# فی ظلالِ القرآن

پارہ ۱ تا ۴

جلد اوّل


سید قطب شہید

ترجمہ

سید معروف شاہ شیرازی



ادارہ منشورات اسلامی

بالمقابل منصورہ ملتان روڈ لاہور

# شہید اسلام سید قطب ؒ اور تفسیر فی ظلال القرآن

شہید اسلام سید قطب کا شمار امت مسلمہ کی ان چند برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریک ادوار میں روشنی کے چراغ جلائے اور اسلامی نظام زندگی کی کھیتی کو اپنے خون سے سینچا۔

سید قطب ؒ ۱۹۰۶ء میں مصر کے ایک صوبہ "اسیوط" کے ایک گاؤں "موشاہ" میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ دونوں عربی النسل تھے۔ سید قطب ؒ اپنے والدین کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔

آپ نے ثانوی تعلیم "تجہیزیہ دارالعلوم" نامی ایک اسکول میں حاصل کی۔ اس اسکول میں طلباء کو دارالعلوم میں داخلہ کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر آپ ۱۹۲۹ء میں قاہرہ کے دارالعلوم میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں آپ نے بی۔ اے کی ڈگری اور ڈپلومہ ان ایجوکیشن حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے محکمہ تعلیم میں بحیثیت انسپکٹر تعلیم ملازمت اختیار کرلی اور ۱۹۵۲ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران ۱۹۵۳ء میں آپ اخوان المسلمون سے متعارف ہوئے۔ اور ۲ جولائی ۱۹۵۴ء میں آپ کو اخوان کے شعبہ نشرواشاعت نے اخبار "الاخوان المسلمون" کا ایڈیٹر مقرر کیا۔

شہید اسلام سید قطب ؒ ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک جیل میں رہے اور اگست ۱۹۶۴ء میں مرحوم عبدالسلام عارف صدر عراق کی کوشش سے رہا ہوئے۔ رہا ہوتے ہی پوری دنیا کے نوجوانوں نے آپ کی طرف رجوع کیا اور آپ کا لٹریچر جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیلنے لگا۔ چنانچہ لادین مغرب پرست کمیونسٹ اور سوشلسٹ عناصر چیخ اٹھے اور بیک وقت ماسکو اور واشنگٹن سے ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ چنانچہ آپ کو ایک سال بعد اگست ۱۹۶۵ء میں دوبارہ گرفتار کرلیا گیا اور ایک سال بعد ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء میں آپ کو شہید کردیا گیا۔

سید قطب اخوان المسلمون میں آنے سے پہلے خالص ادبی کام کرتے رہے۔ لیکن تحریک اخوان المسلمون میں شامل ہونے کے بعد اسلامی انقلاب، اور تحریک اسلامی، ان کا خاص موضوع رہا۔

مصنف نے فی ظلال القرآن میں قرآن پاک کی اثر انگیزی، جس نے عرب کی کایا پلٹ دی تھی کی راہ میں حائل پردوں کو چاک کردیا ہے۔ اس کے ذریعے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والا اس تحریک کے ساتھ جا کھڑا ہوتا ہے جو ہبوط آدم علیہ السلام کے وقت سے روئے زمین پر برپا ہوئی اور انبیا علیہم السلام کی قیادت میں چلتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک آپہنچی۔ آپ ؐ کے بعد بھی یہ تحریک زندہ ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ قاری توحید و رسالت اور آخرت کے عقیدے کو قافلے کے ایک رفیق اور تحریک کے ایک کارکن کی حیثیت سے سنتا اور سمجھتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان کو امت کے ایک فرد کی حیثیت سے پڑھ کر اس سے سبق لیتا ہے۔

فی ظلال القرآن میں علمی موشگافیوں اور فقہی باریکیوں سے ہٹ کر قرآن پاک کے اصل مقصد اور دعوتی رنگ کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے لئے جو زبان استعمال کی گئی ہے۔ وہ سید کا ہی حصہ ہے اور اسے بلاشبہ الہامی زبان کہا جاسکتا ہے۔ اپنے اس رنگ میں یقیناً یہ ممتاز ترین تفسیر ہے۔ تفسیر کیا ہے ایک دعوت عمل اور دعوت انقلاب ہے 'الفاظ اور معنی کا دریا ہے۔ جس میں تحقیقی 'علمی' وجدانی 'اور ادبی نکات جابجا موجود ہیں۔ پورے ذخیرہ تفاسیر میں یہ پہلی تفسیر ہے۔ جو خود قرآن کے اسلوب بیان میں لکھی گئی ہے۔ دوسری تفاسیر بالعموم منطقی انداز بیان میں لکھی گئی ہیں اور فی ظلال القرآن قرآنی اور انقلابی انداز بیان میں ہے۔ اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ یہ اختلافی مسائل اور اسرائیلیات سے خالی ہے۔ اسلام کا جامع تصور لئے ہوئے 'اس کے احیاء کا طریقہ کار نمایاں کرتی ہے۔ غرض اخلاص 'روح ایمان 'عمل صالح اور دعوت انقلاب اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ پندرہ پارے جیل سے باہر اور بقیہ جیل میں لکھے گئے ہیں۔ عربی میں اب تک کئی ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

اردو ترجمہ کی تکمیل کے بعد اب فی ظلال القرآن کی پہلی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس سلسلہ کی مزید ۵ جلدیں 'جلد شائع کرنے کی توفیق نصیب فرمائے آمین ثم آمین (سید عارف شیرازی)

# جلد اول

| | | |
|---|---|---|
| سورۃ الفاتحہ ۔ ۱ | آیات | ۱ -- تا -- ۷ |
| سورۃ البقرہ ۔ ۲ | آیات | ۱ -- تا -- ۲۸۶ |
| سورۃ آل عمران ۔ ۳ | آیات | ۱ -- تا -- ۲۰۰ |
| سورۃ النساء ۔ ۴ | آیات | ۱ -- تا -- ۲۳ |

---ooo---

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# فہرست جلد اول

## پارہ نمبر۔ ۱-------- سورۃ الفاتحہ ۔۱



## .....سورۃ الفاتحہ ۔۱.....



## .....سورۃ البقرہ ۔ ۲.....

## ......پارہ – ۲......

## .....پارہ - ۳.....



## .....سورۃ آل عمران - ۳.....

## .....پارہ - ٤.....



## .....سورۃ النساء - ٤.....

# نوٹ

فی ظلال القرآن کے تفسیری ادب ' میں اپنے اسلوب تفسیر ' انداز بیان اور اپنی صورت فکر کے لحاظ سے ایک منفرد مقام رکھتی ہے ۔ اس کا اسلوب بھی نیا ہے ۔ عربی زبان میں سید قطب صاحب طرز ادیب ہیں ۔ انہوں نے جدید عربی کو بالکل ایک نیا اسلوب دیا ہے ۔ میں اسے "ایمانی اسلوب بیان" سے تعبیر کرتا ہوں ۔ نئی نئی تعبیرات کو استعمال میں لاکر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا ہے ۔ اس کا ترجمہ اس معیار کا تو ممکن ہی نہیں ' میں نے اپنے اس ترجمہ میں نہایت ہی سہل اور سادہ پیرایہ اظہار میں ان کے مفہوم اور مراد کو منتقل کرنے کی سعی کی ہے ۔

کتاب کے معنوی حسن کے ساتھ ساتھ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ اس کی کتابت اور طباعت کا معیار بھی بہتر ہو ' جس کی وجہ سے بہت ہی زیادہ اخراجات اٹھے ۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ زیادہ اخراجات کے باوجود قیمت کم سے کم رکھی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ قارئین اسے خرید سکیں ۔ اس لیے عام کتابوں کی طرح اس میں زیادہ تاجرانہ کمیشن ملنا بھی مشکل ہو گا ۔

اس کتاب کی طباعت اور ترتیب میں برخوردار سید عارف شیرازی نے ' اپنی تعلیمی و تنظیمی مصروفیات کے باوجود میری امداد کی ۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں توفیق دے کہ وہ اس سلسلے کے اختتام تک یہ خدمت کرتے رہیں ۔ اس سلسلے کی مزید دو جلدیں تیار ہیں ۔ باقی تین جلدیں انشاء اللہ جلد ہی منظرعام پر آ جائیں گی ۔ اللہ تعالیٰ اس پیشکش کو قبول فرمائے ' آمین !

تو لیجئے قارئین ! میں ' آپ اور سید قطب شہید کے درمیان زیادہ دیر تک حائل نہیں رہنا چاہتا ۔

سید معروف شاہ شیرازی

منصورہ ۲۵ دسمبر ۱۹۸۷ء

☆☆☆☆☆

# قرآن کے سائے میں

قرآن کے سائے میں زندگی بسر کرنا نعمت عظمیٰ ہے اور اس کی قدر وہی جانتا ہے جو اس سے لطف اندوز ہوا ہو۔ یہ نعمت زندگی کی شان بلند کر دیتی ہے' اسے بابرکت بنا دیتی اور اسے پاک کر دیتی ہے۔ مجھ پر اللہ تعالیٰ کا یہ کرم عظیم ہے کہ اس نے مجھے ایک عرصہ تک قرآن کے سائے میں جینے کا موقع عنایت فرمایا۔ اس عرصہ میں میری کیفیت یہ تھی کہ گویا میں براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوں۔ میں ...... اللہ کا ایک حقیر اور بے بضاعت بندہ۔ اور ذات باری ؎

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

انسان کے لئے' عالم بالا کے اس جلیل القدر اعزاز سے اور بڑا کوئی اعزاز نہیں ہو سکتا۔ کیا ہیں وہ بلندیاں جہاں تک اللہ کا یہ کلام انسانی زندگی کو پہنچاتا ہے اور کیا ہے وہ مقام بلند' جو بندہ ناچیز کا خالق اسے مرحمت فرماتا ہے' ہاں تو ..... قرآن کے سائے میں جیتے ہوئے۔

میں نہایت بلندی سے دیکھتا رہا کہ اس زمین پر جاہلیت کا سیلاب امنڈ رہا ہے۔ میں اس جاہلیت کے پیروکاروں کے حقیر و صغیر تکلفات کو بھی دیکھتا رہا۔ اہل جاہلیت کے خامکارانہ معارف و تصورات اور طفلانہ اہتمامات کو میں ایک فرزانہ اور جہاندیدہ شخص کی نظر سے دیکھتا رہا کہ وہ کھیلتے ہیں گھروندے بناتے ہیں اور بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ مجھے تعجب ہوتا کہ یہ لوگ اس گندے اور وبائی ماحول میں خطرناک حد تک گھرے ہوئے ہیں اور اس جلیل القدر آسمانی آواز کو نہیں سن رہے جو انہیں مسلسل پکار رہی ہے اور جو ان کی زندگی کو بلند' بابرکت اور پاکیزہ بنانا چاہتی ہے۔

اور قرآن کے سائے میں جیتے ہوئے ......

میں اس کائنات کی غرض و غایت' موجودات کے مقصد وجود اور وجود انسانی کے بارے میں ایک مکمل و جامع اور ایک بلند و پاکیزہ تصور سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ میں اس پاکیزہ تصور حیات اور ان جاہلی تصورات زندگی کے درمیان موازنہ کرتا جن کے مطابق مشرق و مغرب میں آج پوری انسانیت زندگی بسر کر رہی ہے اور قدرتی طور پر میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا کہ انسانیت اس سڑاند' ان پستیوں اور اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں کیونکر زندگی بسر کر رہی ہے جبکہ اس کے پاس ایک سرسبز و شاداب سیرگاہ' ایک بلند مقام اور ضو پاش چراغ ہے۔

اور قرآن کے سائے میں جیتے ہوئے ......

میں نے محسوس کیا کہ انسان کی حرکت اور اس پوری کائنات کی حرکت کے درمیان مشیت ایزدی ایک حسین ربط ہے۔ دونوں کو اللہ نے پیدا کیا اور دونوں اسی کے ارادے کے مطابق متحرک ہیں۔ پھر پوری انسانیت قوانین فطرت کی خلاف ورزی کر رہی ہے اور اس وجہ سے گم کردہ راہ ہو کر بے حد و حساب مصائب کا شکار ہے۔ اس کی فطرت سلیمہ اور ماحول کی ان فاسد اور فتنہ پرور تعلیمات کے درمیان کشمکش برپا ہے۔ جو اس ماحول میں رائج ہیں اور ہر طرف سے اسے یہ خلاف فطرت تعلیمات دی جا رہی ہیں۔ میں بڑی بے بسی سے اپنے دل میں کہتا کہ کوئی شیطان ہے جو پوری انسانیت کو اس جہنم کی طرف لے جا رہا ہے اور حیرت ہے ان لوگوں پر کہ وہ بے خبر ہیں اور نہیں سمجھتے۔

اور قرآن کے سائے میں جیتے ہوئے ......

میں نے اس کائنات کو اس کی ظاہری شکل و صورت سے کہیں بڑا پایا۔ میں نے دیکھا کہ یہ ایک عظیم حقیقت ہے' اس کے متعدد پہلو ہیں' اس میں صرف عالم عیاں ہی نہیں عالم غیاب بھی ہے۔ وہ صرف دنیا ہی نہیں بلکہ دنیا بھی ہے اور آخرت بھی۔ ایک طویل راہ حیات ہے۔ انسانی زندگی اس کی گھاٹیوں میں پھیلی ہوئی ہے لیکن موت اس سفر حیات کی آخری منزل نہیں ہے بلکہ اس طویل سفر کا ایک اہم مرحلہ ہے۔ انسان اس زمین پر جو کچھ سمیٹ سکتا ہے صرف وہی اس کا پورا حصہ نہیں ہے' بلکہ اس کے لئے مقررہ حظ وافر کی قسط اول ہے۔ اگر اس دنیا میں وہ جزائے وفاق نہیں پا سکا تو کیا بات ہے۔ آخرت میں اسے پورا بدلہ دیا جائے گا وہاں نہ ظلم ہو گا' نہ کمی ہو گی اور نہ ہی ضیاع اجر کا امکان ہو گا..... نیز وہ مرحلہ حیات جسے وہ ستارہ زمین کی پشت پر طے کر رہا ہے محض سفر ہی نہیں بلکہ وہ اسے ایک زندہ و مانوس اور محب و انیس کائنات کی معیت میں طے کر رہا ہے۔ ایک زندہ' سامع اور مجیب کائنات کے درمیان' جو اسی خالق کائنات کی طرف متوجہ ہے۔ جس کی طرف ایک مومن عالم خضوع اور خشوع میں متوجہ ہوتا ہے وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۞ (السجدہ) وہ تو اللہ ہی ہے جس کو زمین و آسمان کی ہر چیز طوعاً و کرہاً سجدہ کر رہی ہے۔ (۱۳-۱۵) تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ

"اس کی پاکی تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں بیان کر رہی ہیں جو آسمان و زمین میں ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو۔" (۱۷-۴۴) کیا راحت ہے اور کیا ہی وسعت؟ اس انس اور وثوق کا کیا کہنا جو ایک چشمے کی طرح زندگی کے اس کامل' ہمہ گیر اور وسیع تصور سے قلب انسانی پر پھوٹا پڑتا ہے۔

اور قرآن کے سائے میں جیتے ہوئے......

میں نے پایا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک بلند رتبہ دیا ہے اور یہ عزت اور مرتبہ اسے نہ پہلے کسی تصور حیات سے ملا اور نہ آئندہ ملے گا۔ قرآنی تصور کی رو سے انسان وہ ذات ہے جس میں خود اللہ ذوالجلال نے اپنی روح پھونکی۔ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ "اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔" (۱۵-۲۹) بلکہ وہ اس کے ساتھ رب ذوالجلال کا خلیفہ بھی ہے وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً "اور جس وقت کہا آپ کے رب نے فرشتوں کو کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔" (۲-۳۰) اور لیجئے وہ اس پوری کائنات کا امین بھی ہے اور یہ اسی کے لئے ہے۔ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ مسخر کر لیا ہے تمہارے لئے زمین کی چیزوں کو۔" (۲۲-۶۵) انسان کی برگزیدگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی اس قدر و منزلت سے آگے بڑھ کر اللہ کی ہدایت اور مشفقانہ نفخ روح ہی کو پوری انسانیت کے باہمی اجتماعی روابط کی اساس اور وسیلہ بنایا۔ ربط انسانیت کی عمارت کی اساس ایمان باللہ کے عقیدے پر رکھی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مومن کا نظریہ اور عقیدہ ہی اس کی قومیت قرار پایا۔ اور عقیدہ ہی اس کا وطن بنا۔

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

عقیدہ ہی اس کا خاندان قرار پایا' ایک مومن بھائی کا درجہ سگے بھائی سے بلند اور مضبوط ہو گیا۔ چنانچہ انسانیت کا مستحکم اجتماع اور اکٹھ ہمیشہ عقیدے ہی کی بنیاد پر ہوا اور کبھی وہ حیوانات اور بہائم کی طرح باڑے' چراگاہ' چارے اور ریوڑ کی بنیاد پر جمع نہ ہوئی۔

ذرا دیکھئے تو کسی مومن کا نسب کس قدر بلند ہے۔ اس کا شجرہ نسب تاریخ انسانیت میں دور دور تک جا پہنچا ہے۔ وہ ایک ایسے معزز خاندان کا فرد ہے جس کی قیادت اونچے درجے کے معزز حضرات کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی حضرت نوح علیہ السلام' حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت اسماعیل علیہ السلام' حضرت اسحاق علیہ السلام' حضرت یعقوب علیہ السلام' حضرت یوسف علیہ السلام' حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بالآخر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

إِنَّ هَٰذِهِۦٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَٰحِدَةً وَأَنَا۠ رَبُّكُمْ فَٱعْبُدُونِ "یہ ہے امت ایک اور میں تمہارا رب ہوں پس میری ہی بندگی کرو۔"
(۲۱-۹۲)

یہ معزز اور مکرم جماعت' انسانیت کی تاریخ قدیم کے نشیب و فراز میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن کریم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہر فرد کو ایک ہی جیسی صورت حال کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ہر جگہ وہی موقف' وہی بحران' اور ویسے ہی تجربات و پیش آنے والے واقعات ہیں۔ زبان و مکان بدل رہے ہیں۔ نئی نئی اقوام تاریخ کے اسٹیج پر آتی ہیں لیکن ایک ہی پارٹ ادا کر رہی ہیں۔ ہر جگہ ان حضرات کا استقبال ضلالت و گمراہی' ہوا و ہوس' تمرد و سرکشی' ظلم و تعدی اور تہدید و جلاوطنی سے کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ جماعت متاثر ہوئے بغیر برابر اپنی راہ پر گامزن نظر آتی ہے۔ اس کا ضمیر مطمئن ہے' پاؤں جمے ہوئے ہیں اور اسے اللہ کی حمایت و نصرت کا بھرپور یقین ہے۔ ناامیدی کا کہیں نام و نشان نہیں اور اسے ہر لمحہ اللہ کی حمایت و نصرت کا بھرپور یقین ہے۔ ناامیدی کا کہیں نام و نشان نہیں اور اسے ہر لمحہ اللہ کے اس سچے وعدے پر بھروسہ ہے۔ اس قافلہ حق کو ہر دور میں یہ چیلنج دیا گیا۔

وَقَالَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُم مِّنْ أَرْضِنَآ أَوْ لَتَعُودُنَّ فِى مِلَّتِنَا ۖ فَأَوْحَىٰٓ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ ٱلظَّٰلِمِينَ O وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ ٱلْأَرْضَ مِنۢ بَعْدِهِمْ ۚ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِى وَخَافَ وَعِيدِ O

"آخر کار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ "یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہو گا ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے۔" تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے۔ یہ انعام ہے اس کا جو میرے حضور جواب دہی کا خوف رکھتا ہو اور میری وعید سے ڈرتا ہو۔"

ہر جگہ وہی موقف' وہی تجربہ اور وہی تہدید ہے.... لیکن اس کے مقابلے میں ہر جگہ ایک ہی یقین محکم ہے اور ایک ہی وعدہ ہے جو اس برگزیدہ جماعت کے ساتھ ہو رہا ہے اور مومنین کی جماعت۔ "یہ سب مظالم سہتے ہوئے اور ہر قسم کی وعید و تخویف سنتے ہوئے' پایان کار ایک ہی جیسے انجام کی منتظر ہے۔

اور قرآن کے سائے میں جیتے ہوئے......

میں نے جانا کہ اس کائنات میں اندھے اتفاق کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ نہ یہ دنیا بغیر کسی سوچی سمجھی سکیم کے اچانک ہی نمودار ہو گئی ہے إِنَّا كُلَّ شَىْءٍ خَلَقْنَٰهُ بِقَدَرٍ "ہم نے ہر چیز کو اندازے سے پیدا کیا۔" (۵۴-۴۹) وَخَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ فَقَدَّرَهُۥ تَقْدِيرًا O "اس نے ہر چیز کو پیدا کیا' پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔" (۲۵-۲)..... بے شک یہاں ہر کام کسی نہ کسی حکمت کے مطابق ہی ہو رہا ہے لیکن یہ حکمت نہایت ہی گہری اور پردہ غیب میں مستور ہے اور کبھی وہ ہماری تنگ ظاہر بین سے اوجھل بھی رہتی ہے۔ فَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُوا۟ شَيْـًٔا وَيَجْعَلَ ٱللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا O "ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔" (۴-۱۹) وَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُوا۟ شَيْـًٔا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰٓ أَن تُحِبُّوا۟ شَيْـًٔا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ "ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لئے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لئے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔" (۲-۲۱۶)

رہی متعارف اسباب کی دنیا' جس کے مطابق لوگ کاروبار زندگی چلاتے ہیں تو اس کی حالت بھی یکساں نہیں ہے۔ کبھی تو ان اسباب سے متوقع نتائج نکل آتے ہیں اور کبھی نہیں بھی نکلتے۔ حتیٰ کہ جن مقدمات کو عوام حتمی اور یقینی سمجھتے ہیں ان سے بھی متوقع نتائج کبھی برآمد

ہوتے ہیں اور کبھی نہیں ہوتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان مقدمات و اسباب کو ظہور نتائج میں مطلق دخل نہیں ہے۔ یہ تو صرف اللہ کا ارادہ مطلقہ ہے جو خود ان نتائج کا بھی خالق ہے اور اس طرح ان کے اسباب و مقدمات کو بھی پیدا کرتا ہے لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝ "تجھ کو خبر نہیں' شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کردے۔" (۶۵-۱) وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ "اور اللہ کے چاہے بغیر تم کوئی بات چاہ نہیں سکتے۔" (۷۶-۳۰) اس میں شک نہیں کہ ترک اسباب از روئے شریعت روا نہیں ہے۔ مومن انہیں اختیار کرتا ہے اور وہ مراعات اسباب پر مامور ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے آثار و نتائج کا صحیح اندازہ صرف اللہ۔ کہ علم وقدرت میں ہے اور انسان کے لئے پرامن راستہ صرف یہی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت' اس کے عدل وانصاف اور اس کے علم و حکمت پر مطمئن ہو اور صرف اسی صورت میں وہ قلق اور وسوسوں سے نجات پا سکتا ہے۔ اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ یَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ

✓ "شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرز عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔" (۲-۲۶۸)

ان وجوہات سے جب قرآن کریم کی چھاؤں میں.......

میں زندگی بسر کر رہا تھا تو میرا دل مطمئن تھا' میرا نفس پرسکون تھا اور میرا ضمیر برقرار تھا۔ مجھے ہر حادثہ اور ہر امر اللہ کی قدرت کا کرشمہ نظر آنے لگا۔ میں خاص اللہ کی پناہ اور نگرانی میں جی رہا تھا۔ اور مجھے صفات الہٰی کی ایجابیت (Possitivness) اور فاعلیت (Activeness) کا مکمل شعور تھا۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ "کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے۔" (۲۷-۶۲) وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ۝ "وہ اپنے بندوں پر کامل اختیار رکھتا ہے اور وہ دانا اور باخبر ہے۔" (۶-۱۸) وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ "اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔" (۱۲-۲۱) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ "اور جان رکھو کہ اللہ' آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے۔" (۸-۲۴) فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۝ "جو چاہے کرے" (۱۱-۱۰۷) وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۝ "اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں ہوتا اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔" (۶۵-۳) مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا "کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔" اَلَیْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ وَیُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ "یہ لوگ اس کے سوا دوسروں سے تم کو ڈراتے ہیں۔" (۳۹-۳۶) وَمَنْ یُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ "اور جسے اللہ ذلیل وخوار کرے اسے پھر کوئی عزت دینے والا نہیں ہے۔" (۲۲-۱۸) وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ "جسے اللہ بھٹکا دے اسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہوتا۔" (۴۰-۳۳)

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اندھے اور بہرے مشینی قوانین کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ دیا بلکہ ان قوانین فطرت کے پیچھے ایک مدبر ارادہ ہے اور ایک مطلق مشیت ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ میں نے یہ بات اچھی طرح جان لی کہ اللہ کی قدرت برابر کام کر رہی ہے۔ لیکن اس کے کام کا ایک خاص طریقہ ہے اور ہمارے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم کسی کام میں جلد بازی

کریں یا اللہ کی بارگاہ میں تجاویز بھیجتے پھریں کیونکہ اسلامی نظام زندگی..... جیسا کہ قرآن کے گہرے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے..... بنایا ہی اس لئے گیا ہے کہ وہ ہر معاشرے میں چلے۔ انسانی ترقی کے ہر مرحلے میں اور بنی نوع انسان کے ذہنی ارتقاء کے مختلف حالات میں سے ہر حال میں رائج و نافذ ہو۔ یہ نظام زندگی اس آدمی کے لئے بنایا گیا ہے جو اس کرہ ارض پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس نظام میں اس آدمی کی فطرت 'اس کی قوتوں 'اس کی قابلیتوں 'اس کے حالات 'اس کی کمزوریوں اور ہر لحہ بدلنے والے حالات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ یہ نظام انسانوں کے بارے میں کوئی بری رائے نہیں رکھتا کہ اس کرہ ارض پر اس کی کوئی حیثیت اور وقعت ہی نہ ہو۔ آدمی مختلف شکلوں اور صورتوں کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بحیثیت ایک فرد بھی بحیثیت ایک جماعت بھی اور یہ نظام زندگی کی کسی ظاہری شکل کو حقیر نہیں سمجھتا۔ اسی طرح یہ نظام محض خیالی باتوں کے درپے نہیں ہوتا اور انسان کو اس کی حقیقی قدر و منزلت 'اس کی طاقت اور قابلیت اور اس کے مقصد وجود سے زیادہ بلند بھی نہیں کرتا 'جس کے لئے اسے روز اول سے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ نظام دونوں حالتوں میں یہ فرض نہیں کرتا کہ فطرت انسانی کے بنیادی عناصر کوئی سطحی چیز ہے اور انہیں کسی قانون کے ذریعے تخلیق کیا جاسکتا ہے۔ یا محض قلم کاری کے بل بوتے پر انسان کو اپنی فطرت سلیمہ سے معراء کیا جاسکتا ہے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ انسان اپنی فطرت 'اپنے میلانات اور اپنی قابلیت کے نقطہ نظر سے اپنی اسی مخصوص شکل میں ایک مستقل "حقیقت ہے اور اسلامی نظام زندگی صرف اس کی رہنمائی کرکے اسے ان بلند درجات تک پہنچانا چاہتا ہے جو اس کے لئے 'اس کے مقصد تخلیق اور اس کی ذمہ داریوں کے نقطہ نظر سے مقرر ہیں۔ یہ نظام آدمی کی ذات 'اس کی فطرت اور اس کے بنیادی عناصر ترکیبی کا احترام کرتے ہوئے اسے اس راہ پر چلاتا ہے جو سیدھی ذات باری تک جا پہنچتی ہے..... غرض اسلامی نظام زندگی ایک طویل زمانے کے لئے بنایا گیا ہے جس کی طوالت کا صحیح اندازہ اس انسان کے خالق اور اس قرآن کے نازل کرنے والے ہی کے پاس ہے۔ اس لئے 'اپنے بلند مقاصد کے حصول کے لئے" یہ نظام نہ تو بے راہ روی اختیار کرتا ہے نہ جلد بازی سے کام لیتا ہے۔ اس کے سامنے ایک طویل عرصہ حیات اور ایک وسیع میدان کار ہے۔ ایک فرد کی عمر اسے محدود نہیں کر سکتی 'نہ ہی کسی فنا ہونے والے کی یہ خواہش اور ڈر کہ اپنے انتہائی مقصد تک پہنچنے سے قبل ہی کہیں اس کا سررشتہ حیات ٹوٹ نہ جائے 'اسے اپنی فطری رفتار سے تیز کر سکتا ہے۔

عام طور پر دنیاوی نظریات و مذاہب کے حاملین کا حال ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ تمام کام کو ایک ہی نسل میں کر گزرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح وہ فطرت کے متوازن طریق کار سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک متوازن اور صبر آزما طریق کار کے مطابق کام کرنے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں رکھتے۔ اور وہ جو راہ اختیار کرتے ہیں 'اس میں قتل و غارت ہوتی ہے 'خون ناحق ہوتا ہے 'اعلیٰ اقدار پامال ہوتی ہیں اور زندگی کے پرسکون معاملات میں ایک شدید اضطرابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فطرت سے ٹکرا کر ایسے لوگ خود بھی پاش پاش ہو جاتے ہیں اور جب انکے مصنوعی نظریات فطرت سلیمہ کی زد میں آتے ہیں تو ان کا نام و نشان ہی صفحہ ہستی سے مٹ جاتا ہے ' کیونکہ فطرت کے مقابلے میں ناپختہ نظریات کبھی نہیں ٹھہر سکتے۔

اس کے مقابلے میں اسلامی نظام زندگی نہایت دھیمی رفتار سے 'فطرت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ بعض مواقع پر وہ فطرت کو آگے بڑھاتا ہے 'بعض جگہ وہ اسے پیچھے ہٹاتا ہے۔ اگر اس میں کجی آجائے تو اسے سیدھا کر دیتا ہے 'وہ اس میں توڑ پھوڑ کو پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک صاحب بصیرت اور صاحب حکمت انسان کی طرح صبر کرتا ہے 'جسے منزل مقصود تک پہنچ جانے کا وثوق ہوتا ہے اور جسے یقین ہوتا ہے کہ جو کام اس کوشش میں نہیں ہو پاسکا وہ دوسری میں ہو جائے گا ورنہ تیسری میں 'ورنہ دسویں میں 'ورنہ سویں میں 'ورنہ ایک ہزارویں میں تو ہو کے رہے گا۔ کیونکہ زمانہ طویل ہے 'مقصد واضح ہے اور اعلیٰ مقصد تک پہنچنے کے لئے راہ دور ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک پودا اگتا ہے 'اس کی جڑیں زمین میں گہری ہوتی چلی جاتی ہیں اور پھر اس کی شاخیں فضا میں دور دور تک پھیل جاتی ہیں اور وہ ایک دوسرے سے

پیوستہ ہوتی ہیں اور اسی میں ان کے لئے امید بہار ہوتی ہے۔ بعینہ اسی طرح اسلامی نظام حیات کا پودا دلوں میں اگتا ہے۔ دھیرے دھیرے وہ بلند ہوتا ہے اور اس کے بعد زمین پر ہونا وہی کچھ ہے جس کے بارے میں اللہ کے ہاں فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے کہ ہو جائے۔ دیکھئے کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ فصل ریت میں دب جاتی ہے۔ کبھی اسے ٹڈی دل چاٹ جاتا ہے۔ کبھی خشک سالی اسے تباہ کر دیتی ہے۔ کبھی سیلاب اسے بہا کر لے جاتا ہے لیکن ایک صاحب بصیرت کسان اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ فصل اپنی جڑ کے لحاظ سے باقی ہے' اسے کامل ہونا ہے اور بالآخر ایک عرصہ بعد وہ ان سب آفات پر غالب آجاتی ہے لیکن ان سب حالات کے باوجود کسان جلد بازی نہیں کرتا' پریشان نہیں ہوتا اور فطرت کے متوازن اور تدریجی خوشگوار اور پیارے طریق کار کے علاوہ کسی اور مصنوعی طریق سے وہ اس فصل کو پکانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ یہی ہے اسلامی انقلاب کا ربانی طریق کار جو اس پوری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ یہی سنت اللہ ہے اور ظاہر ہے کہ سنت اللہ میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔" وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا

اسلامی نظام حیات کی رو سے اس کائنات کی تعمیر میں سچائی ایک ٹھوس (Solid) حقیقت ہے۔ یہ کوئی سرسری حادثہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی غیر مطلوب و مقصود اتفاق ہے۔ اللہ ہی حق ہے اور ہر موجود اپنا وجود اسی سے اخذ کرتا ہے۔ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ

"یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور اسے چھوڑ کر جن دوسری چیزوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں اور اللہ ہی بزرگ و برتر ہے۔" (۳۱-۳۰) نیز اللہ نے اس کائنات کو حق پر پیدا کیا ہے اور اس کی مخلوق میں باطل کی آمیزش نہیں ہو سکتی۔ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ "اللہ نے یہ سب کچھ بطور حق بنایا ہے۔" رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ "پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا' تو پاک ہے۔" (۳-۱۹۱) حق و صداقت ہی اس کائنات کا قوام ہیں۔ اگر یہ کائنات صداقت کی ڈگر سے ہٹ جائے تو پھر تباہی یقینی ہے۔ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ "اگر حق ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین و آسمان اور ان کے درمیان ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔" ( بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ "مگر ہم باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے۔" (۲۱-۱۸) اس لئے یہ لابدی ہے کہ سچائی ظاہر ہو اور باطل روپوش ہو جائے۔ اگرچہ بظاہر اس کے خلاف نظر آئے۔

نیز نیکی' بھلائی اور احسان بھی' صداقت کی طرح ٹھوس حقائق ہیں اور جب تک یہ دنیا باقی ہے باقی رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهُ ۚ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ

"اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا۔ پھر جب سیلاب اٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آ گئے اور ایسے ہی جھاگ ان دھاتوں پر بھی اٹھتے ہیں جنہیں زیور اور برتن وغیرہ بنانے کے لئے لوگ پگھلایا کرتے ہیں۔ اسی مثال سے اللہ حق و باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لئے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔ اسی طرح مثالوں سے اللہ اپنی بات سمجھاتا ہے۔" (۱۳-۱۷) اور دوسری جگہ ہے أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۝ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت، جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے۔ یہ مثالیں اللہ اس لئے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بدذات درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے، اس کے لئے کوئی استحکام نہیں ہے۔ ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قول ثابت کی بنیاد پر دنیا و آخرت دونوں میں ثابت عطا کرتا ہے اور ظالموں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے۔ اللہ کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔

ذرا غور تو کیجئے! اس قدر عظیم اطمینان ہے جسے یہ تصور حیات جنم دے رہا ہے۔ سکون و طمانیت کا ایک سرچشمہ ہے، جس کے سوتے قلب مومن میں پھوٹ رہے ہیں۔ کس قدر بھرپور یقین ہے حق و صداقت اور صلاح و تقویٰ پر اور قوت اور سربلندی کا مدہوش کن جام ہے جو ایک چھوٹی سی مثال کے ذریعہ قلب مومن میں انڈیلا جا رہا ہے۔

قرآن کے سائے میں جی کر.........

میں اس یقین محکم اور قطعی فیصلے پر پہنچا کہ اس زمین کی اصلاح، اس میں بسنے والی انسانیت کی مسرت، انسان کے لئے اطمینان قلب، اس زمین میں اس کے لئے سربلندی اور برتری، اس کے کاموں میں برکت اور پاکیزگی اور سب سے زیادہ یہ کہ اس کائنات کے قوانین قدرت اور انسانی زندگی کے فطری امور کے درمیان ہم آہنگی صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ انسان از سر نو خدا کی طرف رجوع کرے۔

قرآن کریم کے گہرے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خدا کی طرف "رجوع" صرف ایک ہی صورت میں ممکن ہے۔ اللہ تک پہنچنے کا راستہ صرف ایک ہے جس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے اور وہ راستہ یہ ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی کو اس نظام حیات کے مطابق تبدیل کر دیں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہی کتاب میں، پوری انسانیت کے لئے نازل فرمایا ہے۔ اس طرح کہ تمام انسان اپنی پوری زندگی میں اس کتاب کو حکم بنائیں اور اپنی زندگی کے تمام حالات و قضیات میں صرف اس کے مطابق فیصلے کریں۔ اگر یہ صورت نہیں ہوتی تو پھر روئے زمین پر فساد ہی فساد ہو گا، لوگوں کے لئے بدنصیبی مقدر ہو چکی ہو گی، گندگیوں کے سیلاب میں گرنا ہو گا اور اس زمین پر جاہلیت کا دور دورہ ہو گا، جو اللہ کے بجائے ہوائے نفس کی بندے کرے گی۔ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ "اگر وہ تمہارا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دراصل یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں، اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو گا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے۔ اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز نہیں بخشتا۔" (۲۸-۵۰)

اللہ کی کتاب ہی کے مطابق فیصلے کرنے کا یہ حکم کوئی مستحب یا اختیاری امر ہی نہیں ہے بلکہ اس پر ہمارے ایمان کا دارومدار ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ایمان نہیں ہے وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ "کسی مومن مرد اور کسی مومنہ عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ﷺ کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ (۳۳-۳۶) ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا

تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ

"اس کے بعد اے نبی ﷺ 'ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے۔ لہذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔ اللہ کے مقابلے میں وہ تمہارے کچھ بھی کام نہیں آسکتے۔ ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور متقیوں کا ساتھی اللہ ہے۔" (۴۵۔۱۸'۱۹)

لہذا یہ معاملہ نہایت ہی اہم ہے اور اس کا تعلق اساسی عقائد سے ہے بلکہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اس پر پوری انسانیت کی سعادت و شقاوت کا دارومدار ہے۔ یہ انسانیت جسے اللہ نے تخلیق کیا ہے 'اپنی فطرت کا راز اس وقت تک نہیں پا سکتی جب تک وہ خود صانع کائنات کی بنائی ہوئی چابیوں کو استعمال نہ کرے۔ اس کے دکھ درد اور اس کی بیماریوں کا علاج صرف اسی دوا سے ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے تجویز ہو اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر عقدے کا حل اور ہر بیماری کا علاج صرف اسلامی نظام زندگی میں ودیعت کیا ہوا ہے۔ وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۝ اور ہم اس قرآن کے سلسلہ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لئے تو شفاء اور رحمت ہے مگر ظالموں کے لئے خسارے کے سوا اور کچھ چیز میں اضافہ نہیں کرتا۔" اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ "حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔" (۱۷۔۹)

انسانوں کا بھی عجیب حال ہے کہ وہ اس قفل کو اس کاریگر کے پاس نہیں لے جاتے جس نے اسے بنایا۔ بیمار کے علاج کے لئے مشورہ اس ذات سے نہیں کرتے جس نے بیمار کو پیدا کیا۔ وہ اپنی شخصیت 'اپنی انسانیت اور اپنی شقاوت و سعادت جیسے اہم معاملات میں بھی سادہ اور فطری طریق کار اختیار نہیں کرتے جو اپنے روز مرہ کے چھوٹے موٹے کاموں میں استعمال ہونے والے معمولی آلات اور مشینوں کے سلسلے میں اپنی عام زندگی کے دوران استعمال کرتے ہیں۔ عام طور پر لوگ کسی مشین کو درست کرنے کے لئے اس کارخانے کے انجینئر یا ماہر کو بلاتے ہیں جس نے اس مشین کو تیار کیا ہوتا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ انسانیت اس سادہ اصول کو خود اپنے نفس کے بارے میں استعمال نہیں کرتی تاکہ اسے بھی وہ اس کارگاہ کی طرف لوٹا دے جہاں سے نفس تیار ہو کر آیا ہے۔ وہ اس کے معاملات میں اس ذات سے کوئی استفسار نہیں کرتی جس نے اس عجیب و غریب کل کی تخلیق کی۔ یہ عظیم انسانی مشین 'نہایت قیمتی' باریک اور نازک 'جس کی باریکیوں اور اندرونی پیچیدگیوں کو صرف وہی جانتا ہے جس نے اسے پیدا کیا اور اس کی تخلیق کی اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۭ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ

"وہ دلوں تک کی باتوں سے خوب واقف ہے۔ کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے اور وہ باریک بین اور پورا باخبر ہے۔" (۶۷۔۱۴) یہیں سے اس گم کردہ راہ بیچاری حیران و پریشان انسانیت کی بدبختی کا آغاز ہوتا ہے 'جو رشد و ہدایت اور آرام و سعادت صرف اسی صورت میں پا سکتی ہے کہ وہ انسانی فطرت کو 'اس کے صانع اور خالق کی طرف لوٹا دے۔ جس طرح کہ وہ ایک معمولی مشین کو اس کے اوّلی صانع اور بنانے والے کے پاس بغرض اصلاح لے جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا مقام قیادت سے برطرف کر دیا جانا 'انسانیت کی تاریخ میں' پوری انسانی تاریخ کا ایک اندوہناک حادثہ تھا۔ انسانوں کی تاریخ میں یہ ایک عظیم الشان اور تباہ کن شکست تھی۔ اور اس سے قبل انسانیت پر جس قدر مصائب بھی نازل ہوئے 'ان سب میں سے یہ عظیم تر مصیبت تھی۔

اسلام نے انسانیت کی قیادت کا منصب اس وقت سنبھالا تھا جبکہ پوری دنیا کا نظام فاسد ہو گیا تھا۔ انسان کے لئے زندگی وبال جان بن گئی تھی' قیادت متعفن ہو گئی اور فاسد قیادت اس کے لئے بے پناہ مصائب و آلام کا باعث بن رہی تھی اور دنیا کی حالت یہ تھی کہ

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ "خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے' لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے۔" (۳۰-۴۱)

اسلام نے اس قرآن مجید کو دستور حیات بنا کر دنیا کی قیادت کی ذمہ داری سنبھالی' دنیا کو وہ نیا تصور دیا گیا جو قرآن اور اس کی تعلیمات پر مبنی شریعت نے پیش کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں انسانیت کو بالکل ایک نیا جنم ملا جو اس کے طبیعی جنم سے زیادہ عظیم تھا۔ قرآن کریم نے انسانیت کو اس کائنات' حیات انسانی' اعلیٰ اقدار اور زندگی کے معاملات کی تنظیم کے لئے ایک جدا تصور دیا۔ پھر اس نے اس تصور حیات کے مطابق ایک معاشرہ عملاً قائم بھی کر دیا۔ قرآن مجید کے پیدا کردہ اس معاشرے سے قبل' انسانیت کے لئے محض خیالی اور ایسے مجرد معاشرت کا تصور تک ممکن نہ تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت متقاضی نہ ہوتی اور وہ عملاً اس معاشرے کو قائم نہ کر دیتا تو انسانیت کے لئے ایسے بلند و برتر' حسین و جمیل' سہل و سادہ' مثبت و حقیقت پسندانہ اور متوازن و متناسب معاشرے کا تصور تک کرنا بھی ممکن نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے.........

قرآن کے سائے میں.......

قرآنی شریعت کے ذریعہ.......

اور اسلامی نظام زندگی کے مطابق.......

اس زندہ و تابندہ معاشرے کو عالم وجود میں لا کر کھڑا کر دیا۔

وائے ناکامی! پھر اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کے بعد یہ تباہ کن شکست اور تاریخی واقعہ عالم ظہور میں آیا۔ اسلام کو مقام قیادت سے ہٹا دیا گیا تاکہ جاہلیت ایک بار پھر' اپنی مختلف شکلوں میں دندناتی پھرے۔ جیسا کہ آج وہ مادیت کے روپ میں ہمارے سامنے ہے۔ اور انسانیت ہے کہ اس پر فریفتہ ہوئی جا رہی ہے۔ اس کی مثال بعینہ اسی طرح ہے جیسے بچے زرق و برق لباس اور قیمتی رنگارنگ کھلونوں کو دیکھ کر بے تاب ہو جاتے ہیں۔

بدقسمتی سے اس وقت ہمارے درمیان ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو انسانیت کا دشمن ہے۔ اور اسے صریح دھوکہ دے رہا ہے۔ یہ طبقہ اسلامی نظام زندگی کو ایک ہاتھ میں اور انسان کی مادی ترقیوں کو دوسرے ہاتھ میں رکھ کر دنیا کو کچھ اس رنگ میں دعوت دیتا ہے کہ "ان دو چیزوں میں سے تم کسی ایک کو اختیار کر لو! یا تو اسلامی نظام زندگی اختیار کر لو اور مادی میدان میں انسان نے جو ترقیاں کی ہیں ان سے دست بردار ہو جاؤ اور یا انسان کی علمی ترقیوں کے پھل چن لو اور اسلامی نظام زندگی کو ترک کر دو۔" یہ نہایت ہی مذموم دھوکہ ہے اور خباثت سے پر سازش ہے' جو اسلام اور پوری انسانیت کے خلاف کی جا رہی ہے۔ کیونکہ مسئلہ کی حقیقی صورت یہ ہرگز نہیں ہے۔ اسلامی نظام زندگی' انسانی ترقیوں کا مخالف نہیں ہے' وہ تو ان ترقیوں کا موجد ہے اور ان کے لئے ترقی و افادیت کی ایک صحیح سمت مقرر کرتا ہے اور مادی ترقیوں کو صحیح رخ پر ڈال دیتا ہے تاکہ انسان خلافت فی الارض کے منصب کو خوش اسلوبی سے سنبھال سکے۔ خلافت خداوندی کا یہ منصب عظیم انسان کو خود اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمایا ہے اور اسی منصب کی وجہ سے انسان کی قدر و منزلت میں دوسری مخلوق کے مقابلے میں اضافہ ہوا ہے۔ اس منصب کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو کچھ خاص قوتیں بھی عطاء کیں' جو اس کے فرائض اور ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے ضروری تھیں۔ اور انسان کے لئے تکوینی قوانین کو سہل کر دیا گیا تاکہ وہ ان فرائض کی ادائیگی میں انسان

کے ممد اور معاون ہوں۔ اس کائنات کی تخلیق اور انسان کی تخلیق کے درمیان خدا تعالیٰ نے ایک خاص توازن برقرار رکھا ہے تاکہ وہ اس کائنات میں زندہ رہے' کام کرے اور نئی نئی چیزیں دریافت کرے۔ لیکن اس کی ہر ایجاد اللہ کی عبادت اور بندگی ہو اور اللہ تعالیٰ کے عظیم انعامات و اکرامات پر شکر گذاری کے وسائل میں سے ایک وسیلہ ہو۔ اور یہ تمام کام اللہ تعالیٰ کی شرط خلافت کے دائرے کے اندر رہ کر کیا جائے اور انسان کی ہر حرکت اور اس کا ہر عمل رضائے الٰہی کے دائرے کے اندر محدود ہو۔

جو لوگ اسلامی نظام حیات کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھتے ہیں اور انسانی ترقیوں کو دوسرے میں وہ دراصل بدنیت اور شریر ہیں۔ وہ اس حیران اور واماندہ انسانیت کے لئے گھات میں بیٹھے ہیں۔ اور جب بھی وہ اس حیرانی و پریشانی اور گمراہی و ضلالت سے نکلنے کا ارادہ کرتی ہے اور ناصح مشفق کی میٹھی آواز پر کان دھرتی ہے اور اس پر آمادہ ہوتی ہے کہ اس حیرانی اور ہلاکت سے نکل آئے اور اللہ تعالیٰ کے جوار رحمت میں پر امن زندگی بسر کرے تو گھات میں چھپے ہوئے یہ دشمن اسے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک گروہ ایسا بھی ہے کہ اس میں خلوص دل کی کمی تو نہیں لیکن وہ معاملے کو صحیح طریقے سے سمجھ نہیں سکا۔ اس کی نظر گہری نہیں ہے ۔ طبعی اکتشافات اور مادی ترقیوں کی چمک دمک نے اس کی نظروں کو چندھیا دیا ہے اور مادی دنیا میں انسان کی عظیم اور بے مثال کامیابیوں سے وہ مرعوب ہے۔ یہ تحیر اور مرعوبیت ان کے شعور کا جزو بن جاتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ طبعی قوانین اور ایمانی اقدار کے درمیان فرق کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی عملی زندگی میں اور اس کائنات میں' ان اقدار کا جو اثر ہوتا ہے وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ اس گروہ نے طبعی قوانین کے لئے ایک علیحدہ میدان کار تجویز کر رکھا اور ایمانی اقدار کے لئے علیحدہ۔ اس کا خیال ہے کہ طبعی قوانین ایمانی اقدار سے متاثر ہوئے بغیر بھی اپنا کام برابر کرتے رہتے ہیں اور اپنے مخصوص نتائج پیدا کرتے چلے جاتے ہیں اور اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لوگ مومن ہیں یا کافر۔ اسلامی نظام زندگی کے متبع ہیں یا مخالف۔ اپنی زندگی کے تنازعات میں اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلے کرتے ہیں یا لوگوں کی خواہشات کے مطابق۔

یہ نہایت ہی غلط نقطہ نظر ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کی دو قسموں کے درمیان تفریق کرتا ہے اور ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیتا ہے حالانکہ دراصل یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمانی اقدار اللہ کے تکوینی قوانین ہی کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ اور بالکل طبعی قوانین کی طرح ان کے نتائج بھی ایک دوسرے سے مربوط اور باہم پیوستہ ہوتے ہیں۔ ایک مومن کے تصور زندگی اور احساسات میں' ان دونوں کے درمیان جدائی کرنے کی کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

یہ ہے وہ صحیح تصور حیات جسے یہ قرآن کریم' انسان کے دل و دماغ میں پیوست کرتا ہے جبکہ وہ قرآن کے سائے میں زندگی بسر کر رہا ہو۔ یہ تصور پیدا کرنے کے لئے قرآن مجید سابقہ کتب سماوی کے حاملین' ان کی بے راہ روی اور آخر کار اس ضلالت کے نتائج کا بھی ذکر کرتا ہے

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ

"اگر (اس سرکشی کے بجائے) یہ اہل کتاب ایمان لاتے اور خدا ترسی کی روش اختیار کرتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور ان کو نعمت بھری جنتوں میں پہنچا دیتے۔ کاش انہوں نے تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ ایسا کرتے تو ان کے لئے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے ابلتا۔" (۵-۶۶)

اس تصور کو ذہن نشین کرنے کے لئے قرآن مجید حضرت نوح ؑ کے اس وعدے کا ذکر بھی کرتا ہے جو انہوں نے اپنی قوم سے کیا تھا
فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا

اور میں نے کہا کہ تم اپنے پروردگار سے گناہ بخشواؤ۔ بے شک وہ بڑا بخشنے والا ہے' وہ کثرت سے تم پر بارش بھیجے گا اور تمہارے مال اور اولاد میں ترقی دے گا اور تمہارے لئے باغ لگادے گا۔ اور تمہارے لئے نہریں بہادے گا۔ (۱۷-۱۲)

پھر اس تصور کو پیدا کرنے کے لئے قرآن مجید لوگوں کی نفسیاتی صورت حال اور خارجی اور واقعاتی دنیا کے درمیان' جسے اللہ تعالیٰ لوگوں کے ذریعے عالم وجود میں لانا چاہتے ہیں' ایک حسین ربط پیدا کر دیتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ "بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔" (۱۳-۱۱)

اللہ کی ذات پر ایمان' اس کی ٹھیک ٹھیک بندگی اور زمین میں اس کی شریعت کا نفاذ' سب کے سب دراصل اللہ کے قانون قدرت ہی کے نفاذ ہیں۔ یہ قوانین بھی مثبت اثرات کے حامل ہیں اور اسی سرچشمے سے نکلے جس سے دوسرے تکوینی اور طبعی قوانین نکلے ہیں اور جن کے اثرات ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جو رات دن ہمارے مشاہدات و تجربات میں آتے رہتے ہیں۔

بعض اوقات ہمیں ایسے مظاہرے سے دوچار ہونا پڑتا ہے' جو قوانین قدرت کے درمیان اس تفریق کے بارے میں ہمارے لئے باعث فریب ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایمانی قدروں کی مخالفت کرتے ہوئے بھی طبعی قوانین کی پیروی کامیابی کی ضمانت دے رہی ہے۔ اس میں شک نہیں...... کہ شروع شروع میں اس تفریق کے نتائج سامنے نہیں آتے' لیکن آخر کار وہ لازماً ظاہر ہو کے رہتے ہیں۔ یہ صورت حال خود اسلامی معاشرے کو بھی پیش آئی۔ ایمانی قدروں اور طبعی قوانین کے نقطہ ارتقاء سے اسلامی معاشرے کی ترقی شروع ہوئی اور جس نقطے سے ان دونوں کے درمیان افتراق ہوا' اسی سے اسلامی معاشرے کا زوال شروع ہو گیا۔ آج تک جوں جوں ان کے درمیان خلیج وسیع تر ہوتی جاتی ہے' اسلامی معاشرہ اسی نسبت سے زیادہ زوال پذیر ہو رہا ہے اور اس کا یہ زوال اب اس درجے تک آپہنچا ہے کہ مسلمانوں نے بیک وقت اسلامی قدروں اور طبعی قوانین و مادی ترقیات سب کو کھو دیا ہے۔

اس کے بالمقابل آج مغربی تہذیب قائم ہے اور اس کی مثال یوں ہے جیسا کہ ایک پرندہ صرف ایک مضبوط پر کے بل بوتے پر اڑنا چاہتا ہے اور فضا میں معلق ہو کر پھڑپھڑا رہا ہے اور اس کا دوسرا پر شل ہو کر لٹک رہا ہے۔ یہ تہذیب مادی ایجادات کے میدان میں جس قدر بلند مقام تک جا پہنچی ہے' انسانی قدروں کے لحاظ سے اسی قدر پستیوں میں جا گری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تہذیب مغرب کے فرزند اس قدر جاں گسل قلق و بے چینی اور اس قدر اعصابی و نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو گئے ہیں جس سے مغربی دنیا کے اہل دانش چیخ اٹھے ہیں۔ لیکن اے کاش کہ یہ بدنصیب اسلامی نظام زندگی کی طرف نہیں لوٹتے۔ حالانکہ صورت حال کا صحیح علاج و مداوا صرف وہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے جو شریعت بھیجی ہے' وہ اس کائنات کے لئے اللہ کے کلی قانون کا ایک حصہ اور جز ہے لہٰذا اس دنیا میں اس شریعت کو نافذ کرنے کا لازمی اور مثبت اثر یہ ہو گا کہ اس پوری کائنات کی روش اور لوگوں کے طرز عمل کے درمیان ایک حسین ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔

شریعت الٰہی ایمان کا ثمرہ اور نتیجہ ہے اور ایمان اس کی بنیاد ہے۔ یہ اپنی اس بنیاد کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی۔ اسے وضع ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ ایک مسلم معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں مدد دے۔ اس عظیم کائنات کے بارے میں اور اس کائنات میں انسانی وجود کے متعلق اسلام جو تصور رکھتا ہے' اور اس تصور کے نتیجے میں انسان کے ضمیر میں جو تقویٰ' اس کے شعور میں جو پاکیزگی اس کی اعلیٰ اقدار کے

اندر جو عظمت' اس کے اخلاق کے اندر جو بلندی اور اس کے طرز عمل میں جو استقامت پیدا ہو جاتی ہے' یہ سب چیزیں اس شریعت مطہرہ سے مل کر ایک متماثل الاجزا اکائی بن جاتی ہیں۔ اس طرح اس کائنات کے بارے میں سنت الٰہی کی مختلف قسموں کے درمیان مکمل توافق اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے خواہ وہ سنت الٰہی ان امور پر مشتمل ہو جنہیں ہم قوانین قدرت کہتے ہیں یا ان امور پر مشتمل ہو جنہیں ایمانی اقدار سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ یہ سب چیزیں اس کائنات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے کلی قوانین و سنن کا ایک جزو اور حصہ ہیں۔

انسان بحیثیت ایک کائناتی قوت' اس کا عمل و ارادہ' اس کا ایمان اور نیکی اور اس کی عبادات اور سرگرمیاں سب کی سب ایسی قوتیں ہیں جو اس کائنات میں مثبت اثرات کی حامل ہیں۔ یہ قوتیں اس سنت الٰہی سے مربوط ہیں جس کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے۔ یہ سب قوتیں باہم مل کر کام کرتی ہیں اور جب یہ صحیح طریقہ سے جمع ہو جاتی ہیں اور ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تو اپنے کامل برگ و بار سامنے لے آتی ہیں لیکن جب ان قوتوں کے درمیان افتراق واقع ہو جائے تو ان کے فاسد نتائج ظاہر ہوتے ہیں' ان میں اضطراب رونما ہو جاتا ہے اور زندگی کا پورا نظام بگڑ جاتا ہے اور انسانیت بدبختی اور ہلاکت سے دوچار ہوتی ہے۔ **ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ** "اللہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔" (۸۔۵۳)

غرض انسان کے عمل و شعور اور عالمگیر سنت الٰہی کے مطابق وقوع پذیر ہونے والے تمام واقعات و حوادث کے درمیان ایک گہرا ربط ہے جو شخص بھی اس ربط کو ختم کرنا چاہتا ہے' اس ہم آہنگی کو درہم برہم کرتا ہے' اور انسانیت اور عالمگیر سنت الٰہی کے درمیان حائل ہو جاتا ہے' وہ اس انسانیت کا بدترین دشمن ہے اور وہ دراصل اسے نور ہدایت کی طرف آنے سے روکتا ہے۔ انسانیت کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کا پیچھا کرے اور اسے اس راہ سے ہٹا کر پرے پھینک دے جس میں وہ حاصل ہے اور یہ وہ راہ ہے جو رب کریم تک پہنچاتی ہے۔

تو ایک عرصہ تک قرآن کے سائے میں جی کر.........!

یہ چند نقوش تھے جو میرے دل میں نقش ہوئے' چند خطوط تھے جو لوح دماغ پر ابھرے۔ میں نے انہیں صفحہ قرطاس پر محض اس لئے منتقل کر دیا ہے کہ شاید ان سے کسی کا بھلا ہو' کسی کو ہدایت ملے اور حقیقت یہ ہے کہ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ اگر اللہ نہ چاہے۔

# فی ظلال القرآن

## سورۃ الفاتحہ

## پارہ ——— 1

# سورۂ فاتحہ ایک نظر میں

اس مختصر اور سات آیتوں پر مشتمل چھوٹی سی سورت کو ایک مسلمان ' رات دن میں کم از کم سترہ مرتبہ دہراتا ہے اور جب وہ سنتیں پڑھتا ہے تو یہ تعداد اس سے بھی دوچند ہو جاتی ہے اور اگر کوئی فرائض و سنن کے علاوہ نوافل بھی پڑھتا ہے تو وہ اسے بے شمار مرتبہ دہراتا ہے۔ اس سورت کی تلاوت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ صحیح حدیث میں حضرت عبادہ ابن صامت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں "اس کی نماز نہیں ہوتی جس نے فاتحہ نہ پڑھی"

اس سورت میں اسلامی عقائد کے بلند اصول' اسلامی تصور حیات کے کلیات و مبادی اور انسانی شعور اور انسانی دلچسپیوں کے لئے نہایت ہی اہم اصولی ہدایات بیان کی گئی ہیں' اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نماز کی ہر رکعت میں اس سورت کا پڑھنا ضروری قرار دیا ہے' اور جس نماز میں اس سورت کی تلاوت نہ ہو اسے فاسد قرار دیا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ (۱) مَكِّيَّةٌ (۵) اٰيَاتُهَا (۷) رُكُوْعُهَا (۱)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ «۱» اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ «۲» مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ «۳» اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ «۴» اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ «۵» صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ «۶» غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ «۷» ع

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے' نہایت مہربان اور رحم فرمانے والا ہے' روز جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا' ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا' جو معتوب نہیں ہوئے' جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔" ع

اس سورت کا آغاز "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سے ہوا ہے۔ اس کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ ہر سورت کی ایک آیت ہے یا پورے قرآن مجید کی ایک آیت ہے' اور صرف پڑھتے وقت ہر سورت کا آغاز اس سے کیا جاتا ہے' لیکن راجح بات یہی ہے کہ بسم اللہ سورۃ فاتحہ کی ایک آیت ہے اور اس کو ملا کر ہی سورۃ فاتحہ کی آیتوں کی تعداد سات ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے وَ لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ O "ہم نے تم کو سات ایسی آیتیں دے رکھی ہیں جو بار بار دہرائی جانے کے لائق ہیں' اور تمہیں قرآن کریم عطا کیا۔" (۱۵:۸۷) اس آیت کے مفہوم کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد سورۃ فاتحہ ہے کیونکہ اس کی سات آیتیں ہیں اور اسے مثانی اس لئے کہا گیا ہے کہ اسے نماز میں بار بار دہرایا جاتا ہے۔

بسم اللہ سے آغاز کرنا ان آداب میں سے ایک ہے جو اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو آغاز وحی کے وقت بتا دیئے تھے۔ **اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ** (پڑھئے اپنے رب کے نام سے) اور یہ ان آداب میں سے ہے' جو اسلامی تصور حیات کے اساسی عقیدے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ "وہی پہلے ہے' وہی پیچھے ہے' وہی ظاہر ہے' وہی مخفی ہے۔" (۵۷:۳) صرف اللہ موجود برحق اور حقیقی وجود رکھتا ہے اور تمام دوسرے موجودات اپنا وجود اس سے لیتے ہیں۔ ہر چیز کا آغاز اس سے ہوتا ہے لہذا ایک مسلمان ہر آغاز اور ہر حرکت اسی کے نام سے کرتا ہے۔

اللہ کی صفات رحمان و رحیم' جنہیں شروع ہی میں لایا گیا ہے۔ رحمت کے تمام حالات اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ ان دونوں کو یکجا طور پر صرف اللہ ہی کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے جبکہ الرحمن اکیلا بھی صرف اللہ ہی کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔ یہ تو جائز ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی انسان کو بھی رحیم کہہ دیں لیکن اسلامی عقائد کی رو سے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم بندے کو رحمان کہیں۔ افضل یہ ہے کہ اللہ <u>کے لئے ان دونوں صفات کو بیک وقت استعمال کیا جائے یعنی "رحمان و رحیم" اگرچہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ ان دونوں میں سے</u>

یہ رائے شوافع کی ہے۔ حنفی کہتے ہیں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم پورے قرآن مجید کی ایک آیت ہے اور فاتحہ کی آیتوں کی تعداد بسم اللہ کو چھوڑ کر سات ہے۔ البتہ سلف کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ سبع مثانی سے مراد فاتحہ ہی ہے' امام بخاری نے اس سلسلے میں دو مرفوع روایتیں بھی پیش کی ہیں۔

کس لفظ کے معنی وسیع تر ہیں لیکن قرآن کے اس سائے میں ہمیں ایسی بحثوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے' ہاں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دونوں صفات ملکہ رحمت کے تمام معانی' تمام وسعتوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم سے آغاز کلام' اللہ کی عظمت اور وحدانیت کے معانی پر مشتمل ہوتے ہوئے اگر اسلامی تصور حیات کا پہلا اصول ہے تو رحمان رحیم کی دو صفتوں میں رحمت کے تمام مفاہیم تمام حالات اور تمام وسعتوں کا سمو دینا' اسلامی تصور حیات کا دوسرا زریں اصول ہے۔ جس سے ایک بندے اور اس کے خدا کے درمیان تعلق کی صحیح نوعیت کا اظہار ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ساتھ آغاز کرنے کے بعد' اب انسان اپنے خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کی تعریف کرتا ہے اور پوری کائنات کے لئے اس کی عالمگیر ربوبیت کا اعلان کرتا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ "تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے۔" اللہ کی تعریف وہ شعور ہے جو اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتے ہی قلب مومن میں موجزن ہوتا ہے اور مومن کا دل اس سے سرشار ہو جاتا ہے کیونکہ وجود انسانی اپنے آغاز ہی میں اللہ کی بے پایاں نعمتوں اور فیوض میں سے ایک فیض ہے' جو قلب مومن میں اللہ کی حمد وثنا کے جذبات کے مہمیز کا کام کرتا ہے۔

اللہ کی نعمتیں قدم قدم پر لمحہ لمحہ مسلسل اور جوق در جوق آتی ہیں اور اللہ کی تمام مخلوقات اور بالخصوص اس "انسان" کو فیض یاب کر رہی ہے۔ لہٰذا اللہ کی حمد سے ہر کلام کا آغاز اور اسی کی تعریف وثنا پر ہر کام کا انجام اسلامی تصور حیات کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ "وہی اللہ جس کے سوا کوئی عبادت کے مستحق نہیں اس کے لئے حمد ہے۔ اول میں بھی اور آخر میں بھی۔" (۲۸۔۷۰) ایسے بندے پر ذرا اللہ کے فضل وکرم کو تو دیکھئے! جب وہ اپنی زبان سے "الحمد للہ" ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے نامہ اعمال میں وہ بھلائی لکھ دیتا ہے جو سب نیکیوں پر بھاری ہوتی ہے۔ ابن ماجہ میں حضرت ابن عمر کی روایت کردہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کسی بندے نے اللہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا يَا رَبِّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا يَنْبَغِيْ لِجَلَالِ وَجْهِكَ وَعَظِيْمِ سُلْطَانِكَ "اے اللہ تیرے لئے ایسی حمد ہے جو تیرے چہرے کی بزرگی اور تیری سلطنت کی عظمت کے لائق ہو۔"

"فرشتے اس معاملے میں متحیر ہوئے اور فیصلہ نہ کر سکے کہ اسے کس طرح لکھیں چنانچہ وہ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی "یاخدایا! تیرے بندے نے ایک ایسی بات کہی ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کس طرح لکھیں۔" یہ جانتے ہوئے بھی کہ بندے نے کیا کہا تھا' اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے سوال کیا "تو میرے بندے نے کیا کہا؟" فرشتوں نے عرض کی' اس نے کہا! "اے اللہ تیرے لئے ایسی تعریف ہے جو تیرے چہرے کی عظمت وجلال اور تیری سلطنت کی عظمت کے لائق ہے۔" تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ اسی طرح لکھو کہ جس طرح میرے بندے نے کہا۔ قیامت کے دن وہ مجھ سے ملے گا اور میں خود اسے اس کی جزا دوں گا۔"

غرض اللہ کی تعریف کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہونا ایک مومن کا وہ شعور ہے جو اللہ کا نام زبان پر آتے ہی' قلب مومن میں موجزن ہوتا ہے۔ اس آیت کا دوسرا حصہ رب العالمین بھی لفظ اسلامی تصور حیات کا ایک بنیادی اصول ہے۔ اللہ کی عالمگیر اور مطلق ربوبیت اسلامی عقائد کا اصل الاصول ہے۔ رب اس ذات کو کہتے ہیں جو مالک اور متصرف ہو اور عربی لغت میں یہ لفظ اس سربراہ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو اصلاح و تربیت کی خاطر کسی چیز میں تصرف کرتا ہے۔ اصلاح و تربیت کے لئے تصرف اور ربوبیت تمام جہانوں اور تمام مخلوقات کو شامل ہے' اللہ نے مخلوقات کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ اسے یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے' بلکہ اللہ ہی اس کائنات میں متصرف اور اس کا مصلح ہے' وہ اس کی نگرانی کرتا ہے اور اسے مسلسل پال رہا ہے' تمام جہانوں اور تمام مخلوقات کی دیکھ بھال رب العالمین کی

نگرانی میں کی جارہی ہے' خالق اور مخلوق کے درمیان رابطہ وصلہ ہر لمحہ اور ہر حال میں قائم ہے اور ہر وقت رواں دواں ہے۔

اس مکمل اور ہمہ گیر عقیدہ توحید کی تشریح و توضیح اور اس ژولیدہ فکری کے درمیان جو اس عقیدے کی عدم وضاحت کے نتیجے میں پیدا ہو جایا کرتی ہے' نقطہ امتیاز صرف ربوبیت مطلقہ ہے۔ یہ ربوبیت ہی ہے جو ان دونوں کے درمیان قطعی امتیاز کر کے رکھ دیتی ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے کہ لوگ خدائے واحد اور صانع کائنات کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ متعدد الٰہوں اور ارباب کے بھی قائل ہیں اور وہ ان الٰہوں اور ارباب کو اپنی زندگی میں حاکم تسلیم کرتے ہیں۔ اگرچہ بادی النظر ہی میں یہ عقیدہ نہایت ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت واقعہ یہی ہے کہ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ تھا اور اب بھی ہے۔ قرآن کریم نے' بعض مشرکین کا یہ عقیدہ بیان کیا ہے۔ جو وہ اپنے الٰہوں اور ارباب کے بارے میں رکھتے تھے۔

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ "ہم تو ان کی عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں۔" (۳۹۔۳) جیسا کہ اہل کتاب کے بارے میں کہا گیا۔ اِتَّخَذُوٓا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا ہے۔ (۹۔۳۱) نزول قرآن کے وقت مشرکین عرب کی حالت یہ تھی کہ وہ بڑے الٰہوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے ارباب کے بھی قائل تھے' اور یہ چھوٹے ارباب ان کے خیالات کے مطابق وہ تھے جو بڑے خداؤں کے ساتھ ساتھ خدائی کا کام کر رہے تھے۔

غرض اس صورت میں عالمگیر ربوبیت کا بیان کرنا اور اسے تمام جہانوں کے لئے عام و شامل کرنے سے غرض یہ ہے کہ جاہلیت کے فکری انتشار اور اسلام کی نظریاتی ہم آہنگی کے درمیان واضح طور پر خط فاصل کھینچ دیا جائے تاکہ یہ پوری کائنات اور تمام لوگ صرف ایک خدا کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی حاکمیت مطلقہ (Boundless Sovereignty) کا اقرار کریں اور اپنی گردنوں سے ارباب متفرقوں کی غلامی کا جوا اتار پھینکیں اور بے شمار خداؤں کو ماننے سے وہ جس فکری انتشار و پریشانی میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں اس سے نجات پائیں۔ اور اس طرح اللہ کی مخلوق کا ضمیر اللہ تعالیٰ کی دائمی نگرانی اور قائم ربوبیت کے سائے میں مطمئن ہو جائے' وہ ربوبیت جو کسی وقت بھی منقطع نہیں ہوتی' جس کا سلسلہ ابد الآباد تک قائم دائم اور جاری و ساری ہے۔ یاد رہے یہ کوئی ایسی ربوبیت نہیں جس کا تصور ارسطو نے پیش کیا کہ اللہ نے اس کائنات کی تخلیق کی اور پھر اسے یونہی چھوڑ دیا۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ کو کیا پڑی ہے کہ وہ اپنے سے فروتر چیزوں کے بارے میں فکر کرے' وہ صرف اپنی ذات ہی کے بارے میں فکر کرتا ہے۔" یہ خیال اس شخص کا ہے جو ایک عظیم فلسفی سمجھا جاتا ہے' اس کا فلسفہ ایک ٹھوس حقیقت مانا جاتا ہے اور اس کی عقل کو عقل رسا اور اسے عبقری تسلیم کیا جاتا ہے۔

جب اسلامی تعلیمات کا آغاز ہوا تو اس دنیا میں عقائد و تصورات' افکار و توہمات اور فلسفوں اور روایات کا ایک عظیم ذخیرہ موجود تھا جس میں حق و باطل کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ کھرے اور کھوٹے میں کوئی جدائی نہ تھی۔ خرافات دین کا جزو تھے۔ فلسفے اور عقائد اوہام و خرافات کا ملیدہ تھے' اور انسانی ضمیر ان اوہام و روایات کے تہ بہ تہ ذخیرے کے نیچے دب گیا تھا اور یقین سے محروم وہم و گمان کے ان گھٹاٹوپ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔

یہ حیرانی و پریشانی کیا تھی' جس میں اسے نہ سکون ملتا اور نہ نور ہدایت کی کرن نظر آتی؟ یہ فقط اس وقت کا تصور الٰہ تھا۔ الٰہ العالمین اس کی صفات' مخلوق سے اس کا تعلق ایسے مسائل' بالخصوص اللہ تعالیٰ اور انسان کے باہم تعلق کی صحیح نوعیت' اس وقت کے تمام عقائد اس ضلالت اور گمراہی کا شکار تھے۔

اور اس سے قبل کہ انسان اپنے خدا اور اس کی صفات کے بارے میں کوئی تصور قائم کرتا اور اس وقت کی موجود گمراہی' سرگردانی

اور اوہام و تخیلات کے بھاری بھرکم ذخیرے سے نجات پا۔ انسان کے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اس کا ضمیر اس کائنات کے بارے میں یا خود اپنے نفس کے بارے میں اور اپنے لئے کسی نظام زندگی کے بارے میں مطمئن ہو جائے اور اسے قرار و سکون حاصل ہو سکے۔ (لہذا سب سے پہلے تصور الٰہ کی درستگی اور ان باطل نظریات سے نجات ضروری تھی)

اس سکون اور تطہیر عقائد کی ضرورت اور اہمیت کا احساس' انسان کو اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس فکری ضلالت کے طول و عرض سے خوب واقفیت نہ رکھتا ہو' اور اسے اس بارے میں پورا پورا علم نہ ہو کہ جب اسلام آیا تو انسان کے دل و دماغ پر غلط عقائد و تصورات' باطل فلسفوں اور غلط روایات کی کس قدر تہیں جمی ہوئی تھیں۔ ہم نے یہاں تو ان کی طرف اجمالی اشارہ کیا ہے۔ تفصیلی بحث ان مقامات میں ہوگی جہاں قرآن کریم نے تفصیلاً ان تصورات سے بحث کی ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر اسلام نے سب سے پہلے اسلامی عقائد اور اسلام کے اساسی تصورات سے تفصیلی بحث کی اور اللہ کی ذات و صفات' مخلوقات سے اس کے تعلق اور مخلوق کے اپنے خالق کے ساتھ ربط کی نوعیت کے بارے میں اسلامی تصور کو قطعی اور یقینی طور پر واضح اور متعین کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تصور حیات کی بنیاد' وہ کامل' خالص اور ہمہ گیر توحید بنی جس میں شرک کا شائبہ تک نہ تھا۔ اسلامی تعلیمات میں مسلسل اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کے بارے میں اٹھنے والے تمام شکوک و شبہات کا قلع قمع کیا گیا۔ اس کے متعلق ہر قسم کے خلجان اور اجمال کو دور کیا گیا اور اسے پاک و صاف کر کے خالص اور واضح شکل میں دل مومن میں جاگزیں کیا گیا تاکہ وہ اس معاملے میں کسی طرح وہم و گمان کا شکار نہ ہو' اسلام نے اللہ کی صفات اور صفت ربوبیت مطلقہ کے بارے میں بھی دو ٹوک اور واضح تعلیمات دیں۔ کیونکہ غلط فلسفوں اور بے اصل نظریات کا ایک بڑا حصہ انہی شرکیہ اوہام و اساطیر پر مشتمل تھا جو اللہ کی صفات کے بارے میں' ان غلط فلسفوں نے لوگوں کے دل و دماغ میں جاگزیں کر دی تھیں اور انسانی ضمیر پر ان کا بڑا اثر تھا اور پھر انسانی طرز عمل پر بھی یہ تصورات اثر انداز ہو رہے تھے۔

جن لوگوں نے ان کوششوں کا سرسری مطالعہ کیا ہے جو اسلام نے اللہ کی ذات و صفات اور مخلوق کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کو لوگوں کے ذہن نشین کرنے کے لئے اور جن کے بیان میں قرآن کی لاتعداد آیات نازل ہوئیں اور اس نے ان باطل فلسفوں اور شرکیہ نظریات کا مطالعہ نہیں کیا جن کے بھاری بھرکم بوجھ تلے انسانی ضمیر دبا ہوا تھا۔ اور پوری انسانیت ان نظریات میں گم گشتہ تھی' تو وہ قرآن مجید کی ان کوششوں' عقائد کے بارے میں بے حد تاکید و تکرار اور تفصیل و توضیح کی حقیقی وجہ کو ہرگز نہ پا سکے گا۔ لیکن اس کے برعکس جو شخص ان باطل نظریات و عقائد کا گہرا مطالعہ کرے گا جو نزول قرآن کے وقت رائج تھے' اس پر ان کوششوں کی حقیقت و اہمیت اور ضرورت اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔ وہ سمجھ سکے گا کہ عقیدۂ توحید نے انسانی ضمیر کی آزادی میں کیا پارٹ ادا کیا۔ کیونکہ اس سے انسان کو اوہام و اساطیر اور متعدد خداؤں کی دیومالائی تصورات سے نجات دی۔

غرض عقیدۂ توحید کا حسن' اس کا کمال' اس کی ہم آہنگی اور جس حقیقت کا اس میں اظہار کیا گیا ہے' اس کی سادگی اور واقعیت پسندی' اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک انسان ان باطل تصورات و عقائد اور اساطیر و روایات کا اچھی طرح جائزہ نہ لے جو اس وقت دنیا میں رائج تھے۔ بالخصوص ذات باری کی حقیقت' اس دنیا کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت وغیرہ' غرض ان باطل افکار کے گہرے مطالعے کے بعد ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات دراصل ایک نعمت ہے۔ یہ قلب و نظر دونوں کے لئے رحمت ہے' اس کا حسن اور سادگی انعام الٰہی ہے' انسانی فطرت سے اس کی ہم آہنگی اور معقولیت' ذہن انسانی سے قرب اور جامعیت اور اس کا توازن اور اعتدال یہ سب کچھ اللہ کی رحمت خاص ہے جو اس نے اپنی مخلوق پر کی۔

الرحمن الرحیم کی صفت کو یہاں وسط سورت میں بطور ایک مستقل آیت پھر دھرایا جا رہا ہے ۔ یہ رحمت و شفقت کے تمام معانی ' تمام حالات اور تمام وسعتوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے ۔ اور یہاں دوبارہ لانے کی غرض و غایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عالمگیر ربوبیت کی ان صفات کے ایک نہایت ہی ممتاز پہلو کو نمایاں کیا جائے اور خالق و مخلوق اور اللہ اور اس کے پروردہ بندوں کے درمیان ربط و تعلق کو مزید مضبوط اور استوار کر دیا جائے ۔ یہ ربط و تعلق اپنی نوعیت کے اعتبار سے رحمت و شفقت کا تعلق ہے ۔ جو ایک مومن کو باری تعالیٰ کی حمد و ثنا پر ابھارتا ہے اور یہ وہ تعلق ہے جو اطمینان قلب کی اساس پر قائم ہے اور اس کی تہ میں محبت کے ساتھ بھرے ہوئے دل میں جڑی ہوئی ہیں ۔ لہذا الحمد للہ درحقیقت انسانی فطرت کی وہ آواز ہے جو وہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کے جواب میں بلند کرتی ہے ۔

اسلام نے اللہ اور رب کا جو تصور پیش کیا ہے وہ اس تصور سے سراسر مختلف ہے جو اولمپک (Olympic) خداؤں کے متعلق یونانی افکار نے پیش کیا ۔ اس تصور کے مطابق یہ قسی القلب خدا زمانہ امن اور حالت جنگ دونوں میں یکساں طور پر اپنے بندوں کے پیچھے پڑے رہتے تھے ۔ اور ایک دشمن کی طرح اپنے بندوں کے تعاقب میں لگے رہتے تھے ۔ لیکن اسلام کا الٰہ العلمین اپنے بندوں کے لئے وہ انتقامی تدابیر اختیار نہیں کرتا جن کا ذکر عہد نامہ قدیم کی محرف روایات میں ہوا ہے ۔ مثلاً سفر تکوین کے باب ۱۱ میں بابل کے متعلق جو داستان بیان کی گئی ہے وہ اس کی واضح ترین مثال ہے ۔[۱]

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ "روز جزاء کا مالک ہے ۔" اس آیت میں اسلام کا وہ اصولی اور بنیادی عقیدہ بیان کیا گیا ہے ' جس کے اثرات پوری انسانی زندگی پر نہایت ہی گہرے ہوتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے روز جزاء کے بارے میں ملکیت کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ جو قبضہ و استیلاء اور تصرف و اختیار کے نہایت اعلیٰ درجے کو ظاہر کر رہا ہے ۔ یوم الدین سے مراد قیامت کا روز جزاء ہے ۔ یاد رہے کہ نزول قرآن کے وقت بعض ایسے لوگ بھی تھے جو اللہ تعالیٰ کو الٰہ مانتے تھے ۔ اور اللہ کی صفت تخلیق پر بھی یقین رکھتے تھے ۔ اور کہتے تھے کہ اللہ ہی اس دنیا کو عدم سے وجود میں لایا ' اس کے باوجود وہ یوم جزاء اور حساب کتاب کے قائل نہ تھے ۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن مجید کہتا ہے وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ "اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا تو کہیں گے اللہ نے ۔" اور دوسری جگہ میں ہے بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ O "نہیں یہ بات عجیب لگی کہ ان کے پاس خود ان میں سے ڈرانے والا آیا ۔ کافروں نے کہا کہ یہ اچنبھے کی بات ہے ۔ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو پھر آنا عقل سے بعید کی بات ہے ۔" (۵۰-۲)

یوم آخرت پر ایمان اسلام کے اساسی عقائد میں سے ایک اہم عقیدہ ہے ۔ اور لوگوں کے دل و دماغ میں ' اس جہاں سے آگے ' دار آخرت میں اللہ کے سامنے جوابدہی کا احساس پیدا کرنے میں اس کی اہمیت حد درجہ مسلمہ ہے ۔ اس عقیدے پہ ایمان لانے والے اس دنیا ئے

---

۱ ۔ "اور تمام زمین پر ایک ہی زبان اور ایک ہی بولی تھی اور ایسا ہوا کہ مشرق کی طرف سفر کرتے کرتے ان کو ملک سنعار میں ایک میدان ملا اور وہاں بس گئے اور انہوں نے آپس میں کہا آؤ ہم اینٹیں بنائیں اور ان کو آگ میں خوب پکائیں ۔ سو انہوں نے پتھر کی جگہ اینٹ سے اور چونے کی جگہ گارے سے کام لیا ۔ پھر وہ کہنے لگے آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر اور ایک برج جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے ' بنائیں اور یہاں اپنا نام کریں ۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تمام روئے زمین پر پراگندہ ہو جائیں اور خداوند اس شہر اور برج کو جس کو بنی آدم بنانے لگے دیکھنے کو اترا اور خداوند نے کہا دیکھو ! یہ لوگ سب ایک ہیں اور ان سبھوں کی ایک ہی زبان ہے ۔ وہ جو یہ کرنے لگے ہیں تو اب کچھ بھی جس کا وہ ارادہ کریں ان سے باقی نہ چھوٹے گا ۔ سو آؤ ہم وہاں جا کر ان کی زبان میں اختلاف ڈالیں تاکہ وہ ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھ سکیں ۔ پس خداوند نے ان کو وہاں سے تمام روئے زمین میں پراگندہ کیا ۔ سو وہ اس شہر کے بنانے سے باز آئے ۔ اس لئے اس کا نام بابل ہوا کیونکہ خدا نے وہاں ساری زمین کی زبان میں اختلاف ڈالا اور وہاں سے خداوند نے ان کو تمام روئے زمین پر پراگندہ کیا ۔"

دنی کی ضروریات کے حصول ہی میں منہمک نہیں ہو جاتے بلکہ اس عقیدے پر ایمان لانے کے بعد وہ دنیاوی حوائج و ضروریات سے بلند ہو کر سوچتے ہیں۔ انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی کہ اس محدود مختصر عمر اور دنیا کے اس تنگ دائرہ مکافات میں انہیں اپنے اعمال حسنہ کی پوری جزاء ملتی ہے یا نہیں۔ بلکہ ان کی تمام نیکی اور اللہ کی راہ میں تمام جدوجہد سے مقصود صرف اللہ کی رضا جوئی ہوتی ہے۔ وہ اعمال کا بدلہ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے مانگتے ہیں۔ خواہ وہ اس دنیا میں ملے یا آخرت میں ملے۔ وہ مطمئن رہتے ہیں۔ انہیں حق و صداقت پر بھروسہ ہوتا ہے۔ وہ حق پر جم جاتے ہیں اور وہ دولت یقین' وسعت قلب و نظر اور حسن خلق کے مالک ہو جاتے ہیں..... غرض یہ اصولی عقیدہ اس بات کے لئے معیار و کسوٹی ہے کہ کوئی انسان محض اپنی خواہشات و مرغوبات کا بندہ و غلام ہے یا اسے انسان کی انسانیت کے لائق آزادی و حریت بھی حاصل ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس جہاں میں دنیاوی اقدار' مادی تصورات اور جاہلیت کو برتری حاصل ہے یا ربانی اقدار' روحانی تصورات اور اسلامی نظریۂ حیات کو جاہلیت کی منطق پہ غلبہ حاصل ہے۔ نیز اس اصولی عقیدے کے ذریعے وہ بلند مقام نکھر کر سامنے آتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے پسند فرمایا ہے اور ناقص' ناخالص اور منحرف تصورات حیات اور انسانیت کے اس بلند مقام کے درمیان فرق و امتیاز بھی واضح ہو جاتا ہے۔

جب تک انسانوں کے دل و دماغ میں یہ اصولی عقیدہ جاگزیں نہیں ہو جاتا' اور لوگوں کے دلوں میں یہ اطمینان پیدا نہیں ہو جاتا کہ دنیاوی فوائد اور مادی مرغوبات میں انسان کا پورا مقدر نہیں ہے اور جب تک محدود عمر رکھنے والا یہ انسان' یہ یقین نہیں کر لیتا کہ ایک آنے والی زندگی بھی ہے اور اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اگلے جہاں اور اس زندگی کے لئے بھی محنت کرے' اس کے لئے قربانی دے' حق کی نصرت کرے' بھلائی میں تعاون کرے اور یہ کہ ان سب باتوں کا اجر اسے آخرت میں ملے گا' اس وقت تک انسانی زندگی اسلامی نظام حیات کے مطابق استوار نہیں ہو سکتی۔

عقیدۂ آخرت پر یقین رکھنے والا اور اس کا انکار کرنے والا اخلاق و شعور اور فکر و عمل میں ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا یہ دونوں گروہ اللہ کی مخلوقات کے علیحدہ علیحدہ انواع ہیں۔ یہ دونوں مختلف طبائع رکھتے ہیں اور اس دنیا میں ان دونوں کا طرز عمل ہرگز ایک نہیں ہو سکتا اور نہ آخرت میں یہ دونوں ایک ہی طرح کے جزاء کے مستحق ٹھہر سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ عقیدہ ان دونوں کے درمیان ایک واضح فرق و امتیاز کا باعث بن جاتا ہے۔

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔" یہ بھی ایک اصولی عقیدہ ہے اور اس سے پہلے جن عقائد کا ذکر ہوا ہے انہی کا منطقی نتیجہ ہے۔ اللہ کے سوا کوئی بندگی اور عبادت کے قابل نہیں ہے' اور نہ کوئی اس قابل ہے کہ اس سے مدد مانگی جائے۔ یہ عقیدہ بھی اس میدان میں حق و باطل کے درمیان فرق کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ ہر قسم کی غلامیوں سے مکمل آزادی کیا ہوتی ہے' اور انسان کی جانب سے دوسرے انسانوں کی غلامی کی حقیقت کیا ہے؟ یہ اصول دراصل اس بات کا اعلان عام ہے کہ انسان کو مکمل اور بھرپور آزادی ملنی چاہئے۔ اوہام و خرافات کی پیروی سے آزادی' غلط اوضاع و اطوار کی پابندی سے آزادی اور باطل نظام زندگی کی اطاعت سے آزادی جب صرف ایک اللہ کی بندگی رہے اور صرف ایک خدا سے نصرت طلب ہو تو انسانی ضمیر کو دوسرے انسانوں' جاہلی نظام ہائے حیات اور رسم و رواج کی جکڑ بندیوں سے آزادی نصیب ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اوہام و خرافات اور مذہبی دیومالائی تصورات (Mythology) کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔

یہاں اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ انسانی قوتوں (Human Powers) اور کائناتی قوتوں (Physical Powers) کے بارے میں ایک مسلمان کے نقطہ نظر کو واضح کر دیا جائے۔

ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے انسانی قوت و اقتدار کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ قوت ہے جو ہدایت اور صراط مستقیم پہ قائم ہوتی ہے اور اسلامی نظام زندگی کی مطیع ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں ایک مسلم کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ وہ بھلائی' سچائی اور اصلاحی کاموں میں اس کا معاون و مددگار ہوتا ہے اور اسے اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے۔ دوسری جاہلی قوت ہوتی ہے جو صراط مستقیم سے بھٹکی ہوئی ہوتی ہے۔ اسلامی نظام زندگی کی مطیع نہیں ہوتی۔ اس کے بارے میں ایک مسلمان کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کا مقابلہ کرتا ہے' اس سے لڑتا ہے اور اسے ختم کر کے اس کی جگہ صحیح قوت و اقتدار قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

یاد رکھیے! کسی مسلم کو جاہلی قوت کی ظاہری جسامت اور شان و شوکت کو دیکھ کر مضطرب نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ ایک مسلمان کے لئے قوت کا اصل سرچشمہ ذات باری ہے۔ اور جاہلیت اپنی طاقت کے اس اصل سرچشمے کو کھو چکی ہوتی ہے' جو مسلسل اور دائمی طور پر انسان کو قوت فراہم کر رہا ہوتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اجرام فلکی میں سے کوئی عظیم جرم جب کسی جلتے ہوئے ستارے سے جدا ہوتا ہے تو بہت دیر نہیں گزرتی کہ وہ بجھ کر رہ جاتا ہے۔ اس کی روشنی مدہم اور تپش ختم ہو جاتی ہے' اگرچہ اس کا ظاہری جسم عظیم الشان ہو۔ لیکن اس کے برعکس اگر ایک حقیر ذرہ بھی اپنی قوت اور روشنی کے اصل منبع سے جڑا ہوا ہوتا ہے تو وہ اس سے مسلسل حرارت اور روشنی حاصل کرتا رہتا ہے اور حالت یہ ہوتی ہے کہ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ "بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل جماعت نے اللہ کے حکم سے ایک کثیر جماعت پر غلبہ پایا۔" (۲-۲۴۹)

رہی طبیعاتی قوت تو اس کے ساتھ ایک مومن کا تعلق علم و معرفت اور دوستی و ہم آہنگی کا تعلق ہوتا ہے۔ خوف اور دشمنی کا تعلق نہیں ہوتا۔ کیونکہ انسانی اور طبعی دونوں قوتیں ایک مصدر اور مشیت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یعنی دونوں ارادہ ربی کے تابع ہوتی ہیں اور دونوں خالق کائنات کے ارادوں کے سامنے محکوم و مقسور ہیں۔ ان کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور پورا پورا تعاون ہے۔ وہ یکساں طور پر متحرک ہوتی ہیں اور ان کی حرکت کی سمت بھی ایک ہوتی ہے۔

ایک مسلمان کا عقیدہ اور نظریۂ حیات ہی اسے یہ سکھلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو بنایا ہی اس لئے ہے کہ مومن اس کا دوست' معاون اور پشتیبان ہو اور اس دوستی کا تحقق اس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک مومن اس کائنات میں غور و فکر کرے' اس سے متعارف ہو' اس کے ساتھ تعاون کرے اور اس کائنات کے ساتھ مل کر اپنے رب کی طرف منہ موڑے۔ اگرچہ بظاہر بعض اوقات طبعی قوتیں انسان کے لئے باعث مضرت ہوتی ہیں لیکن اس کی وجہ یہ ہوتی ہے انسان ان کے سمجھنے میں غلطی کرتا ہے۔ وہ ان کے بارے میں گہری سوچ بچار نہیں کرتا اور وہ اس اصلی طاقت کو بھول جاتا ہے جو اس پوری کائنات کو چلا رہی ہے۔

رومی جاہلیت کے وارث مغرب کے ہاں یہ فیشن سا ہو گیا ہے کہ وہ طبعی طاقتوں کے استعمال کو "تسخیر طبیعت" کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ تعبیر صاف صاف بتا رہی ہے کہ اس جاہلیت کا رشتہ رب کائنات سے ٹوٹ چکا ہے اور اسے کائنات کی اس روح سے کوئی تعلق نہیں ہے جو اللہ کو لبیک کہہ رہی ہے۔ رہا وہ مسلمان جس کا دل رحمان و رحیم سے متعلق ہے اور وہ اس کائنات سے بھی پیوستہ ہے جو اللہ رب العالمین کی تسبیح و تہلیل میں ہر وقت محو ہوتی ہے' تو وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ قہر و جفاء کے علاوہ کائنات کے ساتھ تعلق کی ایک دوسری نوعیت بھی ہے۔ اس کا یہ ایمان ہوتا ہے کہ اللہ ہی اس کائنات کا پیدا کرنے والا ہے۔ اسی نے اس پوری کائنات اور اس کی تمام قوتوں کو پیدا کیا۔ اور اس کے لئے قانون قدرت کا ایک ضابطہ کار مقرر کیا تاکہ یہ تمام قوتیں' اس کے دائرے کے اندر اندر' وہ مقاصد پورے کریں جو اللہ کو ان سے مطلوب ہیں۔ اللہ نے اس کائنات کو صرف انسان کے لئے پیدا کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ سہولت دی کہ وہ اس کے قوانین و ضوابط کو سمجھ سکے اور اس کے بھیدوں کو پا سکے۔ جب بھی وہ ان رازوں میں سے کسی نئے راز کو پالے تو اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کیونکہ اللہ ہی ہے جس نے اس کیلئے کائنات کو مسخر کیا ہے۔ از خود انسان کے

یہ فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کیونکہ اللہ ہی ہے جس نے اس کے لئے اس کائنات کو مسخر کیا ہے۔ از خود انسان کے بس میں یہ بات نہ تھی کہ وہ اس کائنات کو مسخر و مغلوب کر سکتا۔ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ "مسخر کیا اس نے تمہارے لئے ان سب چیزوں کو جو زمین میں ہیں۔"

اس تصور کے نتیجے میں' ان کائناتی قوتوں کے بارے میں ایک مومن کا احساس و شعور' ہر قسم کے اوہام و خرافات سے پاک ہوتا ہے۔ اس کے اور ان کائناتی قوتوں کے درمیان خوف و ہراس کے پردے حائل نہیں ہوتے۔ وہ صرف خدائے واحد پر ایمان لاتا ہے' صرف خدائے واحد کی بندگی کرتا ہے اور صرف رب یکتا سے نصرت کا طلبگار ہوتا ہے۔ رہیں یہ طبعی قوتیں تو اس کے تصور کائنات کی رو سے' یہ بھی اللہ کی مخلوقات کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ وہ ان میں غور و فکر کرتا ہے' ان میں دلچسپی لیتا ہے' اور ان کے بھیدوں کو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے جواب میں یہ تکوینی قوتیں اس کی مددگار ہوتی ہیں اور اس کے سامنے اپنے راز کھول کر رکھ دیتی ہیں اور وہ ان قوتوں کے ساتھ پرامن "مشفقانہ" ایک صدیق صمیم اور یار مانوس کی سی زندگی بسر کرتا ہے۔ جبل احد کی طرف نظر اٹھاتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا خوب کہا "یہ پہاڑ ہے اسے ہم سے محبت ہے اور ہمیں اس سے محبت ہے۔" یہ کلمات اس حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں کہ مسلم اول حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اس کائنات کی ٹھوس ترین شکل ایک پہاڑ کی بھی کس قدر وقعت اور محبت تھی اور ان کو اس کے ساتھ کس قدر لگاؤ تھا۔

اسلامی تصور حیات کی ان اصولی باتوں کے بعد اور اس بات کی وضاحت کے بعد کہ عبادت و استعانت میں ایک مسلم کو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہوتا ہے۔ اب ان باتوں کی عملی تطبیق شروع ہوتی ہے۔ دعا اور تضرع کے ذریعے اب بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یہ دعا بھی ایک اصولی دعا ہے جو اس سورت کی اصولی فضاء اور اس کے مجموعی مزاج سے مکمل ہم آہنگی اور مطابقت رکھتی ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝

"ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا' جو معتوب نہیں ہوئے اور جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔"

"ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ یعنی ہمیں سیدھے اور منزل مقصود تک پہنچانے والے راستے کو سمجھنے کی توفیق دے۔ اور اس کو سمجھنے کے بعد اس پر چلنے کی استقامت دے۔ کیونکہ معرفت حق اور پھر اس پر استقامت دراصل اللہ کی رحمت شفقت اور رہنمائی کا ثمرہ ہوتی ہے۔ اور اسی بارے میں اللہ کی طرف رجوع کرنا دراصل عقیدۂ توحید کا ثمرہ ہے۔ لہٰذا ایک مومن جن معاملات میں اپنے رب سے مدد اور نصرت طلب کرتا ہے ان میں سے صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق کی دعا ایک نہایت ہی اہم اور عظیم مطلوب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا و عقبیٰ کی سعادت اس پر موقوف ہے کہ انسان جادہ مستقیم کی طرف راہنمائی پائے۔ اور جادۂ مستقیم تک رسائی دراصل اس الٰہی ناموس تک رسائی ہوتی ہے جو اس پوری کائنات کی حرکت اور اس کے اندر اس چھوٹے سے انسان کی حرکت کے درمیان توازن و تناسق پیدا کر رہا ہے اور ان دونوں کو اللہ رب العالمین کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔

اس کے بعد باری تعالیٰ اس راستے کی حقیقت کو بیان فرماتے ہیں "وہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر تو نے انعام فرمایا' جو معتوب نہیں ہوئے اور جو بھٹکے ہوئے نہیں۔" یعنی ان لوگوں کا راستہ جن کی قسمت میں اللہ کا انعام لکھا ہوا ہے اور ان لوگوں کا راستہ نہیں جنہوں نے حق کو جانا اور پھر اس سے روگردانی اختیار کی۔ یا جو سرے سے راہ حق کی معرفت ہی سے محروم رکھے گئے۔ اور ہدایت ہی نہ پا سکے۔ بلکہ ان لوگوں کی راہ جو سعادت مند اور واصلین حق ہیں۔

غرض یہ ایک مختصر اور بکثرت نماز میں دہرائے جانے والی سورت ہے، جس کے بغیر نماز نہیں ہوتی اور مختصر ہونے کے باوجود اسلامی نظریۂ حیات کے نہایت ہی اہم اور اصولی عقائد پر مشتمل ہے۔ نیز اس میں وہ شعوری ہدایات دی گئی ہیں جن کے سرچشمے اسلامی تصور حیات سے پھوٹتے ہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت علاء حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے "اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان پورا پورا تقسیم کر دیا ہے۔ نصف اپنے لئے اور نصف بندے کے لئے اور میرے بندے کے لئے وہ سب کچھ ہے جو وہ طلب کرے۔ جب بندہ کہتا ہے الحمد للہ رب العالمین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "میرے بندے نے میری حمد اور تعریف کی" اور جب وہ الرحمن الرحیم ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "میرے بندے نے میری ثناء کی" جب وہ مالک یوم الدین پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرے بندے نے میری بڑائی بیان کی۔" اور جب وہ کہتا ہے إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور میرے بندے کے لئے وہ کچھ ہے جو اس نے طلب کیا۔ اور جب وہ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ....... وَلَا الضَّالِّينَ تک پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے بندے کے لئے ہے اور اس کے لئے وہ کچھ ہے جو اس نے مانگا۔"

اس بیان اور تفسیر کی روشنی میں وہ حکمت کھل کر سامنے آجاتی ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو کم از کم سترہ مرتبہ نماز کے دوران پڑھنا فرض قرار دیا۔ اور اگر کوئی اس سے زیادہ پڑھتا ہے تو یہ اس سے بھی زیادہ مرتبہ دہرائی جاتی ہے۔

☆☆☆☆

# فی ظلال القرآن

## سورۃ البقرہ

## آیات نمبر1تا141

# سورۂ بقرہ ایک نظر میں

سورۂ بقرہ کا شمار ان ابتدائی سورتوں میں ہوتا ہے جن کا نزول ہجرت کے متصلاً بعد شروع ہوا۔ قرآن مجید کی تمام سورتوں میں یہ طویل ترین سورت ہے۔ راجح قول یہی ہے کہ اس کی آیات کا نزول اس طرح تسلسل کے ساتھ نہیں ہوا کہ اس کی تکمیل سے قبل کسی دوسری سورت کی کوئی آیت نازل نہ ہوئی ہو۔ کیونکہ جب ہم سورۂ بقرہ کی بعض آیات اور مدینہ میں نازل ہونے والی دوسری طویل سورتوں کی بعض آیات کے اسباب نزول پر غور کرتے ہیں (اگرچہ اسباب نزول کے واقعات قطعی الثبوت نہیں ہوتے) تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام سورتوں کی آیات کا نزول تسلسل سے نہیں ہوا۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک سورت کا نزول شروع ہو جاتا ہے لیکن ابھی اس کی ابتدائی آیات ہی نازل ہوتی ہیں کہ دوسری سورت کا نزول شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سورتوں کے زمانہ نزول کے تعین کا دارومدار ان کی ابتدائی آیات پر ہوتا ہے نہ کہ پوری سورت پر مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ربا کا شمار ان آیات میں ہوتا ہے جو نزول قرآن کے آخری دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ حالانکہ راجح قول کے مطابق بقرہ کا ابتدائی حصہ مدنی دور میں سب سے پہلے نازل ہوا۔

آیات قرآنی کی ترتیب اور انہیں ایک سورت کی شکل میں جمع کرنے کا کام براہ راست اللہ تعالیٰ کی ہدایات کی روشنی میں ہوا۔ امام ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے سوال کیا "آپ لوگوں نے سورۂ انفال اور سورۂ توبہ کو باہم دگر ملا دیا ہے حالانکہ انفال مثانی میں سے ہے اور توبہ "مئین" میں سے ہے۔ نیز آپ حضرات نے دونوں کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی سطر بھی نہیں لکھی اور ان کو سبع طوال میں رکھ دیا ہے۔ معلوم نہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا "دراصل بات یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بیک وقت متعدد سورتیں نازل ہوتی رہتی تھیں۔ جب کبھی آپ پر نئی آیات کا نزول ہوتا" آپ کاتبین وحی میں سے کسی کو بلا لیتے اور حکم دیتے کہ اس آیت کو فلاں فلاں سورت میں شامل کر دو۔" سورۂ انفال ان سورتوں میں سے تھی جو مدینہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی اور سورۂ توبہ ایسی آیات پر مشتمل تھی جن کا نزول سلسلہ نزول قرآن کے آخری دور میں ہوا۔ ان دونوں کے مضامین چونکہ باہم مشابہ تھے' اس لئے میں نے یہ گمان کیا کہ شائد یہ انفال ہی کا حصہ ہے۔ اس اثناء میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا اور آپ کو اس بات کی وضاحت کرنے کا موقع نہ ملا کہ وہ انفال کا حصہ ہے یا نہیں؟ ان وجوہات کی بنا پر میں نے ان دونوں سورتوں کو باہم ملا دیا اور اسی لئے دونوں کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ لکھا اور ان کو "سبع طوال" میں رکھ دیا۔"

یہ روایت صاف صاف بتا رہی ہے کہ سورتوں کی شکل میں آیات کی ترتیب خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے تحت تکمیل پذیر ہوئی۔ امام مسلم اور بخاری نے حضرت ابن عباس سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں آپ فرماتے ہیں "رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم

---

قرآن مجید کی سورتوں کی تقسیم یوں ہے کہ بقرہ سے توبہ تک "طوال" ہیں یعنی لمبی سورتیں یونس سے فرقان تک مئین کہلاتی ہیں۔ یعنی ایسی سورتیں جن کی آیات سو کے لگ بھگ ہیں۔ الشعراء سے الفتح تک مثانی کہلاتی ہیں۔ ان کی آیات سو سے کم ہیں۔ اور ان میں سے قصوں کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ سورہ الحجرات سے لے کر اختتام تک تمام سورتوں کو مفصل کہلاتی ہیں (ایسی سورتیں جن کی آیات کے آخر میں آنے والے الفاظ صوتی ہم آہنگی رکھتے ہیں) اس آخری قسم کو پھر مزید تین قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ طوال مفصل (لمبی) وساط مفصل (متوسط) قصار مفصل (مختصر) یعنی سورہ الحجرات سے الانشقاق تک طوال' "والسماء ذات البروج" سے لم یکن تک اوساط اور یہاں سے آخری تک قصار (مترجم)

کے ساتھ بھلائی کرنے میں بے حد کشادہ دل تھے۔ بالخصوص رمضان المبارک میں تو آپ کی فراخ دلی کی کوئی انتہا نہ رہتی تھی۔ پورے رمضان مبارک میں ہر رات جبرئیل امین آپ سے ملتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو قرآن کریم سناتے تھے۔ بعض روایات میں فیدارسہ القرآن کے لفظ آتے ہیں۔ یعنی باہم پڑھتے پڑھاتے تھے۔ تو جب رمضان میں جبرئیل امین آپ سے ملتے تو آپ کار خیر کے لئے فراخدلی میں' ان ہواؤں سے بھی بڑھ جاتے تھے جو بارش لاتی ہیں۔" اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پورا قرآن مجید جبرئیل امین کو سناتے تھے اور اسی طرح جبرئیل امین آپ کو سناتے۔ تو معلوم ہوا کہ پورا قرآن سورتوں کی شکل میں بہرحال مرتب تھا۔

جو شخص قرآن کے سائے میں جیتا ہے اور اس میں غور وفکر کرتا ہے اس پر یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ قرآن کی ہر سورت ایک مستقل اور ذی روح شخصیت رکھتی ہے۔ دل مومن تو اس کے ساتھ اسی طرح مانوس ہو جاتا ہے کہ گویا وہ کسی زندہ انسان سے ہم کلام ہے جو واضح خدوخال اور روح و حیات رکھتا ہے..... ہر سورت کا ایک مرکزی مضمون ہے یا کئی مضامین ہیں جو ایک ہی محور کے گرد گھوم رہے ہیں۔ نیز ہر سورت کی ایک مخصوص فضا ہے جو اس کے تمام موضوعات سخن پر چھائی ہوئی ہے۔ اس میں ان موضوعات پر متعین پہلوؤں سے بحث ہوتی ہے تاکہ ان موضوعات اور سورت کی اس عمومی فضا کے درمیان کامل درجہ کی ہم آہنگی پائی جائے۔ پھر ہر سورت کا ایک مخصوص صوتیاتی اثر ہوتا ہے۔ اور وہ پوری سورت میں ایک ہی رہتا ہے۔ اگر کہیں اس میں کوئی تبدیلی ہو بھی تو وہ اس مخصوص موضوع سخن کی وجہ سے ہوتی ہے۔ قرآن کی تمام سورتوں کی یہی خصوصیت ہے اور اس سے سورۂ بقرہ جیسی طویل ترین سورتیں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔

سورہ بقرہ متعدد موضوعات پر مشتمل ہے لیکن وہ تمام موضوعات ایک ہی محور کے اردگرد گھوم رہے ہیں۔ یہ محور دو متوازی اور باہم مربوط خطوط سے مرکب ہے۔ ایک طرف تو یہ پوری سورت یہ بتاتی ہے کہ بنی اسرائیل نے دعوت اسلامی کے مقابلے میں کیا موقف اختیار کیا؟ انہوں نے اس دعوت کا استقبال کس طرح کیا؟ اس کے پیغامبر کو کیا کیا اذیتیں دیں۔ اس دعوت کی بنیاد پر اٹھنے والی جماعت اور امت مسلمہ کے خلاف کیا کیا سازشیں کیں۔ نیز اس موقف کی دوسری تفصیلات اور کڑیاں مثلاً یہود و منافقین کا باہم گٹھ جوڑ' یہود و مشرکین کا باہم تعلق وغیرہ...... دوسری طرف اس سورت میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اب بنی اسرائیل کو فریضہ ادائیگی خلافت کے لئے نااہل قرار دیا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے اس بارے میں خداوند کریم سے جو عہد وپیمان باندھے تھے وہ ایک ایک کر کے توڑ چکے ہیں اور یہ کہ اب انہیں اس تحریک کے داعی اول حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام سے کوئی نسبت نہیں رہی ہے اور یہ کہ مسلمانوں کو بھی اس بات کی تنبیہہ کی جاتی ہے کہ وہ ان غلطیوں سے بچیں جن کی وجہ سے بنی اسرائیل کو نااہل قرار دیا جارہا ہے۔ پھر اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اپنے ابتدائی حالات میں (منصب امانت کو سنبھالتے ہوئے) اسلامی جماعت نے کیا موقف اختیار کیا اور کس پالیسی پر گامزن رہی۔ اس نے فریضہ اقامت دین' دعوت دین اور خلافت فی الارض کی اس عظیم الشان اور بھاری ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے اپنے آپ کو کیونکر تیار کیا؟

غرض سورۂ بقرہ کے تمام مضامین ان دو متوازی خطوط پر چل رہے ہیں۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ تفصیلی بحثوں کے دوران آئے گی۔

یہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ اس صورت حالات پر اجمالاً بحث کی جائے جس کے مقابلے کے لئے سب سے پہلے یہ سورت نازل ہوئی تاکہ ایک طرف تو اس سورت اور اس کے مضامین کے درمیان ربط کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ اور دوسرے یہ معلوم ہو سکے کہ مدنی دور کے ابتدائی ایام میں دعوت اسلامی کی رفتار کیا تھی؟ اور اسلامی جماعت کی سرگرمیاں اور پیش آنے والے حالات کیا تھے؟ یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ یہ صورت حال اپنے عمومی پہلو سے بعینہ وہی ہے جو ہر دور اور ہر زمانے میں ایک معمولی فرق کے ساتھ دعوت اسلامی کے حاملین کو پیش آتی رہی ہے۔ تاریخ میں دعوت اسلامی کے دشمنوں نے ہمیشہ وہی کردار ادا کیا ہے جو کبھی مدینہ کے اسلام دشمنوں نے ادا

کیا تھا۔ اور اس کے دوستوں کا تعلق اخلاص بھی ایسا رہا جو قرن اول کے فدا کار اسلام کا رہا۔ اس طرح یہ قرآنی ہدایات دعوت اسلامی کے لئے ایک طرح کا دائمی دستور بن جاتی ہیں۔ اور ان آیات میں ہر حال اور ہر زمانے کے لئے زندہ جاوید ہدایت پائی جاتی ہے اور یہ آیات امت مسلمہ کے لئے اس طویل اور کٹھن سفر میں مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں جس میں اسے کئی مختلف الشکل لیکن متحد المزاج مخالف عناصر کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ پورے قرآن مجید کی ایک ایک آیت میں یہ خصوصیت موجود ہے اور یہ قرآن کریم کے اعجاز کے ایک خاص پہلو کو ظاہر کر رہی ہے۔

مدینہ کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا عمل ایک محکم منصوبے اور سوچی سمجھی تعلیم کے مطابق ظہور پذیر ہوا۔ اور جن حالات میں ہجرت کا فیصلہ ہوا وہ ایسے تھے کہ انہوں نے ہجرت کے عمل کو لابدی اور حتمی بنا دیا تھا کیونکہ جس منصوبہ کے مطابق باری تعالیٰ کو تحریک اسلامی کو چلانا مقصود تھا اس کے لئے ہجرت ضروری ہو گئی تھی۔ قریش نے دعوت اسلامی کے بارے میں جو سخت موقف اختیار کیا تھا' حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور ابو طالب کی وفات کے بعد' اس کی وجہ سے مکہ اور اس کے ماحول میں دعوت اسلامی پر ایک جمود اور ٹھہراؤ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اگرچہ قریش کی گہری سازشوں اور ان کی بے حد ایذا رسانیوں کے باوجود بعض لوگ دین اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ تاہم قریش کے سخت رویے اور اسلام کے خلاف ان کی چومکھی لڑائی کی وجہ سے مکہ اور اس کے ارد گرد کے علاقوں میں عملاً دعوت اسلامی کا پھیلاؤ روک دیا گیا تھا اور مکہ کے علاوہ دوسرے عرب قبائل نے بھی ٹھنڈا اور "انتظار کرو اور دیکھو" کا رویہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ اس بات کے منتظر تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے قریبی رشتہ داروں' ابولہب' عمرو' ابن ہشام' ابو سفیان بن حرب وغیرہ کے درمیان جو کشمکش برپا ہے اس کا کیا فیصلہ ہوتا ہے کیونکہ یہ لوگ دعوت اسلامی کے داعی کے قریبی رشتہ دار تھے اور عرب کے قبائلی معاشرے میں کنبہ پروری کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور عام لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ سب سے پہلے اسلام کو قبول کرے۔ لہٰذا ان کے اس معاندانہ موقف میں کوئی وجہ نہ تھی کہ ایک عام عرب دعوت اسلامی کو قبول کرے بالخصوص جبکہ حضور کا خاندان خانہ کعبہ کا متولی بھی تھا۔ اور جزیرۃ العرب میں وہی دینداری اور مذہبیت کی نمائندگی کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل اس بات کی تلاش میں رہے کہ مکہ کے باہر دعوت اسلامی کے لئے کوئی ایسا مرکزی مقام تلاش کیا جائے جو اس نظریۂ حیات کا گہوارہ ہو اور تحریک کو امن و آزادی کی ضمانت دے۔ جہاں تحریک اسلامی اس جمود کی حالت سے نکل سکے جو مکہ میں اس پر طاری ہو گئی تھی اور جہاں آزادی کے ساتھ لوگوں کے سامنے دعوت اسلامی پیش کی جا سکے اور اسے قبول کرنے والے آلام و فتن اور دشمن کی ایذا رسانیوں سے محفوظ ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہجرت کے اقدام کے جو اسباب بھی ہوں ان میں سے یہ پہلا اور سب سے اہم سبب ہے۔

یثرب کو تحریک اسلامی کا مرکز بنانے سے قبل بھی کئی دوسرے مقامات زیر غور رہے تھے۔ سب سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت ہوئی تھی۔ جن لوگوں نے ابتدائی ایام میں دین اسلام کو قبول کیا تھا' ان کی ایک بڑی تعداد نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ یہ بات درست نہیں ہے کہ یہ لوگ محض جسمانی نجات حاصل کرنے کے لئے حبشہ کی طرف نکل گئے تھے۔ کیونکہ قرائن اس کی تردید کرتے ہیں۔ اگر یہ ہجرت صرف جسمانی اذیت سے نجات پانے کے لئے ہوتی تو مسلمانوں میں سے صرف وہ لوگ ہجرت کرتے جن کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کا مکہ مکرمہ میں کوئی بندوبست نہ تھا۔ حالانکہ جو لوگ نکلے ان کی حالت اس سے برعکس تھی۔ ان مہاجرین میں وہ لوگ شامل نہ تھے جن پر جسمانی اذیت کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے مثلاً ضعفاء اور غلام وغیرہ۔ جو لوگ اس ہجرت میں شریک ہوئے وہ سب خاندانی اور ذی وجاہت لوگ تھے۔ اور ان کے خاندان کے ہوتے ہوئے کوئی شخص یہ جرات نہ کر سکتا تھا کہ انہیں کسی قسم کی اذیت پہنچائے۔ کیونکہ قبائلی عصبیت

کے اس معاشرے میں لوگ اپنے مسلمان رشتہ داروں کی حمایت بھی کرتے تھے۔ ان مہاجرین کی اکثریت قریش سے نسبی تعلق رکھتی تھی۔ مثلاً جعفر بن ابی طالب (حالانکہ ابو طالب اور دوسرے ہاشمی نوجوان ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کر رہے تھے) زبیر بن عوام' عبدالرحمن بن عوف' ابو مسلمہ مخزومی اور عثمان بن عفان وغیرہ۔ اسی طرح ان مہاجرین میں مکہ کے اونچے خاندانوں کی خواتین بھی شامل تھیں اور اس بات کا کوئی امکان ہی نہ تھا کہ انہیں کسی قسم کی اذیت پہنچائے۔

البتہ اس بات کا امکان ہے کہ ہجرت کے پس منظر میں کچھ اور اسباب بھی پوشیدہ ہوں مثلاً یہ کہ قریش اونچے درجے کے گھرانوں میں یہ احساس اور بے چینی برپا کرنا کہ ان میں سے ایسے معزز اور سرکردہ شرفا ان کی ایذاؤں سے تنگ آکر' اپنے نظریۂ حیات کو لے کر' اور اپنے وطن عزیز اور اعزہ کو الوداع کہہ کر' جاہلیت سے بھاگ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عرب جیسے باحمیت اور کنبہ پرست معاشرے میں مسلمانوں کا یہ اقدام غم و غصہ کی لہر دوڑا سکتا تھا۔ جبکہ مہاجرین میں ام حبیبہ بنت ابی سفیان بھی شامل تھیں جو جاہلیت کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ اور اسلامی نظریۂ حیات اور اس کے داعی کے خلاف برپا کی ہوئی اس فتنہ انگیزی میں ایک بڑا پارٹ ادا کر رہا تھا لیکن ان اسباب کو صحیح تسلیم کرنے کے بعد بھی اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حبشہ کی طرف ہجرت بھی انہی کوششوں کی ایک کڑی تھی۔ جو تحریک اسلامی کے لئے ایک آزاد مرکز کی تلاش کے سلسلے میں ہو رہی تھیں۔ جہاں یہ نئی تحریک آزاد اور پر امن طریقے سے کام کر سکے۔ اس کی تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے جو حبشہ کے نجاشی کے اسلام کے بارے میں کتب احادیث میں نقل ہوئی ہیں۔ جن میں کہا گیا ہے کہ نجاشی نے اپنے اسلام کا اعلان محض اس لئے نہ کیا کہ وہ اپنے مذہبی لیڈروں سے خائف تھا۔

سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا سفر فرمایا۔ اس کا مقصد بھی دعوت اسلامی کے لئے ایک آزاد اور مامون مرکز کی تلاش تھا۔ لیکن آپ کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ اور ثقیف کے کبراء نے آپ کا استقبال پتھروں سے کیا۔ انہوں نے اپنے نادانوں اور بچوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ یہ لوگ آپ کو پتھر مارنے لگے۔ آپ کے پاؤں مبارک زخمی ہو گئے اور آپ کو مجبوراً عتبہ اور شیبہ پسران ربیعہ' کے باغ میں پناہ لینا پڑی۔ اس باغ میں آپ کی زبان مبارک سے جو پر خلوص اور گہری دعا نکلی وہ داعیان حق کے لئے نمونہ عبرت ہے۔ آپ نے فرمایا!

"اللہ! میں اپنی ناتوانی' قلت تدبیر اور لوگوں کے مقابلے میں اپنی کمزوری کی فریاد آپ ہی سے کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو ہی میرا اور سب ضعیفوں کا رب ہے۔ تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے۔ کیا تو نے میرا معاملہ دشمن کے سپرد کر دیا ہے؟ یا کسی غیر کے جو مجھ سے ترشروئی سے پیش آئے۔ اگر تو مجھ پر غضبناک نہیں ہے تو پھر مجھے کسی چیز کی کوئی پروا نہیں لیکن تیری عافیت میرے لئے کشادہ ہے۔ میں تیرے غضب اور تیری پھٹکار سے تیرے چہرہ کے نور میں پناہ مانگتا ہوں۔ جس نے اندھیروں کو اجالا کر دیا جن سے دینی اور دنیوی امور درست ہوتے ہیں۔ میں تیرے ہی در کا سوالی ہوں۔ یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے اور تیرے سوا قوت و استطاعت کا کوئی اور مصدر نہیں ہے۔

چنانچہ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دعوت اسلامی کے لئے غیبی اسباب فراہم ہو گئے۔ عقبہ گھاٹی کے دامن میں پہلی بیعت ہوئی۔ پھر اگلے سال دوسری ہوئی۔ چونکہ ان بیعتوں کا ہمارے موضوع اور مدینہ میں دعوت اسلامی کی تاریخ سے گہرا تعلق ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کا مختصر تذکرہ کیا جائے۔

ہجرت سے ۳ سال قبل کا واقعہ ہے کہ حجاج کے سامنے دعوت اسلامی پیش کرنے کے دوران نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات خزرج کے کچھ لوگوں سے ہوئی۔ آپ کا معمول تھا کہ حج کے موقع پر آپ لوگوں کو دعوت دیتے اور ایک ایک قبیلے سے درخواست کرتے کہ وہ

دعوت اسلامی و قبول کریں اور آپ کی حمایت کریں تاکہ آپ اپنے رب کا پیغام پوری دنیا تک پہنچا سکیں۔ یثرب کے باشندوں کے پڑوس میں چونکہ یہود آباد تھے اور یہ لوگ اکثر اوقات یہودیوں سے یہ بات سنا کرتے تھے کہ ایک نبی آخر الزمان آنے والا ہے اور یہ کہ اس کی حمایت و قیادت میں وہ عربوں پر فتح یاب ہوں گے۔ وہ اللہ سے یہ دعائیں بھی مانگتے تھے کہ وہ انہیں اس کی طفیل فاتح و کامران کرے اور وہ نبی ان کے دشمنوں کے مقابلے میں ان کا حامی و مددگار ہو۔ جب خزرج کے وفد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو سنا تو آپس میں کہنے لگے "خدا کی قسم یہ وہی نبی ہے جس سے تمہیں یہود ڈراتے ہیں اور ایسا نہ ہو کہ یہودی تم سے پہلے اس پر ایمان لے آئیں۔ لہٰذا انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کر لی۔ اور آپ سے کہا کہ "ہماری پوری قوم مدینہ طیبہ میں ہے اور ان میں آج کل ایسی دشمنی اور خانہ جنگی برپا ہے جو کسی دوسری قوم میں نہیں ہے۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ آپ کے ذریعہ اللہ اس دشمنی کو ختم کر دے۔" جب یثرب لوٹے تو یہ واقعہ انہوں نے اہل مدینہ کو سنایا۔ اہل مدینہ بے حد خوش ہوئے اور دعوت اسلامی کو قبول کر لینے پر متفق ہو گئے۔

اگلے سال اوس اور خزرج کی ایک جماعت موسم حج میں مکہ آئی۔ اس نے حضور سے ملاقات کی اور حلقہ بگوش اسلام ہو کر لوٹی۔ آپ نے کچھ معلمین اور مبلغین ان کے ساتھ کر دیئے تاکہ وہ ان کی مزید تربیت کریں۔

تیسرے سال اوس و خزرج کی ایک بہت بڑی جمعیت حاضر ہوئی۔ اور آپ کے ساتھ معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ حضرت عباس کی موجودگی میں ہوا۔ معاہدہ کی اہم شق یہ تھی کہ اہل یثرب آپ کی حفاظت اسی طرح کریں گے جس طرح وہ اپنی جان اور مال کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس معاہدے کو بیعت عقبہ کبریٰ کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں محمد بن کعب قرظی نقل کرتے ہیں کہ اس میں حضرت عبداللہ بن رواحہ نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "آپ اپنے رب اور اپنی ذات کے لئے جو شرائط چاہیں ہم سے منوا لیں۔" آپ نے فرمایا اللہ کے لئے صرف یہ شرط ہے کہ آپ لوگ اس کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور اپنے لئے میں تم پر صرف یہ شرط عائد کرتا ہوں کہ آپ لوگ میری حفاظت ایسے ہی کریں جیسے اپنی جان و مال کی کرتے ہیں۔" اس پر عبداللہ بن رواحہ نے کہا تو پھر اس پر ہمیں کیا اجر ملے گا؟" آپ نے فرمایا "جنت!" اس پر سب نے کہا "بہت نفع بخش سودا ہے۔" نہ ہم اسے واپس کرتے ہیں اور نہ فریق ثانی سے اس کا مطالبہ کرتے ہیں۔

یوں مسلمانوں نے بزور طاقت نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لیا اور اسلام مدینہ طیبہ میں تیزی سے پھیل گیا۔ کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں کوئی نہ کوئی مسلمان نہ ہو۔ مسلمان مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آنا شروع ہو گئے۔ اور صرف دولت ایمان لے کر اپنے گھروں سے نکلے اور اپنا سب کچھ اس راہ حق میں لٹا دیا۔ مدینہ میں ان کے بھائیوں نے جو ان سے قبل دارالاسلام اور ایمان میں جم کر بس گئے تھے ' ان کے ساتھ جس ایثار اور بھائی چارے کا مظاہرہ کیا ' وہ ایسا ہے کہ پوری انسانی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر نے ہجرت فرمائی۔ اور آپ اس مامون اور آزاد مرکز میں جا پہنچے جس کے آپ ﷺ ایک عرصہ سے متلاشی تھے۔ جس دن آپ مدینہ پہنچے اسی دن اس نئے مرکز میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی تھی۔

جن لوگوں نے تحریک اسلامی کے اس مرحلے میں مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی اور ان کے معاون و مددگار پہلے سے مدینہ میں ان کے لئے منتظر بیٹھے تھے ' یہ دونوں مل کر وہ جماعت بن گئے جس کی طرف قرآن کریم متعدد مقامات پر اشارہ کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ کے آغاز ہی میں جن ایمانی مبادیات کا ذکر شروع ہو جاتا ہے ' یہ صفات اگرچہ بظاہر علی الاطلاق تمام سچے مومنین کی ہیں لیکن ان صفات کا سب سے پہلا مصداق مومنین کی وہ جماعت ہے جو اس وقت مدینہ طیبہ میں جمع تھی۔

الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

يُنفِقُونَ ۝ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

"الف' لام' میم - یہ اللہ کی کتاب ہے - اس میں کوئی شک نہیں - ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کے لئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے' اس میں سے خرچ کرتے ہیں' جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں' ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں - ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں -

مومنین کی یہ صفات بیان کرنے کے بعد سیاق کلام میں متصلاً کفار کی صفات کا بیان آجاتا ہے - اگرچہ علی العموم ان صفات کا تعلق بھی تمام کفار سے ہے لیکن ان کا سب سے پہلا مصداق وہ کفار بنے جو اس وقت دعوت اسلامی کی راہ روکے کھڑے تھے - خواہ وہ مکی کفار ہوں یا ان کا تعلق مدینہ اور اس کے ماحول سے ہو -

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

"جن لوگوں نے ان باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا' ان کے لئے یکساں ہے' خواہ تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو' بہرحال وہ ماننے والے نہیں ہیں - اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے - وہ سخت سزا کے مستحق ہیں -

ان دو گروہوں کے علاوہ وہاں منافقین کا ایک تیسرا گروہ بھی موجود تھا جیسا کہ ہم نے بالتفصیل بتایا' جن حالات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی' ان کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ ہجرت کی تکمیل کے فوراً بعد ہی وہ گروہ پیدا ہو گیا - مکہ میں اس گروہ کا وجود نہ تھا - کیونکہ وہاں اسلام کی پشت پر کوئی قوت اور حکومت نہ تھی اور نہ کوئی ایسی قوی جماعت تھی جس سے ڈر کر قریش اسلام کے بارے میں کوئی منافقانہ رویہ اختیار کرتے بلکہ اس کے برعکس مکہ میں اسلام کمزور تھا - دعوت ہر قسم کے خطرات میں گھری ہوئی تھی - صرف مخلصین ہی تھے جو اس دور میں دعوت اسلامی کی صفوں میں شامل ہونے کی جرأت کر سکتے تھے' جو اس کی راہ میں ہر قسم کے مصائب جھیلنے کے لئے تیار تھے اور اس کے لئے سب کچھ لٹانے پر تلے ہوئے تھے لیکن یثرب..... (جو پہلے دن ہی سے مدینۃ الرسول کے نام سے مشہور ہو گیا) میں حالات کا رخ یکلخت بدل گیا تھا - اسلام ایک ایسی قوت بن گیا تھا جسے ہر شخص محسوس کرنے لگا تھا اور ہر کوئی مجبور تھا کہ وہ اس قوت سے تھوڑا بہت بنائے رکھے - بالخصوص جنگ بدر کی عظیم کامیابی کے بعد تو بڑوں بڑوں کی گردنیں جھک گئی تھیں - جو لوگ روش نفاق پر مجبور تھے ان میں بعض کبرائے یثرب بھی تھے - ان کے خاندان اور قبیلے کے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے تھے - اس لئے یہ کبراء بھی اپنی سابقہ پوزیشن کو بحال رکھنے کے لئے اور اپنے مخصوص مصالح کی خاطر بظاہر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے - ایسے لوگوں میں عبداللہ بن ابی ابن سلول کا نام سرفہرست تھا - کیونکہ مسلمانوں کی ہجرت سے کچھ قبل ہی اس کی قوم نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ اسے بادشاہ بنا دیں - اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس کی قوم اس کے لئے ہار اور تاج تیار کر رہی تھی -

سورۂ بقرہ کی ابتدا میں بالتفصیل ان منافقین کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں - بعض فقروں سے یہ معلوم ہوتا ہے اکثر و بیشتر فقروں کا مصداق یہی بڑے لوگ ہیں جنہوں نے حالات سے مجبور ہو کر اپنے آپ کو دائرہ اسلام میں داخل کر دیا تھا - لیکن وہ اب بھی عوام الناس پر اپنی لیڈرشپ قائم رکھنے کے خواب دیکھ رہے تھے - اور عام طور پر ایسے متکبر اکابرین جس طرح عوام کے بارے میں رائے رکھتے ہیں اسی

طرح یہ لوگ اسلام قبول کرنے والوں کو "بے وقوف" لوگ کہہ کر پکارتے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں' حالانکہ در حقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں۔مگر دراصل وہ اپنے آپ ہی کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا اور جو جھوٹ وہ بولتے ہیں اس کی پاداش میں ان کے لئے دردناک سزا ہے۔جب کبھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو' تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔خبردار! حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انہیں شعور نہیں ہے اور جب ان سے کہا گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں' اسی طرح تم بھی ایمان لے آؤ تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں؟..... خبردار! حقیقت میں تو یہ خود بیوقوف ہیں 'مگر یہ جانتے نہیں ہیں۔جب یہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں' اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں' تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں..... اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے' وہ ان کی رسی دراز کئے جاتا ہے' اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکے چلے جاتے ہیں۔یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے 'مگر یہ سودا ان کے لئے نفع بخش نہیں ہے اور یہ ہرگز صحیح راستے پر نہیں ہیں۔ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب سارا ماحول چمک اٹھا تو اللہ نے ان کا نور بصارت سلب کر لیا اور انہیں اس حال پر چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔یہ بہرے ہیں' گونگے ہیں' اندھے ہیں۔یہ اب نہ پلٹیں گے یا پھر ان کی مثال یوں سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے۔اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک بھی ہے۔یہ بجلی کے کڑاکے سن کر اپنی جانوں کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لیتے ہیں اور اللہ ان منکرین حق کو ہر طرف سے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔چمک سے ان کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ گویا عنقریب بجلی ان کی بصارت اچک لے جائے گی۔جب ذرا کچھ روشنی انہیں محسوس ہوتی ہے تو اس میں کچھ دور چل لیتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل ہی سلب کر لیتا یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

مریض دل منافقین پر اس بھرپور وار کے دوران' ان کے شیاطین کی طرف اشارے ملتے ہیں۔اس سورت کے سیاق و سباق اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد یہود ہیں۔کیونکہ اس سورت میں ان کے کردار پر بھرپور تنقید کی گئی ہے۔دعوت اسلامی کے بارے میں یہودیوں نے جو طرز عمل اختیار کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مدینہ طیبہ میں یہود وہ پہلا طبقہ تھا جس نے تحریک اسلامی سے ٹکر لی اور اس ٹکراؤ اور تصادم کے متعدد اسباب تھے۔وہ اوس خزرج جیسی امی اقوام کے مقابلے میں' اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔مشرکین عرب میں اگرچہ مذہب یہود کی طرف کم میلان پایا جاتا تھا لیکن وہ آسمانی کتاب و ہدایت رکھنے کی وجہ سے یہودیوں کے لئے مفید مطلب تھیں۔فتنہ و فساد اور تشتت و افتراق وہ میدان ہے جس میں یہودی زیادہ چابکدستی سے کام کرتے ہیں لیکن جب اسلام آیا تو یہودیوں کے ان تمام مفادات پر زد پڑی۔وہ ایک ایسی کتاب لے کر آیا جو سابقہ کتب کی تصدیق کرتی تھی اور ان کی تعلیمات کی محافظ تھی۔پھر اسلام نے اوس اور خزرج کے اختلافات کو بھی ختم کر دیا' جن کے ذریعے یہودی اپنے مکر و فریب کا جال بچھاتے تھے اور مالی مفادات حاصل کرتے تھے۔اوس اور خزرج کے باہم دست و گریبان لوگ اسلامی صفوں میں آکر ایک دوسرے سے گلے مل گئے اور اوس و خزرج کے بجائے وہ دونوں مہاجرین کی نصرت کی وجہ سے انصار کہلانے لگے۔اور ان سب عناصر کو ملا کر اسلام نے وہ بے نظیر اور نیا اسلامی معاشرہ تیار کیا جس کے تمام افراد متحد اور متفق تھے' یوں کہ گویا وہ تمام ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء ہیں اور جس کی مثال نہ اس سے پہلے کبھی تاریخ میں پائی گئی اور نہ اس کے بعد آج تک کہیں وجود میں آسکی۔

یہودی اپنے آپ کو اللہ کی مختار اور برگزیدہ قوم سمجھتے تھے۔ ان میں بے شمار رسول اور نبی مبعوث ہوئے تھے اور وہ متعدد کتابوں کے حامل تھے۔ وہ ہمیشہ اس کی توقع رکھتے تھے اور شدت سے منتظر بھی تھے کہ نبی آخر الزماں خود ان کے ہاں سے مبعوث ہو گا لیکن جب وہ عربوں سے مبعوث ہوا تو پھر انہوں نے یہ توقعات باندھ لیں کہ شاید نیا نبی ان کو اپنے دائرہ دعوت سے باہر رکھے گا اور اپنی دعوت کو ان پڑھ عربوں تک ہی محدود رکھے گا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہ سب سے پہلے اہل کتاب کو اللہ کی اس آخری کتاب کی طرف دعوت دے رہا ہے اور اس بات پر وہ دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ وہ عربوں کی نسبت زیادہ ذی علم ہیں اور ان کا یہ فرض ہے کہ وہ مشرکین سے بھی پہلے اس دعوت حق پر لبیک کہیں تو ان کے غرور نفس نے انہیں بغاوت پر آمادہ کر لیا اور انہوں نے اسے اپنے لئے اہانت سمجھا اور اپنے مذہب کے خلاف اس نئی دعوت کو دست درازی تصور کرنے لگے۔

اب یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف شدید حسد و بغض میں مبتلا ہو گئے۔ ایک تو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزماں کے منصب کے لئے آپ کو منتخب فرمایا اور آپ کو کتاب دی جس کی صداقت میں یہودیوں کو ذرہ بھر شبہ نہ تھا۔ دوسرے اس لئے کہ ظہور نبوت کے ساتھ ساتھ آپ کو اس نئے ماحول میں برق رفتار کامیابی حاصل ہو گئی' ان اسباب کے علاوہ اس حسد و بغض 'تحریک اسلامی سے عداوت اور اس کے خلاف ہر قسم کے اوچھے ہتھیار استعمال کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہودی اس بات کا پختہ شعور رکھتے تھے کہ نئے حالات میں یا تو انہیں اس نئے معاشرے سے پوری طرح کٹ جانا ہو گا اور اس صورت میں ان کی فکری قیادت 'تجارت اور سودی کاروبار کے تمام مفادات ختم ہو جائیں گے اور یا پھر انہیں پوری طرح اس نئے معاشرے میں ضم ہو کر گم ہو جانا ہو گا اور یہ دونوں گولیاں ایسی ہیں کہ جو کسی قیمت پر بھی ایک یہودی کے حلق سے نہیں اتر سکتیں۔

یہ تھے وہ وجوہات جن کی بنا پر یہودان مدینہ نے تحریک اسلامی کے مقابلے میں وہ سخت رویہ اختیار کیا' جس کی تفصیل سورۂ بقرہ اور دوسری سورتوں میں بیان کی گئی ہے۔ ہم یہاں ایسی چند آیات نقل کر رہے ہیں جن میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بنی اسرائیل کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے 'قرآن انہیں ان الفاظ سے پکارتا ہے اور ایمان کی دعوت دیتا ہے۔

"اے بنی اسرائیل! ذرا خیال کرو اس نعمت کا' جو میں نے تم کو عطا کی تھی' میرے ساتھ تمہارا جو عہد تھا' اسے پورا کرو' تو میرا جو عہد تمہارے ساتھ ہے اسے میں پورا کروں' اور مجھ ہی سے ڈرو' اور میں نے جو کتاب بھیجی ہے' اس پر ایمان لاؤ۔ یہ اس کتاب کی تائید میں ہے' جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی' لہٰذا سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بن جاؤ۔ تھوڑی قیمت پر میری آیات کو نہ بیچ ڈالو۔ اور میرے غضب سے بچو! باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو' نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو' اور جو لوگ میرے آگے جھک رہے ہیں' ان کے ساتھ تم بھی جھک جاؤ' تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لئے کہتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو' حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو؟ کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے؟"

ایک دوسری جگہ تفصیل سے وہ رویہ اور طرز عمل بیان کیا گیا ہے جو بنی اسرائیل نے اپنے رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اختیار کیا تھا کہ کس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کے انعامات کا کفران کیا۔ کس طرح انہوں نے کتاب اللہ اور شریعت کے بارے میں بے عملی کا مظاہرہ کیا اور بار بار اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے ہوئے وعدوں کو توڑا۔ یہ کچھ بالتفصیل بیان کر کے قرآن مجید مسلمانوں کو متنبہ کرتا ہے۔

اے مسلمانو! اب کیا ان لوگوں سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف کی۔ محمد رسول اللہ کو ماننے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی انہیں مانتے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے سے تخلیے کی بات چیت ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ بیوقوف ہو گئے ہو؟ ان لوگوں کو وہ

باتیں بتاتے ہو' جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ تمہارے رب کے پاس تمہارے مقابلے میں انہیں حجت میں پیش کریں۔" (۲-۷۶)

"وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز چھونے والی نہیں ہے۔ الا یہ کہ چند روز کی سزا مل جائے تو مل جائے ان سے پوچھو کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے' جس کی خلاف ورزی وہ نہیں کر سکتا؟ یا یہ بات ہے کہ تم اللہ کے ذمے ڈال کر ایسی بات کہہ دیتے ہو' جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ اس نے ان کا ذمہ لیا ہے۔" (۲-۸۰)

"اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے' اس کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے؟ باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی' باوجودیکہ اس کی آمد سے قبل وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے' مگر جب وہ چیز آگئی' جسے وہ پہچان بھی گئے' تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ خدا کی لعنت ان منکرین پر۔" (۲-۸۹)

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے' اس پر ایمان لاؤ تو کہتے ہیں "ہم تو صرف اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو ہمارے ہاں یعنی نسل بنی اسرائیل میں اتری ہے۔ اس دائرے کے باہر جو کچھ آیا ہے اسے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں' حالانکہ وہ حق ہے اور اس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے' جو ان کے پاس پہلے سے موجود ہے۔" (۲-۹۱)

"اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا' جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی' تو ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو' اس طرح پس پشت ڈالا گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔" (۲-۱۰۱)

"یہ لوگ جنہوں نے دعوت حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے خواہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرک ہوں' ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بھلائی نازل ہو۔" (۲-۱۰۵)

"اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں۔ اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا مگر اپنے نفس کی حسد کی بنا پر تمہارے لئے ان کی یہ خواہش ہے۔" (۲-۱۰۹)

"ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک وہ یہودی نہ ہو یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو یہ ان کی تمنائیں ہیں۔" (۲-۱۱۱)

"یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے' جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔" (۲-۱۲۰)

یہ قرآن مجید کا زندہ جاوید معجزہ ہے کہ قرآن نے ان یہودیوں کو جس صفت سے موصوف کیا وہ صفت آج تک ان کے ساتھ چپکی ہوئی ہے اور یہ صفت ہے جو ان کی ہر نسل میں ان کے ساتھ لازم رہی ہے۔ خواہ وہ نسل قبل اسلام گزری ہو یا اسلام کے بعد آج تک کسی دور میں رہی ہو۔ قرآن کریم ان کو یوں خطاب کرتا ہے کہ گویا یہود ان یثرب بذات خود حضرت موسیٰ اور آپ کے بعد آنے والے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے ادوار میں موجود تھے۔ کیونکہ اول روز سے بنی اسرائیل کی یہی فطرت رہی ہے۔ ان کے اوصاف وہی ہیں۔ ان کا طرز عمل وہی ہے اور حق و صداقت کے ساتھ وہ ہر دور اور ہر زمانے میں ایک ہی برتاؤ کرتے چلے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوران کلام قوم موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کے بعد آنے والی اسرائیلی نسلوں کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔ اور قرآن مجید کے یہ زندہ کلمات آج بھی امت مسلمہ اور یہودیوں کے باہم تعلق اور موقف کو ظاہر کر رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ یہودی دعوت اسلامی اور امت مسلمہ کے مقابلے میں آج بھی وہی طرز عمل اختیار کر رہے ہیں جو انہوں نے آج سے صدیوں قبل اختیار کیا اور یہی ان کا طرز عمل مستقبل میں بھی ہو گا۔ یہ قرآنی آیات اس وقت امت مسلمہ کے لئے ایک دائمی ہدایت اور تنبیہ کی حیثیت رکھتی تھیں اور آج بھی وہ یہی بتا رہی ہیں کہ اعداء اسلام نے ہمارے اسلاف کے ساتھ جو رویہ روا رکھا تھا وہی پالیسی وہ آج بھی اختیار کریں گے۔ آج بھی ان کی ریشہ دوانیاں اور

مکروفریب ویسے ہی ہیں جیسے یثرب میں تھے۔ وہ ہر دور میں اسلام کے خلاف مختلف اور متنوع طریقوں سے بر سرپیکار رہے۔ لیکن اس جنگ کی حقیقت صرف ایک رہی یعنی اسلام دشمنی۔

غرض اس صورت میں جہاں یہودیوں کے یہ اوصاف بیان ہوئے ہیں اور مسلمانوں کو ان کی سازشوں سے متنبہ کیا گیا' وہاں اسلامی جماعت کی تشکیل اور اس دنیا میں اسلامی نظریۂ حیات کی امانت کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے' اسے تیار کرنے اور اس کی تربیت کرنے کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں' جبکہ بنی اسرائیل ایک زمانے سے اس امانت کی ذمہ داریاں پوری کرنے میں ناکام ہو چکے تھے اور آخر میں انہوں نے اس نظریۂ حیات کے بارے میں یہ معاندانہ رویہ تک اختیار کر لیا تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں سورت کا آغاز ان طبقات کے ذکر سے ہوتا ہے جنہوں نے ہجرت کے متصلاً بعد تحریک اسلامی کے بارے میں مختلف طرزہائے عمل اختیار کر رکھے تھے۔ ان طبقات میں شیاطین بنی اسرائیل کی طرف مخصوص اشارے بھی تھے۔ جن کا ذکر بعد میں مفصل ہوا۔ اس سورت کے آغاز میں جن طبقات کا ذکر ہوا ہے ان کی نوعیت ایسی ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں دعوت اسلامی کے مقابلے میں لوگوں نے ایسے ہی طرز عمل اختیار کئے۔ اس کے بعد پوری سورت کے مباحث اپنے انہی متوازی خطوط پر چل رہے ہیں جن میں اس وحدت و یگانگت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ جس سے اس سورت کی خاص شخصیت کا ظہور ہو رہا ہے' حالانکہ اس کے موضوعات سخن میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔

کافرین اور منافقین کے تین طبقات کے ذکر اور شیاطین یہود کی طرف اشارات کے بعد اب تمام انسانوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ صرف ایک اللہ کی بندگی کریں اور اللہ نے اپنے بندے پر جو کتاب نازل کی ہے' اس پر ایمان لے آئیں۔ کافروں کو چیلنج دیا جاتا ہے کہ اگر وہ کتاب کی صداقت میں شک کرتے ہیں تو پھر اس جیسی کوئی ایک سورت لے آئیں' کافروں کو آگ سے ڈرایا جاتا ہے اور مومنین کو جنتوں کی خوشخبری دی جاتی ہے۔ اس کے بعد کافروں کو غور و فکر کی دعوت دی جاتی ہے اور متعجبانہ انداز میں ان کے کفر کی تردید کی جاتی ہے۔

"تم اللہ کے ساتھ کفر کا رویہ کیسے اختیار کرتے ہو؟ حالانکہ تم بے جان تھے' اس نے تمہیں زندگی عطا کی' پھر اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔ پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان استوار کئے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔" (۲-۲۹)

اس حقیقت کی طرف اشارے کے بعد' کہ زمین کی تمام مخلوقات کو انسانوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے' حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت فی الارض کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔

"پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو' جب اس کے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔" اس کے بعد قصے کی تفصیلات بیان ہوتی ہیں۔ آدم و ابلیس کا معرکہ پیش آتا ہے اور آخر کار حضرت آدم علیہ السلام کا نزول ہوتا ہے اور زمین کے اندر "عہد خلافت آدم" کا آغاز ہوتا ہے۔ جو در اصل دور ایمان ہے۔

ہم نے کہا "تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو یہ لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے' ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے' وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں' جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" (۲-۳۹)

اس کے بعد بنی اسرائیل کی تاریخ پر طویل ترین تبصرہ شروع ہوتا ہے جس کے چند فقرے ہم اس سے پہلے نقل کر آئے ہیں۔ اس تبصرے اور تنقید کے درمیان جگہ جگہ انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اسلامی نظام حیات کو اپنا لیں اور اس کتاب پر ایمان لے آئیں جو ان

کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جن کے حامل خود وہ ہیں۔ ساتھ ساتھ انہیں یہ تنبیہہ کی جا رہی ہے کہ انہوں نے کیا کیا کوتاہیاں کیں۔ کس طرح وہ راہ راست سے بھٹکتے رہے اور حق و باطل کی آمیزش کرتے رہے۔ بنی اسرائیل کے ساتھ بحث و تمحیص قرآن مجید کے پہلے پارے کے آخر تک پھیلی ہوئی ہے۔

اس پوری بحث سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ بنی اسرائیل نے دین اسلام' نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کا استقبال کس طرح کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا۔ انہوں نے حق و باطل کی تلبیس کی' وہ دوسرے لوگوں کو تو یہ مشورہ دیتے کہ وہ ایمان لے آئیں لیکن خود اپنے آپ کو بھول جاتے۔ وہ کلام اللہ سنتے' اچھی طرح سمجھتے لیکن اس کے بعد اس کو غلط معانی پہنا کر جھوٹا پروپیگنڈا کرتے۔ وہ پہلے ایمان کا اظہار کرتے اور پھر کفر کا اعلان کر کے مومنین صادقین کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے اور جب آپس میں اکٹھے ہوتے تو ایک دوسرے کو بتاکید یہ کہتے کہ خبردار! وہ رازکی باتیں مسلمانوں کو نہ بتانا' جو حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کتب سابقہ میں وارد ہیں اور جنہیں انہوں نے چھپا رکھا تھا۔ انہوں نے کوششیں کیں کہ کسی طرح مومنین کو دوبارہ کفر کی روش پر مجبور کر دیں۔ وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ صحیح اہل ہدایت ہیں ہی یہود۔ جیسا کہ نصرانیوں کا یہ خیال تھا کہ روئے زمین پر اہل ہدایت صرف وہ ہیں۔ وہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے محض اس لئے دشمن ہو گئے تھے کہ بقول ان کے انہوں نے ان کو چھوڑ کر پیغام خداوندی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا دیا۔ وہ مسلمانوں کی ہر کامیابی پر منغض ہو جاتے اور ان کی بربادی کے منتظر رہتے' وہ ہر لحظہ یہ کوشش کرتے کہ وحی الٰہی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و اوامر میں شک پیدا کیا جائے' اور تحویل قبلے کے موقع پر تو ان کے پروپیگنڈے کی تو کوئی انتہا نہ رہی۔ منافقین کے ساتھ مسلسل ربط ضبط رکھتے تھے اور ہر وقت ان کی راہنمائی کرتے تھے اور مشرکین کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں ان کے کردار پر سخت ترین تنقید پائی جاتی ہے اور سورت انہیں یاد دلاتی ہے کہ انہوں نے یہی طرز عمل خود اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں اختیار کیا تھا اور آپ کے بعد بھی انبیاء و رسل کے ساتھ یہ لوگ ایسا سلوک کرتے رہے۔ نسلوں تک ان کا رویہ یہی رہا۔ قرآن کریم انہیں اس طرح مخاطب کرتا ہے کہ بنی اسرائیل جہاں اور جس دور میں بھی ہوں گویا وہ ایک ہی گروہ ہے کیونکہ وہ ایک ہی فطرت اور جبلت رکھتے ہیں جس میں کبھی بھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اس طویل ترین تنقید کے آخر میں مسلمانوں کو بنی اسرائیل کے ایمان سے مایوس کر دیا جاتا ہے کیونکہ ان کی یہ خود غرضانہ ذہنیت اور مطلب پرستی اور سڑی ہوئی اور خبیث طبیعت ان کے ایمان کی راہ میں رکاوٹ ہے اور بالآخر یہ تقریر ان کے اس دعوے کی تردید پر ختم ہوتی ہے کہ "صرف وہی ہدایت پر ہیں کیونکہ وہی حضرت ابراہیم ؑ کے وارث ہیں" اور بتایا جاتا ہے حضرت ابراہیم ؑ کے صحیح وارث وہی لوگ ہیں جو سنت ابراہیمی پر چلتے ہیں اور اس عہد کی پابندی کرتے ہیں جو حضرت ابراہیم ؑ نے اپنے رب کے ساتھ باندھا تھا لہٰذا حضرت ابراہیم ؑ کی وراثت اور جانشینی گویا اب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو حاصل ہو گئی ہے کیونکہ یہودی راہ راست سے بھٹک گئے' اپنے دین کو تبدیل کر دیا اور اب وہ اسلامی نظریۂ حیات کی امانت کی حفاظت کے اہل اور اس زمین پر منصب خلافت الٰہی کے قابل نہیں رہے لہٰذا یہ ذمہ داری اب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والوں نے اپنے کاندھوں پر لے لی۔ خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھاتے وقت حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے جو دعا کی تھی امت مسلمہ کا برپا ہونا گویا اس دعا کی قبولیت کا مجسم ظہور تھا' انہوں نے کہا تھا:

"اے رب ہم دونوں کو اپنا مطیع بنا' ہماری نسل سے ایک ایسی امت اٹھا' جو تیری مسلم ہو' ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری

کوتاہیوں سے درگزر فرما تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے اور اے رب ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھائیو جو انہیں تیری آیات سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوار دے۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔" (۲۔۱۲۹)

اب یہاں سے قرآن مجید کا خطاب اور روئے سخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے گرد جمع ہونے والی جماعت مسلمہ کی طرف پھر جاتا ہے اور وہ اصول و قواعد بیان کئے جاتے ہیں جن پر اس نئی جماعت کی تشکیل ہوئی ہے جو دعوت دین کا کام لے کر اٹھی ہے اور یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس جماعت کا ایک خاص مزاج ہے اور نظریہ و عمل میں وہ ایک مخصوص زاویہ نگاہ رکھتی ہے۔

امت مسلمہ کی خصوصیات کا بیان تحویل قبلہ سے شروع ہوتا ہے۔ وہ سمت متعین ہو جاتی ہے جس کی طرف امت مسلمہ کو متوجہ ہونا ہے۔ یہ نیا قبلہ بیت الحرام ہے جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اللہ کے خاص احکامات کے تحت تعمیر کیا تھا۔ اللہ نے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ اسے تعمیر کریں اور پاک و صاف کریں تاکہ وہاں صرف ایک اللہ تعالیٰ کی پرستش کی جائے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش بھی یہی تھی کہ قبلہ بدل دیا جائے لیکن آپ نے کبھی اس کا اظہار نہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ لو ہم اس قبلے کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں' جسے تم پسند کرتے ہو۔ مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو اب جہاں کہیں تم ہو' اس طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔" (۲۔۱۴۴)

اس کے بعد اسلامی نظام حیات کی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں' جس پر اس جماعت نے عمل پیرا ہونا ہے۔ نظریۂ حیات اور طریق عبادت اور سلوک و معاملات کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ راہ حق میں جو لوگ جانیں دیتے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو وہ تو زندہ جاوید ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خوف' بھوک' مالی نقصانات' جانی نقصانات' فصلوں اور پھلوں کی تباہی جیسی ابتلائیں محض اذیتیں نہیں ہوتیں بلکہ وہ آزمائشیں ہوتی ہیں۔ اور یہ ہمیشہ ان لوگوں کی راہ میں آتی ہیں جو دعوت حق کو لے کر اٹھتے ہیں۔ تنبیہ کی جاتی ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں شیطان تمہیں فقر و مسکنت سے ڈراتا ہے اور فحاشی اور بے حیائی پر آمادہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ تم سے یہ ہوتا ہے کہ وہ تمہیں بخش دے گا۔ اور تمہیں اپنے فضل سے نوازے گا۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ مومنین کا والی اور مددگار ہے اور وہ انہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے اور کافروں کے والی طاغوت ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر اندھیروں میں پھینک دیتے ہیں۔ اس کے بعد کھانے پینے کی چیزوں میں حلال و حرام احکامات بیان کئے جاتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ نیکی کی حقیقت کیا ہے۔ صرف ظاہری شکل و صورت ہی کو دیکھ کر نیک و بد کا فیصلہ نہ کرنا چاہئے۔ پھر قتل میں قصاص کے احکام' وصیت کے احکام' روزے کے احکام' جہاد کے احکام' حج کے احکام اور نکاح و طلاق کے احکام بیان کئے جاتے ہیں۔ اسلام کے عائلی نظام کی دقیق شیرازہ بندی کی جاتی ہے۔ اور نظام معیشت میں زکوٰۃ' ربا کی حرمت' لین دین اور تجارت کے احکامات بیان ہوتے ہیں۔

۵۔ ان تمام موضوعات پر بحث کرتے ہوئے دوران گفتگو' موقع و محل کی مناسبت سے' موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے حالات کی طرف اشارہ بھی کیا جاتا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے کچھ پہلو بھی بیان ہوتے ہیں۔ لیکن پہلے پارے کے بعد پوری سورت میں روئے سخن مستقلاً اسلامی جماعت کی طرف پھر جاتا ہے۔ اسے اسلامی نظام حیات کی ذمہ داریوں کو اٹھانے اور اللہ کی شریعت کے مطابق' زمین میں نظام خلافت کے قیام کی ذمہ داریوں کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور اس طرح امت مسلمہ کو تمام دوسری امتوں سے ممتاز کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ امت خود اس کائنات اور رب کائنات (جس نے اس امت کو اس عظیم منصب کے لئے چنا) کے درمیان ربط و تعلق کی نوعیت کے بارے میں ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتی ہے۔

سورت کے آخر میں پہنچ کر ہم دیکھتے ہیں کہ کلام کے خاتمے میں سورت کے ابتدائیہ کو دہرایا جاتا ہے۔ ایمانی نظریۂ حیات کی حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ امت مسلمہ تمام انبیاء پر ایمان رکھتی ہے۔ نیز تمام کتب سماوی پر اس کا ایمان ہے اور وہ انبیاء کے بیان کردہ امور غیبیہ پر بھی یقین رکھتی ہے اور انبیاء کی تعلیمات کو مانتی ہے اور دل و جان سے مطیع فرمان ہے۔ فرمایا جاتا ہے:

"رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب سے اس پر نازل ہوئی ہے اور جو لوگ اس رسول اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں۔ اور ان کا قول یہ ہے کہ "ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے' ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی۔ مالک! تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔ اللہ کسی متنفس پر' اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے' اس کا پھل اس کے لئے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال اسی پر ہے۔ (ایمان لانے والو! تم یوں دعا کیا کرو) اے ہمارے رب! ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں' ان پر گرفت نہ کر۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار! جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے' وہ ہم پر نہ رکھ۔ ہمارے ساتھ نرمی کر' ہم سے درگزر فرما' ہم پر رحم کر' تو ہمارا مولیٰ ہے' کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔"

اسی طرح آغاز و انجام کے درمیان پوری پوری یک رنگی پائی جاتی ہے اور سورت کے تمام موضوعات تحت مومنین صادقین کی صفات اور خصوصیات کے ان دو بیانوں کے درمیان سمٹ جاتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

# درس ۲ ایک نظر میں

(۱) آیات کا یہ حصہ' اس عظیم سورت کا افتتاحیہ ہے' اس میں یہودیوں کے سوا' ان تمام عناصر (Pressure Groups) سے ہم متعارف ہو جاتے ہیں' جن کا مقابلہ مدینہ طیبہ میں تحریک اسلامی کو کرنا پڑا۔ اس میں یہودیوں کی طرف ایک مختصر سا اشارہ پایا جاتا ہے۔ قرآن انہیں منافقین کو "شیاطین" کا لقب دیتا ہے' یہ لفظ ہی ان کی بیشتر صفات کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اور بتا رہا ہے کہ تحریک اسلامی کی مخالفت میں ان کا کیا کردار رہا۔ اگرچہ یہ اشارہ مختصر ہے لیکن ابتدا میں ان کی حقیقت کے اظہار کے لئے کافی ہے۔ بعد میں ان کے کردار پر تفصیلی تبصرہ ہوتا ہے۔

(۲) ان خصوصیات کی نقشہ کشی کے دوران ہم قرآن مجید کی تعبیری خصوصیات (Style of expression) سے بھی متعارف ہوتے ہیں۔ منظر کشی کے لئے خطوط والوان کی جگہ یہاں حسین الفاظ کا انتخاب پایا جاتا ہے۔ ان الفاظ کو پڑھتے ہی اصل مناظر آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ یہ مناظر اور یہ تصورات بڑی تیزی سے حرکت پذیر ہوتے ہیں اور زندگی کی تگ و تاز سے بھرپور نظر آتے ہیں۔

(۳) سورت کے آغاز ہی میں ہلکے پھلکے' عام فہم اور مختصر الفاظ میں تین قسم کے انسانوں کی عجیب تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان میں سے ہر نوع ایسی ہے کہ انسانی افراد اور مجموعوں کی ایک عظیم الشان تعداد کا زندۂ جاوید نمونہ ہے۔ یہ مجموعے صد درجہ حقیقی اور گہرے ہیں اور ہر زمان و مکان میں بار بار وجود میں آتے ہیں اور قرآن کریم کے اعجاز کا یہ ایک خاص پہلو ہے کہ انسانیت کی طویل ترین تاریخ میں روز اول سے لے کر آج تک پوری انسانیت انہی تین گروہوں میں منقسم نظر آتی ہے۔

(۴) ان مختصر کلمات اور معدودے چند جملوں کے ذریعہ' ان طبقوں کے حقیقی خدوخال اس طرح واضح اور مکمل صورت میں لوح دماغ پر منقش ہو جاتے ہیں کہ یہ طبقے زندہ و متحرک' ممتاز و مشخص اور اپنے حقیقی خدوخال کے ساتھ ساتھ صاف صاف آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ یہ بے ساختہ جملے اس قدر موزوں اور متناسب اور اپنے اندر اس قدر مترنم صوتی ہم آہنگی رکھتے ہیں کہ کوئی طویل ترین کلام اور کوئی مفصل ترین بیان بھی اس کی گرد تک نہیں پہنچ سکتا۔

(۵) جب ان طبقوں کی یہ منظر کشی ختم ہو جاتی ہے تو پھر قرآن کریم تمام بنی نوع انسان کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ پہلے طبقے میں شامل ہوں۔ وہ انہیں پکارتا ہے کہ ایک خدا ایک خالق اور ایک رازق کی بندگی اور غلامی کی طرف لوٹ آئیں' جس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور رسالت اور آپ پر نزول قرآن کے بارے میں جو لوگ متشکک ہیں انہیں چیلنج دیا جاتا ہے کہ وہ ایسی ایک سورت تو بنا لائیں۔ اگر وہ اس چیلنج کو قبول نہیں کر سکتے تو پھر دردناک اور خوفناک عذاب کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس کے برعکس مومنین اور صالحین کو خوشخبری دی جاتی ہے کہ ان کے لئے نہ ختم ہونے والا انعام و اکرام ہے۔ اور الفاظ کے آئینے میں اس کی جھلک بھی دکھا دی جاتی ہے۔

(۶) اس کے بعد پھر یہود و منافقین کی فتنہ پردازی کا جائزہ لیا جاتا ہے جو یہ کہتے تھے کہ قرآن کریم میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کو تمثیلات دی گئی ہیں۔ لہٰذا یہ منزل کتاب نہیں ہے۔ انہوں نے اس مسئلے کو آڑ بنا کر شکوک و شبہات پھیلانے کا ایک وسیع کاروبار شروع کر دیا تھا۔ ان کو بتایا گیا کہ یہ مثالیں گہری حکمت پر مبنی ہیں اور یہ کہ انہیں پڑھ کر ایک شخص گمراہ بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ وہ ہوئے اور دوسری طرف ان سے مومنین کا گروہ ایمان میں اور پختہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ان پر نکیر کی جاتی ہے کہ وہ اس

خالق و مدبر 'علیم و بصیر اور جلانے والے اور مارنے والے کا انکار کیوں کر کرتے ہیں؟ حالانکہ وہی تو ہے جس نے انسانوں کے لئے اس پوری کائنات کو پیدا کیا' انہیں یہاں یہ طویل و عریض مملکت دے کر اپنا خلیفہ و مختار بنایا اور انہیں بے شمار انعامات و اکرامات سے نوازا۔

(ے) بقرہ کا یہ پہلا درس جن اساسی خطوط پر آگے بڑھتا ہے یہ ان کا اجمالی بیان ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس اجمالی نظر کے بعد آیات و کلمات کی قدرے مفصل تشریح کر دی جائے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

سُورَةُ الْبَقَرَةِ (٢) مَدَنِيَّةٌ (٨٧) آيَاتُهَا (٢٨٦) رُكُوعَاتُهَا (٤٠)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ (١) ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (٢) الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ
بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (٣) وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ
بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (٤)
اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٥﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٦﴾ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى
قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٧﴾ ع ۱
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨﴾
يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٩﴾
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا
يَكْذِبُوْنَ ﴿١٠﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ
مُصْلِحُوْنَ ﴿١١﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٢﴾ وَاِذَا
قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ اَلَآ
اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا
اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٤﴾
اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١٥﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿١٦﴾
مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ

بِنُوْرِهِمْ وَ تَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا
يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ
اَصَابِعَهُمْ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَ اللّٰهُ مُحِيْطٌۢ
بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا
فِيْهِ ۙ وَ اِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ ۲
وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ ع ۳ ۲
الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ
الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ
الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَ اِنْ
كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَ ادْعُوْا
شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ
تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾
وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا
مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَ لَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّ هُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

الف' لام' میم۔ یہ اللہ کی کتاب ہے' اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے ان پرہیزگار لوگوں کے لئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں۔ جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے' اس میں سے خرچ کرتے ہیں' جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں' اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔

جن لوگوں نے ان (باتوں کو تسلیم کرنے سے) انکار کر دیا' ان کے لئے یکساں ہے' خواہ تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو' بہرحال وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ وہ سخت سزا کے مستحق ہیں۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں' حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں مگر دراصل وہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا ہے اور جو جھوٹ بولتے ہیں' اس کی پاداش میں ان کے لئے دردناک سزا ہے۔ جب کبھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو' تو انہوں نے یہی کہا کہ "ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔" خبردار' حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انہیں شعور نہیں ہے۔ اور جب ان سے کہا گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ "ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں؟" --- خبردار' حقیقت میں تو یہ خود بیوقوف ہیں مگر یہ جانتے نہیں ہیں۔ جب یہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں' اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں' تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں۔ اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے۔ وہ ان کی رسی دراز کئے جاتا ہے اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے مگر یہ سودا ان کے لئے نفع بخش نہیں ہے اور یہ ہرگز صحیح راستے پر نہیں ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب اس نے سارے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا نور بصارت سلب کر لیا اور انہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ بہرے ہیں' گونگے ہیں' اندھے ہیں' یہ اب نہ پلٹیں گے یا پھر ان کی مثال یوں سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک بھی ہے' یہ بجلی کے کڑاکے سن کر اپنی جانوں کو ہر طرف سے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ چمک سے ان کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ گویا عنقریب بجلی ان کی بصارت اچک لے جائے گی۔ جب ذرا کچھ روشنی انہیں محسوس ہوتی ہے تو اس میں کچھ دور چل لیتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل ہی سلب کر لیتا' یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

لوگو' بندگی اختیار کرو' اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے' تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت سے ہو سکتی ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا' آسمان کی چھت بنائی' اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لئے رزق بہم پہنچایا۔ پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مدمقابل نہ ٹھیراؤ۔

اور اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے' یہ ہماری ہے یا نہیں' تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ' اپنے سارے ہمنواؤں کو بلا لو' ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو' مدد لے لو' اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر' جو مہیا کی گئی ہے منکرین حق کے لئے۔

اور اے پیغمبر' جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئیں اور (اس کے مطابق) اپنے عمل درست کر لیں' انہیں خوشخبری دے دو کہ ان کے لئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان باغوں کے پھل صورت میں دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے۔ جب کوئی

پھل انہیں کھانے کو دیا جائے تو وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے دنیا میں ہم کو دیئے جاتے تھے۔ ان کے لئے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی' اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔

سورت کا آغاز تین حروف مقطعات الف' لام اور میم سے ہوتا ہے۔ اور ان کے متصلاً بعد کتاب اللہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے

"یہ اللہ کی کتاب ہے' اس میں کوئی شک نہیں' پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے۔"

قرآن کی بعض دوسری سورتوں کے شروع میں بھی ایسے ہی حروف آئے ہیں۔ لوگوں نے ان کی مختلف تفسیریں کی ہیں۔ ہم ان میں سے اس تشریح کو اختیار کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ یہ دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کتاب بھی انہی حروف تہجی سے مرکب ہے۔ جو معلوم و معروف ہیں اور یہ حروف و کلمات ایسے ہیں جنہیں عرب بسہولت استعمال کر رہے ہیں لیکن اس حقیقت کے باوجود قرآن کریم صفت اعجاز رکھنے والی کتاب ہے۔ عربوں کی استطاعت سے یہ باہر ہے کہ وہ انہی حروف و کلمات سے اس جیسی کتاب تیار کر سکیں۔ یہ کتاب انہیں بار بار چیلنج دیتی ہے کہ اگر ان کے بس میں ہے تو وہ اس جیسی کوئی کتاب پیش کریں' یا اس کی سورتوں جیسی دس سورتیں ہی بنا لائیں۔ ورنہ ایک سورت ہی لے آئیں لیکن اس تحدی کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔

قرآن کریم کی شان اعجاز ایسی ہی ہے جیسے اس پوری کائنات کی ہے۔ جیسے اللہ کی تخلیق اور انسانی مصنوعات میں نمایاں فرق ہے۔ ایسے ہی قرآن اور انسانی کلام میں امتیاز ہے۔ ذرا اس مٹی کو دیکھئے کہ یہ چند معلوم و معروف عناصر سے مرکب ہے۔ ہم ان سے اینٹ اور برتن یا زیادہ سے زیادہ کوئی پیچیدہ مشین بناتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی شان تخلیق کو دیکھئے کہ وہ ان ذرات کو حیات بخشتا ہے۔ اور یکایک وہ ذرات ذی روح اور متحرک مخلوق بن جاتے ہیں اور ذات باری کے اس معجزانہ راز یعنی "حیات" کو اپنے اندر لئے ہوئے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہ "حیات" ایسا راز ہے جو انسان کے حیطۂ قدرت سے باہر اور اس کے ادراک سے وراء ہے۔ بس بعینہٖ یہی مثال ہے قرآن کریم کی۔ یہ حروف تہجی اور ان سے مرکب معروف و متداول کچھ کلمات ہیں جن سے تمام انسان نظم و نثر بناتے ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ اسی مواد کو استعمال کرتا ہے تو وہ قرآن و فرقان کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ غرض اللہ کے کلام اور انسانی کلام کے درمیان فرق ایسا ہے جیسے ایک بے جان مادہ اور ایک زندہ متحرک مخلوق کے درمیان ہوتا ہے۔ یہی ہے فرق ظاہری زندگی اور حقیقی زندگی کے درمیان۔

"اس کتاب میں شک نہیں۔"

اس میں شک و شبہ کیونکر ہو؟ جبکہ اس کے آغاز ہی میں صداقت و یقین کے دلائل پوشیدہ ہیں۔ حروف تہجی سے عرب ادباء ایسی کتاب بنانے میں ناکام رہے ہیں حالانکہ یہ حروف و کلمات ان کے درمیان متداول و معروف ہیں لہٰذا اب شک کی کیا گنجائش ہے؟

"اس میں کوئی شک نہیں اور پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے۔"

بلکہ ہدایت اس کی حقیقت و مزاج میں داخل ہے۔ اس کی ماہیت اور اس کا وجود ہی عین ہدایت ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کن لوگوں کے لئے ہدایت ہے؟ اور کن لوگوں کے لئے نور مبین اور مشفق رہنما ہے؟ صرف متقین کے لئے۔ اس سے صرف وہی شخص مستفید ہو سکتا ہے جس کا دل خوف خدا سے اور تقویٰ سے معمور ہے۔ تقویٰ ہی اس کتاب کے لئے دل کے دریچے کھولتا ہے۔ اور جب یہ کتاب کسی دل میں اتر جاتی ہے تو پھر وہاں جا کر ہی یہ اپنا اہم پارٹ ادا کرتی ہے۔ کیونکہ صرف تقویٰ ہی کسی دل کو اس طرف آمادہ کرتا ہے کہ وہ سچائی کو آگے بڑھ کر اٹھا لے اور آواز حق پر لبیک کہے۔

جو شخص قرآن سے ہدایت لینا چاہتا ہے اس کے لئے یہ ازحد ضروری ہے کہ وہ قرآن کے پاس قلب سلیم لے کر آئے اور اس کا دل خلوص سے پر ہو۔ پھر وہ دل تقویٰ اور خوف خداوندی سے بھی معمور ہو۔ اس کو اس بات کا خوف ہو کہ وہ کہیں گمراہی میں مبتلا نہ ہو یا

ضلالت اسے اپنی طرف کھینچ نہ لے۔ جب ایک شخص اس طرح قرآن کا مطالعہ کرتا ہے تو پھر قرآن بھی اس پر اپنے اسرار و رموز کھول دیتا ہے اور اس پر اپنے انوار و برکات کی بارش کر دیتا ہے۔ اور یوں وہ اس خائف' متقی' حساس اور غیب دل میں شراب معرفت انڈیل دیتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ تقویٰ کا مفہوم کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا "کیا آپ کا گزر کبھی کسی پر خار راستے سے نہیں ہوا؟" آپ نے کہا "ہاں۔" تو انہوں نے کہا "تو پھر آپ اس راہ سے کیونکر گزرے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا "میں نے اپنے کپڑوں کو سمیٹ لیا اور احتیاط سے چلا! انہوں نے کہا "بس یہی ہے تقویٰ!"

یہ ہے تقویٰ کا مفہوم۔ ضمیر کا احساس' شعور کی صفائی' دائمی خوف خدا' مسلسل احتیاط اور زندگی کی شاہراہ میں آنے والے کانٹوں سے بچنا۔ بالخصوص ایسی راہ جہاں ہر طرف خواہشات نفس اور مرغوبات کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ جہاں خوف و ہراس کے کانٹے ہیں' طمع ولالچ کے کانٹے ہیں اور جھوٹی تمناؤں اور آرزوؤں کے کانٹے ہیں۔ اور یہ تمنائیں ان لوگوں سے وابستہ ہیں جو انہیں پوری نہیں کر سکتے۔ اور یہ خوف ان لوگوں سے ہے جو کسی کو نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ غرض یہ اور دوسرے ہزاروں قسم کے کانٹے اور رکاوٹیں جو ہر وقت' ہر طرف سے دامنگیر ہوتی ہیں۔

اس کے بعد متقین کی صفات بیان کی جاتی ہیں۔ ان صفات کا ذکر ہوتا ہے جو مدینہ طیبہ کے سابقین مومنین میں پائی جاتی تھیں۔ اور اب اس امت کے مخلصین کے لئے ہر دور میں وہی معیار بن گئی ہیں۔

"جو غیب پر ایمان لاتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے' اس میں سے خرچ کرتے ہیں' جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں۔ ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔"

متقین کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں فعال اور مثبت شعوری اتحاد پایا جاتا ہے۔ ان سب کے دل ایمان بالغیب سے معمور ہیں۔ وہ سب ایک جیسے فرائض بجالاتے ہیں' سب کے سب تمام انبیاء پر ایمان لاتے ہیں اور سب کو قیامت کی جواب دہی کا خوف ہے۔ یہ فکری اتحاد اسلامی نظریۂ حیات کی ممتاز خصوصیت ہے اور جو لوگ اس نظریۂ حیات کو قبول کرتے ہیں ان میں دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کامل اتحاد پایا جاتا ہے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ یہ نظریۂ حیات پوری انسانیت کا نظریہ بن جائے۔ پوری انسانیت اسے قبول کرے اور اس نظریۂ حیات کے سائے میں تمام دنیا اپنے احساسات اور طریقہ ہائے حیات کے ساتھ' مکمل اتحاد کی شکل میں زندگی بسر کرے اس کے باشندوں کے شعور و نظریات اور ان کی عملی زندگی اور اجتماعی نظم پر یہ نظریۂ حیات حاوی ہو۔

جب ہم متقین کی اس اہم اور ممتاز خصوصیت کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں اور اس کے ایک ایک جز کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اجزاء وہی ہیں جو ہمیشہ تمام انسانوں کی زندگی میں بحیثیت اعلیٰ اقدار مسلم رہے ہیں مثلاً الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ "جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔" اس لئے' ان کی ارواح اور اس قوت کے درمیان جس نے انہیں اور اس پوری کائنات کو پیدا کیا' مادیات اور حسیات کے پردے حائل نہیں ہوتے۔ اس مادی دنیا سے وراء الوراء جو عالم اور جو موجودات اور جو "قوت" اور "حقیقت" موجود ہے' ان کی روح اور اس کے درمیان حسیات و مادیت کے یہ پردے حائل نہیں ہو سکتے۔

ایمان بالغیب وہ پہلی سیڑھی ہے' جسے انسان عبور کر کے حیوانیت کے مقام ارزل سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ جہاں صرف اسی چیز کا ادراک ہوتا ہے جسے یہ ظاہری حواس پا سکتے ہیں۔ لیکن ایمان بالغیب کے مقام پر آکے' انسان اب انسانیت کے اس مقام تک بلند ہو جاتا ہے' جہاں اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کائنات جو اس کی اس محدود دنیا سے کہیں بہت بڑی ہے۔ حواس (یا آلات جدیدہ کے ذریعہ ترقی یافتہ حواس) کا دائرہ ادراک بہت محدود ہے اور یہ کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ اس طرح ایک "مومن بالغیب" انسان کے تصور

کی دنیا میں' اس پوری کائنات کی حقیقت کے بارے میں 'بلکہ خود انسان کے وجود کے بارے میں اور وجود انسانی میں جو قوتیں کارفرما ہیں ان کے بارے میں اور اس کائنات اور اس کی پشت پر کام کرنے والی مدبرانہ قوت کے متعلق 'ایک دوررس تبدیلی اور ایک ہمہ گیر انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ صرف تصور ہی میں نہیں بلکہ اس کرہ ارض پر اس کے طور طریقوں میں بھی ایک وسیع تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے ظاہری حواس کی محدود دنیا میں گم رہتا ہے' اس کی زندگی اس شخص کی طرح نہیں ہو سکتی جو اس عظیم تر کائنات میں رہتا ہو جسے اس کی بصارت یا بصیرت دیکھ رہی ہو اور وہ اپنی دلی گہرائیوں اور اپنے تصور میں' اس وسیع تر اور عظیم تر کائنات کی صدائے بازگشت ہر وقت پا رہا ہو۔ اسے اس بات کا پختہ شعور ہو کہ اس کا انجام زمان و مکان کے محدود' اور اس مختصر عمر میں خود اس کے اپنے حقیر ادراکات سے وراء ہے۔ اور یہ کہ اس ظاہری اور باطنی کائنات کی پشت پر ایک "عظیم حقیقت" کام کر رہی ہے جو اس انسان کے وجود کا مصدر و منبع ہے اور وہ حقیقت صرف "ذات باری تعالیٰ" ہے۔ جو ہماری نظری گرفت سے باہر ہے اور عقل کے حیطہ ادراک سے وراء ہے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ

صرف یہی ایک صورت ہے جس کے ذریعے انسان کی اس محدود فکری قوت کو پریشانی' انتشار اور ایسی لایعنی چیزوں میں مشغول ہونے سے بچایا جا سکتا ہے جن کے لئے اسے پیدا ہی نہیں کیا گیا اور نہ ہماری یہ محدود فکری قوت ان امور کا احاطہ کر سکتی ہے۔ اور اگر ہم اپنی پوری فکر کو ان امور میں صرف بھی کر دیں تو ان سے ہمیں نہ کوئی دینی فائدہ حاصل ہوتا ہے نہ دنیوی۔ اللہ نے انسان کو جو محدود فکری قوت دی ہے' وہ اسے صرف اسی لئے دی گئی ہے کہ وہ زمین پر اللہ کے نائب ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دے۔ انسانی فکر کے ذمہ صرف اس واقعی اور قریب زندگی کے امور کو سلجھانا ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ انسانی زندگی پر غور کرے' اسے گہری اور عمیق نظر سے دیکھے' اس سے نتائج اخذ کرے۔ اس زندگی کو ترقی دے' حسین تر بنائے' لیکن وہ یہ سب کام اس روحانی قوت کے مستند طریقے کے مطابق کرے جسے اس کائنات اور اس کائنات کے خالق کے ساتھ براہ راست ربط ہے۔ رہے وہ غائبانہ امور اور عالم مغیبات' تو اسے اپنے حال پر چھوڑ دے کیونکہ انسان کی محدود عقل عالم مغیبات کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اسی واقعاتی دنیا سے آئے' جو عالم اور جو جہال ہیں' ان کی تلاش میں جو لوگ اس کوتاہ عقل کو لے کر نکلتے ہیں' جس کی نظر اس زندگی اور اس کرہ ارض تک ہی محدود ہے' اور اس تلاش میں وہ روحانیت اور الہام اور کھلی بصیرت سے بھی کوئی مدد نہیں لیتے اور غائبانہ امور کو ناقابل ادراک سمجھ کر اپنی جگہ نہیں چھوڑتے' ایسے لوگوں کی تمام کوششیں بالآخر ناکامی کا منہ دیکھیں گی۔ ان کی یہ کوشش اس لئے ناکام ہو گی کہ وہ اس کام کے لئے اس طاقت کو استعمال کر رہے ہیں جو اس میدان میں کام ہی نہیں آ سکتی نہ اس کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور ان کی یہ کوشش عبث اس لئے ہو گی کہ فکری طاقت کو غلط جگہ استعمال کر کے وہ اسے منتشر کر دیں گے۔ جب انسانی ذہن اس بات کو تسلیم کر چکا ہے کہ ایک محدود ذہن مطلق اور لامحدود اشیاء کا ادراک بھی نہیں کر سکتا تو ذہن انسانی کی اس منطق کا احترام کرنا چاہئے اور اس امر کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ مطلق اور لامحدود امور کا ادراک محال ہے۔ نیز یہ بھی پیش نظر رہے کہ کسی مجہول امر کا عدم ادراک اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ وہ امر سرے سے عالم غیب میں موجود ہی نہیں ہے۔ لہٰذا انسان کا فرض ہے کہ وہ غیبی امور کو قوت عقلی کے علاوہ کسی اور قوت کے سپرد کر دے اور اس بارے میں اسے جو معلومات درکار ہیں وہ اس ذات سے حاصل کرے جو علیم و خبیر ہے' ظاہر و باطن پر محیط ہے۔ عالم غیب اور عالم شہادت اس کے سامنے یکساں ہیں۔

یہ صرف مومن ہی ہے جو اس نقطہ نظر سے عقل کی اس منطق کا احترام کرتا ہے اور یہاں قرآن مجید اہل تقویٰ کی یہ صفت بیان کرتا ہے کہ ان کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ غائب امور پر ایمان لاتے ہیں۔

ایمان بالغیب کا عقیدہ' درجہ حیوانیت سے انسان کی ترقی کے سلسلے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ہمارے زمانے کی طرح ہر دور میں مادہ پرست انسانوں نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ انسان کو پیچھے لوٹا کر دوبارہ درجہ حیوانیت میں گرا دیں۔ اسے حیوانی دنیا میں لے جائیں۔ جہاں محسوسات کے سوا کسی اور چیز کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ اس عمل کو "ترقی پسندی" کا نام دیتے ہیں حالانکہ وہ ترقی پسندی نہیں بلکہ رجعت قہقری ہے اور اس سے اللہ نے ایک مومن کو یوں بچایا کہ ان کی ممتاز صفت ہی یہ قرار دی کہ وہ عالم مغیبات پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ اللہ کی ایک عظیم نعمت ہے ہم اس پر اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ رہی وہ حیوانیت جس پر یہ مادہ پرست فریفتہ ہو چکے ہیں تو یہ انہیں ہی مبارک ہو۔

وَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ "نماز قائم کرتے ہیں۔" وہ صرف ایک خدا تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کرتے ہیں اور اس طرح وہ انسانوں یا دوسری کسی چیزوں کی غلامی سے بلند اور آزاد ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسی ذات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو لامحدود قوت و قدرت کی مالک ہے۔ ان کے سر کسی انسان کے آگے نہیں' بلکہ ذات باری تعالیٰ کے سامنے خم ہو جاتے ہیں۔ وہ "دل" جو صحیح معنوں میں ذات باری کے سامنے سربسجود ہوتا ہے اور شب و روز کی ہر گھڑی میں وہ اللہ سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اپنے اندر یہ شعور پاتا ہے کہ اس کا تعلق خالق کائنات سے قائم ہے۔ اب وہ اس دنیائے دنی اور اس کی ضروریات میں غرق نہیں ہو جاتا بلکہ وہ زندگی کا ایک بلند نصب العین پالیتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ تمام مخلوق سے قوی تر اور برتر ہے کیونکہ اس کا جوڑ اس ذات سے ہے جس نے تمام دنیاوی مخلوقات کو پیدا کیا ہے۔ یہی شعور دراصل انسانی ضمیر کی قوت کا مصدر ہے اور تقویٰ اور نیک و بد کے احساس کی یہی اساس ہے۔ انسانی شخصیت کی تربیت کے لئے یہ ہمیشہ ایک اہم عنصر رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں جو شخصیت تیار ہوتی ہے وہ ربانی فکر' ربانی شعور اور ربانی طرز عمل کی حامل ہوتی ہے۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ "جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے' اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔" یعنی وہ اس کے معترف ہوتے ہیں کہ ان کے قبضے میں جو دولت ہے' وہ اللہ کی دی ہوئی ہے' وہ خود ان کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ بخشش رزق کے اس اعتراف ہی کے نتیجے میں' انسان کے دل میں' ناتوانوں کے ساتھ احسان' خالق کائنات کی عیال کے درمیان باہم تعاون اور انسانی اخوت اور روابط کا شعور و احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس اعتراف کی قدر و قیمت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب دوسروں کے ساتھ احسان کر کے نفس انسانی حرص و آز کی امراض سے پاک ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زندگی میں طبقاتی کشمکش اور ظلم و ستم کی جگہ طبقاتی تعاون (Co-operation) پیدا ہوتا ہے۔ دولت کے اس تصور میں ضعیف و ناتواں اور فقیر و مسکین یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ دل اور روح کی دنیا میں رہتے ہیں' انہیں خوبصورت چہروں سے واسطہ پڑتا ہے اور ظلم و ستم کے چنگل میں گرفتار نہیں۔ نہ ہی وہ شعور رکھتے ہیں کہ انہیں درندوں اور بھیڑیوں سے واسطہ ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ میں زکوٰۃ' صدقات واجبہ اور بھلائی کی راہ میں خرچ ہونے والے سب سرمائے داخل ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ کو فرضیت زکوٰۃ سے بھی پہلے لازم کیا گیا۔ یہ دراصل ایک عمومی پالیسی ہے۔ فرضیت زکوٰۃ کی آیات اس کی ایک مخصوص اور جزوی شکلوں کو متعین کرتی ہیں۔ فاطمہ بنت قیس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (بروایت ترمذی) نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں مساکین کا حق ہے۔" وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ "جو کتاب تم پر نازل کی گئی (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں' ان سب پر ایمان لاتے ہیں۔" یہی صفت امت مسلمہ کے شایان شان ہے۔ وہ آسمانی عقائد کی وارث ہے؟ آغاز انسانیت سے لے کر آخر تک تمام نبیوں کی وہ وارث ہے؟ وہ عقائد کی وارث اور نبوت کے ورثے کی امین ہے اور تاقیامت' اس زمین پر قافلہ ایمان کی حدی خواں ہے۔

اس صفت کی وجہ سے امت مسلمہ میں انسانی اتحاد کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح پوری انسانیت کا دین ایک ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک معبود قرار پاتا ہے اور اس کی طرف سے جو رسول بھیجے گئے سب کے نزدیک وہ رسولان برحق ہو جاتے ہیں۔ اس صفت کی وجہ سے دوسرے ادیان اور ان کے ماننے والوں کے خلاف مذموم تعصب ختم ہو جاتا ہے' جب تک وہ صحیح راہ پر ہوں' اور انسان اس پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ مختلف ادوار اور زمانوں میں اللہ تعالیٰ پوری انسانیت کی ہدایت اور اصلاح کا بندوبست فرماتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے مسلسل ایک ہی پیغام اور ایک ہی ہدایت مختلف رسولوں کے ذریعے انسانوں تک پہنچانے کا اہتمام فرمایا۔ نیز اس صفت کے نتیجے میں یہ احساس بھی ابھرتا ہے کہ مختلف ادوار اور زمانوں میں حالات کی تبدیلی کے باوجود حق اور ہدایت ایک ہی رہی ہے۔ یہ ہدایت اور روشنی اسی ستارے کی طرح مسلسل قائم ہے جو اندھیروں میں ہر فرد کے لئے رہنما ہوتا ہے۔

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ "اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔" یہ مومنین کی صفات میں سے آخری صفت ہے۔ یہاں آکر اب دنیا کے ڈانڈے آخرت سے مل جاتے ہیں۔ ابتدا کا ربط انجام سے ہوتا ہے۔ اعمال پر سزا جزاء مرتب ہوتی ہے اور انسان کے اندر یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی مہمل اور عبث مخلوق نہیں ہے۔ نہ ہی وہ اس دنیا میں خود مختار چھوڑ دیا گیا ہے۔ بلکہ اسے ایک عظیم عدالت میں جانا ہے تاکہ اس کا دل مطمئن ہو جائے۔ اس کی پریشانیاں دور ہو جائیں۔ وہ اعمال صالحہ کی طرف مائل ہو جائے۔ اور اسے یقین ہو جائے کہ انجام کار اسے اللہ' رحمان و رحیم کی عدالت میں حاضر ہونا ہے۔ جہاں ہر کسی کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔

محسوسات کے محدود دائرے میں قید رہنے والوں اور اس وسیع کائنات میں آزاد پھرنے والوں کے درمیان' یوم آخرت پر یقین کی وجہ سے واضح طور پر فرق و امتیاز ہو جاتا ہے۔ پہلی قسم کے لوگوں کا احساس اور شعور یہ ہوتا ہے کہ حیات انسانی بس وہی ہے جو اس کرہ ارض پر گزرتی ہے۔ لیکن دوسرے قسم کے لوگوں کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ دنیا تو دارالامتحان ہے۔ جو جزائے اعمال کی تمہید ہے۔ حقیقی زندگی تو اس جہاں کی ہے' جو اس محدود اور مختصر دنیا سے آگے آنے والی ہے۔

جیسا کہ اوپر جائزہ لیا گیا کہ جن صفات کا ذکر یہاں ہوا ہے وہ حیات انسان کی وقیع ترین صفات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان صفات کو متقین کی خصوصی صفات قرار دیا گیا۔ ان سب صفات کے درمیان ایک منطقی ربط پایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ باہم مل کر ایک مربوط اور متناسب اکائی بن جاتی ہیں۔ مثلاً انسانی ضمیر میں تقویٰ اس وجدانی حالت کا نام ہے جو کچھ خاص میلانات اور اعمال صالحہ کو جنم دیتی ہے۔ اس صفت کی وجہ سے باطنی احساسات اور انسان کی عملی سرگرمیوں اور تصرفات کے درمیان وحدت اور ربط پیدا ہو جاتا ہے اور انسان اپنی باطنی اور فکری اور ظاہری اور عملی دونوں پہلوؤں میں اپنے رب کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ اس کی روح شفا پاتی ہے۔ روح اور عالم غیب و شہادت کی حاوی اور اپنے گھیرے میں لینے والی ذات مطلق کے درمیان تمام حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ معلوم اور مجہول کی سرحدیں آپس میں مل جاتی ہیں۔ جب روح شفا پا جائے اور ظاہر و باطن کے درمیان سے حجابات اٹھ جائیں تو اس وقت ایمان بالغیب سچائی کو چھپانے والے پردوں کے اٹھنے کا قدرتی ثمرہ ہوتا ہے۔ اس طرح انسانی روح عالم مغیبات سے جڑ جاتی ہے اور اسے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ تقویٰ اور ایمان بالغیب کے ساتھ اللہ کی عبادت کی وہ صورت بیان ہوئی ہے' جو اللہ نے تجویز کی ہے یعنی نماز۔ اللہ اور بندے کے درمیان یہ ایک خاص تعلق ہے۔ اس کے بعد یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے تم پر جو احسانات و اکرامات کئے ان کا شکر ادا کرتے ہوئے انسانی اخوت کے قیام کے لئے تم ان انعامات کا ایک حصہ خرچ کرو۔ پھر قافلہ ایمان کی لمبی تاریخ کے بارے میں وسعت فکر و نظر کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ شعور بیدار کیا جاتا ہے کہ ہر مومن ہمارا بھائی ہے۔ ہر رسول ہمارا رسول ہے۔ اور ہمیں اس سے فکری قرب ہے۔ اگرچہ وہ بعد زمانی رکھتا ہو۔ اس کے بعد آخرت کی جوابدہی کے متعلق پختہ یقین یہ سب صفات ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔

مدینہ طیبہ میں ابتداً جو جماعت قائم ہوئی وہ ایسی ہی تھی جو مہاجرین و انصار کے سابقین اولین پر مشتمل تھی۔ یہ جماعت اپنی ان اوصاف کے ساتھ ایک عظیم حقیقت تھی۔ وہ عظیم حقیقت کہ یہ ایمانی حقائق اس کی زندگی میں مجسم و متشکل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر انسانی تاریخ میں اس جماعت کے ہاتھوں وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فیصلہ دیا جاتا ہے أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ "ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں۔ اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔" ...... یوں انہوں نے ہدایت پائی لہٰذا وہ کامیاب رہے اور ہمیشہ کے لئے ہدایت و فلاح کی واحد راہ یہی ہے۔ جو چاہے اس پر گامزن ہو جائے۔

اب ہمارے سامنے منکرین دعوت اسلامی کی تصویر آتی ہے۔ اس تصویر کشی میں وہ تمام اہم عناصر (Groups) بیان کر دیئے گئے ہیں جو کفر کی حقیقت کے اندر پائے جاتے ہیں' یہ کفر جس دور میں ہو اور زمین کے جس حصے میں بھی وہ پایا جائے یہ عناصر اس میں ضرور پائے جاتے ہیں۔

"جن لوگوں نے (ان باتوں کو تسلیم کرنے سے) انکار کر دیا' ان کے لئے یکساں ہے' خواہ تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو بہرحال وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ وہ سخت سزا کے مستحق ہیں۔"

یہاں متقین اور کافرین بالکل ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب متقین کے لئے تو ہدایت اور نور بصیرت ہے لیکن کفار کا حال یہ ہے کہ خواہ انہیں خبردار کیا جائے یا نہ کیا جائے' وہ ہر حال میں روش کفر پر جمے ہوئے ہیں۔ مومنین کے دلوں میں ہدایت ربانی کے جو دریچے سدا وا ہوتے ہیں اور وہ روابط جن کی وجہ سے وہ ہروقت اس پوری کائنات' اس کے خالق' اس کے ظاہر و باطن اور اس کے عالم غیب و شہادت سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں' رشد و ہدایت کے یہ سب دریچے کفار کے لئے بند نظر آتے ہیں' اسی منظر میں انسان اور خالق کائنات کے درمیان وہ تمام رابطے بالکل کٹے ہوئے ہیں' جو مومنین اور خالق کائنات کے درمیان قائم و دائم ہوتے ہیں۔

خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ "اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگادی ہے۔" "جس کی وجہ سے وہ حقیقت رشد و ہدایت پانے اور حق کی آواز سننے کے قابل ہی نہیں رہے۔ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ "اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ لہٰذا وہ نور ہدایت کے دیکھنے سے محروم ہیں۔ چونکہ انہوں نے اپنی غلط روش سے مسلسل انذار و تبشیر کو ٹھکرا دیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی اس روش پر انہیں دنیا ہی میں یہ سخت سزا دی کہ ان کے دلوں پر مہر لگادی' آنکھوں پر پردے پڑ گئے اور ان کے کان صدائے صداقت کے لئے بہرے ہو گئے ہیں۔ یوں ان کے لئے وعظ و تبلیغ اور انہیں خبردار کرنا نہ کرنا برابر ہو گیا۔

یہ نہایت کرخت' جامد اور تاریک تصویر ہے' جو ان لوگوں کے دل و دماغ کی گہری تاریکی و سیاہی اور مسلسل اندھے پن اور بہرے پن کی روش اختیار کرنے کی وجہ سے منقش ہو کر ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○ "اور وہ سخت عذاب کے مستحق ہیں۔" کیونکہ یہی ان کی معاندانہ اور کافرانہ روش کا قدرتی انجام ہے' جو لوگ ڈرانے والے کی بات کو مان کر نہیں دیتے اور جن کو ڈرانا یا نہ ڈرانا یکساں ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں بھی یہ بات ہوتی ہے کہ یہ لوگ آخر تک اپنی اس روش پر قائم رہیں گے۔ وہ اسی انجام کے مستحق ہیں۔

اب سیاق کلام تیسری تصویر اور تیسرے منظر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس تیسرے نمونے کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی جاتی ہے۔

"بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت پر ایمان لائے ہیں' حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ

اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں۔ مگر دراصل وہ اپنے آپ ہی کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور انہیں اس کا شعور نہیں۔ ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا۔ اور جو جھوٹ وہ بولتے ہیں' اس کی پاداش میں ان کے لئے دردناک سزا ہے۔ جب کبھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو' تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انہیں شعور نہیں۔ اور جب ان سے کہا گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں؟

خبردار! حقیقت میں تو یہ خود بے وقوف ہیں مگر یہ جانتے نہیں۔ جب یہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اور جب علیحدگی میں' اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں۔ اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے' وہ ان کی رسی دراز کئے جا رہا ہے اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں' جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے' مگر یہ سودا ان کے لئے نفع بخش نہیں ہے' اور یہ ہرگز صحیح راستے پر نہیں ہیں۔ ان الفاظ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ مدینہ طیبہ کی واقعی صورت حال کی صحیح تصویر کشی ہے لیکن زمان و مکان کی حدبندیوں سے قطع نظر کرکے بھی جب ہم دیکھتے ہیں تو اس قسم کے لوگ ہمیں انسانوں کی ہر نسل میں موجود نظر آتے ہیں۔ ہر نسل میں ایسے ذی حیثیت منافق لوگ پائے جاتے ہیں جو نہ تو اپنے اندر یہ جرأت پاتے ہیں کہ حق و صداقت کو پوری طرح تسلیم کرلیں اور ایمان لے آئیں اور نہ ان میں یہ سکت ہوتی ہے کہ حق و صداقت کا صاف صاف انکار کر دیں۔ اس صورت حال کے ساتھ ساتھ ایسے لوگ عوام کے مقابلے میں اپنے لئے ایک اونچی حیثیت اور رتبہ بلند بھی پسند کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو جمہور عوام سے زیادہ علیم و فہیم سمجھتے ہیں۔ لہذا ہم ان آیات کو ہر قسم کی تاریخی مثالوں سے آزاد اور اصولی آیات سمجھتے ہیں جو ہر دور کے ان تمام لوگوں پر صادق ہیں جو منافقانہ روش اختیار کرتے ہیں۔ غرض ان آیات میں جس نفسیاتی صورت حال کی تصویر کھینچی گئی ہے وہ ایسی صورت حال ہے کہ ہر دور میں نفس انسانی کی گہرائیوں میں موجود رہی ہے اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

اس قسم کے لوگ ہمیشہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان (اور خادم اسلام ہونے) کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت ان کے دل دولت ایمان سے خالی ہوتے ہیں' یہ صریح طور پر منافقت میں مبتلا ہوتے ہیں' یہ بزدل ہوتے ہیں اور مومنین کے بارے میں ان کی جو حقیقی رائے ہوتی اس کا اظہار کرنے کی جرأت ان کے اندر نہیں ہوتی۔

ایسے لوگ ہمیشہ اس زعم میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ غایت درجے کے ذہین' معاملہ فہم اور پالیسی باز ہیں اور وہ ہر حال میں ان سادہ لوح مومنین کو طرح دے سکتے ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ ایسے لوگ صرف مومنین ہی کو نہیں بلکہ اللہ کو بھی دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا "وہ اللہ اور ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے ہیں' دھوکہ بازی کر رہے ہیں۔" اس آیت اور اس جیسی دوسری آیات میں ایک عظیم حقیقت کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم الشان فضل و کرم ہے کہ قرآن کریم میں بار بار اور بتاکید و تکرار اس کا اظہار ہوا ہے اور اسی میں دراصل بندہ مومن اور اللہ تعالیٰ کے درمیان قائم ربط و تعلق کا راز پنہاں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ مومنین کے محاذ کو خود اپنا محاذ قرار دیتا ہے۔ ان کے معاملات اور حالات کو خود اپنے معاملات اور حالات قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے ساتھ ملاتا ہے اور انہیں اپنے دامن شفقت و رافت میں لیتا ہے۔ ان کے دشمن کو خود اپنا دشمن قرار دیتا ہے' ان کے خلاف کی جانے والی سازشوں کو اپنے خلاف سازشیں قرار دیتا ہے۔ یہ اس کی انتہائی شاہانہ کرم نوازی اور عزت افزائی ہے جس سے مومنین کی قدر و منزلت اپنے انتہائی عروج تک جا پہنچتی ہے اور جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس کائنات میں ایمان باللہ ایک

عظیم ترین حقیقت ہے جس سے دل مومن میں ثبات و طمانیت کے سرچشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک مومن کے مسائل اور مشکلات کو اپنے دست قدرت میں لے لیتا ہے' اس کا معرکہ اللہ کا معرکہ قرار پاتا ہے' اس کا دشمن اللہ کا دشمن بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے محاذ میں لے لیتا ہے اور اپنے عمل عاطفت میں داخل کر لیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں پھر انسانوں اور حقیر بندوں کی سازشوں' دھوکہ بازیوں اور ایذا رسانیوں کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟

اس حقیقت کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اس میں ان لوگوں کے لئے ایک خوفناک تہدید ہے جو مومنین کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے خلاف سازشیں کرتے ہیں اور ان کی ایذا رسانی کے درپے ہوتے ہیں۔ انہیں کہا جا رہا ہے کہ ان کی یہ جنگ صرف مومنین کے خلاف ہی نہیں بلکہ وہ درحقیقت اس ذات اقدس کے خلاف صف آرا ہیں جو قوی و متین ہے اور قہار و جبار ہے۔ اللہ کے دوستوں سے برسرپیکار ہو کر وہ دراصل اللہ کے خلاف لڑ رہے ہیں اور اپنی ان ذلیلانہ سرگرمیوں کی وجہ سے اللہ کے قہر و غضب کے مستحق بن رہے ہیں۔

مومنین کا یہ فرض ہے کہ وہ اس حقیقت عظمیٰ کے ان دونوں پہلوؤں پر اچھی طرح غور و فکر کریں تاکہ انہیں اطمینان و ثبات حاصل ہو اور وہ ٹھیک ٹھیک اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہیں اور دھوکہ بازوں کے دھوکوں' سازشیوں کی سازشوں اور اشرار کی ایذا رسانیوں کی کوئی پروا نہ کریں۔ مومنین کے دشمنوں کو بھی ایک لمحہ کے لئے اس حقیقت پر غور کر لینا چاہئے۔ انہیں چاہئے کہ وہ سوچ لیں کہ وہ کس کے ساتھ برسرپیکار ہیں اور کس ذات کے قہر و غضب کا مستحق بن رہے ہیں۔ انہیں اس بات سے ڈرنا چاہئے کہ مومنین کے درپے آزار ہو کر وہ کیا خطرہ مول لے رہے ہیں؟

اب ہم دوبارہ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو بزعم خود مومنین کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں اور اپنے کو غایت درجے کا ذہین اور معاملہ فہم تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے ہیں۔ لیکن ملاحظہ کیجئے کہ آیت کے اختتام سے پہلے ہی وہ کس عظیم مذاق کا شکار ہو جاتے ہیں۔

وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝ "مگر دراصل وہ اپنے آپ ہی کو دھوکہ دے رہے ہیں اور انہیں اس کا شعور نہیں یعنی وہ اس قدر غافل ہیں کہ خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں اور انہیں اس کا شعور تک نہیں اور اللہ ان کی سب حرکات سے باخبر ہے۔ رہے مومنین تو وہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہیں اور ان کے اس ذلیلانہ مکر و فریب سے وہ خود انہیں بچا رہا ہے۔ لیکن یہ نادان خواہ مخواہ دھوکہ کھا رہے ہیں۔ اور اپنے آپ کو برائی اور گناہوں سے ملوث کر رہے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ روش نفاق اختیار کر کے انہوں نے بہت نفع بخش سودا کیا ہے۔ اور اس سے انہیں کافی فائدہ پہنچا لیکن اس طرح وہ مومنین کی سوسائٹی میں اعلان کفر جیسے مشکل کام سے بھی بچ گئے اور مومنین کے ساتھ نئے معاشرے کے مفادات بھی انہوں نے سمیٹ لئے۔ حالانکہ جس کفر کو وہ اپنے دل میں چھپا رہے ہیں وہ انہیں ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جا رہا ہے۔ ان کا نفاق ان کے لئے تباہی کا سامان ہے اور اس کی وجہ سے وہ ایک نہایت نامسعود انجام تک پہنچنے والے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ منافقین یہ حرکت کیوں کرتے ہیں۔ روش نفاق اختیار کر کے وہ مومنین کو یہ دھوکہ کیوں دینا چاہتے ہیں؟ اس لئے کہ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ "ان کے دلوں میں بیماری ہے۔" ان کے دلوں کو یہ روگ لگ گیا ہے۔ دماغوں پر یہ آفت آن پڑی ہے اور یہ انہیں حق کی راہ مستقیم پر چلنے نہیں دیتی۔ اس کی وجہ سے وہ پھر اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قانون قدرت ان کے اس روگ کو اور زیادہ کر دے فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا "ان کی اس بیماری کو اللہ نے اور بڑھا دیا۔" ظاہر ہے کہ ایک بیماری دوسری کو

جنم دیتی ہے۔ گمراہی ابتدا میں نہایت معمولی ہوتی ہے اور جونہی اس کے خطوط و حدود آگے بڑھتے ہیں اس کا زاویہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ اللہ کا قانون قدرت ہے' جو ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ یہ قانون فطرت انسانی سوچ اور طرز عمل' تمام چیزوں اور تمام حالات میں جاری ہے۔ وہ خود ایک معلوم و معروف انجام کی طرف چلے جارہے ہیں۔ وہ انجام جو ان سب لوگوں کے لئے مقدر ہے جو اللہ اور مومنین کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ۝

"یہ جھوٹ بولتے ہیں اور اس کی پاداش میں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔" ان کی اہم صفات میں سے یہ دوسری صفت ہے' بالخصوص ان لوگوں کی جو ان میں سرکردہ تھے اور ہجرت رسول ﷺ سے قبل اپنی قوم اور قبیلے میں سرداری کے مناصب پر فائز تھے مثلاً عبداللہ ابن ابی ابن سلول۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مومنین کے خلاف دل میں گہرا کینہ رکھتے تھے اور جو فتنہ و فساد برپا کرتے تھے اس کے لئے تاویلیں پیش کرتے اور اپنے ان کارناموں پر ہر قسم کی سزا و مواخذہ سے بچ کر پھولے نہ سماتے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ۝

"جب کبھی ان سے یہ کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار! حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انہیں شعور نہیں۔"

گویا یہ لوگ جھوٹ اور فریب پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ مومنین کو بیوقوف سمجھتے ہوئے الٹا یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ہم تو مصلح ہیں وہ اس نصیحت کا کہ "زمین میں فساد نہ کرو۔" یہ سادہ جواب نہیں دیتے کہ "بھائی ہم کب فساد برپا کر رہے ہیں؟ بلکہ وہ اکڑ کر یہ ادعا کرتے ہیں کہ "مصلح تو ہیں ہی ہم۔"

ہر دور اور ہر زمانے میں لوگوں کی یہ قسم دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ عملاً فساد کی بدترین شکلیں برپا کر رہی ہوتی ہے اور اس کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ ہم تو بس اصلاح معاشرہ چاہتے ہیں جب معاشرہ میں بلند اقدار تباہ ہوتی ہیں تو ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اخلاص اور پاکیزگی نفس سے محروم ہوتے ہیں اور جب اخلاص جاتا رہے اور نفس انسانی میں فساد پیدا ہو جائے تو تمام اعلیٰ قدریں اور حسن و قبح کے پیمانے از خود ختم ہو جاتے ہیں اور جن لوگوں کے دلوں میں خلوص اور ایمان نہ رہے۔ وہ کبھی بھی فساد فکر و عمل کا شعور نہیں پاسکتے اور ان کے دل و دماغ میں خیر و شر اور اصلاح و فساد کا جو پیمانہ ہوتا ہے' وہ ان کی خواہشات نفسانی کی طرف جھکتا رہتا ہے اور ربانی نظام حیات کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ اسی لئے ان کے اس دعوے کا یہ سخت لیکن حقیقت پسندانہ جواب دیا جاتا ہے۔

أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ۝ "خبردار! حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انہیں شعور نہیں ہے۔"

ان لوگوں کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کبر و غرور میں مبتلا ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو عوام الناس سے اونچے درجے (Upper Class) کے لوگ سمجھتے ہیں اور لوگوں کے دلوں میں اپنا جھوٹا وقار قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ

"اور جب ان سے کہا گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں؟ خبردار حقیقت میں تو یہ خود بے وقوف ہیں مگر یہ جانتے نہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ مدینہ طیبہ میں منافقین کو جس چیز کی طرف بلایا جارہا تھا وہ یہ تھی کہ وہ مخلصانہ طور پر ایمان لے آئیں اور اپنے ایمان کو ذاتی خواہشات سے پاک کردیں۔ جس طرح دوسرے مخلصین اپنی انفرادیت ختم کر کے پوری طرح اسلام کے اندر جذب ہو گئے

تھے۔ اور انہوں نے اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنے دلوں کے تمام دریچے کھول دیئے تھے۔ آپ ﷺ انہیں جو ہدایت بھی دیتے وہ اخلاص اور بے نفسی سے لبیک کہتے تھے۔ چنانچہ منافقین کو دعوت دی جارہی تھی کہ وہ بھی ان لوگوں کی طرح اخلاص' استقامت اور واضح اور صاف دل و دماغ کے ساتھ ایمان لائیں۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ منافقین ان معنوں میں نبی کریم ﷺ کے سامنے پوری طرح جھکنے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ اپنے آپ کو اعلیٰ طبقے (UpperClass) کے لوگ سمجھتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ان کے لئے تسلیم و رضا کی یہ کیفیت ضروری نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مومنین کے بارے میں کہتے تھے کہ کیا ہم ان بیوقوفوں کی طرح اندھی اطاعت کرتے پھریں اور قرآن نے بھی اس سختی' تاکید اور جزم کے ساتھ ان کے اس زعم باطل کی تردید کی۔ "خبردار! حقیقت میں تو یہ خود بے وقوف ہیں مگر جانتے نہیں۔"

سوال یہ ہے کہ کوئی بے وقوف بھی یہ سمجھا ہے کہ وہ بے وقوف ہے' یا کوئی گمراہ بھی یہ شعور رکھتا ہے کہ وہ جادہ مستقیم سے ہٹ چکا ہے۔

اس کے بعد اب منافقین کی آخری صفت کو بیان کیا جاتا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ صرف جھوٹ' فریب کاری' تحقیر مسلمین اور ادعاء و تعلی ہی میں مبتلا نہیں بلکہ ان مذموم صفات کے ساتھ ساتھ وہ پست ہمت' لئیم' سازشی اور مکار بھی ہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ وَ إِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ۚ وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ۝

"جب یہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں۔"

بعض لوگ اس ذلت اور کمینگی کو قوت اور حکمت سمجھتے ہیں' مکر و فریب ان کے خیال میں اعلیٰ درجے کی فراست و سیاست ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ چیز درحقیقت بے چارگی اور خسیس پنے کی آخری حد ہوتی ہے۔ ایک پر شوکت اور قوی انسان کبھی کینہ اور خبیث النفس نہیں ہو سکتا۔ نہ اسے مکر اور فریب کی ضرورت پڑتی ہے۔ نہ اسے اس بات کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ تنہائی میں چغل خوریاں کرے اور طعنے اور طنز سے دل کا غبار نکالے۔ ان منافقین کا حال یہ تھا کہ وہ کھلم کھلا مسلمانوں کا سامنا کرنے سے کتراتے تھے اور مومنین سے مل کر اپنی طرف سے بھی اس بات کا اظہار کر رہے تھے کہ ہم مومن ہیں تاکہ اس طرح وہ مومنین کی جانب سے ہر قسم کی اذیت سے محفوظ رہیں اور اس طرح محفوظ و مامون ہو کر مومنین کے خلاف نیش زنی کرتے رہیں۔ یہ لوگ جب اپنے شیاطین کے پاس جاتے' (جو غالباً یہود ہوا کرتے تھے' اور جنہیں ایسے لوگوں میں سے ایسے کئی افراد مل جاتے تھے جو اسلامی صفوں میں انتشار و اختلاف پھیلانے کے لئے استعمال ہوں۔ دوسری طرف سے یہودی بھی ایسے لوگوں کے لئے ایک سہارے اور ملجا و ماویٰ کا کام کرتے تھے۔ چنانچہ یہ منافقین "جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے تو کہتے کہ اصل میں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں۔" مومنین سے ان کا مذاق یہ تھا کہ وہ ایمان اور تصدیق قلبی کا اقرار کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ بس مومنین کیا جانتے ہیں کہ ہم کیا ہیں۔

ان کی اس عیارانہ گفتگو اور مکارانہ طرز عمل کی وضاحت کے فوراً بعد قرآن کریم انہیں ایسی سخت ڈانٹ پلاتا ہے کہ اگر احساس ہو تو پہاڑ بھی مارے خوف کے کانپ اٹھیں۔

اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ O "اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے' وہ ان کی رسی دراز کئے جاتا ہے اور یہ اپنی رو میں اندھوں کی طرح بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔" کس قدر بدبخت ہے وہ شخص کہ آسمان و زمین کا قہار و جبار جس کے ساتھ مذاق کر رہا ہے؟ اس سے بڑی شقاوت کوئی اور نہیں "اللہ ان کی رسی دراز کئے جارہا ہے اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکتے ہیں۔" جب ایک حساس انسان ان الفاظ پر غور کرتا ہے اور مرکب خیال جولانی دکھاتا ہے تو یہاں اگر وہ نہایت ہی خوفناک اور کپکپا دینے والے منظر کے سامنے بے حس و حرکت کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ اس قدر خوفناک انجام ہے جس سے دل دہل جاتے ہیں اور بدن پر رونگٹے

کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان مکاریوں کو یوں اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ نہ ان کا کوئی مرشد ہے' نہ کوئی راہ بھائی دیتی ہے' نہ ان کے سامنے کوئی مقصد ہے۔ یہ لوگ اسی سرگردانی کی حالت ہی میں ہوتے ہیں کہ اللہ کا دست قدرت انہیں اپنی شدید گرفت میں لے لیتا ہے اور یہ چوہوں کی طرح غفلت ولاپرواہی کے عالم میں جال میں کود جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ ایک خوفناک انجام ہے اور اس کے مقابلے میں اس مذاق کی کوئی حیثیت نہیں ہے جو یہ اپنے خیال کے مطابق کر رہے ہیں۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے جس کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر آئے ہیں کہ کفر و اسلام کے معرکے میں خود اللہ تعالیٰ مومنین کا والی اور مددگار ہوتا ہے۔ اللہ کے دوستوں اور بندوں کے لئے اس کی اس سرپرستی میں اگر طمانیت قلب کا ایک عظیم سرمایہ ہے تو خدا تعالیٰ کے مخبوط الحواس 'غافل اور راندہ درگاہ دشمنوں کے لئے انجام بد اور ایک خوفناک پایان کار کی نشاندہی ہے' جو اس لئے دھوکہ کھائے ہوئے ہیں کہ اللہ ان کے لئے رسی دراز کئے جا رہا ہے اور وہ اپنی سرکشی اور گمراہی میں سرگرداں ہیں۔ یہ اندھے ہو رہے ہیں' غفلت میں ڈوبے جا رہے ہیں' حالانکہ ایک خوفناک انجام ان کا منتظر ہے۔

اب قرآن کریم چند آخری کلمات میں ان کی حقیقت حال اور ان کے اس خسارے کو بیان کرتا ہے جو ان کی اس روش کی وجہ سے انہیں پہنچ رہا ہے۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝

"یہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے مگر یہ سودا ان کے لئے نفع بخش نہیں ہے اور یہ ہرگز صحیح راستے پر نہیں ہیں۔" اگر وہ چاہتے تو ہدایت کی راہ ان کے پاس تھی۔ ان پر ہدایت کے دریا بہا دیئے گئے تھے۔ یہ ان کے ہاتھ میں تھی لیکن انہوں نے اپنی مرضی سے ہدایت دے کر اس کے بدلے ضلالت خرید لی۔ جیسا کہ ایک غافل تاجر کا انجام ہوتا ہے۔ ویسا ہی انجام ان کا بھی ہوا۔ اس سودے میں انہیں کوئی نفع نہ ہوا اور ہدایت بھی ہاتھ سے جاتی رہی۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن نے ان آیات میں تین قسم کے لوگوں کی تصویر کشی کی ہے۔ ان میں سے اس تیسرے فریق نے لوح قرطاس میں نسبتاً زیادہ وسیع جگہ لی۔ اس کے اس وسیع خاکے میں ہمیں مختلف رنگ بھرے ہوئے نظر آتے ہیں' جو پہلی اور دوسری تصویر میں نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی اور دوسری تصویر میں جو لوگ دکھائے گئے ہیں ان کی راہ و رسم کسی نہ کسی شکل میں متعین ہے۔ وہ سیدھی طرح ایک مخصوص روش پر قائم ہیں۔ پہلی تصویر میں ایک ایسا کردار نظر آتا ہے جو فکر مستقیم کا مالک ہے۔ ایک سیدھی راہ ہے جس پر وہ بالکل سیدھا جا رہا ہے۔ دوسری تصویر میں ایک نابینا شخص دکھایا گیا ہے جو حیران و سرگردان ہے اور اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔ لیکن تیسرے شخص کی نفسیاتی حالت آپس قدر پیچیدہ اس کا دل اس قدر بیمار ہے اور فکر اس قدر پریشان ہے کہ اس پر مزید آخری' ایک آخری تبصرے کی ضرورت ہے۔ اس تصویر میں کچھ مزید خاکے ہیں اور ان میں رنگ بھرے گئے ہیں تاکہ اس گروہ کی مکروہ اور متلون شخصیت کے خدوخال اچھی طرح واضح ہو سکیں۔

اس تفصیلی بحث سے ایک طرف تو وہ کردار بھی اچھی طرح ہمارے سامنے آ جاتا ہے جو منافقین مدینہ 'فدائیان اسلام کی ایذا رسانی' ان کے اندر انتشار اور بے چینی پھیلانے کے سلسلے میں ادا کر رہے تھے۔ دوسری طرف اسلامی جماعت کو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ ہر دور میں ایک منافق 'نظم جماعت کے لئے کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اور اسلامی جماعت میں ان منافقین کی پردہ دری اور ان کی سازشوں کو بے نقاب کرنے کی کتنی اہمیت و ضرورت ہے۔

چنانچہ مزید وضاحت کی خاطر قرآن کریم مثالیں دے کر اس گروہ کی نفسیات' اس کے مزاج کے تلون' اس کی بے ثباتی اور قلابازیوں کی مزید نشاندہی کرتا ہے کہ ایسے افراد کے خدوخال نکھر کر ہمارے سامنے آ جائیں۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾ "ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب سارا ماحول چمک اٹھا تو اللہ نے ان کا نور بصارت سلب کر لیا اور انہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ بہرے ہیں گونگے ہیں' اندھے ہیں' اسی لئے یہ اب نہ پلٹیں گے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں ان کا رویہ ایسا نہ تھا کہ انہوں نے ہدایت سے اعراض کیا ہو' یا اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی ہوں' آنکھیں بند کر لی ہوں اور نہ یہ صورت تھی کہ انہوں نے اس تحریک کے مطالعے سے انکار کیا ہو جیسا کہ کفار نے کیا لیکن بعد میں انہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو پسند کر لیا اور یہ فیصلہ انہوں نے سوچ سمجھ کر غور و خوض کے بعد کیا۔ انہوں نے آگ جلائی۔ اس نے ان کے ماحول کو روشن بھی کیا لیکن انہوں نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا حالانکہ وہ روشنی کے متلاشی تھے۔ جب ان لوگوں نے اپنی مطلوب روشنی کو پا کر بھی اس سے منہ موڑا تو اللہ نے ان کے اس رویے کی وجہ سے ان کا نور بصارت ہی سلب کر لیا اور انہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکی میں بھٹکتے پھریں کیونکہ انہوں نے عین اس چیز سے منہ موڑا جس کے وہ طالب تھے۔

اللہ نے انسان کو آنکھ' کان اور زبان دی ہی اس لئے ہے کہ انسان بات سن سکے' روشنی کو دیکھ سکے اور نور ہدایت سے فائدہ اٹھائے۔ لیکن انہوں نے اپنے کانوں سے کام نہ لیا۔ پس بہرے قرار پائے۔ انہوں نے اپنی زبان سے کام نہ لیا۔ پس گونگے قرار دیئے گئے' انہوں نے آنکھوں سے دیکھنا ہی بند کر دیا لہٰذا اندھے بن گئے۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں ان کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ حق کی طرف لوٹ سکیں' راہ ہدایت کی طرف مڑ سکیں اور صداقت کی اس روشنی کو دیکھ سکیں۔

اب ایک دوسری تمثیل کے ذریعے ان کی نفسیاتی صورت حال کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ جس سے ان کے اندرونی اضطراب' حیرت اور خوف و بے چینی کا اظہار ہوتا ہے۔ أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ ........ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾

"یا پھر ان کی مثال یوں سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے' اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک بھی ہے۔ یہ بجلی کے کڑاکے سن کر اپنی جانوں کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لیتے ہیں اور اللہ ان منکرین حق کو ہر طرف سے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ چمک سے ان کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ گویا عنقریب بجلی ان کی بصارت لے جائے۔ جب ذرا کچھ روشنی انہیں محسوس ہوتی ہے تو اس میں کچھ دور چل لیتے ہیں۔ جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل ہی سلب کر لیتا یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

عجیب منظر ہے یہ بھی' جس دوڑ بھاگ' قلق و اضطراب' گمراہی و ضلالت' خوف و رعب' جزع و فزع' حیرانی و پریشانی' چمک دمک اور چیخ و پکار کی مختلف تصویریں رواں اور دواں نظر آتی ہیں۔ آسمان سے موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹائیں اور تیز چمک اور بجلی کے کڑاکے کی سخت آوازیں ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو اس تیز چمک کی روشنی میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اچانک اندھیرا ہو جاتا ہے۔ بے چارے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حیران و پریشان ہیں' نہیں جانتے کہ کدھر جائیں۔ مارے خوف کے کانپ رہے ہیں اور بجلی کے کڑاکے سن کر جان نکلی جا رہی ہے اور اس کی وجہ سے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لیتے ہیں۔

پورا منظر اس تگ و تاز سے بھرا ہوا ہے' موسلا دھار بارش' تاریکیاں' کڑک اور چمک' خوف زدہ اور پریشان مسافر جو ڈرتے ڈرتے کچھ قدم آگے بڑھاتے ہیں اور اندھیرا آتے ہی رک جاتے ہیں۔ اس پورے منظر سے قرآن کریم یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ منافقین کس طرح قلق و اضطراب' حیرانی و پریشانی' گمراہی و سرگردانی کا شکار ہیں۔ ادھر مومنین سے ملتے ہیں۔ ادھر اپنے شیاطین سے بھی ان کی ملاقات ہے۔

ادھر اقرار حق ہے تو ایک لحظہ بعد انکار اور سرکشی ہے۔ وہ نور اور ہدایت کے متلاشی ہیں۔ لیکن عملاً وہ اندھیروں اور گمراہیوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہ ایک انتہائی محسوس تمثیل اور منظر ہے لیکن منافقین کی خفیہ ترین نفسیاتی صورت حال کو آئینہ دکھا رہا ہے۔ شعوری صور تحال کو مجسم شکل میں ظاہر کر رہا ہے۔ یہ قرآن مجید کا ایک مخصوص اور عجیب اسلوب بیان ہے۔ قرآن کریم نفسیاتی اور الجھی ہوئی ذہنی کیفیات کو اس طرح مخصوص انداز میں بیان کرتا ہے کہ وہ مجسم شکل میں آنکھوں کے سامنے کھڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔[۱]

مذکورہ بالا تین قسم کے لوگوں کی تصویر کشی کے بعد سیاق کلام اب پوری انسانیت کو دعوت دینے کی طرف مڑ جاتا ہے۔ پوری انسانیت سے کہا جاتا ہے کہ وہ ان تین تصاویر میں سے سیدھی اور شریفانہ 'پاک و خالص' سرگرم عمل اور نفع بخش اور ہدایت یافتہ اور کامیاب تصویر یعنی متقین کی تصویر کو اختیار کرے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا

"اے لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گذرے ہیں' ان سب کا خالق ہے' تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت سے ہو سکتی ہے۔ وہی تو ہے' جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا' آسمان کی چھت بنائی' اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لئے رزق بہم پہنچایا۔ پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مد مقابل نہ ٹھہراؤ۔"

اب گویا یہ تمام لوگوں کو دعوت ہے کہ وہ اس رب واحد کی بندگی میں داخل ہو جائیں جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اور اسی نے ان کے آباؤ اجداد کو بھی پیدا کیا ہے۔ وہ ایسا رب ہے جو اکیلا اس کائنات کا خالق ہے لہٰذا صرف وہی اس بات کا حق ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ اور اس کی بندگی کا ایک خاص مقصد ہے اور توقع ہے کہ اللہ کی بندگی کر کے لوگ اس مقصد تک جا پہنچیں اور اسے حاصل کر لیں۔ اور وہ مقصد ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ "تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔" تم انسانی زندگی کا وہ نقشہ اختیار کر لو جو پسندیدہ ہے اور جو خدا کو پسند ہے۔ یعنی اللہ کی بندگی کرنے والوں اور اس سے ڈرنے والوں کا نقش حیات' جنہوں نے اللہ کی خالقیت اور ربوبیت کا حق صحیح طرح ادا کر دیا' صرف ایک خالق کی بندگی کی' جو تم حاضر اور گذشتہ لوگوں کا خالق ہے۔ اور جس نے آسمان و زمین کے وسائل کے ذریعہ ان کے رزق کا بندوبست کیا اور اس کام میں اس کا نہ کوئی مساوی ہے اور نہ شریک۔ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا "جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا۔"

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر انسانی حیات کو بے حد سہل بنایا ہے۔ زمین کو اس طرح بنایا کہ وہ انسانوں کے لئے خوشگوار رہائش گاہ ہو اور فرش کی طرح محفوظ جائے قیام ہو۔ لیکن انسان چونکہ ایک طویل عرصے تک یہاں رہتے ہیں۔ اس لئے ان کے شعور سے زمین و آسمان کی یہ خوشگواری محو ہو جاتی ہے۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے وسائل حیات فراہم کرنے کے واسطے اس زمین کے موسم کو ان کے لئے کیسا موافق اور خوشگوار بنایا ہے' اور ان کے لئے اس جہاں میں آرام اور آسائش کے کیا کیا ذرائع بہم پہنچائے ہیں۔ اگر یہ وسائل نہ ہوتے تو اس کرہ ارض پر ان کی زندگی اس قدر خوشگوار' سہل اور پر سکون نہ ہوتی۔ اس کائنات کے عناصر ترکیبی میں سے اگر کوئی ایک عنصر بھی غائب ہو جائے تو یہاں کا احول اس قدر تبدیل ہو جائے کہ اس میں اس پوری انسانیت کی نشوونما محال ہو جائے۔ صرف ہوا ہی کی مثال لیجئے کہ جن مقررہ عناصر پر یہ مشتمل ہے' اگر ان میں ذرہ بھر کمی ہو جائے تو لوگوں کے لئے زمین پر سانس لینا دشوار ہو جائے۔ اگرچہ انسوں نے ابھی زندہ رہنا ہے۔

[۱] دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن کی فصل حسی تمثیل و تخییل

وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً "اور آسمان کو چھت بنایا" یعنی آسمان ایک چھت کی طرح موزوں اور پختہ ہے۔ اسی زمین میں انسان کی زندگی اور اس زندگی کی آسائشوں کے ساتھ آسمان کو گہرا ربط ہے۔ آسمان کی حرارت اجرام فلکی کی جاذبیت اور توازن وغیرہ غرض زمین و آسمان کے تمام طبعی روابط ممد حیات ہیں اور اس زمین میں قیام حیات کے لئے تمہید اور خشت اول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جب بھی اس جہان کے خالق کی قدرت کا بیان ہوتا ہے' انسان کے رازق کی کبریائی بیان ہوتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ تمام مخلوق اور تمام انسانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ صرف اسی کی عبادت کریں۔ چنانچہ تمام ایسے مواقع پر اللہ کے ایسے احسانات کا ذکر ہوتا ہے۔ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ "اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لیے رزق بہم پہنچایا۔"

اللہ جل شانہ کی قدرت اور اس کے انعامات کے تذکرے کے ضمن میں' آسمان سے پانی برسانے اور اس کے ذریعے مختلف قسم کی پیداوار نکالنے کا ذکر قرآن مجید کے متعدد مقامات میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ آسمان سے اترنے والا پانی' طبعی نقطہ نظر سے بھی اس زمین پر قیام حیات کا بنیادی عنصر ہے۔ زمین پر زندگی اپنی مختلف شکلوں اور درجوں میں' اسی پانی کی رہین منت ہے۔ قرآن مجید میں ہے **وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ** "اور ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندہ بنایا۔" کبھی تو یہ پانی بارش کی صورت میں کھیتوں کو سیراب کرتا ہے' کبھی وہ میٹھی ندیوں اور نہروں کی صورت میں بہتا ہے۔ اور کبھی وہ زمین کی رگوں میں سرایت کر جاتا ہے اور چشموں اور کنوؤں کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور آلات کے ذریعے زراعت اور کھیتی باڑی کے کام میں استعمال ہوتا ہے۔

زمین میں پانی کی اہمیت' عمل بقائے حیات میں اس کا کردار اور مختلف چیزوں کی زندگی کا اس پر موقوف ہونا' ایک ایسی بدیہی اور مسلم بات ہے جس کی طرف اشارہ اور یاددہانی ہی کافی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ جو ہمارا خالق اور رازق ہے اور جس نے یہ تمام نعمتیں ہمیں بخشی ہیں وہ اس بات کا مستحق ہے کہ ہم صرف اسی کی بندگی کریں۔

اس طریقہ دعوت سے' اسلامی تصور حیات کے دو اہم اصول خود بخود واضح ہو جاتے ہیں' ایک یہ کہ اس پوری کائنات کا خالق ایک ہے۔ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ "جس نے تمہیں اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گذرے ہیں' ان سب کو پیدا کیا۔" یعنی یہ کائنات ایک ہے' اس کی اکائیوں اور اجزا کے درمیان مکمل ہم آہنگی ہے اور وہ انسان اور زندگی کے لئے معین و مددگار ہے۔

**الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ** "وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا' آسمان کی چھت بنائی' اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لئے رزق بہم پہنچایا۔" زمین ایک تخت کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ اس کی فضاؤں کا نظام قانون قدرت میں بندھا ہوا ہے۔ اس کے ذریعہ آبپاشی کا ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ روئے زمین پر لوگوں کی ضروریات کی فراہمی کے لئے ہر قسم کی پیداواروں کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ کس کے لئے؟ حضرت انسان کے لئے۔ اور یہ سب کچھ اس کائنات کے خالق وحدہ لاشریک کا کمال ہے۔

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ "پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مد مقابل نہ ٹھہراؤ۔" "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس نے تمہیں پیدا کیا۔ تم سے قبل جو لوگ ہو گذرے ہیں ان سب کو پیدا کیا۔ تم جانتے ہو کہ اسی نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا اور آسمان کو چھت بنایا۔ آسمان سے پانی اتارا اور اس پورے کام میں اس کا کوئی مددگار نہ تھا جو اس کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا۔ نہ کوئی مد مقابل تھا جو اس کی کسی بات کی مخالفت کرتا۔ لہٰذا اس علم کے بعد بھی اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنا نہایت ہی نامناسب طرز عمل ہے۔

عقیدہ توحید کو صاف و شفاف طریقے سے ذہنوں میں بٹھانے کے لئے قرآن کریم' اللہ تعالیٰ کے جن شریکوں کی بار بار نفی اور تردید کرتا ہے' وہ ہمیشہ صرف اسی معروف صورت میں نہیں ہوتے کہ کچھ بت یا اشخاص ہوں جنہیں اللہ کا شریک بنا کر ان کی پوجا کی جائے بلکہ کبھی وہ

اس کے علاوہ دوسری خفی صورتوں میں بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی سے کسی قسم کی امید رکھنا یا اللہ کے سوا کسی سے کسی قسم کا خوف اپنے دل میں رکھنا بھی شرک ہوتا ہے۔ نیز یہ اعتقاد رکھنا بھی شرک ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور بھی نفع و نقصان پہنچا سکتا ہے۔ حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں انداد شرک ہے اور یہ اس قدر خفی ہوتی ہے جس طرح اندھیری رات میں سیاہ پتھر پر چیونٹی کا آہستہ آہستہ چلنا پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کی کئی صورتیں ہیں مثلاً کوئی کہے کہ "اے فلاں خدا کی قسم' میری جان کی قسم' تیری جان کی قسم۔" یا کوئی کہے "اگر گئی رات کتیانہ ہوتی تو چور ہمیں لوٹ لیتے۔" یا کوئی کہے "اگر گھر میں بطخ نہ ہوتی تو چور آ جاتے۔" یا کوئی اپنے دوست سے کہے جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں۔ یا کسی کا یہ کہنا کہ "اگر اللہ اور فلاں نہ ہوتے تو" غرض یہ سب اقوال شرک ہیں۔ نیز حدیث شریف میں آتا ہے کہ کسی شخص نے حضور ﷺ سے کہا "جو اللہ چاہے اور جو آپ ﷺ چاہیں۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا "کیا تم مجھے اللہ کا شریک بنانا چاہتے ہو۔"

یہ تھا سلف صالحین کا نقطہ نظر شرک خفی اور اللہ کے شریکوں کے بارے میں ہمیں چاہئے کہ ہم ذرا گریبان میں سر ڈال کر اپنے حال پر غور کریں۔ کہاں سلف کا شرک کے بارے میں یہ شدید احساس اور کہاں ہم؟ کس قدر دور ہو گئے ہیں ہم عقیدہ توحید کی اس عظیم الشان سچائی سے؟

یہودیوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں شک تھا۔ منافقین بھی اس میں شک کرتے تھے اور مشرکین کی بھی یہی حالت تھی۔ قرآن کریم یہاں سب کو چیلنج دیتا ہے۔ اور ان کے سامنے ایک فیصلہ کن عملی تجربہ رکھ کر ان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس قرآن جیسی کتاب بنا لائیں۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ "اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے' یہ ہماری ہے یا نہیں' تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ' اپنے سارے ہم نواؤں کو بلا لو' ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو مدد لے لو' اگر تم سچے ہو۔"

یہ چیلنج ایک خاص انداز سے شروع ہوتا ہے' جو اس مقام میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت عبودیت کا ذکر فرمایا ہے کہ ہم نے اپنے بندے پر جو کتاب اتاری ہے اگر تمہیں اس کے بارے میں شک ہے کہ وہ ہماری جانب سے ہے یا نہیں تو تم اس جیسی کوئی کتاب بنا لاؤ۔

یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو "اپنا بندہ" کہا گیا ہے' اس سے متعدد اور باہم مربوط باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ آپؐ کو "ہمارا بندہ" کہہ کر آپ کی عظمت شان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ کی بندگی اور غلامی' وہ بلند ترین اعزاز ہے جو کسی انسان کو یہاں دیا جا سکتا ہے اور جس پر کوئی فخر کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ نبی ﷺ کو اپنا بندہ اور غلام کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ذات باری کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔ بلکہ سب لوگ اسی کے بندے اور غلام ہیں اور تو اور حضرت نبی ﷺ پیغمبر اور مورد وحی ہونے کے باوجود اللہ کے غلام اور بندے ہیں اور انہیں اپنے اس اعزاز پر فخر ہے۔

اس چیلنج میں اس بات کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ سورہ کے آغاز میں حروف تہجی کا ذکر تھا۔ اور یہ کتاب انہی حروف کلمات سے مرکب ہے جو ان کی دسترس میں ہیں۔ اگر انہیں اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے میں کوئی شبہ ہے تو یہ حروف ان کے پاس موجود ہیں۔ انہیں چاہئے کہ وہ اس جیسی کوئی ایک سورت مرتب کر کے لے آئیں۔ اور اس کام میں اپنے تمام ہمنواؤں اور مددگاروں سے بھی کام لیں تاکہ وہ اس سلسلے میں ان کے حق میں کوئی بات کریں۔ جہاں تک باری تعالیٰ کا تعلق ہے اس نے تو اپنے بندے کے حق میں گواہی دے دی ہے کہ وہ سچا ہے۔

یہ چیلنج جو مسند کئی کمین قرآن کو دیا گیا حضور ﷺ کی پوری زندگی میں اور آپ ﷺ کے بعد قائم رہا۔ اور آج بھی ہمارے دور تک اسی طرح قائم ہے۔ یہ ایک ایسی دلیل ہے جس کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ آج تک قرآن کریم اور تمام انسانی تحریروں اور ادبی شہ پاروں کے درمیان واضح فرق قائم ہے اور قیامت تک یونہی رہے گا اور یہ فرق قیامت تک اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تصدیق کرتا رہے گا۔

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِينَ ”لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر جو مہیا کی گئی ہے منکرین حق کے لئے۔

یہ چیلنج اگر عجیب ہے تو یہ جزم کہ اسے قیامت تک کوئی قبول ہی نہیں کر سکتا اس سے عجیب تر ہے۔ اگر کفار کے بس میں یہ بات ہوتی کہ وہ اس جیسی کوئی کتاب بنا لائیں تو وہ ایک لحظہ کے لئے بھی توقف نہ کرتے۔ قرآن کا یہ کہہ دینا کہ ”وہ یقیناً اس جیسی کتاب نہیں لا سکتے۔“ اور اس کے بعد صدیوں تک فی الواقعہ مخالفین کا عاجز رہ جانا ہی اپنی جگہ ایک ایسا کھلا معجزہ ہے، جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ مخالفین کے لئے ایک عام چیلنج تھا۔ ان کے لئے میدان کھلا تھا۔ اگر وہ اس جیسی کوئی کتاب لے ہی آتے تو قرآن کا اعجاز ہمیشہ کے لئے ختم ہو سکتا تھا مگر وہ ایسا نہ کر سکے اور نہ ایسا کر ہی سکیں گے۔ اگرچہ ابتداء خطاب ایک نسل کو تھا لیکن دراصل یہ پوری انسانیت کو چیلنج دیا گیا تھا اور اعجاز قرآن اور حجیت قرآن کا تاریخی فیصلہ تھا۔

جو لوگ انسانی اسالیب کلام کا کسی قدر ذوق رکھتے ہیں۔ جنہیں اس کائنات اور موجودات کے بارے میں انسانی تصورات سے کچھ بھی واقفیت ہے اور جو لوگ انسان کے بنائے ہوئے طریقوں اور نظاموں کے بارے میں کچھ بھی جانتے ہیں اور اس کے قائم کئے ہوئے نفسیاتی اور اجتماعی تصورات میں کسی قدر بھی درک رکھتے ہیں، وہ یقیناً اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ بالکل ایک دوسری ہی چیز ہے اور اسے ان گھروندوں سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ جو یہ بے چارہ انسان بناتا رہتا ہے۔ اس بارے میں اگر کوئی شک و شبہ میں مبتلا ہے تو وہ جاہل ہے، اسے کھرے کھوٹے کی کوئی تمیز نہیں ہے یا وہ اپنے کسی مفاد کی خاطر حق و باطل کو گڈمڈ کر رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس چیلنج کے مقابلے میں عاجز آگئے اور پھر بھی انہوں نے اس کھلی سچائی کو تسلیم نہ کیا ان کے بارے میں یہ وعید شدید آئی ہے۔

فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِينَ ”تو ڈرو اس آگ سے، جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر جو مہیا کی گئی ہے منکرین حق کے لئے۔“

اس میں انسان پتھروں کے ساتھ کیوں جمع کئے گئے۔ اور پھر اس خوفناک اور ڈراؤنی صورت میں؟ اس لئے کہ وہ آگ منکرین حق کے لئے تیار کی گئی ہے۔ وہ منکرین جن کا ذکر اس صورت کے آغاز میں ان الفاظ میں کیا گیا تھا کہ ”اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔“ یہ وہی لوگ ہیں جنہیں قرآن کریم یہ چیلنج دیتا ہے کہ وہ اس کے قبول کرنے سے (صدیوں تک) عاجز آجاتے ہیں لیکن پھر بھی دعوت حق کو قبول نہیں کرتے۔ اس لئے یہ لوگ بھی گویا اور پتھروں کی طرح پتھر ہیں، اگرچہ ظاہری صورت کے لحاظ سے یہ آدمی نظر آتے ہیں۔ بس اب انتظار اس بات کا ہے کہ قیامت میں یہ پتھری قسم کے پتھر اور انسانوں کے پتھر جہنم میں باہم جمع ہو جائیں۔

یہاں پتھروں کے ذکر سے ایک خاص مفہوم کو ذہن نشین کرنا مطلوب ہے۔ یعنی آگ کی خوفناکی۔ ملاحظہ ہو پتھروں کو کھائے جا رہی ہے

اور اس آگ کے اندر ان بدبخت آدمیوں کی حالت ملاحظہ ہو جو پتھروں کے اندر دبے پڑے ہوں گے۔

اس خوفناک اور وحشتناک منظر کے بالمقابل ذرا دوسرا رخ بھی دیکھئے کہ انعامات و اکرامات کی کیا فراوانی ہے جو مومنین کا انتظار کر رہی ہے؟ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

"اور اے پیغمبر جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئیں' اور اس کے مطابق اپنے عمل درست کر لیں' انہیں خوشخبری دے دو کہ ان کے لئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان باغوں کے پھل صورت میں دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے۔ جب کوئی پھل انہیں کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے ہم کو دیئے جا چکے ہیں۔ ان کے لئے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔"

یہ رنگا رنگ انعامات و اکرامات' نگاہ جا کر ان میں سے پاکیزہ بیویوں پر جا ٹکتی ہے۔ یہ پھل جو اس سے پہلے کے پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے اور جن کے بارے میں اہل جنت یہ خیال کریں گے کہ اس سے پہلے بھی جنت میں ان کی تواضع ایسے ہی پھلوں سے کی گئی ہے۔ یا وہ ان پھلوں کے ہم شکل ہیں جو انہیں دنیاوی زندگی میں دیئے گئے تھے۔ یہ دراصل مومنین کے ساتھ ایک لطیف مذاق ہو گا کہ انہیں بظاہر ہم شکل پھل دیئے جائیں گے لیکن جب بھی وہ انہیں چکھیں گے تو ان کی حیرانی کی انتہا نہ رہے گی کہ مزا ہر دفعہ علیحدہ اور پر کیف ہو گا۔ قدم قدم پر انہیں ایسے نئے تجربے ہوں گے' جن سے ظاہر ہو گا کہ وہ رضائے الٰہی کے اطمینان بخش ماحول میں رہ رہے ہیں۔ کیا خوب تفکہہ ہے کہ ہر دفعہ بظاہر ہم شکل پھلوں کی صورت میں انہیں ایک نئی نعمت دی جاتی ہے۔

شکل و صورت کی یہ ہم رنگی اور ذائقہ و حقیقت کا یہ تنوع' تخلیق کائنات میں اللہ تعالیٰ کی ایک ممتاز کاریگری ہے' جس سے یہ کائنات بظاہر ایک عظیم حقیقت نظر آتی ہے۔ اس عظیم نکتے کی وضاحت کے لئے مناسب ہے کہ ہم خود اس انسان کا مطالعہ کریں۔ دیکھئے تمام انسان تخلیقی اعتبار سے ایک ہیں۔ سر' جسم اور دوسرے اعضاء سب کے ایک جیسے ہیں۔ سب گوشت پوست اور ہڈیوں اور اعصاب سے بنے ہوئے ہیں۔ سب کو دو آنکھیں' دو کان' ایک ناک اور ایک زبان دی گئی ہے۔ اور سب اسی ایک زندہ (Cell) خلیے سے پیدا کئے گئے ہیں۔ مادہ اور صورت کے لحاظ سے سب ایک جیسے ہیں لیکن اخلاق و قابلیت میں ایک دوسرے کے درمیان کس قدر عظیم فرق پایا جاتا ہے۔ ذہانت و قابلیت میں وہ ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں بعض اوقات ایک انسان اور دوسرے کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور اس ظاہری مشابہت کے باوجود یہ فرق بھی آسمان و زمین سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

جب انسان صنعت باری کی ان باریکیوں پر غور کرتا ہے تو سر چکرا جاتا ہے۔ ذرا غور کیجئے! مخلوقات کی مختلف اقسام اور اجناس میں کیا تنوع ہے۔ مختلف شکلیں اور رنگا رنگ خصوصیات' قابلیتوں اور خصوصیتوں میں امتیاز' لیکن ان تمام چیزوں کا آغاز صرف ایک جیسے خلیے سے ہوا ہے جو اپنی ترکیب اور ساخت کے لحاظ سے بالکل یک گونہ ہوتا ہے۔

پس کون سیاہ دل ہے جو اللہ کی قدرت کے ان کھلے آثار اور شواہد کو دیکھ کر بھی صرف اسی کی بندگی اور غلامی اختیار نہیں کرتا؟ اور کون ہے جو ان معجز دلائل اور واضح براہین کے ہوتے ہوئے بھی اللہ کی ذات و صفات میں کسی کو اس کا ہمسر بناتا ہے! حالانکہ یہ بے شمار آثار اور یہ بکثرت دلائل اس کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور وہ برابر ان کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ کئی ایسے دلائل بھی ہیں جو اس کی نظروں اور

مشاہدے سے اوجھل ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٢٧﴾

"ہاں' اللہ اس سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی تمثیلیں دے۔ جو لوگ حق بات کو قبول کرنے والے ہیں' وہ انہی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے' جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے اور جو ماننے والے نہیں ہیں' وہ انہیں سن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار؟ اس طرح اللہ ایک ہی بات سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے' اور بہتوں کو راہ راست دکھا دیتا ہے اور گمراہی میں انہی کو مبتلا کرتا ہے جو فاسق ہیں۔ اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں' اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے' اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں' حقیقت میں یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔"

اس سے قبل سورت کی ابتدا میں قرآن مجید نے یہود و مشرکین سے تعلق رکھنے والے منافقین کو اس شخص سے تشبیہ دی تھی جو آگ جلاتا ہے یا اس شخص کے ساتھ جو آسمانی بادلوں کی تاریکی اور گرج و چمک میں گھر ہوا ہے' نیز اس سے پہلے مکی دور کے نازل شدہ قرآن کریم میں بھی کئی تمثیلیں بیان کی گئی ہیں اور جو مدینہ میں عام طور پر پڑھی جاتی تھیں۔ مثلاً جو لوگ رب العالمین کا انکار کرتے ہیں انہیں مکڑی سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا گیا تھا "ان کی مثال اس مکڑی کی طرح ہے جو اپنا گھر بناتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سب گھروں میں کمزور گھر مکڑی کا جالا ہوتا ہے۔ کاش کہ یہ لوگ جانتے۔" ایک جگہ یہ کہا گیا تھا کہ جن کو یہ پکارتے ہیں' ان کے عجز و ماندگی کا حال یہ ہے "وہ لوگ جو اللہ کے سوا پکارے جاتے ہیں ان کا حال یہ ہے کہ اگر وہ سب کے سب بھی جمع ہو جائیں تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکیں گے۔ بلکہ اگر ان سے مکھی کوئی چیز لے بھاگے تو وہ اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ کیا برا حال ہے طالب اور مطلوب دونوں کا؟"

یہ آیات بتا رہی ہیں کہ منافقین جن میں یہود و مشرکین دونوں شریک تھے' ایسی تشبیہات پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ ان تشبیہات میں منافقین کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ ان میں مکھیوں اور مکڑیوں جیسی حقیر چیزوں کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کی مقدس ذات اس سے برتر و بالا ہے۔ یہ اعتراض مشرکین مکہ اور منافقین مدینہ کے پھیلائے ہوئے شبہات اور انتشار کے مختلف پہلوؤں اور تدبیروں میں سے ایک ہے۔

چنانچہ ان آیات میں ان شبہات کی تردید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ تمثیلوں کے بیان سے اللہ کا مقصد کیا ہے کفار کو اس بات سے ڈرایا جاتا ہے کہ وہ اس فریب کاری سے باز آ جائیں اور مومنین کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ ان مثالوں سے ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہوگا۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا "اللہ اس بات سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی کسی حقیر تر چیز کی تمثیلیں دے۔" کیونکہ اللہ جس طرح چھوٹی چیزوں کا رب ہے اسی طرح بڑی چیزوں کا بھی رب ہے۔ مچھر کا بھی خالق اور ہاتھی کا بھی خالق۔ جس طرح ہاتھی کی تخلیق ایک اعجاز ہے اسی طرح مچھر کی تخلیق بھی ایک اعجاز ہے اور ان دونوں کی زندگی ایک ایسا راز سربستہ ہے' جس کا علم اللہ کے سوا آج تک کسی کو نہیں ہے۔ پھر تمثیل تو ایک پیرایہ اظہار ہوتا ہے اور اس کی غرض و غایت صرف یہ ہوتی ہے کہ اس کی مدد سے مدعا کو اچھی طرح کھول کر ذہن نشین کرایا جائے' نہ یہ کہ جس چیز سے تشبیہ دی جارہی ہے وہ کوئی عظیم الشان چیز ہی ہو۔ ضرب الامثال میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کا تذکرہ معیوب ہو۔ بلکہ ان تمثیلات کے بیان کے ذریعہ تو اللہ تعالیٰ دلوں کو آزمانا اور نفوس کو پرکھنا چاہتا ہے۔

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ "جو لوگ حق بات کو قبول کرنے والے ہیں وہ انہی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے۔" اپنے ایمان کی بدولت وہ اللہ جل شانہ سے اس طرح ہدایت لیتے ہیں جس طرح اس کی شان ہے۔ نیز وہ جانتے ہیں کہ ان تمثیلوں میں کیا حکمت پوشیدہ ہے۔ ان کا دل نور سے لبریز ہے۔ ان کی روح حساس ہے' ان کا دل و دماغ اس ہدایت کے لئے کھلا ہے۔ ان کے پاس اللہ کا جو حکم آتا ہے' اللہ کی جو بات ان تک پہنچتی ہے' وہ اس کی حکمت اور اس کے پس منظر کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا "اور جو ماننے والے نہیں ہیں' وہ انہیں سن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار؟" یہ اس شخص کا سوال ہے جس کی نظروں سے اللہ کا نور اور اس کی حکمت اوجھل ہے۔ وہ سنت الٰہی اور تدبیر الٰہی کو نہیں جانتا۔ ایسا سوال وہ لوگ کرتے ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا کوئی احترام نہیں ہوتا اور وہ اللہ تعالیٰ کے تصرفات کو ان نظروں سے نہیں دیکھتے جن سے انہیں اللہ کا ایک بندہ اور فرمانبردار غلام دیکھتا ہے۔ ایسے لوگ کبھی تو بطور اعتراض اور ناپسندیدگی ایسی باتیں کرتے ہیں' یا وہ ایسی باتیں اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں اس بات کا یقین نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ بھی ایسی باتیں کر سکتا ہے۔

ان کی اس روش پر تہدید اور تنبیہ کی صورت میں انہیں جواب دیا جاتا ہے کہ ان تمثیلوں کے پیچھے اللہ کی ایک خاص تدبیر کام کر رہی ہے۔ یہ تمثیلیں لوگوں کی تقدیر کا فیصلہ کر رہی ہیں۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيرًا وَّيَهْدِي بِهٖ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهٖ إِلَّا الْفَاسِقِينَ "اس طرح اللہ ایک ہی بات سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہتوں کو راہ راست دکھا دیتا ہے اور گمراہی میں ان ہی کو مبتلا کر دیتا ہے جو فاسق ہیں۔" یہ اللہ تعالیٰ کا قانون قدرت ہے کہ وہ انسانوں کو امتحان اور ابتلا میں ڈالتا ہے۔ ان آزمائشوں اور ابتلاؤں میں ہر انسان مقتضائے طبیعت و استعداد کے مطابق طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ ہر شخص کی روش اس طریق حیات کے مطابق ہوتی ہے جو اس نے اپنے لئے پسند کیا ہوتا ہے۔ آزمائش ایک ہی ہوتی ہے لیکن مختلف نظام ہائے زندگی اختیار کرنے والے لوگوں پر اس کے اثرات مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً مصیبت اور تکلیف ہی کو لے لیجئے۔ سب لوگ مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مومن بھی اور فاسق بھی۔ ایک صالح جو اللہ کی رحمتوں اور حکمتوں پر پختہ یقین رکھتا ہے وہ جب مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ زیادہ خشیت زیادہ عاجزی اور تضرع سے اللہ کے سامنے ملتجی ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایک فاسق تکلیف میں مبتلا ہو تو اس کے قدم اکھڑ جاتے ہیں' وہ اللہ سے اور بعید ہو جاتا ہے۔ وہ مومنین کی صفوں سے نکل جاتا ہے۔ اسی طرح خوشحالی اور تکاثر کو لیجئے کہ ...... بعض لوگ اس آزمائش میں مبتلا ہوتے ہیں۔ لیکن ایک مومن جب زیادہ انعامات اور اکرامات پاتا ہے تو وہ زیادہ بیدار ہو جاتا ہے۔ وہ شکر الٰہی میں پہلے سے بھی زیادہ حساس ہو جاتا ہے۔ لیکن جب ایک فاسق کو سہولتیں ملتی ہیں تو وہ اسے تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔ وہ غرور میں مبتلا ہو جاتا

ہو جاتا ہے اور گمراہی کی روش اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ نے لوگوں کے لئے جو تمثیلیں بیان کیں ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا "ان سے بھی وہ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے" اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی طرف سے آنے والی ہدایت کو اچھی طرح قبول نہیں کرتے۔ وَّ يَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا "اور بہتوں کو راہ ہدایت دکھا دیتا ہے۔" اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو حکمت باری کو جانتے ہوتے ہیں۔ وَ مَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ "اور گمراہی میں انہی کو مبتلا کرتا ہے جو فاسق ہیں۔" یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے دل پہلے سے فاسق ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ ہدایت اور اصلاح کی روش سے نکل جاتے ہیں لہٰذا ان کا صلہ یہی ہے کہ ان کی اس ضلالت میں اور اضافہ کر دیا جائے۔

جس طرح اس سورت کے آغاز میں متقین کی صفات کو تفصیل سے بیان کیا گیا تھا اسی طرح یہاں فاسقین کی خصوصیات کو بھی قدرے تفصیل سے لیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس پوری سورت میں روئے سخن ایسے ہی لوگوں کی طرف رہے گا۔ نیز انسان ہر زمانے میں انہی ہر طبقات میں منقسم رہتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَ يَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھنے کے بعد توڑ دیتے ہیں' اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں' حقیقت میں یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔"

وہ کون سا عہد ہے جسے یہ توڑتے ہیں؟ وہ کون سا تعلق ہے کہ اللہ نے اس کے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور یہ اسے کاٹتے ہیں؟ اور جو فساد یہ کرتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے؟ ان سب امور کو سیاق کلام میں مجمل چھوڑ دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہاں اصولی طور پر ایسے لوگوں کا مزاج بتایا جا رہا ہے۔ ان کی نوعیت کو متعین و مشخص کیا جا رہا ہے۔ کسی حادثے یا کسی مخصوص واقعہ کا بیان مقصود نہیں ہے بلکہ ایک عمومی صورت حال کی وضاحت مطلوب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اور ایسے لوگوں کے درمیان جو عہد بھی ہے وہ توڑ دیا گیا ہے اور اللہ نے جن جن انسانی رابطوں کے قیام کا حکم دیا ہے' وہ سب کے سب ان لوگوں نے توڑ دیئے ہیں اور جو فساد بھی ممکن ہے اس کا ارتکاب یہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کی فطرت میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ لہٰذا یہ لوگ کسی عہد اور کسی رابطے کے پابند نہیں ہیں۔ اور کسی فساد سے بھی باز نہیں رہتے۔ ان کی مثال کچے پھل کی سی ہے' جو شجر حیات سے جدا ہو گیا ہو' گل اور سڑ گیا ہو اور زندگی نے اسے پرے پھینک دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جن تمثیلوں سے مومنین ہدایت پاتے ہیں' ان سے ایسے لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں' جو چیزیں متقین کے لئے سبب ہدایت ہوتی ہیں وہ ان فاسقین کے لئے باعث ضلالت ہو رہی ہیں۔

ایسے لوگ جو کبھی یہود و مشرکین کے منافقین کی صورت میں مدینہ میں پائے جاتے تھے اور جو دعوت اسلامی کے مقابلے میں ایک بڑی رکاوٹ تھے اور جو آج بھی نام اور عنوان کی مختصر تبدیلی اور بالکل معمولی اختلاف کے ساتھ تحریک کی راہ میں سنگ گراں بنے ہوئے ہیں' ان کی فتنہ انگیزیوں کے نشانات تو دیکھئے۔ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ "جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں۔" انسانوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان جو پیمان بندھا ہوا ہے اس کی کئی شکلیں اور صورتیں ہیں۔ ایک تو وہ جبلی عہد ہے جو ہر ذی حیات کی جبلت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اس کی رو سے ہر ذی حیات کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کرے اور اس کی بندگی کرے۔ انسانی فطرت میں ہمیشہ عقیدہ خداوندی کے لئے پیاس رہتی ہے۔ لیکن کبھی اس فطرت سلیمہ میں فساد رونما ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں انسان راہ راست سے بھٹک جاتا ہے' اور دوسروں کو اللہ کا ہمسر اور شریک بنانے لگتا ہے۔ نیز اس کی ایک صورت عہد خلافت کی ہے' جو اللہ تعالیٰ اور آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے درمیان طے پایا۔ جس کا تذکرہ عنقریب ہو گا۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ O وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ O "پھر میری طرف سے جو ہدایت تمہارے پاس پہنچے' تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقعہ نہ ہو گا اور جو لوگ اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے' وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں' جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" نیز اس عہد کی ایک شکل وہ ہے جو مختلف پیغمبروں کے ذریعہ مختلف اقوام سے باندھی گئی کہ وہ صرف ایک اللہ جل شانہ کی بندگی کریں اور اپنی زندگی میں صرف اسی کے تجویز کردہ نظام حیات اور نظام قانون کو اپنائیں گے۔ یہ سب عہد ایسے ہیں جنہیں یہ فاسق لوگ توڑتے ہیں۔ اور جب کوئی اللہ تعالیٰ سے پختہ پیمان باندھنے کے بعد توڑتا ہے تو پھر وہ کسی دوسرے عہد کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ جس کے اندر اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد شکنی کا حوصلہ ہوتا ہے' وہ اس کے بعد کسی عہد و پیمان کا کوئی احترام نہیں کرتا۔

وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ "اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹتے ہیں۔" اللہ تعالیٰ نے کئی قسم کے روابط و تعلقات کو قائم رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اس نے یہ حکم دیا ہے کہ عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کی جائے' اس نے یہ حکم دیا ہے کہ پوری انسانیت کی عظیم برادری قائم کی جائے اور ہر انسان دوسرے کا بھائی ہو۔ اور ان سب سے مقدم درجے میں اس نے حکم دیا ہے کہ ایک نظریاتی اخوت اور ایمانی برادری قائم کی جائے کیونکہ کوئی ربط اور تعلق ایمان و نظریہ کے سوا مضبوط نہیں ہو سکتا۔ جب وہ تعلقات و روابط ٹوٹ جائیں جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے تو پھر تمام رشتے ٹوٹ جاتے ہیں اور تمام روابط ختم ہو جاتے ہیں۔ زمین پر افراتفری عام ہو جاتی ہے اور شر و فساد پھیل جاتا ہے۔

وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ "اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔" زمین پر فساد پھیلانے کی بھی کئی شکلیں ہیں۔ سب کی سب اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑنے' اللہ تعالیٰ نے جن تعلقات کو جوڑنے کا حکم دیا ہے' ان کے کاٹنے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا نتیجہ ہوتی ہیں اور ان تمام فسادات کا سرچشمہ یہ ہے کہ انسان اس نظام حیات کو ترک کر دے جو اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی اور اس کے تصرفات کے لئے تجویز کیا ہے۔ اسلامی نظام حیات ہی وہ راہ ہے جو ان تمام راہوں سے علیحدہ ہو کر جاتی ہے اور جو شر و فساد پر منتج ہوتی ہیں۔ اگر صورت یہ ہو کہ اسلامی نظام زندگی کے تصرف و اقتدار سے اس دنیا کے امور آزاد کر دیئے گئے ہوں' اس زندگی کو اللہ کی شریعت کے دائرے سے نکال دیا گیا ہو تو ممکن نہیں ہے کہ اس دنیا کی اصلاح ہو سکے۔ جب بھی ایسا ہوا ہے کہ انسانوں اور ان کے رب کے درمیان یہ مضبوط تعلق نہیں رہا' تو اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دنیا شر و فساد کے عظیم سیلاب کی لپیٹ میں آگئی ہے' انسانی اخلاق خراب ہو گئے ہیں' لوگوں کی زندگی اور احوال تباہ ہو گئے۔ ان کی معیشت برباد ہو گئی۔ غرض ایسے حالات میں یہ زمین اور اس کے اوپر رہنے والی تمام جاندار مخلوق اور تمام چیزوں میں فساد رونما ہو جاتا ہے اور یہی وہ تباہ کاری اور شر و فساد ہے جو اللہ کی نافرمانی کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ایسے فساد میں مبتلا لوگ اسی کے مستحق ہوتے ہیں کہ جن امور سے مومنین کو راہ ہدایت نصیب ہوتی ہے وہ ان کے لئے باعث گمراہی ہوتے ہیں۔

کفر و فسق کے آثار و نتائج کی وضاحت کے بعد اب روئے سخن تمام انسانیت کی طرف پھر جاتا ہے۔ ان کی تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ اس خالق و رازق' علیم و مدبر اور حیات و ممات کے مالک ذات باری کا انکار کیوں کر رہے ہیں؟

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾ هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى

الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ
هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾ ۳ ع ۹ ۳

"تم اللہ کے ساتھ کفر کا رویہ کیسے اختیار کرتے ہو' حالانکہ تم بے جان تھے' اس نے تم کو زندگی عطا کی' پھروہی تمہاری جان سلب کرے گا' پھروہی تمہیں دوبارہ زندگی عطا کرے گا' پھراسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔ پھر اوپر کی طرف متوجہ فرمائی اور سات آسمان استوار کئے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔"

ان قوی دلائل کے ہوتے ہوئے اللہ کا انکار کرنا' کفروانکار کی وہ قبیح اور ناپسندیدہ روش ہے جس کی پشت پر کوئی سند و دلیل نہیں ہے۔ قرآن کریم یہاں ایک ایسی حقیقت پیش کرتا ہے جس سے ان کے لئے کوئی راہ فرار نہیں ہے۔ وہ اس بات پر مجبور ہیں کہ اس حقیقت اور اس کے لازمی نتائج کو تسلیم کریں۔ قرآن ان کے سامنے قافلۂ حیات اور اس کے مختلف حالات وکیفیات لاکر رکھ دیتا ہے تاکہ وہ اس پر غور کریں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان مردہ حالت میں تھے' اللہ نے انہیں زندگی سے نوازا' اللہ ہی انہیں حالت موت سے حالت حیات کی طرف لایا' یہ ایک ایسی روشن حقیقت ہے کہ سوائے قدرت الہی اور تخلیق الہی کے اس کی کوئی اور توجیہ وہ نہیں کرسکتے۔ وہ زندہ ہیں ان کے قلب جسدی میں حیات موجود ہے؟ اس حیات کا خالق کون ہے؟ وہ کون ہے جس نے جمادات میں یہ زائد صفت' صفت حیات پیدا کی؟ کیونکہ جمادات جن پر موت و جمود کی حالت طاری ہے' وہ حیات کی حقیقت و مزاج سے بالکل مختلف ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس حیات کا مصدر کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ سوال ایسا ہے کہ عقل و نفس ہروقت کوئی حقیقی اور تشفی بخش جواب چاہتا ہے اور کسی کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس سوال کو نظرانداز کرسکے۔ پھراس سوال کے جواب میں کوئی ایسی بات انسان کو مطمئن نہیں کرسکتی جس میں اس مادی دنیا سے آگے کسی خالق ذات کو تسلیم نہ کیا گیا ہو۔

غرض یہ زندگی جو اس زمین پر رواں دواں ہے اور جس کی روش جمادات سے بالکل مختلف ہے کہاں سے آئی؟ اس کا واحد تشفی بخش جواب یہ ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے آئی اور اسی کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ یہی جواب ایسا ہے جو سمجھ میں آسکتا ہے۔ اگر کسی کو یہ جواب تسلیم نہیں ہے تو ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ لائے وہ کوئی تشفی بخش جواب؟

یہ ہے وہ حقیقت جسے قرآن کریم اس موقع پر لوگوں کے سامنے رکھتا ہے۔ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ "تم اللہ کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے' اس نے تم کو زندگی عطا کی۔" یعنی تم اس طرح بے جان تھے جس طرح تمہارے اردگرد پھیلی ہوئی یہ کائنات بے جان ہے۔ اس نے تمہارے اندر جان پیدا کی اور تمہیں زندہ کیا۔ کوئی اپنے خالق سے انکار کیونکر کرسکتا ہے۔ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ "پھر تمہاری جان سلب کرے گا۔" یہ بھی ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ کیونکہ زندہ و ذی روح مخلوقات کا مرنا روز مرہ کا معمول و مشاہدہ ہے۔ لہٰذا زندگی کے بعد مرنا ایک ایسی حقیقت ہے جو از خود ہی ذہنوں پر طاری ہوتی ہے اور اس میں کسی قسم کی بحث وجدال کی کوئی گنجائش نہیں ہے ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ پھروہ تمہیں دوبارہ زندگی عطا کرے گا۔" یہ تھی وہ حقیقت جس میں ان کو شک تھا لہٰذا وہ اس کے بارے میں بحث وجدال کرتے تھے اور آج بھی اس میں بعض کج فطرت لوگ شک کرتے ہیں' جو آج پھر صدیوں قبل کی جاہلیت کی طرف لوٹ چکے ہیں۔ لیکن انسان اگر اس بات پر غور کرے کہ وہ پہلے بھی کچھ نہ تھا۔ اسے

پیدا کیا گیا' لہٰذا یہ بات عقل سے بعید نہیں ہے کہ موت کے بعد دوبارہ اسے زندہ کیا جاسکتا ہے۔ پس یہ عقیدہ کوئی ایسا عجوبہ نہیں ہے کہ لازماً اس کی تکذیب ہی کی جائے۔

ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ "پھر اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔" جیسا کہ اس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا اسی طرح تم اس کی طرف لوٹو گے' جس طرح اس نے تمہیں زمین میں پھیلایا۔ اسی طرح تم اٹھائے جاؤ گے۔ جس طرح تم مردہ حالت سے نکل کر اس زندہ حالت کی طرف لائے گئے۔ اسی طرح تم اس کی طرف پلٹ کر جاؤ گے تاکہ وہ تمہارے درمیان اپنا حکم نافذ کرے اور تمہارے قضیوں کا فیصلہ کرے۔

یہ ایک مختصر سی آیت ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر پل بھر میں زندگی کا پورا دفتر پھیلا بھی دیا۔ اور لپیٹ بھی لیا۔ ایک چمک اٹھی اور دکھا گیا کہ پوری انسانیت اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اللہ نے پہلے اسے زندہ کر کے زمین پر پھیلایا' پھر اسے اچانک موت نے آلیا' پھر روز محشر کا منظر ہے جس میں پوری انسانیت اٹھ رہی ہے اور اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے بعینہٖ اسی طرح جس طرح پہلے اللہ نے اسے زندہ کیا تھا۔ اس برق رفتار پیرایہ بیان میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ صاف صاف نظر آتی ہے اور انسانی احساس و شعور پر اس کے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔

اس پہلی چمک کے متصلاً بعد روشنی کی ایک دوسری کرن آتی ہے جو پہلی کے لئے تکمیل کا درجہ رکھتی ہے۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

"وہی تو ہے' جس نے تمہارے لئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں' پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان استوار کئے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔" اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے بارے میں مفسرین اور متکلمین نے طویل بحثیں کی ہیں' قبلیت وبعدیت اور استوا اور تسویہ اور دوسری کلامی بحثیں یہاں کی جاتی ہیں۔ لیکن یہ حضرات اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ قبل و بعد 'محض انسانی اصطلاحات ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لئے ان کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ یہ حضرات اس بات کو بھی سامنے نہیں رکھتے کہ استوا اور تسویہ انسانی لغوی اصطلاحات ہیں جو لامحدود ذات کو انسان کے محدود تصور کے قریب لے آتی ہیں۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ قرآن کی ایسی تعبیروں پر علمائے اسلام نے جو طویل بحثیں کیں' وہ اس مصیبت اور آفت کا نتیجہ تھیں جو یونانی فلسفہ اور یہود و نصاریٰ کی لاہوتی بحثوں کی صورت میں امت مسلمہ پر نازل ہوئی۔ یہ بحثیں تب پیدا ہوئیں جب اس فلسفہ اور ان لاہوتی بحثوں نے عربوں کی سادہ ذہنیت اور مسلمانوں کے پاکیزہ خیالات کو گدلا کر دیا تھا۔ اب ہمارے لئے یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ ہم بھی اس مصیبت میں خواہ مخواہ گرفتار ہو جائیں اور منطق اور کلامی جدلیات میں قرآن کریم کے حسن و جمال کو گم کر دیں۔

اس لئے ہمیں چاہئے کہ ان مصنوعی تعبیرات و اصطلاحات سے آزاد ہو کر یہ دیکھیں کہ پوری کائنات کو انسان کے لئے پیدا کرنے کی حقیقت کیا ہے؟ اس حقیقت سے کس چیز کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے وجود انسانی کا کیا مقصد قرار پاتا ہے۔ اس زمین پر انسان کے کیا فرائض ہیں۔ اللہ کے ہاں انسان کی قدر و قیمت کیا ہے۔ نیز اسلامی تصور حیات اور تصور کائنات میں انسان کی کیا قدر و قیمت ہے اور اسلامی نظام زندگی میں انسان کا مقام کیا ہے؟

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا "اللہ وہی تو ہے جس نے تمہاری زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔" یہاں لفظ لکم یعنی "تمہارے لئے" اپنے گہری معنویت لئے ہوئے ہے۔ یہ اس گہری حقیقت کا اظہار کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس انسان کو ایک عظیم مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس کی پیدائش کا مقصد یہ ہے کہ وہ زمین پر اللہ کا نائب اور خلیفہ ہو۔ زمین کے اندر جو کچھ ہو وہ

اس کی ملکیت میں ہو اور وہ اس میں مؤثر اور متصرف ہو۔ کیونکہ اللہ کی اس طویل و عریض کائنات میں وہی اعلیٰ مخلوق ہے۔ وہ اس وسیع میراث کا پہلا وارث ہے۔ لہٰذا اس زمین کے حالات اور اس کے انقلاب کے اندر اس کا کردار بھی اول درجے کا ہے۔ وہ جس طرح اس زمین کا سردار ہے اسی طرح اس کے آلات کا بھی سردار ہے۔ وہ آلات پیداوار کے ہاتھ میں مقید اور بے بس نہیں ہے' جس طرح آج کی مادی دنیا میں انسان ان آلات کے ہاتھوں میں بے بس ہو چکا ہے۔ نیز وہ ان تبدیلیوں اور تغیرات کا بھی تابع نہیں ہے جو انسان اور انسان کے باہم روابط میں ان آلات کی پیدا کردہ ہیں جیسا کہ آج کل کے مادہ پرستانہ تصور حیات میں انسان اور اس کے کردار کو حقیر تر سمجھا جاتا ہے اور اسے بے جان اور بے شعور آلات کا غلام بنا دیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ ان سے برتر اور ان کا سردار ہے۔ قرآن کی رو سے ساری اقدار میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے کہ اسے انسانیت کی قدر و قیمت سے برتری حاصل ہو۔ انسان تو اس کے سامنے ذلیل و خوار ہو اور وہ اس کے مقابلے میں بلند و بالا ہو۔ وہ تمام مقاصد جن کے نتیجے میں انسان کی انسانیت کی تذلیل ہو۔ وہ انسان کے مقصد وجود ہی کے خلاف ہیں اور اس لئے معیوب ہیں' چاہے ان کے نتیجے میں بے شمار مادی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی تصور حیات کے مطابق انسان کی شرافت اور انسان کی برتری وہ پہلی قدر ہے جو سب اقدار سے اولیت رکھتی ہے۔ تمام مادی قدریں اس کے تابع ہیں اور ان کا درجہ بعد میں آتا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ اپنی جس نعمت کا ذکر فرما رہے ہیں اور اس کے کفران پر نکیر ہو رہی ہے۔ وہ صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین کی تمام نعمتوں سے نوازا بلکہ یہ بھی ہے کہ انسان ان تمام چیزوں کا مالک اور متصرف بھی ہے اور یہ کہ انسان کی قدر و قیمت ان تمام مادی اقدار سے برتر ہے جن پر یہ زمین حاوی ہے۔ جس انعام کا یہاں ذکر ہے ملکیت کائنات اور زمین کے ذخائر سے انتفاع سے بھی آگے' وہ انسانی شرافت اور انسان کی برتری کی نعمت ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ "پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان استوار کیے۔" یہاں اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ استوا الی السماء کی حقیقت و ماہیت کیا ہے؟ ہمارے لئے صرف یہ جاننا کافی ہے کہ آسمان کی طرف متوجہ ہونے سے مراد کیا ہے؟ استوا الی السماء قدرت الٰہی کے اظہار کا ایک پیرایہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تخلیق و تکوین کا ارادہ فرمایا۔ اسی طرح سات آسمانوں کی حقیقت اور ان کی شکل اور حدود اربعہ کے تعین کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آیت کے اس اصولی اور عام مفہوم کا سمجھ لینا ہی کافی ہے۔ کفار چونکہ کائنات کے خالق و نگہبان کے منکر تھے' اس لئے یہاں یہ بیان کیا گیا کہ اللہ ہی زمین و آسمان کا خالق ہے۔ اس نے انسانوں کے لئے زمین کی تمام مخلوق کو مسخر کر لیا ہے اور آسمانوں کے اندر اس طرح نظم اور ربط پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے اس کرہ ارض پر زندگی کا باقی رہنا آسان اور سہل ہو گیا ہے۔

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ "اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔" وہی سب کا خالق اور سب کا مدبر ہے' لہٰذا ظاہر ہے کہ وہ ہر چیز کا علم بھی رکھتا ہے۔ پوری کائنات کی تدبیر کے ساتھ ساتھ پوری کائنات کا علم بھی رکھنا ایک ایسی حقیقت ہے جو اس کائنات کے خالق وحدہ لاشریک پر ایمان لانے کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے۔ اس سے انسان اس وحدہ لاشریک مدبر کی بندگی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور بطور شکر نعمت اپنے رازق اور منعم کی بندگی بجالاتا ہے۔

یہاں آکر سورت کی ابتدائی بحثیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس پوری بحث میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ لوگ ایمان لے آئیں اور مومنین و متقین کے اختیار کردہ راستے کو اپنالیں۔

# درس ۳ ایک نظر میں

قرآن کریم میں مختلف مواقع پر قصص کا بیان ہوتا ہے۔ موقع و محل خود بتا دیتا ہے کہ یہاں اس قصے کے بیان سے غرض و غایت کیا ہے، سلسلہ کلام کی کون سی کڑی سے تعرض کیا جا رہا ہے؟ کس شکل و صورت میں قصہ پیش ہو رہا ہے اور وہ طرز ادا کیا ہے جس میں وہ قصہ بیان ہو رہا ہے...... اس اسلوب کلام سے روحانی، فکری اور فنی فضا میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک تو موضوع کلام کا حق ادا ہو جاتا ہے دوسری طرف بیان قصہ کی نفسیاتی اغراض بھی پوری ہو جاتی ہیں اور قصہ کو لانے سے جو اثرات پیدا کرنے مطلوب ہوتے ہیں وہ ہو جاتے ہیں۔

بعض لوگوں کو یہ وہم ہوا ہے کہ قرآنی قصص میں تکرار ہے کیونکہ ایک ہی قصہ مختلف شکلوں میں کئی جگہ دہرایا گیا ہے۔ لیکن گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ جن قصوں کا کوئی ایک حصہ یا پورے قصے کو کسی جگہ دہرایا گیا ہے تو وہاں وہ اپنی سابقہ شکل و صورت میں ہی نہیں بیان ہوا بلکہ دونوں مقامات پر قصے کی مقدار اور سیاق کلام اور طرز ادا بالکل مختلف ہوتی ہے۔ جہاں بھی قصے کا کوئی حصہ دہرایا جاتا ہے وہاں ایک نئی بات کہنی مطلوب ہوتی ہے۔ لہٰذا فی الحقیقت قرآن کریم میں بیان قصص میں کوئی تکرار نہیں ہے۔

بعض کج فہم لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن کریم کے بیان کردہ بعض واقعات تخلیق ہیں یا ان کے بیان میں تصرف کیا گیا ہے یعنی محض مقاصد اور تحسین کلام کے لئے یہ قصے لائے گئے ہیں لیکن جو شخص بھی فطرت سلیم رکھتا ہو اور کھلی آنکھوں سے قرآن کا مطالعہ کرتا ہو وہ اس حقیقت کو بسہولت پا لیتا ہے کہ ہر جگہ موضوع بحث کی مناسبت سے کوئی قصہ یا اس کا کوئی حصہ لایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انداز بیان اور طرز ادا بھی موقع و محل کی مناسبت سے بالکل جدا ہوتی ہے۔ قرآن کریم ایک دعوتی کتاب ہے۔ ایک نظام زندگی ہے اور ایک نظام زندگی کا دستور بھی ہے۔ وہ تسکین ذوق کی حکایت یا تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت دین کے دوران منتخب قصے بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ قصوں کے اسلوب بیان اور ان کے مقدار کا فیصلہ سیاق کلام اور مناسبت حال کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ بیان قصص میں صرف حسن ادا کی بہترین خوبیوں ہی کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ زور کلام کی خاطر کہیں بھی واقعات میں اضافہ نہیں کیا گیا ہاں ہر جگہ واقعات کو بالکل ایک انوکھے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اثر انگیزی کے لئے صرف سچائی کی قوت اور حسن ادا پر ہی اعتماد کیا گیا ہے۔

قرآنی قصے در حقیقت قافلہ ایمان کے طویل اور مسلسل سفر کی داستان اور روئیداد ہوتے ہیں اور قرآن میں دعوت دین کی طویل کہانی کو سمو دیا گیا ہے: جو نسلاً بعد نسل لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی رہی اور لوگ اسے قبول کرتے رہے۔ یہ قصے ایک طرف تو انسانوں کی ان برگزیدہ ہستیوں کی کیفیت ایمان کو پیش کرتے ہیں جنہیں اس کام کے لئے منتخب کیا گیا اور دوسری طرف یہ بتاتے ہیں کہ ان برگزیدہ ہستیوں اور رب العالمین کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا تھی؟ ان قصوں کے ذریعہ ہم دیکھتے ہیں کہ یوں یہ قافلہ اہل کرم اس طویل شاہراہ پر چلا آتا ہے۔ دل کو روشنی نور اور طہارت سے بھرتے ہوئے وہ دل کے اندر اس قیمتی متاع، متاع ایمان اور اس کائنات میں اس کی اہمیت کا شعور بیدار کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہ ایمانی تصور حیات کو تمام دوسرے عارضی تصورات زندگی سے ممیز کرتے ہوئے اسے انسان کے حس و شعور میں بٹھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید جو کتاب دعوت ہے اس کا ایک بڑا حصہ ایسے ہی قصص پر مشتمل ہے۔

اب ہمیں چاہئے کہ ان تصریحات کی روشنی میں قصہ آدم کا مطالعہ کریں جیسا کہ سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ اس سے پہلے قافلہ حیات انسانی کی زندگی سے بحث کی گئی ہے بلکہ اس پوری کائنات کے وجود سے بحث کی گئی۔ اس کے بعد انسان پر اپنی نعمتوں کا ذکر کرتے

ہوئے اس کرہ ارض کا ذکر ہوا اور بتایا گیا کہ اس زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ نے انسانوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس ضمن میں اس زمین پر حضرت آدم علیہ السلام کو منصب خلافت عطا کئے جانے کا قصہ شروع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ زمین کے اختیارات حضرت آدم علیہ السلام کے سپرد کر دیتے ہیں لیکن اختیارات کی یہ سپردگی مشروط ہے اور حضرت آدم کے ساتھ ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کو علم و معرفت کی وہ ضروری مقدار بھی عطا کرتے ہیں جو بار خلافت اٹھانے کے لئے ضروری تھی نیز بعد میں چونکہ اللہ تعالیٰ نے منصب خلافت کا معاہدہ بنی اسرائیل سے کیا۔ اس لئے قصہ آدم اس کے لئے تمہید کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد بنی اسرائیل کو اس خلافت سے معزول کر دیا اور قلمدان خلافت اس امت مسلمہ کے حوالے کر دی جاتی ہے جو اللہ کے عہد کو اچھی طرح پورا کرنے والی ہے۔ اس طرح یہ قصہ سیاق سباق سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ اب ہمیں چاہئے کہ لوح بحر آغاز انسانیت کے احوال پڑھیں اور دیکھیں کہ ان کے پس منظر میں کس قدر قیمتی ہدایات پوشیدہ ہیں۔

پردہ اٹھتا ہے اور سب سے پہلے ہم عالم بالا کے اسٹیج پر پہنچ جاتے ہیں۔ بلندیوں کی چمک اور روشنیوں میں نور بصیرت کے ذریعہ ہم انسانیت کے آغاز کی کہانی کو یوں اسٹیج ہوتے دیکھ رہے ہیں۔

☆ ☆ ☆

# درس نمبر۳ تشریح آیات (۳۰ تا ۳۹)

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔" انہوں نے عرض کیا: "کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے نظام کو بگاڑ دے اور خونریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔" فرمایا: "میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔"

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو' جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔" تو معلوم ہوا کہ یہ عالم بالا کی خاص مشیئت ہے کہ اس کائنات میں پیدا کئے جانے والے اس نئے موجود (انسان) کو اس زمین کے تمام اختیارات دے دیئے جائیں۔ اسے اس دنیا میں آزاد چھوڑ دیا جائے اور اس کائنات کے مقصد تخلیق اور اسے عدم سے وجود میں لانے کی غرض وغایت کا اظہار اور اس کے بروئے کار لانے کا کام اس انسان کے سپرد کر دیا جائے اور اس انسان کو اس زمین کی تحلیل و ترکیب' اس کی تبدیلی اور ترقی' اس کے اندر پوشیدہ خزانوں کا کھوج لگانے اور اس خام ذخائر کے پتہ لگانے اور انہیں مسخر کرنے کے کام میں لگا دیا جائے۔ یہ سب کام اللہ کے حکم سے ہو اور انسان کی اس عظیم مہم کا ایک حصہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے اس انسان کے سپرد کی۔

O.... نیز استخلاف آدم سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ نے اس جدید مخلوق (انسان) کے اندر ایسی پوشیدہ قوتیں ودیعت کی ہیں اور اسے ایسی استعداد دی ہے جس کے ذریعے وہ اس زمین کے اندر پوشیدہ تمام قوتوں' تمام مفید ذخیروں اور خام مواد کو کام میں لا سکتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے ایسی اندرونی اور خفیہ طاقتیں دی ہیں جن کے ذریعے وہ اس منشاء خداوندی کو بروئے کار لا سکتا ہے۔

O.... نیز اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کائنات پر حاوی ہونے والے قوانین قدرت اور نوامیس فطرت اور اس انسان اور اس کی قوتوں پر نافذ ہونے والے قوانین شریعت کے درمیان مکمل توافق اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے تاکہ ان دونوں قوانین کے درمیان تصادم اور تضاد نہ ہو اور انسانی طاقت اور قوتیں اس عظیم کائنات کے قوانین قدرت اور نوامیس فطرت سے ٹکرا کر پاش پاش نہ ہو جائیں۔

O.... نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عظیم اعزاز ہے جو اس کائنات کے اندر اور اس پورے کرہ ارض پر حضرت انسان کو دیا گیا۔ یہ وہ شرف ہے جو انسان کے خالق رحیم اور خداوند کریم نے اس کے لئے پسند فرمایا اور کیا ہی بلند ہے یہ مقام! اور یہ تمام باتیں عالم بالا کے اس جلیل القدر اشارے سے معلوم ہوتی ہیں کہ "میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔"

بالخصوص جبکہ آج ہم چشم سر اور چشم بصیرت دونوں سے عیاں دیکھ رہے ہیں کہ انسان نے اس کائنات میں یہ کام کیا اور اس نے اللہ تعالیٰ کی اس زمین میں وہ تکوینی مقصد پورا کیا جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا تھا اور اس وسیع مملکت میں اسے اپنا خلیفہ بنایا گیا تھا۔

قَالُوٓا اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ‌ۚ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ‌ؕ

"انہوں نے عرض کیا کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے نظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ ساتھ تسبیح اور آپ کے لئے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔" ملائکہ کی اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یا تو اس وقت موجودہ صورت حال سے آنے والی مخلوق کے بارے میں اندازہ کر لیا تھا یا اس سے پہلے زمین میں جو مخلوق بسائی گئی تھی اس کے تجربات کی روشنی میں انہوں نے یہ بات کہی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے اپنی خدا داد بصیرت کے ذریعے یہ معلوم کر لیا ہو کہ آنے والی مخلوق کیسی ہوگی؟ نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمین میں انسانی زندگی کے لئے جو ضروری تقاضے تھے اس سے انہوں نے اس مخلوق کی فطرت کا اندازہ لگا لیا ہو۔ اس لئے وہ جانتے تھے یا کم از کم انہیں یہ توقع تھی کہ آنے والی یہ نئی مخلوق زمین میں فساد برپا کرے گی اور یہاں خونریزیاں ہوں گی۔ انہوں نے یہ سوال اس لئے بھی اٹھایا کہ اپنی پاک فطرت اور معصومیت کی وجہ سے وہ خیر مطلق اور ہمہ جہت امن و امان ہی کا تصور کر سکتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس کائنات کا مقصد وجود اور سبب تخلیق ہی صرف یہ ہے کہ اللہ کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تقدیس کی جائے اور یہ بات ان کی موجودگی سے پوری طرح سرانجام دی جا رہی تھی۔ کیونکہ یہ فرشتے ہر وقت اللہ کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتے رہتے تھے اور کسی وقت بھی اس کی بندگی اور اطاعت سے منہ نہ موڑتے تھے۔

لیکن اس زمین کی ساخت و پرداخت اور اس کے اندر زندگی کی بوقلمونیوں کے بروئے کار لانے میں جو گہری اور دور رس مصلحت کارفرما تھی وہ ان کی نظر سے اوجھل تھی۔ مشیت الٰہی یہ تھی کہ اللہ کا یہ خلیفہ جو اگرچہ کبھی کبھار فساد بھی پھیلائے گا' خونریزیاں بھی کرے گا' اس زمین کو مسخر کرے' اسے ترقی دے' اس کی ساخت کو بدلے تاکہ اللہ کا منشا پورا ہو اور اس معمولی اور جزوی شر و فساد کے ہوتے ہوئے وہ عظیم بھلائیاں پروان چڑھیں جو عمومی اور سب کائنات کو شامل ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی اس وسیع کائنات میں دائمی نشوونما' مسلسل تہذیب کی ترقی' تخریب و تعمیر کا دائمی عمل' پیہم جدوجہد' نہ رکنے والی جستجو' مسلسل تغیر و تبدیلی کے ذریعے یہ عظیم تر بھلائی اور بہبود بروئے کار لائی جائے۔

چنانچہ ان کے اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عالم الغیب اور علیم و خبیر ہے یہ فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ قَالَ اِنِّىۡٓ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝ "میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓـئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنۡۢبِــُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝ قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ۝ قَالَ يٰٓـاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ‌ۚ فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلْ لَّكُمۡ اِنِّىۡٓ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ

وَ الْاَرْضِ ۙ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝

"اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے' پھرانھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا اگر تمہارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا) تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ۔" انھوں نے عرض کیا "نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے ہم تو بس اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔" پھر اللہ نے آدم سے کہا "تم انھیں ان چیزوں کے نام بتاؤ؟" جب اس نے ان کو سارے نام بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اسے بھی میں جانتا ہوں۔"

دیکھئے! اب ہم چشم بصیرت سے نہایت بلند روشنیوں میں عالم بالا کے کسی مقام پر فرشتوں کی ایک جمیعت کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اس تقریب میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ انسانیت کو منصب خلافت سپرد کیا جا رہا ہے اور یوں ہمیں اس عظیم راز سے آگاہ کر دیا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی اس انسانی مخلوق کی ذات میں ودیعت فرمایا ہے۔ وہ راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مفاہیم کے اظہار کے لئے ان کے نام رکھنے کی صلاحیت دی ہے اور اس طرح انسان ان ناموں کے ذریعہ اظہار مافی الضمیر کرتے ہیں۔ ناموں کی حقیقت کیا ہے؟ صرف یہ کہ وہ مختلف قسم کی آوازیں ہیں جو انسان اپنے منہ سے نکالتا ہے اور جو ان محسوسات اور اشخاص پر دلالت کرتی ہیں جنہیں انسان دیکھتا ہے۔ اس زمین پر حیات انسانی کو آسان بنانے کے لئے یہ ایک اہم صلاحیت ہے جو اللہ نے انسان کو دی ہے۔ اس کی افادیت کا صحیح تصور اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لیں کہ انسان ...... کے اندر اشیاء کے نام رکھنے اور استعمال کرنے کی قدرت نہیں ہے۔ اب دیکھئے ایک دوسرے کو سمجھنے میں اور باہم معاملات طے کرنے میں کیا مشکلات ہیں؟ ہم سے اچانک یہ دوچار ہو گئے۔ اگر کوئی کسی کے ساتھ کسی چیز کے بارے میں کوئی معاملہ کرنا چاہتا ہے تو خود اس چیز کا حاضر کرنا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ وہ اس کے بارے میں کوئی مفاہمت کر سکیں۔ اگر کسی درخت کا معاملہ درپیش ہے تو ضروری ہے کہ درخت سامنے ہو۔ اگر کسی پہاڑ اور قطعہ زمین کے بارے میں کچھ طے کرنا ہے تو ضروری ہے کہ سب لوگ وہاں جائیں۔ اگر کسی فرد بشر کا معاملہ ہے تو ضروری ہے کہ اسے سامنے لایا جائے۔ ذرا سوچئے مشکلات کا ایک طوفان برپا ہو گیا ہے اور جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ غرض اگر اللہ تعالیٰ حضرت انسان کو یہ راز نہ بتاتے کہ ہر معنی و مفہوم کا اظہار ان ناموں کے ذریعے ہو سکتا ہے تو ہماری زندگی دو قدم بھی آگے نہ بڑھ سکتی۔

رہے فرشتے تو انہیں اس قابلیت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ان کے کام اور ان کی ڈیوٹی کی جو نوعیت تھی اس کے لئے اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ وہ ہر چیز کے نام کو جانیں۔ اس لئے اللہ نے اس وقت فرشتوں کو یہ راز نہ بتایا تھا۔ جب اللہ نے آدم کو یہ راز بتایا اور فرشتوں کے سامنے جب چیزیں پیش کی گئیں تو وہ ان کے نام نہ بتا سکے۔ وہ یہ نہ جانتے تھے کہ مختلف چیزوں اور اشخاص کا نام رکھ کر الفاظ کے ذریعے انہیں بہ سہولت سمجھایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اس ناکامی کو دیکھ کر اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور اپنے عجز و درماندگی کا اقرار کیا اور کہہ دیا ان کا علم تو صرف انہی چیزوں تک محدود ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں دی ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم ؑ کا تعارف کرایا اور آخر میں نتیجہ بحث کے طور پر یوں انہیں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور وسعت علم کی طرف راہنمائی کی۔ "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں۔ جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اسے بھی میں جانتا ہوں۔"

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ڭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

"پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ" تو سب جھک گئے مگر ابلیس نے انکار کیا۔ وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔

پھر ہم نے آدم سے کہا کہ "تم اور تمہاری بیوی' دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ' مگر اس درخت کا رخ نہ کرنا' ورنہ ظالموں میں شمار ہو گے۔"

آخر کار شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انہیں اس حالت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ تھے۔ ہم نے حکم دیا کہ "اب تم سب یہاں سے اتر جاؤ' تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور وہیں گزر بسر کرنا ہے۔" اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا "پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ تو سب جھک گئے۔ اب ذرا اس مفسد اور خوں آشام مخلوق کی عزت افزائی دیکھئے کہ وہ کروبیوں کی مسجود ہو رہی ہے۔ فرشتوں سے بھی بلند ہو جاتی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ایک تو اسے معرفت الٰہی کا راز بخشا گیا دوسرے یہ کہ اسے ایک صاحب ارادہ مخلوق بنایا گیا ہے۔ انسان جس راہ کو اختیار کرنا چاہے آزادانہ اختیار کر سکتا ہے۔ غرض فطرت انسانی کی یہ دو رنگی اپنے ارادے پر اس کا اختیار اور اس کے ذریعے اپنے لئے راہ حیات کے تعین میں آزادی اپنی خاص کوششوں اور جدوجہد سے ہدایت انسانیت کی ذمہ داری اور اس فریضے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی قدرت وغیرہ وہ چیزیں ہیں جن میں اس کے اس عظیم اعزاز کا راز پوشیدہ ہے۔

چنانچہ اس تقریب میں باری تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے سب فرشتے آدم خاکی کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ڭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ "مگر ابلیس نے انکار کیا' وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔"

اس تقریب میں شریر مخلوق مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ خود ذات قدس کی بارگاہ میں باری تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہے اور صاحب فضیلت کے فضل اور اعزاز کا انکار کیا جاتا ہے۔ یہ شریر مخلوق گناہ پر مصر ہے اور فہم و فراست کے تمام دروازے اس کے لئے بند ہو جاتے ہیں۔

سیاق کلام سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ابلیس اگرچہ فرشتوں کے ساتھ رہتا تھا لیکن وہ ملائکہ میں سے نہ تھا کیونکہ اگر وہ فرشتوں میں سے ہوتا تو اسے سرتابی کی مجال نہ ہوتی کیونکہ فرشتوں کی توصفت اور خاصیت ہی یہ ہے کہ لَا يَعْصُونَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ "اللہ انہیں جو حکم دیتا ہے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے بلکہ انہیں جو حکم دیا جاتا ہے وہ اسے کر گزرتے ہیں۔" اگرچہ یہ استثنائی جملہ کہ "سب فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے" بظاہر یہ بتاتا ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا لیکن وہ چونکہ فرشتوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا اسی لئے سلسلہ کلام میں ایسی استثنائی گئی۔ عرب کہتے ہیں جَاءَ بَنُوْ فُلَانٍ اِلَّا اَحْمَدُ فلاں قوم کے لوگ سب آگئے مگر احمد حالانکہ احمد ان میں سے نہیں ہوتا بلکہ وہ ان کے جوار میں رہتا ہے۔ دوسری جگہ قرآن مجید اس کی تصریح بھی کرتا ہے کہ ابلیس جنوں میں سے تھا اور جنوں کو اللہ تعالیٰ نے آگ کے شعلے سے پیدا کیا ہے۔ اس سے یہ بات قطعیت کے ساتھ معلوم ہو جاتی ہے کہ وہ فرشتوں میں سے نہ تھا۔

اس تقریب کے بعد اب ہمارے سامنے میدان کارزار ہے جس میں خلیفہ شر ابلیس' اور خلیفہ خدا انسان ہے اور دونوں کے درمیان مسلسل جنگ ہو رہی ہے۔ یہ جنگ درحقیقت انسانی ضمیر اور اس کے دل و دماغ کے میدانوں میں لڑی جاری ہے۔ اور اس میں وہی انسان کامیاب ہوتے ہیں جو پختہ ارادے کے مالک ہوتے ہیں۔ وہی سرخرو ہوتے ہیں جو اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو مضبوطی سے تھام لیتے ہیں۔ جوں جوں انسان اپنی خواہشات نفس کا بندہ بنتا جاتا ہے اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا جاتا ہے۔ شر کی قوتوں کو پیش قدمی حاصل ہوتی جاتی ہے۔ وَ قُلْنَا

يَاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ "پھر ہم نے آدم سے کہا تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ مگر اس درخت کا رخ نہ کرنا ورنہ ظالموں میں شمار ہو گے۔" ...... آدم و حوا کے لئے جنت کے تمام پھل جائز قرار دیئے گئے' صرف ایک درخت کو مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔

صرف ایک درخت ...... شاید اس میں یہ اشارہ تھا کہ زمین میں نسل انسانی حلال و حرام کے قیود کی پابند ہوگی کیونکہ حدود و قیود کے بغیر آزاد اور خود مختار ارادہ پیدا کیونکر ہو سکتا ہے اور ایک متحرک بالارادہ انسان اور ایک مجبور حیوان کے درمیان فرق کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا تو اس بات کا امکان ہی نہیں رہتا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عائد شدہ حدود و قیود کی پابندی کے سلسلے میں انسان کو آزمایا جائے۔ یہ قوت ارادہ ہی ہے جو ایک حقیقی انسان اور ایک انسان نما حیوان کے درمیان فرق کر دیتی ہے جو مویشیوں کی طرح دنیا میں چرتا پھرتا ہے اور بس۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ "آخر کار شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انہیں اس حالت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ تھے۔" ...... ذرا تعبیر کا شاہکار دیکھئے۔ شیطان نے انہیں پھسلایا۔ "پھسلانے" کا لفظ ہی پوری صورت حال کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ گویا ہم چشم سر دیکھ رہے ہیں کہ شیطان انہیں دھکیل دھکیل کر جنت سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ گویا وہ اچانک ان کی ثابت قدمی کو دھکا دیتا ہے اور وہ گر جاتے ہیں اور نیچے آ رہتے ہیں۔

یہاں آدم و ابلیس کی کشمکش کا پہلا تجربہ مکمل ہو جاتا ہے۔ آدم علیہ السلام اپنے عہد کو بھول جاتے ہیں' وہ اس کے بہکانے کے سامنے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اللہ کا حکم سچائی بن کر سامنے آتا ہے اور قضائے الٰہی کا اعلان یوں ہوتا ہے۔

وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ "ہم نے حکم دیا کہ

اب تم یہاں سے اتر جاؤ' تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور وہیں گزر بسر کرنا ہے۔" یہ اعلان تھا کہ اب آدم و ابلیس کا معرکہ اپنی مقرر جگہ یعنی اس زمین پر شروع ہو جاتا ہے۔ اور اب یہ معرکہ تاقیامت یوں ہی برپا رہے گا۔

آدم علیہ السلام گرنے کے بعد اب سنبھلتے ہیں اور اٹھتے ہیں کیونکہ گرنا اور اٹھنا تقاضائے فطرت انسانی ہے۔ اب اللہ کی رحمت انہیں اپنے سایہ رحمت و عاطفت میں لے لیتی ہے اور جو بھی اللہ کی رحمت کے دامن میں پناہ لے اور اس کی چوکھٹ پر گر جائے یہ رحمت بے پایاں ہمیشہ اسے ڈھانپ لیا کرتی ہے۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ "اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی' جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" آدم اور نسل آدم کے ساتھ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک دائمی معاہدہ ہے۔ بات مکمل ہو گئی۔ آدم اس زمین پر اللہ کا ایک با اختیار اور ذی ارادہ خلیفہ قرار پایا۔ اس کا کام ہے کہ وہ فلاح کی راہ اختیار کرتا ہے یا ہلاکت و بربادی کی۔

( قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ
۴ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا
ع۱۰ ۴ بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾ )

"ہم نے کہا تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے' ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔ اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے' وہ آگ میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" یہاں آکر یہ معرکہ اپنے اصلی میدان' زمین کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اس وقت سے شروع ہے۔ لمحہ بھر کے لئے بھی ختم نہیں ہوتا۔ اور یوں انسان' آغاز انسانیت سے یہ راز پالیتا ہے کہ اگر وہ اس دنیا میں سرخروئی اور کامرانی چاہتا ہے تو اس کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟ اور اگر وہ ذلت و خواری چاہتا ہے تو اس کی راہ کون سی ہے؟

O......☆......O

لمحہ بھر کے لئے ذرا پیچھے کی طرف لوٹئے اور ابتدائی انسانیت کی اس دلچسپ کہانی کے بعض پہلوؤں کا جائزہ لیجئے۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔" معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام پہلے ہی اس زمین کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلے کیوں اسے جنت میں رکھا گیا ہے؟ کیوں ایک درخت کو حرام قرار دیا گیا؟ اسے "ابتلا" میں ڈالا گیا' یوں اسے زمین کی طرف اتار دیا گیا حالانکہ وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق پیدا ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ زمین پر فریضہ خلافت سرانجام دے؟

میں سمجھتا ہوں کہ کشمکش آدم و ابلیس کا یہ پہلا تجربہ کرایا ہی اس لئے گیا تھا کہ اس کے ذریعے آدم علیہ السلام کو کاروبار خلافت کے چلانے کے لئے تیار کیا جائے۔ اس طرح آدم علیہ السلام کی پوشیدہ قوتوں کو جگا دیا گیا۔ اسے لغزش کا تجربہ کرایا گیا اور اس کے نتیجے سے دوچار کیا گیا۔ اس کے بعد ندامت و شرمندگی' توبہ' دشمن کی پہچان اور اللہ کی مامون پناہ گاہ میں آنے کا طریقہ سکھایا گیا۔

شجر ممنوعہ کی کہانی' اس کے چکھنے کے لئے شیطان کی وسوسہ اندازی' انسان اول کا نسیان عہد' نسیان کے بعد ہوش میں آنا' پشیمانی اور

استغفار۔ یہ سب کیفیات و واردات ایسی ہیں جن کا تجربہ ہر انسان کو ہر لحظہ ہوتا رہتا ہے۔

اس انسان پر اللہ کی رحمت اور شفقت کا یہ تقاضا تھا کہ وہ اپنے دار الخلافہ میں تمام ایسے تجربات سے آراستہ ہو کر اترے۔ جن کا پیش آنا اس کی زندگی کا ایک اہم حصہ تھا۔ تاکہ وہ اس طویل اور نہ ختم ہونے والی کشمکش (کشمکش آدم و ابلیس) کے لئے تیار ہو اور یہ تجربہ اس کے لئے نصیحت آموز اور سامان عبرت ہو۔

آپ دوبارہ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ پھر یہ تجربہ کہاں ہوا؟ وہ جنت کون سی ہے جس میں آدم و حوا کچھ عرصے کے لئے قیام پذیر ہوئے؟ فرشتے کیا ہیں؟ ابلیس کی حقیقت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انہیں کیونکر خطاب کیا' اور انہوں نے کیونکر جواب دیا؟

بھائی! یہ اور ایسی تمام دوسری باتیں جو قرآن کریم میں مذکورہ ہیں دراصل یہ اللہ کے ان بھیدوں اور اسرار میں سے ہیں۔ جن کی حقیقت کا علم صرف اللہ ہی کو ہے' اللہ تعالیٰ جو علیم و حکیم ہے' وہ جانتا تھا کہ ان چیزوں کی حقیقی معرفت اور ان کی ماہیت معلوم کرنے سے انسان کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔" لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان چیزوں کی حقیقت معلوم کرنے اور ان کی اصلیت کا ادراک کرنے کی صلاحیت ہی نہیں دی۔ وہ ان کی ماہیت کا احاطہ کر ہی نہیں سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو مدرکات دیئے ہیں وہ صرف اس لئے دیئے ہیں کہ ان کے ذریعے انسان اس زمین میں کاروبار خلافت سرانجام دے۔ یہ مدرکات حقیقت مغیبات کا علم حاصل کرنے کے لئے استعمال ہی نہیں ہو سکتے۔ نیز فریضۂ خلافت کے لئے یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ ہم ان مغیبات کی حقیقت کو بھی جانتے ہوں۔ اللہ کے قوانین قدرت کو کس قدر انسان کے لئے مسخر کیا ہے۔ انسان کو کائنات کے اسرار و رموز کا کتنا علم دیا ہے؟ کتنے اسرار غیبیہ ہیں' جو اس کی نظروں سے اوجھل ہیں؟ یہ ایسی باتیں ہیں جن کے علم و ادراک کی حضرت انسان کو قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انسان کی حالت یہ ہے کہ اس کائنات کے بے شمار اسرار کا پردہ فاش کرنے کے باوجود' وہ اب بھی ان تمام واقعات و حوادث سے مطلقاً بے خبر ہے جو اگلے لمحہ نمودار ہونے والے ہیں۔ تمام مہیا اور میسرہ آلات...... اور ذرائع علم کے باوجود جو اسے میسر ہیں' وہ کچھ نہیں جانتا کہ اگلے لمحے میں کیا ہونے والا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ وہ جو سانس لے رہا ہے وہ آخری سانس لے رہا ہے یا اس کے بعد وہ دوسرا سانس بھی لے سکے گا۔ پردۂ غیب میں جو حقائق پوشیدہ ہیں یہ ان میں سے ایک ادنیٰ مثال ہے۔ غرض فریضۂ خلافت کی ادائیگی کے لئے اسے ان مغیبات میں سے کسی چیز کا جاننا بھی ضروری نہیں ہے' بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اگر انسان پر بعض اسرار کھول دیئے جائیں تو وہ اس کی کارکردگی پر الٹا اثر ڈالیں گے۔ چنانچہ ایسے پوشیدہ اسرار و رموز کی کئی قسمیں جو پردۂ غیب میں مستور ہیں اور اللہ کے سوا ان کا علم کسی کو بھی نہیں ہے۔

اس لئے عقل انسان کا یہ کام ہی نہیں ہے کہ وہ اس میدان میں سعی لاحاصل کرے۔ کیونکہ اس کے پاس وہ ذرائع اور آلات ہی نہیں جو اس میدان میں کام آتے ہیں۔ جو شخص بھی اس میدان میں جدوجہد کرے گا' اور اپنی قوتیں کھپائے گا' اس کی جدوجہد اکارت جائے گی۔ بالکل ضائع اور لاحاصل۔

جب عقل انسانی کو وہ ذرائع ہی حاصل نہیں جن کے ذریعے وہ عالم مغیبات کے بارے میں کسی چیز کا ادراک کر سکے تو پھر اسے کوئی حق نہیں ہے کہ وہ محض ہٹ دھرمی کر کے غیبی حقائق کا انکار کرے۔ کیونکہ کسی چیز کا انکار کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کے وجود کا علم حاصل ہو۔ اور مغیبات کا علم و ادراک عقل کا کام ہی نہیں ہے۔ نہ اس کے حیطۂ قدرت اور دائرہ کار میں یہ چیزیں آتی ہیں۔ اس کے پاس ان کے ادراک کے نہ وسائل ہیں اور نہ ہی عقل کو ان کے ادراک کی ضرورت ہے۔ اور نہ ہی عقل انسانی کا یہ دینی فریضہ ہے کہ وہ ان کا ادراک کرے۔

ہمیں یہ تسلیم ہے کہ وہمیات و خرافات کو تسلیم کرنا نہایت ہی خطرناک اور مضرات ہے' لیکن یہ بات اس سے بھی بدرجہا زیادہ مضر

اور خطرناک ہے کہ انسان ایک ایسی چیز کا انکار کرے جو اس کے علم کے دائرہ رسائی ہی سے باہر ہے۔ یا کسی حقیقت کو محض اس لئے مستبعد سمجھا جائے کہ وہ انسان کے حد ادراک اور حدود قدرت سے باہر ہے۔ اگر ہم علم ویقین کا یہ معیار مقرر کرلیں تو یہ ایک حیوانی معیار ہوگا گویا انسانیت پیچھے لوٹ کر دوبارہ حیوانیت کے مقام تک پہنچے گی۔ جہاں عالم محسوسات سے آگے کوئی چیز نہیں ہوتی اور جس کے لئے محسوسات کی چار دیواری سے نکل کر وجود مطلق تک پہنچنے کا امکان ہی نہیں ہے۔

لہٰذا ہمارے لئے بہتر یہی ہے کہ ہم اس عالم غیب کو اس ذات ہی کے حوالے کردیں جو اس دنیا کا مالک ہے' اور ہمارے لئے وہی کافی ہے جس کی اطلاع وہ ہمیں دے دے۔ صرف اسی قدر جس کی ہمیں اس دنیا میں ضرورت ہے جس سے ہماری روحانی اور مادی اصلاح ہوجائے اور بس!

اب ہم اس قصے کے ان پہلوؤں کو لیتے ہیں جو بعض انسانی اور تکوینی حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ عالم موجودات کا تصور' اس کا باہم ربط' انسانی مزاج اور اس کا معیار حسن وقبح وغیرہ۔ کیونکہ انہی پہلوؤں میں بشریت کی ہدایت اور منفعت کا سامان ہے۔

یہاں ظلال القرآن کی مناسبت سے' اختصار کے ساتھ ہم ان اشارات' تصورات اور حقائق پر ایک اچٹتی نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

۱۔ اس قصے سے یہاں جو بات واضح ہوتی ہے وہ مقام اور حیثیت ہے جو اسلامی تصور حیات' خود اس انسان کو عطا کرتا ہے یعنی اس کائنات میں اس کی اہمیت' ان اقدار کی اہمیت جن سے اسے پرکھا جاتا ہے اور زمین پر اس کے کردار کی اہمیت وغیرہ۔ پھر یہ کہ اسلامی تصور حیات انسان اور عہد ربانی کے درمیان تعلق کی کیفیت کیا ہے؟ اور اس عہد کی حقیقت کیا ہے جس کی بنیاد پر انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔

چنانچہ ملاء اعلیٰ میں تکریم انسانیت کی جو تقریب منعقد ہوتی ہے اور اس کے بعد جو عظیم الشان اعلان ہوتا ہے اس سے صاف صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلامی تصور حیات کے مطابق حضرت انسان کی قدر وقیمت کیا ہے؟ یعنی وہ ایک ایسی مخلوق ہے جسے زمین میں خلیفۃ اللہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس کا نہایت ہی واضح اظہار اس منظر سے ہوتا ہے جس میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کا حکم ہوتے ہی سب کروبی اس پتلۂ خاکی کے آگے سربسجود ہو جاتے ہیں۔ اس تقریب میں ابلیس انکار کرتا ہے اور راندہ درگاہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ آغاز سے انجام تک خاص ذات کبریائی کی نگرانی میں ہوتا ہے۔

انسان کے بارے میں جب یہ نقطۂ نظر اختیار کیا جاتا ہے تو نظریاتی دنیا اور عملی دنیا میں انسان کے اس تصور کے عظیم الشان اور گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

سب سے پہلا تصور یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان اس زمین کا مالک ہے۔ یہ اسی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس کائنات کی تمام چیزیں بھی اس انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ اس لئے وہ ہر مادی چیز سے زیادہ معزز زیادہ قیمتی اور زیادہ عزیز ہے۔ وہ دنیا کی تمام مادی اقدار سے بلند تر ہے۔ لہٰذا یہاں اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ کسی بڑے سے بڑے مادی مفاد' یا عظیم سے عظیم مادی ترقیات کے لئے انسان کو ذلیل و خوار ہونے دیا جائے۔ لہٰذا کسی قسم کی مادی تحقیقات و فتوحات' کسی قسم کی مادی پیداوار یا مادی عناصر میں سے کسی عنصر کی کثرت اور اس کے حصول کے لئے انسان کے انسانی اور اخلاقی عناصر ترکیبی میں سے کسی عنصر کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ تمام مادیات اور تمام مصنوعات' صرف انسان کی خاطر پیدا کی گئی ہیں۔ اس لئے کہ اس کی انسانیت پروان چڑھے اور بحیثیت انسان یہاں اس کی زندگی قائم رہ سکے۔ لہٰذا اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ محض انسانی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے اس کی اعلیٰ اقدار اور اس کی کرامت اور شرافت کے عناصر ترکیبی ہی کو خیرباد کہہ دیں اور انہیں ضائع کردیں۔

۲۔ اس کہانی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس زمین پر انسان ہی اول درجے کی موثر طاقت ہے۔ وہی ہے جو اس زمین کے رنگ ڈھنگ بدلتا ہے اور انسان کی معاشرتی زندگی میں وہی باہمی ربط و تعلق کی نوعیت متعین کرتا ہے۔ وہی ہے جو قافلۂ حیات کا قائد و سالار ہے اور سمت سفر کا تعین کرتا ہے۔ ذرائع پیداوار یا پیداوار کی تقسیم کے کسی نظام کو اس انسان کی قیادت کا مقام حاصل نہیں ہے۔ یوں کہ انسان کی نکیل ان کے ہاتھ میں ہو اور وہ ذلیل و خوار ایک حیوان کی طرح اس کے پیچھے پیچھے عالم بےبسی میں چلتا ہو جیسا کہ آج کل کے بعض مادی فلسفے اس کی ایسی ہی تصویر کھینچتے ہیں۔ اور جن کا نظریہ انسانیت یہ ہے کہ اس زندگی میں ـــــ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ان نظاموں میں جوں جوں مشین کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے' انسان کی انسانیت پامال ہوتی جاتی ہے۔

قرآن انسان کو بطور خلیفۃ اللہ فی الارض پیش کرتا ہے۔ نظام کائنات میں اسے ایک بنیادی اور موثر عامل سمجھتا ہے اور اسلامی نظام میں اس کی ایک اہمیت ہے۔ یہ اہمیت بحیثیت خلیفہ ہے ہے۔ خلافت فی الارض کی حقیقت کیا ہے؟ اسے اس ربط و تعلق کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے جو انسان کو بطور خلیفہ مختلف چیزوں سے ہے۔ آسمانوں سے' زمین سے' ہواؤں سے' بارشوں سے' سورج و سیاروں اور چاند ستاروں سے۔ غرض ان سب چیزوں کی تخلیق میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ یہ حیات انسانی کے لئے ممد اور سازگار ہوں اور ان کے لئے تعاون سے انسان زمین پر خلافت کی ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہو سکے۔ ذرا اس مقام بلند کو دیکھئے اور اس ذلیل و حقیر حیثیت کو دیکھئے جو اس کے لئے دنیا کے تمام مادی نظام ہائے زندگی مخصوص کرتے ہیں۔ اور اسے اجازت نہیں دیتے کہ وہ اس پست مقام سے دو قدم آگے بڑھ سکے۔

یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے کہ انسان کے لئے جو نظام زندگی تجویز کرتا ہے وہ یا تو اس اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق تجویز ہوتا ہے یا پھر اس مادی نقطۂ نظر کے مطابق تشکیل پاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں بلند انسانی اقدار کو یا تو عروج نصیب ہوتا ہے یا وہ پامال ہوتی ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات بن جاتا ہے یا ایک حقیر مشین اور آلہ۔ آج کی اس مادی دنیا میں محض مادی ترقی اور کثرت پیداوار کی خاطر ہر قسم کی انسانی آزادیوں' انسانی شرافتوں اور انسان کی انسانیت کو جو پامال اور برباد کیا جارہا ہے' وہ صرف اس نقطۂ نظر کا فطری نتیجہ ہے جو مادی نظامہائے حیات اس انسان کی حقیقت اور دنیا میں اس کی اہمیت کے بارے میں رکھتے ہیں۔

لیکن اس مادی دنیا کے برعکس انسان کی حقیقت اور اس کے مقصد تخلیق کے بارے میں اسلام جو تصور دیتا ہے' اس کے ترازو اور معیار میں آداب انسانیت کی قدریں بلند ہو جاتی ہیں' اخلاقی فضائل و محاسن اہمیت اختیار کر لیتے ہیں' انسان کی زندگی میں ایمان' نیکی اور اخلاص جیسی صفات اہمیت اختیار کر لیتی ہیں کیونکہ اسلامی تصور حیات کے مطابق یہی وہ اعلیٰ اقدار ہیں جن پر خلافت فی الارض کی ذمہ داری موقوف ہے۔

وَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ "پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے' تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے' ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہو گا۔" غرض یہ اقدار تمام مادی اقدار سے زیادہ قیمتی اور برتر ہیں۔ لیکن یہ بات بھی ہمارے ذہن میں رہنی چاہئے کہ ان مادی اقدار کا حصول بھی مقاصد خلافت فی الارض میں داخل ہے۔ اس حد تک کہ یہ مادی اقدار اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اقدار کے تابع ہوں اور بذات خود اصل مقاصد نہ بننے پائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام انسانی ضمیر کو پاک و صاف اور ایک اعلیٰ زندگی بسر کرنے پر آمادہ کرتا ہے' جبکہ تمام دوسرے مادی نظریات تمام روحانی اقدار کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور مادیت کے لئے آداب انسانیت تک کو قربان کر دیتے ہیں۔ اور یہ سب قربانی کس لئے دی جاتی ہے؟ محض ضروریات زندگی سامان تعیش کی فراوانی اور حیوانوں کی طرح شکم پروری کی خاطر!

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسلام کا تصور انسان کس قدر بلند ہے؟ ذرا اس کے اس پہلو پر غور کیجئے کہ اس کی رو سے انسان ایک بااختیار اور صاحب عزم و ارادہ مخلوق ہے۔ کیونکہ اگر وہ بااختیار اور ذی عزم نہیں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے معاہدے کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ کیونکہ اختیار ہی کی اساس پر انسان مکلف ہے اور جزاء و سزا کا مستحق ہے۔ اگر وہ اپنے ارادے کا پکا اور خواہشات نفسانیہ پر قابو پالیتا ہے تو اس طرح وہ فرشتوں سے بھی ارفع مقام حاصل کر سکتا ہے۔ وہ ہر اس کمزوری سے بچ سکتا ہے جس سے اسے سابقہ درپیش ہو۔ لیکن اگر اس عزم پر خواہشات نفسانیہ غلبہ پالیں، اس کی زندگی میں ہدایت پر ظلمت غالب آجائے اور وہ اپنے اس عہد الست کو بھول جائے جو اس نے اپنے خالق سے باندھا تھا تو وہ اس بلند مقام سے گر بھی سکتا ہے اور اپنے لئے شقاوت و نحبت کے تمام سامان بھی فراہم کر سکتا ہے۔

اسلامی نظام زندگی نے، اس کائنات میں انسان کو برتری اور شرافت کے جو اصول دیئے ہیں اس قصے میں ان کی صرف ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔ انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ سعادت و شقاوت، بلندی و پستی، ایک بااختیار بلند مرتبت انسان اور ایک مقید و مجبور حیوان جو قعر ذلت میں گرا پڑا ہو، ان دونوں کی راہیں کہاں سے جدا ہوتی ہیں۔

اس قصے میں بیان کردہ، واقعات کی تصویر کشی کے دوران یہ یاد دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ معرکہ آدم و ابلیس کی نوعیت کیا ہے؟ ایک طرف بندے اور خدا کا پیمان ہے اور دوسری جانب شیطان کی فتنہ انگیزی ہے۔ ایک طرف ایمان ہے اور دوسری جانب کفر ہے، ایک محاذ پر حق ہے اور دوسرے پر باطل ہے۔" ایک صف اہل ہدایت کی ہے اور دوسری اہل ضلال کی۔ لیکن میدان جنگ کہاں ہے؟ انسان اور اس کی زندگی۔ فاتح بھی انسان اور مفتوح بھی انسان۔ سود و زیاں کا یہ بازار خود اس کے ضمیر میں ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ اسے متنبہ کرتے ہیں کہ وہ ہروقت چوکنا رہے کیونکہ وہ ہروقت میدان کارزار میں ہے۔ صورتیں دو ہی ہیں یا تو وہ لٹ جائے گا اور یا مال غنیمت لے کر ظفریاب ہو گا۔

اس قصے میں اسلام کے تصور خطا اور توبہ کی وضاحت بھی کر دی جاتی ہے۔ گناہ چونکہ ایک فرد سے سرزد ہوتا ہے۔ لہذا توبہ بھی ایک انفرادی عمل ہے۔ یہ ایک ایسا واضح اور صاف نظریہ ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ اہل کنیسا کی طرح یہاں کسی ایسے تصور کی گنجائش نہیں ہے کہ انسان پیدا ہونے سے پہلے خطا کا مرتکب بن جاتا ہو۔ اسلام میں کسی لاہوتی کفارہ معاصی کا کوئی تصور نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ انسان کو آدم ؑ کے گناہ سے پاک کرنے کے لئے مصلوب ہوئے۔ یہ ایک غلط تصور ہے۔ حضرت آدم ؑ کی ایک لغزش ایک انفرادی عمل تھا۔ اور اس سے چھٹکارا پانے کا طریقہ بھی ایک انفرادی عمل ندامت اور توبہ تھا جو بالکل واضح اور صاف اور قابل فہم ہے۔ حضرت آدم ؑ کی اولاد میں سے ہر ایک خود اپنے کئے کا ذمہ دار ہے۔ اور سب کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ صاف اور سادہ اور آسان

## صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

ذرا غور کیجئے کہ کس قدر واضح اور دل لگتا تصور ہے یہ۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنا بوجھ اٹھائے۔ یہ تصور ہر انسان کو بھلائی کے حصول کی جدوجہد پر آمادہ کرتا ہے اور وہ یاس و قنوط کا شکار نہیں ہوتا کیونکہ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ "وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

اشارات قصہ آدم کا یہ صرف ایک پہلو ہے فی ظلال القرآن کے اس مقام پر ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔ صرف اس ایک پہلو ہی میں بے بہا حقائق اور صحت مند تصورات کا ایک عظیم خزانہ موجود ہے۔ اس قصے میں قیمتی اشارات و ہدایات کا ایک وافر ذخیرہ ہے۔

---

ا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سید محمد قطب کی کتاب انسان اسلام اور مادیت

اس میں اسلام کے تصور اجتماع اور طرز معاشرت کی بنیادیں متعین کردی گئی ہیں۔ اور جنہیں بھلائی' اخلاق اور دوسرے فضائل کے ذریعے استحکام بخشا گیا ہے۔ جب ہم اس پہلو پر غور و فکر کرتے ہیں تو ہمیں قرآنی قصوں کی اہمیت اور مقصدیت کا احساس ہوتا ہے کہ یہ قصے کس طرح اسلامی تصور حیات کی بنیادوں کو مضبوط کرتے ہیں۔ اور ان اعلیٰ اقدار کی وضاحت کرتے ہیں جو ان بنیادوں پر قائم ہوتیں ہیں جس کائنات کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور جو اللہ ہی کی طرف متوجہ ہے' اور جسے آخر کار اللہ ہی کی طرف جانا ہے' وہ اس بات کی مستحق ہے کہ اس میں وہی اقدار بلند ہوں جو اللہ کے ہاں بلند ہیں۔

معاہدہ خلافت انسانی دراصل ربانی ہدایت پہ قائم ہے۔ اس کی اہم شرط یہ ہے کہ انسان اسلامی نظام حیات کے مطابق زندگی بسر کرے گا۔ اس معاہدے کے بعد پوزیشن یہ ہو جاتی ہے کہ انسان ایک ذی ارادہ مخلوق کی حیثیت سے ایک دوراہے پر کھڑا ہے۔ ایک طرف اسے خدا پکار رہا ہے' اور وہ سن رہا ہے۔ اگر وہ فیصلہ کرتا ہے تو صراط مستقیم پر چل پڑتا ہے۔ دوسری جانب اسے شیطان پکار رہا ہے۔ وہ چاہے تو شیطانی راہ پر چل پڑے۔ بس یہی دوراہے ہیں۔ ان کے درمیان تیسری راہ نہیں ہے یا تو اللہ ہے اور یا شیطان' یا ہدایت ہے یا ضلالت..... یا حق ہے اور یا باطل..... اور یا فلاح ہے اور یا خسران..... یہ ہے حقیقت اور اسے قرآن کریم ہمیشہ بطور حقیقت اولیہ پیش کرتا ہے۔ عالم انسان کے سارے نظریات و تصورات اور طرزہائے زندگی بس صرف اس ایک حقیقت پر قائم ہیں۔

☆ ☆ ☆

# درس ۴ ایک نظر میں

یہاں آکر گفتگو کا رخ بنی اسرائیل کی طرف مڑ جاتا ہے۔ مدینہ طیبہ میں صرف انہوں نے دعوت اسلامی کا سختی سے مقابلہ کیا تھا۔ انہوں نے ظاہری اور خفیہ دونوں قسم کی تدبیروں کے ذریعے دعوت اسلامی کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اس کا مقابلہ کیا۔ وہ تحریک اسلامی کے خلاف پے در پے سازشیں کرتے رہے اور ظہور اسلام سے لے کر دعوت کے اس مرحلے تک ایک لمحہ بھر ان کی ریشہ دوانیوں میں کوئی کمی نہ آئی۔ انہیں اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ اقتدار کی کنجیاں ایک ایک کر کے مسلمانوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہی ہیں۔ جب سے اوس و خزرج کی لڑائیاں بند ہوئیں اور وہ راستے بند ہوئے جن کے ذریعے یہود مشرکین مدینہ کے اندر اثر و رسوخ پیدا کرتے اور ان پر اثر انداز ہوتے تھے' پھر جب مسلمانوں کے لئے' اس نئی کتاب کی بنیاد پر ایک نئے نظام زندگی کی تشکیل شروع ہوئی تو یہودیوں کو یہ احساس شدت سے ہو رہا تھا کہ اس نئی تحریک نے انہیں ادب و ثقافت اور معیشت و اقتصاد دونوں اہم شعبوں سے باہر نکال پھینکا ہے۔

غرض یہ ہے وہ معرکہ جو یہودیوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اول روز سے شروع کیا اور آج تک وہ جوں کا توں قائم ہے۔ آج بھی وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وہی اوچھے ہتھیار استعمال کر رہے ہیں جو اس وقت کر رہے تھے۔ ہتھیاروں کی شکل اگرچہ مختلف ہے' رنگ ڈھنگ نیا ہے۔ لیکن ان کی حقیقت اور مزاج بالکل وہی ہے..... یاد رہے کہ یہودی اسلام و مسلمانوں کے خلاف اس حقیقت کے باوجود یہ معاندانہ روش اختیار کئے ہوئے ہیں کہ انسانی تاریخ میں پوری دنیا اس قوم کو ہمیشہ دھتکارتی رہی۔ کبھی ادھر سے ادھر اور کبھی ادھر سے ادھر بھگایا جاتا رہا۔ اور یہ لوگ خاک چھانتے پھرے۔ صدیاں یونہی گزر گئیں لیکن بالآخر انہیں آرام اور چین کی زندگی عالم اسلام ہی میں نصیب ہوئی' جو سب کے لئے کھلا ہے اور جس میں عقیدہ و مذہب کی اساس پر کسی کے خلاف کوئی نفرت نہیں ہوا کرتی ہے۔ جہاں فرقہ وارانہ اور مذہبی فسادات کو ہمیشہ بری نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور جہاں ہر اس شخص کو آنے کی کھلی اجازت رہی ہے جو اسلام کو اذیت نہ دے اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں نہ کرتا ہو اور مسالم ہو کر رہے۔

توقع تو یہ تھی کہ یہود مدینہ' اس نئے رسول اور اس نئی دعوت کو سب سے پہلے قبول کرتے اور ایمان لاتے۔ جبکہ قرآن کریم اپنی عمومی حیثیت میں ان تمام تعلیمات کی تصدیق کر رہا تھا جو تورات میں بیان کی گئی تھیں۔ پھر ان کو ایک نئے رسول کی آمد کا انتظار بھی تھا۔ ان کو اس کے اوصاف معلوم تھے اور ان کے پاس کتب سماوی میں اس کے بارے میں بشارتیں موجود تھیں۔ اور وہ ہمیشہ اللہ سے دست بدعا ہوا کرتے تھے کہ وہ نبی منتظر کے طفیل انہیں مشرکین عرب پر ظفریاب کرے۔

یہ سبق' بنی اسرائیل کے ساتھ قرآن کی وسیع گفتگو کا پہلا حصہ ہے۔ بنی اسرائیل کے ساتھ یہ گفتگو درحقیقت ان کے موقف کی تردید اور ان کی سازشوں کو طشت ازبام کرنے کے لئے ان پر ایک ہمہ گیر تنقیدی حملہ ہے اور یہ بطور مجبوری اور ضرورت اس وقت شروع کیا گیا ہے۔ جب دعوت اسلامی نے' مدینہ میں آکر' انہیں اسلام کی طرف بلانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دی' ان پر حجت تمام کر دی اور انہیں اس جدید تحریک کی طرف راغب کرنے کے لئے تمام ذرائع استعمال کر لئے گئے۔

اس سبق کا آغاز باری تعالیٰ کی اس جلیل القدر پکار سے ہوتا ہے جس میں باری تعالیٰ انہیں اپنی نعمتیں یاد دلاتا ہے' انہیں پکارا جاتا ہے کہ وہ اپنے عہد کو پورا کریں تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے اس عہد کو پورا کرے' جو اس نے ان کے ساتھ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں بطور تمہید' پہلے خوف خدا اور تقویٰ و طہارت کی طرف بلاتا ہے اور اس کے بعد انہیں دعوت دیجاتی ہے کہ وہ اس کتاب اور ہدایت کو قبول کر لیں جو ان

تمام کتابوں اور ہدایات کی تصدیق کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود ان کی طرف اتاری ہیں۔ انہوں نے قرآن کریم کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا اللہ تعالیٰ اس کی مذمت کرتا ہے' اور انہیں اس بات کی نصیحت کرتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے نہ ہوں جو سب سے پہلے اس کتاب کے منکر بنے۔ ان کی اس روش کی بھی مذمت کی جاتی ہے کہ وہ حق کو چھپاتے ہیں اور حق و باطل کو باہم مشتبہ بناتے ہیں تاکہ لوگوں کو راہ راست سے بھٹکائیں۔ بالخصوص مسلمانوں کو۔ اور اسلامی جماعت کی صفوں میں فتنہ کھڑا کریں اور انتشار پھیلائیں۔ نیز جو لوگ نئے نئے حلقہ بگوش اسلام ہو رہے تھے ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پھیلائیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں مشورہ دیتا ہے کہ وہ ان فتنہ انگیزیوں کو چھوڑ کر اسلامی جماعت میں شریک ہو جائیں۔ مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھیں' زکوٰۃ ادا کریں اور نظام جماعت قائم کریں اور اپنے آپ کو اس نئے دین میں ضم کر دینے کے مشکل کام میں صبر اور نماز سے مدد لیں۔ اللہ ان کی اس روش پر سخت تنقید کرتا ہے کہ وہ مشرکین کو تو یہ کہتے ہیں کہ وہ ایمان لے آئیں لیکن خود ایمان نہیں لاتے اور نہ اس دین کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کو وہ نعمتیں یاد دلائی جاتی ہیں جن سے انہیں' ان کی پوری تاریخ میں نوازا جاتا رہا تھا۔ دوران گفتگو حاضرین بنی اسرائیل کو یوں مخاطب کیا جاتا ہے کہ گویا حضرت موسیٰ ؑ کے عہد میں خود یہ لوگ وہاں موجود تھے' جو آج مدینہ میں موجود ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل ایک ہی امت ہیں اور صدیوں تک وہ ایک ہی قومیت اور اسی جبلت پر جمے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اس کے بعد بھی وہ ہر دور میں ویسے ہی رہے اور انہیں خصوصیات کے حامل رہے۔

اس کے بعد انہیں اس دن یعنی یوم قیامت سے ڈرایا جاتا ہے جہاں کوئی نفس کسی دوسرے کا بدلہ نہ دے سکے گا۔ کسی کی کوئی سفارش نہ چلے گی نہ کسی سے کسی قسم کا فدیہ اور معاوضہ قبول ہو گا اور اس دن تمام لوگ بے یارو مددگار ہوں گے' اور کوئی انہیں قیامت کے عذاب سے بچانے والا نہ ہو گا۔

اب ان کے سامنے وہ منظر پیش کیا جاتا ہے کہ جب اللہ نے انہیں فرعون سے نجات دی۔ یہ منظر کشی ایسی ہی کہ گویا نظارہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ پھر ان انعامات کا ذکر ہوتا ہے جو پے در پے ان پر ہوتے رہے۔ ان کے سروں پر بادلوں کے سائے کئے جاتے ہیں۔ من و سلویٰ سے ان کی تواضع کی جاتی ہے اور پتھروں کا دل چیر کر ان کے لئے پانی فراہم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد انہیں شرم دلائی جاتی ہے کہ ان انعامات کے بدلے میں وہ پے در پے کیا کیا سرکشیاں اور کیا کیا خرمستیاں کرتے رہے۔ جب اللہ تعالیٰ ان کی ایک غلطی معاف کرتے تو وہ دوسری میں جا پڑتے' ایک مصیبت سے نجات دیتے تو وہ اپنے لئے دوسری کا سامان کر دیتے۔

لیکن بنی اسرائیل بھی تو بنی اسرائیل تھے۔ وہی فساد اور کینہ پروری' وہی کجروی اور گمراہی اور اس پر اصرار۔ ہمیشہ انہوں نے اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی کی۔ امانت میں خیانت کی۔ عہد کو پختہ باندھنے کے بعد توڑا۔ اللہ تعالیٰ اور پیغمبروں کے ساتھ کئے ہوئے ہر میثاق کو انہوں نے بالائے طاق رکھا۔ وہ یہاں تک آگے بڑھے کہ بغیر کسی جواز کے پیغمبروں کو قتل کرنے لگے۔ رب کی آیات کو جھٹلانے لگے۔ بچھڑے کو پوجنے لگے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کی گستاخی اس حد تک پہنچ گئی کہ انہوں نے اس وقت تک ایمان لانے سے انکار کر دیا جب تک وہ اپنی آنکھوں سے اللہ کو نہ دیکھ لیں۔ ذرا غور کیجئے کہ اس کے بعد یہ لوگ اللہ کے حکم کی صریح خلاف ورزی کرتے ہیں اور گاؤں میں داخل ہوتے وقت وہ الفاظ ادا نہیں کرتے' جو اللہ تعالیٰ نے انہیں بتائے تھے' اور جس کے ادا کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ احکام سبت کی خلاف ورزی کرتے رہے۔ عہد طور کو تو صاف بھول گئے۔ جس گائے کو ذبح کرنے کا اللہ نے حکم دیا تھا' اس میں ٹال مٹول کرنے لگے اور مجادلہ اور مباحثہ شروع کر دیا۔

غرض یہ سب کام یہ لوگ اس ادعاء کے ساتھ کرتے رہے کہ بس ہدایت یافتہ امت اگر کوئی ہے تو بس وہ صرف یہودی اور بنی

اسرائیل ہی ہیں۔ قیامت میں اللہ میاں تو صرف بنی اسرائیل ہی سے راضی ہوں گے۔ تمام دین باطل ہیں۔ تمام دوسری امتیں گمراہ ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم اس پہلی تنقیدی گفتگو ہی میں اس کی تردید کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ دوسری امتوں میں سے جو لوگ بھی اللہ تعالیٰ' یوم آخرت پر ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے تو ان کے رب کے نزدیک ان کے لئے اجر ہے۔ ان پر نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ انہیں کسی چیز کا حزن و ملال ہو گا۔

بنی اسرائیل پر یہ بھرپور وار یا بعد میں سورت کے مباحثے کے ضمن میں آنے والی تنقیدیں' وقت کی اہم ضرورت تھی۔ اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ بنی اسرائیل کے تمام کھوکھلے دعووں کی قلعی کھول دی جائے اور ان کی تمام سازشوں سے پردہ اٹھایا جائے اور مسلمانوں کو ان تمام سازشوں اور مکاریوں سے آگاہ کر دیا جائے' جو ان کی جدید سوسائٹی کے خلاف کی جا رہی تھیں۔ ان کے دل و دماغ میں وہ اصول بٹھا دیئے گئے جن کی بنا پر بنی اسرائیل یہ سازشیں کرتے پھرتے۔ نیز مسلمانوں کو اس خلفشار اور فتنہ انگیزی کا مقابلہ کرنے کے لئے متحد ہو جانے کی ترغیب دی گئی۔

تاریخ بنی اسرائیل پر یہ تنقید اس لئے بھی ضروری تھی کہ خود مسلمان متنبہ ہو جائیں۔ انہیں معلوم ہو جائے کہ خلافت ارضی کے اس نئے منصب میں ان کے سامنے کیا کیا دشواریاں ہیں؟ کہاں کہاں پھسلنے کا خطرہ ہے؟ اس سلسلے میں سابقہ مقتدر امتوں سے کیا کیا لغزشیں ہوئیں اور جس کی وجہ سے وہ منصب خلافت سے محروم ہوئیں اور اس زمین میں اللہ کی امانت کے قیام و نگہبانی کا جو شرف انہیں حاصل تھا وہ کس طرح انہوں نے گنوایا۔ اور انسانی قیادت کا نظام کس طرح اور کن اسباب کی بناء پر ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ غرض اس پوری تنقیدی بحث میں کہیں تو کھل کر اور کہیں اشاروں اشاروں میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اس راہ اور اس منصب میں ان کے سامنے کیسے کیسے مشکل مقامات آئیں گے؟ جہاں لغزشوں اور پھسلنے کا سخت اندیشہ ہو گا۔ جیسا کہ اس بحث کے دوسرے حصے میں بھی ایسی ہی تنبیہیں ہوں گی۔

مدینہ طیبہ میں امت مسلمہ کو ان تنبیہات اور ہدایات کی اشد ضرورت تھی' جیسا کہ ہمیشہ اور ہر وقت اور ہر زمانے میں امت مسلمہ کو ان ہدایات کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ آنکھیں کھول کر گہرے اور بصیرت افروز احساس کے ساتھ قرآن کریم کا مطالعہ کریں اور بزرگ و برتر قیادت کی ان ہدایات اور تعلیمات کو اپنائیں۔ جو اس نے اپنے پرانے دشمنوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے مسلمانوں کو دیں۔ مسلمانوں کو ہمیشہ اچھی طرح یہ معلوم ہونا چاہئے کہ انہوں نے ان جدی دشمنوں کی ان سازشوں اور مکاریوں کا مقابلہ کس طرح کرنا ہے' جو یہ دشمن نہایت ہی خفیہ ذرائع اور گہرے فریب کارانہ طریقوں سے اسلامی معاشرہ کے خلاف کرتے ہیں۔ جس شخص کا دل نور ایمان سے منور نہ ہو اور جو ظاہر و باطن اور خفیہ و اعلانیہ غرض اپنی پوری زندگی میں اس بزرگ و برتر قیادت خداوندی سے ہدایات نہیں لیتا' وہ کبھی بھی ان خفیہ راستوں اور ناپاک راستوں اور زیر زمین ذرائع کا پتہ نہیں لگا سکتا جن کے ذریعے یہ خطرناک اور ناپاک سازشیں اسلامی معاشرے میں گھس آتی ہیں۔

اس بحث میں قرآن کریم کی طرز ادا کی فنی اور نفسیاتی ہم آہنگی کا ایک خاص پہلو قابل لحاظ ہے۔ تاریخ بنی اسرائیل کی یہ بحث قصہ خلافت آدم کے اختتام کے متصلاً بعد شروع ہو جاتی ہے۔ یہ بحث اس ذہنی پس منظر میں شروع ہوتی ہے جس کی طرف ہم نے قصہ آدم و ابلیس میں اشارے کئے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے اسلوب ادا میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ پیش کئے جانے والے قصے اور اس ماحول

---

دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن "قرآن مجید کے قصے"

کے درمیان مکمل مطابقت اور ہم آہنگی ہو جس میں قصہ پیش ہو رہا ہوتا ہے۔

ذرا پیچھے لوٹئے' دوران بحث یہ کہا گیا تھا کہ "اللہ تعالیٰ نے اس زمین کی تمام مخلوقات کو تم انسانوں کے لئے پیدا کیا ہے۔" اس کے بعد زمین میں خلافت آدم کا قصہ شروع ہوتا ہے اور آدم اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک اعلانیہ معاہدہ ہوتا ہے۔ آدم کو فرشتوں پر فضیلت دی جاتی ہے۔ اس کے بعد' آدم کو وصیت کرنا' بھول چوک' توبہ و ندامت' ہدایت الٰہی اور مغفرت الٰہی کے مضامین آتے ہیں اور آدم ؑ کو جنت ہی میں شر کی قوتوں اور خیر کی قوتوں کی اس طویل اور نہ ختم ہونے والی کشمکش کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے' جو اس دنیا میں تاقیامت جاری رہنی تھی۔ خیر' اصلاح اور تعمیر کی قوتیں ایک ایسے انسان کی شکل میں پیش ہوتی ہیں جو مومن ہے اور اللہ کی رسی کو تھامے ہوئے ہے اور شر' فساد اور تخریب کی قوتیں ابلیس کی صورت میں مجسم کھڑی ہیں۔

یہ تمام باتیں کرنے کے بعد' اب بنی اسرائیل پر تنقید شروع ہو جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے کس طرح اللہ سے پختہ عہد باندھا اور پھر اسے توڑا۔ ان پر کن کن نعمتوں کی بارشیں ہوئیں اور انہوں نے ان کی ناشکری کی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین میں منصب خلافت سے محروم کر دیا اور ذلت و مسکنت کو ان پر مسلط کر دیا۔ مومنین کو ان کی مکاریوں سے آگاہ کیا گیا اور بتایا گیا کہ اپنی تاریخ میں ان سے کیا کیا لغزشیں سرزد ہوئیں؟ یہاں آکر زمین پر خلیفہ بنانے اور اس کے بعد بنی اسرائیل کو خلیفہ بنانے کے درمیان ایک واضح معنوی ربط پیدا ہو جاتا ہے اور سیاق کلام واضح طور پر باہم مربوط ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم کے پیش نظر یہاں یہ مقصد نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کی قومی تاریخ پیش کرے بلکہ وہ اس تاریخ کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور مناسب اختصار یا مناسب بسط سے۔ اس طویل تاریخ کے بعض مناظر پیش کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ سے پہلے قرآن مجید کی تمام مکی سورتوں میں بھی یہ قصہ بار بار آتا ہے۔

لیکن وہاں اس قصے کے بیان سے مطلوب یہ تھا کہ مکی زندگی کے پر آشوب دور میں مسلمانوں کی قلیل جماعت کی ڈھارس بندھائی جائے۔ اس وقت مطلوب یہ تھا کہ آغاز کائنات سے آج تک قافلۂ اہل ایمان کے وعوتی تجربات' مسلمانوں کی اس قلیل جماعت کے سامنے پیش کئے جائیں اور مکہ مکرمہ میں اسے جو مرحلہ درپیش تھا اس کے تقاضوں کے مطابق اسے ہدایات دی جائیں لیکن یہاں (مدینہ میں) مقصد یہ تھا کہ یہودیوں کی ریشہ دوانیوں اور برے ارادوں سے مسلمانوں کو آگاہ کیا جائے اور اسلامی جماعت کو متنبہ کیا جائے کہ یہودیوں کے ارادے کیا ہیں اور انہیں بروئے کار لانے کے لئے ان کے پاس وسائل کیا ہیں؟ نیز امت مسلمہ کو متوجہ کیا جا رہا ہے کہ خود وہ بھی انہی کوتاہیوں اور کمزوریوں میں مبتلا نہ ہو جائیں جن میں اس سے قبل یہودی مبتلا ہو چکے تھے۔ چونکہ مکہ مکرمہ میں اور مدینہ طیبہ میں مقاصد بالکل مختلف تھے' اس لئے قرآن کریم نے یہاں قصہ بنی اسرائیل کو مختلف اسلوب میں اور مختلف پہلوؤں سے پیش کیا۔ اگرچہ جو حقائق پیش کئے گئے وہ یہاں اور وہاں بالکل ایک ہی تھے۔ یعنی بنی اسرائیل کی گمراہی اور جادۂ مستقیم سے انحراف۔ (جب مکی سورتوں پر بحث ہو گی جو ترتیب نزول کے اعتبار سے بقرہ سے پہلے نازل ہوئیں تو وہاں ہم اس نکتے کی مزید وضاحت کریں گے۔)

بنی اسرائیل کا قصہ قرآن کریم میں جہاں بھی آیا ہے' اس کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس سیاق و سباق میں اسے پیش کیا

---

ف مشہور مستشرق گولڈ زیہر نے قرآن کریم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ مکہ مکرمہ میں یہودیوں کے بارے میں قرآن کریم کا رویہ نرم تھا لیکن مدینہ طیبہ میں قرآن کریم نے یہودیوں پر سخت تنقید شروع کر دی لیکن جیسا کہ سید قطب نے وضاحت کر دی' دونوں مقامات پر مقاصد مختلف تھے مکہ مکرمہ میں بنی اسرائیل پر تنقید کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ مستشرقین جب اسلامی لٹریچر کا مطالعہ' اپنے کج ذہن کے ساتھ شروع کرتے ہیں تو ان کو اسلام میں تضاد ہی تضاد نظر آتا ہے۔

گیا ہے وہ اس سے ہم آہنگ ہے۔ اور اس مقام کے مقاصد و مطالب اور فکری ہدایات و توجہات کا تکملہ ہے۔ یہاں بھی یہ قصہ سیاق و سباق سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ یہاں پہلے انسان کے شرف اور اس کی کرامت کا مضمون بیان ہوا۔ اس کے بعد انسان اور اللہ کے درمیان عہد اور انسان کی جانب سے بھول چوک کے مضامین آئے' جن میں بطور اشارہ یہ بتایا گیا کہ انسانیت ایک اکائی ہے۔ اس کی جانب آنے والے رسول اور ان کا پیش کردہ دین بھی ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں۔ دوران کلام نفس انسانی اور اس کے عناصر ترکیبی کی طرف بھی جابجا اشارہ کیا گیا اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان عناصر ترکیبی کو نظرانداز کرنے اور ان سے انحراف کے عواقب و نتائج کیا ہوں گے؟ جن پر انسان کے خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کا دارومدار ہے اور جن کی اہمیت یہ ہے کہ جو شخص ان کا انکار کرے گا' وہ اپنی انسانیت کا منکر بن جائے گا' وہ ان اسباب کو گم کردے گا جن کی بنا پر اسے خلافت فی الارض کا منصب ملا' نتیجتاً" انسان دوبارہ حیوانیت کے ارذل مقام میں جا گرے گا۔

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کا قصہ سب سے زیادہ آیا ہے۔ اس قصے کے مختلف مقامات اور نصیحت آموز پہلو بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے اللہ تعالیٰ کا وہ حکیمانہ اسلوب تربیت معلوم ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو خلافت کبریٰ کے منصب کے لئے تیار کرنے اور اس کی تعلیم و تربیت کے مقصد کے لئے اختیار فرمایا۔

اس اجمالی بحث کے بعد اب ہم چاہتے ہیں کہ قرآنی آیات پر تفصیلی نظر ڈالیں۔

☆ ☆ ☆

# درس ۴ تشریح آیات

(۴۰ تا ۴۶)

يٰبَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِىْٓ
اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَ اِيَّاىَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ
وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّ اِيَّاىَ
فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾
وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ
بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَ
اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ۭ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ
يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ الربع

۵ ع ۷ ۵

اے بنی اسرائیل، ذرا خیال کرو میری اس نعمت کا جو میں نے تم کو عطا کی تھی۔ میرے ساتھ تمہارا جو عہد تھا اسے تم پورا کرو تو میرا جو عہد تمہارے ساتھ تھا اسے میں پورا کروں' اور مجھ ہی سے تم ڈرو۔ اور میں نے جو کتاب بھیجی ہے اس پر ایمان لاؤ۔ یہ اس کتاب کی تائید میں ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی لہٰذا سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بن جاؤ۔ تھوڑی قیمت پر میری آیات کو نہ بیچ ڈالو اور میرے غضب سے بچو۔ باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو۔ نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو اور جو لوگ میرے آگے جھک رہے ہیں ان کے ساتھ تم بھی جھک جاؤ۔ تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لئے کہتے ہو' مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔ کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے؟ صبر اور نماز سے مدد لو' بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے۔ مگر ان فرماں بردار بندوں کے لئے مشکل نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انہیں اپنے رب سے ملنا اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

جو لوگ بھی بنی اسرائیل کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں' وہ حیران رہ جاتے ہیں کہ باری تعالیٰ نے اس قوم کو کن کن نعمتوں سے نوازا۔ اور یہ کہ نعمتوں کی اس مسلسل بارش کے مقابلے میں وہ کس مکروہ انداز میں بار بار حق کا انکار کرتے رہے۔ یہاں ابتداء میں اللہ تعالیٰ اجمالاً ان نعمتوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو اس نے ان پر کیں۔ اس کے بعد آنے والے پیراگرافوں میں بالتفصیل ان کا ذکر آتا ہے۔ یہ انعامات انہیں اس لئے یاد دلائے جاتے ہیں تاکہ انہیں اس بات کی دعوت دی جائے کہ جو عہد تم نے اللہ سے باندھا تھا اسے پورا کرو تاکہ اللہ تعالیٰ

اپنے انعامات کا سلسلہ جاری رکھے اور اپنی پوری نعمتوں سے انہیں نواز دے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ "اے بنی اسرائیل! ذرا خیال کرو میری اس نعمت کا جو میں نے تم کو عطا کی تھی‘ میرے ساتھ تمہارا جو عہد تھا اسے پورا کرو‘ تو میرا جو عہد تمہارے ساتھ تھا اسے میں پورا کروں۔"

یہاں جس عہد کا ذکر ہو رہا ہے‘ وہ کون سا عہد ہے؟ کیا اس سے "عہد اول" مراد ہے یعنی جو اللہ تعالیٰ اور حضرت آدم ؑ کے درمیان طے پایا تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ ھُدًى فَمَنْ تَبِعَ ھُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ "پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے‘ تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے‘ ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہو گا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے‘ وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں‘ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" یا یہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ کئے ہوئے‘ اس عہد الٰہی سے بھی پہلے کا وہ تکوینی عہد ہے‘ جو اللہ تعالیٰ اور فطرت انسانی کے درمیان تشکیل پایا‘ جس میں فطرت کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ وہ اللہ کی معرفت حاصل کرے۔ اور صرف اللہ وحدہ لاشریک کی پیروی کرے۔ یہ فطری معاہدہ تو ایسا ہے جو بیان اور برہان کا محتاج نہیں ہے کیونکہ انسانی فطرت اپنی حقیقت اور لدنی میلانات کی بنا پر ہی خود بخود معرفت کردگار کی طرف متوجہ ہوا کرتی ہے۔ صرف گمراہی اور فساد فطرت ہی کی وجہ سے انسان معرفت الٰہی سے غافل ہو جاتا ہے۔ یا یہ عہد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم‘ بنی اسرائیل کے جد اعلیٰ کے ساتھ کیا اور جس کا ذکر اسی سورت میں عنقریب ہو گا۔ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَـمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ "یاد کرو جب ابراہیم ؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا۔ تو اس نے کہا "میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔" ابراہیم ؑ نے عرض کیا" اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے۔" اس نے جواب دیا "میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔" (۲-۱۲۴) یا یہ بنی اسرائیل کا وہ مخصوص عہد ہے جو اللہ نے ان کے ساتھ اس وقت طے کیا‘ جبکہ کوہ طور ان کے سروں پر لٹک رہا تھا اور اللہ نے انہیں حکم دیا کہ جو ہدایات انہیں دی جا رہی ہیں‘ وہ سختی سے ان پر عمل کریں اور جس کا ذکر بنی اسرائیل پر اس طویل تنقید کے ضمن ہی میں (۲-۹۳) آ رہا ہے۔

یہ تمام عہد‘ اپنی اصلیت کے لحاظ سے ایک ہی ہیں۔ ان سے مدعا یہ ہے کہ اللہ کے بندے دل و جان سے اس کی طرف متوجہ ہوں‘ اپنی پوری زندگی کو اس کے حوالے کر دیں‘ اللہ کا دین ایک ہی ہے اور تمام انبیاء جو پیغام لے کر آئے‘ وہ ایک ہی ہے یعنی دین اسلام اور آغاز کائنات سے لے کر آج تک قافلۂ ایمان‘ اسی دین کو شعار بنا کر چلتا رہا ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ اسرائیل کو دعوت دیتے ہیں کہ ان معاہدوں کی پابندی کرتے ہوئے وہ اس سے ڈریں اور اپنے اندر صرف اسی کی خشیت پیدا کریں۔ وَاِيَّاىَ فَارْھَبُوْنِ ۝ "اور مجھ ہی سے تم ڈرو۔"

بنی اسرائیل کو دعوت دی جاتی ہے کہ ان معاہدوں کا تقاضا پورا کرتے ہوئے وہ اللہ کے نازل کردہ کلام پر ایمان لائیں‘ جو ان کی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو ان کے پاس ہیں‘ وہ اس کلام کا انکار کرنے اور کفر کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیں کیونکہ ان کے لئے مناسب تو یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے اس پر ایمان لاتے۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ "اور میں نے جو کتاب بھیجی ہے‘ اس پر ایمان

لاؤ۔ یہ اسی کتاب کی تائید میں ہے' جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی۔ لہٰذا سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بن جاؤ۔"

اسلام' جسے اب حضرت محمد ﷺ اپنی آخری صورت میں لے کر آئے ہیں' وہ وہی لازوال دین ہے جو ہمیشہ اللہ کی جانب سے آتا رہا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وہ مسلسل پیغام ہے اور آغاز انسانیت سے یہ اللہ اور انسان کے درمیان ایک معاہدہ ہے۔ اس سے پہلے بھی اس نے پوری انسانیت کو اپنے سایہ عاطفت میں لیا اور آئندہ بھی وہ انسانیت کا ہادی و رہبر ہو گا۔ یہ دین عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کو باہم ملاتا ہے۔ اور مستقبل کی انسانیت کے لئے اللہ تعالیٰ کو جو خیر اور بھلائی مطلوب تھی' اس کا اضافہ کرتا ہے۔ یہ دین اب پوری انسانیت کو ایک لڑی میں پروتا ہے اور انہیں باہم متعارف بھائی بھائی قرار دیتا ہے۔ وہ انسانیت کو مختلف گروہوں' جماعتوں' نسلوں اور اقوام کی صورت میں تقسیم نہیں کرتا' بلکہ وہ ان سب کو اللہ کے ایسے بندوں کی صورت میں منظم کرتا ہے جو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں جو تمام انسانیت سے آج تک ناقابل تغیر ہے۔

اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو اس بات سے روکتے ہیں کہ وہ اس کتاب کا انکار محض دنیاوی مفادات کی خاطر نہ کریں جبکہ وہ ان تمام کتابوں کی تصدیق بھی کرتی ہے' جو تمہارے پاس ہیں۔ وہ زندگی کی مصلحتوں اور ذاتی اغراض کی خاطر' اس سچائی کو رد نہ کریں' بالخصوص احبار اور مذہبی راہنما جو محض اس لئے اسلام قبول کرنے سے ہچکچاتے تھے کہ انہیں معاشرے میں سیادت و قیادت کا جو مقام حاصل تھا' وہ چلانہ جائے اور جو مالی مفادات وہ حاصل کر رہے تھے' وہ بند نہ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں نصیحت کرتا ہے کہ وہ اللہ کا خوف کریں۔ ایسے برے اور گھٹیا خیالات دل میں نہ لائیں وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ تھوڑی قیمت پر میری آیات کو نہ بیچ ڈالو اور میرے غضب سے بچو۔"

دام و درم' مال و دولت اور دنیاوی مفادات کی بندگی یہود کا قدیم وصف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں مالی مفادات سے یہودیوں کے مذہبی رہنماؤں کے وہ مفادات مراد ہوں' جو وہ دینی خدمات' جھوٹے فتوؤں اور روسائے یہود کو شرعی سزاؤں سے بچانے کی خاطر' آیات الٰہی میں تحریف کرنے کے عوض حاصل کرتے تھے۔ جیسا کہ قرآن کریم کے دوسرے مقامات پر اس کی تفصیلات آئی ہیں۔ ان تمام مفادات کی حفاظت کرنے کے لئے یہ لوگ اپنی قوم کو اسلام میں داخل ہونے سے روکتے تھے کیونکہ اس صورت میں اس بات کا خطرہ تھا کہ ان کے ہاتھ سے قیادت اور سرداری چلی جائے۔ نیز جیسا کہ بعض صحابہ اور تابعین نے اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں تصریح کی ہے' کہ یہ دنیا پوری کی پوری ثمن قلیل ہے۔ کیونکہ آیات الٰہی پر ایمان لے آنے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں قیامت کے دن اہل ایمان کا جو بہتر انجام ہونے والا ہے' اس کے مقابلے میں اس پوری دنیا کی بلکہ اس پوری کائنات کی حقیقت ہی کیا ہے۔

اگلے فقرے میں انہیں ان کی دوسری بری خصلت سے روکا جاتا ہے' ان کی عادت تھی کہ وہ باطل کو حق کا رنگ دے کر پیش کرتے تھے اور سچائی کو چھپاتے تھے' حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اسلامی معاشرے کے اندر فکری انتشار پیدا ہو اور مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات کا ایک طوفان کھڑا ہو جائے۔ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ O

"باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو۔" یہودیوں نے ہر موقع اور ہر مناسبت میں سے حق کو چھپایا' اس میں باطل کی رنگ آمیزی کی اور جب بھی انہیں موقع ملا انہوں نے انسانیت کو دھوکہ دینے کی پوری کوشش کی۔ اس لئے قرآن کریم نے بار بار ان کی اس صفت اور عادت کی تفاصیل کو بیان کیا۔ وہ اسلامی معاشرہ اور اسلامی جماعت میں ہمیشہ فتنے اور اضطرابات پیدا کرتے رہتے تھے۔ خلفشار اور انتشار پیدا کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ چنانچہ ان کے اس کردار کی کئی مثالیں اسی

سورت میں آگے بیان کی گئی ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں دعوت دیتے ہیں کہ بد بخت قافلۂ ایمان جارہا ہے' اس میں شامل ہو جاؤ' جماعت کا ساتھ دو' ورنہ مٹ جاؤ گے' مذموم تعصبات کو چھوڑ دو اور اس انفرادیت کو ترک کر کے مسلمانوں کے ساتھ اجتماعی عبادات اور فرائض ادا کرو۔ اس لئے کہ علیحدگی پسندی زمانہ قدیم سے یہودیوں کی عادت مستمرہ چلی آرہی ہے۔ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ O

"نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو اور جو لوگ میرے آگے جھک رہے ہیں' ان کے ساتھ تم بھی جھک جاؤ۔" اس کے بعد یہودیوں کو عموماً اور ان کے مذہبی پیشواؤں کو خصوصاً اس بات کی تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ مشرکین اہل عرب میں اپنے آپ کو ایمان کا داعی کہتے ہیں اور اہل کتاب ہونے کی حیثیت سے وہ ایسے ہیں بھی' اس لئے کہ وہ مشرکین کے مقابلے میں اہل توحید ہیں' لیکن اس کے باوجود' خود اپنی قوم کو' اللہ کے اس دین پر ایمان لانے سے روکتے ہیں' جو تمام سابق ادیان کی تصدیق کرتا ہے۔ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ O "تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لئے کہتے ہو' مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو' حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔" اگرچہ ابتدا میں یہ آیت اس وقت کے بنی اسرائیل کے اندر موجود کمزوریوں کی عکاسی کر رہی ہے' تاہم یہ نفس انسانی اور بالخصوص ہر مذہب و ملت کے دینی پیشواؤں کے لئے سرمہ بصیرت ہے۔ کسی قوم اور ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ نہ کسی خاص نسل اور زمانے تک محدود ہے۔

جب کوئی دین ایک زندہ اور موجزن نظریۂ حیات کے بجائے محض ایک پیشہ اور کاروبار بن جاتا ہے تو دین کے پیشواؤں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی زبان سے جو کچھ کہتے ہیں' وہ ان کے دل میں نہیں ہوتا' وہ بھلائی کا وعظ کرتے ہیں اور خود کار دیگر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ لوگوں کو بر اور تقویٰ کی دعوت دیتے ہیں' لیکن بر و تقویٰ جس چیز کا نام ہے' وہ خود انہیں چھو کر بھی نہیں گزری ہوتی۔ وہ سیدھی بات کو غلط معنی پہنا کر بتنگڑ بناتے ہیں' نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے قطعی نصوص میں تاویلات کرتے ہیں۔ وہ ایسی ایسی حسین تاویلات اور ایسے ایسے مدلل فتوے میدان میں لاڈالتے ہیں' جو بظاہر آیات و نصوص کے ظاہر مفہوم سے بالکل موافق ہوتے ہیں لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے دین کی حقیقت اور اصلیت ہی سے کوسوں دور ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ یہ لوگ اپنے مفادات اور دلی خواہشات کے لئے کرتے ہیں اور ان لوگوں کی خاطر جو یا تو مالدار ہوتے ہیں یا اہل اقتدار۔ یہودیوں کے مذہبی پیشوا یہی کام کرتے تھے۔

لوگوں کو بھلائی کی طرف دعوت دینا' اور پھر اپنی عملی زندگی میں خود' اس کے خلاف چلنا' ایک ایسا مرض ہے اور ایک ایسی وبا ہے جو نہ صرف یہ کہ خود داعیوں کے دلوں میں شبہات و شکوک پیدا کر دیتی ہے' بلکہ دعوت بھی اس سے مشکوک ہو جاتی ہے۔ قول و فعل کے اس تضاد کی وجہ سے لوگوں کے دلوں اور ان کے افکار میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے' کیونکہ لوگ کانوں سے تو بہترین بات سنتے ہیں لیکن آنکھوں سے قبیح ترین افعال دیکھتے ہیں۔ قول و فعل کا یہ تضاد دیکھ کر وہ بے چارے حیران رہ جاتے ہیں۔ ان کے ایمان نے یہ دعوت وہ وعظ سن کر جو دیا ان کی روحانی دنیا میں روشن کیا تھا' وہ بجھ جاتا ہے۔ دلوں سے ایمان کی روشنی ختم ہو جاتی اور جب انہیں مذہبی پیشواؤں میں سے کوئی عقیدت نہیں رہتی' تو اس کے نتیجے میں پھر خود دین سے ان کا اعتماد جاتا رہتا ہے۔

داعی بے عمل کی بات بے جان ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی چنگاری ہوتی ہے جو دوسروں تک پہنچتے پہنچتے بجھ جاتی ہے۔ ایسے داعیوں کی بات بے اثر ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ بات مقفیٰ مسجع' چکنی چپڑی اور جوش و خروش سے پر ہو کیونکہ یہ بات ایسے دل سے نکلی ہی نہیں جو اس پر یقین رکھتا ہو۔ اثر تو اسی بات میں ہوتا ہے جو دل سے نکلتی ہے۔ دل سے جو بات نکلتی اثر رکھتی ہے۔ ایک داعی اپنی بات کا صحیح مومن اسی

وقت ہی ہو سکتا ہے' جب وہ اپنے کردار کے اعتبار سے اس بات کی تفسیر اور ترجمہ ہو' جو دعوت وہ دے رہا ہے' وہ خود اس کی زندگی کی صورت میں عملاً مجسم ہو۔ جب کوئی انسان اس معیار تک پہنچ جاتا ہے' تو پھر لوگ اس پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس پر یقین کرتے ہیں۔ اگرچہ اس کی باتیں چکنی چپڑی نہ ہوں اور اس کی تقریر دھواں دھار نہ ہو کیونکہ اس صورت میں اس بات کے اندر زور اس کی چرب لسانی سے نہیں بلکہ اس کی واقعیت اور حقیقت پسندی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت کلام کی صداقت ہی اس کا حسن ہوتا ہے۔ چرب لسانی سے زور کلام پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود قول و فعل کے درمیان تطابق' ایمان و عمل کے درمیان ہم آہنگی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ کوئی آسان طریقہ نہیں ہے جسے بسہولت اختیار کر لیا جائے۔ اسے حاصل کرنے کے لئے سخت ریاضت اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے تعلق باللہ' اللہ کی اعانت و توفیق اور اس کی ہدایات سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ عملی زندگی کے مختلف احوال' اس کی ضروریات اور اس کی مجبوریاں' انسان کو اپنے دلی معتقدات سے یا ان باتوں سے جن کی طرف اسے دوسرے لوگ بلا رہے ہوتے ہیں' دور پھینک دیتی ہیں۔ یہ انسان' خواہ کسی عظیم قوت کا مالک کیوں نہ ہو' جب تک مالک الملک اور قادر مطلق ہستی کا دامن نہیں تھامے گا کمزور اور ناتواں ہی رہے گا۔ کیونکہ شر' فساد اور انسان کے لئے گمراہ کن شیطانی قوتیں ہر طرف جال پھیلائے ہوئے ہیں۔ اگرچہ انسان بسااوقات اور بار بار ان پر غالب آسکتا ہے لیکن جونہی کسی لمحہ وہ کمزوری دکھاتا ہے' تو گر جاتا ہے' ذلیل ہو جاتا ہے۔ اپنے ماضی' حال اور مستقبل سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ لیکن جب انسان کا اعتماد اس ازلی اور ابدی طاقت پر ہوتا ہے' تو پھر اس کی قوت کے کیا کہنے' وہ ہر چیز پر غالب آجاتا ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں اور اپنی خواہشات نفس تک کو مغلوب کر لیتا ہے۔ وہ اپنی ضروریات اور اپنی مجبوریوں پر بھی غالب آجاتا ہے۔ وہ ان تمام قوتوں پر غالب آجاتا ہے جو اس کا سامنا کرتی ہیں۔

اس لئے قرآن کریم یہاں پہلے تو یہود کو اس طرف متوجہ کرتا ہے' کیونکہ روئے سخن ان کی طرف ہے اور پھر ان کے بعد پوری دنیا کو اس طرح متوجہ کرتا ہے کہ وہ اس مشکل کام اور کٹھن معرکے کو سر کرنے کے لئے صبرو ثبات اور نماز و نیاز سے مدد حاصل کریں۔ یہودیوں سے مطلوب یہ تھا کہ مذہبی خدمات' یا پوری دنیا کا مال و منال جو انہیں حاصل تھا' اسے متاع قلیل سمجھیں اور اس کے مقابلے میں حق کو ترجیح دیں۔ کیونکہ مدینہ میں اپنی مذہبی حیثیت اور مذہبی معلومات کی وجہ سے وہ اس سچائی و صداقت کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس لئے ان کا فرض ہے کہ جلد قافلۂ ایمان کے ہمرکاب ہو جائیں کیونکہ وہ پہلے سے لوگوں کو ایمان کی طرف بلا رہے ہیں۔ چونکہ یہودیوں کی طرف سے کوئی ایسا فیصلہ کرنے کے لئے قوت و شجاعت کی ایک بڑی مقدار کی ضرورت تھی' اس لئے انہیں حکم دیا گیا کہ وہ صبرو ثبات اور نیاز نماز سے مدد لیں۔

وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ "نماز اور صبر سے مدد لو' بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے' مگر ان فرمانبردار بندوں کے لئے مشکل نہیں ہے' جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔"

میں سمجھتا ہوں کہ انہا کی ضمیر شان ہے (یعنی کسی فرد کی طرف اشارہ نہیں بلکہ صورت حال کی طرف اشارہ ہے) یعنی صورت حال یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو اعتراف حق کی دعوت دینا' جبکہ اس کی راہ میں ایسی رکاوٹیں کھڑی ہوں' بڑا مشکل اور جاں گسل کام ہے۔ یہ صرف ان بزرگوں کے لئے آسان ہے جو اپنے دلوں میں اللہ کی خشیت رکھتے ہوں اور اس کے مطیع فرمان ہوں۔ جنہیں اللہ کی خشیت اور اس کے تقویٰ کا اچھی طرح شعور ہو' اور جنہیں پورا یقین ہو کہ انہیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صبر و ثبات سے مدد لینے کی اشد ضرورت انسان کو بار بار پیش آتی ہے۔ یہ ہر مصیبت اور ہر مشقت کا درماں ہے۔ یہ ہر مشکل کا حل ہے اور انسان کے لئے مشکل ترین کام یہ ہے کہ وہ قیادت اور ریاست کے منصب سے نیچے اتر آئے' حق و سچائی کی خاطر اپنے مفادات اور کسب و کمائی پر لات مار دے اور سب چیزوں سے بے نیاز ہو کر حق کا اعتراف کرے اور اس کے تابع ہو جائے۔

سوال یہ ہے کہ انسان اس کام میں نماز سے کس طرح مدد لے؟

نماز در حقیقت بندے اور اس کے رب کے درمیان ایک خاص ملاقات ہے۔ اس سے دل غذا لیتا ہے اور روح ایک خاص تعلق کا احساس کرتی ہے۔ اس کے اندر نفس انسانی کے لئے وہ سروسامان ہے' جو دنیا کے تمام مال و متاع سے زیادہ قیمتی ہے۔ نبی ﷺ کی حالت یہ تھی کہ جب کوئی معاملہ انہیں پریشان کرتا تو آپ نماز کی طرف لپکتے تھے' حالانکہ آپ ﷺ کا حال یہ تھا اپنے رب سے' آپ ﷺ ہروقت جڑے رہتے تھے' آپ کی روح ہر وقت وحی اور الہام سے مربوط تھی۔ یہ سرچشمہ خیر و برکت اب بھی ہر مومن کی دسترس میں ہے' جسے زاد راہ کی طلب ہو' جو سخت گرمی میں شراب بارد کا خواہاں ہو' جو ایسے حال میں مدد کا طلب گار ہو' جب ہر قسم کی مدد منقطع ہو گئی ہو اسے زاد راہ کی ضرورت ایسے حال میں پیش آئے جبکہ اس کا توشہ دان خالی ہو۔

اللہ کی طرف پلٹ کر جانے کا یقین (قرآن کریم میں بارہا ظن اور اس کے مشتقات یقین کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ نیز عربی زبان میں بھی علی العموم ظن کا استعمال یقین میں ہوتا ہے) اور ہر معاملے میں پلٹ کر اس کی طرف جانے کا یقین ہی انسان کے اندر صبر و استقلال پیدا کرتا ہے۔ تقویٰ اور بھلائی کی حس اسی پر موقوف ہے۔ دنیاوی اقدار اور اخروی اقدار کے درمیان صحیح توازن اسی یقین کا مرہون منت ہے۔ ان اقدار کا توازن جب درست ہو جاتا ہے۔ ترازو کی ڈنڈی جب سیدھی ہو جاتی ہے تو پھر انسان کو یہ تمام دنیا' متاع قلیل اور ایک حقیر چیز نظر آتی ہے۔ تب جا کر آخرت صحیح نظر آتی ہے اور پھر کوئی عقلمند آدمی اسے ترجیح دینے اور اختیار کرنے میں ایک لمحہ بھر تردد نہیں کرتا۔

جب انسان اس نہج پر قرآن کریم میں غور و فکر کرتا ہے تو یہ ہدایات جو ابتدائی اسرائیل کو دی گئی تھیں' سب کے لئے دائمی ہدایات بن جاتی ہیں۔

چنانچہ بنی اسرائیل کو دوبارہ پکارتے ہوئے' دوبارہ انہیں اپنی نعمتیں یاد دلاتے ہوئے اور آنے والی تفصیلات سے پہلے' اجمالاً انہیں آنے والی گھڑی سے ڈراتے ہوئے' اللہ تعالیٰ انہیں اس طرح خطاب کرتے ہیں۔

يَٰبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتِىَ ٱلَّتِىٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّى فَضَّلْتُكُمْ
عَلَى ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿٤٧﴾ وَٱتَّقُوا۟ يَوْمًا لَّا تَجْزِى نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَلَا يُقْبَلُ
مِنْهَا شَفَٰعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤٨﴾

"اے بنی اسرائیل یاد کرو میری اس نعمت کو' جس سے میں نے تمہیں نوازا تھا اور اس بات کو کہ میں نے تمہیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت عطا کی تھی۔ اور ڈرو اس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا' نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی' نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی۔"

بنی اسرائیل کو تمام مخلوق پر فضیلت دینا' اس وقت کی بات ہے جب وہ صحیح معنوں میں' اس زمین پر اللہ کے نائب اور خلیفہ تھے' لیکن جب انہوں نے اپنے رب اور مالک کے احکامات سے منہ پھیر لیا' اپنے انبیاء کی نافرمانی کرنے لگے' اللہ نے ان پر جو انعامات کئے تھے ان کی ناشکری کی اور پھر یہ کہ انہوں نے اللہ سے جو عہد کر رکھے تھے' اور جو ذمہ داریاں لے رکھی تھیں ان کا پورا کرنا ترک کر دیا' تو اللہ تعالیٰ نے بھی فیصلہ کیا کہ اب وہ ہمیشہ کے لئے ملعون مغضوب اور ذلیل و خوار رہیں گے۔ ان کی جلاوطنی اور دربدر ہونے کا فیصلہ ہوا اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے۔

انہیں یہاں یاد دلایا جاتا ہے کہ ایک وقت وہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ان پر یہ فضل و کرم تھے اور وہ دنیا کی افضل تر قوم تھے۔ یہ بات انہیں بطور ترغیب سنائی جا رہی ہے کہ اب پھر ان کے لئے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کے مواقع ہیں۔ یوں کہ وہ اس نئے قافلۂ ایمان میں شامل ہو جائیں۔ دعوت اسلامی کا ساتھ دیں۔ اللہ کے عہد میں دوبارہ داخل ہو جائیں اور اللہ نے ان کے آباؤ اجداد کو جو فضیلت دی تھی اس کا شکر وہ بھی ادا کریں اور اب مومنین کو جو مقام عنایت ہو رہا ہے' اس میں وہ بھی شریک ہو جائیں۔

لیکن اس ترغیب کے ساتھ ساتھ اور فضل و کرم اور نعمت عظیمہ کی یاد دہانی کے ساتھ ساتھ آنے والے دن کی ترہیب و تخویف بھی آتی ہے جس میں لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا "کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا"

کیونکہ قیامت کے دن ہر شخص فرداً اپنے اعمال کا صلہ پائے گا۔ وہاں حساب انفرادی طور پر ہو گا' ہر کوئی صرف اپنے کئے کا جوابدہ ہو گا' کوئی شخص کسی کے کام نہ آ سکے گا۔ یاد رہے کہ شخصی مسؤلیت' دنیا و آخرت میں اسلام کا ایک زریں اور عظیم اصول ہے۔ شخصی مسؤلیت کا یہ اصول' انسان کے آزاد ارادہ اور اختیار تمیزی پر قائم ہے۔ اور اس کے مطابق ہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے عالمگیر عدل و انصاف ہو گا۔ یہی وہ اصول ہے' جو انسان کے اندر' اس کے ذی شرف ہونے کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اور اس سے اس کے دل میں دائمی بیداری کا جذبہ موجزن رہتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں انسان کی تہذیب اور تربیت کے لئے بے حد مفید ہیں۔ نیز ان سے ان انسانی قدروں میں اضافہ ہوتا ہے' جن کی بنا پر اسلام نے انسان کو اشرف المخلوقات کا مقام دیا ہے۔

وَلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ "نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہو گی' نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا" اس دن جو شخص ایمان اور عمل صالح کا توشہ لے کر نہ آئے اس کے حق میں کوئی سفارش نہ ہو گی۔ کفر اور معصیت کی معافی کے لئے کوئی فدیہ نہ لیا جائے گا۔ وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ "اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی۔" اس دن عذاب الٰہی سے انہیں نجات دینے کے لئے کوئی ناصر و یاور نہ ہو گا۔ کوئی نہ ہو گا جو انہیں اس کے عذاب سے نجات دلا سکے۔ اس آخری فقرے میں لفظ جمع سے سب کو یکجا بیان کیا گیا۔ یعنی وہ تمام لوگ جو ایک دوسرے کے کام نہ آ سکیں گے' اور جن کی سفارش ایک دوسرے کے بارے میں قبول نہ ہو گی' اور ایک دوسرے کے بارے میں ان سے فدیہ نہ لیا جائے گا' ابتدائے آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا' لیکن آخر میں کلام کا اسلوب خطاب سے غائبین کی طرف چلا گیا' تاکہ یہ اصول عام ہو جائے اور وہ لوگ جن سے خطاب کیا جا رہا ہے وہ اور دوسرے سب لوگ اس میں شامل ہو جائیں۔

اس کے بعد قرآن کریم ایک ایک کر کے اللہ کے ان انعامات کا تذکرہ کرتا ہے جو ان پر ہوتے رہے ہیں اور یہ بتاتا ہے کہ انہوں نے ان انعامات کے مقابلے میں کیا طرز عمل اختیار کیا؟ کس طرح انہوں نے انکار کیا' کفر کیا اور راہ راست سے ہٹ گئے؟ فرعون کی غلامی اور اس کے دردناک مظالم سے انہیں نجات دینا ان احسانات میں سے چونکہ عظیم ترین احسان تھا' اس لئے یہاں سب سے پہلے اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ
وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾ وَ اِذْ فَرَقْنَا
بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾

"یاد کرو وہ وقت جب ہم نے تم کو فرعونیوں کی غلامی سے نجات بخشی۔ انہوں نے تمہیں سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا' تمہارے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس حالت میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔" یہاں اس کربناک صورت حال کو ان کے پردہ ذہن پر دوبارہ اجاگر کیا جا رہا ہے' جس میں ان کے آباؤ اجداد فرعون کے زمانے میں مبتلا تھے۔ کیونکہ یہ لوگ ان بنی اسرائیل کی اولاد تھے جو اس عذاب میں مبتلا ہوئے۔ تعذیب اور مظالم کی تصویر کشی کے بعد' اللہ تعالیٰ ان کے سامنے وہ منظر بھی پیش فرماتے ہیں' جس سے انہیں نجات دی گئی۔ انہیں کہا جاتا ہے ذرا اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تمہیں فرعونیوں سے نجات دی' جو تمہیں مسلسل عذاب میں مبتلا کئے ہوئے تھے۔ يَسُوْمُوْنَ کے معنی ہیں "ہمیشہ تمہیں عذاب میں رکھتے تھے۔" یہ لفظ سام الماشیتہ "اس نے مویشیوں کو ہمیشہ چرنے والے (سائمہ) بنایا۔" گویا فرعونیوں نے ان مظالم کو بنی اسرائیل کے لئے ایک قسم کی غذا بنا دیا تھا' جو انہیں مسلسل کھلائی جاتی تھی۔ اس کے بعد اس عذاب کی ایک خاص قسم کا ذکر کیا جا رہا ہے یعنی وہ مردوں کو ذبح کرتے تھے۔ اور عورتوں کو زندہ رکھتے تھے تاکہ بنی اسرائیل کی قوت کم ہو۔

اس سے پہلے کہ بنی اسرائیل کی نجات کے واقعے کی تفصیلات پیش ہوں انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ مصیبت بنی اسرائیل کے لئے ابتلائے عظیم تھی۔ تاکہ ان کے احساس و شعور' بلکہ ہر اس مسلمان کے احساس و شعور میں جو کسی مصیبت میں مبتلا ہو' یہ بات بیٹھ جائے کہ اللہ کے بندوں پر مصائب کا آنا دراصل ان کے لئے ابتلا و امتحان ہوتا ہے۔ انہیں آزمائشوں اور فتنوں میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ جو شخص ابتلا کی اس حقیقت کو سمجھتا ہے وہ سختی اور مصیبت سے فائدہ حاصل کرتا ہے' وہ اپنے اس شعور کی وجہ سے مصائب و شدائد سے کچھ حاصل ہی کر لیتا ہے۔ رنج و الم میں مبتلا شخص اگر یہ جانتا ہے کہ اس کا امتحان لیا جا رہا ہے اور اس کے بعد اس سختی سے' اسے فائدہ ہی پہنچنے والا ہے تو یہ رنج و الم اس کے لئے بے فائدہ نہیں ہوتے۔ جب آدمی اس تصور کے ساتھ مصیبت کی زندگی گزار رہا ہو تو اس کی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ بالخصوص جبکہ ان دردناک تجربات کے دوران حاصل ہونے والے ثبات اور علم و معرفت کو پیش نظر رکھا جا رہا ہو۔

نیز جبکہ یہ احساس بھی ہو کہ اللہ کے ہاں اس مصیبت کا اجر محفوظ ہے اور اللہ کے سامنے سلسلہ عجز و نیاز بھی جاری ہو اور اس کی جانب سے نجات کی پوری امید بھی ہو اور اس کی رحمت و شفقت سے کسی قسم کی مایوسی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مصیبت بنی اسرائیل کے ذکر کے ساتھ ہی یہ فرما دیا

وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ O "اور اس حالت میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔"

اس کے بعد بنی اسرائیل کے قصۂ نجات کی تمہید شروع ہوتی ہے۔

وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ

"یاد کرو وہ وقت' جب ہم نے سمندر پھاڑ کر تمہارے لئے راستہ بنایا' پھر اس میں سے بخیر تمہیں گزار دیا' پھر وہیں تمہاری آنکھوں کے

سامنے فرعونیوں کو غرقاب کیا۔" اس نجات کی تفصیلات سورۂ بقرہ سے پہلے نازل ہونے والی مکی سورتوں میں بالتفصیل آچکی تھی یہاں ان لوگوں کو جو تفصیلات سے واقف تھے 'محض یاد دہانی کے طور پر بتایا جارہا ہے۔ مخاطب اس قصے کی تفصیلات کو جانتے تھے 'قرآن کریم سے یا اپنے محفوظ قصوں یا مذہبی کتابوں کی وساطت سے۔ یہاں ان کے سامنے دوبارہ اس نجات کی تصویر کشی کی جارہی ہے تاکہ وہ اسے پردہ خیال پر لاکر اس سے متاثر ہوں۔ انداز بیان تو دیکھئے کہ گویا مخاطب خود دیکھ رہے ہیں کہ دریا پھٹ رہا ہے اور ان کی آنکھوں کے سامنے بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں دریا کو پار کر رہے ہیں۔ قرآن کریم کا یہ اسلوب بیان 'یعنی منظر کشی کے ذریعے مخاطب کو متاثر کر دینا' وہ خاص معجزانہ اسلوب بیان ہے جو قرآن کے لئے مخصوص ہے۔[1] اب گفتگو کا سلسلہ خروج بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ بنی اسرائیل مصری غلامی سے نجات پاچکے ہیں۔

وَإِذْ وٰعَدْنَا مُوسَىٰٓ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنۢ بَعْدِهِۦ وَأَنتُمْ ظٰلِمُونَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنكُم مِّنۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٢﴾ وَإِذْ ءَاتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿٥٣﴾ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِۦ يٰقَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُم بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوٓا۟ إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿٥٤﴾

"یاد کرو' جب موسیٰ کو ہم نے چالیس شبانہ روز کی قرارداد پر بلایا' تو اس کے پیچھے تم بچھڑے کو اپنا معبود بنا بیٹھے۔ اس وقت تم نے بڑی زیادتی کی تھی مگر اس پر بھی ہم نے تمہیں معاف کیا کہ شاید اب تم شکر گذار بنو۔

یاد کرو کہ (ٹھیک اس وقت جب تم یہ ظلم کر رہے تھے) ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان عطا کی تاکہ تم اس کے ذریعے سیدھا راستہ پاسکو۔

یاد کرو' جب موسیٰ (یہ نعمت لئے ہوئے پلٹا تو اس) نے اپنی قوم سے کہا کہ "لوگو! تم نے بچھڑے کو معبود بناکر اپنے اوپر سخت ظلم کیا ہے' لہٰذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو' اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے۔ اس وقت تمہارے خالق نے تمہاری توبہ قبول کرلی کہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل کا بچھڑے کو خدا بنالینا' اور اس کی پوجا کرنا' جبکہ موسیٰ علیہ السلام چالیس دن کے لئے کوہ طور پر گئے تھے' سورۂ بقرہ سے پہلے نازل ہونے والی سورت' سورت طٰہٰ میں بالتفصیل بیان ہوا ہے۔ یہاں صرف انہیں اس کی یاد دہانی کرائی جارہی ہے کیونکہ وہ اس کی تفصیلات سے خوب واقف ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں یاد دلا رہے ہیں کہ ان کی حالت یہ تھی کہ نبی کے اوجھل ہوتے ہی بچھڑے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ حالانکہ نبی نے انہیں فرعونیوں کے دردناک عذاب سے محض اللہ تعالیٰ کے نام پر رہائی دلائی تھی۔ اللہ تعالیٰ یہاں ان کے موقف پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ وَأَنتُمْ ظٰلِمُونَ "اور تم ظالم تھے۔" اس سے بڑا ظلم اور

[1] دیکھئے التصویر الفنی فی القرآن۔ فصل "قرآن کا انداز بیان"

کون ہو گا جو اللہ کی بندگی ترک کر کے اپنے پیغمبری وصیت کو بھلا کر' ایک بچھڑے جیسے جسم کی پوجا شروع کر دے' حالانکہ اللہ ہی تھا جس نے اسے ان لوگوں کی غلامی سے نجات دی جو گائے کے بچھڑے کو مقدس سمجھتے تھے۔

لیکن اس کے باوجود اللہ انہیں معاف کر دیتے ہیں۔ ان کے نبی کو کتاب ہدایت' تورات دیتے ہیں جس میں جو کچھ لکھا تھا وہ حق و باطل کے درمیان فرقان تھا۔ اس امید پر کہ شاید یہ لوگ گمراہی کو چھوڑ کر واضح حق کو قبول کر لیں۔

لیکن پھر بھی اس بات کی ضرورت تھی کہ سنگدلی سے ان کی تطہیر کی جائے۔ کیونکہ ان کی بگڑی ہوئی فطرت کو صرف ننگی تلوار اور سخت ترین عذاب کے ذریعے ہی سیدھا کیا جا سکتا تھا۔ ان کی فطرت کا تقاضا تھا کہ ان کے لئے سزا بھی سخت ہو اور انوکھی بھی۔ چنانچہ حکم ہوا وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰی بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ "یاد کرو' جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ لوگو! تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر سخت ظلم کیا ہے' لہٰذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو' اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے۔" اپنے آپ کو قتل کرو تاکہ اسے بھی پاک کر دے اور خود اپنے آپ کو بھی پاک کر دے۔ تم میں سے فرمانبردار مجرم قتل کرے۔ اس سخت عذاب اور شدید کفارہ کے بارے میں روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ بے شک یہ ایک جانگسل اور روح فرسا ذمہ داری تھی کہ بھائی بھائی کو قتل کرے۔ گویا وہ خود اپنے آپ کو قتل کرے۔ لیکن ان کے اس بگڑے ہوئے مزاج اور بزدلانہ طبیعت کی تربیت کے لئے یہ ضروری تھا کیونکہ ان کا مزاج ہر شر پر مائل تھا۔ اور کسی ناپسندیدہ فعل کے کر گزرنے سے وہ نہ چوکتے تھے۔ اگر وہ ناپسندیدہ امور سے رکنے کی صلاحیت رکھتے تو نبی کے غیر حاضر ہوتے ہی وہ بچھڑے کی پوجا پر نہ چل پڑتے۔ ان کا علاج یہ تھا۔ کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ ان کے لئے مناسب یہی تھا کہ وہ اس قسم کا بھاری بھرکم تاوان ادا کریں تاکہ انہیں کچھ نفع ہو' اور بگڑے ہوئے مزاج کی تربیت ہو۔

لیکن اس سزا کے بعد پھر اللہ کی رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے۔ فَتَابَ عَلَیْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝ "اس وقت تمہارے خالق نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

لیکن بنی اسرائیل بھی تو بنی اسرائیل تھے وہ موٹا دماغ رکھنے والے دنیا پرست تھے اور عالم غیب اور آخرت ان کی نظروں سے اوجھل اور مستور تھا۔ اس لئے انہیں صرف یہی سوجھتا ہے کہ رویت الٰہی کا مطالبہ کر دیں اور جنہوں نے یہ مطالبہ کیا وہ کوئی عام لوگ بھی نہ تھے' بلکہ ان میں سے ستر مختار اور برگزیدہ لوگ تھے جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے ملاقات کے موقع پر پوری قوم سے چنا تھا اور ساتھ لے گئے تھے۔ جس کی پوری تفصیل' اس سے پہلے کی کئی آیات میں بیان ہو چکی ہے۔ غرض بنی اسرائیل نے علانیہ اللہ کو دیکھنے سے پہلے' ایمان لانے سے صاف صاف انکار کر دیا۔ قرآن کریم یہاں بنی اسرائیل کے آباؤ اجداد کی گستاخی کو نقل کر کے یہ بتانا چاہتا ہے کہ زمانہ قدیم سے یہ قوم ضد اور ہٹ دھرمی میں جتلا چلی آ رہی ہے اور ان کی یہ قدیم ہٹ دھرمی اس ہٹ دھرمی کے بالکل مشابہ ہے جو اس وقت یہ لوگ نبی آخر الزمان ﷺ کے مقابلے میں اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ خود بھی' اپنے آباؤ اجداد کی طرح معجزات کا مطالبہ کر رہے ہیں اور سادہ دل مومنین کو بھی اس پر آمادہ کرنے کی سعی کر رہے ہیں کہ وہ حضور ﷺ کی سچائی کو آزمانے کے لئے معجزات کا مطالبہ کریں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

وَإِذْ قُلْتُمْ يَٰمُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى ٱللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ ٱلصَّٰعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنَٰكُم مِّنۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ ٱلْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ ٱلْمَنَّ وَٱلسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا۟ مِن طَيِّبَٰتِ مَا رَزَقْنَٰكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝

"یاد کرو' جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ ہم تمہارے کہنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے' جب تک کہ اپنی آنکھوں سے علانیہ خدا کو (تم سے کلام کرتا) نہ دیکھ لیں۔ اس وقت تمہارے دیکھتے دیکھتے ایک زبردست صاعقے نے تم کو آلیا۔ تم بے جان ہو کر گر چکے تھے۔ مگر پھر ہم نے تم کو جلا اٹھایا' شاید کہ اس احسان کے بعد تم شکر گزار بن جاؤ۔ ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا۔ من سلویٰ کی غذا تمہارے لئے فراہم کی اور تم سے کہا کہ جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں' انہیں کھاؤ مگر تمہارے اسلاف نے جو کچھ کیا وہ ہم پر ظلم نہ تھا بلکہ انہوں نے آپ اپنے ہی اوپر ظلم کیا۔"

اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو یہ ٹھوس اور مادی احساس ہی ان کا واحد ذریعہ علم ہے اور محسوسات سے آگے وہ کسی چیز کے ادراک کے اہل ہی نہ تھے اور یا پھر یہ لوگ چاہتے تھے کہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہیں اور مخاطب کو عاجز کر دیں۔

اللہ کے بے شمار نشانیاں' اس کی نعمتیں بار بار کی عفو اور درگزر' ان سب چیزوں کا ان کی اس مادی فطرت اور مادہ پرست طبیعت کے سامنے بالکل بے اثر تھیں۔ ان سب نعمتوں کے باوجود یہ لوگ سخت جھگڑالو اور فریب کار تھے۔ اور کسی سخت عذاب اور انتقام کے بغیر' قبول حق کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرعون کی غلامی اور اس کے ظالمانہ نظام نے ان بیچاروں کی فطرت ہی کو بری طرح مسخ کر ڈالا تھا۔ یاد رہے کہ جب کوئی ظالمانہ اور جابرانہ نظام ایک طویل عرصے تک کسی قوم پر مسلط رہے تو وہ قوم اس کی فطرت سلیمہ کو بالکل مسخ کر دیتا ہے اور اس سے تمام انسانی فضائل اور اچھی عادات ایک ایک کر کے ختم ہو جاتی ہیں۔ غلامی سے انسانیت کے بنیادی فضائل اور اساسی عناصر ضائع ہو جاتے ہیں اور اقوام کے اندر غلاموں کی معروف اور گھٹیا صفات و عادات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایسے لوگوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ جب ان کے سروں پر ڈنڈا مسلط ہو' تو وہ رام ہو جاتے ہیں اور جونہی وہ آزاد ہوتے اور آزادی کے سائے میں قوت اور آسائش پاتے ہیں تو آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ جنون کی سی سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ یہی حالت تھی بنی اسرائیل کی جو آج تک اس پر قائم ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے کفریہ کلمات کہتے ہیں اور ذلت و گمراہی کے گہرے گڑھے میں جا پڑتے ہیں۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَٰمُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى ٱللَّهَ جَهْرَةً "یاد کرو' جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ ہم تمہارے کہنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے' جب تک کہ اپنی آنکھوں سے علانیہ' خدا کو (تم سے کلام کرتے) نہ دیکھ لیں۔"

یہی وجہ ہے کہ ابھی وہ پہاڑ پر ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں' ان کے اس کافرانہ رویے کے بدلے یہ سزا دی۔ فَأَخَذَتْكُمُ ٱلصَّٰعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ "اس وقت تمہارے دیکھتے دیکھتے' ایک زبردست صاعقۃ نے تم کو آلیا۔"

چنانچہ اس کے بعد دوبارہ ظیفن کو اللہ کی رحمت ڈھانپ لیتی ہے۔ انہیں دوبارہ زندگی کا موقع دیا جاتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور رب العزت کا شکر ادا کریں۔

یہاں اللہ تعالیٰ انہیں اپنی وہ نعمت یاد دلاتے ہیں۔ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ○ "مگر پھر ہم نے تم کو جلا اٹھایا شاید کہ اس احسان کے بعد تم شکر گذار بن جاؤ۔"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں وہ مراعات اور احسانات یاد دلاتے ہیں' جو اس نے ان پر سینائی کے چٹیل میدان میں کئے۔ ان کو کھانے کے لئے مطلوبہ خوراک دی گئی۔ جس کے لئے انہیں کوئی خاص محنت نہ کرنی پڑتی تھی۔ بے کدو کاش انہیں مل جاتی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور تدبیر خاص سے انہیں صحرا کی تپش اور سورج کی جھلسا دینے والی گرمی سے بچایا۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ "ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا' من و سلویٰ کی غذا تمہارے لئے فراہم کی اور تم سے کہا کہ جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں' انہیں کھاؤ' مگر تمہارے اسلاف نے جو کچھ کیا' وہ ہم پر ظلم نہ تھا' انہوں نے آپ اپنے ہی اوپر ظلم کیا۔"

روایات میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بادل کا ایک ٹکڑا ان کے سروں پر قائم رکھا تاکہ وہ گرمی سے محفوظ رہیں۔ صحرا کا موسم ایسا ہوتا ہے کہ اگر بادل اور بارش نہ ہو تو وہ ایک کھولتی ہوئی جہنم کی مانند ہوتا ہے۔ اس سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر صحرا میں بارش ہو جائے اور مطلع ابر آلود ہو تو اس کا موسم تر و تازہ اور نہایت خوشگوار ہوتا ہے۔ جس میں جسم و روح دونوں فرحت محسوس کرتے ہیں۔ روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے من کا انتظام فرمایا' جو درختوں پر ہوتا تھا اور شہد کی طرح میٹھا ہوتا تھا۔ نیز اللہ تعالیٰ نے ان کی خوراک کے لئے سلویٰ پرندے کی وافر مقدار پیدا کر دی جو ان کے گھروں کے قریب بڑی مقدار میں پائے جاتے تھے۔ ان دو چیزوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لئے ایسے لذیذ کھانے کا بندوبست کیا' جس کی نظیر دنیا میں نہ تھی۔ رہائش کے لئے مقام کو خوشگوار بنایا اور ان پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال کیا۔ لیکن اب ذرا اس قوم کی روش تو دیکھئے! کیا اب بھی وہ شکر گذار بنتی ہے یا نہیں؟ ہدایت پاتی ہے یا نہیں؟ آیت کا آخری حصہ صاف صاف نشاندہی کر رہا ہے کہ انہوں نے ان تمام نعمتوں کا انکار کیا اور ظلم کا ارتکاب کیا لیکن یہ ظلم خود اپنے اوپر تھا۔

وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ "تمہارے اسلاف نے جو کچھ کیا وہ ہم پر ظلم نہ تھا' انہوں نے اپنے ہی اوپر ظلم کیا۔"

اس کے بعد بنی اسرائیل کے انحراف' انکار حق اور معصیت پر مسلسل اصرار کی یہ طویل داستان ذرا اور آگے بڑھتی ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ
رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ
الْمُحْسِنِيْنَ ۞ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا
عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۞ ٦ ع١٣ ٦

"اور پھر یاد کرو' جب ہم نے کہا تھا کہ یہ بستی جو تمہارے سامنے ہے' اس میں داخل ہو جاؤ' اس کی پیداوار جس طرح چاہو' مزے سے کھاؤ' مگر بستی کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہونا اور کہتے جانا حطۃ حطۃ' ہم تمہاری خطاؤں سے درگذر کریں گے اور نیکو کاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے۔ مگر جو بات کہی گئی تھی' ظالموں نے اسے بدل کر کچھ کر دیا۔ آخر کار ہم نے ظلم کرنے والوں

پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔ یہ سزا تھی ان نافرمانیوں کی جو وہ کر رہے تھے۔"

بعض روایات میں اس کی تصریح آتی ہے کہ اس گاؤں سے مراد بیت المقدس ہے۔ مصر سے خروج کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ وہ اس شہر میں داخل ہو جائیں۔ اس وقت اس میں عمالقہ آباد تھے۔ بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ وہ ان لوگوں کو نکال دیں۔ لیکن بنی اسرائیل نے اس سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا "اے موسیٰ! اس شہر میں تو ایک جبار قوم آباد ہے۔ ہم تو اس میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے جب تک وہ وہاں سے نکل نہیں جاتے۔ اگر وہ نکل جاتے ہیں تو ہم داخل ہوں گے۔" نیز اسی شہر کے بارے میں انہوں نے اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا "اے موسیٰ ﷺ ہم ہرگز اس شہر میں داخل نہ ہوں گے' جب تک کہ یہ لوگ اس شہر میں موجود ہیں' جائیں! آپ اور آپ کا رب لڑیں ان سے' ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔" چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کی یہ سزا دی کہ وہ چالیس سال تک بھٹکتے پھرے۔ ان کی موجودہ نسل سب مر گئی' ایک جدید نسل تیار ہو گئی اور اس نے حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں اس شہر کو فتح کیا اور یہ لوگ شہر میں داخل ہوئے۔ لیکن اس طویل سزا کے بعد بھی جیسا کہ اللہ نے انہیں حکم دیا تھا کہ خشوع و خضوع اور تواضع سے جھک کر شہر میں داخل ہوں اور حطة حطة پکاریں' انہوں نے ویسا نہ کیا۔ شہر میں داخلے کی جو صورت اللہ تعالیٰ نے تجویز کی تھی اس کے مطابق داخل نہ ہوئے' نیز وہ لفظ بھی ادا نہ کئے جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا۔

یہاں اللہ تعالیٰ' ان کی اس تاریخی نافرمانی کو نقل کر کے ان کے سامنے رکھتے ہیں۔ نیز تاریخی لحاظ سے یہ واقعہ پیش بھی 'موضوع زیر بحث یعنی خروج بنی اسرائیل کے متصلاً بعد آیا تھا۔ اس لئے یہاں اس کا بھی ذکر ہوا۔ قرآن کریم کا یہ انداز بتا رہا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی پوری تاریخ کو ایک اکائی تصور کرتا ہے جس کا آغاز' وسط اور انتہا بالکل یکساں ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ہمیشہ اپنی پوری تاریخ میں 'مخالف حق' سرکش' نافرمان اور راہ راست سے بھٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔

تاریخی طور پر یہ واقعہ جو بھی ہو اس کا کوئی یقینی علم ہمیں نہیں ہے۔ البتہ قرآن کریم ان کے سامنے جو واقعہ پیش کر رہا ہے۔ اس کا انہیں علم ہے۔ وہ اس بات کو جانتے ہیں جس کی طرف یہاں اشارہ کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی تھی اور وہ اس خاص شہر میں داخل ہوئے تھے۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ تھا کہ وہ خضوع اور خشوع کی حالت میں' اس شہر میں داخل ہوں اور اللہ سے دعا کریں کہ وہ ان کی ان غلطیوں کو معاف کرے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی غلطیوں کو معاف کر دے گا۔ اور نیکی کرنے والوں پر اپنا مزید فضل و کرم کرے گا۔ لیکن ان لوگوں نے اپنی عادت مستمرہ کے مطابق اس حکم کی بھی خلاف ورزی ہی کی فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ مگر جو بات کہی گئی تھی ظالموں نے اسے بدل کر کچھ اور کر دیا۔

یہاں اللہ تعالیٰ بالخصوص ان لوگوں کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم و نصیحت کو بدل دیا تھا۔ یعنی **الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا** یا تو اس لئے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک خاص گروہ نے یہ کام کیا تھا اور یا اس لئے کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ بنی اسرائیل سب کے سب ظالم ہیں اور ان سب نے اس کریہہ فعل کا ارتکاب کیا۔

فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ آخر کار ہم نے ظلم کرنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔ یہ سزا تھی ان نافرمانیوں کی' جو وہ کر رہے تھے۔"

الرجز کے معنی ہیں عذاب اور فسق کے معنی ہیں حکم کی مخالفت اور دائرہ حق سے خروج۔ اور یہ دونوں صفات بنی اسرائیل کی منجملہ اور صفات کے ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

اللہ تعالیٰ نے' جس طرح صحرا کی تپش میں بنی اسرائیل کے لئے سائے کا انتظام کیا اور بے آب و گیاہ چٹیل میدان میں ان کے طعام کا

بندوبست کیا' اسی طرح ان کے پینے کے لئے پانی کا بھی خاص بندوبست کیا اور یہ بندوبست بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تمام دوسرے معجزات کی طرح معجزانہ انداز میں کیا۔ اس واقعہ کو بھی قرآن کریم یہاں بطور احسان بیان کرتا ہے اور اس کے بعد بتاتا ہے کہ اس احسان اور انعام کا جواب ان لوگوں نے کس شکل میں دیا۔

وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ۝۶۰

"اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی تمام قوم کے لئے پانی کی دعا کی' تو ہم نے کہا کہ فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو۔ چنانچہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر قبیلے نے جان لیا کہ کون سی جگہ اس کے پانی لینے کی ہے۔ اس وقت یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ پیو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب فرمایا۔ اور انہوں نے یہ درخواست اپنے رب سے کی اور اس نے قبول فرمائی۔۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ وہ ایک متعین پتھر کو اپنے عصا سے ماریں۔ آپ نے حکم کی تعمیل کی اور پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ یہ بارہ چشمے بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کی تعداد کے مطابق تھے۔ کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پوتوں کے بعد یہ لوگ بارہ قبائل میں تقسیم ہو گئے تھے۔ حضرت یعقوب کا نام اسرائیل تھا جس کی طرف یہ لوگ نسبت کرتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پوتے اسباط کے نام سے مشہور ہیں' جن کا ذکر بار بار قرآن کریم میں آیا ہے۔ یہ لوگ بنی اسرائیل کے سردار تھے۔ اور قبائلی نظام کے مطابق زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور قبائلی نظام میں قبیلے کی نسبت اکثر اوقات مورث اعلیٰ کی طرف کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کہتا ہے قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ "ہر قبیلے نے جان لیا کہ کون سی جگہ ہے اس کے پانی لینے کی۔" یعنی وہ چشمہ جو بارہ چشموں سے ان کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ "اس وقت انہیں ہدایت کر دی گئی تھی کہ اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ پیو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔"

بنی اسرائیل کی حالت یہ تھی کہ وہ خشک صحرا کی پتھریلی زمین میں تھے۔ آسمان اوپر سے آگ کے شعلے برسا رہا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پتھروں سے پانی نکالا۔ آسمان سے من و سلویٰ' شہد و پرندوں کا انتظام فرمایا' لیکن ان کی فاسد اور گری ہوئی ذہنیت اور گری ہوئی فطرت اور عادات نے' انہیں اس بلند مقام تک پہنچنے نہ دیا جس کے لئے انہیں مصر سے نکالا گیا تھا۔ اور اس بے آب و گیاہ صحرا میں ڈال دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے ذلت و خواری سے اس لئے نکالا تھا کہ ارض مقدس دوبارہ ان کے اقتدار میں آجائے اور وہ اس ذلت اور خواری کی زندگی سے باہر نکل آئیں۔ ظاہر ہے کہ حریت و آزادی اور عزت و آبرو کے حصول کے لئے کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ جو امانت کبریٰ ان کے حوالے کی جارہی تھی اس کا کسی قدر ان سے شکرانہ بھی لینا مقصود تھا۔ لیکن بنی اسرائیل تو ایسے لوگ تھے جو اس کی کوئی قیمت ادا نہ کرنا چاہتے تھے۔ نہ وہ تکالیف اور آزمائشوں کو انگیز کر سکتے تھے۔ اس لئے وہ اس مقام رفیع کا کوئی شکرانہ دینے کے لئے بھی تیار نہ تھے۔ نہ وہ یہ چاہتے تھے کہ مصر میں وہ جس طرح کی پر کیف اور پر آسائش زندگی بسر کر رہے تھے

اسے چھوڑ دیں۔ یہاں تک کہ وہ اس بلند مرتبے کے لئے اپنے مالوف کھانوں اور پینے کی چیزوں کو بھی ترک نہ کر سکتے تھے اور کسی طرح بھی آمادہ نہ تھے کہ عزت و شرف اور حریت و آزادی کے حصول کے لئے' وہ اپنی زندگی کو کسی قدر نئے سانچے میں ڈھالیں۔ وہ تو وہی کھانے چاہتے ہیں کہ جن کے وہ مصر میں عادی تھے۔ اور ساگ' ترکاری' گیہوں اور لہسن وغیرہ کے دلدادہ تھے۔ یہاں مدینہ میں قرآن کریم انہیں ان کے پارسائی کے ان طویل و عریض دعووں کے جواب میں یہ کہتا ہے کہ وہ ذرا اپنی تاریخ کے اوراق تو الٹیں اور دیکھیں کہ انہوں نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیے ہیں۔

وَ اِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی لَنۡ نَّصۡبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادۡعُ لَنَا رَبَّکَ یُخۡرِجۡ لَنَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ مِنۡۢ بَقۡلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوۡمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسۡتَبۡدِلُوۡنَ الَّذِیۡ هُوَ اَدۡنٰی بِالَّذِیۡ هُوَ خَیۡرٌ ؕ اِهۡبِطُوۡا مِصۡرًا فَاِنَّ لَکُمۡ مَّا سَاَلۡتُمۡ ؕ وَ ضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّۃُ وَ الۡمَسۡکَنَۃُ ٭ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقۡتُلُوۡنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوۡا وَّ کَانُوۡا یَعۡتَدُوۡنَ ﴿۶۱﴾ ۷ ع۲ ۷

"یاد کرو جب تم نے کہا تھا "اے موسیٰ! ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے لئے زمین کی پیداوار ساگ' ترکاری' گیہوں' لہسن' پیاز' دال وغیرہ پیدا کرے۔" تو موسیٰ نے کہا "کیا ایک بہتر چیز کی بجائے تم ادنیٰ درجے کی چیز لینا چاہتے ہو؟ اچھا کسی شہری آبادی میں جا رہو۔ جو کچھ تم مانگتے ہو' وہاں مل جائے گا۔" آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذلت و خواری اور پستی و بدحالی ان پر مسلط ہو گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔ یہ نتیجہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیات سے کفر کرنے لگے اور پیغمبروں کا ناحق قتل کرنے لگے۔ یہ نتیجہ تھا ان کی نافرمانیوں کا اور اس بات کا کہ حدود شرع سے نکل نکل جاتے تھے۔"

حضرت موسیٰ' ان کی یہ طفلانہ درخواست سن کر سخت رنجیدہ ہوئے۔

"کیا ایک بہتر چیز کے بجائے' تم ادنیٰ درجے کی چیز لینا چاہتے ہو؟" اللہ تعالیٰ تو تمہارے لئے بلندیاں پسند کرتا ہے اور تم ہو کہ گرے جا رہے ہو۔

"اچھا کسی شہری آبادی (یا مصر) میں جا رہو' جو کچھ مانگتے ہو' وہاں مل جائے گا۔"

اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو کچھ وہ طلب کر رہے ہیں وہ تو بالکل ایک معمولی چیز ہے۔ اس لئے کوئی لمبی چوڑی درخواست دینے اور دعا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' کسی شہری آبادی میں چلے جائیں وہاں یہ چیزیں بڑی مقدار میں انہیں مل سکتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ تم دوبارہ لوٹ کر مصر چلے جاؤ' جہاں سے تمہیں نکالا گیا تھا۔ اپنی اس مالوف ذلت آمیز اور گھٹیا درجے کی غلامانہ زندگی کو دوبارہ اختیار کر لو۔ وہاں تمہیں کافی مقدار میں ساگ' ترکاریاں' گیہوں' اور لہسن پیاز وغیرہ سب دستیاب ہوں گے۔ اور اس بلند نصب العین کو چھوڑ دو جس کے لئے تمہیں چن لیا گیا تھا۔ اگر یہ دوسرا مفہوم لیا جائے تو یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ایک قسم کی تادیب اور توبیخ ہوگی اور انہیں شرم دلانا مقصود ہو گا۔

اگرچہ بعض مفسرین نے اس دوسرے معنی کو مستبعد سمجھا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کے بعد آنے والے نتیجے پر غور کیا جائے تو یہی مفہوم زیادہ مناسب ہے۔ فرمایا جاتا ہے۔

"آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذلت و خواری اور پستی و بدحالی ان پر مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔"

ان پر ذلت و خواری کا ہمیشہ کے لئے مسلط ہونا" اور ان کا اللہ کے غضب میں گھر جانا تاریخی لحاظ سے اس مرحلے میں واقع نہیں ہوا۔ یہ لوگ ذلیل خوار زمانہ مابعد میں' اس وقت ہوئے جب کہ وہ بہت سی برائیوں میں مبتلا ہو گئے اور جس کا ذکر اس آیت کے آخری حصے میں ہوا۔

"یہ نتیجہ تھا' اس کا کہ وہ اللہ کی آیات سے کفر کرنے لگے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے لگے۔ یہ نتیجہ تھا ان کی نافرمانیوں کا اور اس بات کا کہ حدود شرع سے نکل نکل جاتے تھے۔"

اور ان برائیوں کا صدور' ان سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے کئی نسلیں بعد ہوا۔ لیکن یہاں چونکہ انہوں نے ساگ ترکاریوں' گیہوں اور لہسن پیاز وغیرہ کا مطالبہ کر دیا تھا' اس لئے' ان کے اس مکروہ موقف کی مناسبت سے یہاں ہی بتا دیا کہ منجملہ اور اسباب کے ان کی ذلت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ ان چیزوں کا مطالبہ کر رہے تھے۔

اس لئے مناسب یہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول کہ "کسی شہر میں جا کر آباد ہو جاؤ۔" اس پر محمول کیا جائے کہ آپ انہیں مصری غلامانہ زندگی یاد دلا رہے ہیں اور انہیں جتلاتے ہیں کہ وہ اس زندگی سے چھٹکارا پانے پر شکر ادا کریں۔ اور ان نفسانی ذلیل خواہشات کے پیچھے نہ بھاگیں' جن کے وہ مصری ذلیل و خوار زندگی میں خوگر ہو گئے تھے۔

راہ ہدایت کی طرف بلانے والے مصلحین اور پیغمبروں پر' بنی اسرائیل نے جو مظالم ڈھائے اور ان کے ساتھ وہ مسلسل جو وحشیانہ اور سنگدلانہ برتاؤ کرتے رہے' اس کی مثال کسی دوسری قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ انہوں نے کئی انبیاء و مصلحین کو ذبح کیا' قتل کیا بلکہ آرے سے چیر ڈالا کیا ہی بد ترین اور وحشیانہ فعل ہے جو ان سے صادر ہوا...... انہوں نے کفر اور حد سے گزر جانے کی بد ترین مثالیں پیش کیں۔ ظلم و زیادتی کی وحشیانہ مثالوں میں وہ سب سے بازی لے گئے۔ اور سرکشی اور نافرمانی کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔ غرض فسق و فجور کے ان سب میدانوں میں انہوں نے وہ وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جو انہی کا حصہ تھے اور ہیں۔

لیکن اس کے باوجود' پھر بھی وہ طویل و عریض اور بڑے بڑے دعوے کرتے رہے۔ ان کا ہمیشہ سے یہ دعویٰ تھا کہ صرف وہی ہیں جو ہدایت یافتہ کہلا سکتے ہیں۔ صرف وہی اللہ کی پسندیدہ قوم ہیں' وہی اللہ کی جانب سے اجر و ثواب کے مستحق ہیں۔ اللہ کا فضل و کرم ان کے لئے مخصوص ہے اور اس میں ان کا کوئی شریک نہیں ہے۔ قرآن کریم یہاں ان کے دعاوی کی تردید کرتے ہوئے ایک قاعدہ بیان کر دیتا ہے اور یہ قاعدہ قرآن کریم کے تمام قصص کے درمیان بار بار دہرایا جاتا ہے۔ کبھی پہلے اور کبھی ان کے آخر میں۔ یعنی یہ کہ ایمان کی حقیقت ایک ہے۔ صحیح عقیدہ ایک ہی ہے' بشرطیکہ اس عقیدے کے نتیجے میں نفس انسانی اللہ کے سامنے جھک جائے اور ایمان ایسا ہو کہ اس سے عمل صالح کے چشمے پھوٹ رہے ہوں اور یہ کہ اللہ کا فضل و کرم کوئی محدود چیز نہیں ہے نہ کسی نسل سے مخصوص ہے۔ وہ تمام مؤمنین کے لئے ہے۔ تمام لوگ' چاہے جس زمان و مکان سے بھی تعلق رکھتے ہوں' اللہ کے اس ازلی ابدی دین کے مطابق اس کے فضل و کرم کے مستحق رہے ہیں اور رہیں گے اور آخر میں آخری دین (محمدی) اور آخری نبوت کے مطابق مومنین کا انجام یہ ہو گا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

"یقین جانو! کہ نبی عرب کے ماننے والے ہوں یا یہودی' عیسائی ہوں یا صابی جو بھی اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ..... یعنی مسلمان

وَالَّذِيْنَ هَادُوْا ..... یعنی وہ جو اللہ کی طرف راہ پا گئے وہ جو "یہودا" کی اولاد ہیں۔

وَالنَّصٰرٰى ..... یعنی عیسائی

وَالصّٰبِـِٕيْنَ ..... میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ صابئین سے مراد مشرکین کے وہ لوگ ہیں' جو بعثت سے قبل مشرکین کے موروثی شرکیہ دین سے برگشتہ ہو گئے تھے۔ انہیں بتوں کی پوجا کی معقولیت میں شک لاحق ہو گیا تھا۔ اس لئے انہوں نے خود اپنے غور و فکر سے اپنے لئے خود کوئی عقیدہ تجویز کرنے کی کوشش کی اور اس آزادانہ غور و فکر کے نتیجے میں وہ عقیدۂ توحید پر پہنچ گئے تھے۔ ان لوگوں کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ابتدائی دین حنیف پر ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے بتوں کی پوجا ترک کر دی تھی' اگرچہ وہ اپنی قوم کو عقیدۂ توحید کی طرف دعوت نہ دیتے تھے۔ ان لوگوں کے بارے میں مشرکین کہتے تھے کہ یہ لوگ صابی ہو گئے ہیں۔ یعنی اپنے باپ دادا کا دین انہوں نے ترک کر دیا ہے جیسا کہ بعد میں یہی طعنہ مشرکین ان مسلمانوں کو بھی دیا کرتے تھے۔ یہ جو بعض تفاسیر میں آیا ہے کہ یہ لوگ ستارہ پرست تھے۔ اس کے مقابلے میں یہ قول راجح معلوم ہوتا ہے۔

آیت کا مقصد یہ ہے کہ ان گروہوں میں سے جو بھی ایمان لائے' اللہ پر اور یوم آخرت پر اور اس کے ساتھ ساتھ عمل صالح بھی کرے تو وہ اپنے رب کے نزدیک اجر کا مستحق ہو گا۔ اسے کسی قسم کا خوف اور حزن و ملال نہ ہو گا کیونکہ اسلام میں دارومدار نظریہ اور عقیدے پر ہے کسی قوم اور نسل پر نہیں۔ لیکن عمل و جزاء کا یہ اصول بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے ادوار سے متعلق ہے۔ آپ کی بعثت کے بعد ظاہر ہے کہ ایمان باللہ کی آخری شکل (اسلام کی صورت میں) متعین ہو گئی ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں کو سناتے ہوئے اور یہود مدینہ کو سامنے رکھتے ہوئے بنی اسرائیل کے کچھ کارنامے بیان کئے جاتے ہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

"یاد کرو وہ وقت' جب ہم نے طور کو تم پر اٹھا کر تم سے پختہ عہد لیا اور کہا تھا کہ "جو کتاب ہم تمہیں دے رہے ہیں' اسے مضبوطی سے تھامنا اور جو احکام و ہدایات اس میں درج ہیں انہیں یاد رکھنا۔ اسی ذریعے سے توقع کی جاسکتی ہے کہ تم تقویٰ کی روش پر چلو۔" مگر اس کے بعد تم اپنے عہد سے پھر گئے۔ اس پر بھی اللہ کے فضل اور اس کی رحمت نے تمہارا ساتھ نہ چھوڑا' ورنہ تم کبھی کے تباہ ہو چکے ہوتے۔

اس عہد کی تفصیل دوسری سورتوں اور خود اس سورۂ بقرہ میں بھی بعد میں مذکور ہے۔ یہاں مقصد صرف یہ ہے کہ اس منظر کو دوبارہ

ان کی نظروں کے سامنے اجاگر کر دیا جائے' اور یہ بتایا جائے کہ ان کے سروں پر کوہ طور کو معلق کرنا اور طاقت سے عہد لینا اور ان کو حکم دینا کہ وہ احکام تورات کو پوری قوت کے ساتھ تھام لیں' ان امور کے درمیان ایک نفسیاتی اور تعبیری ہم آہنگی موجود ہے۔ انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ وہ عقاید کے سلسلے میں عزیمت کی روش اختیار کریں۔ کیونکہ عقاید و نظریات میں کسی قسم کی نرمی اور مداہنت نہیں برداشت کی جا سکتی۔ نظریات کے باب میں کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اختیار نہیں کی جا سکتی۔ نہ ہی اس بارے میں غیر سنجیدگی اور نرمی برداشت کی جا سکتی ہے۔ نظریہ و عقیدہ اللہ اور مومنین کے درمیان ایک عہد ہے۔ ایک سنجیدہ اور برحق معاہدہ۔ لہٰذا اس میں باطل اور غیر سنجیدگی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس راہ میں بے حد قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ کیونکہ عقاید و نظریات کا مزاج ہی یہ ہے۔ عقیدہ ایک عظیم چیز ہے۔ اس کائنات میں اس کی عظمت ہر چیز سے بڑھی ہوئی ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ وہ بڑی سنجیدگی سے' اچھی طرح سمجھتے ہوئے اور اس کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو۔ اور پوری دلجمعی اور عزم صمیم سے نظریہ کی راہ میں آنے والی مشکلات کو انگیز کرے۔ جو شخص بھی کسی عقیدے کو ان معنوں میں اپنائے' اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اب اس نے آرام و آسائش اور عیش و عشرت کو الوداع کہہ دیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے لئے پکارا تو آپ نے فرمایا "خدیجہ! اب آرام اور سونے کا زمانہ ختم ہو گیا۔" نیز اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کو متنبہ فرمایا کہ سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلاً ثَقِیْلاً "ہم عنقریب آپ پر ایک بھاری بات نازل کریں گے۔" اور جیسا کہ بنی اسرائیل سے کہا گیا "جو کتاب ہم تمہیں دینے والے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ تھامنا اور جو احکام و ہدایات درج ہیں انہیں یاد رکھنا۔ اسی ذریعے سے توقع کی جا سکتی ہے کہ تم تقویٰ کی روش اختیار کرو۔

لیکن قوت' سنجیدگی' دلجمعی اور عزم صمیم کے ساتھ عہد لینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ عہد کرنے والے مسلمان اس عہد کی حقیقت کو بھی سمجھیں۔ انہیں اس عہد و پیمان کی نوعیت کا شعور اچھی طرح ہو' وہ اپنی زندگیوں کو اس عہد و پیمان کے رنگ میں رنگ دیں۔ تاکہ معاملہ محض جذبات' حمیت' طاقت اور جوش و خروش تک ہی محدود نہ رہے کیونکہ اللہ کے ساتھ ہمارا عہد درحقیقت یہ ہے کہ ہم پوری زندگی' اس کے پسندیدہ نظام حیات کے مطابق گزاریں گے۔ یہ نظام زندگی قلب و دماغ میں بطور حیات اور زندہ شعور کے رائج ہوتا ہے اور عملی زندگی میں نظام حیات اور طریقۂ زندگی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ معاشرت میں حسن خلق اور حسن سلوک کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اخروی' زندگی میں تقویٰ اور اللہ کے سامنے جوابدہی کے شعور احساس پر منتج ہوتا ہے۔

لیکن وائے ناکامی! بنی اسرائیل پھر بھی جوں کے توں رہتے ہیں۔ ان کی بری فطرت ان پر غالب آ ہی جاتی ہے۔ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ "مگر اس کے بعد تم پھر اپنے عہد سے پھر گئے۔"

اس کے بعد پھر اللہ کی رحمت و شفقت ان کا ساتھ دیتی ہے۔ اللہ کا فضل و کرم ان کے شامل حال ہو جاتا ہے اور انہیں خسران اور تباہی میں سے نکال لیا جاتا ہے۔

فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ "اس پر بھی اللہ کے فضل و کرم اور اس کی رحمت نے تمہارا ساتھ نہ چھوڑا ورنہ تم کبھی کے تباہ ہو چکے ہوتے۔"

☆☆---○---☆☆

اب دیکھئے ان کی غداری' عہد شکنی اور حیلہ سازی کا ایک نیا منظر' جس میں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ کسی عہد کی پابندی کرنے کے سرے سے اہل ہی نہیں۔ وہ اس عہد و پیمان کی ذمہ داریاں ادا ہی نہیں کر سکتے۔ خواہشات نفس اور وقتی مفادات کو دیکھ کر وہ بے بس ہو جاتے ہیں۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ﴿٦٦﴾

"پھر تمہیں اپنی قوم کے ان لوگوں کا قصہ تو معلوم ہی ہے جنہوں نے سبت کا قانون توڑا تھا۔ ہم نے انہیں کہہ دیا کہ بندر بن جاؤ اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر دھتکار پھٹکار پڑے۔ اس طرح ہم نے ان کے انجام 'اس زمانے کے لوگوں اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے عبرت اور ڈرانے والوں کے لئے نصیحت بنا کر چھوڑا۔"

دوسری جگہ قرآن کریم نے سبت کے احکام کی خلاف ورزی کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ "اور ذرا ان سے اس بستی کا حال بھی پوچھئے' جو سمندر کے کنارے واقع تھی۔ انہیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں کے لوگ سبت (ہفتہ) کے دن احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سبت ہی کے دن ابھرا بھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں۔" (۷-۱۶۳)

بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ ان کے آرام کے لئے ایک دن کو مقدس قرار دیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سبت کے دن کو مقدس دن قرار دیا اور اس دن دنیاوی معاش کے لئے کوئی کام کرنا حرام قرار دیا۔ اس کے بعد انہیں اس آزمائش میں ڈالا کہ ہفتے کے دن تمام مچھلیاں بڑی کثرت سے دریا کی سطح پر نکل آتیں اور دوسرے دنوں میں غائب ہوتیں۔ یہ ایسی آزمائش تھی' جس کے مقابلے میں یہود نہ ٹھہر سکے۔ ان کے لئے ثابت قدمی کیسے ممکن تھی۔ ایسا بہترین شکار بالکل قریب مل رہا تھا۔ انہیں اس کے سوا اور کیا چاہئے تھا۔ کیا محض عہد و پیمان کی خاطر وہ اس شکار کو جانے دیتے۔ یہودیوں سے بہر حال یہ کام نہیں ہونے کا۔ یہ تو ان کے مزاج کے خلاف ہے۔

فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ "ہم نے انہیں کہہ دیا کہ بندر بن جاؤ اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے دھتکار پھٹکار تم پر پڑے۔"

اللہ کا عہد توڑ کر بہر حال وہ اس سزا کے مستحق بن چکے تھے۔ وہ اس بات کے مستحق تھے کہ حیوان بن جائیں کیونکہ انسان تو ایک صاحب ارادہ مخلوق ہے اور وہ اس مقام سے نیچے گر گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ کوئی حیوان اپنے پیٹ سے بلند ہو کر نہیں سوچ سکتا۔ چنانچہ جونہی انہوں نے انسان کی خصوصیت اولیٰ یعنی ٹھوس اور بلند ارادہ اور خداوند کریم کے ساتھ کئے ہوئے عہد پر قائم رہنے کا عزم صمیم ..... کو ترک کیا تو وہ مقام انسانیت سے گر کر بہیمیت کے درجے میں آگئے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کے جسم بھی بندر کے جسموں میں تبدیل ہو گئے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ روح' فکر' شعور اور مزاج کے اعتبار سے وہ بندر بن گئے ہوں اور بندروں جیسی حرکتیں کرتے ہوں کیونکہ فکر کا پرتو ہمیشہ چہرے' شکل وشبہت اور حرکات و سکنات پر پڑتا ہے۔ انسان کی ظاہری حالت پر اس کی فکر کے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔

یہ واقعہ اس دور میں اور اس کے متصلاً بعد کے ادوار میں مخالفین حق کے لئے ایک نہایت ہی عبرت آموز واقعہ تھا اور مومنین کے لئے ہر دور میں یہ ایک بہترین نصیحت ہے فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ "اس طرح ہم نے ان کے انجام کو 'اس زمانے کے لوگوں اور بعد کی آنے والی نسلوں کے لئے عبرت اور ڈرنے والوں کے لئے

نصیحت بنا کر چھوڑا۔"

اس سبق کے آخر میں اب گائے ذبح کرنے کا مشہور قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ قصہ ایک کمال کی شکل میں بڑی تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔ اور اس سے قبل اس سورت میں بنی اسرائیل کے جو تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں' ان میں اجمال و اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ تمام واقعات سورہ بقرہ سے پہلے نازل ہونے والی مکی سورتوں میں بیان ہو چکے تھے لیکن یہ واقعہ کسی دوسری جگہ بیان نہیں ہوا تھا۔ یہ قصہ بنی اسرائیل کی جہالت' نافرمانی اور تعمیل حکم میں لیت و لعل اور عذر سازی کی ایک واضح تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے' جس میں مدینہ کے
یہودی بھی مبتلا تھے۔ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِۦٓ إِنَّ ٱللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تَذْبَحُوا۟ بَقَرَةً ۖ
قَالُوٓا۟ أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۖ قَالَ أَعُوذُ بِٱللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ ٱلْجَٰهِلِينَ ﴿٦٧﴾ قَالُوا۟
ٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِىَ ۚ قَالَ إِنَّهُۥ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ
وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَٱفْعَلُوا۟ مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا۟ ٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ
يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُۥ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا
تَسُرُّ ٱلنَّٰظِرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا۟ ٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِىَ إِنَّ ٱلْبَقَرَ تَشَٰبَهَ
عَلَيْنَا وَإِنَّآ إِن شَآءَ ٱللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُۥ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ
لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ ٱلْأَرْضَ وَلَا تَسْقِى ٱلْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا۟
٨ ع١٠ ٨ ٱلْـَٰٔنَ جِئْتَ بِٱلْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا۟ يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾ وَإِذْ قَتَلْتُمْ
نَفْسًا فَٱدَّٰرَْٰٔتُمْ فِيهَا ۖ وَٱللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾ فَقُلْنَا ٱضْرِبُوهُ
بِبَعْضِهَا ۚ كَذَٰلِكَ يُحْىِ ٱللَّهُ ٱلْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ ءَايَٰتِهِۦ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٧٣﴾

"پھر وہ واقعہ یاد کرو' جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ کہنے لگے تم ہم سے مذاق کرتے ہو؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں۔ بولے اچھا اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہمیں اس گائے کی کچھ تفصیل بتائے۔ موسیٰ ؑ نے کہا' اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ ایسی گائے ہونی چاہئے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا' بلکہ اوسط عمر کی ہو۔ جو حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرو۔ پھر کہنے لگے اپنے رب سے یہ اور پوچھ دو کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ موسیٰ ؑ نے کہا وہ فرماتا ہے' زرد رنگ کی گائے ہونی چاہئے' جس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جائے۔ پھر بولے اپنے رب سے صاف صاف پوچھ کر بتاؤ کیسی گائے مطلوب ہے' ہمیں اس کے تعین میں اشتباہ ہو گیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم اس کا پتہ پا لیں گے۔ موسیٰ ؑ نے جواب دیا!

جواب دیا! اللہ کہتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی' نہ زمین جوتتی ہے' نہ پانی کھینچتی ہے' صحیح سالم اور بے داغ ہے' اس پر وہ پکار اٹھے کہ ہاں' اب تم نے ٹھیک پتہ بتایا ہے۔ پھر انہوں نے اسے ذبح کیا' ورنہ وہ ایسا کرتے معلوم نہ ہوتے تھے۔

اور تمہیں یاد ہے وہ واقعہ جب تم نے ایک شخص کی جان لی تھی۔ پھر اس کے بارے میں جھگڑنے لگے اور ایک دوسرے پر قتل کا الزام تھوپنے لگے تھے اور اللہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کچھ تم چھپاتے ہو' اسے کھول کر رکھ دے گا۔ اس وقت ہم نے حکم دیا کہ مقتول کی لاش کو اس کے ایک حصے سے ضرب لگاؤ۔ دیکھو اس طرح اللہ مردوں کو زندگی بخشتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے' تاکہ تم سمجھو۔"

قرآن کریم نے یہ قصہ جس انداز میں بیان کیا ہے' اس کے کئی پہلو غوروفکر ہیں۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے قومی مزاج اور ان کی موروثی جبلت کو اچھی طرح اجاگر کر دیتا ہے۔ نیز اس سے موت و حیات کی حقیقت' موت کے بعد اٹھائے جانے کی کیفیت اور اللہ تعالیٰ کی قدرت بے پایاں کا اظہار بھی ہوتا ہے' پھر اس قصے میں بیان اور طرز ادا کی فنی خوبیاں بھی قابل لحاظ ہیں۔ قصے کا آغاز' اس کی انتہا اور سیاق و سباق سے اس کی ہم آہنگی قابل غور ہیں۔

مختصراً یہ کہ بقرۃ کے اس قصے میں بنی اسرائیل کے قومی خدوخال بڑی خوبی سے ظاہر کئے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت کے اس صاف و شفاف سرچشمے وحی الٰہی اور ان کے دلوں کے رابطے ٹوٹ چکے ہیں۔ ایمان بالغیب' اللہ پر توکل' اور اصولوں پر نازل شدہ ہدایت الٰہی کی تصدیق سے محروم ہو چکے ہیں۔ اللہ کے احکام و ہدایات کے قبول کرنے میں وہ ہر وقت متامل ہیں اور پس و پیش کرتے ہیں۔ ہر وقت جھوٹے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں اور بارہا اپنی چرب زبانی اور دل کی بے باکی کی وجہ سے وہ شعائر دین کے ساتھ مذاق کرنے پر اتر آتے ہیں۔

ان کے پیغمبر انہیں اللہ کا صاف صاف حکم سناتے ہیں۔ "اللہ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم گائے ذبح کرو۔" ظاہر ہے کہ یہ حکم اپنے الفاظ میں بالکل صاف اور واضح تھا اور اس پر عمل کیا جا سکتا تھا۔ حکم سنانے والے نبی ان کے وہ محبوب رہنما تھے' جن کی قیادت میں اللہ نے انہیں فرعونیوں کے دردناک عذاب سے نجات دی تھی اور نجات کا یہ کام اللہ کی خاص رحمت' نگرانی اور ہدایات کے مطابق ایک حیرت انگیز معجزانہ انداز میں اپنے انجام کو پہنچا تھا۔ ان کے نبی نے انہیں واضح طور پر بتا دیا کہ یہ کوئی ان کی ذاتی رائے یا ذاتی حکم نہیں ہے بلکہ یہ اس رب ذوالجلال کا حکم ہے' جس کی ہدایات کے مطابق وہ بنی اسرائیل کو لے کر چل رہے ہیں۔ اب ذرا غور تو کیجئے! یہ لوگ اس جلیل القدر نبی کو کیا جواب دیتے ہیں؟ نہایت گستاخی' حماقت اور بے حیائی سے وہ اپنے نبی سے کہتے ہیں کہ کیا وہ ان کے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔ ان کی بے حیائی تو دیکھئے کہ ان کے نزدیک گویا اللہ کی معرفت رکھنے والا ایک عام آدمی بھی نہیں' بلکہ اللہ کے جلیل القدر نبی اور کسی عام معاملے میں بھی نہیں' بلکہ اللہ کے نام پر اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے معاملے میں برسرعام اور لوگوں کے سامنے مذاق کر سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا "کیا تم ہم سے مذاق کر رہے ہو۔"

اس احمقانہ اور سفیہانہ بہتان کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نعوذ باللہ پڑھنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتے تھے' چنانچہ آپ بڑی نرمی کے ساتھ اشاروں کنایوں میں انہیں سمجھاتے ہیں کہ اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں کس قدر ادب و احترام لازم ہے۔ آپ انہیں سمجھاتے ہیں کہ انہوں نے جو بہتان باندھا ہے اس کا ارتکاب وہی کر سکتا ہے جو بارگاہ قدس کے آداب و احترام سے ناواقف ہو۔ اور اس کے دل میں اللہ کی عظمت اور قدر و منزلت نہ ہو۔ چنانچہ آپ نے کہا قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ "موسیٰ نے کہا' میں اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں۔"

یہ ہدایت و رہنمائی ان کے لئے کافی تھی کہ اب وہ ہوش میں آ جائیں' اپنے رب کی طرف لوٹیں اور اپنے نبی کے حکم کی تعمیل کریں

لیکن بہرحال وہ بنی اسرائیل تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ حکم آئے اور وہ عمل پیرا ہو جائیں۔

ان کے لئے یہ ممکن تھا جب حکم بالکل آسان تھا کہ وہ کسی گائے کو پکڑتے اور ذبح کر ڈالتے' اور اس طرح بسہولت وہ اللہ کے حکم پر عمل پیرا ہو جاتے اور اپنے لیڈر اور اپنے نبی کا اشارہ ملتے ہی اسے نافذ کر دیتے۔ لیکن اس وقت ان کی فطرت حیلہ ساز جاگ اٹھتی ہے' اور اپنے اس موروثی مزاج سے مغلوب ہو کر وہ پوچھنے لگتے ہیں قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ "بولے! اچھا اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہمیں اس گائے کی کچھ تفصیل بتائے۔" انہوں نے اپنا سوال جن الفاظ میں بیان کیا' وہ الفاظ ہی یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ انہیں اب بھی اس بارے میں شک ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مذاق کر رہے ہیں۔ یہ سنجیدہ نہیں' وہ پہلے تو کہتے ہیں کہ اپنے رب سے درخواست کرو گویا موسیٰ ﷺ کا رب صرف اسی کا ہے اور وہ ان کا رب نہیں ہے۔ یا گویا' اس سوال کا تعلق صرف موسیٰ ہی سے ہے' انہیں اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ یہ صرف حضرت موسیٰ ﷺ اور آپ کے رب کا معاملہ ہے۔ پھر وہ حضرت موسیٰ ﷺ سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے معلوم کر کے بتائے کہ وہ گائے "کیا ہے" یہاں مقصد تو یہ تھا کہ گائے کیسی ہو' لیکن بطور استہزا اور انکار پوچھتے ہیں کہ "گائے! گائے کیا چیز ہوتی ہے؟" گویا وہ گائے کی ماہیت سے واقف نہیں۔ گائے کیسی ہو' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ کوئی گائے ذبح کریں تعمیل حکم کے لئے وہ کافی ہوگی۔ اب حضرت موسیٰ ﷺ ان کے سوال کو نظر انداز کر کے انہیں صحیح جواب دیتے ہیں اور انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ان کے اصلی سوال کا جواب دے کر ان کے ساتھ گائے کی ماہیت پر فلسفیانہ بحث و مباحثہ نہیں شروع کرتے' بلکہ انہیں اس طرح جواب دیتے ہیں جس طرح ایک مصلح اور مربی' ایسے لوگوں کو دیا کرتا جبکہ اللہ تعالیٰ اسے ایسے احمقوں اور فاسقوں کو راہ ہدایت پر لانے کے مشکل کام میں لگا کر آزماتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں گائے کے بارے میں کہتے ہیں۔ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ کما اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ ایسی گائے ہونی چاہئے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا' بلکہ اوسط عمر کی ہو۔" یعنی نہ بہت بوڑھی ہو اور نہ ہی بالکل جوان ہو بلکہ اوسط درجے کی ہو' لیکن اس مجمل بیان کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام پھر انہیں نصیحت کرتے ہیں اور بتاکید انہیں کہتے ہیں۔ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ "بس جو حکم دیا جا رہا ہے اس کی تعمیل کرو۔"

یہاں تک جو گفتگو ہوئی' اگر بنی اسرائیل حکم کی تعمیل چاہتے تو یہ کافی شافی تھی۔ اس گفتگو سے انہیں تسلی ہو جانی چاہئے تھی' دو مرتبہ یہ جلیل القدر پیغمبر انہیں جادۂ مستقیم پر لا چکے اور بارگاہ اقدس میں سوال و جواب اور وہاں سے استفادہ کرنے کے آداب بھی انہیں سمجھا چکے' دوبار انہیں بتا چکے کہ بس آگے بڑھیں اور اپنی گائیوں میں سے کسی اوسط درجے کی گائے کو ذبح کر ڈالیں۔ نہ بوڑھی ہو اور نہ ہی بہت چھوٹی' ادھیڑ عمر کی ہو' اس طرح وہ اس فرض کی ادائیگی سے جلد ہی بری الذمہ ہو جائیں اور اسے ذبح کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر ڈالیں اور اپنے آپ کو مزید قیود و حدود اور تنگی و مشقت میں نہ ڈالیں...... لیکن وائے ناکام! بنی اسرائیل بہرحال بنی اسرائیل تھے! پھر پوچھتے ہیں۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا "پھر کہنے لگے' اپنے رب سے یہ اور پوچھ دو کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟" یوں سہ بارہ وہ کہتے ہیں۔ "اپنے رب سے یہ اور پوچھ دو۔" اس لئے ان کے اصرار و تکرار کے نتیجے میں یہ ضروری ہو گیا کہ بالتفصیل انہیں جواب دیا جائے۔ چنانچہ جواب آیا! قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ

"موسیٰ نے کہا" وہ فرماتے ہیں زرد رنگ کی گائے ہونی چاہئے جس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جائے۔"

یوں ان بدبختوں نے اپنا وسیع دائرہ اختیار کم کر دیا۔ اس سے پہلے اس حکم میں بڑی وسعت اور گنجائش تھی لیکن اب وہ صرف کوئی

ایک گائے ذبح کرنے کے مکلف نہیں بلکہ ایک ایسی گائے انہیں ذبح کرنی ہے جو ادھیڑ عمر کی ہو 'نہ بوڑھی اور نہ بچھیا ہو' پھر اس کا رنگ بھی زرد ہو اور اس میں بھی پھر شوخ رنگ کی گئے ہو۔ پھر وہ دبلی پتلی اور بدصورت بھی نہ ہو بلکہ ایسی ہو کہ اسے دیکھ کر جی خوش ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ دیکھنے والے کا سرور تب ہی مکمل ہو سکتا ہے کہ جب مطلوبہ گائے خوب موٹی تازی' حیات و نشاط سے بھرپور' اچھلتی کودتی چلبلی ہو۔ کیونکہ مویشیوں میں یہ صفات لوگوں کے نزدیک پسندیدہ صفات ہیں اور لوگ بالعموم زندگی سے بھرپور اور متوسط عمر کے اور خوبصورت جانوروں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور دبلے پتلے' بدصورت جانوروں سے نفرت کرتے ہیں۔

غرض اب تک بنی اسرائیل نے لیت و لعل سے کام لیا۔ فانباوہ کافی بلکہ ضرورت سے بھی زیادہ تھا۔ لیکن وہ اب بھی بس نہیں کرتے۔ اپنی غلط روش میں آگے ہی بڑھتے جاتے ہیں' معاملے کو اور پیچیدہ بناتے چلے جاتے ہیں۔ اپنے اوپر اور تنگی کر رہے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ بھی ان کی روش کے مطابق اپنے حکم اور سخت کرتے جاتے ہیں۔ اس قدر تفصیلات آچکنے کے بعد وہ اچانک دوبارہ گائے کی ماہیت اور حقیقت کے بارے میں پوچھنے لگتے ہیں۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ "پھر بولے 'اپنے رب سے صاف صاف پوچھ کر بتاؤ' کیسی گائے مطلوب ہے؟..... اس سوال اور لیت و لعل کا عذر وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ معاملہ ان کے لئے موجب اشتباہ بن گیا اور گائے کے تعین میں بڑی مشکل درپیش آرہی ہے۔ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا "ہمیں اس گائے کے تعین میں اشتباہ ہو گیا ہے۔" اب آکر انہیں اپنی لجاجت اور جھگڑالو پنے کا قدرے احساس ہو جاتا ہے۔ اور بادل نخواستہ ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں۔ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ "اللہ نے چاہا تو ہم اس کا پتہ پالیں گے۔"

غرض اس نہ ختم ہونے والی لجاجت اور ہٹ دھرمی کے نتیجے میں اس کے سوا کوئی اور چارہ کار ہی نہ تھا کہ اس حکم کو مزید پیچیدہ اور سخت کر دیا جائے اور انتخاب و اختیار کا جو وسیع دائرہ انہیں فراہم کیا گیا تھا' اسے مزید تنگ اور محصور کر دیا جائے اور مطلوبہ گائے کے اندر چند مزید اوصاف کا اضافہ کر دیا جائے' جبکہ پہلے ان اوصاف کی ضرورت نہ تھی اور حکم کی تعمیل کا دائرہ وسیع تر رکھا گیا تھا۔ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا موسیٰ نے کہا' اللہ کہتا ہے وہ ایسی گائے ہو جس سے خدمت نہیں لی جاتی' نہ زمین جوتتی ہے' نہ پانی کھینچتی ہے' صحیح سالم اور بے داغ ہے۔"

اب وہ گائے صرف شوخ اور دل کو لبھانے والے زرد رنگ کی متوسط عمر کی گائے ہی نہ رہی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایسی گائے بن گئی جو کوئی محنت نہیں کرتی' ہل نہیں جوتتی' پانی نہیں کھینچتی اور ہے بھی خالص رنگ کی اس میں کوئی داغ نہیں ہے۔

یہاں آکر اب ان کا دماغ درست ہوتا ہے۔ معاملے کو مشکل سے مشکل تر بنانے' زیادہ سے زیادہ شرائط عائد کرانے اور اپنے دائرہ عمل کو آخری حد تک تنگ کرانے کے بعد اب وہ پکار اٹھتے ہیں۔ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ "اس پر وہ پکار اٹھے 'ہاں اب تم نے ٹھیک پتہ بتایا۔"

"اب" گویا اس سے پہلے جو کچھ آپ فرما رہے تھے وہ حق نہ تھا' گویا اس لمحہ ہی میں انہیں یہ یقین ہو رہا ہے کہ حضرت موسیٰ جو کچھ پیش فرما رہے ہیں وہ حق ہے۔

فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ "پھر انہوں نے اسے ذبح کیا' ورنہ وہ ایسا کرتے معلوم نہ ہوتے تھے۔"

جب وہ حکم الٰہی پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں اور فریضہ الٰہی کو ادا کر دیتے ہیں' تو اب یہاں پوری کہانی کے آخر میں' اللہ تعالیٰ انہیں بتاتے ہیں کہ اس نے گائے کو ذبح کرنے کا حکم کیوں دیا تھا۔

وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ O

"اور تمہیں یاد ہے' وہ واقعہ جب تم نے ایک شخص کی جان لی تھی' پھر اس کے بارے میں جھگڑنے اور ایک دوسرے پر قتل کا الزام تھوپنے لگے تھے اور اللہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کچھ تم چھپاتے ہو' وہ اسے کھول کر رکھ دے گا۔ اس وقت ہم نے حکم دیا کہ مقتول کی لاش کو اس کے حصے سے ضرب لگاؤ۔ دیکھو اس طرح اللہ مردوں کو زندگی بخشتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔"

یہاں آکر ہم قصہ بقرۃ کے ایک دوسرے پہلو تک آپہنچے ہیں۔ یہ پہلو اللہ تعالیٰ کی قدرت بے پایاں کا اظہار کر رہا ہے۔ اس سے موت و حیات کی حقیقت اور موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کی کیفیت کی حقیقت معلوم ہوتی ہے اور یہاں اسلوب کلام' کہانی کے انداز کے بجائے خطاب کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ کی قوم کے لئے گائے کو ذبح کرنے کے حکم کی حکمت کھول دیتے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ انہوں نے ایک شخص کو قتل کیا تھا' اور ہر آدمی اپنے آپ کو قتل کے الزام سے بری قرار دے کر دوسرے پر الزام لگاتا تھا اور کوئی گواہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیئت نے چاہا کہ مقتول خود صداقت کو ظاہر کر دے اور اس شہادت حق سے پہلے گائے کا ذبح کیا جانا دراصل ادائیگی شہادت کا ایک ظاہری ذریعہ تھا۔ یوں کہ بقرہ کے گوشت سے اسے مارتے ہی اس نے زندہ ہو جانا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا' انہوں نے اسے ذبح شدہ گائے کے ایک ٹکڑے سے مارا اور وہ زندہ ہو گیا۔ تاکہ وہ خود اپنے قاتل کی نشاندہی کر دے اور ان تمام شکوک و شبہات کو ختم کر دے جو اس کے قتل کے مسئلے میں پھیلے ہوئے تھے اور یوں صداقت محکم ترین دلائل کے ساتھ سامنے آجائے۔ حق حق ہو جائے اور باطل باطل۔ دودھ' دودھ اور پانی' پانی۔

سوال یہ ہے کہ اس ظاہری وسیلہ اور سبب کی کیا ضرورت تھی؟ اللہ تعالیٰ تو اس کے بغیر بھی مردوں کو زندہ کر سکتا ہے' بغیر کسی وسیلے اور ذریعے کے بھی۔ سوال یہ ہے کہ ذبح شدہ گائے اور زندہ کئے جانے والے مقتول کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

بنی اسرائیل کی عادت کے مطابق' ان کے ہاں بطور قربانی اور تقرب الی اللہ گائے ذبح ہوا کرتی تھی' رہا یہ منظر کہ ایک بے جان قطعہ لحم ایک بے جان مقتول کے اندر بظاہر زندگی کے آثار پیدا کر دیتا ہے' تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ گوشت کا ٹکڑا محض ظاہری سبب ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت ماہرہ کا اظہار کر رہا ہے' جس کی حقیقت تک پہنچنا انسان کے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔ لوگ اس کا اثر اور نتیجہ تو اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ رہے ہیں' لیکن مردے کو جلانے کا یہ طریق کار ان کی فہم سے باہر ہے۔ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى "وہ مردوں کو کیوں کر زندہ کرتا ہے؟ یوں جیسا کہ تم بچشم سر دیکھ رہے ہو' لیکن اس کے باوجود اس کی حقیقت سے بے خبر ہو۔ نہیں جانتے کہ وہ کیوں کر زندہ ہوا؟ مقصد یہ ہے کہ ایسی ہی بے مشقت اور بڑی سہولت سے اللہ تعالیٰ مردوں کو دوبارہ زندہ کر دے گا۔

موت اور حیات کی نوعیت کے درمیان کس قدر بعد ہے؟ اس فرق سے سر چکرا جاتے ہیں لیکن قدرت الٰہی کے مقابلے میں موت سے حیات اور حیات سے موت ایک معمولی اور آسان عمل ہوتا ہے۔ کیونکر؟ بس یہی وہ بات ہے جو ہر انسان کے حد ادراک سے وراء ہے۔ اسے کوئی نہیں پا سکتا۔ موت و حیات کے بھید کو پانا دراصل اسرار ادھیہ کو پانا ہے اور اس جہان فانی میں اللہ کے اس راز تک رسائی پانا ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ ایک انسان اس بھید اور راز پر غور کر کے اس سے نصیحت اور عبرت حاصل کر سکتا ہے۔

وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ O "اور اللہ تعالیٰ نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔"

اب ہم حسن ادا اور سیاق کلام سے اس کی ہم آہنگی پر آتے ہیں۔

یہ ایک مختصر قصہ ہے' جس کا آغاز بھی نہایت مجمل انداز میں ہوتا ہے۔ ابتدا میں ہمیں یہ تک معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم کیوں دیتے ہیں؟ جیسا کہ خود بنی اسرائیل کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ انہیں یہ حکم کیوں دیا جارہا ہے؟ یوں بنی اسرائیل کے جذبہ اطاعت اور جذبہ تسلیم ورضا کو آزمایا جاتا ہے۔

اس کے بعد اصل حصہ شروع ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ کے مابین گفتگو شروع ہوتی ہے۔ یہ بات بڑھتی جاتی ہے اور دوسری جانب اللہ تعالیٰ بھی اس گفتگو میں برابر شریک ہیں لیکن معلوم نہیں ہو سکتا کہ حضرت موسیٰ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کیا گفتگو ہوئی؟ حالانکہ وہ ہربار آپ سے پوچھتے تھے کہ وہ اپنے رب سے پوچھ کر بتائیں اور آپ بھی پہلے اپنے رب سے پوچھتے اور پھر جواب انہیں سنادیتے۔ اگرچہ سیاق کلام میں یہ بات نہیں ہے کہ آپ نے اللہ سے کیا پوچھا اور اللہ نے اس کا کیا جواب دیا' یہ سکوت اور یہ خاموشی اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور برتری اور علو مرتبت سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ بنی اسرائیل جس طریقہ سے گفتگو کرنے کے عادی تھے اور جس طرح گفتگو بالخصوص اس واقعہ میں وہ کر رہے تھے' ہرگز مناسب نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضرت موسیٰ کے سوال وجواب کا بھی اس میں ذکر کیا جاتا۔

آخر میں اچانک......جیسا کہ اس وقت بنی اسرائیل کے لئے یہ بات بالکل خلاف توقع تھی۔ بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے کہ وہ مذبوحہ بقرہ کے مردہ اور بے جان ٹکڑے کو مقتول پر ماریں اور دیکھیں کہ وہ کس طرح زندہ ہو جاتا ہے اور بات کرتا ہے' حالانکہ بقرہ کے گوشت میں نہ زندگی تھی اور نہ زندگی کا کوئی سامان تھا۔

غرض قرآن کریم کے دیگر مختصر اور بہترین قصوں کی طرح اس مختصر قصے میں بھی حکیمانہ موضوع سخن کے عین مطابق' نہایت ہی حکیمانہ طرز ادا اختیار کی گئی ہے۔

قصے کے اس آخری منظر کے اختتام پر اور اس قصے سے پہلے کے عبرت انگیز مظاہر اور سبق آموز واقعات کے نتیجے کے طور پر اس بات کی توقع تھی کہ اب تو بنی اسرائیل کے دل پگھل جائیں گے اور ان کے دلوں میں خوف خدا اور تقویٰ کے جذبات امڈ آئیں گے' لیکن ہمارے تعجب کی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ کلام کا خاتمہ بالکل خلاف توقع ان الفاظ پر ہوتا ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ

"مگر ایسی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی آخر کار تمہارے دل سخت ہو گئے' پتھروں کی طرح سخت' بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے کیونکہ پتھروں میں سے تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس میں سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں' کوئی پھٹتا ہے اور اس میں سے پانی نکل آتا ہے' اور کوئی خدا کے خوف سے لرز کر گر بھی پڑتا ہے۔ اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے۔"

یہاں ان کے دلوں کو پتھروں سے تشبیہہ دی جاتی ہے اور جب ان کا مقابلہ پتھروں کے ساتھ کیا جاتا ہے تو وہ ان سے بھی سخت اور خشک تر نکلتے ہیں۔ جیسے پتھروں سے یہاں انہیں تشبیہہ دی جارہی ہے۔ وہ بنی اسرائیل کے علم میں ہے۔ اس سے قبل وہ یہ منظر دیکھ چکے

تھے کہ ایک پتھر سے ۱۲ چشمے پھوٹ نکلے تھے...... وہ یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ جب تجلیات الٰہی کا ایک پرتو پہاڑ پر پڑا تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی بیہوش ہو کر گر پڑے تھے۔ لیکن ان کے دل اس قدر سخت ہیں کہ ان کے اندر کسی قسم کی کوئی نرمی یا تروتازگی پیدا نہیں ہوتی۔ ان میں خوف خدا سے دھڑکن نہیں پیدا ہوتی بلکہ وہ نہایت سخت' خشک' بنجر اور کافر دل ہیں۔ اس لئے انہیں ان الفاظ میں تنبیہ کی جاتی ہے۔وَ مَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ "اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے۔"

ان الفاظ پر بنی اسرائیل پر تنقید اور ان کی طویل تاریخ...... کفر' تکذیب انبیاء' مکر و فریب' فسق و فجور' حکم عدولی و سرکشی' بے خوفی وسنگدلی اور لجاجت اور چالاکی سے بھرپور تاریخ پر بحث کا پہلا حصہ یہاں ختم ہو جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

# درس ۵ ایک نظر میں

اس سے قبل ہم نے جس ٹکڑے کی تشریح کی ہے' اس میں خاتمۂ کلام بنی اسرائیل کے لئے یاد دہانی اور تذکیر پر ہوا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ ان پر انعامات کی بارش کرتا رہا اور اس کے مقابلے میں یہ لوگ کس ثابت قدمی سے بار بار کفران نعمت کرتے رہے۔ وہاں کہیں بسط کے ساتھ اور کہیں اختصار کے ساتھ اللہ کے انعامات اور بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کے واقعات اور مشاہدات بیان کئے گئے تھے۔ بیان کا خاتمہ اس فیصلے پر ہوا تھا کہ بنی اسرائیل کے دل قبول ہدایت کے معاملے میں اس قدر سخت' خشک اور بنجر ہو چکے ہیں جیسے مضبوط پتھر ہوتے ہیں بلکہ سنگدلی اور خشکی میں ان کے دل پتھروں سے بھی کہیں زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔

اب ان زیر بحث آیات میں' روئے سخن اسلامی جماعت کی طرف پھر جاتا ہے اور مسلمانوں کے سامنے ان کی کہانی بیان ہوتی ہے اور انہیں بتایا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کس قدر مکار اور فتنہ پرداز قوم ہے۔ ان کی فطرت اور ان کی طویل تاریخ کی روشنی میں اسلامی جماعت کو ان کی مکاری اور عیاری سے خبردار کیا جاتا ہے۔ تاکہ کہیں ان کی فتنہ پردازی اور غلط پروپیگنڈے اور جھوٹے دعووں سے متاثر ہو کر مسلمان دھوکہ نہ کھا جائیں۔ بنی اسرائیل کی مکاری کا یہ طویل بیان اور پھر بار بار اور مختلف پہلوؤں سے اس کا تکرار' اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ اس دور میں یہودی امت مسلمہ اور دین اسلام کے خلاف کتنے وسیع پیمانے پر سازشیں کر رہے تھے اور کس طرح وہ ہر وقت اس تحریک کو نقصان پہنچانے کی تاک میں بیٹھے رہتے تھے۔ اس لئے اس قدر تفصیلی گفتگو کی ضرورت پیش آ رہی تھی۔

دوران گفتگو' روئے سخن کبھی کبھی بنی اسرائیل کی طرف پھر جاتا ہے تاکہ امت مسلمہ کے سامنے' انہیں یاد دلایا جائے کہ اللہ نے ان سے کیا کیا وعدے لئے تھے اور انہوں نے کس کس طرح ان وعدوں کو توڑا تھا۔ کس طرح وہ گمراہ ہوئے' عہد شکنی کرتے رہے اور پھر انبیاء کرام کی تکذیب کرتے رہے۔ انہوں نے کئی انبیاء کو قتل بھی کیا۔ کیونکہ وہ ان کی خواہشات نفس کے مطابق نہ چل سکتے تھے۔ نیز یہ کہ کس طرح انہوں نے اللہ کی شریعت کی خلاف ورزی کی ناجائز بحث و جدل کرتے رہے اور شریعت کے جو قوانین ان کے پاس تھے ان میں تحریف کرتے رہے۔

مسلمانوں کے ساتھ جو بحث اور مناظرہ اور جو کٹ حجتی وہ کرتے تھے یہاں اس کے کچھ نمونے بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ ان کے دعووں کی حقیقت کھول دیں اور ان کے دلائل کی کمزوری واضح کر دیں اور ان کی باطل سازشوں کے مقابلے میں روشن اور واضح سچائی پیش کریں۔

مثلاً ان کا خیال تھا کہ وہ تو صرف گنتی کے چند دن ہی جہنم میں رہیں گے۔ کیونکہ وہ اللہ کے پسندیدہ اور محبوب لوگ ہیں' اللہ کے ہاں ان کا بلند رتبہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتے ہیں کہ ذرا " ان سے پوچھیں' کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے' جس کی خلاف ورزی وہ نہیں کر سکتا؟ یا یہ بات ہے کہ تم اللہ کے ذمے ڈال کر ایسی بات کہہ دیتے ہو' جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ اس نے اس کا ذمہ لیا ہے۔"

جب انہیں اسلام کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو وہ کہتے! " ہم تو صرف اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو ہمارے ہاں اتری ہے۔" اور اس دائرے سے باہر جو کچھ آیا ہے اسے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں' حالانکہ وہ حق ہے اور اسی تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی۔ چنانچہ نبی ﷺ کو یہ ہدایت کی جاتی ہے۔" اچھا ان سے کہو " اگر تم اس تعلیم ہی پر ایمان رکھنے والے ہو جو تمہارے

ہاں آئی تھی' تو اس سے پہلے اللہ کے پیغمبروں کو (جو خود بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے) کیوں قتل کرتے رہے۔" تمہارے پاس موسیٰ کیسی کیسی روشن نشانیوں کے ساتھ آیا۔ پھر بھی تم ایسے ظالم رہے کہ اس کے پیٹھ موڑتے ہی بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے۔ پھر ذرا اس میثاق کو یاد کرو جو کوہ طور کو تمہارے اوپر اٹھا کر ہم نے تم سے لیا تھا۔ ہم نے تاکید کی تھی کہ جو ہدایات ہم دے رہے ہیں ان کی سختی کے ساتھ پابندی کرو اور کان لگا کر سنو تمہارے اسلاف نے کہا کہ ہم نے سن لیا مگر مانیں گے نہیں اور ان کی باطل پرستی کا یہ حال تھا کہ دلوں میں ان کے بچھڑا ہی بسا ہوا تھا۔ کہو اگر تم مومن ہو' تو یہ عجیب ایمان ہے' جو ایسی بری حرکات کا تمہیں حکم دیتا ہے۔" (البقرہ۔ ۹۳)

ان کا دعویٰ یہ تھا کہ اگلا جہاں تو صرف انہی کے لئے ہے۔ دوسرے لوگوں کو تو وہاں کچھ نہ ملے گا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین کی کہ آپ ان کو دعوت مباہلہ دیں اور کسی میدان میں دونوں فریق جمع ہو جائیں اور اللہ سے دست بدعا ہوں کہ ان میں سے جو جھوٹا ہے اللہ اسے مار دے۔ "ان سے کہو کہ اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لئے مخصوص ہے' تب تو تمہیں چاہئے کہ موت کی تمنا کرو' اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔" اس کے بعد اللہ تعالیٰ خود ہی بتا دیتے ہیں کہ یہ لوگ "ہرگز موت کی تمنا نہ کریں گے۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ مباہلہ کرنے سے پھر گئے کیونکہ جس چیز کا وہ دعویٰ کر رہے تھے انہیں معلوم تھا کہ وہ اس میں جھوٹے ہیں۔

غرض دوران کلام یہودیوں پر کڑی تنقید کی جاتی ہے۔ ان کی مکاریوں پر سے پردہ اٹھایا جاتا ہے اور مسلمانوں کو ان کے بارے میں محتاط رہنے کی ہدایات دی جاتی ہیں۔ اس اقدام کا مقصد یہ ہے کہ جماعت مسلمہ کی صفوں میں خفیہ سازشوں کے ذریعے' انتشار پیدا کرنے کی جو کوششیں اس وقت یہودی کر رہے تھے' ان کا زور توڑا جائے اور مسلمانوں کو چوکنا کر دیا جائے۔ آج بھی امت مسلمہ کو یہودیوں کی اسی مکاری اور فریب کاری کا سامنا ہے۔ جس کا سامنا کبھی مدینہ طیبہ میں امت مسلمہ کے اسلاف کو تھا لیکن نہایت افسوس کے ساتھ یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ امت مسلمہ ان قرآنی آیات سے اس طرح فائدہ نہیں اٹھا رہی' جس طرح اس امت کے اسلاف نے اس ربانی ہدایت سے فائدہ اٹھایا تھا اور جس کے نتیجے میں وہ مدینہ طیبہ میں یہودیوں کی مکاری اور عیاری پر غالب آئے تھے۔ حالانکہ اس وقت دین اسلام نیا تھا اور جماعت مسلمہ ابھی ابھی تشکیل پائی تھی۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہ یہودی اس بات کی سخت کوشش کر رہے ہیں کہ امت مسلمہ کو قرآن کریم سے دور ہٹا دیں' مسلمان اپنے دین کو چھوڑ دیں' کیونکہ یہودیوں کو شدید خطرہ ہے کہ کہیں مسلمان ان کے خلاف وہی قرآنی ہتھیار کام میں لانا نہ شروع کر دیں اور ان کی مکاری اور سازشوں سے بچنے کے لئے وہ تدابیر نہ کریں جو ان کے بچاؤ کی حقیقی تدابیر ہیں اور کارگر بھی ہیں۔ کیونکہ یہودی اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب تک امت مسلمہ اپنی شوکت اور برتری کے ان حقیقی سرچشموں سے محروم ہے یہودی امن وچین سے رہ سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ ایک حقیقت ہے کہ اس امت کو جو شخص بھی قرآن کریم اور دین اسلام سے دور کرتا ہے وہ یہودیوں کا ایجنٹ ہے۔ چاہے وہ یہ کام شعوری طور پر کر رہا ہو یا غیر شعوری طور پر' بالارادہ کر رہا ہو یا بلا ارادہ۔ کیونکہ جب تک یہ امت ایک حقیقت یعنی حقیقتاً ایمانی' ایمانی نظام زندگی اور ایمانی شریعت اور اسلامی قانون سے دور اور غافل ہے۔ اس وقت تک یہودیت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امت مسلمہ کا وجود' اس کی قوت اور اس کی برتری کا حقیقی اور منفرد سرچشمہ صرف ایک ہے یعنی ایمان اور اسلام۔ یہی ایک راہ ہے اور رہنمائی کرنے والے یہی نشانات ہیں جن پر چل کر ایک مسلمان منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

☆☆☆

# درس ۵ تشریح آیات (۷۵ تا ۱۰۳)

أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ
كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٥﴾ وَإِذَا
لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا
أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُم بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا
تَعْقِلُونَ ﴿٧٦﴾ أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٧٧﴾

"اے مسلمانو! اب کیا ان لوگوں سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنا اور خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف کی۔ محمد رسول اللہ کے ماننے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی انہیں مانتے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے سے تخلیے کی بات چیت ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ کیا بے وقوف ہو گئے ہو؟ ان لوگوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ تمہارے رب کے پاس تمہارے مقابلے میں انہیں حجت میں پیش کریں؟ اور کیا یہ جانتے نہیں ہیں کہ جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے۔"

گزشتہ درس کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے قلوب کی حالت کا جو نقشہ کھینچا تھا۔ اس سے ہمیں معلوم ہوا تھا کہ وہ نہایت سنگدل، خشک اور ناقابل تغیر دل و دماغ کے مالک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ایسے پتھروں سے تشبیہ دی تھی جو نہایت ہی ٹھوس تھے اور جن میں سے پانی کا کوئی قطرہ برآمد نہ ہوتا تھا۔ اس قدر کھردرے تھے کہ انسان ان پر سہولت سے ہاتھ نہیں پھیر سکتا تھا۔ ان کے اندر کسی چیز کا اگنا یا ان کے اندر زندگی کے آثار پیدا ہونا تو یہ سرے سے ممکن ہی نہ تھا۔

یہ ایک ایسی تصویر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس جامد دماغ ایسی پست فطرت اور ایسی بے لچک متعصبانہ ذہنیت کی وجہ سے اس قابل ہی نہیں رہے کہ راہ ہدایت پر آجائیں۔ چنانچہ اس تصویر کشی اور ان کی طرف سے مایوس ہو جانے کے اس اشارے کے بعد کلام کا رخ بعض ان مسلمانوں کی طرف پھر جاتا ہے جو اب بھی یہ خیال کرتے تھے کہ شاید بنی اسرائیل راہ ہدایت پر آجائیں۔ ایسے لوگ کوشش کرتے تھے کہ بنی اسرائیل کے دلوں میں ایمان انڈیل دیں، کسی طرح انہیں ایمان کی روشنی کی طرف لے آئیں۔ قرآن کریم اس طرز پر سوچنے والے مومنین کو سوالیہ انداز میں مایوس کر دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اس سلسلے میں ان کے دلوں میں امید کی جو آخری کرن ہے اسے بھی دل سے نکال دیں۔

أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ اے مسلمانو! اب کیا ان لوگوں سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ تمہاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ

ان میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف کی۔"

خبردار! ایسے لوگوں کے ایمان لانے کی کوئی امید نہیں ہے۔ ایمان لانے والوں کا مزاج ہی دوسرا ہوتا ہے ان میں کچھ دوسری ہی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ ایمان لانے والی طبیعت نرم' سادہ اور سہل ہوتی ہے۔ اس کے دل و دماغ کے دریچے ہر قسم کی روشنی کے لئے کھلے ہوتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ازلی و ابدی سرچشمہ ہدایت سے جڑنے اور سیراب ہونے کے لئے ہر وقت تیار ہوتی ہے۔ اس کے اندر احساس' احتیاط اور خدا خوفی ہوتی ہے اور یہ خدا خوفی اس بات سے روکتی ہے کہ خدا کے کلام کو سن کر' اسے سمجھ کر پھر اس میں تحریف کرے۔ محض ذاتی خواہش کے لئے اور محض تعصب کی خاطر کلام الٰہی میں تحریف کرے کیوں کہ ایمان لانے والی طبیعت' بالکل سیدھی سادی ہوتی ہے اور وہ اس قسم کی کجروی اور بات کو توڑ موڑ کر پیش کرنے سے محترز رہتی ہے۔

پھر یہاں جس طبقے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ (یہود) سب سے زیادہ تعلیم یافتہ طبقہ ہے۔ اور اس سچائی کو سب سے زیادہ جاننے والا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کی کتاب میں اتاری۔ جیسے علمائے یہود کا طبقہ' جو ان کے نبی پر اتری ہوئی کتاب تورات کو سنتے تھے' سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود اسے بدل ڈالتے تھے اور اس میں ایسی تاویلات کرتے تھے کہ بات کچھ کی کچھ بن جاتی تھی اور یہ بات وہ اس لئے نہ کرتے تھے کہ انہیں اس کلام کا صحیح محمل معلوم نہ تھا بلکہ وہ یہ حرکت سوچ سمجھ کر بالارادہ کیا کرتے تھے اور یہ جانتے ہوئے کرتے تھے کہ وہ تحریف کر رہے ہیں۔ خواہشات نفس اور مصلحت کے ہاتھ میں ان کے فکر و عمل کی لگام تھی اور ذلیل اغراض کے نغموں کے پیچھے مست ہو کر دوڑ رہے تھے۔ جب وہ حضرت موسیٰ ؑ کی کتاب کے ساتھ بد سلوکی کرتے تھے' جس پر ان کا ایمان بھی تھا تو قرآن کریم جو حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا' اس کے ساتھ تو انہیں اس سے بھی بدتر سلوک کرنا ہی تھا کیونکہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سرے سے ایمان ہی نہ لائے تھے۔ لہٰذا اپنی اس خراب ذہنیت اور باطل رویے پر وہ جان بوجھ کر اصرار کرتے تھے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی ذہنیت خراب ہے اور یہ کہ وہ سوچ سمجھ کر باطل پر اصرار کر رہے ہیں یا پھر ان کی جانب سے دعوت اسلامی کی یہ مخالفت اور تحریک اسلامی کے خلاف سازشیں اور بہتان تراشیاں کوئی خلاف توقع امر نہیں رہتا۔

وَ إِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ۚ وَ إِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُم بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ

"جب محمد رسول اللہ کے ماننے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی انہیں مانتے ہیں اور جب آپس میں تخلئے کی بات چیت ہوتی ہے تو کہتے ہیں۔ بے وقوف ہو! ان لوگوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ تمہارے رب کے پاس تمہارے مقابلے میں انہیں حجت میں پیش کریں۔"

کیا تم ان سے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان جائیں گے؟ حالانکہ وہ نہایت غیر ذمہ دار' حق کو چھپانے والے اور کلام اللہ میں تحریف کرنے والے لوگ ہیں۔ ریاء' فریب کاری' منافقت اور چالبازی جیسے مفاسد ان کی جبلت میں داخل ہو گئے ہیں۔ پھر ان میں بعض ایسے بھی تھے کہ جب مسلمانوں سے ملتے تو کہتے ہم بھی ایمان لا چکے ہیں۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لا چکے ہیں کیونکہ ان کے ہاں تورات میں نبی آخر الزماں کے بارے میں واضح بشارتیں موجود تھیں اور وہ نبی آخر الزماں کی بعثت کا بڑی شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کیا کرتے تھے کہ وہ نبی آخر الزماں کے ذریعے انہیں کفار پر فتح عطا کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **كَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا** "وہ اس سے قبل کفار پر دعائے فتح مندی مانگا کرتے تھے۔" لیکن جب وہ ایک دوسرے کے

ساتھ تنہائی میں ملتے' تو ایک دوسرے کو اس بات پر سخت تنبیہہ کرتے کہ کیوں وہ مسلمانوں کو وہ باتیں بتارہے ہیں جو آپ کی رسالت کی صداقت کے بارے میں تورات میں مذکور ہیں' کہتے ہیں۔ بے وقوف ہوگئے ہو! ان لوگوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ تمہارے رب کے پاس تمہارے مقابلے میں انہیں حجت میں پیش کریں۔" اس طرح تم پر حجت قائم کردیں گے۔ یہاں ان کا مخصوص مزاج جو معرفت الٰہی سے بالکل کورا ہے ان پر غالب آجاتا ہے' وہ اللہ تعالیٰ کے علم کی حقیقت اور اس کی صفات کے حقیقی تصور تک سے عاری نظر آتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ یہ باتیں مسلمانوں کو نہ بتائیں تو اللہ تعالیٰ ان سے کچھ مواخذہ نہ کرے گا۔ مواخذہ صرف اس صورت میں ہوگا جب یہ باتیں مسلمانوں کو بتادی جائیں۔

اس سے بھی زیادہ ان کی مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو کہتے ہیں۔ "کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟" معلوم نہیں وہ کیسی عقل و دانش ہے جس کے کام میں نہ لانے پر وہ ایک دوسرے کی سرزنش کررہے ہیں۔

چنانچہ قرآن کریم آگے بڑھنے سے پہلے ان کی اس طرز فکر اور طرز عمل پر تعجب کا اظہار کیے بغیر نہیں رہتا۔

أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ "اور کیا یہ جانتے نہیں ہیں کہ جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے۔"

اب قرآن کریم ایک دوسرے پہلو سے مسلمانوں کے سامنے بنی اسرائیل کے حالات پیش کرتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ان میں دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ تو ان جاہلوں اور ان پڑھ لوگوں کا ہے جو ان پر نازل ہونے والی کتاب الٰہی کا کوئی علم نہیں رکھتا۔ اس کے دماغ میں صرف اوہام و خرافات اور ظن و تخمین اور خوش آئند آرزوئیں ہی بسی ہوئی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ کی پسندیدہ اور برگزیدہ قوم ہیں اور جو برے عمل بھی وہ کریں اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام گناہ معاف کردیئے ہیں' اس لئے یہ اپنے ذہن میں بسہولت نجات پاجانے کی امید لئے بیٹھے ہیں۔

دوسرا فریق وہ ہے جو اس جہالت سے خوب ناجائز فائدہ اٹھارہا ہے' وہ بے دھڑک اپنی جانب سے آیات و نصوص گھڑتا ہے۔ اپنی مفید مطلب تاویلات کرکے کتاب اللہ کے مفہوم کو کچھ سے کچھ بنادیتا ہے۔ جس چیز کو چاہتا ہے' چھپالیتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے لوگوں کے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔ خود اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی باتوں کے بارے میں یہ مشہور کرتا ہے کہ وہ اللہ کا کلام ہے اور یہ سب کام وہ دنیا کے ختم ہوجانے والے منافع اور ذاتی مفادات کے لئے کرتا ہے یا اس لئے کرتا ہے کہ اس کی پیشوائی اور برتری برقرار رہے۔

النصف

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿۷۸﴾
فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ
اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ
لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ ﴿۷۹﴾

"ان میں سے ایک دوسرا گروہ امیوں کا ہے' جو کتاب کا تو علم رکھتے نہیں بس اپنی بے بنیاد امیدوں اور آرزوؤں کو لئے بیٹھے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جارہے ہیں۔ پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں۔ پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کرلیں۔ ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا ہوا' ان

کے لئے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لئے موجب ہلاکت ہے۔

اب ان دونوں گروہوں میں سے ہم کس سے توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ مشرف بایمان ہو گا۔ حق کی آواز پر لبیک کہے گا اور ہدایت پر قائم ہو جائے گا۔ اور اپنے آپ کو ان پر نازل شدہ کتاب کی ان نصوص کی تحریف سے بچائے گا جو ان کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔ غرض ایسے لوگوں سے کوئی امید نہیں ہے کہ وہ ایمان لے آئیں گے۔ مسلمانوں کی بات مان کر دیں گے۔ ان کی قسمت میں تو تباہی اور بربادی لکھی ہوئی ہے اور یہ تباہی اور بربادی جو ان کی نوشتہ تقدیر ہے اس لئے ان کے لئے مقرر کی ہوئی ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آیات لکھیں اور پھر انہیں اللہ کی طرف منسوب کر ڈالا۔ یہ تباہی اور بربادی خود ان کے ہاتھوں کی کمائی ہے۔ کیونکہ انہی ہاتھوں سے انہوں نے ان آیات کو تراشا اور اللہ کی طرف منسوب کیا۔

ان کی خواہشات اور باطل آرزوؤں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ جس قدر بدکاری اور احکام کی جتنی خلاف ورزی بھی کریں بہرحال وہ نجات پانے والوں میں سے ہوں گے۔ وہ جہنم کی آگ میں چند دن رہیں گے اور اس کے بعد جنت کی طرف جانکلیں گے۔ ظاہر ہے ان کی یہ تمنا اللہ کے نظام عدالت' اس کی سنت دائمہ اور جزا و سزا کے صحیح تصور کے سراسر خلاف ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی اس آرزو کی بنیاد کیا ہے۔ وہ کس دفعہ کی بنیاد پر اس وقت کا یقین کرتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ اور ان کے درمیان کوئی باقاعدہ معاہدہ ہو گیا ہے۔ اور اس کے اندر ان کی تعذیب کی معیاد متعین ہو چکی ہے۔ یہ خیال جاہل لوگوں کی بے بنیاد آرزو اور خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے اور دوسری جانب سے یہ تصور ان کے فریب کار علماء کے کذب و افتراء کا پلندہ ہے۔ یہ ایسی آرزوئیں ہیں جن کا سہارا وہ تمام لوگ لیا کرتے ہیں جو صحیح عقیدہ اور نظریۂ حیات کو چھوڑ چکے ہوتے ہیں' اس پر ایک عرصہ گزر چکا ہوتا ہے اور اپنے حقیقی دین کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں رہا ہوتا۔ وہ اپنے دین کے صرف نام اور چند ظاہری رسومات کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔ اور دین کی حقیقت اور اس کے اصل موضوع سے بے خبر ہو جاتے ہیں لیکن چونکہ وہ اپنے آپ کو اس دنیا کی طرف منسوب کرتے ہیں' اس لئے سمجھتے ہیں کہ بس یہ زبانی نسبت ہی ان کی نجات کے لئے کافی ہو گی۔

وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

"وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز چھونے والی نہیں ہے۔ الا یہ کہ چند روز کی سزا مل جائے تو مل جائے۔ ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے' جس کی خلاف ورزی وہ نہیں کر سکتا۔ یا بات یہ ہے کہ تم اللہ کے ذمے ڈال کر ایسی باتیں کہہ دیتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ اس نے ان کا ذمہ لیا ہے۔"

یہاں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایک ایسی دلیل اور حجت کی تلقین کرتے ہیں جو باطل کا سر کچل دیتی ہیں۔ "کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے' جس کی خلاف ورزی وہ نہیں کر سکتا؟" اگر کوئی ایسا عہد تم نے لے رکھا ہے تو بتاؤ وہ کہاں ہے؟ "یا بات یہ ہے کہ تم اللہ کے ذمے ڈال کر ایسی باتیں کہہ دیتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہوتا۔" یہ سوالیہ انداز بات کو اور مضبوط بنانے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے پاس اللہ کا کوئی عہد نہیں ہے۔ سوالیہ انداز میں ناپسندیدگی اور زجر و توبیخ کے معانی بھی مضمر ہوتے ہیں۔

یہاں اب اس سلسلے میں' انہیں ایک فیصلہ کن اور قطعی بات بتادی جاتی ہے کہ ان کے اس دعوے کی حقیقت کیا ہے؟ یہ بات جزاء و سزا کے متعلق اسلام کے عالمگیر تصور ہی سے ماخوذ ہے اور بطور قاعدہ کلیہ بتادیا جاتا ہے کہ جزا عمل کے مطابق ہوگی۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

۹
ع ۱۱
۹

"آخر تمہیں دوزخ کی آگ کیوں نہ چھوئے گی۔ جو بھی بدی کمائے گا اور اپنی خطاکاری کے چکر میں پڑا رہے گا وہ دوزخی ہے اور دوزخ ہی میں وہ ہمیشہ رہے گا اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے وہی جنتی ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اس مخصوص اصول جزاء و سزا اور اس ذہنی مفہوم کو قرآن نے جس معجزانہ اور فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے اور جس طرح اس کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے' ہم قدرے توقف کر کے اس پر غور کریں اور اللہ کے اس اٹل حکم اور ابدی اصول کے اسباب و اسرار معلوم کرنے کی کوشش کریں۔

"ہاں جو بھی بدی کمائے اور خطاکاری کے چکر میں پڑا رہے گا گویا بدی ایک قسم کی کمائی ہے۔ یہاں معنی مطلوب صرف غلطی کا ارتکاب ہے لیکن' جن الفاظ سے اس کی تعبیر کی گئی ہے وہ معروف نفسیاتی حالت کی عکاسی کرتے ہیں۔ جو لوگ معصیت میں مبتلا ہوتے ہیں' وہ اس کے عادی ہو جاتے ہیں اور اس کے ارتکاب میں انہیں مزا آتا ہے۔ اور وہ اس سے لذت اندوز ہوتے ہیں۔ اور اسے اپنی کمائی سمجھنے لگتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ اسے مکروہ اور ناپسندیدہ سمجھتے تو اس کا ارتکاب نہ کرتے۔ نیز اگر وہ سمجھتے کہ یہ ایک قسم کا خسارہ ہے تو وہ اس جوش و خروش سے اس کا ارتکاب نہ کرتے' نیز وہ اس برائی کو اپنے اوپر اس طرح غالب نہ کرتے کہ ان کی پوری دنیا اس کی لپیٹ میں آ جائے اور وہ پوری طرح اس کے چکر میں پھنس جائیں کیونکہ یہ لوگ اگر اسے ناپسند کرتے اور اس کے اندر جو خسارہ تھا' اسے محسوس کرتے تو اس کے سائے سے بھی دور بھاگتے۔ اگرچہ طبعاً وہ اس کے ارتکاب کی طرف مائل ہوتے۔ نیز وہ اللہ سے معافی مانگتے اور اس گناہ کے دائرہ اثر سے نکل کر کسی اور کے دامن میں پناہ لیتے۔ اس صورت میں یہ برائی انہیں گھیر نہ سکتی اور نہ ہی ان پر چھا سکتی تھی اور ان کے لئے توبہ اور تلافی مافات کے دروازے بند نہ ہو جاتے وَ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ "اور اس کی خطاکاری نے اسے گھیر لیا۔" یہ ایک ایسی تعبیر ہے جو اس کیفیت اور معنی کو مجسم شکل میں پیش کرتی ہے۔ قرآن کریم کی فنی خوبیوں اور خصوصیات میں سے یہ ایک اہم خصوصیت ہے نیز قرآن کریم کی مخصوص طرز تعبیر کی اہم نشانی ہے۔ اس طرز تعبیر کا انسان کے ذہن پر ایک خاص اثر پڑتا ہے' جو خالص مفہومات و معانی کا نہیں پڑتا۔ وہ معنوی تعبیریں جو متحرک شکل میں نہ ہوں ایسا اثر پیدا نہیں کر سکتیں۔ معصیت پر اصرار کی معنوی کیفیت کی اس سے اور مستحسن تعبیر کیا ممکن ہے کہ معصیت کا مرتکب خود معصیت کے دائرے میں قید ہو' اس کی حدود کے اندر ہی زندگی بسر کر رہا ہو' وہ اس معصیت ہی کا ہو کر رہ گیا ہو' اس کے بغیر اس کے لئے زندگی کا ایک سانس لینا بھی ممکن نہ رہا ہو۔

اور جب ایک انسان کسی معصیت کے چکر میں اس طرح پڑ جاتا ہے وہ ہر طرف سے محصور ہو جاتا ہے اور اس کے لئے توبہ کے تمام

دروازے بند ہو جاتے ہیں تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کا یہ عادلانہ اور اٹل فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ O "ایسے لوگ دوزخی ہیں اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔"

اس فیصلے اور نتیجے کے بعد دوسرا اور متقابل صورت کا حکم بھی یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ "اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے وہی جنتی ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور نیک عمل کریں گے۔"

یعنی ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ دل سے عمل صالح کی شکل میں پھوٹ کر باہر نکل آئے۔ جو لوگ ایمان کے دعویدار ہیں' انہیں چاہئے کہ اس حقیقت پر ذرا غور کرلیں نیز وہ تمام مسلمان جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہیں' اور ہم بھی ان میں شامل ہیں' اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اس حقیقت کے بارے میں اچھی طرح تسلی کرلیں۔ ایمان کا وجود اس وقت تک متصور نہ ہو گا جب تک کہ اس کے نتیجہ میں عمل صالح پیدا نہ ہو' رہے وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں' پھر وہ زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور نیکی اور بھلائی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ زمین پر اسلامی نظام حیات کے قیام اور اسلامی شریعت کے نفاذ کو روکتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں۔ اسلامی اخلاق کے خلاف بر سرپیکار رہتے ہیں۔ تو ایسے لوگوں کے لئے دولت ایمان کا ایک ذرہ بھی نہیں ہے' ان کے لئے اللہ کے ہاں کوئی اجر نہیں ہے۔ انہیں اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ اگرچہ وہ ایسی خوش آئند امیدیں اور آرزوئیں اپنے دلوں کے اندر رکھتے ہیں جیسی یہود رکھتے تھے' اور جن کا اوپر اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا۔ پس سب کے لئے یہی حکم ہے۔

☆........O........☆

اس کے بعد بنی اسرائیل کے کچھ اور حالات مسلمانوں کے سامنے رکھے جاتے ہیں' مختلف اوقات میں ان کے طرز عمل' معصیت' کجروی' گمراہی اور عہد و پیمان کی خلاف ورزی کے مختلف واقعات بیان کئے جاتے ہیں اور یہودیوں کے یہ سیاہ کارنامے مسلمانوں کے سامنے' ان پر کھولے جاتے ہیں۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ ﴿٨٣﴾ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿٨٤﴾ ثُمَّ أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ۚ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاءُ

مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ
اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۫ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ
۱۰
يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ ع
ع

۱۰ "یاد کرو اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا' رشتہ داروں کے ساتھ یتیموں کے ساتھ نیک سلوک کرنا' لوگوں سے بھلی بات کہنا' نماز قائم کرنا اور زکوۃ دینا' مگر تھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے اور اب تک پھرے ہوئے ہو۔ پھر ذرا یاد کرو' ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا' تم نے اس کا اقرار کیا تھا۔ تم خود اس پر گواہ ہو' مگر آج وہی تم ہو کہ اپنے بھائی بندوں کو قتل کرتے ہو' اپنی برادری کے کچھ لوگوں کو بے خانماں کر دیتے ہو' ظلم و زیادتی کے ساتھ ان کے خلاف جتھا بندیاں کرتے ہو' اور جب وہ لڑائی میں پکڑے ہوئے تمہارے پاس آتے ہیں تو ان کی رہائی کے لئے فدیہ کا لین دین کرتے ہو' حالانکہ ان کو ان کے گھروں سے نکالنا ہی تم پر حرام تھا۔ تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصہ کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کو بیچ کر دنیا کی زندگی خرید لی ہے' لہٰذا نہ ان کی سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انہیں کوئی مدد پہنچ سکے گی۔"

گزشتہ سبق میں جہاں بنی اسرائیل کی وعدہ خلافیوں کا ذکر کیا گیا تھا' اس میثاق کی طرف اشارہ بھی کیا گیا تھا۔ یہاں اس معاہدہ کی بعض شقوں کی طرف تفصیلی اشارہ کیا جاتا ہے۔

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ساتھ جس معاہدہ کا ذکر کیا ہے وہ وہی معاہدہ ہے جو ان کے ساتھ کوہ طور کو ان کے سروں پر لٹکانے کے بعد طے پایا تھا۔ اور جس کے بارے میں انہیں تاکید کی گئی تھی کہ وہ اسے مضبوطی سے پکڑیں اور اس کے اندر جو ہدایات انہیں دی گئی ہیں انہیں یاد رکھیں۔ غالباً اس کے اندر دین کے اساسی امور کا بیان تھا اور یہ اساسی امور وہی ہیں جو اب اسلام نے ان کے سامنے پیش کئے ہیں اور جنہیں وہ کوئی عجیب اور نئی چیز سمجھ کر رد کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ جو عہد کیا تھا' وہ جن امور پر مشتمل تھا' ان میں ایک اہم امر یہ تھا کہ وہ صرف اللہ کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں' یعنی وہ مکمل توحید کا عقیدہ اختیار کریں۔ اس عہد میں یہ حکم بھی تھا کہ والدین' رشتہ داروں' یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں۔ اس میں یہ بھی تھا کہ وہ لوگوں کو اچھی باتوں کی تلقین کریں اور ظاہر ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اچھی باتوں میں سرفہرست ہے۔ نیز اس عہد میں نماز فرض کی گئی تھی اور زکوۃ کی ادائیگی کا حکم دیا گیا تھا۔ غرض یہ سب چیزیں ایسی تھیں جو اسلام کے اندر بھی اساسی امور گنے جاتے ہیں اور یہ سب باتیں اسلام میں فرض قرار دی گئی ہیں۔

اس عہد کے مطالعے سے کئی باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ کا دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے جو اسلام ہے اور یہ کہ اسلام اس دین کی آخری کڑی ہے اور اس میں سابقہ شرائع کی تمام اصولی باتوں کو تسلیم کیا گیا ہے۔ دوسری حقیقت یہ عیاں ہوتی ہے کہ یہودیوں کو دین اسلام سے بے حد بغض تھا۔ اسلام انہیں محض انہیں

باتوں کی طرف بلا رہا تھا جس کا انہوں نے اپنے اللہ سے معاہدہ کر رکھا تھا لیکن اس کے باوجود اس کا انکار کر رہے تھے۔

ان کے اس شرمناک طرز عمل کی وجہ سے انداز گفتگو غائبانہ کلام سے تبدیل ہو کر خطاب کی شکل اختیار کر لیتا ہے حالانکہ اس سے قبل بنی اسرائیل کو چھوڑ کر مومنین کو خطاب کیا جا رہا تھا اور ان کے سامنے ان کے برے کارنامے بیان کئے جا رہے تھے۔ ان کے یہ سیاہ کارنامے بیان کرتے کرتے اچانک ان سے مخاطب ہونا ان کے لئے سخت شرمندگی کا باعث ہے ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ "مگر تھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے ہو اور اب تک پھرے ہوئے ہو۔"

اس سے وہ بعض راز معلوم ہو جاتے ہیں کہ اللہ کی اس عجیب کتاب میں واقعات کو بیان کرتے ہوئے' کلام میں اچانک التفات کیوں ہوتا ہے۔ اور اس میں کیا حکمت پوشیدہ ہوتی ہے؟

اب اس سے آگے بھی کلام رخ بنی اسرائیل کی طرف ہی ہے۔ قرآن کریم ان کو مخاطب کر کے بتاتا ہے کہ ان کے موقف میں کیا کیا تضادات پائے جاتے ہیں۔ اور کہاں کہاں وہ اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝

"پھر یاد کرو! ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا اور تم اس پر گواہ ہو۔" پھر اس اقرار اور شہادت اور گواہی کے بعد کیا ہوا؟

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ؗ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ

"مگر آج وہی تم ہو کہ اپنے بھائی بندوں کو قتل کرتے ہو۔ اپنی برادری کے کچھ لوگوں کو بے خانماں کر دیتے ہو۔ ظلم و زیادتی کرنے کے ساتھ ان کے خلاف جتھا بندیاں کرتے ہو' اور جب وہ لڑائی میں پکڑے ہوئے تمہارے پاس آتے ہیں تو ان کی رہائی کے لئے فدیہ کا لین دین کرتے ہو۔ حالانکہ ان کو ان کے گھروں سے نکالنا ہی سرے سے تم پر حرام تھا تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو۔"

یہ واقعہ جو قرآن کریم ان کے خلاف پیش کر رہا ہے' وہی تھا جو غلبہ اسلام سے کچھ زمانہ پہلے اوس و خزرج کی جنگوں میں پیش آ چکا تھا۔ اوس و خزرج مشرکین یثرب کے دو قبیلے تھے اور ان کے درمیان ایسی شدید دشمنی تھی جس کی مثال پورے عرب قبائل میں نہ تھی۔ یثرب میں یہودیوں کے بھی تین قبائل تھے جن میں سے بعض ایک قبیلے اور بعض دوسرے قبیلے کے حلیف ہوتے تھے۔ جب ان دو قبائل کے درمیان جنگ ہوتی تو ان کے یہودی حلیف بھی جنگ میں شریک ہوتے۔ اس طرح بعض اوقات ایک یہودی مد مقابل کے حلیف دوسرے یہودی کو قتل کرتا اور اللہ کے ساتھ انہوں نے جو پختہ عہد باندھا تھا یہ اس کے سراسر خلاف تھا۔ جب ایک قبیلے کا حلیف غالب آتا تو خود بنی اسرائیل' بنی اسرائیل کو لوٹتے۔ انہیں گھروں سے نکالتے' ان کی عورتوں کو غلام بناتے حالانکہ میثاق کی نص کی رو سے یہ حرکت ان پر حرام تھی۔ لیکن جب جنگ ختم ہو جاتی تو پھر یہ غالب یہودی مقابل کے مغلوب یہودیوں کا فدیہ دیتے۔ انہیں قید اور غلامی سے رہائی

دلاتے۔ جہاں جہاں بھی وہ قید ہوتے خواہ اپنے کیمپ میں ہوتے یا مخالفین کے کیمپ میں ہوتے۔ اور یہ کام وہ تورات کے اس حکم پر عمل کرتے تھے جس میں کہا گیا تھا "تجھے بنی اسرائیل کا جو شخص غلام ملے اسے خرید و اور رہا کرو۔"

یہ تھا ان کی زندگی کا اہم تضاد اور اسے ان کے سامنے رکھ کر قرآن کریم ان سے پوچھتا ہے'

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ "تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہوئے اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو۔"

اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ یہ عہد کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اس لئے انہیں اس بات کی تہدید کی جاتی ہے کہ اس وجہ سے وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہوں گے اور آخرت میں اس پر انہیں دردناک عذاب دیا جائے گا۔ نیز انہیں تنبیہہ کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ ان سے غافل ہے اور نہ ہی ایسی صریح غلطیوں کو معاف کرے گا۔

فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ "پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں' ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔"

اس کے بعد مسلمانوں کو خصوصاً اور تمام انسانیت کو عموماً خطاب کیا جاتا ہے۔ اور بتایا جاتا ہے کہ ان یہودیوں کی حقیقت کیا ہے اور ان کے ان اعمال کا انجام کیا ہے؟ جو وہ کر رہے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۡ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ "یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت بیچ کر دنیا خرید لی ہے۔ لہٰذا نہ ان کی سزا میں کوئی تخفیف ہوگی اور نہ انہیں کوئی مدد پہنچ سکے گی۔"

لہٰذا ان کا یہ دعویٰ بالکل جھوٹا ہے کہ ہمیں تو صرف چند دن ہی آگ چھوئے گی کیونکہ "ان کے عذاب میں کوئی تخفیف بھی نہیں ہوگی اور نہ انہیں کوئی مدد پہنچ سکے گی۔"

سوال یہ ہے کہ انہوں نے آخرت بیچ کر دنیا کس طرح خرید لی؟ وہ یوں کہ وہ اللہ کا عہد توڑنے پر محض اس لئے آمادہ ہوئے کہ وہ اپنے دنیاوی مفادات کی خاطر مشرکین کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو نبھائیں اور یہ عہد ایسا ہے جسے نبھانے میں لازماً انہیں اپنے دین اور اللہ کی کتاب کی خلاف ورزی کرنی پڑ رہی ہے۔

یاد رہے کہ دو دھڑوں میں بٹ کر دو حلیفوں سے معاہدے کر لینا بنی اسرائیل کا پرانا حربہ ہے۔ یہ ہمیشہ بین بین رہتے ہیں اور احتیاطاً باہم متحارب بلاکوں میں سے ہر ایک کے ساتھ ہو جاتے ہیں تاکہ جو بلاک بھی کامیاب ہو' اس کے حاصل ہونے والے مفادات میں ان کا حصہ بہرحال محفوظ ہو' جو گروہ بھی کامیاب ہو اس کی کامیابی یہودیوں کی کامیابی ہو۔ جن لوگوں کو اللہ پر اعتماد نہیں ہوتا اور جو اللہ کی رسی کو مضبوط تھامے ہوئے نہیں ہوتے ان کا طرز عمل ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ عیاری اور چالبازی سے کام لیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اللہ کے مقابلے میں انہیں انسانوں کی مدد حاصل رہے۔ وہ اللہ کے عہد و پیمان سے زیادہ انسان کے عہد و پیمان کو اہمیت دیتے ہیں۔

لیکن ایمان تو انسان کو ہر اس عہد و میثاق کے اندر شامل ہونے سے روکتا ہے جو احکام شریعت کے خلاف ہو اور جس سے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کی خلاف ورزیاں لازم آتی ہے۔ کسی مصلحت کی خاطر یا بچاؤ کی کوئی تدبیر اختیار کرنے کی خاطر کوئی ایسا عہد نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ بچاؤ اس میں ہے کہ انسان اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کی پابندی کرے۔ نیز سب سے بڑی مصلحت یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ

کے احکام بجالائے اور اپنے دین کا اتباع کرے۔

یہ تھا بنی اسرائیل کا طرز عمل' ان کے مصلحین اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ! قرآن کریم ان کے اس طرز عمل کو بالتفصیل بیان کرتا ہے اور مسلسل واقعات کی روشنی میں اسے ثابت کرتا ہے اور پھر اچانک ان کو آڑے ہاتھوں لیتا ہے اور نبی آخر الزمان اور اس نئی اور آخری رسالت کے بارے میں ان کے مکروہ طرز عمل پر گرفت کرتا ہے۔ قرآن کریم انہیں بتاتا ہے کہ تمہی تو ہو جنہوں نے انبیائے سابقین کے ساتھ یہ سلوک کیا۔ ذرا غور سے پڑھیے؟

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا
عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ
بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

ہم نے موسیٰ کو کتاب دی' اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے' آخر کار عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں دے کر بھیجا اور روح پاک ۳۰۔ سے اس کی مدد کی۔ پھر یہ تمہارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشات نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمہارے پاس آیا تو تم نے اس کے مقابلے میں سرکشی ہی کی' کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾
وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ
يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ
اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ
عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ
الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ
مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ
الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا

فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡعِجۡلَ بِکُفۡرِهِمۡ‌ؕ قُلۡ بِئۡسَمَا يَاۡمُرُكُمۡ بِهٖۤ اِيۡمَانُكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۹۳﴾

"وہ کہتے ہیں؟" ہمارے دل محفوظ ہیں" نہیں' اصل بات یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہے' اسی لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے اس کے ساتھ ان کا برتاؤ کیا ہے؟ باوجود یہ کہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے۔ جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی' باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے' مگر جب وہ چیز آگئی' جسے وہ پہچان بھی گئے تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ خدا کی لعنت ان منکرین پر' کیسا برا ذریعہ ہے' جس سے یہ اپنے نفس کی تسلی حاصل کرتے ہیں کہ جو ہدایت اللہ نے نازل کی ہے' اس کو قبول کرنے سے صرف اس ضد کی بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل (وحی و رسالت) سے اپنے جس بندے کو چاہا' نواز دیا۔ لہٰذا اب یہ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے ہیں اور ایسے کافروں کے لئے سخت ذلت آمیز سزا مقرر ہے۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے' اس پر ایمان لاؤ' تو وہ کہتے ہیں "ہم تو صرف اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو ہمارے ہاں (یعنی نسل بنی اسرائیل) اتری ہے۔" اس دائرے کے باہر جو کچھ آیا ہے' اسے ماننے سے انکار کرتے ہیں' حالانکہ وہ حق ہے اور اس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی۔ اچھا' ان سے کہو؟ اگر تم اس تعلیم ہی پر ایمان رکھنے والے ہو جو تمہارے ہاں آئی تھی' تو اس سے پہلے اللہ کے ان پیغمبروں کو (جو خود بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے تھے) کیوں قتل کرتے رہے؟ تمہارے پاس موسیٰ کیسی کیسی روشن نشانیوں کے ساتھ آیا۔ پھر بھی تم ایسے ظالم تھے کہ اس کے پیٹھ موڑتے ہی بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے۔ پھر ذرا اس میثاق کو یاد کرو' جو طور کو تمہارے اوپر اٹھا کر ہم نے تم سے لیا تھا۔ ہم نے تاکید کی تھی کہ جو ہدایات ہم دے رہے ہیں ان کی سختی سے پابندی کرو۔ اور کان لگا کر سنو تمہارے اسلاف نے کہا کہ ہم نے سن لیا' مگر مانیں گے نہیں۔ اور ان کی باطل پرستی کا یہ حال تھا کہ دلوں میں ان کے بچھڑا ہی بسا ہوا تھا۔ کہو؟ اگر تم مومن ہو' تو یہ عجب ایمان ہے' جو ایسی بری حرکات کا تمہیں حکم دیتا ہے۔

یہاں آکر قرآن کریم کا انداز بیان عنیف و شدید ہو جاتا ہے اور بعض مقامات پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا بجلی گر رہی ہے یا آگ برس رہی ہے۔ قرآن کریم' خود ان کے اقوال اور ان کے تاریخی افعال میں ان کے سامنے رکھ کر' انہیں اس طرح آڑے ہاتھوں لیتا ہے کہ بیچارے بالکل لاجواب ہو جاتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی حجت نہیں رہتی۔ نہ ہی وہ کوئی معذرت پیش کر سکتے ہیں۔ درحقیقت تو وہ از روئے استکبار سچائی قبول کرنے سے اعراض برتے تھے۔ ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف بغض بھرا ہوا تھا' وہ مسلمانوں کو حقیر سمجھ کر ان سے دوری اختیار کئے ہوئے تھے' انہیں یہ بات بے حد ناپسند تھی کہ ان کے علاوہ کوئی بھی یہ مقام بلند پائے اور ان کے دلوں کو یہ حسد کھائے جا رہا تھا کہ اللہ کا یہ فضل و کرم مسلمانوں پر کیوں ہو رہا ہے؟ لیکن لوگوں کو دکھانے کی خاطر اسلام نہ قبول کرنے کی مذکورہ بالا وجوہات بیان کرتے تھے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے سختی سے رد کر دیا کیونکہ اللہ اور رسول کے مقابلے میں ان کے منکرانہ اور متمردانہ موقف کا یہی علاج تھا۔

وَ قَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ‌ؕ بَلۡ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِکُفۡرِهِمۡ فَقَلِيۡلًا مَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝ "اور وہ کہتے ہیں کہ "ہمارے دل محفوظ ہیں"۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہے۔ اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔"

وہ کہتے تھے کہ ہمارے دلوں کے اوپر غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ ان تک کوئی جدید دعوت نہیں پہنچ سکتی۔ نہ ہی وہ کسی نئے داعی کی پکار سننے کے لئے تیار ہیں۔ یہ بات وہ اس لئے کہتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو مایوس کر دیں تاکہ وہ انہیں اس دین جدید کی طرف بلانا ہی چھوڑ دیں' نیز وہ یہ باتیں نبی ﷺ کی دعوت قبول نہ کرنے کے علت کے طور پر بھی کہتے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ان کی ان باتوں کو رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ "بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہے۔" یعنی ان کے مسلسل انکار کی وجہ سے اللہ نے انہیں بطور سزا ہدایت سے بہرہ ور ہونے سے محروم کر دیا اور اس روشنی کے درمیان پردے حائل ہو گئے۔ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ "اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔"

یعنی چونکہ اپنے مسلسل کفر اور قدیم گمراہی کی وجہ سے وہ راہ حق سے دور جا پڑے ہیں۔ اور اللہ نے بطور سزا انہیں محروم بھی کر دیا ہے۔ اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔ نیز اس آیت کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے۔ "چونکہ وہ کافرانہ روش اختیار کئے ہوئے ہیں' اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔" یعنی یہ ان کی مستقل روش ہے جس پر وہ قائم ہیں۔ دونوں مفہوم سیاق کلام سے مناسبت رکھتے ہیں۔

ان کی جانب سے یہ کافرانہ رویہ اختیار کرنا اس لئے زیادہ قبیح تھا کہ وہ اس نبی کا انکار کر رہے تھے۔ جس کے انتظار میں وہ صدیوں تک بیٹھے ہوئے تھے اور وہ یہ امید لگائے ہوئے تھے کہ اس کے ذریعہ وہ تمام کفار پر غلبہ پائیں گے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس آنے والے نبی کے ذریعے وہ فتح اور نصرت حاصل کریں گے۔ اور جب وہ اس کتاب کی تصدیق کرتے ہوئے تشریف لائے' جو ان کے پاس تھی تو انہوں نے کفر کی راہ لی۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے۔ اس کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے؟ باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے۔ جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی۔ باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ مگر جب وہ چیز آگئی' جسے وہ پہچان بھی گئے تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔"

یہ ان کی ایسی قبیح حرکت تھی کہ اس پر وہ بجا طور پر اس سزا کے مستحق تھے کہ انہیں راہ ہدایت سے دور پھینک دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر اللہ کی پھٹکار برستی ہے۔ اور انہیں کفر کے عیب سے متصف قرار دیا جاتا ہے فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ "خدا کی لعنت ان منکروں پر۔" اس کے بعد اللہ تعالیٰ یہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے جو سودا کیا ہے وہ گھاٹے کا سودا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ ان کے اس مکروہ موقف اور ناپسندیدہ طرز عمل کا اصل اور پوشیدہ سبب بھی ظاہر فرما دیتے ہیں۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۚ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ "کیا بری ہے وہ قیمت جس سے یہ اپنے نفس فروخت کرتے ہیں کہ جو ہدایت اللہ نے نازل کی ہے' اس کو قبول کرنے سے صرف اس ضد کی بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل (وحی و رسالت) سے اپنے جس بندے کو خود چاہا نواز دیا! لہٰذا اب یہ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے ہیں اور ایسے کافروں کے لئے سخت ذلت آمیز سزا مقرر ہے۔"

انہوں نے جان بوجھ کر اپنی جان کے بدلے جو کفر خریدا ہے' وہ ان کے لئے بہت گھاٹے کا سودا ہے۔ گویا انہوں نے اپنی جان کی قیمت کفر کو قرار دیا۔ انسان اپنے آپ کی کم و بیش کوئی نہ کوئی قیمت لگاتا ہے اور اگر وہ اپنی ذات کو کفر کے عوض فروخت کر دے تو یہ اس کے لئے سخت خسارے کا سودا ہو گا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے ایسا ہی کیا' اگرچہ یہ بات یہاں بطور تمثیل اور منظر کشی کے بیان ہوئی ہے۔

دنیا میں انہیں یہ خسارا ہوا کہ وہ اس قابل احترام قافلۂ ایمان کے ممبر نہ بن سکے۔ اور آخرت کا خسارہ یہ ہوا ہے کہ نہایت ذلت آمیز عذاب ان کے لئے چشم براہ ہے۔ کیونکہ ان کا آخری خاتمہ کفر پر ہوا اور اپنی پوری زندگی میں انہوں نے کفر ہی کمایا۔

انہیں اس روش پر جس چیز نے مجبور کیا وہ صرف یہ تھی کہ ان کے دل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حسد سے بھرے پڑے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ نبی آخر الزمان ان میں سے ہو گا لیکن اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب فرمایا۔ وہ اپنے دلوں میں یہ وسعت پیدا کرتے ہوئے یہ برداشت نہ کر سکے کہ اللہ اپنے فضل و کرم اور وحی و رسالت سے جسے چاہے نواز دے۔ ان کا یہ طرز عمل صریح ظلم اور حد سے تجاوز تھا۔ اور اس ظلم و تعدی کی وجہ سے یہ لوگ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو کر لوٹے۔ چنانچہ اس انکبار' حسد اور مذموم تعدی کی سزا کے طور پر ایک ذلت آمیز عذاب ہے جو ان کے لئے چشم براہ ہے۔

یہودیوں کے اندر اس قسم کا جو ایک خاص مزاج پایا جاتا ہے' یہ احسان فراموشی کا مزاج ہے اور جو لوگ یہ مزاج رکھتے ہیں وہ شدید ترین تعصب کے محدود دائرے میں خود غرضانہ زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ ہر وقت یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کی خیر و فلاح در حقیقت ان کی محرومی ہے۔ ایسے لوگ انسانیت کے وسیع ترین تصور اخوت کے شعور سے عاری ہوتے ہیں۔ یہودیوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے سالہا سال تک ایسی ذہنیت کے ساتھ پوری انسانیت سے علیحدگی کی زندگی بسر کی۔ گویا کہ شجر انسانیت سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ وہ ہمیشہ پوری انسانیت کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ وہ ہمیشہ اپنے دلوں کے اندر پوری انسانیت کے خلاف بغض اور حسد کی آگ سلگاتے رہے اور یوں یہ بغض و حسد ان کے لئے بلائے جان بنے رہے۔ اس بغض اور کینہ کا مزہ وہ پوری انسانیت کو یوں چکھاتے رہے کہ انہوں نے ہمیشہ بعض اقوام کو دوسری اقوام کے خلاف بھڑکایا اور انہیں باہم لڑایا تاکہ وہ ان جنگوں کے نتیجہ میں مالی منفعت حاصل کریں' اور اس طرح اپنے دلوں میں بغض و حسد کی سدا سلگنے والی آگ کو بجھاتے رہیں۔ انہوں نے ہمیشہ مختلف اقوام پر ایسی تباہیاں لانے کی سازشیں کیں' جس کے نتیجہ میں بعض اوقات خود یہ لوگ بھی تباہ اور برباد ہوتے رہے۔ شر و فساد کا یہ طویل سلسلہ ہمیشہ اس لئے بپا ہوا کہ یہودیوں کے دل انسانیت کے خلاف حسد اور بغض سے بھرے ہوئے تھے اور یہ لوگ انتہائی خود غرضانہ ذہنیت کے مالک تھے؟

بَغْيًا أَنْ يُنَزِّلَ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ "صرف اس ضد کی بنا پر کہ اللہ نے اپنے فضل (وحی و رسالت) سے اپنے جس بندے کو خود چاہا نواز دیا۔"

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے' اس پر ایمان لاؤ' تو وہ کہتے ہیں "ہم تو اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو ہمارے ہاں (بنی اسرائیل میں) اتری ہے۔"

اس دائرے کے باہر جو کچھ آیا ہے اسے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور اس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی۔ یہ بات وہ اس وقت کہتے تھے' جب انہیں قرآن پر ایمان لانے اور اسلام کو قبول کرنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ وہ کہتے تھے' کہ "ہم پر جو کچھ نازل ہوا ہے' ہم اس پر ایمان لا چکے ہیں اور وہ کافی و شافی ہے۔" اس کے سوا وہ تمام ہدایات کا انکار کرتے تھے۔ خواہ وہ عیسیٰ علیہ السلام پر اتری ہوں یا نبی آخر الزمان' حضرت محمد ﷺ پر اتری ہوں۔

قرآن کریم کے نزدیک ان کا یہ طرز عمل اور ان کی جانب سے توریت کے علاوہ تمام دوسری ہدایات کا انکار ایک عجیب حرکت ہے۔

وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ "کیونکہ وہ حق ہے اور اس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود ہے۔"

یعنی بنی اسرائیل کو حق سے کیا واسطہ؟ کیا ہوا کہ سچائی ان تعلیمات کی تصدیق کر رہی ہے جو ان کے پاس موجود ہیں 'کیونکہ اس سے وہ محروم ہو گئے ہیں۔ وہ تو خود اپنے نفس کے پجاری ہیں 'اپنی قومی عصبیت کے بندے ہیں بلکہ اس سے بھی آگے وہ تو اپنی ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے قبل وہ ان ہدایت کو بھی ٹھکرا چکے ہیں جو خود ان کے انبیاء پر اتاری گئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کو سکھاتے ہیں کہ ان کی حقیقت کھولنے کے لئے اور ان کے موقف کی کمزوری کی وضاحت کے لئے وہ ان پر اس پہلو سے حملہ آور ہوں قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ "کہہ دیجئے کہ اگر تم اس تعلیم پر ہی ایمان رکھنے والے ہو جو تمہارے ہاں آئی تھی تو اس سے پہلے اللہ کے ان پیغمبروں کو (جو خود بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے تھے) کیوں قتل کرتے رہے؟ تمہارا دعویٰ ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل تمہارے پاس جو تعلیم وہدایت لے کر آئے تھے 'تم ان پر ایمان لائے ہوئے تھے 'تو اگر تم سچے مومن تھے 'تو تم نے پھر ان انبیاء عظام کو قتل کیوں کیا؟"

بات یہ نہیں کیونکہ حضرت موسیٰ تمہارے پہلے نبی تھے اور تمہارے عظیم نجات دہندہ تھے۔ وہ تمہارے پاس جو ہدایت لے کر آئے تھے تم نے اس کا بھی انکار کیا تھا۔ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ "تمہارے پاس موسیٰ کیسی کیسی روشن نشانیوں کے ساتھ آئے تھے 'پھر بھی تم اتنے ظالم تھے کہ ان کے پیٹھ موڑتے ہی بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور روشن نشانیوں کے بعد اور خود آپ کی زندگی میں تم نے جو بچھڑے کو معبود بنایا تھا۔ کیا یہ تمہارے ایمان اور وحی الٰہی کا مقتضاء تھا؟ کیا اس طرز عمل کے ہوتے ہوئے تم یہ دعویٰ کر سکتے ہو کہ تم ان ہدایات اور نشانیوں پر ایمان لا چکے ہو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام تمہارے پاس لائے تھے؟

یہی نہیں بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک چٹان اور پہاڑ کے سائے میں تم سے ایک پختہ میثاق لیا تھا 'کیا تمہیں یاد نہیں کہ تم نے اس قسم کے غیر معمولی میثاق کو بھی توڑ دیا تھا اور تم سرکشی اور معصیت میں مبتلا ہو گئے تھے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ "پھر ذرا اس میثاق کو یاد کرو جو طور کو تمہارے اوپر اٹھا کر ہم نے تم سے لیا تھا۔ ہم نے تاکید کی تھی کہ جو ہدایات ہم دے رہے ہیں 'ان کی سختی کے ساتھ پابندی کرو اور کان لگا کر سنو۔ تمہارے اسلاف نے کہا کہ ہم نے سن لیا مگر مانیں گے نہیں۔ اور ان کی باطل پرستی کا یہ حال تھا کہ دلوں میں ان کے بچھڑا ہی بسا ہوا تھا۔"

یہاں آکر خطابی انداز گفتگو 'حکایت وبیان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پہلے تو بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے انہیں یاد دلایا جاتا ہے کہ تم یہ کرتے رہے 'اس کے بعد کلام کا رخ مومنین اور عام انسانوں کی طرف پھر جاتا ہے اور انہیں بتایا جاتا ہے کہ دیکھو یہ بنی اسرائیل یہ یہ کام کرتے رہے۔ اور نبی ﷺ کو سمجھا دیا جاتا ہے کہ آپ اچانک انہیں آڑے ہاتھوں لیں۔ اور ان سے پوچھیں کہ ان کا ایمان کس قدر گھٹیا اور مکروہ ایمان ہے جو بقول ان کے انہیں ایسا صریح کافرانہ اور ناپسندیدہ رویہ اختیار کرنے کے لئے مجبور کر رہا ہے۔ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ "کہو اگر تم مومن ہو 'تو یہ عجیب ایمان ہے جو ایسی بری حرکات کا تمہیں حکم دیتا ہے۔"

قرآن کریم کی یہ دو مصورانہ تعبیریں کس قدر گہری سوچ بچار کی مستحق ہیں۔ یہ کہ "انہوں نے کہا "ہم نے سن لیا مگر مانیں گے نہیں۔" اور یہ کہ؟ "اور ان کی باطل پرستی کا یہ حال تھا کہ دلوں کو بچھڑا پلا دیا گیا تھا۔"

انہوں نے کہا "ہم نے سن لیا۔" اور بعد میں کہا "ہم مانیں گے نہیں۔ لیکن پہلے ہی سے۔ یہ نہیں کہا؟ "ہم مانیں گے نہیں۔" سوال یہ

ہے کہ یہ دونوں باتیں وہ ایک ہی سانس میں کس طرح کہہ گئے؟ در حقیقت یہ ایک خاموش موقف اور حقیقت واقعہ کی حکایتی تعبیر ہے۔ انہوں نے اپنے منہ سے تو کہا "ہم نے سن لیا۔" لیکن اپنے عمل سے انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ "مانیں گے نہیں۔" کیونکہ عمل ہی دراصل زبانی تکلم کو معنی پہناتا ہے۔ اور عملی اظہار قولی اظہار سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ واقعاتی صورت حال کی اس تعبیر سے دراصل اسلام کے اس ہمہ گیر اصول کا اظہار ہوتا ہے کہ عمل کے بغیر محض باتوں اور زبانی جمع خرچ کی اسلام میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسلام میں اصل اعتبار عمل ہی کا ہے۔ واقعاتی حرکات اور الفاظ کی تعبیروں کے درمیان عمل ہی اصل رابطہ ہے اور فیصلے عمل پر ہی کئے جاتے ہیں۔

دوسری تعبیر کہ "ان کے دلوں کو بچھڑا پلا دیا گیا ہے۔" بڑی ہی سخت اور اپنی نوعیت کی منفرد تعبیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "وہ پلائے گئے ہیں" یعنی کسی نے انہیں کچھ پلا دیا ہے۔ کیا پلا دیا ہے؟ انہیں بچھڑا پلایا گیا ہے۔ کہاں؟ ان کے دلوں میں کس قدر سخت تعبیر ہے یہ؟ انسانی تخیل یہ کوشش کر رہا ہے کہ دلوں میں ایک بچھڑے کو داخل ہوتے ہوئے دیکھے یا تصور کرے۔ یعنی گویا مجسم بچھڑا دلوں میں داخل ہو رہا ہے اور یہ بچھڑا ان کے دلوں کی دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ تعبیر معانی کے لئے ایسی حسی تجویز کی گئی ہے کہ ایک لمحہ کے لئے انسان کے پردہ خیال سے اصل مفہوم و مدعا یعنی ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت و عبادت، اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور انسان یہ سوچتا ہے کہ گویا فی الواقعہ بچھڑا انہیں گھول کر پلا دیا گیا ہے۔

ایسے مقامات پر ادبیاتی نقطہ نظر سے غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے مصورانہ طرز ادا کی کیا قدر و قیمت ہے؟ نظریاتی اور ذہنی تعبیروں کے مقابلے میں قرآن کریم کی حسی تعبیر کس قدر واضح اور مفصل ہے۔ الفاظ میں اصل صورت واقعہ کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا جاتا ہے۔

قرآن کریم کی حسی طرز تعبیر اور اس کی خصوصیات میں سے یہ ایک اہم تعبیر ہے۔

یہودیوں کا یہ بڑا دعویٰ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ مخلوق ہیں۔ وہی راہ ہدایت پر ہیں اور وہی ہیں جنہیں عالم آخرت میں یقیناً فلاح نصیب ہوگی۔ اور آخرت میں ان کے سوا، دوسری اقوام کو کچھ نہ ملے گا۔ یہودیوں کے اس دعوے کا صاف صاف اشارہ اس طرف تھا کہ آخرت میں نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کی امت بھی نجات سے محروم ہوگی۔ اس پروپیگنڈے سے یہودیوں کا مقصد یہ تھا کہ عام مسلمانوں کے دلوں میں قرآن کریم کی تعلیمات حضرت محمد ﷺ کے ارشادات اور دین اسلام کے بارے میں بے اعتقادی کی فضا پیدا کر دی جائے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت نبی ﷺ کو حکم دیا کہ آپ انہیں مباہلے کی دعوت دیں، دونوں فریق کھڑے ہو جائیں اور ان میں سے جو بھی جھوٹا ہے اس کی ہلاکت کے لئے دعا کریں؟

قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٩٤﴾

"ان سے کہو اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لئے مخصوص ہے، تب تو تمہیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو، اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔"

اس کے بعد قرآن کریم خود ہی اعلان کر دیتا ہے کہ یہ لوگ ہرگز دعوت مباہلہ قبول نہ کریں گے۔ اور کبھی موت کی طلب نہ کریں گے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں اور انہیں یہ ڈر تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ فریقین کی دعا قبول کر لیں تو وہ اس کی پکڑ میں آ جائیں گے۔ نیز

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ انہوں نے اس دنیا میں جو برے کام کئے ہیں ان کے نتیجے میں 'دار آخرت میں خود ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور اگر انہوں نے مباہلہ کیا تو نتیجہ یہ ہو گا کہ اپنے منہ مانگی موت کے نتیجے میں وہ دنیا سے بھی محروم ہو جائیں گے اور جو برے کام انہوں نے کئے ہیں اس کے نتیجہ میں آخرت میں تو وہ محروم ہیں ہی..... اس لئے قرآن کریم فیصلہ کن انداز میں کہتا ہے کہ ان سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس تحدی کو قبول کریں گے کیونکہ وہ حیات دنیوی کے لئے سب سے زیادہ حریص ہیں اور یہی حال تمام دوسرے مشرکین کا بھی ہے۔ (بلکہ یہ اس معاملے میں ان سے بھی بڑھے ہوئے ہیں) چنانچہ فرماتے ہیں؟

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَتَجِدَنَّھُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰي حَيٰوةٍ ڔ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ڔ يَوَدُّ اَحَدُھُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا ھُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝

ع ۱۰

"یقین جانو کہ یہ کبھی اس کی تمنا نہ کریں گے 'اس لئے کہ اپنے ہاتھوں جو کچھ کما کر انہوں نے وہاں بھیجا' اس کا اقتضاء یہی ہے (کہ یہ وہاں جانے کی تمنا نہ کریں) 'اللہ ان کے حال سے خوب واقف ہے۔ تم انہیں سب سے بڑھ کر جینے کا حریص پاؤ گے۔ حتی کہ یہ اس معاملے میں مشرکوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ہزار برس جیئے حالانکہ لمبی عمر بہرحال انہیں عذاب سے تو دور نہیں پھینک سکتی' جیسے کچھ اعمال یہ کر رہے ہیں اللہ تو انہیں دیکھ ہی رہا ہے۔"

وہ موت کی تمنا اس لئے نہ کریں گے کہ انہوں نے اس دنیا میں جو کمائی کی ہے 'اس پر انہیں عالم آخرت میں کسی اجر کی توقع نہیں ہے۔ اور نہ انہیں اس بات کی امید ہے کہ اس کے ذریعے وہ عذاب الٰہی سے بچ سکیں گے۔ بلکہ یہ عذاب تو وہاں ان کا منتظر ہے۔ اللہ ظالموں کو اچھی طرح جانتا ہے اور ان کی بداعمالیاں بھی اس کی نظر میں ہیں۔

صرف یہی نہیں 'بلکہ یہودیوں کے اندر ایک دوسری خصلت بھی پائی جاتی ہے۔ قرآن کریم اس خصلت کی ایسی تصویر کھینچتا ہے جس سے ان کی ذلت' حقارت اور رذیل پنا ٹپکا پڑتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے وَلَتَجِدَنَّھُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰي حَيٰوةٍ "تم انہیں سب سے بڑھ کر جینے کا حریص پاؤ گے۔" کیسا جینا؟ اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ زندگی ہو' چاہے جیسی ہو۔ ان کے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ زندگی باعزت بھی ہو۔ بس وہ تو صرف زندگی چاہتے ہیں۔ چاہے وہ ذلت اور حقارت کی زندگی ہو۔ زندگی اور عافیت...... بس یہی یہودیوں کی حقیقت رہی ہے۔ یہی یہودیوں کا ماضی ہے' یہی حال ہے اور یہی مستقبل کا مطمح نظر ہے۔ یہودی صرف اسی وقت سر اٹھاتے ہیں جب خطرہ دور ہو جاتا ہے۔ جب تک خطرہ سروں پر قائم ہو وہ سر نہیں اٹھاتے' ان کی گردنیں جھکی رہتی ہیں کیونکہ وہ پرلے درجے کے بزدل ہیں اور انہیں زندہ رہنے سے بے حد محبت ہے...... وہ کیسی زندگی چاہتے ہیں؟

وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ڔ يَوَدُّ اَحَدُھُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا ھُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ "جب حیات کے معاملے میں یہ مشرکوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ہزار برس جیئے۔ حالانکہ لمبی لمبی عمر بہرحال انہیں عذاب سے تو دور نہیں پھینک سکتی۔ جیسے کچھ اعمال یہ کر رہے ہیں اللہ تو انہیں دیکھ رہا ہے۔

ان میں سے ہر صاحب ایک ہزار سال عمر کی تمنا رکھتے ہیں۔کیوں؟ اس لئے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونے کے بارے میں کوئی پختہ یقین نہیں ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ اس زندگی کے علاوہ بھی کوئی زندگی ہے؟ اور جب کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کی اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے تو اس پر عرصہ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ اسے اپنی دنیاوی زندگی بہت ہی تنگ نظر آتی ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اسے صرف انہی معدودے چند گھنٹوں اور سانسوں کی مہلت ملی ہوئی ہے۔

جب اس نقطہ نظر سے غور کیا جائے تو اخروی زندگی پر ایمان' ایک عظیم نعمت ہے جو انسان کو بخشی گئی ہے۔ ایسی نعمت جس کا فیضان' ایمان کے ذریعے' انسان کے دل پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نعمت اس فانی انسان کو اس لئے عطا کرتا ہے کہ اسے اس دنیا میں ایک محدود وقت دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں آرزوؤں کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے' لہٰذا اسے زندگی کی تنگ دامانی کا احساس نہیں رہتا جو لوگ اپنے آپ کو اس نعمت سے محروم کر دیتے ہیں' اور اپنے لئے حیات دوام کا دروازہ بند کر دیتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں "زندگی" کا ایک ناقص اور مسخ شدہ تصور ہوتا ہے۔ غرض یوم آخرت پر ایمان لانا تو اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف اور آخرت میں مکافات عمل پر ایمان لانا ہے' دوسرے یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بندۂ مومن کا وجود زندگی کی فیوض سے مالا مال ہے' اور اسے ایک ایسی دائمی زندگی بخشی گئی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی اور نہ کسی سرحد پر جاکر رک جاتی ہے' بلکہ یہ زندگی تمام سرحدوں سے گزر کر بقائے دوام کے حدود تک جا پہنچتی ہے۔ اور جس کی انتہا کا علم صرف اللہ کی ذات کو ہے۔ یہ زندگی مستقلاً بلندیوں تک اٹھتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ وصال باری کی منزل تک جا پہنچتی ہے۔

اب اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو ایک نئے پہلو کی طرف متوجہ فرماتے ہیں۔ یہودیوں کو کھلا چیلنج دیا جاتا ہے اور اس حقیقت کا اعلان کیا جاتا ہے کہ؟

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

"ان سے کہو جو کوئی جبرئیل سے عداوت رکھتا ہو' اسے معلوم ہونا چاہئے کہ جبرئیل نے اللہ ہی کے اذن سے یہ قرآن تمہارے قلب پر نازل کیا' جو پہلے آئی ہوئی کتابوں کی تصدیق و تائید کرتا ہے۔ اور ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت اور کامیابی کی بشارت بن کر آیا ہے۔ (اگر جبرئیل سے ان کی عداوت کا سبب یہی ہے تو کہہ دو کہ) جو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرئیل اور میکائیل کے دشمن ہیں' اللہ ان کافروں کا دشمن ہے۔

اس چیلنج کے ذریعے ہمیں یہودیوں کی ایک عجیب و غریب نئی خاصیت معلوم ہو جاتی ہے۔ یہودیوں نے محض اس لئے کہ ایک غیر یہودی پر وحی نازل ہوئی۔ شدید بغض میں مبتلا ہو گئے' بلکہ انہوں نے بغض و حسد کا ریکارڈ قائم کر دیا ہے اور اس سلسلے میں وہ حماقت کی حد تک جا پہنچے ہیں اور ایسی متضاد باتیں کر رہے ہیں جن کی توقع کسی عقلمند انسان سے نہیں کی جا سکتی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوتے ہیں تو یہ لوگ حسد اور بغض کی وجہ سے جل بھن گئے اور ایک واہیات قصہ گھڑ لیا کہ

جبرئیل ﷺ تو ان کے پرانے دشمن ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ اللہ کا عذاب ان پر لاتے رہے ہیں اور ان کے ہاتھوں بنی اسرائیل ہمیشہ تباہ و برباد ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ محمد ﷺ کا تعلق حضرت جبرئیل سے ہے' اس لئے وہ اس پر ایمان نہیں لاتے۔ اگر حضرت میکائیل وحی لاتے تو وہ ضرور ایمان لاتے کیونکہ حضرت میکائیل اللہ کے وہ فرشتے ہیں جو بارش' تروتازگی اور انسانوں کے لئے خوشی کے سامان فراہم کرتے ہیں۔ کیا واہیات دلیل ہے یہ؟

ان کی اس احمقانہ بات پر انسان کو بے اختیار ہنسی آتی ہے لیکن جب انسان بغض و حسد کا شکار ہوتا ہے تو اس کی جانب سے اس سے بھی کہیں بڑی حماقتوں کا صدور ہونا کوئی امر بعید نہیں ہوتا۔ کیونکہ جبرئیل کوئی انسان نہ تھے کہ وہ کسی کے ساتھ دشمنی کر سکیں یا وہ کسی کے ساتھ از خود کوئی دوستی گانٹھ سکیں۔ وہ اپنی مرضی سے کوئی کام کرنے کی سرے سے قدرت ہی نہ رکھتے تھے۔ حضرت جبرئیل فرشتہ ہونے کی وجہ سے' اللہ کے احکامات کی سرتابی نہیں کر سکتے تھے وہ وہی کرتے تھے جس کا انہیں حکم دیا جاتا تھا۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ "کہو اگر کسی کو جبرئیل سے عداوت ہے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ جبرئیل نے اللہ ہی کے اذن سے یہ قرآن تمہارے قلب پر نازل کیا ہے۔"

جبرئیل علیہ السلام نہ ذاتی رجحان رکھتے تھے اور نہ انہوں نے آپ کے دل پر قرآن کریم اپنے ذاتی ارادہ سے نازل کیا تھا۔ وہ تو صرف ارادۂ الٰہی کو نافذ کرنے والے تھے اور آپ کے قلب پر نزول قرآن کا کام وہ اللہ کے احکامات کے تحت کر رہے تھے۔ قرآن کریم کا نزول دل پر ہو رہا تھا۔ دل ہی دراصل محل ادراک ہے اور وہی ہے جو ادراک کے بعد معانی کو سمجھتا ہے اور مدرکات کو محفوظ رکھتا ہے۔ قرآن کریم انسان کی قوت مدرکہ کی تعبیر "قلب" سے کرتا ہے لہٰذا قلب مدرک سے مراد خون اور گوشت کا معروف طبیعی لوتھڑا نہیں ہے بلکہ وہ ملکہ ہے جو فہم و ادراک کا کام کرتا ہے۔

جبرئیل نے آپ ﷺ کے قلب پر اس حال میں قرآن اتارا کہ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ "جو پہلے آئی ہوئی کتابوں کی تصدیق و تائید کرتا ہے اور ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت و کامیابی کی بشارت بن کر آیا ہے۔"

قرآن کریم اصولی طور پر تمام کتب سابقہ کی تصدیق کرتا ہے کیونکہ تمام سماوی کتب اور تمام الٰہی ادیان کی اساسی تعلیمات ایک ہی تھیں اور وہ صرف مومنین کے لئے ہدایت اور پیغام مسرت ہے کیونکہ اس کی تعلیمات کے لئے صرف ایک مومن دل ہی کے دریچے کھلے ہوتے ہیں۔ **مومن ہی اس کی تعلیمات پر لبیک کہتے ہیں۔ یہ ایک نہایت اہم حقیقت ہے جس کا کھول کر بیان کرنا نہایت ہی ضروری ہے۔** قرآن کریم کی آیات دل مومن کے اندر اس قدر انس پیدا کرتی ہیں۔ اس کے اندر معرفت و ادراک کی ایسی راہیں کھولتی ہیں اور اس کے اندر ایک ایسا شعور اور احساس پیدا کر دیتی ہیں جن سے ہر وہ دل محروم رہتا ہے جس میں ایمان نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قلب مومن کو قرآن کریم میں ہدایت ملتی ہے اور اس کے لئے اس میں پیغام مسرت ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو مختلف مقامات کے اندر بیان کیا ہے۔ "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" "متقین کے لئے ہدایت ہے۔" "هُدًى لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ" "وہ اس قوم کے لئے ہدایت ہے جو ایمان لاتی ہے۔" "هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ" "وہ ایسے لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو پختہ یقین رکھتے ہیں۔" گویا ایمان تقویٰ اور یقین کے نتیجے کے طور پر ملتی ہے۔ اور بنی اسرائیل اسی لئے اس سے محروم رہے کہ نہ وہ مومن تھے نہ متقی تھے اور نہ ذوق یقین سے آشنا تھے۔

گویا ہدایت ایمان تقویٰ اور یقین کے نتیجے کے طور پر ملتی ہے اور بنی اسرائیل اسی لئے محروم رہے کہ نہ وہ مومن تھے نہ متقی تھے اور نہ ذوق یقین سے آشنا تھے۔

ان کی یہ عادت تھی کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسولوں اور اس کے ادیان و شرائع کے درمیان فرق کرتے تھے۔ اسی طرح وہ اللہ

تعالیٰ کے فرشتوں کے درمیان بھی فرق کرتے تھے جن کے ناموں اور کاموں سے وہ واقف تھے۔ کہتے تھے میکائیل سے تو ان کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ البتہ جبرئیل سے ان کے مراسم اچھے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے جبرئیل میکائیل وغیرہ تمام فرشتوں اور رسولوں کو جمع کر لیا۔ مقصد یہ ہے کہ وہ سب ایک ہی ہیں جو شخص ان میں سے ایک سے عداوت رکھتا ہے وہ سب سے عداوت رکھتا ہے۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ سے عداوت رکھتا ہے۔ لہٰذا اللہ کو بھی ان سے عداوت ہوگی اور وہ کافر ہو جائیں گے۔

مَنۡ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبۡرِيۡلَ وَ مِيۡكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ "جو اللہ کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرئیل اور میکائیل کے دشمن ہیں اللہ ان کافروں کا دشمن ہے۔"

اس کے بعد روئے سخن نبی ﷺ کی طرف پھر جاتا ہے۔ آپ کو تلقین کی جاتی ہے کہ آپ پر جو سچائی اور کھلی نشانیاں نازل ہو رہی ہیں آپ ان پر جم جائیں۔ سوائے فساق و فجار کے اور کوئی ان کا منکر نہیں ہو سکتا۔ اور بنی اسرائیل کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ کبھی اپنے عہد پر قائم نہیں رہتے۔ چاہے وہ عہد انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہو یا انبیائے سابقین کے ساتھ کیا ہو۔ یا وہ عہد انہوں نے نبی آخر الزمان کے ساتھ کیا ہو۔ قرآن کریم ان کی مذمت کرتا ہے کہ انہوں نے ایک ایسی کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال دیا ہے جو ان تمام کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو خود ان کے پاس موجود ہیں۔

وَلَقَدۡ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكۡفُرُ بِهَآ اِلَّا الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۹۹﴾ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوۡا عَهۡدًا نَّبَذَهٗ فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ نَبَذَ فَرِيۡقٌ مِّنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوۡرِهِمۡ كَاَنَّهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾

"ہم نے تمہاری طرف ایسی آیات نازل کی ہیں جو صاف صاف حق کا اظہار کرنے والی ہیں۔ اور ان کی پیروی کرنے سے صرف وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو فاسق ہیں۔ کیا ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوتا رہا کہ جب انہوں نے کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک نہ ایک گروہ نے اسے ضرور ہی بالائے طاق رکھ دیا؟ بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہی ہیں جو سچے دل سے ایمان نہیں لاتے اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی تو ان اہل کتاب میں ایک گروہ نے کتاب اللہ کو اس طرح پس پشت ڈالا گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے وہ اسباب کھول کر بیان کر دیے ہیں جن کی بناء پر بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کی ان واضح آیات کا انکار کر رہے تھے جو خود اللہ کی جانب سے نازل ہوئی تھیں۔ یعنی وہ لوگ فسق و فجور میں مبتلا تھے۔ ان کی فطرت بگڑی ہوئی تھی کیونکہ فطرت سلیمہ کے لئے تو اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ تھا کہ وہ ان آیات پر ایمان لے آئے اگر دل میں کجی نہ ہو تو یہ آیات از خود اپنے آپ کو منواتی ہیں اور یہودیوں نے کفر کا جو رویہ اختیار کیا ہے تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم کی آیات میں دلائل کی کچھ کمی ہے یا وہ تشفی بخش نہیں بلکہ اصل سبب یہ ہے کہ خود ان کی فطرت بگڑ چکی ہے اور وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

اس کے بعد روئے سخن مسلمانوں اور تمام دوسرے انسانوں کی طرف پھر جاتا ہے۔ یہودیوں کی مذمت کی جاتی ہے اور ان کی صفات

رذیلہ میں سے ایک دوسری صفت کو بیان کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ آپس میں بھی مختلف خواہشات اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اپنے اس مذموم تعصب کے باوجود ان کے درمیان قدر مشترک ہے۔ وہ کسی ایک رائے پر جمتے بھی نہیں نہ ہی وہ اپنے کیے ہوئے معاہدوں کی پابندی کرتے ہیں۔ وہ کسی ایک رسی کو مضبوطی سے نہیں پکڑتے۔ اگرچہ وہ اپنے ذاتی مفاد اور اپنے قومی مفاد کے سلسلے میں پرلے درجے کے خود غرض ہیں اور اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان کے سوا کسی اور کو بھی اللہ کا فضل و کرم نصیب ہو۔ لیکن اس قومی تعصب کے ہوتے ہوئے بھی وہ باہم متحد نہیں ہیں۔ وہ خود ایک دوسرے کے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں کی پابندی بھی نہیں کرتے۔ جب بھی وہ آپس میں کوئی پختہ عہد کرتے ہیں تو ان میں سے کوئی ایک گروہ اٹھ کر اسے توڑ دیتا ہے اور ان کے اس متفقہ فیصلے کی کھلی خلاف ورزی کرتا ہے۔

اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ "کیا ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوتا رہا کہ جب انہوں نے کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک نہ ایک گروہ نے اسے ضرور ہی بالائے طاق رکھ دیا بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو سچے دل سے ایمان نہیں لاتے۔"

انہوں نے کوہ طور کے نیچے اللہ کے ساتھ پختہ پیمان باندھا اور بعد میں اس کی خلاف ورزی کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل آنے والے پیغمبروں کے ساتھ انہوں نے جو جو عہد کئے ان کی خلاف ورزی کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ تشریف لانے کے بعد یہودیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا اسے بھی انہوں نے پس پشت ڈال دیا حالانکہ اس معاہدے میں ان کے ساتھ شرائط طے کی گئی تھیں اور انہوں نے پہل کر کے حضور ﷺ کے دشمنوں کی معاونت کی۔ نبی ﷺ کے پیش کردہ نظام زندگی پر تنقید شروع کر دی اور مسلمانوں کے اندر انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ یہ سب باتیں میثاق مدینہ کے خلاف تھیں۔

یہ تھی بنی اسرائیل کی مذموم عادت جب کہ مسلمانوں کا رویہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں "مسلمانوں کے خون باہم مساوی ہیں اور وہ سب دوسروں کے مقابلے میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور ان میں ادنیٰ ترین آدمی بھی سب کی طرف سے امان دے سکتا ہے۔" اور جب وہ کسی کے ساتھ کوئی معاہدہ کریں تو ان میں سے کسی کو یہ اجازت نہ ہوگی کہ وہ اسے توڑے یا اس کی خلاف ورزی کرے۔

حضرت عمر ؓ کے زمانہ خلافت میں ان کے کمانڈر انچیف حضرت ابو عبیدہ ؓ نے لکھا کہ عراق کے ایک گاؤں والوں کو ہمارے ایک غلام نے امان دے دی ہے۔ اب ہم ان کے ساتھ کیا معاملہ کریں؟ حضرت عمر ؓ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے معاہدے کی پابندی کرنے کو ایک عظیم فریضہ قرار دیا ہے۔ اور جب تک آپ لوگ اپنے عہد کو پورا نہ کریں گے اس وقت تک آپ کو وفادار نہیں کہا جاسکتا۔ چنانچہ انہوں نے عہد پر عمل کرتے ہوئے اس شہر کے باشندوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔

یہ ہے صفت ایک شریف، راستباز اور اصول پرست جماعت کی۔ اس سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ بدکردار یہودیوں کے اخلاق اور راستباز مسلمانوں کے اخلاق کے درمیان کیا فرق ہوتا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

"اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی تو اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اس طرح پس پشت ڈالا گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔"

یہ وعدہ خلافی کی ایک مثال ہے جس کا ارتکاب ان میں سے ایک فریق نے کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے جو عہد لیا تھا اس کی ایک شق

یہ بھی ہے کہ آئندہ جو جو رسول بھیجے جائیں گے تم ان پر ایمان لاؤ گے۔ ان کا احترام کرو گے اور ان کی مدد کرو گے۔ جب اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان کے ذریعے ان کے پاس اپنی کتاب (قرآن) کو بھیجا تو ان اہل کتاب میں سے ایک فریق نے اسے پس پشت ڈال دیا۔ اس طرح انہوں نے ایک تو اس کتاب الٰہی کا انکار کیا جو خود ان کے پاس تھی اور جس کے اندر حضور کے بارے میں پیشن گوئیاں موجود تھیں۔ اور انہوں نے ان پیشن گوئیوں کو پس پشت ڈالا اور دوسرے حضور پر جو نئی کتاب اتری اسے بھی پس پشت ڈال دیا۔

اس آیت میں اہل کتاب پر ایک لطیف طنز بھی مقصود ہے یعنی کتاب اللہ کو مشرکین رد کر دیتے تو ان سے یہ امر کوئی مستبعد نہ تھا لیکن ان بدبختوں نے اہل کتاب ہوتے ہوئے بھی اسے رد کر دیا۔ وہ رسالت اور رسولوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ہمیشہ ہدایت کے سرچشموں سے وہ وابستہ رہے۔ ہمیشہ روشنی ان کی نظروں میں رہی لیکن صاحب ہدایت اور صاحب بصیرت ہوتے ہوئے انہوں نے کیا کیا؟ کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال دیا یعنی انہوں نے کتاب کا انکار کیا اور اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔ انہوں نے کتاب اللہ کو اپنی فکر اور اپنی زندگی سے خارج کر دیا۔ یہاں قرآن کریم نے ان کے انکار اور بے عملی کے ذہنی مفہوم کو ایک خالص حسی انداز میں پیش فرمایا ہے۔ ذہنی مفہوم اب ایک معنویت کے دائرے سے نکل کر محسوسات کے دائرے میں آجاتا ہے۔ ان کے اس عمل کو ایک محسوس جسمانی حرکت سے تعبیر کیا گیا اور اس کی ایسی قبیح اور بدشکل تصویر کھینچی جاتی ہے کہ اس سے انکار و جحود ٹپکتے پڑتے ہیں۔ اس تصور میں وہ نہایت ہی غلیظ القلب اور احمق نظر آتے ہیں۔ گستاخی اور گندگی اور ذلت کا مجسمہ نظر آتے ہیں۔ اس تصویر کشی سے انسانی تخیل ایک شدید حرکت کو دیکھتا ہے گویا کچھ ہاتھ حرکت میں آتے ہیں اور کتاب الٰہی کو پس پشت پھینک دیتے ہیں۔

ایسی کتاب کی تکذیب کے بعد جو خود اس دین کی تصدیق کر رہی تھی جو ان کے پاس موجود تھی، پھر کیا ہوا؟ غالباً انہوں نے اس ناقابل شکست سچائی کو قبول کر لیا ہو گا یا اس کے برعکس انہوں نے خود اس ہدایت ہی کا دامن تھام لیا ہو گا جس کی تصدیق یہ قرآن کریم بھی کر رہا تھا۔ اور وہ خود بھی اس پر ایمان لائے ہوئے تھے؟

ہرگز نہیں! نہ صرف یہ کہ انہوں نے ان میں سے کوئی ایک معقول روش اختیار نہیں کی بلکہ انہوں نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈالا اور ایسی ناقابل فہم موہوم اعجوبوں اور دقیانوسی باتوں کے پیچھے پڑ گئے۔ جن کی کوئی حقیقت نہ تھی نہ وہ باتیں کسی یقینی اساس پر مبنی تھیں۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ
وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ
بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ
فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ
وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّھُمْ
وَلَا يَنْفَعُھُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ
ڜ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَھُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا وَ

۱۲ ع ۷ ۱۲ اتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

"اور لگے ان چیزوں کی پیروی کرنے جو شیاطین سلیمان کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے تھے۔ حالانکہ سلیمان نے کبھی کفر نہیں کیا۔ کفر کے مرتکب تو وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے نہ ہی یہ درست ہے کہ جادوگری کی تعلیم بابل کے دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر نازل کی گئی تھی وہ (فرشتے تو آزمائش تھے) جب بھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے تو پہلے صاف طور پر متنبہ کر دیا کرتے تھے کہ دیکھ ہم محض ایک آزمائش ہیں تو کفر میں مبتلا نہ ہو۔" پھر بھی وہی لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ ظاہر تھا کہ اذن الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو خود ان کے لئے نفع بخش نہیں بلکہ نقصان دہ تھی۔ اور انہیں خوب معلوم تھا کہ جو اس چیز کا خریدار بنا اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ کتنی بری متاع تھی جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا۔ کاش انہیں خبر ہوتی۔"

انہوں نے اللہ کی اس کتاب کو تو چھوڑ دیا جو خود اس ہدایت کی تصدیق بھی کر رہی تھی۔ جو ان کے پاس تھی اور ان باتوں کی پیروی شروع کر دی۔ جو شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور کی طرف منسوب کرتے تھے۔ یہ شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف غلط باتیں منسوب کیا کرتے تھے۔ یعنی یہ کہ وہ ایک عظیم جادوگر تھے اور انہوں نے جن جن چیزوں کو مسخر کر رکھا تھا وہ انہوں نے اس کالے علم کے ذریعے مسخر کر رکھی تھیں۔ قرآن کریم ان کے اس زعم باطل کی تردید کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ حضرت سلیمان جادوگر نہ تھے۔ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ "سلیمان نے کفر نہیں کیا۔" قرآن کریم گویا جادوگری کو کفر سمجھتا ہے۔ اس لئے حضرت سلیمان علیہ السلام سے اس کی نفی کر کے اور یہ بتا رہا ہے کہ جادوگری کا کام حضرت سلیمان علیہ السلام نہیں بلکہ شیاطین کیا کرتے تھے۔ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ "کفر کے مرتکب تو وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے۔"

اس کے بعد قرآن کریم اس خیال کی تردید کرتا ہے کہ جادوگری کی تعلیم خود اللہ تعالیٰ نے بابل کے دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر نازل کی تھی۔ وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ "نہ ہی یہ بات درست ہے کہ جادوگری بابل میں ہاروت و ماروت نامی دو فرشتوں پر نازل کی گئی تھی۔"

معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے ہاں ان دو فرشتوں کے بارے میں کوئی قصہ خاصا مشہور تھا اور یہودی اور شیطان یہ کہتے تھے کہ دو فرشتے جادو کا علم رکھتے تھے۔ اور یہ علم وہ لوگوں کو بھی سکھاتے پھرتے تھے۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ جادو کی یہ تعلیم ان پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کی گئی تھی۔ قرآن کریم نے اس افتراء کی بھی تردید کر دی کہ سحر کی تعلیم بابل میں ان دو فرشتوں پر اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھی۔

البتہ یہاں قرآن کریم اس قصہ کی حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ یہ دو فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ رازوں میں سے ایک راز تھے اور عوام الناس کے لئے انہیں بطور فتنہ اور آزمائش کے بھیجا گیا تھا۔ اور وہ ہر شخص جو ان کے پاس تعلیم سحر کے حصول کے لئے جاتا تھا وہ اسے کہہ دیتے تھے وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ "وہ فرشتے جب بھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے تو پہلے صاف طور پر متنبہ کر دیا کرتے تھے دیکھ ہم محض ایک آزمائش ہیں تو کفر میں مبتلا نہ ہو۔"

یہاں قرآن کریم دوبارہ سحر کی تعلیم اور جادوگری کو کفر سے تعبیر کرتا ہے اور اس کے کفر ہونے کا اعلان دو فرشتوں ہاروت و ماروت کے ذریعہ کرایا جاتا ہے۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ بعض لوگ ایسے تھے جو ان فرشتوں کے واضح تنبیہ کے باوجود اس بات پر مصر تھے کہ وہ ان سے سحر کی تعلیم

حاصل کریں۔ جب انہیں اصرار تھا کہ وہ اس فتنے کا شکار ہوں تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے لئے یہ دروازہ کھول دیا۔ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ "پھر بھی یہ لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں۔

حالانکہ یہی شر تھا اس سیاہ علم میں جس سے فرشتوں نے انہیں آگاہ کر دیا تھا لیکن قرآن کریم موقع و محل کی مناسبت سے یہاں اسلامی نظریۂ حیات کے ایک بنیادی اصول کی طرف مبذول کر دیتا ہے یہ کہ اس کائنات میں اللہ کی مشیئت اور اذن کے بغیر ایک پتا بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ "یہ بات ظاہر تھی کہ اذن الٰہی کے بغیر وہ اس کے ذریعے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے۔

یہ اللہ کی مشیئت اور اس کا اذن ہی ہے جس کی وجہ سے اسباب سے مسببات اور نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ اسلامی نظریۂ حیات کا یہ نہایت ہی بنیادی اور اہم اصول اور عقیدہ ہے۔ اور ایک مومن کے دل و دماغ میں اسے اچھی طرح واضح اور جاگزین ہونا چاہئے۔ اس عقیدے کو پیش کرنے کا بہترین مقام بھی ایسا ہی ساحرانہ ماحول ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ اگر اپنا ہاتھ آگ میں ڈالیں گے تو وہ لازماً جل جائے گا' لیکن یہ جلنا اللہ کے حکم اور مشیت کے بغیر ممکن نہیں۔ اللہ ہی نے آگ میں جلانے اور آپ کے ہاتھ میں جلنے کی قابلیت رکھی ہے اور وہ جب چاہئے آگ اور ہاتھ دونوں سے یہ قابلیت سلب کر سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں ایسا عملاً ہوا بھی۔ یہی حال اس جادو کا بھی ہے جس کے ذریعے جادوگر میاں بیوی میں تفرقہ ڈالتے ہیں' اگر اللہ کی مشیئت نہ ہو تو وہ کوئی اثر نہیں کر سکتا۔ اگر اس کی حکمت اور مشیئت متقاضی نہ ہو' تو وہ جادو کی اس خاصیت کو کسی وقت بھی معطل کر سکتا ہے۔

یہی حال ہے ان تمام مؤثرات اور اسباب کا جو آج تک ہمارے علم میں آچکے ہیں۔ ان میں سے ہر سبب میں اللہ تعالیٰ نے ایک مخصوص خاصیت ودیعت کی ہے اور یہ خاصیت اللہ تعالیٰ کے اذن اور مشیئت سے کام کر رہی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان اسباب کو یہ خصوصیات عطا کی ہیں' بعینہ اسی طرح وہ ان سے ان خاصیات کو سلب بھی کر سکتا ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم اس چیز کی حقیقت بھی کھول کر بیان کر دیتا ہے' جس کی تعلیم وہ حاصل کرتے تھے۔ یعنی وہ جادو جس کے ذریعے وہ میاں اور بیوی کے درمیان تفرقہ ڈالتے تھے۔ قرآن حکیم بتاتا ہے کہ یہ کالا علم خود ان کے لئے بھی کوئی مفید چیز نہ تھی۔ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ "مگر اس کے باوجود وہ اسی چیز کو سیکھتے تھے' جو خود ان کے لئے نفع بخش نہیں بلکہ نقصان دہ تھی۔" جس فتنے میں وہ مبتلا ہو رہے تھے اس کا کفر ہونا ہی اس بات کے لئے کافی ثبوت تھا کہ وہ شر ہی شر ہے اور اس میں کوئی منفعت نہیں ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ "اور انہیں خوب معلوم تھا کہ جو اس چیز کا خریدار بنا اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔" اور جب کسی کو یہ معلوم ہوا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے' اس کے نتیجے میں وہ آخرت کی تمام بھلائیوں سے محروم ہو جائے گا اور پھر بھی وہ اس روش کو اختیار کرتا ہے' تو گویا وہ بالقصد اپنی آخرت کو خراب کر رہا ہے اور اپنے آپ کو آنے والے جہاں کی جملہ بھلائیوں سے محروم کر رہا ہے۔

یہ کیوں؟ تاکہ وہ اس چند روزہ زندگی میں مزے لوٹ لے۔ کیا ہی برا سودا ہے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ اس کی حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہیں۔

وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ "کتنی ہی بری متاع تھی جس کے بدلے میں انہوں نے جان کو بیچ

ڈالا! کاش انہیں معلوم ہوتا!"

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ "اگر وہ ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کے ہاں اس کا جو بدلہ ملتا' وہ ان کے لئے زیادہ بہتر تھا' کاش انہیں خبر ہوتی!"

یہ بات تو ان لوگوں پر بھی صادق آتی ہے جو بابل میں ہاروت اور ماروت سے جادو سیکھتے تھے' ان پر بھی صادق آتی ہے جو ان باتوں کی پیروی کرتے تھے جنہیں شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کا نام لے کر پیش کرتے تھے اور یہ لوگ یہودی تھے جنہوں نے اللہ کی کتاب کو تو پس پشت ڈال دیا اور ان خرافات اور مذمومات کی پابندی اپنے اوپر لازم کر دی۔

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس جادو کی حقیقت پر بھی قدرے روشنی ڈال دی جائے جس کے پیچھے یہ یہودی پڑ گئے تھے اور جس کے ذریعے یہ لوگ میاں اور بیوی میں ناچاقی پیدا کرتے تھے اور اس کی وجہ سے انہوں نے کتاب الٰہی تک کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

یہ بات ہمارے دور میں بھی بارہا مشاہدے میں آتی رہتی ہے کہ بعض لوگ اپنے اندر ایسے معجزانہ خصائص رکھتے ہیں کہ سائنس آج تک ان کی کوئی علمی توجیہہ نہیں کر سکتی۔ ایسے عجائبات کے لئے لوگوں نے 'مختلف نام تو تجویز کر رکھے ہیں' تاہم ان کی حقیقت کا تعین ابھی تک نہیں کیا جا سکا۔ اور ابھی تک وہ عجوبہ ہی ہیں۔ مثلاً ٹیلی پیتھی یعنی دور سے خیالات کا اخذ کرنا' اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک آدمی ایک ایسے فاصلے سے' جہاں تک نہ اس کی نظر پہنچتی ہے اور نہ آواز' ایک آدمی کو بلاتا ہے اور اس سے خیالات اخذ کرتا ہے اور ان دونوں کے درمیان طویل فاصلے حائل نہیں ہوتے۔

پھر مقناطیسی تنویم کا عمل بھی قابل غور ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہو جاتا ہے۔ ایک ارادہ دوسرے پر ناقابل ادراک طریقے سے استیلاء حاصل کر لیتا ہے اور ایک فکر دوسری فکر کے ساتھ کس طرح مطابقت اختیار کر لیتی ہے کہ ایک دوسرے کی طرف خیالات منتقل کرتی چلی جاتی ہے اور دوسری اس سے اخذ کرتی چلی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا متاثر شخص ایک کھلی کتاب پڑھ رہا ہے۔

آج تک سائنس اس سلسلے میں جو کچھ کر سکی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس نے ان حقائق کا اعتراف کر کے ان کے لئے کچھ نام تجویز کر لئے ہیں لیکن سائنس آج تک اس بات کا جواب نہیں دے سکی کہ ان کی حقیقت کیا ہے؟ نیز سائنس کے پاس اس کا جواب نہیں ہے کہ یہ عمل کیسے مکمل ہوتا ہے؟

ان حقائق کے علاوہ بھی بعض ایسی چیزیں ہیں جن کے تسلیم کرنے میں سائنس کو ابھی تامل ہے۔ یا تو اس لئے کہ ابھی تک ان کے بارے میں اس قدر مشاہدات جمع نہیں ہوئے جن کی بنا پر سائنس انہیں تسلیم کر لے اور یا ابھی تک سائنس کو ادراک کے وہ ذرائع حاصل نہیں ہوئے جن کے ذریعے وہ اس میدان میں کوئی تجربہ کر سکے۔ خود سچے خوابوں کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہے۔ فرائڈ جو ہر روحانی قوت کا بڑی شدت سے انکار کرتا ہے' وہ بھی ان کا انکار نہیں کر سکا۔ خواب کے ذریعے ہمیں' مستقبل کی تاریکیوں میں ہونے والے واقعات کا اشارہ کیسے مل جاتا ہے؟ اور پھر طویل عرصہ نہیں گزرتا کہ وہ اشارہ واقعات کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی معاملہ انسان کے ان خفیہ احساسات کا ہے' جن کا ابھی تک وہ کوئی نام بھی تجویز نہیں کر سکا۔ بعض اوقات انسان یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے؟ یا کوئی آنے والا ہے؟ اور اس کے بعد یہ متوقع امر کسی نہ کسی صورت میں وقوع پذیر ہو جاتا ہے۔

لہٰذا یہ محض ہٹ دھرمی ہے کہ انسان محض بے تکلفی میں ان نامعلوم حقائق کا انکار کر دے' صرف اس لئے کہ سائنس کی رسائی ابھی ایسے وسائل تک نہیں ہو سکی جن کے ذریعے وہ اس میدان میں کوئی تجربہ کر سکے۔

اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ انسان دنیا کے تمام خرافات کو بے چون و چرا مانتا چلا جائے' ہر فسانے پر ایمان لاتا چلا جائے' بلکہ صحیح

اور معتدل روش یہ ہے کہ ایسے نامعلوم حقائق کے بارے میں انسان ایک لچک دار اور معتدل موقف اختیار کرے۔ نہ تو سو فیصدی ان کا انکار کرنا درست ہے اور نہ ہی بے چون وچرا تسلیم کر لینا معقول ہے۔ اس درمیانی روش کا نتیجہ یہ ہو گا کہ انسان کو علم و ادراک کے جو ابتدائی ذرائع اس وقت حاصل ہیں جب ان میں انسان مزید ترقی کرے گا تو اس کے لئے ایسے حقائق کا معلوم کر لینا ممکن ہو جائے گا۔ لہٰذا انسان کو یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ اس کا علم محدود ہے۔ اور بعض حقائق ایسے بھی ہیں جو اس کے حیطۂ ادراک سے باہر ہیں۔ اسے اپنی حدود کو پہچاننا چاہئے اور نامعلوم حقائق کا بھی کچھ لحاظ رکھنا چاہئے۔

جادوگری کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ شیاطین کی جانب سے جو القاء بدکردار لوگوں کو ہوتا ہے' وہ بھی فوق الادراک امور میں سے ہے۔ اس کی متعدد شکلوں میں سے ایک یہ ہے کہ جادوگر انسانوں کے حواس اور خیالات پر اثر انداز ہونے کی قدرت رکھتا ہے۔ کبھی اس کا اثر ٹھوس چیزوں اور اجسام پر بھی ہوتا ہے۔ البتہ قرآن کریم میں فرعون کے جادوگروں کی جس سحر کاری کا ذکر ہے' وہ محض نظربندی اور نظر فریبی ہی تھی' دراصل اس سے کسی چیز کی حقیقت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوتی تھی۔

**يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ** "ان کی جادوگری کی وجہ سے' اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ چل رہی ہیں۔" ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ اپنی جادوگری کے ایسے اثرات استعمال کر کے میاں بیوی اور دوست اور دوست کے تفریق ڈالتے ہوں' کیونکہ جب انسان کسی چیز سے متاثر ہوتا ہے' اس انفعال کی مطابقت میں اس سے بعض حرکات سرزد ہو جاتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ کہا گیا وسائل و اسباب اور ان کے نتائج اور مسببات کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے سوا کام نہیں کر سکتا۔

قدرتی طور پر یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ دو فرشتے ہاروت و ماروت کون تھے؟ اور تاریخ کے کس دور میں وہ بابل میں گزرے ہیں؟ اس سوال کی تشریح قرآن نے اس لئے ضروری نہیں سمجھی کہ ان فرشتوں کا قصہ یہودیوں کے درمیان عام طور پر معروف تھا۔ اور جب قرآن کریم نے انہیں یہ قصہ سنایا تو انہوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کئی ایسے واقعات جو اس وقت قرآن کریم کے مخاطبین کے ہاں مشہور و معروف تھے۔ انہیں قرآن کریم نے اجمال کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کا مقصد صرف اشارے ہی سے پورا ہو جاتا تھا اور قصہ گوئی قرآن کے پیش نظر تھی ہی نہیں۔

فی ظلال القرآن میں' ہم وہ تمام تفصیلات اور رطب و یابس روایات درج کرنا نہیں چاہتے' جو ان فرشتوں کے بارے میں مشہور ہیں۔ کیونکہ تفاسیر میں ان کے بارے میں جو مواد پایا جاتا ہے' یا جو روایات منقول ہیں ان میں کوئی روایت ثقہ نہیں ہے۔

انسانیت اپنی طویل ترین تاریخ میں متعدد آزمائشوں اور ابتلاؤں سے دوچار ہوتی رہی ہے' یہ آزمائشیں اور ابتلائیں' مختلف ادوار میں انسانیت کی ذاتی سطح اور اس وقت کے ماحول کی مناسبت سے مختلف نوعیت اختیار کرتی رہی ہیں۔ اب یہ آزمائش اگر کسی وقت دو فرشتوں کی صورت میں یا دو فرشتہ سیرت انسانوں کی صورت میں آئی ہے تو یہ کوئی تعجب انگیز اور انوکھی بات نہیں ہے۔ کیونکہ انسانیت پر جو آزمائشیں آتی رہی ہیں وہ کئی قسم کی عجیب و غریب اور خارق العادۃ بھی ہوتی رہی ہیں' بالخصوص اس دور میں جبکہ انسانیت فکر و ادراک کی دنیا میں ترقی کی ابتدائی منازل طے کر رہی تھی اور وہم و جہالت کی تاریک رات میں سماوی روشنی کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔

نیز ان آیات میں جو محکم اور واضح ہدایات دی گئی ہیں ہمارے لئے وہی کافی ہیں۔ اور اگر کوئی چیز متشابہ اور ناقابل فہم ہے تو اس کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بالخصوص اب جبکہ ہم اس ماحول سے بہت دور جا نکلے ہیں۔ جہاں ایسے واقعات پیش آئے تھے۔ بس ہمارے لئے یہی جان لینا کافی ہے کہ بنی اسرائیل جادوگری اور دوسری موہوم اور لایعنی باتوں کے پیچھے پڑ کر گمراہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی سچی اور یقینی ہدایات کو پس پشت ڈال دیا تھا اور یہ کہ عمل سحر ایک کفریہ عمل ہے۔ اور جو لوگ ایسے اعمال کریں گے ان کے لئے

دار آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو گا۔ اور وہ ان تمام بھلائیوں اور خیرات سے محروم ہو جائیں گے جو ان کے لئے وہاں اللہ تعالیٰ کی جانب سے تیار کی گئی ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

# درس ۶ ایک نظر میں

اس سبق میں یہودی سازشوں اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کی ریشہ دوانیوں کو مزید کھولا جاتا ہے۔ اسلامی جماعت کو ان کی چالوں اور حیلوں سے خبردار کیا جاتا ہے جو یہودی اسلام کے خلاف استعمال کرتے تھے۔ نیز بتایا جاتا ہے کہ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف کس قدر بغض اور حسد پایا جاتا ہے اور وہ امت مسلمہ کو نقصان پہنچانے اور ان کے خلاف سازشیں تیار کرنے میں کس طرح رات دن مصروف عمل ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو اپنی بول چال اور اپنے طرز عمل میں ان دشمنان اسلام 'کفار اہل کتاب کے ساتھ ہر قسم کا تشبہ کرنے سے روکا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو یہودیوں کے اقوال اور افعال اور پالیسیوں کے حقیقی اسباب بتائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے اتحاد اور یکجہتی کے خلاف وہ جو سازشیں' جو فتنہ انگیزیاں اور جو فریب کاریاں کر رہے تھے' انہیں واضح طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے اسلامی معاشرے کی تشکیل جدید اور نئے حالات اور تقاضوں کے مطابق بعض شرعی احکامات اور تکالیف میں رد و بدل اور نسخ جیسے مسائل کی آڑ لے کر مکروہ پروپیگنڈے کا طوفان برپا کیا تھا۔ انہوں نے جو گہری سازش مرتب کی تھی اس کے ذریعے وہ ان احکامات اور تکالیف کے منبع یعنی ذات باری تعالیٰ اور اس کی جانب سے وحی الٰہی کے نزول کی بابت مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ مسلمانوں سے کہتے تھے "اگر یہ وحی من جانب اللہ ہوتی تو سابقہ احکامات میں رد و بدل اور انہیں منسوخ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔"

یہودی پہلے بھی ایسے پروپیگنڈے کرتے رہتے تھے لیکن جب ہجرت نبوی ﷺ کے ۱۶ مہینے بعد تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا تو ان لوگوں نے اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک عظیم طوفان برپا کر دیا۔ ہجرت کے بعد ایک عرصے تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم' یہودیوں کے قبلہ "بیت المقدس" ہی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے اور اس امر سے یہودی یہ استدلال کرتے تھے کہ بس قبلہ حق اور دین حق تو انہی کا دین اور قبلہ ہیں لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دلی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس سے تبدیل ہو کر' بیت الحرام ہو جائے۔ البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کا اظہار نہ کیا تھا لیکن اس پورے عرصے میں یہ خواہش بدستور آپ کے دل میں موجود رہی اور اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خواہش کے مطابق آپ ﷺ کے پسندیدہ قبلہ ہی کو مسلمانوں کا قبلہ بنا دیا جیسا کہ آئندہ صفحات میں تفصیلات مذکور ہیں۔ بنی اسرائیل چونکہ اس بات کو اچھی طرح محسوس کر رہے تھے کہ تحویل قبلہ کے نتیجہ میں اسلام کے مقابلے میں ان کے دین کی ایک ظاہری برتری بھی ختم ہو جائے گی۔ اور آئندہ وہ اسے اپنے دین کی برتری کے لئے بطور دلیل استعمال نہ کر سکیں گے لہٰذا اس مرحلے پر انہوں نے اسلامی صفوں میں انتشار پھیلانے اور وحی الٰہی کے من جانب اللہ نزول کے بارے میں اہل ایمان کے عقائد کے اندر شکوک و شبہات پیدا کرنے کی خاطر زبردست پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ ان کی یہ سازش اس قدر گہری تھی کہ اس میں انہوں نے مسلمانوں کے بنیادی عقیدے اور قرآن کے من جانب اللہ ہونے پر کلہاڑا چلانے کی کوشش کی تھی۔ وہ مسلمانوں سے جو کچھ کہتے تھے اس کا خلاصہ یہ تھا "اگر بیت المقدس کی طرف چہرے کر کے نماز پڑھنا باطل اور خلاف حق تھا تو ۱۶ ماہ تک تمہاری تمام نمازیں ضائع ہو گئیں۔ اور اگر یہ فعل برحق تھا تو پھر تبدیلی کیوں ہوئی؟ مقصد یہ تھا کہ اب تک انہوں نے جو نمازیں ادا کیں اس کا انہیں کوئی ثواب نہ ملے گا اور یہ کہ حضرت نبی کریم ﷺ کی قیادت کوئی حکیمانہ قیادت نہیں ہے۔ (نعوذ باللہ)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں پر اس پروپیگنڈے کے برے اثرات بھی پڑنے لگے تھے۔ اس لئے وہ نہایت ... اور بے

چینی سے اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات بھی کرنے لگے تھے۔ کیونکہ یہ واقعہ اس قدر غیر معمولی تھا اور دلوں میں اس قدر خلش پیدا ہوگئی کہ اس کے ہوتے ہوئے اسلامی قیادت پر اطمینان کی فضا قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ نہ اسلامی عقائد کے منبع و ماخذ پر مکمل اعتماد رہ سکتا تھا۔ اس لئے مسلمان بھی اس کی حکمت اور اس کے بارے میں اطمینان بخش دلائل پوچھنے لگے تھے۔ یہ تھی وہ فضا جس میں قرآن کریم کی یہ آیات نازل ہوئیں۔ ان میں بتایا گیا کہ احکامات میں نسخ ایک گہری حکمت پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لئے زیادہ بہتر احکامات نازل فرماتے ہیں۔ ایسے احکامات جو نئے حالات میں مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید ہیں۔ کیونکہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کن حالات میں کیا حکم بہتر ہے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو اس امر سے بھی خبردار کر دیا جاتا ہے کہ یہودیوں کا اصل مقصد اور کوشش صرف یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو ایمان لانے کے بعد دوبارہ کافر بنا کے چھوڑیں کیونکہ ان کو یہ حسد کھائے جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی الٰہی جیسا فضل و کرم اور اعزاز عظیم مسلمانوں کو کیوں بخشا ہے؟ کیونکہ اللہ نے اپنی آخری کتاب مسلمانوں پر نازل کر دی ہے اور ان کے مقابلے میں یہ عظیم ذمہ داری کیوں ان کے سپرد کر دی ہے۔ قرآن کریم یہاں اس بات کو کھول کر بیان کرتا ہے کہ یہودیوں کی ان تمام فتنہ سامانیوں کے پیچھے کون سا خفیہ مقصد کام کر رہا ہے۔ اس موقع پر قرآن کریم ان کے اس جھوٹے دعوے کا بھی مضحکہ اڑاتا ہے کہ جنت تو صرف ان کے لئے مخصوص ہے۔ قرآن کریم ان کی آپس کی الزام تراشیوں کو بھی نقل کر دیتا ہے کہ یہودی کہتے ہیں "نصرانیوں کے دین کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔" اور نصرانی کہتے ہیں "یہودیوں کے دین کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔" اور مشرکین آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں "دونوں باطل پر ہیں۔"

قرآن کریم تحویل قبلہ کے معاملے میں ان کی بدنیتی اور خفیہ سازشوں کے راز کو یوں کھولتا ہے کہ بیت اللہ تو روئے زمین پر اللہ کی پہلی عبادت گاہ ہے اور اس کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھنے سے لوگوں کو روک کر یہودی اللہ کی مساجد اور عبادت گاہوں کو خراب کرنے کے لئے ایسے جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں جو خود ان کے نزدیک بھی بہت بڑا جرم ہے۔

غرض اس پورے سبق میں یہی مضمون آخر تک بیان کیا گیا ہے اور آخر میں مسلمانوں کے سامنے یہودیوں اور نصرانیوں کے اس مقصد کو واضح طور پر رکھ دیا گیا ہے۔ جو ان تمام کارروائیوں سے ان کے پیش نظر ہوتا ہے۔ یعنی مسلمانوں کو اپنے اس دین حق سے پھیر کر اپنے دین پر لے آنا۔ قرآن کہتا ہے کہ اہل کتاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت تک راضی نہیں ہو سکتے جب تک آپ ﷺ ان کی ملت کے پیروکار نہ بن جائیں۔ جب تک آپ ان کی یہ آرزو پوری نہ کریں گے وہ مکر و فریب اور جھوٹے پروپیگنڈے کی اس جنگ کو آخری وقت تک جاری رکھیں گے۔ ان کی تمام فتنہ انگیزیوں' فریب کاریوں اور ان کی جانب سے پیش کئے جانے والے تمام کھوکھلے دلائل کے پس پشت بس یہی ایک مقصد کار فرما ہے۔

☆☆☆☆

# درس ۶ تشریح آیات (۱۰۴ تا ۱۲۳)

اس سبق کے شروع میں روئے سخن "ان لوگوں کی طرف ہے جو ایمان لا چکے ہیں۔" مقصد یہ ہے کہ دوسرے لوگوں سے ان مابہ الامتیاز کی صفت ایمان ہے۔ یہی صفت ہے جس کی وجہ سے ایک طرف تو وہ اپنے نبی سے مربوط ہیں اور دوسری طرف اپنے پروردگار سے منسلک ہیں۔ اور یہی صفت ہے کہ جس کے ساتھ اگر انہیں پکارا جائے تو اس کی وجہ سے ان کے دل متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ہر پکار پر لبیک کہنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

اس صفت سے انہیں پکار کر اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دیتے ہیں کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہوتے وقت "راعنا" کا لفظ استعمال نہ کریں۔ بلکہ "انظرنا" کا کیونکہ انظرنا (ہماری رعایت کیجئے) کے بھی وہی معنی ہیں۔ صفت ایمان کے ساتھ اپیل کرتے ہوئے قرآن کریم انہیں سمع اور طاعت اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے اور کافروں کے برے ٹھکانے اور برے انجام یعنی عذاب الیم سے انہیں ڈراتا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ۗ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

"اے ایمان والو! راعنا نہ کہا کرو' بلکہ انظرنا کہو' اور توجہ سے سنو اور یہ کافر عذاب الیم کے مستحق ہیں۔"

لفظ "راعنا" کے استعمال سے ممانعت کا سبب مفسرین نے یہ بتایا ہے کہ بعض احمق یہودی اس لفظ کو یوں ادا کرتے تھے کہ یہ مصدر "رعایت" کے بجائے مصدر "رعونت" کا مشتق معلوم ہوتا تھا۔ یہ لوگ یوں نبی کریم ﷺ کی توہین کر کے اور آپ ﷺ کی شان میں گستاخی کر کے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان میں یہ جرأت تو تھی نہیں کہ اعلانیہ کھل کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ کہہ سکیں۔ اس لئے یہودیوں کے بعض کمینے اور ذلیل لوگ یوں لفظی ہیرپھیر سے آپ کے حق میں بدزبانی کرنے کی سعی کرتے تھے۔ اس لئے مومنین کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ سرے سے وہ الفاظ استعمال نہ کریں' جسے یہودی اس ذلیل مقصد کے لئے استعمال کر رہے تھے تاکہ ان کی کمینگی کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔

نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے کے لئے یہودیوں کی جانب سے ایسے ذلیلانہ ہتھکنڈوں کا استعمال اس امر کو اچھی طرح ظاہر کر دیتا ہے کہ ان بدبختوں کو نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کی تحریک سے کس قدر بغض تھا۔ اور کس طرح وہ آپ کے خلاف ہر گھٹیا حربہ استعمال کرنے کے لئے تیار رہتے تھے' اور اس سلسلے میں کسی موقع کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ نیز ایسے موقع پر وحی الٰہی کے ذریعے ایسے الفاظ کے استعمال کی ممانعت کر دینے سے یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اپنے نبی اور تحریک اسلامی کے نگہبان تھے اور ان کے مکار دشمنوں کی سازشوں اور مکاریوں کا فیصلہ فرما دیتے تھے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف کس قدر بغض اور کینہ بھرا ہوا ہے۔ کیونکہ یہ ہر وقت مسلمانوں کی عداوت اور ایذا رسانی پر کمربستہ ہیں۔ یہ سب کچھ وہ محض اس لئے کر رہے ہیں کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے اس مخصوص فضل و کرم سے نوازا۔ یہ تفصیلات اللہ تعالیٰ نے اس لئے بیان کیں کہ مسلمان اپنے دشمنوں سے محتاط ہو

جائیں اور جس ایمان کی وجہ سے ان کے دشمنوں کے دل جل اٹھے ہیں' اس پر اور جم جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان پر جو خصوصی فضل فرمایا ہے اس کا شکریہ ادا کریں۔ اس کی حفاظت کریں۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

"یہ لوگ جنہوں نے دعوت حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا' خواہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرک ہوں' ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بھلائی نازل ہو مگر اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے چن لیتا ہے۔ اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔"

اللہ تعالیٰ یہاں اہل کتاب اور مشرکین دونوں کو کافروں کے زمرے میں داخل فرماتے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں طبقے نبی آخر الزمان کی رسالت کے منکر تھے' لہٰذا اس پہلو سے وہ دونوں ایک حیثیت رکھتے ہیں اور دونوں کے دل مسلمانوں کے حسد اور بغض سے بھرے ہوتے ہیں' دونوں یہ نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کو کوئی بھلائی نصیب ہو۔ وہ مسلمانوں کی جس چیز سے بہت جل بھن گئے ہیں وہ ان کا دین ہے۔ ان کو یہ بات کھلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں چھوڑ کر اس بھلائی کے لئے مسلمانوں کو کیوں منتخب فرمایا۔ ان پر قرآن کی صورت میں وحی الٰہی کیوں نازل ہوئی' انہیں اس انعام و اکرام سے کیوں نوازا گیا۔ اور کائنات کی عظیم ترین امانت یعنی اسلامی نظریۂ حیات کا محافظ مسلمانوں کو کیوں قرار دیا گیا۔

اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ لوگ اس بات کے ہرگز روادار نہیں تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے کسی اور بندے کو بھی نوازے۔ اس سلسلے میں ان کی تنگ دلی اس حد کو جا پہنچی ہے کہ نبی ﷺ پر پیغام وحی لے کر آنے کی وجہ سے یہ لوگ حضرت جبریل علیہ السلام کے بھی دشمن ہو گئے۔ حالانکہ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ "اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے چن لیتا ہے۔" نیز صرف اللہ ہی اس بات کو جانتا ہے کہ اس کی اس امانت و رسالت کا بہترین مہبط کہاں ہے؟ اب اگر اللہ تعالیٰ نے یہ پیغام حضرت محمد ﷺ پر اتارا ہے اور مسلمان اس پر ایمان لائے ہیں تو اللہ کے علم میں یہ بات موجود تھی کہ حضور اکرم ﷺ اور مؤمنین اس بار امانت کے اٹھانے کے اہل ہیں وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ "اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔"

نبوت اور رسالت کی نعمت سے کوئی بڑی نعمت نہیں ہے' اور دولت ایمان سے بڑی دولت کوئی نہیں ہے اور دعوت اسلامی کے اعزاز سے کوئی بڑا اعزاز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہاں یہ احساس دلانا چاہتا ہے اور ان کے اندر یہ شعور اجاگر کرنا چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک عظیم احسان اور فضل و کرم کیا ہے۔ اس سے پہلے مسلمانوں کو یہ تصور دلایا گیا تھا کہ مسلمانوں پر اللہ کے ان احسانات کی وجہ سے کفار کے دل کینہ اور حسد سے جل بھن گئے ہیں۔ لہٰذا انہیں ان سے چوکنا رہنا چاہئے۔ اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمان ان سے محتاط رہیں اور یہودی سازشوں کے مقابلے میں ان کا شعور تیز رہے۔ یہودیوں کی اس وسوسہ اندازی اور تشکیک کے مقابلے میں مسلمانوں کے اندر اس قسم کے احساس اور شعور کو بیدار کرنا ضروری تھا کیونکہ یہ لوگ اس وقت بھی اور اس کے بعد آج تک مسلمانوں کے دل و دماغ میں سے اس نظریۂ حیات پر ایمان کو کمزور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ دولت ایمان ہی تھی جس کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے ساتھ حسد کرتے تھے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے مسلمان ان سے ممتاز اور برتر ہو گئے تھے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا۔ یہودیوں کے اس حملے کا آغاز قرآن کریم کی بعض آیات اور احکامات کی تنسیخ سے ہوا تھا۔ بالخصوص جب بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف قبلے کی تحویل کا حکم نازل ہوا۔ یہ واقعہ ایسا تھا جس کی وجہ سے یہودی اپنے دعوائے برتری کے اہم ثبوت سے محروم ہو گئے تھے اور انہوں نے یہ مذموم پروپیگنڈا تیز تر کر دیا تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا!

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ

"ہم اپنی جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں اس کی جگہ اس سے بہتر لاتے ہیں یا کم از کم ویسی ہی۔"

یہ آیات تحویل قبلہ کے موقعہ پر نازل ہوئی ہیں' جیسا کہ ان آیات کے بعد سیاق کلام سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ یا اس سے مراد وہ جزوی تبدیلیاں ہوں جو جماعت مسلمہ کی ہدایت کے لئے مختلف حالات میں احکامات قرآنی اور ہدایات الٰہی میں کی جاری تھیں یا اس سے مراد قرآن کریم کی وہ مجموعی تبدیلیاں ہوں جو تورات و انجیل کے مقابلے میں قرآن نے کیں حالانکہ مجموعی لحاظ سے قرآن نے ان کتابوں کو کتب برحق کہا تھا۔ ان میں سے کوئی ایک مراد ہو یا تینوں مراد ہوں جنہیں یہودیوں نے اس وقت تحریک اسلامی کے خلاف پروپیگنڈے اور مسلمانوں کے اندر شبہات پھیلانے کی خاطر استعمال کیا تھا اور اسلام کے مرکزی عقاید پر حملے شروع کر دیئے تھے۔ بہر حال مراد جو بھی ہو قرآن کریم اس موقع پر احکامات میں تبدیلی اور نسخ کے بارے میں واضح ہدایات دے دیتا ہے۔ اور یہودیوں کی ان تمام وسوسہ اندازیوں اور نکتہ چینیوں کا خاتمہ کر دیتا ہے جو وہ حسب عادت مختلف طریقوں سے' اسلامی نظریۂ حیات کے خلاف کرتے رہتے تھے۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ زمانہ رسالت کے دوران ہدایات و احکامات میں جزوی تبدیلی خود انسانوں کی بھلائی کے لئے کی جاتی ہے۔ اور ہر تبدیلی بدلے ہوئے حالات میں انسانیت کی بہتری ہی کے لئے کی جاتی ہے کیونکہ اللہ ہی انسانوں کا خالق ہے۔ اسی نے رسول بھیجے ہیں۔ وہی ان احکامات کا نازل کرنے والا ہے اور یہ سب کچھ اس کے مقررہ پروگرام کے مطابق ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کسی آیت کو منسوخ کر دیتا ہے یا بھلا دیتا ہے۔ آیت سے مراد پڑھی جانے والی آیات قرآن ہو جو احکامات پر مشتمل ہوتی ہے۔ یا اس سے مراد علامت یا طبعی معجزات اور خارق عادات واقعات ہوں جن کا صدور مختلف حالات میں پیغمبروں کے ہاتھوں ہوا کرتا تھا۔ اور بعد میں یہ آیات و معجزات لپیٹ لئے جاتے تھے۔ جو بھی مراد ہو' اللہ تعالیٰ اس کی جگہ اس سے بہتر لے آتا ہے۔ اور وہ ہر چیز کا مالک ہے' وہ کسی چیز کے معاملے میں بے بس نہیں ہے۔ زمین و آسمان کے تمام امور اس کے دست قدرت میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾

"کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ کیا تمہیں خبر نہیں ہے کہ زمین و آسمان کی فرماں روائی اللہ ہی کے لئے ہے اور اس کے سوا کوئی تمہاری خبرگیری کرنے والا اور تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہے۔"

جن الفاظ میں مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے کہ "تمہاری خبرگیری کرنے والا اور تمہاری مدد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔" ان سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان سے بیک وقت تنبیہ اور تذکیر مطلوب ہے۔ غالباً تنبیہ کا انداز اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ بعض لوگ یہودیوں کے اس گمراہ کن پروپیگنڈے سے متاثر ہو گئے تھے۔ اور ان کی جانب سے پیدا کردہ شر انگیزی سے مرعوب ہو کر وہ نبی ﷺ سے ایسے

سوالات کرنے لگے تھے' جو مکمل اعتماد اور پختہ یقین سے میل نہ کھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے ایسے سوالات کو ناپسند کیا اور واضح طور پر انہیں تنبیہ کی۔

أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ ۗ وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿١٠٨﴾

"پھر کیا تم اپنے رسول سے اس قسم کے سوالات اور مطالبے کرنا چاہتے ہو جیسے اس سے پہلے موسیٰ سے کئے جا چکے ہیں؟ حالانکہ جس شخص نے ایمان کی روش کو کفر کی روش سے بدل لیا وہ راہ راست سے بھٹک گیا۔"

اللہ مؤمنین کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کی قوم کی طرح کج بحثی میں نہ پڑیں اور اپنے پیغمبر سے خواہ مخواہ دلائل نہ پوچھیں اور نہ ہی خارق عادت باتوں کا مطالبہ کریں۔ جس طرح بنی اسرائیل نے یہ حرکت اپنے نبی کو تنگ کرنے کے لئے کی تھی۔ ان کی یہ عادت تھی کہ حضرت موسیٰ ﷺ انہیں کوئی حکم دیتے یا ان تک اللہ تعالیٰ کا کوئی پیغام پہنچاتے تو وہ کج بحثیوں میں پڑ جاتے جیسا کہ اس سے قبل اسی سورت میں کئی واقعات گذر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس روش کے قدرتی انجام سے ڈراتے ہیں۔ کیونکہ اس روش کا قدرتی انجام گمراہی اور ایمان کے بعد کفر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسی انجام تک اس سے پہلے بنی اسرائیل پہنچ چکے ہیں اور اب ان لوگوں کی دلی خواہش یہ ہے کہ مسلمان بھی اسی انجام تک پہنچ جائیں۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ

اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹالے جائیں اگرچہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے مگر اپنے نفس کے حسد کی بناپر تمہارے لئے ان کی یہ خواہش ہے۔

حسد' جو ایک نہایت ہی بری خصلت اور ایک اخلاقی بیماری ہے۔ نفس انسانی کے اندر یہ خواہش پیدا کر دیتی ہے کہ تمام دوسرے لوگ ہر قسم کی بھلائی سے محروم ہو جائیں اور راہ ہدایت نہ پائیں۔ اس لئے نہیں کہ ایسے حاسد شرپسند لوگ حقیقت حال سے واقف نہیں ہوتے۔ وہ حقیقت حال سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں مگر محض حسد کی بناپر یہ خواہش رکھتے ہیں۔

حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ "اگرچہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے مگر نفس کے حسد کی بناپر وہ ایسا کرتے ہیں۔"

یہود کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف حسد کے جو سیاہ اور گھٹیا جذبات موجزن تھے وہ جذبات آج بھی جوں کے توں موجود ہیں۔ اسلام کے خلاف ان کی تمام سازشیں اور تمام تدابیر انہی جذبات پر مبنی تھیں۔ اور آج تک ان کا طرز عمل جوں کا توں ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن کریم تفصیل کے ساتھ مسلمانوں کے سامنے کھول کر بیان کر رہا ہے تاکہ وہ معاملے کی حقیقت تک پہنچ جائیں۔ اور یہ

معلوم کر لیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کی اس مسلسل جدوجہد کے پس منظر میں صرف وہ جذبہ کار فرما ہے کہ وہ مسلمانوں کے عقائد کو متزلزل کر دیں اور انہیں دوبارہ اسی حالت کفر کی طرف لوٹا کر لے جائیں جس میں وہ پہلے مبتلا تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے نجات دی اور وہ ایمان لے آئے اور انہیں فضل عظیم اور نعمت جلیلہ سے نوازا گیا۔

جب یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور یہودیوں کا مکروہ بغض و حسد عیاں ہو جاتا ہے تو قرآن کریم مسلمانوں کو یہ تلقین کرتا ہے کہ وہ یہودیوں کی پست سطح سے بالا ہو کر سوچیں۔ حسد کا جواب حسد اور شر کا جواب شر سے نہ دیں بلکہ عفو اور درگذر سے کام لیں اور اس وقت کا انتظار کریں جب اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ لے آئے۔

فَاعْفُوْا وَ اصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

"اس کے جواب میں تم عفو و درگذر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ خود اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔ مطمئن رہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جس راہ کو پسند فرمایا ہے اس پر گامزن ہو جاؤ۔ اس کی بندگی کرو اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کما کر اس کے ہاں جمع کرتے رہو۔

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

"نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ تم اپنی عاقبت کے لئے جو بھلائی کما کر آگے بھیجو گے اللہ کے ہاں اسے موجود پاؤ گے جو کچھ تم کرتے ہو وہ سب اللہ کی نظر میں ہے۔"

غرض اس پورے پیراگراف میں اسلامی جماعت کو یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور مسلمانوں کی فکر کو اس پر مرکوز کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے لئے خطرے کی اصل جگہ کونسی ہے۔ کہاں ان کے خلاف سازشیں تیار ہوتی ہیں۔ یوں اسلامی شعور کو یہودیوں کے برے ارادوں گھٹیا سازشوں اور مذموم حاسدانہ جذبات کے مقابلے کے لئے تیار کیا جاتا ہے لیکن اس تیاری کے بعد اس اسلامی شعور کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے تاکہ مسلمان اس کے احکام کے منتظر ہوں اور اپنی ہر حرکت اور اپنے ہر فعل کو اللہ تعالیٰ کے تصرف میں دے دیں۔ یہاں تک کہ فیصلے کی گھڑی آ جائے۔ اس وقت مسلمانوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ عفو و درگذر سے کام لیں اور اپنے دلوں کو بغض و حسد اور کینہ و دشمنی سے پاک رکھیں اور صاحب امر اور صاحب مشیئت کے احکامات اور فیصلے کا انتظار کریں۔

OOOOO

اس کے بعد قرآن کریم ان دعووں کا جائزہ لیتا ہے جو یہود و نصاریٰ بالعموم کیا کرتے تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ کہتے تھے کہ صرف وہی ہدایت پر ہیں۔ یہ کہ جنت صرف ان کے لئے ہے اور ان کے علاوہ اس میں کوئی بھی داخل نہ ہو گا۔ اور یہ دعویٰ بیک وقت یہودی اور عیسائی کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک شخص کہتا تھا کہ دوسرے کے پاس سچائی کا ایک ذرہ بھی نہیں۔ ان کے ان دعووں کے تذکرے کے ضمن میں قرآن کریم عمل اور مکافات عمل کے بارے میں اپنے حقیقی تصور کی وضاحت بھی کر دیتا ہے۔

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ
أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١١١﴾ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ
لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ ١٣
يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ ع٩
لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ ١٣
لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا
كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١١٣﴾

"ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو یا عیسائی نہ ہو۔ یہ ان کی تمنائیں ہیں ان سے کہو اپنی دلیل پیش کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ دراصل نہ تمہاری کچھ خصوصیت ہے نہ کسی اور کی۔ حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے اس کے لئے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لئے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔"

یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں۔ عیسائی کہتے ہیں یہودیوں کے پاس کچھ نہیں۔ حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھتے ہیں اور اسی قسم کے دعوے ایسے لوگوں کے بھی ہیں جن کے پاس کتاب کا علم نہیں ہے۔ یہ اختلاف جن میں یہ لوگ مبتلا ہیں ان کا فیصلہ قیامت کے روز اللہ کر دے گا۔"

مدینہ طیبہ میں جو لوگ مسلمانوں کے مقابلے میں اترے ہوئے تھے وہ یہودی تھے کیونکہ وہاں نصرانیوں کا کوئی ایسا منظم گروہ موجود نہ تھا جو یہودیوں کی طرح اسلام دشمنی میں مبتلا ہوتا لیکن آیت میں انداز بیان کو عام رکھا گیا ہے۔ یہاں آیات الٰہی دونوں گروہوں کے اقوال کی تردید کرتی ہیں۔ اور ایک دوسرے کے بارے میں یہود و نصاریٰ دونوں کے اقوال نقل کر کے آخرت میں ان دونوں کے بارے میں مشرکین عرب کے خیالات نقل کر دیے جاتے ہیں وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو یا عیسائی نہ ہو۔" یہاں ان دونوں فرقوں کے دعووں کو یکجا کر کے بیان کیا گیا ورنہ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ مدعی تھا۔ یہودی کہتے تھے کہ جنت میں صرف وہ شخص داخل ہو گا جو یہودی ہو اور نصرانی کہتے تھے کہ جنت میں صرف وہ شخص داخل ہو گا جو نصرانی ہو۔ ان دونوں کے یہ لمبے چوڑے دعوے محض ادعائی تھے۔ ان کی پشت پر کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ وہ انہیں ان کے ان دعووں کی دلیل پیش کرنے کا چیلنج کریں۔

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ "ان سے کہو اپنی دلیل پیش کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔"

یہاں اللہ تعالیٰ موقع کی مناسبت سے مکافات عمل کے بارے میں اسلامی نظریۂ حیات کا ایک اہم اصول بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس معاملے میں کسی امت کسی گروہ یا کسی فرد کی کوئی رو رعایت نہ کی جائے گی۔ اللہ کے ہاں جس چیز کی قدر ہے وہ نیکی اور مکمل بندگی اور

تسلیم و رضا ہے۔ یہاں محض نام اور عنوان کو دیکھ کر فیصلے نہیں ہوتے۔

بَلٰی ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ "حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے' اس کے لئے اس کے رب کے پاس اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لئے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں ہے۔"

اس سے قبل ایک جگہ یہودیوں کے اس دعوے پر کہ "انہیں آگ نہیں چھوئے گی مگر چند دن" کی تردید کرتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاں سزا کا یہ عام اصول بیان کیا تھا۔ "ہاں جو بھی برائی کمائے گا اور اس کی برائیاں اسے گھیر لیں گی وہ لوگ جہنمی ہوں گے اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔" یعنی خطیئات کے مرتکب لوگوں کو سزا محض اس لئے ہوگی کہ انہوں نے خطیئات کا ارتکاب کیا۔ اس کے علاوہ کوئی نقطہ نظر یا کوئی پہلو اس کا باعث نہ ہوگا کہ انہیں سزا دی جائے۔ غرض نیکی اور بدی میں اللہ کے ہاں جزو سزا کا یہی ایک اصول ہے بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ جو اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے "یعنی اپنی پوری ذات کو اللہ کے لئے مختص کر دے۔ اپنے پورے شعور کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے اور جس طرح پہلا شخص خالصتاً برائی میں گرفتار ہو گیا تھا۔ یہ ہمہ تن اللہ کے لئے ہو جائے۔ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ "جو اپنی ذات کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے۔" اس فقرے میں اسلام کی اہم ترین خصوصیت اور واضح علامت کو بیان کیا گیا ہے۔ یعنی ایک انسان پوری طرح اللہ کی طرف منہ کر لے۔ یعنی ہمہ تن متوجہ ہو جائے اور مکمل انقیاد اور اطاعت اختیار کر لے یعنی معنوی طور پر اللہ کے آگے جھک جائے اور عملاً بھی اس کا مطیع فرمان ہو جائے اور چونکہ معنوی تسلیم و رضا کے لئے ظاہری دلیل عملاً اطاعت حکم ہوا کرتی ہے' اس لئے کہا گیا اور عملاً نیک روش اختیار کرے۔ اسلام کی اہم ترین خصوصیات اور نشانیوں میں سے ایک یہ امر ہے کہ انسان کا شعور اور روش اس کا عقیدہ اور عمل' اس کا قلبی ایمان اور عملی روش کے درمیان مکمل یگانگت ہو۔ جب ایک انسان یہ مقام حاصل کر لیتا ہے تو اس وقت نظریۂ حیات نظام حیات بن جاتا ہے۔ اور اس وقت انسان کی شخصیت اپنی سرگرمیوں اور اپنے رجحانات کے اندر متحد ہو جاتی ہے۔ اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور تب ایک بندہ مومن اس عطاء الٰہی کا مستحق قرار پاتا ہے۔ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ "ان کے لئے ان کے رب کے پاس اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لئے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقعہ نہیں۔" ان کا اجر محفوظ ہے اور ان کے رب کے پاس ہے۔ امن و طمانیت کی ایک عظیم دنیا جس میں رنج و الم کا شائبہ تک نہیں' ان کے لئے منتظر ہے۔ فرحت و سرور کا ایک عالم ہے جس میں حزن و ملال کا کوئی لمحہ نہیں۔ ان کے تیار ہے۔ جزا کلیہ اصول عامہ ہے اور تمام لوگ اس میں برابر ہیں۔ اللہ کے ہاں کسی کی رو رعایت یا کسی کی کوئی شان محبوبیت نہیں ہے۔

یہود و نصاریٰ دونوں لمبے چوڑے دعوے کرتے رہتے تھے اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے بارے میں کہتا تھا کہ وہ تو کچھ نہیں۔ نیز مشرکین تو ان سے بھی ایک قدم آگے بڑھے ہوئے تھے اور کہتے تھے کہ ان دونوں گروہوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

"یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں' عیسائی کہتے ہیں یہودیوں کے پاس کچھ نہیں۔ حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھتے ہیں

اور اسی قسم کے دعوے ایسے لوگوں کے پاس بھی ہیں جن کے پاس کتاب کا علم نہیں۔ یہ اختلافات جن میں یہ لوگ مبتلا ہیں ان کا فیصلہ اللہ قیامت کے روز کرے گا۔"

جن لوگوں کے پاس کتاب کا علم نہیں یعنی ان پڑھ عرب جن کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔ یہ لوگ بھی جب دیکھتے تھے کہ یہود و نصاریٰ جس تفرق اور اختلاف کا شکار ہیں ایک دوسرے کو جس طرح گالیاں دے رہے ہیں اور جس طرح الزام تراشیاں کر رہے ہیں یا جن خرافات اور بے حقیقت باتوں پر وہ ایمان لائے ہوئے ہیں۔ وہ اہل شرک اور عربوں کے مشرکانہ خیالات 'فرشتوں کے اولاد الٰہی ہونے کے تصورات سے کسی طرح بھی اونچے عقائد یا نظریات نہیں۔ اس لئے وہ بھی ان عقائد کو حقیر سمجھتے ہوئے یہود و نصاریٰ کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ ان کے ارکان کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

جنت کی ملکیت کے بارے میں یہود و نصاریٰ کے ان دعوؤں کے بعد قرآن کریم ان لوگوں کی باہم الزام تراشیاں نقل کر کے ان کے فیصلے کو اللہ پر چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ

"پس اللہ ہی قیامت کے دن ان کے مختلف فیہ مسائل کا فیصلہ کرے گا۔ کیونکہ وہی عادل جج ہے۔ اور آخر کار تمام امور اسی کے سامنے جانے ہیں۔ جو لوگ دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہی جنتی اور اہل ہدایت ہیں لیکن وہ کسی منطق کے قائل نہیں ہوتے 'نہ ان کے دعاوی کسی دلیل پر مبنی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا معاملہ اللہ ہی پر چھوڑ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں سے جان چھڑانے کی بس یہی صورت ہے۔

یہودی 'مسلمانوں کے دلوں میں پیغمبر ﷺ کے اوامر اور آپ کی تعلیمات کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی مساعی کرتے تھے 'خصوصاً تحویل قبلہ کے معاملے میں 'ان کا پروپیگنڈا تو اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اب روئے سخن ان کی ان مذموم مساعی کی تردید کی طرف پھر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی یہ جدوجہد در حقیقت مساجد اللہ کی تخریب ہے اور ان کا مقصد مساجد اللہ میں اللہ کے ذکر و فکر سے لوگوں کو منع کرنا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

"اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ کے معبدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور ان کی ویرانی کے درپے ہو؟ ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ ان کی عبادت گاہوں میں قدم نہ رکھیں اور اگر وہاں جائیں بھی 'تو ڈرتے ہوئے جائیں۔ ان کے لئے تو دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں عذاب عظیم۔ مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں جس طرف بھی تم رخ کرو گے اسی طرف اللہ کا رخ ہے۔ اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔"

اقرب الی الذہن یہ ہے کہ ان دو آیات کا تعلق مسئلہ تحویل قبلہ سے ہے۔ کیونکہ اس مرحلے پر یہودی اس کوشش میں لگے ہوئے

تھے کہ مسلمانوں کو نئے قبلہ کی جانب منہ کر کے نماز پڑھنے سے باز رکھیں' حالانکہ کعبہ وہ پہلا عبادت خانہ تھا جو عوام کے لئے بنایا گیا اور وہی اسبق قبلہ تھا۔ اگرچہ اس آیت کے اسباب نزول کے سلسلے میں اس کے علاوہ بھی متعدد روایات ہیں۔

بہرحال آیت کی عمومیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ یہ ایک عام حکم ہے اور اس میں ہر کسی کو اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی مساجد میں اس کے ذکر و فکر اور عبادت سے روکیں۔ یا ان مساجد کی تخریب کے درپے ہوں۔ یہاں ایسے لوگوں کا حکم اور وہ جزا بھی بتادی جاتی ہے جس کے مستحق وہ تمام لوگ ہیں جو ایسے کام کرتے ہیں۔" اور وہ جزا یہ ہے۔ أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ "ایسے لوگ تو اس قابل ہیں کہ ان عبادت گاہوں میں قدم نہ رکھیں اور اگر وہاں جائیں بھی تو ڈرتے ہوئے جائیں۔"

یعنی وہ ہمیشہ دھکیلے جانے' بھگائے جانے اور امن و سکون سے محروم ہونے کے مستحق ہیں الا یہ کہ وہ اس خوف اور بے چینی سے پناہ گاہ کی تلاش میں ڈرتے ڈرتے مسجدوں میں جاگھسیں۔ اور مسجد کے احترام کا دامن تھام لیں۔ (یہی صورت حال فتح مکہ کے موقع پر پیش آئی) جب رسول اللہ ﷺ کے منادی نے پکارا کہ "جو شخص مسجد حرام میں پناہ لے گا اسے پناہ مل جائے گی۔" چنانچہ قریش کے تمام سرکش افراد مسجد میں جاگھسے حالانکہ یہی وہ لوگ تھے جو ایک عرصہ تک رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو مسجد حرام میں عبادت کرنے سے بھی روک رہے تھے۔) ایسے لوگوں کا انجام بتاتے ہوئے قرآن کریم مزید وضاحت کرتا ہے کہ ایسے لوگ دنیا میں بھی ذلیل ہوں گے اور آخرت میں تو ان کے لئے عذاب عظیم تیار کیا گیا ہے۔ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ "ان کے لئے تو دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں عذاب عظیم ہے۔"

بعض مفسرین نے آیت مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ کی تفسیر یہ کی ہے کہ ایسے لوگوں کا فرض یہ ہے کہ وہ آداب مسجد کا لحاظ کرتے ہوئے' مساجد میں ڈرتے ڈرتے اور خضوع اور خشوع کے ساتھ داخل ہوں' کیونکہ اللہ کی مساجد کا احترام اور اللہ ذوالجلال کی ہیبت اور دبدبے کا یہ تقاضا ہے کہ اس کے گھر میں بصد احترام قدم رکھا جائے۔ بہرحال یہ بھی ایک تفسیر ہے اور آیت اس کی بھی متحمل ہے۔

لیکن ان آیات میں سے دوسری یعنی وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ چونکہ تحویل قبلہ کے موقع پر نازل ہوئی اس لئے ہم نے پہلی آیت ومن اظلم کو بھی تحویل قبلہ پر محمول کیا ہے۔

وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ "مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ جس طرف بھی تم رخ کرو گے اسی طرح اللہ کا رخ ہے۔ اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے اس پروپیگنڈے کے رد میں نازل ہوئی ہے جو وہ تحویل قبلہ کے خلاف کر رہے تھے کہ اگر قبلہ یہ ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ مسلمانوں نے جو نمازیں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے ادا کیں وہ سب باطل تھیں۔ سب ضائع گئیں اور اللہ کے ہاں ان کا کوئی حساب نہ ہوگا۔ آیت میں یہودیوں کے اس خیال باطل کی تردید کی جاتی ہے کہ جس طرف بھی رخ کیا جائے وہی قبلہ ہے۔ ایک عبادت گذار جس طرف بھی رخ کرے' اللہ کا رخ اسی طرف ہے۔ رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک معین سمت کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا جو حکم دیا ہے وہ محض امتثال امر ہے اور عبادت و اطاعت ہے۔ یہ حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ نعوذ باللہ کہیں اس طرف اللہ کا رخ ہے اور دوسری طرف نہیں ہے۔ رہا اللہ تو وہ اپنے بندوں پر کسی معاملے میں بھی ضیق اور تنگی نہیں کرتا' نہ ان کے ثواب میں کمی کرتا ہے' کیونکہ وہ ان کے دلوں کے بھید جانتا ہے اور ان میلانات اور رجحانات کو بھی جانتا ہے جو ایک خاص

سمت کی طرف رخ کرنے کے لئے لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ اللہ کے ہاں بڑی وسعت ہے۔ وہ نیتوں کا مالک ہے۔ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۞ "اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔"

اس کے بعد قرآن کریم اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ ان لوگوں کے تصور الٰہ میں ہی فتور آگیا ہے اور یہ لوگ اساس دین یعنی عقیدۂ توحید ہی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ جو تمام رسالتوں اور نبوتوں کا بنیادی اور صحیح تصور تھا۔ اور ان کے تصور الٰہ کے ڈانڈے' اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں دوسرے جاہل تصورات سے جاملے ہیں۔

چنانچہ قرآن کریم یہاں اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ مشرکین عرب اور مشرکین اہل کتاب کے تصور الٰہ میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ ان دونوں کے دل باہم ملے ہوئے ہیں۔ اور اس موقع پر ان دونوں فرقوں کے سامنے اسلام کے صحیح ایمانی عقیدے کی وضاحت کر دی جاتی ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۙ سُبْحَانَهُ ۖ بَلْ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ كُلٌّ لَهُ قَانِتُونَ ۞ بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۞ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۘ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ ۗ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۞

"ان کا قول ہے کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے اصل حقیقت یہ ہے کہ زمین و آسمان کی تمام موجودات اس کی ملک ہیں۔ سب کے سب اس کے مطیع فرمان ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جس بات کا وہ فیصلہ کرتا ہے' اس کے لئے بس یہ حکم دیتا ہے کہ ہو جا' اور وہ ہو جاتی ہے۔"

نادان کہتے ہیں کہ اللہ خود ہم سے بات کیوں نہیں کرتا یا کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں آتی۔ ایسی ہی باتیں ان سے پہلے لوگ بھی کیا کرتے تھے۔ ان سب کی ذہنیتیں ایک جیسی ہیں۔ یقین لانے والوں کے لئے تو ہم نشانیاں صاف صاف نمایاں کر چکے ہیں۔"

یہ قول کہ "اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔" یہ صرف عیسائیوں کا ہی عقیدہ نہیں جو وہ حضرت مسیح کے بارے میں رکھتے تھے بلکہ خود یہودی بھی حضرت عزیر کی ابنیت کے قائل تھے۔ اور یہی عقیدہ مشرکین مکہ اللہ کے فرشتوں کے بارے میں رکھتے تھے۔ قرآن کریم نے یہاں ان فرقوں کے عقیدے کی تفصیلات بیان نہیں کیں۔ کیونکہ یہاں اجمالی بحث مطلوب تھی۔ یہاں اجمالاً ان تین فرقوں کی طرف اشارہ مطلوب تھا جو اس وقت جزیرہ عرب میں تحریک اسلامی کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ تعجب ہے کہ آج بھی عالم اسلام میں اسلام کی راہ میں تین فرقے روکے کھڑے ہیں۔ یہودی بین الاقوامی صیہونیت کے روپ میں' عیسائی بین الاقوامی صلیبیت کی شکل میں اور عرب عالمی کیموزم کی شکل میں۔ یہ آخری یعنی کیموزم اس وقت کے "عربی شرک" سے زیادہ شدید کفر ہے۔ اس مشترکہ خصوصیت کے بیان سے یہودیوں اور عیسائیوں کا یہ دعویٰ خود بخود رد ہو جاتا ہے کہ صرف وہی اہل ہدایت ہیں کیونکہ ہدایت کے اس اصل عقیدے میں وہ مشرکین کے ہم مشرب ہیں۔

ان کے تصور الٰہ کے دوسرے سقیم و فاسد پہلوؤں کے بیان سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ اپنے بارے میں ان کے مذکورہ بالا سقیم تصور سے

اپنی پاکی اور براءت کا اعلان کرتا ہے اور یہ بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی تمام مخلوقات کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۞ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ

"اللہ پاک ہے ان باتوں سے اصل حقیقت یہ ہے کہ زمین و آسمان کی تمام موجودات اس کی ملک ہیں' سب کے سب ان کے مطیع فرمان ہیں' وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے' اور جس بات کا وہ فیصلہ کرتا ہے' اس کے لئے بس یہ حکم دیتا ہے کہ "ہو جا" اور وہ "ہو جاتی ہے"

اس آیت میں' اسلامی نقطۂ نظر سے اللہ سبحانہ' تعالیٰ کا خالص تجریدی تصور بیان کیا گیا ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ نیز اللہ کی ذات سے اس کائنات کا صدور کیونکر ہوا؟ ان تمام امور کے بارے میں جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ ان کے بارے میں تمام دوسرے تصورات کے نسبت اعلیٰ و ارفع ہے۔ یہ کائنات اللہ کی ذات و الاصفات سے کیونکر صادر ہوئی؟ بس اللہ نے ارادہ کیا اور وہ وجود میں آگئی۔ "کُنْ" کہنے کی دیر تھی کہ "فَیَکُوْنُ" (وہ ہو گئی)۔ یعنی کسی ہونے والی چیز کی طرف ارادہ الٰہی کی توجہ ہی امر کے لئے کافی ہے کہ وہ فی الفور وجود میں آجائے۔ اسی صورت اور شکل میں جو اس کے لئے مقرر اور متعین ہے۔ اس عمل میں کسی واسطے اور کسی مادی قوت کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اب سوال یہ ہے کہ ارادہ الٰہی کسی مخلوق کے ساتھ کیونکر وابستہ ہو جاتا ہے؟ اور اس کے نتیجہ میں مخلوق کس طرح وجود میں آجاتی ہے؟ تو اس کی حقیقت سے ہم واقف نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا راز ہے جو انسانی ادراک کے لئے سربستہ ہے۔ اس لئے کہ انسان کی ادراکی قوت ابھی تک اس راز کی متحمل نہیں ہے۔ از روئے خلقت انسان کی ادراکی قوت کو اس راز کے معلوم کرنے کا اس لئے متحمل نہیں بنایا گیا کہ انسان کی تخلیق' جس مقصد کے لئے ہوئی ہے' اس کی ادائیگی کے سلسلے میں اسے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تخلیق انسان کا کیا مقصد ہے؟ زمین میں فریضہ خلافت کی ادائیگی اور زمین کے اندر تعمیر و ترقی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے قوانین قدرت کے اتنے ہی راز بتائے ہیں جن کی اسے ضرورت تھی اور جن کے بغیر وہ اپنے فرائض منصبی ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اور جن کے ذریعے سے انسان کے لئے خزائن الارض سے انتفاع ممکن ہوا۔ دوسری طرف اسے ایسے رازوں سے بے خبر رکھا گیا جن کا مقصد تخلیق انسانیت یعنی خلافت کبریٰ کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ اس سلسلے میں دوسرے فلسفے اس قدر بھٹکے کہ انہیں کہیں بھی روشنی کی کرن نظر نہ آئی۔ وہ بے سود ان اسرار و رموز کے حل کے پیچھے پڑے رہے۔ انہوں نے ایسے مفروضے قائم کئے جو محض انسانی ادراک کی پیداوار تھے۔ حالانکہ انسانی ادراک اپنی خلقت ہی کے اعتبار سے اس قابل نہیں ہے کہ وہ ان فوق الطبیعاتی مفروضات پر غور کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی ادراک کو سرے سے وہ ذرائع ہی نہیں دیئے جن کے ذریعے وہ ان بھیدوں تک پہنچ سکے۔ چنانچہ اگر غور کیا جائے تو تمام فلسفیانہ افکار میں سے اعلیٰ ترین افکار بھی ایسے مضحکہ انگیز ہیں کہ انہیں دیکھ کر ایک عام انسان بھی حیران رہ جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ ایک فلسفی اور ذہین شخص ان نتائج تک کیونکر پہنچا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ان فلسفوں کے پیش کرنے والوں نے انسانی ادراک کو اس کی فطری حدود سے آگے بڑھا دیا اور اسے ان فوق الطبیعاتی مسائل میں استعمال کیا جن میں اس کی کوئی مجال نہ تھی۔ اس لئے وہ کسی قابل اطمینان نتیجے تک نہ پہنچ سکے۔ بلکہ ان کے نتائج فکر اس شخص کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتے جو اسلامی نظریۂ حیات پر ایمان رکھتا ہو اور اس کے سایۂ عاطفت میں زندگی بسر کر رہا ہو۔ اسلام نے اپنے معتقدین کو بغیر واضح حجت کے ان اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے محفوظ کر دیا ہے۔ اس لئے وہ اس بنیادی طور پر غلط طریق فکر کی راہ سے مابعد الطبیعاتی مسائل کے حل کی ناکام

کوشش ہی نہیں کرتے۔ مابعد کے ادوار میں مسلمانوں میں سے جن متفلسفوں نے' یونانی فلسفے سے متاثر ہو کر فلسفیانہ مفروضات کے مطابق سوچنا شروع کیا' وہ بے حد الجھن اور غلط مبحث کا شکار ہوئے۔ جیسا کہ ان سے پہلے ان کے اساتذہ یونانی فلسفی شکار ہوئے تھے۔ ان مسلم فلسفیوں نے اسلامی نظام فکر میں وہ مسائل داخل کر دیئے جو اس کے مزاج ہی کے خلاف تھے۔ اور انہیں اسلامی نظریۂ حیات کی حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ غرض جب بھی انسان نے اپنی عقل و فکر کو اپنی حدود سے آگے بڑھایا اور اپنے مزاج اور خلقت کے خلاف استعمال کیا اس کا انجام یہی رہا۔ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ "اصل حقیقت یہ ہے کہ زمین و آسمان کی تمام موجودات اس کی ملک ہیں۔ سب کے سب اس کے مطیع فرمان ہیں۔"

آسمانوں اور زمینوں کے درمیان جو چیزیں ہیں ان میں سے اسے کسی کو بیٹا بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا تمام لوگ اس کی مخلوق ہے اور ایک درجے میں ہے' اور ایک ہی حیثیت رکھتی ہے۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ "وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جس بات کا فیصلہ کرتا ہے اس کے لئے بس صرف یہ حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔"

اللہ کا یہ ارادہ جس طرح اس ہونے والی مخلوق کے ساتھ متعلق ہو جاتا ہے' اس کی تفصیلی کیفیت انسانی ادراک اور فہم سے بالا ہے۔ کیونکہ یہ انسانی ادراک کے حیطۂ قدرت ہی سے وراء ہے۔ لہٰذا انسانی ادراک کی قوتوں کو ایسی ناقابل تصور کیفیات کے ادراک میں صرف کر دینا ایک عبث کام ہو گا۔ اور بلا دلیل و برہان اس وادی پر پیچ میں سرگرداں ہونے کے مترادف ہو گا۔

یہاں آکر اہل کتاب کے قول ابنیت پر تبصرہ ہو جاتا ہے۔ ان کے عقائد باطلہ کی تصحیح کے بعد' اب مشرکین کے ان اقوال کو لیا جاتا ہے جو مقام الوہیت کے خلاف ہیں اور جو اہل کتاب کے عقائد و اقوال سے ملتے جلتے ہیں۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ

"نادان کہتے ہیں کہ اللہ خود ہم سے بات کیوں نہیں کرتا یا کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں آتی؟ ایسی ہی باتیں ان سے پہلے لوگ بھی کیا کرتے تھے۔"

"جو لوگ نہیں جانتے" ان سے مراد ان پڑھ لوگ ہیں جو کتاب کے علم سے بے بہرہ ہیں اور وہ بالعموم مشرک تھے۔ ان کے پاس کتاب الٰہی کا کوئی علم نہ تھا۔ ان لوگوں نے بارہا نبی ﷺ سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ آپ انہیں اللہ تعالیٰ سے ہمکلام کرائیں۔ یا ان کے سامنے کوئی معجزہ پیش کریں۔ یہاں ان لوگوں کے اس نامعقول مطالبے کا تذکرہ اس لئے ہوا تاکہ یہ بتایا جا سکے کہ ان سے پہلے کی اقوام یہود و نصاریٰ نے بھی اپنے انبیاء سے ایسے ہی مطالبے کیے تھے۔ قوم موسیٰ علیہ السلام نے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو کھلا دیکھنا چاہتے ہیں۔ نیز انہوں نے مادی خوارق عادات اور معجزات کے مطالبے میں بھی بے حد غلو کیا تھا۔ مقصود یہ ہے کہ یہ مشرکین اور یہودی ایک ہی مزاج اور ایک ہی طرز فکر کے مالک ہیں' اور یہ ایک ہی قسم کی کجروی میں مبتلا ہیں تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ "ان سب کی ذہنیتیں ایک ہی جیسی ہیں۔" لہٰذا یہودیوں کو مشرکین پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ یہ سب طرز فکر' ہٹ دھرمی اور کجروی میں بالکل ہم مشرب ہیں۔ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ "یقین لانے والوں کے لئے تو ہم نشانیاں صاف صاف نمایاں کر چکے ہیں۔"

جس کے دل میں ذوق ایمان ہے' وہ جب آیات الٰہی کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے اپنے ایمان کا مصداق ان آیات میں نظر آتا ہے۔ اور ان آیات میں اس کے ضمیر کے اطمینان کا سامان ہوتا ہے۔ غرض یہ آیات اور نشانیاں کسی کے اندر ایمان نہیں پیدا کر سکتیں بلکہ یہ ایمان

ہے جس کی روشنی میں اللہ کی آیات اور نشانیوں کو سمجھا جاسکتا ہے اور اطمینان حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اور اس طرح انسان کا دل و دماغ پیہم ہدایت حاصل کر سکتے ہیں۔

ان کے اقوال کے اختتام ' ان کے افکار باطلہ کی تردید ' اور ان کے گمراہ کن پروپیگنڈے کے پس پردہ کارفرما مقاصد کی پردہ دری کے بعد اب روئے سخن حضرت نبی کریم ﷺ کی طرف پھر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے فرائض بیان فرماتے ہیں ' آپ کے لئے مقاصد متعین کر دیئے جاتے ہیں اور آپ کو یہ بتایا جاتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور آپ کے درمیان جو معرکہ بپا ہے ' اس کی نوعیت کیا ہے؟ آپ اور ان لوگوں کے درمیان کتنا گہرا اختلاف ہے اور یہ کہ اس اختلاف کو ایک بھاری قیمت ادا کر کے ہی دور کیا جاسکتا ہے جبکہ آپ نہ تو وہ قیمت رکھتے ہیں اور نہ اسے ادا کر سکتے ہیں۔ اور اگر (نعوذ باللہ) ان لوگوں سے اتحاد کرنے کے لئے آپ یہ بھاری قیمت ادا کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں تو آپ اپنے آپ کو غضب الٰہی کا مورد ٹھہرائیں گے۔

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ بِٱلْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۖ وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحَٰبِ
ٱلْجَحِيمِ ﴿١١٩﴾ وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ ٱلْيَهُودُ وَلَا ٱلنَّصَٰرَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۗ
قُلْ إِنَّ هُدَى ٱللَّهِ هُوَ ٱلْهُدَىٰ ۗ وَلَئِنِ ٱتَّبَعْتَ أَهْوَآءَهُم بَعْدَ ٱلَّذِى
جَآءَكَ مِنَ ٱلْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ ٱللَّهِ مِن وَلِىٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿١٢٠﴾ ٱلَّذِينَ
ءَاتَيْنَٰهُمُ ٱلْكِتَٰبَ يَتْلُونَهُۥ حَقَّ تِلَاوَتِهِۦٓ أُو۟لَٰٓئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِۦ ۗ وَمَن ۱۴
يَكْفُرْ بِهِۦ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْخَٰسِرُونَ ﴿١٢١﴾ ع۹
۱۴

"ہم نے تم کو علم حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اب جو لوگ جہنم سے رشتہ جوڑ چکے ہیں ان کی طرف سے تم ذمہ دار و جواب دہ نہیں ہو۔ یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔ صاف صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے۔ ورنہ اگر اس علم کے بعد ' جو تمہارے پاس آچکا ہے ' تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی ' تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لئے نہیں ہے۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے ' وہ اسے اسی طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ وہ اس پر سچے دل سے ایمان لاتے ہیں اور جو اس کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کریں وہی اصل میں نقصان اٹھانے والے ہیں۔"

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ بِٱلْحَقِّ "ہم نے تم کو علم حق کے ساتھ بھیجا ہے۔"

ان کلمات میں اس قدر زور ہے کہ وہ گمراہی پھیلانے والوں کے گمراہ کن شبہات کو ختم کر دیتے ہیں۔ سازشیوں کی سازشوں کی جڑ کاٹ دیتے ہیں اور منافقین کی تلبیس اور تلقین کو ختم کر دیتے ہیں ' نیز ان کلمات کا صوتی زیر و بم بھی حزم و یقین کا مظہر ہے۔ بَشِيرًا وَنَذِيرًا "خوشخبری دینے والا اور ڈرنے والا۔" یعنی پیغام حق پہنچانا اور تبلیغ کرنا آپ کا بنیادی فریضہ ہے ' آپ اطاعت کرنے والوں کو خوشخبری دیں گے اور نافرمانوں کو ڈرائیں گے۔ اس پر آپ کا فریضہ ادا ہو جائے گا۔ وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحَٰبِ ٱلْجَحِيمِ ○ "جو لوگ جہنم سے رشتہ جوڑ چکے ہیں ان کی طرف سے تم ذمہ دار اور جواب دہ نہیں ہو۔" یہ لوگ ایسے ہیں جو اپنی معصیت اور اس کے نتائج

نتائج کی وجہ سے جہنم میں داخل ہوں گے۔

اے پیغمبر! یہود و نصاریٰ ہمیشہ آپ کے خلاف بر سرپیکار رہیں گے' آپ کے خلاف سازشیں کرتے رہیں گے۔ کبھی آپ سے مصالحت نہ کریں گے اور نہ ہی کبھی آپ سے راضی ہوں گے۔ الا یہ کہ آپ اپنے مشن کو چھوڑ دیں' حق کو ترک کر دیں' جو یقین آپ کو حاصل ہے' اسے خیرباد کہہ دیں اور یہ لوگ جس کجروی' شرک اور جاہلی تصورات میں مبتلا ہیں اسے اختیار کرلیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے قریب ہی بیان ہو چکا ہے۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ "یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے۔ جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔"

یہ ہے وہ اصل سبب ان کے انکار حق کا۔ یہ نہیں کہ شاید ان کے سامنے دلیل و برہان پیش کرنے کے معاملے میں کچھ کمی کی گئی ہے۔ نہ اس بات کی کمی ہے کہ وہ آپ کے راہ حق پر ہونے کے سلسلے میں مطمئن نہیں ہیں یا یہ کہ آپ کے پاس جو ہدایات آرہی ہیں وہ اللہ کی جانب سے نہیں آرہی ہیں۔ آپ ان کی طرف جس قدر بھی آگے بڑھیں اور جس قدر بھی آپ ان سے محبت کریں' ان میں سے کوئی چیز بھی آپ سے انہیں راضی نہیں کر سکتی۔ یہ آپ سے صرف اسی صورت میں راضی ہو سکتے ہیں کہ آپ ان کی ملت اور ان کے دین کو اپنا لیں اور جو حق اور صداقت آپ کے پاس ہے اسے چھوڑ دیں۔

یہ نظریۂ حیات ہی ہے جس کے مظاہر' ہر زمان و مکان میں نظر آتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ ہر دور اور ہر زمانے میں جو اسلام اور جماعت مسلمہ کے خلاف بر سرپیکار نظر آتے ہیں' وہ دراصل اسلام کے خلاف ایک نظریاتی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اور یہ نظریاتی جنگ اسلامی بلاک اور ان دو مغربی بلاکوں کے درمیان جاری ہے۔ اگرچہ یہ مغربی بلاک کبھی کبھار ایک دوسرے کے خلاف بھی برسرپیکار ہو جاتے ہیں' لیکن یہ تخاصم ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ ایک ملت کے دو فرقوں کے درمیان ہوتا ہے جبکہ اسلام اور مسلمانوں کے مقابلے میں یہ دونوں فرقے (یہود و نصاریٰ) ہمیشہ متحد رہے ہیں۔

اپنی حقیقت اور اصلیت کے اعتبار سے یہ ایک نظریاتی جنگ ہے' لیکن یہودی اور عیسائی دنیا جو اسلام اور مسلم دشمنی میں غرق ہے' اسے مختلف رنگ دیتی رہتی ہے۔ اور اس کے اوپر مختلف قسم کے جھنڈے لہراتی رہتی ہے۔ اور یہ کام وہ نہایت ہی بدباطنی' مکاری اور فریب دہی کے ساتھ کرتی ہے۔ اس سے قبل مسلمانوں کے خلاف نظریاتی جنگ لڑ کر یہ لوگ مسلمانوں کے اس والہانہ عشق کا تجربہ کر چکے ہیں جو انہیں اپنے دین اور نظریۂ حیات کے ساتھ ہے۔ چنانچہ اسلام کے ان دشمنوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ پلٹا کھاکر' اپنی جدوجہد کا عنوان اور جھنڈا تبدیل کر دیا۔ اب انہوں نے نظریاتی جنگ کا اعلان کئے بغیر ہی اسلام کے خلاف لڑائی شروع کی ہے۔ کیونکہ نظریاتی جنگ میں وہ مسلمانوں کے جذبات اور جوش و خروش سے خائف تھے۔ نیز اب یہ لوگ وطن' اقتصادیات' سیاسیات اور جنگی مراکز کے حصول اور ایسے ہی دوسرے مقاصد کے عنوان سے آگے بڑھے اور بعض غافل اور فریب خوردہ مسلمانوں کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ عقائد اور نظریات کی جنگ اب قصہ پارینہ بن چکی ہے' جس کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔

اب دین و عقیدے کی بنا پر علم جہاد بلند کرنا اور معرکہ آرائی کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ ہے ان متعصب اور بظاہر شکست خوردہ دشمنان اسلام کی خصوصیت۔ اور یہ روش انہوں نے محض اس لئے اختیار کی ہے کہ وہ مسلمانوں کے نظریاتی جوش اور غیظ و غضب سے محفوظ رہیں جبکہ اپنی نیت اور مقاصد کے اعتبار سے کٹر قسم کے صیہونی' اور بین الاقوامی صلیبی (چاہے وہ عالمی کیمونسٹ ہی کیوں نہ ہوں) دراصل یہ سب لوگ اپنی راہ سے اس سنگ گراں (نظریہ اسلامی) کے ہٹانے میں مصروف ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس سے پہلے وہ ایک طویل

عرصے تک اس سے ٹکر لیتے رہے مگر اسلام نے ان سب کو شکست دی۔

غرض یہ ایک نظریاتی جنگ ہے' یہ نہ تو کسی قطعہ ارضی کا جھگڑا ہے' نہ مفادات کا تنازعہ ہے اور نہ جنگی اہمیت کے مقامات پر نزاع ہے۔ زر و زمین کے ان بوگس نعروں اور جھنڈوں کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے' یہ سب تدابیر دشمنان اسلام نے محض اس لئے اختیار کی ہیں تاکہ سادہ لوح مسلمانوں کو اس معرکے کی اصلیت اور اس کے حقیقی اغراض و مقاصد سے بے خبر رکھیں۔ اور ہم ہیں کہ ان کے اس فریب کا شکار ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ان دشمنوں کو ملامت کرنے کی ضرورت نہیں ہے' بلکہ ہمیں چاہئے کہ خود اپنے آپ کو ملامت کریں' کیونکہ ہم نے نبی ﷺ کی سنت' اور اللہ تعالیٰ کی ہدایات کو ترک کر دیا ہے جو اس نے نبی کو امت مسلمہ کی راہنمائی کے لئے دی تھیں جبکہ اللہ تعالیٰ سب سے سچا ہے اور ان کا فرمان صاف صاف یہ ہے۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ "اور یہود و نصاریٰ آپ سے اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک آپ ان کے طریقے پر نہ چلنے لگیں۔"

وہ مسلمانوں سے صرف یہی ایک قیمت مانگتے ہیں۔ اس کے سوا جو کچھ بھی ہو وہ انہیں قبول نہیں ہے۔ لیکن سچی ہدایت اور اٹل فیصلہ یہی ہے قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى "کہہ دیجئے کہ ہدایت بس وہی ہے جس کی طرف اللہ نے راہنمائی فرمائی۔"

ہدایت وہی ہے' ہدایت اس میں محصور اور محدود ہے اور اس کے سوا سرے سے کوئی ہدایت ہے ہی نہیں' لہٰذا اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے صراط مستقیم کے علاوہ کسی راہ پر چل کر کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا اسے اختیار کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس سے کوئی چھٹکارا نہیں ہے۔ ہم اس کے اندر کوئی ترمیم نہیں کر سکتے اور نہ اس میں سے کسی چھوٹی یا بڑی چیز کے بارے میں کوئی سودا بازی کر سکتے ہیں۔ یہ ہدایت پوری کی پوری قبول کرنی ہو گی جو چاہے قبول کرے' اور جو چاہے انکار کر دے' لیکن خبردار کہ ان کے ایمان و ہدایت کی خواہش یا ان کی محبت اور دوستی تمہیں کہیں اس راہ حق سے اور صراط مستقیم سے ہٹا نہ دے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ "اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آ چکا ہے تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لئے نہیں ہے۔" کیسی خوفناک تہدید ہے؟ کیا اٹل فیصلہ ہے اور کتنی سخت وعید ہے؟ اور ہے کس کے حق میں؟ سرتاج انبیاء اور محبوب کبریا حضرت نبی ﷺ کے حق میں!

مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت جس کے سوا کوئی ہدایت نہیں ہے' اس سے تم صرف اس وجہ سے ہٹ سکتے ہو کہ تم ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی شروع کر دو ورنہ اس کے سوا اسے ترک کرنے کی کوئی وجہ' یعنی دلیل و برہان کی کمی یا کمزوری' نہیں ہے۔

اہل کتاب میں سے جو لوگ خواہشات نفسانیہ سے پاک ہو جاتے ہیں' وہ بھی اپنی کتاب کو اس طرح پڑھتے ہیں جس طرح اس کے پڑھنے کا حق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس سچائی پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ کے پاس ہے اور جو لوگ اس سچائی کا انکار کریں گے وہی گھاٹے میں رہیں گے نہ آپ ر خسارے میں ہیں اور نہ مؤمنین۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ "جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہوتا ہے۔ وہ اس پر سچے دل سے ایمان لاتے ہیں اور جو اس کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کریں وہی اصل میں نقصان اٹھانے والے ہیں۔"

کیونکہ وہ ایمان سے محروم ہو گئے ہیں اور ایمان اس پوری کائنات میں اللہ کی جملہ نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے۔ لہٰذا ایمان

کے خسارے سے بڑا خسارہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس فیصلہ کن اور زوردار تقریر کے بعد روئے سخن بنی اسرائیل کی طرف پھر جاتا ہے۔ گویا اس طویل مقابلے اور مجادلے کے بعد اور اللہ اور اس کے نبیوں کے ساتھ ان کے طرز عمل کی طویل تاریخ کے دہرانے کے بعد انہیں آخری بار متوجہ کیا جاتا ہے۔ انہیں چھوڑ کر حضرت نبی ﷺ اور مومنین کو خطاب کرنے کے بعد اب یہاں دوبارہ انہیں آخری بار دعوت دی جاتی ہے۔ دراں حالیکہ وہ امانت الٰہی یعنی اسلامی نظریۂ حیات کی حفاظت کے شرف سے حد درجہ غافل اور بے پروا ہو چکے ہیں۔ حالانکہ یہ شرف اور ذمہ داری انہیں ازمنہ قدیم سے حاصل چلی آرہی تھی۔ غرض اس تقریر کے آخری حصے میں بھی لوگوں کو وہی دعوت دی جاتی ہے جو اس کے آغاز میں انہیں دی گئی تھی۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ
فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۲۲ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا
وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۱۲۳

"اے بنی اسرائیل یاد کرو میری وہ نعمت جس سے میں نے تمہیں نوازا تھا اور یہ کہ میں نے تمہیں دنیا کی تمام قوموں پر فضیلت دی تھی اور ڈرو اس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا نہ کسی کا فدیہ قبول کیا جائے گا نہ کوئی سفارش کسی آدمی کو فائدہ دے گی اور نہ مجرموں کو کہیں سے کوئی مدد پہنچ سکے گی۔"

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

# درس ۷ ایک نظر میں

اب یہاں سے وہ حالات بیان کئے جا رہے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی پہلے کے دور سے متعلق ہیں یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے کو جس طرح بیان کیا جا رہا ہے اس سیاق کلام میں اس کی اہمیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ مدینہ طیبہ میں اسلامی جماعت اور یہودیوں کے درمیان جو مختلف النوع اختلافات پائے جاتے تھے' ان پر روشنی ڈالنے کی لئے یہ قصہ بے حد اہم تھا۔

کیونکہ اہل کتاب حضرت اسحاق علیہ السلام کے واسطہ سے اپنی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے تھے اور اپنی اس نسبت اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے بعد اولاد ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ترقی اور برکت کا وعدہ کرنے پر فخر کرتے تھے۔ اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ ہدایت اور صحیح دین پر قائم رہنا گویا ان کی اجارہ داری ہے۔ جیسا کہ وہ اپنے آپ کو جنت کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں چاہے ان کا عمل جیسا بھی ہو۔

اہل قریش بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے واسطے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد تھے۔ اور اپنی اس نسبت پر فخر کرتے تھے اور انہوں نے بیت اللہ کی نگرانی اور مسجد حرام کی تعمیر کے مناصب حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے ورثے میں پائے تھے اور پورے عرب پر دینی سیادت اور فضل و شرف کے رتبے بھی انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے ورثے میں پائے تھے۔

اس سے قبل جنت کے بارے میں یہود و نصاریٰ کے دعاوی پر کلام کرتے ہوئے یہاں تک کہا گیا تھا۔ "وہ کہتے ہیں کہ جنت میں صرف وہی شخص داخل ہو گا' جو یہودی ہو یا عیسائی ہو۔" اور دوسری جگہ ان کا یہ قول نقل کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کو یہودی یا عیسائی بنانے کی سعی کرتے ہوئے کہتے ہیں! "تم یہودی بن جاؤ یا عیسائی تاکہ ہدایت پاؤ۔" نیز یہ بھی بتایا گیا کہ ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو لوگوں کو اللہ کی مساجد میں ذکر الٰہی سے روکتے ہیں اور مساجد کو خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہاں ہم نے یہ کہا تھا کہ یہ باتیں واقعہ تحویل سے متعلق ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ اس موقع پر یہودیوں نے اسلامی جماعت کے خلاف مسموم پروپیگنڈہ شروع کر دیا تھا۔

اب یہاں حضرت ابراہیم حضرت اسحاق و حضرت اسماعیل علیہم السلام اور بیت اللہ' اس کی تعمیر اور اس سے متعلق اسلامی شعائر کی بابت بات کی جا رہی ہے کیونکہ یہی مناسب موقع ہے۔ تاکہ انبیاء کرام کے شجرہ نسب اور باہمی تعلق کے بارے میں یہودیوں' عیسائیوں اور مشرکین کے بے بنیاد دعوؤں کے بارے میں صحیح حقائق لوگوں کے ذہن نشین ہو جائیں اور مسلمانوں کو جس قبلے کی طرف مڑنا ہے اس کے مسئلے کا بھی فیصلہ ہو جائے۔ نیز اس موقع پر دین ابراہیم علیہ السلام یعنی خالص توحید کی وضاحت بھی کر دی جاتی ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین نے جو من گھڑت عقائد اور بے راہ روی اختیار کی ہوئی ہے' اس کا اسلام کے عقیدۂ توحید کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ اس کے برعکس حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت اسماعیل علیہ السلام' حضرت اسحٰق علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام (اسرائیل جس کی طرف سے یہ لوگ نسبت کرتے ہیں) اور مسلمانوں کے عقائد اور آخری دین میں کوئی فرق نہیں ہے۔ نیز یہ بھی بتایا گیا کہ اللہ کا دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور وہی دین تمام انبیاء اور رسل کا مشن رہا ہے اور وہ کسی قوم یا کسی نسل کے ساتھ مخصوص نہیں ہے نہ اس پر کسی کی اجارہ داری ہے۔ یہ تو ایک عقیدہ ہے جو دل مومن کی دولت ہے۔ اندھی عصبیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی میراث ہے جو خون اور نسل کے رشتوں پر تقسیم نہیں ہوتی بلکہ ایمان اور عقائد کے رشتے پر قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی اس دین کو قبول کرے اور اس

کی نگہبانی کرے' وہ جس نسل سے متعلق ہے اور جس قوم کا فرد ہو' وہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔ یعنی اپنے حقیقی بھائیوں اور صلبی اولاد سے بھی زیادہ۔ کیونکہ یہ اللہ کا دین ہے اور اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان کوئی نسبی یا کوئی اور رشتے کا تعلق نہیں ہے۔

یہ حقائق جو اسلامی تصور حیات کے اساسی خطوط کا ایک اہم حصہ ہیں۔ قرآن کریم یہاں انہیں بڑے عجیب طرز ادا میں نہایت واضح کر کے بیان کرتا ہے۔ فصیح و بلیغ انداز بیان کے علاوہ سیاق کلام یہاں غایت درجہ مربوط ہے۔ پہلے بیان کیا جاتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا اور وہ اس آزمائش میں پورے اترے اور اس کے نتیجے میں انہیں امامت عالم کے لئے چن لیا گیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کو تعمیر کیا۔ تعمیر بیت اللہ کے موقع پر جو دعا مانگی اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا اور امت مسلمہ کو برپا کیا گیا۔ اس لئے امت مسلمہ اس ورثے کی جائز وارث بن گئی اور اولاد ابراہیم علیہ السلام سے یہ اعزاز چھین لیا گیا۔ کیونکہ نظریاتی ورثے کے مستحق صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو رسالت پر پختہ ایمان رکھتے ہیں اور اچھی طرح سے اسے روبہ عمل لاتے ہیں اور رسالت کا صحیح تصور قائم رکھتے ہیں۔ یہی ہے علت نظریاتی میراث کی۔

ان تاریخی حقائق کے بیان کے درمیان' طرز ادا سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اپنے مفہوم کے اعتبار سے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے' سلسلہ رسل کی ابتدا میں بھی پیغام اول تھا' اور اس سلسلے کو اختتام پر بھی یہی اسلام رسولوں کا مشن تھا۔ یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نظریہ تھا اور آپ کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام' حضرت اسحاق علیہ السلام اور دوسری رسالتوں اور تحریکات حقہ کا عقیدہ تھا۔ ان حضرات نے اس امانت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سپرد کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ وراثت آخر کار امت مسلمہ تک آپہنچی۔ اس عقیدے اور اس نظریے پر جو بھی ثابت قدم ہو گا وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا روحانی وارث ہو گا۔ اور وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کئے ہوئے وعدوں کا حقدار اور ان کی دی ہوئی بشارتوں کا مصداق ہو گا۔ اور جس شخص نے اسلام سے روگردانی کی اور اپنے نفس کو ملت ابراہیمی سے دور رکھا' تو گویا وہ اللہ کے عہد کا مستحق نہ رہا اور اس نے اپنے آپ کو اس حق وفا سے محروم کر دیا اور ان بشارتوں کا مصداق نہ رہا۔

یہاں آکر یہود و نصاریٰ کے وہ تمام دعوے اپنی اساس کھو دیتے ہیں کہ وہ چیدہ اور برگزیدہ قوم ہیں۔ محض اس لئے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے پڑپوتے ہیں' اور ان کے خلیفہ ہیں۔ اس لئے کہ جب سے انہوں نے عقیدۂ توحید کو خیرباد کہا تب سے وہ وراثت ابراہیمی سے محروم ٹھہرے۔

اور اس مقام پر قبیلہ قریش کے یہ دعوے بھی منہدم ہو جاتے ہیں کہ وہ بیت اللہ کی تولیت اور دیکھ بھال اور تعمیر کے حقدار ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اس مقام مقدس کے بانی اول کی روحانی میراث سے انحراف اختیار کر لیا۔ اسی طرح یہودیوں کا یہ دعویٰ بھی منہدم ہو جاتا ہے کہ وہ بیت المقدس کے اصحاب قبلہ ہیں اور مسلمانوں کے لئے بھی مناسب یہی ہے کہ وہ بدستور بیت المقدس کو قبلہ بنائے رکھیں۔ اس لئے کہ خانہ کعبہ ان کا بھی قبلہ ہے اور ان کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی قبلہ تھا۔

ان تمام امور کو ایک حسین و جمیل پیرائے میں ادا کیا گیا جس کے اندر بے شمار واضح اشارات موجود ہیں اور جس کے اندر ایسے مواقف اور مقامات غور و فکر بھی ہیں جن کے اندر نہایت ہی دقیق مفاہیم پوشیدہ ہیں اور ایسی توضیحات ہیں جو نہایت پر اثر ہیں۔ اب ہم اس فصیح و بلیغ انداز کلام پر' درج بالا اشارات کی روشنی میں تفصیلی بات کریں گے۔

☆ ☆ ☆

# درس ۷ تشریح آیات (۱۲۴ تا ۱۴۱)

وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ۝

"یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا تو اس نے کہا "میں تجھے لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔" ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا "اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟ اس نے جواب دیا "میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔"

خطاب حضور ﷺ سے ہے۔ ذرا روئیداد ابتلائے ابراہیم علیہ السلام یاد کرو۔ آپ کو کچھ احکام دیئے گئے۔ آپ پر کچھ بندشیں عائد کی گئیں اور آپ نے پوری وفا کیشی سے ان اوامر و نواہی پر عمل کیا۔ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفا کیشی کو سراہتے ہوئے فرمایا وَ اِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤى "اور ابراہیم علیہ السلام جنہوں نے احکام پورے کئے۔" یہ وہ بلند و بالا مقام ہے جس تک حضرت ابراہیم علیہ السلام پہنچے۔ اس مقام تک جہاں اللہ تعالیٰ خود بندے کی وفاداری اور اطاعت شعاری کی شہادت دیتا ہے جبکہ بحیثیت انسان ایک ضعیف اور پر تقصیر مخلوق ہے اور اس کے لئے وفائےعین پوری اطاعت ممکن نہیں ہے۔

اور اس مقام تک رسائی حاصل کرنے ہی کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سعادت اور اس اعتماد کے مستحق ہوئے قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا "میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔" ایسا پیشوا جو لوگوں کا قبلہ و کعبہ ہو۔ جو انہیں اللہ تک پہنچانے والا ہو' جو بھلائی کے کام میں سب سے پہلے ہو' اور لوگ ان سے پیچھے ہوں اور وہ ان کا محبوب قائد ہو۔

یہاں آکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات سے انسانی فطرت نمودار ہوتی ہے۔ انسان کے اندر یہ فطری داعیہ موجود ہوتا ہے کہ اس کا تسلسل بذریعہ اولاد جاری رہے۔ یہ ایک گہرا فطری اور نفسیاتی شعور ہوتا ہے' جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کی گہرائیوں میں ودیعت کیا ہوا ہے۔ اور اس کی حکمت یہ ہے کہ زندگی کی ترقی جاری رہے اور انسانی زندگی ان خطوط پر آگے بڑھتی رہے جو خالق نے اس کے لئے وضع کئے ہیں۔ اور جن ترقیات کا آغاز اگلوں نے کیا ہوتا ہے' آنے والے اسے مزید آگے بڑھائیں اور تمام نسلوں کے اندر یہ ہم آہنگی قائم رہے۔ یہ شعور جسے بعض لوگ توڑنا چاہتے ہیں اور ختم کرنا چاہتے ہیں' حالانکہ وہ انسان کی عین فطرت کے اندر مرکوز ہے۔ اور اس کی حکمت یہ ہے کہ انسان بعض دور رس مقاصد پورے کر سکے۔ اسی جذبے اور شعور کے تحت اسلام نے قانون میراث کے لئے تفصیلی قواعد وضع کئے ہیں تاکہ اولاد و احفاد کی بھلائی کے لئے انسان اپنی سعی جاری رکھے اور تیز تر کر دے۔ آج اس فطری شعور کو منہدم کرنے کے لئے دنیا میں جو سعی نامشکور ہو رہی ہے دراصل فطرت انسانی کی تباہی کا سامان ہے۔ انسان کی اجتماعی زندگی میں بے شک بعض مفاسد پائے جاتے ہیں لیکن ان مفاسد کو ختم کرنے کے لئے خود فطرت انسانی اور انسان کی شخصیت ہی کو تباہ کر دینا ایک نہایت ہی بھونڈا' کوتاہ اندیشانہ اور غیر فطری طریق علاج ہے اور ان اجتماعی مفاسد کا ہر وہ علاج جو خلاف فطرت طریقے سے کیا گیا ہو کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کبھی بھی مفید نہیں ہو گا اور قطعاً دیرپا نہیں ہو سکتا۔ ایسے علاج موجود ہیں جو ان مفاسد کو تو ختم کر دیں گے لیکن وہ فطرت انسانی سے

بھی متصادم نہ ہوں گے۔ لیکن ایسے طریقے پانے کے لئے ایمان و ہدایت کی ضرورت اور اس بات کی ضرورت ہے کہ معالج کو فطرت انسانی کا مکمل اور گہرا شعور ہو۔ اور اس کی فکر انسان کی طبعی تخلیق سے بھی آگے گہرائیوں تک پہنچی ہوئی ہو اور یہ فکر اور یہ جذبہ اصلاح طبقاتی بغض و عداوت سے پاک ہو' اس لئے کہ ان طبقاتی جذبات کی وجہ سے بجائے اس کے کہ انسان کی کوئی ہمہ گیر اصلاح ہو' انسان ہمہ گیر تباہی سے دوچار ہو جاتا ہے' تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا قَالَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ "اور کہا کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟"

اس سوال کا جواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پروردگار کی طرف سے آتا ہے جس نے انہیں آزمایا اور پھر چن لیا تھا۔ یہ جواب اس اہم اصول کی بنیاد رکھ دیتا ہے جس کا تذکرہ ہم کر آئے ہیں۔ یہ کہ امامت و قیادت ان لوگوں کا حق ہے جو اپنے شعور اور طرز عمل اور اپنی صلاحیت اور ایمان سے اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کر دیں۔ یہ کوئی نسلی اور موروثی منصب نہیں ہے کہ باپ سے بیٹے کی طرف منتقل ہوتا چلا آئے۔ یہاں رشتہ و تعلق' خون' نسل اور قومیت پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ یہاں دین و ایمان کے رشتے مدار تعلق ہوتے ہیں اور منصب و قیادت کے معاملے میں خونی' نسلی اور قومی نعرے دعوائے جاہلیت کے زمرے میں آتے ہیں' جو حیات انسانی کے بارے میں صحیح انسانی نقطہ نظر کے ساتھ صریحاً متصادم ہوتے ہیں۔

قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِيْنَ "کہا میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔"

ظلم کی بھی کئی قسمیں اور کئی رنگ ہیں۔ نفس انسانی کا شرک کرنا بھی ایک طرح کا ظلم ہے۔ لوگوں کی جانب سے اللہ کی نافرمانی بھی ایک ظلم ہے۔ ظالموں پر یہاں جس امانت کو ممنوع قرار دیا گیا ہے' اس سے عمومی امامت مراد ہے' جو امامت کی تمام اقسام پر مشتمل ہے۔ امامت رسالت' امامت خلافت' امامت صلوٰۃ اور ان کے علاوہ بھی امامت و قیادت کے تمام مناصب شامل ہیں۔ لہذا عدل و انصاف' اپنے وسیع معنوں میں' ہر قسم کی امامت کے استحقاق کے لئے پہلی شرط ہے۔ اور کوئی شخص کسی قسم کے ظلم کا ارتکاب بھی کرے' وہ اپنے آپ کو امامت و قیادت کے استحقاق سے محروم کر دیتا ہے' چاہے وہ قیادت جیسی بھی ہو۔

یہ جو کچھ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا گیا اور یہ عہد جس کے الفاظ میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیتا ہے کہ یہودی ہمیشہ منصب قیادت سے دور اور محروم رہیں گے۔ کیونکہ انہوں نے ظلم کا ارتکاب کیا' فسق و فجور میں مبتلا ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی' اور انہوں نے اپنے جد امجد کے عقائد و نظریات کو ترک کر دیا۔

نیز جو کچھ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا اور یہ عہد جس کے الفاظ میں کوئی کجی اور کوئی غموض نہیں ہے' ان لوگوں کو بھی قطعی طور پر منصب امامت سے محروم کر دیتا ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہیں' انہوں نے بھی ظلم کا ارتکاب کیا ہے' فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے دور بھٹک گئے ہیں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی شریعت کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ وہ دعویٰ تو اسلام کا کرتے ہیں حالانکہ انہوں نے اپنی پوری زندگی سے اللہ تعالیٰ کی شریعت اور ان کے نظام حیات کو باہر نکال دیا ہے۔ ان لوگوں کا دعوائے اسلام محض جھوٹا دعویٰ ہے' جو دراصل اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کی اساس محکم پر استوار نہیں ہے۔

اسلامی تصور حیات ان تمام رشتوں اور تعلقات کی جڑ کاٹ دیتا ہے جو کسی فکر و نظریا وحدت عمل کی اساس پر قائم نہیں ہوتے۔ وہ صرف ایسے رشتوں اور تعلقات کو تسلیم کرتا ہے جو وحدت نظریہ اور عمل کی اساس پر قائم ہوں۔ اس کے علاوہ جو روابط بھی ہوں اسلام کی نظر میں ان کی کوئی وقعت نہیں ہے بلکہ اسلام ایک ہی امت کی ان دو نسلوں میں بھی تفریق کر دیتا ہے جب کہ ایک نسل اپنے عقیدے اور نظریہ میں دوسری کی مخالف ہو جائے۔ بلکہ اگر عقیدے کا تعلق ٹوٹ جائے تو اسلام باپ بیٹے اور میاں بیوی کے درمیان بھی جدائی کر دیتا ہے۔ غرض حالت شرک کی عرب دنیا اور حالت اسلام کی عرب دنیا میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان دونوں کے درمیان اسلامی نقطہ نظر سے

کوئی تعلق نہیں' کوئی ربط اور کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ ایمان لائے وہ ایک امت ہیں اور جن لوگوں نے حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے دین کو ترک کیا اور ایک دوسری امت ہیں۔ ان دونوں کے درمیان بھی کوئی تعلق' کوئی رابطہ اور کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یہاں خاندان کی تشکیل باپ دادا' پوتوں کے تعلق سے نہیں ہوتی بلکہ یہاں وہ لوگ افراد خاندان ہوتے ہیں جو ایک عقیدے اور نظریے پر جمع ہو جائیں۔

اسلامی نقطہ نظر سے کسی امت کی تشکیل بھی نسلی بنیادوں پر نہیں ہوتی بلکہ امت کی تشکیل اہل ایمان سے ہوتی ہے۔ خواہ ان کے رنگ' ان کی نسل اور ان کے وطن مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ غرض یہ ہے اسلامی تصور حیات جس کے چشمے کتاب الٰہی کے اس ربانی انداز بیان سے پھوٹتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆ وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴿١٢٥﴾

"اور یہ کہ ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لئے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ابراہیم ؑ جہاں عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہے اس مقام کو مستقل جائے نماز بنا لو اور ابراہیم ؑ اور اسماعیل ؑ کو تاکید کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔" (۲-۱۲۵)

یہی گھر ہے خدا کا کہ آج جس کے مجاور اہل قریش' اہل ایمان کو خوفزدہ کر رہے ہیں' انہیں طرح طرح کی اذیت دے رہے ہیں' انہوں نے محض دین و ایمان کے جرم میں ان پر طرح طرح کے مصائب ڈھائے' یہاں تک کہ وہ اس گھر کے پڑوس اور اس کی برکات کو چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ حالانکہ اس گھر کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ تھا کہ یہ مرکز عوام ہو گا اور تمام لوگ ہر طرف سے اس کا رخ کریں گے۔ یہاں کوئی انہیں خوفزدہ کرنے والا نہ ہو گا۔ یہاں انہیں روحانی اور جسمانی امن و طمانیت حاصل ہو گی۔ کیونکہ یہ گھر بذات خود مجسمہ امن منبع طمانیت اور جائے سلامت ہے۔

لوگوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ حضرت ابراہیم ؑ کے مقام عبادت یعنی خانہ کعبہ کو (مقام ابراہیم ؑ سے میری رائے اور ترجیح کے مطابق پورا خانہ کعبہ مراد ہے) جائے نماز اور مقام عبادت قرار دیں۔ اس لئے یہ بات اب بالکل منطقی ہے کہ یہی گھر اہل اسلام کا بھی قبلہ ہو۔ اور اس پر کسی کا کوئی اعتراض جائز نہیں ہے۔ مسلمانوں کے لئے یہی مناسب قبلہ ہے کیونکہ ایمان اور توحید کی نسبت سے صرف مسلمان ہی حضرت ابراہیم ؑ کی ملت ہیں اور اس کے وارث ہیں۔ اور خانہ کعبہ صرف اللہ کا گھر ہے۔ کسی انسان کا گھر نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ جو اس کا مالک ہے' اس نے اپنے نیک بندوں میں سے دو حضرات حضرت ابراہیم ؑ اور حضرت اسماعیل ؑ کو یہ فریضہ سپرد کیا تھا' کہ وہ اسے ان لوگوں کے لئے پاک و صاف اور تیار رکھیں جو یہاں رکوع و سجود کی غرض سے آئیں گے اور یا جو لوگ مقام امن کی تلاش میں یہاں پناہ لیں گے' یا حج و زیارت کی غرض سے یہاں آئیں گے۔ یا وہ لوگ جو یہاں مقیم ہیں اور اس گھر میں اعتکاف کرتے ہیں یا جو باہر سے بغرض عبادت یہاں پہنچتے ہیں' یہاں تک کہ یہ گھر خود حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی ملکیت بھی نہ تھا۔ تاکہ موروثی

طور پر یہ حقوق قریش کو حاصل ہو جاتے۔ قریش تو محض اللہ تعالیٰ کے اذن اور حکم سے اس کے مجاور اور خادم مقرر ہوئے تھے کہ وہ اسے یہاں آنے والے اہل ایمان کے لئے تیار رکھیں۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۱۲۶﴾

"اور یہ کہ ابراہیم ؑ نے کہا! اے میرے رب' اس شہر کو امن کا شہر بنا اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں' انہیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔" جواب میں اس کے رب نے فرمایا! "اور جو نہ مانے گا دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اسے بھی دوں گا مگر آخر کار اسے جہنم کی طرف گھسیٹوں گا اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔" (۲-۱۲۶)

حضرت ابراہیم ؑ کی یہ دعا ایک بار پھر اس بات کی تائید کرتی ہے کہ اللہ کا یہ گھر بیت الامن ہے۔ اور ایک بار پھر یہاں اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ اسلام میں وراثت دنیابت کا مدار اخلاقی فضیلت اور نیکی پر ہے۔ اس سے پہلی آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو ہدایت دی گئی تھی کہ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ "میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔"

تو اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام خوب سمجھ گئے تھے کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے دعائے رزق میں مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ "جو اللہ اور آخرت کو مانیں" کہہ کر از خود غلط لوگوں کو مستثنیٰ کر دیا تھا۔ اس لئے کہ وہ سنت الٰہی اور منشائے الٰہی کو خوب سمجھ گئے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نہایت ہی حلیم الطبع اور خدا ترس پیغمبر تھے۔ وہ نہایت ہی یکسو اور راہ مستقیم پر گامزن رہنے والے تھے۔ وہ فوراً وہ طرز عمل اختیار کر لیتے تھے جس کا انہیں حکم دیا جاتا تھا۔ اور آپ ہر دعا و درخواست میں بھی منشائے الٰہی کو ملحوظ رکھتے تھے۔ تو اس مقام پر اللہ میاں ان کی دعا کا جواب یوں دیتے ہیں کہ جن لوگوں کے بارے میں آپ خاموش ہو گئے تھے۔ یعنی اہل کفر اور اہل جہنم ان کے بارے میں بھی کہہ دیا جاتا ہے وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ

"اور جس نے کفر اختیار کیا تو دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اسے بھی دوں گا مگر آخر کار اسے عذاب جہنم کی طرف گھسیٹوں گا اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا

۱۵
ع۸
۱۵

مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

"اور یاد کرو ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے' تو یہ دعا کرتے جاتے تھے!" "اے ہمارے رب! ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب' ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا' ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا' جو تیری مسلم ہو۔ ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا' اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما' تو بڑا معاف کرنے والا' رحیم فرمانے والا ہے۔ اور اے رب! ان لوگوں میں خود ان کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو' جو انہیں تیری آیات سنائے۔" "ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔"

ذرا انداز کلام ملاحظہ ہو! کلام کا آغاز حکایتی ہے۔ ایک قصے کا آغاز یوں ہوتا ہے۔ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيْلُ ۖ "اور یاد کرو کہ جب ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔"

اب قاری انتظار میں ہے کہ یہ حکایت آگے بڑھے گی' لیکن اچانک ہمارے تصور کے اسکرین پر ایسا منظر آتا ہے کہ گویا حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اس پر سامنے آتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ گویا تصور نہیں بلکہ ہم اپنی آنکھوں سے ان حضرات کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے حاضر ہیں اور قریب ہے کہ ہم ان حضرات کی یہ رقت آمیز دعا اپنے کانوں سے سن لیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

"اے ہمارے رب' ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے رب' ہم دونوں کو اپنا مسلم بنا' ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو' ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما' تو بڑا درگزر فرمانے والا' رحم فرمانے والا ہے۔

زمزمہ دعا' نغمہ التجا اور طلب دعا کی یہ عجیب فضا بالکل آنکھوں کے سامنے ہے' گویا یہ سب کچھ اسی وقت ہو رہا ہے۔ ایک زندہ اور متحرک منظر سامنے ہے جس کے کردار مشخص کھڑے ہیں۔ حسین وجمیل تعبیر اور انداز گفتگو قرآن مجید کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت ہے۔ قرآن مجید ازمنہ سابقہ کے کسی بھی منظر کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ وہ بالکل اسکرین پر چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ زندگی سے بھرپور' متحرک اور مشخص تصویر کشی اور منظر نگاری کی یہ ایسی خصوصیت ہے جو اللہ کی اس دائمی کتاب ہی کو زیب دیتی ہے اور ہے بھی معجزانہ۔

اور اس دعا کے اندر کیا ہے؟ نبوت کی نیازمندانہ ادا' نبوت کا پختہ یقین اور اس کائنات میں نظریہ اور عقیدے کا پیغمبرانہ شعور۔ یہی ادا اور یہی یقین اور یہی شعور اللہ تعالیٰ وارثان انبیاء کو سکھانا چاہتے ہیں۔ قرآن مجید کی یہ کوشش ہے کہ اس القاء کے ذریعہ یہ شعور وارثان انبیاء کے دل ودماغ میں عمیق تر ہو جائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ O "اے ہمارے رب' ہم سے قبول فرما' بے شک آپ ہی سننے والے ہیں اور جاننے والے ہیں۔" یہ دعائے اجابت ہے۔ اور یہی منتہائے مراد ہے۔ اس لئے کہ یہ عمل خالص اللہ کے لئے ہے۔ خشوع خضوع کے ساتھ۔ اس کے ذریعہ وہ دونوں اللہ کی جانب متوجہ ہوں۔ اور اس سب کارروائی اور عمل کے پیچھے صرف رضائے الٰہی اور مقبولیت دعا

کا جذبہ کار فرما ہے۔ اور امید کی کرن یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس پکار کے پیچھے جو جذبہ کار فرما ہوتا ہے اور پکارنے والے کا جو شعور ہوتا ہے وہ بھی اس کے علم میں ہوتا ہے۔

رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۖ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ "اے ہمارے رب ہم دونوں کو اپنا مطیع فرمان بنا' ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مطیع ہو۔ ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما' بے شک تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔" (۲-۱۲۸)

یہ اس معاونت کی امید ہے جو یہ دونوں اسلام کی طرف ہدایت پانے کے سلسلے میں اللہ سے رکھتے تھے۔ ان کے دلوں میں یہ پختہ شعور تھا کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں ہیں' یہ کہ ہدایت صرف اس کی ہدایت ہے۔ اس کی معاونت و توفیق کے بغیر کوئی نہیں جو ہدایت پا سکے۔ اس لئے وہ دونوں ہمہ تن اللہ کی طرف متوجہ اور اس کی طرف راغب اور مائل ہیں اور اللہ تو بہترین مددگار ہے۔

امت مسلمہ کا یہ مزاج ہے کہ وہ باہم معاون و مددگار ہوتی ہے۔ اس کے افراد نسلاً بعد نسل نظریاتی طور پر باہم پیوست ہوتے ہیں' اس لئے دعا کی جاتی ہے' وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ 'اور ہماری نسل سے بھی تیری مسلم امت پیدا ہو۔"

یہ ایک ایسی دعا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل مومن کی پہلی تمنا کیا ہوتی ہے۔ عقیدہ اور نظریہ ہی ایک مومن کا محبوب' مشغلہ ہوتا ہے۔ وہ اس کی پہلی ترجیح ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے سامنے اس دولت کی اہمیت واضح تھی جو انہیں دی گئی تھی یعنی دولت ایمان اور ثروت عقیدہ۔ یہ اہمیت اور خواہش انہیں مجبور کرتی ہے کہ وہ آنے والی نسلوں کے لئے بھی اس دولت کے بارے میں التجا کریں۔ اس لئے وہ اپنے رب سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان کی اولاد کو بھی اس دولت ثروت سے محروم نہ رکھیں جس کی قدر و قیمت کے برابر کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ اس سے قبل انہوں نے دعا کی تھی کہ وہ ان کی اولاد کو وسائل رزق فراوانی سے دیں۔ اس لئے انہوں نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ ان کی اولاد دولت ایمان سے بھی محروم نہ ہو۔ انہوں نے یہ دعا بھی کی کہ وہ ان کی اولاد کو تعلیم مناسک بھی دے۔ ان کو طریقۂ عبادت بھی سکھائے' ان کی مغفرت کرنے والا غفور الرحیم ہے۔

اس کے بعد وہ مزید التجا کرتے ہیں کہ ازمنہ بعیدہ میں بھی وہ ان کی ہدایت کے لئے مستقل بندوبست فرمائیں۔

وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ "اے اللہ! ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک رسول مبعوث فرما جو تیری آیات کی تلاوت کرے' ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیوں کو پاک کر دے۔ بے شک تو غالب و حکیم ہے۔"

حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی اس دعا کی قبولیت کے نتیجے میں اب اس رسول کریم کی بعثت ہوئی ہے اور کئی صدیاں گزرنے کے بعد' اور آپ کی بعثت حضرت ابراہیم ﷺ و اسماعیل ﷺ کی اولاد میں سے ہوئی جو اب انہیں آیات سناتے ہیں' انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور انہیں ہر قسم کی گندگیوں اور آلودگیوں سے پاک کرتے ہیں۔ اللہ کے ہاں مخلصانہ دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے لیکن وہ اپنے اس وقت میں ظاہر ہوتی ہے' جو اللہ تعالیٰ کی حکمت نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہوتا ہے۔ عام لوگوں کی عادت یہ ہے کہ وہ جلد بازی کرتے ہیں اور جو لوگ منزل مراد نہیں پاتے وہ مایوس و پریشان ہوتے ہیں۔

سورۂ بقرہ کی اس دعا کے نزول کے وقت مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک ہمہ گیر کشمکش جاری تھی' ان حالات میں اس دعا کے اندر بعض اشارات بھی پنہاں ہیں اور اس کی خاص اہمیت ہے۔ یہ کہ حضرت ابراہیم و اسماعیل جن کو اس گھر کی تعمیر و تطہیر اور عبادت گزاروں' زیارت کنندگان اور وہاں ٹھہرنے والوں کے لئے سہولیات فراہم کرنے کا حکم دیا گیا تھا' وہ دونوں موجودہ مجاوروں یعنی قریش کے

آباؤ اجداد جن کے ہاتھ میں آج خانہ کعبہ کا انتظام ہے۔ اور ان کا واضح فرمان ہے "ہمیں اپنا مطیع فرمان بنا" اور "ہماری اولاد سے بھی ایک امت مسلمہ اٹھا" جس طرح انہوں نے یہ بھی کہا "اے ہمارے رب ان میں خود انہی سے ایک رسول مبعوث فرما' جو انہیں آیات پڑھ کر سنائے' انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیوں کو پاکیزہ بنادے۔" گویا حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی اپنی اس دعا سے اس بات کا تقرر کرتے ہیں کہ امت مسلمہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی جانشین و خلیفہ ہے۔ اور اس بات کی حق دار ہے کہ اب خانہ کعبہ کا انتظام اس کے ہاتھ میں ہو۔ گویا خانہ کعبہ امت مسلمہ کا مرکز ہے۔ اور مشرکین کے مقابلہ میں یہ امت "اس خانہ خدا کے انتظام و انصرام کی زیادہ حقدار ہے اور یہ کہ یہ یہود و نصاریٰ کے قبیلوں کے مقابلے میں اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ امت مسلمہ کا اپنا قبلہ ہو۔

جو لوگ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہدایات پر ہیں اور اپنے دین کا جوڑ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ملت ابراہیمی کے وارث و جانشین ہیں اور قریش کے جو لوگ اپنا نسب نامہ حضرت اسماعیل سے ملاتے ہیں انہیں کان کھول کر سن لینا چاہئے کہ حضرت ابراہیم ﷺ نے جب اپنی اولاد کی نسبت سے اس جانشینی اور امامت و سلطنت کا سوال کیا تھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب یہ تھا۔

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ "میرا وعدہ ظالموں کی بابت نہیں ہے۔"

اور اس کے بعد جب ابراہیم علیہ السلام نے اہل مکہ کے لئے برکت و فراوانی رزق کی استدعا کی تو آپ نے فرمایا مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ "جو اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئے۔"

اور یہ کہ جب یہ حضرات تعمیر کعبہ کے لئے اٹھے تو انہوں نے یہ دعا کی کہ اے رب! ہمیں اپنا مطیع فرمان بنا اور یہ کہ ہماری اولاد میں سے بھی ایک امت مسلمہ اٹھاتے رہیو! اور یہ کہ ہماری اولاد میں سے نبی آخر الزمان کو مبعوث فرمایئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی دعاؤں کو قبول فرمایا اور حضرت محمد بن عبد اللہ کو مبعوث فرمایا اور ان کے ذریعہ امت مسلمہ کو از سر نو قائم فرمایا اور اس نظریاتی وراثت کو یوں جاری فرمادیا۔

قصہ ابراہیم ﷺ کے اختتام پر اب روئے سخن ان لوگوں کی طرف مڑ جاتا ہے جو لوگ امت مسلمہ کے حق امامت و برتری کو چیلنج کر رہے تھے' جو رسول خدا ﷺ کی نبوت اور رسالت سے برسرپیکار تھے اور حضور سے اس موضوع پر بحث و جدال میں مبتلا تھے کہ دین اسلام کی حقیقت کیا ہے اور یہ کہ اصل دین کیا ہے اور ان کے مزعومات کیا ہیں اس لئے قرآن مجید ان لوگوں کے بارے میں یہ تبصرہ دیتا ہے۔ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

وَ مَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَ وَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

"اور کون ہے جو ابراہیم کے طریقے سے نفرت کرے؟ جس نے خود اپنے آپ کو حماقت و جہالت میں مبتلا کر لیا ہو' اس کے سوا کون یہ حرکت کر سکتا ہے؟ ابراہیم تو وہ شخص ہے جس کو ہم نے دنیا میں اپنے کام کے لئے چن لیا تھا اور آخرت میں اس کا شمار صالحین میں ہو گا۔

اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا مسلم ہو جاتو اس نے فوراً کہا "میں مالک کائنات کا مسلم ہو گیا" اسی طریقے پر چلنے کی ہدایت اس نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیت یعقوب اپنی اولاد کو کر گیا۔ اس نے کہا تھا "میرے بچو اللہ نے تمہارے لئے یہی دین پسند کیا ہے۔ لہٰذا مرتے دم تک مسلم رہنا۔"

یہ ہے ملت ابراہیم علیہ السلام یعنی خالص اور واضح اسلام اور فرماں برداری۔ اور اس سے کنارہ کش صرف وہی ہو گا جو اپنے اوپر ظلم کرے گا۔ اس سے وہی دور ہو گا جو دراصل احمق ہو گا۔ اور اپنے آپ کو برباد کرنے والا ہو گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جسے رب ذوالجلال نے دنیا کی امت کے لئے چنا اور جن کے بارے میں اللہ نے گواہی دی کہ وہ آخرت میں صالحین میں سے ہوں گے۔ انہوں نے اس دین کو پسند کیا ہے۔ جب ان سے ان کے رب نے کہا "مسلم ہو جا" تو انہوں نے بغیر ہچکچاہٹ کے اور بغیر کسی تردد اور انحراف کے فوراً سر تسلیم خم کر دیا اور فوراً کہا قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ "میں رب العلمین کا فرماں بردار ہو گیا ہوں۔"

یہ ہے ملت ابراہیمی' خالص اسلام اور واضح دین۔ ابراہیم علیہ السلام نے اسے صرف اپنی ذات تک محدود نہیں چھوڑا بلکہ اسے اپنی اولاد کے لئے بھی پسند کیا۔

اپنی اولاد کو وصیت کی کہ وہ اسے اپنائے رکھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو اس کی وصیت کی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنی اولاد کو اس کی وصیت کی اور یاد رہے کہ حضرت یعقوب ہی وہ اسرائیل ہیں جن کی طرف یہ لوگ اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں۔ لیکن اس کی وصیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اپنے جد امجد کی وصیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام دونوں نے اپنی اولاد کو یہ یاد دہانی کرائی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اس دین کو پسند کیا ہے یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّیْنَ "میرے بچو! اللہ نے تمہارے لئے یہی دین پسند کیا ہے۔"

یہ اللہ کی پسند ہے لہٰذا اللہ کی پسند کے بعد اب ان کے لئے اس کے سوا کوئی راہ نہیں ہے کہ وہ اسے پسند کریں اور اللہ کے اس فضل وکرم اور خصوصی عنایت کا کم از کم تقاضا یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس پسند اور اس عطا پر اس کا بے حد شکر ادا کریں اور ہروقت یہ سعی کرتے رہیں کہ کسی دور اور کسی زمانے میں بھی اللہ تعالیٰ کی یہ سرزمین امت مسلمہ سے خالی نہ ہو اور اس زمین پر خدا پرستی کی یہ تحریک ہروقت جاری وساری رہے فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ O "تم صرف اس حال میں مرو کہ تم مسلم ہو۔"

اور اب صدیوں بعد خدا تعالیٰ نے تمہیں یہ موقع فراہم کر دیا ہے۔ اب تو وہ رسول بھی آگیا ہے جو تمہیں اسلام کی طرف دعوت دے رہا ہے اور اس کی بعثت نتیجہ ہے اس دعا کا جو تمہارے جد امجد ابراہیم علیہ السلام نے صدیوں پہلے کی تھی۔

..........O..........

یہ تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وصیت جو انہوں نے اپنی اولاد کو کی تھی اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو کی تھی۔ اور یہ وصیت حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی زندگی کے اختتامی لمحات میں پھر اپنی اولاد کے سامنے بطور تاکید دہرائی تھی۔ اور اس میں ان کی دلچسپی اس قدر سوا تھی کہ زندگی کے آخری لمحات اور سکرات الموت میں بھی وہ اسے نہ بھلا سکے۔ بنی اسرائیل کو چاہئے کہ وہ اس پر خوب غور کریں۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ

اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝۱۳۳

"پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا اور اس نے مرتے وقت اپنے بیٹوں سے پوچھا بچو میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے؟ ان سب نے جواب دیا! ہم اس ایک خدا کی بندگی کریں گے جسے آپ نے آپ کے بزرگوں ابراہیم ؑ اسماعیل ؑ اور اسحاق ؑ نے خدا مانا ہے اور ہم اس کے مسلم ہیں۔"

سکرات الموت کے وقت حضرت یعقوب ؑ اور آپ کے بیٹوں کا یہ منظر ایک عظیم منظر ہے۔ یہ منظر ایک نہایت ہی نصیحت آموز' سبق آموز اور پرتاثیر منظر ہے۔ ایک شخص موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اور ان لمحات میں اس کے دل دماغ پر کیا چھایا ہوا ہے؟ وہ کیا دلچسپی ہے جس میں اس کا دل دماغ مشغول ہے حالانکہ وہ زندگی کے آخری لمحات میں ہے۔ اس وقت وہ کس عظیم الشان معاملے پر بات کر کے اس کے بارے میں اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی اولاد کے لئے کیا ترکہ چھوڑ رہے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ وہ اس ترکہ کی آخر دم تک حفاظت کریں اور وہ آخری ہچکیوں میں اسے اولاد کے حوالے کر رہے ہیں اور اس پر بڑی تفصیل سے بات کرتے ہیں۔ یہ ترکہ نظریۂ حیات اور عقیدے کا ترکہ ہے۔ یہی دولت ہے جسے وہ بیٹوں کے حوالے کرتے ہیں اور یہی وہ اہم مسئلہ ہے جس میں وہ بے حد دلچسپی لے رہے ہیں۔ یہ ہے وہ عظیم الشان معاملہ جو آخری لمحات میں بھی انہیں یاد ہے۔ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ "تم میرے بعد کس کی بندگی کرو گے۔"

یہ وہ عظیم معاملہ ہے جس کے لئے میں نے تمہیں بلایا ہے۔ اور اس اہم معاملے میں' میں چاہتا ہوں کہ تم اسے اطمینان حاصل کر لوں۔ یہ میری دولت ہے' میرا ترکہ ہے اور وہ اہم امانت ہے جو میں تمہارے سپرد کر رہا ہوں قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ان سب نے کہا! ہم اس ایک خدا کی بندگی کریں گے جسے آپ نے' آپ کے بزرگوں ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق علیھم السلام نے خدا مانا۔ اور ہم اس کے مسلم ہیں۔"

یوں وہ اپنے دین کو پہچان لیتے ہیں۔ اسے یاد کر لیتے ہیں۔ اس ورثے کو وہ قبول کرتے ہیں۔ اور اس کی حفاظت کا عزم ارادہ کر لیتے ہیں اور یوں وہ اپنے والد محترم کو مطمئن کر دیتے ہیں جو اپنی زندگی کے آخری لمحات میں ہے۔

حضرت یعقوب ؑ کی اولاد نے آخر تم تک ہمیشہ اس وصیت کا خیال رکھا اور وہ ہمیشہ اس بات کے معترف رہے کہ وہ مسلم ہیں۔ اس موقع پر قرآن مجید بنی اسرائیل سے یہ سوال کرتا ہے۔ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ "کیا تم موجود تھے جب حضرت یعقوب ؑ کے سامنے موت آگئی۔"

ہاں یہ واقعہ ہوا تھا' قرآن مجید اس کی گواہی دیتا ہے' اس کی تائید کرتا ہے۔ یوں قرآن مجید ان لوگوں کے مکر و فریب کا پردہ چاک کر دیتا ہے اور یہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ بنی اسرائیل کا اب اپنے جد امجد اسرائیل کے ساتھ کوئی نظریاتی یا روحانی تعلق نہیں ہے۔

..........O..........

اس بیان کی روشنی میں وہ فرق و امتیاز کھل کر سامنے آجاتا ہے جو دور رفتہ کی امت مسلمہ اور تحریک اسلامی کے مزاحم بنی اسرائیل کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ دور رفتہ کی اس امت مسلمہ اور اب کے اس نام نہاد جانشینوں کے درمیان کوئی تعلق کوئی وراثت اور کوئی روحانی وراثت کا تعلق نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٤﴾

"وہ کچھ لوگ تھے جو گزر گئے۔ جو کچھ انہوں نے کمایا' وہ ان کے لئے ہے اور جو کچھ تم کماؤ گے وہ تمہارے لئے ہے۔ تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔"

ہر شخص اپنا حساب خود دے گا۔ ہر ایک کا اپنا راستہ ہے' ہر ایک کا ایک عنوان ہے اور ہر کسی کی اپنی خصوصیات ہیں۔ وہ ایک مومن جماعت تھی جس کا بعد میں آنے والے اس کے فاسق جانشینوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعد میں آنے والے ناخلف اور نالائقوں کا ان پاک بازوں سے کیا واسطہ؟ وہ اک علیحدہ جماعت تھے اور یہ ایک علیحدہ جماعت ہیں۔ ان کا جھنڈا علیحدہ تھا اور ان کا جھنڈا جدا ہے۔ ان کا تصور حیات ایک ایمانی تصور حیات تھا اور ان نالائقوں کا تصور حیات بالکل جاہلی تصور ہے۔ جاہلی تصور حیات میں ایک جماعت اور دوسری جماعت اور ایک دور اور دوسرے دور میں فرق نہیں کیا جاتا کیونکہ اس تصور کے مطابق اگر دو معاشروں کے درمیان اگر خون اور نسب کا اتحاد ہے تو گویا دونوں معاشرے ایک ہیں لیکن ایمانی تصور حیات میں ایک مومن معاشرے اور ایک فاسق معاشرے کے درمیان امتیاز ہوتا۔ ان کے درمیان کوئی ایک رشتہ داری نہیں ہوتی۔ کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ یہ دونوں معاشرے ایک امت بن سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ دونوں علیحدہ امتیں ہیں۔ اس لئے مومنین کی اقدار حیات کے مطابق بھی یہ دونوں مختلف اور متضاد ہیں۔ اسلامی تصور حیات کے مطابق ایک امت صرف وہ ہوتی' جو صرف ایک نظریۂ حیات اور عقیدہ پر ایمان رکھتی ہو' چاہے جسمانی تعلق کے لحاظ اور رنگ نسل کے اعتبار سے اس کا تعلق مختلف علاقوں سے ہو۔ اسلامی جماعت کا تعلق کسی زمین کسی علاقے یا کسی رنگ و نسل سے نہیں ہوتا' یہ وہ تصورِ حیات ہے جو شرف انسانیت کے زیادہ مناسب ہے۔ جس کی اساس بلند اور عالم بالا کی روحانیت پر ہے اور اس کی بنیاد خاکی اور سفلی تعلقات پر نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور کے تاریخی واقعات کے اس تفصیلی بیان کے ضمن میں' مسلمانوں کے بیت الحرام اور کعبہ کی تاریخ کے بیان کے ضمن میں اور اسلامی نظام زندگی کی حقیقت اور موروثی تصورات کی حقیقت کے بیان کے ضمن میں' اب قرآن کریم معاصر اہل کتاب کے بوگس دعوؤں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور ان کے غلط خیالات' بے بنیاد دلائل اور غیر معقول مباحث کی تردید کرتا ہے' جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سب تصورات دلائل کے اعتبار سے اور بحث و جدال کے میدان میں پائے چوبین ہیں۔ اور محض ضد' عناد پر مبنی ہیں اور ان کے ان مزعومات کے حق میں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ یوں قرآن مجید یہ ثابت کرتا ہے کہ اسلامی نظریات و عقائد دراصل معقول اور فطری عقائد ہیں۔ اور ان سے انحراف صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو صرف ضدی اور معاند ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٣٥﴾ قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَ

وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا
نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٦﴾ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ
مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ
اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾ صِبْغَةَ اللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ
صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ﴿١٣٨﴾ قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ
وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ ﴿١٣٩﴾ أَمْ تَقُولُونَ
إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا
أَوْ نَصَارَىٰ ۗ قُلْ أَأَنتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ ۗ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَتَمَ شَهَادَةً
عِندَهُ مِنَ اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٠﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۱۶
لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤١﴾ ع ۱۲ ۱۶

"یہودی کہتے ہیں! یہودی ہو جاؤ ہدایت پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں عیسائی ہو جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔ ان سے کہو نہیں بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ...... اور ابراہیم علیہ السلام مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم علیہ السلام' اسماعیل علیہ السلام' اسحاق علیہ السلام' یعقوب علیہ السلام اور اولاد یعقوبؑ کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔ پھر اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم لائے تو ہدایت پر ہیں اور اگر وہ اس سے منہ پھیریں تو کھلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں۔ لہٰذا اطمینان رکھو کہ ان کے مقابلے میں اللہ تمہاری حمایت کے لئے کافی ہے۔ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

کہو اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اس کے رنگ سے اچھا اور کوئی رنگ نہ ہو گا؟ اور ہم اس کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں۔

اے نبی ان سے کہو! کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو حالانکہ وہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں' تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں' اور ہم اللہ کے لئے اپنی بندگی کو خالص کر چکے ہیں یا پھر تمہارا کہنا یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام' اسماعیل علیہ السلام' اسحاق علیہ السلام و یعقوب علیہ السلام اور اولاد یعقوبؑ سب یہودی تھے یا نصرانی تھے؟ کہو تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جس کے ذمے اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے؟ تمہاری حرکات سے اللہ تو غافل نہیں ہے وہ کچھ لوگ تھے جو گزر چکے۔ ان کی کمائی ان کے لئے تھی اور تمہاری تمہارے لئے۔ تم سے ان کے اعمال کے متعلق سوال نہیں ہو گا۔"

یہودیوں کا کہنا یہ تھا کہ تم یہودیت اختیار کر لو تو راہ ہدایت پالو گے اور عیسائیوں کا کہنا یہ تھا کہ عیسائی بن جاؤ تو ہدایت پالو گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان دونوں دعووں کو جمع کر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ وہ ان الفاظ میں ان کے ان باطل دعووں کی تردید فرما دیں۔ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ "کہو بلکہ ملت ابراہیم علیہ السلام راہ ہدایت ہے جو مشرکین میں سے

نہ تھے۔"

حضور کو سمجھایا گیا کہ آپ ان سے کہہ دیں' آیئے ہم اور آپ سب اپنے اصل کی طرف واپس لوٹتے ہیں۔ یعنی ملت ابراہیمی کی طرف جو ہمارے بھی باپ ہیں اور آپ کے بھی جد امجد ہیں اور اسلام کا اصل منبع اور سرچشمہ ہیں اور ان کے رب سے ان سے ساتھ جو عہد کیا ہوا تھا اور وہ مشرک نہ تھے' جبکہ آپ لوگ شرک میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس عظیم دینی وحدت کے اور دینی اتحاد کے اعلان کا حکم دیتے ہیں' جو دین ابو الانبیاء، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جاری رہا اور جس کی آخری کڑی اب اسلام ہے۔ اہل کتاب کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اس متحدہ اور مسلسل دین پر ایمان لائیں قُولُوٓا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ مَآ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَ مَآ اُنۡزِلَ اِلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطِ وَ مَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسٰی وَ مَاۤ اُوۡتِیَ النَّبِیُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّہِمۡ لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡہُمۡ وَ نَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ "کہو ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم علیہ السلام 'اسماعیل علیہ السلام 'اسحاق علیہ السلام 'یعقوب علیہ السلام اور اولاد یعقوب کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔"

یہ سب ملتوں کا اتحاد ہے۔ سب رسولوں کے درمیان وحدت ہے اور یہ اسلامی تصور حیات کی اساس ہے۔ اور یہی وہ فکر ہے جو امت مسلمہ کو ایک ایسی ملت بنا دیتی ہے جو اس زمین پر اس نظریہ کی واحد حامل اور وارث ہے جو نظریہ اللہ کے دین پر مبنی ہے۔ اور جس کی جڑ اصل ابراہیمی سے مربوط ہے اور جس کی وجہ سے ...... یہ امت انسانی تاریخ میں ہدایت اور روشنی کی علمبردار ہے۔ اور یہی تصور حیات ہے جو اسلامی نظام زندگی کو ایک حقیقی عالمی نظام بنا دیتا ہے جس میں کوئی تعصب نہیں ہے۔ اور کوئی ظلم و استحصال نہیں ہے اور جس کے نتیجے میں اسلامی معاشرہ ایک کھلا OpenSociety معاشرہ قرار پاتا ہے جس کے دروازے تمام انسانوں کے لئے وا ہیں۔ اور ان افراد معاشرہ کے درمیان باہم مکمل انس و محبت پائی جاتی ہے۔

اس لئے یہاں دوران کلام ایک فیصلہ کن بات بتا دی جاتی ہے اور مسلمانوں کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ اس بات پر ڈٹ جائیں۔ وہ یہ کہ یہی عقیدہ اور یہی تصور حیات راہ ہدایت ہے۔ جس نے اس تصور حیات اور اس راہ کو اپنا لیا تو گویا اس نے منزل مراد کو پا لیا۔ اور جو شخص اس حقیقت سے منہ موڑ لے گا تو وہ کبھی بھی ثابت قدمی سے کسی مقام پر ٹک نہ سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم تمام ایسے فرقوں سے اختلاف کرتا ہے جو ثابت قدمی سے کسی اصولی موقف پر قائم نہ ہوں۔ قرآن کہتا ہے فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِہٖ فَقَدِ اہۡتَدَوۡا ۚ وَ اِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا ہُمۡ فِیۡ شِقَاقٍ "پھر اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم لائے ہو' تو ہدایت پر ہیں اور اگر اس سے منہ پھیریں تو کھلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں۔"

یہ کلمات الٰہی ہیں اور یہ خود اللہ تعالیٰ کی جانب سے شہادت ہے۔ یوں قلب مومن کو ایک گونہ احساس عزت دلایا جاتا ہے کہ وہ جس موقف کو اختیار کئے ہوئے ہیں وہ قابل فخر بات ہے۔ کیونکہ ان کو لوگوں کے لئے ایک معیار اور ایک ماڈل قرار دیا جا رہا ہے۔ اور یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کا ایمان ایسا ہونا چاہئے جس طرح کا ایمان تمہارا ہے ورنہ وہ منکر حق' دشمنان دین اور ہٹ دھرم قرار پائیں گے اور کوئی مومن گمراہوں اور کافروں کا دوست نہیں ہو سکتا۔ نہ اسے ایسے لوگوں کے ساتھ کسی مناقشہ کی ضرورت ہے۔ نہ اسے ان کے خلاف کسی سازش یا چالبازی کی ضرورت ہے نہ ان کے ساتھ جنگ و جدال اور مقابلہ و معارضہ کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل اسلام کی جانب سے از خود ان کے مقابلے کے لئے کافی ہے۔ وہ خود ان سے نمٹ لے گا۔ فَسَیَکۡفِیۡکَہُمُ اللّٰہُ ۚ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ "ان کے

مقابلے میں اللہ تمہاری حمایت کے لئے کافی ہے وہ سننے اور جاننے والا ہے۔"

ایک مومن کی ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ وہ اپنی راہ پر سیدھا چلتا رہے۔ اور وہ اس حق کو مضبوطی سے تھام لے جو اس نے براہ راست اللہ تعالیٰ سے پایا ہے۔ وہ اس رنگ میں رنگا ہے جو اللہ کے دوستوں کا رنگ ہوتا ہے اور وہ دنیا میں اپنے اس مخصوص رنگ سے پہچانے جاتے ہیں۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ "اللہ کا رنگ اختیار کرو' اس کے رنگ سے اچھا کوئی رنگ نہیں ہے اور ہم اسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔"

اور اللہ کا یہ رنگ اللہ تعالیٰ کا وہ آخری پیغام ہے جو اس نے عالم بشریت کو دیا ہے۔ تاکہ اس رنگ میں انسانیت کا ایک وسیع تر حصہ رنگ جائے اور انسانیت ایسے وسعت پذیر اصولوں پر مجتمع ہو جائے جن میں نہ کوئی تعصب ہو' نہ کوئی بغض و کینہ ہو' نہ ان میں محدود قومیت ہو اور نہ محدود رنگ ہو۔

یہاں قرآن مجید کے اسلوب ادا کے ایک خاص رنگ کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ اور اس طرز ادا میں ایک گہرا مفہوم پوشیدہ ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس آیت کا پہلا حصہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک بیانیہ ہے صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً "اللہ کا رنگ اختیار کرو' اس سے زیادہ اچھا کس کا رنگ ہو گا۔"

اور اس آیت کا باقی حصہ بطور کلام مومنین ہے اور سیاق کلام میں دونوں کلاموں کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں ہے۔ اگرچہ آیت کے دونوں حصے کلام الٰہی ہیں۔ لیکن ایک میں متکلم اللہ میاں اور دوسرے میں مؤمنین ہیں۔ مؤمنین صادقین کی یہ ایک عظیم عزت افزائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے تکلم کو اپنے کلام کا جز بنا دیا جو ایک ہی فقرہ ہے۔ اس سے اس حقیقت کا اظہار مطلوب ہے کہ مومنین کا اپنے رب کے ساتھ ایک گہرا رابطہ ہے۔ اس قسم کے بیان کی کئی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں اور ان کی بہت بڑی اہمیت ہے۔

اب قرآن مجید کی یہ دندان شکن حجت اور دلیل اپنے فیصلہ کن انجام تک یوں پہنچتی ہے۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۝

"اے نبی ان سے کہو! کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو۔ حالانکہ وہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے' تمہارے لئے۔ اور ہم اللہ ہی کے لئے اپنی بندگی خالص کر چکے ہیں۔

اللہ کی وحدانیت اور اللہ کی صفت ربوبیت میں کسی کو مجال اختلاف نہیں۔ وہ ہمارا بھی رب اور تمہارا بھی رب ہے۔ ہم اپنے اعمال کا حساب دیں گے اور تم اپنے اعمال کے جوابدہ ہو گے۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم صرف اس کے ہو گئے ہیں' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے اور اس کے ساتھ کسی اور سے امیدیں وابستہ نہیں کرتے۔ یوں اللہ تعالیٰ اہل اسلام کی زبانی ان کے نظریاتی موقف کی وضاحت فرماتے ہیں اور یہ موقف ایسا ہے کہ جس میں بحث و مباحثہ اور نزاع و اختلاف کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے۔

اب اس ناقابل نزاع موقف سے روئے سخن ایک دوسرے موضوع کی طرف پھر جاتا ہے' جس میں اختلاف موجود تھا لیکن بتایا جاتا ہے کہ اس میں بھی جو اختلاف کیا گیا وہ بھی غیر ضروری اور غیر معقول اختلاف ہے۔ فرماتے ہیں۔ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی "یا پھر تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیم' اسماعیل' اسحاق' یعقوب اور اولاد یعقوب سب کے سب یہودی تھے یا نصرانی تھے؟"

یہ لوگ تو حضرت موسیٰ سے بھی پہلے گزرے ہیں اور یہودیت اور نصرانیت کے وجود میں آنے سے بھی بہت پہلے گزرے ہیں۔ اور

ان کے دین کی حقیقت اللہ نے بیان بھی کر دی ہے۔ اور اس کی گواہی دے دی ہے کہ ان کا دین اسلام تھا۔ جس طرح اوپر تفصیل سے بیان ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ قُلْ ءَ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰہُ "کہو تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟"

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے موقف پر صرف ایک سوال کر دیا ہے۔ اس لئے کہ ان کا موقف بادی النظر میں غلط تھا۔ جواب دینے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ صرف سوالیہ نظروں سے تنبیہ کر دی گئی۔

اس کے بعد بنی اسرائیل اور اہل کتاب سے کہا جاتا ہے کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ حضرات یہودیت اور نصرانیت کے وجود میں آنے سے بھی پہلے گزرے ہیں۔ اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ وہ اس ابتدائی دین کے حامل تھے جسے حنفیت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ کہ تمہاری کتابوں میں، تمہارے پاس یہ شہادت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ عنقریب نبی آخر الزمان کو اسی دین حنیف کے ساتھ بھیجنے والے ہیں۔ جو دین ابراہیم ﷺ بھی ہے لیکن تم اس شہادت کو چھپا رہے ہو۔ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ "اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جس کے ذمے اللہ کی طرف سے گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے۔"

اور اللہ کو اس بات کی اچھی طرح خبر ہے کہ جس شہادت کو تمہارے پاس بطور امانت ودیعت کیا گیا تھا اسے تم چھپا رہے ہو اور اس کے برعکس تم اسے چھپانے کے لئے بحث و جدال اور تلبیس بھی کر رہے ہو۔ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ "اور اللہ اس بات سے غافل نہیں جو تم کرتے ہو۔"

اب بات اپنی انتہائی بلندی تک جا پہنچتی ہے۔ اس مسئلے کا خاطر خواہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور یہ بتا دیا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم ؑ، حضرت اسماعیل ؑ، حضرت اسحاق ؑ اور حضرت یعقوب ؑ اور اولاد یعقوبؑ کے مابین اور ان کے موجودہ نام نہاد پیرو کاروں کے درمیان مکمل تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ کچھ اور تھے اور یہ کچھ اور۔ اس لئے یہاں خاتمہ کلام اسی فقرے پر کیا جاتا ہے جو پہلے گزر چکا ہے تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ "یہ کچھ لوگ تھے جو گزر چکے۔ ان کی کمائی ان کے لئے تھی اور تمہاری کمائی تمہارے لئے۔ تم سے ان کے اعمال کے متعلق سوال نہ ہو گا۔"

یہ ہے ایک فیصلہ کن بات اب گویا نزاع ختم کر دیا گیا ہے اور ان لوگوں کے فضول دعوؤں کے متعلق آخری بات کہہ دی گئی۔

**و اخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین**

☆ ☆

# فی ظلال القرآن

## پارہ دوم ............. ایک نظر میں

(سورۃ البقرہ آیات ۱۴۲ تا ۲۵۲)

# پارہ دوم ایک نظر میں

سورۂ بقرہ کے اس حصے میں' یعنی پارۂ دوئم کے شروع ہی سے اس امر پر زور دیا جارہا ہے کہ تحریک اسلامی کو امانت کبریٰ کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ اسلامی نظریۂ حیات کی ذمہ داریاں۔ پھر اس نظریۂ حیات کی اساس پر اس دنیا میں نظامِ خلافت کے قیام کی ذمہ داریاں۔ اگرچہ جا بجا تحریک اسلامی کے مخالفین کے ساتھ بحث و تکرار کے مضامین بھی پائے جاتے ہیں۔ اس وقت مخالفین کے سرخیل بنی اسرائیل' یعنی یہودی تھے۔ اس لئے یہاں ان کی سازشوں' مکاریوں اور اسلامی نظریۂ حیات کے خلاف ان کی نظریاتی جنگ اور تحریکِ اسلامی کے وجود کے خلاف ان کی جدوجہد کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تحریک اسلامی کو ہدایات دی گئی ہیں اور انہیں دشمنانِ تحریک اسلامی کی اس چومکھی لڑائی سے خبردار کیا گیا ہے جو انہوں نے تحریک کے خلاف شروع کر رکھی ہے۔ مسلمانوں کو ان کوتاہیوں سے آگاہ کیا گیا ہے' جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے تھے۔

اس پارے اور سورت کے بقیہ حصے کا بنیادی مضمون امت مسلمہ کو ایک مستقل تشخص اور ایک علیحدہ قبلہ عطا کرنا ہے' تاکہ وہ ایک ایسی امت قرار پائے جو منصب خلافت الٰہی کی حامل بن سکے۔ اور اسے ایک الگ ایسا نظام قانون اور الگ ایسی شریعت دی جائے جو پہلے آئے ہوئے قوانین و شرائع کی تصدیق کرتی ہو اور ان کی حامل ہو۔ اور امت ایک جامع نظام اور عمومی منہاج کی حامل ہو۔ سب سے اہم یہ کہ یہ امت انسانی حیات و ممات کے بارے میں ایک خاص نظریہ کی حامل ہو اور وہ اپنے رب کے ساتھ خصوصی اور شعوری رابطہ رکھتی ہو' نیز اس کرۂ ارض پر ایک نظریۂ حیات اور ایک نصب العین کی حامل ہو۔ اسے اس امر کا شعور ہو کہ اسے اس نظریہ حیات کی راہ میں مال و زر' شعور و خیال' طور اطوار اور جان و آبرو کی کیا کیا قربانیاں دینی ہوں گی۔ اسے اپنے آپ کو قرآن و سنت کے مطابق قادر مطلق کے اقتدار اعلیٰ کے ماننے اور اس کی اطاعت کے لئے تیار کرنا ہے۔ غرض تسلیم و رضا اور نہایت فرمانبرداری کے ساتھ اسے یہ سب کچھ کرنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ابتداء ہی سے تحویل قبلہ کے متعلق بات شروع کی جاتی ہے۔ تحویل قبلہ کے حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کو امت وسط قرار دیا جارہا ہے۔ یہ لوگوں پر گواہ ہے اور رسول امت پر گواہ ہیں۔ یہ امت پورے کرۂ ارض کی قائد ہے' رہبر و راہنما ہے' لہٰذا اسے نصیحت کی گئی ہے کہ اس منصب کی وجہ سے اسے جو جو مشکلات پیش آئیں ان پر صبر کرے۔ راضی برضا رہنا ہو گا۔ مالی و جانی قربانیاں پیش کرنی ہوں گی اور ہر حال میں اپنے تمام امور اللہ کے سپرد کر دینے ہوں گے۔

ذرا آگے چلیں تو ہمارے سامنے ایمانی تصور حیات کے کچھ اصول رکھے جاتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ "نیکی" تقویٰ اور عمل صالح کا دوسرا نام ہے۔ شرق و غرب کی سمتیں اور عبادت کرتے وقت ان کی طرف رخ کرنا بذات خود کوئی ٹھوس نیکی نہیں ہے۔ دراصل یہ یہودیوں کی اس غوغا آرائی کا جواب ہے جو وہ تحویل قبلہ کے وقت بپا کئے ہوئے تھے۔ وہ حقائق کو مسخ کر رہے تھے یا چھپا رہے تھے اور یہ تمام بحث و تکرار ایک نمائش تھی۔ وہ یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر کر رہے تھے' چنانچہ ان آیات میں زیادہ تر بحث تحویل قبلہ اور اس سے متعلق دوسرے مباحث پر مشتمل ہے۔

اب سیاق کلام تحریک کی عملی تنظیم کی طرف پھر جاتا ہے اور ساتھ ساتھ بنیادی عبادات سے متعلق بھی کچھ احکام دیئے جاتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اجتماعی نظم اور عبادت ہی دراصل وہ بنیادی اصول ہیں جن پر امت مسلمہ کی اجتماعی زندگی کا قیام ہے۔ معاشرہ کی تنظیم اس لئے

بھی ضروری ہے کہ تحریک اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی ادا کر سکے جو اس پر ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ اس حصے میں قانون قصاص' قانون وصیت' احکام صیام' مسجد حرام اور اشہر حرام میں قانونی جنگ۔ فریضۂ حج' شراب اور جوئے کے تعزیری قوانین اور عائلی قوانین کا ذکر ہے۔ یہ سب احکام اسلامی نظریۂ حیات اور تعلق باللہ کے اصولوں پر قائم ہیں۔ اس پارے کے آخری حصہ میں جہاد بالنفس اور جہاد بالمال کی مناسبت سے بطور عبرت و مثال موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کی نشاۃ ثانیہ کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ جب انہوں نے اپنے وقت کے نبی سے کہا: "ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔" (۱)

یہ بھی تحریک اسلامی کے لئے عبرت ہے۔ اس میں اس کے لئے اہم تجربات و ہدایات موجود ہیں کیونکہ تحریک اسلامی ہی ان امم کے نظریات اور تجربات کی اصل وارث ہے۔

پارۂ اول کے عمیق مطالعے سے اس کشمکش کی حقیقت عیاں ہو جاتی ہے جو قرآن مجید نے برپا کی تھی۔ امت مسلمہ کی تعمیر و تشکیل کے سلسلے میں قرآن کا نصب العین واضح ہوتا ہے۔ یہ ایک عظیم کشمکش ہے۔ جو بیرونی سازشوں' نفرتوں' دھوکہ بازیوں' جھوٹے پروپیگنڈوں اور سفید جھوٹ کے پلندوں کے خلاف شروع کی گئی ہے۔ اور نفس انسانی کی اصلاح کے لئے اس کی اندرونی و بشری کمزوریوں' اخلاقی فتنوں اور گمراہیوں کے خلاف برپا ہے۔ یہ دراصل تعمیر و ہدایت اور صحیح تصور حیات قائم کرنے کا معرکہ ہے جس پر ایک ایسی امت کی اساس رکھنی ہے جو خلیفۃ اللہ فی الارض کا منصب سنبھال سکے اور پوری دنیا کو ایک صالح قیادت دے سکے۔

قرآن کا اعجاز تو دیکھئے! تنظیم جماعت کے وہ اصول و مبادی اور ہدایات و اشارات جو اس نے سب سے پہلی اسلامی جماعت کے لئے تجویز کئے وہ آج بھی اور کل بھی ہر اس جماعت کے لئے ضروری ہیں جو اسلامی خطوط پر اٹھنا چاہے۔ اسلام نے اپنے مخالفین کے مقابلے میں جو معرکہ سر کیا آج بھی ہر مخالف اسلام کے خلاف وہی معرکہ بپا ہو سکتا ہے بلکہ قرآن اپنے اولین مخالفین کی جن سازشوں اور مکاریوں اور مخالفانہ تدبیروں سے برسرپیکار ہوا۔ وہ مخالفین بعینہٖ آج بھی موجود ہیں اور ان کی مکاریاں' سازشیں اور تدبیریں بھی وہی ہیں چنانچہ امت مسلمہ آج اپنی جدوجہد اور اپنے بچاؤ کے لئے انہی ہدایات کی محتاج ہے جن کے لئے پہلی تحریک اسلامی محتاج تھی۔ اسی طرح آج بھی تحریک اسلامی اپنے صحیح تصور حیات' اس کائنات میں اپنے منصب کے تعین' لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات کے انضباط میں انہی ہدایات اور نصوص قرآنی کی محتاج نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں قرآن واضح سنگہائے میل پیش کرتا ہے جبکہ علم و معرفت اور رشد و ہدایات کے تمام دوسرے مصادر جدید سے جدید سلسلے بھی اس معاملے میں خاموش ہیں۔ قرآن آج بھی اس امت کا اس کی پوری زندگی میں راہ عمل ہے۔ وہ اس امت کا آج بھی اس راہ حقیقت میں رہبر و راہنما ہے۔ وہ آج بھی امت کا مکمل دستور اس کے نظام زندگی کا منبع اس کی اجتماعیت کا مرجع ہے۔ اس کے عالمی معاملات اور اخلاقی ضوابط کا سرچشمہ ہے۔ یہ ہے اس کتاب کا اصل اعجاز!

☆ ☆

# درس ۸ ایک نظر میں

اس سبق میں موضوع سخن صرف تحویل قبلہ ہے۔ تمام مباحث اس سے متعلق ہوں گے۔ اس پورے سبق میں ان سازشوں کو بے نقاب کیا گیا ہے جو اس موقع پر یہودیوں نے 'اسلامی جماعت کی صفوں میں انتشار پھیلانے کے لئے کیں۔ اس واقعے پر یہود نے جو اعتراضات کئے اور ان کے نتیجے میں اہل اسلام کے ذہنوں پر جو اثرات ہوئے 'انہیں دور کیا گیا ہے۔

اس واقعہ سے متعلق کوئی قطعی روایت نہیں ہے۔ نہ ہی اس کی تاریخ کے بارے میں قرآن مجید میں کچھ ذکر ہے۔ ان آیات کا تعلق بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف قبلے کی تحویل سے ہے۔ یہ واقعہ مدینہ طیبہ میں ہجرت کے سولہ یا سترہ ماہ بعد پیش آیا۔ اس سے متعلق روایات پر مجموعی نظر ڈالنے سے اجمالاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں 'فرضیت صلوٰۃ کے بعد 'مسلمان خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ اگرچہ یہ بات منصوص نہیں ہے۔ ہجرت مدینہ کے بعد 'امر ربی سے مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے تھے۔ اگرچہ اس سلسلے میں بھی قرآن مجید کی کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تھی صرف رسول خدا کو حکم دیا گیا تھا۔ آخر کار اس معاملے میں قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی:

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ (البقرۃ-۱۴۴)

"مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں تم ہو 'اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔" سابق حکم منسوخ ہو گیا۔ حقیقت واقعہ جو بھی ہو 'لیکن مسلمان چونکہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور بیت المقدس اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کا قبلہ تھا 'اس لئے یہود مدینہ نے اسے اسلام میں داخل نہ ہونے کا بہانہ بنا لیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھی چونکہ ہمارے قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اس لئے دین دراصل ہمارا ہی دین ہے۔ ہمارا قبلہ ہی حقیقی قبلہ ہے۔ ہم اصل ہیں اور مسلمان تابع 'لہذا محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کے لئے مناسب یہ ہے کہ خود وہ دین یہود میں داخل ہو جائیں 'نہ یہ کہ وہ ہمیں اپنے دین کی طرف بلائیں۔

علاوہ ازیں 'بیت المقدس کو قبلہ بنانا عرب مسلمانوں کو بہت شاق تھا۔ وہ بیت الحرام کے ادب و احترام کے خوگر تھے۔ وہ ہمیشہ سے ان کا کعبہ اور قبلہ تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہودیوں نے اس پر فخر کرنا شروع کر دیا تھا کہ مسلمان ان کے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ وہ اسے دین اسلام کے خلاف بطور دلیل بھی استعمال کر رہے تھے۔

اندریں حالات رسول ﷺ 'بار بار آسمان کی طرف منہ اٹھاتے اور اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے تھے 'لیکن زبان سے کچھ نہ فرماتے تھے۔ اس انتظار میں تھے کہ خداوند تعالیٰ اپنی مرضی سے راہنمائی فرمائیں گے۔

یہ حالات ہیں کہ وحی کا نزول ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کی خواہش پوری ہو جاتی ہے:

قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۖ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ (البقرہ-۱۴۴)

"اے نبی یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ لو 'ہم اسی قبلے کی طرف تمہیں پھیر دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو۔ مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں تم ہو 'اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔"

روایت میں آتا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت کے سولویں یا سترہویں ماہ میں پیش آیا۔ مسلمانوں نے جب تحویل قبلہ کی خبر سنی تو ان میں سے بعض نماز کی حالت میں تھے' اور نصف نماز پڑھ چکے تھے۔ انہوں نے دوران نماز ہی میں اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیا اور قبلہ جدید کی طرف رخ پھیر کر نماز مکمل کی۔ قبلہ بدلنا تھا کہ یہودیوں نے پورے مدینہ کو سر پر اٹھالیا' شور مچانا شروع کر دیا۔ قبلے کا بدل دینا' ان پر شاق گزرا۔ اس لئے کہ وہ قبلہ کے سلسلے میں حجت بازی کر کے' مسلمانوں کے دلوں میں' ان کے دین کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتے تھے اور تحویل قبلہ سے ان کی یہ حجت بازی ختم ہو رہی تھی لیکن اب بہ انداز دگر ان کی غوغا آرائی شروع ہو گئی۔ انہوں نے بھی اس کا رخ بدل دیا اور وہ اب دوسری طرف مسلمانوں کے دلوں میں شکوک پیدا کرنے لگے۔ مسلمانوں سے کہتے ہیں: "اگر بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا باطل تھا اور تم ایک عرصہ تک اسی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھتے رہے تو تمہاری وہ تمام نمازیں ضائع ہو گئیں اور اگر بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا ٹھیک تھا تو اب تحویل قبلہ باطل ہے اور تمہاری تمام نمازیں ضائع ہو رہی ہیں۔ احکام میں یہ تغیر اور ان آیات کا یہ نسخ بہرحال اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی وحی نہیں آتی۔"

یہودیوں کے اس مخالفانہ حملے کے اثرات اسلامی کیمپ میں بھی محسوس کئے گئے۔ اس کا اندازہ قرآن مجید کی ان آیات سے ہوتا ہے جو اس سلسلے میں نازل ہوئیں۔ پارۂ اول میں مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا ....الخ" (جس آیت کو ہم منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں الخ)" پورے دو اسباق وہاں نازل ہوئے اور دوسرے پارے کی آیات زیر بحث بھی اسی سے متعلق ہیں۔ جن میں اس جدل کے بارے میں تاکیدی ہدایات دی گئی ہیں۔ وضاحتیں کی گئی ہیں اور مسلمانوں کو ڈرایا گیا ہے ان مسائل کے بارے میں نصوص کی تشریح کے موقعہ پر عرض کروں گا۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحویل قبلہ اور اس کی حکمت کے متعلق کچھ کہا جائے۔ مسلمانوں کے لئے ایک مخصوص قبلہ کے تعین کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ یہ درحقیقت تحریک اسلامی کی تاریخ میں ایک اہم موڑ تھا۔ تحریک کی زندگی میں اس کے عظیم آثار نمودار ہوئے۔

مسلمانوں کا قبلہ پہلے خانہ کعبہ تھا۔ ہجرت کے بعد بعض تربیتی مقاصد کے لئے اسے تبدیل کر دیا گیا اور بیت المقدس کو قبلہ مقرر کر دیا گیا۔ اس جانب اسی سبق کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:" وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ"

ترجمہ: "پہلے جس طرف تم رخ کرتے تھے' اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لئے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسول ﷺ کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے۔"

درحقیقت دور جاہلیت ہی سے عرب بیت الحرام کا بہت احترام کرتے تھے۔ اسے وہ اپنے قومی وقار کی علامت تصور کرتے تھے۔ اسلام چونکہ خالص للہیت قائم کرنا چاہتا تھا' مسلمانوں کے دلوں سے خداوند قدوس کے تعلق کے سوا تمام تعلقات کو ختم کر دینا چاہتا تھا اور اسلامی نظریۂ حیات کے سوا' ہر نعرۂ جاہلیت اور ہر جذبہ عصبیت کو مٹا دینا چاہتا تھا اور ایک ایسا خدائی نظام قائم کرنا چاہتا تھا جس کا تعلق صرف اللہ سے براہ راست ہو۔ وہ تمام تاریخی اور قبائلی عصبیتوں اور رنگ و نسل کی تمام آلائشوں سے پاک ہو' اس لئے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ نماز میں خانہ کعبہ کی طرف منہ کرنا ترک کر دیں۔ اگرچہ یہ حکم ایک عرصہ قلیل کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ حکم ہوتا ہے کہ اب وہ اپنا رخ بیت المقدس کی طرف موڑ دیں۔ تاکہ ان کے دلوں سے جاہلیت کی تمام گندگی بالکل ختم ہو جائے۔ ان کے نفوس جاہلیت کی تمام نجاستوں سے پاک ہو جائیں۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون رسول خدا کی غیر مشروط اطاعت کرتا ہے۔ کون ہے جو تسلیم و رضا کا پیکر ہے اور پختہ کردار کے

ساتھ بغیر کسی تحفظ (Reservation) کے تابع فرمان ہے اور کون جاہلیت کے تصورات 'رنگ و نسل کے قومی خیالات اور تاریخ و وطن کے جاہلی نعروں سے متاثر ہو کر الٹے پاؤں پھر جاتا ہے' نیز معلوم ہو جائے کہ کسی مسلمان کے شعور کے خفیہ ترین گوشوں میں کسی کلا کن کے ضمیر کے پوشیدہ ترین تہوں میں براہ راست یا بالواسطہ باطل کی کوئی آمیزش تو نہیں ہے۔

اس حکم کے مطابق جب مسلمانوں نے سر تسلیم خم کر دیا' وہ اس نئے قبلے کی طرف خوشی سے پھر گئے۔ جس کی طرف رسول خدا ﷺ نے انہیں حکم دیا تھا تو یہود نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اسے تحریک اسلامی کے خلاف بطور دلیل استعمال کرنا شروع کر دیا تو حکم الٰہی آپہنچا۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اب اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر کے نماز ادا کریں۔ نہ صرف یہ کہ یہودیوں کی دلیل ختم ہوئی بلکہ اس تبدیلی سے مومنین کے دل ایک دوسری حقیقت سے آشنا ہو گئے۔ حقیقت اسلام سے 'اسلامی تاریخ ہے۔ اس حقیقت سے کہ بیت اللہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خالص اللہ کی بندگی کے لئے تعمیر کیا تھا تاکہ وہ اس امت کی میراث بنے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کے نتیجے میں اٹھنے والی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی کہ رب العالمین میری نسل سے ایک رسول پیدا کر اور وہ اس دین پر ہو جو ان کا اور ان کے لڑکوں پوتوں کا دین تھا۔ جیسا کہ پہلے پارے میں ذکر ہوا: وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ " (البقرہ۔۱۲۴)

ترجمہ:" یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اترا۔"

جہاں موضوع سخن مسجد حرام تھی اس کی بنیاد اور تعمیر سے متعلق اور ان امور کے ساتھ وابستہ دوسرے حالات و معاملات کے متعلق۔ اہل کتاب اور مشرکین کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام 'ان کے دین' ان کی اولاد' ان کے قبلہ' ان کے عہد اور ان کی وصیت کے متعلق 'لیکن پارۂ اول کی مذکورہ آیات دراصل 'تحویل قبلہ کے موجودہ احکام کی تمہید تھیں' جن میں ایک تھوڑے ہی وقفے کے بعد ہی قبلہ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف بدل دیا گیا۔ مسجد حرام کو حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام نے تعمیر کیا تھا۔ اس کے پاس کھڑے ہو کر دونوں نے طویل دعا کی تھی۔ پھر امت مسلمہ کو دین حنیف پر اٹھایا گیا اور وہی عہد ابراہیمی کی وارث قرار پائی۔ ان حالات میں بیت المقدس سے بیت الحرام کی طرف قبلہ کی تحویل کا حکم حالات کا طبعی اور منطقی نتیجہ تھا۔ تاریخ نے امت مسلمہ کے دل و دماغ میں جو شعوری ربط پیدا کر رکھا تھا اس حکم نے مسلمانوں کے حسی مظاہر کو ان کے تاریخی شعور کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتاکید وصیت کی تھی کہ وہ مسلمان رہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو بتاکید وصیت کی تھی کہ وہ بھی دین اسلام پر قائم رہیں جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام (اسرائیل) نے بھی ایسی ہی وصیت اپنی اولاد کو کی۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ حقیقت بھی جان چکے تھے کہ اللہ کے اس عہد میں ظالم نہیں آتے۔ چونکہ بیت الحرام کی تعمیر کا حکم حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کو ملا تھا' لہٰذا یہ انہی کی میراث تھی۔ یہ میراث ان لوگوں ہی کو ملنی تھی جو دین ابراہیم علیہ السلام کی میراث پانے والے تھے۔ اور چونکہ امت مسلمہ ہی نے اس عہد اور اس فضل خداوندی کو وراثت میں پایا' لہٰذا اس کا طبعی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اللہ کا گھر بھی ان کو ملے اور وہ اس امت کا قبلہ ہو۔

بے شک ایک مختصر عرصہ کے لئے مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی' جو یہود و نصاریٰ کا قبلہ تھی جیسا کہ سیاق و سباق سے اشارہ ملتا ہے۔ ایک مخصوص مصلحت کے تحت ایسا ہوا' جس کا ذکر ہم تفصیل سے لے آئے ہیں۔ اب مشیت ایزدی یہ ہے کہ یہ وراثت امت مسلمہ کے سپرد کر دی جائے۔

اہل کتاب نے دین اسلام کا انکار کر کے خود اپنے آپ کو ورثہ ابراہیمی سے محروم کر دیا تھا' لہٰذا ایسے حالات میں تحویل قبلہ کا حکم

عین حکمت پر مبنی اور نہایت ہی بر محل تھا۔ چنانچہ بحکم خدا اب حضرت ابراہیم ؑ کا تعمیر کردہ بیت اللہ قبلہ ہو گیا۔ تاکہ ظاہری اور شعوری طور پر مسلمان پوری پوری وراثت پالیں۔ دینی وراثت قبلہ کی وراثت اور اللہ کے فضل و کرم کی وراثت۔

تحریک اسلامی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ممتاز ہو مخصوص و جدا ہو' تصورات و عقائد میں ممتاز اور قبلہ و عبادات میں ممتاز' قبلہ اور عبادات کا امتیاز بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح تصورات و نظریات میں امتیاز ضروری ہے۔

تصوراتی اور نظریاتی امتیاز تو بالعموم سمجھ میں آتا ہے' لیکن قبلہ اور ظاہری شعائر دین کی امتیازی حیثیت بعض اوقات سمجھ میں نہیں آتی' للذا مناسب ہے کہ عبادات کی شکل و صورت پر بھی کچھ کہا جائے۔

جو شخص عبادات کی ظاہری شکل و صورت کو ان کے اصل پس منظر میں نہیں دیکھ پاتا یا انسان کی نفسیات و تاثرات سے ہٹ کر عبادات میں صرف ظاہری اشکال کا مطالعہ کرتا ہے' ایسا شخص جب دیکھتا ہے کہ لوگوں کی طرف سے عبادات کی ظاہری اشکال کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے تو یہ فعل اسے متقشفانہ شکل پرستی' تنگ نظری اور تاریک خیالی نظر آتا ہے لیکن ایسا خیال درست نہیں۔ وسیع نقطۂ نظر سے دیکھا جائے اور عمیق غور و فکر سے کام لیا جائے تو ہر اعتبار سے ایک مختلف حقیقت سامنے آتی ہے مثلاً:

انسان کی شخصیت کی تشکیل ظاہری جسم اور پوشیدہ روح سے کی گئی ہے۔ اس لئے انسان روحانی شعور اور پوشیدہ جذبات کے اظہار کے لئے ظاہری شکل و صورت اختیار کرتا ہے۔ اندرونی جذبات کی تسکین اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک وہ محسوس ظاہری شکل و صورت اختیار نہ کرلیں۔ صرف اسی صورت میں اندرونی جذبات و میلانات کی مکمل تعبیر ممکن ہے' اس طرح ان میلانات کی تعبیر محسوس طور پر بھی مکمل ہو جاتی جس طرح وہ نفس انسان کے اندر یہ جذبات و میلانات مکمل صورت میں موجود ہوتے ہیں اور یوں جذبات تسکین پاتے ہیں اور انسان مطمئن ہو جاتا ہے اور انسانی شخصیت کا ظاہر و باطن ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

یوں نفس انسانی بیک وقت ایک طرف کائنات کے اسرار اور نامعلوم حقائق کی طرف مائل ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ ظاہری اشکال کی اطاعت کرتا ہے۔ ان فطری اصولوں کو مد نظر رکھ کر اسلام نے عبادات و شعائر کی ظاہری شکل و صورت متعین کی ہے' للذا محض نیت یا روحانی توجہ اور ارتکاز فکر سے اسلامی عبادات کی ادائیگی ممکن نہیں ہے۔ اسلامی عبادات میں نیت' توجہ اور ارتکاز فکر کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک ظاہری شکل و صورت میں ہو۔ مثلاً نماز میں قیام کرنا' روبقبلہ ہونا' تکبیر ادا کرنا' تسبیحات پڑھنا' جھکنا' سجدہ ریز ہونا وغیرہ۔

حج میں متعین ایام سے احرام باندھنا' متعین لباس پہننا' متعین حرکات' سعی' دعا' تلبیہ' قربانی اور بال ترشوانا۔ اور روزے میں نیت' کھانا پینا چھوڑنا اور تعلقات زن و شوئی چھوڑنا' اسی قبیل سے ہے۔ دیکھئے ہر عبادت میں حرکت اور ہر حرکت میں عبادت ہے۔ یوں انسانی نفسیات کے ظاہر و باطن کو ہم آہنگ کر دیا گیا ہے۔ انسانی قوتوں کے درمیان' حسن و ترتیب قائم ہو گیا اور یوں فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق اسلامی نظریۂ حیات کے تمام مقاصد حاصل کر لئے گئے۔

یہ بات اللہ کے علم میں تھی کہ فطری طور پر انسان اپنے اندرونی تصورات و جذبات کے اظہار کے لئے ظاہری شکل و صورت اختیار کرتا ہے۔ اسی طبعی میلان کی وجہ سے کئی اقوام جادۂ مستقیم سے منحرف ہو گئیں۔ بعض لوگوں نے قوت کبریائی کے اظہار کے لئے کچھ ظاہری رموز و اشارات سے کام لیا۔ پتھروں کے بت گھڑ لئے گئے۔ درختوں اور پتھروں کی پوجا کی گئی۔ سورج' چاند اور ستاروں کے آگے جھکے۔ حیوانات اور طیور و حوش کی پرستش کی۔

جب ان لوگوں نے اندرونی جذبات و عقائد کے اظہار کے لئے موزوں طریقہ اظہار اختیار نہ کیا جو مطابق فطرت ہوتا تو ان حالات میں منشائے الٰہی کے مطابق دعوت اسلامی اٹھی اور اس نے عقائد و جذبات کے اظہار کے لئے وہ فطری طریقہ اختیار کیا جو اسلامی عبادات

کی ظاہری شکل کے تعین سے نظر آتا ہے۔ اسلام نے عبادت الٰہی کے لئے ایسے طریقے اختیار کئے اور اس کے لئے ایسی شکلیں وضع کیں ' جن میں ذات خداوندی کے لئے جسمانیت کے تصور کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اس میں ذات باری کے لئے کوئی طرف ' جہت متعین نہیں ہوتی۔ اسلامی طریقہ عبادت کے مطابق ' جب کوئی شخص جناب باری کی طرف مکمل طور پر متوجہ ہوتا ہے ' تو وہ قبلہ رخ ہوتا ہے لیکن اس کا دل ' اس کے حواس اور اس کے اعضاء صرف اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس کا ظاہری رخ ایک مکان کی سمت میں ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ پھر کسی ایک جگہ کو کیوں مخصوص کیا گیا؟ اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ایک مسلمان دوسرے لوگوں سے امتیازی شکل اختیار کرلے اور وہ نماز اور دوسری عبادات میں ایک مخصوص قبلہ یا سمت سے متعارف ہو۔ یہ تعین دراصل تفرد و امتیاز کے فکری دواعی کا تقاضا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس تعین اور تخصیص نے مسلمانوں کو انفرادیت بخشی ورنہ اللہ تعالیٰ کو کسی سمت و جہت سے کوئی تعلق نہیں۔

یہی وہ داعیہ تھا ' جس کی بنا پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب و اقوام کے مخصوص شعارات اور ان کے مخصوص مظاہر کو نہ اپنائیں۔ ایسے شعار ' جو انہوں نے اپنے اندرونی تصورات و عقائد یا خیالات و جذبات کے اظہار کے لئے وضع کئے ہیں۔ مسلمانوں کو یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل میں غیر مسلموں کے طور طریقے نہ اپنائیں۔ یہ حکم محض تعصب یا تنگ نظری و تقشف کی بنا پر نہیں دیا گیا بلکہ اسلام کے پیش نظر شکل و صورت سے ورا ' ایک عمیق اور حکیمانہ نقطۂ نظر تھا۔ ظاہری شکل و صورت کے پس منظر میں کچھ اسباب اور حکمتیں بھی پوشیدہ تھیں۔ یہ وہی وجوہات تھیں جن کی بنا پر ایک قوم دوسری قوم سے جدا ہو جاتی ہے ' ایک قوم دوسری قوم سے مختلف ہو جاتی ہے ' ایک نظریہ دوسرے نظریہ سے ممتاز ہو جاتا ہے ' ایک ضمیر دوسرے ضمیر سے الگ ہو جاتا ہے۔ ایک شخص کے اخلاق اور دوسرے شخص کے اخلاق میں فرق ہو جاتا ہے اور زندگی کی گزرگاہوں میں دو افراد کی راہیں مختلف سمتوں میں نکل جاتی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں: حضور ﷺ نے فرمایا! یہودی و عیسائی رنگ نہیں لگاتے تم ان کے خلاف کرو۔" (۱)

ایک بار نبی ﷺ کچھ لوگوں کے پاس تشریف لے گئے وہ تعظیماً اٹھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا! "عجمیوں کی طرح مت اٹھو ' ان میں سے بعض لوگ دوسروں کی تعظیم کرتے ہیں۔" (۲)

آپ ﷺ نے ایک موقعہ پر فرمایا! میری شان میں اس قدر مبالغہ نہ کرو ' جس طرح عیسائیوں نے ابن مریم کی شان میں مبالغہ کیا۔ میں تو ایک بندہ خدا ہوں۔

غرض حضور ﷺ نے مظاہر اور لباس میں غیر مسلموں کے ساتھ تشبہ سے منع فرمایا۔ حرکات و سکنات اور طور طریقوں میں بھی تشبہ بالکفار سے منع کیا گیا۔ قول و فعل میں تشبہ سے منع کیا گیا۔ کیونکہ اس ظاہری شکل و صورت کے پس منظر میں درحقیقت وہ تصورات ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر ایک نظریۂ حیات دوسرے نظریہ سے ' ایک نظام زندگی دوسرے نظام سے اور کسی ایک قوم کا شعار دوسری اقوام کے شعار سے مختلف ہو جاتا ہے۔

امت مسلمہ اس لئے برپا ہوئی ہے کہ وہ دنیا میں اسلامی نظام قائم کرے۔ لہٰذا مسلمانوں کو سختی سے منع کیا گیا کہ وہ اللہ اور اسلامی نظام زندگی کے علاوہ کسی اور نظام سے ہدایات حاصل کریں۔ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اس کرۂ ارض پر کسی دوسری قوم کے مقابلے میں ذہنی شکست ہرگز قبول نہ کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو پھر یہی شکست انہیں مجبور کرے گی کہ وہ اس قوم اور اس کی تہذیب کی تقلید کریں۔ امت مسلمہ کو تو اس لئے برپا کیا گیا ہے کہ دوسری اقوام اس کی تقلید کریں اور وہ قیادت سنبھالے۔

(۱) امام مسلم۔ بخاری ابوداؤد (۲) ابوداؤد ' ابن ماجہ

لہٰذا اسے چاہئے کہ وہ اپنے نظریات اور طور طریقے صرف اسی منبع اور سرچشمہ سے حاصل کرے' جس نے اس امت کو قیادت کا درجہ عطا کیا ہے۔ اللہ کے نزدیک مسلمان ہی اعلیٰ و برتر ہیں۔ وہی امت وسط ہیں۔ وہی خیر امت ہیں' جنہیں لوگوں کی قیادت اور بھلائی کے لئے برپا کیا گیا ہے۔ تو پھر ان کے نظریہ و عمل کا سرچشمہ کیا ہونا چاہئے؟ وہ اپنے طور طریقے اور اپنے لئے نظم و ضبط کے اصول کہاں سے اخذ کریں؟ کیا وہ اللہ کو چھوڑ دیں اور ان ذلیل ترین اقوام کو سرچشمہ رشد و ہدایت تسلیم کرلیں' جن کو قعر ذلت سے اٹھانے کے لئے اللہ نے خود مسلمانوں کو اٹھایا تھا!

اسلام نے پوری انسانیت کو ایک اعلیٰ تصور حیات سے روشناس کرایا' اس نے انسانوں کو ایک اعلیٰ نظام زندگی دیا' لہٰذا وہ تو پوری انسانیت کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس اعلیٰ تصور حیات اور اعلیٰ نظام زندگی کے حلقہ بگوش ہو جائے۔ اگر اسلام دوسرے نظاموں اور نظریات کے مقابلے میں' انسانیت کو اپنے پیش کردہ اعلیٰ نظام زندگی اور ارفع نظریۂ حیات کی اساس پر متحد کرنا چاہتا ہے' تو اس کی یہ خواہش کسی تعصب کی بنا پر نہیں ہے۔ بلکہ اسلام تو اللہ کی توحید کا داعی ہے۔ وہ ایک اعلیٰ نظریہ حیات پر اتحاد قائم کرتا ہے۔ وہ ایک اعلیٰ نظام پر پوری انسانیت کو متحد کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ کسی ایسے اتحاد میں شریک نہیں ہوتا جس میں اسلام کے الٰہی نظام حیات کو ترک کیا گیا ہو۔ وہ کسی ایسے اتحاد میں شریک نہیں ہوتا جس کی بنیاد جاہلیت پر رکھی گئی ہو اور یقیناً یہ کوئی تعصب نہیں ہے۔ کیا یہ تعصب ہے؟ اگر ہے تو پھر یہ نیکی' سچائی اور اصلاح حالات کے لئے کی گئی کوشش کا تعصب ہے اور ایسے تعصب پر میں قربان جاؤں!

تحریک اسلامی کو چاہئے کہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کرلے کہ کیوں وہ ایک مخصوص قبلہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتی ہے؟ قبلہ محض ایک مکان ہی نہیں جس کی طرف نماز کے وقت مسلمان رخ کرتے ہیں۔ مکان اور سمت تو محض ایک اشارہ ہے۔ دراصل یہ امتیاز و خصوصیت کا اشارہ ہے اور یہ نظریہ کا امتیاز ہے' تشخص کا امتیاز ہے' نصب العین کا امتیاز ہے' ترجیحات کا امتیاز ہے اور امت کے عناصر ترکیبی کا امتیاز ہے۔

اس وقت دنیا جاہلی تصورات سے اٹی پڑی ہے اور مسلمان اس دنیا کے بیچ میں کھڑے ہیں۔ جاہلیت پر مبنی بے شمار نصب العین ہیں جنہیں لوگوں نے اپنایا ہوا ہے۔ بے شمار جاہلی ترجیحات ہیں جو انسانوں کے دل و دماغ پر سوار ہیں۔ جاہلیت کے بے شمار جھنڈے ہیں جو مختلف لوگوں نے اٹھا رکھے ہیں لہٰذا آج کی ضرورت یہ ہے کہ امت مسلمہ اپنا ایک علیحدہ تشخص قائم کرے جو آج کے مروجہ تشخصات کے ساتھ گڈمڈ نہ ہو وہ اپنی زندگی اور اپنے وجود کے لئے ایک جدا نظریہ اور ایک ممتاز فلسفہ متعین کرے۔ جو جاہلی تصورات اور جاہلی فلسفوں سے مختلف ہو۔ وہ اپنے لئے ایک ایسا نصب العین وضع کرے اور اپنے لئے ایسی ترجیحات متعین کرے جو خاص اس کی شخصیت اور اس کے نظریۂ حیات سے ہم آہنگ ہوں۔ وہ ایک ایسا ممتاز جھنڈا بلند کرے جو صرف للہیت پر مبنی ہو' اس کا طرۂ امتیاز یہ ہونا چاہئے کہ وہ امت وسط ہے' وہ امت وسط جسے اللہ نے انسانوں کی بہتری کے لئے برپا کیا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ ان تک وہ نظریاتی میراث منتقل کر رہی ہے جس کی وہ امین ہے۔

یہ عقیدہ ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ یہ امت اس عقیدے کی وارث اور امین ہے۔ وہ زمین پر خلافت الٰہیہ کی منصب دار ہے اور یہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ امت لوگوں پر گواہ ہوگی اور اس کے فرائض میں یہ داخل ہے کہ کل عالم بشریت کی قیادت کرے۔ کدھر! اللہ کی طرف اور اسلامی نظام کے قیام کی طرف۔ غرض اسلامی نظام زندگی کا قیام ہی اس کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اسی سے اس کی شخصیت قائم ہوتی ہے۔ اس کے وجود کے عناصر ترکیبی' اس کی شخصیت کا امتیاز' اس کے مقاصد' اس کی ترجیحات' اس کا علم اور اس کا شعار غرض یہ سب کچھ اس کے نظریات کا مرہون منت ہے۔ یہ نظریہ ہی ہے جو اسے قیادت کا مقام عطا کرتا ہے۔ یہ نظریہ ہی ہے جس کی

خاطر اس کی تخلیق ہوئی۔ اس نظریہ کے سوا وہ جو لباس پہنے، جو تحریک بھی شروع کردے، جو علم بھی بلند کرے، وہ امتیاز حاصل نہ کرسکے گی، وہ جاہلی تحریکات کے سیلاب میں بہہ جائے گی اور اس کے خدوخال ہمیشہ مبہم رہیں گے۔ تحریک اسلامی کے فلسفہ و حکمت پر روشنی ڈالنے کے بعد اب ہم تشریح آیات کی طرف آتے ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

# درس نمبر ۸ تشریح آیات (۱۴۲ تا ۱۵۲)

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ
قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿١٤٢﴾
وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ
الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۗ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ
مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا
عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ
لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿١٤٣﴾

ترجمہ: نادان لوگ ضرور کہیں گے! انہیں کیا ہوا کہ پہلے یہ جس قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے' اس سے یکایک پھر گئے؟ اے نبی! ان سے کہو کہ "مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے" اور اس طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک "امت وسط" بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

پہلے جس طرف تم رخ کرتے تھے' اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لئے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے۔ یہ معاملہ تو بڑا سخت تھا مگر ان لوگوں کے لئے کچھ بھی سخت ثابت نہیں ہوا جو اللہ کی ہدایت سے فیض یاب تھے' اللہ تمہارے اس ایمان کو ہرگز ضائع نہ کرے گا یقین جانو کہ وہ لوگوں کے حق میں نہایت شفیق رحیم ہے۔"

قرآن کریم کے سیاق و سباق اور مدینہ طیبہ میں رونما ہونے والے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ سفہاء سے مراد یہاں یہودی ہیں۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے تحویل قبلہ کے موقع پر غوغا آرائی کی تھی۔ وہی تھے جنہوں نے یہ سوال اٹھایا تھا: " مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا " ( "کیا وجہ تھی کہ وہ پہلے جس قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اس سے وہ یکایک پھر گئے") اور جس قبلہ کی طرف وہ نماز پڑھتے تھے وہ بیت المقدس تھا۔

حضرت براء ابن عازب ؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں! حضور ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو وہ انصار میں سے اپنے ننھیال کے ہاں اترے اور آپ ﷺ یہاں سولہ یا سترہ ماہ تک' مسجد اقصیٰ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔ لیکن دل ہی دل میں آپ ﷺ کو یہ بات اچھی لگتی کہ کاش قبلہ بیت اللہ کی طرف پھر جائے۔ ایک دن نماز عصر کا وقت تھا کہ وحی الٰہی سے قبلہ تبدیل ہو گیا اور آپ نے نماز عصر بیت اللہ کی طرف منہ کر کے پڑھی۔ لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ قبلہ تبدیل کیا۔ پھر ایک صاحب نماز پڑھ کر نکلے تو دیکھا کہ لوگ ایک دوسری مسجد میں نماز پڑھ رہے ہیں اور رکوع کی حالت میں ہیں۔ اس شخص نے کہا! "میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے حضور ﷺ کے پیچھے ابھی ابھی نماز پڑھی ہے اور ہم نے بیت اللہ کی طرف منہ کیا۔" چنانچہ وہ لوگ اسی طرح حالت رکوع میں کعبہ کی طرف پھر گئے۔

یہودی اس پر بہت خوش تھے کہ حضور ﷺ ان کے قبلہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں' لیکن جب قبلہ بدل گیا' تو انہوں نے بہت ہی برا محسوس کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ("اے نبی ﷺ یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھتے ہیں۔")

اس پر احمقوں یعنی یہودیوں نے کہا: مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ("انہیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ جس قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اس سے یکایک پھر گئے۔")(۱)

آنے والی آیات کے دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ جس قدر قرآن مجید نے ان لوگوں کے سوالات و اعتراضات کے تفصیلی جوابات دیئے اس لئے کہ ان کے پروپیگنڈے کے اثرات بھی مسلمانوں کے دل و دماغ کو متاثر کر رہے تھے۔ اس بات کا اندازہ قرآن کے طرز تعبیر سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ("نادان لوگ ضرور کہیں گے! انہیں کیا ہوا کہ پہلے یہ جس قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اس سے یکایک پھر گئے۔")

یہ آیات درحقیقت آنے والی آیات تحویل قبلہ کے لئے تمہید کا کام دے رہی ہیں۔ بات سوال و جواب کی صورت میں کی جا رہی ہے۔ اللہ کو علم تھا کہ ناراض لوگ ایسے سوالات اٹھائیں گے' لہٰذا بطور پیش بندی از خود جواب دے دیا گیا۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ تحویل قبلہ کا حکم آپ کا تھا' جس طرح حدیث میں ذکر ہوا' مخالفین نے بھی سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دی تھی' لیکن اللہ تعالیٰ نے مستقبل کا انداز بیان اختیار کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ ان کے پروگرام کے مطابق ہے۔ ان کا یہ منصوبہ کوئی پوشیدہ منصوبہ نہ تھا' لہٰذا اس کا جواب بھی پہلے سے تیار تھا۔ تردیدی مقاصد کے لئے یہ انداز بیان بے حد پر تاثیر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لوگ ایسا کہیں گے! حالانکہ وہ کہہ چکے ہوتے ہیں۔

قرآن پہلے سے مخالفین کے سوالات کے جوابات نبی ﷺ کو بتا دیتا ہے' تاکہ جب بھی وہ سوال اٹھائیں مسلمان جواب دے دیں' چنانچہ اس سلسلے میں تحریک اسلامی کو پہلے سے ایک صحیح نقطہ نظر دے دیا جاتا ہے۔ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ("کہو! مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے' سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔")

شرق و غرب سب اللہ کے ہیں' جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔ ذاتی طور پر کسی سمت یا کسی جگہ کو کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوئی ہے۔ ہاں اللہ کسی سمت و مکان کے بارے میں کوئی حکم دیتا ہے یا کسی جگہ کو وہ خود اختیار کرتا ہے تو یوں اس بات سے فضیلت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ تو اللہ ہے کہ جسے چاہے سیدھی راہ پر لگا دے۔ اگر وہ اپنے بندوں کے لئے کوئی سمت اختیار کرے' ان کے لئے کسی مکان کو قبلہ قرار دے دے' تو پھر وہ جگہ ممتاز و محترم ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ اللہ کا حکم وابستہ ہو گیا' لہٰذا صراط مستقیم اس سمت سے گزرتا ہے' باقی سب سمتیں ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔

اس ایک فقرے ہی میں مکان و جہت کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس سرچشمے کی نشاندہی ہو جاتی ہے جو انسان کے لئے مصدر ہدایت ہے۔ یوں ایک صحیح نقطۂ نظر سامنے آ جاتا ہے۔ کیا؟ یہ کہ ہر حال میں' زندگی کے ہر موڑ پر' ذات باری تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جانا۔

(۱) روایت امام مالک: مسلم' بخاری اور ترمذی

اب روئے سخن امت مسلمہ کی طرف ہو جاتا ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ اس کائنات میں وہ کس عظیم مرتبے کی حامل ہے اور اس کرۂ ارض پر اسے کیا فرائض سرانجام دینے ہیں؟ عالم انسانیت میں اسے کیا فضیلت و برتری حاصل ہے؟ لوگوں کی زندگی میں اسے کیا رول ادا کرنا ہے۔ اس مقام اور مرتبے کا تقاضا ہے کہ اس کا ایک خاص قبلہ ہو۔ وہ ایک مخصوص تشخص کی مالک ہو۔ چھوڑیئے اور باتیں! اس رب عظیم کی سنئے جس نے اس امت کو اس عظیم مشن کے لئے منتخب کیا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

("اس طرح تو ہم نے تمہیں ایک امت وسط" بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔")

یہ امت وسط ہے۔ لوگوں پر گواہ ہے۔ اس کا فرض ہے کہ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرے۔ ان کے لئے معیار حق و اقدار حیات کا تعین کرے۔ ان کو ایسی رائے دے جو رائے عامہ بن جائے۔ اور لوگ اس پر اعتماد کریں۔ وہ تمام دنیا کے لوگوں کی اقدار' ان کے نظریات' ان کے رسم و رواج اور ان کے قومی شعاروں کا بغور جائزہ لے اور اپنا فیصلہ سنا دے! یہ حق ہے اور یہ باطل!" وہ کوئی ایسی امت نہیں ہے کہ دوسری اقوام سے نظریات' اقدار اور معیار حسن و قبح حاصل کرے۔ وہ لوگوں پر گواہ ہے اور ایک منصف اور جج کے منصب پر فائز ہے۔ جس طرح وہ لوگوں پر گواہ ہے۔ خود رسول ﷺ اس پر گواہ ہیں۔ حضور ﷺ اس امت کے لئے اقدار حیات اور معیار حق تجویز کریں گے۔ اس کے اعمال اور رسم و رواج کے بارے میں فیصلہ دیں گے۔ اس کے افعال و اقوال کے بارے میں آخری فیصلہ حضور ﷺ دیں گے۔ اس سے اس امت کی حقیقت اور اس کے فرائض معلوم ہو جاتے ہیں۔ اسے چاہئے کہ اپنی حقیقت سے اچھی طرح روشناس ہو جائے۔ اپنی اہمیت اور قدر و قیمت جانے اور اس دنیا میں اپنے منصب و کردار کو ٹھیک طرح متعین کرے اور اسے ادا کرنے کے لئے اپنے آپ کو پوری طرح تیار بھی کرے' یعنی وہ لوگوں کے لئے معیار حق ہو اور حضور ﷺ اس کے لئے معیار حق ہوں۔

یہ امت' امت وسط ہے۔ وسط کے ہر مفہوم کے اعتبار سے وہ وسط ہے۔ وسط کا مفہوم اگر احسن و افضل ہو' تو پھر بھی یہ وسط ہے۔ وسط کا مفہوم اگر میانہ روی اور اعتدال لیا جائے تو بھی یہ وسط ہے۔ وسط سے مراد اگر مادی اور حسی وسط مراد ہو تو بھی یہ امت' امت وسط ہے۔

"امت وسط" عقائد و نظریات میں وسط' میانہ رو' نہ روحانی تجرد میں ڈوبی ہوئی اور نہ مادہ پرستی میں گرفتار' بلکہ اصول فطرت کو اپنائے ہوئے ہے۔ مثلاً انسانی جسم کیا ہے؟ ایک مادہ ہے اور روح کو جسم مادی میں پیوست کیا گیا ہے یا مادی جسم کو روح کے ساتھ ایک کر دیا گیا ہے۔ یہ امت ان مختلف عناصر کے مرکب اس انسان کو' بلکہ اس کے عناصر ترکیبی میں سے ہر عنصر کو اس کا پورا پورا حق دیتی ہے۔ وہ روحانی زندگی کی ترقی اور کمال کے لئے بھی کام کرتی ہے اور انسان کی مادی ضروریات پوری کر کے اس کی اس مادی زندگی کی بقا کا کام بھی کرتی ہے۔ یہ امت انسان کی آزادی فکر' اس کی آزادی اظہار خیال اور اس کی ذاتی ذوق و شوق کی تسکین کے لئے بلا افراط و تفریط' میانہ روی اور ہم آہنگی اور اعتدال کے ساتھ' ایک وسیع دائرہ مقرر کرتی ہے اور انسان کو اس دائرے میں پوری پوری آزادی دیتی ہے۔

یہ امت وسط ہے' فکر و شعور کے میدان میں بھی' یہ موجودہ ذخیرۂ علم پر قانع اور منجمد ہو کر نہیں بیٹھ جاتی اور نہ علم و معرفت اور تجربہ و تحقیق کے دروازے بند کر دیتی ہے' لیکن وہ ہر سوچے سمجھے بغیر ہر نعرہ باز کے پیچھے بھی نہیں لگ جاتی۔ بندر کی طرح ہر کسی کی نقل بھی نہیں کرتی۔ وہ اپنے نظریات' اصول اور نظام فکر و عمل کی محافظ بن جاتی ہے اور انہیں مضبوطی سے تھامے ہوئے ہوتی ہے' لیکن پوری انسانیت کے افکار و تجربات پر بھی کڑی نظر رکھے ہوئے ہوتی ہے۔ اور اس کی مستقل پالیسی یہ ہے! "سچائی مومن کا سامان گم گشتہ ہے۔ جہاں

اسے مل گیا وہ اسے اٹھا لے گا۔" لیکن ثابت قدمی' مستقل مزاجی اور یقین کے ساتھ۔

وہ نظم و ضبط میں بھی امت وسط ہے۔ وہ کار گاہ حیات میں انسان کو' اس قدر آزاد بھی نہیں چھوڑتی کہ اس پر ضمیر و شعور کے سوا کوئی خارجی چیک نہ ہو۔ اس طرح وہ اسے پوری طرح خشک قانونی جکڑ بندی اور جبری اصلاح کے طریقوں کے رحم و کرم پر بھی نہیں چھوڑ دیتی بلکہ وہ ایک طرف رشد و اصلاح کے ذریعہ ضمیر و شعور کو ابھار کرتی ہے اور معاشرے میں نیکی کا شعور پیدا کرتی ہے۔ لیکن دوسری طرف سے قانونی نظام اور تعزیری تادیب کے ذرائع بھی استعمال میں لاتی ہے اور معاشرے کو منظم کرتی ہے۔ بلکہ وہ رشد و ہدایت اور قانون و تعزیر کے درمیان ایک حسین امتزاج کی قائل ہے۔ نہ وہ انسان کو صرف قانون کی جبریت کے حوالہ کرتی ہے اور نہ اس قدر آزاد چھوڑتی ہے۔

یہ امت' امت وسط ہے۔ روابط و تعلقات میں بھی امت وسط ہے۔ وہ فرد کے ذاتی وجود کو بھی ایک حقیقت تصور کرتی ہے۔ اس لئے اسے بالکل یہ نظر انداز نہیں کرتی کہ فرد کی شخصیت کو جماعت یا ریاست کی شخصیت میں بالکل گم کر دیا جائے۔ نہ ہی اس کو اس قدر آزاد چھوڑتی ہے کہ وہ یکلخت خود سر ہو جائے اور اس کے سامنے اپنی ذات کے سوا کچھ نہ رہے۔ وہ فرد کے ان ذاتی رجحانات اور ان ذاتی قوتوں کو آزاد چھوڑ دیتی ہے جن کے نتیجے میں معاشرے میں حرکت اور فعالیت پیدا ہو اور وہ ترقی کرے۔ وہ ایسے رجحانات اور ایسی خصوصیات کو آزادی دیتی ہے' جن سے فرد کی ذات اور اس کی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہو۔

اس کے بعد وہ سوچ سمجھ کر ایسی پابندیاں عائد کرتی ہے جو غلو اور افراط و تفریط کو منضبط کر دیں۔ عام طور پر وہ ایسی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے جن سے جذبہ خدمت خلق پیدا ہو' لیکن اس کے بعد ایسی قانونی تدابیر بھی اختیار کرتی ہے جن کے ذریعہ فرد جماعت کا خادم ہو اور ریاست اور جماعت فرد کی کفیل ہوں اور امت وسط یہ کام بڑی ہم آہنگی سے انتہائی مناسب طریقے سے سرانجام دیتی ہے۔

جغرافیہ کے لحاظ سے بھی یہ امت وسط ہے۔ وہ زمین کے درمیان میں رہتی ہے۔ کرۂ ارض کے آباد علاقے کے مرکز میں' روئے زمین پر جہاں یہ امت آباد ہے وہ شمال و جنوب اور شرق و غرب کے عین وسط میں واقعہ ہے۔ انسان پر وہ گواہ اور پوری انسانیت اس پر گواہ۔ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کو تمام باشندگان زمین کو عطا کرتی ہے اور اس امت کے واسطہ ہی سے قدرت کے مادی خزانے اور روحانی خزانے پوری انسانی آبادی تک پہنچتے ہیں۔ اور وہ اس اہم مقام عالی پر حاکم و مختار ہے۔ اور تمام دنیا کی مادی اور روحانی حرکات اس کے زیر اثر نظر آتی ہیں۔

مکان کے بعد زمانی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بھی یہ امت' امت وسط ہے۔ انسان کا عہد طفولیت آتے آتے اس امت پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس امت سے' عقل و دانش کا دور بلوغ شروع ہوتا ہے۔ انسان کے عہد طفولیت سے' اس کے ساتھ اوہام و خرافات کی آلودگی چلی آرہی تھی۔ یہ امت وسط' انسانی تاریخی ادوار کے وسط میں کھڑی اسے جھاڑ رہی ہے۔ اور اس دور بلوغ میں بھی اسے فتنہ خود سری اور عقلی بے راہ روی سے بچا رہی ہے۔ اس نے پیغمبروں کے دور کی خدائی ہدایات و تعلیمات اور عقل و حکمت کے دور جدید کے علمی انکشافات کے درمیان ایک حسین ہم آہنگی پیدا کر دی ہے اور وہ عین وسط میں راہ مستقیم پر پوری انسانیت کو لے کر چلتی نظر آتی ہے اور ہر وقت نقطہ اعتدال پر رہتی ہے۔

یہ تھا وہ مقام جو کبھی اللہ میاں نے اس امت کو بخشا تھا۔ کیا وہ اسے آج دوبارہ نہیں حاصل کر سکتی؟ یقیناً وہ اسے دوبارہ حاصل کر سکتی ہے۔ اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ اس امت نے اس نظام زندگی کو ترک کر دیا ہے' جسے اللہ نے اس کے لئے پسند کیا تھا۔ اس کے بجائے اس نے دوسرے نظام ہائے زندگی کو اپنا لیا ہے' جنہیں اللہ نے اس کے لئے پسند نہیں کیا۔ اس امت نے کچھ دوسرے رنگ ڈھنگ اختیار کر لئے ہیں۔ جن میں سے ایک بھی صبغۃ اللہ نہیں ہے۔ حالانکہ اللہ کی مرضی یہ تھی کہ یہ امت خالص اللہ

کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو۔

یہ ہے امت اور یہ ہے اس کا مشن اور یہ ہے اس کا رول۔ وہ اس لائق ہے کہ یہ ذمہ داریاں اٹھائے اور اس راہ میں قربانی دے۔ مقام قیادت کے لئے جو کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ کچھ فرائض ہوتے ہیں۔ مقام قیادت کے حصول سے پہلے آزمائشیں ضروری ہوتی ہیں تاکہ معلوم ہو کہ امت' اللہ کے معاملے میں کس قدر مخلص و یکسو ہے۔ اور وہ کس حد تک ایک صالح قیادت کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے تیار ہے۔

تحویل قبلہ کا حکم صادر ہو گیا اور اس موقع پر اس بات کی وضاحت بھی ہو گئی کہ مسلمانوں کو کیوں حکم دیا گیا تھا کہ وہ مسجد اقصیٰ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ "پہلے جس قبلے کی طرف تم رخ کرتے تھے اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لئے قبلہ مقرر کیا ہے کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے۔"

اس آیت سے وہ منصوبہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے جو اس نوخیز جماعت کی دینی تربیت کے لئے اللہ تعالیٰ نے وضع کیا تھا' اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ جماعتِ اسلامی نظریہ کی وارث و امین ہو گی اور خلافت فی الارض کا منصب حاصل کرے گی۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ تھی کہ امت خالصتاً اس نظریۂ حیات کے لئے کام کرے اور وہ اپنے دل و دماغ کو تمام جاہلی تصورات کے اثر سے پاک کر دے۔ وہ تمام قدیم عادات اور قومی خصوصیات ترک کر دے۔ جاہلیت کی ہر سلگتی ہوئی چنگاری کو بجھا دے۔ جاہلیت کے تمام لباس اتار پھینکے۔ جاہلیت کا ہر شعار ترک کر دے۔ اس کے شعور میں صرف اسلامی سند ہو' خالص اسلامی شعار' ہر آمیزش سے پاک شعار۔ اس کے رشد و ہدایت کا سرچشمہ ایک اور صرف ایک ہو' کوئی دوسرا سرچشمہ اس میں شریک نہ ہو۔

بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کے معاملہ میں نظریاتی رجحان کے علاوہ کچھ اور رجحانات بھی تھے۔ قریش مکہ کے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم ؑ کا خالص اسلامی نظریہ ان کے ہاں خالص نہ رہا تھا۔ اس میں مختلف اقسام کی شرک داخل ہو چکی تھی اور قومی عصبیت بھی ان کے دین کا حصہ بن چکی تھی۔ اس وقت بیت اللہ صرف عربوں کا ایک مقدس مقام تصور ہوتا تھا اور اللہ کی رضا اس میں تھی کہ وہ عربوں کے بجائے اللہ تعالیٰ کا مقدس مقام ہو۔ اور اللہ کی نسبت کے سوا اس کی طرف کوئی اور نسبت نہ ہو۔ اور یہ مقام صرف ربانی شعار ہو' کوئی اور نسبت اس سے منسلک نہ ہو۔

چونکہ کعبہ شریف کے ساتھ عربوں کے تاریخی جذبات بھی وابستہ تھے۔ اور قومی میلانات بھی وابستہ تھے' اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک مختصر عرصے کے لئے یہ حکم دیا کہ مسلمانوں کا قبلہ' کعبہ شریف کے بجائے مسجد اقصیٰ ہو گا تاکہ عربوں کے دلوں سے خانہ کعبہ کے سلسلے میں تاریخی اور قومی میلانات کی جڑ کٹ جائے' پھر یہ بھی معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں میں سے کون ہے جو رسول خدا ﷺ کی اطاعت کرتا ہے اور کون ہے جو نہیں کرتا۔ وہ لوگ جو رسول ﷺ کی اطاعت محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ رسول خدا ہیں' ان لوگوں سے جدا ہو جائیں جو اس لئے آپ کے مطیع فرمان ہیں کہ آپ عرب ہیں اور خانہ کعبہ کو قبلہ و کعبہ سمجھتے ہیں' اور اس وجہ سے کہ ان کے قومی شعور اور ان کے قدیم مقامات مقدسہ کے احترام کے جذبات کو اسلام میں بھی اہمیت دی جاتی اور یہ کہ ان کے تاریخی میلانات کا سامان تسکین اسلام میں بھی ہے اور ضرور اسی وجہ سے وہ مسلمان ہیں۔

یہ ایک نہایت ہی لطیف اور دقیق نکتہ ہے۔ اسلام کا نظریۂ حیات وحدہ لاشریک ہے اور جب وہ کسی دل میں جاگزیں ہو جائے تو پھر اس دل میں وہ کسی اور شریک کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ اپنے شعار اور اپنی خصوصیات کے سوا تمام دوسرے شعارات و خصوصیات کو ختم کر دیتا ہے۔ اسلامی نظریہ حیات تمام جاہلی تصورات اور جاہلی طور طریقوں کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ بڑے ہوں یا چھوٹے۔ یہ آیت اس طرف اشارہ

کرتی ہے وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ "پہلے جس قبلہ کی طرف تم رخ کرتے تھے' اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لئے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ تو مستقبل میں ہونے والے واقعات سے قبل از وقوع ہی باخبر ہیں' لیکن ارادۂ الٰہی یہ ہوتا ہے کہ ہونے والا واقعہ لوگوں پر ظاہر ہو جائے اور اس کے بعد محاسبہ کیا جائے اور سزا دی جائے۔ وہ اپنے رحم و کرم کی وجہ سے محض اپنے علم مستقبل کی بنا پر سزا نہیں دیتا۔ صرف ان امور پر سزا دیتا ہے جو واقع ہو جائیں اور مجرم سے ان کا صدور ہو جائے۔

یہ بات اللہ کے علم میں تھی تمام تاریخی اور قومی شعوری رجحانات کو یکلخت ترک کر دینا' ایسی خصوصیات اور شعارات کو جو دل و جان سے اٹکی ہوئی ہوں اور جو دل و دماغ میں رچی بسی ہوں' یکلخت ترک کر دینا ایک نہایت ہی مشکل کام ہے' نہایت ہی شاق ہوتا ہے ان کا اکھاڑ پھینکنا۔ یہ کام صرف اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب ایمان دل و دماغ پر پوری طرح چھا جائے اور پھر اس دل کو خدائی امداد حاصل ہو اور ذات باری کا قرب حاصل ہو۔ ذات باری اسے اپنے ساتھ ملا لے اور اس کی راہنمائی کرے۔ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ "یہ معاملہ تھا بڑا سخت مگر ان لوگوں کے لئے کچھ بھی سخت ثابت نہ ہوا' جو اللہ کی ہدایت سے فیض یاب تھے۔"

چونکہ وہ ہدایت الٰہی سے فیض یاب ہے' اس لئے ان کے لئے' اپنے دل و دماغ سے جاہلی تصورات کو نکال دینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اور انہوں نے ہدایت پاتے ہی جاہلیت کے تمام نشانات کو پرے پھینک دیا۔ یہ امت اللہ کی امت بن گئی۔ سمع و طاعت اس کا شعار ہو گیا اور حالت یہ ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ جس طرف چاہیں اسے ادھر موڑ دیں۔ رسول اللہ ﷺ جدھر چاہیں انہیں لے جائیں۔

اب مسلمانوں کو ان کے ایمان اور ان کی نماز کے بارے میں اطمینان دلایا ہے کہ وہ راہ ہدایت پر گامزن ہیں۔ اس لئے ان کی نمازیں ضائع نہیں ہو سکتیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔ وہ اس کی جو عبادت بھی گزارتے ہیں' اسے ضائع نہیں کرتا' وہ ان پر ایسا بوجھ بھی نہیں ڈالتا جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو۔ اگرچہ یہ طاقت ایمان کی وجہ سے قوی تر ہو جاتی ہے بلکہ دوچند ہو جاتی ہے:

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (١٤٣) "اللہ تمہارے ایمان کو ہرگز ضائع نہ کرے گا یقین جانو کہ وہ تم لوگوں کے حق میں نہایت شفیق و رحیم ہے۔"

وہ انسان کی طاقت اور قوت برداشت سے اچھی طرح باخبر ہے۔ لہٰذا وہ کوئی ایسا حکم صادر نہیں کرتا' جو ان کے دائرہ طاقت سے باہر ہو۔ وہ تو انسان کی راہنمائی کرتا ہے۔ اور اگر ان کی نیت ٹھیک ہو' عزم پختہ ہو تو وہ ہر امتحان میں خود ان کی امداد کرتا ہے تاکہ وہ کامیابی کے ساتھ اس آزمائش سے نکل آئیں۔ اگر امتحان و آزمائش اس کی حکمت کا مظہر ہیں' تو آزمائش میں پورا اترنا اس کا فضل و کرم ہے:

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ "یقین جانو کہ وہ تم لوگوں کے حق میں شفیق و رحیم ہے۔")

یوں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دلوں میں طمانیت قلب کا جام انڈیل دیتا ہے۔ ان کی بے اطمینانی دور ہو جاتی ہے۔ اور ان کے دلوں میں رضائے الٰہی کا پختہ شعور اور یقین پیدا ہو جاتا ہے۔

اب اعلان ہوتا ہے کہ قبلہ کے معاملہ میں رسول خدا ﷺ کی خواہش پوری کر دی گئی۔ تحویل قبلہ کا اعلان ہو جاتا ہے' لیکن ساتھ ساتھ مسلمانوں کو یہودیوں کی فتنہ انگیزی سے بھی باخبر کر دیا جاتا ہے۔ ان عوامل اور محرکات سے بھی پردہ اٹھایا جاتا ہے جو اس فتنہ انگیزی اور مسلسل سازشوں کے پس منظر میں کام کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس انداز میں کہ تحریک اسلامی کو اس عظیم جدوجہد کا صحیح علم ہو جائے' جو خداوند کی طرف سے اس کی تنظیم و تربیت کے لئے کی جا رہی ہے جو مخالفین کی فتنہ انگیزیوں اور غوغا آرائیوں سے بچانے کے لئے' اس کی خاطر کی جا رہی ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً

تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا
وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ
وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝١٤٤ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ
قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ
اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝١٤٥ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ
اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝١٤٦ اَلْحَقُّ مِنْ
١٧ ع٢ ١ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝١٤٧ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا
الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝١٤٨ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ
وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝١٤٩ وَمِنْ حَيْثُ
خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا
وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۗ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۗ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُوْنَ ۝١٥٠

یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ لو ہم اس قبلے کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو' مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں تم ہو اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔

یہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی ہے' خوب جانتے ہیں کہ تحویل قبلہ کا یہ حکم ان کے رب ہی کی طرف سے ہے اور برحق ہے' مگر اس کے باوجود جو کچھ یہ کر رہے ہیں' اللہ تعالیٰ اس سے غافل نہیں ہے۔ تم ان اہل کتاب کے پاس خواہ کوئی نشانی لے آؤ' ممکن نہیں کہ یہ تمہارے قبلے کی پیروی کرنے لگیں اور نہ تمہارے لئے یہ ممکن ہے کہ ان کے قبلے کی پیروی کرو' اور ان میں سے کوئی گروہ بھی دوسرے کے

قبلے کی پیروی کے لئے تیار نہیں ہے اور اگر تم نے اس علم کے بعد 'جو تمہارے پاس آچکا ہے' ان کی خواہشات کی پیروی کی تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہو گا' جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے 'وہ اس مقام کو (جسے قبلہ بنایا گیا ہے) ایسا پہچانتے ہیں 'جیسا کہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ مگر ان میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے حق کو چھپا رہا ہے۔ یہ قطعی ایک امر حق ہے تمہارے رب کی طرف سے 'لہٰذا اس کے متعلق تم ہرگز کسی شک میں نہ پڑو۔

ہر کے لئے ایک رخ ہے' جس کی طرف وہ مڑتا ہے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو' جہاں بھی تم ہو گے' اللہ تمہیں پالے گا۔ اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔ تمہارا گزر جس مقام سے بھی ہو' وہیں سے اپنا رخ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف پھیر دو 'کیونکہ یہ تمہارے رب کا بالکل برحق فیصلہ ہے۔ اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ اور جہاں سے بھی تمہارا گزر ہو' اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیرا کرو' اور جہاں بھی تم ہو' اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی حجت نہ رہے۔ ہاں جو ظالم ہیں ان کی زبان کسی حال میں بند نہ ہو گی تو ان سے تم نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ اور اس لئے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں گا اور اس توقع پر کہ میرے حکم کی پیروی سے تم فلاح کا راستہ پاؤ گے۔")

ان آیات کے شروع میں نبی ﷺ کی حالت کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی گئی تھی! قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ("اے رسول! یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔")

اس سے اس شدید خواہش کا اظہار ہوتا ہے جو آپ ﷺ تحویل قبلہ کے سلسلے میں رکھتے تھے۔ یہودیوں کی کٹ حجتیوں اور دلیل بازیوں سے مجبور ہو کر آپ ﷺ یہ چاہنے لگے تھے کہ مسلمانوں کا موجودہ قبلہ بدل جائے۔ چونکہ مسلمان یہودیوں کے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے اور یہودیوں نے اس غلط پروپیگنڈے' غوغا آرائی اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی تھی' اس لئے حضور ﷺ اپنی دلی خواہش کے تحت' بار بار منہ آسمان کی طرف اٹھاتے' ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی بات کا اظہار نہ کرتے' اس خوف سے کہ جناب باری میں وہ کوئی تجویز پیش کرنے کی جرات کیسے کریں؟ یا از خود کوئی بات اللہ کے سامنے لائیں۔ مبادا کہ اللہ کو پسند نہ ہو لیکن اللہ نے اس کی خواہش پوری کر دی۔ اور جن الفاظ میں یہ خواہش پوری کی گئی ہے' ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کو اپنے حبیب کی رضا منظور تھی۔

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ("تو ہم اسی قبلہ کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں' جسے تم پسند کرتے ہو۔")

اب اس قبلہ کا تعین ہو جاتا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ آپ کی مرضی بھی اسی میں ہے: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ("مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو۔")

اب یہ تمہارا قبلہ ہے تمہاری امت کا قبلہ ہے۔ جو لوگ تمہارے ساتھ موجود ہیں ان کا اور جو آنے والے ہیں ان کا تاقیامت' قبلہ ہے۔ اس وقت تک جب کرۂ ارض پر اور اس میں بسنے والے آخر کار اللہ کے سامنے پیش ہوں گے:

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ("اب جہاں کہیں تم ہو' اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔")

ہر سمت سے کرۂ ارض کے تمام اطراف و جوانب سے' اب یہ ایک ہی قبلہ ہے اور امت کا ہر فرد اسی طرف رخ کرے گا جہاں کہیں بھی وہ رہتا ہو' چاہے وطن کوئی بھی ہو' محل وقوع دور دراز ہی کیوں نہ ہو۔ چاہے ان افراد کے رنگ جدا جدا ہوں' زبانیں مختلف ہوں اور قومیتیں الگ ہوں لیکن قبلہ ایک ہو گا۔ اور امت مسلمہ چاہے شرق میں ہو یا غرب میں' اس سمت میں قبلہ رخ ہو گی۔ یوں اس امت میں احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایک جسم ہے' ایک جان ہے' ایک ہی نصب العین اس کے سامنے ہے' ایک ہی نظام زندگی کے قیام کے لئے سرگرم عمل ہے۔ وہ نظام جو اسے ایک ہی تصور' ایک ہی رسول' اور ایک ہی قبلہ عطا کرتا ہے۔

ہے۔ وہ نظام جو اسے ایک ہی تصور' ایک ہی رسول اور ایک ہی قبلہ عطا کرتا ہے۔

یوں اللہ نے اس امت کو جوڑ دیا۔ ایک خدا' ایک رسول' ایک دین اور ایک قبلہ۔ قومیت و اوطان اور السنہ و الوان کے اختلاف کے باوجود ایک امت رنگ و نسل اور لسان و وطن کے تمام اصولوں کو نظر انداز کر دیا گیا اور وحدت امت کی اساس اسلامی نظریۂ حیات اور وحدت قبلہ پر رکھی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی اتحاد بنی آدم کے شایان شان ہے کیونکہ انسان عقیدے اور نظریہ پر متحد ہوتا ہے۔ ایک طرز عبادات اور قبلہ عبادت پر متحد ہوتا ہے جبکہ حیوانات کا اجتماع چارے' چراگاہ اور غار اور باڑے کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

اب موضوع ہے "اہل کتاب اور قبلہ جدید" وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ("یہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی تھی' خوب جانتے ہیں کہ تحویل قبلہ کا یہ حکم ان کے رب ہی کی طرف سے ہے اور برحق ہے۔")

یہ بات ٹھیک ٹھیک ان کے علم میں ہے کہ خانہ خدا یعنی مسجد حرام کی بنیادیں اٹھانے والے حضرت ابراہیم ﷺ تھے۔ اس امت کے جد امجد جو اس مشن کے وارث بنے بلکہ تمام مسلمانوں کے جد امجد' انہیں اس امر کا بھی ٹھیک ٹھیک طرح علم ہے کہ قبلہ جدید کا حکم بھی اللہ ہی کی جانب سے آیا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن اپنی موروثی عادت کے مطابق وہ اپنے اس علم و یقین کے عین مخالف رویہ اختیار کریں گے۔ محض مسلمانوں کی دشمنی اور عناد کی بنا پر' لیکن اللہ ہی ان کا محافظ ہے۔ وہی ہے نگہبان جو ان کی ہر سازش کو برباد کرے گا وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ۱۴۴ ("مگر اس کے باوجود جو کچھ یہ کر رہے ہیں' اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔")

وہ کسی بھی دلیل سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ان کے ہاں فہم دلیل کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اگر وہاں کسی چیز کی کمی ہے تو وہ اخلاص ہے۔ وہ ہوائے نفس کے بندے ہیں اور باوجود علم کے ان میں حق و صداقت کے تسلیم کرنے کی استعداد نہیں ہے: وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ "تم ان اہل کتاب کے سامنے چاہے کوئی دلیل پیش کرو' ممکن نہیں کہ یہ تمہارے قبلے کی پیروی کرنے لگیں۔")

ان کی نکیل ہوائے نفس کے ہاتھ میں ہے۔ دنیاوی مصالح انہیں ہانکے لے جا رہے ہیں اور ذاتی اغراض ان کے لئے حدی خواں ہیں۔ مخلصین میں سے بے شمار لوگ اب بھی ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ اسلام کو اس لئے قبول نہیں کرتے کہ انہیں اسلام کا صحیح علم نہیں ہے۔ یا ان کے سامنے اطمینان بخش طریقے سے' اسلام پیش ہی نہیں کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ایک وہم ہے وہ تو اسلام قبول ہی اس لئے نہیں کرتے کہ انہیں اس کا صحیح صحیح علم ہے! وہ جانتے ہیں کہ اسلام ان کے مفادات کے سرا سر خلاف ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس میں ان کے لئے قیادت و سیادت کا کوئی مقام نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اسلام کے خلاف مسلسل بلا انقطاع سازشیں کرتے چلے جاتے ہیں' مختلف طریقوں سے' مختلف وسائل کے ذریعہ' براہ راست بھی اور بالواسطہ بھی وہ اسلام کے خلاف بر سر پیکار ہیں۔ دو بدو بھی اور پس پردہ بھی۔ وہ اسلام کے خلاف خود بھی لڑتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کے خلاف لڑنے پر آمادہ اور برانگیختہ کرتے ہیں۔ غرض ہر شکل میں وہ یہ کام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ سے جو کہا ہے وہ ہر وقت اس کا مصداق ہیں وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ("تم اہل کتاب کے سامنے چاہے کوئی دلیل پیش کرو' ممکن نہیں کہ وہ تمہارے قبلے کی پیروی کرنے لگیں۔")

اہل کتاب کا تو حال یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے قبلہ اور اسلامی نظام زندگی سے مسلسل اعراض کرتے چلے آتے ہیں۔ جس کے اشارات اس قبلہ میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے اس موقف کے مقابلے میں نبی ﷺ اور حلقہ بگوشان اسلام کا موقف کیا ہے؟ وَمَا أَنتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ "اور نہ تمہارے لئے یہ ممکن ہے کہ ان کے قبلے کی پیروی کرو" قدرتی طور پر یہ

درست موقف ہے۔)

یعنی آپ ﷺ کی شان کے خلاف ہے کہ آپ ﷺ کسی صورت میں بھی ان کے قبلے کی پیروی کریں' یہاں قرآن نے یہ انداز بیان اختیار کیا "اور آپ بھی ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں" یعنی جملہ اسمیہ منفیہ' اور یہ نہیں کہا کہ "آپ ان کے قبلے کی پیروی نہیں کرتے" کیونکہ پہلے فقرے کے ذریعے حضور ﷺ کی مستقل شان اور اس معاملے میں اپنے موقف سے ڈٹا رہنے کا اظہار اچھی طرح ہوتا ہے اور آپ ﷺ کے بعد امت مسلمہ کو بھی واضح اشارہ مل جاتا ہے کہ وہ بھی اپنے رسول کے اختیار کردہ قبلے کو ہرگز ترک نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ اپنے رسول کی خواہش اور دلجوئی کی خاطر تمہارے لئے پسند کیا ہے۔ وہ اس ربانی جھنڈے کے سوا کوئی اور علم بلند نہ کرے' وہ اسلامی نظام حیات کے علاوہ کسی دوسرے نظام کی پیروی نہ کرے' جس کی طرف تحویل قبلہ میں اشارات موجود ہیں۔ جب تک وہ امت' امت مسلمہ ہے اسے یہی طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو پھر اس کا اسلام سے کوئی واسطہ اور تعلق نہ رہے گا۔ اس کا اسلام محض دعوائے اسلام رہ جائے گا۔

تحویل قبلہ کی مناسبت سے بتایا جاتا ہے کہ خود اہل کتاب کے مابین بھی قبلے کے معاملے میں شدید اختلاف رائے پہلے سے موجود ہے۔ وہ بھی باہم متفق نہیں ہیں کیونکہ ان کی خواہشات نفس بھی مختلف ہیں وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ("اور ان میں سے کوئی گروہ بھی دوسرے گروہ کے قبلے کی پیروی کے لئے تیار نہیں۔")

یہود و نصاریٰ کے درمیان عداوت ہے' مختلف یہودی فرقے باہم ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ پھر مختلف نصرانی فرقے بھی باہم برسرپیکار ہیں۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اہل کتاب کی یہ عداوت ہے اور آپ پر اللہ کی طرف سے سچائی نازل بھی ہو گئی ہے تو پھر آپ کے لئے یہ کیونکر درست ہو سکتا ہے کہ آپ ان کی خواہشات نفس کی پیروی کریں جبکہ آپ کے پاس اللہ کی جانب سے علم آچکا ہے:

وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ("اور اگر تم نے اس علم کے بعد' جو تمہارے پاس آچکا ہے' ان کی خواہشات کی پیروی کی تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہو گا۔")

اس سے پہلے انداز کلام نہایت نرم اور مشفقانہ تھا' لیکن یہاں آکر نبی ﷺ کے ساتھ خطاب خداوندی یکایک کچھ سخت ہو جاتا ہے۔ انداز کلام میں قطعی سنجیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اب بات عمل و استقامت کی ہے۔ معاملہ ہدایات پر عمل کرنے کا ہے۔ چنانچہ دو ٹوک الفاظ میں متنبہ کیا جاتا ہے۔ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ("تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہو گا")

راہ واضح ہے۔ صراط مستقیم سامنے ہے۔ علم وہ ہے جو اللہ کی جانب سے ہو۔ اس کے سوا دوسرے ذرائع سے صرف ہوائے نفس ہی حاصل ہوتی ہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ علم یقین حاصل کرے۔ بدلنے والے اور خواہش نفسانیہ پر مبنی مشکوک ذرائع علم کے مقابلے میں علم حقیقی کو ترک نہ کرے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ جو علم وحی پر مبنی نہ ہو وہ ہوائے نفس کے سوا کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ یہودیوں کے منظم پروپیگنڈہ اور گمراہ کن وسوسہ اندازیوں کے نتیجے میں' مدینہ طیبہ کے اندر بعض مسلمانوں کی ذہنی کیفیت ایسی ہو گئی تھی کہ ان کے لئے اس قسم کی قطعی تعبیر کی ضرورت تھی۔ ان کو ڈرانا مناسب تھا۔ زجر و توبیخ کا انداز مناسب تھا۔

مسلمانوں سے اس مختصر خطاب کے بعد اب روئے سخن پھر اصل موضوع پر لوٹ آتا ہے۔ بات وہی ہے کہ اہل کتاب اس بات کو یقینی طور پر جانتے ہیں کہ حق وہی ہے جس کا اظہار قرآن شریف کرتا ہے اور جس کا حکم حضور ﷺ دیتے ہیں لیکن وہ اپنے اس یقینی علم کے

باوجود' اس حق کو چھپاتے ہیں-کیوں؟ اس لئے کہ وہ خدا پرست نہیں بلکہ نفس پرست ہیں!

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ ؕ وَاِنَّ فَرِیۡقًا مِّنۡهُمۡ لَیَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ("جن کو' ہم نے کتاب دی ہے-وہ اس مقام کو (جسے قبلہ بنایا گیا) ایسا ہی پہچانتے ہیں جیساکہ وہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں مگر ان میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے حق کو چھپارہا ہے")

اپنے بچوں کو پہچاننا علم و معرفت کی اعلیٰ ترین مثل ہے- عربی زبان میں یہ مثل ایک ایسے مقام اور ایسے واقعہ کے لئے استعمال ہوتی ہے جو یقینی ہو اور اس کے علم و معرفت میں کوئی شک و شبہ نہ ہو- اہل کتاب کی حالت یہ ہے کہ ان کو سچائی کا یقینی علم ہو چکا ہے- تحویل قبلہ کا حکم بھی اسی عالمگیر سچائی کا ایک حصہ ہے اور پھر بھی وہ اس سچائی کو چھپاتے ہیں جو یقینی علم کے طور پر انہیں حاصل ہے- تو پھر مؤمنین کے لئے درست راہ عمل یہ ہے کہ وہ یہودیوں کے کذب و افتراء سے ہرگز متاثر نہ ہوں- ان کو یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی کہ وہ ان یہودیوں سے کوئی چیز اخذ کریں جنہیں حقیقت کا علم ہے اور پھر بھی وہ اسے چھپاتے ہیں- وہ خود اپنے دین کے اس حصے کا بھی انکار کر دیتے ہیں جسے مسلمانوں کے رسول امین وحی کی صورت میں پیش کریں- محض تعصب کی وجہ سے-

اہل کتاب کے سلسلے میں بیان کے بعد اب روئے سخن نبی ﷺ کی ذات کی طرف ہو جاتا ہے اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ (۱۴۷)("یہ ایک قطعی امر حق ہے' جو تمہارے رب کی طرف سے ہے' لہٰذا اس کے متعلق تم ہرگز کسی شک میں نہ پڑو-")

کیا رسول خدا ﷺ نے بھی کبھی شک کیا؟ نہیں ہرگز نہیں- ایک دوسری آیت میں جب کہا گیا: فَاِنۡ كُنۡتَ فِیۡ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكَ فَسۡـَٔلِ الَّذِیۡنَ یَقۡرَءُوۡنَ الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكَ ("جو کلام ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے' اگر تمہیں اس کے بارے میں کوئی شک ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لو جو تم سے پہلے کتاب پڑھتے چلے آرہے ہیں-")

اس پر آپ ﷺ نے فرمایا! "نہ مجھے شک ہے اور نہ ہی میں ان سے پوچھتا ہوں-"

تو پھر رسول خدا ﷺ کو ذاتی طور پر کیوں مخاطب کیا گیا؟ مسلمانوں کو متوجہ کرنا تھا- چاہے وہ مسلمان جو آپ ﷺ کے ساتھ موجود تھے اور یہودیوں کے خرافات سے متاثر ہورہے تھے یا وہ لوگ ہوں جو بعد میں آنے والے تھے اور دینی معاملات میں یہودیوں کے اباطیل واکاذیب سے متاثر ہوسکتے تھے-

میں کہوں گا کہ آج مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ذرا اس تنبیہہ پر کان دھریں- آج ہم ایسی نادانی میں مبتلا ہیں جس کی کوئی مثال ہی نہیں ہے- ہم اپنے دینی معاملات میں بھی یہود و نصاریٰ اور اشتراکی ملحدین سے یہ ہدایت طلب کرتے ہیں اور فتویٰ لیتے ہیں- ہم ان لوگوں سے خود اپنی تاریخ پڑھتے ہیں- ہم ان پر اعتماد کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ورثہ کے بارے میں کوئی بات کریں- وہ ہمارے قرآن اور ہمارے رسول ﷺ کی سنت اور آپ کی سیرت کے بارے میں جو شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں یہ ان پر اطمینان سے کان دھرتے ہیں- ہم ان کے پاس اپنے طلبہ بھیجتے ہیں تاکہ وہ ان سے اسلامی تعلیمات حاصل کریں اور ان کی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہو کر آئیں اور جب ہمارے پاس لوٹیں تو ان کی عقل ان کا ضمیر فاسد ہو چکا ہو اور وہ فاضل کہلائیں-

یاد رکھیے! یہ قرآن ہی ہمارے لئے کتاب شریعت ہے- وہ پوری امت مسلمہ کی کتاب ہے- یہ امت کی وہ دائمی کتاب ہے جس میں اسے راہ عمل بتایا گیا ہے اور راہ بد سے ڈرایا گیا ہے- اس کے بالمقابل اہل کتاب بہرحال اہل کتاب ہیں- کفار' کفار ہیں- ان کا دین ان کا دین ہے' اور ہمارا دین ہمارا دین!

اب بات کا رخ اصل موضوع کی طرف پھر جاتا ہے- مسلمانوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اہل کتاب کی باتوں پر کان ہی نہ دھریں- ان کی

ہدایات و راہنمائی قبول ہی نہ کریں اور مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے طریق زندگی اور اپنے نقطہ نظر کی طرف بڑھتے چلے جائیں۔ ہر گروہ کا اپنا رخ رفتار ہوتا ہے۔ مسلمانوں کا رخ نیکی اور خیر کی طرف ہے۔ انہیں چاہئے کہ کسی چیز کی طرف بھی نظریں نہ اٹھائیں اور بڑھتے چلے جائیں۔ آخر کار انہیں خداوند قیامت کے سامنے حاضر ہونا ہے جو اس پر اچھی طرح قدرت رکھتا ہے کہ انہیں جمع کرے۔ وہ قادر ہے کہ وہاں سب کو جزاو سزا دے۔ وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

(" ہر ایک کے لئے ایک رخ ہے' جس کی طرف وہ مڑتا ہے۔ بس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو۔ جہاں بھی تم ہو گے' اللہ تمہیں پا لے گا۔ اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔")

اہل کتاب جو فتنے پھیلاتے تھے اور جو سازشیں کرتے تھے اور اللہ کے کلام کی جو تاویلات و تحریفات کرتے تھے یہاں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اہل کتاب کی ان کارستانیوں میں بالکل دلچسپی نہ لیں۔ وہ راہ عمل پر گامزن ہوں اور نیکی کے کام میں ایک دوسرے سے آگے بڑھیں۔ ساتھ ساتھ یہ یاد دہانی بھی کرائی جاتی ہے کہ آخر کار انہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے آنا ہے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اس کے لئے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی چیز اس کی نظروں سے اوجھل ہو سکتی ہے۔ یہ ہے وہ سچائی جس کے مقابلے میں تمام اقوال احوال باطل ہیں' جن کی کچھ حقیقت ہی نہیں ہوتی۔

پھر تحویل قبلہ کی بات دہرائی جاتی ہے' تاکیداً حکم دیا جاتا ہے کہ جدید قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرو' جسے اللہ تعالیٰ نے منتخب کیا ہے' اس موقع پر کچھ نئی تفریعات مرتب ہوئی ہیں اور کچھ نئے نتائج نکالے جاتے ہیں۔ وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ)

(" تمہارا گزر جس مقام سے بھی ہو' وہیں سے اپنا رخ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف پھیر دو' کیونکہ یہ تمہارے رب کا بالکل برحق فیصلہ ہے اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔")

اس تاکیدی حکم میں اب یہودیوں کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہی قبلے کے سلسلے میں ان کے موقف کا ذکر ہے۔ کہا گیا ہے کہ نبی ﷺ جہاں بھی ہوں اور ان کا گزر جس مقام سے بھی ہو' وہ نماز کے وقت رخ بیت اللہ کی طرف پھیر دیں۔ کیونکہ یہ ان کے رب کا برحق فیصلہ ہے۔ اشارۃً یہ بھی کہہ دیا گیا کہ کہیں تمہیں اس سچائی سے روگردانی نہ کر دو۔ قرآن مجید کے الفاظ: "اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے" سے واضح طور پر اس طرف اشارہ ہوتا ہے۔ ان الفاظ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ واقعی بعض مسلمانوں کے دلوں میں خلجان تھا اور ایسی صورت حال موجود تھی کہ اللہ تعالیٰ کو بار بار تاکید کرنی پڑی اور شدید وعید بھی فرمائی۔

تیسری مرتبہ پھر بالکل ایک جدید غرض کی خاطر' قبلہ کے معاملے میں تاکید کی جاتی ہے۔ مسلمان یہودیوں کے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور یہودی اور دوسرے لوگ اس پر استدلال کرتے تھے کہ ان کا دین مسلمانوں کے دین سے زیادہ افضل ہے۔ کیونکہ ان کا قبلہ اصل ہے' لہذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا نظام زندگی بھی اصل ہے۔ اس لئے تحویل قبلہ کے حکم کی تاکید مزید کر کے اس استدلال کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔ (دوسری طرف مشرکین عرب بیت الحرام کو ایک مقدس مقام سمجھتے تھے اور اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ بھی بیت المقدس کے قبلہ ہونے پر یوں اعتراض کرتے تھے کہ مسلمان تو یہودیوں کے تابع ہیں۔ انہوں نے اپنے مقدس مقام کو چھوڑ دیا ہے اور بنی اسرائیل کے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔

وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ) ("اور جہاں سے بھی تمہارا گزر ہو' اپنا رخ مسجد حرام ہی کی طرف پھیرا کرو اور جہاں بھی تم ہو' اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی حجت نہ ملے۔ ہاں جو ظالم ہیں ان کی زبان کسی حال میں بھی بند نہ ہوگی۔ تو ان سے تم نہ ڈرو' بلکہ مجھ سے ڈرو' اور اس لئے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں۔ اس توقع پر کہ تم یہ ہدایت و فلاح کا راستہ پالو۔")

رسول خدا ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ تمہارا گزر جہاں سے بھی ہو' مسجد حرام کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں۔ اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جہاں بھی وہ ہوں اپنا منہ بیت اللہ کی طرف پھیر کر نماز پڑھا کریں۔

ارشاد ہوا! لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ("تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف حجت نہ ملے۔") ظالم اپنی بات کرتے ہی رہیں گے۔ وہ کسی حجت اور کسی دلیل کے آگے نہیں جھکتے۔ ہدایت ہوتی ہے کہ ایسے لوگوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ لوگ کٹ حجتی کرتے ہیں اور عناد میں مبتلا ہیں۔ ایسے لوگوں کو کسی طرح بھی مطمئن نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اپنی حجت بازی جاری رکھیں گے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ("ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو")

ان کو تم پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ تمہاری زمام کار ان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ یہ بات تمہارے شایان شان نہیں ہے کہ تم ان سے ڈر کر ان احکام کو ترک کرو' جو میری جانب سے تم پر نازل ہوئے۔ ڈر اور خشیت کا لائق تو میں ہوں۔ اس لئے کہ تمہاری دنیا و آخرت کے تمام امور میرے ہاتھ میں ہیں۔

ظالموں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو اللہ کی پکڑ سے ڈرایا جاتا ہے اور مسلمانوں کو اللہ کے انعام و اکرام یاد دلائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر تم نے اپنا رویہ درست رکھا اور احکام خداوندی کی اطاعت کی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مزید انعامات کی بارش ہوگی: وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ اس لئے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں اس توقع پر کہ تم راہ ہدایت پالو۔")

غرض یہ ایک یاد دہانی ہے جس میں ایک خاص اشارہ ہے' ایک بڑھتی ہوئی حوصلہ افزائی ہے' اور بار بار اللہ کے فضل و کرم کی طرف اشارہ ہے۔

وہ کیا انعام ہے؟ وہ تو ان کے ہاتھوں میں ہے' خود ان کے دل و دماغ گواہ ہیں کہ وہ کیا ہے؟ ان کی پوری زندگی میں موجود ہے۔ وہ اپنے موقف اور اپنے معاشرہ میں اسے پاتے ہیں۔ اس کائنات میں انہوں نے جو مقام اپنے لئے متعین کیا ہے اس میں بھی وہ اس نعمت کو پاتے ہیں۔

وہ جاہلیت کی جہالتوں اور تاریکیوں میں زندگی بسر کر چکے تھے۔ وہ اپنی آنکھوں سے جاہلیت کی تاریکیوں کو دیکھ چکے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے خود نور ایمان کو اختیار کیا۔ پاکیزگی اور طہارت کو اختیار کیا اور علم و معرفت کو اختیار کیا۔ اس لئے وہ اپنے دل و دماغ میں اس نعمت کا اثر ہر وقت تروتازہ' گہرا اور واضح پاتے ہیں۔

وہ کوتاہ اندیشانہ قبائلی زندگی بسر کر چکے تھے۔ گھٹیا مقاصد کے لئے سالہا سال کشت و خون کرتے رہے تھے۔ پھر وہ اپنی خوشی سے ایک نظریہ حیات کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے' ایک قوت اور شوکت بن گئے۔ ان کے مقاصد بلند ہو گئے اور ترجیحات وسیع ہو گئیں۔ ان کا نقطہ نظر خاندانوں اور قبائل کے محدود دائرے سے بلند ہو کر تمام بشریت کی بنیادوں پر استوار ہو گیا۔ اور اس نے وسعت اختیار کر لی۔ اس لئے وہ اپنے اندر اور اپنے ماحول میں انعامات الہیہ کا وسیع شعور رکھتے ہیں۔

اسلام سے پہلے وہ کس مقام پر کھڑے تھے؟ گرا پڑا غلیظ معاشرہ' افکار پریشاں اور زندگی کی اقدار مضطرب' یعنی جاہلی معاشرہ کے مقابلے میں۔

انہوں نے خوب سمجھ کر سوچ کر اسلام کا پاک اور بلند معاشرہ اپنایا' جس کے نظریات اور عقائد شیشے کی طرح صاف تھے' جس کی اقدار متوازن تھیں۔ اس لئے اسلام ان کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھا۔ وہ اپنے شعور میں' اپنی پوری زندگی میں اور اقوام کی برادری میں' اپنے مقام کو دیکھ کر محسوس کرتے تھے کہ سراپا اسلام کے انعامات و برکات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

اس لئے اللہ کا فرمان وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ "اس لئے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کردوں" تو اللہ کی طرف سے' اس فقرے میں دراصل ایک خفیہ اشارہ ہے' ایک قسم کی حوصلہ افزائی تھی اور ہے' ان انعامات و اکرامات کی طرف جس کا احساس خود مسلمانوں کو تھا۔

یہاں تحویل قبلہ کے حکم میں تکرار سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اس تکرار میں ہر مرتبہ ایک نیا مفہوم دیا گیا ہے۔ پہلی مرتبہ کہا گیا کہ حضور ﷺ چونکہ تحویل قبلہ کی خواہش رکھتے تھے۔ اس خواہش کا انداز بیان باادب خوشی تھا۔ آپ بار بار آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ منظور فرمالیا۔ دوسری مرتبہ کہا گیا کہ اگرچہ حضور ﷺ کی طلب اور خواہش بھی تھی' لیکن حکم اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور عین حق ہے۔ تیسری مرتبہ جو حکم دیا گیا اس میں مسلمانوں کو بتایا گیا کہ تحویل قبلہ کی حکمت کیا ہے؟ یہ کہ دشمنان اسلام اس سے اپنے دین کی برتری کے لئے استدلال کرتے تھے اور اس لئے حکم تحویل صادر ہوا۔ اس لئے مقصد یہ تھا کہ جو لوگ حق کا ساتھ نہیں دیتے' براہین و دلائل کو تسلیم نہیں کرتے' وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی کوئی عزت نہ ہو اور وہ ہر معاملے میں ہلکے ہوں۔

ان وجوہ کے ساتھ' اس وقت مدینہ طیبہ میں اس نوخیز اسلامی تحریک کی صفوں میں' ایسے حالات پائے جاتے تھے' جو اس تکرار و تاکید اور استدلال و بیان کے متقاضی تھے۔ بعض مسلمانوں کے دلوں پر مخالفین کے گمراہ کن پروپیگنڈے اور باطل استدلالات کا اثر پایا جاتا تھا' جس کا اندازہ اس امر سے ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلے میں بار بار تاکید کے ساتھ مسلمانوں کو خطاب فرماتے ہیں اور اس اثر کے ازالے کے لئے' قرآن مجید نے یہ زوردار انداز بیان اختیار کیا ہے اور تحویل قبلہ کی ان وقتی ہدایات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قرآن مجید کا جزء بنا دیا گیا۔ تاکہ اس قسم کے حالات میں' مسلمان ایسا ہی طرز عمل اختیار کریں' کیونکہ وہ ایک ایسے معرکہ میں کود پڑے ہیں جو تاقیامت جاری رہے گا' کبھی ٹھنڈا نہ ہو گا' کبھی نرم نہ ہو گا یعنی معرکہ انقلاب اسلامی۔

اس مناسبت سے قرآن مجید مسلمانوں کو پھر یاد دلاتا ہے کہ اللہ نے تمہیں اپنی نعمت سے نوازا ہے۔ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت قبول کرتے ہوئے تمہاری طرف اپنے نبی کو بھیجا' وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو قبلہ مسلمین بیت الحرام کے معمار اول تھے۔ یوں قرآن مجید مسلمانوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا روحانی وارث قرار دیتا ہے۔ اور مسلمانوں کا براہ راست تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قائم کر دیا جاتا ہے۔

كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا۟ عَلَيْكُمْ ءَايَـٰتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ
وَيُعَلِّمُكُمُ ٱلْكِتَـٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا۟ تَعْلَمُونَ ﴿١٥١﴾ فَٱذْكُرُونِىٓ
أَذْكُرْكُمْ وَٱشْكُرُوا۟ لِى وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿١٥٢﴾

۱۸ ع۵ ۲

"جس طرح میں نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا' جو تمہیں میری آیات سناتا ہے' تمہاری زندگی کو سنوارتا ہے'

تمہیں کتاب اور سنت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے' لہٰذا تم مجھے یاد رکھو' میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو' کفران نعمت نہ کرو۔"

اس آیت کے مضمون پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں انہی باتوں کو دہرایا گیا ہے' جن کی دعوت اس صورت میں حضرت ابراہیم ﷺ نے دی تھی۔ اس وقت حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل ﷺ خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔ جناب خلیل اللہ نے دعا فرمائی تھی کہ: "اے اللہ' میری اولاد میں سے جو اس گھر کے جوار میں رہتی ہے' ایک نبی مبعوث فرما۔ جو ان کو تیری آیات پڑھ کر سنائے۔ انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور انہیں پاک کر دے۔" یوں مسلمانوں کو یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ ان میں رسول اللہ ﷺ کا مبعوث کیا جانا' اور خود ان کا بطور مسلمان پایا جانا' یہ دراصل ان کے ابا جان حضرت ابراہیم ﷺ کی دعا کی براہ راست قبولیت ہے۔ اس میں یہ اشارہ بھی مضمر ہے کہ ان کی تحریک کوئی نئی تحریک نہیں ہے۔ ایک قدیم تحریک ہے۔ ان کا قبلہ کوئی نیا قبلہ نہیں ہے' بلکہ ان کے ابا ابراہیم ﷺ کا قبلہ ہے۔ اور ان پر اسلام نے جو جود و کرم کیا ہے وہ وہی جود و کرم ہے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دوست سے کیا تھا۔

اس نے تمہیں تمہارا پرانا قبلہ دے دیا' تمہیں ایک مستقل شخصیت عطا کر دی۔ یہ تو اس کے انعامات کا ایک نمونہ ہے جو وہ تم پر مسلسل کرتا چلا آ رہا ہے۔ اور سب سے پہلی نعمت یہ ہے کہ اس نے تم میں اپنا رسول ﷺ تم ہی میں سے مبعوث فرمایا: كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ "جس طرح میں نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا۔"

اس نے تمہارے اندر رسالت قائم کر دی۔ کیا یہ تمہارے لئے کوئی کم عزت افزائی ہے؟ یہودی ایک عرصہ سے آخری رسول کا انتظار کر رہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ انہی میں سے ہو گا اور اس کی قیادت میں وہ قریش پر فتح پائیں گے' لیکن اللہ تعالیٰ نے وہ خاتم الرسل تم میں سے چن لیا يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا "تمہیں میری آیات سناتا ہے۔"

وہ جو کچھ پڑھ کر تمہیں سناتا ہے وہ حق ہے۔ اس فقرے میں ایک شاہانہ حوصلہ افزائی ہے۔ اللہ کا کلام' رسول خدا ﷺ پر نازل ہو رہا ہے' لیکن خطاب اپنے بندوں سے ہو رہا ہے۔ اس انداز کلام پر غور کیا جائے تو یہ ایک عظیم عزت افزائی معلوم ہوتی ہے۔ دل مارے خوشی کے جھوم جاتا ہے۔ کیا شان ہے ان لوگوں کی! وہ کون ہیں اور کیا ہیں؟ خداوند قدوس ان سے خطاب کر رہا ہے۔ خود اپنے الفاظ میں ان سے بات ہو رہی ہے۔ کیا عظیم قدردانی ہے یہ؟ اگر اللہ تعالیٰ ان پر اپنا فضل و کرم نہ کرتا تو وہ یہ شان کہاں سے حاصل کرتے۔ یہ محض خدا کی جانب سے باران رحمت کا نتیجہ ہے۔ ابتدائے آفرینش میں اللہ تعالیٰ نے انسان کا ڈھانچہ تیار کیا اور اس میں روح پھونکی۔ اس کی نسل چلائی تاکہ ان میں سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے انعامات کے مستحق ہوں۔ وہ ایسے ہوں' جو ان انعامات کو خوش آمدید کہیں۔

وَيُزَكِّيْكُمْ "اور وہ تمہیں پاک کر دے۔" اگر اللہ نہ ہوتا تو مشرکین اہل عرب اور مسلمانوں میں سے کوئی بھی پاک نہ ہوتا۔ نہ پاک ہوتا اور نہ ہی مرتبہ بلند پاتا۔ اللہ نے ان میں سے رسول بھیجا تاکہ وہ انہیں پاک کر دے۔ ان کے دل کو شرک کی آلائش اور جاہلیت کی آلودگی سے پاک کر دے۔ ان کی روح کو ایسے تمام تصورات سے پاک کر دے جن کے بوجھ تلے انسانی روح صدیوں سے دفن ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ انہیں شہوانی قوت کی آلودگیوں سے بھی پاک کرتا ہے' لہٰذا ان کی روح جنسی بے راہ روی کے گڑھے میں نہیں گرتی۔ وہ لوگ جنہیں اسلام پاک نہیں کرتا' چاہے زمانہ قدیم کے باشندے ہوں یا زمانہ جدید کے' وہ گویا گندے پانی کے چشمے سے جنسی پیاس بجھاتے ہیں' جس سے طبیعت نفرت کرتی ہے اور جس سے انسان کی انسانیت ختم ہو جاتی ہے۔ اور ایک حیوان جو صرف حیوانی فطرت کا پابند ہوتا ہے' اس انسان سے ارفع و برتر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ جو ایمان سے محروم ہیں ان سے یہ حیوان بدرجہا پاک ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ ان کے

معاشرے کو لوٹ کھسوٹ اور سود و ساہو کاری سے بھی پاک کرتا ہے۔ یہ سب چیزیں بھی ایک قسم کی گندگی ہیں۔ یہ انسانی شعور اور انسانی روح کو گندہ کر دیتی ہیں۔ اور اجتماعی زندگی ان سے آلودہ ہو جاتی ہے۔ وہ ان کی زندگی کو ظلم و زیادتی سے پاک کرتا ہے اور انہیں نظام عدل و احسان عطا کرتا ہے۔ وہ عدل و انصاف جو اسلامی نظام حیات' اسلامی نظام حکومت سے پہلے انسانیت نے نہ دیکھا تھا اور نہ سنا تھا۔ غرض انہیں تمام گندگیوں اور آلودگیوں سے پاک و صاف کر دیتا ہے جو ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی جاہلیت کے چہرے کا بدنما داغ ہیں اور ہر اس معاشرے میں پائی جاتی ہیں' جسے اسلامی روح نے پاک کیا ہو' جس میں اسلام کا پاک و صاف نظام زندگی رائج نہ ہو۔

وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ "تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔" اس سے پہلے جو فرمایا گیا کہ وہ رسول ہی آیات پڑھ کر تمہیں سناتا ہے' اس سے بھی مراد یہ ہے کہ رسول تمہیں کتاب پڑھاتا ہے لیکن یہاں تعلیم کتاب کے ساتھ تعلیم حکمت کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ حکمت درحقیقت تعلیم کتاب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ حکمت اس مہارت کا نام ہے جس کے ذریعے انسان ہر چیز کو اس کا اصلی اور صحیح مقام دے دے۔ ہر بات اور ہر مسئلے کو ایک صحیح معیار پر پرکھے اور احکام و ہدایات کی صحیح غرض و غایت سمجھ سکے۔ تاریخ شاہد ہے کہ رسول خدا ﷺ نے جن لوگوں کو تربیت دی تھی اور جن کو آیات کتاب اللہ کے ذریعہ پاک فرمایا تھا' وہ حکمت و دانائی میں اس طرح کامل ہو گئے تھے جس طرح ایک پھل درخت کے اوپر پوری طرح پک جاتا ہے۔

وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (۱۵۱) "اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے۔" اسلامی جماعت کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ یہ ایک عظیم سچائی ہے۔ اسلام نے اس جماعت کو عربی معاشرے سے چنا۔ جس کے پاس چند متفرق معلومات کے سوا کوئی ذخیرۂ علم نہ تھا۔ صرف وہ علم جو صحرا میں ایک قبیلے کی زندگی کے لئے ضروری تھا یا صحرا کے درمیان گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے شہروں کی ضرورت کے لئے کافی تھا۔ اسلام نے اس صحرائی جماعت کو ایک ایسی امت بنا دیا جو پوری انسانیت کو نیک۔ اور عادلانہ قیادت فراہم کرنے لگی۔ ایک مختصر عرصے میں حالت یہ ہو گئی تھی کہ اب یہ امت کڑی نگاہ رکھتی ہے۔ امور عالم سے باخبر ہے اور زیور علم سے آراستہ ہے۔ قرآن اور حکمت قرآن پر مبنی ہدایات رسول ﷺ اس امت کے لئے راہ ہدایت اور سرچشمہ علم بن گئے ہیں۔

مدینہ میں مسجد نبوی" جہاں قرآن کریم اور قرآن پر مبنی ارشادات رسول پڑھے اور پڑھائے جاتے تھے' امت کے لئے ایک عظیم یونیورسٹی بن گئی۔ اس یونیورسٹی سے وہ لوگ فارغ ہو کر نکلے جنہوں نے پوری انسانیت کی حکیمانہ راہنمائی کی ایسی قیادت کی جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہ اس سے پہلے ملتی ہے اور نہ اس کے بعد آج تک ملتی ہے۔

اسلامی نظام حیات' جس نے یہ قیادت فراہم کی اور انسانوں کا یہ معیاری گروہ تیار کیا' آج بھی یہ استعداد رکھتا ہے کہ انسانیت کو ویسی ہی قیادت فراہم کرے' بشرطیکہ یہ امت صحیح طرح اس قرآن کریم پر ایمان لے آئے۔ اسے صحیح طرح اپنے لئے زندگی کا ماخذ قرار دے۔ اور اسے خوش الحانی سے پڑھ کر قوت سامعہ کی تسکین کے لئے استعمال نہ کرے' بلکہ اسے دستور حیات بنالے۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ "تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔" یہ وہ کرم ہے جس کا صدور صرف اللہ تعالیٰ ہی سے ہو سکتا ہے جس کے خزانوں میں کمی نہیں' جس کے خزانوں پر کوئی چوکیدار نہیں اور جس کی داد و دہش کا نہ حساب ہے' نہ محاسب۔ اس کے خزانوں سے بغیر طلب اور بلا سبب داد و دہش ہوتی رہتی ہے' اس لئے نہیں کہ ضرورت مند ہے' بلکہ اس کے وہ معطی ہے' وہ فیاض ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے "جس نے مجھے دل میں یاد کیا میں بھی اسے دل میں یاد کروں گا' جس نے مجھے بھری مجلس میں یاد کیا میں بھی اسے ایسے لوگوں میں یاد کروں گا' جو اس کے لوگوں سے افضل و اخیر ہوں گے۔" (حدیث صحیح)

ایسی ہی ایک دوسری حدیث شریف کا مضمون ہے! "رسول اللہ فرماتے ہیں:" اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اے بنی آدم! اگر تو نے مجھے دل

میں یاد کیا میں بھی تجھے دل میں یاد کروں گا اور اگر تو نے مجھے لوگوں میں یاد کیا تو میں بھی تجھے ملائکہ کے درمیان یاد کروں گا۔"

بعض روایات میں آتا ہے "ایسے لوگوں میں جو ان سے بہتر ہوں گے۔ اگر تو ایک بالشت میرے قریب آئے گا میں ایک ہاتھ تیرے قریب آؤں گا۔ اگر تم ایک ہاتھ میرے قریب آؤ گے تو میں دو ہاتھ تیرے قریب آؤں گا۔ اگر تو میری طرف چل کر آئے گا تو میں تیری طرف دوڑ کر آؤں گا۔"

یہ ہے وہ فضل و کرم جس کا بیان الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ اس کا شکر 'سوائے اس کے کہ دل اپنی گہرائیوں کے ساتھ سجدہ ریز ہو جائے' ادا نہیں ہو سکتا۔

اللہ کی یاد کیسے ہو' الفاظ میں؟ الفاظ ضروری نہیں ہیں' یہ تو دل کی توجہ ہے۔ دل کا اللہ کی طرف متوجہ ہونا ہے' چاہے الفاظ ساتھ ہوں یا نہ ہوں۔ یاد تو ایک دلی شعور اور انفعال ہے اور اس شعور و انفعال کے ادنیٰ اثرات یہ ہوں کہ انسان اللہ کی اطاعت پر آمادہ ہو جائے اور اعلیٰ اثرات یہ ہوں کہ انسان کو اللہ کا دیدار نصیب ہو' جو لوگ وصول الی اللہ کی نعمت سے سرفراز ہوتے ہیں اور جو ذوق دیدار چکھ لیتے ہیں ان کے پیش نظر اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ صرف دیدار یار۔

وَ اشْكُرُوْا لِیْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ "میرا شکر ادا کرو اور کفر نہ کرو۔" شکر کے بھی کئی درجے ہیں۔ پہلا یہ کہ انسان اللہ تعالیٰ کے انعامات کا اقرار کرے۔ اور پھر اس کی نافرمانی سے حیا کرے۔ اور آخری درجہ یہ ہے کہ انسان مجسمہ شکر بن جائے۔ بدن کی ہر حرکت' زبان کا ہر لفظ' دل کی ہر دھڑکن اور دماغ کا ہر تصور نمونہ شکر ہو۔ کفر سے روکا گیا ہے۔ اشارہ اس آخری مقام کی طرف ہے' جس تک آخر کار ایک ناشکر گزار انسان پہنچ جاتا ہے۔ لاتکفرون سے وہ آخری نکتہ بتایا گیا ہے جہاں ناشکری کے خط کی انتہا ہو جاتی ہے۔ العیاذ باللہ۔

تحویل قبلہ کے موقعہ پر انتباہات اور ہدایات بالکل واضح اور مناسب ہیں۔ ذکر الٰہی وہ نقطہ ہے جہاں اگر مومن کا دل اللہ کی عبادت کے لئے تیار ہوتا ہے۔ پھر وہ خالصتاً اللہ کا ہو جاتا ہے اور اسی نسبت سے منسوب ہوتا ہے' یعنی بندگی کی وجہ سے بندہ ہو جاتا ہے۔

یہودی سازشوں سے خبردار کرنے کے موقعہ پر بھی فکر و شکر کی ہدایت دینا مناسب ہے۔ ہم کہہ آئے ہیں کہ یہودیوں کا آخری مقصد یہ تھا کہ وہ مومنین کو دوبارہ کفر میں داخل کر دیں۔ وہ چاہتے تھے مسلمانوں سے یہ نعمت چھن جائے' جو بطور خاص اللہ نے انہیں دی تھی۔ کیا نعمت؟ نعمت ایمان۔ وہ بلند ترین نعمت جو کسی فرد یا کسی جماعت کو دی جا سکتی ہے۔ خصوصاً عربوں کے لئے تو یہ نعمت عظیم سے بھی عظیم تر تھی۔ اسی سے تو عربوں کا وجود قائم ہوا۔ تاریخ آدمیت میں عربوں نے ایک عظیم رول ادا کیا' ان کا نام اس نظریہ حیات سے منسلک ہو گیا جس کے وہ حامل تھے اور جسے انہوں نے بنی نوع آدم تک پہنچایا تھا۔

اس نعمت کے بغیر عرب کچھ نہ تھے۔ گمنام تھے' اب بھی گمنام ہیں اور اگر وہ نہ ہو۔ آئندہ بھی گمنام ہوں گے اگر اسے نہ اپنائیں گے۔ اسلامی نظریہ حیات کے سوا ان کے پاس تھا ہی کیا؟ جس کے ذریعہ وہ دنیا میں کوئی نام پیدا کرتے' کیا کسی نظریہ حیات کے بغیر کوئی قوم دنیا میں مقام قیادت حاصل کر سکتی ہے؟

مقام قیادت کے لئے ایسی فکر کی ضرورت ہے جو پوری زندگی کی قیادت کرے۔ انسانی حیات کو ترقی کی راہ دکھائے۔ اسلامی نظریہ حیات دراصل زندگی کا پورا نظام ہے۔ وہ صرف ایک نعرہ ہی نہیں ہے جس کے پیچھے مثبت عمل نہ ہو بلکہ ایسا عمل ہے جو اس نظریہ کی تائید کرے۔ اسلام کے کلمہ طیبہ کے ساتھ ساتھ عمل طیب بھی ضروری ہے جو کلمہ کا مصداق ہو۔

امت کے لئے ضروری بلکہ فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کو یاد رکھے تاکہ اللہ اسے یاد رکھے۔ اور اللہ نے اسے نسیاً منسیاً نہ کر دے اور جسے اللہ نے بھلا دیا سمجھو کہ وہ ڈوب گیا۔ زمین پر اس کا ذکر خیر نہ رہے گا۔ آسمانوں پر اس کا کوئی خیر خواہ نہ رہے گا۔ اور جو اللہ کو

یاد کرے گا اللہ اسے یاد کرے گا۔ آسمانوں پر بھی اس کا ذکر ہوگا اور اس طویل و عریض کائنات میں بھی اس کا ذکر خیر گونج اٹھے گا۔

ایک وقت تھا کہ مسلمانوں نے اللہ کو یاد کیا۔ پھر اللہ نے بھی انہیں یاد کیا۔ پھر کیا تھا؟ ان کا نام پوری کائنات میں بلند ہو گیا' دنیا کی قیادت صالح قیادت ان کے سپرد ہو گئی۔ لیکن پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے رب ذوالجلال کو بھلا دیا۔ تو اس نے بھی ان کو بھلا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مہمل بن گئے۔ ضائع ہو گئے۔ وہ اقوام کی برادری میں ایک حقیر تابع کے مقام تک جا گرے۔ علاج اب بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ بلاتا ہے "تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ میرا شکر ادا کرو اور کفر اختیار نہ کرو۔"

☆ ☆ ☆ ☆

# درس ۹ ایک نظر میں

تحویل قبلہ کے بعد اور امت مسلمہ کو ایک مستقل اور ممتاز حیثیت دینے اور ایسا تشخص عطا کرنے کے بعد' جو اس امت کے ممتاز نظریہ حیات کے ساتھ مناسب تھا' مسلمانوں کو پہلی ہدایت یہ دی گئی کہ وہ صبر و صلوٰۃ سے مدد لیں کیونکہ انہیں ایک عظیم ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ یہ منصب بڑی بڑی قربانیاں چاہتا ہے۔ شہداء کو خون پیش کرنا ہو گا۔ جانی نقصان' مالی نقصان' متاع و ثمرات کا نقصان برداشت کرنا ہو گا۔ وہ بھوک کے دن دیکھیں گے اور خوفناک راتوں سے دوچار ہوں گے۔ اس کے علاوہ انہیں بے شمار قربانیاں دینی ہوں گی۔ ان سب قربانیوں کے لئے انہیں اپنے آپ کو تیار کرنا ہو گا۔

انہیں اپنے نفس سے اور اس پوری دنیا سے اسلامی نظام کے قیام کے لئے جہاد کرنا ہو گا۔ اس عظیم جہاد کی خوفناکیوں کا مقابلہ کرنا ہو گا اور یہ مقابلہ اور تیاری اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ اہل ایمان صبر و صلوٰۃ سے امداد حاصل کریں۔ انہیں اس امت کا دل اللہ سے جوڑنا ہو گا۔ اپنے قلوب کو اللہ کے لئے خالص کرنا ہو گا اور اپنے تمام کاموں میں اللہ اور رسول اللہ کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ یہ سب کچھ کس لئے؟ کیا کس انعام کے لالچ میں؟ یا اللہ کی رضامندی کے حصول کے لئے؟ اس کی رحمت و ہدایت کی طلبگاری کی خاطر؟ کس قدر عظیم اجر ہے یہ؟ اس کی قدر و قیمت دل مومن ہی سے پوچھئے!

☆ ☆ ☆ ☆

# درس نمبر۹ تشریح آیات (۱۵۳ تا ۱۵۸)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿١٥٣﴾

"اے ایمان لانے والو! صبر اور نماز سے مدد لو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" قرآن کریم میں صبر کا تذکرہ بتکرار ہوا ہے۔ اس لئے کہ تحریک اسلامی کو سخت ترین مخالفتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ اس راہ میں صبرو استقامت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ تحریک اسلامی کو مسلسل مشکلات اور لگاتار کشمکشوں کا مقابلہ کرنا ہوگا لہٰذا اس بات کی ضرورت تھی کہ اہل ایمان صبر سے کام لیں اور ان کے نفوس داخلی و خارجی معاملات میں بیدار رہیں۔ اہل ایمان کی قوتیں منظم رہیں اور ان کے اعصاب پختہ رہیں۔ ایسے حالات میں صبرو استقامت کے سوا چارۂ کار ہی کیا ہے؟ اس طرح عبادت میں بھی صبر کی ضرورت ' گناہوں سے بچنے میں بھی صبر کی ضرورت ' غرض ان مختلف النوع سازشوں کے خلاف صبر' نصرت خداوندی میں تاخیر پر صبر' طویل تر جدوجہد پر صبر' باطل کی قوت پر صبر' دین کے حامیوں کی قلت پر صبر' بغض و عناد کے بوجھ پر اور غرض پر حق کی تلخی پر صبر۔

جب صبر طویل ہو جاتا ہے اور مشقت بڑھ جاتی ہے تو قوت صبر کمزور پڑ جاتی ہے۔ اور بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اگر بیرونی امداد میسر نہ ہو تو پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا ہے' اس لئے نماز کے ساتھ ساتھ صبر کی تلقین بھی کی جارہی ہے۔ نماز وہ سرچشمہ ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔ یہ وہ زادِ راہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ منبع تجدید قوت ہے' یہ قوت دل کا سامان ہے۔ اس سے صبر کی بھرپور قوت حاصل ہو جاتی ہے اور صبر کے ساتھ رضامندی و خندہ پیشانی اور یقین محکم پیدا ہوتا ہے۔

انسان فانی ہے' ضعیف ہے اور محدود قوت کا مالک ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوت کبریٰ سے لو لگائے۔ جب اس کا مقابلہ شر کی ظاہری اور باطنی قوتوں سے ہو اور معاملہ اس کی محدود قوت برداشت سے بڑھ جائے تو اسے چاہئے کہ وہ اس "عظیم قوت" سے مدد لے۔ اس راہ میں ایسے مقامات آتے ہیں کہ خواہشات نفس کا زور ہو جاتا ہے' طمع و لالچ کی شدید کشش ہوتی ہے۔ اور راہ حق پر استقامت کی جدوجہد بھاری ہو جاتی ہے' فسق و فجور اور ظلم و عدوان کی قوتیں زور پکڑ لیتی ہیں اور مقابلہ دشوار ہو جاتا ہے' راستہ طویل ہو جاتا ہے' مشقت بڑھ جاتی ہے اور زندگی کے شب و روز تاریک نظر آتے ہیں۔

انسان غور کرتا ہے دیکھتا ہے کہ ابھی تک وہ کسی مقام تک نہیں پہنچ سکا' لیکن موت قریب ہے۔ اس نے تو کچھ نہیں پایا اور زندگی کا سورج قریب الی الغروب ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ شر دھنی ہوئی روئی کی طرح پھولا ہوا ہے اور حق سکڑا ہوا ہے۔ منزل دور ہے' افق پر سے آخری شعاع امید غائب بھی ہے اور راستے پر کوئی نشان راہ نہیں۔ ایسے حالات میں صبر صلوٰۃ ہی سرچشمہ قوت ہوتے ہیں۔

ایسے مقامات اور ایسی منازل ہی پر نماز کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ انسان فانی اور خدائے باقی کے درمیان واحد براہ راست رابطہ نماز سے قائم ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام التقا ہے جس پر ایک تھا قطرہ ابدی سرچشمہ سے آملتا ہے۔ یہ اللہ کے ان خزانوں کی کنجی ہے' جو مستغنی کر دیتے ہیں' جھولی بھر دیتے ہیں اور رحمتوں کی بارش کر دیتے ہیں۔ یہ ایک جست ہے اس کے ذریعے انسان اس چھوٹی اور محدود دنیا کی حدود کو پھاند کر عظیم تر کائنات کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ سخت گرمی اور تپتی ہوئی دھوپ میں' ٹھنڈی چھاؤں ہے' نسیم سحر اور خوشگوار شبنم ہے۔ وہ تھکے ماندے دل کے لئے ایک خوشگوار احساس ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ جب پریشان ہوتے' سخت حالات سے دوچار ہوتے تو فرماتے! "بلال! ذرا ہمیں اس کے ذریعہ تسکین دو۔" جب بھی آپ ﷺ پریشانیوں کے ہجوم میں ہوتے' نماز کثرت سے پڑھنا شروع کر دیتے۔

اسلامی نظام دراصل عبادت اور بندگی کا نظام ہے۔ اس کی عبادت بھی حکیمانہ ہے اس کی سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ وہ زاد راہ ہے۔ روحانی امداد کا سرچشمہ ہے۔ اور وہ دل کی صفائی ہے۔ جب بھی انسان مصیبت میں مبتلا ہو' دل تنگ ہو' یہ عبادت کشادگی کا ذریعہ بن جاتی ہے اور انسان آرام' خندہ پیشانی اور خوشگواری سے اس مصیبت کو انگیز کرتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو اس عظیم شعار اور بھاری منصب کے لئے منتخب کیا تو آپ کو حکم دیا: يَٰٓأَيُّهَا ٱلْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ ٱلَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ نِّصْفَهُۥٓ أَوِ ٱنقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ ٱلْقُرْءَانَ تَرْتِيلًا ۝ إِنَّا سَنُلْقِى عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا

"اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے' رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو' مگر کم' آدھی رات' یا اس سے کچھ کم کر لو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا لو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔" (مزمل ۱:۵)

یہ رات کا قیام' یہ دن کے رکوع و سجود کیا تھے؟ یہ بھاری کلام' اور اس عظیم ذمہ داری کے لئے تیاری اور تربیت تھی' جس کی راہ مصائب و شدائد سے پر تھی۔ یہ وہ عبادت تھی جس سے سکون کے سوتے پھوٹ پڑے ہیں۔ باہمی ربط مضبوط ہو جاتا ہے' کام آسان ہو جاتا ہے' آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اور قلب مومن پر تسلی و تشفی اور آرام و اطمینان کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب مسلمان ان مصائب و شدائد کی دہلیز تک جا پہنچتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں صبر و صلوٰۃ کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ کیا ہو گا فرماتے ہیں إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ "بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

اللہ ان کے ساتھ ہے' ان کی مدد کرتا ہے' انہیں قوت اور ثابت قدمی عطا کرتا ہے' ان کے ساتھ انس و محبت رکھتا ہے۔ اس کٹھن سفر میں وہ انہیں اکیلے نہیں چھوڑتا۔ وہ انہیں اور ان کی محدود طاقت اور قوت کو چھوڑ کر ایک طرف نہیں ہو جاتا۔ جب بھی زاد راہ ختم ہو اس کی جانب سے رسد آ جاتی ہے۔ جب بھی وہ تھک کر چور چور ہو جائیں وہ انہیں از سرنو قوت عطا کرتا ہے۔ وہ اس آیت کا آغاز "اے ایمان والو" کی پیاری آواز سے کرتا ہے اور اس کا اختتام ان حوصلہ افزا الفاظ پر کرتا ہے۔ "بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

صبر و تحمل کے بارے میں بے شمار احادیث وارد ہیں۔ یہاں سیاق قرآنی کی مناسبت سے اور اس ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے امت مسلمہ کو تیار کرنے کی خاطر جس کے لئے اس امت کو برپا کیا گیا ہے ان میں سے چند احادیث کا ذکر مناسب ہے:

"حضرت خباب ؓ ابن الارت روایت بیان کرتے ہیں! "ہم نے حضور ﷺ سے شکایت کی۔ آپ ﷺ اس وقت خانہ کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا: "حضور ﷺ آپ ہمارے لئے نصرت طلب نہیں فرماتے؟ ہمارے لئے دعا نہیں فرماتے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تم میں سے پہلے ایسا ہوتا تھا کہ ایک شخص کو پکڑا جاتا' اس کے لئے زمین میں گڑھا کھودا جاتا اور اسے اس میں رکھ دیا جاتا' پھر آرا لایا جاتا اور اس کے سر پر رکھ کر اسے دو ٹکڑے کر دیا جاتا۔ اور لوہے کی کنگھیوں سے نوچ کر اس کی ہڈیوں سے گوشت الگ کر دیا جاتا لیکن باوجود ان مشکلات کے کوئی طاقت اسے اپنے دین سے نہ روک سکتی۔ اور خدا کی قسم اللہ اس کام کو ضرور پورا کرے گا۔ یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضرموت تک سفر کرے گا' لیکن اسے اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ ہو گا۔ بھیڑیا بھیڑوں کی رکھوالی کرے گا لیکن افسوس کہ تم جلد بازی کرتے ہو۔" (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک بار حضور ﷺ کسی نبی کی کہانی بیان کرتے تھے گویا کہ میں اب بھی انہیں دیکھ رہا ہوں' اس کی قوم نے انہیں مارا اور لہولہان کر دیا۔ وہ اپنے چہرے سے خون صاف کر رہے تھے اور فرما رہے تھے! "اللہ میری قوم کو معاف کر دے۔ یہ لوگ جانتے نہیں۔" (۲)

یحییٰ ابن وثاب نے حضور ﷺ کے ایک بوڑھے ساتھی سے روایت کی ہے۔ آپ نے فرمایا وہ مسلمان جو لوگوں میں رہے اور ان کی اذیتوں پر صبر کرے اس مسلمان سے بہتر ہے جو لوگوں سے الگ رہے اور ان کی اذیتوں پر صبر نہ کرے۔ (۳)

اور اب 'تحریک اسلامی مدینہ طیبہ میں ہے۔ کرۂ ارض پر 'اسلامی نظام کے قیام کے لئے' وہ آگے بڑھ رہی ہے۔ کیوں نہ بڑھے! یہ روز ازل سے اس کا مقسوم و مقدر تھا۔ اس نے حق کا علم اٹھالیا ہے اور اس علم کو لے کر ایک طویل و دشوار گزار سفر پر روانہ ہو رہی ہے۔ قرآن مجید روحانی طور پر اسے تیار کر رہا ہے اس عظیم تحریک جہاد کے دوران کھینچاتانی ہوگی' مصائب حائل ہوں گے اور ان مجاہدین کو اپنی جانوں اور مالوں کی قربانی دینی ہوگی' لہٰذا قرآن مجید یہاں انہیں ایک صحیح نقطہ نظر اور ایک درست نقطہ نظریۂ حیات عطا کرتا ہے۔ قرآن تحریک اسلامی کو ایک ایسا معیار' ایسی کسوٹی ایک ایسی میزان عطا کرتا ہے جس پر وہ اس طویل اور کٹھن سفر میں اپنے تمام معاملات اور اپنی تمام اقدار کو پرکھ سکیں۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

"اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں' انہیں مردہ نہ کہو' ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں' مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا"

معرکہ حق و باطل میں کچھ لوگ کام آئیں گے' راہ حق میں جان دیں گے۔ کچھ عزیز و محبوب مارے جائیں گے' کچھ شرفاء اور دین دار بھی شہید ہوں گے' تو جو لوگ اللہ کی راہ میں نکلتے ہیں اور جو لوگ معرکہ خیر و شر میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں' وہ بالعموم پاک نیت اور صاف دل اور صیقل شدہ روح کے مالک ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر اللہ کی راہ میں مارے جائیں تو وہ مردہ نہیں ہیں۔ درحقیقت وہ زندہ ہیں۔ یہ جائز نہیں کہ انہیں مردہ کہو' نہ تو اپنے احساس اور شعور میں انہیں مردہ سمجھو اور نہ ہی زبان سے انہیں مردہ پکارو۔ وہ تو زندہ ہیں اور اللہ اس پر گواہ ہے۔ وہ زندہ ہیں یقیناً زندہ!

چشم ظاہر بیں' دیکھتی ہے کہ بظاہر وہ مرچکے ہیں۔ کیا یہ سطحی نظر موت و حیات کی حقیقت کا فیصلہ کر سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ زندگی عمل' ارتقاء اور تسلسل کا نام ہے۔ موت بے کاری' جمود اور انقطاع سے عبارت ہے۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں ان کا عمل جاری رہتا ہے' ان کی شہادت معاشرے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ ان کا خون اس نظریۂ حیات کو پہنچتا ہے اور اس سے نظریۂ حیات نشو و نما پاتا ہے۔ دوسرے افراد اس شہادت سے متاثر ہوتے رہتے ہیں اور یہ تاثر لگاتار قائم رہتا ہے۔ شہادت کے بعد بھی شہداء فعال اور موثر ہوتے ہیں۔ ان کا خون پورے معاشرے کی زندگی میں ایک رنگ پیدا کرتا رہتا ہے۔ اور یہ تسلسل تاقیامت رہتا ہے۔ یہ ہے زندگی' بلکہ حیات جاوداں۔ اس اعتبار سے تو لوگوں کی اس دنیا میں بھی وہ زندہ ہیں۔

(۱) بخاری' ابوداؤد' نسائی (۲) بخاری اور مسلم (۳) ترمذی

لیکن وہ اپنے رب کے ہاں بھی زندہ ہیں اور وہاں بھی اس طرح زندہ ہیں جیسے یہاں زندہ ہیں۔ رب کے ہاں ان کی زندگی کی کیا کیفیت ہے؟ اسی طرح ہے جیسے یہاں ہے یا یہ کہ ہمیں اس کی کیفیت کا پورا شعور نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ دراصل وہ زندہ ہیں مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں۔" ہمارے علم کا دائرہ محدود ہے۔ اور یہ ایسی زندگی ہے جسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن بہرحال وہ ہیں زندہ!

وہ زندہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام مردوں کی طرح انہیں غسل نہیں دیا جاتا۔ انہیں ان کے انہی کپڑوں میں دفن کیا جاتا ہے جن میں وہ شہادت پاتے ہیں۔ غسل سے غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ مردے کا جسم پاک ہو جائے لیکن شہداء پہلے سے پاک ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے بدن میں روح ہوتی ہے۔ دنیا میں جو کپڑے انہوں نے پہنے ہوئے تھے قبر میں بھی وہی پہنیں گے کیونکہ بہرحال وہ زندہ ہیں۔

وہ زندہ ہیں۔ ان کے خاندان میں اس قتل پر ماتم نہیں ہے۔ ان کے یاروں دوستوں پر یہ جدائی گراں نہیں ہے۔ وہ اس طرح زندہ ہیں کہ اپنے خاندان اور عزیز و اقارب کے امور حیات میں شریک ہیں۔ وہ زندہ ہیں۔ اسی لئے تو پیچھے رہنے والوں پر ان کی جدائی گراں نہیں ہوتی۔ یہ عظیم واقعہ' یہ عظیم قربانی نہ انہیں خائف کرتی ہے' نہ ان کے لئے بوجھ بنتی ہے۔ وہ زندہ ہیں تو پھر؟ وہ اپنے رب کے ہاں باعزت طور پر رہ رہے ہیں۔ ان کو بلند ترین اعزاز دیا جاتا ہے اور ان کی اس قربانی کا پورا پورا بدلہ چکا دیا جاتا ہے' بلکہ فضل عظیم اس پر مزید ہوتا ہے۔

صحیح مسلم میں روایت ہے "شہداء کی روحیں سبز پرندوں کی شکل میں' جنت میں جہاں چاہیں اڑتی پھرتی ہیں' پھر وہ عرش کے نیچے معلق قندیلوں میں آکر بسیرا کرتی ہیں۔" اس کی اطلاع تو رب ذوالجلال کو ہوتی ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "تم کیا چاہتے ہو؟ وہ کہتے ہیں! ہمارے رب ہمیں اور کیا چاہئے۔ آپ نے ہمیں وہ کچھ دیا ہے جو آپ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں دیا؟ اللہ تعالیٰ پھر وہی سوال فرماتے ہیں۔ جب انہیں علم ہو جاتا ہے کہ جب تک وہ کچھ مانگیں گے نہیں جان نہ چھوٹے گی۔ تب وہ کہتے ہیں! ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں دوبارہ دنیا میں لوٹا دیں' ہم آپ کی راہ میں لڑیں' ایک بار پھر مارے جائیں۔ اس لئے کہ شہادت کا اجر تو وہ خود دیکھ ہی رہے ہیں۔ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں! "میں نے لکھ دیا ہے کہ شہداء پھر دنیا میں نہ لوٹائے جائیں۔"

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں "حضور ﷺ نے فرمایا!" کوئی شخص ایسا نہیں جو ایک بار جنت میں داخل ہو جائے اور پھر وہاں سے نکلنے کی تمنا کرے۔ اگرچہ اسے تمام دنیا بخش دی جائے۔ ہاں صرف شہید اس بات کی تمنا کرتا ہے کہ وہ دنیا کو لوٹایا جائے اور ایک مرتبہ پھر اللہ کی راہ میں قتل ہو' کیونکہ اسے نظر آتا ہے کہ شہید کی کیا قدر ہے۔" (مسلم' بخاری)

یہ شہداء کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں' جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑیں۔ صرف اللہ کی راہ میں۔ اس میں کوئی دوسرا نعرہ' کوئی دوسرا مقصد اور کوئی دوسرا نظریہ شریک نہ ہو' صرف اس سچائی کے لئے لڑ رہے ہوں' جسے اللہ نے نازل فرمایا۔ صرف اس نظام زندگی کے لئے جو اس نے وضع فرمایا۔ صرف اس دین کی راہ میں جسے اللہ نے واجب کر دیا ہے۔ صرف اس کی راہ میں۔ کسی اور راہ میں نہیں' کسی اور جھنڈے تلے نہیں' نہ کسی اور شعار اور کسی مقصد کی شراکت میں۔ قرآن و سنت نے اس خلوص نیت پر بہت زور دیا ہے' یہاں تک کہ مجاہد کے نفس میں کوئی شبہ نہ رہے' غیر اللہ کا کوئی شائبہ نہ رہے۔ وہ صرف اللہ ہی کا ہو۔

حضرت ابو موسیٰ سے روایت ہے' فرماتے ہیں! رسول اللہ ﷺ سے' ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا' جو نمائش شجاعت کے لئے یا اظہار حمیت کے لئے یا ریا کے لئے لڑتا ہے آیا ان میں سے کون فی سبیل اللہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا! فی سبیل اللہ صرف وہ ہے جو محض اس لئے لڑے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔" (مالک' امام بخاری' امام مسلم)

حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے' ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ! ایک شخص جہاد فی سبیل اللہ کا ارادہ کرتا ہے' لیکن اس کے ساتھ اس کی دنیاوی غرض بھی وابستہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا! "اس کے لئے کوئی اجر نہیں ہے۔" اس شخص نے تین مرتبہ یہ سوال دہرایا۔ اور ہر مرتبہ حضور ﷺ نے فرمایا! "اس کے لئے کوئی اجر نہیں ہے۔" (ابوداؤد)

حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا! جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلتا ہے اور اس جہاد کے لئے وہ صرف اس لئے نکلتا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لایا ہے' رسولوں کی تصدیق کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کو ضمانت دی ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کریں گے یا وہ جس مسکن سے جہاد کے لئے نکلتا ہے اسے وہاں تک واپس کردے گا اور وہ اپنے ساتھ اجر و ثواب اور مال غنیمت کا ایک حصہ وافر لے جائے گا۔ خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے۔ اللہ کی راہ میں اسے جو زخم آئے' قیامت کے دن یہ مجاہد اسی زخمی حالت میں اٹھایا جائے گا۔ زخم کا رنگ خون کے رنگ جیسا ہو گا اور اس کی بو' مشک کی طرح ہوگی۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے۔ اگر مسلمانوں کے لئے یہ بات مشقت نہ بنتی تو میں کبھی اس دستے سے پیچھے نہ رہتا جو اللہ کی راہ میں لڑائی کی لئے نکلتا ہے۔ لیکن نہ میرے پاس اس قدر گنجائش ہوتی ہے کہ میں تمام لوگوں کے لئے سواری کا بندوبست کروں اور نہ ان میں طاقت ہوتی ہے کہ وہ میرے پیچھے آسکیں۔ اور یہ بات ان کے لئے قابل برداشت نہ ہو کہ میں چلا جاؤں اور وہ پیچھے رہیں۔ اس ذات کی قسم' جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ میں راہ خدا میں جنگ کروں اور مارا جاؤں۔ پھر جنگ کروں اور مارا جاؤں۔ پھر جنگ کروں اور مارا جاؤں۔ (مالک' بخاری' مسلم)

یہ ہیں شہداء وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلتے ہیں۔ لیکن سوائے اس کے کہ وہ اللہ پر ایمان لائے ہوئے ہیں' سوائے اس کے کہ وہ تمام رسولوں کی تصدیق کرتے ہیں اور سوائے' اس کے کہ وہ اس ایمان کے نتیجے میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہتے ہیں' ان کے دل میں کوئی اور داعیہ نہ ہو۔

ایک موقعہ پر حضور ﷺ نے ایک فارسی مجاہد کو اس بات سے روکا کہ وہ جہاد کے موقعہ پر اپنی فارسیت کا ذکر کرے یا اپنی قومیت پر کسی قسم کا فخر کرے۔ حضرت عبدالرحمٰن ؓ ابن ابو عقبہ سے روایت ہے' وہ اپنے باپ سے روایت فرماتے ہیں (یہ اہل فارس کے آزاد کردہ غلام تھے) فرماتے ہیں میں جنگ احد میں حضور ﷺ کے ساتھ شریک ہوا۔ میں نے مشرکین کے ایک آدمی پر ضرب لگائی اور کہا: یہ لو' اور میں ایک فارسی الاصل غلام ہوں۔" اس پر حضور ﷺ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا! "تم نے یہ کیوں نہ کہا! اور میں انصاری غلام ہوں میں ان کی بہن کا بیٹا ہوں اور ان کا آزاد کردہ غلام ہوں۔" (ابوداؤد)

حضور ﷺ نے اس بات کو پسند نہ فرمایا کہ وہ آپ کی نصرت کی صفت کے علاوہ کسی اور صفت پر فخر کرے' یا وہ اس دین کی حمایت و نصرت کے علاوہ کسی اور جھنڈے یا کسی اور نعرے کے لئے جنگ کرے۔

یہ ہے اسلامی جہاد اور صرف اس جہاد کے نتیجے میں انسان مرتبہ شہادت پر فائز ہوتا ہے۔ اور اسے وہ زندگی نصیب ہوتی ہے جس پر شہداء فائز ہوتے ہیں۔

اب اس سبق میں تحریک اسلامی کو نئے واقعات اور نئی صورت حال کے مقابلے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ آنے والے واقعات کے سلسلے میں اسے ایک صحیح نقطہ نظر دیا جاتا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ

وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِیْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر فاقہ کشی' جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ "ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔"

تربیت کے لئے انسان کو مصائب کی بھٹی سے گزارا جاتا ہے۔ خوف و خطر میں مبتلا کر کے' جان و مال کا نقصان دے کر' مصائب اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے' اللہ طالب صادق کے عزم صمیم کا امتحان کرتے ہیں۔ یہ آزمائشیں اس لئے ضروری ہیں کہ مؤمنین اسلامی نظریۂ حیات کی ذمہ داریاں اچھی طرح پوری کرنے کے قابل ہو سکیں اور اسلامی نظریۂ حیات کی راہ میں' جتنا جتنا مصائب سے دوچار ہوں' اسی قدر یہ نظریۂ حیات انہیں عزیز ہوتا چلا جائے۔

وہ نظریات جن کے لئے ان مجاہدین نے کوئی تکلیف نہ اٹھائی ہو نہ کوئی مصیبت برداشت کی ہو' پائیدار نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ مصیبت کے پہلے مرحلے ہی میں انہیں الوداع کہہ دیتے ہیں۔ آزمائشیں دراصل ایک نفسیاتی امتحان ہوتی ہیں' جو ایک کارکن اپنے نظریۂ حیات کے لئے پاس کرتا ہے اور اس کی وجہ سے دوسرے لوگوں سے پہلے یہ نظریہ اس کارکن کے لئے عزیز تر از جان ہو جاتا ہے۔ کارکن نظریہ کی خاطر جب دکھ پائیں گے اور مال خرچ کریں گے تو وہ پھر اس کی قدر کریں گے اور اس کی حفاظت بھی کریں گے۔

دوسرے لوگ بھی اس نظریے کی قدر تب ہی کریں گے جب وہ دیکھیں گے کہ اس نظریے کے ماننے والے ان پر جان دیتے ہیں اور اس کی وجہ سے آنے والی تمام مصیبتوں کو بخوشی برداشت کرتے ہیں۔ اپنے نظریات کے لئے مصیبت اٹھانے والوں کو دیکھ کر عام تماشائی بھی یہ کہیں گے "وہ نظریۂ حیات جس کے لئے یہ لوگ لڑتے ہیں کوئی بڑی ہی قیمتی چیز ہے' اگر وہ قیمتی نہ ہوتی تو یہ لوگ اس قدر عظیم قربانیاں ہرگز نہ دیتے اور ان عظیم مصائب و شدائد پر صبر نہ کرتے۔

ایسے حالات میں اس نظریۂ حیات کے مخالفین بھی لاجواب ہو جاتے ہیں اور اس کے بارے میں تحقیق شروع کر دیتے' قدر کرنے لگتے ہیں اور خود بخود اس کی طرف کھچے چلے آتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جس تک پہنچ جانے کے بعد اللہ کی امداد اور نصرت آ پہنچتی ہے اور لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوتے ہیں۔

آزمائش بہت ضروری ہے اس سے نظریاتی لوگوں کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے ان کی کمر مضبوط ہوتی ہے۔ مصائب و شدائد سے ان کی خفیہ قوتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ ذخیرہ شدہ طاقتوں کے لئے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ دل کے دریچے کھل جاتے ہیں اور دل میں ایسے چشمے ابل پڑتے ہیں جن کے بارے میں' ان مصائب و شدائد سے پہلے مومن کو گمان بھی نہیں ہوتا۔

اسلامی اقدار اور اسلامی تصورات اس وقت تک پختہ اور سیدھے نہیں ہو سکتے جب تک انہیں شدائد و مصائب کی بھٹی سے نہ گزارا جائے۔ یہ مصائب کا نتیجہ ہی ہوتا ہے کہ کارکنوں کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اور دلوں سے میل دور ہو جاتا ہے۔

سب سے اہم' بلکہ سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ مصائب و شدائد کی حالت میں تمام دنیاوی رابطے کٹ جاتے ہیں۔ مختلف الاقسام اوہام اور تمنائیں غائب ہو جاتی ہیں' دل اللہ کے لئے خالی ہو جاتا ہے بلکہ صرف اللہ ہی کا سہارا باقی رہ جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے' جہاں تمام پردے ہٹ جاتے ہیں' بصیرت کے دروازے کھل جاتے ہیں' مطلع دور تک صاف و شفاف ہوتا ہے' اللہ کے سوا کوئی شے نظر نہیں آتی' اللہ

کی قوت کے سوا کوئی قوت نظروں میں نہیں جچتی' اللہ کے سوا کسی کا کوئی اختیار نظر نہیں آتا' اللہ ہی کی پناہ ہوتی ہے۔ اس کے سوا کسی کی پناہ نہیں ہوتی۔ اس مقام پر پہنچ کر انسانی روح اس حقیقت کے ساتھ یکجا ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن کریم کی یہ آیت نفس انسانی کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ وَ بَشِّرِ

الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ "اور خوش خبری سنائیں ان صبر کرنے والوں کو' جن پر جب کبھی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں! ہم تو اللہ کے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹنا ہے۔" بے شک ہم اللہ کے لئے ہیں۔ سب کے سب اللہ کے لئے ہیں۔ ہمارے جسم کے اندر جو طاقتیں ہیں' بلکہ ہمارا تمام وجود اور ہماری پوری شخصیت اللہ اور صرف اللہ کے لئے ہے۔ ہم کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ تمام باتوں کا مرجع وہی ہے۔ سر تسلیم خم ہے۔ ہر معاملے میں سر تسلیم خم ہے!

گویا ہم صحیح تصور اور صحیح عقیدے کے ساتھ' کائنات کی واحد سچائی اور حقیقت یعنی رب ذوالجلال کے سامنے کھڑے ہیں اور دست بدعا ہیں۔

یہ ہیں وہ صابرین جنہیں جلیل القدر رسول' انعام و اکرام کی خوش خبری دیتا ہے۔ اس مقام و مرتبے کا اعلان خود رب جلیل کرتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۟ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی' اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔"

اللہ کی طرف سے عنایات ہوں گی۔ یہاں صابرین کے لئے لفظ صلوات استعمال کر کے گویا صابرین کو ان صلوات (عنایات) میں شریک کر دیا گیا جو اللہ اور اس کے فرشتے نبیوں پر بھیجتے رہتے ہیں۔ کیا ہی بلند مقام ہے۔ کیا فیضان رحمت ہے کہ خود اللہ گواہ ہے کہ مصائب میں صبر کرنے والے ہی دراصل صحیح معرفت رکھتے ہیں اور صحیح راہ پر گامزن ہیں۔ غرض ہدایات عظیم اور محیر العقول ہے۔

تحریک اسلامی کی تیاری اور تربیت کے اس سبق کے آخر تک ہم پہنچ گئے۔ ذرا رک کر جائزہ لیجئے! مصائب و شدائد' قتل و شہادت' جان و مال کا نقصان' بھوک و افلاس اور خوف و خطر اور دوسری مشکلات کے لئے یہ عظیم تیاری اور تربیت' پر آشوب اور پر خطر اور عظیم المشقت طویل ترین معرکہ حق و باطل کے لئے یہ عظیم تیاری۔ یہ سب امور گہرے غور و فکر کے مستحق ہیں۔

ذرا دیکھئے! اللہ ان تمام مصائب اور مشکلات کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھتے ہیں' جبکہ دوسری طرف صرف ایک بات ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایات' اس کی جانب سے رحمت کے مستحق ہیں اور یہ اعلان کہ دنیا میں یہی لوگ ہدایت پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس موقعہ پر مؤمنین صابرین کے ساتھ کسی ظفر مندی اور کامرانی کا وعدہ نہیں فرماتے' کسی خصوصی امداد کا بھی یہاں کوئی اعلان نہیں کیا جاتا۔ نہ یہاں مال غنیمت کا لالچ دیا جاتا ہے۔ کچھ بھی نہیں! صرف اللہ کی رحمت و عنایات کا وعدہ ہوتا ہے اور یہ شہادت دی جاتی ہے کہ وہ یقیناً سچائی اور حق پر ہیں۔۔۔ اللہ تعالیٰ صابرین کو ایک ایسے کام کے لئے تیار کر رہا تھا جو ان کی ذات و حیات سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اس جماعت کو ہر اس خواہش و رغبت سے پاک کرنا چاہتا ہے' جس کا تعلق اس دنیا سے ہو۔ یہاں تک کہ ان کو ہدایت کی گئی کہ جس نصب العین کے لئے وہ کام کر رہے ہیں' جس نظریۂ حیات کے لئے وہ جدوجہد کر رہے ہیں اور جان تک دینے کو تیار ہیں' اس کے غلبہ کی خواہش تک دلوں سے نکال دیں۔ اور صرف رضائے الٰہی اور اطاعت حکم خداوندی کو اپنا منشور قرار دیں۔ وہ صرف حکم الٰہی کے پابند ہوں۔ وہ آگے بڑھتے چلے جائیں اور ان کے پیش نظر اللہ کی رضامندی' اللہ کی رحمت کے حصول اور اس اطمینان کے سوا کچھ نہ ہو' کہ وہ حق

کے لئے نکلے ہوئے ہیں اور صحیح رستے پر ہیں۔ یہ ہے صحیح نصب العین۔ یہ ہے صحیح غرض وغایت اور یہ اور صرف یہ ہے وہ ثمر شیریں جس کے لئے وہ والہانہ دوڑ رہے ہیں۔ رہی یہ امید یہ کہ اس جدوجہد کے نتیجے میں انہیں فتح و نصرت حاصل ہوگی۔ انہیں کرۂ ارض پر غلبہ و اقتدار نصیب ہوگا تو یہ تصرف و غلبہ یہ اقتدار و اختیار ان کے لئے تو نہیں ہے' یہ تو اس دعوت اسلامی کا غلبہ ہوگا جس کے وہ حامل ہیں۔

رہے اہل ایمان مجاہدین' تو انہیں ایک عظیم اجر دے دیا گیا' اللہ کی عنایات' اور اللہ کی رحمت ہوگی اور انہیں یہ سرٹیفکیٹ دے دیا گیا کہ وہی حق پر ہیں۔ اور یہ اجر انہیں کس کے بدلے دیا گیا؟ جان و مال کی قربانی پر اور آمدنیوں پر دیا گیا ہے۔ یہ اللہ کی راہ میں قتل و شہادت پر دیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی اللہ کے فضل و عنایت کا پلڑہ بھاری ہے۔ یہ عنایت تمام عنایات سے بھاری ہے۔ فتح' نصرت اور تمکن فی الارض تمام امور سے یہ عنایت بھاری ہے۔ نیز یہ اس مسرت سے بھی زیادہ خوش آئند ہے جو فتح و نصرت اور اسلامی انقلاب کے بعد حسرت دل پوری ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔

یہ ہے وہ نظم تربیت جس سے اللہ تعالیٰ نے اسلامی محاذ کو گزارا۔ بنی نوع انسان میں سے' جو شخص اپنے نفس' اپنی دعوت اور اپنے دین کو پاک و صاف کرنا چاہتا ہے' اسے چاہئے کہ وہ تربیت کے اس انداز کو اپنائے۔

☆ ☆ ☆ ☆

# درس ۱۰ ایک نظر میں

اس سبق میں بعض بنیادی اصولوں کی تصحیح مطلوب ہے' جن پر اسلامی تصور حیات کی عمارت قائم ہے۔ اسلام کے ان بنیادی اصولوں کے سلسلے میں مدینہ طیبہ کے یہودی تلبیس کرتے تھے اور حق کو باطل سے ملاتے تھے' جان بوجھ کر حق چھپاتے تھے' مسلمانوں کے دلوں میں اضطراب اور ذہنوں میں پراگندگی پیدا کرتے تھے۔ اس لئے ضروری تھا ان اصولوں کے بارے میں واضح احکام دے دیئے جائیں۔ البتہ انداز بیان عمومی ہے اور یہود اور دوسرے تمام مخالفین کے برخلاف بات اصولی طور پر کی گئی اور مسلمانوں کو ان خطرات سے آگاہ کیا گیا ہے' جو اس راہ میں' بالعموم انہیں درپیش ہو سکتے ہیں۔

صفا اور مروہ کے درمیان طواف کے مسئلے کو بھی لیا گیا ہے۔ دور جاہلیت میں اس سعی کے ساتھ چونکہ بعض غیر اسلامی اور شرکیہ تصورات وابستہ تھے' اس لئے وضاحت کر دی گئی کہ یہ شعائر اللہ میں سے ہیں لہذا سعی جائز ہے۔ تحویل قبلہ سے بھی اس کی مناسبت واضح ہے۔ نیز بیت اللہ کے حج اور دوسرے شعائر کو چونکہ اسلامی نظام نے قائم رکھا' اس لئے بھی یہ مناسب تھا کہ ان امور کے سلسلے میں اسلامی نظام اپنی پالیسی واضح کرے۔

یہودی اللہ کی تعلیمات وہدایات کو چھپاتے تھے۔ یہاں ان کی سخت مذمت کی جاتی ہے۔ البتہ یہ کہا جاتا ہے کہ توبہ کا دروازہ کھلا ہے' صد بار اگر توبہ شکستی باز آ' لیکن اگر وہ اپنی روش پر قائم رہتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں تو ان پر لعنت کی بارش ہو گی اور دردناک عذاب ان کا منتظر ہے۔ اللہ کی وحدانیت کا بیان اور اس پر تکوینی دلائل ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ ان لوگوں کے لئے شدید وعید ہے جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان تابعین اور متبوعین کے تعلق کا ایک منظر بھی پیش کیا گیا ہے جو قیامت میں اس وقت سامنے آئے گا جب یہ لوگ عذاب الٰہی کو دیکھیں گے تو ایک دوسرے سے بریت کا اظہار کریں گے لیکن بے سود۔

جو لوگ محض دنیاوی اغراض و مناصب کے لئے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام چھپاتے ہیں' انہیں سخت تنبیہ کی گئی ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ آخرت میں ذلت' حقارت اور اللہ تعالیٰ کا شدید غضب تمہارے لئے تیار ہے۔

آخر میں نیکی اور بدی کا اسلامی معیار بتایا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ایمان اور عمل صالح ہی وہ اصول ہیں' جن سے اسلامی تصور حیات درست ہوتا ہے۔ نیکی سے مراد کوئی ظاہری شکل وصورت نہیں ہے نہ ہی صرف شرق و غرب کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھنا اصول تقویٰ میں سے ہے۔ نیکی تو شعور وعمل اور اس شعور وعمل میں اللہ سے پختہ رابطے کا نام ہے۔ یہ بیان دراصل تحویل قبلہ کے مباحث سے ملحق ہے۔

اس تمام بحث کو بغور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بات اسی ایک مضمون یعنی معرکہ حق وباطل کے اردگرد گھومتی ہے۔ ذہن انسانی میں حق وباطل کی کشمکش ہے۔ اسلامی اقدار کا تعین ہو رہا ہے اور تصور حیات کی وضاحت ہو رہی ہے اور بیرونی سازشوں اور مکر و فریب اور ذہنی پراگندی پیدا کرنے والے مخالفین کے اعتراضات اور پروپیگنڈے کا جواب دیا گیا ہے۔

٭٭٭٭

# درس ۱۰ تشریح آیات (۱۵۹ تا ۱۷۸)

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿١٥٨﴾

"بے شک صفا و مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس کے لئے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کرے اور جو شخص برضا و رغبت کوئی بھلائی کا کام کرے گا' اللہ کو اس کا علم ہے اور وہ اس کی قدر کرنے والا ہے۔"

اس آیت کی شان نزول میں متعدد روایات منقول ہیں۔ اسلام نے مہاجرین و انصار کے سابقون الاولون کے دلوں میں جس قسم کا تصور حیات پیدا کیا تھا اس کی نوعیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے سب سے زیادہ موزوں اور اس وقت کی نفسیاتی منطق کے مطابق کتب حدیث کی وہ روایت ہے جس میں کہا گیا ہے: "بعض مسلمان حج و عمرہ کے موقع پر صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے سے کراہت محسوس کرتے تھے۔ کیونکہ جاہلیت کے زمانہ میں ان پہاڑیوں کے درمیان وہ اس لئے سعی کرتے تھے کہ یہ مقامات دو بتوں' اساف و نائلہ کے استھان تھے۔ اس لئے اسلام آنے کے بعد اب مسلمان اس سعی میں کراہت محسوس کرنے لگے تھے اور اسے زمانہ جاہلیت کا ایک فعل تصور کرنے لگے تھے۔"

امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے محمد ابن یوسف' سفیان' عاصم بن سلیمان کے سلسلے سے روایت نقل کی ہے۔ سلیمان کہتے ہیں: میں نے حضرت انس ﷺ سے صفا و مروہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: "ہم سمجھتے تھے کہ یہ دور جاہلیت کی رسومات ہیں۔ جب اسلام کا ظہور ہوا تو ہم نے صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا ترک کر دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی یہ آیت نازل فرمائی "صفا و مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔

امام شعبی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اساف بت صفا پر تھا' اور نائلہ مروہ پر اور وہ انہیں بوسہ دیا کرتے تھے۔ اس لئے اسلام کے بعد مسلمانوں نے ان کے درمیان سعی کرنے میں کراہت محسوس کی اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

روایات میں اس آیت کے نزول کی تاریخ متعین نہیں ہے' البتہ راجح صورت یہ ہے کہ تحویل قبلہ کے سلسلے میں جو آیات نازل ہوئیں یہ ان کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اگرچہ اس دور میں مکہ مکرمہ دارالحرب بن گیا تھا' لیکن اس کے باوجود بعض مسلمان انفرادی طور پر حج اور عمرہ کر سکتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں نے صفا و مروہ کے درمیان سعی کو جاہلیت کی ایک رسم سمجھا ہو گا۔ ان کے دلوں میں طویل تعلیم و تربیت کے نتیجے میں ایمانی تصور حیات جاگزیں ہو چکا تھا۔ اور اس کی برکت سے وہ جاہلیت کے ہر فعل اور ہر رسم و رواج کو شک اور کراہیت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ جاہلیت کے ہر کام کے بارے میں اس قدر حساس ہو گئے تھے کہ جاہلیت کے دور میں کئے جانے والے ہر فعل کو کرتے ہوئے ڈرتے تھے' مبادا کہ اسلام نے اسے ترک کرنے کا حکم دیا ہو۔ مسلمانوں نے مختلف مواقع پر اپنے اس احساس کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

اسلام کی دعوت نے ان کے دلوں کو خوب جھنجوڑ دیا تھا اور یہ دعوت ان کے دلوں کی گہرائیوں تک اتر چکی تھی اور اس دعوت نے

ان کے دلوں میں ایک عظیم نفسیاتی اور شعوری انقلاب برپا کر دیا تھا۔ وہ اپنی ہر بات کو کراہیت سے دیکھتے تھے بلکہ وہ ماضی کو ترک کر چکے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ دور جاہلیت ان کی زندگی کا ایک باب تھا جسے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر چکے ہیں۔ ان کی ماضی کا اب ان سے کوئی تعلق ہے' نہ ان کا ماضی سے کوئی واسطہ ہے۔ ان کے خیال میں ان کا ماضی ایک قسم کی ناپاکی اور گندگی تھا جسے اب چھونا بھی جائز نہ تھا۔

اس برگزیدہ قوم کی زندگی کے آخری دور کو ذرا غور سے پڑھا جائے' تو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ان پاک نفوس پر اس اسلامی نظریۂ حیات کا کیا ہی عجیب اثر ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو پکڑ کر جھنجھوڑا اور ان سے ہر قسم کی آلودگی کو جھاڑ دیا۔ اور ان کے وجود کے ذرات کو جدید طرز پر مرتب کر دیا بعینہ اس طرح جس طرح بجلی کا ایک جھٹکا دینے سے کسی مادے کے اجزاء اپنی سابقہ کیمیاوی شکل بدل دیتے ہیں اور ایک بالکل نئی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

یہ ہے اسلام یعنی جاہلیت سے پوری طرح باہر نکل آنا' اور جاہلیت کے تمام امور کو پوری طرح حرام اور ناپسندیدہ سمجھنا۔ ہر اس ناپسندیدہ حرکت سے باہر آنا جو جاہلیت میں ہوتی تھی۔ ہر اس شعور کو دل و دماغ سے نکال دینا جو جاہلیت کے دور میں ذہنوں پر حاوی ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ مومن کا جام صبو نئے تصور حیات اور اس کے تمام لوازمات کے لئے خالی ہو جائے۔

تحریک اسلامی کی تاریخ شاہد ہے کہ جب مسلمانوں کے دل و دماغ میں یہ شعور اچھی طرح رچ بس گیا اور وہ اچھی طرح پختہ کار ہو گئے' تب اسلام نے دور جاہلیت کے شعائر میں سے 'بعض مناسب شعائر کو باقی رکھنے کا اعلان فرمایا۔ اور اس سے پہلے ان شعائر کا رشتہ دور جاہلیت سے کاٹ دیا اور ان کے اسلام کے نظام میں' اس طرح پیوست کر دیا' جس طرح نگینہ انگشتری میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اب ان چیدہ شعائر پر ایک مسلمان اس لئے عمل پیرا نہیں ہوتا تھا کہ دور جاہلیت میں وہ ان پر عمل کرتا تھا' بلکہ وہ انہیں اسلام کا ایک شعار جدید تصور کرتا تھا۔ جس کا اصل اسلام میں ہوتا تھا جس کی جڑیں اسلامی نظام زندگی سے آبیاری حاصل کرتی تھیں۔

اسلام کے ٹھوس اور عمیق نظام تربیت کی ایک مثال یہ ہے کہ قرآن مجید خاص اس مسئلے کے بارے میں اس طرح بات شروع کرتا ہے کہ وہ صفا و مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ "یقیناً صفا و مروہ اللہ کی نشانیوں میں ہیں۔" گویا بتایا جاتا ہے کہ ان کے درمیان جو شخص بھی سعی کرے گا وہ اللہ کے شعائر میں سے ایک فریضہ ادا کرے گا۔ وہ ان کے درمیان جو سعی کرے گا اس سے غرض اطاعت حکم خداوندی ہے۔ اس سعی اور دور جاہلیت کی سعی کے درمیان اب کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اب اس کا آساف و نائلہ اور جاہلیت کے دوسرے بتوں سے کوئی ربط و عقیدت نہیں ہے' بلکہ تعلق صرف اللہ اور رسول سے ہے۔

لہٰذا اب اس طواف و سعی میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کوئی گناہ نہیں ہے' بات وہ پرانی بات نہیں رہی' نقطۂ نظروہ پرانا نقطہ نظر نہیں رہا ہے فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا "لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے' اس کے لئے کوئی گناہ کی بات نہیں ہے کہ وہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان سعی کرے۔"

حج میں عرب جن مناسک پر عمل کیا کرتے تھے ان میں سے اکثر کو اسلام نے علی حالہ برقرار رکھا ہے۔ صرف ان چیزوں کو ترک کروایا جن کی نسبت سے بتوں کی طرف تھی یا جو جاہلیت کے اوہام پر مبنی تھیں اور ان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ جن شعائر کو بحال رکھا گیا ان کا ربط بھی اسلام کے جدید تصور حیات نے قائم کر دیا اور یہ کہا کہ یہ وہ شعائر ہیں جن پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عمل کیا۔ (تفصیلات آئندہ بیان حج میں ملاحظہ ہوں)

حج اور عمرہ کے مناسک ایک ہی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عمرہ میں عرفہ پر وقوف فرض نہیں ہے' نیز حج کے لئے جو میقات (وہ مقامات جن سے آگے بغیر نیت نہیں جا سکتا) مقرر ہیں وہ عمرہ کے لئے نہیں ہیں' لیکن حج اور عمرہ دونوں میں سعی بین الصفاء والمروۃ ضروری ہے۔

اور شعائر اللہ میں سے ہے۔

آیت کا اختتام اس فقرے پر ہوتا ہے کہ جو شخص بھی برضا و رغبت مطلقاً نیکی کا کوئی کام بھی کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے:

وَ مَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ "اور جو شخص بھی برضا و رغبت کوئی بھلائی کا کام کرے گا' اللہ کو اس کا علم ہے اور وہ اس کی قدر کرنے والا ہے۔"

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ سعی بھی دراصل بھلائی ہے۔ اس اشارے سے دلی کراہیت دور ہو جاتی ہے' دل ان کی ادائیگی پر آمادہ ہو جاتا ہے' اس امر پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اللہ تو اس سعی کا شمار نیکی میں کرے گا۔

پھر اس نیکی پر جزائے خیر بھی دیتا ہے اور وہ نیتوں کا مالک ہے اور قلب کی ہر شعوری حرکت سے باخبر ہے۔

اب ذرا رکیے! اور اس حکیمانہ انداز بیان پر دوبارہ ایک نگاہ ڈالئے فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ "اللہ قدر کرنے والا ہے۔" مقصد یہ ہے کہ اللہ اس بھلائی سے راضی ہوتا ہے۔ اس کا اجر دیتا ہے' ثواب دیتا ہے۔ لفظ "شاکر" سے صرف ایک خاص مفہوم ہی نہیں نکلتا بلکہ وہ ایک خاص سایہ عاطفت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ یہ لفظ رضائے کامل کا پرتو ہے۔ گویا ذات باری بندے کے نیک اعمال کی قدر کرتی ہے' تو پھر اب بندے کا فرض کیا ہے کہ وہ بارگاہ خداوند میں شکر بجالائے؟ اس کا فرض ہے کہ وہ اللہ کی مہربانی کے جواب میں مزید شکر ادا کرے۔ اس کی بے حد تعریف کرے' قرآن کے طرز تعبیر کا یہ ایک خاص اسلوب ہے' جو انسانی شعور و احساس کو شبنم کے تازہ قطروں کی طرح تازگی' حسن اور ملائمت عطا کرتا ہے۔

صفا و مروہ کے درمیان سعی کی فرضیت کے بعد اب ان لوگوں کی مذمت ہے جو اللہ کی نازل کردہ تعلیمات و ہدایات کو چھپاتے ہیں۔ یہ وہ یہودی ہیں جن کے بارے میں اس سورت میں طویل بحث' اس سے پہلے ہو چکی ہے۔ یہاں دوبارہ اس بحث کے چھیڑنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تحویل قبلہ اور فرضیت حج کے سلسلے میں انہوں نے بحث و تکرار شروع کر رکھی تھی۔ ابھی تک وہ ختم نہیں ہوئی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

"جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں' درآں حالیکہ ہم انہیں سب انسانوں کی راہنمائی کے لئے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں۔ یقین کرو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں' البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کریں اور جو کچھ چھپاتے تھے' اسے بیان کرنے لگیں' ان کو میں معاف کر دوں گا اور میں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔

جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا اور کفر کی حالت ہی میں جان دے دی ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ اس لعنت زدگی کی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کی سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انہیں پھر کوئی دوسری مہلت دی جائے گی۔"

اہل کتاب' خود اپنی کتاب کے ذریعے سے یہ جانتے تھے کہ حضور ﷺ کی رسالت برحق ہے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ آپ ﷺ جن احکامات کی تبلیغ کرتے ہیں وہ برحق ہیں اور من جانب اللہ ہیں۔ اس کے باوجود وہ ان احکامات کو چھپاتے تھے جو اللہ نے ان کے لئے ان کی کتاب میں نازل کئے تھے۔ بس ان لوگوں اور ہر دور میں ان جیسے لوگوں کا کردار یہ رہا ہے کہ یہ اللہ کی نازل کردہ حق اور سچائی کو چھپاتے ہیں' خواہ اس حق پوشی کی کوئی معقول وجہ بھی نہ ہو۔ ایسے لوگ مختلف ادوار میں مختلف مقامات پر پائے جاتے ہیں' جو حق و صداقت کا علم رکھتے ہیں مگر پھر بھی اظہار حق کے وقت خاموش رہتے ہیں۔ انہیں وہ اقوال و آیات یقین کے ساتھ معلوم ہوتی ہیں جن میں اس سچائی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے' اللہ کی کتاب میں سے کئی آیات سے وہ ایک طرف ہو جاتے ہیں' ان کا اظہار نہیں کرتے' ان کے بارے میں خاموشی اختیار کر لیتے ہیں' انہیں چھپا کر اس حقیقت سے پہلوتہی کر جاتے ہیں جس کی وہ آیات حامل ہوتی ہیں۔ وہ ان آیات کو لوگوں کے سمع و احساس سے دور رکھتے ہیں' چاہے کسی وجہ سے بھی وہ ایسا کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی صورت حال ہے جس سے ہم زندگی کے مختلف مراحل میں دوچار ہوتے رہتے ہیں اور حقائق دین میں سے مختلف اور بے شمار حقائق میں یہ صورت حال پیش آتی رہتی ہے۔

"یقین کرو کہ اللہ بھی ایسے لوگوں پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت کرتے ہیں۔ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ (۱۵۹)

گویا وہ لعنت کے مقام پر کھڑے ہوں گے' اور ان پر ہر طرف سے لعنت کی بارش ہو رہی ہوگی اور اللہ کے بعد ہر لعنت کرنے والا ان پر لعنت برسا رہا ہو گا۔

لعنت کا مفہوم ہے قہر و غضب سے دھتکارنا۔ اللہ کی لعنت یہ ہوگی کہ وہ انہیں اپنی رحمت سے نکال دے گا اور پھر ہر طرف سے لعنت کرنے والے ان کا پیچھا کر رہے ہوں گے۔ یوں وہ درگاہ الٰہی سے بھی راندہ ہوں گے اور مسلمانوں کی طرف سے بھی دھتکارے جائیں گے۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ "البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں' اور جو کچھ چھپاتے تھے' اسے بیان کرنے لگیں' ان کو میں معاف کروں گا۔ میں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔"

اس تنبیہہ و تہدید کے باوجود قرآن کریم توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ اس سے وہ روشنی پاتے ہیں اور رشتۂ امل ٹوٹنے نہیں پاتا۔ اس طرح دل نور کے سرچشمے کی طرف کھنچتے ہیں اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے۔ اللہ کے عفو و درگزر کی امید باقی رہتی ہے۔ اس لئے جو چاہے' جس وقت بھی چاہے صدق نیت سے' اس دارالامن میں داخل ہو جائے۔

سچی توبہ کی نشانی کیا ہوگی؟ عمل میں تبدیلی اور اصلاح' صاف صاف بات کرنا' حق کا اعتراف کرنا' اور حق کے تقاضے پورے کرنا۔ اور جو لوگ توبہ کر لیں وہ یقیناً اللہ کی رحمت سے بہرہ ور ہوں گے' ان کی توبہ قبول ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ "اور میں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔" یقیناً ایسا ہو گا کیونکہ 'بات کرنے والوں میں اللہ تعالیٰ سب سے صادق القول ہے۔

اور جو لوگ اپنی غلط روش پر مصر ہوتے ہیں اور مہلت اور فرصت کو غنیمت نہیں سمجھتے تو وہ یقیناً اپنے اس انجام کو پہنچیں گے جس کی وعید اللہ نے اس سے قبل ان سے فرمائی ہے۔ اور اب زیادہ تفصیل و تاکید کے ساتھ کہا جاتا ہے إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ

وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ (۱۶۲)

"اور جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا اور کفر کی حالت ہی میں جان دی' ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ اسی لعنت زدگی کی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے' نہ ان کی سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انہیں پھر کوئی دوسری مہلت دی جائے گی۔"

کیوں؟ اس لئے کہ انہوں نے اس کھلے دروازے کو' خود اپنے اوپر بند کر دیا' انہوں نے فرصت کو غنیمت نہ جانا اور موقعہ ہاتھ سے جانے دیا اور کتمان حق' اور کفر و ضلالت پر اصرار کیا: أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ "ان پر اللہ' فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت۔" یہ ہمہ جہت لعنت ہوگی' کسی صورت میں بھی وہ اس سے چھٹکارا نہ پا سکیں گے۔ نہ کسی سینے میں ان کے لئے رحم ہو گا۔

قرآن کریم نے ہمہ جہت لعنت کے سوا ان کے لئے کسی اور عذاب کا تذکرہ نہیں کیا' بلکہ کہا ہے کہ اس عذاب میں کوئی تخفیف نہ ہو گی۔ نہ کوئی تاخیر ہوگی اور انہیں کسی قسم کی کوئی مہلت نہ دی جائے گی یہ ایک ایسا عذاب ہے جس سے تمام دوسرے عذاب کم ہوں گے' دھتکارنے' پرے پھینک دینے اور اظہار لاتعلقی کا عذاب۔ کوئی ان پر رحم کرنے والا نہ ہو گا۔ کوئی آنکھ انہیں قبول نہ کرے گی' کسی زبان پر ان کے لئے سلام تک نہ ہو گا۔ ہر طرف سے لعنت' دھتکار اور قطع تعلق' انسانوں کی طرف سے بھی اور خداوند تعالیٰ کی طرف سے بھی' زمین پر بھی اور آسمانوں پر بھی' ہر جگہ اور ہر طرف سے۔ یہ ہے وہ دردناک اور توہین آمیز عذاب۔

اس کے بعد سیاق کلام توحید کی طرف پھر جاتا ہے' ایمانی تصور حیات کی بنیاد عقیدۂ توحید پر رکھی جاتی ہے۔ کائنات سے ایسے مشاہد پیش کئے جاتے ہیں' جو عقیدہ توحید پر ناقابل تردید دلائل پیش کرتے ہیں' جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو معبود بناتے ہیں۔ ان پر تنقید ہے اور بتایا جاتا ہے کہ قیامت کے دن یہ لوگ کس قدر ذلیل و خوار ہوں گے' جب عذاب الٰہی سامنے ہو گا' تابع متبوع سے' اور متبوع تابع سے تبری کر رہا ہو گا' لیکن کوئی معذرت بھی انہیں کچھ فائدہ نہ دے سکے گی۔ ان کی پشیمانی ان کے لئے مفید نہ ہوگی نہ انہیں اس کی وجہ سے نار جہنم سے چھٹکارا حاصل ہو گا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ

١٩ ع ١١ ٣ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (۱۶۳) اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ

الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ

اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ

فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ

السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۱۶۴) وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا

لِّلّٰهِ ؕ وَ لَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ

وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾ إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا
وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ
أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ
أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾

۲۰
ع ۴
۴

"تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے' اس رحمن اور رحیم کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔" (۲:۱۶۳-۱۶۷)

(اور اس حقیقت کو پہچاننے کے لئے کوئی نشانی اور علامت درکار ہے تو) جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لئے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں' رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں' ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لئے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں' بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے۔ ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں بے شمار نشانیاں ہیں مگر (وحدت خداوندی پر دلالت کرنے والے ان کھلے کھلے آثار کے ہوتے ہوئے بھی) کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدمقابل بناتے ہیں اور ان کے ایسے گرویدہ ہیں جیسے اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہئے۔ حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔ کاش جو کچھ عذاب کو سامنے دیکھ کر انہیں سوجھنے والا ہے وہ آج ہی ان ظالموں کو سوجھ جائے کہ ساری طاقتیں اور سارے اختیارات اللہ ہی کے قبضے میں ہیں اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔ جب وہ سزا دے گا اس وقت کیفیت یہ ہوگی کہ وہی پیشوا اور راہ نما' جن کی دنیا میں پیروی کی گئی تھی' اپنے اپنے پیروؤں سے بے تعلقی ظاہر کریں گے مگر سزا پا کر رہیں گے۔ اور ان کے سارے اسباب و وسائل کا سلسلہ کٹ جائے گا اور وہ لوگ جو دنیا میں ان کی پیروی کرتے تھے کہیں گے کہ کاش ہم کو پھر ایک موقع دیا جاتا تو جس طرح آج یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں' ہم ان سے بیزار ہو کر دکھا دیتے۔ یوں اللہ ان لوگوں کے وہ اعمال' جو یہ دنیا میں کر رہے ہیں' ان کے سامنے اس طرح لائے گا کہ یہ حسرتوں اور پشیمانیوں کے ساتھ ہاتھ ملتے رہیں گے مگر آگ سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔

ایمانی تصور حیات وحدت الوہیت کے اصول پر قائم ہے۔ حضور ﷺ کے وقت اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں کوئی تنازعہ نہ تھا۔ البتہ ذات باری' صفات باری اور مخلوق و خالق کے باہمی تعلق کے بارے میں اختلاف رائے ضرور تھا۔ کوئی بھی اللہ کے وجود کے بارے میں اختلاف نہ کرتا تھا۔ ایسا کبھی نہ ہوا کہ انسانی فطرت نے کبھی وجود باری کو بھلا دیا ہو۔ یا انسان کسی خدا کا قائل نہ رہا ہو۔ یہ تو اس دور جدید کی بیماری ہے جب اذہان میں ایسے افکار اگ آئے' جن کا تعلق زندگی کے شجرہ طیبہ سے نہیں ہے' جو فطرت کے عین خلاف ہیں' جن کے نتیجے میں انسان نے سرے سے وجود باری کا بھی انکار کر دیا۔ یقیناً یہ اوپرے افکار ہیں اور موجودات و کائنات میں ان کی کوئی جڑ موجود نہیں ہے۔ ایک وقت ضرور آئے گا جب یہ افکار سرے سے ناپید ہو جائیں گے اور ان کا کوئی نام و نشان بھی نہیں رہے گا۔ کائنات کی تشکیل و تکوین اور اس کی ساخت ان افکار کی متحمل نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کو فطرت کائنات مسترد کرتی ہے اور یہ لوگ اس لئے ناقابل برداشت ہیں کہ ان کے افکار کی جڑیں فطرت کائنات میں نہیں ہیں۔

عقیدۂ توحید انسان کے نظریۂ حیات میں ایک ضروری تصحیح ہے' اسلامی نظام حیات کے لئے تو خشت اول ہے۔ اس لئے قرآن حکیم بار بار عقیدۂ توحید کا بیان مختلف پیرایوں میں کرتا ہے۔ یہی وہ بنیاد اور اساس ہے جس پر اسلام کا اخلاقی نظام اور اس کی اجتماعی تنظیم استوار ہوئی۔ یعنی اس کائنات میں وحدت ربوبیت کا تصور وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ "تمہارا خدا ایک ہی ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ "اس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔" "رحمان و رحیم ہے۔"

تاکید اور بار بار تاکید' یعنی وحدانیت الٰہ کی اس تاکید کا نتیجہ یہ ہے کہ معبود ایک ہو جاتا ہے جس کی تمام مخلوق بندگی کرتی ہے اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتی ہے۔ وہ سمت ایک متعین ہو جاتی جس سے پوری مخلوق اپنے اخلاق اور اپنے طرز عمل کے اصول اور طریقے اخذ کرتی ہے اور وہ ماخذ اور منبع بھی متعین ہو جاتا ہے۔ جس سے انسان شریعت و قانون کے اصول اخذ کرتا ہے۔ اور وہ واحد نظام حیات بھی متعین ہو جاتا ہے جو انسان کے تمام اصول حیات میں متصرف ہوتا ہے۔

جیسا کہ سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ یہاں امت مسلمہ کو اس عظیم رول کے لئے تیار کیا جارہا ہے جو اسے کرہ ارض پر ادا کرنا ہے۔ اس مناسبت سے یہاں اس حقیقت کا پھر ذکر کر دیا جاتا ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں بار بار کیا جاتا ہے۔ جو قرآن مجید کا وہ سایہ دار درخت ہے جس کی جڑیں دور تک زمین میں گئی ہوئی ہیں اور اس کی شاخیں عقل و شعور کے آسمان پر دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ بلکہ وہ اس پوری کائنات کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہیں۔ اس حقیقت کا ذکر یہاں مکرر کر دیا جاتا ہے کہ اسلامی معاشرے کی تمام قانون سازی اور ضابطہ بندی میں اسے پیش نظر رکھا جائے۔ کیا ہے وہ حقیقت؟ وہ ہے توحید الٰہی۔ پھر یہاں اللہ تعالیٰ کی صفت رحمٰن رحیم کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تمام تشریعات و ضابطہ بندیوں کا ماخذ اور سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی یہ گہری اور عمومی صفت' صفت رحمت ہے۔

اسی طرح پوری کائنات اور اس کی ہر گزرگاہ اللہ کی رحمت اور اس کی وحدانیت پر شاہد عادل ہے۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

"جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لئے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں' رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں' ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لئے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں' بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ زمین کو زندگی بخشتا ہے۔ اور اپنے اسی انتظام کی بدولت زمین ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے۔ ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو (زمین و آسمان کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں' بے شمار نشانیاں ہیں)۔

احساس و شعور کو بیدار کرنے کے لئے یہ بالکل ایک نیا انداز ہے۔ اس کے ذریعے عجائبات دنیا کے نظاروں اور کائنات کے گہرے مطالعہ کے قلب و نظر کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اس کائنات کے عجائب سے چونکہ ہم مانوس ہو چکے ہیں' رات دن انہیں دیکھتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان کی جدت و ندرت' احساس و شعور پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ کائنات انسان کے لئے ایک معمولی چیز بن گئی ہے۔ اس لئے انسان سے کہا گیا ہے کہ وہ ایک دفعہ لوٹ کر کھلی آنکھوں کے ساتھ' تیز احساس کے ساتھ اور زندہ دل کے ساتھ' اس کائنات پر یوں نظر ڈالے جیسے وہ اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہو اور پھر وہ بار بار مشاہدہ کرے۔ یوں وہ اس کائنات میں عجیب و غریب مشاہدات کر سکے گا۔ یہاں بے شمار مناظر ایسے ہیں کہ جب ان پر انسان نے پہلی نظر ڈالی تو آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور دل متحیر ہو گئے لیکن پھر کیا ہوا؟ قلب و نظر کے لئے وہ

مناظر معمولی بن گئے۔ دنیا کے اس عجیب میلے کو ہر روز دیکھتے رہے۔ ہم اس سے مانوس ہوگئے۔ گردش ایام کوئی اچنبھے کی بات نہ رہی۔ اس کا انوکھا پن یک لخت ختم ہوگیا اور یہ رونگٹے کھڑے کر دینے والے مناظر فطرت تو اب ہمارے لئے جاذب نظر ہی نہ رہے۔

یہ آسمان و زمین' یہ خوفناک فاصلے' یہ دیوہیکل اجرام فلکی' یہ حیران کن آفاق اور پھر یہ معلوم اور نامعلوم بے شمار جہاں اس فضا میں ان جہانوں کی گردش ان کے مواقع و مدارات' یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کے تصور ہی سے سر چکرانے لگتا ہے۔ یہ اسرار کائنات جو پردہ غیب میں نہاں ہیں' جو کائنات کے پردوں سے نفس انسانی کو جھانکتے ہیں۔ آسمان و زمین پر مشتمل یہ عظیم کائنات۔ اور پھر یہ انسان ان ابعاد اور فاصلوں سے بے خبر' ان کے حجم اور عظمت سے بے خبر اور ان کے اسرار و رموز سے عاجز۔ ہاں جب انسانی ادراک ترقی کر جائے گا اور جدید علوم اور انکشافات اس کی مدد اور معاون ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ اسے کچھ رازہائے دروں سے خبردار کرے گا۔ا۔

شب و روز کا اختلاف' نور ظلمت کا باہمی تعاقب' صبح شام کی گردش یہ طلوع اور وہ غروب' اور نگہ اولیں پر ابتدائے آفرینش سے چٹکیاں لینے لگتا تھا' دل دھڑکتے تھے اور یہ سب مناظر انسان کے لئے عجب العجائب تھے' پھر کیا ہوا؟ انسان بار بار مشاہدہ کرتا رہا اور یہ سب کچھ اس کے لئے ایک معمول بن گیا۔ انوکھا پن نہ رہا۔ کشش ختم ہوگئی۔ اور انسان غافل ہوگیا لیکن قلب مومن ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔ اس کے احساس میں یہ بات مشاہدات تازہ بتازہ ہوبہو رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ان میں اللہ کو دیکھتا ہے' اسے یاد کرتا ہے اور وہ ان مشاہد و عجائب کو ہر باریوں دیکھتا ہے کہ ایک جہان نو' ایک تخلیق نو ابھی ابھی اسے دکھائی گئی ہو۔

دیکھئے لوگوں کی ضروریات لئے ہوئے بحری جہاز جارہا ہے (اور اس منظر کا بقدر حصہ میں نے خود احساس کیا ہے) کیا ہی منظر ہے۔ ایک عظیم سمندر میں سیاہ نقطہ ہے جس پر ہم سوار ہیں جو ہمیں لے کر رواں دواں ہے' ہر طرف سے متلاطم موجوں کے تھپیڑے ہیں اور تاحد نظر نیلگوں بحر بیکراں کی وسعت ہے۔ یہ کشتی تیر رہی ہے۔ ادھر گرتی' ادھر پڑتی جارہی ہے۔ اللہ کی قدرت اور اللہ کی نگہبانی کے سوا کوئی اور طاقت نہیں' جس کا یہاں بس چل سکے۔ یہاں اللہ کے بنائے ہوئے قانون کی حکمرانی ہے۔ ایک چھوٹا سا نقطہ ہے' لہروں کے مٹتے ہوئے خطوط پر' خوفناک بحر بیکراں کے سینے پر۔

بس وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمان کی بلندیوں سے پانی اتارا۔ باغ و راغ اجڑے ہوئے تھے۔ خزاں کا دور دورہ تھا۔ زمین مرچکی تھی۔ یکایک وہ پھر سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ مرنے کے بعد پھر زندہ ہو جاتی ہے۔ نوع بنوع کے جانور اس پر دوڑتے پھرتے ہیں۔ قسم قسم کے پرندے اڑتے اور چہچہاتے ہیں۔ ہوائیں چلتی ہیں جن میں درخت جھومتے ہیں۔ زمین و آسمان کے درمیان بادل جھومتے ہیں مگر ہیں قید میں۔ کیا مناظر ہیں یہ اگر انسان' قرآنی اشارات کی سمت میں ان پر قرآنی زاویہ نگاہ سے غور و فکر کرے تو اللہ کی عظیم قدرت اور پھر اس کی وسیع شان رحیمی کو دیکھ کر' اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ یہ زندگی جس کے ادراک سے ہم قاصر ہیں۔ جس کا جوہر لطیف سرحدات ادراک سے ماورائی ہے۔ جو بڑے لطف سے کرہ ارض پر نمودار ہوتی ہے۔ پھر یک لخت کھل کر سامنے آجاتی اور طاقتور بن جاتی۔ گٹھلی سے درخت بن جاتا ہے۔ یہ کہاں سے آگئی؟ اگر تخم اور گٹھلی کے اندر پوشیدہ تھی تو پھر گٹھلی اور تخم کہاں سے آئے؟ اور ان میں یہ زندگی کیسے داخل ہوئی؟ اس کا اصل کیا ہے؟ اس کا پہلا مصدر کیا ہے؟ آپ بھاگ نہیں سکیں گے۔

ٹھہریئے! فطرت اصرار کرتی ہے کہ آپ اس سوال کا جواب دیں۔ ملحدین نے اس سوال کے جواب سے ہمیشہ راہ فرار اختیار کی ہے۔ بے شک بہت مشکل سوال ہے۔ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ ایک قادر مطلق تخلیق کنندہ موجود ہے۔

---

ا۔ سید قطب شہید کی پیش گوئی کے عین مطابق یہ سلسلہ بڑی تیزی سے جاری ہے۔

وہی ہے جو مردے کو زندگی بخشتا ہے۔ ملحدین مغرب لوگوں کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ مردہ چیز کو زندگی بخشنے کی تحقیقات کر رہے ہیں تاکہ خدا کو ماننے کی ضرورت ہی نہ رہے لیکن سعی پیہم کے بعد اپنے کفرو الحاد کے باوجود آخر کار انہیں اقرار کرنا پڑا کہ ہم اس سلسلے میں ناکام ہیں۔ زندگی کی ایجاد محال ہے۔ آج روس ملحد روس میں حیاتیات کے ماہرترین کو یہ اعلان کرنا پڑا ہے ہم اس راز کے ادراک سے عاجز ہیں۔ اس سے قبل بھی حیاتیات کے ایک مشہور عالم ڈاروِن نے اس سوال کا جواب دینے سے گریز کیا تھا۔

اور پھر یہ ہوائیں کبھی ادھر رواں ہیں کبھی ادھر چلتی ہیں۔ اپنے کندھوں پر بادل لئے ہوئے۔ بادل زمین و آسمان کے درمیان مقید ہیں۔ کرہ ارض پر اللہ تعالیٰ نے جو قوانین مقرر کئے ہیں ان کے عین مطابق ان کی حقیقت کیا ہے؟ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ صرف یہی کافی نہیں ہے کہ ہواؤں کے چلنے کے اسباب گنوا دیں۔ مادہ پرستوں کے نظریات پڑھ دیں۔ یہ بتادیں کہ بادل یوں بنتے ہیں اور یوں برستے ہیں۔ راز تو کچھ اور ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان اسباب کی حقیقت کیا ہے؟ قدرت اس کا منبع اس کا موجودہ توازن اور اس کے موجودہ قوانین جو زندگی کو یہ سہولت فراہم کرتے ہیں۔ زندگی کے اسباب بادل ہوا بارش اور شبنم ان سب کا سرحلقہ کیا ہے؟ یہ سہولتیں جو ہم معلوم کرسکے ہیں ہزاروں ہیں اور اگر ان سب سے صرف ایک ہی نہ ہو تو زندگی یک لخت معدوم ہو جائے یا اس طرح خوشگواری سے نہ چلے۔ جس طرح رواں دواں ہے۔ عناصر فطرت کی یہ پیچیدہ ہم آہنگی بتاتی ہے کہ زندگی کوئی اتفاقی چیز نہیں ہے۔ یقیناً اس کے پس منظر میں ایک ارادہ کارفرما ہے۔ ایک اختیار کارگر ہے۔ یہ ارادہ صرف ایک ہے۔ اس میں دوئی نہیں کیوں؟ اس لئے کہ کوئی اس میں تضاد نہیں اور نہایت ہی مشفقانہ ہے اس لئے کہ اس کی ہر حرکت زندگی کے لئے معاون ہے۔ (بے شمار نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں) انسان کو دنیا کی الفت اور غفلت نے کند کردیا ہے۔ اگر وہ الفت اور غفلت کے ان پردوں کو دماغ سے اتار پھینکے تو یقیناً ان مشاہدات فطرت کو ایک جدید احساس کے ساتھ دیکھ سکے گا۔ بالغ نظری سے دیکھ سکے گا۔ وہ ایک ایسے دل کے ساتھ غور کرسکے گا جو نور ایمان سے لبریز ہو۔ اگر وہ اس کرہ ارض پر ایک نووارد کی طرح نگاہ ڈالے جو گویا کسی دوسرے جہان سے اس زمین پر پہلی مرتبہ اترا ہے تو وہ ہر چمک کی طرف ملتفت ہو جائے۔ اس کے کان ہر آواز کی طرف متوجہ ہوں۔ اس کا احساس ہر حرکت کو نوٹ کرے اور قلب و نظر اور حس و شعور نئی نئی واردات سے دوچار ہوں اور وہ حیرت و استعجاب سے کانپ اٹھے۔

یہ ہیں ایمان کی کارستانیاں اور ایمان کی برکات! وسعت نظر حد احساس و شعور حسن ہم آہنگی اور کمال کی قدردانی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان اس کائنات کا ادراک جدید ہے۔ اور حسن و جمال کا ایک نیا شعور ہے۔ ایمانی دراصل اللہ تعالیٰ کے قوانین کے رنگین میلے میں چہل پہل کا نام ہے جس میں صبح و شام تماشائے قدرت کا نئے سے نیا نظارہ پیش ہوتا ہے۔ لیکن کارگاہ حیات کی ان نیرنگیوں کے باوجود یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو عقل کے ادراک سے کورے ہیں۔ ان کی نظر کوتاہ ہے اور وہ قوانین فطرت کی ایسی وحدت کو اور اس کائنات کے چلانے والے اس واحد اور منضبط نظام کو جو عقیدۂ توحید کی طرف صاف صاف اشارہ کرتا ہے نظر انداز کردیتے ہیں اور ان سب چیزوں پر سے یونہی گزر جاتے ہیں یا ان کے لئے مختلف خدا اور مختلف اسباب تلاش کرتے ہیں۔ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدمقابل بناتے ہیں۔ اور ان کے لئے ایسے گرویدہ ہیں جیسے اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہئے۔"

ہاں بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اللہ کا شریک بناتے ہیں۔ جن لوگوں سے قرآن مخاطب تھا۔ ان کے معاشرے میں اللہ کے یہ ہمسر درخت پتھر ستارے اور ملائکہ و شیاطین تھے۔ جاہلیت کے مختلف ادوار میں کبھی عام چیزیں کبھی افراد و اشخاص کبھی اشارات و اعتبارات اللہ کے ہمسر رہے ہیں۔ بعض اوقات یہ ہمسری شرک خفی کی تعریف میں آتی ہے اور کبھی شرک ظاہر و جلی کی صورت

میں۔ جب ان اشیاء کا ذکر اللہ کے ساتھ ہو اور دل میں ان کے بارے میں وہی عظمت و محبت ہو' جو اللہ تعالیٰ کی ہونی چاہئے تو یہ خفیہ شرک ہو گا اور اگر صورت احوال یہ ہو کہ دل سے اللہ کی محبت بالکل نکل جائے اور اس کی جگہ کسی اور چیز کی محبت اور عظمت جاگزین ہو جائے تو یہ کھلا شرک ہو گا۔

مومنین کی صفت یہ ہے کہ وہ اللہ کی محبت اور اللہ کی عظمت کی طرح کسی دوسری چیز کی عظمت نہیں کرتے اور نہ اس کی عظمت کے قائل ہوتے ہیں۔ نہ اپنی جان سے نہ کسی اور کی جان سے نہ کسی شخصیت سے' نہ کسی اشارہ و اشعار سے' نہ کسی نعرہ و نظریہ سے اور نہ ان جدید اقدار میں سے کسی ایک قدر کے ساتھ' جن کے پیچھے آج کل مخلوق خدا بھاگ رہی ہے۔ غرض ان میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی وہ ربط و تعلق نہیں رکھتے وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ "حالانکہ ایمان لانے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔" ان کے دلوں میں اللہ کی شدید محبت ہوتی ہے۔ صرف اللہ کی محبت بلاقید و بلاقدر۔ ان تمام محبتوں پر جو دوسری چیزوں کے لئے ان کے دل میں ہوتی ہیں۔ اللہ کی محبت شدید تر ہوتی ہے۔ سب پر غالب ہوتی ہے۔

بندہ اور یزداں کے مابین تعلق کی تعبیر محبت سے کی گئی ہے۔ یہ بہت ہی اچھی تعبیر ہے۔ ایک سچے مومن اور حق تعالیٰ کے در میں محبت ہی کا تعلق ہوتا ہے۔ قلبی محبت کا تعلق' روحانی کشش کا رابطہ' قرب و دوستی کا تعلق اور ایک پر خلوص نورانی جذبہ محبت کا تعلق۔ یہ افسر ماتحت کا سرکاری تعلق نہیں ہوتا۔

وَ لَوْ یَرَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَ قَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْهِمْ ؕ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ

"کاش' جو کچھ عذاب سامنے دیکھ کر' انہیں سوجھنے والا ہے۔ وہ آج ہی ان ظالموں کو سوجھ جائے کہ ساری طاقتیں اور سارے اختیارات اللہ ہی کے قبضے میں ہیں۔ اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے۔ جب وہ سزا دے گا اس وقت کیفیت یہ ہو گی کہ وہی پیشوا اور راہ نما' جن کی دنیا میں پیروی کی گئی تھی' اپنے پیروؤں سے بے تعلقی ظاہر کریں گے' مگر سزا پا کر رہیں گے۔ اور ان کے اسباب و وسائل کا سلسلہ کٹ جائے گا اور وہ لوگ جو دنیا میں ان کی پیروی کرتے تھے' کہیں گے کاش ہم کو پھر ایک موقع دیا جاتا تو جس طرح آج یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں' ہم ان سے بیزار ہو کر دکھا دیتے۔ یوں اللہ ان لوگوں کے وہ اعمال' جو یہ دنیا میں کر رہے ہیں' ان کے سامنے اس طرح لائے گا کہ یہ حسرتوں اور پشیمانیوں کے ساتھ ہاتھ ملتے رہیں گے مگر آگ سے بچنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔"

یہ لوگ ہیں جنہوں نے غیر اللہ کو اللہ کا ہمسر بنایا' انہوں نے سچائی کے ساتھ ظلم کیا۔ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا۔ کاش وہ آنکھیں کھول کر دیکھتے' اس منظر کے بارے میں کچھ سوچتے کہ ان کو ایک دن اللہ وحدہ لاشریک کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ کاش وہ چشم بصیرت سے اس عذاب کو دیکھ سکتے جو ظالموں کا انتظار کر رہا ہے۔ ہاں اگر وہ آنکھیں کھولتے تو یقیناً دیکھ لیتے کہ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا "تمام طاقتیں اور اختیارات تو اللہ ہی کے ہیں۔" لہٰذا وہ اللہ کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرے۔ نہ کسی کو اس کا ہمسر بنائے اور ان کو معلوم ہو جاتا وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ "یہ کہ اللہ بہت ہی سخت سزا دینے والا ہے۔"

کاش وہ اس منظر کو دیکھ سکتے کہ پیشوا اپنے مریدوں سے بے تعلقی ظاہر کر رہے ہیں۔ انہوں نے عذاب خود دیکھ لیا ہے۔ ان کے درمیان تمام تعلقات اور دوستیاں ختم ہو چکی ہیں۔ پیشوا ہے کہ مرید دونوں نفسانفسی کی حالت میں ہیں۔۔ وہ قیادت اور ریاست ڈھیر ہو گئی جس کی وجہ سے پیروکار ان کے پیچھے بھاگتے تھے۔ قائدین کو خود اپنی پڑی ہے۔ وہ پیروؤں کی عزت پر کیا توجہ کریں' ان کو کس طرح بچائیں۔ اب تو الٰہ واحد کی حقیقت اور طاقت ظاہر ہو چکی ہے۔ اب تو ان کے سامنے صرف ایک ہی قدرت ہے۔ گمراہ قیادتوں کا جھوٹ' ان کی کمزوری اور اللہ کے سامنے ان کا عجز اور عذاب الٰہی کے سامنے ان کی سراسیمگی اور بے بسی سب پر ظاہر ہو چکی ہے وَ قَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا "اور وہ لوگ جو دنیا میں ان کی پیروی کرتے تھے' کہیں گے کاش کہ ہم کو پھر ایک موقعہ دیا جاتا تو جس طرح آج یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں' ہم ان سے بیزار ہو کر دکھا دیتے۔" وہاں یہ فریب خوردہ پیروکار اپنی گمراہ قیادت پر سخت غیظ و غضب کا اظہار کریں گے۔ وہ یہ تمنا کریں گے کہ کاش ایک موقعہ ہمیں اور مل جاتا اور ہم زمین پر دوبارہ لوٹا دیئے جاتے تاکہ اپنی کمزور اور ناکارہ دھوکہ باز قیادت سے لاتعلقی کا اظہار کرتے۔ کیا ہولناک منظر ہے یہ' قائد اور پیروکار ایک دوسرے پر تبرہ بھیج رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے ہیں۔ کل کے دوست آج سخت دشمن ہیں۔ ان کے اس حسرت ناک انجام پر یہ نتیجہ بیان کیا جاتا ہے۔ كَذٰلِكَ

يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ "یوں اللہ ان لوگوں کے اعمال' جو یہ دنیا میں کر رہے ہیں' ان کے سامنے اس طرح لائے گا کہ یہ حسرتوں اور پشیمانیوں کے ساتھ ہاتھ ملتے رہیں گے۔ مگر آگ سے بچنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔"

اب بتایا جاتا ہے کہ زندگی کی پاک چیزوں سے فائدہ اٹھاؤ' ناپاک اور خبیث چیزوں سے دور رہو' خبردار! شیطان کی اطاعت نہ کرو' وہ تو ہر وقت ناپاک چیزوں کی طرف پکارتا ہے۔ شیطان بعض چیزوں کو خدا کی طرف سے حلال قرار دیتا ہے اور بعض کو حرام قرار دیتا ہے۔ حالانکہ اللہ نے اسے تحلیل و تحریم اور قانون سازی کا یہ اختیار ہرگز نہیں دیا ہے۔ (مسلمانوں کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ اپنے عقائد و نظریات کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور ذریعے سے راہ نمائی حاصل نہ کریں۔ جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر' ایسی چیزوں کو پکارتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ سمجھتی ہیں۔ ان کے اس احمقانہ فعل پر تنبیہ کی جاتی ہے۔ یوں ان آیات کا فصل سابق کی آیات کے ساتھ معنوی ربط بھی واضح ہو جاتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

"لوگو! زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں انہیں کھاؤ اور شیطان کے بتائے ہوئے راستوں پر نہ چلو۔ وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے' تمہیں بدی اور فحش کا حکم دیتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ تم اللہ کے نام پر وہ باتیں کہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ وہ اللہ نے فرمائی ہیں۔"

ان سے جب کہا جاتا کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں ان کی پیروی کرو' تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے باپ دادا کو پایا ہے۔ اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی کیے چلے جائیں گے؟ یہ لوگ جنہوں نے خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے۔ یہ بہرے ہیں' گونگے ہیں' اندھے ہیں' اس لئے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔"

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ وہی ایک معبود اور اللہ ہے۔ وہی ایک خالق ہے اور جو لوگ دوسروں کو اللہ کا ہمسر بناتے ہیں۔ ایک شدید عذاب ان کا منتظر ہے۔ اب یہاں بیان کیا جاتا ہے کہ اپنے بندوں کا رازق بھی وہی ہے۔ حلال و حرام کے بارے میں قانون سازی کا اختیار بھی اسی کو ہے اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا وحدت الوہیت کا یہ قدرتی ثمرہ ہے۔ جس ذات نے پیدا کیا اور پھر پرورش کی' وہی اس بات کی مستحق ہے کہ حلال و حرام کے معاملے میں قانون سازی کرے اور قانون سازی اور نظریات عقائد سے ہم آہنگ ہو۔ اس فقرے میں اللہ تعالیٰ اعلان فرماتے ہیں کہ زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں انہیں کھاؤ' سوائے ان کے جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے۔ حرام و حلال کے تعین میں صرف اللہ تعالیٰ سے راہ نمائی حاصل کرو اور ان معاملات میں سے کسی ایک میں بھی شیطان کی پیروی نہ کرو۔ وہ تو تمہارا دشمن ہے۔ وہ ہرگز تمہیں نیکی کا حکم نہیں دے سکتا۔ وہ تو تمہیں غلط تصورات دیتا ہے۔ غلط افعال کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان خود اپنی مرضی سے بعض چیزوں کو حلال قرار دے اور بعض کو حرام۔ حالانکہ اس پر اللہ کی جانب سے کوئی دلیل و سند نہ ہو اور اس پر مستزاد یہ کہ ایسے انسان کو یہ زعم بھی ہو کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ عین شریعت کے مطابق ہے۔ جیسا کہ یہود مدینہ اور مشرکین مکہ اپنے عقائد و نظریات اور افعال' اعمال کے بارے میں کرتے تھے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿١٦٨﴾ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿١٦٩﴾

"اے لوگو! زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں انہیں کھاؤ اور شیطان کے بتائے ہوئے راستوں پر نہ چلو۔ وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے' تمہیں بدی اور فحش کا حکم دیتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ تم اللہ کے نام پر وہ باتیں کہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ وہ اللہ نے فرمائی ہیں۔" (یہ حکم کہ زمین کی تمام چیزیں تمہارے لئے جائز و مباح ہیں۔ الا یہ کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہو' ظاہر کرتا ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات ایک سادہ اور وسیع نظریہ ہے۔ وہ اس کائنات کے مزاج اور پھر اس میں بسنے والوں کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو انسان کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس کے لئے ان کا استعمال جائز قرار دیا ہے اور یہ کہ کسی چیز کے بارے میں ممانعت کا کوئی حکم آیا ہو' یا یہ کہ کوئی حکم نہ بھی ہو تو بھی یہ عام حکم موجود ہے کہ کسی چیز کا استعمال حد اعتدال سے زیادہ نہ ہو۔ لیکن اصل پالیسی یہ ہے کہ دنیا کی تمام پاک چیزوں سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ تقاضائے فطرت کے عین مطابق' تنگی' سخت گیری اور ناجائز پابندیوں کے بغیر۔ صرف ایک شرط ضرور ہے وہ یہ کہ لوگوں کے لئے کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے؟ اس کا فیصلہ صرف اللہ کے پاس ہو' کیونکہ اللہ ہی نے ان طیبات کو پیدا کیا ہے۔ لہٰذا حلال و حرام کے احکامات وہ اس شیطان سے اخذ نہ کریں جو ان کا عین دشمن ہے۔ وہ

تو انہیں صرف برائی اور فحش کا حکم دیتا ہے۔ اور بغیر کسی ثبوت و تعین کے یہ شیطان اللہ پر افترا باندھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف کفر کی نسبت کر کے اس کی توہین کرتا ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا "ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کئے ہیں ان کی پیروی کرو' تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔"

یہ لوگ کون تھے' مشرکین بھی ہو سکتے ہیں جو بار بار یہ ورد کرتے تھے کہ جب بھی انہیں اسلام کی طرف دعوت دی جاتی اور کہا جاتا کہ وہ اپنی اقدار اور اپنے قانون کا ماخذ اسلام کو تسلیم کر لیں اور جاہلیت کی ان تمام باتوں کو ترک کر دیں جنہیں اسلام نے بحال نہیں رکھا' تو وہ یہی دلیل دیتے۔ یہودی بھی مراد ہو سکتے ہیں' جنہوں نے اپنی روایات کو سختی سے پکڑا ہوا تھا' اور وہ دین اسلام کی کسی بات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ بہرحال مراد مشرکین ہوں یا یہود' اسلام اپنے پیروکاروں کو بڑی شدت سے منع کرتا ہے کہ وہ نظریہ و عمل میں کوئی چیز ان لوگوں سے اخذ کریں۔ مسلمان ان لوگوں کی تقلید کریں اور نہ ہی ان سے کوئی چیز سوچے سمجھے بغیر درآمد کریں۔

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ "اگر ان کے آباؤ اجداد نے کسی چیز کو سمجھا ہو نہ کوئی راہ پائی ہو تو پھر بھی" "اگر ان کے آباؤ اجداد کی فہم و فراست یہ ہو تو کیا پھر بھی یہ لوگ ان کے اتباع پر اصرار کریں گے؟ تقلید و جمود کی یہ کیا گھناؤنی مثال ہے۔ اس تقلید و جمود کی وجہ سے ہی قرآن مجید ان کے لئے نفرت آمیز خاکہ تجویز کرتا ہے۔ انہیں ایک ایسے حیوان سے تشبیہ دی جاتی ہے جو کچھ نہیں سمجھتا۔ اگر چرواہا پکارتا ہے تو وہ صرف آواز سنتا ہے۔ کچھ نہیں سمجھتا کہ اس نے کہا کیا۔ بلکہ ان کی حالت اس حیوان سے بھی بدتر ہے۔ حیوان بہرحال دیکھتا ہے' سنتا ہے' آواز نکالتا ہے اور یہ لوگ نپٹ اندھے' گونگے اور بہرے ہیں۔

وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

"ان کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے۔ یہ بہرے ہیں' گونگے ہیں' اندھے ہیں' اس لئے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔"

گونگے' بہرے اور اندھے ہیں۔ اگرچہ وہ کانوں' آنکھوں اور زبانوں والے ہیں۔ وہ کیوں ایسے نہ ہوں کہ ان چیزوں کے باوجود وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ راہ ہدایت نہیں پاتے۔ جو آنکھیں ہوتے نہیں دیکھتا تو اندھا ہے' کان ہوتے نہیں سنتا تو بہرا ہے' زبان ہوتے حق بات نہیں کرتا تو گونگا ہے۔

جو شخص غور و فکر چھوڑ دے۔ علم و معرفت اور رشد و ہدایت کے دروازے اپنے اوپر بند کر دے اور نظریۂ حیات اور راہ عمل کا ماخذ و مصدر اس ذریعے کو قرار دے جو دراصل ماخذ و مصدر نہ ہو اور نہ اس کا حق ہو تو ایسے شخص کی اس سے زیادہ گھناؤنی تصویر کھینچنا ممکن نہیں ہے۔

اب یہاں روئے سخن مومنین کی طرف پھر جاتا ہے۔ ان کے لئے کھانے پینے کی پاک چیزوں کو حلال قرار دیا جاتا ہے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے منعم کا شکر ادا کریں۔ غیر پاکیزہ چیزوں میں سے بعض کو بصراحت حرام قرار دیا جاتا ہے۔ یہودی' مسلمانوں کے ساتھ ان طیبات اور محرمات کے معاملے میں خواہ مخواہ الجھتے تھے۔ ان پر تنقید کی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ حلال و حرام کے یہ احکامات اور یہ اصول تو خود ان

کے ہاں بھی بصراحت موجود تھے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ
اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ
مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ
عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ
الْكِتٰبِ وَ يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا
النَّارَ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ ۚۖ وَ لَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ
فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ ۲۱
الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ لَفِىْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع۹
۵

"اے ایمان لانے والو! اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو' تو جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انھیں بے تکلف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ اللہ کی طرف سے اگر کوئی پابندی تم پر ہے' تو وہ یہ ہے کہ مردار نہ کھاؤ۔ خون سے اور سور کے گوشت سے پرہیز کرو۔ اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھالے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے' تو اس پر کچھ گناہ نہیں اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ حق یہ ہے کہ جو لوگ ان احکام کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل کئے ہیں اور تھوڑے سے دنیوی فائدوں پر انہیں بھینٹ چڑھاتے ہیں' وہ دراصل اپنے پیٹ آگ سے بھر رہے ہیں۔ قیامت کے روز اللہ ہرگز ان سے بات نہ کرے گا' نہ انہیں پاکیزہ ٹھہرائے گا اور ان کے لئے دردناک سزا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے ضلالت خریدی اور مغفرت کے بدلے عذاب مول لیا۔ کیسا عجیب ہے ان کا حوصلہ کہ جہنم کا عذاب برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔
یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ نے تو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق کتاب نازل کی تھی' مگر جن لوگوں نے کتاب میں اختلافات نکالے وہ اپنے جھگڑوں میں حق سے بہت دور نکل گئے۔"

یہاں مسلمانوں کو "اے ایمان والو" کے الفاظ سے پکارا گیا ہے۔ اس لئے کہ ایمان ہی اہل اسلام کے درمیان مضبوط رابطہ ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ میں ہی ماخذ قانون ہوں اس لئے قانون مجھ سے اخذ کرو۔ مجھ ہی سے حلال و حرام کے احکام اخذ کرو۔ بتایا جاتا ہے کہ میں نے تم پر جو انعامات کئے ہیں انھیں یاد رکھو۔ میں ہی تمہارا رازق ہوں اور میں نے ہی تمہارے لئے کھانے پینے کی پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیا ہے۔ پاکیزہ چیزوں میں سے کسی ایک کو بھی حرام نہیں قرار دیا گیا۔ جو چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں وہ اس لئے حرام نہیں کہ اللہ تم پر تنگی کرنا

چاہتا ہے بلکہ اس لئے کہ اپنی اصلیت کے اعتبار سے وہ پاک اور طیب نہیں ہیں۔ وہی تو ہے جو ابتدائے آفرینش سے تمہیں رزق دے رہا ہے۔ پھر تلقین ہوتی ہے کہ اگر وہ صرف اللہ وحدہ لاشریک کی بندگی چاہتے ہیں تو پھر اس کا شکر ادا کریں۔ شکر بھی عبادت اور بندگی کی ایک قسم ہے۔ اور اللہ شکر ادا کرنے سے بہت راضی ہوتا ہے۔ یہ تمام ہدایات اس آیت میں دے دی گئی' جو چند کلمات پر مشتمل ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ایمان لانے والو اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انہیں بے تکلف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔"

اس کے بعد مخصوص طور پر بعض ان چیزوں کو جو حرام قرار دی گئی ہیں بیان کر دیا جاتا ہے۔ اور لفظ قصر "انما" استعمال کر کے دائرہ محرمات کو محدود کر دیا إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ "اللہ کی طرف سے اگر کوئی پابندی تم پر ہے تو وہ یہ ہے کہ تم حرام نہ کھاؤ۔ خون سے اور سور کے گوشت سے پرہیز کرو اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔"

ہر سلیم الفطرت انسان' از روئے طبع مردار کو ناپسند کرتا ہے۔ یہی حال خون کا ہے لیکن فطرت کی کراہت کے علاوہ قرآن اور اس سے پہلے تورات کی بیان کردہ حرمت کے طویل عرصہ بعد' طب جدید نے بھی اس سلسلے میں کچھ قیمتی انکشافات کئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ خون اور مردار میں کئی قسم کے مضر صحت اجزاء اور جراثیم (Microde) جمع ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہمیں کوئی یقینی علم نہیں ہے کہ طب جدید نے وہ تمام مضرات اور نجاستیں معلوم کر لی ہیں اور کوئی اور سبب تحریم اب باقی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان اشیاء کی تحریم کے لئے کچھ اور اسباب بھی ہوں جن کا علم تک ہمیں نہ ہو سکا ہو۔ رہا خنزیر تو اس کے متعلق ابھی تک بعض لوگ اچھی رائے رکھتے ہیں۔ لیکن فطرت سلیمہ اس سے بھی شدید متنفر ہے۔ ایک طویل عرصہ سے شرائع سماویہ نے اسے حرام قرار دیا ہوا ہے۔ اب جا کر یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کے خون' گوشت اور انتڑیوں میں ایک خطرناک کیڑا موجود ہے۔ یہ کیڑا لمبے دھاگے (Tape Worm) کی شکل میں ہوتا ہے۔ اور اس کے انڈے ملفوف ہوتے ہیں۔ اس کے بارے میں بعض سور خور کہتے ہیں۔ صحت و صفائی کے وسائل بہت ترقی کر چکے ہیں۔ لہذا یہ کیڑے اور ان کے انڈے مضر صحت نہیں رہے۔ کیوں کہ زیادہ حرات سے یہ انڈے اور کیڑے یکسر ختم ہو جاتے ہیں۔ اور صحت و صفائی کے جدید وسائل کے تحت یہ سہولتیں ہر جگہ میسر ہیں لیکن یہ لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ قرون طویلہ کے بعد ان کے علمی جدوجہد نے صرف ایک مضر صحت کیڑا دریافت کیا۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ خنزیر کے گوشت میں کوئی اور ایسا مضر صحت جز نہیں ہے۔ جس کا انکشاف نہ ہوا ہو۔ شریعت الہیہ، جس نے ہزاروں سال پہلے' انسانی علم و آگہی سے بہت پہلے اس مضر صحت کو ممنوع قرار دیا' کیا اس بات کی مستحق نہیں ہے کہ اس پر کلی اعتماد کیا جائے۔ اس کے فیصلے کو قول فیصل سمجھا جائے اور اس کے حلال کردہ کو حلال اور اس کے حرام کردہ کو حرام قرار دیا جائے۔ اس لئے کہ یہ شریعت حکیم و خبیر خدا کی جانب سے نازل شدہ ہے۔

وہ چیزیں جن پر اللہ کے سوا دوسروں کا نام لیا گیا ہو۔ ان چیزوں کے مالکان نے انہیں غیر اللہ کی طرف موڑ دیا ہو۔ یہ چیزیں بھی حرام ہیں۔ اس لئے نہیں کہ ان چیزوں کی ذات میں حرمت کی کوئی وجہ ہے' محض اس لئے کہ ان چیزوں کا رخ غیر اللہ کی طرف کر دیا گیا ہے۔ مرکز توجہ بدل گیا' ضمیر خالص نہ رہا۔ روح پاک نہ رہی' دل اللہ کے لئے سالم نہ رہا اور عقیدہ و نظریہ پاک نہ رہا۔ یہ ہے وہ روحانی سبب جس کی وجہ سے ان چیزوں کا استعمال حرام قرار دیا گیا اور یہ بھی اسی طرح ناپاک ہوا' جس طرح مادی نجاست ناپاک ہوتی ہے۔ لہذا یہ بھی غیر طیب اور وہ بھی غیر طیب۔ چونکہ اسلام اس امر کی تاکید کرتا ہے کہ مسلمان تعظیم و تکریم کے ساتھ صرف بارگاہ الٰہی کی طرف متوجہ

ہوں اور اس میں کسی اور کو شریک نہ کریں' اس لئے ان چیزوں کو بھی اسی طرح نجس قرار دے کر نجس العین اشیاء کے ساتھ رکھا۔ کیونکہ یہ اشیاء نظریاتی طور پر ناپاک ہیں۔ا۔

پاکی قلب و نظر اور جسم و جگر ان تمام حرام کردہ چیزوں کے اسباب میں قدر مشترک ہے۔ چونکہ سابقہ آیات میں عقیدۂ توحید بیان ہوا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ تمہارا خالق و رازق ایک ہے۔ یہاں کہا گیا کہ شارع اور مقنن بھی وہی ہے۔ رزق و خلق کا مصدر اور قانون و شریعت کا مآخذ ایک ہے۔ ان آیات میں یہ تصور ایک گہرا ربط پیدا کر دیتا ہے۔

اس حرمت کے باوجود اسلام بعض حالات و ضرورت کا خیال بھی رکھتا ہے۔ ایسے حالات میں محدود طور پر' ضرورت کی کم سے کم حد تک' ان محرمات کو جائز قرار دے دیتا ہے۔ لیکن ہدایت کرتا ہے کہ ضرورت کی حدود سے آگے ہرگز نہ بڑھا جائے۔ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ "ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھا لے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو۔ یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے' تو اس پر کچھ گناہ نہیں اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" استثناء کا یہ اصول بذاتہ تو عام ہے' لیکن یہاں یہ مذکورہ بالا محرمات پر متفرع ہے۔ لیکن ان محرمات کے علاوہ اس کا اطلاق دوسرے محرمات پر بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں ایسی ضرورت ہو' جہاں زندگی خطرے میں ہو اور ان محرمات کے علاوہ کوئی اور چیز سامنے نہ ہو تو وہاں بھی کسی ممنوع چیز کو کم از کم ضرورت پورا کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت کے مقامات کے بارے میں فقہاء کے درمیان فقہی اختلافات پائے جاتے ہیں' مثلاً کیا ضرورت کے مسئلے میں قیاس چلے گا یا محض منصوص ضرورت تک استفادہ محدود ہو گا؟ پھر ضرورت پوری کرنے کی مقدار کیا ہے؟ کم از کم استعمال ہے یا سیر ہو کر کھا لینا ہے؟ میں یہاں ان اختلافات کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا۔ جو کچھ کہا گیا' فی ظلال القرآن کے لئے کافی ہے۔

جن چیزوں کو حرام یا حلال قرار دیا گیا تھا' ان کے بارے میں یہودیوں نے غوغا آرائی شروع کر دی تھی۔ جیسا کہ قرآن مجید نے دوسری جگہ صراحت کی ہے۔ بعض چیزیں ایسی بھی تھیں جو صرف یہودیوں پر حرام کی گئی تھیں۔ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ "اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے' اور گائے اور بکری کی چربی بھی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا ان کی آنتوں سے لگی ہوئی ہو یا ہڈی سے لگی رہ جائے۔" یہ چیزیں مسلمانوں کے لئے جائز تھیں۔ غالباً اس جواز پر وہ سخت معترض تھے۔ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ ان کو ان چیزوں کی حرمت پر بھی اعتراض تھا جو یہاں حرام کر دی گئی ہیں حالانکہ یہ چیزیں تورات میں خود ان کے لئے بھی حرام بیان ہوئی تھیں۔ مطلب ان کا صرف یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح قرآنی احکامات کو مشکوک کیا جائے اور مسلمانوں کے دلوں میں یہ شبہ ڈال دیا جائے کہ حضور پر وحی من جانب اللہ آتی ہے یا نہیں۔

جو لوگ آسمانی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کو چھپاتے ہیں ان پر ان آیات میں شدید ترین تنقید کی گئی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

ا۔ یاد رہے کہ اسلام معدہ اور جسم کی پاکی کے مقابلہ میں قلب و نظر کی پاکی کو زیادہ ملحوظ رکھتا ہے۔ (مترجم)

اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ۝

"حق یہ ہے کہ جو لوگ ان احکام کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل کئے ہیں اور تھوڑے دنیوی فائدوں پر انہیں بھینٹ چڑھاتے ہیں' وہ دراصل اپنے پیٹ آگ سے بھر رہے ہیں۔ قیامت کے روز اللہ ہرگز ان سے بات نہ کرے گا' نہ انہیں پاکیزہ ٹھہرائے گا' اور ان کے لئے دردناک سزا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے ضلالت خریدی اور مغفرت کے بدلے عذاب مول لیا' کیسا عجیب ہے ان کا حوصلہ کہ جہنم کا عذاب برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ نے تو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق کتاب نازل کی تھی مگر جن لوگوں نے کتاب میں اختلافات نکالے وہ اپنے جھگڑوں میں حق سے بہت دور نکل گئے۔

کون لوگ تھے وہ جو اللہ کے نازل کردہ احکام کو چھپاتے تھے؟ سب سے پہلے ان سے مراد اہل کتاب ہیں۔ لیکن قرآن مجید کی اس آیت کے مفہوم میں ہر مذہب و ملت کے وہ لوگ شامل ہیں جو سوچنے سمجھنے کے باوجود حق کو چھپاتے ہیں۔ کیوں چند ٹکوں کی خاطر ان مفادات کی خاطر جو وہ کتمان حق کے نتیجے میں حاصل کرتے ہیں یا اس لئے کہ انہوں نے کچھ مفادات پیش نظر رکھے ہوتے ہیں اور اگر وہ حق بیان کریں تو یہ مفادات خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔ یا ثمن قلیل سے مراد پوری دنیا ہے۔ کتمان حق سے یہ لوگ ثواب آخرت اور رضائے الٰی سے محروم ہو جاتے ہیں اور یہ ایک عظیم خسارہ ہے۔ اس کے مقابلے میں بے شک پوری دنیا ثمن قلیل ہے۔

کھانے پینے کے حلال و حرام اشیاء کے بیان کے سلسلے میں اعلان ہوتا ہے۔ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وہ دراصل اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں۔" حلال و حرام کے بیان کی مناسبت سے ان کے لئے یہ فقرہ استعمال کیا گیا۔ یعنی حق چھپا کر وہ جو قلیل اجرت لیتے ہیں اور اسے کھاتے ہیں' یہ دراصل ان کے پیٹ میں آگ ہو گی اور ان کا کھانا بھی آگ ہی ہو گی۔

انہوں نے حق کو چھپایا۔ اس کے تحت سزا ملے گی انہیں۔ انہیں قیامت کے دن ذلت اور اہانت کی حالت میں چھوڑ دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی توجہ اور نظر کرم سے وہ محروم رہیں گے اور اس حالت زار' بے قدری اور ذلت کی تعبیر اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ "قیامت کے روز اللہ ہرگز ان سے بات نہ کرے گا اور نہ انہیں پاکیزہ ٹھہرائے گا۔" ان کے ساتھ کوئی بات نہ ہو گی' ان کا کوئی اہتمام نہ ہو گا' انہیں پاک نہ کیا جائے گا اور ان کی مغفرت بھی نہ ہو گی۔ اور انہیں مکمل طور پر نظرانداز کر دیا جائے گا۔ یہ اس لئے کہ اہل ایمان کی نظر میں ان کی سزا خوفناک ہو جائے اور صورت حال عام لوگوں کے حس و شعور کے قریب ہو جائے وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ "اور ان کے لئے دردناک سزا ہے۔" اور ایک دوسری زندہ تعبیر اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ "یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے ضلالت خریدی اور مغفرت کے بدلے عذاب مول لیا۔ گویا یہ ایک خرید و فروخت ہے۔ جس میں یہ لوگ ہدایت سے روگردانی کرتے ہیں اور ضلالت خریدتے ہیں۔ مغفرت سے محروم ہوتے اور عذاب دائمی خریدتے ہیں۔ کس قدر ناسمجھ ہیں یہ لوگ جو اس قدر عظیم خسارے کا سودا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے ایک عظیم الشان برائی خرید لی ہے۔ ہدایت ان کے لئے عام تھی مگر انہوں نے اسے ترک کر کے ضلالت کو اختیار کر لیا۔ مغفرت کے مواقع انہیں فراہم تھے۔ مگر انہوں نے انہیں گنوا دیا اور عذاب کو اپنا لیا۔ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ' کیا عجیب ہے

ان کا حوصلہ کہ جہنم کا عذاب برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس کی طرف آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کے اس احمقانہ کام پر قدرت خندہ زن ہے۔

انہوں نے سخت گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا ہے اور یہ اس کی پوری سزا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو کتاب اس لئے بھیجی تھی کہ اسے لوگوں تک پہنچایا جائے' اسے اس زمین پر نافذ کیا جائے۔ اور وہ ان کا قانون ہو' ان کا نظام زندگی ہو' لیکن ان ظالموں نے اس کو چھپالیا۔ اسے چھپاکر میدان عمل سے خارج کر دیا۔ حالانکہ وہ ایک ایسی سچائی تھی جس پر عمل کرنے کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ "یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ نے تو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق کتاب نازل کی تھی۔" اور جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئے وہ ہدایت پر آگئے' حق کے ساتھی بن گئے' ان لوگوں کے ٹولے میں آگئے جو حق کے راہ یاب تھے۔ انہوں نے فطرت کائنات کا ساتھ دیا اور فطرت کے حقیقی اصولوں پر آگئے۔

وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ "مگر جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف نکالے وہ اپنے جھگڑوں میں حق سے بہت دور نکل گئے۔" ایسے لوگ حق سے دور جاچکے ہیں۔

وہ اصول فطرت سے بھی ٹکراتے ہیں۔ وہ خود ایک دوسرے سے بلکہ خود اپنے نفس سے بھی ٹکراتے ہیں۔ وہ اس طرح تھے اور اسی طرح رہیں گے۔ یہی حال ہو گا ہر اس امت کا جو کتاب اللہ میں جھگڑے ڈالتی ہے۔ کتاب الٰہی کو پورے طور پر قبول نہیں کرتی۔ بلکہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ ہر دور اور ہر زمانے میں' ہر امت اور ہر قوم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہی سلوک ہے۔ جس دنیا میں ہم رہ رہے ہیں' اس آیت کا مصداق ہمیں اچھی طرح نظر آرہا ہے۔

سب سے آخر میں ایک اور صرف ایک آیت میں ایمانی تصور زندگی کے تمام اصول رکھ دیئے جاتے ہیں۔ ایمانی طرز عمل کا معیار بیان کر دیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ قرآن کی رو سے نیک لوگوں کی صفات کیا ہیں؟

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لئے یا مغرب کی طرف' بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر' مسکینوں اور مسافروں پر' مدد کے لئے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے' نماز قائم کرے' اور زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں' تو وفا کریں اور تنگی اور مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راست باز لوگ

اور یہی متقی ہیں۔" صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت بھی تحویل قبلہ کے احکام اور ان پر یہودیوں کے طویل اعتراضات و جوابات کے ساتھ مربوط ہیں۔ تحویل قبلہ کی حکمت کے بارے میں تو ہم اس سے پہلے بیان کر آئے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ عبادات اور شعائر دین کی ظاہری شکل و صورت کے بارے میں یہودیوں کی ظاہر بینی اور تقشف پرستی کو بے نقاب کرتے ہوئے' حسن و قبح کا ایک عظیم معیار اور نیکی اور بدی کی اصلی حقیقت بیان کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہودی ان ظاہری امور کے بارے میں بے حد حساس تھے اور جھگڑتے تھے۔

تحویل قبلہ یا تمام عبادات میں غرض و غایت یہ نہیں کہ لوگ مشرق کی طرف رخ کریں یا مغرب کی طرف چھوڑ کر کے عبادت سرانجام دیں۔ بیت المقدس کی طرف رخ کریں یا مسجد حرام کی طرف۔ یا یہ کہ عبادات کی موجودہ شکل و صورت ہی عین خیر و بھلائی نہیں ہے۔ بلکہ ان کے لئے بہت ضروری ہے کہ دل کے اندر محسوس کیا جانے والا تصور اور اسلامی نظریۂ حیات کا زندہ شعور ضروری ہے۔ ان ذہنی امور کے ساتھ ساتھ مخصوص طرز عمل اپنانا بھی ضروری ہے۔ ورنہ نیکی و بھلائی کے حصول اور حسن و خیر کو بروئے کار لانے کا اصل مقصد پورا نہ ہو سکے گا۔ نیکی دراصل ایک تصور ہے' ایک شعور ہے' کچھ اعمال ہیں' ایک طرز عمل ہے۔ یہ ایک تصور حیات ہے۔ جو ایک فرد اور ایک جماعت کے ضمیر پر اثرانداز ہو' وہ ایک عمل ہے جو فرد و جماعت کی زندگیوں میں پسندیدہ اثرات پیدا کرے۔ صرف مشرق و مغرب کی طرف سے رخ پھیر دینے سے زندگی میں یہ انقلاب کیونکر آسکتا ہے۔ مَنہ کوئی ادھر کرے یا ادھر کرے' فرق کیا پڑتا ہے۔ اصل مقصد تو رجوع قلب ہے۔ جو اللہ کے احکام مانتا ہے' منزل پا لیتا ہے۔ یہی معاملہ ہے تمام دینی شعائر کی ظاہری شکل و صورت کا' جنہیں یہ ادا کرتے ہیں۔ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ "بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے۔"

یہ ہے بھلائی کا وہ معیار جو تمام بھلائیوں کا مجموعہ ہے۔ اس معیار میں نیکی کی جو اقدار مقرر کی گئی ہیں وہ بہت ہی وزنی ہیں۔ اللہ پر ایمان' یوم آخر پر ایمان اور ملائکہ و کتب اور انبیاء پر ایمان کی قدر و قیمت اسلامی نقطۂ نظر سے کیا ہے؟

اللہ پر ایمان لانا انسانی زندگی میں ایک نقطۂ انقلاب ہے۔ اس کے ذریعے انسان مختلف قوتوں' مختلف چیزوں اور مختلف پسندیدہ تصورات کی بندگی اور غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور صرف ایک بندگی اور ایک غلامی قبول کر لیتا ہے۔ یوں انسان تمام دوسرے انسانوں کے ساتھ' ایک ہی صف میں کھڑا ہو کر' ایک ہی معبود کے سامنے جھک کر' اخوت و مساوات کا بلند مقام حاصل کر لیتا ہے۔ ایمان وہ مقام ہے جہاں طوائف الملوکی کی بجائے ایک نظام قائم ہوتا ہے۔ انتشار کی جگہ یکسوئی اور اختلاف کی جگہ اتحاد قائم ہو جاتا ہے نیز گمراہی کے بجائے ایک اونچا نصب العین سامنے آ جاتا ہے۔ اگر انسان کے دل میں ایک واحد لاشریک خدا پر ایمان نہ ہو تو' اس دنیا میں اس کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا' جس پر دلجمعی کے ساتھ اپنی قوتوں کو مرتکز کر سکے اور جس پر مساوات کے ساتھ وہ مجتمع ہو سکے۔ بعینہ اس طرح جس طرح وجود کائنات ایک نقطہ کے اردگرد مرتکز ہے۔ اس کے اجزا کا باہمی ربط ہے۔ اور ان کے مابین واضح نسبت موجود ہے۔ اور جس کے مختلف اجزاء کے باہمی علائق اور مقاصد بالکل واضح اور معلوم اور مربوط ہیں۔

آخرت پر ایمان کا مقصد یہ ہے کہ انسان جزا و سزا میں اللہ تعالیٰ کی عدالت کو یقین کے ساتھ تسلیم کرے۔ یہ جانے کہ اس کرۂ ارض پر انسان کو یونہی بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا۔ وہ غیرذمہ دار نہیں ہے بلکہ اسے حساب دینا ہو گا اگر کوئی بھلائی کرے تو وہ ختم نہیں ہو سکتی اگرچہ اس کی جزا اس دنیا میں نہ ملے۔ ملائکہ پر ایمان بھی غیب پر ایمان کا ایک حصہ ہے۔ انسانی فہم و ادراک اور ایک حیوان کے فہم و ادراک میں یہی فرق ہے۔ انسانی تصور حیات اور حیوانی تصور حیات میں یہی فرق ہے کہ انسان محسوسات سے آگے کی بھی بعض چیزوں پر ایمان لاتا ہے اور ان کا ادراک کر سکتا ہے۔ جبکہ حیوان کا احساس صرف محسوسات کے دائرے تک محدود ہوتا ہے (ا) کتاب اور نبیوں پر

ایمان کا مقصد یہ ہے کہ انسان تمام رسولوں پر ایمان لائے بلاتفریق۔ یعنی انسانیت بھی ایک ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے۔ اس کا خدا بھی ایک ہے۔ اس کے لئے دین اور نظام زندگی بھی ایک ہے۔ اس طرح مومن انبیاء ورسل کے اعلیٰ خیالات کا وارث ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کتب ورسل پر ایمان ایک مومن کو بہت ہی قیمتی شعور عطا کرتا ہے۔

مال کے ساتھ انسان کو بڑی محبت ہے لیکن مالی قربانی کرنے کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ غریب رشتہ داروں' یتیموں' مسکینوں' مسافروں اور گردن چھڑانے اور غلامی سے نجات دلانے کے لئے مال خرچ کرنا یہ سبھی کام انسان کو بلند مرتبہ بناتے ہیں۔

انفاق فی سبیل اللہ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان لالچ' خود غرضی اور بخل کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ مال کی محبت ہاتھوں کو انفاق سے کھینچ لیتی ہے۔ انسان بلند ہمتی' اولوالعزمی' جود وسخا اور داد و دہش کے مقام بلند سے گر جاتا ہے اور روح انسانی میں کشادگی نہیں رہتی۔ اسلامی نظام میں انفاق کا ایک روحانی مقام ہے۔ اس لئے یہاں مسلمانوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ مال کی محبت کے باوجود اپنا محبوب ترین اور پسندیدہ ترین مال کو دل و جان کی آمادگی اور کشادگی کے ساتھ خرچ کریں۔ اس کی بڑی روحانی اہمیت ہے اور اس طریقہ سے مومن اپنے آپ کو دولت کی پوجا اور دولت کی غلامی سے چھڑا لے گا۔ دولت کی پوجا سے انسان بالیقین ذلیل ہو جاتا ہے۔ سرفرازی کی بجائے سرنگوں ہوتا ہے اور انفاق سے وہ لالچ اور حرص کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے سرنگوں ہونے کے بجائے وہ گردن فراز ہو جائے گا لیکن اگر وہ انفاق نہ کرے گا تو ذلیل ہو گا۔ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی بہت بڑی قدر و قیمت ہے۔ کیونکہ اسلامی نظام کی غایت یہ ہے کہ وہ انسان کو سب سے پہلے نفسیاتی پریشانیوں' اخلاقی کمزوریوں اور طمع و لالچ سے نجات دلائے۔ یہ کام انسان کے لئے معاشرتی آزادی سے بھی پہلے کیا جاتا ہے۔ شخصی و سیاسی آزادی سے بھی پہلے کیوں؟ اس لئے کہ جو شخص اپنے نفس کا غلام ہو وہ بسہولت طاغوت کی غلامی کے لئے بھی تیار ہوتا ہے۔ لیکن جو شخص خواہشات نفسانیہ کے قید و بند سے آزاد ہو جاتا ہے وہ اپنے معاشرے اور سوسائٹی میں بھی آزاد ہوتا ہے۔ کسی کی غلامی کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ انسانی معاشرے میں انفاق فی سبیل اللہ کی ایک معاشرتی قدر و قیمت بھی ہے۔ اقرباء سے صلہ رحمی کی وجہ سے نفس انسانی میں مروت پیدا ہوتی ہے' خاندان میں شرافت کا چلن فروغ پاتا ہے اور اقرباء کے درمیان تعلقات زیادہ قوی ہو جاتے ہیں۔ اسلامی معاشرے کی اساس خاندان پر ہے اس لئے یہاں انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعہ خاندانی نظام کو مضبوط کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ پھر یتیموں کی مالی امداد کا حکم ہے۔ اس کا مقصد اصل معاشرہ میں امیر و غریب' طاقتور اور کمزور کے درمیان نظام کفالت کا قیام ہے۔ یتامٰی مادری اور پدری شفقت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کے لئے ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ ان کے احساس محرومیت کی تلافی کی جائے۔ پھر اس تکافل کے نتیجے میں پوری سوسائٹی کو ان خودرو شتر بے مہار اور غیر تربیت یافتہ افراد کی کثرت سے بھی بچایا گیا ہے۔ جو معاشرے کے لئے مسائل پیدا کرتے ہیں۔ اس کے لئے وبال جان بن جاتے ہیں اور فتنہ سامانیوں کا موجب بنتے ہیں۔ ایسے لوگ آگے جاکر معاشرے کی لاپروائی اور بے مروتی کا خوب انتقام لیتے ہیں۔ (۲) مساکین پر انفاق جن کے پاس وسائل زندگی نہیں ہیں۔ پھر بھی وہ خاموش بیٹھے ہیں۔ عزت نفس رکھتے ہیں اور سوال نہیں کرتے۔ یہ انفاق ان کی عزت نفس کے لئے محافظ ہے۔ انہیں تباہی سے بچاتا ہے۔ نظام انفاق سے اسلامی معاشرے میں' ایسے حضرات کے دلوں میں اجتماعی کفالت اور ضمانت کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ تو ہوتا ہی وہ ہے جس میں کسی فرد کو بے یار و مددگار نہ چھوڑا جائے اور اس کے کسی عضو کو ضائع ہونے نہ دیا جائے۔ ابن سبیل (مسافر) جو اپنے خاندان سے دور ہو' جن کے پاس وسائل موجود نہ ہوں' اچانک مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ خاندان کے افراد اس سے دور ہوں' ایسے حالات میں یہ مسافر بھی مصیبت زدہ ہے۔

(۱) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات۔ (۲) آج کے مغربی ترقی یافتہ معاشرہ کے لئے ایسے ہی لوگ وبال جان بنے ہوئے ہیں۔ (مترجم)

یہ انفاق اس کے لئے ایک قسم کی ہنگامی امداد ہے۔ اس امداد سے اسے یہ شعور دیا جاتا ہے کہ پوری انسانیت اس کا خاندان ہے۔ ہر ملک اس کا ملک ہے' ہر جگہ اس کا خاندان موجود ہے' مسلمان اس کے اہل خاندان ہیں۔ ہر جگہ اس کے اپنے مال کے بدلے اس کے لئے مال موجود ہے۔ اس کے لئے صلہ رحمی موجود ہے۔ اور اس کے لئے آرام کا سامان فراہم ہو سکتا ہے۔ سائلین پر انفاق ضروری ہے تاکہ ان کی ضرورت پوری ہو' وہ آئندہ سوال کرنا چھوڑ دیں۔ اسلام بھیک مانگنے کو ناپسند کرتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جس کے پاس بقدر کفالت موجود ہو اس کے لئے سوال جائز نہیں ہے۔ جو کام کاج کر سکتا ہے' اس کے لئے بھی سوال جائز نہیں ہے۔ ایسے شخص کے لئے خدا کا حکم یہ ہے کہ وہ مزدوری کرے' بھیک نہ مانگے یا قناعت کرے' دست سوال دراز نہ کرے' بھیک مانگنا تب جائز ہے جب کام نہ ہو' مال نہ ہو' اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو۔

غلامی سے چھڑانے میں انفاق بھی ایک مد ہے۔ جو بدقسمت اپنی بدعملی کی وجہ سے غلام ہو گیا' اس نے اسلام کے خلاف تلوار اٹھائی۔ جنگ کے نتیجے میں اس کی آزادی ختم ہو گئی۔ اسے عارضی طور پر معاشرے میں مقام شرافت سے محروم کر دیا گیا۔ اس پر انفاق یوں ہو کہ اس کو خرید کر آزاد کر دیا جائے یا غلام اپنے آقا سے معاہدۂ آزادی کرے اور اسے رقم معاہدہ ادا کرنے کا پابند ہو۔ اسلام نے غلاموں کے لئے یہ قانون بنایا تھا کہ غلام جس وقت چاہتا مالک کے ساتھ ایک معاہدہ آزادی کرتا ہے اور آزاد ہو جاتا ہے۔ اس معاہدے کے مطابق اسے وہ رقم ادا کرنی ہوتی ہے جو طے پا جائے۔ (ایسے معاہدہ کے بعد غلام) اپنے کام کی اجرت وصول کرنے کا مستحق ہو جاتا ہے جو معاہدے کی رقم میں کٹتی رہتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ مستحق زکوٰۃ ہو جاتا۔ اسی طرح انفاق فی سبیل اللہ کی تمام مدات میں سے اس کی امداد کی جاسکتی تھی تاکہ وہ جلد از جلد رقم معاہدہ ادا کر کے آزادی کی نعمت سے سرفراز ہو جائے۔

## اقامت صلوٰۃ

نیکی کے اس معیار میں نماز کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اور اقامت صلوٰۃ صرف مشرق و مغرب کی طرف چہرہ کر کے کھڑے ہو جانے سے اقامت کا مفہوم ادا نہیں ہو جاتا۔ یہ نقطہ وسیع تر مفہوم رکھتا ہے۔ جو یہ ہے کہ انسان کا ظاہر و باطن اور اس کی عقل و روح سب پوری طرح اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ نماز نہ تو محض جسمانی ورزش کا نام ہے اور نہ ہی صرف صوفیانہ ورد و وظائف کا نام ہے۔ نماز دراصل اسلام کے بنیادی فکر و نظر کی عکاس ہے۔ اسلام اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ انسان اس ایک وجود میں جسم' روح اور عقل تین چیزوں کا اجتماع ہے۔ اسلام اس بات کا بھی قائل نہیں ہے کہ ان تین طاقتوں کی سرگرمیوں اور دائرہ عمل میں باہمی کوئی تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ جسم کو فنا کر کے روح کو آزاد کرنا جائز نہیں سمجھتا۔ کیونکہ روحانی آزادی کے لئے جسمانی فنا یا جسم کو مارنا لازمی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے' اپنی سب سے اہم اور بڑی عبادت یعنی نماز میں ان تینوں طاقتوں کی سرگرمی کو ہم آہنگ کر دیا ہے۔ نماز میں تینوں قوتیں مکمل نظم کے ساتھ اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں۔ قیام' رکوع اور سجدہ وہ جسمانی حرکات ہیں جو روح کو رجوع الی اللہ کی طرف راغب کرتی ہیں۔ قرآن کی تلاوت' اس میں غور و فکر اور مفہوم کو سمجھنا عقل کا کام ہے اور اس پورے عرصے میں عقل انسانی اس کام میں مصروف ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عزت توجہ اور مکمل تسلیم و رضا اور عجز و انکسار روح کا کام ہے اور اس طرح یہ تینوں قوتیں ایک ہی وقت میں مصروف کار ہوتی ہیں۔ غرض اس معنی میں اقامت صلوٰۃ پوری اسلامی طرز فکر کی نمائندہ ہے۔ اور وہ چشم بینا کو یہ سبق یاد دلاتی ہے کہ پوری زندگی کے متعلق اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟ ہر نماز اور ہر نماز کی ہر رکعت میں ہم یہ سبق دہراتے ہیں۔

# زکوٰۃ کی ادائیگی

یہ اسلامی نظام میں غرباء و مساکین کے لئے اغنیاء اور اہل ثروت کی دولت پر عائد کردہ' ایک اسلامی ٹیکس ہے۔ یہ ٹیکس اللہ تعالیٰ نے عائد کیا ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ ہی دولت کا حقیقی مالک ہے۔ بندے کو اس کا مجازاً مالک بنایا گیا ہے۔ اور اس لئے اسلامی نقطۂ نظر سے اس پر کچھ شرائط عائد کی گئی ہیں اور ان میں سے اہم اور لازمی شرط ادائیگی زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کا ذکر عام انفاق فی سبیل اللہ کے عام حکم کے بعد کیا گیا ہے جس کا ذکر اوپر ہو گیا ہے کہ دولت محبت کے باوجود اقرباء وغیرہ پر صرف کی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ مذکورہ بالا تمام صرف مال اور انفاق فی سبیل اللہ سے علیحدہ ایک مستقل مد ہے۔ یہ لازمی ٹیکس اور منصوص فرض ہے۔ جب کہ عام انفاق فی سبیل اللہ صرف ترغیب ہے۔ لیکن نیکی کا یہ مجموعی معیار جس کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے' اس وقت تک مکمل نہ ہو گا جب تک ان دونوں مدات پر حسب حساب و حسب توفیق عمل نہ کیا جائے۔ یہ دونوں مدیں اسلام کے بنیادی عناصر ترکیبی ہیں۔ قرآن نے زکوٰۃ کو علیحدہ اس لئے بیان کیا ہے کہ یہ ایک لازمی اور فرض مد ہے' جب کہ مذکورہ بالا دولت کا عام خرچ نفلی ہے۔ لیکن ہر انسان کی زندگی میں دونوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ ایک پر عمل کرنے سے دوسرا ہرگز ساقط نہیں ہو سکتا۔

# وفائے عہد

یہ اسلام کی وہ علامت ہے جس کی حفاظت میں اسلام بے حد کوشش کرتا ہے۔ قرآن کریم میں بار بار اس کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اسے ایمان کی نشانی گردانا گیا ہے۔ اسے احسان اور آدمیت کی نشانی قرار دیا گیا ہے' اور یوں اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ ایک انسان اور انسان کے تعلقات میں ایک فرد اور جماعت کے تعلقات میں' ایک قوم اور دوسری قوم کے تعلقات میں اعتماد اور اطمینان پیدا کرنے کے لئے وفائے عہد نہایت ہی ضروری ہے۔ وفائے عہد کی حیثیت اول خود ذات باری تعالیٰ سے اپنے عہد کی وفا ہے۔ اگر ایک مستحق اپنے مالک کا وفادار نہ ہو تو ہمیشہ پریشان اور غیر مطمئن رہے گا اور کوئی عہد پورا نہ کر سکے گا۔ وہ کسی میثاق پر جم نہ سکے گا۔ کسی انسان پر اعتماد نہ کریگا۔

دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ' وفائے عہد میں اسلام اس مقام اس مقام بلند تک پہنچا ہے کہ جس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتی۔ کوئی قوم' کوئی امت بھی اس مقام بلند تک نہیں پہنچ سکی۔ یہ مقام انسانیت کو اسلام کے سایہ اور اسلامی نظریۂ حیات کی روشنی ہی میں معلوم ہوا۔

# حق و باطل کی کشمکش میں صبر

صبر وہ وصف ہے جو انسان کو مصائب برداشت کرنے کے قابل بناتا ہے۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ کوئی مشکل مرحلہ آئے تو انسان بہت ہمت سے اس کا مقابلہ کرے۔ مصیبت کے وقت آہیں بھرنا شروع نہ کر دے۔ سختیوں میں جزع و فزع شروع نہ کر دے۔ صبر اور مصابرت اور تحمل و ثبات اسی کا نام ہے۔ صبر مضبوطی سے حق کو پکڑ لینے کا نام ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مصائب کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ مصیبت دور ہو جاتی ہے اور مشکلات کے بعد آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ اللہ کی مرضی کو قبول کرنا ہے' اس سے پر امید ہونا' اس پر اعتماد کرنا ہے۔ وہ امت جسے پوری انسانیت کی امامت اور نگرانی کا مقام دیا گیا ہو' جسے دنیا میں عدل قائم کرنا ہے اور پوری انسانیت کی اصلاح کا فرض ادا کرنا ہے' اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دولت صبر سے مالا مال ہو۔ مشکلات درپیش ہوں' اس کی راہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں کھڑی ہوں۔ اسے تنگیوں' مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔ باطل کے ساتھ کشمکش برپا ہو اور شدید سے شدید تر حالات پیش آئیں تو

صبر و استقامت ہی اس کا سب سے بڑا ہتھیار ہو۔ مصیبت اور غربت میں صبر' جسمانی ضعف اور بیماری میں صبر افراد کی قلت اور کمزوری پر صبر' محاصرے اور مجاہدے میں صبر' غرض ہر حال میں صبر اور ہر آن میں صبر۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس میں یہ امت اپنا عظیم فرض منصبی ادا کر سکتی ہے۔ وہ اپنے منصوبے کو پورا کر سکتی ہے۔ بصورت دیگر اسے کامیابی حاصل نہ ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تنگی و مصیبت اور حق و باطل کی کشمکش میں صبر کرنے والوں کو لفظ الصابرین (حالت نصبی) سے مخاطب کیا ہے۔ جس سے لفظ "خاص کر" کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سے پہلے جن صفات کا ذکر ہوا ہے وہ حالت رفعی (مستقل جملوں) میں ہیں لیکن اس صفت کو حالت منصبی (مفعول ہے اور فعل محذوف ہے) میں ذکر کیا ہے۔ مطلب ہے (میں صابرین کو مخصوص طور پر بیان کرتا ہوں' نیکی اور بھلائی کی صفات کے ذکر کے ضمن میں یہ ایک خاص اشارہ ہے اور اس کا اپنا ایک مخصوص وزن اور ایک خاص اہمیت ہے' یعنی اللہ پر ایمان فرشتوں پر ایمان' کتابوں پر ایمان' نبیوں پر ایمان' مال کا خرچ کرنا' نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا۔ اور وفائے عہد کی تمام صفات میں سے صفت صبر اور اس کے حاملین الصابرین کو زیادہ اہمیت حاصل ہے' اللہ کے ہاں ان کی سب سے زیادہ قدر ہے۔ صابرین کا مقام سب سے زیادہ برتر و بلند ہے۔ صابرین کے اس مقام بلند کو دیکھ کر تمام لوگوں کی نگاہیں اس طرف اٹھ جاتی ہیں۔۱۔

ذرا دیکھئے ایک ہی آیت میں نظریہ و عقیدہ کے اصول' جسمانی فرائض اور مالی ذمہ داریوں اور دولت کے واجبات کو بیان کر دیا گیا ہے۔ نظریہ و حقیقت کو ایک کر دیا گیا۔ ایسی اکائی کی صورت میں' جس کو ٹکڑے نہ کیا جا سکتا ہو' جس کے اجزاء ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہو سکیں اور زندگی کے ان مختلف شعبوں کا عنوان صرف ایک ہے (نیکی)۔ بعض احادیث میں نیکی کو عین ایمان کہا گیا ہے۔ غرض یہ آیت اسلامی تصور حیات کا مکمل خلاصہ ہے۔ اسلامی نظام زندگی کے اصول اس میں یکجا ہو گئے ہیں۔ یہ سب ضروری اصول ہیں ایک دوسرے کے متکامل ہیں۔ اور ان کے بغیر اسلامی نظام کا قیام ہرگز نہیں ہو سکتا۔

جن لوگوں کی صفات یہ ہوں' ان کا مقام بھی یہاں آخر میں بطور نتیجہ بیان کر دیا جاتا ہے۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (۱۷۷) "یہ ہیں راست باز لوگ اور یہ ہیں متقی۔"

یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اسلام میں' اپنے رب کے ساتھ بالکل سچ کہا۔ وہ ایمان و اعتقاد میں بھی سچے ہیں اور اپنے ایمان و اعتقاد کو اپنی زندگی میں عملی شکل دینے میں بھی وہ بالکل سچے ہیں۔ یہی لوگ دراصل متقی ہیں جو اپنے رب کے ساتھ جڑے ہیں' اس سے ڈرتے ہیں۔ وہ احساس ذمہ داری اور شعور کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔

ان آیات کے درمیان سے ذرا جھانک کر دیکھیں' ہمیں ایک بلند افق نظر آئے گا۔ ایک بلند مقام عزت نظر آئے گا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں تک اللہ تعالیٰ' انسانیت کو اپنے تجویز کردہ اعلیٰ ترین نظام حیات کے ذریعے سرفراز کرنا چاہتا ہے۔ اور پھر ہم ذرا لوگوں کی حالت زار پر نظر ڈالیں' تو وہ اس نظام سے دور بھاگتے ہیں۔ اس سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ اس کا مقابلہ کرتے ہیں' بلکہ اس کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں۔ اور اس کے ماننے والے کے جانی دشمن ہو جاتے ہیں۔ جب ہم یہ سب کچھ دیکھتے ہیں تو ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا اسی طرح کہنا پڑتا ہے۔ یا حسرۃ علی العباد۔

اور پھر ہم نصب العین کے اس افق بلند پر دوبارہ نظر ڈالتے ہیں۔ یاس و حسرت کی یہ کیفیت فوراً رفو ہو جاتی ہے۔ امید کی کرن نظر آتی ہے۔ اللہ پر پختہ یقین پیدا ہو جاتا ہے۔ اسلامی نظام زندگی کی قوت اور برتری پر غیر متزلزل یقین پیدا ہو جاتا ہے اور جب اپنے مستقبل پر نظر ڈالتے ہیں تو افق پر امید کی کرن موجود پاتے ہیں۔ وہ روشن تر اور واضح تر ہے۔ ضروری ہے کہ اس طویل تھکاوٹ اور مصائب نے ایک بار پھر اسلامی نظام زندگی پر ان کا یقین پختہ کر دیا ہو۔ امید ہے اس اعلیٰ و ارفع نظام کی طرف انسانیت ایک بار پھر بڑھے گی اور یہ ان سے گی کہ اللہ ہی مستعان ہے وہی معین و مددگار ہے۔

(۱) اس سلسلے میں دیکھئے آیات یا ایھا الذین امنوا استعینوا بالصبر والصلوۃ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

# درس ۱۱ ایک نظر میں

اس سبق میں مدینہ طیبہ کے نوزائیدہ اسلامی معاشرہ کے بعض اجتماعی معاملات کی شیرازہ بندی کی گئی ہے۔ ساتھ ساتھ بعض عبادات جیسے فرض عبادات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں یہ دونوں چیزیں اس سورت کے ایک ہی ٹکڑے میں باہم ضم کر دی گئی ہیں۔ دونوں قسم کی تعلیمات کے درمیان رابطہ تقویٰ اور خوف خدا کو بنایا گیا ہے' جہاں اجتماعی معاملات کی شیرازہ بندی کے آخر میں بار بار تقویٰ اور خوف خدا کا ذکر ہے وہاں عبادات مفروضہ کے آخر میں بھی تقویٰ 'شکر اور خشیت اللہ پر زور دیا گیا ہے' اور پھر اس سبق کو آیات بر کے بعد لایا گیا ہے' جو ایمانی تصورات زندگی' ایمانی طرز عمل اور اسلامی طریق کار پر مشتمل ہے۔ اور جس میں نیکی اور تقویٰ کا اعلیٰ معیار بیان ہوا ہے۔

اس سبق میں 'مقتولین کے قصاص کے احکام بیان کئے گئے ہیں اور اس سلسلے میں ضروری قانون سازی کی گئی ہے۔ موت کے وقت وصیت کے احکام' روزے کی فرضیت کے احکام اور دعا' اعتکاف کے احکام بیان ہوئے ہیں اور آخر میں مالی واجبات کی ادائیگی کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔

احکام قصاص کے بیان کے بعد خاتمہ کلام تقویٰ پر کہا گیا' وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ "عقل و خرد رکھنے والو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔" اسی طرح جب وصیت کے احکام بیان ہوئے تو بات پھر تقویٰ ہی پر ختم ہوتی ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ "تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو' تو والدین اور رشتہ داروں کے لئے معروف طریقے سے وصیت کرے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔"

اب روزے کی فرضیت کے حکم کا مطالعہ کریں۔ اس کے آخر میں بھی بتایا گیا ہے کہ یہ فرض ہی اس لئے ہوا ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں' جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کئے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو جائے۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ

احکام روزہ کے آخر میں اعتکاف کے احکام ہیں اور ان کے بعد بھی آخری نتیجہ تقویٰ ہی ہے۔ یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں۔ ان کے قریب نہ پھٹکنا۔ اس طرح اللہ اپنے احکام لوگوں کے لئے بصراحت بیان کرتا ہے۔ توقع ہے کہ وہ غلط رویے سے بچیں گے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ

اس کے علاوہ اس سبق میں اختتام مضمون پر جو تبصرے کئے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی تقویٰ اور دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور جلالت شان کا شعور پیدا کرنے کے مضامین سے خالی نہیں ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا گیا اور جس ہدایت پر اللہ تعالیٰ نے تمہیں سرفراز کیا ہے' اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو۔ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ دوسری جگہ ہے فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَ لْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ لہٰذا انہیں چاہئے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں شاید کہ وہ راہ راست پالیں۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ "بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ "بے شک بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

غرض اس پورے متن میں تسلسل کے ساتھ تقویٰ کا ذکر ہے جس سے ایک نظر میں دین کی حقیقت تک رسائی ہو جاتی ہے اور اندازہ ہو جاتا ہے کہ دین ایک ایسی اکائی ہے جس کے اجزا ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اس کا اجتماعی نظام' اس کے قانونی اصول' اس کی رسوم عبادت' سب کی سب صرف ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی نظریہ کے سرچشمے سے پھوٹتے ہیں۔ یہ سب شعبے صرف ایک ہی تصور حیات سے نکلتے ہیں اور یہ تصور حیات نظریۂ اسلام سے ابھرتا ہے۔ یہ سب شعبے ایک ہی رسی میں بندھے ہوئے ہیں اور ان کا آخری نقطہ ارتکاز اللہ ہے۔ سب کی غرض و غایت ایک ہی ہے' یعنی بندگی۔ صرف خدائے واحد کی' جس نے پیدا کیا' جس نے رزق دیا' جس نے انسان کو اس زمین میں اپنا جانشین مقرر کیا۔ مگر یہ جانشین اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ صرف خدائے واحد پر ایمان لائے' وہ صرف خدائے واحد کی بندگی کرے اور وہ اپنا تصور حیات اپنے اجتماعی نظم کو اپنے قوانین کا ماخذ صرف اللہ ہی کو قرار دے' صرف اللہ کو!

غرض یہ پورا سبق اور اس کے مضامین اور پھر مضامین کے آخر میں بیان کردہ تبصروں اور نتائج کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دین کے تمام اجزاء باہمی مربوط ہیں اور ربط کیا ہے؟ تقویٰ' بندگی اور ایمان باللہ!

☆ ☆ ☆ ☆

# درس نمبر۱۱ تشریح آیات (۱۷۹ تا ۱۸۸)

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٨﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَاأُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٧٩﴾

"اے ایمان والو! تمہارے لئے قتل کے مقدمات میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔ آزاد آدمی نے قتل کیا ہو' تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے' غلام قاتل ہو' تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے اور عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو اس عورت ہی سے قصاص لیا جائے۔ ہاں کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لئے تیار ہو' تو معروف طریقے کے مطابق خون بہا کا تصفیہ ہونا چاہئے اور قاتل کو لازم ہے کہ وہ راستی کے ساتھ خون بہا ادا کرے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ اس پر بھی جو زیادتی کرے اس کے لئے دردناک سزا ہے۔ عقل رکھنے والو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔ امید ہے کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے۔

یہ پکار صرف اہل ایمان کے لئے ہے۔ صفت ایمان کو خطاب میں کیا گیا' اس صفت کا تقاضا یہ ہے کہ قصاص کے معاملے میں ہدایت صرف اللہ ہی سے حاصل کی جائے' جس پر تم ایمان لائے ہو۔ اللہ پکار کر اطلاع دیتا ہے کہ تم پر مقتولین کے معاملے میں قصاص فرض کر دیا گیا۔ پہلی آیت قانون سازی کے ضمن میں ہے اور دوسرے میں اس قانون کی حکمت بیان کی گئی ہے۔ اہل ایمان کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ سمجھنے کی کوشش کریں' اس طرح مسلمانوں کے دلوں میں خدا خوفی کا احساس پیدا کیا گیا ہے۔ غرض قتل اور سزا کے قتل کے معاملے میں اسلام کا نظام قصاص سیفٹی وال (Safty Valve) کی حیثیت رکھتا ہے۔

منقولہ بالا آیت میں جو قانون بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ قتل کے معاملے میں قصاص یوں ہو گا کہ آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے' غلام نے قتل کیا ہو تو غلام ہی سے بدلہ لیا جائے گا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ایسی رعایت کا ذکر کر دیا گیا جو انسانی تمدن کی استواری کے لئے ضروری ہے۔ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ "ہاں اگر قاتل کے ساتھ اس کا بھائی (مقتول کا وارث) کچھ نرمی کرنے کے لئے تیار ہو' تو معروف طریقے کے مطابق خون بہا کا تصفیہ ہونا چاہئے' اور قاتل کو لازم ہے کہ راستی کے ساتھ خون بہا ادا کرے۔"

نرمی اور معافی کی صورت میں یہ ہے کہ مجرم کو قصاص میں قتل کرنے کے عوض مقتول کے ورثا دیت قبول کرنے پر راضی ہو جائیں۔ جب وہ دیت لینے پر راضی ہوں تو انہیں چاہئے کہ وہ باہمی رضامندی اور معروف اصولوں کے مطابق دیت کی رقم طے کر لیں۔ اور قاتل اور اس کے اولیاء کا فرض ہے کہ وہ راستی اور حسن و خوبی کے ساتھ دیت ادا کریں، تاکہ ان کے دلوں کی کدورت دور ہو

جائے تلخی کم ہو جائے اور مقتول کے خاندان کے جو لوگ زندہ رہ گئے ہیں' ان کے پھر سے برادرانہ تعلقات قائم ہو سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس اہم ترین معاملے میں دیت کی گنجائش رکھ کر مسلمانوں پر تخفیف اور رحمت کی ہے۔ اس لئے انہیں توجہ دلائی گئی کہ وہ اسے اللہ کا ایک عظیم احسان سمجھیں۔

ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ "یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔" یہ گنجائش تورات کے قانون قصاص میں نہ تھی۔ یہ امت مسلمہ کے ساتھ ایک رعایت ہے۔ جو محض اس لئے کی گئی کہ اگر فریقین کے درمیان راضی نامہ ہو جائے اور دل ایک دوسرے کے لئے صاف ہو جائیں تو اس صورت میں نہ صرف رنجشیں مٹ جائیں بلکہ ایک شخص کی زندگی بھی بچ جائے۔ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ اس کے بعد بھی اگر کوئی زیادتی کرے تو اس کے لئے دردناک سزا ہے۔"

آخرت میں جو سزا ہوگی وہ تو ہوگی' اس دنیا میں اس کی سزا یہ ہوگی کہ اگر قتل ثابت ہو جائے تو اس کا قتل لازمی ہوگا۔ اور اس سے دیت قبول نہ کی جائے گی' کیونکہ باہمی رضامندی اور مصالحت کو بے کار بنانا ہے۔ دلوں کی صفائی کے بعد دشمنی پیدا کرنا ہے۔ اسی طرح اگر وارث نے دیت قبول کر لی ہے تو پھر اس کے لئے دوبارہ انتقام لینے کا کوئی جواز نہیں ہے' یہ ناروا زیادتی ہے۔

قصاص اور دیت کے نظام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کس قدر وسیع نقطہ نظر کا حامل ہے اور قانون سازی کے وقت نفس انسانی کے محرکات پر اس کی پوری نظر ہے۔

خدائے برتر نے انسان کی فطرت میں جو رجحانات ودیعت کئے ہیں ان کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ خون دیکھ کر خون فطرتاً کھول اٹھتا ہے۔ اسلام نے اس کا تقاضا قانون قصاص کے ذریعہ پورا کر دیا۔ صحیح انصاف یہ ہے کہ دلوں کو ٹھنڈا کر دے۔ دلوں کے اندر انتقام کی جو گھٹن پائی جاتی ہے اسے دور کر دے۔ یہاں تک کہ مجرم کے خیالات بھی درست کر دے۔ ان سب تدابیر کے باوجود اسلام اس بات کو پسند کرتا ہے کہ غلطی معاف کر دی جائے۔ اس لئے وہ عفو و درگزر کی راہ ہموار کرتا ہے۔

قانون قصاص کی فرضیت کے بعد عفو و درگزر کی دعوت دینے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی اس معافی سے یہ بلند مرتبہ حاصل کرنا چاہے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے۔ لیکن یہ عفو و درگزر فرض نہیں ہے۔ یہ اس لئے کہ انسان کے فطری تقاضے دب نہ جائیں۔ اور اس پر اس قدر بوجھ نہ ڈالا جائے کہ وہ اسے سہار نہ سکے۔

بعض روایات میں یہ ذکر ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور اس کو سورت مائدہ کی اس آیت نے منسوخ کر دیا ہے جو اس کے بعد نازل ہوئی ہے۔ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ

علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں "ان آیت کی شان نزول کے سلسلے میں ابن ابی حاتم کی روایت بیان کی جاتی ہے۔ ابو زرعہ' یحییٰ بن عبداللہ بن بکیر' عبداللہ بن لهیعہ' عطاء ابن دینار' سعید ابن جبیر کے واسطہ سے نقل کیا ہے۔ اس آیت کے بارے میں يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى یعنی اگر قتل عمد ہو' تو اس میں آزاد کو آزاد ہی کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ اس کی شان نزول یہ ہے کہ اسلام سے کچھ ہی پہلے' دور جاہلیت میں قبائل آپس میں لڑ پڑے۔ بہت لوگ قتل ہوئے بے شمار زخمی ہوئے۔ یہاں تک کہ غلام اور عورتیں بھی ماری گئیں۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے سے ابھی کچھ نہ لیا تھا کہ اسلامی نظام آ گیا۔ اور وہ مسلمان ہو گئے۔ ایک قبیلہ دوسرے پر مال اور تعداد میں بے انصافی کرنے لگا۔ انہوں نے قسم اٹھائی کہ وہ اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک ہمارے غلام کے بدلے میں ان سے آزاد نہ مارا جائے اور ہماری عورت کے بدلے ان کا مرد نہ مارا جائے۔ اس پر آیت نازل ہوئی "آزاد کے بدلے آزاد' غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔" لیکن یہ آیت منسوخ ہے اور اسے آیت النفس بالنفس

نے منسوخ کر دیا ہے اس طرح ابو مالک سے روایت ہے کہ اس آیت کو آیت النفس بالنفس نے منسوخ کر دیا ہے۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کا مقام و محل اور مائدہ کی آیات النفس بالنفس کا موقع و محل ہی الگ ہے۔ النفس بالنفس کا اطلاق انفرادی قتل پر ہے یعنی کوئی متعین شخص کسی متعین شخص یا اشخاص کو قتل کرے۔ اگر قتل عمد ہو تو مجرم سزایاب ہو گا۔ لیکن زیر بحث آیت کا محل ہی الگ ہے۔ اس میں اجتماعی قتل کی صورت کا حکم بیان کیا ہے۔ جہاں خاندان دوسرے خاندان پر ہاتھ اٹھائے' قبیلہ قبیلے کے خلاف لڑے اور ایک گروہ دوسرے گروہ پر حملہ آور ہو' جیسا کہ مذکورہ بالا قبائل کا معاملہ تھا۔ جس سے آزاد' غلام اور عورتیں ماری گئی تھیں۔ ایسے مواقع پر جب قصاص طے ہو گا تو آزاد کے بدلے آزاد' ایک قبیلے کے غلام کے بدلے دوسرے قبیلے کا غلام اور ایک عورت کے بدلے دوسرے کی عورت قتل ہو گی۔ اگر یہ محل نہ ہو گا تو پھر بتایا جائے کہ جب کسی تنازعے میں دونوں طرف سے بڑے بڑے گروہ باہم برسرپیکار ہوں تو اس صورت میں قصاص کی صورت کیا ہو گی؟

اگر اس نقطہ نظر کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ آیت منسوخ تصور نہ ہو گی اور قصاص کی آیات میں کوئی تعارض نہ ہو گا۔

اب قصاص کے قانون کی گہری حکمت اور اس کے دور رس مقاصد بتا کر بات ختم کی جاتی ہے وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ عقل و خرد رکھنے والو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔" امید ہے کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے۔"

ضرور انتقام ہی لیا جائے بلکہ یہ اس سے کہیں بلند و برتر مقاصد کا حامل ہے۔ یہ زندگی کے لئے' زندگی کے قیام کی راہ میں انسان کا قتل ہے' بلکہ قیام قصاص بذات خود زندگی ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ اس فریضہ کی حقیقت کو سمجھا جائے۔ اس کی حکمت میں غور و تدبر کیا جائے۔ دل زندہ ہوں اور ان میں خدا خوفی موجزن ہو۔

ایک مجرم جرم کی ابتدا کرتا ہے اسے سوچنا چاہئے کہ یہ بات معمولی نہیں بلکہ ایسی ہے کہ مجھے تو اس کے بدلے میں اپنی جان کی قیمت دینی پڑے گی۔ یوں نظام قصاص سے دو زندگیاں بچ جاتی ہیں۔

ارتکاب قتل کی صورت میں قاتل کو سزا ہو جاتی ہے۔ وہ قصاص میں مارا جاتا ہے۔ مقتول کے ورثا مطمئن ہو جاتے ہیں ان کے دلوں سے کینہ دور ہو جاتا ہے اور انتقام کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں اور پھر وہ انتقام جو عرب قبائل میں تو کسی حد پر' کسی مقام پر رکتا ہی نہ تھا۔ چالیس چالیس سال تک قتل کے بدلے قتل کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ مثلاً حرب البسوس میں یہی ہوا۔ عرب کیا آج بھی اس پر گواہ ہیں' جہاں زندگی خاندانی دشمنیوں اور کینوں کے بھینٹ چڑھتی رہتی ہے اور نسلاً بعد نسل یہ معاملہ چلتا ہی رہتا ہے اور یہ سلسلہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔

"قصاص میں زندگی ہے۔" اپنے عمومی مفہوم میں۔ ایک فرد کی زندگی پر حملہ دراصل جنس زندگی پر حملہ ہے۔ پوری زندگی پر حملہ ہے۔ ہر زندہ انسان پر حملہ ہے۔ ہر اس انسان پر حملہ جو مقتول کی طرح زندہ ہے۔ اگر قانون قصاص کی وجہ سے ایک مجرم' صرف ایک زندگی کو ختم کرنے سے رک جائے تو اس نے پوری انسانیت کو بچا لیا۔ یوں اس کا ارتکاب جرم سے رک جانا عین حیات ہے اور یہ عام زندگی' کسی ایک فرد کی زندگی نہیں ہے' کسی خاندان کی نہیں' کسی جماعت کی نہیں بلکہ مطلقاً زندگی ہے۔

اب آخر میں قانون الٰہی کی حکمت میں غور و فکر اور اس فکر کے شعور کو موجزن کیا جاتا ہے اور خدا خوفی کی تلقین کی جاتی ہے۔ (یہی وہ اہم فیکٹر اور موثر ذریعہ ہے جس کی وجہ سے انسانی زندگی قائم رہ سکتی ہے) تَتَّقُوْنَ "امید ہے کہ تم قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے۔"

یہ ہے وہ اصل بندھن' جو انسان کو ظلم و زیادتی سے باز رکھتا ہے' ابتدا میں قتل ناحق کی زیادتی سے روکتا ہے' اور آخر میں انتقام کی زیادتی سے۔ یہ کیا ہے؟ خدا خوفی تقویٰ' دل میں خدا خوفی کا شعور اور شدید احساس۔ اللہ کے قہر و غضب سے ڈرنے کا احساس اور اس کی رضاجوئی کی کشش۔

اس پابندی کے بغیر کوئی قانون کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کوئی شریعت کامیاب نہیں ہوتی۔ کوئی شخص ارتکاب جرم سے باز نہیں رہتا۔ انسانی طاقت سے اعلیٰ اور برتر طاقت کے تصور کے بغیر اخروی خوف اور طمع کے روحانی احساس کے بغیر کوئی ظاہری شیرازہ بندی اور قانونی انتظام کامیاب نہیں ہو سکتا۔

حضرت محمد ﷺ کے دور اور خلافت اسلامیہ کے زمانہ میں جرائم کا وقوع شاذ و نادر ہی رہا ہے۔ جو جرائم وقوع پذیر ہوئے بھی تو مجرم نے خود اعتراف کیا۔ اس کا راز یہی ہے کہ وہاں تقویٰ کا زور تھا۔ لوگوں کے دل و دماغ میں' ایک زندہ ضمیر کی صورت میں تقویٰ' چوکیدار کی طرح بیٹھا تھا۔ جو ہروقت بیدار رہتا تھا۔ وہ انہیں حدود جرم سے بھی دور رکھتا۔ ساتھ ساتھ انسانی فطرت اور انسانی جذبات و میلانات و انصرام تھا۔ دوسری طرف اسلامی عبادات کے نتیجے میں تقویٰ اور خدا خوفی کا سیل رواں تھا۔ دونوں کے باہم تعاون اور ہم آہنگی کے نتیجے سے ہم آہنگ اور پاک وصاف قانون اور شریعت بھی موجود تھی۔ ایک طرف شریعت و قانون اور ظاہری انتظام میں ایک پاک صالح تصور زندگی' اور نظام زندگی نے جنم لیا' جس میں لوگوں کا طرز عمل پاک طرز فکر صالح تھی۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس نظم نے ملک سے پہلے ہر شخص کے دل میں ایک منصف بٹھا دیا تھا اور ایک عدالت قائم کر دی تھی۔ "حالت یہ تھی کہ اگر کسی وقت کسی پر حیوانیت غالب ہی آگئی اور غلطی کا صدور ہو گیا اور یہ شخص قانون کی گرفت سے بچ بھی گیا تو بھی اس کا ایمان اس کے لئے نفس لوامہ بن گیا۔ اس نے اپنے ضمیر میں خلش اور چبھن محسوس کی۔ دل میں ہروقت خوفناک خیالات کا ہجوم برپا ہو گیا۔ اور گناہ کرنے والے کو تب آرام نصیب ہوا کہ جب اس نے قانون کے سامنے رضاکارانہ اعتراف جرم کر لیا اور اپنے آپ کو سخت ترین سزا کے لئے پیش کر دیا اور خوشی اور اطمینان کے ساتھ اس سزا کو برداشت کیا' محض اللہ کے غضب سے بچنے کی خاطر۔ ہاں یہ ہے تقویٰ' یہ ہے خدا خوفی۔

اب موت کے وقت وصیت کے مسائل کا بیان ہوتا ہے۔ آیات قصاص کی فضا اور ان آیات کی فضا (یعنی موت اور زندگی کا انتظام) کے درمیان مناسبت بالکل ظاہر ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَمَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾

۲۲ ع۶ ۲ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٨٢﴾

"تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو' تو والدین اور رشتہ داروں کے لئے معروف طریقے سے وصیت کرے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔ پھر جنہوں نے وصیت سنی اور بعد میں اسے بدل ڈالا' تو اس کا گناہ بدلنے والوں پر ہو گا۔ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ البتہ جس کو یہ اندیشہ ہو کہ وصیت کرنے والے نے نادانستہ یا قصداً حق تلفی کی ہے

اور معاملہ سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان وہ اصلاح کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے 'اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

وصیت بھی فرائض میں سے ایک فرض ہے۔ والدین اور اقرباء کے لئے بشرطیکہ مرنے والا اپنے پیچھے دولت چھوڑ رہا ہو۔ خیر سے مراد دولت ہے۔ کتنی مقدار پر وصیت فرض ہے؟ اس میں اختلاف رائے ہے۔ راجح بات یہ ہے کہ مقدار کا تعین مختلف مواقع کے لئے' عرف کے مطابق' مختلف ہو سکتا ہے۔ بعض فقہاء نے کہا ہے کہ ۶۰ درہم سے کم ترکہ ہو تو سمجھا جائے کہ کوئی ترکہ نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اس حد کو ۸۰ دینار' بعض نے ۴۰۰ دینار اور بعض نے ایک ۱۰۰۰ تک بڑھا دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مختلف ادوار میں' اور مختلف خاندانوں کے لئے ظروف و احوال کے مطابق مقدار میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

وصیت کی ان آیات کے بعد میراث کی آیات نازل ہوئیں جن میں ورثاء کے لئے حصص متعین ہو گئے۔ اور وراثت کی ہر صورت میں والدین کو حقدار قرار دیا گیا' لہٰذا اب والدین کے لئے وصیت نہ ہو گی کیونکہ وارث بہرحال وصیت سے محروم ہیں۔

حضور نے فرمایا ہے "اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق عطا کر دیا ہے' لہٰذا اب وارث کے لئے کوئی وصیت موثر نہ ہو گی۔" رہے اقرباء تو ان کے لئے یہ حکم اب بھی اپنے عموم پر باقی ہے۔ لہٰذا اب جو شخص قانون میراث کے مطابق حصہ پا لے' وہ وصیت سے فائدہ نہ اٹھا سکے گا اور جو قانون میراث میں حقدار نہیں ہے آیت وصیت اس لئے موجود (Operative) ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں' بعض صحابہ اور تابعین میں سے بعض حضرات اس طرف گئے ہیں۔ ہم بھی اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔

قانون میراث کی دفعات کی رو سے بعض اوقات بعض قریبی رشتہ دار محروم ہو جاتے ہیں۔ صلہ رحمی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور دیا جائے' ایسے حالات میں وصیت کے ان احکام کی حکمت خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے۔ قانون وصیت درحقیقت قانون وراثت کے دائرے سے باہر خاندان کے باہمی تکافل اور معاشی ذمہ داریوں کا ایک رنگ ہے۔ اس لئے حکم ہوا کہ حق وصیت کا استعمال معروف اصولوں کے مطابق ہونا چاہئے اور اس سلسلے میں خدا خوفی کے اصل الاصول کو پیش نظر ہونا چاہئے۔

بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ "معروف طریقے سے' یہ متقین پر حق ہے۔"

اس حق کے استعمال سے ورثاء پر ظلم نہ ہو' نہ غیر وارث محروم رہیں' اعتدال و انصاف کے ساتھ' خدا خوفی کو پیش نظر رکھتے ہوئے' احسان اور نیکی کی خاطر اس حق کو استعمال کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں اس حق پر پابندی لگائی گئی اور ۱/۳ حصہ حد مقرر کر دی گئی ہے اور افضل یہ ہے کہ اس حق کو ۱/۴ حصہ تک محدود رکھا جائے۔ تاکہ اس غیر وارث کی وجہ سے اصل وارث کو زیادہ نقصان نہ ہو۔ اس معاملے کا فیصلہ' بیک وقت قانون اور تقویٰ دونوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے اور یہی روح ہے اس اجتماعی نظام کی جسے قرآن مجید قائم کرنا چاہتا ہے۔

جو شخص بھی وصیت سنے اس کا فرض ہے کہ وہ بے کم و کاست فریقین تک پہنچا دے۔ اگر وہ اس میں تبدیلی کرے گا تو اسے سخت گناہ ہو گا اور اگر سننے والے اپنی طرف سے تبدیلی کریں گے تو متوفی بری الذمہ ہو گا۔ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ "پھر جنہوں نے وصیت سنی اور بعد میں اسے بدل ڈالا' تو اس کا گناہ ان بدلنے والوں پر ہو گا۔ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

اس شخص نے جو سنا اور جس کا اسے علم ہے اس پر خود اللہ گواہ ہے۔ وصیت کنندہ کے لئے بھی اللہ گواہ ہے۔ لہٰذا میت پر کوئی مواخذہ نہ ہو گا اور چونکہ تبدیل کنندہ کے خلاف بھی اللہ گواہ ہے' لہٰذا اس ناجائز تغیر و تبدل پر اس سے مواخذہ ہو گا۔

ایک حالت ایسی ہے جس میں وصی کو اختیار ہے کہ وہ وصیت کرنے والے کی وصیت میں کچھ رد و بدل کرے' لیکن یہ اس وقت ہو

گا جب اس بات کا علم ہو جائے کہ وصیت کرنے والے نے کسی کی ناحق طرفداری کی ہے یا ناجائز طور پر وارث کی حق تلفی کی ہے۔ اس صورت میں جو شخص وصیت نافذ کرنے کا اختیار رکھتا ہے اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس حد تک اس میں تبدیلی کرے کہ ناجائز حق تلفی نہ رہے نہ ہی کسی کی طرفداری رہے۔ معاملہ عدل و انصاف کے مطابق ہو جائے فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

"البتہ جس کو اندیشہ ہو کہ وصیت کرنے والے نے نادانستہ یا قصداً حق تلفی کی ہے اور پھر معاملہ سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان، وہ اصلاح کرے، اس پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

تمام معاملات میں، معاملہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی رحمت خصوصی کے سپرد ہے۔ ہر حال میں اللہ کا کرم اور اس کی نگہبانی ہمارے حالات کی شیرازہ بند ہے۔ اور یہی عدل و انصاف کے حصول کی آخری ضمانت ہے۔ قانون قصاص اور قانون وصیت دونوں کو ایک ہی رسی میں باندھ دیا گیا ہے یعنی خدا خوفی بلکہ اسلامی نظام زندگی کے تمام شعبے اور اسلامی معاشرے کا ہر مسئلہ اس میں باندھا ہوا ہوتا ہے۔

یہ امت پوری انسانیت پر گواہ ٹھہرائی گئی ہے۔ وہ انسانیت کی نگران اعلیٰ ہے۔ اور اسے کرۂ ارض پر اسلامی نظام زندگی قائم کرنا ہے اور اس سلسلے میں اس پر جہاد فی سبیل اللہ فرض ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب یہ قدرتی امر ہے کہ اس پر روزہ بھی فرض کر دیا جائے۔ روزہ سے ارادہ قوی اور عزم صمیم ہو جاتا ہے۔ اس کے ذریعے انسان اطاعت و انقیاد کے ساتھ اپنے رب سے ملتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے انسان جسم کی تمام ضروریات پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے دباؤ اور ان کے بوجھ کو برداشت کرتا ہے۔ محض رضائے الٰہی کے حصول اور اجر اخروی کے طمع میں۔

یہ سب تدابیر اس لئے ہیں کہ تحریک اسلامی کے کارکنوں کی راہ میں جو دشواریاں اور جو مشکلات ہیں، اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں اور جو کانٹے بچھے ہیں، ان کے برداشت کے لئے نفس انسانی تیار ہو جائے۔ یہ راستہ ایسا ہے کہ اس کی دشواریوں کے علاوہ اس کے دونوں طرف مرغوب اور پسندیدہ چیزیں بکھری پڑی ہیں۔ ہزاروں ایسی چیزیں اس راستے میں پڑی ہیں، جو قدم قدم پر اسے فریب دینے کے لئے تیار ہیں۔

اب دور حاضر کے انکشافات سامنے آتے ہیں۔ حکما کہتے ہیں کہ روزہ سے انسان کے جسم پر بھی اچھے اثرات پڑتے ہیں۔ اگرچہ میں اس بات کے حق میں نہیں ہوں کہ روزے یا دوسری اسلامی عبادات کے ایسے دنیاوی فوائد بیان کئے جائیں جو طبی زندگی سے متعلق ہوں اور حس و نظر تک محدود ہوں۔ اس لئے کہ عبادات کی اصل غرض و غایت یہ ہے کہ انسان کو اس فرض کی ادائیگی کے لئے تیار کیا جائے جو اسے اس کرۂ ارض پر ادا کرنا ہے۔ دوسری طرف اسے اس کامیابی اور اس کمال کے لئے جدوجہد کرنی ہے، جو اسے دار آخرت میں حاصل ہو گا لیکن اس کے باوجود میں اس کے خلاف بھی نہیں ہوں کہ سائنس اور تجربہ سے عبادات کے سلسلے میں جو فوائد ثابت ہوتے ہیں ان کا بالکل انکار کر دیا جائے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے وجود انسانی کے لئے فرائض و عبادات کے تعین میں جو عمومی تدابیر اختیار کی ہیں۔ ان سے جو حکمت واضح طور پر ملحوظ و مفہوم نظر آتی ہے، اس پر اعتقاد ضروری ہے۔ البتہ یہ بات پیش نظر رہے کہ سائنس اور تجربات سے ظاہر ہونے والی ان حکمتوں اور فوائد کو احکام و تکالیف شرعیہ کا اصل سبب اصل علت نہیں قرار دینا چاہئے۔ اس لئے کہ سائنس کا دائرہ بہت ہی محدود ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی حیوانیت کو توڑ کر جس طرح اس کی تربیت کرنا چاہتا ہے اور اس میں جو حکمتیں ہیں وہاں تک انسانی علم ترقی کر ہی نہیں سکتا۔ یا خود اس پوری کائنات کی بے قابو قوتوں کو اللہ تعالیٰ جس طرح سدھانا چاہتا ہے، سائنس کی وہاں تک رسائی کب ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُونَ ﴿۱۸۳﴾ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ
فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ
تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ
وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ
وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ
الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا
هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۸۵﴾

"اے ایمان لانے والو! تم پر روزے فرض کر دیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیرووں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی' چند مقرر دنوں کے روزے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو' یا سفر پر ہو' تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرلے اور جو روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہیں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے' تو یہ اسی کے لئے بہتر ہے۔ لیکن اگر تم سمجھو' تو تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ روزہ رکھو۔

رمضان وہ مہینہ ہے' جس میں قرآن نازل کیا گیا' جو انسانوں کے لئے سرا سر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے' جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا اب سے' جو شخص اس مہینے کو پائے' اس کو لازم ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو' تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔ اللہ تمہارے ساتھ نرمی چاہتا ہے' سختی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے یہ طریقہ تمہیں بتایا جا رہا ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے' اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو۔"

اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ فرائض اور تکلیفات پر عمل کرنے کے لئے انسان کے نفس کو بڑی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں انسان اللہ کی خصوصی امداد کا محتاج ہے۔ اس بات کی ضرورت تھی کہ ان احکامات پر عمل کرنے کے لئے اس میں سپرٹ پیدا کی جائے۔ اس کی روح ان احکامات کی طرف مائل ہو جائے تاکہ وہ مطمئن ہو جائے اور عمل پر راضی ہو جائے۔ حالانکہ ان احکام پر عمل کرنے میں خود اس کا مفاد مضمر ہے۔ چنانچہ اسی خاطر بہت ہی پیاری آواز سے پکارا گیا۔ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو" غور کیجئے' یہ آواز انہیں ان کی اصل حقیقت یاد دلاتی ہے۔ پھر روزہ فرض ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے اور یہ تو پہلی امتوں کے مؤمنین پر بھی فرض ہوتا رہا ہے۔ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔

اس کا مقصد اہل ایمان کے دلوں کو صاف کرنا ہے۔ انہیں خوف خدا کے لئے تیار کرنا ہے اور ان میں اللہ کی مشیئت کا احساس و شعور بیدار کرنا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں' جس طرح تم سے پہلے انبیاء علیہم السلام کے پیروؤں پر فرض کئے گئے تھے' اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔"

اس آیت میں روزے کی اصلی غرض و غایت ظاہر کی جاتی ہے' یعنی تقویٰ جب ایک مومن اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے اور اللہ کی رضا کے حصول کی خاطر روزہ رکھتا ہے تو اس کے دل میں تقویٰ کا شعور اجاگر ہو جاتا ہے۔ یہ تقویٰ ہی ہے جو دلوں کا نگہبان ہے اور جو انسان کو روزے کے احکام کی خلاف ورزی سے بچاتا ہے۔ اگرچہ وہ ایسی معصیت سے بھی انسان کو بچاتا ہے' جو کسی حد تک محض وسوسہ ہو۔ قرآن کریم کے اول مخاطب صحابہ کرام اس کے معنی سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اللہ کے ہاں تقویٰ کس قدر وزنی ہے۔ اس لئے تقویٰ ہی ان کا نصب العین تھا۔ وہ برابر اس کی طرف بڑھتے جاتے تھے اور روزہ ذرائع حصول تقویٰ میں سے چونکہ ایک ذریعہ ہے اس لئے یہ فرض کیا گیا۔ دراصل روزہ وہ راہ ہے جس کی آخری منزل تقویٰ ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہاں قرآن مجید' ایک بلند مقام پر' بالکل سامنے تقویٰ کا ایک روشن نشان رکھ دیتا ہے اور اہل ایمان کی آنکھیں اس نشانہ پر جم جاتی ہیں اور وہ روزہ کے واسطے اور روزے کی امداد سے وہاں تک پہنچنے کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ "تاکہ تم ڈرو۔"

بات کا ایک دوسرا رخ دیکھئے' کہا جاتا ہے! یہ تو چند دن ہیں پوری عمر کے روزے تو فرض نہیں کئے گئے۔ تمام زمانے کے لئے تو فرض نہیں ہیں۔ ساتھ ساتھ یہ کہ بیمار اس وقت تک مستثنیٰ جب تک وہ صحت یاب نہ ہو جائیں۔ مسافروں پر اس وقت تک لازم نہیں جب تک گھر تک لوٹ نہ آئیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور سہولت اور تخفیف خاص رعایت دی گئی ہے۔ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ "چند مقرر دنوں کے روزے ہیں' اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو' یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرے۔"

سفر اور مرض کے اعتبار سے آیت کا مفہوم عمومیت کا حامل ہے۔ اسے محدود نہ کیا جائے گا۔ بیماری کی نوعیت کیسی بھی ہو' جس قسم کا سفر بھی درپیش ہو روزہ قضا کرنا جائز ہے' لیکن سفر ختم ہونے کے بعد اور بیماری دور ہونے کے بعد چھوڑے ہوئے روزے رکھنے ضروری ہیں۔ آیت میں بیماری کی شدت اور سفر کی مشکلات کو اس رخصت کا سبب نہیں بنایا گیا۔ صرف "مرض" اور "سفر" کا علی العموم ذکر کیا گیا ہے تاکہ لوگوں کے لئے مشکلات پیدا نہ ہوں اور سہولت رہے۔ اب اس میں کیا حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف مرض اور صرف سفر کا ذکر کیا ہے۔ ساتھ کوئی قید نہیں لگائی؟ یہ صرف اللہ جانتا ہے' ہو سکتا ہے کہ بیماری اور سفر میں کچھ ایسی باتیں اللہ تعالیٰ کے پیش نظر ہوں جنہیں ہم نہیں جانتے۔ ہو سکتا ہے کہ سفر اور بیماری میں کچھ ایسی مشکلات ہوں جن کا احساس ہمیں نہ ہو۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس حکم کی اصل علامت کو ظاہر کرنا ضروری نہیں سمجھا تو ہمیں اس بارے میں تاویلات کی کیا ضرورت ہے۔ بہر حال ہمیں ان کی حکمت معلوم ہو یا نہ ہو۔ یہ عقیدہ ضرور رکھتے ہیں کہ ان کے پیچھے کوئی حکمت و مصلحت ضرور ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ رخصت مرض و سفر کی اس تعبیر سے ان لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوگی جو ہر وقت دین میں رخصت و سہولت کی تلاش میں رہتے ہیں۔ کیا کسی ادنیٰ سبب یا بلاوجہ ہم فرض عبادات کو ترک کر دیں؟ یہی تو وجہ ہے کہ ہمارے فقہاء نے سختی کر کے اس رخصت سے استفادہ پر قیود و شروط عائد کی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ استدلال ایک ضعیف استدلال ہے۔ محض اس کی وجہ سے اور صرف اس استدلال کی بنا پر ایک مطلق آیت کو مقید کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ لوگوں کو زنجیروں میں باندھ کر ان کو عبادات پر مجبور کرنا اسلام کی مستقل

پالیسی نہیں۔ اسلام تقویٰ کے ذریعہ عبادات میں کشش پیدا کرنا مناسب سمجھتا ہے۔ روزہ تو ہے ہی وہ عبادت جس کا مقصد صرف تقویٰ ہے۔

جس شخص کی حالت یہ ہے کہ وہ رخصتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر عبادات سے پیچھا چھڑاتا ہے' وہ تو پہلے ہی بھلائی سے محروم ہے۔ وہ اگر روزہ رکھ بھی لے تو وہ مقصد پورا نہ ہو گا جو فرضیت صیام کا اصل مطالبہ ہے۔

پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ دین لوگوں کا ہے یا اللہ تعالیٰ کا؟ دین اللہ کا ہے اور وہ رخصت اور نرمی اور عزیمت و تشدد کے مقامات کو خوب جانتا ہے۔ بعض اوقات رخصت سے ایسے مقاصد کا حصول پیش نظر ہوتا ہے جو رخصت کے بغیر کسی طرح حاصل نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو رعاتیں دی ہیں' انہیں چاہئے کہ وہ ان سے استفادہ کریں۔ خصوصاً ایسے دور میں جب مسلمانوں کی اخلاقی اور دینی حالت تباہ و برباد ہو چکی ہو تو ایسے حالات میں احکام میں تشدد' اصلاح احوال کے لئے مفید نہیں ہوتا' ضرورت اس بات کی ہے کہ نرمی اور آسانی سے لوگوں کو اخلاقی تربیت دی جائے' اور ان کے دلوں اور ان کی روح میں خدا خوفی کو نئے سرے سے زندہ کیا جائے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر میں کہوں گا کہ امت کے عمومی فساد کے وقت احکام میں تشدد کرنا غیر موثر علاج ہے۔ اس سے ذرائع اصلاح بند ہو جاتے ہیں۔ یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ عبادات کے فرائض اور معاملات کے احکام میں بہت بڑا فرق ہے۔ عبادات میں معاملہ صرف بندے اور اس کے رب کا ہوتا ہے۔ اس میں عوام الناس کا براہ راست فائدہ یا نقصان نہیں ہوتا۔ جبکہ معاملات میں شریعت معاملے کے صرف ظاہری پہلو پر نظر رکھتی ہے۔ رہی عبادات تو ان کی ظاہری صورت اس وقت تک مفید نہیں ہوتی جب تک ان کی تہہ میں تقویٰ نہ ہو۔ اگر دل میں تقویٰ ہو تو کوئی شخص ادھر ادھر نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔ اور ایک متقی شخص صرف اس رخصت سے فائدہ اٹھائے گا جس پر اس کا دل مطمئن ہو گا کہ رخصت سے فائدہ اٹھانے ہی میں اللہ کی رضا اور اطاعت ہے۔

عبادات کے احکام میں سختی کرنا یا تنگی پیدا کرنے کی سعی کرنا' یعنی اللہ تعالیٰ نے جن احکام کو عام چھوڑا ہے' ان پر قیود کا اضافہ کرنا' بعض اوقات عوام کے لئے سخت مشکلات تو پیدا کر دیتا ہے لیکن اس سختی کے نتیجے میں کج رو افراد کی کجی میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اس لئے ہر حال میں بہتر رویہ یہ ہے کہ ہم معاملات کو اس طرح لیں جس طرح اس دین میں اللہ تعالیٰ نے طے کر دیئے ہیں۔ رخصتوں اور عزائم میں جو حکمتیں ہیں ان کے متعلق ہم سے اللہ تعالیٰ زیادہ جاننے والا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس نکتے پر جو کچھ کہہ دیا گیا وہ کافی و شافی ہے۔

اب ہم چاہتے ہیں کہ حالات سفر کے بارے میں جو متعدد احادیث مروی ہیں' وہ سب یہاں نقل کر دیں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں جن میں افطار کی طرف میلان پایا جاتا ہے۔ بعض ایسی ہیں جن میں روزہ توڑنے سے منع نہیں کیا گیا۔ ان سب روایات پر غور کرنے سے وہ نقشہ ذہن نشین ہو جاتا ہے' جس پر صحابہ کرام کا تعامل تھا۔ متاخرین فقہاء نے جو سختیاں کی ہیں ان سے پہلے اس معاملے میں سلف صالحین اور صحابہ کرام کی سوچ کیا تھی؟ صحابہ کرام کا تعامل کیا تھا؟ اس کے بارے میں ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف صالحین اور صحابہ کرامؓ کا طرز عمل بمقابلہ متاخرین فقہاء اور ان کے فقہی بحوث کے' دین اسلام کی روح اور اس کے مزاج کے زیادہ قریب تھا۔ صحابہ کرامؓ کی زندگیوں اور ان کے طرز عمل کے مطالعہ سے اسلامی نظریۂ حیات اور اس کی خصوصیات کا ایک زندہ ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔

حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں: رسول خدا ﷺ فتح مکہ کے سال' ماہ رمضان میں' جانب مکہ نکلے۔ آپ ﷺ نے روزہ رکھا۔ جب آپ ﷺ "کراع الغمیم" تک پہنچے تو لوگوں نے بھی روزہ رکھ لیا۔ اس پر آپ ﷺ نے پانی کا ایک پیالہ منگوایا اور اسے اتنا اٹھایا کہ لوگ دیکھ لیں۔ اس کے بعد اسے نوش فرمایا۔ آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ "بعض لوگ تو روزے سے ہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا! "یہ لوگ نافرمان ہیں' یہ لوگ نافرمان ہیں۔" (مسلم۔ ترمذی)

۲۔ حضرت انس ؓ سے روایت ہے "ہم نبی ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ہم میں سے بعض روزے سے تھے اور بعض نے افطار کیا تھا۔ سخت گرم دن تھا۔ ہم نے ایک جگہ ڈیرہ ڈالا۔ سب سے زیادہ سایہ اس کا تھا جس کے پاس چادر تھی۔ ہم میں سے بعض ایسے تھے کہ وہ ہاتھ کا سایہ کر کے اپنے آپ کو سورج کی تپش سے بچاتے تھے۔ روزہ دار تو گر پڑے اور جن کا روزہ نہ تھا وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے خیمے لگائے' جانوروں کو پانی پلایا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: آج تو افطار کرنے والوں نے ثواب لوٹ لیا۔" (بخاری۔ مسلم۔ نسائی)

۳۔ حضرت جابر ؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں: حضور ﷺ سفر میں تھے۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ ایک شخص کے پاس لوگ جمع ہیں اور اس پر سایہ کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا "اسے کیا ہو گیا ہے؟" لوگوں نے بتایا "یہ ایک روزہ دار ہے۔" اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔" (امام مالک' امام بخاری۔ مسلم۔ ابوداؤد۔ نسائی)

۴۔ عمرو بن امیہ ضمری ؓ سے روایت ہے۔ میں ایک سفر سے رسول خدا ﷺ کے پاس حاضر ہوا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "ابو امیہ کھانے کا انتظار کرو۔" میں نے عرض کیا: حضور میں تو روزے سے ہوں۔" آپ ﷺ نے فرمایا تو پھر سنئے مسافر سے متعلق: "اللہ تعالیٰ نے اس کا روزہ معاف فرمایا ہے اور نصف نماز معاف فرمادی ہے۔" (نسائی)

۵۔ انس بن مالک ؓ سے روایت ہے' حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے نماز کا ایک حصہ مسافر کے لئے معاف فرمادیا ہے۔ سفر میں اس کے لئے افطار کی رخصت ہے۔ دودھ پلانے والی اور حاملہ کے لئے بھی یہی رخصت ہے' اگر بچے کو نقصان پہنچنے کا خوف ہو۔" (روایت سنن)

۶۔ حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں: "حمزہ بن عمرا سلمی نے حضور ﷺ سے سفر میں روزے رکھنے کے بارے میں دریافت کیا۔ یہ صاحب بہت روزے رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا! "چاہو تو روزہ رکھو چاہو تو افطار کرو۔"

۷۔ حضرت انس ؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں: "ہم حضور ﷺ کے ساتھ تھے ہم میں سے بعض روزے سے تھے اور بعض نے افطار کیا تھا۔ نہ روزہ دار افطار کرنے والے پر نکتہ چینی کرتا اور نہ افطار کرنے والا روزہ رکھنے والے کے طرز عمل کو معیوب سمجھتا۔" (روایت مالک' مسلم' بخاری' ابوداؤد)

۸۔ حضرت ابوالدرداء سے روایت ہے فرماتے ہیں: "ہم حضور ﷺ کے ساتھ ماہ رمضان میں شدید گرمی میں نکلے۔ گرمی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ ہم تپش سے بچنے کے لئے سر پر ہاتھ رکھ دیتے۔ ہم سب میں صرف حضور ﷺ اور حضرت ابن رواحہ ؓ روزے سے تھے۔ (بخاری' مسلم' ابوداؤد)

۹۔ حضرت محمد بن کعب سے روایت ہے فرماتے ہیں: "میں رمضان شریف میں انس ؓ بن مالک کے پاس آیا۔ آپ سفر پر نکلنے والے تھے۔ سواری تیار تھی۔ آپ نے سفر کا لباس پہن رکھا تھا۔ آپ نے کھانا منگوایا اور کھایا۔ سب نے کہا: کیا یہ سنت ہے؟" آپ نے فرمایا "ہاں!" اس کے بعد سوار ہو گئے۔" (ترمذی)

۱۰۔ عبید ؓ بن حبیرہ سے روایت ہے فرماتے ہیں: "میں حضور ﷺ کے ایک صحابی ابو بصرہ غفاری ؓ کے ساتھ کشتی میں تھا' ماہ رمضان میں کشتی کو پانی میں ڈال دیا گیا اور کھانا ان کے قریب لایا گیا۔ انہوں نے فرمایا: "قریب ہو جایئے۔" میں نے عرض کیا: "آپ دیکھ نہیں رہے کہ مکانات ابھی نظر آتے ہیں؟" انہوں نے کہا "کیا تم رسول خدا ﷺ کی سنت سے منہ پھیرتے ہو؟" چنانچہ انہوں نے بھی کھانا کھایا اور میں نے بھی کھایا۔" (ابوداؤد)

۱۱۔ منصور کلبی سے روایت ہے کہ حضرت دحیہ ابن خلیفہ رضی اللہ عنہ اپنے نواح دمشق کے ایک گاؤں سے ماہ رمضان میں سفر پر نکلے۔ سفر اس قدر تھا جس طرح فساط گاؤں سے عقبہ گاؤں ہے اور یہ فاصلہ بقدر تین میل ہے۔ آپ نے افطار کیا۔ آپ کے ساتھ بے شمار لوگوں نے افطار کر لیا' لیکن بعض دوسرے لوگوں نے روزہ افطار کرنے میں کراہت محسوس کی۔ جب وہ اپنے گاؤں لوٹے تو فرمایا: "خدا کی قسم میں نے آج وہ بات دیکھی ہے جو کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ لوگوں کے ایک گروہ نے حضور ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کی سنت سے منہ پھیر لیا ہے۔ اے اللہ مجھے اپنی طرف اٹھالے۔" (روایت ابوداؤد)

ان تمام احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ خوشگوار اور آرام دہ سفر میں بھی رخصت افطار کو قبولیت حاصل ہوئی ہے بلکہ افطار کو ترجیح دی گئی ہے۔ اور رخصت پر عمل کرنے کے لئے سفر کی مشقت یا دشواری کو ضروری شرط نہیں قرار دیا گیا جیسا کہ آخری دو احادیث سے خاص طور پر معلوم ہوتا ہے۔ آٹھویں حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے سوا کسی اور کا روزہ نہ تھا۔ لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادات میں آپ ﷺ کے لئے بعض خصوصیات ایسی تھیں جو امت کے لئے نہ تھیں۔ مثلاً "وصال روزہ" رکھنے سے آپ ﷺ نے منع فرمایا حالانکہ آپ کبھی کبھی "وصال" روزہ رکھتے تھے۔ ("وصال" کا مطلب یہ ہے کہ ایک دن کا روزہ دوسرے دن سے بلا افطار مل جائے) صحابہ کرام نے اس سلسلے میں آپ ﷺ سے بات کی تو آپ ﷺ نے فرمایا! "میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ مجھے میرا رب ہر وقت کھلاتا پلاتا رہتا ہے۔" (بخاری' مسلم) پھر پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آپ ﷺ نے افطار فرمایا اور جنہوں نے افطار نہ کیا تھا ان کے بارے میں فرمایا! "یہ لوگ نافرمان ہیں' یہ لوگ نافرمان ہیں۔" پھر یہ حدیث ہے بھی سب احادیث سے متاخر کیونکہ یہ فتح مکہ کے سال کا واقعہ ہے' چنانچہ اس میں جو حکم ہے وہ سب سے آخر میں ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پسندیدہ طرز عمل کیا ہے۔

ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے پردۂ احساس پر جو تصویر ابھرتی ہے' اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے وقت کچھ مخصوص واقعات تھے' جن میں ایک متعین حکم دینا ضروری تھا۔ حضور ﷺ ملت اسلامیہ کی تربیت فرما رہے تھے۔ آپ کو ایک زندہ اور متحرک صورت حال سے واسطہ تھا۔ محض جامد اور غیر متحرک متون ہی سے واسطہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ایک عام موضوع کے متعلق جو احادیث وارد ہوتی ہیں ان میں احکام و ہدایات میں تنوع ہوتا ہے۔ اس لئے کہ احکام موقعہ و محل کے مطابق دیئے جاتے ہیں۔

تمام حالات و احادیث کو پیش نظر رکھ کر جو تاثر قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سفر میں روزے کے مقابلے میں افطار زیادہ افضل ہے اور اس میں کوئی قید نہیں ہے کہ عملاً مشقت موجود ہے یا نہیں۔

رہی بیماری' تو اس کے بارے میں اقوال فقہاء کے علاوہ مجھے کچھ نہیں ملا۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ حالت ہے جس پر مرض اور بیماری کا اطلاق ہو سکتا ہو۔ اس کی نوعیت' اس کی مقدار اور اس کی شدت وغیرہ کی کوئی قید نہیں ہے۔ صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ بیماری اور سفر میں دن کے بدلے قضا کرنی ہوگی اور قضا لوٹانے میں بھی راجح مذہب یہ ہے کہ دنوں کی تعداد پوری کرنی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ روزے مسلسل ہوں۔

ان تفصیلات کا ذکر میں نے اس غرض سے نہیں کیا کہ میں فقہی اختلافات میں کوئی خاص دلچسپی رکھتا ہوں۔ میرا مقصد صرف اس بنیادی اصول کی وضاحت ہے جس کے مطابق اسلامی عبادات کو دیکھنا چاہئے۔

سوال ہے کہ ان کا اصل مقصد کیا ہے؟ کیا یہ کہ انسان کے ذہن میں ایک ایسی شعوری حالت پیدا ہو جائے' جو انسان کے طرز عمل پر اثر انداز ہو۔ یہی وہ حالت ہے جس کا اثر انسان کے طرز عمل پر ہوتا ہے اور اسی سے انسان کی روحانی تربیت ہوتی ہے۔ عبادات میں خشوع کا مطلب ہے دل کا اللہ کی طرف پوری طرح متوجہ اور گداختہ ہو جانا اور پوری زندگی میں حسن سلوک اور بہتر طرز عمل صرف اسی

شعوری حالت کے نتیجے میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ تو ہے ایک پہلو اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہم اس دین کو اسی طرح قبول کریں جس طرح وہ ہے۔ پورے فرائض و تکالیف کے ساتھ۔ اطاعت و خشیت کے ساتھ۔ اس کی عزیمتوں پر عمل کریں اور رخصتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ پوری طرح ہم آہنگی سے 'اطمینان قلب کے ساتھ' اس کی حکمتوں پر یقین رکھتے ہوئے اور خدا خوفی کا پورا پورا احساس کرتے ہوئے۔

اس بحث کے بعد اب پھر سیاق کلام کو لیجئے!

وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۚ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۚ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

"اور جو لوگ مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہوں تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے تو یہ اسی کے لئے بہتر ہے۔ لیکن اگر تم سمجھو "تو تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ روزہ رکھو۔"

روزہ سنہ ۲ ہجری میں جہاد کی فرضیت سے کچھ پہلے فرض ہوا۔ پہلے پہل روزہ کی تکالیف مسلمانوں کے لئے بہت ہی شاق تھیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے لئے چھوٹ دے دی' جو مشکل سے روزہ رکھ سکتے تھے۔ (یطیقونہ کے معنی ہیں جو مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہوں۔ الاطاقہ کے معنی عربی میں مشکل سے اٹھانے کے ہوتے ہیں۔ رخصت یہ دے دی کہ ایسے لوگ افطار کرلیں مگر انہیں ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہو گا۔ اس کے بعد انہیں ترغیب دی کہ وہ مساکین کے ساتھ مزید بھلائی کریں مثلاً یہ کہ بغیر فدیہ کی مقرر حد سے زیادہ مساکین کو کھانا کھلائیں۔ مثلاً رمضان شریف کے ایک روزے کے بدلے اگر تین' چار یا اس سے بھی زیادہ افراد کو کھانا دیں۔ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ "اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے تو یہ اس کے حق میں اچھا ہے۔" پھر انہیں ترغیب دی گئی کہ سفر و بیماری کے علاوہ اگر وہ روزہ ہی رکھ لیں تو یہ ان کے لئے زیادہ اچھا ہے۔ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ "لیکن اگر تم سمجھو تو تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ روزہ رکھو۔" کیونکہ ایسے حالات میں روزہ رکھنا بہت بڑی بھلائی ہے۔ ایسے حالات میں روزہ رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ دار پختہ ارادے کا مالک ہے۔ اس کے اندر قوت برداشت موجود ہے اور وہ اپنے آرام کو اللہ کی بندگی کے لئے قربان کر سکتا ہے۔ اور یہ تمام وہ امور جو اسلام کے نظام تربیت کے مقاصد اولیہ ہیں۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مریض کے علاوہ دوسرے لوگ اگر جبر و مشقت کے ساتھ روزے رکھیں تو اس میں ان کے لئے جسمانی فائدہ بھی ہے۔

بہرحال یہ آیت ایک تمہید تھی۔ اور جیسا کہ دوسری آیت میں ذکر ہوا ہے' اصل مقصد یہ تھا کہ تندرست اور مقیم پر بتدریج روزے کو علی الاطلاق فرض کر دیا جائے۔ ہاں البتہ یہ حکم ایسے بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لئے اب بھی باقی ہے جن کے لئے روزہ رکھنا بہت مشکل ہو اور یہ امید بھی نہ ہو کہ وہ پھر سے تندرست ہو کر روزہ رکھنے کے قابل ہو سکیں گے۔ امام مالک ﷺ فرماتے ہیں کہ ان تک یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت انس ﷺ بن مالک کافی بوڑھے ہو گئے تھے' اور ان میں روزہ رکھنے کی قدرت ہی نہ رہی تھی۔ اس لئے ان کی جانب سے فدیہ دیا جاتا تھا۔ (حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ یہ اس بوڑھے مرد اور اس بوڑھی عورت کے لئے ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔ ان پر فرض ہو گا کہ وہ ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ ابن ابولیلی ﷺ سے روایت ہے۔ کہتے ہیں: میں رمضان شریف میں عطاء کے پاس گیا۔ دیکھتا ہوں کہ کھانا کھا رہے ہیں۔ اس کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے فرمایا! ابن عباس فرماتے ہیں کہ (ا) یہ آیت نازل ہوئی۔ سابقہ منسوخ ہو گئی۔ البتہ نہایت بوڑھے شخص کے لئے اب بھی یہ رخصت ہے کہ وہ اگر چاہے تو ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا کر افطار کرے فرض اگلی آیت سے ثابت ہوتا ہے

ا۔ شھر رمضان۔

کہ تندرست اور گھر میں مقیم شخص سے یہ رخصت اٹھالی گئی ہے۔اور آنے والی آیت فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ "تم میں سے جو بھی اس مہینے کو پائے اس کے پورے روزے رکھے۔" نے اس آیت کو اس حد تک منسوخ کر دیا ہے۔

تندرست اور مقیم شخص کو اب دوبارہ ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ ضرور روزے رکھے۔ یہ رمضان شریف کے روزے ہیں۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن عظیم نازل ہوا ہے۔ رمضان میں نزول قرآن کا آغاز ہوا یا یہ کہ اس کا زیادہ تر حصہ رمضان شریف میں نازل ہوا۔ قرآن اس امت کے لئے دائمی کتاب ہے۔ قرآن ہی نے تو اس امت کو گھٹاٹوپ اندھیروں سے نکال کر روشنی بخشی اور اسے اس عظیم الشان عروج تک پہنچایا۔ خوف کے بدلے اسے چین نصیب ہوا۔ اسے اس کرۂ ارض پر تمکنت بخشی۔ اسے ایسے مقومات اور ایسے عناصر دیئے جن کی بنیاد پر وہ ایک امت قرار پائی۔ حالانکہ قرآن سے پہلے وہ کیا تھی؟ کچھ نہ تھی اور اب بھی اس قرآن کے بغیر اس کرۂ ارض پر اس امت کا مقام ہی کیا رہتا ہے؟ اس کے بغیر تو وہ امت ہی نہیں رہتی۔ نہ زمین پر اس کا کوئی مقام ہو گا نہ آسمان میں اس کا کوئی ذکر ہو گا۔ لہٰذا ان انعامات کا کم از کم شکر یہ ہے کہ مسلمان شہر رمضان میں روزے سے ہوں' جس میں یہ قرآن نازل ہوا۔

شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡهُدٰی وَ الۡفُرۡقَانِ ۚ فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡیَصُمۡهُ ؕ وَ مَنۡ كَانَ مَرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ

"رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لئے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں' لہٰذا تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے اس کو لازم ہے کہ وہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے۔"

یہ آیت روزے کو مطلقاً فرض کر دیتی ہے اور تندرست اور مقیم سے افطار کی رخصت واپس لے لی جاتی ہے۔ اب وہ فدیہ دے کر افطار نہیں کر سکتے ماسوائے بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے' جس طرح کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں۔ فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡیَصُمۡهُ "لہٰذا اب سے جو شخص اس مہینے کو پائے' اس کو لازم ہے کہ وہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے۔" یعنی جو اس مہینے کو پائے اور مسافر نہ ہو۔ جو شخص ماہ رمضان کا چاند دیکھ لے۔ اگر کسی کو چاند ہونے کا یقین ہو جائے چاہے جس ذریعہ سے بھی' تو اس پر بھی روزہ اس طرح فرض ہے جس طرح چاند دیکھنے والے پر فرض ہے۔

چونکہ یہ آیت بھی عمومیت کی حامل ہے' اس لئے یہاں مریض اور مسافر کے لئے دوبارہ استثنائی دفعہ تجویز کی گئی۔ وَ مَنۡ كَانَ مَرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ "اور جو مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔"

اب تیسری مرتبہ پھر اس اہم فریضہ کی ادائیگی کی ترغیب دی جاتی ہے بیان کیا جاتا ہے کہ روزے کی فرضیت بھی ایک رحمت ہے اور افطار کے لئے رخصت بھی ایک رحمت۔ یُرِیۡدُ اللّٰهُ بِكُمُ الۡیُسۡرَ وَ لَا یُرِیۡدُ بِكُمُ الۡعُسۡرَ "اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے سختی کرنا نہیں چاہتا۔" غرض اسلامی نظریۂ حیات میں تمام عبادات و فرائض کا اصل الاصول یہ ہے کہ معاملات میں نرمی ہو اور ضرورت سے زیادہ سختی نہ ہو۔ یہ عبادات ایسی ہیں کہ جس دل میں ان کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے' اسے یہ شعور ملتا ہے کہ وہ پوری زندگی کے معاملات میں نرم رویہ اختیار کرے سختی نہ کرے۔ ان کے نتیجے میں ایک مسلمان میں سادگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی زندگی پاک ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی تکلف نہیں ہوتا' اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی۔ یوں نظر آتا ہے کہ ایک مسلمان کی پوری زندگی فرائض و واجبات کی ادائیگی' عملی زندگی کے پورے معاملات' ایک سیل رواں کی طرح جاری و ساری ہیں۔ اس کی زندگی اس طرح غیر محسوس طور پر' اطمینان' یقین اور

تسلیم و رضا کے ساتھ ترقی کر رہی ہوتی ہے جس طرح ایک درخت بڑھتا رہتا ہے اور یہ شعور ہر جگہ مومن کے ساتھ ہوتا ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے شامل حال ہے اور یہ کہ وہ ترقی کرتا ہے۔ عبادات گزاری میں مومنین پر کوئی بے جا سختی نہیں ہے۔

مریض و مسافر کے لئے یہ رخصت ہے کہ وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھے تاکہ جو شخص مجبوراً رخصت پر عمل کر رہا ہے وہ ہمیشہ کے لئے اجر عبادت سے محروم ہی نہ ہو جائے وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ "تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو۔"

اس نقطہ نظر سے روزہ ایک عظیم نعمت ہے۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اللہ کی عظمت کا اقرار کریں اور اس کے شکر گزار بنیں: وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ "اور جس ہدایت سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں سرفراز کیا ہے' اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو۔"

اس فریضہ کے مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے دلوں میں اس ہدایت و راہنمائی کی قدر و قیمت کا صحیح شعور پیدا ہو جائے' جو اللہ تعالیٰ نے انتہائی سہولت اور فراوانی سے انہیں فراہم کر دی ہے اور ان کی حالت یہ ہو جائے کہ دوسرے ایام کے مقابلے میں ماہ صیام میں' ان کے دلوں میں دین کا شعور زیادہ پختہ ہو۔ ان کے دل معصیت اور گناہ کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیں۔ ان کے اعضاء معصیت کے ارتکاب کے لئے تیار ہی نہ ہوں۔ وہ اس طرح لگیں کہ اللہ کی ہدایت کو محسوس کر رہے ہیں' بلکہ اسے چھو رہے ہیں۔ ان کے دل اس اطاعت و بندگی کے ساتھ اللہ کی طرف مائل ہوں جیسا کہ رمضان شریف کی بحث کے آغاز میں کہا گیا۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ "اس امید پر کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔"

روزہ جو بادی النظر میں جسم و بدن کے لئے شاق و دشوار نظر آتا ہے دراصل اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے تربیتی مقاصد کیا ہیں۔ اور یہ کہ اس تربیت کے ذریعے ایک مومن کو اس عظیم کردار کے لئے تیار کیا جا رہا ہے جس کے لئے اس امت کو برپا کیا گیا ہے تاکہ وہ نہایت ہی خدا خوفی سے' اللہ کی نگرانی اور ایک زندہ ضمیر کے ساتھ اس فرض کو ادا کرے۔

اس سے پہلے کہ روزے کے تفصیلی احکام بیان ہوں' یعنی کس وقت سے کس وقت تک روزہ ہو اور اس میں کیا جائز ہے اور کیا منع ہے' ہم روزے کی برکات کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ روزے کی مشقتوں کے عوض اللہ ہمیں پورا پورا معاوضہ عطا کرتا ہے۔ یہ معاوضہ اور یہ صلہ کیا ہے؟ اللہ کا قرب اور دعاؤں کی قبولیت۔ ذرا قرآن کے الفاظ کو دیکھئے۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ لا فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَ لْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

"میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں بتادو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے' میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انہیں چاہئے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں' شاید کہ وہ راہ راست پالیں۔"

"میں قریب ہوں۔" "پکارنے والا جب بھی مجھے پکارے میں اس کی پکار سنتا ہوں۔" کیا نرمی ہے؟ ذرا نظر کرم ملاحظہ ہو؟ الفاظ و معانی کی صفائی دیکھو! انس و محبت دیکھو! روزے کی تکالیف کیا۔ بلکہ تمام عبادات کی تکالیف مشقتیں اس قرب و محبت کے مقابلے میں کہاں رہتی ہیں؟ اس انس اور محبت کے ٹھنڈے سایے میں احساس مشقت کہاں باقی رہتا ہے؟

اس آیت کے لفظ لفظ پر انس و محبت کی تازہ شبنم ہے۔ "میرے بندے! اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں بتا دیجئے کہ میں تو ان سے قریب ہوں پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار سنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں۔" اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا

دُعَانِ

عجیب آیت ہے یہ! دل مومن کو میٹھی تازگی' خوشگوار محبت' پرسکوں و رضامندی اور یقین محکم سے بھر دیتی ہے۔ مومن تسلیم و رضا کی جنت میں پہنچ جاتا ہے۔ اسے پر شفقت وصال نصیب ہوتا ہے۔ وہ پر امن پناہ گاہ اور پر سکون آرام گاہ میں پہنچ جاتا ہے۔

انس و محبت کی اس فضا میں پر جوش باریابی کے اس ماحول میں اور الہامی قبولیت کے اس پس و پیش میں' اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ہدایت فرماتے ہیں کہ وہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ایمان اور یہ اطاعت انہیں راہ ہدایت اور راہ مستقیم پر پہنچا دے۔ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ "لہٰذا انہیں چاہئے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لے لائیں شاید کہ وہ راہ راست پا لیں۔"

تسلیم و رضا اور ایمان باللہ کا آخری فائدہ بھی بندوں کا ہے یعنی ہدایت و راہنمائی اور اصلاح حال۔ خود اللہ کو ایمان اور بندگی سے کیا فائدہ ہے۔ وہ تو دونوں جہانوں سے مستغنی ہے۔

غرض ہدایت وہی ہے جو اللہ پر ایمان اور اللہ کی اطاعت پر مبنی ہو۔

صرف اسلامی نظام ہی انسان کو راہ ہدایت دے سکتا ہے اور اسلامی نظام ہی صحیح راہ ہے۔ اس کے علاوہ تمام نظام عین جاہلیت ہیں۔ عین حماقت ہیں۔ کوئی حق پسند ان پر راضی نہیں ہو سکتا۔ نہ ان نظاموں کے ذریعے انسان راہ ہدایت پا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری بھی تب ہی ممکن ہے کہ جب لبیک کہنے والا راہ ہدایت پر ہو۔ متلاشیان راہ حق کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پکاریں' لیکن قبولیت دعا میں جلدی نہ کریں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی حکیمانہ مصلحتوں کے مطابق اور ہر پکار کا جواب اپنے وقت اور مناسب انداز میں دیتے ہیں۔

ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ نے ابن میمون کی حدیث اپنی سند کے ساتھ حضرت سلمان فارسی ﷺ سے روایت کی۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے سامنے اگر کوئی ہاتھ پھیلائے اور اللہ سے خیر کا طلب گار ہو تو اللہ تعالیٰ ان ہاتھوں کو نامراد لوٹانے سے بہت حیاء کرتے ہیں۔"

ترمذی نے عبداللہ بن عبدالرحمٰن کے ذریعہ سے ابن ثوبان کی حدیث اپنی سند سے اور اسی حدیث کو عبداللہ بن امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبادہ ابن الصامت سے روایت کیا ہے۔ دونوں نے کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "اس روئے زمین پر جو شخص بھی اللہ کو پکارے اور کوئی خیر طلب کرے' اللہ تعالیٰ یا تو اس کو وہ چیز عطا کر دیتا ہے یا اس مطلوب کے مطابق اس سے کوئی درپیش آنے والی مصیبت دور کر دیتا ہے بشرطیکہ وہ کسی بری چیز یا قطع صلہ رحمی کا طالب نہ ہو۔"

بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: تمہاری دعا قبول ہوگی بشرطیکہ تم نے جلد بازی نہ کی۔ مثلاً کوئی کہے: "میں نے تو اللہ کو بہت پکارا مگر میری دعا قبول نہ کی گئی۔"

صحیح مسلم میں ہے حضور ﷺ نے فرمایا: "بندے کی دعا ضرور قبول ہوگی بشرطیکہ وہ گناہ اور قطع صلہ رحمی کا طلب گار نہ ہو اور جلد بازی نہ کرے۔" صحابہ ﷺ نے فرمایا یارسول اللہ! جلد بازی کیسے ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ کہے کہ میں نے بار بار اللہ کو پکارا' مجھے یقین نہیں ہے کہ میری دعا قبول ہوگی۔ یوں وہ دعا چھوڑ کر خسارے میں پڑ جائے۔"

روزہ دار تو ہوتا ہی مستجاب الدعوات ہے۔ امام ابو داؤد ﷺ اپنی مسند میں' اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ "افطار کے وقت ہر روزہ دار ایک دعا کی قبولیت کا حقدار ہوتا ہے۔"

چنانچہ عبداللہ بن عمر ﷺ جب بھی افطار کرتے تو اہل خانہ ان کو بلاتے اور دعا کرتے۔

ابن ماجہ نے اپنے سنن میں اپنی سند کے ساتھ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے' حضور ﷺ نے فرمایا : ہر روزہ دار کے لئے افطار کے وقت ایک دعا کی قبولیت کا حق ہے۔"

مسند امام احمد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا : تین افراد ایسے ہیں جن کی دعا مسترد نہیں ہوتی۔ امام عادل' روزہ دار یہاں تک کہ افطار کرے اور مظلوم کی پکار۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے بادلوں کے اوپر اٹھائے گا اس کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا :" میری عزت کی قسم میں ضرور تمہاری امداد کروں گا اگرچہ قدرے دیر سے۔" یہی وجہ ہے کہ ذکر صیام میں دعا کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا۔

اب اہل ایمان کے لئے روزے کے ضروری احکام بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ روزہ دار کو اس بات کی اجازت مل جاتی ہے کہ ماہ رمضان میں مغرب سے لے کر طلوع فجر تک اپنی بیویوں کے پاس جاسکتے ہیں۔ اسی طرح اس عرصہ میں کھانا بھی کھاسکتے ہیں۔ روزے کا وقت بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک ہے۔ اس طرح مدت اعتکاف کے دوران میں بیویوں کے پاس جانے کا حکم بھی دے دیا جاتا ہے۔ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللّٰهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْـَٔـٰنَ بَـٰشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَـٰشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَـٰكِفُونَ فِي الْمَسَـٰجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ ءَايَـٰتِهِۦ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾

"وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔ اللہ کو معلوم ہو گیا کہ تم لوگ چپکے چپکے اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے مگر میں نے تمہارے قصور معاف کر دیئے اور تم سے درگزر فرمایا۔ اب تم راتوں کو کھاؤ پیو یہاں تک کہ تم کو سیاہی شب کی دھاری سے سپیدۂ صبح کی دھاری نمایاں نظر آجائے۔ تب یہ سب کام چھوڑ کر رات تک اپنا روزہ پورا کرو' اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو' بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔ یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں' ان کے قریب نہ پھٹکنا۔ اس طرح اللہ اپنے احکام لوگوں کے لئے بصراحت بیان کرتا ہے' توقع ہے کہ وہ غلط رویے سے بچیں گے۔"

ابتداً حکم یہ تھا کہ اگر روزہ دار افطار کے بعد سو جائے تو اس پر کھانا پینا اور بیویوں کے پاس جانا حرام ہے۔ اگر کسی کی آنکھ لگ جاتی اور پھر وہ اٹھتا تو اگرچہ طلوع فجر سے پہلے اٹھتا۔ اس کے لئے بیوی کے پاس جانا اور کھانا پینا حرام ہوتا۔ بارہا ایسا ہوتا کہ ایک صحابی پر افطار کے وقت نیند کا غلبہ ہو گیا اور آنکھ لگ گئی۔ اب اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا کہ وہ مسلسل دوسرے دن تک روزہ رکھے۔ ایک صاحب کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ دوسرے دن اس نے بڑی مشکل سے روزہ پورا کیا۔ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ اس طرح ایسے واقعات

بھی ہوئے کہ افطار کے بعد ایک صاحب سو گئے' بیوی بھی سو گئی۔ جب جاگے تو ہم بستری کی اور حضور تک بات پہنچ گئی۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر یہ حکم بھاری ہو رہا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس مشکل حکم کو منسوخ کر دیا اور معاملہ آسان ہو گیا۔ چونکہ روزے کے ان احکام میں مشکلات کا سامنا وہ کر چکے تھے۔ تجربہ ان کے ذہن میں تھا' اس لئے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کو انہوں نے خوب محسوس کیا۔ آیت نازل ہوئی اور ان کے لئے مغرب اور طلوع فجر کے درمیان کھانا پینا اور بیوی کے پاس جانا جائز قرار دیا گیا۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ "تمہارے لئے روزوں کے مہینے میں راتوں کو اپنی بیویوں کے پاس جانا جائز قرار دیا گیا ہے۔" الرفث کا مفہوم مباشرت کا آغاز ہے یا عین مباشرت ہے۔ یہاں دونوں کا جواز مقصود ہے۔ دونوں جائز ہیں لیکن دوران بیان' قرآن مجید پر ایک نظر پھیرتا ہوا خوشگوار تاثر چھوڑے بغیر نہیں رہتا۔ میاں بیوی کے اس تعلق کے اندر ابریشم کی طرح ملائمت' شیشے کی سی صفائی پیدا کی جاتی ہے۔ نیز اس کو حیوانی درشتگی اور حیوانی نقائص سے پاک کر دیا جاتا ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ "وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔" لباس پردہ پوشی کرتا ہے۔ گرمی سردی سے بچاتا ہے' اسی طرح میاں بیوی کا باہمی تعلق دونوں کا پردہ پوش ہے۔ ان کا محافظ ہے۔ اسلام مخلوق انسانی کو اس کی حقیقت واقعیہ کے لحاظ سے دیکھتا ہے۔ اور حقیقت واقعیہ کے لحاظ سے اس کے فطری تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے اور اس طرح یہ نظام انسان کا ہاتھ پکڑ کر اسے بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ ہے اسلام اور یہ ہے اس کا نظریۂ حیات۔ وہ گوشت و پوست کے فطری تقاضے پورے کرتا ہے اور پورے بھی کرتا ہے خوشگوار اور لطیف فضا میں' پاکیزگی کے لطیف پردوں میں۔

اللہ علیم و خبیر ہے۔ وہ بتا دیتا ہے کہ تمہارے خفیہ جذبات کیا ہیں؟ اور پھر دکھاتا ہے کہ وہ تمہارے فطری دواعی پورے کرنے کے لئے تمہاری حاجات کو پوری کرتا ہے۔

عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ "اللہ کو معلوم ہو گیا کہ تم لوگ چپکے چپکے اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے' مگر اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا اور تم سے درگزر فرمایا۔" یہ خیانت کیا تھی؟ ان کے دلوں میں دبی ہوئی خواہشات تھیں۔ خفیہ جذبات تھے جو ارتکاب جرم کا تقاضا کر رہے تھے۔ یا مراد یہ ہے کہ تم چوری چھپے اس حکم کو توڑ رہے تھے۔ جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ بعض حضرات سے اس کی خلاف ورزی کا ارتکاب ہوا لیکن دونوں قسم کے حضرات کو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا۔ چونکہ ان کی کمزوری اور ناتوانی ظاہر ہو گئی تھی' اللہ تعالیٰ جانتے تھے چنانچہ ان کی حاجت روائی کر دی گئی فَالْـَٔانَ بَاشِرُوهُنَّ "اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو۔"

لیکن اس جواز کا رابطہ بھی رضائے باری سے جوڑ دیا گیا۔ حکم دیا گیا کہ اس میں بھی تم اللہ کی طرف متوجہ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ "اور جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے اسے حاصل کرو۔" یعنی عورتوں سے جو لطف اندوزی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جائز کر دی ہے' اس سے فائدہ اٹھاؤ اور اس کے نتیجے میں آنے والی اولاد سے بھی بہرہ مند ہو۔ دونوں چیزیں حکم خداوندی میں شامل ہیں۔ دونوں وہ سامان ہیں جن کا حاصل کرنا اور جن سے لطف اندوز ہونا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جائز قرار دے دیا ہے لیکن اس لطف اندوزی کے پس منظر میں ایک گہری حکمت پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ ایک بامقصد فریضہ ہے۔ یہ جسمانی طلب اور مجرد حیوانی تلذذ ہی نہیں ہے جس کا تعلق محض جسم سے ہو۔ اس طرح میاں بیوی کے درمیان تعلق ایک بلند مقصد سے مربوط ہو کر فریضۂ فطرت قرار پاتا ہے۔ وہ لطف و لذت کے ایک مختصر لمحے کے بجائے انسانیت کے افق پر ایک پاک مقصد قرار پاتا ہے۔ اسلامی نظام حیات' اور اسلام کے طرز زندگی کے اندر اس قسم کے اشارات و ارشادات دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام انسانی زندگی کے اندر کیا انقلاب لانا چاہتا ہے اور اسے کن

خطوط پر ترقی دیتا ہے یہ تمام کام وہ انسان کے حدود میں' اس کی قوت برداشت کے اندر اور اس کے پیدائشی مزاج کے مطابق سرانجام دیتا ہے۔ یہ ہے تربیت' سربلندی اور ترقی کا اسلامی نظام۔ جس کا سرچشمہ خدا تعالیٰ ہے' جو اسے مخلوق کے حالات سے خوب خبردار ہے۔ جو باریک بین اور لطیف و خبیر ہے۔

ان اوقات میں جس طرح بیوی کے پاس جانے کی اجازت دے دی گئی اسی طرح ان اوقات میں کھانے پینے کی اجازت بھی مل گئی۔

وَ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ "راتوں کو کھاؤ یہاں تک کہ تم کو سیاہی شب کی دھاری سے سپیدۂ صبح کی دھاری نمایاں نظر آجائے۔" یعنی اس وقت تک کہ افق پر اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر روشنی پھیل جائے۔ اس سے مراد افق پر سفید دھاری کا محض "ظہور" نہیں ہے۔ اس کو فجر کاذب کہتے ہیں۔ روزہ بند کرنے کے سلسلے میں جو روایات وارد ہیں ان کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ وقت طلوع الشمس سے تھوڑا پہلے ہے۔ آج کل ہمارے علاقے میں عام طور پر جو اوقات مقرر ہیں ہم انہی کے مطابق روزہ رکھتے ہیں۔ یہ اوقات شرعی وقت سے قدرے پہلے ہی ہیں اور مزید احتیاط کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔

ابن جریر ﷺ نے اپنی سند سے' سمرہ ﷺ بن جندب سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تمہیں بلال کی اذان اور یہ سفیدی دھوکہ میں نہ ڈال دے۔ یہاں تک کہ صبح کھل نہ جائے یا فرمایا' طلوع نہ ہو جائے۔"

اس حدیث کو اس نے شعبہ ﷺ سواد ﷺ بن حنظلہ اور سمرہ ﷺ کے واسطوں سے یوں نقل کیا ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلال کی اذان اور "مستطیل صبح" کہیں تمہیں سحری کرنے سے روک نہ دے۔

اس سے مراد وہ صبح ہے جو افق میں پھیل جائے (المستطیر) اور طلوع آفتاب سے قدرے پہلے صبح پھیلتی ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ حضرت بلال سوئے ہوئے لوگوں کو سحری سے آگاہ کرنے کے لئے بہت سویرے اذان دیتے تھے اور ابن ام مکتوم آخر میں روزہ بند کرنے کے لئے اذان دیتے تھے۔ اس لئے یہ کہا گیا کہ تم اذان بلال سے دھوکہ نہ کھا جاؤ۔

اس کے بعد مساجد میں اعتکاف کے دوران میں مباشرت کے حکم کا بیان ہوتا ہے۔ اعتکاف کے معنی ہیں' مسجد میں علیحدہ ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا اور سوائے حاجات ضروریہ کے مسجد سے نہ نکلنا۔ مثلاً کھانا پینا قضائے حاجت وغیرہ۔ یہ مستحب ہے اور رمضان شریف کے آخری عشرے میں کیا جاتا ہے۔ رمضان شریف کے آخری عشرے میں حضور ﷺ اس پر عمل پیرا ہوتے تھے' اعتکاف کا عرصہ عام معمولات زندگی سے الگ ہو کر صرف اللہ کی طرف متوجہ ہونے کا عرصہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس تجرد اور علیحدگی کو مکمل کرنے کے لئے حکم دیا گیا کہ اس عرصے میں بیویوں کے پاس جانے سے بھی اجتناب ہونا چاہئے۔ تاکہ نفس انسانی تمام الائشوں سے علیحدہ ہو جائے اور دل تمام مشغولیات سے پاک ہو جائے۔

وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ "اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔" چاہے روزے کا وقت ہو یعنی دن یا افطار کا وقت ہو یعنی رات۔

سب سے آخر میں تمام معاملے کو ذات باری کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہر انضباتی حکم اور ہر ہدایت کے معاملے میں قرآن مجید کا مستقل انداز بیان ہے۔ یعنی ہر امر میں' ہر نہی میں ہر حرکت میں اور ہر سکون میں۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا "یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں' ان کے قریب نہ پھٹکنا۔"

یہاں اس شدت سے روکا گیا ہے کہ قریب ہی مت جاؤ' تاکہ انسان اور ممنوعات کے درمیان امن کا ایک لازمی علاقہ موجود ہو۔ جو

چرندہ چراگاہ کے ارد گرد گھومتا ہے آخر کار اس میں داخل ہو جاتا ہے اور ہر وقت انسان بھی اپنے نفس کی نگرانی نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ ایسی ممنوعات کے قریب گھومتا رہے جو مرغوب ہوں اور پھر اس اعتماد پر کہ وہ جب چاہے گا اپنے نفس پر قابو پالے گا۔ کسی شخص کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ایسے خطرناک امتحان میں ڈالے' چنانچہ یہ ممانعت ایسے ہی معاملے سے وابستہ ہے جو پر لطف ہے اور مرغوبات میں سے ہے۔ اس لئے حکم دیا گیا ہے کہ قریب ہی مت جاؤ۔ حالانکہ مقصد صرف یہ ہے کہ ان ممنوعات کے اندر مبتلا ہونے سے بچو کہ قریب جانے کی ممانعت نہیں ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ احتیاط اور خدا خوفی سے کام لینا چاہئے۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اس طرح اللہ اپنے احکام لوگوں کے لئے بصراحت بیان کرتا ہے۔ توقع ہے کہ وہ غلط رویے سے بچیں گے۔" بتایا جاتا ہے کہ نزول قرآن اور تبلیغ آیات کا آخری مقصد خدا خوفی کا حصول ہے۔ یہ وہ قیمتی اور عظیم مقصد ہے جس کی اہمیت اور قدر و قیمت صرف ان لوگوں کے ہاں ہے جو ایمان لانے والے ہیں اور جو ہر دور میں قرآن کے طالب ہیں۔

روزہ کے بیان کی مناسبت سے کھانے کی ایک اور قسم کی بھی ممانعت کی گئی ہے۔ اور وہ ہے لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھانا' انہیں مقدمات میں ملوث کرنا' چالاکی سے انہیں پھنسانا اور ان کے خلاف حکام کے سامنے شواہد اور قرائین فراہم کرنا اور چالاکی اور چرب زبانی سے ان کے خلاف ڈگری حاصل کر لینا۔ یہ سخت ممنوع ہے۔ کیونکہ حاکم تو مقدمہ کے ظاہری حالات اور شہادت و دلائل کے مطابق ہی فیصلہ کرے گا۔ اور اگر جھوٹی شہادتیں پیش کر دی جائیں تو یہ فیصلہ خلاف موقعہ ہو گا اس لئے یہ ممانعت اللہ کے حدود کے ذکر کے بعد خدا خوفی اور خدا ترسی کی مسلسل دعوت کے بعد کی گئی ہے تاکہ نہی کا یہ اہم حکم خدا خوفی کے ایسے ماحول میں وارد ہو جو انسان کو ارتکاب ممنوعات سے باز رکھے۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ
۲۳ ع ۶ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾
۷

"اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس غرض کے لئے پیش کرو کہ تمہیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقہ سے کھانے کا موقع مل جائے۔"

ابن کثیر ؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: علی ابن ابو طلحہ' حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں: "یہ اس شخص کے بارے میں ہے کہ اس پر دوسرے کا قرضہ ہو۔ اور اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ہو۔ وہ انکار کر دے اور مقدمہ حکام کے پاس جائے۔ وہ جانتا ہو کہ اس پر حق موجود ہے اور اسے خوب علم ہو کہ وہ گناہ گار اور حرام خور ہے۔" مجاہد ؒ' سعید ؒ بن جبیر' عکرمہ ؒ' حسن' قتادہ ؒ' سدی ؒ' مقاتل ؒ بن حیان اور عبدالرحمن ؒ بن زید بن اسلم سے روایت ہے۔ ان سب نے کہا! "اگر تمہیں معلوم ہو کہ تم ظلم کر رہے ہو تو ہرگز مقدمہ دائر نہ کرو۔" بخاری و مسلم میں حضرت ام سلمہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! "بہر حال میں ایک انسان ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ تم ایک مقدمہ میرے پاس لاؤ اور تم میں سے ایک شخص دوسرے کی نسبت زیادہ چرب زبان ہو اور میں اس کے حق میں فیصلہ کروں۔ یاد رکھو کہ جس کے حق میں' میں کسی دوسرے کی کسی چیز کا فیصلہ کروں تو وہ اس کے حق میں دوزخ کا ایک ٹکڑا ہو گا۔ اب یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ اسے اٹھاتا ہے یا اسے چھوڑ دیتا ہے یوں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا

معاملہ خود ان کے سپرد کر دیتا ہے جو اپنے دعویٰ کی حقیقت سے باخبر ہوں۔ جج کے فیصلے سے حرام حلال نہیں ہو جاتا نہ حلال حرام ہو جاتا ہے۔ اس کی حیثیت صرف یہ ہوتی ہے کہ بظاہر وہ فیصلہ نافذ ہو جاتا ہے۔ اور گناہ دھوکہ باز کے ذمہ ہوتا ہے۔

حکم قصاص، حکم وصیت اور احکام صیام کی طرح مقدمہ بازی Letigation اور مالی معاملات میں بھی معاملہ خدا خوفی اور تقویٰ کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ یہ سب احکام دراصل اسلامی نظام کے جسم اجتماعی کے مختلف اجزاء ہیں اور سب کی روح تقویٰ ہے۔ یہ تمام اجزاء تقویٰ کی مضبوط رسی میں بندھے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام حیات ایک وحدت ہے۔ یہ جزلایتجزیٰ ہے۔ ایک ایسی اکائی ہے جس کے اجزاء علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم اس کے بعض اجزاء پر عمل کریں اور بعض کو ترک کر دیں تو یہ بعض کتاب پر عمل ہو گا اور ایک حصے کا انکار ہو گا جو آخر کار کفر پر منتج ہو گا۔ نعوذ باللہ!

☆ ☆ ☆

# درس ۱۲ ایک نظر میں

سابقہ اسباق کی طرح اس سبق میں امت کو بعض مزید فرائض کی تعلیم دی گئی ہے۔ اسلامی نظام زندگی کے بعض قومی اور بعض بین الاقوامی معاملات پر قانون سازی کی گئی ہے۔

اس سبق میں چاند کی بڑھتی گھٹتی صورتوں کا بیان ہے۔ گھروں میں پیچھے کی طرف سے داخل ہونے کا بیان ہے' جاہلیت میں بعض اوقات لوگ اس رسم کی پابندی کرتے تھے۔ احکام قتال' حرام مہینوں میں مسجد حرام کے پاس جنگ اور حج وعمرہ کے اصلاح شدہ احکام ہیں۔ ترتیب وتعدیل کے ساتھ اور مناسب ترامیم کے ساتھ۔ ان تمام معاملات سے وہ اجزاء نکال دیئے گئے ہیں جن کا ربط دور جاہلیت سے تھا۔

سابقہ درس کی طرح اس میں بھی بعض احکام' عقائد و نظریات سے متعلق ہیں اور بعض کا تعلق رسومات و عبادات سے ہے جبکہ بعض احکام کا تعلق جنگ سے ہے۔ ان سب کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کا ذکر اور اس کا ڈر یعنی تقویٰ۔

جہاں حکم دیا جاتا ہے کہ تم گھروں میں پیچھے کی طرف سے نہ داخل ہو' سیدھے آؤ۔ اس کے ساتھ ہی نیکی کے مفہوم اور تصور کو درست کر دیا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ حرکات وسکنات کی ظاہری اشکال کا نام نیکی نہیں ہے۔ بلکہ بر خدا خوفی کا نام ہے۔ وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَ اْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ "یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں پیچھے سے داخل ہوتے ہو۔ نیکی تو اصل میں یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ناراضی سے بچے۔ لہذا تم اپنے گھروں میں دروازے ہی سے آیا کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔"

حکم دیا جاتا ہے کہ دوران جنگ ظلم اور زیادتی سے بچو۔ لیکن اس سے بچنے کا محرک بھی خدا سے لگاؤ اور اس کا خوف ہونا چاہئے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ مسجد حرام کے قریب جنگ کے حکم میں بھی کہا جاتا ہے۔ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ انہی لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کی حدود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں۔"

اب مواقیت حج کا بیان شروع ہوتا ہے۔ اس کے دوران میں شہوانی افعال' بدفعلی اور لڑائی جھگڑے کی ممانعت ہوتی ہے اور نتیجہ وہی تقویٰ ہے۔ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَ اتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ سفر حج کے لئے زاد راہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے بہتر زاد راہ پرہیزگاری ہے۔ پس اے ہوشمندو! میری نافرمانی سے پرہیز کرو۔"

انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا جاتا ہے اور اس میں آخری نتیجہ تقویٰ اور احسان ہے۔ وَ اَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ "احسان کا طریقہ اختیار کرو اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔" حج کے بعض احکام کے آخر میں بھی دعوت دی گئی ہے کہ خدا خوفی اختیار کرو ورنہ عذاب سے نہ بچ سکو گے وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ اللہ کے احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔"

حج کے بعد لوگوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ اللہ کی یاد میں مشغول ہو جاؤ۔ لیکن آخری نصیحت پھر تقویٰ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ "اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمہاری پیشی ہونے والی ہے۔"

صاف نظر آجاتا ہے کہ یہ تمام اور مختلف النوع احکام ایک مضبوط رسی میں نہایت مضبوطی سے باندھے ہوئے ہیں۔ یہ رسی اور یہ رابطہ اس دین کے مجموعی مزاج سے وجود میں آتا ہے۔ اس دین کا مزاج یہ ہے کہ اس میں عبادات شعور سے جدا نہیں ہوتیں اور عبادات سے قوانین عامہ اور دنیاوی قواعد و ضوابط جدا نہیں ہوتے۔ یہ دین اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک دنیاوی امور اور آخرت کے امور کو ساتھ ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ نظریۂ حیات اور قلب و نظر کی دنیا کے ساتھ قومی اور بین الاقوامی معاملات کو وابستہ نہ کر دیا جائے اور جب تک اس دین کو انسان کی پوری زندگی میں جاری و ساری اور غالب نہ کر دیا جائے اور حالت یہ نہ ہو جائے کہ پوری زندگی مکمل طور پر تصور وحدت کے مطابق چل رہی ہے' ایک ہی ہم آہنگ نظام اس پر حاوی ہے ایک ہی اور کامل نظام ہے جو اس میں نافذ ہے اور یہ ایسا نظام ہے جو اللہ کی شریعت پر قائم ہے۔ ایک اکائی ہے اور زندگی کے پورے معاملات کو اپنی حدود میں لئے ہوئے ہے۔

سورت کے اس حصے کے آغاز ہی میں ہمارے سامنے ایک منظر آتا ہے۔ اس منظر میں مسلمان زندگی کے مختلف شکلوں کے بارے میں اپنے پیارے نبی کے اسوۂ حسنہ کی طرف نظر کرتے ہیں۔ ایسے حالات کے بارے میں پوچھتے ہیں جو آئے دن زندگی میں انہیں پیش آتے رہتے ہیں۔ وہ یہ جاننے کے لئے بے تاب نظر آتے ہیں کہ وہ ان معاملات میں' اپنے جدید تصور حیات کے مطابق کیا طرز عمل اختیار کریں۔ جو ان کے جدید نظام زندگی کے مطابق ہو۔ وہ سب سے پہلے جس چیز کی طرف توجہ مبذول کرتے ہیں وہ مظاہر فطرت ہیں وہ چاند کے بارے میں غور کرتے ہیں کہ اس کی کیا حقیقت ہے؟ وہ ہلال نظر آتا ہے۔ پھر وہ بتدریج مکمل ہو جاتا ہے اور پھر گھٹنے لگتا ہے۔ پھر ہلال ہو جاتا ہے یہاں تک کہ غائب ہو جاتا ہے اور پھر نئے سرے سے ہلال ہو کر نکلتا ہے۔ پھر وہ یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ مال کی کون سی قسم خرچ کریں؟ وہ کس قدر خرچ کریں؟ خرچ کس نسبت سے ہو؟

پھر وہ سوچتے ہیں کہ مسجد حرام کے نزدیک جنگ کرنا کیسا ہے؟ پھر حرام مہینوں میں جنگ کرنے کا کیا حکم ہے؟ پھر وہ جوئے اور قمار بازی کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہ نئے نظام میں کیا حکم ہے؟ کچھ ہی عرصہ پہلے وہ تو سب شراب خور تھے اور جوئے بازی کے سوا ان کا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔

پھر اچانک عورتوں کے ایام کے سلسلے میں پوچھتے ہیں کیا ان ایام میں تعلقات زن شوئی جائز ہیں؟ پھر وہ اپنی بیویوں کے خصوصی تعلقات کے بارے میں سوال کرتے ہیں اور بعض اوقات تو ایسے سوالات خود بیویوں نے بھی کئے۔ غرض پورے نظام زندگی کے بارے میں نہ صرف ان کی سوچ بدل جاتی ہے بلکہ طرز عمل بھی بدل جاتا ہے۔ وہ طہارت اور پاکیزگی میں معراج کمال پر نظر آتے ہیں۔

یہ سوالات نہایت اہمیت کے حامل ہیں اور ان سے بے شمار حقائق کا اظہار ہوتا ہے مثلاً:

اولاً یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس وقت اجتماعی زندگی کی جو اشکال تھیں اور ان کے درمیان جو ربط ضبط تھا وہ زندہ' ترقی پذیر اور وسعت پذیر تھا۔ اسلامی معاشرے کی تشکیل جدید ہو رہی تھی' تشخص قائم ہو رہا تھا اور نئی نئی صورتیں پیش کی جا رہی تھیں۔ افراد معاشرہ اپنی اجتماعی زندگی پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ وہ اب بکھرے ہوئے افراد اور متفرق قبائل نہ تھے۔ اب وہ ایک امت بن چکے تھے' جس کا الگ وجود تھا۔ اپنا نظام تھا۔ اس کی اپنی وضع قطع تھی اور سب افراد اس نظام کے ساتھ پختہ طور پر وابستہ تھے۔ ہر فرد کیلئے یہ بات اہم تھی کہ وہ زندگی کے پاکیزہ خطوط سے پوری طرح باخبر ہو' باہمی تعلقات و رابطہ کی نوعیت کے بارے میں خبردار ہو۔ یہ نئی صورت حال دراصل نئے نظریۂ حیات' نئے نظام زندگی اور نئی قیادت کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی۔ اور ان کی انسانیت' ان کا شعور اور ان کی فکر غرض پوری سوسائٹی ہمہ جہت ترقی کر رہی تھی۔

اس ہمہ جہت تجسس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی دینی حس کس قدر تیز تھی۔ اسلامی نظریۂ حیات ان کے دلوں میں کس

قدر اتر چکا تھا۔ یہ نظریہ ان کی زندگیوں پر یوں چھا گیا تھا کہ وہ روز مرہ کا کوئی کام بھی اس وقت تک نہ کرتے تھے جب تک اس جدید نظریۂ حیات کی روشنی میں یہ یقین نہ کر لیتے کہ وہ درست ہے۔ اس لئے کہ اب ان کی سابقہ زندگی کی کوئی بات برقرار نہ تھی۔ انہوں نے دور جاہلیت کی تمام رسموں اور عادتوں کا جوا گردن سے اتار پھینکا تھا۔ اب انہیں قدیم رسومات پر کوئی اعتماد نہ تھا اور وہ زندگی کے ہر کام اور ہر موڑ پر ایک جدید تعلیم کے منتظر تھے۔ وہ ہروقت بیدار اور باشعور رہتے تھے اور ان کی یہ شعوری حالت سچائی پر پختہ عقیدے کی وجہ سے تھی۔ ان کے نفوس تمام جاہلی عادات اور طور طریقوں سے پاک ہو گئے تھے۔ وہ جاہلیت کی ہربات کا بڑی احتیاط سے جائزہ لیتے تھے اور اسے ترک کر دیتے تھے۔ جدید نظریۂ حیات سے ہدایات لینے کے لئے وہ ہروقت تیار رہتے تھے۔ وہ اپنی نئی زندگی کو خالصتاً اس نئے نظریہ حیات کے مطابق جلد از جلد استوار کرنے کا عزم کر چکے تھے۔ یہ جدید نظریہ حیات ان کی زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھال رہا تھا۔ قدیم عہد کی جن باتوں کو بدرجہ مجبوری باقی رکھا گیا تھا انہیں بھی وہ جدید رنگ اور جدید تربیت کے ساتھ لیتے تھے۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر آنے والا نظام قدیم نظام کی جزئیات تک کو ترک کر دے۔ اصل بات یہ ہوتی ہے کہ جدید نظام قدیم نظام کی بعض صالح جزئیات کو منتخب کر کے انہیں جدید نظام میں سمو دیتا ہے۔ وہ اس جدید نظام کا جزو ہو جاتی ہیں۔ مثلاً حج کے اکثر مناسک ایسے ہیں جنہیں اسلام نے باقی رکھا ہے۔ اور وہ یوں ہو گئے کہ گویا وہ اسلامی نظام زندگی کے سرچشمے سے پھوٹے ہیں۔

تیسری بات اس دور کی تاریخ سے سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ اس دور میں مشرکین مکہ اور یہود مدینہ بار بار 'اسلامی اقدار کے سلسلے میں' مسلمانوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اسلام نے جاہلیت کے رسوم عبادت میں جو ترمیمات کی تھیں یا اس دور میں جو واقعات پیش آئے تھے ان کی وجہ سے یہ عناصر کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے اور اسلام کے خلاف ہروقت گمراہ کن پروپیگنڈے میں لگے رہتے تھے۔ مثلاً مشرکین عبداللہ بن جحش کے سریہ کے سلسلے میں سخت اعتراض کرتے تھے۔ انہوں نے حرام مہینوں میں مشرکین پر حملہ کر دیا تھا۔ اور اس کی وجہ سے بے شمار سوالات پیدا ہو گئے تھے جن کا جواب ضروری تھا۔ اندرونی طور پر قرآن کریم جاہلی تصورات' جاہلی رسومات اور جاہلی نظام کا ابطال کر رہا تھا تو ظاہری طور پر اسلام اور مسلمانوں کے ان دشمنوں کے خلاف اس نے اعلان جنگ کر دیا تھا۔ یہ اندرونی اور بیرونی جنگ مسلمانوں کے لئے اب بھی بپا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسانی نفس اور انسانی ذہن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی' اسلام کے وہی دشمن آج بھی تیغ بکف ہیں اور قرآن کریم اس وقت جو جواب دے رہا تھا آج بھی وہی جواب دے رہا ہے اور یہ امت آج بھی' اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں کر سکتی جب تک حق و باطل کی اس جنگ میں قرآن عظیم کو اپنا رہنما نہیں بناتی۔ یقیناً قرآن کریم آج بھی وہ کارہائے نمایاں دکھائے گا جو اس نے سینکڑوں سال پہلے دکھائے تھے۔ جب تک مسلمان اس حقیقت کا یقین اور تسلیم نہ کریں گے اور اس پر عمل نہ کریں گے' ان کے لئے کوئی نجات نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس دنیا میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

اس حقیقت پر غور کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ انسان اس تصور اور ادراک کے ساتھ' اس کتاب کو قبول کرے۔ وہ اس کی طرف اس طرح متوجہ ہو کہ اس کی تعلیمات متحرک صورت میں نظر آئیں' وہ میدان عمل میں ہو اور ذہن کو ایک جدید تصور حیات دے رہا ہو۔ جاہلیت کے تصورات کا مقابلہ کر رہا ہو' اس امت کو لغزشوں سے بچا رہا ہو اور اس کی مدافعت کر رہا ہو' اس حال میں متوجہ نہ ہو' جس طرح آج ہم اس کی طرف رخ کرتے ہیں۔ میٹھے نغمے کی طرح ایک اچھے کلام کی صورت میں' جو ترتیل سے پڑھا جا رہا ہے اور بس.....

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے تو قرآن مجید کو ذہنی آسودگی حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ ایک عظیم مقصد کے لئے اتارا تھا۔ اسے اس لئے اتارا تھا کہ وہ اس کرۂ ارض پر ایک پاکیزہ اور مکمل زندگی تخلیق کرے۔ اسے حرکت دے۔ راستے کی مصیبتوں' لغزشوں اور کانٹوں کے درمیان سے انسان کی راہنمائی کر کے اسے پر امن منزل تک پہنچائے۔

# درس نمبر ۱۲ تشریح آیات (۱۸۹ تا ۲۰۳)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَ اْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

"اے نبی' لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق پوچھتے ہیں' کہو یہ لوگوں کے لئے تاریخوں کی تعین کی اور حج کی علامتیں ہیں۔ نیز ان سے کہو کہ یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں پیچھے کی طرف داخل ہوتے ہو۔ نیکی تو اصل یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ناراضی سے بچے۔ لہٰذا تم اپنے گھروں میں دروازے ہی سے آیا کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو' شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال کیا گیا تھا' جیسا کہ پہلے ہم کہہ آئے ہیں' یعنی چاند کا ظہور اس کا گھٹنا بڑھنا کیونکر ہوتا ہے؟ بعض روایات میں آتا ہے کہ سوال اس طرح تھا کہ حضور ﷺ چاند کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ سوال کا یہ انداز جواب سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ اس لئے حضور ﷺ سے کہا گیا کہ اے نبی تم یہ جواب دے دو : قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ "یہ لوگوں کے لئے تاریخوں کے تعین اور حج کی علامتیں ہیں۔" یعنی حج کا احرام باندھنے کا وقت' حج سے باہر آنے کا وقت' روزہ بند کرنے کا وقت' روزہ کھولنے کا وقت۔ نکاح' طلاق اور عدت کا وقت۔ معاملات تجارت اور قرضوں کی ادائیگی کے اوقات وغیرہ۔ تمام دینی امور میں اور تمام دنیاوی امور میں وقت کا حساب ضروری ہے اور اس لئے چاند کا حساب رکھنا تمام امور میں لابدی ٹھہرا۔

چاہے یہ پہلے سوال کا جواب ہو یا دوسرے کا' تعلق اس کا بہرحال مسلمانوں کی عملی زندگی کے ایک حقیقی مسئلے سے ہے۔ محض سائنسی اور علمی مسئلے کا حل یہاں مقصود نہیں ہے۔

قرآن کریم نے بھی انہیں چاند کے وہ فائدے گنوا دیئے جو ان کی عملی زندگی میں رات دن انہیں نظر بھی آتے تھے لیکن قرآن نے انہیں زمین کی گردش یا چاند گردش کے بارے میں کچھ نہیں بتایا' حالانکہ سوال کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ سوال یہ تھا : چاند ہلال بن جاتا ہے کیسے؟ پھر اسی طرح قرآن کریم نے انہیں یہ بھی نہیں بتایا کہ نظام شمسی میں چاند کا کام (Function) کیا ہے یا اجرام سماوی کی گردش میں چاند کا مدار کیا ہے؟ یہ بات بھی یقیناً سائل کے سوال میں شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عملی جواب دیا تھا اس کا راز کیا ہے۔ قرآن کریم نے سائنسی معلومات کے بجائے محض عملی فوائد کیوں گنوائے؟

دراصل قرآن کریم کا مقصد نزول یہ تھا کہ انسان کو ایک خاص نظریۂ حیات دے۔ ایک خاص مقام زندگی عطا کرے۔ اس کے نتیجے میں ایک مخصوص معاشرہ وجود میں آئے۔ قرآن کریم کے پیش نظر اس کرۂ ارض پر ایک امت کی تشکیل تھا' جس نے زمین پر پوری انسانیت کی قیادت کا اہم فریضہ ادا کرنا تھا۔ اس کو تاریخ انسانیت کے اندر ایک ایسے معاشرے کی تخلیق کرنی تھی جو تمام گزشتہ انسانی معاشروں میں سب سے زیادہ بلند ہو۔ اس کو انسانی زندگی کا ایک ایسا نمونہ پیش کرنا تھا جس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہ ہو۔ اس کو

اس طرز زندگی کے بنیادی اصول وضع کرتا تھے اور لوگوں کو ان کی طرف دعوت دیتی تھی۔

قرآن کی زبان میں کیا اللہ تعالیٰ اس سوال کا علمی جواب دیتے ہیں۔ظاہر ہے قرآن ان احکام کا مجموعہ ہے جو انسانی زندگی کو پاکیزہ بنانے اور خدا پرستی تک لے جانے والے ہیں۔ یہ علم فلکیات کی کتاب نہیں ہے۔ اس لئے کوئی علمی جواب تلاش کرنا قرآن کے مزاج اور موضوع سے بے خبری کی دلیل ہو گا۔ یوں بھی یہ علوم ایک نہج پر نہیں۔ نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ ان نظریات کو انسانی فہم و ادراک تک لانے کے لئے بے شمار معلومات و نظریات کی ضرورت ہوتی رہی ہے۔ اور اس وقت پوری انسانیت کا جو مبلغ علم تھا اس کے مطابق یہ علمی جواب ایک معمہ ہی نظر آتا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے علمی جواب کو چھوڑ دیا۔ قرآن کریم اپنے مقصد نزول کی تفہیم کو اولیت دیتا ہے اور اس فہم میں علم فلکیات کے انداز میں جواب موزوں ہی نہ ہوتا اور اگر یہ علمی جواب ضروری بھی ہوتا تو بھی قرآن کریم جیسی کتاب اس کے لئے موزوں نہ تھی جس کا موضوع سائنس نہیں ہے کیونکہ قرآن بلند تر مقاصد کے لئے نازل ہوا ہے۔ قرآن مجید کے بعض ناداں دوست اس میں علوم جدیدہ تلاش کرتے ہیں جو قرآن کا موضوع ہی نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں کینہ پرور دشمنوں کا خیال یہ ہے کہ قرآن مجید طبیعی علوم کا مخالف ہے۔ یہ بھی خام خیالی ہے۔ گو قرآن کا موضوع مادی علوم نہیں، لیکن اس کا اعجاز یہ بھی ہے کہ ان علوم کے سرچشمے اس میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔

یہ دونوں طرف کے خیالات اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ ان کے حامل حضرات نے اس کتاب مقدس کے مزاج ہی کو نہیں سمجھا۔ اس کے مقاصد اور اس کے دائرہ کار ہی کو یہ حضرات متعین نہیں کر سکے۔ قرآن کریم کا دائرہ کار بالیقین نفس انسانی اور حیات انسانی کا تزکیہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کائنات اور ان موجودات کے سلسلے میں انسان کو ایک ایسا تصور دیا جائے جس کے ذریعے یہ اپنے خالق سے پیوستہ ہو جائیں اور پھر اس تصور کی اساس پر زندگی کا ایک پورا نظام تعمیر کیا جائے جس میں انسان آزادی کے ساتھ اپنی پوری قوتوں کو کام میں لائے۔ ظاہر ہے کہ انسانی قوتوں میں، ایک قوت، قوت عقل و ادراک بھی ہے اور یہ قوت صحیح طرح کام تب ہی کر سکتی ہے جب اس کرۂ ارض پر ایک صالح نظام قائم ہو جائے اور قوت عقلی کو آزادانہ طور پر تحقیقات علمیہ کا موقع دیا جائے اور علمی و سائنسی نتائج اخذ کرنے میں آزادانہ طور پر ترقی و کمال کے جس مقام تک پہنچنا چاہئے پہنچ جائے۔ لیکن انسان اپنی اس محدود قوت ادراک کے ذریعے میں جس مقام پر بھی پہنچے وہ آخری مقام نہ ہو گا جیسا کہ تجربات سے ظاہر ہے۔

قرآن کا موضوع "انسان" ہے۔ انسان کا تصور و نظریہ، اس کا فہم اور شعور، اس کا طرز عمل اور کردار، اس کے تعلقات و باہمی روابط۔ رہے طبیعی علوم، انواع و اقسام کی مادی ایجادات، تو وہ قرآن کے موضوع بحث نہیں۔ بلکہ یہ عقل انسانی کے لئے موضوع بحث اور مرکز عمل ہیں۔ یہ عقل انسانی کا کام ہے کہ وہ اس میدان میں نظریات قائم کرے اور نئے نئے انکشافات کرے۔ کیونکہ عقل انسانی کا فہم و ادراک ہی وہ امتیاز ہے جس کی وجہ سے سے خلیفتہ اللہ فی الارض کا مقام حاصل ہوا ہے۔ اور یہ خصوصیت انسان کو اس کی تخلیق کے وقت سے دی گئی ہے۔ رہا قرآن مجید تو وہ صرف فطرت انسانی کا رہنما و نگہبان ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ انسان کی فطرت میں فساد واقع نہ ہو، اس نظم میں خلل نہ پڑے جس کے مطابق زندگی بسر کر کے یہ اپنی فطری طاقتوں کو کام میں لائے گا۔ قرآن کریم انسان کو اس کائنات کے بارے میں ایک جامع علم دیتا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ اس کائنات کا تعلق اس کے خالق کے ساتھ کیا ہے؟ اس کے مختلف اجزاء کا (جن میں سے ایک خود انسان بھی ہے) باہمی تعلق کیا ہے؟ اس کے بعد قرآن نے انسان کو آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ جزئیات کا ادراک خود کرے اور اپنے منصب خلافت کی ... زندگی میں ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائے جو اللہ تعالیٰ نے اسے دی ہیں۔ قرآن کریم ان جزئیات کی تفصیل مہیا نہیں

کرنا کہ یہ تو انسان کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔(۱)

مجھے تو قرآن مجید کے ان نام نہاد حامیوں کی سادہ لوحی پر بے اختیار ہنسی آتی ہے' جو قرآن مجید کی طرف ایسی چیزوں کی نسبت کرتے ہیں جو اس کا حصہ نہیں اور نہ وہ اس کے مقاصد میں شامل ہیں۔ یہ لوگ قرآن مجید سے علم طب' علم کیمیا اور علم فلکیات کی جزئیات ثابت کرتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کے نزدیک قرآن مجید کی عظمت ثابت کرنے کے لئے یہی بات رہ گئی ہے؟

اپنے موضوع کے اعتبار سے بالیقین قرآن کریم ایک عظیم و کامل کتاب ہے اور ان تمام علوم کے مقابلے میں قرآن کا موضوع ایک عظیم الشان موضوع ہے۔ کیونکہ اس کا موضوع خود انسان ہے۔ ادراک (جس سے یہ علوم عبارت ہیں) کا سرچشمہ انسان کی قوت مدرکہ ہے جو انکشافات کرتی ہے اور دنیا میں انسان ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ تحقیقات و تجربات اور ان سے نتائج کا اخذ کرنا عقل کے خواص ہیں اور عقل خود انسان کا ایک جزء ہے۔ اس کے مقابلے میں قرآن مجید کا موضوع خود انسان کی تشکیل و تکوین ہے۔ اس کی شخصیت کی تعمیر' اس کے ضمیر' اس کی عقل اور اس کی فکر کی تعمیر ہے۔ اس کے بعد قرآن مجید ایک صالح انسانی معاشرہ کی تعمیر سے بحث کرتا ہے جس میں انسان ان قوتوں کو کام میں لائے جو اللہ تعالیٰ نے نفس انسان میں ودیعت کی ہیں۔ جب ایک سلیم الطبع انسان صحیح تصور حیات' صحیح فکر' پختہ شعور پا لیتا ہے اور ایک ایسا اسلامی معاشرہ اسے مل جاتا ہے جس میں وہ آزادی سے کام کرتا ہے تو پھر قرآن مجید اسے آزاد چھوڑ دیتا ہے تاکہ سائنس اور دوسرے علوم کے میدان میں وہ تحقیقات اور تجربے کرے۔ قرآن صرف صحیح فکر' صحیح شعور اور صحیح تصور حیات کے معیار مقرر کر دیتا ہے اور بس۔

قرآن کریم بعض اوقات اس کائنات کے وجود کے بارے میں اور اس کے اجرام کے باہمی ربط اور پھر کائنات اور اس کے خالق کے درمیان ربط کے بارے میں صحیح فکر دینے کے لئے کچھ آخری حقائق بیان کرتا ہے۔ یہ وہ حقائق ہوتے ہیں جن پر علم طبیعات جاکر ختم ہو جاتا ہے' لہٰذا ان حقائق کے ساتھ ہمیں عقل انسانی کے ان مفروضات کو نہیں ملانا چاہئے جو انسانی نظریات ہیں اور جنہیں عوام سائنسی حقائق کہتے ہیں۔ اور جن تک انسان ان تجربات کے نتیجے میں پہنچا ہے اور جنہیں وہ قطعی اور آخری حقائق سمجھتا ہے' اس لئے کہ قرآن کریم جن حقائق کا ذکر کرتا ہے وہ قطعی اور انتہائی ہیں۔ لیکن وہ حقائق جن تک انسان بذریعہ عقل و تجربہ پہنچتا ہے۔ وہ آخری اور قطعی ہرگز نہیں ہوتے۔ وہ انسان کے تجربات' میسر آلات کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں اور آلات کی قوت کی بھی ایک حد ہوتی ہے' لہٰذا یہ حقائق فہم انسانی اور اس کو میسر آلات کی قوت کی حد تک ہی ہو سکتے ہیں۔ خود انسانی تحقیقات اور تجربات کے جو مسلم اصول ہیں ان کے مطابق بھی ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انسان کے دریافت کردہ حقائق' قرآن کریم کے بیان کردہ حقائق کے مقابلے میں معیار صحت ہو سکتے ہیں' کیونکہ یہ حقائق علم بشری کے حدود تک ہیں۔ (اور قرآنی حقائق علم بشری سے ماورا ہیں)

یہ تو تھی بات سائنسی تجربات کی۔ رہے وہ نظریات یا مفروضات جنہیں سائنسی اور علمی کہا جاتا ہے۔ مثلاً فلکیات کے بارے میں نظریات' انسان کی تخلیق اور ترقی کے بارے میں نظریات' انسان کی نفسیات اور اس کے طرز عمل کے بارے میں نظریات' انسانی معاشرے اور اس کی

(۱) یہاں سید کا اشارہ اس طرف ہے کہ انسان کو فرشتوں پر ترجیح اس لئے دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی میں فہم و ادراک کی قوت ودیعت کر دی تھی۔ **وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا**۔ یعنی آدم سے مراد اگر جنس آدم لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جنس آدم کے اندر یہ قوت ودیعت کر دی گئی تھی اور اسے منصب خلافت کے لئے زمین پر اتار دیا گیا تھا تاکہ یہاں اس فطری قوت کو کام میں لا کر انسان منصب خلافت کے فرائض سرانجام دے۔ اگرچہ ادراک جزئیات کے نتیجے میں وہ ایٹم بناکر ہیروشیما کو تباہ کر دے۔ **وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا**۔ "کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے اور خونریزیاں کرے گا۔"

ترقی کے بارے میں نظریات' یہ سب نظریات مفروضی ہیں اور انسانی قیاس اور گمان پر مبنی ہیں۔ انہیں کسی مفہوم میں بھی سائنسی حقائق نہیں کہا جاسکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نظریات' اس کائنات کے مظاہر' انسانی زندگی' انسانی نفسیات اور انسانی معاشرے کی تفسیر و تشریح ہیں اور ان کی اصلیت یہ ہے کہ ایک نظریے کی جگہ دوسرا نظریہ لیتا چلا آرہا ہے۔ ان کا اعتبار اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک دوسرا نظریہ اس کی جگہ نہیں لے لیتا۔

یہی وجہ ہے کہ یہ مفروضات اور یہ نظریات ہمیشہ تغیر اور تبدل کے قابل ہوتے ہیں اور ان میں کمی بیشی ہوتی ہی رہتی ہے۔ بعض اوقات تو وہ یکلخت الٹ ہو جاتے ہیں' اس لئے کہ بعض اوقات انسان تجربات اور ملاحظہ کا کوئی جدید اور زیادہ طاقتور آلہ دریافت کر لیتا ہے۔ یا بعض وقات جب انسان ان تمام مشاہدات کو اکٹھا کرتا ہے اور ان پر مجموعی حیثیت سے غور کرتا ہے تو وہ ایک جدید نظریہ اور مفروضہ قائم کر لیتا ہے۔

وہ کوشش اور تفسیر' جو ان عام قرآنی اشارات کو سائنس کے متغیر و متبدل نظریات سے وابستہ کرتی ہے' یا ان سائنسی حقائق سے وابستہ کرتی ہے جو بذات خود آخری اور قطعی نہیں ہیں تو ایسا نتیجہ مرتب نہیں ہوتا جسے قطعی کہا جاسکے۔ یہ کوشش ایک تو خود سائنس کے منہاج بحث و تحقیق کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسی کسی کوشش کے فوائد و مقاصد صرف تین ہو سکتے ہیں اور تینوں ایسے ہیں جو قرآن مجید کے شان جلالت اور علو مرتبت کے منافی ہیں۔

۱۔ یہ ایک قسم کی اندرونی اور ذہنی شکست خوردگی ہے جو لوگ اس ذہنی مرعوبیت کا شکار ہوتے ہیں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید سائنس قرآن مجید پر غالب ہے اور اس سے برتر درجہ رکھتی ہے۔ یہ قرآن مجید کی تفسیر و تشریح میں سائنس کے انکشافات بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید خود اپنے موضوع پر ایک مکمل کتاب ہے۔ اور اس نے جو حقائق بیان کئے ہیں وہ آخری حقائق ہیں' جبکہ سائنس کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع کے ہر دائرے میں ناقص ہے۔ وہ آج جس حقیقت کو ثابت کر رہی ہے' کل خود اس کی تردید کر دیتی ہے۔ سائنس کی رسائی جہاں تک بھی ہو' وہ آخری اور مطلق نہیں کہلا سکتی۔ سائنس کی ہر دریافت' انسانی قوات' اس کے عقلی اور اکات اور اس کے آلات معاونہ کے حدود و قیود کے ساتھ مقید ہوتی ہے اور یہ سب ادوات و آلات ایسے ہیں جو اپنے مزاج و ساخت کے اعتبار سے کوئی ایک آخری اور مطلق حقیقت کو گرفت میں نہیں لا سکتے۔

۲۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ایسے حضرات نے سرے سے قرآن مجید کے مزاج اور اس کے مقاصد ہی کو نہیں سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید آخری اور مطلق حقائق کا مجموعہ ہے اور وہ انسان کی تعمیر و تربیت بعینہٖ ایسے انداز میں کرنا چاہتا ہے جو نوامیس فطرت اور اس کائنات کے مزاج کے خلاف نہ ہو اور جہاں تک انسانی مزاج اس کا متحمل ہو۔ یہ اس لئے کہ انسان اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کے درمیان کوئی تصادم نہ ہو' بلکہ انسان اس کائنات کے راز معلوم کرے' قوانین فطرت دریافت کرے اور انہیں اپنے منصب خلافت فی الارض کے فرائض سرانجام دینے میں استعمال کرے۔ ان قوانین فطرت کو جو مکمل فکر و نظر' تحقیق و تطبیق اور عمل و تجربہ کے نتیجے میں خود اس نے حاصل کئے ہوں۔ یہ نہ ہو کہ اسے کوئی تیار علوم دے دے اور وہ انہیں من و عن تسلیم کر لے۔

۳۔ تیسری قباحت یہ ہے کہ ان حضرات کو بڑے ہی تکلف اور چالاکی کے ساتھ' آیات قرآنی میں مسلسل تاویل کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ حضرات ان آیات کو اٹھائے ہوئے' بے آبروئی کے ساتھ ان سائنسی نظریات اور مفروضات کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہیں' جنہیں کوئی ثبات و قرار حاصل نہیں ہے۔ ان نظریات کے شب و روز میں تو ہر شب تاریک تر ہوتی جارہی ہے اور ہر دن ایک نیا نظریہ لے

کر آتا ہے جو سابق نظریہ کو باطل کر دیتا ہے۔ کیا ہم بھی سابق تفاسیر کو باطل کرتے چلے جائیں؟

جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں' یہ انداز فکر' نہ صرف یہ ہے کہ قرآن عظیم کی شان و عظمت و جلالت کے خلاف ہے' بلکہ خود سائنس کے منہاج تحقیق و تجربہ کے بھی خلاف ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ سائنس نے اس کائنات' نسل انسانی اور زندگی کے بارے میں جو حقائق و نظریات پیش کیے ہیں یا مسلسل دریافت ہو رہے ہیں' ہم قرآن مجید کے فہم و ادراک میں ان سے کام نہ لیں اور انہیں بالکل نظرانداز کر دیں۔ ہرگز نہیں۔ ہماری مراد یہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں خود فرماتے ہیں:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ "عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی' یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔"

اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم نفس انسانی اور آفاق کے متعلق سائنس کی فراہم کردہ تازہ بتازہ معلومات پر مسلسل غور و فکر کرتے رہیں اور اپنی اس محدود قوت مدرکہ اور دائرہ تصور میں' قرآنی مدلولات و مفاہیم کا دائرہ وسیع کرتے چلے جائیں۔

یہ کیسے؟ اور پھر بغیر اس قباحت کے کہ قرآن مجید کے مطلق اور آخری مطالب کو ان سائنسی اکتشافات سے وابستہ بھی نہ کریں جو آخری نہیں ہیں جو مطلق نہیں ہیں' اضافی ہیں۔ یہاں ایک مثال مفید مطلب ہے:

قرآن کریم میں ہے وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا "اس نے ہر چیز کو پیدا کیا' پورے پورے اندازے سے۔"[1]

جب سائنس نے ترقی کی تو معلوم ہوا کہ اس کرۂ ارض پر بعض نہایت ہی پنہاں سہولتیں ہیں' بعض نہایت ہی دقیق ہم آہنگیاں ہیں۔ یہ کرۂ ارض' اپنی اس مخصوص ہیئت کے ساتھ' سورج سے اس مخصوص فاصلے پر' چاند سے ایک متعین بعد پر' سورج اور چاند کے مقابلے میں ایک حساس حجم لئے ہوئے' اس قدر تیزی سے رواں دواں' اپنے محور کے گرد ایک خاص انداز میں جھکا ہوا' اس موجودہ پانی اور سطح کے ساتھ اور ان کے علاوہ اپنی ہزاروں دوسری خصوصیات کے ساتھ' صرف یہ کرۂ ارض ہی اس قابل ہے کہ یہاں زندگی اور زندگی کے دوسرے ملحقات قائم رہ سکتے ہیں۔ ان حقائق میں سے کوئی بھی عارضی انتظام نہیں ہے۔ نہ ہی یہ کام بغیر کسی منصوبے کے یوں اتفاقاً ہو رہا ہے۔ ان حقائق کا سائنٹیفک مطالعہ قرآن مجید کی اس آیت کے مفہوم میں کس قدر وسعت پیدا کر دیتا ہے: وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا

ذرا سوچئے اکتشافات جدیدہ نے اس آیت کے مفہوم کو کیا وسعت دے دی ہے۔ پوری سائنس آیت کی تفسیر ہو گئی' لہٰذا قدرت کی مزید کاریگری معلوم کیجئے اور یوں آیت کے مفہوم کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جایئے۔

قرآن کریم میں ہے خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ "ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا۔" صدیوں بعد والاس اور ڈارون نظریہ ارتقا پیش کرتے ہیں۔ وہ فرض کرتے ہیں کہ زندگی کا آغاز ایک خلیہ سے ہوا۔ اس خلیہ نے پانی میں نشوونما پائی۔ وہ خلیہ ارتقا کی منزلیں طے کرتے کرتے موجودہ انسان پر منتج ہوا۔ ضرورت تھی کہ اس نظریئے کو علمی معیار پر پرکھا جاتا' لیکن ہم دوڑے اور قرآن مجید کو اٹھاتے ہوئے' نہایت بے آبروئی کے ساتھ اس نظریہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا بلکہ اسے تفسیر قرآن بنا دیا۔

اول تو یہ نظریہ کوئی آخری نظریہ نہیں ہے۔ ابھی ایک صدی بھی نہیں گزری کہ اس میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہو گئیں۔ قریب ہے کہ سرے سے پورا نظریہ ہی ختم ہو جائے۔ کیونکہ یہ ناقص معلومات پر مبنی تھا اور اس کی کمزوریاں ظاہر بھی ہو چکی ہیں۔ مثلاً حیوانات

(۱) حم سجدہ ۵۳

کے ہر نوع کے کچھ موروثی خصائص ہوتے ہیں اور ہر نوع کی موروثی اکائیاں ان کا تحفظ کرتی ہیں۔ یہ ایک نوع کو دوسرے نوع کی طرف منتقل ہونے ہی نہیں دیتیں۔ یہ ایک ایسا نقص ہے جس کے ذریعہ سرے سے یہ نظریہ ہی ختم ہو سکتا ہے اور آج نہیں تو کل یہ نظریہ ختم ہو گا۔ جبکہ قرآن کریم آخری حقائق پر مشتمل ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ قرآن مجید کا مفہوم یہی ہو جو نظریۂ ارتقاء نے پیش کیا۔ قرآن نے تو صرف انسان کی اصلی تخلیق کا تذکرہ کیا ہے' انسان کی نشوونما کی تفصیلات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اصل تخلیق ایک آخری حقیقت ہے۔ وہ آخری نکتہ جہاں سے وجود انسان کا آغاز ہوا بس یہی آیت کا مفہوم ہے۔ اس کی مزید تفصیلات کیا تھیں ان کا ذکر یہاں نہیں ہے۔

قرآن مجید نے کہا اَلشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا "اور سورج' وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے۔" (۱) اس آیت میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ سورج چلتا ہے۔ سائنس کی دریافت یہ ہے کہ سورج اپنے اردگرد کے تاروں کی نسبت سے تو ۱۲ میل کی سیکنڈ کی رفتار سے چلتا ہے۔ لیکن وہ اپنی کہکشاں کو لئے ہوئے' جس کا وہ خود بھی ایک ستارہ ہے' ۲۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا جا رہا ہے' لیکن سائنس کی یہ معلومات بھی قرآن مجید کی اس آیت کا عین مدلول نہیں ہیں۔ کیونکہ سائنس نے ابھی تک جو کچھ دریافت کیا ہے وہ نسبتی ہے۔ آخری علم یا حقیقت نہیں۔ اس میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ رہی آیت تو اس میں اس آخری حقیقت کا اظہار ہوا ہے کہ سورج چلا جا رہا ہے۔ بس ہم اس رفتار کو کسی سائنسی رفتار سے وابستہ نہیں کر سکتے جو بذات خود متبدل ہے۔

ایک دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے: اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا "کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبی کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان و زمین باہم ملے ہوئے تھے' پھر ہم نے انہیں جدا کیا۔" سائنس ایک نظریہ پیش کرتی ہے۔ "یہ کہ کرۂ ارض سورج کا ایک حصہ تھا' جو اس سے جدا ہوا" اور ہم بھاگے' سانس پھولا ہوا' زبان نکلی ہوئی۔ ہم نے کوشش کی کہ اس نظریہ کو اٹھالیں اور قرآن مجید کی آیت کو لے جا کر اس سے ملا دیا۔ اور کہنے لگی بس یہی تو ہے جس کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے۔

ہرگز نہیں' یہ ہمارا مقصد کبھی نہیں ہونا چاہئے کیونکہ سائنس کا یہ تو کوئی آخری نظریہ نہیں ہے۔ زمین کی طبیعاتی تشکیل کے کئی سائنسی نظریات موجود ہیں۔ کئی ہو سکتے ہیں رہا قرآن مجید تو اس نے فقط یہ کہا ہے اور جو آخری حقیقت ہے کہ زمین آسمان سے جدا ہوئی ہے اور بس۔ وہ کیسے جدا ہوئی؟ آسمانوں کے کس حصے سے جدا ہوئی؟ ان تفصیلات کا ذکر آیت نے نہیں کیا ہے' لہٰذا اس موضوع پر سائنس جو نظریہ پیش کرے' جس مفروضے پر چاہے بحث کرے' ہم یہ نہیں کر سکتے کہ آیت کا مفہوم سائنس کے موجودہ نظریئے کے مطابق ہے اور یہی آخری ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس آیت کی مناسبت سے یہاں یہ تفصیل کافی ہے۔ یہاں ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ سائنس کے انکشافات کو آیت کے فہم اور آیات کے مفہوم میں وسعت اور عمق پیدا کرنے کے لئے کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے؟ بغیر اس قباحت کے کہ ہم کسی آیت کو سائنس کے کسی نظریہ کے ساتھ وابستہ کر دیں اور وہ بھی اس طرح کہ دونوں کو ایک سمجھ لیا جائے' دونوں کو ایک دوسرے کا مصداق گردانا جائے۔ ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ ان دونوں صورتوں میں فرق کر لیا جائے۔ اب ہم قرآن کی اصل عبارت کی طرف لوٹتے ہیں:

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ "نیز ان سے کہو! یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں پیچھے کی طرف سے داخل ہو۔ نیکی تو

(۱) یٰس: ۳۸

دراصل یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ناراضگی سے بچے۔ لہٰذا تم اپنے گھروں میں دروازے ہی سے آیا کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔"

آیت کے دونوں حصوں کے درمیان ربط یہ ہے کہ پہلے حصے میں بیان کیا گیا کہ چاند کی بڑھتی گھٹتی شکلیں اوقات مناسک حج کے تعین کی خاطر ہیں اور دوسرے حصے میں دور جاہلیت کی اس رسم کی اصلاح کر دی گئی جو ایام حج ہی سے وابستہ تھی۔ (بخاری و مسلم میں حضرت براء ﷺ بن عازب سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں: انصار کا رواج یہ تھا کہ جب وہ حج کرنے جاتے تو واپسی کے وقت گھروں میں دروازوں کی جانب سے داخل نہ ہوتے۔ ایک بار ان کا ایک آدمی آیا اور وہ سیدھا دروازے کی طرف سے داخل ہو گیا۔ لوگوں نے اسے ملامت کی' اس پر یہ آیت نازل ہوئی" "یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں پیچھے کی طرف سے داخل ہو' نیکی تو دراصل یہ ہے کہ آدمی' اللہ کی ناراضی سے بچے' لہٰذا تم اپنے گھروں میں دروازے میں سے آیا کرو۔"

ابوداؤد نے' شعبہ ﷺ بن اسحاق اور براء ﷺ بن عازب کی روایت سے نقل کیا ہے کہ "انصار جب کسی بھی سفر سے لوٹتے تو دروازے کی جانب سے داخل نہ ہوتے' اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔"

یہ رسم چاہے ہر سفر کے موقع پر ہو یا صرف حج میں ہو (سیاق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حج میں تھی) بہرحال ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ نیکی کا کوئی کام ہے۔ ایمان کا جزو ہے۔ قرآن کریم نے اس باطل تصور کو ختم کر دیا کیونکہ یہ ایک فضول حرکت تھی۔ اس کی کوئی شرعی حیثیت نہ تھی۔ نہ اس میں کوئی دنیاوی فائدہ تھا۔ قرآن کریم نے نیکی کا صحیح تصور دے دیا کہ نیکی خدا خوفی کا نام ہے۔ ظاہر و باطن میں اللہ کی نگرانی اور اس کے وجود کا پختہ شعور ہی نیکی ہے۔ وہ کسی ایسی ظاہری شکل کا نام نہیں ہے' جس کے پس منظر میں کوئی ایمانی شعور کار فرما نہ ہو' بلکہ محض ایک رسم جاہلیت ہی ہو۔

حکم دیا گیا کہ دور جہالت کی رسم ترک کر کے گھروں میں دروازے سے داخل ہوا کرو اور پھر اشارہ کیا کہ تقویٰ ہی راہ نجات ہے۔

وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ "لہٰذا تم اپنے گھروں میں دروازے ہی سے آیا کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔"

یوں دلوں کو اصلی ایمانی حقیقت سے مربوط کر دیا گیا۔ یعنی تقویٰ کو' دنیا و آخرت کی فلاح و بہبود سے جوڑ دیا گیا۔ اور جاہلیت کی اس رسم کو جڑ سے اکھاڑ دیا گیا جس کے پس منظر میں کوئی ایمانی جذبہ نہ تھا اور مومنین کو متوجہ کر دیا گیا کہ اللہ کی اس نعمت کو سمجھنے کی کوشش کریں جو اللہ نے چاند کی شکل میں' ان کے اوقات اور مناسک حج کے تعین کے لئے فراہم کی گئی ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے صرف ایک آیت میں ایسے اہم مضامین بیان فرما دیئے۔

اب جنگ کی عمومی بحث شروع ہو جاتی ہے۔ پھر مخصوص طور پر مسجد حرام کے ساتھ' محرم اور ممنوعہ مہینوں میں جنگ کے بارے میں احکام آتے ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ کی دعوت بھی دی جاتی ہے جو جہاد و قتال کے ساتھ گہرا ربط رکھتا ہے۔ فرمایا:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿١٩٠﴾ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِ

الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى
لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ
اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ
وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَ اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا
بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَ اَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

"اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان سے لڑو جہاں بھی تمہارا ان سے مقابلہ پیش آئے اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا' اس لئے کہ قتل اگرچہ برا ہے مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ اور مسجد حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں تم بھی نہ لڑو۔ مگر جب وہ وہاں لڑنے سے نہ چوکیں تو تم بھی بے تکلف انہیں مارو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

تم ان سے لڑتے رہو' یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی جائز نہیں۔

ماہ حرام کا بدلہ ماہ حرام ہی ہے اور تمام حرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہو گا لہذا جو تم پر دست درازی کرے' تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو البتہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ اللہ انہی لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کی حدود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔"

بعض روایات میں آتا ہے کہ قانون جنگ کے سلسلے میں قرآن کریم کا یہ پہلا حکم ہے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان مؤمنین کو جن کے ساتھ کفار برسرپیکار تھے صرف جنگ کی اجازت دی تھی۔ اس لئے کہ وہ مظلوم ہیں۔ مسلمانوں نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ اذن فرضیت جہاد کے لئے ایک تمہید ہے اور اللہ تعالیٰ اب اس زمین پر مسلمانوں کو تمکنت عطا کرنے والا ہے' چنانچہ سورۃ حج میں فرمایا:

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهُ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزُ الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔

"اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے۔ صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے" اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور مندر اور مسجدیں' جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے' سب مسمار کر ڈالی جائیں۔ اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ دیں گے' نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔" وہ اس اذن کے معنی خود سمجھ گئے کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے' لہٰذا وہ ظلم کا بدلہ لے سکتے ہیں۔ مکہ مکرمہ میں ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور وہ ظلم کی مدافعت بھی نہ کر سکتے تھے۔ وہاں انہیں حکم دیا گیا تھا= كُفُّوٓا اَيۡدِيَكُمۡ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ "ہاتھ روکے رکھو' نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔"

مکہ میں ہاتھ اٹھانے کی ممانعت بھی ایک خاص حکمت پر مبنی تھی۔ اس حکمت کے بعض پہلو ہم یہاں بیان کرتے ہیں:

۱۔ جنگ اور مدافعت سے روکنے کا پہلا سبب یہ تھا کہ عرب مسلمانوں کے اندر ڈسپلن پیدا کرنے کی ضرورت تھی تاکہ وہ اطاعت امیر کے عادی ہو جائیں' اپنی قیادت کے مطیع فرمان ہوں اور مدافعت اور قتال کے حکم تک انتظار کریں۔ جاہلیت میں تو وہ سخت جنگجو تھے۔ پہلی آواز پر ہی آپے سے باہر ہو جاتے تھے اور کسی ناخوشگوار بات کو دیکھ کر ان میں صبر کرنے کا مادہ تو تھا ہی نہیں۔ انسانی تاریخ میں امت مسلمہ نے جو کردار ادا کرنا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس امت کی ایسی تربیت ہو اور اس کی سیرت کی تعمیر ایسی ہو کہ اس کی یہ تمام نفسیاتی کمزوریاں ضبط و نظم میں ڈھل جائیں' وہ ایک مقتدر و مدبر قیادت کے تابع فرمان بن جائیں۔ اس حد تک تابع کہ وہ دور جاہلیت کی تمام عصبیتوں اور ناجائز طرفداری کو چھوڑ دیں' جن کی حمایت میں وہ جنگ و جدل کے لئے کسی پکارنے والے کی پہلی پکار پر اٹھ کھڑے ہو جاتے تھے۔

یہی تعمیر سیرت تھی جس کی وجہ سے حضرت عمر بن الخطاب ﷺ جیسے پرجوش شخص اور حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ﷺ اور ان جیسے نڈر اشخاص امت مسلمہ کو سخت مصائب و شدائد میں دیکھتے اور اف تک نہ کرتے۔ اس لئے کہ انہیں حکم دیا تھا کہ وہ حضور ﷺ کی ہدایت کے مطابق اپنے آپ کو پوری طرح کنٹرول میں رکھیں۔ اپنی ہائی کمان کی پوری اطاعت کریں اور قیادت عالیہ کا حکم تھا=

كُفُّوٓا اَيۡدِيَكُمۡ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ "ہاتھ روکے رکھو' نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر پائے جانے والی تیزی سے کود پڑنے اور سوچنے سمجھنے' جلد بازی اور تدبر اور حمیت اور اطاعت امر جیسی متضاد صفات کے درمیان توازن قائم ہو گیا اور پھر عرب جیسی بے حد پرجوش اور جنگجو قوم میں۔ حقیقت یہ ہے کہ عربوں میں اس قسم کی تربیت کا کامیاب ہونا اور ان کے اندر ڈسپلن کا پیدا ہونا ہی ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرا اہم سبب جس کی وجہ سے مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کو قتال سے روکا گیا تھا وہ یہ تھی کہ عرب معاشرہ ایک بہادر اور شریف معاشرہ تھا۔ لوگ خوددار اور عزت نفس کے مالک تھے۔ مسلمانوں میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جو اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے تھے لیکن اس کے باوجود جب وہ مظالم پر صبر کرتے' کئی شرفاء کی عزت نفس اور شرافت میں جوش آ جاتا اور ان کے دل اسلام کی طرف مائل ہو جاتے۔

اس کا ظہور عملاً اس وقت ہوا جب قریش نے بنی ہاشم کے ساتھ بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور وہ شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے۔ قریش کا مطالبہ یہ تھا کہ بنی ہاشم حمایت رسول سے دستبردار ہو جائیں۔ جب بنی ہاشم پر مصائب ناقابل برداشت ہو گئے تو بعض غیور اور شرفاء کی

بہادری اور غیرت جوش میں آگئی۔ انہوں نے اس دستاویز کو پھاڑ ڈالا' جس کے مطابق انہوں نے بائیکاٹ کا معاہدہ کیا تھا۔ اور محض اس جذبہ شرافت کی وجہ سے یہ محاصرہ ختم ہو گیا۔ جنگ اور مدافعت سے ہاتھ روکنے کی کی پالیسی میں رسول برحق ﷺ نے عربوں کے ان جذبات کو پیش نظر رکھا تھا۔ اگر حضور ﷺ کی سیرت کا مطالعہ بحیثیت قائد تحریک کیا جائے تب ان حکمتوں کا اظہار ہر جگہ ہوتا ہے۔

داعی اسلام ﷺ کا یہ منشاء نہ تھا کہ اسلام کی وجہ سے گھر گھر میں خونریزی شروع ہو جائے کیونکہ ہر خاندان میں سے کوئی نہ کوئی مسلمان تھا اور مسلمانوں کو ایذا رسانی میں' اور انہیں دین اسلام سے روکنے میں' خود مسلمانوں کے اپنے خاندان پیش پیش تھے۔ وہاں کوئی منظم حکومت نہ تھی جو مسلمانوں پر تشدد کر رہی تھی۔ اگر اس مرحلے میں مسلمانوں کو یہ اجازت دے دی جاتی کہ وہ اپنی مدافعت میں جنگ کریں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گھر گھر میں فساد رونما ہوتا اور خاندان سے خاندان ٹکراتا اور خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔ ایسی صورت رونما ہوتی تو لازمی طور پر یہ تاثر قائم ہو جاتا کہ اسلام نے گھر گھر اور خاندان خاندان میں فتنہ و فساد کے شعلے بھڑکا دیئے ہیں۔

ہجرت کے بعد صورت حال بالکل جدا ہو گئی' اب جماعت اسلامی مدینہ طیبہ میں ایک مستقل اور منظم وحدت تھی اور اس کا مقابلہ مکہ مکرمہ کی ایک منظم برادری سے تھا جس میں افواج کی تنظیم ہو رہی تھی اور وہ فوج تحریک اسلامی کے خلاف حملہ آور ہو رہی تھی۔ یہ صورت حال مکہ مکرمہ کی صورت حال سے بالکل مختلف تھی۔ گویا واضح طور پر اپنی حفاظت کا مسئلہ سامنے تھا اور یہ حفاظت افراد کے بجائے پوری ملت کی تھی۔ یہ ہیں وہ اسباب جو ایک انسان اپنے محدود ذہن کے ساتھ' اس بارے میں سوچ سکتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کو تشدد و بربریت کا جواب دینے سے کیوں روکا گیا تھا۔

ان اسباب کے علاوہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت مسلمان تعداد کے اعتبار سے بہت ہی کم تھے' پھر وہ مکہ مکرمہ میں محصور تھے' اگر وہ مقاتلہ شروع کر دیتے تو ان کے خلاف فوراً مقاتلہ شروع ہو جاتا اور ان کا مقاتلہ ایسے لوگوں سے ہوتا جو ہر لحاظ سے ان کے مقابلے میں طاقتور اور بارسوخ تھے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیئت یہ تھی کہ مسلمانوں کی تعداد میں قدرے اضافہ ہو جائے اور وہ اپنے مستقل دارالحکومت میں علیحدہ ہو کر مجتمع ہو جائیں۔ جب یہ کام ہو گئے تو انہیں جہاد و قتال کی اجازت دے دی گئی۔

بہرحال اس کے بعد' تدریج کے ساتھ' جزیرۃ العرب اور عرب سے باہر کے علاقوں میں' حسب ضرورت مسلمانوں کو جنگ کے احکام دیئے جاتے رہے۔

زیر بحث آیات اس سلسلے کی ابتدائی آیات ہیں اور ان میں قتال کے بعض ایسے احکام دیئے گئے ہیں جو اس وقت کے بنیادی متحارب کیمپوں میں' اسلامی کیمپ اور مشرکین مکہ کے کیمپ کے درمیان محاذ آرائی کے لئے مناسب اور ضروری تھے۔ جبکہ بعض احکام ایسے بھی ہیں جو اصولی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر جنگ میں عموماً ایسے حالات پیش آسکتے ہیں۔ ان احکام میں معمولی رد و بدل سورت براۃ کے احکام کے ذریعہ ہوا ہے۔

یہاں' تفسیر آیات قتال سے پہلے' مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کے موضوع پر ایک مختصر نوٹ دے دیا جائے تاکہ آیات قتال اور دوسری آیات کی تفسیر کے لئے اساس کا کام دے۔

اسلامی نظریۂ حیات' اپنی آخری شکل و صورت میں یعنی دین اسلام کی صورت میں رونما ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ اب اسے یہ تمام انسانیت کی زندگی کا اصول بن جائے۔ تمام انسانیت کا نظام زندگی قرار پائے اس نظام اور اس منہاج کو لے کر امت مسلمہ اٹھے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے پوری انسانیت کی قیادت کرے۔ یہ نظام زندگی ایک ایسا نظام ہے کہ یہ اس کائنات کے وسیع تر تصور پر مبنی ہے۔ وجود انسانی کے اصل اور حقیقی مقصد کی اساس پر تعمیر شدہ ہے اور اس کی توضیح و تشریح ایک کتاب میں کر دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ خالق

کائنات کی جانب سے اتاری گئی ہے۔ نیز اس امت نے راہنمائی بھی ایک خالص بھلائی اور خیر محض کی طرف کرنی ہے' جو کسی دوسرے جاہلی نظام میں نہیں ہے اور انسانیت کو ایک ایسے مقام بلند تک پہنچایا جہاں تک وہ اسلامی نظام زندگی کے سوا' کسی اور نظام کے ذریعے نہیں پہنچ سکتی۔ اسے ایسی نعمت سے سرفراز کرنا ہے جس کے مقابلے میں کوئی نعمت نہیں ہے۔ اسلام یقیناً وہ نظام زندگی ہے کہ اگر اس سے انسانیت محروم ہو جائے تو پھر اس کے لئے نجات و فلاح نہیں ہے۔ اگر انسانیت کو اس نیکی سے محروم کر دیا جائے اور اللہ تعالیٰ اسے جس بلندی' جس پاکیزگی اور جس سعادت و کمال تک پہنچانا چاہتا ہے' اسے اس سے روک دیا جائے تو انسانیت کے ساتھ اس سے بڑا ظلم اور اس سے بڑی زیادتی کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

یوں انسانیت کا یہ حق ہو جاتا ہے کہ اسلام کے اس مکمل نظام زندگی کی دعوت پوری انسانیت تک آزادی کے ساتھ پہنچ سکے۔ اور اس کی راہ میں یعنی دعوت اسلامی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو' اور کوئی حکومت بھی کسی صورت میں بھی سد راہ نہ بن سکے۔

ادھر انسانیت پر یہ لازم تھا کہ جب لوگوں تک دعوت اسلامی پہنچے تو وہ اس کے رد و قبول میں بالکل آزاد ہوں۔ دین قبول کرنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ کوئی حکومت سد راہ بنی ہوئی نہ ہو۔ اگر کوئی شخص اسلامی نظام کو قبول کرتا ہے تو حکومت رکاوٹ نہ ڈالے' نیز اسے یہ اختیار نہ ہو کہ دعوت اسلامی کو اپنی منزل تک بڑھنے سے روکے۔ علاوہ ازیں انسانیت کا یہ بھی فرض تھا کہ اسلام قبول کرنے والوں کو اطمینان اور آزادی کی ضمانت دے اور تبلیغ دین کے سلسلے میں تحریک اسلامی کی راہ میں جو مشکلات درپیش آرہی ہیں وہ انہیں دور کردے۔ اس سلسلے میں کارکنان دعوت اسلامی پر کوئی زیادتی نہ ہونے پائے۔

اگر اللہ تعالیٰ کسی کو ہدایت نصیب فرمائے اور وہ دعوت اسلامی کو قبول کرلیں تو ان کا یہ بنیادی حق ہے کہ ان پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ ان پر تشدد نہ ہو اور ان کے خلاف کوئی اشتعال نہ ہو۔ ان کی راہ میں اس قسم کی رکاوٹیں نہ کھڑی کی جائیں جن کا مقصد لوگوں کو اسلامی نظام سے روکنے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

تحریک اسلامی کے کارکنان کے فرائض میں یہ بات داخل تھی کہ وہ قوت کے ساتھ تشدد اور اشتعال کا مقابلہ کریں تاکہ دنیا میں آزادی رائے جیسے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جاسکے اور وہ لوگ امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں جنہوں نے اس دین کو اپنانا ہے تاکہ زندگی میں اسلامی نظام رائج ہو اور انسانیت اس بھلائی اور نیکی سے محروم نہ ہو۔ ان بنیادی حقوق کے قیام کے نتیجے میں جماعت مسلمہ پر ایک اور ذمہ داری یہ عائد ہوجاتی ہے کہ وہ ہر اس قوت کو پاش پاش کردے جو دعوت اسلامی اور اس کی تبلیغ کے آڑے آئے۔ یا وہ حق آزادی رائے کو چیلنج کرے یا وہ ایسے لوگوں پر تشدد کرے جنہوں نے دین و نظریہ کے معاملے میں آزادی سے کوئی نظریہ قبول کرلیا ہے۔

امت مسلمہ کا یہ فرض اس وقت تک ہے جب تک اسلامی نظام قبول کرنے والوں کے لئے کوئی تشدد باقی رہتا ہے اور نظام زندگی صرف اللہ ہی کا رائج نہیں ہو جاتا۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جہاد اس وقت تک جاری رہے گا جب تک لوگوں کو اسلامی نظام زندگی اختیار کرنے پر مجبور نہیں کر دیا جاتا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر اسلامی نظام زندگی غالب ہونا چاہئے یوں کہ جو شخص بھی دین اسلام میں داخل ہونا چاہے اس کیلئے کوئی رکاوٹ نہ ہو' دنیا میں کوئی ایسی قوت نہ ہو جو کسی کو دین اسلام قبول کرنے سے روکے' یا اس کی تبلیغ کرنے سے روکے' یا اس دین پر قائم رہنے سے روکے۔ دنیا میں کوئی ایسا نظام نہ ہو جو اللہ کی ہدایت اور اس روشنی کو چھپا رہا ہو اور اس کے تحت رہنے والوں تک یہ ہدایت و روشنی پہنچنے میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہو' یا عوام کو اللہ کی اس راہ سے گمراہ کیا جارہا ہو' چاہے اس رکاوٹ کی نوعیت جو بھی ہو۔

یہ تھے وہ بنیادی مقاصد جن کے لئے اسلام نے جہاد فی سبیل اللہ کو فرض کیا ہے۔ یہ جہاد صرف انہی مقاصد عالیہ کے لئے تھا' ان کے علاوہ اسلام کے پیش نظر اور کچھ نہ تھا۔ نہ کوئی اور مقصد نہ کوئی اور رنگ۔

یہ جہاد اسلامی نظریۂ حیات کے لئے تھا' کافرانہ نظریاتی پھیلاؤ کا محاصرہ توڑنے کے لئے تھا' نظریۂ تشدد کے خلاف تھا' اور زندگی میں اسلامی نظام کے بچاؤ اور اسلامی شریعت کے قیام کے لئے تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کرۂ ارض پر اسلامی جھنڈے بلند کر دیئے جائیں' اس طرح کہ اسلامی نظریۂ حیات کے مخالفین دہشت زدہ ہو جائیں اور ہر وہ شخص جو اسلامی نظام زندگی میں دلچسپی رکھتا ہے' وہ اس میں داخل ہو جائے اور اسے دنیا کی کسی قوت کی جانب سے یہ خوف نہ ہو کہ اسے روکا جائے گا' اس پر تشدد ہو گا۔

یہ ہے اور صرف یہی ہے وہ جہاد جس کا حکم اسلام نے دیا تھا اور یہ ابھی تک برقرار ہے اور اسلامی نظام اس پر قائم ہے جو لوگ اس میں کام آئیں اسلام کی نظر میں شہید ہوتے ہیں اور جو لوگ جہاد کے مصائب برداشت کرتے ہیں وہ غازی اور اولیاء اللہ کہلاتے ہیں۔

یہ تھی وہ صورت حال جس سے مدینہ طیبہ میں جماعت مسلمہ دوچار تھی اور جس کے بارے میں سورۂ بقرہ کے اس سبق کی یہ آیات نازل ہوئیں' مشرکین قریش نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے ناحق نکال دیا تھا۔ انہیں محض اس لئے تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا کہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہو چکے ہیں۔ ان کو صرف یہ اعتراض تھا کہ انہوں نے آزادانہ طور پر کیوں ایک نظریہ حیات قبول کر لیا ہے۔ ان حالات میں خصوصی ہدایت کے ساتھ ساتھ یہ آیات اسلام کے نظریہ کے لئے قاعدہ کلیہ بھی بیان کر دیتی ہیں جو یوں ہے کہ مسلمانو! تم ان لوگوں سے جنگ کرو جنہوں نے تم سے ناحق جنگ کی اور ابھی تک برسر جنگ ہیں اور آئندہ بھی تمہارے لئے یہی ہدایت ہے کہ جو تم سے لڑے اس سے لڑو مگر زیادتی نہ کرو۔ ارشاد ہوا! وَ قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ وَ لَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ "اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

آیات قتال میں سے یہ پہلی آیت ہے اور پہلی آیت ہی میں قتال کے مقاصد کے بارے میں قطعی فیصلہ کر دیا گیا اور واضح طور پر بتا دیا گیا کہ وہ کون سا علم ہے جس کے تحت مسلمانوں کو معرکہ جہاد سر کرنا ہے۔ وَ قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ "اور اللہ کی راہ میں' ان لوگوں سے لڑو' جو تم سے لڑتے ہیں۔"

یہ جہاد' یہ قتال صرف اللہ ہی کے لئے ہے اور انسان نے طویل انسانی تاریخ میں' جن معروف مقاصد کے لئے زبردست جنگیں لڑیں ان میں سے کوئی مقصد بھی اسلامی جہاد کو مطلوب نہیں ہے۔ نہ خاندانی شرف کے لئے' نہ علو فی الارض اور برتری کے لئے' نہ دولت و غنیمت کے لئے' نہ منڈیوں اور خام اشیاء پر قبضے کے لئے' نہ کسی طبقے پر دوسرے کی سیادت کے قیام کے لئے اور نہ کسی نسل پر کسی نسل کی حکومت کے لئے۔ اسلامی جہاد صرف ان مقاصد کے لئے ہے جن کی تحدید اسلام نے کر دی ہے۔ دنیا میں اسلام کا کلمہ بلند کرنے کیلئے' اسلامی نظام زندگی کے نفاذ کیلئے' مسلمانوں کو ظلم و تشدد سے بچانے کیلئے' مسلمانوں کو گمراہی اور ضلالت سے بچانے کے لئے۔ غرض یہ ہیں اسلامی مقاصد' ان کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لئے جو جنگیں بھی لڑی جائیں وہ اسلامی جہاد کہلانے کی مستحق نہیں ہیں اور جو شخص بھی ایسی جنگوں میں حصہ لے گا اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ کسی اجر کا مستحق نہیں ہے۔ نہ ہی اللہ کے ہاں اس کا کوئی مقام ہے۔

جنگ کے مقاصد کے تعین کے ساتھ ساتھ' اس کی مقدار اور حد بھی مقرر کر دی گئی:

وَ لَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ "مگر زیادتی نہ کرو' اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

زیادتی یوں ہو گی کہ جنگ لڑنے والے سپاہیوں کے علاوہ پرامن شہریوں کو بھی تکلیف دی جائے' جو دعوت اسلامی کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہیں' نہ ہی ان سے اسلامی جماعت کو کوئی خطرہ ہے۔ مثلاً عورتیں' بچے' بوڑھے اور جو لوگ خدا کی عبادت کے لئے الگ ہو گئے ہیں خواہ وہ کسی بھی مذہب و ملت سے متعلق ہوں حکم دیا گیا کہ جنگ میں ان حدود و قیود کو پامال نہ کیا جائے' جو اسلام نے جنگ کے لئے مقرر کئے ہیں۔ اسلام نے سب سے پہلے' ان قباحتوں پر پابندی عائد کی جو جاہلیت میں عام طور پر معروف تھیں۔ خواہ یہ جاہلیت قدیم ہو یا جدید۔ یہ

قباحتیں ہیں جن سے اسلامی نظام متصادم ہے۔ جن سے اسلام کی روح ابا کرتی ہے۔

اس سلسلے میں حضور ﷺ کی چند احادیث کا مطالعہ کیجئے۔ آپ ﷺ کے ساتھیوں کی ہدایات پڑھیے' ان سے ان آداب کا مزاج آپ پالیں گے۔ یہ وہ آداب جنگ ہیں' جن سے انسانیت کا تعارف سب سے پہلے اسلام کے نظام جنگ کے مطالعہ کے بعد ہوا :

۱ حضرت ابن عمر ؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں: "حضور ﷺ کے مغازی میں سے ایک موقعہ پر ایک عورت پائی گئی جسے قتل کر دیا گیا تھا' اس پر حضور ﷺ نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا۔" (مالک' صحیحین' ابوداؤد اور ترمذی)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں' رسول خدا ﷺ نے فرمایا! "جب تم جنگ کر رہے ہو' تو اس وقت چہرے پر مارنے سے اجتناب کرو۔" (صحیحین)

۳۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں! "ہمیں رسول خدا ﷺ نے جنگ کے لئے بھیجا۔ اس موقع پر فرمایا: "اگر تم فلاں فلاں (قریش کے دو افراد) کو پاؤ تو انہیں آگ میں جلاؤ۔" جب ہم تیار ہو کر نکلنے لگے تو آپ نے فرمایا! "میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ فلاں فلاں کو آگ میں ڈالو! لیکن آگ کے ساتھ اذیت دینا' صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے' للذا حکم یہ ہے کہ اگر تم انہیں پاؤ تو دونوں کو قتل کر دو۔" (بخاری' ابوداؤد اور ترمذی)

۴۔ حضرت ابن مسعود ؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! "جنگ میں سب سے زیادہ عفو و درگزر کرنے والے صرف اہل ایمان ہیں۔" (ابوداؤد)

۵۔ عبد بن یزید انصاری **سے روایت** ہے۔ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت میں چوری اور قتل میں مثلہ کرنے سے منع فرمایا۔

۶۔ حضرت ابویعلی ؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں ہم عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کی قیادت میں شریک جنگ ہوئے۔ دشمن کے چار آدمی لائے گئے۔ حکم دیا گیا کہ انہیں نیزے کے چھوٹے حصے کی طرف سے قتل کیا جائے اور انہیں اس طرح قتل کیا گیا۔ اس کی اطلاع حضرت ابو ایوب انصاری ؓ کو ہوئی تو انہوں نے فرمایا: میں نے حضور ﷺ کو اذیت دے کر قتل کرنے سے منع کرتے ہوئے سنا۔ خدا کی قسم اگر مرغی بھی ہوتی تو بھی میں اسے اذیت دے کر نہ قتل کرتا۔ جب اس کا علم عبدالرحمٰن ؓ کو ہوا تو انہوں نے چار غلام آزاد کئے۔ (ابوداؤد)

۷۔ حارث نے مسلم ابن حارث ؓ سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک سریہ میں بھیجا۔ جب ہم حملہ کی جگہ پہنچے تو میں نے گھوڑی کو ایڑی دی۔ وہ میرے ساتھیوں سے آگے جا نکلی۔ میں نے دیکھا کہ آبادی کے لوگ (خوف کے مارے) چیخ پکار کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے کہا جلدی سے کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کر لو اور اپنے آپ کو بچالو' انہوں نے کلمہ پڑھ لیا۔ میرے ساتھیوں نے مجھے سخت ملامت کی اور کہنے لگے' تم نے ہمیں مال غنیمت سے محروم کر دیا۔ ہم رسول خدا ﷺ کے پاس واپس آئے۔ لوگوں نے حضور کو میری حرکت سے آگاہ کیا۔ آپ نے میری تعریف کی۔ اس کے بعد مجھ سے کہا: "اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے ہر آدمی کے بدلے تمہارے لئے یہ یہ اجر لکھ دیا ہے۔ (ابوداؤد)

۸۔ حضرت بریدہ ؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں' رسول خدا ﷺ جب بھی کسی کو مجاہدوں کے دستے کا سردار مقرر کرتے یا کوئی سریہ بھیجتے تو انہیں سب سے پہلے خدا خوفی کی وصیت فرماتے۔ پھر فرماتے کہ اپنے ساتھیوں سے حسن سلوک رکھو اور پھر فرماتے "اللہ کے نام کے ساتھ لڑو' اللہ کی راہ میں' ان لوگوں سے لڑو جنہوں نے کفر اختیار کیا۔ لڑو لیکن غداری نہ کرو۔ مقتول کا مثلہ نہ کرو اور بچے

کو نہ قتل کرو۔" (مسلم' ابوداؤد اور ترمذی)

۹۔ مالک نے حضرت ابوبکر صدیق ﷺ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے اپنی فوج کو وصیت کرتے ہوئے منجملہ اور باتوں کے یہ فرمایا "تمہیں ایسے لوگ بھی ملیں گے جنہوں نے بزعم خود اپنے آپ کو اللہ کا کر دیا ہے۔ انہیں ان کی حالت عزلت ہی میں چھوڑ دو۔ عورت کو قتل نہ کرنا۔ بچے اور بہت زیادہ بوڑھے کو بھی قتل نہ کرنا۔"

یہ ہے وہ جنگ جو اسلام فرض کرتا ہے اور یہ ہیں اسلام کے آداب جنگ۔ وہ مقاصد جن کے لئے اسلام معرکہ جنگ برپا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور ان سب کا منبع قرآن مجید کا یہ حکم ہے "اور اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو' جو تمہارے ساتھ لڑیں اور زیادتی نہ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

قرن اول کے مسلمان اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ محض اپنی تعداد کے بل بوتے پر فتح حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کی تعداد تو بہت قلیل ہے۔ وہ اپنی تعداد اور سازوسامان کی بدولت فتح مند نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان کا سازوسامان دشمن کے مقابلے میں بہت ہی قلیل ہے۔ وہ جانتے تھے کہ فتح صرف ایمان' بندگی اور اللہ کی نصرت کے نتیجے میں حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر انہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کو ترک کیا تو وہ فتح و نصرت سے محروم ہو جائیں گے جو ان کا اصل سہارا ہے۔ اس لئے وہ اپنی جنگوں میں ان آداب جنگ کو سختی سے ملحوظ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ آداب انہوں نے اپنے ان ازلی دشمنوں کے ساتھ بھی ملحوظ رکھے جنہوں نے انہیں سخت سے سخت اذیتیں دی تھیں۔ اور ان کے شہداء کی لاشوں کا مثلہ کیا تھا۔ ایک موقعہ پر حضور ﷺ کا غضب جوش میں تھا' آپ نے بعض لوگوں کے جلا دینے کے احکامات صادر فرما دیئے' لیکن تھوڑی ہی دیر بعد میں ہی آپ نے اپنے احکامات واپس لے لئے اور جلانے سے منع فرمایا۔ اس لئے کہ آگ کے ساتھ سزا صرف خاصۂ خدا ہے۔

مسلمانوں کو صرف ان لوگوں کے ساتھ جنگ کی تاکید کی جاتی ہے' جنہوں نے ان کے ساتھ جنگ کی۔ محض دینی نظریات کی وجہ سے ان پر تشدد کیا۔ انہیں ان کے گھروں سے نکالا۔ حکم دیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ وہ جس حال میں بھی ہوں' مارے جائیں' جہاں بھی ہوں مارے جائیں۔ ماسوائے مسجد حرام کے' ہاں اگر مسجد حرام میں بھی کفار جنگ کا آغاز کر دیں تو پھر مسلمانوں کے لئے بھی جائز ہو گا' سوائے اس کے کہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں۔ اس صورت میں چاہے انہوں نے مسلمانوں کو قتل کیا ہو' چاہے ان پر ظلم کیا اور تشدد کا ارتکاب کیا ہو' مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ وہ ہاتھ روک لیں: وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۗ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۹۲) "اور ان سے لڑو جہاں بھی ان سے تمہارا مقابلہ پیش آئے' اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے' اس لئے کہ قتل اگرچہ برا ہے مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے اور مسجد حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں' تم بھی نہ لڑو۔ مگر جب وہ وہاں لڑنے سے نہ چوکیں' تو تم بھی بے تکلف انہیں مارو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

محض دین' مذہب یا نظریہ کے اختلاف کی وجہ سے تشدد کرنا' دراصل' حیات انسانی کی مقدس ترین قدر (Value) پر دست درازی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اسے قتل سے بھی زیادہ برا قرار دیا ہے۔ اسے جان لینے اور زندگی ختم کر دینے سے بھی زیادہ گھناؤنا جرم قرار دیا ہے۔ یہ فتنہ جو قتل سے بھی شدید تر ہے کیا ہے؟ محض ہراساں کرنا بھی اس میں آتا ہے۔ عملاً تشدد بھی اس میں شامل ہے۔ ایسے حالات پیدا کر دینا بھی فتنہ ہے' جن میں لوگوں کو گمراہ کیا جاتا ہو' انہیں اللہ کے مقرر کردہ نظام زندگی سے دور کرنا بھی فتنہ ہے۔

مسلمانوں کے لئے کفر کو مرغوب بنانا اور اسلام سے انہیں دور کرنا ان کے اخلاق کو خراب کرنا یہ سب فتنے کی تعریف میں داخل ہیں۔ اس فتنے کی واضح ترین مثال اشتراکی نظام ہے۔ جہاں دینی تعلیم ممنوع اور الحاد کی تعلیم لازمی ہوتی ہے۔ ایسے قوانین بنائے جاتے ہیں جو زنا، شراب جیسے محرمات کو جائز قرار دیتے ہیں اور نشر و اشاعت کے مختلف ذرائع سے ان چیزوں کو انسانوں کے لئے مرغوب بناتے ہیں۔ جب کہ اسلامی نظام زندگی کی ہر بات میں کیڑے نکالتے ہیں۔ اسے مسخ کرتے ہیں اور جو اجتماعی حالات میں یہ نظام پیدا کر دیتا ہے ان کا اتباع وہاں کے عوام الناس کے لئے ایک حتمی فریضہ قرار پاتا ہے۔

آزادی رائے کے بارے میں یہ نقطۂ نظر' انسانی زندگی میں آزادی رائے کا یہ مقام بلند اسی نظام کے عین مطابق ہے۔ وجود کائنات کی جو غرض و غایت اسلام نے پیش کی ہے۔ یہ نقطۂ نظر اس کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے۔ اسلام کے مطابق تخلیق کائنات کی غرض و غایت بندگی ہے۔ بندگی ہر اس اچھے کام کو کہا جاتا ہے جس میں کرنے والے کے پیش نظر خدا کی رضامندی ہو' اور اللہ کی بندگی تب ہی ممکن ہے جب انسان تمام دوسری بندگیوں سے آزاد ہو' یہی وجہ ہے کہ انسان کی بلند ترین قدر (Value) اس کی آزادی ہے۔ بالخصوص آزادی رائے۔ اب جو شخص کسی کی آزادی چھین لیتا ہے' محض نظریہ کی وجہ سے تشدد کرتا ہے' براہ راست یا بالواسطہ' وہ اس شخص کے قتل سے بھی اس پر زیادہ ظلم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے افراد کے مقابلہ میں مدافعت ہر طرح جائز ہے' اگرچہ اس کے لئے جنگ کرنی پڑے۔ قرآن کریم نے (قاتلوھم) جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ (واقتلوھم) انہیں قتل کر دینے کا حکم دیا ہے۔ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ اور جہاں بھی ایسے لوگ پائے جائیں انہیں قتل کر دینے کا حکم دیا ہے۔ جہاں بھی پائے جائیں۔ جس حال میں بھی وہ ہوں' جس ذریعے سے بھی تم نے ایسے لوگوں کو مار سکو' ہاں اس سلسلے میں تم صرف اسلامی آداب جنگ کا لحاظ رکھنا ہو گا' کسی کو مثلہ نہ کرنا کسی کو آگ میں جلانا۔

مسجد حرام دار الامن ہے۔ اس لئے اس کے قریب نہ لڑو۔ اس کے بارے میں اللہ نے اپنے دوست ابراہیم کی دعا قبول کی تھی۔ اسے مرکز عوام قرار دیا گیا تھا۔ اسے دار الامان گردانا گیا تھا۔ لہٰذا حکم ہوا مسجد حرام کے قریب کسی کے ساتھ نہ لڑو' الا یہ کہ کفار کا کوئی گروہ یہاں تمہارے ساتھ لڑنے لگے' لیکن جنگ کا آغاز تم نہ کرو۔ اگر وہ آغاز کر دیں اور مسجد حرام کا پاس نہ رکھیں تو پھر تمہارے ہاتھ بھی بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ لوگ عوام کو ان کے دین کی وجہ سے ستاتے ہیں۔ مسجد حرام کا احترام نہیں' لہٰذا یہی ان کے لئے مناسب سزا ہے۔ ارشاد ہوا!

فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ "پھر اگر وہ باز آجائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔" صرف باز آنا ہی کافی نہیں۔ مسلمانوں پر تشدد سے باز آجائیں۔ جنگ سے باز آجائیں' کفر سے بھی باز آجائیں تب وہ معافی اور مہربانی کے مستحق ہوں گے۔ صرف جنگ سے باز آنے کے لئے تو یہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان حالت امن کا اعلان کر دیں۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ کفار اللہ کی مغفرت اور رحمت کے بھی مستحق ہو جائیں۔ ہاں یہاں مغفرت اور رحمت کی طرف اشارے سے مراد یہ ہے کہ کفار کو ایمان کی ترغیب دی جائے تاکہ کفر اور تشدد کے چھوڑ دینے کے بعد وہ اللہ کی مغفرت اور اس کی رحمت کے مستحق بھی ہو جائیں۔

اسلام کی شان عظمت اور شان کریمی تو دیکھئے۔ کفار اور ظالموں کو بھی اشارہ دیا جاتا ہے' کہ آؤ مغفرت و رحمت کی بارش ہو رہی ہے۔ آؤ تمہارے سب سابقہ گناہ معاف' تشدد اور ظلم کا قصاص معاف' دیت معاف' اسلامی صفوں میں مؤمنانہ شان سے داخل ہو جاؤ' تو سب کچھ معاف۔ تم نے قتل کیا' تم نے تشدد کیا' تم نے کیا کچھ نہ کیا' مگر سب معاف اور مغفرت و رحمت کی بارش۔

اسلام میں جنگ کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ لوگوں کے تشدد کے ذریعے' دین اسلام سے نہ روکا جائے۔ قوت کے ذریعے' یا قوت

سے بھی زیادہ موثر ہتھیار یعنی معاشرتی حالات کے ذریعے عوام کو اسلام سے نہ پھیرا جائے۔ ان کے اخلاق کو خراب کرنے والے' انہیں گمراہ کرنے والے اور انہیں فریب دینے والے ذرائع استعمال نہ کئے جائیں۔ نیز یہ کہ اسلامی نظام کو وقعت حاصل ہوا اور اس کا پلڑا بھاری ہو' اس کے دشمن ہیبت زدہ ہوں۔ ان کو یہ جرأت نہ ہو کہ وہ اہل ایمان پر تشدد کریں یا انہیں اذیت دیں۔ نیز عام لوگوں کے لئے اب کوئی خوف محسوس نہ ہو کہ اگر انہوں نے اسلام قبول کیا تو ان پر تشدد ہو گا یا انہیں کوئی اذیت دی جائے گی۔ ایک اسلامی جماعت کا یہ مستقل فریضہ ہے کہ وہ اس وقت تک برسرپیکار رہے جب تک ظالمانہ اور جابرانہ قوتیں ختم نہیں ہو جاتیں۔ اور جب تک وقار اور غلبہ صرف اسلام کو حاصل نہیں ہو جاتا۔ اور کوئی فتنہ باقی نہ رہے وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ تم ان سے لڑتے رہو' یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں' تو پھر سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی جائز نہیں ہے۔"

ایک وقت تھا' جب یہ آیت نازل ہوئی تھی تو روئے سخن جزیرۃ العرب میں مشرکین مکہ کی طرف تھا کیونکہ اس وقت مشرکین مکہ ہی تشدد پر اترے ہوئے تھے۔ جو یہ نہ مانتے تھے کہ نظام زندگی کا سرچشمہ صرف اللہ ہی ہے۔ آیت کا مفہوم عام ہے۔ ہر وقت نافذ ہے اور ہمارے لئے بھی راہ ہدایت ہے' اس لئے کہ جہاد امت مسلمہ کے لئے قیامت تک ایک فریضہ رہے گا کیونکہ ہر دور میں ایسی قوتیں موجود رہتی ہیں جو لوگوں کو دین سے روکتی ہیں۔ وہ ان کے کانوں تک دعوت اسلامی کی پہنچنے کے تمام ذرائع مسدود کرتی ہیں اور پھر بھی اگر کوئی کسی طرح دعوت اسلامی پر مطمئن ہو جائے تو یہ قوتیں عوام کو روکتی ہیں کہ وہ اسلام قبول کریں اور اسلام پر امن و امان کی حالت میں عمل پیرا ہوں چنانچہ ہر وقت اسلامی جماعت کا یہ مستقل فریضہ ہے کہ وہ ایسی طاقتوں کو پاش پاش کر دے اور لوگوں کو ان کے جبر و تشدد سے آزاد کرائے۔ وہ آزادی سے جیسے چاہے قبول کریں یا نہ کریں۔ تشدد اور فتنے کو قتل سے بھی برا قرار دینے کے بعد' بار بار اس کا تکرار بھی خالی از حکمت نہیں ہے۔ یہ تکرار اس لئے کی جا رہی ہے کہ اس معاملے کو اسلام میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں اسلام ایک عظیم اصول کی بنیاد رکھ رہا ہے' انسان بدل رہا ہے۔ یہ انسان کے لئے درحقیقت ایک نیا جنم ہے۔ یہ نئی زندگی انسان کو اسلامی نظام سے مل رہی ہے۔ اب انسان کی قدر و قیمت اس کی حیوانیت اور اس کی جسمانی زندگی سے نہیں۔ بلکہ اس کی قدر و قیمت کا تعین اس کے عقیدے اور نظریے سے ہو رہا ہے۔ ایک طرف انسان کی زندگی ہے' دوسری طرف انسان کا نظریہ اور اس کا عقیدہ ہے۔ عقیدے کا پلڑا بھاری قرار دیا جا رہا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ انسانیت کے دشمن صرف وہ لوگ ہیں جو دوسرے انسانوں پر محض اختلاف عقیدہ' اختلاف نظریہ کی وجہ سے ظلم و تشدد کریں۔ وہ لوگ جو ایک مسلمان پر محض اس لئے ظلم کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہے۔ وہ اسے تشدد کے ذریعہ اسلام سے پھیرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ انسانیت کو ایک ایسے تصور سے محروم کرتے ہیں جو خیر ہی خیر ہے۔ وہ لوگوں کو اللہ کے عطا کردہ نظام زندگی کی طرف آنے نہیں دیتے۔ اس لئے ان کے ساتھ جنگ کرتے رہنا اسلامی جماعت کا فرض اولین ہے۔ اس کا فرض ہے کہ ایسے لوگ جہاں بھی ملیں انہیں ختم کر دے تاکہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے۔

یہ عظیم اصول' جسے اسلام نے اپنے ابتدائی ایام میں وضع کیا تھا۔ اب بھی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اب بھی اسلامی نظریۂ حیات اور اس کے حاملین پر قسم قسم کے تشدد ہو رہے ہیں۔ حاملین اسلام کو' فرداً فرداً بھی اور بحیثیت جماعت بھی ظلم اور تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اور جو لوگ بھی ظلم و تشدد کا محض اس لئے شکار بنائے جا رہے ہیں کہ انہوں نے ایک نظریۂ حیات کو اپنا لیا ہے یا انہوں نے ایک پسندیدہ نظام زندگی کو اپنا رکھا ہے' چاہے جس قسم کا تشدد بھی ہو' ان لوگوں کا فرض ہے کہ وہ ایسے ظالموں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں' ان کے ساتھ لڑیں۔ ماریں یا مارے جائیں اور ہر حال میں اس علم کو بلند رکھیں۔ آزادی رائے کے علم کو جسے سب سے پہلے اسلام نے بلند کیا جس کے

ذریعے بالکل ایک نیا اور آزاد انسان وجود میں آیا۔

جب بھی ظالم اپنے ظلم سے باز آجائیں۔ وہ انسان اور اس کے خدا کے درمیان مداخلت چھوڑ دیں تو ان پر کوئی زیادتی یعنی ان کے خلاف کوئی مدافعت نہ ہوگی۔ کیونکہ جہاد ہمیشہ صرف ظلم اور ظالم کے خلاف ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا کسی اور کے خلاف کوئی مدافعت نہ ہوگی۔ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۔ یہاں ظالموں کے خلاف مدافعت اور ان کے مقابلے کی تعبیر لفظ عدوان سے کی گئی ہے۔ محض لفظی مشکلات کی بنا پر ورنہ ظالموں کے خلاف جو کارروائی ہے' وہ عدل ہے۔ انصاف ہے اور مظلوموں کو ظلم سے بچانا ہے' ظلم کو روکنا ہے' کوئی زیادتی نہیں ہے۔

مسجد حرام کے قریب لڑنے کے احکام بیان کرنے کے بعد اب حرام مہینوں میں جنگ کے احکام بیان کئے جاتے ہیں۔ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ "ماہ حرام کا بدلہ ماہ حرام ہی ہے۔ اور تمام حرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہو گا' لہٰذا جو تم پر دست درازی کرے' تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ اللہ انہی لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کی حدود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں۔"

جو شخص محرم کے مہینے کی حرمت کا کوئی پاس نہیں رکھتا اسے یہ حق نہیں ہے کہ وہ ان پابندیوں سے فائدہ اٹھائے جو ان حرام مہینوں کے اندر عائد ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام معاملات میں صرف ایک مقام مسجد حرام کو دارالامن قرار دیا ہے اور زمانوں میں سے حرام مہینوں کو زمانہ امن قرار دیا ہے۔ اس مکان اور اس زمان میں کسی کا خون نہیں بہایا جاسکتا۔ ہر کسی کی جان و مال محفوظ ہوں گے۔ کسی بھی زندہ چیز کو دکھ نہ دیا جائے گا۔ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ وہ خود تو امن کے اس شاداب باغیچے میں عیش کرے اور مسلمانوں کو اس سے محروم کر دے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ خود اسے بھی اس سے محروم کر دیا جائے۔ جو دوسروں کی آبرو ریزی کرتا ہے۔ خود اس کی آبرو محفوظ نہ ہوگی کیونکہ الحرمات قصاص تمام حرمتوں کا لحاظ برابری کا ہو گا لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کو تنبیہ کر دی گئی کہ ظلم کا مقابلہ کرنے اور ظلم کا بدلہ لینے میں' وہ اپنے حدود سے آگے نہ بڑھیں۔ کیونکہ ان مقدس مقامات اور ان مقدس و محرم مہینوں کے اندر محض ضرورت کے تحت تمہیں جنگ کی اجازت دی جارہی ہے۔

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ "لہٰذا جو تم پر دست درازی کرے تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو" لیکن اس معاملہ میں غلو اور زیادتی سے کام نہ لو۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے قدر انتقام مقرر نہیں کی۔ مقدار ان کی خدا خوفی پر چھوڑ دی گئی ہے۔ جب کہ اوپر ہم کہہ آئے ہیں کہ مسلمان اس بات سے خوب واقف تھے کہ ان کی نصرت اور امداد صرف اللہ تعالیٰ کر رہا ہے۔ اس لئے انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اللہ سے ڈریں۔ یہی وہ حد ہے جس پر انہیں رکنا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا خوفی ہی امن کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

جہاد میں افراد کی طرح مال کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاد سے پہلے ایک مجاہد کو سامان جنگ کی ضرورت ہوگی' مثلاً سواری' اور دوسرا سامان جنگ۔ حضور ﷺ کے دور میں فوجیوں اور افسروں کے لئے مقررہ تنخواہ نہیں تھیں۔ وہ لوگ اسلام کے لئے جس طرح جان قربان کرتے تھے' اس طرح اپنی دولت بھی راہ خدا میں خرچ کرتے تھے۔ اگر اجتماعی نظم' نظریۂ حیات پر استوار کیا جائے تو یہی صورت ہوتی ہے۔ اگر حکومت کی بنیاد نظریہ پر ہو تو پھر اپنے بچاؤ یا اپنے عوام کے بچاؤ کے لئے' یا دشمنوں کے مقابلے میں کسی جنگ کے لئے اسے دولت خرچ کر کے تنخواہ دار ملازمین رکھنے کی ضرورت سرے سے پیش ہی نہیں آتی' فوج خود آگے بڑھتی ہے' لیڈر خود آگے بڑھتے ہیں' جان بھی دیتے

ہیں اور مال بھی۔

ضرورت اس بات پر غور کرنے کی تھی کہ بے شمار غریب مسلمان ایسے تھے' جو جذبہ جہاد سے تو سرشار تھے' وہ اسلامی نظریۂ حیات اور اسلامی نظام زندگی کے لئے لڑ مرنے کے لئے تیار تھے لیکن صورت حال یہ تھی کہ ان کے پاس سامان جنگ تھا اور نہ کوئی زاد راہ تھا۔ میدان جنگ تک جانے کے لئے کوئی سواری نہ تھی' ایسے لوگ حضور کے پاس آتے اور التجائیں کرتے کہ آپ انہیں دور دراز میدان جنگ تک لے جائیں۔ کیونکہ میدان جنگ بعض اوقات اتنا دور ہوتا تھا کہ وہاں تک پیدل جانا ممکن نہ تھا اور جب حضور معذرت کا اظہار فرماتے تو وہ مایوس لوٹتے۔ ان کے بارے میں قرآن مجید میں ہے۔

تَوَلَّوْا وَّاَعْیُنُھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا یَجِدُوْا مَا یُنْفِقُوْنَ (وہ لوٹے' مگر اس حال میں کہ ان کی آنکھیں اشک بار ہوتیں' اس دکھ کی وجہ سے کہ ان کے پاس وہ کچھ نہیں ہے جسے وہ اس موقعہ پر خرچ کریں) قرآن مجید کی بے شمار آیات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے شمار احادیث میں انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دی گئی ہے۔ خصوصاً غازیوں کے سازوسامان کے لئے۔ قرآن مجید میں بے شمار مقامات ایسے ہیں جہاں دعوت جہاد کے ساتھ ساتھ دعوت انفاق بھی دی گئی ہے اور یہاں تو انفاق فی سبیل اللہ سے پہلوتہی کرنے کو ہلاکت اور بربادی سے تعبیر کیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ اس سے بچو وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔"

جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے وہ بخیل ہوتے ہیں اور بخل کی وجہ سے نفس انسانی مردہ ہو جاتا ہے۔ بخیل جس جماعت کا فرد ہے وہ اپنی ضعیفی کی وجہ سے مرگ مفاجات میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ بالخصوص ایسے نظام زندگی میں جو قائم ہی رضاکاری پر ہو' جیسے کہ اسلام کے ابتدائی ایام میں نظر آتا ہے۔

بطور مزید تاکید کہا جاتا ہے کہ انفاق سے بھی آگے بڑھو۔ درجہ احسان تک جا پہنچو: وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ "احسان کا طریقہ اختیار کرو' بے شک اللہ تعالیٰ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔"

اسلام میں جو مراتب ہیں' احسان ان میں بلند ترین مرتبہ ہے۔ احسان کی تعریف خود رسول خدا ﷺ نے فرمائی ہے۔ "تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے اور جو انسان اس مقام بلند تک جا پہنچے' اس کے لئے تمام دوسری عبادات ادا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ تمام معاصی خود بخود چھوٹ جاتے ہیں اور ایسا شخص چھوٹے بڑے گناہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے ڈرتا ہے۔ تنہائی میں اور محفل میں ہر جگہ خدا کا خوف اس کے پیش نظر رہتا ہے۔

یہ وہ آخری نتیجہ ہے جس پر آیات جہاد کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور جہاد کے معاملہ میں نفس انسانی کو احسان کے سپرد کر دیا جاتا ہے' جو ایمان کا بلند ترین درجہ ہے۔

اب یہاں سے حج' عمرہ اور ان کے مناسک کا بیان شروع ہوتا ہے۔ سلسلہ کلام میں خود بخود ربط قائم ہو جاتا ہے۔ پہلے بات چاند گھ سے چلی تھی جواب دیا گیا تھا کہ وہ لوگوں کیلئے اور حج کے دوران اوقات کے تعین کیلئے ہے۔ پھر حج کے حرام مہینوں میں جنگ' کے تذکرے جنگ کی بات چلی اور اسکے بعد اب حج اور عمرہ کے احکام بیان ہوتے ہیں جو مسجد حرام میں سرانجام پاتے ہیں۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَ
لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا
اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ
اَمِنْتُمْ ٚ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ
لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ
كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ۲۴
وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ ع ۸
فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِى الْحَجِّ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا ۸
مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَ اتَّقُوْنِ
يٰۤاُولِى الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَاۤ
اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۚ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا
هَدٰىكُمْ ۚ وَ اِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ
اَفَاضَ النَّاسُ وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمْ
مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ
مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا وَ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَ
مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا
عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾
وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ فِىْۤ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِىْ يَوْمَيْنِ فَلَاۤ اِثْمَ
عَلَيْهِ ۚ وَ مَنْ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا
اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

۱۹۶ اللہ کی خوشنودی کے لئے جب حج اور عمرہ کی نیت کرو' تو اسے پورا کرو اور اگر کہیں گھر جاؤ تو جو قربانی میسر آئے' اللہ کی جناب میں پیش کرو اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ مگر جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا

پر اپنا سر منڈوالے تو اسے چاہئے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی دے' اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے حج کے زمانے میں اور سات گھر پہنچ کر' اس طرح پورے دس روزے رکھ لے۔ یہ رعایت ان لوگوں کے لئے ہے جن کے گھر مسجد حرام کے قریب نہ ہوں۔ اللہ کے ان احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔"

حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ جو شخص ان مقرر مہینوں میں حج کی نیت کرے اسے خبردار رہنا چاہئے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل' کوئی بد فعلی' کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو اور جو نیک کام تم کرو گے وہ اللہ کے علم میں ہو گا۔ سفر حج کے لئے زاد راہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے بہتر زاد راہ پرہیزگاری ہے۔ پس اے ہوشمندو' میری نافرمانی سے پرہیز کرو اور اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ پھر جب عرفات سے چلو تو مشعر حرام کے پاس ٹھہر کر اللہ کو یاد کرو۔ اور اس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے' ورنہ اس سے پہلے تو تم بھٹکے ہوئے تھے۔ پھر جہاں سے سب لوگ پلٹتے ہیں' وہیں سے تم بھی پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو' یقیناً وہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ پھر جب اپنے رب کے احکام ادا کر چکو تو جس طرح پہلے اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرتے تھے' اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر (مگر اللہ کو یاد کرنے والے لوگوں میں بھی بہت فرق ہے) ان میں سے کوئی تو ایسا ہے جو کہتا ہے کہ اے ہمارے رب' ہمیں دنیا ہی میں سب کچھ دے دے' ایسے شخص کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور کوئی کہتا ہے' اے ہمارے رب' ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی۔ اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔ ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے اور اللہ کو حساب چکاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ یہ گنتی کے چند روز ہیں جو تمہیں اللہ کی یاد میں بسر کرنے چاہئیں۔ پھر جو کوئی جلدی کر کے دو ہی دن میں واپس ہو گیا تو کوئی حرج نہیں اور جو کچھ دیر زیادہ ٹھہر کر پلٹا تو بھی کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ یہ دن اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کئے ہوں۔ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمہاری پیشی ہونے والی ہے۔

ہمارے پاس آیات حج کی تاریخ نزول کا کوئی صحیح علم نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ایک روایت ہے جس میں آیا ہے کہ آیت فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ "اور اگر کہیں گھر جاؤ تو جو قربانی میسر ہو" ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی' لہٰذا اسلام میں حج کب فرض ہوا؟ اس کی صحیح تاریخ بھی ہمیں معلوم نہیں' اس میں اختلاف رائے ہے کہ حج فرض کس آیت سے ہوا' اس آیت سے یعنی أَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ اللہ کی خوشنودی کے لئے جب حج اور عمرہ کی نیت کرو تو اسے پورا کرو یا وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا "جن لوگوں کے پاس زاد راہ کی استطاعت ہو ان پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے حج بیت اللہ فرض ہے۔" بہرحال ان دونوں آیات کے نزول کے بارے میں تاریخ کا تعین کرنے والی کوئی روایت منقول نہیں ہے۔

امام ابن قیم جوزی اپنی کتاب زاد المعاد میں لکھتے ہیں کہ حج ۹ھ یا ۱۰ھ میں فرض ہوا ہے۔ انہوں نے یہ سن اس قیاس میں متعین کیا ہے کہ حضور ﷺ نے دس ہجری کو حج فرمایا۔ ظاہر ہے کہ لازماً آپ ﷺ نے یہ فریضہ فرض ہونے کے بعد ادا کیا ہو گا جو ۹ھ یا ۱۰ھ میں ہو سکتا ہے' لیکن صرف یہ بات صحیح دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ ہو سکتا ہے کہ حج پہلے سے فرض ہو۔ مگر بعض مجبوریوں اور رکاوٹوں کی وجہ سے حضور ﷺ نے اسے ۱۰ھ تک مؤخر فرما دیا ہو۔ جبکہ ۹ھ میں حضور ﷺ نے حضرت ابوبکر ؓ کو امیر حج مقرر فرما کر بھیجا۔ روایات میں یہ بات آ چکی کہ حضور ﷺ جب غزوۂ تبوک سے واپس ہوئے تو آپ نے حج کا ارادہ فرمایا تھا۔ اس کے بعد جب آپ ﷺ نے یہ خیال کیا کہ مشرکین حسب عادت حج کے موسم میں مکہ مکرمہ آتے ہیں اور ان میں سے بعض لوگ بالکل ننگے ہو کر طواف کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ان لوگوں میں خلط ہونے کو پسند نہ فرمایا۔ اس کے بعد سورت براءت نازل ہوئی۔ حضور ﷺ نے حضرت علی ؓ کو ارسال فرمایا تاکہ وہ سورت براءت

کا ابتدائی حصہ پڑھ کر لوگوں کو سنائیں 'جن مشرکین کے ساتھ جو معاہدے تھے انہیں ختم کر دیں اور جب لوگ منیٰ میں قربانی کے وقت جمع ہوں تو اعلان کر دیں یاد رکھو! کوئی کافر جنت میں داخل نہ ہو گا' اس سال کے بعد کوئی مشرک طواف نہ کر سکے گا کوئی ننگا شخص طواف نہ کر سکے گا۔ جن لوگوں نے حضور ﷺ کے ساتھ کوئی معاہدہ کر رکھا ہے 'تو وہ اپنی میعاد تک ہی رہے گا۔ یہی وجہ تھی کہ خود حضور ﷺ نے حج نہ فرمایا اور انتظار کیا تاکہ بیت اللہ پاک ہو جائے۔ مشرکین اور برہنہ ہوکر طواف کرنے والوں سے۔

یہاں یہ بات دل کو لگتی ہے کہ اسلام نے فریضہ حج اور مناسک حج اکثر و بیشتر برقرار رکھے تھے۔ اور ان تاریخوں سے بہت پہلے ایسی روایات موجود ہیں کہ ہجرت سے پہلے ہی مکہ مکرمہ میں حج فرض ہو چکا تھا لیکن ان روایات کی سند قوی نہیں ہے۔ سورت حج 'جو ارجح قول کے مطابق مکی سورت ہے۔ اس میں حج کے اکثر و بیشتر مناسک کا ذکر ہوا ہے۔ یوں کہ حضرت ابراہیم ؑ نے ان مناسک کا حکم دیا تھا۔ سورت حج کی یہ آیات ملاحظہ فرمائیں:

(یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے ابراہیم ؑ کے لئے اس (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو' اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک رکھو اور لوگوں کو حج کے لئے اذن عام دے دو کہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں تاکہ وہ فائدے دیکھیں 'جو یہاں ان کے لئے رکھے گئے ہیں۔ اور چند مقرر دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں بخشے ہیں۔ خود بھی کھائیں اور تنگ دست اور محتاج کو بھی دیں۔ پھر اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں 'اور اس قدیم گھر کا طواف۔ یہ ہے اصل معاملہ (اسے سمجھ لو) اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔ تمہیں ایک وقت مقررہ تک ان (ہدی کے جانوروں) سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے 'پھر ان کے قربان کرنے کی جگہ اسی قدیم گھر کے پاس ہے۔

اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لئے شعائر اللہ میں شامل کیا ہے۔ تمہارے لئے ان میں بھلائی ہے 'پس انہیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو اور جب (قربانی کے بعد) ان کی پیٹھیں زمین پر ٹک جائیں تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور ان کو بھی کھلاؤ جو قناعت کئے بیٹھے ہیں اور ان کو جو اپنی حاجت پیش کریں ان جانوروں کو ہم نے اس طرح تمہارے لئے مسخر کیا ہے تاکہ تم شکریہ ادا کرو۔ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون 'مگر اسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اس نے ان کو تمہارے لئے اس طرح مسخر کیا ہے تاکہ اس کی بخشی ہوئی ہدایت سے تم اس کی تکبیر کرو اور اے نبی بشارت دے نیکو کاروں کو۔"

ان آیات میں اکثر مناسک کا ذکر ہوا ہے یا اشارہ ملتا ہے 'مثلاً ھدی 'نحر' طواف 'احلال' احرام اور تسمیہ 'یہی حج کے اساسی شعائر ہیں۔ خطاب 'حضرت ابراہیم ؑ کے تاریخی واقعہ کی شکل میں 'مسلمانوں سے ہو رہا ہے۔ ان آیات میں واضح طور پر یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ حج کافی ابتدائی دور میں فرض ہو گیا تھا۔ کیونکہ حج حضرت ابراہیم ؑ کا شعار تھا 'جن سے مسلمانوں کی نسبت تھی۔ چونکہ مشرکین مکہ خانہ کعبہ کے مجاور تھے 'کلید بردار تھے 'اور ایک عرصہ تک مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان سخت کشمکش برپا تھی 'ہو سکتا ہے کہ فریضہ حج کی ادائیگی کو مناسب وقت تک مؤخر کر دیا گیا ہو۔ لیکن یہ تاخیر تو الگ بات ہے۔ تو اس پارے کی ابتدائی آیات میں ہم اس رائے کو ترجیح دے چکے ہیں کہ بعض مسلمان 'بہت پہلے سے فریضہ حج کو ادا کرتے تھے۔ یعنی دو ہجری میں تحویل قبلہ کے بعد۔

بہرحال حج کی تاریخ کے سلسلے میں یہی بحث کافی ہے 'اب ہم تشریح آیات 'شعائر حج کے بیان اور ان ہدایات کی تشریح کریں گے جو ان کے اثناء میں دی گئی ہیں۔

**وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّى يَبْلُغَ الْهَدْيُ**

مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَّرِيۡضًا اَوۡ بِهٖۤ اَذًى مِّنۡ رَّاۡسِهٖ فَفِدۡيَةٌ مِّنۡ صِيَامٍ اَوۡ صَدَقَةٍ اَوۡ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنۡتُمۡ ٚ فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ اِلَى الۡحَجِّ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡىِ ۚ فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الۡحَجِّ وَسَبۡعَةٍ اِذَا رَجَعۡتُمۡ ؕ تِلۡكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ اَهۡلُهٗ حَاضِرِى الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ ؕ

"اللہ کی خوشنودی کے لئے جب حج اور عمرے کی نیت کرو تو اسے پورا کرو' اور اگر کہیں گھر جاؤ تو جو قربانی میسر آئے' اللہ کی جناب میں پیش کرو اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ مگر جو شخص بیمار ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا پر اپنا سر منڈوا لے تو اسے چاہئے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔ پھر اگر تمہیں امن نصیب ہو جائے (اور تم حج سے پہلے مکہ پہنچ جاؤ) تو جو شخص تم میں سے حج کا زمانہ آنے تک عمرے کا فائدہ اٹھائے' وہ حسب مقدور قربانی دے اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے حج کے زمانے میں اور سات گھر پہنچ کر' اس طرح پورے دس روزے رکھ لے۔ یہ رعایت ان لوگوں کے لئے ہے جن کے گھر مسجد حرام کے قریب نہ ہوں۔ اللہ کے ان احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔"

ان آیات میں' سب سے پہلے وہ حسن الفاظ اور حسن تعبیر قابل دید ہے جسے اس قانون سازی کے لئے اختیار کیا گیا ہے' فقروں کی تقسیم' بامقصد اور بہترین طرز ادا' ہر فقرے میں الگ بیان اور الفاظ و فقرات مختصر' جن میں کوئی لفظ بھی زیادہ نہیں۔ ہر حکم کے ساتھ شرائط تحدید اور سب احکام کو خوف خدا اور تقویٰ کے ساتھ مربوط کرتے چلے جانا۔

پہلے فقرے میں کہا گیا کہ حج اور عمرے کو شروع کر چکنے کے بعد' مطلقاً تکمیل لازمی ہے۔ جب حاجی حج کا آغاز کر دے' عمرہ کرنے والا عمرے کا آغاز کر دے' نیت باندھ لے خواہ علیحدہ علیحدہ یا دونوں کی ایک ساتھ اور اس کی توجہ کا مرکز خالص اللہ کی رضا جوئی ہو' تو انہیں حکم ہے وَاَتِمُّوا الۡحَجَّ وَالۡعُمۡرَةَ لِلّٰهِ "اللہ کی خوشنودی کے لئے جب حج اور عمرے کی نیت کرو' تو اسے پورا کرو۔"

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ لفظ "پورا کرو" کے ذریعہ ہی سب سے پہلے حج فرض ہوا ہے۔ لیکن بعض نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جب تم شروع کرو تو پھر پورا کرو۔ مکمل کرو۔ یہ مفہوم زیادہ ظاہر ہے۔ اس لئے کہ یہاں یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ حج بھی فرض ہو گیا اور عمرہ بھی فرض ہو گیا۔ کیونکہ بعض علماء عمرے کو فرض نہیں سمجھتے' لہٰذا یہاں مقصد یہی ہو گا کہ حج و عمرہ شروع کرنے کے بعد واجب ہو جاتے ہیں۔ اتمام لازمی ہے ابتداً عمرہ واجب نہیں ہوتا لیکن جب اس کی نیت کر کے احرام باندھ لیا جائے تو پھر پورا کرو۔ اب اتمام واجب ہو گا اور عمرہ تمام مناسک میں حج ہی کی طرح ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عمرے میں' میدان عرفات میں وقوف نہیں ہوتا۔ نیز عمرے کے لئے مقررہ اوقات بھی نہیں۔ پورے سال میں کسی بھی وقت ادا کیا جا سکتا ہے۔ حج کی طرح معلوم مہینوں کے اندر ہی اس کی ادائیگی لازمی نہیں ہے۔

اتمام حج و عمرہ کے اس عام حکم سے حالت احصار کو مستثنیٰ قرار دیا جاتا ہے۔ احصار کسی جانی دشمن کی وجہ سے ہو (اس پر سب مذاہب کا اتفاق ہے) یا بیماری یا بیماری کی طرح کوئی اور رکاوٹ ہو۔ جس کی وجہ سے حج اور عمرے کی تکمیل ممکن ہو' فقہاء کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ بیماری کی وجہ سے احصار جائز ہے یا نہیں۔ راجح بات یہ ہے کہ بیماری کی وجہ سے احصار معتبر ہے۔ فَاِنۡ اُحۡصِرۡتُمۡ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡىِ "اور اگر کہیں گھر جاؤ' تو جو ھدی بھی میسر ہو' جناب باری میں پیش کرو۔" اس حالت میں حاجی یا عمرے کی نیت کرنے والا وسعت و سہولت کے مطابق جو قربانی کر سکے کرے اور احرام توڑ دے۔ وہیں جہاں حالت احصار پیش آئی۔ اگرچہ وہ مسجد حرام تک نہ پہنچ سکے۔ میقات سے احرام باندھنے کے سوا' مناسک حج ادا نہ کر سکے۔ مناسک عمرہ ادا نہ کر سکے (میقات وہ مقام ہے جہاں

سے حاجی اور عمرہ کرنے والا احرام باندھتا ہے' پھر اس کے لئے سلے ہوئے کپڑے پہننا حرام ہو جاتا ہے' بال چھوٹے کرنا' منڈوانا' ناخن چھوٹے کرنا منع ہو جاتا ہے۔ نیز اس پر خشکی کا شکار کھیلنا اور اس کا کھانا منع ہو جاتا ہے۔

۶ھ ہجری میں یہی پیش آیا' جب حضور ﷺ اور آپ کے ساتھی حدیبیہ پہنچے تو مشرکین نے آپ کو مسجد حرام آنے سے روک دیا۔ اس پر مذاکرات ہوئے اور معاہدہ صلح حدیبیہ طے ہوا۔ اس کے مطابق طے ہوا کہ حضور ﷺ اگلے سال عمرہ ادا کریں۔ روایات میں آتا ہے کہ یہ آیت نازل ہوئی اور حضور ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ جہاں جہاں تک پہنچے ہیں وہیں رک جائیں' قربانی کریں اور عمرہ کی نیت ختم کر کے احرام سے باہر آجائیں۔ مسلمان تعمیل امر سے ہچکچانے لگے۔ ان پر یہ بات گراں گزر رہی تھی کہ وہ کیونکر ہر ہدی کو اس کے مقام نحر سے پہلے ہی قربان کر دیں' حالانکہ عادۃً وہ منیٰ میں ایسا کرتے ہیں۔ ان کی ہچکچاہٹ کو دیکھ کر حضور ﷺ آگے بڑھے اور اپنی قربانی ذبح کر کے احرام سے باہر نکل آئے۔ اس پر سب نے تعمیل کی۔

فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ سے مراد وہ ہے جو میسر آجائے۔ ہدی جن مویشیوں سے ہوگی وہ یہ ہیں' اونٹ' گائے' بھینس اور بھیڑ بکری۔ صرف اونٹ' بھینس اور گائے میں سات افراد تک شریک ہو سکتے ہیں جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر سات افراد ایک اونٹنی میں شریک ہوئے تھے۔ یہ ہے تیسر۔ یہاں بھیڑ بکری صرف ایک آدمی کے لئے ہدی ہوگی۔

حالت احصار' جیسا کہ حدیبیہ میں پیش آیا' یا بیماری کی وجہ سے گھر جانے کے حالات کو اصل حکم سے اس لئے مستثنیٰ کیا گیا کہ مسلمانوں پر تنگی نہ ہو' اس کی حکمت صرف مسلمانوں کے لئے سہولت کی گنجائش رکھنا ہے۔ مناسک حج کی غرض و غایت یہی ہے کہ انسان اللہ کے نزدیک ہو جائے اور اس کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہو جائے۔ اور اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ فرائض سرانجام دینے کے لئے تیار ہو جائے۔ جب اس نے نیت کرلی' احرام باندھ لیا اور دشمن اس کی راہ میں حائل ہو گیا یا بیماری اور یا اسی طرح کا کوئی اور عذر لاحق ہو گیا تو حاجی یا عمرہ کی نیت کرنے والا آخر عمرے کے ثواب سے کیوں محروم ہو۔ اس حالت کا حکم ایسا ہی ہو گا جیسے حج مکمل ہو گیا' عمرہ ادا ہو گیا' چنانچہ ایسا شخص وہیں قربانی کر کے احرام سے نکل آئے گا۔ یہ سہولت ایسی ہے جو اسلام کی روح' اسلامی عبادات کے مقاصد اور شعائر حج و عمرہ کی اصل غرض و غایت کے عین مطابق ہے۔

پہلے عام حکم کی اس استثناء کے بعد' اب روئے سخن ایک دوسرے حکم' عام حکم' حج کے لئے بھی' عمرے کے لئے بھی اس کی طرف پھرتا ہے۔ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ "اور اپنے سر نہ مونڈو' جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔" یہ حکم اس حالت کے لئے ہے کہ جہاں حج و عمرہ مکمل ہو رہے ہوں اور احصار نہ ہو' حج' عمرے یا دونوں کی نیت کی صورت میں آدمی اس وقت تک حالت احرام میں رہتا ہے اور اسے سر مونڈانے کی اجازت نہیں ہوتی جب تک قربانی اپنی جگہ کو پہنچ کر ذبح نہ ہو جائے۔ یعنی میدان عرفات میں وقوف کر کے' مزدلفہ آنے کے بعد بمقام منیٰ' ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو۔ اس قربانی کے بعد حاجی احرام سے نکلتا ہے۔ اس سے پہلے اس کے لئے سر مونڈنا' بال چھوٹے کرنا یا دوسرے کام جو محرم کے لئے جائز نہیں ان کا ارتکاب کرنا منع ہے۔ اب اس عام حکم میں بھی استثنا (Proviso) ہے۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ "مگر جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا پر اپنا سر منڈوا لے تو اسے چاہئے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے!"

---

۱۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے سورۃ الفتح کی تفسیر ۲۶

اگر ایسی بیماری لاحق ہو جائے جس میں سر منڈوانا ضروری ہو یا سر میں جوئیں وغیرہ پڑ جائیں' بال لمبے ہو جائیں اور دیر تک ان میں کنگھی نہ کی گئی اور جوئیں وغیرہ پڑ گئیں تو اس وقت ہدی کے محل تک پہنچنے سے پہلے بھی سر منڈوانا جائز ہے۔ کیونکہ اسلام سہولت کا دین ہے' لہٰذا تکمیل حج سے پہلے بھی سر منڈوا سکتا ہے۔ البتہ اس صورت میں ایسے شخص کو فدیہ دینا پڑے گا یا تین دن کے روزے یا چھ مساکین کو کھانا یا ایک بکری ذبح کر کے صدقہ کرنا' فدیہ کی یہ تحدید حضور ﷺ کی احادیث میں کی گئی ہے۔ امام بخاری ؒ نے اپنی سند کے ساتھ کعب بن عجرہ سے روایت کی ہے' فرماتے ہیں: مجھے حضور ﷺ کے پاس لے جایا گیا' میری حالت یہ تھی کہ میرے بالوں سے میرے چہرے پر جوئیں گر رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا میرا یہ خیال نہ تھا کہ تم اس قدر مصیبت میں پڑ گئے ہو۔ کیا تمہارے پاس بکری ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا: تین روزے رکھو یا چھ مساکین کو کھانا کھلاؤ اور کھانے کی مقدار یہ ہو کہ مساکین کو نصف صاع غلہ ملے' اور اپنے سر کو منڈوا لو۔

اب حج کا ایک دوسرا' عام حکم سنیں فَإِذَآ أَمِنتُمْ فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ "پھر اگر تمہیں امن نصیب ہو جائے تو جو شخص تم سے حج کا زمانہ آنے تک عمرے کا فائدہ اٹھائے۔ وہ حسب مقدور قربانی دے۔" مطلب یہ ہے کہ جب احصار کی صورت درپیش ہو اور تم فریضہ حج ادا کر رہے ہو' پس جو شخص ایام حج آنے سے پہلے عمرہ کرنا چاہتا ہو تو وہ حسب مقدور قربانی دے۔ اس حکم کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شخص عمرہ کے لئے نکلے' میقات پر احرام باندھے' عمرہ ادا کرلے' یعنی طواف اور سعی بین صفا مروہ سے فارغ ہو جائے' پھر وہ حج کی نیت کرلے اور ایام حج کا انتظار کرے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ ایک شخص یہ عمرہ حج کے مہینوں میں کر رہا ہو' حج کے مہینے شوال' ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے دس دن ہیں' حج سے عمرہ کرنے کی یہ ایک صورت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ میقات سے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھے اور عمرہ ادا کرنے کے بعد حج کے ایام کا انتظار کرے۔ یہ تمتع کی دوسری صورت ہے۔ ان دونوں صورتوں میں تمتع کرنے والے پر قربانی واجب ہے۔ یہ قربانی عمرہ کے بعد ہوگی تاکہ وہ احرام سے نکل آئے۔ یہ شخص ادائے عمرہ اور آغاز حج کے درمیانی عرصہ میں حلال رہے گا۔ حسب مقدور قربانی اونٹ' گائے' بھیڑ بکری کی ہوگی۔

اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ "اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے حج کے زمانے میں اور سات گھر پہنچ کر اس طرح پورے دس روزے رکھ لے۔" اس سلسلے میں اولیٰ یہ ہے کہ حج کے تین روزے ذوالحجہ کو عرفات پر وقوف سے پہلے ہی رکھ لے اور باقی سات دن گھر لوٹ کر رکھ لے۔ اس طرح پورے دس روزے رکھ لے' مزید تاکید کے لئے کہا گیا ہے ہدی اور روزے کی حکمت صرف یہ ہے کہ حاجی کا تعلق اللہ کے ساتھ مسلسل قائم رہے' یعنی عمرہ اور حج کے درمیانی عرصے میں جب وہ احرام سے باہر آجاتے تو اس کا یہ شعور ختم نہ ہو جائے کہ وہ ایام حج کی فضا میں ہے۔ اسے برائیوں سے خاص طور پر بچنا چاہئے اور یہ کہ اللہ مسلسل نظر رکھے ہوئے ہے۔ یہ شعور اور جذبہ بالعموم ایام حج میں زندہ ہوتا ہے۔

رہے وہ لوگ جو مسجد الحرام کے رہنے والے ہیں تو ان کے لئے ایام حج میں عمرہ جائز نہیں ہے۔ وہ صرف حج کریں گے۔ وہ عمرے اور حج کے درمیان قربانی کر کے احرام سے نہیں نکل سکتے۔ اس لئے ان پر فدیہ' قربانی یا روزہ لازم نہیں ہے۔ ذَٰلِكَ لِمَن لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ "یہ رعایت ان لوگوں کے لئے ہے' جن کے گھر مسجد حرام کے قریب نہ ہوں۔" جو احکام یہاں تک بیان ہو چکے ہیں ان کے آخر میں اب قرآن مجید ایک زوردار تعقیب اور نتیجہ پیش کرتا ہے اور حجاج کے دلوں کو اللہ تعالیٰ کی جانب موڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ "اللہ کے ان احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور خوب جان لو کہ اللہ خوب سزا دینے والا ہے۔" تقویٰ ہی امتثال امر کی گارنٹی ہے۔ اللہ کا خوف اور اللہ کی سزا کا خوف ہی تعمیل احکام کا ضامن ہے۔ احرام میں تو ایک وقت کے لئے پابندی عائد ہو جاتی ہے۔ قانونی پابندی لیکن اگر احرام کی حالت ختم ہو جائے تو پھر تقویٰ اور خدا خوفی وہ واحد نگرانی ہے جو انسان پر اچھا اثر ڈال سکتی ہے اور ایک مومن کی نگہبان ہو سکتی ہے۔ اب حج کے خصوصی احکام بیان ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ حج کے آداب کیا ہیں؟ اوقات کیا ہیں؟ سابق پیراگرافوں کی طرح اس مقطع کا اختتام بھی اسی تلقین خدا خوفی اور اتقاء پر ہوتا ہے۔ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَ اتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ "حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ جو شخص ان مقرر مہینوں میں حج کی نیت کرے، اسے خبردار رہنا چاہئے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل کوئی بدعملی کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو، اور جو نیک کام تم کرو گے، وہ اللہ کے علم میں ہو گا۔ سفر حج کے لئے زاد راہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے بہتر زاد راہ پرہیزگاری ہے۔ پس اے ہوشمندو، میری نافرمانی سے پرہیز کرو۔"

اس آیت کی ظاہری عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ اوقات معلوم ہیں۔ وہ شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے ابتدائی دس دن ہیں۔ لہٰذا صرف ان اوقات کے اندر ہی حج کی نیت درست ہو گی۔ اس سے پہلے اگر کوئی نیت کرے تو صحیح نہ ہو گی۔ اگرچہ بعض مذاہب نے سنت رسول ﷺ کی بنیاد پر اسے جائز قرار دیا ہے اور وہ اس آیت کا مفہوم بیان کرتے ہیں کہ حج کے جو معلوم اوقات ہیں وہ مناسک حج کی ادائیگی کے لئے ہیں۔ نیت پہلے بھی درست ہے۔ یہ رائے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کی ہے۔ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ، ثوری رحمۃ اللہ علیہ اور لیث بن سعد بھی اسی طرف گئے ہیں۔ جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی رائے اختیار کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، جابر رضی اللہ عنہ، عطاء رضی اللہ عنہ، طاؤس رضی اللہ عنہ، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے بھی یہی مروی ہے۔ چنانچہ یہی رائے زیادہ واضح معلوم ہوتی ہے۔

اب ان معلوم ایام میں اگر کوئی اپنے اوپر حج فرض کر لے یعنی وہ یہ پختہ ارادہ کر لے کہ وہ حج ادا کرے گا اور احرام باندھ لے تو اسے خبردار رہنا چاہئے کہ حج کے دوران میں کوئی رفث کوئی بدفعلی کوئی جھگڑے لڑائی کی بات سرزد نہ ہو۔ رفث سے مراد یہاں جماع اور دواعی جماع کا تذکرہ ہے۔ عورتوں کے سامنے یا عام محفلوں میں جدال سے مراد وہ لڑائی جھگڑا جس سے فریق روم غصہ ہو جائے اور فسوق سے مراد تمام بدفعلیاں ہیں، چھوٹی ہوں یا بڑی۔ ان افعال کے ذکر سے مراد یہ ہے کہ ان تمام کاموں سے دوران حج میں بچنا چاہئے جو تحرج و احتیاط اور خدا کی جانب تنہائی اور یکسوئی کی فضا کے خلاف ہوں، کیونکہ حج کے دوران میں انسان تمام دنیاوی معاملات ترک کر دیتا ہے، اور اللہ سے لو لگا دیتا ہے اور یہ پورا عرصہ تعلق باللہ کے قیام کی روحانی مشقوں کا عرصہ ہوتا ہے۔ ایام حج وہ پیریڈ ہے جس میں انسان اپنے عادی لباس سے بھی علیحدہ ہو کر اللہ کے گھر میں چلا جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں اسے چاہئے کہ اس گھر کے شایان شان احترام اور ادب کو ملحوظ رکھے۔

برے افعال سے روکنے کے بعد اب کہا جاتا ہے کہ تم اچھے کام کثرت سے کرو وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ "اور جو نیک کام تم کرو گے، وہ اللہ کے علم میں ہو گا۔" کیا مومن کے لئے یہی کافی نہیں ہے کہ اس کا آقا اس کے ہر اچھے کام کو ہر وقت دیکھتا رہتا ہے۔ اللہ دیکھ رہا ہے یہ احساس جگاؤ لو، تمہارا آقا دیکھتا ہے۔ بڑھتے چلے جاؤ، زیادہ سے زیادہ بھلائی جمع کر لو۔ یہ ہوتا ہے مومن کا احساس۔ یقیناً یہ اخروی جزاء سے پہلے ہی ایک عظیم انعام ہے۔

اس کے بعد یہ ترغیب دی جاتی ہے کہ سفر حج کے دوران میں اپنے لئے حسب مقدور زاد راہ کا انتظام کرو۔ ہر قسم کا زاد راہ۔ روح کے لئے بھی اور جسم کے لئے بھی۔ احادیث میں آتا ہے کہ یمنیوں میں سے کچھ لوگ حج کے لئے ایسے حال میں چل پڑے تھے کہ پاس کچھ بھی نہیں۔ وہ کہتے ہم تو اللہ کے گھر کی زیارت کو جائیں اور وہ ہمیں روٹی بھی نہ دے۔ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ انسان جو کام بھی کرے وہ مکمل تیاری سے کرے۔ پوری تیاری کے ساتھ دل کو اللہ کی طرف متوجہ کرے اور پھر اعتماد اور بھروسہ مکمل اسی پر ہو۔ ان لوگوں کی یہ بات نہ صرف اسلام کے مزاج کے خلاف تھی بلکہ اس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بات چیت میں ایک قسم کی بے باکی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ حج کرنے کو ذات باری پر ایک قسم کا احسان سمجھتے تھے۔ چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا حج کرتے ہیں لہٰذا وہ زاد راہ کا ذمہ دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زاد راہ کی دونوں اقسام 'جسمانی زاد راہ اور خدا خوفی اور تقویٰ کا زاد راہ کا انتظام کرنے کا حکم دیا۔ اور کہا کہ اللہ کے جناب میں بے باکی اختیار نہ کرو۔ تعبیر ایسی ہے کہ ہروقت' ہر لمحہ تقویٰ ہی تمہارا زاد راہ ہو' زاد حیات ہو وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَ اتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ "سفر حج کے دوران زاد راہ ساتھ لے جاؤ۔ بہترین زاد راہ پرہیزگاری اور خدا خوفی ہے۔"

تقویٰ روح اور قلب کی خوراک ہے۔ اس سے روح کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ تقویٰ اور خدا خوفی سے روح طاقتور ہوتی ہے۔ پھرپھڑاتی لہلہاتی ہے۔ روح اس سے جلا پاتی ہے اور روشن ہو جاتی ہے۔ تقویٰ ہی مدار نجات ہے۔ وہی لوگ ہو[illegible] جو تقویٰ اور خدا خوفی کی راہ لیں اور ہر کام میں اسے کام میں لاکر خیر و برکت حاصل کریں۔

مزید احکام حج بیان ہوتے ہیں' کیا تجارت جائز ہے۔ کیا دوران حج میں حاجی مزدوری کر سکتا ہے؟ وقوف کہاں ہو اور کہاں سے واپسی جائز ہے؟ ذکر و استغفار کا کیا طریقہ ہے' یہ مسائل سنئے!

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۞ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ "اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ' تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ پھر جب عرفات سے چلو' تو مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس ٹھہر کر اللہ کو یاد کرو اور اس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے' ورنہ اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔ پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو' اور اللہ سے معافی چاہو' یقیناً وہ معاف کرنے والا' رحم فرمانے والا ہے۔

امام بخاری ﷫ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس ﷜ سے روایت کی ہے' فرماتے ہیں عکاظ مجنہ اور ذوالمجاز دور جاہلیت کے مشہور تجارتی میلے ہوا کرتے تھے۔ مسلمانوں نے خیال کیا شاید دور اسلام میں ان میلوں میں تجارت کرنا اب جائز نہیں ہے۔ اس پر حکم آیا کہ موسم حج میں "اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ' تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

ابوداؤد نے' اپنی سند کے ساتھ' ایک دوسرے واسطہ سے حضرت ابن عباس ﷜ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں: مسلمان ایام حج اور اس کے بعد تجارتی موسم میں خرید و فروخت سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ تو اللہ کو یاد کرنے کے دن ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا' اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرتے جاؤ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ابو امامہ تیمی کی ایک روایت میں ہے' کہتے ہیں میں نے حضرت ابن عمر سے پوچھا ہم بار برداری کا کام کرتے ہیں۔ کیا ہمارا بھی حج ہوگا؟ انہوں نے فرمایا کیا تم طواف نہیں کرتے' نیکی کے کام نہیں کرتے' جمرے نہیں مارتے' پھر سر نہیں منڈواتے؟ کہتے ہیں ہم نے جواب

دیا ہاں' ابن عمر نے فرمایا ایک صاحب رسول خدا ﷺ کے پاس آئے اس نے آپ ﷺ سے یہی سوال دریافت کیا جو آپ لوگ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ آپ نے اس وقت تک کوئی جواب نہ دیا جب تک حضرت جبریل یہ آیت لے کر آنہیں پہنچے۔ اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ' تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ابن جریر ﷺ نے ابو صالح حضرت عمر ﷺ کے آزاد کردہ غلام' سے روایت کی ہے۔ اس نے کہا اس نے سوال کیا امیر المومنین کیا تم حج میں تجارت کیا کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا بھائی ہمارے لوگوں کی معیشت کا تو دارومدار ہی حج پر تھا۔

تجارت کے بارے میں اوپر کی پہلی دو روایات سے اہل اسلام کی جس احتیاط کا اظہار ہوتا ہے پھر دوسری روایت میں بار برداری اور مزدوری کے بارے میں جس احتیاط اور پرہیز کا ذکر ہے' یہ اسی احتیاط اور پرہیز ہی کا ایک حصہ ہے جو اسلام نے مسلمانوں کے اندر دور جاہلیت کے ہر فعل و ہر رسم کے خلاف پیدا کر دی تھی۔ مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ وہ دور جاہلیت کے کسی فعل یا کسی رسم کا ارتکاب اس وقت تک نہ کرتے تھے جب تک اس کے بارے میں اسلام کوئی فیصلہ نہ سنا دیتا۔ اس پارے کی ابتداء میں ہم اس پر بحث کر چکے ہیں' یعنی صفاد مروہ کے درمیان سعی کے بیان کے ضمن میں۔ ایام حج کے دوران میں بیع و شراء بار برداری و مزدوری کی اجازت قرآن نے دے دی مگر اس کی تعبیر یوں ہے کہ یہ اللہ کا فضل ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ "تم اگر اپنے رب کا فضل تلاش کرو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

حلال کمائی کی تعبیر فضل خداوندی سے کی گئی ہے۔ تاکہ تجارت کرنے والے' مزدوری کرنے والے یا دوسرا کوئی نفع آور کام کرنے والے' یہ سمجھیں کہ وہ محض دولت نہیں کماتے بلکہ یہ اللہ کا فضل بھی ہے۔ یہ کام صرف مادی جسم کا سروساماں ہی نہیں ہے بلکہ اسے تقدس حاصل ہے اور فضل خدا ہے۔ اور اللہ اسے اپنے فضل سے نوازتا ہے۔ اس لئے اس تجارت کی اس نوعیت یعنی فضل خداوندی کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ فضل خداوندی اسے تب ہی مل سکتا ہے جب وہ لین دین کرے اور ان اسباب کے ذریعے ہی اسے تلاش کرے جو اللہ تعالیٰ نے نظام رزق کے لئے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ جب قلب مومن میں یہ احساس جاگزیں ہو جاتا ہے اور پھر وہ طلب رزق میں نکلتا ہے' تو وہ اس سعی میں بھی دراصل حالت عبادت میں ہوتا ہے اور اس لئے یہ سرگرمی حالت حج کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ حج بھی اللہ کے لئے ہے اور یہ تجارت بھی فضل الٰہی ہے۔ اسلام سب سے پہلے قلب مومن میں ایسے جذبات اور ایسے تصورات بٹھا دیتا ہے اور پھر اسے میدان عمل میں اتار دیتا ہے اور کھلا چھوڑ دیتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے کام کرے۔ اس نقطہ نظر سے اس کا ہر فعل' اس کی ہر حرکت اللہ کی عبادت ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ طلب رزق' تجارت کے حکم کو بھی احکام حج کے عین وسط میں بیان کر دیا اور تلاش فضل کے ساتھ ہی شعر حرام کے پاس ذکر اور عرفات سے واپسی کے مسائل بیان ہوئے فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَٰتٍ فَٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ عِندَ ٱلْمَشْعَرِ ٱلْحَرَامِ وَٱذْكُرُوهُ كَمَا هَدَىٰكُمْ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِۦ لَمِنَ ٱلضَّآلِّينَ "پھر جب عرفات سے چلو' تو مشعر الحرام کے پاس ٹھہر کر اللہ کو یاد کرو اور اس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمہیں کی ورنہ اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔"

عرفات پر وقوف (کھڑا ہونا) افعال حج کا مرکزی ستون ہے۔ اصحاب سنن نے دیلمی کی روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے رسول خدا ﷺ کو یہ کہتے سنا: حج عرفات ہے (تین مرتبہ فرمایا) اگر کوئی شخص طلوع فجر سے پہلے پہلے عرفات تک جا پہنچے تو گویا اس نے حج پا لیا۔ منیٰ میں قیام کے دن تین ہیں۔ لیکن اگر کوئی دو دن گزار کر چلا آئے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اور کوئی تاخیر کرے تو بھی گناہ گار نہیں ہے۔

عرفات کے میدان میں کھڑے ہونے کا وقت یوم عرفہ کے زوال کے بعد دوپہر سے شروع ہوتا ہے یعنی ۸ ذوالحجہ کے دن ظہر سے۔ اور یہ وقت دوسرے دن' یعنی یوم النحر' قربانی کے دن کے طلوع فجر تک ہے۔ امام احمد کا قول یہ ہے کہ وقوف عرفہ کا وقت دن کے شروع ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ وہ ایک حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو انہوں نے روایت کی ہے۔ دوسرے اصحاب سنن کے علاوہ امام ترمذی نے روایت کر کے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ شعبی عروہ بن مضرس ابن حارثہ ابن لام الطائی سے روایت کرتے ہیں۔ میں حضور ﷺ کے پاس مقام مزدلفہ میں آیا' جب آپ نماز کے لئے کھڑے ہوئے' میں نے کہا حضور ﷺ میں طے پہاڑ سے آیا ہوں۔ میری سواری بھی تھک گئی اور میں بھی چور چور ہو گیا۔ خدا کی قسم میں ہر پہاڑ پر کھڑا ہوا ہوں۔ کیا میرا حج مکمل ہو گیا؟ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا جو شخص ہماری اس نماز میں پہنچ جائے اور ہمارے ساتھ یہاں توقف کرے یہاں تک کہ ہم یہاں سے چل پڑیں۔ بشرطیکہ وہ اس سے پہلے دن کے وقت یا رات کے وقت میدان عرفات میں کھڑا ہو چکا ہو۔ تو اس کا حج پورا ہو گیا اور اس کی تکلیف دور ہو گئی۔

درج بالا دو اقوال کے مطابق' حضور ﷺ نے عرفات پر وقوف کے وقت کو قدرے بڑھایا یا اسے یوم النحر کی صبح تک بڑھا دیا' یعنی ذوالحجہ کی دسویں تک' یہ کیوں؟ اس لئے کہ مسلمانوں کا طرز عمل مشرکین کے طرز عمل سے قدرے مختلف ہو جائے۔ ابن مردویہ اور حاکم نے مستدرک میں روایت کی ہے۔ دونوں نے عبدالرحمٰن بن مبارک سے حضرت مسور ابن مخرمہ سے وہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ہمیں عرفات میں خطبہ دیا۔ حمد و ثنا کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا (امابعد) آج کا دن حج اکبر کا دن ہے۔ مشرکین اور بت پرست غروب شمس سے پہلے ہی چلنا شروع کر دیتے تھے۔ جب سورج ابھی پہاڑیوں کے سروں پر ہوتا اور سورج کے سامنے پہاڑیاں یوں نظر آئیں گویا کہ آدمیوں کے عمامے ہیں اور ہم ان کے طرز عمل کے خلاف دوسرے دن طلوع الشمس سے پہلے پہلے یہاں سے چلیں گے۔

حضور ﷺ کی یہ روایت کہ آپ یوم عرفہ کے دن' غروب آفتاب کے بعد عرفات سے روانہ ہوئے۔ صحیح مسلم میں جابر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ کی روایت میں ہے۔ آپ یوں عرفات پر کھڑے رہے' سورج غروب ہو گیا' زردی تھوڑی تھوڑی واضح ہو گئی۔ اور سورج کی ٹکیہ صاف غائب ہو گئی۔ اسامہ آپ کے پیچھے آپ کی سواری پر بیٹھ گئے۔ حضور ﷺ اب آگے بڑھے۔ اونٹنی کی لگام خوب کھینچ لی۔ یہاں تک کہ اس کا سر ہودج کے اگلے حصے سے لگنے لگا۔ آپ ﷺ اپنے دائیں ہاتھ سے اشارہ فرماتے رہے: لوگو! آرام سے' رک رک کر چلو۔ جب راستے میں پہاڑی آجاتی اور سواری کو اوپر چڑھنا ہوتا تو آپ مہار ڈھیلی چھوڑ دیتے تاکہ وہ سہولت سے چڑھ جائے۔ جب آپ ﷺ مزدلفہ پہنچے تو آپ ﷺ نے مغرب و عشاء کی دونوں نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ پڑھائیں۔ دونوں نمازوں کے درمیان تسبیح کچھ نہ تھی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے آرام فرمایا۔ صبح طلوع ہونے کے بعد جب روشنی خوب پھیل گئی تو آپ ﷺ نے صبح کی نماز ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ پڑھائی۔ آپ ﷺ پھر اونٹنی پر سوار ہو گئے اور مشعر الحرام تک آئے اور روبقبلہ ہو کر وہاں دعا فرمائی۔ تکبیر و تہلیل فرمائی۔ یہاں آپ ﷺ کھڑے ہی رہے' یہاں تک زردی پھیل گئی۔ اور طلوع آفتاب سے پہلے ہی آپ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ یہ ہے وہ فریضہ جو ادا کیا اور حضور ﷺ نے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے فَإِذَا أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ "پھر جب تم عرفات سے چلو' تو مشعر حرام کے پاس ٹھہر کر اللہ کو یاد کرو۔ اور اس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے تو تم بھٹکے ہوئے تھے۔"

مشعر حرام سے مراد مزدلفہ ہے۔ قرآن مجید کا حکم یہ ہے کہ عرفات سے واپسی پر یہاں آکر اللہ کو یاد کرو' یاد دلایا جاتا ہے کہ اس ذکر کی بھی اس نے انہیں ہدایت کی ہے۔ اس کی ہدایات میں سے یہ ہدایت ہے اور یہ ذکر گویا ان کی جانب سے ایک شکریہ ہے جو وہ اللہ تعالیٰ کا ادا کرتے ہیں کیوں کہ یہ وہی ہے جس نے انہیں ہدایت دی ورنہ اس ہدایت سے پہلے تو ان کی حالت یہ تھی وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِ

لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ورنہ اس سے پہلے تو تم بھٹکے ہوئے تھے۔"

پہلی جماعت مسلمہ، صحابہ کرام اس حقیقت کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے اور اس کا گہرا احساس اپنے اندر پاتے تھے۔ عرب گمراہی میں ڈوبے ہوئے تھے' انہوں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ عقائد خراب' بتوں' جنوں اور ملائکہ کے پجاری' فرشتوں کو اللہ کی اولاد سمجھنے والے' جنوں کو اللہ تعالیٰ کا رشتہ دار سمجھنے والے' غرض یہ اور اس قسم کے بے شمار نظریاتی اور عملی گمراہیوں میں یہ لوگ ڈوبے ہوئے تھے۔ ان غلط تصورات اور باطل عقائد کی اساس پر ان لوگوں نے اپنے لئے ایک نظام عبادت اور نظام زندگی وضع کر لیا تھا۔ بعض جانوروں کی پشت کا گوشت اور یا پورا گوشت بغیر کسی معقول جواز کے انہوں نے حرام قرار دے دیا تھا' جواز یہ پیش کرتے کہ ان جانوروں کا خدا تعالیٰ سے خاص تعلق ہے۔ وہ اپنی اولاد کو اللہ کے لئے نذر کرتے اور جنات کو اس میں شریک کرتے۔ اور اس کے علاوہ بے شمار جاہلی عبادات و رسومات تھے جن کا کوئی جواز نہ تھا' صرف ان بے بنیاد اور غلط عقائد کا نتیجہ تھے۔ نیز ان عقائد کی وجہ سے ان کا اجتماعی نظام فاسد ہو چکا تھا اور وہ بحیثیت قوم اخلاق باختہ تھے۔ ان کے اندر طبقاتی امتیازات گھر کر چکے تھے مثلاً ایک یہ کہ وہ عرفات تک نہ جاتے اور جس کی اصلاح اس آیت سے کی گئی کہ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ "پھر جہاں سے اور لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو" اور قرآن مجید نے ان تمام فسادات اور رسومات کو ختم کر کے رکھ دیا۔ اس کے علاوہ ان کے درمیان مسلسل خاندانی رقابتیں اور قبائلی جنگیں جاری رہتی تھیں اور وہ اجتماعی طور پر کسی وقت بھی ایک قوم نہ بن سکے تھے' تاکہ اقوام کی برادری میں ان کی کچھ وقعت ہوتی۔ ان کا خاندانی نظام تباہ و برباد ہو چکا تھا اور جنسی تعلقات میں سخت بے راہ روی پائی جاتی تھی اور وہ اس جنسی بے راہ روی پر فخر کرتے تھے۔ ان کے زبردست لوگ ضعفاء کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرتے تھے اور اس سلسلے میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے سوا ان کے معاشرے میں کوئی میزان عدالت نہ تھی۔ غرض اس وقت کے عرب معاشرے کا اگر سرسری جائزہ لیا جائے تو وہ انسان کی فکری اور عملی گمراہی اور فساد کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔

اور یہ صرف اسلام تھا' جس نے اس معاشرے کو بلند کیا اور اسے فکری اور عملی ضلالت سے نجات دی۔ اور جب وہ قرآن مجید کی یہ آواز سنتے وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ اللہ کو اس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمہیں کی' ورنہ اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔" تو ان کے حافظہ کی سکرین پر ان کے تخیلات کے نگار خانہ میں' ان کے شعور کے نہاں خانہ سے یکلخت وہ تصاویر۔ ان کی زندگی کی بھدی تصاویر' ان کی زندگی کے گرے ہوئے بدنما نقشے سامنے آ جاتے ہوں گے۔ ان کی تاریخ تو ان بدنما مناظر سے بھری پڑی تھی۔ خیال و شعور کی اسکرین پر اپنی یہ تصاویر دیکھ کر جب وہ پھر اپنی موجودہ پاکیزہ زندگی اور اپنے اس بلند مقام پر نگاہ ڈالتے ہوں گے جو اسلام نے انہیں عطا کیا' جہاں تک اسلام نے انہیں بلند کیا۔ تو وہ اس سچائی کی گہرائیوں تک جا پہنچتے ہوں گے۔ وہ بغیر کسی بحث کے یہ سمجھ جاتے ہوں گے کہ ان کی زندگی میں اسلام کا اساسی رول کیا ہے؟

عربوں کے علاوہ بھی ہر قوم' ہر نسل کے مسلمانوں کے سلسلے میں یہ بات اب بھی ایک زندہ حقیقت ہے۔ اسلام کے بغیر ان کی حیثیت کیا تھی؟ اس نظریۂ حیات کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو ان کا وزن کیا رہ جاتا ہے؟ جب یہ لوگ اسلام کی روشنی پالیتے ہیں' اور جب ان کی پوری زندگی میں اسلامی نظام حیات نافذ ہو جاتا ہے اور ایک حقیقت بن جاتا ہے۔ تو وہ گراوٹ سے رفعت' چھٹ پنے کے مقابلے میں عظمت' گمراہی کے بدلے ہدایت اور پریشان خیالی کے مقابلے میں فکر مستقیم پا جاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں یہ تبدیلی اس وقت تک رونما نہیں ہوتی جب تک وہ صحیح معنوں میں مسلمان نہیں بن جاتے۔ اور جب تک وہ اپنی پوری زندگی کو اسلامی نظام حیات کے مطابق استوار نہیں کر لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت پوری انسانیت ایک اندھی جاہلیت میں سرگرداں ہے۔ اور اس وقت تک یوں ہی رہے گی

جب تک وہ اسلام کے حظیرہ ہدایت میں داخل نہیں ہو جاتی۔ اس راز کو تو صرف وہی شخص کما حقہ پا سکتا ہے' جس نے جاہلیت میں کچھ دن گزارے ہوں' جس میں آج کل پوری انسانیت مبتلا ہے اور جس نے پوری دنیا کو بدی سے مالا مال کر دیا ہے' جس کا ہر جگہ دور دورہ ہے' پھر ایسا شخص اسلامی تصور حیات کو پالے اور پھر اس کے مطابق زندگی بسر کر کے دیکھ لے اور تجربہ کر کے معلوم کرے کہ اسلامی نظام زندگی کس قدر اعلیٰ وارفع نظام ہے اور اس کے علاوہ اس کے ماحول میں جو نظام ہیں وہ ناپاکی' غلاظت اور گندگی کے ڈھیر ہی ڈھیر ہیں۔

جب انسان اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام زندگی کی بلند ترین چوٹی پر چڑھ جاتا ہے وہاں سے پوری انسانیت کے تمام تصورات زندگی' تمام مروجہ اجتماعی نظام اور زندگی کے تمام طور طریقوں پر نظر ڈالتا ہے' ان تمام بڑے بڑے فلسفیوں کے تصورات پر' تمام جدید و قدیم مفکرین کے افکار پر' تمام جدید و قدیم نظام ہائے زندگی پر انسان اس بلندی اور اسلامی نظام حیات کی بلند چوٹی سے جب نظر ڈالتا ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے کہ پوری انسانیت کس مصیبت' کس بدبختی میں مبتلا ہے۔ ان فضولیات اور ان بدبختوں نے اسے کس قدر ذلیل و لاغر کر دیا ہے۔ وہ ایسی ژولیدہ فکری اور علمی افراتفری میں مبتلا ہے کہ کوئی عقلمند آدمی اس میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ اور پھر وہ بزعم خود ایک عظیم عقلمند ہے' جسے زندگی کی گاڑی کے چلانے والے کسی خدا کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یا اگر خدا ہے تو اس بر خود غلط انسان کا دعویٰ یہ ہے کہ اسے خدا کے بھیجے ہوئے نظام زندگی کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ ہے وہ حقیقت جس کی یاد دہانی اللہ میاں یہاں کرا رہے ہیں اور جس کا احسان مومنین کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ اللہ میاں کا یہ عظیم کرم ہے کہ اس نے تمہیں اس نعمت کبریٰ سے سرفراز کیا وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ اور اسے اس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے۔ اگرچہ اس سے قبل تم گم کردہ راہ تھے۔"

حج مسلمانوں کا ایک عظیم سالانہ اجتماع ہے۔ اس میں وہ باہم ملتے ہیں' اسلام کے آسرے کے سوا کوئی آسرا نہیں ہوتا' اسلامی نشانات کے سوا سب نشانات مٹ جاتے ہیں۔ بدن پر غیر سلے دو کپڑے' باقی ہر چیز سے عاری۔ ضروری ستر کے علاوہ سرپاؤں ننگے' فرد اور فرد کے درمیان کوئی جدائی نہیں' قبیلے اور قبیلے کے درمیان کوئی امتیاز نہیں' قوم اور قوم کے درمیان کوئی جدائی نہیں' اسلامی نظریہ حیات ہی سب کا عقیدہ ہے' اسلامی نسبت میں سب کا نسب ہے۔ اسلامی رنگ ہی سب کا رنگ ہے۔ قریش دور جاہلیت میں اپنے آپ کو "حمس" بہادر و غیور کہتے تھے۔ انہوں نے اپنے لئے ایسے امتیازات اختیار کئے ہوئے تھے جو انہیں تمام عربوں سے الگ کر دیتے تھے' ان امتیازات میں سے ایک یہ تھا کہ وہ عام عربوں کی طرح عرفات پر "وقوف" نہ کیا کرتے تھے۔ نہ وہ قیام (عرفات) سے لوٹتے تھے جو' اسے تمام لوگ واپس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ احکام حج میں خصوصی طور پر ان کے لئے یہ حکم نازل ہوا' اور امتیاز ختم کر کے انہیں اس مساوات کے دائرے کے اندر لے آیا گیا' جو اسلام پیدا کرنا چاہتا تھا' چنانچہ تمام مصنوعی امتیازات کو ختم کر کے ذی امتیاز قبیلہ قریش کو امت مسلمہ کے اندر ضم کر دیا گیا۔ حکم دیا گیا ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ "اور پھر جہاں سے سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو' یقیناً وہ معاف کرنے والا ہے۔"

امام بخاری نے ہشام' اس کے باپ کے واسطہ سے حضرت عائشہ کی یہ حدیث روایت کی ہے۔ فرماتی ہیں:" قریش اور ان کے دین کے پیروکار نہ صرف وہاں رک جاتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو "حمس" کہتے تھے جبکہ تمام عرب اقوام عرفات میں "وقوف" کرتیں۔ جب اسلام ظہور پذیر ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ آپ عرفات پر جائیں اور وہاں وقوف فرمائیں اور پھر وہاں سے پلٹیں۔ یہ ہے مراد اس آیت سے حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ "جہاں سے لوگ پلٹیں۔"

جہاں اور لوگ ٹھہریں وہاں تم بھی ٹھہرو' جہاں سے اور لوگ پلٹیں وہیں سے تم بھی پلٹو' اسلام کی نظر میں انساب اور طبقات کی کوئی

حیثیت نہیں ہے۔ تمام لوگ ایک ہی امت کے فرد ہیں۔ بالکل برابر' یوں جس طرح کنگھی کے دندانے' کسی کو کسی پر برتری نہیں۔ سوائے تقویٰ اور خدا خوفی کے۔ اسلام نے تو حکم دیا ہے کہ وہ عام طور پر رنگارنگ لباس پہنتے ہیں اسے اتار پھینکیں۔ اللہ کے گھر میں بھائیوں کی طرح سادہ شکل اور عام حیثیت میں آئیں۔ بھائی بھائی سے برابری کے ساتھ ملے۔ جب رنگارنگ کپڑے تک اتروا لئے گئے تو قوم و نسب پر فخر کے کیا معنی؟ چھوڑ دو' چھوڑ دو جاہلیت کے تمام تعصبات کو۔ یہ تو ناپاک ہیں۔ اسلامی رنگ میں رنگ جاؤ۔ اللہ سے مغفرت کے طلب گار ہو۔ ایک مدت اس عظیم جاہلیت میں پھنسے رہے۔ اس کوتاہی کی معافی مانگیں۔ ان تمام وسوسوں' ان تمام غلطیوں' ان تمام بدکلامیوں پر معافی مانگیں جو دوران حج میں تمہارے دلوں میں کھٹکے' جن کا تم سے ارتکاب ہو گیا۔ جو غصے میں تمہاری زبان پر آگئیں۔ اگرچہ معمولی ہوں کیونکہ ان سے تمہیں روکا گیا تھا۔ حکم تھا کسی شہوانی فعل کو سوچو بھی مت۔ کسی بدفعلی کا ارتکاب نہ ہو اور کسی سے غصے کی بات نہ کرو۔

یوں اسلام' دوران حج مسلمانوں کے سلوک اور طرز عمل کو درست کر دیتا ہے۔ ایک امت اور ایک ملت کے تصور پر' جس میں کوئی طبقاتی امتیاز نہ ہو۔ جس میں کسی قوم اور قوم کے درمیان کوئی فرق نہ ہو' جس میں لسانی بنیادوں پر لوگوں کے درمیان امتیازات نہ ہوں۔ جس میں وطن کی بنیاد پر قوم' قوم سے جدا نہ ہو جاتی ہو۔ غرض مسلمانوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ ہر چیز سے استغفار پڑھیں جو انہیں اس بلند اور پاکیزہ تصور زندگی سے دور پھینک دیتی ہو۔

فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ

"پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو' تو جس طرح پہلے اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرتے تھے' اسی طرح اب اللہ کا ذکر کرو' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ (مگر اللہ کے یاد کرنے والے لوگوں میں بھی بہت فرق ہے) ان میں سے کوئی تو ایسا ہے جو کہتا ہے اے ہمارے رب! ہمیں دنیا ہی میں سب کچھ دے دے۔ ایسے شخص کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور کوئی کہتا ہے اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی۔ اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا' ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے اور اللہ کو حساب چکاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔"

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا' اختتام حج کے بعد عرب سوق عکاظ' مجنہ اور ذوالمجاز نامی بازاروں کو جاتے۔ یہ بازار صرف خرید و فروخت ہی کے بازار نہ تھے' بلکہ ان میں تقریروں' اشعار اور آباؤ اجداد کی تفاخر کا بھی مقابلہ ہوتا۔ ان بازاروں میں ہر شخص اپنا نسب نامہ بیان کرتا۔ اس وقت عربوں کی حالت یہ تھی کہ ان تفاخر اور کارہائے نمایاں کے بیان و اظہار کے علاوہ عربوں کے پاس کوئی پروگرام ہی نہ تھا۔ ان کے پاس کوئی انسانی مشن نہ تھا جس کی راہ میں وہ اپنی عظیم قوت گویائی اور بلاغت اور عظیم عملی قوتوں کو کام میں لاتے۔

عربوں کو بلند تر انسانی مشن تو صرف اسلام نے دیا ہے۔ اسلام سے پہلے ان کی حالت یہ تھی کہ نہ زمین پر ان کا کوئی پروگرام ہے اور نہ آسمانوں پر ان کا کوئی ذکر یا مقام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حج سے فارغ ہو کر یہ لوگ ان میلوں اور بازاروں میں اپنے قیمتی اوقات اور اپنی قیمتی طاقتوں کو ان لغو اور بے کار باتوں میں صرف کرتے۔ اپنے حسب و نسب بیان کرتے' اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے یاد کرتے۔ اور تفاخر و مباہات کے ساتھ...... لیکن جب اسلام آیا اور انہیں ایک عظیم نصب العین دیا گیا' انہیں زندگی کا ایک جدید تصور دیا گیا' بلکہ انہیں ایک نیا جنم دیا گیا تو وہ بامقصد اور بامراد قوم بن گئے۔ قرآن کریم انہیں صرف وہ تعلیم دیتا ہے جس میں ان کی بھلائی ہے۔

مناسک حج ادا کر چکنے کے بعد' اب اسلامی تعلیم پر کہئے کہ آباؤ اجداد کے تذکروں کی بجائے اللہ تعالیٰ کو یاد کرو فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا "پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو' تو جس طرح پہلے اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرتے تھے' اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔"..... "جس طرح پہلے اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرتے تھے۔" ان الفاظ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ کے ذکر کے ساتھ اب بھی آباؤ اجداد کا تذکرہ جائز ہے۔ اس تمثیل میں تنقیدی پہلو ہے اور مقصد یہ ہے کہ اس کام سے بہتر کام میں اپنے اوقات صرف کرو یعنی جس طرح تم پہلے آباؤ اجداد کا تذکرہ کرتے تھے جو ایک فضول حرکت تھی۔ جو کوئی جائز یا مستحسن کام نہیں تھا' اس کو بدل دو۔ اب اللہ کو یاد کرو بلکہ اس سے بھی اللہ کو زیادہ یاد کرو بالخصوص موسم حج میں جبکہ تم نے عام لباس بھی اتار کر ایک خاص لباس پہن لیا ہے۔ اسی طرح آباؤ اجداد پر تکابر و تفاخر کے لباس کو اتار پھینکو۔ صرف اللہ کے ذکر ہی سے انسان کا رتبہ بلند ہوتا ہے۔ آباؤ اجداد کے جائز و ناجائز تفاخر کے ذریعے نہیں۔ اب زندگی کی جدید قدروں کا میزان و معیار تقویٰ ہے۔ خدا کا خوف ہے اور تعلق باللہ ہے۔ اس کا ذکر اور اس کی خشیت ہے۔

اب یہاں انسانوں کو اسلامی میزان اور اسلامی معیار کے مطابق تولا اور پرکھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو انسانوں کی قدریں بتاتا ہے اور ان کے مطابق مختلف لوگوں کی قیمتیں متعین کرکے دکھاتا ہے:

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ "ان میں سے کوئی تو ایسا ہے' جو کہتا ہے: اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں سب کچھ دے دے۔ ایسے شخص کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور کوئی کہتا ہے' اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی' اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا' ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے اور اللہ کو حساب چکاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔"

لوگوں میں دو نقطہ ہائے نظر ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جس کے پیش نظر صرف دنیا ہے۔ اسے حصول دنیا کا بے حد شوق ہوتا ہے۔ ہر وقت دنیاوی امور ہی میں مصروف رہتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے حامل لوگ بھی حج کے موقعہ پر آیا کرتے تھے' ان لوگوں کی دعائیں کچھ اس قسم کی ہوا کرتی تھیں: "اللہ! اس سال کو بارشوں کا سال بنائیے' تروتازگی کا سال بنائیے' اچھی اولاد کا سال بنائیے وغیرہ۔ یہ لوگ اپنی دعاؤں میں آخرت کا ذکر تک نہ کرتے تھے۔

حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت ایسے ہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے' لیکن اس آیت کا مفہوم عام ہے اور ہمیشہ کے لئے ہے۔ کیونکہ ہر نسل اور ہر علاقے میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں۔ وہ لوگ جن کے پیش نظر صرف دنیا ہی دنیا ہوتی ہے اور یہ لوگ جب اللہ تعالیٰ سے بھی کچھ مانگیں تو بھی دنیا ہی مانگتے ہیں۔ کیونکہ ان کا شغل ہی دنیا میں ہوتا ہے۔ ان کے دل و دماغ پر دنیا ہی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اور دنیا اس کی ذات کی گہرائیوں تک اتر چکی ہوتی ہے۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ان کا پورا حصہ اس دنیا ہی میں عطا کر دیتا ہے۔ اگر ان کے لئے یہاں کچھ مقرر ہو' ان کے مقدر میں ہو' اور آخرت میں تو ایسے لوگوں کا کچھ حصہ نہیں ہے۔ مطلقاً کچھ نہیں۔

دوسرا گروہ ایسا ہے جس کا نقطہ نظر گروہ سابق سے زیادہ وسیع ہے۔ ان کا نفس بلند اور فطرت عظیم ہے۔ یہ لوگ واصل باللہ ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ اچھی دنیا کے طالب بھی ہیں لیکن وہ عالم آخرت میں بھی حصہ چاہتے ہیں۔ اسے بھی صاف بھولے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ گروہ کہتا ہے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ "اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔"

یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے دونوں جہانوں کی بھلائی کے طلبگار ہیں۔ یہ بھلائی کا نام نہیں لیتے۔ اس کی تخصیص نہیں کرتے' یہ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اللہ ان کے لئے جو بھلائی چاہے اختیار کرے۔ وہ مختار ہے اور یہ لوگ اس کے اختیار پر راضی ہیں۔

اس قسم کے لوگوں کو اللہ ضمانت دیتا ہے کہ ان کا حصہ انہیں ضرور ملے گا۔ اس میں دیر نہ ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ بڑی جلدی حساب چکاتے ہیں۔

ان قرآنی تعلیمات کی رو سے دیکھا یہ جاتا ہے کہ ایک شخص کا نقطہ نگاہ کیا ہے؟ لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہو' اپنے تمام امور اس کے سپرد کر دے' اللہ کو اپنا اختیار دے دے' اور پھر اللہ اس کے لئے جو اختیار کرے اس پر راضی ہو' تو ایسے شخص کو دنیاوی بھلائیاں بھی ملیں گی اور آخرت میں بھی خیر ہی خیر اس کے حصے میں ہوگی اور جس شخص نے اپنے پیش نظر صرف دنیا ہی کو رکھا تو ایسا شخص تو آخرت کو ابھی سے کھو بیٹھا۔ اس لحاظ سے پہلا شخص ہر لحاظ سے ظاہری حساب کے لحاظ سے بھی فائدے میں رہا۔ لیکن اللہ کے ہاں تو وہ بہت ہی فائدے میں ہے۔ اس نقطہ نظر والے شخص نے اپنی دعا میں بھی راہ اعتدال کو اختیار کیا ہے اور یہ اسلام کے پیدا کردہ ایک ایسے تصور حیات پر جما ہوا ہے جو نہایت موزوں اور نہایت خوشگوار ہے۔

اسلام اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ ترک دنیا اختیار کرلیں۔ کیونکہ انہیں خلافت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور منصب خلافت انہوں نے اس کرۂ ارض پر سنبھالنا ہے۔ اسلام کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ مسلمان اپنے دنیاوی امور میں بھی اللہ کی طرف متوجہ رہیں۔ وہ اپنے نقطہ نظر کو اس قدر محدود نہ کریں کہ وہ خود دنیا کے محدود دائرے کے اندر محدود ہو کر رہ جائیں۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان کو اس محدود دنیا کی چار دیواری سے آزاد کر دے۔ یوں کہ وہ اس دنیا میں کام بھی کرے' اس سے کام بھی لے۔ مگر اس کے اندر گھر نہ جائے۔ اس کے پنجے سے آزاد بھی رہے۔ وہ یہاں منصب خلافت کے تمام فرائض سرانجام دے۔ لیکن اس کی نظریں افق اعلیٰ پر ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام اہتمامات' وہ تمام سرگرمیاں جن کے فوائد اس دنیا تک محدود ہوں' ان پر اگر ایک انسان' ایک مومن انسان اسلامی تصور حیات کے مقام بلند سے ایک حقارت آمیز نظر ڈالے تو وہ سب کچھ اسے حقیر ذلیل اور بے وقعت نظر آئے گا بشرطیکہ وہ اسلامی تصور حیات کی بلند چوٹی پر پہنچا ہوا ہو۔

مناسک حج اب ختم ہوتے ہیں۔ جملہ مناسک حج ادا کئے جا چکے' تو اب ذکر الٰہی کی طرف توجہ کرو۔ خدا خوفی کی راہ اختیار کرو۔ اللہ ہی اللہ کیا کرو۔ وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَعْدُودَاتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقَى وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ "یہ گنتی کے چند روز ہیں جو تمہیں اللہ کی یاد میں بسر کرنے چاہئیں۔ پھر جو کوئی جلدی کرکے دو ہی دن میں واپس ہو گیا تو کوئی حرج نہیں' اور جو کچھ دیر زیادہ ٹھہر کر پلٹا تو بھی کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ یہ دن اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کئے ہوں۔ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمہاری پیشی ہونے والی ہے۔"

راجح بات یہ ہے کہ ایام ذکر یوم عرفہ' یوم نحر اور پھر ایام تشریق ہیں۔ ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ ایام معدودات سے مراد ایام تشریق ہیں۔ عکرمہ ؓ کہتے ہیں کہ معدود دنوں میں ذکر سے مراد وہ تکبیریں ہیں جو ایام تشریق میں ہر فرض نماز کے بعد پڑھی جاتی ہیں۔ اللہ اکبر' اللہ اکبر۔ پہلے ہم عبدالرحمٰن ؓ بن معمر دیلمی کی حدیث نقل کر آئے ہیں کہ "منیٰ کے دن تین ہیں۔ اب اگر کوئی دو ہی دنوں میں شتاب واپس ہو گیا تو بھی کوئی حرج نہیں ہے اور اگر کوئی تاخیر کرکے پورے وقت کے بعد آئے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ غرض عرفہ' حج اور ایام تشریق سب میں مناسب ہے کہ اللہ کا ذکر زیادہ سے زیادہ ہو' چاہے ان میں پہلے دو دنوں کو منتخب کیا جائے یا دوسرے دو دنوں کو' لیکن ہر معاملے میں خدا خوفی اور پرہیزگاری پیش نظر رہے "بشرطیکہ یہ دن تقویٰ کے ساتھ بسر کئے۔" لِمَنِ اتَّقَى۔

حج کی گہما گہمی کی مناسبت سے 'اب یہاں یوم حشر کا ذکر کیا گیا جہاں تمام مخلوق حساب و کتاب کے لئے جمع ہوگی۔ وہاں ایک خوفناک منظر ہوگا لہٰذا اس مقام کی تیاری کرو اور پرہیزگاری کا راستہ اختیار کرو۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ "اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمہاری پیشی ہونے والی ہے۔"

ان آیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے عربوں کے مروجہ حج کو کس طرح ایک اسلامی فریضہ قرار دیا۔ اس کا ربط جاہلیت کے پس منظر سے ٹوٹ گیا۔ اب وہ اسلامی نظام زندگی کا ایک جزو بن گیا۔ اسے بداخلاقیوں اور گندگیوں سے پاک کر دیا۔ اسلام نے زندگی کے تمام معاملات میں یہی طریقہ اختیار کیا ہے' جس رسم' جس عبادت کو بھی باقی رکھا ہے اسے جاہلیت کے شوائب سے پاک کر کے رکھا ہے۔ اس کی وہ شکل بالکل بدل گئی ہے جو ایام جاہلیت میں ہوا کرتی تھی۔ یوں نظر آتا ہے جیسا کہ جدید لباس میں ایک موزوں ٹکڑا۔ اب حج معروف معنوں میں اہل عرب کا ایک عادی اور رسمی فعل نہ رہا بلکہ اب وہ ایک اسلامی عبادت قرار دے دی گئی ہے کیونکہ اب اسلام ہی معیار ہے۔ اسلام ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہے تو کسی مفید رسم کو باقی رکھے۔

☆ ☆ ☆

# درس ۱۳ ایک نظر میں

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کی ہدایات دیں۔ مختلف موضوعات پر قانون وضع کئے گئے ہیں۔ ان ہدایات اور قوانین کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان سے ایک خدائی نظام زندگی وجود میں آتا ہے جو انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔ اس راہنمائی اور اس قانون سازی کے درمیان اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک نظام تربیت بھی عطا کر دیا ہے۔ یہ ایک بہترین نظام اصلاح ہے۔ اس لئے کہ اللہ نفس انسانی کی حقیقت کے بارے میں اس کی ظاہری اور خفیہ رسم و راہوں کے بارے میں سب سے زیادہ علم رکھتا ہے اللہ تعالیٰ نفس انسانی کے ہر پہلو کو لیتا ہے۔ اور مختلف انسانوں کی ایسی تصویر بناتا ہے' جس کے خدوخال بالکل واضح ہوتے ہیں۔ جس میں تمام مطلوبہ خصائص واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ جب انسان الفاظ کی اس تصویر کو آئینہ دماغ میں رکھ کر' انسانوں کی بھیڑ میں ان اوصاف کے حاملین کی تلاش میں نکلتا ہے' تو یوں لگتا ہے کہ گویا وہ لوگ گلیوں اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں۔ زمین پر دوڑتے پھرتے ہیں اور ایک انسان انگلی رکھ کر بتا سکتا ہے کہ یہ ہیں وہ لوگ جن کا تذکرہ قرآن نے کیا ہے۔

اس سبق میں انسانوں کی دو اقسام کے واضح خدوخال بیان کئے گئے ہیں۔ یہ اقسام عام طور پر انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ پہلی قسم نمائش' شریر اور زبان دراز لوگوں کی ہے۔ ایسا شخص اپنی ذات کو پوری زندگی کا محور بنا لیتا ہے۔ ایسا شخص بظاہر بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے' لیکن جب اندرون کھلتا ہے تو گندگی ہی گندگی ہوتی ہے۔ اسے جب اصلاح احوال اور خدا خوفی کی طرف دعوت دی جائے تو حق کی طرف نہیں آتا۔ اپنی اصلاح نہیں کرتا' اپنے وقار کا خیال اسے گناہ پر جما دیتا ہے۔ اپنے غرور کی وجہ سے وہ سچائی اور بھلائی سے منہ پھیر لیتا ہے وہ کھیتوں کو غارت کرتا ہے اور نسل انسانی کو تباہ کرتا ہے۔

دوسری قسم ان مومنین صادقین کی ہے جو اپنی پوری ہستی کا سودا رضائے الٰہی کے حصول کے عوض کر لیتے ہیں۔ پوری زندگی بیچ دیتے ہیں۔ اس کا کچھ حصہ بھی رہنے نہیں دیتے۔ اپنی سعی اور عمل' اپنی تمام تگ و دو میں' وہ اپنا کوئی حصہ نہیں رکھتے۔ وہ اپنے آپ کو فنا فی اللہ کر دیتے ہیں اور ہمہ تن اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

انسانوں کے یہ دو معیاری نمونے پیش کرنے کے بعد اب مسلمانوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ کسی تردد' کسی جھجک' مطالبہ خوارق و معجزات کے بغیر پورے کے پورے دین اسلام میں داخل ہو جائیں۔ بنی اسرائیل کی طرح نہ بنیں' جنہوں نے قدم قدم پر خوارق و معجزات کا مطالبہ کیا' اللہ کی اس نعمت یعنی اسلامی نظام زندگی کی نعمت کو چھوڑ کر کفر کا راستہ اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :" پوری طرح اسلام میں داخل ہو جاؤ۔" اشارہ اس طرف ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور تمہیں اپنی پوری زندگی کو اس نظام میں ڈھالنا ہے۔ اس نظام پر عمل کرنا ہے۔ (تفصیل آگے آ رہی ہے)

ایمان کی نعمت عظمیٰ اور مسلمانوں پر اس کی امن و آشتی کی چھاؤں کے مقابلے میں' کفار کے غلط نقطۂ نظر کی ایک جھلک بھی دکھائی جاتی ہے۔ یہ لوگ اپنے ناقص تصور زندگی کی وجہ سے مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ لیکن بتا دیا جاتا ہے کہ اللہ کے نزدیک کس کی کیا قدر (Value) ہے۔ "مگر قیامت کے روز پرہیزگار لوگ ہی ان کے مقابلے میں عالی مقام ہوں گے۔"

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ لوگوں کے درمیان اختلاف رائے کس طرح پیدا ہو گیا اور یہ کہ اس کا حل صرف یہ ہے کہ وہ معیار حق کی طرف پلٹیں اور اسے اپنا حکم تسلیم کریں۔ بتایا جاتا ہے کہ حق کا یہ معیار اللہ کی کتاب ہے' جو نازل ہی اس لئے کی گئی ہے تاکہ لوگوں کے

درمیان حق کے بارے میں جو اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے' اس میں ان کے درمیان فیصلہ کرے۔

اس مناسبت سے بتادیا جاتا ہے کہ اس معیار حق کتاب اللہ کے حاملین کی راہ میں بے شمار مشکلات ہیں۔ امت مسلمہ کو بتایا جاتا ہے کہ اس کی راہ میں سختیاں ہیں' مصیبتیں ہیں' نہ صرف تمہاری راہ میں بلکہ تاریخ انسانی میں جس جماعت نے بھی اس امانت کا بوجھ اٹھایا' اس کا حال یہی رہا ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو اس بار امانت کے اٹھانے کے لئے تیار کر سکے۔ جسے بہرحال اس نے اٹھانا ہے۔ اور تاکہ وہ خوشی خوشی اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار ہو' اطمینان کے ساتھ۔ جب بھی فضا میں خطرات کی آلودگی ہو' جب بھی اسے یہ نظر آتا ہو کہ صبح دور ہے' وہ اللہ کی نصرت کے بارے میں پرامید رہے۔

اس سبق میں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی جماعت کی ٹریننگ اور تربیت کے لئے قانون سازی کے ساتھ ساتھ اسلامی نظم و تربیت بھی سکھایا جا رہا ہے۔ اس تربیت کے مختلف پہلو بیان کئے جاتے ہیں جن کا زمزمہ نہایت خوشگوار اور پرتاثیر ہے اور یہ سب کچھ ان ہدایات و وضع قوانین کے اثنا میں ہو رہا ہے جن سے اسلامی نظام بنتا ہے جو انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

# درس ۱۳ تشریح آیات (۲۰۴ تا ۲۱۴)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿٢٠٤﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى
سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ
الْفَسَادَ ﴿٢٠٥﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ
جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٢٠٦﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ
مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠٧﴾

انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے۔ مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمن حق ہوتا ہے۔ جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے' تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لئے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے' کھیتوں کو غارت کرے اور نسلوں کو تباہ کرے۔ حالانکہ اللہ (جسے وہ گواہ بنا رہا ہے) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو' تو اپنے وقار کا خیال اسے گناہ پر جما دیتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے تو بس جہنم ہی کافی ہے۔ اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ دوسری طرف انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔"

نفس انسانی کے یہ عجیب خدوخال' کسی ماہر فن عکاس کی قلم سے ہیں اور یہ اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ یہ کلام کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ یہ تصویر کسی انسان کی بنائی ہوئی نہیں ہے۔ اس کلام اور اس نفسیاتی عکاسی کا سرچشمہ انسانی دماغ ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی انسان اس قدر مختصر الفاظ میں' اتنی مختصر عکاسی کے ساتھ' اس طرح انسانی نفسیات کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور نفس انسانی کے ایسے گہرے خدوخال سامنے نہیں لاسکتا۔ جو اس قدر وسیع بھی ہوں اور اس قدر واضح بھی۔

اس کلام کا ہر لفظ تصویر کی ایک لکیر ہے' جو انسان کے کسی خدوخال' کسی خصوصیت کا اظہار کرتی ہے' جلد ہی یہ نقش و نگار چلتے پھرتے زندہ انسانوں کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ جس کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ وہ ایک الگ شخصیت بن جاتی ہے' جس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ لاکھوں انسانوں میں سے' اسے الگ کیا جاسکتا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہے وہ شخص جس کی مصوری قرآن نے کی ہے۔ الفاظ میں تصویر کشی بھی ایک قسم کی تخلیق ہے جس طرح زندہ چیزیں دست قدرت سے' رات اور دن پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

اب یہ زندہ شخصیت ہے۔ گویا بھی ہے اور چلتی پھرتی ہے۔ اور اس کی ذات نیکی کا خلاصہ اور اخلاص کا پتلا ہے۔ محبت و یکسوئی کا نمونہ اور بلند ہمت ہے' بھلائی و نیکی اور طہارت و پاکیزگی کی ایک تڑپ ہے۔ جو اس کے اندر پائی جاتی ہے۔

اور یہ دوسری شخصیت جس کی باتیں بھلی معلوم ہوتی ہیں جو بہت زبان دراز ہے۔ اس کی آواز کڑاکے دار ہے' بات کرتا ہے تو

بھلائی، نیکی اور اصلاح کی بات کرتا ہے۔ اپنی نیک نیتی پر اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہے تاکہ اس کی بات زیادہ موثر اور واضح ہو۔ اور اس کی یکسوئی اور خلوص میں شبہ نہ ہو' اس سے بظاہر نیکی اور خدا خوفی کا اظہار ہو' حالانکہ یہ شخص فی الحقیقت اللہ کا بد ترین دشمن ہے۔ اس کا نفس کینے اور جھگڑے سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں محبت اور شرافت کا ہلکا سا پرتو بھی نہیں یہ محبت و بھلائی سے یکسر محروم ہے۔ احسان و ایثار اس میں نام کو نہیں۔

اس شخص کا ظاہر اس کے باطن سے الٹ ہے۔ اس کا عیاں اس کے نہاں سے دور ہے۔ وہ جھوٹ کو بڑی چابکدستی سے سچ کا رنگ دے سکتا ہے لیکن جب عمل کا میدان آتا ہے تو وہ یہاں عیاں ہو جاتا ہے۔ حقیقت پردے سے باہر آجاتی ہے اور اس کا شر و فساد' اور اس کا فتنہ و شر کھل کر سامنے آجاتا ہے اس کی دشمنی اور کینہ پروری عیاں ہو جاتے ہیں وَ إِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ "جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اسی لئے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے' کھیتوں کو غارت کرے' اور نسل انسانی کو تباہ کرے۔ حالانکہ اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

جب وہ کسی عملی کام کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کا رجحان شر و فساد' سنگدلی اور ظلم کی جانب ہوتا ہے۔ ہر معاملے میں سخت جھگڑالو۔ وہ کھیتوں کو غارت کرتا ہے' کھیتوں کے پھل' سبزیاں اور روئیدگی و سرسبزی چھین لیتا ہے اور نسل انسانی کو بھی برباد کر دیتا ہے۔

وہ ہر قسم کی بھلائی کا دشمن ہے۔ کھیتوں کو غارت کر دیتا ہے۔ پھل اور سبزیاں اور غلے تباہ ہو جاتے ہیں۔ سرسبزی و شادابی کی جگہ خشکی و ویرانی آبستی ہے۔ اور اس کا غلبہ نسل انسانی کی ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔

زندگی کی ہلاکت سے مراد وہ کینہ و شر اور وہ غدر و فساد ہے' جو اس بد اخلاق شخص کے وجود میں پرورش پا رہی تھی لیکن یہ شخص اسے اپنی چرب زبانی اور شیریں کلامی' نیکی کے مظاہرے اور اصلاح و شرافت اور بھلائی و تقویٰ کی نمائش کے ذریعے چھپائے رکھتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا اور ان مفسدین کو بھی پسند نہیں کرتا جو اس کائنات میں فساد پھیلانے کا موجب بنتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے اس قسم کے لوگ ہرگز پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ ملمع کاری اور یہ پالش کارگر نہیں ہو سکتی' ہاں انسانوں میں کبھی کبھار یہ روغن سازی اور ملمع کاری دھوکہ دے سکتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کو اس قسم کے بد اخلاق اور بدفطرت شخص کی ملمع سازی دھوکہ نہیں دے سکتی۔ ہاں عوام الناس جن کے سامنے خفیہ راز نہیں ہوتے اور ظاہرداری انہیں دھوکہ دے سکتی ہے۔ ان کی نظروں میں ضرور اس قسم کے لوگ کسی قدر وقعت رکھتے ہیں۔

سیاق کلام آگے بڑھتا ہے۔ یہی تصور سامنے ہے کچھ رنگ اور بھرے جاتے ہیں۔ کچھ لکیریں مزید کھنچی جاتی ہیں اور کچھ نشانات اور واضح ہو کر سامنے آتے ہیں وَ إِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ "جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو اپنے وقار کا خیال اس کو گناہ پر جما دیتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے تو بس جہنم ہی کافی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔"

جب اسے اقتدار حاصل ہوتا ہے تو وہ زمین میں فساد برپا کرتا ہے' کھیتوں کو غارت کرتا ہے' انسانی نسل کو تباہ کرتا ہے' تباہی و بربادی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ ایسے شخص کے سینے میں شر و فساد' اور کینہ کا جو لاوا پک رہا تھا وہ پھوٹ کر باہر نکل آتا ہے۔ جب اس قسم کا شخص یہ سب کچھ کرنے لگتا ہے اور اسے نصیحت کی خاطر خدا خوفی کی یاد دہانی کے لئے اللہ کے غضب سے بچنے کے لئے اور اس محسن سے حیا کرنے کے لئے صرف یہ کہا جاتا ہے :"اللہ سے ڈرو" (اتق اللہ) تو وہ سخت بگڑتا ہے کہ کیوں اس کے سامنے یہ جرأت کی گئی۔ یہ بات اسے کیوں کہی گئی' یہ تو بری چیز ہے۔ اسے نیکی کی طرف متوجہ کرنے والے ہیں کون؟ اس پر اعتراض کرنے والوں کو یہ جرأت کیسے ہوئی۔ کیا یہ لوگ اسے

ہدایت دے رہے ہیں چنانچہ اسے اپنے وقار کا خیال' حق پر نہیں' انصاف پر نہیں' بھلائی پر نہیں بلکہ گناہ پر جما دیتا ہے۔ وہ جرم کو عزت سمجھنے لگتا ہے۔ خطا کو صواب سمجھتا ہے۔ گناہ کو نیکی تصور کرتا ہے اور حق کے مقابلے میں اکڑتا ہے۔ گردن فرازی کرتا ہے' اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بزرگ و بڑائی سے اتراتا ہے۔ حالانکہ پہلے خود اس کی حالت یہ تھی کہ یہ اپنی نیک نیتی پر ہر وقت اللہ کو گواہ ٹھہراتا اور ہر وقت بھلائی' نیکی' یکسوئی اور حیا جشمی کا مظاہرہ کرتا۔

یہ ایک آخری (Touch) ہے' جس سے اس تصویر کے خدوخال پورے ہو جاتے ہیں۔ یہ واضح تر ہو جاتی ہے اور اس کی کئی اقسام بھی سامنے آجاتی ہیں۔ یہ تصویر اب زندہ و متحرک مثالوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کسی تردد کے بغیر آپ یہ کہہ سکتے ہیں: "وہ ہے! وہ ہے! وہ ہے جس کی تصویر قرآن مجید نے الفاظ میں کھینچی ہے۔ غرض ایسے لوگ تمہیں زندہ اشخاص کی صورت میں ہر دور میں اور ہر جگہ نظر آئیں گے۔

ان صفات کفر پر جم جانے' گناہ کو وطیرہ بنا لینے' حق کے ساتھ دشمنی اختیار کرنے' سنگدلانہ فساد بپا کرنے اور فسق و فجور پھیلانے غرض ان سب صفات کے مقابلے میں اللہ کا صرف ایک ہی تازیانہ آتا ہے۔ تازیانہ عبرت! جو اس قماش کے لوگوں کے لئے موزوں اور ان کے حالات کے مطابق ہے کیا؟ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ایسے لوگوں کے لئے تو جہنم ہی علاج ہے جو بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔"

کافی ہے ان کے لئے بس' بس یہ کفایت کرتی ہے۔ جہنم جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ جہنم جس میں ایسے مفسدین کو اٹھا کر کے گرایا جائے گا اور شیطان کا تمام لشکر اس میں اٹھا کر کے گرایا جائے گا۔ جہنم جس کی آگ دل کو جلا ڈالے گی۔ جس کی جلن بجلی کی طرح دل سے چیخیں نکال دے گی۔ جہنم جو ہر چیز کو نیست و نابود کر دے گی' جلا کر راکھ کر دے گی۔ جہنم جس کے شعلے خوفناک و غضبناک ہوں گے...... یہ جہنم ہی اس کا علاج ہے' بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

غور کیجئے! اس قدر حقارت آمیز تصویر ہے جہنم کی۔ اس حقیر ٹھکانے کی۔ کس قدر بدحال ہو گا وہ شخص جس کا یہ ٹھکانا ٹھہرے۔ ابھی ابھی دنیا میں یہ شخص اکڑ کر چلتا تھا۔ پھولا ہوا پھرتا تھا اور کبر و غرور کا عالم یہ تھا کہ برائی پر بھی جم جاتا تھا لیکن اب کہاں ہے؟ مقام ذلت میں!

"یہ تو ہے ایک قسم کے لوگوں کی تصویر۔ یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ دوسرا بھی دیکھئے۔ اس دنیا میں کچھ اچھے لوگ بھی تو ہیں۔ ذرا ان نفوس قدسیہ پر بھی نظر ڈالیں۔ ان کے مقابلے میں وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ دوسری طرف انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔"

لفظ یشری کا مفہوم وسیع ہے یعنی فروخت کر دیتا ہے اپنی جان کو' پوری جان کو' پوری کی پوری حوالہ کر دیتا ہے۔ اپنے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑتا' لیکن اس سودے میں قیمت کیا وصول کرتا ہے؟ صرف رضائے الٰہی کی امید۔ اب اس کا نفس اس کا اپنا نہیں رہا ہے۔ نہ نفس کے بعد اس کے لئے کچھ رہ گیا' بے دھڑک اس نے سب کچھ بیچ ڈالا۔ بے خطر سب کچھ دے دیا اور لیا بھی کچھ نہیں۔ تمام پونجی' تمام وجود بیچ ڈالا' اللہ کو دے دیا۔ غیر اللہ کے لئے نفس کا کوئی حصہ بچا کر نہ رکھا گیا۔

ایک تعبیر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنے نفس کو بیچا نہیں' بلکہ خریدا ہے۔ اس کا نفس اغراض دنیاوی کا غلام تھا۔ اس نے اسے خرید لیا۔ خرید کر آزاد کر دیا۔ آزاد کر کے اللہ میاں کے سامنے پیش کیا۔ خالص اللہ کا کر دیا۔ اب اس نفس کے ساتھ کسی کا کوئی حق وابستہ نہیں ہے۔ صرف اللہ کا حق ہے۔ مالک کا حق ہے۔ یہ شخص دنیا کی تمام اغراض' تمام مقاصد کو قربان کر دیتا ہے اور اپنے نفس کو قابض کر کے اللہ کے لئے کر دیتا ہے۔ بعض روایات میں ان آیات کے نزول کا موقعہ بھی بیان کیا گیا ہے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے: "ابن عباس ؓ ' انس ؓ ' سعید بن مسیب ؓ ' ابو عثمان نہدی ؓ ' عکرمہ ؓ اور ایک پوری جماعت صحابہ و تابعین کا کہنا ہے: کہ یہ آیت صہیب ؓ بن سنان رومی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ مکہ مکرمہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ہجرت کی تیاری کرنے لگے۔ لوگوں نے کہا کہ تم اپنی دولت کے ساتھ نہیں جاسکتے۔ اگر جانا ہی چاہتے ہو تو دولت یہاں چھوڑ دو اور انہوں نے ان کی شرائط کے مطابق جان چھڑائی۔ تمام دولت ان کے حوالے کر دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ان کے حق میں نازل فرمائی۔ حضرت عمر ؓ اور آپ کے بعض دوسرے رفقاء کی ملاقات ان سے حرہ کے گردونواح میں ہوئی۔ انہوں نے اس سے کہا: "سودا نفع بخش ہے۔" انہوں نے کہا: "اچھا آپ لوگ ہیں! اللہ آپ کی تجارت میں کبھی خسارہ نہ کرے۔ معاملہ کیا ہے؟" انہوں نے انہیں پورا قصہ سنایا اور اطلاع دی کہ تمہارے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ان سے کہا: "صہیب نے اس سودے میں بہت ہی نفع کمایا ہے۔"

ابن مردویہ ؒ نے محمد ابن ابراہیم ؒ ' محمد بن عبداللہ ؒ ' سلیمان بن داؤد ' جعفر ابن سلیمان ضبعی ' عوف ؒ ' اور ابو عثمان نہدی ؒ کے واسطوں سے حضرت صہیب ؓ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں: "جب میں نے مکہ مکرمہ سے حضور ﷺ کی طرف ہجرت کا ارادہ کر لیا تو مجھے اہل قریش نے کہا صہیب! جب تم آئے تھے تو تمہارے پاس ایک کوڑی نہ تھی' اب تم جاتے ہو تو مال کے ساتھ۔ یہ نہ ہو سکے گا۔ میں نے ان سے کہا: اگر میں اپنی دولت تمہارے لئے چھوڑ دوں تو کیا تم مجھے جانے دو گے؟ انہوں نے کہا: "بڑی خوشی سے۔" میں نے اپنی دولت ان کے حوالے کر دی انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں نکل پڑا۔ مدینہ پہنچا۔ اس ماجرا کی اطلاع حضور ﷺ نے پائی تو آپ ﷺ نے فرمایا: "صہیب خوب کمایا صہیب خوب کمایا۔" دو مرتبہ آپ نے فرمایا۔

چاہے آیت اس واقعے میں نازل ہوئی یا اس واقعے پر حضور ﷺ اور صحابہ نے اسے منطبق پایا۔ لیکن اس کا مفہوم ایک حادثہ ایک فرد کے مقابلے میں بہت ہی وسیع ہے۔ یہ تو ایک نفس کی نفسیاتی کیفیت کی ایک تصویر ہے۔ اس میں لوگوں کی ایک قسم کے خدوخال بتائے گئے ہیں۔ اس کی مثالیں جگہ جگہ ملتی ہیں' دیکھی جاسکتی ہیں۔

یہ دو فیچر ہیں' دو تصاویر ہیں' پہلی تصویر ہر شخص پر منطبق ہوتی ہے جس میں دورنگی ہو' نمائش ہو' چرب زبان ہو' سنگ دل ہو' شریف النفس ہو' سخت جھگڑالو ہو اور اس کی فطرت فاسدہ ہو چکی ہو۔۔۔ دوسری تصویر ہر اس شخص کی ہے جو مومن ہو۔ خالص الایمان ہو' اللہ کے لئے یکسو ہو' اس نے اغراض دنیا کو خیرباد کہہ دیا ہو۔ یہ دونوں انسانوں کے دو معروف نمونے ہیں۔ تخلیق قلم سے ان کی یہ عجیب معجزانہ تصاویر ہیں۔ لوگوں کے سامنے ان دونوں تصاویر کی نمائش ہو رہی ہے۔ لوگ ایک طرف قرآن کے اعجاز بیان پر غور کرتے ہیں اور دوسری طرف اس پر حیران ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس اعجاز سے انسانوں میں فرق کیا ہے۔ ایک ہی انسان ہے مگر مومن اور وہی انسان ہے مگر منافق۔ ایک ہی شکل مگر ذائقہ جدا۔۔۔۔۔ لوگوں کو جتایا جاتا ہے کہ میٹھی میٹھی باتوں سے دھوکہ نہ کھاؤ' محض چرب زبانی کی وجہ سے کسی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر لو' میٹھی میٹھی ذائقہ دار باتوں کے پیچھے حقیقت بھی تلاش کرو۔ نیز الفاظ اور بناوٹی لفاظی' خوش ذائقہ ریاکاری کے پس منظر میں معنی بھی دیکھو اور ساتھ ہی ساتھ بتا دیا کہ ایمانی قدریں کیا ہیں؟

دو تصاویر آئل پینٹنگ (Oil Painting) کی دو چادریں' ایک بدکار منافقت کا نمونہ اور دوسری خالص ایمان کا نمونہ۔ ان کو سامنے رکھ کر' ان کے سائے میں رک کر تحریک اسلامی کو پکارا جاتا ہے۔ اہل ایمان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس نام سے جو ان کا جانا پہچانا ہے: ایمان والو! پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ! شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو! ہوشیار ہو جاؤ! اس بین خطاب کے بعد بھی کہیں پائے خیال پھسل نہ پڑے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱدْخُلُوا۟ فِى ٱلسِّلْمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا۟ خُطُوَٰتِ ٱلشَّيْطَٰنِ ۚ إِنَّهُۥ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٢٠٨﴾ فَإِن زَلَلْتُم مِّنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ ٱلْبَيِّنَٰتُ فَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٠٩﴾

"اے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ جو صاف صاف ہدایات تمہارے پاس آچکی ہیں۔ اگر ان کو پالینے کے بعد بھی تم نے لغزش کھائی' تو خوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔"

اہل ایمان کو بلایا جاتا ہے ایمان کے لقب کے ساتھ۔ صفت ایمان کے ساتھ جو انہیں بہت ہی پیاری ہے' جو انہیں امتیاز بخشتی ہے۔ انہیں اوروں سے ممتاز بناتی ہے۔ جو ان کے اور ان کو پکارنے والے' ان کے اپنے رب کے درمیان واحد رابطہ ہے۔ اہل ایمان کو پکار کر دعوت دی جاتی ہے کہ پورے پورے اسلام میں آجاؤ!

اس دعوت کا پہلا اور ابتدائی مفہوم یہ ہے کہ اہل ایمان کلیتًا' اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ اور ان کا پورا وجود' اپنے چھوٹے اور بڑے سے بڑے معاملے میں' اللہ کے لئے ہو جائے۔ ان کے تصور اور ان کے شعور' ان کی نیت اور ان کے عمل' ان کی خواہش اور ان کی قناعت کا کوئی حصہ بھی آزاد نہ رہ جائے۔ وہ پورے کے پورے اسلام میں آجائیں۔ پورے کے پورے اللہ کے تابع ہو جائیں۔ اور ہر معاملے میں اللہ کے ہوں اور اللہ کے فیصلے پر راضی ہوں۔ وہ اپنی لگام اس ہاتھ میں 'مکمل یقین و اطمینان کے ساتھ تھما دیں جو ان کی قیادت کر رہا ہے۔ اور انہیں پورا پورا یقین ہو کہ ان کا قائد بھلائی' خیر خواہی اور صحیح راہنمائی کے سوا کچھ بھی نہیں چاہتا۔ وہ اطمینان کرلیں کہ جس راہ پر وہ گامزن ہیں' جس منزل کی طرف وہ رواں ہیں وہی حق ہے اور اسی میں دنیا و آخرت کی فلاح ہے۔

اس مرحلے پر' اہل ایمان کو مکمل تسلیم کی دعوت دینے سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ابھی تک مسلمانوں کی صفوں میں ایسے لوگ پائے جاتے تھے جن کے دلوں میں تردد تھا' خلجان تھا جو ابھی تک اس بات پر مطمئن نہ تھے کہ انہوں نے ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے پوری پوری اطاعت کرنی ہے۔ اور یہ کوئی اچنبے کی بات بھی نہیں ہے۔ تحریکات میں ایک طرف اگر مطمئن' پختہ کار اور مطیع فرمان لوگ ہوتے ہیں' تو ساتھ ساتھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن میں کمزوریاں ہوتی ہیں۔ یہ پکار اور یہ دعوت ایسی ہے جو ہر وقت اہل ایمان کو دی جاتی رہے گی کہ وہ مخلص ہو جائیں' یکسو ہو جائیں۔ ان کے دل کی دھڑکنیں' ان کے شعور اور میلانات اللہ کے حکم اور اللہ کے ارادے سے ہم آہنگ ہو جائیں' وہ اللہ کے ہو جائیں جو انہیں ان کے نبی اور ان کے اپنے نظام کی طرف لے جاتا ہے' بغیر کسی تردد' بغیر کسی خلجان کے اور پوری یکسوئی کے ساتھ۔

اور ایک مومن جب اس دعوت کو قبول کرتا ہے' شرح صدر کے ساتھ اور پورے طور پر' تو وہ ایک ایسی دنیا میں قدم رکھتا ہے' جو امن کی دنیا ہے' جو سلامتی کی دنیا ہے۔ وہ ایک ایسے جہاں میں داخل ہو جاتا ہے جو اطمینان کا جہاں ہے۔ جو رضا اور سکون کا جہاں ہے' وہ ایک ایسے عالم میں جا پہنچتا ہے جس میں نہ حیرانی ہے نہ پریشانی' جس میں فساد ہے نہ گمراہی جہاں ہر شخص اور ہر ذی روح کے ساتھ بن پڑتی ہے۔ جہاں وجود اور موجودات کے ساتھ ہم آہنگی ہوتی ہے۔ جہاں نفس انسانی کے خفیہ ترین اور پوشیدہ ترین گوشوں میں بھی سکون ہے اور انسان کی ظاہری اور اجتماعی زندگی میں سکون ہے۔ ایسا عالم جس کی زمین پر امن و سکون اور جس کے ایمان پر بھی اطمینان و قرار

اس سلامتی کا قلب مومن پر پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے خدا اور اپنے رب کے بارے میں ایک صحیح تصور ملتا ہے۔ یہ تصور خالص بھی ہے اور ستھرا بھی۔ یہ کہ وہ واحد معبود ہے صرف اسی کی طرف مومن متوجہ ہوتا ہے اور وہی اس کا قبلہ ہوتا ہے۔ پھر اس پر مومن مستقلاً جم جاتا ہے اس کا دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ نہ اب مختلف راستے رہتے ہیں نہ مختلف قبلے رہتے ہیں۔ اب وہ حالت نہیں رہی جیسا کہ جاہلیت کی بت پرستی میں تھی کہ ایک معبود ادھر سے اس کا پیچھا کر رہا ہے تو دوسرا ادھر سے 'بلکہ اب وہ ایک خدا ہے جس کی طرف وہ نہایت ہی اطمینان 'نہایت ہی وثوق اور نہایت صحت اور نہایت صفائی کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے۔

وہ ایک ایسا الٰہ ہے جو عزیز اور طاقتور ہے 'جو غالب اور قادر ہے۔ جب مومن اس کی طرف پھرتا ہے تو وہ سچائی کی ایک زبردست قوت کی طرف پھرتا ہے 'جو اس کائنات کی واحد قوت ہے۔ اب یہ اطمینان و استراحت کی زندگی بسر کرے گا اور اسے کسی جھوٹی قوت کا کوئی ڈر نہ ہو گا۔ وہ کسی چیز سے خوف نہیں کھائے گا وہ ایسے معبود کی بندگی کرے گا جو عزیز اور طاقتور ہے۔ جو غالب اور صاحب قدرت ہے۔ اس لئے اب اسے کسی چیز کی محرومی کا کوئی خوف نہ ہو گا۔ نہ وہ ایسی طاقتوں سے خوف کھائے گا نہ ایسی طاقتوں سے توقع کرے گا جن کے پاس نہ دینے کی طاقت ہے اور نہ محروم کرنے کی قوت ہے۔

وہ ایک عادل اور حکیم اللہ ہے۔ اس کی قوت اور اس کی قدرت ہی مظالم کے خلاف ضمانت ہے۔ خواہشات نفسانیہ کے خلاف ضمانت ہے 'کھوٹ کے خلاف ضمانت ہے۔ وہ جاہلیت کے بتوں جیسا معبود نہیں ہے۔ جن کے تصور کے ساتھ سفلی جذبات اور شہوات کا تصور لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک شخص اسلام میں داخل ہوتا ہے تو وہ باطل معبودوں کو چھوڑ کر ایک مضبوط ذات کا سہارا لیتا ہے۔ جہاں سے انصاف ملتا ہے 'امن ملتا ہے اور خصوصی رعایت و اکرام حاصل ہوتا ہے۔

وہ ایک ایسا رب ہے جو نہایت مہربان ہے۔ نہایت مشفق ہے 'منعم ہے 'وہاب ہے۔ گناہ معاف کرنے والا 'توبہ قبول کرنے والا ہے۔ وہ مصیبت زدہ کی پکار کو سنتا ہے اور قبول کرتا ہے۔ اس کی مصیبت دور کرتا ہے 'لہٰذا ایک مسلمان اس کے سایہ عطوفت میں مانوس و مامون ہوتا ہے۔ سلامتی میں اور بہرہ مندی میں ہوتا ہے۔ اگر ضعیف ہو جائے تو اس پر رحم ہوتا ہے۔ اگر تائب ہو جائے تو معاف کر دیا جاتا ہے۔

اسلام میں آنے کے بعد ایک مومن کو اسلام سب سے پہلے اپنے اس رب کی صفات سے روشناس کراتا ہے۔ مومن ان صفات کا مطالعہ کرتا جاتا ہے۔ اس صفت میں اسے ایسا مفہوم ملتا ہے جس سے اس کا دل مانوس ہوتا جاتا ہے۔ اس کی روح مطمئن ہوتی چلی جاتی ہے اور اسے اپنے اس معبود کی طرف سے حمایت 'بچاؤ 'مہربانی 'رحمت 'عزت 'شرافت وسکون اور امن کی گارنٹی ملتی ہے۔

سلامتی کے جس نظام میں یہ مومن داخل ہوتا ہے 'اس سے اسے بندے اور خدا کے مابین تعلق کے بارے میں صحیح تصور ملتا ہے۔ نیز یہ نظام خدا اور بندے کے تعلق 'اس کائنات کے ساتھ انسان کے تعلق کے بارے میں صحیح فکر دیتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے سچائی کے ساتھ اس کائنات کی تخلیق کی۔ اس کائنات میں پھر اس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ پورا پورا پیدا کیا۔ پھر اس نے اس کائنات میں انسان کو ایک حکمت کے تحت پیدا کیا۔ اس لئے اسے یونہی آزاد نہ چھوڑ دیا جائے گا۔ اللہ نے تمام کائناتی ماحول کو ایسا بنایا ہے کہ یہ سب کا سب اور اس کی ہر چیز انسانوں کے لئے ممد حیات ہے۔ پھر زمین کے اندر جتنی چیزیں ہیں ان پر انسان کا اقتدار قائم کیا۔ (اللہ کے نزدیک بھی انسان بڑی ذی شرف مخلوق ہے۔ اس زمین پر وہ اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے۔ اس منصب خلافت کے چلانے میں خود اللہ اس کا مددگار ہے۔ اور پھر اس انسان کے اردگرد پھیلی ہوئی یہ کائنات بھی اس کی ہمدم ہے 'اس کے ساتھ مانوس ہے۔ کائنات کی روح انسان کی روح سے ہم آہنگ ہے۔ یہ کائنات بھی اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور انسان بھی اس کی تمجید کرتا ہے۔ کائنات کیا ہے بلکہ ارض وسماوات میں

ایک میلہ ہے جو قادر مطلق نے اس انسان کی فرحت، طبع کے لئے قائم کیا ہے اور اسے دعوت دی ہے کہ وہ اس میلے میں شریک ہو۔ اس کے خلا کو بھر دے اور اس کے ساتھ مانوس ہو جائے۔ اسے کہا گیا ہے کہ وہ اس کائنات عظیم کی ہر چیز کے ساتھ محبت کرے' اس کے ہر انداز کے ساتھ پیار کرے' اس کائنات میں تو بے شمار ہمدم ہیں اور وہ بھی خصوصی دعوت پر اس میلے میں وارد ہیں' غرض کائنات کی سب چیزیں بے جان یا زندہ سب کی سب اس جشن نو بہار اس کے ارکان ہیں اور پیار کی مستحق ہیں۔

آشتی کا یہ نظام مسلمان کو ایک نظریۂ حیات عطا کرتا ہے۔ اس نظریہ کے ساتھ وہ اگر ایک حقیر پودے کو دیکھتا ہے' جسے پانی کی ضرورت ہے اور پھر اسے سیراب کر دیتا ہے' اس کی نشوونما میں معاون ہوتا ہے' اس کی راہ میں حائل مشکلات کو دور کرتا ہے' تو اس نظریۂ حیات کے مطابق محض اس فعل پر بھی وہ ماجور ہو گا۔ کیا حسین نظریہ ہے! کیا ہی قیمتی نظریہ ہے! جو ایک ماننے والے کی روح کو امن سے بھر دیتا ہے۔ وہ اس پوری کائنات کا ہمدم بن جاتا ہے اور ہر موجود کو گلے لگاتا ہے۔ وہ اس طرح بن جاتا ہے کہ ایک قمقمے کی طرح اپنی ہر طرف امن و سلامتی اور رفق و محبت کی ضوپاشی کرتا رہتا ہے۔

پھر اس نظام میں عقیدہ آخرت ہے۔ مومن کی روح اور مومن کی دنیا میں یہ عقیدہ بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس پر سلامتی کا فیضان ہو جاتا ہے۔ اس کی زندگی سے ہر قسم کی بے چینی' پریشانی' مایوسی اور جھنجلاہٹ دور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حساب و کتاب اس دنیا ہی میں ختم نہیں ہو جاتا' ضروری نہیں ہے کہ پوری پوری چیز اس دنیا میں چکادی جائے۔ اصل حساب و کتاب تو عادل مطلق کی عدالت میں ہو گا۔ اس لئے وہ اگر کوئی بھلائی کرتا ہے' اللہ کی راہ میں جدوجہد کرتا ہے اور اس دنیا میں کامیاب نہیں ہوتا اور اسے اس کا کوئی صلہ نہیں ملتا تو اسے کوئی ندامت نہیں ہوتی۔ اسے اس پر کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی کہ اس دنیا میں' دنیا والوں کے معیاروں کے مطابق' اسے کوئی صلہ نہیں ملا' نہیں ملا تو نہ ملے۔ عنقریب اسے اللہ کی میزان کے مطابق مل جائے گا اور پورا پورا۔ جب اس دنیا میں حقوق کی غیر منصفانہ تقسیم ہوتی ہے۔ اس کے منشاء کے خلاف تقسیم ہوتی ہے تو وہ "عدل" کے معاملے میں مایوس نہیں ہوتا' عدالت تو لازماً لگنے والی ہے۔ جس کا افسر رب العباد ہے' جو اپنے عباد پر ظلم و زیادتی کا ارادہ ہی نہیں کرتا چہ جائیکہ ظلم کرے۔

اس دنیا میں ایک مجنونانہ کشمکش برپا ہے۔ اس کشمکش میں بالعموم بلند اقدار پامال ہو رہی ہیں۔ آبروئیں لٹ رہی ہیں۔ بے شرمی اور بے حیائی سے حقوق پامال ہوتے ہیں' لیکن مومن سلامتی و آشتی کے اس نظام حیات میں داخل ہونے والا مومن اس سے دور رہتا ہے۔ یہ عقیدہ آخرت ہی ہے' جو اسے اس گندگی سے دور رکھتا ہے۔ وہ تو آخرت پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ وہاں داد و دہش ہے' وہاں تلافی مافات ہے۔ وہاں عطا و غنا ہے۔ یہ دنیا باہمی مسابقت کا ایک میدان ہے۔ باہمی حسد و منافقت کی ایک جنگاہ ہے۔

زندگی کا یہ تصور قلب مومن پر سکون و سلامتی اور صبر و قناعت کی بارش کر دیتا ہے۔ جب وہ اس دوڑ میں حصہ لینے والوں کی حرکات کو دیکھتا ہے تو یہ اسے بھلی معلوم نہیں ہوتیں۔ انسان میں قدرتاً یہ شعور ہوتا ہے کہ زندگی مختصر ہے۔ فرصت کے لمحات تھوڑے ہیں۔ زندگی کی اس دوڑ میں پھر یہ شعور شدید سے شدید تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اسلامی نظریۂ حیات کا عقیدہ آخرت پیاس کی اس شدت کو کم کر دیتا ہے۔

پھر امن و آشتی کے اس نظام میں' انسان کو وجود میں لانے کی غرض و غایت اور اس کا مقصد تخلیق اللہ کی بندگی اور اللہ کی غلامی کو قرار دیا جاتا ہے۔ وہ پیدا ہی اس لئے ہوا ہے کہ اللہ کی غلامی کرے' حقیقت یہ ہے کہ اس طرح' یہ انسان کی ایک بلند اور روشن افق پر ایک بلند ستارہ بن جاتا ہے۔ اس کا ضمیر اور اس کا شعور بلند ہو جاتے ہیں۔ اس کے اعمال اور اس کی سرگرمیاں بلند ہو جاتی ہیں۔ اس کے وسائل اور اس کے ذرائع پاک ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے تمام اعمال اور تمام سرگرمیوں میں اللہ کا غلام بن جاتا ہے۔ اس کا کمانا اور اس کا خرچ کرنا بھی

عبادت بن جاتے ہیں۔ وہ دنیا میں منصب خلافت حاصل کرتا ہے اور یہاں اسلامی نظام زندگی قائم کرتا ہے تو بھی عبادت کرتا ہے۔ بندگی، عبادت اور غلامی کے اس تصور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مسلم نہ غدار ہوتا ہے نہ بدکار، وہ نہ فریب کار ہوتا ہے نہ دھوکہ باز، نہ ظالم ہوتا اور نہ جبار، وہ حصول مقصد کے لئے ناپاک ذرائع کام میں نہیں لاتا، نہ وہ خسیسانہ وسائل سے کام لیتا ہے۔ وہ منزل تک پہنچنے کے لئے بے تاب بھی نہیں ہوتا۔ وہ عجلت و جلد بازی نہیں کرتا اور وہ اپنے آپ کو دنیاوی مشکلات میں نہیں پھنساتا۔ وہ خالص نیت کے ساتھ مسلسل عمل کے ساتھ، اپنی طاقت کے حدود میں رہتے ہوئے، اپنے نصب العین کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی خوف اور کوئی لالچ اس کے نفس پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ زندگی کے اس سفر کے مختلف مراحل میں سے کسی مرحلے میں بھی وہ بے چین نہیں ہو جاتا۔ اس لئے کہ ہر قدم پر وہ اللہ کی عبادت میں ہوتا ہے۔ وہ ہر خطرے کو انگیز کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہی اس کا مقصد تخلیق ہے۔ غرض وہ ہر سرگرمی اور ہر میدان میں بلندیوں کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اپنے اللہ رب العالمین اور اپنے خالق کی سمت میں۔

مومن کا یہ شعور کہ وہ اللہ کی تقدیر کا ہمدم ہے۔ شاہراہ تقدیر پر گامزن ہے۔ وہ اللہ کی بندگی میں ہے، وہ ارادۂ الٰہی کا عملی مظہر ہے، اس کی روح پر طمانیت کی بارش کر دیتا ہے۔ اس کا پیمانہ دل سکون و قرار سے لبریز ہو جاتا ہے۔ کسی تحیر کے بغیر، کسی بے چینی کے بغیر، کسی جھنجلاہٹ کے بغیر اور مصائب و مشکلات کو خاطر میں لائے بغیر اپنے نشان منزل کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی اعانت اور نصرت سے مایوس نہیں ہوتا۔ اسے یہ خوف بھی نہیں رہتا کہ اس کا نصب العین نظروں سے اوجھل ہو جائے گا یا اس کا اجر ضائع ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ، اللہ کے دشمنوں کے ساتھ برسر جنگ بھی ہوتا ہے لیکن اس کی روح میں ٹھہراؤ اور سکون ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ نہ جاہ و منصب کے لئے لڑ رہا ہوتا ہے، نہ دولت اور غنیمت کے لئے لڑتا ہے اور نہ اغراض دنیا میں سے کسی غرض کے لئے برسرپیکار ہے۔

قلب مومن یہ شعور لئے ہوئے ہے کہ وہ اس پوری کائنات میں سنت اللہ کا ہمقدم ہے۔ اس کا قانون قانون فطرت ہے۔ اس کا رخ اسی سمت ہے جو فطرت کائنات کی سمت ہے۔ پس اس کے اور اقوائے فطرت کے درمیان کوئی تصادم نہیں، حقائق فطرت کے ساتھ اس کی کوئی لڑائی نہیں۔ اس لئے مومن کی فطری قوتیں اور اس کائنات کی قوتیں ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ ان کے درمیان ٹکراؤ کے نتیجے میں یہ قوتیں بکھر نہیں جاتیں۔ منتشر نہیں ہو جاتیں بلکہ اس کائنات کی تمام قوتیں ایک مسلمان کی قوتوں کے ساتھ آملتی ہیں۔ یہ قوتیں بھی اسی روشنی کے ساتھ منزل تلاش کرتی ہیں جس کے ساتھ مرد مومن تلاش کرتا ہے۔ غرض کائنات کی تمام قوتیں اللہ کی سمت میں رواں دواں ہیں اور مرد مومن بھی اس طرف رواں دواں ہے۔

اسلام نے، مسلمانوں کے لئے جو فرائض مقرر کئے ہیں وہ فطری ہیں، فطرت کی تصحیح کے لئے ہیں۔ سب کے سب انسانی طاقت کے حدود میں ہیں۔ ان میں انسان کے مزاج اور اس کے عناصر تکوینی کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اسلام انسان کی قوتوں میں سے کسی قوت کو بھی مہمل رہنے نہیں دیتا، ہر قوت کام میں لگی ہوتی ہے، نشوونما اور تعمیر و ترقی میں اپنا پارٹ ادا کر رہی ہوتی ہے۔ وہ انسان کی روحانی اور جسمانی ضروریات میں سے کسی کو نظرانداز نہیں کرتا، بلکہ وہ بڑی آسانی، بڑی نرمی، بڑی فراخ دلی کے ساتھ انسان کے تمام دواعی فطرت کو پورا کرتا ہے۔ اس لئے ان عبادات پر عمل پیرا ہوتے وقت اسے کوئی پریشانی نہیں ہوتی، بے چینی کا مقابلہ نہیں کرنا ہوتا۔ وہ ان عبادات و فرائض پر اپنی طاقت و قدرت کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے۔ اور بڑی طمانیت قلب کے ساتھ، بڑے روحانی سکون کے ساتھ مسلسل اپنی منزل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ کدھر؟ اپنے خالق معبود کی طرف۔

اسلام، یعنی ربانی نظام زندگی جس معاشرے کو جنم دیتا ہے، وہ معاشرہ بھی امن و سلامتی کا مینار ہے۔ یہ مینار ایک اونچے مقام سے مسلسل امن و آشتی کی ضوپاشی کر رہا ہے۔ یہ معاشرہ اس نظام کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ جس کی کونپلیں اس قیمتی اور حسین نظریۂ حیات کے

شجر سے پھوٹتی ہیں جو قلب مومن میں جاگزیں ہے' یہ معاشرہ حفظ نفس' حفظ آبرو اور حفظ مال کی خدائی تحفظات (Guaranties) کے سائے میں نشوونما پاتا ہے۔

ایسا معاشرہ' جس کے سپوت بھائی بھائی ہوں' ایک دوسرے کے ساتھ پیار کرنے والے ہوں' ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں' ایک دوسرے کا سہارا ہوں اور ایک دوسرے کے ساتھ اجتماعی طور پر ضامن (SocialSureties) ہوں اور جس کا ہر جزو دوسرے اجزاء کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ تاریخ میں ایک بار تو اسلام ایسے معاشرے کو عملاً وجود میں لایا۔ بہت اعلیٰ و اصفیٰ شکل میں' اپنی ترقی یافتہ صورت میں' اسلامی تاریخ کے بعد کے ادوار میں بھی ایسے معاشرے وجود میں آتے رہے جو اپنے معیار کے اعتبار سے بے شک بعض کم رہے' بعض اچھے رہے' لیکن اپنی کمزوریوں کے باوجود وہ ان تمام معاشروں سے اونچے رہے جو کبھی بھی وجود میں آئے' چاہے جاہلیت قدیمہ کے دور میں ہوں' چاہے جاہلیت جدیدہ کے دور میں ہوں بلکہ ان تمام معاشروں سے بھی جو اگرچہ جاہل نہ ہوں' لیکن ان میں جاہلیت کی آمیزش آگئی ہو۔ جو جاہلیت کے ساتھ آلودہ ہو چکے ہیں اور جن کی فکر میں اور جن کے نظم اجتماعی میں صرف دنیاوی تصورات ہی کارفرما ہوں۔

یہ معاشرہ یعنی اسلامی معاشرہ ایسا ہوتا ہے جس کے افراد و اجزاء میں صرف ایک رابطہ ہوتا ہے یعنی نظریۂ حیات کا رابطہ۔ یہ بہت ہی وسیع نظریاتی معاشرہ ہوتا ہے۔ تمام قومیات' تمام ملکی حدود' تمام زبانیں اور تمام رنگ اس کے مقابلے میں پگھل کر فنا ہو جاتے ہیں۔ غرض تمام غلط افکار قومیت' انسانیت' وطنیت اور رنگ و نسل کے تمام فکری فتنے جن کا انسان کی انسانیت کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہوتا وہ سب کے سب پگھل کر اس وسیع الاساس اسلامی معاشرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔

ذرا سنئے! اس معاشرے کے بارے میں اللہ کی ہدایات :"بے شک مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ا۔ اس معاشرے کی بہترین تصویر حضور ﷺ نے ایک مشہور حدیث میں کھینچی ہے :"باہمی محبت' باہمی رحم' باہمی مہربانی کے لحاظ سے' مومنین کی مثال ایک جسم واحد کی سی ہے۔ جسم میں سے ایک عضو بھی تکلیف میں ہو تو تمام جسم بے آرام ہوتا ہے۔ پورا جسم جاگتا ہے اور پورے جسم میں بخار کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔۲۔

ذرا دیکھئے اس معاشرے کے عمومی آداب کیسے حسین ہیں اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمہیں سلام کرے تو اس کو اس سے بہتر طریقہ کے ساتھ جواب دو یا کم از کم ۳۔ اسی طرح "اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر' نہ زمین میں اکڑ کر چل' اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۴۔ بدی کو نیکی سے رفع کر جو بہترین ہو۔ 'تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی' وہ جگری دوست بن گیا۔"۵۔ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں' اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے اور جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں۔۶۔ "اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے گا؟ دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو' اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے رحیم ہے۔۷۔

یہ معاشرہ ایسا ہے جو اپنے کو یہ ضمانتیں (Securities) دیتا ہے :"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے' تو تحقیق کر لیا کرو' کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کئے پر پشیمان ہو۔"

ا۔ سورۃ الحجرات :۱۰۔ ۲۔ روایت امام احمد۔ ۳۔ نساء ۸۶۔ ۴۔ لقمان ۱۸۔ ۵۔ حم سجدہ ۳۴۔ ۶۔ الحجرات ۱۱۔ ۷۔ الحجرات :۱۲

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو"۔ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک گھر والوں کی رضا نہ لے لو' اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج دو۔ ا" ہر مسلمان دوسرے مسلمان پر حرام ہے یعنی اس کا خون' اس کی عزت اور اس کا مال۔"

یہ پاک معاشرہ ایسا ہے کہ اس میں فحاشی نہیں پھیل سکتی۔ اس میں بے حیائی کو پسند نہیں کیا جاتا۔ اس میں فتنے کا رواج نہیں۔ اس میں عریانی نہیں پھیلتی۔ آنکھیں پوشیدہ مقامات جسم کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتیں۔ اس میں لوگوں کی عصمتیں آزاد شہوت رانی سے محفوظ ہوتی ہیں۔ اس میں جنسی خواہشات اور خون اور گوشت کا ملاپ اس طرح آزاد نہیں ہوتا جس طرح نظام جاہلیت میں ہوتا ہے' خواہ جاہلیت قدیمہ ہو یا جدیدہ۔ اس سلسلے میں اس اسلامی معاشرہ پر ربانی ہدایات کی حکمرانی ہوتی ہے اور وہ ہر وقت اپنے رب کی بات سنتا ہے۔ آپ بھی سنیں :"جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحاشی پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۲ "زانیہ عورت اور زانی مرد' دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔ اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو۔ اگر تم اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور ان کو سزا دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔"۳

"اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں' پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں' ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو' اور وہ خود ہی فاسق ہیں۔"۴ "اے نبی مومنین مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں' یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے' جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے' اور اے نبی مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظر بچا کر رکھیں' اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے کہ جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔ وہ اپنے بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے شوہر' باپ' شوہروں کے باپ' اپنے بیٹے' شوہروں کے بیٹے' بھائی' بھائیوں کے بیٹے' بہنوں کے بیٹے' اپنے میل جول کی عورتوں' اپنے لونڈی غلام' وہ زیردست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہو' اس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔ اے مومنو! تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو' توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے۔"۵۔ پھر قرآن مجید خود حضور ﷺ کی عورتوں سے بھی خطاب کرتا ہے جو کرۂ ارض پر پاکیزہ ترین عورتیں تھیں' پاکیزہ ترین گھر' پاکیزہ ترین خاندان میں اور پھر پاکیزہ ترین دور میں۔

"نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔ اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔ نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو' اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو' اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبی سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے۔"۶

ایسے معاشرہ میں بیوی کو خاوند پر اعتماد ہوتا ہے۔ خاوند کو بیوی پر اعتماد ہوتا ہے۔ والدین و سرپرست اپنی حرمتوں اور عصمتوں کے بارے میں مطمئن ہوتے ہیں۔ لوگوں کو اپنے دلوں اور اپنے اعصاب پر اعتماد ہوتا ہے۔ نظروں سے فتنے اوجھل ہوتے ہیں' اس لئے وہ دلوں کو ممنوعات کی طرف کھینچ ہی نہیں سکتیں۔ اس کے مقابلے میں آج کل کے مغربی ممالک کا حال یہ ہے کہ

ا۔ النور ۲۷۔ ۲۔ نور ۱۹۔ ۳۔ نور ۲۔ ۴۔ النور ۳۱۔ ۵۔ الاحزاب ۳۳۔

دز دیدہ نگاہوں کا تبادلہ ہروقت ہوتا رہتا ہے۔اس معاشرے کے افراد کو ہروقت خواہشات کو دبانا پڑتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ کئی قسم کی نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کے اعصاب میں ہروقت تناؤ ہوتا ہے جبکہ اسلام کا پاکیزہ اور عفت مآب معاشرہ ہروقت تھما ہوا ہے۔اس معاشرے پر ہروقت امن' پاکیزگی اور سلامتی کے کشادہ پردوں کا سایہ ہوتا ہے۔

اور سب سے آخر میں یہ کہ معاشرہ ہراس شخص کو جو کام کرنے کی قدرت رکھتا ہے' رزق حلال اور روزگار کی ضمانت دیتا ہے۔ یہ معاشرہ ہر معذور شخص کو شریفانہ زندگی اور مناسب ضروریات زندگی کی ضمانت دیتا ہے۔ جو شخص عفت اور پاکدامنی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے' اس معاشرے میں اس کے لئے جائز نکاح کی سہولتیں ہوتی ہیں۔ اسے صالح رفیقہ حیات ملتی ہے۔ یہ ایسا معاشرہ ہوتا ہے کہ اگر اس کے کسی محلے میں کوئی بھوک سے مرجائے تو وہ تمام محلہ کو اس موت کا قانوناً ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اور ان پر تعزیری سزا عائد کرتا ہے' بعض فقہاء اور قانون دانوں نے لکھا ہے کہ اہل محلّہ کو بطور تاوان اس شخص کی دیت ادا کرنی ہوگی۔

اور پھر ایک نئے پہلو سے دیکھئے' یہ معاشرہ اپنے افراد کو شہری آزادیوں کی ضمانت دیتا ہے۔ اس میں لوگوں کی شرافت' ان کی عزتیں اور ان کے جان و مال ازروئے قانون محفوظ ہوتے ہیں۔ اس بات کی ضمانت خود شارع مطلق رب ذوالجلال دیتا ہے' جو مطاع ہے اور اس معاشرے میں اس کی ہربات قانون ہے۔ لہٰذا اس معاشرے میں محض شک کی بناپر کوئی نہ پکڑا جائے گا۔ کسی کی دیوار پھاند کر کوئی کسی کا حق تنہائی چھین نہ لے گا۔ کوئی شخص کسی کے خلاف تجسس نہ کر سکے گا۔ اس معاشرے میں اگر کسی کا خون بہا تو وہ لغو نہ جائے گا بلکہ قصاص نافذ ہوگا۔ کسی کا مال چوری یا ڈاکے میں نہ جائے گا کیونکہ اس میں حدود نافذ ہیں۔

اور پھر اس معاشرے کا سیاسی نظام شوریٰ (Parliament) تعاون اور آزادی رائے اور ضمانت حق تنقید (نصیح) پر قائم ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں انصاف اور قانون کی نظروں میں سب لوگ برابر ہوتے ہیں۔ اس کا ہر فرد یہ شعور رکھتا ہے کہ اس کے بارے میں ہر قانونی فیصلہ اللہ کی جانب سے ہے۔ اللہ کے قانون کا فیصلہ ہے' اس میں نہ حاکم وقت کا دخل ہے' نہ اس کے کسی حاشیہ نشین کا دخل ہے اور نہ ہی اہل کاران سرکار کے رشتہ داروں کا دخل۔

الغرض پورے انسانی معاشروں میں یہ واحد معاشرہ ہے' جس میں انسان' انسان کے تابع نہیں ہے' بلکہ تمام انسان حاکم ہوں یا محکوم ہر صورت میں اللہ اور اس کی شریعت کے تابع ہیں۔ حاکم ہوں کہ محکوم دونوں اللہ کی شریعت کو نافذ کرتے ہیں' چنانچہ سب کے سب برابری اور مساوات کے ساتھ' پورے ایمان' پورے یقین اور پورے وثوق کے ساتھ' اللہ رب العالمین اور احکم الحاکمین کے سامنے قدم بقدم کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ سب معانی السلم کے مفہوم میں داخل ہوتے ہیں' جو آیت میں استعمال ہوا ہے اور جس میں مومنین کو پورا پورا داخل ہونے کی دعوت دی گئی ہے تاکہ وہ اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیں۔ پورے کے پورے سپرد کردیں۔ اس طرح کہ ان کے لئے ان کے نفس کا کچھ حصہ بھی نہ رہے۔ سب کا سب اللہ کا ہو جائے' اطاعت و انقیاد میں اور تسلیم و رضا میں۔

امن و سلامتی کے اس مفہوم کا صحیح ادراک تب ہی ہوسکتا ہے جب ہم ان معاشروں کا مطالعہ کریں' جو اسلام سے متعارف نہیں ہیں یا اسلام سے متعارف تو ہیں لیکن پھر بھی اس سے بیگانہ ہوگئے ہیں اور دوبارہ نظام جاہلیت کی طرف پلٹ گئے ہیں اور مختلف ادوار میں انہوں نے اپنے لئے مختلف نام اور مختلف عنوان تجویز کئے۔ ان معاشروں کی حالت یہ ہے کہ وہ بے یقینی میں مبتلا ہیں۔ ایمان سے خالی ہیں۔ ان کے افراد نفسیاتی اور اعصابی پریشانیوں اور بے چینیوں کا شکار ہیں۔ یہ معاشرے تہذیبی ترقی کے اعلیٰ معیار تک پہنچے ہوئے ہیں۔ ان میں ساری سہولتیں اپنے انتہا کو پہنچی ہوئی ہیں اور وہ تمام سہولتیں وافر ہیں جنہیں کوئی بھی گم کردہ راہ جاہلی تہذیب ترقی کیلئے ضروری سمجھتی ہو۔

اس مثال کا مطالعہ کیجئے۔ سویڈن دنیا کے تمام ممالک کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ہے جس کے ہر فرد پر قومی دولت سے پانچ سو پونڈ سالانہ خرچ کیا جاتا ہے۔ جہاں ہر آدمی کے لئے علاج و معالجے کی ضمانت حاصل ہے۔ جہاں علاج کیلئے نقد رقم دی جاتی ہے' اور ہسپتالوں میں علاج مفت ہے۔ جہاں ہر مرحلہ تعلیم میں تعلیم بالکل مفت ہے' جہاں ہر طالب علم کو کپڑوں کا الاؤنس دیا جاتا ہے۔ اور لائق طالب علموں کو قرض بھی دیا جاتا ہے' جہاں حکومت تین سو پونڈ شادی الاؤنس دیتی ہے تاکہ گھریلو سامان خریدا جاسکے۔ غرض ان کے علاوہ متعدد سہولیات اور آسانیاں ہیں جو وہاں عوام کو میسر ہیں لیکن اس مادی ترقی اور تہذیبی سہولتوں کے نتائج کیا ہے؟ جبکہ ان فرزندان تہذیب کے دل ایمان سے خالی ہیں۔

اس قوم کا حال یہ ہے کہ آزادانہ جنسی اختلاط کی وجہ سے جسمانی لحاظ سے پوری قوم مسلسل روبزوال ہے۔ آزادانہ جنسی اختلاط' فتنہ انگیز عریانی اور آزادانہ جنسی بے راہ روی کی وجہ سے ہر چھٹی شادی طلاق پر منتج ہوتی ہے۔ا۔ جدید نسل بری طرح منشیات کی عادی ہو چکی ہے۔ ان منشیات کے استعمال سے یہ لوگ اس روحانی خلا کو بھرتے ہیں اور بے یقینی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے عدم اطمینان کا نعم البدل تلاش کرتے ہیں۔ نفسیاتی بیماریاں' اعصابی بیماریاں اور جنسی بیماریاں وبا کی طرح ان کے دماغ' ان کے اعصاب اور ان کی روح پر حملہ آور ہیں اور ہزاروں آدمی ان میں بری طرح مبتلا ہیں۔ اس بے چینی کی انتہا اس وقت ہوتی ہے' جب ایک شخص تنگ آکر خودکشی کا فیصلہ کرتا ہے۔

امریکہ کا حال بھی ایسا ہے بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔ اور روس کے حالات تو اس سے بھی بدتر ہیں۔

یہ تلخی اور بدبختی مقدر ہے ہر اس شخص کے لئے جس کا دل فرحت ایمان سے خالی ہے' بشاشت ایمانی سے خالی۔ ایسا شخص ہرگز امن و سلامتی سے لطف نہیں اٹھا سکتا' جس میں پوری طرح داخل ہونے کی دعوت' مسلمانوں کو دی جارہی ہے تاکہ وہ اس کے سائے میں امن و آرام اور قرار و سکون سے خوش و خرم رہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ "اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں' امن میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو' کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

اس دعوت کے ساتھ ساتھ کہ تم پورے کے پورے' اس امن و سلامتی (اسلام) میں داخل ہو جاؤ' مسلمانوں کو خبردار کیا جارہا ہے کہ تم ہرگز شیطان کی پیروی نہ کرنا۔ کیونکہ راستے دو ہی ہیں۔ ایک اسلام کا' سلامتی کا راستہ اور دوسرا شیطان کے نقش قدم والا راستہ۔ ایک طرف ہدایت کی راہ ہے' دوسری طرف گمراہی کی راہ ہے۔ ایک طرف اسلام ہے' اور دوسری طرف جاہلیت ہے۔ یا اللہ کا راستہ یا شیطان کا راستہ یا اللہ کی ہدایت ہے اور یا شیطان کی غوایت ہے۔ مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے موقف کے فیصلہ کن انداز کو اچھی طرح سمجھے' چنانچہ اس سلسلے میں وہ کسی تردد' کسی حیرانی کو قریب نہ آنے دے اور مختلف راستوں کو دیکھ کر ایک منٹ کے لئے بھی متحیر نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک مومن کو یہ آزادی نہیں دی گئی کہ وہ زندگی کے متعدد نظاموں میں سے کسی ایک نظام حیات کو اپنے لئے چن لئے۔ یا ایک دو نظاموں کے اجزا کو ملا کر ایک تیسرا نظام گھڑ لے۔ اس کے لئے صرف دو راستے ہیں' حق ہے یا باطل' ہدایت ہے یا ضلالت' اسلام ہے یا جاہلیت' اللہ کا نظام زندگی ہے یا شیطان کی گمراہی ہے۔ یہاں اس آیت میں ایک تو اللہ مسلمانوں کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ پورے کے پورے سلامتی کے اس نظام میں آجائیں۔ دوسرے انہیں اس بات سے منع کرتا ہے کہ وہ شیطان کی پیروی کریں۔ یہاں ان

ا۔ یاد رہے کہ ایک فرد بار بار شادی کرتا ہے اس لئے کوئی فرد ایسا نہیں رہتا جس نے کبھی طلاق نہ دی ہو یا طلاق نہ لی ہو۔ الا ماشاء اللہ

کے ضمیر اور شعور کو بیدار کیا جا رہا ہے۔ انہیں شیطان کی جدی عداوت یاد دلا کر چوکنا کیا جا رہا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ شیطان کی تمہارے ساتھ جو دشمنی ہے وہ کوئی پوشیدہ اور چھپی ہوئی دشمنی نہیں ہے۔ یہ بالکل بین اور واضح ہے۔ اسے تو صرف وہ شخص بھول سکتا ہے جو غافل ہو۔ اور غفلت اور ایمان ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

اب بتایا جاتا ہے کہ اگر ان ہدایات اور واضح ہدایات کے بعد بھی تم لغزش کھاتے ہو تو تمہارا انجام اچھا نہ ہو گا۔ فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَٰتُ فَاعْلَمُوٓا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ "جو صاف صاف ہدایات تمہارے پاس آچکی ہیں' اگر ان کے پا لینے کے بعد پھر تم نے لغزش کھائی' تو خوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور حاکم ہے۔"

وہ عزیز ہے اور غالب ہے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ وہ قوت' قدرت اور غلبے کا مالک ہے۔ اگر وہ اللہ کی ہدایات کی خلاف ورزی کریں گے تو انہیں اللہ کی قوت قاہرہ کا سامنا کرنا ہو گا۔ اور وہ حکیم ہے' صاحب حکمت ہے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ اس نے تمہارے لئے جو نظام زندگی تجویز کیا ہے' وہ بہتر ہے اور جس سے اس نے تمہیں روکا ہے وہ دراصل تمہارے لئے برا ہے اور اگر وہ اللہ کے احکام کی پیروی نہیں کریں گے اور اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے نہیں بچیں گے تو انہیں سخت خسارہ ہو گا۔ اس لئے اس تعقیب اور خلاصے کے دونوں جملے دراصل سخت تنبیہ ہیں اور ایک ڈراوا ہے۔

اب یہاں سے تنبیہ و تخویف کے لئے ایک جدید اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اسلام میں پورے پورے نہ آنے اور شیطان کی پیروی اختیار کرنے پر کیا نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ اب خطاب کا انداز ترک کر کے غائب کے صیغے استعمال کئے جاتے ہیں۔

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّآ أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَ
قُضِيَ الْأَمْرُ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿۲۱۰﴾

۲۵
ع ۱۴
۹

"کیا اب وہ اس کے منتظر ہیں کہ اللہ بادلوں کا چتر لگائے' فرشتوں کے پرے ساتھ لئے' خود سامنے آموجود ہو اور فیصلہ ہی کر ڈالا جائے۔ آخر کار سارے معاملات پیش تو اللہ ہی کے حضور ہونے والے ہیں۔"

ھل' کے لفظ کے ساتھ عربی میں ایسا سوال ہوتا ہے جس میں ناپسندیدگی کا اظہار بھی ہو۔ اس کے جواب میں وہ وجوہات بیان کی گئی ہیں جن کی وجہ سے بعض مخاطبین' اسلام کو قبول کرنے میں پس و پیش کر رہے ہیں اور پورے کے پورے اسلام میں داخل نہیں ہوتے۔ وہ کیا وجہ ہے جس کی وجہ سے وہ اسلام کی اس دعوت کو قبول نہیں کرتے؟ وہ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ اسی طرح بغیر کسی وجہ کے انتظار کرتے رہیں گے' اور اللہ تعالیٰ بادلوں کا چتر لگائے آجائے گا۔ فرشتے آجائیں گے؟ بالفاظ دیگر' کیا یہ لوگ اس خوفناک دن کا انتظار کر رہے ہیں' جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ اللہ بادلوں کا چتر لگائے ہوئے آئیں گے اور فرشتے صفیں باندھے ہوئے ہوں گے کوئی بات نہ کرے گا۔ مگر وہ شخص جسے بات کی اجازت ہو گی اور وہ بات بھی درست کر رہا ہو گا۔

اچانک...... ہم اس تہدید آمیز سوال کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ گویا وہ دن پہنچ ہی گیا اور فیصلہ ہو ہی گیا۔ معاملہ ختم ہی ہو گیا۔ لوگوں کے سامنے اچانک وہ منظر آجاتا ہے' جس سے انہیں ڈرایا جا رہا تھا۔ جس کی طرف اشارہ ہو رہا تھا۔

قُضِيَ الْأَمْرُ ("اور فیصلہ ہو ہی گیا") وقت کا فتر لپیٹ کر رکھ دیا گیا۔ فرصت کے اوقات ختم ہو گئے۔ نجات مشکل ہو گئی۔ اب تو گویا لوگ اللہ میاں کے سامنے کھڑے ہیں۔ اس اللہ کے سامنے جس کے آگے سارے معاملات کو پیش ہونا ہے: وَ إِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُوْرُ "تمام امور نے اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔"

یہ قرآن مجید کا ایک انوکھا انداز ہے۔ تمام دوسری تقاریر اور تحریروں سے یہ انداز اسے امتیازی حیثیت دیتا ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ قرآن مجید' چند لمحوں کے اندر اندر اچانک کسی بھی منظر کو زندہ و متحرک صورت میں پیش کرتا ہے۔ انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ گویا وہ اس منظر کے سامنے کھڑا ہے اور وہ دیکھتا ہے' سنتا ہے' اور اپنی آنکھوں سے گویا اس منظر کا معائنہ کر رہا ہے۔

کب تک یہ لوگ پیچھے رہیں گے اور اس سلامتی میں داخل نہ ہوں۔ خوفناک دن ان کے انتظار میں ہے۔ بلکہ وہ اچانک ان پر آنے ہی والا ہے۔ اور سلامتی ان کے قریب ہے۔ دنیا کی سلامتی اور آخرت کی سلامتی' جس دن آسمان پر بادل پھٹے پھٹے ہوں گے اور فرشتے اتر رہے ہوں گے۔ جس دن روح اور ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے' کوئی نہ بولے گا سوائے اس کے جسے رحمان اجازت دے اور جو ٹھیک بات کہے' وہ دن جب اللہ فیصلے کرے گا۔ وہ دیکھو گویا اس نے معاملات چکا دیئے اور سب معاملات کو آخر کار اللہ کے حضور پیش ہونا ہی ہے۔ وَ إِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُوْرُ

اب انداز کلام میں اچانک ایک اور تبدیلی آتی ہے۔ روئے سخن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتا ہے۔ آپ ﷺ سے کہا جاتا ہے کہ ذرا بنی اسرائیل سے تو پوچھئے' بنی اسرائیل ان لوگوں کے سرخیل تھے جو دعوت اسلامی کو قبول کرنے میں متردد تھے اور پس و پیش کرتے تھے۔ اسی سورت میں ان کے بارے میں کہا گیا ہے "اللہ نے بے شمار واضح نشانیاں انہیں دکھائیں لیکن پھر بھی انہوں نے دعوت کو قبول نہ کیا۔ لیکن انہوں نے ایمان کی نعمت اور سلامتی کی نعمت کے مقابلے میں کفر کو اختیار کیا۔ حالانکہ یہ انعامات بذریعہ رسول خود ان کے ہاں بھیجی گئی تھیں۔

سَلْ بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۗ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَإِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾

"بنی اسرائیل سے پوچھو کیسی کھلی کھلی نشانیاں ہم نے انہیں دکھائی ہیں (اور پھر یہ بھی انہی سے پوچھ لو کہ) اللہ کی نعمت پانے کے بعد جو قوم اس کو شقاوت سے بدلتی ہے اسے کیسی سخت سزا دیتا ہے۔"

بات پھر بنی اسرائیل کی طرف پلٹتی ہے اور یہ ایک قدرتی امر ہے۔ ڈرایا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل جیسا موقف اختیار نہ کرو' اس میں تو ہلاکت ہے۔ جو تردد اور انکار حق کا موقف ہے۔ بغاوت اور سلامتی سے دور بھاگنے کا موقف ہے۔ ہٹ دھرمی اور بار بار طلب معجزات کا موقف اور معجزات دیکھ کر بھی بغض و عناد رکھنے اور انکار کرتے چلے جانے کا موقف۔ یہ ہیں وہ مقامات جہاں یہ قدم ڈگمگا سکتے ہیں' پائے استقامت پھسل سکتا ہے' اس لئے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو پہلے سے خبردار کر دیتا ہے' تاکہ مسلمان بنی اسرائیل کی طرح تلخ انجام تک نہ پہنچ جائیں۔

سَلْ بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ "بنی اسرائیل سے پوچھو کیسی کھلی کھلی نشانیاں ہم نے انہیں دکھائی ہیں۔"
سوال سے مراد یہ نہیں ہے کہ حضور ﷺ جائیں اور بنی اسرائیل سے سوال کریں اور وہ پھر کوئی جواب دیں۔ یہ تو اسالیب قرآن

میں سے ایک اسلوب ہے' مقصد یہ یاد دلانا ہے کہ بنی اسرائیل کے سامنے بکثرت معجزات پیش کئے گئے۔ بے شمار کھلی نشانیاں ان کے سامنے آتی رہیں۔ بعض نشانیاں تو ان کی ضد اور مطالبے پر دکھائی گئیں اور بعض معجزات اللہ تعالیٰ نے از خود اس وقت کی کسی مصلحت کی خاطر صادر فرمائے' لیکن کثرت معجزات کے باوجود ان کا طرز عمل کیا تھا' تردد اور وعدہ خلافی' ہٹ دھرمی اور پس وپیش کرنا لیکن مسلسل یہ لوگ امن و سلامتی کے اس سایہ سے دور رہے جو صرف حظیرۂ ایمان پر سایہ فگن ہے۔ ———— اس

پر ایک عام تعقیب آتی ہے وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ اللہ کی نعمت پالینے کے بعد جو قوم اسے شقاوت سے بدلتی ہے' اسے اللہ سخت سزا دیتا ہے۔" یہاں جس نصیحت کا ذکر ہو رہا ہے وہ نصیحت اسلام ہے یا اس سے مراد ایمان کی نعمت ہے۔ دونوں تقریباً مترادف ہیں۔ اللہ کی نعمت کو شقاوت سے بدل دینے کی اعلیٰ ترین مثال تاریخ بنی اسرائیل میں ملے گی۔ جب انہوں نے نعمت کو شقاوت سے بدلا تو اطمینان اور سکون و قرار سے محروم ہو گئے۔ انہوں نے تسلیم و رضا سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا۔ انہوں نے ہمیشہ شک اور تردد کا رویہ اپنایا۔ قدم قدم پر معجزات طلب کرتے رہے۔ ہر مرحلے پر دلائل پوچھتے رہے لیکن نہ معجزات سے انہیں اطمینان ہوا نہ دلائل بینات سے وہ قائل ہوئے۔ نہ انہوں نے اللہ کے نور اور ہدایت سے استفادہ کیا۔ اور "اللہ کے عذاب شدید سے ڈرو"' اس کی اعلیٰ ترین مثال بھی تاریخ بنی اسرائیل ہے۔ اور اس کے انجام بد کا انتظار وہ سب لوگ' ہر دور میں اور ہر جگہ کرتے ہیں جو نعمت اسلام کے مقابلے میں شقاوت اور بدبختی کو اختیار کرتے ہیں اور پھر وہ اس پر فخر کرتے ہیں (تاریخ شاہد ہے کہ ایسے لوگ ایسے ہی انجام سے دوچار ہوئے جس طرح بنی اسرائیل)

انسانیت نے جب بھی اس نعمت عظمیٰ کو بیچ کر شقاوت اور بدبختی حاصل کی' سے آخرت سے بھی پہلے اس کی اس دنیاوی زندگی میں سخت سے سخت سزا دی گئی۔ ذرا کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی اس بدبخت انسانیت کی حالت زار پر تو نگاہ ڈالئے! کیا وہ ایک شدید عذاب میں مبتلا نہیں ہے؟ دیکھتے نہیں کہ وہ ہر جگہ بدبختی اور تلخی ہی پاتی ہے۔ ہر جگہ حیرت و اضطراب کا شکار ہے۔ انسان' انسان کو کھائے جا رہا ہے بلکہ انسان خود اپنی جان اور اپنے اعصاب کو کھائے جا رہا ہے۔ فرد انسانیت کی تلاش میں دوڑتا ہے۔ اور انسانیت فرد کی متلاشی ہے۔ لیکن دونوں خالی سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ غرض عالم انسانیت میں اس وقت ایک مہلک خلا ہے۔ اس خلا کو بعض نام نہاد تہذیب مغرب کے فرزند بھرنے کی کوشش کرتے ہیں' مگر کبھی مسکرات کے استعمال سے اور کبھی منشیات کے کثرت استعمال سے۔ بعض اوقات ان لوگوں سے ایسی حرکات ہو جاتی ہیں کہ انسان حیران ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ بھاگ رہے ہیں اور کوئی خوفناک غول ان کے تعاقب میں ہے۔

فرزندان تہذیب مغرب کی صرف شکل و صورت ہی کا مطالعہ کیجئے۔ یہ عجیب عجیب شکلیں بناتے ہیں' اور پھر ان کی نمائش کرتے ہیں۔ کوئی عورت سر جھکائے ہوئے ہے۔ کسی نے سینہ بالکل ننگا کر رکھا ہے' کوئی منی سکرٹ پہنے ہوئے ہے' کسی نے ایسا ٹوپ بنایا ہے جیسے کوئی حیوان سر پر رکھا ہوا ہے۔ بعض نے ایسی نائیاں باندھ رکھی ہیں' جن پر ہاتھی کی تصویر ہے' ایسی قمیصیں پہنی ہیں جن پر شیر یا ریچھ کی تصویر ہے۔

دراصل ایک نظر دیکھئے! ان کے مجنونانہ رقص' ہیجان انگیز گانے' متکلفانہ طرز زندگی' تقریبات اور مجالس میں شوخ لباس' انوکھی اور جاذب نظر شکلیں بنا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا' اور عجیب و غریب طرح اپنے آپ کو ممتاز کر کے جذبات کی تسکین کرنا۔

ایک نظر ان لوگوں کی بدلتی ہوئی خواہشات پر بھی ڈالئے۔ خواہشات بدل جاتی ہیں' خاوند بدل جاتے ہیں' دوست بدل جاتے ہیں' لباس بدل جاتے ہیں' ہر موسم میں' بلکہ ہر صبح و شام میں۔

یہ سب چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ یہ معاشرہ قلق اور بے چینی اور حیرت و اضطراب میں مبتلا ہے۔ جس میں کوئی اطمینان نہیں ہے۔

جس میں کوئی امن نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان اقوام کی حالت خوفناک حد تک گر گئی ہے۔ چنانچہ لوگ اپنے معاشرے اور اپنی تہذیب سے فرار کی راہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ لیکن افسوس کہ وہ کوئی راہ نہیں پاتے۔ یوں لگتا ہے جیسے فرزندان تہذیب کی روح خالی ہے' خود اپنے سایے سے بھاگ رہے ہیں' گویا کہ جنات اور بھوت ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔

کیا یہ عذاب الٰہی نہیں ہے۔ یقیناً یہ عذاب ہے اور ہر اس شخص کے لئے ہے جو اسلامی نظام زندگی اختیار نہیں کرتا۔ جو اللہ کی یہ پکار نہیں سنتا يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً "اے ایمان لانے والو! امن و سلامتی میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے۔"

غرض اللہ کے انعامات پر پختہ یقین کسی چیز سے بھی نہیں بدلتا۔ الا یہ کہ کسی کو خداوند کریم کا یہ عذاب گھیر لے تو یقیناً پختہ ایمان ختم ہو جاتا ہے۔ العیاذ باللہ۔

اس سے پہلے بیان ہوا کہ جو لوگ دعوت اسلامی قبول کرنے میں پس و پیش کر رہے ہیں اور نعمت کے مقابلے میں شقاوت اور بدبختی لے رہے ہیں' ایک سخت عذاب ان کے انتظار میں ہے۔ اب یہاں بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی جنت کیا ہے اور ان کا انجام کیا ہو گا اور کافروں کا حال کیا ہے اور ان کا انجام کیا ہو گا؟ بتایا جاتا ہے کہ اشخاص کی قدر و قیمت معلوم کرنے اور احوال اور اقدار حیات کے ناپ تول کے لئے مسلمانوں کا ترازو کیا ہے؟ اور کافروں کا ترازو کیا ہے؟

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا ۘ وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢١٢﴾

"جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے' ان کے لئے دنیا کی زندگی بڑی محبوب و دل پسند بنا دی گئی ہے۔ ایسے لوگ ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں مگر قیامت کے روز پرہیزگار لوگ ہی ان کے مقابلے میں عالی مقام ہوں گے۔ رہا دنیا کا رزق تو اللہ کو اختیار ہے' جسے چاہے بے حساب دے دے۔"

کافروں کے لئے اس دنیا کی حقیر عارضی چیزوں اور چھوٹی چھوٹی ضروریات کو ہی اہم اور مزین بنا دیا گیا ہے۔ یہ چیزیں انہیں اتنی بھلی لگیں کہ وہ انہی کے ہو کر رہ گئے۔ اور آگے نہ بڑھے۔ ان کی نظریں انہی پر ٹک گئیں اور ان سے آگے حقائق تک نہ پہنچ سکیں۔ ان لوگوں کو ان حقیر چیزوں کے علاوہ' بلند اقدار کا علم ہی نہیں ہے اور جو شخص دنیا میں پھنس جاتا ہے' دنیا کی آخری حد پر جا کے ہی دم لیتا ہے۔ ممکن نہیں کہ اس کی عقل و فکر ان بلند مقاصد تک رسائی حاصل کر سکے جو مرد مومن کی توجہ کا مرکز ہیں اور جن کو مومن کی نگاہ بلند نے بہت دور اور بلند آفاق میں پالیا ہے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک مومن بنیادی ساز و سامان کو بالکل ہی نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ دوں ہمت ہے' اس لئے نہیں کہ اس میں حصول دنیا کا جوہر نہیں ہے۔ اس لئے بھی نہیں کہ وہ منفی انداز فکر کا حامل ہے اور دنیا کی ترقی و کمال میں اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے' یہ محض اس لئے ہوتا ہے کہ وہ ایک نہایت ہی بلند مقام سے' اس عارضی دنیا پر نگاہ غلط انداز ڈالتا ہے' باوجود اس کے کہ وہ اس دنیا میں اللہ کا نائب ہے' اس کی دیکھ بھال اس کی ذمہ داری میں ہے۔ وہ اس کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیتا ہے' وہ اس کی تہذیب اور پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرتا ہے' لیکن وہ اس زندگی کی تمام بوقلمونیوں میں سے اپنے لئے اس اعلیٰ مقصد کو تلاش کر کے چن لیتا ہے جو بہت ہی

اعلیٰ ہے' ارفع ہے' اور قیمتی ہے۔ اس کی نگاہ انتخاب اس پر پڑتی ہے کہ اس دنیا کے لئے ایک نظام زندگی چاہئے۔ انسانیت ٹھیکریاں اور خزف تلاش کرتی پھرتی ہے' اس کی راہنمائی اس کان تک کی جانی چاہئے جہاں موتی ہی موتی ہیں۔ لوگوں کے سروں پہ اور زمین کی چوٹیوں پر اللہ کا علم بلند ہونا چاہئے تاکہ انسانیت اس مقام بلند تک ترقی کر سکے۔ انسانیت اس دنیا کی ذلیل و حقیر چیزوں سے نظریں اٹھاکر آگے بھی دیکھے کہ اس قصر دنیا سے آگے اور جہاں بھی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کے دل میں ایمان کی چنگاری نہیں ہے وہ بڑے مقاصد' اعلیٰ نصب العین اور وسعت فکر و نظر سے محروم ہوتے ہیں اور ایسے لوگ ہی دنیا کے غلام ہوتے ہیں اور بندگان دنیا کہلاتے ہیں۔

یہ کوتاہ ہمت اور زمین کی آلائشوں میں گھرے ہوئے بونے قد کے لوگ' یہ دنیاوی اغراض کے بندے اور مطلب پرست' بڑی حقارت سے ایمان داروں پر نظر ڈالتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں نے دنیا کی تمام آلودگیوں تمام کدورتوں اور تمام حقیر ساز و سامان کو ان کفار کے لئے کھلا چھوڑ دیا ہے اور اپنے سینوں میں پاک آرزوہائے عالیہ لئے پھرتے ہیں' ان آرزوؤں کا تعلق ان کی ذات ہی سے نہیں ہوتا بلکہ وہ تمام انسانیت کی آرزوئیں ہوتی ہیں۔ ان تمناؤں کی تعلق ان کا ذات ہی سے نہیں ہوتا' بلکہ یہ ان کے نظریۂ حیات کی تمنائیں ہوتی ہیں۔ اب یہ کفار ذرا اور گہری نظر اور سنجیدگی سے دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ ان آرزوؤں کے حصول کے لئے نہ صرف یہ کہ دنیا کو ترک کئے ہوئے ہیں بلکہ وہ اس جدوجہد میں تھک کر چور چور ہو گئے' وہ ان کی خاطر بڑی سے بڑی مشکلات کا مقابلہ کر رہے ہیں اور ان بونے لوگوں نے جن دنیاوی لذائذ کو زندگی کی روح سمجھ رکھا ہے اور جو ان کا بلند ترین مقصد ہے' ان پر ان اولوالعزم لوگوں نے لات مار دی ہے۔ غرض ایسے حالات میں یہ بونے اور دوسرے درجے کے لوگ ان لوگوں کی زندگیوں پر نظر دوڑاتے ہیں جو صحیح معنوں میں مومن ہیں تو یہ لوگ ان کے مقاصد بلند تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان کی زندگی کے راز کو نہیں پا سکتے۔ تو پھر کیا ہوتا ہے؟ وہ بے اختیار ان سے مذاق کرتے ہیں' ان کے حال پر انہیں ہنسی آتی ہے' پھر وہ ان کے نظریات کا مذاق اڑاتے ہیں اور انہوں نے جو طرز عمل اختیار کر رکھا ہوتا ہے اس پر منہ چڑاتے ہیں زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ يَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا "جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ان کے لئے دنیا کی زندگی بڑی محبوب اور دل پسند بنادی گئی ہے۔ ایسے لوگ ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔"

لیکن جس ترازو میں یہ کفار' زندگی کی قدروں کو تولتے ہیں' وہ حقیقی ترازو نہیں ہے۔ سچائی کا ترازو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے' اور اللہ کے ترازو میں ایمان والوں کا کیا وزن ہے اور کیا قدر و قیمت ہے وَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ "مگر قیامت میں پرہیزگار مومن ہی ان کفار کے مقابلے میں عالی مقام ہوں گے۔"

---

یہ ہے سچائی کا ترازو اور پھر یہ بھی دست قدرت میں۔ اہل ایمان کو چاہئے کہ وہ اپنی قدر و قیمت کا تعین اس ترازو سے کریں۔ وہ منزل کی طرف بڑھتے چلیں اور ان احمقوں کی حماقتوں کی طرف توجہ ہی نہ کریں' مذاق اڑانے والوں کے مذاق کی طرف دھیان ہی نہ دیں' کافروں کی گھٹیا اقدار کو خاطر ہی میں نہ لائیں۔ اس لئے کہ اہل ایمان تو ان کفار کے مقابلے میں' دار آخرت میں بلند مرتبت ہوں گے۔ آخری حساب جب ہو گا تو اہل ایمان کا حساب زیادہ نکلے گا۔ اور اس بات پر اللہ گواہ ہے جو احکم الحاکمین ہے۔

اللہ نے ان کے لئے بھلائی رکھ چھوڑی ہے' وہ رزق سے بھی زیادہ کشادہ ہے یعنی روح کی غذا ہے' وہ یہ دولت انہیں دنیا میں بھی عطا کرے گا اور آخرت میں بھی۔ یا دنیا و آخرت دونوں میں جو وہ مناسب سمجھے کیونکہ وہ مختار ہے' حکیم ہے' وہی سمجھتا ہے کہ ان کے لئے بھلائی کس میں ہے۔ رزق دنیا کی اہمیت ہی کیا ہے وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ "دنیا کا رزق تو اللہ کو اختیار ہے' جسے چاہے بے حساب دے۔"

وہی داتا ہے' جسے چاہتا ہے دیتا ہے' جس پر چاہتا عطیات کی بارش کر دیتا ہے' وہ کبھی کفار کو دنیاوی شان و شوکت دیتا ہے اور یہ اس کی حکمت ہوتی ہے۔ اس میں ان کی کوئی فضیلت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے مختار بندوں کو بھی دنیا و آخرت دونوں میں دیتا ہے۔ ہر قسم کی داد و دہش کا سرچشمہ وہی ہے لیکن برگزیدہ لوگوں کے لئے اس کی پسند بہت ہی اعلیٰ اور دیرپا ہوتی ہے۔

انسانی زندگی میں ہروقت انسانوں کے یہ دونوں نمونے پائے جاتے ہیں۔ بعض ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی قدر و قیمت اپنے فکر و عمل کی قدر اللہ رب العزت سے اخذ کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی صفات اور زمین کی عارضی چیزوں' اور چھوٹے چھوٹے مقاصد سے بلند ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی انسانیت ایک ٹھوس حقیقت ہوتی ہے۔ یہ لوگ زندگی کے حکمران ہو جاتے ہیں' زندگی کے غلام نہیں ہوتے۔ بعینہٖ اسی طرح ایسے لوگوں کے مقابلے میں کچھ دوسرے لوگ ہیں' جن کے لئے دنیا کی زندگی کو محبوب بنا دیا گیا ہے۔ وہ دنیا کے عارضی سازوسامان کے غلام بنا دیئے گئے ہیں۔ وہ بنیادی اقدار کے غلام ہیں۔ یہ لوگ ضروریات زندگی کے دام میں گرفتار ہیں اور دنیا کے اس گندے دلدل میں ایسے پھنسے ہیں کہ اب اس سے نکل ہی نہیں سکتے۔

لیکن اس افتادہ مخلوق خدا کے پاس چاہے جتنا سازوسامان ہو' ان پر مرد مومن ایک نہایت ہی بلند مقام سے نظر ڈالتا ہے۔ اگرچہ اپنی جگہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ خوش قسمت ہیں۔ صاحب فضل و کرم ہیں اور ایمان والے محروم ہیں۔ کبھی تو یہ لوگ ایمان والوں کے ساتھ ہمدردی کرتے ہیں اور کبھی ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ حالانکہ خود وہ ہمدردی کے مستحق ہیں' خود وہ قابل رحم و قابل شفقت ہیں۔

زندگی کی اعلیٰ قدروں کے بیان اور اہل ایمان کے بارے میں کافروں کے موقف کی وضاحت اور خود اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کفار کے وزن اور مقام کے تعین کے بعد' اب اگلی آیات میں وہ اصل کہانی بیان کی جاتی ہے کہ لوگوں کے درمیان تصورات و نظریات اور اقدار و مقاصد کے بارے میں اختلاف رائے شروع کیسے ہوا؟ اور پھر وہ اصول بتا دیا جاتا ہے جس پر اختلاف کرنے والے یہ لوگ ایسے اختلافات ختم کر سکتے ہیں اور عدالت کی وہ ترازو بتائی جاتی ہے جو ان اختلافات کے بارے میں' ان لوگوں کے درمیان' آخر کار فیصلہ دے گی۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۖ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ ۗ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿٢١٣﴾

"ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے' (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہو گئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے۔ اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے' ان کا فیصلہ کرے۔ اختلاف ان لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انہوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد' محض اس لئے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لے آئے' انہیں اللہ نے اپنے اذن سے اس حق کا راستہ دکھایا جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے۔"

یہ ہے وہ کہانی۔ پہلے سب لوگ ایک امت ہی کے افراد تھے۔ ایک تصور زندگی اور ایک ہی طرز عمل تھا۔ یہ اشارہ ہے اس چھوٹے انسانی خاندان کی طرف' جو حضرت آدم علیہ السلام حضرت حوا اور ان کی اولاد پر مشتمل تھا۔ اور ابھی ابن آدم کے درمیان افکار و نظریات کا اختلاف پیدا نہ ہوا تھا۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی کا آغاز ایک چھوٹے سے خاندان سے محض اس لئے کیا کہ انسانی زندگی میں خاندانی نظام معشت اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ ابتدا میں انسانیت پر ایک ایسا دور گزرا ہے' جس میں سب انسان ایک ہی سطح کے تھے' ان کا ایک ہی رخ تھا' ایک ہی نظریہ تھا۔ وہ صرف ایک ہی خاندان کی شکل میں تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ انسان ترقی کر گئے۔ پھر ادھر ادھر بکھر کر بسنے لگے ان کے بود و باش کے طریقوں میں اختلاف ہو گیا۔ ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو خوبیاں ودیعت کی تھیں وہ ظاہر ہونے لگیں۔ یہ خوبیاں اللہ نے تخلیق کے وقت ان کے اندر رکھ دی تھیں۔ کسی میں کم تھیں کسی میں زیادہ۔ اس کی حکمت اللہ ہی کے علم میں ہے اور زندگی کی بوقلمونی کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ کسی میں کچھ استعداد اور کسی کا کچھ رجحان۔

قدرت کی سکیم کے مطابق لوگوں کے درمیان نقطہ نظر کا اختلاف شروع ہو گیا۔ ان کے رجحانات کی سمتیں مختلف ہو گئیں۔ ان کے زندگی کے نظام مختلف ہو گئے۔ ان کے عقائد میں اختلاف پیدا ہو گیا' لہٰذا انسانیت نے اگلے درجے میں قدم رکھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی راہنمائی کے لئے نبی بھیجے جو بشارت دینے والے اور ڈرانے والے تھے وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ "اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے' ان کا فیصلہ کرے۔"

یہاں وہ عظیم حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے یہ کہ لوگوں کے درمیان اختلاف رائے ایک طبعی امر ہے۔ کیونکہ اختلاف ان کی تخلیق کے اصولوں میں سے ایک اصل ہے۔ اس اختلاف ہی کے نتیجے میں وہ سکیم روبعمل آتی ہے جس کی خاطر اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ یعنی زمین پر نیابت الٰہی اور منصب خلافت کے چلانے میں انسان کو مختلف قسم کے فرائض سرانجام دینے تھے' ان کے لئے مختلف قسم کے لوگ اور گوناگوں قابلیتیں رکھنے والوں کی ضرورت تھی تاکہ یہ سب افراد مل کر نظام خلافت کو پوری ہم آہنگی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچائیں اور اس کرۂ ارض کی تعمیر و ترقی کے لئے اللہ تعالیٰ کی تیار کردہ سکیم کو روبعمل لائیں اور ہر شخص اس میں اس کے لئے طے شدہ رول ادا کرے' لہٰذا ضروری ہے کہ مختلف فرائض کی ادائیگی کے لئے لوگوں کی صلاحیتیں بھی مختلف ہوں اور جس طرح انسان کی ضروریات ہیں اسی طرح انسانوں کی استعداد بھی مختلف ہو: وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ "اور یہ لوگ یونہی مختلف رہیں گے۔ ماسوائے ان کے جن پر اللہ رحم فرمائے اور اسی اختلاف کے لئے تو اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے۔"

قابلیتوں اور فرائض کے اس قدرتی اختلاف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان افکار کا اختلاف جنم لیتا ہے' ان کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ ان کا طریقہ کار اور پھر آخر کار ان کا نظام زندگی بدل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ یہ فطری اختلافات مطلوب حد تک ہونے ضروری ہیں۔ البتہ ان اختلافات کو ایک وسیع دائرے کے اندر رہنا چاہئے اور یہ اختلافات تعمیری ہونے چاہئیں اور سیدھے ہونے چاہئیں۔ یہ وسیع دائرہ کیا ہے جس کے اندر یہ محدود ہوں؟ وہ ایمانی تصور حیات کا دائرہ ہے اور یہ اس قدر وسیع ہے کہ مختلف استعداد رکھنے والے لوگ' مختلف طاقتوں کے مالک لوگ' اور مختلف قابلیتوں کے لوگ اس کے اندر پوری ہم آہنگی کے ساتھ کام کر سکتے ہیں۔ ایمانی تصور حیات ان اختلافات یعنی فطری اختلافات کو نہ دباتا ہے اور نہ ہی بالکل ان کا قتل عام کرتا ہے بلکہ ان کو ایک تنظیم میں لاتا ہے اور ہم آہنگ کرتا ہے اور ان سب کے رخ کو اصلاح و ترقی کی شاہراہ کی طرف موڑ دیتا ہے۔

اندریں حالات ایک ایسے معیار کا وجود ضروری ہو گیا تاکہ باہم ٹکراؤ کی صورت میں لوگ اس کی طرف رجوع کریں۔ جو ایک حاکم عادل ہو' جس کے سامنے فریقین پیش ہوں اور جس کا قول قول فیصل ہو' جس کے بعد بحث و تکرار ہی نہ رہے' وہ ایسا ہو کہ سب لوگ اس کے ذریعہ ذوق یقین اپنے اندر پیدا کریں فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا "تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلاف رونما ہو گئے تھے' ان کا فیصلہ کرے۔"

ہمیں چاہئے کہ لفظ بالحق پر غور کریں۔ یہ دراصل اس امر پر قول فیصل ہے کہ حق وہی ہے جو کتاب اللہ میں ہے۔ اور اس حق کو اس لئے اتارا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے مختلف تصورات' ان کے طریقہ ہائے کار اور ان کی اقدار کے لئے بمنزلہ دیانت دار منصف ہے اور تمام اختلافات میں فیصلے کا آخری مقام ہے۔ اس کے سوا سچائی کہیں نہیں ملے گی' اس کے ساتھ کوئی متوازی منصف نہیں ہے' اس کی بات کے بعد پھر کوئی بات نہیں ہے' یہ حق جو ایک اور لاشریک ہے' اس کے بغیر تمام اختلافات اور نظریات میں اسے حکم بنائے بغیر' اور بغیر کسی مزید مقدمہ بازی اور بغیر کسی اعتراض کے اس کے حکم کو حکم آخر تسلیم کئے بغیر اس زندگی کی گاڑی سیدھی پٹڑی پر روانہ نہیں ہو سکتی۔ ہرگز نہیں ہو سکتی۔ لوگوں کے درمیان موجود شدید اختلافات ختم نہیں ہو سکتے۔ زمین پر امن قائم نہیں ہو سکتا اور کسی صورت میں بھی' ان تدابیر کے بغیر' انسان امن و سلامتی میں داخل نہیں ہو سکتا۔

لوگ اپنے تصورات اور قوانین حیات کہاں سے لیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قوانین حیات اور نظام حیات کے سرچشمے کے تعین کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے کتاب اللہ کی اس حیثیت کو تسلیم کیا جائے کہ تمام اختلافات کا آخری فیصلہ کتاب اللہ ہی سے ہو گا۔ نیز یہ کہ یہ دوئی قبول نہیں کرتا۔ اللہ پاک نے اس کتاب کو نازل فرمایا اور حق کے ساتھ نازل فرمایا۔ وہ منبع ایک ہی ہے۔ اس میں تعدد ممکن نہیں اور یہ وہی منبع ہے جہاں سے کتاب اللہ کا نزول ہوا اور اس لئے ہوا کہ وہ اختلافی امور میں قوت فیصلہ ہو' معیار حق ہو۔

وہ کتاب اپنی ماہیت کے اعتبار سے ایک ہی ہے۔ سب رسول اسی ایک کتاب کو لے کر آتے رہے ہیں' لہٰذا تمام آسمانی کتابیں ایک ہی کتاب ہیں اور تمام ملتیں بھی دراصل ایک ہی ملت ہیں اور ان کتب و رسل کے تصورات حیات بھی دراصل ایک ہی ہیں۔ ایک خدا' ایک معبود' تمام انسانوں کے لئے ایک ہی قانون ساز' البتہ مختلف ادوار اور مختلف ملل و نحل اور مختلف طرز ہائے زندگی اور مختلف قسم کے ادوار کے لئے تفصیلی اور جزوی احکام میں قدرے فرق ہوا۔ اور تمام حذف و اضافہ کے بعد آخری مستقل اور مکمل صورت قرآنی تعلیمات اور ان تعلیمات کے ذریعہ زندگی کو بغیر کسی رکاوٹ کے ترقی کی راہ پر آزادانہ طور پر ڈال دیا گیا تاکہ انسانی زندگی اپنے وسیع دائرے میں' اللہ کی راہنمائی اور ہدایت کی روشنی میں' اللہ کی شریعت اور زندہ نظام زندگی کے مطابق اپنے وسیع حدود میں ترقی کرتی چلی جائے۔

کتاب اللہ کے بارے میں قرآن کریم کا یہ فیصلہ ہی دراصل تمام نظریات اور تمام عقائد کے بارے میں صحیح اسلامی نقطہ نظر ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اصل میں ہر نبی اسی ایک دین کو لے کر آیا جو چند بنیادی عقائد یعنی عقیدۂ توحید وغیرہ پر مشتمل رہا ہے لیکن ہوتا یہ رہا کہ ہر امت نے اپنے رسول کے اٹھ جانے کے بعد رفتہ رفتہ اپنے اصل دین سے انحراف اختیار کر لیا اور غلط روایات اور کہانیوں کا ایک ایسا انبار جمع ہوا کہ اس کے اندر دین کے اصل الاصول دب کر رہ گئے۔ لوگ اصل دین سے دور جا پڑے۔ یوں ضرورت پیش آتی ہے کہ ایک جدید رسالت ایک جدید نبی کے ذریعے بھیجی جائے۔

جدید نبی ضرور آتا رہا لیکن دراصل دین اسلام کی تجدید ہی ہوتی رہی۔ خرافات کا جو انبار دین میں داخل ہو چکا تھا یہ رسول اس کی نفی

کرتا رہا اور اس دور کے حالات کے مطابق لوگوں کو ایک قانون دیا جاتا رہا۔ ایک نظام معاشرت کی بنیاد رکھتا رہا تا آنکہ قرآن نازل ہوا اور اب دینی نظریات و عقائد کے بارے میں قرآن کریم ہی لائق اتباع ہے اور حق ہے۔

بعض غیر مسلم علماء جب تدریج مذاہب وعقائد پر بحث کرتے ہیں تو ان کا منہاج بحث یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر نبی کی تعلیمات کو نبی ماقبل سے مختلف ثابت کرتے ہیں' یوں گویا وہ نظریاتی ارتقاء ثابت کرتے ہیں۔ بعض مسلم محققین بھی اس منہج بحث سے متاثر ہوتے جاتے ہیں اور غیر شعوری طور پر وہ بھی ادیان کے اصل نظریات و عقاید میں تغیر و تبدل ڈھونڈتے ہیں۔ یہ انداز بحث مستشرقین اور مذاہب کے بارے میں خود مغرب کے اہل تحقیق اختیار کرتے ہیں۔

ایمان کے اصل تصور میں تسلسل اور ثبات کا یہ نظریہ ہی اس کتاب کا مقصد نزول ہے' جسے سچائی کے ساتھ نازل کیا گیا ہے اور اس لئے نازل کیا گیا کہ وہ لوگوں کے درمیان' ان کے اختلافی مسائل کے بارے میں فیصلہ کرے۔ ہر دور میں' ہر رسول' نبی کے بارے میں اور ابتدائی زمانوں سے لے کر آج تک کے تمام مسائل کے بارے میں کرے۔

اس بات کی ضرورت بھی تھی کہ ایک ایسی ترازو موجود ہو جس کے مطابق سب لوگ اپنے نظریات و عقائد کی قیمت معلوم کریں۔ ایک قول فیصل ہو جس کے بعد بحث ختم ہو جائے' نیز اس بات کی بھی اشد ضرورت تھی کہ اس ترازو اور اس قول فیصل کا سرچشمہ انسانی نہ ہو۔ یہ ترازو اور قول فیصل اس ذات کا ہو جو انسانی خواہشات سے متاثر نہ ہو' وہ انسانی نقائص سے بھی پاک ہو اور اس سرچشمے میں انسان کی طرح جہالت بھی نہ ہو۔ پھر اس قسم کی ترازو قائم کرنے کے لئے لامحدود علم کی ضرورت ہے۔ ہر واقعہ کا علم ضروری ہے' خواہ ہو چکا ہے' ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے۔ یہ علم ہو بھی مطلق یعنی وہ علم نہ زمانے کی قید سے مقید ہو کر ایک ہی چیز زمانے کے اعتبار سے جدا ہو جاتی ہے۔ ماضی' حال اور مستقبل قرار پاتی ہے۔ ایک ہی چیز یقینی' ظنی اور مجہول کہلاتی ہے۔ ایک ہی چیز کبھی حاضر ہوتی کبھی غائب ہوتی ہے۔ کبھی قابل مشاہدہ ہوتی اور کبھی چھپی ہوئی۔ پھر مکان کی قید سے ایک ہی چیز قریب ہوتی ہے' پھر وہی بعید ہوتی ہے۔ کبھی دائرہ نظر میں ہوتی کبھی پس پردہ ہوتی ہے' یا کبھی محسوس ہوتی ہے اور کبھی غیر محسوس ہوتی ہے۔ غرض ایسے اللہ و معبود کے علم کی ضرورت ہے جو یہ جانے کہ کیا پیدا کیا اور کس نے پیدا کیا۔ اسے معلوم ہو کہ کیا مفید ہے اور کیا سب کے لئے مفید ہے۔

اس قسم کی میزان قائم کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ میزان قائم کرنے والا ضروریات سے بے نیاز ہو' نقص سے پاک ہو' فنا سے مبرا ہو' کوئی چیز اس سے بچ نہ سکتی ہو' اور موت اسے لاحق نہ ہوتی ہو' وہ طمع سے پاک ہو' اسے کسی چیز کی رغبت نہ ہو اور نہ کسی کا ڈر ہو۔ وہ اس پوری کائنات پر غالب ہو اور اس کی ہر چیز اور ہر شخص پر حکمرانی ہو' غرض میزان اس اللہ اور معبود کی ہو جو خواہشات سے پاک' ضروریات سے پاک اور اس میں کوئی قصور اور کمی نہ ہو۔

رہی خود انسان کی عقل و دانش' تو اس کے لئے تو یہی کافی ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات پر نظر رکھے' بدلتے ہوئے ماحول پر اس کی نظر ہو' نئی نئی ضروریات اس کے سامنے ہوں اور پھر وہ ان حالات میں ایک متعین وقت اور ایک مخصوص صورت حال میں' ہم آہنگی پیدا کرے' لیکن اس صورت میں جب انسان کے پاس کوئی معیار حق موجود ہو' جس کے ذریعہ انسان اپنی غلطی اور اپنی راستی کا اندازہ کر سکے۔ اپنی راست روی اور کج روی معلوم کر سکے' بر سر حق اور بر سر باطل ہونے کا اندازہ کر سکے اور یہ سب فیصلے اسی معیار کے مطابق ہی ہوں۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس کے مطابق زندگی صحیح ڈگر پر چل سکتی ہے۔ اور لوگ اس بات پر مطمئن ہو سکتے ہیں کہ ان کے امور سیاست و قیادت رب معبود کے ہاتھ میں ہیں۔

یہ کتاب سچائی کے ساتھ اس لئے نہیں اتاری گئی کہ یہ لوگوں کے درمیان سے قدرتی صلاحیتوں کے امتیازات ختم کر دے' متنوع

وسائل حیات کو ختم کر دے' مختلف طور طریقوں اور مختلف تعلیمات کا فرق اور امتیاز مٹا ڈالے بلکہ اس کتاب کا مقصد ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اگر لوگوں کے درمیان کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو حق کے مطابق فیصلہ کر دے۔

اس حقیقت کو اگر صحیح طرح ذہن نشین کر لیا جائے تو اس کے منطقی نتیجے کے طور پر اسلام کا تاریخی نقطہ نظر اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ اسلام اس کتاب کو' جسے اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ نازل فرمایا' لوگوں کے اختلافی امور میں ایک لازمی حاکمیت کا درجہ دیتا ہے۔ وہ اس کتاب کو انسانی زندگی کا اصل الاصول قرار دیتا ہے۔

اب قافلہ حیات کو دیکھا جائے گا کہ اگر وہ اس اصل سے متفق ہے' اس کے مطابق جا رہا ہے' اس اصول پر قائم ہے' تو وہ راہ حق پر ہے۔ اگر قافلہ حیات اس نظام سے نکل جائے اور کچھ دوسرے اصولوں پر چل پڑے' تو معلوم ہو جائے گا کہ اب یہ قافلہ راہ باطل پر گامزن ہو گیا ہے۔

اگر تاریخ انسان کے کسی دور میں تمام کے تمام انسان اس نظام باطل پر راضی بھی ہو جائیں تب بھی وہ اس باطل کو حق میں نہیں بدل سکتے۔ باطل' باطل ہی رہے گا۔ اس لئے کہ لوگ حق و باطل کھرے اور کھوٹے کو معلوم کرنے کا معیار ہی نہیں ہیں۔ وہ حکم نہیں ہیں۔ لوگ اگر از خود کسی بات کا فیصلہ کر لیں تو وہ حق نہیں بن جائے گی اور نہ یہ کہ اگر پوری انسانی آبادی کوئی فیصلہ کر دے تو وہ دین بن جائے گا۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ اگر لوگ کسی بات پر عمل پیرا ہیں۔ اگر لوگ کسی بات کے قائل ہو گئے ہیں' اگر سب لوگ کسی غلط اصول پر اپنی زندگیاں استوار بھی کر لیں تب بھی وہ قول' وہ فعل اور وہ اصول حق میں نہیں بدل جاتا۔ اگر وہ اللہ کی کتاب کے خلاف ہو' لوگوں کا اجتماع اس باطل کو اصول دین میں داخل نہیں کر دیتا' نہ لوگوں کے اس عمل سے وہ اصول دین کی تعبیر و تشریح بن جائے گا۔ ایسی باتوں پر اگر صدیوں عمل ہوتا رہا ہے۔ تب بھی اس کے معنی یہ نہیں کہ اب وہ جائز ہو گئی ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے اور اس کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ اصول دین میں لوگوں نے کئی نئی چیزیں داخل کر دی ہیں اور صرف اس صورت میں ہم ان چیزوں کو دین سے علیحدہ کر سکتے ہیں کہ کتاب اللہ کو حکم مانیں۔ خود اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ مختلف مراحل میں لوگوں نے اصول دین سے انحراف کیا ہے اور یہ انحراف رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا چونکہ ایک عرصہ سے لوگوں کی زندگی کا اجتماعی نظام اس انحراف پر استوار ہو گیا ہے اس لئے اب یہ انحراف ہی اسلامی نظام کی واقعی اور عملی شکل ہے۔ ہرگز نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا۔

اگر تاریخ میں اسلام سے کوئی انحراف ہوا ہے اور تعامل بن گیا ہے تو اسلام اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ یہ انحراف اب بھی ایک غلطی تصور ہو گی۔ اسے حجت نہ سمجھا جائے گا اور نہ وہ کوئی نظیر قرار پائے گا۔ اس لئے جو لوگ نئے سرے سے اسلامی نظام زندگی قائم کرنا چاہتے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ ان تمام انحرافات کو اکھاڑ پھینکیں' ان کو کالعدم قرار دیں۔ اور سب لوگ اس کتاب کی طرف لوٹ آئیں جو نازل ہی اس لئے کی گئی ہے کہ حق کے ساتھ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کرے اور ان کے درمیان حکم ہو۔

جب یہ کتاب آئی تو لوگ ہر طرف سے خواہشات میں گھرے ہوئے تھے۔ لوگوں پر ان کی خواہشات غالب تھیں۔ خوف اور لالچ' مرغوبات اور کمزوری لوگوں کو اللہ کی اس کتاب کی حاکمیت سے دور کئے ہوئے تھی۔ لوگوں نے حق کی طرف لوٹنا چھوڑ دیا تھا۔ محض خواہشات نفسانیہ کی بنا پر وَ مَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ "اختلاف ان لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا' انہوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لئے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔"

بغی سے مراد حسد ہے۔ لالچ میں منافست ہے' حرص میں مقابلہ اور خواہشات نفسانیہ کی حسد ہے۔ غرض یہ حسد اور منافست ہی ہے جس نے لوگوں کو اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام زندگی کے بارے میں اختلافات کو ہوا دینے پر آمادہ کیا۔ لوگ تفرقہ بازی' عناد اور بحث و تکرار میں مبتلا رہے۔

اس اصول کے مطابق مذہبی اختلافات کا تاریخی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اگر اصول دین کے بارے میں کبھی دو آدمیوں کے درمیان کوئی اختلاف ہوا ہے تو دو میں سے ایک کے دل میں حسد ضرور تھا' یا دونوں ہی حسد کا شکار تھے لیکن اگر ان فریقین میں ایمانی قوت موجود ہو تو پھر اتحاد و اتفاق کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ "پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لے آئے انہیں اللہ نے اپنے اذن سے اس حق کا راستہ دکھا دیا' جس میں ان لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔"

اہل ایمان کو اس لئے ہدایت نصیب ہوئی کہ ان کے دل صاف تھے' ان کی روح یکسو تھی' ان کے دلوں میں حق تک پہنچنے کی امنگ تھی۔ اگر حالات ایسے ہوں تو پھر حق تک پہنچنا اور اس پر جم جانا بہت ہی آسان ہو جاتا ہے وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ "اللہ جسے چاہتا ہے' راہ راست دکھا دیتا ہے۔"

وہ راہ کون سی ہے' جس کی طرف یہ کتاب راہنمائی کرتی ہے؟ وہ نظام جو حق پر قائم ہوتا ہے اور حق پر چلتا ہے اور حق پر جما رہتا ہے۔ لوگوں کی خواہشات کے مطابق کبھی ادھر کبھی ادھر نہیں بدلتا۔ انسانوں کی مرغوبات اور ان کے رجحانات کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن کر نہیں رہ جاتا۔

اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس راہ مستقیم کے لئے چن لیتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کون لوگ ہیں جن میں قبولیت حق کی استعداد ہے اور پھر اس پر جم سکتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو سلامتی کی راہ پا لیتے ہیں بلکہ سلامتی کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ غالب ہوں گے۔ اگرچہ دنیا پرستوں کی نظروں میں ان کی کچھ قدر و قیمت نہیں ہوتی اور یہ لوگ محروم تصور ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ دنیا پرست ان کا مذاق اڑاتے ہیں' جس طرح کافر مومنین کا مذاق اڑاتے ہیں۔

اب تک جو ہدایات دی گئیں ان کا مقصد یہ تھا' جماعت مسلمہ کے دل میں ایک مکمل واضح اور جامع تصور حیات قائم ہو جائے۔ یہ ہدایات یہاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اب جماعت مسلمہ کو توجہ دلائی جاتی ہے کہ وہ ذرا ان اہل ایمان کے حالات کا مطالعہ کرے' جو اپنے مخالف دشمنان اسلام' مشرکین اور اہل کتاب کے ساتھ اختلاف رائے رکھتے تھے' پھر ان نظریاتی اختلافات کی وجہ سے ان پر بے شمار مصیبتیں آئیں۔ ان اختلافات کی بنا پر بڑی بڑی جنگیں لڑی گئیں' لوگوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے اور وہ چور چور ہو گئے۔

جماعت مسلمہ کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ یہ سنت اللہ ہے جو زمانہ قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ یوں اہل ایمان کو عام لوگوں سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے اور انہیں جنت میں داخل کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ اس میں داخل ہوں اور اس کے مستحق ہوں۔ سنت اللہ یہ ہے کہ نظریاتی لوگ اپنے نظریات کی مدافعت کریں۔ وہ اپنے عقائد و نظریات کے لئے مشکلات' تکالیف اور دکھ و درد برداشت کریں۔ انہیں کبھی فتح نصیب ہو گی کبھی شکست لیکن وہ ہر حال میں اپنے نظریات پر ثابت قدم رہیں گے' کوئی سختی انہیں متزلزل نہ کر سکے گی۔ کوئی قوت انہیں ڈرا نہ سکے گی۔ مشکلات اور آزمائشوں کے پے در پے حملوں میں وہ ہمت نہ ہاریں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو وہ لوگ اللہ کی نصرت کے مستحق ہو جائیں گے۔ کیونکہ وہ اللہ کے دین کے امین بن گئے ہیں اور جو امانت ان کے سپرد کی گئی ہے اس میں وہ دیانتدار ہیں۔ وہ اس کے بچانے کی قابلیت رکھتے ہیں اور اس لئے وہ جنت کے بھی مستحق ہیں۔

ان کی روحیں خوف سے آزاد ہو گئیں ہیں' وہ ذلت سے آزاد ہو گئے ہیں۔ وہ عیش و آرام کے حریص نہیں رہے۔ بلکہ انہیں اب

خود اپنی زندگی کی بھی کوئی پروا نہیں ہے۔ ایسے حالات میں اللہ کے یہ سپاہی آب و گل کی اس دنیا سے بہت ہی دور ہو جاتے ہیں اور جنت اور خدا کے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ۝

"پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا' حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے' جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں' مصیبتیں آئیں اور ہلا مارے گئے حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی (اس وقت انہیں تسلی دی گئی) ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔"

یہ تھا اللہ تعالیٰ کا خطاب' پہلی اسلامی جماعت سے۔ فرماتے ہیں کہ میری ایک سنت ہے کہ میں اپنے بندوں میں سے جس کے ہاتھ میں اپنا علم پکڑاتا ہوں' جنہیں میں اس دنیا میں اپنا امین بنالیتا ہوں' جن کے ذریعے میں اسلامی نظام قائم کرتا ہوں' اور شریعت نافذ کرتا ہوں انہیں پہلے مصائب کی بھٹی میں ڈال کر ان کی تربیت کرتا ہوں' یہ میری تاریخی سنت ہے۔

ذرا انسانی تاریخ میں اسلامی تحریکات کا مطالعہ تو کرو۔ یہ خطاب صرف مدینہ طیبہ کی پہلی تحریک اسلامی کے لئے مخصوص نہ تھا' بلکہ یہ خطاب ہر اس تحریک کے لئے ہے جسے اللہ تعالیٰ اس کائنات میں یہ عظیم رول ادا کرنے کے لئے منتخب کر لیتا ہے جو اسلامی نظام کے داعی ہوں' ان سے یہ خطاب ہے۔

یہ ایک عظیم' دور رس اور خوفناک تجربہ ہے' رسولوں کا چیخ اٹھنا' رسولوں کے ساتھ مومنین کا پکار اٹھنا' سب کا یک آواز پکار اٹھنا کہ کب آئے گی اللہ کی مدد؟" اس سوال ہی سے ان مصائب و شدائد کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جنہوں نے ان خدا رسیدہ لوگوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا' یقیناً وہ مصائب و شدائد ناقابل برداشت ہوں گے' جنہوں نے ایمان سے بھرے ہوئے ان دلوں کو متاثر کر لیا اور ان کے منہ سے بھی یہ کربناک چیخ نکل ہی گئی: "کب آئے گی اللہ کی مدد؟"

اللہ کی سنت ہے کہ جب ایمان سے بھرے ہوئے یہ دل ان ہلا مارنے والے مصائب کو برداشت کر لیتے ہیں تو پھر اللہ کی بات پوری ہو جاتی ہے اور اس کی مدد آپہنچتی ہے أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔"

ہاں اللہ کی نصرت محفوظ ہوتی ہے' ان کے لئے جو اس کے مستحق ہوتے ہیں اور اس کے مستحق وہ لوگ ہوتے ہیں جو آخر وقت تک ثابت قدم رہتے ہیں۔ جو تنگی اور مصیبت میں ثابت قدم رہتے ہیں جو لوگ مصائب کے مقابلے میں کھڑے رہتے ہیں۔ شدائد کی آندھیوں کے آگے جھکتے نہیں' جنہیں یہ یقین ہوتا ہے کہ صرف اللہ ہی ہے جو امداد و نصرت دے سکتا ہے (اور جب اس کی مشیئت ہوگی وہ نصرت دے گا) حالت یہ ہو جائے کہ مصائب انتہا کو پہنچ جائیں اور اہل ایمان کا کوئی اور سہارا نہ رہے۔ اللہ کے سوا کسی اور نصرت و امداد کا کوئی ذریعہ نہ رہے۔ صرف اللہ ہی کی نصرت باقی رہ جائے اور اہل ایمان بھی صرف اللہ ہی کی طرف نظریں اٹھائے ہوئے ہیں۔

یہ ہے وہ حالت جس کی بنا پر اب تو مومنین داخلہ جنت کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ وہ جنت میں داخل ہوتے ہیں' آزمائش و امتحان کے بعد' صبر و اثبات کے بعد' صرف اللہ کی ہی طرف یکسو ہو جانے کے بعد صرف اللہ کیلئے اپنا شعور خالص کر دینے کے بعد اور اللہ کے سوا ہر چیز

اور ہر سبب کو بھول چکنے کے بعد۔

اسلامی جدوجہد اور اس کے دوران میں مصائب و شدائد پر صبر کے نتیجے میں انسان کو ایک عظیم قوت عطا ہو جاتی ہے۔ انسان کو اپنی ذات پر حاکمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اذیت و معصیت کی بھٹی میں نفس انسانی کے عناصر صاف و شفاف ہو جاتے ہیں۔ اسلامی نظریۂ حیات میں گہرائی' زندگی اور قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ نظریہ زندہ اور تابندہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اس نظریہ کے اعداء کی آنکھیں بھی چکاچوند ہو جاتی ہیں اور یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں پھر دین کے یہ ازلی دشمن بھی فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہونے لگتے ہیں۔

ہر مسئلہ حق میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ آغاز سفر میں حاملین حق کو مشکلات پیش آتی ہیں' لیکن جب وہ ثابت قدمی دکھائیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کے دشمن اور محارب بھی ان کی طرف جھکتے ہیں اور اس نظریۂ حیات کے شدید ترین دشمن اور اس کے طاقتور مخالف بھی ہتھیار ڈالتے ہیں اور اس دعوت کی نصرت اور امداد کرنے لگتے ہیں لیکن اگر یہ نتیجہ نہ بھی نکلے' تو بھی اس سے زیادہ عظیم نتائج نکلتے ہیں۔

دعوت اسلامی کے حاملین کی روح تمام دنیاوی فتنوں' تمام دنیاوی خرابیوں پر غالب آجاتی ہے۔ یہ روح حرص و لالچ اور عیش و عشرت کی غلامی سے آزاد ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں جاکر مرد مومن کو اپنی زندگی کا لالچ بھی نہیں رہتا۔ جب نفس انسانی اس مقام تک پہنچ جائے تو وہ پوری کائنات کو جیت لیتا ہے۔ ان تمام دلوں کو جیت لیتا ہے جو اس مقام تک مشکلات پر غالب ہو کر پہنچتے ہیں۔ یہ وہ نفع ہے جو تمام مصائب تمام سختیوں پر بھاری ہے۔ جو اہل ایمان اس مقام تک پہنچنے کے لئے مصائب برداشت کرتے ہیں' یہ وہ اہل ایمان جو اللہ کے علم کے امین ہیں۔ جو اللہ کے دین' اس کی شریعت اور اس کی امانت کے اٹھانے والے ہیں۔

یہ آزادی ہی اہل ایمان کو' اس جہاں میں داخلہ جنت کے اہل بناتی ہے۔ یہ ہے اصل راہ۔ یہ وہ راہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے روز اول تحریک اسلامی کو دکھائی۔ ہر دور میں اٹھنے والی ہر اسلامی تحریک کے لئے یہی راہ ہے۔

یہی ہے راہ ایمان و جہاد کی راہ' آزمائش و ابتلا کی راہ' صبر و ثبات کی راہ' صرف اللہ وحدہ لاشریک کی طرف رخ۔ پھر دیکھئے کہ کس طرح مدد آتی ہے' پھر دیکھئے کہ انعامات کی بارش کس طرح ہوتی ہے۔

☆☆☆☆

# درس ۱۴ ایک نظر میں

جیسا کہ واضح ہے' سورت کے اس حصے میں احکام کے سوال و جواب کی فضا ہے۔ جیسا کہ ہم آیت **یسئلونک عن الاھلہ** کی تفسیر میں بیان کر آئے ہیں کہ یہ ایک ایسا منظر ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات کس قدر بیدار تھا' جماعت کے افراد کے دلوں پر کس طرح چھایا ہوا تھا اور یہ کہ مسلمان اپنی روز مرہ کی زندگی کے ہر معاملے میں اپنے نظریے کا حکم معلوم کرنے کے لئے کس قدر بے تاب تھے' تاکہ ان کا طرز عمل ان کے نظریۂ حیات کے مطابق ہو اور یہ ایک صحیح مسلمان کی پختہ علامت ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اسلام کا حکم معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ اور وہ اس وقت تک عملی قدم نہ اٹھائے جب تک یہ معلوم نہ کرلے کہ اس بارے میں اسلام کا حکم کیا ہے؟ جس چیز کو اسلام برقرار رکھے وہ اس کا دستور اور قانون بن جائے اور جسے اسلام ترک کردے وہ اس کے لئے ممنوع اور حرام ہو جائے۔ یہ حساسیت دراصل اس نظریہ حیات پر پختہ ایمان کی علامت ہے۔

یہودیوں' منافقین اور مشرکین نے 'اسلام کی بعض اصلاحات کے خلاف جو اعتراضات شروع کر رکھے تھے اور اس سلسلے میں وہ سازش کے طور پر حملے کر رہے تھے' ان سے متاثر ہو کر یا ان کی اصل حقیقت اور حکمت معلوم کرنے کی خاطر بعض مسلمان بھی سوالات اٹھا رہے تھے۔ ان اصلاحات کے خلاف یہودی سخت زہریلا پروپیگنڈا کرتے تھے اور بعض مسلمان اس سے متاثر بھی ہو جاتے۔ ایسے مواقع پر قرآن مجید کا کوئی حصہ نازل ہوتا اور مسئلہ زیر بحث کا فیصلہ کر دیتا۔ مسلمان یقین حاصل کر لیتے' سازشیں ختم ہو جاتیں۔ فتنے اپنی موت آپ مرجاتے اور سازشیوں کی سازش خود ان کے گلے پڑ جاتی۔

ان سوالات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں قرآن مجید چوکھی فکری جنگ لڑ رہا تھا' کبھی یہ معرکہ خود مسلمانوں کے دل و دماغ میں برپا ہے' کبھی مسلمانوں کی صفوں میں اور کبھی ان دشمنان اسلام کے خلاف ہے جو اسلام سے برسرپیکار تھے اور اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔

یہ سبق بھی اس فکری جنگ کا ایک حصہ ہے اور اس میں بعض سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ مثلاً انفاق' اس کی مقدار' اس کے مصرف اور مال کی قسم جس سے انفاق کیا جائے' کے بارے میں سوال' حرام مہینوں میں لڑنے کے بارے میں سوال' شراب اور جوئے کے بارے میں سوال' یتیموں کے بارے میں سوال' ان سب سوالات کے اسباب وہی تھے جن کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں اور آیات پر بحث کے وقت تفصیلات عرض ہوں گی انشاء اللہ!

☆ ☆ ☆ ☆

# درس نمبر ۱۴ تشریح آیات (۲۱۵ تا ۲۲۰)

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

"لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟" جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر' رشتے داروں پر' یتیموں اور مسکینوں پر اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے اللہ اس سے باخبر ہو گا"

اس سوال سے پہلے انفاق فی سبیل اللہ کے بارے میں متعدد آیات نازل ہو چکی تھیں۔ جن حالات میں تحریک اسلامی کا آغاز ہوا' ایسے حالات میں انفاق فی سبیل اللہ نہایت ضروری ہوتا ہے' تاکہ اسلامی جماعت مصائب و مشکلات اور ان جنگی معرکوں میں دشمنوں کا مقابلہ کر سکے' جو اسے درپیش آنے والے تھے۔ انفاق کی اہمیت ایک دوسری وجہ سے بھی اس دور میں بہت زیادہ ہو گئی تھی' مثلاً یہ کہ تحریک اسلامی میں ساتھیوں کے درمیان اجتماعی تکافل کے قیام کی بھی اشد ضرورت تھی۔ افراد جماعت کے مابین ظاہری امتیازات کو ختم کرنے کی ضرورت تھی تاکہ ہر فرد یہ سمجھے کہ وہ ایک جسم کا عضو ہے اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے اور نہ کوئی چیز ان سے روکی جاتی ہے۔ شعوری طور پر ایک جماعت کے قیام کے لئے اجتماعی تکافل اور انفاق کا نظام قائم کرنا بہت ہی ضروری ہے۔ افراد جماعت کی کارکردگی میں اضافہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کی ضروریات کا لحاظ رکھا جائے۔

ایسے حالات میں بعض مسلمانوں نے سوال کیا تھا کہ وہ کیا خرچ کریں؟ سوال تو یہ تھا کہ وہ کیا خرچ کریں؟ نوعیت انفاق کیا ہو؟ جواب میں انفاق کی صفت اور انفاق کے مصارف بیان کئے گئے:

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ "جو مال بھی تم خرچ کرو" اس تعبیر میں دو اشارے ہیں۔ ایک یہ کہ جو چیز بھی تم خرچ کرو اسے خیر ہونا چاہئے۔ دینے والے کے لئے بھی خیر ہو' لینے والے کے لئے بھی۔ اس معاشرے کے لئے بھی جس میں یہ لین دین ہو رہا ہے اور اپنی ذات میں بھی وہ خیر ہو۔ اس طرح ہو کہ عمل بھی پاک' تحفہ بھی پاک' چیز بھی پاک۔

دوسرا اشارہ یہ ہے کہ خرچ کرنے والے کو اچھی طرح سوچ کر اپنے مال سے اعلیٰ تر چیز خرچ کرنی چاہئے۔ اس کے پاس جو بہترین چیزیں ہوں انہیں خرچ کرے۔ اس میں دوسروں کو شریک کرے۔ انفاق سے دل پاک ہو جاتا ہے۔ نفس کا تزکیہ ہوتا ہے اور دوسروں کا فائدہ ہوتا ہے۔ ان کی اعانت ہو جاتی ہے۔ پھر تلاش کر کے اپنے مال میں سے بہتر چیز خرچ کرنا ایک ایسا اقدام ہے' جس سے دل میں طہارت آجاتی ہے۔ نفس انسانی پاک و صاف ہو جاتا ہے اور انفاق کو اپنانے کا اعلیٰ مفہوم سامنے آتا ہے۔

لیکن یہ محض اشارہ ہے اور اسے لازم اور فرض قرار نہیں دیا گیا۔ جبکہ دوسری آیت میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مناسب ہے کہ اوسط درجے کا مال اللہ کی راہ میں دیا جائے۔ نہ بہت قیمتی ہو اور نہ بالکل ردی ہو' البتہ آیت میں یہ اشارہ ہے کہ نفس پر قابو پانے کے لئے بہتر مال خرچ کیا جائے اور اہل ایمان کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی قرآن کریم کا انداز تربیت ہے یعنی بذریعہ ترغیب اور آمادگی اصلاح کی جاتی ہے۔

انفاق کا طریقہ اور مصرف کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ "اپنے والدین رشتے داروں پر یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو۔"

انفاق کرنے والے اور ان لوگوں کے درمیان مخصوص روابط ہیں۔ بعض افراد اور انفاق کرنے والے کے درمیان نسبی رشتہ ہے۔ بعض کے درمیان رحم کے رشتے ہیں۔ بعض کے ساتھ محض رحم و شفقت کا رشتہ ہے اور بعض کے ساتھ نظریات کے وسیع حدود میں صرف انسانی ہمدردی کا تعلق ہے۔ اور سب کو ایک ہی آیت میں سمو دیا گیا ہے۔ والدین' اقربین' یتامیٰ' مساکین' مسافر' ان سب کو اسلامی نظریات حیات کے وسیع دائرے میں ضروریات اور بوقت ضرورت معاونت کی گارنٹی حاصل ہے۔

انفاق کے مصارف میں وہی ترتیب ہے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ نیز بعض دوسری آیات میں بھی اس کی وضاحت کی گئی اور بعض احادیث میں اس کی مزید تفصیل اور تشریح کا ذکر ہے۔ صحیح مسلم میں ایک روایت ہے جس میں حضور ﷺ نے ایک شخص سے کہا: "پہلے اپنے نفس سے آغاز کرو اور اس پر صدقہ کرو۔ اس سے بھی زیادہ ہو تو اپنے اہل و عیال پر خرچ کرو' اگر پھر بھی کچھ بچ جائے تو رشتے داروں پر خرچ کرو' اگر ان سے بھی بچ جائے....."

مصارف کی اس ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے نفس انسانی کی تربیت اور اس کی قیادت اور راہنمائی کے لئے کیا حکیمانہ اور سادہ انداز اختیار کیا ہے۔ اسلام انسان کے ساتھ اس کی حقیقت کے مطابق معاملہ کرتا ہے۔ اس کی فطرت' اس کے میلانات اور اس کے رجحانات کے عین مطابق۔ اسلام انسان کو ساتھ لے کر اس طرح چلتا ہے جس طرح بچہ پیدا ہوتا ہے پھر وہ کھڑا ہوتا ہے اور ایک متعین مقام پر ہوتا ہے۔ اسلام اس کا ہاتھ پکڑ کر قدم بقدم اسے لے کر چلتا ہے۔ آہستہ آہستہ آگے بلندی تک اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ بڑی آہستگی کے ساتھ دھیمی رفتار سے وہ چڑھتا جاتا ہے' لیکن بڑے آرام کے ساتھ اس کی یہ رفتار اس کی فطرت' اس کے رجحانات اور اس کی استعداد کے تقاضوں کے مطابق ہوتی ہے۔ وہ تدریج کے ساتھ اپنے ساتھ پوری زندگی کو نشوونما اور ترقی دیتا جاتا ہے۔ وہ بلندی کی طرف جا رہا ہوتا ہے۔ لیکن تنگی اور تھکاوٹ کا اسے احساس تک نہیں ہوتا۔

اسلام کے ترقی کا انداز یہ نہیں ہے کہ کسی کو بیڑیاں اور ہتھکڑیاں پہنا کر اور اسے گھسیٹ کر بلندیوں تک لے جایا جائے۔ نہ ہی اس کی فطری قوتوں اور فطری رجحانات کو دبا دیا جاتا ہے کہ وہ ایک پرندے کی طرح پنجرے میں بند ہو جائے اور پھڑپھڑائے اسے راہ ترقی پر اس طرح نہ لے جایا جائے کہ ترقی نہ رہے بلکہ ظلم بن جائے۔ یا اسے ٹیلوں اور پہاڑیوں سے اڑاتے ہوئے لے جایا جائے۔ بلکہ اسے آہستگی اور نرمی سے اوپر کی طرف لے جایا جائے۔ قدم زمین پر ہوں' آنکھیں آسمان پر ہوں اور دل افق کے ساتھ لٹکا ہوا ہو اور اس کی روح عرش کی بلندیوں میں واصل باللہ ہو۔

یہ بات اللہ کے تو علم میں تھی کہ انسان میں حب ذات کا داعیہ ہے۔ اس لئے اللہ نے حکم دیا کہ پہلے اپنی ذات کے لئے بقدر کفایت سامان مہیا کرو۔ ذات کے بعد پھر دوسرے رشتے داروں پر انفاق کا حکم دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے کھانے پینے کی پاک چیزوں کو جائز قرار دیا۔ اسے ترغیب دی کہ وہ ان پر حلال چیزوں سے لطف اٹھائے' البتہ یہ پابندی لگا دی کہ عیاشی اور غرور سے دور رہے۔

انفاق و صدقہ تو تب شروع ہوتا ہے جب انسان بقدر کفایت خود اپنی ضروریات پوری کر لے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: "بہترین صدقہ وہ ہے جو ضروریات پورا کر کے دیا جائے اور اوپر کا ہاتھ نچلے ہاتھ سے زیادہ بہتر ہے اور شروع اپنے خاندان سے کرو۔"

حضرت جابر ؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: "حضور ﷺ کے پاس ایک شخص ایک انڈے کے برابر سونا لے کر حاضر ہوا۔ اس نے عرض کیا حضور ﷺ یہ مجھے کان سے ملا ہے۔ آپ ﷺ اسے لے لیں۔ یہ صدقہ ہے اور اس کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

حضور ﷺ نے اس سے منہ پھیر لیا۔ وہ حضور ﷺ کے داہنے جانب سے لے آیا اور وہی بات دہرائی' تو آپ ﷺ نے پھر منہ پھیر لیا۔ پھر بائیں جانب سے آیا اور وہی بات دہرائی۔ حضور ﷺ نے پھر منہ پھیر لیا۔ پھر وہ پیچھے کی طرف سے آیا اور وہی بات دہرائی۔ اس پر حضور ﷺ نے اس سونے کو لیا اور اسے اس پر دے مارا۔ اگر اسے لگی ہوتی تو یاد رکھتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا :"تم میں سے ایک صاحب میرے پاس وہ سب کچھ لے کر آجاتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے اور کہتا ہے یہ صدقہ ہے' اور پھر بیٹھ جاتا ہے لوگوں سے بھیک مانگنے۔ بہترین صدقہ وہ ہے جو غنا پر کیا جائے۔"

یہ حقیقت اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی کہ انسان سب سے پہلے اپنے قریبی افراد خاندان سے محبت کرتا ہے' اپنی اولاد سے اور اپنے والدین سے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کی ذات کے بعد انفاق کے لئے ان افراد کو مستحق قرار دیا تاکہ وہ اپنی دولت کا کچھ حصہ ان پر خوشی و رضا کے ساتھ خرچ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں انسان کے ان فطری میلانات کا لحاظ رکھا ہے' جو بے ضرر ہیں' بلکہ ان کا لحاظ رکھنے میں بھلائی اور حکمت پوشیدہ ہے۔ اور اس حکمت کے ساتھ ساتھ بعض ایسے افراد کی کفالت بھی ہو جاتی ہے جو صدقہ دینے والے کے قریبی رشتہ دار بھی ہیں اور خود امت مسلمہ کے بھی افراد ہیں۔ اگر ان حضرات کی اعانت ان کے اس قریبی رشتہ دار نے نہ کی تو وہ محتاج ہوں گے۔ ان کے لئے اپنے اس قریب رشتہ دار سے امداد حاصل کرنا زیادہ بہتر ہے' بہ نسبت اس کے کہ وہ کسی دور کے شناسا یا غیر شناسا شخص سے امداد لینے پر مجبور ہو جائیں۔

پھر یہ فائدہ مزید ہے کہ اس کے ذریعہ انسان کی پہلی تربیت گاہ یعنی خاندان کے اندر امن و محبت میں اضافہ ہو گا اور افراد خاندان کے درمیان روابط مضبوط ہوں گے جو ایک عظیم انسانیت کی تعمیر میں خشت اول کی حیثیت رکھتا ہے۔

اپنے قریبی رشتہ داروں کے بعد انسان فطرتاً اپنے جملہ رشتہ داروں کو درجہ بدرجہ اور تعلقات و روابط کے مطابق ترجیح دیتا ہے اور خالق فطرت اس بات سے خوب واقف ہے۔ اور یہ کوئی بری بات بھی نہیں ہے کیونکہ یہ رشتہ دار بھی بہرحال امت کا ایک حصہ ہیں اور اسلامی معاشرے کے اجزاء ہیں۔ چنانچہ ایک دولت مند مسلمان اپنے قریبی رشتے داروں کے دائرہ سے ایک قدم اور باہر نکل آتا ہے۔ اس کی یہ پیش رفت بدستور اس کے فطری رجحانات اور میلانات کی سمت میں ہے اور ان دور کے رشتے داروں کی ضرورت بھی پوری ہو رہی ہے اور دور کے رشتہ داروں کے ساتھ بھی محبت اور رشتے کے تعلقات بھی استوار ہو رہے ہیں۔ یوں اسلامی جماعت کی ابتدائی یونٹ کے باہم تعلقات مربوط ہو جاتے ہیں اور روابط قوی ہو جاتے ہیں۔

اپنی ذات اور قریب و بعید رشتے کے لوگوں پر خرچ کرنے کے بعد بھی اگر کچھ بچ رہتا ہے تو پھر اسلام کا حکم یہ ہے کہ معاشرے کے ان ضعفاء پر خرچ کرو جنہیں دیکھ کر ہی ایک آدمی کی شرافت' جذبہ رحمت اور جذبہ اشتراک میں جوش آجاتا ہے اور ایک شریف انسان ایسے کمزور لوگوں کی امداد کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں میں یتیم سب سے پہلے درجے میں آتے ہیں جو چھوٹے بھی ہوتے ہیں اور کمزور بھی۔ پھر ان مساکین کا درجہ ہے جن کے پاس اخراجات کے لئے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن وہ اپنی شرافت اور اپنی سفید پوشی کی وجہ سے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ پھر مسافروں کا نمبر آتا ہے جن کے پاس اگر مال و دولت ہوتا ہے لیکن ان سے دور گھر میں اور اس کے حصول میں رکاوٹیں ہوتی ہیں۔

ابتدائی دور میں تحریک اسلامی میں ایسے لوگوں کی کثرت تھی۔ یہ لوگ اپنی دولت مکہ مکرمہ میں چھوڑ کر ہجرت کر آئے تھے' اور اب یہ لوگ اسلامی معاشرے کے افراد تھے۔ اسلام تحریک اسلامی کے خوش حال لوگوں کی راہنمائی کرتا ہے کہ وہ ایسے نادار لوگوں پر خرچ کریں۔ اس سلسلے میں اسلام ان لوگوں کے پاک فطری رجحانات کو ابھارتا ہے اور ان کی تطہیر کرتا ہے اور بڑی نرمی اور تدریج کے ساتھ ان

لوگوں کو نصب العین تک پہنچا دیتا ہے۔ پہلے ان خوشحال لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کیا جاتا ہے۔ اور وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں وہ طیب نفس کے ساتھ خرچ کرتے ہیں' خرچ پر راضی ہوتے ہیں۔ بغیر کسی تنگی اور بغیر کسی جبر کے' اپنے اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ معاشرے کے ضعیف اور محتاج لوگوں کو ان کی ضروریات مل جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ تمام افراد معاشرہ باہم پیوست ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے کفیل اور مددگار بن جاتے ہیں لیکن اس اجتماعی کفالت میں نہ جبر ہے اور نہ کسی کا کوئی نقصان ہے۔ اسلام کی یہ راہنمائی نہایت ہی لطیف' نہایت ہی خوشگوار اور نہایت ہی دوررس ہے۔ اس میں بھلائی ہی بھلائی ہے۔ یہ راہنمائی نہ جابرانہ ہے' نہ مصنوعی ہے اور نہ اس میں کسی قسم کا تشدد ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کے اس کفالتی انتظام کا سررشتہ بھی افق اعلیٰ سے ملا دیا جاتا ہے۔ اس لئے انفاق کر کے دل مومن میں تعلق باللہ کا ایک جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی داد و دہش میں' اس کے قول فعل میں' اس کے ضمیر و نیت میں اور اس کے فہم و شعور میں' غرض اس کی ہر چیز میں تعلق باللہ پیدا ہو جاتا ہے وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ "اور جو بھلائی بھی تم کرو گے' اللہ اس سے باخبر ہو گا۔" اللہ تعالیٰ اس انفاق سے بھی باخبر ہے۔ اس کی غایت سے بھی خبردار ہے' اس کے پس منظر میں جو نیت ہے اس کا بھی اسے علم ہے۔ اس لئے یہ انفاق ہرگز ضائع نہیں ہو سکتا۔ وہ اللہ کے کھاتے میں لکھا گیا ہے اور اس کھاتے میں کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ وہ لوگوں کے حقوق میں کوئی کمی نہیں کرتا اور نہ ان پر کسی قسم کا ظلم کرتا ہے' لیکن اس پر ریاکاری کا کچھ اثر ہوتا ہے نہ دھوکہ بازی اس کے ہاں چل سکتی ہے۔

یوں قرآن کی یہ راہنمائی دلوں کو لے کر افق اعلیٰ کی بلندیوں تک جا پہنچتی ہے۔ یہ دل صاف و شفاف ہو جاتے ہیں' یکسو ہو جاتے ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خالص ہو جاتے ہیں' لیکن بڑی نرمی کے ساتھ' بڑی دھیمی رفتار کے ساتھ' بغیر کسی مصنوعی طریقے کے' بغیر کسی جابرانہ ذریعے کے۔ یہ ہے وہ نظام تربیت جسے اللہ تعالیٰ نے وضع کیا ہے جو علیم بھی ہے اور خبیر بھی ہے۔ اور اس نظام تربیت کے اصولوں کے مطابق اسلامی نظام زندگی تیار ہوتا ہے۔ یہ نظام انسان کی تکمیل اپنے ہاتھ میں لے کر ایک عام انسان کی قیادت سنبھالتا ہے۔ وہ جہاں بھی ہو وہاں سے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور اسے عروج و کمال کے اس مقام بلند تک لے جاتا ہے جہاں تک یہ انسانیت اسلام سے قبل اپنی پوری تاریخ میں نہیں پہنچ سکی ہوتی۔ ہاں انسانیت نے یہ مقام بلند اگر کبھی حاصل کیا ہے تو وہ صرف اسلامی نظام زندگی کے سایہ میں' اسلام کے صراط مستقیم پر چل کر۔

انفاق فی سبیل اللہ کے بعد' جہاد فی سبیل اللہ کا حکم آتا ہے اور اس میں بھی اسلام نے وہی منہاج تربیت اختیار کیا ہے جو انفاق کے سلسلے میں اختیار کیا گیا ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

۲۶
ع۶
۱۰

"تمہیں جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لئے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لئے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔"

قتال فی سبیل اللہ بہت گراں بار فریضہ ہے۔ اس کے باوجود یہ ایسا ہے کہ اس کی ادائیگی واجب ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایک

مسلمان کے لئے بھی بہت بڑی خیر ہے' اسلامی جماعت کے لئے بھی خیر کثیر ہے بلکہ اس میں پوری انسانیت کی عظیم بھلائی ہے۔ یہ فریضہ محض سچائی کے لئے ہے' بھلائی کے لئے ہے اور اصلاح احوال کے لئے ہے۔

اسلام چونکہ ایک فطری دین ہے' اس لئے وہ ہر معاملے میں اپنا موقف اور نقطہ نظر بھی عین مطابق فطرت اختیار کرتا ہے۔ اس فریضے کی ادائیگی میں جو مشقتیں اور دشواریاں ہیں اللہ ان کا انکار نہیں کرتا۔ نہ اسے آسان اور ہلکا تصور کیا جاتا ہے۔ نہ اس بات کا انکار کیا جاتا ہے کہ نفس انسانی اسے بتقاضائے فطرت ناپسند کرتا ہے اور اسے بھاری سمجھتا ہے۔ اسلام نہ فطرت کا انکار کرتا ہے۔ نہ کسی معاملے میں نظام فطرت سے متصادم ہوتا ہے۔ نہ انسان پر اس کے ان فطری احساسات کو حرام قرار دیتا ہے' جن کے انکار کا کوئی جواز نہیں ہے۔ جن کو کالعدم نہیں گردانا جاسکتا۔ البتہ اسلام ان فطری احساسات کا علاج ایک دوسرے طریقے سے کرتا ہے۔ اسلام فطرت کی ان تاریکیوں کو ایک جدید قسم کی روشنی سے ختم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم پر جو فرض عائد کیا گیا ہے بے شک وہ شاق ہے ناپسندیدہ ہے' لیکن اس کے پس منظر میں ایک عظیم مصلحت ہے' جس کی وجہ سے وہ بہت ہی ہلکا ہو جاتا ہے' آسان ہو جاتا ہے۔ اس کی مشقت کم ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ذائقے کی کڑواہٹ کم ہو جاتی ہے۔ اس کے ذریعہ ایک پوشیدہ بھلائی وجود میں آتی ہے۔ اس پوشیدہ بھلائی کو انسان کی سطحی نظر اچھی طرح نہیں دیکھ سکتی۔ اس نقطہ نظر کو پالینے کے بعد' انسانی روح پر معرفت کے لئے دروازے کھل جاتے ہیں اور ان کے ذریعہ انسان اس معاملے کی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔ اب انسان جہاد و قتال کے مسئلے پر ایک نئے زاویہ سے نگاہ ڈالتا ہے۔ اور پھر جب انسان مشکلات سے دوچار ہوتا ہے اور مصائب میں گھرا ہوتا ہے' تو اس کی روح کے اس زاویہ اور معرفت کے اس نئے دروازے سے اس کے قلب و نظر پر ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا چلتی ہے اور اسے اطمینان نصیب ہوتا ہے اس لئے کہ عین ممکن ہے شاید ان مشکلات کے بعد آسانیاں ہوں اور کسے خبر ہے کہ شاید پسندیدہ امر کا انجام یہ نہ ہو گا۔ یہ تو وہی ہے جو دور دراز انتہاؤں کا علم رکھنے والا ہے جبکہ تمام لوگ اس علم کے ایک حصہ سے بھی خبردار نہیں ہیں۔

جب نفس انسانی پر یہ خوشگوار باد نسیم چلتی ہے تو اس پر ٹوٹنے والے تمام مصائب اور مشقتیں اور سختیاں آسان ہو جاتی ہیں۔ امید و بقا کے دریچے کھل جاتے ہیں' سخت تپش میں بھی دل ٹھنڈک محسوس کرتا ہے اور یقین و امید کے ساتھ اطاعت اور ادائے فرض کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

اسلام فطرت کے ساتھ یوں معاملہ کرتا ہے کہ وہ انسان کے فطری رجحانات پر کوئی نکیر نہیں کرتا۔ اور نہ ہی انسان کو کسی مشکل فرض کے سرانجام دینے پر محض آرڈر اور حکم کے ذریعہ مجبور کرتا ہے' بلکہ وہ انسان کی تربیت کرکے اسے اطاعت پر آمادہ کرتا ہے۔ امید کا دائرہ وسیع کر دیتا ہے۔ وہ اسے یہ تعلیم دیتا ہے کہ ادنیٰ چیز کو خرچ کرکے اعلیٰ حاصل کرو' وہ انسان کو ذاتی خواہشات کے مقابلے میں نہیں بلکہ خوشی و رضا سے کھڑا کرتا ہے تاکہ انسان کی فطرت کو اس بات کا احساس ہو کہ اللہ کا رحم و کرم اس کے شامل حال ہے کیونکہ وہ انسانی کمزوریوں سے خوب واقف ہے۔ اور وہ معترف ہے کہ انسان پر جو فریضہ عائد کیا گیا ہے وہ ایک مشکل کام ہے۔ وہ اس کی مجبوریوں سے بھی واقف ہے اور انسان کی قدر بھی کرتا ہے اور بلند ہمتی' التجا اور امید کے ذریعے اسے مسلسل آگے بڑھانے کی ہمت بھی دیتا رہتا ہے۔

یوں اسلام انسانی فطرت کی تربیت کرتا ہے' وہ فرائض پر ملول نہیں ہوتی' صدمات کی ابتلا میں جزع فزع نہیں کرتی اور نہ مصائب شروع ہوتے ہی وہ ہمت ہار بیٹھتی ہے۔ اگر مشکلات کے مقابلے میں کمزوری ظاہر ہو جائے تو شرمندہ ہو کر صاف گر ہی نہیں جاتی بلکہ ثابت قدم رہنے کی سعی کرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ اسے عند اللہ معذور سمجھا جائے گا۔ اسے یہ امید ہوتی ہے کہ اللہ اس کی امداد کرے گا اور اپنی طرف سے قوت بخشے گا اور مصائب کا مقابلہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیتی ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ان مشکلات کی تہ میں کچھ خیر پوشیدہ ہو۔

مشکلات کے بعد آسانیاں آجائیں۔ تھکاوٹ اور ضعف کے بعد بہت بڑا آرام نصیب ہو جائے۔ یہ فطرت محبوبات و مرغوبات پر فریفتہ نہیں ہوتی اس لئے کہ عیش و عشرت کا نتیجہ حسرت بھی تو ہو سکتی ہے۔ محبوب کی تہہ سے مکروہ بھی بر آمد ہو سکتا ہے۔ کبھی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روشن تر امیدوں کے پس پردہ ہلاکت اور مصیبت انتظار کر رہی ہو۔

تربیت کا یہ عجیب نظام ہے۔ بہت ہی گہرا اور بہت ہی سادہ۔ یہ نظام نفس انسانی کے سرچشموں' اس کے پوشیدہ گوشوں اور اس کے مختلف گزر گاہوں کا شناسا ہے۔ یہ نظام تربیت سچائی اور صداقت سے کام لیتا ہے۔ اس میں جھوٹے اشارے' جھوٹے تاثرات اور نظر فریب جعل سازی نہیں ہوتی۔ پس یہ حقیقت ہے کہ انسان کا ناقص اور ضعیف ذہن کسی بات کو ناپسند کرے حالانکہ وہ خیر ہی خیر ہو۔ اور یہ بھی حق ہے کہ انسان کسی چیز کو پسند کرے اور اس کا جانثار ہو۔ لیکن اس میں شر ہی شر ہو۔ اور یہ بھی حق ہے کہ اللہ جانتا ہے اور انسان نہیں جانتے۔ لوگوں کو عواقب اور انجام کا کیا علم ہے۔ وہ کیا جانیں کیونکہ پردہ گرا ہوا ہے اور پس پردہ کیا ہے؟ غرض لوگوں کو ان حقائق کا علم نہیں ہو سکتا جو ہماری خواہشات' جہالت اور نفس کے تابع نہیں ہیں۔

قلب انسانی کے اندر یہ ربانی احساس' اس کے دریچے کھول دیتا ہے۔ اس کے سامنے ایک نئی دنیا نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ دنیا اس محدود دنیا سے بالکل مختلف ہے جسے ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ اس کی نظروں کے سامنے کچھ دوسرے عوامل بھی آجاتے ہیں جو اس کائنات کی گہرائیوں میں کام کر رہے ہوتے ہیں' جو معاملات کی کایا پلٹ دیتے ہیں' جو نتائج کی اس ترتیب کو الٹ دیتے ہیں جن کی انسان کو تمنا ہوتی ہے یا وہ ان کی توقع کئے ہوئے ہوتا ہے۔ جب قلب مومن تن بہ تقدیر اس ربانی احساس کے تابع ہو جاتا ہے' تو پھر وہ پرامید ہو کر کام کرتا ہے۔ اسے امید بھی ہوتی ہے اور خدا کا ڈر بھی' لیکن وہ تمام نتائج برضا و رغبت دست قدرت کے سپرد کر دیتا ہے جو حکیم ہے اور علیم ہے۔ جس کا علم سب کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ ہے دراصل سلامتی کے کھلے دروازے کا داخلہ۔ نفس انسانی کو اسلام کا صحیح شعور اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتا' جب تک اس میں یہ یقین پیدا نہ ہو جائے کہ خیر اسی میں ہے جسے اللہ نے خیر بتایا' بھلائی اس میں ہے کہ اپنے رب کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کو آزمانے اور اللہ سے براہین طلب کرنے میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ پختہ یقین' پرسکوں امید اور سعی پیہم ہی سلامتی کے دروازے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو انہی دروازوں سے داخل ہونے کی دعوت دیتا ہے اور حکم دیتا کہ نیمے دروں اور نیمے بیروں میں نہیں بلکہ پورے پورے ان دروازوں سے داخل ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بڑے سادہ عجیب لیکن بہت گہرے منہاج کے ساتھ اس سلامتی کی طرف لے جارہا ہے۔ بڑی نرمی' بڑی آسانی اور دھیمی رفتار سے۔ سلامتی کے اس راستے پر وہ انہیں اس طریقے سے لے جارہا ہے کہ آخر کار وہ ان پر قیام امن کے لئے قتال بھی فرض کر دیتا ہے۔ سلامتی کیا چیز ہے؟ سلامتی یہ ہے کہ میدان جنگ میں انسان کی روح اور اس کا ضمیر مطمئن اور امن و سلامتی سے رہیں۔

قرآن کریم کی اس آیت میں قتال کی نسبت سے جو اشارہ کیا گیا ہے' وہ قتال تک ہی محدود نہیں ہے۔ قتال تو ان امور کی ایک واضح مثال ہے جسے نفس انسانی فطرتاً پسند نہیں کرتا۔ لیکن اس میں نتائج کے اعتبار سے بھلائی ہوتی ہے۔ یہ نکتہ دراصل مومن کی پوری زندگی میں اس کا فلسفہ حیات ہے۔ اس کے تمام واقعات زندگی پر اس کا پر تو ہوتا ہے۔ انسان تو کسی معاملے میں یہ نہیں جانتا کہ خیر کہاں ہے اور شر کہاں ہے؟ بدر کے دن مسلمان نکلے کہ قریش کے قافلے کو لوٹ لیں اور ان کے مال تجارت پر قبضہ کر لیں۔ اللہ نے ان سے غنیمت کا وعدہ بھی کر رکھا تھا' وہ سمجھتے تھے کہ یہی قافلہ اور اس کا مال تجارت بس انہیں ملنے ہی والا ہے۔ ان کے تصور میں بھی نہ تھا کہ انہیں قریش کی فوج کے ساتھ دوچار ہونا پڑے گا' لیکن اللہ کا کرنا یہ تھا کہ قافلہ بچ نکلا اور ان کا سامنا قریش کی ساز و سامان سے لیس فوج سے ہو گیا اور اس کے نتیجہ میں اہل اسلام کو وہ کامیابی نصیب ہوئی جس کی آواز بازگشت پورے جزیرۃ العرب میں سنی گئی۔ اب دیکھئے کہ مسلمانوں کی کامیابی کے

مقابلے میں قافلہ اور اس کے سامان تجارت کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ اب دیکھئے 'مسلمانوں نے اپنے لئے جو پسند کیا اس کی قدر و قیمت کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جو اختیار کیا اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ جانتا ہے اور لوگ نہیں جانتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھی نوجوان اپنا کھانا بھول گیا یعنی مچھلی۔ جب پتھر کے پاس پہنچے تو مچھلی دریا میں چلی گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے چلے گئے اور اپنے خادم سے کہا لاؤ ہمارا ناشتہ آج کے سفر میں تو ہم بری طرح تھک گئے ہیں۔ خادم نے کہا آپ نے دیکھا' یہ کیا ہوا؟ جب ہم اس چٹان کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے' اس وقت مجھے مچھلی کا خیال نہ رہا اور شیطان نے مجھ کو ایسا غافل کر دیا کہ میں اس کا ذکر آپ سے کرنا بھول گیا۔ مچھلی تو عجیب طریقے سے نکل کر دریا میں چلی گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اسی کی تو ہمیں تلاش تھی' چنانچہ وہ دونوں اپنے نقش قدم پر پھر واپس ہوئے اور وہاں انہوں نے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سفر اختیار کیا۔ اگر مچھلی کا واقعہ نہ ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ لوٹتے اور وہ پورا مقصد فوت ہو جاتا جس کے لئے انہوں نے یہ تھکا دینے والا سفر اختیار کیا تھا۔

ہر انسان اگر تامل کرے تو وہ بعض مخصوص تجربوں میں اس سچائی کو دریافت کر سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کئی ایسے تجربات سے دوچار ہوا جو اسے ناپسند تھے۔ لیکن ان کے پس پردہ خیر عظیم کار فرما تھی۔ اور کئی پر ذائقہ اور لذیذ چیزیں بھی تھیں۔ لیکن ان کی تہ میں شر عظیم نہاں تھا۔ کئی ایسے مقاصد ہوتے ہیں کہ جن سے انسان محروم ہو جاتا ہے اور اسے اپنی اس محرومی کا بے حد صدمہ بھی ہوتا ہے لیکن ایک عرصے کے بعد نتائج دیکھ کر انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے محروم رکھ کر دراصل بلائے عظیم سے نجات دی تھی۔ کئی مصائب و شدائد ایسے جاں گسل ہوتے ہیں' کہ انسان بڑی ناخوش گواری سے ان کے کڑوے گھونٹ بھرتا ہے اور قریب ہوتا ہے کہ ان مصائب کی سختی کے نتیجے میں اس کی جان ہی نکل جائے' لیکن ایک طویل عرصہ نہیں گزرتا کہ ان سختیوں کے نتائج اتنے اچھے نکلتے ہیں جتنے ایک طویل پر آسائش زندگی کے نتیجے میں اچھے نہ ہو سکتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان نہیں جانتا' اللہ ہی جانتا ہے۔ اب انسان اگر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا' راضی برضا نہیں ہوتا تو وہ کرے گا کیا؟

یہ ہے منہاج تربیت جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نفس انسانی کو لیتا ہے کہ وہ ایمان لے آئے' اسلام میں داخل ہو جائے اور آنے والے نتائج اللہ کے سپرد کر دے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ بقدر استطاعت' ظاہری جدوجہد کے میدان میں اپنی پوری قوت لگا دے۔

تحریک اسلامی کو امن و سلامتی کی طرف لے جایا جا رہا تھا کہ وہ پوری کی پوری سلامتی کے نظام میں داخل ہو جائے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی حرام مہینوں میں قتال کے بارے میں فتویٰ بھی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢١٧﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢١٨﴾

"لوگ پوچھتے ہیں کہ ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو: اس میں لڑنا بہت برا ہے مگر راہ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے اور فتنہ خونریزی سے شدید تر ہے۔ وہ تو تم سے لڑے ہی جائیں گے حتیٰ کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہارے دین سے تم کو پھیر لے جائیں (اور یہ خوب سمجھ لو کہ) تم میں جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا اس کے اعمال دنیا و آخرت میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے سب لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ بخلاف اس کے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور جہاد کیا ہے' وہ رحمت الٰہی کے جائز امیدوار ہیں اور اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمت سے انہیں نوازنے والا ہے۔"

متعدد روایات میں آیا ہے کہ یہ آیات عبداللہ ابن جحش کے سریہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ حضور ﷺ نے انہیں ایک سیل شدہ خط دیا اور آٹھ افراد ان کے ساتھ روانہ کئے جو سب کے سب مہاجر تھے' انصار کا ان میں کوئی نہ تھا۔ آپ ﷺ نے عبداللہ کو حکم دیا کہ وہ دو رات دن کے سفر سے پہلے اس خط کو نہ کھولے۔ جب اس نے اپنے مقررہ وقت پر خط پڑھا تو اس کی عبارت یہ تھی جب تم میرے اس خط کو پڑھو تو آگے بڑھو یہاں تک کہ وادی بطن نخلہ میں جا اترو۔ جو مکہ اور طائف کے درمیان ہے۔ یہاں تم قریش کے حالات نگاہ میں رکھو اور ہمیں ان کی اطلاع دیتے رہو۔ لیکن اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو بھی اپنے ساتھ لے جانے پر مجبور نہ کرنا۔ یہ واقعی بدر کبریٰ سے پہلے کا ہے۔ عبداللہ بن جحش نے خط پڑھ کر کہا "سر آنکھوں پر"۔ اس کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہا کہ حضور ﷺ نے تو مجھے حکم دیا ہے کہ میں بطن نخلہ جاؤں' وہاں قریش کو نگاہ میں رکھوں اور ان کے حالات کی اطلاع حضور ﷺ کو دوں۔ حضور ﷺ نے مجھے اس سے منع کیا ہے کہ میں تم میں سے کسی کو اپنے ساتھ جانے پر مجبور کروں۔ تم میں سے جو شخص شہادت کا درجہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور اسے اس کا شوق ہے تو وہ چلے اور اگر کوئی اسے ناپسند کرتا ہے تو واپس ہو جائے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں حضور ﷺ کے حکم کو بجا لاؤں گا۔ چنانچہ وہ آگے چلا اور اس کے تمام ساتھی اس کے ساتھ ہو لیے' کوئی بھی ان میں پیچھے نہ مڑا۔ وہ حجاز کے راستے گئے اور ابھی راستے پر ہی تھے کہ سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان کا اونٹ گم ہو گیا۔ وہ عبداللہ بن جحش کے قافلے سے پیچھے رہ گئے تاکہ اونٹ تلاش کر لیں۔ باقی چھ افراد آگے بڑھ گئے۔ جب یہ بطن نخلہ پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ قریش کا ایک قافلہ جا رہا ہے' جس کے اونٹوں پر سامان تجارت لدا ہوا ہے۔ اس قافلے میں عمرو بن الحضرمی اور تین دوسرے افراد تھے۔ عمرو کو قتل کر دیا گیا اور دو گرفتار ہوئے اور ایک بھاگ نکلا۔ انہوں نے پورے قافلے کے سامان کو قبضے میں کر لیا۔ اس دستے کا خیال یہ تھا کہ حملے کا دن جمادی الاخر کا آخری دن ہے۔ حالانکہ دراصل حملے کا دن رجب کا پہلا دن تھا۔ اور حرام مہینوں کا آغاز ہو گیا تھا' جن کا احترام عرب بھی بہت زیادہ کرتے تھے اور اسلام نے بھی ان کے احترام کو برقرار رکھا تھا۔ جب یہ دستہ اس قافلے اور قیدیوں کو لے کر مدینہ پہنچا اور حضور ﷺ کے سامنے غنیمت پیش کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے تمہیں حرام مہینوں میں لڑنے کا حکم دیا ہی کب تھا؟ قافلہ اور قیدی کھڑے کر دیئے گئے اور آپ ﷺ نے ان کے لینے سے انکار فرمایا۔

جب حضور ﷺ نے یہ فرمایا تو لوگ گھبرا گئے اور انہوں نے یہ یقین کر لیا کہ ان سے ایک عظیم جرم کا ارتکاب ہو گیا ہے' وہ تو مارے گئے۔ مسلمان بھائیوں نے بھی انہیں سخت سست کہا کہ انہوں نے یہ کیا کیا؟ قریش مکہ نے کہا محمد ﷺ اور اس کے ساتھیوں نے حرام مہینوں کی حرمت کو ختم کر دیا ہے' انہوں نے ان میں خون ریزی کی' مال چھین لیا اور لوگوں کو قید کر لیا۔ یہودیوں نے اس واقعے سے حضور ﷺ کیلئے فال بد نکالی۔ انہوں نے کہا عمرو الحضرمی کو واقد ابن عبداللہ نے قتل کیا: "عمرو" یعنی جنگ کی عمارت بن گئی "حضرمی" یعنی جنگ سرسبز ہو گئی "واقد" جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ا۔

غرض اس واقعے کے بعد گمراہ کن پروپیگنڈے کا طوفان برپا ہو گیا اور اسے مختلف مکارانہ طریقوں سے اہل عرب کے درمیان پھیلایا گیا۔ اور اس میں حضور ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو ایک ایسے شخص کی شکل میں پیش کیا گیا جو عربوں کے تمام مقدسات کا انکار کرتا ہے اور جو صدیوں سے قائم روایات کو پامال کر رہا ہے۔ اور جب بھی مصلحت کا تقاضا ہو وہ ہر بندھن کو توڑتا ہے۔ (نعوذ باللہ) اس پروپیگنڈا کے طوفان بدتمیزی کے دوران' اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں' جنہوں نے بات کو کاٹ کر رکھ دیا اور معاملے کا فیصلہ سچائی کے ساتھ کر دیا گیا۔ حضور ﷺ نے مال غنیمت اور قیدیوں کو قبول فرمایا:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۚ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ "لوگ پوچھتے ہیں ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو اس میں لڑنا بہت برا ہے۔" یہ آیات نازل ہوئیں۔ انہوں نے حرام مہینوں میں لڑائی جھگڑے کو تو برا اور گناہ کبیرہ قرار دیا اور کہا یہ تو ٹھیک ہے' لیکن وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ "مگر راہ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا' اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے اور فتنہ خونریزی سے شدید تر ہے۔"

یہ جنگ مسلمانوں نے شروع نہ کی تھی' دشمنی کا آغاز انہوں نے کیا تھا۔ یہ تو مشرکین ہی تھے جنہوں نے پہل کی۔ انہی لوگوں نے اللہ کی راہ میں لوگوں کو روکا' انہی لوگوں نے اللہ سے کفر کیا۔ انہی لوگوں نے خدا پرستوں کو مسجد حرام سے روکا۔ انہوں نے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے کے لئے ہر کبیرہ گناہ کا ارتکاب کیا۔ انہوں نے خود بھی اللہ کا انکار کیا اور لوگوں کو بھی اللہ کا منکر بنایا۔ انہوں نے مسجد حرام کی حرمت کا بھی انکار کیا اور اس کی حرمت کو توڑا۔ اس میں مسلمانوں کو اذیت دی اور ہجرت سے پہلے پورے تیرہ سال تک' وہ مسلمانوں کو اذیتیں دے دے کر انہیں ان کے دین سے روکتے رہے۔ پھر انہوں نے اس پر بھی اکتفانہ کیا بلکہ انہوں نے مسجد حرام کے باشندوں کو ان کے گھروں سے نکالا حالانکہ وہ قابل احترام اور امن کی جگہ تھی۔ انہوں نے حرم کے تقدس کا کوئی خیال نہ رکھا اور اس کے احترام کے کسی اصول پر عمل نہ کیا۔

اللہ کے نزدیک باشندگان حرم کو ان کے گھروں سے نکالنا حرام مہینوں میں جنگ کرنے سے زیادہ برا ہے۔ اور لوگوں کو محض دین اور نظریہ کی وجہ سے مصائب میں مبتلا کرنا اور انہیں تکالیف پہنچانا قتل سے بھی زیادہ برا ہے۔ چونکہ مشرکین مکہ نے اعلانیہ ان دو کبائر کا ارتکاب کر لیا تھا' لہٰذا ان کا یہ استدلال کہ مسلمانوں نے حرام مہینوں کے احترام کا کوئی خیال نہیں کیا' یا بیت الحرام کی حرمت کا کوئی خیال نہیں کیا' یہ محض پروپیگنڈا ہے اور ساقط الاعتبار ہے۔ چنانچہ ان آیات کے ذریعہ خود مسلمانوں کا موقف واضح ہو کر سامنے آگیا کہ مسلمان تو درحقیقت ان لوگوں کے خلاف برسرپیکار ہیں جو حرم مقدس کا کوئی احترام نہیں کرتے۔ دراصل حرم شریف اور حرام مہینوں کے احترام

ا۔ عمرو کے لفظی مفہوم میں تعمیر شامل ہے۔ حضرمی کے لفظی مفہوم سرسبزی شامل ہے اور واقد کا لفظی معنی "جلانے والا"

کو اپنے لئے ایک پردہ اور پناہ بنا لیا ہے جس کی آڑ میں یہ لوگ جب چاہیں قداست اور پاکی کا ڈھنڈورا پیٹیں اور جب چاہیں اس تقدس کو پامال کر دیں۔ مسلمانوں کا فرض یہ تھا کہ یہ لوگ جہاں ملیں انہیں ختم کر دیں کیونکہ یہ لوگ باغی اور شرپسند ہیں 'کسی احترام کا کوئی لحاظ نہیں رکھتے 'کسی جعلی پردے کے پیچھے من مانی کرنے نہ دیتے۔ کیونکہ ان کے دل میں کوئی حقیقی احترام نہیں ہے۔

حرمتوں کے شعار اور روایات دراصل ایک حیثیت تھی مگر اس سے وہ ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے 'کفار مکہ ماہ حرام کی بے حرمتی کا جو پروپیگنڈا کر رہے تھے 'وہ تو محض ظاہرداری تھی 'اس کے پردے میں چھپ کر دراصل وہ ثابت یہ کرنا چاہتے تھے 'مسلمان زیادتی کر رہے ہیں اور یہ ان کا موقف درست نہیں ہے۔ حالانکہ ظلم و زیادتی کی ابتدا خود انہوں نے کی۔ یہ وہی تھے جنہوں نے بیت الحرام کی حرمت کا کوئی خیال نہ کیا۔

اسلام زندگی کا ایک حقیقت پسندانہ نظم ہے۔ نہ محض خیالی مثالوں اور نظریاتی شکلوں پر مبنی نہیں ہے وہ انسانی زندگی کا حقیقت پسندانہ مطالعہ کرتا ہے۔ اس کی مشکلات 'اس کے میلانات اور اس کے واقعی حالات پر نظر رکھتا ہے۔ اس کی حقیقت پسندانہ راہنمائی کرتا ہے۔ وہ اس زندگی کو زمیں پر بطور حقیقت واقعہ چلاتا ہے اور آہستہ آہستہ اسے ترقی کی سمت میں لے جاتا ہے۔ وہ اس کے مسائل کو اس طرح حل کرتا ہے کہ وہ حل ایک عملی حل ہو۔ محض خام خیالی اور فلسفیانہ تخیلات ہی نہ ہوں بلکہ وہ ایسا حل پیش کرتا ہے جو عملی دنیا میں چل بھی سکے۔

اب ذرا قریش کی حالت کو دیکھئے۔ یہ لوگ سخت ظالم اور سرکش تھے 'مقامات مقدسہ ان کی نظروں میں کچھ حیثیت ہی نہ رکھتے تھے۔ وہ حرمتوں کے تقدس کے قائل ہی نہ تھے۔ وہ ہر اچھے اخلاق 'ہر دینداری اور ہر اچھے نظریہ کو کچل رہے تھے۔ حق کے مقابلے میں اکڑ گئے تھے اور لوگوں کو حق قبول کرنے سے روکتے تھے۔ مومنین کو انہوں نے فتنوں میں مبتلا کر رکھا تھا 'اور انہیں سخت اذیتیں پہنچاتے تھے 'وہ انہیں مسجد حرام سے نکال رہے تھے حالانکہ عربوں کی روایات کے مطابق مسجد حرام اور بیت الحرام دارالامان تھے اور ان میں انسان کیا 'حیوانوں اور کیڑوں مکوڑوں کو بھی امن امان حاصل تھا 'لیکن ان سب حقائق کے باوجود ان لوگوں نے ان حرمتوں کی آڑ میں پوری دنیا کو سر پر اٹھا رکھا تھا 'اور ان حرمتوں کا ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے۔ وہ چلاتے تھے 'دیکھو 'یہ ہے محمد ﷺ اور اس کے ساتھی 'انہوں نے حرام ماہ کی حرمت کو پامال کر دیا۔

اب دیکھئے اسلام ان کے مقابلے میں کیا رویہ اختیار کرتا ہے۔ کیا اسلام ان کے مقابلے میں کوئی نظری 'مثالی اور خیالی جواب لاتا ہے اور مسئلے کا نظریاتی جائزہ لیتا ہے۔ اگر اسلام اس معاملے میں کوئی خیالی حل پیش کرتا تو یقیناً وہ آئیڈیل ضرور ہوتا لیکن نتیجہ یہ ہوتا کہ مسلمانوں کی حالت یہ ہوتی کہ ان کو غیر مسلح کر کر دیا جاتا۔ جب کہ ان کا مقابلہ ایک ایسے شریر اور سرکش دشمن سے تھا 'جو ہر ہتھیار استعمال کرتا تھا اور کوئی حربہ استعمال کرنے میں دریغ نہ کرتا تھا۔ ہرگز نہیں 'اسلام کبھی بھی یہ رویہ اختیار نہیں کرتا کیونکہ اس کا مقابلہ ایک حقیقی صورت حال سے تھا۔ اس نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنا تھا۔ اور اسے اپنے راستے سے ہٹانا تھا۔ اسلام شر و فساد کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ وہ اس زمین کے اختیارات ایک صالح قوت کے ہاتھ میں دینا چاہتا تھا 'وہ اختیارات اور قیادت ایک صالح جماعت کے ہاتھ میں دینا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ ہرگز یہ نہ کر سکتا تھا کہ یہ حرمتیں مفسدوں اور باغیوں کے لئے قلعہ بن جائیں اور اس کے اندر پناہ لے کر یہ لوگ پاک طینت صالح اور تعمیری کام کرنے والوں پر وار کریں۔ اور جوابی حملے سے بالکل محفوظ بیٹھے ہوں۔

اسلام تو ان لوگوں کے مقابلے میں حرمتوں کا بہت خیال رکھتا ہے جو خود ان کا لحاظ رکھیں اور وہ حرمتوں کے اصول و روایت کا سختی سے پابند ہے۔ لیکن وہ ہرگز کسی کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ خود تو ان حرمتوں کا کوئی خیال نہ کرے 'ان کو خوب توڑے اور اپنے لئے انہیں

ایک حصار قرار دے اور اس کی اوٹ سے نیک بندوں کو اذیت دے' بھلے لوگوں کو قتل کرے اور ہر برائی کا مزے سے ارتکاب کرے اور ان حرمتوں کی اوٹ میں جوابی حملے سے محفوظ و مامون رہے اور لوگوں کو تلقین کرے کہ ان حرمتوں کا لحاظ رکھو۔

اسلام نے ہر معاملے میں یہی پالیسی اختیار کی ہے' مثلاً اسلام میں غیبت حرام ہے' لیکن فاسق کی غیبت' غیبت ہی نہیں ہے۔ اگر وہ اپنے فسق و فجور میں مشہور ہو تو جو لوگ اس کے فسق و فجور کے نتیجے میں داغہائے سینہ رکھتے ہیں' وہ معاف ہیں۔ اسلام الجہر (بدگوئی) کو حرام قرار دیتا ہے لیکن اس شخص کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے جس پر ظلم کیا گیا ہو' اگر کوئی مظلوم ہے تو وہ اس ظالم کے خلاف علی الاعلان بدگوئی کر سکتا ہے کیونکہ یہ اس کا حق ہے۔ اگر ظالم کے خلاف آواز نہ اٹھائی گئی' اس نیت سے کہ وہ غیبت ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ظالم کو ایک اچھے اصول کی پناہ دیتے ہیں حالانکہ وہ اس بات کا حق نہیں ہے کہ وہ اس اصول سے فائدہ اٹھائے۔

لیکن برابر کے اس معاملے میں باوجود اسلام اپنا معیار گرنے نہیں دیتا' وہ اپنی اونچی سطح سے اتر کر ان شریروں اور ظالموں کی سطح تک نہیں اترتا۔ وہ اپنے مخالفین کے مقابلے میں اوچھے ہتھیار استعمال کرتا ہے' نہ غیر اخلاقی وسائل یا قابل نفرت ذرائع۔ وہ مسلمانوں کو صرف یہ حکم دیتا ہے کہ ظالموں کے ہاتھ توڑ دو' ان سے لڑائی کرو' ان کو قتل کر دو۔ اور زندگی کے ماحول کو ان سے پاک کر دو' کھلے طور پر' ور علی الاعلان۔

اصل مسئلہ ہے قیادت کا' جب قیادت پاک لوگوں کے ہاتھ میں آجائے' جو مومن ہوں' سلیم الفطرت ہوں اور جب زمین کو ان لوگوں کی نجاست سے پاک کر دیا جائے جو کسی حرمت کا کوئی لحاظ نہیں رکھتے اور تمام مقدسات کو پامال کرتے ہیں تب جاکر تمام مقدسات کی حرمت بحال ہوگی اور اس طرح بحال ہوگی جس طرح اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔

یہ ہے اسلام۔ صریح' واضح' قوی اور باطل کا سر پھوڑنے والا جس میں کوئی گمی لپٹی نہیں' کوئی ہیر پھیر نہیں۔ نہ وہ کسی دوسری طاقت کو یہ موقعہ دیتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کوئی ہیرا پھیری کرے یا اسے کوئی دھوکہ دے۔ اور یہ ہے قرآن مجید جو مسلمانوں کو ایک مضبوط موقف عطا کرتا ہے۔ اس قدر مضبوط جس پر ان کے قدم ڈگمگانے نہ پائیں۔ وہ راہ خدا میں آگے ہی بڑھتے جائیں اور خدا کی اس زمین کو ہر قسم کے شر و فساد سے پاک کر دیں۔ قرآن مجید ان کے دل و دماغ کو شیشے کی طرح صاف نقطہ نظر عطا کرتا ہے' وہ ان کے دلوں میں کسی قسم کا قلق' کسی قسم کا خلجان نہیں رہنے دیتا' شبہات و وساوس ان کے دلوں سے ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ قرآن صاف صاف کہتا ہے دیکھو! وہ شر ہے' فساد ہے' نافرمانی ہے اور باطل ہے' لہٰذا اسے کوئی حرمت اور کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ اس باطل کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ ان حرمتوں کو ڈھال بناکر خود ان حرمتوں پر ضربیں لگائے۔ قرآن مجید واضح طور پر یہ ہدایت کرتا ہے کہ اپنی منزل کی طرف بڑھے چلو' یقین کے ساتھ' اطمینان کے ساتھ' اپنے ضمیر کی سلامتی کے ساتھ اور اپنے اللہ کے ساتھ جڑے ہوئے۔

اس حقیقت کے بیان اور اچھی طرح ذہن نشین کرنے اور مسلمانوں کو دلجمعی اور صبر و ثبات دینے کے بعد اب انہیں بتایا جاتا ہے کہ جس شر سے ان کا مقابلہ ہے وہ کوئی سطحی شر نہیں ہے وہ بہت ہی گہری برائی ہے۔ دشمنوں کا منصوبہ بہت ہی گہرا ہے اور وہ اس پر بطور اصول جمے ہوئے ہیں۔

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا "اور وہ تم سے لڑے ہی جائیں گے حتیٰ کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہارے دین سے تم کو پھیر لے جائیں۔"

یہ ہے صحیح رپورٹ' جو علیم و خبیر کی طرف سے ہے اور جو بتاتی ہے کہ شر اپنے ناپاک موقف پر کس قدر مصر ہے' کفار' مسلمانوں کو اپنے دین سے ہٹانے کے لئے کس قدر زور لگارہے ہیں اور یہ کہ مسلمانوں کے دشمنوں کا یہ ایک مستقل نصب العین ہے' وہ چاہتے ہیں کہ

انہیں کسی طرح اسلام سے دور کر دیں۔ دشمنان اسلام کا یہ نصب العین ایسا مستقل نصب العین ہے کہ یہ کسی دور میں اور کسی علاقے میں کبھی بھی تبدیل نہیں ہوا۔ زمین پر اسلام کا وجود ہی ان کو ناگوار ہے۔ دین کے دشمن اس سے ہمیشہ خائف رہے ہیں۔ ہر دور میں یہ لوگ اسلامی جماعت اور اسلامی تحریک سے خائف رہتے ہیں۔ نفس اسلام سے انہیں چڑ ہے' انہیں اس سے سخت اذیت ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت اس سے خوف کھاتے ہیں۔ اسلامی نظام کی قوت اور اس کی سنجیدگی سے ہر باطل پرست خائف رہتا ہے۔ خدا کا ہر باغی اس سے مرعوب ہوتا ہے۔ ہر مفسد اسلام کو ناپسند کرتا ہے۔ اسلام بذات خود کفر سے ایک جنگ ہے۔ اسلام کی روشن سچائی' اس کا پائیدار نظام زندگی اور اس کا پائیدار طریق کار ہی باطل کے لئے چیلنج ہے۔ ان خوبیوں کی وجہ سے اسلام بذات خود کفر اور فساد کے لئے اعلان جنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باطل پرست' باغی اور مفسد کبھی بھی اسلام کو برداشت نہیں کرتے۔ وہ ہر وقت اس ٹوہ میں لگے رہتے ہیں کہ اہل اسلام کو کسی نہ کسی طرح فتنے میں ڈال دیں۔ انہیں واپس کفر کی طرف لے آئیں۔ چاہے کفر کی کوئی صورت ہی وہ اختیار کریں لیکن اسلام کو چھوڑ دیں۔ جب تک اس کرۂ ارض پر کوئی ایسی جماعت بھی موجود ہے جس کا نصب العین اسلامی نظام زندگی ہے' جو اسلام کی پیرو کار ہو اور اسلام میں زندہ رہنا چاہتی ہو۔ اس وقت تک باطل پرست اپنے باطل پر اور اپنے فساد پر پر امن طور پر گامزن نہیں رہ سکتے۔ اس لئے وہ تحریک اسلامی سے ہر وقت خائف رہتے ہیں۔

اسلام کے یہ دشمن' مسلمانوں کے خلاف کئی قسم کی جنگ لڑتے ہیں اور اس میں قسم قسم کے ہتھیار استعمال کرتے ہیں' لیکن ان کا مقصد ایک ہی رہتا ہے اور ہمیشہ وہی ان کے پیش نظر رہتا ہے یہ کہ اگر ان کا بس چل سکے تو یہ لوگ صادق مسلمانوں کو اپنے دین سے پھیر دیں۔ جب ان کا کوئی ایک ہتھیار ناکارہ ہو جاتا ہے تو یہ فوراً دوسرا ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ جب ان کا ایک ہتھیار کند ہو جاتا ہے تو یہ لوگ دوسرا ہتھیار تیز کر لیتے ہیں' لیکن علیم و خبیر کی یہ سچی رپورٹ اپنی جگہ پر قائم ہے اور مسلمانوں کو ان مخالفین کے ہتھکنڈوں سے خبردار کرتی ہے کہ وہ ہتھیار نہ ڈالیں۔ مسلمانوں کو دعوت دی جاتی کہ وہ ان کفار کی سازشوں کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں۔ ان کے ساتھ جنگ پیش آجائے تو اس میں صبر و تحمل سے کام لیں۔ اور اگر ایسا نہ کریں گے تو دنیا و آخرت میں خسارہ اٹھائیں گے۔ وہ ایسے عذاب سے دوچار ہوں گے جو کسی عذر سے معاف نہ ہو گا اور جو کسی جواز سے کم نہ ہو گا:

وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ "تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا اس کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے سب لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔"

**حبطت** حبوط سے نکلا ہے۔ عرب کہتے ہیں **حبطت الناقۃ**' یعنی اونٹنی پھول گئی۔ جب وہ کوئی ایسی چیز چر لے جس سے وہ پھول جائے اور آخر کار مر جائے (جس طرح شفتل اور بعض دوسرے چاروں سے جانور پھول جاتے ہیں)۔ قرآن مجید نے اس لفظ کو کفار کے اعمال کے لئے استعمال کیا ہے جس سے حسی اور معنوی مفاہیم کا تطابق بھی معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح اونٹنی بظاہر پھول کر بڑی ہو جاتی ہے لیکن اس کا انجام ہلاکت ہوتا ہے۔ اس طرح کفار کے اعمال بہت ہی بڑے اور پھولے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن انجام ان کا کچھ نہیں ہوتا بلکہ تباہ ہو جاتے ہیں۔

یہی حال اس شخص کا ہو گا' جو اسلام کو سمجھنے اور اس کا تجربہ کر لینے کے بعد' اس سے روگردانی کرے گا۔ محض اذیتوں اور مصیبتوں سے گھبرا کر۔ اگرچہ وہ حد سے گزر جائیں تو اس کا انجام یہی ہو گا جس کا اللہ نے ذکر فرمایا: کہ دنیا و آخرت میں اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور آخرت میں وہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہیں گے۔

جو دل ایمان کا ذوق آشنا ہو جائے' صحیح طرح وہ اسلام کو سمجھ لے' اس بات کا امکان ہی نہیں ہے کہ وہ فی الواقع اسلام کو چھوڑ دے اور راہ ارتداد اختیار کرے۔ الا یہ کہ کسی کا دل و دماغ اس قدر فاسد ہو جائے جس کی اصلاح کی کوئی صورت نہ رہے لیکن یہ حکم ان لوگوں کا نہیں ہے جو ناقابل برداشت عذاب سے بچنے کے لئے تقیہ اختیار کرلیں۔ اللہ رحیم و کریم ہے' اس نے مسلمان کو اجازت دی ہے کہ جب مصائب اس کی قوت برداشت سے بڑھ جائیں تو وہ ظاہری رواداری اختیار کرلیں بشرطیکہ ان کا دل اسلام پر ثابت قدم ہو' قلب ایمان پر مطمئن ہو۔ لیکن اللہ نے کسی صورت میں بھی کفر حقیقی اور ارتداد حقیقی اختیار کرنے کی کوئی رخصت نہیں دی۔ یوں کہ وہ کافر ہو کر رہ جائے نعوذ باللہ من ذلک۔

اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ تنبیہ اور تحذیر روز قیامت تک اپنی جگہ پر قائم ہے۔ مسلمان کے لئے اس بات کا کوئی عذر نہیں ہے کہ وہ مصائب اور شدائد سے تنگ آکر اپنا دین ایمان چھوڑ دے۔ اور ایمان و اسلام سے منحرف ہو جائے اور اس حق کو ترک کر دے جو اس نے چکھا اور جانا۔ بلکہ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ جس قدر ممکن ہو وہ مجاہدہ کرے۔ جبر و ثبات سے کام لے اور سخت جانی سے کام لے۔ یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو اس پر ایمان لے آئیں اور پھر اس کی راہ میں مصائب برداشت کریں یونہی نہیں چھوڑ دیتا۔ وہ ان کی ان تکالیف پر انہیں جزائے خیر دیتا ہے اور وہ دو باتوں میں سے ایک ضروری ہوتی ہے یا اس کی نصرت آجاتی ہے اور مومن کامیاب ہو جاتا ہے اور یا اسے شہادت کا مقام بلند حاصل ہو جاتا ہے۔

جن لوگوں کو اللہ کی راہ میں اذیت دی جائے۔ وہ اللہ کی خصوصی رحمت کے امیدوار ہوتے ہیں اور جس مومن کا دل ایمان سے معمور ہو وہ کبھی بھی مایوس نہیں ہوتا۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ "جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور جہاد کیا' وہ رحمت الٰہی کے جائز امیدوار ہیں اور اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمت سے انہیں نوازنے والا ہے۔"

جب ایک مومن رحمت خداوندی کا امیدوار ہو تو اللہ اسے کبھی نامراد نہیں لوٹاتے۔ مہاجرین و انصار کے مخلص مومنین نے' اگرچہ وہ قلیل تعداد میں تھے' اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کو اپنے کانوں سے سنا تھا' انہوں نے جہاد کیا' مشکلات پر صبر کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ بعض کو شہادت نصیب ہوئی اور بعض کو نصرت خداوندی پہنچی۔ دونوں خیر ہیں۔ دونوں اللہ کی رحمت ہیں۔ یہ لوگ اللہ کی مغفرت اور اللہ کی رحمت کے مراتب پر فائز ہو گئے کیونکہ اللہ غفور ہے اور رحیم ہے۔ یہ ہے طریقہ مومن۔

اب سیاق کلام بعض منہیات کی طرف آتا ہے۔ شراب اور جوئے کے احکام بیان ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ان لذات میں سے ہیں جن میں عرب کانوں تک غرق تھے۔ کیونکہ اس دور میں ان کے سامنے کچھ اونچے مقاصد نہ تھے جن میں وہ اپنے آپ کو مصروف رکھتے اور یوں ان کا قیمتی وقت اور ان کی قیمتی توتیں کسی تعمیری کام میں صرف ہوتیں۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا ۗ

پوچھتے ہیں: شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ کہو ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں لوگوں کے لئے کچھ منافع بھی ہیں مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔

اس وقت شراب اور جوئے کی حرمت کا حکم نازل نہ ہوا تھا' لیکن قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت بھی نہیں ہے جس سے ان کی حلت کا ثبوت ملتا ہو' لیکن اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جس راستے پر لے جانا چاہتا تھا' اس کی مرضی یہ تھی کہ وہ انہیں اس راہ پر قدم بقدم لے جائے اور خود اپنی نگرانی میں اس امت کو اس رول کیلئے تیار کرے' جس کیلئے اس نے اسے برپا کیا۔ یہ رول اس قدر عظیم تھا کہ اس کے ساتھ شراب اور جوئے جیسے مخرب اخلاق و مخرب اوقات کام چل ہی نہ سکتے تھے۔ عمر کا ٹکڑے ٹکڑے کر دینا' فہم کا پریشان کر دینا اور جدوجہد کے حصے بخرے کر دینا اس رول اور اس منصب کے مناسب نہیں۔ اس کے حاملین ان نکموں کی طرح نہیں ہو سکتے' جن کا کوئی کام اس کے سوا نہیں ہوتا کہ وہ کام و دہن اور گوشت و پوست کی لذت کے پیچھے دوڑتے پھریں۔ نہ وہ ایسے لوگوں کی طرح ہوتے ہیں جن کا کوئی نظریہ نہ ہو اور ذہن و شعور کا خلا' خوفناک خلا' ان کے تعاقب میں ہو اور وہ اس خلا کو شراب کی مدہوش اور جوئے کی مشغولیت سے بھرنا چاہتے ہیں : نہ وہ ایسے لوگوں کی طرح ہوتے ہیں کہ جو نفسیاتی مریض ہیں اور خود اپنے سایے سے بھاگ رہے ہیں اور شراب و قمار کی پناہ لینے پر مجبور ہیں۔ حاملین جاہلیت ہمیشہ ان مفاسد میں مبتلا رہے ہیں۔ آج بھی وہ اس میں مبتلا ہیں اور مستقبل میں بھی جاہلیت کا یہی نشان ہو گا۔ البتہ یہ بات ایک حقیقت ہے کہ اسلام اپنے مخصوص نظام تربیت کے مطابق' نفس انسانی کو بڑی سہولت میں لے کر چلتا ہے اور بڑی تدریج اور ترقی کے ساتھ اس کی تربیت کرتا ہے۔

آیت زیر بحث محرمات کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ یہ پہلا قدم ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی چیز یا کوئی فعل بذات خود شر ہی شر ہو' ہو سکتا ہے کہ شر میں خیر کا بھی کوئی پہلو موجود ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ خیر اور بھلائی میں بھی شر کا کوئی پہلو ہو۔ لیکن جائز' حلال و حرام اور امر و نہی کا دارومدار دراصل غالب خیر یا غالب شر کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ جوئے اور شراب میں شر کا پہلو چونکہ غالب ہے اس لئے یہ ان چیزوں کی حرمت کے لئے علت بن جائے گا۔ اگرچہ یہاں ان اشیاء کی حرمت کی صراحت نہیں کی گئی۔

یہاں اسلامی نظام تربیت اور قرآنی منہاج تعمیر اور ربانی طرز تعلیم کا ایک انداز کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ یہ نہایت ہی حکیمانہ انداز تربیت ہے۔ اسلام کی اکثر ہدایات و فرائض اور قانون سازی میں تتبع اور استقراء سے معلوم ہو گا کہ یہی منہاج اختیار کیا گیا ہے۔ خمر اور میسر کے بارے میں اس ہدایت کی مناسبت سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام تربیت کے ایک اصول کی طرف یہاں اشارہ کر دیں :

۱۔ اگر کسی امر و نہی کا تعلق کسی ایسے اصول سے ہو جس کا تعلق اسلام کے نظریات و عقائد سے ہو تو اسلام پہلی فرصت میں اس کا قطعی اور اٹل فیصلہ کر دیتا ہے۔

۲۔ اور اگر امر و نہی کا تعلق کسی ایسے معاملے سے ہو جو بطور عادت معمول بہ ہو یا بطور رسم چلا آتا ہو' تو اسلام اس کے بارے میں اصلاحی قدم اٹھانے سے پہلے انتظار کرتا ہے۔ تدریج' رفق اور سہولت سے اس میں کوئی قدم اٹھاتا ہے اور اقدام سے پہلے ایسے حالات تیار کرتا ہے' جن میں نفاذ قانون اور نفاذ حکم کے لئے راہ اچھی ہموار ہو جاتی ہے۔

مثلاً مسئلہ توحید اور مسئلہ شرک کے بارے میں اسلام نے پہلی فرصت میں فیصلہ کن بات کر دی۔ عقائد شرکیہ پر فیصلہ کن حملہ کیا۔ بغیر کسی تردد کے' بغیر کسی جھجک کے' بغیر کسی رکھ رکھاؤ کے' بغیر کسی سودے بازی کے' بغیر کچھ لو اور کچھ دو پالیسی کے۔ پہلے ہی مرحلے میں ایک ایسا وار کیا کہ شرک کا تانا بانا ادھیڑ کر رکھ دیا۔ کیونکہ یہ مسئلہ اسلامی نظریۂ حیات کا اساسی مسئلہ' اعتقاد کا مسئلہ تھا۔ اس کے بغیر ایمان مکمل ہی نہ ہو سکتا تھا۔ اس کی صفائی کے بغیر اسلام اپنی جگہ پر قائم ہی نہیں رہ سکتا تھا۔

شراب اور جوا ایسے معاملات تھے جن کا تعلق عادت (Custom) سے تھا۔ عادت بد ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج معالجہ ضروری ہے۔ اس لئے اس کے علاج کے لئے قرآن کریم نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان چیزوں کے خلاف دینی شعور بیدار کیا گیا' مسلمانوں

کے دماغ میں قانون سازی کرنے کے لئے وہ دلائل بٹھائے گئے جن کی وجہ سے ان چیزوں کو حرام قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ جوئے اور شراب میں جو مضرات اور قباحتیں ہیں وہ ان فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں جو ان میں ہیں۔ اس منطقی دلیل میں اسی طرف اشارہ تھا کہ ان چیزوں سے پرہیز کرنا زیادہ بہتر و مناسب ہے۔ اس کے بعد دوسرا اقدام سورۃ نساء کے ذریعہ کیا گیا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ تم جو کہتے ہو اسے سمجھنے لگو پھر نماز پڑھو۔ اب نماز کے پانچ اوقات ہیں اور اکثر اوقات ایک دوسرے کے بہت ہی قریب ہیں۔ ان کے مابین اتنا وقت نہیں ہوتا کہ ایک شخص شراب پیئے نشہ میں ہو جائے اور پھر اسے افاقہ ہو جائے۔ یوں عملاً اس کے اوقات میں کمی کر دی گئی۔ یوں نشے کے مخصوص اوقات میں نفس میں جو اشتیاق پیدا ہوتا ہے اسے توڑ دیا گیا۔ یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ نشے کے عادی نشے کے اوقات میں طلب محسوس کرتے ہیں یعنی جن اوقات میں عام طور پر وہ نشہ کرتے ہیں۔ اگر کوشش کر کے کسی طرح وہ وقت گزار دیا جائے تو پھر نشے کی حدت طلب ختم ہو جاتی ہے اور اگر مسلسل اس طرح کیا جائے تو اس پر غلبہ پایا جاسکتا ہے۔ جب یہ دو مرحلے طے ہو گئے تو پھر آخری اور قطعی حکم نازل ہوا اور شراب اور جوئے کو قطعاً حرام قرار دے دیا گیا۔ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ "اے ایمان لانے والو! یہ شراب اور جوا' یہ آستانے اور پانسے' یہ سب شیطانی گندے کام ہیں۔ ان سے پرہیز کرو۔ امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہو گی۔"

اس اصول کی دوسری مثال غلامی ہے۔ غلامی اس وقت کے اجتماعی اور اقتصادی نظام کا ایک لازمی حصہ تھی۔ اس وقت کا یہ ایک مسلم بین الاقوامی قانون (International Law) تھا اور اقوام کا یہ رواج تھا کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنالیا جاتا تھا اور ان سے کام لیا جاتا تھا۔ ان بین الاقوامی اجتماعی حالات کی ظاہری شکل و صورت کو تبدیل کرنے سے پہلے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان اسباب میں تبدیلی کی جائے جن کی وجہ سے یہ حالات رونما ہوئے اور ان بین الاقوامی روابط کو بدلا جائے جن کے نتیجے میں غلامی کے ذرائع وجود میں آتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی رسومات میں بین الاقوامی سمجھوتوں اور معاہدوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس نے قیام غلامی کے سلسلے میں کوئی حکم نہیں دیا۔ نہ قرآن مجید میں کوئی آیت اتری ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنا لیا جائے۔

جس وقت اسلامی نظام زندگی کا آغاز ہوا' تو اس وقت غلامی کا ایک عالمی نظام رائج تھا' اور یہ مسئلہ صرف غلامی اور جنگی قیدیوں کا نہ تھا' بلکہ غلامی بین الاقوامی تجارت کا بھی ایک حصہ تھی۔ اور جنگی قیدیوں کو غلام بنانا ایک بین الاقوامی معروف ضابطہ تھا۔ اور اس پر بین الاقوامی اور مقامی جنگوں میں حصہ لینے والے تمام فریق عمل کرتے تھے۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ اسلام اس عالمی اور اجتماعی مسئلے کے مکمل حل کے لئے ٹھوس اقدامات کرتا۔

اسلام نے ابتدائی طور پر جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ اس نے اس جبر' تشدد اور استحصال کو ختم کر دیا جو غلامی کا خاصہ تھا' اس نے کوشش کی کہ غلامی کا یہ نظام ہی ختم ہو جائے۔ غلامی کے ختم کرنے کے لئے اسلام نے کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھایا۔ نہ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس وقت کے اجتماعی نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی' اس طرح کہ جھٹکے کے بعد اس کے نتائج کو کنٹرول نہ کیا جاسکے یا اس تحریک کی قیادت ہی مشکل ہو جائے۔ غرض غلامی کے سرچشمے بند کرنے کے ساتھ ساتھ غلاموں کی زندگی کی سہولیات میں اضافہ کیا۔ ان کو مناسب زندگی گزارنے کی ضمانت دی اور وسیع حدود میں انہیں شریفانہ زندگی بسر کرنے کی اجازت دے دی۔

اسلام نے سب سے پہلے دو ذرائع کے علاوہ غلامی کے تمام سرچشمے بند کر دیئے۔ ایک یہ کہ کوئی شخص جنگی قیدی بن جائے اور اس کے نتیجے میں وہ غلام بن جائے۔ دوسرا یہ کہ اس شخص کا باپ غلام ہو تو اس کا بیٹا بھی غلام ہو گا۔ یہ بھی اس لئے کہ اسلامی نظام کے دشمن معاشروں میں مسلمان اسیروں کو غلام بنالیا جاتا تھا' اور یہ اس وقت کا معروف طریقہ تھا' اور اسلام اس وقت کوئی بین الاقوامی غالب قوت نہ تھا کہ وہ ان دشمن معاشروں کو اس بات پر مجبور کر سکتا کہ وہ نظم غلامی سے دستبردار ہو جائیں' جس پر پوری دنیا کا اجتماعی اور اقتصادی نظام قائم تھا(۱)۔ اگر اسلام یکطرفہ طور پر غلامی کے نظام کو ختم کر دیتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ اسلامی ضابطے کا اجراء صرف ان اسیروں پر ہوتا جو مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے' جبکہ خود مسلمانوں کے قیدی اس وقت کے نظام کے مطابق غلام ہی رہ جاتے۔ اس طرح اسلام کے دشمن بڑی جرأت سے اسلام کے خلاف لڑتے' اس خیال سے کہ اگر وہ قید ہوئے تو رہا ہو جائیں گے جبکہ جو مسلمان ان کے ہاتھ آئیں گے وہ غلام بن جائیں گے اور قبل اس کے کہ اسلامی حکومت کا اقتصادی نظام مستحکم ہوتا' غلاموں کی جو نسل اس وقت عملاً موجود تھی' اگر اسے آزاد کر دیا جاتا تو ان غلاموں کا اس وقت کے معاشرے میں آمدن کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا' نہ ان کی کفالت کرنے والا کوئی ہوتا اور نہ ہی وہ کسی خاندان کے اجزاء تصور ہوتے' نہ ان کے کسی کے ساتھ رشتے ناطے کے تعلقات ہوتے جو انہیں معاشرتی اور اخلاقی بے راہ روی سے بچاتے۔ اس حالت میں ایک تو ان لوگوں کے معاشی حالات خراب ہوتے جن کی غلامی سے یہ آزاد ہوتے۔ اور دوسرے خود یہ لوگ اسلامی معاشرہ کو ایک گری پڑی نسل کی حیثیت سے' خراب اور گندہ کر دیتے جبکہ خود مسلمان مالکان کے حالات بھی اچھے نہ تھے اور اسلامی معاشرہ بھی بالکل نیا تھا۔ غرض یہ تھی اس وقت کی صورت حال اور اس کے پیش نظر' اس کے مطابق قرآن مجید نے صرف یہ کیا کہ اسلامی قانون میں کوئی ایسی دفعہ نہیں رکھی جس کے مطابق جنگی قیدیوں کو لازماً غلام بنالیا جائے بلکہ قرآن مجید نے صرف یہ حکم دیا **فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا** "پس جب ان کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو اس کے بعد (تمہیں اختیار ہے) احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کر لو' تاآنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے۔"

قرآن مجید نے یہ بھی نہیں کہا کہ جنگی قیدیوں کو غلام نہ بنایا جائے' بلکہ اس معاملے کو اسلامی حکومت کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے۔ تاکہ وہ موقعہ و محل کے اعتبار سے جو موقف مناسب ہو وہ اختیار کرے۔ یا فریقین کے قیدیوں کا باہمی تبادلہ ہو جائے اور جن لوگوں کا غلام بنانا ہی مناسب ہو انہیں غلام بنالے۔ اس صورت میں معاملہ وہی ہو گا جو کہ محارب قوت معاملہ کرے گی۔

اسی طرح غلامی کے دوسرے سرچشمے بند ہو جانے سے غلاموں کی تعداد کم ہوتی چلی گئی۔ جبکہ اس وقت مختلف ذریعوں سے لوگوں کو غلام بنا لیا جاتا تھا۔ غلاموں کی جو قلیل تعداد رہ گئی تھی اسے بھی اسلامی نظام مختلف تدابیر کے ذریعہ کم سے کم کئے جا رہا تھا۔ مثلاً جب کوئی غلام دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا اور پھر وہ دشمن کے کیمپ کو چھوڑ کر اسلامی کیمپ میں داخل ہو جاتا تو وہ آزاد قرار پاتا۔ پھر اسلام نے ہر غلام کو یہ حق دیا کہ وہ اپنے مالک سے آزادی کا سودا کر سکتا ہے۔ اور اس سودے کا معاوضہ ادا کرنے کے سلسلے میں مالک کے ساتھ اسے تحریری یا زبانی اگریمنٹ کرنے کا پورا پورا اختیار ہے۔ یہ معاہدہ ہونے کے بعد جسے مکاتبت کہتے تھے غلام آزاد ہو جاتا تھا۔ آزادانہ کاروبار کر سکتا تھا۔ چاہے اپنے مالک ہی کی نوکری کر لیتا۔ وہ اپنی کمائی کا خود مالک ہوتا تھا۔ چاہے دوسری کسی جگہ آزادانہ کام کرتا اور مالک کو مقررہ رقم ادا کر دیتا۔

---

۱۔ قدیم نظام کو جزوی طور پر برقرار رکھنے کے باوجود اسلام نے عملاً غلامی کے رواج کو اس طرح ختم کیا کہ اکثر گناہوں کا کفارہ غلام آزاد کرنا قرار دیا اور مالکوں کو حکم دیا کہ وہ جو خود کھائیں وہی غلاموں کو کھلائیں اور جو خود پہنیں وہی غلاموں کو پہنائیں۔ ۲۔ محمد ہم

مکاتبت کے ساتھ یہ غلام اس معاشرے کا ایک مستقل فرد بن جاتا تھا۔ ایسے افراد کے لئے اسلام کے نظام زکوٰۃ کا ایک حصہ مقرر ہے۔ اس کے علاوہ بھی مسلمانوں کے لئے یہ بات ضروری قرار دی گئی کہ وہ ایسے افراد کو مالی امداد دیں تاکہ وہ اپنی گردن کو غلامی کے جوئے سے آزاد کر سکیں۔ اس کے علاوہ جو اسلامی نظام نے مختلف معاملات میں افراد معاشرہ پر کفارات (Fines) واجب کئے اور کفارے کی شقوں میں سے ایک شق یہ ہوا کرتی ہے کہ کسی غلام کو آزاد کر دیا جائے۔ مثلاً قتل خطاء کی بعض صورتوں میں، قسم کے کفارے میں۔ ظہار کے کفارے میں' ان تدابیر کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ غلامی کا وجود ہی ختم ہو گیا۔ اور یہ چیز طبعی موت مر گئی۔ اگر اسے یکلخت ختم کر دیا جاتا تو اس وقت کے معاشرے میں بے حد افراتفری پیدا ہو جاتی' اور اس معاشرے میں فتنہ و فساد برپا ہو جاتا۔

سوال یہ ہے کہ دور نبوی کے بعد اسلامی معاشرے میں غلامی ختم ہونے کے بجائے غلامی میں اضافہ کیوں ہو گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعد کے ادوار میں غلامی میں اضافہ محض اس لئے ہو گیا تھا کہ مسلمانوں نے اسلامی نظام زندگی سے انحراف کر لیا تھا' جوں جوں مسلمان اسلامی نظام سے دور ہوتے گئے' خرابیاں زیادہ ہوتی گئیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کا قصور تھا' اسلامی نظام زندگی کا اس میں کوئی قصور نہ تھا۔ دور نبوی کے بعد اگر لوگوں نے اسلامی نظام زندگی سے انحراف کیا(۱)' تھوڑا کیا یا زیادہ کیا اور اسلامی نظام زندگی کے اصولوں کو اچھی طرح نافذ نہ کیا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلامی نظام میں کچھ خرابی ہے۔ اسلامی تاریخ کے سلسلے میں ہمارا جو نقطہ نظر ہے وہ ہم اس سے پہلے بیان کر آئے ہیں۔ اگر اسلامی نظام سے انحراف کے نتیجے میں کچھ ناپسندیدہ حالات' اسلامی تاریخ کے کسی دور میں' بھی پیدا ہو گئے تھے۔ تو ان حالات کو اسلام کے سر نہیں تھوپا جا سکتا۔ ایسے حالات کو اسلامی تاریخ کی کوئی کڑی نہ گردانا جائے گا۔ اس لئے کہ اسلام میں کوئی تبدیلی نہیں آگئی۔ نہ اس کے اصولوں میں نئے اصولوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اگر تبدیلی آئی ہے تو لوگوں میں آئی ہے۔ لوگ اسلام سے اس قدر دور ہو گئے کہ ان کا اسلام سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا۔ اور ان کی تاریخ اسلامی تاریخ کا حصہ نہ رہی۔

اب اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ نئے سرے سے اسلامی نظام زندگی قائم ہو' تو وہ اسلامی نظام زندگی کا آغاز اسلامی تاریخ کے اس مقام سے ہرگز نہ کرے گا جہاں اسلامی تاریخ ختم ہو جاتی ہے' بلکہ اب اسلامی نظام زندگی کا قیام از سر نو اسلامی اصولوں کی روشنی میں کیا جائے گا۔ خالص اسلامی اصولوں کی روشنی میں!

یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ نظریہ اور نقطہ نظر کے اعتبار سے بھی اور اسلامی نظریہ اور اسلامی نظام کے قیام کی تحریک کے نشوونما کے نقطہ نظر سے بھی۔ اس نکتے کی تاکید یہاں دوبارہ اس لئے کی جا رہی ہے کہ اسلام کی تاریخ اور اسلامی نظام زندگی کے درمیان لوگوں کے ذہنوں میں سخت الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے' حالانکہ اسلامی نظام اور ہے اور عملی اسلامی تاریخ' یعنی مسلمانوں کی تاریخ چیزے دیگر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ لوگ صحیح اسلامی تحریک اور صحیح اسلامی نظام زندگی اور مسلمانوں کی تاریخ کے درمیان فرق نہیں کر پاتے۔ اس دھوکے میں وہ تمام مستشرقین مبتلا ہیں' جنہوں نے اسلامی تاریخ پر قلم اٹھایا ہے۔ بعض لوگ جان بوجھ کر اسلامی تاریخ کو یہ رنگ دیتے ہیں اور بعض لوگ فی الواقعہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔

اب اس سے اگلی آیات میں' اسلامی اصول حیات کے بارے میں چند سوالات کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ سوالات مختلف لوگوں نے مسائل سمجھنے کے لئے کئے تھے:

---

۱۔ یہ انحراف واضح ہے' لیکن اس کے باوجود یہ حیرت انگیز واقعہ بھی ہوا کہ اسلامی معاشرے میں غلام سربراہ مملکت بنے۔ اس سلسلے میں غزنی کے سلاطین' مصر کے مملوک اور ہندوستان کا خاندان غلاماں روشن مثالیں ہیں۔ (مترجم)

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ قُلِ الْعَفْوَ ۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ

" پوچھتے ہیں: ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو' جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو' اس طرح اللہ تمہارے لئے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے' شاید کہ تم دنیا و آخرت دونوں کی فکر کرو۔"

اس سے پہلے بھی انہوں نے سوال کیا تھا کہ وہ کیا خرچ کریں؟ اس کے جواب میں خرچ کی نوعیت اور مصرف کی تشریح کر دی گئی۔ یہاں بھی سوال تو وہی ہے' جواب میں خرچ کی مقدار اور اس کا درجہ بتایا گیا ہے۔ عفو کے معنی عربی میں فاضل اور زیادہ کے ہوتے ہیں۔ جو مال ذاتی ضروریات سے زیادہ ہو۔ ضروریات سے مراد ایسی ضروریات ہیں جو عیاشی اور نمائشی نہ ہوں' اسے خرچ کیا جا سکتا ہے اور مصرف کی ترتیب وہی ہے جو اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ قریب سے قریب تر کا حق زیادہ ہے اس کے بعد دوسرے لوگ درجہ بدرجہ۔ ☆

انفاق کا حکم صرف ادائیگی زکوٰۃ ہی سے پورا نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ اس آیت کو نہ تو آیت زکوٰۃ نے منسوخ کیا ہے اور نہ ہی مخصوص کیا ہے۔ جیسا کہ میں سمجھا ہوں۔ زکوٰۃ کی ادائیگی سے ایک فرض ادا ہو جاتا ہے لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ادا کنندہ بس دوسری معاشرتی ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو گیا بلکہ زکوٰۃ کے بعد بھی انفاق کا حکم علی حالہ باقی رہتا ہے۔ زکوٰۃ تو مسلمانوں کے بیت المال کا حق ہے اور اسے وہ حکومت حاصل کرے گی جو اللہ کی شریعت نافذ کرے۔ اور یہ حکومت بھی اسے اس کے معلوم و معروف مصارف پر خرچ کرے گی۔ لیکن اس کے بعد بھی مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے اور خود مسلمان بھائیوں کی جانب سے عائد شدہ ذمہ داریاں بدستور قائم رہتی ہیں۔ پھر زکوٰۃ تو ایک خاص شرح سے فرض کی گئی ہے۔ اور یہ ممکن نہیں ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے تمام فاضل دولت سرمایہ دار کے ہاتھ سے نکل جائے۔ لیکن آیت زیر بحث تو واضح طور پر بتاتی ہے کہ العفو پورا کا پورا خرچ ہونا چاہئے۔

اس سلسلے میں ایک واضح حدیث بھی موجود ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: **اِنَّ فِى الْمَالِ حَقًّا سِوَى الزَّكٰوةِ** "بے شک دولت میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے۔"

ایسا حق' جسے صاحب ثروت اللہ کی رضا کے لئے خود مناسب جگہ خرچ کرتا ہے اور یہ خرچ کی اعلیٰ صورت ہے' کامل صورت۔ اگر وہ خود خرچ نہیں کرتا اور اسلامی نظام کو نافذ کرنے والی حکومت کو اس کی ضرورت ہوتی ہے تو اسے اختیار ہے کہ وہ یہ دولت اس صاحب ثروت سے حاصل کرے اور اسلامی جماعت کے ان افراد پر خرچ کر دے جو امداد کے مستحق ہیں' تاکہ صاحب ثروت نہ اسے عیش و عشرت اور عیاشی کے کاموں میں استعمال کر سکے اور نہ ہی ذخیرہ کر کے معطل کر دے۔ دولت کی گردش روک دے اور اس پر سانپ بن کر بیٹھ جائے۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے۔ شاید کہ تم دنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو۔"

اس آیت میں فرمایا گیا ہے' اللہ تعالیٰ اپنے احکام بیان کرتا ہے اور اس لئے بیان کرتا ہے کہ تم لوگ دنیا و آخرت دونوں کے بارے میں غور و فکر سے کام لو۔ اس لئے کہ صرف دنیا کے بارے میں غور و فکر کرنے سے' وجود انسانی کی حقیقت' انسان کی زندگی اور اس کے فرائض اور ان کے درمیان باہمی ربط کی اصل حقیقت کے بارے میں نہ عقل انسانی صحیح تجزیہ کر سکتی ہے۔

---

(۱) اے الجصاص۔ احکام القرآن۔ روایت فاطمہ بنت قیس

اور نہ ہی انسان کے قلب و نظام زندگی اور اس کی قدروں کی صحیح تصویر بنائی جاسکتی ہے۔ اس لئے کہ دنیا تو زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اور بہت ہی ادنیٰ اور مختصر حصہ ہے۔ اگر انسان اپنے نظریات اور اپنے نظام کی اساس اس مختصر اور سطحی نقطہ نظر پر رکھے تو اس کے نتیجے میں بھی انسان نہ کسی صحیح تصور حیات تک پہنچ سکتا ہے اور نہ زندگی میں کوئی صحیح طرز عمل اختیار کر سکتا ہے۔ پھر انفاق کا ذاتی طور پر دنیا سے بھی تعلق ہے۔ اور آخرت سے بھی تعلق ہے۔ انفاق سے اس کی دولت میں جو کمی آتی ہے اس کے نتیجے میں اسے دل کی صفائی اور قلب و نظر کی پاکیزگی' اس دنیا میں نصیب ہو جاتی ہے۔ پھر انفاق کرنے والا جس معاشرے میں رہتا ہے اس معاشرے کے ساتھ اس کی آشتی ہو جاتی ہے' صلح ہو جاتی ہے اور افراد کے درمیان تعلقات مضبوط ہو جاتے ہیں۔ لیکن ابنائے معاشرہ کا ہر فرد ہو سکتا ہے یہ باتیں نہ سوچ سکے اس لئے' آخرت کا عقیدہ اور شعور اور جزائے اخروی کی امید اور آخرت میں جو درجات ہیں اور جو قدریں ہیں ان کا خیال تو ہر شخص کے ذہن میں وزن رکھتا ہے اور اس سے انفاق کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔ اس سے نفس انسانی مطمئن ہو جاتا ہے' اسے سکون و آرام نصیب ہوتا ہے۔ ترازو نفس انسانی کے ہاتھ میں آجاتا ہے جو ہر وقت معتدل رہتا ہے اور کسی وقت بھی کھوئی قدروں اور آنکھوں کو چکا چوند کرنے والے دنیاوی معیارات سے اس کے ترازو کو ہلکا نہیں کر سکتے۔

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

"پوچھتے ہیں یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ کہو: جس طرز عمل میں ان کیلئے بھلائی ہو' وہی اختیار کرنا بہتر ہے۔ اگر تم اپنا اور انکا خرچ اور رہنا سہنا مشترک رکھو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آخر وہ تمہارے بھائی بند ہی تو ہیں۔ برائی کرنیوالے اور بھلائی کرنیوالے دونوں کا حال اللہ پر روشن ہے۔ اللہ چاہتا تو اس معاملے میں تم پر سختی کرتا۔ مگر وہ صاحب اختیار ہونے کے ساتھ صاحب حکمت بھی ہے۔"

اجتماعی تکافل (Social Security) اسلامی معاشرے کا سنگ اول ہے۔ اسلامی جماعت کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے نادار اور ضعیف لوگوں کا خیال رکھے' یتیموں کا بالخصوص' جو نابالغ ہیں اور ماں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے ہیں۔ چونکہ وہ کمزور ہیں اس لئے وہ اجتماعی امداد اور اجتماعی حمایت کے مستحق ہیں۔ اسلامی معاشرے کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کی پرورش کرے اور ان کے اموال اور ان کی جائدادوں کی حفاظت کرے۔ بعض اولیاء (Guardians) ایسے تھے جو یتیموں اور خود اپنے کھانے پینے کا انتظام یکجا کرتے تھے۔ نیز انہوں نے اپنے اور یتیموں کے اموال کو یکجا کر کے تجارت میں لگایا ہوا تھا۔ بعض اوقات اس طرح یتیموں کو نقصان ہوتا تھا۔ اس پر قرآن مجید کی آیات اتریں جن میں مسلمانوں کو یتیموں کا مال کھانے سے سخت ڈرایا گیا۔ اس پر بعض نیک لوگوں نے اس قدر احتیاط شروع کر دی کہ انہوں نے یتیموں کا مال کھانا بھی الگ کر دیا۔ اب صورت حال یہ ہو گئی کہ کسی کے پاس اگر یتیم ہوتا تو وہ یتیم کے مال سے اس کے لئے کھانا تیار کرتا۔ اگر کچھ بچ جاتا تو وہ دھرا رہتا تو وہ دوسرے وقت اسے کھاتا یا ضائع ہو جاتا اور پھینک دیا جاتا۔ یہ اس قدر زیادہ تشدد تھا جسے اسلام کا مزاج گوارا نہ کرتا تھا۔

علاوہ ازیں بعض اوقات اس میں یتیم کو نقصان بھی ہوتا' چنانچہ یہ آیات نازل ہوئیں اور مسلمانوں کو تلقین کر دی گئی کہ وہ اعتدال

اور آسانی کا راستہ اختیار کریں، جس میں اس کی مصلحت ہو۔ درحقیقت ان کے لئے خیر خواہی کا جذبہ اس سے بہتر ہے کہ انہیں الگ تھلگ کر دیا جائے۔ اگر اکٹھا رہنے سہنے اور کھانے پینے کے انتظام میں یتیم کی بھلائی ہے تو ساتھ رکھنا چاہئے۔ کیونکہ یتیم بھی بہرحال اولیاء کے بھائی بند ہی تو ہیں۔ تمام مسلمان ہیں اور بھائی بھائی ہیں۔ سب کے سب ایک عظیم اسلامی خاندان کے افراد ہیں۔ اللہ بھلائی کرنے والے اور برائی کرنے والے دونوں کے حال سے باخبر ہے۔ اللہ کے ہاں ظاہری شکل و صورت پر ہی فیصلے نہ ہوں گے، نیت اور نتائج کو بھی دیکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو تکلیف میں ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ نہ امر و نہی میں ان پر کوئی تکلیف لانا چاہتا ہے یا ان کو مشقت میں ڈالنا چاہتا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو تکلیف میں ڈال دیتا، لیکن اللہ کا یہ ارادہ نہ تھا، وہ تو عزیز و حکیم ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے لیکن وہ حکیم ہے۔ آسان بھلائی اور اصلاح کے سوا وہ اور کچھ نہیں چاہتا۔

یوں تمام معاملات کا ربط خدائے لایزل سے قائم ہو جاتا ہے۔ تمام معاملات کو اس اصلی محور کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے۔ جس کے گرد پورا نظریہ حیات گھومتا ہے۔ جس کے گرد پوری زندگی گھومتی ہے۔ یہ ہوتا ہے حال اس نظام قانون کا جو کسی نظریۂ حیات پر مبنی ہوتا ہے۔ اس قانون کے نفاذ کی ضمانت، انسان کے خارج، انسان کی ذات سے علیحدہ کسی اور ذریعہ سے فراہم نہیں ہوتی۔ بلکہ انسان کے ضمیر کے اندر گہرائیوں سے اس قانون پر عمل کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور ہر شخص اس پر از خود عمل کرتا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

# درس ۱۵ ایک نظر میں

یہ سبق گویا عائلی قوانین پر مشتمل ایک ضابطہ ہے۔ اس میں خاندانی نظام کی شیرازہ بندی کی گئی ہے۔ خاندان تحریک اسلامی کی تنظیم کی اساس ہے۔ خشت اول ہے۔ اس اساس کو اسلام نے ہر پہلو سے مضبوط کیا ہے۔ اس پر بے حد توجہ دی گئی ہے۔ اسے بڑی تفصیل سے منظم کیا ہے۔ اسے ہر طرح سے بچا کر رکھا گیا ہے۔ اسے دور جاہلیت کی انارکی سے پاک کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اتنی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں جگہ جگہ اس سلسلے میں ہدایات دی گئی ہیں اور ان میں وہ تمام بنیادیں فراہم کر دی گئی ہیں جو تحریک اسلامی کی تنظیم کے ابتدائی حلقے کی تنظیم اور تعمیر کے لئے ضروری تھیں۔

اسلام کا اجتماعی نظام ایک قسم کا خاندانی نظام ہے۔ اس کی اساس خاندان پر ہے۔ اس لئے کہ انسان کے لئے اس کے رب کا تجویز کردہ نظام ہے۔ اس میں انسان کی فطرت کی تمام ضروریات' تمام خصوصیات اور تمام بنیادی باتوں کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

خاندانی نظام کی جڑیں ابتدائے تخلیق تک جا پہنچی ہیں۔ اس کی کونپلیں شاخ فطرت سے پھوٹتی ہیں۔ انسان بلکہ تمام حیوانات کی تخلیق ہی خاندانی نظام پر ہے۔ قرآن مجید سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ "اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں' شاید کہ تم اس سے سبق لو۔"

ایک دوسری آیت میں فرماتے ہیں سُبْحٰنَ الَّذِي خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ "پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑوں کو پیدا کیا' ان تمام چیزوں سے جو زمین اگاتی ہے۔ انسانی نفوس سے اور ان تمام دوسری چیزوں سے جو وہ نہیں جانتے۔"

اب انسان کا مزید نقطہ نظر سے جائزہ لیا جاتا ہے اور اسے وہ پہلا انسان یاد دلایا جاتا ہے جس کے واسطے سے پہلی انسانوں کی بستی کا آغاز ہوا۔ پہلی انسانی آبادی ایک جوڑا تھا۔ پھر اس کی اولاد پیدا ہوئی' پھر اس سے انسانیت اور انسانی آبادی پھیل گئی۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَاۗءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاۗءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا "لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو' اور رشتہ و قربت کے تعلقات بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔"

دوسری جگہ ہے يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا "لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔"

پھر بتایا جاتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان ایک فطری جاذبیت ہے۔ اس لئے نہیں کہ مرد و عورت علی الاطلاق اکٹھے ہوں' بلکہ ان کے درمیان انس و محبت کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ خاندان کی بنیاد ڈالیں اور گھرانے تعمیر ہوں: وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔" هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ "وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔" نِسَاۗؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا

حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ "تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں تمہیں اختیار ہے۔ جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو اور اللہ کی ناراضگی سے بچو۔ خوب جان لو کہ تمہیں ایک دن اس سے ملنا ہے۔ **واللّٰہ جعل لکم من بیوتکم سکنا** "حقیقت ہے کہ اللہ نے تمہارے گھروں کو تمہارے لئے جائے سکون بنایا ہے۔"

یہ فطرت ہے کہ جو اپنا کام کرتی ہے اور یہ خاندان ہی ہے جو ابتدائی تخلیق اور پھر انسان کی تعمیر و تربیت میں فطرت عمیق مقاصد کی بجا آوری کے لئے لبیک کہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی میں خاندانی نظام ایک فطری اور طبعی نظام ہے جس کا سرچشمہ انسان کی تخلیق کے آغاز ہی سے پھوٹتا ہے۔ (آدم و حوا سے) اگر گہرا مطالعہ کیا جائے تو اس کائنات کی تمام اشیاء کا آغاز تخلیق بھی اسی نظام کے مطابق ہوا ہے۔ اس طرح اسلام نے نظام فطرت کے منہاج کو اپنایا ہے' جس طرح اس کائنات کی دوسری اشیاء کی تخلیق خاندانی نظام کے اسلوب پر ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلامی نظام کی اساس بھی خاندان کو قرار دیا گیا کیونکہ انسان بھی بہرحال اس کائنات کا ایک جزء ہے۔

خاندان دراصل ایک قدرتی نرسری ہے۔ جہاں چھوٹے بچوں کی صحیح دیکھ بھال اور تربیت ہو سکتی ہے۔ صرف اس نرسری میں وہ صحیح طرح روحانی' عقلی اور جسمانی نشوونما پا سکتے ہیں۔ خاندان کے سایہ میں بچے میں محبت' شفقت اور اجتماعی ذمہ داری (Reciprocal Responsibility) کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ اور اس نرسری میں اس پر جو رنگ چڑھتا ہے' وہ پوری زندگی میں قائم رہتا ہے۔ بچے کو خاندان کی نرسری میں جو سبق ملتا ہے اسی کی روشنی میں وہ زندگی' عملی زندگی کے لئے آنکھیں کھولتا ہے' اسی کی روشنی میں وہ حقائق حیات کی تشریح کرتا ہے اور اسی کی روشنی میں زندگی میں عمل پیرا ہوتا ہے۔

تمام زندہ مخلوقات میں طفل آدم کی طفولیت سب سے طویل ہوتی ہے۔ تمام زندہ چیزوں سے زیادہ۔ وجہ یہ ہے کہ ہر زندہ ذی روح کا عہد طفولیت دراصل باقی زندگی کے لئے تیاری' تربیت اور ٹریننگ کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس میں بچے کو اس رول کے لئے تیار کیا جاتا ہے جو اس نے باقی زندگی میں ادا کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ دنیا میں انسان نے جو فرائض سرانجام دینے ہیں وہ عظیم فرائض ہیں۔ جو رول زمین پر انسان نے ادا کرنا ہوتا ہے وہ ایک عظیم رول ہے' اس لئے اس کا عہد طفولیت بھی نسبتاً لمبا رکھا گیا ہے تاکہ اسے مستقبل کی ذمہ داریوں کے لئے بطریق احسن تیار کیا جاسکے اور اسے اچھی طرح ٹریننگ دی جاسکے۔ اس لئے دوسرے حیوانات کے مقابلے میں وہ والدین کے ساتھ رہنے کے لئے زیادہ محتاج ہے لہٰذا ایک پرسکون خاندانی ماحول' مستقل خاندانی نرسری انسانی نظام زندگی کی لئے لازمی ہے۔ انسانی فطرت کے زیادہ قریب اور اس کی تشکیل اور نشوونما اور اس زندگی میں اس کے کردار کے لئے موزوں تر ہے۔

دور جدید کے تجربات نے اس بات کو یقین تک پہنچا دیا ہے کہ خاندانی گہوارے کے مقابلے میں لوگوں نے بچوں کی نگہداشت کے جو انتظامات بھی کئے وہ سب کے سب ناقص رہے اور وہ خاندان کے نعم البدل ثابت نہیں ہو سکے' بلکہ ان انتظامات میں سے کوئی انتظام بھی ایسا نہیں ہے جس میں بچے کی نشوونما کے لئے مضر پہلو نہ ہوں یا جس میں اس کی معیاری تربیت ممکن ہو سکے۔ خصوصاً اجتماعی نرسری کا وہ نظام جسے دور جدید کے بعض مصنوعی اور جابرانہ نظام ہائے حیات نے محض اس لئے قائم کیا کہ وہ اللہ کے قائم کردہ مضبوط فطری اور صالح خاندانی نظام کی جگہ لے سکے۔ محض اس لئے کہ یہ لوگ دین کی دشمنی میں مبتلا ہو گئے اور دین پر اندھا دھند حملے کر کے اس کی ہر چیز کے خلاف ہو گئے۔ اس لئے خاندانی نظام کو جبراً ختم کر کے اس کی جگہ بچوں کے لئے نرسریاں قائم کر دیں۔ اگرچہ بعض اوقات ایسی نرسریاں حکومت کے تحت بھی قائم ہوئیں مثلاً دینی حدود و قیود سے آزاد مغربی ممالک نے ماضی قریب میں جو وحشیانہ جنگیں لڑیں' وہ سب کے سامنے ہیں۔ ان جنگوں میں ان وحشیوں نے لڑنے والوں اور پرامن شہریوں میں کوئی تمیز نہ کی' اس کے نتیجے میں لاتعداد لاوارث بچے ماں

باپ کے سایہ کے بغیر رہ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کی بعض حکومتیں ان بچوں کے لئے اجتماعی نرسریاں قائم کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

(۱) علاوہ ازیں مغرب کے جاہلی تصور حیات کے نتیجہ میں وہاں کے انسان کے لئے مناسب اجتماعی اور اقتصادی نظام کے مقابلے میں بدشکل اقتصادی اور معاشرتی نظام وجود میں آیا اور جس میں نوزائیدہ بچوں کی مائیں اس پر مجبور ہو گئیں کہ وہ اپنے لئے خود کمائیں اور مجبوراً بتقاضائے ضرورت بچوں کی اجتماعی نرسریاں وجود میں آئیں۔ یہ نظام نہ تھا بلکہ ایک لعنت تھی۔ اس نے بچوں کو ماؤں کی مامتا اور خاندان کے زیر سایہ ان کی تربیت سے محروم کر دیا' بچاروں کو نرسری میں پھینک دیا گیا' نرسری کا نظام بچوں کی فطرت اور ان کے نفسیاتی ساخت سے متصادم تھا اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ اس قسم کے بچے ذہنی الجھنوں کا شکار ہو گئے اور انھیں بے شمار نفسیاتی پریشانیاں لاحق ہو گئیں۔

تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ہمارے بعض معاصرین ان حقائق کے باوجود اس بات پر زور دیتے ہیں کہ عورت کے لئے ملازمت کا اختیار کرنا ترقی اور آزادی کی علامت ہے۔ اور اس بات کا ثبوت ہے کہ معاشرہ رجعت پسندی سے آزاد ہو گیا ہے۔ آپ نے دیکھا! ان لوگوں کے نزدیک آزادی اور ترقی اس لعنت کا نام ہے جس کی وجہ سے اس دنیا میں انسان کے سب سے قیمتی ذخیرہ یعنی بچوں کی نفسیاتی صحت اور ان کی اخلاقی ترقی تو ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ حالانکہ بچے انسانیت کے مستقبل کا سرمایہ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس قیمتی سرمایہ کو ضائع کر کے انسان فائدہ کیا حاصل کرتا ہے؟ صرف یہ کہ خاندان کی آمدنی میں ایک حقیر سا اضافہ ہو جاتا ہے بجائے اس کے کہ وہ اپنی اولاد کی کفالت کرے۔ یہ صورت حال اس لئے پیش آئی کہ مغربی جاہلیت اور جدید مشرقی جاہلیت اور اس کے فاسد اجتماعی نظام نے بچوں کے لئے والدہ کی کفالت کی خاطر والدہ کی ملازمت کی حوصلہ شکنی کرنے سے انکار کیا۔ اور صورت یہ ہو گئی کہ اگر کوئی عورت ملازمت نہیں کرتی تو اس کے ساتھ رشتہ کرنے کے لئے بھی کوئی تیار نہ ہوتا۔ حالانکہ ملازمت سے وہ جو کچھ کماتی ہے وہ اس عظیم سرمایہ کی تربیت اور نگہداشت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ اس لئے کہ بچے انسانیت کا نہایت ہی قیمتی اور نایاب سرمایہ ہیں۔

نرسریوں کے تجربات سے سب سے پہلے جو چیز ثابت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے دو سال کے عرصہ میں بچہ فطری اور نفسیاتی طور پر اس بات کا محتاج ہوتا ہے کہ اسے مستقلاً والدین کی گود میں ہونا چاہئے۔ بالخصوص والدہ کے معاملے میں تو اس کی ضرورت یہ ہے کہ والدہ مستقلاً صرف اس کی خدمت گزار ہو اور اس کے ساتھ اس میں کوئی دوسرا بچہ بھی شریک نہ ہو۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک پھر اسے یہ ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے ماں اور باپ ہوں اور اس کی نسبت ان کی طرف ہو۔ پہلی ضرورت نرسری کے سلسلہ میں ممکن نہیں ہے اور دوسری صورت سوائے اس کے کہ خاندانی نظام موجود ہو ممکن الحصول نہیں ہے۔

جو بچہ ان دو سہولتوں سے محروم رہے وہ توانائی اور نفسیاتی لحاظ سے ناقص رہے گا۔ ایسے بچے لازماً کسی نہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہوتے ہیں۔

اگر کسی کو کوئی ایسا حادثہ پیش آجائے اور وہ ان دونوں سہولتوں میں سے کسی ایک سے محروم ہو جائے تو یہ حادثہ اس بچے کے لئے تباہ کن ہوتا ہے لیکن ہمیں تعجب ہے کہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟ ذرا اس غافل اور بے خبر جاہلیت پر غور کریں' جس کی کوشش یہ ہے کہ نرسری کا نظام عام کر دیا جائے اور زیادہ سے زیادہ بچوں کو ایسے تباہ کن حادثوں سے دوچار کیا جائے اور پھر جاہلیت کے بعض وہ تماشائی جو اسلام کی عطا کردہ امن و سلامتی سے محروم ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہلاکت' چھوٹے چھوٹے بچوں کی ہلاکت و تباہی ترقی اور آزادی ہے۔ ثقافت و تہذیب ہے۔ (۲)

۱۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو۔ الانسان بین المادیۃ والاسلام فصل جنسیت۔ کتاب شبہات حول الاسلام 'محمد قطب فصل المرأۃ

۲۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو۔ الانسان بین المادیۃ والاسلام فصل جنسیت۔ کتاب شبہات حول الاسلام 'محمد قطب فصل المرأۃ

یہی وہ وجوہات ہیں جن کی وجہ سے اسلامی نظام حیات نے اپنے اجتماعی نظام کی بنیاد "خاندان" پر رکھی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا یہ تھی کہ مسلمان امن و سلامتی کے دائرے میں داخل ہو جائیں۔ اور اسلام کے زیر سایہ سلامتی اور چین کی زندگی بسر کریں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے خاندانی نظام کے استحکام پر بہت زیادہ توجہ کی ہے۔ اس لئے کہ اسلام کے اجتماعی نظام میں خاندان بنیادی یونٹ قرار پانے والا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں خاندانی نظام کے استحکام کے لئے اس کے مختلف پہلوؤں کو منظم کیا گیا ہے اور اس کے لئے بنیادی مواد فراہم کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ بقرہ ان سورتوں میں سے ایک ہے۔

اس سورت میں خاندانی نظام کے سلسلے میں جو آیات نازل ہوئی ہیں ان میں نکاح' معاشرت' ایلا' طلاق' نفقہ' متعہ' رضاعت اور حضانت کے اہم مسائل بیان کئے گئے ہیں' لیکن یہاں ان احکام کو خاص احکام کی شکل میں بیان نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر قانون کی کتابیں پڑھنے والے کتب قانون میں مجرد دفعات اور احکام پاتے ہیں۔ ہرگز نہیں! یہ احکام ایسی فضا میں وارد ہوتے ہیں کہ انسان کا دل و دماغ اسے بحیثیت ایک عظیم اصول کے لیتے ہیں۔ انسانی زندگی کے لئے اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام زندگی کا ایک عظیم اصول اور اس نظریۂ حیات کا عظیم اصول جس سے اسلامی نظام زندگی کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ اور یہ کہ اس اصول اور اس قانون کا تعلق براہ راست اللہ تبارک و تعالیٰ سے ہے۔ یہ قانون اس کے ارادے' اس کی حکمت' اس کی مشیئت سے ملا ہوا ہے۔ اور یہ اصول اس نظام زندگی کا ایک اہم حصہ ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پسند کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ساتھ اللہ کی رضا و غضب' ثواب و عقاب وابستہ ہوتے ہیں اور ان احکام کا تعلق اسلامی نظریۂ حیات سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی ان پر عمل کرے گا تو وہ شخص مسلم کہلائے گا۔ اگر عمل نہ کرے گا تو مسلم نہ کہلائے گا۔

انسان پہلی نظر ہی میں اس معاملے کی نزاکت اور اہمیت کو سمجھ لیتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس نظام کا ہر جز خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو اہمیت کا حامل ہے۔ خود اللہ تعالیٰ اس نظام کا نگران ہے اور اس طرف اس کی خاص توجہ ہے۔ اور یہ کہ اس نظام کی ہر چھوٹی اور بڑی بات مقصود بالذات ہے اور اللہ کے ہاں ایک عظیم مقصد کے لئے اسے رکھا گیا ہے۔ اور یہ کہ اس انسان کی ذات کی نگرانی خود اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ پھر تحریک کی تعمیر و تربیت کا کام بھی خود ذات باری اپنی نگرانی میں فرماتی ہے اور اس تعمیر اور نشوونما اور ٹریننگ کی غرض صرف یہ ہے کہ تحریک اسلامی کو اس عظیم رول کے لئے تیار کرنا ہے' جو اس نے اس کائنات میں ادا کرنا ہے' پھر انسان یہ محسوس کر لیتا ہے کہ اس نظام زندگی کے کسی حصے پر عمل نہ کرنا' اسے کمزور کرنا' اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ ایسے افراد شدید غضب کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

پھر یہ احکام بڑی تفصیل سے بیان کئے جاتے ہیں' جب تک ایک حکم ختم نہیں ہو جاتا' اس کے مالہ و ماعلیہ بیان نہیں کر دیئے جاتے' اس وقت تک دوسرے حکم کا آغاز نہیں کیا جاتا۔ پھر ہر حکم کے بعد تعقیبات اختتامیہ تبصرے اور نتائج بیان کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ تعقیبات اور تنبیہات بیان احکام کے درمیان ہی آجاتی ہیں' جن سے مقصود یہ بتلانا ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اہمیت کا حامل ہے۔ بالخصوص وہ تعقیبات' جن کا تعلق ضمیر و احساس اور دل کے تقویٰ سے ہوتا ہے کیونکہ یہ بیدار تقویٰ' احساس اطاعت اور ضمیر کی نگرانی کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ان احکام کے بجالانے میں حیلہ سازی سے کام لیا جائے۔

پہلا حکم یہ ہے کہ مسلمان مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کریں نہ اپنی عورتوں کا نکاح کر کے مشرک کے حوالہ کریں۔ اس کی وجوہات یہ بتائی گئی ہیں۔ **أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ ۖ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ** "یہ لوگ تمہیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور وہ اپنے احکام

واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے' توقع ہے کہ وہ سبق لیں گے اور نصیحت قبول کریں گے۔"

دوسرا حکم حیض کے دوران میں عورتوں کے ساتھ مباشرت کرنے کے مسئلے سے متعلق ہے۔ اس پر جو تعلیق و تبصرہ ہے' اس میں اس فعل کو محض قضائے شہوت کے چند منٹ کے جسمانی تلذذ سے بلند کر کے' اعلیٰ مقاصد اور انسانی فریضے کے اعلیٰ مقام تک بلند کیا جاتا ہے۔ بلکہ بتایا گیا ہے کہ یہ انسان کے ذاتی اور نجی فرائض میں سے ایک اہم فریضہ ہے اور اس کا تعلق خالق تعالیٰ کی اس سکیم سے ہے کہ اس کی مخلوق اس کی عبادت اور اس کے ذکر کی وجہ سے پاک و صاف ہو جائے۔

فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ ۖ وَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلَاقُوهُ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ "پھر جب وہ پاک ہو جائیں' تو ان کے پاس جاؤ اس طرح جیسا کہ اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے' اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے' جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں۔ تمہاری عورتیں کھیتیاں ہیں۔ تمہیں اختیار ہے' جس طرح چاہو' اپنی کھیتی میں جاؤ مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو اور اللہ کی ناراضی سے بچو۔ خوب جان لو کہ تمہیں ایک دن اس سے ملنا ہے۔ اور اے نبی جو تمہاری ہدایات لیں انہیں خوشخبری دے۔"

تیسرے حکم میں قسموں کے بارے میں احکام ہیں۔ بعد میں چونکہ ایلا اور طلاق کے احکام بیان ہوں گے۔ اس لئے یہاں بطور تمہید قسموں کے بارے میں عمومی حکم دے دیا۔ اللہ کے نام کی قسمیں کھانے کا ربط بھی' اللہ پر پختہ یقین اور خدا خوفی سے قائم کر دیا گیا ہے۔ ایک جگہ کہا گیا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ "اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔" اور دوسری جگہ ہے وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ "اللہ بہت درگزر کرنے والا بردبار ہے۔"

چوتھا حکم ایلا کا ہے اور اس کے آخر میں یہ تعقیب ہے فَإِنْ فَاءُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ "اگر انہوں نے رجوع کر لیا تو اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔ اور اگر انہوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو تو جانے رہیں کہ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

پانچواں حکم مطلقہ عورت کی عدت کے بارے میں ہے۔ اور اس حکم کے ساتھ بھی متعدد تعقیبات و تنبیہات پیوستہ ہیں۔

لَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ "اور ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو کچھ خلق فرمایا ہو' اسے چھپائیں' انہیں ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے اگر وہ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتی ہیں۔"

اور چھٹا حکم طلاقوں کی تعداد کے بارے میں ہے اور طلاق کی حالت میں مہر اور نفقہ واپس لینے کے احکام ہیں۔ ان احکام کے بعد بھی یہ تعقیبات وارد ہیں۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ "اور تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو' اس میں سے کچھ واپس لے لو' البتہ یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ زوجین کو اللہ کے حدود پر قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو' ایسی صورت میں اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہ رہیں گے تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کرے۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں' ان سے تجاوز نہ کرو اور جو لوگ حدود الٰہی سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔"

اور یہ کہ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۗ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ "اور یہ دوسرا شخص بھی اسے طلاق دے دے تب اگر پہلا شوہر اور یہ عورت دونوں یہ خیال کریں کہ حدود الٰہی پر قائم رہیں گے' تو ان کے لئے ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں' جنہیں وہ ان لوگوں کی ہدایت کے لئے واضح کر رہا ہے' جو (ان حدود کو توڑنے کا انجام) جانتے ہیں۔"

ساتواں حکم یہ ہے کہ اگر تم عورت کو طلاق دو تو یا پھر صحیح طرح اسے الگ کر دو اور یا صحیح طرح اسے اچھے طریقے سے رخصت کر دو اور اس حکم پر اللہ تعالیٰ کا تبصرہ یہ ہے۔ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ "یا بھلے طریقے سے انہیں روکو یا بھلے طریقے سے رخصت کرو۔ محض ستانے کی خاطر انہیں نہ روکے رکھنا کہ یہ زیادتی ہوگی اور جو ایسا کرے گا' وہ درحقیقت آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ۔ بھول نہ جاؤ کہ اللہ نے کس نعمت عظمیٰ سے تمہیں سرفراز کیا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ جو کتاب اور حکم اس نے تم پر نازل کی ہے اس کا احترام ملحوظ رکھو۔ اللہ سے ڈرو اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے۔"

دوسری ہدایت یہ ہے :

ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ یہ تمہیں نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسی حرکت نہ کرنا' اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان لانے والے ہو' تمہارے لئے شائستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے کہ اس سے باز رہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

آٹھواں حکم رضاعت اور اجرت پر دودھ پلانے اور اس کی اجرت کے متعلق ہے۔ اور مفصل احکام بیان کرنے کے بعد اس پر یہ نصیحت کی جاتی ہے وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ "اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو' سب اللہ کی نظر میں ہے۔"

نواں حکم اس عورت کی عدت کے بارے میں ہے جس کا خاوند فوت ہو گیا ہو' اس پر یہ تعقیب با پروانہ آزادی فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ "پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں اختیار ہے کہ اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے' جو چاہیں فیصلہ کریں' تم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اللہ تم سب کے اعمال سے باخبر ہے۔"

دسواں حکم دوران عدت عورت کو اشارۃً نکاح دینے کے بارے میں ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ تعقیب و تبصرہ آتا ہے۔

عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ "اللہ جانتا ہے کہ ان کا خیال تمہارے دل میں تو آئے گا ہی مگر دیکھو' خفیہ عہد و پیمان نہ کرنا' اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف طریقے سے کرو۔ اور عقد نکاح باندھنے کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تمہارے دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ لہٰذا اس سے ڈرو اور یہ بھی جان لو کہ اللہ بردبار ہے۔ (چھوٹی چھوٹی باتوں سے) درگذر فرماتا ہے۔"

گیارہواں حکم اس مطلقہ عورت کے بارے میں ہے' جس کے ساتھ مباشرت نہ ہوئی ہو' ایسی عورت کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو حکم یا ادا کر دیا گیا ہو تو حکم۔ اس پر یہ وجدانی تبصرہ دیکھئے۔

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ "اور اگر تم (مرد) نرمی سے کام لو' تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو۔ تمہارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے۔"

بارہواں حکم مطلقہ عورتوں کے بارے میں اور جس کا خاوند فوت ہو چکا ہے۔ اس کے بارے میں ہے کہ ایک سال تک نان و نفقہ دو۔ اس حکم پر آخر میں حکم ہوتا ہے وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ اور مطلقہ عورتوں کا حق ہے کہ انہیں مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔"

اب ان سب احکام کے بیان کرنے کے بعد ان سب پر ایک جامع تبصرہ کیا جاتا ہے: كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ "اس طرح اللہ اپنے احکام تمہیں صاف صاف بتاتا ہے۔ امید ہے کہ تم سمجھ بوجھ کر کام کرو گے۔"

یہ سب احکام عبادت ہیں۔ نکاح میں اللہ کی بندگی۔ مباشرت اور اضافہ نسل میں اللہ کی بندگی ہے۔ طلاق اور جدائی بھی اللہ کی غلامی اور بندگی ہے۔ عدت اور دوران عدت طلاق سے رجوع بھی بندگی ہے' نفقہ اور رخصتی کا سازوسامان بھی اللہ کی بندگی ہے۔ معروف طریقے سے عورت کو روک کر بیوی بنا لینا بھی بندگی ہے۔ ورنہ اچھے طریقہ سے ہمیشہ کے لئے رخصت کر دینا بھی اللہ کی بندگی' فدیہ دینا بھی بندگی ہے۔ عوض دینا بھی بندگی دودھ پلانا بھی بندگی ہے اور دودھ سے چھڑانا بھی اللہ کی بندگی اور اطاعت ہے۔ غرض ہر حرکت اور ہر پیش آمدہ واقعہ میں ایک مسلمان کا طرز عمل اگر خدائی ہدایات کے مطابق ہے تو بندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان احکام کے عین وسط میں اچانک نماز کا حکم بھی آجاتا ہے۔ یعنی خوف میں بھی نماز اور امن میں بھی نماز فرماتے ہیں حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ "اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو' خصوصاً ایسی نماز کی جو محاسن صلوٰۃ کی جامع ہو۔ (پانچ والی نماز) اللہ کے آگے اس طرح کھڑے ہو' جیسے فرمانبردار غلام کھڑے ہوتے ہیں' بدامنی کی حالت ہو تو خواہ پیدل ہو' خواہ سوار جس طرح ممکن ہو' نماز پڑھو اور جب امن میسر آجائے تو اللہ کو اس طریقے سے یاد کرو جو اس نے تمہیں سکھایا ہے' جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔"

آپ دیکھیں نماز کا یہ حکم عائلی احکام کے درمیان واقعہ ہے۔ ابھی عائلی احکام ختم نہ ہوئے تھے کہ درمیان میں نماز کا ذکر آگیا۔ تاکہ نماز کی عبادت کا حکم دوسری عبادات زندگی کے درمیان خلط ہو جائے۔ یہ خلط اس لئے ہوا کہ یہ اسلام کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ اور اسلامی نظریۂ حیات کی رو سے یہ کلی بندگی اور ہر کام میں عبادت وجود انسان کی اصل غرض و غایت ہے۔ اس پورے سبق کا انداز بیان' اسطرف بہت ہی لطیف انداز میں اشارہ کرتا ہے۔ یہ کہ یہ سب چیزیں عبادت ہیں۔ جس طرح نماز کے معاملے میں احکام الٰہی کی اطاعت عبادت ہے' اسی طرح ان دوسرے عائلی معاملات میں بھی احکام الٰہی کی اطاعت عبادت ہے۔ زندگی ایک اکائی ہے اور عبادات سب کی سب ایک ہی نوعیت کی ہیں۔ تمام احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور یہ سب احکام ہی زندگی کا وہ نظام ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تجویز کیا ہے۔[1]

---

(1) قرآن مجید میں اس مقام پر سیاق کلام میں اچانک تبدیلی کی وجہ سے سخت پریشان تھا' بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میں نے اس حصہ کے طبع اول اور دوئم میں یہ کہا تھا "میں سیاق کلام کی اس اچانک تبدیلی کے بارے میں سوچتا رہا لیکن اس سلسلے میں کوئی حکمت میری سمجھ میں نہ آئی۔ اس لئے میں اس سلسلے میں بلند سازی مناسب نہیں سمجھتا اور بعض مفسرین نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے اس پر میں مطمئن نہیں ہوں۔ وہ کہتے ہیں عائلی احکام کے درمیان نماز کا ذکر اس لئے کر دیا گیا کہ نماز کی اہمیت واضح ہو۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں نماز کو نہ بھولنا۔" دیکھئے طبع اول ۱۸۳٬۱۸۴۔ میں نے مزید کہا تھا' لیکن میں اس پر مطمئن نہیں ہوں' اور اگر اللہ نے مجھے کوئی چیز سجھائی تو انشاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں اس کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ قرآن مجید کے کسی معاملے میں کوئی بات سجھا دے تو اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اب خدا کے فضل سے بات سمجھ میں آگئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ راز اور حکمت ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس نے یہ بات سجھائی ورنہ اگر وہ مہربانی نہ کرتے تو اس نکتے کا سمجھنا مشکل تھا۔

ان تمام احکام میں' جس طرح خدا کی عبادت اور بندگی کا ماحول' خدا کی اطاعت و عبادت کا رنگ ہے اور اللہ کی غلامی کا پر سکون سایہ ہے' اسی طرح ان میں واقعی زندگی کے ماحول کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ انسان کی طبعی ساخت اور اس کی فطری خواہشات سے بھی قطع نظر نہیں کی گئی اور اس کرۂ ارض پر انسان کی انسانی ضروریات کو بھی اچھی طرح پورا کیا گیا ہے۔

اسلام جو قانون بناتا ہے وہ انسانوں کے ایک گروہ کے لئے بنا رہا ہے' وہ یہ قانون بہرحال فرشتوں کے لئے نہیں بنا رہا ہے۔ نہ اڑتے ہوئے تخیلات کے عالم میں کسی فرضی مخلوق کے لئے۔ اس لئے عام ہدایات اور قانون سازی یا شرعی احکام کے ذریعے' جب اسلام انہیں اللہ کی بندگی کی فضا تک بلند کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ حقیقت اچھی طرح اس کے سامنے ہوتی ہے کہ وہ سب کچھ ایک انسان کے لئے کر رہا ہے۔ یہ کہ یہ بندگی ایک بشر نے کرنی ہے اور انسانوں میں انسانی جذبات و میلانات پائے جاتے ہیں۔ ان میں ضعف ہے اور کئی قسم کی کمزوریاں ہیں۔ ان کو ضروریات لاحق ہوتی ہیں اور ماحول سے متاثر ہوتے ہیں' وہ جذبات رکھتے ہیں اور باشعور مخلوق ہیں۔ ایک طرف ان میں روحانی اشراق ہے تو دوسری طرف انسانی کثافتیں بھی ہیں اور اسلامی نظام زندگی ایک ایسا نظام ہے جو ان سب امور کا خیال رکھتا ہے۔ اور ان کے باوجود انسان کو ایک پاک بندگی کی راہ پر لگا دیتا ہے۔ ایک روشن چراغ انہیں دکھاتا ہے۔ ہدایت کا روشن چراغ۔ لیکن بغیر کسی جبر کے' بغیر کسی مصنوعی ذریعہ کے' وہ اپنے تمام نظام زندگی کی بنیاد اس پر قائم کرتا ہے کہ یہ انسان بہرحال انسان ہے!

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ایلا کو جائز قرار دیا۔ یعنی ایک مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ ایک مقررہ وقت تک عورت کے ساتھ مباشرت نہ کرنے کی قسم کھالے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ قسم چار ماہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ پھر اسلام طلاق کی گنجائش رکھتا ہے۔ اور اس کے لئے باقاعدہ قانون سازی کرتا ہے۔ اس کے احکام اور اس کے نتائج کو بھی منظم طریقے سے قانونی ضابطہ کا پابند کر دیتا ہے۔ ایسے حالات میں از روئے قانون طلاق کی گنجائش رکھی گئی ہے' جبکہ دوسری طرف خاندانی نظام کی بنیادوں کو پوری طرح مستحکم کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی ہے۔ خاندانی تعلقات کو مزید پختہ کرنے کی سعی کی گئی ہے اور افراد خاندان کے باہمی ربط کو محض معاشرتی فائدے سے بلند کر کے اسے اطاعت خداوندی اور عبادت رب کا بلند تصور دے دیا گیا ہے۔ یہ وہ توازن ہے جو اسلامی نظام زندگی کے عملی پہلوؤں کو واقعی بہت ہی بلند اور ایک حقیقی مثالی نظام کر دیتا ہے۔ جو مثالی ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی طاقت اور وسعت کے دائرے کے اندر بھی رہتا ہے۔ اور یوں لگتا ہے کہ یہی نظام ہے جو فی الواقعہ ایک عام انسان کے لئے بنایا گیا ہے۔

نظام کیا ہے فطرت کے لئے سہولتیں ہی سہولتیں ہیں۔ مرد اور عورت دونوں کے لئے حکیمانہ سہولیات ہیں۔ اگر ایک تشکیل شدہ خاندان' جس کی بنیاد مرد و عورت کے نکاح سے پڑی تھی کامیاب نہیں ہوتا' اس ابتدائی انسانی خلیہ (Cell) میں امن و سکون قائم نہیں ہو سکتا تو اللہ وہ ذات ہے جو جاننے والا ہے خبردار ہے' وہ لوگوں کے بارے میں وہ کچھ جانتا ہے' جو وہ خود بھی نہیں جانتے۔ اس لئے ذات باری نے یہ نہ چاہا کہ وہ مرد و عورت کے رابطہ نکاح کو ناقابل انفکاک بنا دے اور اس طرح ابتدائی انسانی جوڑے کو انس و محبت کے گہوارے کے بجائے ایک قید خانہ بنا دے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو دیکھنا چاہتے ہوں مگر جدائی محال ہو' ان کے دلوں میں سب شکوک و شبہات سیلابی شکل اختیار کر گئے ہیں لیکن بچنے کی کوئی صورت نہ ہو۔ میاں بیوی کے تعلقات شبہات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں دب کر رہ گئے ہوں لیکن روشنی کی طرف نکل آنے کی کوئی صورت نہ ہو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو میاں بیوی کے جوڑ اور اس چھوٹے خاندان کو اس لئے بنایا تھا کہ وہ دارالسکون ہو' دارالامن ہو۔ اور اگر اس سے یہ مقصد پورا نہ ہو رہا ہو اور اس لئے نہ ہو رہا ہو کہ فریقین کی فطرت اور طبائع میں اختلاف ہو' تو پھر ایسی صورت میں بہتر یہی ہے کہ میاں بیوی کے درمیان جدائی ہو جائے اور اس بیمار خاندان کو ختم کر دیا جائے اور وہ دوبارہ کوشش کریں کہ جڑ سکیں لیکن جدائی کا فیصلہ بھی محض سرسری اختلافات کی بنیاد پر نہیں کیا جاتا بلکہ خاندان کے بچانے کے

لئے تمام وسائل کام میں لائے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اسلامی نظام زندگی میں انسانی اجتماع میں خاندان مقدس ترین اکائی ہے۔ لیکن جدائی کی صورت میں بھی ایسے احکام دیئے گئے ہیں کہ نہ خاوند کو نقصان پہنچے نہ بیوی کو۔ نہ بچے کو اور نہ جنین کو۔

یہ ہے وہ ربانی نظام زندگی' جسے اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے تشکیل دیا۔

جب انسان اس نظام کی بنیادوں پر غور کرتا ہے' جسے اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے تجویز کیا ہے اور پھر اس نظام کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اس معاشرے' پاک معاشرے پر نگاہ ڈالتا ہے جس میں امن و سلامتی کا دور دورہ ہوتا ہے اور پھر اس کے مقابلے میں اس نظام زندگی کا مطالعہ کرتا ہے' جو اس وقت فعلاً انسانی زندگی میں قائم و رائج تھا۔ تو نظر آتا ہے کہ دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور اسلامی معاشرہ ایک مثالی معاشرہ ہے۔ اور اگر اسلامی معاشرے کا مقابلہ مشرق و مغرب میں آج کے جدید جاہلی معاشروں سے کیا جائے تو بھی یہ مثالی معاشرہ ایک اونچے مقام پر نظر آتا ہے' حالانکہ ان جدید جاہلی معاشروں کے حامی اپنے آپ کو بڑا ترقی یافتہ معاشرہ سمجھتے ہیں۔ اس تقابلی مطالعہ کے نتیجے میں اچھی طرح احساس ہو جاتا ہے کہ اسلام نے شرافت' پاکیزگی اور امن و سکون کا اونچا معیار قائم کیا ہے۔ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اس اونچے مقام تک انسانوں کو پہنچانے کے لئے قانون بنایا۔ خصوصاً عورت کو تو اس نظام میں خصوصی رعایتیں دی گئی ہیں۔ بہت بڑی حرمت اور شرافت اسے عطا کر دی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو مستقیم الفطرت عورت بھی ان خصوصی رعایتوں پر غور کرے' جو اللہ نے اسلامی نظام میں عورتوں کو دی ہیں' وہ بے اختیار اللہ تعالیٰ کے ساتھ بے پناہ محبت کرنے لگے گی' بشرطیکہ وہ استقامت فکر سے غور کرے۔ (۱)

اب دیکھئے آیات کی تشریح و تفصیلات

☆ ☆ ☆

(۱) دیکھئے۔ العدالت الاجتماعیہ کی فصل انسانی مساوات۔۔۔ انسان مادیت اور اسلام۔ فصل صنفی تعلقات۔۔۔ شبہات حول الاسلام' فصل "اسلام اور عورت"۔۔۔ فی ظلال القرآن سورت احزاب' نساء اور طلاق

# درس نمبر ۱۵ تشریح آیات (۲۲۱ تا ۲۲۲)

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ
لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ
مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى
۲۷ ع۵ اا
الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

"اور تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی ایک مشرک شریف زادی سے بہتر ہے۔ اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن غلام مشرک شریف سے بہتر ہے' اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو۔ یہ لوگ تمہیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے' اور وہ اپنے احکام واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے' توقع ہے کہ وہ سبق لیں گے اور نصیحت قبول کریں گے۔"

نکاح یعنی شادی بنی آدم کے دو افراد کے درمیان بہت گہرا' بہت مضبوط اور بہت ہی دائمی رشتہ ہے۔ اس رشتے کے دونوں فریق ایک دوسرے کے وسیع مطالبات پورے کرتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ فریقین کے دل ایک ہوں' وہ ایک ہی لاینحل گرہ میں بندھے ہوئے ہوں' لیکن دونوں کا ملاپ تب ممکن ہے جب اس غرض وغایت میں اتحاد ہو جس پر معاہدۂ نکاح کا انعقاد ہوا ہے☆۔ اور وہ ذات متحد ہو جس کی طرف یہ دونوں متوجہ ہوں۔ جہاں تک دینی عقائد و نظریات کا تعلق ہے وہ انسان کی زندگی اور ان کی شخصیت پر بہت ہی گہرے اثرات رکھتے ہیں۔ انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسانی شعور کو ایک خاص کیفیت عطا کرتے ہیں۔ یہ اس کی تاثر کی حد مقرر کرتے ہیں اور نفس کی خواہشات کو محدود کرتے ہیں اور پوری زندگی میں نفس انسانی کی راہنمائی واعانت کرتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات مذہبی عقیدہ پس پشت چلا جاتا ہے۔ اور اس میں ٹھہراؤ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے اکثر لوگوں کو یہ مغالطہ ہو جاتا ہے کہ شاید دین کا تصور نفس انسانی کے لئے کوئی ضروری تصور نہیں۔ یہ ایک عارضی شعور ہے اور بعض فکری فلسفے اور بعض اجتماعی نظام دینی شعور کی جگہ لے سکتے ہیں اور یوں ہم مذہب اور دین سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ ایک وہم ہے اور نفس انسانی کی حقیقت اور اس کی نفسیات سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اور اس کے عناصر ترکیبی کو نہ سمجھنے کی دلیل ہے۔ یا یہ لوگ جان بوجھ کر نفس انسانی اور اس کے مناہج اور اس کی عملی صورت حال سے جان بوجھ کر تغافل کرتے ہیں۔

مکہ کے ابتدائی دور میں اگرچہ مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان شعور و اعتقاد اور نظریاتی اعتبار سے مکمل جدائی ہو گئی تھی لیکن فریقین کے درمیان معاشرتی اور عائلی روابط کے اعتبار سے کلی طور پر جدائی کرنا ناممکن تھا اور نہ ہی مناسب تھا۔ اس لئے کہ اس وقت کے حالات کے مطابق ضرورت اس بات کی تھی کہ اس قسم کی اصلاحات مناسب وقت کے بعد اچھی طرح حکیمانہ طور پر کی جائیں۔ لیکن اس کے

بعد اللہ تعالیٰ نے تحریک اسلامی کو مدینہ طیبہ میں ایک مستقل مستقر بخشا اور اعتقادی تشخص کی طرح اس کا اجتماعی تشخص بھی قائم ہو گیا۔ چنانچہ اب موقعہ آگیا اور اب عائلی زندگی کی تحدید جدید کا کام شروع ہو گیا اور یہ آیات نازل ہوئیں۔ ان کی رو سے مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان نئے نکاح پر پابندی لگادی گئی۔ رہے وہ نکاح جو پہلے سے قائم تھے تو ان کے بارے میں کوئی حکم نہ تھا۔ یہ سن چھ ہجری تک قائم رہے۔ چھ ہجری کو صلح حدیبیہ کے موقعہ پر آیات نازل ہوئی :

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا جَآءَكُمُ ٱلْمُؤْمِنَٰتُ مُهَٰجِرَٰتٍ فَٱمْتَحِنُوهُنَّ ۖ ٱللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَٰنِهِنَّ ۖ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى ٱلْكُفَّارِ ۖ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ..... وَلَا تُمْسِكُوا۟ بِعِصَمِ ٱلْكَوَافِرِ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو (ان کا مومن ہونے کی) جانچ پڑتال کر لو' اور ان کے ایمان کی حقیقت تو اللہ ہی خوب جانتا ہے' پھر جب تمہیں معلوم ہو جائیں کہ وہ مومن ہیں' تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو۔ وہ کفار کے لئے حلال ہیں اور نہ کفار ان کے لئے حلال ہیں۔۔۔ اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رکھو۔

غرض ان آیات کے نزول سے مسلمانوں اور کفار کے درمیان عائلی تعلقات منقطع کر دیے گئے۔

اب یہ بات حرام ہو گئی کہ کوئی مسلمان مشرک عورت سے نکاح کرے یا کوئی مشرک کسی مسلمان عورت سے نکاح کرے۔ یہ بات حرام کر دی گئی کہ جب دو دل ایک نظریۂ حیات پر اکٹھے نہیں ہو سکتے تو ان کے لئے نکاح میں اکٹھا ہونا بھی ممکن نہیں ہے لہٰذا یہ حرام ہے۔ کیونکہ اسلام رشتہ نکاح کو بہت مضبوط رشتہ قرار دیتا ہے اور وہ ایک مضبوط رشتہ استوار کرنا چاہتا ہے جبکہ نظریۂ حیات کے اتحاد کے بغیر یہ رشتہ کمزور' ڈھیلا کھوٹا اور ناکارہ ہو گا۔ کیونکہ دونوں فریق اللہ کے معاملے میں ملے ہوئے نہیں ہیں۔ اللہ کے نظام زندگی پر وہ متفق نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے میاں بیوی کو پیدا کیا اور اسے انسانی شرافت دے کر اس مقام حیوانیت سے بلند کر دیا۔ اس کا منشا یہ ہے کہ یہ تعلق محض حیوانی تعلق نہ ہو' نہ محض شہوت رانی کے لئے ایک طریقہ ہو۔ اسلام اس تعلق کو ایک بلند مقام دیتا ہے بہت بلند اللہ کے پاس۔ زندگی کی پاکیزگی' نشوونما اور ترقی کے بارے میں اس کا جو منصوبہ ہے وہ اسے پاکیزہ تعلقات زن و شوئی کے نتیجے میں پورا کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَا تَنكِحُوا۟ ٱلْمُشْرِكَٰتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ "اور مشرک عورتوں سے نکاح اس وقت تک نہ کرنا' جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔" اگر وہ ایمان لے آئیں تو پھر وہ رکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ اب دونوں دل اللہ کے ہاں مل گئے ہیں۔ اور دو انسانوں کا یہ خاندانی ربط اب پرامن رہ گیا اور اس رکاوٹ سے پاک ہو گیا جو ان کے باہمی تعلق کو خراب کر رہی تھی۔ یہ باہمی تعلق صحیح و سالم رہ گیا اور ان کا اتحاد نظریۂ حیات کے نتیجے میں قوی تر ہو گیا۔ اب یہ نظریۂ حیات کا عقد قرار پایا۔ صرف کاروباری عقد نہ رہا۔ وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ "اور ایک مومن لونڈی' ایک مشرک شریف زادی سے بہتر ہے۔ اگرچہ تمہیں بہت ہی پسند ہو۔" یہ پسندیدگی محض انسانی طبیعت کی بنا پر ہے۔ اس میں انسان کے بلند افکار کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس پسندیدگی کا دائرہ صرف اعضاء اور حواس تک محدود ہوتا ہے۔ حالانکہ دل کا حسن زیادہ گہرا اور زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مسلمان عورت غلام ہو' آزاد نہ ہو' تو اسلام کے ساتھ اس کا جو نسب ہے۔ وہ اسے اس مقام شرافت سے زیادہ بلند کر دیتا ہے جو ایک کافرہ کو بطور حسب حاصل ہے۔ یہ نسب اللہ کا نسب ہے اور انسانی انساب میں یہ سب سے اعلیٰ نسب ہے وَلَا تُنكِحُوا۟ ٱلْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا۟ ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ "اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا' جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن غلام مشرک شریف سے بہتر ہے۔" یہی مسئلہ تکرار کے ساتھ دوسری صورت میں بیان کیا گیا ہے۔

محض تاکید اور بیان کی زیادہ گہرائی کے لئے۔ علت دونوں کی ایک ہی ہے أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ ۖ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ "یہ لوگ تمہیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور وہ اپنے احکام واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے' توقع ہے کہ وہ سبق لیں گے اور نصیحت قبول کریں گے۔"

راستے دونوں کے بالکل جدا ہیں۔ دونوں کا نظریہ اور دعوت بالکل جدا ہے۔ کس طرح یہ دو متضاد نظریات رکھنے والے اکٹھے رہ سکتے ہیں اور ایسا جوڑ جس پر آئندہ نسلوں کی زندگی کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔

مشرکوں اور مشرکات کا راستہ جہنم پر ختم ہوتا ہے اور وہ خود بلاتے بھی جہنم کی طرف ہیں۔ مومنین اور مومنات کا راستہ اللہ تعالیٰ تک جاتا ہے اور اللہ جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور اپنے اذن سے بلاتا ہے۔ ذرا سوچو تو سہی اُن کی دعوت اللہ کی دعوت سے کس قدر دور ہے۔

کیا مشرکین اور مشرکات آگ کی طرف بلاتے ہیں؟ پھر کون ہے جو اپنی جان کو آگ کے حوالے کرنا چاہتا ہے؟

یہ آخری حقیقت ہے اور بات آکر یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ پہلے سے حقیقت کو ظاہر کر دیا جاتا ہے کہ یہ دراصل دعوت الی النار ہے۔ اس لئے اس راستے پر جو بھی جاتا ہے اس کی آخری منزل آگ ہی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کفار کی اس دعوت سے مومنین کو ڈراتا ہے: وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ "اور وہ اپنے احکام واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے' توقع ہے کہ وہ سبق لیں گے اور نصیحت قبول کریں گے۔"

اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی اس واضح نصیحت کو قبول نہیں کرے گا اسے پلے نہیں باندھے گا تو وہ خود ملامت ہو گا۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ اہل کتاب کی پاکدامن عورتوں کے ساتھ نکاح کر سکتے ہیں' حالانکہ ان کے اور مسلمانوں کے عقیدے کے درمیان بہت بڑا اختلاف ہے۔ لیکن اہل کتاب کی عورتوں کا معاملہ دوسروں سے مختلف ہے۔ مسلمان مرد اور اہل کتاب عورت اصل عقیدہ میں تو بہرحال متحد ہیں۔ دونوں خدا تعالیٰ کو تسلیم کرتے ہیں البتہ تفصیلات شرعیہ میں دونوں کے درمیان اختلاف ہے۔

فقہاء کے درمیان اس کتابیہ عورت کے بارے میں اختلاف نہیں ہے' جو اس کی قائل ہے کہ اللہ تینوں کا ایک ہے۔ اور یہ کہ حضرت مسیح بن مریم الٰہ ہیں یا یہ کہ حضرت عزیر' اللہ کے بیٹے ہیں۔ کیا یہ عورت مشرکہ کی تعریف میں آکر حرام ہو جائے گی؟ یا اسے کتابیہ سمجھا جائے گا اور سورۂ مائدہ کی اس آیت میں شامل ہو گی:

الْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ ۖ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ "آج تمہارے لئے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ ان قوموں کی محفوظ عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی۔"

جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ ایسی عورت اس آیت میں داخل ہے اور اس کے ساتھ نکاح جائز ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کی رائے درست ہے جو ایسی عورت سے نکاح کو حرام کہتے ہیں۔ امام بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے' فرماتے ہیں حضرت ابن عمر ﷺ نے فرمایا "کیا اس سے بھی بڑی مشرک ہو سکتی ہے جو کہے کہ اس کا رب حضرت عیسیٰ ہیں۔

ہاں مسلمان عورت کا نکاح کتابی مرد سے منع ہے۔ کیونکہ یہ صورت اس سے اپنے نتائج کے اعتبار سے مختلف ہے کہ ایک مسلم مرد کتابیہ سے نکاح کرے۔ اسلامی قانون کی رو سے اولاد باپ کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ جس طرح بیوی اپنے خاندان کو چھوڑ دیتی ہے اور

شوہر کے خاندان کا ایک حصہ بن جاتی ہے اور خاوند کی زمین پر بستی ہے اور شوہر کے خاندان کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ جبکہ یہ امر واقع ہے کہ اگر ایک مسلم کتابیہ سے شادی کرتا ہے تو وہ مسلمان کی قوم کی طرف چلی آتی ہے۔ اس کی اولاد مسلمان ہوتی ہے۔ اور مسلمان کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ چنانچہ اس عورت اور اس کے خاندان پر اسلامی فضا غالب ہوتی ہے۔ لیکن اگر ایک مسلمان عورت کا نکاح اہل کتاب مرد سے ہو جائے تو صورت حال بالکل اس کے برعکس ہو جاتی ہے۔ مسلمان عورت اپنی قوم سے دور رہے گی۔ اپنے فطری ضعف کی وجہ سے اور مخالف دین کے غلبہ کی وجہ سے اس کی اسلامی حیثیت کمزور ہو سکتی ہے اور پھر اس کے بچے بھی اہل کتاب ہی ہوتے۔ اور ان کا دین والدہ کے دین سے علیحدہ ہوتا حالانکہ اسلام کی پالیسی ہمیشہ یہ ہے کہ وہ ہر جگہ غلبہ کی پوزیشن اختیار کرے گا۔

لیکن ان قرآنی احکام کے باوجود بعض عملی اور انتظامی وجوہات کی بنا پر کسی مسلمان کے لئے غیر ملکی عورت سے شادی مکروہ قرار دی جا سکتی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب ؓ نے انہی وجوہات کی بنا پر اسے ناپسند فرمایا۔ ابن کثیر نے ابن جریر کی یہ رائے نقل کی ہے کہ حضرت عمر ؓ ایسی شادیوں کو اس لئے ناپسند فرماتے تھے کہ اس طرح مسلمان عورتوں کو نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ نیز اس کے علاوہ دوسری وجوہات بھی ہو سکتی تھیں۔

یہ روایت ہے کہ حضرت حذیفہ ؓ نے ایک یہودی عورت سے شادی کر لی۔ اس پر حضرت عمر ؓ نے انہیں لکھا: "اسے طلاق دے دو" اس پر حضرت حذیفہ ؓ نے فرمایا: "کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ وہ مجھ پر حرام ہے اس لئے میں اسے گھر سے نکال دوں" حضرت عمر ؓ نے فرمایا: "نہیں' یہ میرا عقیدہ نہیں ہے کہ وہ حرام ہے۔ لیکن میں اس بات سے خائف ہوں کہ تم اس کے مقابلے میں مومن عورتوں کو حقیر سمجھو گے۔" اور ایک دوسری روایت میں خود حضرت عمر ؓ سے مروی ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان عورت یا عیسائی عورت سے نکاح کرنا چاہئے۔

اور ہم آج تجربہ سے دیکھتے ہیں کہ اس قسم کی بیویاں ایک مسلمان خاندان کے لئے مصیبت ہوتی ہیں۔ بطور حقیقت واقعہ ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے کہ یہودی عیسائی اور لادینی عورت اپنی اولاد کو اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ اور ایسی شادیوں کے نتیجے میں ایسی نسل وجود میں آتی ہے جو اسلام سے بہت دور ہوتی ہے اور خصوصاً جاہلیت کے اس جدید معاشرے میں' جس میں ہم رہ رہے ہیں اور جو اپنے آپ کو اسلامی معاشرہ کہلاتا ہے' لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے اس معاشرہ کے لئے لفظ اسلام کا استعمال بطریقہ مجازی ہو سکتا ہے' جس میں لوگوں کا تعلق اسلام کے ساتھ اس قدر کمزور ہو گیا ہے' جیسے کسی نے کچا دھاگہ پکڑا ہوا ہو اور جب کسی ایسے گھرانے میں ایک غیر مسلم داخل ہوتی ہے تو یہ تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے۔

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۖ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿٢٢٢﴾ نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ ۖ وَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلَاقُوهُ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٢٣﴾

"پوچھتے ہیں حیض کا کیا حکم ہے؟ کہو وہ ایک گندگی کی حالت ہے' اس میں عورتوں سے الگ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ' جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہو جائیں۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ۔ اس طرح جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں۔ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ تمہیں اختیار ہے' جس طرح چاہو' اپنی کھیتی میں جاؤ' مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو اور اللہ کی ناراضی سے بچو۔ خوب جان لو کہ تمہیں ایک دن اس سے ملنا ہے۔ اور اے نبی! جو تمہاری ہدایات کو مان لیں انہیں (فلاح و سعادت کی) خوشخبری دے دو۔"

زن و شوہر کے باہمی تعلقات پر یہ ایک دوسری نظر ہے۔ اچٹتی نظر۔ اس طبیعی تعلق کو اللہ کی طرف ذرا اور بلند کر دیا جاتا ہے۔ جسم انسانی کے اعضائے رئیسہ کی شدید ترین طبیعی اور حیوانی لذتیت یعنی مباشرت کو بھی بلند مقصدیت عطا کر دی جاتی ہے۔ اور اس میں بھی ایک گونہ تقدس کا رنگ آجاتا ہے۔

زن و شوہر کے باہمی تعلق میں مباشرت بھی ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ بذات خود مقصد نہیں ہے۔ یہ حیات انسانی کے ایک گہرے راز اور بلند مقصد کا ذریعہ ہے۔ نسل کشی اور زندگی کا تسلسل اور یہ نقطہ نظر آخر کار ہمیں اللہ تک پہنچاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ دوران حیض مباشرت سے مرد و زن دونوں کے لئے مضرات یقینی ہیں لیکن اس کے باوجود محض حیوانی لذت تو بہرحال موجود ہوتی ہے' پھر کیوں اس کی ممانعت کی گئی۔ اس لئے کہ اس صورت میں وہ مقصد اعلیٰ پورا نہیں ہو سکتا۔ نیز یہ وجہ بھی ہوتی ہے کہ اس دوران طبع سلیم بھی مباشرت سے ابا کرتی ہے۔ کیونکہ جس طرح خارج سے اسلامی قانون اس عرصہ میں مباشرت سے روکتا ہے' اسی طرح ذات انسانی کے اندر سے فطرت سلیمہ بھی اسے روکتی ہے۔ اس لئے کہ بجائی کے لئے یہ موزوں موسم نہیں ہے۔ اس موسم میں فصل نہیں اگ سکتی۔ نہ اس بجائی سے زندگی کے کھیت میں کسی پودے کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں پاکی کے دنوں میں مباشرت میں لذت بھی پوری پوری ہوتی ہے اور وہ فطری مقاصد بھی پورے ہوتے ہیں' جن کے لئے یہ نظام وضع کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایام حیض کے بارے میں سوال کا یہ جواب دیا گیا۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۖ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِى الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ "پوچھتے ہیں حیض کا کیا حکم ہے؟ وہ ایک گندگی کی حالت ہے' اس میں عورتوں سے الگ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ' جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں۔"

لیکن اس کے بعد بھی تم اس میں بالکل آزاد نہیں ہو کہ اپنی خواہشات کے مطابق جو چاہو کرو۔ ایام حیض کے بعد بھی تم امر و نہی کے پابند ہو۔ گویا مباشرت بھی ایک فریضہ حیات ہے۔ اس میں بھی تم اس کے نازل کردہ حدود و قیود کے پابند ہو۔ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۚ "پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ' اس طرح جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔"

یعنی رحم کی جانب سے دوسری جانب سے نہیں کیونکہ مقصد مطلق شہوت رانی ہی نہیں بلکہ مقصد زمین پر سلسلہ حیات کو بھی جاری رکھنا ہے۔ مباشرت کے نتیجے میں اولاد کی دولت حاصل کرنا ہے۔ جس کا آنا اللہ نے مقرر فرما دیا ہے۔ اللہ حلال اور جائز چیز کو مقرر فرماتے ہیں اور اسے فرض قرار دیتے ہیں۔ مسلمان اس حلال کا متلاشی ہوتا ہے' جو اس کے لئے اس کے رب نے لکھ دیا ہے۔ وہ اپنے لئے خود کوئی منصوبہ نہیں بناتا۔ اللہ اپنے بندوں کے لئے جو فرائض مقرر فرماتا ہے' وہ سب اس لئے ہیں کہ اس کے یہ بندے پاک و صاف ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں۔ اگر ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اس کی طرف رجوع کریں۔ اور اس کی مغفرت کے طلبگار ہو کر اس کی جانب سے لوٹ آئیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ "اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے' جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار

کریں۔"

یہ ہے قرآن مجید کے خوشگوار سایوں میں سے ایک ظل' ایک چھاؤں۔ اس میں زن و شو کے باہمی تعلقات کے مختلف رنگوں میں سے ایک رنگ کو تصویر کی شکل دی گئی ہے۔ جو قرآنی تعلیمات کے ساتھ مناسب ہے اور جو قرآنی منصوبہ حیات کے عین مطابق ہے۔ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ "تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں' جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ۔"

یہاں اس آیت میں زن و شوئی کے تعلقات کی نوعیت اور اس کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی اس تعلق کے مقاصد کیا ہیں اور اس کا اصلی رجحان کیا ہونا چاہئے۔ اس کے سب پہلو یہاں نہیں بیان کئے گئے۔ دوسرے مقامات پر ان مقامات کی مناسبت سے کچھ دوسرے پہلو بھی نمایاں کئے گئے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ یہ فرمایا گیا ہے هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ : "وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔" ...... دوسری جگہ فرمایا: وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے' تمہاری جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت و رحمت پیدا کی۔"

غرض ان تعبیرات میں سے ہر تعبیر اس عمیق و عظیم تعلق کے کسی نہ کسی پہلو کو ظاہر کرتی ہے' ہر جگہ جو پہلو مناسب ہو۔ یہاں سیاق کلام ایسا ہے جس کے ساتھ "کھیتی" کی تعبیر زیادہ مناسب تھی۔ کیونکہ یہاں تروتازگی' پیدائش اور نشوونما کی فضا ہے' اس لئے کھیتی کے لفظ سے اس تعلق کی تعبیر کی گئی اور حکم دیا گیا کہ جس طرح چاہو اپنی عورتوں کے پاس جاؤ مگر رحم کی جانب سے جہاں سے پیداواری عمل ہوتا ہے۔ **فاتوا حرثکم انی شئتم** "تم اپنی کھیتی میں آؤ جس طرح چاہو۔"

لیکن ساتھ ساتھ اس ملاپ کا مقصد اصلی بھی نہ بھولو' اسے عبادت اور خدا خوفی سمجھو اور اس لئے اگر تم اس میں بھی خدا کے بیان کردہ حدود و قیود کی پابندی کرو گے تو یہ تمہارے لئے توشہ آخرت ہو گا۔ اور یقین رکھو کہ ایک دن تمہیں اللہ کے سامنے جانا ہے اور وہاں تم اپنے تمام اعمال کا صلہ پاؤ گے۔ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُم مُّلَاقُوهُ "مگر اپنے مستقبل کے لئے کچھ آگے بھیجو' اللہ کی ناراضی سے بچو' خوب جان لو کہ تمہیں ایک دن اس سے ملنا ہے اور اے نبی' جو تمہاری ہدایات کو مان لیں انہیں خوشخبری دے دو۔"

آیت ختم ہو جاتی ہے اور مسلمانوں کو خوشخبری دے دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بہت بڑی بھلائی تیار کی ہوئی ہے اور اس بھلائی میں وہ بھلائیاں بھی شامل ہیں جو انہوں نے اپنے کھیت میں بوئی ہیں۔ کیونکہ مومن جو کچھ بھی کرتا ہے وہ خیر ہے اور اللہ اس پر اس کا ثواب دیتا ہے۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ "مومنین کو خوشخبری دیجئے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک فطری اور سادہ نظام زندگی ہے۔ وہ انسان کو بحیثیت انسان لیتا ہے۔ اس کے رجحانات اور میلانات کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ بلندی اور پاکیزگی کے نام پر فطرت کے ساتھ جنگ نہیں کرتا۔ وہ انسانوں کی ان ضروریات کو گندگی قرار نہیں دیتا' جن پر اس کا بس ہی نہ چلے۔ اور بلکہ وہ قرار دیتا ہے کہ زندگی کی ترقی' نشوونما اور تسلسل کے لئے' یہ اس کا فریضہ حیات ہیں اور فطری فریضہ ہیں۔ اسلام کی کوشش تو یہ ہے کہ انسان کی انسانیت برقرار رہے۔ اسے اس کی انسانیت کے دائرے کے اندر ترقی دے۔ اسے اللہ سے جوڑ دے' اس کے جسمانی میلانات بھی پورے کرے' پہلے جسمانی تقاضوں اور انسانی شعور کا امتزاج پیدا کر دے اور پھر اس پر دینی شعور کا رنگ غالب کر دے۔ یوں عارضی جسمانی تقاضے پورے کرتے ہوئے' اس تلذذ کو دائمی انسانی فرائض کے ساتھ مربوط کر دے اور یہ سب کچھ دینی وجدان اور دینی شعور کے ماحول میں ہو۔ غرض ایک ہی لمحہ میں ایک ہی وقت میں' ایک ہی رخ میں یہ دینی شعور اور جسمانی

تلذذ انسان کی اس چھوٹی سی ہستی میں جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ زمین میں اللہ کا خلیفہ ہو۔ اور اس وجہ سے ہو کہ اس کی اس ہستی میں اللہ تعالیٰ نے مختلف النوع طاقتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ دینی شعور اور جسمانی تقاضے۔ یہ ہے اسلامی نظام زندگی اور یہ ہے انسان کی فطرت۔ چونکہ اللہ خالق فطرت بھی ہے اور اسلامی نظام زندگی بھی اس کی طرف آیا ہے۔ اس لئے اس نظام میں تمام فطری تقاضوں کو پورا کیا گیا ہے۔ اور تمام دوسرے نظامہائے زندگی جو من جانب اللہ نہیں ہیں وہ فطرت سے متصادم ہیں اور بعض میں یہ تصادم کم ہے اور بعض میں بہت ہی زیادہ ہے۔ اس لئے ان کا انجام ہلاکت و بربادی ہے۔ ان نظاموں میں افراد کی بھی کم بختی ہے اور جماعتوں کی بھی ہلاکت ہے۔ اس لئے کہ اللہ جانتا ہے اور انسان نہیں جانتا۔

ایام حیض میں مباشرت کے مسائل کے بیان کے بعد ایلا کا حکم بیان کیا جاتا ہے۔ ایلا کا مفہوم یہ ہے کہ خاوند یہ قسم کھائے کہ وہ بیوی کے ساتھ مباشرت نہیں کرے گا۔ قبل اس کے کہ قسم ایلا کا بیان ہو، نفس قسم کے بارے میں بھی ہدایات دے دی جاتی ہیں۔ گویا قسم تمہید ہے ایلا کے لئے۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

"اللہ کے نام کو ایسی قسمیں کھانے کے لئے استعمال نہ کرو، جن سے مقصود نیکی اور تقویٰ اور بندگان خدا کی بھلائی کے کاموں سے باز رہنا ہو۔ اللہ تمہاری ساری باتیں سن رہا ہے اور سب کچھ جانتا ہے جو بے معنی قسمیں تم بلا ارادہ کھا لیا کرتے ہو، ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا مگر جو قسمیں تم سچے دل سے کھاتے ہو، ان کی باز پرس وہ ضرور کرے گا۔ اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔

جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں، ان کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اگر انہوں نے رجوع کر لیا، تو اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔ اور اگر انہوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو تو مانے رہیں کہ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تم اپنی قسم کو اس لئے استعمال نہ کرو کہ تم بھلائی کے کام نہ کرو گے بلکہ قسم کا کفارہ ادا کرو اور بھلائی کرتے چلے جاؤ۔ یہی تفسیر مسروق، شعبی، ابراہیم نخعی، مجاہد، طاؤس، سعید بن جبیر، عطاء، عکرمہ، مکحول، زہری، حسن، قتادہ، مقاتل بن حیان، ربیع بن انس، ضحاک، عطا خراسانی، السدی سے منقول ہے۔ تفصیل دیکھئے ابن کثیر میں۔

اسی کی تائید میں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے جو کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "جو کوئی ایسی قسم کھا بیٹھے کہ اس کے توڑ میں خیر ہو، اسے چاہئے کہ وہ قسم کا کفارہ ادا کرے۔ اور وہ کام کر ڈالے جس میں بھلائی ہے۔"

اس طرح امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ ؓ سے نقل کیا ہے' حضور ﷺ فرماتے ہیں: خدا کی قسم تم سے کوئی شخص اپنے اہل و عیال کے بارے میں قسم کو پورا کرے۔ تو وہ زیادہ گناہگار ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ کفارہ دے دے' جو اللہ نے فرض کیا ہے۔

ان احادیث کی روشنی میں مفہوم یہ ہو گا کہ اللہ کے نام کی قسم کھالینا تمہیں نیکی' تقویٰ اور اصلاح بین الناس کے کاموں سے کہیں روک نہ دے۔ اگر تم اس قسم کی کوئی قسم کھا بیٹھے تو اسے توڑ دو' نیکی کے کام جاری رکھو اور حلف توڑنے کا کفارہ ادا کرو۔ کیونکہ نیکی' تقویٰ اور بھلائی کے کاموں پر عمل کرنا اس سے بہتر ہے کہ کوئی اپنی قسم کو پورا کرے۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ آپ کے ایک رشتہ دار کا نام مسطح تھا' آپ ان کے ساتھ امداد و تعاون فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ ؓ پر افک کے معاملے میں غیر شعوری طور پر یہ بھی شریک ہو گیا تھا' اور اس پر حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے قسم کھالی تھی کہ وہ اس کے ساتھ کوئی امداد نہ کریں گے۔ اس پر سورۃ النور کی یہ آیت نازل ہوئی۔ **وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ** "تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور صاحب مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار' مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے۔ انہیں معاف کر دینا چاہئے' درگزر کرنا چاہئے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے۔" اس پر حضرت ابوبکر ؓ نے اپنی قسم کو توڑ دیا اور کفارہ ادا کیا۔

اللہ تعالیٰ رؤف و رحیم ہے' اس لئے اس نے کفارہ اس قسم پر عائد کیا ہے جو قصد و ارادہ سے ہو' جس میں قسم کھانے والا قصداً قسم کھالے۔ اور اس کا ارادہ یہ ہو کہ اس نے جس چیز پر قسم کھائی ہے وہ اس کا ارتکاب نہ کرے گا' لیکن عام طور پر لوگ بلاارادہ اور بلاقصد جو قسمیں کھالیتے ہیں ان پر کفارہ عائد نہیں کیا گیا۔

**لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ** "جو بے معنی قسمیں تم بلاارادہ کھالیا کرتے ہو' ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا' مگر جو قسمیں تم سچے دل سے کھاتے ہو' ان کی باز پرس وہ ضرور کرے گا۔ اللہ بہت درگزر کرنے والا ہے۔"

ابوداؤد نے اپنی سند سے حضرت عائشہ ؓ سے روایت کی ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا' قسم میں لغو یہ ہے کہ آدمی گھر میں کے ہرگز نہیں خدا کی قسم' یا کہے ہاں خدا کی قسم۔ ابن جریر نے عروہ کے واسطہ سے اس روایت کو حضرت عائشہ سے موقوف[1] نقل کیا' فرماتی ہیں جن بے معنی قسموں پر اللہ کی گرفت نہیں ہے وہ یہ ہیں" کہ کوئی کہے' ہرگز نہیں خدا کی قسم ہے یا کہے ہاں اللہ کی قسم' حسن بن حسن سے ایک مرسل حدیث میں ہے حضور ﷺ ایک گروہ پر سے گزرے جو تیراندازی کر رہے تھے۔ حضور ﷺ کے ساتھ ایک صحابی بھی تھے۔ ایک شخص ان میں سے اٹھا اور چلایا خدا کی قسم میرا تیر نشانے پر لگ گیا ہے اور تمہارا نشانہ ٹھیک نہیں لگا' خدا کی قسم' حضور ﷺ کے ساتھ جو صحابی جا رہا تھا اس نے کہا حضور ﷺ' یہ شخص تو اپنی قسم میں حانث ہو گیا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا' ہرگز نہیں' تیراندازی کا مقابلہ کرنے والوں کی قسمیں لغو ہیں' بے معنی ہیں ان میں نہ کفارہ ہے اور نہ ہی کوئی عذاب ہے۔

حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں' لغو قسم یہ ہے کہ کوئی شخص غصے کی حالت میں قسم کھا بیٹھے۔ نیز ان سے یہ روایت ہے کہ یمین لغو یہ ہے کہ تم اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام قرار دو۔ اس میں تم پر کوئی کفارہ نہیں ہے۔

حضرت سعید ابن المسیب سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ دو انصار بھائیوں کے درمیان میراث کا تنازعہ تھا' ایک نے دوسرے

---

[1] موقوف اس روایت کو کہتے ہیں جس میں صحابیؓ سے ایک روایت نقل کرے لیکن حضور ﷺ کی طرف نسبت نہ ہو

سے کہا کہ وہ اسے اس کا حصہ دے دے' اس پر اس نے قسم کھائی کہ اگر تم نے دوبارہ مجھ سے اپنا حصہ طلب کیا تو میرا تمام مال خانہ کعبہ کے لئے وقف ہوا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کعبہ غریب نہیں ہے۔ کعبہ کو تیرے مال کی ضرورت نہیں ہے' اپنی قسم کا کفارہ ادا کرو اور اپنے بھائی سے بات کرو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ کی معصیت میں تم جو قسم کھاؤ وہ کوئی قسم نہیں ہے اور نہ وہ کوئی نذر ہے۔ نہ صلہ رحمی قطع کرنے کی کوئی قسم واجب ہے۔ نہ اس چیز کی قسم جس کے تم مالک ہو۔

ان روایات سے جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ قسم میں اگر اس کام کے کرنے اور چھوڑنے کی نیت نہ ہو' جس پر قسم کھائی گئی ہے' تو یہ قسم بے معنی ہے اور اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے۔ وہی قسم' قسم کہلائے گی کہ قسم کھانے والا کسی بات کے کرنے یا کسی کام سے رکنے کا پختہ ارادہ کرے جس پر وہ قسم کھا رہا ہے۔ ایسی قسم اگر توڑ دی جائے تو اس پر کفارہ واجب ہو گا۔ اور اگر اس قسم کی قسم کسی اچھے کام سے رکنے کے لئے ہو یا کسی برے کام یا برے فعل کے ارتکاب کے لئے ہو' تو ایسی قسم کا توڑنا لازمی ہے۔ رہا وہ شخص جو کسی ایسے امر پر قسم کھائے جس کے بارے میں اسے یقین ہو کہ وہ جھوٹا ہے' تو بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اس قسم کا کوئی کفارہ نہیں ہے' نہ کسی کے کفارے سے اس گناہ کی تلافی ممکن ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ موطا میں فرماتے ہیں' اس سلسلے میں سب سے اچھی جو بات میں نے سنی ہے وہ یہ ہے کہ یمین لغو وہ ہے کہ انسان کسی بات پر قسم کھائے اور اسے یقین ہو کہ وہ سچا ہے' لیکن بعد میں آشکارا ہو جائے کہ حقیقت اس کے خلاف تھی۔ اس میں کوئی کفارہ نہیں ہے۔ اور اگر کوئی قسم کھائے اور جان رہا ہو کہ وہ جھوٹا ہے' گناہ گار ہے' اس طرح کرنے سے وہ کسی کو خوش کر رہا ہو' یا کسی کا حق مارنا چاہتا ہو' یہ عظیم گناہ ہے اور کفارہ سے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

جس قسم کے توڑنے میں خیر ہو' بھلائی ہو' اس کے حکم کے آخر میں فرمایا جاتا ہے وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ "اللہ سننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔" اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ تم جو کچھ کہتے ہو وہ اسے سنتا ہے لیکن وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ خیر کس میں ہے اس لئے وہ یہ حکم دیتا ہے۔

اور لغو و بے معنی قسم اور سچی قسم کے حکم کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ "غفور رحیم" معاف کرنے والا اور رحیم ہے کہ وہ بندوں کے ہر فعل پر مواخذہ نہیں کرتا۔ جب ان کے منہ سے غلطی سے جو نکل جائے وہ اس پر مواخذہ نہیں کرتا۔ وہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو معاف کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ بندہ اس کی طرف لوٹ آئے۔ ان دونوں تبصروں اور نتائج سے قسم کے یہ معاملات سب کے سب اللہ سے جڑ جاتے ہیں اور ایک مسلمان کا دل ہر قول میں اور ہر فعل میں اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

قسم کے قاعدہ کلیہ کے بیان کے بعد اب مسئلہ ایلا کا بیان شروع ہوتا ہے' جو قسم ہی کی ایک قسم ہے۔ ایک خاوند قسم کھالے کہ وہ اپنی بیوی کے پاس نہیں جائے گا۔ یا محدود وقت کے لئے یا غیر محدود عرصہ کے لئے تو اس قسم کو شرعی اصطلاح میں ایلا کہا جاتا ہے۔ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ "جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں ان کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اگر انہوں نے رجوع کر لیا' تو اللہ معاف کرنے والا رحیم ہے۔ اور اگر انہوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو' تو جانے رہیں کہ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

میاں بیوی کی زندگی میں ایک طویل رفاقت ہوتی ہے' جس میں مختلف قسم کے حالات پیش آتے رہتے ہیں۔ مختلف نفسیاتی کیفیات زوجین پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ اور ان کے بے شمار اسباب ہوتے ہیں۔ ان حالات میں جب شدت آ جاتی ہے تو زوجین مباشرت تک کے تعلقات قطع کر دیتے ہیں۔ یہ عارضی جدائی اور قطع تعلق بیوی کے لئے سخت دشوار ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی ذات پر نفسیاتی اور

اعصابی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ بحیثیت ایک عورت اس کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔ غرض ہر قسم کے تعلقات زن‌شوئی ختم ہو کر رہ جاتے ہیں اور حسن معاشرت کے تمام بندھن ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں اور اگر یہ کیفیت غیر متعین مدت تک رہے تو پورا خاندان ہی تباہ ہو کر رہ جائے۔

اسلام نے ابتداء ہی سے ایلا کو حرام قرار نہیں دیا۔ اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ بعض حالات میں وہ ترش مزاج بیوی کے لئے ایک مفید علاج ہو' بالخصوص ایسی بیوی کا علاج جسے اپنی نسوانیت پر بہت ناز ہو' جو کبرو غرور میں مبتلا ہو اور اپنے غرور یا ناز و ادا کے ذریعہ مرد کو ذلیل کرنا چاہتی ہو' یا وہ سمجھتی ہو کہ وہ مرد کو جس طرح چاہے زیر کر سکتی ہے۔ نیز بعض اوقات اس عرصہ میں ذہنی کوفت اور تھکاوٹ دور کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ جس طرح بعض اوقات آدمی پر غصے کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور اس کے بعد دل کا غبار نکل جاتا ہے اور زندگی کی گاڑی نئے سرے سے بڑی قوت اور خوشی سے چل پڑتی ہے۔

لیکن اسلام نے مرد کو بھی اس معاملے میں مکمل آزاد نہیں چھوڑ دیا۔ ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات وہ حد سے گزر جائے اور عورت کے ساتھ ظلم و زیادتی شروع کر دے۔ اور اسے ذلیل کر کے رکھ دے۔ اس کی حالت اس طرح ہو جس طرح کوئی چیز فضا میں معلق ہو' نہ وہ بیوی بن کر رہ سکے اور نہ وہ آزاد ہو کہ کسی دوسری جگہ گھر بسا سکے۔

اس لئے' متعدد صورتوں' مختلف قسم کے حالات اور زندگی کے عملی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام نے یہ فیصلہ کیا کہ ایلا اور تعلق زن‌شوئی کے بائیکاٹ کے لئے انتہائی مدت چار ماہ ہے۔ اس سے زیادہ کسی خاوند کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ بائیکاٹ کرے۔ چار ماہ کی مدت بھی صانع فطرت نے اس لئے مقرر کی ہے کہ اس میں عورت کی فطری خواہشات اور اس کی قوت برداشت کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے فطری تقاضے پورے کرنے کے لئے اپنے خاوند کی بجائے کسی دوسرے ناجائز ذریعہ کی طرف رجوع کرے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ ایک رات خفیہ طور پر نکلے۔ لوگوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے۔ ان کی ضروریات معلوم کرنے کے لئے۔ ایک گھر سے انہیں آواز آئی ایک عورت یہ شعر گا رہی تھی۔

رات لمبی ہے' اور اس کا ہر پہلو تاریک ہو گیا!
میں جاگ رہی ہوں' کیوں؟
اس لئے کہ میں کس سے پیار کروں؟
خدا کی قسم! خدا کی قسم جو نگہبان ہے' جو دیکھ رہا ہے!
اگر یہ خدا نہ ہوتا تو میری چارپائی کے چاروں کونے جھنکار رہے ہوتے۔

حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹی حفصہ سے پوچھا کہ عورت خاوند کے بغیر کتنا عرصہ رہ سکتی ہے۔ حضرت حفصہؓ نے فرمایا چھ ماہ یا چار ماہ۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ میں اپنے فوجیوں میں سے کسی کو بھی چھ ماہ سے زیادہ باہر نہ رکھوں گا۔ اسی پر آپ نے احکامات جاری کر دیئے کہ فوجیوں کو چھ ماہ سے زیادہ عرصہ کے لئے اپنے گھروں سے دور نہ رکھا جائے۔

بہرحال ان معاملات میں مختلف لوگوں کے مختلف مزاج ہوتے ہیں۔ لیکن چار ماہ کا عرصہ ایک مرد کے لئے کافی ہے کہ وہ اس میں اپنے نفس اور اپنے جذبات کو آزمائے۔ ان چار مہینوں میں یا تو وہ لوٹ آئے اور میاں بیوی کے درمیان از سرنو ایک صحت مند عائلی زندگی کا آغاز ہو جائے اور اپنی بیوی کو گلے لگائے۔ اور اپنے بستر پر لوٹ آئے اور یا یہ کہ چار ماہ کے عرصہ میں بھی وہ اپنے آپ کو اس قابل نہ پائے کہ تعلقات کی پھر سے تجدید ہو اور قطع تعلق مجبوراً جاری ہو' اگر حالات دوسری صورت ہی کے ہوں تو پھر قرآن کا حکم یہ ہے کہ عقدۂ

نکاح کو کمل جانا چاہئے۔ بیوی کو طلاق دے کر اسے آزاد کر دینا چاہئے۔ یا وہ خود طلاق دے دے اور اگر وہ نہ دے تو قاضی اس کی طرف سے طلاق دے دے تاکہ میاں بیوی سے ہردو اس امر میں آزاد ہو جائیں کہ وہ اپنے لئے کسی دوسرے جوڑے سے نئی اور صحت مند عائلی زندگی کا آغاز کر سکیں۔ بیوی کے لئے بھی یہی شریفانہ اور پاکیزہ راستہ ہے اور مرد کے لئے بھی یہی خوشگوار اور فرحت بخش راستہ ہے۔ اور یہی مناسب ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو سنجیدہ راستہ ہے' جو منصفانہ راستہ ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر زندگی کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے ورنہ کشیدہ تعلقات کی صورت میں زندگی' دونوں فریقوں کی زندگی' منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔ قسم اور ایلا کے مسائل آخر کار طلاق پر منتہی ہوئے۔ اس مناسبت سے یہاں طلاق کے تفصیلی احکام دیئے گئے۔ نیز طلاق کے ساتھ دوسرے متعلقہ مسائل مثلاً عدت' فدیہ' نفقہ' رخصتی کا سامان اور دوسرے نتائج وغیرہ۔ سب سے پہلے عدت اور رجوع کے مسائل۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ یَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ یُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۲۸﴾

۲۸
ع ۷
۱۲

"جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو' وہ تین مرتبہ ایام ماہواری آنے تک اپنے آپ کو روکے رکھیں' اور ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو کچھ خلق فرمایا ہو' اسے چھپائیں انہیں ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے۔ اگر وہ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتی ہیں۔ ان کے شوہر تعلقات درست کر لینے پر آمادہ ہوں' تو وہ اس عدت کے دوران میں انہیں پھر اپنی زوجیت میں واپس لے لینے کے حقدار ہیں۔ عورتوں کے لئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں۔ جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے۔ اور سب پر اللہ غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے۔"

اپنے آپ کو روکے رکھیں ذرا اپنے جذبات پر کنٹرول کریں۔ تین مرتبہ ایام ماہواری تک یا تین مرتبہ ایام ماہواری سے پاک ہونے تک' اپنے آپ کو روکے رکھیں۔ میں نے قرآن مجید کی اس تعبیر اور انداز بیان پر بہت غور کیا' لطیف نفسیاتی حالت کی یہ عجیب تصویر کشی ہے۔ مفہوم اور مقصد یہ ہے کہ تین دفعہ ایام ماہواری آنے یا ان سے پاک ہونے تک وہ دوسری شادی کرنے سے باز رہیں۔ لیکن اس عقلی اور قانونی مفہوم کے علاوہ قرآن کریم کا طرز تعبیر کچھ اور بھی بتاتا ہے۔ انداز تعبیر روکے رکھیں' لگام کھینچ لیں' باوجود اچھلنے کودنے کے روکے رکھیں' اس تعبیر سے اس نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے جو ایسے حالات میں پائی جاتی ہے۔ ایسے حالات میں بالعموم مطلقہ عورت کو اس بات کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ وہ جلد از جلد نئی زندگی کا آغاز ایک نئے شوہر کی قیادت میں کر دے۔ یہ کیفیت فطری ہے۔ ایسے حالات میں عورت پر شدید اعصابی دباؤ ہوتا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ وہ ثابت کر دکھائے کہ سابقہ تجربہ ازدواج میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس میں کوئی جسمانی نقص نہیں ہے۔ وہ کسی وقت بھی' دوسرے شوہر کے لئے پرکشش بن سکتی ہے اور جدید ازدواجی زندگی کا آغاز کر سکتی ہے جبکہ یہ جذبہ اور یہ احساس مرد میں نہیں ہوتا' اس لئے کہ طلاق کا حق اس کے ہاتھ میں ہے' طلاق کا وار اس نے کیا ہے اور عورت نے اس وار کو برداشت کیا ہے۔ اس لئے عورت سے یہ کہا گیا کہ ذرا نفس کو روکے رکھو' اس کی لگام کو کم از کم تین ماہ تک کھینچے رکھو۔ یوں قرآن

مجید ایک لفظ اور ایک انداز تعبیر سے نفسیاتی کیفیت کی فضا ظاہر کر دیتا ہے۔ اس نفسیاتی کیفیت کو ملحوظ خاطر رکھ کر ہدایات دیتا ہے اور ضابطہ بندی کرتا ہے۔

وہ اس عرصہ کے لئے اپنے نفوس کو روکے رکھیں تاکہ ان کے رحم سابق زوجیت کے آثار سے پاک ہو جائیں اور پھر وہ نئے سرے سے ازدواجی زندگی کا آغاز کر سکیں' اگر چاہیں لَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ "اور ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو کچھ خلق فرمایا ہو' اسے چھپائیں۔ انہیں ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے اگر وہ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتی ہیں۔"

ان کے رحم میں حالت حمل ہے یا حالت حیض ان کے لئے جائز نہیں ہے کہ اسے چھپائیں۔ رحم میں جو کچھ ہے' اسے خدا تعالیٰ کی خالقیت سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ تاکہ ان کے دلوں میں خدا خوفی پیدا ہو۔ انہیں اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ویقین کی غیرت دلا کر کہا جاتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو تمہیں ہرگز کسی چیز کو چھپانا نہیں چاہئے۔ یہاں یوم آخرت کا ذکر اس لئے ہوا ہے کہ یوم آخرت یوم الجزاء ہے۔ اس دنیا میں جو چیز احکام خداوندی کے بجالاتے ہوئے فوت ہو جائے' وہ ایک مومن کو وہاں بطور اجر ملتی ہے۔ یہاں چونکہ عورتوں کے لئے حکم ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کے جذبات کو ٹھیس لگی ہے وہ اپنے نفوس کو روکے رکھیں۔ اس لئے کہا گیا کہ جزاء آنے والی ہے۔ ہاں اگر وہ پردہ داری کریں گی اور جو کچھ ان کے رحم میں ہے صاف صاف اس کا اظہار نہ کریں گی تو اس پر سزا بھی ہے۔ اس سے تو کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ کیا کوئی چیز اللہ سے چھپائی جا سکتی ہے؟ للذا مت چھپاؤ۔ کسی بات سے اثر لے کر' کسی مطلب کے لئے' کسی خواہش سے مغلوب ہو کر' کہیں خلق خدا کو چھپا نہ لو۔

یہ تو تھا ایک پہلو' دوسرا پہلو یہ ہے کہ قطعی جدائی سے پہلے' ایک وقفہ کی ضرورت ہے۔ معقول وقفہ۔ اس وقفے میں فریقین جدائی کے بعد اپنے جذبات کو اچھی طرح آزما لیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے دل میں محبت کی کوئی چنگاری باقی ہو اور پھر محبت سلگ اٹھے۔ ہو سکتا کہ جذبات محبت میں پھر تلاطم برپا ہو جائے اور وہ ایک دوسرے سے آملیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی سوچ جذبات' کوتاہی یا کبرو غرور کے نیچے دب گئی ہو اور وقفے میں انہیں سوچ آ جائے۔ جب غصہ فرو ہو جائے' جب طیش اتر جائے' جب نفس مطمئن ہو جائے اور وہ اسباب جو موجب فراق بن گئے تھے دب جائیں' کچھ عقل کی باتیں سامنے آ جائیں' سوچ کی نئی راہیں کھل جائیں۔ جن اسباب کو عظیم سمجھ کر فراق کا فیصلہ کر لیا گیا تھا وہ اس وقفے میں معمولی نظر آنے لگ جائیں اور فریقین میں از سرنو زندگی کا آغاز کرنے کا داعیہ پیدا ہو جائے۔ یا اس عرصہ میں کسی اور حسن عمل اور حسن تدبیر سے حالات کا رخ بدل جائے۔ اس لئے یہ بات نہایت ضروری تھی کہ ایک طلاق کے بعد متعلقہ تین ایام ماہواری یا ان کے پاک ہونے تک انتظار کرے۔ اسلام میں طلاق مشروع ہے لیکن خدا اور رسول کو سخت ناپسندیدہ بھی ہے۔ یہ کاٹ دینے کا عمل ہے اور اسے صرف اس وقت اختیار کرنا چاہئے' جب علاج کا کوئی طریقہ' جوڑنے کا کوئی حربہ کام نہ آ سکے۔ (قرآن مجید میں دوسری جگہ تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے کہ طلاق واقعہ ہونے سے پہلے صلح صفائی کے لئے سخت کوشش ہونی چاہئے۔ نیز یہ بھی ہدایت ہے کہ طلاق ایسی حالت میں دینی چاہئے کہ عورت ایام ماہواری سے پاک ہو چکی ہو' اور ابھی مرد نے اس کے ساتھ مباشرت نہ کی ہو محض اس لئے کہ طلاق دینے یا طلاق کو آخری شکل دیتے وقت مرد کو سوچ بچار کی کافی مہلت ملے۔ اگر حیض کی حالت ہے تو مرد طلاق دینے کے لئے طہر کا انتظار کرے گا۔

جہاں تک پہلی طلاق کا تعلق ہے' یہ ایک تجربہ ہے۔ اس تجربہ سے میاں بیوی دونوں یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ ان کے جذبات اور احساسات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ اگر دوران عدت انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ ایک دوسرے کی رفاقت میں زندگی کا آغاز نئے سرے

سے کر سکتے ہیں تو راستہ کھلا۔ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا "ان کے شوہر تعلقات درست کر لینے پر آمادہ ہوں' تو وہ اس عدت کے دوران میں انہیں پھر اپنی زوجیت میں واپس لینے کے حقدار ہیں۔

فِیْ ذٰلِكَ یعنی اس میں' اس سے مراد عدت کے دوران میں انتظار اور تربص کے زمانے میں۔ بشرطیکہ تعلقات زوجیت کو نئے سرے سے اختیار کرنے کا ارادہ ہو محض عورت کو اذیت دینا مقصود نہ ہو' محض انتقام لینے کی خاطر اسے ایسی زندگی کی طرف لوٹانا مقصود نہ ہو' جس میں کانٹے ہی کانٹے ہوں۔ یا محض غرور کی خاطر یہ رجوع نہ ہو۔ یا محض اس لئے نہ ہو کہ اگر میں نے رجوع نہ کیا تو اسے کوئی دوسرا خاوند نکاح میں لے لے گا' جو میرے لئے شرم کی بات ہے۔ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ "عورتوں کے لئے بھی معروف طریقے پر وہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔" یعنی اس حالت میں مطلقات کیلئے ایسے حقوق ہیں جس طرح ان پر واجبات ہیں وہ مکلف ہیں کے دوران عدت میں اپنے آپ کو روکے ہوں' ان کے رحموں میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ خلق فرمایا ہے اسے چھپائیں نہیں۔ خاوند کا فرض یہ ہے کہ اگر وہ رجوع کرتا ہے تو خالص نیت سے ہو' اس سے عورتوں کو تکلیف دینا مقصود نہ ہو' نہ اذیت دینا ہو' اس پر مزید یہ کہ دوران عدت وہ نان و نفقہ کی بھی حقدار ہوں گی جیسا کہ عنقریب بیان ہو گا۔ اس لئے کہ وہ از روئے قانون روکی ہوئی ہیں۔ وَ لِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ "البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے۔" اس درجہ سے مراد یہ ہے کہ مردوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوران عدت اگر چاہیں تو مطلقہ عورت کو دوبارہ اپنی زوجیت میں لوٹا سکتے ہیں۔ یہ حق اللہ تعالیٰ نے مرد کو اس لئے دیا ہے کہ طلاق کا حق مرد کا ہے۔ بعض لوگوں نے اس فقرے سے یہ مفہوم لیا ہے کہ عمومی طور پر مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل ہے۔ یہ حضرات اس سے مراد یہ نہیں لیتے کہ صرف مرد کو حق مراجعت حاصل ہے چنانچہ وہ حق مراجعت عورت کو بھی دیتے ہیں کہ عورت کو بھی اختیار ہے کہ وہ واپس چلی آئے اور مرد کو اپنی زوجیت میں لے لے' لیکن ان حضرات کا یہ استدلال نہایت ہی سقیم' بے محل اور بے موقعہ ہے۔ یہ حق' حق طلاق کے ساتھ وابستہ ہے اور صرف مرد ہی کو حاصل ہے۔

اب آخری تبصرہ اور نتیجہ وَ اللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ "اللہ سب پر غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔" یعنی اللہ قوت اور اقتدار اعلیٰ کا مالک ہے۔ لہٰذا وہ ہر قسم کا حکم نافذ کرنے کا مجاز ہے۔ اور پھر یہ کہ وہ حکیم و دانا ہے۔ اس کے احکام بھی حکیمانہ ہیں۔ اس آخری تبصرے کا اثر یہ ہے کہ مختلف وجوہات اور مختلف حالات سے متاثر ہو کر تم اللہ کے احکام سے منحرف نہ ہو جاؤ' انہیں پس پشت نہ ڈال دو۔

اب آنے والا حکم طلاقوں کی تعداد کی تحدید کے بارے میں ہے۔ یہ کہ مطلقہ کو یہ حق ہے کہ وہ پورا مہر حاصل کرے۔ یہ حرام ہے کہ وہ مرد طلاق کے وقت اس سے کچھ واپس لے۔ ہاں ایک صورت ایسی ہے جس میں مرد کو حق ہے کہ وہ اگر چاہے تو واپس لے۔ اگر صورت حال یہ ہو کہ عورت کو مرد سے سخت نفرت ہو' اور وہ اس کے ساتھ حدود الٰہی کی پابندی کرتے ہوئے زندگی گزارنے کے اہل نہ ہو' خطرہ ہو کہ وہ کسی معصیت میں مبتلا ہو جائے یعنی خلع کی وہ حالت جس میں عورت' فدیہ کے بدلے اپنی آزادی خریدنا چاہتی ہو۔ اس صورت میں مرد کو حق ہے کہ وہ کچھ لے لے۔

☆☆☆☆☆ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ

(۱) میں بھی اپنی بعض تحریروں میں کسی وقت یہ تاویل اختیار کی تھی' لیکن میرا خیال یہ ہے کہ یہ تاویل سقیم ہے۔

بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

"طلاق دوبار ہے۔ پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت کر دیا جائے اور رخصت کرتے وقت ایسا کرنا تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو' اس میں سے کچھ واپس لے لو' البتہ یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ زوجین کو اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورت میں اگر انہیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہ رہیں گے' تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کرے۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں۔ ان سے تجاوز نہ کرو اور جو لوگ حدود الٰہی سے تجاوز کریں' وہی ظالم ہیں۔"

وہ طلاق جس کے بعد' فریقین ازدواجی زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں دو ہیں۔ اگر خاوند ان دو سے بھی آگے بڑھ جائے تو پھر ان کے درمیان ازدواجی تعلقات صرف اس صورت میں قائم ہو سکتے ہیں' جس کی تشریح اگلی آیات میں آرہی ہے۔ یعنی یہ کہ پہلے وہ کسی دوسرے خاوند سے جدا ہو جائے۔ صرف اس صورت میں پہلے خاوند کے لئے' جس نے تین طلاقوں کا حق استعمال کر لیا تھا' یہ جائز ہے کہ اس عورت سے دوبارہ نکاح کرے بشرطیکہ یہ عورت از سرنو اس کے ساتھ نکاح کرنے پر راضی ہو۔

اس پابندی کے عائد ہونے کی وجہ کے بارے میں بعض روایات میں آتا ہے کہ اسلامی دور کے آغاز میں بھی (جاہلیت کی طرح) طلاقوں کی تعداد مقرر نہ تھی۔ اور مرد کو یہ حق بھی حاصل تھا کہ وہ ہر طلاق کے بعد دوران عدت رجوع کر سکے۔ چنانچہ بعض لوگ اسی طرح طلاق دیتے' پھر رجوع کرتے اور یوں ہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اسلامی دور میں انصار میں سے ایک صاحب کی اپنی بیوی کے ساتھ ان بن ہوگئی' اس نے بیوی سے کہا بخدا کی قسم نہ میں تجھے اپنے قریب چھوڑوں گا اور نہ ہی تجھے اپنے سے جدا کروں گا۔ اس نے کہا کیونکر ہو گا؟ اس نے کہا میں تجھے طلاق دوں گا لیکن جب عدت کا وقت قریب آئے گا تو میں رجوع کروں گا۔ وہ پریشان ہوئی اور اس نے رسول اللہ ﷺ سے یہ شکایت کی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ وحی آئی اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ طلاقیں دو ہیں۔"

اللہ نے اسلامی نظام کے نزول احکام میں یہ حکیمانہ پالیسی اختیار کی کہ جب بھی کسی حکم کی ضرورت پڑی' حکم نازل کر دیا گیا۔ اور اس طرح بتدریج پورے احکام نازل ہو گئے۔ اور اسلامی نظام زندگی کے اصول مکمل کر لئے گئے۔ اب جو کام رہ گیا تھا وہ جزوی اور نئے حالات پر ان اصولی احکام کی تطبیق کا تھا تاکہ اصول کی روشنی میں جزئیات کے حل معلوم کئے جائیں۔

اس پابندی کے نتیجے میں طلاقوں کی تعداد محدود ہو گئی۔ اب وہ سابقہ صورت حال باقی نہ رہی کہ خاوند مسلسل طلاق دیتا چلا جائے اور اس کو بازیچۂ اطفال بنادے۔ اب طریق کار یہ ہو گیا کہ جب مرد عورت کو ایک مرتبہ طلاق دے دے تو وہ دوران عدت کسی قانونی پیچیدگی کے بغیر اپنی بیوی سے رجوع کر سکتا ہے۔ اور اگر یوں ہی عدت گزر جائے تو عورت جدا ہو جائے گی جسے فقہ میں 'بائنہ' کہتے ہیں۔ اب بھی عدت کا عرصہ گزر جانے کے بعد وہ محض رجوع سے واپس نہیں لے سکتا' بلکہ اسے ایک نئے نکاح کے ذریعہ' اور ایک نیا مہر مقرر کر کے عورت کی رضا سے اسے واپس نکاح میں لانا ہو گا۔ ایک طلاق کے بعد مرد عورت کو دوران عدت میں واپس لے لے' رجوع کر کے یا عدت گزرنے کے بعد وہ نکاح تازہ کر لے اور جدید مہر کے ساتھ عورت کو واپس کر لے دونوں صورتیں جائز ہیں۔

اس کے بعد اگر دوسری مرتبہ یہ خاوند پھر اسے ایک طلاق دے دیتا ہے تو بھی اسے یہی حق حاصل ہو گا۔ یعنی دوران عدت میں رجوع اور بعد از عدت نکاح جدید۔ لیکن اگر وہ تیسری مرتبہ طلاق دے دے تو اس صورت میں یہ عورت اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے گی۔ فقہی اصلاح میں اسے عظیم جدائی (بینونت کبریٰ) کہتے ہیں۔ تیسری مرتبہ طلاق دیتے ہی عورت بائن ہو جائے گی یعنی جدا تصور ہو گی۔ اب یہ مرد دوران عدت رجوع کا حق استعمال نہیں کر سکتا' نہ وہ نکاح جدید کر سکتا ہے۔ الایہ کہ اس عورت کا نکاح کسی دوسرے مرد سے ہو جائے اور یہ دوسرا خاوند اپنی ازدواجی زندگی کے دوران اسے طلاق دے دے' پھر رجوع نہ کرے یا یہ دوسرا خاوند بھی تین طلاقوں کا حق استعمال کرے اور عورت ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے تو پھر پہلے مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ اس عورت کو اپنے نکاح میں لے لے۔ لیکن یہ سب کام اپنی قدرتی رفتار سے ہونا چاہئے۔

پہلی طلاق ایک کسوٹی اور ایک معیار ہے جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں۔ دوسری طلاق دوبارہ آزمائش اور ایک آخری تجربہ ہے۔ دوسری طلاق کے بعد اگر زندگی کی گاڑی چل پڑے تو فبہا ورنہ تیسری طلاق اس بات کا بین ثبوت فراہم کر دیتی ہے کہ زوجین کے درمیان طبائع اور مزاجوں کا اختلاف بہت ہی بنیادی نوعیت کا ہے اور ناقابل اصلاح ہے۔

بہرحال طلاق بھی ایک آخری علاج ہے۔ کوششوں کے بعد بھی اگر فریقین کے درمیان مصالحت کا کوئی امکان نہ رہے تو پھر یہی بہتر ہے کہ دائمی جدائی ہو جائے۔ اگر دو طلاقیں ہو جائیں تو پھر بیوی کو یا تو معروف طریقے سے رکھنا ہے اور نرمی و محبت کی زندگی کا نئے سرے سے آغاز کرنا ہے اور یا پھر بھلے انداز میں حسن و خوبی کے ساتھ' احسان کے ساتھ' شرافت کے ساتھ اس کو رخصت کر دینا ہے' یعنی تیسری مرتبہ طلاق دے کر' جس کے بعد عورت کو پھر زندگی کی نئی لائن اختیار کرنی ہوتی ہے۔ یہ ہے حقیقت پسندانہ قانون سازی' جو انسان کے حقیقی واقعاتی زندگی کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ اور جو عائلی زندگی کے پیچیدہ مسائل کا بہترین اور عملی (Practical) حل پیش کرتی ہے۔ اس قانون سازی میں ایسی شدت بھی نہیں ہے جو مفید نہ ہو' انسان کو ایسے اخلاقی نظام میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کرتی جو اسکی جبلت سے متصادم ہو' نہ یہ قانون سازی انسان اور اسکی قوتوں کو مہمل چھوڑنے پر اصرار کرتی ہے' اگر یہ اسے یوں ہی چھوڑ دیتے ہیں کوئی فائدہ نہ ہو۔

ازدواجی زندگی کے دوران مرد نے عورت کو جو مہر دیا ہے' یا اس پر مختلف قسم کے جو اخراجات کئے ہیں' مرد کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ تیسری طلاق کے بعد' وہ اس سے کوئی چیز واپس لے محض اس کے بدلے میں کہ اب وہ اس عورت کو آزاد کر رہا ہے۔ ہاں صرف ایک صورت ہی ایسی ہے جس میں مرد کوئی چیز واپس لینے کا حقدار بن جاتا ہے۔ وہ یہ کہ عورت کو ذاتی اسباب کی بناپر ذاتی جذبات اور بمقتضائے طبیعت مرد ناپسند ہو اور عورت یہ محسوس کرتی ہو کہ اس نفرت اور کراہت کی وجہ سے وہ اس خاوند کے ساتھ حدود الٰہی کی پابندی کرتے ہوئے زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کے ساتھ حسن معاشرت سے پیش آئے۔ اس کے ادب کا خیال رکھے یا اس کی عزت و آبرو بچائے اور عفیفانہ زندگی بسر کر سکے تو ایسے حالات میں عورت کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ مرد سے طلاق طلب کرے۔ اس صورت میں یہ عورت چونکہ محض ذاتی وجوہات کی بناپر اس مرد کے جذبات مجروح کرتی ہے اور اس کے خاندان اور گھر کو خراب کر رہی ہے۔ اور اس میں بچارے مرد کا کوئی ذاتی قصور نہیں ہے۔ اس لئے اس عورت کا فرض ہے کہ وہ مہر واپس کر دے۔ یہ محض اس لئے کہ عورت اللہ کی معصیت سے بچے' اس کی حدود توڑنے کا موقعہ اسے نہ ملے' اور نہ اپنے نفس پر اور نہ دوسروں پر معصیت لانے کے مواقع پیدا ہوں۔

یہ ہے اسلامی نظام زندگی' جس میں لوگوں کو پیش آنے والے تمام واقعی حالات زندگی کی رعایت کی گئی ہے۔ اس میں ان انسانی

جذبات اور فطری پسند و ناپسند کا بھی خاطر خواہ لحاظ رکھا گیا ہے' جن پر خود انسان کو کوئی کنٹرول نہ ہو' بیوی کو بھی مجبور نہیں کیا گیا کہ وہ اپنی پوری زندگی ایک ایسے شخص کے ساتھ بسر کر دے جسے وہ پسند ہی نہیں کرتی' اس سے طبعہ متنفر ہے' اور ساتھ ہی مرد کے حقوق کو بھی نظر انداز نہیں کرتی۔ جس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس طبعی نفرت اور مزاج کی ناہمواری کے پیدا کرنے میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔

اس آیت کی اہمیت اور اس کے دور رس نتائج تک پہنچنے کے لئے' ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم قارئین کے سامنے وہ واقعی حالات بھی رکھ دیں جن حالات کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے یہ قانون بنایا اور اسے نافذ کیا گیا۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے اس ربانی نظام زندگی میں کس حقیقت پسندی' کس وقت نظر' کس میانہ روی اور عدل و انصاف کے کس اونچے معیار کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

امام مالک ؒ نے اپنی مشہور کتاب موطا میں روایت کی ہے کہ حبیبہ ؓ بنت سہل انصاری' ثابت ابن قیس ابن شماس کی بیوی تھی۔ حضور ﷺ صبح اندھیرے منہ گھر سے باہر نکلے تو دیکھا کہ صبح کی تاریکی میں حبیبہ ؓ کھڑی ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کون ہو سکتی ہیں یہ ؟ کہنے لگی میں حبیبہ بنت سہل ہوں جناب۔ حضور ﷺ نے فرمایا! ایسے وقت میں کیسے ؟ کہنے لگی حضور ﷺ میں کسی صورت میں بھی ثابت ابن قیس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔

اس کے بعد ثابت بن قیس بلائے گئے تو حضور ﷺ نے فرمایا! ثابت' یہ حبیبہ ہے اس نے میرے سامنے تمہارے بارے میں وہ باتیں کی ہیں جو اللہ کو منظور ہوں گی۔

اس پر حبیبہ نے کہا حضور ﷺ "اس نے مجھے جو کچھ دیا ہے وہ میرے پاس محفوظ ہے۔"

اس پر حضور ﷺ نے ثابت ؓ سے کہا اس سے لے لو چنانچہ اس نے وہ سب کچھ لے لیا اور حبیبہ اپنے اہل خاندان کے پاس چلی گئی۔

امام بخاری ؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس ؓ سے روایت کی ہے کہ ثابت ابن قیس ابن شماس کی بیوی حضور ﷺ کے پاس آئیں' کہنے لگیں حضور ﷺ میں اس پر کسی بے دینی و بد اخلاقی کا الزام نہیں لگاتی' لیکن میں نہیں چاہتی کہ ہم مسلمان ہو کر کفر کا ارتکاب کریں۔

حضور ﷺ نے فرمایا! "کیا تم اس باغ کو واپس کر دو گی جو اس نے تمہیں (بطور مہر) دیا ہے ؟"

اس نے کہا: "ہاں" حضور ﷺ نے فرمایا: "ثابت! اپنا باغ واپس لے لو اور اسے ایک طلاق دے دو۔"

ایک دوسری روایت میں ذرا زیادہ تفصیل آئی ہے۔ ابن جریر ؒ نے نقل کیا ہے کہ ابو جریر ؒ نے عکرمہ ؒ سے دریافت کیا: کیا خلع کی کوئی شرعی حقیقت ہے ؟ عکرمہ ؒ نے جواب دیا حضرت ابن عباس ؓ کہا کرتے تھے اسلام میں پہلا خلعہ عبداللہ ابن ابی کی بہن کا ہوا۔ وہ حضور ﷺ کے پاس آئیں اور کہا: حضور' میرا سر اس چیز کے سر کے ساتھ ہرگز جمع نہیں ہو سکتا۔ میں نے پردے کا ایک کونہ اٹھایا اور اسے چند آدمیوں کے درمیان آتے ہوئے دیکھا۔ وہ سب میں سیاہ رنگ تھا' سب میں کوتاہ قد اور سب میں قبیح صورت تھا۔"

اس پر اس کے خاوند نے کہا: "حضور ﷺ میں نے تو اسے بہترین جائیداد عطا کر دی ہے۔ ایک ہی باغ تھا میرا جو میں نے اسے دے دیا ہے' کیا وہ میرا باغ واپس کر دے گی ؟"

حضور ﷺ نے عورت سے دریافت کیا تمہاری رائے کیا ہے ؟ اس نے کہا: "ہاں اگر وہ چاہتا ہے تو میں اسے واپس کر دوں گی۔" ابن

عباس ﷺ کہتے ہیں : "اس پر حضور ﷺ نے دونوں کے درمیان تفریق کرا دی۔"

ان تمام روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا نفسیاتی صورت حالات تھی' جو حضور ﷺ کے سامنے آئی۔ حضور ﷺ نے اس صورت حال کو اس طرح قبول کر لیا کہ یہ کیس ناقابل علاج ہے۔ تشدد اور سختی سے اس کا علاج ممکن نہیں ہے اور نہ اس میں ازدواجی زندگی میں کوئی مفید مثال قائم ہو سکتی ہے۔ کہ عورت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایسی تلخ معاشرت پر مجبور کر کے رکھ دیا جائے۔ اس لئے حضور ﷺ نے اس صورت حال کا اصل اسلامی نظام زندگی کے مطابق' اسلامی منہج کے مطابق' پیش کر دیا جو بے حد عملی ہے۔ واضح ہے' حقیقت پسندانہ ہے اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ حضور ﷺ نے نفس انسانی کے ساتھ ایک ایسے شخص کا معاملہ کیا جو اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہو کہ اس نفس کے اندر کیا جذبات کام کر رہے ہیں۔ کیا رجحانات ہیں۔

پھر ایسی تمام صورتوں میں سنجیدہ طرز عمل یا ظالمانہ طرز عمل' اور سچائی کی راہ یا فریب کاری کی راہ اختیار کرنے کے لئے واحد نگراں صرف خدا خوفی اور اس کی پکڑ کا ڈر ہی ہو سکتا تھا' اس لئے ان احکام کے خاتمہ پر تنبیہ کر دی گئی کہ یہ ہیں اللہ کی حدود۔ ان سے تجاوز مت کرنا۔

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ "یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں' ان سے تجاوز نہ کرو اور جو حدود الٰہی سے تجاوز کریں' وہی ظالم ہیں۔"

یہاں ذرا تھوڑی دیر کے لئے رکیے! یہاں ہمارے سامنے قرآن مجید نے ایک ہی مضمون کو مختلف حالات میں مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ مضمون ایک' حالات مختلف' اس لئے انداز بیان اور۔

اس صورت میں روزے پر بحث کرتے ہوئے آخر میں یہ تنبیہ فرمائی گئی تھی تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا "یہ اللہ کی حدیں ہیں' ان کے قریب نہ بھٹکو اور یہاں یہ کہا گیا ہے۔ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا "یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔" سوال یہ ہے کہ انداز بیان میں یہ اختلاف کیوں ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ سابقہ مقام ایسا تھا' جس میں اللہ تعالیٰ نے ایسی چیزوں سے روکا تھا' جو طبعاً سخت پسندیدہ ہیں بلکہ ایک مادہ پرست کے لئے خلاصہ حیات ہیں وہاں فرمایا گیا تھا:

> "تمہارے لئے روزوں کے زمانے میں راتوں کو اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔ اللہ کو معلوم ہو گیا کہ تم لوگ چپکے چپکے اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے۔ مگر اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا اور تم سے درگزر فرمایا۔ اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو اور جو لطف اللہ نے تمہارے لئے جائز کر دیا ہے اسے حاصل کرو۔ نیز راتوں کو کھاؤ پیو یہاں تک کہ تم کو سیاہی شب کی دھاری سے سپیدہ صبح کی دھاری نمایاں نظر آ جائے۔ تب یہ سب کام چھوڑ کر اپنا روزہ پورا کرو اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔ یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں' ان کے قریب نہ پھٹکنا۔" تلک حدود اللہ فلا تقربوھا

ان آیات میں جن چیزوں کی ممانعت کر دی گئی ہے' وہ سب ایسی ہیں کہ انسان از روئے طبیعت انہیں بے حد چاہتا ہے۔ اس لئے یہاں حکم دیا گیا کہ ان کے قریب نہ پھٹکنا' قریب ہی نہ ہونا' انسان ضعیف ہے' ہو سکتا ہے کہ ان چیزوں کی جاذبیت کا مقابلہ نہ کر سکے اور ان میں مبتلا ہو جائے' ان کے پھندے میں بس کہیں پھنس ہی نہ جائے۔

اب یہاں سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی چیزوں سے منع کیا گیا ہے جو بذات خود ناپسندیدہ ہیں۔ گھریلو اختلافات' جھگڑے

بذات خود ناپسندیدہ ہیں۔ یہاں خطرہ اس بات کا نہیں ہے کہ کوئی لڑائی جھگڑے کا شوق کرے' بلکہ خطرہ اس بات کا ہے کہ بامر مجبوری اگر کوئی جھگڑا ہو ہی جائے تو اس میں حدود سے تجاوز نہ کرے۔ معقول حدود میں رہے' حدیں توڑ ہی نہ دے۔ اس لئے یہاں حکم یہ نہیں دیا گیا کہ قریب ہی مت جاؤ بلکہ یہ حکم دیا گیا کہ حدود سے آگے نہ بڑھو۔ انداز بیان میں یہ لطیف فرق اس لئے ہوا ہے کہ موقع و محل میں اختلاف ہے۔ دونوں مواقع و محل کے اس قدر لطیف فرق میں بالکل جدا ہیں۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ وہ مواقع و محل کے اس قدر لطیف فرق میں بھی انداز بیان مختلف اختیار کرتا ہے۔

احکام طلاق کا سلسلہ جاری ہے۔ چلتے جایئے:

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۗ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٢٣٠﴾

"پھر اگر (دوبار طلاق دینے کے بعد) تیسری بار طلاق دے دی' تو وہ عورت پھر اس کے لئے حلال نہ ہوگی' الا یہ کہ اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو اور وہ اسے طلاق دے دے۔ تب اگر پہلا شوہر اور عورت دونوں یہ خیال کریں کہ حدود الٰہی قائم رکھیں گے تو ان کے لئے ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں' جنہیں وہ ان لوگوں کی ہدایت کے لئے واضح کر رہا ہے۔ جو (اس کی حدوں کو توڑنے کا انجام جانتے ہیں۔)

جیسا کہ اوپر ہم کہہ آئے ہیں' تیسری بار طلاق اس بات کی دلیل ہے کہ میاں بیوی کے یہاں بنیادی اختلاف موجود ہے۔ اس قدر گہرا کہ اصلاح کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ تو اس صورت میں مناسب یہی ہے کہ میاں بیوی کو ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا جائے اور ہر ایک کو آزاد کر دیا جائے کہ وہ اپنے لئے جدید رفیق حیات تلاش کریں اور از سر نو عائلی زندگی کا آغاز کریں۔ اور اگر خاوند محض ژاوہ گوئی' جلد بازی اور کبر و غرور کی وجہ سے یہ طلاقیں دے رہا ہو تو پھر بھی تیسری طلاق دینے کو نافذ کر دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس نازک معاملے میں ژاوہ گوئی کے لئے بھی کوئی حد ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ طلاق کی گنجائش اس لئے نہیں رکھی گئی کہ اسے مذاق بنا دیا جائے۔ یہ تو اس لئے مقرر ہوئی ہے کہ بعض ناقابل علاج اور ناقابل اصلاح کیسوں میں اسے استعمال کرنا چاہئے۔ اس لئے ایسے جوڑے کو بھی علیحدہ کر دینا چاہئے جس کے دل میں اس مقدس عقد کا کوئی احترام اور اس کا کوئی تقدس نہیں ہے۔ اور خاوند بار بار طلاق کو استعمال کر رہا ہے اور اس معاملے میں کوئی احتیاط نہیں کرتا۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایک غیر ذمہ دار خاوند کی جانب سے لفظ طلاق کہنے کے نتیجے میں ایک بے گناہ عورت کا امن و سکون کیوں تباہ کیا جاتا ہے۔ اس کی زندگی کو کیوں خطرے میں ڈالا جا رہا ہے؟ جواب یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں ہم فی الحقیقت ایسے واقعات سے دوچار ہوتے ہیں' جن کا علاج ضروری ہوتا ہے' ایسے قضیے ہوتے ہیں جن کا فیصلہ ضروری ہے' قانون سازی ضروری ہے۔ اگر ہم یہ علاج نہ کریں جو قرآن کریم نے بتایا' اس قانون پر فیصلہ نہ کریں جو اللہ نے دیا ہے تو بتایئے کیا کریں۔ کیا ہم اس عورت کو اس مرد پر ٹھونس دیں لو یہ تمہاری بیوی ہے' تم چاہو نہ چاہو' یہ تمہاری بیوی ہے۔ تم سو بار طلاق دو ہم تمہاری طلاق کو تسلیم نہیں کرتے۔ تمہاری طلاق بے اثر ہے' حالانکہ اس شخص کے دل میں بیوی کا کوئی احترام نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ذرہ بھر محبت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک

عورت کے لئے اس سے بڑی اہانت اور کیا ہو سکتی ہے؟ ازدواجی تعلقات کی اس سے زیادہ اور تذلیل کیا ہو سکتی ہے؟ اسلام میں عورت کا احترام ضروری ہے۔ مرد و زن کے باہمی تعلقات کو اسلام مقدس رشتہ سمجھتا ہے۔ اس رشتے کو محض رشتہ تلذذ ہی نہیں سمجھتا بلکہ اسے فریضہ حیات اور اللہ کی عبادت اور بندگی کا درجہ دیتا ہے۔ وہ خاوند جو طلاق کو ایک مذاق بناریتا ہے تو اگر اس نے ایک طلاق دی ہے یا دوسری طلاق دی ہے اور قبل از رجوع عورت بائن ہوگئی ہے' جدا ہوگئی تو اس کی سزا یہ ہی کہ اگر وہ دوبارہ نکاح کرنا چاہتا ہے تو اس عورت کو دوبارہ راضی کرے گا۔ نکاح ہوگا اور اسے مہر ادا کرنا ہوگا۔ اور اگر وہ تیسری بار طلاق دیتا ہے تو پھر اس کی سزا یہ ہے کہ وہ عورت اس پر حرام ہوگئی ہے مکمل حرام اگرچہ اب یہ پشیمان ہو جائے۔ اب اس عورت کی دوسری شادی اور اس میں بھی ناکامی سے قبل یہ اس کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتا۔ مزید یہ کہ مہر بھی اسے دینا پڑے گا اور جو کچھ عورت کو دیا ہے اس کی واپسی سے بھی یہ محروم ہوگا۔ ہر حال میں اسے دوران عدت نفقہ بھی ادا کرنا ہوگا۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم انسانی نفسیات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں۔ انسان کی زندگی کے عملی پہلوؤں پر غور کریں۔ ہمیں ایسی تخیلاتی دنیا میں نہیں ٹھہرنا چاہئے چاہے جس کا عملی وجود' اس کرہ ارض پر نہ ہو۔ انسان کی عملی زندگی میں وہ خیالی تصور قابل عمل نہ ہو۔

اب اگر یہ عورت' تیسری طلاق کے بعد' جیسا کہ قدرتی طور پر ہوتا ہے' دوسرے خاوند سے شادی کر لیتی ہے اور یہ دوسرا خاوند بھی اتفاقاً اس عورت کو طلاق دے دیتا ہے' تو پھر یہ بیوی اور اس کا پہلا خاوند اگر چاہیں تو دوبارہ معاہدہ نکاح کر سکتے ہیں' اب ان کے لئے کوئی ممانعت نہیں ہے۔ صرف یہ شرط ہے (قانونی نہیں) اخلاقی اور ایمانی شرط ہے۔

إِنْ ظَنَّآ أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ "اگر ان دونوں کا خیال یہ ہو کہ وہ حدود الٰہی پر قائم رہ سکیں گے۔ اور ویسا معاملہ نہ ہو گا جس طرح پہلے ہوا۔ کیونکہ اسلام میں رشتہ نکاح محض خواہش نفس کی پیروی کا نام نہیں ہے۔ یہ محض داعیہ شہوت کی تشفی کے لئے کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ اور اسلامی معاشرہ میں میاں بیوی کو اس طرح آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا کہ بس وہ آزاد شہوت رانی کریں' جب چاہیں نکاح کر لیں' جب چاہیں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ ان کو حدود الٰہی کی پابندی کرنی ہوتی ہے۔ اسلام کا نظام ازدواج تو حیات انسانی کی شیرازہ بندی ہے' زندگی کے لئے ایک فریم ہے۔ اگر زندگی اس فریم سے باہر نکل آئے تو وہ زندگی اللہ کو مطلوب نہیں ہے۔ وہ اللہ کو پسند نہیں ہے۔

وَ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ "یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں جنہیں وہ ان لوگوں کی ہدایت کے لئے واضح کر رہا ہے' جو (اس کی حدوں کو توڑنے کا انجام) جانتے ہیں۔"

اپنے بندوں پر اللہ کی یہ ایک عظیم رحمت ہے کہ اس نے اپنی حدیں کھول کھول کر بیان فرمادی ہیں۔ ان میں کوئی شبہ اور کوئی پیچیدگی نہیں چھوڑی گئی۔ ان سب کو واضح کر دیا گیا ہے لیکن ان لوگوں کے لئے جو جانتے ہیں' جو قدر کرتے ہیں جو لوگ ان حدوں کو صحیح طرح جانتے ہیں وہ ان حدود پر جاکر رک جاتے ہیں۔ اگر وہ ان حدود کو پار کر جائیں تو آگے قابل مذمت جاہلی دنیا ہے۔ اور اندھی جاہلیت ہے۔

اب ان مردوں کو ہدایات دی جارہی ہیں جو طلاق کا حق استعمال کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تم مطلقہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ شریفانہ رویہ اختیار کرو اور طلاق کے متصلا بعد کے تلخ دور میں بھی معروف طریقے کے مطابق حسن سلوک کا رویہ اختیار کرو وَ إِذَا

طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ

وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَ

لَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ

عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ

۲۹ ع۳ ۱۳ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۲۳۱﴾ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ

أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ ۗ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ

مَن كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۳۲﴾

"اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہو جانے کو آجائے' تو یا بھلے طریقے سے انہیں روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔ محض ستانے کی خاطر انہیں نہ روکے رکھنا کہ یہ زیادتی ہوگی اور جو ایسا کرے گا وہ درحقیقت آپ اپنے اوپر ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ۔ بھول نہ جاؤ کہ اللہ نے کس نعمت عظمیٰ سے تمہیں سرفراز کیا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ جو کتاب اور حکمت اس نے تم پر نازل کی ہے' اس کا احترام ملحوظ رکھو' اللہ سے ڈرو" اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے۔

جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو پھر اس میں مانع نہ ہو کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں' جبکہ وہ معروف طریقے سے باہم مناکحت پر راضی ہوں۔ تمہیں نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسی جرأت ہرگز نہ کرنا' اگر تم اللہ اور روز آخر پر ایمان لانے والے ہو' تمہارے لئے شائستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے کہ اس سے باز رہو' اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

زندگی کے رشتے کٹ رہے ہوں یا جڑ رہے ہوں' ہر صورت میں اسلام یہ ہدایات دیتا ہے کہ احسان' حسن سلوک اور معروف و مستحسن طرز عمل کو فضا پر غالب رہنا چاہئے۔ اگر رشتے ٹوٹ رہے ہوں تو نیت یہ نہ ہو کہ فریق مخالف کو اذیت دی جائے' اسے بطور پالیسی دکھ پہنچایا جائے۔ جدائی اور طلاق کی فضا میں نفوس اور مزاج ایک دوسرے سے کھچے رہتے ہیں' ایسے حالات میں حسن سلوک کا یہ اعلیٰ و ارفع معیار صرف اس صورت میں قائم کیا جاسکتا ہے کہ اس کی اساس کسی ایسے اصول حیات پر رکھی گئی ہو جو اس دنیاوی زندگی کے حالات سے بلند تر ہو۔ ایسا اصول جو دلوں سے حسد اور بغض اور کینہ نکال دے' زندگی کے آفاق کو وسیع تر کر دے' زندگی کو موجود اور حاضر سے وسیع کر کے غیر موجود اور دوسرے جہاں تک وسیع کر دے۔ یہ اساس صرف اللہ پر ایمان کی اساس ہو سکتی ہے۔ آخرت پر ایمان کی اساس ہو سکتی ہے۔ یہ اساس ہو سکتی کہ انسان انعامات الٰہی پر غور کرے۔ جن میں سے سب سے بڑی نعمت' نعمت ایمان ہے۔ پھر اس نے ہر شخص کو قدر کے مطابق جو فراخی رزق دیا ہے اس پر غور کرے' پھر ہر شخص کو جو صحت اور توانائی دی ہے' اس پر غور کرے تو انسان کے سوچ کی سطح بلند ہو سکتی ہے۔ پھر اللہ کا خوف دل میں موجود ہو' اور یہ امید بھی ہو کہ جو ازدواجی زندگی ناکام ہو گئی ہے جو نقصانات و اخراجات ضائع ہو چکے' ان کے عوض اللہ تعالیٰ نعم البدل عطا کر سکتا ہے۔ غرض یہ ہے وہ اساس جسے یہ دو آیات پیش کر رہی ہیں' جن کا مقصد صرف یہ ہے کہ رشتہ کٹ رہا ہو یا جڑ رہا ہو' ہر صورت میں ایثار' بھلائی اور احسان کا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔

زمانہ جاہلیت میں عورت پر جو مظالم ممکن تھے' ہوا کرتے تھے۔ بچپن میں اس پر مظالم ہوتے' اسے زندہ درگور کر دیا جاتا' اگر زندہ

دفن کرنے سے بچ جاتی تو وہ ذلت ' مشقت اور سخت اہانت کی زندگی بسر کرتی۔ پھر جب وہ ازدواجی زندگی میں قدم رکھتی تو اسے مرد کے عام سامان اور مال کی طرح ایک مال ہی سمجھا جاتا ہے۔ مال بھی اس درجے کا کہ اس کے مقابلے میں گھوڑے کی قیمت زیادہ ہوتی۔

بہت زیادہ اگر ناچاقی کے نتیجے میں خاوند اسے طلاق دے دیتا تو یہ عضو معطل کی طرح پابند رہتی اور جب تک طلاق دینے والا خاوند رحم کھاکر اسے اجازت نہ دیتا وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح نہ کر سکتی یا اس کے اہل خاندان غیرت میں آکر اسے بند کر دیتے۔ اور اگر طلاق دینے والا شخص پشیمان ہو کر رجوع کرنا چاہتا تو یہ لوگ اسے اس کے پاس واپس جانے سے روکتے۔

عموی طور پر عورت کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھا جاتا۔ معاشرے میں اسے گھٹیا درجے کی طبعی تصور کیا جاتا۔ غرض عرب معاشرہ میں عورت کی وہی حیثیت تھی جس طرح اس دور کے دوسرے جاہل معاشروں میں عورت کی حیثیت تھی۔

ایسے حالات میں اسلامی نظام زندگی کا نزول ہوتا ہے۔ اب ریگستان عرب کی طوفانی اور گرم ہواؤں کے بجائے ' مصیبت زدہ عورت باد نسیم کے خوشگوار جھونکے محسوس کرتی ہے ' جس کے کچھ نمونے ان آیات میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اب عورت کے بارے میں یہ نقطہ نظر دیا جاتا ہے کہ مرد و عورت دونوں ایک ہی نفس سے پیدا کئے گئے ہیں۔ دونوں کا خالق ایک ہے۔ ازدواجی تعلقات کو محض ذریعہ لذت کے بجائے عبادت اور احسان کا درجہ دیا گیا۔ اسے فریضۂ حیات کا درجہ دیا گیا۔ یہ اس وقت اور ایسے حالات میں دیا گیا جبکہ عورتوں کی کسی انجمن نے کوئی مطالبہ نہ کیا تھا ' نہ عورت اس وقت ان حقوق کی اہمیت سے واقف تھی۔ نہ اس وقت کے عورت پرست مردوں نے عورت کے حقوق کے لئے کوئی مطالبہ کیا تھا ' نہ ایسا کوئی مطالبہ ان کے تصور ہی میں تھا ' یہ تو اللہ کی رحمت اور فضل کی ایک عام بارش تھی ' جس سے بیک وقت مرد اور عورت دونوں فیض یاب ہوئے اور پوری انسانیت اور انسانی زندگی کو سیراب کیا۔ وَ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ‌ وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا "اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہونے کو آجائے ' تو یا بھلے طریقے سے انہیں روک لو ' یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔ محض ستانے کی خاطر انہیں نہ روک رکھنا کہ یہ زیادتی ہوگی۔"

فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ میعاد جو گزشتہ آیت میں مقرر کی گئی ہے ' وہ پوری ہونے کو آجائے۔ اگر عدت ختم ہونے کو آجائے تو پھر دو طریقے ہیں یا تو معروف طریقے سے ' اصلاح احوال کی نیت سے روک لو ' یعنی طلاق سے رجوع کر لو۔ امساک معروف کا یہی مفہوم ہے۔ اگر اصلاح نیت سے روکنا مطلوب نہیں ہے تو پھر رجوع نہ کرو اور عدت پوری ہونے دو تاکہ عورت کی طلاق ' طلاق بائنہ ہو جائے۔ یہ ہے معنی تسریح باحسان کا۔ یعنی بغیر کسی قسم کی ایذا رسانی کے ' بغیر فدیہ طلب کرنے کے اور بغیر کسی قسم کی جاہلانہ پابندی کے کہ وہ فلاں جگہ شادی نہ کرے گی یا فلاں حدود کے اندر شادی نہ کرے گی۔ اور وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا "محض ستانے کی خاطر انہیں روکے نہ رکھنا

جیسا کہ اوپر ہم ایک انصاری کی روایت نقل کر آئے ہیں جس نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ نہ تو میں تمہیں زوجیت میں لوں گا اور نہ ہی تمہیں طلاق دوں گا۔ یہ ہے برے طریقے سے روکے رکھنا۔ محض ستانے کے لئے روکے رکھنا۔ اسلام ایسے روکنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس سلسلے میں ان آیات میں بار بار نہی آئی ہے۔ یہ تکرار تاکید اس لئے ہے کہ اس وقت کی عربی سوسائٹی میں یہ ظلم عام تھا۔ بلکہ یہ ظلم ہر اس سوسائٹی میں عام ہو سکتا ہے جسے اسلام نے مہذب نہ بنایا ہو اور جسے ایمان نے اونچا نہ کر دیا ہو۔

یہاں اب قرآن مجید انسان کے فہم و شعور میں جوش پیدا کرتا ہے ' انسان کے جذبات شرم و حیا کو بیدار کرتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ انہیں اپنے برے انجام سے بھی ڈراتا ہے۔ یہ سب ذرائع محض اس لئے استعمال کئے جارہے ہیں کہ انسان کی زندگی سے جاہلیت کے آثار کو

ایک ایک کر کے مٹا دیا جائے اور اسے شرافت و عزت کے اس بلند مقام تک پہنچا دیا جائے جہاں تک اسے اسلامی نظام زندگی ہاتھ پکڑ کر لے جانا چاہتا ہے۔

وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ؗ وَّ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مَاۤ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ

"اور جو ایسا کرے گا وہ درحقیقت آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ۔ بھول نہ جاؤ کہ اللہ نے کس نعمت عظمیٰ سے تمہیں سرفراز کیا ہے۔ اور وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ جو کتاب اور حکمت اس نے تم پر نازل کی ہے' اس کا احترام ملحوظ رکھو۔ اللہ سے ڈرو اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے۔"

جو شخص عدت گزرنے والی عورت کو محض ستانے کے لئے یا اسے نقصان پہنچانے کے لئے روکے رکھتا ہے' وہ خود آپ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ آخر یہ بیچاری عورت بھی بنت آدم ہے اور اس طرح اس کی بہن ہے۔ اس کی جنس ہے۔ اگر یہ اس پر ظلم کرتا ہے تو گویا خود اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے۔ پھر وہ اپنی جان پر بھی ظلم کرتا ہے کہ وہ معصیت کر کے اسے مستوجب سزا ٹھہرا رہا ہے۔ راہ اطاعت سے اسے ہٹا رہا ہے۔ یہ ہے وہ پہلا احساس جو ان آیات میں دلایا جا رہا ہے۔

معاشرت اور طلاق کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے جو آیات بیان کی ہیں وہ بین ہیں' ظاہر ہیں' اور بالکل سیدھی ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کی تنظیم صداقت اور سنجیدگی پر ہونا چاہئے۔ کوئی شخص ان آیات کو کھیل نہ بنائے' انہیں عورت کو محض تکلیف دینے اور اسے ایذا پہنچانے کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ یہ رخصتیں تو اللہ تعالیٰ نے اس لئے دیں کہ معاشرتی زندگی امن و قرار کی جگہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو رجوع کرنے کا حق اس لئے دیا ہے میاں بیوی کی شکر رنجی ختم ہو جائے اور ان کے درمیان ازدواجی زندگی کا از سرنو آغاز ہو جائے۔ اس لئے نہیں کہ مرد اس حق سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس عورت کو ایذا دینے اور اس پر تشدد کرنے کے لئے استعمال کرے۔ اگر کوئی شخص اس حق کو اس مطلب کے لئے استعمال کرے گا تو وہ آیات الٰہی کا کھیل بنا رہا ہے اور ان سے مذاق کر رہا ہے۔ یہ صورت حال ہمارے موجودہ جاہلی معاشرے میں بہت عام ہے۔ لوگ فقہی رخصتوں اور فقہی مسائل کو آڑ بنا کر ان کی بنا پر دھوکہ' ایذا رسانی اور شر و فساد کا کام کر رہے ہیں۔ نیز مرد کو جو طلاق اور رجعت کا حق دیا گیا ہے' اس سے بھی یہ لوگ بہت ہی غلط فائدہ اٹھاتے ہیں' ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی آیات کا کھیل بناتے ہیں اور انہیں اپنی حیلہ سازیوں کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس سارے عمل پر انہیں شرم بھی نہیں آتی۔

اللہ تعالیٰ یہاں انسان کے جذبۂ حیا اور اعتراف نعمت کو بھی بیدار فرماتے ہیں۔ انہیں یاد دلایا جاتا ہے کہ ان پر اللہ نے جو انعام و اکرام کیا ہے ذرا اس پر بھی غور کریں۔ ان پر اس نے اپنی کتاب نازل فرمائی' حکمت و دانائی کے ذخائر سے انہیں نوازا۔ اس وقت کے اہل ایمان کو نعمت الٰہی کا یاد دلانا' دراصل اس عظیم انقلاب کی طرف ان کو متوجہ کرنا تھا' جو ان کی پوری زندگی میں تحریک اسلامی کی وجہ سے رونما ہو گیا تھا۔ ان مسلمانوں کے لئے انعامات الٰہی کا یاد دلایا جانا ایک گہرے مفہوم کا حامل تھا۔ شاید آج کے لوگ اس کا اچھی طرح تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اہل ایمان' یہ محسوس کرتے تھے کہ انعامات الٰہی میں سے پہلا انعام ان پر یہ ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر ایک امت کی حیثیت سے موجود ہیں' ذرا غور کریں کہ عرب اور اعراب اسلام کے آنے سے پہلے تھے کیا؟ ان کی کیا حقیقت تھی؟ ان کی کوئی قابل ذکر حیثیت نہ تھی۔

ان کو دنیا نہ جانتی تھی اور نہ ہی دنیا عربوں کو کچھ سمجھتی تھی۔ وہ قبائل کی شکل میں ٹکڑے ٹکڑے تھے۔ نہ ان کا کوئی وزن تھا اور نہ کوئی قیمت تھی۔ ان کے پاس کوئی پیغام نہ تھا کہ وہ یہ پیغام انسانیت کو دیتے اور یوں وہ پہچانے جاتے۔ بلکہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جو وہ خود استعمال کرتے اور دوسری اقوام سے کم از کم بے نیاز تو ہو جاتے۔ غرض وہ تہی دامن تھے 'کچھ بھی نہ تھا ان کے پاس۔ نہ کوئی مادی چیز ان کے پاس تھی' نہ کوئی معنوی چیز' نہ مصنوعات اور نہ ہی نظریات۔ وہ فقراء کی طرح غربت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک قلیل تعداد ایسی تھی جنہیں خوشحال کہا جاتا تھا' لیکن اس کی خوشحالی بھی ایسی تھی جیسے بدویانہ زندگی میں ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی بدوی کسی ایسی جگہ خیمہ زن ہو جہاں زیادہ شکار ملتا ہو' یعنی یہ خوشحالی بھی بہت سادہ' بہت ابتدائی قسم کی تھی' جسے آج کی دنیا میں خوش حال بھی نہیں کہا جا سکتا۔

عقل' روح اور ضمیر کے لحاظ سے وہ بالکل تہی دامن تھے۔ عقاید بالکل مہمل' بے ہودہ اور بہت ہی سادہ قسم کے تھے۔ زندگی کا جو تصور ان کے دماغ میں تھا' وہ بالکل سادہ' ابتدائی اور قبائلی قسم کا تھا۔ ان کی زندگی کا اہم مشغلہ لوٹ مار اور ڈاکے ڈکیتی تک محدود تھا۔ اس سے اگر زیادہ کوئی چیز تھی تو وہ یہ تھی کہ لوگ سخت منتقم المزاج تھے۔ لہو و لعب' شراب و کباب اور جوئے اور قمار کے دلدادہ تھے۔ غرض زندگی کے ہر پہلو میں یہ لوگ بالکل ابتدائی حالت میں تھے۔

یہ تھا قعر مذلت جس میں عرب گرے ہوئے تھے اور یہ تھا اسلام جس نے اس سے انہیں نجات دلائی بلکہ انہیں از سر نو پیدا کیا۔ نئی زندگی دی۔ انہیں پیدا کیا اور ایک عظیم وجود انہیں عطا کیا۔ ایسا وجود جسے پوری انسانیت نے پہچانا۔ اسلام نے انہیں ایک ایسا پیغام دیا' جو انہوں نے پوری انسانیت کو عطا کیا۔ یوں عرب بھی اس پیغام کی وجہ سے نامور ہو گئے۔

اسلام نے ان کو ایک عظیم نظریۂ حیات دیا' مکمل نظریۂ حیات۔ اس نظریۂ حیات نے اس کائنات کی وہ تشریح' دل لگتی تشریح کی جو اس سے قبل کسی نظریۂ حیات نے نہ کی تھی۔ اس نظریۂ حیات نے انہیں قیادت کا مقام عطا کیا اور انہوں نے انسانی تاریخ میں پوری انسانیت کی قیادت کی۔ بہت اعلیٰ و ارفع قیادت کی۔ برادری اقوام میں ان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اس نظریۂ حیات اور اس پیغام کی بدولت انہوں نے اقوام عالم کی صف میں ایک مقام عالی اور مرتبہ بلند حاصل کیا بلکہ ان کی شخصیت امور عالم میں ممتاز شخصیت بن گئی۔ پھر اس نظریۂ حیات نے انہیں ایک ایسی عظیم قوت کی شکل میں نمودار کیا کہ پوری دنیا اس قوت سے خائف ہو گئی اور اسے قابل قدر اہمیت دینے لگی۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ عربوں کے ارد گرد پھیلی ہوئی شہنشاہیتوں کے خدام سمجھے جاتے تھے۔ یا ایسی گری پڑی قوم اور بدوی قبائل سمجھے جاتے تھے' جن کی طرف سرے سے کوئی متوجہ ہی نہ ہوتا۔ اور پھر سب سے ممتاز چیز یہ کہ اس فقر کے مقابلے میں اسلام نے ان لوگوں کو عظیم دولت و ثروت سے نوازا۔ دولت کے دروازے ہر طرف سے کھل گئے اور تمام دنیا کی ثروت ان کے پاس جمع ہو گئی۔ اور سب سے بڑی چیز یہ کہ اسلام نے امن و سلامتی دی۔ نفس کی سلامتی' گھر کا امن اور معاشرے کا سکون دیا جس میں عیش و عشرت سے زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کے دل مطمئن ہو گئے' ان کے شعور و ضمیر میں فرحت آگئی اور جو نظام زندگی انہوں نے پایا وہ اس پر جم گئے۔ اور انہیں وہ سربلندی دی' وہ اونچا مقام دیا کہ جہاں سے وہ پوری انسانیت کے گم کردہ راہ گروہوں پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ جاہلیت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں راہ حیات گم کئے ہوئے ہیں اور ٹاک ٹوئیاں مار رہے ہیں اور پوری دنیا کی یہی حالت ہے۔ اس مقام بلند پر انہیں احساس ہو جاتا ہے کہ فی الواقعہ وہی اعلون ہیں' وہی سربلند ہیں اور اللہ نے انہیں وہ دولت دی ہے جس سے پوری آباد دنیا محروم ہے۔

ان حالات میں جب قرآن مجید اہل ایمان عربوں کو اپنے انعامات یاد دلاتا ہے تو ان انعامات کی فہرست دینے یا اس دعوت تذکیر پر ان کو زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خود ان کی پوری زندگی ہی انعامات الٰہیہ کی ایک نمونہ تھی۔ وہی لوگ تھے جو جاہلیت کے زمانے میں ایک عرصے تک رہ بس چکے تھے اور وہی تھے جو اب اسلامی نظام حیات کی برکات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ اپنی آنکھوں سے اس

عظیم انقلاب کا مشاہدہ کر رہے تھے جس کے بارے میں انسان تصور بھی نہ کر سکتا تھا اور جو اسلام اور قرآن کا ایک زندہ معجزہ تھا۔ وہ اللہ کی کتاب اور اس میں بیان کردہ حکیمانہ فلسفہ حیات کی صورت میں اس نعمت عظمیٰ کو یاد کیا' دیکھ ہی رہے تھے وہ اس کا زندہ نمونہ تھے۔ قرآن انہیں خطاب کر کے کہہ رہا تھا وَ مَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ جو تم پر نازل کیا گیا' انہیں مخاطب کر کے کہا گیا تم پر' تاکہ وہ اس انعام کی عظمت کا شعور پیدا کر سکیں' اس کی گہرائی تک پہنچ سکیں اور یہ دیکھ سکیں کہ یہ انعام الٰہی ان کے لئے ہے' ان پر حاوی ہے اور ان کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ اللہ یہ آیات حکمت ان پر نازل کر رہا ہے جو آیات اسلامی نظام زندگی کی تشریح و تکمیل کر رہی ہیں اور مسلمانوں کا عائلی ضابطہ بھی اسی ربانی نظام کا ایک حصہ ہے۔

اب ذرا آخری احساس دیکھئے۔ آخری بار چٹکی بھری جاتی ہے۔ متنبہ کیا جاتا ہے کہ جاگو' سوچو کہ اللہ تو علیم بذات الصدور ہے۔ جانو کہ وہ جاننے والا ہے سنبھل کر رہو۔ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ "اللہ سے ڈرو اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے۔" حیا اور شکر کے بعد اب یہاں خوف اور خبرداری کے جذبات کو بیدار کیا جا رہا ہے۔ یوں نفس انسانی کو ہر طرف سے گھیر کر اسے حسن سلوک' مشفقانہ طرز عمل اور سچائی کا رویہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

پھر مزید یہ کہ اگر ایک بیچاری کو تم نے طلاق دے دی ہے' اپنی رفاقت کے لائق نہیں سمجھا ہے تو اسے پابند نہ بناؤ۔ اگر وہ عدت پوری کر دیتی ہے تو اب اسے ہر طرح سے' ہر طرف سے' آزاد چھوڑ دو۔ اگر وہ اس سابق خاوند کے ساتھ دوبارہ نکاح کرنا چاہتی ہے اور دونوں اس پر راضی ہو گئے ہیں تو تم اسے اپنی عزت کا مسئلہ نہ بناؤ اور اسے ایسا کرنے دو وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ "اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں' تو پھر اس میں مانع نہ ہو' کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں' جبکہ وہ معروف طریقے سے باہم مناکحت پر راضی ہوں۔"

ترمذی میں معقل بن یسار سے روایت ہے کہ اس نے اپنی بہن کا نکاح مسلمانوں میں سے کسی سے کرا دیا تھا۔ وہ اس کے پاس کچھ عرصہ رہی پھر اس نے اسے ایک طلاق دے دی لیکن رجوع نہ کیا اور عدت ختم ہو گئی۔ اس کے بعد وہ اسے چاہنے لگا اور عورت اسے چاہنے لگی۔ اب دوسرے پیغام دینے والوں کے ساتھ اس نے بھی دوبارہ اس کا پیغام دیا۔ اس پر معقل نے اسے کہا اے ذلیل بن ذلیل' میں نے اپنی بہن تجھے دے کر تمہیں اعزاز بخشا۔ تجھے نکاح کر کے دے دی لیکن تو نے اسے ناحق طلاق دے دی۔ خدا کی قسم! اب وہ کبھی تمہارے پاس نہ لوٹے گی۔ اور قیامت تک' معقل کہتا ہے۔ اللہ کو اس بات کا علم تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اس لئے یہ آیات نازل ہوئیں وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ ۔۔۔ لَا تَعْلَمُوْنَ جب معقل نے سنا کہ یہ آیات نازل ہو گئی ہیں تو اس نے کہا میرا رب سنتا ہے۔ میں مطیع فرمان ہوں۔ اس کے بعد اس نے اس شخص کو بلایا اور کہا میں تمہیں اپنی بہن نکاح کر کے دیتا ہوں اور میں تمہارا احترام کرتا ہوں۔

اللہ نے جان لیا کہ میاں بیوی دونوں صدق دل سے ازدواجی زندگی کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی طرف مائل ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فوراً ہمدردانہ انداز میں ان کی خواہش کو قبول کر لیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں پر کس قدر رحمت و شفقت ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کے ساتھ کس قدر نرمی چاہتا ہے۔ جماعت مسلمہ کو کس قدر تربیت دی جا رہی ہے۔ اسلامی نظام زندگی کے زیر سایہ وہ مہذب انسان بن رہے ہیں اور اسلامی نظام کے زیر سایہ ان پر ربانی عنایات کی بارش ہو رہی ہے۔ زندگی کے ہر ہر موڑ پر ان کی بہترین راہنمائی کی جا رہی ہے۔

اس ممانعت اور تنبیہ کے بعد اب مسلمانوں کے ضمیر اور ان کے وجدان کو جگایا جا رہا ہے ذٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۗ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ "تمہیں نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان لانے والے ہو' تمہارے لئے شائستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

اللہ و رسول پر ایمان ہی وہ عامل ہے جس کی وجہ سے یہ نصیحت دلوں کی تہوں تک پہنچ جاتی ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب یہ دل اس دنیا سے زیادہ تر وسیع دنیا یعنی دار آخرت سے متعلق ہوں۔ جب دلوں کی پسند و ناپسند اللہ کی رضا کے تابع ہو جاتی ہے۔ جب دلوں میں یہ شعور پیدا ہو جاتا ہے کہ اللہ' جو طرز عمل اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے' وہی اعلیٰ ہوتا ہے' وہی شائستہ ہوتا ہے اور وہی پاکیزہ ہوتا ہے لہٰذا اہل ایمان کا فرض ہے کہ وہ اسے اپنائیں اور پاکیزگی اور شائستگی اختیار کریں' اپنے لئے بھی اور اپنے پورے معاشرے کے لئے بھی۔ آخر میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ جو ذات تمہارے لئے لائحہ عمل کا انتخاب کرتی ہے' وہ ذات وہ ہے' جو سب کچھ جانتی ہے لہٰذا تمہارا فرض ہے کہ تسلیم و رضا کی حالت میں اس کی ہدایات پر لبیک کہو۔

یوں اللہ تعالیٰ عائلی زندگی کے ان چھوٹے چھوٹے معاملات کو بلند کر کے عبادت کے مقام تک پہنچا دیتے ہیں۔ ان معاملات کا تعلق بھی اللہ کی رسی سے ہو جاتا ہے۔ ان کو زمین کی آلودگیوں سے پاک کر دیا جاتا ہے۔ زندگی کی گندگیوں سے صاف کر دیا جاتا ہے اور یہ معاملات اب محض دنیاوی کھینچا تانی یا محض خاندانی اور معاشرتی کشمکش نہیں رہتے جو بالعموم طلاق کے وقت ایک فضا بن جاتی ہے' بلکہ ان کو پاک کر کے خدائی تعلیمات کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا ہے۔

اگلا حکم طلاق کے بعد' بچے کی پرورش اور دودھ پلانے کے بارے میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر اوقات محض تکمیل طلاق سے میاں بیوی کے باہمی معاملات ختم نہیں ہو جاتے۔ اکثر اوقات بچے رہ جاتے ہیں جن کی پیدائش میں دونوں نے حصہ لیا ہوتا ہے۔ جو اب بھی دونوں کے لئے باہمی رابطے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اگر والدین کی باہم نہیں نبھتی تو چھوٹے لوتھوں کا قصور کیا ہے؟ ان کے لئے تو مناسب اور تفصیلی گارنٹی ہونی چاہئے تاکہ وہ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے قابل بن سکیں' ایسی گارنٹی جو سب حالات میں ان کے لئے مفید ہو:

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۗ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ ۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

"جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدت رضاعت تک دودھ پئے' تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں۔ اس

صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقے سے انہیں کھانا کپڑا دینا ہو گا۔ مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہئے۔ نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا ہے' نہ ہی باپ کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے۔ دودھ پلانے والی کا یہ حق جیسا کہ بچے کے باپ پر ہے' ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے۔ لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں' تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر تمہارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دودھ پلوانے کا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں' بشرطیکہ اس کا جو کچھ معاوضہ طے کرو' وہ معروف طریقے پر ادا کرو۔ اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو' سب اللہ کی نظر میں ہے۔"

مطلقہ والدہ' اپنے بچوں کے بارے میں بالخصوص دودھ پینے والے بچوں کے بارے میں بری الذمہ نہیں ہے۔ اس پر اس سلسلے میں فرائض عائد ہوتے ہیں۔ یہ فرائض اللہ تعالیٰ کی جانب سے عائد ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو آزاد نہیں چھوڑ دیا کیونکہ ایسے حالات میں' اگر عورت کو ایسے حالات میں اپنی فطرت کے مطابق آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ کشیدہ تعلقات کی وجہ سے کوئی غلط فیصلہ بھی کر سکتی ہے اور اس کے غلط فیصلے کے نتیجے میں بچہ ضائع ہو سکتا ہے' اسے نقصان پہنچ سکتا ہے' چنانچہ اللہ تعالیٰ یہاں بچوں کے لئے ضابطہ وضع فرماتے ہیں اور والدہ پر فرض کر دیتے ہیں کہ وہ ایسے حالات میں کوئی ایسا رویہ اختیار نہ کرے جس سے بچے کو نقصان پہنچے۔ اللہ کو ہم سے بھی' ہمارے ساتھ زیادہ محبت ہے۔ وہ سب سے زیادہ مہربان ہے بلکہ والدین سے بھی زیادہ رحیم و کریم ہے۔ ماں کا فرض ہے کہ وہ پورے دو سال تک بچے کو دودھ پلائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ اس بات سے واقف ہیں کہ اصول صحت کے لحاظ سے بچے کے لئے دو سال کے عرصہ تک دودھ پینا ضروری ہے۔ صحت کے اصولوں کے لحاظ سے بھی اور نفسیاتی اصولوں کے اعتبار سے بھی لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ "جو لوگ پوری مدت رضاعت تک دودھ پلانا چاہیں۔" جدید اصول صحت اور جدید اصول نفسیات کی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحت اور نفسیات دونوں اعتبار سے بچے کو اپنی ماں کی گود میں ہونا ضروری ہے۔ تاکہ دونوں لحاظ سے وہ صحیح طرح نشوونما پا سکے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی نعمت نے اس وقت تک انتظار نہ کیا کہ مسلمان ازخود' اصول فطرت کے ان رازوں تک رسائی حاصل کریں اور پھر ان پر عمل پیرا ہوں۔ کیونکہ اللہ میاں صدیوں تک بچوں کی قیمتی نسل کو انسان کی جہالت کے حوالے نہیں فرما سکتے تھے۔ اللہ تو اپنے بندوں پر بے حد مہربان ہے۔ بالخصوص ان چھوٹے اور بے بس بچوں پر تو وہ بہت مہربان ہے۔ کیونکہ وہ اس کے رحم و شفقت کے زیادہ محتاج ہیں۔

لیکن والدہ پر جو فرض عائد کیا گیا ہے' اس کے مقابلے میں اسے حق بھی دیا گیا ہے اور یہ حق والد کے ذمہ ہے یہ کہ وہ والدہ کو معروف طریقے کے مطابق نفقہ اور لباس فراہم کرے۔ اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرے' کیونکہ بچوں کے معاملے میں دونوں شریک ہیں۔ اور دودھ پینے والے اس چھوٹے بچے کے مقابلے میں دونوں مسئول ہیں' وہ اسے دودھ پلائے گی اور دیکھ بھال کرے گی اور والد اس کی ماں کو نفقہ اور لباس فراہم کرے گا۔ دونوں اپنے اپنے فرائض ادا کریں گے۔ اپنی اپنی طاقت کی حدود میں۔ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا "کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالا جائے۔"

اور یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ والدین میں سے کوئی بھی اس بچے کو دوسرے کی اذیت و انتقام کا وسیلہ بنائے لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ "نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا ہے' نہ ہی باپ کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے۔"

ماں کو بچے سے بے حد محبت ہوتی ہے۔ وہ بچے کے سوا زندہ نہیں رہ سکتی۔ باپ کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ ماں کی محبت سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور اسے ایسی شرائط پر مجبور کر دے جو معروف نہ ہوں۔ نہ ہی ماں کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ والد کی مجبوری اور اس کی محبت سے غلط فائدہ اٹھائے اور اس پر ایسا بوجھ ڈالے جو اس کی قوت برداشت سے زیادہ ہو' یا ضد میں آکر سرے سے انکار کر دے۔

اگر والد فوت ہو جائے تو اس کے ورثاء پر یہی فرائض عائد ہوتے ہیں جو بچے کے والد پر عائد ہوتے ہیں۔ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ "اور وارث پر بھی ایسے ہی حقوق ہیں جس طرح والد پر ہیں۔" وارث کا یہ فرض ہے کہ وہ دودھ پلانے والی کو خرچہ اور کپڑے دے' معروف طریقے کے مطابق اور حسن سلوک کے ساتھ۔ اس لئے کہ معاشرہ کی اجتماعی ذمہ داریاں پوری کی جاسکیں۔ ایک طرف میت کی میراث وارثوں کو ملے تو دوسری طرف میت کے ذمہ جو عائد فرائض ہیں وہ بھی وارثوں پر عائد ہوں۔ اس طرح اگر کبھی ایسا ہو کہ بچے کا والد فوت ہو جائے تو بچہ ضائع نہ ہو۔ یوں اسلامی نظام میں ایسے بچے اور اس کی والدہ دونوں کے حقوق ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

ان تمام احتیاطی تدابیر کے بعد اب قرآن مجید حالت رضاعت کی ایک دوسری صورت کی طرف متوجہ ہوتا ہے فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا "اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں' تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔" اگر والد اور والدہ یا وارث اور والدہ باہمی مشورے سے یہ فیصلہ کرلیں کہ دو سال کا عرصہ پورا ہونے سے پہلے ہی بچے کا دودھ چھڑا لیں' اس لئے کہ اسی میں بچے کی مصلحت ہے' مثلاً اصول صحت کے اعتبار سے یا اور کسی وجہ سے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بشرطیکہ یہ فیصلہ دونوں فریقوں کی رضامندی اور مشورے سے ہو۔ اور اس میں بچے کے لئے کوئی مصلحت ہو' جس کی تربیت ان دونوں کے حوالے سے ہے' جس کی دیکھ بھال ان دونوں پر من جانب اللہ فرض ہے۔

یہی حکم اس صورت میں ہے کہ والد کی خواہش یہ ہو کہ وہ اجرت پر بچے کو کسی کا دودھ پلائے۔ بشرطیکہ بچے کا مفاد اس میں ہو' بشرطیکہ وہ دودھ پلانے والی کو طے شدہ اجرت ادا کرے۔ اور اس کے ساتھ بھی حسن سلوک اختیار کرے۔ وَإِنْ أَرَدْتُّمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَّا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ "اگر تمہارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دودھ پلوانے کا ہو' تو اس میں کوئی حرج نہیں' بشرطیکہ اس کا جو کچھ معاوضہ طے کرو' معروف طریقے سے ادا کرو۔" یہ ادائیگی اس بات کی ضمانت ہوگی کہ دودھ پلانے والی بچے کے ساتھ اچھا سلوک رکھے گی۔ اس کی خدمت کرے گی اور اس کی ہر ضرورت کو پوری کرے گی۔ اور آخر کار پھر اس سارے معاملہ کو اللہ کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ تقویٰ کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ اس گہرے اور لطیف شعور سے وابستہ کر دیا جاتا ہے' جو وہ کام کر سکتا ہے جو دوسرے ذرائع سے نہ کیا جاسکتا ہو یا نہ کرایا جاسکتا ہو وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ "اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو' سب اللہ کی نظر میں ہے۔" یہ ہے وہ آخری ضمانت۔ پختہ گارنٹی اور یہی وہ آخری ضمانت ہے جو قابل اعتماد ہے۔

مطلقات یعنی مطلقہ عورتوں کے بارے میں احکام بیان کرنے اور طلاق کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاملات کے بارے میں قانون سازی کے بعد' اب اس عورت کا حکم بیان ہوتا ہے' جس کا خاوند فوت ہو جائے۔ اس کی عدت کا حکم' عدت کے اختتام کے بعد اسے نکاح ثانی کی پیشکش دینے کے بارے میں اور دوران عدت کنایوں سے خواہش نکاح کرنے کے سلسلے میں احکام:

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا

تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ
اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ
سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ
الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا ۳۰
اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ ع۴
۱۴

"تم میں سے جو لوگ مر جائیں' ان کے پیچھے اگر ان کی بیویاں زندہ ہوں' تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روکے رکھیں' پھر جب ان کی مدت پوری ہو جائے' تو انہیں اختیار ہے' اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے جو چاہیں کریں۔ تم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ اللہ تم سب کے اعمال سے باخبر ہے۔ زمانہ عدت میں خواہ تم ان بیوہ عورتوں کے ساتھ منگنی کا ارادہ اشارے کنایے میں ظاہر کر دو' خواہ دل میں چھپائے رکھو' دونوں صورتوں میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ ان کا خیال تو تمہارے دل میں آئے گا ہی۔ مگر دیکھو' خفیہ عہد و پیمان نہ کرنا۔ اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف طریقے سے کرو۔ اور عقد نکاح باندھنے کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تمہارے دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ لہٰذا اس سے ڈرو اور یہ بھی جان لو کہ اللہ بردبار ہے۔ (چھوٹی چھوٹی باتوں) سے درگزر فرماتا ہے۔"

دور جاہلیت میں' جس عورت کا خاوند فوت ہو جاتا' وہ بیچاری سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاتی۔ اہل خاندان' مرد کے اہل خاندان اور پورا معاشرہ اس پر ظلم کرتا۔ عربوں میں رواج یہ تھا کہ جب اس کا خاوند فوت ہو جاتا تو وہ ایک خستہ حال مکان میں چلی جاتی' سب سے بے کار کپڑے پہن لیتی۔ وہ ایک سال تک خوشبو نہ لگا سکتی اور نہ ہی اور زیب و زینت کا کوئی کام کر سکتی۔ اس کے بعد یہ زمانہ جاہلیت چند جاہلانہ رسومات کی ادائیگی پر ختم ہوتا' جو سب کی سب سخت توہین آمیز اور گری ہوئی تھیں جیسا کہ جاہلیت کی دوسری رسومات ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً وہ اونٹ کی مینگنی لیتی اور اسے پھینکتی۔ کسی سواری مثلاً گدھے پر یا بکری پر سوار ہوتی وغیرہ وغیرہ لیکن جب اسلام آیا تو اس نے اس بیچاری کو ان تمام مصیبتوں سے چھڑایا۔ اس کے کندھوں سے یہ تمام بوجھ اتار دیے۔ اس کے بعد وہ بیک وقت دو مصیبتوں میں گرفتار نہ ہوتی' یعنی ایک تو خاوند فوت ہو جائے اور دوسرے اہل خاندان اس کے ساتھ برا سلوک کریں۔ اور اس پر شریفانہ زندگی کے تمام دروازے بند کر دیں اور مطمئن ہو کر عائلی زندگی گزارنے کے لئے آزاد نہ ہونے دیں۔ اسلام نے اس کی عدت چار ماہ اور دس دن مقرر کئے بشرطیکہ حاملہ نہ ہو' ورنہ اس کی عدت وضع حمل ہوگی' یہ عدت مطلقہ کی عدت سے قدرے طویل ہے۔ اس میں ایک طرف تو اس کا رحم صاف ہو گا۔ یہ شبہ نہ رہے گا کہ سابق خاوند کے کچھ آثار اس میں ہیں۔ اور چار ماہ دس دن کے انتظار میں یہ فائدہ بھی ہو گا کہ خاوند کے اہل خاندان کے جذبات بھی مجروح نہ ہوں گے' کیونکہ ادھر خاوند فوت ہو' ادھر عورت اگر دوسرے خاوند کی تلاش میں نکل پڑے تو خاوند کے اہل خاندان لازماً اسے محسوس کریں گے۔ اس عدت کے دوران میں اسے اچھے کپڑے زیب تن کرنے کی اجازت ہوگی' البتہ وہ ایسے کپڑے نہ پہنے گی جن کی وجہ سے لوگ اسے نکاح ثانی کا پیغام دیں۔ اور جب عدت ختم ہو جائے تو اب وہ مکمل آزاد ہے' اس پر کسی کا کوئی اختیار نہیں ہے' نہ اس کے اپنے خاندان کی طرف سے اور نہ ہی اس کے خاوند کے خاندان کی طرف سے۔ وہ معروف طریقے سے اپنے لئے جو شریفانہ رویہ اختیار کرنا چاہے' قرآن و سنت کے مطابق وہ آزادانہ طور پر اپنے لئے اختیار کر سکتی ہے۔ مسلمان عورتوں کے

لئے جو زیب و زینت جائز ہے وہ اسے اختیار کر سکتی ہے وہ پیغام نکاح حصول کر سکتی ہے۔ وہ جس سے چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ اب اس کی راہ میں کوئی جاہلی رسم رکاوٹ نہیں ہے۔ اور نہ کوئی کھوٹا متکبر د غرور اسے روک سکتا ہے۔ اب اس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی رقیب و نگراں نہیں ہے وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ "تم جو کام کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔"

یہ تو تھی عورت۔ اب اللہ تعالیٰ ان مردوں کو بھی ہدایات دیتے ہیں جو اس عورت سے نکاح چاہتے ہیں 'لیکن وہ عدت گزار رہی ہے۔ ان کو ایسی ہدایت دی جاتی ہے کہ جس میں ذاتی آداب 'اجتماعی آداب 'فریقین کے جذبات و میلانات اور ایسے مرحلے کے مصالح اور تقاضوں سب کو ملحوظ رکھا گیا ہے:

وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ "زمانۂ عدت میں خواہ تم ان بیوہ عورتوں کے ساتھ منگنی کا ارادہ اشارے کنایے میں ظاہر کردو' خواہ دل میں چھپائے رکھو' دونوں صورتوں میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

دوران عدت عورت کے ساتھ 'میت کے خاندان کی کچھ ایسی یادیں وابستہ ہوتی ہیں' جو ابھی تک زندہ ہوتی ہیں۔ پھر ابھی تک اس بات کا امکان بھی ہوتا ہے کہ اس کے رحم میں حمل کے آثار نمایاں ہو جائیں یا حمل واضح ہے اور عدت وضع حمل تک متعلق ہے۔ یہ تمام حالات ایسے ہیں' جن میں کوئی شریف عورت مناسب نہیں سمجھتی کہ بصراحت' جدید ازدواجی زندگی کے سلسلے میں کوئی بات کر سکے کیونکہ ایسے حالات میں ایسی باتوں کا ہونا مناسب نہیں ہوتا۔ اس طرح عورت کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اور ابھی یادیں تازہ تازہ ہوتی ہیں۔

ان آداب کا لحاظ کرتے ہوئے' اشارے 'کنایے میں بات کرنے کو جائز قرار دیا گیا ہے' لیکن بصراحت کوئی معاملہ طے کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اشارہ ایسا ہو کہ اس سے عورت یہ سمجھ جائے کہ یہ مرد اسے بحیثیت رفیقہ حیات لینے میں دلچسپی رکھتا ہے' لیکن کنایات میں۔ حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اس اشارے کنایے کی یہ مثال بیان کی ہے۔ مجھے ایک رفیقہ حیات کی ضرورت ہے۔ مجھے عورتوں سے دلچسپی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی صالح رفیقہ حیات مل جائے۔

اسی طرح قرآن کریم نے دلی رغبت اور خواہش کی بھی کوئی ممانعت نہیں کی ہے۔ بشرطیکہ اس کی کوئی صراحت نہ کی گئی ہو اور نہ ہی اشارہ کنایہ سے ظاہر کی گئی ہو۔ اس لئے کہ دلی خواہش پر انسان کوئی ضبط نہیں کر سکتا۔ دل پر کوئی کنٹرول کس طرح کر سکتا ہے:

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ "اللہ جانتا ہے کہ ان کا خیال تو تمہارے دل میں آئے گا ہی۔"

یہ اللہ تعالیٰ نے اس لئے جائز قرار دیا ہے کہ یہ فطری میلان ہے۔ اور بذات خود نکاح جائز ہے۔ اس میں کسی قسم کی ممانعت نہیں ہے۔ یہاں بعض خارجی اسباب کی بناپر اس بات کی ممانعت کی گئی ہے کہ بصراحت شادی کا پیغام دوران عدت میں نہ دیا جائے۔ کوئی عملی قدم نہ اٹھایا جائے۔ اسلام فطری میلانات کا قلع قمع کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ وہ انہیں تہذیب کے دائرے میں لاتا ہے اور ان کی اصلاح کرتا ہے۔ وہ انسان کے طبعی جذبات کو دباتا نہیں بلکہ ان کی ضابطہ بندی کرتا ہے۔ اس معاملے میں وہ صرف ایسی پابندیاں عائد کرتا ہے جو شعور کی پاکیزگی کے خلاف ہوں اور جو ضمیر کی طہارت کے منافی ہوں: وَ لٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا "مگر ان کے ساتھ خفیہ عہد و پیمان نہ کرو۔" اس پر کوئی مواخذہ نہ ہو گا کہ تم منگنی کی طرف اشاروں کنایوں میں عورت کی توجہ مبذول کر دو۔ یا تم دل ہی دل میں نکاح کی خواہش رکھو۔ ممنوع یہ ہے کہ تم خفیہ طور پر عدت گزرنے سے پہلے ہی نکاح کا کوئی معاہدہ کر لو۔ یہ فعل آداب نفسیات کے خلاف ہے' سابقہ خاوند کی یادوں کو مجروح کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ازدواجی زندگی کے دو ادوار کے درمیان عرصہ عدت کو حد فاصل رکھا ہے' ہمیں ایسا کرنے سے حیا آنا چاہئے اور ایسا کرنے سے انقضائے عدت تک باز رہنا چاہئے اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا "اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف طریقے سے کرو۔"

جس میں کوئی ناپسندیدہ بات نہ ہو' کوئی فحش بات نہ ہو اور کوئی ایسی بات نہ ہو' جس کے ذریعہ اللہ کے وہ حدود ٹوٹتے ہوں' جو اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے مقرر کئے ہیں وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ "اور عقد نکاح باندھنے کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔" یہاں قرآن مجید کے الفاظ قابل غور ہیں۔ یہ نہیں کہا ہے: تم نکاح نہ کرو" یا "عقد نکاح نہ باندھو" بلکہ یہ کہا ہے: "عقد نکاح باندھنے کا فیصلہ نہ کرو۔" مقصد یہ ہے کہ دوران عدت عقد نکاح باندھنے سے سخت گریز کرو۔ یہاں تک کہ اس کا فیصلہ بھی نہ کرو۔" کیونکہ فیصلہ عقد کے نتیجے ہی میں عقد وجود میں آتا ہے' جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ قرآن مجید کی اس قسم کی لطیف طرز ادا کی طرف ہم اوپر آیت تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا "یہ اللہ کی حدیں ہیں' ان کے قریب ہی نہ جاؤ۔" میں بیان کر آئے ہیں۔ یعنی قرآن مجید محض ایک لفظ کے انتخاب کے ذریعہ ایک ایسے مفہوم کی طرف اشارہ کر دیتا ہے جو نہایت ہی لطیف و دقیق ہوتا ہے وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ "خوب سمجھ لو کہ اللہ تمہارے دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ لہٰذا اس سے ڈرو۔" یہاں آکر قرآن مجید اپنے منہاج کے عین مطابق قانون سازی اور خدا خوفی کو باہم مربوط کر دیتا ہے' بتاتا ہے کہ جو خدا قانون بنا رہا ہے وہ تمہارے دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے۔ مرد و زن کے باہمی تعلقات کا گہرے میلانات اور خفیہ جذبات سے گہرا تعلق ہے۔ اس تعلق میں دل کو دل سے ربط ہوتا ہے' ایک دوسرے کی محبت دلوں کی تہوں تک پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں انہیں یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ اللہ تو تمہارے ہر راز سے واقف ہے۔ تمہارے دلی بھیدوں کا جاننے والا ہے۔ خبردار رہو! اس سے ڈرو! اور اللہ کے حدود اور اللہ کے قانون کے سلسلے میں تمہاری حیلہ سازی یا بہانہ سازی یا کوئی بات خفیہ اور راز' اس کے مقابلے میں نہ رہ سکے گی۔ خبردار!

اب تک انسانی ضمیر کو خوف دلا کر متنبہ کر کے جھنجھوڑ دیا گیا' وہ جاگ اٹھا اور اس کے اندر احتیاط اور خدا خوفی پیدا کر دی گئی۔ تو خدائے شفیق و رحیم دیر کئے بغیر خود اسے تسلی بھی دے دیتے ہیں' اطمینان قلب کا سامان بھی فراہم کر دیا جاتا ہے۔ یقین دلایا جاتا ہے کہ وہ تو غفور و رحیم ہے۔ وہ نہایت بردبار ہے اور سزا دہی میں جلدی نہیں کرتا۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ "اور جان لو کہ اللہ بردبار ہے' چھوٹی چھوٹی باتوں سے درگزر فرماتا ہے۔" وہ تو بخشنے والا ہے اور اس دل کی خطا معاف کر دیتا ہے' جس میں اللہ کا شعور ہو' جو اپنی پوشیدہ اور نہفتہ بھیدوں کے بارے میں محتاط ہو۔ وہ حلیم اور بردبار ہے۔ سزا دہی میں جلدی نہیں کرتا' اس انتظار میں کہ بیچارہ بندہ عاجز بندہ' شاید باز آجائے اور توبہ تائب ہو جائے۔

سلسلہ عائلی احکام جاری ہے' اب اس عورت کے احکام آتے ہیں جس کو رخصتی سے پہلے ہی طلاق دے دی جائے۔ یہ صورت ان سے مختلف ہے' جن میں مطلقہ عورتوں کے ساتھ شب باشی ہو چکی ہو' جن کا بیان پوری طرح ہو چکا ہے۔ یہ ایسی صورت ہے جو اکثر و بیشتر آتی رہتی ہے' اس صورت میں حقوق الزوجین یہ ہیں:

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚۖ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ

قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

"تم پر کچھ گناہ نہیں' اگر اپنی عورتوں کو طلاق دے دو قبل اس کے کہ ہاتھ لگانے کی نوبت آئے یا مہر مقرر ہو۔ اس صورت میں انہیں کچھ نہ کچھ دینا ضرور چاہئے۔ خوشحال آدمی اپنی مقدرت کے مطابق اور غریب اپنی مقدرت کے مطابق معروف طریقہ سے دے۔ یہ حق ہے نیک آدمیوں پر۔ اگر تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دی ہو' لیکن مہر مقرر کیا جاچکا ہو تو اس صورت میں نصف مہر دینا ہو گا۔ یہ اور بات ہے کہ عورت نرمی برتے (اور مہر نہ لے) یا وہ مرد' جس کے اختیار میں عقد نکاح ہے' نرمی سے کام لے (اور پورا مہر دے دے) اور تم (یعنی مرد) نرمی سے کام لو' تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو۔ تمہارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے۔"

اس میں دو حالتیں ہیں۔ پہلی حالت یہ ہے مطلقہ کے ساتھ شب باشی نہ ہوئی ہو اور اس کا مہر بھی مقرر نہ کیا گیا ہو۔ مہر چونکہ ایک لازمی فریضہ ہے اس لئے ایسے حالات میں خاوند پر لازم ہے کہ وہ مطلقہ کو اپنی وسعت کے مطابق کچھ ساز و سامان دے۔ اس سے ایک تو عورت کی دلجوئی ہوگی اور نفسیاتی طور پر دونوں خاندانوں کے درمیان خوشگواری پیدا ہوگی اور دوسرے یہ کہ اسے کچھ نہ کچھ مالی فائدہ ہو گا۔ اس طرح کی جدائی سے عورت اپنے لئے کرب اور درد محسوس کرتی ہے۔ یہ اس کے لئے عمر بھر کا طعنہ اور دشمنی بن جاتی ہے۔ ایسے حالات میں اگر اسے بطور تحفہ کچھ دے دے تو اس سے نفسیاتی طور پر اس عورتکے برے احساسات میں کمی آسکتی ہے اور دونوں خاندانوں کے درمیان کشمکش' کشیدہ تعلقات کے بادل چھٹ سکتے ہیں اور یہ تحفہ اس قسم کا اظہار محبت ہو سکتا ہے اور ساتھ ہی اعتراف جرم اور معذرت بھی۔ اس سے خود مرد کی جانب سے بھی اس بات کا اظہار ہو گا کہ وہ خود بھی اس طلاق اور جدائی پر متاسف ہے' معذرت خواہ ہے۔ یہ کہ یہ باہمی تعلقات کی یہ ایک ناکام کوشش تھی لیکن یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے باہمی حسن سلوک کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا جائے۔ اس لئے یہاں وصیت کی گئی کہ اس صورت میں عورت کو کچھ نہ کچھ ضرور دیا جائے معروف طریقے کے مطابق تاکہ فریقین کے درمیان انسانی بنیادوں پر انس و محبت قائم رہ سکے اور ٹوٹے ہوئے تعلقات کی اچھی یادیں باقی رہیں۔ لیکن قرآن مجید ساتھ ساتھ یہ ہدایت بھی کر دیتا ہے کہ خاوند پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ غنی اپنی مقدرت کے مطابق اور نادار آدمی اپنی وسعت کے مطابق دے عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ "خوشحال آدمی اپنی مقدرت کے مطابق اور غریب اپنی مقدرت کے مطابق۔"

اشارہ کیا جاتا ہے کہ یہ تحفہ معروف طریقے کے مطابق اور احسان سے ہو تاکہ خشک دلوں میں تازگی پیدا ہو جائے اور باہمی تعلقات کی فضا پر جو گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں وہ چھٹ جائیں۔ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ○ "یہ تحفہ ہے معروف طریقے کے مطابق اور یہ حق ہے نیک آدمیوں پر۔"

دوسری صورت یہ ہے کہ مباشرت سے پہلے ہی طلاق دے دی جائے' لیکن نکاح کے ساتھ مہر بھی مقرر کر دیا گیا ہو۔ اس صورت میں

مہر کا نصف حصہ واجب ہو گا۔ یہ تو ہے قانون' لیکن قرآن مجید قانون کے بجائے معاملہ مہربانی حسن سلوک اور سہولت پر چھوڑ دیتا ہے۔ عورت اور اگر وہ نابالغ ہے تو اس کے ولی نکاح کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ معاف کرے اور اپنے قانونی حق سے دستبردار ہو جائے۔ ایسے کشیدہ حالات میں جو فریق اپنے حق سے دستبردار ہو جاتا ہے' دراصل بہت ہی شریف النفس' خوش اخلاق' بردبار اور معاف کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ کسی ایسے شخص کے مال کو بھی اسی کے پاس رہنے دیتا ہے' جس کے ساتھ اب دوسرے تعلقات باقی نہیں رہے۔ لیکن قرآن مجید آخر تک اس کوشش میں ہے کہ ان کے درمیان سے کدورتیں صاف ہو جائیں۔ ان میں کوئی کدورت نہ رہے اور دل ہلکے ہو جائیں وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰىؕ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَكُمْؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ○ "اور اگر تم نرمی سے کام لو تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسب ہے۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو' تمہارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے۔"

سب سے آخر میں تقویٰ کے احساس کو تیز کیا جاتا ہے۔ باہمی حسن سلوک اور احسان کے رویہ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اپنے دلوں میں یہ شعور پیدا کرو کہ اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے اور نگران ہے تاکہ تمہارے باہمی تعلقات میں حسن سلوک' نرمی اور احسان کی فضا غالب رہے' چاہے تعلقات رشتہ داری کامیاب ہوں یا ناکام ہو چکے ہوں۔ دلوں کو صاف اور خالی رہنا چاہئے اور ہر حال میں تعلق باللہ قائم اور پختہ رہنا چاہئے۔

مندرجہ بالا تمام احکام میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ دلوں کا رابطہ اور تعلق باللہ مضبوط ہو جائے اور یہ سعی کی گئی ہے کہ باہمی معاشرت میں نیکی اور احسان کو عبادت سمجھا جائے' ایسی فضا کے عین بیچ میں نماز کا ذکر کر دیا جاتا ہے جو اسلام کی سب سے بڑی اور اہم عبادت ہے۔ حالانکہ ابھی تک عائلی احکام کا بیان جاری تھا اور وہ ختم نہ ہوئے تھے۔ ابھی ایک حکم یہ باقی تھا کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے۔ اس کے حق میں یہ وصیت کی جائے کہ اسے ایک سال تک گھر سے نہ نکالا جائے اور نان و نفقہ دیا جائے۔ دوسرا یہ کہ مطلقہ عورتوں کو بالعموم کچھ نہ کچھ سامان بطور تحفہ دے دیا جائے۔ اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ جس طرح نماز ایک عبادت ہے اس طرح ان احکام پر عمل کرنا عبادت ہے۔ یہ دونوں امور اللہ کی بندگی کے ضمن میں آتے ہیں۔ یہ ایک بہت ہی لطیف اشارہ ہے اور یہ اشارہ انسان کی تخلیق کے بارے میں' اسلامی نقطہ نظر کے عین مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کے بارے میں فرماتے ہیں وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ "میں نے جن و انس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔" (عبادت اور بندگی صرف ان چیزوں میں نہیں ہے جو شعائر عبادات ہیں بلکہ ہر وہ کام عبادت ہے جس میں انسان اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کا مقصد' اس کام سے صرف یہ ہو کہ اللہ کی اطاعت کی جائے۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰىۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ ﴿۲۳۸﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًاۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾

"اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو' خصوصاً اس نماز کی جو درمیان میں ہے۔ اللہ کے آگے اس طرح کھڑے ہو جیسے فرمان بردار غلام کھڑے ہوتے ہیں۔ بدامنی کی حالت ہو' تو خواہ پیدل ہو' خواہ سوار' جس طرح ممکن ہو نماز پڑھو۔ اور جب امن میسر آجائے تو اللہ کو اس

۱۔ روایت امام مسلم

طریقے سے یاد کرو جو اس نے تمہیں سکھادیا ہے۔ جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔" یہاں حکم دیا ہے کہ نماز کی حفاظت کرو۔ یعنی اسے اپنے وقت پر' تمام ارکان نماز صحیح طرح ادا کرتے ہوئے تمام شرائط پوری کرتے ہوئے ادا کرو۔ راجح قول یہ ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے نماز عصر مراد ہے۔ یوم احزاب کے موقعہ پر حضور ﷺ نے فرمایا: "ہمیں ان لوگوں نے درمیانی نماز سے مشغول کر دیا' نماز عصر سے' اللہ ان کے گھروں اور دلوں کو آگ سے بھردے۔" نماز عصر کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا گیا کہ اکثر اوقات قیلولہ کے بعد نماز آتی ہے اور اس کے قضا ہونے یا موخر ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔

راجح قول یہ ہے کہ قنوت کے معنی عاجزی اور خشوع کے ہیں۔ نماز میں اس کی یاد کی طرف یکسو ہو جانے کا مفہوم بھی اس میں داخل ہے۔ ایک وقت تک سخت ضرورت کے وقت مسلمان نماز کے دوران' ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کر لیا کرتے تھے۔ اس آیت کے نزول کے بعد مسلمانوں نے جان لیا کہ اللہ کے ذکر' خشوع اور یکسوئی کے سوا کوئی اور شغل نماز کے دوران جائز نہیں ہے۔

اگر حالت خوف و خطر کی ہو اور ممکن نہ ہو کہ قبلہ رخ ہو کر نماز ادا کی جا سکے تو بھی نماز ادا ہو گی۔ اسے موقوف نہ کیا جائے گا۔ اگر کوئی سواری پر سوار ہے یا کوئی خطرے کی حالت میں مدافعت پر مامور ہے تو اس کے لئے جس طرف ممکن ہو' اس طرف منہ کر کے پڑھ لے۔ اشارے سے پڑھے اور رکوع و سجود کے لئے خفیف اشارہ کرے۔ یہ نماز اس سے مختلف ہے' جسے صلوٰۃ الخوف کہا جاتا ہے۔ اور جس کی تفصیل سورت نساء میں بیان کی گئی ہے۔ وہ نماز ایسی حالت میں ادا ہوتی ہے' جہاں ایسے حالات ہوں کہ مسلمانوں کا صف میں کھڑا ہونا ممکن ہو' یوں امام کھڑا ہو اور ایک صف آکر ایک رکعت پڑھ لے۔ پھر دوسری صف آجائے اور وہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھ لے۔ اور دوسری صف اس کی حفاظت میں کھڑی رہے۔ یہاں جس نماز کا ذکر کیا گیا ہے' اس سے مراد وہ نماز ہے' جو ایسے حالات میں ادا کی جا رہی ہو جہاں جنگ عملاً شروع ہو' تلواریں چل رہی ہوں' فائرنگ ہو رہی ہو اور صف بستہ ہونا ممکن نہ ہو۔

یہ ایک عجیب بات ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نماز کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ مسلمانوں کو یہاں اشارتاً بتایا جاتا ہے کہ خوف اور شدائد جنگ کی انتہائی حالت میں بھی نماز پڑھی جانی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قدر خوف میں' عین جنگ کے وقت تلوار ہاتھ میں ہو بلکہ دشمن کی تلوار سر پر ہے' لیکن نماز ادا ہو رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز مرد مومن کا اسلحہ ہے' اس کا سامان جنگ ہے۔ وہ مومن کی ایک دفاعی تدبیر ہے۔ ایسے حالات میں مومن نماز میں کھڑا ہو جاتا ہے تو وہ اللہ تک پہنچ جاتا ہے اور یہی وقت ایسا ہوتا ہے جس میں اللہ تک پہنچنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے ماحول میں' جس میں انسان چاروں طرف سے خطرات میں گرا ہوا ہو' اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔

کیا خوب دین ہے ہمارا۔ یہ عبادت کا نظام ہے۔ مختلف شکلوں اور مختلف عنوانوں سے عبادت' جن میں نماز ایک جلی سرخی ہے۔ اس عبادت کے ذریعہ یہ دین' انسان کو مقام بلند تک پہنچاتا ہے۔ اس عبادت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مومن کو شدائد کے وقت ثابت قدم کر دیتا ہے۔ اس عبادت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ' امن و امان کے دور میں ایک مومن کو مہذب بنا دیتا ہے۔ اس عبادت ہی کے ذریعہ ایک مومن پورے کا پورا ایک ایسی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے جو امن و سکون کی دنیا ہے۔ جہاں اس پر اطمینان اور سلامتی کی بارش ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عبادت کی سخت تاکید عین ایسے حالات میں بھی کی جاتی ہے جبکہ تلواریں سروں کو کاٹ رہی ہوں اور گردنوں کو اڑا رہی ہوں۔

اور اگر بالکل امن و امان کی حالت ہو جائے تو پھر نماز وہی ہے' جس کی تعلیم دی ہے اور مزید انہیں ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان باتوں کی تعلیم دی جن سے وہ واقف نہ تھے: فَإِذَا أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ

كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ○ "اور جب امن میسر آجائے تو اللہ کو اس طریقے سے یاد کرو' جو اس نے تمہیں سکھایا ہے۔ جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔" لوگ جانتے ہی کیا تھے' اگر اللہ تعالیٰ انہیں نہ سکھاتا؟ اگر اللہ تعالیٰ زندگی کے ہر موڑ پر لمحہ لمحہ ان کی راہنمائی نہ فرماتا۔

ازدواجی زندگی کے احکام اور طلاق کے احکام کے دوران' نماز کی یہ سرسری بحث بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے مقصود مسلمانوں کے دل میں عبادت اور بندگی کا وہ جامع تصور بٹھانا ہے جو اسلامی نظام زندگی کا اصل الاصول ہے یعنی امتثال امر عبادت ہے چنانچہ پھر اصل موضوع یعنی عائلی احکام کو یہاں مکمل کر دیا جاتا ہے:

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا
إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي
أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٤٠﴾ وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۖ
حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿٢٤١﴾ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٢٤٢﴾ ٣١ ع٧ ١٥

"تم میں سے جو لوگ وفات پائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑ رہے ہوں' ان کو چاہئے کہ اپنی بیویوں کے حق میں' یہ وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک ان کو نان و نفقہ دیا جائے اور وہ گھر سے نہ نکالی جائیں۔ پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے وہ جو کچھ بھی کریں اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے' اللہ سب پر غالب' اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ اس طرح جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو' انہیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔ اس طرح اللہ اپنے احکام تمہیں صاف صاف بتاتا ہے۔ امید ہے کہ تم سمجھ بوجھ کر کام کرو گے۔"

پہلی آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو' اپنی وفات سے پہلے وہ اپنی عورت کے بارے میں ضرور یہ وصیت کر جائے کہ اسے گھر سے ایک سال کے عرصہ تک کم از کم نہ نکالا جائے اور ایک سال تک اسے اجازت ہو کہ وہ اس کے مال سے اخراجات کرے۔ گھر سے نہ نکلے اور اگر وہ مناسب سمجھتی ہے کہ اس کے حالات ابھی نکاح ثانی کے لئے مناسب نہیں یا اس کے جذبات ابھی تک مجروح ہیں تو ایک سال تک گھر میں رکی رہے۔ لیکن یہ حق عورت کا ہے اور چار ماہ دس دن کی عدت گزارنے کے بعد بہرحال وہ آزاد ہو جاتی ہے اور اگر وہ گھر سے نکلنا چاہے تو نکل سکتی ہے کیونکہ عدت تو اس پر فرض ہے اور گھر میں رہنا اس پر فرض نہیں ہے بلکہ یہ اس کا حق ہے جس کا استعمال کرنا اس پر لازمی نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا کہ یہ آیت' آیت عدت کے ذریعہ منسوخ ہو گئی ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ نسخ کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ دونوں آیات کے محل میں اختلاف ہے۔ جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں عدت اس کے ذمہ ایک فریضہ ہے' جو اس نے ادا کرنا ہے اور ایک سال کا عرصہ اس کا حق ہے جس کا استعمال کرنا اس پر لازم نہیں ہے۔

فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ "پھر اگر وہ خود نکل جائیں' تو اپنی ذات کے معاملے میں' معروف طریقے سے' وہ جو کچھ بھی کریں' اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔" علیکم (تم پر) سے مراد مسلمانوں کا اجتماعی نظام ہے' جو ہر فعل کا ذمہ دار ہے جو اسلامی معاشرہ میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اسلامی نظام زندگی میں' ہر نظریے کا معاملہ' ہر فرد کا معاملہ' اور

ہر واقعہ کی ذمہ داری معاشرے پر ہے۔ اگر اسلامی معاشرے میں بھلائی ہوتی ہے یا برائی دونوں کا اجر اور باز پرس اسلامی معاشرے سے بھی ہوگی۔ اسلامی جماعت کی حقیقت اور اس کے فرائض کی نوعیت کا اندازہ اس اشارے سے اچھی طرح ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریک اسلامی کا قیام ضروری ہے تاکہ اسلامی نظام زندگی کا قیام عمل میں آسکے۔ قیام کے بعد پھر اس نظام کی حفاظت کی جاسکے اور یہ نگرانی ہوتی رہے کہ اسلامی معاشرے کا کوئی فرد اس نظام کی خلاف ورزی یا اس سے بغاوت کا ارتکاب تو نہیں کر رہا ہے۔ اس لئے کہ افراد جماعت کے ہر چھوٹے بڑے کام کی آخری مسئولیت اسلامی جماعت ہی کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے۔ یہاں لفظ "تم پر" استعمال کر کے اس حقیقت کو اسلامی جماعت کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی کہ یہ حقیقت اسلامی جماعت اور اس کے ہر فرد کے حس و شعور میں اچھی طرح جاگزین ہو جائے اور آخری تبصرہ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○ "اللہ مقتدر اعلیٰ اور دانا ہے۔" وہ مقتدر اعلیٰ ہے اس لئے اسے حق ہے کہ جو قانون بنائے لیکن جو قانون بنائے گا حکیمانہ ہو گا۔ مقتدر ہے' صاحب قوت ہے' نافرمانی پر تمہیں سزا دے سکتا ہے۔

دوسری آیت میں خدا خوفی کی دعوت دیتے ہوئے حکم دیا گیا کہ ہر مطلقہ کو رخصت کرتے وقت کچھ نہ کچھ سامان ضرور دیا جائے:

وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ○ "جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو' انہیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔"

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ چونکہ مطلقات کے بارے میں سابقہ آیات میں تفصیلی احکام آچکے ہیں' اس لئے یہ آیت ان آیات کی وجہ سے منسوخ تصور ہوگی۔ لیکن یہاں اسے منسوخ سمجھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ متاع یعنی کچھ نہ کچھ دے دینا نفقات واجبہ سے علیحدہ ایک چیز ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید نے جو احکامات اب تک دیئے ہیں' ان کی حقیقت پر غور کیا جائے تو ہر مطلقہ عورت کے لئے' تحفہ کے طور پر کچھ نہ کچھ دیئے جانے کی گنجائش رکھنا اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ چاہے اس کے ساتھ مباشرت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ اس کا مہر مقرر کیا گیا ہو یا مقرر نہ کیا جا سکا ہو۔ اس لئے کہ طلاق کی وجہ سے فریقین کے تعلقات میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے' دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف وحشت اور نفرت پیدا ہو جاتی ہے' چنانچہ ایسے موقع پر اس قسم کے حسن سلوک سے تعلقات میں تازگی پیدا ہو سکتی ہے' دلوں کی باہمی وحشت دور ہو سکتی ہے۔ یہ واحد گارنٹی ہے' جس کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ اور جس سے جماعت مسلمہ کے تعلقات درست ہو سکتے ہیں۔

اب تیسری آیت اس میں ان تمام عائلی احکام پر تبصرہ ہے جو اس پورے سبق میں بیان کئے گئے ہیں۔ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ○ "اس طرح اللہ اپنے احکام تمہیں صاف صاف بتاتا ہے' امید ہے کہ تم سمجھ بوجھ کر کام کرو گے۔"

اس طرح اس بیان کی طرح جو اس پورے سبق میں بیان احکام کے سلسلے میں تمہاری نظروں سے گزرا' جو محکم' دقیق' الہامی اور اثر انگیز بیان ہے۔ اس طرح' اللہ صاف صاف اپنے احکام بیان کرتا ہے' اس امید پر کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو گے تمہیں عقل آجائے اور تم ان احکام میں تدبر کرو گے' غور و فکر سے کام لو گے' ان کی تہہ میں جو حکمت کارفرما ہے اسے پانے کی کوشش کرو گے۔ ان میں اللہ کی شان رحمت کی جو جھلک ہے اسے دیکھ سکو گے' ان میں تمہارے لئے جو انعامات پوشیدہ ہیں انہیں جان سکو گے۔ سہولت اور تیسیر کی نعمت' سادگی اور صفائی کی نعمت' پختگی اور قطعیت کی نعمت اور پھر ان کی وجہ سے پوری زندگی پر امن و سلامتی کی موسلادھار بارش کی نعمت۔

اے کاش! لوگ اسلامی نظام کو سمجھتے۔ کاش! وہ اس پر غور کرتے۔ اگر وہ اسے صحیح طرح سمجھتے تو ان لوگوں کا اسلامی نظام سے وہ تعلق نہ ہوتا جو آج ہے' بلکہ وہ اسلامی نظام کے مطیع ہو جاتے' اس کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے' ان کے دل قبولیت کے لیے ہر وقت تیار ہوتے' ان کے دل اس کی ہر ہدایت پر راضی ہوتے اور ان کے قلوب اور ان کی روح' امن و سلامتی اور یقین اطمینان سے بھر جاتے۔ کاش! کہ وہ سوچتے کاش کہ وہ سمجھتے۔

# درس نمبر۱۶ ایک نظر میں

اس سبق کی اہمیت اور اس میں امم سابقہ کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان کی صحیح قدر و قیمت تب ہی ذہن میں بیٹھ سکتی ہے' جب ہم پہلے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ قرآن امت مسلمہ کی ایک زندہ کتاب ہے' یہ کتاب اس کے لئے ایک راہنمائے ناصح ہے۔ یہ اس کی مرشد ہے۔ یہ اس کا مدرسہ ہے جہاں وہ امن سے زندگی کا سبق حاصل کرتی ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی اسلامی جماعت کے لئے اس کتاب کو ضابطہ تربیت قرار دیا۔ جس نے اپنے وقت پر اس کتاب کی روشنی میں اسلامی نظام زندگی قائم کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا اور یہ کہ پہلی اسلامی جماعت کو اس منصب پر اس وقت فائز کیا گیا' جب اس کتاب کے مطابق اسے اچھی طرح تیار کیا گیا' اور اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے لئے یہ مقام متعین کیا ہے کہ وہ تحریک اسلامی کا ایک زندہ راہنما ہو گی اور یہ کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد اس تحریک کی آنے والی نسلوں کے لئے یہ کتاب زندہ قائد کا کام سرانجام دے گی۔ ان آنے والی نسلوں کی تربیت کرے گی اور انہیں اس قائدانہ رول کے لئے تیار کرے گی' جس کے لئے اس کتاب نے اس تحریک کی ہر نسل کے ساتھ پختہ وعدہ کر رکھا ہے کہ جب بھی تحریک اسلامی اس کتاب کو اپنا ہادی اور راہنما تسلیم کرے گی' جب بھی اس کی ہدایت کو اپنائے گی' جب بھی تحریک اپنا یہ عہد پورا کرے گی کہ وہ مطیع فرمان ہے اور اپنا نظام زندگی اس کتاب سے اخذ کرے گی' اس کتاب کو باعث عزت سمجھے گی' اور تمام نظاموں پر اس کو غالب کرے گی تو تحریک اسلامی دنیا میں اعلیٰ مقام پائے گی۔ سب سے برتر ہو گی اور یہ اللہ کا وعدہ ہے' یہ اس کتاب کا وعدہ ہے۔

یاد رکھو! قرآن مجید محض ایک کتاب تلاوت ہی نہیں ہے یہ تو ایک مکمل دستور حیات ہے۔ یہ تو دستور تربیت ہے۔ یہ تو دستور عمل ہے اور پوری زندگی کے لئے راہ عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں امم سابقہ کے تجربے اور ان کے واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں تاکہ ان سے جماعت مسلمہ عبرت حاصل کرے' اس لئے کہ یہ کتاب نازل ہی اس لئے ہوئی کہ اس سے اس جماعت کی تربیت ہو۔ اس کتاب میں آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ کے دور تک تمام کرۂ ارض پر ان تمام ایمانی دعوتوں کے تجربات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ تمام دعوتی تجربات امت مسلمہ کے لئے تاقیامت زاد راہ ہیں۔ نفس انسانی کے تجربات اور حیات انسانی کے مختلف واقعاتی تجربات اس کتاب میں ضبط ہیں تاکہ امت مسلمہ اپنی راہ و رسم سے باخبر ہو جائے' اپنے لئے زاد راہ کا ساز و سامان تیار کرے اور اس راہ میں ان متنوع تجربات کا ذخیرہ اس کے لئے مشعل راہ ہو۔

یہی وہ مقاصد ہیں جن کی خاطر قرآن مجید میں بکثرت قصص بیان ہوئے' یہ قصے مختلف نوعیت رکھتے ہیں اور ہر قصے میں امت کے لئے واضح اشارات پائے جاتے ہیں۔ قرآن مجید نے اور اقوام کی نسبت' بنی اسرائیل کے قصے زیادہ تعداد میں نقل کئے ہیں' جس کی متعدد وجوہات ہیں۔ ان میں سے کچھ وجوہات ہم نے فی ظلال القرآن پارۂ اول کی تفسیر میں 'آغاز ذکر بنی اسرائیل کے موقعہ پر بیان کئے ہیں۔ کچھ وجوہات اس بارے میں مختلف مقامات پر ہم نے بیان کی ہیں۔ بعض وجوہات یہاں کی مناسبت سے پیش خدمت ہیں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی کہ امت مسلمہ کی بعض آنے والی نسلیں ان حالات سے گزریں گی' جن سے بنی اسرائیل گزرے۔ مسلمان اپنے دین اور اپنے نظریۂ حیات کے معاملے میں وہی موقف اختیار کریں گے جو بنی اسرائیل نے اختیار کیا۔ اس لئے قرآن مجید نے درحقیقت سر دلبراں' قصص بنی اسرائیل کی صورت میں بیان کیا ہے تاکہ مسلمانوں کی آنے والی نسلیں اس سے نصیحت حاصل کریں اور عبرت پکڑیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے آنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ایک صاف آئینہ تھما دیا ہے تاکہ وہ ہر وقت اس میں اپنی شکل دیکھ سکیں' اور زندگی کی گزرگاہوں میں' جو نشیب

وفراز پیش آتے رہتے ہیں' ان کے بارے میں پیشگی ہدایات ان کے پاس ہوں۔

امت مسلمہ کی تمام نسلوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اس کتاب الٰہی کو خوب سمجھ بوجھ کر پڑھیں۔ وہ اس کی ہدایات پر اس طرح غور کریں کہ گویا یہ ہدایات آج اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہو رہی ہیں' تاکہ آج کے مسائل کو ان کی روشنی میں حل کیا جائے اور انسانیت کے لئے آج کے سفر میں' اس کے مستقبل کی تاریکیاں روشن کرے۔ اس کتاب کو محض کلام جمیل سمجھ کر اور نہایت ہی حسن قرأت سے پڑھ کر ہی نہ بیٹھ جاؤ یا اسے یہ سمجھ کر نہ پڑھو کہ یہ ایک رفتہ وگزشتہ حقیقت کی محض ایک روئیداد ہے۔ اور اس حقیقت کو اس کرۂ ارض پر اب دوبارہ نہیں دہرایا جاتا۔

ہم اس قرآن مجید سے اس وقت تک فائدہ نہیں اٹھاسکتے جب تک اس میں ہم روز مرہ کی واقعاتی زندگی کے حقائق کے بارے میں ہدایات کی تلاش نہ کریں۔ آج کے مسائل کا حل اور کل کے مسائل کی منصوبہ بندی' بعینہٖ اسی طرح جس طرح پہلی جماعت اسلامی اس کتاب کو اس طرح لیتی تھی۔ وہ اپنے تمام موجودہ مسائل کا حل اس کتاب میں تلاش کرتی تھی۔ جب بھی ہم قرآن مجید کو' اس فہم و تدبر کے ساتھ پڑھیں گے' ہمیں جس چیز کی بھی تلاش ہوگی وہ ہمیں اس میں ملے گی۔ بلکہ ہم اس میں ایسی عجیب ہدایات پائیں گے' جن تک کسی ایسے شخص کا ذہن نہیں پہنچ سکتا' جو اس کتاب کو غفلت سے پڑھتا ہے۔ ہمیں اس کا ہر کلمہ' اس کا ہر لفظ' اس کی ہر عبارت اور اس کی ہر ہدایت زندۂ جاوید نظر آئے گی۔ چلتی پھرتی نظر آئے گی' زندہ و متحرک نظر آئے گی' اور صاف صاف اشارہ کرتی نظر آئے گی یہ وہ ہے تمہاری راہ! وہ ہے نشان راہ! یہ کتاب کہے گی یہ کرو اور اس سے بچو' وہ کہے گی یہ تمہارا دوست ہے اور یہ دشمن ہے۔ وہ کہے گی یہ احتیاط کرو اور یہ تیاری کرو۔ غرض یہ کتاب ہماری زندگی کے ہر حال کے بارے میں ہم سے طویل اور مفصل گفتگو کرے گی اگر ہم اس انداز سے قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو یقیناً ہمیں اس میں زندگی بھی ملے گی اور زندگی کا سازوسامان بھی ملے گا۔ اور تب ہم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو صحیح طرح سمجھ سکیں گے يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' جب اللہ اور رسول تمہیں اس بات کی طرف بلائیں' جو تمہیں زندہ کرتی ہے' تو اس پر لبیک کہیں۔" قرآن کریم دراصل زندگی کی طرف دعوت ہے۔ دائمی زندگی اور تازہ بتازہ زندگی کی دعوت ہے۔ وہ تمہیں ایسی زندگی کی طرف دعوت نہیں دیتا جو گزر چکی ہے اور جو صفحات تاریخ کا ایک ورق بن چکی ہے۔

اب اس تمہید کی روشنی میں ذرا اس پورے سبق پر ایک نظر دوڑائیں۔ اس سبق میں امم سابقہ کے تجربات میں سے دو تجربے پیش کئے گئے ہیں۔ امت مسلمہ جن عملی تجربات سے گزری' ان دو تجربات کو بھی اس کے ذخیرہ میں شامل کیا جارہا ہے۔ امت کے سامنے یہ تجربات رکھ کر اسے' ان حالات کے لئے تیار کیا جارہا ہے جو اس کی زندگی میں پیش آنے والے ہیں۔ اس لئے کہ وہی ایمانی نظریۂ حیات کی وارث ہے اور امم سابقہ کے تجربات کے اس سرسبز کھیت کی دہقانی اب اس امت کے حصے میں ہے اور اسے میدان میں ایک اہم رول ادا کرنا ہے۔

پہلا تجربہ ایسے لوگوں کا ہے جن کا نام قرآن مجید نے نہیں لیا۔ یہ واقعہ قرآن مجید نے پورے اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے' لیکن جس مقصد کے لئے اسے لایا گیا ہے وہ اچھی طرح پورا ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے لوگوں کا تجربہ ہے جو خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ "موت کے ڈر سے اپنے گھربار چھوڑ کر نکلے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں تھے۔" لیکن انہیں اس خروج وفرار اور اس خوف و ہراس نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا اور وہ جس انجام سے ڈر کے مارے بھاگ رہے تھے اور جو اللہ نے ان کے لئے مقدر کر رکھا تھا' اس نے انہیں آلیا۔ ان سے اللہ نے کہا: مُوتُوا "مرجاؤ۔" ثُمَّ أَحْيَاهُمْ "پھر اس نے ان کو زندگی بخشی" نہ ان کی جدوجہد

انہیں موت سے بچا سکی اور نہ ہی دوبارہ زندگی حاصل کرنے کے لئے ان کو کچھ جدوجہد کرنی پڑی۔ دونوں حالات میں اللہ کی مشیت نے فیصلہ کیا۔

اس تجربہ کی روشنی میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور انہیں قتال فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس لئے کہ زندگی دینے والا بھی وہ ہے اور مال دینے والا بھی وہ ہے۔ وہ اس بات پر قادر ہے کہ زندگی قبض کرے اور مال واپس لے لے۔

دوسرا تجربہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد "تاریخ بنی اسرائیل سے لیا گیا ہے۔ اس دور میں ان کی مملکت تباہ ہو چکی تھی۔ ان کے مقدسات لوٹ لئے گئے تھے۔ وہ دشمنوں کے سامنے ذلیل و خوار ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے نبی کی تعلیمات اور اپنے رب کی ہدایات کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ اور اس وجہ سے وہ ذلت اور خواری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ لیکن اس گراوٹ کے بعد وہ پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنے کپڑے جھاڑے اور نئے سرے سے تیار ہوئے اور ان کے دلوں میں نظریۂ حیات پھر سے زندہ ہو گیا اور ان کے دلوں میں اپنے نظریۂ حیات کے لئے پھر سے ولولہ جہاد پیدا ہوا اور اپنے نبی سے کہنے لگے: ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ "ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔"

قرآن مجید جس الہامی انداز میں اس تجربے کو بیان کرتا ہے' اس سے تمام حقائق کھل کر سامنے آجاتے ہیں اور اس میں دور اول کی تحریک اسلامی کے لئے جس طرح واضح اشارات پائے جاتے ہیں' اسی طرح ہر دور کی اسلامی جماعت کے لئے واضح ہدایات موجود ہیں۔

اس قصے سے جو عام عبرت حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مومنین کی ایک مٹھی بھر تعداد نے ثابت قدمی کا ثبوت دیا اور اس کے نتیجے میں بنی اسرائیل کو ایک عظیم کامیابی نصیب ہوئی' اگرچہ اس پورے واقعہ میں لشکر اسلام کو بار بار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا' اور اس مہم میں کئی نقائص تھے جو سامنے آئے' متعدد کمزوریاں بار بار سامنے آتی رہیں۔ لشکر کشی کے مختلف مراحل میں' فوج در فوج لوگ الگ ہوتے رہے اور نافرمانیاں کرتے رہے' لیکن ان سب کمزوریوں کے باوجود بنی اسرائیل کا یہ اٹھنا' آلودگیاں جھاڑ کر اٹھنا اور نظریۂ حیات کو لے کر اٹھنا' مٹھی بھر ثابت قدم مومنین کی وجہ سے کامیاب رہا۔ اس کامیابی کے نتیجے میں بنی اسرائیل کو نصرت' عزت اور استقرار حاصل ہوا' حالانکہ اس سے پہلے وہ شکست فاش کھا چکے تھے۔ انتہائی ذلت کی زندگی بسر کر رہے تھے' طویل عرصہ تک جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان پر دوسری اقوام مسلط تھیں۔ اس کامیابی کے نتیجے میں بنی اسرائیل میں حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کی حکومت قائم ہوئی' جن کے دور میں بنی اسرائیل کی حکومت اپنے عروج کو پہنچی' اور ان حضرات کا دور ان کی تاریخ کا سنہری دور قرار پایا۔ جس کے بارے میں بنی اسرائیل فخریہ انداز میں بات کرتے ہیں اور اس مقام تک بنی اسرائیل اپنی نبوت کبریٰ کے دور میں بھی نہ پہنچے تھے۔ یہ تمام کامیابی نتیجہ ہے اس نظریاتی قیام کا' جبکہ انہوں نے نظریۂ حیات کو جاہلیت کے ڈھیروں کے نیچے سے نکالا اور ایک قلیل جماعت اس نظریہ کو لے کر اس ثابت قدمی سے اٹھی اور جالوت کی عظیم افواج سے ٹکرا گئی اور کامیاب رہی۔

اس تجربے کے دوران بعض جزوی مسائل کے بارے میں بھی ہدایات دی گئی ہیں' جن کی اس دور میں اسلامی جماعت کو بہت ضرورت تھی اور اس کے لئے بہت اہم تھیں۔ مثلاً یہ کہ اجتماعی جوش و خروش بعض اوقات قائد کو دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔ اگر وہ محض ظاہر بینی سے کام لے اور حقیقت تک پہنچنے کی کوشش نہ کرے۔ اس لئے قائدین کا یہ فرض ہے کہ وہ کارکنان کو کسی سخت معرکے میں ڈالنے سے پہلے انہیں آزمائے۔ اس واقعہ میں بنی اسرائیل کے اصحاب رائے' نبی وقت کے پاس گئے اور ان سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ کوئی بادشاہ مقرر کر دیں' جس کی قیادت میں وہ اپنے دین کے دشمنوں سے لڑیں' اس لئے کہ ان دشمنوں نے ان سے حکومت چھین لی ہے' ان کی

دولت پر قابض ہو گئے ہیں' وہ ان مقدسات سے بھی محروم کر دیئے گئے ہیں جو آل موسیٰ ؑ اور ہارون کے عہد سے ان کے پاس محفوظ تھے۔ جب نبی وقت نے ان سے' ان کے اس ارادے کے بارے میں تسلی چاہی اور ان سے کہا: قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا "کہیں ایسا تو نہ ہو گا کہ تم کو لڑائی کا حکم دیا جائے اور پھر تم نہ لڑو۔" انہوں نے نبی کے اس سوال اور طلب یقین دہانی کو اچھا نہ سمجھا۔ یہ بات ان پر ناگوار گزری اور ان کا جوش و خروش انتہا کو پہنچ گیا اور کہنے لگے وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا "بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہ خدا میں نہ لڑیں' جبکہ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے۔ اور ہمارے بال بچے ہم سے جدا کر دیئے گئے ہیں؟" لیکن اس جوش و خروش کی آگ جلد ہی بجھ گئی۔ جذبات کا طوفان ختم ہو گا۔ اور اس راہ کے مختلف مراحل میں وہ بیٹھتے گئے۔ جیسا کہ اس واقعہ میں تفصیلات آئی ہیں یا سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ "مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا تو ایک قلیل تعداد کے سوا' وہ سب پیٹھ موڑ گئے۔"

"بنی اسرائیل کی تو یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ وعدہ خلافی کرتے ہیں' اپنے عہد سے پھر جاتے ہیں اور اپنے ساتھی کو آدھی راہ میں چھوڑ دیتے ہیں' لیکن ایسے واقعات انسانی جماعتوں میں بہرحال پائے جاتے ہیں اور خصوصاً ان جماعتوں میں' جو اپنے ایمان و یقین کے اعتبار سے' اور اپنی اعلیٰ تربیت کے اعتبار سے ابھی اعلیٰ معیار تک نہ پہنچی ہوں۔ اس لئے جماعتی زندگی کا یہ منظر بھی' ہر دور کی جماعت مسلمہ کے سامنے پیش کیا جانا ضروری تھا' تاکہ ہر دور کی مسلم جماعت بنی اسرائیل کے اس تجربے سے فائدہ اٹھائے۔

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے ظاہری جوش و خروش' جذباتی اور فوری اقدام کی آزمائش صرف ایک مرتبہ ہی نہ ہو بلکہ بار بار کارکنان کو آزمانا چاہئے۔ جب بنی اسرائیل کے اپنے مطالبے پر قتال فرض ہوئی تو ان کی اکثریت نے پیٹھ پھیر لی۔ وہی قلیل تعداد رہی جس نے اپنے نبی کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو قائم رکھا۔ اور یہ وہی لوگ تھے جو پہلے تو نبی وقت کے ساتھ طالوت کی سربراہی پر لڑتے رہے کہ وہ بادشاہت کے قابل ہی نہیں ہے۔ لیکن جس وقت اس کی بادشاہی کی علامت ظاہر ہو گئی اور بنی اسرائیل کو اس کی قیادت میں وہ مقدسات واپس مل گئے جو دشمنوں کے قبضے میں چلے گئے تھے اور جنہیں فرشتوں نے اٹھا کر واپس کیا' تب بنی اسرائیل قیادت پر تو راضی ہوئے لیکن ان کی اکثریت پہلے مرحلے ہی میں جہاد سے مکر گئی۔ اور وہ پہلی آزمائش ہی میں' جو ان کے قائد نے قائم کی' ناکام ہو گئے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ

"پھر جب طالوت لشکر لے کر چلا' تو اس نے کہا: "ایک دریا پر اللہ کی طرف سے تمہاری آزمائش ہونے والی ہے۔ جو اس کا پانی پیئے گا وہ میرا ساتھی نہیں۔ میرا ساتھی صرف وہ ہے' جو اس سے پیاس نہ بجھائے' ہاں ایک آدھ چلو کوئی پی لے' مگر ایک گروہ قلیل کے سوا سب اس دریا سے سیراب ہوئے۔" لیکن یہ قلیل تعداد بھی آخر تک ثابت قدم نہ رہ سکی۔ یہ قلیل تعداد ایک زندہ خطرہ کے مقابلے میں آئی' جب انہوں نے دشمن کی کثرت اور ان کی قوت کو دیکھا تو حوصلے پست ہو گئے' دل متزلزل ہو گئے فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ "پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی مسلمان دریا پار کر کے آگے بڑھے تو انہوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔" اس شرمناک موقف کے مقابلے میں صرف چنے ہوئے اور مٹھی بھر لوگ ڈٹ گئے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ پر اعتماد کیا۔ اور اس پر یقین کیا اور انہوں نے کہا: كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے

ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔" یہ تھا وہ قلیل گروہ جس نے پلڑا بھاری کر دیا۔ اور اللہ کی امداد آگئی اور بنی اسرائیل عزت اور استقرار کے مالک بن گئے۔

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صالح' دانشمند اور مومن قیادت کی شان کیا ہوتی ہے؟ طالوت کی قیادت میں یہ تمام صفات موجود ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طالوت لوگوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے بنی اسرائیل کا ظاہری جوش و خروش دیکھ کر دھوکہ نہ کھایا۔ پھر انہوں نے صرف ایک ہی تجربہ پر اکتفانہ کیا۔ انہوں نے اپنے فوجیوں کے عزم اور اطاعت امر کا اصل معرکہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی امتحان لیا۔ جو لوگ ان آزمائشوں میں ناپختہ پائے گئے انہیں جدا کر کے پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ پھر اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے مشکل سے مشکل حالات میں بھی ہمت نہیں ہاری۔ ایک ایک تجربہ کے بعد ان کی فوج گھٹتی ہی رہی لیکن وہ بڑھتے چلے گئے اور ہمت نہ ہاری۔ آخر کار ان کے ساتھ مٹھی بھر لوگ ہی جمے رہے لیکن چنے ہوئے لوگ منتخب مجاہد تھے۔ اب وہ خالص قوت ایمان اور اللہ کے بھروسہ کے بل بوتے پر معرکے میں کود پڑے اور اللہ کا وعدہ تو ایمان والوں سے سچا ہونا ہی ہے۔

اس معرکہ میں جو آخری عبرت ہے وہ یہ ہے کہ جو انسان اللہ سے لو لگالیتا ہے تو اس کی اقدار بدل جاتی ہیں' اس کے تصورات کے پیمانے بدل جاتے ہیں' کیونکہ اس کی نظر صرف اس دنیا کے اس محدود دائرے پر ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ اس دنیا سے بہت ہی آگے' ایک وسیع دائرے میں جاکر سوچتا ہے' جو تمام معاملات کا اصل الاصول ہے۔ یہ مٹھی بھر اہل ایمان جو ثابت قدم رہے جو معرکے میں کود پڑے' اور جنہوں نے اللہ کی نصرت حاصل کی' وہ بھی تو اپنی قلت کو دیکھ رہے تھے کہ ان کی تعداد کم ہے۔ اور ان کے دشمن تعداد میں بہت ہی زیادہ ہیں اور جنہیں دیکھ کر ان کے دوسرے بھائی' یہ پکار چکے قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ "ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کے ساتھ لڑنے کی طاقت نہیں۔" لیکن اس مٹھی بھر ایماندار جماعت نے اس صورت حال کے بارے میں وہ فیصلہ نہ کیا۔ اس نے بہت ہی مختلف فیصلہ کیا۔ انہوں نے کہا كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ "بارہا ایسا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔" اس کے بعد یہ گروہ مٹھی بھر ایمانداروں کا گروہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے: رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ "اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر۔ ہمارے قدم جمادے اور کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر۔" یہ جماعت محسوس کرتی تھی کہ قوتوں کا ترازو کافروں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ وہ تو صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے اس گروہ نے اللہ سے نصرت طلب کی اور اس نے وہ امداد اس ہاتھ سے وصول کر لی جس کا وہ ہاتھ مالک تھا' اور جس کو وہ ہاتھ عطا کر سکتا تھا۔ جب اہل ایمان اللہ تک پہنچ جاتے ہیں تو ان کے پیمانے بدل جاتے ہیں' ان کی اقدار بدل جاتی ہیں اور جب دل میں صحیح ایمان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ دل کی دنیا میں اللہ کے ساتھ معاملہ کرنا زیادہ بہتر ہے بجائے اس کے کہ ہم اس ظاہری اور جھوٹی دنیا کے معیاروں کے مطابق کوئی معاملہ کریں۔

ان سطور میں ہم نے ان تمام اشارات کا احاطہ نہیں کر لیا' جو اس قصہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ قرآنی اشارات اور حکمتوں کا القاء ہر اس شخص پر اس کے حالات کے مطابق ہوتا ہے اور نیز اس مقدار کے مطابق ہوتا ہے جس قدر اس کو ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ہر شخص اپنا حصہ لے لیتا ہے' پھر بھی اشارات اور حکم کا بڑا حصہ محفوظ ہوتا ہے اور مختلف حالات میں اپنی اپنی مقسوم کے مطابق' ان اشارات کا انکشاف ہوتا رہتا ہے۔

غرض اس عمومی تبصرے کے بعد اب مناسب ہے کہ آیات پر تفصیلاً بحث کی جائے۔

☆ ☆ ☆

# درس نمبر ۱۶ تشریح آیات (۲۴۳ تا ۲۵۲)

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٢٤٣﴾

"تم نے ان لوگوں کے حال پر بھی کچھ غور کیا؟ جو موت کے ڈر سے اپنے گھر بار چھوڑ کر نکلے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں تھے؟ اللہ نے ان سے فرمایا: مرجاؤ۔ اور پھر اس نے ان کو دوبارہ زندگی بخشی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ انسان پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔"

یہ لوگ کون تھے؟ جو ہزاروں کی تعداد میں تھے اور جو موت کے ڈر کے مارے اپنے گھروں سے نکلے۔ یہ کس سرزمین کے باشندے تھے؟ تاریخ کے کس دور میں نکلے یہ لوگ؟ میں ان کے بارے میں تاویلات و توجیہات کے انبار میں اپنے آپ کو گم کرنا نہیں چاہتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کو ان کے بارے میں کچھ بتانا مقصود ہوتا تو وہ ضرور بتا دیتے۔ جیسا کہ قرآن مجید کے بعض دوسرے متعین قسم کے قصص کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔ یہاں مطلب صرف عبرت کا حصول اور مسلمانوں کو نصیحت کرنا ہے۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ قصہ بذات خود مطلوب ہے تاکہ اس کے اشخاص 'مقام واقعہ اور زمان واقعہ کی تفصیلات دی جائیں۔ یہاں اگر مکان و زمان کا تعین کر بھی لیا جائے تو بھی اس سے معنی و مطلب میں نہ اضافہ ہوتا ہے اور نہ کمی۔ یعنی واقعہ سے عبرت لینا۔

یہاں مقصود صرف یہ ہے کہ موت و حیات کے ظاہری اسباب اور ان اسباب سے بھی آگے اس کی اصل حقیقت کے بارے میں مسلمانوں کے نقطہ نظر کو درست کر دیا جائے۔ اور یہ بتا دیا جائے کہ موت و حیات کا فیصلہ اس دنیا میں نہیں ہوتا۔ یہ فیصلے قادر مطلق اور مدبر الکون کرتا ہے۔ اور یہ کہ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کے نوشتہ پر مکمل اطمینان کر لینا چاہئے۔ اور اس باب میں انسان کو بغیر کسی خوف و خطر اور بغیر کسی جزع و فزع کے اپنے فرائض سرانجام دینے چاہئیں۔ تقدیریں لکھنے والا موجود ہے اور زندگی اور موت کا آخری فیصلہ صرف اس کے ہاتھ میں ہے۔

یہاں مقصد یہ کہنا ہے کہ موت کے ڈر سے موت ٹل نہیں جاتی اور جزع و فزع کرنے سے 'چیخنے پکارنے سے' زندگی میں اضافہ نہیں ہو جاتا' نہ ان سے قضائے الٰہی ٹل سکتی ہے۔ نہ اجل ان سے ذرا بھی موخر ہو سکتی ہے۔ اللہ ہی ہے جو زندگی عطا کرتا ہے۔ وہی زندگی کی بخشش کرتا ہے اور وہی ہے جو زندگی واپس لے لیتا ہے۔ دونوں حالات میں اس کا فضل انسان کے شامل حال ہوتا ہے۔ لیتا ہے پھر اس کا فضل ہے اور اگر دیتا ہے پھر فضل ہے۔ زندگی دینے کے پس منظر میں اور زندگی نہ دینے کے پس منظر میں دونوں حالات میں اس کی عظیم حکمت عملی کارفرما ہوتی ہے۔ ان دونوں حالات میں لوگوں کی مصلحت ہے۔ دونوں صورتوں میں لینے میں اور دینے میں اللہ کا فضل ہمارے شامل حال ہوتا ہے: إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ○ "حقیقت یہ ہے کہ اللہ انسان پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔"

ان لوگوں کا جمع ہونا' پھر ہزاروں کی تعداد میں جمع ہونا' پھر اپنے گھروں سے نکل پڑنا اور موت کے ڈر سے نکل پڑنا لازماً ایسے حالات میں جزع و فزع' ہائے ہو کا عالم ہو گا۔ ان کا یہ بھاگنا کسی جنگجو دشمن کے ڈر سے ہو یا کسی سخت وبائی بیماری کے پھوٹ پڑنے کی وجہ سے ہو' چاہے وجہ جو بھی ہو' اس سے موت کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا اللہ نے فرمایا: مر جاؤ۔"

اللہ تعالیٰ نے کس طرح انہیں کہا؟ وہ کس طرح مر گئے؟ کیا وہ اسی مصیبت کی وجہ سے مر گئے' جس کی وجہ سے نکلے تھے یا وہ کسی دوسرے ایسے سبب کی وجہ سے مر گئے جس کا انہیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اس کی کوئی تفصیل قرآن مجید نے نہیں دی ہے۔ کیونکہ ان تفصیلات کی اس مقصد کے لئے کوئی ضرورت نہ تھی یعنی عبرت انگیزی۔ بتانا یہ ہے کہ جزع و فزع اور خوف و ہراس کی وجہ سے وہ اس چیز سے بچ نہ سکے جس کی وجہ سے وہ بھاگ رہے تھے۔ وہ موت سے بچ نہ سکے اور اللہ کے فیصلے کو رد کرنے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ اگر وہ اللہ کی طرف لوٹ آتے اور صبر و ثبات اور سنجیدہ رویہ اختیار کرتے تو یہ زیادہ بھلا ہوتا۔

ثُمَّ اَحْيَاهُمْ "پھر اس نے ان کو دوبارہ زندگی بخشی۔" کس طرح اس نے ان لوگوں کو زندہ کر دیا؟ کیا انہی لوگوں کی موت کے بعد معجزانہ طور پر زندہ کر دیا گیا۔ یا ان کی نسلوں سے ایسے لوگ پیدا کئے جو طاقتور اور بہادر تھے اور آباؤ اجداد کی طرح آہ و بکا کرنے والے نہ تھے۔ ان باتوں کی تفصیل بھی قرآن مجید نے پیش نہیں فرمائی۔ اس لئے ہمیں بھی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم اس کی تشریح میں طرح طرح کی تاویلات شروع کر دیں اور بے سند روایات کے انباروں میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو گم کر دیں' جیسا کہ بعض تفاسیر میں ذکر ہوا ہے۔ جو کچھ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے' وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے' بغیر کسی جدوجہد و مشقت کے ان کو دوبارہ زندگی دے دی' حالانکہ انہوں نے موت سے بچنے کے لئے جو آہ و بکا کیا تھا' اس سے ان کی موت رک نہ سکی۔

خلاصہ یہ ہے کہ آہ و بکا اللہ کے فیصلے کو نہیں روک سکتی۔ جزع و فزع سے زندگی محفوظ نہیں ہو جاتی۔ زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور یہ ایک شخص کو اس کی اپنی جدوجہد کے بغیر ہی دی جاتی ہے۔ اگر یہ ہے حقیقت تو پھر بزدلو! تمہاری آنکھیں نیند کے لئے ترس جائیں اور تمہیں کبھی چین نہ ملے:

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۴۴﴾

"اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور خوب جان رکھو کہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔" یہاں اس حادثے کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے' بلکہ اس کی مغز سامنے آ جاتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی نسلوں میں سے پہلی نسل کے سامنے اس واقعہ کو کس غرض کے لئے بیان کیا گیا تھا۔ یہ کہ کہیں زندگی کی محبت کی وجہ سے کہیں تم گھروں ہی میں نہ بیٹھ جاؤ۔ موت کے ڈر سے کہیں پیچھے نہ ہٹ جاؤ۔ ان وجوہات سے کہیں جہاد فی سبیل اللہ ترک نہ کرو۔ موت و حیات تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور تم صرف اللہ کی راہ میں لڑو۔ کسی اور مقصد کے لئے نہ لڑو۔ صرف اللہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاؤ اور اس کے سوا تمام جھنڈوں کو ترک کر دو۔ اس کی راہ میں لڑو اور یاد رکھو وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ "خوب جان رکھو کہ وہ سنتا ہے اور جانتا ہے۔" ———— وہ بات سنتا ہے اور اس کے پس منظر کو بھی جانتا ہے۔ وہ سنتا ہے' اور دعا قبول کرتا ہے" اور یہ بھی جانتا ہے کہ انسان کی زندگی اور اس کے قلب و نظر کے لئے کیا مفید ہے اور کیا نہیں ہے۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اپنی جدوجہد جاری رکھو۔ تمہارا کوئی عمل بھی ضائع نہ ہو گا۔ اور وہی ہے جو زندگی دیتا ہے اور وہی ہے جو زندگی واپس لیتا ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ قربانی اور خرچ کا دوسرا نام ہے۔ قرآن مجید کے اکثر مقامات میں جہاد و قتال کے ساتھ ساتھ مال خرچ کرنے اور انفاق

فی سبیل اللہ کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ بالخصوص حضور ﷺ کے دور میں تو انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت اور زیادہ اس لئے تھی کہ آپ ﷺ کے دور میں جبکہ جہاد فی سبیل اللہ میں لوگ رضاکارانہ طور پر حصہ لیتے تھے اور مجاہدین اپنا خرچہ خود برداشت کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ وہ جذبہ جہاد سے تو سرشار ہوتے تھے لیکن وہ مال سے محروم ہوتے تھے اور ان کے پاس اسلحہ اور سواری نہ ہوتی۔ اس لئے نادار مجاہدین کی سہولیات کے لئے ضروری تھا کہ لوگوں کو بار بار انفاق فی سبیل اللہ کی طرف متوجہ کیا جاتا رہے۔ اس لئے قرآن مجید بہت ہی موثر انداز میں انفاق کی دعوت دیتا ہے :

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۴۵

”تم میں سے کون ہے' جو اللہ کو قرض حسن دے تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کر دے۔ گھٹانا بھی اس کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی' اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔“

جس طرح موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اگر اللہ نے زندگی لکھی ہوئی ہے تو موت آہی نہیں سکتی' اسی طرح مال انفاق فی سبیل اللہ سے نہیں جاتا۔ وہ تو اللہ میاں کے نام قرض حسن ہوتا ہے۔ اللہ اس کا ضامن ہے اور وہ اس قرض کو بڑھا چڑھا کر کئی گنا دے گا۔ دنیا میں بھی ایسے شخص کا مال بڑھے گا اسے سعادت و برکت نصیب ہوگی اور آخرت میں بھی سکون اور راحت نصیب ہوگی۔ اور آخرت میں تو ایسے شخص کے لئے بے شمار ساز و سامان اور انعام و اکرام ہوگا۔ اسے اللہ کا قرب نصیب ہوگا اور اللہ راضی ہوگا۔

انسان حرص اور بخل کی وجہ سے غنی نہیں ہوتا۔ غنا و فقر تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ انفاق اور خرچ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے :

وَ اللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ ”گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی۔“

اور آخر کار تم سب نے اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ جب تم چار و ناچار اللہ کی طرف روانہ ہوگے اور اس دنیا سے رخصت ہوگے تو اس وقت تمہیں مال و دولت سے کیا فائدہ ہوگا : وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ”اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔“ اگر اسی کی طرف بہرحال جانا ہے تو پھر موت سے ڈرنا کیا؟ جزع و فزع سے کیا حاصل؟ نہ موت کا ڈر اس لئے کہ اللہ کی طرف تو جانا ہے۔ نہ فقر و مسکنت کا ڈر' اس لئے کہ بہرحال اس دنیا کو چھوڑ کر جانا ہی ہے۔ تو پھر مومنین کو چاہئے کہ وہ اللہ کی راہ میں زور و شور کے ساتھ جہاد شروع کریں۔ وہ جان بھی پیش کریں اور مال بھی۔ وہ یقین کر لیں کہ اس دنیا میں ان کے گنے چنے سانس ہیں۔ زندگی محدود ہے۔ ان کا رزق مقرر ہے۔ ان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ جرأت و بہادری کی زندگی گزاریں۔ شریفانہ اور آزادانہ زندگی بسر کریں۔ آخر کار جانا انہوں نے اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے ہے۔

ان آیات کی تشریح' ایمانی ہدایات کی توضیح اور تربیتی ہدایات کے اظہار کے بعد مناسب ہے کہ قرآن مجید کے حسن ادا اور اظہار خیال کی فنی خوبیوں کو بھی کچھ وقت دیں۔ مناسب نہیں کہ یوں ہی گزر جائیں اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ”کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا؟ جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے۔“ انداز تعبیر ایسا ہے' جیسا کہ یہ لوگ ہزارہا کی تعداد میں صفیں باندھے کھڑے ہیں اور ان کا معائنہ ہو رہا ہے۔ (جس طرح گارڈ آف آنر کا معائنہ ہوتا ہے) قرآن نے صرف دو الفاظ استعمال کر کے ان لوگوں کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے اَلَمْ تَرَ کیا آپ نے نظر نہیں ڈالی۔ ان دو الفاظ کے سوا' کوئی اور انداز

تعبیر وہ نقشہ نہیں کھینچ سکتا تھا جو ان دو الفاظ نے پردۂ تخیل پر منقش کر دیا۔ یوں لگتا ہے کہ گویا یہ لوگ صف بستہ سامنے کھڑے ہیں اور ہم انہیں دیکھ رہے ہیں۔

ان کی حالت یہ ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ گھروں سے نکل پڑے ہیں' ڈرے سہمے' پھٹی پھٹی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں۔ اب قرآن مجید صرف ایک لفظ استعمال کرتا ہے اور یہ تمام لوگ میدان معائنہ کی بجائے اب میدان مقتل میں پہنچ جاتے ہیں۔ گویا گارڈ آف آنر کا معائنہ کرنے والا حاکم مطلق ایک کاشن دیتا ہے مُوْتُوْا "مرجاؤ" اور سب ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ اب منظر یہ ہے کہ گارڈ آف آنر کی صفوں کی بجائے میدان میں لاشے بکھرے پڑے ہیں۔ ان کا یہ ڈر انہیں کام نہیں دیتا۔ ان کا یہ اجتماع عظیم ان کے لئے مفید ثابت نہیں ہوتا۔ تمام تر کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ صرف ایک لفظ سنائی دیتا ہے' مُوْتُوْا "مرجاؤ" اور نقشہ بدل جاتا ہے۔ اس لفظ سے احساس دلایا جاتا ہے کہ موت کے سامنے بند نہیں باندھے جا سکتے۔ تمہارا طرز عمل غلط ہے۔ یہ لفظ بتاتا ہے کہ اللہ کے فیصلے کاشن کی طرح نافذ ہوتے ہیں۔ ادھر لفظ نکلتا ہے' ادھر اس پر عمل ہو جاتا ہے۔ جس طرح پریڈ کے میدان میں ہوتا ہے۔

ثُمَّ اَحْيَاهُمْ "پھر ان کو زندہ کر دیا۔" کیونکر؟ اس کی کوئی تفصیل یہاں نہیں۔ اللہ قادر ہے' مالک ہے۔ موت و حیات کی زمام اس کے ہاتھ میں ہے۔ بندوں کے ہر معاملے میں وہ خود متصرف ہے۔ اس کا کوئی ارادہ مسترد نہیں ہو سکتا۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ یہ انداز تعبیر ہی بتا دیتا ہے کہ اللہ کے ہاں موت و حیات کے فیصلے کس طرح ہوتے ہیں اور امر الٰہی کے نفاذ کا منظر کیا ہوتا ہے۔ یوں جیسے پریڈ کا میدان اور کاشن پر کاشن۔

اوپر ہمارے پردۂ تخیل پر موت و حیات کا منظر تھا۔ روح کو مٹھی میں لے لینے' قبض کرنے اور پھر یکلخت اسے آزاد کرنے کے مناظر تھے۔ اس کے متصلاً بعد جب رزق کا معاملہ آتا ہے تو قرآن مجید اس کے لئے قبض اور بسط کے الفاظ استعمال کرتا ہے وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ "اللہ مٹھی بند کرتا ہے اور کھولتا ہے۔" تنگی رزق و فراخی رزق کی یہ تعبیر اس لئے اختیار کی تاکہ قبض روح اور اعادۂ روح کے سابقہ مضامین سے متناسق الفاظ آجائیں۔ دونوں جگہ الفاظ کا اختصار' معانی کا استحضار قرآن مجید کا ایک عظیم الشان اعجاز ہے۔

ایک طرف عجیب منظر کشی ہے۔ دوسری طرف استعمال الفاظ میں عجیب تناسق اور ہم آہنگی ہے۔ معانی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور حسن ادا کی تو کوئی انتہا نہیں ہے۔

اب قرآن مجید دوسرا تجربہ امت مسلمہ کے سامنے رکھتا ہے۔ اس کے کردار بنی اسرائیل ہیں۔ واقعہ حضرت موسیٰ کے زمانہ مابعد کا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۲۴۶

"پھر تم نے اس معاملے پر غور کیا' جو موسیٰ کے بعد سرداران بنی اسرائیل کو پیش آیا تھا؟ انہوں نے اپنے نبی سے کہا ہمارے لئے

ایک بادشاہ مقرر کردو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ نبی نے پوچھا! کیا کہیں ایسا تو نہ ہو گا کہ تم کو لڑائی کا حکم دیا جائے اور پھر تم نہ لڑو؟ وہ کہنے لگے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہ خدا میں نہ لڑیں' جبکہ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور ہمارے بال بچے ہم سے جدا کر دیئے گئے ہیں؟ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا' تو ایک قلیل تعداد کے سوا وہ سب پیٹھ موڑ گئے' اور اللہ ان میں سے ایک ایک ظالم کو جانتا ہے۔"

کیا تو نے نہیں دیکھا گویا یہ ابھی ابھی کا واقعہ ہے اور دیکھا ہوا منظر ہے۔ بنی اسرائیل کے سردار جمع ہوئے ہیں۔ ان کے اکابرین اور اہل الرائے کا ایک عظیم اجتماع ہے۔ وہ اپنے نبی وقت کے پاس آتے ہیں۔ سیاق کلام میں نبی کا نام بھی نہیں لیا جاتا' اس لئے کہ مقصد قصہ گوئی نہیں ہے۔ اگر نبی کا نام لیا جائے تو اس سے اس قصے کی مقصدیت میں کوئی اضافہ نہیں ہو جاتا۔ بنی اسرائیل میں نبیوں کی کثرت تھی ان کی طویل تاریخ میں بے شمار نبی مبعوث ہوئے۔ غرض یہ سردار اور یہ امراء جمع ہیں۔ وہ نبی وقت سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ ان کے اوپر ایک بادشاہ مقرر فرمادیں' جس کی کمانڈ میں وہ فی سبیل اللہ جہاد کریں۔ اس جنگ کے لئے وہ فی سبیل اللہ کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جنگ کی نوعیت کا اظہار بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں ایمان نے کروٹ لی ہے۔ ایمان پیدا ہو کر کھڑا ہو گیا اور اپنے آپ کو جھاڑ کر اقدام کے لئے تیار ہو گیا۔ ان کا یہ شعور زندہ ہو گیا کہ وہ تو ایمان اور نظریۂ حیات کے حاملین ہیں۔ وہ تو حق اور سچائی کے علمبردار ہیں۔ ان کے دشمن ضلالت' کفر اور باطل کے علمبردار ہیں۔ ان کے سامنے اب ایک منزل ہے' جہاد فی سبیل اللہ کی منزل۔

غرض مقصد کی یہ وضاحت' مقصد کا تعین اور مقصد کی قطعیت سے کامرانی اور فتح مندی کی نصف منزل طے ہو جاتی ہے۔ اس لئے مومن کے ذہن میں سب سے پہلے یہ بات واضح ہو کر بیٹھ جانی چاہئے کہ وہ حق پر ہے اور اس کا دشمن باطل پر ہے۔ اس کے شعور میں مقصد متعین ہو۔ خالص اللہ کے لئے ہو۔ اس میں کسی دوسری چیز کی آمیزش نہ ہو اور نہ ہی اس میں کوئی التباس ہو جس کی وجہ سے اسے معلوم نہ ہو کہ وہ کدھر جا رہا ہے؟

نبی نے چاہا کہ وہ نیت کی پختگی اور عزم کی سچائی کے بارے میں تسلی کر لیں۔ معلوم کر لیں کہ آیا وہ اس قدر عظیم ذمہ داری کے اٹھانے کا قابل ہونا بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ وہ اس معاملے میں سنجیدہ ہیں۔ سوچ سمجھ کر مطالبہ کر رہے ہیں: قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا "نبی نے پوچھا! کہیں ایسا تو نہ ہو گا کہ تم کو لڑائی کا حکم دیا جائے اور پھر تم نہ لڑو۔" کیا ایسا ممکن ہے کہ تم پر جہاد فرض کر لیا جائے اور تم اس سے پیٹھ پھیر لو؟ اب تو تم آزاد ہو۔ جہاد کرو نہ کرو۔ لیکن اگر اللہ میاں تمہارے اس مطالبے کو مان لیتے ہیں اور تم کو جہاد کا حکم دے دیا جاتا ہے تو پھر یہ تم پر فرض ہو جائے گا۔ پھر تم انکار نہ کر سکو گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک نبی کو ایسا ہی سوال کرنا چاہئے تاکہ وہ معاملہ کی تاکید و توثیق کرے۔ انبیاء کے کلمات اور ان کی باتیں مذاق نہیں ہوا کرتیں۔ ان کے احکام میں نہ تردد ہوتا ہے اور نہ ہی ذرہ بھر تاخیر ہو سکتی ہے۔

نبی وقت کے اس استفسار پر ان کا جوش و خروش عروج تک پہنچ گیا۔ سرداران نے بتایا کہ جنگ ناگزیر ہو چکی ہے۔ اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں رہا ہے۔ درستی حالات کا مدار اب صرف جہاد اور جہاد فی سبیل اللہ پر ہے۔ جنگ متعین ہے اور اس میں تردد کی کوئی گنجائش نہیں قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا "کہنے لگے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہ خدا میں نہ لڑیں جبکہ ہمیں اپنے گھروں سے نکالا گیا ہے اور ہمارے بال بچے ہم سے جدا کر دیئے گئے ہیں؟" معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں بات واضح ہے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ جنگ ضروری ہے۔ ان کے دشمن اللہ کے دشمن ہیں۔ اللہ کے دین کے دشمن

ہیں- انہیں گھروں سے نکال دیا گیا ہے- ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا گیا ہے- اس لئے ان دشمنوں کے ساتھ جنگ کرنا واجب ہے- بلکہ ان کے سامنے واحد راستہ ہی یہ ہے کہ وہ ان دشمنان حق کے ساتھ جنگ کریں- اس لئے اس سلسلے میں ان سے بار بار پوچھنا اور تکرار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے- یہ تو عزم صمیم ہے اور ہم یہ عزم کئے ہوئے ہیں-

لیکن یہ وقتی بہادری' اور حالات امن کی یہ جرأت' زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی- قرآن مجید جلد ہی تصویر کا دوسرا رخ سامنے کر دیتا ہے فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ "مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا تو ایک قلیل تعداد کے سوا وہ سب پیٹھ موڑ گئے-"

یہاں آکر بنی اسرائیل کی ایک اہم خصوصیت معلوم ہو جاتی ہے- اپنی تاریخ میں وہ سخت وعدہ خلاف رہے ہیں' عہد کر کے فوراً پھر جائیں گے- جب حکم دیا جائے تو اطاعت سے پہلوتہی کریں گے- فرائض کی ادائیگی میں پیچھے رہتے ہیں- حق سے منہ موڑتے ہیں اور باہمی اختلاف ان کا شعار ہوتا ہے- لیکن یہ صفات ہر اس جماعت میں پائی جاتی ہیں جن کی ایمانی تربیت مکمل نہ ہوئی ہو- جن کو دیر تک گہری اور اعلیٰ معیار کی تربیت سے گزارا گیا ہو- یہ ایک ایسی کمزوری ہے' جس پر تحریک کی قیادت کو خبردار رہنا چاہئے اور اس کی فکر کرنی چاہئے- مشکلات راہ میں اس کا خیال رکھنا چاہئے- یہ نہ ہو کہ مشکلات میں یہ کمزوریاں سامنے آجائیں اور معاملات مشکل ہو جائیں- ایسے حالات میں ان تمام انسانی جماعتوں کو پیش آتے رہتے ہیں جن کی صفوں میں ابھی تک کمزور لوگ موجود ہوں اور جن کو پگھلا کر میل کچیل سے صاف نہ کیا گیا ہو-

اس روگردانی پر اللہ تعالیٰ صرف یہ تبصرہ فرماتے ہیں وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ "اللہ ان میں سے ایک ایک ظالم کو جانتا ہے-" یہ بنی اسرائیل کے لئے سخت نکیر ہے- ان لوگوں نے پہلے جہاد کا مطالبہ کیا- جہاد فرض کیا گیا اور قبل اس کے کہ یہ لوگ میدان جہاد کو جائیں' انہوں نے انکار کر دیا- حالانکہ تعداد میں یہ بہت زیادہ ہیں- بہت ہی ذلیل ہیں یہ لوگ- ذلت کے ساتھ ساتھ ظالم بھی ہیں- اپنے نفس کے لئے بھی ظالم' نبی کے لئے بھی ظالم' حق کے لئے بھی ظالم- انہوں نے حق کو پہچانا اور پھر اسے اہل باطل کے ہاتھوں ذلیل ہونے دیا-

جو شخص سچائی کو پہچان لے اور یقین کرے کہ وہ حق پر ہے- یہ جان لے کہ اس کا دشمن باطل پر ہے- جس طرح بنی اسرائیل کے سرداروں نے جان لیا تھا' اور نبی سے مطالبہ کر دیا تھا کہ وہ ان کے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دے تاکہ اس کی سرکردگی میں وہ دشمنوں سے' اللہ کی خاطر جنگ کریں اور پھر یہ شخص پیٹھ پھیر لے اور دشمن کے مقابلے میں علم جہاد نہ بلند کرے اور نہ ہی تکالیف اٹھائے' سب کچھ جانتے ہوئے تو یہ شخص ظالم ہے' اور اسے اس ظلم کی سزا دی جائے گی- وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ "اور اللہ ایک ایک ظالم کو جانتا ہے-"

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٧﴾

"ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارے لئے بادشاہ مقرر کیا ہے- یہ سن کر وہ بولے: "ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے

حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے۔" نبی نے جواب دیا "اللہ نے تمہارے مقابلے میں اس کو منتخب کیا ہے اور اس کو دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے' اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے۔"

اس بحث و تکرار اور سوال و جواب سے بنی اسرائیل کی ایک اور خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے' جس کا تذکرہ اس سورت میں بارہا ہوا ہے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ان کے لئے ایک بادشاہ مقرر ہو' جس کی قیادت میں رہ کر' وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کریں' لیکن بادشاہ کے تقرر کا اعلان ہوتے ہی انہوں نے سرجھکالئے گردنیں پھیرلیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے بادشاہ کی تقرری اور نبی کی جانب سے اس کی اطلاع پر اس معاملے میں بحث و تکرار میں مشغول ہو گئے۔ طالوت کی بادشاہت پر ناک بھنویں چڑھانے لگے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہ طالوت کے مقابلے میں اپنے آپ کو موروثی طور پر زیادہ مستحق رکھتے ہیں۔ طالوت ایک تو شاہی خاندان سے نہ تھا' دوسرے یہ کہ وہ کوئی دولت مند آدمی نہ تھا کہ دولت کی بناپر وراثت کے استحقاق کو نظرانداز کر دیا جائے۔ غرض یہ تاریک خیالی اور یہ لجاجت بنی اسرائیل کی مستقل خصوصیت ہے۔

نبی وقت نے بتایا کہ وہ ذاتی خصوصیات کی وجہ سے زیادہ مستحق ہے اور یہ کہ اس کے انتخاب میں یہ حکمت کارفرما ہے : قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ وَ اللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ "اللہ نے تمہارے مقابلے میں اس کو منتخب کیا ہے اور اس کو دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے' اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے۔"

وہ ایک ایسا شخص ہے جسے اللہ نے چنا ہے۔ یہ تو اس کی صفت ہے۔ اس کو دماغی اور جسمانی قابلیتیں دی ہیں۔ یہ اس کی دوسری ترجیح ہے اور پھر اللہ جسے چاہے اپنا ملک عطا کر دے۔ وہ اس کا ملک ہے۔ دنیا اس کی ہے۔ وہ متصرف و مختار ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چن لے۔ وہ بڑی وسعت والا ہے۔ بڑے علم والا ہے۔ اس کے فضل و کرم پر کوئی خازن مقرر نہیں۔ اس کی داد و دہش کے لئے کوئی حد و قید نہیں ہے۔ وہی جانتا ہے کہ بھلائی کس میں ہے؟ وہی جانتا ہے کہ کس موقع پر کیا فیصلہ بہتر ہے؟

یہ ایسے معاملات ہیں جن کے بارے میں ایک مسلمان کا نقطہ نظر درست ہونا چاہئے۔ اور اس کا ذہن کدورت سے صاف ہونا چاہئے۔ لیکن کیا کیا جائے معاملہ بنی اسرائیل سے آپڑا ہے۔ ان کے نبی اس بات سے خوب واقف ہیں۔ نبی وقت جانتا ہے کہ بنی اسرائیل کا مزاج ان بلند حقائق کا متحمل ہی نہیں ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ فہمائش کے لئے وقت نہیں ہے۔ معرکہ حق و باطل سرپر ہے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ وقت کی کمی کے باعث ان کے سامنے ایک ایسا معجزہ ظاہر کر دیا جائے جس سے ان کے دل نرم ہو جائیں۔ وہ بے حد متاثر ہوں اور انہیں اس قیادت پر اطمینان ہو جائے اور وہ یقین کر لیں :

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ۳۲ ع۶ ۱۶

"ان کے نبی نے کہا خدا کی طرف سے اس کے بادشاہ مقرر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے عہد میں وہ صندوق تمہیں واپس مل جائے گا' جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لئے سکون قلب کا سامان ہے' جس میں آل موسیٰ اور آل ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں اور جس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں۔ اگر تم مومن ہو تو یہ تمہارے لئے بہت بڑی نشانی ہے۔"

تیہ کی سرگردانی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے زمانہ مابعد میں یہ اس دور کا واقعہ ہے جبکہ حضرت یوشع نبی تھے۔ اس دور میں بنی اسرائیل کے دشمنوں نے ان پر حملہ کیا۔ ان سے ان کا علاقہ بھی چھین لیا اور وہ تبرکات بھی چھین لئے جو ان کے پاس ایک بکس میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے خاندانوں سے محفوظ چلے آ رہے تھے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ اس بکس میں تورات کا وہ نسخہ بھی محفوظ تھا' جو کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے دیا گیا تھا۔ نبی وقت نے اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علامت قرار دیا کہ یہ معجزہ تمہارے سامنے رونما ہو گا۔ یہ بکس تمہارے پاس لوٹ آئے گا۔ فرشتے اسے اٹھائے ہوئے ہوں گے تاکہ ان کے دلوں پر اطمینان کی بارش ہو جائے۔ نبی وقت نے فرمایا کہ یہ معجزہ اس بات کا شاہد صادق ہو گا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا ہے بشرطیکہ تمہارے دلوں میں ایمان ہو۔

سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معجزہ رونما ہوا اور تب جا کر ان لوگوں کو یقین ہوا کہ طالوت اللہ کی جانب سے مقرر ہیں۔

اب طالوت نے ان لوگوں کو منظم کیا' جنہوں نے جہاد میں شریک ہونے سے انکار نہ کیا تھا' اور انہوں نے نبی وقت کے ساتھ جو پختہ عہد کیا تھا' وہ اس پر قائم تھے۔ یہ سب باتیں قرآن مجید نے' اپنے اسلوب قصص کے عین مطابق ترک کر دیں۔ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ کسی قصے کے ایک منظر کے بعد متصلاً دوسرا منظر پیش کر دیتا ہے۔ اور درمیان کی غیر ضروری کڑیاں چھوڑ دیتا ہے۔ (۱) چنانچہ یہاں بھی جو منظر پیش ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت طالوت لشکر اسلام کو لے کر دشمن کی طرف مارچ کر رہے ہیں:

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ ۙ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۖ وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ ۚ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ۚ

"پھر جب طالوت لشکر لے کر چلا' تو اس نے کہا:" ایک دریا پر اللہ کی طرف سے تمہاری آزمائش ہونے والی ہے۔ جو اس کا پانی پئے گا وہ میرا ساتھی نہیں۔ میرا ساتھی صرف وہ ہے کہ جو اس سے پیاس نہ بجھائے ہاں ایک آدھ چلو کوئی بھر لے' تو پی لے مگر ایک گروہ قلیل کے سوا وہ سب اس دریا سے سیراب ہوئے۔"

یہاں پہلے قدم پر ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کا انتخاب کیوں فرمایا تھا۔ وہ ایک سخت معرکہ سر کرنے جا رہے تھے' لیکن ان کے ساتھ جو فوج تھی وہ شکست خوردہ لوگوں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ اپنی طویل تاریخ میں بار بار ہزیمت اٹھا چکے تھے۔ اور بار بار ذلت اٹھانے کے خوگر ہو گئے تھے۔ اور مقابلہ ایک فاتح اور غالب قوم کی فوج کے ساتھ تھا۔ اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ اس ظاہری شان و شوکت والی فوج کے مقابلے میں ایک ایسی فوج لے کر جائیں جن کے ضمیر قوت' پوشیدہ قوت سے بھرے ہوئے ہوں' یہ پوشیدہ قوت' قوت ارادی ہی ہو سکتی ہے۔ اتنا پختہ ارادہ کہ وہ ہر خواہش اور ہر رجحان کو ضبط کر سکے۔ وہ محرومیت اور شدائد کے مقابلے

(۱) دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن

میں چٹان کی طرح کھڑا ہو سکے۔ جو ضروریات اور لازمی حاجات سے بھی بلند ہو جائے۔ وہ اطاعت حکم کو ترجیح دے اور اس سلسلے میں مشکلات اور تکلیفات کو انگیز کرے۔ آزمائش کے بعد آزمائش سے گزرتا چلا جائے' لہٰذا اس چنے ہوئے' اللہ کے پسند کئے ہوئے کمانڈر کا فرض تھا کہ وہ اپنی فوج کی قوت ارادی کو آزمائے۔ اس کی ثابت قدمی اور صبر کو پرکھے کہ کس حد تک وہ خواہشات نفس اور مرغوبات کے مقابلے میں ٹھہر سکتے ہیں۔ کس قدر وہ ضروریات زندگی سے محرومی اور مشکلات کو برداشت کر سکتے ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ کمانڈر نے یہ حکم فوج کو اس وقت دیا جبکہ وہ سخت پیاسے تھے۔ پیاس سے نڈھال ہو رہے تھے۔ یہ جاننے کے لئے کہ کون ہے جو صبر کرتا ہے اور کون ہے جو پیٹھ پھیر کر واپس ہو جاتا ہے' الٹے پاؤں پھرتا ہے اور کنج عافیت میں بیٹھ جاتا ہے چنانچہ اس مختار کمانڈر کی فراست صحیح ثابت ہوئی۔

فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ "ایک گروہ قلیل کے سب اس سے سیراب ہوئے۔" انہوں نے پیا لیکن خوب پیٹ بھر کر حالانکہ ان کو اجازت یہ دی گئی تھی کہ وہ صرف ہاتھ سے ایک آدھ چلو بھر کر پی لیں۔ اس قدر کہ پیاس کی تیزی ختم ہو جائے۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو کہ وہ واپس ہونا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی اکثریت نے گویا ہتھیار ڈال دیے۔ پیاس کے سامنے' اور پیٹھ پھیر لی دشمن سے' اس لئے یہ جدا ہو گئے۔ یہ اس قابل ہی نہ تھے کہ طالوت اور اس کے ساتھیوں کے ذمہ جو مہم سر کرنی تھی اس میں ان کو شریک کیا جائے۔ بہتری اسی میں تھی۔ دانشمندی یہی تھی کہ وہ اس فوج سے الگ ہو جائیں جس نے فی الواقعہ جنگ لڑنی ہے۔ یہ دراصل کمزوری' شکست اور ناکامی کا بیج تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ فوج کی کامیابی عظیم تعداد کی وجہ سے نہیں ہوا کرتی بلکہ پختہ ارادے اور مضبوط ایمان' مضبوط دل اور مستقل مزاجی سے ہوا کرتی ہے۔

اس تجربے سے معلوم ہوا کہ صرف چھپی ہوئی نیت ہی کافی نہیں بلکہ عملی تجربہ بھی ضروری ہے۔ میدان جنگ میں قدم رکھنے سے پہلے اس راہ کے نشیب و فراز سے واقفیت ضروری ہے۔ اس تجربے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے جو قائد چنا تھا وہ کس قدر اولوالعزم تھا۔ اس کی ہمت کی بلندی تو دیکھو کہ اکثر لوگوں نے اعلان جہاد کے وقت ہی انکار کر دیا لیکن اس کا ارادہ متزلزل نہ ہوا۔ پھر پہلے تجربے ہی میں اس کی فوج کی اکثریت ناکام رہی اور انہوں نے پیٹھ پھیر لی۔ لیکن وہ ثابت قدم رہا اور اپنی راہ پر گامزن رہا۔

یہاں پہلے تجربے نے جیش طالوت کو اگرچہ چھان کر رکھ دیا تھا' کمزور لوگ اگرچہ الگ ہو گئے تھے لیکن اب بھی تجربات کا سلسلہ جاری ہے:

فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ

"پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی مسلمان دریا پار کر کے آگے بڑھے تو انہوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔" اب یہاں آکر فی الواقعہ وہ ایک قلیل تعداد میں رہ گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دشمن کے پاس ایک عظیم قوت ہے۔ جالوت جیسا کمانڈر اس کی قیادت کر رہا ہے۔ وہ مومن ہیں انہوں نے اپنے نبی کے ساتھ جو عہد کیا تھا' اس پر وہ اب بھی قائم ہیں۔ لیکن وہ اپنی آنکھوں سے حالات کو دیکھ رہے ہیں' وہ صدق دل سے محسوس کر رہے ہیں کہ وہ اس عظیم قوت کے ساتھ مقابلے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ اب یہ آخری اور فیصلہ کن تجربہ ہے۔ یہ تجربہ کہ کون دنیا کی ظاہری قوت پر بھروسہ کرتا ہے اور کون ہے جو ظاہری قوت کے مقابلے میں اللہ کی عظیم قوت پر بھروسہ کرتا ہے۔ ایسے معاملات میں صرف وہ لوگ ہی ثابت رہ سکتے ہیں جن کا ایمان مکمل ہو چکا ہو' ان کے دل اللہ تک پہنچ چکے ہوں۔ ان کی قدریں بدل چکی ہوں۔ وہ خیر و شر کا امتیاز اپنے ایمان کی روشنی میں متعین کرتے ہوں' ان ظاہری حالات کی روشنی میں نہیں جن میں عوام الناس گرفتار ہوتے ہیں۔

یہاں آکر اب وہ مٹھی بھر گنے چنے اہل ایمان کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ وہ لوگ جن کی تعداد کا تعین ایمان کی روشنی میں ہوتا ہے۔ جن کا پیمانہ ظاہر بین کے پیمانوں سے مختلف ہوتا ہے:

قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

”لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں اللہ سے ملنا ہے انہوں نے کہا بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔“ یہ ہے اصول ان لوگوں کا جنہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ ایک دن اللہ کے سامنے پیش ہوں گے' کہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ کم لوگ کثیر تعداد پر غالب آگئے ہیں۔ اس لئے کہ وہ مصائب و شدائد کے مختلف مراحل سے گزر کر' کٹھن حالات سے دوچار ہو کر' مقام برگزیدگی اور مقام عالی پر فائز ہو چکے ہوتے ہیں اور غالب اس لئے ہوتے ہیں کہ طاقت کا سرچشمہ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ اس عظیم قوت تک رسائی پا چکے ہوتے ہیں' جو تمام قوتوں کا سرچشمہ ہوتی ہے' تمام قوتوں پر غالب ہوتی ہے جس کے احکام نافذ ہوتے ہیں جو اپنی مخلوق کے مقابلے میں جبار ہے' جو دنیا کے جباروں کو پاش پاش کر دیتی ہے' جو ظالموں کو ذلیل کر دیتی ہے اور بڑے بڑے گردن فرازوں پر غلبہ پا لیتی ہے۔

ان کو یہ کامیابی اللہ کے اذن سے ہوتی ہے' خود ان میں کوئی کمال نہیں ہوتا۔ اس کا حقیقی سبب اللہ میاں کی ذات برتر ہوتی ہے۔ **وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ** ”اس لئے کہ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہوتا ہے۔ وہ اس لئے کامیاب ہوتے ہیں کہ اذن الٰہی ایسا ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں کہہ کر یہ مٹھی بھر لوگ ثابت کر دیتے ہیں کہ یہ ہیں وہ لوگ جو معرکہ حق و باطل کے لئے چن لئے گئے ہیں۔

اب ہم اس کہانی کو لے کر ذرا آگے بڑھتے ہیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ نہایت ہی قلیل افراد پر مشتمل ایک گروہ ہے جسے یہ یقین ہے کہ وہ ایک دن اللہ کے سامنے پیش ہوں گے۔ اسے اس ملاقات کا پورا یقین ہے اور یہی یقین اس کی اس مصابرت کا سرچشمہ ہے۔ یہ گروہ اپنی قوت حکم الٰہی اور اذن اللہ میں تلاش کرتا ہے۔ اسے اللہ پر پورا پورا بھروسہ ہے' اس لئے اسے اپنی کامیابی کا پورا یقین ہے اور یہ گروہ ان لوگوں کے شانہ بشانہ کھڑا ہے جو اللہ کے ہاں صابرین کہلاتے ہیں۔ غرض یہ گروہ جو صابر ہے ثابت قدم ہے اور غیر متزلزل' ضعف و قلت کے باوجود خائف نہیں۔ یہ گروہ اچانک میدان معرکہ میں ایک عظیم قوت کے مقابلے میں کود پڑتا ہے اور فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ یہ تجدید عہد کرتا ہے۔ اس کے دل اللہ تک جا پہنچتے ہیں' صرف اللہ سے نصرت مانگتے ہیں اور اس ہولناک معرکے میں کود پڑتے ہیں۔

وَ لَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ

”اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلے پر نکلے تو انہوں نے دعا کی ”اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر' ہمارے قدم جما دے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر۔“ آخر کار اللہ کے اذن سے انہوں نے کافروں کو مار بھگایا اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور

اللہ نے اسے سلطنت اور حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کا چاہا علم دیا۔"

یہ ہے صحیح طریقہ "اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر۔" یہ ایسی تعبیر ہے جس سے فیضان صبر کا پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اللہ کی طرف سے فیضان اس طرح ہوتا ہے جس طرح ایک برتن بھر کر ان پہ انڈیل دیا جائے اور ان کا پیالہ دل اس سے لبریز ہو جائے۔ اس کے نتیجے میں ان پر طمانیت اور سکینت نازل ہو جاتی ہے اور وہ اس ہولناک معرکے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ "ہمارے قدم جمادے۔" اس لئے کہ قدم اس کے دست قدرت میں ہیں۔ وہی ہے جو ان کو اپنی جگہ ثابت کرتا ہے کہ متزلزل نہ ہوں' پھسلیں نہیں' جگہ چھوڑ کر ہٹ نہ جائیں۔ "اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب فرما۔" موقف واضح ہے ایمان کا مقابلہ کفر کے ساتھ ہے حق باطل کے مقابلے میں صف آراء ہے اسی لئے اللہ کو پکارا جاتا ہے کہ اللہ اپنے دوستوں کی مدد فرما' جو تیرے کافر دشمنوں کے مقابلے میں صف آرا ہیں۔ ان لوگوں کے ضمیر میں کوئی شک و شبہ نہیں' کوئی خلجان نہیں' ان کی فکر میں کوئی کھوٹ نہیں اور نصب العین کی صحت اور طریق کار کے تعین میں کوئی شک نہیں۔

نتیجہ وہی ہوا جس کے وہ منتظر تھے' جس کا انہیں پوری طرح یقین تھا فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللَّهِ آخر کار انہوں نے کافروں کو مار بھگایا "اللہ کے اذن سے" کا لفظ استعمال کر کے یہ بتایا جاتا ہے کہ فتح و نصرت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور مسلمانوں کو اس معاملے میں اپنا ذہن اچھی طرح صاف کر لینا چاہئے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کے اذن سے ہوتا ہے' اس قوت کی منشا کے مطابق ہوتا ہے جو اس کائنات کو چلا رہی ہے۔ مومن تو دراصل قدرت کا ایک ہاتھ ہیں۔ ان کے ذریعے اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے' وہ جو چاہتا ہے ان کے ذریعے نافذ کرتا ہے۔ وہ خود مختار نہیں ہیں نہ ان کے ہاتھ میں کوئی قدرت ہے۔ نہ ان کے پاس کوئی طاقت ہے۔ اللہ ان کے ذریعے اپنی مشیئت نافذ کرتا ہے۔ اس لئے وہ جو چاہتا ہے' ان کے ذریعے وہ چیز صادر ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ حقیقت جو مرد مومن کے دل کو ایمان' اطمینان اور یقین و سکون سے بھر دیتی ہے۔ مومن اللہ کا غلام ہے۔ اللہ نے اسے اہم رول ادا کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ اور یہ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اس اہم رول کے لئے مومنین کا انتخاب کیا ہے تاکہ وہ اس قدر اہم رول ادا کرے۔ یعنی وہ اللہ کی تقدیر کو حقیقت بنانے والا ہو۔ اس اہم رول کے لئے اسے چن لینے کے بعد اللہ مزید فضل و کرم کا اظہار یوں کرتا ہے کہ یہ اہم رول ادا کرنے کا اعزاز حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ اسے اس کا ثواب بھی عطا کرتا ہے۔ اگر اللہ کا یہ کرم نہ ہوتا تو ہرگز ایسا نہ کرتا۔ اور اگر اللہ کی کرم نوازی نہ ہوتی تو اس پر وہ ثواب نہ دیتا۔ پھر مرد مومن کو یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ ضرور اپنی منزل مقصود تک پہنچے گا۔ اس کا مقصد پاک ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ کار پاکیزہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جہاد فی سبیل اللہ سے اس کی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں ہوتی۔ وہ تو اللہ کی مشیئت کا نافذ کنندہ ہوتا ہے۔ اس کے ارادے کا تابع ہوتا ہے اور اس مقام کا وہ مستحق بھی اس لئے ہوا ہے کہ اس کی نیت صاف ہے۔ وہ اطاعت کا عزم صمیم کئے ہوئے ہے اور پر خلوص طریقے سے اللہ کی طرف متوجہ ہے۔

قرآن مجید حضرت داؤد کا نام لے کر کہتا ہے وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا۔" داؤد بنی اسرائیل کا ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ جبکہ جالوت ایک شہنشاہ اور خوفناک قائد تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیئت تھی کہ وہ مسلمانوں کو موقعہ پر ہی یہ سبق دے دے کہ معاملات ہمیشہ اس طرح نہیں چلتے رہتے جس طرح بظاہر نظر آتے ہیں۔ بلکہ معاملات کا فیصلہ حقائق کے مطابق ہوتا ہے۔ اور حقائق کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہوتا ہے۔ واقعات کی تقدیریں اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ مومنین کا فرض یہ ہے کہ ان کے ذمے جو ڈیوٹی ہے وہ بس اسے ادا کر دیں۔ اللہ کے ساتھ انہوں نے جو عہد باندھا ہوا ہے اسے پورا کر دیں' اس کے بعد فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیں' وہ جو چاہتا ہے وہی ہو گا۔ دیکھئے اللہ نے چاہا کہ اس جبار اور طاقتور بادشاہ کا کام اس چھوٹے سے نوجوان کے ہاتھوں تمام کر دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا' تاکہ

لوگ دیکھ لیں کہ وہ جبار وقہار لوگ جن سے ضعفاء ڈرتے رہتے ہیں' جب اللہ چاہتا ہے کہ وہ ختم ہو جائیں تو ایسے چھوٹے بچوں کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔ ایک دوسری پوشیدہ حکمت یہ تھی کہ مشیئت الٰہی میں یہ بات طے شدہ تھی کہ طالوت کے بعد داؤد نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لیں اور اس کے بعد داؤد کے بیٹے سلیمان تک یہ نظام پہنچے تاکہ سلیمان علیہ السلام اور داؤد علیہ السلام کا دور بنی اسرائیل کا سنہری دور بنے۔ اس لئے کہ بنی اسرائیل محض اسلامی نظریۂ حیات لے کر اٹھے۔ بڑے عرصہ تک وہ گمراہی کی حالت میں پھرتے رہے۔ بار بار نقض عہد اور نافرمانی کرتے رہے' لیکن جب بھی انہوں نے اسلامی نظریہ حیات کے مطابق انقلاب برپا کیا تو بطور جزاء اللہ تعالیٰ نے انہیں بام عروج پر پہنچایا وَ اٰتٰـىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا یَشَآءُ "اور اللہ نے اسے سلطنت و حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کا چاہا اس کو علم دیا۔"

حضرت داؤد بیک وقت نبی اور بادشاہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو زرہ اور دوسرا سامان جنگ کی تیاری کی مہارت دی تھی' جن کی تفصیلات قرآن مجید نے دوسری جگہ دی ہیں۔ یہاں اس قصے کو لانے سے مقصد چونکہ اور ہے اس لئے یہاں تفصیلات ترک کر دی ہیں۔

جب بات یہاں تک پہنچ گئی اور اعلان ہو گیا کہ فتح نظریۂ حیات اور پختہ عقائد کی ہو گی' مادیت کو شکست ہو گی' کثرت تعداد کو نہیں بلکہ ہمت بلند کو کامرانی ہو گی۔ اس لئے یہاں وہ بلند حکمت عملی بیان کر دی جاتی ہے۔ وہ فلسفہ بتایا جاتا ہے' جو حق و باطل کے اس ٹکراؤ کے پس پشت کارفرما ہے۔ اللہ نے جہاد و قتال اس لئے نہیں فرض کیا کہ مال غنیمت حاصل کیا جائے' لوٹ مار کی جائے' دنیا میں عزت و برتری حاصل کی جائے' بلکہ اسلام کا فلسفہ جنگ یہ ہے کہ یہ جنگ دراصل بھلائی اور شر کا ٹکراؤ ہے۔ یہ اس لئے کہ کرۂ ارض پر حق و صداقت اور خیر کو غلبہ حاصل ہو اور شر مغلوب ہو۔ اس لئے ہے کہ طاقت کو اصلاح فی الارض کے لئے استعمال کیا جائے۔

وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۵۱﴾

"اگر اللہ اس طرح انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے ہٹاتا نہ رہتا' تو زمین کا نظام بگڑ جاتا۔ لیکن دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔" اب اشخاص پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ واقعات اختتام پذیر ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ قرآن مجید کے ایک مختصر فقرے میں' اس کرۂ ارض پر مختلف طاقتوں کے ٹکراؤ' مختلف قوتوں کی باہمی منافست اور زندگی کے میدان میں آگے بڑھنے کی سعی اور جدوجہد کا عظیم فلسفہ بیان کر دیتے ہیں۔ اب اسکرین پر کرۂ ارض کا وسیع و عریض میدان ہے۔ اس میدان میں لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ دھکم پیل شروع ہے' کھینچاتانی شروع ہے' مختلف لوگوں کے سامنے مختلف مقاصد ہیں اور حصول مقاصد کے لئے ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ہر شخص کی یہ کوشش ہے کہ وہ گیند لے جائے لیکن سب کی ڈوری اللہ جل شانہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے آگے بڑھا دیتا ہے' جسے چاہتا ہے ڈوری کھینچ لیتا ہے۔ اس اژدہام میں جو لوگ بھلائی اصلاح اور ترقی کے لئے کوشش کر رہے ہیں آخر کار نتیجہ یہ ہے کہ وہ آگے بڑھ جاتے ہیں اور دست قدرت تمام اہل باطل کی لگام کھینچ لیتا ہے۔

• اگر لوگ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا نہ ہوتے اور ان کا مزاج' جس پر انہیں پیدا کیا گیا ہے ایک دوسرے سے مختلف نہ ہوتا' ان کے ظاہری رجحانات اور ان کے قریبی مقاصد باہم متعارض نہ ہوتے' تو زندگی باسی ہو کر متعفن ہو جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے مزاج مختلف بنائے تاکہ وہ اپنی تمام قوتوں کو کام میں لا کر ایک دوسرے کی مزاحمت کریں' ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں

اور ایک دوسرے پر غالب آنے کی سعی کریں وہ سستی اور جمود کو ختم کریں' اپنی خفیہ قوتوں کو بیدار کریں' بروقت چوکنے رہیں۔ زمین کے خفیہ ذخائر کی تلاش کریں۔ زمین کی خفیہ قوتوں اور پوشیدہ اسرار کو دریافت کریں اور آخر کار اصلاح' بھلائی اور ترقی کا دور دورہ ہو۔

لیکن یہ سارا کام اللہ میاں کس طرح کرتے ہیں؟ ایک صالح' ہدایات یافتہ اور مخلص جماعت کے قیام سے' جو اس سچائی سے واقف ہو' جسے اللہ نے سچائی قرار دیا ہو' وہ اس طریقہ کار سے بھی واقف ہو' جو طریقہ کار اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔ اسے یہ یقین ہو کہ وہ اس کرۂ ارض پر سچائی کو غالب کرنے اور باطل کا مقابلہ کرنے کے لئے من جانب اللہ مامور ہے۔ اسے یہ یقین ہو کہ اس کی نجات اسی میں ہے کہ وہ بلند رول ادا کرے۔ وہ صرف اسی صورت میں نجات پا سکتی ہے کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے مشکلات برداشت کرے۔ اور یہ سب کچھ وہ اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے اور حصول رضائے الٰہی کے لئے کرے۔

جب ایسی جماعت قائم ہوتی ہے اور جدوجہد کرتی ہے تو پھر امر نہی نافذ ہوتا ہے' اللہ کی تقدیر ظاہر ہوتی ہے۔ سچائی' بھلائی اور اصلاح کا کلمہ بلند ہو جاتا ہے۔ اس کشمکش' باہمی منافست اور باہمی مدافعت کا حاصل اس قوت کے ہاتھ آتا ہے جو اس کرۂ ارض پر بھلائی اور تعمیر کی علمبردار ہوتی ہے' وہ اس کشمکش کے نتیجے میں آگے بڑھتے ہیں اور ان کو ان درجات کمال کی انتہاؤں کو پہنچا دیا جاتا ہے جو ان کے لئے مقرر اور مقدر تھا۔ سب سے آخر میں' اس پورے قصے پر ایک تعقیب ہے :

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۲۵۲

"یہ اللہ کی آیات ہیں' جو ہم ٹھیک ٹھیک تم کو سنا رہے ہیں اور تم یقیناً ان لوگوں میں سے ہو جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔"

یہ آیات عالی مقام ہیں' دوررس مقاصد کی حامل ہیں' اور اللہ تعالیٰ خود ان کو اپنے نبی کو پڑھ کر سناتے ہیں نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ "ہم خود تم کو سنا رہے ہیں۔" ہم خود سنا رہے ہیں۔ کس قدر عظیم بات ہے۔ انتہائی مہیب حقیقت ہے یہ۔ سوچنے کی بات ہے کہ خود رب ذوالجلال ان آیات کو پڑھ کر سنا رہا ہے اور جو بالحق سچائی کے ساتھ۔ خود ذات باری یہ آیات سنا رہی ہے جسے سنانے کا حق ہے۔ جس کے حکم پر یہ آیات نازل ہو رہی ہیں' جس کے حکم سے یہ انسانوں کا دستور العمل بن رہی ہیں۔ اللہ کے سوا یہ مقام کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اس لئے جو شخص انسانوں کے لئے از خود کوئی نظام تجویز کرتا ہے وہ مفتری ہے۔ وہ حق تعالیٰ پر افتراء باندھتا ہے۔ وہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہا ہے اور بندوں پر بھی ظلم کر رہا ہے۔ وہ ایک ایسا دعویٰ کر رہا ہے جس کا وہ مستحق نہیں ہے۔ وہ باطل پرست ہے اور اس بات کا مستحق نہیں کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ اطاعت تو امر الٰہی کے لئے مخصوص ہے۔ پھر اس کی اطاعت کی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ سے ہدایت لیتا ہے۔ اس کے سوا کوئی مستحق اطاعت نہیں ہے۔

وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ "تم یقیناً ان لوگوں میں سے ہو' جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔" یہی وجہ ہے کہ باری تعالیٰ خود تم پر آیات کی تلاوت فرماتے ہیں اور پوری انسانی تاریخ کے تمام تجربات سے تمہیں آگاہ کر رہے ہیں۔ قافلہ اہل ایمان کے تمام تجربے' تمام مراحل کے نشیب و فراز تمہیں بتائے جا رہے ہیں اور تمام مرسلین کی میراث تمہارے حوالے کی جا رہی ہے۔

چنانچہ یہاں یہ سبق ختم ہو جاتا ہے' جو تحریکی تجربات کے ذخیرہ سے بھرا پڑا ہے۔ اس سبق پر فی ظلال القرآن کا یہ دوسرا حصہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ جس میں تحریک اسلامی کو مختلف سمتوں میں لے جایا گیا اور مختلف میدانوں میں اسے پھرایا گیا۔ اور اسے اس عظیم رول کے لئے تربیت دی گئی جس کو اس نے اس کرۂ ارض پر ادا کرنا تھا' جسے اللہ تعالیٰ نے اس کا نگران مقرر کیا اور اسے امت وسط قرار دیا تاکہ وہ زمانہ آخر تک لوگوں کے لئے اس ربانی نظام زندگی کی حامل ہو۔

# فی ظلال القرآن

## پارہ نمبر ........ ۳

## سورۃ البقرہ آیات ۲۵۳تا۲۸۶

### سورہ آل عمران ۱تا۹۱

# پارہ سوئم ایک نظر میں

## (سورۃ البقرہ کا آخری حصہ)

تیسرا پارہ دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ پہلا سورۂ بقرہ کے بقیہ پر مشتمل ہے (یاد رہے کہ پہلے دو اجزاء سورۂ بقرہ ہی پر مشتمل رہے ہیں) اور دوسرا سورۂ آل عمران کے ابتدائی حصہ پر مشتمل ہے۔

یہاں ہم صرف بقرہ کے آخری حصہ کے بارے میں اجمالی بحث کریں گے۔ اور آل عمران کے حصہ پر بحث اس وقت کریں گے جب سورۂ آل عمران پر بحث کا آغاز ہو گا۔

سورۂ بقرہ کے اس حصہ میں بھی اسی اساسی موضوع ہی کو لیا گیا ہے جس کے بارے میں ہم حصہ اول کے آغاز میں بتا چکے ہیں۔ اور جس کا مطالعہ ہم اس سورت میں مسلسل کرتے رہے ہیں۔ وہ یہ کہ امت مسلمہ کو اس ہدف کے لئے تیار کرنا جس کی خاطر اسے برپا کیا گیا ہے تاکہ وہ ان مقاصد کو لے کر آگے بڑھے' ایسے حالات میں کہ اس کے سامنے ایمانی تصور حیات ہو اور اسے یہ احساس ہو کہ اس عظیم امت اور تحریک کو انہی مقاصد کے لئے برپا کیا گیا ہے۔ اور اس کے سامنے امم سابقہ کے وہ تمام تجربات بھی کھول کر رکھ دیئے ہیں۔ اسے آگاہ کر دیا گیا ہے کہ اس راہ کے لئے اس نے کن کن وسائل کو کام میں لانا ہے اور یہ کہ اس راہ کی مشکلات کیا ہیں اور یہ کہ تحریک کے دشمن اس کے خلاف کیا کیا سازشیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ کے دشمن' حق کے دشمن اور ایمان کے دشمن ہیں اور یہ اس لئے کہ یہ امت اس مشکل راہ میں بیدار مغزی کے ساتھ آگے بڑھے اور تمام مراحل طے کرے۔

امت مسلمہ کی تربیت و تیاری' اس کی یہ تمام سرو سامانیاں اور اس کی ہمہ گیر ٹریننگ اور اس کا نصب العین اور اس کے اغراض و مقاصد' وہ مضامین ہیں جن کے ذریعہ قرآن کریم' ابتدائی نسل کے بعد' ہر دور میں جماعت مسلمہ کو تر و تازہ رکھتا ہے۔ کیونکہ ہر دور میں تحریک اسلامی کی قیادت و راہنمائی کے لئے یہی منبع ہدایت متین ہے۔ لہٰذا قرآن مجید ایک زندہ' فعال اور محرک ذریعہ تربیت ہے اور وہ ہر وقت اور ہر زمانہ میں ایک زندہ اور فعال اور مکمل دستور ہے بلکہ قرآن مجید ہر مرحلے' ہر قدم اور ہر دور میں ایک قائد' ایک مرشد اور ایک راہنما ہے۔ لیکن صرف اس شخص کے لئے جو قرآن سے نصیحت' ہدایت اور راہنمائی کا طالب ہے۔

پارۂ دوئم کا خاتمہ اس آیت پر ہوا تھا تِلْكَ آيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ......... "یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم ٹھیک ٹھیک تم کو سنا رہے ہیں اور تم یقیناً مرسلین میں سے ہو۔" اور یہ آیت بنی اسرائیل کے بعض لوگوں کے اس قصے کے بعد "جو موسیٰ کے بعد سرداران بنی اسرائیل کو پیش آیا تھا' جنہوں نے اپنے نبی سے کہا تھا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔" (۲۴۶:۲) اور اس قصے کے آخر میں کہا گیا تھا "اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اسے سلطنت اور حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کا چاہا اسے علم دیا۔" (۲۵۱:۲) تو گویا پارۂ دوئم کا خاتمہ حضرت موسیٰ ﷺ کی قوم کی بات پر ہوا۔ جس میں حضرت داؤد کے واقعہ کی تفصیل تھی۔ اس میں حضور اکرم ﷺ کی رسالت کی طرف بھی اشارہ تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ آپ ﷺ کو ان تجربات سے مسلح کیا جا رہا ہے جو تمام مرسلین کو انسانی تاریخ میں پیش آتے رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ پارۂ سوئم میں بات یوں شروع کی جاتی ہے کہ وہ اس سے پہلے کے کلام سے مربوط ہے۔ یعنی انبیائے سابقہ کے بارے

میں بات یوں چلتی ہے کہ ان میں سے بعض دوسروں کے مقابلے میں زیادہ برگزیدہ تھے۔ بعض کے درجات دوسروں پر بلند تھے۔ اور یہ کہ ان رسولوں کے پیروکاروں نے ازمنہ ما بعد میں باہم اختلافات پیدا کر لئے۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ حق پر کون ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اختلافات قائم رکھے۔ ان میں سے بعض لوگ ایمان پر قائم رہے اور بعض نے کفر کا راستہ اپنایا۔ ان میں سے بعض نے دوسروں کو قتل کیا۔ کہا جاتا ہے :"یہ رسول ..... ہم نے ان کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مرتبے عطا کئے۔ ان میں سے کوئی ایسا تھا جس سے خدا خود ہمکلام ہوا۔ کسی کو اس نے دوسری حیثیتوں سے بلند درجے دیئے اور آخر میں عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور روح پاک سے اس کی مدد کی۔ اگر اللہ چاہتا تو ممکن نہ تھا کہ ان رسولوں کے بعد جو لوگ روشن نشانیاں دیکھ چکے تھے وہ آپس میں لڑتے۔ مگر انہوں نے باہم اختلاف کیا' پھر کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر کی راہ اختیار کی۔ ہاں' اللہ چاہتا' تو وہ ہرگز نہ لڑتے' مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

ربط کلام بالکل واضح ہے کہ پارۂ دوئم کے آخر میں بھی رسولوں کی نسبت بات تھی اور پارہ سوئم کے آغاز میں بھی یہی بات ہے بلکہ اس پوری سورت میں کلام مربوط ہے۔ اس پوری سورت میں' مدینہ میں منظم ہونے والی اسلامی جماعت اور بنی اسرائیل کے درمیان فکری مجادلہ ہے۔ اور قرآن مجید کے پہلے دو پاروں میں عموماً یہی مباحث ہیں۔ اسی نسبت سے یہاں رسولوں اور ان کے بعد ان کی امم کے مابین فرقہ وارانہ اختلافات اور باہم قتل ومقاتلہ کی بات یہاں تفصیل سے چھیڑی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ ان امتوں میں سے بعض لوگ تو ایمان پر قائم رہے اور بعض نے کفر کا راستہ اختیار کیا اور پھر ناحق باہم دست و گریباں ہوئے۔ لہٰذا ربط کلام واضح ہے ا۔

یہاں یہ بات اس لئے کی گئی ہے کہ تحریک اسلامی کے سامنے' اس وقت کے متبعین انبیاء' بنی اسرائیل وغیرہ کی مبہم اور واقعی صورت حالات واضح کر دی جائے تاکہ تحریک ان حالات میں اپنے لئے مناسب راہ عمل اختیار کرے۔ امت مسلمہ کو بتایا گیا کہ متبعین انبیاء میں سے بعض لوگ تو راہ ہدایت پر صحیح طرح قائم ہیں اور بعض منحرف ہو گئے ہیں۔ ایسے حالات میں امت مسلمہ کا فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرے۔ کیونکہ اب متبعین انبیاء میں صرف یہی امت ہے جو راہ ہدایت پر ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ منحرفین کا مقابلہ کرے۔

رسولوں' ان کے متبعین اور ان کے باہم مجادلہ اور مقاتلہ کے بیان کے بعد تحریک اسلامی کو یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں اپنا بہترین مال خرچ کرے اور یہ محض توشۂ آخرت کے لئے جہاں "نہ خرید و فروخت ہوگی' نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی" (۲ : ۲۵۴) اس لئے کہ انفاق فی سبیل ایک ایسا مالی فریضہ ہے جو فریضۂ جہاد فی سبیل اللہ کا ایک لازمہ ہے۔ اور خصوصاً ایسے حالات میں جو تحریک اسلامی کو اس وقت درپیش تھے' جن میں غازیان کرام کو خود ان کے لئے اپنے اموال اور ان لوگوں کے اموال کے ذریعہ جنگ کے لئے تیار کیا جا رہا تھا جو انفاق فی سبیل اللہ کے نتیجے میں فراہم ہوتے تھے۔

اس کے بعد اس فکری اساس کے بعض پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے جس پر اسلامی جماعت کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ یعنی وجود باری اور اس کی وحدانیت یہ کہ اللہ وحدہ ہر چیز کا منتظم ہے اور ہر چیز اس کی وجہ سے قائم ہے۔ وہ اس کائنات کا مالک مطلق ہے۔ وہ اس کائنات کی ہر چیز کا علیم و خبیر ہے۔ اسے اس پوری کائنات پر قدرت حاصل ہے' وہ پوری طرح اس کے قبضہ میں ہے اور اس کی حفاظت میں ہے۔ اور یہ کہ قیامت کے دن اس کے ہاں کوئی سفارش کارگر نہ ہوگی الا یہ کہ وہ اجازت دے' یہ کہ اس جہاں میں انسان کو وہی علم حاصل ہے جو وہ عطا کرتا ہے' تاکہ ایک مسلمان اپنی راہ پر اس طرح گامزن ہو کہ اس کے ذہن میں اس کے نظریات کا ایک واضح تصور ہو

---

ا۔ مرحوم سید قطب نے اپنی تفسیر قرآن مجید کے پاروں کو پیش نظر رکھ کر لکھی ہے۔ حالانکہ قرآن مجید کی تدوین میں پاروں کا لحاظ نہ تھا۔ پاروں کی تقسیم محض ایک ماہ میں تلاوت کرنے میں سہولت پیدا کرنے کے لئے کی گئی ہے۔ لہٰذا تلک الرسل سے جو کلام شروع ہوتا ہے ظاہر ہے کہ وہ سابقہ آیات سے مربوط ہے۔

جن نظریات پر یہاں وہ نظام زندگی قائم کرنے چلا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی ہے جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے' اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے' اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے' اس سے بھی واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز بھی ان کی گرفت ادراک میں نہیں آسکتی۔ الا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے۔ اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی نگہبانی اس کے لئے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے۔" (۲:۲۵۵)

اس تصور حیات کے مطابق ایک مسلمان آگے بڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتال شروع کرتا ہے' اس لئے نہیں کہ وہ لوگوں سے اپنے نظریۂ حیات اور اپنے عقائد زور سے منوائے' بلکہ اس لئے کہ ہدایت اور گمراہی کے درمیان تمیز ہو جائے' فتنہ و فساد اور ضلالت و گمراہی کے اصل عوامل و اسباب کا خاتمہ کر دیا جائے اور اس کے بعد لوگوں کو مکمل آزادی ہوگی کہ وہ جو رویہ چاہیں اپنائیں۔

"دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا' اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا' جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔" (۲:۲۵۶)

یوں ایک مسلمان اپنی راہ حیات پر پورے اطمینان کے ساتھ رواں دواں ہے۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں سمجھتا ہے۔ اور اللہ کی نصرت اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ اللہ کی راہنمائی اور اللہ کی امداد اس کے شامل حال ہے۔

"جو لوگ ایمان لاتے ہیں اللہ ان کا ناصر و مددگار ہے۔ وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کی راہ اپنائی ہے ان کے حامی شیطان ہیں جو انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف لاتے ہیں۔ یہ لوگ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جو وہاں ہمیشہ رہیں گے۔" (۲:۲۵۷)

غرض اس پارہ کے آخر میں بھی' یہ پیراگراف مسلسل اسی ہدف کی طرف آگے بڑھتا ہے جس کی طرف اس پارہ کے آغاز میں روئے سخن تھا یعنی تحریک اسلامی کے اغراض و مقاصد کا بیان اور جماعت اسلامی میں ان مقاصد کی آبیاری۔

اس کے بعد اسلامی نقطۂ نظر سے موت و حیات کی حقیقت پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نظریاتی زندگی کے دو تجربات بیان کئے جاتے ہیں اور ایک مشاہدہ ایک دوسرے شخص کا بیان کیا گیا ہے جس کا نام ظاہر نہیں کیا گیا۔ ان تجربات میں موت و حیات کی حقیقت یہ بتائی گئی ہے کہ اس کا تعلق صرف اللہ کے علم و ارادہ کے ساتھ ہے۔ اور یہ کہ انسان کا محدود ادراک موت و حیات کی اصل حقیقت کو اپنے احاطہ میں لانے سے قاصر ہے کیونکہ اصل حقیقت ماوراء الادراک ہے۔ اور اس کی حقیقت صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

یہاں موت اور حیات کی حقیقت کو اس لئے واضح کیا گیا ہے کہ ایک تو حیات انسانی کے بارے میں انسانی تصور اور فکر کی اصلاح ہو دوسرے یہ کہ جہاد و قتال میں جو لوگ شریک ہوتے ہیں ان کے پیش نظر بھی موت و حیات کا صحیح تصور آنا ضروری ہے۔

ان فکری ہدایات کے بعد اسلامی معاشرہ کے اجتماعی معاملات کے سلسلے میں قدرے طویل بات ہوتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ سوشل سیکورٹی اسلامی معاشرہ کی اساس ہے' اس معاشرہ میں ربا کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک قابل لعنت فعل تصور ہوگا۔ اس کے مقابلے میں اسلامی معاشرہ میں زیادہ دولت بذریعہ صدقات و انفاق فی سبیل اللہ خرچ کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اور اس پر قدرے طویل بحث ہوتی

ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کا بیان بہترین تصویر کشی' بہترین تأثرات و اشارات اور اعلیٰ فنی خوبیوں پر مشتمل ہے۔ اس فنی اور ادبی پہلو پر ہم انشاء اللہ اس وقت بات کریں گے جب یہ خوبصورت آیات تشریح و تفسیر کے وقت ہمارے سامنے ہوں گی۔ یہاں اس قدر اشارہ مناسب ہے کہ جہاد و قتال اور انفاق فی سبیل اللہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ نیز انفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ و خیرات اسلام کی اجتماعی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے۔ اور معاشی زندگی کے اس پہلو کو اس سورت میں ترغیب اور قانون سازی کے مختلف طریقوں سے منظم کیا گیا ہے۔

احسان و صدقہ کے بالمقابل سود کا خبیث نظام ہے۔ اس خبیث نظام کے خلاف قرآن مجید نے طویل جنگ کی ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے بمباری کر کے اجتماعی زندگی کے معاشی نظام سے اس مذموم ادارے کی بنیادیں بھی منہدم کر دی ہیں۔ قرآن سودی نظام کی جگہ ایک مستحکم اور صحت مند معاشی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ جس کے ذریعہ معاشرے کا اقتصادی نظام ترقی کر سکے۔

اس کے بعد باہمی لین دین کے بارے میں قانون سازی کی گئی ہے اور ایسا قانون بنایا گیا ہے کہ دنیا کے کسی قانونی نظام میں یہ قانون (معاملات کی تحریری شکل) نہ تھا۔ یہ قانون سازی دو آیات میں کی گئی ہے۔ ایک آیت قرآن کریم کی طویل ترین آیات میں سے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم قانون سازی میں کیا طریق کار اختیار کرتا ہے۔ اور کس انداز سے کرتا ہے۔ قرآن کا قانون ایک زندہ' منفرد اور معجزانہ قانون ہوتا ہے اور ہر دور اور ہر زمانے کے لئے موزوں بھی۔

اس سورت کا خاتمہ بھی انہی الفاظ اور مضامین پر کیا جاتا ہے جن سے اس کا آغاز ہوا تھا یعنی اللہ کی ذات' ملائکہ' اللہ کی کتابوں اور رسولوں کے بارے میں اسلامی تصور اور نظریہ کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ "ہم اللہ کے رسولوں کے درمیان فرق نہیں کرتے۔" یہ وہ اصول ہے جس کا اس سورت میں بار بار اظہار کیا گیا۔ آخر میں مؤمنین کو طریقہ دعا سکھایا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ایک مومن کا تعلق اپنے رب کے ساتھ کیسا ہوتا ہے؟ اور اس دعا میں بھی بنی اسرائیل کی تاریخ کی طرف ایک اشارہ ہے یعنی یہ کہ انہوں نے اپنے خدا کے ساتھ اپنا تعلق نہ جوڑا تھا۔ اس دعا پر اس سورت کا خاتمہ ہوتا ہے جو مختلف مضامین پر مشتمل اس طویل سورت کا مناسب خاتمہ ہے۔

"اے ہمارے رب! ہم سے بھول و چوک میں قصور ہو جائے ان پر گرفت نہ کر۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال' جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار! جس بوجھ کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں ہے' وہ ہم پر نہ رکھ۔ ہمارے ساتھ نرمی کر' ہم سے درگزر فرما' ہم پر رحم کر' تو ہمارا مولیٰ ہے' کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔" (۲:۲۸۶)

✡ ✡ ✡

# درس ۱۷ ایک نظر میں

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اس سبق کے آغاز ہی میں ہمیں رسولوں کے بارے میں قرآن کریم کا مخصوص انداز تعبیر ملتا ہے۔ **تِلْكَ الرُّسُلُ** ..... "رسولوں کی یہ جماعت" اور **هٰٓؤُلَاۗءِ الرُّسُلُ** ...... "یہ رسول" کا لفظ اختیار نہیں کیا گیا۔ رسولوں کے لئے آغاز کلام میں یہ خاص طرز تعبیر کیوں اختیار کیا گیا؟ اس میں کچھ واضح اشارات ہیں۔ مناسب ہے کہ تشریح آیات سے پہلے اس انداز کلام پر کچھ بات ہو جائے۔

**تِلْكَ الرُّسُلُ** .... "یہ گروہ رسل" جو ایک خاص جماعت ہیں۔ اس جماعت کا ایک خاص مزاج ہے اور ایک خاص ماہیت ہے۔ اگرچہ وہ بشر ہیں۔ تو پھر وہ کون ہیں؟ رسالت کی حقیقت کیا ہے؟ رسالت کا مزاج کیا ہے؟ یہ فریضہ کیسے ادا کیا جاتا ہے؟ پھر صرف ان مخصوص افراد ہی کو کیوں درجہ رسالت پر فائز کیا گیا اور کیسے کیا گیا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن پر میں ایک طویل عرصے سے سوچتا رہا ہوں۔ تسلی بخش جواب کا متلاشی رہا ہوں۔ میرے پردۂ احساس پر کچھ ایسے مفہوم اور معانی ابھرتے ہیں جن کو میں کلمات و عبارات کی صورت میں منتقل نہیں کر سکتا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ میں اپنے اس وجدان و شعور کو اور ان تصورات و مفہومات کو الفاظ و افہام کے قریب تر کر سکوں۔

یہ کائنات جس میں ہم زندہ ہیں اور ہم جس کا ایک اہم حصہ ہیں کچھ اصول و قواعد پر چل رہی ہے۔ اور یہ اصول وہ تکوینی اصول و ضوابط ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے لئے وضع فرمائے ہیں۔ اور اس کائنات کو حکم دیا ہے کہ یہ ان کے مطابق چلتی رہے اور ان کے مطابق حرکت کرے اور ان اصولوں کی منشا کے مطابق چلے۔ اور اس کائنات میں انسان جونہی علمی میدان میں ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کچھ نئے انکشافات و دریافت کر لیتا ہے یا انسان کو اللہ تعالیٰ کچھ مزید معلومات حاصل کرنے کے مواقع فراہم کر دیتا ہے تو یہ ادراک اور انکشاف اس کی محدود قوت مدرکہ کے حدود کے اندر ہوتا ہے اور اسی قدر ہوتا ہے جس قدر اسے اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ یہاں اپنی محدود زندگی میں انسانی خلافت کے فرائض اچھی طرح سرانجام دے سکے۔

اور اس کائنات میں' ان طبعی قوانین اور ضوابط کے دریافت کرنے کے لئے انسان اپنی شخصیت کے نقطۂ نظر سے دو چیزوں کو کام میں لاتا ہے۔ ایک مشاہدہ اور دوسرا تجربہ۔ مشاہدہ اور تجربہ اپنے مزاج کے اعتبار سے دونوں جزوی ذرائع علم ہیں۔ وہ اپنے نتائج کے اعتبار سے اٹل اور آخری اور فیصلہ کن نہیں ہوتے۔ البتہ ان دو ذرائع سے اس کائنات میں بعض ایسے کلی قواعد و ضوابط دریافت کر لیے جاتے ہیں جو ایک طویل عرصے تک قوانین کلیہ سمجھے جاتے ہیں لیکن آخر کار یہ دریافت بھی ایک جزوی دریافت بن جاتی ہے۔ جو نہ تو انتہائی ہوتی ہے اور نہ ہی مطلق۔ اس لئے کہ کائنات کے ان قوانین کے درمیان تناسق و تطابق اس کلی ناموس سے منسلک ہے' جو ان تمام کلیات کو باہم مربوط کرتا ہے۔ اور یہ ناموس اکبر ہمیشہ سے مخفی رہتا ہے اور یہ اس جزوی مشاہدہ اور تجربہ کے دائرہ سے باہر ہوتا ہے۔ اگرچہ بحث و تحقیق کا ایک طویل دور گزر جائے اس لئے کہ اس سلسلے میں زمانہ کوئی اہم عنصر نہیں ہے۔ اس کائنات میں اس کی اہمیت اور اس کی تشکیل کے لحاظ سے یہ تو انسانی ذات اور طاقت کے میدان کے لئے ایک حد ہے۔ اور اس کی یہ حیثیت بھی ایک جزوی اور نسبتی حیثیت ہے۔ پھر پوری بنی نوع انسان کو جو زمان عطا کیا گیا ہے وہ بھی جزئی اور محدود ہے۔ اس لئے ہمارے ذرائع معرفت اور ان ذرائع کے نتیجے میں حاصل ہونے

والے تمام نتائج جزئی ہی رہتے ہیں اس لئے کہ یہ جزوی اور نسبتی ذرائع کے واسطے سے سامنے آتے ہیں۔

یہاں اگر معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات میں رسالت کی اہمیت کیا ہے۔ رسالت کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے اور یہ مزاج خاص اور یہ قوت اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوتی ہے تاکہ وہ اس ناموس اکبر کو اخذ کر سکے اور اس کی گہرائی تک جا سکے۔ جس پر اس کائنات کا وجود قائم ہے۔ ایک رسول کا رابطہ اس ناموس اکبر کے ساتھ کس نوعیت کا ہوتا ہے' ہم آج تک اس کی حقیقت کو نہیں پا سکے۔ ہم صرف اس رابطہ و تعلق کے آثار کو سمجھ سکتے ہیں۔

رسول کی یہ مخصوص طبیعی قوت ہوتی ہے جو اس ناموس اکبر سے وحی حاصل کرتی ہے۔ اور اس میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے' اس لئے کہ رسول کا یہ مزاج اس پیغام کے وصول کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اور یہ پیغام وہی پیغام ہوتا ہے جو اس ناموس اکبر سے یہ پوری کائنات بھی وصول کرتی رہتی ہے۔ اس لئے کہ یہ پوری کائنات براہ راست اس ناموس اکبر سے منسلک ہے اور اس کے تصرف اور کنٹرول میں ہے۔ اب رسول یہ اشارہ کس طرح وصول کرتا ہے' وہ کس ذریعہ یا کس سے یہ اشارہ وصول کرتا ہے؟ اس سوال کا جواب ہم صرف اس وقت دے سکتے ہیں جب اللہ تعالیٰ ہمیں بھی وہ استعداد اور وہ طبیعی استعداد بخش دے جو وہ اپنے بندوں میں سے ان مختار اور منتخب لوگوں کو بخش دیتا ہے جو رسول کہلاتے ہیں اور وَاللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ.................. "اور اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ استعداد رسالت کہاں رکھ دے" یہ ایک عظیم الشان معاملہ ہے اور یہ اس کائنات کا وہ عظیم الشان راز ہے جو انسان کی قوت وادراک سے ماوراء ہے۔

تمام رسول توحید کی حقیقت کو پا گئے تھے اور تمام رسولوں کا نظریہ نظریۂ توحید رہا ہے۔ اس لئے کہ ان رسولوں کے وجود کے اندر ناموس اعظم کے ساتھ رابطے کی استعداد ودیعت کی گئی اس لئے کہ ان تمام انبیاء کا منبع ہدایت ایک ہی تھا۔ اگر یہ منبع اور مصدر ہدایت ایک نہ ہوتا تو ان انبیاء کے نظریات جدا ہوتے اور ان کا طریقۂ واردات متنوع ہو جاتا۔ رسولوں کا یہ ادراک اس دور میں ہوا جب کہ انسانیت اپنے ابتدائی دور میں تھی اور فہم و ادراک اور مشاہدہ و تجربہ کے وہ ذرائع جو آج ہیں انسانیت کو میسر نہ تھے اور نہ ہی اس دور میں وہ کلی قوانین بشریت پر ظاہر ہوئے تھے جو نظریۂ توحید پر دلالت کرتے ہیں۔

آغاز بشریت سے آج تک تمام رسولوں نے صرف اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دی ہے۔ یہ تمام انبیاء اس ایک حقیقت کی طرف بلاتے رہے ہیں اور انہوں نے اپنے اس مزاج خاص اور طبیعت خاصہ سے یہی پیغام پایا ہے۔ اس لئے ان کے اس مزاج نبوی پر جب اس ناموس کلی کا القاء ہوا تو اس سے ان کے قلوب پر ایک فطری سوچ ابھری جو اس ناموس کلی سے پوری طرح مربوط تھی۔ پھر اس پیغام کی تبلیغ و اشاعت بھی ان کی اس سوچ اور یقین کا قدرتی نتیجہ تھی۔ ان کا یہ پختہ ایمان تھا کہ یہ حق ہے اور یہ سوچ ان کی طرف اللہ وحدہ کی طرف سے القاء ہوئی ہے اور یہ کہ عالم بالا سے ان کے اس وثیق اور قوی رابطہ اور ان کی مخصوص رسولانہ فطرت کی وجہ سے ان کو پورا یقین تھا کہ وہ ناموس اللہ وحدہ لاشریک ہے اور اس کی ذات میں تعدد ممکن نہیں ہے۔

عقیدۂ توحید رسولوں کی فطرت نبوت کا لازمی شعور ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے انبیاء علیہم السلام کے جو قصص نقل کئے ہیں ان میں بعض الفاظ ایسے موجود ہیں جن سے اس فطرت نبویہ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات انبیاء کو اس فطرت سے موصوف کیا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کے قصے میں مذکور ہے

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ

أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنتُمْ لَهَا كَارِهُونَ ۝ وَيَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۚ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الَّذِينَ آمَنُوا ۚ إِنَّهُم مُّلَاقُو رَبِّهِمْ وَلَٰكِنِّي أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ۝ وَيَا قَوْمِ مَن يَنصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِن طَرَدتُّهُمْ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ

"اے برادران قوم! ذرا سوچو تو سہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ کو اپنی خاص رحمت سے بھی نواز دیا' مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو تمہارے سر چپک دیں؟ اور اے برادران قوم! میں اس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا' میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور میں ان لوگوں کو دھکے دینے سے بھی رہا جنھوں نے میری بات مانی ہے' وہ آپ بھی اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو اور اے قوم! اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کی پکڑ سے مجھے کون بچانے آئے گا؟ تم لوگوں کی سمجھ میں کیا اتنی بات نہیں آتی؟

(۲۸:۱۱)

اور حضرت صالح علیہ السلام کی زبانی فرمایا گیا

قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَآتَانِي مِنْهُ رَحْمَةً فَمَن يَنصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ عَصَيْتُهُ ۖ فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ

"اے برادران قوم! تم نے کچھ اس بات پر غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھے نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھے کون بچائے گا۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تم خسارے میں ڈالنے کے سوا میرے کس کام آسکتے ہو۔"

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرۃ میں بھی یہی نظر آتا ہے۔

وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ ۚ قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ ۚ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَن يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا ۗ وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۗ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ۝ وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُم بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا ۚ فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ

"اور اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے قوم سے کہا "کیا تم لوگ اللہ کے معاملے میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے راہ راست دکھادی ہے۔ اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا۔ ہاں اگر میرا رب کچھ چاہے تو ضرور ہو سکتا ہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ پھر کیا تم ہوش میں نہیں آؤ گے؟ اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے میں کیسے ڈروں جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے۔ جن کے لئے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے۔ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی اور اطمینان کا مستحق ہے۔ بتاؤ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔

اور حضرت شعیب علیہ السلام کے قصے میں بھی یہی بات بتائی گئی ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ مَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَ مَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ

"بھائیو! تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر تھا اور پھر اس نے اپنے ہاں سے مجھ کو اچھا رزق بھی عطا کیا اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں ان کا خود ارتکاب کروں۔ میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں' جہاں تک میرا بس چلے اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں' اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے۔ اس پر میں نے بھروسہ کیا اور ہر معاملہ میں اس کی طرف رجوع کرتا ہوں۔" (۱۱:۸۸)

اور یہ بات حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان الفاظ میں کی

قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ

"اس نے کہا میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا۔ اور اللہ سے جیسا میں واقف ہوں تم نہیں ہو۔" (۱۲:۸۶)

یوں اور اسی طرح تمام رسولوں کے اقوال اور ان کے اوصاف میں اس گہری ہم آہنگی اور رابطے کے اثرات پائے جاتے ہیں جو ان کی فطرت کا حصہ ہیں اور ان کے ضمیر کی گہرائیوں میں جاگزیں ہیں۔ اور جن کی وجہ سے ان رسولوں کا کلام متنوع اور مزین ہوتا ہے۔

مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ انسان کے علم و معرفت نے کچھ ایسی علامات دریافت کرلی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات میں قانون وحدت موجود ہے۔ انسانوں میں اہل علم اس بات کو پاچکے ہیں کہ اس طویل و عریض کائنات میں وحدت وجود اور وحدت حرکت موجود ہے۔ اور انسان نے اپنے محدود علم کے اندر رہتے ہوئے اس بات کو پالیا ہے کہ اس کائنات کی تعمیر ذرہ سے ہوئی ہے اور یہ کہ ذرہ دراصل قوت (Power) ہے۔ یوں اس ذرے میں مادہ اور قوت دونوں ملے ہوئے ہیں اور علماء طبیعات اس عرصے تک جس نظریہ پر قائم تھے کہ یہ کائنات مادہ اور قوت دو علیحدہ چیزوں سے مرکب ہے وہ اب ختم ہوگیا ہے۔ اب صحیح بات یہ ہے کہ کائنات ذرے سے مرکب ہے اور ذرے کو اگر توڑ دیا جائے تو یہ ایک عظیم قوت ہے۔ اور انسان نے اپنے محدود علم کی حد تک اس بات کو پالیا ہے کہ یہ ذرہ اپنے اندرونی نظام کے مطابق متحرک ہے اور وہ الیکٹرون اور پروٹون نیوٹرون سے مرکب ہے۔ اور الیکٹرون دونوں کے اردگرد ہروقت حرکت کرتے ہیں جو اس ذرے کا قلب ہوتا ہے۔ اور یہ حرکت دائمی ہے اور ہر ذرے میں ہے۔ اور جس طرح فرید الدین العطار نے کہا ہے کہ ہر ذرہ ایک سورج کے مانند ہے جس کے اردگرد ستارے گھومتے ہیں۔ جس طرح ہمارے اس سورج کے اردگرد ستارے گھومتے ہیں اور جو تسلسل کے ساتھ گھوم رہے ہیں۔

اس کائنات کی وحدت اور حرکت کی وحدت اس کائنات کی وہ خصوصیات ہیں جن کو انسان نے پالیا ہے اور یہ دونوں خصوصیات دور سے یہ اشارہ کررہی ہیں کہ اس کائنات کو ایک وسیع تر ضابطۂ وحدت اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ اس حقیقت تک انسانی علم نے اس حد تک رسائی حاصل کرلی ہے جس حد تک انسان کی قوت مشاہدہ اور قوت تجربہ کے لئے رسائی ممکن تھی لیکن خواص کی قوائے موہوبہ اس

قدر طاقتور ہوتی ہیں کہ وہ ان تمام حقائق کو ایک لمحہ میں پالیتی ہیں' اس لئے کہ ان پر یہ حقائق بلاواسطہ القاء ہوتے ہیں اور ان حقائق کی ادراک کی قوت صرف ان خواص کے پاس ہوتی ہے۔

ان خواص نے علمی تجربات کے ذریعہ ان مشاہدات اور خصوصیات کا ادراک نہیں کیا ہوتا' ان کو ایسی قوت مدرکہ عطا کی گئی ہوتی ہے جو اس حقیقت وحدت کو براہ راست پالیتی ہے۔ یہ خواص اس واحد ناموس کو براہ راست پاتے ہیں اور یہ ان کا داخلی' اپنی ذات کے اندر کامل ہوتا ہے۔ وہ اس بات کو پاتے ہیں کہ یہ ایک جیسا القاء لازماً ایک ہی مصدر اور منبع سے صادر شدہ ہے۔ ان خواص کی ذات میں جو مشینی قوت مدرکہ ودیعت کی جاتی ہے وہ نہایت ہی کامل اور نہایت ہی پیچیدہ ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ آن واحد میں اس حقیقت کو پالیتے ہیں' جس منبع سے ان کو ہدایت ملتی ہے۔ وہ واحد ہے' جس ارادے کے تحت وہ روبعمل ہوتے ہیں۔ وہ اسی منبع سے صادر ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کی یہ مخصوص قوت مدرکہ یا یہ مخصوص آلات مدرکہ بشکل یقین اس حقیقت کو پالیتے ہیں کہ اللہ جل شانہ کی واحد ذات ہی ہے جو اس کائنات میں متصرف حقیقی ہے۔

میں یہ بات اس بنا پر نہیں کر رہا ہوں کہ جدید سائنس کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے وحدت کائنات سے متعلق کوئی ایک یا دو حقائق دریافت کر لئے ہیں۔ اس لئے کہ سائنسی حقائق کبھی ثابت تصور ہوتے اور کبھی ان کی تردید ہو جاتی ہے اور سائنس جن حقائق تک پہنچتی ہے وہ جزوی اور نسبتی حقائق ہوتے ہیں کیونکہ سائنس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کسی مطلق اور اٹل حقیقت تک پہنچ سکے۔ اس لئے کہ سائنسی نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ بعض نظریات بعض دوسرے نظریات کی تکذیب کرتے ہیں۔ بعض ایک دوسرے میں تبدیلی کرتے ہیں۔

میں نے وحدت کائنات اور وحدت حرکت کے بارے میں جو بات کی ہے اس لئے نہیں کہ اس کا اور اس ناموس وحدت کے درمیان کوئی مماثلت ہے جو ان خواص رسل پر من جانب اللہ القاء ہوا کرتی ہے۔ میرا منشاء یہ ہرگز نہیں ہے۔ میرا مقصد ایک دوسرا امر ہے اور وہ یہ ہے کہ ہدایت اور راہنمائی کا قابل اعتماد مصدر اور منبع صرف انبیاء کے ہاں ہے اور صرف انبیاء ہی اس کائنات کے بارے میں واحد 'مکمل' جامع اور سچائی پر مشتمل تصور دے سکتے ہیں۔

یہ ممکن ہے کہ جدید علمی انکشافات نے اس کائنات کی حقیقت عظمیٰ کے بعض پہلو اور بعض خواص پالئے ہوں اور انہوں نے یہ معلوم کر لیا ہو کہ حقیقت کبریٰ صرف ایک ہی ہے لیکن یہ وہی حقیقت ہے جسے رسولوں نے براہ راست اپنی مخصوص قوت مدرکہ سے پالیا ہوتا ہے اور اس کا احاطہ کر لیا ہوتا ہے اور وہ حقیقت ان رسولوں کی فطری قوت مدرکہ میں براہ راست پوری طرح موجود ہوتی ہے اور یہ کہ رسولوں کا یہ ادراک اپنی جگہ سچائی پر مبنی ہوتا ہے' چاہے جدید سائنس نے اس کی بعض خصوصیات کو صحیح طرح پالیا ہو یا نہ پایا ہو۔ اس لئے کہ سائنسی نظریات قابل بحث اور قابل نظرثانی ہوتے ہیں۔ پہلے تو یہ ثابت نہیں ہوتے۔ ظن وتخمین پر مبنی ہوتے ہیں پھر اگر بظاہر ثابت نظر بھی آئیں تو یہ ثبوت اٹل نہیں ہوتا۔ اس لئے حقیقت رسالت کو ان نظریات پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ مقیاس و معیار ہمیشہ ایسا ہونا چاہئے جو ثابت ہو اور اٹل ہو۔ اس لئے ہم لازماً اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ رسالت ہی وہ معیار و مقیاس ہے جس پر ہم جدید سائنسی نظریات کی جانچ پڑتال کریں گے۔

اس حقیقت سے ایک دوسری حقیقت سامنے آتی ہے جو نہایت ہی اہم ہے۔ وہ یہ کہ یہ مخصوص شخصیات جن کا براہ راست ناموس حقیقت سے رابطہ ہوتا ہے۔ یہی اس بات کی مستحق ہیں کہ انسانیت کے لئے نظریہ وعمل کی مکمل سمت مقرر کریں۔ ایسی سمت جو اس کائنات کی فطرت اور کائنات کے مستحکم ضابطوں اور اس کے اٹل اصولوں سے ہم آہنگ ہو۔ یہ شخصیات براہ راست مہبط وحی ہوتی ہیں اس لئے ان کی ہدایات میں کسی خطا کا کوئی امکان نہیں ہوتا اور نہ اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ وہ صحیح راستے سے بھٹک جائیں۔ یہ شخصیات نہ تو جھوٹ

بولتی ہیں اور نہ ہی حق کو چھپاتی ہیں۔ اظہار حقیقت سے ان کی راہ میں زمان و مکان کے عوامل حائل نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ یہ شخصیات اس حقیقت کو اللہ کی جانب سے پا رہی ہوتی ہیں اور اللہ کی ذات حقیقت زمان و مکان کے عوامل سے وراء ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شان کبریائی نے یہ ارادہ کیا کہ اس کائنات کی تاریخ میں وقفے وقفے سے انبیاء و رسل کو بھیجا جاتا رہے تاکہ انسانیت کا رابطہ حقیقت مطلقہ سے قائم رہے۔ اس لئے کہ انسان اپنے تجربے اور مشاہدے کے بل بوتے پر ہزارہا سال کی جدوجہد کے بعد بھی اس کے ایک حصے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور اپنی پوری زندگی یعنی تاقیامت اس حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ اس رابطے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ یہ اشخاص اس پوری کائنات کے ساتھ ہم آہنگی سے قدم اٹھاتے ہیں۔ ان کی حرکت اس کائنات کی حرکت کی سیدھ میں ہوتی ہے اور ان کی فطرت 'فطرت کائنات سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

ایک اور صرف ایک منبع صافی ہے جس سے تمام بشریت ایک سچا' ایک جامع اور کامل تصور حیات اخذ کر سکتی ہے۔ ایسا تصور حیات جس میں اس پوری کائنات کی ماہیت کو سمو دیا گیا ہو۔ اس میں حقیقت انسانی کا صاف تصور بھی موجود ہو۔ اس میں اس پوری کائنات کی تخلیق کی غرض و غایت بھی موجود ہو اور اس کائنات میں وجود انسانی کی تخلیق کے مقاصد بھی موجود ہوں۔ ایسے جامع تصور کے نتیجے ہی میں ایک صحیح اور مضبوط نظام وجود میں آ سکتا ہے' جو تخلیق کائنات کے اصل منصوبے کے مطابق ہو' جو نظام اس کائنات کی حرکت اور اس کے رخ کے مطابق ہو اور جس کے قیام کے نتیجے میں پوری انسانیت کو امن و سلامتی نصیب ہو۔ انسان اس کائنات کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو اور انسان اپنی فطرت سے بھی ہم آہنگ ہو۔ اس لئے کہ فطرت انسان بھی فطرت کائنات ہی کا ایک حصہ ہے۔ اور تمام انسان اس دنیا میں اپنی جدوجہد' اپنی سرگرمیوں' اپنی ترقیات اور اپنی تمام حرکات و سکنات میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوں اور ان کے درمیان کوئی کجی نہ ہو۔

اور یہ مصدر وحید اور یہ منبع صافی صرف انبیاء کا سرچشمہ ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ باطل اور گمراہی ہے۔ کیونکہ ان تمام دوسرے سرچشموں کا تعلق خالق کائنات سے نہیں ہوتا۔

وحی کے علاوہ علم معرفت کے جو ذرائع بھی انسان کو دیئے گئے ہیں وہ بہت ہی محدود ہیں۔ اور وہ اس لئے دیئے گئے ہیں کہ انسان اس کائنات کے بعض ظاہری قوانین دریافت کر لے اور اس کائنات کی بعض طبیعی قوتوں تک رسائی حاصل کر لے اور اسے یہ محدود علم اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کرۂ ارض پر اسے جو محدود خلافت کا منصب سپرد کیا گیا ہے وہ اس کی ذمہ داریاں پوری کر سکے۔ اور یہاں اپنی اس محدود زندگی کو کسی قدر پرسکون بنا سکے۔ بعض اوقات انسان اس محدود دائرے کے اندر اندر کافی آگے بڑھ جاتا ہے' لیکن اپنی اس تمام ترقی کے باوجود انسان اپنے خالق اور قادر مطلق تک اور ماوراء تک رسائی نہیں حاصل کر سکتا' حالانکہ انسان اس بات کا محتاج ہے کہ وہ حقیقت مطلقہ تک پہنچ سکے اور اپنی زندگی کو اس کے رنگ میں رنگ سکے۔ فقط نئے نئے ظروف و احوال کے مطابق نہیں بلکہ اس کائنات کے ثابت شدہ اور اٹل قوانین کے مطابق جن پر اس کائنات کا وجود قائم ہے' بلکہ اس غرض و غایت کے مطابق جس کے لئے اس پوری کائنات کی تخلیق کی گئی ہے اور اس حقیقت کا علم صرف خالق کائنات ہی کے پاس ہے جو زمان و مکان کے محدود دائروں سے باہر ہے۔ اور انسان اس کا ادراک اس لئے نہیں کر سکا کہ اس کی قوتیں محدود ہیں اور وہ زمان و مکان کے محدود دائروں ہی میں کام کر سکتا ہے۔

جو ذات سفر آخرت اور اس کائنات کے انجام کا منصوبہ بناتی ہے وہی اس کے پورے راستے کے نشیب و فراز سے واقف ہوتی ہے۔ انسان جس کا علم محدود ہے اور اس کا دائرہ علم محدود ہے۔ اس کائنات کے اوجھل انجام تک صرف اپنے عقل کے بل بوتے پر نہیں پہنچ سکتا۔ اسے آنے والے پل کی خبر نہیں ہے۔ آنے والے واقعات اور انسان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ اسی لئے انسان کے

لئے یہ جائز بھی نہیں ہے اور نہ اس کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اس پورے سفر آخرت کے لئے کوئی منصوبہ خود تیار کرے۔

انسان یا تو تباہی اور گمراہی کا راستہ اختیار کرے گا اور یا اسے رسولوں کے اس راستے کی طرف لوٹنا ہو گا۔ اسے وہ نظام زندگی اختیار کرنا ہو گا جو رسولوں نے براہ راست خالق کائنات سے پایا۔ یہ ان انبیاء عالی مقام کا نظام ہے جن کو خالق کائنات کے ساتھ براہ راست رابطہ کی سہولت حاصل ہوتی ہے۔

یہ انبیاء و رسل یکے بعد دیگرے گزرتے رہے اور یہ مشعل نور لئے ہوئے اور انسانیت کا ہاتھ پکڑے ہوئے اس کی مسلسل راہنمائی کرتے رہے اور اسے ایک مقام بلند تک پہنچا گئے۔ انسانیت کبھی ایک جگہ سے بھٹک جاتی اور کبھی دوسری جگہ سے گمراہ ہو جاتی۔ کبھی ایک مقام پر منحرف ہو جاتی اور کبھی غفلت کا شکار ہو جاتی اور اللہ میاں اس کی ہدایت کے لئے ایک نیا رسول بھیج دیتے جو اس کائنات کا قائد ہوتا اور اسے پھر سے راہ راست پر لاتا۔

ہر بار یہ نیا رسول ایک ہی حقیقت کو پیش کرتا لیکن انسانیت علمی دنیا میں جو نئے تجربات کر چکی ہوتی تھی یہ حقیقت ان تجربات کی مناسبت سے ذرا ترقی یافتہ شکل میں ہوتی۔ جب یہ سلسلہ رسل رسول آخر الزمان کے دور تک پہنچا تو انسانوں کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ عقلی لحاظ سے بالغ ہو چکے تھے اور ان کی عقل منور ہو گئی تھی۔ اور اس آخری رسالت نے آخر کار انسانی عقل سے خطاب کیا اور عقل انسانی کو اس حقیقت مطلقہ کے جملہ اصول بتا دیئے تاکہ ان خطوط کے مطابق انسانیت اس راہ حقیقت پر گامزن رہے۔ اور اس آخری رسالت نے حقیقت اعلیٰ کو اس قدر واضح شکل میں بیان کر دیا کہ اب اس کے بعد کسی جدید رسالت کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اب امت کے لئے آئندہ زمانوں کے لئے یہ انتظام کر دیا گیا کہ مجددین ان اصولوں کی تعبیر جدید کرتے رہیں گے۔

بہر حال انسانیت کے لئے اب اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں رہا کہ یا تو وہ انبیاء نے وضع کردہ دائرہ فکر و عمل میں داخل ہو جائے جو انسانیت کی سرگرمیوں کے لئے ہمیشہ کھلا اور کشادہ ہے اور جو انسانیت کی ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ سرگرمیوں کے لئے کافی ہے اور اس حقیقت کبریٰ تک رسائی حاصل کرلے جس تک انسانیت کسی اور راستے سے نہیں پہنچ سکتی۔ اور یا پھر اس بات کے لئے تیار ہو جائے کہ گمراہی کے گڑھے میں ڈوبی رہے اور بے آب و گیاہ صحرا میں یوں بھٹکتی رہے کہ اسے کوئی نشان راہ نظر نہ آئے۔

☆ ☆ ☆ ☆

# درس ۱۷ تشریح آیات

## آیت نمبر ۲۵۳ تا ۲۵۷

اس آیت میں رسولوں اور ان کے مشنوں کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ نیز اس نے جماعت رسل کو علیحدہ رکھ کر اسے تمام لوگوں سے ایک امتیازی مقام دیا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی بیان کر دی ہے کہ خود رسولوں میں سے بھی بعض رسول بعض کے کے مقابلے میں زیادہ فضیلت کے حامل رہے ہیں۔ اور اس میں اس فضیلت و امتیاز کی بعض علامتوں کا بیان بھی ہے۔ اس کے بعد اس میں آنے والی نسلوں کے اختلافات کا تذکرہ ہے' حالانکہ ان کے پاس واضح نشانیاں آگئی تھیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ اختلافات کی وجہ سے یہ قومیں باہم جنگ و جدل میں بھی مبتلا رہیں اور بعض نے ایمان کی راہ لی اور بعض نے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان جدل و جدال اور قتل و قتال کا فتنہ ڈال دیا تاکہ کفر کا مقابلہ ایمان سے کیا جائے اور شر کی مدافعت بذریعہ خیر ہو۔ یہ سب مضامین جن کی طرف اس آیت میں اشارات کئے گئے ہیں یہ اس طویل تاریخ رسالت کے اہم واقعات ہیں۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۘ

"یہ رسول (ایسے تھے کہ) ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر زیادہ فضیلت دی۔" یہ فضیلت کبھی اس نسبت سے ہوئی ہے کہ بعض رسولوں کو دوسروں کے مقابلے میں وسیع دائرہ کار دیا گیا۔ جس کے اندر اس رسول نے کام کرنا تھا۔ مثلاً کبھی وہ ایک قبیلے کا رسول ہوتا یا وہ ایک قوم کا رسول ہوتا' یا وہ ایک نسل کا رسول ہوتا یا تمام امتوں اور اپنے وقت کی تمام اقوام کا رسول ہوتا۔ نیز رسولوں کے درمیان فرق مراتب ان خصوصیات کی وجہ سے بھی ہوتا جو کسی رسول یا اس کی قوم کو عطا کی جاتی تھیں۔ نیز اس پیغام' اور اس کی عمومیت اور اس کی ہمہ گیری اور جامعیت کی اساس پر بھی رسولوں کے درمیان فرق مراتب رہا ہے۔

یہاں اس آیت میں بطور مثال دو پیغمبروں کا ذکر کیا ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام اور ان کے علاوہ دوسرے انبیاء کی طرف اجمالی اشارہ کیا گیا ہے۔

مِنْهُم مَّن كَلَّمَ اللَّهُ ۖ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۚ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۗ

"ان میں سے کوئی ایسا تھا جس سے خدا تعالیٰ خود ہمکلام ہوا۔ کسی کو اس نے دوسری حیثیتوں سے بلند درجے دیئے اور آخر میں عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور روح پاک سے اس کی مدد کی۔"

جب اس بات کا ذکر ہوتا ہے کہ کوئی نبی اللہ سے ہمکلام ہوا تو ذہن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف خود بخود منتقل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ان کا نام نہیں لیا گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لیا گیا۔ اور قرآن مجید کے اکثر مقامات پر ان کے نام کی نسبت ان کی

والدہ کی طرف کی گئی ہے۔ جس کی حکمت واضح ہے۔ اس لئے کہ نزول قرآن کے زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بے شمار رطب ویابس قصے مشہور تھے۔ نعوذ باللہ یہ کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں اور یہ کہ ان کا مزاج لاہوت اور ناسوت کا مرکب تھا یا یہ کہ وہ منفرداً خود ایک الٰہ تھے اور اس کے اندر مادی مزاج اس طرح گھل مل گیا تھا جس طرح قطرہ دریا میں۔ یہ اور ان جیسے فضول تصورات اور نظریات جن پر مجمعوں اور کنیسوں میں جدل و جدال اور بحث و مناظرے کے بازار گرم تھے۔ اور مملکت روما میں اس بات پر اس قدر خونریزی ہوئی تھی کہ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشریت کا ذکر بطور تاکید بار بار کرتا ہے۔ اور اکثر مقامات پر اسے ابن مریم کہا گیا ہے۔ روح القدس سے قرآن کی مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ وہ رسولوں تک پیغام پہنچانے کے ذمہ دار تھے۔ اس لئے بینات کے ساتھ ساتھ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظیم تائید تھی۔ یہ حضرت جبرئیل ہی تھے جو رسولوں تک وہ پیغام اور بشارت لے کر آئے تھے کہ انہیں اس عظیم ذمہ داری کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔

یہ وہی تھے جو انہیں اس طویل اور پرمحنت راستے میں جہد مسلسل کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ وہی تھے جو کہ وہ اس راستے کے ہولناک اور مایوس کن مواقع پر سکینہ لے کر آتے تھے اور الٰہی تائید و نصرت سے رسولوں کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ یہ سب وہ تائیدیں ہیں جو جبرئیلؑ کے ذریعہ ہوا کرتی تھیں۔ بینات میں سب سے پہلے انجیل آتی ہے جو حضرت عیسیٰؑ کو دی گئی۔ نیز بینات میں وہ معجزات بھی آتے ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھوں ظاہر ہوئے اور جن سے مخالفین بنی اسرائیل کے مقابلے میں آپ کی تائید ہوئی اور جن کی تفصیل قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر بیان کی گئی ہے۔

قرآن مجید کی اس آیت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہیں لیا گیا۔ اس لئے کہ خطاب خود حضور سے ہو رہا ہے۔ اس آیت سے پہلی آیت میں تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ

تلک الرسل ..... "یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم ٹھیک ٹھیک تم کو سنا رہے ہیں اور تم یقیناً ان لوگوں میں سے ہو جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یہ رسول......" یعنی بات یہ ہو رہی ہے کہ آپ کو دوسرے رسولوں کی بابت بتایا جا رہا ہے اور آپ تو یقیناً رسولوں میں سے ہیں۔

انبیاء و رسل کی سیرتوں اور خصوصیات کے اعتبار سے ہم ان کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالتے ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سرفہرست پاتے ہیں۔ رسالت کی جامعیت اور شمولیت کے اعتبار سے دیکھیں یا اس کے دائرہ کار کی وسعت اور زمانی دوام کے اعتبار سے دیکھیں ہر اعتبار سے حضور سرور انبیاء ﷺ نظر آتے ہیں۔

اسلام نے نظریۂ توحید کو اپنی بہترین شکل میں پیش کیا ہے۔ اور یہ الٰہی حقائق میں سے اعلیٰ حقیقت ہے یہ کہ 'خالق صرف ایک ہے اور اس جیسا کوئی نہیں (لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ)........ اور یہ کہ وہ اپنی ذات میں بھی ایک ہے اور صرف اس کے ارادۂ کن سے پوری کائنات وجود میں آئی ہے اور وہ قانون قدرت بھی ایک ہے جو اس پوری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اور سادہ سے سادہ مخلوقات سے لے کر انسان ناطق جیسی پیچیدہ سے پیچیدہ مخلوقات بھی اسی ارادۂ کن اور اسی قانون قدرت کا نتیجہ ہے اور آدم علیہ السلام سے دنیا کے آخری انسان تک تمام انسان بھی ایک ہی مخلوق ہیں اور اس ایک انسانیت کے لئے اللہ کی ارسال کردہ تحفہ ہے اور دین بھی ایک ہے۔ جماعت انبیاء بھی ایک ہی جماعت ہے اور وہ تمام امم بھی ایک امت ہیں جنہوں نے ان انبیاء کی دعوت پر لبیک کہا ہے۔ اور وہ تمام بشریت ایک ہے جو اس ایک خالق کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور اس توجہ اور یکسوئی کا نام بھی ایک ہے یعنی عبادت...... دنیا اور آخرت بھی ایک ہیں۔ بدیں مضمون کہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزاء ہے اور وہ شریعت اور قانون بھی ایک ہے جو اللہ نے ان انسانوں کے لئے وضع کیا ہے۔ اس کے سوا اسے کوئی اور شریعت مقبول نہیں ہے اور وہ سرچشمہ اور مصدر اور منبع بھی ایک ہے جس سے اس

انسانیت نے اپنی زندگی کا نظام فکر و عمل اخذ کرنا ہے۔

اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ ذات ہیں جن کو اس قدر روحانی قوت دی گئی تھی کہ ان کی روح وحدانیت کبریٰ اور لامحدود سے رابطہ رکھتی تھی۔ نیز آپ کو اس قدر طاقتور قوت ادراک دی گئی تھی۔ آپ وحدانیت کبریٰ کا تصور کر سکتے تھے۔ اور اسے مثالی شکل دے سکتے تھے اور آپ کی ذات میں ایسی قوت پنہاں تھی کہ آپ نے اپنی ظاہری اور عملی زندگی میں وحدانیت کبریٰ کے اس تصور کو عملاً پیش کیا۔

یہ تھا وہ رسول جو پوری بشریت کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا۔ اپنے یوم بعثت سے لے کر اس وقت تک جب تک اس دنیا کی مخلوقات اپنے خالق اللہ کے ہاں حاضر نہیں ہو جاتی۔ آپ کی رسالت ایسی تھی جس نے انسان کے فہم وادراک پر بغیر کسی پابندی کے اعتماد کیا۔ یہاں تک کہ مادی اور قاہرانہ معجزات کے مقابلے میں بھی اور اس سے مقصود یہ تھا کہ دنیا کے سامنے یہ اعلان کر دیا جائے کہ اب وہ دور آگیا ہے جس میں انسان نے عقلی بلوغ کا مقام پالیا ہے۔

اس کا منطقی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ آپ خاتم الرسل ہوں اور آپ کی رسالت خاتم رسالات ہو اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے بعد اب سلسلہ وحی منقطع ہو گیا اور آپ کی رسالت کے عہد میں بشریت کے لئے وحدانیت کبریٰ کے خطوط وحدود قائم ہو گئے اور ایک ایسے مکمل نظام زندگی کا اعلان کر دیا گیا جس کے حدود میں تمام آنے والی نسلیں زندگی کی تگ ودو جاری رکھ سکتی ہیں۔ اس نے تفصیلات وتشریحات تو عقل انسان پر چھوڑ دیں اور باقی سب کچھ بتا دیا اور لازم کر دیا گیا کہ یہ تفصیلات وتشریحات بھی اس مکمل نظام الٰہی کی روشنی میں طے کی جائیں۔ کیونکہ ان کے لئے جدید رسالت کی ضرورت نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ خوب جانتا تھا وہی تو تھا جس نے انسان کو پیدا کیا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ وہ کون ہیں اور کیا ہیں۔ وہ خوب جانتا تھا کہ وہ کیا تھے اور کیا ہیں؟ وہ خوب جانتا تھا کہ اس رسالت آخرہ نے جو مکمل نظام زندگی تجویز کیا ہے وہ اس انسان کی جدید سے جدید اور ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ زندگی کے لئے کافی ہے۔ کون ہے جو یہ زعم لے کر سامنے آسکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے بندوں کی مصلحت کے بارے میں زیادہ جانتا ہے یا کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ خاتم النبیین کا پیش کردہ نظام زندگی اس قابل نہیں ہے کہ دور جدید میں انسان کی ترقی یافتہ زندگی کے لئے مفید ہو۔ یا کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ الٰہی نظام زندگی کے مقابلے میں کوئی اچھا نظام زندگی تجویز کر سکتا ہے۔ جو شخص بھی ان میں سے کوئی ایک دعویٰ کر بیٹھے یا یہ یقین کرتا ہو کہ یہ دعوے درست ہیں تو اس شخص نے کفر صریح کا ارتکاب کر لیا ہے۔ اور یہ ایسی حرکت ہے جس کے کفریہ حرکت ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ اور ایسے شخص نے گویا اپنی ذات اور پوری انسانیت کے لئے ایک عظیم فتنہ اور ایک عظیم شر کا ارادہ کر لیا ہے۔ یہ شخص صریحاً اللہ کا دشمن ہے۔ یہ انسانیت کا کھلا دشمن ہے حالانکہ اسلامی نظام زندگی اس بشریت کے لئے بطور رحمت وبرکت نازل کیا گیا تھا تاکہ وہ قیامت تک انسانی زندگی پر حکم فرما ہو۔

اور اس کے بعد کیا ہوا؟ ان رسولوں کے پرستاروں نے باہم مقاتلہ شروع کر دیا۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور پیغام کی ایک نوعیت نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا۔ تمام انبیاء کی جماعت کے اتحاد سے بھی انہیں کوئی فائدہ نہ ہوا۔ یہ حقیقت ان متبعین کو اس بات سے باز نہ رکھ سکی کہ وہ باہم جدال وقتال میں مبتلا ہوں اور یہ اس لئے کہ

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا

۳۴
۴۵
۱

جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخۡتَلَفُوۡا فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ كَفَرَ‌ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقۡتَتَلُوۡا وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا يُرِيۡدُ ﴿۲۵۳﴾

"اگر اللہ چاہتا تو ممکن نہ تھا کہ ان رسولوں کے بعد' جو لوگ روشن نشانیاں دیکھ چکے تھے' وہ آپس میں لڑتے مگر (اللہ کی مشیت یہ نہ تھی کہ وہ لوگوں کو جبراً اختلافات سے روکے' اس وجہ سے) انہوں نے باہم اختلاف کیا۔ پھر کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر کی راہ اختیار کی۔ ہاں اللہ چاہتا تو وہ ہرگز نہ لڑتے مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔"

یعنی یہ جدال و قتال اللہ تعالیٰ کی مشیت کے خلاف نہ تھے۔ اس لئے کہ اللہ کی مشیت کے خلاف اس کائنات میں کوئی واقعہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کارخانہ قدرت جس طرح چل رہا ہے یہی اللہ کی مشیت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور اس میں ہدایت اور ضلالت دونوں کی استعداد کا ودیعت ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات انسان کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دی ہے کہ وہ اچھا راستہ اختیار کرتا ہے یا برا۔ اس لئے اس تخلیق اور اس کے اندر ودیعت کی ہوئی استعداد کے نتیجے میں جو امر بھی وقوع پذیر ہوتا ہے وہ دائرہ مشیت ایزدی میں شامل ہے اور وہ اللہ کی مشیت کے عین مطابق ہے۔

اسی طرح مخلوقات اور خصوصاً انسان میں قابلیت اور استعداد کا تفاوت بھی سنن الٰہیہ میں سے ایک اہم سنت ہے۔ خالق نے مخلوقات کو متنوع بنایا ہے۔ اگرچہ اصل تخلیق اور نشوونماسب کی ایک جیسی ہے اور یہ اس لئے کہ انسان نے اس کرۂ ارض پر جو فریضۂ منصبی اور بار خلافت اٹھانا تھا وہ مختلف النوع تھا اس لئے ہر کسے را بہر کارے ساختند۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ نہ تھی کہ تمام مخلوقات کو ایک ہی صلاحیت اور ایک ہی معیار پر کاربن کاپی کی طرح بنتا چلا جائے۔ اس لئے کہ اس دنیا میں اس مخلوقات نے مختلف النوع کام سرانجام دینے تھے۔ جہاں حیات انسانی کو ترقی دینا مقصود تھا اس میں رنگارنگی اور بوقلمونی پیدا کرنا مطلوب تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کے لئے متنوع فرائض منصبی پیدا کئے تھے تو لازمی تھا کہ استعداد اور صلاحیتوں میں بھی فرق ہوتا۔ تاکہ یہ اختلاف وسیلہ کمال بنے۔ ہاں اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر یہ لازم کیا ہے کہ وہ غوروفکر کرے۔ اپنے لئے راہ ہدایت اور حقیقت ایمان تلاش کرے۔ اس لئے کہ اس نے انسان کے اندر یہ استعداد اور صلاحیت ودیعت کی ہے کہ وہ غوروفکر کے ذریعہ براہ راست ہدایت پائے۔ اس کائنات میں ایمان و ہدایت کی راہ پانے کے لئے واضح دلائل بکثرت موجود ہیں اور انسانی تاریخ میں سلسلہ انبیاء و رسل کا تاریخی ریکارڈ اس کے سامنے موجود رہا ہے۔ اور اس ہدایت اور ایمان کے دائرے کے اندر اندر ہر قسم کا صحت مند تنوع اور اختلاف جاری رہے گا۔ اور یوں بھی نہ ہو گا کہ لوگ کاربن کاپی بن جائیں اور ایک ہی قالب سے نکلی ہوئی مصنوعات کی طرح بنتے رہیں۔

وَلٰكِنِ اخۡتَلَفُوۡا فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ كَفَرَ‌ؕ ...... "مگر انہوں نے باہم اختلاف کیا پھر کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر کی راہ اختیار کی۔"

انسانوں کا اختلاف ایمان و عقیدہ کے اعتبار سے جب اس حد تک پہنچ جائے تو یہ نظریاتی اختلاف کفر و ایمان کا اختلاف بن جاتا ہے۔ پھر تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور یہ تصادم اس لئے ہوتا ہے کہ دنیا میں قوت کا توازن قائم ہو اور ایک قوت کا دفاع دوسری قوت کے ذریعہ ہو۔ کفر کا دفاع ایمان کے ذریعہ کیا جائے۔ گمراہی کا مقابلہ ہدایت سے کیا جائے۔ شر کا دفاع خیر سے کیا جائے' اس لئے کہ اللہ کی اس سرزمین کو کفر گمراہی اور شر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب صورت حال یہاں تک پہنچ جائے کہ ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان کفر

وایمان کی خلیج واقعہ ہو جائے تو اس وقت کوئی گروہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ مطیع انبیاء ہے۔ جب مدینہ طیبہ میں یہ آیات نازل ہوئیں تو جماعت مسلمہ ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھی۔ مکہ مکرمہ میں مشرکین مکہ اس زعم میں مبتلا تھے کہ صرف وہی ملت ابراہیمی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مدینہ طیبہ میں یہودی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین کے پیرو ہیں۔ اور عیسائیوں کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کے پیروکار ہیں۔ حالانکہ ان فرقوں میں سے ہر ایک فرقہ اپنے اصل دین سے بہت دور جا چکا تھا۔ اس نے اپنے نبی کے پیغام کو ترک کر دیا تھا۔ اور وہ اپنے اصل ادیان سے اس قدر دور جا چکے تھے کہ ان پر کافر ہو جانے کا اطلاق درست طور پر ہو سکتا تھا۔

جس دور میں یہ آیات نازل ہوئیں اس دور میں مسلمان مشرکین عرب کے ساتھ بر سرپیکار تھے اور حالات یہ رخ اختیار کر رہے تھے کہ قریب ہی اہل کتاب کے اہل کفر کے ساتھ بھی ان کی لڑائی شروع ہونے والی تھی۔ اس لئے ایسے حالات میں عام مسلمانوں کے ذہن کو صاف کر دیا گیا کہ مختلف الخیال لوگوں کے درمیان نظریاتی جنگ اور مسلح جنگ ایسے حالات میں مشیت الٰہی کے عین مطابق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی اجازت سے یہ جنگ لڑی جارہی ہے۔

لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ............... "اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ ہرگز نہ لڑتے۔" لیکن اللہ نے چاہا کہ وہ لڑیں اور اس لئے چاہا کہ ایمان کفر کے مقابلے میں صف آرا ہو اور دنیا میں وہ نظریاتی اساس جم جائے اور مستحکم ہو جائے جسے تمام انبیاء لے کر آئے جو ایک بھی ہے اور مسلم سچائی بھی ہے۔ لیکن بعض لوگوں نے اس متحدہ سچائی سے انحراف اختیار کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو خوب جانتے تھے کہ باطل اور گمراہی کا مزاج یہی ہے کہ وہ کبھی غیر جانبدار ہو کر کھڑی نہیں رہتی۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے شوریدہ سر ہے۔ اس لئے وہ لازماً جارحیت کی راہ اختیار کرتی ہے۔ اور اہل ہدایت کو گمراہ کرتی ہے۔ وہ راستی کو کجی میں تبدیل کرتی ہے۔ لہٰذا اہل ایمان اور اہل راستی کا فرض ہے کہ وہ گمراہی اور کجی کے خلاف بر سرپیکار رہیں۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ............... "مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" اللہ کی مشیت بے قید ہے۔ اس کی قدرت کامل اور فعال ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے مختلف ہوں۔ اس نے یہ فیصلہ فرمایا کہ انہیں اپنی زندگی کی راہیں اختیار کرنے کی آزادی ہو۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ جو راہ ہدایت اختیار نہ کرے گا وہ گمراہ ہو گا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ شر اپنے مزاج کے اعتبار سے جارح ہوگی اور کجی کو پسند کرے گی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ خیر و شر بر سرپیکار ہوں۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اہل ایمان اس واحد، واضح اور بالکل سیدھی حقیقت کے قیام کے لئے جہاد کریں۔ اس نے یہ قرار دیا کہ انبیاء و رسل کے متبعین کے لئے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو انبیاء کی طرف منسوب کر دیں۔ اعتبار اس بات کا ہے کہ ان کا رویہ کیسا ہے اور ان کا عمل کیا ہے؟ اور یہ کہ اہل ایمان کے جہاد کی زد سے وہ محض اس لئے نہ بچ سکیں گے کہ وہ انبیاء کے وارث ہیں حالانکہ انہوں نے انبیاء کے عقیدہ اور ایمان سے انحراف کر لیا ہے۔

یہ حقیقت اور اصول جس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کی پہلی اسلامی جماعت کے لئے کیا ایک ایسی حقیقت اور ایک ایسا اصول ہے جو بے قید ہے اور جس کا تعلق کسی خاص زمانے سے نہیں ہے۔ قرآن مجید کا یہ انداز بیان ہے کہ وہ ایک اصولی اور مطلق بات کو بھی ایک مخصوص واقعہ کے ضمن میں بیان کرتا ہے۔ محل خاص ہوتا ہے لیکن حکم عام ہوتا ہے۔

○○○

یہی وجہ ہے کہ اس اصولی بات یعنی اختلاف عقیدہ اور قتال کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو خطاب کر کے یہ حکم دیتے ہیں

کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو وسائل رزق دیئے ہیں اس میں سے اس کی راہ میں خرچ کریں۔ اس لئے کہ انفاق مالی جہاد ہے اور مالی قربانی جہاد کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ۗ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۵۴﴾

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' جو کچھ مال و متاع ہم نے تم کو بخشا ہے' اس میں سے خرچ کرو' قبل اس کے کہ وہ دن آئے' جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی' نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔ اور ظالم اصل میں وہی ہیں جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں۔"

اہل ایمان کے دلوں سے یہ ایک محبت بھری اپیل ہے۔ یہ اپیل اہل ایمان اور اپیل کنندہ کے درمیان ایک روحانی رابطہ ہے کیونکہ وہ ذات باری پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ "اے ایمان لانے والو!"

اپیل یہ ہے کہ جو تمہیں ہم نے عطا کیا ہے اس کا ایک حصہ ہمیں دے دو۔ آخر ہم ہی دینے والے اور داتا ہیں اور ہم ہی اپنے دیئے سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُم ............... "جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے' اس میں سے خرچ کرو۔"

دیکھو ایسے مواقع بار بار نہیں آتے۔ اگر تم نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر یہ مواقع نصیب نہ ہوں گے۔ مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ............... "قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی' نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔"

یہ آخری موقعہ ہے۔ اگر یہ تم سے چلا گیا تو پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ اس موقعہ پر مال نفع بخش کاروبار میں لگ رہا ہے۔ اس کے بعد کوئی دوستی' کوئی سفارش اس نقصان اور خسارے کی تلافی کرنے کے لئے نہیں ہے۔

یہاں اس مقصد کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے جس کے لئے خالق کائنات خود چندہ کی اپیل کر رہے ہیں یعنی جہاد فی سبیل اللہ کے لئے یہ مطالبہ ہو رہا ہے۔ اور جہاد اس لئے ہے کہ کفر کا وفیہ کیا جائے۔ دنیا سے ظالمانہ نظام کو ختم کیا جائے جو کفر کی شکل میں قائم ہے۔ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ............... "ظالم وہی ہیں جو کفر کی روش پر جم جاتے ہیں۔"

انہوں نے سچائی کا انکار کر کے ظلم کا ارتکاب کیا۔ انہوں نے خود اپنے نفوس پر ظلم کیا ہے جنہیں وہ ابدی ہلاکت کے گڑھے میں گرا رہے ہیں۔ وہ عوام الناس پر بھی ظلم کر رہے ہیں۔ یوں کہ وہ انہیں راہ ہدایت پر آنے سے روکتے ہیں اور انہیں گمراہ کرتے ہیں اور انہیں اس بھلائی تک پہنچنے نہیں دیتے جس جیسی اور کوئی بھلائی نہیں ہے۔ یعنی امن و سلامتی کی بھلائی' اطمینان و محبت کی بھلائی اور اصلاح و یقین کی بھلائی۔

جو لوگ اس بات کے دشمن ہیں کہ لوگوں کے دل و دماغ میں ایمان کی حقیقت جاگزیں ہو جائے۔ جو لوگ اس بات کے دشمن ہیں کہ ایمانی نظام زندگی ہماری زندگیوں میں جاری و ساری ہو جائے اور جو لوگ اس بات کی جدوجہد کر رہے ہیں کہ ایمانی شریعت ہمارے اجتماعی نظام میں نافذ نہ ہونے پائے' وہ اس انسانیت کے بدترین دشمن ہیں۔ وہ پرلے درجے کے ظالم ہیں۔ اگر انسانیت نے راہ راست کو پا لیا ہے تو اس کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے لوگوں کا اس وقت تک تعاقب کرے جب تک وہ اس ظلم سے باز نہیں آ جاتے۔ جو وہ مسلسل

انسانیت پر ڈھا رہے ہیں۔ انسانیت کا یہ فرض اولیں ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے مقابلے کے لئے جان و مال کی یہ قربانی دے۔ اور یہ ہر اس اسلامی جماعت کا بھی فرض ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے برپا کیا ہے۔ اور جسے یہ فریضہ سرانجام دینے کی دعوت دی جا رہی ہے اور جسے اس کا رب ایسے گہرے الہامی الفاظ میں پکار رہا ہے۔

○○○

رسولوں کے بعد ان کی امتوں کے درمیان نظریاتی اختلافات اور تاریخی جنگ و جدال کے بیان کے بعد اور یہ واضح کرنے کے بعد کہ واضح ایمانی دلائل کے باوجود انہوں نے ناحق کفریہ تصورات اپنا لئے۔ اب یہاں یہ مناسب سمجھا گیا کہ یہاں ایک ایسی جامع آیت اتار دی جائے جو ایمانی تصورات کے اصول و قواعد پر مشتمل ہے۔ یہ آیت الکرسی ہے جو نظریۂ توحید کو اپنی پوری گہرائیوں اور واضح نشانات کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ یہ ایک عظیم المرتبہ آیت ہے۔ جس میں گہرے معانی پوشیدہ ہیں اور جس کا دائرہ اطلاق بہت ہی وسیع ہے۔ (جس میں وہ کم از کم عقائد بیان کئے گئے ہیں جو کفر و ایمان کے درمیان فاصلہ متعین کرتے ہیں)

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ۚ وَ لَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ وَ لَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَ هُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

"اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی، جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے۔ اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے، اس سے بھی وہ واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفت اور اک میں نہیں آسکتی۔ الا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی نگہبانی اس کے لئے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی بزرگ و برتر ذات ہے۔"

اس آیت میں جن صفات کو گنوایا گیا ہے ان میں ہر ایک اسلامی تصور کائنات کے اساسی اصولوں میں سے کسی ایک اصول پر مشتمل ہے۔ اگرچہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلام کے اساسی عقائد پر مکی دور میں نازل ہونے والی آیات میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ تاہم اس اہم اور اساسی موضوع پر مدینہ میں نازل ہونے والی آیات میں بھی بعض اوقات بحث کی گئی ہے۔ اس لئے کہ ان عقائد و تصورات پر ہی اسلامی نظام زندگی کی بنیاد رکھی گئی ہے اور جب تک اساس ٹھیک نہ ہو، پوری دیوار درست نہیں ہو سکتی۔ نہ اس نظام کی تشریح ہو سکتی اور نہ یہ نظام نفس انسانی کے مسلمہ حقائق سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ نہ اس کی کوئی معقول اور پر از یقین تعبیر کی جا سکتی ہے۔

اس کتاب کے حصہ اول میں "تفسیر سورۂ فاتحہ کے ضمن میں" میں نے اس گمراہی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ ذات

باری کے بارے میں انسانی ضمیر اور عقیدہ کے تطہیر کی بڑی ضرورت ہے۔ انسانی ضمیر جاہلیت کی تہ بہ تہ غلط افکار کے نیچے محض اس لئے دبا ہوا تھا کہ انسان کے ذہن میں تصور الٰہ اپنی صاف و شفاف اور واضح شکل میں نہ تھا۔ یہ عقیدہ خرافات اور دیو مالائی عقائد کے نیچے دبا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے فلاسفر کے ہاں بھی تصور خدا واضح اور صاف نہ تھا۔ یہاں تک کہ جب اسلامی نظریۂ حیات آیا اور اس نے ذات باری کو اپنے صحیح تصور کے ساتھ پیش کیا اور انسانی ضمیر کو ان ناقابل یقین مروجہ تصورات کے بوجھ کے نیچے سے نکال دیا اور انسان جس اندھیر میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا' اس سے اسے نجات ملی۔

غرض اس آیت میں جو صفات بھی بیان کی گئی ہیں وہ اسلامی تصور کائنات کے لئے ایک عمومی اساس ہیں اور اس طرح یہ صفات پھر اسلام کے تفصیلی نظام زندگی کے لئے ماخذ ہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ............ "اللہ' جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔" یہ ایک فیصلہ کن وحدانیت ہے جس میں کسی قسم کے انحراف کی کوئی گنجائش نہیں ہے' اور اس میں وہ شرکیہ شائبے بھی نہیں ہیں جو سابقہ ادیان کے تصور الٰہ پر طاری ہو گئے تھے۔ مثلاً تثلیث کا خود ساختہ عقیدہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اہل کلیسا نے اختیار کیا۔۔۔ یا وہ عقائد جن کی قدیم مصری اقوام قائل تھیں۔ جو کسی وقت ایک خدا کے قائل تھے لیکن ازمنہ مابعد میں اس ایک خدا کو سورج کی ٹکیا کی شکل میں متمثل کر دیا گیا اور بعدہ' اس بڑے سورج الٰہ کے تحت بہت سے چھوٹے چھوٹے الٰہ گھڑ لئے گئے۔

یہ فیصلہ کن وحدانیت' اسلامی تصورات و عقائد کی اساس ہے جس سے اسلامی نظام زندگی اپنی مفصل صورت میں متشکل ہوتا ہے۔ یہی تصور خدا ہے جس کے نتیجے میں ہم اپنی عبادات اور اپنی اطاعت میں صرف اللہ کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اس کے مطابق کوئی انسان اللہ کے سوا کسی کا مطیع فرمان اور کسی کا غلام نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف اللہ کی عبادت کر سکتا ہے۔ صرف اللہ کی اطاعت اس پر فرض ہے جس کا اللہ نے اطاعت کرنے کا واضح حکم دیا ہے۔ اسی تصور خدا سے یہ اصول پھوٹتا ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس لئے صرف وہی قانون ساز ہو سکتا ہے اور انسان اپنے قواعد و ضوابط صرف شریعت کی روشنی میں وضع کر سکتا ہے۔ اسی تصور الٰہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ انسان اپنے لئے اقدار حیات صرف اللہ سے اخذ کر سکتا ہے۔ زندگی کی کوئی قدر اگر اللہ کے ترازو میں کوئی وزن نہیں رکھتی تو اس کا کوئی وزن نہ ہو گا۔ کوئی قانون' کوئی رواج اور کوئی تنظیم جو اللہ کے نظام کے خلاف ہے بالکل کالعدم ہے۔ غرض عقیدۂ توحید کے نتیجے میں انسانی ضمیر میں ایک شعور پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں ایک تفصیلی نقشۂ حیات مرتب ہوتا ہے۔

اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ............ "زندۂ جاوید اور سنبھالنے والا" جس حیات کی نسبت یہاں ذات باری کی طرف کی گئی ہے۔ وہ ذاتی صفت ہے۔ وہ ایسی حیات نہیں ہے جو مثلاً ایک مخلوق اپنے خالق سے مستعار لیتی ہے۔ اس معنی میں صرف اللہ ہی زندۂ جاوید ہے۔ وہ ازلی اور ابدی زندہ ہے۔ نہ اس کا کوئی نقطۂ آغاز ہے اور نہ نقطۂ انتہا ہے۔ حیات الٰہیہ زمان و مکان کے اس تصور سے پاک ہے جو مخلوقات کی زندگی کا ایک لازمہ ہے۔ جس کا ایک نقطہ سے آغاز ہوتا ہے اور ایک پوئنٹ پر وہ جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں هُوَ الْحَيُّ ....... کہا گیا کہ صرف وہی زندہ ہے۔ اس مفہوم کے ساتھ اور کوئی زندہ نہیں ہے۔ پھر حیات باری ان تصوراتی لوازم سے پاک ہے۔ جن کے ساتھ ایک انسان زندگی کا کوئی تصور کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ جیسا کوئی نہیں ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ........ یہی وجہ ہے کہ عام زندگی کے مفہوم کے ساتھ جو خصائص وابستہ ہیں اللہ تعالیٰ کی زندگی میں ان کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی حیات ایک مطلق اور بے قید حیات ہے اور ان خصوصیات سے پاک ہے جو انسانی زندگی کا لازمہ ہیں۔ لہٰذا اس سے ان تمام تصوراتی دیو مالائی مفاہیم کی نفی ہو جاتی ہے جو لوگوں نے اللہ کی جانب منسوب کر رکھے ہیں۔

القیوم کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کا نگہبان ہے اور تمام موجودات اس کی وجہ سے موجود ہیں۔ اور تمام موجودات اپنے وجود اور قیام کے لئے اس کے محتاج ہیں اور اس کے زیر تدبیر ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ اللہ تخلیق کے بعد اپنی مخلوقات کے بارے میں کوئی فکر نہیں کرتا جیسا کہ ارسطو کا قول ہے۔ ارسطو کا خیال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے علاوہ کسی کے بارے میں فکر مند نہیں ہو سکتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ قیومیت کے اس تصور میں مکمل پاکی اور عظمت پائی جاتی ہے۔ حالانکہ اس کے اس تصور کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ جل شانہ کا رابطہ اپنی مخلوق کے ساتھ کٹ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ مخلوق کو ترک کر دیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اللہ کا اسلامی تصور ایک مثبت تصور ہے اس میں سلبیت نہیں ہے۔ وہ اس اساس پر قائم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا نگہبان ہے اور دنیا کی ہر ہستی اپنے وجود میں اللہ کے وجود اور تدبیر کی محتاج ہے۔ یوں ایک مسلم مومن کا ضمیر و شعور' اس کی پوری زندگی اور اس کا پورا وجود' اس کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کا وجود اللہ جل شانہ کے وجود کے ساتھ مربوط اور متعلق ہو جاتا ہے۔ اور وہ اللہ ہی ہے جو اس مومن و مسلم کی زندگی میں متصرف ہے اور پھر وہی ذات اس کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات میں بھی متصرف ہے اور یہ تصرف ذات باری تعالیٰ نہایت ہی حکیمانہ اور مدبرانہ شان سے فرما رہی ہے۔ اس لئے انسان اپنی پوری زندگی میں ایک مقرر منہاج پر کاربند ہوتا ہے جو منہاج نہایت ہی حکیمانہ اور مدبرانہ ہے۔ اسی منہاج سے وہ اپنی اقدار حیات' اور حسن و قبح کے پیمانے اخذ کرتا ہے۔ اور اس پوری زندگی میں اور اس پورے عمل میں اللہ تعالیٰ انسان کا نگہبان رہتا ہے۔

لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۔۔۔ "وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے۔" یہ اس کی نگہبانی کی تائید ہے۔ یعنی ہر چیز پر وہ نگہبان ہے۔ اور ہر چیز اس سے قائم ہے۔ یہ ایک قسم کی تعبیر ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفت نگہبانی کو انسانی ادراک کے قریب تر کر دیتی ہے ورنہ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات جیسی نہیں ہو سکتی۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہاں اگرچہ اس بات کی نفی کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نیند آتی ہے یا اونگھ پکڑ سکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذات باری ان سب تصورات سے وراء ہے اور مطلقاً ان تشبیہات سے پاک ہے۔

یہ حقیقت کہ اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کا اس کی تمام جزئیات کے ساتھ نگہبان ہے اور ہر وقت اور ہر حالت میں قیوم ہے۔ ایک عظیم حقیقت ہے بشرطیکہ انسان اس کا اچھی طرح تصور کر سکے۔ خصوصاً جب وہ اپنے محدود تصور میں اس عظیم کائنات کے لاتعداد ذرات' خلیوں' مخلوقات' اشیاء اور ان کی نسبت ہونے والے ان گنت واقعات کو لانے کی سعی کرے اور اپنی وسعت فکر کے مطابق یہ سوچنے کی کوشش کرے کہ کس طرح یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی نگہبانی میں چل رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان تمام امور کی تدابیر کس طرح اختیار فرماتے ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ عقل انسانی کے حقیقی ادراک سے وراء ہے۔ اور انسان اس کا ایک محدود تصور ہی کر سکتا ہے اور اس محدود تصور سے بھی سر چکرا جاتا ہے۔ عقل حیران رہ جاتی ہے ہاں دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ ☆

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ "زمین و آسمان میں جو کچھ ہے' اسی کا ہے۔" یہ ایک ہمہ گیر ملکیت ہے اور بے قید ملکیت ہے۔ کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں۔ کسی حد میں محدود نہیں ہے۔ نہ اس میں کوئی شریک ہے اور نہ یہ ملکیت کبھی ختم ہوتی ہے۔ یہ وحدہ' لاشریک الہ واحد کے معانی میں سے ایک معنی ہے۔ وہ واحد اللہ ہے۔ صرف وہی الٰہ ہے۔ صرف وہی نگہبان ہے۔ صرف وہی مالک ہے۔ اس سے ان تمام شرکیہ عقائد کی نفی کر دی گئی جو بھی انسانی عقل میں در آسکتے ہیں۔ اس دنیا میں ملکیت اور حاکمیت کے نظریہ کی بھی وضاحت ہو جاتی۔ جب اللہ ہی حاکم و مالک ٹھہرا تو پھر اس دنیا میں بھی حق حاکمیت کسی کو حاصل نہ ہو گا۔ انسان حاکم نہ ہو گا بلکہ وہ اسی وحدہ لاشریک حاکم کا خلیفہ ہو گا۔ اور وہ نظام خلافت میں ان تمام حدود و قیود کا پابند ہو گا جو حدود و قیود خلیفہ

گیرندہ نے استخلاف کے وقت اپنی شریعت میں خلیفہ پر عائد کی ہیں۔ اس لئے کوئی خلیفہ شریعت کی حدود و قیود سے آزاد نہ ہو سکے گا۔ اور اگر کوئی خلیفہ ان قیود کی پابندی نہ کرے گا جو خلافت کے منصب کی وجہ سے اس پر عائد ہیں تو سرے سے اس کی خلافت ہی کالعدم ہو جائے۔ اور اہل ایمان کا یہ فرض ہو گا کہ وہ اس خلیفہ کے خلاف شریعت اقدامات کو مسترد کر دیں۔ اسلامی شریعت میں یہی اسلامی نظریہ کار فرما ہے۔ نیز اس شریعت پر مبنی جو عملی زندگی تشکیل ہوتی ہے۔ اس کی تہہ میں بھی یہی نظریہ کار فرما ہے۔ جب اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں یہ فرماتے ہیں لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ ............ "اسی کے لئے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔" تو اس سے محض عقیدہ اور نظریہ یا محض خیال مراد نہیں ہوتا۔ یہ فقرہ دراصل انسان کی پوری زندگی کے لئے ایک دستوری دفعہ ہوتی ہے۔ نیز دنیاوی زندگی میں باہم جو رابطے قائم ہوتے ہیں' وہ بھی اسی اساس پر ہیں کہ جو کچھ اس دنیا میں ہے وہ اللہ کا ہے۔

جب یہ حقیقت انسانی ضمیر میں جاگزیں ہو جائے۔ جب انسان اپنے مالک حقیقی کا صحیح شعور اپنا لیتا ہے کہ وہ زمین و آسمان کا مالک ہے اور جب انسان اپنے دل و دماغ سے یہ غلط خیال نکال لیتا ہے کہ جسے وہ اپنی ملکیت سمجھتا ہے وہ تو اس کی ملکیت ہی نہیں ہے اور جب وہ شعوری طور پر اپنی جملہ مقبوضات کو مالک حقیقی کی ملکیت سمجھتا ہے اور جب انسان کے ذہن میں صرف یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں جو کچھ ہے وہ تو عارضی طور پر مانگا ہوا ہے۔ اور اسے مالک حقیقی کی جانب سے ایک محدود وقت کے لئے دیا ہوا ہے تو ان حقائق کا محض ادراک اور احساس ہی انسان کے دل سے اس کی سرتیزی' لالچ' حرص' بخل اور رات دن جمع کرنے کی فکر کی شدت کو کم کر دیتا ہے۔ اس تصور حیات اور ان احساسات کی وجہ سے انسان کے اندر صبر' تمنا اور قناعت اور راضی برضا ہونے کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ فیاض اور سخی ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں سکون اور طمانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ امیر ہو یا غریب اس کی چال ڈھال میں ایک قسم کا سکون و اطمینان اور قرار پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اسے کچھ نہ ملے تو اسے حسرت نہیں ہوتی اور اگر اسے اس کا مطلوب حاصل نہیں ہوتا تو وہ اپنے دل میں جلن یا گھٹن نہیں پاتا۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ ... "کون ہے جو اس کے ہاں' اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرتا ہے؟" یہ صفات باری میں سے ایک دوسری صفت ہے۔ اس سے مقام الوہیت اور مقام عبدیت کی اچھی طرح وضاحت ہو جاتی ہے۔ بندے سب کے سب اللہ تعالیٰ کے دربار میں مقام عبودیت میں کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اس مقام سے نہ آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ تجاوز کر سکتے ہیں۔ وہ بندے کے مقام پر خشوع و خضوع کی حالت میں ایستادہ ہوتے ہیں۔ جو نہ رب کی طرف آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ ہی اس کے ہاں سفارش کی جرأت کر سکتا ہے۔ الا یہ کہ اسے پیشگی اجازت مل گئی ہو تو وہ اس صورت میں اس اجازت کی حدود میں سفارش کر سکتا ہے۔ ہاں یہ بندے اور غلام خود اپنے درمیان ضرور فرق مراتب رکھتے ہیں اور خود اللہ کے ہاں بھی ان کے درجات و مقامات میں ضرور تفاوت ہے۔ لیکن جناب باری تعالیٰ میں ان کے لئے ایک حد عبدیت ہے جس سے انہیں آگے بڑھنے کی نہ اجازت ہے اور نہ صلاحیت۔

اللہ تعالیٰ کی شان کبریائی' اس کی جلالت شان اور اس کے رعب اور دبدبے کی طرف یہاں ایک اشارہ کیا گیا ہے اور استفہام انکاری کا فقرہ استعمال کر کے اس اشارے کو مزید مؤثر بنا دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور اگر ایسا ہوا تو وہ ناپسندیدہ ہو گا۔ لہٰذا کون ہے جو جناب باری میں ایسی جرأت کر سکے؟ ہاں اگر اس کی اجازت ہو تو......

اسی حقیقت کی روشنی میں وہ تمام باطل تصورات واضح ہو جاتے ہیں۔ جو انبیاء و رسل کے بعد میں آنے والے لوگوں میں پیدا ہو گئے تھے جن کے حاملین نے حقیقت الوہیہ اور حقیقت عبدیت کے درمیان التباس پیدا کر دیا تھا۔ ان لوگوں نے یہ عقیدہ اختیار کر لیا تھا کہ اللہ کا بیٹا ہے جو اس کے ساتھ بوجہ تعلق ابنیت کسی نہ کسی شکل میں شریک اور خلیط ہے۔ پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسے لوگوں

کو شریک بنالیا تھا جو اللہ کے ہاں سفارش کرتے ہیں اور وہ لازماً ان کی سفارش کو تسلیم کرتے ہیں یا پھر انہوں نے انسانوں میں سے بعض کو اللہ کا جانشین مقرر کر دیا تھا جو اللہ سے اپنی قرابت کی وجہ سے اختیارات حاصل کر چکے تھے لیکن اس حقیقت کے اظہار کے بعد کہ اللہ کے ہاں کوئی شفیع نہیں ہے۔ یہ تمام تصورات باطل اور ناپسندیدہ ٹھہرتے ہیں۔ اور انسانی ذہن انہیں قبول ہی نہیں کرتا۔ انسانی ضمیر اس کا انکار کرتا ہے اور وہ ایک مومن کے رخ خیال پر آتے ہی نہیں۔

یہ اسلامی تصور حیات کا ایک جلا ہے کہ اس میں کوئی وہم و تلبیس نہیں ہے۔ اسلامی سوچ میں کوئی لچک نہیں ہے۔ خدائی خدائی ہے اور بندگی بندگی ہے۔ ان دو حقائق میں کوئی ذاتی التقاء ممکن نہیں ہے۔ رب رب ہے اور بندہ بندہ ہے۔ ان کے مزاج اور طبیعت میں اشتراک ممکن نہیں اور نہ ہی ان کا آپس میں ملاپ اور اتحاد ممکن ہے۔

ہاں بندے کا اپنے رب کے ساتھ ایک تعلق ہوتا ہے۔ رب کی جانب سے بندے پر رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ قرب، محبت اور اعانت ہوتی ہے۔ اسلام اس تعلق کو تسلیم کرتا ہے اور تعلق باللہ سے نفس انسانی کو شرابور کر دیتا ہے۔ اس سے دل مومن بھر جاتا ہے اور اس پر فیضان رحمت و محبت ہوتا ہے اور مومن رحمت رب کی خوشگوار چھاؤں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ بغیر اس کے ذات الٰہی اور ذات انسانی کے درمیان اختلاط کا کوئی تصور پیش کیا جائے۔ بغیر اس کے کہ ہم حق و باطل کی کوئی آمیزش کریں یا افکار باطلہ کا ڈھیر لگا کر کوئی ایسا فکری انتشار و اضطراب پیدا کریں، جس میں صداقت اور سچائی کی کوئی واضح اور صاف و شفاف صورت نظر نہ آئے۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ

.................. "جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے۔ اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز بھی ان کی گرفت ادراک میں نہیں آسکتی۔ الا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود انہیں دینا چاہے۔" اس حقیقت کے دو متقابل پہلو ہیں۔ ایک جانب اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ایک مسلم کا تصور الٰہ کیا ہے؟ دوسری جانب اس کا اظہار ہوتا ہے کہ اس الٰہ کے سامنے بندۂ مسلم کا مقام کیا ہے؟ اللہ کا مقام یہ ہے کہ وہ ہر ظاہر و باطن، حاضر و غائب کے بارے میں مکمل علم رکھتا ہے۔ وہ علیم و خبیر ہے۔ اس کا علم، کامل، جزئیات پر حاوی اور تمام موجودات پر مشتمل ہے۔ وہ انسان کے موجود حاضر پر بھی حاوی ہے۔ اور ان سے پوشیدہ ماضی اور آنے والے مستقبل پر بھی حاوی ہے۔ وہ ان امور پر بھی حاوی ہے جنہیں انسان جانتا ہے اور ان پر بھی حاوی جن کے بارے میں اسے کوئی علم نہیں ہے۔ غرض ان فقروں میں اللہ تعالیٰ کے علم کی شمولیت اور استقصاء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ رہے انسان تو وہ صرف اس قدر جانتے ہیں جس قدر انہیں اللہ تعالیٰ جاننے کی اجازت دیتے ہیں۔

حقیقت کا پہلا حصہ یہ ہے کہ اللہ ہر ظاہر و باطن کا عالم ہے۔ یہ حقیقت نفس انسان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے انسان اور اس کا ضمیر باری تعالیٰ کے سامنے بالکل ننگا ہو جاتا ہے۔ باری تعالیٰ ظاہر و باطن کا علیم و بصیر ہے۔ جس حقیقت کا انسان کو علم ہے اور وہ اس کا اظہار کر رہا ہے وہ بھی اس کے سامنے ہے اور جس چیز کو وہ نہیں جانتا وہ بھی اس کے سامنے ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل مستور کو بھی جانتا ہے۔ جس کے بارے میں نفس انسانی بے علم ہوتا ہے۔ جب انسان کو اس حقیقت کا صحیح شعور ہو جائے تو اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ تو باری تعالیٰ کے سامنے بالکل ننگا کھڑا ہے۔ نیز اس تصور سے نفس انسانی میں تسلیم و رضا اور خدا خوفی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ علیم و بصیر ہے۔

دوسرا پہلو اس حقیقت کا یہ ہے کہ انسان کا علم صرف اس حد تک محیط ہے جس حد تک اللہ تعالیٰ کی مرضی ہو۔ انسانوں کو اس حقیقت پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے۔ خصوصاً اس دور میں جبکہ انہوں نے اس کائنات کے طبیعی اور تخلیقی شعبے میں قدرے معلومات

حاصل کر لی ہیں۔

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ............... "اور وہ اللہ کے علم میں سے کسی چیز کا ادراک نہیں کر سکتے الا یہ کہ خود اللہ چاہے۔" صرف اللہ ہی ہر چیز کا مکمل علم رکھتا ہے جو کامل اور شامل ہے۔ اور اس کا علم بے قید ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی اجازت ہی سے انسانوں پر بعض علوم منکشف ہو جاتے ہیں۔ اور یہ انکشافات اللہ تعالیٰ اس لئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہوا ہے اور اس کا وعدہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ............... "عنقریب ہم ان کو اپنے نشانات دکھائیں گے جو آفاق میں بھی ہیں اور خود ان کے نفسوں میں بھی ہیں' تاکہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ وہ حق ہے۔" لیکن انسان اس بات کو بھول جاتے ہیں اور اللہ میاں ان پر جن علوم و حقائق کا انکشاف کر دیتے ہیں وہ ان کے لئے فتنہ بن جاتے ہیں۔ چاہے اس انکشاف کا تعلق قوانین فطرت کائنات سے ہو یا اس کا تعلق ان پوشیدہ معلومات سے ہو جسے وہ چند لحظوں کے لئے ایک متعین حد کے اندر اندر رہ کر جان لیتے ہیں۔ ان دونوں حقائق اور عطا کردہ معلومات سے انسان فتنے اور گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے کہ ان انکشافات کا اصل داتا تو اللہ ہے۔ اس فتنے اور گمراہی کی وجہ سے وہ نہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور نہ ذکر الٰہی ان کے دل میں ہوتا ہے بلکہ وہ خود سر ہو جاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات کفر تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے جب چاہا کہ انسان کو اس کرۂ ارض پر اپنا خلیفہ بنائے تو اس نے انسان کو اپنی معرفت سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ یہ وعدہ کیا کہ وہ عنقریب تمہیں تمہارے انفس اور تمہارے آفاق میں تمہیں بعض نشانات راہ دکھائے گا۔ اللہ کا وعدہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے۔ اور اللہ نے اسے یوں سچا کر دکھایا کہ آئے دن انسان پر نئے نئے رازوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ نسلوں کے بعد نسلوں میں ان انکشافات کا گراف مسلسل اوپر چلا جا رہا ہے۔ ان انکشافات میں قدرتی توانائیاں' اور اس کائنات کے طبیعی اصول شامل ہیں جو فریضۂ خلافت ارضی ادا کرنے کے لئے انسان کے لئے ضروری ہیں تاکہ وہ ان اصولوں کی دریافت کے نتیجے میں ان درجات بلند تک پہنچ سکے جو اس کے لئے اللہ نے مقدر کر رکھے ہیں۔

اس میدان میں اللہ تعالیٰ نے جس قدر علم مناسب سمجھا' انسان کو عطا کر دیا اور اسے اجازت دے دی کہ وہ اس میں کام کرے اور کچھ گوشے ایسے بھی تھے جن کی بابت اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم نہیں دیا۔ اس لئے کہ منصب خلافت فی الارض کے لئے اسے ان گوشوں کی ضرورت نہ تھی۔ مثلاً انسان سے خود زندگی کا راز پوشیدہ رکھا گیا جو ابھی تک پوشیدہ ہے اور مستقبل میں بھی وہ ذہن انسانی کے قابو میں آنے والا معلوم نہیں ہوتا۔ اور ابھی تک پوزیشن یہ ہے کہ اس موضوع پر بحث کرنا اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے برابر ہے۔ جبکہ کسی بات پر کوئی بین دلیل نہیں ہوتی۔ اسی طرح انسان سے اگلے لمحے میں ہونے والے واقعات محفوظ اور پوشیدہ رکھے گئے۔ کیونکہ وہ واقعات غیب ہیں جن تک رسائی کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ اور ان کے آگے اس قدر بھاری دیوار کھڑی کر دی گئی ہے کہ انسان اسے دور نہیں کر سکتا۔ ہاں بعض اوقات اس پردۂ مستور کے پیچھے سے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو ایک جھلک دکھا دیتا ہے۔ اور پھر پردہ گر جاتا ہے اور خاموشی چھا جاتی ہے۔ اور انسان کی رفتار ایک حد پر رک جاتی ہے اور وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

بہت سے اسرار و رموز انسان سے پوشیدہ رکھے گئے' جن کے علم کی اسے کوئی حقیقی ضرورت نہ تھی۔ جن کے بغیر بھی وہ خلافت فی الارض کے فرائض سرانجام دے سکتا تھا۔ اور اس زمین کی حقیقت کیا ہے؟ یہ تو ایک ذرہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اس وسیع کائنات کی فضا میں تیر رہا ہے۔

اپنے اس علم کی محدودیت کے باوجود اور اس حقیقت کے باوجود کہ اسے جو کچھ دیا گیا ہے وہ اللہ کی جانب سے ہے اور اس کی اجازت سے ہے۔ انسان فتنے میں پڑ جاتا۔ وہ اس زمین پر اپنے آپ کو الٰہ سمجھنے لگتا ہے۔ وہ کفر کی راہ اختیار کرتے ہوئے اس کائنات کے لئے کوئی اور الٰہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ حالانکہ آج بیسویں صدی کے سائنس دان بڑی عاجزی سے یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ ان کا علم محدود ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کائنات کے وہ گوشے بہت ہی کم ہیں جن کا وہ ادراک کر سکے ہیں۔ ہاں بعض جاہل جو اپنے آپ کو سائنس دان سمجھتے ہیں وہ اس غرے میں مبتلا ہیں کہ وہ بہت کچھ جانتے ہیں۔

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ ............... "اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور اس کی نگہبانی اس کے لئے تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔"

یہ مقام تو ایسا ہے کہ یہاں اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا بیان مجرد طور پر کیا جاتا لیکن یہ قرآن کریم کا ایک خاص انداز بیان ہے کہ وہ مجرد حقائق کو بھی محسوسات کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ اس محسوس تصویر کشی کے انداز بیان سے ذہن انسانی اصل حقیقت کے قریب آجاتا ہے۔ اور یوں حقیقت انسان کے دل و دماغ میں بیٹھ جاتی ہے۔ کرسی سے مراد بالعموم اقتدار اعلیٰ ہوتا ہے۔ اور جب یہ کہا گیا کہ اس کی کرسی آسمانوں اور زمین سے بھی وسیع تر ہے تو گویا آسمانوں اور زمین پر اسی کا اقتدار اعلیٰ قائم ہے۔ یہ بات تو تصوراتی پہلو سے ہے لیکن ایک محسوس اور ٹھوس انداز تعبیر سے جو تصویر ذہن نشین ہوتی ہے وہ دیرپا اور ٹھوس ہوتی ہے۔ یہی بات وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۔۔ میں ہے۔ اس میں بطور کنایہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا بیان کیا گیا ہے۔ لیکن یہ تعبیر بھی محسوس انداز میں پیش کی گئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو اس عظیم نگہبانی میں نہ کوئی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ اور نہ ہی اسے کوئی تھکاوٹ لاحق ہوتی ہے۔ تعبیر کا یہ انداز قرآن کریم اس لئے اختیار کرتا ہے کہ معانی کی ایسی تصویر کشی کی جائے کہ وہ حس میں اتر جائے اور اس طرح ذہن انسانی میں یہ معانی اچھی طرح بیٹھ جائیں اور یوں نظر آئیں جس طرح محسوسات نظر آتے ہیں۔

جو شخص قرآن کے اس انداز بیان کو سمجھ لیتا ہے اسے ان مباحث اور اعتراضات سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی جو قرآن کی اس محسوس انداز تعبیر پر یونانی فلسفہ کے نتیجے میں پیدا ہوئیں اور ان پر طویل عرصے تک جدل و جدال ہوتا رہا۔ کیونکہ ان مباحث نے قرآن مجید کے سادہ اور فطری انداز تعبیر کو خواہ مخواہ چیستاں بنانے کی کوشش کی اور اس کے حسن سادہ کو ختم کر دیا [1]

یہاں اس قدر کہنا کافی ہے کہ کرسی اور عرش کے بارے میں مجھے کوئی ایسی صحیح حدیث نہیں ملی ہے جس میں کرسی اور عرش کی تفسیر اور توضیح کی گئی ہو۔ اس لئے میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ ان کے بارے میں مزید کچھ نہ کہوں۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ............... "اور وہ بزرگ و برتر ہے۔" اس آیت میں جو صفات بیان کی گئی ہیں یہ ان میں سے آخری صفات ہیں۔ جن میں ایک حقیقت کا بیان ہے اور نفس انسانی میں اس حقیقت کا القاء مقصود ہے۔ یعنی صرف وہ ذات ہی بلند ہے اور صرف وہ ذات ہی عظیم ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اس کے علاوہ نہ کوئی عظیم ہے اور نہ کوئی سربلند ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ "وہ بزرگ و برتر ہے" بلکہ یہ کہا گیا: "وہی علی اور وہی عظیم ہے" پہلی تعبیر میں نفس علو و عظمت ثابت ہوتی۔ دوسری تعبیر میں علو اور عظمت کو ذات باری کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا۔ اور یہ اشارہ دیا گیا کہ اس معاملے میں اس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں ہے۔

صرف وہی علی ہے۔ عظمت میں وہ منفرد ہے۔ اور بندوں میں سے جو بھی علو اور عظمت کا ادعاء کرتا ہے اللہ اسے ذلیل اور سرنگوں کرتا ہے۔ اور آخرت میں وہ توہین آمیز سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

---

[1] تفصیلات کے لئے دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن میں فصل التصویر الفنی اور طریقۃ القرآن

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا

"وہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لئے مخصوص کر دیں گے جو زمین پر اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں۔" (۲۸:۸۳) اور جب فرعون کو ہلاک کیا گیا تو اس پر یہ تبصرہ کیا گیا **انہ کان من العالین** ..............................

"وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی بڑائی چاہتے ہیں۔"

انسان بہت بلند ہو سکتا ہے' وہ عظمت و سربلندی کے اونچے مدارج تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے حدود و قیود سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اور جب قلب مومن میں یہ عقیدہ اچھی طرح بیٹھ جاتا ہے تو وہ اسے مقام عبودیت تک پہنچا دیتا ہے۔ اور وہ سرکشی اور بڑائی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس کی طبیعت میں جھکاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی ہیبت بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے دل میں اللہ کی عظمت اور جلالت قدر کا شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا طرز عمل نہایت ہی مؤدبانہ اور پھر وہ اللہ کے بندوں کے مقابلے میں غرور و تکبر کا رویہ بھی اختیار نہیں کرتا۔ غرض یہ شعور ایک طرف سے ایک عقیدہ اور ایک تصور ہے اور دوسری جانب ایک طرز عمل اور ایک سلوک اور رویہ ہے۔

اسلامی تصور حیات کے ان دقیق پہلوؤں کی وضاحت اور تشریح اور اس بیان کے بعد کہ اس کائنات اور مخلوقات کا اپنے خالق کے ساتھ تعلق کیا ہے اور اس وضاحت کے بعد کہ خالق کائنات کے اوصاف کیا ہیں' اب یہاں یہ موضوع لیا جاتا ہے کہ اس ایمانی تصور حیات کو اپنا نصب العین بنانے کے بعد اب اہل ایمان کا طریق کار کیا ہو گا؟ وہ اس نظریے کی دعوت کس طرح دیں گے۔ اور وہ اس گم راہ انسانیت کی ہدایت کے لئے کیا طریقہ کار اختیار کریں گے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ ۙ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ۚ فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۵۶﴾ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ۬ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾

۳۴
ع ۴
۲

"دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا' اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا حامی اور مددگار اللہ ہے۔ اور وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کا حامی و مددگار طاغوت ہے۔ اور وہ انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔"

نظریہ ایک ایسی چیز ہے کہ بیان و ادراک کے بعد یہ سمجھنے اور سمجھانے کی چیز ہے۔ جبر و تشدد اور ظلم و عدوان کے نتیجے میں نظریات نہیں پھیلائے جاسکتے اور یہی پالیسی اسلام نے اسلامی نظریۂ حیات کی بابت اختیار کی ہے۔ دین اسلام اپنی پوری قوت اور طاقت کے ساتھ انسانی قوت مدرکہ کو خطاب کرتا ہے۔ وہ غور و فکر کرنے والے دماغوں کو خطاب کرتا ہے۔ اور ایک واضح سوچ دیتا ہے۔ اور وہ اثر پذیر وجدان کو مخاطب کرتا ہے۔ اسلام فطرت سلیمہ کو خطاب کرتا ہے بلکہ پوری انسانی شخصیت پر اثرانداز ہوتا ہے اور وہ انسانی فہم و ادراک کے ہر پہلو کو آزماتا ہے۔ جس میں وہ جبر و تشدد کو کام میں نہیں لاتا۔ یہاں تک کہ وہ نظریۂ حیات دینے میں خوارق عادت ذرائع کا بھی زیادہ استعمال نہیں کرتا۔ اس لئے کہ خوارق عادت واقعات کے نتیجے میں ذہن انسانی اگرچہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن یقین کے باوجود ذہن انسانی اس حقیقت کے فہم و ادراک سے قاصر رہتا ہے۔ بات انسان کی عقل میں نہیں اترتی کیونکہ خارق عادت مناظر کی وجہ سے وہ عقل و ادراک کے دائرہ سے باہر ہوتی ہے۔

اگر دین اسلام' اسلامی نظریۂ حیات کو لوگوں کے دلوں میں اتارنے کے لئے خارق عادت مناظر اور معجزات کا استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھتا' اس لئے کہ یہ بھی مخاطب کو ایک طرح مجبور کرنا ہوتا ہے کہ وہ مان لے' تو اسلامی نظریہ کے پھیلانے میں جبر و اکراہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام کی یہ پالیسی نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو دباؤ اور تہدید کے ذریعہ دائرہ اسلام میں داخل کرے' اس معاملہ میں اسلام صرف تبلیغ اور تلقین اور افہام و تفہیم سے کام لیتا ہے۔ اور وہ لوگوں کے دل و دماغ کو مطمئن کرتا ہے۔

اسلام سے قبل مسیحیت آخری دین حق تھا۔ اس کے پیروکاروں نے اس کے پھیلانے کے لئے اسلحہ کا استعمال کیا۔ لوگوں کو زندہ جلایا گیا۔ اور جوں ہی شہنشاہیت روما کے فرمانروا قسطنطین نے عیسائیت کو قبول کیا' حکومت نے جبر و تشدد کے تمام وسائل استعمال کئے اور لوگوں کو مسیحیت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے یہی حکومت ان مسیحیوں کے خلاف جبر و تشدد کے تمام وسائل بروئے کار لاچکی تھی جنہوں نے برضاء و رغبت عیسائیت کو قبول کیا تھا۔ سلطنت روما کا یہ جبر و تشدد صرف ان لوگوں کے خلاف نہ تھا جو مسیحیت قبول نہ کر رہے تھے بلکہ یہ جبر و تشدد ان صحیح العقیدہ مسیحیوں کے خلاف بھی بڑی بے دردی سے جاری رہا جو حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات کے بارے حکومت روما کے غلط عقاید تثلیث قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔

جب اسلام آیا تو اس کا پہلا اعلان ہی یہ زریں اصول تھا کہ اسلام کے قبول کرنے پر کسی کو مجبور نہ کیا جائے گا۔ گمراہی سے ہدایت بالکل الگ ہوگئی ہے۔ اب یہ لوگوں کا اپنا کام ہے کہ وہ برضا ہدایت قبول کریں۔

اس اصول کو وضع کر کے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عزت و کرامت سے نوازا ہے۔ اس کے ارادے' اس کی فکر اور اس کے شعور کا احترام کیا گیا اور نظریاتی ہدایت و گمراہی کے اختیار کرنے میں اسے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اسے کہہ دیا گیا کہ وہ ایک ذمہ دار ذات ہے۔ اس سے اس کے افعال و اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ یہ آزادی انسانی آزادیوں میں سے اہم ترین آزادی ہے جو اسلام نے انسان کو عطا کی۔ یہ وہ آزادی ہے جس سے انسان اس بیسویں صدی میں بھی محروم ہے۔ متعصب نظریات اور ظالمانہ نظامہائے زندگی آج بھی انسان کو یہ آزادی نہیں دیتے۔ ذات انسانی جسے اللہ نے مکرم بنایا ہے آج اسے اپنے عقائد کے معاملے میں بھی مجبور و مقہور بنا دیا گیا ہے۔ اسے مجبور کیا جارہا ہے کہ یا تو وہ ان نظریات کو اپنائے جسے حکومت وقت اپنے تمام وسائل اور میڈیا کے ذریعہ پھیلاتی ہے اور جو ایسے نظریات ہیں جو انکار خدا کے تصورات پر مبنی ہیں اور یا وہ موت کے لئے تیار ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ نظریاتی آزادی وہ پہلا حق ہے جو انسان کو بحیثیت انسان ملنا چاہئے۔ جو شخص یا جو نظام انسان سے نظریاتی آزادی چھین لیتا ہے' وہ در حقیقت انسان سے اس کی انسانیت سلب کر لیتا ہے۔ نظریاتی آزادی کا پھر فطری تقاضا ہے کہ انسان کو اپنے عقیدہ کی تبلیغ

کی بھی اجازت ہو۔ اور ایسا کرنے میں وہ محفوظ و مامون بھی ہو۔ اگر حریت عقیدہ کے ساتھ اظہار رائے کی آزادی نہ ہو تو آزادی رائے بے معنی ہو جاتی ہے اور اس میں کوئی واقعیت نہیں رہتی۔

اسلام زندگی اور موجودات کا ایک بہترین تصور ہے اور وہ بلاشک و شبہ ایک بہترین اور مستحکم نظام زندگی ہے۔ یہ اسلام ہی ہے جو ببانگ دہل پکار رہا ہے کہ اختیار دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے۔ وہ اپنے قبول کرنے والوں کو سب سے پہلے یہ تلقین کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو دین اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ جب اسلام جیسا دین فطرت لوگوں کو مسلمان بنانے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا تو اس کے دوسرے مروجہ ادیان باطلہ کو یہ اجازت کیسے دی جاسکتی ہے کہ وہ محض حکومت کے بل بوتے پر ان ادیان کے نہ ماننے والوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں۔

یہاں جبر و اکراہ کی مطلق نفی کی گئی ہے۔ یعنی دین میں سرے سے جبر نہیں ہے۔ یعنی جنس جبر کا وجود دین میں نہیں ہو گا۔ یعنی جبر کا وجود ہی نہ ہو گا۔ وہ وقوع پذیر ہی نہ ہو گا۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ تم جبر کا ارتکاب نہ کرو۔ یعنی جبر تو ہو گا مگر تم جبر کا ارتکاب نہ کرو۔ جنس جبر اور وجود جبر کی نفی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سخت تاکید فرما رہے ہیں کہ اسلام میں جبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہ انداز کلام نہایت ہی موثر ہے۔

یہاں سیاق کلام' انسانی ضمیر کو ٹچ کرتا ہے اور اسے جگا دیتا ہے' اسے راہ ہدایت اختیار کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ اسے راہ راست کی طرف موڑ دیتا ہے اور یہ بیان کر دیا جاتا ہے کہ جس حقیقت ایمانی کا اعلان کیا گیا ہے وہ واضح اور متمیز ہو چکی ہے۔ فرماتے ہیں قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ............................ "راہ ہدایت غلط راہوں سے الگ کر دی گئی ہے۔" ایمان کی راہ' راہ ہدایت ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اسے پالے اور اس کی طرف لپکے۔ اور کفر بے راہ روی ہے۔ انسان کو چاہئے کہ اس سے نفرت کرے اور اس سے منسوب ہونے کے مواقع اپنے لئے فراہم نہ کرے۔

عملی صورت حال کچھ ایسی ہے کہ انسان دولت ایمان کی حقیقت کو پانے کی کوشش نہیں کر رہا ہے۔ ایمان انسانیت کو ایک صاف ستھرا تصور حیات دیتا ہے۔ وہ انسانیت کو اطمینان قلب اور سلامتی عطا کرتا ہے۔ وہ انسان کے دل و دماغ میں اعلیٰ قدریں اور پاک ترجیحات پیدا کرتا ہے۔ وہ انسانی معاشرہ کو ایک صحت مند نظام زندگی اور ترقی پذیر پالیسی عطا کرتا ہے۔ جس سے زندگی ترقی یافتہ اور متنوع بن جاتی ہے۔ ان خطوط پر اگر انسان حقیقت ایمانی پر غور کرتا تو پھر کوئی بے وقوف ہی ہوتا جو راہ ایمان کو اختیار نہ کرتا۔ ہدایت چھوڑ کر گمراہی لیتا' سیدھی راہ چھوڑ کر ٹیڑھی راہ اختیار کرتا۔ اطمینان' سلامتی' بلندی اور علو شان کے مقابلے میں بے اطمینانی' پریشانی' گراوٹ اور گمراہی اختیار کرتا۔

اس کے بعد حقیقت ایمانی کی مزید وضاحت اور تشریح کرتے ہوئے کہا جاتا ہے

فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لَا انْفِصَامَ لَهَا

............... "اب جو طاغوت کا انکار کر کے' اللہ پر ایمان لے آیا' اس نے ایک مضبوط سہارا تھام لیا' جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔"

الطاغوت' طغیان سے ہے۔ مفہوم ہے ہر وہ شخص جو صحیح فکر سے تجاوز کر جائے جو حق سے سرکشی کرے۔ جو ان حدود سے آگے بڑھ جائے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے قائم کئے ہیں۔ اس کا اللہ کے بارے میں کوئی باضابطہ عقیدہ نہ ہو۔ وہ اللہ کی شریعت کا پابند نہ ہو۔ اسی طرح ہر وہ نظام طاغوتی نظام ہے جو ذات باری سے اخذ نہ کیا گیا ہو۔ اسی طرح ہر وہ عقیدہ' وہ تمام عادات و تقالید جو ذات باری سے مستفاد نہ ہوں' طاغوت ہیں۔ پس راہ راست پر وہی شخص ہے جو طاغوت کی ان تمام شکلوں اور تمام صورتوں کا انکار کر دے اور صرف

اللہ وحدہ پر ایمان لائے اور وہی کامیاب ہے۔ اور اس کی مثال اس طرح ہے جس طرح ایک شخص مشکل حالات میں ایک مضبوط سہارا تھام لے جو گرنے والا نہ ہو۔

یہاں اگر ہم اپنے آپ کو ایک شعوری حقیقت کی محسوس تصویر کے سامنے پاتے ہیں۔ اللہ پر ایمان لانا دراصل ایک ایسے سہارے کا دستیاب ہونا ہے جس کے لئے کبھی کوئی زوال نہیں ہے۔ یہ ایک ناقابل انقطاع ٹھوس سہارا ہے جو شخص بھی اس سہارے کو مضبوطی سے پکڑ لے وہ کبھی بھی گمراہ نہ ہو گا۔ اس سہارے کا براہ راست اس ذات سے تعلق ہے جو کامیابی اور ناکامی کا مالک ہے۔ ایمان دراصل اس حقیقت کبریٰ تک رسائی کا نام ہے جس کی ذات سے اس کائنات کے تمام حقائق قائم ہیں یعنی ذات باری تک رسائی۔ ایمان اس ناموس اکبر تک رسائی کا نام ہے جو ذات باری نے اس کائنات کے لئے وضع کیا ہے۔ اور جس پر یہ کائنات قائم ہے۔ اور جو شخص ایمان کو مضبوط کر لیتا ہے وہ راہ راست پر پڑ کر اپنے رب تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے پاؤں نہیں ڈگمگاتے۔ وہ پیچھے نہیں رہتا اور نہ وہ بھول بھلیوں میں پڑتا ہے۔ نہ بے راہ روی میں پڑتا ہے اور نہ گمراہی کا شکار ہوتا ہے۔

وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ............................... "اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔" وہ مختلف بولیوں کی بات سنتا ہے۔ وہ دلوں کے مضمرات کو جانتا ہے۔ اس لئے جو شخص اس ذات پر ایمان لے آئے وہ گھاٹے میں نہ رہے گا۔ اس پر کوئی ظلم نہ ہو گا۔ اور نہ ہی وہ کبھی ناکام ہو گا۔

اب سلسلہ کلام اور آگے بڑھتا ہے۔ ایک متحرک اور محسوس انداز میں منظر کشی کی جاتی ہے۔ ہدایت کا صراط مستقیم اور گمراہی اور ضلالت کے راستے صاف صاف آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ نظر آتا ہے کہ ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیسی ہے؟ اسکرین پر نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو ہاتھ سے پکڑ کر اندھیروں سے نکالتے ہیں اور روشنی میں لاتے ہیں جبکہ طاغوت جو کفار کے مددگار ہیں اہل کفر کا ہاتھ تھامے ہوئے انہیں نور ایمان سے ظلمات کفر میں لے جاتے ہیں۔

یہ ایک عجیب پر کیف زندہ منظر ہے۔ راہوار خیال کبھی ایک منظر کی طرف سرپٹ دوڑ رہا ہے اور کبھی دوسرے کی طرف۔ ادھر سے واپس ہوتا ہے تو ادھر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ انداز گفتگو ایسے جامد اور غیر متحرک انداز کلام کی جگہ اختیار کیا گیا ہے جو راہوار خیال کو مہمیز نہیں دے سکتا۔ نہ اس سے انسانی احساس لطف اندوز ہو سکتا ہے نہ شعور و وجدان میں طلاطم آتا ہے۔ اور جو صرف ذہن انسانی سے بذریعہ الفاظ ہی خطاب کر سکتا ہے۔

اگر ہم کلام الٰہی کی عظمت کا صحیح اندازہ کرنا چاہیں تو اسی مفہوم کو ہم مختلف الفاظ میں محض لفظ اور معانی کا اظہار کر سکتے ہیں مثلاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ مسلمانوں کا دوست ہے وہ انہیں راہ ایمان کی طرف لاتا ہے اور وہ لوگ جو کفر اختیار کرتے ہیں' وہ انہیں راہ کفر کی طرف کھینچتے ہیں۔" دیکھئے یہ الفاظ اور انداز کلام ہمارے سامنے مردہ پڑا ہے۔ اس میں وہ گرمی' وہ حرکت اور القاء نہیں ہے جو کلام الٰہی میں ہے۔[ا]

لیکن اس حسی اور القائی تصویر کشی کے ساتھ قرآن کریم کا حسن تعبیر اور حقیقت پسندانہ اظہار مفہوم دیکھئے۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔـھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ ....

ا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن کی فصل طریقہ قرآن

"جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا حامی و مددگار اللہ ہے اور وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے حامی و مددگار طاغوت ہیں اور وہ انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ ایمان نور ہے۔ وہ اپنے مزاج اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک منفرد نور ہے۔ اور بے شک کفر اندھیرے ہیں۔ اور یہ اپنے مزاج اور حقیقت کے اعتبار سے متعدد اور متنوع ہیں لیکن ہیں سب کے سب اندھیرے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان کی تعبیر نور کے ساتھ اور کفر کی تعبیر ظلمات کے ساتھ ایک بہترین تعبیر ہے۔ یہ نہایت ہی حقیقت پسندانہ انداز تعبیر ہے۔

جب دل مومن میں پہلے پہل ایمان کی چنگاری سلگتی ہے تو اس کے ذریعہ مومن کی پوری شخصیت نور سے بھر جاتی ہے۔ اس کی روح روشن ہوتی ہے اور اسے تشفی ہو جاتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مومن کی روح اپنے ماحول میں روشنی پھیلاتی ہے۔ اس کا ماحول روشن اور واضح ہو جاتا ہے۔ اس نور سے تمام موجودات کی حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ تمام اقدار کی تشریح ہو جاتی ہے۔ تمام تصورات حیات کی اصلیت سامنے آجاتی ہے۔ مومن کا دل و دماغ ان تمام حقائق کو بغیر کسی ملاوٹ کے واضح طور پر پالیتا ہے۔ وہ ہر قدر کو اپنی جگہ دیکھتا ہے اور اسے اس کا صحیح مقام دیتا ہے۔

ایمان ایک ایسا نور ہوتا ہے جس کے ذریعہ ایک مومن اس کائنات میں رائج قانون قدرت کو پالیتا ہے۔ اب یہ مومن اپنے طرز عمل کو اس کائنات میں رائج قانون قدرت کے ساتھ ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ جو اس کے ارد گرد جاری و ساری ہوتا ہے۔ اور وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ پروقار طریقے سے اپنی راہ پر آگے بڑھتا ہے۔ وہ اپنی راہ کو چونکہ اچھی طرح پالیتا ہے اس لئے وہ نہ کہیں گمراہ ہوتا ہے اور نہ ہی اپنی راہ میں غیر اہم رکاوٹوں کے ساتھ الجھتا ہے۔

یہ ایک ایسی روشنی ہے جو صرف ایک اور منفرد راستہ دکھاتی ہے۔ کفر کی گمراہیاں تو وہ مختلف قسم کی تاریکیاں ہیں۔ شہوت و خود سری کی تاریکی' فسق و فجور کی تاریکی' کبر و غرور اور سرکشی کی تاریکی' غلامی اور ضعیفی کی تاریکی' ریاکاری اور نفاق کی تاریکی' لالچ اور نفع اندوزی کی تاریکی' شک اور بے چینی کی تاریکی' غرض بے شمار اور لاتعداد ظلمات ہیں جو سب کے سب کفر و گمراہی کی تاریکیاں ہیں اور سب کا مزاج یہ ہے کہ ان میں گھرا ہوا انسان اللہ کی راہ سے بے طرف ہو جاتا ہے۔ وہ غیر اللہ سے ہدایت حاصل کرتا ہے اور غیر اسلامی نظام زندگی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور جونہی ایک انسان اللہ کے اس منفرد نور اس واحد حقیقت پسندانہ اور واضح روشنی کو ترک کر دیتا ہے' وہ کفر کے مختلف اندھیروں میں سے کسی اندھیرے میں پھنس جاتا ہے۔ یہ اندھیرے متنوع ہیں اور سب ہی اندھیرے ہیں۔ اور ان اندھیروں کا انجام کیا ہے؟ جو لوگ ان اندھیروں میں زندگی بسر کرتے ہیں أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ..................

"یہ لوگ آگ والے ہیں اور یہ ہمیشہ آگ میں رہنے والے ہیں۔" اگر یہ لوگ اسلام کی روشنی میں راہ پانے کی کوشش نہیں کرتے تو وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ہمیشہ آگ میں رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سچائی ایک اور منفرد حقیقت ہے۔ سچائیاں دو نہیں ہو سکتیں اور گمراہی کی مختلف انواع و اقسام ہیں اور حق و صداقت کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب گمراہی ہے۔

○○○

اس سے پہلے کہ ہم اس سبق پر بات ختم کر کے آگے بڑھیں' مناسب یہ ہے کہ ہم اس قاعدے یعنی لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ .................. کے بارے میں ایک اصولی بات کر دیں۔ اس قاعدہ کلیہ کے ساتھ ساتھ اسلام میں فرضیت جہاد کا بھی حکم دیا گیا ہے

اور ایسے مواقع پر پیش آئے ہیں جن میں اسلام نے جہاد میں حصہ بھی لیا ہے۔ حالانکہ ایک سابقہ آیت میں کہا گیا ہے۔ وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ............... (بقرہ ۱۹۳)" اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور نظام زندگی اللہ کا ہو جائے۔"

اسلام کے بعض مفاد پرست دشمنوں نے یہ الزام لگایا ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ............... کے اصولی قاعدہ کے ساتھ ساتھ جہاد کی فرضیت کا حکم دینا ایک متضاد بات ہیں۔ اس سوال کے جواب میں بعض لوگوں نے بظاہر اسلام کی مدافعت کرتے ہوئے اور بباطن اسلام کے ساتھ دشمنی کرتے ہوئے مسلمانوں کے شعور سے جذبۂ جہاد ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسے لوگ فریضہ جہاد کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ اسلام کے قیام اور اس کی نشرو اشاعت میں فریضۂ جہاد نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ ایسے لوگ بڑی مکاری سے' نہایت ہی نرم انداز سے اور نہایت ہی حکیمانہ انداز سے مسلمانوں کے دل میں یہ بات بٹھانا چاہتے ہیں کہ آج جہاد کی ضرورت باقی نہیں رہی اور نہ آئندہ کبھی فریضہ جہاد کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ بظاہر یہ لوگ یہ بات اسلام کی مدافعت میں کرتے ہیں۔[1]

یہ دونوں قسم کے لوگ مستشرقین ہیں۔ جو ایک ہی میدان میں کام کرتے ہیں۔ یہ دونوں اسلام کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ یہ اسلامی منہاج میں تحریف کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ اس شعور کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو نظام جہاد ایک مسلمان کے نفس میں پیدا کر دیتا ہے۔ یہ لوگ اسلام کے شعور جہاد سے خائف ہیں۔ اس لئے کہ میدان جہاد میں وہ کبھی بھی اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ اس لئے اس شعور کو متاثر یہ اپنے لئے امن و اطمینان پیدا کرنا چاہتے ہیں اور جب سے انہوں نے دل مسلم سے جذبہ جہاد ختم کیا ہے یا اسے الجھا دیا ہے' انہوں نے امت مسلمہ کے جسم پر مختلف پہلوؤں سے ضرب ہائے کاری لگائی ہیں اور ہر میدان میں اسے شکست دے دی ہے۔ یہ لوگ امت مسلمہ کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مسلم اقوام اور استعماری قوم کی جنگ فقط معاشی اور تجارتی منڈیوں کی جنگ ہے۔ لہٰذا اس جنگ میں امت مسلمہ کو جذبہ جہاد کو بیچ میں نہیں لانا چاہئے جو فقط نظریاتی جنگ میں کار آمد ہوتا ہے۔ اس لئے اس دور جدید میں جہاد کی بات بلاجواز ہے۔

اسلام نے پہلے پہل جہاد اس وقت شروع کیا جس وقت مسلمانوں پر مظالم توڑے جا رہے تھے تاکہ ان کی جان' مال اور نظریۂ حیات کو محفوظ کیا جاسکے۔ یعنی جہاد برائے قیام امن۔ اس تفسیر کے حصہ دوئم میں اس اصول کی تشریح آیت وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ......... (اور فتنہ و فساد و قتل سے زیادہ شدید ہیں) کی تفسیر کے موقعہ پر کر چکے ہیں۔ اس اصول کے مطابق اسلام نے نظریاتی تشدد اور اس کی وجہ سے جسمانی اذیت اور اہل نظریہ پر بوجہ نظریہ ظلم و تشدد کو قتل سے زیادہ شدید قرار دیا۔ اس اصول کے مطابق نظریات کی قدر و قیمت انسانی زندگی سے بھی زیادہ ہے۔ اگر ایک مسلمان کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنے مال اور اپنی جان کی حفاظت میں ہتھیار اٹھا سکتا ہے تو اسے بطریق اولیٰ اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنے دین' عقیدے اور نظریہ کی حفاظت اور دفاع میں ہتھیار اٹھائے۔ اس وقت مسلمان محض اپنے عقیدے کی وجہ سے ظلم و تشدد کی چکی میں پس رہے تھے۔ ان کے سامنے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا کہ وہ اپنی عزیز ترین دولت یعنی دولت ایمان کی مدافعت میں ہتھیار اٹھائیں۔ ان پر یہ تشدد محض ان کے عقیدے کی وجہ سے ہو رہا تھا اور کرۂ ارض کے مختلف حصوں میں ان پر یہ مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ سرزمین اندلس نے ان وحشیانہ مظالم کو دیکھا ہے۔ وہ اس اجتماعی قتل و غارت کی گواہ جو مسلمانوں پر محض ان کے دین اور عقیدے کی وجہ سے ڈھائے گئے۔ پھر یہ سرزمین ان مظالم کی بھی گواہ ہے جو وہاں عیسائیوں کے کیتھولک فرقے نے دوسرے فرقوں کے خلاف روا رکھے تاکہ انہیں زبردستی کیتھولک بنایا جائے۔ آج اسپین کی حالت یہ

---

[1] دیکھئے آرنلڈ کی کتاب "دعوت اسلامی" ترجمہ ڈاکٹر ابراہیم حسن وبرادرنہ

ہے کہ وہاں سے مسلمانوں اور دوسرے عیسائی فرقوں کا نام و نشان مٹادیا گیا ہے۔ پھر بیت المقدس اور اس کے ارد گرد کے اسلامی علاقے صلیبی حملوں سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ جن کا ہدف صرف اسلامی نظریۂ حیات اور دین اسلام پر غلبہ پانا تھا۔ ان جنگوں کا دفاع بھی اہل اسلام نے اسلامی نظریۂ حیات کے پلیٹ فارم سے دیا اور وہ اس میں بہت اچھی طرح کامیاب رہے۔ اور اس علاقے کو اندلس کے انجام بد سے بچالیا۔ آج بھی اشتراکی علاقوں' بت پرست علاقوں' یہودی علاقوں اور مسیحی علاقوں میں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جارہے ہیں اور یہ محض اس لئے کہ وہ مسلمان ہیں۔ لہٰذا اگر مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان ہیں تو آج بھی ان پر جہاد اسی طرح فرض ہے جس طرح پہلے فرض تھا تاکہ مسلمانوں کے خلاف ان مظالم کو بند کیا جاسکے۔

اسلام کے نظریۂ جہاد کی پشت پر دوسرا محرک یہ تھا کہ نظریاتی آزادی کے بعد نظریاتی دعوت و تبلیغ کی آزادی کے لئے بھی مواقع پیدا کئے جائیں۔ اس لئے کہ اسلام انسانی زندگی اور اس کائنات کا ایک بہترین حل پیش کرتا ہے۔ وہ اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی کی نشوونما کے لئے ایک بہترین نظام تجویز کرتا ہے۔ وہ اس بہترین عقیدے اور مکمل نظام کو پوری انسانیت تک پہنچانا چاہتا ہے۔ تاکہ وہ اسے سنیں اور سمجھیں۔ اور سننے اور سمجھنے کے بعد پھر وہ آزاد ہیں کہ وہ اسے قبول کرلیں یا رد کردیں۔ اس لئے کہ دین و عقیدے کے بارے میں وہ کسی جبرو اکراہ کا قائل نہیں ہے۔ لیکن مکمل نظریاتی آزادی سے پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ تمام انسانوں تک اسلامی پیغام کے پہنچنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اس لئے کہ اللہ کی جانب سے یہ پیغام تمام انسانوں کے لئے بھیجا گیا ہے۔ لہٰذا وہ تمام رکاوٹیں دور ہونی چاہئیں جو عوام الناس کو اس پیغام کے سننے' اسے قبول کرنے اور اگر وہ چاہیں تو قافلہ ہدایت یافتگاں میں شامل ہونے کی راہ میں حائل ہیں۔ ان رکاوٹوں میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کرۂ ارض پر قائم طاغوتی نظام زندگی ہوتا ہے۔ یہ نظام عوام الناس اور اس پیغام کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ اور جو لوگ کسی طرح اس عقیدے اور پیغام کو سن کر اپنالیتے ہیں۔ یہ طاغوتی نظام ان پر تشدد شروع کردیتا ہے۔ لہٰذا اسلام نے جب بھی جہاد کیا ہے اس نے ایسے باطل اور طاغوتی نظامہائے زندگی کا قلع قمع کرنے کے لئے کیا ہے۔ اور اس نے ایسے نظاموں کی جگہ ایسا عادلانہ نظام زندگی قائم کیا ہے جس میں ہر جگہ دعوت حق اور داعی حق کو پوری پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ مقصد اور ہدف آج بھی قائم ہے۔ لہٰذا آج بھی مسلمانوں پر جہاد فرض ہے تاکہ وہ اس پیغام کو عام کرسکیں بشرطیکہ مسلمان 'مسلمان' ہوں۔

ایک دوسرا مقصد جس کے لئے اسلام نے جہاد کو روا رکھا ہے وہ اسلامی نظام زندگی کا قیام اور اس کی حفاظت ہے۔ یہ واحد نظام زندگی ہے جو ایک انسان کو اپنے دوسرے انسان بھائی تک رسائی حاصل کرنے کی آزادی عطا کرتا ہے۔ اور اس میں ہر انسان دوسرے انسان کی نسبت سے بالکل آزاد بھی ہے۔ اس نظام میں بندگی صرف خدائے بلند و برتر کے لئے مخصوص ہے۔ اور یہ نظام اس دنیا سے انسان کی جانب سے دوسرے انسان کے لئے ہر قسم کی غلامی کا قلع قمع کردیتا ہے۔ اس نظام میں کوئی فرد' کوئی طبقہ اور کوئی قوم دوسرے انسانوں کے لئے قانون سازی کا کام نہیں کرسکتی۔ اور نہ اس قانون سازی کے ذریعہ انسانوں کو کوئی اپنا غلام اور زیردست بناسکتا ہے۔ اس نظام میں سب انسانوں کا ایک ہی رب ہے۔ وہ تمام انسانوں کے لئے قانون وضع کرتا ہے بالکل مساوات کے ساتھ۔ اور تمام انسان صرف اس رب کی بارگاہ میں خضوع اور خشوع کے ساتھ سجدہ ریز ہوتے ہیں' صرف اس رب واحد کی بندگی کرتے ہیں اور صرف اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اس نظام میں انسان کی جانب سے کسی دوسرے انسان کی اطاعت صرف ایک ہی صورت میں کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی شریعت کا نافذ کنندہ ہو۔ اور امت کی جانب سے نفاذ شریعت کا کام اس کے سپرد کردیا گیا ہو۔ نفاذ شریعت کا کام بھی کوئی ازخود نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ قانون سازی صرف اللہ کا کام ہے۔ انسانی زندگی میں شریعت شان خداوندی کا اظہار ہے۔ اس لئے کوئی انسان اس بات کا مستحق نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے شریعت سازی کا کام مخصوص کرسکے حالانکہ وہ صرف ایک بندۂ خدا ہے۔

یہ اسلامی نظام حیات کا اصل الاصول ہے اور اس اصول و دستور کے نتیجے میں ایک ایسا پاک اخلاقی نظام زندگی پرورش پاتا ہے جس میں تمام بنی نوع انسان کو کامل حریت اور آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ ان انسانوں کو بھی جو اسلامی عقیدۂ حیات کو سرے سے قبول ہی نہیں کرتے۔ اس نظام میں ہر شخص کی عزت محفوظ ہوتی ہے' یہاں تک کہ جو لوگ اسلامی نظام زندگی کو قبول ہی نہیں کرتے ہر اس باشندے کے حقوق محفوظ ہوتے ہیں جو کسی اسلامی ملک میں رہائش پذیر ہوتا ہے۔ چاہے اس کا عقیدہ جو بھی ہو۔ اس نظام میں کسی بھی شخص کو اسلامی عقاید اپنانے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ اس میں دین کے بارے میں کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا۔ اس میں صرف تبلیغ کی آزادی ہوتی ہے۔

محض اسلام نے جہاد کو اس لئے فرض کیا ہے کہ وہ دنیا میں مذکورہ بالا ارفع اور اکمل نظام زندگی قائم کرے اور اس کی حمایت اور بچاؤ کی تدابیر اختیار کرے۔ یہ اسلام کا حق تھا کہ وہ بذریعہ جہاد باطل اور فاسد نظامہائے زندگی کا قلع قمع کر دے جو اس اصول پر قائم تھے کہ بعض انسان بعض دوسرے انسانوں کے غلام ہیں اور جن میں بعض انسان خدائی کے مقام کے مدعی ہوتے ہیں جو خدائی فرائض سنبھالتے ہیں' حالانکہ یہ ان کا حق نہیں ہوتا۔ اور ظاہر ہے کہ جب اسلام اس نصب العین کو لے کر اٹھتا ہے تو یہ باطل نظامہائے زندگی بھی اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا کہ اسلام ان طاغوتی نظاموں کا قلع قمع کر کے ان کی جگہ اس کرۂ ارض پر اپنے ارفع اور اکمل نظام کا اعلان کر دے۔ اور پھر اس نظام کے زیر سایہ انہیں اپنے مخصوص عقائد کے اندر آزادی عطا کر دے اور ان پر صرف اسلام کے اجتماعی سول کوڈ' اسلامی اخلاقیات اور مملکت کی اقتصادی پالیسی کی پابندی لازم ہو۔ رہے دینی اور قلبی عقائد و رجحانات تو ان میں وہ مکمل طور پر آزاد ہیں۔ ان کے شخصی قوانین و معاملات میں بھی وہ مکمل طور پر آزاد۔ اپنے عقائد کے مطابق اپنے معاملات طے کریں لیکن اسلامی نظام زندگی ان پر قائم ہو جو ان کی حفاظت کرے۔ ان کی آزادی اس کے سایہ میں محفوظ ہو۔ ان کو مکمل آزادی رائے حاصل ہو۔ ان کی عزت محفوظ ہو اور ان کے مکمل اساسی حقوق انہیں حاصل ہوں لیکن اس نظام کے دائرے کے اندر۔

یہ جہاد اب بھی باقی ہے اور مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اسلامی نظام زندگی کے قیام کے لئے اس جہاد کو قائم رکھیں۔ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ..................... "یہاں تک کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور جنس دین اللہ کا ہو جائے۔" اور اس دنیا سے انسانوں کی خدائی ختم ہو اور اللہ کے سوا کسی کی بندگی اور غلامی دنیا میں نہ رہے۔[۱]

غرض اسلام نے تلوار اس لئے نہیں اٹھائی کہ وہ لوگوں کو اسلامی اعتقادات اور تصورات اپنانے پر مجبور کر دے۔ نہ دنیا میں اسلام کا پھیلاؤ تلوار کے بل بوتے پر ہوا ہے جیسا کہ اسلام کے بعد اعداء اسلام یہ الزام لگاتے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے جہاد اس لئے شروع کیا تھا کہ وہ اس کرۂ ارض پر ایک پرامن نظام زندگی قائم کر دے جس کے سائے میں تمام عقائد اور مختلف دینی تصورات رکھنے والے لوگ امن و آشتی کی زندگی بسر کر سکیں۔ ہاں وہ اسلام کے سیاسی دائرۂ عمل میں رہتے ہوئے اپنے عقائد محفوظ رکھیں اور آزادی سے رہیں۔ اگرچہ وہ اسلامی عقائد قبول نہ کریں۔

اسلامی نظام کے وجود' اس کے پھیلاؤ اور اہل اسلام کے امن و سکون کے لئے اور ان کو لوگوں کے امن و اطمینان کے لئے جو لوگ اس نظام زندگی میں داخل ہونا چاہتے تھے اسلام کی مسلح قوت کی اشد ضرورت تھی۔ نیز اقامت دین اور حفاظت دین کے لئے بھی مسلح قوت کا وجود ازبس ضروری تھا۔ اسلامی جہاد کا ادارہ کوئی معمولی اہمیت کا حامل نہ تھا۔ نہ وہ ایسا تھا کہ اس کی اس وقت کوئی ضرورت نہ ہو

۱۔ مسئلہ جہاد میں زیادہ وضاحت کے لئے ملاحظہ فرمایئے کتاب الجہاد فی الاسلام مصنفہ المسلم العظیم سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ نیز میری کتاب "السلام العالمی فی الاسلام" (سید قطب)

یا آج اس کی ضرورت نہ ہو یا یہ کہ مستقبل میں اس کی ضرورت نہ ہو۔ مسلمانوں کے بد ترین دشمن یہ بات ان کے ذہن نشین کرتے ہیں کہ اب جہاد کی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو ایک اجتماعی نظام کی ضرورت ہے۔ اس نظام کو ایک اجتماعی قوت کی ضرورت ہے۔ اور یہ قوت اسلام کے جذبہ جہاد میں مضمر ہے۔ یہ اسلام کا مزاج ہے جس کے بغیر نہ اسلام قائم ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ قائدانہ کردار ادا کر سکتا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ........................ "دین میں جبر نہیں ہے" لیکن اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید یہ حکم بھی دیتا ہے

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ

"اور تم لوگ' جہاں تمہارا بس چلے' زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لئے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعدا کو خوفزدہ کر دو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔" (۸:۶۰)

اسلام کی نظر میں یہ بنیادی نقطہ ہے اور اسی کی روشنی میں مسلمانوں کو اپنے دین کو سمجھنا چاہئے اور اسی نقطۂ نظر سے اہل اسلام کو اپنی تاریخ پڑھنا چاہئے۔ اسلام کے نظریۂ جہاد کے بارے میں مسلمانوں کو ایسا موقف اختیار نہ کرنا چاہئے جس میں وہ ایک ملزم کی طرح کھڑے ہوں اور اپنا دفاع کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اس سلسلے میں انہیں ایک پر اعتماد' پر عزم اور خوددار شخص کا موقف اختیار کرنا چاہئے جسے یہ یقین ہو کہ وہ اس دنیا کے تمام تصورات سے بلند تر ہے۔ اسلامی نظام تمام نظاموں کے مقابلے میں بلند تر ہے۔ دین اسلام تمام ادیان سے بالا تر ہے۔ اہل اسلام کو ان لوگوں سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے جو بظاہر دین اسلام کا دفاع کر رہے ہوتے نظر آتے ہیں لیکن دراصل وہ ان کے دل و دماغ سے تصور جہاد کھرچ کھرچ کر نکال رہے ہیں تاکہ وہ خود اسلام دشمن اقوام کو محفوظ کر سکیں۔ جہاد دراصل ظالم طاغوت کی برتری کو ریزہ ریزہ کرنے والا عمل ہے۔ اور جہاد میں تمام انسانیت کی بھلائی ہے۔ اور انسانیت کا سب سے بڑا دشمن وہ شخص ہے جو اسے جہاد سے محروم کرتا ہے اور انسانیت اور جہاد کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔ لہٰذا یہ شخص انسانیت کا دشمن نمبر ایک قرار پاتا ہے۔ اور انسانیت میں اگر رشد و ہدایت ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے اس عظیم دشمن کا پیچھا کرے۔ اور انسانیت میں اس قسم کی رشد و ہدایت پیدا کرنے کے لئے اہل ایمان کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس دشمن انسانیت کا پیچھا کریں۔ اس لئے کہ اہل ایمان امت مختار ہیں۔ انہیں دولت ایمان سے برگزیدہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے خود ان کے اپنے نفوس کے لئے بھی اور پوری انسانیت کی خاطر بھی یہ ان کا فرض بنتا ہے کہ وہ منکر جہاد کا تعاقب کریں اور یہ ان کا ایک ایسا فریضہ ہے' جس کے بارے میں از روئے شریعت وہ عند اللہ مسئول ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

# درس ۱۸ ایک نظر میں

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

یہ تین آیات ہیں اور ان کا موضوع ایک ہے یعنی زندگی اور موت کی حقیقت کیا ہے؟ اور موت کے بعد زندگی کا راز کیا ہے؟ حیات بعد الممات اسلامی نظریات کا ایک اہم پہلو ہے۔ جس پر قرآن مجید میں بحث کی گئی ہے۔ اور اس پارہ کے آغاز ہی سے جابجا اس پر بحث کی گئی ہے۔ نیز ان آیات کا ان صفات الٰہی کے ساتھ بھی براہ راست تعلق ہے جو آیت الکرسی میں بیان کی گئی ہیں۔ اور ان سب آیات سے قرآن کریم کی اس واضح جدوجہد کا اظہار ہوتا ہے' جو قرآن مجید 'ایک مسلمان کے شعور و ادراک میں 'ایک صحیح اسلامی تصور حیات کے پیدا کرنے کے لئے کر رہا ہے۔ اور انسانی زندگی کے بصیرت افروز جائزے کی خاطر اس بات کی ضرورت ہے کہ ذہن انسانی میں اس کا صاف ستھرا تصور موجود ہو' جو اس کائنات کے حقیقی مشاہدے پر مبنی ہو۔ اور جو مضبوط اور دل نشین اعتقاد پر مبنی ہو۔ اس لئے کہ انسان کے پورے نظام زندگی' انسان کے مکمل طرز عمل اور اس کے تمام اخلاق و آداب کے قواعد و ضوابط کا ایک گہرا تعلق اس کے اعتقادات کے ساتھ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ تمام چیزیں انسان کے عقائد و نظریات پر مبنی ہوتی ہیں۔ انسانی نظام زندگی کا تعلق اگر اس کے عقائد و نظریات اور اس کے مکمل تصور کائنات کے ساتھ نہ ہو تو وہ نظام زندگی نہ تو مضبوط و مستحکم ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی ایک مستقل معیار ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے تطہیر افکار اور عقائد و تصورات کی توضیح اور پختگی پر بڑا زور دیا ہے اور قرآن کریم کا مکی دور زیادہ تر اسی پر مشتمل ہے۔ اور یہی رنگ مدنی دور کی آیات میں بھی نظر آتا ہے۔ جہاں تفصیلی ہدایات اور قانون سازی بھی ہو رہی ہے۔

ان میں سے پہلی آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے دور کے کسی بادشاہ کے درمیان ہونے والی گفتگو کو نقل کیا گیا ہے۔ یہاں بادشاہ کا نام نہیں دیا گیا' اس لئے کہ یہاں اس کے نام کے ذکر سے اصل بات میں کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا۔ یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور جماعت مسلمہ کے سامنے استعجاب کے ساتھ اس گفتگو کو پیش کیا جاتا ہے کہ اس شخص نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ رب کائنات کے بارے میں یہ مناظرہ کیا اور کس قدر احمقانہ موقف اختیار کیا۔ اس نے اور قرآن کریم نے اپنے خاص بلیغانہ انداز میں اس مباحثے کو یہاں نقل کیا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

# تشریح آیات درس نمبر ۱۸

## آیت نمبر ۲۸۵ تا ۲۶۰

☆☆☆☆☆ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ
الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ
قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ
فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢٥٨﴾ أَوْ كَالَّذِي مَرَّ
عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّى يُحْيِي هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ
مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ
يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَ
شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ إِلَى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ وَانْظُرْ
إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ
اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٥٩﴾ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَى
قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلَى وَلَكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِنَ
الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَى كُلِّ جَبَلٍ مِنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ
يَأْتِينَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦٠﴾

۳۵ ع۳ ۳

"کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑا کیا تھا۔ جھگڑا اس بات پر کہ ابراہیم علیہ السلام کا رب کون ہے اور اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ "میرا رب وہ ہے جس کے

اختیار میں زندگی اور موت ہے۔" تو اس نے جواب دیا : "زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔" ابراہیم علیہ السلام نے کہا : "اچھا' اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے' تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا۔" یہ سن کر وہ منکر حق ششدر رہ گیا' مگر اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھایا کرتا۔

یا پھر مثال کے طور پر اس شخص کو دیکھو' جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا' جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی۔ اس نے کہا : "یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے' اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟" اس پر اللہ نے اس کی روح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پوچھا : "بتاؤ' کتنی مدت پڑے رہے ہو؟" اس نے کہا : "ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا" فرمایا : "تم پر سو برس اسی حالت میں گزر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے۔ دوسری طرف ذرا اپنے گدھے کو بھی دیکھو (کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے) اور یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں۔" اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی' تو اس نے کہا : "میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

اور وہ واقعہ بھی پیش نظر رہے' جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا کہ "میرے مالک' مجھے دکھا دے' تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔" فرمایا : "کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟" اس نے عرض کیا "ایمان تو رکھتا ہوں' مگر دل کا اطمینان درکار ہے۔" فرمایا : "اچھا' تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے۔ پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو پکار' وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ خوب جان لے کہ اللہ نہایت با اقتدار اور حکیم ہے۔"

یہ شخص جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ یہ مباحثہ کیا وہ وجود باری کا منکر نہ تھا۔ وہ اگر منکر تھا تو اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت کا منکر تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کو اس کائنات کا واحد متصرف اور واحد مدبر ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اسی طرح جس طرح جاہلیت کے گمراہ لوگوں میں سے بعض ایسے تھے جو وجود باری کے معترف تھے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بعض دوسروں کو شریک ٹھہراتے تھے۔ بعض افعال واقعات کو ان شریکوں کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اسی طرح یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی صفت حاکمیت کے بھی منکر تھے۔ اسلامی تصور کائنات کے مطابق جس طرح اس کائنات کے تکوینی امور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اسی طرح یہاں قانون سازی اور اجتماعی امور کے فیصلے کا اختیار بھی اللہ کے پاس ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

یہ منکر حق بادشاہ بہت ہی ہٹ دھرم تھا اور یہ اس سبب کی وجہ سے منکر حق تھا کہ اسے اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ ........ حالانکہ اس سبب کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اس کی وجہ سے پکا مومن ہوتا اور شکر گزار ہوتا اور اللہ کے احسانات کا معترف ہوتا لیکن اس نے اس اقتدار اور بادشاہت کی وجہ سے کفر و طغیان کا راستہ اختیار کیا۔ اور اللہ کے اس انعام کی ناقدری کی اور اس انعام و اکرام کی اصل حقیقت اور اس کے حقیقی تصور کو نہ پا سکا۔ شکر کی جگہ اس نے کفر کی روش اختیار کی۔ اور جو بات ان کی ہدایت کا سبب ہونا چاہئے تھی' اس کی وجہ سے وہ گمراہ ہو گئے۔ وہ حاکم اس لئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حاکم بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حاکم اس لئے نہیں بنایا کہ وہ عوام کو خود اپنا بندہ بنا لیں۔ اور خود اپنے بنائے ہوئے قوانین کی پیروی کرائیں۔ وہ تو خود اللہ کے بندے ہیں جس طرح دوسرے لوگ اللہ کے بندے ہیں۔ وہ بھی ان کی طرح اللہ سے شریعت پانے والے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے بغاوت کر کے نہ حاکم رہتے ہیں اور نہ کوئی قانون بنا سکتے ہیں۔ یہ حکام تو خلفاء ہیں اصل حاکم نہیں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب یہ بادشاہ نبی وقت کے ساتھ مباحثہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ طرز عمل عجیب نظر آتا ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِىۡ حَآجَّ اِبۡرٰهٖمَ فِىۡ رَبِّهٖۤ اَنۡ اٰتٰٮهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ‌ۘ ..................

"کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا تھا۔ جھگڑا اس بات پر کہ ابراہیم کا رب کون ہے؟ اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔" "کیا تونے نہیں دیکھا! یہ قابل مذمت رویے اور حقارت آمیز طرز عمل پر استعجاب کا اظہار ہے۔ انکار اور استنکار اپنے لفظی اور معنوی ہم آہنگی کی وجہ سے ایک ساتھ چلتے ہیں۔ اس بادشاہ کی یہ حرکت فی الحقیقت ناپسندیدہ ہے۔ اس لئے کہ انعام واکرام پانے کے سبب اگر کوئی جدل وجدال شروع کردے تو یقیناً قابل مذمت ہے۔ نیز یہ بات بھی قابل مذمت ہے کہ کوئی رب کائنات کی صفات اپنے لئے مخصوص کرے۔ اور کوئی حاکم اپنی خواہشات نفس کے مطابق عوام الناس پر حکمرانی کرے اور تقنین وتشریع کے کام میں اللہ سے ہدایت نہ لے۔

اِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىۡ يُحۡىٖ وَيُمِيۡتُۙ .................. "جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے۔" زندگی اور موت ایسے واقعات ہیں جن کا اعادہ ہر لحظہ ہوتا رہتا ہے' یہ حقائق ہر وقت انسانی احساس اور انسانی عقل کے سامنے آتے رہتے ہیں لیکن باوجود اس تکرار اور کثرت وقوع کے زندگی اور موت ایک حیرت انگیز راز ہیں۔ اس سربستہ راز کے حل کے لئے عقل انسانی ایک ایسے سرچشمے کی طرف رجوع کرتی ہے جو بشریت سے وراء ہے۔ اور ایک ایسے مرجع اور مصدر کی طرف رجوع جس کا اس مخلوقات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا اس ناقابل حل پہیلی کے صحیح حل کے لئے ضروری ہے کہ انسان ذات باری کی طرف رجوع کرے جو پیدا کرنے پر بھی قادر ہے اور فنا کرنے پر بھی قادر ہے۔

آج تک ہم موت وحیات کی حقیقت نہیں پاسکے۔ البتہ زندوں میں ہم زندگی کے آثار سمجھ لیتے ہیں اور مردوں سے ہم موت کی خصوصیات جان لیتے ہیں۔ اس لئے ہم مجبور ہیں کہ موت وحیات کی حقیقت اس حقیقی قوت کے حوالے کردیں جو ان تمام قوتوں سے وراء ہے جن کو ہم جانتے ہیں یعنی قوت الٰہیہ۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کی ایک ایسی صفت بیان کی جس میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ نہ کسی کو یہ زعم ہو سکتا ہے کہ وہ اس میں شریک کار ہو سکتا ہے۔ جب ابراہیم علیہ السلام سے اس بادشاہ نے پوچھا کہ تمہارا رب کون ہے جو تمہارے لئے قانون بناتا ہے' جس کے پاس اقتدار اعلیٰ ہے اور جسے قانون سازی کے پورے اختیارات حاصل ہیں؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں موت وحیات ہے۔ لہٰذا وہی ہے جو حاکم اور قانون ساز ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام موت وحیات کی حقیقت سے خوب واقف تھے۔ اور موت اور زندگی سے ان کی مراد یہ تھی کہ اللہ ان حقائق کا خالق ہے۔ اس لئے کہ وہ رسول تھے اور انہیں وہ لدنی اسرار ورموز عطا کئے گئے تھے جن کے بارے میں ہم نے حصہ اول میں بحث کی ہے۔ اور موت وحیات کی تخلیق ایک ایسا عمل ہے جس میں اللہ کے ساتھ اس کے بندوں میں سے کوئی شریک نہیں ہے لیکن جو بادشاہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مباحثہ کر رہا تھا وہ یہ سمجھتا تھا کہ وہ اپنی قوم کا حاکم مختار ہے۔ اس کی قوم پر اس کے پورے احکام نافذ ہوتے ہیں۔ وہ سزائے موت بھی دے سکتا ہے اور معاف بھی کر سکتا ہے۔ تو گویا یہ بھی ایک قسم کی ربوبیت ہے۔ اس لئے اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا: "میں اس قوم کا سردار ہوں۔ ان کے معاملات میرے ہاتھ میں ہیں۔ اس لئے میں ہی ایک قسم کا رب ہوں۔ جس کے سامنے تمہیں بھی جھکنا چاہئے اور مری حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنا چاہئے۔" چنانچہ اس نے کہا

قَالَ اَنَا اُحۡىٖ وَاُمِيۡتُ‌ؕ .................. "زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔"

اس موقعہ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ وہ اس کے ساتھ حقیقت موت وحیات کے موضوع پر تفصیلی بات

چیت شروع کر دیں۔ خصوصاً ایسے شخص کے ساتھ جو حقیقت موت و حیات میں بذات خود اشتباہ میں تھا اور ڈانواں ڈول تھا۔ جو ہمیشہ ایک مشکل مسئلہ رہی ہے۔ یعنی یہ حقیقت کہ اللہ تعالیٰ انسان کو کس طرح زندگی عطا کرتے ہیں اور کس طرح اس پر موت طاری کر دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا راز ہے جس تک پوری انسانیت کی رسائی آج تک نہیں ہو سکی ہے۔ اس لئے اس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مناسب سمجھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس مشکل تکوینی حقیقت سے ذرا ہٹ کر ایک ایسی ظاہری سنت کا سہارا لیں جو ہروقت اس شخص کے مشاہدے میں آ رہی ہے۔ پہلے تو آپ نے صرف تکوینی سنت الٰہیہ کو پیش کیا کہ اللہ وہ ہے جو زندگی اور موت عطا کرتا ہے۔ اب انہوں نے اپنے مخالف کے لئے ظاہری چیلنج کا راستہ اختیار کیا کہ تم اللہ کی قدرت کے بارے میں جھگڑتے ہو تو اللہ کی سنن میں سے کسی سنت کو تبدیل کر کے دکھا لو۔ اور یہ چیلنج انہوں نے یہ دکھانے کے لئے دیا کہ رب وہ نہیں ہوتا جو انسانی زندگی کے کسی ایک شعبے میں حاکم ہو یا کسی ایک خطے میں حاکم ہو وہ تو اس پوری کائنات میں متصرف ہوتا ہے اور اس کی اس عمومی ربوبیت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ تمام لوگوں کے لئے قانون ساز بھی ہو اس لئے کہ وہ ان کا رب ہے۔

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ ........................ "ابراہیم نے کہا: "اچھا اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے' تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا۔" یہ بھی ایک مسلسل وقوع پذیر ہونے والی کائناتی حقیقت ہے۔ ہماری نظر روز یہ نظارہ دیکھتی ہیں اور ہماری قوت مدرکہ روز اسے پاتی ہے اور کبھی بھی اس نظام میں کوئی تعطل یا تاخیر واقعہ نہیں ہوتی۔ یہ کائنات ایک شہادت ہے جو ہماری فطرت کو اپیل کرتی ہے۔ اگرچہ ہم اس کائنات کی طبیعت اور مزاج کو اچھی طرح نہ سمجھ پا رہے ہوں۔ اگرچہ ہم نے فلکیات کے بارے میں مختلف نظریات کا علم حاصل نہ کیا ہو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جس قدر انبیاء مبعوث فرمائے ہیں انہوں نے ہمیشہ انسانی فطرت کو مخاطب کیا ہے۔ چاہے فطرت انسانی اپنی علمی اور عقلی ترقی کے تاریخی مراحل میں سے جس مرحلے میں بھی ہو اور فطرت انسانی نے اجتماعی لحاظ سے ترقی کے جو مدارج بھی طے کئے ہوں انبیاء نے فطرت انسانی کا ہاتھ پکڑا ہے۔ اور اسے ترقی کے اگلے مدارج تک پہنچایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس بادشاہ کو جو چیلنج دیا اور جو مطالبہ فطرت پر مبنی تھا وہ لاجواب تھا۔ اور نتیجہ یہ نکلا فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ........................ "تو وہ منکر حق ششدر رہ گیا۔"

یہ چیلنج اس منکر حق کے سامنے کھڑا تھا۔ بات بالکل واضح تھی' کسی غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ مناسب رویہ تو یہ تھا کہ وہ سیدھی طرح ایمان لے آتا اور سر تسلیم خم کر دیتا لیکن جو شخص کافرانہ رویہ اختیار کر لیتا ہے اور پھر متکبر بھی ہوتا ہے۔ یہ صفات اسے رجوع الی الحق سے روک لیتی ہیں اور وہ حیران رہ جاتا ہے' پریشان ہوتا ہے اور متحیر ہو جاتا ہے۔ اسے نہیں سوجھتا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ لیکن اسے اللہ تعالیٰ راہ حق اس لئے نہیں سجھاتے کہ وہ ہدایت کا متلاشی ہی نہیں ہوتا۔ اسے راہ حق کی طرف آنے کا شوق نہیں ہوتا۔ وہ سیدھی راہ نہیں پکڑتا تاکہ منزل مقصود پائے۔ اس لئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ........................ "مگر اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھایا کرتا۔"

اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی پہلی جماعت' جماعت مسلمہ کے سامنے' بعض عناد اور ضلالت اور ہٹ دھرمی کی مثال کے طور پر یہ پیش فرمایا۔ نیز ان لوگوں کے لئے بھی جو دور جدید میں دعوت اسلامی کا کام کرتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی تجربہ کے طور پر قرآن مجید میں درج کر دیا گیا کہ اہل دعوت منکرین حق کا مقابلہ کس طرح کریں۔

سیاق کلام ایسے حقائق کو لے کر آگے بڑھتا جو ایمان و یقین کے ساتھ ایک واضح تصور کے عناصر ترکیبی ہیں۔ "میرا رب وہ ہے جس

کے اختیار میں موت و حیات ہے۔" اور "اللہ تو سورج کو مشرق سے نکال کر لاتے ہیں' تم ذرا اسے مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔" ایک حقیقت ایسی ہے جو نفوس انسانی میں پائی جاتی ہے۔ دوسری حقیقت ایسی ہے جو آفاق کائنات میں عیاں ہے۔ دونوں عظیم تکوینی حقیقتیں ہیں لیکن اپنی عظمت کے ساتھ ساتھ پیش پا افتادہ ہیں۔ روز کے مشاہدے میں ہیں۔ رات دن فکر و نظر کی آماجگاہ ہیں اور ان حقائق کے پانے کے لئے کسی بڑی علمی استعداد کی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ کسی طویل غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحیم و کریم ہے۔ وہ اللہ پر ایمان لانے اور اللہ کی جانب ہدایت پانے کے مسئلے پر اس قسم کی علمی اور منطقی بحث نہیں کرتا کہ جو کم علم آدمی کی دسترس سے باہر ہو یا ایسے لوگوں کی استعداد فکری کے دائرے سے باہر ہو جو غور و فکر کے معاملے میں طفل مکتب ہوں۔ یہ ایک زندہ اور اہم معاملہ ہے۔ انسانی فطرت کے لئے وہ لابدی ہے۔ اس کے بغیر انسانی زندگی استوار ہو سکتی ہے نہ انسانی معاشرہ اس کے بغیر منظم ہو سکتا ہے۔ اور اس کے بغیر انسان یہ پہچان حاصل نہیں کر سکتے کہ ان کے اجتماعی نظام اور اعلیٰ اقتدار اور آداب کا ماخذ کیا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ایمان کے مسئلہ میں انسان کے ساتھ ایسے حقائق کو پیش نظر رکھ کر بات کرتا ہے' جو سب کے سامنے ہوتے ہیں اور جن کا تعلق فطرت انسانی سے ہوتا ہے۔ اور وہ حقائق ایسے ہوتے ہیں جو ہر فطرت سلیمہ سے اپنے آپ کو خود تسلیم کراتے ہیں۔ ان حقائق اور مشاہدات کے اشارات اس قدر مضبوط ہوتے ہیں کہ ان کی گرفت سے انسان بمشکل نکل سکتا ہے۔ اور ان سے دامن چھڑانے کے لئے اسے انتہائی محنت' مشقت' تکبر و غرور اور عناد و مکابرہ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

اعتقادات اور ایمانیات کے علاوہ بھی انسانی زندگی کے وہ معاملات جن پر حیات انسانی مکمل طور پر موقوف ہے' ان میں بھی انسان راہ فطرت اپناتا ہے اور اشارات فطرت کے دائرے میں رہتا ہے۔ مثلاً تلاش معاش' ہوا' پانی' تناسل و تکاثر وغیرہ۔ ان اہم معاملات میں بھی انسان کو اپنے حال پر نہیں چھوڑا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی سوچ مکمل اور پختہ ہو گئی۔ اس کا علم ترقی کر گیا اور پختہ ہو گیا۔ اگر اسے یونہی چھوڑ دیا جاتا تو وہ کب کا ہلاک و برباد ہو گیا ہوتا۔ ایمان انسان کے لئے اسی قدر اہم اور ضروری ہے جس قدر اس کی زندگی کے لئے کھانا' پینا اور ہوا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان موضوعات پر اللہ تعالیٰ فطرت انسانی کے تقاضوں کے مطابق بات کرتا ہے اور ایسے آثار و شواہد پیش کرتا ہے جو انسان کے اردگرد صفحہ کائنات پر پھیلے ہوئے ہیں۔

○○○

راز حیات اور اسرار وجود ہی کے موضوع پر ایک دوسرا قصہ شروع ہو جاتا ہے۔

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۖ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

یا پھر مثال کے طور پر اس شخص کو دیکھو ' جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا ' جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی ۔ اس نے کہا : " یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے ' اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا ؟ " اس پر اللہ نے اس کی روح قبض کرلی اور وہ سو برس تک مردہ پڑا رہا ۔ پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پوچھا : " بتاؤ ' کتنی مدت پڑے رہے ہو ؟ " اس نے کہا : " ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا ۔ " فرمایا : " تم پر سو برس اسی حالت میں گزر چکے ہیں ۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے ۔ دوسری طرف ذرا اپنے گدھے کو بھی دیکھو ( کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے ) اور یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں ۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں ۔ " اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہوگئی ' تو اس نے کہا : " میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۔ "

یہ شخص کون تھا جس کا گزر ایک بستی پر ہوا ۔ وہ کون سی بستی تھی جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری ہوئی تھی ۔ اس کے بارے میں قرآن کریم خاموش ہے ۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوتی تو قرآن کریم اس بستی کے بارے میں تفصیلات بتا دیتا ۔ اگر ان تفصیلات کے حذف کر دینے سے حکمت قرآنی کے اظہار و بیان میں کچھ فرق پڑتا تو قرآن کریم میں اس کی تفصیلات ضرور بتائی جاتیں ۔ یہاں صرف اس بستی کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے اور جس طرح فی ظلال القرآن میں ہمارا منہاج ہے ہم بھی بس اس جھلک سے آگے تفصیلات میں جانا مناسب نہیں سمجھتے ۔ اس بستی کی جو جھلک یہاں دکھائی گئی ہے وہ نہایت ہی واضح ' مؤثر اور پردہ دماغ میں مرتسم اور منقش ہو جاتی ہے ۔ موت ' پھر بوسیدگی اور ٹوٹ پھوٹ کا ایک واضح نقشہ اپنی پوری صفات کے ساتھ ذہن نشین ہو جاتا ہے ۔ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ........... " جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی ہے ۔ " یہ بستی گر کر اپنی بنیادوں پر پڑی ہے اور ریزہ ریزہ ہو چکی ہے ۔ جو شخص اس پر سے گزرتا ہے اس کے احساسات میں یہ تصور نمودار ہوتا ہے ۔ وہ سوچنے لگتا ہے اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ ............ " یہ آبادی جو مکمل طور پر تباہ و برباد ہو چکی ہے اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا ۔ "

قائل یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ موجود ہے لیکن اس بستی کی موجودہ شکست و ریخت کی صورت حال کو دیکھ کر سوچتا ہے ۔ اس کے احساسات میں یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ اس ہمہ گیر تباہی کے بعد اللہ اسے کس طرح دوبارہ زندہ و تابندہ بنا دے گا ۔ احساسات کی یہ تعبیر ایسی منظر کو دیکھ کر جو احساسات پیدا ہو سکتے ہیں ۔ قرآن کریم ان کی نہایت رقت کے ساتھ ' پر تاثیر تعبیر کرتا ہے ۔ یوں قرآن کریم اپنا پرتو اور اپنی تعبیرات کو مخاطب کے ذہن میں منقش کر دیتا ہے ۔ یوں نظر آتا ہے کہ قاری کے سامنے وہ منظر عیاناً موجود ہے ۔ وہ اسے دیکھ رہا ہے اور اس کے دل میں وہی احساسات پیدا ہو رہے ہیں جو کبھی اس شخص کے دل میں پیدا ہوئے تھے ۔

اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ............ " اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا ۔ " اس تباہی میں سے تعمیر کس طرح نمودار ہوگی ؟ " فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ ............ " تو اللہ تعالیٰ نے اس کی روح قبض کرلی ۔ وہ سو برس تک مردہ پڑا رہا ۔ پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی ۔ " اللہ تعالیٰ نے اسے زبانی طور پر یہ نہ کہا کہ اسے اس طرح زندہ کیا جائے گا ۔ بلکہ اسے واقعات کی دنیا میں بطور تجربہ دکھایا گیا ۔ اس لئے کہ تاثر اور شعور بعض اوقات اس قدر گہرے اور مشکل ہوتے ہیں کہ عقلی دلائل سے انہیں بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ نہ منطق اور وجدان سے وہ تاثر پیدا کیا جا سکتا ہے ۔ بعض اوقات یوں ہوتا ۔ ایک عام اور پیش پا افتادہ واقعات سے بھی ایسا تاثر اخذ نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ شعور اور تاثر صرف براہ راست ذاتی تجربے ہی سے پیدا کیا جا

سکتا ہے۔ ایسے تجربے کے بعد یہ شعور انسان کے احساسات پر چھا جاتا ہے۔ دل اس پر مطمئن ہو جاتا ہے اور پھر کسی مزید یقین دہانی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ ............ "اللہ نے اس سے پوچھا "بتاؤ کتنی مدت پڑے رہے ہو؟ اس نے کہا ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں۔" اسے کیا پتہ تھا کہ وہ کتنی مدت پڑا رہا ہے۔ زمانے کا احساس اور شعور تب ہوتا ہے جب انسان زندہ ہو اور اس کی سمجھ کام کر رہی ہو۔ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ انسانی حس دراصل ادراک حقیقت کے لئے صحیح معیار بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ حس اور ادراک حقیقت میں کبھی دھوکہ دیتی ہے اور کبھی دھوکہ کھاجاتی ہے۔ مثلاً حس نے یہاں ایک طویل زمانے کے ادراک میں دھوکہ کھایا اور اسے ایک دن یا اس سے بھی مختصر زمانہ سمجھا۔ اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ انسانی حس ایک مختصر زمانے کو ایک طویل عرصہ تصور کرتی ہے۔

قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ ............ "اللہ نے کہا بلکہ تو نے اس حالت میں سو سال گزارے ہیں۔" اس تجربے کی نوعیت کا تقاضا یہ تھا' خصوصاً جبکہ یہ ایک حسی تجربہ تھا کہ وہاں لازماً ایسے آثار ہونے چاہئیں جو یہ بتائیں کہ ایک سو سال کا طویل عرصہ گزر گیا ہے لیکن اس شخص کے کھانے اور پینے کے سامان سے تو ایسے آثار ظاہر نہیں ہو رہے تھے۔ اس لئے کہ اس کے کھانے پینے کے سامان میں کوئی تغیر واقعہ نہیں ہوا تھا۔ نہ وہ خراب اور متعفن ہوئے تھے۔

فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ ............ "اور اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں کوئی تغیر واقعہ نہیں ہوا۔" اور ظاہر ہے کہ پھر ایسے آثار صرف اس شخص کی ذات یا اس کے گدھے کے ساتھ متعلق ہو سکتے ہیں۔"

وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ

"اور اپنے گدھے کو بھی دیکھو اور یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں۔"

کون سی ہڈیاں؟ کیا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کی ہڈیاں؟ اگر یوں ہوتا جس طرح بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس شخص کی ہڈیاں گوشت و پوست سے ننگی ہو گئی تھیں تو جب اس کی نظروں میں بینائی ڈالی گئی اور وہ دیکھنے لگا تو وہ سب سے پہلے خود اپنی حالت کو دیکھتا اور سوچنے لگتا۔ اور اس وقت اس کا جواب یہ نہ ہوتا لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ............ "کہ میں ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں۔"

اس لئے صحیح تفسیر یہ ہے کہ ان ہڈیوں سے مراد صرف گدھے کی ہڈیوں کا پنجر ہے جو گوشت و پوست سے ننگی ہو کر علیحدہ ہو گئی تھیں۔ اور اس کے بعد یہ معجزہ رونما ہوا کہ یہ ہڈیاں آپس میں جڑنے لگیں۔ ان پر گوشت و پوست چڑھنے لگا۔ اور پھر اسی صحیح و سالم گدھے کو دوبارہ حیات بخشی گئی۔ اور یہ شخص جو اس طویل عرصہ میں بذات خود اپنے کھانے اور پینے کے سامان سمیت صحیح سالم اپنی اصلی حالت میں رہا تھا اس کے دیکھتے ہی دیکھتے یہ معجزہ رونما ہوا۔ تاکہ ایک ہی جگہ ان دونوں مادی اشیاء کے انجام کا یہ متضاد فرق' باوجود اس کے کہ فضا اور موسمی موثرات ایک ہی تھے۔ ایک دوسرے معجزے کا اظہار کر دے۔ یہ معجزہ یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی اس مخلوقات پر قدرت کاملہ حاصل ہے۔ اس کی قدرت و اختیار بے قید ہے۔ اس معجزے سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کو دوبارہ زندہ کرے گا اور اس کی کیفیت کچھ ایسی ہی ہوگی۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ معجزہ کس طرح وقوع پذیر ہوا۔ یہ اسی طرح ہوا جس طرح تمام معجزات وقوع پذیر ہوا کرتے ہیں۔ جس طرح اس کرۂ ارض پر پہلی زندگی کو وجود میں لانے کا معجزہ رونما ہوا۔ جسے ہم اکثر اوقات بھول جاتے ہیں۔ اور ہم نہیں جانتے کہ آغاز حیات کیونکر ہوا؟ زندگی کس طرح آئی؟ یہ آئی اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے چاہا اسے لے آیا اور جو ہمارے سامنے موجود ہے۔ ڈارون علمائے حیاتیات میں ایک اونچے درجے کا سائنسدان تھا۔ وہ اپنے نظریہ کو لے کر درجہ بدرجہ نیچے آتا رہا۔ وہ زندگی کی گہرائیوں میں دور تک سرگرداں رہا اور آخر کار وہ اسے یہاں تک پہنچا سکا کہ اس کا آغاز ایک زندہ خلیے سے ہوتا ہے۔ یہاں آکر وہ رک جاتا ہے اور اس کا راستہ آگے سے بند ہے۔ اس زندہ خلیے میں زندگی کہاں سے داخل ہوئی؟ اس راز کو وہ نہیں پا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا جسے انسانی ادراک کو تسلیم کر لینا چاہئے۔ جو حقیقت انسانی کی فطری سوچ اور منطق کو ہر لحہ مجبور کر رہی ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے۔ یہ کہ ایک ایسی ذات کو تسلیم کیا جائے جس نے اس خلیے کو زندگی عطا کی اور ڈارون کسی علمی یا منطقی دلیل کی بنا پر اس حقیقت کے تسلیم کرنے سے انکاری نہیں ہے بلکہ یہ انکار اہل کیسا کے اس رویہ کی وجہ سے ہے جو انہوں نے اہل علم و دانش کے خلاف اپنی پوری تاریخ میں اختیار کیا۔ ڈارون اس تعصب کی وجہ سے کہتا ہے "زندگی کے معاملات کی ایسی تفسیر جس میں ایک خالق کے وجود کو تسلیم کیا جائے، رب ہے جس طرح ایک خالص طبعی میکانزم میں ایک خارق العادت عنصر کو شامل کیا جائے۔" سوال یہ ہے کہ وہ طبعی میکانزم کیا ہے؟ میکانزم کا اس حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے جو ہمارے فکر و نظر کے سامنے کھڑی ہے اور ہم سے باصرار مطالبہ کر رہی ہے کہ ہم اس کا راز بتائیں یعنی حیات اولی کا راز۔

ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے کہ اس فطری اور منطقی استدلال کے سامنے خود ڈارون بھی بے بس ہو جاتا ہے۔ جو استدلال باصرار مطالبہ کرتا ہے کہ خلیہ اولی کے پیچھے خالق کائنات کو تسلیم کیا جائے تو وہ خلیہ اول کو سبب اول کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اور اگر اس سے کوئی پوچھے کہ یہ سبب اول ہے کیا؟ اس کا اس ماہر حیاتیات کے پاس کوئی جواب نہیں ہے حالانکہ یہ ایک اہم سوال ہے کہ خلیہ اول کے اندر حیات اور زندگی کا موجد کون ہے؟ اس سوال کا جواب دیئے بغیر ہی وہ اس خلیے سے اپنے نظریئے کا آغاز کرتا ہے جبکہ آج اس کا یہ مشہور نظریہ بھی محل نظر بن گیا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی اپنی موجودہ شکل میں اس خلیے کی ترقی یافتہ شکل ہے حالانکہ آغاز حیات کا دوسرا طریق کار بھی ہو سکتا ہے اور ہے۔

آغاز حیات کے بارے میں اہم سوال کا جواب ڈارون نہ دے سکا۔ اس نے فرار کی راہ اختیار کی اور اپنا بناوٹی بوگس نظریہ پیش کیا۔ا۔

اب ہم دوبارہ اس گاؤں کے معجزے کی طرف لوٹتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ایک ہی حالات و کوائف میں ہیں اور ایک ہی مقام پر یہ معجزہ کیسے ظہور پذیر ہو گیا کہ بعض چیزیں تو متغیر ہو جاتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں اور بعض دوسری چیزیں اپنی اصل شکل و صورت اور حالت و کیفیت پر قائم رہتی ہیں۔ آغاز حیات بھی ایک معجزہ ہے کہ دوبارہ تخلیق بھی ایک بڑا معجزہ لیکن ان دونوں معجزات سے اس بات کی وضاحت نہیں ہوتی کہ ایک جیسی چیزوں میں سے بعض ختم ہوں اور بعض اپنی اصل حالت پر قائم رہیں۔

اس متضاد صورت حال کی وضاحت دراصل اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ مشیت ایزدی بے قید ہے۔ اللہ کی مشیت اس ہمہ گیر قانون فطرت سے بھی آزاد ہے جسے ہم لازمی اور اٹل سمجھتے ہیں اور ہمارے ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے نہ اس قانون فطرت کی مخالفت ہو سکتی ہے اور نہ اس سے کوئی جزئیہ مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔ ہمارے لئے یہ بات کافی ہے کہ اللہ کی مشیت کی نسبت سے یہ عقیدہ غلط ہے کہ قانون طبیعت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور ہمارے لئے یہ الجھن اس لئے پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم اپنے اندازوں یا عقلی

ا۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے کتاب "الانسان بین المادیہ والاسلام" کا باب "فرائڈ"

فیصلوں کو نام نہاد سائنسی اصولوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھی لازماً منطبق کرتے ہیں اور یہ ہمارے فکر و نظر کی وہ غلطی ہے جو کئی دوسری غلطیوں کو جنم دیتی ہے۔

۱۔ مثلاً ہمیں یہ حق کب پہنچتا ہے کہ ہم قادر مطلق کو اس قانون کا تابع قرار دیں جس کے ہم قائل ہیں' جو ہمارے محدود وسائل کے محدود تجربات سے اخذ کیا گیا ہوتا ہے۔ پھر ہم اپنی محدود قوت مدرکہ کی وجہ سے ان تجربات کی تفسیر کرتے ہیں جس میں غلطی کا امکان ہر وقت موجود ہوتا ہے۔

۲۔ چلو ہم نے قوانین قدرت میں سے کوئی قانون صحیح طور پر سمجھ لیا اور وہ فی الحقیقت ہے بھی قانون قدرت۔ لیکن ہمیں یہ کس نے بتایا کہ بس یہ قانون انتہائی اٹل قانون ہے' بے قید و شرط ہے۔ اور اس سے زیادہ کلی اور جامع اور کوئی قانون اور ضابطہ نہیں ہے۔

۳۔ چلو مان لیا کہ وہ قانون اٹل ہے' مطلق ہے اور عام حالات میں اس سے تخلف ممکن نہیں ہے لیکن یہ قانون اللہ کا وضع کردہ ہے۔ ذات باری کس طرح اپنے بنائے ہوئے قانون میں مقید ہو گئی۔ ذات باری تو بہرحال مختار کل ہے۔

غرض یہ تجربہ یوں ہی آگے بڑھتا ہے۔ جدید اہل دعوت کے فکری سرمایہ میں ایک صحیح ایمانی تصور حیات کا اضافہ کرتا ہے اور موت و حیات کی حقیقت کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس دوسری حقیقت کا اضافہ بھی کرتا ہے جس کی جانب ہم نے ابھی اشارہ کیا۔ یہ حقیقت کہ اللہ کی مشیت بے قید ہے۔ اور قرآن کریم نے اس حقیقت کو بار بار بیان کر کے اہل ایمان کے ضمیر میں اسے پختہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ اہل ایمان براہ راست اپنے خدا سے تعلق قائم کریں۔ اس سلسلے میں ظاہری اسباب کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ ان تمہیدات کو خاطر میں نہ لائیں جو عام طور پر منظور نظر ہوتی ہیں۔ اللہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ اور یہی بات اس شخص نے کی' جس کے سامنے اس تجربے کو دہرایا گیا تھا۔ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ ۙ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ............................ "میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

○○○

اس کے بعد حقیقت موت و حیات کے سلسلے میں ایک تیسرا تجربہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ تجربہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کرایا گیا۔ جو امت مسلمہ کے نزدیک ترین گزرے ہیں۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ

"جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ "میرے رب مجھے دکھا دے تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟" فرمایا: "کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟" اس نے عرض کیا" ایمان تو رکھتا ہوں مگر دل کا اطمینان درکار ہے۔ فرمایا اچھا تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے پھر ان کا ایک ایک جز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو پکار' وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ خوب جان لے کہ اللہ نہایت بااقتدار اور

حکیم ہے۔"

یہ قدرت الٰہیہ کی کاریگریوں تک رسائی کا ایک شوق ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو نہایت ہی حلیم الطبع اور مطیع فرمان اولوالعزم نبی تھے ان کی جانب سے یہ شوق اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ بعض اوقات اللہ کے برگزیدہ اور اقرب المقربین بندوں کے دل میں بھی یہ امنگ پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کاریگریوں کے رازہائے پس پردہ تک رسائی حاصل کریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے راضی برضا' خشوع و خضوع کرنے والے اور عبادت گزار بندے کی جانب سے اس خواہش کا اظہار دراصل اسی قسم کی امنگ کا نتیجہ ہے۔

اس امنگ کا تعلق ایمان 'کمال ایمان یا ایمان کی پختگی اور ثبوت و قرار کے ساتھ نہیں ہے۔ اس امنگ کے ذریعہ حضرت ابراہیم کسی قوی دلیل کا مطالبہ نہ کر رہے تھے یا ایمان کی کمزوری دور کر کے اس میں پختگی حاصل کرنا نہ چاہتے تھے۔ یہ چیزیں تو انہیں پہلے سے حاصل تھیں۔ رازہائے درون پردہ تک رسائی دراصل ایک دوسرا ہی ذوق ہے۔ یہ ایک قسم کا روحانی شوق ہے۔ بندہ مومن رازہائے الٰہیہ کے ساتھ منسلک ہونا چاہتا ہے۔ عملاً ان واقعات کو رونما ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ وجود انسانی میں یہ ذوق و شوق ایک فطری امر ہے۔ اس کا تعلق ایمان بالغیب سے نہیں ہے۔ ایمان بالغیب بکمال درجہ موجود ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ جذبہ کمال درجہ موجود ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ ذات باری سے ہمکلام ہیں۔ رب کریم حضرت ابراہیمؑ سے ہمکلام ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کو اس ہمکلامی سے زیادہ کس ایمان کی ضرورت تھی' کس دلیل و برہان کی ضرورت تھی؟ وہ جو چیز دیکھنا چاہتے تھے وہ یہ تھی کہ کارخانہ قدرت میں قدرت کو کام کرتے ہوئے دیکھیں تاکہ ان کے اس جذبہ حصول رازہائے دروں کو تسکین حاصل ہو۔ وہ ان رازوں کے ہم نفس ہو جائیں۔ اور ان میں گھل مل جائیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کا نفس ایمان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کیونکہ نبی کے ایمان کے لئے کوئی اور ایمان نہیں ہوتا وہ تو درجہ کمال میں ہوتا ہے۔

جب حضرت ابراہیمؑ کی گفتگو اور ان کا یہ تجربہ مکمل ہوتا ہے تو پھر پتہ چلتا ہے کہ ایمان کے نتیجے میں قلب مومن میں متعدد قسم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اور مومن کامل کے دل میں پیدا ہونے والی یہ امنگیں اسے مجبور کرتی ہیں کہ وہ حریم قدرت کے اندر جھانکنے کی کوشش کرے۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ ؕ

"جب ابراہیم نے کہا "مجھے دکھا دے تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟" فرمایا :"کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟" اس نے عرض کیا "ایمان تو رکھتا ہوں مگر دل کا اطمینان درکار ہے۔" حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ قلبی اطمینان تب حاصل ہو تا جب وہ دست قدرت کو کام کرتے دیکھ لیں۔ اور جذبہ افشائے رازہائے درون خانہ کی تسکین تب ہوتی ہے جب انسان ان رازوں کو کھول دیتا ہے اور وہ اس پر عیاں ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح علم تھا کہ اس کا بندہ اور دوست پکا مومن ہے لیکن اس کا یہ سوال محض تسکین شوق اور اعلان ذوق کی خاطر ہے۔ سوال و جواب کا یہ سلسلہ اللہ کریم کی جانب سے اپنے اس مطیع فرمان اور حلیم الطبع بندے کے ساتھ ایک قسم کا اظہار لطف و کرم تھا اور ذرہ نوازی تھی۔

غرض اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے اس شوق تجسس کی تسکین کا سامان فراہم فرما دیا۔ اور اس کو براہ راست ایک ذاتی تجربے سے

دو چار کر دیا۔

قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ

"فرمایا تو چار پرندے لے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے۔ پھر ان کا ایک جزء ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو پکار' وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ خوب جان لے کہ اللہ نہایت بااقتدار اور حکیم ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ اب چار پرندے لیں۔ ان کو اپنے ساتھ مانوس کر لیں۔ ان کی خصوصیات اور ان کی نشانیاں اچھی طرح جان لیں تاکہ انہیں جاننے میں غلطی واقعہ نہ ہو۔ پھر انہیں ذبح کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں اور ان کے اجزاء کو ارد گرد کے پہاڑوں پر بکھیر دیں۔ اور پھر ان کو پکاریں۔ اب ان کے یہ متفرق اعضاء دوبارہ صحیح ہونے لگیں گے۔ ان میں زندگی لوٹ آئے گی اور دوڑ کر وہ تمہاری طرف لوٹ آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

حضرت ابراہیم ؑ نے راز تخلیق کو عیاں پایا۔ یہ وہ راز ہے جو ہر لحظہ دہرایا جارہا ہے۔ لیکن لوگ اس راز کی تکمیل کے بعد صرف اس کے آثار دیکھ سکتے ہیں۔ یہ راز عطائے حیات کا راز تھا۔ یہ وہ حیات ہے جو اس کائنات کو عطا کی گئی جبکہ پہلے کچھ نہ تھا۔ اور اب وہ ہر زندہ مخلوق کی شکل میں دہرائی جارہی ہے۔

حضرت ابراہیم ؑ نے اپنی آنکھوں سے اس راز کو دیکھ لیا۔ چند پرندے تھے' جن سے زندگی الگ ہو گئی تھی۔ ان کا قیمہ مختلف مقامات پر بکھیر دیا گیا۔ اب ان کے اجزاء جمع ہو رہے ہیں اور ان میں دوبارہ زندگی ڈالی جارہی ہے۔ اور وہ آکر حضرت ابراہیمؑ تک پہنچ جاتے ہیں۔

یہ کیونکر ہوا؟ یہی تو وہ راز ہے جس کا ادراک اس بشر کے حیطۂ قدرت سے وراء ہے۔ کبھی انسان اس راز کو اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا۔ وہ اس کی تصدیق اسی طرح کرتا ہے جس طرح حضرت ابراہیم ؑ نے اس کی تصدیق فرمائی۔ لیکن وہ اس کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا۔ اس کا طریقہ واردات اسے معلوم نہیں ہے۔ یہ امر الٰہی ہے۔ اور لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ علوم الٰہیہ میں سے ایک محدود مقدار کو جان اور پا سکتے ہیں' وہ بھی جسے وہ چاہے دے دے لیکن راز حیات سے اس نے کسی کو آگاہ نہیں کیا۔ اس لئے کہ وہ انسان کی قدرت اور طاقت کے مقابلے میں بہت ہی بڑا راز ہے۔ اس کو عبث ہمارے حس و ادراک کی نوعیت سے مختلف ہے۔ اور اس کرۂ ارض پر ادائیگی فریضۂ خلافت کے سلسلے میں انہیں اس تکوینی علم کی قدرت بھی نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص شان ہے اور مخلوقات کا شملہ علم اس کے مقابلے میں بہت ہی کوتاہ ہے اور اگر انسان دروازۂ مستورات میں جھانکنے کی سعی بھی کرے تو اسے پردے ہی پردے نظر آئیں گے اور حجاب در حجاب نظر آئے گا۔ اس کی یہ سعیٔ لاحاصل ہوگی اور عالم الغیب کا دائرہ علوم النبوت تک ہی محدود رہے گا۔

☆ ☆ ☆ ☆

# درس نمبر۱۹ ایک نظر میں

اس پارے کے سابقہ تینوں سبق مجموعی طور پر بعض اساسی ایمانی تصورات کے بارے میں تھے۔ اور ان میں اس تصور حیات کے بارے میں بعض وضاحتیں کی گئی تھیں۔ اور مختلف پہلوؤں سے اس کی جڑیں مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ اس طویل سورت کی اس لائن کا ایک مرحلہ تھا' جس پر یہ پوری سورت جارہی ہے یعنی انسانیت کی قیادت کے نصب العین کی راہ میں امت مسلمہ پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے امت کو تیار کرنا جیسا کہ اس سے قبل ہم اس بات کی تشریح کر چکے ہیں۔

یہاں سے لے کر تقریباً اس سورت کے اختتام تک اب بیان کا رخ ان اساسی معاشی اصولوں کے بیان کی طرف ہے جن پر امت مسلمہ کے اجتماعی نظام کی نیو اٹھائی جانی مقصود ہے۔ اور جن کے مطابق جماعت مسلمہ کی تنظیم بھی مقصود تھی۔ اور یہ اجتماعی نظام دراصل باہم تعاون اور تکافل پر مبنی ہے اور جس کی تشکیل عشر و زکوٰۃ اور خیرات و صدقات پر مبنی ہے۔ اور یہ معاشی نظام اس سودی نظام سے بالکل مختلف ہے۔ جو اس دور جاہلیت میں رائج تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں صدقہ کی فضیلت اور آداب کا بیان کیا جاتا ہے اور ربا کی مذمت کی جاتی ہے۔ اور اگلے اسباق میں آپ پڑھیں گے کہ قرضہ اور تجارت کے اساسی اصول بیان کئے گئے ہیں اور مجموعی طور پر یہ سب چیزیں اسلام کے اقتصادی نظام کا حصہ ہیں اور اسلام کی اجتماعی زندگی ان پر قائم ہے۔ آگے آنے والے تینوں اسباق باہم مربوط ہیں۔ یہ سب دراصل ایک ہی موضوع (اقتصادیات) کے مختلف پہلو ہیں یعنی اسلام کا اقتصادی نظام۔

اس سبق میں انفاق فی سبیل اللہ اور دولت کے خرچ کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اور اسلام کے ایک اقتصادی پہلو یعنی صدقہ اور اجتماعی کفالتی نظام کے بارے میں زور دیا گیا ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ دراصل جہاد کی ایک قسم ہے اور یہ بات واضح ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ امت مسلمہ پر فرض کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اللہ کی جانب سے امت مسلمہ پر یہ ڈیوٹی عائد کی گئی ہے کہ وہ پوری دنیا میں اس دعوت کو پھیلائے۔ پوری دنیا تک اس پیغام کو پہنچائے۔ پوری دنیا میں اہل ایمان کی حمایت کرے اور پوری دنیا سے شر و فساد اور ظلم و زیادتی کو ختم کر دے اور ان تمام قوتوں کو پاش پاش کر دے جو اہل اسلام کے مقابلے میں غالب ہیں اور جو زمین پر فساد پھیلاتی ہیں اور اہل دنیا کو اللہ کی سیدھی راہ اپنانے میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔ اور بالفاظ دیگر دنیا کو اس خیر عظیم سے محروم رکھنا چاہتی ہیں۔ جس کا حامل اسلامی نظام حیات ہے۔ دنیا کو اس خیر سے محروم کرنا اس قدر بڑا جرم ہے جس سے بڑا جرم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور انسانی روح اور انسانی جسم اور مال کے خلاف اس سے بڑی دست درازی اور کوئی نہیں ہے۔

اس سورت میں بار بار انفاق فی سبیل اللہ کی دعوت دی گئی ہے لیکن یہاں انفاق فی سبیل اللہ کے اصول و آداب کو ذرا تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔ یہاں دستور انفاق کی تصویر کشی بڑے ہی پیارے اور مانوس پرتو سے کی جاتی ہے۔ اس کے اجتماعی اصول اور آداب و اثرات اور نفسیاتی مضمرات سے تفصیلاً بحث کی جاتی ہے۔ ایسے آداب جن کی وجہ سے خود انفاق کرنے والے کی نفسیاتی اصلاح ہوتی ہے۔ اور دوسری جانب صدقہ وصول کرنے والے کے لئے وہ مفید بن جاتا ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں معاشرتی انقلاب یوں برپا ہوتا ہے کہ یہ معاشرہ اجتماعی طور پر باہم متعاون اور متکافل (Socially Sacurl) معاشرہ بن جاتا ہے۔ اور اس کے افراد میں باہم محبت اور ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے انسانیت ایک بلند مقام تک جا پہنچتی ہے۔ اور جس میں دہندہ اور گیرندہ بالکل ایک ہی سطح کے لوگ بن جاتے ہیں۔

اس حقیقت کے باوجود کہ اس سبق میں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ عمومی ہیں اور کسی زمان و مکان کی قید کے ساتھ مقید نہیں ہیں۔ اور ایک دائمی دستور کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن یہ بات ہمارے پیش نظر رہنی چاہئے کہ اس وقت جماعت مسلمہ کے اندر ایسے حالات موجود تھے جن کی اصلاح کے لئے یہ ہدایات اتاری گئیں۔ اور یہ بات بھی عین ممکن ہے کہ آنے والے ادوار میں بھی یہ بات ممکن تھی کہ مستقبل کا کوئی اسلامی معاشرہ بھی ایسی ہی ہدایات کا محتاج ہو۔ اس وقت اسلامی معاشرہ میں ایسے اشخاص موجود تھے جن کی نظروں میں مال ہی سب کچھ تھا اور جن کی اصلاح کے لئے ایسی ضربات کی ضرورت تھی اور جن کے لئے اس طرح کی موثر روحانی اثر اندازی کی ضرورت تھی۔ انہیں ضرورت تھی کہ ضرب الامثال کے ذریعہ حقائق کو ان کے مشاہدے میں لایا جائے اور یوں بات ان کی دلی گہرائیوں تک اتر جائے۔

اس وقت کے معاشرے میں اگر ایک طرف ایسے لوگ تھے جو سود خوری کے بغیر کسی کو مال دینا تصور نہ کر سکتے تھے تو دوسری طرف اس معاشرے میں ایسے لوگ بھی تھے جو بادل ناخواستہ خرچ کرنے والے تھے یا محض دکھاوے کے لئے خرچ کرتے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جو خرچ کر کے مسلسل احسان جتلاتے تھے اور یوں دوسروں کے لئے باعث اذیت ہوتے تھے۔ بعض ایسے تھے جو ردی اور بیکار مملوکات اللہ کے نام پر دیتے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ بہرحال مخلصانہ طور پر اللہ کی راہ میں بھی انفاق کرنے والے موجود تھے جو اپنے بہترین اموال خرچ کیا کرتے تھے جو اگر موقعہ و محل کا تقاضا خفیہ طور پر خرچ کرنے کا ہو تو خفیہ خرچ کرتے تھے اور اگر موقعہ و محل علی الاعلان خرچ کرنے کا ہو تو اعلانیہ خرچ کرتے تھے۔ یہ خرچ خالص اللہ کے لئے 'بالکل پاک اور ستھرا ہوتا تھا۔

اور مذکورہ بالا دونوں قسم کے افراد جماعت مسلمہ میں اس وقت موجود تھے۔ ہمیں اس حقیقت پر غور کرنا چاہئے اور اگر اسے پالیں تو یہ ہمارے لئے نہایت مفید ہو گی۔

اس حقیقت سے پہلا فائدہ یہ ہو گا کہ ہم اس کتاب کی حقیقت کو صحیح طرح پا سکیں گے۔ اور اس کے مقاصد ہم پر واضح ہوں گے۔ ہمیں یوں نظر آئے گا کہ قرآن کریم ایک زندہ اور متحرک حقیقت ہے۔ ان واقعات کی روشنی میں وہ ہمیں مسلسل سرگرم اور متحرک نظر آتا ہے اور قرآن کریم کی یہ تحریک جماعت مسلمہ کے اندر نظر آتی ہے۔ اس کا مقابلہ واقعی حالات سے ہے۔ وہ بعض واقعات اور حقائق کو برقرار رکھتا ہے اور بعض حالات کو تبدیل کر رہا ہے۔ یوں یہ جماعت قدم بقدم آگے بڑھ رہی ہے۔ اور قرآن ان حالات کا مقابلہ کر رہا ہے۔ وہ مسلسل فعال اور متحرک ہے۔ اس کی حرکت میں تسلسل اور دوام ہے۔ وہ زندگی کے عملی میدان میں برسرپیکار ہے۔ قرآن کریم ہی اس معاشرہ میں واحد ترقی پسند 'محرک اور عملی میدان میں آگے بڑھنے والا عنصر ہے۔

آج ہمیں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہم اس نہج پر قرآن کریم کا احساس کریں اور دیکھیں کہ قرآن کریم ایک زندہ حقیقت' متحرک اور آگے بڑھنے کے لئے اقدام کرنے والا ایک فیکٹر ہے۔ اس لئے کہ آج تحریک اسلامی 'اسلامی نظام زندگی' اور اسلامی معاشرہ کے ناپید ہوئے ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ قرآن کریم' جس طرح ہم نے اسے محسوس کیا ہے اور سمجھا ہے وہ انسانی تاریخ کے زندہ دھارے سے الگ تھلگ ایک کتاب ہے۔ آج قرآن کریم کو جس طرح ہم نے سمجھا ہے وہ اس نظام زندگی کا کوئی نقشہ پیش نہیں کرتا جو کبھی یہی قرآن عملاً اس کرۂ ارض پر وجود میں لایا تھا اور جو جماعت مسلمہ کی تاریخ میں کبھی زندہ حقیقت تھی۔ اور اب ہمیں یہ سبق یاد نہیں رہا ہے کہ اس وقت کے مسلم مجاہد کے لیے قرآن حکم الیوم (Order of the day) تھا۔ یعنی ان کے لئے قرآن کریم ایسی ہدایات تھا جن پر عمل ضروری تھا۔ ان پر فرض تھا کہ وہ ہر روز کی ہدایات کو عملاً نافذ کر دیں۔ ہمارے فہم و ادراک میں وہ عملی قرآن گویا مر گیا ہے یا وہ سو گیا ہے۔ اور ہم قرآن کریم کو اس طرح سمجھنے اور محسوس کرنے کی کوشش نہیں کرتے جس طرح اسے دور اول کے مسلمانوں نے سمجھا اور محسوس کیا۔

ہمارا طرز عمل یہ بن گیا ہے کہ ہم قرآن کریم کو نہایت ہی خوش الحانی 'اور گلوکاری کے ساتھ پڑھتے ہیں اور جھومتے ہیں یا ہمارا وجدان اس سے کچھ چالو 'مجمل اور ناقابل فہم و ناقابل تاویل تاثرات لیتا ہے یا ہم اس کی تلاوت بطور اوراد کرتے ہیں 'جس سے مومنین صادقین کے دل میں وجد 'خوشی اور قلبی اطمینان کی ایک مبہم اور مجمل سی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ تلاوت قرآن میں یہ سب فائدے بھی موجود ہیں لیکن ان تمام فوائد کے ساتھ ساتھ اصل مطلوب یہ ہے کہ قرآن قلب مومن میں فہم و فراست اور عمل و حرکت پیدا کر دے۔ اسے زندہ کر دے۔ اعلیٰ ترین مقصد یہ ہے کہ مسلمان کے دل و دماغ میں ایسی کیفیت پیدا ہو جائے کہ وہ قرآن کریم کی ہدایات کے ساتھ ساتھ ایک زندہ اور عملی زندگی لے کر چلتا رہے 'ایسی زندگی جسے قرآن یہاں رائج کرنا چاہتا ہے اور جس کے لئے اس کا نزول ہوا ہے۔ ایسی زندگی جسے مومن اس عرصۂ کارزار میں اور اس میدان کشمکش میں پائے 'جس کے لئے ایک مومن اپنے آپ کو ہمیشہ تیار رکھتا ہے۔ کیونکہ امت مسلمہ کی زندگی میں یہ کشمکش ایک لابدی امر ہے۔ مطلوب یہ ہے کہ ایک مسلمان قرآن کریم کی طرف اس نیت سے متوجہ ہو کہ وہ اس سے اپنی زندگی کا لائحہ عمل اخذ کرنا چاہتا ہے۔ بعینہ اس طرح جس طرح "مسلم اول" کرتا تھا۔ وہ آج کی زندگی' آج کے واقعات' آج کے مسائل جو اس کے اردگرد رواں دواں ہیں' ان کے بارے میں قرآنی ہدایات و اشارات کا طلبگار ہو۔ اسے چاہئے کہ وہ امت مسلمہ کی تاریخ کی تشریح بھی قرآنی ہدایات کی روشنی میں کرے۔ قرآنی کلمات و اشارات کو اسلامی تاریخ کی تشریح قرار دے۔ اور یوں محسوس کرے کہ اسلامی تاریخ قرآن کریم سے کوئی علیحدہ تاریخ نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ قرآن کی تاریخ ہے۔ اور آج امت مسلمہ جس صورت حالات سے دوچار ہے 'وہ بھی قرآنی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ آج کے حالات ان حالات کا منطقی نتیجہ ہیں جو اس امت کے اسلاف کو پیش آئے۔ اس وقت بھی قرآن ان حالات و حوادث میں ایک معین تبدیلی کا خواہاں تھا اور آج بھی یہ قرآن ویسی ہی تبدیلیاں چاہتا ہے۔ اس لئے ایک مومن یہ محسوس کرتا ہے کہ جس طرح یہ قرآن اس امت کے لئے کتاب عمل تھی 'آج میرے لئے بھی کتاب عمل ہے۔ آج بھی وہ چاہتا ہے کہ اپنے شب و روز کے معاملات میں 'پیش آمدہ حادثات میں قرآن کی طرف رجوع کرے گا۔ وہ اس کے تصورات اور اس کی فکر کا اصول اساسی ہے۔ وہ آج بھی اس کی تگ و دو اور اس کی جہد و عمل کا حقیقی محرک ہے۔ وہ کل بھی اس کے لئے محرک ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا محور ہے۔

اس حقیقت کے سمجھ لینے کا دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ اس سے ہمیں انسانی فطرت اور انسانی مزاج کی حقیقت اور ماہیت کا واضح ادراک ہو جاتا ہے۔ دعوت اسلامی اور اس کے عائد کردہ فرائض اور واجبات کو ہمیشہ اس انسانی فطرت سے واسطہ پڑا ہے۔ ان آیات میں پہلی اسلامی جماعت کے حوالے سے 'انسانی فطرت کا جو واضح نقشہ کھینچا گیا ہے اس سے انسانی فطرت اپنی اصل شکل اور ماہیت میں واضح ہوتی ہے۔ اس پہلی جماعت پر قرآن نازل ہو رہا تھا۔ اس جماعت کے نگراں و مربی خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اس جماعت کی صفوں میں بعض کمزور پہلو موجود تھے۔ جن کی اصلاح کی ضرورت تھی 'جن کی طرف مستقلاً توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ اور جن کی نشاندہی اور جن کی رعایت کی ضرورت تھی۔ یاد رہے کہ صحابہ کرام ﷢ کی اصلاح کرنا اس بات کے منافی نہیں کہ وہ امت کے تمام طبقات سے برگزیدہ تھے۔ اس حقیقت کا ادراک ہمارے لئے بہت ہی مفید ہے۔ یوں ہم ایک انسانی جماعت اور تنظیم کی حقیقت و ماہیت بغیر افراط و تفریط کے سمجھ سکیں گے۔ بغیر اس کے کہ اس پر مصنوعی خول چڑھائے ہوئے ہوں۔ بغیر اس کے کہ اس کے بارے میں کسی قسم کے گمراہ کن تصورات قائم کئے جائیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے ہمارے دل و دماغ سے مایوسی کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ کیونکہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام انسانیت کے لئے جو مقام بلند تجویز کرتا ہے ہم اس سے بہت دور ہیں۔ لہٰذا ہمارے لئے کافی ہے کہ ہم اس راہ پر چلتے رہیں۔ اس مقام بلند تک پہنچنے کی جدوجہد جاری رکھیں۔ اس سے ہمیں ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم اس حقیقت کو پا لیتے ہیں کہ

لوگوں کو مقام بلند اور کمال کے اعلیٰ درجوں تک پہنچانے کے لئے مسلسل دعوت کی ضرورت ہے۔ اس میں کسی وقت بھی کی سستی، مایوسی اور وقفہ نہیں ہونا چاہئے۔ اگرچہ بعض نفوس میں نقص اور عیب پایا جاتا ہو کیونکہ انسان تو ہوتا ہی ایسا ہے۔ انسان مسلسل دعوت اور اصلاحی جدوجہد کے نتیجے میں اصلاح پذیری کی راہ پر آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ اسے قرآن کے مقام بلند تک پہنچانے کے لئے مسلسل دعوت کی ضرورت ہے۔ اسے ہمیشہ بھلائی کی یاد دہانی کی ضرورت ہے۔ ہمیشہ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کے سامنے بھلائی کو اچھی صورت میں اور شر کو قبیح صورت میں مسلسل پیش کیا جاتا رہے۔ اور کردار کی کمزوری، اور نقائص سے اس کے دل میں مسلسل نفرت بٹھانا چاہئے۔ اور جب بھی وہ بے راہ روی اختیار کرے، اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے صحیح راہ پر ڈال دیا جانا چاہئے۔ کیونکہ زندگی کا یہ سفر بہت ہی طویل اور کٹھن ہے۔

اس سے ہمیں تیسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس سادہ حقیقت کو اچھی طرح پا لیتے ہیں جس سے بارہا ہم غافل ہو جاتے ہیں۔ یہ کہ انسان بہرحال انسان ہے۔ دعوت اسلامی بہرحال اسلام کی طرف بلاوا ہے۔ اور یہ معرکہ بہرحال انسانوں کا معرکہ اور انسانی جدوجہد ہے۔ یہ معرکہ سب سے پہلے اپنی ذات کی کمزوریوں، اپنے ذاتی نقائص اور نفس انسانی میں پوشیدہ جذبات حرص اور بخل کے خلاف ہے۔ اس کے بعد انسان کے اردگرد پھیلی ہوئی زندگی میں باطل، شر، ظلم اور گمراہی کے خلاف معرکہ ہے۔ یہ ایک قسم کی دو طرفہ جنگ ہے جو ایک داعی کو کرنی ہے۔ اور اس کرۂ ارض پر جماعت مسلمہ کی لیڈرشپ کو یہ دو طرفہ جنگ لازماً لڑنا پڑے گی۔ جس طرح قرآن کریم کو پہلی مرتبہ یہ جنگ لڑنا پڑی تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے یہ جنگ لڑنا پڑی تھی اور اس مسلسل معرکہ کے دوران یہ امر لازمی ہے کہ کچھ غلطیاں بھی ہوں، لغزشیں بھی ہوں اور اس کٹھن راہ کے مختلف مراحل میں بعض نقائص اور بعض کمزوریوں کا ظہور بھی ہو۔ اور نئے واقعات اور نئے تجربوں کے دوران ان نقائص اور لغزشوں کی اصلاح بھی ہوتی رہے۔ اور اصلاح وہدایت کے معاملے میں قرآن کریم نے جو طریقہ کار اختیار کیا ہے، اس کے مطابق لوگوں کے دل و دماغ کی اصلاح ہوتی رہے۔ یہاں میں پھر یہ بات کہوں گا جو پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہم تمام حالات، اور اپنی زندگی کی تمام تگ و دو میں قرآن مجید کو اپنا مشیر اور ہادی بنا دیں۔ یوں نظر آئے کہ ہمارے خیالات و شعور میں ہماری عملی زندگی میں اور ہمارے تمام معاملات میں قرآن کریم یوں جاری و ساری ہے جس طرح پہلی جماعت مسلمہ کی زندگی میں وہ پوری طرح جاری و ساری تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆

# درس نمبر۱۹ تشریح آیات

## آیت نمبر ۲۶۱ تا ۲۷۴

اب ہم اس سبق کی قرآنی آیات و نصوص کی تفصیلی تشریح کرتے ہیں۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

"جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں' ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے' افزونی عطا کرتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی"

اسلامی نظام زندگی کا آغاز فرائض واجبات سے نہیں ہوتا۔ اسلام اپنے کام کا آغاز' محبت' تالیف قلب اور نیکی کی تحریک سے کرتا ہے۔ وہ انسانی شعور کو جگاتا ہے اور انسانی زندگی میں زندہ جذبات پیدا کرتا ہے۔ وہ انسان کے مطالعہ اور مشاہدہ کے لئے زندگی کی ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے جو پھوٹتی ہے' بڑھتی ہے اور آخر کار ایک مفید پھل دیتی ہے۔ انسان اس سے ثمرہ حاصل کرتا ہے۔ وہ انسان کے سامنے فصل کی مثال پیش کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور زمین کا ایک عام عطیہ ہے۔ کھیتی ایک دانہ لیتی ہے لیکن سینکڑوں دانے واپس دیتی ہے۔ تخم اور بیج کی نسبت سے وہ کئی گنا حاصلات دیتی ہے۔ قرآن کریم میں یہ زندہ منظر ان لوگوں کے سامنے رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی کمائی خرچ کرتے ہیں۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ

"جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں' ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے' جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس کی سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔"

تعبیر کا یہ تصوراتی انداز حساب و کتاب کے عمل پر جا پہنچتا ہے۔ ایک دانہ بڑھ کر سات سو دانے بن جاتا ہے لیکن اس مفہوم کو قرآن مجید جس زندہ و تابندہ انداز میں پیش کرتا ہے وہ نہایت ہی حسین و جمیل ہے۔ اس سے انسانی شعور میں ایک قسم کا جوش و خروش پیدا ہوتا ہے۔ انسانی ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ ایک زندہ اور بڑھنے والی فصل کا منظر سامنے آتا ہے۔ ایک زندہ طبیعت ظاہر ہوتی ہے۔ پیداوار دینے والا ایک ہرا بھرا کھیت نظروں کے سامنے آتا ہے۔ عام نباتات کا ایک عام اور عجیب بیش پا افتادہ تجربہ سامنے آتا ہے۔ ایک ڈنٹھل پر سات بالیں ہیں

اور ہربال میں سو دانے ہیں۔

اس زندہ اور نامی منظر کے سامنے انسانی ضمیر بھی بذل و عطا کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن دراصل وہ دیتا نہیں کچھ لیتا ہی ہے۔ یوں یہ عطا اور داد و دہش ایک ایسے راستے پر جاتی ہے جس میں وہ کئی گنا نشوونما پاتی ہے۔ یوں انسان کا جذبہ داد و دہش کئی گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ فصل کی طرح کئی گنا زیادہ حاصلات لاتا ہے۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے' اس سے بھی زیادہ حاصلات دیتا ہے۔ بغیر حساب دیتا ہے اور بے شمار دیتا ہے۔

وہ اپنی مخلوق کے لئے اس کے رزق میں اس قدر فراوانی کرتا ہے جو بے حد و حساب ہوتی ہے۔ اس کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ جس کی انتہاؤں کا پتہ نہیں۔ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ............... "وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔"

وہ اس قدر فراخ دست ہے کہ جس کی عطا میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ وہ نہ ختم ہونے والی ہے اور نہ اس کے جوش میں کمی آنے والی ہے۔ وہ علیم ہے۔ وہ نیتوں کا مالک ہے۔ نیت اور نیکی پر بھی اجر دیتا ہے۔ اس پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سا انفاق فی سبیل اللہ ہے جو بڑھتا ہے اور نفع بخش ہے اور وہ کون سی جود و کرم ہے' جسے اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں دوچند کر دیتا ہے؟ جس کے لئے چاہے۔ یہ انفاق وہ ہے جو انسانی جذبات کو بلند کر دے اور انہیں پاک و صاف کر دے۔ وہ انفاق فی سبیل اللہ وہ ہے جو کسی انسان کی شرافت و عزت نفس نہ کچلے۔ وہ انفاق جسے دلی طہارت اور صفائی کے نتیجے میں روبعمل لایا جائے۔ وہ محض جذبہ رضائے الٰہی کے تحت کیا جائے۔ اور اس کے علاوہ کوئی اور مقصد پیش نظر نہ ہو۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًىۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾

"جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے' نہ دکھ دیتے ہیں' ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ اور ان کے لئے کسی رنج اور خوف کا موقعہ نہیں۔"

احسان جتلانا ایک مکروہ' ناپسندیدہ اور گھٹیا درجے کی حرکت ہے۔ یہ ایک ایسا شعور ہے جو نہایت ہی پست ہے۔ نفس انسانی صرف اس صورت میں احسان جتلاتا ہے جب وہ جھوٹے احساس برتری میں مبتلا ہو اور اسے تعلی کا روگ لگا ہوا ہو۔ یا وہ گیرندہ کو ذلیل کرنا چاہتا ہو' یا وہ دل میں یہ خواہش رکھتا ہو کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں اور اس کے اس فعل انفاق کو پسندیدہ نظروں سے دیکھیں۔ اس صورت میں بھی سطح نظر لوگ ہیں۔ اللہ کی ذات نہیں ہے۔ یہ تمام جذبات ایسے ہیں جو کبھی ایک پاکیزہ دل میں پروان نہیں چڑھ سکتے۔ اور نہ ہی ایسے جذبات ایک سچے مومن کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ پس احسان جتلانا بیک وقت ایک دہندہ کے لئے اور گیرندہ کے لئے موجب اذیت ہے۔ دہندہ کے لیے اذیت یہ ہے کہ اس کے دل میں کبر و غرور پیدا ہوتا ہے۔ اس کے دل میں یہ خیال اور یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ایک بھائی اس کے سامنے ذلیل اور شکستہ حال صورت میں ظاہر ہو۔ اور خود دہندہ کے دل میں نفاق' ریاکاری اور اللہ سے دوری کے جذبات پیدا ہوں اور گیرندہ کے لئے اذیت یوں ہے کہ وہ اپنے آپ کو کمتر اور شکستہ حال تصور کرتا ہے اور پھر اس کے دل میں حقارت اور انتقام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ سے اسلام کی غرض صرف یہ نہیں ہے کہ ایک خلا کو پر کر دیا جائے' کسی کی حاجت پوری ہو اور بھوکا پیٹ بھر جائے۔ صرف یہ غرض ہرگز نہیں ہے۔ اس سے اسلام ایک طرف تو عطا کنندہ کی اخلاقی تطہیر کا بندوبست کرتا

ہے۔ اس کے نفس کو پاک کرتا ہے۔ اس کے اندر انسانی ہمدردی کے جذبات کو ابھارتا ہے۔ اور ایک مسلم بھائی اور بھائی کے درمیان رابطہ پیدا کر کے بحیثیت انسان اور مسلمان صرف رضائے الٰہی کے لئے اسے ایک فقیر کی امداد پر آمادہ کرتا ہے۔ اسلام ایک دہندہ کو یہ یاد دلاتا ہے کہ اس پر اللہ کا فضل ہے اور اس نے اس فضل کے بارے میں اللہ سے ایک عہد بھی کر رکھا ہے اور وہ عہد یہ ہے کہ وہ اس فضل و نعمت سے بغیر اسراف کے بقدر ضرورت کھائے بھی اور اس سے فی سبیل اللہ خرچ بھی کرے۔ یعنی بغیر کسی رکاوٹ اور احسان جتلانے کے۔ دوسری جانب اس سے اللہ تعالیٰ گیرندہ کی دلجوئی اور رضامندی کا سامان بھی کرتے ہیں۔ اور یوں ایک انسان اور ایک انسان اور ایک مومن اور مومن کے درمیان اچھے تعلقات بھی قائم ہو جاتے ہیں۔ اور اسلامی معاشرہ میں یہ خطرہ بھی نہیں رہتا کہ اس کے درمیان تعاون و تکافل نہ ہو۔ یوں ایک اسلامی معاشرہ کی تعمیر میں وحدت' اس کے رجحانات میں یکسوئی' اس کے فرائض و ذمہ داریوں میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن احسان جتلانے سے یہ تمام فائدے ختم ہو جاتے ہیں اور انفاق فی سبیل اللہ زہر اور آگ بن جاتا ہے۔ اگرچہ انسان کے ہاتھ اور اس کی زبان سے کسی گیرندہ کو کوئی اذیت نہ پہنچی ہو لیکن مجرد احسان جتلانا ہی بڑی اذیت ہے۔ یہ بذات خود مجسم اذیت ہے۔ اس سے انفاق بے اثر ہو جاتا ہے۔ معاشرہ کے اندر تفرقہ پیدا ہوتا ہے اور افراد معاشرہ کے درمیان دشمنیاں اور نفرتیں پیدا ہوتی ہیں۔ جدید علوم نفسیات کے ماہرین اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ احسان جتلانے یا احسان کرنے کے نتیجے میں بالآخر محسن اور وہ شخص جس کے ساتھ احسان کیا گیا؟ کے درمیان کسی نہ کسی وقت دشمنی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اس سلسلے میں یہ دلیل دیتے ہیں کہ ایک گیرندہ اپنے دل ہی دل میں احساس کمتری' اور معطی کے سامنے اپنے ضعف کے جذبات اپنے دل میں پیدا کر لیتا ہے۔ اور یہ شعور ہر وقت اس کے دل میں چھتا رہتا ہے۔ اور ایک احسان مند شخص اس شعور پر غلبہ پانے کے لئے ردعمل میں خود احسان کنندہ پر حملہ آور ہو جاتا ہے اور اپنے دل میں اس کی دشمنی کو چھپا لیتا ہے۔ اس لئے کہ احسان کنندہ کی نسبت سے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو کمتر سمجھتا ہے اور خود احسان کنندہ بھی یہ شعور اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے کہ وہ اس شخص کے مقابلے میں برتر ہے۔ اور یوں یہ شعور یعنی ایک جانب احساس برتری اور دوسری جانب احساس کمتری ایک دوسرے کی دشمنی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

بے شک ماہرین نفسیات کا یہ تجربہ بعض اوقات جاہلی اور غیر اسلامی معاشروں کے درمیان بالکل درست نکلتا ہے۔ یہ جاہلی معاشرے ایسے ہوتے ہیں جن میں نہ اسلامی روح ہوتی ہے نہ اس میں اسلامی افکار کی حکمرانی ہوتی ہے۔ لیکن اسلامی نظام زندگی نے اس مسئلے کو بالکل ایک نئے انداز میں حل کیا ہے۔ وہ یوں کہ اسلام تمام لوگوں کے دل و دماغ میں یہ حقیقت بٹھاتا ہے کہ مال و دولت دراصل اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے جو رزق اور دولت اہل ثروت کے ہاتھوں میں ہے وہ اس کے محافظ و امین ہیں۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار جاہل سے جاہل شخص بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ دولت و ثروت کے قریبی اور دور کے تمام اسباب اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔ ان اسباب میں سے کوئی سبب بھی انسان کے دائرہ قدرت میں نہیں ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے۔ گندم کا ایک دانہ لیجئے۔ اس کی پیدائش میں اس کائنات کی کئی قوتیں شریک ہوئی ہیں۔ سورج سے لے کر زمین تک اور پانی سے لے کر ہوا تک۔ ان میں سے کوئی قوت بھی انسان کے دائرہ قدرت میں نہیں ہے۔ گندم کے ایک دانے پر تمام دوسری اشیاء کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ چاہے وہ کپڑے کا ایک ریشہ ہو یا کوئی اور چیز ہو۔ یوں اس تصور کے ساتھ اگر کوئی صاحب ثروت اگر کوئی چیز خرچ کرتا ہے تو گویا وہ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی چیز خرچ کرتا ہے۔ نیز اس تصور کے مطابق اگر کوئی شخص کوئی نیکی کر کے اپنی آخرت کے لئے جمع کرتا ہے تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے اس کا کئی گنا اجر دے گا۔ البتہ یہ نادار شخص اس مالدار شخص کے اخروی اجر کا ایک سبب بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اخذ و عطا کے لئے ایسے آداب مقرر فرمائے ہیں جن کو یہاں ہم بیان کر رہے ہیں۔ یہ آداب انسانی دل و دماغ میں یہ

تصور راسخ کرتے ہیں کہ کوئی دینے والا تعلی نہ کرے اور نہ کوئی لینے والا احساس کمتری کا شکار ہو اور دونوں ان آداب و اصول کا لحاظ رکھیں جو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے لئے وضع فرمائے ہیں۔ اور ان عہدوں کی پوری پوری پابندی کریں جو اللہ تعالیٰ نے ان سے لئے ہیں۔ فرماتے ہیں

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ ............................ "ان کے لئے کسی خوف کا موقعہ نہ ہو گا۔" یعنی ان کے لئے نہ یہ خطرہ ہے کہ ان کے ساتھ دشمنی ہو گی' نہ یہ خطرہ ہے کہ وہ غریب ہو جائیں گے اور نہ یہ خطرہ ہے کہ ان کا کوئی اجر ضائع ہو گا۔

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ............................ "اور نہ ان کے لئے رنج و ملال کا موقع ہو گا۔" یعنی دنیا میں بھی ان کے لئے کوئی رنج نہ ہو گا۔ اور نہ آخرت میں انجام بد سے دوچار ہو کر وہ پریشان ہوں گے۔

بذل و انفاق کی مذکورہ بالا حکمت کی تائید مزید کے لئے اور اس بات کی مزید وضاحت کے لئے انفاق فی سبیل اللہ سے اصل غرض و غایت تہذیب نفس اور اصلاح القلوب ہے۔ اور عطاکنندہ اور گیرندہ کے درمیان محض دینی محبت کا قیام ہے' اگلی آیت میں کہا جاتا ہے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾

"ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے' جس کے پیچھے دکھ ہو۔" اور اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے۔"

یہاں یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ جس صدقہ کے بعد نادار کو اذیت دی جاتی ہو' ایسے صدقے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس سے تو ایک میٹھا بول اور ایک نرم بات ہی بہتر ہے۔ ایک اچھی بات سے دلوں کے زخم جڑ جاتے ہیں۔ اس سے خوشی اور رضا جوئی پیدا ہوتی ہے' جس سے زخم بھر آتے ہیں۔ معافی اور چشم پوشی سے دلوں کی میل دور ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بدلے بھائی چارہ اور دوستی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے حالات میں میٹھا بول اور عفو و درگزر دوستی اور اخوت کے راستے میں خشت اول کا کام دیتے ہیں۔ اس سے نفوس میں پاکیزگی اور دو دلوں میں یگانگت پیدا ہوتی ہے۔

یہ بات کہنے کے بعد کہ صدقہ عطاکنندہ کی طرف سے گیرندہ پر کوئی برتری نہیں اس لئے کہ صدقہ کر کے ایک شخص دراصل اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہے' تو اس کے بعد کہا جاتا ہے وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ............................ "اور اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے۔" وہ عطاکنندہ کی ایسی عطا سے مستغنی ہے جس کے بعد وہ ایک نادار کو اذیت دیتا ہو اور وہ بردبار ہے۔ کیونکہ وہ اپنے بندوں کو سب کچھ دیتا ہے اور پھر بھی وہ اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ انہیں سزا دینے میں عجلت سے کام نہیں لیتے اور نہ ہی شتابی سے انہیں اذیت دیتے ہیں۔ اللہ اپنے بندوں کو سب کچھ دیتا ہے اور سب کچھ دینے سے بھی پہلے انہیں وجود عطا کرتا ہے۔ لہٰذا بندوں کو بھی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے بردباری سیکھیں۔ وہ اگر اللہ کے دیئے میں سے کچھ کسی کو دے بھی دیں تو فوراً ہی اس احسان مند کے درپے آزار نہ ہو جائیں۔ ایسے حالات میں جبکہ انہیں ان کی کوئی بات پسند نہ ہو یا یہ کہ وہ احسان مند شخص ان کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔

قرآن کریم بار بار لوگوں کے سامنے صفات باری کا ذکر کرتا ہے۔ اور مطلوب یہ ہے کہ لوگ حتی الوسع اپنے اندر وہ صفات پیدا کریں۔ اسلامی زندگی کے آداب میں سے یہ ایک اہم طرز عمل ہے کہ ایک مسلم اپنے اندر صفات باری پیدا کرتا رہے اور اس راہ کے

مختلف مراحل مسلسل طے کرتا رہے۔ اور ان صفات میں سے جو حصہ اس کا ہے وہ اسے حاصل کرتا رہے۔ اپنے مزاج اور اپنی طبیعت کی صلاحیتوں کے مطابق۔

جب یہ وجدانی تاثر اپنی انتہاؤں کو چھو لیتا ہے اور جو لوگ اپنے اموال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں' جب ان کے سامنے ترقی پذیر اور مفید زندگی کے طبعی مظاہر پیش کر دیئے جاتے ہیں' اور یہ انفاق ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بعد کوئی احسان مندی' احسان جتلا کر اذیت رسانی نہیں ہوتی اور یہ اشارہ دینے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے انفاق اور ایسے صدقات اور احسانات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جن کے بعد ایذا رسانی ہو اور یہ کہ اللہ تعالیٰ رازق اور داتا ہے۔ وہ اپنا قہر و غضب نازل کرنے میں اور اذیت رسانی میں جلدبازی نہیں کرتا۔ غرض جب یہ وجدانی تاثر اپنی ان انتہاؤں تک جا پہنچتا ہے۔ تو اب روئے سخن ان لوگوں کی طرف پھر جاتا ہے جو اہل ایمان ہیں کہ وہ احسان جتا کر اور احسان کے بعد اذیت دے کر اپنے صدقات اور نیکیوں کو ضائع نہ کریں۔

قرآن یہاں ان کے سامنے ایک عجیب صورت حال کی منظر کشی کرتا ہے۔ یہ دو مناظر ہیں جو بڑے خوبصورت ہیں۔ جو پہلے منظر کے ساتھ ایک جگہ چلتے ہیں۔ پہلا منظر یہ تھا کہ ایک کھیت ہے جو نشوونما پا رہا ہے۔ لیکن ان دو نئے مناظر میں اس انفاق فی سبیل اللہ کا مزاج بتایا جا رہا ہے جو خالص للہ ہو اور اس انفاق کی حقیقت بھی بتائی جاتی ہے جو احسان مندی اور اذیت رسانی کے ساتھ ہو اور یہ مناظر قرآن کریم کے اس اسلوب میں ہیں جو وہ فن کارانہ تصویر کشی کے لئے اختیار کرتا ہے یعنی مفہوم اور معنی کو ایک مشخص شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور اس میں کسی عمل کے اثرات متحرک شکل میں ہوتے ہیں اور یہ منظر کشی ایسے حالات میں ہوتی ہے کہ پورا نظارہ ہمارے تخیل کے سامنے ہوتا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تُبْطِلُوا۟ صَدَقَٰتِكُم بِٱلْمَنِّ وَٱلْأَذَىٰ كَٱلَّذِى يُنفِقُ مَالَهُۥ رِئَآءَ ٱلنَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ ۖ فَمَثَلُهُۥ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُۥ وَابِلٌ فَتَرَكَهُۥ صَلْدًا ۖ لَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا۟ ۗ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿٢٦٤﴾ وَمَثَلُ ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَٰلَهُمُ ٱبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ ٱللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَـَٔاتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٦٥﴾

"اے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو' جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے' نہ آخرت پر۔ اس شخص کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان تھی' جس پر مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی۔ اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر

کے جو نیکی کماتے ہیں' اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا اور کافروں کو سیدھی راہ دکھانا اللہ کا دستور نہیں ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضاجوئی کے لئے دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں۔ ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے' جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو۔ اگر زور کی بارش ہو جائے تو دگنا پھل لائے' اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لئے کافی ہو جائے۔ تم جو کچھ کرتے ہو' سب اللہ کی نظر میں ہے۔"

یہ ہے وہ پہلا منظر یہ ایک مکمل اور دو اجزاء سے مرکب منظر ہے' جو اپنی شکل وضع اور اپنے نتائج کے اعتبار سے ایک دوسرے کے متضاد مناظر ہیں۔ ہر منظر کے پھر مختلف اجزاء ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ متناسق ہیں۔ وہ تعبیر اور مشاہدے کے اعتبار سے بھی باہم متوافق اور ہم رنگ ہیں۔ اور معانی اور جذبات کے اعتبار سے بھی جو معانی اور جو جذبات اس منظر کشی سے پیدا کرنے مطلوب تھے۔ جن کا اظہار اس پوری منظر کشی سے مطلوب تھا یا جو شعور ان مناظر کی وجہ سے پیدا کیا جانا مطلوب تھا۔

پہلے منظر میں ہمیں ایک ایسے دل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو پتھر سے بھی سخت ہے۔ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ............... "اس شخص کی طرح جو اپنے مال کو محض لوگوں کے دکھلاوے کے لئے خرچ کرتا ہے۔ نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ آخرت پر۔" اسے ایمان کی تروتازگی اور مٹھاس کا شعور نہیں ہوتا' لیکن وہ اپنی اس سنگ دلی پر ریاکاری کا پردہ ڈالتا ہے۔ یہ دل جس پر ریاکاری کا پردہ ہوتا ہے' اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان ہو اور اس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی ہو۔ ایک ایسا پتھر جس پر کوئی تروتازگی نہ ہو' جس میں کوئی نرمی نہ ہو۔ اس پر مٹی کی ایک ہلکی سی تہہ ہو اور جس کی سختی اور درشتی کو اس تہہ نے چھپا رکھا ہو۔ بعینہ اسی طرح جس طرح ایک شخص اپنی ریاکاری کی وجہ سے اپنے اس دل کی کیفیت کو چھپالیتا ہے جو ایمان سے خالی ہو۔

فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ............... "اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔" موسلا دھار بارش نے مٹی کی اس خفیف تہہ کو ختم کر دیا۔ چٹان ظاہر ہو گئی اور وہ کیا تھی؟ ایک سخت اور مضبوط اور کرخت چٹان۔ جس پر کوئی روئیدگی ممکن نہ تھی۔ نہ اس سے کسی قسم کی پیداوار حاصل ہو سکتی تھی۔ یہی مثال اس دل کی ہے جو اپنا مال محض ریاکاری کے طور پر خرچ کرتا ہے۔ جس سے کوئی فائدہ نہ ہو گا نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔

اس منظر کے بالمقابل ایک دوسرا منظر ہے' جو اس کے بالکل متضاد ہے۔ ایک دل ہے جو ایمان سے بھرا ہوا ہے۔ وہ ایمان کی تروتازگی سے سرشار ہے۔ وہ اپنے مال کو محض رضائے الٰہی کی خاطر خرچ کرتا ہے۔ اسے پورا پورا یقین ہے کہ وہ جو کچھ خرچ کر رہا ہے اس کا وہ اجر ضرور پائے گا۔ اور یہ خرچ وہ محض اپنے ایمان اور نظریہ کے تقاضے کے طور پر کرتا ہے۔ یہ نظریہ اس کے دل کی گہرائیوں میں رچا بسا ہے۔ ایک طرف یہاں ریاکار دل ہے' اس کو ایک ایسے پتھر کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے جس پر مٹی کا ایک خفیف سا پردہ ہے۔ اور دوسری جانب ایک ایسا دل ہے جو ایمان سے بھرپور ہے اور اسے ایک سرسبز باغ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے' جس کی زمین زرخیز ہے اور مٹی گہری ہے جبکہ پتھر پر مٹی کا ایک خفیف سا پردہ تھا۔ باغ ایک اونچے مقام پر ہے اور مذکور چٹان ایک گہرے گڑھے میں ہے۔ تاکہ یہ دونوں مناظر متناسب اور ہم شکل ہو جائیں۔ اب اگر اس باغ پر موسلا دھار بارش برس جاتی ہے تو اس سے اس کی تروتازگی ختم نہیں ہوتی۔ جس طرح چٹان پر سے مٹی کی خفیف تہہ بہہ نکلتی ہے۔ بلکہ یہ بارش اس باغ کو زیادہ سرسبز اور شاداب کر دیتی ہے۔ اسے نئی زندگی عطا کرتی ہے اور اس کی نشوونما ہوتی ہے۔ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ............... "اور اس پر زور کی بارش ہو جائے تو دگنا پھل لائے۔"

یہ بارش اس باغ کو زندہ اور سرسبز کر دیتی ہے۔ جس طرح صدقہ ایک مومن کے دل کو پاک و صاف کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے ایک مومن کا تعلق باللہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ دل مومن کی طرح ایک مومن کا مال بھی صاف ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس میں برکت ڈالتے ہیں اور اسی طرح انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعہ جماعت مسلمہ کی اجتماعی زندگی میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے اور اس سے اجتماعی روابط بڑھتے ہیں۔ اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لئے کافی ہو جاتی ہے جبکہ مٹی میں پہلے سے نم موجود ہو تو ہلکی بارش بھی کافی ہوتی ہے۔

یہ ہے ایک مکمل نظارہ' جس کے مناظر ایک دوسرے کے بالمقابل صاف نظر آتے ہیں جس کی جزئیات باہم متناسب ہیں اور جسے ایک معجزانہ پیرایہ اظہار میں پیش کیا گیا ہے۔ طرز ادا میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور اس کے مناظر تمام دلی خلجانات اور تمام غلط تصورات کے علاج کے لئے بالکل واضح ہیں۔ یہ منظر انسانی وجدان اور انسانی شعور کے سامنے ایک صاف تصویر پیش کرتا ہے۔ تمام حالات اور تمام محسوسات کو بڑے امتیاز کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ جو انسان کے قلب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور انسان بڑی آسانی سے راہ ہدایت پالیتا ہے۔

اس منظر کا تعلق چونکہ فکر و نظر سے تھا اور اس سے اصل غرض و غایت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی جائے اور اس ظاہری دنیا سے آگے اس کے کرشمہ ہائے قدرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جائے۔ اس لئے اس کے آخر میں یہ نتیجہ نکالا گیا

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ......................... "اور جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ کی نظر میں ہے۔"

رہا دوسرا منظر تو احسان جتلانے اور اذیت دینے کی انتہائی تمثیل ہے۔ اس میں باری تعالیٰ بتاتے ہیں کہ اس قسم کے صدقے اور احسان کو اللہ تعالیٰ کس طرح تباہ و برباد کر دیتے ہیں' جبکہ صاحب صدقہ اور صاحب احسان اس وقت اس صدقے اور احسان کے فائدے کا بہت زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ وہ ضعیف ہو جاتا ہے۔ جسمانی قوتیں ختم ہوتی ہیں لیکن وہ اس بربادی کا کوئی علاج نہیں کر سکتا۔ یہ انجام بد کی ایک انتہائی قسم کی بری منظر کشی ہے۔ اور نہایت ہی موثر اور سبق آموز۔ اس منظر میں امن اور خوشحالی کے بعد مکمل تباہی اور ویرانی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ
اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ
الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۚ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۭ كَذٰلِكَ
۳۶ ع۲ ۴ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٦٦﴾

"کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک ہرا بھرا باغ ہو' نہروں سے سیراب' کھجوروں اور انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا' اور وہ عین اس وقت ایک تیز بگولے کی زد میں آکر جھلس جائے جبکہ وہ خود بوڑھا ہو اور اس کے کم سن بچے ابھی کسی لائق نہ ہوں؟ اس طرح اللہ اپنی باتیں تمہارے سامنے بیان کرتا ہے' شاید کہ تم غور و فکر کرو۔"

یہاں صدقہ کو اپنی حقیقت اور اپنے آثار کے اعتبار سے ایک محسوس شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ ................ "یہ صدقہ گویا ایک باغ ہے جو نہروں سے سیراب ہے۔ کھجوروں اور انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا۔" اس کی چھاؤں گھنی ہے' خوشگوار اور تروتازہ ہے۔ اس میں ہر قسم کے پھل کثرت سے ہیں جس طرح یہ باغ مفید ہے اس طرح صدقہ بھی مفید اور فائدہ بخش اور فرحت بخش تھا۔ یہ صدقہ دینے والے کے لئے بھی مفید تھا۔ لینے والے کے لئے بھی مفید تھا اور پورے معاشرے کے لئے بھی مفید تھا۔ جس کے روحانی فائدے بے شمار تھے اور اس میں خیر و برکت تھی جس کے ذریعہ معاشرے کو مفید غذا مل رہی تھی اور جو معاشرے میں اجتماعی نشوونما اور ترقی کا باعث تھا۔

کوئی بدبخت ایسا ہے جو اس قسم کے باغ کا مالک ہو اور جو اس قسم کے اعلیٰ بھائی چارے اور نیکی کا مالک ہو اور پھر وہ ایسے باغ کو احسان جتلانے یا احسان کے بعد اذیت دینے کی آفات و بلیات کے ذریعہ جلاکر خاکستر کر دے' جس طرح ایک آتشی بھگولا کسی سرسبز و شاداب باغ کو جھلسا کر خاکستر کر دیتا ہے۔

اور پھر یہ عمل کیسے حالات میں ہو؟ ایسے حالات میں کہ اس باغ کا مالک صاحب احتیاج ہو۔ جسمانی لحاظ سے ضعیف ہو گیا ہو' عیالدار ہو اور اسے اس باغ کی چھاؤں اور نعمتوں کی اشد ضرورت بھی ہو۔ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَ لَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ ................................ "وہ خود بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے بھی کسی لائق نہ ہوں اور ایسے میں ایک تیز بگولے کی زد میں آجائے جس میں آگ ہو۔" کون ہے جو ایسی صورت حال کو پسند کرے گا؟ کون ہے جو اگر ایسے انجام کو سمجھ سکتا ہو اور اس سے بچنے کی سعی نہ کرے؟

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ............................ "اس طرح اللہ اپنی باتیں تمہارے سامنے بیان کرتا ہے' شاید کہ تم غور و فکر کرو۔"

یوں یہ زندہ و تابندہ منظر سٹیج ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا نہایت خوشی' خوشگواری اور آرام سے ہوتی ہے۔ منظر کا آغاز تروتازگی' فرح و سرور اور حسن و جمال سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد تباہی کا منظر آتا ہے اور یہ ایک خوفناک منظر ہوتا ہے۔ ایک بگولا آتا ہے جو اس تروتازگی کو پژمردہ کر دیتا ہے۔ جب یہ سب مناظر اسٹیج پر آتے ہیں تو انسان کو ایک لاشعوری احساس دلاتے ہیں اور یہ شعور اس قدر پرتاثیر ہوتا ہے کہ ایک باشعور آدمی کو ایک صحیح راہ اختیار کرنے میں کوئی تردد نہیں رہتا۔ اس سے پہلے کہ انسان کے ہاتھ سے موقعہ جاتا رہے اور اس سے پہلے کہ گھنی چھاؤں والے باغات اور پھلوں سے لدے ہوئے درخت پژمردہ ہو جائیں اور جھلس جائیں۔ ایک باشعور انسان ردو قبول کا فیصلہ کر ہی لیتا ہے۔

میں یہاں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ حسین و جمیل انداز کلام اور مربوط اور ہم آہنگ مناظر جن سے اس سبق کا ہر انفرادی منظر تشکیل پاتا ہے اور پھر جس خوش اسلوبی سے ہر ایک انفرادی منظر کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ربط و ہم آہنگی صرف ان انفرادی مناظر تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ ہم آہنگی مجموعی طور پر ان تمام مناظر میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ تمام مناظر بھی باہم مربوط اور متناسب ہیں۔ دیکھئے! ایک زرعی ماحول ہے۔ ایک دانہ ہے جس سے سات بالیں اگتی ہیں۔ ایک چٹان ہے جس پر مٹی کی ایک خفیف تہہ جمی ہوئی ہے۔ اور اس پر اچانک موسلادھار بارش ہو جاتی ہے۔ پھر ایک اونچی جگہ پر ایک باغ ہے جو ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا ہے۔ اور وہ چند پھل لگا ہوا ہے۔ یہ باغ

کھجوروں اور انگوروں پر مشتمل ہے۔ کہیں زوردار بارش ہورہی اور کہیں پھوار ہے۔ اور پھر ایک بگولا ہے جو اکثر زرعی کھیتوں میں تباہی مچاتا ہے۔ غرض ایک زرعی ماحول کے تمام قدرتی اجزاء یہاں موجود ہیں اور کوئی ایسا جزغائب نہیں ہے جو موثر ہو سکتا ہو۔

قرآن کریم کے بلیغانہ انداز گفتگو کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے کہ وہ انسانی اوراک اور اس زمین کے قدرتی ماحول کے درمیان فاصلے کم کر دیتا ہے کیونکہ انسان کا وجود اسی کائنات کے عناصر ترکیبی سے مرکب ہے۔ انسان اور کائنات میں نباتات کی نشوونما کے درمیان ایک مکمل ہم آہنگی ہے۔ جس طرح ایک بگولا اس کائنات کی تروتازگی کو جھلس دیتا ہے' اسی طرح گمراہی انسان کی روحانی دنیا کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔ یہ ہے قرآن کریم۔ ایک خوبصورت انداز گفتگو جو یقیناً علیم و خبیر کی جانب سے ہے۔

○○○

انفاق فی سبیل اللہ کے آداب اور نتائج کے بیان کے بعد اب یہاں سے سیاق کلام' انفاق فی سبیل اللہ کے دستور کو لے کر اب مزید آگے بڑھتا ہے۔ انفاق کی حقیقت' انفاق کا طریقہ کار اور لوازمات کو بیان کیا جاتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو ہم نے زمین سے تمہارے لئے نکالا ہے' اس میں سے بہتر حصہ راہ خدا میں خرچ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لئے بری سے بری چیز چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو' حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمہیں دے' تو تم ہرگز اسے لینا گوارا نہ کرو گے۔ الا یہ کہ اس کو قبول کرنے میں تم اغماض برت جاؤ۔ تمہیں جان لینا چاہئے کہ اللہ بے نیاز ہے اور بہترین صفات سے متصف ہے۔"

اس آیت سے پہلی آیات میں انفاق فی سبیل اللہ کے لئے جو قواعد اور اساسات متعین کئے تھے اور جن پر اس کی عمارت اٹھانے کا حکم دیا تھا' ان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں بہترین مال خرچ کیا جائے۔ اللہ کی راہ میں ردی اور گھٹیا اشیاء خرچ کرنے کا ارادہ ہی نہ کیا جائے جن میں خود مالک کی کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ ایسی اشیاء اگر خود ایسے شخص کو کسی سودے یا بیوپار میں دی جائیں تو وہ ان کے عوض حقیر قیمت دینے کے لئے بمشکل تیار ہو۔ اللہ غنی بادشاہ ہے۔ اسے ضرورت نہیں ہے کہ ایسی ردی اشیاء قبول کرے۔

اللہ کی یہ پکار تمام مسلمانوں کے لئے ہے۔ وہ جب بھی ہوئے ہوں اور جہاں کہیں بھی ہوں اور یہ حکم تمام اموال کے لئے ہے جو ان کے ہاتھ آجائیں۔ وہ تمام اموال جو انہوں نے حلال اور پاکیزہ طریقے سے کمائے ہوں یا وہ اموال ہوں جو ان کے لئے زمین سے پیدا کئے گئے ہوں۔ زرعی اجناس ہوں یا معدنیات ہوں مثلاً پٹرول وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ آیت میں عمومی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ یعنی وہ اموال جو حضور ﷺ کے وقت موجود تھے یا وہ جو بعد میں پیدا ہوئے۔ اس لئے آیت کے الفاظ عام ہیں۔ ان کا اطلاق ان اموال پر بھی ہوتا ہے جو بعد میں پیدا ہوں۔ ان تمام پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ ہاں نصاب زکوٰۃ کا تعین سنت نبوی ﷺ نے کر دیا ہے۔ لہٰذا ہر قسم کی پیداوار کو ان

اموال پر قیاس کر لیا جائے۔ جو حضور ﷺ کے وقت موجود تھے۔ ہر نئی پیداوار کو ان اجناس پر قیاس کر لیا جائے گا جو حضور ﷺ کے وقت موجود تھیں' اپنی اپنی نوعیت کے مطابق۔

بعض روایات میں' اس آیت کا شان نزول بھی بیان ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہاں ان کا تذکرہ غیر موزوں نہ ہو گا۔ کیونکہ ان روایات کے ذریعہ وہ حالات دوبارہ سامنے آجاتے ہیں' جن میں ان آیات کا نزول ہوا۔ ان روایات سے وہ پست معاشرتی صورت حال بھی مستحضر ہو جاتی جس کی اصلاح قرآن کے پیش نظر تھی اور جس کے معیار کی بلندی کے لئے قرآن کریم جدوجہد کر رہا تھا۔

ابن جریر نے حضرت براء ابن عازب ؓ سے روایت کی ہے' فرماتے ہیں "یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی' جب کھجوریں توڑنے کا وقت قریب آتا تو وہ اپنے باغوں میں سے کھجوروں کے ایسے خوشے توڑ لاتے جن کے رنگ پیلے ہو جاتے تھے' لیکن ابھی پکے نہ ہوتے تھے اور وہ انہیں مسجد نبوی کے دو ستونوں کے درمیان لٹکا دیتے تھے' تو فقراء مہاجرین ان سے کھاتے تھے۔ بعض لوگ ردی قسم کی کھجوریں بھی لاکر ان میں لٹکا دیتے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ جائز ہے۔ جو لوگ یہ کام کرتے تھے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ ......... "اور خبیث کا ارادہ نہ کرو کہ اس میں سے تم خرچ کرو۔" اس حدیث کو براء سے حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔ اور یہ کہا کہ یہ حدیث اگرچہ بخاری اور مسلم کی شرائط صحت کے مطابق ہے۔ لیکن بخاری مسلم نے اسے روایت نہیں کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے اپنی سند کے ساتھ ایک دوسری سند کے ساتھ حضرت براء ؓ سے روایت کی ہے۔ کہتے ہیں یہ ہمارے متعلق نازل ہوئی ہے۔ ہم کھجوروں کے مالک تھے تو ہر شخص تھوڑی بہت کھجوریں لایا کرتا تھا' بعض لوگ ناپختہ لاتے تھے اور مسجد میں لٹکاتے تھے۔ اہل صفہ کے طعام و قیام کا بندوبست کوئی نہ تھا۔ ان میں سے جو بھی بھوکا ہو جاتا' وہ آتا اور اپنی لاٹھی ان لٹکی ہوئی کھجوروں پر مارتا اور نیم پختہ اور پوری پختہ کھجوروں میں سے جو کچھ گرتا' وہ کھا لیتا۔

لوگوں میں سے بعض ایسے بھی تھے جو مائل بخیر نہ تھے' وہ ناپختہ اور ردی قسم کی کھجوریں لے آتے۔ وہ خصوصاً ایسا خوشہ لاتے جو ٹوٹ چکا ہوتا تھا اور جس کے دانے ناپختہ ہوتے تھے' اسے لٹکا دیتے تو یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ ........ "ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لئے بری سے بری چیز چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو' حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمہیں دے تو تم ہرگز اسے لینا گوارا نہ کرو گے۔ الایہ کہ اسے قبول کرنے میں تم اغماض برت جاؤ۔" فرمایا: کہ اگر تم میں سے کسی کو ایسی ہر چیز ہدیہ دے جو وہ خود دے رہا ہے' تو وہ اسے ہرگز نہ لے۔ الایہ کہ اغماض برتے یا حیا چشی سے کام لے۔ چنانچہ اس کے بعد ہم سے ہر شخص کے پاس جو کچھ ہوتا' اس میں سے اچھی چیز لاتا۔

دونوں روایات قریب المفہوم ہیں۔ دونوں مدینہ طیبہ میں فی الواقع موجود صورت حال کا نقشہ کھینچ رہی ہیں۔ یہ دونوں احادیث تاریخ کے ایک ورق کے بالمقابل ایک دوسرا ورق دکھاتی ہیں' جس کے اوپر انصار مدینہ فیاضانہ داد و دہش کے انمٹ نشان چھوڑتے ہیں۔ نیز یہ احادیث بتاتی ہیں کہ ایک ہی جماعت کے اندر بعض افراد نہایت ہی عجیب اور بلند مقام کے حامل ہوتے ہیں اور بعض دوسرے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تربیت اور تہذیب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ انہیں درجہ بلند کے راستے پر ڈالا جائے' جس طرح بعض انصار کے معاملے میں یہ ضرورت پیش آئی' انہیں اللہ کے راستے میں ردی اموال کو خرچ کرنے سے منع کیا جائے۔ ایسے اموال کہ خود اگر انہیں پیش کئے جائیں تو وہ انہیں قبول نہ کریں۔ الایہ کہ رد کرنے میں حیا مانع ہو اور اگر کوئی لین دین ہو تو اس میں وہ اغماض برت جائیں۔ یعنی قیمت میں کمی کرنے کے معاملے میں۔ حالانکہ وہ جس ذات باری کے سامنے ہدیہ پیش کر رہے ہیں وہ باری تعالیٰ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آیت کا خاتمہ اس فقرے پر ہوتا ہے۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ..................
"تمہیں جان لینا چاہئے کہ اللہ بے نیاز ہے اور بہترین اوصاف سے متصف ہے۔" یعنی وہ اس بات سے مطلقاً بے نیاز ہے کہ اس کی راہ میں کوئی دیتا ہے یا نہیں دیتا۔ اگر کوئی اس کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو خود اپنے مفاد کے لئے کرتا ہے۔ تو بس اس کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ بہترین چیز خرچ کرے اور بطیب خاطر کرے نیز وہ حمید ہے۔ وہ پاکیزہ چیزیں قبول کرتا ہے اور ان کی تعریف کرتا ہے۔ ان پر جزا دیتا اور اچھی جزا۔ غرض اس مقام پر یہ ان دونوں صفات کے ذکر سے انسانی دل اس طرح دہل جاتے ہیں' جس طرح ان انصار کے دل دہل گئے تھے جن کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' جو مال تم نے کمائے ہیں' ان میں سے بہترین حصہ راہ خدا میں خرچ کرو۔" ورنہ اللہ کو اس ردی چیز کی ضرورت نہیں جس کو تم چھانٹ چھانٹ کر بطور صدقہ خرچ کرتے ہو' حالانکہ اللہ وہ ذات ہے جو تمہاری تعریف اس صورت میں کرتا ہے کہ تم اس کی راہ میں پاکیزہ چیز خرچ کرو اور اس رضامندی کی وجہ سے وہ پھر تمہیں اچھی جزا بھی دیتا ہے۔ درآں حالیکہ کہ یہ مال اسی نے تمہیں دیا۔ اصل داتا تو وہی ہے وہ تو بطور اعزاز تمہیں اس فیاضی پر جزا دیتا ہے' اس لئے کہ تم جو کچھ دیتے ہو وہ اسی نے تو تمہیں عطا کیا ہے۔ کس قدر شاندار تفہیم ہے یہ! کیا عجب انداز ترغیب ہے! یہ ایک عجیب اسلوب تربیت ہے جو قرآن کریم نے اختیار کیا ہے۔

حقیقت یہ تھی اور ہے کہ اللہ کی راہ میں انفاق نہ کرنا' یا ردی اور بیکار چیز بارگاہ الٰہی میں پیش کرنا' اپنے اندر بعض برے تصورات لئے ہوتے ہیں۔ ایسے شخص کو دراصل ان اعمال پر اللہ تعالیٰ کے ہاں جو اجر مقرر ہے اس پر پورا یقین نہیں ہوتا یا ایسے شخص کو تنگ دستی کا خوف لاحق ہوتا ہے' جو کبھی بھی ان لوگوں کو لاحق نہیں ہوتا جن کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے' جن کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا بھروسہ ہوتا ہے۔ انہیں اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ ہر چیز کا انجام آخر کار اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر پختہ ایمان کے مقابلے میں ان تصورات کی حقیقت کھول کر رکھ دی' یہ بات عیاں کر دی اور اچھی طرح سمجھا دیا کہ نفس انسانی کے اندر یہ تصورات کہاں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور انسانی دلوں میں ان کو بار بار جگانے والی وہ قوت کون سی ہے؟ چنانچہ بتایا جاتا ہے کہ وہ قوت شیطانی قوت ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾ ۖ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾

"شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرز عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے' مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔ جس کو چاہتا ہے' حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت ملی' اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔ ان باتوں سے صرف وہی لوگ سبق لیتے ہیں جو دانشمند ہیں۔"

شیطان تمہیں فقر اور تنگدستی کا خوف دلاتا ہے۔ اس وجہ سے تمہارے نفوس کے اندر حرص' بخل پیدا کرتا ہے۔ شیطان تمہیں فاشی کا حکم دیتا ہے۔ عربی زبان میں فاشی ہر اس معصیت کو کہتے ہیں' جس میں انسان حد سے تجاوز کر جائے۔ اگرچہ زیادہ تر اس کا استعمال

ایک خاص معصیت میں ہوتا ہے۔تاہم یہ لفظ عام ہے۔ تنگدستی کا یہ خوف ہی تھا جس کی وجہ سے ایام جاہلیت میں اقوام عرب اپنی بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے جو ایک قسم کی فحاشی تھی۔ اسی طرح زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کا جذبہ انہیں سود خوری پر آمادہ کرتا تھا۔ جو ایک قسم کی فحاشی تھا۔ نیز یہ خوف کہ انفاق فی سبیل اللہ سے وہ تنگدست ہو جائیں گے بجائے خود فحاشی ہے۔

ایک طرف شیطان تمہیں تنگدستی سے ڈراتا ہے اور فحشاء پر آمادہ کرتا ہے' جبکہ دوسری جانب اللہ تعالیٰ تمہیں مغفرت کا یقین دلاتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ پر وہ تمہیں اجر عطا کرے گا۔ وَ اللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ ............ "ولیکن اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔"

یہاں لفظ مغفرت کو پہلے لایا گیا ہے' اس لئے کہ فضل و کرم مغفرت کے بعد ہوتا ہے۔ اور اس فضل و کرم میں اس سرزمین پر وسائل رزق بھی شامل ہیں یعنی بطور جزائے انفاق فی سبیل اللہ اس دنیا میں بھی رزق فراواں عطا ہو گا۔ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ ... "اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔"

وہ اپنی وسعت اور فراخ دستی سے عطا کرتا ہے' وہ تمام دلی خلجانات کو بخوبی جانتا ہے۔ وہ انسانی ضمیر کے تمام میلانات اور رجحانات سے بھی واقف ہے' اس لئے وہ فقط مال ہی عطا نہیں کرتا' فقط مغفرت ہی نہیں کرتا بلکہ وہ حکمت و دانشمندی بھی عطا کرتا ہے۔ اور دانشمندی اور حکمت سے انسان میں توازن اور اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ انسان اسباب اور مقاصد کے ادراک سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں انسان ہر چیز کو اس کی ماہیت کے مطابق مقام عطا کرتا ہے۔ اور وہ تمام فیصلے فہم و فراست کے ساتھ سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔

يُّؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ
............ "جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت ملی' اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔"

اسے میانہ روی دی گئی اور اعتدال نصیب ہوا' اس لئے وہ انتہاپسندی اور حد سے تجاوز سے محفوظ ہو گیا۔ اسے تمام چیزوں کے اسباب اور نتائج سمجھائے گئے۔ اس لئے وہ اشیاء کی قدر و قیمت کے تعین میں غلطی نہیں کرتا' اسے روشن بصیرت دی گئی' اس لئے وہ حرکات و سکنات اور اعمال و افعال میں سے صالح اور صائب کا انتخاب کرتا ہے اور یہ ایک ایسی دولت ہے جو مختلف رنگوں میں ظاہر ہوتی ہے۔

وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ............ "ان باتوں سے صرف وہی لوگ سبق لیتے ہیں جو دانشمند ہیں۔" غرض وہی لوگ سبق لیتے ہیں جو صاحب بصیرت ہیں اور عقلمند ہیں۔ ایسے لوگ سبق کو یاد بھی کرتے ہیں' بھول نہیں جاتے۔ ایک دفعہ اگر متنبہ ہو جائیں تو پھر غفلت نہیں کرتے۔ اگر کسی واقعہ سے عبرت پکڑیں تو پھر گمراہی کے راستے پر نہیں پڑتے۔ یہ سب کام عقل کے فرائض میں شمار ہوتے ہیں۔ عقل کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ راہ ہدایت اور اس کے نشانات کو پالے۔ وہ معقول روش اختیار کرے اور لہو و لعب کی بے مقصد زندگی نہ گزارے۔

یہ حکمت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے پسند کرتا ہے' اسے عطا کر دیتا ہے۔ یہ حکمت و دانائی اللہ کی مشیئت پر موقوف ہے۔ اسلامی تصور حیات کا یہ اصل الاصول ہے۔ یہاں ہر چیز کا مرجع اللہ جل شانہ کی بااختیار مشیئت ہے۔ ہاں اس کے ساتھ ساتھ قرآن کریم نے ایک دوسرا اصول بھی بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ جو شخص بھی راہ ہدایت کی تلاش کا ارادہ کرے اور اس کے لئے پوری جدوجہد کرے تو اللہ تعالیٰ کبھی بھی اسے راہ ہدایت پانے سے محروم نہیں کرتا بلکہ وہ اس سلسلے میں اس متلاشی کی پوری پوری اعانت کرتا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ............

"جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے' اور یقیناً اللہ نیکو کاروں ہی کے ساتھ ہے۔" (۶۹:۲۹) اس لئے ہر وہ شخص جو راہ ہدایت اختیار کرنا چاہتا ہے' پوری طرح مطمئن رہے کہ مشیئت ایزدی اس کا حصہ ضرور کرے گی اور اسے راہ ہدایت کے ساتھ ساتھ حکمت و دانشمندی بھی عطا ہوگی اور اسے اس کے ساتھ ساتھ خیر کثیر بھی عطا ہوگی۔

ذرا رکئے! اس سے قبل کہ ہم اس آیت پر غور و خوض ختم کر دیں۔ ایک دوسری اور اہم حقیقت کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ ذرا غور کیجئے "شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے۔ اور شرمناک طرز عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت ملی' اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔"

انسان کے سامنے صرف دو راستے ہیں' کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔ ایک اللہ کا راستہ ہے اور ایک شیطان کا راستہ ہے۔ وہ یا تو اللہ کے وعدہ کی طرف کان لگائے گا اور یا شیطان کی پکار پر لبیک کہے گا۔ اور یاد رکھو کہ جو شخص اللہ کی راہ پر گامزن نہیں اور اللہ کی پکار نہیں سن رہا ہے' وہ شیطان کی راہ پر گامزن ہے اور اس کے ورغلانے میں آگیا ہے۔ صرف ایک ہی طریق زندگی ہے' یعنی حق کا راستہ۔ وہ منہج' وہ نظام جسے اللہ تعالیٰ نے وضع کیا۔ اس کے علاوہ جو بھی راستہ ہے وہ شیطان کا راستہ ہے اور اس کی انتہا شیطان تک ہے۔ وہ شیطان تک پہنچاتا ہے۔

قرآن کریم اس حقیقت کو بار بار بیان کرتا ہے۔ بار بار اس کی تاکید کرتا ہے۔ اس لئے کہ جو شخص اسلامی طریقۂ حیات کو ترک کر کے شیطانی نظام زندگی اختیار کرنا چاہتا ہے' اس کے لئے کوئی ایسا دعویٰ کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہے کہ وہ کسی طرح بھی راہ ہدایت پر ہے۔ اس میں اب نہ کوئی شبہ کی گنجائش ہے اور نہ اس میں کوئی پوشیدگی ہے۔ ایک جانب اللہ ہے اور دوسری طرف شیطان ہے۔ ایک طرف خدائی طریق حیات ہے اور دوسری جانب شیطانی طریقۂ کار ہے۔ ایک طرف اللہ کی راہ ہے دوسری جانب شیطان کی راہ ہے۔ جو چاہے جس راستے کو اختیار کرے۔ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنۢ بَيِّنَةٍ ..................

"اور جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ زندہ رہے۔" (۸ : ۴۲) کوئی بات پوشیدہ نہ ہو۔ کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ یا گمراہی ہے اور یا راہ مستقیم ہے۔ یہ راہ راست ہی حق اور سچائی ہے اور یہی واحد راہ ہے۔ اس راہ کے علاوہ جس قدر راہیں ہیں وہ سب باطل ہیں اور ضلالت کی راہیں ہیں۔

اس اہم نکتے کے بعد ہم اصل بات کی طرف آتے ہیں۔ یعنی صدقہ اور انفاق فی سبیل اللہ۔ جو شخص بھی اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی خرچ کرے اللہ کو اس کا پوری طرح علم ہے۔ وہ صدقہ ہو یا نذر ہو۔ وہ خفیہ ہو یا علانیہ ہو' وہ اللہ کے علم میں ہوتی ہے اور علم الٰہی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ اس فعل پر بھی اجر دیتا ہے اور اس فعل کے پس منظر میں جو نیت اور ارادہ پنہاں ہوتا ہے' اس پر بھی اجر ملتا ہے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝٢٧٠ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاۗءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝٢٧١

"تم نے جو کچھ بھی خرچ کیا ہو اور جو نذر بھی مانی ہو' اللہ کو اس کا علم ہے' اور ظالموں کا کوئی مدد گار نہیں۔ اگر اپنے صدقات اعلانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے' لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔ تمہاری بہت سی برائیاں اس طرز عمل سے محو ہو جاتی ہیں۔ اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ کو بہرحال اس کی خبر ہے۔"

انسان اپنی دولت میں سے جو کچھ بھی خرچ کرتا ہے' اس پر صدقہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ زکوۃ' خیرات و صدقات اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے دیا جانے والا مال سب صدقات کے ضمن میں آتے ہیں۔ نذر بھی انفاق فی سبیل اللہ کی ایک قسم ہے۔ صرف فرق یہ ہوتا ہے کہ انفاق کرنے والا ایک معلوم چیز کو اپنے اوپر لازم کر دیتا ہے۔ اللہ کے سوا کسی کے لئے' کسی کی راہ میں' کسی کی وجہ سے' کسی قسم کی نذر دینا منع ہے۔ اللہ کے سوا' اس کے بندوں میں سے کسی کی نذر ماننا ایک گونہ شرک ہے۔ جس طرح مشرکین اپنے الٰہوں اور بتوں کے استھانوں پر مختلف جانور ذبح کرتے تھے اور یہ کام جاہلیت کے مختلف ادوار میں ہوتا رہا ہے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ..................... "تم نے جو کچھ بھی خرچ کیا ہو اور جو نذر بھی مانی ہو' اللہ کو اس کا علم ہے۔" مومن کا یہ عقیدہ کہ ذات باری کو اس کی نیت کا پورا علم ہے' وہ اس کے ضمیر کی پوشیدہ خواہشات سے بھی خبردار ہے اور اس کی تمام خفیہ حرکات بھی اس کی نظر میں ہیں' اس کے شعور میں مختلف قسم کے زندہ احساسات پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ اس بات سے پرہیز کرتا ہے کہ اس کی سوچ اور اس کے عمل میں کسی قسم کی ریاکاری یا دکھاوا پایا جائے۔ وہ بخیلی اور کنجوسی سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اس کے دل میں کمی وسائل اور فقر مسکنت کا خوف پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا یہ شعور پختہ ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کے ہاں پوری پوری جزا پالے گا۔ وہ راضی برضا ہو کر اطمینان اور راحت کی زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ وہ اللہ کے دربار میں اس کے انعامات کا شکر ادا کرتے ہوئے حاضر ہوتا ہے۔

لیکن اس کے برعکس جو شخص حق نعمت ادا نہیں کرتا' وہ اللہ اور اپنے بندوں کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ وہ اللہ کے دیئے سے خیرات و صدقات نہیں ادا کرتا' تو وہ شخص ظلم کا ارتکاب کرتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے ساتھ ظلم کرتا ہے' عوام الناس پر ظلم کرتا ہے' خود اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے' وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ..................... "اور ظالموں کا کوئی مدد گار نہیں۔"

پس داد و دہش انصاف اور عدل ہے اور عدم انفاق ظلم اور بربریت ہے۔ اور اس باب میں لوگوں کی صرف دو قسمیں ہیں جو اللہ کے عہد پر قائم رہتے ہوئے' اللہ کے دیئے ہوئے انعامات کا شکر ادا کرتے ہوئے' ان میں خرچ کرتا ہے' دوسرا وہ ظالم ہے جو اللہ کے عہد کو توڑتا ہے اور لوگوں کے حقوق ادا نہ کر کے ناشکری کرتا ہے اور ظالم ہے وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ..................... "اور ظالموں کا کوئی مدد گار نہیں ہے۔"

صدقہ اگر نفلی ہو تو اس صورت میں اللہ کے ہاں پسندیدہ یہ ہے کہ وہ خفیہ ہو' اور اس لائق ہے کہ اس میں ریاکاری اور دکھلاوے کا شائبہ تک نہ ہو۔ لیکن اگر صدقہ' صدقات واجبہ اور فرائض میں سے ہو' تو اس میں اطاعت اور حکم کی بجا آوری کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ اور اس پہلو کا اظہار اور اشاعت زیادہ مطلوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ..................... "اگر اپنے صدقات اعلانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔" اس میں ان دونوں حالتوں کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ اس لئے ہر صورت کو اس وقت کے موجودہ حالات کی نسبت سے اختیار کیا جاتا ہے اور ہر بات عملاً موجودہ حالات کے مطابق اچھی یا بری شمار ہوتی ہے۔ بہرحال اہل ایمان انفاق فی سبیل اللہ کے لئے جو صورت بھی اختیار کریں' اس

پر ان کے ساتھ وعدہ کیا جاتا ہے کہ یہ ان گناہوں کا کفارہ ہو گا۔ يُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ............................

"تمہاری بہت سی برائیاں محو کر دے گا۔" ایک طرف اہل ایمان کے دل خدا خوفی اور برائی کے مقابلے میں پر جوش اور ہوشمند ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف وہ راحت 'اطمینان کا صلہ پاتے ہیں۔ اور نیت اور اعمال کے ہر مرحلے اور ہر حال میں وہ تعلق باللہ قائم رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ............................ "اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ کو بہرحال اس کی خبر ہے۔"

یہاں مناسب ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کی ان طویل ہدایات پر قدرے غور کریں۔ ان ہدایات میں مختلف انداز میں ترغیب و ترہیب سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس غور و فکر سے ہمیں دو باتیں حاصل ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ اسلامی نظام میں انسان کے مزاج اور اس کی طبیعت کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ انسانی مزاج میں بخل اور کنجوس داخل ہے۔ انسان مال سے بے حد محبت کرتا ہے۔ اور اس بات کی ضرورت ہے کہ بار بار اسے انفاق فی سبیل اللہ پر آمادہ کیا جائے۔ اس کے سرانجام دینے کے لئے اسے بار بار جوش دلاتے رہنا چاہئے تاکہ وہ اس بخل اور لالچ سے ذرا بلند ہو کر سوچے اور بخل و کنجوسی کے بندھنوں سے رہائی پائے۔ اور اس رتبہ بلند پر فائز ہو جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے پسند کیا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ عربی معاشرہ میں جود و کرم ایک عام صفت تھی لیکن وہ لوگ جود و کرم محض اس لئے کرتے تھے کہ انہیں شہرت عام نصیب ہو' ان کی فیاضی کا ڈھنڈورہ پٹ جائے۔ شہروں اور بازاروں میں ان کا تذکرہ ہو۔ اسلام کے لئے یہ آسان نہ تھا کہ وہ ابتدائے کار ہی میں لوگوں سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ ان امور میں سے کسی کا انتظار کئے بغیر ہی اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔ اور ان امور میں سے کسی کا کوئی لحاظ نہ رکھیں۔ صرف اللہ کی ذات پیش نظر ہو اور عوام الناس کو خاطر ہی میں نہ لائیں۔ یہ مقام تو ایک طویل تعلیم و تربیت ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وہ بھی ایک طویل جدوجہد کے بعد۔ یہ تو تب حاصل ہو گا کہ لوگوں کو یہ بلند مقام حاصل کرنے کے لئے مسلسل پکارا جائے اور ان کو تزکیہ اور اخلاص کی تربیت دی جائے۔ چنانچہ تحریک اسلامی نے مسلسل یہ کام جاری رکھا۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں اب اہل ایمان سے روئے سخن پھیر کر' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ اور روئے سخن اس لئے پھیر دیا جاتا ہے کہ وہ تمام حقائق یہاں ذہن نشین کر دیئے جائیں جن کا اسلامی تصور حیات کی نشوونما میں بہت زیادہ دخل ہے۔ اور اسلامی نظام زندگی کے حوالے سے' اسلامی طرز عمل اختیار کرنے اور انسانی طرز عمل کو درست کرنے میں وہ بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

☆ ☆ ☆

"لوگوں کو ہدایت دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ ہدایت تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے بخشتا ہے۔ اور خیرات میں جو مال تم خرچ کرتے ہو' وہ تمہارے اپنے لئے بھلائی ہے۔ آخر تم اسی لئے خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔ تو جو کچھ مال تم خیرات میں خرچ کرو گے' اس کا پورا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی ہرگز نہ ہو گی۔"

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس ﷺ کے ذریعہ حضور ﷺ سے یہ روایت کی ہے کہ حضور ﷺ یہ حکم فرماتے تھے کہ صرف اہل

اسلام پر صدقہ کیا جائے۔ یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی "لوگوں کو ہدایت دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے....." تو آپ نے حکم دیا کہ جس دین کے پیروکار بھی تم سے سوال کریں انہیں صدقہ دیا کرو۔

دل اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اللہ کی مخلوق میں سے یہ بات کسی کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ کسی کو ہدایت دے یا گمراہ کر دے۔ اگرچہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود ہوں۔ ہدایت دینا یا گمراہ کرنا اللہ وحدہ کی ذات کا کام ہے۔ اس لئے کہ وہ دلوں کا خالق ہے۔ دلوں پر صرف اللہ کی حکمرانی ہے۔ صرف اللہ ہی دلوں کو موڑ سکتا ہے۔ وہی ہے جو دلوں کو حکم دے سکتا ہے۔ رسول کا کام صرف یہ ہے کہ وہ پیغام اچھی طرح پہنچا دے۔ رہی ہدایت تو یہ صرف اللہ کا کام ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت نصیب کر دے کیونکہ وہی ہدایت دینے کا مستحق ہے۔ ہدیت دینا صرف اللہ کا استحقاق ہے۔ انسان سے اس استحقاق کو لے لینا محض اس لئے ہے کہ ایک مومن طلب ہدایت کے لئے صرف اللہ کی طرف رجوع کرے اور وہ صرف اللہ ہی سے دلائل ہدایت اخذ کرے۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس استحقاق کو صرف خاصہ خدا اقرار دینے کے بعد اب ایک داعی کے لئے یہ جواز باقی ہی نہیں رہتا کہ وہ گمراہ لوگوں کے ساتھ نفرت کرے یا ان کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے دل تنگی محسوس کرے۔ اس لئے کہ وہ انہیں مسلسل دعوت دیتا رہے گا۔ ان کے ساتھ رحیمانہ برتاؤ کرے گا اور اس بات کا انتظار کرے گا کہ کب اللہ میاں ان کے دلوں کو اجازت دیتا ہے کہ وہ راہ راست پر آجائیں؟ کب انہیں توفیق بخشتا ہے کہ وہ اس سمت قدم اٹھائیں اور اپنے اللہ کو پہچانیں۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ............................ "لوگوں کو ہدایت دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ ہدایت تو اللہ ہی ہے جسے چاہتا ہے بخشتا ہے۔" لہٰذا تم انہیں کھلے دل کے ساتھ دعوت دو اور ان کے لئے سینہ کھول دو۔ ان پر اپنی رحمت اور حسن عمل کا فیضان کرو۔ ان کے ساتھ بھلائی کرتے رہو اور ان کے لئے مددگار ثابت ہو جہاں تک بھی وہ تمہاری امداد کے محتاج ہوں۔ انہیں حکم دیتے رہو کہ وہ اللہ کی طرف لوٹ آئیں اور اس امداد کا اجر اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔

یہاں آکر ہم ان بلندیوں تک پہنچ پاتے ہیں جن کے آفاق وسیع اور روشن ہیں۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے دل و دماغ کو ان بلندیوں تک پہنچا دیتے ہیں اور ان پر ان کے دلوں کو مستحکم کر دیتے ہیں۔ اسلام نہ صرف یہ کہ مذہبی آزادیوں کا اصول متعین کرتا ہے' نہ صرف یہ کہ وہ دینی امور میں جبر و تشدد کا ہی قلع قمع کرتا ہے بلکہ وہ اس سے بھی آگے بڑھ کر مذہبی رواداری کی ایسی فضا قائم کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہدایات پر مبنی ہے اور وہ یہ اصول طے کرتا ہے کہ بلا امتیاز مذہب و عقیدہ' معاشی تعاون اور معاشی امداد کے دروازے تمام لوگوں پر کھلے ہیں۔ بشرطیکہ وہ امت مسلمہ کے ساتھ حالت جنگ میں نہ ہوں۔ وہ یہ یقین دلاتا ہے کہ ایسے حالات میں غیر مسلموں پر خرچ کرنے والوں کا اجر بھی عند اللہ محفوظ ہے' بشرطیکہ یہ انفاق فی سبیل اللہ محض حصول رضائے الٰہی کے لئے ہو۔ انسانیت کی یہ ایک ایسی سربلندی ہے' جس سے ایک جست میں وہ ایک مقام بلند تک پہنچ جاتی ہے اور یہ مقام بلند اسے صرف اسلام کے طفیل ہی نصیب ہو سکتا ہے اور صرف وہی لوگ اس مقام بلند کی حقیقت پا سکتے ہیں۔ جو صحیح معنوں میں مسلمان ہوں۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ

"اور خیرات میں جو مال تم خرچ کرتے ہو وہ تمہارے اپنے لئے بھلائی ہے۔ آخر تم اسی لئے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل

ہو۔ تو جو کچھ مال تم خیرات میں خرچ کروگے ' اس کا پورا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا۔ اور تمہاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کی شان کی جو جھلک دکھائی ہے ' وہ ہمارے پیش نظر رہنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اہل ایمان جب خرچ کرتے ہیں تو وہ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ "............ "تم اسی لئے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔" ایک مومن کی صفت بس یہی ہے ' اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ صرف رضائے الٰہی کے لئے خرچ کرتا ہے۔ وہ خواہشات نفسانیہ یا کسی غرض اور مطلب براری کے لئے نہیں خرچ کرتا۔ وہ یوں انفاق فی سبیل اللہ نہیں کرتا کہ انفاق کرے اور پھر کان لگا کر بیٹھ جائے اور سنے کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ وہ اس لئے خرچ نہیں کرتا کہ وہ اپنے انفاق کے ذریعہ لوگوں کی گردنوں پر سوار ہو جائے۔ ان پر اپنی برتری ثابت کرے اور ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا ثابت کرے۔ وہ اس لئے نہیں خرچ کرتے کہ ان سے صاحبان اقتدار لوگ راضی ہوں یا وہ انہیں اس کا کوئی بدلہ دیں۔ وہ تو صرف حصول رضائے الٰہی کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ خالص اللہ کے لئے۔ اس لئے دل مومن اس پر مطمئن ہوتا ہے کہ اللہ میاں اس صدقہ کو ضرور قبول فرمائیں گے۔ نیز اسے پورا پورا اطمینان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے مال میں برکت دے گا۔ اسے یہ اطمینان بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ اسے پورا پورا اجر دے گا بلکہ اس پر مزید انعام بھی ہوگا۔ اسے پورا اطمینان ہوتا ہے کہ اللہ کی مخلوق پر احسان اور انفاق کے نتیجے میں اللہ کی جانب سے وہ احسان اور بھلائی کا مستحق ہے۔ چنانچہ اس داد و دہش کی وجہ سے اس کا تزکیہ نفس ہوتا ہے۔ اس کے اخلاق پاکیزہ ہوتے ہیں۔ اور اس کی شخصیت بلند ہو جاتی ہے۔ جب تک وہ اس جہاں میں زندہ ہوتا ہے رہی جزائے آخرت تو وہ بہرحال اعلیٰ وافضل ہوتی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ خیرات و صدقات کے مصارف میں سے خصوصاً ایک مصرف کا ذکر فرماتے ہیں۔ مومنین میں سے ایک گروہ کی تصویر پیش کی جاتی ہے جو صاف و شفاف ہے۔ شریفانہ اور باوقار ہے۔ اس تصویر کو دیکھ کر انسانی شعور میں تلاطم برپا ہوتا ہے۔ اس تصویر کو دیکھ کر دل مومن حرکت میں آتا ہے اور نفس انسانی ایسی شخصیات کا ادراک کر لیتا ہے جو کسی جانب سے کسی قسم کی امداد حاصل کرنے کو پسند نہیں کرتیں۔ اس لئے ان کی عزت نفس کو کسی طرح بھی ٹھیس نہ لگے۔ اور وہ طلب حاجت نہیں کرتیں۔ مبادا کہ انہیں حقیر سمجھ لیا جائے۔ اس لئے وہ دست سوال دراز کرنے پر آمادہ نہیں ہو پاتیں۔ اور نہ وہ اس سلسلے میں اظہار مطلب کرتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :۔

☆☆☆ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ؗ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْــَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝

الربع ۲۷۳ ع ۳۷ ۵

"خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنی ذاتی کسب معاش کے لئے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں۔ تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو۔ مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں۔ ان کی اعانت میں جو مال تم خرچ کروگے وہ اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گا۔"

یہ پرتاثیر صفت مہاجرین کی ایک جماعت پر پوری طرح منطبق تھی۔ وہ اپنے پیچھے اپنی دولت اور اپنا خاندان چھوڑ کر آئے ہوئے تھے۔ وہ مدینہ میں قیام پذیر تھے اور انہوں نے اپنے آپ کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے وقف کر لیا تھا۔ یہ لوگ ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باڈی گارڈ تھے۔ مثلاً اہل صفہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقامت گاہوں کے محافظ بھی تھے۔ کوئی دشمن ان سے آنکھ چرا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقامت گاہوں تک نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے وقف تھے اور کسب معاش یا تجارتی مقاصد کے لئے ادھر ادھر نہ جاسکتے تھے۔ اس صورت حال کے باوجود وہ لوگوں سے کچھ مانگتے بھی نہ تھے۔ وہ اس قدر خوددارانہ رویہ اختیار کیے ہوئے تھے کہ جو شخص ان کے حالات سے واقف نہ ہوتا وہ سمجھتا کہ یہ تو بہت ہی خوش حال اور فارغ البال لوگ ہیں۔ نہ کسی سے کچھ مانگتے ہیں اور نہ ہی کوئی کاروبار کرتے ہیں۔ صرف اصحاب عقل و دانش ان کی اصل صورت حال و کیفیت کو سمجھ پاتے تھے۔

لیکن اس ابتدائی مصداق کے باوجود' یہ آیت عام ہے۔ اس کا اطلاق ہر دور اور ہر زمانے میں پائے جانے والے لوگوں پر ہوتا ہے جو شرفاء میں سے ہوں جو ایسے حالات میں محبوس ہوں کہ وہ ان میں تلاش معاش نہ کر سکتے ہوں۔ اور ان کی شرافت نفس انہیں اس بات سے روک رہی ہو کہ وہ کسی سے سوال کریں۔ وہ بظاہر ایسا رویہ رکھتے ہوں جس سے ان کی اصل حالت کا اندازہ نہ ہو سکتا ہو اور ان کی اس ظاہری حالت کے پس پردہ جو صورت حال ہو' ناواقف آدمی ان کی اس خودداری کی وجہ سے اس کا صحیح اندازہ نہ کر سکتا ہو' ہاں ایک حساس اور سمجھدار شخص ہی ان کی اصل صورت حال سے واقف ہو سکتا ہو۔ اس لئے کہ کسی بھی شخص کے اندرونی تیز احساسات چہرے پر آہی جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ شخص حیاء اور خودداری کی وجہ سے انہیں چھپانے کی بہتری کوشش کرتا ہو۔

یہ ایک ایسی تصویر ہے جو گہرے اشارات کی مظہر ہے۔ یہ مختصر آیت ان شرفاء کی ایسی تصویر بناتی ہے۔ یہ ایک مکمل تصویر ہے اور خودداری اور حیا چشمی کے رنگوں سے بنی ہوئی ہے۔ اس آیت کا ہر جملہ گویا نقاش کی قلم کی نوک ہے۔ جو ان لوگوں کے خدوخال کو کاغذ پر منتقل کرتی چلی جارہی ہے اور اس تصویر سے ان کے تاثرات اور احساسات کا پوری طرح اظہار ہوتا ہے۔ جونہی ایک انسان ان آیات کی تلاوت کرتا ہے' اس کی لوح دماغ پر ان حضرات کی تصاویر منقش ہو جاتی ہیں۔ اس طرح کہ گویا وہ شخصیات نظروں کے سامنے کھڑی ہیں۔ وہ چہرے صاف نظر آرہے ہیں۔ انسانیت کے مختلف نمونوں کی تصویر کشی میں قرآن کریم کا یہی انداز ہے۔ مختلف قسم کے انسان یوں نظر آتے ہیں کہ گویا وہ زندہ اور متحرک شخصیات ہیں۔

ان شرفاء اور فقراء کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی ضروریات اور حاجات کو یوں چھپاتے ہیں جس طرح ایک انسان اپنے ستر کو چھپاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اگر کچھ دیا جائے گا تو وہ صرف تنہائی میں دیا جائے گا تاکہ ان کی خودداری اور عزت نفس کو ٹھیس نہ لگے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کے آخر میں ایک قسم کا اشارہ دیا جاتا ہے کہ ایسے لوگوں کی امداد بھی نہایت ہی خفیہ طریقے سے کی جانی چاہئے۔ چنانچہ انفاق کنندہ کو یقین دہانی کرائی جاتی ہے کہ اللہ خوب جانتا ہے۔ اور اس کی پوری پوری جزا دینے والا ہے۔ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ............ "ایسے لوگوں کی اعانت میں جو مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گا۔" یہ صرف اللہ ہی ہے جو خفیہ بھیدوں کو بھی جانتا ہے اور اس کے ہاں کوئی بھلائی بغیر اجر کے ضائع نہیں ہوتی۔

سب سے آخر میں اس ضابطہ انفاق فی سبیل اللہ کا خاتمہ ایک عام اور ایک کلیہ پر مشتمل آیت پر ہوتا ہے۔ جو ہر قسم کے انفاق اور صدقات کو شامل ہے۔ اور اس کا حکم بھی عام ہے اور ہر اس چیز کو شامل ہے جو اللہ کے لئے دی جائے۔

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ

عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧٤﴾

"جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ اور ان کے لئے کسی خوف و رنج کا مقام نہیں۔"

اس خاتمہ کلام پر اس آیت کی عمومیت اور ہم آہنگی بہت ہی خوبصورت نظر آتی ہے۔ آیت کا آغاز اور اختتام ایک موزوں سرکی طرح باہم متوازن اور اصول عام کی صورت میں دوبارہ دہرایا جاتا ہے۔ اور بہت ہی موزونیت کے ساتھ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ ............ "وہ لوگ جو اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔" یعنی ہر قسم کے مال اور دولت جو وہ خرچ کرتے ہیں۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً ............ "شب و روز' چھپے یا کھلے۔" یعنی جن اوقات اور جن حالات میں بھی وہ انفاق فی سبیل اللہ کرتے ہیں فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ ............ "تو ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔" ان کا ہر قسم کا اجر محفوظ ہے۔ اس میں اضافہ بھی ہو گا' اس سے ان کی عمر میں برکت بھی ہو گی۔ آخرت میں بھی پوری پوری جزا ملے گی۔ اور اللہ کی رضامندی اس پر مستزاد ہو گی۔ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ...... کسی جانب سے بھی انہیں کوئی خوف نہ ہو گا۔ کسی جانب سے کسی کی کا کوئی خدشہ نہ ہو گا۔ نہ دنیا میں ہو گا نہ آخرت میں ہو گا۔ غرض دستور انفاق فی سبیل اللہ کا یہ موزوں اور متناسب اختتامیہ ہے جس میں یہ اشارات پنہاں ہیں کہ انفاق فی سبیل اللہ اپنی عمومی شکل میں ماجور ہے چاہے وہ جس قسم کا ہو جس وقت ہو' جس مقصد کے لئے ہو۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کی زندگی کی معیشت کا مدار صرف انفاق فی سبیل اللہ پر نہیں رکھتا۔ اسلامی نظام میں معیشت کا دارومدار اس پر تھا کہ ہر اس شخص کے لئے' جو قدرت رکھتا ہو' روزگار کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ اس کے علاوہ اسلام نے اپنی معیشت کا دارومدار' اہل اسلام کے درمیان' دولت کی منصفانہ تقسیم پر رکھا ہے اور دولت کی اس تقسیم کا اصول حسن کارکردگی اور استحقاق پر رکھا گیا ہے لیکن بعض اوقات ایسے استثنائی حالات درپیش ہو جاتے ہیں' جن میں معیشت کے عمومی اصول کارآمد نہیں ہوتے اور ان حالات میں درپیش مشکلات ان سے حل نہیں ہوتیں۔ ایسے حالات کو اسلام انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعہ حل کرتا ہے۔ یہ انفاق بعض اوقات تو ایک لازمی ٹیکس کی صورت میں ہوتا ہے' جسے وہ اسلامی حکومت نافذ کرتی جو اسلامی شریعت نافذ کرنے والی ہو۔ صرف اسلامی حکومت ہی اس قسم کا لازمی ٹیکس نافذ کر سکتی ہے۔ زکوۃ اور صدقات واجبہ اسلامی حکومت کے محاصل میں سے اہم ہوتے ہیں اور بعض اوقات یہ تقسیم دولت صدقات نفلیہ کی صورت میں ہوتا ہے جس کی مقدار کا تعین نہیں ہوتا اور یہ نفلی صدقات اہل ثروت کی جانب سے مستحقین کے لئے ہوتے ہیں۔ جو انہیں ذاتی طور پر دیئے جاتے ہیں۔ اور اس قسم کا عطیہ دیتے وقت ان آداب اور شرائط کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے' جن کا اوپر ذکر ہوا۔ اور ان آداب ہی کی وجہ سے لینے والے خودداری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہی خودداری ہے جس کا اظہار اس آیت میں ہوا ہے۔ اس خودداری کو اسلام نے اسلامی معاشرہ میں اس قدر ترقی دی تھی کہ ایک شخص کے پاس کچھ بھی نہ ہوتا اور وہ معمولی ضروریات زندگی کا بھی محتاج ہوتا' تب بھی وہ دست سوال کسی کے سامنے دراز نہ کرتا۔

بخاری نے عطاء ابن یسار اور عبدالرحمن بن ابی عمرہ سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے ابوہریرہ سے سنا۔ فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مسکین وہ نہیں ہوتا جسے ایک کھجور یا دو کھجوریں لوٹا دیں۔ یا ایک لقمے یا دو لقموں کے لئے وہ بھیک مانگتا پھرے' مسکین وہ ہوتا ہے جو خوددار ہو۔" اگر تم چاہو تو اس آیت کو پڑھو لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا" ............

"وہ لوگوں کے پیچھے پڑکر سوال نہیں کرتے۔"

امام احمد نے ابوبکر 'عبدالحمید بن جعفر' اس کے والد کے واسطہ سے قبیلہ مزینہ کے ایک شخص کی روایت نقل کی ہے۔ اس شخص کو اس کی والدہ نے مشورہ دیا کہ دوسرے لوگوں کی طرح تم کیوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاکر سوال نہیں کرتے؟ اس نے کہا کہ میں چلا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگوں۔ پہنچا تو آپ تقریر فرما رہے تھے "جس نے خودداری کی اللہ تعالیٰ اسے دے دے گا اور جو شخص استغناء کرے گا اللہ تعالیٰ اسے غنی بنادے گا۔ جو شخص لوگوں سے سوال کرتا ہو حالانکہ اس کے پاس پانچ اوقیہ کے برابر مال موجود ہے تو گویا اس نے اصرار کر کے سوال کیا (الحافا)" میں نے اپنے دل میں کہا "میرے پاس ایک اونٹنی ہے جو یقیناً پانچ اوقیہ سے زیادہ قیمتی ہے۔ اور میرے غلام کے پاس ایک دوسری اونٹنی ہے' وہ بھی یقیناً پانچ اوقیہ سے زیادہ قیمتی ہے۔" اس لئے میں واپس ہو گیا اور درخواست نہ کی۔

حافظ طبرانی نے اپنی سند کے ساتھ 'محمد بن سیرین سے روایت کی ہے۔ حارث کو (ایک شخص جو قریشی تھے اور شام میں رہتے تھے) خبر ملی کہ حضرت ابوذر رضی کے مالی حالات ٹھیک نہیں تو اس نے انہیں تین سو دینار بھجوائے۔ ابوذر نے جواب دیا: "کیا عبداللہ کو مجھ سے زیادہ تنگ دست اور کوئی نظر نہیں آیا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا "جو شخص سوال کرے اور اس کے پاس چالیس درہم ہوں تو اس نے الحاف کیا۔" ابوذر کے خاندان کے پاس چالیس درہم موجود ہیں ایک بکری اور دو نوکر بھی موجود ہیں۔ ابوبکر بن عیاش نے کہا کہ ماهنان سے مراد خادمان ہے۔

غرض اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ اس کے نصوص 'اس کی ہدایات اور اس کے قوانین سب کے سب بیک وقت کام کرتے ہیں ان نصوص وہدایات اور قوانین کے دفعات پر علیحدہ علیحدہ غور نہ کیا جائے گا۔ اسلام کے اصول اور ضابطے بیک وقت روبعمل ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں باہم تناسق اور تناسب ہوتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا ہے جس کی نظیر اس کرۂ ارض پر انسانی معاشروں میں نہیں ہوتی۔ وہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد معاشرہ ہوتا ہے۔

☆ ☆ ☆

# درس ۲۰ ایک نظر میں

گزشتہ سبق میں' اسلامی نظام زندگی میں انفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ کا دستور اور طریقہ بیان کیا گیا تھا۔ یہاں انفاق اور صدقے کا عین صفحہ' بالمقابل الٹا جاتا ہے۔ یعنی نظام ربا اور اس کے ظالمانہ اور سیاہ کارانہ نتائج صدقہ میں تو داد و دہش' احسان و پاکیزگی ہے اور طہارت و جوانمردی ہے۔ باہم تعاون اور تکافل ہے۔ جبکہ سود خوری میں بخل اور کنجوسی' گندگی اور نجاست' خود غرضی اور ذاتی مفاد ہے۔

صدقہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں دنیا میں مال کو ترک کر لیا جاتا ہے۔ اور بظاہر اس کا کوئی عوض یا بدلہ نہیں لیا جاتا اور ربا کا خلاصہ یہ ہے کہ قرض روپیہ واپس لینے کے ساتھ ساتھ سود خور کچھ زیادہ بھی وصول کرتا ہے۔ یہ زائد دولت مدیون کی محنت یا اس کے گوشت اور خون سے لی جاتی ہے۔ محنت سے اس صورت میں جب مدیون نے مال لیا' اس کے ساتھ محنت کی اور اس کی محنت کے نتیجے میں اسے منافع حاصل ہوا۔ اس صورت میں تو زائد دولت محنت کا حصہ ہوگی لیکن اگر اسے نفع نہ ہوا یا اسے خسارہ ہو گیا تو اس صورت میں اس کے خون پسینہ کا حصہ ہوگی۔ یا مثلاً قرض اس نے ذاتی اخراجات یا اپنے خاندان کے ضروری اخراجات کے لئے لیا ہو اور اسے نفع بخش کاروبار میں لگایا ہی نہ ہو تو اس صورت میں بھی سود کی رقم گویا' اس شخص کی ذات سے وصول ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ اگر صدقہ روشن صفحہ ہے تو ربا اس کے بالمقابل ایک تاریک صفحہ ہے۔ انفاق کرنے والے کا چہرہ اگر روشن ہے تو سود خور کا چہرہ تاریک اور سیاہ ہے۔ اس لئے کہ اس حسین و جمیل اور پاک وصاف اور رحیم و کریم چہرے کے بیان کے متصلاً بعد سود خور کے بدنما چہرے کو بھی پیش کر دیا گیا۔ اس چہرے کو ایسے انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ جس سے سودی کاروبار کی تمام اندرونی برائیاں اور قباحتیں اس چہرے سے عیاں ہو گئیں' افراد کا سنگدلانہ طرز عمل' ناداروں کی ہلاکت اور معاشرہ میں اس سودی نظام سے پیدا ہونے والی تمام برائیاں اور فسادات ظاہر ہو گئے۔

اسلام نے دور جاہلیت کی کئی برائیوں کو ختم کیا' لیکن اسلام نے جس قدر مذمت سود خوری کی کی ہے' اس قدر مذمت کسی دوسری برائی کی نہیں کی ہے۔ نیز اسلام نے سود خوری کے خلاف جس طرح لفظی اور معنوی دھمکی دی ہے' اس قدر کسی بھی دوسری برائی کے ارتکاب کرنے والے کو نہیں دی گئی۔ ان آیات میں بھی اور ان کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی۔ اور اللہ کی ذات یقیناً دور رس حکمتوں کا احاطہ کرنے والی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دور جاہلیت میں جو سودی نظام جاری و ساری تھا اس کے اپنے مفاسد اور قباحتیں تھیں' لیکن آج ہمارے دور سرمایہ داری میں جس طرح اس کے نتائج اور فسادات کھل کر سامنے آگئے ہیں اور اس کا یہ بدنما چہرہ جس خوش اسلوبی سے بے نقاب ہو کر سامنے آگیا ہے' دور جاہلیت میں ایسا کبھی نہ تھا۔ اس دور میں یہ مکروہ چہرہ اس طرح بدنما' بدشکل اور پھر تیوری چڑھائے ہوئے نہ تھا جس طرح وہ آج ہے۔ اور ہمارے اس جدید دور میں وہ کھل کر سامنے آگیا ہے۔

اس وقت کے غالب سودی معیشت پر' اس آیت میں جو خوفناک حملہ شروع کیا گیا ہے' اس کی حقیقی حکمت و افادیت' دور جاہلیت کے مقابلے میں آج اچھی طرح ظاہر ہو رہی ہے جبکہ پوری انسانیت آج اس نظام کی چکی میں پس رہی ہے۔ جو شخص اسلامی نظام زندگی کی اصل حکمت' اس کی حقیقی عظمت اور اس کی جامعیت اور اس کی باریک بینی پر اچھی طرح غور و فکر اور تدبر کرنا چاہتا ہے' وہ ان آیات و نصوص پر غور کر کے وہ کچھ پا سکتا ہے' جو ان لوگوں کے لئے ممکن نہ تھا جنہوں نے سب سے پہلے ان آیات کا مطالعہ کیا تھا۔ اس لئے کہ آج پوری انسانی معیشت ان نصوص کے ایک ایک حکم کی براہ راست تصدیق کر رہی ہے۔ آج کی پوری انسانیت جو سود کھلاتی ہے اور سود

کھاتی ہے' اس پر مصائب و شدائد کے وہ پہاڑ ٹوٹ چکے ہیں' جنہوں نے اس کی کمر توڑ دی ہے اور اسے پیس کر رکھ دیا ہے۔ اس نظام نے اس کے اخلاق کو بگاڑ دیا ہے۔ اس کی صحت کا معیار گرا دیا ہے' اس کا اقتصادی نظام درہم برہم ہو گیا ہے اور سب سے بڑی خرابی یہ کہ اس کے دین کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ آج دنیا خالق حقیقی کے ساتھ بر سرپیکار ہے۔ جس کی وجہ سے وہ عذاب الٰہی میں مبتلا ہے۔ ایک فرد ہے تو وہ بھی اس عذاب میں گرفتار ہے۔ کوئی قوم ہے یا امت ہے تو وہ بھی اس مصیبت میں گرفتار ہے۔ لیکن نہ تو اس عذاب میں کمی آتی ہے اور نہ ہی کوئی قوم یا امت عبرت پکڑتی ہے۔

گزشتہ سبق میں قرآن نے جو دستور انفاق فی سبیل اللہ وضع فرمایا تھا' تو وہ دراصل اسلام کے اجتماعی اور اقتصادی نظام کا اصل الاصول تھا' مطلوب یہ تھا کہ ایک اسلامی معاشرہ کا اقتصادی نظام باہم بر د احسان اور صدقہ و انفاق پر قائم ہو اور اس کے سائے میں لوگ باہم شفیق و ہمدرد بن کر رہیں۔ جبکہ جاہلی نظام' اس کے بالمقابل سود خوری کے ظالمانہ اور گھٹیا درجے کے اخلاقیات پر قائم ہوتا ہے۔ جس میں احسان اور رحم کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

یہ دونوں نظام دراصل ایک دوسرے کے بالمقابل نظام ہیں۔ ایک اسلامی نظام ہے اور دوسرا سودی نظام ہے۔ اپنے اساسی فکر کے اعتبار سے یہ کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ کسی اساس پر یہ متحد نہیں ہو سکتے۔ نہ اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے وہ ایک جیسے ہو سکتے ہیں۔ ہر ایک اپنے مخصوص تصور حیات' اپنے اہداف و مقاصد کے پیش نظر کام کرتا ہے اور یہ دونوں نظام پوری طرح ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ ان دونوں کے نتائج بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف مرتب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹتے ہی اس نظام پر یہ خوفناک حملہ کیا گیا اور جو لوگ نظام سود خوری کے کل پرزے ہیں انہیں خوفناک نتائج کی دھمکی دی گئی۔

اسلام اپنے اقتصادی نظام' بلکہ اپنے پورے نظام کی بنیاد اس سچائی کے اساسی تصور پر رکھتا ہے جو اس کائنات میں موجود ہے۔ یہ سچائی ذات باری ہے۔ وہ اس کائنات کی خالق ہے۔ وہ اس زمین کی خالق ہے۔ وہ اس انسان کی خالق ہے۔ وہی تو ہے جس نے ہر موجود کو انور وجود سے آراستہ کیا۔ وہی تو ہے جو ہر موجود کا مالک ہے۔ اس لئے کہ وہی ہر موجود کا موجد ہے۔ اس نے اس کائنات میں بنی نوع انسان کو اپنا جانشین بنایا۔ اس کائنات میں اس نے جو قوتیں اور جو ضروریات زندگی ودیعت کئے تھے' اس نے انہیں بنی نوع انسان کے تصرف میں دیا۔ لیکن یہ اختیارات ایک وعدے اور ایک شرط کے ساتھ مشروط تھے۔ یہ عظیم کائنات اس نے اس حضرت انسان کے تصرف میں بے قید و بے شرط نہیں دیدی کہ جو چاہے اس میں کرتا پھرے۔ یہاں زندگی بسر کرنے کے لئے' اس نے انسان کے لئے کچھ حدود و قیود واضح طور پر متعین کر دیئے تھے۔ اس نے اسے خلافت فی الارض اس شرط پر دی کہ وہ الٰہی نظام حیات کے مطابق یہاں اپنی زندگی بسر کرے گا۔ وہ اللہ کی شریعت کا پیروکار ہو گا۔ اس لئے یہاں اس کے وہ تمام فیصلے' اعمال' اخلاق اور عبادات جو اس عہد کے مطابق ہوں گے وہ نافذ العمل اور معتبر ہوں گے۔ اور اس کے جو کام اس عہد کے خلاف اور شریعت سے متضاد ہوں گے وہ باطل' کالعدم اور موقوف ہوں گے۔ اور اگر وہ خلاف شریعت کسی اصول و اخلاق کو زبردستی یہاں نافذ کرتا ہے تو وہ ظلم اور عدوان ہو گا۔ اور انہیں نہ مسلمان تسلیم کریں گے اور نہ ہی اللہ انہیں قبول کرے گا۔ لہٰذا اس کرۂ ارض پر حاکمیت صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ جس طرح اس کائنات میں حاکمیت صرف اللہ کی جاری و ساری ہے۔ رہے انسان تو وہ حاکم ہوں یا محکوم' ان کی حاکمیت کا ماخذ اور منبع اسلامی نظام زندگی اور اسلامی شریعت کا نفاذ ہے۔ پوری کی پوری انسانیت بھی اگر فیصلہ کر دے تب بھی اسے یہ فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں کہ اب وہ اتباع شریعت سے آزاد ہے۔ اس لئے کہ انسان بحیثیت حاکم و مختار یہاں اللہ کا نائب اور ایجنٹ ہے اور اسے یہ ایجنسی ایک چارٹر کے تحت دی گئی ہے۔ جس کی پابندی اس کے لئے ضروری ہے۔ انسان بذات خود اس دولت کا مالک نہیں ہے جو اس کے تصرف میں ہے۔

اس عہد اور چارٹر کی دفعات میں سے ایک اہم دفعہ یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر وہ تمام لوگ جو اپنے خالق پر ایمان لانے والے ہیں' باہم تعاون اور تکافل سے زندگی بسر کریں۔ وہ ایک دوسرے کے ولی اور دوست ہوں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جو وسائل رزق عطا کئے ہیں ان سے سب کے سب فائدہ اٹھائیں۔ باہمی تعاون و تکافل کی اساس پر۔ اس اساس پر نہیں کہ یہ تمام وسائل مطلقاً مشترک ہیں۔ جس طرح مارکسیت جدیدہ کا تصور ہے۔ یہ تکافل و تعاون محدود انفرادی ملکیت کے اساس پر ہے۔ اس محدود ملکیت کی اساس پر اگر کسی کی محنت پھل لائے اور اس کے پاس وافر دولت جمع ہو جائے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اللہ کے دیئے میں سے ان لوگوں پر خرچ کرے جو نادار ہیں اور جن کے وسائل محدود ہیں لیکن اس انفاق کے ساتھ ساتھ تمام افراد معاشرہ پر اپنی طاقت و وسعت کے مطابق کسب و عمل فرض کیا گیا ہے۔ جس قدر وسائل اسے میسر ہیں۔ کسی کے لئے یہ جائز نہیں قرار دیا گیا کہ وہ دوسروں پر بوجھ بنے۔ یا باوجود اس کے کہ وہ کسب و عمل پر قادر ہو اور پھر بھی معاشرے سے اجتماعی کفالت کا طالب ہو۔ جیسا کہ اس سے قبل ہم بیان کر چکے ہیں۔ اسلامی نظام کے اس اجتماعی کفالتی نظام کے لئے ہر شریعت نے زکوٰۃ کو فرض قرار دیا ہے اور صدقہ اور انفاق فی سبیل اللہ کو نفلی مدد قرار دیا ہے' جس کی کوئی انتہا اور کوئی حد نہیں ہے۔

اسلام نے اپنے اقتصادی نظام کے اصول وضع کرتے وقت میانہ روی اور اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس نظام میں انفاق فی سبیل اللہ میں بھی اسراف اور ظلم اور حد سے تجاوز کو منع کیا گیا ہے۔ نیز جو پاک چیزیں یہاں انسان کے لئے جائز قرار دی گئی ہیں' ان سے انتفاع اور تلذذ میں بھی اسراف سے منع کیا گیا ہے۔ اس لئے انسان کی ضروریات زندگی کی مد میں اخراجات کے دائرے کو محدود کر دیا گیا ہے۔ اور اسے دائرہ اعتدال میں محدود کیا گیا ہے۔ محدود ضروریات کے بعد جو بچ جاتا ہے' اس پر زکوٰۃ اور صدقات نافلہ کا ہروقت تصرف رہتا ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ ایک مومن کو یہ حکم بھی دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی دولت کو نفع بخش کاروبار میں لگائے اور اس میں اضافہ کرتا رہے۔

کاروباری زندگی میں اہل اسلام پر یہ قید لگائی گئی ہے کہ وہ اپنی کاروباری جدوجہد میں کسی کے لئے اذیت اور مضرت کا باعث نہ بنیں۔ اور ایسا کاروبار نہ کریں جس کے نتیجے میں لوگوں تک ان کی ضروریات کی رسد میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا ہو۔ نہ ایسا کاروبار کریں جس کے نتیجے میں دولت بالا بالا چند ہاتھوں تک محدود ہو جائے اور اس کا دائرہ محدود ہو جائے۔ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ........................ "تاکہ وہ تمہارے مالداروں کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔" (۵۹: ۷)

اسلام نے معاشی جدوجہد میں فکر و عمل کی طہارت و پاکیزگی کو بھی لازم قرار دیا ہے۔ اس نے کاروبار میں وسائل و نتائج کی پاکیزگی پر بہت زور دیا ہے۔ کاروبار کی ترقی اور دولت میں اضافہ کرنے کے بارے میں ایسے ضابطے اور قاعدے وضع کئے ہیں جن کے نتیجے میں انسانی ضمیر اور انسانی اخلاق پر برے اثرات نہیں پڑتے۔ نہ ان سرگرمیوں سے معاشرے کے اجتماعی وجود اور اجتماعی زندگی متاثر ہوتی ہے [۱] یہ سب اصول اور سرگرمیاں اس سچائی کی اساس پر ہیں جو اس پوری کائنات میں جاری ہے۔ یعنی تصور الٰہ اور پھر اس عہد کے دائرے کے اندر جو انسان اور حقیقت وجود کے درمیان طے پایا جو خلیفہ بننے والے انسان کے تمام تصرفات اور سرگرمیوں پر حاوی ہے' جو اللہ کی مملوکہ سرزمین پر فرائض خلافت سرانجام دے رہا ہے۔

یہ وجوہات ہیں جن کے نتیجے میں سود خوری ایک ایسا عمل قرار پاتی ہے' جو اساسی طور پر پوری طرح ایمانی تصور حیات کے ساتھ متصادم ہے۔ اس لئے کہ سودی نظام بالکل ایک علیحدہ تصور حیات پر مبنی ہے۔ ایک ایسا تصور جس میں عقیدۂ توحید اور وجود باری کے لئے

۱۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو میری کتاب العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام

کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ ایک بے خدا تصور حیات ہے۔ اس لئے سودی نظام میں اس اصول و اخلاق کی کوئی گنجائش نہیں ہے جس اصول اور اخلاق کی اساس پر اللہ تعالیٰ انسانی زندگی کی تنظیم چاہتے ہیں۔

سودی نظام کا اساسی تصور یہ ہے کہ انسانی زندگی اور ارادۂ الٰہی کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے۔ انسان ابتداء ہی سے اس کرۂ ارض کا مالک ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی عہد و پیمان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جاری کردہ احکام کا سرے سے پابند ہی نہیں ہے۔

اس تصور حیات کے مطابق انسان ان تمام ذرائع کے استعمال میں آزاد ہے' جن کے ذریعہ وہ دولت جمع کر سکے۔ وہ دولت کے بڑھانے اور ترقی دینے میں بھی کسی اصول کا پابند نہیں ہے۔ اسی طرح وہ دولت کے استعمال میں بھی کسی حد و قید کا پابند نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اللہ کے ساتھ کسی عہد و پیمان کا بھی پابند نہیں ہے۔ نہ وہ اس بات کا پابند ہے کہ دوسرے لوگوں کی مصلحتوں کو خاطر میں لائے۔ اس لئے اس پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اگر اس کی ذخیرہ اندوزی اور سرمایہ میں بے پناہ اضافے کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کو تکلیف پہنچے۔ بعض اوقات انسان کے بنائے ہوئے قوانین' ایسے شخص کی آزادی پر بعض جزدی پابندیاں عائد کر کے' دولت کی لامحدود ارتکاز کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً سود کی شرح پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔ بعض اوقات انسان کے بنائے ہوئے قوانین بعض مالی چالبازیوں' ظلم و زیادتی' دھوکہ بازی اور مالی ضرر انسانی پر پابندیاں عائد کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ پابندیاں ایک روٹین بن جاتی ہیں اور لوگ اپنی اصلی عادت کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اس لئے وہ وہی کام کرنے لگتے ہیں جن کی خواہش ان کے دلوں میں بھی رچی بسی ہوتی ہے۔ یہ انسانی قوانین معاشرے میں وہ اصول رائج اور راسخ نہیں کر سکتے جو خداوند قدوس کی طرف سے نازل کردہ قوانین انسان کے دل میں پیدا کر دیتے ہیں۔ غرض سودی نظام کی نیو ایک غلط اور فاسد اساس پر اٹھائی جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس جہاں میں انسان کا مقصد اعلیٰ صرف یہ ہے کہ وہ مال و دولت جمع کرتا پھرے۔ چاہے اس کے لئے جو بھی مکروہ ذریعہ اسے اختیار کرنا پڑے۔ اور پھر وہ اس دولت سے فائدہ اٹھائے اور اسے جس طرح چاہے خرچ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مادہ پرست شخص کے دل میں اس قدر لالچ پیدا ہو جاتا کہ وہ کتوں کی طرح دولت پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اور سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس سے ہر طرح کے مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یوں وہ تمام اصولوں کو پامال کر کے اور تمام جہاں کے مفادات کو قربان کر کے بھی دولت جمع کرنے میں لگا رہتا ہے۔

نظام ربا کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام بشریت کو پیس کر رکھ دیتا ہے۔ اس میں افراد اور معاشرے کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اقوام و ملل تباہ ہو جاتی ہیں۔ اور یہ تباہی صرف ان مٹھی بھر لوگوں کے مفاد کے لئے ہوتی ہے جو اس نظام میں روپیہ فراہم کرتے ہیں۔ جو اقوام اس نظام کی زد میں آجاتی ہیں وہ اخلاقی' نفسیاتی اور اعصابی اعتبار سے بھی گر جاتی ہیں' ان اقوام کا مالی نظام خراب ہو جاتا ہے' اور انسانی اقتصادیات میں مناسب نشوونما نہیں ہوتا۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پوری انسانیت پر حقیقی اور عملی اقتدار چند ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے' جو اللہ کی اس پوری مخلوق میں ذلیل ترین لوگ ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ پرلے درجے کے فسادی ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا طبقہ ہوتا ہے جو انسانیت کیلئے اس کرۂ ارض پر کسی قسم کی دوستی' ہمدردی یا ذمہ داری کا کوئی پاس نہیں رکھتا۔ جیسا کہ ہمارے اس جدید دور میں انسانیت کو ایسے ہی ایک گروہ سے واسطہ پڑا ہوا ہے۔ یہ گروہ جس طرح افراد کو روپیہ فراہم کرتا ہے اسی طرح حکومتوں اور اقوام کو بھی روپیہ فراہم کرتا ہے۔ اپنے وہ ممالک جہاں پر یہ گروہ رہائش پذیر ہوتا ہے' ان کے اندر بھی یا کاروبار کرتا ہے اور بیرونی دنیا میں بھی یہ کام کرتا ہے۔ اور تمام انسانیت کی محنت کا پھل اسے ملتا رہتا ہے۔ اور لوگوں کی خون پسینے کی کمائی غیر محسوس طور پر ان کی تجوریوں کی طرف لوٹتی رہتی ہے۔ اور یہ فائدہ انہیں محض اپنے اس سودی کاروبار کی وجہ سے ملتا رہتا ہے' جس میں خود ان کی محنت و مشقت کا کوئی

دخل نہیں ہوتا۔

نہ صرف یہ کہ لوگوں کی دولت اس گروہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے بلکہ اس گروہ کو اس معاشرہ میں مکمل اثر و رسوخ بھی حاصل ہوتا ہے۔ اس گروہ کے پیش نظر نہ اصول ہوتے ہیں' نہ وہ کسی اخلاقی نظام کا پابند ہوتا ہے' نہ وہ کسی دین و مذہب پر یقین رکھتا ہے بلکہ وہ مذہب و اخلاق اور اصول اور کردار کا مزاح اڑانے میں اپنا پورا اثر و رسوخ استعمال میں لاتے ہیں۔ جو اس سودی معاشرے میں انہیں حاصل ہوتا ہے اور اس خوفناک اثر و رسوخ کے نتیجے میں وہ ایسے حالات پیدا کرتے ہیں اور ایسے ایسے منصوبے روبعمل لاتے ہیں اور ایسی فکری فضا پیدا کرتے ہیں جس کے اندر رہ کر وہ اس سودی نظام کی وجہ سے عوام الناس کا مزید استحصال کرتے ہیں۔ ان حالات میں ان کی خساست اور قابل نفرت لالچ کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔ اور ان کے تمام مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایسے لوگوں کا بہترین اور آسان طریقہ یہ ہوتا ہے وہ عوام کو جنسیت اور لذتیت کا خوگر بنا کر انسانی اخلاق اور عفت کو ختم کر کے انسان کو شہوات ولذتیت کے گندے نالے میں گرا دیتے ہیں۔ اور وہ اس کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ اپنی آخری کوڑی بھی اس میں صرف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی دولت ان کے اقتصادی جال میں پھنستی چلی جاتی ہے۔ یہ کام یوں سرانجام دیا جاتا ہے کہ یہ سودی کاروبار کرنے والے تمام عالمی اقتصادی نظام کو اپنی محدود مصلحتوں کے موافق چلاتے ہیں۔ چاہے ان کے ان اقدامات کی وجہ سے عالمی اقتصادی نظام بدترین بحرانوں کا شکار ہو جائے۔ جن سے آج کل ماہرین اقتصادیات اچھی طرح واقف ہیں۔ اس نظام کے نتیجے میں عالمی صنعتی پیداوار عوام الناس اور پورے انسانی معاشرے کے مفاد کے مقابلے میں چند سرمایہ داروں کے مفاد میں محبوس ہو جاتی ہے جو سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور جن کے ہاتھ میں عالمی سرمایہ کی باگیں آجاتی ہیں اور وہ سب تاریں اپنے مفاد میں ہلاتے ہیں۔

یہ اندوہناک واقعہ ہمارے' اس دور جدید میں یوں پایہ تکمیل کو پہنچا کہ دور جاہلیت میں بھی وہ ایسی خوفناک صورت میں نہ تھا۔ اس لئے کہ قرون اولیٰ کے سود خور' جو ایک فرد کی صورت میں یا ایک ادارے کی صورت میں ہوتے تھے وہ اس قدر موثر نہ تھے' جیسا کہ جدید دور کے بنک اور مالی ادارے کام کرتے ہیں۔ ان جدید مالی اداروں کو پوری دنیا میں بڑی بڑی حکومتوں کے اندر اثر و رسوخ حاصل ہوتا ہے۔ وہاں حکومتوں کی خارجہ پالیسیوں اور تجارتی پالیسیوں پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ پھر وہ صحافت اور نشرواشاعت کے عالمی اداروں پر قابض ہیں۔ اپنے مزاج اور نظریات کے مطابق تصانیف لکھواتے ہیں۔ اساتذہ اور یونیورسٹیوں پر ان کا قبضہ ہوتا ہے۔ اور میڈیا پر مکمل طور پر وہ اثرانداز ہوتے ہیں۔ ان وسائل اور ذرائع سے وہ عامۃ الناس میں ایک ایسی ذہنیت پیدا کرتے ہیں کہ وہ عوام جن کا گوشت و پوست وہ کھا رہے ہوتے ہیں۔ ان کا خون چوس رہے ہوتے ہیں اور اس سودی نظام کی وجہ سے ان کی محنت لوٹ رہے ہوتے ہیں وہ ان کے ذہنوں کو اس طرح مسخر کر دیتے ہیں کہ یہ سودی نظام ان کی نظروں میں ایک معقول نظام اور لازمی نظام بن جاتا ہے جو بالکل معقول نظر آتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سودی نظام کے بغیر دنیا اقتصادی ترقی سے محروم رہے گی۔ اور یہ کہ مغربی دنیا کی اقتصادی ترقی محض اس سودی نظام کی وجہ سے ہوئی ہے اور یہ کہ جو لوگ سودی نظام کے خاتمہ کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں وہ عملی لوگ نہیں' محض خیالی گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ اور یہ کہ ان کے خیالات و تصورات کی اساس محض اخلاقی نظریات پر ہے یا محض نظریاتی اصولوں پر ہے۔ جن کا عملی دنیا میں کوئی نمونہ موجود نہیں ہے۔ اور نہ ان کے نفاذ کی کوئی راہ ہے۔ اور اگر ایسا کوئی نظام وضع کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتیجے میں پوری دنیا کا اقتصادی نظام تباہ ہو جائے گا۔ پھر یہ سود خور ان لوگوں کو مزاح کا نشانہ بناتے ہیں جو موجودہ سودی اقتصادی نظام پر تنقید کرتے ہیں۔ اور یہ مزاح ان لوگوں کے ذریعہ سے کرایا جاتا ہے' جو خود اس سودی نظام کے ڈسے ہوئے ہیں اور صرف اس نظام کی وجہ سے وہ مفلوک الحال ہیں جس طرح آج کا پورا عالمی اقتصادی نظام اس سودی نظام کی وجہ سے خستہ اور تباہ و برباد ہو گیا ہے اور سود خوروں کی یہ عالمی تنظیمیں اس

اقتصادی نظام کو محض اپنی نہج اور اپنی منشاء کے مطابق چلاتی ہیں اور جب بھی وہ ان کی منشاء کے خلاف جائے' یہ اسے ایسے جھٹکے دیتی ہیں اور ایسے مالی بحران پیدا کرتی ہیں کہ ماہرین اقتصادیات کے دماغ درست ہو جاتے ہیں اور وہ اس پورے عالمی مالی نظام کو از سرنو اس مٹھی بھر سود خوروں کی جماعت کے مفادات کے مطابق استوار کر دیتے ہیں۔

خالص اقتصادی نقطۂ نظر سے بھی' یہ سودی نظام ایک ناقص نظام ہے۔ بعض مغربی ماہرین اقتصادیات پر بھی اس کے مفاسد آشکارا ہو چکے ہیں' حالانکہ یہ لوگ اس سودی نظام میں پروان چڑھے۔ اور خود مغربی علوم و ثقافت اور اخلاق و تصورات میں مغربی مالیاتی اداروں کے پروپیگنڈے کی وجہ سے سود کا تصور رچا بسا تھا۔ وہ ماہرین اقتصادیات جو محض اقتصادی نظام کے نقطہ نظر سے سود کے خلاف ہیں' ان میں سرفہرست جرمنی کے ڈاکٹر شاخت ہیں۔ وہ جرمنی بینک "رائخ" کے سابق ڈائریکٹر تھے۔ ۱۹۵۳ء میں انہوں نے دمشق میں جو تقاریر کیں ان میں یہ ایک اہم نتیجہ حیرت انگیز ہے کہ ایک گہرے اور مسلسل شماریاتی عمل سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ پوری دنیا کی دولت آخر کار چند مٹھی بھر سود خوار مالی اداروں کی طرف لوٹتی نظر آتی ہے۔ اس لئے کہ اس نظام میں روپیہ فراہم کرنے والا فائدہ ہی اٹھاتا چلا جاتا ہے جبکہ قرض لینے والا ہروقت خسارہ اٹھاتا ہے۔ لہٰذا آخر کار شماریات کے عمل کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ دولت ہمیشہ قرض دینے والے سود خواروں کی طرف لوٹتی رہتی ہے۔ ہمارے دور میں شاخت کا نظریہ پوری طرح ثابت ہو چکا ہے۔ اس لئے کہ اس وقت اس کرۂ ارض کی پوری دولت کا حقیقی مالک چند ہزار افراد اور ادارے ہیں۔ دوسرے وہ افراد جو مالک تصور ہوتے' یا کارخانوں کے مالک جو بینکوں سے قرض لیتے ہیں یا وہ لوگ جو ان کارخانوں میں کام کرتے ہیں' یہ سب لوگ دراصل ان مالی اداروں کے کارکن اور ملازم ہیں اور ان کے مفادات کے لئے کام کرتے ہیں یہ چند ہزار افراد اور ادارے اس پوری دنیا کے کارکنوں کی محنت کے نتائج وصول کرتے ہیں۔

سودی اقتصادی نظام کی یہ صرف ایک کمزوری ہے۔ جو نظام بھی سودی لین دین پر مبنی ہو گا' اس میں رقم فراہم کرنے والے اور صنعت و تجارت کے میدانوں میں کام کرنے والوں کے درمیان ہمیشہ مخالفت اور تضاد کا تعلق ہو گا اور وہ ایک جواری کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں اور مسلسل ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہیں۔ قرض دہندہ ہروقت زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے درپے ہوتا ہے۔ اس لئے وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ دولت کو سمیٹے رکھے اور تجارت اور صنعت کو اس کی بے حد ضرورت ہو جائے اور یوں ایک تاجر اور صنعت کار اسے زیادہ سے زیادہ نفع دینے پر آمادہ ہو جائے۔ وہ شرح سود مسلسل بڑھاتا رہتا ہے یہاں تک کہ قرض لینے والے تاجر اور صنعت کار یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کام میں انہیں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ جو کام کرتے ہیں' اس کے نتائج قرض اور سود میں چلے جاتے ہیں' ان کے لئے کچھ نہیں بچتا۔ ایسے وقت مال کا پھیلاؤ ختم ہو کر سکڑتا ہے۔ کارخانے پیداوار بند کر دیتے ہیں۔ کارکن بے روزگار ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے۔ اور جب اقتصادی بحران اس مقام تک پہنچ جاتا ہے تو سود خور اب محسوس کرتا ہے کہ دولت کی طلب ختم ہو گئی ہے' سرمایہ بیکار پڑا ہے تو وہ مجبوراً پھر سود کی شرح کم کر دیتا ہے بلکہ کم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور صنعت کار اور تاجر پھر اس طرف متوجہ ہوتے ہیں اور پھر زندگی میں خوشحالی عود کر آتی ہے۔ یوں یہ دنیا عالمی اقتصادی بحرانوں کا شکار ہوتی رہتی ہے اور ایک عام آبادی اس چکی میں پستا رہتا ہے اور ایک مویشی کی طرح بے خبر رہتا ہے۔

اس نظام میں ہر صارف بالواسطہ سود خوروں کو ان کے حصے کا ٹیکس ادا کرتا ہے۔ اس لئے کہ تاجر اور صنعت کار سود خوروں کو جو نفع ادا کرتے ہیں وہ انہیں اپنی جیب سے نہیں ادا کرتے۔ وہ یہ نفع ایک صارف سے وصول کرتے ہیں۔ وہ اشیائے صرف کی قیمت بڑھاتے ہیں اور یوں یہ سودی رقم پوری انسانیت پر تقسیم ہوتی ہے اور ان سے وصول ہو کر آخر کار سود خوار کے ہاں جمع ہوتی ہے۔ رہے وہ قرض جو حکومتیں ان مالی اداروں سے لیتی ہیں یعنی اصلاحات اور ترقیاتی منصوبوں کے لئے' تو ان کا بوجھ بھی آخر کار ایک عام آدمی پر پڑتا ہے۔

اس لئے کہ حکومت ان قرضوں کا سود ادا کرنے کے لئے لوگوں پر مزید ٹیکس عائد کرتی ہے۔ اور یوں ایک عام آدمی یہ بوجھ بھی اٹھاتا ہے۔ غرض آخر کار ہر شخص سود خوروں کو شرح سود ادا کرنے میں اپنے حصے کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ لیکن اس حد تک بھی یہ معاملہ رکتا نہیں۔ یہ استعماریت صرف سودی لین دین پر آکر نہیں رکتی۔ اس کے بعد اس استحصال کے لئے جنگیں شروع ہوتی ہیں۔

یہاں فی ظلال القرآن میں ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ سودی نظام کے تمام مفاسد گنوا دیں۔ اس کے لئے ایک مستقل بحث کی ضرورت ہے۔ا۔ اس لئے یہاں ہم صرف اس قدر تلخیص پیش کرتے ہیں تاکہ جو لوگ صحیح مسلمان بننا چاہتے ہیں' انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اساسی حقائق کیا ہیں جن کی وجہ سے اسلام نے اس مکروہ سودی نظام کو حرام قرار دیا ہے :-

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں اس کے بارے میں اپنے دل و دماغ کو صاف کر لینا چاہئے۔ وہ یہ کہ اسلام کے ساتھ کسی بھی جگہ سودی نظام جمع نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ جو عالم' جو مفتی بھی جو بات کہے گا وہ فریب کاری ہے۔ اور صریح دھوکہ ہے۔ اس لئے کہ اسلامی تصور حیات بنیادی طور پر سودی نظام سے متصادم ہے۔ سودی نظام کے نتائج جو عوام کے فکر و عمل میں پیدا ہوتے ہیں یا اس کے نتیجے میں جو اخلاقیات پیدا ہوتی ہیں وہ اسلام کے خلاف ہیں۔

۲۔ سودی نظام پوری انسانیت کے لئے ایک مصیبت ہے۔ صرف ایمان اخلاق' اور تصور حیات کے میدان ہی میں نہیں بلکہ خالص اقتصادی زندگی کی گہرائیوں میں بھی ایک عذاب ہے۔ یہ نظام انسان کی خوشحالی اور فلاح پر ڈاکہ ڈالتا ہے اور انسانیت کی متوازن نشوونما کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ حالانکہ بظاہر اس نظام پر یہ جعلی لیبل لگایا گیا ہے کہ وہ پوری انسانیت کی اقتصادی ترقی کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

۳۔ اسلام میں عملی نظام اور اخلاقی نظام کا باہم چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسلام میں تصور یہ ہے کہ اپنے تمام معاملات اور تصرفات میں انسان اس عہد کا پابند ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے۔ اور اس کے تمام تصرفات شرط خلافت سے مشروط ہیں۔ اور یہ کہ یہاں اس کی پوری زندگی امتحان گاہ میں ہے۔ وہ بطور آزمائش یہاں بھیجا گیا ہے۔ اور اس نے اپنی پوری زندگی کا حساب و کتاب ایک دن دینا ہو گا۔ اسلامی نظام زندگی نہ تو صرف اخلاقی نظام ہے جو صرف چند اخلاقی ہدایات پر مشتمل ہو اور نہ ہی صرف عملی نظام ہے' یہ بیک وقت اخلاقی اور عملی ہدایات پر مشتمل نظام زندگی ہے۔ اگر اس نے اچھی طرح اس نظام کو اپنایا تو اسے اس کی پوری زندگی پر اس طرح اجر ملے گا' کہ گویا اس نے عبادت کی۔ اور اگر اس نے اسے ترک کیا تو بعینہٖ اسی طرح اسے آخرت میں ان دو پہلوؤں پر سزا دی جائے گی۔ چنانچہ اسلام کا اقتصادی نظام اس کے اخلاقی پہلو کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ اور اسلام کے اقتصادی اخلاقیات کوئی غیر لازم عمل نہیں ہے بلکہ اسلام کے اقتصادی نظام کا وہ لازمی جزو ہیں۔ ان کے بغیر اسلام کا عملی اقتصادی نظام چل ہی نہیں سکتا۔

۴۔ چوتھی بات یہ ہے کہ سودی کاروبار کے نتیجے میں لازماً انسانی ضمیر مردہ اور خراب ہو جاتا ہے۔ انسان کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں۔ دوسرے بنی نوع انسان کے حق میں ایک سود خوار کارویہ اور اس کے جذبات اچھے نہیں رہتے۔ انسانی معاشرہ کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ معاشرے کی اجتماعی کفالت کا انتظام خراب ہو جاتا ہے۔ سودی نظام کی وجہ سے عوام کے اندر طمع' لالچ' خود غرضی' دھوکہ بازی اور قمار بازی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ دور جدید کے ماہرین اقتصادیات سود خوری کو اس بات کی بڑی وجہ تصور کرتے ہیں کہ جس کی وجہ سے سرمایہ گھٹیا درجے کے غیر پیداواری مصارف کی طرف بہہ نکلتا ہے' تاکہ سرمایہ کاری پر یقینی فائدہ حاصل ہو۔

ا۔ اس سلسلے میں وہ قیمتی مباحث قابل ملاحظہ ہیں جو علامہ العظیم سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلام اور جدید اقتصادی نظریات کے نام سے لکھی ہیں۔ (سید قطب)

اور سود ادا کرنے کے بعد اس سے قرض حاصل کرنے والے کے لئے بھی کچھ بچ جائے۔ یہی جذبہ ہے جس کی وجہ سے گھٹیا درجے کی گندی فلموں' گندی صحافت' رقص گاہوں' عیاشی کے اڈوں' شراب خانوں اور ان تمام مصارف میں سرمایہ لگایا جاتا ہے جو اخلاق کے لئے تباہ کن ہوتے ہیں اور جن کے ذریعہ اخلاقی توڑ پھوڑ کا عمل جاری رہتا ہے اور سودی نظام کے تحت ایسے کاموں میں سرمایہ کاری نہیں کی جاتی جو انسانیت کے لئے مفید ہوں بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایسے منصوبوں میں سرمایہ لگایا جائے جن سے زیادہ سے زیادہ نفع ملے۔ آج کی عالمی اقتصادیات میں یہ روزانہ کا مشاہدہ ہے۔ اور اس کا پہلا سبب سودی کاروبار کا موجودہ نظام ہے۔

۵۔ پانچواں نکتہ یہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی ایک مکمل نظام حیات ہے جو باہم مربوط ہے۔ وہ جب سودی کاروبار کو حرام قرار دیتا ہے تو وہ ایک ایسا نظام تیار کرتا ہے' جس میں اس سودی کاروبار کی طرف سے کوئی احتیاج ہی نہیں رہتی۔ وہ اقتصادی زندگی کی تشکیل و تنظیم یوں کرتا ہے کہ کسی شعبے میں سرے سے اس کی ضرورت ہی نہ رہے۔ اور اس سے انسان کی معاشی ترقی کا کوئی گوشہ بھی متاثر نہیں ہوتا۔ اجتماعی اقتصادی ترقی جاری رہتی ہے۔

۶۔ ششم نکتہ یہ ہے کہ جب اسلامی نظام زندگی کو اپنا نظام نافذ کرنے کا موقعہ ملے گا' تو اس کی پالیسی یہ نہ ہوگی کہ وہ اجتماعی ترقی کے اداروں کو سرے سے ختم کردے بلکہ پالیسی یہ ہوگی کہ ان اداروں کو سودی کاروبار سے پاک کردیا جائے۔ چنانچہ ان اداروں سے سودی نجاست کو ختم کردیا جائے گا۔ یہ ادارے بعض دوسرے اصولوں پر منظم ہوں گے اور اجتماعی ترقی کے لئے کام کرتے رہیں گے۔ ان اداروں میں بینک' کمپنیاں اور جدید اقتصادی ادارے سب شامل ہیں۔

۷۔ یہ نہایت ہی اہم نکتہ ہے۔ ایک مسلمان کو یہ پختہ یقین کرلینا چاہئے کہ یہ بات بالکل محال ہے کہ اللہ تعالیٰ سودی کاروبار کو حرام کردیں اور پھر صورت حال یہ ہو کہ انسان کی اجتماعی زندگی غیر سودی کاروبار کے ذریعہ چل ہی نہ سکے۔ اسی طرح یہ بھی محال ہے کہ ایک ناپاک' نجس اور مضر چیز ہو اور انسانی زندگی اس کے بغیر استوار نہ ہوسکتی ہو۔ اس لئے کہ اللہ ہی اس کرۂ ارض پر حیات انسانی کا خالق ہے۔ اسی نے اس کرۂ ارض پر انسان کو اپنا خلیفہ قرار دیا ہے اور خود ذات باری کا حکم ہے کہ اس کرۂ ارض پر حیات انسانی کو ترقی دی جائے اور انسان کو سہولیات فراہم کی جائیں۔ ہر کام اللہ تعالیٰ کے ارادے سے ہی سرانجام پاتا ہے۔ وہی ہے جو انسان کو توفیق دیتا ہے کہ وہ اس جہاں میں بھلائی کرے۔ اسی لئے نظریاتی حوالے سے یہ بات محال ہے کہ کوئی چیز اللہ کے ہاں حرام ہو اور اس کے ساتھ ساتھ وہ زندگی کی ترقی اور نشوونما کے لئے ضروری ہو۔ اس کے سوا زندگی میں ترقی نہ کی جاسکتی ہو۔ یا کوئی بھی گندی اور خبیث چیز ایسی ہو' جس کے سوا زندگی قائم نہ رہ سکتی ہو یا اس کے سوا اس جہاں میں زندگی کو ترقی نہ دی جاسکتی ہو جو شخص یہ سوچ رکھتا ہو' یقیناً اس کی یہ سوچ غلط ہے۔ اس کا یہ دعویٰ زہر آلود اور یہ تصور غلط تصور ہے۔ جسے نسلاً بعد نسل پھیلایا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ سودی نظام دنیا کی ترقی اور نشوونما کے لئے سنگ میل ہے۔ اور یہ کہ سودی نظام ایک قدرتی نظام ہے۔ اس تصور کو دراصل ایک منظم سازش کے ذریعہ تعلیم و ثقافت کے سرچشموں میں داخل کردیا گیا ہے اور شرق و غرب میں علوم اور تربیت کے منابع کے اندر اسے داخل کردیا گیا ہے پھر دور جدید میں ' زندگی کی اساس اس نظام پر استوار کردی گئی ہے۔ اور یہ کام ان افراد اور ایجنسیوں نے کیا ہے جو اس نظام میں سرمایہ فراہم کرنے والی ہیں۔ مشکل یہ درپیش ہے کہ ہر کسی کو زندگی کا نظام سود کے سوا کسی دوسری اساس پر قائم کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ یہ مشکل اس وقت ایک بھیانک شکل اختیار کرلیتی ہے جب ایک انسان دولت ایمان سے محروم ہو۔ پھر ذہنی غلامی اور آزادانہ غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے بھی یہ کام مشکل نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ سرمایہ فراہم کرنے والی ایجنسیوں نے یہ وہم انسانی دل و دماغ میں یقین کی صورت میں جانشین کردیا ہے۔ اس لئے کہ ذرائع علم و معرفت پر ان کا مکمل کنٹرول ہے۔ بین الاقوامی

اداروں اور حکومتوں پر ان ایجنسیوں کو مکمل کنٹرول حاصل ہے۔ عام اور خاص نشرو اشاعت کے اداروں پر ان سود خوروں کا مکمل قبضہ ہے۔

۸۔ آٹھویں بات یہ ہے کہ جو لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ دور جدید میں سودی نظام کے علاوہ کسی اور نظام پر اقتصادی نظام استوار نہیں ہو سکتا' دراصل ایک بے حقیقت وہم ہے۔ یہ دراصل ایک بہت بڑا جھوٹ ہے اور یہ جھوٹ اس لئے رائج ہے کہ بعض طاقتور بین الاقوامی ادارے اسے محض اپنی مصلحت کے لئے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ جس وقت بھی بین الاقوامی مالی اداروں کی نیت درست ہوگی۔ جس وقت بھی پوری انسانیت اس نظام کو بدلنے کا عزم کرے گی یا کم از کم امت مسلمہ اس کی تبدیلی کا ارادہ کرے گی اور یہ ٹھان لے گی کہ اب وہ بین الاقوامی مالی اداروں کے چنگل سے آزاد ہونا چاہتی ہے اور وہ اپنی بھلائی کا انتظام خود کرتی ہے' اپنی خوشحالی اور ترقی کے نظام کی اساس' اخلاق اور پاکیزگی پر استوار کرتی ہے تو اسی وقت دنیا کے سامنے بالکل ایک نیا مالی نظام استوار ہو کر سامنے آ جائے گا۔ یہ اسلامی نظام ہو گا اور جسے اللہ تعالیٰ نے تمام انسانیت کے لئے پسند کیا ہوا ہے۔ جس کا نفاذ عملاً ہو چکا ہے۔ اس کے سائے میں زندگی نے بھرپور مظاہرہ کیا ہوا ہے۔ اب بھی یہ نظام قابل نفاذ ہے اور اس کے تحت اقتصادی نظام منظم ہو سکتا ہے' لیکن شرط یہ ہے کہ لوگ سمجھیں اور راہ ہدایت پالیں۔

یہاں ہم وہ تفصیلات نہیں دے سکتے جن سے اس نظام کی مکمل تفصیلات اور جزئیات سے بحث کی جاسکے۔ یہاں ہمارے لئے یہ اجمالی اشارات ہی کافی ہیں ا۔ ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سود خوری کی یہ برائی اقتصادی زندگی کی ضروریات میں سے نہیں ہے۔ تاریخ انسانیت میں اس سے پہلے بھی یہ سودی نظام چھا گیا تھا اور اسلام نے انسانیت کو اس کے چنگل سے آزاد کرایا تھا۔ آج بھی انسانیت نے اقتصادی بے راہ روی اختیار کر لی ہے۔ اور اسے اس بے راہ روی سے صرف اسلام کا محکم' رحیمانہ اور سلیم الفطرت نظام نجات دلا سکتا ہے۔

اب ذرا تفصیل سے ملاحظہ کیجئے کہ سود کے تلخ اقتصادی نظام پر اسلام کس طرح حملہ آور ہوتا ہے۔ اس نظام نے انسانیت کو ان تلخیوں سے دوچار کر دیا ہے۔ جس سے زیادہ کوئی اور تلخی انسانیت کو کبھی نصیب نہیں ہوئی۔

☆ ☆ ☆

---

ا اس سلسلے میں بعض عملی تجاویز مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے پیش کی ہیں جن کا حوالہ میں اس سے پہلے دے چکا ہوں۔ ان پر غور کیا جاسکتا ہے۔ (سید قطب)

# درس نمبر ۲۰ تشریح آیات

## آیت نمبر ۲۷۴ تا ۲۸۱

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ
مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ
الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ
وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾
يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾

جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو اور اس حالت میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: "تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے" حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ لہٰذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت آپہنچے اور آئندہ وہ سود خواری سے باز آجائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا سو کھا چکا اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے، وہ جہنمی ہے، جہاں وہ ہمیشہ رہیگا۔ اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔"

یہ ایک خوفناک جملہ ہے اور دہشتناک تصویر کشی ہے۔ لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ........ "ان کا حال اس شخص جیسا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو۔"

قرآن کریم نے سود خور کی جو تصویر کھینچی ہے جس طرح سود خوار کو زندہ اور متحرک شکل میں پیش کیا ہے۔ اس جیسی تاثیر اور تنبیہ حسین سے حسین معنوی اور نظری پیرایہ اظہار میں نہیں پیدا کی جاسکتی۔ یہ ایسی تصویر کشی ہے جس کے نتیجے میں سود خوار کی تصویر الگ محسوس اور پیش پا افتادہ پیرائے میں نظر آتی ہے۔ اس تصویر کے ذریعے معروف اور عام طور پر تجربے میں آنیوالے کرداروں کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قرآن لوگوں کے اس دیکھے ہوئے کردار کو ان کی نظروں میں تازہ کرتا ہے تاکہ یہ کردار انسانی احساس میں خوف پیدا کرے، سرمایہ کاری کرنے والے سود خوروں کے انسانی جذبات جاگیں اور متحرک ہوں۔ انہیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ان کے مروج اور عادی سودی نظام

اقتصادیات سے انہیں نکالا جائے۔ اور انہیں لالچ اور خود غرضی کی اس فضاء سے نکالا جائے جس میں انہیں بہت سے فائدے نظر آتے ہیں۔ اپنی جگہ یہ انداز تربیت بہت ہی مفید ہوتا ہے جبکہ یہ پیرایہ بیان اپنی جگہ حقیقت پسندانہ اور واقعی بھی ہوتا ہے۔

اکثر تفاسیر میں لَا يَقُومُونَ ...... کا مفہوم یہ بیان ہوا ہے کہ اس سے مراد روز قیامت کا قیام اور حشر ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر ہماری زندگی میں بھی خوفناک تصویر عملاً موجود ہوتی ہے۔ نیز یہ مفہوم کہ دنیا میں سود خوار کی حالت ایسی ہوتی ہے اگلے فقرے کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہوتا ہے کہ جو لوگ سودی نظام کو ترک نہیں کرتے وہ دراصل اللہ تعالیٰ کے ساتھ اعلان جنگ کر رہے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ عالم اقتصادیات میں یہ جنگ مسلسل لڑی جارہی ہے اور گم کردہ راہ انسانیت پر یہ جنگ مسلط ہے اور اس نظام میں ایک سود خور اسی طرح دیوانہ وار تگ و دو میں مصروف ہے جس طرح شیطان کا چھوا ہوا شخص دیوانہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم سود خور کی دیوانگی کو زندگی کے عملی نظام میں تلاش کریں ذرا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے دور میں نزول قرآن کے وقت سودی اقتصادی نظام جس نہج پر چل رہا تھا ذرا اس کی تصویر کشی کر دیں۔ نیز یہ کہ اس سودی نظام کے بارے میں اہل جاہلیت کے ماہرین اقتصاد کے تصورات کیا تھے۔

سودی نظام عرب اقتصادیات میں نزول قرآن کے وقت ایک معروف نظام تھا اور اس وقت اچھی طرح مروج تھا۔ جس سودی نظام کو ان آیات میں باطل قرار دیا گیا ہے اس کی بڑی دو صورتیں اس وقت رائج تھیں۔ ایک "ربائے میعاد" اور دوسری "ربائے فاضلہ" ربائے معیاد کے بارے میں حضرت قتادہ فرماتے ہیں "یوں ہوتا کہ ایک شخص کسی پر کچھ فروخت کرتا اور ادائیگی ثمن کے لئے وقت مقرر ہو جاتا۔" جب مقررہ وقت آپہنچتا تو مدیون کے پاس رقم نہ ہوتی تو قرض خواہ میعاد میں اضافہ کر دیتا لیکن زر ثمن میں بھی اضافہ کر دیتا۔" .... اور حضرت مجاہد فرماتے ہیں "جاہلیت میں ایسی صورت پیش آتی کہ ایک شخص کا دوسرے کے ذمے قرض ہوتا تو قرض دار قرض خواہ کے سامنے یہ تجویز پیش کرتا کہ آپ قرض میں تاخیر کر دیں اور اس کے عوض آپ کیلئے یہ رقم ہوگی چنانچہ قرض خواہ موخر کر دیتا۔" امام ابوبکر الجصاص اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں "یہ بات طے شدہ ہے کہ جاہلیت میں مروج ربا کی حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک قرض ہوتا تھا اور اس میں ایک مقررہ شرح کے عوض میعاد مقرر ہوتی تھی اور شرح سود کا اضافہ اس معیاد کا معاوضہ ہوتا تھا جو مدیون کو دی جاتی تھی' اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا۔"

امام رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "میعادی ربا وہ تھی جو جاہلیت میں معروف اور مروج تھی۔ ان میں سے کوئی اپنا مال دوسرے پر ادھار فروخت کرتا اور ہر مہینہ میں ایک مقرر شرح سے سود وصول کرتا اور اصل زر ثمن اپنی جگہ قائم رہتا جب بھی میعاد پہنچی سرمایہ دار سرمایہ کی واپسی کا مطالبہ کرتا۔ اگر مدیون ادا نہ کر سکتا تو وہ سرمایہ اور میعاد دونوں میں اضافہ کر دیتا۔"

حضرت اسامہ ابن زید ﷺ کی حدیث میں یہ بات آئی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: لَا رِبَا اِلَّا فِی النَّسِیئَۃِ ...................... "سود صرف میعاد میں ہوتا ہے" (بخاری' مسلم)

"ربائے فاضلہ" دراصل اجناس کے باہم تبادلہ میں ہوتی یعنی ایک جنس کا تبادلہ اسی جنس سے ہو رہا ہو' مثلاً سونے کا تبادلہ سونے سے روپے کا تبادلہ روپے سے' گندم کا تبادلہ گندم سے' جو کا تبادلہ جو سے ہو رہا ہو تو اس میں اگر کوئی فریق زیادہ لے گا تو وہ سود ہو گا۔ اس قسم کے تبادلہ اجناس کو سود میں اس لئے شامل کیا گیا کہ یہ سودی کاروبار کے ساتھ بالکل ہم جنس اور ہم شکل ہے۔ اس میں بھی وہی جذبات کارفرما ہوتے ہیں جو سودی کاروبار کرنے والے تجار کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ جدید سودی نظام اقتصادیات پر بحث کرتے

وقت ہمیں "ربائے فاضلہ" کے متعلق وارد ہونے والی حرمت پر زیادہ غور کرنا ہوگا۔

حضرت ابو سعید خدری ؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سونا سونے کے عوض' چاندی چاندی کے بدلے' گندم گندم کے بدلے' جو جو کے بدلے کھجور کھجوروں کے بدلے' نمک نمک کے بدلے برابر برابر ہوں گے اور دستی ہوں گے' جس شخص نے اضافہ کیا یا اضافے کا مطالبہ کیا تو گویا اس نے سود کیا۔ سودی معاملات میں لینے والا اور دینے والا دونوں برابر ہیں" (شیخان)

حضرت ابو سعید خدری ؓ سے ایک دوسری روایت میں مروی ہے فرماتے ہیں: "حضرت بلال حضور ﷺ کے پاس "برنی" کھجور لیکر آئے۔" حضور ﷺ نے فرمایا بلال! یہ کہاں سے لائے؟ فرمایا ہمارے پاس ردی قسم کی کھجوریں تھیں تو ہم نے انہیں ایک صاع کے بدلے دو صاع کے ساتھ تبادلہ کر دیا۔ تو آپ نے فرمایا "بہت افسوس) یہ تو عین ربا ہے۔ ایسا نہ کیا کرو اگر کبھی تمہیں بدلنے کی ضرورت پڑے تو ردی کھجوروں کو علیحدہ سودے میں فروخت کردو اور پھر رقم کے عوض اچھی خرید لو۔" (بخاری' مسلم)

ربائے میعادی (ربا النسیہ) بالکل واضح ہے' اسکے بارے میں کسی قسم کی تشریح کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسی میں سودی معاملہ کے تمام اجزاء بالکل واضح نظر آتے ہیں یعنی یہ کہ اصل زر پر اضافہ وہ میعاد جس کی وجہ سے یہ اضافہ کیا گیا اور یہ کہ اس اضافے کا سودی معاہدہ میں بطور شرط طے پانا یعنی سرمایہ کی وجہ جلب از بوجہ میعاد اور مدت ایک خالص سودی معاملہ ہے۔

رہی دوسری قسم یعنی ربائے فاضلہ تو یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ اس میں ہم جنس تبادلہ میں آنیوالی اشیاء کی نوعیت اور قیمت میں بنیادی طور پر فرق ہوتا ہے جس کی وجہ سے اضافہ کا تقاضا پیدا ہوتا ہے۔ حضرت بلال ؓ کے واقعہ میں یہ بات واضح ہو کر آجاتی ہے کہ انہوں نے دو ردی صاع کھجوریں دیں اور ایک صاع اعلیٰ قسم کی لے لیں لیکن دو قسم کی کھجوریں چونکہ ہم جنس ہیں اور دونوں پر کھجور کا اطلاق ہوتا ہے اس لئے ان میں اضافہ سودی کاروبار کا شبہ پیدا کرتا ہے کیونکہ کھجور کے بدلے کھجور ہی آتی ہے اور اضافے کو حضور ﷺ نے ربا قرار دیا اور اس سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ پہلے ردی اور گھٹیا چیز کو فروخت کر کے نقد وصول کرو اور پھر نقد دے کر اچھی چیز لے لو' چاہے اس میں کمی بیشی ہو تاکہ بظاہر معاملے میں سودی کاروبار کا شبہ نہ رہے۔

اسی طرح ایسے تبادلہ میں یہ شرط بھی لگائی گئی کہ ایک تو مقدار برابر ہو اور دوسری یہ کہ ہم جنس اشیائے مبادلہ کو حالاً اپنے اپنے قبضے میں لیا جائے۔ اس سلسلے میں کوئی میعاد مقرر نہ ہو یعنی اگر زیادت نہ بھی ہو تو بھی قبضہ فوری ضروری ہے۔ اس لئے کہ مدت اور میعاد سودی کاروبار کا اہم جز ہے...... اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کاروبار میں سودی عنصر کے خلاف کس قدر حساس تھے۔ آپ نے اس معاملے میں بے حد سختی کر کے اس وقت نظام جاہلیت میں رائج و شائع سودی نظام کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

ہمارے زمانے میں مغرب کے سرمایہ دارانہ نظاموں کے مقابلے میں شکست خوردہ بعض ماہرین اقتصادیات یہ کوشش کرتے ہیں کہ سودی عمل و نظام کو صرف اس شکل میں محدود کر دیا جائے جسے اسلامی اقتصادیات میں "ربائے میعاد" کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ حضرت اسامہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں یا ان آثار سے استدلال کرتے ہیں جن میں بعض سلف صالحین نے دور جاہلیت میں مروج ربا کی شکلوں کو بیان کیا ہے۔ یہ لوگ اسلامی نقطۂ نظر سے دور جدید کے سودی نظام کو ان تمام جدید شکلوں کو جائز گردانتے ہیں جو حرف بحرف دور جاہلیت میں مروج شکلوں کے ساتھ منطبق نہ ہوں۔

ان لوگوں کی یہ حرکت اور یہ سعی لاحاصل صرف اس بات کا اظہار کر دیتی ہے کہ یہ لوگ روحانی اور ذہنی طور پر مغربی سودی نظام کے مقابلے میں بری طرح شکست کھا چکے ہیں۔ اسلام کوئی ایسا نظام نہیں ہے جس میں معاملات کی صرف ظاہری شکل دیکھ کر فیصلہ کر دیا جاتا ہو۔ یہ نظام ایک حقیقی تصور حیات پر قائم ہے۔ اس نے جب ربا کو حرام قرار دیا تو مقصد یہ نہ تھا کہ ربا کی صرف ایک شکل کو حرام قرار

دیدیا جائے اور دوسری شکلوں کو ترک کر دیا جائے۔ اسلام ہر اس تصور حیات کا مقابلہ کرتا ہے جو اس کے اپنے تصور حیات کے خلاف ہو۔ وہ ہر اس ذہنیت سے بر سرپیکار ہوتا ہے جو اس کی ذہنیت کے مطابق نہ ہو۔ اس نے "ربائے فاضلہ" کو محض اس لئے حرام قرار دیا کہ اس میں بظاہر سودی ذہنیت کی ایک مماثلت پائی جاتی تھی اور بالکل ایک معمولی سودی شعور پایا جاتا تھا۔

اس لئے ہمارے نزدیک تمام سودی معاملات حرام ہیں۔ چاہے وہ ان سودی معاملات سے ہم شکل ہوں جو دور جاہلیت میں مروج تھے یا جاہلیت جدیدہ میں نئی شکلوں میں سامنے آئے ہیں۔ بشرطیکہ ان شکلوں میں سودی معاملہ کے اساسی عناصر ترکیبی پائے جاتے ہوں یا ان میں سودی ذہنیت کارفرما ہو اور یہ سودی ذہنیت کیا ہے؟ وہ خود غرضی 'لالچ' انفرادیت اور قماربازی ہے جن میں یہ خبیث شعور اور بری نیت پائی جاتی ہے کہ جس طرح ہو فائدہ حاصل کیا جائے چاہے جس طرح بھی ہو۔

اس لئے دور جدید میں اہل اسلام کا فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح پالیں اور اس بات کا یقین کرلیں کہ کہیں وہ اپنے معاملات میں سودی کاروبار کر کے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ اعلان جنگ تو نہیں کر رہے۔

**اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ**

..................... "جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو۔" اس سے مراد صرف وہ لوگ نہیں ہیں جو سودی منافع کھاتے ہیں اگرچہ اس خوفناک دھمکی کا پہلا نشانہ یقیناً وہی ہیں اس آیت کے مفہوم میں وہ معاشرہ بھی شامل ہے جس کا تمام لین دین سودی اصولوں پر ہوتا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ ؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ سود کھانے والے سود کھلانے والے' سودی معاہدے کے دو گواہوں اور سودی دستاویز لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی اور فرمایا کہ وہ سب کے سب برابر ہیں۔" (مسلم' احمد' ابوداؤد' ترمذی)

یہ تو تھے وہ لوگ جو فرداً سودی معاملے کرتے ہیں۔ رہا وہ معاشرہ جس میں سودی کاروبار ہوتا ہے جس کا اقتصادی نظام اصول ربا پر قائم ہے تو اس معاشرے کے تمام افراد قابل لعنت و ملامت ہیں۔ وہ اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں اور بے شک وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہیں۔

ایسے لوگوں کی حالت یہ ہوئی کہ وہ اس زندگی کے ہر موقف میں یوں نظر آتے ہیں کہ گویا وہ آسیب زدہ ہیں۔ پریشان اور مضطرب نظر آتے ہیں ایک نامعلوم خوف اور خطرہ ہروقت ان کے چہروں سے عیاں ہوتا ہے اور دولت اطمینان سے محروم اور مخبوط الحواس نظر آتے ہیں۔ آج سے چار صد سال قبل جب سودی اصول پر مبنی نظام سرمایہ داری وجود میں آیا۔ اس نظام کی ان مضرتوں میں شک و شبہ کی گنجائش موجود تھی لیکن گزشتہ چار سو سالوں کے تجربے نے اس شک کے لئے اب کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔

آج ہم جس جہاں میں رہ رہے ہیں۔ اس کے اطراف و اکناف میں قلق و اضطراب اور خوف خطرات کا دور دورہ ہے' لوگوں کے اعصاب شل ہو چکے ہیں اور وہ نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہیں۔ ہماری اس ترقی یافتہ دنیا کے عقلاء' مفکرین علماء اور پروفیسر کھلے بندوں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں اور جن لوگوں نے مغربی تہذیب اور مغربی معاشروں کا مشاہدہ کیا ہے وہ چشم سران بیماریوں اور اعصاب شکن حالات کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ اس کے باوجود کہ مغربی معاشرہ' مغربی تہذیب کے زیر سایہ اپنی مادی ترقیات کے حوالے سے آج بھی بام عروج پر ہے۔ ان ممالک میں مجموعی پیداوار کا گراف بہت ہی اونچا ہے۔ ہر طرف خوشحالی اور مادی عروج کے مظاہرے ہیں اور نظروں کو چکاچوند کر رہے ہیں۔ اعصابی اور نفسیاتی بیماریوں کے علاوہ یہ معاشرے ہروقت عالمگیر جنگوں کے خطرات سے دوچار ہیں۔ حکومتوں کے درمیان ایک نہ ختم ہونے والی اعصابی کشمکش جاری ہے اور وہ معاشرے ایک نہ ختم ہونے والی اضطراری کیفیات کا شکار ہیں اس لئے کہ ان

کے سر پر ایک نہ ختم ہونے والی جنگ کے خطرات منڈلا رہے ہیں۔

مصائب سے پر اور ہر بھلائی سے محروم ایک ہمہ گیر شقاوت و بدبختی جو جہان مغرب پر چھائی ہوئی ہے اور مغرب کی خالص مادی تہذیب و تمدن کے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔مادی خوشحالی اور مادی زندگی کی ہمہ گیر سہولتوں اور مغربی ممالک کی اکثریت جہاں زندگی نہایت ہی آسان ہے اور اشیاء ضرورت کی فراوانی ہے اس میں ان بیماریوں کا کوئی علاج نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان تمام سہولیات اور فراوانیوں کی کیا قدر و قیمت رہ جاتی ہے۔ اگر ان کی وجہ سے نفس انسانی کو تسلیم و رضا اور طمانیت اور سکون حاصل نہ ہو؟

دور جدید میں یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے اگر کوئی چاہے تو مشاہدہ کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ خود اپنی آنکھوں پر از خود وہ مصنوعی پردے نہیں ڈال دیتا جو اس نے خود اپنے لئے تیار کئے ہیں تاکہ وہ بھیانک منظر نہ دیکھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کرہ ارض کے وہ تمام ممالک جو مادی لحاظ سے ترقی یافتہ ہیں۔ جہاں زندگی کی تمام سہولیات وافر مقدار میں فراہم کی جارہی ہیں۔ مثلاً امریکا' سوئٹزرلینڈ' وغیرہ جہاں مادی سہولیات کے دریا بہہ رہے ہیں' وہاں کے لوگوں کو دیکھو تو وہ خوشحال ہونے کی بجائے پریشان حال ہیں۔ وہ گہرے قلق میں مبتلا ہیں۔ یہ اندرونی رنج و الم ان کی نظروں سے آنسوؤں کی طرح ٹپک رہا ہے' حالانکہ بظاہر وہ بڑے دولتمند ہیں۔ وہ رات دن میں پیداوار (Production) کے اضافے میں مصروف ہیں لیکن یہ اندرونی قلق ان کی زندگی کو گھن کی طرح کھائے جارہا ہے۔ اس قلق کو کبھی تو وہ بداخلاقیوں کا ارتکاب کرکے چھپاتے ہیں کبھی شور و شغب میں اسے بھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی وہ عجیب و غریب حرکات کا ارتکاب کرکے اسے بھلانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سے بھی مسئلہ حل نہ ہو تو وہ جنسی آوارگی میں پناہ لیتے ہیں۔ اگر پھر بھی افاقہ نہ ہو تو پھر وہ اس ترقی یافتہ اور آسائشوں سے بھرپور زندگی سے فرار اختیار کرتے ہیں۔ اپنے آپ سے بھاگتے ہیں۔ اس خلاء سے بھاگنا چاہتے ہیں جس میں وہ جی رہے ہوتے ہیں۔ انہیں اس پرکشش اور سہولیات سے بھرپور زندگی میں اس قلق و اضطراب کا کوئی منطقی سبب بھی نظر نہیں آتا چنانچہ وہ یا تو پاگل ہو کر اس سے نجات پاتے ہیں اور پھر بھی نہ ہو تو وہ خودکشی کرکے نجات پاتے ہیں۔ جنسی بے راہ روی تو ایک عام بات ہے۔ غرض قلق و اضطراب کا خلا اور گمشدگی کا یہ بھوت بدستور ان کا پیچھا کرتا رہتا ہے اور کسی وقت بھی ان کو چین لینے نہیں دیتا۔

سوال یہ ہے کہ یہ مغربی مادی معاشرہ اس صورت حال سے کیوں دوچار ہے اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اپنی مادی ترقیات کے باوجود مغرب کی روح اندر سے خالی اور تہی دامن ہے۔ وہ سرگرداں گم کردہ راہ ہے اور یہ روح اطمینان سے محروم' اہل مغرب کو روحانی غذاء اور دوا کی ضرورت ہے اور روحانی علاج بغیر ایمان کے نصیب نہیں ہو سکتا۔ اطمینان صرف ذکر الٰہی سے نصیب ہوتا ہے جس سے روح مغرب محروم ہے۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ اہل مغرب انسانیت کے مقاصد بلند سے تہی دامن ہیں جو صرف ایمان کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں۔ جن کے خدوخال ایمان سے متعین ہوتے ہیں۔ ان کا تعین اس معاہدۂ خلافت کے تصور سے ہوتا ہے جس کے امر سے انسان کو اس کرۂ ارض پر اللہ کا نائب بنایا گیا ہے۔

اس بڑے سبب کے ضمن میں پھر مغرب کا سودی نظام بھی ان مصائب کا ایک اہم سبب ہے۔ سودی نظام ایک ایسی معصیت ہے جس میں اقتصادیات بظاہر تو ترقی پذیر نظر آتی ہیں لیکن دراصل ان میں کوئی ترقی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ سودی نظام میں ترقی میں اعتدال' توازن اور وسعت نہیں ہوتی۔ اس ترقی کے ثمرات عامۃ الناس تک نہیں پہنچتے۔ بلکہ تمام انسانیت کے مقابلے میں اس کے ثمرات اور اس کی برکات سے صرف سود خور فائدہ اٹھاتے ہیں اور سود خوروں کا بھی ایک قلیل گروہ جو سرمایہ فراہم کرتا ہے اور جو بینکوں اور مالی اداروں کے پس منظر میں ہروقت روپے کھرے کرتا رہتا ہے۔ جو صنعتی اداروں' تجارتی اداروں کو ہروقت مجبور کرتا رہتا ہے کہ وہ ان کے پسندیدہ پروگرام کے مطابق چلتے رہیں اور ان کے مفادات کے لئے کام کریں۔ ان سود خوروں کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کو ان کی

بنیادی ضروریات فراہم کریں یا ایسی پیداوار سامنے لائیں جس میں معاشرے کا اجتماعی مفاد ہو یا یہ کہ عملاً منظم طریقے سے عامۃ الناس کیلئے فراہمی رزق کا بندوبست کریں یا وہ عامۃ الناس کا اطمینان قلب اور سوشل سیکورٹی کے کوئی مقاصد سامنے رکھتے ہوں بلکہ ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ایسی پیداوار مارکیٹ میں لائی جائے جس سے انہیں زیادہ سے زیادہ مفاد حاصل ہو۔ اگرچہ اس پیداوار کے نتیجے میں ہزاروں لاکھوں افراد شکست و ریخت کا شکار ہوں اور لاکھوں کی زندگی تباہ ہو جائے یا لاکھوں افراد شک ' بے اطمینانی اور خوف و خطرے سے دوچار ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بالکل برحق ہے کہ اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ ............ ............ "وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو۔" رسول اللہ ﷺ کے دور میں سود خوروں نے سود کی حرمت پر سخت اعتراضات کئے تھے۔ ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ سودی اقتصادیات کو حرام قرار دینے اور تجارتی لین دین کو جائز قرار دینے کی کوئی حقیقی وجہ ان کے فہم میں نہیں آئی۔ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ............ ............ "اس حالت میں مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں "تجارت بھی تو دراصل سود ہی جیسی چیز ہے۔" حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔"

وہ جس اعتراض اور شبہ پر اعتماد کرتے تھے وہ یہ تھا کہ تجارت بھی ایک نفع بخش عمل ہے اور سود خوری بھی ایک نفع بخش عمل ہے حالانکہ یہ ایک بالکل واہیات قسم کا استدلال تھا۔ اسی لئے کہ تجارتی عمل میں نفع و نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ پھر اس میں شخصی محنت اور مہارت کا بھی عمل دخل ہوتا ہے تجارت میں قدرتی حالات یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ تاجر کو فائدہ ہو یا نقصان ہو لیکن سودی کاروبار میں ہر حالت اور ہر صورت میں فائدہ اور سود متعین ہوتا ہے۔ یہ تجارت اور ربا میں یہ ایک بنیادی فرق ہے اور یہی وہ بڑی علت ہے جس کی وجہ سے ایک کو حلال اور دوسری کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ ہر وہ کاروبار جس میں ہر صورت اور ہر حال میں فائدہ متعین کر دیا گیا ہو وہ حرام ہے اس لئے کہ وہ ربا ہے۔ اس لئے کہ اس میں فائدہ محفوظ و مضمون ہے اور مقرر ہے۔ اس میں کسی ہیرپھیر کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ............ "اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام قرار دیا ہے۔" اس لئے کہ سود کے اساسی عناصر ترکیبی تجارت میں نہیں پائے جاتے۔ نیز تجارت کے جواز کے لیے بہت سے دوسرے اسباب و علل بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ تجارتی سرگرمیاں بنیادی طور پر انسانیت کے لئے مفید ہیں اور سودی لین دین اپنی اصل کے اعتبار سے انسانیت کیلئے تباہ کن ہے۔ [۱]

جب اسلام آیا تو اس دور میں سودی اقتصادیات جس حالت میں فی الواقعہ رائج تھیں اس نے ان کی حقیقت پسندانہ اصلاح کی۔ ایسی اصلاح جس کی وجہ سے نہ کوئی اقتصادی بحران پیدا ہوا نہ اجتماعی نظام میں کوئی اکھاڑ پچھاڑ ہوا۔ فَمَنۡ جَآءَہٗ مَوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ فَانۡتَہٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمۡرُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ ............ ............ "لہٰذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کیلئے وہ سود خوری سے باز آجائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا سو کھا چکا' اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔"

اسلام نے اپنے نظام کا دارومدار وعظ و نصیحت اور اصلاح پر رکھا ہے اور اسی مقصد سے اسلام قانون سازی کرتا ہے۔ جو شخص نصیحت پکڑے۔ اللہ کے حکم کو تسلیم کرتے ہوئے سود خوری سے باز آجائے تو اسلام وہ دولت اس سے واپس نہیں لیتا جو وہ کھا چکا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ قیامت کے دن اس کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہوگا۔ وہ جو چاہے گا فیصلہ کرے گا۔ اس

۱۔ وہ مجمل بحث جو ان موضوعات پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے اور جس کی ہم اس سے پہلے اشارہ کر چکے ہیں وہ ملاحظہ فرمائیں (سید قطب رحمۃ اللہ علیہ)

انداز بیان سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ایام ماضیہ میں جو سود کھایا جا چکا ہے اس کا فیصلہ اللہ کی رضا اور مشیئت پر ہے۔ اس سے ایک مسلمان اور خطاکار مسلمان کے دل میں ہر وقت یہ ڈر رہتا ہے کہ اس نے جو کچھ کیا وہ بہرحال غلط تھا۔ وہ سوچے گا کہ جو سرمایہ گناہ وہ جمع کر چکا ہے بس وہ اس کیلئے کافی ہے اور اگر میں نے آئندہ اس برے عمل سے توبہ و استغفار کے ساتھ اجتناب کیا تو امید کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سابقہ گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ اس لئے مجھے اس سرمایہ میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہئے۔ یوں قرآن مجید اپنے اس منفرد انداز اصلاح کے ساتھ انسانی قلب و شعور کی تربیت کرتا ہے۔

وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ............................ "اور جو اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے وہ جہنمی ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔"

یہ تہدید اور تنبیہ کہ جو دوبارہ اس حرکت کا ارتکاب کرے گا وہ عذاب آخرت کا مستحق ہوگا۔ یہ بتاتی ہے کہ قرآن کریم کا انداز تربیت کیا ہے۔ قرآن کریم انسان کے دل میں خوف آخرت پیدا کر کے اس کی اصلاح کرتا ہے۔

بعض ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جنہیں شاید یہ طویل ڈھیل غرہ میں مبتلا کر دے۔ شاید وہ وعدۂ آخرت کا علم و یقین نہ رکھتے ہوں اور شاید ان کے حساب و کتاب میں عذاب آخرت کا کوئی مقام نہ ہو، اس لئے قرآن انہیں اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ اس دنیا میں بھی سودی نظام نیست و نابود ہوگا اور آخرت میں بھی وہ کالعدم تصور ہوگا۔ قرآن مجید یہ قرار دیتا ہے کہ یہ نظام صدقات ہی ہے جو اس دنیا میں بھی نشوونما پائے گا اور ایک پاکیزہ نظام ہوگا اور آخرت میں بھی وہ موجب اجر ہوگا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ان ہدایات کو تسلیم نہیں کرتے وہ گناہ گار ہیں اور کفریہ اعمال کے مرتکب ہیں اور اللہ تعالیٰ کافروں اور گناہ گاروں سے نفرت کرتے ہیں۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ

............ "اللہ تعالیٰ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔"

اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی سچا ہے اور اس کی وعید بھی یقینی ہے۔ ہمارے اس دور میں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ آج کے دور جدید میں جو معاشرے بھی سودی کاروبار کرتے ہیں ان کے افراد کے دلوں میں سکون اور اطمینان نہیں ہے ان معاشروں سے برکت اٹھ گئی ہے اور خوشحالی اور اطمینان قلب ختم ہے۔

اللہ تعالیٰ ربا کو محو کرنا چاہتا ہے اس لئے وہ ایسے معاشرے پر اپنے فیوض و برکات نازل نہیں فرماتا جس میں ربا کی گندگی پائی جاتی ہو۔ ایسے معاشروں کو وہ قحط اور بدنصیبی سے دوچار کرتا ہے۔ بظاہر تو یوں نظر آتا ہے کہ معاشرے میں ہر سو خوشحالی ہی خوشحالی ہے۔ ہر طرف وافر پیداوار نظر آتی ہے۔ ہر طرف سے وافر مقدار میں آمدن ہو رہی ہے لیکن جس قدر زیادہ آمدن ہو رہی ہے اس قدر برکت نظر نہیں آتی۔ اس طرح کہ انسان اس وافر آمدنی سے پاکیزہ طریقے سے امن و اطمینان کے ساتھ فائدہ اٹھائے۔ اس سے پہلے ہم اس محرومی اور بدنصیبی کی طرف اشارہ کر چکے ہیں جو مغرب کے مالدار اور کثیر آمدنیوں والے ممالک میں لوگوں کے چہروں سے ٹپکی پڑتی ہے اور اس روحانی قلق اور پریشانی کا بیان بھی ہم اس سے قبل کر چکے ہیں۔ جس میں زیادہ دولت مندی کی وجہ سے اضافہ ہی ہو رہا ہے کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ان ممالک کی جانب سے یہ قلق و اضطراب اور یہ محرومی اور بدحالی تمام دنیا میں پھیل رہی ہے۔ اس لئے کہ ان ممالک میں انسانیت ایک دائمی اور مسلسل مہلک جنگ میں مصروف ہے۔ وہاں کے لوگ صبح و شام سرد جنگ میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ شب و روز کے بعد ان کے اعصاب پر زندگی کا بوجھ بھاری ہوتا جا رہا ہے۔ چاہے انہیں اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔ اس ذہنی اور اعصابی کشمکش کی وجہ سے نہ

ان کے مال میں برکت ہوتی ہے' نہ عمر میں برکت ہوتی ہے' نہ ان کی صحت قابل رشک ہوتی ہے اور نہ ان کے دل مطمئن ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس جو معاشرہ اجتماعی تعاون اور باہم کفالت پر استوار ہو' چاہے یہ تعاون بذریعہ صدقات واجبہ ہو یا صدقات نافلہ ہو اور اس معاشرے میں باہم محبت' باہم احسان' باہم رضامندی کی روح کارفرما ہو اور جس میں ہر فرد کی تگ و دو محض اس لئے ہو کہ وہ اللہ کی رضامندی حاصل کرکے اس کے اجر کا مستحق بنے اور جسے ہروقت اطمینان ہو کہ اللہ اس کا مددگار ہے اور وہ صدقہ اور احسان کا اجر اس سے کئی گنا زیادہ دے گا تو ایسے تمام معاشروں پر اللہ تعالیٰ اپنی برکت نازل کرتا ہے' معاشرہ کے افراد پر بھی برکات نازل ہوتی ہیں اور ایسے معاشرہ کی جماعتوں پر بھی فیوض نازل ہوتے ہیں۔ ان کے مال میں برکت ہوتی ہے' ان کے رزق میں فراوانی ہوتی ہے' ان کی صحت میں برکت ہوتی ہے' ان کی قوت میں برکت ہوتی ہے اور ان کے دل اطمینان سے سرشار ہوتے ہیں اور دل برقرار ہوتے ہیں۔

جن لوگوں کو انسان کی موجودہ صورتحال میں یہ حقائق نظر نہیں آتے' وہ اس قسم کے لوگ ہیں جو ان حقائق کو درحقیقت دیکھنا ہی نہیں چاہتے' اس لئے کہ ان کی نفسانی خواہشات یہ تقاضا کرتی ہیں کہ وہ ان حقائق کو نہ دیکھیں۔ یہ لوگ ایسے ہیں جن کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے ہیں اور یہ پردے انہوں نے قصداً ڈالے ہوئے ہیں اور یہ لوگ وہ سود خوار ہیں جن کی ذاتی مصلحت اس میں ہے کہ یہ سودی نظام دائم و قائم رہے' اس لئے یہ لوگ ان حقائق کو نہ دیکھ سکے۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ............................ "اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے' بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔" اس تعقیب اور نتیجے سے یہ بات قطعی طور پر معلوم ہوجاتی ہے کہ سودی نظام اقتصادیات کی حرمت کے بعد بھی اگر کچھ لوگ اس کے جاری رکھنے پر اصرار کرتے ہیں تو وہ گناہ گار اور کفار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے محبت نہیں کرتا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو لوگ بھی اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں ان پر کفر اور گناہ گاری کی صفت کا اطلاق ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنی زبان سے ایک ہزار مرتبہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ............................ کہتے رہیں' اس لئے کہ اسلام صرف زبانی کلمات کا نام نہیں ہے وہ تو ایک مکمل نظام حیات اور طریقہ عمل ہے اور اس کے کسی ایک جزو کا انکار اس بات کو مستلزم ہے کہ وہ سب کا انکار کردے۔ ربا اور سود خوری کی حرمت میں تو کوئی شبہ نہیں ہے اور اسے حلال تصور کرنے اور اس کی اساس پر اپنی اقتصادیات کو استوار کرنے پر یقیناً ایک شخص گناہ گار ہوتا ہے اور کفر کا ارتکاب کرتا ہے۔ نعوذ باللہ منہ۔

اس کفریہ اور غیر صالح نظام زندگی کے بالمقابل اور سودی اقتصادیات کے حامیوں اور حامیوں کے لئے اس حقارت آمیز ڈراوے کے مقابلے میں' قرآن کریم ایمان اور عمل صالح کے باب کا آغاز کرتا ہے جو اس معاملے میں جماعت مسلمہ کی اہم خصوصیات ہیں اور اس ظالمانہ سودی نظام کے بالمقابل جو صالح اسلامی نظام ہے' اس کا مرکزی نکتہ یہاں بیان کیا جاتا ہے' یعنی نظام ربا کے مقابلے میں نظام زکوٰۃ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

☆ ☆ ☆ ☆

ا۔ شرح بعض اشیاء میں ۵ فیصد' ۱۰ فیصد' ۲۰ فیصد تک بڑھ جاتی ہے یعنی معدنیات اور زراعت میں۔

"جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں' ان کا اجر بے شک ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقعہ نہیں ہے۔"

نظام ربا کے صفحہ بالمقابل کا بنیادی عنصر زکوٰۃ ہے اور زکوٰۃ کی ماہیت یہ ہے کہ وہ ایک قسم کا خرچ اور انفاق ہے' جس کا کوئی عوض اس جہاں میں نہیں ہے نہ اس خرچ کے نتیجے میں کچھ واپس ہوتا ہے اور سیاق کلام میں زکوٰۃ کے ذکر سے مقصد یہ ہے کہ یہاں مؤمنین کی اس اہم صفت کو بیان کر دیا جائے نیز اسلامی معاشرہ کی اس اہم صفت کو بیان کر دیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ سودی معاشرہ کے مقابلے میں اس ایمانی معاشرہ میں اطمینان قلب' امن و امان' اللہ کی رضامندی اور برکات الٰہی کے کیا کیا نظارے ہیں اور کس قدر پر کیف منظر ہے اس معاشرے کا۔

زکوٰۃ دراصل ایک ایسے معاشرے کا اصل الاصول ہے جو باہم تضامن اور باہم کفالت پر مبنی ہوتا ہے اور اس معاشرے کے کسی بھی شعبے اور کسی بھی پہلو میں سودی اقتصادیات کا نہ وجود ہوتا ہے اور نہ وہ ان اقتصادیات سے کوئی ضمانت طلب کرتا ہے۔

امت اسلامیہ کے احساس اور خود ہمارے احساسات میں زکوٰۃ کی اصل صورت پریشان اور گم ہو گئی ہے۔ امت مسلمہ کی بدبخت نسلوں نے صدیاں گزر گئیں کہ اسلام کے اقتصادی نظام کو عملاً چلتا ہوا نہیں دیکھا ہے۔ اس نے اسلامی نظام زندگی کا عملی مشاہدہ نہیں کیا کہ وہ خالص ایمانی تصور حیات' خالص نظریاتی تربیت اور نظریاتی اخلاق کی اساس پر قائم ہوا ہو اور وہ انسانیت کو اور انسانی نفسیات کو ایک خاص نہج پر ڈھال رہا ہو اور خود یہ نظام اس طرح ہو کہ اس میں اس کے صحیح تصورات زندہ ہوں' پاک اخلاقی نظام رائج ہو اور اونچی اقدار حیات قائم ہوں اور اس میں اسلام کے اقتصادی نظام کا مرکزی نکتہ زکوٰۃ ہو جبکہ اس کے مقابلے میں تمام دوسرے نظام عملاً ربا کی اساس پر قائم ہوں اور پھر امت دیکھے کہ انسانی زندگی نشو و نما پا رہی ہو اور اقتصادی نظام انفرادی سعی و جدوجہد پر قائم ہو اور اگر باہم تعاون کی کوئی اجتماعی شکل ہو تو وہ ربا سے پاک ہو۔

زکوٰۃ کی اصل شکل و صورت ہمارے دور کی بدبخت اور ہدایت سے محروم نسلوں کے دل و دماغ میں مشتبہ ہو گئی ہے' اس لئے کہ ان نسلوں نے انسانیت کی وہ بلند و برتر خوبصورت تصویر دیکھی ہی نہیں جو نظام زکوٰۃ کے نتیجے میں سامنے آتی ہے۔ موجودہ نسلیں جدید لوگ نظام کے اندر پیدا ہوئیں' اور اسی کے سائے میں پروان چڑھیں اور یہ جدید نظام خالص سودی تصور پر قائم ہے۔ ان نسلوں نے صرف بخل اور کنجوسی' حرص و لالچ اور انفرادیت اور خود غرضی ہی دیکھی ہے جو دور جدید میں ہر کسی کے دلوں پر حکمران ہے۔ اس دور میں دولت محتاجوں اور غریبوں تک صرف قابل نفرت سودی نظام ہی کے ذریعے سے پہنچ رہی ہے۔ لوگ بغیر کسی اجتماعی کفالتی نظام کے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ صرف اس صورت میں انہیں تحفظ ملتا ہے جب وہ خود سرمایہ رکھتے ہوں یا انہوں نے اپنی دولت کا ایک معتدبہ حصہ خرچ کر کے موجودہ سودی نظام کے تحت اپنے آپ کو انشور کرا لیا ہو۔ آج صنعت اور تجارت کو صرف اس صورت میں سرمایہ دستیاب ہوتا ہے۔ جب وہ اسے سودی نظام کے واسطے سے لیں' اس لئے جدید نسلوں کے دل و دماغ پر یہ بات چھا گئی ہے کہ ماسوائے سودی نظام اقتصادیات کے اور کوئی اقتصادی نظام سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور یہ کہ صرف اسی نظام کے تحت زندگی بسر ہو سکتی ہے۔

جدید دور کے انسانوں کے ذہن سے زکوٰۃ کا حقیقی تصور یوں مٹ گیا ہے کہ وہ اسے صرف ایک انفرادی احسان اور نیکی سمجھنے لگے ہیں اور یہ کہ اس کی اساس پر کوئی اجتماعی نظام استوار نہیں ہو سکتا لیکن یہ لوگ حاصلات زکوٰۃ کے عظیم حجم کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ اصل سرمایہ اور منافع دونوں پر واجب ہے اور وہ لوگ بڑی خوشی سے یہ شرح ادا کرتے ہیں جن کی تربیت اسلام نے کی ہوئی ہوتی ہے اور اپنے مخصوص انداز میں کی ہوئی ہوتی ہے۔ وعظ و ارشاد کے ذریعہ' قانون سازی کے ذریعہ اور ایک ایسے نظام زندگی

کے ذریعے جس کا تصور ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہوتا ہے اور اس شرح زکوٰۃ کو ایک اسلامی حکومت بطور ایک لازمی حق کے وصول کرتی ہے' یوں نہیں کہ کوئی بطور خیرات یہ حق ادا کرے اور اس عظیم فنڈ سے ان تمام لوگوں کی کفالت ہوتی ہے' جن کے لیے اپنے ذاتی وسائل ناکافی ہو جائیں اور حالت یہ ہوتی ہے کہ معاشرے کا ہر فرد یہ ضمانت پالیتا ہے کہ اس کی زندگی اور اس کی اولاد کی زندگی محفوظ ہے اور ہر حالت میں محفوظ ہے۔ اس فنڈ میں سے ان لوگوں کے قرضے بھی ادا کئے جاتے ہیں جو قرضوں کے بوجھ تلے دب جائیں چاہے یہ تجارتی قرضے ہوں یا غیر تجارتی ہوں۔

اسلام میں اہمیت اس بات کو حاصل نہیں ہے کہ کسی نظام کی ظاہری شکل وصورت کیسی ہے۔ اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ کسی نظام کی روح کیسی ہے۔ اسلام اپنی تربیت اور ہدایت' اپنے قانونی نظام اور ضابطہ بندی اور اپنے پورے نظام کے ذریعہ جس قسم کی سوسائٹی وجود میں لانا چاہتا ہے۔ وہ سوسائٹی اس کے نظام کی شکل وصورت' اس کے اجزاء اور اداروں اور اسکی حکمت عملی کے ساتھ مکمل طور پر مناسب اور متناسق ہوتی ہے۔ وہ سوسائٹی اس کے قانون نظام کا تکملہ ہوتی ہے۔ اس سوسائٹی کے افراد کے ضمیر کی گہرائیوں سے ایک اجتماعی کفالتی نظام وجود میں آتا ہے۔ اس کے تمام ادارے اور حکمت عملیاں ایک اجتماعی کفالت وجود میں لاتی ہیں۔ اس نظام میں فرد اور ادارہ باہم معاون اور باہم کفیل ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ان لوگوں کے فہم وادراک سے بہت بلند ہے جو جدید مادی نظام زندگی میں پروان چڑھے ہیں لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہم مسلمان بخوبی جانتے ہیں۔ اور ہمارا ذوق ایمانی اس کا مٹھاس محسوس کرتا ہے۔ جبکہ جدید دور کے باسی اپنی بدبختی اور بدذوقی کی وجہ سے یہ مٹھاس نہیں محسوس کرتے۔ جدید دور کا انسان اسی محرومی اور بدبختی میں اسلئے مبتلا ہے کہ اس کی باگ دوڑ اس جدید مادی نظام کے ہاتھ میں ہے۔ خدا کرے یہ اسی طرح محروم ہوں اور یونہی خیر سے دور ہی رہیں جس کی خوشخبری اللہ ان الفاظ میں دیتے ہیں۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ ............ ............ "جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں' ان کا اجر بے شک ان کے رب کے پاس ہے اور ان کیلئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں" ایسے لوگ جو ان آسمانی ہدایات سے محروم ہیں۔ وہ قلبی اطمینان اور سکون سے بھی محروم رہیں گے۔ جبکہ اجر وثواب سے تو وہ محروم ہیں ہی۔ اس لئے کہ وہ اپنی جہالت' اپنی جاہلیت' اپنی ضلالت اور اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے تو وہ محروم ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے پختہ عہد کرتا ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی کو ایمان اور عمل صالح پر استوار کریں گے۔ باہم اقتصادی تعاون کرکے اپنی معیشت کو درست کریں گے۔ ان کا اجر اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔ وہ امن میں رہیں گے' وہ کسی خوف وخطر سے دوچار نہ ہوں گے۔ وہ خوش قسمت ہیں۔ محروم نہیں ہیں۔ اس لئے وہ ہر قسم کے اندیشوں سے محفوظ ہوں گے لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ............ ............ "ان کا اجر بے شک ان کے رب کے پاس ہے' ان کیلئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔"

ایسے حالات میں جبکہ ایک سودی نظام اقتصادیات والی سوسائٹی اللہ کے قہر وغضب کی مستحق قرار پاتی ہے۔ اس کے افراد مخبوط الحواس اور گم کردہ راہ ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ روحانی خوف اور رنج والم کا شکار ہوتے ہیں۔

انسانی تاریخ میں انسانیت نے صحیح اسلامی معاشرہ میں یہ نظام امن وسکون بچشم سر دیکھا ہے۔ اور وہ رنج والم اور خوف وبے اطمینانی کی عام فضاء وہ جدید سودی معاشرے میں بھی دیکھ رہی ہے۔ اے کاش کہ ہم ہر حساس دل کو پکڑ کر جھنجھوڑ سکتے۔ تو اسے خوب جھنجھوڑتے اور وہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر اس حقیقت کو پالیتا۔ اے کاش! کہ اگر ممکن ہوتا تو ہم ہر سوتی آنکھ کو جگاتے۔ اسے کھولتے

اور وہ اس عظیم حقیقت کو پالیتی۔

افسوس کے ہمارے پاس وہ قوت نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو ہم ایسا کر گزرتے...... ہم صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ ہی کرسکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اللہ اس گم کردہ راہ اور بدنصیب انسانیت کو اس طرف متوجہ کردیں۔ اور دل تو اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں وہ جدھر چاہے پھیر دے۔ اور ہدایت تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہی میں ہے جسے چاہے عطا کرے۔ ان حالات میں امن و فراوانی' جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ ایک اسلامی سوسائٹی کے ساتھ کر رہا ہے۔ جو اپنی زندگی سے ربا کو نکال دیتی ہے۔ یوں وہ گویا کفر اور معصیت کو اپنی زندگی سے نکال پھینکتی ہے۔ اور اپنی زندگی کو ایمان' عمل صالح اور اللہ کی بندگی اور نظام زکوٰۃ پر قائم کرتی ہے۔ غرض ایسے حالات میں امن و فراوانی میں اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے ان لوگوں کو پکارتے ہیں۔ جو ایمان لے آئے ہیں اور یہ پکار دراصل آخری وارننگ ہے۔ انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی کو اس نجس اور مفلس سودی اقتصادی نظام سے پاک کردیں اور اگر وہ اس کام کیلئے تیار نہیں ہیں تو یہ گویا ان کی جانب سے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ بغیر کسی نرمی کے' بغیر مہلت کے اور بغیر کسی تاخیری حربے کے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝

☆ ☆ ☆ ☆

"اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے' اسے چھوڑ دو' اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا' تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اب بھی توبہ کرلو اور سود چھوڑ دو تو اپنا اصل سرمایہ تم لینے کے حقدار ہو۔ نہ تم ظلم کرو' نہ تم پر ظلم کیا جائے۔"

اس آیت میں ان لوگوں کے ایمان کو جو ایمان لاچکے ہیں۔ اس بات سے متعلق کر دیا گیا ہے کہ وہ اس سود کو چھوڑ دیں جو باقی رہ گیا ہے۔ وہ اس وقت تک صحیح مومن نہیں ہوسکتے جب تک وہ خدا سے ڈریں گے نہیں اور باقی ماندہ سودی رقم کو ترک نہ کردیں گے وہ صحیح مومن نہیں ہیں اگرچہ وہ اپنے ایمان کا اعلان کرتے پھریں۔ اس لئے کہ اللہ کے احکام و فرامین کی اطاعت و انقیاد کے بغیر ایمان کے کیا معنی ہیں۔ آیت انہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھتی نہ وہ کسی بھی شخص کو اس شبہے میں چھوڑتی ہے' جو ایمان کے اعلان کے پردے میں چھپ کر اپنی حقیقت پر پردہ ڈالتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ نہ تو وہ مطیع فرمان ہوتا ہے اور نہ راضی برضائے شریعت ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں شریعت کو نافذ نہیں کرتا۔ وہ اپنے معاملات میں شریعت کو حکم نہیں بناتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ دین اسلام میں اعتقادات اور اعمال میں فرق کرتے ہیں وہ صحیح مومن نہیں ہیں۔ اگرچہ وہ طویل و عریض دعوائے ایمان کریں۔ زبان سے ایمان کا اعلان کریں' یہاں تک کہ وہ دوسری عبادات میں پابند صوم و صلوٰۃ کیوں نہ ہوں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ............... "اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے۔ اسے چھوڑ دو' اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔"

اسلام نے ان لوگوں کے حق میں وہ سودی منافع چھوڑ دیا جو وہ کھا چکے تھے۔ یہ فیصلہ نہ کیا کہ کھایا ہوا سود بھی ان سے لوٹایا جائے۔ نہ اسلام نے ان کی تمام یا کچھ حصہ جائیداد کو ضبط کرنے کا حکم دیا۔ اس سبب سے کہ ان کے کاروبار میں سود شامل تھا۔ اس لئے کہ اسلام میں کوئی بات حرام نہیں قرار پاتی' جب تک اسے اللہ تعالیٰ حرام قرار نہ دیں۔ بغیر قانون سازی کے کوئی حکم نہیں دیا جاسکتا۔ اور قانون کا مزاج یہ ہے کہ وہ اپنے آثار اپنے نفاذ کے بعد ظاہر کرتا ہے۔ جو گزر چکا سو گزر چکا۔ گزرے ہوئے معاملات اللہ کے سپرد ہیں۔ ان پر قانونی احکام کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس طرح اسلام نے سوسائٹی کو ایک بڑے دھماکہ خیز اقتصادی اور اجتماعی بحران سے بچالیا۔ اگر اس قانون کو موثر بماضی قرار دیا جاتا تو ایک بہت بڑا بحران پیدا ہو جاتا۔ یہ وہ اصول ہے جسے جدید قانونی نظام نے حال ہی میں اپنایا ہے۔ اس لئے کہ اسلام میں قانون سازی اس لئے کی جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے انسان کی واقعی اور عملی زندگی کی اصلاح ہو۔ وہ اسے صحیح راستے پر ڈالے' اسے گندگیوں سے پاک کرے' اسے ناجائز بندھنوں سے آزاد کرے تاکہ وہ ترقی کرے اور اس کا معیار بلند ہو' اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے اہل ایمان کے ایمان کو اس بات پر موقوف کر دیا کہ وہ تب ہی مومن ہوں گے جب وہ اس قانون سازی کو قبول کریں۔ وہ نازل ہوتے ہی اور علم میں آتے ہی اسے اپنی زندگی میں نافذ کر دیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اسلام ان کے دلوں میں خوف خدا اور تقویٰ بھی پیدا کرتا ہے۔ تقویٰ کا شعور ہی وہ گارنٹی ہے جس کے ذریعہ اسلام اپنے قوانین نافذ کراتا ہے۔ یہ وہ گارنٹی ہوتی ہے جو خود اہل ایمان کے نفس کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ یہ اندر کا چوکیدار ہوتا ہے اور اسلام میں اس کا درجہ ان گارنٹیوں اور چوکیداروں سے اونچا ہے جو کسی قانون کو روایتی طور پر حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے اسلامی قوانین کو نفاذ کیلئے وہ گارنٹی اور نگرانی حاصل ہوتی ہے جو جدید دور کے وضعی قوانین کو حاصل نہیں ہوتی' اس لئے کہ یہ قوانین صرف خارجی دباؤ کی وجہ سے نافذ ہوتے ہیں۔ اور یہ بات پوشیدہ نہیں کہ خارجی نگران کو کس خوبی سے جل دی جاسکتی ہے۔ ایسے حالات میں جب انسان کے ضمیر کے اندر کوئی چوکیدار نہ بیٹھا ہو یعنی خدا خوفی اور رضائے الٰہی کا نگران۔

یہ تو تھی ترغیب اس بات کی کہ ربا کو ترک کرو' لیکن اس کے ساتھ ساتھ دھمکی اور ترہیب بھی آتی ہے۔ اور یہ دھمکی اس قدر شدید ہے کہ اس سے دل دہل جاتے ہیں۔ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ...........
............. "اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔"

خدا کی پناہ! اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے اعلان جنگ! یہ ایسی جنگ ہے' جو نفس انسان کو درپیش ہے۔ خوفناک جنگ۔ جس کا انجام بالکل سامنے ہے۔ جس میں بشر کو شکست سے دوچار ہونا ہی ہے۔ انسان فانی اور ضعیف ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی قوت جابرہ کا کیا مقابلہ کرے گا جو آن واحد میں سب کچھ بھسم کر کے رکھ دے گی۔ اور اس کا نام و نشان مٹا دے گی۔

ان آیات کے نزول کے بعد' حضور ﷺ نے حاکم مکہ کو حکم دیا کہ وہ مکہ کے آل مغیرہ کے ساتھ جنگ کریں' اس لئے کہ وہ ان ت کے نزول کے بعد بھی سودی کاروبار سے باز نہ آئے تھے۔ فتح مکہ کے دن حضور ﷺ نے اپنے خطبے میں جاہلیت کے دور کے تمام سودی سوں کو ختم کر دیا تھا۔ اور آپ نے فرمایا سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس ﷺ کے قرضے کو معاف کرتا ہوں۔ اور یہ بوجھ قرضداروں پر ام کے آنے کے بعد بھی ایک عرصہ تک رہا۔ لیکن جب اسلامی معاشرہ پختہ ہو گیا۔ اور اس کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں اور وقت آگیا کہ ے کے اقتصادی نظام کو اصول رباسے ہٹا کر صحیح اسلامی اصولوں سے استوار کیا جائے تو اسلام نے یہ قدم اٹھایا۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا۔

"جاہلیت کے دور کا تمام سود میرے ان دونوں پاؤں کے نیچے ہے اور سب سے پہلا سودی قرضہ جسے میں

موقوف کرتا ہوں وہ عباس کا سود ہے۔"

اس کے ساتھ ساتھ آپ لوگوں کو یہ تلقین بھی فرماتے کہ دور جاہلیت میں انہوں نے جو سود وصول کیا اسے واپس کردیں...... اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ جنگ کرے جو سودی اقتصادیات کو جاری رکھنے پر مصر ہیں۔ اور جو اللہ کے حکم کی نافرمانی کرتے ہیں۔ اگرچہ ایسے لوگ یہ اعلان کریں کہ وہ مسلمان ہیں۔ حضرت ابوبکر ؓ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ اسی اصول کے تحت کی تھی حالانکہ وہ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ یعنی کلمہ پڑھتے تھے۔ نماز ادا کرتے تھے۔ اس لئے کہ جو شخص شریعت کی اطاعت کا انکار کردے اور اسے اپنی زندگی میں نافذ نہ کرے وہ مسلم نہیں رہتا۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ اللہ اور رسول اللہ کی جانب سے سود خوروں کے خلاف اعلان جنگ توپ و تفنگ کی جنگ سے عام ہے۔ جو ایک امام وقت کسی قوت کے خلاف کرتا ہے۔ یہ اعلان جنگ 'جیسا کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا ہر اس معاشرے کے خلاف ہے جو اپنے اقتصادی نظام کی اساس سود پر رکھتا ہو' یہ جنگ ہمہ گیر اور خوفناک جنگ ہے۔ یہ اعصاب کی جنگ ہے۔ یہ دلوں کی جنگ ہے۔ یہ خیر د برکت اور خوشحالی کے خلاف ربانی جنگ ہے۔ یہ سودی نظام کی جانب سے انسانیت کی سعادت اور خوشحالی اور اطمینان کے خلاف جنگ ہے۔ یہ انسان کی کشاکش اور ایک دوسرے کے تعاقب کی جنگ ہے۔ آخر کار یہ جنگ اقوام اور امم کے درمیان افواج اور اسلحہ کی جنگ ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر اور تباہ کن جنگ ہے اس کرۂ ارض پر اس لئے برپا ہوتی ہے کہ یہاں کا نظام اصول ربا پر مبنی ہو جاتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے اس زمین سے خیر و برکت ختم ہو کر رہ جاتی اور خوشحالی ناپید ہو جاتی ہے۔ یہ تمام جنگیں اور کشمکشں ان سرمایہ داروں کی جانب سے برپا کی جاتی ہیں جو پوری دنیا کے سرمایہ پر قابض ہوتے ہیں۔ اور ان جنگوں کے شعلے بڑھکاتے ہیں۔ کبھی وہ یہ کام براہ راست کرتے ہیں اور کبھی بالواسطہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے دام تزویر میں کارخانوں اور کمپنیوں کو پھانس لیتے ہیں۔ اس کے بعد اقوام اور حکومتیں ان کے دام میں شکار ہوتی ہیں۔ اس کے بعد یہ حکومتیں' اپنے شکار پر جھپٹتی ہیں اور یوں ان کے درمیان جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ کبھی یہ حکومتیں اپنے مفادات اور سرمائے کو بچانے کیلئے دوڑتی ہیں اور اپنی فوجی قوت میدان میں لاتی ہیں اور یوں جنگ کے شعلے بڑھک اٹھتے ہیں۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ عوام الناس ٹیکس اور حکومتی واجبات ادا کرنے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ عوام میں غربت عام ہو جاتی ہے۔ محنت کار اور جفاکش لوگ تنگ آکر ایسی تحریکات سے وابستہ ہو جاتے ہیں جن کا مشن تخریب کاری اور تباہی پھیلانا ہوتا ہے۔ اور یوں کسی بھی علاقے میں عوامی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ اور اس سودی نظام کے تحت جو کشمکش برپا ہوتی ہے۔ اس کے عام اور بسہولت بر آمد ہونے والے نتائج یہ ہوتے ہیں کہ لوگوں کے نفوس خراب ہو جاتے ہیں۔ اخلاقی تباہی پھیل جاتی ہے۔ لوگوں میں عیاشی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور انسانیت کا ڈھانچہ ہی تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور انسان کی روحانی دنیا ایسی تباہی کا شکار ہوتی ہے کہ اس جیسی تباہی انسان کے جسم کو کسی ایٹمی جنگ سے بھی نہیں پہنچ سکتی۔

یہ جنگ جس کا اعلان سودی کاروبار کرنے والوں کے خلاف کیا گیا ہے۔ ہر وقت اس کے شعلے بلند ہوتے ہیں۔ آج بھی یہ ہر طرف برپا ہے۔ گم کردہ راہ انسانیت کا رطب ویابس اس کی نظر ہو رہا ہے۔ لیکن یہ انسانیت اس کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ انسانیت یہ سمجھ رہی ہے کہ وہ دولت کما رہی ہے۔ وہ ترقی کر رہی ہے۔ وہ بڑی کثرت سے مادی نتائج پیدا کر رہی ہے۔ متنوع مصنوعات تیار ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ پیداوار ہی اس کیلئے تباہی ہے۔ یہی پیداوار اگر کسی پاک اور غیر سودی نظام سے ہوتی تو یہ انسانیت کیلئے نیک بختی اور خوشحالی کا سبب ہوتی۔ لیکن یہ پیداوار سود کے ناپاک اور آلودہ نظام کے نتیجے میں سامنے آتی ہے۔ اس لئے یہ انسانیت کیلئے ایک ایسا بوجھ ہے جس کے نتیجے میں انسانیت کا دم گھٹ رہا ہے۔ جبکہ سود خوروں کا عالمی گروہ عیش و آرام سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور اسے اس پوری انسانیت کی مصیبتوں

اور رنج والم کا کوئی احساس ہی نہیں ہو رہا ہے۔

اسلام نے پہلی اسلامی جماعت کو اس بات کی دعوت دی اور آج پوری انسانیت کو اس بات کی دعوت دے رہا ہے کہ وہ پاک و صاف ذریعہ آمدن اختیار کریں اور وبائی سودی نظام سے تائب ہو کر راہ راست اختیار کریں وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ .................. "اب بھی توبہ کر لو تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حقدار ہو۔ نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔" یہ ایک معصیت سے توبہ ہے' ایام جاہلیت میں رائج خطاکاری سے رجوع ہے۔ اور جاہلیت کا تعلق کسی خاص زمانے سے نہیں ہوتا یا کسی خاص نظام ہی پر جاہلیت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جاہلیت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان الٰہی نظام زندگی سے منحرف ہو جائے۔ جب بھی یہ انحراف ہو اور جہاں بھی ہوں' وہ جاہلیت ہو گی۔ ربا ایک ایسی خطاکاری ہے جس کے اثرات انسان کے تصور حیات' انسان کے اخلاق اور انسان کے شعور پر چھا جاتے ہیں۔ پھر اس کے اثرات سوسائٹی پر اور سوسائٹی کے اجتماعی تعلقات پر پڑتے ہیں۔ پوری انسانی زندگی پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اقتصادی نشوونما اور ترقی پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں اگرچہ وہ لوگ جو سودی کاروبار کرنے والوں کے جھانسے میں آ چکے ہیں' یہ سمجھتے ہیں کہ سودی نظام اقتصادیات وہ واحد نظام ہے جو نشوونما اور اقتصادی ترقی کا اہل اور سبب ہے۔

صرف اصل زر کی واپسی کا حق دینا ایک ایسا قاعدہ ہے جس کی رو سے نہ قرض دہندہ کو نقصان ہے اور نہ ہی قرض گیرندہ پر ظلم ہے۔ رہی یہ بات کہ دولت میں اضافہ کیسے کیا جائے گا تو اس کے وسائل و ذرائع علیحدہ ہیں۔ جو ربا سے پاک و صاف ہیں۔ اس کا پہلا ذریعہ ایک فرد کی ذاتی جدوجہد ہے۔ دوسرا ذریعہ بطریقہ مضاربت باہم شراکت اموال ہے۔ یعنی ایک شخص سرمایہ فراہم کرے اور دوسرا اس کے ساتھ کاروبار کرے اور دونوں فائدے اور نقصان میں شریک ہوں۔ نیز اقتصادی ترقی ان کمپنیوں کے ذریعہ بھی ممکن ہو گی جو اپنے حصص براہ راست بازار حصص میں فروخت کرتی ہیں۔ (ماسوائے تاسیسی سندات کے جن کے ذریعہ زیادہ نفع سمیٹ لیا جاتا ہے۔) اور حلال اور جائز ذریعہ کاروبار سے منافع حاصل کرتی ہیں۔ پھر ایسی رقومات سے بھی اقتصادی ترقی ممکن ہو گی جو بغیر منافع کے محض امانت کے طور پر بینکوں میں جمع ہوں گی۔ اس طرح کہ ایسی رقومات کو بینک کمپنیوں' صنعتوں' تجارتی اور کاروباری مدات میں براہ راست استعمال کریں یا بالواسطہ ان میں شرکت کریں اور شرط یہ ہو کہ وہ اپنے لئے متعین منافع طے نہ کریں اور بینک اپنا منافع یا خسارہ ایک مقررہ نظام کے تحت ان لوگوں پر تقسیم کریں جو ان کے پاس امانتیں رکھتے ہیں۔ اور بینک کو یہ اجازت ہو کہ وہ اپنی کاروباری مصروفیات کے عوض ایک مقرر اور معین منافع اپنے لئے رکھ لے۔ غرض ان ذرائع اور وسائل کے علاوہ بھی اقتصادی ترقیات کیلئے مزید اور وسائل اور ذرائع بھی پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ جن کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں ہے۔ اگر کسی قوم کا ایمان مضبوط ہو تو ایسے بے شمار وسائل پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ نیز نیت صاف ہو جائے اور پختہ ارادہ کر لیا جائے کہ ہم نے پاک اور صاف ذرائع سے وسائل رزق و ترقی حاصل کرنے ہیں اور گندہ اور ناپاک ذرائع پر لات مارنی ہے۔[1]

آخر میں قرآن کریم قرضوں کے بارے میں احکام کی ایک خاص شکل کو بیان کرتا ہے کہ اگر مدیون کیلئے قرضے کی ادائیگی ممکن نہ ہو' اس کیلئے مشکلات ہوں تو اس کا حل یہ نہیں ہے کہ اس پر بذریعہ ربا قرضے کا اضافہ کر دیا جائے' بلکہ حل یہ ہے کہ اسے اس وقت تک مہلت دی جائے جب تک اس کے حالات اچھے نہیں ہو جاتے۔ اور جو شخص زیادہ بھلائی سمیٹنا چاہے اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ سرے سے قرضہ ہی معاف کر دے۔ اسلام کی نظر میں یہی بلند مرتبہ ہے۔

[1] تفصیلات کیلئے دیکھئے وہ مباحث جو اس موضوع پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ؒ نے کئے ہیں اور جن کی طرف اشارہ میں پہلے کر چکا ہوں۔ (سید قطب ؒ)

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٨٠﴾

"تمہارا قرض دار تنگ دست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اسے مہلت دو اور جو صدقہ کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھو۔"

یہ وہ خوشگوار دادو دہش ہے جسے اسلامی نظام زندگی انسانیت کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ وہ گھنی چھاؤں ہے جس میں 'خود غرضی' لالچ' بخل اور مفاد پرستی کی تپش میں تھکی ماندی انسانیت پناہ لیتی ہے اور سکون کا سانس لیتی ہے۔ یہ قرضدار کیلئے بھی رحمت ہے اور قرض خواہ کیلئے بھی رحمت ہے۔ اور اس پورے معاشرہ کیلئے بھی رحمت و شفقت ہے۔ جس میں یہ دونوں رہتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ دور حاضر کی مادی جاہلیت کے زیر سایہ پلنے والے جدید مفلوک الحال لوگ ہماری یہ باتیں لایعنی تصور کریں گے اور یہ باتیں انہیں نامعقول نظر آئیں گی۔ ان کے منہ کا بگڑا ہوا ذائقہ 'ان باتوں کے مٹھاس کا احساس ہرگز نہیں کر سکتا۔ خصوصاً وہ وحشی سود خوار جو اس کرۂ ارض کے کونے کونے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ جو اپنے شکار کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ جو ایسے محتاجوں اور مفلوک الحال لوگوں کی تلاش میں رہتے ہیں جن پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ چکے ہیں۔ جو روٹی کپڑے اور علاج معالجے کے ضرور تمند ہیں۔ تاکہ ان کا استحصال کریں۔ بعض اوقات ان کے پاس اس قدر رقم نہیں ہوتی کہ وہ اپنے مردے دفن کر سکیں اور ان لوگوں کو اس کنجوس اور بخیل دنیا میں کوئی نہیں ملتا۔ جو ان کے لئے بے لوث معاون ثابت ہو۔ اس لئے وہ مجبور ہو کر ان وحشی سود خوروں کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ ان کی حالت ایک ایسے شکار جیسی ہوتی ہے جو خود چل کر دام میں اپنے آپ کو پھنساتا ہے۔ ضرور تمندی اور مجبوری انہیں دھکیل کر ان سود خوروں کے پاس لے جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ سود خور تو ایسے بیت المالوں کی صورت میں منظم ہوتے ہیں جو سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور بعض اوقات بینکوں کی شکل میں کام کرتے ہیں۔ یہ سب کے سب اسلام کی نظر میں برابر ہیں۔ ہاں فرق صرف اس قدر ہے کہ ان مالی کارپوریشنوں اور بینک کے مالک سود خوار بڑے بڑے دفاتر میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ ان کے نیچے بڑی بڑی آرام دہ کرسیاں ہوتی ہیں۔ ان کی پشت پر سود کے اقتصادی نظریات کی قوت ہوتی ہے۔ بڑی بڑی علمی کتابیں ان کے اس کاروبار کی تائید میں ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے تعلیمی ادارے اور انسٹی ٹیوٹ ان کی حمایت میں لگے ہوتے ہیں۔ عدالتیں اور بڑی بڑی فوجیں اس نظام کی مؤید ہوتی ہیں۔ یہ تمام ادارے جرم سود خوری کے لئے جواز فراہم کرتے ہیں' ان کے حامی ان کو تحفظ دینے کے لئے ایک وسیع قانونی نظام اور ضابطے کام کر رہے ہوتے ہیں اور مددگار ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ انہیں سود ادا نہیں کرتے۔ اس قانونی نظام کے ذریعہ وہ ان کی پکڑ دھکڑ شروع کر دیتے ہیں۔ اور یہ سب دارو گیر انصاف کے نام پر ہوتی ہے۔

ہمیں یہ پورا یقین ہے کہ ہماری یہ باتیں ہرگز ایسے لوگوں کے دلوں میں نہیں اترتیں۔ لیکن ہمیں پورا یقین ہے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ حق ہے اور ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ تمام انسانیت کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ ان باتوں پر کان دھرے' اور ان پر عمل کرے یعنی

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ .....

........................ "تمہارا قرضدار اگر تنگ دست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اسے مہلت دو' اور جو صدقہ کرو تو تمہارے لئے یہ بہتر ہے۔ اگر سمجھو۔"

اسلامی نظام زندگی میں ضابطہ یہ ہے کہ تنگ دست کا تعاقب نہ کیا جائے گا۔ نہ تو قرض خواہ یہ کرے گا اور نہ ہی قانون اور عدالتوں

کو یہ اختیار ہو گا کہ وہ تنگ دست مقروض کا تعاقب کریں۔ بلکہ اسے اس وقت تک مہلت دی جائے گی جب تک اس کے حالات اچھے نہیں ہو جاتے۔ پھر اسلامی سوسائٹی مقروض کو اپنے حال پر نہیں چھوڑتی۔ پہلے تو قرض خواہ سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اسے معاف کردے۔ اگر وہ ایسا کر سکے۔ وہ خود اس کیلئے بھی بہتر ہے اور مدیوں کیلئے بھی خیر ہے۔ یہ اس سوسائٹی کے لئے ابھی بہتر ہے جو اپنے افراد کیلئے تکافل فراہم کرتی ہے۔ بشرطیکہ دائن و مدیون دونوں اس بات کو سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں جو کچھ ہے وہ ان کیلئے مفید ہے۔

اگر قرض خواہ کو یہ اجازت دیدی جائے کہ وہ مدیون پر عرصہ حیات تنگ کردے اور اس کا تعاقب کرے تو اس صورت میں تحریم ربا سے جو فوائد مطلوب تھے' وہ سب فوت ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ مدیوں تنگ دست ہے اس کے پاس کچھ ہے نہیں۔ دوسری جانب سے قرض خواہ از روئے قانون اسے تنگ کرنے کا مجاز ہے۔ چنانچہ یہاں شرط و جواب شرط کی شکل میں یہ حکم دیا گیا کہ اگر تنگ دست ہے تو اسے اس وقت تک مہلت دی جائے جب تک اس کے مالی حالات اچھے نہیں ہو جاتے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تنگدستی کی صورت میں قرض خواہ کو یہ ترغیب بھی دی جاتی ہے کہ اگر وہ ایسی صورت میں کچھ معاف کردے یا سب کچھ معاف کردے تو اس کیلئے یہ بہت اچھا ہے۔

مہلت کے علاوہ قرآن کریم نے دوسری جگہ ایسے نادار قرض داروں کیلئے زکوٰۃ فنڈ سے بھی ایک مد فراہم کی ہے' تاکہ وہ اپنا قرضہ ادا کر سکے۔ اور اس کی زندگی کا بوجھ اتر جائے۔ **إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ ........ وَالْغَارِمِيْنَ** ............................................ "بے شک صدقات کے حقدار فقراء مساکین'..... اور قرضدار ہیں۔"

الغارمین سے مراد وہ قرضدار ہیں جو قرضوں کے بوجھ تلے دب گئے ہوں۔ وہ نہیں جنہوں نے قرضے لیکر عیاشی اور لذت پرستی کی ہو۔ بلکہ انہوں نے جائز مدات میں اخراجات کئے ہوں یا وہ معقول وجوہ کی بناء پر قرضدار ہو گئے ہوں۔ اور ان کے حالات خراب ہو گئے ہوں۔

اب آخر میں قرآن کریم' خاتمہ کلام پر 'ایک نہایت موثر اور گہرا اشارہ دیتا ہے جس سے ایک مومن پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ تمنا کرنے لگتا ہے کہ کاش وہ سب قرضہ ہی معاف کردے۔ اور قیامت کے دن اللہ کے ہاں فلاح پالے۔

٣٨ ع٨ ٦ **وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ** (٢٨١)

"اس دن کی رسوائی اور مصیبت سے بچو' جبکہ تم اللہ کی طرف واپس ہو گے۔ وہاں ہر شخص کو اس کی کمائی ہوئی نیکی یا بدی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر ظلم ہرگز نہ ہو گا۔"...... یہ وہ دن ہو گا' جس میں سب اللہ کی طرف لوٹیں گے اور ہر شخص کو اس کی کمائی پوری پوری دی جائے گی۔ وہ دن بڑا مشکل دن ہو گا۔ اس دن کی بابت دل مسلم میں بڑا خوف پایا جاتا ہے۔ مومن کے ضمیر کی گہرائیوں میں شاید قیامت کا نقشہ اور اس کی ہولناکیاں موجود ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ باری تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا تصور ہی اس قدر خوفناک ہوتا ہے کہ اس سے انسان کا پورا وجود کانپ اٹھتا ہے۔ یہ خاتمہ کلام ایسا ہے جو مذکورہ معاملات کی فضا کے ساتھ متناسق ہے۔ یہ فضا لینے اور دینے کی فضا ہے۔ کسب اور جزاء کی فضا ہے۔ اس فضا میں انسان کی پوری زندگی کا تصفیہ ہو رہا ہے۔ انسان کی پوری زندگی کے فیصلے کی فضا ہے۔ اس فضا سے دل مومن خائف ہوتا ہے اور اپنے آپ کو اس کی ہولناکیوں سے بچاتا ہے۔

تقویٰ اور خدا خوفی وہ چوکیدار ہے جو انسانی ضمیر کی گہرائیوں میں بیٹھا ہوتا ہے۔ اسلام ہر مومن کے دل کی گہرائیوں میں یہ چوکیدار بیٹھا دیتا ہے۔ تاکہ دل مومن کیلئے فرار کی کوئی راہ ہی نہ رہے۔

یہ ہے اسلامی نظام زندگی جو ایک مضبوط اور قوی نظام ہے۔ یہ ایک سنجیدہ اور زندگی سے بھرپور نظام زندگی ہے اور ایسا نظام ہے جو اس کرۂ ارض پر عملاً چلنے کے قابل ہے۔ انسانیت کیلئے یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و رأفت ہے۔ یہ انسانیت کیلئے ایک اعزاز ہے۔ یہ ایک ایسی بھلائی ہے جس سے انسانیت کو دور رکھا جارہا ہے۔ اور اللہ کے دشمن اور انسانیت کے دشمن انسانوں کو اس کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔

☆......☆......☆......☆......☆

# درس ۲۱ ایک نظر میں

درس سابق کا موضوع سود خوری اور صدقہ تھا' اس درس میں اسی موضوع کے تکمیلی احکام بابت قرضہ جات' تجارت وغیرہ کا ذکر ہے۔ درس سابق میں سودی کاروبار کو ممنوع قرار دیا گیا۔ اسی طرح وہاں سودی قرضہ جات اور سودی نظام تجارت اور بیع و شراء کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ یہاں قرض حسن' جس میں ربا کا کوئی شبہ نہ ہو' جس پر کوئی سودی منافع عائد نہ ہو کی بات ہو رہی ہے۔ ان تجارتی امور پر بحث ہوتی ہے جو دستی طور پر طے ہوتے ہیں اور جن میں کسی قسم کے سودی نفع کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔

اس درس پر ایک نظر ڈال کر انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم قانون سازی کیلئے جو انداز تعبیر اختیار کرتا ہے وہ حیران کن انداز ہے۔ قانون مدعی کو اس باریک بینی کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں کسی لفظ کو بدل کر دوسرا لفظ اس کی جگہ نہیں رکھا جاسکتا۔ کوئی فقرہ نہ بدلا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے آگے پیچھے کیا جاسکتا ہے۔ اس خالص قانونی انداز تعبیر کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کی خوبصورت ادبیانہ طرز ادا اور الفاظ کی خوشگواری اور مٹھاس اور روانی میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قانونی مدعا دینی وجدان کے رنگ میں بیان ہوتا ہے۔ جو بہت ہی لطیف انداز میں اور نہایت ہی اثر آفرینی کے ساتھ اور بہترین طرز کے ساتھ جبکہ آیت کے ربط میں بھی کوئی خلل نہیں آتا۔ اور مکمل قانونی مدعا بھی بیان ہو جاتا ہے۔ اس میں معاہدہ کرنے والے فریقین کے درمیان جو جو احتمالات ہو سکتے ہیں' جو جو موقف بھی ہو سکتا ہے' لکھنے والوں کی ذمہ داری' گواہوں کی ذمہ داری وغیرہ سب امور کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ غلط طور پر اثر انداز ہونے والے تمام عوامل کی نفی کر دی گئی ہے۔ اور ہر ممکن صورت کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔

بیان مدعا میں ایک قانونی نکتے سے دوسرے نکتے کی طرف منتقل ہونے سے پہلے اسے مکمل طور پر بیان کر دیا جاتا ہے۔ جسے دوبارہ نہیں دہرایا جاتا۔ الا یہ کہ اس کے اور جدید نکتے کے درمیان کوئی خاص تعلق ہو۔ اس صورت میں پہلے بیان کردہ قانونی نکتے کے ساتھ اسے جوڑ دیا جاتا ہے اور اشارہ کر دیا جاتا ہے۔

قرآن کریم جس طرح اپنی قانون سازی کیلئے انتخاب الفاظ و فقرات میں اعجاز رکھتا ہے' اسی طرح وہ انسان کی ہدایت اور راہنمائی کے سلسلے میں نازل ہونیوالی آیات میں بھی صاحب اعجاز ہے۔ بلکہ قانونی عبارات میں اس کا اعجاز عام آیات سے بھی زیادہ واضح اور حیران کن ہے۔ یہاں کوئی بھی قانونی مدعا اور اصول ایسے لطیف اور ٹیکنیکل پیرائے میں بیان کیا جاتا ہے کہ کسی ایک لفظ کو بھی کسی دوسرے لفظ سے بدل کر وہ مدعا حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ کسی لفظ کی جگہ کوئی دوسرا لفظ نہیں لے سکتا۔ اگر قرآن مجید معجزہ نہ ہوتا تو خالص قانونی تعبیرات میں' اس طرز ادا کے ساتھ' خالص ادبی اور فنی پیرایہ اظہار میں کلام نہ کیا جاسکتا۔ جس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

ان سب خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے۔ دیوانی' شہری' اقتصادی اور تجارتی معاملات میں دور جدید سے بھی تقریباً ایک ہزار سال پہلے قرآن کریم نے یہ قانون سازی کی ہے۔ جسے تمام جدید ماہرین قانون تسلیم کرتے ہیں اور فقہاء اور محدثین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کریم اس معاملے میں سرخیل ہے۔

# درس ۲۱ تشریح آیات

## آیت نمبر ۲۸۲ تا ۲۸۴

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَٱكْتُبُوهُ ۚ

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب کسی مقررہ مدت کیلئے تم آپس میں قرض کا لین دین کرو' تو اسے لکھ لیا کرو۔" یہ ایک عام قانون ہے جسے اس آیت میں طے کیا گیا ہے۔ اس آیت کی رو سے کسی معاہدے کا لکھنا نہایت ہی ضروری ہے۔ اور اگر کسی قرضے کا معاملہ ہو اور اس قرضے کے سلسلے میں کوئی میعاد مقرر ہو تو اس صورت میں اس کا تحریر میں آنا فرض ہے کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ تحریر میں نہ لائے۔ اور اس کی حکمت بھی اس آیت کے آخر میں بیان کر دی گئی ہے۔

وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِٱلْعَدْلِ ۚ

"فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے۔"...... یہاں اس شخص کو بھی متعین کر دیا گیا جو ان قرضہ جات کے سلسلے میں دستاویز تیار کرے گا۔ مثلاً عرضی نویس' یہ ایک تیسرا شخص ہو گا۔ فریقین میں سے کوئی نہ ہو گا۔ کسی معاملے میں فریقین معاہدہ کے علاوہ تیسرے شخص کو بلانا محض زیادہ احتیاط کیلئے ہے تاکہ کوئی شک نہ رہے۔ پھر کاتب کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ وہ عدل و انصاف کے ساتھ لکھے گا۔ فریقین میں سے کسی کی طرفداری نہ کرے گا۔ عبارت میں کسی قسم کی کم بیشی نہ کرے گا۔

وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ ٱللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ

"جسے اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت بخشی ہو اسے لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہئے۔" اس لئے کہ لکھنے کا حکم اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے یعنی کاتب کو بھی اللہ کی جانب سے حکم دیا جا رہا ہے۔ تاکہ وہ پیچھے نہ ہٹے۔ لکھنے سے انکار نہ کرے اور لکھنے کا یہ کام اس کیلئے ایک بوجھ نہ ہو۔ یہ تو اب اللہ تعالیٰ کی جانب سے منصوص فریضہ ہے۔ اور از روئے قانون یہ لکھنے والے کی ڈیوٹی ہے۔ اور اس کا معاوضہ بھی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ لکھنے کا عمل اس کی جانب سے اللہ تعالیٰ کے ہاں شکر نعمت ہے۔ اللہ ہی ہے جس نے اپنا فضل کر کے اسے لکھنے کا فن سکھایا۔ اس لئے اسے معاہدات کو تحریر میں لانا چاہئے کیونکہ اللہ ہی نے اسے یہ علم دیا ہے۔

یہاں تک شارع نے میعادی قرضے کو تحریر میں لانے کی قانونی دفعہ کو ختم کر دیا۔ یہ بھی متعین کر دیا گیا کہ لکھنے کی ڈیوٹی کون سرانجام دے گا۔ اس پر یہ فریضہ عائد کر دیا گیا کہ وہ لکھے۔ اسی اثناء میں کاتب کو یہ بھی یاد دلایا گیا کہ وہ اس ضمن میں اللہ کی اس نعمت کا شکرانہ ادا کرے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ صاحب فن ہونے کی وجہ سے اس کا فرض ہے کہ وہ لکھنے میں عدل و انصاف کے دامن کو تھامے رکھے۔

اس پہلی دفعہ کی تکمیل کے بعد اب دوسری دفعہ کیفیت تحریر کے بارے میں ہے۔

وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَإِنْ
كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ
فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ

"اور املاوہ شخص کرائے جس پر حق آتا ہے اور اسے اللہ ' اپنے رب سے ڈرنا چاہئے کہ جو معاملہ طے ہوا ہو اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ لیکن اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو' یا املانہ کر سکتا ہو' تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کرائے۔"

مدیون' جس پر حق آرہا ہوں' وہ اس بات کا حق ہے کہ وہ دستاویز املاء کرائے۔ قرضے کا اعتراف کرے۔ قرضے کی مقدار لکھوائے۔ اس کی شرائط طے کرے اور نوٹ کرائے' اور اس کی میعاد لکھوائے۔ یہ اس لئے کہ مدیون کے ساتھ تحریر دستاویز میں کوئی یادتی نہ ہو جائے۔ کیونکہ اگر قرض فراہم کرنے والا دستاویز طے کرائے تو وہ شرائط یا قرضے میں اضافہ کر سکتا ہے۔ میعاد میں کمی بیشی کر سکتا ہے۔ یا اپنی مصلحت و مفاد کیلئے کچھ شرائط اس میں لکھ سکتا ہے۔ اس لئے کہ قرض لینے والا کمزور پوزیشن میں ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے' دائن کی املاء کی اس وقت مخالفت کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اس لئے کہ وہ سودا ہر صورت میں کرنا چاہتا ہے اور اسے سخت ضرورت ہے۔ اور اس صورت میں دائن املا کر کے اس کے ساتھ زیادتی کرے۔ لیکن خود اگر مدیون دستاویز لکھوا رہا ہو تو وہ اپنی بات لکھوائے گا۔ جو اس نے بطیب نفس قبول کی ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں اس کا اقرار زیادہ قوی اور مضبوط ہو گا۔ کیونکہ ں نے خود تحریر کو املا کیا ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ مدیون کے ضمیر کو بھی بیدار کیا جاتا ہے کہ وہ خدا خوفی کو پیش نظر رکھے۔ اور اس کے ے جو قرض ہے۔ اس میں سے کسی چیز کو بھی کم نہ کرے۔ اور نہ ہی اس دستاویز کی ضروری شرائط میں سے کسی ایک کو ترک کرے۔ اگر یون نادان ہو' اپنے معاملات کو اچھی طرح طے نہ کر سکتا ہو۔ یا وہ ضعیف ہو یعنی عمر میں کم ہو یا ضعیف العقل ہو' یا کسی اور عذر کی وجہ سے املانہ کر سکتا ہو یعنی ان پڑھ ہے' جاہل ہے۔ یا اس کی زبان میں کوئی لکنت وغیرہ ہے۔ یا کوئی محسوس یا معقول سبب ہو' تو اس صورت میں ں کا ولی الامر یہ کام کرے اور اس ولی الامر کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ بھی فریقین کے ساتھ انصاف اور عدل سے معاملہ کرے۔ یہاں عدل ذکر اس لئے کیا گیا کہ بعض اوقات ولی الامر بھی لاپرواہی کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ قرضے کا تعلق اس کی ذات سے نہیں ہے تاکہ وہ اس رے میں تمام مفادات اور گارنٹیوں کو ضابطہ بند کر دے۔ اور یہ معاہدہ صحیح طور پر طے ہو جائے۔

یہاں آکر تحریر معاہدہ کے سلسلے میں بات ختم ہو جاتی ہے اور تحریر معاہدہ بابت قرضہ جات میعادی کے تمام پہلوؤں پر بحث مکمل ہو جاتی ہے۔ اور اب معاہدے کے دوسرے ضروری جزء پر بات ہوتی ہے۔ یعنی گواہان دستاویزات (Marguel Witnesses) وَ

اسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ ۖ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ
مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ۚ

"پھر اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرالو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک

بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلائے۔ یہ گواہ ایسے لوگوں میں سے ہونے چاہیں 'جن کی گواہی تمہارے درمیان مقبول ہو۔"

ہر معاہدے پر دو گواہوں کی شہادت ضروری ہے۔ اور وہ ایسے لوگ ہونے چاہئیں جن کی گواہی مقبول ہو۔ ترضون کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ گواہ عادل ہوں اور امت میں ان کی شہادت کو قبولیت حاصل ہو۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ان کی شہادت پر معاہدے کے ہردو فریق راضی ہو۔ لیکن بعض اوقات ایسے حالات ہوتے ہیں کہ شہادت میسر نہیں ہوتی اس لئے یہاں قانون میں یہ سہولت رکھ دی گئی ہے کہ اگر مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بن سکتی ہیں۔ گواہی کا کام مردوں کے سپرد اس لئے کیا گیا ہے کہ ایک صحت مند اسلامی معاشرہ میں عموماً مرد ہی یہ کام کرتے ہیں۔ کیونکہ اسلامی معاشرہ میں بالعموم 'عورت کو اپنی ضروریات زندگی کے لئے جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔ وہ بحیثیت ماں اور بحیثیت صنف نازک اپنے فرائض سرانجام دیتی ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ انسانیت کے سب سے بڑے سرمایہ یعنی بچوں کی پرورش اور تربیت کا کام کرے جو مستقبل کے نمائندے ہوتے ہیں اور ان بچوں کی قدروقیمت ان چند لقموں اور چند ٹکوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ جو کوئی عورت اپنے عمل سے کما سکتی ہے۔ جب کہ آج کے بے راہ اور محروم معاشرہ میں عورت کو مجبوراً اپنے ان فرائض کے ساتھ یہ کام بھی کرنا پڑتا ہے 'تو ایسے حالات میں اگر دو مرد گواہ نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بن جائیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک مرد کے مقابلے میں عورتیں دو کیوں رکھی گئی ہیں؟ قرآن کریم نے اس بات کو مجمل نہیں چھوڑا ہے۔ اس لئے کہ قانون سازی کے میدان میں ہر عبارت واضح' متعین اور قانون سازی کے اصل سبب پر مشتمل ہونا چاہئے۔

أَنْ تَضِلَّ إِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدٰىهُمَا الْأُخْرٰى "........."کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلادے۔"

سوال یہ ہے کہ عورت بھولتی کیوں ہے؟ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ کبھی یہ بھی سبب ہو سکتا ہے کہ عورتوں کو عموماً معاہدات کے میدان میں زیادہ تجربہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ کسی معاہدے کے حالات اور شرائط پوری طرح اس کے ذہن میں نہ بیٹھے ہوں۔ اور وہ مقدمہ بازی کے وقت ان کے بارے بالکل اچھی طرح شہادت نہ دے سکتی ہو۔ اس لئے سہولت کیلئے دوسری عورت کو ساتھ رکھا گیا تاکہ شہادت کے وقت وہ اسے اصل بات یاد دلا دے۔ اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور موضوع متنازعہ کے اصل حالات کو ذہن میں لا سکیں۔

کبھی اس بھول کا سبب یہ ہوتا ہے کہ عورت بہت زیادہ منفعل مزاج ہوتی ہے۔ عورت کی مامتا اور اس کی جسمانی اور عضویاتی اور طبیعاتی وظائف کا بھی یہ اہم تقاضا ہے کہ عورت منفعل ہو۔ جلد لبیک کہنے والی ہو تاکہ وہ بچے کی نشوونما کے سلسلے میں اپنے طبعی فرائض اچھی طرح سرانجام دے سکے۔ یہ فرائض ایسے ہیں جو کسی بھی عورت کی شخصیت سے جدا نہیں کئے جاسکتے۔ یہ عورت پر اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا کرم ہے اور اسی طرح پیدا ہونے والے بچے پر بھی اللہ کی رحمت ہے۔ اس لئے عورت کا یہ مزاج کسی بھی وقت اس کی شخصیت سے جدا نہیں ہو سکتا۔ اسکی اپنی شخصیت ہے اور اپنا مزاج ہے بشرطیکہ عورت صحت مند ہو اور اس کی شخصیت کو بگاڑ نہ دیا گیا ہو۔ جبکہ معاہدات جیسے پیچیدہ معاملات اور ان معاملات میں شہادت دینا ایک ایسا فریضہ ہے جس میں کسی شخص کا اپنے موقف پر جمار ہنے اور کسی بات سے متاثر نہ ہونا ایک ضروری امر ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ گواہ ایک حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو اور ثابت قدم ہو۔ ایسے مواقع پر دو عورتوں کا بیک وقت شہادت دینا اس بات کی ضمانت ہے کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلائے۔ جبکہ وہ بھول اور فطری انفعال کی وجہ سے غلط ہو رہی ہو۔ اس طرح یاددہانی کے بعد وہ اصلی واقعہ کی طرف لوٹ آئے گی۔

آغاز آیت میں جس طرح لکھنے والوں کو یہ کہا گیا تھا کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کریں۔ اب گواہوں سے بھی کہا جاتا ہے کہ جب انہیں شہادت کیلئے بلایا جائے تو وہ شہادت حق دینے سے انکار نہ کریں۔

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا ط

"گواہوں کو جب گواہ بننے کیلئے کہا جائے تو انہیں انکار نہ کرنا چاہئے۔" گویا شہادت دینا ایک فریضہ ہے محض نفل اور غیر لازم کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ احقاق حق اور قیام عدل کا اہم ذریعہ شہادت حق ہے۔ چونکہ یہ فریضہ اللہ تعالیٰ نے عائد کیا ہے اس لئے اسلامی نظام عدل میں گواہ اپنی دلی رضا شعوری آمادگی کے ساتھ شہادت دینے کیلئے آئیں گے اور وہ بغیر کسی نقصان دہی یا ہچکچاہٹ کے شہادت کیلئے آئیں گے۔ اسی طرح وہ فریقین مقدمہ میں سے کسی پر کوئی احسان بھی نہ کر رہے ہوں گے۔ چاہے وہ ایک فریق کی طرف سے بلائے گئے ہوں یا دونوں کی طرف سے بلائے گئے ہوں۔

* یہاں شہادت کی بات ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے شارع اب ایک دوسرے اہم معاملے کے سلسلے میں ہدایات دیتے ہیں۔ یہ ایک عام ہدایت ہے۔ اس میں تحریر کی تاکید کی گئی ہے۔ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو۔ بعض اوقات ایک انسان یہ بات سوچ کر کہ قرضہ تھوڑا ہے یا معاملے کی اہمیت زیادہ نہیں ہے۔ وہ لکھنے میں سستی کرتا ہے۔ یا بعض اوقات بعض دوسرے حالات ایسے ہوتے ہیں کہ انسان لکھنے میں کوتاہی کر لیتا ہے۔ مثلاً شرم و حیاء سستی اور تن آسانی لاپرواہی اور عدم مبالات وغیرہ۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ وجدانی اور عملی وجوہات کی بنا پر لکھنے اور تحریر میں لانے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ط ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا

"معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا میعاد کی تعیین کے ساتھ اس کی دستاویز لکھوا لینے میں تساہل نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ تمہارے لئے زیادہ مبنی بر انصاف ہے۔ اس سے شہادت قائم ہونے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے اور تمہارے شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے کا امکان کم رہ جاتا ہے۔"

"تساہل نہ کرو" جب نفس انسانی یہ محسوس کرتا ہے کہ کسی کام کی مشقت اس کی قدر و قیمت سے زیادہ ہے تو اس وقت نفس انسانی متاثر ہو کر وہ کام کرنے سے کتراتا ہے اور قرآن کریم اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہے۔ "یہ طریقہ تمہارے لئے زیادہ مبنی بر انصاف ہے۔" اس لئے کہ کسی معاملے میں زبانی شہادت کے مقابلے میں دستاویزی شہادت کی اساس پر زیادہ سہولت کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ زبانی شہادت کا دارومدار صرف حافظہ پر ہوتا ہے۔ اسی طرح دو مردوں یا دو عورتوں کی شہادت بمقابلہ ایک مرد یا ایک عورت کے زیادہ قوی ہے۔ اور شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے کا امکان کم رہ جاتا ہے۔ اس صورت میں شک کی گنجائش کم سے کم ہو جاتی ہے۔ یعنی معاہدہ کے اندر مشمولہ بیانات میں شک نہ رہے۔ یا تمہارے نفوس کے اندر شک نہ رہے یا دوسرے لوگوں کے اندر شک نہ رہے۔ یہاں شک کو عام رکھا گیا ہے۔ یعنی کسی پہلو میں بھی شک نہ رہے۔

یوں ان اقدامات کی حکمت آشکارہ ہو جاتی ہے۔ اور معاملہ کرنے والے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو قانون سازی فرمائی ہے وہ نہایت ہی حکیمانہ ہے اور اس کے مقاصد بہت ہی گہرے ہیں اور نہایت ہی عملی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ معاملات کے اندر صحت یقین اطمینان اور اعتبار قائم ہو۔

یہ احکام اس قرض کے بارے میں ہیں' جو میعادی قرض ہو' رہی وہ تجارت جو ہم روز مرہ کے معمولات کے مطابق کرتے ہیں' تو روز مرہ کے معاملات میں یہ حکم نہیں ہے کہ انہیں لازماً ضابطہ تحریر میں لایا جائے۔ اس میں گواہوں کی شہادت ہی کافی ہے۔ اس لئے کہ ہر کام میں معاہدے اور تحریر کے لازم کرنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تجارتی اور کاروباری سرگرمیوں میں رکاوٹیں پیدا ہوں گی۔ اس لئے کہ روز مرہ کی تجارتی سرگرمیاں بڑی تیزی سے اور مختصر وقت صرف کر کے کی جاتی ہیں۔ اسلام قانون سازی انسانی زندگی کی بہتری کیلئے کرتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر قانون بناتا ہے۔ وہ ایک عملی نظام قانون ہے' جس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ نہ اس قانون کی وجہ سے زندگی کی پر سکون رفتار میں کمی آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَٰرَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ وَأَشْهِدُوٓا۟ إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ

"ہاں جو تجارتی لین دین دست بدست تم لوگ آپس میں کرتے ہو' اس کو نہ لکھا جائے تو کوئی حرج نہیں 'مگر تجارتی معاملے طے کرتے وقت گواہ کر لیا کرو۔"

بظاہر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عام معاملات تحریر نہ کرنا رخصت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کتابت واجب ہے۔ اور لازمی ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی ذکر ہے کہ ہر معاملے کی کتابت مستحسن ہے۔ لازمی نہیں ہے۔ لیکن راجح بات یہ ہے کہ کتابت معاملات لازمی ہے۔

یہاں تک تو قانون سازی تھی اس قرضے کی بابت جس کی میعاد متعین ہو' یا وہ تجارت جس کا تعلق روز مرہ لین دین سے ہو' اور دونوں میں کتابت اور شہادت کو ضروری قرار دیا گیا ہو' لازماً یا بطور استحباب یہاں سے آگے اب کاتبوں اور گواہوں کے حقوق کا تعین کیا جاتا ہے۔ نیز ان کے فرائض کا بھی تعین کر دیا جاتا ہے۔ ان پر پہلا فریضہ یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ لکھنے یا گواہ بننے سے انکار نہ کریں۔ اور یہ کہ اب یہاں حکم دیا جاتا ہے کہ کاتبوں اور گواہوں کو مکمل تحفظ فراہم ہو تاکہ سچائی اور لوگوں کے حقوق میں توازن پیدا ہو اور لوگ بسہولت اپنے سوشل فرائض سرانجام دے سکیں۔ بلا خوف و خطر..... فرماتے ہیں۔

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِن تَفْعَلُوا۟ فَإِنَّهُۥ فُسُوقٌۢ بِكُمْ ۗ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ ٱللَّهُ ۗ وَٱللَّهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٨٢﴾

"کاتب اور گواہ کو نہ ستایا جائے۔ ایسا کرو گے تو گناہ کا ارتکاب کرو گے۔ اللہ کے غضب سے بچو۔ وہ تم کو صحیح طریق عمل کی تعلیم دیتا ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔"

کسی لکھنے والے یا کسی گواہی دینے والے کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ محض اس وجہ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے' اس پر عائد کردہ فریضہ ادا کر رہا ہے۔ اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمہاری جانب سے خدا کے قانون کے خلاف بغاوت ہوگی اور اسلامی طریقہ حیات کی مخالفت ہوگی۔ لہٰذا اسلامی ریاست کو چاہئے کہ وہ یہ تحفظ لازماً فراہم کرے۔ کیونکہ کاتبین اور شاہد اکثر اوقات مقدمہ کے فریقین میں سے کسی ایک کے غیظ و غضب کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے انہیں ایسے تحفظات اور ایسی ضمانتیں حاصل ہونا چاہئیں جن کی وجہ سے وہ

مطمئن ہو کر اپنا فرض ادا کر سکیں۔ بلکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو کہ وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے اچھی طرح عہدہ بر آ ہو سکیں اور شرح صدر کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دے سکیں چاہے حالات کیسے ہی ہوں۔

قرآن کریم کی یہ عادت ہے کہ وہ ہروقت انسان کے ضمیر کو جگاتا رہتا ہے' انسان کے دل میں یہ شعور پیدا کرتا ہے کہ وہ ایک ذمہ دار شخصیت ہے۔ تاکہ اطاعت قانون کا جذبہ خود نفس انسانی کے اندر سے پیدا ہو' اسلام صرف دفعات قانون کے دباؤ پر اکتفاء نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اہل ایمان کو خدا خوفی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اور یہ بات تقریباً ہر مضمون کے خاتمہ پر کی جاتی ہے۔ قرآن کریم اہل ایمان کو یاد دلاتا ہے کہ یہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے تم پر اپنا فضل و کرم کیا۔ وہی ہے جو تمہیں تعلیم دیتا ہے۔ اور تمہاری راہ نمائی کرتا ہے۔ خدا خوفی سے ان کے دلوں کے دروازے معرفت الٰہیہ کیلئے کھل جاتے ہیں۔ ان کی روح علم حاصل کرنے کیلئے متوجہ ہوتی ہے۔ اور یہ سب کچھ محض اس لئے ہے کہ وہ اللہ کے اس فضل و کرم کا شکرانہ ادا کرتے ہوئے اس کی اطاعت کریں۔ اس سے راضی ہوں' اور اس کی ذات پر مکمل بھروسہ کریں۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ

"اللہ کے غضب سے بچو' وہ تم کو صحیح طریق عمل کی تعلیم دیتا ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔"

اس کے بعد شارع قرضے کے احکام کی تکمیلی دفعات بیان کرتا ہے۔ یہ احکام ذرا مؤخر اس لئے بیان کئے گئے ہیں کہ ان کا تعلق عام حالات سے نہیں ہے۔ بلکہ بعض خاص حالات سے ان کا تعلق ہے۔ مثلاً فریقین معاہدہ اگر سفر میں ہوں اور انہیں ایسا شخص نہ مل رہا ہو جو تحریر تیار کرے تو اللہ تعالیٰ نے بغیر تحریر کے زبانی معاہدہ کرنے کی بھی اجازت دے دی بشرطیکہ قبضہ موقعہ پر ہی دے دیا گیا ہو یعنی اس چیز کا قبضہ جو مقروض نے قرض خواہ کو بطور گارنٹی دینا کی ہو۔ فرماتے ہیں۔ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰي سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِھٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ

"اگر تم سفر کی حالت میں ہو' اور دستاویز لکھنے کیلئے کوئی کاتب نہ ملے' تو رہن بالقبض پر معاملہ کرو۔" لیکن اس ظاہری ضمانت کے ساتھ شارع اہل ایمان کے ضمیر کے اندر خدا خوفی کا جذبہ پیدا کر کے انہیں آمادہ کرتا ہے کہ وہ امانت دار بنیں' اپنی ذمہ داریاں پوری کریں' اس لئے کہ ظاہری ضمانت کے مقابلے میں خدا خوفی وہ آخری ضمانت ہے جو کسی معاملے میں کارگر ہو سکتی ہے۔ اور جس کی اساس پر کسی قانون پر صحیح طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے کسی حقدار تک اس کا حق اچھی طرح پہنچ سکتا ہے۔ اور سب کے حقوق محفوظ ہو سکتے ہیں۔

فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۭ

"اگر تم میں سے کوئی شخص دوسرے پر بھروسہ کر کے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرے' تو جس پر بھروسہ کیا گیا ہو' اسے چاہئے کہ امانت ادا کرے اور اللہ' اپنے رب سے ڈرے۔"

مدیون پر بھروسہ کیا جاتا ہے کہ وہ قرضہ پوری طرح ادا کرے گا اور قرض خواہ پر یہ اعتماد کیا گیا ہے کہ وہ مرہون چیز کو اپنی اصلی حالت میں واپس کرے گا۔ دونوں کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ خدا خوفی کا رویہ اختیار کر کے اپنے اپنے فرائض سرانجام دیں۔ اس لئے کہ اللہ ہی ہے جو ان دونوں کا رب ہے۔ وہی دونوں کا نگہبان' مربی' سربراہ' حکم اور قاضی ہے۔ یہ تمام تصورات' معاملات اور فرائض و ذمہ داریوں کی ادائیگی کے معاملے میں بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس نے

امانت داری کے معاملے میں آیت کتابت کو منسوخ کردیا ہے۔ لیکن یہ رائے درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ صرف حالت سفر میں معاملات کے اندر تحریر نہ کرنے کی رخصت ہے اور یہ امانت داری اور قرض مکفول کا تعلق بھی سفر کی حالت سے ہے اور سفر میں قرض خواہ اور قرض دار دونوں ہی ایک دوسرے پر بھروسہ کرکے معاملہ کرتے ہیں۔ غرض تقویٰ و طہارت پر ابھارتے ہوئے یہاں شہادت کے سلسلے میں بات اختتام تک پہنچتی ہے۔ اور یہاں شہادت سے مراد وہ شہادت نہیں ہے جو بوقت کتابت کسی تحریر پر ڈالی جاتی ہے بلکہ اس سے مراد وہ شہادت ہے جو عدالت میں دی جاتی ہے۔ اس لئے کہ یہ شہادت گواہ کے پاس ایک قسم کی امانت ہوتی ہے۔

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ

"اور شہادت ہرگز نہ چھپاؤ اور جو شہادت چھپاتا ہے اس کا دل گناہ آلودہ ہے۔"

یہاں بات کی نسبت قلب مومن کی طرف کی جاتی ہے۔ اور گناہ کا استناد قلب مؤمن کی طرف کیا جاتا ہے۔ یوں شہادت کا چھپانا دراصل اپنے ضمیر میں گناہ کا چھپانا ہے۔ دونوں باتوں کا تعلق دل و دماغ کی گہرائیوں سے ہے۔ چنانچہ خاتمۂ کلام ایک دھمکی آمیز فقرے سے کیا جاتا ہے۔ جس میں یہ توجہ دلائی جاتی ہے کہ

۳۹ ع۲ ۷

وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٢٨٣﴾

"اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔" "اور وہ اپنے علم کے مطابق پوشیدہ قلبی اعمال پر بھی جزاء و سزا دے گا۔"

انہی ہدایات کی مزید تاکید اگلی آیت میں بھی جاری ہے۔ مالک ارض و سماوات کے خوف پر دلوں کو ابھارا جاتا ہے۔ جو اس کائنات کی تمام چیزوں کا مالک حقیقی ہے۔ جو تمام دلی بھیدوں کا بھی جاننے والا ہے اور تمام ظاہری باتوں سے بھی خبردار ہے۔ اور وہ تمام اعمال پر سزا اور جزاء بھی دینے والا ہے۔ وہی ہے جو تمام بندوں کے معاملات پر فیصلے کرتا ہے۔ کسی پر اُس کی رحمت نازل ہوتی ہے اور کوئی اس کے عذاب میں گرفتار ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے اور ہر چیز اس کی مشیئت کے تابع ہے۔ اور اللہ کی مشیئت بے قید ہے۔

لِّلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَإِن تُبْدُوا مَا فِي أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُم بِهِ اللَّهُ ۖ فَيَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٨٤﴾

"آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے۔ تم اپنے دل کی باتیں خواہ ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ بہرحال ان کا حساب تم سے لے گا۔ پھر اسے اختیار ہے جسے چاہے معاف کردے اور جسے چاہے سزا دے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ وہ خالص قانون سازی کرنیوالی آیات کے خاتمہ کلام پر بھی خالص وجدانی اور اخلاقی راہنمائی کرتا ہے۔ یوں وہ دنیاوی زندگی کے لیے ضابطہ بندی کا تعلق بھی خالق کائنات سے جوڑ دیتا ہے۔ اور یہ رابطہ ایک مستحکم رابطہ ہوتا ہے۔ جس میں ایک طرف تو خدا خوفی کا تصور ہوتا ہے اور دوسری جانب مالک ارض و سما کی مغفرت اور رحمت کی امیدواری ہوتی ہے۔ یہی اخلاقی ضمانت

ہے جو اسلامی نظام قانون کو حاصل ہوتی ہے۔ اور جو اسے دوسرے نظامہائے قانون سے ممتاز اور ممیز کر دیتی ہے۔ اور ایک اسلامی معاشرے میں ایک مسلمان کے دل میں اسلامی قانون کا بے حد احترام پایا جاتا ہے۔ یہ اخلاقی گائڈ اور قانون سازی اسلامی معاشرہ میں متوازی طور پر چلتی ہیں۔ اسلام ان دونوں کی اخلاقی تربیت کا بھی انتظام کرتا ہے جس کے لئے وہ قانون سازی کرتا ہے۔ نیز اسلام اس معاشرے کی اخلاقی تربیت بھی کرتا ہے جس کیلئے وہ قانون سازی کرتا ہے۔ اور یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کی مکمل اور متوازن حکمت عملی پر مبنی ہوتا ہے۔ کہ ایک طرف افراد و معاشرہ کی اخلاقی تربیت ہو رہی ہوتی ہے' اور دوسری جانب ان کے لئے حکیمانہ قانون سازی ہو رہی ہوتی ہے۔ خدا کا خوف اور قانون کا خوف ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اور انسان کیلئے قانون وہی ہوتا ہے جو انسان کے خالق نے اس کیلئے تجویز کیا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے مقابلے میں اہل زمین کے قوانین' اہل دنیا کی ضابطہ بندیاں' اہل زمین کے نظام کیسے چل سکتے ہیں۔ انسان کی کوتاہ سوچ' انسان کی محدود عمر' انسان کا محدود علم' انسان کی محدود فکر' اس کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے۔ انسان کی خواہشات آئے دن بدلتی رہتی ہیں۔ کبھی دو انسان کسی بات پر متفق نہیں ہوتے۔ انسان کی کسی رائے کو قرار و ثبات حاصل نہیں ہوتا۔ اس کی معلومات آئے دن بدلتی رہتی ہیں۔ ایسے حالات میں انسانیت کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے خالق سے جدا ہو کر ماری ماری پھر رہی ہے۔ حالانکہ اللہ وہ ذات ہے جس نے انسان کو پیدا کیا۔ وہ جانتا ہے کہ اس نے جس چیز کی تخلیق کی ہے اس کی فطرت کیا ہے۔ اس کی مصلحت کیا ہے' ہر آن اور ہر جگہ اس کے بدلتے ہوئے مصالح اور ضروریات کیا ہیں۔

انسانیت جان لے کہ اس کی یہ عظیم بدبختی ہے کہ وہ اللہ کی شریعت اور اللہ کے منہاج زندگی سے روگردانی اختیار کئے ہوئے ہے۔ یاد رہے کہ الٰہی نظام زندگی سے فرار اور بغاوت کا آغاز مغرب میں اس وقت شروع ہوا' جب لوگوں ظالم اور باغی کلیسا کا جُوا اپنی گردنوں سے اتارنا چاہا۔ مغرب میں لوگوں نے کنیسا کے اس تصور خدا اور تصور الٰہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ جس کی طرف کنیسا لوگوں کو بلاتا تھا۔ اور جس تصور کے مطابق لوگوں کے لئے غور و فکر کرنا اور عقل سے کام لینا حرام تھا۔ اور کلیسا نے مغرب میں عوام پر بھاری ٹیکس عائد کر رکھے تھے۔ اور ان پر ایک ظالمانہ استبدادی نظام مسلط کر رکھا تھا' جس سے عوام کے اندر سخت نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ جب لوگوں نے اس جبر و استبداد سے گلوخلاصی چاہی تو انہوں نے سوچا کہ جب تک وہ کنیسا کے خلاف اعلان جنگ نہ کریں گے اور اس جبر و استبداد سے گلوخلاصی حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن اس معاملے میں اہل مغرب حد اعتدال پر قائم نہ رہے' انہوں نے اہل کنیسا سے آزادی حاصل کرنے پر اکتفانہ کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ خدا اور خدا کے اقتدار اعلیٰ سے بھی اپنے آپ کو آزاد کر لیا۔ اس طرح انہوں نے کرہ ارض پر سے ہر اس دین کو مٹا دیا جس کی دعوت یہ ہو کہ لوگ اللہ کے نظام زندگی کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری انسانیت پر ایک عظیم تباہی نازل ہوئی اور اس پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے۔[۱]

رہے ہم جو اسلام کے مدعی ہیں' تو ہمارے حالات قابل غور ہیں۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نے اسلامی نظام زندگی سے بغاوت حاصل کر لی ہے۔ اللہ کی شریعت اور اسلامی قانون کو ترک کر دیا ہے۔ اور ہمارے یہ حالات اس حقیقت کے باوجود ہیں کہ ہمارے سیدھے سادھے فطری دین نے ہمیں صرف وہی احکام دیئے ہیں جو ہم سے وہ تمام بوجھ اتارتے ہیں جو عیسائیت نے عائد کئے تھے۔ وہ تمام بندھن توڑ دیئے ہیں جن میں ہم ناجائز طور پر جکڑے ہوئے تھے۔ اس دین نے ہمارے ساتھ نہایت ہی مشفقانہ' رحیمانہ سلوک کیا اور ہمارے لئے راہنمائی' یسر اور استقامت کا سامان فراہم کیا۔ اور ایک ایسے راستے پر ہمیں گامزن کیا جو ہر طرف سے ترقی و اصلاح کی طرف جاتا ہے۔ اور جس راستے میں کامیابی ہی کامیابی ہے۔

---

۱۔ اس موضوع پر دیکھئے کتاب الانسان بین المادیہ والاسلام اور کتاب معرکۃ التقالید' از جناب محمد قطب ﷾

# درس ۲۲ ایک نظر میں

یہ سبق اس عظیم سورت کا اختتامیہ ہے۔ یہ قرآن کریم کی طویل ترین سورت ہے۔ اور اس کی تعبیرات بھی اپنے اندر ایک بڑا حجم رکھتی ہیں۔ اس سورت کے اس حجم اور طوالت کے اندر اسلامی تصور حیات کے ایک بڑے حصے کو سمو دیا گیا ہے۔ اسلامی نظریۂ حیات کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کے ساتھ ساتھ' اسلامی جماعت کی مختلف صفات' اس کے فرائض' اس کے طریقۂ کار اور اس کرۂ ارض پر مختلف امور کے بارے میں اسکی پالیسیوں کے بارے میں پوری تفصیلات اس سورت میں موجود ہیں۔ اس پوری کائنات میں امت مسلمہ کا کیا کردار ہے؟ اسلامی نظام زندگی کے مخالفین' مقابلین اور دشمنان کے بارے میں اس کا کیا موقف ہے؟ ان دشمنان کا مزاج کیا ہے اور اسلامی نظام کی محاربت میں ان کے وسائل کیا ہیں؟ نیز اسلامی جماعت ان کے مقابلے میں کیا وسائل و ذرائع اختیار کر رہی ہے۔ اور ان کی سازشوں کا مقابلہ کن ذرائع سے کر رہی ہے۔ ان امور کے علاوہ اس سورت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مجموعی لحاظ سے خود حضرت انسان کا اس کرۂ ارض پر کیا کردار مقرر کیا گیا ہے؟ انسان کی فطرت کیا ہے؟ اور انسانی تاریخ میں انسان سے کیا کیا کوتاہیاں اور لغزشیں ہوئی ہیں۔ تاریخی قصص پیش کر کے اسکی وضاحت کی گئی ہے۔ غرض یہ اور وہ تمام دوسری باتیں جن کی تفصیلات اس طویل سورت میں بیان کی گئیں۔

یہ سبق اس طویل سورت کا اختتامیہ ہے اور صرف دو آیات میں لیکن ان دو آیات میں ان تمام مضامین اور افکار کو سمو دیا گیا ہے۔ جو اس طویل ترین سورت میں زیر بحث آئے۔ یہ آیات فی الواقع سورت کا ایک اچھا اختتامیہ ہیں جو اس پوری سورت کے ساتھ ہم آہنگ' متناسب اور اس سورت کے مقاصد اور اس کے اندر پائی جانے والی واقعاتی فضاء کے ساتھ مناسب ہیں۔

اس سورت کا آغاز ان الفاظ سے ہوا تھا۔ "الف' لام' میم' یہ اللہ کی کتاب ہے۔" اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ ہدایت ہے ان پرہیز گاروں کیلئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے انہیں سے خرچ کرتے ہیں۔ جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں۔ اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔"

ان الفاظ میں اس حقیقت کی طرف واضح اشارات دیئے گئے ہیں کہ اہل ایمان تمام رسولوں اور تمام کتابوں پر ایمان لاتے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ اب ذرا اس اختتامیہ کے الفاظ پر غور کریں۔ اور رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے۔ جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے۔ اور جو لوگ اس رسول کے ماننے والے ہیں۔ انہوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کر لیا ہے۔ یہ سب اللہ اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ "ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔" غرض یہ ایک ایسا اختتامیہ ہے جس طرح کتاب کے کور کے دو حصے ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس سورت میں امت مسلمہ کے فرائض کا بڑا حصہ بیان کیا گیا ہے۔ اور زندگی کے مختلف میدانوں میں اسلامی قوانین کی تفصیلات بھی دی گئی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے جس طرح اپنے فرائض کو نظر انداز کیا اور جس طرح انہوں نے شریعت خداوندی سے روگردانیاں کیں ان کا بھی تفصیلاً ذکر کیا گیا۔ چنانچہ اختتامیہ میں یہ آیات صاف بتا رہی ہیں کہ اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی اور شریعت کی اطاعت کس طرح ہوتی ہے اور ذمہ داریوں سے پہلوتہی اور شریعت سے نافرمانیاں کیونکر کی جاتی ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ پر کوئی مصیبت ڈالنا نہیں چاہتے۔ نہ اس پر کوئی بھاری بوجھ لادنا چاہتے ہیں۔ نہ اللہ تعالیٰ کو امت مسلمہ

سے کوئی خاص دوستی ہے۔ جس طرح یہود و نصاریٰ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خاص محبوبین میں سے ہیں۔ اور نہ یہ صورت حال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو نظرانداز کردیا ہے۔ بلکہ صورت احوال یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے' اس کا پھل اسی کیلئے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے' اس کا وبال اسی پر ہے۔"

اس سورت میں بنی اسرائیل کے کچھ قصے بھی بیان کئے گئے ہیں۔ وہ حالات بھی بیان کئے گئے ہیں جن میں بڑے مشکل وقت اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر اپنا فضل و کرم کیا اور اس انکار اور ناشکری کا تذکرہ بھی ہوا ہے۔ جو ان انعامات کے مقابلے میں انہوں نے کی۔ پھر وہ سزائیں بھی مذکور ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے بطور کفارہ ناشکری انہیں دیں اور یہ سزائیں سزائے موت تک تھیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ............................ "تو اپنے باری تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور اپنے آپ کو قتل کرو۔" ایسے ہی حالات کے بارے میں اسی سورت کے اختتام پر اہل ایمان کو دعا سکھائی جاتی ہے کہ وہ خشوع و خضوع کے ساتھ ایسے حالات سے پناہ مانگیں جو بنی اسرائیل کو پیش آئے۔ فرماتے ہیں۔ "اے ایمان والو' یوں دعا کرو "اے ہمارے رب' ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں' ان پر گرفت نہ کر' مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال' جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار! جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے وہ ہم پر نہ رکھ' ہمارے ساتھ نرمی کر' ہم سے درگزر فرما' ہم پر رحم کر۔"

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے مومنین پر قتال فی سبیل اللہ فرض کیا تھا۔ اور انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کے راستے میں جہاد کریں اور اپنا مال اس کی راہ میں خرچ کریں تاکہ کفار اور کفر دونوں کا دفاع کیا جاسکے۔ چنانچہ سورت کے آخر میں اس دعا میں وہ ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کیلئے اللہ کی امداد چاہتے ہیں۔ دشمن کے مقابلے میں اللہ کی نصرت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ "تو ہمارا مولیٰ ہے' کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔"

غرض یہ اس پوری سورت کا اختتامیہ ہے۔ اس میں مضامین سورت کا خلاصہ بصورت اشارات دیا گیا ہے۔ جو پوری سورت کے اصل خطوط کے ساتھ متناسب اور متوازی ہے۔ پھر ان دونوں آیات پر مشتمل اس اختتامیہ کا ہر لفظ اپنے اندر وسیع معانی رکھتا ہے۔ ہر لفظ کا اپنا موضوع اور اپنی اہمیت ہے اور اس کے پیچھے جو مباحث گزرے ہیں۔ یہ لفظ ان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور یہ مباحث عظیم مباحث ہیں۔ جن کا تعلق اسلامی نظریۂ حیات' نیز دین اسلام میں اسلامی نظریۂ حیات کی اہمیت' اس کی خصوصیات اور اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ہیں۔ ان میں اہل ایمان کا اپنے رب کے ساتھ تعلق کی نوعیت' اللہ کے بارے میں ان کا تصور' وہ فرائض اور ذمہ داریاں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر عائد کیں۔ ان کی تفصیلات ہیں۔ وہ التجا کرتے ہیں کہ اللہ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ وہ مشیت ایزدی کے تابع ہوں اور اللہ کی مدد ان کے شامل حال رہے۔ غرض اس اختتامیہ کے ہر لفظ کی اپنی جگہ ایک عظیم اہمیت ہے۔ اور جو شخص قرآن کے سائے میں زندگی بسر کر چکا ہوں اور اسے معلوم ہو کہ قرآن کریم کا انداز تعبیر کیا ہے؟ اور اس کی آیات میں سے ہر آیت کے اسرار و رموز کیا ہیں تو اسے معلوم ہے کہ ان الفاظ میں سے ہر لفظ کی اپنی شان ہے اور ہر لفظ ایک اعجوبہ ہے۔.......... مناسب ہے کہ ہم ان آیات پر قدرے تفصیلی بحث کریں۔

☆......☆......☆......☆......☆

# درس ۲۲ نمبر تشریح آیات

## آیت نمبر ۲۸۵ تا ۲۸۶

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝

"رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے' جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے۔ اور جو لوگ اس رسول کے ماننے والے ہیں' انہوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کیا ہے۔ یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ "ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔" ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی۔ مالک ہم تجھ سے خطابخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔"

ان آیات میں اہل ایمان کی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ اس برگزیدہ جماعت کی تصویر ہے۔ جس کی زندگی میں حقیقت ایمان عملی شکل میں ظاہر تھی۔ اور قیامت تک آنیوالی تمام جماعتوں کے یہی خدوخال ہوں گے۔ جن کی زندگیوں میں حقیقت ایمان عملی شکل اختیار کرلے۔ اس جماعت مومنہ کو اللہ تعالیٰ یوں اعزاز دیتے ہیں کہ اس کا ذکر حضور ﷺ کے ساتھ صفت ایمان میں یکجا کرتے ہیں۔ یہ ایک عظیم اعزاز و شرف ہے۔ اس لئے کہ اس یکجائی سے جماعت مومنہ حقیقت رسالت تک رسائی حاصل کرلیتی ہے۔ اور جماعت مسلمہ کو یہ شعور بھی حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر اس کی حیثیت اور مقام کیا ہے' اسے احساس ہو جاتا ہے۔ وہ کیا مرتبۂ بلند ہے۔ جس تک اللہ تعالیٰ نے اسے اٹھایا ہے۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ صفت ایمان میں اہل ایمان کو حضور اکرم ﷺ کے ساتھ یکجا فرماتے ہیں کہ رسولؐ اور صحابہ کرامؓ سب ایمان لائے ہیں۔ ایک ہی صفت ایک ہی آیت میں اور پھر اللہ کے کلام میں اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ...... .................... "رسول اس ہدایت پر ایمان لائے ہیں۔ جو ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل ہوئی ہے۔ اور جو لوگ اس رسول کے ماننے والے ہیں۔ انہوں نے بھی اسی ہدایت کو دل سے تسلیم کیا ہے۔"

رسول خدا پر جو کلام نازل ہوتا ہے' اس پر رسول کا ایمان مہبط وحی ہونے کی وجہ سے براہ راست ہوتا ہے۔ آپ کے قلب صافی پر بلند و برتر وحی نازل ہوتی ہے اور براہ راست حقیقت عظمیٰ کے ساتھ آپ کا بلاواسطہ تعلق قائم ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو شخصیت رسول میں بذات خود' بلاکسب و اکتساب متشکل ہوتی ہے۔ رسول اور ذات باری کے درمیان نہ کوئی واسطہ ہوتا ہے اور نہ ہی رسول کے مقام رسالت کے بارے میں کچھ عزائم ہوتے ہیں۔ اس لئے رسول کا درجہ ایمان کے متعلق تو رسول ہی سوچ سکتا ہے اور اس کا وصف اور بیان بھی وہی شخص کر سکتا ہے جس نے درجہ ایمان کو بعینہ رسولؐ کی طرح پالیا ہے۔ تو ذات باری اور کلام باری پر یہ براہ راست

ایمان صرف رسول کا ایمان ہوتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو رسول خدا ؐ کے ساتھ صفت ایمان میں شریک کر کے گویا ان کو ایک قسم کا شرف و اعزاز عطاء فرماتے ہیں۔ حالانکہ رسول خدا ﷺ کے ساتھ صفت ایمان کی حقیقت اور آپ کے سوا تمام اہل ایمان کی حقیقت' ماہیت اور کیفیت میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اور اس ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کے حدود اربعہ کیا ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۤ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ

"یہ سب اللہ' اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔ ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی۔ مالک ہم تجھ سے خطابخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔"

یہ ہے مکمل ایمان جو دین اسلام نے پیش کیا ہے۔ یہ ایمان اس قابل ہے کہ جس پر یہ امت پوری طرح جم جائے جو دین کی وارث ہے۔ جو اس دین کی داعی ہے۔ اور یہ دعوت اس نے قیام تک پوری دنیا کو دینی ہے۔ جس دعوت کی جڑیں تاریخ کی طویل وادیوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جس کے قافلے مسلسل چل رہے ہیں۔ یہ رسالت کے قافلے ہیں' ایمان کے قافلے ہیں اور انسان کی طویل تاریخ میں یہ قافلے پھیلے ہوئے ہیں۔ یہی ایمان ہے جس نے آغاز انسانیت سے' انسانوں کو دو محاذوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک محاذ اہل ایمان کا ہے۔ اور دوسرا محاذ اہل کفر کا ہے۔ ایک محاذ حزب اللہ کا ہے اور دوسرا حزب الشیطان کا ہے۔ اور پوری انسانی تاریخ گواہ ہے کہ ان کے علاوہ کوئی تیسرا محاذ نہیں ہے۔

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ......... "سب ایمان لائے ہیں۔" اللہ کی ذات پر ایمان اسلامی تصور حیات کا بنیادی پتھر ہے۔ یہ اس نظام زندگی کی اساس ہے جو زندگی کو استحکام بخشتا ہے۔ یہ اسلامی اخلاقیات کی اساس ہے۔ اور اسی پر اسلام کا اقتصادی نظام استوار ہوا ہے۔ اور یہ ہر اس تحریک کی اساس ہے جو ایک مسلم یہاں یا وہاں برپا کرتا ہے۔

اور ایمان باللہ کا مفہوم کیا ہے؟ یہ کہ صرف اللہ ہی الٰہ ہے۔ وہی رب ہے' وہی بندگی کے لائق ہے۔ وہی ہے جسے انسان کے ضمیر' انسان کے طرز عمل' اور اس کی زندگی کے ہر موڑ پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔ اس لئے اللہ کے ساتھ اس کی خدائی میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اس جہاں کی نگہبانی میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اسی کائنات کی تخلیق میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کائنات کو چلانے میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کائنات کے چلانے میں اس کے کام میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ اس زندگی کے چلانے میں کوئی دخیل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اس مخلوق کی رزاقی میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس مخلوق کی نفع رسانی یا ضرر رسانی میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ غرض اس کائنات کا کوئی بڑا معاملہ ہو یا چھوٹا' اس کی مشیئت اور رضا کے سوا پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔

عبادت اور بندگی کے معاملے میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں۔ عبادت کے شعائر میں کوئی شریک نہیں' اطاعت و بندگی میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ نہ دین میں اس کا کوئی شریک ہے۔ لہٰذا پرستش صرف اسی کی ہوگی۔ اطاعت صرف اسی کی ہوگی یا اس کی ہوگی جو اللہ تعالیٰ کیلئے کام کر رہا ہے اور اس کی شریعت کو نافذ کر رہا ہے اور اپنے اقتدار اور سلطنت کو اللہ سے اخذ کرتا ہے۔ اس لئے کہ مقتدر اعلیٰ تو وہی ذات ہے۔ لہٰذا عوام الناس پر فکری حکومت' یا ان کے طرز عمل پر حکومت وہی شخص کر سکتا ہے۔ جو

دین اسلام سے اپنے لئے اقتدار اعلیٰ حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا اخلاقی اصول اور قانون سازی کے اصول و قواعد ' ہمارے اجتماعی نظام کے اصول اور ہمارے اقتصادی اصول ' سب کے سب صرف ذات باری تعالیٰ کے احکام اور اس کی ذات سے اخذ ہوسکتے ہیں۔ یہی ہے ایمان کا مفہوم اور اس کا خلاصہ ' یہی ایمانی تصور حیات ہے جس کو اپنا کر ایک شخص ماسوا اللہ کے بندھنوں اور غلامیوں سے آزاد ہوسکتا ہے۔ شریعت خداوندی کے علاوہ تمام حدود و قیود سے آزاد ہو جاتا ہے۔ آزاد ہی نہیں بلکہ انسان سلطنت الٰہیہ کے سوا تمام قوتوں پر غالب آجاتا ہے۔

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ ............ "اور اس کے فرشتوں پر۔" اللہ کے فرشتوں پر ایمان لانا ' ایمان بالغیب کا ایک پہلو ہے۔ اسی سورت کے آغاز میں ' یعنی حصہ اول میں ہم اس موضوع پر بحث کر آئے ہیں کہ فرشتوں پر ایمان لانے کے اثرات انسانی زندگی پر کیا پڑتے ہیں اور اس کے کیا فوائد ہیں۔ ۱۔ یہ ایمان انسان کو اس نچلی سطح سے بلند کر دیتا ہے جو خود اس کی دنیا تک محدود ہے اور جو خاصہ حیوانات ہے۔ اس ایمان کی بدولت انسانی علم و معرفت کا ماخذ حواس سے وراء ہو جاتا ہے۔ اور ایک انسان ایک حیوان کی سطح سے بلند ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ اعلان کر دیتا ہے کہ وہ انسان ہے اور اس کے خواص بالکل جدا ہیں۔ انسان کا یہ ایک فطرتی تقاضا ہے کہ وہ پردۂ غیب کے اندر مستور نامعلوم حقائق کو معلوم کرنے کا شوق رکھتا ہے۔ یہ حقائق اگرچہ اس کے حواس کے دائرہ سے باہر ہوتے ہیں لیکن انسان بتقاضائے فطرت ان کے وجود کو محسوس کرتا ہے۔ اگر انسان کے اس فطری داعیہ اور تقاضے کو سامنے وہ غیبی حقائق نہ رکھے گئے۔ جو اسے اللہ تعالیٰ نے عطا کئے ہیں تو انسان کا یہ داعیہ افسانوں اور مذہبی دیومالاؤں میں گم ہو کر اپنے اس فطری تقاضے کی تشفی کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی ایک فطری پیاس کو بجھاتا ہے اور اگر وہ ان توہمات اور طلسمات میں نہ پڑے تو وہ نفسیاتی الجھنوں اور اضطرابات کا شکار ہو جاتا ہے۔ ۲۔

فرشتوں پر ایمان لانا بھی ایک ایسی حقیقت ہے کہ انسان کا فہم و ادراک بذات خود اسے نہیں پاسکتا۔ یعنی صرف ان محسوس اور عقلی قوتوں کے بل بوتے پر جو اسے عطا کی گئی ہیں۔ لیکن اپنی فطرت کے اعتبار سے ' انسان کے اندر ان غیبی حقائق تک رسائی کا بے حد شوق پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ خالق انسان ہے۔ وہ اس کی ساخت اور اسکے رجحانات سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ ان امور سے بھی واقف ہے جو انسان کیلئے مفید ہیں اور جن سے اسکی اصلاح بھی اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی رحمت و شفقت کی وجہ سے بعض غیبی حقائق سے مطلع کیا۔ اور تمثیلات کے ذریعہ ' ان غیبی حقائق کو اس کے فہم و ادراک کے قریب لانے کی کوشش کی۔ کیونکہ بغیر تمثیلات کے انسان کے موجود ذرائع فہم ان کا براہ راست ادراک سے قاصر تھے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی ذاتی جدوجہد سے ان حقائق کے معلوم کرنے کی خاطر محنت و مشقت سے بچالیا۔ اس لئے کہ صرف اپنی ذاتی قوتوں کے بل بوتے پر اس کیلئے یہ ممکن ہی نہ تھا۔ اس سلسلے میں وہ الٰہی علم و معرفت کا محتاج تھا۔ اگر اللہ کی جانب سے اسے یہ حقائق بتلائے نہ جاتے تو اس کا دل کبھی مطمئن نہ ہوتا اور اس کی شخصیت سکون و قرار سے محروم ہوتی۔ جو لوگ اپنی فطرت کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور اپنی زندگی کے تصور سے غیبی حقائق کی نفی کرتے ہیں۔ وہ ایسے خرافات اور اوہام کا شکار ہو جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ یا پھر وہ ذہنی خلجان میں مبتلاء ہو جاتے اور ان کی زندگی پیچیدگیوں اور مضحکہ انگیز خرافات کا شکار ہو جاتی ہے۔

ملائکہ پر ایمان دراصل ان غیبی حقائق پر ایمان ہے ' جو عقل و خرد کے اعتبار سے یقینی حقائق ہیں۔ پھر یہ حقائق منجانب اللہ ہیں اور ان پر ایمان کے نتیجے میں اس کائنات کے بارے میں انسانی شعور کو وسعت ملتی ہے۔ مومن کے تصور میں یہ جہاں اسقدر سکڑا ہوا نہیں ہوتا کہ یہ اسی قدر ہے جس قدر اس کے حواس میں آسکتا ہو۔ اس لئے کہ انسانی حواس اس کائنات کے نہایت ہی مختصر حصے پر قابو پا

۱۔ دیکھئے حصہ اول ' طبع چہارم ص ۴۰۔ ۲۔ دیکھئے ' اسلامی تربیت کا منہاج ' مصنفہ محمد قطب ' فصل خطوط متقابلہ فی النفس البشریہ۔

سکتے ہیں۔ فرشتوں پر ایمان لانیوالے انسان میں یہ شعور بھی موجزن ہوتا ہے کہ اس کی رفاقت میں' اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے' بے شمار غیر مرئی مومنین ہیں' جو اس کے ساتھ اپنے رب پر ایمان لانے میں شریک ہیں' جو اس کیلئے ہروقت استغفار کرتے رہتے ہیں۔ ہر بھلے کام میں اس کے معاون و مدد گار ہیں' اگر اللہ چاہے۔ غرض یہ ایک لطیف' اور تروتازہ ہم نشین کا شعور ہوتا جو ہروقت ایک مومن کو حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے غیبی معرفت حاصل کئے ہوئے ہوتا ہے۔ جو اللہ پر ایمان لانیوالوں اور فرشتوں پر ایمان لانے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔

وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ ........... ......... "اس کی کتابوں پر' اس کے رسولوں پر..... اور ہم اس کے رسولوں میں سے کسی ایک میں تفریق نہیں کرتے۔" اسلام نے اللہ پر ایمان لانے کا جو تصور دیا ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ ہم اللہ کی تمام کتابوں اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لے آئیں۔ اور اس سلسلے میں کسی ایک رسول اور دوسرے رسول کے درمیان کوئی امتیاز نہ کریں۔ اس لئے کہ اللہ پر ایمان لانے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ان تمام حقائق پر ایمان لے آئے' جو منجاب اللہ آئے ہیں۔ ان تمام رسولوں کی تصدیق کرے' جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے کبھی مبعوث ہوئے۔ اس لئے کہ وہ سرچشمہ ایک ہے۔ جس کی جانب سے یہ سب رسول آئے۔ وہ تمام کتابیں جو نازل ہوئیں وہ ایک ہی ذات کی طرف سے نازل ہوئیں۔ اس لئے' اس تصور ایمان کے نتیجے میں ایک مسلمان کے ذہن میں رسولوں کے مقام و حیثیت میں کوئی فرق و امتیاز ممکن ہی نہیں ہے۔ ہر رسول اللہ جل شانہ کی جانب سے مبعوث ہوا۔ اور وہ ایسی صورت میں مبعوث ہوا' جو ان لوگوں کے حالات کیلئے مناسب تھی جن کی طرف وہ رسول مبعوث ہوا تھا۔ اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا اور آخر کار حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ پر ختم ہوا۔ اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت ایسی شکل و صورت میں تشکیل پائی کہ وہ تعلیمات تمام انسانیت کیلئے ایک آخری اور مکمل نظام زندگی قرار پائی۔

اس تصور ایمان کے نتیجے میں امت مسلمہ تمام رسولوں کی رسالت کی وارث قرار پائی۔ اب اسلامی نظام زندگی امت مسلمہ کی وراثت ہے اور اس کرۂ ارض پر وہ اس کی محافظ ہے۔ گویا انسانیت کی طویل تاریخ کا نہایت ہی قیمتی اثاثہ اب امت مسلمہ کی تحویل میں دیدیا گیا ہے اور اسے اس پر نگران مقرر کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ اپنے اندر یہ شعور پاتی ہے کہ اس کرۂ ارض پر اس کے کاندھے پر عظیم ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ اور مومنین اللہ تعالیٰ کے صاحب اختیار علم بردار ہیں۔ وہ صرف اللہ کا علم بلند کریں گے اور اس علم کے بل بوتے پر وہ اس کرۂ ارض پر' جاہلیت کے تمام نشانات اور علامات کا مقابلہ کریں گے۔ اس وقت یہ جاہلیت کبھی وطنی قومیت کا علم بلند کرتی ہے۔ کبھی نسلی قومیت کے روپ میں آگے بڑھتی ہے۔ کبھی یہ طبقاتی رنگ میں آتی ہے اور کبھی یہ صیہونیوں اور صلیبیوں کے جھنڈوں کے سایہ میں استعماری شکل میں آتی ہے۔ کبھی وہ الحاد اور بے دینی کی شکل میں آتی ہے۔ غرض زمان و مکان کے اختلاف سے' اس کے رنگ ڈھنگ بھی مختلف ہیں۔ کبھی وہ کس نام سے آتی ہے اور کبھی کس نشان سے آتی ہے۔ لیکن اس کے علم بردار وہی ہیں یعنی جاہلیت کے پرستار۔

اس کرۂ ارض پر امت مسلمہ جس سرمایہ کی حفاظت پر مامور ہے' وہ اسے قدیم ترین ادوار سے اس کرۂ ارض پر مبعوث ہونے والے تمام رسولوں سے ملا ہے۔ اور یہ سرمایہ پوری انسانیت کا نہایت ہی قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ ہدایت اور روشنی کا سرمایہ ہے۔ یہ یقین و اطمینان کا سرمایہ ہے۔ یہ سعادت اور رضائے الٰہی کا سرمایہ ہے۔ یہ علم و معرفت کا سرمایہ ہے۔ یاد رکھو! جو دل اس سرمایہ سے تہی دامن ہوا وہ تاریکیوں اور رنج دائم میں ڈوبا ہو گا۔ وہ اضطراب و خلجان سے دوچار ہو گا اور شکوک و شبہات میں گرفتار ہو گا۔ وہ بدبختی اور پریشانی کے ہاتھوں عاجز آجائے گا۔ اس کی زندگی یوں گزرے گی جس طرح ایک شخص تہہ بہ تہہ اندھیروں' بے آب و گیاہ ریگستان میں ٹامک ٹوئیاں

مار رہا ہو۔ اسے نظر نہ آرہا ہو کہ وہ کہاں قدم رکھے اور کہاں نہ رکھے۔

ان دلوں کی چیخ و پکار انتہائی کربناک ہے۔ جو اس زاد راہ سے محروم ہو گئے ہیں۔ جن سے یہ قیمتی سرمایہ لٹ گیا ہے۔ جو ایسے غمگسار' رفیق سفر سے محروم ہو چکے ہیں۔ یہ کربناک چیخ و پکار تاریخ کے ہر دور میں سنی گئی۔ا۔ بشرطیکہ دل زندہ ہوں' ان میں احساس ہو۔ وہ اپنے اندر معرفت حقیقت اور حصول یقین کا داعیہ رکھتے ہوں۔ رہے وہ دل جو مر چکے ہیں' جو غبی ہیں' جن کی عقل موٹی ہے' جن کی سوچ کے سوتے خشک ہو چکے ہیں' ہو سکتا ہے ان میں حصول معرفت کی یہ تڑپ نہ ہو' وہ حصول معرفت سے بے نیاز ہوں۔ لیکن اس کرۂ ارض پر ان جیسے لوگوں کی روش بہائم کی روش ہوتی ہے۔ وہ مویشیوں کی طرح کھاتے اور چرتے ہیں۔ ان کا محبوب مشغلہ یہ ہوتا ہے۔ اس کرۂ ارض پر ظلم و استبداد کا ارتکاب کریں' مار اور دھاڑ میں مشغول ہوں اس زمین میں فساد پھیلائیں اور اس سے اس طرح رخصت ہوں کہ ان پر تمام لوگوں کی نفریں ہو اور اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔

وہ معاشرے انتہائی' بد بخت معاشرے ہیں جو اس دولت سے محروم رہ گئے۔ اگرچہ وہ مادی سہولیات میں گردن تک ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ معاشرے گرے ہوئے تباہ حال معاشرے ہیں۔ اگرچہ مادی پیداوار کے اعتبار سے ان کا گراف بہت اونچا ہو۔ یہ معاشرے کربناک معاشرے ہیں۔ اگرچہ وہ مکمل شہری آزادیوں سے مستفید ہوں' داخلی طور پر زندگی پرامن ہو اور انہیں کوئی خارجی خطرہ بھی لاحق نہ ہو' ہمارے پاس اس جدید دور میں ایسے معاشروں کی کئی مثالیں موجود ہیں' اس بات کا انکار صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو انتہائی درجے کا مکار ہو اور جو اس قدر بے حیا ہو کہ محسوس اور کھلے حقائق کا انکار کر سکتا ہو۔

رہے اہل ایمان تو ان کی صفت یہ ہے کہ وہ اللہ پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ بارگاہ الٰہی میں تسلیم و رضا اور سمع و طاعت کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ آخر کار اللہ کی جانب لوٹنے والے ہیں۔ لہٰذا وہ ہر وقت اپنی تقصیرات پر طلب مغفرت کرتے ہیں وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ............... "ہم نے حکم سنا اور اطاعت کی۔ مالک! ہم تجھ سے خطابخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔"

ان کلمات سے ایمان باللہ' فرشتوں' کتابوں اور رسولوں پر ایمان کے اثرات روشنی کی طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کا ظہور سمع و اطاعت کی صورت میں ہوتا ہے۔ اہل ایمان کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو کچھ پیغام آتا ہے' وہ اسے سنتے ہیں' وہ ہر اس حکم پر عمل پیرا ہوتے ہیں جس کا حکم اللہ تعالیٰ دیتے ہیں۔ یعنی ان کا قائد صرف اللہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے قائد کے ہر اشارے کو روبعمل لاتے ہیں۔ اس لئے کہ اسلام کا کوئی ایسا تصور نہیں ہے جس میں اللہ کے احکام کی اطاعت نہ ہو' جس میں پوری زندگی میں ربانی نظام زندگی کا نفاذ ضروری نہ ہو۔ اگر کسی معاشرے کی حالت یہ ہو جائے کہ اس میں لوگ اپنی زندگیوں کے یہ چھوٹے بڑے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی نگرانی پر اتر آئے ہوں تو ایسے معاشرے کو اہل ایمان کا معاشرہ نہیں کہا جا سکتا۔ یا جہاں اللہ کی شریعت نافذ نہ ہو۔ جس کے اخلاقی تصورات' جس کا طرز عمل' جس کے اجتماعی اور اقتصادی اور سیاسی امور سب کے سب غیر اسلامی تصورات سے ماخوذ ہوں تو ایسے معاشرے کو کس طرح ایک اسلامی معاشرہ کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ ایمان کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ دل مومن میں قرار پکڑے اور اس کی تصدیق عمل سے ہو۔

اور سمع و طاعت کے ساتھ ساتھ' انسان کو اپنی تقصیرات اور کوتاہیوں کا بھی مکمل شعور ہو' وہ یقین رکھتا ہو کہ وہ اللہ کی نعمتوں کا حق شکر ادا نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے فرائض سے کماحقہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ اللہ میاں کے ہاں التجا کرتا ہے کہ وہ اس کی کوتاہیوں کا تدارک اپنی رحمت اور مغفرت سے فرمائیں۔ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا............... "اے ہمارے رب' ہم تیری مغفرت کے طلبگار ہیں۔"

ا۔ ذرا عمر خیام جیسے فلسفی کی چیخیں سنیں۔

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اپنی تقصیرات پر طلب مغفرت کا مقام و محل سمع و اطاعت اور اللہ کے سامنے مکمل طور پر سرتسلیم خم کرنے کے بعد آتا ہے۔ پہلے بغیر کسی نافرمانی اور بغیر کسی انکار کے مکمل انقیاد ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی انسان کے اندر یہ یقین پیدا ہو سکتا ہے کہ اس نے دنیا و آخرت میں اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ اس کے عمل معاملے میں' اور ہر عمل میں اس نے خدا کے سامنے جوابدہی کرنی ہے۔ اور اللہ کا فیصلہ پھر اس معاملے میں اٹل ہو گا۔ اسکے علاوہ کوئی جائے پناہ نہ ہوگی' اس کے مقابلے میں کوئی طاقت بچانے والی نہیں ہے۔ اس کے فیصلے اور حکم سے صرف اس کی مغفرت ہی بچاسکتی ہے۔ صرف اس کی رحمانیت ہی کام آسکتی ہے۔

**وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ** ........................ "تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔" ان الفاظ میں ایمان بالآخرۃ کا بیان ہوا ہے۔ اللہ پر ایمان لانے کے تقاضوں میں سے ایک بین تقاضا ایمان بالآخرت ہے۔ اسلامی تصور حیات کے حوالے سے یہ لازم و ملزوم ہیں۔ اس تصور حیات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا۔ ایک عہد کے تحت اسے اس زمین پر اپنا خلیفہ بنایا۔ یہ عہد اس کے اندر طے شدہ شرائط' اس کرۂ ارض پر' انسان کی پوری زندگی کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ اللہ نے یہاں اسے خلیفہ اس غرض و غایت کے لئے بنایا ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں وہ اس کا امتحان لے۔ اور آخری امتحان کے بعد وہ آخرت میں اسے جزاء و سزا دے۔ اس لئے اسلامی تصور حیات کی رو سے عقیدۂ آخرت ایمان کے لازمی تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا ہے۔ اس پر ایمان لانا' ایک مومن و مسلم کے تصورات اور اس کے طرز عمل پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے' اسی ایمان کی روشنی میں' اس دنیا میں ایک مومن کی اقدار حیات تشکیل پاتی ہیں۔ اور اس کے حسی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ وہ مطیع فرمان ہو کر چلتا ہے۔ وہ بھلائی کی راہ پر چلتا ہے۔ وہ بھلائی کا متلاشی اور سچائی پر قائم رہتا ہے۔ چاہے اس کا نتیجہ اس جہاں میں اسے بصورت راحت ملے یا بصورت مشقت' اسے اس جہاں میں فائدہ ہو یا نقصان ہو' اسے فتح ہو یا شکست ہو' وہ کچھ پا رہا ہو یا کچھ کھو رہا ہو۔ اسے یہاں زندگی مل رہی ہو یا شہادت نصیب ہو رہی ہو۔ اس لئے کہ اس کی اصل جزاء اسے یوم آخرت میں ملے گی جب وہ اس دنیا کے امتحان میں کامیاب اور سرخرو ہو جائے گا...... اس کا عزم اس قدر صمیم ہوتا ہے کہ اس راہ اطاعت' راہ حق' راہ بر اور راہ صداقت سے' اسے پوری دنیا کی مخالفت' پوری دنیا کی فتنہ انگیزی اور فتنہ و قتل اسے نہیں ہٹاسکتے۔ کیونکہ اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ عہد الست کو اپنی پوری شرائط کے ساتھ نافذ کر رہا ہوتا ہے۔ اور اپنے اجر کا طلبگار آخرت میں ہوتا ہے۔

یہ ایک عظیم وحدت ہے۔ اسلامی نظریۂ حیات کا یہی مزاج ہے۔ اور اسے اس مختصر سی آیت میں سمو دیا گیا ہے۔ اللہ اور ملائکہ پر ایمان' تمام کتابوں اور تمام رسولوں پر ایمان' بلاتفریق و امتیاز' اور اللہ کی طرف مکمل رجوع' سمع و طاعت کے ساتھ اور یوم آخرت میں جوابدہی پر ایمان اور اس کا ہر وقت احساس۔

یہ ہے اسلام' یہ ایسا عقیدہ جو خاتم العقائد ہے۔ یہ آخری رسالت ہے۔ ایسا عقیدہ جو قافلہ اہل ایمان کو آغاز انسانیت سے انتہائے انسانیت تک ساتھ لیکر چلتا ہے۔ اس کے سفر کی سمت پوری تاریخ انسانیت میں' اللہ کے رسول متعین کرتے ہیں۔ جن کی قیادت میں انسانیت بتدریج ترقی کے درجات طے کرتی ہے۔ یہ عقیدہ اسے اس کائنات کے ناموس اکبر سے بقدر استطاعت انسان' اسے متعارف کراتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں اسلامی نظام زندگی آتا ہے۔ وہ توحید کامل کا اعلان کرتا ہے اور عقل انسانی کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اب وہ معرفت کردگار میں خود آگے بڑھے۔

یہی وہ نظریۂ حیات ہے جو ایک انسان کو انسانیت سے روشناس کراتا ہے۔ وہ اسے جمادات اور حیوانات کے مقام سے بلند کرتا ہے۔ وہ اسے فرشتوں اور شیطانوں سے بھی ایک علیحدہ تشخص دیتا ہے۔ وہ انسان کا بحیثیت انسان اعتراف کرتا ہے۔ وہ اس کی کمزوریوں کو بھی تسلیم کرتا ہے اور اس کے کمالات کا بھی لحاظ رکھتا ہے۔ وہ اسے ایک ایسی مخلوق کی طرح لیتا ہے جس کے جسم میں مختلف قسم کے رجحانات

ہیں۔ وہ ایک عقل فعال کا حامل ہے۔ وہ ایک روح رکھتا ہے جس کے میلانات میں بوقلمونی ہے۔ اسی لئے وہ اس پر صرف ایسے فرائض و واجبات عائد کرتا ہے جن کے لئے یہ جسم اور یہ حضرت انسان اور اس کی شخصیت متحمل ہو سکتی ہو۔ یہ عقیدہ ان فرائض اور انسان کی صلاحیت اور طاقت کے درمیان بہترین توازن قائم رکھتا ہے۔ اس قدر بوجھ ڈالتا ہے کہ انسان مشقت اور تھکاوٹ محسوس نہ کرے۔ یہ عقیدہ انسان کے جسمانی تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے۔ انسان کے عقلی تقاضوں کا بھی خیال رکھتا ہے۔ اور اس کی روحانی دنیا بھی آباد کرتا ہے۔ اور یہ سب کام انتہائی فطری توازن کے ساتھ 'اور ان سب امور کے بعد وہ انسان کو یہ آزادی عطا کرتا ہے کہ وہ جو راہ اپنے لئے اختیار کرنا ہے کرے۔

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۗ

"اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے زیادہ ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے 'اس کا پھل اسی کیلئے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال اسی پر ہے۔"

یوں ایک مسلمان کی سوچ ہی میں یہ بات ہوتی ہے کہ اس کا رب رحیم ہے 'وہ بطور خلیفہ اس پر جو فرائض و واجبات عائد کرتا ہے وہ نہایت ہی عادلانہ اور منصفانہ ہیں۔ اس کی جانب سے ڈالی جانے والی آزمائشیں بھی عادلانہ ہیں اور آخر کار قیامت کے دن بھی اس کے ساتھ ٹھیک ٹھیک انصاف ہو گا۔ اور وہ پوری طرح مطمئن ہو گا۔ اس لئے وہ اللہ کی جانب سے عائد کردہ فرائض پر کوئی تنگی اور دشواری محسوس نہیں کرتا۔ وہ انہیں بوجھ نہیں سمجھتا۔ اس لئے کہ اس کا یہ پختہ یقین ہوتا ہے کہ جس خدا نے یہ فرائض عائد کئے ہیں وہ خوب جانتا ہے کہ میرے اندر ان کے سرانجام دینے کی استطاعت فی الواقعہ ہے۔ اگر طاقت نہ ہوتی تو وہ فرض ہی نہ کرتا۔ اس تصور سے ایک طرف تو دل مومن اطمینان اور انس و محبت سے بھر جاتا ہے 'دوسری جانب اس کے اندر ان فرائض و واجبات کو سرانجام دینے کیلئے عزم اور ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرائض اس پر عائد کر دیئے ہیں تو لامحالہ وہ اس کی ڈیوٹی کا حصہ ہیں۔ اور جب بھی وہ ضعف محسوس کرتا ہے 'کبھی تھکاوٹ محسوس کرتا ہے 'یہ فرائض بھاری ہونے لگتے ہیں تو وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ اس کی ذاتی کمزوری ہے۔ بوجھ زیادہ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اپنے عزم کو از سرنو تازہ کرتا ہے۔ اپنی کمزوری کو دور کرتا ہے اور از سرنو فرائض پورے کرنے کا عزم صمیم کرلیتا ہے۔ جب تک کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ از سرنو عزم کرنے کیلئے مومن کیلئے یہ اشارہ ہے کہ اگر راہ طویل ہو جائے تو از سرنو عزم کرو۔ چنانچہ یہ تصور روح مومن اور اس کی ہمت مردانہ کے لئے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ اور اس طرح اس کی ہمت اور اس کے ارادے میں پختگی آجاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

اس تصور حیات کا دوسرا اہم حصہ ہے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۗ ..................

......... "ہر شخص نے جو نیکی کمائی اس کا پھل اسی کیلئے ہے اور جو برائی سمیٹی اس کا وبال اسی پر ہے۔"

ہر فرد اپنے کیے کا ذمہ دار ہے۔ اس لئے اسے وہی کچھ ملے گا جو اس نے خود کمایا۔ نیز سزا بھی کسی کو صرف اسی جرم کی ملے گی جو وہ خود کرے گا۔ ہر کوئی اپنے کئے کا ذمہ دار خود ہو گا۔ ہر شخص اپنے رب کے سامنے خود اپنا اعمال نامہ لیکر جائے گا۔ اور اس میں وہی کچھ ہو گا جو اس نے کمایا 'یا جس کا اس نے ارتکاب کیا۔ کوئی شخص وہاں کوئی حیلہ بہانہ نہ کر سکے گا۔ نہ وہاں کسی کو کسی کی امداد یا سفارش کی امید ہوگی۔ انسان بحیثیت فرد اپنے رب کے سامنے ہو گا۔

جب انفرادی مسئولیت کا یہ تصور کسی مومن کے قلب میں جاگزین ہو جاتا ہے 'تو ہر فرد اپنے اللہ کے جو حقوق اس کے ساتھ وابستہ

ہوتے ہیں۔ ان کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔ وہ دوسرے انسانوں کی وجہ سے کسی صورت میں بھی ان حقوق اللہیہ سے دست بردار نہیں ہوتا الا یہ کہ شریعت کے مطابق یہ دست برداری ہو۔ اب ہر انسان مومن کی ذات کے ساتھ جو حقوق اللہ وابستہ ہوتے وہ اس بارے میں ہر دھوکے' ہر حدود شکنی' ہر گمراہی اور ہر فساد کے مقابلے میں سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنے نفس اور اس کے ساتھ وابستہ حقوق اللہ کے بارے میں ذاتی طور پر خود جوابدہ ہے۔ اور ہر نفس کے ساتھ اللہ کے جو حقوق وابستہ ہیں وہ صرف وہی ہیں جن کا اللہ نے حکم دیا ہے یا جن سے اس نے منع فرمایا ہے۔ یعنی ہر فرد اپنے طرز عمل اور اپنے شعور میں صرف اللہ وحدہ کی بندگی بجالائے۔ اگر وہ ان حقوق میں کسی انسان کی وجہ سے کمی کرتا ہے۔ مثلاً یوں کہ اسے کوئی گمراہ کردے' اسے دھوکہ دیدے' یا اسے مجبور کرے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیامت کے دن یہ انسان اس مومن کی کوئی امداد نہ کرسکیں گے۔ (ہاں اگر یہ بظاہر وہ بحالت جبر کرتا ہے اور دل اس کا اسلامی فرائض حقوق پر مطمئن ہے' تو پھر یہ معذور قصور ہوگا۔) غرض ایسے اشخاص قیامت کے دن نہ اس مومن کی مدافعت کرسکیں گے نہ سفارش کرسکیں گے' نہ وہ اس پوزیشن میں ہوں گے کہ اس شخص کا بوجھ اتاریں یا خود اٹھائیں۔

مسئولیت کے اس ذاتی تصور کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص بڑی جراءت کے ساتھ خود اپنی اور اس کے ساتھ وابستہ حقوق اللہ کی مدافعت کرتا ہے۔ اسی لئے کہ اس کی سزا صرف اسے ہوگی۔ اور وہ خود اپنے کئے کا ذمہ دار ہوگا۔ یاد رہے کہ یہاں انفرادی مسئولیت کے نظریہ سے مراد یہ خطرہ نہیں ہے کہ کوئی شخص معاشرہ کے اندر اپنی اجتماعی ذمہ داریاں پوری کرنے سے پہلو تہی کرے۔ اس لئے کہ اجتماعی ذمہ داریاں بھی شریعت نے ایک فرد پر بحیثیت فرد ڈالی ہیں۔ اگر معاشرہ میں اجتماعی ذمہ داریاں پوری نہ ہوں گی تو بھی فرد ذمہ دار ہوگا۔ کیونکہ یہ بھی اللہ کی جانب سے اس پر انفرادی طور پر ڈالی گئی ہیں۔ مثلاً ہر فرد اللہ تعالیٰ کی جانب سے مامور ہے کہ وہ اپنے مال اور اپنی دولت سے اجتماعی ذمہ داریاں ادا کرے۔ نیز اسے یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ وہ دوسروں کو تواصی بالحق کرے' معاشرہ میں عدل و انصاف قائم کرے' اپنے معاشرے سے باطل کو مٹانے کی کوشش کرے۔ معاشرے میں سچائی اور بھلائی کو مستحکم کرے اور شر اور منکر کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ اس کے اعمال نامہ میں اجتماعی معاملات کے حوالے سے بھی اس کی تمام کارکردگیاں اور کوتاہیاں درج ہوں گی۔ اور جزاء و سزا کا وہ انفرادی طور پر ذمہ دار یا حقدار ہوگا۔

اہل ایمان نے جب انفرادی ذمہ داری کے اس حکم کو سن لیا اور سمجھ لیا۔ تو اب ان کے دلوں سے یہ دعا نکلی' جو بڑی جامع اور پر از اخلاص ہے۔ اس دعا کو قرآن کریم اپنے خاص انداز تصویر کشی میں بیان کرتا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ اہل ایمان ہاتھ اٹھائے ہمارے سامنے کھڑے ہیں۔ صفیں باندھی ہوئی ہیں۔ اور خشوع و خضوع کے ساتھ وہ یہ دعا پڑھ رہے ہیں۔ (خصوصاً فرائض و ذمہ داریوں کی حقیقت پاکر)

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

۴۰ ع۳ ۸

"اے ہمارے رب' ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں۔ ان پر گرفت نہ کر۔ مالک' ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال' جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار' جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔ وہ ہم پر نہ رکھ' ہمارے ساتھ نرمی کر۔ ہم سے درگزر فرما' ہم پر رحم کر' تو ہمارا مولیٰ ہے۔ کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔"

یہ ایسی دعا ہے جو اہل ایمان اور ان کے رب کے ساتھ ان کے تعلق کی خوب تصویر کشی کرتی ہے۔ وہ اپنے عجز اور ناتوانی کا عمرا اور اک رکھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اپنے رب کی رحمت اور درگزر کا محتاج پاتے ہیں۔ وہ اس کے در گاہ میں پناہ کے خواستگار ہیں۔ وہ اپنے آپ کو صرف اللہ کے حوالے کرتے ہیں۔ اسی سے تعلق جوڑ رہے ہیں اور ماسوا اللہ سے کٹ رہے ہیں۔ وہ اس کی راہ میں جہاد کیلئے تیار ہیں۔ اور اسی سے نصرت کے طلبگار ہیں۔ اور ان کی یہ دعا ایک انتہائی دلدوز اور ملال انگیز نغمے کی صورت میں ہے۔ جس کے صوتی زیر و بم میں ان کے دل کی دھڑکن اور ان کے روح کی بیقراری صاف سنائی دیتی ہے اور صاف نظر آتی ہے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ

"اے ہمارے رب ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں ان پر گرفت نہ کر۔"

اگر انسان اس قدر کمزور ہو جائے اور اس سے ایسی بھول چوک ہو جائے جس میں اس کا کوئی دخل نہ ہو اور یہ بھول چوک کبھی کبھار ہو ہی جاتی ہے تو ایسی غلطیاں 'خطاء اور نسیان کے حکم میں ہوں گی۔ ان پر ایک مؤمن کیلئے صحیح طریقہ کار یہ ہے کہ وہ فوراً اللہ سے معافی مانگے۔ اپنے رب کی طرف متوجہ ہو۔ بھول چوک وہ ہوتی ہے کہ اس میں کوئی شخص غلطی پر مصر نہ ہو۔ یا وہ قصداً حکم عدولی نہ کر رہا ہو۔ یا وہ کبر و غرور کی وجہ سے نافرمانی نہ کر رہا ہو یا بالارادہ ٹیڑھے راستے پر نہ چل رہا ہو۔ ان حالات میں سے کوئی صورت حال بھی وہ نہیں ہے جو ایک مومن اپنے رب کی بارگاہ میں اختیار کرتا ہے۔ نہ ایسے حالات میں وہ اللہ کی جانب سے عفو و درگزر کا مستحق ہو گا۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ وہ تائب ہو جائے اور ٹھیک طور پر اللہ کی طرف رجوع کرلے۔ غرض مومنین نے بھول چوک کے بارے میں جو درخواست معافی گزاری ' اسے اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "میری امت سے خطاء اور نسیان پر کوئی مواخذہ نہ ہو گا جب تک انہوں نے ایسے افعال کو برا سمجھا۔"[۱]

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ

"اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔"

یہ دعا مرد مومن کی زبان پر اس احساس ذمہ داری کی وجہ سے آتی ہے جو امت مسلمہ پر تمام رسولوں کی رسالت کے سلسلے میں ڈالی گئی ہے' یہ امت تمام رسالتوں کے بار امانت کے نیچے آگئی ہے۔ جیسا کہ ان کے رب نے اس قرآن کریم میں اس امت کو جابجا بتلایا کہ اس سے قبل جن امتوں کے پاس رسول بھیجے گئے انہوں نے اپنے رسولوں کے ساتھ کیا کیا سلوک کئے اور ان امتوں کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان پر کیا کیا بوجھ ڈالے گئے۔ اور یہ بوجھ ان پر ان کے بعض جرائم کی وجہ سے ڈالے گئے۔ مثلاً بنی اسرائیل کی بعض بداعمالیوں کی وجہ سے ان پر بعض پاکیزہ قسم کی غذائیں حرام کر دی گئیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ "اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیے تھے اور گائے اور بکری کی چربی بھی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا ان کی آنتوں سے لگی ہوئی ہو یا ہڈی سے لگی رہ جائے۔" (۶ : ۱۴۶) یا جس طرح سورۃ البقرہ میں ہے کہ انہوں نے بچھڑے کی عبادت شروع کر دی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ ایک دوسرے کو قتل کریں۔ اسی طرح ان کی اس بدعملی کا کفارہ ہو سکے گا۔ ان پر سبت کے دن تجارت اور شکار کو حرام قرار دیا گیا۔ اسی وجہ سے یہاں اہل ایمان کو دعا سکھائی گئی کہ وہ دست بدعا ہوں کہ ان پر اللہ تعالیٰ وہ بوجھ نہ ڈالے جو ان سے پہلے لوگوں پر ڈالے گئے۔ اس لئے کہ

۱۔ طبرانی وغیرہ

نبی آخر الزماں کی بعثت کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ وہ ان کے ذریعہ اہل ایمان اور پوری انسانیت سے وہ بوجھ اتار دیں جو انسانیت پر ڈالے گئے تھے۔ اور وہ بندھن توڑ دیں جن میں بشریت خواہ مخواہ جکڑی ہوئی تھی اور جس کے نتیجے میں اسلامی نظریۂ حیات سیدھا سادھا نظریہ بن کر آیا' جو آسان بھی ہے اور نرم بھی ہے۔

فطرت انسانی کے عین مطابق شاہراہ فطرت سے ہمقدم اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور سے فرمایا۔ **وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرَى** ............ "اور ہم تیری راہنمائی سہولت کے ساتھ' سہل فرائض کی طرف کریں گے۔"

وہ عظیم بوجھ کیا ہے جو امم سابقہ کے کاندھوں پر ڈالا گیا تھا اور اس لئے ڈالا گیا تھا کہ انہوں نے خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کے ناطے اپنے عہد کی خلاف ورزی کی تھی اور عہد توڑ دیا تھا اور وہ عظیم بوجھ اب امت مسلمہ کے کاندھوں سے اتار دیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیا ہے اور اس کی ماہیت کیا ہے؟ یہ عظیم بوجھ انسان کیلئے انسان کی غلامی کا بوجھ ہے۔ جس میں بندہ بندے کا غلام ہوتا ہے' جس میں انسان کیلئے دوسرا انسان ضابطۂ حیات بناتا ہے۔ اس طرح ایک نسل انسانی دوسرے انسان کی ذات کے تابع ہوتی ہے' یا انسان ایک طبقے کے غلام ہوتے ہیں یا جس میں انسان ایک نسل کے غلام ہوتے ہیں۔ یہ ہے وہ عظیم بوجھ جس سے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو رہائی دلائی۔ اور ان تمام غلامیوں سے انہیں چھڑا کر صرف اپنی بندگی اور غلامی اور اپنی اطاعت کے اندر داخل کر دیا۔ اس آزادی کے بعد اب اہل ایمان صرف اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے ضابطۂ حیات اخذ کرنے لگے۔ یوں انہیں ایک اللہ وحدہ کی غلامی میں داخل کر کے' ان کی روح' انکی عقل اور ان کی پوری زندگی کو دوسرے انسانوں کی غلامی سے نکالا گیا۔

اللہ جل شانہٗ کی بندگی اور غلامی بایں مفہوم کہ انسان اپنی اقدار حیات نیک و بد کا معیار اور اجتماعی زندگی کے قوانین صرف اللہ سے اخذ کرے گا۔ پوری انسانیت کیلئے آزادی کا نقطۂ آغاز ہے۔ یوں ایک انسان دوسرے جبار و قہار انسانوں کی غلامی اور بندگی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ مذہبی پروہتوں' کاہنوں اور پیشواؤں کی غلامی سے بھی آزاد ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ ایک انسان اوہام و خرافات اور رسوم و رواجات کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک انسان ہوائے نفس اور جسمانی شہوات و مرغوبات کے بندھنوں سے بھی چھٹکارا پاتا ہے۔ انسان ہر کھوٹی قوت کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے جو ناحق انسان کے کاندھوں پر سوار ہوتی ہے اور تاریخ شاہد ہے ایسی غلامیوں نے انسانوں کی کمر توڑ کر رکھدی تھی۔ اور جس کی وجہ سے لوگوں کے سر اللہ واحد القہار کے مقابلے میں دوسرے جباروں کے سامنے جھکتے تھے۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ

"پروردگار' جس بوجھ کو ہم اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے وہ ہم سے نہ اٹھوا۔"

اس دعا سے اہل ایمان کے اس شعور کا اظہار ہوتا ہے کہ اب وہ انسان کی غلامی سے آزاد ہو گئے ہیں۔ نیز وہ اب خائف ہیں کہ کہیں وہ اپنی کوتاہیوں کے سبب دوبارہ دور غلامی میں واپس نہ چلے جائیں جو نہایت ہی برا دور تھا۔

"اے ہمارے رب' ہم سے وہ بوجھ نہ اٹھوا جس کے اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔" ایک ایسی دعا ہے جس سے مکمل طور پر سر تسلیم خم کر دینے کی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ اہل ایمان کے دل سے اب یہ ارادہ اور نیت ہی نکل گئی ہے کہ وہ احکام خداوندی کی خلاف ورزی کریں گے۔ چاہے جو احکام بھی ہوں' وہ صرف یہ درخواست پیش کرتے ہیں کہ وہ ضعیف ہیں۔ یہ توقع رکھتے ہیں۔ اجرائے احکام میں ان کی صفت کو مدنظر رکھا جائے گا۔ پروردگار' ہم پر رحم کر اور تکلیف مالایطاق سے ہمیں بچا تاکہ ان سے تعمیل احکام میں عجز و

قصور کا ارتکاب نہ ہو' ورنہ وہ تو پختہ ارادہ کیے ہیں کہ مکمل تسلیم و انقیاد کا مظاہرہ کریں گے۔ صرف بندہ ناتواں کی امید یہ ہے کہ مالک الملک ان کے ساتھ مہربانی کرے۔ اور جس طرح وہ اپنے بندوں کے ساتھ جود و کرم' نرمی اور محبت کا رویہ رکھنے کے عادی ہے وہی سلوک ہم سے جاری رکھا جائے۔ ہم اپنی تقصیرات کا اعتراف کرتے ہیں اور وہ تقصیریں صرف اسی صورت میں معاف اور بے اثر ہو سکتی ہیں جب اللہ کا فضل شامل حال ہو۔

وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ

"ہمارے ساتھ نرمی کر' ہم سے درگزر فرما' ہم پر رحم فرما۔"

اس لئے کہ اس امتحان میں کامیاب ہونے کی یہ واحد گارنٹی ہے صرف اسی صورت میں اللہ کی رضامندی حاصل ہو سکتی ہے۔ انسان جس قدر محنت سے بھی وفاداری کرے' اس کے کام میں کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی ہے اور اگر اللہ کا فضل شامل حال نہ ہو وہ عفو و درگزر اور رحمت نرمی سے کام لے گا۔ حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے' فرماتی ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص بھی صرف اپنے عمل کے بل بوتے پر جنت میں داخل نہ ہو گا۔ صحابہ کرام ؓ نے پوچھا' رسول خدا' اور آپ بھی؟ تو حضور ؐ نے فرمایا۔ "اور میں بھی' الا یہ کہ اللہ نے مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ لیا ہے۔"

ایک صحیح مومن کے احساس میں یہی اصل بات ہے۔ وہ حتی المقدور عمل کرتا ہے لیکن اپنی تقصیرات کا اسے پوری طرح احساس ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد اسے پوری امید ہوتی ہے کہ اللہ اس کی تقصیرات سے عفو و درگزر فرمائے گا۔ اور اس کے ساتھ نرمی برتی جائے گی۔

سب سے آخر میں اہل ایمان اللہ کے مضبوط سہارے کو پکڑتے ہیں' وہ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ کا ارادہ ہے کہ حق کا بول بالا ہو' دین اسلام اور اسلامی نظام زندگی اس کرۂ ارض پر غالب ہو' اور صورت حال یہ ہو کہ "کوئی فتنہ نہ رہے اور دین صرف اللہ کا چلے۔" اب اہل ایمان اللہ کا مضبوط سہارا لیتے ہیں۔ وہ اپنے سروں پر اسلام کے جھنڈے بلند کرتے ہیں۔ وہ صرف انہی جھنڈوں سے اپنی پہچان کراتے ہیں۔ جبکہ جاہلیت کی علامات اور جھنڈے بہت ہی مختلف ہیں' اب وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا وہی والی اور وارث ہے۔ وہ اہل کفر کے ساتھ صرف اللہ کیلئے لڑتے ہیں۔ جو دین اسلام سے خارج ہیں۔

أَنتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٨٦﴾

"تو ہمارا مولیٰ ہے کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔"

یہ ہے اس عظیم سورت کا خاتمہ جس میں اس پوری سورت کے مضامین کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس خلاصے میں اسلامی تصور حیات کا خلاصہ بیان ہوا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ایک سچے مومن کا اپنے رب کے ساتھ ہر حال میں کیا تعلق ہوتا ہے۔

صدق اللہ العظیم ○

☆......☆......☆......☆......☆

# فی ظلال القرآن

# سورۃ آل عمران

## پارہ ------ ۳

## آیات:- ۱ تا ۹۱

# سورۂ آل عمران' ایک نظر میں

قرآن حکیم ہی دعوت اسلامی کی کتاب ہے' وہی اس کا باعث اور روح رواں ہے۔ دعوت اسلامی کی شخصیت اور اس کا وجود یہی کتاب ہے۔ اور یہی کتاب اس کی پاسبان اور سارباں ہے۔ یہی اس کا بیان اور ترجمان ہے۔ یہی اس کا نظام اور دستور ہے' اس کی دعوت کا مرجع اور ماخذ یہی کتاب' اس کے داعیوں کیلئے یہی گائیڈ ہے۔ اسی سے دعوت اسلامی منہج حرکت وعمل اخذ کرتی ہے اور اسی سے وہ زاد راہ اور نشان منزل پاتی ہے۔

لیکن جب تک ہم اس بات کو اچھی طرح سمجھ نہ لیں گے کہ اس کتاب کا پہلا خطاب ایک زندہ اور متحرک امت سے تھا۔ اس وقت تک ہمارے اور اس کتاب کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل رہے گی۔ ہمارے ذہن میں یہ حقیقت اچھی طرح بنازین ہونی چاہئے کہ قرآن کی مخاطب امت کا ایک حقیقی وجود تھا۔ پھر اس خطاب کی وجہ سے اس امت نے عالم واقعہ میں بعض عملی اقدامات کئے اور ان واقعات اور اقدامات کے ذریعہ اس امت نے اس کرۂ ارض پر اس وقت کی پوری انسانی زندگی کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا۔ اس خطاب کی وجہ سے اس وقت پوری انسانیت کی نفسیاتی دنیا میں ایک زبردست معرکہ برپا ہوا۔ اس نظریاتی جنگ کے علاوہ اس کرۂ ارض کے بعض حصوں میں عملاً معرکے بھی ہوئے۔ یہ ایسے معرکے تھے کہ جن کے عمل اور ردعمل کی وجہ سے دنیا متاثر ہوئی۔ اثرات ڈالے اور ایک طوفان برپا ہوا۔

جب تک اس کتاب کے ساتھ ہمارا رویہ یہ ہو گا کہ ہم صرف خوش الحانی کے ساتھ اس کی تلاوت کریں۔ اسے سنیں' اس پر جھومیں اور اسے صرف برائے حصول ثواب اس کے ختم کرائیں۔ لیکن اس کے علاوہ انسان کی عملی اور واقعاتی زندگی کے ساتھ اس کا کوئی عمل دخل نہ ہو' تو حقیقت یہی رہے گی کہ ہمارے اور اس قرآن کے درمیان ایک دبیز پردہ حائل رہے گا۔ اور اس وقت صورت حالات یہی ہے کہ اس مخلوق یعنی حضرت انسان کی عملی زندگی سے اس کتاب کو نکالا گیا ہے۔ بلکہ امت مسلمہ کی عملی زندگی بھی قرآن کے تابع نہیں ہے۔ حالانکہ اس کتاب کا نزول تو ان حالات میں ہوا تھا کہ زندہ انسانوں کو ہدایت دے رہی تھی۔ وہ عملی واقعات کا رخ پھیر رہی تھی۔ وہ زندہ حادثات میں ہدایت تھی' ان واقعات کا ایک مستقل تاریخی وجود تھا اور وہ زندہ تھے۔ اس نے ان انسانوں کی کایا پلٹ دی۔ ان واقعات کا رخ پھیر دیا۔ ان کے نتیجے میں وہ ایک زندہ موجود معاشرہ وجود میں آیا۔ عام انسانی زندگی میں وہ ممتاز خصوصیات کا حامل تھا۔ لیکن امت مسلمہ کے حوالے سے تو اس وقت کی واقعاتی دنیا خصوصی اہمیت رکھتی تھی۔

اس کتاب کا تو اعجاز ہی یہ ہے کہ اس کا نزول' اس کی ہر آیت کا نزول ہی' ایک متعین واقعہ اور ایک متعین صورت حالات میں ہوا' ایک متعین اور زندہ سوسائٹی میں وہ نازل ہوا اور انسانی تاریخ کے ایک متعین پیریڈ میں وہ نازل ہوا۔ اس نے اس سوسائٹی اور امت کو لیکر ایک عظیم معرکہ برپا کیا۔ جس نے پوری انسانیت کے حوالے سے تاریخ کا رخ پھیر کر رکھ دیا۔ لیکن اس تاریخی رول کے ساتھ ساتھ اس کا یہ اعجاز اب بھی قائم ہے کہ وہ اب بھی ایک زندہ کتاب ہے۔ اس میں اب بھی یہ صلاحیت ہے۔ جو انسان کی موجودہ زندگی کا سامنا کرلے۔ بلکہ اس پر غور کیا جائے تو وہ یوں نظر آتی ہے کہ گویا اب بھی وہ امت مسلمہ کو اس کی جاری و ساری زندگی میں ہدایات دے رہی ہے۔ اس وقت امت مسلمہ کو اس کے اردگرد پھیلی ہوئی جاہلیت کے ساتھ ساتھ جو معرکہ درپیش ہے۔ اس میں وہ مسلسل اسے ہدایات دے رہی ہے۔ خود امت مسلمہ کی ذاتیت اور اس کے ضمیر کے اندر جو داخلی کشمکش برپا ہے۔ اس میں بھی وہ ہادی و رہبر ہے۔ اور یہ

راہنمائی اس طرح ایک زندہ راہنمائی ہے جس طرح دور اول میں تھی' اسی طرح واقعاتی راہنمائی جس طرح ہوا کرتی تھی۔

ہم کیونکر اس قرآن کی عملیت اور فعالیت کو دریافت کر سکتے ہیں؟ اس کی پوشیدہ زندگی کا راز ہم کس طرح معلوم کر سکتے ہیں تاکہ اسے ہم دور حاضر میں اپنی زندگی کا راہنما بنالیں اور وہ جماعت مسلمہ کا گائیڈ اور راہنما بن جائے۔ اس مقصد کیلئے ہمیں اس جماعت کی زندگی کی تشکیل کا تفصیلی مطالعہ کرنا ہوگا۔ جس کو اس قرآن نے سب سے پہلے خطاب کیا۔ ایسا مطالعہ کہ ہماری نظروں میں گویا اسکرین پر وہ جماعت تشکیل پا رہی ہے' وہ درپیش واقعات و حادثات میں زندہ اور متحرک ہے۔ وہ مدینہ اور پورے جزیرۃ العرب میں واقعات و حوادث کا مقابلہ کر رہی ہے۔ وہ دشمنوں کے ساتھ بھی برت رہی ہے اور دوستوں کے ساتھ بھی رواں دواں ہے۔ وہ اپنی خواہشات نفس کے ساتھ بھی برسرپیکار ہے اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی جاہلی سوسائٹی کے ساتھ بھی برسرجنگ ہے اور اس پورے عرصے میں قرآن مسلسل نازل ہو رہا ہے۔ اور ان سب واقعات کے بالمقابل جن میں وہ اس جماعت کی راہنمائی اس کشمکش کے حوالے سے بھی کر رہا ہے' جو خود اس کے پہلو میں اپنے نفس کے ساتھ جاری ہے' اور اس معرکے میں بھی کر رہا ہے جو اس جماعت کو اپنے ظاہری دشمنوں کے ساتھ' مکہ ان کے اردگرد' مدینہ کے ماحول میں اور پورے جزیرۃ العرب میں درپیش ہے۔

ہاں! ہمارے لئے بہت ہی ضروری ہے کہ ہم کچھ عرصہ اس پہلی جماعت اسلامی کے ساتھ زندہ رہیں۔ اپنے ذہن کی اسکرین پر اسے اس کے حقیقی انسانی روپ میں دیکھیں۔ اس کی زندگی کے واقعات کو چلتا پھرتا دیکھیں بحیثیت انسانی اس کی مشکلات پر غور کریں' اور پھر دیکھیں کہ یہ قرآن اس کی راہنمائی کس طرح براہ راست کر رہا ہے۔ اس کی روزمرہ زندگی میں بھی وہ اس کے لئے گائیڈ ہے۔ اس کے اصولی معاملات میں بھی وہ راہنما ہے۔ ہمیں اس اسکرین پر نظر آئے گا کہ قرآن مجید نے اس جماعت کو ہاتھ سے پکڑ کر رکھا ہے۔ قدم قدم پر اس کے ساتھ ہے۔ وہ کبھی گرتی اور پھر اٹھتی ہے۔ کبھی راستہ کھو دیتی ہے تو فوراً پھر جادۂ مستقیم پر آجاتی ہے۔ کبھی کمزور پڑ جاتی ہے تو فوراً کھڑی ہو جاتی ہے۔ مشکلات کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں تو صابر و شاکر ہے۔ وہ مشکلات سے پر دشوار گزار گھاٹیوں کو بڑی مشقت سے عبور کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ بڑے نظم و ضبط' صبر و مشقت کے ساتھ اور جدوجہد کے ساتھ مشکلات پر قابو پاتی ہے۔ اس اسکرین پر صاف نظر آتا ہے کہ اس جماعت میں تمام انسانی خصوصیات موجود ہیں۔ اس میں انسانی ضعف و درماندگی بھی ہے اور اس میں ہمت و مردانگی بھی ہے۔

اس پہلی جماعت اسلامی کے ساتھ قدرے زندگی بسر کرنے کے بعد ہی ہم یہ شعور پیدا کر سکتے ہیں کہ یہ کتاب تو ہمیں بھی بعینہ اس طرح خطاب کر رہی ہے جس طرح اس نے پہلی جماعت مسلمہ کو خطاب کیا تھا۔ اور یہ کہ آج کی انسانیت جسے ہم دیکھتے ہیں۔ جسے ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ جسے ہم اس کی پوری خصوصیات کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں۔ یہ دعوت قرآن پر لبیک کہنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ بعینہ پہلی جماعت کی طرح قرآنی قیادت اور قرآنی راہنمائی سے مستفید ہو سکتی ہے۔

اس جماعت مسلمہ کی زندگی پڑھ کر محسوس کریں گے کہ یہ قرآن تو آج بھی ایک زندہ کتاب ہے۔ وہ ہمیں اس جماعت کی زندگی میں فعال نظر آئے گی۔ اور آج کے دور میں وہ ہماری زندگی میں فعال ہو سکتی ہے۔ یوں ہم محسوس کریں گے کہ یہ کتاب آج بھی ہمارے شانہ بشانہ کھڑی ہے اور کل بھی ہمارے ساتھ ہوگی اور یہ کہ یہ محض برائے ثواب تلاوت ہی کیلئے نہیں ہے۔ صرف جھومنے کیلئے نہیں ہے۔ اسے ہماری عملی زندگی سے دور نہیں رکھا جاسکتا' نہ یہ ہماری کوئی ایسی تاریخ ہے' جو گزر گئی اور اس کے صفحات الٹ کر رکھ دیئے گئے۔ اب عملی میدان کے ساتھ اس کو کوئی سروکار نہیں۔ اب جدید تاریخ میں اس کا کیا کام۔

قرآن کریم' ایک ایسی حقیقت ہے' ایک ایسا وجود ہے جس طرح یہ کائنات ایک مستقل وجود رکھتی ہے' یہ کائنات اللہ کی وہ کتاب ہے جسے ہم دیکھتے ہیں اور مشاہدہ کرتے ہیں اور قرآن اللہ کی وہ کتاب ہے جسے ہم پڑھتے ہیں اور اس پر تدبیر کرتے ہیں۔ جس طرح کتاب

کائنات وجود باری پر شاہد ہے' اسی طرح قرآن کریم بھی اپنی شان اعجاز کے ساتھ ذات باری پر شہادت ہے۔ اور یہ دونوں وجود یہاں جاری و ساری ہیں۔ یہ کائنات اپنے تمام قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کے ساتھ متحرک ہے۔ اس کے خالق نے اس کی ڈیوٹی لگائی ہے وہ اسے پورا کر رہی ہے۔ سورج اپنے مدار میں متحرک ہے اور اپنا فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ چاند' زمین اور تمام دوسرے ستارے اور سیارے اپنا اپنا فرض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ زمانے کی دوری اور طوالت کال ان کے فرائض منصبی پر کوئی اثر نہیں ہے۔ نہ زمانے کی جدت نے اس کی کسی حرکت کو جدت دی ہے ......... بعینہ اسی طرح قرآن کریم نے بھی ایک دفعہ انسانیت کی راہنمائی میں ایک بہترین کردار ادا کیا۔ وہ آج بھی اسی طرح موجود ہے' جس طرح تھا۔ انسانیت آج بھی اسی طرح ہے جس طرح تھی۔ اور یہ انسان اسی طرح اپنی حقیقت اور فطرت پر قائم رہے گا۔ اور یہ قرآن مجید اسی انسان کو اللہ کی جانب سے پکار ہے۔ جس طرح اس نے پہلے لوگوں کو پکارا' اس پکار میں کوئی تغیر نہیں ہے۔ اس لئے کہ خود ذات انسانی اور فطرت انسانی میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے۔ اگرچہ اس کے ماحول اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا میں تغیر اور تبدیلی واقعہ ہوگئی ہے۔ اور وہ خود بھی ان جدید حالات اور واقعات سے متاثر ہوا ہے۔[1] جبکہ قرآن مجید اسے اس کی اصل فطرت اور اس کی اصل حقیقت کو سامنے رکھ کر خطاب کرتا ہے۔ جس میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ نہ کوئی تغیر ہوا ہے۔ قرآن مجید آج بھی انسان کی زندگی کا رخ پھیر سکتا ہے اور کل بھی پھیر سکتا ہے' اس لئے کہ وہ اس راہنمائی کیلئے ہر وقت تیار ہے۔ اس لئے کہ وہ انسانیت کے لئے خداوند قدوس کا آخری خطاب اور آخری پیغام ہے۔ اس کا مزاج اس طرح فطری ہے جس طرح اس کائنات کا مزاج ایک فطرت پر ہے۔ جس میں کوئی تغیر اور کوئی تبدیلی نہیں ہے۔

ذرا سوچئے یہ بات کس قدر مضحکہ خیز ہوگی کہ کوئی سورج کے بارے میں یہ کہے کہ یہ تو ایک قدیم ستارہ ہے۔ یہ "قدامت پرست" ہے۔ مناسب ہے کہ اس سورج کی جگہ ایک جدید ترقی پذیر سورج ہو یا یہ کہ یہ انسان تو ایک قدیم مخلوق ہے۔ یہ قدیم اور رجعت پسند ہے۔ مناسب ہے کہ اس انسان کی جگہ ایک نیا انسان ہو' جو اس نئی دنیا کی تعمیر و ترقی میں کام کرے......... اگر اس قسم کی بات اور اس قسم کے منصوبے مضحکہ خیز ہو سکتے ہیں۔ تو یہی بات قرآن کریم کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ جو اپنی حیثیت پر اسی طرح قائم ہے۔ اور اس کا مقام یہ ہے کہ وہ انسان کے لئے رب کا آخری پیغام ہے۔

○......... ○ .........○

مدینہ طیبہ میں اسلامی جماعت کے حالات میں اس سورت میں' ایک زندہ و تابندہ حصہ پیش کیا گیا ہے۔ یعنی ۲ھ میں غزوۂ بدر کے متصلاً' بعد اور ۳ھ میں غزوۂ احد کے بعد تک اس دور میں امت مسلمہ جن حالات سے دوچار ہوئی۔ ان حالات میں قرآن کریم نے کیا کیا ہدایات دیں۔ کیا کیا تصرفات کئے اور جماعتی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں جو کام کیا اس کا اس میں ذکر ہے۔

ان کا بیان ایسے شوکت اور قوت سے بھرپور الفاظ میں کیا گیا ہے کہ اس دور کے پورے حالات جن سے تحریک اسلامی گزر رہی تھی' ان کی ایک مکمل تصویر کھینچ گئی ہے۔ ان حالات میں جو جھڑپیں ہوئیں۔ جیسے حالات میں ہوئیں' ان کا مکمل نقشہ سامنے آتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا سورت کا قاری زندہ طور پر ان حالات میں چل پھر رہا ہے' وہ اس تحریک میں ہے جو ان معرکوں میں حصہ لے رہی تھی۔ اور جو ان کا مقابلہ کر رہی تھی۔ انداز بیان ایسا ہے کہ لوگوں کے دلی راز دلی پوشیدہ جذبات' دلی وساوس اور تفکرات اور ایسے حالات میں انسانی جذبات اور میلانات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ اگر انسان تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر لے تو جس طرح میں دیکھ رہا ہوں' اس طرح اسے بھی اپنے پردۂ خیال پر یہ جماعت مسلمہ یوں چلتی پھرتی نظر آئے' جس طرح گویا وہ زندہ نظر آرہی ہو' تمام چہرے اپنے

[1] دیکھئے محمد قطب کی کتاب معرکہ التقالید۔

خدوخال کے ساتھ صاف نظر آئیں' ان کے چہروں پر ان کے قلبی میلانات بھی صاف نظر آئیں۔ اس جماعت کے اردگرد دشمن بھی صاف نظر آئیں۔ جو ان کے خلاف گھات میں بیٹھے ہیں' ان کے خلاف حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس جماعت کے اندر وہ شبہات اور غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہیں' اس کو حقارت اور دشمنی کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اب اس کے خلاف جمع ہو رہے ہیں' اور اب میدان میں آپہنچے' وہ دیکھو یہ دشمن شکست کھا گیا (احد میں) اب وہ چال چلتے ہیں اور وہ آئے گھاٹی کی اوٹ سے 'حملہ آور ہوئے' مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے........

غرض اس معرکہ کی تمام حرکات و سکنات' اس کے تمام باطنی اثرات اور ظاہری تاثر صاف صاف پردۂ خیال پر نظر آتے ہیں۔

اس منظر میں قرآن کریم کا نزول ہو رہا ہے' تاکہ کفار کے مکر و فریب کا جال پاش پاش کر دے۔ ان کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات زائل کر دے' مسلمانوں کے دلوں کو جمع اور ان کے قدموں کو پختگی عطا کرے۔ ان کی روح کو پاک اور ان کے افکار کو صاف کر دے۔ حادثات پر تبصرہ کرے اور غلطیوں سے عبرت سکھائے۔ ان کے افکار کی تعمیر کرے اور ان میں سے آمیزش کو پاک کرے' ان کو آگاہ کرے کہ ان کا دشمن غدار اور امور جنگ میں سخت مکار ہے اور تاکہ وہ اس وادی پرخار میں' تحریک اسلامی کو تمام پھندوں اور کیموفلاگ سے بچاتے ہوئے آگے بڑھائے' یوں جس طرح ایک ماہر تجربہ کار جرنیل اور اپنی فوج کی ظاہری اور چھپی ہوئی کمزوریوں سے باخبر جرنیل قیادت کرتا ہے۔

اس تاریخی پس منظر کے باوجود' اس سورت میں قرآن مجید جو ہدایات اور احکامات دیتا ہے' وہ بالکل عام' دائمی اور زمان و مکان کے قیود و حدود سے پاک ہیں۔ نہ ان میں اس دور کا کوئی رنگ نظر آتا ہے اور نہ اس ماحول کی کوئی جھلک نظر آتی ہے' ان ہدایات کا رخ پوری انسانیت اور ہر دور کی جماعت مسلمہ کی طرف ہے۔ آج کی جماعت ہو یا مستقبل کی جماعت ہو' بلکہ ان ہدایات کا مخاطب پوری انسانیت ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ شاید یہ آیات آج نازل ہو رہی ہیں اور آج کی جماعت مسلمہ کو آج کے مسائل میں ہدایات دی جا رہی ہیں۔ اور موجودہ صورت حال پر تبصرہ کر رہی ہیں۔ یہ اس لئے کہ ان آیات میں ایسے امور پر بحث کی گئی اور ایسے واقعات اور ایسے جذبات کا ذکر کیا گیا ہے جن کا تعلق وجدان کے ساتھ ہے' جن کا تعلق انسان کی نفسیات سے ہے' گویا اس وقت ایسے ہی حالات پیش نظر تھے اور اس سورت میں ان کا ذکر ہے......بلکہ حقیقت یہ ہے کہ صورت حال کچھ ایسی ہی تھی اور اللہ تعالیٰ جو علیم و خبیر ہے' جو نفس انسانی' امور انسانی اور تمام اشیاء کی حقیقت کا علم رکھتا ہے وہ ہمیشہ کے واقعات و حالات کے بارے میں خوب جانتا ہے۔

اس لئے صاف نظر آتا ہے کہ یہ قرآن دعوت اسلامی کا قرآن' چاہے یہ دعوت جس دور میں ہو' اور جس جگہ بھی ہو' قرآن امت مسلمہ کا دستور حیات' وہ جس زمانے میں ہو' جس نسل میں ہو اور جس قبیلے میں بھی' وہ اس کی راہ کا حدی خواں ہے اور دشوار راستوں میں اس کا رہبر ہے۔ ہر دور اور ہر زمان میں' اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسی انسانیت کیلئے آخری راہنمائی اور آخری پیغام ہے۔

○..........○ ..........○

یہ سورت اس دور میں نازل ہوئی جس میں مدینہ کے اندر تحریک اسلامی کو کسی قدر قرار و سکون مل گیا تھا' وہ اپنے ایک مستقل وطن میں جم گئی تھی۔ مسلمان مدینۃ الرسول میں حکومت قائم کر چکے تھے۔ اور جس طرح ہم نے سورۃ البقرہ کی ابتداء میں تفصیل سے بتایا' مسلمانوں نے مدینہ میں اپنے پروگرام کے مطابق اقدامات شروع کر دیئے تھے۔

اس دور میں بدر کی عظیم جنگ وقوع پذیر ہو گئی تھی۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے قریش پر مسلمانوں کو فتح دی تھی۔ جن حالات میں یہ ٹکر ہوئی تھی اور جس ماحول میں مسلمانوں کو یہ غلبہ نصیب ہوا تھا' ان میں یہ عظیم کامیابی ایک معجزے سے کم نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خزرج قبیلے کے رئیس وقت عبداللہ بن ابی ابن السلول کے دانت بھی کھٹے ہو گئے۔ اس کا غرور ٹوٹا اور وہ دین اسلام سے جس قدر نفرت کرتا تھا' اس کی

نفرت میں قدرے کمی آئی' حضور ﷺ سے یہ جو بغض رکھتا تھا' اس میں قدرے کمی ہوئی' چنانچہ اس نے اب اپنی ان ظاہری نفرتوں کو دل میں چھپالیا۔ اور ایک منافق کی حیثیت سے اسلام میں داخل ہوگیا۔ وہ کہتا تھا: "یہ ایک ایسی تحریک ہے جو مقبول ہو رہی ہے۔" اور وہ ایک راہ پڑگئی' اب اس تحریک کی راہ کوئی نہیں روک سکتا۔

بدر الکبریٰ کے بعد مدینہ طیبہ میں نفاق کی بنیاد پڑگئی۔ یا منافقت میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ اس لئے کہ بدر سے پہلے بھی بعض ایسے لوگ تھے' جو منافق تھے اور وہ اسلام میں محض اس لئے داخل ہوگئے تھے کہ ان کے اہل و موالی سب اسلام میں داخل ہوگئے تھے۔ بہرحال اس وقت ایک گروہ ایسا پیدا ہوگیا تھا' جن میں بعض بااثر لوگ بھی شامل تھے۔ جو بظاہر اسلام میں داخل ہونے پر مجبور ہوگیا تھا' یہ ان کی مجبوری تھی کہ وہ مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہوجائیں۔ حالانکہ ان کے دل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بغض و عداوت سے بھرے ہوئے تھے' وہ اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ مسلمانوں پر کوئی مصیبت نازل ہو۔ وہ ہروقت اس تلاش میں رہتے تھے کہ اہل اسلام کے اندر انہیں کوئی سوراخ ملے' وہ ایسے واقعات کے انتظار میں تھے۔ جن سے اہل اسلام کی قوت منتشر ہو اور ان کی صفوں میں انتشار پیدا ہو تاکہ انہیں اپنے دلی بغض اور حسد کے اظہار کا موقع ملے اور وہ اس نئی تحریک پر فیصلہ کن وار کرسکیں اگر ممکن ہوسکے۔

ان منافقین کو ایک قدرتی عنصر ایسا مل گیا تھا' جو اس کام میں ان کا قدرتی حلیف تھا' یعنی اہل یہود' جن کے دل بھی تحریک اسلامی اور مسلمان کے خلاف جل بھن گئے تھے۔ ان کو ان منافقین سے بھی' حضور اکرم ﷺ کے ساتھ زیادہ نفرت تھی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ عرب کی جاہل اقوام میں ان کی جو قدر و منزلت' اہل کتاب ہونے کے ناطے تھی' اس میں تحریک اسلامی کی وجہ سے کمی آنے کا شدید خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ نیز وہ اوس و خزرج کو باہم لڑا کر مدینہ میں اپنی جو برتری قائم کئے ہوئے تھے' وہ اس سے قبل اسلام نے ختم کردی تھی' جبکہ اوس اور خزرج خدا کے فضل سے بھائی بھائی بن چکے تھے اور اسلام کے سایہ میں وہ ایک ہی صف میں بنیان مرصوص کی شکل میں کھڑے تھے۔

جب بدر میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی' یہ یہودی جل بھن گئے' ان کے دلوں کے بغض و عناد میں ابال آگیا۔ اس لئے اس سے جس قدر ممکن تھا' اسلام کے خلاف انہوں نے خفیہ سازشیں' مکاری اور فریب کاری شروع کردی۔ وہ ہروقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہو' مسلمانوں کے اندر حیرانی و پریشانی پیدا ہو' ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوں' ان کے عقائد میں شبہات پیدا ہوں اور خود ان کے نفوس میں شک کا بیج بو دیا جائے۔

ان ہی دنوں غزوہ بنی قینقاع واقعہ ہوا' جس میں یہودیوں کی اسلام دشمنی کھل کر سامنے آگئی۔ حالانکہ یہودی قبائل اور حضور اکرم ﷺ کے درمیان پختہ معاہدے ہو چکے تھے۔ مدینہ میں تشریف لاتے ہی حضور ﷺ نے ان کے ساتھ یہ معاہدے کئے تھے۔

ادھر مشرکین مکہ کی حالت یہ تھی کہ وہ بدر الکبریٰ کی کامیابی سے سخت خوفزدہ تھے۔ وہ رات دن حضرت محمد ﷺ کے مدنی محاذ کی کامیابی پر سوچتے رہتے تھے۔ اس کامیابی سے ان کی تجارت' ان کے وقار اور حتیٰ کہ ان کے لیے وجود کے جو خطرات پیدا ہوگئے تھے اس سے وہ بے فکر نہ تھے۔ اس لئے وہ بھی اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قبل اس کے کہ یہ خطرہ ناقابل علاج ہو جائے اس کا تدارک ضروری ہے۔

ان حالات میں صورت حال یہ تھی کہ مسلمانوں کے دشمنوں کے جذبات دشمنی جوبن پر تھے۔ ان کی قوت میں بھی جوش و خروش تھا' ان کے جذبات بغض و عناد اپنی شباب میں تھے۔ لیکن مسلمانوں کی تنظیم بہرحال اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ اس کی تربیت اور ان کا نظم و نسق ابھی تک مکمل نہ تھا۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو مہاجرین و انصار میں ممتاز اور تجربہ کار لوگ تھے۔ جو اسلام میں بہت ہی آگے تھے۔ لیکن ایسے بھی تھے' جو ان سابقین مہاجرین و انصار کی طرح پختہ کار اور اسلام میں زیادہ پختگی نہ رکھتے تھے۔ نیز اسلامی جماعت ابھی

تک بہت زیادہ تجربات سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ جس سے اس کی ناہمواریاں دور ہو جاتیں۔ ان پر دعوت اسلامی کی حقیقت اچھی طرح ظاہر ہو جاتی۔ زمانے کے نشیب و فراز سے وہ واقف ہوتے اور تحریک اسلامی کی حکمت عملی اور نظام کار سے اچھی طرح واقف ہوتے۔

اس وقت منافقین کو مدینہ میں اہم مقام حاصل تھا۔ ان کا سربراہ عبداللہ بن ابی تھا۔ ان منافقین کے خاندان اور قبائلی رابطے ابھی تک قائم تھے' مسلمانوں پر ابھی تک یہ حقیقت نہ کھلی تھی کہ صرف اسلامی نظریۂ حیات ہی ان کا خاندان ہے۔ یہی ان کا قبیلہ ہے' یہی ان کا مددگار ہے اور اس کے سوا کوئی قوت ان کی قوت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان منافقین کے نفوذ کی وجہ سے اسلامی صفوں میں جابجا کمزوریاں تھیں' اس لئے کہ منافقین اہل اسلام میں ابھی تک اثر و رسوخ بھی رکھتے تھے اور ان میں اچھی طرح گھل مل گئے تھے۔ (غزوہ احد کے بارے میں آیات کی تشریح کے وقت انشاء اللہ اس نکتے کی وضاحت ہوگی۔)

اسی طرح اہل یہود کا بھی مدینہ کی سوسائٹی میں اہم مقام تھا۔ اہل مدینہ کے ساتھ ان کے صدیوں پرانے تجارتی اور حلیفانہ تعلقات تھے۔ اور ابھی تک ان کی دشمنی بھی کھل کر سامنے نہ آئی تھی۔ اور اہل اسلام کے دلوں کے اندر بھی ابھی تک یہ بات پختہ طور پر نہ بیٹھی تھی کہ ان کے لئے صرف ان کا نظریۂ حیات ہی عہد و میثاق ہے۔ نظریہ ہی ان کا وطن ہے۔ نظریہ ہی ان کے معاملات اور معاہدوں کی اصل اساس ہے۔ اس لئے جب مسئلہ نظریات کا آجائے' تو اس وقت کوئی معاہدہ یا کوئی پختہ رابطہ بھی کام نہیں دیتا۔ ان حالات میں یہودیوں کیلئے یہ اچھا موقع تھا کہ وہ مسلمانوں کے اندر شکوک و شبہات پھیلائیں۔ انہیں بدراہ کریں اور ان کے اندر افواہیں پھیلائیں۔ بعض اہل اسلام ان کی باتوں پر کان بھی دھرتے تھے اور ان سے متاثر ہوتے تھے۔ بعض اہل اسلام ایسے بھی تھے کہ جب حضور اکرم ﷺ ان کی سازشوں کے دفعیہ کیلئے کوئی پیش بندی فرماتے تو ان یہودیوں کی مدافعت کرتے۔ (مثلاً جب بنی قینقاع کے بارے میں عبداللہ بن ابی نے سفارش کی اور اس معاملے میں حضور ﷺ کے بارے میں سختی کی۔)

دوسری جانب مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ انہیں بدر میں فتح ہوئی تھی۔ یہ ایک مکمل فتح تھی اور واضح فتح تھی۔ اس میں اہل اسلام نے بہت کم تیاری کی تھی اور یہ فتح معمولی جدوجہد کے بعد نصیب ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی مٹھی بھر تعداد' بغیر ساز و سامان اور بغیر کسی بڑی تیاری کے نکلی۔ اس کا مقابلہ کفار کے ایک عظیم اور ساز و سامان سے لیس لشکر کے ساتھ ہوا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں یہ مڈبھیڑ ہوئی تو اہل کفر مقابلے میں اہل اسلام کے حصہ میں ایک واضح فتح آئی۔

یہ فتح اہل اسلام اور اہل کفر کے درمیان ان کی پہلی مڈبھیڑ میں ہوئی تھی۔ اور یہ درحقیقت اللہ کے معجزات میں سے ایک معجزہ تھی۔ آج ہمیں اس کی حکمت کا ایک پہلو سمجھ میں آتا ہے' وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نئی اٹھنے والی تحریک کو قدرے ثبات و استحکام بخشنا چاہتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ تحریک دشمن کے ساتھ جنگ کے عملی تجربے سے کامیابی کے ساتھ گزر جائے تاکہ وہ آئندہ اپنے لئے راہ عمل طے کرے اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھے۔

یہ تو تھی حکمت ایزدی لیکن غالباً مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ شاید ان کی کامیابی گویا ایک قدرتی امر ہے اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ کسی معرکے میں کود پڑیں اور انہیں فتح نہ ہو' وہ جس طرف بڑھیں گے فتح ان کے قدم چومے گی۔ بہرحال اور ہر مرحلے میں کامیابی ان کیلئے مقدر ہے' اس لئے کہ وہ مسلمان ہیں اور اس لئے کہ ان کے دشمن اہل کفر ہیں اور ظاہر ہے کہ اہل کفر اور اہل ایمان کے مقابلے میں فتح اہل ایمان کی ہی ہوگی۔

لیکن فی الحقیقت بات اس قدر سادہ نہ تھی۔ میدان جنگ میں فتح و شکست کا اصول اس قدر سادہ نہ تھا کہ بس صرف اسلام سبب فتح ہے اور محض کفر سبب شکست ہے۔ بلکہ ان اسباب کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ نفس انسانی کو اچھی طرح تربیت دی جائے۔ اچھی

صفوں کو اچھی طرح درست اور مرتب کیا جائے۔ جنگ کے لئے ضروری سازو سامان تیار کیا جائے۔ افواج کے اندر نظم و اطاعت بکمال ہو اور جنگی اصول و قواعد کی پوری طرح پابندی کی جائے۔ انسانی نفسیات کا اچھی طرح خیال رکھا جائے اور میدان جنگ میں حرکات و سکنات کنٹرول میں ہوں۔ غرض یہ سب امور تھے جو اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو میدان جنگ میں عملاً سمجھانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اہل ایمان کو ہزیمت سے دوچار کیا اور اس کے بعد پھر سورت آل عمران میں اس پر زندہ جاوید تبصرہ فرمایا۔ جس نے اہل ایمان کی زندگیوں پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اس تبصرے میں انہیں شکست کے اسباب بتائے گئے کہ یہ شکست بعض مسلمانوں کی غلطیوں کی وجہ سے ہوئی۔ ان تبصروں کے اندر ان کے اصلاح نفوس کیلئے تعمیری نصیحتیں بھی کی گئیں اور مسلمانوں کے اندر پختگی پیدا کی گئی۔

جب ہم غزوۂ احد کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ 'اس تجربے کیلئے مسلمانوں کو بہت ہی قیمت ادا کرنی پڑی۔ وہ بہت بڑے خوف سے دوچار ہوئے' ایک بڑی تعداد زخمی ہوئی۔ معزز ترین لوگ شہید' ان میں سرفہرست سید الشہداء حضرت حمزہ ؓ تھے۔ اس سے بڑی قیمت وہ تھی جو ان کے لئے ناقابل برداشت تھی' یعنی رسول خدا ﷺ بذات خود زخمی ہوں' ان کے چہرے پر زخم آئیں اور دانت مبارک شہید اور آپ گڑھے میں گر جائیں اور آپ کے رخساروں میں زرہ کے حلقے چبھ جائیں' یہ ایک ایسا صدمہ تھا جو مسلمانوں کیلئے ناقابل برداشت تھا۔ اور وہ اس کو امر عظیم سمجھتے تھے۔

اس سورت میں 'غزوۂ احد کے واقعات اور ان پر تبصرہ کو پیش کرنے سے بھی پہلے' سورت کا ایک بڑا حصہ ان متنوع ہدایات پر مشتمل ہے۔ جس میں اسلامی تصور حیات کے مختلف پہلوؤں کو صاف کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ تاکہ اس میں شرک اور جاہلیت کا کوئی شائبہ نہ رہے۔ ان ہدایات میں عقیدۂ توحید کو صاف ستھرا اور نکھار کر رکھ دیا گیا ہے' اس میں اہل کتاب نے جو شرکیہ عناصر داخل کر دیئے تھے ان پر سخت تردید کی گئی۔ چنانچہ اہل کتاب کے معتقدات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح اہل کتاب اسلامی عقائد و نظریات کے سلسلے میں اعتراضات کر کے اہل ایمان کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی جو سعی کر رہے تھے اس پر بھی بھرپور وار کیا گیا۔

بعض روایات میں یہ بات آئی ہے کہ اس سورت کی آیات ۱تا۸۳ کا نزول اس وقت ہوا جب یمن کے عیسائیوں کا مشہور وفد نجران حضور ﷺ سے ملاقات کے لئے مدینہ آیا۔ یہ وفد ۹ھ میں آیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ۹ھ میں ان آیات کا نزول بعید از قیاس ہے' ان آیات کے مضمون ان کی فضا سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ آیت ہجرت کے متصلاً بعد کے ادوار میں نازل ہوئیں' جب کہ اسلامی جماعت نوخیز تھی اور اس کی صحیح تشکیل اور اس کے طرز عمل پر یہودی سازشوں کے اثرات بڑھ رہے تھے۔

وفد نجران کے سلسلہ میں وارد ہونے والی روایات درست ہوں یا نہ ہوں لیکن ان آیات کا موضوع بحث یہ بتا رہا ہے کہ ان میں ان شبہات کی تردید کی گئی ہے جو نصاریٰ کی طرف سے وارد کئے جا رہے تھے۔ خصوصاً جن کا تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تھا یا جن کا تعلق عقیدۂ توحید کی اس تعبیر سے تھا جسے اسلام نے پیش کیا اور ان آیات میں عیسائیوں کے عقائد کی غلطیہائے مضامین کو درست کیا گیا تھا۔ اور ان کے تمام ان خرافات تلبیسات کو دور کر کے بتایا گیا کہ وہ اس سچائی کی طرف آئیں جو خود انجیل میں بھی موجود ہے اور جس کی طرف قرآن مجید انہیں دعوت دے رہا ہے۔

لیکن اس حصے میں یہودیوں اور اہل ایمان دونوں کیلئے اشارات و تنبیہات موجود ہیں۔ خصوصاً اہل ایمان کو سخت تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ یہودیوں اور اہل کتاب کی سازشوں سے چوکنے رہیں۔ اور مدینہ کے ماحول میں جو خطرناک اہل کتاب موجود تھے وہ یہودی ہی تھے۔

غرض یہ حصہ جو اس سورت کا تقریباً نصف حصے پر مشتمل ہے' اس میں اسلامی نظریۂ حیات اور اس وقت جزیرۃ العرب میں موجود

منحرف اور باطل نظریات کے درمیان طویل کشمکش کا ذکر ہے اور یہ بحث صرف نظریاتی بحث ہی نہیں ہے جس کا عملی دنیا سے کوئی تعلق نہ ہو۔ بلکہ وہ مدینہ طیبہ کے اندر اٹھنے والی نوخیز تحریک اسلامی اور اس کے ان تمام دشمنوں کے درمیان برپا ہونے والی جنگ کا یہ نظریاتی پہلو تھا۔ یہ جنگ عملاً برپا تھی پورے جزیرۃ العرب میں پھیلی ہوئی تھی اور اس میں تحریک اسلامی کے دشمن ہروقت چوکنے تھے' وہ ماک میں بیٹھے رہتے تھے۔ تحریک کیلئے ہروقت کنویں کھودتے رہتے تھے۔ اور اس ہمہ گیر جنگ میں وہ تحریک کے خلاف ہر حربہ استعمال کر رہے تھے۔ اس میں ان کا پہلا ہتھیار یہ تھا کہ مسلمانوں کے عقائد کو متزلزل کر دیں۔ اور یہ نظریاتی جنگ بس جنگ تھی جو آج تک امت مسلمہ اور اس کے دشمنوں کے درمیان جاری وساری ہے۔ یہ دشمن وہی ہیں جو تھے۔ وہی ملحد' وہی منکرین حق' وہی عالمی عیسوئی اور وہی عالمی صیہونیت!!!

اس سورت کے مضامین پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے' اس وقت یہ لوگ جو وسائل اور جو دلائل کام میں لا رہے تھے آج بھی وہی دلائل اور یہی ذرائع استعمال کر رہے ہیں۔ اس وقت ان کے جو مقاصد تھے' آج بھی وہی مقاصد ہیں' اور اس وقت بھی قرآن ان کا جواب دے رہا تھا اور آج بھی وہ مدافعت کر رہا ہے۔ آج بھی قرآن ہمارے لئے مرجع ہے اور آئندہ بھی یہی ہوگا۔ جس طرح اس سے قبل تھا اور آج جو مسلمان قرآن مجید کی اس حیثیت سے انکار واعراض کرتا ہے' اور اس ناصح مشفق سے نصیحت نہیں لیتا' یا اس مشیر ماہر سے مشورہ نہیں لیتا؟ اس جنگ میں جو آج اہل ایمان اور اعدائے ایمان کے درمیان جاری ہے' تو یقیناً ایسا شخص دشمنان اسلام کا جاسوس اور ایجنٹ ہے' وہ اس اسلحہ کو نظرانداز کر رہا ہے' جو اس معرکہ میں موجب ظفر ہے' وہ اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے' وہ اس امت کو دھوکہ دیتا ہے' اور وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ اسلام کے قدیم دشمنوں کے مفاد کیلئے کر رہا ہے' وہ اسلام کے جدید دشمنوں کا ایجنٹ ہے' یا تو وہ بہت بڑا احمق ہے اگر وہ نادانی سے کر رہا ہے اور یا وہ بہت بڑا خبیث النفس اگر وہ جان بوجھ کر کر رہا ہے۔

○.........○.........○

سورت کے اس حصے میں جو انتقادیات' جو مناظرہ اور جو تنقید اہل کتاب کے حوالے سے آئی ہے اس سے یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اس وقت اہل کتاب کا خود اپنی کتاب کے بارے میں کیا موقف تھا' تحریک اسلامی کے بارے میں ان کا کیا موقف تھا اور اسلامی نظریۂ حیات کے بارے میں ان کا موقف کیا تھا۔ اہل کتاب کا نقطہ نظر درج ذیل آیات سے اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے۔

☆ "وہی خدا ہے' جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے' اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں: ایک محکمات' جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری متشابہات' جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے' وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔" (۳:۷)

☆ "تم نے دیکھا نہیں انہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ ملا ہے' ان کا حال کیا ہے؟ انہیں جب کتاب الٰہی کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے' تو ان میں سے ایک فریق پہلو تہی کرتا ہے اور اس فیصلے کی طرف آنے سے منہ پھیر جاتا ہے۔" (۳:۲۳)

☆ "اے اہل کتاب' تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑا کرتے ہو' تورات اور انجیل تو ابراہیم علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی ہیں۔" (۳:۶۵)

☆ "ایمان لانے والو! اہل کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے کہ کس طرح تمہیں راہ راست سے ہٹا دے۔" (۳:۶۹)

☆ "اے اہل کتاب! کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو' حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو۔" (۳:۷۰)

☆ "اے اہل کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھاکر مشتبہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو۔" (۳:۷۱)

☆ "اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو انکار کردو' شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں' نیز یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں کہ اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات نہ مانو۔" (۳:۷۳)

☆ "اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دیدو تو وہ تمہارا مال تمہیں ادا کردے گا۔ اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملہ میں بھی اس پر بھروسہ کرو تو وہ ادا نہ کرے گا۔ الا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ "امیوں (غیر یہودیوں) کے معاملے میں ہم سے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔" اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی۔" (۳:۷۵)

☆ "ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں' جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا الٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے' حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی' وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم پڑھ رہے ہیں' یہ خدا کی طرف سے ہے' حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا' وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔" (۳:۷۸)

☆ کہو' اہل کتاب یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اسے بھی تم اللہ کے راستے سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے حالانکہ تم گواہ ہو۔" (۳:۹۹)

☆ "کہو اے اہل کتاب' تم کیوں اللہ کی باتیں ماننے سے انکار کرتے ہو' جو حرکتیں تم کر رہے ہو' اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔" (۳:۹۸)

☆ "تم ان سے محبت رکھتے ہو' مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے' حالانکہ تم تمام کتب آسمانی کو مانتے ہو' جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے بھی مان لیا ہے مگر جب جدا ہوتے تو تمہارے خلاف ان کے غیظ و غضب کا یہ حال ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں۔" (۳:۱۱۹)

☆ "تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے' اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔" (۳:۱۲۰)

یوں اس پوری سورت میں نظر آتا ہے کہ اسلامی جماعت کے دشمن' اس کے خلاف صرف روایتی ہتھیاروں ہی سے کام نہ لیتے تھے' وہ صرف میدان جنگ میں' تیر و تفنگ ہی سے نہ لڑتے تھے' محض یہ نہ کرتے تھے کہ تمام دشمنوں کو جماعت اسلامی کے خلاف جمع کریں اور ان کے خلاف میدان کارزار گرم کریں۔ جبکہ وہ تحریک اسلامی کے برخلاف نظریاتی جنگ میں رات و دن مصروف تھے۔ وہ تحریک کے خلاف شکوک و شبہات پھیلاتے تھے۔ خفیہ سازشیں کرتے تھے۔ دشمنوں کو بھڑکاتے' اس نظریاتی جنگ میں وہ سب سے پہلے اسلامی عقائد پر تنقید کرتے' اس لئے کہ امت مسلمہ کی تشکیل اور اس کی شخصیت کی اساس ہی عقائد پر تھی۔ اس لئے وہ ہروقت اس کام میں لگے رہتے تھے کہ ان عقائد و ایمانیات کو کمزور کریں اور جس طرح ہو سکے ان کی بیخ کنی کریں۔ اس لئے کہ انہیں اچھی طرح یقین ہو گیا تھا۔ جس طرح آج امت کے دشمنوں کو یقین ہو گیا ہے کہ اس امت پر صرف اس صورت میں حملہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کے عقائد کو کمزور کیا جائے' یہ

صرف اس وقت کمزور ہوگی جب اس کے نظریات کمزور پڑ جائیں' اسے جسمانی شکست تب ہی دی جاسکتی ہے جب اسے روحانی شکست دی جائے۔ جب تک اس امت نے ایمان کی مضبوط رسی کا سہارا لیا ہوا ہے اس وقت تک وہ اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے۔ جب تک یہ امت اپنے اس مضبوط سہارے کو تھامے ہوئے ہے۔ اپنے نظریات کی راہ پر رواں دواں ہے' جب تک اس نے نظریاتی جھنڈے گاڑھے ہوئے ہیں' جب تک یہ جماعت ایک نظریاتی جماعت ہے' جب تک ان نظریات سے اسکی پہچان ہے اور جب تک اسے اپنے ان نظریات پر فخر ہے اس وقت تک وہ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا سخت ترین دشمن وہ ہے' جو اسے اس کے نظریات سے بدراہ کر رہا ہو' اور اللہ کے منہاج اور اللہ کے طریقوں سے بدراہ کر رہا ہو' لیکن یہ دشمن اپنی حقیقت کو ظاہر نہیں کرتا اور نہ اس کے دور رس اہداف و مقاصد کا مسلمانوں کو پتہ ہوتا ہے۔

خوب سمجھ لو' کہ امت مسلمہ اور اس کے دشمنوں کے درمیان' ہر بات سے پہلے نظریاتی دشمنی ہے' امت مسلمہ کے دشمن جب بھی چاہتے ہیں کہ وہ ارض اسلام پر قابض ہوں' اہل اسلام کے محاصل ان کے قبضے میں ہوں' ان کے خام مال ان کے تصرف میں ہوں' ان کی اقتصادیات پر ان کا کنٹرول ہو' تو وہ سب سے پہلے اہل اسلام کو نظریاتی شکست دیتے ہیں اس لئے کہ امت مسلمہ کے بالمقابل تمام تاریخی تجربات سے انہوں نے اس بات کو اچھی طرح پالیا ہے کہ وہ اپنے ان مقاصد میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے نظریات پر استحکام کے ساتھ کھڑی ہے' جب تک وہ اسلامی منہاج پر قائم ہے۔ جب تک وہ جانتی ہو کہ اس کے دشمن کیا کیا سازشیں کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ کے دشمن اور ان کے ایجنٹ اپنی پوری قوت اس بات پر خرچ کرتے ہیں کہ وہ اس امت کو پوری طرح دھوکے میں رکھیں' انہیں اس نظریاتی جنگ کا کہیں علم نہ ہو جائے۔ اور جب وہ اس جنگ کو خفیہ رکھنے میں کامیاب ہوں گے تو پھر ان کیلئے ان تمام مقاصد کا حصول بہت ہی آسان ہو جائے گا۔ جو وہ چاہتے ہیں' پھر وہ آزادانہ استعماری مقاصد پورے کر سکتے ہیں۔ امت کا اچھی طرح استحصال کر سکتے۔ بشرطیکہ وہ اس امت کے دل سے اس کے عقائد و نظریات کی عظمت نکال دیں۔

جب بھی اس مکر و فریب اور نظریاتی جنگ کے وسائل ترقی کرتے ہیں یہ دشمن ان ترقی یافتہ ذرائع کو کام میں لاتے ہیں' اور اسلامی نظریات میں شبہات پیدا کرتے رہتے ہیں' ان کی اہمیت کو کم کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس میدان میں جدید سے جدید ہتھیار لیکر آتے ہیں۔ لیکن ان کے مقاصد وہی ہوتے ہیں جو اول روز سے ان کے پیش نظر تھے۔ "اہل کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمہیں راہ راست سے ہٹا دے۔" یہی ان کی مستقل اور خفیہ پالیسی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے سب سے پہلے ان کے نظریاتی ہتھیاروں کو کند کیا۔ اس نے جماعت مسلمہ کو سخت ترین ہدایات دیں کہ وہ اس سچائی پر سختی سے جم جائیں جس پر وہ قائم ہیں۔ اہل کتاب نے اس سلسلے میں جو جو شبہات پھیلائے قرآن کریم نے بڑی سختی اور قوت سے ان کی تردید کی۔ اور اس حقیقت کبریٰ کو نکھار کر رکھ دیا جس کا حامل یہ دین جدید تھا۔ جماعت مسلمہ کو مطمئن کیا' اس کو اس کے اصل مقام سے آگاہ کیا کہ اس کرۂ ارض پر اس کی اہمیت کیا ہے۔ یہاں اس کا مشن کیا ہے؟ اور یہاں ان نظریات کی اہمیت کیا ہے' جن کی وہ حامل ہے۔

چنانچہ اس سورت میں قرآن کریم امت مسلمہ کو ان سازشیوں کی سازشوں کے مقابلے میں اچھی طرح چوکنا کر دیا۔ اپنے خفیہ مقاصد کے لئے جو اوچھے ہتھیار استعمال کر رہے تھے' انہیں طشت از بام کیا' ان کے خطرناک عزائم سے پردہ اٹھایا' جماعت مسلمہ اور اسلام کے خلاف ان کے دل میں جو نفرت و حقارت تھی اس سے انہیں آگاہ کیا اور بتایا کہ یہ سب دشمنیاں اس لئے ہیں اللہ نے ان پر اپنا فضل

عظیم کیا ہے۔

قرآن کریم نے اس نوخیز جماعت کو بتایا کہ اس کائنات میں جو قوتیں کارفرما ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ یہاں ان کا توازن کیا ہے' چنانچہ بتایا گیا کہ دشمنان اسلام کی کوئی حیثیت نہیں' اللہ کے مقابلے میں وہ پر کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے' انہوں نے خود اپنے دین کے مقابلے میں کفر اور بے راہ روی کا رویہ اختیار کیا' اپنی کتابوں کا انکار کیا اور اپنے انبیاء تک کو قتل کیا' یہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ جب تک اللہ کی مدد تمہیں حاصل ہو۔ وہ مالک الملک ہے' عزت و ذلت صرف اس کے ہاتھ میں ہے' وہ اس معاملے میں وحدہ لاشریک ہے' وہ عنقریب ان سازشی کفار پر اپنا عذاب نازل کر دے گا' کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ میدان بدر میں اس کا عذاب کفار مکہ پر کیونکہ نازل ہوا۔ اس پر کچھ زیادہ وقت تو نہیں گزرا۔

امت مسلمہ کو اس وقت ان الفاظ میں یہ ہدایات دی گئیں۔

☆ "اللہ' وہ زندہ جاوید ہستی' جو نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے' حقیقت میں اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اس نے تم پر یہ کتاب نازل کی' جو سچائی لیکر آئی ہے اور ان کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے وہ انسانوں کی ہدایت کیلئے تورات اور انجیل نازل کر چکا ہے۔ اور اس نے وہ کسوٹی اتاری ہے۔ (جو حق و باطل کا فرق کرنیوالی ہے) اب جو لوگ اللہ کے فرامین کو قبول کرنے سے انکار کریں۔ ان کو یقیناً سخت سزا ملے گی۔ اللہ بے پناہ طاقت کا مالک ہے اور برائی کا بدلہ دینے والا ہے۔ زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔" (۳ : آتا۵)

☆ "جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے' انہیں اللہ کے مقابلے میں نہ ان کا مال کچھ کام دے گا۔ نہ اولاد' وہ دوزخ کا ایندھن بن کر رہیں گے۔ ان کا انجام ویسا ہی ہو گا جیسا فرعون کے ساتھیوں اور ان سے پہلے کے نافرمانوں کا ہو چکا ہے کہ انہوں نے آیات الہٰی کو جھٹلایا' نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا' اور حق یہ ہے کہ اللہ بہت ہی سزا دینے والا ہے۔ بس اے محمد' جن لوگوں نے تمہاری دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے' ان سے کہہ دو کہ قریب ہے وہ وقت' جب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور جہنم بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔ تمہارے لئے ان دو گروہوں میں ایک نشان عبرت تھا' جو (بدر میں) ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے' ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ دیکھنے والے بچشم سر دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ مومن گروہ سے دوچند ہے۔ مگر (نتیجے نے ثابت کر دیا۔) اللہ اپنی فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے مدد دیتا ہے۔ دیدۂ بینا رکھنے والوں کیلئے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے۔ (۳ : ۱۳)

☆ "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے' اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے' جنہیں کتاب دی گئی' ان کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آ جانے کے بعد' آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کیلئے ایسا کیا' اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات سے انکار کر دے' اللہ کو اس سے حساب لینے کچھ دیر نہیں لگتی۔"

☆ "اس فرمان برداری کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے' اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔"

☆ "کہو' خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دیدے اور جس سے چاہے چھین لے' جسے چاہے' عزت دے' جسے چاہے ذلیل کر دے' بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔"

☆ "مومنین اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور دوست ہرگز نہ بنائیں۔ جو ایسا کرے گا اللہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں' ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کیلئے بظاہر ایسا طرز عمل اختیار کر جاؤ مگر اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے۔ اور تمہیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔"

☆ "ابراہیم ﷺ سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنھوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے اس نسبت کے زیادہ حقدار ہیں۔ اور اللہ صرف انہی کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔" (۳:۶۸)

☆ "کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دین اللہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں' حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کے تابع فرمان (مسلم) ہیں اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔" (۳:۸۳)

☆ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔ تمہارے لئے اب کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقع باقی ہے جبکہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جا رہی ہیں اور تمہارے درمیان اس کا رسول موجود ہے' اور جو اللہ کا دامن مضبوطی سے تھامے گا' وہ ضرور راہ راست پالے گا۔" (۳:۱۰۱)

☆ "اے ایمان والو' اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے' تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو' سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو' اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے' اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔" (۳:۱۰۳)

☆ اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو' جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے' تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو' اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو' یہ اہل کتاب ایمان لاتے تو انہیں کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں سے کچھ لوگ ایماندار بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ زیادہ سے زیادہ بس کچھ ستا سکتے ہیں۔ اگر تم سے لڑیں گے تو مقابلے میں پیٹھ دکھائیں گے۔ پھر ایسے بے بس ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی۔ یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار ہی پڑی۔ کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں۔ ان پر محتاجی و مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے۔ اور یہ سب کچھ صرف اس لئے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔" (۳:۱۱۲)

☆ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنی جماعت کے لوگوں کے علاوہ دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ' وہ تمہاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے' تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی انہیں عزیز ہے' ان کے دل کا بغض

ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔ ہم نے تمہیں صاف صاف ہدایات دیدی ہیں۔ اگر تم عقل رکھتے ہو' تم ان سے محبت رکھتے ہو مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے حالانکہ تم تمام کتب آسمانی کو مانتے ہو اور جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بھی مان لیا ہے' مگر جب جدا ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف ان کے غیظ و غضب کا یہ حال ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں۔ ان سے کہہ دو اپنے غصے میں آپ جل مرو' اللہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔...... تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی۔ بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو' جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس پر حاوی ہے۔" (۳:۱۲۰)

اہل کتاب پر اس طویل بمباری (جس کا ہم نے ایک مختصر حصہ یہاں قارئین کیلئے نقل کیا ہے) سے چند امور کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

پہلا یہ کہ مدینہ اور اس کے اردگرد علاقوں میں' اہل کتاب نے اسلامی نظریۂ حیات کے خلاف ایک عظیم نظریاتی جنگی برپا کر رکھی تھی' یہ نہایت ہی گہری مکاری پر مبنی تھی' اور اس میں اہل کتاب اپنے تمام وسائل لیکر میدان میں آگئے تھے۔ اور ان کا مقصد وحید یہ تھا کہ اسلامی نظریۂ حیات کو متزلزل کر دیا جائے اور اس کے نتیجے میں اسلامی صفوف کے اندر تفرقہ پیدا کر دیا جائے۔

دوسرا یہ کہ اس عظیم مہم کے نتیجے میں' بعض اہل اسلام اس نظریاتی جنگ سے متاثر ہو رہے تھے' اسی لئے قرآن کریم نے اس سورت میں اس کا مختلف اسالیب کے ساتھ قلع قمع کیا اور اس کی جڑ کاٹ کر رکھدی۔

تیسری بات یہ کھل کر ظاہر ہوتی ہے اور اسلامی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اسلام کے یہی دشمن ہیں جو اس محاذ پر مسلسل کام کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ دعوت اسلامی کے برخلاف یہی محاذ کھولے رکھا' جب بھی تحریک اسلامی اٹھی' جہاں بھی اٹھی' انہوں نے اس تحریک کے برخلاف نظریاتی جنگ شروع کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ جو علیم و خبیر تھا جس نے آفاق کائنات میں یہ عظیم مشعل روشن کر دی تاکہ اسلام کے لئے کام کرنیوالے اس سے دور دور تک روشنی حاصل کریں اور آنے والی نسلیں اپنے اس تاریخی اور روایتی دشمن سے چوکنا رہیں اور یہ بات اچھی طرح جان لیں کہ یہ لوگ ہیں جو اس نظریۂ حیات اور اس امت کے دائمی دشمن!

○..........○..........○

اس سورت کا دوسرا حصہ غزوہ احد پر تبصرے کیلئے مخصوص ہے' اس حصے میں اسلامی عقیدہ اور اسلامی نظریۂ حیات کے بعض اہم نکات طے کئے گئے ہیں' پھر یہ بتایا گیا ہے کہ ان نکات کی اساس پر کس طرح ایک اسلامی جماعت کی تنظیم و تشکیل ہوگی' ان واقعات' حادثات' میلانات اور احساسات کی تفصیلات دینے کے ساتھ ساتھ' اس حصے' اس دور کی جماعت مسلمہ کی شب و روز کو بھی کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ اس وقت جماعت کے اندر مختلف درجات و اقسام کے جو لوگ پائے جاتے تھے۔ ان کی بھی مکمل وضاحت کی گئی ہے' جس طرح ہم اپنی ابتدائی تمہید میں کہہ آئے ہیں۔

اس حصے اور اس سے پہلے حصے کے درمیان ربط بالکل ظاہر ہے' پہلے حصے میں اسلامی تصور حیات کی تعبیر اور وضاحت تھی' یعنی معرکۂ کارزار میں جس میں لوہا خوب گرم ہو' اور اس کے ساتھ دونوں حصوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کرۂ ارض پر حاملین دعوت اسلامی کے لئے ضروری ہے وہ اپنی جماعت کی صفوں کو درست کریں اور اس سلسلے میں ان پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کا حق ادا کریں۔ اس کے ساتھ بتایا گیا کہ یہاں اللہ کی جانب سے فتح و شکست کے اصول کیا ہیں۔ اس موضوع پر قرآن نے اپنے خاص انداز میں ہدایات دی ہیں

اور واقعات بیان کر کے جماعت مسلمہ کی تربیت کی گئی ہے۔

یہاں ہم اس دوسرے حصے پر تفصیلی تبصرہ اس لئے نہیں کر سکتے کہ اس کا بیشتر حصہ چوتھے پارے میں آتا ہے۔ اس لئے تفصیلی بحث تو وہاں ہوگی البتہ یہاں اس قدر کافی..... اس میں اسلامی نظریہ حیات کے استحکام اور اسلامی جماعت کی تربیت و تشکیل کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں۔

غزوۂ احد کی تفصیلات ختم کر کے جب یہ سورت اختتام تک پہنچتی ہے 'تو نظر آتا ہے کہ یہاں اساسی موضوعات کو پھر دہرایا جاتا ہے۔ اس کا آغاز ان اشارات سے کیا جاتا ہے جو ایک مومن کے دل و دماغ کیلئے اللہ کی اس کھلی کتاب یعنی کائنات کے اندر پائے جاتے ہیں 'جن پر جب ایک مومن غور و فکر کرتا ہے تو وہ غور و فکر اس کی دعا کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ بڑی نرم اور پر کیف دعا ہے۔ یہ مشاہدہ کائنات پر مبنی دعا ہے۔ جس میں ایک مومن کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں۔

☆ "زمین و آسمان کی پیدائش میں 'اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوشمند لوگوں کیلئے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے 'بیٹھتے اور لیٹتے' ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں۔) "پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا 'تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب 'ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے 'تو نے جسے دوزخ میں ڈالا اسے درحقیقت بڑی ذلت و رسوائی میں ڈال دیا 'اور پھر ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ اے مالک ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو 'ہم نے اس کی دعوت قبول کرلی 'پس اے ہمارے آقا 'جو قصور ہم سے ہوئے ان سے درگزر فرما 'جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر ' خداوندا 'جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال 'بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنیوالا نہیں ہے۔" (۳:۱۹۴)

اس کا جواب اللہ تعالیٰ کی جانب سے آتا ہے 'دعا قبول ہوتی ہے اور جو اعمال باعث قبولیت بنتے ہیں وہ ہجرت 'جہاد فی سبیل اللہ اور ایذاء فی سبیل اللہ ہیں 'فرماتے ہیں :۔

☆ "جواب میں 'ان کے رب نے فرمایا' میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنیوالا نہیں ہوں 'خواہ مرد ہو 'یا عورت ' تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو 'لہذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لیے لڑے اور مارے گئے ان سب کے قصور میں معاف کروں گا اور انہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں اور بہترین جزا اللہ کے پاس ہے۔" (۳:۱۹۵)

اس میں غزوۂ احد کے واقعات اور نتائج کی طرف اشارہ ہے..... اس کے بعد اس سورت میں اہل کتاب کا دوبارہ ذکر ہوتا ہے ' جن کے بارے میں اس سورت کے پہلے حصے میں طویل بات ہو چکی ہے۔ اہل ایمان کو بتایا جاتا ہے کہ جس سچائی کے وہ حاملین ہیں 'تمام اہل کتاب اس کے منکر نہیں ہیں 'ان میں سے ایسے لوگ بہرحال ہیں جو ایمان لا چکے ہیں۔ اور سچائی کی شہادت دیتے ہیں۔ "اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں 'جو اللہ کو مانتے ہیں 'اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف بھیجی گئی ہے اور اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے قبل ان کی طرف بھیجی گئی تھی 'اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں 'اور اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔" (۳:۱۹۹)

اور سب سے آخر میں مسلمانوں کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ وہ راہ ایمان میں صبر' پامردی' خدا خوفی کا مظاہرہ کریں اور کمربستہ ہو جائیں۔ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' صبر سے کام لو' باطل پرستوں کے مقابلہ میں پامردی دکھاؤ' حق کی خدمت کیلئے کمربستہ ہو' اور اللہ سے ڈرتے رہو' امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔" (۳:۲۰۰) یہ ایک ایسا اختتامیہ ہے جو اس سورت کی فضا اور اس میں بیان کردہ مضامین اور واقعات کے ساتھ مناسب ہے۔

☆..........☆..........☆..........☆..........☆

اس سورت کا مجمل تعارف اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ہم ان تین خطوط کا قدرے ذکر نہ کریں جن پر اس سورت کے تمام مضامین چل رہے ہیں' یہ مضامین اس سورت میں منتشر بھی ہیں اور ایک جگہ بھی ہیں' مناسب ہے کہ ان کی وضاحت کر دی جائے۔

پہلی لائن یہ ہے کہ اس پوری سورت میں الدین اور الاسلام کی حقیقت اور ماہیت پر زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ بتایا گیا ہے کہ دین سے مراد صرف وہ عقائد نہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں رکھے جاتے ہیں' یعنی عقیدۂ توحید' باین مضمون اللہ ایک ہے' وہ وحدہ لاشریک ہے' وہ جس طرح انسانوں کا الٰہ ہے بعینہ اسی طرح وہ اس پوری کائنات کا بھی الٰہ ہے۔ جس طرح کائنات اس کی مطیع ہے' انسان بھی مطیع ہیں' وہ اس کائنات کو بھی تھامے ہوئے اور اس انسانیت کو بھی' ہر چیز اس سے قائم ہے۔ وہی ان کا محافظ ہے' اس لئے اللہ کو مجرد عقیدۂ توحید یا مجرد دین بمعنی عقیدہ مقبول نہیں ہے' بلکہ وہ دین اللہ کے نزدیک مقبول ہے جو اسلام ہو۔ اور اس صورت حال میں اسلام کے معنی مکمل اطاعت اور مکمل انقیاد کے ہیں۔ باین صورت کہ انسان اپنی زندگی کے تمام معاملات میں اسی اللہ سے ہدایت لے۔ اپنے تمام فیصلے اس کی کتاب کے مطابق کرے' ان تمام رسولوں کی اطاعت کرے جن پر یہ کتابیں نازل ہوئیں۔ اپنی اصلیت کے اعتبار سے تمام کتابیں ایک ہی کتاب ہیں۔ تمام الٰہی ادیان بھی ایک دین ہیں یعنی اسلام' یعنی انسان کے دل و دماغ میں بھی اسلام اور اس کی عملی زندگی میں بھی اسلام' اور ہر دور میں ہر مومن کا نقطۂ اتحاد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے رسول کا مطیع فرمان ہوتا ہے' جب اسلام کا مفہوم یہ ہو کہ نظریاتی طور پر ایک الٰہ اور حی و قیوم کا عقیدہ رکھنا اور عملی زندگی میں' پوری عملی زندگی میں اسلامی نظام کی اطاعت کرنا۔

یہ تمام سورت اس لائن پر جاری ہے اور تیس سے زیادہ مقامات پر اس نکتے کی وضاحت کی جاتی ہے کہ دین اسلام عقیدہ و عمل دونوں سے عبارت ہے' آیات کے بعض ٹکڑے یہ ہیں :-

"اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے جو حی و قیوم ہے۔" "وہ گواہی دیتا ہے کہ نہیں ہے کوئی الٰہ مگر وہ' یہی گواہی فرشتوں' اور سب اہل علم نے بھی دی ہے۔ وہ انصاف پر قائم ہے۔ اس زبردست حکیم کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔"..... "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔"..... "تو اگر یہ لوگ تیرے ساتھ جھگڑیں' تو کہہ دیں' میں اور میرے متبعین اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر چکے ہیں' آپ اہل کتاب اور دوسرے امیوں سے یہ کہیں کیا تم اسلام میں داخل ہو گئے؟ اگر وہ اسلام لے آئیں' ہدایت پالیں گے۔"

"تمہیں معلوم ہے ان لوگوں کی حالت جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا تھا۔ کہ جب انہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے' اس پر ان میں سے ایک فریق پلٹتے ہوئے منہ پھیر لیتا ہے۔"

....."کہو اللہ کی اطاعت کرو' اور رسول کی اطاعت کرو' پس اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ بھی کافروں کو محبوب نہیں رکھتا۔"......"

حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں' ہم اللہ پر ایمان لائے گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں۔ اے ہمارے رب' ہم ایمان لائے اس کتاب پر جو تو نے نازل کی' اور ہم نے رسول کی پیروی کی' پس لکھ دیجئے ہمیں بھی گواہوں میں سے۔"..... "کہہ دیجئے' اہل کتاب' آؤ اس کلمے پر متفق ہو جائیں جو ہمارے اور آپ کے درمیان برابر ہے۔ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور ہم

آپس میں ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ بنائیں' تو اگر وہ اس سے منہ پھیریں تو کہو گواہ رہو کہ ہم تو مسلمان ہیں۔" ...... "ابراہیم نہ یہودی تھا' نہ نصرانی تھا' وہ تو سیدھا مسلمان تھا' وہ مشرکین میں سے نہ تھا۔" ...... "کیا وہ اللہ کے نظام (دین) کے سوا کوئی اور دین کی تلاش میں ہیں؟ حالانکہ جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے' چار و ناچار اس کا مطیع فرمان ہے' سب نے اس کی طرف پلٹنا ہے۔" ...... "اگر کوئی اسلام کے سوا کوئی اور نظام (دین) تلاش کرے گا تو اس کی یہ سعی نامقبول ہوگی۔" ...... غرض یہ اور تمام دوسری آیات میں یہ تفصیلا بتایا گیا ہے کہ دین صرف اسلام ہے۔

وہ دوسری لائن جس پر پوری سورت چل رہی ہے وہ جماعت مسلمہ کے شب و روز ہیں۔ اس پوری سورت میں مسلمانوں کی تصویر کھینچی گئی ہے کہ یہ لوگ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ ان پر جو حکم بھی نازل ہوتا وہ بڑی رقت اور صفائی سے اس پر عمل کرتے ہیں۔ فوراً قبول کرتے ہیں اور فوراً ہی رو بعمل لاتے ہیں۔ اس کی تفصیلات تو ہم تشریح آیات کے وقت بتائیں گے' کچھ جھلکیاں یہاں بھی ملاحظہ ہوں۔

☆ "جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں' وہ کہتے ہیں' ہم اس پر ایمان لائے' سب اللہ کی طرف سے ہے' اور حقیقت یہ ہے کہ دانشمند لوگ ہی صحیح طرح نصیحت حاصل کرتے ہیں۔" ..... "وہ دعا کرتے ہیں' کہ اے پروردگار' جب تو ہمیں سیدھے راستے پر لگا چکا ہے' تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دیجیو' ہمیں اپنے خزانہ فیض سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاض حقیقی ہے۔ پروردگار! تو سب لوگوں کو ایک روز جمع کرنیوالا ہے' جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں' تو ہرگز اپنے وعدے سے ٹلنے والا نہیں۔" ..... "وہ لوگ جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب' ہم ایمان لائے ہیں' ہمارے گناہوں کو بخش دے' اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا' صبر کرنے والے' سچے' نیکو ہونے والے' خرچ کرنیوالے اور راتوں کو استغفار کرنیوالے" ...... "حواریوں نے کہا ہم ہیں اللہ کے مددگار' ہم اللہ پر ایمان لائے' گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں..... اے ہمارے رب تو نے جو کتاب نازل کی' ہم اس پر ایمان لائے' ہم نے رسول کی پیروی کی' تو ہمیں لکھ دیجئے گواہوں میں۔" ...... "تم خیر امت ہو جسے لوگوں کیلئے نکالا گیا ہے۔ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہو' اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔" ...... "اہل کتاب میں سے ایک گروہ ایسا ہے' جو راتوں کو کھڑا رہتا ہے وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور یوم آخرت پر ایمان لاتے ہیں' بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں' نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھتے ہیں' ایسے ہی لوگ صالح ہوتے ہیں۔"

...... "کئی ایسے نبی گزرے ہیں جن کے ساتھ خدا پرستوں نے مل کر قتال کیا اور اللہ کے رستے میں انہیں جو تکلیف پہنچی' اس کی وجہ سے انہوں نے نہ سستی کی اور نہ کمزوری دکھائی۔ نہ سرنگوں ہوئے اور اللہ صبر کرنیوالوں کو پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی اے ہمارے رب' ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما' ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو تجاوز ہو گیا ہو اسے معاف کر دے' ہمارے قدم جمادے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔" ...... "وہ لوگ جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا' ان میں جو اشخاص نیکوکار ہیں اور پرہیزگار ہیں ان کیلئے بڑا اجر ہے۔ اور جن سے لوگوں نے کہا کہ "کہ تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں ان سے ڈرو۔" تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے۔" ...... "وہ لوگ جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں' اور آسمان و زمین کی ساخت پر غور و فکر کرتے ہیں' پروردگار' یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا' تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے' پس اے رب' ہمیں دوزخ کی آگ سے بچا۔" تو نے جسے

آگ میں ڈالا وہ حقیقت بڑی ذلت اور رسوائی میں ڈالدیا- اور پھر ظالموں کا کوئی مدد گار نہ ہو گا' مالک' ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو' ہم نے اس کی دعوت قبول کرلی' پس اے ہمارے آقا' جو قصور ہم سے ہوئے ان سے درگزر فرما' جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کردے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر' خداوند جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال' بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنیوالا نہیں ہے۔" ..... "اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں' اسی کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف بھیجی گئی اور اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی طرف بھیجی گئی۔ اللہ کے آگے جھکتے ہیں اور اللہ کی آیات کو تھوڑی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔" ...... یہ اور ایسی ہی دوسری آیات۔

تیسری لائن اس سورت میں یہ دی گئی ہے کہ اس پوری سورت میں مسلسل اہل ایمان کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ غیر اہل ایمان کے ساتھ دوستی نہ رکھیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس ممانعت کے ساتھ یہ بھی سمجھایا گیا کہ اہل کفر اس قابل ہی نہیں کہ وہ تمہارے دوست ہوں۔ نیز فیصلہ کن انداز میں یہ سمجھایا گیا ہے' قرآن کے نزدیک اس شخص کا ایمان کوئی ایمان نہیں ہے' جو ایسے کفار کے ساتھ دوستی رکھتا ہے جو اپنے نظام میں کتاب اللہ پر فیصلہ نہیں کرتے' اور اپنی زندگی کو اسلامی نظام کے مطابق نہیں گزارتے' اس سے پہلے بھی ہم اسلام کی اس پالیسی کی طرف اشارہ کر چکے ہیں لیکن اس کی وضاحت کی اشد ضرورت ہے' اور اس سورت میں اس کو جس قدر کھولا گیا ہے' اس کا یہاں ذکر ضروری ہے' کچھ جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

"مومنین' اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں' اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ اللہ کے نزدیک کچھ ملیشی نہیں ہے۔ الا یہ کہ تم اس سے ڈر کی حالت میں ہو' اللہ تمہیں خود اپنے آپ سے خوف دلاتا ہے اور تمہیں اس طرف پلٹ کر جانا ہے' کہہ دو' تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے۔ اسے تم چھپاؤ یا ظاہر کرو' اللہ اسے جانتا ہے' بلکہ وہ ان چیزوں کو جانتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔"

......"اہل کتاب کا ایک گروہ دل سے یہ چاہتا ہے کہ وہ تمہیں گمراہ کردے' لیکن وہ خود گمراہ ہو رہے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔" .....

"اے ایمان لانے والو' اگر تم ان لوگوں سے ایک فریق کے پیچھے چلو گے جنہیں کتاب دی گئی ہے' تو وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد پھیر کر کافر بنا دیں' اور اب تم کس طرح کفر کر سکتے ہو حالانکہ تم پر اللہ کی آیات پڑھی جارہی ہیں اور رسول خدا' تم میں بذات خود موجود ہیں اور جس شخص نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیا تو اس نے سیدھا راستہ پالیا' اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے اس طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو' اور سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور تفرقہ نہ کرو۔" ..... "وہ تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے' الا یہ کہ کچھ اذیت دیدیں۔ اگر وہ تم سے لڑیں' تو شکست کھائیں' پھر ان کو کسی طرف سے مدد نہ ملے گی۔ یہ جہاں بھی ہوں گے ذلت ان پر مسلط ہوگی۔" ...... "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ' وہ تمہاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے۔ تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے' ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے۔ اور جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے وہ اس سے شدید تر ہے۔"

...... "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم ان لوگوں کے اشارے پر چلو گے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو تم کو الٹا پھیر لے جائیں اور تم نامراد ہو جاؤ گے' حقیقت یہ ہے کہ اللہ تمہارا حامی و مددگار ہے اور وہ بہترین مددگار ہے' عنقریب وہ وقت آنیوالا ہے جب ہم منکرین حق کے دلوں میں رعب بٹھا دیں گے۔ اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کو خدائی میں شریک ٹھہرایا ہے جن کے شریک

ہونے پر اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے۔" ...... "اے نبی دنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈال دے۔ یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے' پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے۔ جو بدترین جائے قرار ہے۔" ......یہ اور بہت سے دوسری آیات اسی لائن پر ہیں۔

یہ تینوں خطوط باہم متوازن اور متوازی اس پوری سورت میں ایک ساتھ چلتے ہیں۔ یہ مل کر اس سورت کے مقاصد کو مکمل کرتے ہیں۔ یہ حقیقت توحید' توحید کے تقاضے' انسانی زندگی میں اس کے اثرات' انسانی شعور اور سوچ پر اس کے اثرات اور اس عقیدے کی روشنی میں اسلامی تصور حیات کی تشکیل اور پھر اس کی روشنی میں دشمنان اسلام کے ساتھ اپنے موقف کے تعین کے سلسلے میں اہم ہدایات دیتے ہیں۔

اس سورت میں جو آیات آئی ہیں ان کے درمیان موقع و محل کے لحاظ سے ایک زندہ اور گہرا ربط ہے۔ یہ سورت ایک عملی نظریاتی اور میدانی جنگ کے موقع پر نازل ہوئی' نظریاتی جنگ اس وقت افکار و اذہان کے میدان میں لڑی جارہی تھی' جبکہ جسمانی جنگ معرکہ کارزار میں لڑی جارہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں ہدایات و راہنمائی کا ایک زندہ ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ اس میں ہر جگہ ملے جلے تاثرات اور اشارات پائے جاتے ہیں۔ مناسب ہے کہ اب ہم نصوص و آیات کا تفصیلی جائزہ لیں' اس سیاق و سباق میں ایک زندہ کلام اپنی طرف سے جاذب کھینچتا ہے اور بہت ہی خوبصورت ہے۔

☆ ☆ ☆

# درس ۲۳ ایک نظر میں

اگر ہم ان روایات کو لے لیں' جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اس سورت کی ابتدائی ۸۰ سے کچھ اوپر آیات اس موقع پر نازل ہوئیں جب وفد نجران حضور کے ساتھ مناظرے کیلئے آیا تھا' یہ وفد عیسائیوں پر مشتمل تھا' اور یہ لوگ حضور ﷺ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ تو پھر اس سبق کی تمام آیات گویا اس موقع پر نازل شدہ تصور ہوں گی' لیکن یہ روایات خود اس حقیقت کو بیان کر دیتی ہیں کہ یہ وفد عام الوفود ۹ھ میں آیا تھا' اس وقت غلبہ اسلام کا شہو جزیرۃ العرب اور اس کے اردگرد علاقوں میں پھیل گیا تھا اور جزیرۃ العرب کے مختلف علاقوں سے وفود حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ملاقات کیلئے دھڑا دھڑ حاضر ہو رہے تھے' ان وفود میں سے بعض تو معلومات حاصل کرنے آتے تھے اور بعض ایسے تھے جو جدید حالات میں حضور اکرم کے ساتھ معاہدات کی پیشکش بھی کرتے تھے۔

جیسا کہ اس سے پہلے میں کہہ چکا ہوں' کہ ان آیات میں جن موضوعات پر بحث کی گئی ہے اور جس انداز سے بحث کی گئی ہے۔ یہ دونوں اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ آیات ہجرت کے بعد قریبی زمانہ میں نازل ہوئیں۔ اس سورت میں زیادہ تر اہل کتاب کے ساتھ نظریاتی مباحثہ ہے۔ ان کے غلط عقائد کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر جو شبہات پیدا ہوتے تھے۔ ان کے جوابات ہیں' یا ان اعتراضات کے جوابات ہیں جو وہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی صحت کے بارے میں کرتے تھے' یا وہ ہدایات ہیں جو اہل کتاب کے حوالے سے حقیقت توحید اور شرک کے بارے میں نازل ہوئیں' یا وہ خبرداری ہے جو اللہ نے یہاں اہل کتاب کی سازشوں کے مقابلے میں دی اور کہا کہ تم ان کے دھوکے میں نہ آؤ' اپنے موقف پر ثابت قدم رہو' ان موضوعات و مباحث کی وجہ سے میرا میلان اس طرف ہے کہ یہ آیات وفد نجران کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ وفد ۹ھ میں آیا تھا' اس لئے کہ ان آیات کے نزول کیلئے ۹ھ سے پہلے بھی مدینہ طیبہ میں ایسے حالات تھے کہ ان کا نزول ان میں ہوا ہو یا یہ پوری سورت ان میں نازل ہوگئی ہو۔ اس لئے ان آیات کی تشریح کے وقت ہم واقعہ وفد نجران ہی کو پیش نظر نہ رکھیں گے بلکہ اس سورت کا خطاب عام اہل کتاب کو سمجھا جائے گا۔ کیونکہ تاریخی شواہد کے مطابق یہ واقعہ بہت متاخر ہے۔ ا۔

جیسا کہ ہم نے اوپر تمہید میں کہا' ان آیات میں' اس اصلی کشمکش کا ذکر ہے' جو اس وقت تحریک اسلامی اور اس کے عقائد و نظریات اور اہل کتاب اور مشرکین اور ان کے عقائد و نظریات کے درمیان برپا تھی' یہ جنگ ظہور اسلام کے ساتھ ہی شروع تھی' اس میں کوئی وقفہ نہ تھا' خصوصاً اس وقت اس کشمکش میں بڑی تیزی آگئی تھی جب تحریک اسلامی کا ہیڈ کوارٹر مدینہ منتقل ہوا اور وہاں ایک اسلامی حکومت قائم ہوگئی۔ اس نظریاتی جنگ میں مشرکین اور یہودی شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ اور ان کی اس مشترکہ مہم کو قرآن کریم تفصیل سے ریکارڈ کرتا ہے۔

یہ بات بعید از امکان نہیں ہے کہ جزیرۃ العرب کے اطراف و اکناف میں جو عیسائی آباد تھے' ان میں مذہبی پیشوا بھی اس

---

ا۔ استاذ محمد عزہ دروزہ اپنی کتاب سیرۃ الرسول میں لکھتے ہیں کہ بعض روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وفد نجران ہجرت نبوی کے زمانے میں سے پہلی چوتھائی میں آیا تھا۔ معلوم نہیں انہوں نے کن روایات پر یہ موقف اختیار کیا ہے۔ کیونکہ اکثر روایات وفد نجران کی آمد کی تاریخ ۹ھ ہی متعین کرتی ہیں۔ یعنی دوسرے وفود کے ساتھ' ہاں ابن کثیر نے اس احتمال کا ذکر کیا ہے کہ شاید یہ وفد صلح حدیبیہ سے پہلے آیا ہو' لیکن ابن کثیر نے بھی روایات سلف میں سے کسی روایت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بہرحال اگر ان آیات کو وفد نجران سے متعلق کروانا جائے تو پھر یہ وفد پہلے آیا ہوگا لیکن چونکہ اکثر روایات میں یہی آیا ہے کہ یہ وفد ۹ھ کو آیا تھا' اس لئے میں یہی موقف اختیار کرتا ہوں کہ ان آیات کا وفد نجران کے ساتھ تعلق نہیں ہے۔

نظریاتی جنگ میں کسی نہ کسی صورت میں شریک ہوں' نیز یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ قرآن مجید نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو صحیح عقائد و نظریات پیش کیے ان کا علم ان عیسائیوں کو ہو گیا ہو' اور وہ اس موضوع پر حضور اکرم ﷺ کے ساتھ بحث و مباحثہ کیلئے آئے ہوں' کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عیسائی اپنی اصل راہ سے ہٹ گئے تھے۔ اور اس موضوع پر قرآن کریم تنقید کر چکا تھا' اور عقیدہ توحید کے حوالے سے عیسائیوں پر رد آ گیا تھا۔

اس سبق میں ابتداء ہی اسلام کے عقیدۂ توحید کو اہل شرک کے انحرافات اور شبہات سے پاک و صاف کر کے بیان کیا گیا ہے' اور یہ قرار دیا گیا کہ قرآن کریم حق و باطل کے درمیان فرقان ہے' اور جو شخص بھی آیات الٰہی کا انکار کرے گا وہ کافر تصور ہو گا۔ چاہے وہ اہل کتاب میں سے ہو' ان آیات میں قرآن کے حوالے سے بتایا گیا مسلمانوں اور اہل ایمان کا رویہ ان آیات کے ساتھ کیا ہے' اپنے رب کے ساتھ ان کا کیا رویہ ہونا چاہئے' واضح طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ ایمان کی کیا علامات ہوتی ہیں' وہ اس قدر واضح ہوتی ہیں کہ اہل ایمان کی پہچان میں کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ اور کفر کی بھی کچھ علامات ہوتی ہیں اور اہل کفر کی پہچان میں بھی غلطی نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں :

"اللہ وہ : زندۂ جاوید ہستی' جو نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے' حقیقت میں اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے' اس نے تم پر کتاب نازل کی' جو حق لیکر آئی ہے' اور ان کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے آئی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے وہ انسانوں کی ہدایت کیلئے تورات و انجیل نازل کر چکا ہے' اور اس نے وہ کسوٹی اتاری ہے۔ اب جو لوگ اللہ کے فرامین قبول کرنے سے انکار کریں۔ ان کو یقیناً سخت سزا ملے گی۔" اللہ بے پناہ طاقت کا مالک ہے اور برائی کا بدلہ دینے والا ہے' زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہی تو ہے جو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں' تمہاری صورتیں' جیسی چاہتا ہے بناتا ہے' اس زبردست حکمت والے کے سوا کوئی اور خدا نہیں۔ وہی خدا ہے' جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی۔ اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں۔ ایک محکمات جو کتاب کی اصل بنیادیں ہیں۔ اور دوسری متشابہات' جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں' حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بخلاف اس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ "ہمارا ان پر ایمان ہے' یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہیں' اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔" (۲ تا ۸)

"اللہ نے خود شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے' اور فرشتوں اور سب اہل علم نے بھی شہادت دی ہے' وہ انصاف پر قائم ہے' اس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں' اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے' اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے جنہیں کتاب دی گئی تھی۔ ان کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد' آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کیلئے ایسا کیا' اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات کی اطاعت سے انکار کر دے' اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔

اور اس سبق میں ایک تہدید تو ایسی آئی ہے جس میں روئے سخن یہود کی طرف ہے' مثلاً فرمایا "جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں' جو نبیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں' اور ان لوگوں کو بھی قتل کرتے ہیں جو عدل و انصاف کا حکم دیتے ہیں تو انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔" قتل انبیاء کا ذکر آتے ہی ذہن یہودیوں کی طرف چلا جاتا ہے' اس لئے کہ یہ کارنامہ وہی سرانجام دیتے رہے ہیں۔ ایک دوسری آیت میں آیا ہے۔ "اہل ایمان اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں۔" اس آیت میں اگرچہ لفظ کافر واقع ہے تاہم اس سے مراد بھی غالباً یہودی ہیں' اگرچہ اس میں مشرکین بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اسلامی تحریک کے اس دور تک بعض مسلمان' اپنے

کافر مشرکین اقارب اور یہودیوں میں سے اپنے دوستوں کے ساتھ تعلقات قائم کئے ہوتے تھے۔ اس لئے یہاں انہیں اب ایسے تعلقات جاری رکھنے سے منع کر دیا گیا اور اس قدر سخت الفاظ میں ان تعلقات کے انجام بد سے ڈرایا گیا' چاہے یہ دوست یہودی ہوں یا مشرکین ہوں۔ کیونکہ سب کیلئے الکافرین کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اسی طرح ایک دوسری آیت "ان لوگوں کو کہہ دو جنہوں نے کفر اختیار کیا' تم عنقریب مغلوب ہو گے اور تمہیں جہنم کی طرف لے جایا جائے گا' جو بہت ہی برا ٹھکانا ہے' تمہارے لیے ان دو گروہوں میں سامان عبرت ہے جو ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے' ایک اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا کافر تھا' دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ مومن گروہ سے دوچند تھا۔" اس آیت میں غزوۂ بدر کے واقعات کی طرف اشارہ ہے' لیکن خطاب یہودیوں سے ہے' اس سلسلے میں حضرت ابن عباس ؓ سے ایک روایت منقول ہے' فرماتے ہیں کہ جب حضور اکرم ﷺ نے بدر کے دن قریش کو شکست دی اور آپ مدینہ طیبہ لوٹے تو یہودیوں کو جمع کیا تو انہیں یہ نصیحت کی کہ اس سے قبل کہ تمہارا وہ حال ہو جائے جو قریش کا ہو' تم مسلمان ہو جاؤ۔ انہوں نے کہا: محمد! بے شک تم نے قریش کے چند آدمیوں کو قتل کر دیا ہے مگر اس سے کہیں غرور میں مبتلا نہ ہو جاؤ کیونکہ وہ ناتجربہ کار تھے اور وہ جنگ کے بارے میں زیادہ نہ جانتے تھے۔ اگر تم نے ہمارے ساتھ جنگ کی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کچھ لوگ ہیں شائد آپ کو ہم جیسے لوگوں سے کبھی واسطہ نہ پڑے۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت فرمائی کہ "ان لوگوں سے کہہ دو جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا' کہ بہت جلدی تم مغلوب ہو جاؤ گے اور پھر جہنم کی طرف تمہیں اٹھایا جائے گا"...... ان الفاظ تک "ایک گروہ اللہ کے راستے میں لڑتا ہے۔" یعنی بدر میں اور "دوسرا کافر ہے۔" (ابوداؤد)

اسی طرح اس سبق کی آیت "اب اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں' تو ان سے کہو' میں نے اور میرے پیروؤں نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔" "پھر اہل کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں سے پوچھو" "کیا تم نے بھی اس کی اطاعت اور بندگی قبول کی؟" "اگر کی' تو راہ راست پا گئے اور اگر اس سے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچانا ہے۔ آگے اللہ خود اپنے بندوں کے معاملات دیکھنے والا ہے۔" (۳:۲۰ میں حضور ﷺ کو خطاب ہے' اور یہ خطاب اگرچہ اہل کتاب کے ساتھ نظریاتی مباحثہ کے اس سبق کے آغاز میں ہے' تاہم یہ عام ہے اور مخالف خواہ اہل کتاب ہوں یا غیر اہل کتاب ہوں' اس آیت کا آخری حصہ "اگر انہوں نے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک حضور ﷺ پر اہل کتاب کے خلاف جہاد فرض نہ ہوا تھا۔ اور آپ ان سے جزیہ بھی وصول نہ کرتے تھے۔ جس سے ہمارا یہ نظریہ درست معلوم ہوتا ہے کہ اس سبق میں جو زیر بحث آیات ہیں وہ ہجرت کے بعد ابتدائی دور میں نازل ہوئیں۔

غرض ان تمام آیات پر اچھی طرح غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق کسی ایک واقعہ مثلاً قدوم وفد نجران سے نہیں ہے' ان میں دی گئی ہدایات عام ہیں اور ان کا انطباق تمام مخالفین اسلام پر ہوتا ہے' ہاں جن واقعات کی نسبت سے ان آیات کا نزول ہوا ہے۔ ایسے واقعات میں سے ایک واقعہ وفد نجران کا بھی ہو سکتا ہے' کیونکہ ان ابتدائی دنوں میں ایسے مواقع بار بار وقوع پذیر ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ اس دور میں جزیرۃ العرب میں مسلمانوں اور ان کے مخالفین کے درمیان ایک ہمہ گیر نظریاتی جنگ جاری تھی۔ خصوصاً یہود مدینہ کے ساتھ۔

اس پہلے سبق میں اسلامی تصور حیات کے بارے میں نہایت ہی اہم بنیادی تصورات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس نظریۂ حیات کی نوعیت اور اس کے مزاج کے بارے میں بھی اہم وضاحتیں دی گئی ہیں۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس نظریہ حیات کے عملی اثرات' انسانی زندگی پر کیا مرتب ہوتے ہیں' وہ آثار جو لازمۂ ایمان ہیں' مثلاً اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک سمجھنا' اور اس کا لازمی نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ ایک موحد اللہ کا

مسلم بھی ہو جائے' یہی دین ہے اور اس کے سوا کوئی دین نہیں ہے۔ اور مسلم ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ کے سامنے سرتسلیم خم کردے اور اس کی اطاعت کرے۔ اس کے اوامر کو مانے' اس کی شریعت کو مانے' اس کے رسول اور رسول کے طریقہ زندگی کا اتباع کرے۔ پس اس نظریۂ حیات کی رو سے اگر کوئی سرتسلیم خم نہیں کرتا' کوئی اطاعت نہیں کرتا کوئی رسول کا اتباع نہیں کرتا تو وہ مسلم نہیں ہے۔ لہٰذا وہ ایسا دیندار نہیں ہے جس کے دین کو اللہ نے پسند کیا ہو۔ اور اللہ نے تو صرف اسلام کو پسند کیا ہے۔ اور اسلام جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا مکمل طور پر سرتسلیم خم کردینے' اطاعت کرنے اور اتباع کرنے کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم بڑے تعجب کے ساتھ اہل کتاب پر یہ تبصرہ کرتا ہے کہ جب انہیں اس طرف بلایا جاتا ہے کہ آؤ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کریں يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ وہ منہ پھیر کر چلے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں یہ اعراض کفر کے ہم معنی ہے' اور اس اعراض سے ان کے دعوائے ایمان کی قلعی کھل جاتی ہے اور اس سے ایمان کی نفی ہوتی ہے۔ اس حقیقت کی مزید وضاحت اس سورت کے حصہ دوئم میں کی گئی ہے۔........... اس قدر اجمالی تعارف کے بعد اب مناسب ہے کہ اس درس کی آیات کی مفصل تشریح و تفسیر پیش کی جائے۔

○..........○..........○

# درس ۲۳ تشریح آیات

## آیات ۱ تا ۳۲

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ (۳) مَدَنِيَّةٌ (۸۹)
اٰيَاتُهَا ۲۰۰ رُكُوْعَاتُهَا ۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝۱

یہ حروف مقطعات ہیں' ان کی کوئی یقینی تشریح تو ممکن نہیں ہے' البتہ ترجیحی بنیاد پر' میں اس کا وہی مفہوم بیان کرتا ہوں' جو میں نے سورۂ بقرہ کے ابتداء میں بیان کیا تھا یعنی یہ اس چیلنج کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کتاب انہی حروف سے بنی ہے' جو مخالفین اسلام کے دسترس میں ہیں' لیکن اس کے باوجود یہ کتاب معجز ہے' اور مخالفین اس جیسی کتاب لانے میں ناکام رہے ہیں۔

ان حروف کی جس تفسیر کو ہم نے ترجیح دی ہے' متعدد سورتوں میں اس چیلنج کی تشریح یا اشارہ خود اس سورت میں بھی پایا جاتا ہے جس کی ابتداء میں یہ حروف وارد ہوئے ہیں۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں یہ اشارہ بطور صریح چیلنج موجود ہے

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۲۳

"اور اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے' یہ ہماری ہے یا نہیں تو اس کی مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ' اپنے سارے ہم نواؤں کو بلا لو' ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو' مدد لے لو' اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔"

(۲۳:۲)

زیر بحث سورۂ آل عمران میں' تحدی اور چیلنج کا اشارہ ایک دوسری نوعیت سے لیا گیا ہے' یہ کہ یہ کتاب اس خدا کی جانب سے نازل کی گئی ہے۔ جس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے۔ اور یہ انہی حروف و کلمات سے مولف ہے جن حروف و کلمات سے تمام دوسری کتب سماوی نازل ہوئی تھیں۔ اور جن پر خود اہل کتاب ایمان لا چکے ہیں' جن سے اس سورت کا زیادہ تر خطاب متعلق ہے۔ اس لئے یہ بات کوئی قابل تعجب یا قابل انکار نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان ہی حروف سے مولف ایک نئی کتاب اپنے رسول پر نازل کرے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝۲ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۝۳ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۬ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ

شَدِيدٌ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿٤﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي
الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ﴿٥﴾ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ
لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦﴾ هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ
آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ۖ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ
زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ۗ وَمَا يَعْلَمُ
تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ
رَبِّنَا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿٧﴾ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا
وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿٨﴾ رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ
النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿٩﴾

ع ۱ ۹ ۹

"اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی' جو نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے' حقیقت میں اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اس نے تم پر کتاب نازل کی' جو حق لیکر آئی ہے اور ان کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں' اس سے پہلے وہ انسانوں کی ہدایت کیلئے تورات اور انجیل نازل کر چکا ہے' اور اس نے یہ فرقان اتارا ہے' اب جو لوگ اللہ کے فرامین کو قبول کرنے سے انکار کریں ان کو یقیناً سخت سزا ملے گی' اللہ بے پناہ طاقت کا مالک ہے اور برائی کا بدلہ دینے والا ہے' زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں' وہی تو ہے جو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں' جیسی چاہتا ہے' بناتا ہے' اس زبردست حکمت والے کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ وہی خدا ہے' جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔ اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں' ایک محکمات' جو کتاب کی اصل بنیادیں ہیں اور دوسری متشابہات' جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے' وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بخلاف اس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں' وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ان پر ایمان ہے' یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔ وہ اللہ سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ پروردگار! جب تو ہمیں سیدھے رستے پر لا چکا ہے تو پھر ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دیجیو' ہمیں اپنے خزانۂ غیب سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاض حقیقی ہے۔ پروردگار! تو یقیناً سب لوگوں کو ایک روز جمع کرنیوالا ہے' جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے' تو ہرگز اپنے وعدے سے ٹلنے والا نہیں ہے۔"

یوں اس سورت کا آغاز ان منکرین اسلام اہل کتاب پر تنقید سے ہوتا ہے' جو حضورؐ کی رسالت کا انکار کر رہے تھے' حالانکہ وہ اپنے دین کی بنیاد پر اور اہل کتاب ہونے کے ناطے نبوت' رسالت' کتب سماوی اور وحی الٰہی کے تصور سے واقف تھے' اس لئے انکا

فرض تھا کہ سب سے پہلے اسلام لاتے اور حضور ؐ کی تصدیق کرتے بشرطیکہ ان کی تصدیق صرف دلیل اور حجت کے اطمینان پر موقوف ہوتی۔

اس فیصلہ کن حملے میں 'ان تمام شبہات کی بیخ کنی کردی جاتی' جو اہل کتاب کے دلوں میں پائے جاتے تھے 'یا جنہیں وہ جان بوجھ کر مومنین کے دلوں میں ڈالنا چاہتے تھے 'اس لئے ان کا پروپیگنڈا کرتے تھے۔ اس تنقید میں ان راستوں اور ان دروازوں کی نشاندہی کردی گئی ہے جن کے ذریعہ یہ شبہات داخل ہوتے تھے۔ اس لئے یہاں انسدادی طور پر بتادیا گیا کہ اللہ کی آیات سے متعلق سچے مومنوں کا موقف کیا ہے اور ان کے بارے میں مخالفین اور منحرفین کی سوچ کیا ہے۔ سورت کے اس آغاز میں سچے اہل ایمان کا تعلق باللہ 'اللہ کے دربار میں ان کی عاجزی اور ان کی التجاؤں کی ایک خوبصورت تصویر کشی کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا کہ وہ اللہ کی صفات کے بارے میں یہ تصور رکھتے ہیں۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ.................................. ...............'' اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی ہے 'جو نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔''

یہ خالص اور صاف ستھری توحید دراصل ایک مسلمان کے عقیدہ اور تمام غیر مسلموں کے عقائد کے درمیان ایک خط امتیاز کھینچ دیتی 'جن میں ملحدین اور مشرکین بھی شامل ہیں اور منحرفین اہل کتاب بھی شامل ہیں چاہے یہودی ہوں یا انصاری ہوں 'اپنے تصورات اور عقائد کے اختلاف کے مطابق 'غرض توحید ایک مسلم اور تمام غیر مسلموں کے عقائد کے درمیان ایک خط امتیاز ہے 'اس لئے کہ یہاں نظام زندگی کا تعین تصور حیات اور عقائد پر ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ ہی ہے جو نظام زندگی کا تعین کرتا ہے۔

اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے 'خدائی میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے 'وہ زندہ ہے 'اور حیات اس کی ذاتی صفت ہے۔ وہ ہر قید سے آزاد ہے 'زندہ مطلق ہے 'وہ القیوم ہے 'اس کائنات کو اسی نے تھاما ہوا ہے 'زندگی اس کی وجہ سے قائم ہے ' ہر موجود اس کی وجہ سے موجود ہے۔ پھر وہ سب کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس لئے اس کے بغیر اس کائنات میں نہ کوئی ہستی موجود رہ سکتی ہے اور نہ موجود ہو سکتی ہے۔

یہ ہے خط امتیاز ایک تصور حیات اور عقیدہ میں اور یہی فرق ہے ایک مسلم کے طرز عمل اور نظام زندگی میں بمقابلہ ایک غیر مسلم ' اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں اسلامی تصور توحید اور اسلامی عقائد اور ان کے عقائد باطلہ اور عقائد جاہلیت کے اندھیروں کے درمیان بھی امتیاز ہو جاتا ہے۔ جاہلیت کے تصورات میں مشرکین عرب کے اس وقت کے تصورات بھی شامل ہیں اور یہود و نصاریٰ کے وہ منحرف شدہ تصورات بھی جن کے وہ قائل تھے۔

قرآن کریم نے یہودیوں کے بارے میں 'یہ بات نقل کی ہے کہ وہ حضرت عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کا مقام دیتے تھے ' قرآن کریم نے یہودیوں کے جس باطل عقیدے کا ذکر کیا ہے آج یہودی جس کتاب مقدس کے قائل ہیں اس میں موجود ہے 'مثلاً سفر تکوین اصحاح ششم میں ذکر ہے۔

> ''جب روئے زمین پر آدمی بہت بڑھنے لگے اور ان کی بیٹیاں پیدا ہوئیں 'تو خدا کے ''بیٹوں'' نے آدمی کی بیٹیوں کو دیکھا کہ وہ خوب صورت ہیں اور جن کو انہوں نے چنا ان سے بیاہ کر لیا۔ تب خداوند نے کہا کہ میری روح انسان کے ساتھ ہمیشہ مزاحمت نہ کرتی رہے گی کیونکہ وہ بھی تو بشر ہے اس کی عمر ایک سو بیس برس کی ہوگی۔ ان دنوں میں زمین پر جبار تھے اور بعد میں جب خداوند کے بیٹے انسان کی بیٹیوں کے پاس گئے تو ان کے لئے ان سے اولاد ہوئی۔ یہی قدیم زمانے کے سورما ہیں جو بڑے نامور ہوئے۔''

مسیحی تصورات میں جو خرابی پیدا ہو گئی تھی' قرآن کریم نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اللہ تینوں میں سے ایک ہے"۔ اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ ........ اور ان کا یہ قول اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ ........ "کہ اللہ مسیح بن مریم ہیں" اور یہ کہ انہوں نے حضرت مسیح اور ان کی والدہ کو اللہ کے سوا دو الٰہ بنا لیا تھا۔ اور انہوں نے اپنے احبار اور رھبان کو بھی اللہ کے علاوہ رب بنا لیا تھا' مشہور مصنف آرنلڈ اپنی کتاب تبلیغ اسلام میں لکھتے ہیں :۔

"ظہور اسلام سے تقریباً ایک سو سال پہلے قیصر یوستینیان رومی سلطنت میں اتحاد پیدا کرنے میں بظاہر کامیاب رہا تھا مگر اس کی وفات کے بعد سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے کیونکہ دارالسلطنت اور صوبجات کے درمیان ایک مشترکہ قومیت کا جذبہ بالکل باقی نہیں رہا تھا۔ ہرقل نے کوشش کی تھی کہ شام کے ملک کو مرکزی حکومت کے ساتھ دوبارہ وابستہ کرے اور اسے اس میں کسی قدر کامیابی بھی ہوئی تھی مگر بدقسمتی سے اس نے مصالحت کیلئے جو طریقے اختیار کئے' ان سے اختلاف رفع ہونے کی بجائے اور شدید ہو گیا' لوگوں کے دلوں میں مذہبی تعصبات نے قومی جذبے کی جگہ لے رکھی تھی لہذا قیصر نے کوشش کی کہ دین مسیحی کی تفسیر و تشریح ایسے طریق پر کرے جس سے مخالف فرقوں کے باہمی مناقشات مٹ جائیں اور جو لوگ دین سے منحرف ہو چکے ہیں ان کو آرتھوڈکس کلیسا اور مرکزی حکومت کے ساتھ متحد کر دیں۔ خلقیدونہ کے مقام پر مسیحی علماء کی جو مجلس ۴۵۱ء میں بیٹھی تھی اس نے اس عقیدے کا اعلان کیا تھا کہ "حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دو اقنوم تسلیم کرنے چاہئیں' اس طور پر کہ ان میں کوئی اختلاط یا تبدیلی یا تقسیم یا علیحدگی نہیں ہے۔ ان کی فطرتوں کا جو اختلاف ہے جو ان کے اجتماع سے باطل نہیں ہو جاتا بلکہ ہر اقنوم کے خواص برقرار ہیں اور ایک ذات اور ایک وجود میں موجود ہیں۔ مگر اس طرح نہیں ہے کہ یہ خواص دو ہستیوں میں منقسم یا الگ الگ ہوں بلکہ وہی ایک بیٹا ہے' اکلوتا' کلمۃ اللہ مگر مونو فزائٹ (Monophysites) فرقے نے اس عقیدے کو رد کر دیا کیونکہ وہ لوگ اس بات کے قائل تھے کہ مسیح کی ذات میں صرف ایک اقنوم ہے' یہ ذات مرکب ہے جس میں تمام ربانی اور انسانی صفات شامل ہیں۔ مگر وہ وجود جس میں یہ صفات ہیں' اس میں دوئی نہیں ہے بلکہ وہ ایک مرکب وحدت ہے۔" اس فرقے کے لوگ خاص طور پر شام' مصر اور رومی سلطنت کے باہر کے ملکوں میں آباد تھے۔ چنانچہ ان دونوں فرقوں کے درمیان اس مسئلے پر دو صدیوں تک گرماگرم مباحثہ جاری رہا' یہاں تک کہ ہرقل نے آخر فریقین کے درمیان مونو تھیلٹزم (Monotheletism) کے عقیدے کے ذریعے سے مصالحت پیدا کرانی چاہی۔ اس عقیدے کا مفہوم یہ تھا کہ اقانیم کی دوئی کو تسلیم کرتے ہوئے مسیح کی واقعی زندگی میں ذات کی وحدت کو قائم رکھا جائے' اس لئے کہ ایک واحد ذات میں حرکت و عمل کے دو سلسلے قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ مسیح' جو ابن اللہ ہیں' ایک ہی ذریعے اور وسیلے سے انسانی اور ربانی دونوں قسم کے نتائج پیدا کرتے ہیں' یعنی کلمہ مجسم میں ایک ہی مشیت کارفرما ہے۔"

"مگر ہرقل کا بھی وہی انجام ہوا جو بہت سے اور صلح کرانے والوں کا ہوا کرتا ہے کیونکہ نہ صرف مناظرے کی آگ اور بھڑک اٹھی بلکہ لوگوں نے قیصر پر بے دینی کا الزام لگایا اور دونوں فرقوں کو مورد عتاب بننا پڑا۔"

ایک دوسرے مسیحی مسٹر کینن ٹیلر لکھتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے وقت مشرقی عیسائیوں کی حالت یہ تھی کہ یہ لوگ درحقیقت مشرکین تھے' وہ شہداء کے ایک طبقے کی پوجا کرتے تھے۔ اسی طرح عیسائی پیروں اور فرشتوں کی عبادت کرتے تھے۔ ا۔

مشرکین کے غلط عقائد کا ذکر قرآن کریم نے یوں کیا کہ وہ جن اور ملائکہ کی بندگی کرتے تھے۔ سورج' چاند اور بتوں کو پوجتے تھے'

اور ان کا کم سے کم جو شرکیہ عقیدہ تھا وہ یہ ہے کہ بقول ان کے وہ ان الٰہوں کی بندگی محض اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی بندگی کی وجہ سے انہیں قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى .........

غلط اعتقادات اور تصورات کے اس جنگل اور ڈھیر میں' جن کی طرف اس سے قبل ہم اشارہ کر چکے ہیں' اسلام آیا اور اس نے اسلامی نظریۂ حیات اور اسلامی عقیدے کا فیصلہ کن' صریح اور واضح و ممتاز تصور دیا۔ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ..... ..................... ............ "نہیں کوئی الٰہ مگر خدا' وہی زندہ ہے اور وہی ہے جو تھامنے والا ہے۔" ...... یہ عقیدہ اور یہ تصور حیات ایسا تھا کہ اس نے فریقین کے راستے جدا کر دیئے۔ دونوں کا طرز عمل اور دونوں کا طریق زندگی جدا کر دیا...... جس شخص کے نظریہ اور شعور میں یہ ہو کہ اللہ ایک واحدہ لاشریک ہے اور اسکے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے اور اس کے سوا اس مفہوم میں کوئی زندہ نہیں ہے' تمام دوسرے موجودات کا وجود اس کے ساتھ قائم ہے۔ اور وہی ہے جو تمام موجودات اور تمام زندوں کو تھامے ہوئے ہے۔........ جس شخص کا یہ عقیدہ ہو اور ان صفات کے ساتھ ہو' اس کا نظام زندگی اور طرز حیات یقیناً اس شخص سے مختلف ہونا چاہئے جس کی ذہنی دنیا پر غلط اور وہم پرستانہ تصورات کے وہ بادل چھائے ہوئے ہوں جن کا اوپر ہم نے ذکر کیا۔ اس قسم کے غلط تصورات کے حامل شخص کی زندگی پر وہ اثرات مرتب نہیں ہو سکتے۔ جو اس شخص کی زندگی پر ہو سکتے ہیں ایسے خدا کا قائل ہو جو اس کی زندگی میں فعال اور متصرف ہے اور علی کل شئی قدیر ہے۔

یہ صرف توحید خالص کی برکت ہے جس کے نتیجے میں ایک انسان صرف ایک ہی الٰہ کی بندگی کر سکتا ہے۔ ایسے تصور میں کوئی شخص کسی غیر اللہ سے کوئی امداد طلب نہیں کرتا۔ وہ صرف اللہ سے نصرت کا طلبگار ہوتا ہے۔ نہ وہ غیر اللہ سے نظام حیات اور نظام قانون اخذ کرتا ہے' نہ وہ اخلاق و آداب غیر اللہ سے اخذ کرتا ہے۔ نہ وہ اجتماعی اور اقتصادی نظام کے اغیار سے لیتا ہے۔ غرض ایک موحد اپنی زندگی کے کسی بھی شعبے میں غیر اللہ سے کچھ اخذ نہیں کرتا اور نہ ہی حیات بعد الممات کے تصور میں غیر اللہ کو اہمیت دیتا ہے۔ رہے وہ کھوٹے' ٹیڑھے' پیچیدہ' ناپختہ شرکیہ جاہلی عقائد تو ان کے حاملین کا ایک رخ ہوتا ہے نہ ان کو قرار و ثبات حاصل ہوتا ہے' نہ ان میں حدود حلال و حرام ہوتے' نہ ان میں صحیح اور غلط کے اندر کوئی تمیز ہوتی' نہ نظام اور شریعت میں' نہ آداب و اخلاق میں' نہ طرز عمل اور سلوک میں' غرض یہ تمام امور تب طے ہوتے جب کسی شخص کے عقیدے اور نظریئے میں ان کی جہت طے ہوتی ہے' اس کے بعد ایک انسان' اس مصدر' اس جہت کی طرف متوجہ ہو کر اس کی بندگی اور اطاعت کرتا ہے۔

اور جب اسلام نے طے کر دیا کہ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ............................................. ...... تو اس طرح ایک مسلمان اللہ وحدہ کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس طرح اس کے اور دوسرے عقائد والوں کے راستے جدا ہو گئے۔

یہی وجہ ہے کہ اس اعتقادی جدائی کی وجہ سے اسلامی نظام زندگی کا مزاج بالکل علیحدہ ہو گیا۔ اسلامی زندگی' اپنے تمام عناصر ترکیبی کے ساتھ پوری کی پوری اسلامی تصور حیات سے تشکیل پاتی ہے۔ اور اسلامی تصور حیات ایک خالص اور مکمل توحید پر مبنی ہے اور یہ عقیدۂ توحید اس وقت انسانی ضمیر میں مستقلاً قرار نہیں پکڑتا جب تک اس کے کچھ عملی آثار زندگی میں مرتب نہ ہوں' مثلاً زندگی کے ہر شعبے میں عقیدۂ توحید کے ساتھ انسانی نظام شریعت بھی اللہ تعالیٰ سے اخذ کرے اور زندگی کی ہر سرگرمی اور تگ و دو میں ذات خداوندی کی طرف متوجہ ہو۔

توحید خالص کے بیان کے بعد' ایسی جامع توحید کہ اللہ کی ذات میں بھی اس کا کوئی شریک نہ اور اس کی صفات میں بھی کوئی شریک نہ ہو' اب اس منبع اور مصدر کا بیان ہوتا ہے جس سے کہ ایک مسلمان اپنا دین اخذ کرتا ہے۔ جہاں سے کتب سماوی اور رسولوں کی تعلیمات

نازل ہوتی ہیں۔ یعنی جہاں سے ہر دور اور ہر زمانے میں انسانوں نے اپنے لئے نظام زندگی اخذ کیا ہے۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ

"اس نے تم پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری' جو اس کی تصدیق کرتی ہے' جو اس سے پہلے نازل ہوا اور وہ تورات اور انجیل اس نے اس سے پہلے نازل کیں' لوگوں کی ہدایت کیلئے اور کسوٹی اتاری' بے شک وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا۔ ان کیلئے شدید عذاب ہے اور اللہ غالب اور بدلہ لینے والا ہے۔"

اس آیت کے پہلے جملے میں اسلامی تصور حیات کے تمام اساسی حقائق ذکر ہوئے ہیں' اہل کتاب وغیرہ میں سے جو لوگ حضرت محمد ﷺ کی رسالت کے منکر تھے۔ ان کی تردید کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو کچھ نازل ہوا ہے وہ درست ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ہدایت کا نزول صرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے۔ تمام کتب سماوی اس کی جانب سے ہیں' اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور وہ حی اور قیوم ہے' وہی ہے جس نے آپ پر یہ قرآن کریم اتارا اور وہی ہے جس نے اس سے پہلے حضرت موسیٰؑ پر تورات اتاری' وہی ہے جس نے حضرت عیسیٰؑ پر انجیل اتاری' اس لئے اللہ کی الوہیت اور اس کی بندگی میں اس کے ساتھ کسی کا اشتراک و اختلاط نہ ہوگا۔ وہی ایک الٰہ ہے جو اپنے مختار بندوں پر کتابیں نازل کرتا ہے۔ اور وہ بندے اس سے یہ ہدایت اخذ کرتے ہیں۔ اور وہ اخذ کرنیوالے بھی اللہ کے بندے ہی ہوتے ہیں اگرچہ وہ انبیاء ہوں۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ کتب سماوی میں جو راہ ہدایت ہے وہ ایک ہی دین ہے' اس لئے کہ آپ پر یہ کتاب جو سچائی لیکر آئی ہے' وہ ان تمام صداقتوں کی تصدیق کرتی ہے' جو انبیاء سابقہ پر نازل ہوئیں۔ مثلاً تورات اور انجیل میں' اور ان سب کتابوں اور رسالتوں کا ہدف ایک ہی رہا ہے یعنی لوگوں کو راہ راست پر لانا' پھر یہ کتاب جو آپ پر نازل کی گئی ہے۔ اس کی ایک دوسری صفت بھی ہے۔ وہ یہ کہ چونکہ کتب سماوی کے اندر ان کے ماننے والوں نے مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ بہت تحریفات کی ہیں اس لئے یہ فرقان بھی ہے۔ یہ ان کتب سماوی کی اصل ہدایات اور ان منحرفہ ہدایات کے درمیان فرق کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ کیا اصل ہے اور کیا انحراف اور تحریف ہے' جیسا کہ اس کا ایک نمونہ ہم نے آرنلڈ کی کتاب دعوت الی الاسلام کے طویل اقتباس میں دیا تھا۔

اس میں ضمناً یہ فیصلہ بھی کر دیا جاتا ہے کہ اہل کتاب کے لئے اس رسالت جدیدہ کے انکار کرنے کیلئے کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس رسالت کی راہ بھی وہی ہے جن پر سابقہ رسالتیں تھیں۔ یہ کتاب اسی طرح نازل ہوئی جس طرح اس سے قبل کتابیں نازل ہوئیں۔ جس طرح اس سے قبل ایک بشر رسول پر نازل ہوئیں' اسی طرح یہ کتاب بھی ایک بشر پر ہی نازل ہوئی ہے۔ اور یہ کتاب ان تمام کتابوں اور رسولوں کی تصدیق کرتی ہے۔ جس طرح یہ حق پر مشتمل ہے' اسی طرح وہ کتابیں بھی سچائی پر مشتمل تھیں۔ اور اس کتاب کو اسی ذات نے اتارا ہے جس کا حق ہے کہ وہ سچائی اتارے' اس لئے کہ صرف اسی ذات کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ انسانوں کیلئے نظام زندگی تجویز کرے' ان کے فکری تصورات ان کیلئے وضع کرے۔ ان کے لیے شریعت تجویز کرے۔ ان کے لئے اخلاق و آداب کا نظام تجویز کرے اور یہ تمام باتیں اس کتاب منزل میں موجود ہوں۔

اس آیت کے دوسرے حصے میں ان لوگوں کیلئے ایک خوفناک تنبیہہ کا ذکر ہے جو بغیر کسی حجت کے اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اللہ عزیز ہے' وہ بے پناہ قوتوں کا مالک ہے اور اس کی پکڑ شدید ہوتی ہے اور کبھی انتقام بھی لیتا ہے جو بہت خوفناک ہوتا ہے۔ اور وہ لوگ جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں گویا وہ تمام دینوں کا انکار کرتے ہیں جو اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہے' اہل کتاب نے پہلے اس کتاب کا انکار کیا جو ان پر نازل ہوئی ہے اور جس کی انہوں نے تحریف کی ہے۔ وہی اب اس کتاب کا انکار کرتے ہیں۔ اس لئے

کہ انہوں نے خود اپنی کتاب کی بھی تحریف کی تھی۔ اس لئے یہ کتاب جدید ان کیلئے فرقان ہے۔ اس لئے یہاں یہ شدید دھمکی انہی کو دی گئی ہے۔ اور انہی سے کہا گیا ہے کہ تم اللہ کے انتقام سے بچو۔

عذاب الٰہی اور انتقام الٰہی کی دھمکی کے بعد انہیں یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ کی ذات سے کسی کی کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے۔ اس سے نہ کوئی چیز مخفی ہے اور نہ ہی اس سے کوئی چیز بچ سکتی ہے۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ........... "اللہ وہ ذات ہے جس پر زمین و آسمان دونوں کے اندر پائے جانے والی کوئی شئی مخفی نہیں ہے۔" یہ کہ اس پر کوئی بات مخفی نہیں ہے اور ہر وہ چیز کو جانتا ہے اس لئے کہ وہی اللہ ہے' وہی ہے جس نے اس کائنات کو تھاما ہوا ہے۔ اس لئے اس کا علم محیط ہے۔ سورت کے آغاز میں اس کی صفت قیومیت کا ذکر موجود ہے۔ نیز یہاں خصوصاً اس لئے بھی صفت احاطہ علم کا ذکر کیا گیا کہ اس آیت میں ایک خوفناک' ڈراوا بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ اس سے کوئی چیز پوشیدہ رکھی جائے۔ ارض و سماء میں کوئی شئی بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس سے کسی نیت و ارادہ کو بھی پوشیدہ نہیں رکھا جاسکتا۔ کوئی تدبیر بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس طرح اس کے نظام میں یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ کوئی سزا سے بچ نکلے یا اس کے حیطہ علم سے کچھ باہر رہ جائے۔

اللہ کے اس لطیف اور دقیق علم کے سائے' انسانی شعور کو خود اس کی پیدائش کے سلسلہ میں ایک ٹچ دیا جاتا ہے' انسانی شعور کو یہ چٹکی' خود تخلیق انسان کے بارے میں دی جاتی ہے۔ انسان کی تخلیق جو پردۂ غیب میں' رحم مادر کے پس پردہ اندھیروں میں عمل پذیر ہوتی ہے' جس کے بارے میں نہ انسان کا علم رسائی حاصل کر سکا ہے اور نہ ہی اس کا ادراک کرتا ہے۔ اور نہ ہی وہ عمل تخلیق انسان کے دائرہ قدرت میں آسکا ہے۔

هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ

........... "اللہ وہ ذات ہے جو رحم مادر میں تمہاری تصویر بناتا ہے' جس طرح چاہتا ہے' اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے۔"

وہ رحم مادر میں تمہیں ایک شکل و حرارت دیتا ہے' جس طرح اس کی مشیئت ہوتی ہے پھر وہ تمہیں اس شکل و صورت کے ساتھ مناسب خصوصیات بھی عطا کرتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اس لئے اس کے سوا کوئی ذات اس تصویر سازی میں شریک نہیں ہوتی' یہ کام وہ صرف اپنے ارادے اور اپنی مشیئت سے کرتا ہے۔ "جس طرح چاہتا ہے۔" "اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔" "وہ عزیز ہے۔" "وہ اس تخلیق اور تصویر سازی پر پوری قدرت رکھتا ہے۔" "وہ حکیم ہے' یہ تمام تخلیقی عمل بڑی گہری' ٹیکنالوجی پر مبنی ہے۔ اس میں نہ کوئی رکاوٹ آتی ہے' اور نہ اس کام میں اس کے ساتھ کوئی شریک ہے۔"

تخلیق انسان کی طرف یہاں اشارہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ خطاب اہل کتاب سے ہے اور اہل کتاب کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق کے بارے میں نہایت ہی غلط خیالات اور شکوک و شبہات پائے جاتے تھے۔ اللہ ہی ہے جس نے حضرت عیسیٰ کی تصویر کشی کی' جس طرح اس نے چاہا' یہ عقیدہ باطل ہے کہ حضرت عیسیٰ بذات خود رب ہیں۔ یا خدا ہیں' یا خدا کے بیٹے ہیں یا کوئی لاہوتی ناسوتی اقنوم ہیں۔ اس لئے کہ یہ تصورات ناقابل فہم ناقابل ادراک ہونے کے ساتھ ساتھ' عقیدۂ توحید کی صحیح' قابل فہم اور واضح تصور کے بھی خلاف ہیں۔

اس کے بعد قرآن مجید ان لوگوں کی نشاندہی کرتا ہے جس کے دلوں میں ٹیڑھ ہے۔ اور یہ لوگ وہ ہیں جو قرآن کریم کی قطعی الدلالت آیات کو چھوڑ کر ان آیات کے درپے ہوتے ہیں جن کے مفہوم میں تاویل کا احتمال ہوتا ہے تاکہ وہ ایسی آیات کی غلط تاویل کر کے اسلامی نظریات کے اندر شبہات پیدا کریں۔ یہ نشاندہی اس لئے کی جاتی ہے کہ اہل ایمان اور اہل حقائق کی حقیقی صفات بیان کردی جائیں۔ یہ بتایا جائے کہ ان کا ایمان کس قدر خالص ہے۔ اور کس طرح اللہ کے قطعی احکام کو بلاچون وچرا عمل میں لاتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ

وہی ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی' اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں' ایک محکمات جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری متشابہات' جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے' وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا' بخلاف اس کے کہ جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں' وہ کہتے ہیں' ہمارا ان پر ایمان ہے' یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہیں' اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کردے' اور ہمیں اپنی جانب سے رحمت عطا فرما' بے شک تو ہی داتا ہے۔ اے ہمارے رب' تو ایک ناقابل شک دن میں سب لوگوں کو یقیناً جمع کرنے والا ہے' بے شک تو کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔"

ایک روایت میں آتا ہے کہ وفد نجران کے عیسائیوں نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ کیا آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ حضرت عیسیٰ کو کلمتہ اللہ اور روح اللہ سمجھتے ہیں؟ وہ ان الفاظ سے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے عقائد باطلہ ثابت کرنا چاہتے تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ بشر نہیں' وہ روح اللہ ہیں اور روح اللہ کی وہ اپنی تعبیرات کرتے تھے۔ لیکن وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم کی ان آیات کی بات بھی نہ کرتے تھے۔ جو اس موضوع پر محکمات تھیں' جن میں اللہ کی بے قید وحدانیت کا ذکر تھا۔ اور جن میں اس بات کی قطعی تردید کردی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک یا اس کا کوئی لڑکا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان آیات کا نزول فرمایا اور ان کی اس سازش کا انکشاف کیا جس کی وجہ سے وہ ان متشابہ تعبیرات قرآن سے غلط فائدہ اٹھاتے تھے۔ اور قطعی الدلالت آیات سے صرف نظر کرتے تھے۔

لیکن یہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے عام ہے' اس میں قرآن مجید کی آیات کے بارے میں مختلف مکتبہائے فکر کے لوگوں کے مختلف مواقف پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ قرآن مجید ایک کتاب ہدایت ہے۔ اس میں بعض باتیں تو ایسی ہیں جن کا تعلق اصول ایمان اور اسلامی فکر کے بنیادی حقائق سے ہے۔ بعض میں اسلامی نظام حیات کی تفصیلات دی گئی ہیں اور بعض آیات میں ان غیبی امور کا بیان ہے جن کا صحیح تصور ہماری محدود عقل کے دائرہ قدرت سے باہر' جن پر ادراک انسانی اپنے موجود محدود وسائل علم کے ذریعہ قابو نہیں پاسکتا۔ اور ان نصوص میں اکثر وہ باتیں بیان کی گئی ہیں جو انسان کے ادراک سے باہر ہیں۔

قرآن مجید نے پہلے دو امور یعنی عقیدہ اور نظریہ تصورات اور افکار کے بارے میں اور اسلامی نظام حیات اور شریعت کے بارے میں قطعی الدلالت آیات نازل فرمائیں۔ جن کا تصور بھی ممکن ہے اور جن کے مقاصد بھی بالکل واضح ہیں اور یہی دو شعبے ہیں جو قرآن کا اصل موضوع ہیں۔ رہے وہ امور جن کی خبر حضور نے دی یا قرآن نے دی اور ہم نے انہیں سنایا پڑھایا یا وہ غیبی خبریں جو قرآن نے سنائی ہیں جن میں پیدائش مسیح کی خبر بھی ہے تو اس بارے میں ہدایت یہ ہے کہ جس حد تک انہیں سمجھ سکتے ہو تو ضرور راہوار ادراک کو طولانی دو لیکن حد ادراک سے آگے ایمان لاؤ کہ بس یہ خالق حقیقی کی جانب سے ایک حق بات اور ماہیت اور کیفیت کا ادراک فی الحال مشکل ہے' اس لئے کہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے وہ انسان کے موجودہ ذرائع سے وراء ہے۔

اب رہے لوگ' تو وہ ان آیات پر غور' خود اپنی شخصیت کے حوالے سے کرتے ہیں' اگر وہ صحیح الفکر ہیں تو ان کی سوچ صحیح ہے۔ اگر ان کی فکر ٹیڑھی ہے تو انکی سوچ بھی ٹیڑھی ہے۔ اور وہ اپنی اس ٹیڑھی فطرت کی وجہ سے گمراہ ہوگئے ہیں تو یہ لوگ قرآن کریم کی صاف ستھری اور واضح آیات سے صرف نظر کرتے ہیں۔ وہ واضح اصولوں کو ترک کر دیتے ہیں۔ وہ نہایت ہی مفصل ہیں اور جن کے اوپر اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام زندگی قائم ہے۔ اور یہ لوگ ان متشابہات کے درپے ہوتے ہیں جن کی تصدیق کا دارومدار صرف ایمان پر ہے کہ یہ اللہ کی جانب سے نازل کی گئی ہیں۔

اور یہ کہ ان کے صحیح معنی صرف اللہ جل شانہ کے علم میں ہیں۔ جیسا کہ انسانی ذرائع علم نسبتی ہیں اور ان کی قوت مدرکہ کا میدان کار محدود ہے۔ نیز ان کے صحیح فہم کا مدار اس براہ راست الہام اور شعور پر ہے' جو کتاب اللہ کی صداقت کے بارے میں ایک صحیح الفکر آدمی کو حاصل ہوتا ہے کہ یہ پوری کتاب ایک سچی کتاب ہے۔ اور یہ کہ وہ سچائی کے ساتھ اتاری گئی ہے اور کسی پہلو سے بھی باطل نہ اس پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ اور ٹیڑھے دل و دماغ والے ان متشابہات کے پیچھے اس لئے پڑے رہتے ہیں کہ وہ ان آیات میں ایسے مواقع تلاش کر لیتے ہیں جن کے ذریعے وہ فتنے پیدا کرتے ہیں۔ ایسی تاویلات پیدا کرتے ہیں۔ جن سے اسلامی تصور حیات کے اندر شکوک پیدا کئے جاسکیں۔ اور جب ان کے ذریعے وہ فکری انتشار پیدا کرلیں تو پھر وہ فکری ژولیدگی کو ان آیات میں بھی داخل کر دیں جو بالکل قطعی اور واضح ہیں۔ حالانکہ ان متشابہات کی تاویل صرف اللہ جانتا ہے وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ...................... "حالانکہ اس کے اصل معنی صرف اللہ جانتا ہے۔"

رہے وہ لوگ جو علم میں پختہ کار ہیں' وہ لوگ جنہوں نے علم کے بل بوتے پر جان لیا ہے کہ انسانی عقل' انسانی فکر اور یہ عقل و فکر اپنی موجودہ قوت اور موجود ذرائع عقل و فکر کی مدد سے وہ ان متشابہات کے مفاہیم نہیں پا سکتے۔ اس لئے وہ پوری شرح صدر اور اطمینان سے کہتے ہیں آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا ...................... "ہم ان پر ایمان لائے' سب ہمارے رب کی طرف سے ہیں" ان کا یہ ایمان انہیں اس نتیجے تک پہنچاتا ہے' بڑے وثوق سے کہ یہ آیات اللہ کی جانب سے ہیں' اس لئے یہ حق ہیں اور سچائی پر مبنی ہیں۔ اور جس چیز کا فیصلہ اللہ کردے وہ بذات خود سچی ہوتی ہے اور انسانی عقل کے نہ یہ بات فرائض میں شامل ہے۔ اور نہ ہی اس کے دائرہ قدرت میں ہے کہ وہ ان آیات کے اسباب و علل کا کھوج لگائے ...... اس کے مفاہیم کی ماہیت معلوم کرے اور ان کے اندر پوشیدہ اسباب و علل کا کھوج لائے وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ ...................... کے سامنے جب آیات پیش ہوتی ہیں تو وہ ان کی صداقت کو قبول کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی صداقت شعار فطرت اور فہم رسا کی وجہ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ان کی عقل ان میں شک ہی نہیں کرتی۔ اس لئے کہ انہوں نے یہ بات پالی ہوتی ہے کہ علم اور خردمندی یہ ہے کہ جس حقیقت کا ادراک بذریعہ علم و عقل نہ ہو سکے اس میں دلچسپی نہ لی جائے۔ خصوصاً جو امور انسان کے ذرائع علم کے حدود سے باہر ہوں۔

وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ .............. کی یہ ایک بہترین تصویر ہے' اس تصویر اور تعریف کا انکار وہی شخص کر سکتا ہے جو سطحی ہو۔ جو اپنے سطحی علم کی وجہ سے اس غرے میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے سب کچھ حاصل کر لیا ہے۔ اور جو چیز ان کے علم میں نہیں ہے گویا اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ وہ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ سب کچھ پا گئے۔ اس لئے تمام حقائق کی صورت وہی ہے جو ان کے ذہن میں آتی ہو' اس سے وہ اللہ تعالیٰ کے مطلق اور بے قید کلام کا قیاس اپنی عقلیت کے پیمانوں اور فیصلوں کے مطابق کرتے ہیں' حالانکہ یہ پیمانے ان کی محدود عقل نے تراشے ہیں' ہاں ان کے مقابلے میں حقیقت پسند علماء کا شعار انکسار ہوتا ہے اور وہ اس طرف مائل ہوتے ہیں کہ لامحدود حقائق محدود عقل میں نہیں سماتے' اس لئے ہزارہا حقائق عقل بشری کے دائرے سے باہر ہیں۔ چونکہ وہ فطرتاً یقین کرنیوالے ہوتے ہیں' اس لئے ان کی یہی فطرت سچائی تک جلدی پہنچ جاتی ہے اور تصدیق کر لیتی ہے اور مطمئن ہو جاتی ہے۔ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُولُوا الْأَلْبَابِ ............ "اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاحب دانش اور سچائی کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا' ان کی فطرت سلیمہ کے اندر یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ حق کو پالیں' اس لئے کہ فطرت سلیمہ کا تعلق براہ راست اللہ سے ہوتا ہے۔

جب ایک انسان دانشمندی کے اس مقام بلند تک آپہنچتا ہے تو ان کا اجر اللہ کی طرف سے ہوتا ہے وہ خشوع و خضوع اور گڑگڑا کر دست بدعا ہو جاتے ہیں کہ اللہ۔ انہیں حق پر قائم رکھ کر ہدایت کے بعد گمراہ نہ کر' ان پر اپنی رحمت اور اپنے فضل کی بارش کر دے۔ خوف آخرت ان کے دامن گیر ہو جاتا ہے' جہاں انہیں لازماً جانا ہے' جس سے کوئی مفر نہیں۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ
رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ

"وہ دعا کرتے ہیں کہ پروردگار! جب تو سیدھے راستہ پر لگا چکا ہے' تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دیجئو! ہمیں اپنے خزانہ فیض سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاض حقیقی ہے' پروردگار! تو یقیناً سب لوگوں کو ایک روز جمع کرنے والا ہے۔ جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں تو ہرگز اپنے وعدہ سے ٹلنے والا نہیں ہے۔"

جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں ان کا اپنے رب کے ساتھ یہ تعلق ہے' اور یہ ایسا تعلق ہے جو ایک صحیح مومن کا ہونا چاہئے' جو اللہ کے کلام اور اللہ کے عہد پر پورا بھروسہ ہونے کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے فضل و رحمت کے صحیح شعور کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے' خصوصاً اس وقت جب ایک مومن اللہ کی قضا و قدر پر پختہ یقین بھی رکھتا ہو اور خدا کا خوف بھی اس کے دل میں موجزن ہو۔ اور ایک مومن نہ غافل ہوتا ہے' نہ مغرور ہوتا ہے' نہ اپنے روز و شب میں کبھی اپنے فرائض بھولتا ہے۔

قلب مومن کی ضلالت اور گمراہی کے بعد دولت ایمان ملنے کی بڑی قدردانی ہوتی ہے۔ اور کسی دھندلے تصور کے بعد اپنی آنکھوں سے حقیقت کو دیکھ لینے کی اس کے دل میں بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اور حیرانی و پریشانی کے بعد راہ راست پانے سے اسے شعور ہوتا ہے۔ خلجان اور بے یقینی کے بعد اطمینان یقین پانے پر وہ بہت ہی خوش ہوتا ہے' وہ دنیا کی تمام غلامیوں سے آزاد ہو کر ایک اللہ کی غلامی میں داخل ہو کر پرمسرت ہوتا ہے۔ وہ لہو و لعب کی زندگی سے نکل کر اقدار عالیہ کے میدان میں داخل ہوا ہوتا ہے۔ جس سے وہ خودشناسی حاصل کئے ہوئے ہوتا ہے اور اسے یہ شعور ہوتا ہے کہ دولت ایمان دیکر اللہ تعالیٰ نے اسے بہت کچھ دیدیا ہے........ اس لئے وہ دوبارہ گمراہی کی راہ سے بہت ہی ڈرتا ہے' چونکہ وہ راہ راست پر آچکا ہوتا ہے اس لئے دوبارہ گمرہی کے نشیب و فراز اور تاریک راہوں میں پھنس

جانے سے بہت خوف کھاتا ہے' وہ یوں ڈرتا ہے جس طرح وہ شخص جو ایک خوش گوار موسم میں گھنی چھاؤں میں بیٹھا ہو تو جھلسا دینے والی گرمی اور بے آب وگیارہ صحرا کے تصور سے بھی ڈر رہا ہو' حقیقت یہ ہے ایمان کی قدر اور ذوق یقین وہی شخص پاسکتا ہے جس نے بدبختی کے کڑے دن اور الحاد و زندقہ کی ذہنی خشکی کے دن دیکھے ہوں۔ ایسا ہی شخص اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے۔ بے دینی گمراہی اور فسق و فجور کی زندگی کے مقابلے میں ایمانی زندگی کے اندر کس قدر مٹھاس ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایسے مقامات پر ایک مومن ایسے خشوع و خضوع کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا ............... "اے ہمارے رب! راہ ہدایت دکھانے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر دیجیو۔" یہ پکارتے ہیں کہ انہیں گمراہی کے بعد ایک عظیم رحمت مل گئی ہے۔ کہیں وہ لٹ نہ جائے' یہ ایک ایسا انعام ہے جس سے بڑا کوئی انعام نہیں ہے۔

وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ............... "ہمیں اپنے خزانہ غیب سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاض حقیقی ہے۔" یعنی یہ لوگ اپنے شعور ایمان کے ذریعہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے فضل و رحمت کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ خود ان کے دل بھی ان کے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ اس لئے وہ اپنی ہدایت اور نجات اخروی کیلئے بھی اللہ کے سامنے دست بدعا ہوتے ہیں۔

حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ اکثر اوقات یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔ "اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر جمادے۔" میں نے عرض کیا کہ حضور ؐ آپ یہ دعا' بہت زیادہ کرتے ہیں؟ تو آپ ؐ نے فرمایا: "تمام دل اللہ رحمان کی دو انگلیوں کی گرفت میں ہیں' جب وہ دلوں کو سیدھا کرنا چاہے تو سیدھا کر دیتا ہے۔ اور جب وہ ٹیڑھا کرنا چاہے تو وہ ٹیڑھا کر دیتا ہے۔" اور جب ایک مومن کو صحیح طرح اس بات کا شعور حاصل ہوتا ہے تو وہ نہایت گرم جوشی کے ساتھ آستانہ درگاہ الٰہی کے ساتھ چمٹ جاتا ہے' اور گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ کی معاونت اور توفیق کا طلبگار ہو جاتا ہے اور اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کی رحمت اور اس کے فضل و کرم کا طلبگار ہوتا ہے تاکہ وہ خزانہ محفوظ رہے' جو اس نے اس مومن کو عطا کیا ہے اور وہ کرم باقی رہے جس سے اسے نوازا گیا ہے۔

اس کے بعد روئے سخن اہل کفر کی طرف مڑ جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ ان کے بارے میں وہ سنت الٰہی کیا ہے۔ جس میں کوئی تبدیلی کبھی واقعہ نہیں ہوتی۔ معنی یہ کہ ان کے گناہوں پر ان سے ضرور مواخذہ ہو گا۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ' اس دین کا انکار کرتے ہیں اور اس کی راہ روکے کھڑے ہیں انہیں یہ دھمکی دی جاتی ہے کہ وہ باز آجائیں' حضور ؐ کے واسطہ سے انہیں متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ کفار مکہ کے انجام بد سے عبرت حاصل کریں' جو ان کی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوا' جس میں ایک قلت قلیلہ کے مقابلے میں ان کے بھاری لشکر کو شکست ہوئی۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ﴿١٠﴾ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ شَدِيدُ

الْعِقَابِ ﴿۱۱﴾ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ
الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِىْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِىْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَ اُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ الْعَيْنِ ؕ وَ اللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ
مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِى الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾

"جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے' انہیں اللہ کے مقابلے میں نہ ان کا مال کچھ کام دے گا' نہ اولاد' وہ دوزخ کا ایندھن بن کر رہیں گے۔ ان کا انجام ویسا ہی ہوگا جیسا فرعون کے ساتھیوں اور ان سے پہلے کے نافرمانوں کا ہو چکا ہے کہ انہوں نے آیات الٰہی کو جھٹلایا' نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا اور حق یہ ہے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ پس اے محمدؐ! جن لوگوں نے تمہاری دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ قریب ہے وہ وقت' جب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم بڑا ہی ٹھکانا ہے۔ تمہارے لئے ان دو گروہوں میں نشان عبرت تھا' جو ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ دیکھنے والے بچشم سر دیکھ رہے تھے کہ وہ ان سے دو چند ہیں اور اللہ فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے مدد دیتا ہے۔ دیدۂ بینا رکھنے والوں کیلئے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے۔"

یہ آیات بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے کہی گئی ہیں۔ ان میں یہ دھمکی دی گئی ہے کہ وہ اہل کفر کے انجام پر غور کر لیں۔ پہلے جو ہو چکا ہے اور آئندہ جو ہونے والا ہے۔ اس میں ایک لطیف اور عمیق اشارہ ہے اس جانب کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کو ہلاک کیا اور بنی اسرائیل کو نجات دی لیکن یہ ہلاکت اس لئے نہ تھی کہ فرعون فرعون تھا بلکہ اس لئے کہ وہ کافر تھا۔ اور نجات بنی اسرائیل بھی اس لئے نہ تھی کہ وہ قوم بنی اسرائیل سے نسبی رشتہ رکھتے تھے۔ بلکہ اس لئے تھی کہ وہ اہل ایمان تھے۔ اس لئے اب اگر وہ کفر اور گمراہی کا رویہ اختیار کریں گے تو وہ نجات کے مستحق نہ ہوں گے۔ اگر وہ گمراہ ہو گئے تو وہ اہل کفر کہلانے سے نہ بچ سکیں گے۔ اسی طرح وہ دنیا و آخرت میں اہل کفر کے انجام بد سے لازماً دوچار ہوں گے جیسا کہ بوجہ کفر آل فرعون کا یہ انجام ہوا۔

اسی طرح انہیں بدر کے میدان میں اہل قریش کے مقتل کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ اس صورت حال سے وہ محض اس لئے دوچار ہوئے کہ وہ کفار تھے۔ اگر وہ بھی کفر پر قائم رہے تو پھر سنت الٰہی یہی ہے کہ وہ لازماً اسی انجام سے دوچار ہوں گے جن سے اہل قریش دوچار ہوئے۔ اس لئے کہ اس انجام کا اصل سبب کفر تھا۔ اللہ کے ہاں کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں ہے' نہ وہاں سفارش چلتی ہے' صرف ایمان صحیح ہی وہاں شفیع ہو سکتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِىَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ
وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ

"جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا' انہیں اللہ کے مقابلے میں نہ ان کا مال کچھ کام دے گا اور نہ اولاد' وہ دوزخ کا ایندھن بن

کر رہیں گے۔"

دنیا میں مال اور اولاد بچاؤ کا سہارا ہوتے ہیں لیکن یہ دونوں چیزیں' اس دن کام نہ دیں گی جس کے آنے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس دن کے آنے کا وعدہ اللہ نے کیا ہے اور اللہ کے وعدے میں کبھی تخلف نہیں ہوتا۔ اللہ کا وعدہ کبھی ٹلتا نہیں' اہل کفر وہاں جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ یہاں انداز تعبیر ایسا اختیار کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اہل جہنم سے انسانی خصوصیات سلب ہو جائیں گی اور وہ جہنم میں خس و خاشاک کی طرح سوختنی اشیاء ہوں گے۔ اور اس وقت نہ مال اور نہ دولت' نہ جاہ اور نہ سلطنت ان کے کچھ کام آئے گی۔

كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ

"ان کا انجام ایسا ہی ہو گا جیسا کہ فرعون کے ساتھیوں کا اور اس کے پہلے کے نافرمانوں کا ہو چکا ہے۔ کہ انہوں نے آیات الٰہی کو جھٹلایا تو اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا' اور حق یہ ہے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔"

یہ ایک ایسی مثال ہے جو تاریخ میں بار بار دہرائی گئی ہے۔ اور اس کے کئی قصے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں بڑی تفصیلات کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اللہ کی آیات کے جھٹلانے والوں کے بارے میں اللہ کی سنت ان قصوں میں پائی جاتی ہے۔ جہاں اللہ چاہے' اپنی اس سنت کو کام میں لاتا ہے۔ اس لئے اللہ کی آیات کو جھٹلانے والوں کو اس جہاں میں کوئی گارنٹی حاصل نہیں' نہ وہ محفوظ ہیں۔ اس لئے اب جو لوگ رسالت محمدیہ کا انکار کر رہے ہیں اور قرآن کریم کی تکذیب کر رہے ہیں جو آپ پر نازل ہوا ہے۔ ان کے لئے اس انجام سے دوچار ہونا یقینی ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی' اس لئے یہاں رسول اکرم ؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ان کفار اہل کتاب کو اس انجام بد سے خبردار کریں۔ اگر وہ فرعون اور تاریخ اسلامی کے دوسرے نافرمانوں کے انجام بد کو بھول چکے ہیں تو خدارا اہل مکہ کے اس انجام بد پر غور کریں جس کا مظاہرہ ابھی ان کی آنکھوں کے سامنے ہو چکا ہے۔ یہ سب کچھ تکذیب آیات ہی کا شاخسانہ تو ہے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ

"جن لوگوں نے تمہاری دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا' ان سے کہہ دو کہ قریب ہے وہ وقت' جب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے' تمہارے لئے ان دو گروہوں میں ایک نشان عبرت تھا' جو ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے' ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا کافر تھا' دیکھنے والے بچشم سر دیکھ رہے تھے کہ وہ ان سے دوچند ہے۔"

اس آیت

يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ ......................... کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں '

یرون کی ضمیر اگر کفار کی طرف ہے اور ھم سے مراد اہل ایمان ہیں تو مفہوم ہو گا کہ اہل کفر کو اپنی ظاہری کثرت کے باوجود نظریوں آرہا تھا کہ اہل اسلام ان سے دوگناہ ہیں۔ اور یوں یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تائید غیبی تھی کہ کفار کو اہل اسلام زیادہ اور وہ خود تھوڑے نظر آرہے تھے۔ یوں ان کے قدم اکھڑ گئے اور ان کے دل بیٹھ گئے۔

اور اگر اس کے برعکس لیا جائے یعنی یرون سے مراد ہو کہ مسلمان ھم ان کو دیکھ رہے تھے۔ تو مفہوم یہ ہو گا کہ مسلمانوں کو وہ اپنے سے دوگناہ نظر آرہے تھے' وہ تین گناہ تھے۔ اس کے باوجود اہل اسلام ثابت قدم رہے' اور فتح یاب ہوئے۔ اصل بات یہ ہے کہ تائید و نصرت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے دکھانا یہ مطلوب ہے کہ اہل کفر اپنے انجام پر غور کریں۔ اور اہل اسلام دلوں کو مضبوط کرلیں اور یقین کرلیں کہ ان کے اعداء کی تقدیر میں شکست لکھی جاچکی ہے۔ اس لئے وہ ان اعداء سے خوف نہ کھائیں۔ جیسا کہ ہم نے اس سورت پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اس وقت جو صورت حال تھی' اس میں اہل کتاب کو اس قسم کی تنبیہہ اور تخویف کی ضرورت تھی۔

قرآن کریم مسلسل اپنی عظیم حقیقت پر کاربند ہے اور اس عظیم سچائی میں سے ایک بات یہ ہے کہ اس دنیا میں جو لوگ کفر کرتے ہیں' آیات کو جھٹلاتے ہیں اور اسلامی نظام زندگی سے انحراف کرتے ہیں ان کی شکست کا وعدہ اب بھی اپنی جگہ قائم ہے اور قائم رہے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا' اہل ایمان کے ساتھ یہ وعدہ بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ وہ فتح یاب ہوں گے اگرچہ وہ تعداد میں قلیل ہوں' اور نصرت اور فتح صرف تائید ایزدی پر موقوف ہے اور یہ صرف اس کا اختیار ہے' جسے چاہے وہ فتح و نصرت سے نوازے۔ حقیقت اپنی جگہ اب بھی قائم ہے۔ منسوخ نہیں ہوئی۔

اہل ایمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس حقیقت پر اچھی طرح مطمئن ہو جائیں۔ اور اس پر پوری طرح اعتماد کریں۔ اور میدان جہاد میں اپنی تیاری مکمل طور پر کریں' جس قدر ممکن ہو' اور اس تیاری کے بعد پھر تائید خداوندی کا انتظار کریں۔ وہ نہ جلد بازی کریں' نہ مایوس ہوں' اگرچہ انہیں طویل انتظار ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ کیونکہ اللہ حکیم ہے وہ اپنی تدابیر خود اپنے وقت پر کرتا ہے' اور اس حکمت کے مطابق ہی اس کا وعدہ اپنے وقت پر پورا ہوتا ہے۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ......................... "دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لئے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے۔ اس لئے ضروری ہے دیکھنے والی آنکھ ہو' تدبر کرنے والی بصیرت ہو' تب ہی ایک انسان عبرت حاصل کر سکتا ہے اور تب ہی قلب میں فہم پیدا ہوتا ہے۔ اگر بصیرت نہ ہو تو سامان عبرت شب و روز آنکھوں کے سامنے سے گزرتا ہے مگر آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔"

☆......☆......☆......☆......☆

اگلی آیت میں' جماعت مسلم کی تربیت کے سلسلے میں' اسے ان فطری میلانات اور فطری اسباب کے بارے میں آگاہ کیا جاتا ہے' جن کی وجہ سے انسان کی زندگی میں گمراہی اور انحراف کا آغاز ہوتا ہے' اس لئے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ان فطری میلانات کو ہر وقت ضبط و کنٹرول میں رکھا جائے۔ اور ہر وقت زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو پیش نظر رکھا جائے اور اصل مطمع نظر وہ اکرام و انعام ہو جائے جو کسی انسان کو یوم آخرت میں مل سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خواہشات دنیاوی میں گم ہو جانے' مرغوبات نفس کے درپے ہو جانے اور دوسرے فطری میلانات کا بندہ بن جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے' کہ انسان کے دل بصیرت اور اس کی عقل سے عبرت آموزی ختم ہو جاتی ہے۔ اور انسان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

وہ حسی لذتوں اور دنیاوی مرغوبات کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ اور بلند مقاصد نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ انسان کے احساسات مادی ہو جاتے ہیں وہ دنیائے قریب کی ان لذتوں کے دائرے سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور وہ ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کی لذت سے محروم ہو جاتا ہے جس کا تعلق انسان کے خلیفتہ اللہ فی الارض ہونے کے منصب سے ہے۔ اور جو اس دنیا کی اس مخلوق کے شایان شان ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ اس وسیع مملکت دنیا میں۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ یہ فطری میلانات اور دنیاوی مرغوبات چونکہ اللہ کی جانب سے' انسان کے تکوینی فرائض ہیں اور یہ رجحانات و میلانات' اس دنیا میں حیات انسانی کی نشوونما اور ترقی کیلئے اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ایک قسم کا فطری فریضہ ہیں' اس لئے اسلام نے ان فطری میلانات کو ختم کرنے یا انکی بیخ کنی کا کوئی اشارہ نہیں دیتا۔ ہاں اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ ان میلانات کو ضابطے کا پابند بنایا جائے۔ ان کو منظم کیا جائے' ان کی تیزی کو کم کیا جائے ان کو اس طرح کنٹرول کیا جائے کہ ان پر انسان کو پورا پورا ضبط حاصل ہو' انسان ان کا مالک اور متصرف ہو' اور انسان ان سے آگے مقاصد عالیہ پر بھی نظر جمائے ہوئے ہو اور اپنے آپ کو ان کی غلامی سے بلند سمجھتا ہو۔

اس لئے قرآن کریم کی آنیوالی آیات ان مرغوبات اور ان میلانات کے بارے میں بحث کرتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس آیت میں ان اخروی لذائذ' مرغوبات جن کا تعلق کام و دہن سے ہے اور ان کا ذکر کرتے ہیں جن کا تعلق عقل و خرد سے ہوتا۔ اور یہ اخروی لذات ان لوگوں کا نصیبہ ہو گا جنھوں نے اس جہاں میں اپنے نفوس کے اوپر کنٹرول کیا۔ اور وہ اس جہاں میں عیش و عشرت اور لذات میں غرق نہ ہوئے اور انہوں نے یہاں اپنے آپ کو مقام انسانیت پر بلند رکھا۔

اس ایک ہی آیت میں قرآن کریم نے دوران کلام' اس دنیا کی تمام اہم مرغوبات کو ایک ساتھ جمع کر دیا۔ مثلاً عورتیں' اولاد' مال و دولت' گھوڑے اور سواری' سرسبز و شاداب اراضی اور اس میں قسم قسم کے مویشی' اس دنیا میں جس قدر مرغوبات ممکن ہیں وہ سب اس آیت میں جمع کر دی گئی ہیں۔ یا تو بذات خود یہ اشیاء مرغوبات میں شامل ہیں' یا وہ انسان کے لئے فراہمی مرغوبات کا ذریعہ ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی دوسری آیت میں ان مرغوبات اور لذائذ کا ذکر ہے' جو اللہ نے اہل ایمان کیلئے' اس جہاں میں تیار کی ہیں۔ ایسے باغات اور لذائذ کا ذکر ہے' جو اللہ نے اہل ایمان کیلئے' اس جہاں میں تیار کی ہیں۔ ایسے باغات جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی' پاکیزہ بیویاں' اور ان سب انعامات سے بڑا انعام یعنی ذات باری کی رضامندی اور خوشنودی۔ اور یہ انعام صرف ان لوگوں کیلئے ہیں جن کی نظریں ان دنیاوی لذائذ سے اونچی ہیں' جن کا تعلق اللہ سے قائم ہے' ذرا ان آیات پر غور فرمائیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ
وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ
وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ
الْمَاٰبِ ۝۱۴ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ

مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

"لوگوں کیلئے مرغوبات نفس 'عورتیں' اولاد' سونے چاندی کے ڈھیر' چیدہ گھوڑے' مویشی اور زرعی زمینیں' بڑی خوش آیند بنادی گئی ہیں۔ مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے' وہ اللہ کے پاس ہے۔ کہو: میں تمہیں بتاؤں کہ اس سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں' ان کیلئے ان کے رب کے پاس باغ ہیں۔ جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی' وہاں انہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی' پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے' اللہ اپنے بندوں کے رویے پر گہری نظر رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں "مالک! ہم ایمان لائے ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں آتش دوزخ سے بچا۔" یہ لوگ صبر کرنیوالے ہیں۔ راست باز ہیں۔ فرمانبردار اور فیاض ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔"

زُيِّنَ لِلنَّاسِ ............ میں فعل مجہول کا صیغہ استعمال کرکے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان چیزوں کی طرف لوگوں کا میلان بتقاضائے فطرت ہے۔ ان چیزوں کو محبوب بنادیا گیا ہے اور ان کی تزئین کرکے ان کی محبوبیت میں اضافہ کردیا گیا ہے۔ گویا یہ حقیقت واقعہ کے ایک پہلو کی تصدیق ہے۔ اس لئے کہ انسان کی شخصیت میں ان چیزوں کی طرف میلان اور رغبت رکھی گئی ہے۔ یہ اس کے اصل وجود اور اس کی ذات کا حصہ ہے۔ اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان خواہ مخواہ اس حقیقت کا انکار کرے۔ نہ خود انسان اپنی ذات میں ان میلانات اور رجحانات کو قابل اعتراض سمجھے۔ اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی کی ترقی اور نشوونما کیلئے ان میلانات کا موجود ہونا ازبس ضروری ہے جیسا کہ اس موضوع پر اس سے پہلے ہم مفصل بحث کر آئے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت واقعہ ہے کہ انسان کی فطرت کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے' جو ان میلانات اور فطری رجحانات میں توازن پیدا کرتا ہے اور وہ ایک قسم کا چوکیدار' جو انسان کو ان میلانات میں مستغرق ہونے سے بچاتا ہے۔ اور یہ پہلو انسان کے عالم بالا کے ساتھ روحانی تعلق کو قائم رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کی زندگی میں روحانی معنویت اور روحانی ہدایت پائی جاتی ہے۔ اور یہ پہلو انسانی کی روحانی زندگی کا پہلو ہے جو اس کے اندر بلندی کی استعداد پیدا کرتا ہے۔ اس کے اندر ضبط نفس کی قوت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں انسان ان' دنیاوی مرغوبات کے استعمال میں ایک حد اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ ایسی حدود کے اندر جس میں نفس کی تعمیر ہو۔ زندگی کا نشوونما ہو اور اس کے ساتھ ساتھ یہ جدوجہد بھی جاری رہے کہ انسانی زندگی کو حیوانیت کے نچلے مقام سے بلند کرکے عالم بالا کے روحانی افق تک پہنچایا جائے۔ انسان کے دل کا تعلق عالم بالا سے قائم ہو اور اس کا ہدف دار آخرت اور اللہ کی رضامندی ہو۔ نفس انسانی کی یہ دوسری جبلت' اس کی پہلی فطری جبلت کو مہذب بناتی ہے۔ اور اس کو تمام حیوانی آمیزشوں سے پاک کرتی ہے۔ اور اسے ایسے حدود وقیود کے اندر بند کردیتی ہے جس کے نتیجے میں فطری میلانات سرکش نہیں ہوتے اور انسان صرف دنیاوی لذات کا گرویدہ نہیں ہوجاتا۔ اس طرح کہ اس کی انسانی' روحانی قدریں دب جائیں۔ تقویٰ خدا خوفی اور زندگی کی اونچی اقدار کی راہیں بالکل مسدود ہوجائیں۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ "لوگوں کیلئے مرغوبات نفس کو مزین بنادیا گیا ہے۔" بس یہ مرغوبات مستحب ہیں اور لذیذ ہیں' یہ مکروہ اور غلیظ نہیں ہیں۔ انداز تعبیر ایسا ہے کہ جس سے ان مرغوبات کی غلاظت اور کراہت کا اظہار نہیں ہوتا۔ آیت صرف ان چیزوں کے مزاج اور ان کی حقیقت سمجھانا چاہتی ہے۔ اور ان کے اثرات کا اظہار مقصود ہے۔ نیز یہاں مطلوب یہ ہے کہ ان اشیاء کی قدر و قیمت اور ان کے مقام کا تعین کر دیا جائے' تاکہ وہ اس مقام سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ نہ وہ ان اقدار پر دست درازی کر سکیں جو ان کے مقابلے میں اعلیٰ و ارفع ہیں۔ انسان صرف ان دنیاوی شہوات میں غرق ہو کر نہ رہ جائے بلکہ اس کی نظریں دار آخرت پر مسلسل لگی ہوں' اگرچہ وہ بقدر ضرورت ان لذات سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔

یہاں آکر معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام فطرت انسانی کو ایک حقیقت واقعیہ کے طور پر لیتا ہے اور فطری میلانات کا مناسب لحاظ رکھتا ہے۔ اور وہ ان میلانات کو مہذب اور شائستہ بناتا ہے۔ اور ان کو رفعت دیتا ہے۔ وہ کسی صورت میں بھی ان میلانات کی بیخ کنی نہیں کرتا' جو لوگ آج کل علم النفس کے مضمون میں میلانات کی بیخ کنی کے نقصانات بیان کرتے ہیں یا وہ نفسیاتی الجھنوں پر بحث کرتے ہیں جو جذبات کی بیخ کنی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ نفسیاتی الجھن جذبات کی بیخ کنی سے پیدا ہوتی ہے' وہ جذبات کے ضبط اور تہذیب سے پیدا نہیں ہوتی اور بیخ کنی کا مفہوم یہ ہے تقاضائے فطرت کو گندگی سمجھا جائے اور اس کے ارتکاب کو برا سمجھا جائے۔ ایسا کرنے کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ایک فرد مختلف سمتوں سے مختلف قسم کے دو میلانات کے دباؤ میں آجاتا ہے۔ ایک طرف اس کے شعور اور ضمیر کا دباؤ ہوتا جس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان ان فطری خواہشات کے پورا کرنے سے اجتناب کرے۔ اور یہ شعور اور میلان اس کے نظریہ حیات' اس کے مذہب یا اس کے رسم و رواج کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً یوں کہ اس کا نظریہ یہ ہو کر فطری میلانات تمام کے تمام گندے ہیں۔ ان کا وجود ہی نہیں ہونا چاہئے' اور در حقیقت وہ شیطانی میلانات ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ کوئی نظریاتی یا کوئی مذہبی شعور کبھی بھی ان فطری رجحانات کے دبانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس لئے کہ یہ میلانات فطری ہوتے ہیں اور فطرت کے اندر اس کی گہری جڑیں ہوتی ہیں۔ نیز ان کا تعلق بسا اوقات وظیفہ بقائے انسانیت سے ہوتا ہے۔ ان کے بغیر بقائے انسانیت کا فرض ادا ہی نہیں کیا جاسکتا۔ انسانی فطرت میں' اللہ تعالیٰ نے یہ میلانات یونہی عبث طور پر نہیں ودیعت کئے۔ اس کشمکش کے نتیجے میں نفسیاتی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہم ان نفسیاتی مباحث کو تسلیم بھی کرلیں تب بھی یہ بات نظر آئے گی کہ اسلام نے بہت پہلے فطرت انسانی کے ان دونوں رجحانات و میلانات کے اندر توازن پیدا کیا ہے۔ اس نے شہوت اور لذت اور اخلاقی بلندی اور پاکیزگی کے درمیان ایک حسین توازن پیدا کر کے دونوں کو اپنے اپنے مقام پر حدود و اعتدال کے اندر کام کرنے کی اجازت دی ہے۔ا۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ؕ

"لوگوں کیلئے مرغوبات نفس' عورتیں' اولاد' سونے اور چاندی کے ڈھیر' چیدہ گھوڑے' مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوشنما بنادی گئی ہیں۔"

عورتیں اور بچے انسانی خواہشات میں سے بہت ہی قوی اور شدید خواہشات ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ سونے اور چاندی کے ڈھیروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کو وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ ............ سے بیان کیا گیا ہے۔ اور اگر

ا۔ دیکھئے محمد قطب کی کتاب الانسان بین المادیہ والاسلام۔

صرف مال و دولت کی مذمت مطلوب ہوتی تو مِنَ الْاَمْوَالِ.......... کا لفظ ہوتا ہے مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ.......... ہوتا لیکن قناطیر مقنطرۃ یعنی مال و دولت اور سونے چاندی کے ڈھیر کے الفاظ ایک خاص شیڈ دیتے ہیں۔ اور یہ سونے اور چاندی کے زیادہ سے زیادہ ذخار کا مطلب یہ ہے ایک کہ دولت کا جمع کرنا بذات خود ایک مرغوب چیز ہے۔ رہے اس کے فوائد تو وہ سب کو معلوم ہیں یعنی یہ ڈھیر ایک انسان کیلئے ہر قسم کے شہوات کی فراہمی کا سبب بنتے ہیں۔ عورتوں' اولاد اور ڈھیر سے سونے چاندی کے ساتھ ساتھ یہاں وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ.......... کا ذکر کیا گیا یعنی چیدہ گھوڑے۔ گھوڑے' جس طرح آج کے اس مادی اور صنعتی دور میں بھی محبوب سواری تصور ہوتے ہیں۔ اس دور میں نہایت ہی محبوب اور مرغوب ہوتے تھے۔ اور یہ اس لئے کہ ان میں حسن و جمال بھی ہوتا ہے۔ وہ پر شوکت اور سریع الحرکت ہوتے ہیں۔ ان میں ذہانت اور اپنے مالک کے ساتھ بے حد محبت بھی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے عملاً گھوڑ سواری نہیں کی ہوتی انہیں بھی اسے دیکھ کر خوب مزہ آتا ہے۔ جب تک ان میں اس قدر زندگی موجود ہو کہ وہ ایک مضبوط اور جوان گھوڑے کو دیکھ کر خوش ہوتے ہوں۔

اس کے بعد ان مرغوبات کے ساتھ ساتھ دو سرے مویشیوں اور زرعی اراضی کا ذکر کیا' مویشی اور زرعی اراضی کے درمیان چولی دامن کا تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا ایک ساتھ ذکر ہوا۔ ذہن میں بھی وہ ساتھ ہوتے ہیں اور حقیقت واقعہ میں بھی۔ مویشی اور کھیت اور تروتازہ کھیت' جہاں نشوونما کا کام جاری رہتا ہے۔ انسان کے پسندیدہ ترین مرغوبات ہیں۔ اس لئے کہ ان کھیتوں میں سے زندگی پھوٹ کر نکلتی ہے۔ اور یہ ایک عجیب نظارہ ہوتا ہے۔ بہت ہی پسندیدہ اور جب اس منظر کے ساتھ یہ شعور بھی وابستہ ہو جاتے کہ اس کھیت اور اس میں چلتی جوڑی کا میں مالک بھی ہوں تو واقعی یہ ایک فطرتاً پسندیدہ منظر ہوتا ہے۔

یہاں جن مرغوبات کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ مرغوبات نفس کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔ ان میں سے بعض ایسی مرغوبات ہیں جو اس سوسائٹی میں اعلیٰ ترین مرغوبات تھیں جس سے قرآن کریم اس دور میں خطاب کر رہا تھا اور بعض مرغوبات ایسی ہیں جو ہر زمانے میں نفس انسانی کیلئے مرغوب ہیں۔ اسلام ان مرغوبات کا ذکر کرتا ہے' ہر ایک کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ تاکہ یہ مرغوبات اپنی جگہ پر قائم رہیں اور زندگی کی دو سری قدروں پر دست درازی نہ کریں۔

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ.......... "یہ دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔" یہ تمام مرغوبات جو پیش کی گئیں یا ان کے علاوہ جو دوسری فطرتاً پسندیدہ چیزیں ہیں' یہ دنیا کی چند روزہ حیات کیلئے سازو سامان ہیں' جو اعلیٰ و ارفع اور دائمی زندگی کا سامان نہیں ہیں' نہ یہ ان آفاق عالیہ تک انسان کو بلند کرتے ہیں۔ یہ تو قریب ہی زمین کے اوپر زندہ رہنے کے اسباب ہیں۔ لیکن جو شخص اس سے بہتر مرغوبات چاہتا ہے ان سب مرغوبات سے زیادہ قیمتی' زیادہ بلند اور پاکیزہ مقاصد چاہتا ہے اور اس لئے چاہتا ہے کہ وہ ان مرغوبات ارضی اور شہوات نفسی میں مستغرق ہی نہ ہو جائے اور بلندیوں تک اونچا ہونے کی بجائے زمین پر ہی پڑا نہ رہے تو جو شخص فی الواقعہ اس دنیائے ادنیٰ سے کہیں بلند آشیانے کی تلاش میں ہے تو قرآن کریم اس مقام بلند تک بھی اس کی راہنمائی یوں کرتا ہے۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۚ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ

"کہو! میں تمہیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں' ان کیلئے ان کے رب کے پاس باغ ہیں' جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہاں انہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی۔ پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ

سرفراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں کے رویے پر گہری نظر رکھتا ہے۔"

یہ ہے آخرت کا سازو سامان' جس کا تذکرہ قرآن مجید کرتا ہے اور رسول خدا ﷺ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اہل تقویٰ مؤمنین کو اس کے بارے میں خوشخبری دیدیں۔ نعیم اخروی بھی عموماً انسانی خواہش ہی سے تعلق رکھتی ہیں لیکن اس کے اور اس دنیاوی انعام و اکرام کے درمیان ایک بہت ہی بڑا فرق بھی ہے۔ یہ ایک ایسا سازو سامان ہے جس تک صرف ان لوگوں کی رسائی ہوگی' جو اس دنیا میں اہل تقویٰ تھے' جس کے دل خوف خدا سے بھرے تھے۔ ان کے دل یاد الٰہی سے معمور تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا خوفی کا شعور بیک وقت روحانی دنیا اور حسی دنیا کی اصلاح کرتا ہے۔ وہ نفس انسانی کو شہوات میں مستغرق ہونے سے بچاتا ہے۔ اس کی حفاظت کرتا ہے کہ وہ ان مرغوبات میں جانوروں کی طرح گم نہ ہو جائے۔ جن لوگوں کے دلوں میں خوف خدا ہوتا ہے وہ عالم آخرت کے ان حسی مرغوبات کو بھی غلیظ حسی لذتیت کے مقام سے ذرا بلند کر کے دیکھتے ہیں۔ اسے جانوروں کی طرح کی شہوت رانی سے ذرا اونچا مقام دیتے ہیں۔ وہ اس زمین پر رہتے ہوئے اپنے دلوں میں اس مقام رفیع کی تمنا رکھتے ہیں' اس سے قبل کہ وہ اس جہاں فانی سے کوچ کریں اور رخصت ہوں۔

عالم آخرت کے اس پاک و صاف اور کامل و مکمل سازو سامان میں' اس دنیائے دنی کی ترک کردہ شہوات کا بہترین بدلہ ہے۔ بلکہ وہ انعام ان شہوات سے بہت زیادہ ہے۔ اس دنیا میں اگر وہ ان کھیتوں کے مالک تھے' جو سرسبز و شاداب تھے اور اچھی پیداوار دیتے تھے تو آخرت میں انہیں ایسے باغات دیئے جائیں گے جو مکمل ہوں گے' جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اور اس شعور اور یقین کے ساتھ ہوں گے کہ وہ ان باغوں میں ہمیشہ کیلئے ہوں گے اور وہ باغ بھی دائمی طور پر سرسبز ہوں گے جو موسمی نہ ہوں گے۔ اس دنیا کے موسمی کھیت کی طرح نہ ہوں گے۔ اگر دنیا میں عورتیں اور بچے ہیں تو وہاں بہت ہی پاکیزہ بیویاں ہیں۔ اور ان کی پاکیزگی گویا دنیاوی بیویوں کے مقابلے میں ایک امتیاز ہے اور بہتری ہے۔ رہے چیدہ گھوڑے' مویشی کھیت اور سونے چاندی کے ڈھیر' تو اس دنیا میں یہ وسائل عیش تھے۔ فراہمی مرغوبات کا سبب تھے۔ قیامت میں ان کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ اس لئے کہ وہاں وسائل رغبت کی فراوانی ہوگی۔ اور وہ اپنی بڑی تعداد میں حاصل ہوں گے' پس وسائل کی کیا ضرورت جب مراد حاصل ہو۔

اور وہاں پر سازو سامان سے بھی ایک عظیم نعمت ہوگی۔ یعنی رب ذوالجلال کی رضامندی۔ یہ رضامندی اس قدر عظیم نعمت ہے جو اس پوری دنیا کی شہوات اور پوری آخرت کی مرغوبات پر بھی بھاری ہے۔ اور پھر ذرا لفظ رضوان پر غور کریں' بذات خود لفظ رضوان کس قدر خوش کن ہے۔ تروتازہ ہے۔ انس و محبت کی خوشبو لئے ہوئے ہے۔

وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ...................... "اور اللہ اپنے بندوں پر گہری نظر رکھتا ہے۔" ........وہ خوب جانتا ہے کہ ان کی فطرت کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس میں کیا کیا میلانات ہیں' اس میں کیا کیا متضاد میلانات ہیں' اس فطرت کو کن کن ہدایات کی ضرورت ہے۔ وہ بھی اس کے علم میں ہیں' وہ فطرت انسانی کے امور کے فیصلے کی اچھی بصیرت رکھتا ہے' اس جہاں میں بھی اور آخرت میں بھی' اس لئے کہ وہ صانع فطرت ہے۔

یہاں اب اللہ تعالیٰ' اپنے خاص بندوں کی صفات گنواتے ہیں' یہ کہ اب آپ کے ساتھ ان کا تعلق کیسا ہوتا ہے۔ اور وہ کیا اعمال ہوتے ہیں جن کی بنا پر بندے جنتوں کے ان انعامات کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ اَلصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْمُنْفِقِيْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ

"یہ وہ لوگ ہیں' جو کہتے ہیں کہ مالک! ہم ایمان لائے' ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں آتش دوزخ سے بچا' یہ لوگ صبر کرنیوالے ہیں راستباز ہیں' فرماں بردار اور فیاض ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔" ان کی دعاؤں میں انکے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ ان کے تقویٰ اور خدا خوفی کا نتیجہ ہوتی ہے وہ خدا سے ڈر کر پہلے ایمان کا اعلان کرتے ہیں۔ پھر ایمان کو عند اللہ اپنا شفیع بناتے ہیں اور مغفرت طلب کرتے ہیں او اپنے آپ کو آگ سے بچاتے ہیں۔

ان کی تمام صفات میں سے' انسانی زندگی کی اقدار میں سے ایک اعلیٰ قدر کا ذکر ہے۔ خصوصاً جماعت مسلمہ کیلئے ان اقدار کی بہت اہمیت ہے۔ وہ صبر کرنیوالے ہیں' صبر میں انسان ہر رنج والم کو برداشت کرتا ہے۔ اور دعوت اسلامی کی راہ میں جو بھی مشکلات درپیش ہوں ان پر ثابت قدم رہتا ہے۔ دعوت اسلامی کی راہ میں اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ وہ اللہ کے سامنے تسلیم ورضا کا پیکر بن جاتا ہے اور حالات اس پر مصائب کے جو پہاڑ بھی توڑیں وہ اللہ کے حکم پر راضی برضا ہوتا ہے۔ وہ سچے ہیں۔ اس لئے کہ سچائی اس کائنات کی بنیاد ہے۔ سچائی کا دامن تھام کر وہ عام لوگوں سے اونچے ہو جاتے ہیں۔ جھوٹ کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کسی فائدے کیلئے یا کسی ضرر سے بچنے کے لئے سچائی چھوڑ دیتا ہے۔

اور فرمان بردار ہیں' یوں حق الوہیت ادا کرتے ہیں اور اپنی جانب سے واجبات بندگی پر کاربند ہوتے ہیں۔ اور صرف اللہ کی بندگی کرتے ہیں جس کے سوا اور کسی کی بندگی ان کے تصور حیات میں نہیں ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دولت کے ہاتھوں ذلیل نہیں ہوتا۔ اور اسے بخل سے نجات ملتی ہے۔ اور انفاق کر کے ایک شخص عملاً انسانی اخوت کو ذاتی خواہش اور لذت پر ترجیح دیتا ہے اور وہ ایسے اجتماعی تحفظ کی فضا پیدا کرتا ہے جو سب انسانوں کیلئے خوشگوار ہو۔

اور رات کے آخر پہر اللہ سے اپنے گناہوں کا استغفار تو ایک ایسا مقام ہے' جہاں گھنی اور خوشگوار چھاؤں' جس کی فضا تروتازہ ہے اور لفظ "اِسحَارٌ" تو اس خاص وقت یعنی طلوع فجر سے قدرے پہلے کی ایسی خوشگوار اور پر سکون تصویر کشی کرتا ہے جو اپنی جگہ لاجواب ہے۔ یہ ایک ایسا وقت ہوتا ہے جب کائنات نہایت ہی پر سکون ہوتی' فضا صاف ہوتی ہے' اس وقت نفس انسانی کے روحانی تصورات جاگ اٹھتے ہیں۔ اچھے خیالات کا ذہن وقلب پر القاء ہوتا ہے۔ اس پر کیف فضا میں جب انسان کی جانب سے بارگاہ الٰہی میں استغفار ہو رہا ہو' تو پھر اس کا پر تو بھی نفس انسانی پر نہایت ہی روحانی اثرات ڈالتا ہے۔ اس وقت انسان کی روح اور اس کائنات کی روح رب کائنات اور خالق انسان کے سامنے ہم سبق اور ہم سمت ہو جاتی ہیں۔

ایسے صابروں' ایسے صداقت شعاروں' ایسے ہی اطاعت گزاروں' ایسے ہی دولت نثاروں اور ایسے بخشش کے طلبگاروں کا یہ حق ہوتا ہے کہ اللہ کی رضامندی ان کا استقبال کرے اس لئے کہ وہ اس کے مستحق ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ کی رحمت کی چھاؤں گھنی ہوتی ہے۔ اور اس کا پھل تروتازہ ہوتا ہے۔ اور وہ ہر لذت اور ہر شہوت سے اپنے اندر زیادہ مٹھاس رکھتی ہے۔ اگر ذوق سلیم ہو۔

یوں قرآن کریم' اس زمین کے اوپر سے اسے مخلوق ارضی سمجھتے ہوئے' نفس انسانی کی راہنمائی شروع کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ اسے بلند کرتا ہے اور اسے ایک بلند افق پر ملاء اعلیٰ کی روشنیوں تک لے جاتا ہے' اور یہ عمل بڑے آرام سے' بڑی تسلی سے' بڑی نرمی اور شفقت سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس روحانی ترقی میں انسان کی فطرت اور اس کے فطری میلانات کو پوری طرح مد نظر رکھا جاتا ہے۔ اس میں اس کی جسمانی کمزوریوں اور ناتوانیوں کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ اس محبت اور اس کے شوق کو بھی جوش دلایا جاتا ہے۔ اور اس میں کسی فطری جذبے کی بیخ کنی نہیں کی جاتی اور نہ ہی اسے کسی کام پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس مہم کے دوران عام زندگی رواں دواں رہتی ہے۔ اس

میں تعطل پیدا نہیں کیا جاتا۔ یہ ہے فطرت اللہ ' یہ ہے اللہ کا نظام حیات ' اس فطرت کیلئے اور اللہ اپنے بندوں کے حال سے اچھی طرح خبردار ہے۔ وَاللّٰهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ !

☆......☆......☆......☆......☆

یہاں تک تو اس سورت کا ہدف یہ تھا کہ عقیدۂ توحید کو نکھار کر رکھ دیا جائے۔ یوں کہ خدا ایک ہے۔ وہی اس کائنات کو تھامے ہوئے ہے۔ دنیا میں آنے والے رسول بھی ایک ہیں اور انکی رسالت بھی ایک ہی اکائی ہے۔ اور یہ بتایا گیا تھا کہ آیات الٰہی اور افکار الٰہیہ کے بارے میں اصل اہل ایمان کا رویہ کیا ہوتا ہے اور جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہوتی ہے وہ ان افکار و آیات کتاب کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ انحراف کرنیوالوں کو اپنے انجام بد سے ڈرایا گیا اور اس سلسلے میں ان کی توجہ ماضی اور حال کے منحرفین کے انجام بد کو بطور مثال پیش کیا گیا۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا کہ عقیدۂ توحید اور اسلامی نظریۂ حیات ایک فطری نظام ہے اور اس میں فطری میلانات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ لیکن متقین کی نظران سے بلند ہوتی ہے اور وہ ہروقت اپنے رب کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔

لیکن اب یہاں سے لیکر اس سبق کے اختتام تک ایک دوسری حقیقت سے ہمیں روشناس کرایا جاتا ہے۔ اور یہ دوسری حقیقت عقیدۂ توحید اور اسلامی نظریۂ حیات کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ اگر پہلی حقیقت ہے تو دوسری کو بھی موجود ہونا چاہئے۔ وہ یہ کہ حقیقت توحید کا مصداق اور مظہر ہماری زندگیوں میں ہونا چاہئے۔ یہ تمام باتیں اس سبق کے آنے والے حصے میں بیان کی گئی ہیں۔

پہلے حصہ اول کے خلاصے کو پھر ذہین نشین اور مستحضر کیا جاتا ہے تاکہ اس کے نتائج دوسری حقیقت کے ذریعہ مرتب ہوں' اس حصے کا آغاز اس شہادت سے کیا جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اس عقیدہ کی شہادت فرشتے بھی دیتے آئے ہیں اور اصحاب العلم بھی اس کی تصدیق کرتے آئے ہیں۔ الٰہ ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ قوام بھی ہے یعنی اس کائنات کا نگہبان ' اور اس کی قیومیت کا یہ مفہوم ہے کو وہ اس کائنات اور اس کے اندر انسان دونوں کو عدل کے مطابق چلاتا ہے۔ اور جب یہ بات مسلم ہے کہ اللہ ہی الٰہ اور قیوم ہے تو پھر دوسری بات خود بخود مستلزم ہو جاتی ہے کہ یہ اللہ کی بندگی کا اقرار کریں۔ یہ بندگی صرف اس کی ہو' اس کا حکم تمام انسانوں کی زندگی میں نافذ ہو' اس کے مطابق فیصلے ہوں' تمام بندے اللہ کے سامنے سرتسلیم خم کریں۔ اس کے سامنے جھکیں ' اس ہستی کی اطاعت کریں جو قیوم ہے۔ اس کی نازل کردہ کتاب اور اس کے رسول کی سنت پر عمل پیرا ہوں۔

اس دوسری حقیقت کا اظہار یوں کیا گیا إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ..................... "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔" اس لئے اللہ اسلام کے سوا کوئی دین قبول نہیں فرماتے ' اور اسلام کیا ہے۔ وہ سرتسلیم خم کرنا' اطاعت کرنا اور ہر معاملے میں اتباع کرنا ہے۔ اس لئے اللہ کے ہاں مقبول دین صرف عقلی تصور نہیں ہے۔ نہ صرف تصدیق بالقلب دین' دین یہ ہے کہ اس تصور حیات اور اس تصدیق ویقین کے تقاضے بھی پورے کئے جائیں اور تقاضے یہ ہیں کہ لوگ اپنے تمام امور میں شریعت کے مطابق فیصلے کریں۔ اور پھر شریعت جو فیصلہ کرے اسے بطیب خاطر قبول کریں اور اس نظام میں رسول خدا کی اطاعت کریں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم بڑے تعجب خیز انداز میں اہل کتاب کے بارے میں اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے دین پر ہیں لیکن ان کا رویہ یہ ہے کہ جب انہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے کہ آؤ اس کے مطابق فیصلہ کریں تو ان میں سے ایک گروہ روگردانی کرتا ہے جس سے ان کے دعوائے دین کی قلعی کھل جاتی ہے اور وہ باطل ہو جاتا ہے اللہ کے نزدیک مقبول دین صرف اسلام ہے' اور اسلام بغیر سرتسلیم خم کرنے کے نہیں ہے۔ اسلام یہ ہے کہ رسول خدا کی اطاعت ہو اور امور زندگی میں فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہوں۔

یہاں اللہ کتاب سے اعراض اور روگردانی کی علت کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے' اور اسکی ایسی حسی اور واقعی تعبیر کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرے سے دین پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ اس لئے کہ وہ یوم الحساب کے عدل و انصاف کے تصور پر پوری طرح یقین نہیں رکھتے۔ وہ اس لئے کہ ان کا خیال تھا "کہ انہیں دوزخ کی آگ میں صرف چند دن ہی رہنا ہو گا۔ اس لئے کہ وہ اہل کتاب ہیں اور ان کے دین کے معاملے میں انہیں ان عقیدوں نے فریب میں ڈالدیا تھا جو انہوں نے جھوٹے طور گھڑے ہوئے تھے۔" اور یہ ان کیلئے عجیب دھوکہ تھا' غرض اس وقت وہ نہ اہل کتاب ہیں اور نہ اہل دین ہیں۔ نہ مومن ہیں کیوں؟ اس لئے کہ جب انہیں بلایا جاتا ہے کہ آؤ تمہاری کتاب کے مطابق کسی قضیئے کا فیصلہ کریں تو وہ منہ موڑ کر بھاگتے ہیں۔

غرض قرآن کریم اس قطعیت اور جزم کے ساتھ دین کا مفہوم اور دین کی حقیقت یہاں بیان کرتا ہے۔ اس لئے تمام لوگوں کی جانب سے اب اللہ کے ہاں مقبول دین صرف دین اسلام ہے جو واضح' صاف اور قطعی ہے۔ یعنی دین اسلام اور اسلام کا معنی ہے کتاب اللہ کے مطابق عدالتوں میں فیصلہ کرنا اور اس کے بعد اسے تسلیم کرنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو وہ دین دار نہیں ہے۔ وہ مسلم نہیں ہے۔ اگرچہ وہ دعوائے دین کرے اور دعوائے اسلام کرے۔ اللہ تعالیٰ دین کی جو حد بیان فرماتے ہیں' جو تعریف کرتے ہیں' جس کی تائید کرتے ہیں وہ وہی ہے جو اوپر ہم نے بیان کیا اور اللہ دین کی تعریف بیان کرنے میں کسی انسان کی خواہش کے تابع نہیں' وہ جس طرح جانتا ہے۔

نہ صرف یہ بلکہ جو شخص کفار کو دوست بناتا ہے۔ (اور سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار وہ ہیں جو عدالتوں کے اندر کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔) تو اس کا اللہ کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو گا۔" کسی معاملے میں بھی وہ اللہ سے متعلق نہ ہو گا۔ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی رابطہ نہ رہا۔ یعنی صرف اس لئے کہ اس شخص نے کافروں سے دوستی کی' یا کافروں کی نصرت کی یا کافروں سے نصرت طلب کی۔ اور کافر وہ جو اللہ کی کتاب پر اپنی عدالتوں میں فیصلے نہیں کرتے۔ اگرچہ زبانی طور پر وہ دعویٰ کریں کہ وہ دین اللہ پر ہیں۔

کفار کی دوستی سے اس قدر سختی سے منع کیا جاتا ہے کہ اگر تم باز نہ آئے تو اس سے تمہارا دین اپنی اساس سے ختم ہو جائے گا۔ اور قرآن کریم اس تنبیہہ اور ڈراوے کے ساتھ ساتھ انہیں اچھی طرح سمجھاتا بھی ہے۔ مسلمانوں کو یہ بصیرت دی جاتی ہے کہ وہ اللہ ہی اس پوری کائنات میں اصل متصرف فی الامور ہے۔ وہ سردار ہے۔ اور اسی کے تصرف میں تمام امور ہیں۔ وہی مالک الملک ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے ملک عطا کرتا ہے جس سے چاہتا ہے ملک لے لیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس سے چاہتا ہے عزت واپس لے لیتا ہے۔ اور لوگوں کی زندگی کے امور میں اس کا یہ تصرف بھی اس تکوینی تصرف کا ایک حصہ ہے' جو وہ اس کائنات کو چلانے کیلئے کرتا ہے۔ دیکھئے' وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ وہ مردہ چیزوں سے زندہ چیزوں کو نکالتا ہے اور زندہ چیزوں سے مردہ چیزیں نکالتا ہے۔ اور یہی اس کا قیام بالعدل ہے۔ جس کے ساتھ وہ انسانوں کو بھی تھامے ہوئے ہے۔ اور کائنات کو بھی تھامے ہوئے ہے۔ اس لئے اہل ایمان کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر کفار کے ساتھ دوستیاں قائم کریں۔ چاہے اہل کفار کی قوت بہت زیادہ ہو' ان کا مال بہت زیادہ ہو اور اولاد بہت زیادہ ہو۔

اس تکرار اور موکد ڈراوے اور تنبیہہ سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اس وقت تو خیر جماعت مسلمہ پر اس نکتے کی اچھی طرح وضاحت نہ ہوئی تھی۔ اور اس وقت اہل اسلام میں سے بعض لوگوں نے اپنے سابقہ خاندانی' قومی اور اقتصادی روابط بحال رکھے ہوئے تھے۔ یہ روابط مشرکین مکہ اور یہودیان مدینہ کے ساتھ بیک وقت تھے۔ اس لئے دین اسلام کی یہ تفسیر کی گئی اور انہیں ان اہل کفر کے ساتھ دوستانہ روابط نہ رکھنے کا حکم دیا گیا۔ نیز اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے' دنیا میں انسان انسان کی ظاہری قوتوں کی طرف میلان رکھتا ہے' ان

سے متاثر ہوتا ہے' اس لئے انہیں بتایا جاتا ہے کہ اصلی قوت کون ہے' اصلی حقیقت ان لوگوں کی کیا ہے' اور یہ کہ اسلامی نظریۂ حیات کیا ہے۔ اور اس کے تقاضے کیا ہیں یعنی عملی زندگی میں۔

اور اس سبق کا خاتمہ اس قطعی فیصلے پر ہوتا ہے کہ اسلام اللہ اور رسول کی اطاعت کا نام ہے اور یہ کہ اللہ کی جانب چلنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ رسول خدا کی اطاعت کی جائے۔ صرف یہ کافی نہیں ہے کہ کلمۂ شہادت پر دل سے مجرد یقین کر لیا جائے اور زبان سے اس کا اقرار کر لیا جائے۔ فرماتے ہیں "کہہ دیجئے' اگر تم اللہ کو محبوب رکھتے ہو تو میری اطاعت کرو اللہ تمہیں محبوب رکھے گا۔"..........

"کہہ دو' اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو' اگر وہ اس سے منہ پھیرلیں' تو جان لو کہ اللہ کافروں کے ساتھ محبت نہیں رکھتا۔"........ پس یا تو اتباع ہو گا اور مکمل تابعداری کرو گے تو اللہ بھی اسے پسند کرے گا یا پھر کفر ہو گا جسے اللہ نہایت ہی ناپسند کرتا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جس سے ایک مسلمان اور ایک کافر کے راستے جدا ہوتے ہیں۔ اس سبق کے اس دوسرے حصے پر اب تفصیل سے غور ہو گا۔

☆......☆......☆......☆......☆

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۙ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُؕ۝۱۸

النصف

"اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اور فرشتے اور سب اہل علم بھی راستی کے ساتھ اس پر گواہ ہیں کہ اس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں ہے۔"

یہ وہ پہلی حقیقت ہے' جس پر اسلام کے نظریاتی تصورات قائم ہیں یعنی عقیدۂ توحید' الوہیت میں توحید' قیومیت میں توحید اور یہ کہ اس کائنات کی پوری نگہبانی اصول انصاف وعدل پر منجانب اللہ ہو رہی ہے۔ اس پہلی حقیقت کے ساتھ اس سورت میں کلام کا آغاز ہوا تھا۔ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ............... "اللہ وہ ذات ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور وہ زندۂ جاوید اور نگہبان ہے۔" اس آغاز سے ایک تو اسلامی عقیدہ کا اظہار اور توضیح مقصود تھی اور دوسری جانب سے اہل کتاب کے پھیلائے ہوئے شبہات کا رد مطلوب تھا۔ ایک تو خود اہل کتاب کیلئے ان کے موروثی عقیدۂ توحید کی تشریح اور توضیح بھی مقصود تھی' دوسرے یہ کہ ان کے پھیلائے ہوئے شبہات کا جو اثر اہل اسلام پر ہو رہا تھا' اس کی توضیح بھی مقصود تھی' کیونکہ بعض اوقات اہل اسلام بھی ان سے متاثر ہو جاتے تھے۔

اللہ کی شہادت' کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے' یہ ہر اس شخص کیلئے کافی و شافی عقیدہ ہے' جو ایمان لا چکا ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اللہ کی گواہی تو ان کیلئے کافی و شافی ہو سکتی ہے۔ جو اللہ پر ایمان رکھتے ہوں' اور جو لوگ ایمان لے آئے ہوں۔ پھر ان کو شہادت کی ضرورت ہی کیا رہتی ہے۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اہل کتاب تو اللہ پر ایمان لاتے تھے لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ اللہ کیلئے اولاد بھی ٹھہراتے تھے اور اس کیلئے شریک بھی ٹھہراتے تھے۔ بلکہ مشرکین مکہ بھی خدا پر ایمان لاتے تھے۔ وہ گمراہ اس حوالے سے ہوتے تھے کہ وہ اللہ کے ساتھ کئی شرکاء بناتے تھے' کئی کو اللہ کے مساوی ٹھہراتے تھے۔ اللہ کیلئے بیٹے اور بیٹیوں کے قائل تھے۔ اس لئے جب قرآن کریم نے اس بات کی تصدیق کی کہ خود وہ جس خدا کے قائل ہیں وہ شہادت دے رہا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ لہٰذا یہ شہادت ان کے تطہیر افکار کیلئے ایک موثر شہادت تھی۔

نیز یہ معاملہ جس طرح کہ ہم نے اس حصے سے قبل اپنے تبصرے میں اس کا جائزہ لیا ہے۔ یہ ایک بڑا ہی گہرا اور دقیق معاملہ ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی جانب سے نظریۂ توحید پر شہادت اس لئے دی گئی ہے کہ شہادت توحید کے ساتھ اس کے تقاضے بھی وابستہ ہیں اور ان تقاضوں کا ذکر بعد میں آرہا ہے۔ وہ یہ عقیدۂ توحید کے ان حاملین سے بندگی اور اطاعت بھی صرف اس وحدہ لاشریک کی متوقع ہے۔ اور وہ بندگی اور اطاعت بھی صرف اسلام کی شکل میں ہے۔ اور اسلام بھی سرتسلیم خم کردینے اور مکمل انقیاد کے معنی میں مطلوب ہے۔ اسلام سے مراد صرف شعور' تصور اور عقیدہ مراد نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد عمل' اطاعت اور مکمل انقیاد بھی ہے۔ اور یہ انقیاد بھی اسلامی نظام زندگی کی اس شکل و صورت کے مطابق جو قرآن و سنت سے ماخوذ ہے۔ اس پہلو سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر دور اور ہر زمانے میں لوگوں کی اکثریت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ ایمان لاچکے ہیں' لیکن وہ اس اللہ کے ساتھ بے شمار غیروں کو شریک بھی ٹھہراتے ہیں' اس صورت میں جب وہ اپنے فیصلے ایسے قوانین کے مطابق کراتے ہیں جو شریعت پر مبنی نہیں' ہیں اور وہ ایسے لوگوں کی اطاعت کرتے ہیں جو اللہ اور رسول کی اطاعت نہیں کرتے' اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اخلاق و اقدار' اپنے تصورات و افکار اور اپنے حسن و قبح کے پیمانے غیر اللہ سے لیتے ہیں' تو یہ سب باتیں ان کے اس قول سے متصادم ہوتی ہیں کہ ہم ایمان لاچکے ہیں' نیز ان کا یہ طرز عمل خود اللہ کی شہادت کے بھی منافی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

اب سوال رہ جاتا ہے' ملائکہ اور علماء کی شہادت کا' تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ علماء اور ملائکہ مکمل طور پر اللہ اور کے اوامر و نواہی کی اطاعت کرتے ہیں' وہ صرف اللہ سے ہدایات لیتے ہیں۔ اور اللہ کی جانب سے جو کچھ نازل ہوتا ہے اس کی پیروی کرتے ہیں۔ نہ اس کے بارے میں بحث و مناظرہ کرتے ہیں۔ اور نہ ہی اس میں کسی قسم کا شک کرتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ ثابت ہو جائے کہ یہ بات من جانب اللہ ہے۔ اس سورت میں اولو العلم کا حال بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا تھا۔ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ ........................................ "اور علم میں جو لوگ پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں' سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ یہ ہے اہل علم اور فرشتوں کی شہادت یعنی تصدیق' اطاعت اتباع اور انقیاد' اور فرشتوں' اہل علم کی شہادت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور وہ عدل و انصاف کے ساتھ قائم ہے۔ یعنی عدل و انصاف ایک ایسی صفت ہے جو اس کی شان الوہیت کے ساتھ وہ قائم و لازم ہے۔"

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ۭ

"اللہ خود اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور فرشتے اور سب اہل علم بھی شہادت دیتے ہیں کہ اللہ راستی اور انصاف کے ساتھ قائم ہے۔" جس طرح عبارت نص سے معلوم ہوتا ہے قائما بالقسط ایسی حالت ہے جو شان الوہیت کے ساتھ لازم ہے۔ اور یہ اس بات کی وضاحت ہے جو اس سے پہلے سورت میں کہا گیا کہ اللہ قیوم اور نگہبان ہے' مطلب یہ ہوا کہ اس کی نگہبانی عدل پر قائم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس جہان کے چلانے کیلئے جو تدابیر اختیار کی ہیں' یا یہاں لوگوں کی زندگی کے قیام و دوام کیلئے جو تدابیر اختیار کی ہیں وہ عدل و انصاف کے اصولوں پر کی ہیں۔ اس لئے لوگوں کی زندگیوں میں عدل تب ہی قائم ہو سکتا ہے جب ان کی زندگیاں کتاب اللہ کی شریعت پر استوار ہوں' جس طرح اس کائنات کو نوامیس فطرت کے عادلانہ اصولوں پر قائم کیا گیا ہے اور وہ استوار ہے۔ صرف اسی صورت میں انسان اور فطرت کائنات ہم آہنگ ہو کر چل سکتے ہیں' شریعت وہ نظام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ اگر یہ نہ ہو گا تو اس جہان میں عدل و انصاف نہ ہو گا اور یہاں توازن و اعتدال قائم نہ ہو سکے گا۔ اس کائنات کی چلن اور انسان کی چلن کے درمیان

تطابق اور ملامت نہ ہوگی۔ نتیجہ ظلم' افتراق اور قوتوں کے ضیاع کی صورت میں بر آمد ہوگا۔

انسانی تاریخ شاہد عادل ہے کہ اس میں انسانیت نے عدل و انصاف کا مزہ صرف انہیں ادوار میں چکھا جن میں صرف کتاب اللہ کی حکمرانی رہی۔ اور ان کی زندگی اسطرح منظم اور استوار ہوئی جس طرح اس زمین کی گردش منظم اور استوار ہے۔ اس قدر جس قدر انسانی فطرت کیلئے ممکن ہو۔ یعنی فطرت انسانی کے رجحانات اطاعت اور رجحانات معصیت کے درمیان توازن ہو۔ اور ان دونوں پلڑوں کے درمیان توازن ہو۔ اور انسان اسلامی نظام زندگی کے قیام اور کتاب اللہ کی حکمرانی کی صورت میں اللہ کی اطاعت کی طرف مائل ہو۔ اگر انسانی زندگی پر کوئی ایسا نظام حکمران ہو۔ جو خود انسان نے بنایا ہو تو اس میں لازماً انسانی جہالت کا دخل ہوگا۔ انسان کے قصور اور ادراک کا قصور اس میں شامل ہوگا۔ اور اس کے نتیجے میں یہ نظام کسی نہ کسی شکل میں ظلم اور تضاد کا شکار ہوگا۔ کبھی ایک فرد پوری سوسائٹی پر ظلم ڈھائے گا' اور کبھی ایک سوسائٹی ایک فرد پر ظلم کر رہی ہوگی' یا کبھی ایک طبقہ دوسرے طبقات پر ظلم کر رہا ہوگا یا ایک قوم دوسری اقوام پر ظلم کر رہی ہوگی یا ایک نسل دوسری نسل پر ظلم کر رہی ہوگی۔ رہا اسلامی نظام زندگی تو وہ ان تمام میلانات و رجحانات سے پاک ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ سب کا اللہ ہے۔ اور اس پر اس ارض و سماء میں کوئی راز مخفی بھی نہیں ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ............................ "اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہی غالب ہے اور وہی حکیم ہے۔" یہاں اس آیت کے اس ٹکڑے میں دوبارہ وحدت الٰہیت کو دو اہم صفات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ایک صفت یہ کہ وہ غالب ہے قوت والا ہے اور دوسری یہ کہ وہ حکیم ہے اور قدرت و حکمت دونوں ایسی صفات ہیں جن کا موجود ہونا اللہ کی شان عدل و نگہبانی کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے کہ عدل کا مفہوم یہ ہے کہ حقدار کو حق ملے اور اسے حق دلایا جاسکے۔ اور اللہ کی صفات کا تصور یہ ہے کہ وہ مثبت کارکردگی کا شعور دیتی ہیں۔ اس لئے کہ اسلام کے تصور خدا میں کوئی سلبیت نہیں ہے۔ ایجابی ہی ایجاب ہے' اور یہ تصور خدا تعالیٰ کا سب سے مکمل تصور ہے۔ سب سے سچا تصور ہے' اور یہ تصور خود اللہ تعالیٰ نے اپنے حوالے سے پیش کیا ہے۔ اور اس مثبت اور ایجابی فعالیت کا اثر انسان پر یہ ہوتا ہے کہ انسان کا دل اللہ کے ارادے سے متعلق ہو جاتا ہے۔ اس لئے انسان کا عقیدہ زندہ اور موثر عقیدہ ہوتا ہے' وہ محض خشک تصوری نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر فعالیت اور تروتازگی ہوتی ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

اب اس حقیقت پر جسے اس ایک آیت میں دوبارہ دہرایا گیا' اس کا فطری نتیجہ مرتب کیا جاتا ہے وہ یہ کہ خدا ایک ہے تو پھر بندگی اور اقتدار بھی صرف اسی خدا کیلئے ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ
بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ
سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۭ
وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۭ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ
وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾

ع ۲ ۱۱ ۱۰

"اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے' جنہیں کتاب دی گئی تھی۔ ان کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کیلئے ایسا کیا اور جو کوئی اللہ کے احکام وہدایات کی اطاعت سے انکار کر دے' اللہ کو اس سے حساب لینے میں دیر نہیں لگتی۔ اب اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں' تو ان سے کہو۔ "میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔" پھر اہل کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں سے پوچھو۔ "کیا تم نے بھی اس کی اطاعت اور بندگی قبول کی؟" اگر کی تو راہ راست پا گئے۔ اور اگر اس سے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی۔ آگے خود اللہ اپنے بندوں کے معاملات دیکھنے والا ہے۔"

غرض تصور یہ ہے کہ ایک الٰہ ہے۔ اس لئے ایک ہی نظام ہے' پھر اس الٰہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ نہ ان کے تصور میں اس کے سوا کوئی تصور ہو' نہ ان کی زندگی کا کوئی گوشہ اس نظام سے آزاد ہو.......... جب اللہ ایک ہے تو پھر بندگی اور انقیاد بھی اسی کیلئے ہے۔ اور یہی اللہ اس بات کا حقدار بھی ہے کہ لوگ اس کے مطیع فرمان ہوں' ان کے قانونی نظام میں شریعت نافذ ہو اور ان کی اقدار حیات اور حسن وقبح کے پیمانوں میں یہ شریعت معیار ہو۔ اور ان کی پوری عملی زندگی اس شریعت پر قائم ہو۔

اگر ایک اللہ ہے تو پھر تصور حیات بھی ایک ہی ہو گا۔ اور یہ تصور و نظریہ وہی ہو گا جسے اس الٰہ نے اپنے بندوں کیلئے پسند کیا ہے۔ یعنی خالص عقیدۂ توحید چمکتا ہوا اور صاف ستھرا۔

جس طرح ہم مکرر کہہ آئے ہیں کہ عقیدۂ توحید کا پہلا تقاضا یہ ہے۔ إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ....... اللہ کے نزدیک نظام زندگی صرف اسلام ہے۔ اور اسلام صرف دعویٰ ہی نہیں ہے۔ وہ صرف جھنڈے کا نام بھی نہیں ہے۔ وہ صرف نعرے کا نام بھی نہیں ہے' وہ صرف ایک تصور اور خیال کا نام بھی نہیں ہے جس پر دل مطمئن ہو' اور نہ وہ صرف انفرادی عبادات کا نام ہے جنہیں ایک فرد بطور فرد ادا کرتا ہے۔ مثلاً نماز' حج اور روزے' ایسا ہرگز نہیں ہے۔ صرف یہ امور وہ اسلام نہیں ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس کے سوا کوئی دین قبول نہیں کرتا۔ بلکہ اسلام تو مکمل انقیاد کا نام ہے۔ اسلام مکمل عبادت کا نام ہے۔ وہ مکمل اتباع ہے۔ اسلام یہ ہے کہ عدالتوں میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے ہو رہے ہوں' جس کی تفصیلات عنقریب آرہی ہیں۔

اسلام یہ ہے خدا کو وحدہ لاشریک سمجھا جائے۔ یہ عقیدہ پختہ ہو کہ اس کائنات کو وہی تھامنے والا ہے۔ جبکہ اہل کتاب ذات باری اور ذات مسیح میں خلط کرتے تھے۔ بلکہ وہ اللہ کے ارادے اور مسیح کے ارادے میں بھی خلط کرتے تھے۔ اور اس موضوع پر خود ان کے درمیان کئی فرقے تھے اور ہر فرقے کا اپنا عقیدہ تھا۔ اور ان کے یہ اختلافات بعض اوقات اس قدر شدید ہو جاتے تھے کہ وہ قتل و غارت پر منتج ہوتے تھے۔ اس لئے یہاں اللہ تعالیٰ اہل کتاب اور جماعت مسلمہ کو بتاتے ہیں کہ ان اختلافات اور فکری ژولیدگی کا اصل سبب کیا تھا۔

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ

"اور اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے جنہیں کتاب دی گئی تھی' ان کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد' آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کیلئے ایسا کیا۔"

یہ اختلافات اس لئے نہ تھے کہ انہیں حقیقت واقعہ کا پتہ نہ تھا کیونکہ اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے بارے میں فیصلہ کن معلومات آگئی تھیں کہ اللہ صرف ایک ہے' انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ صرف بندہ ہے' معبود نہیں ہے۔ یہ جو انہوں نے شدید اختلافات پیدا کئے یہ محض ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کی خاطر کئے۔ ایک دوسرے پر ظلم اور دست درازی کیلئے جواز پیدا کیا گیا۔ ان کیلئے اللہ کے نظام عدل و انصاف میں کوئی جواز نہ تھا' اسلامی نظریۂ حیات اور سماوی شریعت یا سماوی کتب میں ایسے اختلافات کیلئے

کوئی جواز نہ تھا۔

اس سے قبل ہم مسیحی مورخ کا حوالہ دے چکے ہیں جس میں ہم نے بتایا کہ عیسائیوں کے ہاں سیاسی تحریکات کس طرح جان بوجھ کر مذہبی اختلافات پیدا کرتی تھیں اور یہودی اور عیسائی افکار کے درمیان اختلافات بھی اسی قبیل کے تھے۔ ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ مصر اور شام کے درمیان یہ مذہبی منافرت کس قدر پھیلی ہوئی تھی۔ شام میں چونکہ رومی سلطنت کی حکمرانی تھی۔ اس لئے مصریوں نے اس سیاسی نفرت کی وجہ سے رومی کیتھولک مکتب کو چھوڑ کر دوسرا مکتب فکر اپنایا۔ یا جس طرح روم کے قیصروں میں سے بعض نے یہ کوشش کی کہ تمام عیسائی مکاتب فکر ایک متوسط مکتبہ فکر پر متفق ہو جائیں' تاکہ ان کے زیر اقتدار رعایا کے درمیان فکری اتحاد پیدا ہو جائے' ان کا خیال تھا ایسے مذہب سے سب کے مقاصد پورے ہو جائیں گے۔ گویا عقیدہ ایک کھیل تھا اور اسے بڑی آسانی سے سیاسی اور ملکی مقاصد کیلئے بدلا جاسکتا تھا۔ حالانکہ درحقیقت یہ ایک عظیم ظلم تھا۔ اور یہ ظلم اور تعدی وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا کرتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اسی حرکت پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے سخت سرزنش ہوتی ہے اور ٹھیک مناسب وقت پر وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ............................ "اور جو کوئی اللہ کی ہدایات اور احکام کی اطاعت سے انکار کر دے' اللہ کو اس سے حساب لینے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔" یہاں اللہ تعالیٰ نے عقیدۂ توحید میں اختلاف کرنے کو کفر سے تعبیر فرمایا' اور اہل کفر کو تنبیہ کی اور خوف دلایا کہ میں بہت جلد حساب لینے والا ہوں۔ اس لئے کہ اگر زیادہ مہلت دوں تو یہ لوگ اختلافات اور کفر و الحاد میں مزید سرگرداں رہیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو حکم دیتے ہیں کہ آپ ان لوگوں سے فیصلہ کن بات کریں۔ یعنی اہل کتاب اور غیر اہل کتاب سب سے تاکہ ان کے ساتھ بات چیت فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو جائے۔ اور اس کے بعد اسے ختم کر دیا جائے' اور آپ اپنے واضح راستے پر اکیلے گامزن ہو جائیں۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۲۰

"اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں' تو ان سے کہو' "میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔" پھر اہل کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں سے پوچھو' کیا تم نے بھی اس کی اطاعت اور بندگی قبول کی؟" اگر کی تو وہ راہ راست پاگئے۔ اور اگر اس سے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی...... آگے اللہ خود اپنے بندوں کے معاملات دیکھنے والا ہے۔"

اب مزید وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بہت کچھ کہہ دیا گیا' اس لئے اب یا تو تم لوگ اللہ وحدہ کی الوہیت کا اعتراف کرو' اس کی نگہبانی کا اعتراف کرو اور نہج حیات' اتباع اور انقیاد کرو ورنہ پھر تمہیں اس کا کوئی حل نہ ملے گا۔ اور یہ مباحثہ یونہی جاری رہے گا۔ اور تم توحید اور اسلام سے محروم رہو گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ رسول خدا کو صرف ایک لفظ ایسا بتاتے ہیں جو بیک وقت نظریۂ حیات اور نظام زندگی کا مظہر ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر پھر بھی یہ لوگ تم سے جھگڑیں تو تم صاف کہہ دو کہ ہم نے اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ ............ میں اسلام لایا اور میرے متبعین بھی' یہاں اہل ایمان کو متبعین کہہ کر اشارہ اس طرف مطلوب ہے کہ اسلام صرف تصدیق ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد اتباع بھی ضروری ہے' اسی طرح یہ تعبیر کہ میرا چہرہ اللہ کے سامنے جھک گیا ہے۔ اس لئے کہ اسلام محض قول و اقرار کا نام بھی نہیں ہے۔ نہ صرف عقیدے اور تصور کا نام ہے۔ اس کے مفہوم میں انقیاد بھی داخل ہے۔

اتباع اور اطاعت بھی داخل ہے۔ چہرے کا مطیع ہونا مقصد ہے مکمل انقیاد و اتباع' اس لئے کہ انسان کے جسم میں چہرے کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ چہرے مہرے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کس قدر مطیع 'مقیع 'فرماں بردار اور بروقت عمل کے لئے چاق و چوبند ہے۔

یہ ہے خود حضرت محمد ﷺ کا اعتقاد اور آپ کا نظام زندگی 'نظام مصطفیٰ' اور مسلمان تو ہیں ہی وہ لوگ جو اس کے تبع اور مقلد ہیں 'اس کے اعتقاد میں بھی اور اس کے عمل میں بھی اس تقابل پر اہل کتاب اور غیر اہل کتاب سے پوچھا جائے۔ اب سوال کیا جائے جو دونوں کیمپوں کے درمیان واضح حد بندی کر دے۔ دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کر دے۔ جس میں کوئی اشتباہ نہ رہے اور دونوں کے درمیان کوئی فکری اختلاط و التباس نہ رہے۔

وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ............ "اہل کتاب اور امیوں (غیر اہل کتاب) سے کہو: "کیا تم نے بھی سر تسلیم خم کر دیا؟"......... یہاں اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کا فرق اب ختم کر دیا جاتا ہے۔ اب دونوں ایک ہی مقام پر کھڑے ہیں۔ اہل کتاب اور مشرکین دونوں کو دعوت اسلام دی جاتی ہے اور یہ دعوت اسلام اسی مفہوم کے ساتھ ہے۔ جس کی تشریح ہم کرتے ہیں۔ انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ وہ عقیدہ توحید قبول کریں اللہ کی ذات میں اور اس کی قیومیت اور نگہبانی میں' اس کے بعد انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اس عقیدے کو اپنانے کے بعد پھر مطیع فرمان ہو جائیں اور اطاعت یہ ہو گی کہ وہ اپنی پوری زندگی میں فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کریں' اسلامی نظام زندگی کو اپنائیں فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ............... ......... اگر انہوں نے یہ اطاعت قبول کر لی تو راہ راست پا گئے۔"

معلوم ہوا کہ ہدایت کا ظہور صرف ایک ہی شکل میں ہوتا ہے یعنی اسلام کی صورت میں یعنی اس کی اس ماہیت اور اس طبیعت کے مطابق' اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں ہے' کوئی دوسرا تصور نہیں ہے' کوئی دوسرا طریق کار نہیں اور نہ کوئی دوسرا ایسا منہاج ہے جس کے ذریعہ ہدایت اب حاصل کی جا سکتی ہو۔ اس کے سوا جو بھی اور راستے ہیں وہ سب ٹیڑھے ہیں' وہ سب حیرانی و پریشانی کے راستے ہیں۔ وہ سب زیغ و ضلال کے راستے ہیں۔

وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ............ "اگر وہ منہ موڑیں تو تم پر صرف پیغام پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔" پیغام پہنچانے کے بعد رسول کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ آپ کا کام ختم ہو جاتا ہے اور یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ کو ان لوگوں کے ساتھ قتال کی اجازت نہ دی گئی تھی جو اسلام قبول نہیں کرتے یہاں تک کہ وہ باز آ جائیں' بعد کا حکم یہ تھا کہ وہ یا تو مکمل انقیاد اختیار کر لیں اور اسلامی نظام کے مطیع ہو جائیں یا پھر وہ معاہدہ کریں اور جزیہ ادا کر کے اسلامی نظام کے تابع ہو جائیں پھر وہ آزاد ہیں اس لئے کہ اسلام میں عقائد تبدیل کرنے کا کوئی جبر نہیں ہے۔

وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ............ "اللہ اپنے بندوں کے معاملات سے اچھی طرح باخبر ہے۔" وہ اپنے علم اور بصیرت کے مطابق ہی ان کے معاملات کو چلاتا ہے اور ان کے تمام امور اسی کے ہاتھ میں ہیں ہر حال میں' اس لئے وہ اپنے بندوں کو اندھیرے میں نہیں رکھتا۔ اور وہ انہیں صاف صاف بتاتا ہے کہ ان کا انجام کیا ہو گا۔ وہ بتاتا ہے کہ گزشتہ تاریخ انسانیت میں اللہ کے باغیوں اور نافرمانوں کا انجام کیا ہوتا ہے اور اب بھی اس کی سنت وہی ہے۔ فرماتے ہیں۔ :

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ

(۲۱) أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ (۲۲)

"وہ لوگ جو اللہ کی ہدایات و احکامات ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں' جو خلق خدا سے راستی اور عدل کا حکم دینے کیلئے اٹھیں' ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سناؤ' یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت دونوں میں ضائع ہو گئے۔ اور ان کا مددگار کوئی نہیں۔"

یہ ہے ان لوگوں کا حتمی انجام' ان کیلئے دردناک عذاب ہو گا' یہ عذاب دنیا و آخرت دونوں میں ہو گا۔ یہاں بھی وہ اس کی توقع کریں اور آخرت میں تو یقینی ہے ہی...... دنیا اور آخرت میں ان کے اعمال باطل ہوں گے' بے اثر ہوں گے۔ یہ عجیب تصویر کشی ہے' حبوط کا لغوی معنی ہے۔ کسی مویشی' زہریلی گھاس چر کر پھول جانا ہے۔ بظاہر تو اس صورت میں ایک مویشی کا خوب موٹا تازہ ہو جاتا ہے' لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آخر کار برباد اور ہلاک ہو جاتا ہے' یہاں بظاہر تو ان کے بڑے بڑے کارنامے ہیں لیکن قیامت میں ان کا کوئی فائدہ نہ ہو گا اور نہ ان کا کوئی حامی و مددگار ہو گا۔

قرآن کریم نے آیات الٰہی کا انکار کے ساتھ ساتھ انبیاء علیہم السلام کے قتل کا ذکر بھی کیا۔ جو ناحق قتل کیے گئے' اس لئے کہ قتل انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کبھی حق یکجا نہیں ہو سکتا۔ اور ساتھ ہی یہ ذکر کیا کہ وہ لوگ ان افراد کو بھی قتل کرتے تھے جو عدل و انصاف کا حکم دیتے تھے۔ یعنی وہ لوگ انہیں اس لئے قتل کرتے تھے کہ وہ اس نظام الٰہی کے قائل اور داعی تھے جو عادلانہ نظام تھا۔ اور اس کے سوا کسی دوسرے نظام کے ذریعہ عدل کا قیام ممکن ہی نہ تھا۔ ان تمام صفات کے ذکر سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ توبیخ اور تخویف یہود کیلئے تھی۔ کیونکہ یہ ان کی تاریخی صفات ہیں اور ان صفات کے ساتھ وہ مشہور ہیں۔ جہاں بھی ان کا ذکر ہو ذہن ان کی طرف جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں نصاریٰ سے خطاب ہو کیونکہ نزول قرآن کے زمانے تک انہوں نے بھی اپنے مذہب کے مخالفین کو ہزاروں کی تعداد میں قتل کیا تھا۔ کیونکہ جو شخص بھی رومی سلطنت کے سرکاری مذہب کے خلاف ہوتا تھا وہ اسے قتل کر دیتے تھے۔ ان میں وہ مسیحی بھی شامل تھے جو توحید کے قائل تھے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بشر سمجھتے تھے۔ اور یہ لوگ ایسے تھے جو نظام حکومت میں عدل و انصاف کی پرچار بھی کرتے تھے۔ یہود و نصاریٰ کے علاوہ یہ حکم ہر زمان و مکان میں تمام ان لوگوں پر صادق آتا ہے جو اس قسم کے متشددانہ حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں اور ہر دور میں کبھی بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں رہی ہے۔

یہاں یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ قرآن کے یہ الفاظ "وہ لوگ جو آیات کا انکار کرتے ہیں۔" سے مراد کیا ہے۔ ان سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ کوئی آیات الٰہی کا انکار کر کے کلمہ کفر ادا کر دے۔ اس لفظ کے مفہوم میں یہ شامل ہے کہ کوئی وحدت اللہ یا عقیدۂ توحید کا قائل نہ ہو' پھر وہ صرف اللہ کی بندگی کا قائل نہ ہو۔ اور اس میں یہ بات از خود آجاتی ہے کہ کوئی اس مصدر اور منبع کا قائل نہ ہو جہاں سے انسانی زندگی کیلئے قانون سازی کی جاتی ہے اور حسن و قبح کی اقدار کا تعین کرتا ہے یعنی کتاب اللہ کا' اس لئے جو شخص ان امور میں بھی اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرے گا وہ بھی مشرک تصور ہو گا اور الوہیت کا منکر شمار ہو گا۔ اگرچہ وہ لفظ زبان سے اسے ایک ہزار بار جھپتا رہے۔ اس مفہوم کا اظہار آنے والی آیات میں ملے گا۔

☆......☆......☆......☆......☆

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾ فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٥﴾

"تم نے دیکھا نہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ ملا ہے۔ ان کا حال کیا ہے؟ انہیں جب کتاب الٰہی کی طرف بلایا جاتا ہے' تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلے کرے' تو ان میں سے ایک فریق اس سے پہلوتہی کرتا ہے اور اس فیصلے کی طرف آنے سے منہ پھیرتا ہے۔ ان کا یہ طرز عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ "کہ آتش دوزخ تو ہمیں مس تک نہ کرے گی اور اگر دوزخ کی سزا ہم کو ملے گی بھی تو بس چند روز" ان کے خود ساختہ عقیدوں نے ان کو اپنے دین کے معاملے میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال رکھا ہے۔ مگر کیا بنے گی ان پر جب ہم انہیں اس روز جمع کریں گے جس کا آنا یقینی ہے؟ اسی روز ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ پورا پورا دیدیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہوگا۔"

یہ سوال سوالیہ ہے اور اسی سے ان کے اس عجیب اور متضاد موقف کی تشہیر مطلوب ہے۔ یہ موقف ان لوگوں نے اختیار کیا ہے جنہیں کتاب الٰہی کا ایک حصہ بھی خوش قسمتی سے ملا۔ مثلاً یہود کو تورات اور عیسائیوں کو انجیل کی شکل میں' اور یہ کتابیں کتاب اللہ کا حصہ اس اعتبار سے ہیں کہ کتاب اللہ تو وہ تمام ریکارڈ ہے جو اللہ کی طرف سے کسی بھی زمان و مکان میں کسی نبی پر اترا۔ کیونکہ خدا کے ہاں اللہ بھی ایک ہے۔ نگہبانی بھی ایک ہے۔ اور حقیقتاً کتاب بھی ایک ہے۔ یہود و نصاریٰ کو تو اس کا ایک حصہ ملا اور مسلمانوں کو پوری کتاب ملی۔ اس لئے کہ قرآن کریم اصول الدین کا جامع ہے۔ اور سابقہ کتب کی توثیق کرتا ہے۔ یہ سوال ان لوگوں سے کیا گیا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا۔ تاکہ وہ کتاب ان کے درمیان برپا شدہ اختلافات کا بھی فیصلہ کردے۔ ان کے تمام امور حیات میں وہ فیصلہ کن ہو۔ ان کی معیشت اور معاش میں وہ فیصلہ کن ہو۔ تو وہ اس دعوت کو قبول نہیں کرتے۔ ان کا ایک فریق اس سے پیچھے ہٹ منہ موڑ دیتا ہے۔ اور کتاب الٰہی اور شریعت الٰہیہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتا لہٰذا یہ ایک ایسا موقف ہے جو ایمان کے خلاف ہے اور وہ ان کے اس دعوے کے بھی خلاف ہے کہ وہ اہل کتاب ہیں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ

"تم نے دیکھا نہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ ملا ہے۔ ان کا حال کیا ہے؟ انہیں جب کتاب الٰہی کی طرف بلایا جاتا ہے' تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلے کرے' تو ان میں سے ایک فریق اس سے پہلوتہی کرتا ہے اور اس فیصلے کی طرف آنے سے

منہ پھیرتا ہے۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ بعض اہل کتاب کے طرز عمل پر تعجب کا اظہار فرماتے ہیں' سب کے نہیں بعض کے طرز عمل پر کہ انہیں یہ دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے نظریاتی امور میں اور اپنے عملی امور میں کتاب الٰہی کی طرف رجوع کریں اور اس کا انکار کردیں۔ وہ یہ انکار مسلمان ہوتے ہوئے کیسے کرسکتے ہیں' مسلمان بھی ہیں اور شریعت کو انہوں نے اپنی زندگی سے بدر کیا ہوا ہے۔ اور یہ یقین پھر بھی کئے جارہے ہیں کہ وہ مسلم ہیں۔ یہ تعجب انگیز سوال اس لئے کیا جارہا ہے تاکہ مسلمان بھی سمجھ لیں کہ حقیقت دین کیا ہے۔ اور حقیقت اسلام کیا ہے۔ اس لئے کہ ایسا نہ ہو کہ وہ بھی اللہ کے ہاں اضحوکہ بن جائیں اور اس کی جانب سے ایسے سوال کا سامنا کرنا پڑے۔ اہل کتاب جو اسلام کے مدعی نہیں ہیں اگر ان کا حال یہ ہو گا اگر وہ کتاب اللہ کے مطابق اپنے فیصلے نہ کرائیں تو پھر اہل اسلام کیلئے لمحہ فکریہ ہے۔ کہ اگر وہ اپنے فیصلے اللہ کی کتاب اور شریعت کے مطابق نہیں کرتے تو وہ اللہ کی جانب سے کس قدر نکیر' استنکار' تعجب اور قابل نفرت اور مضحکہ خیزی کے مستحق ہوں گے۔ یہ ایک ایسا تعجب ہے جو رفع نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک عظیم مصیبت ہے جس کا اندازہ نہیں کیا گیا۔ اور یہ اللہ کا اسقدر عظیم غضب الٰہی کو دعوت دینا ہے جس کے نتیجے میں ایک مسلم غضب الٰہی کا مستحق ہوسکتا ہے اور راندۂ درگاہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور اللہ کی رحمت سے محروم بھی ہوسکتا ہے۔ العیاذ باللہ۔

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ

"ان کا یہ طرز عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ "کہ آتش دوزخ تو ہمیں مس تک نہ کرے گی اور اگر دوزخ کی سزا ہم کو ملے گی بھی تو بس چند روز" ان کے خود ساختہ عقیدوں نے ان کو اپنے دین کے معاملے میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال رکھا ہے۔"

یہ ہے ان کے اعراض کا اصل سبب' جس کی وجہ سے وہ کتاب اللہ کے مطابق اپنے فیصلے نہیں کراتے۔ اور ان کے موقف میں یہ تناقض ان کے اس دعوے کے باوجود ہے کہ وہ اہل کتاب ہیں' دراصل وہ قیامت کے دن کے حساب و کتاب کے بارے میں سنجیدہ ہی نہیں ہیں۔ یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن پورا پورا انصاف کریں گے۔ اس پر انہیں کوئی بھروسہ نہیں ہے اور یہ بات ان کے اس قول سے اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے کہ دوزخ کی آگ انہیں مس تک نہ کرے گی۔ اگر کوئی سزا ہوگی بھی تو وہ چند روزہ ہوگی۔ اگر یہ حقیقت نہیں تو پھر کیوں انہیں آگ نہیں چھوئے گی۔ اور ان کو چند روزہ سزا ہی کیوں ہوگی۔ وہ اصول الدین سے کیوں پھر گئے ہیں۔ وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیوں نہیں کراتے۔ اگر ان کا خدا کے عدل و انصاف پر یقین ہے تو پھر ان کا یہ موقف کیوں ہے؟ یہ ممکن نہیں ہے اگر انہیں یوم الآخرۃ کے حساب کا یقین ہوتا تو وہ ایسا ہرگز نہ کرتے۔ یہ دراصل وہ جھوٹ بولتے ہیں جس پر خود انہیں بھی یقین نہیں اور وہ اپنے ان خود ساختہ عقائد کے جال میں خود پھنس گئے ہیں وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ............
"ان کے خود ساختہ عقیدوں نے ان کو ان کے دین کے معاملے میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال دیا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی دل میں قیام قیامت کا صحیح عقیدہ موجود ہے تو وہ شخص قیامت کے دن کے حساب و کتاب اور اللہ کی جانب سے عدل و انصاف کے بارے میں وہ سوقیانہ تصورات نہیں اپنا سکتا جو یہ لوگ اپنائے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی معقول شخص کے دل و دماغ میں خوف آخرت' اللہ کے مقابلے میں حیادارانہ موقف ہونے کے بعد یہ بات آہی نہیں سکتی کہ اسے کتاب الٰہی کے مطابق فیصلے کیلئے بلایا جائے اور وہ انکار کردے یا اعراض کردے۔

آج ہمارے دور میں بھی مسلمانوں کی حالت ایسی ہی ہے جیسا کہ اہل کتاب کی تھی۔ آج کے مسلمان بھی بزعم خود مسلمان ہیں۔ اور جب انہیں یہ دعوت دی جاتی ہے کہ آؤ کتاب اللہ کے مطابق اپنے فیصلے کرائیں اور شریعت نافذ کر دیں تو وہ روگردانی کرتے ہوئے اس بات سے انکار کرتے ہیں۔ ان میں بعض کھاتے پیتے لوگ اس قدر بے حیا ہو گئے ہیں۔ زندگی دنیا کا نام ہے اور دنیا کے ساتھ دین کا تعلق کیا ہے۔ ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ لوگوں کی روزمرہ کی عملی اقتصادی اور اجتماعی روابط کے اندر دین کو گھسیڑنے کی ضرورت ہی کیا۔ بلکہ اب وہ کہتے ہیں کہ خاندانی زندگی میں بھی دین کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ان خیالات کے حامل ہونے کے بعد بھی وہ مسلسل یہ دعویٰ کئے چلے جا رہے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ اس کے بعد ان میں سے بعض اس احمقانہ دھوکے میں مبتلا ہیں کہ اللہ انہیں پاک وصاف کرنے کیلئے صرف چند روز تک آگ میں ڈالے گا۔ اس کے بعد وہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ مسلمان نہیں ہے۔ یہ بعینہ وہی توقع ہے جو بنی اسرائیل کے اہل کتاب کو لاحق تھی۔ یہ بھی وہی دھوکہ ہے جو اہل کتاب کو تھا اور دین اسلام میں اسکی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور یہ اہل اسلام بھی دین سے اسی طرح دور ہو گئے ہیں جس طرح اہل کتاب دور ہو گئے تھے۔ اور یہ لوگ دراصل دین سے اس طرح بسہولت نکل گئے ہیں جس طرح کسی کے ہاتھ سے مچھلی چھوٹ جاتی ہے۔ یہ اس حقیقت سے نکل گئے جسے اللہ نے پسند فرمایا تھا۔ اس لئے کہ اسلام سے مراد انقیاد اور اطاعت ہے۔ اور زندگی کے ہر شعبے میں اللہ سے ہدایت اور تعلیم لینے کا نام اسلام ہے۔

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ

"مگر کیا بنے گی ان پر جب ہم انہیں اس روز جمع کریں گے جس کا آنا یقینی ہے؟ اس روز ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ پورا پورا دیدیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہو گا" ............ کیا حال ہو گا؟ یہ ایک خوفناک دھمکی ہے۔ دل مومن کانپ اٹھتا ہے' وہ سنتے ہی محسوس کرتا ہے کہ وہ دن نہایت ہی خوفناک اور سنجیدہ ہو گا' اللہ کے سامنے پیشی کا دن ہو گا۔ اس دن صحیح عدل ہو گا۔ اس دن کا تصور اور اس کا صحیح شعور ان باطل تصورات اور انکے خود گھڑے ہوئے تصورات سے کوئی میل نہیں کھاتا۔ اس تہدید اور تخویف کے بعد یہ حکم قائم ہے۔ یہ مشرکین کیلئے بھی ہے' ملحدین کیلئے بھی دعوائے اسلام رکھنے والے اہل کتاب کیلئے بھی اور آج کے مسلمانوں کیلئے بھی جو اپنی زندگیوں میں اسلام کو صحیح طرح نافذ نہیں کرتے۔ ان لوگوں کا اس دن کیا حال ہو گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں اور جس میں ہم ان سب کو جمع کریں گے۔ اور جس دن اللہ تعالیٰ کا نظام عدل اپنے طریقوں پر چلے گا۔ اور ہر شخص کو اس کی کمائی کا صلہ مل جائے گا۔ پورا پورا بغیر کسی ظلم اور بغیر کسی لحاظ کے کسی پر کوئی زیادتی نہ ہو گی۔ گو اللہ کے حساب میں کوئی رورعایت ان سے نہ ہو گی۔......... آیت میں سوال کر دیا گیا ہے' لیکن اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا' دل کانپ اٹھے' بدن ہل گیا اور جواب از خود آنکھوں کے سامنے تھا۔

☆......☆......☆......☆......☆

اس کے بعد ہر مومن اور خود رسول خدا ﷺ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوں' اللہ کو اپنی الوہیت میں ایک سمجھتے ہوئے' اسے اس جہاں کا واحد نگہبان سمجھتے ہوئے' خود بشری زندگی میں بھی اور اس کائنات کی تدبیر میں بھی کیونکہ یہ دونوں پہلو اللہ کی خدائی اور اس کی حاکمیت کے مظاہر ہیں اور ان میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی مثل اور شبیہ ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَ

تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (۲۶) تُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ ۡ وَ تُخْرِجُ الْحَىَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَىِّ ۡ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۷)

"کہو خدایا' ملک کے مالک! تو جسے چاہے' حکومت دے اور جس سے چاہے' حکومت چھین لے' جسے چاہے' عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے' بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں' جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے اور بے جان میں سے جاندار کو' اور جسے چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے۔"

یہ نہایت ہی دھیمی اور پر مضمت آواز ہے۔ اس کی لفظی ترکیب کا دعائیہ ہے۔ لیکن اس کی روح میں گہری معنویت اور خشوع و خضوع ہے۔ اس میں اس کھلی کائنات کی کھلی کتاب پر نظر التفات ڈالی گئی ہے۔ بڑی نرمی اور بڑی محبت کے ساتھ انسان کے شعور میں ابال آتا ہے اس کو بتایا گیا ہے کہ وہ ذات باری مدبر کائنات ہے اور ساتھ ہی انسانی امور کا بھی مدبر ہے۔ اس کی ہمہ گیر تدبیر کو یکجا کر کے ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ عظیم سچائی یہ ہے کہ اس کائنات کا الٰہ اور نگہبان اور اس کے اندر اس انسان کا الٰہ و نگہبان ایک ہی ہیں۔ یہ انسان اس کائنات کا ایک حصہ ہے۔ وہ اس سے علیحدہ کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور دونوں میں اصل متصرف اللہ ہے۔ صرف اللہ کی نظام زندگی جس اس کائنات کی شان ہے۔ انسان کا فریضہ بھی یہی ہے۔ اور جس طرح یہ کائنات اللہ کے دین سے خارج نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح انسان کے لئے بھی دین الٰہی سے خارج ایک قسم کا انحراف ہے' حماقت ہے اور فساد ہے۔ اللہ فرماتے ہیں :۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ

"کہو اے ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے' چھین لے' جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے۔"

یہ وہ حقیقت ہے' جو عقیدہ وحدالوہیت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک خدا کا مفہوم یہ ہے کہ وہی ایک مالک ہے۔ وہ مالک الملک ہے۔ اس کے ساتھ اس میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی جانب سے جو کچھ چاہتا ہے اور جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اس کی یہ عطا عاریتاً ہوتی ہے جب چاہتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اپنا ملک واپس لے لیتا ہے۔ اس لئے یہاں کوئی کسی چیز کا بھی اصلی مالک نہیں ہے کہ اپنی ذاتی خواہش کے مطابق اس میں تصرف کرے۔ انسانوں کی ملکیت عارضی ہے۔ عطائی ہے۔ اور یہ ان شرائط و قیود کے تحت ہے جن کے تحت عطا کنندہ نے عطا کی ہے۔ اس کی تعلیمات کے تحت حکومت اور ملکیت میں تصرف ہو گا۔ اگر عطا کنندہ کے شرائط کے خلاف تصرف کیا گیا تو وہ باطل ہو گا۔ اس دنیا میں مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس قسم کے ہر تصرف کو مسترد کر دیں اور آخرت میں خود اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے حساب و کتاب لیں گے۔

نیز یہ اس کے اختیار میں ہے کہ وہ جسے چاہے عزت بخشے اور جسے چاہے ذلیل کردے۔ اس کے حکم اور ارادہ کی راہ میں کوئی رکاوٹ ڈالنے والا نہیں ہے۔ اس پر کسی کا کوئی جبر نہیں اور اس کے فیصلوں کو کوئی رد کرنیوالا بھی نہیں ہے۔ وہ صاحب الامر ہے۔ تمام امور اس کے ہاتھ میں ہیں۔ وہی اللہ ہے اور شرک سے پاک' اور اس کے اس اختصاص اور اس کبریائی میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اس نگہبانی میں سب کا بھلا ہے۔ وہ اس کائنات اور انسان کی نگہبانی انتہائی عدل کے اصولوں پر کرتا ہے۔ جسے چاہتا ہے مملکت اور سلطنت دیتا ہے۔ اور جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ اور یہ سب کچھ انصاف اور عدل کے ساتھ۔ جسے چاہتا ہے معزز بنادیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کردیتا ہے اور یہ سب کچھ عدل کے ساتھ۔ وہ ہر حالت میں خیر ہی خیر ہے۔ "اس کے ہاتھ میں بھلائی ہے۔" "وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔"

انسانی امور کی یہ نگہبانی اور انسانی معاملات کا بھلائی کے ساتھ یہ انتظام یہ سب کے سب اس کے اس عظیم اور عظیم تر کائنات کی تدبیر کا ایک حصہ ہے۔ اور اس وسیع اور عریض نظام حیات کا ایک پرتو وہ فرماتا ہے۔

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ

"تو رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں' جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے اور بے جان میں سے جاندار کو' اور جسے چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے۔"

اس عظیم حقیقت کو ایک تصویر کشی کے انداز میں بیان کیا گیا ہے' جس کی ایک جانب قلب و شعور خوشی سے بھر جاتے ہیں اور دوسری جانب حواس اور نظر بھی مزے لیتی ہے۔ ایک غیر محسوس باہم حرکت رات اور دن کی شکل اختیار کرتی ہے۔ رات دن میں بدلتی ہے اور دن رات میں پرو دیا جاتا ہے اور شب و روز سلسلہ تسبیح کے دانے نظر آتے ہیں' مردہ سے زندہ چیز نکل رہی ہے اور زندہ سے مردہ' اور یہ حرکت اور مسلسل حرکت بلاشبہ یہ بتارہی ہے کہ اس نظام میں خدائے حکیم کا ہاتھ ہے۔ جو شخص غور سے اور کان لگا کر سنے' اسے معلوم ہوگا کہ اس کائنات سے گہری صداقت پر مبنی آواز آرہی ہے۔

رات کو دن میں داخل کرنے اور دن کو رات میں داخل کرنے کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ گرمیوں میں رات کا ایک حصہ دن میں بدل جاتا ہے اور سردیوں میں دن کا حصہ رات بن جاتا ہے اور یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ رات کی تاریکی میں دن کی روشنی نفوذ کرتی ہے اور دن کی روشنی میں رات داخل ہوتی ہے' جو مفہوم بھی مراد ہو' لیکن اس منظر میں حسی طور پر نظر آتا ہے کہ دست قدرت ارض و سما کو حرکت دے رہا ہے اور یہ زمین جو ایک تاریک کرہ ہے وہ سورج کے روشن کرے کے سامنے اپنے محور پر گردان ہے۔ یوں تاریک حصہ روشن حصے سے بدلتا رہتا ہے اور روشن تاریک سے' یوں دھیرے دھیرے رات کی تاریکی دن کی روشنی کی طرف آرہی ہے۔ اور دن کی روشنی رات میں بدلتی ہے۔ آہستہ آہستہ رات لمبی ہوتی ہے اور دن کو کھاتی جاتی ہے اور اسی طرح غیر محسوس طور پر دن بڑا ہوتا ہے اور رات کو کھاتا جاتا ہے۔ اور یہ ایسی حرکت ہے جس کے بارے میں کوئی انسان یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کی تاہیں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ اور نہ ہی کوئی عقل مند یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ حرکت اتفاقاً کسی مدبر کی تدبیر کے بغیر ہی شروع ہوگئی۔

اسی طرح زندگی اور موت کا اعجوبہ بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ زندگی موت کی طرف بڑھتی ہے اور موت سے زندگی نمودار ہوتی ہے۔ اور یہ کام بڑے آرام اور بڑے سکون سے ہوتا ہے۔ ایک زندہ مخلوق پر جو لمحہ بھی گزرتا ہے' اس میں زندگی کے

ساتھ اس پر موت بھی طاری ہوتی رہتی ہے۔ اور اس کی زندگی کو موت کھاتی جاتی ہے۔ اور اس سے پھر حیات نمودار ہوتی ہے۔ ایک زندہ چیز سے خلئے مرتے جاتے ہیں اور ختم ہوتے جاتے ہیں۔ اور ان کی جگہ جدید خلئے پیدا ہوتے ہیں اور کام کرتے ہیں۔ اور جو خلئے مرجاتے ہیں وہ دوسرے دورے میں دوبارہ زندہ ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے جو زندہ ہوگئے وہ دوسرے دورے میں پھر مرجاتے ہیں۔ یہ حالت تو ہے ایک زندہ کے جسم کی۔ اب موت کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور یہ تمام زندہ مرجاتا ہے' لیکن اس کے خلئے ذرات کی شکل اختیار کرلیتے ہیں جو دوسری ترکیب میں آتے ہیں اور دوسرے زندہ جسم میں آتے ہیں اور یہ زندگی اس میں داخل ہوتی ہے۔ یوں رات اور دن یہ دورہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ اور کوئی انسان یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ خود ان زندہ مخلوقات میں سے کوئی مخلوق تیار کرسکتا ہے۔ اور نہ ہی کوئی اس بات پر یقین کرسکتا ہے کہ موت و حیات کا یہ نظام از خود اتفاقاً اور مصادفتہً قائم ہوگیا ہے۔

اس پوری کائنات میں ایک حرکت جاری ہے اور ہر موجود کے جسم کے اندر ایک حرکت جاری ہے۔ یہ ایک عظیم حرکت ہے مگر نہایت ہی خفیہ' نہایت ہی گہری اور نہایت ہی لطیف' قرآن کا یہ مختصر اشارہ اس مسلسل ذات کا انکشاف کرتا ہے انسان کے دل و دماغ کو ایک اشارہ دیا جاتا ہے اور اس حرکت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ قادر ہے' از سرنو پیدا کرنے والا ہے۔ اور مدبر ہے' کوئی شخص بھی یہ سعی نہیں کرسکتا کہ وہ اپنی کسی بھی تدبیر اور بہبود میں اللہ تعالیٰ سے علیحدہ ہوجائیں جو لطیف اور مدبر ہے۔ اور کس طرح وہ اپنے لئے از خود کوئی نظام تجویز کرسکتے ہیں۔ جو خود ان کی اپنی خواہش نفس پر مبنی ہوں' اس لئے کہ وہ اس کائنات کا حصہ ہیں اور اس کائنات کی تنظیم وہ حکیم و خبیر ہی کر رہا ہے۔

پھر وہ کس طرح ایک دوسرے کو غلام اور بندے بناسکتے ہیں اور کیا جواز ہے کہ بعض لوگ دوسرے کے لئے رب اور الٰہ بن جائیں۔ حالانکہ سب کا روزی رساں اللہ ہے۔ اور سب لوگ اللہ کے عیال ہیں۔ فرماتے ہیں

وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ .................. "اور تو جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے۔"

یہ ایک آخری ٹچ ہے اور اس سے انسانی دل پر حقیقت کبریٰ منکشف ہوجاتی ہے۔ وہ کون سی حقیقت ہے؟ یہ کہ اللہ ایک ہی ہے یعنی اللہ' وہی ایک اس کائنات کا نگہبان ہے۔ وہی ایک ذات ہے جو فعال ہے۔ وہ ایک ہی ہے جو مدبر ہے' وہی ایک مالک ہے' وہی مدبر ہے۔ وہی داتا ہے' اور دین بھی اسی کا ہے۔ وہی مالک الملک ہے' وہی معز اور مذل ہے۔ وہی زندہ کرنیوالا اور مارنیوالا ہے۔ وہی دینے والا اور لینے والا ہے۔ وہی اس کائنات کا مدبر ہے جو نظام عدل پر تدبیر کرتا ہے وہی ہے جو بھلائی ہی بھلائی ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆

اس سے پہلے' اہل کتاب کے موقف پر جو استنکار اور تنبیہہ کی گئی تھی' یہ آخری تبصرہ بھی اس کی تائید مزید ہے۔ پہلے اہل کتاب کے اس رویے کی مذمت کی گئی تھی۔ کہ انہیں جب اس بات کی طرف بلایا جاتا ہے کہ آؤ اپنے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کریں تو وہ اس بات سے بھی اعراض کرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں سمجھایا گیا تھا کہ کتاب اللہ اسی نظام زندگی پر مشتمل ہے۔ جو اللہ نے اپنے بندوں کیلئے اتارا اور یہ پوری کائنات بھی منہاج الٰہی کے مطابق رواں اور دواں ہے۔ جس میں خود انسان بھی شامل ہے۔ یہ اس بات کی تمہید تھی جو آگے آرہی ہے کہ مومنین کیلئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اہل ایمان کے مقابلے میں کافروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم' اس لئے کہ کافروں کی اس کائنات میں کوئی قوت نہیں ہے۔ نہ ان کا یہاں اختیار چلتا ہے' یہاں تو تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور اللہ ہی اہل ایمان کا ولی و مددگار ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُونِ
الْمُؤْمِنِينَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللهِ فِي شَيْءٍ إِلَّآ أَنْ تَتَّقُوا
مِنْهُمْ تُقٰىةً ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللهُ نَفْسَهُ ۗ وَإِلَى اللهِ الْمَصِيرُ ﴿۲۸﴾ قُلْ إِنْ
تُخْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ اللهُ ۗ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ
مَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَاللهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا
عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚۖ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَ
۳ ع ۱۰ ۱۱ بَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللهُ نَفْسَهُ ۗ وَاللهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾

"مومنین' اہل ایمان کو چھوڑ کر' کافروں کو اپنا رفیق اور دوست ہرگز نہ بنائیں۔ جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کیلئے بظاہر ایسا طرز عمل اختیار کر جاؤ مگر اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور تمہیں اس کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ اے نبی لوگوں کو خبردار کر دو کہ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے خواہ تم چھپاؤ' یا ظاہر کرو' اللہ بہرحال اسے جانتا ہے۔ زمین و آسمان کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں اور اس کا اقتدار ہر چیز پر حاوی ہے۔ وہ دن آنے والا ہے جب ہر نفس اپنے کیے کا پھل پائے گا۔ خواہ اس نے بھلائی کی ہو یا برائی' اس روز آدمی یہ تمنا کرے گا کہ کاش ابھی یہ دن اس سے دور ہوتا' اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور اپنے بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے۔"

سابقہ آیت میں قرآن کریم نے اہل ایمان کے اس شعور کو بیدار کیا تھا کہ تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں' ہر قسم کی قوتوں کا مالک وہ ہے۔ تمام تدابیر وہ اختیار کرتا ہے اور رزق صرف اس کے ہاتھ میں' تو اب یہاں سمجھایا جاتا ہے کہ اہل ایمان پھر کس غرض کیلئے کافروں کے ساتھ دوستیاں قائم کرتے ہیں۔ قلب مومن میں یہ دو متضاد امور کس طرح جمع ہو سکتے ہیں۔ ایک طرف خدا پر ایمان اور خدا سے محبت دوسری جانب خدا کے دشمنوں سے محبت جن کا حال یہ ہے کہ جب انہیں خدا کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ اس کے مطابق فیصلے کئے جائیں تو وہ اس سے اعراض کرتے ہیں۔ اس لئے یہاں یہ شدید دھمکی دی گئی کہ اگر مومن ایسے لوگوں سے محبت کرتا ہے جو کتاب اللہ اور شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تو ان کا ایمان خطرے میں ہے۔ کفار کے ساتھ دوستی مختلف شکلوں میں ممکن ہے۔ دل سے محبت کرے' ان کی مدد کرے یا ان سے مدد مانگے یہ سب موالاۃ الکفار ہے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ
مِنَ اللهِ فِي شَيْءٍ

"مومنین' اہل ایمان کو چھوڑ کر' کافروں کو اپنا رفیق اور دوست ہرگز نہ بنائیں۔ جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔"

بالکل یونہی 'وہ اللہ کے نزدیک کچھ نہیں ہے۔ اس کا اللہ کے ساتھ نہ تعلق ہے اور نہ نسبت ہے۔ نہ وہ اللہ کے دین پر ہے اور نہ عقیدے پر' نہ اس کا اللہ سے ربط ہے اور نہ دوستی۔ یہ شخص اللہ سے دور ہے۔ وہ ہر چیز سے غیر متعلق ہو گیا ہے' جس کے ذریعہ کوئی بھی تعلق قائم ہوا کرتا ہے۔ ہاں یہاں بعض غیر معمولی حالات میں استثناء رکھی جاتی ہے۔ بعض ممالک ایسے ہو سکتے ہیں جہاں بامر مجبوری ایسے تعلقات رکھنے پڑتے ہیں۔ لیکن ان حالات اور علاقوں میں بھی صرف زبانی تقیہ جائز ہے۔ یہ جائز نہیں ہے کہ انسان دل سے اہل کفر کے ساتھ محبت کرے یا گہرے تعلقات قائم کرے۔ حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں تقیہ کا تعلق عمل سے نہیں ہوتا' تقیہ صرف زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے جس تقیہ کی اجازت دی گئی اس میں یہ نہیں ہوتا کہ اہل ایمان اور کفار کے درمیان تعلقات قائم ہوں۔ اور اس سیاق میں کافر کا لفظ اس شخص کیلئے استعمال ہوا ہے جو شخص کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرنے سے روگردانی کرتا ہے۔ یعنی پوری زندگی میں' یہاں تو یہ بات ضمناً کہی گئی مگر دوسری جگہ قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ ایسے لوگوں کے لئے الکافرون کا لفظ استعمال کیا ہے۔ نیز تقیہ میں یہ بات بھی شامل نہیں ہے کہ ایک مسلمان کسی بھی صورت میں اہل کفر کے ساتھ عملی تعاون کرے۔ اللہ کے ساتھ اس قسم کا کوئی دھوکہ نہیں کیا جاسکتا۔

ولایت اور محبت چونکہ دلوں کا کام ہے۔ انسانی ضمیر اور شعور کے ساتھ اس کا تعلق ہوتا ہے اور جذبہ خدا خوفی اور تقویٰ ان جرم سے باز رکھ سکتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ایک عجیب انداز میں اپنے غضب اور اپنے قہرانہ انتقام سے ڈرایا ہے۔ وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ "اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔" "اور اسی کی طرف تمہیں آنا ہے۔ اور یہ تخویف اور ڈراوا مزید آگے بڑھ کر دلوں کو چھوتا ہے' ان کی توجہ اس طرف مبذول کرتا ہے دیکھو تم اللہ کی نظروں میں ہو۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

"اے نبی لوگوں کو خبردار کر دو کہ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے خواہ تم چھپاؤ' یا ظاہر کرو' اللہ بہرحال اسے جانتا ہے۔ زمین و آسمان کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے اور اس کا اقتدار اور ہر چیز پر حاوی ہے۔"

تہدید اور ڈراوے کی یہ انتہاء ہے۔ خدا خوفی کو ہوش میں لایا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے انتقام سے اپنے آپ کو بچاؤ' اللہ کے پاس علم و قدرت کے دور رس وسائل ہیں۔ اس سے بچ نکلنے کی کوئی جگہ نہیں ہے اور اسکے مقابلے میں کوئی مددگار نہ ہو گا۔

یہ تہدید اور ڈراوا مزید آگے بڑھتا ہے اور دلوں کی گہرائیوں کو چھوتا ہے' اب اس خوفناک دن کو یادوں کے پردے پر لایا جاتا ہے۔ جس میں ہر عمل اور ہر نیت پیش ہو گی' اور اس دن ہر شخص کا مکمل سرمایہ اس کے سامنے ہو گا۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖۚ وَّ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَ بَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ؕ

"وہ دن آنے والا ہے جب ہر نفس اپنے کئے کا پھل حاضر پائے گا۔ خواہ اس نے بھلائی کی ہو یا برائی' اس روز آدمی یہ تمنا کرے گا کہ کاش ابھی یہ دن اس سے دور ہوتا۔"

یہ ایک ایسا خطاب ہے' جو قلب انسانی کی گہرائیوں تک اترتا چلا جاتا ہے' انسان کا کل سرمایہ اس کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور اسے یاد دلایا جاتا ہے کہ ایک دن وہ بذات خود اپنے اس سرمایہ کے سامنے کھڑا ہو گا اور وہ پسند کرے گا اس کا یہ سرمایہ اس سے دور ہوتا لیکن

افسوس کی اس کی یہ خواہش ہرگز پوری نہ ہو سکے گی۔ یا وہ یہ خواہش کرے گا کہ یہ دن ہی نہ آتا لیکن وہ تو آگیا ہے۔ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ پکڑا گیا ہے۔ اب کوئی چھٹکارا نہیں ہے۔ اب کوئی جائے فرار نہیں ہے!

اور یہ کلام عالی مقام قلب بشری پر مزید حملے جاری رکھتا ہے' اب اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنی ذات ہیبت مآل سے ڈراتا ہے۔

وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ........................ "اور اللہ اب تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔

"...... لیکن آخر میں اللہ تعالیٰ اس خوفناک ماحول میں بھی بندے اپنی رحمت کی کرن بھی دکھاتا ہے اور یہ اشارہ کرتا ہے کہ ابھی فرصت باقی ہے وقت ختم نہیں ہوگیا۔ واللہ رؤف بالعباد "اور اللہ اپنے بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے۔" اور اللہ کی جانب سے قبل از وقت یہ تحذیر اور ڈراوا بھی اس کی مہربانی ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ اپنے بندوں کی بھلائی چاہتا ہے۔

اہل ایمان اور کفار کے درمیان دوستی کے تعلق کے خلاف یہ عظیم حملہ' یہ ہمہ جہت حملہ' جس کے اندر مختلف قسم کے مفید اشارے' ہدایات اور نصیحتیں پائی جاتی ہیں۔ اس کی ضرورت اس موقع پر کیوں پیش آئی' اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اس دور میں اسلامی کیمپ اور اس کے اردگرد پھیلے ہوئے مخالف کیمپ میں' لوگوں کے درمیان رشتہ داری' معاشی اور معاشرتی تعلقات موجود تھے۔ جماعت مسلمہ کے افراد کے تعلقات اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے قائم تھے۔ یہ تعلقات مکہ کے لوگوں کے ساتھ بھی تھے۔ اور مدینہ کے اردگرد یہودیوں کے ساتھ بھی قائم تھے۔ ان تعلقات کی اساس رشتہ داری یا تجارت پر تھی۔ جبکہ اسلام یہ چاہتا تھا کہ اس کے اس جدید معاشرے میں لوگوں کے باہمی تعلقات صرف نظریۂ حیات کی اساس پر ہوں۔ اس نظام زندگی کی اساس پر جو اس نظریۂ حیات سے تشکیل پایا ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں اسلام کسی قسم کی کمزوری یا نرمی ہرگز برداشت نہیں کرتا۔

نیز اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے' انسانی دل و دماغ اور اس کی فکر و نظر ہروقت اس بات کی محتاج ہے وہ ان مشکلات اور رکاوٹوں سے آزادی حاصل کرے اور ان بندھنوں کو توڑ دے جو اسلامی نظام اور اللہ کی راہ کی طرف آنے میں حائل ہوں۔........

ہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اسلام اپنے دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک سے منع نہیں کرتا۔ اگرچہ وہ اس کے دین کے دشمن ہوں۔ اس لئے کہ حسن سلوک اور حسن معاملہ ایک الگ چیز ہے اور ولاء اور دوستی ایک الگ معاملہ ہے۔ دوستی میں باہم محبت ہوتی ہے' ایک دوسرے کی امداد اور نصرت ہوتی ہے۔ اور یہ کام وہ دل ہرگز نہیں کر سکتا جو مومن ہے۔ ایک مومن صرف مومنین کے ساتھ دوستی کر سکتا ہے جو رابطہ ایمان میں منسلک ہیں۔ اور جو اسلامی نظام زندگی میں باہم رفیق ہیں اور جو لوگ شریعت نافذ کرتے اور اس کے سامنے جھکتے ہیں۔

☆......☆......☆......☆......☆

سب سے آخر میں اس سبق کا اختتامیہ ایک فیصلہ کن انداز میں سامنے آتا ہے۔ اور وہ اس مسئلے کو فیصلہ کن انداز میں پیش کرتا ہے اور یہ مسئلہ وہی ہے جس کے اردگرد یہ پوری سورت گھوم رہی ہے۔ یہ اختتامیہ فیصلہ کن اور مختصر انداز میں حقیقت ایمان اور حقیقت دین کو بیان کر دیتا ہے اور ایمان اور کفر کے درمیان ایک حد فاصل قائم کر دی جاتی ہے۔ یہ حد اس قدر واضح ہے کہ اب کسی کو کوئی غلط فہمی پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ

اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

"اے نبی لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو' اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنیوالا اور رحیم ہے۔ کہو کہ "اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کرلو۔" پھر اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول نہ کریں تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے جو اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے سے انکار کرتے ہوں۔"

اللہ کی محبت صرف زبانی دعویٰ نہیں ہے اور نہ وہ کوئی وجدانی امر ہے۔ اس کے ساتھ رسول خدا ﷺ کا اتباع ضروری ہے۔ آپ کی سیرت اور نقش قدم پر چلنا ضروری ہے۔ اپنی زندگی میں اسلامی نظام رائج کرنا ضروری ہے۔ ایمان صرف چند کلمات ادا کرنے کا نام نہیں ہے۔ نہ یہ شعور اور جذبات سے عبارت ہے۔ نہ وہ صرف چند شعائر کے قیام کا نام ہے۔ بلکہ ایمان اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا نام ہے۔ اور اس منہاج پر عمل کا نام جس کے حامل رسول خدا ہیں۔

پہلی آیت کی تفسیر میں امام ابن کثیر فرماتے ہیں "یہ آیت ہر اس شخص کے کیس کا فیصلہ کر دیتی ہے جو اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اس کا سلوک طریقہ محمدیہ پر نہیں ہے۔ یہ شخص فی الحقیقت جھوٹا ہے۔ یہاں تک کہ وہ شریعت محمدیہ کی اطاعت کرے۔ اور اپنے تمام اقوال اور اعمال میں دین محمدی کی اطاعت کرے۔ جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول خدا ﷺ سے ثابت ہے۔ "جس شخص نے جو عمل کیا' جو ہمارے کام کے مطابق نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔"

"اور دوسری آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا............ "کہہ دو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو بس اگر وہ منہ پھیر دیں۔"......... اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے طریقے کی مخالفت کفر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے اوصاف والے شخص سے محبت ہرگز نہیں کرتا۔ اگرچہ ایسا شخص یہ دعویٰ کرے یا یہ یقین کرے کہ وہ محبِ اللہ ہے۔"

امام شمس الدین ابو محمد' ابن قیم الجوزیہ اپنی کتاب زاد المعاد میں فرماتے ہیں۔ "جو شخص کتب سیرت اور ثابت شدہ احادیث پر غور کرے گا اسے معلوم ہو گا بے شمار اہل کتاب اور مشرکین ایسے ہیں جو حضور ﷺ کی صداقت اور حقانیت کی شہادت دیتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ شہادت انہیں اسلام میں داخل نہیں کرتی۔ تو معلوم ہوا کہ اسلام اس سے کہیں زیادہ کوئی اور چیز ہے۔ اسلام صرف علم اور معرفت کا نام نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ معرفت اور اقرار سے عبارت ہے۔ بلکہ اسلام عبارت ہے 'معرفت' اقرار اور اطاعت تینوں سے۔ یہ انقیاد اور طاعت ظاہری امور میں بھی لازمی ہے اور باطنی امور میں بھی۔"

دین اسلام کی ایک حقیقت اور ماہیت ہے اور جب تک وہ حقیقت اور ماہیت موجود نہ ہوگی دین نہ ہو گا۔ اور وہ حقیقت صرف رسول اللہ ﷺ کا اتباع ہے۔ شریعت کا اتباع ہے۔ کتاب اللہ کے مطابق عدالتی نظام کا قیام ہے۔ اور یہ حقیقت عقیدۂ توحید سے پھوٹ کر نکلتی ہے۔ جس طرح اس عقیدے کی تشریح اسلام نے کی ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ اپنی ذات میں واحد لاشریک ہے۔ اس کا حق ہے کہ لوگ پوری طرح اس کے غلام اور بندے ہوں' وہ اللہ کے احکام نافذ کرنے والے ہوں۔ ان میں شریعت الٰہیہ نافذ ہو اور وہ ایسی اقدار قائم کریں جن کے مطابق لوگ اپنے فیصلے کریں اور پھر ان پر راضی ہوں۔ اس عقیدے کی رو سے اللہ واحد نگہبان ہے۔ اس لئے وہی حاکم ہے اور لوگوں کے درمیان تمام اجتماعی تعلقات اس حاکمیت کی اساس پر قائم ہوں' جس طرح اس پوری کائنات کا نظام اس کے قانون قدرت

کے مطابق رواں دواں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انسان بھی اس کائنات کا ایک جزء ہے۔

جیسا کہ ہم نے تفصیل سے مطالعہ کیا اس سورت کا پہلا سبق بالکل وضاحت اور صاف ستھرے طریقے سے اس بات کا فیصلہ کر دیتا ہے کہ اللہ کے نزدیک مقبول نظام زندگی صرف اسلام ہے۔ اس سے فرار اور جان چھڑانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جو شخص بھی مسلمان بننا چاہتا ہے اسے یہ حقیقت تسلیم کرنا ہوگی۔ اسلام کی یہی صورت ہے' وہ صورت نہیں ہے جو آج کل لوگوں نے اپنے لئے خود گھڑ رکھی ہے۔ وہ محض اوہام ہیں' محض خرافات ہیں۔

O.........O.........O.........O.........O

# درس ۲۴ ایک نظر میں

بعض وہ روایات' جن میں حضور اکرم ﷺ اور وفد نجران کے درمیان مناظرے کا بیان آیا ہے۔ یہ کہتی ہیں کہ اس سورت میں جن قصوں کا ذکر ہوا ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کی ولادت' ان کی والدہ کی ولادت' حضرت یحییٰ اور دوسرے واقعات' ان شبہات کے رد میں نازل ہوئے۔ جن کو لیکر یہ وفد آیا تھا۔ اور ان لوگوں کے شبہات کی عمارت قرآن کریم کی اس آیت پر کھڑی کی گئی تھی جس میں کہا گیا کہ حضرت عیسیٰ كَلِمَةُ اللهِ .................. ہیں جو مریم کی طرف آیا اور وہ "اس کا روح" ہیں نیز سورت مریم میں جن امور کا ذکر نہ ہوا تھا انہوں نے اس کے بارے میں بھی حضور سے جواب طلب کیا تھا۔

یہ بات درست بھی ہو سکتی ہے' لیکن اس سورت میں جس طرح ان قصوں کو لایا گیا ہے وہ بعینہٖ اسی طریقہ پر ہے جس طرح قرآن کریم قصوں کو لاتا ہے۔ یعنی کچھ حقائق پیش نظر ہوتے ہیں۔ اور ان قصوں کے ذریعے قرآن کریم ان حقائق کو ذہن نشین کرتا ہے اور وہ حقائق دراصل پوری سورت کا موضوع سخن ہوتے ہیں' جو اس موضوع کے اردگرد گھومتے ہیں۔ اور قصوں کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ خود بخود ان سے وہ حقائق ظاہر ہوتے ہیں اور ذہن نشین ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور وہ حقائق زندہ حقائق بن جاتے ہیں اور یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ بعض حقائق اور تصورات کے قصوں کے ذریعے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ذہن نشین کر دیا جاتا ہے' انسان پر ان کا گہرا اثر ہوتا ہے اور وہ زندہ صورت میں نظر آتے ہیں۔ وہ حقائق انسان کی زندگی میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جس طرح اسکرین پر کردار ہوتے ہیں۔ محض فلسفیانہ اور تجریدی انداز بیان کے مقابلے میں حکایتی انداز بیان بہت ہی موثر ہوتا ہے۔

اگر غور کریں تو ان قصوں سے بھی وہ حقائق اچھی طرح کھل کر سامنے آتے ہیں جو اس سورت کا موضوع ہیں اور یہ سورت ان حقائق پر مرکوز ہے۔ اور جن خطوط پر اس میں بحث ہو رہی ہے اسی پر یہ قصے چلتے ہیں۔ اس لئے ان قصوں میں' ان کے شان نزول کا کوئی مخصوص واقعہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ قصوں سے وہ واقعات لئے گئے ہیں جو اصل واقعات ہیں اور جن سے اسلام کا نظریاتی پہلو اچھی طرح واضح ہوتا ہے۔

اس سورت کا اصل مسئلہ جس طرح کہ ہم اس سے پہلے کہہ آئے ہیں۔ عقیدۂ توحید ہے۔ یہ کہ اللہ اپنی ذات میں ایک ہے اور اس کے سوا کوئی الٰہ موجود نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ واحد نگہبان ہے اور اس جہاں کو وہ چلانے والا ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ اور دوسرے وہ قصص جو اس کی تکمیل میں یہاں لائے گئے ہیں وہ اس عقیدۂ توحید کو اچھی طرح ثابت کرتے ہیں۔ یہ قصص اللہ کیلئے اولاد کے تصور کی نفی کرتے ہیں' اس لئے شرک کے تصور کو رد کرتے ہیں۔ وہ ان تصورات کو بعید از قیاس اور بعید از فہم بتاتے ہیں۔ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس قسم کے شبہات غلط ہیں۔ اور ایسے تصورات کھوٹے تصورات ہیں۔ اس لئے حضرت مریم کی پیدائش کے واقعات کھول کر بیان کئے جاتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کی تصویر کھینچی جاتی ہے اور متعلقہ واقعات دیئے جاتے ہیں۔ یہ واقعات اس انداز میں لائے جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کے ذہن میں اس کی بشریت کے بارے میں کوئی شبہ ہی نہیں رہتا۔ اور پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ اسی طرح رسول ہیں جس طرح دوسرے رسول گزرے ہیں۔ ان کا وہی مقام ہے جو ان رسولوں کا تھا۔ ان کی طبعی حقیقت بھی وہی ہے جو ان رسولوں کی تھی' یہ قصص حضرت عیسیٰ کی اور غیر معمولی پیدائش کے خارق العادت واقعہ کی ایسی تعبیر اور ایسی تشریح کرتے ہیں کہ جس سے اس اعجوبے کی دل لگتی تعبیر سامنے آجاتی ہے۔ جس میں کوئی پیچیدگی اور کوئی لاینحل عقدہ نہیں رہتا۔ اور اس تعبیر پر دل و دماغ بالکل مطمئن ہو

جاتے ہیں اور یہ معاملہ ایک عام اور عادی معاملہ بن جاتا ہے اس میں کوئی بات خارق العادت نظر نہیں آتی اور قصے کے آخر میں جو اختتامیہ آتا ہے وہ قابل غور ہے۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ

"بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی پیدائش آدم کی طرح تھی۔ اس کو اللہ نے مٹی سے بنایا اور پھر اس کو کہا ہو جا تو ہو گیا۔"

یوں دل کو یقین اور سکون نصیب ہو گیا۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس قدر سادہ حقیقت کے بارے میں کیونکر شبہات پیدا ہو گئے۔

اس سورت میں جو دوسرا اہم مسئلہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ یہ دوسرا مسئلہ بھی پہلے مسئلے یعنی عقیدۂ توحید پر مبنی ہے۔ یعنی دین اسلام ہے اور اسلام کا مفہوم اتباع اور انقیاد ہے۔ یہ بات بھی ان قصص کے اندر بڑی وضاحت سے بیان کی گئی ہے۔ حضرت عیسیٰ ﷺ بنی اسرائیل سے کہتے ہیں "میں اپنے سے پہلے نازل ہونیوالی کتاب تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور اس لئے کہ میں حلال کروں بعض ان اشیاء کو جو تم پر حرام قرار دی گئی تھیں۔" اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالت کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ رسول دراصل بھیجا ہی اس لئے جاتا ہے کہ وہ لوگوں کیلئے نظام زندگی تجویز کرے۔ ان کیلئے حلال و حرام کا ضابطہ وضع کرے تاکہ اہل ایمان اسے تسلیم کریں اور اطاعت کریں۔ اس کے بعد حواریوں کی زبانی بھی اسی مفہوم کی تائید کی گئی۔ "جب عیسیٰ علیہ السلام نے محسوس کیا کہ یہ لوگ کفر پر کمربستہ ہو گئے ہیں" تو آپ نے کہا: کون ہے میری مدد کرنیوالا اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے کہا: "ہم ہیں اللہ کے مددگار ہم اللہ پر ایمان لائے' آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے اتارا ہے اور ہم رسول کے مطیع فرمان ہو گئے ہیں۔ ہمیں بھی آپ گواہوں میں لکھ دیجئے۔"

اس سورت کا ایک اہم موضوع یہ تھا کہ اہل ایمان اور ان کے خدا کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ ان قصص میں تعلق باللہ پر بھی کافی بات ہوئی ہے۔ ان قصوں میں ان برگزیدہ ہستیوں کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ جنہیں اللہ نے چن لیا تھا' اور ان میں سے بعض دوسروں کی اولاد تھے۔ ان قصوں میں بیگم عمران کے قصے میں تعلق باللہ کے موضوع پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ اپنی بچی کے بارے میں اپنے رب سے یوں مخاطب ہوتی ہے جیسے اسے دیکھ رہی ہو' اسی طرح حضرت مریم سے حضرت زکریا ﷺ کا مکالمہ' حضرت زکریا کا اپنے رب کے جناب میں عاجزانہ دعا اور التجاء' پھر حواریوں کا اپنے نبی کو لبیک کہنا اور پھر اللہ تعالیٰ سے ملتجی ہونا' یوں ان قصوں میں تعلق باللہ کے زندہ مناظر نظر آتے ہیں۔

جب یہ قصص ختم ہوتے ہیں تو ان پر ایک ایسا اختتامیہ آتا ہے جس میں یہ تمام حقائق دہرا دیئے گئے ہیں جن کے لئے یہ قصص لائے گئے تھے۔ اور ان حقائق کو خلاصہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اس خلاصے میں عیسیٰ ﷺ کی حقیقت بیان ہوتی ہے۔ مخلوق کا مزاج اور تخلیق میں ارادۂ الٰہیہ کے دخل کے بارے میں حقائق بیان ہوئے ہیں۔ یہ بیان خالص وجدانی بیان ہے۔ اہل کتاب کو ان حقائق کے تسلیم کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور ان کو پھر دعوت مباہلہ دی گئی۔

اس سبق کے آخر میں پھر ایک جامع اور مانع بیان دیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ آپ عام اہل کتاب کو اس حقیقت کی طرف دعوت دیں' چاہے وہ مناظرہ کے لئے آئے ہوں یا نہ آئے ہوں۔ جو اس وقت موجود تھے یا جو آج کے بعد کے ادوار میں موجود ہیں۔ قُلْ

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ

کہو' "اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں' اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔" اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو' ہم تو مسلم ہیں۔" (۳:۶۴)

یہاں یہ مباحث ختم ہو جاتا ہے' اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام لوگوں سے کیا مطالبات کرتا ہے۔ وہ زندگی کے کیا قواعد وضع کرتا ہے۔ یہاں دین اور اسلام کا مفہوم بتایا جاتا ہے۔ ہر وہ بعدی صورت صاف ہو جاتی ہے اور وہ تحریف شدہ نظام چھٹ کر رہ جاتا ہے۔ جس کے بارے میں اس کے ماننے والوں کا دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ اسلام ہے۔ اور وہ دین ہے حالانکہ وہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ غرض اس سبق کا یہ اصل موضوع تھا اور یہی موضوع اس سورت کا بھی موضوع تھا۔ جسے ان قصص نے بیان کیا ایک دلکش اور دلچسپ کہانی کی شکل میں' جس میں گہرے اشارے موجود تھے۔ قرآن میں قصص کے بیان کی غرض وغایت ہی یہ ہے۔ اس غرض وغایت کے لئے یہ قصے مناسب اسلوب میں آتے ہیں۔ اور مختلف سورتوں میں ان قصص کو اسی خاص اسلوب میں لایا گیا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کا قصہ سورت مریم میں بھی بیان ہوا ہے۔ اور یہاں بھی یہ قصہ بیان ہوا ہے۔ یہاں اور وہاں دونوں جگہ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کے بعض حصوں کو مختصر بیان کیا گیا اور بعض تفصیلات دی گئی ہیں۔ مثلاً سورت مریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے حصے کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے' جبکہ حضرت مریم کی ولادت کا ذکر وہاں نہیں تھا۔ یہاں حواریوں کے ساتھ مفصل کلام' اور ولادت کا حصہ مختصر ہے۔ جبکہ یہاں اختتامیہ بہت ہی طویل ہے۔ اس لئے کہ یہاں جن موضوعات پر مباحثہ تھا وہ موضوعات بہت ہی اہم تھے۔ مثلاً عقیدۂ توحید' دین کا صحیح تصور' وحی الہٰی اور رسالت کا تصور جبکہ یہ مسائل سورت مریم میں زیر بحث نہ تھے۔ ان نکات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیان قصص میں قرآن کا اسلوب کیا ہے۔ یہ اسلوب ہمیشہ سورت کے موضوعات کے پیش نظر طے ہوتا ہے۔ ۱

☆ ☆ ☆

۱۔ دیکھئے "التصویر الفنی فی القرآن" فصل القصہ

# درس نمبر۲۴ تشریح آیات

## آیات ۳۳ تا ۶۴

اب ہم آیات پر بحث کریں گے۔ اس قصے کا آغاز ان لوگوں فہرست سے ہوتا ہے جو برگزیدہ تھے اور جنہیں اللہ نے بار رسالت کے اٹھانے کیلئے چن لیا تھا۔ ابتدائے آفرینش سے یہ رسالت ایک تھی اور جس دین کو پیش کیا گیا وہ بھی ایک ہی دین تھا۔ ان لوگوں کا انتخاب اس لئے ہوا تاکہ وہ اقوام اور ازمنہ کی طویل ترین انسانی تاریخ میں قافلہ ایمان کے سالار رہوں' اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ ایک ہی سلسلے کے تھے اور جو ایک دوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ان لوگوں کا نسب نامہ طبعی طور ملتا ہو اور وہ ایک دوسرے کی نسبی ذریت ہوں۔ (اگرچہ ان سب کا نسب نامہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت آدم علیہ السلام پر جاکر ملتا تھا۔) ان کا حقیقی نسب نامہ تو یہ ہے کہ ان سب کو اللہ تعالیٰ نے منتخب اور مختار بنالیا تھا' اور ان کا نسب نامہ ایک نظریاتی نسب نامہ تھا جس کے مطابق یہ قافلہ ایمانی چل رہا تھا۔

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٣٣﴾ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾

"اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر (رسالت کیلئے) منتخب کیا تھا۔ یہ ایک سلسلے کے لوگ تھے' جو ایک دوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے تھے۔ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

سیاق کلام میں حضرت آدم اور حضرت نوح کو بطور فرد گنوایا ہے۔ لیکن حضرت ابراہیم اور عمران کے خاندانوں کا ذکر کیا گیا۔ اس میں اشارہ یہ ہے کہ حضرت آدم اپنی ذاتی حیثیت اور حضرت نوح اپنی ذاتی حیثیت میں قابل احترام اور برگزیدہ تھے۔ لیکن حضرت ابراہیم اور حضرت عمران کی اولاد بھی قابل احترام تھی۔ اور یہ احترام اور برگزیدگی اس اصول کے مطابق تھا جس کا ذکر سورۃ بقرہ میں ہوا ہے۔ اور وہ قاعدہ اور اصول یہ ہے کہ برکت اور احترام جو خاندان نبوت میں آتا ہے وہ محض خونی وراثت کی وجہ سے نہیں آتا بلکہ وہ نظریاتی وراثت ہے۔

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ

"اور یاد کرو جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا تو اس نے کہا میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔" ابراہیم نے عرض کیا: "اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے۔" اس نے جواب دیا میرا وعدہ ظالموں سے

متعلق نہیں ہے۔"

بعض روایات میں آتا ہے کہ عمران حضرت ابراہیم ؑ کی اولاد میں سے تھے۔ تو اس صورت میں حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے اس خاص برانچ کا ذکر ایک مخصوص مقصد کیلئے کیا گیا ہے یعنی حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ ؑ کے قصوں کیلئے بطور تمہید اس کا ذکر ہوا' اور یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے حضرت موسیٰ ؑ' حضرت یعقوب کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس لئے کہ یہ حضرات بنی اسرائیل کے پیشوا تھے' یعنی حضور ﷺ کے وقت اہل یہود تھے اور یہاں آئندہ بحث چونکہ نصاریٰ کے بارے میں ہونے والی تھی اس لئے حضرت موسیٰ اور حضرت یعقوب کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔

○.........○.........○.........○.........○

اس تمہیدی اعلان احترام کے بعد اب آل عمران کے بارے میں براہ راست بات شروع ہو جاتی ہے۔

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَٰنَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٥﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿٣٦﴾ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۖ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِندَهَا رِزْقًا ۖ قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٣٧﴾

"جب عمران کی عورت کہہ رہی تھی کہ میرے پروردگار! میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کرتی ہوں۔ وہ تیرے ہی کام کیلئے وقف ہو گا۔ میری اس پیش کش کو قبول فرما' تو سننے اور جاننے والا ہے۔ پھر جب وہ بچی اس کے ہاں پیدا ہوئی تو اس نے کہا: "مالک! میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہو گئی ہے۔ حالانکہ جو کچھ اس نے جنا تھا' اللہ کو اس کی خبر تھی..... اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا۔ خیر' میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے۔ اور میں اسے اور اس کی آئندہ نسل کو شیطان مردود کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔" آخر کار اس کے رب نے اس لڑکی کو بخوشی قبول کر لیا' اسے بڑی اچھی لڑکی بنا کر اٹھایا اور زکریا کو اس کا سرپرست بنا دیا...... زکریا جب اس کے پاس محراب میں جاتا تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتا۔ پوچھتا مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا۔ وہ جواب دیتی اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔"

نذر کے اس قصے سے بیگم عمران کا دل کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ یہ مریم کی ماں تھیں۔ ان کا دل ذوق ایمان سے معمور ہے۔ وہ اپنے عزیز ترین اثاثے کو اللہ کیلئے پیش کرتی ہیں۔ یعنی وہ بچہ جو ابھی تک ان کے پیٹ میں ہے۔ وہ اسے خالصتاً اللہ کیلئے پیش کرتی ہیں' اس

پیش کش کے ساتھ کوئی شرط اور قید نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کوئی شرکیہ تصور وابستہ نہیں جیسا کہ اکثر نذروں میں ہوتا ہے۔ اس فعل میں اللہ کے سوا کسی کے حق کا تصور نہیں ہے۔ اور لفظ "محرر" سے اس بے قید نذر کی تعبیر نہایت ہی معنی خیز ہے۔ اس لئے کہ صحیح معنوں میں آزاد وہی شخص ہوتا ہے۔ جو اللہ کا ہو جائے۔ وہ ہر طرف سے بھاگ کر جناب باری میں پناہ لے لے۔ وہ ہر شخص' ہر چیز اور ہر قدر کی غلامی سے نجات پاکر نکل آئے اور بندگی صرف اللہ وحدہ کی اختیار کرے۔ صرف اسی صورت میں ایک انسان صحیح معنوں میں تمام غلامیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس صورت کے علاوہ تمام صورتوں میں کسی نہ کسی شکل میں غلامی موجود رہتی ہے اگرچہ بظاہر کسی کو آزادی نظر آئے۔

اس نکتہ کو پالینے کے بعد ہی یہ بات نظر آتی ہے عقیدۂ توحید دراصل مکمل آزادی کا ایک چارٹر ہے۔ وہ شخص کیونکر آزاد تصور ہو سکتا ہے کہ جب وہ کسی معاملے میں' اللہ کے سوا اوروں کا غلام اور تابع ہونے پر مجبور ہو' اپنی ذات و نفسیات کی دنیا میں' یا اپنے روز مرہ کے امور حیات کے معاملے میں یا اپنے طور طریقوں یا اقدار حیات کے معاملے میں یا قوانین اور دستور حیات کے سلسلے میں اس لئے کہ وہ یہ امور ہیں جو اس کی زندگی کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اگر ایک انسان کا دل غیر اللہ کی محبت میں گرفتار ہو' یا غیر اللہ کی غلامی کے زیر بار ہو یا وہ کسی چیز کی محبت کا شکار ہو تو اسے کن معنوں میں آزاد کہا جا سکتا ہے۔ جبکہ اس کی زندگی میں ایسی اقدار کی قدر ہو اور ایسے قوانین پر عمل ہو رہا ہو جو غیر اللہ سے ماخوذ ہوں۔ دنیا میں انسانوں کو حقیقی آزادی اس وقت نصیب ہوئی جب انہوں نے اسلام کے نظریۂ توحید کو اپنایا۔

زوجہ عمران کی یہ خشوع و خضوع کے عطر سے معطر دعا کہ اے رب میری نذر قبول فرما' وہ نذر جو اس کے دل کا ٹکڑا ہے۔ اس کا جگر گوشہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خالص اللہ کی مسلم اور مطیع فرمان ہیں۔ وہ کلمۃ اللہ کی جہت کی طرف رخ کئے ہوئے ہیں۔ بالکل یکسو ہیں۔ ہر قید سے آزاد ہیں اور ان کے دل میں ماسوائے قبولیت نذر اور رضائے الٰہی کے جذبے کے اور کچھ نہیں ہے۔

رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

"میرے پروردگار! میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کرتی ہوں۔ وہ تیرے ہی کام کیلئے وقف ہو گا۔ میری اس پیش کش کو قبول فرما' تو سننے اور جاننے والا ہے۔"

لیکن جب یہ بچہ پیدا ہوا تو لڑکی تھی' لڑکا نہ تھا۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

"پھر جب وہ بچی اس کے ہاں پیدا ہوئی تو اس نے کہا' "مالک! میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہو گئی ہے۔ حالانکہ جو کچھ اس نے جنا تھا' اللہ کو اس کی خبر تھی..... اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا۔ خیر' میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے۔ اور میں اسے اور اس کی آئندہ نسل کو شیطان مردود کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔"

اس کا خیال یہ تھا کہ میرا بچہ لڑکا ہو گا۔ اور گرجوں میں جن بچوں کی نذر دی جاتی تھی وہ بالعموم لڑکے ہوا کرتے تھے تاکہ وہ ہیکل کی خدمت کریں۔ اور وہ صرف عبادت کیلئے وقف ہو جائیں اور دنیا سے کٹ جائیں۔ لیکن وہ کیا دیکھتی ہے کہ بچہ لڑکی ہے۔ اس لئے وہ گڑگڑا کر اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور نہایت ہی متأسفانہ انداز میں کہتی ہے۔

رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰىؕ ........................ "میرے رب، میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہو گئی۔"
وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْؕ ........................ "اور جو کچھ اس نے جنا اس کا علم تو اللہ کو بہر حال تھا۔" لیکن وہ یہ الفاظ اس لئے کہتی ہے کہ وہ خود متوجہ الی اللہ ہے اور ہدیہ پیش کرتی ہے۔ گویا وہ ان الفاظ سے اللہ کے ہاں معذرت پیش کر رہی ہے۔ کہ اگر لڑکا ہوتا تو وہ اپنے فرائض اچھی طرح ادا کرتا۔ وَ لَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰىۚ ........................ "اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا۔" یعنی جس مقصد کیلئے نذر مانی گئی ہے اس مقصد کیلئے تو لڑکا ہی موزوں ہوتا ہے۔ وَ اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ ........................ "میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے۔"

یہاں جس انداز سے بات ہو رہی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زوجہ عمران اللہ میاں سے آمنے سامنے بات کر رہی ہیں، گو تخلیہ میں بات ہو رہی ہے، دل کی پوری بات بتائی جا رہی ہے۔ صاف صاف بتائی جا رہی ہے۔ اور اپنا پورا اثاثہ پیش کیا جا رہا ہے۔ براہ راست خدمت اقدس میں، اللہ کے ان برگزیدہ بندوں کے تعلق باللہ کا یہی حال ہوتا ہے۔ محبت، قرب اور براہ راست رابطہ اپنے رب کے ساتھ سادہ الفاظ میں اخلاص کے ساتھ ہمکلامی، جس میں نہ تکلف ہے اور نہ پیچیدگی ہے۔ وہ بات اس طرح کرتے ہیں جس طرح رب ان کے بالکل قریب ہے۔ ان سے محبت کرتا ہے سنتا ہے اور قبول کرتا ہے۔

وَ اِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ........................ "میں اسے اور اس کی آئندہ نسل کو شیطان مردود کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔" یہ وہ آخری بات ہے جو ایک ماں اپنے بچے کی نذر پیش کرنے کے بعد الوداعی طور پر کہتی ہے۔ اور اسے اپنے رب کی حمایت اور اس کے رحم پر چھوڑ دیتی ہے۔ اور اس کے لئے اور اس کی اولاد کے لئے شیطان سے پناہ مانگتی ہے........ اور یہ باتیں خلوص قلب کا مظہر ہیں، وبطیب خاطر یہ نذر دے رہی ہے اور اپنی محبوب اولاد کے لئے وہ جو تحفظ طلب کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ اسے شیطان مردود سے بچائے۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًاۙ ........................ "آخر کار اللہ نے اس کی لڑکی کو قبول کر لیا اور اسے اچھی لڑکی بنا کر اٹھایا۔" ماں کے دل میں اخلاص اور للہیت کا جو جذبہ موجزن تھا، یہ اس کا صلہ تھا، یہ ایک خالص نذر تھی جو صرف اللہ کیلئے تھی، اور یہ اسے درحقیقت آنیوالے دور میں نفخ روح کیلئے تیار کر رہا تھا۔ کلمۃ اللہ کے حمل کیلئے اسے تیار کر رہا تھا۔ تاکہ وہ حضرت عیسیٰ کی خارق العادۃ ولادت کیلئے تیار ہو جس کی کوئی مثال اس سے قبل موجود نہ تھی۔

وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِیَّاؕ ........................ "زکریا کو اس کا سرپرست بنا دیا گیا۔" وہ اس کے ولی اور ذمہ دار قرار پائے۔ اس دور میں حضرت زکریا ہیکل کے صدر نشین تھے۔ اور وہ حضرت ہارون کی اولاد سے تھے۔ اور ہیکل سلسلہ انکی مجاوری اور انتظام انکی اولاد ہاتھ میں چلا آ رہا تھا۔ یوں حضرت مریم کی نشوونما اور تربیت کا بابرکت سلسلہ شروع ہوا۔ اللہ تعالیٰ اسی نو خیز راہبہ کیلئے اپنے فیض خاص سے رزق کا خصوصی انتظام فرماتے تھے۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْهَا زَكَرِیَّا الْمِحْرَابَۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًاۚ قَالَ یٰمَرْیَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَاؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِؕ اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ

"زکریا جب کبھی اس کے پاس محراب میں جاتا تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتا۔ پوچھتا، مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ وہ جواب دیتی اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔"

ہم ان تفصیلات میں جانا نہیں چاہتے کہ یہ رزق کیسا تھا؟ جس طرح کہ مختلف روایات وارد ہیں' یہاں اس قدر کہنا کافی ہے کہ وہ رزق بڑا بابرکت تھا۔ آپ کے ماحول میں برکت تھی اور ہر طرف سے وہ چیزیں مہیا ہو رہی تھیں جن پر رزق کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس قدر وافر رزق ہوتا کہ ان کا کفیل بھی حیران رہ جاتا۔ حالانکہ وہ نبی تھا۔ وہ ان فیوض و برکات کو دیکھ کر حیرانی سے پوچھتا کہ یہ کیسے اور کہاں سے ہے؟ لیکن حضرت مریم ایک مومن صادق کی طرح بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ جواب دیتیں اور اللہ کے انعامات کا اعتراف کرتیں۔ اللہ کے کرم کا اقرار کر کے معاملہ اس کے حوالے کر دیتیں۔

هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ..........................

" یہ اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔ " یہ وہ کلمات ہیں' جو بتاتے ہیں کہ بندے کا تعلق اپنے رب کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ اور کس طرح بندگان عالی مقام اپنے ان رازوں کو راز ہی رہنے دیتے ہیں جو ان کے اور ان کے رب کے درمیان ہوتے ہیں۔ اور بات میں اس راز کے بارے میں بڑی تواضع اور کسر نفسی سے بات کرتے ہیں۔ اس کبر و غرور میں مبتلا نہیں ہوتے۔ یہاں حضرت مریم کے ہاں فراہمی زرق کے سلسلے میں جو غیر معمولی صورت حال دکھائی گئی اور جس پر حضرت زکریا نبی وقت کو بھی تعجب ہوا۔ وہ آئندہ آنے والے زیادہ عجائبات قدرت کیلئے بطور تمہید ذکر ہوئے۔ جن میں حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت شامل ہے۔

○.........○.........○.........○.........○

اس مقام پر (مریم جیسی اولاد اور اس کے پاس وافر رزق) کو دیکھ کر حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں امید کی کرن پھوٹی' آپ کی اولاد نہ تھی' یہ ایک فطری خواہش تھی' جو ہر انسان کے دل میں دست قدرت نے ودیعت کی ہوئی ہوتی ہے۔ یعنی اولاد صالح کی زبردست خواہش۔ تاکہ انسان کی ذات تسلسل میں رہے۔ اور اس کے بعد اس کا کوئی جانشین ہو' یہ وہ خواہش ہے جو بڑے بڑے عبادت گزاروں اور زاہدوں کے دل میں بھی موجزن رہتی ہے۔ ان لوگوں کے دل میں بھی جنہوں نے اپنے آپ کو عبادت کے لئے وقف کر لیا ہوتا ہے۔ اور جو ہیکل کی خدمت کیلئے وقف ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہ وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے لوگوں کی تخلیق کی ہے۔ اور یہ اس گہری حکمت کا نتیجہ ہے کہ اس جہاں میں زندگی کا تسلسل جاری ہے اور وہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ اس مقام پر حضرت زکریا علیہ السلام سامنے آتے ہیں۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ
اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ وَھُوَ قَاۗىِٕمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ
اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّ
نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ
وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ
اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ
كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾

۴ ع ۱۱ ۱۲

"یہ حال دیکھ کر زکریا نے اپنے رب کو پکارا "پروردگار! اپنی قدرت سے مجھے نیک اولاد عطا کر' تو ہی دعا سننے والا ہے اس پرسوز اور پرکیف دعا کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ فوراً قبول ہوئی اور اب یہ اولاد اور یہ قبولیت زمان و مکان کی قید سے وراء تھی۔ عام معتاد طریقے سے نظام ہٹ گیا۔ اس لئے کہ اصل سبب تو مشیت الٰہی ہے۔" جواب میں فرشتوں نے آواز دی' جب وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا کہ اللہ تجھے یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے۔ وہ اس کی طرف سے ایک فرمان کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے گا۔ اس میں سرداری اور بزرگی کی شان ہوگی۔ کمال درجے کا ضابطہ ہوگا۔ نبوت سے سرفراز ہوگا۔ اور صالحین میں شمار ہوگا۔ زکریا نے کہا۔ "پروردگار! بھلا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہوگا۔ کہا' اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" عرض کیا' مالک! "پھر کوئی نشان میرے لئے مقرر فرمادے۔" کہا' نشان یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے اشارہ کے سواء کوئی بات نہ کروگے۔" (نہ کر سکو گے) اس دوران میں اپنے رب کو بہت یاد کرنا اور صبح و شام اسکی تسبیح کرتے رہنا۔"

یوں ہم اپنے آپ کو ایک غیر معمولی واقعہ کے سامنے پاتے ہیں۔ یہ واقعہ اس بات کا اظہار ہے کہ اللہ کی مشیت بے قید ہے۔ اور وہ ان سلسلہ اسباب و مسببات کی قید و بند سے آزاد ہے۔ جنہیں آگے پیچھے دیکھنے کا انسان عادی ہے۔ اور جن کے بارے میں انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس سلسلے سے تخلف ممکن نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو واقعات و حادثات اس قانون کے حدود و قیود کے اندر نہیں ہوتے یہ انسان ان کے بارے میں شاکی رہتا ہے۔ اور جب وہ اس بات سے عاجز ہوں کہ اس کی تکذیب کردیں۔ جب ان کیلئے ایسے واقعات کو جھٹلانا ممکن نہ رہے کیونکہ وہ واقعات ہوتے ہیں تو وہ ان واقعات کے اوپر قصے اور کہانیوں کے خول چڑھادیتے ہیں۔

دیکھئے زکریا شیخ اور معمر آدمی ہیں اور ان کی بیوی معمر ہونے کے ساتھ ساتھ نوجوانی میں بھی بانجھ رہی ہیں۔ اس بوڑھے کے دل میں اولاد کی خواہش جوش میں آتی ہے۔ جو ایک فطری خواہش ہے۔ وہ مریم جیسی ایک نیک اور خوبصورت بچی کو دیکھتے ہیں' جسے وافر مقدار میں رزق دیا گیا ہے۔ وہ اپنے رب کے ساتھ مناجات کرتے ہیں۔ وہ دعا کرتے ہیں کہ انہیں بھی ایسی ہی پاک اولاد عطا ہو۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۖ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ

"یہ حال دیکھ کر زکریا نے اپنے رب کو پکارا "پروردگار! اپنی قدرت سے مجھے نیک اولاد عطا کر' تو ہی دعا سننے والا ہے۔"............

اس پرسوز اور پرکیف دعا کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ فوراً قبول ہوئی اور اب یہ اولاد اور یہ قبولیت زمان و مکان کی قید سے ماوراء تھی۔ عام معتاد طریقے سے نظام ہٹ گیا۔ اس لئے کہ اصل سبب تو مشیت الٰہی ہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ

"جواب میں فرشتوں نے آواز دی' جب وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا کہ اللہ تجھے یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے ایک فرمان کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے گا۔ اس میں سرداری اور بزرگی کی شان ہوگی۔ کمال درجے کا ضابطہ ہوگا۔ نبوت سے سرفراز ہوگا۔ اور صالحین میں شمار ہوگا۔"

وہ دعا جو دل سے نکلی اور پاک دل سے نکلی وہ قبول ہوگئی۔ اس لیے کہ اس دعا میں امید صرف اس ذات سے تھی جو دعا سنتا ہے۔ اور جس وقت چاہے اسے قبولیت کا جامہ پہنا سکتا ہے۔ فرشتوں نے زکریا کو ایک لڑکے کی خوشخبری دیدی۔ اس کا نام بھی ولادت سے پہلے

یحیٰی رکھ دیا گیا۔ اور صفت و اخلاق بھی قبل از وقت بتا دیئے گئے۔ وہ اچھا سردار ہو گا۔ وہ اپنی خواہشات نفس کو اچھی طرح قابو میں رکھنے والا ہو گا۔ اور اس نے اپنے رجحانات اور میلانات کی لگام اچھی طرح تھام لی ہو گی۔ وہ مومن و مصدق ہو گا اور اس کے پاس اللہ کا جو فرمان ا۔ آئے گا اس کی تائید کرنے والا ہو گا۔ نبی صالح ہو گا اور قافلہ صلحاء کا رکن ہو گا۔

بہرحال یہ دعا قبول ہو گئی۔ اور اس کی راہ میں وہ معمولی صورت حال حائل نہ ہو سکی جسے انسان روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں۔ اور اسے ایک اٹل قانون سمجھتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اللہ کی مشیت بھی اس قانون کی پابند ہے۔ انسان جن امور کا مشاہدہ کرتا ہے اور پھر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ یہ قانون ہے اور اس سے انحراف ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک قطعی امر ہے۔ یہ کوئی آخری مشاہدہ نہیں ہوتا۔ انسان کی عمر محدود ہے۔ اور اس کا علم محدود ہے۔ انسانی عقل طبیعات کے حدود کے اندر محدود ہے۔ وہ اللہ کے انتہائی قانون تک رسائی بھی نہیں پا سکتی۔ نہ وہ حقیقت مطلقہ کا ادراک کر سکتی ہے۔ کیا انسان کیلئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں ذرا انسان بن کر رہے۔ کیا اس کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ "ہر قدر خود بشناس" کے مطابق اپنی حدود میں رہے اور اس وادی بے کنار میں بغیر کسی راہنمائے باخبر کے داخل ہی نہ ہو۔ اس لئے کہ ممکنات اور مستحیلات کی وادی بے کراں ہے۔ تعجب ہے کہ انسان اللہ کی مشیت کیلئے وہ دائرہ تجویز کرتا ہے جو خود اس کے تجربے میں ہو اور جو اس کے علم قلیل کا دائرہ ہے۔

دعائے پرسوز کی یہ قبولیت خود حضرت زکریا علیہ السلام کیلئے بھی تعجب خیز تھی' بہرحال حضرت زکریا بھی تو انسان ہی تھے۔ چنانچہ ان کے دل میں بھی یہ شوق پیدا ہوا کہ وہ دیکھیں کہ یہ خارق العادۃ واقعہ کیسے ظہور پذیر ہو گا' حالانکہ انسان کا روزمرہ کا مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔

قَالَ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَأَتِي عَاقِرٌ ۖ

"زکریا نے کہا پروردگار' بھلا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہو گا۔ میں تو بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔" اس کا جواب بڑی سادگی اور بڑی آسانی سے دیدیا جاتا ہے۔ بات اپنی جگہ تک آجاتی ہے۔ اور ایسی حقیقت کو پیش کر دیا جاتا ہے جس کے فہم میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ اور جس کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ قَالَ كَذَٰلِكَ اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ...................

"اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" یہی طریقہ ہے' جو فی الحقیقت روبعمل ہے۔ رات دن دہرایا جاتا ہے۔ اللہ کی مشیت کا کام کرتی رہتی ہے۔ اللہ کے کام روز و شب یونہی ہوتے ہیں۔ لیکن لوگ ان واقعات پر اچھی طرح غور نہیں کرتے۔ وہ اللہ کی اس کاریگری کا گہرا مشاہدہ اور اس پر غور نہیں کرتے۔ اور حقائق کو ذہن نشین نہیں کرتے۔

یونہی بسہولت' بہ روانی وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس میں اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ زکریا کو بیٹا دیدے۔ اگرچہ وہ بوڑھا ہو گیا ہو اور اس کی عورت بانجھ ہو گئی ہو۔ بوڑھا ہونا اور بانجھ ہونا تو انسانوں کا مشاہدہ ہے۔ جس پر وہ اپنے لئے قواعد بناتے ہیں۔ اس لئے اپنے لئے ضابطہ بناتے ہیں۔ رہے اللہ تعالیٰ تو وہ انسانی ذہن کے قوانین و قیاسات کے پابند کیسے ہو گئے۔ وہ تو جس طرح چاہے تجربات کو پھیر دے۔ اس کی مشیت تو ہر قید سے آزاد ہے۔

لیکن حضرت زکریا کا راہوار شوق سرپٹ دوڑ رہا تھا' بہرحال وہ بھی انسان تھے اچانک خوشخبری سن کر پریشان ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے رب سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کیلئے اس اعجوبے کے ظہور کیلئے کوئی علامت مقرر فرما دیں تاکہ وہ مطمئن ہو کر انتظار کریں۔ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً ۖ ................ "میرے رب میرے لئے کوئی نشانی مقرر کر دے۔" ........ اب اللہ

ا۔ بعض مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جو کلمۃ اللہ ہیں' آپ ان کی تصدیق کریں گے۔ کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ اس سے یہی مراد ہو۔

تعالیٰ ان کیلئے حقیقی اطمینان کا انتظام فرماتے ہیں۔ خود انہیں ان کی روز مرہ معمولات کے دائرے سے ذرا باہر لایا جاتا ہے۔ قرار دیا جاتا ہے کہ علامت یہ ہوگی کہ تین دن کیلئے تیری زبان بند ہو جائے گی' وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوں گے' بات نہ کرسکیں گے۔ صرف اپنے رب کی طرف متوجہ ہوں گے' اللہ کا ذکر کریں گے اور اس کی تسبیح و تہلیل کریں گے۔

قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِیْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِیِّ وَ الْاِبْكَارِ

کہا: "نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے اشارہ کے سواء کوئی بات نہ کرسکو گے۔ اس دوران میں اپنے رب کو بہت یاد کرنا اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہنا۔" ... یہاں قرآن مجید خاموش ہو جاتا ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ واقعہ عملاً ایسا ہوا۔ حضرت زکریا ؑ کی زبان بندی ہوگئی۔ اور وہ تمام روز مرہ کی زندگی سے نکل آئے۔ لوگوں کی روز مرہ زندگی کا قانون بھی معطل ہوگیا۔ دیکھو اس کی یہی زبان تھی جو زور سے چلتی تھی۔ آج بند ہے۔ لوگوں سے بات بند ہے اور اللہ سے مناجات جاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ اب وہ کر' قانون فطرت پر جا رہے ہیں؟ وہ قانون یہ ہے کہ اللہ مطلق کی مشیئت ہر قید و بند سے آزاد ہے۔ اگر ہم اپنی زندگی میں یہ اصول تسلیم نہ کریں گے تو پھر ان خوارق عادت معاملات کی اور کیا توجیہ کرسکتے ہیں۔ ہم اس بوڑھے اور عمر رسیدہ عورت کے ہاں اولاد کی پیدائش کی اور کیا توجیہ کرسکتے ہیں۔

○.........○.........○.........○.........○

یہ خارق عادت واقعہ یہاں اس لئے بیان کیا گیا کہ آگے حضرت عیسیٰ ؑ کی پیدائش کا اصل خارق عادت واقعہ بیان کیا جائے۔ جس کی وجہ سے بے شمار شبہات اور ناقابل یقین نظریات وجود میں آگئے تھے۔ پیدائش مسیح ؑ دراصل اللہ تعالیٰ کی بے قید مشیئت کے سلسلہ واقعات میں سے ایک واقعہ تھا۔ یہاں سے پیدائش مسیح کا واقعہ شروع کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے حضرت مریم کو اس روح کی قبولیت کیلئے عبادت اور رجوع الی اللہ کے ذریعہ پاک کیا جاتا ہے۔

وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ ۝۴۲ یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِیْ وَ ارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ ۝۴۳

"اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دیکر اپنی خدمت کیلئے چن لیا۔ اے مریم! اپنے رب کے تابع فرمان بن کر رہ' اس کے آگے سربسجود ہو اور جو بندے اس کے حضور جھکنے والے ہیں ان کے ساتھ تو بھی جھک جا۔"

یہ برگزیدگی کیا تھی؟ وہ یہ کہ اللہ براہ راست اس کے اندر اپنی ایک روح ڈالنے والے تھے۔ جس طرح اللہ نے حضرت آدم کے جسد خاکی میں سب سے پہلے روح ڈالی دی تھی۔ اور پھر یہ خارق العادۃ واقعہ پوری انسانیت کے سامنے پیش کیا' یا اپنے خاص طریقے کے مطابق' فی الواقع یہ تاریخ انسانیت کی ایک منفرد برگزیدگی ہے۔ اور بلاشبہ ایک عظیم واقعہ ہے۔ ........ لیکن آج تک اس عظیم واقعہ

کا انسانیت کو صحیح علم نہ تھا۔ یہاں صفائی کی طرف اشارہ کرکے یہ تاثر دیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں یہودی جو شبہات پھیلاتے تھے اور جو رکیک حملے کرتے تھے' وہ قابل مذمت ہیں۔ وہ حضرت مریم کی پاکیزگی میں شکوک و شبہات پھیلاتے تھے اور ان کی دلیل یہ تھی کہ آج تک تاریخ انسانیت میں ایسی خارق العادۃ پیدائش کا واقعہ نہیں ہوا ہے۔ اس لئے یہ یہودی (اللہ انہیں غارت کرے) کہتے تھے کہ اس واقعہ کے پیچھے کوئی ناپسندیدہ راز ہے۔

یہاں آکر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی عظمت کا کیا مقام ہے' اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کا منبع صافی کس قدر بلند اور قابل اعتماد ہے۔ حضور پر اہل کتاب بشمول نصاریٰ قسم قسم کے الزامات عائد کر رہے تھے۔ آپ کی تکذیب کر رہے تھے۔ آپ کے دشمن تھے اور جدل و جدال پر ہروقت آمادہ رہتے تھے۔ اسلام کی حقانیت کے خلاف شبہات پھیلاتے تھے۔ لیکن دیکھئے وہ اپنے رب کی جانب سے یہ پیغام لاتے ہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام کی حقیقت یہ ہے اور یہ کہ وہ تمام دنیا کی عورتوں پر فضیلت رکھتی ہیں۔ یوں اسلام حضرت مریم کے مقام کو بلند آفاق تک اونچا کر دیتا ہے۔ لیکن موقعہ و محل ایسا ہے کہ حضرت مریم کے پیروکار آپ کے ساتھ بحث و مناظرہ کیلئے آئے ہوئے ہیں۔ اور حضرت مریم علیہا السلام کی تعظیم کو آپ کیلئے جواز بناتے ہیں کہ وہ حضور ﷺ پر ایمان نہ لائیں۔ اور حضرت محمد ﷺ کے دین کی تکذیب کریں۔

کیا سچائی ہے یہ' کس قدر عظیم عظمت ہے یہ اسلام کی' اس سے بڑی اور دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ حضور سچے ہیں اور ایک سچے منبع سے فیض یاب ہیں۔ آپ پر وحی لانے والے بھی سچے ہیں۔ وہ سچائی اپنے سچے رب سے لیتے ہیں۔ وہ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں بھی جو سچائی پاتے ہیں اس کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اگر آپ اللہ کے سچے رسول نہ ہوتے تو وہ ان حالات میں اپنے دشمنوں کے متعلق اس سچائی کا اظہار نہ کرتے۔

يَمَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّكِعِينَ ........................ "اے مریم! رب کی تابع فرمان بن کر رہ' اس کے آگے سجدہ ہو' اور جو بندے اس کے سامنے جھکنے والے ہیں' ان کے ساتھ تو بھی جھک۔ "........ یعنی خشوع و خضوع اختیار کر' اللہ کی طاعت و عبادت میں مصروف رہ' اور ایسی زندگی بسر کر جو اللہ سے جڑی ہوئی ہو اور یہ سب کچھ عظیم ذمہ داری ادا کرنے کیلئے' جو آنے والی ہے۔

○........○........○........○........○

حضرت مریم کی اس کہانی کے اس مرحلے کے اختتام پر اور آگے اصل کہانی یعنی پیدائش مسیح سے پہلے یہاں قرآن کریم میں بیان قصص کی حکمت بیان کر دی جاتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ سے کہا جاتا ہے کہ تم اس وقت موجود نہ تھے۔ لیکن اس وقت کے صحیح صحیح واقعات تمہیں بتائے جا رہے ہیں' جو اس بات کی دلیل ہیں کہ قرآن کریم وحی الٰہی پر مبنی ہے۔

ذَٰلِكَ مِنْ أَنۢبَآءِ ٱلْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَٰمَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿٤٤﴾

"اے محمد! یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو وحی کے ذریعہ سے بتا رہے ہیں' ورنہ تم اس وقت وہاں موجود نہ تھے۔ جب ہیکل کے خادم نے یہ فیصلہ کرنے کیلئے کہ مریم کا سرپرست کون ہو اپنے اپنے قلم پھینک رہے تھے اور نہ تم اس وقت حاضر تھے جب ان کے درمیان

جھگڑا برپا تھا۔"

یہ اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جب ہیکل کے خدام کے درمیان یہ تنازع اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ ان میں سے کون اس کا سرپرست ہو' جب اس کی ماں اسے لیکر ہیکل میں آئیں۔ وہ اسی وقت چھوٹی بچی تھی۔ ماں اس لئے لائی تھی کہ وہ اپنی نذر پوری کرے اور جو عہد اس نے اپنے رب کے ساتھ کیا ہے۔ اسے پورا کرے۔ اس آیت میں ایسے واقعہ کا ذکر ہے جو عہد قدیم میں مذکور نہیں ہے اور نہ عہد جدید میں مذکور ہے یعنی ان نسخوں میں جو آج کل مروج ہیں' لیکن یہ بات ایسی تھی جو احبار اور رہبان کے درمیان معروف تھی۔ یعنی خدام کا قلمیں پھینکنے کا واقعہ اس دور میں مشہور واقعہ تھا۔ اور یہ اس لئے تھا کہ کون اس کی کفالت کرے۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کی تفصیلات نہیں دی ہیں۔ اور شاید اس لئے کہ سامعین قرآن کے نزدیک یہ واقعہ معروف و مشہور ہو گا۔ یا یہ کہ قرآن کریم نے واقعہ بتادیا اور اس سے زیادہ تفصیلات بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی کیونکہ واقعہ ہی یہ اسی قدر رہو گا۔ مثلاً انہوں نے کفالت کیلئے ایساہی کوئی طریقہ طے کر لیا ہو گا۔ یعنی قلمیں پھینک کر یہ معلوم کرتے ہوں گے کہ کفالت کس کے حصے میں آئے۔ جیسا کہ آج کل قرعہ اندازی میں ہوتا ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے اپنی قلمیں نہر اردن میں پھینکیں' تو سب قلمیں موجوں کے ساتھ بہہ گئیں مگر زکریا کی قلم اپنی جگہ ٹھہری رہی اور یہ ان کے درمیان علامت تھی کہ کفالت کس کے حصے میں آئے۔

بہرحال یہ سب واقعات پردۂ غیب میں تھے۔ اس وقت نبی ﷺ حاضر نہ تھے۔ نیز حضور ﷺ کے علم تک بھی یہ بات نہ پہنچی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات اہل ہیکل کے خفیہ رازوں میں سے ہو جسے عوام کیلئے شائع کرنا منع ہو' اور قرآن نے اس کا افشاکر کے' اس وقت کے علمائے اہل کتاب کو بتایا کہ حضرت محمد ﷺ رسول صادق ہیں اور قرآن کریم وحی الہی پر مبنی ہے۔ کسی روایت میں یہ نہیں ہے کہ اہل کتاب میں سے کسی نے اس اطلاع کی تردید کی ہو حالانکہ قرآن کریم نے یہ اطلاع ان کو دوران بحث و مناظرہ دی تھی۔ اور یہ اہل کتاب آئے بھی مناظرہ کیلئے تھے۔ اگر ان کے ہاں یہ واقعہ نہ ہوتا تو کہتے کہ ایسا کوئی واقعہ ہی سرے سے نہیں ہوا۔

اب یہاں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا واقعہ شروع ہوتا ہے۔ لوگوں کے معمولات کے مطابق یہ عظیم اعجوبہ ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی معمول کے مطابق مشیت کی جو شان ہوتی ہے وہ اس کے خلاف ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ إِذْ قَالَتِ الْمَلَٰٓئِكَةُ يَٰمَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٤٥﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّٰلِحِينَ ﴿٤٦﴾ قَالَتْ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ ۖ قَالَ كَذَٰلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٤٧﴾ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَىٰةَ وَالْإِنجِيلَ ﴿٤٨﴾ وَرَسُولًا

إِلَىٰ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ أَنِّى قَدْ جِئْتُكُم بِـَٔايَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ أَنِّىٓ أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ ٱلطِّينِ كَهَيْـَٔةِ ٱلطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًۢا بِإِذْنِ ٱللَّهِ ۖ وَأُبْرِئُ ٱلْأَكْمَهَ وَٱلْأَبْرَصَ وَأُحْىِ ٱلْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ ٱللَّهِ ۖ وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِى بُيُوتِكُمْ ۚ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَـَٔايَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٤٩﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ ٱلتَّوْرَىٰةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ ٱلَّذِى حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ۚ وَجِئْتُكُم بِـَٔايَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿٥٠﴾ إِنَّ ٱللَّهَ رَبِّى وَرَبُّكُمْ فَٱعْبُدُوهُ ۗ هَٰذَا صِرَٰطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٥١﴾

"اور جب فرشتوں نے کہا "اے مریم! اللہ تجھے ایک فرمان کی خوشخبری دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔ دنیا و آخرت میں معزز ہوگا' اللہ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا۔ لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی اور وہ ایک مرد صالح ہوگا۔" یہ سن کر مریم بولی: "پروردگار' میرے ہاں بچہ کہاں سے ہوگا مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔" جواب ملا۔ "ایسا ہی ہوگا' اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔" (فرشتوں نے پھر اپنے سلسلہ کلام میں کہا) اور اللہ اسے کتاب اور حکمت کی تعلیم دے گا' تورات اور انجیل کا علم سکھائے گا۔ اور بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول مقرر کرے گا۔ (اور جب وہ بحیثیت رسول بنی اسرائیل کے طرف آیا تو اس نے کہا) میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لیکر آیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسمہ بناتا ہوں۔ اور اس میں پھونک مارتا ہوں۔ وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور مردے کو زندہ کرتا ہوں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو۔ اس میں تمہارے لئے کافی نشانی ہے۔ اگر تم ایمان لانیوالے ہو۔ اور میں اس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنیوالا بن کر آیا ہوں جو تورات میں سے اس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے۔ اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لئے بعض ان چیزوں کو حلال کردوں جو تم پر حرام کردی گئیں ہیں۔ دیکھو' میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لیکر آیا ہوں۔ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارے رب بھی' لہٰذا تم اس کی بندگی اختیار کرو' یہی سیدھا راستہ ہے۔"

حضرت مریم علیہا السلام اپنی پاکیزگی' اپنی یکسوئی اور اپنی پیہم عبادت گزاری کی وجہ سے اس بات کی اہل ہوئیں کہ وہ اس کے اس فضل کو قبول کرسکیں اور اس عظیم واقعہ کیلئے تیار ہوسکیں۔ اور دیکھئے اب وہ تیار ہیں اور اب ملائکہ ان کے ساتھ ہمکلام ہو رہے ہیں۔ انہیں اطلاع دی جاتی ہے۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلَٰٓئِكَةُ يَٰمَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّٰلِحِينَ ۔

"اور جب فرشتوں نے کہا"اے مریم! اللہ تجھے ایک فرمان کی خوشخبری دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہو گا۔ دنیا و آخرت میں معزز ہو گا' اللہ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا۔ لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی اور وہ ایک مرد صالح ہو گا۔"

اس آیت میں بات پوری طرح کھول کر انہیں بشارت دی گئی ہے۔ یہ بشارت اللہ کے کلام (فرمان) سے متعلق ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہو گا۔ نحو کے اعتبار سے لفظ مسیح کلمہ کا بدل ہے یعنی کلمہ مسیح ابن مریم ہیں۔ اب اس تعبیر کلام کے بعد کوئی بات ہی نہیں رہتی......... یہ اور اس قسم کے دوسرے بے شمار امور' اصل غیبی امور ہیں اور ان کی ماہیت تک رسائی پوری طرح ممکن نہیں ہوتی۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ امور ان متشابہات میں سے ہوں' جن کے بارے میں اس سورت کے آغاز میں کہا گیا :۔

هُوَ الَّذِىٓ أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَٰبَ مِنْهُ ءَايَٰتٌ مُّحْكَمَٰتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَٰبِ وَأُخَرُ مُتَشَٰبِهَٰتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِى قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَٰبَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَأْوِيلِهِۦ

"وہی خدا ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی ہے۔ اس کتاب میں دو طرح کی آیات درج ہیں' ایک محکمات' جو کتاب کی اصل بنیادیں ہیں اور دوسری متشابہات' جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے' وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔"............ لیکن اس معاملے کا سمجھنا بہت ہی آسان ہے اگر ہم اسے خدا ترسی کے ساتھ سمجھنا چاہیں۔ اور اللہ کی کاریگری اور اس کی قدرت کی نشانیاں ہمارے ذہن میں ہوں اور ہمیں یہ معلوم ہو کہ اللہ کی مشیئت اور حدود و قیود سے آزاد ہے جو اس نے اس جہاں رائی کیلئے خود وضع کیے ہیں۔

اللہ نے جب چاہا تو اس نے مٹی سے آدم کو پیدا کیا' اب تخلیق آدم براہ راست مٹی سے ہوئی اور مٹی میں نفخ روح ہوا ہو یا ابتدائی جرثومہ پیدا کیا گیا ہو اور وہ وجود آدم پر منتج ہوا۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ تخلیق آدم مجسمے سے ہوئی یا جرثومے سے۔ اس لئے کہ ان دونوں صورتوں میں وہ راز راز ہی رہتا ہے۔ جسے ہم راز حیات کہتے ہیں۔ وہ راز جس نے پہلی مخلوق کو حیات عطا کی۔ یا جس طرح آدم کے پہلے مجسمے میں روح ڈالی گئی یا جرثومے میں ڈالی دونوں صورتوں میں یہ ایک عظیم اعجاز اور معجزہ ہے۔ اس لئے کہ جرثومہ زندہ ہو یا پورے انسان کی زندگی میں یکدم روح ڈال دی جائے۔ دونوں صورتیں معجزہ ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ زندگی کہاں سے آئی؟ کیسے آئی؟ بہرحال ہم یہ بات قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ زندگی مٹی اور ان تمام مردہ عناصر سے علیحدہ کوئی چیز ہے۔ یہ ایک زائد چیز ہے۔ یہ عناصر سے علیحدہ ایک حقیقت ہے۔ اس کے کچھ آثار ہیں۔ اس کی کچھ علامات ہیں جو مٹی یا دوسرے عناصر کے اندر موجود نہیں ہیں۔ نہ دوسرے مردہ مادیات میں موجود ہوتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ راز یعنی راز حیات کی اصلیت کیا ہے؟ یہ بات کافی نہیں ہے کہ اس حقیقت کا انکار کرنے کیلئے ہم صرف یہ کہہ دیں کہ ہم نہیں جانتے۔ جیسا کہ آج کل مادہ پرست عاجز آکر یہ کہہ جاتے ہیں لیکن ان کی اس بات کو نہ کوئی عقلمند آدمی اہمیت دیتا ہے نہ کوئی عالم اسے تسلیم کرتا ہے۔

اس راز کو ہم اس حقیقت کے باوجود نہیں جانتے کہ ہم نے راز حیات کے پانے کے سلسلے میں آج تک انتہائی کوششیں کیں لیکن وہ راز ہم نہ پاسکے۔ اس لئے کہ ہم نے اس راز کو معروف مادی ذرائع سے پانے کی کوششیں کیں۔ اور وہ اکارت گئیں۔ ہم نے زندگی کو موت کے جنگل سے چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔......... ہم نہیں جانتے لیکن اللہ جس نے موت وحیات کی تخلیق کی وہ تو جانتا ہے۔ وہ کہتا ہے "اس نے اپنی روح اس میں پھونک دی" اور اس کا اظہار اس نے لفظ کُنْ فَيَكُونُ سے کیا۔ یعنی "ہوجا" بس ہوگیا۔ اب یہ نفخ روح کیا ہے؟ کس طرح حالت موت پر یہ نفخ روح ہوتی ہے اور وہ حالت حیات میں بدل جاتی ہے اور یہ راز لطیف راز فہم سے باہر رہتا ہے۔

اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی کیفیت کیا ہے؟ یہ وہ ماہیت وکیفیت ہے جس کا ادراک عقل بشری کے دائرہ قدرت سے باہر ہے۔ کیونکہ یہ اس کی شان اور مقام سے باہر ہے۔ اسے یہ قدرت ہی نہیں دی گئی کہ وہ اس کا ادراک کرسکے۔ اس کے کاسہ سر میں یہ سمندر رواں جیسی حقیقت سماہی نہیں سکتی؟ اس لئے کہ انسان کا ایک اپنا مقصد تخلیق ہے۔ اس کے یہاں کچھ فرائض ہیں۔ یعنی فریضہ خلافت فی الارض اس کے لئے اسے اس راز سے آگاہی ضروری ہی نہیں ہے۔ وہ یہاں حیات و موت کے کاروبار کیلئے نہیں پیدا کیا گیا تاکہ اسے حیات کی ماہیت بتائی جائے۔ اسے نفخ روح کی کیفیت سے آگاہ کیا جائے اور زندگی کی پہلی سیڑھی پر اس زندگی کا اتصال ذات آدم سے کیسے ہوا؟ جب ان میں زندگی کا ست ڈالا گیا۔

یہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ جب انہوں نے حضرت آدم میں اپنی روح پھونکی تو اس کی وجہ سے حضرت آدم کو یہ اعزاز حاصل ہوا یہاں تک کہ ان کو ملائکہ پر بھی فوقیت دی گئی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ یہ اعزاز اور یہ حیات جرثومے اور میکربادت کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے۔ یہی وہ نفخ روح ہے جس کی وجہ سے ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس کرہ ارض پر انسان ایک ایسی جنس ہے۔ اس کی تخلیق خاص طور پر علیحدہ ہوئی ہے۔ اور اس کائنات میں اس کا معتبر اور مکرم مقام ہے۔ جو دوسری زندہ چیزوں کو حاصل نہیں ہے۔

بہرحال یہاں ہمارا موضوع تخلیق انسان نہیں ہے۔ سیاق کلام میں کچھ دیر کیلئے ہم نے اسی نکتے پر اس لئے روشنی ڈالی ہے کہ بعض اوقات ایک قاری کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے۔ کہ انسان کی پیدائش اس طریقے پر کیسے ممکن ہے۔ یہاں اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہاں راز حیات سے ہمیں آگاہ فرماتے ہیں۔ اگرچہ ہم اس کی ماہیت نہیں پاسکتے۔ اگرچہ ہم مردہ میں نفخ روح کی کیفیت کا ادراک نہیں کرسکتے لیکن راز حیات کو تو سمجھ سکتے ہیں۔......... حضرت آدم علیہ السلام کو براہ راست پیدا کرکے اللہ تعالیٰ نے پھر پیدائش انسانیت کیلئے ایک طبعی راہ متعین کردی۔ یعنی میاں بیوی کے ملاپ کے نتیجے میں قافلہ انسانیت رواں دواں ہوا۔ یعنی بیوی کے پیدا کردہ انڈے کے ساتھ مرد کے جرثومے کے ملاپ یوں گودیں ہری ہوئیں، نسلیں چلیں جس طرح یہ انڈہ زندہ ہے۔ اس طرح یہ جرثومہ بھی زندہ ہے۔ دونوں متحرک ہیں۔

قافلۂ حیات اس شاہراہ پر چل پڑا اور لوگ اس کے عادی ہوگئے۔ اب ایک مقام ایسا آگیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیش پا افتادہ راستے کو بدل دیا۔ مروجہ اصل ایک محدود وقت کیلئے معطل کردیا گیا ایک فرد کے بارے میں اس قاعدے کو معطل کردیا اور ایک مثال ایسی پیدا کردی گئی جو آدم علیہ السلام کی شکل میں ہو۔ اگرچہ بتمامہ اس جیسی نہ ہو۔ یہاں اب صرف عورت سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ وہی روح اس عورت میں پھونک دی جاتی ہے جس کی ابتدائی تخلیق ہوئی۔ اور اس عورت کے رحم میں زندگی کے آثار پیدا ہوگئے۔ یہاں لاہوتی سوالات پیدا ہوئے۔ کیا یہ نفخ کلمہ ہے؟ کیا کلمہ ارادے کے متوجہ ہونے کا نام ہے؟ کیا کلمہ کن ہے؟ جو کبھی حقیقت ہوتا ہے اور کبھی محض توجہ ارادہ سے کنایہ ہوتا ہے۔ کیا کلمہ خود حضرت عیسیٰ ہیں یا کلمہ وہ ہے جس سے وہ وجود میں آئے؟......... یہ تمام مباحث ایسے ہیں جن سے شبہات ہی حاصل ہوسکتے ہیں۔ ان مباحث کے نتیجے میں یقین حاصل نہیں ہوتا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے ایک زندگی ایسی وجود میں لائی تھی

جس کی کوئی مثال نہ ہو۔ اس نے اپنے بے قید ارادے کے ذریعے اسے وجود بخشا۔ اس زندگی میں اپنی جانب خاص سے ایک روح پیدا کی۔ ہمیں اس روح کے آثار تو نظر آتے ہیں لیکن ہم اس کی ماہیت اور کیفیت کے ادراک سے قاصر ہیں۔ ہم پر فرض ہے کہ ہم اس سے قاصر ہیں۔ اس لئے کہ اس ادراک کی وجہ سے ہماری اس قوت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا جو ہمیں اس کرۂ ارض پر فریضہ خلافت کی ادائیگی کیلئے ضروری ہے۔

یہ معاملہ' اس صورت میں بہت سہولت کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے اور اس صورت میں اس کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی شبہ بھی پیدا نہیں ہوتا......... غرض ملائکہ نے حضرت مریم کو بشارت دی۔ اس بشارت میں اللہ کی جانب سے فرمان آنا تھا اس فرمان کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم بتایا گیا۔ ان کی نوع' نام ونسب کاذکر بھی کر دیا گیا۔ نسب نامہ ماں کی طرف راجع ہوا۔ بشارت میں ان کی صفات اور اللہ کے ہاں ان کے لئے رتبہ بلند کاذکر کیا گیا۔ دنیا و آخرت میں ان کی وجاہت کاذکر بھی ہوا اور یہ اعلان بھی ہوا کہ وہ اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہو گا۔ اور یہ ذکر بھی ہوا کہ پیدا ہوتے ہیں اس سے معجزات کاظہور شروع ہو گا۔ "گھوارے" ہی میں لوگوں سے باتیں شروع کر دے گا۔ یعنی جوانی میں بھی بات کرے گا۔ اور اس کی صفات میں سے اہم صفت یہ ہوگی کہ وہ قافلہ صالحین میں سے ہو گا۔

مریم کنواری تھیں' اس کی زندگی پاکیزہ تھی' اس کی سوچ بابت ولادت ایسی ہی تھی جس طرح ماحول میں وہ دیکھ رہی تھی' اس نے اس بشارت کو اسی طرح لیا جس طرح ایک جوان لڑکی اسے سمجھ سکتی ہے' وہ فوراً اپنے رب کی طرف متوجہ ہوئیں' استدعا کی کہ یہ معمہ ان کے فہم کیلئے ناقابل حل ہے۔ اس کی عقل حیران ہے۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌؕ ......................... "میرے ہاں بچہ کہاں سے ہو گا' مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔"....... اس کا انہیں فوراً جواب دیا گیا' اس جواب میں انہیں اس سادہ حقیقت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ جسے انسان روز مرہ زندگی میں سلسلہ اسباب و مسببات کے ساتھ عادی ہو جانے کی وجہ' بھول چکا ہے۔ اس لئے کہ اس کے ذرائع علم قلیل ہیں۔ اور وہ اپنے محدود دائرہ عادت کے اندر بند رہتا ہے۔

قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ......................... "وہ جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو بس کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔"

جب اللہ تعالیٰ' اس معاملے کو ابتدائی آفرینش کی حقیقت سے وابستہ کرتے ہیں تو تعجب ختم ہو جاتا ہے۔ حیرانی جاتی رہتی ہے۔ دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور انسان خود اپنے آپ سے تعجب کے ساتھ پوچھنے لگتا ہے کہ تمہیں اس قدر سادہ اور صاف بات پر تعجب کیسے ہو گیا۔ جو نہایت فطری اور قریب الفہم ہے۔

اس طرح قرآن کریم' اسلامی تصور' کو اس قدر سادگی اور فطری انداز میں' ایسے عظیم حقائق تک بھی پھیلا دیتا ہے۔ فطری انداز میں' قریب الفہم انداز میں اور وہ شبہات جنہیں فلسفیانہ جذبات مزید الجھاتے تھے۔ اسلام انہیں صاف کر کے دلوں میں بٹھا دیتا ہے۔ اور وہ عقل کے بھی قریب آجاتے ہیں۔

اس کے بعد اس بشارت کی مزید تفاصیل بتائی جاتی ہیں' جس کی پیدائش کیلئے حضرت مریم کو منتخب کیا گیا اور جو بے مثال طریقے سے روبعمل آرہی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس نے آنے والے کی سیرت اور کردار کیا ہو گا۔ حضرت عیسیٰ کی آئندہ تاریخ بتائی جاتی ہے۔ اب بشارت اور تاریخ مستقل ساتھ ساتھ جاری ہیں تو یا بشارت بھی ہو رہی اور ساتھ ہی تاریخ بھی چلتی پھرتی ہے۔ یہ قرآن کریم کا اپنا اسلوب کلام ہے۔

وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ............................ "اور اللہ اسے کتاب و حکمت کی تعلیم دے گا اور تورات اور انجیل کا علم سکھائے گا۔ اور بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول مقرر کرے گا۔" کتاب سے کبھی مراد کتابت بھی ہوتی ہے اور کبھی اس سے مراد تورات۔ اور انجیل بھی ہوتی ہے۔ اس صورت میں تورات اور انجیل کا عطف کتاب پر عطف بیان ہو گا۔ حکمت انسان کے ذہن میں ایک ایسے ملکہ کا نام ہے جس کے ذریعہ وہ ہرچیز کو اپنے مقام پر رکھتا ہے۔ جس کے ذریعہ انسان صحیح اور برے کی تمیز کر سکتا ہے۔ اور صحیح کا اتباع کر سکتا ہے۔ اور یہ حکمت اور ملکہ دراصل خیر کثیر ہے۔ تورات بھی حضرت عیسیٰ کی کتاب تھی جس طرح انجیل ان کی کتاب تھی' تورات اس دین کا اساس تھی جو وہ لیکر آتے تھے۔ انجیل دراصل اسی دین کا ایک تکملہ تھا' اس کے ذریعہ تورات کی اصل روح کا احیاء مطلوب تھا' وہ روح جو یہودیوں میں ختم ہو گئی تھی۔ ان کے دل اس روح سے خالی ہو گئے تھے۔ وہ لوگ جو مسیحیت پر بحث کرتے ہیں' ان میں سے اکثر لوگوں کے ذہن میں یہ بات نہیں ہوتی کہ حضرت مسیح کے دین کی اصل اساس تورات ہے۔ اس میں وہ نظام شریعت ہے جس پر معاشرے کا نظام قائم ہے۔ انجیل نے اس میں بہت سی کمی بیشی کی ہے۔ رہی انجیل بذات خود تو وہ صرف احیائے دین کی ایک جدوجہد تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ ظاہری نصوص سے پیچھے جاکر انسان کے ضمیر اور اس کی روح کو پاک کیا جائے۔ اور وہ تحریک احیائے روح کیا تھی جس کی وجہ سے اس معاشرے نے آپ کے خلاف سازش کی تھی۔ وہ اور جس کیلئے آپ جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ وہ یہ تھی :

وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

اور جب وہ بحیثیت رسول بنی اسرائیل کے پاس آیا تو اس نے کہا میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لیکر آیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسمہ بناتا ہوں۔ اور اس میں پھونک مارتا ہوں۔ وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور مردے کو زندہ کرتا ہوں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کرکے رکھتے ہو۔ اس میں تمہارے لئے کافی نشانی ہے۔ اگر تم ایمان لانیوالے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی رسالت صرف بنی اسرائیل کیلئے تھی۔ اس لئے کہ آپ انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تورات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی' اور جس میں بنی اسرائیل کی زندگی کی تنظیم کیلئے شریعت موجود تھی۔ اور جس میں باہم معاملات اور اجتماعی تنظیم کے امور طے ہوئے تھے۔ وہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب بھی تھی' ہاں اس پر انجیل کا اضافہ کیا گیا تھا۔ اور مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل میں روحانی پاکیزگی پیدا کی جائے اور ان کا ضمیر جاگ اٹھے اور قلب روشن ہو۔

اور وہ معجزہ جس کی بابت اللہ نے ان کی والدہ حضرت مریم کو بشارت دی تھی کہ وہ معجزہ ان کے پاس ہو گا۔ اور جس کے ساتھ اس نے بنی اسرائیل سے عملاً مباحثہ کیا وہ یہی معجزہ احیاء تھا۔ یعنی مردہ چیز میں پھونک مار کر روح ڈالدینا' اور کسی چیز کا زندہ ہو جانا' اور مردہ انسانوں کو ازسرنو زندہ کرنا اور مادرزاد اندھوں کو نظر عطا کیا جانا۔ اور کوڑھی کا تندرست ہونا اور غیب کی خبریں دینا مثلاً یہ کہ بنی

اسرائیل نے کیا کھایا ہے اور کیا گھروں میں ذخیرہ کیا ہے۔ جیسا کہ یہ اشیاء نظروں سے اوجھل ہوں...... یہاں آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی جن معجزات کا اظہار ہوا ہے۔ اور جن کی بشارت حضرت مریم کو دی گئی تھی اور جن کا اظہار پھر بعد میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے بھی ہوا۔ یہاں آیت میں بار بار اس بات کی تاکید کی جاتی ہے کہ یہ سب معجزات کا جو اظہار ہوا' اور جو عملاً بنی اسرائیل کے سامنے پیش بھی ہوئے۔ یہ سب معجزات اللہ کی جانب سے تھے اور اللہ کے اذن سے تھے۔ ہر معجزے کے بعد اذن اللہ کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ محض اس احتیاط کی خاطر کی گئی انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذاتی کمال نہ سمجھے۔ ان تمام معجزات کا تعلق یا تو زندگی کی تخلیق سے ہے اور یا جس مخلوق سے زندگی نکل جائے۔ اس میں دوبارہ زندگی لوٹانے سے ہے۔ یا انسانی صحت کے ساتھ ان کا تعلق ہے جو کہ خود بقائے حیات کا ایک ذریعہ ہے۔ یا پھر ان معاملات کو دیکھنے سے جو بظاہر نظروں سے اوجھل ہوں۔ ان تمام معجزات کا تعلق اپنی حقیقت کے اعتبار سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے غیر معمولی تولد کے معجزے سے ہے۔ اللہ نے حضرت عیسیٰ کو اس طریقے سے وجود بخشا جس کی کوئی مثال ماسوائے مثال حضرت آدم کے اور نہ تھی۔ اگر اللہ اپنی مخلوقات میں سے ایک مخلوق کے ہاتھ پر اس قسم کے معجزات کا اظہار فرما سکتے ہیں تو وہ بذات خود اس طریقے پر معجزے کے طور پر خود حضرت عیسیٰ کو کیوں پیدا نہیں کر سکتے۔ اس لئے نہ ان شبہات کا کوئی جواز ہے جو حضرت عیسیٰ کے بارے میں پھیلائے گئے' نہ ان کہانیوں کی ضرورت ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بارے میں خود عیسائیوں نے تصنیف کیں۔ اس لئے کہ جب معاملہ اللہ کی مشیت کا ہو جائے تو پھر کوئی استحالہ نہیں رہتا۔ اور خود انسانی عادت اللہ پر کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتی۔

وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ

"اور میں اس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنیوالا بن کر آیا ہوں جو تورات میں سے اس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے۔ اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لئے بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئیں ہیں۔ دیکھو' میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لیکر آیا ہوں۔ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارے رب بھی' لہٰذا تم اس کی بندگی اختیار کرو' یہی سیدھا راستہ ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا یہ خاتمہ ہے۔ یعنی یہ تھی وہ دعوت جو آپ نے بنی اسرائیل کو دی۔ اس میں انہی بنیادی نکات کی وضاحت کی گئی ہے جو ہمیشہ اللہ کے دین کے اصل نکات رہے ہیں۔ اور جن کی طرف تمام رسول دعوت دیتے رہے ہیں۔ اور یہ وہ حقائق ہیں جن کی بہت ہی اہمیت ہے۔ خصوصاً جبکہ ان حقائق کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے دہرایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی ولادت ہی وجہ نزاع تھی اور یہ نزاعات اس لئے پیدا ہو گئے تھے کہ لوگوں نے دین اور رسولوں کی حقیقت پر غور نہ کیا۔ یعنی یہ کہ رسول بھی ایک ہیں اور ان کا دین بھی ایک ہے۔ اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں۔

وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ

............ "اور میں اس تعلیم کی تصدیق کرتا ہوں جو تورات میں سے میرے سامنے موجود ہے۔ اور اس لئے آیا ہوں کہ تم پر بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں۔"

یہاں وہ سچا مذہب بیان کیا جاتا ہے جو مسیحیت کا اصل مذہب تھا۔ پس تورات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی تھی اس میں وہ دین برحق پوری طرح موجود تھا۔ اور اس میں وہ پوری شریعت موجود تھی جو اجتماعی زندگی کو بہترین طور پر منظم کرتی تھی۔ یعنی اس دور کی ضروریات کے مطابق اور اس وقت بنی اسرائیل کے جو حالات تھے۔ ان کی نسبت سے اور اس نقطہ نظر سے کہ اس وقت وہ انسانوں کے ایک خاص گروہ کیلئے ایک خاص نظام زندگی تھا۔ اور حضرت مسیح اپنی رسالت میں اسی تورات پر اعتماد فرماتے تھے۔ آپ نے تورات کی تصدیق کی۔ ہاں اس میں بعض حرام چیزوں کو حلال کر دیا گیا اور وہ چیزیں ان پر حرام بھی بطور سزا کی گئی تھیں' اس لئے کہ انہوں نے بعض گناہوں اور بعض بداعمالیوں کا ارتکاب کیا تھا۔ اور ان کی تربیت کیلئے اللہ تعالیٰ نے بعض حلال چیزوں کو بھی حرام کر دیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بذریعہ عیسیٰ علیہ السلام ان پر رحم فرمایا اور وہ بعض اشیاء جو حرام کر دی گئی تھیں انہیں دوبارہ حلال کر دیا گیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دین کا یہ حقیقی مزاج ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی زندگی کو بذریعہ قانون سازی منظم کرتا ہے۔ دین کا مزاج صرف تہذیب اخلاق نہیں ہوتا۔ نہ دین انسان کے تصورات اور اس کے وجدان و شعور کو درست کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔ نہ دین کا صرف یہ کام ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کیلئے کچھ عبادات تجویز کر دے اور وہ ان مراسم عبودیت کے عابد بن کر بیٹھ جائیں۔ ایسے جزوی مسائل ہی پر اکتفاء کرنے والا دین' اپنے اصل معنوں میں دین نہیں ہوتا۔ دین تو صرف وہ ہوتا ہے جو پوری زندگی کا نظام ہو' وہ خدا تعالیٰ کا تجویز کردہ ہو۔ اور جو انسانوں کی زندگی کو اللہ کے منہاج کے مطابق استوار کرے۔

اور یہ بات بھی درست ہے کہ ایمانی عقائد' مراسم عبودیت' اخلاقی قدریں اگر دین سے علیحدہ کر دی جائیں تو اس صورت میں دین صرف فقہ بن جاتا ہے۔ اور پھر وہ انسانی زندگی میں صحیح طرح کام نہیں کرتا۔ پھر یہ بات دینی مزاج کے خلاف ہو جاتی ہے۔

یہی وہ حادثہ ہے جو مسیحیت کے ساتھ پیش آیا کہ بعض تاریخی اسباب کی وجہ سے' اور پھر اس وجہ سے بھی کہ وہ ایک محدود وقت کے لئے نازل ہوئی تھی' اور وہ حضرت محمد ﷺ کی آخری نبوت کیلئے بطور تمہید آئی تھی۔ مسیحیت کی روحانی تعلیمات سے نظام شریعت علیحدہ ہو گیا۔ وہ تاریخی اسباب یہ تھے کہ یہودیوں اور مسیح علیہ السلام کے درمیان سخت عداوت پیدا ہو گئی۔ آپ کے بعد آپ کے انصار اور یہودیوں کے درمیان بھی سخت عداوت رہی۔ جس کی وجہ سے تورات جس کے اندر اسلامی نظام زندگی اور شریعت تھی اور انجیل جس کے اندر صرف روحانی قدروں کا احیاء تھا' کے درمیان فاصلے وسیع ہو گئے۔ بہرحال یہ شریعت تورات بھی ایک محدود قوم اور محدود وقت کے لئے تھی اور حضرت عیسیٰ کی اخلاقی تعلیمات بھی۔ تاکہ اللہ کے نظام قدرت میں طے شدہ منصوبے کے مطابق حضرت محمد ﷺ کی آخری اور جامع شریعت نازل ہو اور ہمیشہ کیلئے پوری انسانیت کیلئے شریعت ہو۔

بہرحال صورت حال یہ ہو گئی کہ مسیحیت ایک ایسا تناور درخت بن گئی جس میں نظام شریعت نہ تھا۔ اس لئے وہ ہمیشہ ان اقوام کی اجتماعی زندگی پر کنٹرول کرنے سے عاجز رہی جن اقوام نے بھی اسے قبول کیا۔ اس لئے کہ اجتماعی زندگی کی راہنمائی کیلئے ایک ایسا تصور حیات ضروری ہے جو زندگی کے ہر شعبے کی وضاحت کرتا ہو' وہ یہ بتاتا ہو کہ اس پوری کائنات میں انسان کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اس کے اندر ایک مضبوط نظام عبادات ہو' اور وہ ایک اچھا اخلاقی اور روحانی نظام بھی رکھتا ہو' اور اس کے بعد اس کے پاس ایک بہترین اجتماعی قانونی نظام ہو اور یہ اخلاقی اور قانونی نظام اس کے اصل تصور حیات سے ماخوذ ہو۔ اگر دین ان عناصر ترکیبی سے مرکب ہو تب وہ اجتماعی زندگی کو منظم کر سکتا ہے۔ ... انسان کو حکمت دین بھی سمجھ میں آتی ہے اور وہ پھر انسانی نظام کی ضمانت دیتا ہے۔

غرض جب مسیحیت کی اخلاقی تعلیمات شریعت سے جدا ہو گئیں تو پھر مسیحیت اس قابل نہ رہی کہ وہ مکمل نظام حیات بن جائے۔ اس لئے لوگوں کی زندگی میں اخلاقی قدروں اور اجتماعی قدروں کے درمیان مکمل جدائی واقع ہو گئی۔ اور ان کے اخلاق اور ان کے اعمال

کے درمیان اتحاد نہ رہا۔ اس طرح ان کا اجتماعی نظام ایک فطری نظام نہ رہا جو ان کی اخلاقی قدروں سے ہم آہنگ ہو۔ اس لئے عیسائیوں کا اجتماعی نظام ہمیشہ یا تو ہوا میں معلق رہا' روحانی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا یا اگر وہ چلا بھی تو وہ ایک لنگڑا لولا نظام تھا۔

تاریخ انسانی کے اندر جب انسانیت اس صورت حال سے دوچار ہوئی تو یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا بلکہ یہ ایک عظیم حادثہ تھا۔ یہ بہت ہی تباہ کن حادثہ تھا۔ یہ ایک ایسا عظیم واقعہ تھا جس کی وجہ سے انسانیت کیلئے بدبختی کے چشمے پھوٹے۔ انسان حیرانی اور پریشانی کا شکار ہوئے۔ ان پر اخلاقی بے راہ روی کا سیلاب آیا۔ اور ایسی ایسی مصیبتیں آئیں جن میں یہ لادین مادی اجتماعی نظام آج تک گرفتار ہے اور آج یورپ اس کی مثال ہے۔ چاہے اب یہ نظام ان ممالک میں ہو' جن کا مسیحیت کے ساتھ ابھی تک تعلق ہو۔ اس لئے کہ مسیحیت میں سرے سے کوئی اجتماعی نظام ہی نہیں ہے۔ یا ان ممالک میں ہو جہاں سے مسیحیت ختم ہو گئی ہے۔ بہرحال دونوں ممالک کے درمیان کوئی زیادہ امتیاز نہیں ہے۔ اس لئے کہ مسیحیت جس طرح اسے حضرت مسیح ؑ نے پیش کیا تھا' اور جس طرح ہر وہ نظام جس پر دین کا اطلاق ہوتا ہے' ایک ایسا نظام تھا جس میں زندگی کیلئے ایک مکمل شریعت اور نظام قانون موجود تھا۔ جو عقیدۂ توحید پر مبنی تھا۔ اور جو ان اخلاقی تصورات پر قائم تھا جو اس عقیدے سے ماخوذ تھے۔ اس لئے موجودہ مسیحیت کو اس لئے مسیحیت نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں وہ پورا نظام زندگی موجود نہیں ہے جو حضرت مسیح نے پیش کیا۔ بلکہ مسیحیت سرے سے دین ہی نہ ہوگی۔ غرض ان عناصر ترکیبی کے سوا زندگی کے مسائل کے حل کیلئے کوئی اجتماعی نظام قائم نہیں ہو سکتا جو مکمل بھی ہو' جو نفس انسانی کی پوری ضروریات کیلئے کافی بھی ہو' جو انسان کی عملی زندگی کے مسائل حل کرتا ہو اور جو حیات انسانی کا وثیق رابطہ اپنے رب کے ساتھ قائم کرے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت مسیح ؑ کے اس قول کی تفسیروں اور مفہومات میں سے ایک مفہوم ہے' آپ فرماتے ہیں۔ :

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ

.......... "میں تصدیق کرتا ہوں تورات کے اس حصے کی جو میرے سامنے موجود ہے اور تمہارے لئے بعض ان چیزوں کو حلال قرار دیتا ہوں جو تم پر حرام قرار دی گئی ہیں۔"

حضرت عیسیٰ ؑ اپنے اس منصب کے اظہار کا استدلال توحید الٰہی سے کرتے ہیں جو اسلام میں پہلی عظیم حقیقت ہے' فرماتے ہیں۔ :

وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ

"دیکھو' میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لیکر آیا ہوں۔ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارے بھی' لہٰذا تم اس کی بندگی اختیار کرو' یہی سیدھا راستہ ہے۔"

یہاں آپ اس نظریاتی تصور حیات کو پیش فرماتے ہیں' جس پر اللہ کا دین قائم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے جو معجزات پیش کئے ہیں وہ میں نے اپنی طرف سے نہیں پیش کئے۔ بذات خود تو وہ ایک بشر ہیں وہ ایسے معجزات کیسے صادر کر سکتے ہیں۔ یہ اللہ کے معجزات ہیں اور میری دعوت خدا خوفی اور اطاعت رسول کے اساسی اصولوں پر قائم ہے۔ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ اللہ جس طرح میرا رب ہے اسی طرح تمہارا رب ہے۔ اور یہ کہ وہ بذات خود رب نہیں ہیں بلکہ عبد ہیں۔ اس لئے بندگی اور عبادت رب واحد کی کی جائے کیونکہ عبادت اس کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد ان تمام باتوں کا اظہار یعنی یہ کہ ..واحد ہے۔ اسی کی بندگی ہوگی' رسول اور اس

کے لائے ہوئے نظام حیات کی اطاعت ہوگی۔ یہ تو ہے صراط مستقیم اور اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ بے راہی گمراہی اور انحراف ہے۔

O.........O.........O.........O.........O

ملائکہ کی جانب سے حضرت مریم کو بشارت' پھر آنے والے نبی کی صفات' اس کی رسالت' اس کے معجزات اور کلمات کے تذکرے کے بعد اب اس قصے میں اچانک وہ منظر سامنے آتا ہے جب حضرت عیسیٰ محسوس کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل کفر اور انکار پر تل گئے ہیں' اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب سے اللہ کے دین کی نشرو اشاعت اور اس کے قیام کیلئے ایک عام اپیل کی جاتی ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

"جب عیسیٰ ؑ نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کفرو انکار پر آمادہ ہیں تو اس نے کہا' کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے۔ حواریوں نے جواب دیا ہم اللہ کے مددگار ہیں' ہم اللہ پر ایمان لائے۔ گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں۔ مالک جو فرمان تو نے نازل کیا ہے' ہم نے اسے مان لیا ہے اور رسول کی پیروی قبول کی' ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ دے۔"

یہاں سیاق قصہ میں ایک بہت بڑا خلا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی۔ نہ یہ مذکور ہے کہ ان کی ماں ان کے ساتھ قوم کے سامنے آئی اور اس نے گہوارے میں ان سے باتیں کیں' یہ بات مذکور نہیں ہے کہ جوان ہو کر انہوں نے تبلیغ رسالت شروع کی' نہ یہ مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ کی والدہ کو جن معجزات کے بارے میں بشارت دی گئی تھی وہ ان کے ہاتھ دکھائے گئے (جب کہ سورت مریم میں مذکور ہے۔) اس قسم کے گیپ قرآنی قصوں میں بار بار آتے ہیں' اس کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ تکرار نہ ہو' دوسری یہ کہ قرآن کریم میں قصص کے صرف وہی حصے دیئے جاتے ہیں جن کا تعلق اس سورت میں موضوع کلام سے ہوتا ہے باقی کڑیاں ترک کر دی جاتی ہیں۔

غرض' معجزات پیش کرنے اور تبلیغ شروع کرنے کے ساتھ ہی حضرت عیسیٰ ؑ نے محسوس کر لیا کہ یہ لوگ مان کر دینے والے نہیں ہیں' حالانکہ ایسے معجزات کا صدور کسی انسان سے ممکن نہ تھا۔ اور جن سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان معجزات کے پس منظر میں صرف اللہ کی ذات کام کر رہی ہے۔ اللہ کی قوتیں حضرت عیسیٰ کی مؤید ہیں۔ اور پھر ان امور کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی حقیقت تھی کہ حضرت مسیح اس لئے بھی تشریف لائے تھے کہ بنی اسرائیل پر ان کی نادانیوں کی وجہ سے' جو چیزیں بطور سزا حرام کی گئیں تھیں انہیں حلال کر دیں' تاکہ ان پر تخفیف ہو جائے اور قیود اور بوجھ اتر جائیں۔

تو ایسے موقعہ پر آپ نے فرمایا قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ "کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہے۔" یعنی کون ہے جو دعوت دین' اور اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں میری معاونت کرتا ہے۔ کون ہے جو میرے ساتھ اللہ تک پہنچنے کے سلسلے میں مددگار ہوتا ہے تاکہ میں اپنے فرائض اچھی طرح ادا کر سکوں۔........ یہ تحریک دعوت دین کا طریق کار رہا ہے۔ کہ ہر داعی کیلئے انصار کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ جو اس کی دعوت کے علم اٹھا کر چلتے ہیں' جو اس کی حمایت کرتے ہیں اور اس دعوت کو مسلسل پھیلاتے ہیں اور پھر اس صاحب دعوت کی وفات یا چلے جانے کے بعد اسے لیکر اٹھتے ہیں تو

قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ ۚ آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ

"حواریوں نے جواب دیا ہم اللہ کے مددگار ہیں' ہم اللہ پر ایمان لائے۔ گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں۔"

حواریوں نے اسلام کا ذکر ان معنوں میں کیا' جن کا تعلق دین کی حقیقت سے ہے۔ اور انہوں نے پھر اپنے اسلام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گواہ بنایا اور اللہ کی مدد کیلئے تیار ہو گئے۔ یعنی اللہ کے رسول کی نصرت' دین اسلام کی نصرت اور اسلامی نظام حیات کی نصرت کیلئے وہ تیار ہوئے اور اس کے بعد وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور وہ اس معاملے میں براہ راست اللہ سے بھی اپنا رابطہ قائم کرتے ہیں کہ وہ اس معاملے کیلئے تیار ہو گئے۔ اس لئے آپ بھی اس بات کے گواہ رہیں۔

رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ

"مالک جو فرمان تو نے نازل کیا ہے' ہم نے اسے مان لیا ہے اور رسول کی پیروی قبول کی' ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ دے۔"

یہ جو انہوں نے براہ راست اللہ میاں کی طرف توجہ فرمائی' اور اللہ کے ساتھ بھی یہ وعدہ کیا' اس میں ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے۔ مومن کا ابتدائی عہد صرف اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب ایک رسول کسی پیغام کو اہل ایمان تک پہنچا دیتا ہے تو پھر اس کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے اور اب مومن کی بیعت اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو جاتی ہے۔ اور جب رسول اس دنیا سے چلا بھی جائے تب بھی یہ فریضہ اور یہ ذمہ داری مومن کے گلے میں پڑی رہتی ہے۔ اور اس بیعت میں' معاہدہ ذمہ داری میں یہ بات ہوتی ہے کہ وہ رسول کی اطاعت کرتے رہیں گے۔ اس لئے ایمان صرف عقیدے کا نام نہیں ہے جو انسان کے ضمیر میں ہوتا ہے بلکہ اتباع کا نام ہے اور رسول کے نظام کی اطاعت بھی ضروری ہے اور یہی وہ مفہوم ہے جس کے اردگرد اس پوری سورت کے مضامین گھوم رہے ہیں۔ اس سورت میں اس مضمون کو مختلف طریقوں سے مکرر طور پر بیان کیا گیا ہے۔

یہاں حواریوں کے کلام میں ایک اہم جملہ ہے فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ..................... "آپ ہمارے نام گواہی دینے والوں میں لکھ دیں۔" سوال یہ ہے کہ وہ کیا شہادت دیتے ہیں اور کس بات کے وہ گواہ ہیں؟

درحقیقت ایک شخص جو ایمان لا کر مسلم بن جاتا ہے اور اللہ کے دین کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے تو اس کے بعد اس کا فرض ہے کہ وہ اس دین کے بارے میں شہادت دے۔ وہ گواہی دے کہ اس دین کا یہ حق ہے کہ یہ قائم و دائم رہے۔ وہ ایسی شہادت دے کہ اس دین میں انسانوں کیلئے جو بھلائی ہے وہ اس کی شہادت ہے۔ اور یہ مومن اس وقت تک شہادت نہیں دے سکتا جب تک وہ اپنے نفس اپنے اخلاق اور اپنی پوری زندگی کو اس دین کی جیتی جاگتی تصویر نہ بنا لے۔ وہ ایسی تصویر بنائے کہ لوگ اسے دیکھتے ہی ایک مثال سمجھیں اور اس بات کی شہادت دیں کہ واقعی اگر دین کی یہ صورت ہے تو یہ دین اس بات کا مستحق ہے۔ کہ وہ زندہ رہے۔ اور یہ کہ یہ دین اس پوری کائنات میں تمام نظاموں اور طریقوں اور سوسائٹیوں کے مقابلے میں افضل اور بہتر ہے۔

ظاہر ہے کہ کوئی شخص یہ شہادت اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک وہ اس دین کو اپنے لئے ضابطۂ حیات نہ بنا لے۔ جب تک وہ اسے اجتماعی نظام نہ بنا لے۔ اور جب تک وہ اسے اپنے اور اپنی قوم کیلئے نظام قانون نہ بنا لے۔ اور جب تک اس کے اردگرد ایسا معاشرہ قائم نہ ہو جائے جو اس نظام حیات کے مطابق اپنی زندگی کے معاملات کو چلاتا ہو۔ جو ایک خدائی نظام اور جو ایک مضبوط نظام ہے۔ نیز یہ شہادت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ مومن اس نظام حیات کے قائم کرنے کیلئے جہاد نہیں شروع کرتا۔ اور جب تک وہ اس جہاد میں زندگی پر موت کو ترجیح نہیں دیتا یعنی اس معاشرے کے خلاف جس میں انسانی زندگیوں پر اسلامی نظام رائج نہ ہو اور یہ اس بات کی شہادت ہوگی کہ اقامت دین کا فریضہ خود اس کی زندگی سے بھی عزیز تر ہے۔ حالانکہ زندگی تمام زندہ چیزوں کیلئے ایک عزیز متاع ہوتی ہے۔

ں لئے شھید کو شہید کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ یہ شہادت دیتا ہے۔

یہاں ان حواریوں نے دعا کی کہ اللہ ہمیں ایسے گواہوں میں لکھ دے 'ہم دین کیلئے شہادت دیں گے۔ یعنی وہ دعا کرتے ہیں کہ ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہماری زندگی دین مسیحی کا زندہ نمونہ بن جائیں اور ہمیں توفیق دے کہ ہم ایک ایسے معاشرے کو وجود میں لانے کیلئے سعی کریں جس میں یہ دین قائم ہو۔ اگر انہوں نے اس کا حق ادا کر دیا تو گویا انہوں نے اس دین کے حق کی شہادت دیدی کہ یہ دین سچا دین ہے۔

میں یہاں یہ بات کہوں گا کہ آج جو شخص بھی اپنے لئے ایمان اور اسلام کا دعویدار سمجھتا ہے وہ ذرا اس دعا پر غور کرے۔ یہ ہے اصلی اسلام 'جس طرح حواریوں نے اسے سمجھا۔ جس طرح حقیقی مسلمانوں کے دل میں بھی یہ حقیقت اچھی طرح بیٹھی ہوئی ہے۔ اور جو شخص دین کیلئے یہ شہادت نہ دے گا اور اسے چھپا دے گا تو اس کا دل گنہگار ہے۔ یاد رہے کہ جو شخص اسلام کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنی عملی زندگی میں اسلام کے خلاف روش اختیار کرتا ہے 'جو شخص اسلام پر یقین رکھتا ہے لیکن اسلامی فرائض علی الاعلان ادا نہیں کرتا 'اور اسلامی نظام حیات کو عملاً قائم کرنے کے لئے جدوجہد نہیں کرتا۔ وہ یہ کام یا اپنی پرامن زندگی کیلئے کرتا ہے یا اپنی زندگی کو دین اسلام کی زندگی پر فوقیت دیتا ہے تو اس نے یقیناً شہادت حق دینے میں سخت کوتاہی کی یا اس نے اسلام کے خلاف دوسرے نظاموں کے حق میں شہادت دی۔ یہ ایسی شہادت ہے جو دوسروں کو بھی اسلام کی طرف آنے سے روکتی ہے۔ اس لئے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ اہل اسلام اسلام کے حق میں نہیں بلکہ اسلام کے خلاف شہادت دے رہے ہیں۔ اور اس شخص کا انجام عظیم بربادی ہے جو اپنے اس دعوے کی بناء پر کہ وہ مسلم ہے تمام لوگوں کو اسلام سے روکتا ہے۔ حالانکہ وہ دین کا مومن نہیں ہوتا بلکہ وہ دین سے روکنے والا ہوتا ہے۔[۱] اب بنی اسرائیل کے ساتھ قصہ عیسیٰ علیہ السلام کا آخری حصہ آتا ہے۔

۵ ع ۱۳ ۱۳

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَىَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۫ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾

"پھر بنی اسرائیل مسیح کے خلاف خفیہ تدبیریں کرنے لگے جواب میں اللہ نے بھی اپنی خفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔ (وہ اللہ کی خفیہ تدبیر ہی تھی۔) جب اس نے کہا کہ "اے عیسیٰ! اب میں تجھے واپس لے لوں گا اور تجھ کو اپنی طرف اٹھا

---

[۱] اس موضوع پر استاد مودودی نے اپنی کتاب شہادت حق میں جو تحقیقی بحث کی ہے اسے ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ (سید قطب)

لوں گا۔" اور جنہوں نے تیرا انکار کیا ان سے تجھے پاک کروں گا۔ اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک ان لوگوں پر بالادست رکھوں گا جنہوں نے تیرا انکار کیا ہے۔ پھر تم سب کو آخر کار میرے پاس آنا ہے۔ اس وقت میں ان باتوں کا فیصلہ کروں گا۔ جن میں تمہارے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ جن لوگوں نے کفرو انکار کی روش اختیار کی ہے انہیں دنیا و آخرت دونوں میں سزا دوں گا اور وہ کوئی مددگار نہ پائیں گے' اور جنہوں نے ایمان اور نیک عمل کا رویہ اختیار کیا ہے' انہیں ان کے اجر پورے دیئے جائیں گے اور خوب جان لو کہ ظالموں سے اللہ ہرگز محبت نہیں کرتا۔"

وہ مکاری جو یہودیوں نے اپنے رسول حضرت عیسیٰ ؑ کے ساتھ کی وہ عظیم مکاری تھی' اس کا تانا بانا بہت طویل و عریض تھا۔ جس طرح اناجیل میں مذکور ہے کہ انہوں نے اس پر الزام لگایا کہ اس نے اپنے منگیتر یوسف نجار کے ساتھ تعلقات قائم کئے تھے۔ حالانکہ وہ پاک دامن تھیں اور ابھی یوسف کے ساتھ ان کی شادی نہ ہوئی تھی۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ پر جھوٹ بولنے کا الزام لگایا۔ علاوہ ازیں اس کے بعد انہوں نے رومی حکمران بیلاطس کے پاس ان کے خلاف شکایات کیں اور کہا کہ وہ لوگوں کو رومی حکومت کے خلاف بغاوت پر ابھارتا ہے۔ اور یہ کہ وہ گمراہ ہو گیا ہے اور عوام الناس کے عقائد خراب کر رہا ہے۔ چنانچہ بیلاطس نے انہیں گرفتار کر کے حکم دیا کہ وہ خود اسے جو سزا دینا چاہیں دیدیں' اس لئے کہ وہ اگرچہ ایک بت پرست تھا مگر وہ یہ جانتا تھا کہ ایک ایسے شخص کو وہ کس طرح سزا دے جس پر اس کا کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ یہ تھیں ان کی سازشیں بلکہ یہ ان کی سازشوں کا ایک حصہ تھا۔

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ........................ "وہ اس کے خلاف خفیہ تدبیریں کرنے لگے اور اللہ نے ان کے خلاف خفیہ تدبیر کی' اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔"

اللہ کی تدبیر اور یہودیوں کی تدبیر کے درمیان صرف مشاکلت لفظی ہے ورنہ حقیقت کے اعتبار سے یہودیوں کی تدبیر مکر ہے اور اللہ کا جواب تدبیر ہے اور مکر کا مفہوم بھی تدبیر کرنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہاں لفظ مکر اپنے لئے اس لئے استعمال کیا ہے کہ اس سے اللہ ان کے مکر کی حقارت کا اظہار فرمائیں۔ اس لئے کہ ان کا مقابلہ اللہ سے کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ کہاں اور اللہ کہاں ان کا مکر کیا اور اس کے مقابلے میں اللہ کی تدبیر دونوں میں کیا مقابلہ ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ ؑ کو قتل کرنا یا سولی پر چڑھانا چاہتے تھے۔ لیکن اللہ نے انہیں صحیح سلامت اپنے ہاں بلالیا' اور انہیں ان کفار اور ان کے گندے ماحول سے پاک کر لیا۔ یعنی دور کر دیا' اور اس کے بعد انہیں یہ عزت دی کہ جو لوگ ان کے ماننے والے ہیں قیامت تک ان لوگوں کے مقابلے میں برتر رہیں گے جو ان کی تعلیمات کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔ اور جس طرح اللہ نے چاہا ایسا ہی ہوا۔ اور اللہ نے مکاروں کے مکر کے بخیئے ادھیڑ دیئے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّیْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ

جب اللہ نے کہا کہ "اے عیسیٰ! اب میں تجھے واپس لے لوں گا اور تجھ کو اپنی طرف اٹھالوں گا۔" اور جنہوں نے تیرا انکار کیا ان سے تجھے پاک کروں گا۔ اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک ان لوگوں پر بالادست رکھوں گا جنہوں نے تیرا انکار کیا ہے۔

آپ کی وفات کیسے تھی' آپ کا آسمانوں پر اٹھایا جانا کیسے تھا۔ یہ غیبی امور ہیں اور یہ متشابہات میں داخل ہیں۔ جن کی تاویل صرف اللہ جانتا ہے۔ اس لئے اس بارے میں بحث کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ نہ عقیدہ میں فائدہ ہے اور نہ شریعت میں فائدہ ہے۔ جو لوگ اس کے پیچھے پڑتے ہیں اور اسے بحث و مجادلہ کا موضوع بناتے ہیں تو وہ آخر کار ایسے حالات تک پہنچتے ہیں جو ظاہری اور سطحی باتیں ہوتی

ہیں۔ مزید التباس اور پیچیدگی میں پھنس جاتے ہیں اور وہ کوئی قطعی حقیقت سامنے نہیں لاسکتے۔ نہ دل کو کوئی تسلی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ ایسا امر ہے جس کی تاویل اللہ ہی جانتا ہے......... رہی یہ بات کہ اللہ نے حضرت عیسیٰ ؑ کے پیروکاروں کو قیامت تک ان لوگوں سے برتر کر دیا ہے جنہوں نے ان کا انکار کیا ہے۔ تو اس کا مفہوم بہت ہی سہل ہے۔ حضرت عیسیٰ ؑ کے متبعین وہی لوگ ہیں جو اللہ کے صحیح دین کو ماننے والے ہیں اور وہ اسلام ہے۔ اور اسلام وہ دین ہے جس کی حقیقت ہر نبی کے علم میں تھی۔ اور ہر رسول نے اسلام ہی کی تبلیغ کی۔ اور جب بھی کسی نے دین حقہ پر ایمان لایا تو وہ اسلام ہی تھا' اور اللہ کے دین حق یعنی اسلام کو ماننے والے ہی ان لوگوں سے عند اللہ برتر ہیں۔ جنہوں نے ان کا کفر کیا۔ عملی زندگی میں بھی جب وہ لوگ جو حضرت عیسیٰ ؑ پر ایمان لائے۔ ان لوگوں کے مقابلے میں آتے ہیں جو ان کا انکار کرتے ہیں تو اپنی ایمانی قوت کی وجہ سے وہ لوگ جو ایمان لائے برتر ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ حضرت عیسیٰ کے متبعین ہیں۔ اللہ کا دین ایک ہے۔ اسی دین کو لیکر حضرت عیسیٰ ؑ آئے تھے۔ جس طرح ان سے پہلے اور ان کے رسول سب کے سب اسی دین کو لیکر آئے اور جو لوگ حضرت محمد ﷺ کا اتباع کرتے ہیں وہ آدم ؑ سے لے کر حضرت محمد نبی آخر الزمان تک تمام رسولوں پر ایمان لاتے ہیں......... یہی عام مفہوم ہے جو اس سورت کے سیاق و سباق سے منطبق ہے۔ اور یہی مفہوم حقیقت دین اور حقیقت ایمان کے ساتھ مطابق ہے۔ اور اہل ایمان اور اہل کفر کا انجام کار یہی ہے کہ وہ سب اللہ کے سامنے جائیں گے۔

ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٥٥﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿٥٦﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ

"پھر تم سب کو آخر کار میرے پاس آنا ہے۔ اس وقت میں ان باتوں کا فیصلہ کروں گا جن میں تمہارے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ جن لوگوں نے کفر و انکار کی روش اختیار کی ہے انہیں دنیا و آخرت دونوں میں سزا دوں گا اور وہ کوئی مددگار نہ پائیں گے' اور جنہوں نے ایمان اور نیک عمل کا رویہ اختیار کیا ہے' انہیں ان کے اجر پورے پورے دیئے جائیں گے اور خوب جان لو کہ ظالموں سے اللہ ہرگز محبت نہیں کرتا۔"

اس آیت میں اس بات کا فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ ہر کسی کو کئے کی جزاء ملے گی اور اس قدر انصاف ہو گا کہ بال برابر بے انصافی بھی نہ ہوگی۔ اس سلسلے میں چاہے لوگوں کی تمنائیں جو بھی ہوں یا انہوں نے جو افتراء باندھی ہو......... اللہ کی طرف لوٹنا اٹل ہے۔ اس سے کوئی چھٹکارا نہیں ہے۔ اور لوگوں کے درمیان جو اختلافات ہیں ان کے درمیان ایک دن فیصلہ اللہ نے کرنا ہی ہے۔ اس سے بھاگنے کی سبیل نہیں اور دنیا و آخرت میں اہل کفر کیلئے عذاب طے ہو چکا ہے' کوئی نہیں ہے کہ اسے رو کر سکے۔ اور جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اس کے بعد نیک کام کئے انہیں پورا پورا اجر ملنا ہے۔ اس میں کوئی کمی بیشی ممکن ہی نہیں اور اللہ کبھی ظلم نہیں کرے گا اور وہ کیسے کرے گا جب وہ خود ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

اور اہل کتاب کا یہ گمان کہ وہ محض چند دن ہی آگ میں داخل ہوں گے اور اپنے اس گمان پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے بارے میں جو صغریٰ کبریٰ ملایا وہ سب ان کی نفسانی خواہشات ہیں وہ فاسد ہیں' وہ باطل ہیں اور ان کی کوئی اصل و اساس نہیں ہے۔

○......☆......○......☆......○

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قصہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے ' جس کے بارے میں اس وقت حضور ﷺ کا ان لوگوں کے ساتھ مناظرہ ہو رہا تھا تو اس کے بعد اس قصے پر ایک اختتامیہ آجاتا ہے اور اس اختتامیہ میں وہ تمام حقائق کھول دیئے جاتے ہیں جو اس قصے کے واقعات سے اخذ ہوتے ہیں ۔ اور اب رسول خدا ﷺ کو وہ بات بتا دی جاتی ہے جسے اب اہل کتاب کے سامنے اس مباحثے کو ختم کرنے کیلئے پیش کر دیں ' یہ بات ایک فیصلہ کن بات ہے جس کے ذریعہ یہ تمام مباحثہ اور مذاکرہ ختم ہو جاتا ہے ۔ اور اس میں وہ حقیقت بھی آجاتی ہے جسے لیکر آپ آئے ہیں ۔ جس کی طرف آپ دعوت دیتے ہیں اور یہ نتیجہ مکمل یقین اور مکمل وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے ۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَ الذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿٥٨﴾ اِنَّ
مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ
فَيَكُوْنُ ﴿٥٩﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿٦٠﴾ فَمَنْ حَآجَّكَ
فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ
وَنِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ۫ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ
عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿٦١﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ
وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٦٢﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٣﴾
قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا
اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾

٦ / ع ٩ / ١٤

" یہ آیات اور حکمت سے لبریز تذکرے ہیں جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں ' اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا ۔ یہ اصل حقیقت ہے جو تمہارے رب کی طرف سے بتائی جا رہی ہے ۔ اور تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جو اس میں شک کرتے ہیں ۔ یہ علم آجانے کے بعد اب جو کوئی آپ سے جھگڑا کرے تو اس سے کہو کہ آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں ۔ اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہے اس پر خدا کی لعنت ۔ یہ بالکل صحیح واقعات ہیں ' اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی خداوند نہیں ہے ۔ اور وہ اللہ ہی کی ہستی ہے جس کی طاقت سب سے بالا اور جس کی حکمت نظام عالم میں کارفرما ہے ۔ پس اگر یہ لوگ منہ موڑیں تو ان کا مفسد ہونا صاف کھل جائے گا اور اللہ مفسدوں کے حال سے واقف ہے ۔ کہو اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے ۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا اپنا رب نہ بنالے ۔ " اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں ۔ "

اس اختتامیہ میں سب سے پہلے تو یہ کہا گیا ہے کہ حضور ﷺ پر جو وحی نازل ہوئی ہے وہ حق ہے۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَ الذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ........................ "یہ آیات اور حکمت سے لبریز تذکرے ہیں جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔" یہ قصے اور یہ قرآنی ہدایات 'سب کی سب اللہ کی وحی پر مبنی ہیں اور خود اللہ انہیں پڑھ کر نبی ﷺ کو سناتے ہیں۔ انداز بیان ایسا ہے جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ حضور اکرم کو اللہ میاں کا قرب اور خوشنودی حاصل ہے۔ جب خود اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو حکمت و دانائی کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں۔ اللہ دانا و حکیم ہیں انسانی زندگی اور نفس کے حوالے سے اونچے حقائق اس کے پاس ہیں۔ اور وہ اس نے ایک خاص طریقے اور خاص اسلوب کے ساتھ وہاں ودیعت کیے ہیں۔ وہی بتا سکتا ہے کہ فطرت کے ساتھ ہمکلامی کا طریقہ کیا ہے۔ اور فطرت انسانی تک رسائی کا اسلوب کیا ہے۔ اور یہ حکمت اس انداز میں بتائی جاتی ہے جس کی کوئی سابق نظیر نہیں ہے۔ یعنی اس تمام انسانی حکمت کے ریکارڈ میں جس کا مصدر اور منبع اللہ نہ ہو۔

اس کے بعد یہ اختتامیہ حقیقت مسیح کا فیصلہ کر دیتا ہے 'فیصلہ کن انداز میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کا ارادہ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔ جس طرح اللہ نے حضرت عیسیٰ ؑ کو پیدا کیا۔ اللہ کے ہاں تخلیق کا عمل صرف یہ ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ......... "اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے بنایا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔"

حضرت عیسیٰ کی ولادت اس اعتبار سے کہ وہ پیدائش انسانی کے عام ڈگر سے ہٹ کر ہے ضرور تعجب انگیز ہے۔ لیکن جب اسے حضرت آدم ؑ کی تخلیق کے حوالے سے دیکھا جائے' تو اس میں کوئی انوکھی چیز نظر نہیں آتی۔ پیدائش مسیح کے معاملے میں اہل کتاب کے درمیان جو بحث و مناظرہ اور جدل و جدال جاری تھا۔ اور اس سلسلے میں وہ عجیب و غریب قصے کہانیاں گھڑ رہے تھے۔ طلسماتی ماحول پیدا کر رہے وہ ایک عجیب بات ہے۔ محض اس لئے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ یہی اہل کتاب اپنی کتابوں میں صبح و شام یہ تلاوت کرتے تھے کہ حضرت آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا اور اس ڈھانچے میں پھر اللہ نے روح پھونکی اور اس سے بطور انسان آدم زندہ ہو گیا۔ اور وہ حضرت آدم کے بارے میں اس قسم کے قصے کہانیاں نہ گھڑتے تھے۔ اور نہ ہی بحث و مباحثہ کرتے تھے۔ وہ آدم ؑ کے بارے میں یہ سوچتے تھے کہ ان کی بھی ایک لاہوتی طبیعت ہے۔ اس لئے کہ جس عناصر سے آدم انسان بن کر آئے وہی عناصر ہیں جن سے حضرت عیسیٰؑ بن باپ پیدا ہو کر آئے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ میں اپنی روح پھونکی' اور حضرت عیسیٰؑ میں بھی روح ڈالی۔ اور اس کا طریقہ کار ایک کلمہ کن سے مکمل ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے کن کہا اور جو اس نے پیدا کرنے کا ارادہ کیا تھا وہ فیکون ہو گیا۔

یہ حقیقت کس قدر سادہ ہے حقیقت آدم بھی یہ ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ بلکہ تمام مخلوقات کی تخلیق کی بس یہی حقیقت ہے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو ذہن انسانی میں بسہولت اور بوضاحت آجاتی ہے۔ تعجب تو اس پر ہے کہ ان واقعات کے بارے میں یہ طویل مجادلہ اور مباحثہ کیوں ہوتا رہا۔ حالانکہ یہ واقعہ اللہ کی سنت کبریٰ کے مطابق تھا۔ جو اس پوری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ یعنی تخلیق کرنا اور دوبارہ اٹھانا۔

دراصل یہ ہے انداز اس ذکر حکیم کا' یہ ذکر فطرت انسانی کو فطری منطق سے خطاب کرتا ہے۔ جو واقعی عملی' سادہ ہوتی ہے۔ اس حکیمانہ انداز کلام کی وجہ سے دنیا کے پیچیدہ ترین' مشکل ترین فلسفی مسائل بھی اسے سہل نظر آتے ہیں جیسے روز مرہ کے معمولات۔

سیاق کلام جب اس واضح فیصلے تک پہنچ جاتا ہے۔ تو روئے سخن اب حضور اکرم ﷺ کی طرف پھر جاتا ہے۔ اور آپ کو بتایا جاتا ہے کہ آپ اپنے سچے موقف پر قائم رہیں۔ جس کی تلاوت آپ کے سامنے کی جاری ہے اور جسے آپ کے حس اور شعور میں بٹھایا جا رہا ہے جس

طرح اہل ایمان کے حس و شعور میں اسے مضبوط طرح جاگزین کیا جارہا ہے اس لئے کہ اہل ایمان میں سے بعض افراد پر اہل کتاب کے شبہات اثر ڈال رہے تھے اور عجیب انداز میں تلبیس کر کے اہل ایمان کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

فرماتے ہیں۔ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ..................... "تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جو اس میں شک کرتے ہیں" ......... حضور تو نہ شک کرتے تھے اور نہ ہی ان کے دل میں کوئی خلجان تھا۔ ان پر جو کلام نازل ہوتا تھا وہ اسے من جانب اللہ سمجھتے تھے۔ ایک لحظہ کیلئے بھی شک ان کے قریب نہیں آیا۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ آپ اس ہدایت پر جم جائیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت مسلمہ کے دشمنوں نے اس دور میں اہل ایمان کے خلاف سخت سازشوں کا جال پھیلا رکھا تھا' اور وہ اس سازش میں امت مسلمہ کے بعد افراد کو پھانس رہے تھے۔ امت مسلمہ کے خلاف یہ سازشیں آج بھی ہو رہی ہیں اور ہر دور میں ہوتی رہی ہیں۔ اور اس بات کی ضرورت ہے کہ امت مسلمہ ان دھوکہ بازوں اور جھوٹوں کے مقابلے میں محتاط رہے۔ اس لئے کہ امت کے اس قسم کے دشمن ہر دور میں نیا جال لیکر آتے ہیں۔

غرض پیدائش مسیح کا مسئلہ حل ہو گیا۔ حقیقت واضح ہو گئی' اب اللہ تعالیٰ رسول کریم ﷺ کو اس طرف متوجہ فرماتے ہیں کہ وہ اب ان لوگوں کے ساتھ یہ مجادلہ اور مناظرہ ختم کر دیں اس لئے کہ مسئلہ واضح ہو گیا' سچائی واضح طور پر سامنے آگئی ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ اب آخری بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو مباہلے کی دعوت دی جائے۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ۫ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ

"یہ علم آجانے کے بعد اب جو کوئی آپ سے جھگڑا کرے تو اس سے کہو کہ آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں۔ اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہے اس پر خدا کی لعنت۔"

اس کے بعد اس موضوع پر رسول خدا کے ساتھ جو لوگ مباحثہ کرتے تھے' حضور نے بھرے مجمعے میں انہیں دعوت مباہلہ دی۔ یعنی سب آجائیں اور اللہ سے دست بدعا ہوں کہ اللہ جھوٹوں پر لعنت نازل کرے۔ اس چیلنج کے انجام سے وہ لوگ ڈر گئے اور انہوں نے مباہلہ کرنے سے انکار کر دیا۔ جس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ حضور ﷺ کا موقف سچا ہے۔ لیکن جس طرح بعض آیات میں آتا ہے کہ اسلام اس لئے قبول نہ کیا کہ ان لوگوں کو اپنے معاشرے میں ایک بلند مقام حاصل تھا۔ نیز یہ لوگ ان کے مذہبی پیشواؤں میں سے تھے اور اس دور میں اہل کینہ کو اپنی سوسائٹی میں مکمل اقتدار حاصل تھا اور اس کے ساتھ ان کے بڑے بڑے مفادات وابستہ تھے۔ اس سوسائٹی میں وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ بات نہ تھی کہ جو لوگ دین اسلام سے اعراض کر رہے تھے ان کے سامنے کوئی دلیل نہ پیش کی گئی تھی بلکہ ان کے بعض مفادات ایسے تھے جنہیں وہ نہ چھوڑ سکتے تھے' کچھ ایسی نفسیاتی خواہشات میں وہ گھرے ہوئے تھے جن پر وہ یہ نہ کر سکتے تھے۔ حالانکہ سچائی واضح ہو گئی تھی اور اس میں کوئی شک یا شبہ نہ رہا تھا۔

دعوت مباہلہ کے بعد اب اس اختتامیہ میں حقیقت وحی' حکمت قصص فی القرآن' اور حقیقت توحید کا بیان کیا جاتا ہے۔ شاید یہ آیات دعوت مباہلہ سے مجادلین کے انکار کے بعد اتری ہوں۔ اور ان لوگوں کو سخت دھمکی دی جاتی ہے جو خدا کی اس زمین پر محض برائے فی سبیل اللہ فساد یہ مجادلے کرتے ہیں۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ

الْحَكِيمُ ﴿٦٢﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٦٣﴾

"یہ بالکل صحیح واقعات ہیں' اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی خداوند نہیں ہے۔ اور وہ اللہ ہی کی ہستی ہے جس کی طاقت سب سے بالا ہے اور جس کی حکمت نظام عالم میں کارفرما ہے۔ پس اگر یہ لوگ منہ موڑیں تو ان کا مفسد ہونا صاف کھل جائے گا اور اللہ مفسدوں کے حال سے واقف ہے۔"

ان آیات میں جن حقائق کا بیان ہوا اس سے قبل ان کا بیان ہو گیا ہے۔ یہاں دعوت مباہلہ اور وفد کی جانب سے اس کے انکار کے بعد بطور تاکید دوبارہ ذکر کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں البتہ نئی بات یہ ہے کہ جو لوگ اس سچائی کو قبول نہیں کرتے وہ درحقیقت مفسد ہیں اور خبردار کیا جاتا ہے کہ تم اللہ سے پوشیدہ نہیں ہو' وہ اندازِ قدسے پہچانتا ہے۔

اور وہ فساد جو منکرین توحید' توحید کا انکار کر کے پھیلاتے تھے وہ اللہ کے نزدیک ایک عظیم فساد تھا۔ اور دنیا میں جس قدر فسادات بھی رونما ہوتے رہتے ہیں وہ سب کے سب عقیدۂ توحید سے انحراف کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور عقیدۂ توحید کا اعتراف بھی محض زبانی اعتراف کافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ محض زبانی اعتراف کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ نہ ہی ایسا دینی اعتراف جو خالص حقی اعتراف ہو' اس لئے کہ محض قلبی اور زبانی اعتراف کے نتیجے میں وہ آثار ظاہر نہیں ہوتے جو انسانوں کی عملی زندگی میں نمودار ہونے ضروری ہیں۔ دراصل دنیا نے عقیدۂ توحید کے لازمی آثار و نتائج سے انکار کر دیا ہے اور انسانی زندگی کے عقیدۂ توحید کے آثار کو ختم کر دیا ہے۔ عقیدۂ توحید کا پہلا لازمہ تو یہ ہے کہ ہمارا رب بھی ایک ہو' پھر اس رب کی غلامی اور بندگی بھی ایک ہو' اس لئے کہ بندگی صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے پھر اسی ایک رب کی اطاعت ہو' پھر تمام ہدایات بھی اسی ایک رب سے اخذ کی جائیں یعنی اس کے سوا عبودیت نہ ہو۔ اللہ کے سوا اطاعت نہ ہو اور اللہ کے سوا کوئی مرجع ہدایات نہ ہو۔ ہدایات چاہے قانون سازی میں ہوں' چاہے اقدار حیات اور فلسفہ حیات میں ہوں' چاہے آداب و اخلاق میں ہوں' غرض ان تمام امور میں جو اس کرۂ ارض پر حیات انسانی سے تعلق رکھتے ہیں صرف اللہ سے ہدایت لی جائیں ......... اگر ایسی صورت حال نہیں تو پھر شرک اور کفر کے سوا کوئی بات نہیں ہے۔ چاہے زبان سے جو کچھ کہتے جائیں۔ چاہے قلب و شعور میں مجرد عقائد جو بھی ہوں۔ الا یہ کہ لوگوں کی روزمرہ زندگی میں 'تسلیم و رضا' اطاعت و فرمانبرداری' امر و نہی کی قبولیت کی فضا قائم ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اس پوری کائنات کا نظام اس وقت تک درست طور پر چل ہی نہیں سکتا جب تک یہ تسلیم نہ کر لیا جائے کہ اس کا اللہ ایک ہی ہے۔ جو اس کے تمام معاملات کی تدبیر اور انتظام کرتا ہے۔ وَلَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ......
.......... "اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کئی الٰہ ہوتے تو وہ بگڑ جاتے۔" اور انسان کے حوالے سے اللہ کی خدائی کا ممتاز ترین مظہر یہ ہے کہ تمام بندے اس کی بندگی کریں۔ اور اللہ ان کیلئے نظام حیات تجویز کرے' ان کیلئے حسن و قبح کے پیمانے وضع کرے۔ لہٰذا جو شخص بھی یہ دعویٰ کرے کہ ان اشیاء میں سے کوئی چیز بھی اس کیلئے ہے' تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کے مخصوص ترین حقوق پر دست درازی کرتا ہے اور وہ اس معنی میں آپ کو لوگوں کے لئے الٰہ اور رب قرار دیتا ہے۔

اور اس معنی میں جب اس کرۂ ارض پر بہت سے الٰہ پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر اللہ کی یہ زمین فتنہ و فساد سے بھر جاتی ہے۔ اور لوگ پھر لوگوں کی بندگی اور غلامی شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد پھر بندوں میں سے بعض بندے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں یہ حق حاصل ہے کہ دوسرے لوگ ان کی ذاتی اطاعت کریں۔ اور یہ کہ انہیں بذات خود لوگوں کیلئے قانون بنانے کا حق حاصل ہے۔ اور یہ کہ وہ لوگوں کے بھلے برے کا فیصلہ از خود کر سکتا ہے۔ یہ تمام دعوے دراصل الوہیت کے دعوے ہیں۔ اگر ایسے لوگ فرعون کی طرح زبانی طور پر یہ نہ

کہیں۔ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ................ "میں تمہارا بڑا رب ہوں۔" اس لئے ایسے لوگوں کیلئے ایسے حقوق کا اقرار کرنا شرک اور کفر کا اقرار کرنا ہے۔ اور یہ دنیا میں بدترین فتنہ اور فساد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس تہدید اور توبیخ کے بعد سیاق کلام میں اہل کتاب کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ایسے نظریے کی طرف اٹھ آئیں جو فریقین کے درمیان یکساں ہے۔ یعنی صرف اللہ کی بندگی' اس کے ساتھ شرک نہ کرنا۔ اور ایک دوسرے کو رب نہ بنانا۔ اگر وہ یہ صورت نہیں اپناتے تو پھر ہماری راہیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جدا ہوگئیں۔ اس کے بعد نہ ملاپ ہو سکتا ہے اور نہ مکالمہ۔ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ

"کہو اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔" اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں۔"

اس میں شک نہیں ہے کہ یہ ایک منصفانہ دعوت ہے۔ ایسی دعوت ہے جس میں حضور ﷺ ان پر کسی قسم کی کوئی فضیلت و برتری حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور نہ اہل اسلام اس میں کسی قسم کی برتری چاہتے ہیں۔ ایک یکساں موقف جس کے سامنے سب کے سب برابری کی پوزیشن میں کھڑے ہوں گے۔ کوئی کسی پر برتری نہ چاہے گا۔ کوئی کسی دوسرے کو اپنا غلام نہ بنائے گا۔ یہ ایک ایسی دعوت ہے جس سے صرف بدفطرت اور مفسد ہی انکار کر سکتا ہے۔ جو یہ نہیں چاہتا کہ حق کے سامنے جھک جائے۔

یہ ایک ایسی دعوت ہے کہ وہ صرف اللہ کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کریں۔ نہ کسی بشر کو' نہ کسی پتھر کو' اللہ کی طرف ایسی دعوت کہ جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہ ہو۔ نہ نبی کا غلام ہو' نہ رسول کا غلام ہو' بلکہ سب اللہ کے بندے اور غلام ہوں۔ نبی اور رسول تو وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے تبلیغ دین کیلئے چن لیا ہوتا ہے۔ اس لئے نہیں منتخب کیا ہوتا کہ وہ اللہ کے ساتھ الوہیت یا ربوبیت میں شریک بن جائیں۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ................ "اگر وہ منہ موڑیں تو پھر صاف کہہ دو کہ ہم تو مسلم ہیں۔" یعنی اگر وہ اس بات سے انکار کر دیں کہ وہ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کریں گے اور اس نے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور اس بات سے انکار کر دیں کہ بندگی صرف اللہ کیلئے ہے۔ بغیر کسی شرک کے۔ یہ وہ دو ایسے مظاہر ہیں جن سے اللہ کی نسبت سے بندے کے موقف کا اظہار ہوتا ہے۔ تو اگر اس نظریئے سے وہ منہ موڑیں تو تم اس کے مطابق اپنے اسلام کا اعلان کر دو۔

یہاں مسلمانوں اور ان لوگوں کو جو اللہ کے سوا ایک دوسرے کو رب مانتے ہیں' ایک دوسرے کے مقابلے میں پیش کیا گیا ہے' جس سے اس بات کی فیصلہ کن وضاحت ہو جاتی ہے کہ اللہ کے نزدیک "الْمُسْلِمُوْنَ" کون ہیں' مسلمون وہ ہیں جو صرف اللہ کی بندگی اور اطاعت کریں اور صرف اللہ کی عبادت کریں اور ساتھ ساتھ باہم ایک دوسرے کو بھی اپنا رب نہ بنائیں۔ یہ ہے مسلمانوں کی خصوصیت جو انہیں تمام ملتوں اور تمام مکاتب فکر سے جدا کرتی ہے۔ اور ان کے نظام زندگی کو تمام نظامہائے زندگی سے جدا اور ممتاز کرتی ہے۔ اب اگر ان میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے تو وہ مسلمان ہیں اور اگر ان میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی تو وہ مسلمان نہیں چاہے جس قدر وہ دعویٰ کریں اپنے مسلمان ہونے کا۔

اسلام کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان بندے کی غلامی سے مطلقاً آزاد ہو جائے اور اسلامی نظام زندگی وہ واحد نظام زندگی ہے جو کسی انسان کو اس ہمہ گیر آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کرۂ ارض میں جس قدر نظام ہائے حیات رائج ہیں ان میں لوگ بعض دوسرے لوگوں کو اپنا رب تسلیم کئے ہوئے ہیں۔ دنیا کی بہترین سے بہترین جمہوریتوں میں اور بدترین سے بدترین آمریتوں میں یہی صورت حال ہے۔ ربوبیت کا پہلا خاصہ ہی یہ ہے کہ لوگ اس رب کی بندگی کریں۔ اور وہ رب لوگوں کیلئے اجتماعی نظم' طرز زندگی' ضابطے' قوانین اور نیک و بد کے پیمانے وضع کرے۔ اور اس وقت دنیا میں جس قدر نظامہائے زندگی رائج ہیں ان میں یہ حق بعض افراد کو حاصل ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں یہ حق لوگوں کے کسی مجموعے کو حاصل ہوتا ہے۔ لوگوں کا یہ گروہ جو دوسروں کے لیے قوانین وضع کرتا' نیک و بد کے پیمانے وضع کرتا ہے اور ان کے لئے فکر اور فلسفہ وضع کرتا ہے یہی وہ گروہ ہے جو اپنے آپ کو اس زمین پر رب بناتا ہے۔ یہی مفہوم ہے اس آیت کا تم میں سے بعض بعض کو رب نہ بناؤ۔ ان لوگوں کے متبعین ان کو ربوبیت اور الوہیت کا مقام عطا کرتے ہیں اور پھر اللہ کے سوا ان کی بندگی کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ ان کے سامنے رکوع و سجود نہ کرتے ہوں' اس لئے کہ بندگی ایک عبادت ہے اور یہ صرف اللہ کیلئے مخصوص ہے۔

صرف اسلامی نظام وہ نظام ہے' جس میں انسان کے گلے سے غیر اللہ کی غلامی کا یہ جوا اترتا ہے۔ اور وہ مکمل طور پر آزاد ہو جاتا ہے۔ وہ اس قدر آزاد ہوتا ہے کہ وہ اپنے لئے تصور حیات' اپنے لئے اجتماعی نظم و نسق' اپنے لئے نظام زندگی اور طریقۂ حیات اور اپنے نیک و بد کے پیمانے سب کے سب صرف اللہ سے اخذ کرتا ہے۔ اور اس کی حیثیت بعینہ وہی ہوتی ہے جو اس کرۂ ارض پر کسی بھی دوسرے انسان کی ہوتی ہے۔ پس زید مثلاً دنیا کے تمام انسانوں کے ساتھ من کل الوجوہ مساوی ہو جاتا ہے۔ تمام لوگ ایک سطح پر کھڑے ہوتے ہیں۔ تمام لوگوں کی نظریں ایک ہی مالک کی طرف اٹھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور ان میں کوئی بھی ایک دوسرے کا مالک نہیں ہوتا۔

اسی اور فقط اسی معنی میں اسلام اللہ کا دین ہے۔ اور یہی دین ہے جسے تمام رسل لے کر آئے' اور اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو اسی مفہوم میں مبعوث فرمایا تاکہ وہ لوگوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی کے اندر داخل کریں۔ اور لوگوں کے ظلم سے انہیں نکال کر اللہ کے انصاف کے اندر داخل کریں۔ پس اگر کوئی اس مفہوم کے مطابق اسلام سے منہ پھیرے' تو وہ اللہ میاں کی شہادت کے مطابق مسلم نہیں رہتا۔ چاہے تاویل کرنے والے جس قدر تاویلیں کریں۔ اور لوگوں کو گمراہ کرنے والے جس قدر گمراہ کریں بات یہی ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ ............................ "اللہ کے نزدیک معتبر دین صرف اسلام ہے۔"

# درس ۲۵ ایک نظر میں

سورت کا یہ حصہ بھی انہیں خطوط پر چلتا ہے' جن پر ابتداء یہ سورت چلی آرہی ہے۔ یعنی اہل کتاب اور جماعت مسلمہ کے درمیان برپا معرکہ آرائی' یعنی فریقین کے درمیان نظریاتی جنگ' اور دشمنان دین اور دین اسلام کے خلاف جو حیلہ سازی و مکاری یعنی جو فریب کاری اور دھوکہ بازی' جو کذب و افتراء اور مختلف قسم کی سازشیں اور تدابیر اختیار کرکے حق و باطل میں ہروقت التباس پیدا کرتے تھے۔ شکوک و شبہات پھیلاتے تھے۔ اور جس طرح اس امت کو نقصان پہنچانے کیلئے ہروقت گھات میں بیٹھے رہے تھے اور جس طرح وہ بلاناغہ مسلسل یہ کام کررہے تھے۔ ان کا ازالہ اور جواب' اور اس حصے میں مسلمانوں کو سمجھایا جارہا تھا کہ وہ اس صورت حال کا مقابلہ اس طرح کریں کہ جس حق پر قائم ہیں اس پر علی وجہ البصیرت قائم ہوں اور یہ یقین پیدا کریں کہ ان کے دشمن باطل موقف پر کھڑے ہیں۔ نیز اس سورت میں متنبہ کیا گیا تھا کہ دشمن تمہارے بارے میں کیا کیا منصوبے بناتے ہیں۔ آخر میں پھر ان دشمنوں کی تشریح بھی کردی گئی تھی۔ اور بتایا گیا تھا کہ ان کا مزاج' ان کے اخلاق' ان کے اعمال اور ان کی نیتیں کیسی ہیں۔ اور یہ باتیں کھول کر جماعت مسلمہ کے سامنے رکھدی گئیں تاکہ وہ اپنے دشمنوں کو اچھی طرح جان لے۔ اور وہ جس علم و معرفت کا دعویٰ کرتے تھے۔ اس کی قلعی بھی کھول دی گئی تھی۔ اور پھر جن مسلمانوں کو وہ دھوکہ دے رہے' ان کا اعتماد ان پر سے اٹھادیا تھا۔ انہیں ان سے متنفر کیا گیا۔ اور ان کی مکاریوں کو طشت از بام کردیا گیا تھا تاکہ وہ نہ کسی کو دھوکہ دے سکیں اور نہ ملمع کاری کرسکیں۔ یہ تھے مضامین پہلے سبق کے۔

لیکن اس سبق میں بھی اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے ساتھ بحث ہے' لیکن یہاں بتایا گیا ہے کہ خصوصاً حضرت ابراہیم ؑ کے بارے میں ان کا موقف اور نظریہ تو بادی النظر میں غلط ہے۔ یہودی سمجھتے تھے کہ وہ یہودی تھے' عیسائی یہ سمجھتے تھے کہ وہ عیسائی تھے۔ حالانکہ حضرت ابراہیم ؑ یہودیت اور نصرانیت دونوں کے وجود میں آنے سے بھی بہت پہلے دنیا میں تشریف لائے تھے۔ وہ تورات و انجیل کے نزول سے بھی پہلے تشریف لائے تھے۔ للذا ان کے بارے میں اس قسم کے دعوے کرنا محض وہم ہے۔ جس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم ؑ تو دین حنیف پر قائم تھے۔ جو سیدھے راستے کا نام ہے۔ اور ان کے دوست اور پیروکار کہلانے کے مستحق وہی لوگ ہیں جو اس کے طریقے پر ہوں۔ اور اللہ بھی اہل ایمان کا دوست ہوتا ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کے بارے میں یہ دعوے کہ وہ ابراہیم ؑ کے پیرو اور دوست ہیں باطل قرار پاتے ہیں۔ پھر بتایا جاتا ہے کہ رسولوں کے بارے میں اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ اہل اسلام تمام رسولوں کو برحق تسلیم کرتے ہیں إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ...................................... "ابراہیم سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے اس نسبت کے زیادہ حقدار ہیں۔ اور اللہ صرف انہی کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔" (۳:۶۸)

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم ؑ کے بارے میں اہل کتاب یہ مجادلہ کیوں کرتے ہیں؟ اس میں پردہ راز کیا ہے؟ بتایا جاتا ہے کہ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے دین کے معاملے میں گمراہ کردیں' ان کے عقائد میں شبہات پیدا کئے جائیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کی گوشمالی کی جاتی ہے۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۞ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

"اے اہل کتاب کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو' اے اہل کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مشتبہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو۔"

اس کے بعد جماعت مسلمہ کو ان سازشوں کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے۔ جو سازشیں وہ اہل ایمان کے عقائد' ان کے اعتماد اور ان کے اطمینان کے خلاف وہ خفیہ طور پر کرتے تھے۔ اور نہایت ہی مکاری سے کام لیتے تھے اور وہ سکیم یہ تھی کہ اہل کتاب میں سے کچھ لوگ صبح کے وقت اسلام کا اعلان کریں گے اور شام کو پھر واپس کفر کی طرف لوٹ جائیں گے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اہل اسلام میں سے جو لوگ ثابت قدم نہیں ہیں ان کے دل میں یہ خلجان ڈالدیں کہ اہل کتاب صبح مسلمان ہوئے اور شام کو پھر انہوں نے کفر کیوں اختیار کر لیا' اور ظاہر ہے کہ ہر جماعت کے اندر ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں جو ثابت قدم نہیں ہوتے۔ خصوصاً جبکہ ان کے نزدیک اہل کتاب کتب اور ادیان کے بارے میں زیادہ علم رکھتے تھے۔

وَ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَ اكْفُرُوْۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ

"اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو' شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔" یہ ان کا نہایت ہی مذموم منصوبہ تھا۔

اس کے بعد بتایا جاتا ہے' اہل کتاب کے اجتماعی اخلاق کیا ہیں اور یہ کہ معاہدات کے بارے میں ان کا نقطہ نظر کیا ہے۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جن کی امانت و دیانت مسلم ہے۔ لیکن ان میں اکثر ایسے ہیں ان میں امانت دیانت نام کو نہیں ہے۔ اور انہوں نے اپنی اس بددیانتی اور بدعملی سے اپنے مذہبی عقائد میں سے بعض دلائل تلاش کر لئے تھے۔ حالانکہ اہل کتاب کا اصل دین ایک برحق دین ان باتوں کے ساتھ ان کے دین کا کوئی تعلق نہ تھا۔

وَ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ یُّؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَیْهِ قَآىِٕمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ ۚ وَ یَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ

"اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے' کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دیدو تو وہ تمہارا مال تمہیں ادا کر دے گا اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملے میں اس پر بھروسہ کرو وہ ادا نہ کرے گا۔ الا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ امیوں کے معاملے میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔" اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی۔

یہاں آکر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر کیا ہے۔ یہ کہاں سے انھتا ہے اور یہ کہ اس کا تعلق کس طرح خدا خوفی کے ساتھ ہوتا ہے۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَ اتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓىٕكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَ لَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ لَا یُزَكِّیْهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۝

"جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور برائی سے بچ کر رہے گا۔ وہ اللہ کا محبوب بنے گا۔ کیونکہ پرہیزگار لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اپنے عہد اور قسموں کو تھوڑی قیمت دے کر بیچ ڈالتے ہیں تو ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اللہ قیامت کے روز نہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا۔ بلکہ ان کیلئے تو سخت دردناک سزا ہے۔"

یہ سبق آگے بڑھتا ہے اور اب اس میں اہل کتاب کی ایک کج روی کو منظر پر لایا جاتا ہے۔ اور بتایا جاتا ہے کہ وہ دین کے معاملے میں جھوٹ تک بولنے میں کس قدر بیباک ہیں۔ اور یہ کام وہ دنیاوی مفادات اور نہایت ہی کم قیمت مفادات کیلئے کرتے ہیں۔

وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِیْقًا یَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ یَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ مَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ یَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ۝

"اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا الٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو کہ 'جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے۔ حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں' یہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا۔ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔"

اور من جملہ اور امور کے' جو وہ اپنی زبان کی چالاکی سے کتاب میں داخل کرتے تھے' ایک یہ بات تھی کہ حضرت مسیح علیہ السلام الٰہ ہیں اور یہ کہ روح القدس بھی الٰہ ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ یہاں اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام نہ کوئی ایسی آیت لیکر آئے ہیں اور نہ ہی انہوں نے ان لوگوں کو ایسے عقائد رکھنے کا کوئی حکم دیا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۝ وَ لَا یَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓىٕكَةَ وَ النَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا اَیَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝

"کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کی بجائے تم

میرے بندے بن جاؤ' وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی ہو جاؤ۔ جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ وہ تم سے ہرگز نہ کہے گا کہ فرشتوں یا پیغمبروں کو اپنا رب بنالو' کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تمہیں کفر کا حکم دے جبکہ تم مسلم ہو۔"

اور اس مضمون کی مناسبت یہاں مسلسل دنیا میں بھیجے جانے والے انبیاء کے باہمی تعلق اور تعاون کی سلسلے میں لیے جانے والے اقرار کو بھی بیان کر دیا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر سابق نبی یہ میراث آنے والے کے سپرد کرے گا اور اس کی مدد کرے گا۔

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ ۚ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي ۖ قَالُوا أَقْرَرْنَا ۚ قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ﴿٨١﴾

"اور یاد کرو' اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ "آج ہم نے تمہیں کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے' کل اگر کوئی دوسرا رسول تمہارے پاس اسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے' جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے۔ تو تم کو اس پر ایمان لانا ہو گا اور اس کی مدد کرنا ہو گی۔" یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو" انہوں نے کہا ہاں' ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا! اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔"

یہی وجہ ہے کہ اہل کتاب پر یہ بات فرض ہو جاتی ہے کہ وہ نبی آخر الزمان پر ایمان لائیں اور اس کی امداد کریں۔ لیکن ان کا طیرہ تو یہ ہے کہ وہ اپنے نہ ان وعدوں کی پابندی کرتے ہیں جو انہوں نے اللہ کے ساتھ کئے اور نہ ان معاہدوں کی جو انہوں نے سابقہ رسولوں کے ساتھ کیے۔

ان مقدمات کا فطری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے دین یعنی دین اسلام کے سوا کوئی اور دین اپنے لئے تلاش کرتا ہے۔ تو گویا وہ پوری کائنات کے نظام قدرت سے بغاوت کرتا ہے' جیسا کہ جس طرح اللہ نے اس کا ارادہ کیا ہے۔

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ

"کیا یہ لوگ اللہ کے دین کا طریقہ چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چارو ناچار اللہ ہی کے تابع ہیں (مسلم ہیں) اور اس کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔" پس وہ لوگ جو اسلام سے خارج ہوتے ہیں' ان کا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو اسلامی نظام کی مکمل اطاعت نہیں کرتے' ان کا معاملہ بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس قدر نافرمان ہیں کہ اللہ کے اس تکوینی نظام سے بھی خارج ہیں۔

یہاں رسول خدا ﷺ اور اہل ایمان کو اللہ وحدہ کے دین پر ثابت قدمی کا اعلان کردیں اور دین ان ہدایات کے اندر ہے جو حضور ﷺ اللہ کی جانب سے لیکر آئے اور آپ سے قبل دوسرے رسول لیکر آئے اور اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے کہ وہ انسانوں کی جانب سے صرف اسی دین کو قبول کرے گا۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ

............................................... "اور جو شخص بھی اسلام کے سوا کسی اور دین کی پیروی کرے گا تو یہ اس کی جانب سے قبول نہ کی جائے گی اور آخرت میں وہ خسارہ پانے والوں میں سے ہو گا۔"

اب جو لوگ اس دین پر ایمان نہیں لاتے تو ان کیلئے ہدایت پانے کی کوئی امید نہیں ہے اور نہ ان کیلئے اللہ کی پکڑ سے بچنے کی کوئی امید ہے۔ الا یہ کہ وہ توبہ کریں۔ رہے وہ لوگ جو کفر کی حالت میں اس دنیا سے چلے جائیں تو انہیں وہ تمام مال و دولت کچھ فائدہ نہ دے گی جو انہوں نے بھلائی کی راہ میں خرچ کی۔ اور اگر وہ اپنے اس کفر کا کفارہ اس کرۂ ارض کو بھر کر سونا ادا کریں تو بھی یہ فدیہ قبول نہ ہو گا۔

اللہ کی راہ میں خرچ اور قربانی کے اس مقام پر اہل اسلام کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ اپنے مال و دولت سے اللہ کی راہ میں وہ چیزیں خرچ کریں جو انہیں پسند ہیں۔

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَىۡءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ

............................................... "تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم اپنی وہ چیزیں خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو۔ اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہو گا۔"

غرض اس مختصر حصے میں' اس قدر عظیم حقائق اور بے شمار ہدایات جمع کر دی گئی ہیں۔ اور یہ اس عظیم معرکہ میں ایک مختصر جملہ ہے۔ جو اس پوری سورت میں برپا ہے۔ اور اس کے فریق امت مسلمہ اور اس کے دشمنان ہیں۔ اور یہ معرکہ صدیوں سے یونہی برپا ہے۔ آج بھی امت مسلمہ اور دشمنان دین کے درمیان یہی معرکہ جاری ہے۔ اس معرکے کے اہداف اور مقاصد وہی ہیں جو اس وقت تھے۔ اگرچہ آج کل اس معرکہ میں اسباب اور وسائل بالکل مختلف استعمال ہو رہے ہیں' لیکن لائن آج بھی وہی ہے لیکن آج یہ معرکہ طویل خطوط پر ہے۔

○.........☆.........○.........☆.........○

# درس ۲۵ تشریح آیات

## آیات ۶۵ تا ۹۱

يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لِمَ تُحَآجُّونَ فِيٓ إِبۡرَٰهِيمَ وَمَآ أُنزِلَتِ ٱلتَّوۡرَىٰةُ وَٱلۡإِنجِيلُ إِلَّا مِنۢ بَعۡدِهِۦٓۚ أَفَلَا تَعۡقِلُونَ ﴿٦٥﴾ هَٰٓأَنتُمۡ هَٰٓؤُلَآءِ حَٰجَجۡتُمۡ فِيمَا لَكُم بِهِۦ عِلۡمٞ فَلِمَ تُحَآجُّونَ فِيمَا لَيۡسَ لَكُم بِهِۦ عِلۡمٞۚ وَٱللَّهُ يَعۡلَمُ وَأَنتُمۡ لَا تَعۡلَمُونَ ﴿٦٦﴾ مَا كَانَ إِبۡرَٰهِيمُ يَهُودِيّٗا وَلَا نَصۡرَانِيّٗا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفٗا مُّسۡلِمٗا وَمَا كَانَ مِنَ ٱلۡمُشۡرِكِينَ ﴿٦٧﴾ إِنَّ أَوۡلَى ٱلنَّاسِ بِإِبۡرَٰهِيمَ لَلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا ٱلنَّبِيُّ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْۗ وَٱللَّهُ وَلِيُّ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ ﴿٦٨﴾

"اے اہل کتاب تم ابراہیمؑ کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑتے ہو؟ تورات اور انجیل تو ابراہیمؑ کے بعد نازل ہوئی ہیں' پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے ہو۔ تم لوگ جن چیزوں کا علم رکھتے ہو ان میں تو خوب بحثیں کر چکے' اب ان معاملات میں کیوں بحثیں کرتے ہو جن کا تمہارے پاس کچھ علم بھی نہیں' اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے' ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ عیسائی' بلکہ وہ تو ایک مسلم یکسو تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔ ابراہیمؑ سے نسبت رکھنے کا حق سب سے زیادہ اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے اس نسبت کے زیادہ حقدار ہیں۔ اللہ صرف انہی کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہوں۔"

محمد بن اسحاق' محمد' سعید بن جبیر' یا عکرمہ اور حضرت ابن عباسؓ کے واسطہ سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا نجران کے نصاریٰ اور یہودیوں کے احبار رسول اللہ ﷺ کے پاس جمع ہوئے اور فرمایا آپ سے مباحثہ شروع کر دیا' احبار نے کہا ابراہیم یہودی تھا' نصاریٰ نے کہا کہ وہ نصرانی تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لِمَ تُحَآجُّونَ فِيٓ إِبۡرَٰهِيمَ ......... "اہل کتاب! تم ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو۔" ........ چاہے ان آیات کا شان نزول یہ ہو یا نہ ہو' .........

بہرحال آیات بظاہر اس بات پر شاہد ہیں کہ وہ اہل کتاب بے بنیاد دعوؤں کے رد میں نازل ہوئی۔ ان کا یہ تنازعہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ تھا یا حضورؐ کی موجودگی میں وہ آپس میں جھگڑتے تھے اور ان کے جھگڑے کے پس منظر میں یہ نظریہ کارفرما تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ ان کی اولاد میں نبوت رہے گی تو اس طرح وہ یہ فضیلت اور ہدایت اپنے نام الاٹ کرانا چاہتے تھے۔ یہ تھا ان کا اصل مقصد' دوسرے یہ کہ وہ اس طرح حضور ﷺ کے اس دعویٰ کی بالواسطہ تکذیب کرنا چاہتے تھے کہ حضور اور آپ کی امت دین حنیف کے پیروکار ہیں اور حنیفیت اولیٰ کے وارث ہیں۔ نیز اس طرح وہ مسلمانوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ یا کم از کم بعض اہل اسلام میں وہ شک ڈالنا چاہتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ ان کی سخت ترین الفاظ میں تردید فرماتے ہیں اور ان کی اس خوش فہمی کو طشت ازبام کرتے ہیں' جو کسی علمی دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ اس لئے کہ ابراہیم ﷺ تورات سے بھی پہلے گزرے ہیں اور انجیل سے بھی پہلے گزرے ہیں۔ پس کس طرح ممکن ہے کہ وہ یہودی ہوں یا نصرانی ہوں' لہٰذا یہ دعویٰ مکمل طور پر خلاف عقل ہے۔ صرف پیغمبروں کی تاریخ پر اچٹتی نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا دعویٰ باطل ہے۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

"اہل کتاب تم ابراہیمؑ کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑتے ہو؟ تورات اور انجیل تو ابراہیمؑ کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔"

اس کے بعد ان پر تنقید جاری رہتی ہے' وہ جو دلائل پیش کرتے تھے ان کا پول کھولا جاتا ہے۔ اور ان کی ہٹ دھرمی اور ان کے غیر معقول طرز عمل اور بحث و مباحثہ میں ان کے غیر منطقیانہ استدلال کی وضاحت کی جاتی ہے۔

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

"تم جن چیزوں کا علم رکھتے تھے ان میں تو خوب بحثیں کر چکے۔ اب ان معاملات میں کیوں بحثیں کرنے چلے جن کا تمہارے پاس کچھ بھی علم نہیں' اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔"

انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں مباحثہ کیا' پھر انہوں نے بعض فقہی موضوعات پر بھی مجادلہ کیا' اور جب انہیں دعوت دی گئی کہ آؤ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کریں تو انہوں نے روگردانی کی۔ یہ دونوں موضوعات تو ایسے تھے' جن کے بارے میں انہیں کچھ علم تھا۔ رہے وہ معاملات جو تمہارے وجود سے پہلے ہیں' تمہاری کتابوں سے پہلے ہیں۔ تمہارے اس دین سے پہلے ہیں جن پر تمہارا ایمان ہے۔ تو اس بارے میں تمہارے پاس نہ علم ہے اور نہ سند ہے۔ اگرچہ ہماری سند ہو' لہٰذا ان موضوعات پر تمہارا مباحثہ کرنا صرف بحث برائے بحث ہو گا۔ وہ محض تیر تکے چلانا ہو گا۔ کوئی بامقصد کام نہ ہو گا۔ بلکہ محض مطلب براری اور نفس پرستی ہوگی۔ اور جن لوگوں کا حال یہ ہو وہ ہرگز قابل اعتبار نہ ہوں گے بلکہ ایسے لوگوں سے نہ بات کرنا مناسب ہے اور نہ ان کی بات پر کان دھرنا مناسب ہے۔

ان حضرات کی بحث و تکرار کا پول کھولنے کے بعد اور اس بحث کی حیثیت ختم کر دینے کے بعد اور انہیں مکمل طور پر ناقابل اعتبار کر دینے کے بعد' اب اللہ تعالیٰ وہ اصل حقیقت بیان فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ کیونکہ تاریخ انسانی میں بہت زیادہ قدیم واقعات کی اصل حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے۔ نیز حضرت ابراہیم ﷺ پر جو دین نازل فرمایا گیا تھا' اس کی حقیقت کو بھی اللہ ہی جانتا ہے۔ اور اللہ کا فیصلہ بہرحال قاطع ہے۔ اللہ کے فیصلے کے بعد کسی کیلئے کوئی بات کرنے کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے۔ الا یہ کہ کوئی ہر صورت میں' بغیر کسی دلیل و برہان کے' مجادلہ پر اتر آیا ہو ——— مَا

كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

"ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھا' نہ عیسائی بلکہ وہ ایک مسلم یکسو تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔" یوں' اس سے پہلے اشارۃً جو بات کی گئی تھی کہ ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی' اس لئے کہ تورات و انجیل بعد میں نازل ہوئیں۔ یہاں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ وہ یہودی او نصرانی نہیں تھے بلکہ مسلم حنیف تھے۔ اور وہ اسلام کے سوا کسی اور ملت کی طرف مائل نہ تھے۔ اس لئے کہ وہ مسلم تھے۔ اور مسلم بھی ان معنوں میں تھے' جن کی تفصیل ہم نے اس سے پہلے بیان کر دی ہے۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ............ "اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔" یہ فقرہ سابقہ فقرے کی تاکید مزید ہے کہ وہ مسلم حنیف تھے۔ اور اس لئے کہ مسلم حنیف جو بھی ہو وہ مشرک نہیں ہوتا۔ اب حنیف مسلم کے بعد یہ کہنا کہ وہ مشرک نہ تھے اس میں چند لطیف اشارے مقصود ہیں۔

پہلا اشارہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ جن کے اندر عقائد کا انحراف اس حد تک پہنچ گیا ہے وہ درحقیقت مشرک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ابراہیم نہ یہودی ہو سکتا ہے اور نہ نصرانی' بلکہ وہ مسلم حنیف ہی ہے۔

دوسرا اشارہ یہ ہے کہ اسلام ایک علیحدہ حقیقت ہے اور شرک بالکل ایک الگ چیز ہے۔ ان دونوں کا ایک جگہ اکٹھ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اسلام مطلق توحید کا نام اور توحید بھی ازہمہ جہت و باہمہ خصوصیات و باہمہ مقتضیات اس لئے اسلام شرک کے کسی رنگ کے ساتھ لگا نہیں کھاتا۔

اس میں تیسرا اشارہ یہ مطلوب ہے کہ مشرکین قریش اپنے آپ کو حنیفی اور دین ابراہیمؑ کے پیرو سمجھتے تھے۔ اور وہ خانہ کعبہ کے خادم اور مجاور تھے۔ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ وہ تو مسلم حنیف تھے۔ اور تم مشرکین ہو وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ...... "وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔"

جب حضرت ابراہیمؑ مسلم حنیف تھے اور مشرک نہ تھے تو یہود و نصاریٰ یا مشرکین میں سے کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ ان کے وارث ہیں۔ اور نہ ہی ان میں سے کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ ابراہیم کے دین کے والی ہیں حالانکہ وہ اس کے دین سے بہت ہی دور جا چکے ہیں۔ عقیدہ اور نظریہ وہ رابطہ ہے جس پر لوگ اسلام میں باہم جمع ہوتے ہیں۔ جبکہ ہم نسب' ہم قوم' ہم جنس اور ہم وطن ہو کر بھی لوگ ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں۔ اگر وہ مسلمان نہ ہوں اور جب اسلامی نظریۂ حیات کی اس مضبوط اساس پر اہل ایمان جمع ہوتے ہیں تو پھر ان کی نظر میں انسان وہ ہوتا ہے جو روحانی اعتبار سے انسان ہو۔ یعنی انسان اس وجہ سے ممتاز ہے کہ اس کے جسم میں اللہ نے ایک پاک روح ڈالی ہے۔ چنانچہ اس کا صحیح اکٹھ بھی عقیدے کی اساس پر ہو سکتا ہے جو اس کی روح کی خصوصیات میں سے اہم خصوصیت ہے۔ انسان کا اجتماعی نظام ان اساسوں پر قائم نہیں ہوتا جس پر مویشیوں کا اکٹھ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ چرنے والے مویشی' ایک جنس کے مویشی' ایک چراگاہ والے مویشی ایک ہی باڑے میں اور اہل زندان میں روکے ہوئے مویشی باہم مل کر رہتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ایک فرد اور دوسرے فرد' ایک گروہ اور دوسرے گروہ' ایک نسل اور دوسری نسل کے درمیان ماسوائے عقیدہ اور نظریۂ حیات کے اور کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ اس میں ایک مومن دوسرے مومن سے محبت کرتا ہے' ایک مسلم گروہ کو دوسرے مسلم گروہ سے محبت ہوتی ہے۔ ایک اسلامی جماعت کا دوسرے اسلامی جماعت سے تعلق ہوتا ہے اور مسلم نسلوں کا دوسری مسلم نسلوں سے تعلق ہوتا ہے اور اس کی راہ میں زمان و مکان کی حدود حائل نہیں ہو سکتیں۔ اس تعلق کی راہ میں خون اور نسب کے فاصلے حائل نہیں ہو سکتے۔ قوم اور علاقے کے فاصلے حائل نہیں ہوتے۔ وہ باہم نظریاتی دوست ہوتے ہیں۔ صرف نظریہ کی اساس پر اور ان سب کے اوپر پھر ذات باری سب کی دوست ہوتی ہے۔ إِنَّ

أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا ۗ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ

ہم سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے اس نسبت کے زیادہ حقدار ہیں۔ اللہ صرف انہی کا حامی اور مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔" پس وہ لوگ جو حضرت ابراہیم کی زندگی میں ان کے پیرو رہے' اور ان کے نظام اور طریقے پر چلے' اور انہوں نے ان کے احکام کے مطابق فیصلے کیے تو وہی ان کے دوست تھے۔ پھر یہ نبی ان کے دوست ہیں جو اللہ کی شہادت کے مطابق ان کے دین پر ہیں وہ ان کے دوست ہیں' اس کے بعد وہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوست ہیں جو اس نبی پر ایمان لائے۔ اور وہ اپنے نظام زندگی اور طریقہ حیات میں ان کے ہمرنگ ہو گئے۔ **وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ** "اللہ صرف ان کا حامی اور مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔" اس لئے کہ یہی لوگ اللہ کی پارٹی ہیں' یہی لوگ اللہ کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو اللہ سے محبت اور دوستی رکھتے ہیں اور اس کے سوا ان کا کوئی ولی نہیں ہے۔ یہ لوگ ایک ہی خاندان ہیں۔ یہ ایک امت ہیں' چاہے صدیاں گزر جائیں' زمانے گزر جائیں' زمین اور وطن کے فاصلے طویل کیوں نہ ہوں' نسل اور قوم مختلف کیوں نہ ہو' خاندان اور قبائل مختلف کیوں نہ ہوں' یہ ایک ہیں' ایک رہیں گے۔

انسانی اجتماع کی یہ سب سے ترقی یافتہ شکل ہے جو حضرت انسان کے لئے موزوں ترین ہے۔ اور یہی صورت اسے حیوانوں کے ریوڑ سے ممتاز کرتی ہے۔ دوسری جانب مختلف قسم کی سوسائٹیوں میں سے یہ سوسائٹی سب سے عام اور بلاقید ہے۔ اس لئے کہ اس اجتماعی نظام کی اساس جس شرط کے ساتھ مشروط ہے وہ شرط اختیار ہے۔ انسان کے بس میں ہے کہ وہ اس شرط کو پوری کر دے۔ وہ شرط نظریاتی ہے اور ہر شخص کسی بھی نظریئے کو اپنانے میں آزاد اور مختار ہے۔ جب کہ کوئی شخص اپنی نسل کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ اگرچہ ہم اجتماعی نظام کی اساس کسی نسل پر رکھ دیں تو کوئی شخص بہرحال اس نسل میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اجتماعیت کو قومیت کی اساس پہ استوار کریں تو پھر کوئی شخص اپنی قومیت تبدیل نہیں کر سکتا۔ اگر ہم اجتماعی نظام رنگ پر رکھیں تو کوئی بھی شخص اپنا رنگ نہیں بدل سکتا۔ اسی طرح اگر ہم زبان کی اساس پر اجتماعی نظام استوار کریں تو کوئی شخص اپنی زبان بھی نہیں بدل سکتا۔ اسی طرح اگر نظام طبقات پر مبنی ہو' تو طبقہ بدلنا بھی آسانی سے ممکن نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات طبقات بھی ناقابل تبدیل ہوتے ہیں مثلاً ہندوستان میں اچھوت وغیرہ' یہی وجہ ہے تمام دوسری سوسائٹیوں میں بعض طبقات کی راہ میں پردے حائل ہوتے ہیں اور وہ اس سوسائٹی کا ممبر نہیں بن سکتے۔ صرف نظریاتی اساس پر تشکیل پانے والی سوسائٹی اس عیب سے خالی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ نظریاتی سوسائٹی میں کوئی نظریہ اپنانے نہ اپنانے کا معاملہ ایک فرد کے اختیار میں ہوتا ہے۔ بغیر اس کے اس کی اصلیت بدلے' اس کی زبان بدلے' اس کا طبقہ بدلے' یا وہ صف بدلے جس کی اساس' اس کا پرو واس میں شامل ہو رہا ہے ___ اس کے علاوہ اس نظریاتی سوسائٹی میں انسان کے مقام اور اس کے اکرام میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اور اس کا نظریہ اجتماع ان عناصر کی اساس پر ہوتا ہے جو انسانی عناصر ہیں۔ ان پر نہیں جو جانوروں کو باہم اکٹھا کرتے ہیں۔ اب انسان کے لئے صرف دو راستے ہیں' ایک یہ کہ وہ اسلام کے نظریہ اجتماع کے مطابق وہ روحانی اور نظریاتی اساسوں پر جمع ہو اور انسانوں کی طرح رہے اور یا پھر حیوانوں کے ایک ریوڑ اور گلے کی طرح ہم جنس' جو اکٹھے ہوں یا ایسے مویشی اکٹھے ہوں جن کی چراگاہ ایک ہے۔ اور ان حدود وقیود کے اندر رہیں جو ان مویشیوں کے لئے بنائے گئے ہیں۔

O___O___O

اب امت مسلمہ کو بتایا جاتا ہے کہ اس جدل و جدال اور بحث و مباحثے کے پس منظر میں اہل کتاب کا اصل منصوبہ کیا ہے؟ اس لئے اہل کتاب کی مکاریوں' ان کی خفیہ تدبیروں اور دین کے ساتھ اس کھیل کا بھانڈا امت مسلمہ کے سامنے بھرے چوراہے میں پھوڑا جاتا ہے۔ وہ ستر پاش پاش کر دیا جاتا ہے جس کے پیچھے چھپ کر یہ لوگ یہ گھناؤنا کھیل کھیلا کرتے تھے اور انہیں جماعت مسلمہ کے سامنے صاف ننگا کر کے شرمندہ کر دیا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَ اكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ لَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ ۙ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

ع ۷
۸
۱۵

"اہل کتاب کا ایک گروہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمہیں راہ راست سے ہٹا دے' حالانکہ وہ اپنے سوا کسی کو گمراہی میں نہیں ڈال رہے ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں۔ اے اہل کتاب! کیوں اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہو حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو؟ اہل کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مشتبہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو؟ اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے' اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو۔ شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔ نیز یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں کہ اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات نہ مانو' اے نبی ان سے کہہ دو کہ "اصل میں ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے اور یہ اسی کی دین کہ کسی کو وہی کچھ دے دیا جائے جو کبھی تم کو دیا گیا تھا۔ یا یہ کہ دوسروں کو تمہارے رب کے حضور پیش کرنے کے لئے تمہارے خلاف قوی حجت مل جائے۔" اے نبی! ان سے کہو کہ "فضل و شرف اللہ کے اختیار میں ہے' جسے چاہے عطا فرمائے۔ وہ وسیع النظر ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ اپنی رحمت کے لئے جس کو چاہتا ہے مخصوص کر لیتا ہے اور اس کا فضل بہت بڑا ہے۔"

اہل کتاب مسلمانوں کے خلاف جو عداوت دلوں میں چھپائے ہوئے تھے وہ نظریاتی عداوت تھی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ یہ امت کبھی راہ راست پر آئے۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ یہ امت پوری قوت پورے یقین اور پورے اعتماد کے ساتھ اپنے نظریات کی طرف لوٹ آئے۔ اس لئے ان کی تمام جدوجہد اس نکتے پر مرکوز ہے کہ وہ اسلامی نظام حیات سے اس امت کو ادھر ادھر کر دیں اور اسے اس صراط مستقیم سے پھیر دیں۔ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ ......... "اہل کتاب میں سے ایک گروہ یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمہیں راہ راست سے ہٹا دے۔" یہ ان کی نفسانی خواہش ہے۔ ان

کے دلوں کی تہ میں یہ جذبہ چھپا ہوا ہے۔ ان کی ہر سازش کے پیچھے ان کی یہ خواہش کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کی ہر تدبیر' ہر بحث' ہر مناظرہ اور ہر تلبیس کے پس پشت یہی خواہش کارفرما ہے اور ان لوگوں کی یہ خواہش محض دشمنی' ہوائے نفس اور شرارت پر مبنی ہے۔ اس لئے وہ صریح گمراہی ہے۔ اس لئے کہ سچائی' بھلائی اور ہدایت و خیر خواہی کے جذبات کے نتیجے میں اس قسم کی خواہش کبھی پیدا نہیں ہوتی اور وہ جب بھی اہل اسلام کی گمراہی کے لئے کوئی جدوجہد شروع کرتے ہیں' اسی وقت وہ خود گمراہ ہو جاتے ہیں۔ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ .......... "حالانکہ وہ اپنے سوا کسی کو گمراہی میں نہیں ڈال رہے مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔" اور مسلمان جب تک اسلام پر قائم رہیں گے وہ اپنے ان دشمنوں کی تدابیر کا اچھی طرح مقابلہ کر سکیں گے۔ اہل کفران کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ اللہ تعالیٰ ہر وقت ان کو سازشیوں کی سازشوں سے بچانے والا ہے اور جب تک وہ پکے مسلمان ہیں ان کی تدابیر کو اللہ خود ان کے خلاف الٹاتا ہے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ اہل کتاب کو سختی سے جھنجوڑتا ہے کہ وہ اپنے اس مشکوک اور کمزور موقف پر ذرا نظر ثانی کریں۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

"اے اہل کتاب! کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو؟ اے اہل کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مشتبہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بھی اور آج بھی اہل کتاب حق اور سچائی کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور واضح طور پر سمجھتے ہیں کہ یہ دین' دین حق ہے۔ ان میں سے بعض تو وہ تھے جو اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی کتابوں میں رسول آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت بشارتیں اور اشارے موجود ہیں' ان میں سے پھر بعض ایسے تھے جو ان اشارات کے بارے میں بالصراحت بتلاتے تھے۔ اور کچھ لوگ ایسے تھے کہ وہ ان بشارتوں کی بنا پر شہادت حق بھی دیتے تھے لیکن بعض دوسرے ایسے تھے کہ وہ اگرچہ اپنی کتابوں سے کچھ نہ جانتے تھے لیکن حضور اکرم ﷺ اور آپ کے دین کو دیکھ کر واضح طور یقین کئے ہوئے تھے کہ یہ دین' دین حق ہے لیکن اس کے باوجود یہ لوگ کفر پر کمربستہ تھے۔ اس لئے نہیں کہ دلیل و برہان میں کوئی کمی تھی بلکہ محض خواہشات نفسانیہ' ذاتی مصلحتوں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی خاطر وہ کفر کر رہے تھے۔ قرآن کریم اہل کتاب کہہ کر انہیں کو پکارتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی اس صفت اہل کتاب کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ اللہ کی اس کتاب جدید کو سینہ سے لگائیں۔

ایک بار پھر اللہ انہیں پکارتے ہیں تاکہ انہیں ان کے اس فعل پر اچھا شرمندہ کریں کہ وہ حق پر باطل کا رنگ چڑھاتے ہیں' حق کو چھپاتے ہیں' حق کو ضائع کرتے ہیں' اور وہ یہ سب کچھ جانتے بوجھتے کرتے ہیں اور یہ ان کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ یہ ان کی نہایت ہی مکروہ اور قبیح حرکت ...... اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے اہل کتاب پر جو تنقید فرمائی ہے' اس پر وہ اس وقت سے لے کر آج تک قائم ہیں۔ پوری اسلامی تاریخ میں ان کا کردار یہی رہا ہے۔ سب سے پہلے اس کا آغاز یہودیوں نے کیا اور یہودیوں کے بعد یہی منصب صلیبیوں نے سنبھال لیا۔ اور اس پوری تاریخ میں انہوں نے اسلامی علوم میں بعض ایسے افکار شامل کر دیئے ہیں کہ ان کی تنقیح صرف قرآن کریم کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ انہوں نے تمام اسلامی علوم میں حق کے ساتھ باطل ملا دیا ہے۔ ہاں ان کی ان خفیہ سازشوں سے صرف قرآن کریم محفوظ رہا ہے اس لئے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ ابد الاباد تک وہ قرآن

کریم کو محفوظ رکھے گا۔ انہوں نے تاریخ اسلامی میں دسیسہ کاری کی۔ اسلامی تاریخ کے واقعات میں ملاوٹ کی۔ انہوں نے ذخیرۂ احادیث کے اندر احادیث گھڑ کر جعلی احادیث ملانے کی کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ اس نے اس کے مقابلے کیلئے بعض رجال ایسے پیدا کئے جنہوں نے اس میدان میں داد تحقیق دی اور اس ذخیرہ احادیث کو ان کی جعل سازی سے پاک کیا۔ الا یہ کہ انسان کی محدود جدوجہد کی وجہ سے کوئی چیز بچ گئی۔ لیکن وہ شاذ اور محدود ہو گئی۔ انہوں نے قرآن کے ذخیرہ تفاسیر میں بھی ملمع کاری کی اور اسے ایک ایسا صحرائے بے آب و گیاہ بنا دیا جس میں سے انسان کیلئے نشان راہ پانا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے اسلام کے بعض لیڈروں میں اپنے آدمی داخل کئے۔ سینکڑوں لوگ ایسے تھے جو مسلمان بن کر اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ اور آج دیکھئے کہ مستشرقین اور مستشرقین کے شاگردوں کی شکل میں ایک فوج ہے جو ان ممالک کے اندر نہایت ہی حساس فکری مقامات پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ جن کے باشندے کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اور بیسیوں ایسے لیڈر ہیں جو یہودیوں اور صلیبیوں نے ہمارے لئے لیڈر بنائے ہیں تاکہ وہ اس نام نہاد عالم اسلام میں یہودیوں اور صلیبیوں کے مفادات کا تحفظ کریں۔ اس لئے کہ اسلام کے یہ دشمن اگر کھل کر آئیں تو وہ یہ مفادات حاصل نہیں کر سکتے۔

یہ سازشیں مسلسل روبعمل ہیں۔ اور آج بھی اگر ہم ان سے کوئی جائے پناہ حاصل کر سکتے ہیں تو وہ صرف قرآن کے دامن میں حاصل کر سکتے ہیں' جو محفوظ ترین کتاب ہے۔ اس قرآن کو اگر ہم اس تاریخی کشمکش میں اپنا مشیر بنالیں تو ہمیں محفوظ پناہ مل سکتی ہے۔

قرآن کریم یہاں ان لوگوں کی بعض کوششوں کو بھی ریکارڈ پر لاتا ہے جو انہوں نے جماعت مسلمہ کو اپنے دین سے بدراہ کرنے کی خاطر کی تھیں۔ اور یہ کام وہ حسب عادت نہایت ہی مکارانہ اور ذلیلانہ طریقہ کار کے مطابق کرتے تھے۔ فرماتے ہیں۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَ اكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۚۖ وَ لَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ ؕ

"اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے' اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو۔ شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔ نیز یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں کہ اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات نہ مانو۔"

کس قدر مکارانہ طریق کار ہے یہ؟ جیسا کہ ہم نے کہا یہ لوگ ایسے اوچھے ہتھیار بھی استعمال کرتے تھے۔ اس لئے کہ اسلام لانا اور پھر اسلام سے پھر جانا' اس لئے ممکن تھا کہ بعض کمزور طبع لوگ' کم فہم لوگ' ایسے لوگ جو زیادہ ثابت قدم نہ تھے۔ اور جنہیں اپنے دین کی حقیقت کا بھی اچھی طرح علم نہ تھا' وہ متاثر ہو سکتے تھے۔ ان کے دل میں خلجان پیدا ہو سکتا تھا۔ خصوصاً عرب جو امی تھے۔ اور ان میں یہ بات عام تھی کہ دین اور کتب سماوی کے بارے میں اہل کتاب ان سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہ ایمان لاتے ہیں اور پھر مرتد ہو جاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ انہوں نے اس دین میں کوئی خفیہ کمزوری اور نقص پکڑ لیا ہو گا۔ یا یہ کہ خود یہ مرتد ہونے والے شک میں پڑ گئے کہ وہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ وہ کدھر جائیں اور ان کو کسی حال میں ثبات حاصل نہیں ہے۔ اور اہل کتاب کی جانب سے یہ دھوکہ آج تک جاری ہے۔ ہاں اس کی شکل و صورت اور طور طریقے حالات زمانہ کی مطابقت سے بدل گئے ہیں۔

ہاں آج کے دور میں مسلمانوں کے دشمنوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ اب ان پرانی سازشوں پر ملمع کاری کر کے اہل اسلام کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ اس لئے تمام دشمنوں نے اسی پرانے اسلوب پر کچھ جدید طریقے وضع کئے ہیں اور ان کے ذریعے سے مسلمانوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اب ان لوگوں نے عالم اسلام میں اساتذہ' فلاسفہ' محققین اور پی ایچ ڈی کے حاملین کی ایک جرار فوج چھوڑی ہوئی ہے۔ یہ

سب لوگ درپردہ ان دشمنان اسلام کے ایجنٹ ہیں۔ پھر ان دشمنوں نے ہمارے مصنفین' شعراء' فن کاروں اور صحافیوں کو بھی اپنے جال میں پھنسا رکھا ہے۔ ان لوگوں کے نام مسلمانوں جیسے ہیں۔ اس لئے کہ وہ مسلمانوں کی اولاد ہیں اور بعض تو مسلمانوں کے علماء ہیں۔

ایجنٹ کی اس فوج کا کام صرف یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کے دل و دماغ میں شکوک و شبہات پھیلائے۔ اور اس کے لئے مختلف اسلوب اختیار کرے۔ کبھی وہ علم و ادب کے دروازے سے کام کرتے ہیں۔ کبھی وہ صحافی اور فنکار کے روپ میں کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ اسلامی اصول حیات کی قدر و قیمت کم کرنے' اسلامی نظریۂ حیات کا مزاح اڑانے' اسلامی اصولوں اور نصوص میں ایسی تاویلیں کرنے میں لگے ہوتے ہیں' جن تاویلوں کے وہ نصوص متحمل ہی نہیں ہوسکتے۔ یہ مسلسل یہ ڈھول پیٹتے ہیں کہ اسلامی نظام حیات رجعت پسندی ہے۔ اور وہ ہروقت اس تبلیغ میں لگے رہتے ہیں کہ اسلامی نظریۂ حیات کو ترک کردیا جائے۔ اور اسے انسان کی عملی زندگی سے خارج کردیا جائے۔ گویا کہ انسانی زندگی کو اس سے خطرہ ہے اور اس کو زندگی سے خطرہ ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے شعور اور طرز عمل میں ایسے تصورات اور ایسی روایات اور ایسے اصول کو رواج دیتے ہیں جو اسلامی تصورات کے متضاد ہوتے ہیں اور جن سے اسلامی طرز عمل اور اسلامی روایات کی خوب شکست و ریخت ہوتی ہے۔ یہ ایجنٹ ان جدید جاہلی تصورات اور روایات کو مسلمانوں کے نظریات میں جس قدر جاذب بناتے ہیں۔ اسی قدر ایمانی روایات کا حلیہ بگاڑتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ یہ ایجنٹ جنسیت کو ہرقید وبند سے آزاد کرتے ہیں۔ اور اساسوں کو بنیاد سے اکھاڑتے ہیں۔ جن کے اوپر پاکیزہ اخلاق استوار ہوتے ہیں اور معاشرے کو اس گندگی کے اندر گراتے ہیں جسے وہ جگہ جگہ پھیلاتے پھرتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ ایجنٹ اسلامی تاریخ کا بعینہ اسی طرح حلیہ بگاڑتے ہیں' جس طرح انہوں نے اپنی کتب سماوی کا حلیہ بگاڑا اور اس میں تحریف کی۔

لیکن آپ حیران ہوں گے کہ یہ ایجنٹ ان سب کارناموں کے ساتھ پھر بھی مسلمان ہیں! کیوں مسلمان نہ ہوں' کیا ان کے نام مسلمانوں کی طرح نہیں؟ اور وہ ان ناموں کے ساتھ ساتھ روز دن چڑھے اپنے اسلام کا اظہار و اقرار بھی کرتے ہیں لیکن وہ مذکورہ بالا کارنامے کرکے گویا شام کے وقت وہ اسلام کا انکار کردیتے ہیں۔ اور اس طرح یہ ایجنٹ وہ کردار ادا کرتے ہیں جو پرانے اہل کتاب کرتے تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دور قدیم اور آج کے ماحول اور طریقہ واردات میں قدرے فرق ہے۔

اہل کتاب آپس میں طے کرتے تھے کہ تم لوگ دن چڑھے اپنے اسلام کا اظہار کرو اور شام تک یہ اعلان کردو کہ ہم نے اسلام کا اعلان کیا تھا لیکن اب ہم نے اسے ترک کردیا ہے۔ تاکہ اس طرح مسلمانوں کے دلوں میں شک پیدا ہوجائے اور وہ بھی اسلام سے لوٹ آئیں۔ لیکن یہ بات راز میں رہے۔ اس کا افشا بھی نہ کرو اور اپنے دین والوں کے علاوہ کسی اور کو اس راز سے خبردار بھی نہ کرو۔

وَلَا تُؤْمِنُوٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ........................ "اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات پر اعتماد نہ کرو۔"

فعل "اسلام" کا صلہ اگر لام متعدی ہو تو اس کا مفہوم اعتبار اور اعتماد کرنا ہوتا ہے۔ یعنی اعتماد صرف اس پر کرو جو تمہارے دین کو ماننے والا ہے۔ مسلمانوں کے مقابلے میں صرف اپنے ہم مذہب لوگوں کے سامنے اپنے بھید کھولو۔ مسلمانوں کو ان باتوں کی خبر نہ ہونے پائے۔

آج صیہونیت اور صلیبیت کے ساتھیوں کا طرز بھی یہی ہے۔ یہ لوگ آپس میں ایک بات باہم مفاہمت کرلیتے ہیں۔ وہ یہ کہ اسلامی نظریۂ حیات کے بسمل کو موقعہ پاتے ہی قتل کردیا جائے۔ اس کیلئے ایسے مواقع شاید پھر میسر نہ ہوں۔ اور ہوسکتا ہے کہ صیہونیوں اور صلیبیوں اور ان کے ایجنٹوں کے درمیان اس وقت جو مکمل مفاہمت پائی جاتی ہے وہ پھر نہ پائی جائے۔ لیکن یہ مفاہمت ایک طرف ایک (کلائنٹ) موکل (Client) کے درمیان ہے اور دوسری جانب اس کے ایجنٹ کے درمیان ہے۔ اس میں یہ موکلین بعض اوقات

اپنے ایجنٹ کو اپنے اصل راز بھی بتادیتے ہیں۔ جبکہ انہیں یقین ہو کہ وہ ان رازوں کو افشاء نہ کریں گے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ کو دوسرے روپ میں ظاہر کرتے ہیں اور اس رنگ میں نہیں آتے جس میں انہوں نے ان سازشوں کو تیار کیا ہوتا ہے۔ ان ایجنٹوں کیلئے پہلے سے حالات درست کر کے ماحول کو ان کے لئے سازگار بنادیا جاتا ہے۔ تمام سہولتیں انہیں مہیا کر دی جاتی ہیں۔ اور جو لوگ اس کرۂ ارض پر اس دین کی حقیقت کو سمجھتے ہیں وہ نظروں سے اوجھل ہیں یا معاشروں میں دھتکارے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ کہتے ہیں وَلَا تُؤْمِنُوٓا۟ إِلَّا لِمَن تَبِعَ دِينَكُمْ ................ "اور اپنا راز انہی لوگوں کو بتاؤ جو تمہارے دین کے ماننے والے ہیں۔"

یہاں آکر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ آپ اعلان کر دیں کہ ہدایت تو صرف اللہ وحدہ کی ہدایت ہے۔ اور جو شخص اللہ کی ہدایت کو تسلیم نہیں کرتا وہ کبھی بھی ہدایت نہیں پاسکتا۔ کسی صورت میں بھی اور کسی طریقے سے بھی قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللَّهِ "اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے۔"

اور یہ فیصلہ ان کے اس قول کے جواب میں آتا ہے۔ "اہل ایمان پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ' اور شام کے وقت اس کا انکار کر دو' امید ہے کہ اس طرح وہ پلٹ آئیں۔" مسلمانوں کو ان کے اس مذموم منصوبے کے رو بعمل آنے کے خلاف متنبہ کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو گویا وہ دوبارہ کفر میں داخل ہو جائیں گے۔ اس لئے ہدایت صرف اللہ کی ہدایت ہے۔ اور یہ مکار جو تدابیر اختیار کرتے ہیں وہ خالص کفر ہے۔ اور یہ فیصلہ بیچ میں آتا ہے۔ یعنی بطور جملہ معترضہ' ابھی تک اہل کتاب کی بات ختم نہیں ہوتی۔

أَن يُؤْتَىٰٓ أَحَدٌ مِّثْلَ مَآ أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَآجُّوكُمْ عِندَ رَبِّكُمْ ۗ

"اور یہ کہ کوئی دوسرا اس بات کو جان لے جو تمہیں معلوم ہے اور وہ تمہارے رب کے ہاں تمہارے خلاف حجت پیش کریں۔"

یہ فقرہ ان کے اس موقف پر دلیل ہے کہ "اور اپنا راز انہیں لوگوں کو بتاؤ جو تمہارے دین کے ماننے والے ہیں۔ یہ لوگ اس بغض اور حسد میں جلا تھے کہ کسی دوسرے شخص کو بھی اسی طرح نبوت اور کتاب سے سرفراز کیا جائے جس طرح تم نبوت اور کتاب سے سرفراز ہوئے تھے' انہیں یہ خوف دامنگیر تھا کہ اہل اسلام کو دین اور اسلام پر اطمینان نصیب نہ ہو جائے۔ اور وہ اس حقیقت پر مطلع نہ ہو جائیں جسے اہل کتاب نے چھپا رکھا ہے۔ حالانکہ وہ اسے جانتے ہیں اور نیز قیامت کے دن مسلمان اللہ کے ہاں اسے اہل کتاب کے پاس بطور حجت پیش نہ کر دیں۔ ان لوگوں کا خیال یہ تھا گویا مسلمانوں کی اس قولی شہادت کے سواء اللہ انہیں سزا نہ دے گا۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جو اللہ کی ذات و صفات پر صحیح ایمان کے نتیجے میں انہیں پیدا ہوتا۔ نہ اس قسم کے تصورات ان لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو سکتے ہیں جن کو اللہ کی ذات اور صفات' نبوت اور رسالت' اور ایمان پر مبنی افکار و فرائض کا صحیح علم حاصل ہو۔"

چنانچہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان اور رسول کریم ﷺ کو اس بات کی طرف متوجہ فرماتے ہیں کہ انہیں آگاہ کر دیں کہ یہ تو اللہ کا فضل و کرم ہے اور یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ کسی قوم کو کتاب و نبوت سے نواز دے۔

قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَآءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِۦ مَن يَشَآءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝

"اے نبی ان سے کہو کہ "فضل و شرف اللہ کے اختیار میں ہے' جسے چاہے عطا فرمائے۔" وہ وسیع النظر ہے اور سب کچھ جانتا ہے' اپنی رحمت کے لئے جس کو چاہتا ہے مخصوص کر لیتا ہے اور اس کا فضل بہت بڑا ہے۔"

اللہ کی مشیت نے اب فیصلہ کر لیا ہے کہ اب نبوت اور رسالت سے اہل کتاب کے سوا دوسرے لوگوں کو سرفراز کر دے'

خصوصاً جبکہ وہ اللہ کے ساتھ کئے ہوئے مواعید کی مخالفت کرتے چلے جائیں' جو ان کے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو ذمہ داری ان پر ڈالی تھی اسے بھی توڑتے چلے جائیں' جو امانت اللہ نے ان کے سپرد کی تھی اس میں خیانت کرتے چلے جائیں' وہ اپنی کتاب کے احکام اور اپنے دین کے قوانین کو توڑتے چلے جائیں۔ اور پھر اگر کوئی انہیں دعوت دے کہ آؤ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کریں تو وہ انکار کردیں' اور ان کے ان سب بڑے کارناموں کی وجہ سے انسانوں کی قیادت اور راہنمائی اسلامی نظام زندگی' اسلامی قائدین اور قرآن کریم کی راہنمائی سے آزاد ہو جائے' یہی وہ مقام تھا جس پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل اور اہل کتاب سے قیادت واپس لے لی اور اس بار امانت کو امت مسلمہ کے سپرد کردیا۔ اور یہ اس امت پر اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا فضل اور احسان تھا۔ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿ۚۙ۷۳﴾ ......... "اللہ بڑی وسعت والا ہے اور خبردار ہے۔" اور یَّخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ ............... "وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کیلئے مخصوص کرلیتا ہے۔" اس کا فضل وکرم بڑا وسیع ہے۔ اور اس کا علم بھی بڑا وسیع ہے' اس لئے وہ اس جگہ کو بھی خوب جانتا ہے۔ جہاں اس کی رحمت نازل ہو۔ وَ اللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ .............. "اس کا فضل بہت بڑا ہے۔" اور کسی قوم کیلئے اس سے بڑا اور کیا فضل ہو سکتا ہے کہ وہ اسے ایک کتاب کی صورت میں ہدایت دے۔ اور کسی کو وہ اس سے بڑی کیا خیر و برکت عطاء کرے کہ ان کو رسالت عطا کردے اور اس سے بڑی رحمت کا اور کیا مظاہرہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی قوم میں رسول بھیج دے۔

جب اہل اسلام نے یہ سنا تو ان کے دل میں اللہ کے فضل و کرم کا احساس پیدا ہوا۔ انہوں نے یہ جان لیا کہ انہیں ایک عظیم ڈیوٹی کیلئے منتخب کیا گیا ہے۔ اور انہیں مخصوص طور پر یہ اعزاز دیا گیا ہے۔ تو انہوں نے اپنے اس اعزاز کو بڑی دلچسپی کے ساتھ قائم رکھا۔ بڑی مضبوطی اور عزم سے اسے تھام لیا۔ بڑی قوت اور ثابت قدمی سے اس کی مدافعت کی۔ وہ حاسدوں اور مکاروں کی سازشوں کے مقابلے میں چوکنے ہوگئے۔ قرآن کریم کا یہی انداز تربیت تھا۔ اس لئے کہ یہ حکیم و دانا کا کلام ہے۔ اور آج بھی امت مسلمہ کیلئے یہی عنصر موجب اصلاح و تربیت ہو سکتا ہے۔ ہر زمانے اور ہر نسل میں۔

○........○........○........○........○

آگے بڑھ کر مزید حالات اہل کتاب کی بابت بیان ہوتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کے طرز عمل میں کس قدر تناقض پایا جاتا ہے۔ اور قطعی طور پر بتادیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا دین یعنی اسلام کن صحیح اور سچے اقدار پر استوار ہوا ہے۔ اس سلسلے میں بتایا جاتا ہے کہ اہل کتاب کے اندر باہمی معاملات میں کس قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔

وَ مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡہُ بِقِنۡطَارٍ یُّؤَدِّہٖۤ اِلَیۡکَ ۚ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡہُ بِدِیۡنَارٍ لَّا یُؤَدِّہٖۤ اِلَیۡکَ اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَیۡہِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡا لَیۡسَ عَلَیۡنَا فِی الۡاُمِّیّٖنَ سَبِیۡلٌ ۚ وَ یَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ وَ ہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۵﴾ بَلٰی مَنۡ اَوۡفٰی بِعَہۡدِہٖ وَ اتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۷۶﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَشۡتَرُوۡنَ بِعَہۡدِ اللّٰہِ وَ اَیۡمَانِہِمۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا

أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ

"اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دے دو تو وہ تمہارا مال تمہیں ادا کردے گا' اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملے میں بھی اس پر بھروسہ کرو تو وہ ادا نہ کرے گا الا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ "امیوں کے معاملے میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔" اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں' حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی ہے۔ آخر کیوں ان سے بازپرس نہ ہوگی؟ جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور برائی سے بچ کر رہے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا کیونکہ پرہیزگار لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں' تو ان کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں' اللہ قیامت کے روز نہ ان سے بات کرے گا۔ نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا۔ بلکہ ان کیلئے تو سخت دردناک سزا ہے۔"

جو اہل کتاب اس وقت اہل ایمان اور جماعت مسلمہ کے مقابلے میں اترے ہوئے تھے اور بحث و تکرار کر رہے تھے' ان کے بارے میں قرآن کریم کا تبصرہ نہایت ہی منصفانہ سچائی پر مبنی ہے۔ اور ان کے اوصاف بے کم و کاست بیان کئے گئے ہیں۔ اور جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں' آج تک اہل کتاب کا یہی حال ہے۔ غرض اہل کتاب اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ جو دشمنی کر رہے تھے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف وہ جس قدر گہری اور مذموم سازشیں کر رہے تھے اور جماعت مسلمہ اور دین اسلام کے خلاف وہ جس قدر شدید شر و فساد کیلئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ان سب حقائق کے باوجود ان میں سے جو لوگ اچھے تھے نہ ان کے فضائل چھپاتا ہے اور نہ ان کے بیان میں کمی کرتا ہے۔ حالانکہ اس وقت وہ اہل اسلام کے ساتھ مقابلہ و مناظرہ کی حالت میں تھے۔ اس لئے قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ اہل کتاب میں سے بعض لوگ ایسے ہیں کہ اگر ان کے ہاتھ میں لوگوں کے عظیم حقوق بھی آجائیں تو وہ انہیں تلف نہیں کرتے۔

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ ............... "اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دے دو تو وہ تمہارا مال تمہیں ادا کرے گا۔" لیکن ان میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو پرلے درجے کے خائن' لالچی' اور طمع کار ہیں جو کسی کا حق نہیں لوٹاتے۔ اگرچہ وہ بہت ہی حقیر کیوں نہ ہو' ہاں صرف وہ اس صورت میں ادا کریں گے کہ تم ان سے اصرار سے مطالبہ کرو اور ان کے سر پر سوار ہو جاؤ اور یہ حق مارنے کیلئے وہ ایک ایسا فلسفہ بھی گھڑتے ہیں جس میں سوچے سمجھے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ

اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملے میں بھی اس پر بھروسہ کرو تو وہ ادا نہ کرے گا الا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ' ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں "امیوں (غیر یہودیوں کے معاملے میں) ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔" اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ نے کوئی ایسی بات نہیں فرمائی۔"

اور یہ بھی یہودیوں کی ایک خاص صفت ہے۔ صرف یہودی یہ بات کہتے تھے۔ ان کے ہاں اخلاق و آداب کے مختلف پیمانے تھے۔ امانت و دیانت تو صرف ایک یہودی اور دوسری یہودی کے درمیان معاملات کیلئے ہے۔ رہے غیر یہودی جنہیں وہ امی کہتے تھے۔ اور ان سے مراد ان کی صرف عربوں ہی سے تھی۔ تو ان کے اموال تلف کرنے اور ناجائز ہڑپ کر جانے میں وہ کوئی حرج محسوس نہ کرتے تھے۔ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ غیر یہود کے ساتھ دھوکہ' فریب' طمع کاری' استحصال جیسے جرائم کا ارتکاب کرتے تھے۔ بغیر کسی جھجک کے وہ ان کے خلاف اوچھے ہتھیار استعمال کرتے اور مذموم حرکات کا ارتکاب کرتے۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان کا کہنا یہ تھا کہ ان کا خدا اور ان کا دین انہیں اس بات کا حکم دیتا ہے۔ لیکن دراصل وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کسی فحش بات کا حکم نہیں دیتا۔ مثلاً یہ کہ وہ کسی گروہ کو حکم دے کہ وہ دوسرے گروہ کی دولت ناجائز اور ظالمانہ طور پر کھائے۔ اور اس کے ساتھ اپنے کئے ہوئے معاہدوں کی پابندی نہ کرے۔ اور اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کرے۔ اور ان کو بغیر کسی کراہیت اور حرج کے نقصان پہنچاتا چلا جائے۔ لیکن وہ یہودی تھے۔ وہ یہودی جنہوں نے انسانوں کے ساتھ عداوت اور دشمنی کو اپنا دین بنا رکھا ہے۔ وَ یَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ..................... ....... "وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں' جانتے ہوئے۔"

اس مقام پر قرآن کریم انسانوں کے لئے اپنا واحد اخلاقی اصول طے کر دیتا ہے۔ یہ اس کا واحد اخلاقی معیار ہے۔ اور وہ اپنے اخلاقی نقطہ نظر کو خدا اور خدا خوفی کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَ اتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ.اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓىٕكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَ لَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ لَا یُزَكِّیْهِمْ۪ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ

"آخر کیوں ان سے بازپرس نہ ہوگی؟ جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور برائی سے بچ کر رہے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا' کیونکہ پرہیز گار لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں' تو ان کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں' اللہ قیامت کے روز نہ ان سے بات کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا۔ بلکہ ان کیلئے تو سخت دردناک سزا ہے۔"

غرض یہ ایک اخلاقی اصول ہے' جس نے اس کا لحاظ رکھا' اللہ کے عہد کا پاس کرتے ہوئے خدا خوفی کا شعور رکھتے ہوئے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ محبت رکھے گا' اسے اعزاز اور اکرام نصیب ہوگا۔ اور جس نے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے' اس عہد کو دنیا کے ثمن قلیل کی وجہ سے توڑا' چاہے اسے یہ پوری دنیا کیوں نہ مل رہی ہو' تو اس کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا' اس لئے کہ یہ پوری دنیا بھی آخرت کے مقابلے میں متاع قلیل ہے۔ اللہ کے ہاں ایسا شخص ہرگز مقبول نہ ہوگا اور ایسے شخص کیلئے کوئی نرمی نہ ہوگی۔ نہ وہ صاف ہوگا اور نہ پاک' اس کی حالت یہ ہوگی وہ عذاب الیم میں مبتلا ہوگا۔

یہاں اشارتاً" یہ کہا گیا ہے کہ وفائے عہد کا تعلق خدا خوفی کے ساتھ ہے۔ اس لئے وفائے عہد میں کسی حالت میں بھی فرق نہیں آنا چاہئے۔ وہ دوست کے ساتھ ہو یا دشمن کے ساتھ ہو۔ وفائے عہد مصلحتوں پر موقوف نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وفائے عہد کا معاملہ اللہ کے

ساتھ مربوط ہوتا ہے۔ اس کا ربط اور تعلق اس شخص کے ساتھ نہیں ہوتا جس کے ساتھ عہد کیا گیا ہو۔

یہ ہے اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر' ایفائے عہد میں بھی اور عمومی اجتماعی اخلاق میں بھی۔ یہ کہ اجتماعی معاملات میں سب سے پہلا معاملہ اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک مسلمان سب سے پہلے ذات باری کو پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ سب سے پہلے اللہ کے غضب سے ڈرتا ہے۔ اور اس کی رضامندی کا طلبگار ہوتا ہے۔ اسلام میں اخلاقیات کی تہہ میں محرک مصلحت نہیں ہوتی' نہ اس کا سبب اجتماعی عادت ہوتی ہے اور نہ اخلاقیات سوسائٹی کے دباؤ کی وجہ سے رائج ہوتے ہیں' اس لئے کہ سوسائٹی کبھی راہ راست پر ہوتی ہے اور کبھی گمراہ ہوتی ہے۔ اور اس میں گمراہ کن اقدار اور پیمانے رائج ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا اخلاقیات کیلئے ایسے ناقابل تغیر پیمانے وضع ہونا ضروری ہیں جن کے مطابق ایک فرد بھی اپنے اخلاق کو ناپے اور ایک سوسائٹی بھی ان کے معیار کو سمجھے۔ اور ناقابل تغیر ہونے اور مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ ان اخلاقی پیمانوں کا تعلق عالم بالا سے بھی ہو' جہاں سے یہ پیمانے لئے جائیں۔ یہ پیمانے اور ان کا ماخذ انسانی اصطلاحات اور انسانی ضروریات سے بالا ہو' اس لئے کہ انسانی ضروریات اور مصلحتیں روز بدلتی رہتی ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ یہ اصول اور پیمانے ذات باری سے اخذ کئے جائیں اور وہ اس طرح کہ سب سے پہلے معلوم کیا جائے کہ اللہ کی رضا کیا ہے۔ اس کی رضامندی پیش نظر ہو' اس کا خوف دل میں ہو' یوں اسلام انسانیت کو ایک ایسا اخلاقی نظام دیتا ہے جس کی جڑیں اس دنیا کے بجائے عالم بالا میں ہوتی ہیں اور وہ اسی روشن مستحکم اور سربلند سرچشمے سے اپنے اخلاقی پیمانے اور اخلاقی اصول اخذ کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ وعدہ خلافی کرتے ہیں اور امانت میں بددیانتی کرتے ہیں ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں۔ لہٰذا عہد و پیمان کا پہلا تعلق اللہ اور بندے کے درمیان ہے اور بعد میں اس کا تعلق ایک انسان اور دوسرے انسان کے ساتھ ہے۔ لہٰذا جہاں تک اللہ کا تعلق ہے ایسے عہد شکن لوگوں کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ ہاں اگر وہ اس عہد شکنی اور قسم توڑنے کے عوض کوئی دنیاوی مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں تو یہ مصالح دنیا آخرت کے مقابلے میں کوئی قیمت نہیں رکھتے۔ اس لئے ان کی اس عہد شکنی کی وجہ سے روز آخرت میں ان کے لئے کوئی جزا نہ ہوگی اس لئے کہ انہوں نے لوگوں کے ساتھ جو عہد کیا تھا وہ اللہ کے ساتھ بھی عہد تھا۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ہوتی ہے کہ فنی اعتبار سے قرآن کریم کا اسلوب تعبیر نہایت ہی مصورانہ ہے۔ یہاں اس حقیقت کہ اللہ ان پر کوئی توجہ نہ کرے گا اور ان کی کوئی رورعایت نہ ہوگی۔ یوں ادا کیا گیا ہے کہ اللہ نہ ان کے ساتھ بات کرے گا' نہ ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے گا اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا۔ یہ وہ انداز ہے جو بالعموم نظرانداز کرنے کیلئے عام لوگوں کے درمیان متعارف ہے۔ قرآن کریم نے اس تصویری انداز بیان کو اس لئے اختیار کیا ہے تاکہ قیامت کے دن ان کی رسوائی کی ایک زندہ اور وجدانی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ یہ زندہ اور وجدانی پیرایہ اظہار محض تجریدی انداز بیان سے زیادہ دلنشین ہوتا ہے۔ یہ قرآن کریم کا پیرایہ اظہار' بہت ہی خوبصورت اور حسین و جمیل۔

○.........○.........○.........○.........○

ذرا آگے بڑھئے اور دیکھئے اہل کتاب کے کچھ اور نمونے' ایک نمونہ ان گمراہ کنندگان کا ہے جو خود کتاب اللہ کو لوگوں کی گمراہی کیلئے بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنی زبان کو موڑ کر چالاکی سے بات کرتے ہیں اور مراد کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔ وہ آیات کتاب میں ایسی توڑ پھوڑ کرتے ہیں جس سے مراد اور مفہوم ان کی متعینہ خواہشات کے مطابق ہو جاتا ہے اور اس توڑ اور پھوڑ کے بدلے میں ایک حقیر فیس وصول کرتے ہیں۔ اور اس فیس کا تعلق اس دنیا کے حقیر مقاصد کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ جو تحریفات اور تاویلات کرتے تھے

منجملہ ان میں سے وہ عقائد تھے' جو انہوں نے حضرت مسیح اور حضرت مریم کے بارے میں گھڑ رکھے تھے۔ اور وہ عقائد اہل کنیسہ اور حکام وقت کے مفید مطلب تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆ وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ ۚ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۚ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٨﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ﴿٧٩﴾ وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا ۗ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿٨٠﴾

٨ ع ٩ ١٦

"اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا الٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو کہ جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے۔ حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ پڑھ رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے' حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا' وہ جان بوجھ کر جھوٹی بات اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کسی انسان کا کام یہ نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطاء فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ' وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو' جیساکہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ وہ تم سے ہرگز یہ نہ کہے گا کہ فرشتوں کو یا پیغمبروں کو اپنا رب بنالو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تمہیں کفر کا حکم دے جبکہ تم مسلم ہو۔"

جب اہل دین اخلاقی فساد میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو وہ دینی حقائق میں ملاوٹ کا ذریعہ بنتے ہیں اور یہ کام وہ علمائے دین کے لباس میں کرتے ہیں۔ قرآن کریم یہاں اہل کتاب میں ایک گروہ کے جو حالات بیان کر رہا ہے' ان سے ہم اپنے زمانے میں اچھی طرح واقف ہیں' اہل کتاب نصوص کتاب میں تاویلات کرتے تھے۔ زبان کے ہیر پھیر سے مفہوم تبدیل کرتے تھے۔ اور اس طرح وہ طے شدہ نتائج اخذ کرتے تھے۔ اور ان کا یقین یہ ہوتا تھا کہ کتاب اللہ کا مفہوم یہی ہے۔ اور یہی مفہوم ارادۂ الٰہی کا اظہار ہے۔ حالانکہ جو نتائج وہ اخذ کرتے تھے وہ اصول دین سے متصادم تھے۔ ان کو یہ اعتماد تھا کہ اکثر سامعین ان پڑھ اور بے علم ہیں اور وہ ان کے خود ساختہ نتائج اور آیات کے حقیقی مفہوم کے درمیان کوئی فرق اور امتیاز نہیں کر سکتے۔ حالانکہ ان کے نتائج جعلی اور جھوٹے تھے اور ان نتائج تک وہ آیات کو زبردستی کھینچ کر لاتے تھے۔

اہل کتاب کا یہ نمونہ ہمارے دور میں بعض دینی راہنماؤں میں پوری طرح پایا جاتا ہے' جو بطور ظلم اپنے آپ کو دین کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔ جو دین میں تحریف کرتے ہیں۔ اور جو اپنی تمام خواہشات نفسانیہ میں اسے مزاح بناتے ہیں۔ وہ اپنے کندھوں پر

آیات الٰہی کو اٹھائے ہوئے پھرتے ہیں اور جہاں بھی انہیں کوئی مفاد نظر آئے اسی کی بھینٹ چڑھاتے ہیں' جہاں بھی اس دنیا کے مفادات میں سے کوئی مفاد ملتا ہے۔ ان آیات کے ذریعہ وہ اسے حاصل کرتے ہیں۔ غرض آیات الٰہی کو اٹھائے یہ لوگ اغراض دنیاوی کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں۔ اور پھر ان آیات کی گردن توڑ کر اور انہیں خوب مروڑ کر ان مفادات پر فٹ کرتے ہیں۔ وہ الفاظ کے مفہوم میں ایسی تبدیلی کرتے ہیں کہ وہ ان کے مقاصد اور رجحانات سے موافق ہو جائیں۔ اگرچہ یہ رجحانات دین کے اساسی تصورات اور اصول دین کے ساتھ متصادم ہوں۔ وہ اس میدان میں سہ گانہ جدوجہد کرتے ہیں اور ہر قسم کی بہتان تراشی کا ارتکاب کرتے ہیں اور ہروقت اسی گھات میں بیٹھے رہتے ہیں کہ کسی طرح قرآن مجید کے کسی لفظ کا وہ مفہوم نکال لیں جو ان کی خواہشات نفسانیہ کے مطابق ہو' اور جس سے یہ رائج اور صاید خواہشات ثابت ہو جائیں۔

وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ

''وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم پڑھ رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا' وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔''

قرآن کریم نے اہل کتاب کے ایک گروہ کا جو حال بیان کیا ہے' یہ ایک ایسی بیماری ہے جو اہل کتاب کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اس میں ہر وہ قوم مبتلا ہو جاتی ہے جو دین کا کام ایسے لوگوں کے سپرد کر دیتی ہے جو نام نہاد دیندار ہوتے ہیں اور جن کے نزدیک دین اس قدر ارزاں ہو جاتا ہے کہ اس کی قدر و قیمت ان کی اغراض دنیاوی میں سے ادنیٰ غرض کے برابر بھی نہیں ہوتی۔ اور ان کی ذمہ داری کی حس اس قدر ماند پڑ جاتی ہے کہ ان کا دل اللہ پر جھوٹ باندھنے سے بھی نہیں چوکتا۔ وہ لوگوں اور بندوں کی چاپلوسی کی خاطر آیات الٰہی میں تبدیلی کرتے ہیں۔ اور اپنی غیر صحت مند خواہشات کو پورا کرنے کیلئے وہ اللہ کے دین میں تحریف کا ارتکاب کرتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کو اس خطرناک مقام سے آگاہ کرتے ہیں جہاں قدم پھسل جاتے ہیں اور جس کی وجہ سے بنی اسرائیل نے اپنے مقام قیادت کو کھو دیا۔

ان آیات کے مجموعی تاثر کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کلیہ گروہ کتاب اللہ میں سے مجازی تعبیرات پر مشتمل بعض جملے تلاش کر لیتا تھا' اور پھر ان آیات کو توڑ مروڑ کر ان سے ایسے معانی نکال لیتا تھا جن کی متحمل وہ آیات نہ تھیں۔ یوں وہ اپنی تاویلات کے ذریعہ عجیب معانی نکالتے اور ان پڑھ لوگوں کو یہ تاثر دیتے کہ یہ مفاہیم کتاب اللہ کے مدلولات ہیں۔ حالانکہ وہ خود ان کے ایجاد کردہ تھے۔ وہ لوگوں سے کہتے یہ ہے وہ بات جو اللہ نے کہی ہے۔ حالانکہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہوتی۔ ان تاویلات سے ان کا مقصد اور ہدف یہ تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ ؑ کی الوہیت ثابت کر دیں' اس کے ساتھ روح القدس کی الوہیت ثابت کر دیں۔ یعنی تین اقنوم باپ' بیٹا اور روح القدس تین بھی اور ایک بھی اور وہ ایک اللہ ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کے اس تصور سے پاک ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ ؑ سے ایسے کلمات روایت کرتے تھے جو ان کے ان مزعومات کی تائید کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ان تحریفات اور تاویلات کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ اپنے ایک بندے کو نبوت کیلئے چن لے اور اس کو یہ عظیم منصب عطا کر دے اور وہ بندہ لوگوں کو حکم دے کہ وہ اسے الٰہ بنالیں۔ فرشتوں کو الٰہ بنالیں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَ لَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَ النَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾

"کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم لوگوں کے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو' جیسا کہ اسی کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے ہو اور پڑھاتے ہو۔ وہ تم سے ہرگز یہ نہ کہے گا کہ فرشتوں کو یا پیغمبروں کو اپنا رب بنالو' کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تمہیں کفر کا حکم دے جبکہ تم مسلم ہو۔"

حضرت نبی ﷺ یہ یقین دہانی کراتے ہیں کہ وہ عبد ہیں اور اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک رب ہے اور تمام لوگوں کا فرض ہے کہ وہ صرف اس کی عبادت کریں۔ اس لئے اس بات کا امکان ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے مقام ربوبیت کو مخصوص کریں۔ کیونکہ مقام الوہیت کا تو پھر تقاضا یہ ہے کہ لوگ عبادت بھی نبی کی کریں۔ اس لئے کوئی نبی لوگوں کو یہ نہیں کہہ سکتا **كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** .................... "تم اللہ کے سوا میرے بندے بن جاؤ۔" نبی کی دعوت تو یہ ہوتی کہ **كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ** .................... "تم سب ربانی بن جاؤ۔" اس لئے کہ جس کتاب کا تم نے علم حاصل کیا ہے۔ اس کی تعلیمات یہی ہیں۔ اور جس کی تم تدریس کرتے ہو اس کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اس لئے علم کتاب اور تدریس کتاب کا یہ تقاضا ہے کہ صرف اللہ کی بندگی ہو' پس نبی کیسے لوگوں کو یہ حکم دے سکتا ہے کہ وہ نبیوں اور فرشتوں کو اللہ کے علاوہ رب بنالیں۔ اس لئے کہ نبی اسلام لانے کے بعد لوگوں کو کفر کا حکم کیسے دے سکتا ہے۔ حالانکہ اس کا مقام یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ہدایت دے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو ہدایت پانے کے بعد گمراہ کردے۔ وہ اسلام کی طرف ان کا قائد ہے' اسلام سے نکالنے کیلئے ان کا قائد نہیں ہے۔

اس فارمولے کے مطابق وہ بات محال ہو جاتی ہے۔ جو لوگ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ نیز ان کا یہ جھوٹ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیات، و روایات جو وہ پڑھتے ہیں اللہ اور رسول کی طرف سے ہو سکتے ہیں۔ اس لئے یہ لوگ جو بات کہتے ہیں اس کی حیثیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہ دعویٰ بے اعتبار ہو جاتا ہے جسے وہ بار بار اسلامی صفوف میں شبہات اور خلجان پیدا کرنے کیلئے دہراتے ہیں۔ اس لئے کہ قرآن کریم نے انہیں اچھی طرح ننگا کر کے رکھ دیا ہے۔ اور وہ جماعت مسلمہ کے سامنے کھلے میدان میں ننگے ہو گئے ہیں۔

ان لوگوں کی مثال بھی بعینہٖ ان اہل کتاب جیسی ہے جو علم دین کے مدعی ہیں جیسا کہ ہم اس سے پہلے بالتفصیل بیان کر آئے ہیں۔ یہ لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ قرآن کریم کی یہ آیات ان کے سامنے پیش کی جائیں۔ کیونکہ یہ لوگ بھی نصوص قرآنی کو توڑ موڑ کر پیش کرتے ہیں اور انہوں نے بھی اللہ کے سوا کئی ارباب قائم کر رکھے ہیں اور وہ ہر وقت اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ آیات کو توڑ موڑ کر ان سے وہ مفاہیم نکالیں' جو خود انہوں نے گھڑ رکھے ہیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ

"وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم پڑھ رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا' وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔"

O.........O.........O.........O.........O

اس کے بعد تمام رسولوں اور رسالتوں کے قافلہ ایمانی کے درمیان' اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کے حوالے سے' ایک مضبوط رابطے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے مطابق وہ تمام لوگ اس عہد کو توڑنے والے اور فاسق قرار پاتے ہیں جو نبی آخرالزمان حضرت محمد ﷺ پر ایمان نہیں لاتے۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ اللہ سے کئے ہوئے عہد سے منحرف ہوتے ہیں' بلکہ وہ اس پوری کائنات کے ناموس اعظم سے بھی خارج ہو جاتے ہیں۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۸۱ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۸۲ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝۸۳

"یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ "آج ہم نے تمہیں کتاب و حکمت و دانش سے نوازا ہے' کل اگر کوئی دوسرا رسول تمہارے پاس' اسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے' تو تم کو اس پر ایمان لانا ہو گا اور اس کی مدد کرنی ہو گی۔" یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا "کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو' اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو۔" انہوں نے کہا ہاں ہم اقرار کرتے ہیں' اللہ نے فرمایا۔ "اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں' اس کے بعد جو اپنے عہد سے پھر جائے وہی فاسق ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی خوفناک اور پختہ معاہدہ لیا' اور اس معاہدے پر وہ خود گواہ بن گیا اور اپنے تمام نبیوں کو اس پر گواہ بنایا۔ یہ معاہدہ تمام رسولوں سے لیا گیا تھا۔ مضمون یہ تھا کہ جس رسول کو بھی کتاب و حکمت دی جائے اس کا یہ فرض ہو گا کہ وہ اس کے بعد میں آنیوالے رسول کی تائید کر دے اگر بعد میں آنیوالا رسول خود اس کی تعلیمات کی توثیق و تائید کر رہا ہو۔ تائید کے ساتھ سابقہ رسول کا یہ بھی فرض ہے کہ اس کی نصرت کرے اور اس کی شریعت کی اطاعت کرے۔ یہ معاہدہ اللہ اور ہر رسول کے مابین طے پایا تھا۔

قرآن کریم نے تاریخ انسانی کے طویل ترین دفتر کو لپیٹ کر تمام رسولوں کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ وہ ایک ہی منظر میں سب جمع ہیں۔ اللہ جل شانہ ان کو ایک ساتھ خطاب فرما رہے ہیں تو کیا انہوں نے اس معاہدے کا اقرار کر لیا اور اللہ کی بھاری ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ اللہ تعالیٰ سوال فرماتے ہیں قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ ................ "کیا تم اس

کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو؟" وہ سب جواب دیتے ہیں۔
قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ۭ ........... "ہم اقرار کرتے ہیں۔" ......پس رب ذوالجلال اس معاہدے پر خود بھی گواہ بن جاتے ہیں اور ان کو بھی گواہ بناتے ہیں۔قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ........... "فرمایا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔"

یہ ایک عظیم اور دہشت انگیز منظر جس کی تصویر کشی قرآن کریم کرتا ہے' اسے دیکھ کر دل کانپ اٹھتے ہیں' اس منظر میں تمام انبیاء و رسل جناب باری میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ نظر آتا ہے کہ معززین ارض کا یہ قافلہ ایک دوسرے سے جڑا ہوا' ایک دوسرے پر تکیہ لگائے کھڑا ہے اور سب کے سب لوگ عالم بالا کی ربانی ہدایات کے منتظر ہیں۔ یہ سب اسی حقیقت اور سچائی کی نمائندگی کرتے ہیں جو ایک ہے۔ اور جس کے بارے میں اللہ کا حکم یہ ہے کہ پوری انسانیت کی تعمیر اس کی اساس پر کی جائے جس میں کوئی انحراف نہ ہو' کوئی دوئی نہ ہو کوئی تعارض نہ ہو اور کوئی تصادم نہ ہو' اس سچائی کے نمائندے وہ لوگ ہیں جو لوگوں میں سے برگزیدہ ہیں۔ ان میں سے ہر برگزیدہ اس سچائی کو دوسرے برگزیدہ کی طرف منتقل کرتا چلا آیا ہے۔ اس طرح وہ اپنی ذات کو بھی آنے والے مختار کی طرف منتقل کرتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے کہ نبی کی ذات اس کی اپنی نہیں ہوتی ہے۔ نہ اس مہم میں اس کا کوئی ذاتی مقصد یا خواہش ہوتی ہے' نہ نبی ذاتی اور شخصی عزت و تکریم کے لئے کام کرتا ہے۔ وہ تو بندۂ مختار ہوتا ہے اور ایک ذمہ دار مبلغ ہوتا ہے۔ یہ ذات باری ہی ہے جو مختلف ادوار میں مختلف نسلوں کی طرف دعوت اسلامی کو منتقل کرتا چلا آتا ہے اور مختاران رسل اسے جس طرح چاہتے ہیں چلاتے ہیں۔

دین کے اس تصور اور اللہ کے ساتھ اس سلسلے میں طے ہونے والے اس عہد کے نتیجے میں اللہ کا دین خالص ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی ذاتی عصبیت نہیں داخل ہوتی۔ یعنی رسول کی ذات بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ رسول کی قوم کا اس دین پر کوئی اثر نہیں ہوتا اس کے پیروکاروں اور ان کے خاندانوں کے مخفی اثرات سے بھی یہ دین پاک و صاف ہوتا ہے۔ اسی طرح متبعین کی ذات اور ان کی قوم قبیلے کی شخصیت کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دین اسلام ایک ایسا دین ہے جس میں ہر معاملہ اللہ کے اختیار میں ہوتا ہے' دین بھی ایک اور اللہ بھی ایک' اور اسی ایک دین کو لیکر انسانیت کی تاریخ میں قافلہ رسل بھی ایک' جو نہایت ہی معزز اور ممتاز قافلہ ہے۔

اس حقیقت کے سائے میں ہمارے سامنے اب وہ لوگ کھل کر آجاتے ہیں جو اپنے آپ کو اہل کتاب کہتے ہیں۔ یہ لوگ نبی آخرالزماں پر ایمان نہیں لاتے۔ اور پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ وہ اپنے دین کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے' حالانکہ خود ان کے دین کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نبی آخرالزماں پر ایمان لائیں اور اس کی نصرت اور تائید کیلئے اٹھیں۔ لیکن یہ لوگ محض تعصب کی وجہ سے یہ ایمان نہیں لاتے۔ اس لئے کہ یہ دین ان تک جن رسولوں نے پہنچایا ہے ان سے تو اللہ تعالیٰ نے نہایت ہی پختہ عہد لیا ہے اور انہوں نے اپنے رب کے ساتھ یہ عہد باندھا ہے اور یہ عہد بر سرعام اور اجلاس میں طے پایا ہے کہ وہ نبی آخرالزمان کی نصرت کریں گے۔ اس لئے جو لوگ نبی آخرالزمانؐ پر ایمان نہیں لاتے وہ در حقیقت فاسق اور بد کار ہیں۔ وہ عہد شکن ہیں۔ وہ اس کائنات کے اسی نظام کو توڑنے والے ہیں۔ جو اپنے رب کا فرماں بردار ہے' جو ناموس قدرت کا مطیع فرمان ہے۔ اس لئے کہ یہی ناموس اس پوری کائنات کا مدبر ہے۔ اور یہ پوری کائنات اس کی مشیئت پر چل رہی ہے۔

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ

"اس کے بعد جو شخص اپنے عہد سے پھر جائے وہی فاسق ہے۔ کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ چھوڑ کر کوئی اور دین چاہتے ہیں؟ حالانکہ زمین و آسمان کی ساری چیزیں چاروناچار اللہ ہی کی تابع فرمان (مسلم) ہیں اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔"

حقیقت ہے کہ نبی آخرالزمان کی اطاعت سے صرف فاسق ہی منہ موڑ سکتا ہے اور اللہ کے اس دین سے وہی شخص منہ موڑ سکتا ہو جو شاذ اور مردود ہو' وہ اس کائنات کے پورے طبیعی نظام میں بھی شاذ ہو گا اور مردود ہو گا اور اس پوری تابع فرمان کائنات میں بھی فساد کنندہ' باغیان اور شرانگیز ہو گا۔

اللہ کا دین ایک ہے' سب رسول ایک دین لیکر آئے' سب نے اس پر پختہ معاہدہ کیا۔ اللہ کا عہد بھی ایک ہے' جس کے فریق تمام رسول ہیں۔ لہٰذا اس دین پر ایمان لانا' اس رسول پر ایمان لاؤ اور اتباع کرنا' اس رسول کی نصرت کرنا اور اسلامی نظام قائم کرنا اور تمام دوسرے نظاموں کا مقابلہ کرنا دراصل اس عہد کی وفاداری ہے۔ اس لئے جس شخص نے بھی دین اسلام سے روگردانی کی گویا اس نے اللہ کے تمام ادیان سے منہ موڑا۔ اور اس نے اللہ کے عام عہدوں کو توڑا....... اس لئے کہ وہ اسلام جس سے اس کرۂ ارض پہ اسلامی نظام زندگی کا قیام مطلوب ہو' اس کا اتباع اور اس کے ساتھ خلوص کا مظاہرہ' دراصل اس پوری کائنات کا اسلام اور ناموس قدرت ہے۔ یہ اسلام اس کائنات کے ہر زندہ چرند و پرند کا اسلام ہے۔

یہ ہے کہ اسلام اور سر تسلیم ختم کرنے کی ایک گہری شکل' ایک ایسی شکل و صورت جو تکوینی ہے جو انسان کے شعور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جس سے انسانی ضمیر میں خدا خوفی پیدا ہوتی ہے۔ ایک عظیم قانون قدرت کی صورت جو قہار و جبار ہے۔ جو تمام کائنات کی مردہ اور زندہ چیزوں کو ایک ہی سنت الٰہیہ اور شریعت الٰہیہ کے تابع فرمان بناتی ہے۔ اور جس کے مطابق دونوں کا مآل اور انجام ایک ہے۔ یہ ہے اسلام وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ......... "اور سب نے اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔" ......... لہٰذا یہ سب چیزیں آخر کار لازماً اسی اللہ کی طرف پلٹ کر جائیں گی جو سب کو گھیرے ہوئے ہے' سب کا مدبر ہے اور نہایت ہی جلال و عظمت کا مالک ہے اور اس انجام سے کوئی راہ فرار نہیں ہے۔

اگر انسان اپنی کامیابی اور سعادت چاہتا ہے' اگر وہ راحت اور اطمینان چاہتا ہے' اگر وہ اطمینان قلب اور صلاح حال چاہتا ہے تو اس کے لئے ماسوائے اس کے کوئی اور راہ نہیں ہے کہ اسلامی نظام زندگی کی طرف رجوع کرے۔ اپنی ذات میں بھی' اپنے نظام زندگی میں بھی اور اپنے اجتماعی نظام میں بھی تاکہ اس کی زندگی اس پوری کائنات کے نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔ اور اسے فطرت کائنات کے برخلاف اپنے لئے کوئی علیحدہ نظام زندگی وضع کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اس لئے کہ اس کا یہ خود ساختہ نظام' نظام کائنات کے ساتھ متضاد ہو گا جو اللہ تعالیٰ کا تخلیق کردہ ہے۔ اور یہ انسان طوعاً و کرہاً اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا پابند ہے۔ وہ نظام جو اس کے تصور اور شعور میں ہے' جو اس کی عملی زندگی اور اس کے باہمی تعلقات میں ہے' جو اس کی تمام جدوجہد اور سرگرمیوں میں ہے۔ جب اس کائناتی نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے گا تو یہ ہم آہنگی اس کے اور اس پوری کائنات کی عظیم قوتوں کے درمیان ایک تعاون پیدا کر دے گی۔ اور ان کے درمیان کوئی تصادم نہ ہو گا۔ اس لئے کہ جب انسان کائناتی قوتوں کے ساتھ تصادم کی راہ لیتا ہے تو وہ پاش پاش ہو جاتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کا وجود نہیں مٹتا تو وہ کم از کم فریضہ خلافت فی الارض کی ادائیگی کے قابل نہیں رہتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے تیار کیا ہے۔ اور اگر وہ قوانین قدرت اور کائناتی اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا' جو خود اسے اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی پوری کائنات کو کنٹرول کرتے ہیں۔ خواہ زندہ ہوں یا غیر زندہ تو اس صورت میں وہ تمام اسرار کائنات کا راز دان ہو گا' وہ اس کی قوتوں کو مسخر کر دے گا ان سے مفاد حاصل کرے گا اور اسی طرح وہ راحت' آرام اور سکون حاصل کرے گا۔ اور بے چینی' قلق اور خوف سے نجات ملے

گی۔ مثلاً کائنات کا مفاد یوں ہو گا کہ ایک کائناتی قوت کو جلانے اور تخریب کیلئے استعمال کرنے کے بجائے وہ اسے کھانے پکانے گرمی حاصل کرنے کیلئے استعمال کرے گا۔ اور اس سے روشنی حاصل کرے گا۔

انسانی مزاج اپنی اصلیت کے اعتبار سے ان کائناتی قوتوں اور نوامیس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ انسان کا وجدان اسی طرح اپنے رب کی اطاعت چاہتا ہے جس طرح اس کائنات کی پوری زندہ اور غیر زندہ اشیاء اس کے سامنے سربسجود ہیں۔ جب ایک انسان قوانین فطرت کے خلاف راہ اختیار کرتا ہے۔ تو وہ صرف نظام فطرت کے خلاف ہی نہیں جاتا بلکہ وہ خود ان نوامیس طبیعت کے بھی خلاف جاتا ہے جو اس کے نفس کے اندر موجود اور جاری و ساری ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بروقت پریشان 'شکستہ' حیران اور بے چین نظر آتا ہے۔ اور اس کی زندگی اسی طرح برباد ہو جاتی ہے جس طرح آج کا ایک گمراہ' بے راہ رو انسان کی زندگی ہوتی ہے۔ اور جسے ہم ہر طرف دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ آج کے انسان نے علمی میدان میں بڑی بڑی فتوحات حاصل کی ہیں اور وہ مادی ترقی کے بام عروج پر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت انسانیت ایک انتہائی تلخ روحانی خلا میں مبتلا ہے۔ اور یہ ایک ایسا خلا ہے جسے فطرت انسان بھول نہیں سکتی۔ یعنی انسانیت ذوق یقین سے محروم ہے۔ اس کی زندگی اسلامی نظام سے محروم ہے' اس لئے کہ یہی نظام زندگی' ان مادی ترقیات اور قوانین فطرت کے درمیان توازن پیدا کر سکتا ہے جس میں انسان کی تگ و دو اور قوانین فطرت کی رفتار ایک سمت میں ہو جاتی ہے۔

انسانیت اس وقت جھلس دینے والی تپتی دھوپ میں سرگرداں ہے اور وہ اسلامی نظام زندگی کی گھنی چھاؤں سے محروم ہے جس میں وہ خوشگوار زندگی بسر کر سکے۔ اور اس شر و فساد سے اسے نجات ملے جس میں وہ محض اس لئے گرفتار ہے کہ وہ اسلام کے شاہراہ مستقیم اور جادۂ مانوس سے ہٹ گئی ہے۔ اس دشوار گزار راستے پر حیرانی و پریشانی' قلق و بے چینی اور اضطراب و گمراہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ وہ ہر وقت بھوک' افلاس اور روحانی خلا اور محرومیت کے احساس کا شکار ہے۔ اور اسی صورت حال سے اس نے فرار کا یہی ایک راستہ پایا ہے کہ وہ حشیش' چرس اور ہیروئن جیسی منکرات اور تباہ کن ذرائع اختیار کیے ہوئے ہے۔ یہ جنونی سرعت' احمقانہ حرکات' اخلاقی بے راہ روی سے اس خلا کو بھرنا چاہتی ہے۔ لیکن ناکام ہے۔ اور یہ صورت حال باوجود اس بے پناہ مادی ترقی' بے حد وحساب پیداوار اور ساری زندگی کی بے پناہ سہولیات کے باوجود جوں کی توں ہے۔ بلکہ اس قلق اور اس حیرانی اور ان پریشانیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اسی نسبت سے ہو رہا ہے جس نسبت سے مادی ترقی میں اضافہ ہوتا ہے اور دنیاوی سہولیات اور آسائشوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہ خوفناک اور تلخ خلا' انسانیت کو ایک خوفناک بھوت کی طرف بھگا رہا ہے۔ لیکن بھاگتے بھاگتے وہ جس مقام تک بھی پہنچتی ہے' ہر جگہ یہ بھوت اس کے پیچھے کھڑا نظر آتا ہے' آج جو شخص بھی مغرب کے مالدار اور ترقی یافتہ دور میں جاتا ہے اسکے احساسات میں پہلا تاثر یہ بیٹھتا ہے کہ یہ سب لوگ بھاگ رہے ہیں۔ کوئی بھوت ہے جو انہیں بھگا رہا ہے اور اس سے بھاگ رہے ہیں' بلکہ وہ خود اپنی ذات اور اپنے سائے سے بھاگ رہے ہیں۔ اس شخص پر بہت جلد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان مادی ترقیات نے اور حسی لذتیت نے ان لوگوں کو گندے کیچڑ میں لت پت کر دیا ہے۔ وہ بے شمار نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان کے اعصاب شل ہو گئے۔ وہ بے راہ روی کے ہیجان میں مبتلا ہیں اور اپنی اس روحانی کمی کو منکرات' منشیات اور دوسری مہلک اشیاء کے استعمال سے پورا کرتے ہیں۔ اس لئے وہ جنوں کی حد تک جرائم پیشہ ہو گئے ہیں اور ان کی زندگی ہر قسم کے شریفانہ تصور سے خالی ہے۔

ان لوگوں نے اپنی شخصیت ہی کو گم کر دیا ہے' اس لئے کہ انہوں نے اپنے وجود کا اصل مقصد ہی بھلا دیا ہے۔ وہ روحانی سعادت سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے اسلامی نظام زندگی کو گم کر دیا ہے۔ جو انسان کی روحانی اور جسمانی زندگی کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر کے اسے ان روحانی امراض سے نجات دیتا ہے جس میں وہ مبتلا ہیں۔ اور وہ اس خلجان میں مبتلا اس لئے ہیں کہ وہ معرفت

خداوندی سے محروم ہیں جس کی طرف انہوں نے لوٹنا ہے۔

○.........○.........○.........○.........○

صرف تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے ہی نہیں 'بلکہ حقیقی نفس الامری کے اعتبار سے امت مسلمہ ہی وہ امت ہے جس نے اس عہد کو اچھی طرح اپنالیا ہے' جو اللہ اور اس کے نبیوں کے درمیان طے پایا تھا' صرف اس امت نے اس حقیقت کا ادراک کیا ہے کہ اللہ کا دین ایک ہے اور اس کا نازل کردہ نظام زندگی بھی ایک ہے۔ اور وہ قافلہ انبیائے کرام بھی ایک ہے جنہوں نے تاریخ میں ہمیشہ اسی واحد دین کو پیش کیا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نبی آخر الزماں کو یہ حکم دیتے ہیں کہ وہ اس حقیقت کبریٰ کا اعلان کرے یعنی یہ کہ یہ امت تمام نبیوں پر ایمان لاتی ہے' وہ تمام رسل کا احترام کرتی ہے۔ وہ دین اسلام کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ دین جس کے سوا کوئی دوسرا دین اللہ کے ہاں قبول نہ ہو گا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَاۤ اُوْتِیَ مُوْسٰى وَ عِیْسٰى وَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ۪ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ٘ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴿۸۴﴾ وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ٘ وَ هُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴿۸۵﴾

"اے نبی کہو کہ "ہم اللہ کو مانتے ہیں' اس تعلیم کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی' ان تعلیمات کو بھی مانتے ہیں جو ابراہیمؑ 'اسماعیلؑ' اسحاقؑ 'یعقوبؑ اور اولاد یعقوبؑ پر نازل ہوئی تھیں۔ اور ان ہدایات پر بھی یقین رکھتے ہیں جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے تابع فرمان ہیں۔" اس اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے' اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔"

یہ ہے اسلامی تصور حیات' جو بہت وسیع ہے اور اس میں تمام سابقہ رسالتیں شامل ہیں اور اسلامی نظام کے جھنڈے تلے وہ تمام رسول جمع ہیں جنہوں نے کبھی بھی رسالت خداوندی کا فریضہ سرانجام دیا۔ اسلامی نظام کی اساس عقیدۂ توحید پر ہے اور اس کے تصور کے مطابق تمام انبیاء کا منبع ہدایت ایک ہے یعنی ذات باری اور ذات باری' اور تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ پہلی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ کی ذات پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ پھر اس کتاب پر ایمان لانے کا حکم ہے جو مسلمانوں پر نازل ہوئی اور پھر ان کتابوں پر ایمان لانے کا ذکر ہے جو مسلمانوں سے قبل دوسرے انبیاء پر نازل ہوئیں۔ اور اس کے بعد یہ فقرہ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ............ "اور ہم اس کے مسلم ہیں۔" ان الفاظ سے اسلام کا ان الفاظ میں اقرار کرنا اپنے اندر ایک خاص مفہوم رکھتا ہے۔ پہلے یہ کہا گیا کہ اسلام کا مفہوم سر تسلیم خم کرنا ہے' اطاعت کرنا ہے اور خشوع و خضوع ہے۔ حکم کا اتباع ہے اور اسلامی نظام' اسلامی طریقہ کار اور اسلامی ناموس کی اطاعت ہے۔ اور یہ مفہومات پہلی آیت

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ

"اب کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دین اللہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چاروناچار اللہ ہی کے تابع فرمان ہیں۔ (مسلم ہیں) اور اس کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔" سے اخذ ہوتے ہیں' اس لئے کہ اس کائنات کی تکوینی اشیاء کے اسلام کا صرف یہی مفہوم ہو سکتا ہے۔ کہ وہ مطیع فرمان ہوتی ہیں' وہ نظام کائناتی کے تابع ہوتی ہیں اور ضابطہ تکوینی کے اندر جکڑی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مناسب موقعہ پر اسلام کے اس خاص مفہوم کو واضح فرماتے ہیں کہ اسلام عملی نظام کا نام ہے تاکہ لوگوں کے دل میں یہ بات نہ بیٹھ جائے کہ اسلام صرف زبانی اقرار یا صرف تصدیق کا نام ہے جو دلوں میں بیٹھ جاتی ہے اور اس کے بعد اس ایمان و تصدیق کے عملی اثرات کا وجود میں آنا ضروری نہیں ہے مثلاً اسلامی نظام زندگی کی اطاعت اور انسانی زندگی میں اس نظام کے قیام کی عملی جدوجہد...... غرض آنے والی عمومی توضیح اور بیان سے پہلے یہ نہایت ہی اہم نکتہ ہے جس پر قدرے غور ضروری ہے اور جس میں بتاکید کہا گیا ہے۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِينَ

...................."اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور طریقہ بطور دین اختیار کرے گا اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔"

ان آیات کے بعد' جو مسلسل لفظ اسلام کے مفہوم کی توضیح کرتی ہیں' اب اسلام کے مفہوم میں کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ ان آیات میں تحریف کی جا سکتی ہے نہ توڑ پھوڑ کیا جا سکتا ہے نہ اسلام کا اب کوئی اور مفہوم بیان کیا جا سکتا ہے۔ جس کا علم قرآن کو نہ ہو۔ اسلام بہرحال وہی اسلام ہے جس کی اطاعت یہ پوری کائنات کر رہی ہے اس نظام کی صورت میں جو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے وضع کیا ہے۔

یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اسلام صرف شہادتین کے اقرار تک محدود ہو جائے اور شہادتین کے تلفظ و اقرار کے بعد اس پر وہ مفہوم اور وہ حقیقت مترتب نہ ہو' جو اسلام کے مفہوم میں داخل ہے۔ یعنی ذات باری وحدہ لاشریک ہے اور ذات باری وحدہ قیوم ہے' نظام کائنات کو تھامے ہوئے ہے۔ ہم نے اس کی بندگی کرنی ہے اور اس سے ہدایت اخذ کرنی ہے۔ اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور ہم نے ان کی اطاعت کرنا ہے۔ اس نظام کو قبول کرنا ہے جسے وہ لیکر آئے ہیں۔ اس شریعت کو اپنی زندگی میں نافذ کرنا ہے۔ جسے وہ لیکر آئے ہیں اور اپنے تمام فیصلے اس کتاب کے مطابق کرنے ہیں جسے وہ لیکر آئے ہیں۔

اسی طرح اسلام اس حد تک بھی محدود نہیں ہے کہ ایک انسان دل میں تصدیق کر لے کہ اللہ ایک ہے وہ غیب پر بھی ایمان لائے' قیامت کو بھی مانے' اللہ کی کتابوں اور رسول کو بھی برحق تسلیم کرے' بغیر اس کے کہ اس تصدیق کے بعد کوئی عملی مفہوم بھی زندگی میں ظاہر ہو۔ اور وہ حقیقت نفس الامری وجود میں آئے جیسا کہ اوپر ہم نے تفصیل بیان کی۔

پھر اسلام محض عبادات اور شعائر بندگی تک بھی محدود نہ ہو گا' نہ وہ مراقبے اور ذکر و اذکار تک محدود ہو گا' یا محض اخلاقی اور روحانی اصلاح کے کسی نظام تک بھی محدود نہ ہو گا۔ بغیر اس کے یہ تمام امور ایک منظم نظام حیات کی عملی شکل میں ظاہر نہ ہوں' جس

کی اساس خدائی تعلیمات پر ہو' جس میں دل بھی اللہ کی طرف متوجہ ہوں' مراسم عبودیت اور شعائر بھی اللہ کیلئے ہوں' تصور اور ذکر واذکار بھی اللہ کیلئے ہوں' اس میں خدا خوفی کے ذریعہ اصلاح قلوب ہو اور لوگوں کو رشد و ہدایت دی جاتی ہو' اس لئے کہ جب تک ایک پاک و صاف اور چمکتا دمکتا اجتماعی نظام قائم نہ ہو گا اس وقت تک ان تمام امور کے کوئی اچھے اثرات مرتب نہ ہوں گے۔

○........○........○........○........○

یہ ہے اسلام جیسا کہ اللہ کو مطلوب ہے' اسلام کا مفہوم وہ نہیں جسے لوگوں کی مختلف نسلوں میں سے ایک حی دامن نسل اپنی خواہشات نفسانیہ کے دباؤ کے تحت چاہتی ہے۔ اور نہ اسلام کا مفہوم وہ ہے' جو اسلام کے دشمن اسے پہنانا چاہتے ہیں۔ جو اسلام کے خلاف مورچہ زن ہیں اور مسلمانوں میں انہوں نے ان تحریفات کیلئے اپنے ایجنٹ چھوڑے ہوئے ہیں جو جگہ جگہ کام کر رہے ہیں۔

بس اب جبکہ لوگوں پر اسلام کا مفہوم واضح ہو گیا' پھر بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اسلام کو اس مفہوم میں قبول کرنا نہیں چاہتے جس طرح اللہ چاہتے ہیں' محض اس لئے کہ جانتے ہوئے وہ محض اپنی خواہشات نفسانیہ کے تحت ایسا کرتے ہیں تو یقیناً ایسے لوگ آخرت میں سخت گھاٹے میں ہوں گے۔ اللہ نہ انہیں راہ راست پر لائے گا اور نہ ہی انہیں عذاب سے نجات دے گا۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۙ

"کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ ان لوگوں کو ہدایت بخشے' جنہوں نے نعمت ایمان پا لینے کے بعد پھر کفر اختیار کیا حالانکہ وہ اس بات پر گواہی دے چکے ہیں کہ یہ رسول حق پر ہے اور ان کے پاس روشن نشانیاں آچکی ہیں۔ اللہ ظالموں کو تو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ان کے ظلم کا صحیح بدلہ یہی ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی پھٹکار ہے' اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے' نہ ان کی سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔"

یہ خوفناک دھمکی دیکھ کر' ہر وہ دل جس میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو وہ کانپ اٹھتا ہے اور جن کے دل میں دنیا و آخرت دونوں کے بارے میں ذمہ داری کا احساس ہو اور یہی مناسب سزا ہے اس شخص کی جسے نجات کا خوبصورت موقعہ ملے اور وہ اس سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ اس سے اعراض برتے۔

لیکن اس کفر و اعراض کے باوجود اسلام توبہ کے دروازے کھلے رکھتا ہے۔ اسلام کسی گمراہ کیلئے واپسی کے دروازے بند نہیں کرتا' لیکن اسے ہدایت کی طرف آنے پر مجبور بھی کرتا کہ وہ دروازہ ہدایت پر خود دستک دے۔ بلکہ اسلام اس کے قریب ہوتا ہے اور اس کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہونے دیتا۔ اور یہاں تک کہ وہ اس پر امن محفوظ مقام تک آجائے اور عمل صالح شروع کر دے تاکہ معلوم ہو کہ اس نے توبہ صحیح طرح کرلی ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٨٩﴾

"البتہ وہ لوگ بچ جائیں گے جو اسکے بعد توبہ کرکے اپنے طرز عمل کی اصلاح کرلیں گے۔ اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"

رہے وہ لوگ جو توبہ نہیں کرتے اور نہ باز آتے ہیں وہ لوگ جو اپنے کفریہ رویے پر اصرار کرتے ہیں اور کفر میں آگے ہی بڑھتے ہیں اور جو لوگ کفر ہی کی پناہ میں رہتے یہاں تک کی وقت دیا ہوا ختم ہو جائے اور اختیار اور رد و قبول کی میعاد چلی جائے اور وہ وقت آپہنچے جس میں جزا اور سزا کا عمل شروع ہو جائے تو اس قسم کے لوگوں کیلئے نہ رجوع کا کوئی مقام ہے اور نہ توبہ کرنے کا وقت ہے نہ انہیں نجات ملے گی۔ انہیں ان کا کوئی عمل فائدہ نہ دے گا اگرچہ انہوں نے دنیا میں اس قدر سونا خرچ کیا ہو جس سے دنیا بھر جاتی ہو۔ اگرچہ یہ عمل انہوں نے خیر و برکت سمجھ کر کیا ہو جب تک کہ یہ عمل اللہ کے حوالے سے نہ کیا گیا ہو۔ اس لئے ایسے اعمال اللہ کے ہاں نہ پہنچیں گے اور نہ وہ اعمال اللہ کیلئے ہوں گے۔ وقت ختم ہونے کے بعد اگر وہ پوری دنیا بھر کر کفارہ ادا کریں تب بھی وہ قبول نہ ہو گا۔ وہ عذاب قیامت سے نہ بچ سکیں گے۔ اس لئے کہ میعاد ختم اور دروازے بند ہو چکے ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ﴿٩٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِم مِّلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿٩١﴾

۹ ع ۱۱ ۱۷

"مگر جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے ان کی توبہ بھی قبول نہ ہوگی' ایسے لوگ تو پکے گمراہ ہیں یقین رکھو' جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں جان دیدی ان میں سے کوئی اگر اپنے آپ کو سزا سے بچانے کیلئے روئے زمین بھر کر سونا فدیہ میں دے تو اسے قبول نہ کیا جائے گا۔ ایسے لوگوں کیلئے دردناک سزا تیار ہے۔ اور وہ اپنا کوئی مددگار نہ پائیں گے۔"

یوں سیاق کلام میں اس مسئلے کا فیصلہ کن تصفیہ کر دیا جاتا ہے اور اسے تاکیدی الفاظ میں کر دیا جاتا ہے جس میں کوئی شک اور شبہ نہیں رہنے دیا جاتا۔

اللہ کے اصولوں کے خلاف انفاق' اور اللہ کے راستے میں نہ خرچ کیے جانے والے اموال کے غیر موثر قرار دینے کے بعد اور یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ دارالعمل کے ختم ہونے کے بعد اگر کوئی روئے زمین کو بھر کر بھی انفاق کرے وہ قبول نہ ہو گا' یہاں اللہ تعالیٰ یہ بیان فرما دیتے ہیں کہ وہ کونسا انفاق ہے جو اللہ کو پسند ہے۔

لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ

(۹۲)

"تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو۔" اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہو گا۔

امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ ابو اسحاق ابن عبداللہ ابن ابی طلحہ سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں انہوں نے انس ابن مالک کو یہ کہتے سنا انصار مدینہ میں ابو طلحہ بہت ہی مالدار تھے۔ اور ان کو ان کی دولت سے محبوب ترین ایک کنواں تھا جسے "حاء" کہتے تھے۔ یہ مسجد نبوی کے بالمقابل تھا۔ حضور اس کنویں پر جایا کرتے تھے۔ اور اس کا پاک و صاف پانی پیا کرتے تھے۔ حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ............................ "تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم ان چیزوں کو خرچ نہ کرو جنہیں تم پسند کرتے ہو۔" تو ابو طلحہ نے کہا یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اس وقت تک نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم ان چیزوں کو خرچ نہ کرو جنہیں تم پسند کرتے ہو۔" اور میرا محبوب مال تو "حاء" کنواں ہے۔ اور وہ میری طرف سے صدقہ ہے۔ میں اس کا ثواب اور عند اللہ اس کی جزاء چاہتا ہو۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا بواہ واہ! یہ تو بڑا نفع بخش اور قیمتی مال ہے۔ یہ تو نفع بخش مال ہے۔ میں نے سن لیا لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اسے اقرباء کے درمیان تقسیم کر دیں تو ابو طلحہ نے کہا حضور تو پس آپ ایسا ہی کر دیں۔ تو حضور نے اسے اس کے اقرباء اور چچازادوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ (روایت مسلم و بخاری)

مسلم بخاری نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر نے کہا حضور خیبر میں مجھے جو حصہ ملا ہے' اس سے اچھی جائیداد مجھے کبھی نہیں ملی تو اس کے بارے میں آپ کیا مشورہ دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اصل جائیداد اپنے پاس رہنے دو پیداوار سبیل اللہ کر دو۔"

اسی راستے پر صحابہ کرام ﷺ میں سے اکثر ایک دوسرے سے آگے بڑھے' یوں وہ اپنے رب سے بھلائی کی تلاش میں اس آیت پر لبیک کہتے رہے۔ اس دور میں جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام کی طرف ہدایت دی۔ اللہ کی آواز پر لبیک کہہ کر انہوں نے مال اور دولت کی غلامی سے اپنے آپ کو رہائی دلائی۔ دلی بخل اور کنجوسی سے نجات پائی اور ذاتی لالچ سے پاک ہوئے۔ اور یوں اس مقام بلند تک جا پہنچے جو نہایت بلند' نہایت ہی روشن' چمکدار تھا' آزاد' ہلکے پھلکے ہر قید و بند سے نکلے ہوئے۔

○........○........○........○........○

# فی ظلال القرآن

## پارہ ------ ۴

سورۃ آل عمران بقیہ حصہ: آیات ۹۲ تا ۲۰۰

سورۃ النساء ابتدائی حصہ: آیات ۱ تا ۲۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# پارہ چہارم ایک نظر میں

یہ پارہ سورۂ آل عمران کے آخری حصہ اور سورۂ نساء کے ابتدائی حصہ پر مشتمل ہے۔ یعنی آیت **وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ**........ تک۔ سورۂ آل عمران کا آخری حصہ چار اجزاء پر مشتمل ہے' جو سورت کے موضوع اور مضمون کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں' جن کے بارے میں ہم سورۂ آل عمران پر تبصرہ کرتے وقت بحث کر آئے ہیں۔ یعنی پارہ سوئم میں۔ یہاں اس بحث کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں وہ تبصرہ دیکھا جاسکتا ہے۔

یہاں مختصراً یہ جان لینا چاہئے کہ سورۂ آل عمران کے ان چار اجزاء میں سے پہلا ان مکالمات پر مشتمل ہے جو مدینہ طیبہ کے ابتدائی دور میں' اہل کتاب اور اہل ایمان کے درمیان ہوئے۔ یہ مکالمات اس تاریخی پس منظر میں ہوئے جس کے بارے میں ہم آغاز سورت میں وقت کا تعین کر چکے ہیں۔ یہ مکالمات رمضان ۲ھ کے بعد اور ماہ شوال ۳ھ کے بعد تک کے دور میں ہوئے۔ اس سے پہلے سورۂ آل عمران' تقریباً سب اس عظیم الشان معرکہ پر تبصرہ ہے۔ ان تبصروں کے ذریعہ اسلامی تصور حیات کی ماہیت' دین کی حقیقت' اسلام کی حقیقت اور اس نظام حیات کی حقیقت بیان کی گئی ہے جو اسلام نے پیش کیا' اور اسلام سے قبل تمام رسولوں نے اس نظام کو پیش کیا۔ ان تبصروں میں اہل کتاب کی حقیقت اور ان کے موقف کو بھی واضح کیا گیا' جو حضور اکرم ؐ کے ساتھ دینی امور میں مجادلہ کیا کرتے تھے' اور آپ کے صحابہ کرام کے ساتھ بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔ یہ واضح کیا گیا کہ اہل کتاب دین اسلام سے کس قدر دور جا چکے ہیں' اور یہ کہ مدینہ میں وہ جماعت مسلمہ کے خلاف جو سازشیں کر رہے تھے' اس سورت میں اس کا بھی انکشاف کیا گیا' اور یہ بتایا گیا کہ ان کی ان سازشوں کے پس پردہ کیا کیا خفیہ محرکات کام کر رہے ہیں۔ ان تمام امور پر روشنی ڈال کر اسلامی جماعت کو ان سب معاملات کے بارے میں خبردار کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک عظیم خطرے سے دوچار ہے۔ اسے غفلت نہ کرنا چاہئے اور ان امور میں دشمن کی کوئی بات تسلیم نہیں کرنا چاہئے۔

آیات کا دوسرا ٹکڑا جو اس سورت کے ایک بڑے حصے پر مشتمل ہے' وہ ایک دوسرے معرکے پر محیط ہے۔ یہ معرکہ صرف مکر و فریب اور زبانی جدل و مباحثہ پر ہی موقوف نہیں بلکہ یہ معرکۂ تیر و سنان ہے اور ضرب و حرب پر مشتمل ہے۔ یعنی غزوۂ احد' اس کے واقعات' اس میں پیش آنے والے واقعات کے اسباب و نتائج' غزوۂ احد پر یہ تبصرہ اس مخصوص اسلوب میں ہے جو قرآن مجید کا شاہکار اور اس کا اعجاز ہے' یہ آیات اس معرکہ کے اختتام پر نازل ہوئیں' اس لئے ان میں بھی اسلامی تصور حیات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس معرکے کے حوادث کے حوالے سے اسلامی جماعت کی تربیت کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ اسلامی تصور حیات کے نقطۂ نظر سے اس معرکے میں جو غلطیاں ہوئیں یعنی اسلامی صفوں میں جو انتشار پیدا ہوا اور بعض وہ اقدامات جو اضطراب اور پریشانی کا باعث ہوئے۔ ان واقعات کی وجہ سے ان حالات میں قرآن کریم نے جماعت مسلمہ کو ہدایت دی کہ وہ اپنی راہ پر گامزن رہے' اور اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں انہیں انگیز کرے اور وہ مقام اور مرتبہ حاصل کرے جو اس امانت عظمیٰ کے شایان شان ہے' جو اللہ میاں نے امت مسلمہ کے سپرد کی ہے اور اللہ نے اس امت کو یہ نظام دے کر جس اعزاز پر فائز کیا ہے اور جس عظیم فریضہ کے سرانجام دینے کے لئے

منتخب کیا ہے' اس پر وہ اللہ کا شکر بجالائے۔

تیسرے حصے میں روئے سخن پھر اہل کتاب کی طرف پھر جاتا ہے۔ اور اہل کتاب کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ ان معاہدات کو ایک ایک کر کے توڑ رہے ہیں' جو حضور ﷺ نے ان کے ساتھ مدینہ طیبہ میں تشریف لاتے ہی طے کئے تھے۔ ان کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ انہوں نے صحیح اسلامی تصور حیات سے انحراف کر لیا ہے اور یہ کہ انہوں نے' اپنی پوری تاریخ میں' مختلف اوقات میں اپنے انبیاء کے مقابلے میں مسلسل جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کے بعد امت مسلمہ کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل میں اہل کتاب کی پیروی ہرگز نہ کریں اور راہ حق میں انہیں جو جانی اور مالی نقصانات پیش آ رہے ہیں' ان پر صبر کریں اور ثابت قدم رہیں۔ نیز اہل کتاب اور مشرکین مدینہ' مختلف انداز میں انہیں جو ایذائیں دے رہے ہیں اس پر بھی وہ صبر کریں اور ہر حال میں اپنے دشمنوں سے ہرگز متاثر نہ ہوں۔

حصہ چہارم میں بتایا گیا ہے کہ صحیح اہل ایمان کے نزدیک اپنے رب کے ساتھ تعلق کی نوعیت کیا ہوتی ہے' جب وہ اس کائنات میں باری تعالیٰ کی آیات و نشانات پر غور کرتے ہیں تو ان کے دلوں میں ایمان باللہ راسخ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے رب اور رب کائنات کی طرف بڑے خشوع اور خضوع کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں۔ اور ان کا رب ان کی ایسی دعاؤں کو قبول کرتا ہے اور ان کے گناہوں کو معاف کر کے انہیں اجر عظیم عطا کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اہل کفر کے حالات یہ ہیں کہ انہیں صرف اس دنیا کا متاع قلیل دیا گیا۔ یعنی اس کرۂ ارض پر اور یہ کہ آخرت میں ان کا ٹھکانا جہنم ہے جو ان کے لئے تیار ہے اور وہ نہایت ہی برا ٹھکانا ہے۔ اس سورت کا خاتمہ اس پکار پر ہوتا ہے' جس میں اللہ میاں اہل ایمان کو صبر کرنے' مشکلات برداشت کرنے' باہم متحد ہو کر دشمن کے مقابلے میں چوکنا ہونے' اور ہر وقت خدا کا خوف دل میں رکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ تاکہ وہ اس دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوں۔

○____☆____○

یہ چار اسباق جو باہم مربوط ہیں اور ایک ہی سلسلہ کلام میں پارۂ سوئم میں بیان کئے ہوئے مضامین کا تکملہ ہیں اور انہی خطوط پر آگے بڑھ رہے ہیں' جن کے بارے میں ہم پارۂ سوئم کے آغاز ہی میں تفصیلاً" بحث کر آئے ہیں اور مزید تفصیلات اس وقت بیان ہوں گی جب ہم ان پر تفصیلاً" بحث کریں گے اور آیات کی تفسیر بیان کریں گے۔

اس پارے کا دوسرا حصہ سورۂ نساء کے ابتدائی حصہ پر مشتمل ہے۔ اس پر بحث سورۂ نساء کے ابتدائیہ میں ہوگی' انشاءاللہ۔ اور اللہ ہی ہے جو توفیق اور ہمت دینے والا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

# سبق ۲۶ ایک نظر میں

اس سبق میں' اہل کتاب کے ساتھ' جدل و مناظرے کا یہ معرکہ اپنی انتہاؤں کو پہنچ جاتا ہے۔ اگرچہ یہ آیات وفد اہل نجران کے مباحثے کے ضمن میں نہیں آتیں جیسا کہ روایات میں بھی ذکر آتا ہے' لیکن اپنے مضمون اور مفہوم کے اعتبار سے یہ ان آیات کے ساتھ ملتی جلتی ہیں اور انہی کا تکملہ ہیں جو وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئیں۔ موضوع وہی ہے' اگرچہ روئے سخن خاص یہودیوں کی طرف ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ وہ مدینہ کے اہل ایمان کے خلاف کیا کیا خفیہ سازشیں کس کس طرح کر رہے ہیں۔ یہ مجادلہ مکمل بائیکاٹ اور مکمل علیحدگی پر منتج ہوتا ہے اور پھر روئے سخن' اس سبق میں تھوڑی دیر ہی میں اہل اسلام کی طرف پھر جاتا ہے اور صرف انہیں مخاطب کیا جاتا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ امت مسلمہ کی حقیقت کیا ہے' اس کا نظام زندگی کیا ہے' اس کے فرائض کیا ہیں' بعینہ اس طرح جس طرح سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کے ساتھ مکالمہ ختم کرنے کے بعد امت مسلمہ کو مخاطب کیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے ان دونوں سورتوں میں مکمل مماثلت پائی جاتی ہے۔

اس سبق کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر کھانے پینے کی ہر چیز حلال تھی۔ ہاں حضرت یعقوبؑ نے بعض اشیاء سے پرہیز کرتے ہوئے' انہیں اپنے لئے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ یہ اس سے بہت پہلے کی بات ہے کہ جب توراۃ نازل ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے ہاں محرمات طعام کی جو فہرست مروج تھی' اسلام نے ان اشیاء میں سے بعض کا استعمال چونکہ جائز قرار دے دیا تھا' اس لئے یہودیوں کو اس پر سخت اعتراض تھا۔ حالانکہ یہ اشیاء صرف یہودیوں کے لئے حرام قرار دی گئی تھیں اور یہ بھی اس لئے کہ وہ نافرمانیوں کا ارتکاب کرتے تھے اور ان پر یہ چیزیں حرام کر کے انہیں سزا دی گئی تھی۔

اس کے بعد تحویل قبلہ پر وہ جو اعتراضات کرتے تھے' اس کا بھی جواب دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ بقرہ میں ایک طویل بحث ہو چکی تھی۔ یہاں بتایا جاتا ہے کہ خانہ کعبہ بیت ابراہیمؑ ہے۔ اور یہ پہلا گھر ہے جو اس کرۂ ارض پر صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کے لئے بنایا گیا۔ اس لئے جو لوگ حضرت ابراہیمؑ کے وارث ہونے کے مدعی ہیں' ان کی جانب سے بیت ابراہیمؑ کو قبلہ قرار دینے کی مخالفت ناقابل فہم ہے۔

اس کے بعد اہل کتاب کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ آیات الٰہی کا انکار کرتے ہیں' اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ اختیار کرنے سے روکتے ہیں۔ وہ صحیح اور صراط مستقیم چھوڑ کر ٹیڑھے راستوں پر بھٹک رہے ہیں۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ گمراہی اسلامی نظام زندگی پر بھی چھا جائے' حالانکہ وہ حق کو اچھی طرح پہچان چکے ہیں' اور وہ بے خبر نہیں ہیں۔

ایسے حالات میں قرآن کریم اچانک اہل کتاب کو چھوڑ کر امت مسلمہ کو مخاطب کرتا ہے اور انہیں زوردار الفاظ میں متنبہ کرتا ہے کہ وہ اہل کتاب کی اطاعت نہ کریں کیونکہ ان کی اطاعت عین کفر ہے۔ اور اہل ایمان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ عین اسی وقت کفر اختیار کریں جب نبی ان کے سامنے اللہ کی کتاب پیش کر رہا ہو' اور رسول خدا ان میں موجود ہوں اور انہیں اس کتاب کی تعلیم بنفس نفیس دے رہے ہوں' وہ ان کا تزکیہ کرتے ہوئے انہیں خدا خوفی کی تعلیم دے رہے ہوں' اور انہیں یہ تلقین کر رہے ہوں کہ وہ اسلام پر اپنی پوری زندگی میں جمے رہیں اور اسی حالت میں اسلام میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ رسول خدا اور کتاب اللہ انہیں یاد دلا رہی ہے کہ کس

طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو جوڑا' یہ اس کی بڑی نعمت تھی کہ اس نے' اسلام کے جھنڈے تلے' ان کی صفوں کو یکجا کیا۔ حالانکہ اس سے قبل ان کی حالت یہ تھی کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے تھے' اور باہم بر سرپیکار تھے۔ بلکہ وہ آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے اور اس میں گرنے ہی والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے بچایا اور یہ نجات انہیں اسلامی نظام زندگی کے سبب ملی۔ پھر یہ کتاب تمہیں حکم دیتی ہے کہ تم ایک ایسی امت کی شکل اختیار کرو جس کا مشن اس دنیا میں نیکی اور بھلائی کی طرف بلانا اور برائی سے منع کرنا ہو' اور اس نصب العین کے محافظ رہیں کہ تم نے اسلامی نظام زندگی کو بروئے کار لانا ہے۔ پھر تمہیں ڈرایا جارہا ہے کہ تم اہل کتاب کی وسوسہ اندازیوں اور دسیسہ کاریوں پر کان ہی نہ دھرو کیونکہ یہ لوگ تمہاری صفوں کے اندر ہیں' وہ تمہارے اندر اختلافات ڈال کر تمہیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ جس طرح وہ خود ان ہی اختلافات کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں تباہی سے دوچار ہوئے۔ روایات میں قرآن کریم کے اس انتباہ کا یہ پس منظر بیان کیا گیا ہے کہ اوس اور خزرج کے درمیان یہودیوں نے اختلافات پیدا کر کے ایک عظیم فتنے کے بیج بو دیئے تھے۔

اس کے بعد قرآن کریم امت مسلمہ کو یاد دلاتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر اس کا مقام و منصب کیا ہے؟ حضرت انسان کی زندگی کے ڈرامے میں امت مسلمہ نے کیا کردار ادا کرنا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ

"تم تو وہ خیر امت ہو جسے تمام لوگوں کی خاطر برپا کیا گیا ہے' تمہارا فرض یہ ہے کہ تم بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو اور اللہ پر ایمان لاؤ۔" یوں اللہ تعالیٰ تمہاری رہنمائی کرتا ہے کہ تمہارا مشن کیا ہے؟ اور تمہاری سوسائٹی کا رنگ ڈھنگ کیا ہونا چاہئے۔

اس کے بعد مسلمانوں کے دشمن کی ذرا خبر لی جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ اہل اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے' نہ ہی وہ مسلمانوں پر غلبہ پا سکتے ہیں' ایسا غلبہ جو مکمل بھی ہو اور دائمی بھی ہو' ہاں وہ یہ کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی جدوجہد کے دوران انہیں اذیت دے سکتے ہیں' البتہ مسلمان اگر اسلامی نظام زندگی اور اپنے منہاج پر قائم رہے تو اللہ کی نصرت انہیں حاصل رہے گی۔ ان دشمنان خدا پر اللہ تعالیٰ نے ذلت مسلط کر دی ہے۔ وہ ہمیشہ حالت مسکینی میں رہیں گے' اللہ کا غضب ان کو گھیرے رہے گا۔ اور یہ سب کچھ محض اس لئے ہو گا کہ انہوں نے اپنی پوری تاریخ میں ہمیشہ معاصی کا ارتکاب کیا۔ ناحق اپنے نبیوں تک کو قتل کیا۔ اہل کتاب میں سے' بہرحال ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا۔ ایمان لے آئے اور انہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں اہل اسلام کا منہاج اپنایا۔ اور نیکی اور بھلائی کے پھیلانے کا مشن ان کا نصب العین بن گیا۔ ایسے لوگ بہرحال صالحین میں سے ہیں۔ ہاں جن لوگوں نے کفر کا راستہ اپنایا' اسلام کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا' تو وہ لوگ اپنے کفر کی وجہ سے ماخوذ ہوں گے' ان کی دولت انہیں کوئی نفع نہ دے گی' ان کی اولاد انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکے گی۔ اور انجام کار انہیں ایک عظیم تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس سبق کا خاتمہ اہل ایمان کو اس بات کا خوف دلانے پر ہوتا ہے کہ وہ ایمانداروں کے مقابلے میں دوسرے لوگوں کے ساتھ کوئی خفیہ دوستی قائم نہ کریں۔ اس لئے کہ یہ دوسرے لوگ اپنے دلوں کے اندر مسلمانوں کے خلاف بغض و عداوت چھپائے ہوئے ہیں۔ ان کی باتوں سے اہل اسلام کے خلاف بغض و عداوت ٹپکی پڑتی ہے۔ اور ان کے دلوں کے اندر اہل اسلام کے خلاف جو لاوا پک رہا ہے وہ نہایت ہی خوفناک ہے۔ انتہائی غصے اور نفرت کی وجہ سے وہ اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں اور اہل اسلام پر اگر کوئی آفت و مصیبت آتی ہے تو یہ نہایت ہی خوش ہوتے ہیں اور اگر اہل اسلام کے لئے کوئی کامیابی ظہور پذیر ہوتی ہے تو وہ بہت کبیدہ خاطر ہو جاتے ہیں۔ ان توضیحات

کے آخر میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے ساتھ یہ وعدہ کرتے ہیں کہ وہ ان کا نگہبان اور محافظ ہے۔ اگر وہ صبر سے کام لیں اور خدا خوفی کا رویہ اختیار کریں تو اللہ ان کے دشمنوں کے تمام ہتھکنڈوں کو ناکام کر دے گا۔ إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ................
"جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس پر حاوی ہے۔"

یہ طویل توضیحات اور متنوع اشارے' اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ اس دور میں جماعت مسلمہ اور اہل ایمان کی صفوں میں اہل کتاب کس طرح گھسے ہوئے تھے اور کیا کیا سازشیں کر رہے تھے۔ اور بے چینیاں پھیلا رہے تھے۔ اور یہ کہ اس سبق نے اس وقت بحرانی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ نیز یہاں اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تحریک اسلامی کو کس قدر مضبوط راہنمائی کی ضرورت تھی' تاکہ وہ اپنے اور جاہلیت کے کارندوں کے درمیان پائے جانے والے تعلقات و روابط کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اسلامی نظریۂ حیات اور جاہلیت کے درمیان ایک قطعی امتیاز پیدا کر دیا جائے۔ اور پہلی تحریک اسلامی کے بعد آئندہ نسلوں کے لئے بھی یہ ہدایت اور توضیح کام آئے۔ اور آنے والی نسلوں کو متنبہ کر دیا جائے کہ ان کے موروثی دشمن کون ہیں؟ یہ ایسے دشمن ہیں کہ وہ نئے نئے روپ اور نئے نئے وسائل لے کر میدان میں آتے ہیں لیکن ہیں وہ ایک ہی۔

☆ ☆ ☆

# درس ۲۶ تشریح آیات ۹۲ تا ۱۲۰

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ
اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۹۲﴾ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ
اِسْرَآءِیْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ
فَاتْلُوْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ
ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۫ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ
حَنِیْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ
بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۶﴾

"تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ تم وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہو گا۔ کھانے کی یہ ساری چیزیں (جو شریعت محمدی میں حلال ہیں) وہ بنی اسرائیل کے لئے بھی حلال تھیں۔ البتہ بعض چیزیں ایسی تھیں جنہیں توراۃ کے نازل کیے جانے سے پہلے اسرائیل نے خود اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ ان سے کہو "اگر تم سچے ہو تو لاؤ توراۃ اور پیش کرو اس کی کوئی عبارت ...... اس کے بعد بھی جو لوگ اپنی جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں اللہ کی طرف منسوب کرتے رہیں وہی در حقیقت ظالم ہیں۔"

یہودیوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ ہر قسم شبہ اور ہر دلیل ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے تھے' اور ہر طرح کا حیلہ اور مکر و فریب کام میں لاتے تھے تاکہ وہ رسالت محمدیہ کی صحت میں کوئی شبہ پیدا کر دیں۔ تحریک اسلامی میں فکری بحران پیدا کر دیں اور لوگوں کے دلوں میں اضطراب پیدا کر دیں۔ چنانچہ یہ لوگ ہر وقت شکوک و شبہات پھیلاتے پھرتے تھے۔ جب قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ توراۃ کی تصدیق کرتا ہے تو انہیں یہ اعتراض کرنے کا موقع ملا کہ اگر قرآن کریم توراۃ کا مصدق ہے تو پھر اس کا جواز کیا ہے کہ وہ بعض ان چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے جو بنی اسرائیل کے لئے حرام تھیں۔ روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں اونٹوں کا گوشت اور دودھ کی مثال بھی پیش کی۔ کیونکہ یہ چیزیں بنی اسرائیل پر حرام تھیں۔ اگرچہ اونٹ اور اس کے دودھ کے علاوہ بھی بعض ایسی چیزیں تھیں جو بنی اسرائیل کے لئے حرام تھیں مگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے حلال کر دیا تھا۔

یہاں قرآن کریم ان کی توجہ اس تاریخی حقیقت کی طرف مبذول کراتا ہے جسے وہ جان بوجھ کر نظرانداز کر رہے تھے۔ ان کا مقصد یہ

تھا کہ وہ قرآن کریم کے اس دعوی میں تشکیک پیدا کریں کہ وہ توراۃ کا مصدق ہے۔ دلیل یہ دیتے کہ قرآن نے بعض ایسی چیزوں کو حلال قرار دیا ہے جو بنی اسرائیل پر حرام تھیں' حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ کھانے کی وہ ساری چیزیں جو شریعت محمدیہ میں حلال ہیں' وہ بنی اسرائیل کے لئے بھی حلال تھیں' البتہ بعض چیزیں ایسی تھیں جنہیں توراۃ کے نازل کئے جانے سے پہلے اسرائیل نے خود اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ یہ اسرائیل حضرت یعقوب ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ وہ ایک شدید مرض میں مبتلا ہوئے تھے' اور انہوں نے یہ منت مانی تھی کہ اگر وہ تندرست ہو گئے تو وہ بطور نفل اونٹ کا گوشت کھانا ترک کر دیں گے۔ اونٹ کا دودھ نہ پئیں گے اور یہ دونوں چیزیں انہیں بہت پسند تھیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی منت اور نذر کو قبول فرمایا اور بنی اسرائیل میں یہ سنت یعقوبی چل پڑی اور انہوں نے بھی ان چیزوں کو حرام کر لیا جو ان کے باپ نے حرام کی تھیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر بعض دوسری چیزیں بطور سزا بھی حرام کر دی تھیں' اس لئے کہ انہوں نے بعض جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ ان محرمات کی طرف سورت انعام کی آیات (۱۴۶) میں اشارہ کیا گیا ہے۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ ۖ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ

"اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے' اور گائے اور بکری کی چربی بھی' بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا ان کی آنتوں سے لگی ہوئی ہو یا ہڈی سے لگی رہ جائے۔ یہ ہم نے اس کی سرکشی کی سزا انہیں دی تھی اور یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔" جبکہ اس تحریم سے قبل یہ چیزیں ان کے لئے حلال تھیں۔

ان کی تردید کر کے اللہ تعالیٰ انہیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ کھانے پینے کی چیزوں میں اصل الاصول یہ ہے کہ وہ جائز ہیں' اور بنی اسرائیل پر بعض چیزیں ان کے مخصوص حالات کے پیش نظر حرام کی گئی ہیں' اس لئے اگر ان میں سے بعض چیزوں کے استعمال کو مسلمانوں کے لئے حلال قرار دے دیا گیا تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے' اس لئے کہ اپنی اصلیت کے اعتبار سے وہ حلال تھیں۔ اس لئے اس حلت سے قرآن کریم اور شریعت الٰہیہ کی صحت میں شک نہیں کیا جا سکتا۔

اس موقعہ پر قرآن کریم انہیں چیلنج دیتا ہے کہ لائیں وہ توراۃ اور اسے پڑھیں اور بچشم خود دیکھ لیں کہ ان چیزوں کی حرمت کے اسباب صرف ان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ یہ اسباب عام نوعیت کے نہیں ہیں۔ **قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ** ........ "کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو توراۃ لے آؤ' پڑھ کر بتاؤ۔"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں متنبہ کرتے ہیں کہ ان میں سے جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ ظالم ہیں۔ وہ نہ سچائی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں' نہ خود اپنے آپ کے ساتھ انصاف کرتے ہیں اور نہ اس انسانیت کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ اور ظالموں کی سزا بھی کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اس لئے یہاں قرآن کریم اس پر اکتفاء کرتا ہے کہ انہیں ظالم کہہ دے کیونکہ ظلم کے ساتھ ہی ان کے ظلم کا انجام متعین ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ افتراء اللہ تعالیٰ پر باندھ رہے ہیں حالانکہ وہ خود اللہ کے دربار میں حاضر ہونے والے ہیں۔ وہاں وہ کیا جواب دیں گے؟

○.....☆☆☆.....○

اہل کتاب کے اعتراضات میں سے ایک اعتراض تحویل قبلہ پر بھی تھا' یہ اعتراض بھی وہ بار بار دہراتے تھے۔ یہ اعتراض اس لئے

پیدا ہوا تھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی تو مدینہ طیبہ میں آپ سولہ سترہ یا اٹھارہ مہینوں تک نماز بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھتے رہے تھے۔ باوجود اس کے کہ اس سے پہلے 'سورۃ بقرہ' میں 'اس موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی تھی' اور بتایا گیا تھا کہ خانہ کعبہ دراصل حقیقی اور اصلی قبلہ تھا' اور بیت المقدس کو عارضی طور پر' بعض مصلحتوں کے تحت' قبلہ قرار دیا گیا تھا' جس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے اپنی جگہ کر دی تھی' لیکن اس اظہار حقیقت کے باوجود یہودی بار بار اسی اعتراض کو دہراتے رہتے تھے۔ یہ کام وہ اس لئے کرتے تھے کہ اہل ایمان کے دلوں میں فکری انتشار اور تشکیک پیدا کی جائے اور ایک واضح حقیقت کے اندر التباس پیدا کیا جائے۔ یہ کام آج ہمارے دور میں بھی' اسلامی نظریۂ حیات کے ہر موضوع کے بارے میں دشمنان دین کی جانب سے بڑے منظم طریقے سے کیا جاتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ از سرنو ان کے ان شبہات اور تلبیسات کی تردید فرماتے ہیں۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۗ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّھُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ڬ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ وَلِلّٰهِ عَلَي النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ

"کہو' اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے' سچ فرمایا ہے' تم کو یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرنی چاہئے' اور ابراہیم شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ' جو انسانوں کے لئے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لئے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کھلی نشانیاں ہیں' ابراہیم کا مقام عبادت ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو' وہ اس کا حج کرے' اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہئے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔"

یہ الفاظ کہ "اللہ نے جو کچھ کہا سچ کہا" اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے جو وضاحت کر دی ہے وہ درست ہے یعنی یہ کہ خانہ کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اس لئے تعمیر فرمایا تھا کہ یہ لوگوں کے لئے زیارت گاہ ہو اور جائے امن و سلامتی ہو' اور اہل ایمان کے لئے قبلہ اور جائے عبادت ہو۔ اسی لئے یہاں حکم دیا جاتا ہے کہ تم حضرت ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرو اور حضرت ابراہیمؑ کا طریقہ اور نظریۂ حیات ہمہ جہت توحیدی نظریہ تھا' جس میں شرک کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ............ "پس ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرو اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔" یہودیوں کا زعم یہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے وارث ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم انہیں بتاتا ہے کہ یہ ہے دین ابراہیمی کی حقیقت۔ اور وہ دین یہ ہے کہ ہر قسم کے شرک سے نفرت کی جائے۔ اور یہاں اس حقیقت کا اظہار دو مرتبہ کیا گیا۔ ایک مرتبہ یہ کہہ کر وہ حنیف تھے۔ اور دوسری مرتبہ یہ کہہ کر کہ وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔ اور یہود کا حال یہ ہے کہ وہ مشرک ہیں۔

اس کے بعد یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ رو بقبلہ ہونا دین کے اصولوں میں سے ہے۔ اس لئے کہ اس کرۂ ارض پر یہ پہلا گھر ہے جو اللہ کی پرستش کے لئے تعمیر کیا گیا ہے۔ اور اسے ابتدائے تعمیر سے صرف اس مقصد کے لئے مخصوص کیا گیا ہے کہ وہ طواف کرنے والوں' عبادت کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے مخصوص رہے۔ نیز یہ ایک متبرک مقام ہے' اور وہ اس مفہوم میں جائے

ہدایت ہے کہ یہاں ملت ابراہیمی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اس میں وہ واضح علامات ہیں کہ یہ ابراہیم کی جائے قیام ہے۔ ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ اس سے مراد وہ تاریخی پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہو کر خانہ کعبہ کی تعمیر فرماتے تھے۔ یہ خانہ کعبہ کے ساتھ متصل تھا۔ مگر خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے قدرے ہٹایا' تاکہ طواف کرنے والوں کی وجہ سے ان لوگوں کو تکلیف نہ ہو جو اس کے پاس نفل ادا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اہل اسلام کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس کے پاس نماز پڑھیں وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى ............... "اور حضرت ابراہیم کے مقام کو جائے نماز بناؤ۔"

اس گھر کے فضائل میں سے یہاں ایک بات یہ بتائی جاتی ہے کہ اس گھر میں جو شخص داخل ہوا وہ پر امن رہے گا۔ اس لئے یہ گھر ہر اس شخص کے لئے امن کی جگہ ہے جو یہاں داخل ہو جائے۔ اور یہ حیثیت اس کرۂ ارض پر کسی دوسرے مقام کو حاصل نہیں ہے۔ اور اس کی یہ حیثیت اس وقت سے چلی آرہی ہے جب سے اسے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے تعمیر کیا۔ یہاں تک کہ عربوں کے دور جاہلیت میں بھی اسے یہ حیثیت حاصل رہی جبکہ وہ بالعموم دین ابراہیمی سے منحرف ہو گئے تھے اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح خالص موحد نہ رہے تھے۔ حضرت حسن بصری کے قول کے مطابق اس برے دور میں بھی یہ احترام و مقام اسے حاصل تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ "ایک شخص اگر دوسرے کو قتل کر دیتا تو ایک اونی کپڑا اپنی گردن کے ارد گرد لپیٹ لیتا۔ اس حالت میں اسے اگر مقتول کا وارث بھی ملتا تو وہ اسے خانہ کعبہ میں کچھ نہ کہتا اور اس کے نکلنے کا انتظار کرتا۔" غرض اس بیت اللہ کو اس وقت بھی یہ اعزاز حاصل تھا جب اس کے ارد گرد کے لوگ جاہلیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ اہل عرب پر اپنے احسانات جتلاتے ہوئے فرماتے ہیں اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ............... "کیا یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے ایک پر امن حرم بنا دیا ہے حالانکہ ان کے گرد و پیش لوگ اچک لے جاتے ہیں۔" (۲۹:۶۷)

اور یہ بھی خانہ کعبہ کے احترام کی ایک وجہ ہے کہ اس کے حدود کے اندر شکار کرنا حرام ہے اور وہاں پرندوں کو ان کے گھونسلوں سے نکالنا بھی ممنوع ہے۔ نیز وہاں کے درختوں کو کاٹنا بھی ممنوع ہے۔ صحیحین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے (الفاظ مسلم کے ہیں) کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا "اس شہر کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ اس وقت سے جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آئی ہوئی حرمت کی وجہ سے یہ تا روز قیامت حرام ہے۔ اس میں مجھ سے پہلے بھی کسی کے لئے جنگ کرنا جائز قرار نہیں دیا گیا۔ میرے لئے بھی صرف دن کے ایک تھوڑے سے وقت کے لئے جائز کیا گیا۔ لہٰذا وہ اللہ کی جانب سے آئی ہوئی اس حرمت کی وجہ سے تا روز قیامت حرام ہو گا۔ اس کی جھاڑیوں کو نہ کاٹا جائے گا' اس کے شکار کو نہ بھگایا جائے گا' وہاں کسی گم شدہ چیز کو نہ اٹھایا جائے' الا یہ کہ معلوم ہو کہ کس کی ہے' اور اس کی گھاس کو نہ کاٹا جائے گا..."

یہ ہے وہ خانہ خدا جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے چنا ہے۔ اور یہ اس کا وہ گھر ہے' جسے اس نے یہ شرافت عطا کی۔ اس کرۂ ارض پر یہ وہ پہلا گھر ہے جو صرف عبادت کے لئے بنایا گیا ہے۔ یہ ان کے باپ حضرت ابراہیم کا گھر ہے اور اس کے اندر ایسی علامات اور شواہد موجود ہیں جو اس بات پر گواہ ہیں کہ اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر فرمایا۔ اسلام بھی ملت ابراہیمی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیم کا تعمیر کردہ بیت اللہ' سب سے زیادہ اس بات کا مستحق ہے کہ مسلمان اس کی طرف متوجہ ہوں' جو زمین میں جائے امن ہے' اس میں لوگوں کے لئے سامان ہدایت ہے اور دین اسلام کا یہ ایک مرکز ہے۔

چنانچہ یہاں یہ طے کر دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر بیت اللہ کا حج کرنا فرض کر دیا ہے بشرطیکہ کسی کی استطاعت ہو اور اگر استطاعت کے باوجود کوئی حج نہ کرے گا تو گویا وہ کفر کا ارتکاب کرے گا۔

فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ ۖ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا ۗ وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ﴿٩٧﴾

"لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے' اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔"

یہاں انداز تعبیر قابل توجہ ہے' فرضیت حج نہایت ہی عموم اور شمول پر مشتمل ہے۔ اس کے لئے علی الناس "تمام لوگوں پر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے' اس میں پہلا اشارہ تو یہ ہے کہ یہ حج ان یہودیوں پر بھی فرض کیا گیا ہے جو اس وقت حضور اکرم ﷺ کے ساتھ مناظرہ اور محاربہ کر رہے ہیں کہ کیوں مسلمانوں نے اس کی طرف منہ کر کے عبادت کرنا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خود اہل کتاب سے بھی یہی مطالبہ ہے کہ وہ اس گھر کا حج کریں۔ اس کی طرف متوجہ ہوں' کیونکہ یہ ان کے باپ ابراہیم کا تعمیر کردہ ہے اور پھر اس کرۂ ارض پر یہ پہلا گھر ہے خدا کا اور جو صرف اس کی عبادت کے لئے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس لئے اعتراض کرنے والے یہودی اپنے فرائض سے انحراف کر رہے ہیں' یہ تقصیر ہیں اور اللہ کی معصیت کر رہے ہیں۔ اور اس عمومیت میں دوسرا اشارہ اس طرف ہے کہ تمام لوگوں سے مطالبہ یہ ہے کہ اس دین کا اقرار کرلیں اور اس دین کے فرائض اور شعائر ادا کریں۔ اور وہ بھی خانہ کعبہ کی طرف متوجہ ہوں اور حج کریں جس طرح اہل ایمان کر رہے ہیں۔ اور اگر یہ سب لوگ ایسا نہ کریں گے تو گویا وہ کفر کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اگرچہ وہ زبانی طور پر یہ دعویٰ کریں کہ وہ اس دین پر ہیں اور اللہ تمام جہان والوں سے بے نیاز ہے' اسے قطعاً اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ سب لوگ ایمان لائیں یا سب لوگ حج کے لئے جائیں۔ حج میں تو ان کے لئے مصلحت ہے' صرف ان کی فلاح ہے۔ انہیں چاہئے کہ وہ ایمان لائیں اور اللہ کی عبادت کریں۔

حج پوری عمر میں ایک بار فرض ہے اور یہ فرض اس وقت عائد ہو جاتا ہے جب انسان کو اس کی استطاعت ہو جائے' جس میں ذاتی صحت' سفر کا امکان اور راستوں کا امن و امان شامل ہیں۔ اس کی فرضیت کے وقت میں اختلاف ہے۔ وہ لوگ جن کا خیال ہے کہ یہ آیات ۹ ہجری میں نازل ہوئیں جسے عام الوفود کہا جاتا ہے' اور اس سلسلے میں بعض روایات بھی وارد ہیں یا ان کی رائے یہ ہے کہ ۹ ہجری میں حج فرض ہوا ہے۔ ان کا استدلال اس سے بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ ہجری کے بعد ہی حج فرمایا۔ اس سے قبل جلد دوئم میں تحویل قبلہ سے بحث کرتے ہوئے ہم نے یہ کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے حج میں تاخیر اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ حج کی فرضیت ہی بعد میں ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مصروفیات اور مخصوص حالات کی وجہ سے حج کو مؤخر فرمایا ہو۔ مثلاً یہ کہ مشرکین حج کے موقعہ پر ننگے ہو کر حج کرتے تھے' اور یہ حرکت وہ فتح مکہ کے بعد تک کرتے رہے۔ چنانچہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے ساتھ اختلاط کو ناپسند فرمایا ہو اور جب ۹ ہجری میں سورت براۃ نازل ہوئی اور مشرکین کے لئے طواف کعبہ حرام قرار دے دیا گیا تو اس کے بعد اگلے سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حج ادا فرمایا۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ حج اس سے پہلے فرض ہو چکا ہو۔ اور یہ سورت ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی ہو مثلاً غزوۂ احد کے قریب۔

بہرحال جس وقت بھی حج فرض ہوا ہو' اس کی فرضیت اسی نص قاطع کے ذریعہ ہوئی ہے۔ یعنی حج ان تمام لوگوں پر فرض ہے جو

راستے کی استطاعت رکھتے ہو۔ حج مسلمانوں کا ایک عام سالانہ اجتماع ہے' وہ اس گھر کے پاس جمع ہوتے ہیں' جہاں سے دعوت اسلامی کا آغاز ہوا' جہاں سے ان کے باپ حضرت ابراہیم کی ملت کا بھی آغاز ہوا' اور جسے حضرت ابراہیم نے خدا کی عبادت کے لئے پہلا گھر قرار دیا۔ اس لئے حج ایک نہایت ہی بامقصد اجتماع ہے' اس کی کچھ خاص یادیں ہیں اور ان تمام یادوں کا محور یہ بات ہے کہ انسان کا اپنے رب کے ساتھ رابطہ خاص پیدا ہو' انسان کی روح اللہ کی پکار پر لبیک کہے' اس لئے کہ اس روح کی وجہ سے انسان' انسان بنتا ہے۔ یہ ایک ایسا مقصد ہے جس پر تمام انسانوں کو جمع ہونا چاہئے اور وہ ہر سال اس گھر میں جمع ہوں جہاں سے کبھی خالص "انسانی روحانی اجتماع" کی دعوت کا آغاز ہوا تھا اور یہ دعوت خالص انسانی بنیادوں پر تھی۔

○.....☆☆☆.....○

اس بیان کے بعد اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی جاتی ہے کہ وہ اہل کتاب کو ذرا سختی سے متوجہ کریں اور انہوں نے جانتے بوجھتے جو غلط موقف اختیار کیا ہے وہ ان کے لئے خوفناک ثابت ہو گا۔ وہ لوگوں کو قبول حق سے روکتے ہیں' آیات الٰہی کا انکار کرتے ہیں حالانکہ ان آیات کی صداقت پر وہ خود گواہ ہیں اور انہیں پورا پورا یقین ہے کہ یہ آیات سچائی پر مبنی ہیں۔

قُلْ يٰٓاَھْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ڰ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰي مَا تَعْمَلُوْنَ ۝۹۸ قُلْ يٰٓاَھْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَھَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَاۗءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۹۹

"کہو اے اہل کتاب تم کیوں اللہ کی آیات ماننے سے انکار کرتے ہو؟ جو حرکتیں تم کر رہے ہو اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے' کہو اے اہل کتاب یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اسے بھی تم اللہ کے راستے سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے' حالانکہ تم خود اس پر گواہ ہو' تمہاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں ہے۔"

یہ تہدید اور اس قسم کا زور اور اس سورت میں اور ایسی ہی دوسری سورتوں میں بار بار آیا ہے۔ اس کا پہلا اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ اہل کتاب کو اپنے موقف کی اصلیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کی اصل حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑا مومن اور بڑا دیندار ظاہر کرتے ہیں' جبکہ فی الحقیقت وہ اہل کفر میں سے ہیں' کیونکہ وہ خدا کی نازل کردہ آیات قرآنی کا انکار کرتے ہیں۔ اس لئے جو شخص اللہ کے کسی بھی جزء کا انکار کرے گا گویا وہ سب کتاب کا انکار کرے گا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اگر وہ خود ان کے پاس محفوظ کتاب پر ایمان لائے ہوتے تو وہ لازماً ہر آنے والے رسول پر نازل ہونے والی ہدایات پر ایمان لائے ہوتے۔ اس لئے کہ دین کی حقیقت ایک ہے۔ جو شخص بھی اس حقیقت کو پالے وہ ان تمام رسولوں پر ایمان لائے گا جو بعد میں آئیں اور ان سے بیعت لیں۔ یہ ایک ایسی خوفناک حقیقت ہے جس سے چاہئے کہ وہ کانپ اٹھیں اور انہیں ان کی عاقبت کے بارے میں شک لاحق ہو جائے اور وہ اپنے انجام کی فکر کریں۔

اس کا دوسرا اثر یہ ہے کہ جماعت مسلمہ میں سے بعض لوگ جو اہل کتاب سے ان کے اہل کتاب ہونے کی وجہ سے دھوکہ کھاتے تھے' ان کی آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں کہ اللہ خود اہل کتاب کی حقیقت ان کے سامنے کھول کر بیان فرماتے ہیں اور ان پر صریحاً" کفر کا فتویٰ دیتے ہیں' اس لئے اس کے بعد کسی کے لئے کسی قسم کے شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ اہل کتاب غلط ہیں اور اہل اسلام سچے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کو اس قدر شدید الفاظ میں ڈراتے ہیں جن سے دل دہل جاتے ہیں۔ وَاللّٰهُ شَهِيدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُونَ............ "اللہ ان تمام حرکتوں پر نظر رکھے ہوئے ہے جو تم کر رہے ہو۔" اور وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ............ "تمہاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں ہے۔" یہ ایک خوفناک تنبیہ ہے۔ جب ایک انسان اس بات کو محسوس کرلے کہ اس کے اعمال پر اللہ گواہ ہے اور یہ کہ وہ اس کے اعمال سے غافل نہیں ہے اور عمل بھی کیسا؟ خالص کفر' خالص دھوکہ' خالص فساد اور خالص گمراہ کرنا تو اس کے دل میں خوف کا پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔

اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو ریکارڈ پر لاتے ہیں کہ وہ جس حق کا انکار کرتے ہیں در حقیقت وہ جانتے بوجھتے ایسا کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہوئے لوگوں کو اس حق سے دور روکتے ہیں۔ جبکہ وہ وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ......... "حالانکہ تم اس پر گواہ ہو۔" یعنی انہیں اس بات پر پورا یقین تھا کہ وہ جس حقیقت کو جھلا رہے ہیں وہ حق ہے اور وہ جس بات سے عوام الناس کو روکتے ہیں اس میں ان کی بھلائی ہے۔ اور ان کا یہ رویہ انتہائی قابل نفرت ہے۔ اس لئے ایسے کردار والے کسی شخص پر نہ تو کوئی اعتماد کرنا مناسب ہے اور نہ ایسے شخص کا ہمنشیں ہونا مناسب ہے۔ ایسے شخص کا صحیح علاج یہ ہے کہ اس کے ساتھ پوری طرح نفرت کا مظاہرہ کیا جائے اور اس پر بھرپور تنقید کی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا تعارف ان الفاظ میں کیا ہے۔ لِمَ تَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ مَنْ آمَنَ تَبْغُونَهَا عِوَجًا............ "یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اسے تم اللہ کے راستے سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے۔" یہ ایک بامعنی جائزہ ہے۔ اور اس میں بہت بڑا راز ہے۔ یعنی اللہ کا راستہ تو بالکل سیدھا راستہ ہے اور اس کے علاوہ جو راستے ہیں وہ سب کے سب ٹیڑھے راستے ہیں۔ اور جب لوگوں کو سیدھے راستے سے روکا گیا اور جب ابھی ایمان کو اسلامی نظام حیات سے محروم کیا گیا تو تمام انسانی امور میں استقامت اور سیدھ ختم ہو جائے گی اور حسن و قبح کے پیمانے صحیح و سلامت نہ رہیں گے۔ اور اس زمین کے نظام کا ہر شعبہ ٹیڑھا ہو جائے گا۔ یہ ایک عظیم فساد ہو گا' نظام فطرت میں فساد برپا ہو گا کیونکہ نظام فطرت کی خلاف ورزی ہو گی' انسانی زندگی میں فساد اس لئے ہو گا کہ یہ زندگی ٹیڑھ پر قائم ہو گی' اور یہ عظیم فساد اس لئے رونما ہو گا کہ لوگوں کو اسلامی نظام حیات سے روک دیا گیا ہو گا۔ پھر یہ فساد انسانی تصورات میں بھی برپا ہو گا' انسانی ضمیر میں بھی فساد ہو گا' انسانی اخلاق میں بھی فساد ہو گا' انسانی طرز عمل میں فساد ہو گا' انسانی روابط میں فساد ہو گا' انسانی معاملات میں فساد ہو گا۔ غرض ان تمام روابط میں فساد ہو گا جو ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان پیدا ہوں گے۔ نیز یہ فساد ان کے اور اس نظام کائنات میں بھی برپا ہو گا جس کائنات میں انسان رہتے ہیں۔ پس لوگ یا تو اسلامی نظام زندگی کے تحت زندگی بسر کریں گے تو اس صورت میں وہ صراط مستقیم اور حالت صالحہ میں ہوں گے اور ان کے لئے بھلائی ہی بھلائی ہو گی یا پھر وہ ٹیڑھے اور منحنی راہوں پر چلیں گے ، تو اس صورت میں وہ ٹیڑھ' فساد اور شر میں مبتلا ہوں گے۔ دنیا میں یہی دو راستے ہیں اور یہی دو حالات ہیں جو بنی نوع انسان کی زندگی پر آ سکتے ہیں۔ ایک حالت یہ ہے کہ وہ اسلامی نظام زندگی کی شاہراہ پر گامزن ہوں تو پھر ان کے لئے خیر اور بہتری ہے اور یا وہ اس شاہراہ سے منحرف ہوں گے تو اس صورت حال میں شر و فساد ہی ان کا مقدر ہو گا۔

○.....☆☆☆.....○

یہاں آکر اہل کتاب کے ساتھ اب مناظرہ ختم ہوتا ہے۔ اب انہیں بھلا دیا جاتا ہے۔ اور اب خطاب جماعت مسلمہ سے ہو رہا ہے۔ اب امت مسلمہ کو ہدایات دی جا رہی ہیں۔ انہیں تنبیہ کی جاتی ہے اور دشمن کی چالوں سے ڈرایا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جماعت مسلمہ

کے خصائص کیا ہیں' اس کا تصور حیات کیا ہے اور اس کا نظام زندگی کیا ہے' اور وہ کیا ذرائع ہیں جنہیں کام میں لاکر اس نظام زندگی کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے؟

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى
١٠ عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى
ع١٠ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝
١

"اے ایمان لانے والو! اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔ تمہارے کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقعہ باقی ہے جبکہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جارہی ہیں۔ اور تمہارے درمیان اس کا رسول موجود ہے؟ جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہ راست پالے گا۔"

اس کرہ ارض پر اس امت کو اس لئے اٹھایا گیا تھا کہ وہ اس زمین پر صرف اسلامی نظام زندگی کے برپا کرنے کے لئے اپنے لئے راہ متعین کرے۔ یہ امت ایک منفرد' ممتاز اور نمایاں امت ہے۔ اس کا وجود اسلامی نظام زندگی سے پھوٹا ہے' تاکہ وہ حیات انسانی کے اندر وہ رول ادا کرے جو اس کے سوا کوئی نہیں ادا کرتا۔ یہ امت اس لئے برپا کی گئی ہے کہ وہ اسلامی نظام زندگی کا اقرار کرے اور اسے عملی طور پر نافذ کرے' اور اس نظام کا نشان منزل نظر آرہا ہو۔ اس میں قرآن و سنت کی نصوص اور احکام عملاً زندگیوں میں چلتے پھرتے نظر آئیں' اسلامی نصوص انسانی شعور' انسانی اخلاق اور انسانی طرز عمل اور انسانی روابط میں عملاً نظر آئیں۔

امت مسلمہ کے برپا کرنے کا مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا' اس کی راہ اس وقت تک متعین نہیں ہوسکتی اور وہ انسانی زندگی میں یہ چمکدار اور خوبصورت اور ممتاز عملی زندگی اس وقت تک وجود میں نہیں لاسکتی جب تک وہ تمام ہدایات اللہ جل شانہ' سے اخذ نہ کرے اور جب انسانی قیادت اپنے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ کی راہنمائی کے اصول کو تسلیم نہ کرے۔ تمام انسانوں کی راہنمائی کا انکار نہ کردے' تمام انسانی اطاعتوں کو ترک نہ کردے اور تمام انسانوں کی پیروی ترک نہ کردے۔ اسے یا تو یہ تمام امور سرانجام دینے ہوں گے اور یا پھر اسے کفر گمراہی اور راہ راست سے انحراف قبول کرنا ہوگا۔

یہ وہ اصول ہے جس کی تاکید قرآن مجید بتکرار کرتا ہے' اور مختلف مواقع پر کرتا ہے۔ اور یہی وہ اصول ہے جس پر جماعت مسلمہ کا شعور' اس کی سوچ' اس کے اخلاق پروان چڑھے ہیں جہاں بھی اسے موقعہ ملے۔ ان مواقع میں سے ایک موقعہ یہ تھا' جس میں اہل کتاب حضور اکرم ﷺ کے ساتھ مباحثہ کررہے تھے اور تحریک اسلامی کو مدینہ میں اہل کتاب کے مکر و فریب' خفیہ سازشوں اور عداوتوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ ہاں یہ ہدایات بہرحال مدینہ طیبہ کے ان مخصوص حالات کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ یہ ہدایات امت مسلمہ کے لئے دائمی ہدایات ہیں۔ ہر زمانے اور ہر دور اور ہر نسل کے لئے یہی ہدایات ہیں۔ اس لئے کہ امت مسلمہ کا یہ اصول حیات ہے اور یہی اس کا مقصد وجود ہے۔

اس امت کو اس لئے برپا کیا گیا ہے کہ وہ پوری انسانیت کی قیادت کرے۔ اب یہ کس منطق کی رو سے جائز ہے کہ وہ جاہلیت کی

پیروی کرے حالانکہ اس کا مقصد وجود ہی یہ ہے کہ وہ جاہلیت کا قلع قمع کرے اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکے اور انسانوں کا رشتہ اللہ سے جوڑے۔ انسانوں کی قیادت اسلامی نظام زندگی کے مطابق کرے۔ اور جب یہ امت مسلمہ قیادت کے مقام سے گر جائے تو متصور ہو گا کہ امت مسلمہ کا وجود نہیں ہے۔ اور اگر اس کا کوئی وجود ہے بھی تو وہ بے مقصد وجود ہے۔ اسے تو اس لئے برپا کیا گیا تھا کہ وہ ایک صحیح تصور حیات کے مطابق انسانیت کی قیادت کرے۔ اس کا عقیدہ بالکل درست ہو' اس کا شعور استوار ہو' اس کے اخلاق معیاری ہوں' اس کا نظام مستحکم ہو اور اس کی تنظیم مضبوط ہو۔ صرف ایسے حالات ہی میں انسانی عقل نشوونما پا سکتی ہے اور اس کے لئے مزید راہیں میسر ہو سکتی ہیں۔ اور وہ اس پوری کائنات سے اچھی طرح متعارف ہو سکتی ہے۔ وہ اس کائنات کے بھیدوں سے آگاہ ہو سکتی ہے اور وہ اس کائنات کی قوتوں' اس کے ذخیروں اور خزانوں کو مسخر کر سکتی ہے۔ لیکن امت کی قیادت عالیہ جو تسخیر کائنات کا حکم دیتی ہے' وہ ان تمام قوتوں کو انسانیت کی بھلائی کے لئے استعمال میں لانے کا حکم دیتی ہے۔ وہ ان قوتوں کو مسخر کر کے انہیں اس کائنات کی تباہی اور اس کائنات کی بربادی کے لئے کام میں نہیں لاتی۔ اور نہ وہ ان قدرتی قوتوں کو اس سے دریافت کرتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کرے اور شہوات حیوانیہ میں گم ہو جائے۔ تسخیر کائنات کا مقصد صرف یہ ہے کہ امت اپنے ایمان باللہ کو مضبوط کرے' یہ تسخیر اللہ کی ہدایات کے مطابق ہو' اور اس معاملے میں وہ اللہ کے سوا کسی اور منبع سے ہدایات نہ لے۔

اس سبق میں اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو اس بات سے ڈراتے ہیں کہ وہ غیر اللہ کی اتباع کرے۔ اور یہ بتاتے ہیں کہ وہ کس طرح صحیح حالات پیدا کر سکتی ہے۔ اور کس طرح اپنے آپ کو بچا سکتی ہے۔ چنانچہ پہلا حکم یہ دیا جاتا ہے کہ امت مسلمہ اہل کتاب کی پیروی اور اطاعت نہ کرے' اگر وہ ایسا کرے گی تو اہل کتاب اسے کفر کی طرف لے جائیں گے اور اس کے سوا کوئی دوسری بات نہ ہو گی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ۝۱۰۰ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

"اے ایمان لانے والو! اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔ تمہارے لیے کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقعہ باقی ہے جبکہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جا رہی ہیں۔ اور تمہارے درمیان اس کا رسول موجود ہے؟ جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہ راست پا لے گا۔"

اہل کتاب کی اطاعت کرنا' اور ان سے ہدایات اخذ کرنا' ان کے اوضاع و اطوار کا نقل کرنا' اس بات کا ثبوت ہے کہ امت مسلمہ نے داخلی طور پر شکست قبول کر لی ہے اور اس نے اپنے اس مقام قیادت سے دست برداری کر لی ہے۔ نیز اس سے اسلامی نظام زندگی کی یہ صلاحیت بھی مشکوک ہو جاتی کہ وہ ہمارے دور میں زندگی کی راہنمائی' اس کی تنظیم' اس کی ترقی اور نشوونما کی اہلیت رکھتا ہے۔ اور یہ بات دراصل کفر خفی ہے جو نفس انسانی کے اندر سرایت کر جاتا ہے۔ یہ کفر غیر شعوری ہوتا ہے اور انسان اس کا خطرہ بھی محسوس نہیں کرتا۔ یہ تو اسلام کے نقطہ نظر سے بات تھی' رہی یہ بات کہ اہل کتاب کا نقطہ نظر کیا ہے؟ تو وہ دنیا میں سب سے زیادہ جس امر کے حریص ہیں وہ یہ ہے کہ وہ امت مسلمہ کو اپنے عقیدے سے پھیر دیں۔ اس لئے کہ امت مسلمہ کے لئے یہ عقیدہ صخرۂ نجات ہے۔ وہ اس کے لئے ایک دفاعی لائن ہے اور اس کی قوت اور شوکت کا اصل منبع ہے۔ اور اس امت کے دشمنوں کو اس راز کا بخوبی علم ہے۔ اس سے قبل بھی انہیں اس کا علم تھا اور آج بھی انہیں اس کا علم ہے۔ اور وہ اس امت کو اپنے عقائد و نظریات سے دور کرنے کے لئے ہر مکر اور ہر حیلہ

کام میں لاتے ہیں۔ وہ اس کام میں اپنی پوری توانائی اور اپنی پوری قوت صرف کرتے ہیں۔ اور جب وہ اس امت کا مقابلہ علی الاعلان نہیں کر سکتے تو وہ اس کے خلاف خفیہ مکر و فریب کام میں لاتے ہیں اور جب یہ لوگ تنہا اس کام کو سرانجام دینے کے اہل نہیں رہتے تو پھر وہ اس کام میں ان منافقین سے امداد لیتے ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور اسلام کا اظہار کرتے ہیں لیکن وہ اپنی افواج منظم کر کے اسلامی قلعے کی دیواروں میں اندر سے نقب لگاتے ہیں اور لوگوں کو اسلام سے دور کرتے ہیں۔ اور ان کی نظروں میں ان نظامہائے زندگی کو حسین بناتے ہیں جو اسلامی نظام کے خلاف ہیں۔ ان کے لئے ایسے طریقے ایجاد کرتے ہیں جو اسلام کے خلاف ہیں اور اس امت پر ایسی قیادت مسلط کرتے ہیں جو اسلامی قیادت نہیں ہوتی۔

جب اہل کتاب دیکھتے ہیں کہ اہل اسلام میں سے انہیں ایسے افراد مل رہے ہیں جو ان کے تابع ' ان کے پیروکار اور ان کی بات پر اچھی طرح کان دھرنے والے ہیں تو وہ ان لوگوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور انہیں ان مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں جن کے حصول کے لئے ان کی نیند حرام ہے تو وہ ان کو مقام قیادت دیں گے اور لوگوں کو ان کے پیچھے لگا دیں گے تاکہ یہ ایجنٹ پوری امت کو کفر و ضلال کے راستے پر ڈال دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فیصلہ کن اور دو ٹوک بات آتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ

"اے ایمان لانے والو! اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اہل اسلام اس امر سے زیادہ کسی اور چیز سے نہ گھبراتے تھے کہ وہ اسلام سے پلٹ کر پھر کفر کی طرف چلے جائیں۔ اور جنت کے مستحق ہو کر پھر جہنم کی طرف چلے جائیں۔ اور یہی صفت ہر سچے مومن کی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صورت میں یہ ڈراوا ایک ایسا تازیانہ ہے جس سے ضمیر گرم ہو گا۔ اور اس سے ڈرانے والے کی مشفق آواز سننے کے لئے سامع اچھی طرح آمادہ ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈراوا اور یاد دہانی کے مضامین مسلسل جاری ہیں۔ کیا بڑا منکر حق ہے وہ شخص جو اہل ایمان کو ایمان لانے کے بعد بدراہ کرتا ہے۔ ایسے حالات میں کہ ان پر آیات الٰہی مسلسل پڑھی جارہی ہیں اور رسول خدا ان میں موجود ہیں اور وہ تمام محرکات موجود ہیں جو ایمان لانے کے باعث ہیں اور دعوت اسلامی مسلسل دی جارہی ہو اور کفر و ایمان کے دوراہے پر نور ایمان چھا ہوا ہے۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ............ "تمہارے لئے کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقعہ باقی ہے جب کہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جارہی ہیں اور تمہارے درمیان اس کا رسول موجود ہے۔"

ہاں 'ایسے حالات میں ' ایمان لانے کے بعد کسی مومن کا کافر ہو جانا بے شک ایک عظیم امر ہے ' اور جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا وقت پورا کر لیا اور اپنے رفیق اعلیٰ کے ساتھ جا ملے تو اس صورت میں بھی آیات الٰہی موجود ہیں۔ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم باقی ہے۔ آج ہم بھی ان آیات کے اسی طرح مخاطب ہیں جس طرح قرون اولیٰ کے لوگ مخاطب تھے۔ اور آج بھی کامیابی کی راہ واضح ہے اور کامیابی کے جھنڈے بلند ہیں۔ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ.......

"اور جو اللہ کا دامن مضبوطی سے تھامے گا وہ ضرور راہ راست پالے گا۔"

ہاں 'اللہ کا دامن تھام لینے میں ہی نجات ہے۔ اللہ جل شانہ ' موجود ہیں۔ وہ زندہ اور قیوم ہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم

صحابہ کرام پر' اسلامی نظریہ حیات' اسلامی عقائد اور اسلامی نظام زندگی کے سلسلے میں بہت زیادہ سختی فرماتے تھے۔ جبکہ زندگی کے خالص عملی اور تجربی امور میں آپ انہیں کھلا چھوڑتے تھے' یعنی ان امور میں جن میں حقیقت کا دارومدار تجربے پر موقوف ہوتا ہے مثلاً طریقہ ہائے زراعت' طریقہ ہائے جنگ و قتال اور ایسے ہی دوسرے امور جن کا تعلق خالص علمی اور تجرباتی امور سے ہوتا ہے اور جس میدان میں اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقائد کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یا جن کا تعلق اسلامی نظام زندگی کے ساتھ نہیں ہوتا اور نہ ان کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی کے باہم روابط سے ہوتا ہے۔ اور ان دونوں امور کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسلامی نظام زندگی ایک علیحدہ چیز ہے اور خالص علوم' تجرباتی امور اور دوسرے انطباقی معاملات ایک دوسری چیز ہے۔ اسلام کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ انسانی زندگی کو اسلامی نظام کے مطابق چلایا جائے۔ یہ اسلام ہی ہے جس نے عقل انسانی کو ایسے کام میں لگایا اگر وہ علم و معرفت کی قوت سے نئی نئی مادی ایجادات سامنے لائے اور یہ کام اسلامی نظام زندگی کے دائرے کے اندر اندر کیا جائے۔

امام احمد بن حنبلؒ ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔ بروایت سفیانؒ' جابرؒ' شعبی عبداللہ بن ثابتؓ۔ وہ فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا! یارسول اللہ' میں نے بنی قریظہ میں سے اپنے ایک یہودی بھائی کو کہا اور اس نے مجھے تورات سے بعض جامع چیزیں لکھ دیں' کیا میں وہ آپ کی خدمت میں پیش نہ کردوں؟ فرماتے ہیں کہ یہ سنتے ہی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ عبداللہ بن ثابتؓ کہتے ہیں میں نے ان سے کہا کہ تم دیکھ نہیں رہے کہ رسول ؐ خدا کے چہرے پر کیا آثار ہیں؟ عمر نے کہا میں اس پر راضی ہوں کہ اللہ میرا رب ہے' اسلام میرا دین ہے اور محمد میرے رسول ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے سے آثار غضب غائب ہوگئے اور آپ نے فرمایا "خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اگر آج تم میں موسیٰ علیہ السلام آجائے اور تم اس کی طاعت کرو مجھے چھوڑ دو تو تم یقیناً گمراہ ہو جاؤ گے۔ تمام امتوں میں سے تم میرا حصہ ہو اور میں تمام نبیوں میں سے تمہارا حصہ ہوں۔"

حافظ ابویعلی نے حماد' شعبی کی روایت سے حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اہل کتاب سے کوئی مسئلہ دریافت نہ کرو' اس لئے کہ جب وہ خود گمراہ ہو گئے ہیں تو تمہیں کیسے ہدایت دے سکتے ہیں۔ اگر تم نے ان سے کوئی بات دریافت کی تو پھر یا تو تم کسی غلط بات کی تصدیق کرو گے اور یا پھر کسی صحیح بات کی تکذیب کرو گے۔ اور خدا کی قسم آج اگر تمہارے درمیان موسیٰ علیہ السلام بھی ہوتے تو ان کے لئے میری اتباع کے بغیر اور کوئی چارۂ کار نہ ہوتا اور بعض روایات میں ہے "اگر موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام زندہ ہوتے' تو ان دونوں کے لئے میرے اتباع کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہ ہوتا۔"

یہ لوگ ہیں اہل کتاب اور یہ ہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اس امر کے بارے میں کہ ان تمام امور میں جن کا تعلق عقائد و نظریات سے ہے یا جن کا تعلق نظام زندگی اور اسلامی قانون سے ہے' ان میں اہل کتاب سے مکمل اجتناب کرنا ہے۔ ہاں جن امور کا تعلق محض سائنسی علوم سے ہے تو ان میں اسلام کی روح اور اس کی واضح ہدایات کے مطابق تمام اقوام و ملل سے استفادہ جائز ہے' لیکن ان علوم کو بھی ایمانی نظام زندگی کے ساتھ مربوط کرنا ضروری ہے۔ اس شعور کے ساتھ کہ وہ ذات باری ہی ہے جس نے انسان کو اس فطرت کی تسخیر کی قوت دی ہے۔ اس نے فطرت کا رخ تبدیل کیا اور انسانیت کی بھلائی کے لئے اسے استعمال کیا اور انسانیت کے لئے امن و سکون اور سہولیات کا انتظام کیا۔ لہٰذا وہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ان کائناتی قوتوں کو مسخر کرنے کی طاعت ہمیں عنایت فرمائی اور شکر کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہر معاملے میں اس کی بندگی کی جائے اور پھر اس علم و معرفت اور تسخیر کائنات کو انسانیت کی بھلائی کے لئے استعمال کیا جائے۔

رہا ایمانی تصور حیات کا موضوع' اس کائنات کی تخلیق کی بابت نظریات' وجود انسانی کے مقاصد انسانی نظام زندگی اور اس کی تنظیمات اور قوانین' انسان کا اخلاقی نظام اور اس کا طرز عمل تو ان تمام موضوعات میں کسی غیر اسلامی منبع فکر سے کوئی بات اخذ کرنے سے حضور نے منع فرمایا' جس کی وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک متغیر ہوا تھا۔ حالانکہ وہ معمولی بات تھی' لیکن اللہ تعالی نے امت مسلمہ کو اس سے بڑی سختی سے ڈرایا کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو یہ واضح کفر کا ارتکاب ہو گا۔

یہ ہے اللہ کی ہدایت اور یہ ہے اسوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ رہے ہم لوگ جو دعوائے اسلام کرتے چلے جا رہے ہیں تو ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اپنے علم کے اصول یعنی قرآن اور حدیث کی تعلیم بھی مستشرقین سے حاصل کرتے ہیں یا مستشرقین کے شاگردوں سے حاصل کرتے ہیں اور ذرا غور کیجئے کہ ہم اپنے لئے فلسفہ حیات اور وجود انسانی اور حیات انسانی کے آغاز کے نظریات بھی ان لوگوں سے اخذ کرتے ہیں یا پھر یونانی' روی اور یورپین اور امریکی فلاسفہ سے یہ نظریات اخذ کرتے ہیں اور پھر ذرا ملاحظہ کیجئے کہ ہم اپنا نظام حیات' اپنے ضوابط اور قوانین بھی ان جعلی مصادر سے اخذ کرتے ہیں۔ ہم اپنا طرز عمل' اپنے اخلاق اور اپنے آداب بھی اس گندے تالاب سے اخذ کرتے ہیں جو نہایت ہی گندہ ہے اور جس میں جدید مادی تہذیب و تمدن کی گندگی جمع ہو چکی ہے' جو ہر قسم کے دینی تصورات سے عاری ہے۔ چاہے وہ اسلام کے سوا کوئی اور دین ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے باوجود ہم اس زعم میں مبتلا ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ یہ ایک ایسا زعم ہے جس کا گناہ کفر صریح کے گناہ سے زیادہ ہے۔ اس لئے کہ ایسا زعم باطل رکھ کر گویا ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ آج کے دور میں اسلامی نظام زندگی کامیاب نہیں ہے یا اگر کامیاب ہے تو گویا ہم نے اسلام کی شکل مسخ کر کے موجودہ طرز عمل کو اسلام سمجھ رکھا ہے۔ اور ہم ان امور کی گواہی دے رہے ہیں جبکہ جو لوگ اس زعم میں مبتلا نہیں ہیں وہ دراصل ایسی شہادت نہیں دے رہے۔

حقیقت یہ ہے اور اسے گرہ میں باندھنا چاہئے کہ اسلام ایک ضابطہ حیات ہے۔ وہ چند ممتاز خصوصیات کا حامل نظام ہے۔ اعتقادی تصورات کے اعتبار سے بھی' نظام زندگی اور نظام قانون کے اعتبار سے بھی اور اپنے اخلاقی قواعد و اصول کے اعتبار سے بھی' جس پر ہمارے اجتماعی روابط قائم ہوتے ہیں اور یہ دین انہیں ترک نہیں کرنا چاہئے۔ یہ روابط سیاسی ہوں' اقتصادی ہوں یا اجتماعی ہوں ___ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ نظام پوری انسانیت کی قیادت کے منصب کا بھی مدعی ہے۔ لہذا اس کا ضروری منطقی اور لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کرہ ارض پر ایک ایسی انقلابی جماعت ہو' جو اس نظام کے جھنڈے اٹھائے اور انسانیت کی راہنمائی کرے۔ اور جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا اسلامی نظام کے اس قائدانہ دعویٰ کے مزاج کے ساتھ یہ امر مطابقت نہیں رکھتا کہ مسلمان دوسری ملل سے کوئی استفادہ کریں یا ان سے ہدایات لیں۔

پھر یہ حقیقت بھی ہر وقت نظروں کے سامنے رہے کہ جب یہ دین آیا تھا تو یہ پوری انسانیت کی بھلائی کے لئے آیا تھا۔ اور آج جو لوگ اس نظام کی حکمرانی کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں وہ بھی پوری انسانیت کی بھلائی کے لئے دے رہے ہیں۔ کل بھی جو شخص اس دعوت کا حامل ہو گا وہ بھی اسی مقصد کے لئے ہو گا۔ بلکہ انسانیت جن ظالمانہ نظامہائے زندگی کے نیچے پس رہی ہے' اور جسے ہم جسم سر سے دیکھ رہے ہیں اسے اسلام کے عادلانہ نظام زندگی کی اشد ضرورت ہے۔ اس الٰہی نظام زندگی کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہے جس پر انسانیت کو نجات ملے۔ لہذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اسلامی نظام زندگی اپنی تمام خصوصیات کو محفوظ اور زندہ رکھے۔ اور پوری انسانیت کے اندر قائدانہ مقام حاصل کرے اور اسے ایک بار پھر اس دنیا میں مصائب اور مشکلات سے نجات دے۔

اس وقت انسانیت نے تسخیر کائنات کے سلسلے میں جو جدوجہد کی ہے اور مختلف میدانوں میں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اور طب اور صنعت کے میدان میں جو حقائق فراہم کئے ہیں وہ ماضی کے مقابلے میں معجزانہ ہیں اور انسانیت ان میدانوں میں مسلسل پیش قدمی کر رہی

ہے۔ اور نئی نئی فتوحات حاصل کر رہی ہے لیکن ان سب فتوحات کا اس کی زندگی پر کیا اثر ہے؟ اس کی نفسیاتی دنیا کا حال کیا ہے؟ کیا اس میدان میں بھی وہ خوشحال ہے؟ کیا اسے اطمینان قلب حاصل ہے؟ کیا اس کی زندگی پر امن ہے؟ ہرگز نہیں۔ وہ اس وقت ہمہ گیر بد بختی' بے چینی اور خوف کا شکار ہے۔ وہ اعصابی اور نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ وہ بے راہ روی اور جرائم کی وسیع دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ لیکن اس نے انسانیت' حیات انسانی کے مقصد وجود اور انسان کے مقصد تخلیق کے میدان میں کوئی ترقی نہیں کی۔ اس لئے کہ آج جب ہم جدید تہذیب کے فرزند کی ذہنی دنیا کا مطالعہ کرتے ہیں اور معلوم کرتے ہیں کہ اس کے نزدیک تخلیق انسان کا مقصد کیا ہے تو وہ اسلامی تصور حیات کے مقابلے میں اس میدان میں بالکل مفلس اور پسماندہ اور بونا نظر آتا ہے۔ بلکہ اس میدان میں یوں نظر آتا ہے کہ اسے ایک لعنت گھیرے ہوئے ہے' جس میں انسان خود اپنی ذات' اس کائنات میں اپنے مقام کو گراتا چلا جاتا ہے۔ اور اس گراوٹ کے نتیجے میں انسان کی ترجیحات اور اس کی دلچسپیاں بھی گر جاتی ہیں...... یوں انسان اپنی زندگی میں ایک خلاء محسوس کرتا ہے اور یہ خلا اس تھکے ہوئے انسان کے دل کو کھاجاتا ہے۔ حیرانی و پریشانی میں اس کی روح ہلاک ہو رہی ہے۔ یہ محض اس لئے کہ اس کی روح میں تصور الہ نہیں ہے اور تصور الہ سے شدید معاشی حالات نے اسے دور کر دیا ہے۔ اور غلط علمی تصورات نے اسے گمراہ کر دیا ہے۔ یہی علم اگر اسلامی نظام حیات کے رنگ میں ترقی کرتا' تو اس کی ہر کامرانی انسان کو قدر کے قریب تر کر دیتی' لیکن جدید انسانیت کا حال یہ ہے کہ وہ جس قدر علمی میدان میں آگے بڑھتی ہے' وہ اپنی بجھی ہوئی اور شکست خوردہ روح کی وجہ معرفت خدا سے اور دور ہوتی جاتی ہے۔ وہ اس نور سے محروم ہے جس میں اسے اپنا حقیقی مقصد وجود نظر آئے' اور وہ اس مقصد کی طرف اپنی اس علمی قوت کے ساتھ آگے بڑھے' جو اسے خود اللہ نے عطا فرمایا ہے۔ اور جس استعداد کی وجہ سے وہ یہ علمی ترقی کر رہا ہے وہ بھی اسے اللہ کی عطا کردہ ہی تو ہے۔ چنانچہ انسانیت اس نظام حیات کو نہیں پا رہی ہے جو اس کی حرکت اور اس کائنات کی حرکت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرے' اس کی فطرت اور اس کائنات کی فطرت کے درمیان تطابق پیدا کرے' اس کے قوانین اور قوانین قدرت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرے' ایسا نظام جو اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرے' جو اس کی دنیا اور آخرت کے درمیان جوڑ پیدا کرے' جو ایک فرد اور ایک جماعت کے حقوق کے اندر' توازن پیدا کرے' جو اس کے فرائض اور واجبات کے درمیان عدل پیدا کرے اور یہ سب کام نہایت ہی ترتیب کے ساتھ قدرتی طور پر' جامعیت کے ساتھ اور خوشگوار انداز میں سرانجام پائیں۔

ہمارے دور میں بعض لوگ اسلامی نظام زندگی سے محروم ہو کر کلام کرتے ہیں اور جو لوگ اس دور میں اسلامی نظام زندگی کی بات کرتے ہیں اور پر امید نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہیں' انہیں یہ لوگ رجعت پسندی کا طعنہ دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام حیات کی بات کرنے والے دراصل تاریخ اسلامی کے گزشتہ ایک مختصر سنہری دور کی محض آرزو اپنے دلوں کے اندر بسائے ہوئے ہیں' لیکن وہ اسلامی نظام کے حوالے سے' اپنی جہالت کی وجہ سے یا اپنی بدنیتی کی وجہ سے انسانیت کو اسلامی نظام زندگی کی قیادت سے محروم کئے ہوئے ہیں جو ان کی راہنمائی بڑی خوبی' امن و سلامتی اور سکون و اطمینان کی طرف کر سکتا ہے۔ جو ان کی راہنمائی دنیاوی ترقی اور خوشحالی کی طرف کر سکتا ہے۔

ہم جو اسلامی نظام زندگی کی طرف دعوت دیتے ہیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم کس چیز کی طرف انسانیت کو بلا رہے ہیں۔ ہم اس انسانیت کو اس کی حقیقی تلخیوں میں دیکھ رہے ہیں۔ ہم اس گندے تالاب کا متعفن رائحہ محسوس کر رہے ہیں جس میں انسانیت لت پت ہے لیکن دور بلند افق پر نجات کے جھنڈے لہرا رہے ہیں جو صحراء کی تپش میں جھلنے والی تھکی ماندی انسانیت کو نجات کی چمک دکھا رہے ہیں اور یہ پاک وصاف اور روشن چوٹی' اس گندے تالاب میں انسانیت کو اپنی طرف بلا رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر انسانیت کے قائدین نے

اس نظام زندگی کو قبول نہ کیا تو انسانیت پوری انسانی تاریخ میں توہین آمیز مصیبت کا شکار ہوگی اور یہ پوری انسانی تاریخ میں بد ترین مصیبت ہوگی اور ہر مفہوم کے اعتبار سے بدی ہوگی۔

اس راہ میں پہلا اقدام یہ ہونا چاہئے کہ یہ نظام زندگی ممتاز اور منفرد ہو اور اس کے حاملین' اس کے ارد گرد پھیلی جاہلیت سے کوئی راہنمائی حاصل نہ کریں اور یہ نظام مسلسل پاک اور صاف موجود رہے۔ یہاں تک کہ اللہ کے اذن سے دوبارہ پوری انسانیت کی قیادت سنبھالے۔ اللہ بڑا رحیم وکریم ہے اور وہ انسانوں کو ہمیشہ کے لئے انسان کے دشمنوں کے بلئے رحم وکرم پر نہ چھوڑے گا' جو جگہ جگہ انسانوں کو جاہلیت کی طرف بلاتے ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی تلقین اللہ تعالیٰ' پہلی جماعت مسلمہ کو اپنی کتاب میں کر رہے ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی تعلیمات میں اس نکتے کی بار بار تلقین فرمائی۔

○.....☆☆☆.....○

اس تنبیہ اور خبرداری کے بعد کہ اہل کتاب سے کوئی ہدایت اخذ نہ کی جائے' ان کی اطاعت اور اتباع نہ کیا جائے' اب جماعت مسلمہ کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ اس کی زندگی اور اس کی زندگی کا نظام حیات دو اساسی قواعد پر مبنی ہے۔ یہ ایسے قواعد ہیں جن کو مد نظر رکھنا اس کے لئے اس بار امانت کی اٹھانے کے لئے ضروری ہے' جس کی ذمہ داری اللہ نے اس کے سپرد کی ہے اور جس کی خاطر اللہ تعالیٰ اس امت کو وجود میں لایا ہے۔ یہ دونوں اساسی قواعد ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں یعنی اخوت اور ایمان۔ یعنی اللہ پر ایمان لانا' اس سے ڈرنا اور تمام امور حیات میں ہروقت اور ہر لحظہ اسے یاد رکھنا۔ اور ان تمام لوگوں کے ساتھ اخوت رکھنا جو اس مفہوم میں مومن باللہ ہوں۔ وہ اخوت جس کی وجہ سے جماعت مسلمہ زندہ' قوی اور مستحکم بنیاد بن جاتی ہے اور یوں وہ اس عظیم کردار کے ادا کرنے کے قابل ہو جاتی ہے جو اسے انسانی زندگی اور انسانی تاریخ میں ادا کرنا ہے یعنی امربالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اور اس دنیا کے نظام حیات کو معروف پر قائم کرنا اور منکر کی آلودگی سے اسے پاک کرنا۔ فرماتے ہیں: ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ

آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿١٠٢﴾ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٠٣﴾ وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٤﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ

عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٥﴾ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ
وُجُوهُهُمْ ۚ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿١٠٦﴾
وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١٠٧﴾

"اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے' تم ایک دوسرے کے دشمن تھے' اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے' اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے' شاید کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔ تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں' بھلائی کا حکم دیں' اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔ کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلافات میں مبتلا ہوئے۔ جنہوں نے یہ روش اختیار کی وہ اس روز سخت سزا پائیں گے جبکہ کچھ لوگ سرخرو ہوں گے اور کچھ لوگوں کا منہ کالا ہو گا۔ جن کا منہ کالا ہو گا (ان سے کہا جائے گا کہ ) نعمت ایمان پانے کے بعد بھی تم نے کافرانہ رویہ اختیار کیا؟ اچھا تو اب اس کفران نعمت کے صلہ میں عذاب کا مزہ چکھو۔ رہے وہ لوگ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو ان کو اللہ کے دامن رحمت میں جگہ ملے گی اور ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے۔"

یہ دو مرکزی ستون ہیں جن پر جماعت مسلمہ کا ڈھانچہ قائم ہے۔ اور ان دونوں کے ساتھ وہ اپنا گراں اور عظیم رول ادا کر رہی ہے۔ اگر ان دونوں میں سے ایک پلر (Pillar) بھی گر جائے تو جماعت مسلمہ کا ڈھانچہ گر جائے گا اور اس کے بعد اس جہاں میں اس کا کوئی کردار نہ رہے گا۔

پہلا ستون ایمان اور تقویٰ کا ستون ہے۔ وہ تقویٰ اور خدا خوفی جو اللہ جل شانہ' کے حقوق کی ادائیگی کا موجب بنے۔ دائمی اور بیدار خدا خوفی' جس میں کوئی غفلت نہ ہو' جس میں کوئی وقفہ نہ ہو اور وہ پوری عمر میں تسلسل کے ساتھ قائم رہے۔ یہاں تک کہ انسان پر موت آجائے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ ............ "اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔" اللہ سے ڈرو' جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ اس خدا خوفی کے لئے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی' یہ ڈرنے والے دل کا کام ہے کہ وہ خدا خوفی میں کس مقام تک جا پہنچتا ہے' جس قدر وہ تصور کر سکتا ہے' جس قدر اس کی طاقت ہو۔ قلب مومن اس میدان میں' جس قدر آگے بڑھے گا' اس کے سامنے نئے نئے آفاق کھلیں گے اور اس کا رہوار شوق اور مہمیز پائے گا۔ اور وہ اپنی خدا خوفی سے جس قدر بھی اللہ کا قرب حاصل کرے گا تو اس کا شوق اس سے بھی اونچے مقام کی طرف متوجہ ہو گا۔ اور جس مقام پر وہ ہو گا اس سے اونچے مقامات کا طالب ہو جائے گا اور آخر کار وہ ایسے مقام تک پہنچ جاتا ہے جس میں اس کا دل مدام بیدار ہو جاتا ہے اور پھر وہ کبھی نہیں سوتا۔

وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ............ "تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔"

موت ایک انکا خفیہ اور غائبانہ گھڑی ہے' جس کا علم انسان سے مخفی رکھا گیا ہے۔ پس جو شخص یہ ارادہ کرلے کہ وہ صرف اس حال میں مرنا

چاہتا ہے کہ وہ صحیح مسلم ہو' تو اس کی طرف ایک ہی سبیل ہے کہ وہ فوراً مسلم بن جائے۔ اور ہر لحظہ وہ مسلم رہے۔ تقویٰ اور خدا خوفی کے بعد اسلام کے ذکر سے ایک وسیع حکمت اور مفہوم کی طرف اشارہ مطلوب ہے۔ یعنی مکمل طور پر سر تسلیم خم کرنا۔ مکمل انقیاد صرف اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا۔ اس کی اطاعت کرنا' اس کے نظام زندگی کی پیروی کرنا۔ اس کی کتاب کے مطابق فیصلے کرنا۔ اور یہ وہ مفہوم ہے جسے اس سورت میں بار بار دہرایا گیا ہے جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے۔ یہ تو ہے وہ پہلا ستون جس پر جماعت مسلمہ قائم ہے تاکہ وہ اپنے وجود کو ثابت کرے' اور اس کائنات میں جو اہم رول اسے سپرد کیا گیا ہے اسے ادا کرے۔ اس لئے کہ اس ستون اور اس اساس کے بغیر انسانوں کا ہر اکٹھ ایک جاہلی اکٹھ تصور ہو گا۔ اس صورت میں پھر وہ اکٹھ اسلامی منہاج پر اکٹھ نہ ہو گا' جسے امت مسلمہ کا اجتماع کہا جا سکے۔ پس جاہلیت پر مبنی سوسائٹیاں ہوں گی جن میں ہدایت یافتہ قیادت نہ ہو گی' جو صحیح معنوں میں انسانیت کی راہبر ہو' بلکہ جاہلی قیادتیں اٹھیں گی۔

دوسری اساس جس پر اسلامی سوسائٹی کی عمارت اٹھتی ہے وہ اخوت اسلامی کی اساس ہے۔ صرف اللہ کے نام پر برادری' اسلامی نظام زندگی کی رفاقت' اسلامی نظام زندگی کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے کی رفاقت۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ

"سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو' اور تفرقہ میں نہ پڑو' اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا' تم ایک دوسرے کے دشمن تھے' اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے' اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آ جائے۔"

یہ اخوت گویا خدا خوفی اور ایمان سے پھوٹتی ہے' یعنی اسلام کی اساس اول سے۔ اور اخوت کی بنیاد اللہ کی رسی ہے۔ یعنی اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کی اساس پر' اس کے دین کی اساس پر اور اس کے منہاج کی اساس پر۔ اس اخوت کی اساس جاہلیت کی اکٹھ کی اساس پر نہیں ہے' نہ جاہلیت کے کسی دوسرے مقصد کی اساس پر ہے' نہ کسی اور رسی پر جو اللہ کی رسی کے علاوہ ہو۔ صرف اللہ کی رسی پر وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۪ ......................... "سب مل کر صرف اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ اور تفرقہ میں نہ پڑو۔"

یہ اخوت جس کی اساس اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑنے پر ہے' اللہ تعالیٰ پہلی جماعت اسلامی پر اسے اپنا احسان عظیم بتاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ یہ وہ نعمت ہے' جس سے اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں کو سرفراز فرماتے ہیں جن سے اللہ کو محبت ہوتی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ انہیں اپنے اس انعام کو یاد دلاتے ہیں۔ فرماتے ہیں ذرا اس حالت کو ذہن میں لائیں جس پر وہ جاہلیت کے دور میں تھے۔ یعنی وہ "اعداء" تھے۔ ایک ایک کا دشمن تھا۔ دیکھو مدینہ میں اوس اور خزرج کی طرح دشمنی کا نمونہ اور کوئی پیش کر سکتا ہے۔ یہ یثرب کے دو قبیلے تھے' یہ قبیلے یہودیوں کے پڑوس میں رہتے تھے اور یہ یہودی ان کے درمیان عداوت کی آگ سلگائے رکھتے تھے' وہ ہر وقت پھونکیں مارتے تھے' اور اس آگ کو اس قدر تازہ رکھتے کہ وہ ان کے درمیان ہر قسم کے تعلقات کو جلاکر بھسم کر دیتی۔ یہودیوں کے لئے یہ ایک اچھا میدان کار تھا۔ اور وہ اسی میں رات اور دن کام کرتے رہتے تھے۔ اور اسی کے ساتھ زندہ رہتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان دو عربی قبیلوں کی تالیف قلب کا

سامان کر دیا اور یہ اسلام تھا' یہ صرف اسلام ہی تھا جس نے ان نفرت کرنے والے قبائل کے دلوں کو جوڑا۔ اور یہ صرف اللہ کی رسی ہی تھی جسے سب نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور وہ اللہ کے اس احسان کی وجہ سے بھائی بھائی بن گئے تھے۔ یہ صرف اسلامی اخوت ہی ہے جس کی وجہ سے لوگوں میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے اپنی تاریخی دشمنیاں بھول سکتے ہیں' یا اپنے قبائلی انتقام معاف کر سکتے ہیں' یا لوگ اپنے ذاتی مفادات اور فرقہ وارانہ روایات کو ترک کر سکتے ہیں اور پھر تمام لوگ اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر کے سامنے ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔

وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ

"اور تم ایک دوسرے کے دشمن تھے' اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔"

پھر اللہ تعالیٰ انہیں اپنا وہ احسان جتلاتے ہیں کہ وہ آگ سے بھرے ہوئے گڑھے کے کنارے پر تھے اور قریب تھا کہ وہ اس میں گر جائیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے بچالیا۔ اور وہ اس سے اس طرح بچے کہ انہوں نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور ایمان لے آئے۔ یہ تھی اسلام کی پہلی اساس۔ اور پھر ان کے دلوں میں محبت ڈال دی اور وہ بھائی بھائی بن گئے اور یہ محبت اور رفاقت اسلام کے اجتماعی نظام کی دوسری اساس تھی۔ اس لئے فرمایا وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ .............. "اور تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے تھے' اس نے تم کو اس سے بچالیا۔"

آیت میں "تمہارے دل جوڑ دیئے" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ دل کا لفظ اس لئے استعمال ہوا ہے کہ باہم انسانی رابطے اور شعور محبت کا محل دل ہوتا ہے۔ اس لئے فَاَلَّفَ بَيْنَكُمْ ......... کی جگہ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ .......... کا لفظ استعمال کیا گیا۔ گویا دلوں کی ایک گٹھڑی میں باہم ملا کر' جوڑ دیا گیا' اور وہ اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد اور میثاق کی رسی کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ اس طرح اس آیت میں مسلمانوں کی اس وقت کی تصویر کو جاندار الفاظ پہنایا گیا ہے بلکہ ان کی صورت حال ایک زندہ اور متحرک منظر میں نظر آرہی ہے کہ وہ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ ............................ "اور تم آگ سے بھرے ہوئے گڑھے کے کنارے پر تھے۔" اور صورت حال یوں تھی کہ تم گرنے ہی والے تھے کہ اچانک اللہ کے دست قدرت نے تمہیں بچالیا۔ گویا اللہ کا ہاتھ محسوس اور شاہد ہے۔ اللہ کی رسی محسوس طور پر نظر آتی ہے۔ اور انتہائی خطرے کی صورت حال سے قوم بال بال بچ جاتی ہے۔ یہ ایک زندہ' متحرک نظارہ ہے۔ اس منظر کو دیکھنے والوں کے دل دھڑک رہے ہیں اور خطرہ سامنے موجود ہے۔ صدیوں اور نسلوں کے بعد گویا آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔

محمد بن اسحاق نے اپنی سیرت میں اس کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ آیت اوس اور خزرج کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ہوا یوں کہ ایک یہودی ایک ایسی محفل کے پاس سے گزرا جس میں اوس اور خزرج کے لوگ بھائیوں کی طرح بیٹھے ہوئے تھے' اسے یہ بات بہت ہی شاق گزری۔ اس پر اس نے ایک شخص بھیجا اور اسے کہا کہ جنگ بعاث میں ان کے درمیان جو واقعات ہوئے تھے ذرا اس محفل میں ان کا تذکرہ کرے اور یہ شخص اور ان کی محفلوں میں ان واقعات کا تذکرہ اپنے انداز میں کرتا رہا۔ اس طرح لوگ ایک دوسرے کے خلاف گرم ہو گئے۔ ایک دوسرے کو غضبناک نظروں سے دیکھنے لگے۔ ایک دوسرے کے اندر انہوں نے جذبہ انتقام بھڑکایا۔ اپنے اپنے جھنڈے اٹھالئے' اسلحہ طلب ہو گیا اور مقام "حرہ" دوبارہ جنگ کے لئے تقریباً طے ہو گیا۔ اس بات کی اطلاع حضور ﷺ کو ہو گئی۔ حضور ﷺ ان کے پاس آئے' انہیں ٹھنڈا کیا اور فرمایا: "کیا تم دوبارہ جاہلیت کی طرف دعوت دیتے ہو اور میں تمہارے درمیان ہوں۔" اس کے بعد آپ

نے ان پر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ اس پر انہیں سخت ندامت ہوئی۔ فوراً ان کے درمیان صلح ہو گئی۔ انہوں نے باہم معانقہ کیا اور اسلحے پھینک دیئے گئے' اللہ ان سے راضی ہو۔

جب اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے حقیقت واضح فرمائی تو وہ راہ ہدایت پر آگئے۔ اور ان کے بارے میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی بات بچی ہو گئی۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ............................ "اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تم پر روشن کرتا ہے تاکہ ان نشانیوں سے تمہیں تمہاری فلاح کا سیدھا راستہ نظر آئے۔"

مسلمان ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے' اللہ کے نظام پر قائم تھے اور تمام انسانیت کی قیادت کرنے کی راہ پر گامزن تھے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے اور یہودی یہ سعی کر رہے تھے کہ اس رسی کو کاٹ دیں۔ یہودیوں کی ان مسلسل سازشوں کا یہ ایک نمونہ ہے' جو وہ مسلسل جماعت مسلمہ کے خلاف کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ سازشیں وہ ہمیشہ اس وقت کرنے لگتے ہیں جب بھی مسلمان اللہ کی رسی کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسلامی نظام زندگی کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ان کی یہ کوششیں کامیاب ہی اس لئے ہوتی ہیں کہ مسلمان اہل کتاب کی پیروی شروع کر دیتے ہیں اور ان کی یہ ریشہ دوانیاں اس قدر گہری چال پر مبنی ہوتی ہیں کہ قریب تھا کہ وہ دور اول کے مسلمانوں کو بھی باہم دست و گریباں کر دیں اور انہیں اسلام سے پھیر کر دوبارہ کفر کے حالات میں داخل کر دیں۔ اور ان کے درمیان رابطہ پیدا کرنے والی اللہ کی مضبوط رسی کو کاٹ دیں' جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے بھائی ہو گئے تھے اور متفق اور مجتمع ہو گئے تھے۔ آیت' کا یہ ٹکڑا اس آیت اور اس سے قبل کی آیات کے درمیان ربط کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اس آیت کا شان نزول یہ ہو یا نہ ہو' آیت بہرحال اس واقعہ کے مقابلہ میں ایک عام صورت حال کو بیان کر رہی ہے۔ کیونکہ اس کے سیاق اور سباق یہ بتا رہے ہیں کہ اس وقت یہودیوں کی طرف سے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑانے اور ان کے اندر تفریق پیدا کرنے میں ایک زبردست تحریک مسلسل چل رہی تھی۔ وہ اپنے تمام وسائل کو کام میں لا کر اسلامی صفوں میں فتنہ انگیزی اور تفرقہ برپا کرنے کی کوشش میں ہر وقت لگے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم مسلمانوں کو بار بار تنبیہ کرتا ہے کہ یہودیوں اور اہل کتاب کی سازشوں کے مقابلے میں ہوشیار رہیں' وہ ان کے درمیان شکوک و شبہات اور نفاق کے بیج بو رہے ہیں اور ان کے اندر فکری انتشار کے لئے ہر وقت کوشاں ہیں۔ ہر دور میں یہودیوں کا مسلمانوں کے حوالے سے یہی طرز عمل ہے۔ آج بھی وہ یہی کچھ کر رہے ہیں اور کل بھی ان کا رویہ یہی ہو گا' ہر اسلامی سوسائٹی میں اور ہر زمانے میں۔

سوال یہ ہے کہ ان یہودی سازشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ان دو اساسوں (Bases) پر استوار ہو کر پھر امت مسلمہ کا منشور اور ہدف کیا ہے؟ اس کا فریضہ 'فریضہ اقامت دین ہے۔ اس کرۂ ارض پر اسلامی نظام زندگی کا قیام ہے۔ حق کو باطل پر غالب کرنا ہے' معروف کو منکر پر غالب کرنا ہے' خیر کو پھیلانا ہے اور شر کو روکنا ہے۔ یہ ہے وہ نصب العین جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھوں سے' اپنی نظروں کے سامنے' اپنے خاص منہاج کے مطابق اس امت کو برپا کیا ہے۔ اس نصب العین کا تعین ان الفاظ میں کیا جاتا ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

"تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں' بھلائی کا حکم دیں' اور برائیوں سے روکیں اور جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔"

پس یہ ضروری ہوا کہ ایک ایسی جماعت ہر وقت موجود ہو جو بھلائی کی طرف دعوت دے' معروف کا حکم دے اور منکر سے منع

کرے۔ ان کے اندر ایک ایسا اقتدار' ایک ایسی قوت ضرور ہونی چاہئے جو بھلائی کی طرف بلائے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے۔ یہ بات کہ ایک ایسا اقتدار یا ایسا مقتدر اعلیٰ ضروری ہے جو یہ کام کرے' اس پر یہ آیت بصراحت دلالت کرتی ہے۔ یعنی دعوت الی الخیر ہر وقت ہو اور یہ بات ہر کوئی کر سکتا ہے' لیکن یہاں ساتھ ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے الفاظ بھی وارد ہیں۔ اگر دعوت اسلامی بغیر اقتدار اعلیٰ کے ممکن العمل بھی ہے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بغیر اقتدار اعلیٰ کے حصول کے ممکن نہیں ہے۔

اس مسئلے کے حل کے لئے صحیح اسلامی تصور حیات یہی ہے کہ ایک ایسا اقتدار اعلیٰ ضروری ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ یہ اقتدار اعلیٰ دعوت الی الخیر کے نصب العین پر قائم ہو گا۔ اور اس کا مقصد رفیعہ شر ہو گا۔ یہ اقتدار اعلیٰ ایسا ہو گا جو مکمل اتحاد و اتفاق کے نتیجے میں حاصل ہو گا' یہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کے نتیجے میں اور اخوت اسلامی کے قیام کے بعد ہو گا۔ یعنی یہ اقتدار اعلیٰ' یا مملکت یا سلطنت ان دو بنیادوں پر قائم ہو گی یعنی اتحاد اور اخوت اور اس کا نصب العین انسانی زندگی میں اسلامی نظام حیات کا قیام ہو گا۔ اور اس اقتدار اعلیٰ کا قیام اس طرح ہو گا کہ اس نظام کی طرف جو خیر ہی خیر ہے' عام لوگوں کو دعوت دی جائے گی۔ لوگوں کو اس سے متعارف کرایا جائے گا کہ اس نظام کی حقیقت کیا ہے۔ انہیں یہ بتایا جائے گا کہ اسلامی نظام اقتدار اعلیٰ کا خواہاں ہے تاکہ وہ معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔ اور لوگ اس کی اطاعت کریں یا وہ اپنی اطاعت کروائے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

**وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ** ............................ "ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے' وہ صرف اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔" اس لئے یہ بات ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اس کرۂ ارض پر اسلامی نظام زندگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صرف وعظ و ارشاد اور تبلیغ و بیان جاری ہو۔ یہ تو اسلامی نظام کا ایک حصہ اور جزء ہے۔ اس کا دوسرا اہم جزء یہ ہے کہ ایک ایسا اقتدار اعلیٰ قائم کیا جائے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کرے۔ اور انسانی زندگی میں معروف کو رائج کرے۔ اور منکر کا قلع قمع کرے۔ اور اس "جماعت ممتازہ" کو بھی بچائے رکھے کہ ہر کس و ناکس اس امت کو اپنی خواہشات' اپنی مرغوبات اور شہوات کے بھینٹ نہ چڑھا سکے۔ اور اسے اپنی ذاتی مصلحتوں کی خاطر استعمال نہ کر سکے۔ اور معاشرہ کے اندر نیکی اور بھلائی پر مبنی اخلاق کو کوئی اپنی خاص رائے اور اپنے مخصوص تصورات کے تحت تباہ نہ کر سکے' اگرچہ وہ سمجھتا ہو کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ معروف اور درست ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دعوت الی الخیر' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ کوئی آسان اور سہل کام نہیں ہے۔ خصوصاً جب اس کے مزاج پر غور کریں اور دیکھیں کہ وہ لوگوں کی خواہشات اور میلانات کے ساتھ متصادم ہے۔ وہ بعض لوگوں کی ذاتی مصلحتوں اور مفادات کے ساتھ ٹکراتا ہے' بعض لوگوں کے غرور اور کبریائی پر اس کی زد پڑتی ہے' بعض غاصب جابروں اور زبردستی مسلط ہونے والے حکام بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں' بعض گرے ہوئے طبقات جن میں ترقی اور بلندی کا داعیہ ہی نہیں ہے' وہ اسے مصیبت سمجھتے ہیں' بعض اس قدر کاہل ہوں کہ اس کی مشقتیں برداشت کرنے کی ہمت ہی نہ رکھتے ہوں' بعض اس قدر غیر سنجیدہ لوگ ہوں کہ وہ زندگی میں کسی سنجیدہ کام کے لئے تیار ہی نہ ہوتے ہوں' بعض ظالم طبقات ہوں جس کے ساتھ عدل لگانہ کھاتا ہو۔ بعض ایسے گم کردہ راہ اور کجرو ہوں کہ انہیں صراط مستقیم اچھا ہی نہ لگتا ہو' اور ان میں بعض ایسے بھی موجود ہوں جو منکر کو پسند کرتے ہوں اور معروف کے دشمن ہوں.... حالانکہ انسانیت اور امت مسلمہ صرف اس وقت فلاح پا سکتی ہے کہ اس میں خیر غالب ہو' معروف کو معروف سمجھا جاتا ہو' منکر کو منکر سمجھا جاتا ہو' اور ان تمام امور کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ ایک ایسا اقتدار اعلیٰ ہو جس میں خیر غالب ہو وہ نہی عن المنکر اور امر بالمعروف کا فریضہ ادا کرتا

ہو۔ اور پھر اپنے اوامر اور نواہی کو منوانے کی قوت بھی رکھتا ہو۔

لہٰذا ایک ایسی جماعت کا قیام از حد ضروری ہے جس کی بنیاد ان دو ستونوں پر ہو' اللہ پر ایمان اور اخوت اسلامی تاکہ وہ اپنی قوت ایمانی' قوت خدا خوفی اور باہم الفت اور محبت اور اتفاق و اتحاد کی قوت کے بل بوتے پر وہ فریضہ ادا کر سکے جس کے لئے اسے اٹھایا گیا ہو' اس لئے کہ جماعت مسلمہ کو جو نصب العین دیا گیا ہے اور جو فریضہ اس پر عائد کیا گیا ہے کہ وہ ان دو خصوصیات کے بغیر اس میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتی اور نہ کامیاب و کامران ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ .......... "یہی لوگ فلاح پائیں گے۔"

غرض اس قسم کی جماعت کا قیام اسلامی نظام زندگی کے قیام کے لئے ایک بنیادی ضرورت ہے۔ یہ اسلامی نظام کی ذاتی ضرورت ہے۔ یہ جماعت وہ ماحول فراہم کرے گی جس کے اندر اسلامی نظام سانس لے گا' زندہ ہو گا اور ایک حقیقت کے روپ میں نمودار ہو گا۔ یہ ماحول بھلائی کا ماحول ہو گا' باہم متعاون و متکافل ماحول ہو گا' اور اس میں دعوت الی الخیر کا چرچا ہو گا۔ اس میں بھلائی' نیکی' سچائی' انصاف معروف ہوں گے۔ شر' رذالت' باطل اور ظلم اس میں منکر تصور ہوں گے۔ اس ماحول میں بھلائی آسان ہو گی اور برائی کا ارتکاب مشکل ہو گا۔ اس میں بھلائی پر عمل پیرا ہونے میں اس قدر مشقت نہ کرنا ہو گی جس قدر برائی پر مشقت ہو گی۔ اس میں حق باطل کے مقابل میں طاقتور ہو گا۔ اس میں ظلم کے مقابلے میں عدل سے زیادہ نفع ہو گا' اس میں بھلائی کرنے والے کو معاونین بسہولت دستیاب ہوں گے۔ اور اس میں برائی کا ارتکاب کرنے والے کو مزاحمت اور مخالفت کا سامنا کرنا ہو گا' یہی وجہ ہے کہ ایسی سوسائٹی کا قیام ضروری ہے' جس میں سچائی اور بھلائی بلاجدوجہد نشوونما پا سکے۔ اس کے لئے اس کا پورا ماحول اور اس کا ہر فرد اس میں معاون ہو گا اور جس میں باطل اور شر کی نشوونما کی راہ میں بے حد مشکلات اور رکاوٹیں ہوں گی' اس لئے کہ پورا ماحول اس کے لئے سازگار نہ ہو گا۔

اسلام کا تصور کائنات' اس کا تصور حیات' اس کا تصور اقتدار' اس کا تصور اعمال' اس کا تصور واقعات' اس کا تصور اشیاء اور افراد تمام دوسرے جاہلی تصورات سے' اپنی اساس اور نوعیت کے اعتبار سے بالکل مختلف ہے۔ اس لئے اسلام کے اس وسیع تصور حیات کے لئے ضروری ہے کہ اس کے لئے ایک ماحول ہو' جس میں یہ تصور حیات پھلے پھولے اور اس میں اس کی اپنی اقدار حیات پروان چڑھیں۔ لہٰذا اسلام کے لئے جاہلی ماحول سے جدا ایک عمدہ ماحول کی ضرورت ہے اور اسے ایک جاہلی معاشرے کے سوا اس کا اپنا معاشرہ درکار ہے۔

یہ ماحول اور یہ معاشرہ اسلامی تصور حیات کے لئے ہو جس میں یہ تصور زندہ رہے اور یہ ماحول بھی اس کے لئے زندہ ہو' اس ماحول میں یہ تصور پھلے پھولے' اور آزادی کے ساتھ وہ اس ماحول میں سانس لے سکے' اس میں ذاتی ترقی کر سکے' اور اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو' نہ داخلی رکاوٹیں جو اس کی راہ میں مشکلات پیدا کریں اور نہ خارجی رکاوٹیں جو مزاحمت کریں۔ اور اگر ایسی رکاوٹیں کسی وقت وجود میں آ جائیں تو دعوت اسلامی ان کا مقابلہ کرے' اس لئے کہ یہ دعوت الی الخیر ہے' دعوت امربالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اور جب اس قسم کی کوئی قاہرانہ قوت دعوت اسلامی کی راہ میں رکاوٹیں ڈالے تو اس معاشرے میں اس کی مدافعت کرنے والے موجود ہوں اور یہ لوگ اسلامی نظام کے محافظین ہوں۔

یہ ماحول اسلامی جماعت کی صورت میں فراہم ہوتا ہے اور یہ جماعت دو بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔ ایمان باللہ اور اخوت اسلامی۔ ایمان باللہ اس لئے ضروری ہے تاکہ اس کا تصور کائنات' تصور حیات' اس کی اقدار' تصور اعمال اور تصور اشخاص و اشیاء میں مطابقت ہو۔ یہ تمام تصورات ایک ہی پیمانے کے مطابق ہوں اور ایک ہی منبع سے ماخوذ ہوں' انہی کے مطابق زندگی کے تمام مسائل حل کئے جائیں اور پوری زندگی کے فیصلے اللہ کی طرف سے آئی ہوئی شریعت کے مطابق ہوں۔ اور وہ جماعت محبت کے ساتھ اس قیادت کی پیروی کرے جو

اسلامی نظام حیات کے مطابق قائم ہو۔ وہ اسلامی اخوت پر قائم ہو۔ اس کی تشکیل محبت اور باہم تعاون و تکافل کے اصولوں پر ہو' یہ ایسے اصول ہیں جن کے سایہ میں خود غرضی اور لالچ ختم ہو جاتی ہے اور ایثار اور قربانی کے جذبات دوچند ہو جاتے ہیں' لوگ بڑی سہولت اور آزادی سے اور بڑی گرمجوشی سے ایثار کرتے ہیں اور نہایت ہی اطمینان' خوشی اور اعتماد سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

غرض مدینہ طیبہ میں پہلی اسلامی جماعت انہی دو اصولوں پر قائم ہوئی تھی' اس کا ایمان باللہ نہایت ہی پختہ تھا جو معرفت الٰہی پر مبنی تھا۔ معرفت الٰہی کی وجہ سے صفات باری کا پرتو ان کے ضمیروں پر پڑ گیا تھا' خدا خوفی' خدا کی نگرانی کا شعور' مسلسل بیداری' ذات باری کا احساس اس جماعت کے اندر اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ جس کی نظیر تاریخ انسانی میں بڑی نادر ہے۔ اور معرفت کردگار کے ساتھ ساتھ افراد جماعت کے دلوں میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ باہم فیاض اور ایثار کرنے والے تھے' وہ خوبصورت اور میٹھی محبت کے پیکر تھے۔ معاشی لحاظ سے باہم معاون متکافل اور گہری اور سچی ہمدردی رکھتے تھے۔ اور وہ اس میدان میں اس قدر اونچے مقام تک پہنچے ہوئے تھے کہ اگر انہوں نے یہ معیار عملاً پیش نہ کیا ہوتا تو وہ محض خواب ہی خواب ہوتا۔ غرض مہاجرین اور انصار کے درمیاں برادری اور مواخات کا قصہ تو ایک حقیقت تھا لیکن وہ اس قدر ممتاز اور بلند معیار کا تھا کہ آج بھی وہ محض افسانہ نظر آتا ہے' حالانکہ وہ حقیقت تھی۔ اور وہ قصہ اس سرزمین پر بطور واقعہ پیش آیا تھا۔ اگرچہ وہ محیر العقول اور افسانہ نظر آتا تھا۔ غرض اس قسم کے ایمان اور اس قسم کی اخوت اور بھائی چارے پر ہر دور میں اسلامی نظام قائم ہو گا۔

یہی وجہ ہے کہ سیاق کلام میں مکرر' جماعت مسلمہ کو خبردار کیا جاتا ہے کہ وہ تفرقے اور بے جا اختلافات سے باز رہیں۔ ان سے پہلے جن لوگوں کو اس امانت کے اٹھانے کے لئے منتخب کیا گیا تھا' اور جنہوں نے تفرقہ بازی کی تھی اور انجام کار وہ جس طرح تباہ و برباد ہوئے تھے' اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ اعزاز چھین لیا تھا اور جماعت مسلمہ کے سپرد کر دیا تھا' اس لئے کہ وہ باہم جڑے ہوئے تھے۔ نیز ان لوگوں کا جو برا انجام قیامت میں ہونے والا ہے وہ مستزاد ہے' کہ جس دن کچھ چہرے سیاہ ہوں گے اور کچھ سفید ہوں گے اور یہ لوگ سیاہ چہروں والے ہوں گے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝١٠٥ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝١٠٦ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝١٠٧

"کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے۔ اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلاف میں مبتلا ہوئے' جنہوں نے یہ روش اختیار کی وہ اس روز سخت سزا پائیں گے۔ جبکہ کچھ لوگ سرخ رو ہوں گے اور کچھ لوگوں کا منہ کالا ہو گا۔ جن کا منہ کالا ہو گا (ان سے کہا جائے گا) کہ نعمت ایمان پانے کے بعد بھی تم نے کافرانہ رویہ اختیار کیا؟ اچھا تو اب اس کفران نعمت کے صلے میں عذاب کا مزہ چکھو۔ رہے وہ لوگ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو ان کو اللہ کے دامن رحمت میں جگہ ملے گی اور ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے۔"

یہاں سیاق کلام میں' قرآن اپنے مناظر میں سے ایک منظر کو پیش کرتا ہے' جو زندگی متحرک مناظر سے بھرپور ہے' ہم ایک ہولناک منظر کے سامنے ہیں' یہ اس قدر خوفناک ہے کہ جس کی نقشہ کشی بذریعہ الفاظ ممکن نہیں ہے۔ نہ اس کے خدوخال الفاظ میں بیان ہو سکتے ہیں۔

ہمارے سامنے دو قسم کے انسان کھڑے ہیں' یہ زندہ انسان ہیں' ان کے چہرے ہیں اور خدوخال ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جن کے چہرے نورانی ہیں' خوشی ان سے ٹپک رہی ہے' اور ہشاش بشاش ہیں اور خوشی و مسرت سے چہرے سرخ و سفید ہو گئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں بعض دوسرے چہرے ہیں جو رنج و الم کی وجہ سے بجھے بجھے ہیں' ہوائیاں اڑی ہوئی ہیں' تھکان کی وجہ سے سیاہ ہو گئے ہیں' لیکن اس حالت میں بھی وہ معاف نہیں ہیں۔ اپنے حال پر چھوڑ نہیں دیئے گئے' بلکہ انہیں مزید رلایا جاتا ہے اور ملامت کی جاتی ہے۔

"نعمت ایمان پانے کے بعد تم نے کافرانہ رویہ اختیار کیا؟ اچھا تو اب اس کفران نعمت کے صلے میں عذاب کا مزہ چکھو۔"

"رہے وہ لوگ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو ان کو اللہ کے دامن رحمت میں جگہ ملے گی اور ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے۔"

یوں جماعت مسلمہ کے ضمیر کی گہرائیوں میں تفرقہ اور اختلاف کے برے نتائج کا ایک خوف بیٹھ جاتا ہے۔ اور وہ جان لیتے ہیں کہ ایمان اور محبت و الفت اللہ کا کس قدر عظیم انعام و اکرام ہے۔ اور اس منظر میں جماعت مسلمہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی ہے کہ اہل کتاب جنہوں نے تفرقہ کیا وہ کس قدر بھیانک انجام سے دوچار ہوئے' جن کی اطاعت سے جماعت مسلمہ کو ڈرایا جا رہا ہے تاکہ وہ بھی اسی بھیانک انجام سے دوچار ہو کر عذاب الیم میں گرفتار نہ ہو جائے' جس دن بعض چہرے سفید اور ہشاش و بشاش ہوں گے اور بعض چہرے سیاہ و کبیدہ خاطر ہوں گے۔

اور اب ان دونوں فریقوں کی تصویر کشی اور انجام بتا دینے کے بعد قرآن کریم اس پوری بحث پر اپنے مخصوص انداز میں اختتامی کلمات کہتا ہے۔ یہ کلمات انہی خطوط پر ہیں جن پر اس سورت کے مضامین جا رہے ہیں۔ یعنی یہ کہ وحی الٰہی سچائی اور دانائی پر مبنی ہے اور یہ کہ قیامت دن جزاء و سزاء ایک سنجیدہ امر ہے' اللہ کے احکام دنیا و آخرت میں عدل و انصاف کے اصولوں پر مبنی ہیں۔ اور یہ کہ جو کچھ زمین میں ہے اور آسمان میں ہے وہ سب صرف اللہ کی ملکیت ہے۔ اور تمام امور کا فیصلہ آخر کار اس کے سامنے ہونے والا ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾

۱۱ ع ۸ ۲

"یہ اللہ کے ارشادات ہیں جو ہم تمہیں ٹھیک ٹھیک سنا رہے ہیں کیونکہ اللہ دنیا والوں پر ظلم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا' زمین و آسمان کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہے اور سارے معاملات اللہ کے حضور پیش ہوتے ہیں۔"

یہ صورتیں' یہ حقائق اور یہ نتائج اللہ کی یہ آیات اور اس کے یہ دلائل و براہین' یہ سب آپ پر سچائی اور صداقت کے ساتھ پڑھی جا رہی ہیں' یہ آیات جو اصول اور جو اقدار طے کر رہی ہیں وہ حق ہیں اور اعمال کے جو نتائج اور جو جزاء و سزا یہ طے کر رہی ہیں وہ بھی حق ہیں اور پیش آنے والے ہیں۔ یہ آیات سچائی کے ساتھ اس ذات کی طرف سے نازل ہو رہی ہیں۔ وہ ذات اس نزول کی سزاوار ہے۔ اور وہی اس بات کی مالک ہے کہ اقدار کا تعین کرے' وہی مستحق ہے کہ نتائج تک پہنچائے اور وہی اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اعمال پر جزاء دے۔ اللہ تعالیٰ کبھی اپنے بندوں پر ظلم کا ارادہ نہیں کرتا' اس لئے کہ وہ حاکم عادل دو امور سماوات اور امور ارض کا مالک ہے اور وہ آسمانوں اور زمینوں کے اندر جو کچھ ہے' اس کا بھی مالک ہے' اور تمام امور کا آخری فیصلہ اسی کے ہاں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عمل پر جزاء و سزا کا تعین اس لئے کیا ہے تاکہ سچ کا بول بالا ہو اور نظام عدل جاری ہو اور معاملات اس نہج پر چلیں جو شان جلالت کے لائق ہو اور یہ بات نہیں ہے جیسا کہ اہل کتاب کو زعم ہے کہ انہیں تو صرف معدودے چند دنوں تک آگ کی سزا دی جائے گی پھر وہ نکل آئیں گے۔

○.....☆☆☆.....○

اس کے بعد امت مسلمہ کے اوصاف کا بیان کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی حیثیت ' اپنی قدر و قیمت اور اپنی حقیقت سے شناسا ہو سکے۔ اس کے بعد امت مسلمہ کے سامنے اہل کتاب کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ اہل کتاب کے رتبے کو کم نہیں کیا جاتا' ان کی حقیقت بیان کر کے انہیں یہ امید دلائی جاتی ہے کہ اگر وہ ایمان لے آئیں تو وہ ان کے لئے مفید ہو گا' لہٰذا اہل ایمان کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ ان کے دشمن انہیں کوئی نقصان نہیں دے سکتے' وہ ان کے مکر و فریب اور ان کے قتال کے باوجود مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں دے سکتے' نہ مسلمانوں پر فتح یاب ہو سکتے' اہل کفر آخرت میں دوزخ میں رہیں گے اور اس دنیا میں ایمان و تقویٰ کے بغیر انہوں نے جو کچھ بھی خرچ کیا وہ آخرت میں انہیں کوئی فائدہ نہ دے گا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ۚ مِنْهُمُ
الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿١١٠﴾ لَنْ يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى ۖ وَإِنْ يُقَاتِلُوكُمْ
يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ﴿١١١﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا
إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَ
ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ
الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿١١٢﴾ لَيْسُوا سَوَاءً ۗ
مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ
يَسْجُدُونَ ﴿١١٣﴾ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ
يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ ۖ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿١١٤﴾
وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ﴿١١٥﴾ إِنَّ
الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ
وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١١٦﴾ مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَٰذِهِ

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

"اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہل کتاب ایمان لاتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایماندار بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں۔ یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے' زیادہ سے زیادہ بس کچھ ستا سکتے ہیں۔ اگر یہ تم سے لڑیں گے تو مقابلہ میں پیٹھ دکھائیں گے' پھر ایسے بے بس ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی۔ یہ جہاں پائے گئے ان پر ذلت کی مار پڑی' کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو اور بات ہے۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں' ان پر محتاجی اور مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے' اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔ مگر سارے اہل کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہ راست پر قائم ہیں' راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں' اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں' نیکی کا حکم دیتے ہیں' برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں اور جو نیکی بھی یہ کریں گے اس کی ناقدری نہ کی جائے گی' اللہ پرہیز گار لوگوں کو خوب جانتا ہے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا تو اللہ کے مقابلے میں ان کو نہ ان کا مال کچھ کام دے گا نہ اولاد' وہ تو آگ میں جانے والے لوگ ہیں اور آگ ہی میں ہمیشہ رہیں گے۔ جو کچھ وہ اپنی اس دنیا کی زندگی میں خرچ کر رہے ہیں اس کی مثال اس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہو اور وہ ان لوگوں کی کھیتی پر چلے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اسے برباد کر کے رکھ دے۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ درحقیقت یہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔"

ان آیات کے ابتدائی حصہ میں' جماعت مسلمہ کے کاندھوں پر ایک بھاری بوجھ ڈالا گیا ہے اور یہ بوجھ اس لئے ڈالا گیا ہے کہ اللہ نے اس جماعت کو مکرم اور معزز بنایا ہے اور اسے ایسا مقام و مرتبہ دیا گیا ہے' جس پر آج تک کوئی دوسری جماعت فائز نہیں ہو سکی۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ

"اب دنیا میں وہ بہتر گروہ تم ہو' جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو' اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

یہاں اخرجت صیغہ ماضی مجہول لایا گیا ہے۔ اور یہ ایک خاص انداز تعبیر ہے اور قابل توجہ ہے۔ اس سے اللہ جل شانہ کے لطیف دست قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ جو اس امت کو باہر نکال رہا ہے اور غیب کے اندھیروں میں سے' اس جماعت کو دھکیل دھکیل کر منصہ شہود پر لایا جا رہا ہے۔ اور اسے اس پردے کے پیچھے سے ظاہر کیا جا رہا ہے جس کے پیچھے جھانکنا کسی انسان کا کام نہیں ہے اور نہ انسان اس پردۂ غیب کے پیچھے کچھ جانتا ہے۔ اخرجت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک خفیہ اور نامعلوم قوت انہیں آہستہ اور غیر محسوس طور پر متحرک کر رہی ہے۔ یہ عمل یوں ہوتا ہے کہ اچانک اس کائنات کے اسٹیج پر ایک امت نمودار ہو جاتی ہے۔ اور اس نے اس اسٹیج پر ایک خاص رول

ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہ رول نہایت ہی اہم ہے۔ اور اس کائنات میں اس کا ایک خاص مقام متعین ہو جاتا ہے۔

**كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ** ........... "اب دنیا میں بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے نکالا گیا ہے۔" یہ ہے وہ بات جس کا ادراک امت مسلمہ کو اچھی طرح کر لینا چاہئے تاکہ اسے اپنی حقیقی قدر و قیمت کا احساس ہو جائے۔ اسے معلوم ہو جائے کہ اسے تو تمام انسانوں کی اصلاح کے لئے نکالا گیا ہے تاکہ وہ ہراول دستے کا کام دے اور اس کو اس کائنات میں قیادت کا مقام حاصل ہو۔ اس لئے کہ صرف امت ہی نہیں بلکہ وہ ایک بہترین امت ہے۔ اور اللہ کی مرضی یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر خیر کی قیادت ہو' شر کی قیادت نہ ہو' یہی وجہ ہے کہ یہ بات اس کی شان قیادت سے فروتر قرار دی گئی ہے کہ وہ دوسری جاہلی امتوں سے ہدایت لے۔ اس کا فرض تو یہ ہے کہ وہ دوسری جاہلی اقوام کو اپنے خزانہ علم و اخلاق سے عطیات دے۔ اور اس کے ذخائر میں ہمیشہ ایسی اجناس موجود رہنی چاہئیں جنہیں وہ دوسری محروم اقوام و ملل کو عطا کرتی رہے۔ وہ ان اقوام و ملل کو صحیح عقائد و تصورات دے' صحیح فکر دے' صحیح نظام حیات دے' صحیح اخلاق دے' صحیح علم و معرفت عطا کرے۔ یہ وہ فریضہ ہے جو اس کی اعلیٰ حیثیت کی وجہ سے اس پر عائد ہوتا ہے اور اس پر یہ فریضہ اس کے مقصد وجود کی وجہ سے فرض ہو جاتا ہے۔ یہ بات اس کے فرض منصبی میں داخل ہے کہ وہ ہر میدان میں دوسری امم کے لئے ہراول دستہ رہے۔ وہ ہمیشہ قیادت کے مقام و منصب پر رہے اور ہمیشہ مرکز امم ہو۔ لہٰذا اس کے اس منصب کے کچھ آثار و نتائج ہیں۔ وہ منصب محض دعوے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس امت کے سپرد کیا جاتا ہے جو اس کی اہل ہوا کرتی ہے' وہ اپنے تصورات و افکار کی وجہ سے اور اپنے اعلیٰ نظام حیات کی وجہ سے جب اس کے اہل ہوتی ہے' تب ہی یہ اسے دیا جاتا ہے۔ اس لئے اس امت کو علمی میدان میں بھی سب امم سے آگے ہونا چاہئے اور ترقی و تعمیر کے اعتبار سے بھی اسے اقوام و ملل سے آگے ہونا چاہئے' تاکہ وہ مقام خلافت فی الارض پر فائز ہو اور اپنے آپ کو اس کے لئے اہل ثابت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ جس نظام حیات کی داعی ہو گی وہ نظام اس سے بہت کچھ کمالات کا مطالبہ کرتا ہے' اور اس سے اس کا اولین مطالبہ یہ ہے کہ وہ ہر میدان میں سب سے آگے رہے اگر وہ اس منصب پر بدستور فائز رہنا چاہتی ہو اور اس کے تقاضوں اور اس کے فرائض کو پورا کرتی ہو۔

اس امت کے منصب اور مقام کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس زندگی کو شر اور فساد سے پاک کر دے اور اس کے پاس اس قدر قوت ہونا چاہئے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ اس لئے کہ وہ ایک بہترین امت ہے اور لوگوں کی اصلاح کے لئے نکالا گیا ہے۔ اور وہ خیر امت محض اللہ کی جانب سے کسی مجاملت یا خصوصی تعلق محبوبیت کی وجہ سے نہیں بنی' نہ ہی اسے خیر امت "اتفاقاً" بلا مقصد و ارادہ بنا دیا گیا ہے' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور اس سے ایسے کام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اللہ کے ہاں اعزاز اور شرف ان خام خیالیوں کی بنا پر نہیں ملتا' جن میں اہل کتاب مبتلا ہو گئے تھے اور کہتے تھے **نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ** "ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے محبوب ہیں۔" ہرگز نہیں' یہ ایک مثبت عمل تھا' منصوبے کے مطابق انسانیت کو برائی سے بچانا مقصود تھا' اسے معروف پر قائم کرنا مطلوب تھا' اور اس ایمانی تصور حیات کے ساتھ جو دنیا میں معروف و منکر کی حدوں کو واضح کر دے۔

**تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ** .........

"نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دراصل اس بہترین امت کے فرائض ہیں' جن کو لے کر اسے اٹھنا ہے چاہے وہ ان فرائض کی ادائیگی میں تکالیف اٹھانی پڑیں' اس لئے کہ یہ ایک خاردار راستہ ہے۔ اس میں شر کو چیلنج کرنا ہے' لوگوں کو بھلائی کی طرف بلانا ہے اور معاشرے کو شر و فساد کے عوامل و اسباب سے بچانا ہے اور یہ سب کام تھکا دینے والے کام ہیں' لیکن یہ سب کام ایک صالح معاشرے کے

قیام اور بچاؤ کے لئے ضروری ہیں نیز اس کے سوا وہ نقوش جم نہیں سکتے جن کے مطابق اللہ تعالیٰ انسانی زندگی کو استوار کرنا چاہتے ہیں۔"

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ساتھ ساتھ پکا مومن ہونا بھی ضروری ہے' اس لئے کہ اسلامی معاشرے میں حسن و قبح کے پیمانے ایمان ہی کے ترازو کے ساتھ قائم ہوتے ہیں اور معروف اور منکر کی صحیح پہچان ہو سکے۔ اس لئے کہ کسی ایک گروہ کا صالح ہو جانا ہی کافی نہیں ہے' بعض اوقات شر و فساد اس قدر پھیل جاتا ہے کہ معاشرے کی اجتماعی اقدار بدل جاتی ہیں اور ان میں خلل پڑ جاتا ہے۔ اس لئے خیر و شر کے لئے ایک مستحکم تصور کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں فضائل اعمال اور رذائل صفات کے اندر اچھی طرح جدائی ہو' معروف منکر سے جدا ہو' اور یہ تصور حیات اصلاح کی کسی مخصوص اسکیم سے علیحدہ ایک دائمی اصول و مبادی پر مبنی ہو۔

اور ظاہر ہے کہ یہ مقاصد صرف ایمان کے نتیجے میں ظہور پذیر ہو سکتے ہیں' یعنی اس کائنات کے بارے میں صحیح تصور اور اس کائنات کے خالق کے ساتھ اس کا تعلق کے بارے میں صحیح تصور' انسان اور اس کے مقصد وجود کے بارے میں صحیح تصور اور اس کائنات کے اندر انسان کے مقام اور اس کی حیثیت کے بارے صحیح تصور۔ پھر ان صحیح تصورات کے نتیجے میں صحیح اخلاقی اصول وجود میں آتے ہیں' جو خدا خوفی اور اس کی رحمت و رضا کی امید پر مبنی ہوتے ہیں' اور ان اصولوں کی وجہ سے لوگ ان اخلاقی اصولوں کے قیام پر بخوشی مائل ہوتے ہیں' ان کے دلوں پر اللہ کی حکمرانی ہوتی ہے اور ان کے معاشرے پر اللہ کی شریعت کی حکمرانی ہوتی ہے اور یوں ان اصول و قواعد کی نگہبانی بھی ہوتی رہتی ہے۔

پھر ایمان اس لئے بھی ضروری ہے کہ داعیان خیر' امر کنندہ گان معروف اور مانعان منکر اس راہ پر خار پر ' مشقتوں برداشت کرتے ہوئے ثابت قدمی سے ' اس قوت ایمانی کے بل بوتے پر گامزن ہو سکیں۔ خصوصاً جبکہ ان کا مقابلہ شر کے طاغوتوں سے ہو اور یہ طاغوت نوجوان بھی ہو اور تنومند بھی ہو' جبکہ وہ خواہشات نفس کے طاغوت کا مقابلہ کر رہے ہوں اور یہ خواہش اپنی شدت میں ہو اور خوب جوان ہو' جبکہ وہ گری ہوئی ارواح کا مقابلہ کر رہے ہوں جن کے عزائم کند ہو چکے ہوں جن کی شمع امید بجھ چکی ہو اور ایسے حالات میں ان کا زاد راہ صرف قوت ایمانی ہو' ان کا سامان جنگ صرف ایمان ہو اور ان کا تکیہ صرف اللہ پر ہو' ان کی حالت یہ ہو کہ ایمان کے زاد راہ کے سوا تمام توشے ختم ہو چکے ہوں اور ایمان کے سازوسامان کے سوا تمام سازوسامان ختم ہو چکے ہیں۔ اور اللہ کے سوا تمام سہارے ایک ایک کر کے گر چکے ہوں۔

اس سے پہلے یہ حکم دیا گیا تھا کہ اے امت مسلمہ تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو سرانجام دے۔ وہاں تو امت پر فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر عائد کیا گیا تھا۔ اب یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تم خیر امت ہو' تمہاری صفت و خاصیت یہ ہے کہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہو' اس میں امت کو یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ اگر تمہارے اندر یہ صفت نہ پائی گئی' یا کسی وقت نہ پائی جاتی ہو تو گویا تمہارا حقیقی وجود ہی نہ ہو گا۔ اس لئے کہ انسانی معاشرے میں یہ تمہاری پہچان ہے۔ تم اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ لے کر اٹھو گے' تو تم موجود تصور ہو گے اور اگر تم یہ فریضہ ترک کر دو گے تو تم معدوم تصور ہو گے' اور گویا صفت ایمان اور اسلام معدوم تصور ہو گی۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر امت مسلمہ کے اس فریضے کی طرف صراحت اور اشارات کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے' جس پر بحث ہم ان مقامات پر کریں گے۔ مگر رسول خدا ﷺ کی سنت میں بھی بار بار اس فریضہ منصبی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ چیدہ چیدہ احادیث یہاں پیش کروں :

حضرت ابو سعید خدری ؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا میں نے رسول خدا ﷺ کو یہ کہتے سنا: تم میں سے جو بھی منکر کو دیکھے

تو اسے چاہئے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے زائل کر دے' اگر ایسا نہ کر سکے تو اپنی زبان کے ساتھ' اور اگر اس کی طاقت بھی نہ ہو تو اپنے دل کے ساتھ۔ اور یہ ضعیف ایمان ہے۔" (امام مسلم)

حضرت ابن مسعود ﷺ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا :"جب بنی اسرائیل گناہوں میں پڑ گئے' تو انہیں ان کے علماء نے روکا' اور وہ نہ رکے' تو ان علماء نے ان سے ہم نشینی کی' ان کے ساتھ کھاتے پیتے' تو اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کے دلوں کو دوسروں کے دلوں کے ساتھ مارا' اور حضرت داؤدؑ' حضرت سلیمانؑ' حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کی زبان سے ان پر لعنت کی۔" اس کے بعد آپ ﷺ بیٹھ گئے' (اور آپ ﷺ تکیہ لگائے تھے) اور پھر فرمایا :"ہرگز نہیں! اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' یہاں تک کہ تم انہیں واپس حق کی طرف اچھی طرح پلٹا کر نہ لے آؤ۔" لفظ تامروا کے معنی ہیں **تعطفوا** (موڑو) اور **تردوا** (یعنی واپس لاؤ) ہے۔ (ابوداؤد و ترمذی)

حضرت حذیفہ ﷺ کہتے ہیں' فرمایا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ تمہیں معروف کا حکم دینا ہو گا اور تمہیں منکر سے روکنا ہو گا ورنہ قریب ہے کہ اللہ' اپنی جانب سے تم پر کوئی عذاب بھیج دے اور پھر صورت حال یہ ہو جائے کہ تم اسے پکارو گے اور وہ تمہاری پکار کا کوئی جواب تمہیں نہ دے۔" (ترمذی)

اور حضرت عرس بن عمیو کندی ﷺ سے روایت ہے فرماتے ہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب زمین میں کوئی برائی ہو رہی ہو' تو جو شخص اس وقت اسے دیکھ رہا ہو' اور اس پر نکیر کر رہا تو ایسا ہو گا' جس طرح وہ اس سے غائب ہو' اور جو شخص اس سے غائب ہو لیکن اس پر راضی ہو تو وہ ایسا ہو گا جیسا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہو۔ (ابوداؤد)

حضرت ابو سعید خدری ﷺ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :"یہ بات عظیم جہاد میں ہے کہ کوئی ظالم بادشاہ کے سامنے عادلانہ بات کرے۔" (ابوداؤد' ترمذی)

اور حضرت جابر ﷺ سے روایت ہے' کہتے ہیں' فرمایا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ شہداء کے سردار ہیں اور وہ شخص شہداء کا سردار ہے جو ظالم بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو گیا اسے امر بالمعروف کیا اور اسے منکر سے روکا ٹوکا' اور اس وجہ سے اس نے اس شخص کو قتل کر دیا۔" (روایت حاکم)

یہ اور اس کے علاوہ دوسری بے شمار احادیث اسلامی سوسائٹی کی اس خصوصیت کو بیان کرتی ہیں او[illegible]تی ہیں کہ اسلامی معاشرے میں یہ فریضہ اور اس کی ادائیگی اشد ضروری ہے۔ اس صفت کی وجہ سے معاشرے کی راہنمائی اور تربیت کا انتظام ہوتا رہتا ہے' اور قرآنی ہدایت کا حکم ہونے کے علاوہ یہ ایک ایسا توشہ ہے جس کی افادیت سے اور اس کی قدر و قیمت سے ہم بالکل غافل ہیں۔ ا۔ اس کے بعد اب ہم پہلی آیت کے حصہ آخر کی طرف آتے ہیں۔

وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ............ "یہ اہل کتاب ایمان لاتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایماندار بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں۔"

ان فقروں میں اہل کتاب کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ ایمان لے آئیں۔ ایمان ان کے لئے بہتر ہو گا وہ اس دنیا میں بھی بہتر ہو گا' اس کی وجہ سے ان کو اس تفرقہ بازی اور ہلاکت سے نجات ملے گی جس میں وہ پڑے ہوئے ہیں' وہ اعتقادی تصورات میں بھی فرقہ واریت میں

ا۔ دیکھئے کتاب "قبسات من الرسول" مصنفہ محمد قطب' فصل "قبل ان تدعوا فلا اجیب"

جتلا تھے اور ان کی شخصیت مجتمع نہ تھی' اس لئے کہ انکے اعتقادی تصورات کے اندر اس قدر صلاحیت نہ تھی کہ وہ کسی اجتماعی نظام زندگی کی اساس بن سکیں۔ اس وجہ سے کہ ان کے اجتماعی نظام' ان کے اپنے عقائد کے علاوہ دوسرے تصورات پر قائم تھے۔ چنانچہ ان کا اجتماعی نظام ہمیشہ لنگڑا' لولا اور ہوا کے اندر معلق نظام رہا۔ اس کی جڑیں کبھی بھی ان کے معاشرے کے اندر نہ پھیلیں' جس طرح دنیا کے وہ نظام ہوا میں معلق رہتے ہیں جو کسی مکمل اعتقادی اور نظریاتی اساس پر قائم نہیں ہوتے' جن کی تعمیر ایسے نظریۂ حیات پر نہیں ہوتی جو اس کائنات کے معمہ کا مکمل حل پیش کرتا ہو' جو وجود انسانی کے مقاصد نہ متعین کرتا ہو' جو اس کائنات میں انسان کا مقام نہ متعین کرتا ہو' اور ایمان لانا ان کے لئے آخرت میں بھی مفید ہے۔ اس لئے کہ آخرت میں غیر اہل اسلام کا جو برا انجام ہونے والا ہے' اس سے وہ بچ جائیں گے۔

اس آیت میں صاف صاف اعتراف کیا جاتا ہے کہ ان اہل کتاب میں سے بعض لوگ صالح بھی ہیں۔ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُونَ ............... "ان میں سے بعض اگرچہ مومن ہیں مگر اکثر فاسق ہیں۔"

اہل کتاب میں سے بعض لوگ ایمان لائے تھے' اور وہ بہت ہی اچھے مسلمان تھے۔ مثلاً عبداللہ بن سلام' ثعلبہ بن شعبہ اور کعب بن مالک وغیرہ۔ انہی لوگوں کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ اگرچہ اس آیت میں اجمالی اشارہ ہے اور دوسری آیت میں تفصیلی اشارہ ہے۔ لیکن ان کی اکثریت دین اسلام سے منکر رہی۔ اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے اس عہد کو توڑا جو اللہ نے نبیوں سے لیا تھا کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے نبی پر ایمان لائے گا' جو اس کے بعد مبعوث ہوگا' اور اس کی نصرت کرے گا۔ وہ دین اسلام کے نافرمان اس طرح قرار پائے کہ انہوں نے نبی آخر الزمان کے بھیجنے کے سلسلے میں اللہ کے ارادہ اور حکم کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا' محض اس لئے کہ یہ رسول بنی اسرائیل کے قبیلے سے نہ تھا' اور انہوں نے اس رسول کی اطاعت کرتے ہوئے اللہ کی آخری شریعت کے مطابق اپنی زندگی کے فیصلے کرانے کے اعزاز سے بھی اپنے آپ کو محروم رکھا' حالانکہ اللہ کا ارادہ اور فرمان یہ تھا کہ تمام انسانیت اس شریعت کے مطابق زندگی بسر کرے۔

اہل ایمان میں سے بعض لوگ چونکہ بدستور مدینہ کے اہل یہود کے ساتھ روابط قائم کئے ہوئے تھے اور اس وقت تک مدینہ طیبہ میں یہودی ایک برتر قوت تھے' وہ ایک عسکری قوت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اقتصادی قوت بھی تھے اور اہل اسلام میں سے بعض لوگ ان کی اس حیثیت کو تسلیم بھی کرتے تھے' اس لئے قرآن کریم نے یہ ضروری سمجھا کہ ان نافرمانوں کو اس حیثیت پر تنقید کر کے مسلمانوں کو ان کی مرعوبیت سے نکالا جائے اور ان کے کفر' نافرمانی اور ان کے جرائم کی وجہ سے ان کی حیثیت میں جو کمی واقع ہوئی ہے' اس کا اظہار کیا جائے۔ نیز جس طرح وہ فرقوں میں بٹے ہوئے تھے اور جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر ذلت اور خواری مسلط کر دی تھی یہاں اسے واضح طور پر ریکارڈ کر دیا گیا۔

لَنْ يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى ۖ وَإِنْ يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ﴿١١١﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ

"یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے' زیادہ سے زیادہ بس ستا سکتے ہیں' اگر یہ تم سے لڑیں گے تو مقابلہ میں پیٹھ دکھائیں گے' پھر ایسے بے بس

ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی' یہ جہاں پائے گئے ان پر ذلت کی مار پڑی 'کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو اور بات ہے۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں اور ان پر محتاجی اور مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے۔ اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ اور یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔"

ان آیات میں اللہ مومنین کو فتح و نصرت کی ضمانت دیتے ہیں' اور آخر کار ان کی سلامتی کی بھی صریح ضمانت دیتے ہیں' جب بھی وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ میدان جنگ میں آمنا سامنا کریں گے یہ ضمانت ان کے لئے موجود ہوگی بشرطیکہ وہ اپنے دین کی رسی مضبوطی سے پکڑیں اور اپنے رب پر یقین کریں۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ.........

........ "یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے زیادہ سے زیادہ بس ستا سکتے ہیں' اگر یہ تم سے لڑیں گے تو مقابلہ میں پیٹھ دکھائیں گے' پھر ایسے بے بس ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی۔"

اس لئے وہ دعوت اسلامی کو کوئی حقیقی ضرر نہیں پہنچا سکتے' نہ وہ جماعت مسلمہ کی تشکیل میں کوئی اثر اندازی کر سکتے ہیں اور نہ وہ دعوت اسلامی کو اس کرۂ ارض سے ختم کر سکتے ہیں۔ ہاں جماعت مسلمہ کے ساتھ جب ان کا تصادم ہوتا ہے تو وہ اذیت دے سکتے ہیں' وہ اس قسم کے عارضی دکھ دے سکتے ہیں جو مرور زمانہ کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ مسلمانوں کے ساتھ میدان جنگ میں مقابل ہوں گے تو ان کے لئے شکست لکھی ہوئی ہے اور آخر کار وہ شکست کھائیں گے' ان کی قسمت میں مسلمانوں کے برخلاف کوئی نصرت نہیں ہے۔ نہ ان کو مسلمانوں کے مقابلے میں کوئی مددگار ملے گا اور نہ وہ مسلمانوں کی زد سے بچ سکیں گے۔ اور یہ اس لئے ہے کہ ان پر ذلت کی زد پڑ گئی ہے اور ان کا یہ انجام ابد لکھ دیا گیا ہے' اس لئے وہ جس سرزمین میں بھی ہوں گے وہ ذلیل ہو کر رہیں گے' وہ یا تو اللہ کی ذمہ داری میں رہیں گے اور یا مسلمانوں کی ذمہ داری میں رہیں گے۔ جب وہ مسلمانوں کی ذمہ داری میں داخل ہوں گے تو ان کا مال اور ان کی جان محفوظ ہوگی ماسوائے اس کے کہ ان کے خلاف کوئی حق ثابت ہو چکا ہو' یوں انہیں امن اور اطمینان نصیب ہوگا۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہودیوں کو صحیح امن مسلمانوں کی ذمہ داری کے اندر نصیب ہوا ہے۔ لیکن یہود اس قدر نمک حرام ہیں کہ وہ اس کرۂ ارض پر مسلمانوں سے زیادہ اور کسی کے ساتھ دشمنی نہیں رکھتے۔ "وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے ہیں۔ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ یعنی گویا وہ دربدر ہوئے' مارے مارے پھرتے رہے اور آخر کار اللہ کے غضب کا سامان سروں پر اٹھائے ہوئے لوٹے۔" ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ......... "ان پر محتاجی مسلط کر دی گئی۔" ان کے ضمیر اور شعور میں محتاجی کا احساس رچ بس گیا ہے۔

ان آیات کے نزول کے بعد یہ تمام واقعات یہودیوں کی تاریخ میں انہیں پیش آئے' اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان جو معرکے پیش ہوئے ان میں اللہ نے مسلمانوں کو فتح و نصرت سے سرفراز کیا' جب تک مسلمانوں نے اپنے دین اور اپنے نظام حیات اور اپنے نظریۂ حیات کو اپنے سینے سے لگائے رکھا' اور اپنی زندگیوں میں اسلامی نظام حیات قائم رکھا' تو ان کے اعداء کی قسمت میں اللہ تعالیٰ نے ذلت اور خواری کو لکھ دیا۔ الا یہ کہ مسلمانوں کے عہد و ذمہ داری کی وجہ سے انہیں چین نصیب ہوا یا یہ کہ خود مسلمانوں نے اسلامی نظام حیات کو ترک کر دیا اور اپنے دین کو چھوڑ دیا۔

قرآن کریم اس بات کا بھی انکشاف کرتا ہے کہ ان لوگوں کی قسمت میں ذلت اور خواری کیوں لکھ دی گئی؟ اس کا سبب کیا ہے؟ تو سبب دراصل ایک عام سبب ہے' جس کے آثار و نتائج ہر قوم پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ چاہے وہ دین کے معاملے میں جس قدر اونچے دعوے کرتی

ہو۔ ان کی ذلت و خواری کا سبب اللہ کی نافرمانی اور ظلم تھا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ

"اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام تھا۔"

لہٰذا اللہ کی آیات کا سرے سے انکار کر دینا یا اپنی زندگیوں میں انہیں نافذ نہ کرنا اور ان کے مطابق اپنا نظام عدالت نہ چلانا اور انبیاء کو ناحق قتل کرنا' اور ان لوگوں کو قتل کرنا جو لوگوں میں داعیان عدل ہوں جیسا کہ اس سورت کی دوسری آیت میں وارد ہے۔ یعنی صرف نافرمانی اور ظلم کی وجہ سے وہ اللہ کے اس غضب کے مستحق ہوئے اور شکست' ذلت اور خواری ان کے مقدر میں لکھ دی گئی۔ اور یہی وہ اسباب ہیں جو آج کل اس کرۂ ارض پر مسلمانوں کی بگڑی ہوئی منحرف نسل کے اندر مکمل طور پر پائے جاتے ہیں' وہ نسل جو اپنے اوپر لفظ اسلام کا اطلاق غلط طور پر کر رہی ہے' اور یہی اسباب آج وہ اللہ کے سامنے اپنے کردار کے آئینہ میں پیش کر رہے ہیں' اس لئے اللہ کی جانب سے بھی آج ان کے ساتھ بعینہ وہی سلوک کیا جارہا ہے جو اللہ نے ان ہی اسباب کی وجہ سے یہودیوں کے ساتھ کبھی کیا تھا' یعنی آج شکست' ذلت اور خواری مسلمانوں کا مقدر بن چکی ہے۔ جب آج ان میں سے کوئی پوچھتا ہے کہ ہم اس کرۂ ارض پر غالب کیوں نہیں ہو رہے' حالانکہ ہم مسلمان ہیں؟ تو یہ سوال کرنے سے پہلے اسے معلوم ہونا چاہئے تھا کہ اسلام ہے کیا؟ اور مسلمان ہوتے کون ہیں؟ پھر وہ یہ سوال کرتے۔

بہرحال حضور ؐ کے وقت اہل کتاب میں کچھ اچھے لوگ بھی تھے۔ اگرچہ تھوڑے تھے' یہ ضروری تھا کہ ان کے ساتھ انصاف کیا جاتا۔ اس لئے آیت بالا کے بیان کردہ کلیہ میں استثناء کی گئی۔ بتایا گیا کہ وہ سب ایک جیسے نہیں ہیں' ان میں سے اچھے مومن بھی تو پیدا ہوئے ہیں۔ اور ان کا تعلق باللہ بعینہ ایک اچھے اور صادق مسلمان کی طرح ہے۔ اس لئے وہ اس جزا کے مستحق ہوں گے' جس کے سچے اہل ایمان مستحق ہوئے۔

لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَ هُمْ يَسْجُدُوْنَ ۞ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۞ وَ مَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ

"مگر سارے اہل کتاب یکساں نہیں' ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہ راست پر قائم ہیں' راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں' نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں اور وہ جو نیکی بھی کریں گے اس کی ناقدری نہ کی جائے گی' اللہ پرہیزگار لوگوں کو خوب جانتا ہے۔"

یہ اہل کتاب مومنین کی ایک روشن تصویر ہے۔ ان میں سے بعض لوگوں نے سچائی کے ساتھ ایمان قبول کیا اور یہ ایمان ان کے دلوں میں گہرائی تک اتر گیا۔ پھر یہ ایمان پوری طرح کامل اور شامل تھا۔ یہ لوگ اسلامی صفوں میں شامل ہو گئے اور دین اسلام کے محافظ

بن گئے۔ اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان لے آئے۔ انہوں نے ایمان کے تقاضے پورے کئے' اور جس امت کا وہ جزء بن گئے تھے' اس کی اساسی خصوصیات کے مطابق کام شروع کر دیا' یعنی یہ خصوصیت کہ وہ خیر امت ہے۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے پر کاربند ہو گئے' اس سے پہلے بھی ان کے نفوس خیر طلب تھے' انہوں نے بھلائی کے میدان میں ایک دوسرے سے مسابقت کی۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھے۔ اس لئے عالم بالا سے ان کے حق میں یہ عظیم شہادت نازل ہوئی کہ یہ لوگ یقیناً صالحین میں ہیں۔ اور ان کے ساتھ یہ سچا وعدہ کیا جاتا ہے کہ ان کا کوئی حق نہ مارا جائے گا۔ نہ ہی ان کا کوئی حق رد کیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہہ دیا گیا کہ اللہ کو اچھی طرح علم ہے کہ وہ متقین میں سے ہیں۔

یہ ایک تصویر ہے جو یہاں اس لئے دکھائی جا رہی ہے کہ جن لوگوں کی یہ خواہش ہو کہ وہ اپنے حق میں یہ شہادت قلمبند کرا لیں وہ اسے اس روشن افق پر دیکھیں اور اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کریں۔

یہ تو ایک محاذ ہے' دوسری جانب کافر ہیں' وہ کافر جنہیں ان کی دولت کچھ فائدہ نہیں دے رہی ہے۔ جن کے لئے ان کی اولاد بھی مفید نہیں ہے۔ پھر دنیا میں انہوں نے جو کچھ بھی خرچ کیا وہ ان کے لئے مفید نہیں ہے۔ قیامت کے دن اس انفاق کا انہیں کوئی فائدہ نہ ہو گا' کیوں؟ اس لئے کہ یہ انفاق بھلائی کے اس خط مستقیم کے ساتھ جڑا ہوا نہیں ہے' جو اللہ نے کھینچا ہے۔ یعنی وہ بھلائی جو ایمان اور اسلامی نظریۂ حیات پر مبنی ہو' جس کا تصور واضح ہو' جس کا ہدف مستقل ہو اور جن کی راہ اللہ تک جاری ہو' ورنہ پھر بھلائی کا ایک عارضی جذبہ کبھی کبھار پیدا ہو جائے گا مگر وہ مستقل نہ ہو گا' اور وہ ایک ایسا جھکاؤ ہو گا جس کے رخ کو معمولی آندھی پھیر سکے گی۔ وہ کسی واضح' قابل فہم اور ٹھوس بنیاد پر نہ ہو گا نہ اس کا کسی مکمل اور جامع اور سیدھے نظام حیات سے ربط ہو گا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَٰذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَٰكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ

"رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا تو اللہ کے مقابلے میں نہ ان کا مال کچھ کام دے گا' نہ اولاد وہ تو آگ میں جانے والے لوگ ہیں۔ اور آگ ہی میں ہمیشہ رہیں گے۔ جو کچھ وہ اپنی اس دنیا کی زندگی میں خرچ کر رہے ہیں اس کی مثال اس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہو اور وہ ان لوگوں کی کھیتی پر چلے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اسے برباد کر کے رکھ دے۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا' درحقیقت یہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔"

یوں اس حقیقت کو ایک ایسے منظر کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے' جس میں حرکت ہی حرکت ہے۔ اور یہ حرکت زندگی سے بھرپور ہے اور یہ قرآن کا حسین و جمیل طرز تعبیر ہے' جس میں ایک نظری حقیقت بھی متحرک نظر آتی ہے۔"

ان کفار کے اموال اور ان کی اولاد اللہ کے مقابلے میں ان کے کچھ کام نہ آئے گی' وہ اپنے جرائم کا جرم ادا نہ کر سکیں گے' اس لئے کہ وہاں نہ زور چلے گا اور نہ زر۔ یہ لوگ جہنمی ہیں اور وہ دنیا میں جو مال بھی خرچ کرتے ہیں وہ اکارت جائے گا اور بے اثر ہو گا۔ اگرچہ انہوں نے جن کاموں میں مال خرچ کیا وہ اسے کار خیر سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ خیر وہی ہوتی ہے جس کی کونپلیں شاخ ایمان سے پھوٹیں اور جن کا تعلق ایمان سے ہو' لیکن قرآن کریم اس کی تعبیر اس طرح نہیں کرتا جس طرح ہم کرتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو ایک زندہ اور

متحرک منظر کی صورت میں پیش کرتا ہے' جو نبض کی طرح متحرک ہو۔

ہم ایک ایسے مقام پر کھڑے ہیں جس کے سامنے ایک ہرا بھرا کھیت ہے' اس کی فصل کٹائی کے لئے تیار ہے۔ کھیت لہلہا رہا ہے۔ اچانک تیز ہوا چلتی ہے' یہ نہایت سرد برفانی ہوا ہے' شدید سردی کی وجہ سے تیار فصل جل جاتی ہے' یہ دیکھا گیا ہے کہ شدت برودت کی وجہ سے فصل جھلس جاتی ہے۔ الفاظ اسی طرح استعمال ہوئے ہیں کہ گویا اس کھیت پر بڑی تیزی اور قوت کے ساتھ سنگ باری ہوتی ہے اور پورے کے پورے کھیت کو برباد اور خراب کر دیا جاتا ہے۔

چشم زدن میں یہ پورا عمل سرانجام پاتا ہے۔ "آنا" فانا" کھیت ملیامیٹ اور خراب ہو جاتا ہے۔ یہی مثال اس دنیا میں ان لوگوں کے انفاق کی ہے جو کافر ہیں' اگرچہ وہ بظاہر کار خیر اور اچھے مقاصد میں خرچ کرتے ہیں نیز ان لوگوں کے اموال اور اولاد بھی کچھ کام نہ دیں گے۔ قیامت میں سب کے سب بے کار ہوں گے۔ وہ وہاں نہ کوئی حقیقی دولت ہوں گے اور نہ ان پر کوئی جزاء ہوگی اور نہ مفید بن سکیں گے۔

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ........................ "اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا' وہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔" خود انہوں نے اس نظام زندگی سے روگردانی کی جو تمام انفرادی بھلائیوں اور اچھائیوں کو جمع کرنے والا ہے' ان کو ایک خط مستقیم پر لاتا ہے اور مستحکم کر کے ایک مرکز تک پہنچاتا ہے۔ جس کا ایک مقرر ہدف ہے' ایک قابل فہم داعیہ ہے' اس میں نیکی کا ایک خاص طریق کار ہے' اس میں نیکی کو کسی عارضی جذبے یا کسی پوشیدہ خواہش اور یا کسی بے ربط عمل کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاتا بلکہ اس میں نیکی اور بھلائی ایک مستقل دائمی منہاج کے مطابق سرانجام دی جاتی ہے۔

ان لوگوں نے خود اپنے لئے گمراہی اور نافرمانی کا راستہ اختیار کیا' انہوں نے اللہ کی رسی کی حفاظت سے منہ موڑا' جس کی وجہ سے ان کے تمام اعمال اکارت گئے' یہاں تک کہ جو مال انہوں نے بظاہر کار خیر میں صرف کئے وہ بھی ضائع ہوئے۔ جب ان کا کھیت بھی تباہ ہو گیا' تو پھر ان کا مال ان کے کس کام اور ان کی اولاد ان کے کس کام؟ یہ ظلم انہوں نے خود اپنے آپ پر کیا ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے خود نافرمانی اور روگردانی کا راستہ اپنے لئے اختیار کیا۔

غرض یہ فیصلہ کن بات ہے کہ کوئی انفاق فی سبیل اللہ اور کوئی عمل صالح اس وقت تک مفید نہیں ہے جب اس کا رابطہ ایمانی منہاج سے نہ ہو' جب تک وہ ایمانی داعیہ پر مبنی نہ ہو۔ یہ فیصلہ اللہ کا ہے' یہ اللہ کا کہنا ہے لہٰذا اس میں انسان کے لئے کچھ کہنے کا کوئی موقعہ باقی ہی نہیں رہتا۔ اس فیصلے کو وہی لوگ چیلنج کر سکتے ہیں جو اللہ کی آیات کو چیلنج کرتے ہیں' لیکن ان کا یہ چیلنج علم و دانش پر مبنی نہیں ہوتا۔ وہ ہدایت پر مبنی ہوتا ہے' نہ کتاب الٰہی کے روشن دلائل پر۔

○.....☆☆☆.....○

یہ سبق جس کا آغاز اہل کتاب کے طرز عمل میں انحراف اور بگاڑ سے ہوا تھا' جس میں بتایا گیا تھا کہ اہل کتاب کے جدال و مناظرے میں کیا کیا مغالطے ہیں' جس میں تفصیلاً بتایا گیا کہ یہ اہل کتاب مسلمانوں کے خلاف کیا کیا سازشیں کر رہے ہیں' جس میں جماعت مسلمہ کو بتایا گیا تھا کہ اس کرۂ ارض پر اس کے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہیں' قطع نظر اس سے کہ یہ فاسق' بگڑے ہوئے لوگ جو محاربہ کر رہے ہیں وہ کیا کہتے ہیں۔ اس سبق کے آخر میں جو اس پوری سورت میں ایک طویل سبق ہے' جماعت مسلمہ کو بڑی سختی سے ڈرایا جاتا ہے کہ وہ ہرگز ان لوگوں کے ساتھ خفیہ دوستی نہ رکھے جو اس کے قدرتی دشمن ہیں۔ اس کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ ان دشمنوں کو اپنا راز دان بنائے یا ان پر بھروسہ کرے' جبکہ وہ ان تمام لوگوں کے بھی پکے دشمن ہیں جو ایمان لائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آئی ہوئی یہ

تنبیہ اور تخویف ایک دائمی اصول کی صورت میں ثبت ہوتی ہے اور ہم اس کا مصداق آج بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ ایک ایسی شکل میں ہے جسے قرآن کریم نے ایک زندۂ جاوید صورت میں قلم بند کیا ہے لیکن قرآن کے حاملین آج اس سے غافل ہیں۔ چنانچہ ان کی اس غفلت کی وجہ سے ان پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں اور آئندہ بھی وہ یقیناً شر و فساد سے دوچار ہوں گے اور ان سے توہین آمیز سلوک کیا جائے گا اگر وہ نہ سمجھے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ
قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَ مَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا
لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ هٰاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَ لَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَ
تُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَ اِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَ اِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ
الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾
اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۫ وَ اِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَ اِنْ
۱۲ ع ۱۱ ۳ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾

"اے ایمان لانے والو! اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ۔ وہ تمہاری خرابی کے کسی موقعے سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے۔ تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے۔ ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔ ہم نے تمہیں صاف صاف ہدایات دے دی ہیں' اگر تم عقل رکھتے ہو (تو ان سے تعلق رکھنے میں احتیاط برتو گے) تم ان سے محبت رکھتے ہو مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے۔ حالانکہ تم تمام کتب آسمانی کو مانتے ہو۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بھی (تمہارے رسول اور تمہاری کتاب کو) مان لیا ہے' مگر جب جدا ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف ان کا غیظ و غضب کا یہ حال ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ اپنے غصے میں آپ جل مرو' اللہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔ تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے' اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس پر حاوی ہے۔"

یہ ایک مکمل تصویر ہے' جو نفس انسانی کی اندرونی کیفیات کی مظہر ہے۔ جو انسان کے ظاہری خدوخال کو بھی پیش کرتی ہے اور اس کی

باطنی کیفیات کو بھی اچھی طرح دکھاتی ہے اور انسان کے ظاہری تاثرات کو بھی دکھاتی ہے اور انسان کی آنے اور جانے والی حرکات کا اظہار بھی اس سے ہوتا ہے۔ اس تصویر میں ایک ایسے انسان کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے جو آئے دن ہر جگہ اور ہر زمانے میں ہماری نظروں کے سامنے آتا رہتا ہے اور جماعت مسلمہ کے اردگرد پھیلے ہوئے دشمنوں میں کل بھی یہ نمونے نظر آتے تھے اور آج بھی نظر آتے ہیں۔ یہ ایسے نمونے ہیں کہ جب مسلمانوں کو غلبہ نصیب ہو تو وہ ان کے دوست بن جاتے ہیں لیکن ان کے دل کی ہر دھڑکن ان کی تکذیب کرتی ہے اور ان کا ہر عضو ان کو جھٹلاتا ہے لیکن مسلمان ان سے دھوکہ کھاتے ہیں اور وہ ان سے محبت کرتے ہیں اور ان پر اعتماد کرتے ہیں لیکن اس کے مقابلے میں وہ لوگ مسلمانوں کے لئے صرف بے چینی اور ناکامی ہی کو پسند کرتے ہیں اور وہ مسلمانوں کو نافرمان بنانے اور ان کے راستوں میں کانٹے بچھانے میں کوئی فروگذاشت نہیں کرتے۔ وہ ہر وقت ان کے خلاف سازشیں کرتے ہیں جب بھی انہیں فرصت ملے چاہے رات کو ملے یا دن کو ملے۔

یہ تصویر جس کے عجیب خدوخال قرآن کریم نے یہاں بتائے ہیں' اور جس کا اطلاق سب سے پہلے ان اہل کتاب پر ہوتا تھا جو مدینہ میں مسلمانوں کے پڑوس میں رہتے تھے۔ یہ ایسی تصویر ہے جو اپنے فیچرز سے اس بات کا اظہار کر رہی ہے کہ یہ لوگ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف جو بے پناہ کینہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے وہ اسے چھپا رہے تھے۔ یہ رات دن مسلمانوں کے خلاف سازشیں تیار کر رہے تھے' اور مسلمانوں کی نسبت ان کی نیت میں ہر وقت کھوٹ پایا جاتا تھا۔ اور ان کے ان پوشیدہ جذبات میں ہر وقت ابال آتا رہتا تھا' اس کے برخلاف سادہ دل مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ ابھی تک ان میں سے بعض لوگوں کو ان کے بارے میں غلط فہمی تھی' بعض لوگ ابھی تک ان کے لئے اپنے دل میں محبت رکھتے تھے' اور ابھی تک ان کو یہ اطمینان تھا کہ اگر ہم ان کو کوئی راز بتا دیں تو وہ انہیں بطور امانت محفوظ رکھیں گے۔ اس لئے انہوں نے ان اہل کتاب میں سے بعض لوگوں کو جگری دوست' ساتھی اور رازدان بنا لیا تھا اور وہ جماعت کے اندرونی راز تک انہیں بتانے سے نہ چوکتے تھے' اس لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں یہ روشنی دی گئی جس میں جماعت مسلمہ نے ان کے اندروں کو دیکھ لیا اور حقیقت سے آگاہ ہو گئے۔ اور اس روشنی کے ساتھ انہیں یہ سخت تنبیہہ کی گئی اور انہیں اپنے ان قدرتی دشمنوں کے خفیہ منصوبوں اور سازشوں سے آگاہ کیا گیا' اور یہ بتایا گیا کہ وہ ایسے دشمن ہیں جو کبھی ان کے لئے مخلص نہیں ہو سکتے' مسلمانوں کی جانب سے محبت اور ہم نشینی ان کے اس دلی بغض کو صاف نہیں کر سکتی' یہ تبصرہ اور یہ تنبیہہ اسلامی تاریخ کے کسی خاص دور کے ساتھ مخصوص نہیں ہے' بلکہ یہ ایک دائمی حقیقت ہے' یہ ایک دائمی صورت حال کا مقابلہ ہے اور اس کا مصداق ہم اپنے موجودہ دور میں ایک کھلے مشاہدے کے طور پر اپنے سامنے پاتے ہیں۔

آج مسلمان اپنے رب کریم کے اس حکم سے غافل ہیں' اس نے حکم دیا ہے کہ وہ اپنے سوا کسی کے ساتھ دوستی نہ رکھیں خصوصاً ایسے لوگوں کے ساتھ جو ان کے مقابلے میں اپنی اصلیت کے اعتبار سے بھی کم تر ہیں' نظام زندگی کے اعتبار سے بھی کم تر ہیں اور اپنے وسائل کے اعتبار سے بھی کم تر ہیں۔ اس لئے انہیں چاہئے کہ وہ ان پر اعتماد نہ کریں' ان کو رازدان نہ بنائیں اور ان سے کوئی مشورہ نہ لیں۔ لیکن مسلمانوں کی غفلت کی انتہاء ہے کہ وہ اپنے رب حکیم کا یہ مشورہ بھول چکے ہیں اور ایسے لوگوں کو انہوں نے اپنے لئے ہر معاملے میں مشیر اور مرجع بنایا ہوا ہے۔ ہر معاملے میں' ہر موضوع پر اور ہر مسئلے کے بارے میں' ہر سوچ میں' ہر فکر میں' ہر منہاج میں اور ہر طریقہ کار میں انہوں نے ان لوگوں کو اپنا استاد و مرشد بنا رکھا ہے۔

اللہ کی اس سخت تنبیہہ و تخویف سے آج مسلمان غافل ہیں' وہ ان لوگوں سے دوستی کر رہے ہیں جو اللہ اور رسول کے دشمن ہیں' انہوں نے اپنے دل و دماغ کے دریچے ان دشمنوں کے لئے وا کر دیئے ہیں' حالانکہ اللہ تعالیٰ پہلی جماعت مسلمہ سے بھی کہتے ہیں اور آج کی

جماعت مسلمہ کو بھی کہتے ہیں اور ہر دور کی جماعت مسلمہ کو بھی کہتے ہیں اور آگاہ کرتے ہیں۔

وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ۚ

"تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے۔ ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔"

اور اللہ تعالیٰ مزید فرماتے ہیں:

هَا أَنْتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۚ

"اور تم ان سے محبت رکھتے ہو؟ مگر وہ تو تم سے محبت نہیں رکھتے' حالانکہ تم تمام کتب سماوی کو مانتے ہو' جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بھی مان لیا ہے' مگر جب جدا ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف ان کے غیظ و غضب کا یہ حال ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں۔"

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا ۖ ..............

.............. "تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔"

بار بار ہم تجربات کے تھپیڑے کھاتے ہیں' مگر ہمیں ہوش نہیں آتی' بار بار ہم پر سازشوں اور تخریب کاریوں کا انکشاف ہوتا ہے' جو مختلف بھیس بدل کر کی جاتی ہیں' مگر ہم عبرت نہیں حاصل کرتے' بار بار ان دشمنوں کی زبان پر ایسی باتیں آجاتی ہیں جن سے ان کے دلی کینہ کا اظہار ہوتا ہے' جسے مسلمانوں کی مسلسل محبت اور دوستی کی مساعی زائل نہ کر سکیں اور جسے مسلمانوں کی دینی رواداری بھی صاف نہ کر سکی' لیکن ہم پھر بھی وہی کچھ کرتے ہیں اور ان کے لئے اپنے دل کھول دیتے ہیں' ان میں سے دوست چن لیتے ہیں اپنی زندگی میں بھی اور اپنے نظام زندگی میں بھی۔ اور ان لوگوں کے ساتھ ہماری رواداری اس حد تک پہنچ جاتی ہے یا ہماری روحانی شکست کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے نظریہ حیات میں بھی ان کے ساتھ مجاملت اور مداہنت کرتے ہیں اور اس رواداری یا روحانی شکست کی وجہ سے ان کے سامنے اپنے نظریۂ حیات کے ذکر سے بھی ڈرتے ہیں' ان کے ساتھ ہم اپنے نظام حیات میں بھی رواداری کرتے ہیں اور اسے اسلامی نظریۂ حیات کی اساس پر استوار نہیں کرتے' ان کی خاطر ہم اپنی تاریخ میں بھی تحریف کرتے ہیں' اپنے نشانات راہ ان کی خاطر مٹاتے ہیں تاکہ اس تاریخ کے بیان میں ان معرکوں کا ذکر نہ آجائے جن میں ہمارے اسلاف نے ان کے خلاف کامیابیاں حاصل کیں۔ یہی ذہنی شکست ہے جس کی وجہ سے ہم پر وہ عذاب نازل ہوتا ہے' جو ہر اس قوم پر نازل ہوتا ہے جو اللہ کے امر سے سرتابی کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ذلیل و خوار ہوتے ہیں' ہم ضعیف و ناتواں ہوتے ہیں اور ہم شرمندہ اور نامراد ہوتے ہیں اور ہمیں وہ نقصان پہنچ جاتا ہے جس پر ہمارے دشمن خوش ہوتے ہیں اور ہم اس ناکامی اور خرابی سے دوچار ہوتے ہیں' جس کی سازش وہ ہماری صفوں کے اندر کرتے ہیں۔

لیکن دیکھو' ہماری یہ کتاب ہمیں وہ طریقہ بتاتی ہے کہ کس طرح ہم ان دشمنوں سے جان بچائیں' جس طرح اس کتاب نے یہ سبق پہلی جماعت اسلامی کو بھی سکھایا تھا کس طرح ہم ان کی ایذا رسانیوں سے بچیں گے' کس طرح ہم اس کینے سے محفوظ ہوں گے جو ہمارے خلاف ان کے دلوں میں چھپا ہوا ہے اور کبھی کبھار اس کی چنگاری کے منہ سے نکل جاتی ہے۔

وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ....

............ "مگر ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو' جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس پر حاوی ہے۔"

تو وہ طریقہ صبر اور عزم کا طریقہ ہے اور ان کے مقابلے میں ڈٹ جانے کا طریقہ ہے۔ (اگرچہ وہ بہت ہی طاقتور ہوں) اور ان کی مکاری اور سازشوں کے مقابلے میں جم جانے کا طریقہ ہے۔ اگر وہ سازشوں اور خفیہ ریشہ دوانیوں کا طریقہ اپنائیں تو ہمارا طریقہ صبر اور اپنے نظریۂ حیات پر پختگی سے جم جانے کا طریقہ ہو گا۔ بہہ جانے' ختم ہو جانے اور دوسروں کے مقابلے میں ذلیل ہونے کا طریقہ نہیں ہو گا۔ نہ یہ کوئی صحیح پالیسی ہے کہ دشمنوں کو خوش کرنے کے لئے یا ان کے متوقع شر و فساد کی وجہ سے ہم اپنے تمام نظریات یا بعض نظریات کو ترک کر دیں۔

دشمنان اسلام کے مقابلے میں دوسرا طریق کار خدا خوفی کا طریق کار ہے۔ صرف ایک خدا سے ڈرنا اور صرف اس کی نگرانی کا احساس رکھنا تقویٰ اور خدا خوفی ہی وہ ذریعہ ہے جس سے انسانی دل اپنے رب سے مربوط ہو جاتے ہیں' ان کا تعلق صرف ان لوگوں سے ہوتا ہے جو اس اللہ کے نظام میں داخل ہوتے ہیں اور وہ صرف اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب ایک دل ذات باری کی معرفت حاصل کر لیتا ہے تو پھر اس کے اندر سے اللہ کے سوا تمام دوسری قوتوں کا خوف دور ہو جاتا ہے اور جس قدر عزم پختہ ہو جاتا ہے اسی قدر اللہ سے یہ رابطہ مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے وہ کسی کے سامنے نہیں جھکتا۔ اور نہ ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں۔ محض اپنی جان بچانے کے لئے یا دنیاوی عزت و ناموس کمانے کے لئے۔

مسلمانوں کے لئے یہی ایک راستہ ہے' صبر و تقویٰ کا راستہ اور اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لینے کا راستہ اور اسلامی تاریخ میں مسلمانوں نے جب بھی تاریخ اسلام میں صرف ایک اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑا اور اپنی پوری زندگیوں میں اسلامی نظام حیات اختیار کیا' تو انہوں نے عزت اور وقار کا مقام پایا' وہ کامران رہے' اور اللہ نے انہیں دشمنوں کی سازشوں سے بچایا' ان کا کلمہ بلند ہوا' اور اپنی تاریخ میں مسلمانوں نے جب بھی اپنے قدرتی اعداء کی رسی کو تھاما' وہ اعداء جو ان کے نظریۂ حیات کے مقابلے میں خفیہ اور اعلانیہ طور پر باغیانہ جدوجہد میں مصروف ہیں' اور جب کبھی مسلمانوں نے ان اعداء کے مشوروں پر کان دھرا اور انہوں نے انہیں خفیہ طور پر یا ظاہری طور پر دوست بنایا اور انہیں اپنا معاون' مشیر اور ماہر فن بنایا تو اللہ تعالیٰ نے ایسے مسلمانوں کی تقدیر میں شکست لکھ دی' ان کے دشمنوں کو ان کی سرزمین میں قوت دی' ایسے مسلمانوں کو ان کے مقابلے میں ذلیل کیا اور وہ نہایت ہی برے انجام تک پہنچتے رہے۔ اسلامی تاریخ اس بات پر شاہد عادل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ اصول اٹل اصول ہے۔ یہ اس کی ایسی سنت ہے جس میں کوئی تغیر ممکن نہیں ہے' اور جو شخص اس کرۂ ارض پر اللہ کی اس بار بار دہرائے جانے والی سنت کا مشاہدہ نہیں کرتا تو اس کی آنکھیں صرف ذلت' کمزوری اور توہین اور ناتوانی کے آثار ہی کا مشاہدہ کر سکے گی۔

○.....☆☆☆.....○

اس جملے پر یہ سبق اختتام پذیر ہوتا ہے اور اس سورت کا حصہ اول بھی یہاں اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ اہل کفر کے ساتھ معرکہ یہاں زوروں پر ہے اور اہل اسلام اور اہل کفر کے کیمپ یہاں آکر مکمل طور پر ایک دوسرے سے جدا جدا ہو گئے ہیں۔

اس سبق کو ختم کرنے سے پہلے ایک دوسری حقیقت بھی نوٹ کر لینے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ اسلام اپنے خالص اور کھلے دشمنوں کے ساتھ بھی پوری رواداری برتتا ہے۔ وہ ابھی اسلام کو صرف یہ مشورہ دیتا ہے کہ وہ اہل کفر کے ساتھ خفیہ دوستی نہ رکھیں لیکن وہ اہل

اسلام کو یہ حکم نہیں دیتا کہ وہ کفار کے ساتھ دھوکہ کریں' ان کے ساتھ کینہ رکھیں' یا ان سے نفرت کریں یا ان کے خلاف مکاری اور سازشوں کے اسلوب اختیار کریں۔ اسلام صرف انہیں مشورہ دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بچائیں اور اسلامی اتحاد کا دفاع کریں اور اسلامی تشخص کو قائم رکھنے کی تدبیر کریں یعنی اسلام نے صرف انہیں خطرے سے آگاہ کیا' اپنے دفاع کی طرف انہیں متوجہ کیا اور وہ خطرہ انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ اور اس میں ان کے تمام دشمن شریک تھے۔

رہے اہل اسلام تو وہ اسلامی رواداری کے مطابق دوسرے لوگوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں' لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ پاکیزگی اور صفائی پر مبنی ہوتا ہے' وہ لوگوں کے ساتھ بھلائی سے اور محبت کرتے ہوئے ملتے ہیں' وہ اپنے آپ کو سازشوں سے بچاتے ہیں مگر خود کسی کے خلاف سازش نہیں کرتے' وہ دوسروں کے کینہ سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں لیکن خود ان کے دل میں کسی کے ساتھ کینہ نہیں ہوتا' الا یہ کہ دوسرے ان کے دین اور نظام حیات کے خلاف بغاوت اور دشمنی کر رہے ہیں' وہ ان کے نظریۂ حیات میں فتنہ انگیزی کر رہے ہوں' اور لوگوں کو اللہ کے صراط مستقیم پر آنے کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہوں' اگر ایسے حالات ہوں تو پھر مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ایسے جنگجو دشمنوں کے ساتھ برسرپیکار ہوں' تاکہ فتنے کو روکا جائے اور ان رکاوٹوں کو دور کیا جائے جو راہ خدا میں کھڑی کر دی گئی ہوں۔ اور اسلامی نظام کے قیام کے لئے سدراہ ہوں' ہاں ایسے لوگوں کے ساتھ جہاد بھی جہاد فی سبیل اللہ ہو گا۔ صرف ذاتی مقاصد یا ذاتی انتقام کے لئے نہ ہو گا' یہ جہاد پوری انسانیت کی بھلائی کے لئے ہو گا' صرف ان لوگوں کی ذات کے خلاف نہ ہو گا' جنہوں نے اسلام کی راہ کو روکا۔ اور یہ اس لئے ہو گا کہ اسلامی نظام زندگی کا پیغام جو خیر ہے لوگوں تک بے روک ٹوک پہنچ سکے۔ اس لئے جہاد و قتال نہ ہو گا کہ مجاہدین دنیا میں تغلب حاصل کریں' انہیں اس کرۂ ارض پر سربلندی نصیب ہو اور وہ لوگوں کا استحصال کریں' بلکہ مقصد صرف یہ ہو گا کہ اسلام کا نظام زندگی قائم کیا جائے جس کے عادلانہ سایہ تلے سب لوگ انصاف کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں' یہ جہاد کسی قوم کا علم بلند کرنے کے لئے نہیں ہے اور نہ ہی دنیا میں امپریلزم کے قیام کے لئے شروع کیا جاتا ہے۔

یہ وہ حقیقت ہے جس کی تائید قرآن و سنت کی متعدد نصوص سے ہوتی ہے' پہلی جماعت اسلامی کی تاریخ اس کی ترجمان ہے۔ اور یہ جماعت تو بہرحال اس دنیا میں ان نصوص کے مطابق زندگی گزار رہی تھی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلامی نظام زندگی' بھلائی ہی بھلائی ہے۔ جو لوگ اسلامی نظام کی راہ روکتے ہیں وہ پوری انسانیت کے دشمن ہیں' اور اسلامی نظام کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کا پیچھا کرے اور ایسے لوگوں سے انسانیت کی قیادت چھین لے' اور یہی وہ فریضہ ہے جس کے لئے اسلامی جماعت اور خیر امت کو اٹھایا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

# درس ۲۷ ایک نظر میں

اس سے پہلے اس سورت میں ہم مناظرہ اور مباحثہ کے میدان میں تھے' بیانات اور تبصرے ہو رہے تھے' ہدایات اور تنبیہات کا ذکر تھا' لیکن اس دوسرے سبق میں ہم کلام و بیان کے میدان سے نکل کر اب سیف و سنان کے میدان میں جا اترے ہیں۔ سیف و سنان کا یہ معرکہ معرکہ ءاحد کے نام سے مشہور ہے۔

غزوۂ احد صرف میدان جنگ ہی میں نہیں لڑا گیا بلکہ اس معرکے کا میدان بہت ہی وسیع تھا' یہ انسانی ضمیر اور عقائد کے اندر بھی برپا ہوا تھا' میدان جنگ تو اس کے وسیع میدان کارزار کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا۔ یہ معرکہ نفس انسانی کی گہرائیوں میں' انسان کے تصورات اور اس کے شعور میں' انسانی خواہشات اور اس کے میلانات میں اور اس کے اقدامات اور اس کی رکاوٹوں میں برپا تھا۔ اس معرکے کے اندر قرآن کریم نے نفس انسانی کی تربیت نہایت ہی لطیف 'گہرے' موثر اور جامع طریقہ تربیت کے مطابق کی اور اس پر قرآن نے ان دشمنوں سے زیادہ توجہ دی جو میدان معرکہ میں اسلام کے خلاف برسرپیکار تھے۔

اس معرکہ میں داخل ہوتے ہی مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی لیکن انجام کار یہ فتح شکست میں بدل گئی۔ آغاز فتح مبین سے ہوا اور انجام ہزیمت اور شکست و ریخت سے ہوا' لیکن اس شکست و ریخت کے نتیجے میں مسلمانوں کو علم و معرفت واقفیت اور تجربے کے میدان میں واضح فتح نصیب ہوئی' ان کی آنکھیں کھل گئیں' انہوں نے اپنی آنکھوں سے وہ حقائق دیکھ لئے جنہیں قرآن نے بار بار بیان کیا تھا۔ ان کا شعور ان حقائق کے حوالے سے یقین کی حد تک پختہ ہو گیا' ان کے نفوس پاک ہو گئے' ان کی صفوں میں گندے عناصر چھٹ کر الگ ہو گئے' اور جماعت مسلمہ آگے بڑھنے لگی۔ وہ ان لوگوں کے بوجھ سے آزاد ہو گئی جن کے نظریات صاف ستھرے نہ تھے' جن کی اقدار حیات ناپختہ تھیں' جن کی فکر ڈانواں ڈول تھی۔ یہ مسئلہ یوں حل ہوا کہ اسلامی صفوں سے منافقین کی اکثریت چھٹ کر الگ ہو گئی' نفاق کی علامات واضح ہو کر سامنے آگئیں اور سچائی کے اوصاف نکھر کر واضح ہو گئے۔ اقوال میں بھی اور افعال میں بھی۔ شعور میں بھی اور طرز عمل میں بھی۔ اس معرکے کے نتیجے میں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ ایمان کے تقاضے کیا ہیں' دعوت ایمانی کے تقاضے کیا ہیں' اور تحریک ایمانی کو لے کر اٹھنے کے تقاضے کیا ہیں۔ نیز اس تحریک کو لے کر چلنے کے لئے کس قدر علمی استعداد کی ضرورت ہے' کس قدر یکسو ہو کر تیاری کی ضرورت ہے' اور کس قدر مستحکم تنظیم کی ضرورت ہے۔ اور اس تنظیم و انتظامات کے بعد کس قدر سنگین سمع و اطاعت کی ضرورت ہے۔ اور تنظیم اور سمع و اطاعت کے بعد کس قدر توکل علی اللہ کی ضرورت ہے۔ اس راہ کے ہر قدم پر اللہ پر مکمل بھروسے کی ضرورت ہے اور پوری جدوجہد کر کے بھی نتیجہ' نصرت کی شکل میں ہو یا شکست کی صورت میں' اللہ پر چھوڑ دینا ہے۔ زندہ رہ کر غازی ہونا ہے یا مر کر شہید ہونا ہے' کیا کرنا ہے اور کدھر جانا ہے یہ سب امور اللہ کے ہاتھ میں دے دینا ہے۔

ان واقعات کے نتیجے میں جماعت مسلمہ کے لئے جو بیلنس شیٹ بنی اور ان واقعات کے بعد جماعت کو قرآن کریم نے جو ہدایات دیں' اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے وہ اس مال غنیمت کے مقابلے میں بہت زیادہ اہم تھیں جو فتح مبین کی صورت میں مسلمانوں کو حاصل ہوتا' اس صورت میں کہ مسلمان احد کے میدان سے فتح و نصرت لے کر واپس ہوتے۔ اس لئے کہ اس دور میں مسلمانوں کو ان تجربات کی ضرورت ہزار درجے زیادہ تھی بہ نسبت اس کے کہ وہ میدان سے فتح و نصرت اور مال غنیمت لے کر لوٹتے۔ اس طرح جماعت مسلمہ کے بعد آنے والی امت کے لئے تجربات کا جو سرمایہ چھوڑا گیا وہ زیادہ اہم اور زیادہ باقی رہنے والا تھا' بہ نسبت اس فتح اور مال غنیمت کے جو فتح

کی صورت میں مسلمان حاصل کرتے۔ اس شکست کے پس منظر میں عالم بالا کا منصوبہ یہ تھا کہ اس واقعہ کے ذریعہ وہ نقائص ظاہر کر دیئے جائیں جو مسلمانوں کی صفوں میں پائے جاتے تھے' مثلاً ان کی جسمانی کمزوریاں' اخلاقی کمزوریاں اور فکری ژولیدگی۔ اور ظاہر ہے کہ صرف شکست کھانے کی صورت ہی میں یہ کمزوریاں ظاہر ہو سکتی تھیں۔ عالم بالا کا منصوبہ یہ تھا کہ اس وقت' اللہ کی سنت جاریہ کے مطابق' ٹھیک قدرتی طور پر اور سلسلہ اسباب کے اندر' مسلمانوں کو شکست ہو' اور اس وقت مسلمانوں کے لئے یہ شکست زیادہ مفید تھی' تاکہ جماعت مسلمہ ان تجربات سے دوچار ہو اور اسے عبرت حاصل ہو اور اس طرح اس کی عملی تربیت ہو' اس کی سوچ پختہ ہو جائے اور وہ واقعات کو اپنے فطری انداز میں سمجھے' نیز اس کی صفوں میں کھرے اور کھوٹے کا امتیاز ہو جائے۔ اس کی تنظیم اور تربیت میں جو جھول پائی جاتی تھی وہ دور ہو جائے اور پھر آنے والی امت کے لئے تجربات اور واقعات کا ایک عظیم سرمایہ ریکارڈ پر آجائے' جو اس قدر قیمتی ہو کہ جس کی قیمت نہ چکائی جا سکتی ہو یعنی اس معرکے میں فتح و نصرت سے بھی اس کی قیمت زیادہ ہو۔

یہ معرکہ میدان کارزار میں ختم ہوا اور اب قرآن کریم کے صفحات میں اسے لیا گیا' جو میدان جنگ سے بڑا میدان ہے' پھر یہ معرکہ نفس انسانی کے میدان میں شروع ہوا اور آخر کار وہ جماعت مسلمہ کی اجتماعی زندگی کے میدان میں شروع ہوا' یوں اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے اس جماعت کو بنایا' علم و حکمت کی اساس پر اور تجزیہ و بصیرت کی روشنی میں اور پھر جس طرح اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی اس کے مطابق یہ جماعت تیار ہوئی۔ اسی میں اس جماعت کی بھلائی تھی کہ اسے ضرر پہنچے' اسے اذیتیں دی جائیں' اسے مبتلائے مصیبت کیا جائے' اور اسے سخت رنج و الم سے دوچار کیا جائے۔

اس معرکہ کے واقعات پر یہاں جو اختتامیہ دیا گیا ہے اور جو تبصرہ کیا گیا ہے اس میں جو چیز قابل التفات اور قابل تعجب ہے وہ یہ ہے کہ اس میں اس معرکہ کے مناظر اور واقعات کے بیان کے ساتھ ساتھ ان واقعات کے بارے میں ہدایات بھی ساتھ ساتھ موقعہ پر دی گئی ہیں اور ان ہدایات کے ساتھ ایسی ہدایات بھی دی گئی ہیں جن سے تزکیہ نفس اور تطہیر قلب و نظر کا بھی سامان کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے افکار کو گرد و غبار سے صاف کیا گیا ہے۔ ان کے افکار و تصورات کو خواہشات نفسانیہ کے قیود سے آزاد کیا گیا ہے' مسلمانوں کے کردار سے طمع و لالچ' بغض و کینہ' حرص اور بخل' پوشیدہ خواہشات اور فسق و فجور کو بڑی حکمت کے ساتھ پاک کیا گیا ہے۔

اور ان تعقیبات اور تبصروں میں خصوصاً معرکہ کارزار کے واقعات کے اندر سودی کاروبار سے بھی بحث کی گئی ہے اور سود خوری سے روکا گیا ہے جو بظاہر بے جوڑ نظر آتی ہے اور اس کے بعد یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہر اہم معاملے میں مشورہ ضرور کیا جائے' اور اس پر عمل کیا جائے' اس کے باوجود کہ جنگ احد کے بارے میں جو شوریٰ ہوئی اور فیصلے ہوئے' اس کے نتائج بظاہر اچھے نہ نکلے تھے اور جنگ میں شکست ہو گئی تھی۔ یہ بات بھی قابل تعجب ہے (تفصیلی بحث بعد میں آتی ہے)

پھر اس کے بعد قرآن کریم' اس موقعہ پر انسانی نفسیات پر بھی بحث کرتا ہے' انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو لیتا ہے۔ اس زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مختلف حرکات کے مباحث کو ایک دوسرے کے اندر ملا دیا جاتا ہے۔ یہ مختلف النوع مباحث ایک دوسرے کے ساتھ متداخل نظر آتے ہیں اور بعض اوقات یہ عجیب نظر آتے ہیں۔

لیکن جو لوگ اس ربانی طریقہ کار سے واقف ہیں انہیں وسیع اور مختلف النوع مباحث کی ملاوٹ اور ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ کرنے پر کوئی تعجب نہیں ہوتا' اس لئے کہ تحریک اسلامی جس معرکہ میں کودی ہے' وہ صرف میدان کارزار ہی کا معرکہ نہیں ہے جس میں صرف اسلحہ' گھوڑے اور افراد کار اور ساز و سامان در کار ہوتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ جنگی تدابیر اور جنگی چالیں کام میں لائی جاتی ہیں۔ بلکہ یہ ایک وسیع اور ہمہ گیر معرکہ ہوتا ہے اور میدانی جنگ اس کا ایک حصہ یا شعبہ ہوتا ہے۔ اصل معرکہ وہ عظیم کشمکش ہے اور تھی جو انسانی ضمیر

کی دنیا میں برپا ہوتی ہے' یہ کشمکش اس وقت جماعت کی اجتماعی تنظیم کے اندر برپا تھی' اس معرکے کا تعلق انسانی ضمیر کی پاکیزگی سے تھا' انسانی ضمیر کو خالص اور خالی کرنا مقصود تھا' اور اسے ان تمام آلودگیوں سے پاک کرنا مطلوب تھا' جن سے اس کی صفائی اور پاکیزگی متاثر ہوتی تھی۔ اور انسانی ضمیر قرب الٰہی سے دور بیٹھ جاتا تھا۔ نیز اس معرکے کا تعلق ان تنظیمی امور سے بھی تھا جن پر جماعت مسلمہ کی زندگی کا دارومدار تھا' اسلامی نظام زندگی کے مطابق' یعنی وہ شورائی نظام جس پر پوری اجتماعی زندگی کی عمارت اٹھائی گئی تھی' یعنی صرف نظام حکومت میں ہی نہیں بلکہ پورے اسلامی نظام حیات میں' جو باہم تعاون کے اصول پر قائم ہے اور جس میں سود خوری جیسا ظالمانہ نظام ممنوع ہے اس لئے کہ سود خوری اور باہم تعاون دو متضاد اصول ہیں۔

اسلام' جماعت مسلمہ کی تربیت صرف ایک میدانی جنگ کے بعد کے نقطہ نظر سے نہ کر رہا تھا' بلکہ وہ اس کی تربیت اس عظیم کشمکش کے حوالے سے کر رہا تھا جو وسیع تر میدان میں برپا تھی' انسانی نفس کے میدان میں انسان کی عملی زندگی کے میدان میں اسلام نے ربا کی طرف توجہ کی تو اسے حرام قرار دیا' وہ انفاق کی طرف متوجہ ہوا تو خواہ خوشحالی ہو یا بدحالی اس پر لوگوں کو ابھارا۔ اس نے اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کو اللہ کی رحمت کے لئے ضروری قرار دیا۔ اس نے غصہ پینے اور عفو و درگزر کا حکم دیا' اس نے احسان اور استغفار کا حکم دیا۔ گناہ پر اصرار کرنے سے منع کیا اور توبہ کا حکم دیا۔ اور ان سب امور کو اللہ کی رضامندی کے اسباب قرار دیا۔ انہیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے لئے رحم دل کر کے بھیجا گیا۔ اس نے حکم دیا کہ مشکل سے مشکل اوقات میں شوریٰ کے اصول کو قائم رکھا جائے' اس نے حکم دیا کہ معاملات میں راستی کو اختیار کیا جائے اور بددیانتی نہ کی جائے۔ دولت کو خرچ کیا جائے اور بخل و کنجوسی سے اجتناب کیا جائے۔ غرض یہ اور دوسری ہدایات غزوۂ احد پر تبصرے کے دوران فرمائی گئیں۔

اسلام نے ان سب احکام کی طرف توجہ دی اس لئے کہ یہ وہ عناصر ہیں جن کے ذریعے جماعت مسلمہ کو وسیع تر معرکے اور کشمکش کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ جس میں میدان جنگ میں قتال بھی شامل تھا مگر یہ معرکہ صرف قتال تک محدود نہ تھا بلکہ یہ وسیع تر ذمہ داریوں کا معرکہ تھا تاکہ اس کے نتیجے میں ایک عظیم انقلابی فتح حاصل کی جائے۔ یہ عظیم اور مکمل فتح اپنی لپیٹ میں نفس انسانی' اس کی تمام خواہشات' اس کی ہر قسم کی حرص و لالچ' اس کی تمام کینہ پروری کو لے لے۔ نیز پرامن حالات میں بھی یہ جماعت مسلمہ کے لئے اقدار و اطوار کے میدان میں فتح عظیم پر مشتمل ہو۔

اسلام نے ان تمام امور پر پوری توجہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ پوری انسانیت کی تکوین اور اس کی تشکیل اور اس کی سرگرمیوں کا جائزہ اسلامی نظریۂ حیات کے نقطہ نظر کے مطابق لیا جائے اور پوری انسانیت کو ایک ہی محور کے گرد گھما دیا جائے' وہ محور کیا تھا؟ یہ کہ بندگی صرف اللہ کی ہو گی' پرستش صرف اللہ کی ہو گی' انسان پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ خدا کا خوف دل میں رکھتے ہوئے' اپنے رب کی طرف متوجہ ہوں' اور اللہ کا منہاج زندگی اس پوری کائنات پر چھا جائے اور پوری انسانیت اپنے حالات میں سے ہر حال میں اسی منہاج کے مطابق زندگی بسر کرے۔ اور انسانی زندگی کے مختلف حالات اسلامی نظام زندگی کے رابطے میں مربوط ہوں اور انسانی تگ و دو کے تمام نتائج بھی اسلامی منہاج کے نتائج کے مطابق ہوں اور نفس انسانی کی تمام حرکات اور تمام تنظیمات اور انسانی نظم و نسق کی تمام جزئیات ان آخری نتائج کے برآمد کرنے میں ممد اور مؤثر ثابت ہوں۔

اس لئے جنگ احد پر تبصرے کے درمیان کئی دوسرے مباحث پر بھی گفتگو کی گئی جو اس معرکے کے ساتھ بے جوڑ ہرگز نہیں ہیں' اس لئے کہ نفس انسانی جب تک اپنے شعور و ادراک اور اپنی عادات اور اخلاق میں فاتح نہ ہو گا وہ معرکہ قتال میں بھی فاتح نہیں ہو سکتا۔ اور وہ لوگ جو مقابلے کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا

دیئے تھے۔ (۱۵۵)اور جو لوگ نظریاتی جنگوں میں' اپنے انبیاء کی قیادت میں سرخرو ہوئے تھے' وہ اس لئے سرخرو ہوئے تھے کہ وہ ان معرکوں میں کودنے سے پہلے اپنے گناہوں سے توبہ کر چکے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ سے کامیابی کی التجا کے ساتھ آگے بڑھے تھے اور اللہ کے مضبوط سہارے پر بھروسہ کرتے ہوئے میدان کارزار میں کودے تھے۔ اس لئے گناہوں سے پاکیزگی' اللہ کے ساتھ جڑنا' اللہ پر بھروسہ رکھنا دراصل وہ سازوسامان ہے جس کے نتیجے میں نصرت اور فتح نصیب ہوا کرتی ہے۔ اس لئے ان عوامل کو میدان جنگ سے دور نہیں کیا جا سکتا' لہٰذا سودی نظام معیشت کو ختم کر کے باہم تعاون (Co-operation) کے نظام کو قائم کرنا بھی گویا فتح مندی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے۔ سودی معاشرے کے مقابلے میں باہمی تعاون و تکافل کا معاشرہ فتح مندی سے زیادہ قریب ہے۔ اس طرح غصے کو پی جانا اور غلطیوں کو معاف کر دینا بھی سامان جنگ میں سے اہم ہتھیار ہے' اپنے نفس امارہ کو قابو میں رکھنا بھی ایک قسم کی جنگی تربیت ہے۔ معاشرہ کا معاشی لحاظ سے باہم کفیل ہونا' باہم انس اور محبت رکھنا' ایک دوسرے کی کوتاہیاں معاف کرنا وغیرہ بھی ایک ایسی فعال قوت عامل ہے جو فتح کی ضامن ہے۔

ان عوامل کے ساتھ کچھ مزید حقائق بھی تھے جن پر اس سبق میں شروع سے آخر تک بھروسہ کیا گیا ہے' مثلاً تقدیر الٰہی کی اہمیت اور یہ کہ اللہ نے جن باتوں کا فیصلہ کیا ہوا ہے انہوں نے وقوع پذیر ہونا ہی ہے' اس لئے جو غلطی ہوگئی' اس سلسلے میں اپنے تصور حیات اور اپنے خیالات کو قطعیت کے ساتھ درست کر لیا جائے کہ جو کچھ ہوا وہ سنت الٰہی کے مطابق ہوا' انسانی سرگرمیوں اور اس کی مساعی' انسان کے درست طرز عمل اور اس کی غلطیوں' انسان کی اطاعت امر اور اس کی معصیت' اسلامی منہاج کو مضبوطی سے پکڑ لینا اور اس میں کوتاہی کرنا' ان سب کے نتائج سنت الٰہی کے مطابق مرتب ہوتے ہیں اور سنت الٰہی کے یہ سب مظاہر پردۂ تقدیر کے پیچھے سے ٹھیک ٹھیک نمودار ہوتے ہیں اور یہ سب مشیت الٰہی کے نمونے ہوتے ہیں اور جو کچھ واقع ہو جائے وہ اللہ کے طے شدہ فیصلے ہوتے ہیں' اس لئے ان پر کوئی تاسف کرنے کی ضرورت نہیں۔

اسی نکتے کو آخر میں' جماعت مسلمہ کو خطاب کرتے ہوئے یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اگر تمہیں فتح نصیب ہو تو اتراؤ نہیں' اس میں تمہارا کچھ بھی نہیں ہے' تم تو اللہ کی تدبیر اور اس کی تقدیر کے آلات ہو اور یوں تمہیں جہاد کے میدان میں لا کر اللہ اپنی قدرت کے نمونے دکھا رہا ہے۔ اس لئے اس تمام جدوجہد کا اجر اللہ پر ہی ہے' اس لئے کہ تم اللہ کا کام کر رہے ہو' تمہارے لئے بطور استحقاق اس دنیا میں فتح مندی کے ثمرات میں کوئی ثمرہ لازمی نہیں ہے اور نہ فتح لازم ہے۔ یہ تو اللہ ہے کہ جسے چاہے فتح دے دے اور وہ یہ فتح دنیاوی مقاصد کے لئے بھی عطا نہیں کرتا بلکہ وہ ان مقاصد عالیہ کے لئے عطا کرتا ہے' جو اس کو مطلوب ہیں' اسی طرح شکست بھی جب کسی کے حصے میں آتی ہے تو وہ بھی سنت الٰہیہ کے مطابق واقعہ ہوتی ہے' اور اس کے حقیقی اسباب خود جماعت مسلمہ کے اندر کمزوریوں اور کمیوں کی صورت میں موجود ہوتے ہیں اور اس شکست میں بھی' اللہ کے علم کے مطابق کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے' مثلاً جماعت مسلمہ کا تزکیۂ نفس' اس کی صفوں سے غلط لوگوں کا چھانٹ کر الگ کرنا' حقائق اور تلخ حقائق کا اظہار' اعلیٰ قدروں کا استحکام اور حسن و قبح کے پیمانوں کا قیام اور آئندہ آنے والوں کے لئے عبرت اور نصیحت آموزی کے لئے نمونوں اور مثالوں کا قیام۔

اسلام کی نظر میں عسکری کامیابی' سیاسی کامیابی یا اقتصادی کامیابی کی اس وقت تک کوئی قدروقیمت نہیں ہے' جب تک یہ کامیابی ربانی نظام حیات کی اساس پر نہ ہو' اس کامیابی میں ظاہری فتح و نصرت کے ساتھ ساتھ نفس انسانی پر فتح' خواہشات نفسانیہ پر غلبہ اور شہوات کے مقابلے میں کامیابی حاصل نہ ہو' اور اس سچائی کو غلبہ نصیب نہ ہو جسے اللہ تعالیٰ لوگوں کی زندگیوں میں قائم کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہر فتح اللہ کی فتح ہو اور اسلامی نظام زندگی کے لئے ہو۔ اگر یہ صورت حال نہ ہو تو پھر جو بھی فتح ہوگی وہ جاہلیت کی فتح ہوگی کسی دوسری جاہلیت کے مقابلے

میں ہوگی' ایسی فتح کے نتیجے میں نہ زندگی کو کوئی فائدہ ہو گا نہ انسانیت کا کوئی بھلا ہو گا۔ بھلائی تو یہ ہوگی کہ بھلائی کے جھنڈے محض سچائی کے لئے بلند ہوں اور سچائی اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ہے' اس میں تعدد ممکن نہیں ہے اور وہ اسلامی اور الٰہی منہاج حیات ہے' جس کے علاوہ کسی اور منہاج کے لئے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور اسلامی نظام حیات کی فتح اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک یہ فتح سب سے پہلے نفس انسانی کے میدان میں واقع نہ ہو' اس کے بعد انسان کی عملی زندگی میں حق کو یہ فتح نصیب نہ ہو۔ جب نفس انسانی اپنی ذات میں اپنی خودی کو گم کر دے' اپنی ذات سے لالچ اور خواہش نفس کو ختم کر دے' اسے گندگیوں اور کینہ پروری سے پاک کر دے' وہ پوری طرح نفسانی بندھن توڑ دے اور اس کی نظریں صرف ذات باری کی طرف اٹھ رہی ہوں اور وہ ان تمام بوجھوں اور بندھنوں سے آزاد ہو جائے جن میں وہ جکڑا ہوا ہے' غرض جب وہ پوری جدوجہد کر کے اور پوری تگ و دو کے بعد اپنی ظاہری مادی قوت' اپنے مادی وسائل' اپنے ظاہری اسباب سے آزاد ہو کر صرف اللہ کی ذات پر بھروسہ کرنے لگے' اور جب وہ اپنی پوری زندگی کے معاملات میں اللہ کے حکم کے مطابق فیصلے کرے اور اللہ کی اس حاکمیت کے قیام کو اپنی تمام جدوجہد اور فتح و نصرت کا مقصد اعلیٰ سمجھے' غرض جب وہ یہ تمام امور اچھی طرح مکمل کر لے تو تب میدان کارزار میں اس کی عسکری کامیابی' کسی ملک میں اس کی سیاسی کامیابی اور اقتصادی کامیابی صحیح فتح تصور ہوگی' اور تب جاکر اس کی فتح اللہ کے نزدیک فتح ہوگی ورنہ دراصل وہ ایک جاہلیت کی دوسری جاہلیت پر فتح تصور ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس قسم کی فتح کی نہ کوئی قیمت اور نہ کوئی وزن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ معرکہ بدر پر تبصرے کے درمیان درج بالا امور پر بھی بحث کی گئی ہے جو بظاہر بے جوڑ نظر آتی ہے۔ متنوع امور کو اکٹھا کیا گیا ہے اور اس معرکہ پر اختتامیہ اور تبصرہ میں ان تمام امور کو شامل کیا گیا ہے' اور ان امور کو اس وسیع میدان جنگ میں لایا گیا ہے' جس کا ایک حصہ میدان بدر ہے' جس کے بہت سے پہلوؤں میں سے احد ایک پہلو ہے۔

○.....☆☆☆.....○

اس سے پہلے کہ ہم معرکہ احد کے واقعات پر یہ قرآنی تبصرہ پیش کریں' یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ احد کے واقعات کو اس ترتیب کے ساتھ پیش کر دیا جائے جس کے ساتھ وہ کتب سیرۃ میں بیان ہوئے ہیں۔ تاکہ ہم ان مقامات کو اچھی طرح سمجھ سکیں جن پر اللہ کی جانب سے تبصرہ ہوا اور ہم اس بات کا ادراک کر سکیں کہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ تربیت کیا ہے' جو اللہ نے قرآن کریم میں ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے اختیار کیا ہے؟

حالات یہ تھے کہ مسلمانوں کو بدر میں مکمل فتح نصیب ہوئی تھی۔ اور یہ ایک ایسا واقعہ تھا اور جن ظروف و احوال میں یہ پیش آیا تھا' ان میں یہ ایک بہت بڑا معجزہ نظر آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کے ہاتھوں کفر کے علم برداروں اور بڑے بڑے سرداروں کے سر قلم کروائے۔ جو لوگ قتل ہوئے وہ قریش کے سردار تھے۔

اس کے بعد ابوسفیان بن حرب قریش کا سردار مقرر ہوا۔ سردار مقرر ہوتے ہی اس نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لئے تیاریاں شروع کر دیں' ابوسفیان کا قافلہ بدر میں مسلمانوں کا ٹارگٹ تھا' جس کے پاس قریش کا کافی تجارتی مال تھا۔ اس قافلے میں وہ بچ نکلا تھا' بدر کے بعد مشرکین نے یہ فیصلہ کیا کہ اس قافلے کا تمام تجارتی سامان بطور ابتدائی سرمایہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں استعمال کیا جائے۔

ابوسفیان نے تین ہزار افراد پر مشتمل ایک فوج تیار کی جو قریش' اس کے حلیفوں اور حبشیوں پر مشتمل تھی۔ ماہ شوال ۳ ہجری میں وہ فوج لے کر نکلا۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اپنی عورتیں بھی لے کر آئے تاکہ ان کے بچاؤ کے جوش میں وہ بھاگنے کی کوشش نہ کریں۔ اس نے مدینہ کا رخ کیا اور جبل احد کے قریب اس نے ڈیرے ڈالے۔

اس موقع پر رسول خدا ﷺ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشورہ کیا۔ سوال یہ تھا کہ آپ باہر جاکر مقابلہ کریں یا مدینہ میں ٹھہر جائیں۔ خود حضور اکرم ﷺ کی رائے یہ تھی کہ مسلمان باہر نہ نکلیں بلکہ مدینہ کے اندر قلعہ بند ہو جائیں۔ مرد تنگ گلیوں اور مقامات جنگ پر لڑیں اور عورتیں مکانوں کی چھتوں سے جنگ میں حصہ لیں۔ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ اس رائے میں رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی بھی موافق اور ہم رائے تھا۔ اس پر صحابہ کرام ﷺ کی ایک بڑی تعداد آگے بڑھی اور ان میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو جوان تھے اور جو بدر کی جنگ میں حصہ نہ لے سکے تھے۔ ان لوگوں نے مشورہ دیا کہ ہمیں باہر جاکر میدان جنگ میں لڑنا چاہئے۔ انہوں نے اپنے مشورے پر کافی اصرار بھی کیا۔ یہ بات ظاہر ہو گئی کہ جماعت میں اکثریت کی رائے یہی ہے۔ آپ اٹھے اور آپ اپنے مکان 'حجرۂ عائشہ رضی اللہ عنہا میں داخل ہوئے اور اپنی زرہ پہن کر واپس تشریف لائے۔ اتنی دیر میں ان لوگوں کی رائے بدل چکی تھی۔ انہوں نے سوچا کہ ہم نے رسول خدا ﷺ کو باہر جاکر لڑنے پر خواہ مخواہ مجبور کر دیا۔ اب انہوں نے عرض کی حضور! اگر آپ ﷺ مدینہ کے اندر رہنے کو پسند فرماتے ہیں تو ایسا کر لیں۔ اس پر رسول خدا ﷺ نے فرمایا: "نبی کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کیونکہ نبی جب اپنی زرہ پہن لیتا ہے تو وہ اسے اس وقت تک نہیں اتارتا جب تک اس کے اور دشمن کے درمیان اللہ کوئی فیصلہ نہ کر دے۔" یوں حضور نے انہیں پیغمبرانہ سبق دیا اور وہ سبق یہ تھا کہ شوریٰ کا ایک مقررہ وقت ہوتا ہے' اور جب شوریٰ کا وقت ختم ہو جائے اور عزم و ارادہ کا وقت آجائے اور طے شدہ فیصلے پر عمل کا وقت آجائے تو اس وقت پھر صرف اللہ پر توکل کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر تردد کا کوئی موقعہ نہیں ہوتا۔ نہ دوبارہ شوریٰ کا انعقاد ہوتا ہے اور نہ آراء کے بارے میں دوبارہ سوچا جاتا ہے۔ شوریٰ کے بعد تو معاملات اپنے انتہا کو پہنچ جاتے ہیں اور اب فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو وہ چاہے ظاہر کر دیتا ہے۔

اور حضور ﷺ نے خواب میں دیکھا تھا کہ آپ کی تلوار ایک جگہ سے ٹوٹ کر کند ہو گئی ہے اور ایک گائے ذبح ہو رہی ہے' اور یہ کہ انہوں نے اپنا ہاتھ ایک مضبوط زرہ میں ڈالا ہے۔ آپ نے اس خواب کی تعبیریوں کی تلوار میں کند پڑنے کے معنی یہ ہیں کہ میرے خاندان میں سے کوئی شخص فوت ہو گا' گائے ذبح ہونے کی تعبیر آپ نے یہ فرمائی کہ آپ کے کچھ رفقاء قتل ہوں گے اور زرہ کا مفہوم آپ نے مدینہ سے لیا۔ اس لئے اس خواب کے بعد آپ معرکۂ احد کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے' لیکن اس کے باوجود آپ نے شوریٰ کے طریقہ کار اور فیصلے پر عمل فرمایا' نیز شوریٰ کے بعد اپنی تگ و دو کے ذریعہ فیصلوں پر عمل کیا۔ یہ اس لئے کہ آپ ایک امت کی تربیت فرما رہے تھے' اور اقوام کی تربیت واقعات و حوادث سے ہوا کرتی ہے۔ اور تجربات کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے جس کا نچوڑ چند واقعات کی شکل میں نکلتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ آپ کے فیصلوں کے ذریعہ تقدیر الٰہی کا اظہار ہوتا تھا' وہ فیصلے جن پر آپ کا شعور پختہ تھا' جن پر آپ کا دل مطمئن تھا۔ اس لئے آپ تقدیر الٰہی کے مطابق کام کر رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کا دل ان واقعات کو محسوس کر رہا تھا۔

بہرحال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار صحابہ کرام کو لے کر نکلے' مدینہ میں جو لوگ رہ گئے تھے' ان کو نماز پڑھانے کے لئے آپ نے ابن ام مکتوم کو مقرر فرمایا۔ جب آپ مدینہ اور احد پہاڑ کے درمیان پہنچے تو رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی اس لشکر کے ایک تہائی حصہ کو لے کر واپس ہو گیا' اس نے یہ کہا کہ وہ میری مخالفت کرتے ہیں اور نوجوانوں کی بات سنتے ہیں۔ حضرت جابر کے والد عبداللہ بن عمرو ابن حرام ؓ نے ان کا پیچھا کیا' انہیں سخت وسست کہا اور باصرار انہیں آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ لوٹ آئیں۔ اس نے انہیں پکارا: "آؤ اور اللہ کی راہ میں لڑو' یا کم از کم مدافعت کرو۔" انہوں نے جواب دیا: "اگر ہمیں یقین ہوتا کہ آپ لڑتے ہیں تو ہم واپس نہ ہوتے۔" اس پر حضرت عبداللہ انہیں خوب گالیاں دے کر واپس ہو گئے۔

اس کے بعد انصار میں سے بعض لوگوں نے یہ تجویز پیش کی۔ اس موقعہ پر یہود سے مدد لی جائے جو ہمارے حلیف ہیں۔ لیکن رسول

خدا ﷺ نے اس تجویز کو بھی رد کر دیا۔ اس لئے کہ یہ معرکہ دراصل کفر اور ایمان کا معرکہ تھا' یہودیوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی' اور فتح و نصرت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور یہ فتح تب آتی ہے جب اللہ پر توکل کیا جائے اور قلوب اللہ کے لئے خالص ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا :"کون لوگ ہیں جو ہمارے ساتھ ان لوگوں کے مقابلے کے لئے ریگستان میں اتریں۔" اس پر آپ کے ساتھ انصار میں سے کچھ لوگ نکلے تو آپ وادی کے آخری حصہ میں اترے' آپ نے اپنی پیٹھ احد پہاڑ کی طرف کی اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اس وقت تک جنگ شروع نہ کریں جب تک آپ حکم نہ دیں۔

جب صبح ہوئی تو آپ ﷺ نے سات سو افراد پر مشتمل فوج کو جنگ کے لئے ترتیب دیا۔ ان میں صرف پچاس گھوڑ سوار تھے' آپ نے پچاس تیراندازوں پر عبداللہ بن جبیر کو کمانڈر مقرر فرمایا اور ان لوگوں کو حکم دیا کہ آپ گھاٹی میں جہاں ان کی ڈیوٹی لگا رہے ہیں وہ وہاں جمے رہیں اور اس پوسٹ کو کسی حال میں خالی نہ چھوڑیں' اگرچہ وہ دیکھیں کہ پرندے لشکر اسلام کا گوشت نوچ رہے ہوں' یہ لوگ فوج کی پشت پر پہاڑ میں تھے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ مشرکین پر تیروں کی بارش کر دیں تاکہ وہ پشت کی طرف مسلمانوں پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔

ابن عمیر کو جھنڈا دیا اور آپ ﷺ نے فوج کے ایک طرف پر زبیر ابن العوام کو مقرر فرمایا اور دوسری طرف پر آپ ﷺ نے مصعب ابن عمیر کو مقرر فرمایا۔ احد کے دن نوجوانوں نے اپنے آپ کو جنگ کے لئے پیش کیا۔ آپ نے ان کا معائنہ فرمایا اور جن کو جنگ میں حصہ لینے کے لئے ناقابل پایا انہیں مسترد کر دیا۔ ان میں عبداللہ ابن عمر' اسامہ ابن زید' اسید بن ظہیر' براء ابن عازب' زید ابن ارقم و زید بن ثابت' عرابہ ابن اوس اور عمرابن حزام تھے۔ اور جن لوگوں کو جنگ کے قابل قرار دیا گیا وہ سمرہ ابن جندب اور رافع بن خدیج تھے۔ یہ پندرہ سال کے تھے۔

قریش نے تین ہزار فوجیوں کو جنگ کے لئے تیار کیا۔ ان میں سے دو صد گھوڑ سوار تھے' انہوں نے میمنہ پر خالد ابن الولید اور میسرہ پر عکرمہ ابن ابی جہل کو مقرر کیا۔

آج رسول خدا ﷺ نے اپنی تلوار ابو دجانہ سماک ابن خرشہ کو عطا فرمائی اور وہ ایک ایسے بہادر سورما تھے جو جنگ کے وقت نہایت شوکت اور تعلی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔

مشرکین میں سے پہلے جو شخص نمودار ہوا وہ ابو عامر فاسق تھا۔ یہ ابو عامر راہب کے لقب سے مشہور تھا مگر حضور ﷺ نے اس کا نام ابو عامر فاسق رکھ دیا۔ یہ شخص دور جاہلیت میں قبیلہ اوس کا سردار تھا۔ جب اسلام آیا تو وہ اسلام کے خلاف ہو گیا اور اس نے علی الاعلان رسول خدا ﷺ کے ساتھ عداوت شروع کر دی۔ اس نے مدینہ چھوڑ دیا اور قریش سے جا ملا اور انہیں رسول خدا ﷺ کے خلاف جمع کرتا رہا اور انہیں رسول خدا ﷺ کے خلاف جنگ پر آمادہ کرتا رہا۔ وہ انہیں یقین دلاتا کہ اس کی قوم جب اسے دیکھے گی تو وہ اس کی بات مان کر رسول خدا ﷺ کو چھوڑ دے گی۔ یہ سب سے پہلے مسلمانوں کے سامنے آیا۔ اس نے اپنی قوم کو پکارا' اور اس نے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے جواب دیا :اے فاسق اللہ آپ کو آنکھیں نہ دے۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ میرے بعد میری قوم تباہ ہو گئی ہے۔ اس کے بعد اس نے مسلمانوں کے ساتھ شدید جنگ کی۔

اور جب لڑائی شروع ہوئی تو ابو دجانہ نے داد شجاعت دی۔ ان کے ساتھ طلحہ ابن عبیداللہ' حمزہ ابن عبدالمطلب' علی ابن ابی طالب' نضر بن انس اور سعد ابن ربیع نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ دن چڑھتے ہی مسلمانوں نے کفار کو شکست دے دی۔ ان میں سے انہوں نے ستر بہادر اور معتبر افراد کو قتل کر دیا اور باقی دشمنان خدا ہزیمت اٹھا کر بھاگ گئے' وہ کیمپ میں عورتوں کے پاس پہنچ

گئے۔ عورتوں نے اپنے کپڑے سمیٹ لئے اور بھاگنے لگیں۔

تیر اندازوں کے دستے نے جب دیکھا کہ کفار کو شکست ہو گئی ہے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے ہیں تو انہوں نے اپنے وہ مقامات خالی کر دیئے جہاں انہیں رسول خدا ﷺ نے مامور فرمایا تھا اور حکم دیا تھا کہ وہ انہیں ہرگز نہ چھوڑیں۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ مال غنیمت لٹ رہی ہے یارو! ان کے امیر نے انہیں حضور اکرم ﷺ کا حکم یاد دلایا مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مشرکین اب نہیں لوٹیں گے چنانچہ یہ لوگ بھی مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور گھاٹی کو انہوں نے خالی کر دیا۔

خالد بن ولید کو یہ معلوم ہوا کہ گھاٹی کو تیر اندازوں نے خالی کر دیا ہے' اس لئے وہ مشرکین کے گھوڑ سواروں کو لے کر گھاٹی کے راستے حملہ آور ہوئے' انہوں نے دیکھا کہ راستہ خالی ہے' یوں خالد کی جنگی چال کامیاب ہوئی اور وہ مسلمانوں پر پشت کی جانب سے ٹوٹ پڑا اور جس وقت مشرکین اور شکست خوردہ لشکر نے دیکھا کہ خالد مسلمانوں پر چڑھ دوڑا ہے تو انہوں نے بھی آگے کی طرف سے انہیں گھیرے میں لے لیا۔

اب اس معرکے کی صورت حال مکمل طور پر تبدیل ہو گئی' میدان جنگ مسلمانوں کے خلاف ہو گیا۔ مسلمانوں کی صفوں میں افراتفری مچ گئی۔ لوگوں کے اندر اضطراب پھیل گیا اور وہ سخت خائف ہو گئے۔ اس لئے کہ خالد کا حملہ اس قدر ہولناک اور اس قدر اچانک تھا کہ کسی کو بھی اس کی توقع نہ تھی۔ بہت سے لوگ مارے گئے اور مسلمانوں میں سے جس کی قسمت میں شہادت لکھی ہوئی تھی وہ شہید ہوا۔ اب مشرکین کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تک راہ پانے کا موقعہ مل گیا۔ آپ تنہا رہ گئے تھے' آپ کی حفاظت کے لئے اس قدر تھوڑے افراد رہ گئے تھے کہ انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ انہوں نے رسول خدا ﷺ کا دفاع کیا اور شہید ہو گئے۔ حضور اکرم ﷺ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا' آپ کے نچلے جبڑے اور دانت مبارک زخمی ہوا اور آپ کے سر پر خود ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا' مشرکین نے آپ کو پتھروں سے مارا' یہاں تک کہ آپ ایک پہلو پر گر گئے۔

اس کے بعد آپ ایک گڑھے میں گر گئے جو ابو عامر فاسق نے کھودا تھا اور اوپر سے ڈھانپ دیا تھا کہ مسلمان اس میں گر جائیں اور زرہ کے حلقے آپ کے چہرۂ مبارک میں گھس گئے تھے۔ اس خوفناک صورت حال کے عین درمیان کسی نے چیخ کر یہ آواز دی کہ حضرت محمد ﷺ شہید ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اس خوفناک آواز نے ان کی رہی سہی قوت بھی ختم کر دی۔ چنانچہ بچے کھچے مسلمان بھاگ کھڑے ہوئے اور حضور ﷺ کی وفات کی خبر سن کر وہ اس قدر مایوس ہوئے اور اس قدر کبیدہ خاطر ہوئے کہ ان کی قوت نے جواب دے دیا۔ اب انہوں نے جنگ کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔

تمام لوگ بھاگ کھڑے ہوئے مگر انس ابن نضر نہیں بھاگے۔ وہ حضرت عمر ابن الخطاب' طلحہ ابن عبداللہ کے پاس پہنچے جو بعض مہاجرین اور انصار کے ساتھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہاتھ لٹکائے ہوئے تھے' تو انہوں نے کہا: تم لوگ کیوں بیٹھے ہوئے ہو' انہوں نے کہا رسول خدا ﷺ شہید ہو گئے ہیں۔ تو انہوں نے کہا: "تو رسول خدا ﷺ کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کرو گے؟" "اٹھو اور جس مقصد کے لئے حضور اکرم ﷺ نے جان دے دی اس کے لئے جان دے دو۔" اس کے بعد انس ابن نضر کفار پر ٹوٹ پڑے' اس وقت انہیں سعد ابن معاذ ملے اور انہوں نے انہیں پکار کر کہا: "سعد میں جنت کی ہوا احد کے اس پار سے محسوس کر رہا ہوں۔" اس کے بعد انہوں نے سخت لڑائی کی یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ ان کے جسم پر ستر سے کچھ اوپر زخم آئے تھے' انہیں کوئی پہچان بھی نہ سکا۔ آخر کار ان کی لاش کو ان کی بہن نے ان کی انگلیوں سے پہچان لیا۔

اب حضور ﷺ مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے انہیں خود کے نیچے حضرت سعید بن مالک نے پہچانا۔ انہوں نے

باواز بلند چیخ نکلی۔ اے گروہ مسلماناں! مبارک، رسول خدا ﷺ یہ ہیں۔ حضور ﷺ نے ہاتھ سے اشارہ کیا "خاموش رہو" مسلمان آپ کے پاس جمع ہوگئے۔ آپ کے ساتھ گھاٹی پر چڑھ گئے۔ ان میں حضرت ابوبکر، عمر ابن الخارث، ابن صمہ انصاری وغیرہ تھے۔ جب وہ پہاڑ پر کافی اوپر چڑھ گئے تو رسول خدا ﷺ کو ابی ابن خلف ملا۔ وہ اپنے عود نامی گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ اس گھوڑے کو مکہ میں چارہ دیتے وقت کہتا: "اس پر میں محمد کو قتل کروں گا۔" جب حضور اکرم ﷺ کو اس بات کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا: "ان شاء اللہ میں اسے قتل کروں گا" جب حضور ﷺ نے اسے پایا تو حارث نے نیزہ لیا اور اس سے اس خدا کے دشمن کے سینے کی بالائی ہڈی (Collar Bon) پر وار کی۔ وہ اس طرح شور کرتے ہوئے بھاگا جس طرح بیل۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ مارا گیا۔ جس طرح رسول خدا نے پیشین گوئی کی تھی۔ واپس ہونے سے پہلے وہ راستے ہی میں مر گیا۔

اس موقعہ پر ابوسفیان پہاڑ کے اوپر آیا اور آواز دی: "کیا تم میں محمد ہیں؟" حضور نے فرمایا اسے جواب نہ دو۔ پھر اس نے کہا: کیا تم میں ابوبکر صدیق ہیں؟ پھر بھی مسلمانوں نے جواب نہ دیا۔ "کیا تم میں عمر ابن الخطاب ہیں؟" پھر بھی اسے کوئی جواب نہ دیا گیا۔ اس نے صرف ان تینوں کے بارے میں پوچھا۔ اس پر اس نے اپنی قوم سے کہا "جہاں تک ان تین افراد کا تعلق ہے ان کا کام تم نے تمام کر دیا ہے۔ اس موقعہ پر حضرت عمر ؓ ضبط نہ کر سکے اور کہا: "اے اللہ کے دشمن! جن کا ذکر تم نے کیا ہے وہ سب زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان لوگوں کو باقی رکھا ہے جنہیں تم پسند نہ کرو گے۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ بعض لوگوں نے شہداء کی لاشوں کو مثلہ بنایا ہے۔ میں نے تو ان کو اس بات کا حکم نہ دیا تھا، مگر ان کی اس حرکت پر میں نے برا بھی نہیں منایا۔ (اس میں اس کا اشارہ اس واقعہ کی طرف تھا جس میں اس کی بیوہ ہندہ نے حضرت حمزہ کی لاش کے ساتھ کیا تھا۔ حبشی نے جب اسے قتل کیا، ہندہ نے ان کا پیٹ پھاڑا، ان کا کلیجہ نکالا، اس نے اسے چبایا اور پھر پھینک دیا۔)

اس کے بعد اس نے نعرہ لگایا اُعْلُ ہُبَلْ...... (ہبل سربلند ہو) حضور ﷺ نے فرمایا تم اسے جواب نہیں دے رہے، صحابہ نے کہا ہم کیا جواب دیں؟ آپ نے فرمایا تم کہو اَللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَلّ ............... (اللہ سربلند ہے اور جلیل القدر ہے) پھر اس نے کہا لَنَا عُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ ............... (ہمارا معبود عزیٰ ہے اور تمہارا کوئی عزیٰ نہیں ہے) اس پر پھر حضور ﷺ نے فرمایا تم لوگ اسے جواب نہیں دے رہے۔ صحابہ کرام نے پوچھا حضور کیا جواب دیں؟ آپ نے فرمایا تم کہو اَللّٰہُ مَوْلٰنَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ ............... (اللہ ہمارا مالک ہے اور تمہارا کوئی مالک نہیں ہے) اس پر ابوسفیان نے کہا: "آج کا دن بدر کے بدلے میں ہے۔" اور جنگ میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ اس پر حضرت عمر ؓ نے فرمایا: "بالکل برابری نہیں ہے، ہمارے مقتول جنت میں ہیں اور تمہارے مقتول دوزخ میں ہیں۔"

جب یہ معرکہ ختم ہوا تو مشرکین لوٹے۔ اس پر مسلمانوں کو شک گزرا کہ شاید وہ مدینہ میں جاکر عورتوں کو غلام بنائیں گے اور لوٹ مار کریں گے۔ یہ بات ان پر بہت ہی بھاری گزری۔ اس پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "علی! تم نکلو، ان کے پیچھے پیچھے جاؤ، دیکھو وہ کیا کرتے ہیں؟ ان کا ارادہ کیا ہے؟ اگر انہوں نے گھوڑوں کو ایک طرف چھوڑا اور سامان اونٹوں پر لادا تو وہ مکہ کی طرف جا رہے ہوں گے اور اگر انہوں نے اونٹوں کو چلایا اور گھوڑوں پر سوار ہوئے تو سمجھو کہ وہ مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کر رہے ہیں۔ خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر انہوں نے مدینہ کا ارادہ کیا تو میں ان کی طرف ضرور چلوں گا اور مدینہ میں ان سے لڑوں گا۔

حضرت علی ؓ فرماتے ہیں میں نکلا، ان کے پیچھے چلا، دیکھوں کہ وہ کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے گھوڑوں کو چھوڑ دیا اور اونٹوں پر سوار ہوگئے۔ جب وہ کچھ راستہ طے کر کے آگے نکلے تو انہوں نے ایک دوسرے کو ملامت کی۔ انہوں نے کہا تم نے کچھ بھی نہ کیا۔ تم نے ان کی

قوت کو تو ختم کر دیا مگر تم نے ان کو چھوڑ دیا۔ اور ان میں سے بعض سردار ایسے رہ گئے جو تمہارے لئے پھر جمع ہوں گے۔ اس لئے یہیں سے لوٹ جاؤ اور ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو۔ یہ بات حضور اکرم ﷺ تک پہنچی۔ حضور ﷺ نے مدینہ میں اعلان کیا اور حکم دیا کہ نکلیں اور دشمن کو راستے ہی میں جالیں۔ "اب ہمارے ساتھ وہی شخص جا سکتا ہے جو احد میں حاضر ہوا تھا" حضور ﷺ سے عبداللہ ابن ابی نے درخواست کی کہ "میں تمہارے ساتھ جاتا ہوں۔" آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں۔" مسلمانوں نے اس قدر خوفناک صورت حال میں بھی آپ کی پکار پر لبیک کہا حالانکہ وہ زخموں سے چور چور تھے۔ انہوں نے کہا: "ہم نے سنا اور مانا۔" حضرت جابر ابن عبداللہ نے اجازت چاہی اور کہا حضور میں ہر مقام پر آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں مگر احد کے دن میرے والد نے مجھے روک لیا کہ میں اپنی بہنوں کی حفاظت کے لئے رہوں۔ اس پر آپ ﷺ نے اسے اپنے ساتھ چلنے کی خصوصی اجازت دی۔ حضور ﷺ اور مسلمان مدینہ سے نکلے۔ حمراء الاسد تک جا پہنچے۔ یہاں آپ سے معبد ابن ابو معبد خزاعی آکر ملے۔ یہ مسلمان ہو گئے تھے لیکن ابوسفیان کو ان کے اسلام کے بارے میں علم نہ تھا۔ حضور ﷺ نے ان سے کہا کہ وہ ابوسفیان سے ملیں اور انہیں ڈرائیں۔ وہ مقام روحاء میں اسے ملے۔ ابوسفیان کو اس کے مسلمان ہونے کا علم نہ تھا۔ "معبد تمہارے پیچھے کون آرہا ہے؟ اس سے ابوسفیان نے پوچھا۔ اس نے جواب دیا: "محمد اور اس کے ساتھی آرہے ہیں۔ تم سے وہ جلے ہوئے ہیں اور وہ اس قدر جمعیت کے ساتھ آرہے ہیں' جس قدر جمعیت ان کے ساتھ کبھی نہ نکلی تھی۔ محمد کے جو ساتھی اس جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے وہ نادم ہو گئے ہیں۔" اس پر ابوسفیان نے کہا: "تمہاری رائے کیا ہے؟" اس نے کہا کہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ جب تک تم کوچ کرتے ہو' وہ لشکر اس پہاڑی کے پیچھے سے نمودار نہ ہو جائے۔" اس پر ابوسفیان نے کہا کہ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس سے ایک بار پھر پنجہ آزمائی کریں اور ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ اس پر معبد نے کہا: "ایسا ہرگز نہ کرو' میں تمہارا ناصح مشفق ہوں۔ اس پر وہ مکہ کی طرف واپس لوٹے۔

راستے میں ابوسفیان کو بعض مشرکین ملے جو مدینہ جارہے تھے۔ ابوسفیان نے کہا کیا تم محمد کو میرا یہ پیغام پہنچا دو گے؟ اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمہیں اور تمہارے گھوڑوں کو اپنے ہاں ٹھہراؤں گا جب تم مکہ آؤ۔ تو ان جانے والوں نے کہا ہاں ہم پیغام دیں گے۔ اس پر ابوسفیان نے کہا کہ محمد کو یہ پیغام دے دو کہ ہم نے ایک بار دوبارہ تم سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے تاکہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ حضرت محمد ؐ اور مسلمانوں کو اس کی یہ بات پہنچی تو انہوں نے کہا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ........................ (ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہترین وکیل ہے) اور اس پیغام سے ان پر کوئی اثر نہ ہوا' مسلمان تین دن تک وہاں ٹھہرے اور ابوسفیان کا انتظار کرتے رہے' اس کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ مشرکین اپنی راہ پر بہت دور جا چکے ہیں تو مسلمان مدینہ کو لوٹ آئے۔

○.....☆☆☆.....○

میں یہ کہوں گا کہ غزوۂ احد کے واقعات کا یہ خلاصہ اس قدر مجمل ہے کہ اس میں اس کے تمام پہلوؤں کو نہیں سمویا جا سکا۔ نہ اس خلاصے میں وہ تمام واقعات دیئے گئے ہیں جو اس غزوہ میں پیش آئے اور جو ہمارے لئے مثالی تھے یا جن سے ہم عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہم یہاں مناسب سمجھتے ہیں کہ اس غزوہ کے بعض ان انفرادی واقعات کا ذکر یہاں کر دیں جن میں ہمارے لئے کوئی ہدایت ہے تاکہ اس غزوہ کی فضاء کو یہاں دوبارہ زندہ کیا جا سکے۔

عمر بن قمیئہ ان مشرکین میں سے تھا جو احد کی بھگدڑ کے دوران حضور ؐ تک پہنچ گیا۔ جبکہ اس وقت حضور ؐ اکیلے تھے۔ یہ اس وقت ہوا جب تیر اندازوں نے اپنی جگہ خالی کر دی تھی اور کفار نے مسلمانوں کو گھیرے میں لے لیا تھا اور یہ آوازہ پھیل گیا تھا کہ حضرت محمد ؐ مارے گئے ہیں اور اس افواہ کی وجہ مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو گیا اور وہ ہمت ہار گئے۔

ایسے شدید حالات میں بڑے بڑے سورماؤں کے اوسان بھی خطا ہو جاتے ہیں لیکن ایسے حالات میں ام عمارہ نسیبہ بنت کعب المازنیہ نے حضور ﷺ کا بھرپور دفاع کیا۔ اس نے زبردست جوہر دکھائے۔ اس نے عمرابن قمیئہ کو اپنی تلوار سے کئی بار ضربات پہنچانے کی کوشش کی۔ اس نے اوپر تلے دو زرہ پہن رکھی تھیں' اس لئے وہ بچ گیا۔ لیکن وہ ام عمارہ کو ان کے کاندھے پر شدید طور پر زخمی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان حالات میں ابو دجانہ اپنی خالی پیٹھ کے ذریعے حضور ؐ کو بچا رہے تھے۔ تیر آکر ان کی پیٹھ میں لگتے لیکن وہ حضور ؐ کے سامنے کھڑا رہا۔ نہ حرکت کی اور نہ ہی حضور ﷺ پر تیر لگنے دیا۔

حضرت طلحہ ابن عبید اللہ بار بار رسول خدا ﷺ کی جانب لوٹتے تھے اور صرف اکیلے آپ کے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے یہاں تک کہ وہ مارے گئے۔ صحیح ابن حبان میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر ؓ نے فرمایا' کہ احد کے دن سب لوگ رسول ؐ خدا کے پاس سے چلے گئے تھے' میں پہلا آدمی تھا کہ جو رسول ؐ خدا کی طرف لوٹا۔ میں نے دیکھا کہ حضور کے سامنے ایک شخص کھڑا ہے اور آپ ؐ کا دفاع کر رہا ہے اور ہر طرف سے آپ کو بچا رہا ہے۔ میں نے کہا ہو نہ ہو طلحہ ہے' اس پر میرے باپ و ماں قربان ہوں' خدا کرے تم طلحہ ہو' تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں' تھوڑی ہی دیر میں میرے ساتھ ابو عبیدہ ابن الجراح بھی آ ملے۔ وہ پرندے کی طرح دوڑ رہے تھے۔ جب ہم دونوں ملے تو ہم رسول خدا ﷺ کی طرف دوڑے۔ ہم نے دیکھا طلحہ آپ کے سامنے شہید ہو گئے تھے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :"دیکھو تمہارا بھائی شہید ہو گیا۔" حضور ؐ کے رخسار مبارک زخمی ہو چکے تھے۔ آپ کو تیر مارا گیا تھا۔ آپ کے زرہ کے حلقے آپ کے چہرۂ مبارک کے اندر گھس گئے تھے۔ میں آپ ﷺ کے پاس گیا تاکہ زرہ کے حلقے آپ کے رخساروں سے نکالوں' اس پر ابو عبیدہ نے کہا میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ مجھے یہ کام کرنے دیں۔ آپ نے اپنے منہ میں وہ تیر کو منہ کے ساتھ آہستہ آہستہ نکالتا رہا تاکہ حضور ؐ کو تکلیف نہ ہو' اس سے حضرت ابو عبیدہ کا ایک دانت ختم ہو گیا۔ حضرت ابوبکر فرماتے ہیں۔ میں پھر گیا تاکہ دوسرا تیر میں نکالوں۔ اس پر ابو عبیدہ نے کہا خدا کے لئے مجھے نکالنے دیں۔ اس کے بعد اس نے دوسرے تیر کو بھی دانتوں سے پکڑا اور آہستہ آہستہ اسے کھینچا یہاں تک کہ اسے نکال لیا' اس کے ساتھ اس کا دوسرا دانت بھی نکل گیا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا اپنے بھائی کو سنبھالو' وہ تو مر گیا۔ اس کے بعد ہم طلحہ کی طرف مڑے' اس کا ہم نے علاج کیا۔ اس پر تقریباً چودہ زخم تھے۔

حضرت علی ؓ پانی لائے اور حضور کے زخموں کو دھویا۔ آپ زخموں پر پانی ڈالتے تھے اور حضرت فاطمہ انہیں دھو رہی تھیں' جب خون نہ رکا تو انہوں نے چٹائی کا ایک حصہ جلایا اور اس کی راکھ زخم پر رکھی اور اس طرح خون رک گیا۔

ابو سعید خدری کے والد مالک نے آپ کے زخم کو چوس کر پاک و صاف کیا۔ اس پر اسے رسول خدا ﷺ نے کہا کہ اب اسے تھوک دیں۔ اس پر اس نے جواب دیا :"خدا کی قسم میں اسے ہرگز نہ تھوکوں گا۔" اس پر حضور ﷺ نے فرمایا :"جو شخص کسی جنتی کو دیکھنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ اس شخص کو دیکھ لے۔"

صحیح مسلم میں ہے کہ حضور ﷺ احد کے دن سات انصار اور دو قریشیوں کے ساتھ علیحدہ رہ گئے تھے' جب کفار نے آپ پر سخت دباؤ ڈالا تو آپ نے فرمایا :"کون ہے جو انہیں مجھ سے دور کرے اور اس کے لئے جنت اجر ہے؟" اس پر انصار میں سے ایک شخص آگے بڑھا' تو اس نے کفار سے جنگ کی یہاں تک کہ وہ شہید ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے پھر حضور پر سختی کی تو حضور نے پھر فرمایا انہیں مجھ سے کون دور کرے گا' اور اس کے لئے جنت ہے۔ ایسا ہی ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ سات افراد شہید ہو گئے۔ اس پر رسول خدا ﷺ نے فرمایا :"ہم نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔" اس کے ان کفار کا ابو طلحہ نے سخت مقابلہ کیا یہاں تک کہ انہیں حضور سے دور کر دیا۔ اور جس طرح ہم نے کہا کہ حضرت ابو دجانہ نے اپنی پشت کے ساتھ حضور پر ڈھال کا کام کیا یہاں تک کہ یہ مصیبت ٹل گئی۔ اور حضور ﷺ

اس وقت اس قدر تھک گئے تھے کہ آپ اور حضور پہاڑ پر چڑھ رہے تھے اور مشرکین ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ آپ ایک پتھر کے اوپر چڑھنا چاہتے تھے' لیکن آپ چڑھ نہ سکے۔ طلحہ آپ کے نیچے بیٹھے یہاں تک کہ آپ چڑھ گئے۔ اس وقت نماز کا وقت ہو گیا تھا' حضور نے ان کے ساتھ نماز پڑھی۔"

اس دن کے واقعات میں سے بعض یہ ہیں۔

حنظلہ انصاری' جو "غسیل داد فرشتگان" کے نام سے مشہور ہے' نے ابوسفیان کو دبالیا تھا' جب اس نے اسے اچھی طرح قابو کر لیا تو شداد ابن الاسود نے حملہ کر کے حضرت حنظلہ کو قتل کر دیا۔ وہ جنابت کی حالت میں تھے کیونکہ جب انہوں نے جنگ کے لئے نکلنے کی آواز سنی تو اس وقت وہ اپنی بیوی کے ساتھ تھے' وہ فوراً ہی اٹھے اور جہاد کے لئے نکل پڑے۔ رسول خدا ﷺ نے میدان جہاد میں صحابہ سے کہا کہ اسے فرشتے غسل دے رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ اٹھے اور فرمایا کہ ان کے اہل و عیال سے پوچھو انہوں نے اس کی بیوی سے دریافت کیا تو اس نے ان کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔

حضرت زید ابن ثابت فرماتے ہیں کہ مجھے احد کے دن رسول خدا ﷺ نے بھیجا کہ میں سعد ابن ربیع کو تلاش کروں' میں مقتولین کے درمیان انہیں تلاش کرتا رہا۔ میں ان کے پاس آیا اور وہ آخری سانس لے رہے تھے اور اس کے جسم پر ستر کے قریب ضربات تھیں۔ نیزوں' تیروں اور تلوار کے زخم' میں نے ان سے کہا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو سلام کہتے ہیں اور آپ کو کہتے ہیں کہ تمہارا حال کیا ہے؟ آپ نے کہا کہ رسول ؐ خدا پر سلام ہو' سلام کے بعد ان سے کہیں کہ میں جنت کی ہوا کو محسوس کر رہا ہوں۔ اور میری قوم انصار سے کہیں "تمہارے لئے اللہ کے ہاں کوئی عذر نہ ہو گا اگر تمہارے ہوتے ہوئے کوئی رسول ؐ خدا تک پہنچ گیا جب تک تم میں کوئی ایک شخص بھی موجود ہو۔

ایک مہاجر' ایک انصاری کے پاس سے گزرا۔ اور وہ خون میں لت پت تھا' اس نے کہا اے فلاں! کیا آپ کو اس بات کا علم ہے کہ محمد ؐ قتل ہو گئے ہیں؟ تو انصاری نے کہا کہ اگر محمد ؐ قتل ہو گئے تو انہوں نے دین پہنچا دیا ہے اب تمہیں چاہئے کہ تم اپنے دین کے لئے لڑو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو ابن حرام کہتے ہیں :"میں نے خواب میں دیکھا یعنی احد سے پہلے" کہ مبشر ابن منذر مجھے کہتا ہے :تم چند دنوں میں ہمارے پاس آنے والے ہو' میں نے پوچھا کہ تم کہاں ہو' تو اس نے کہا کہ میں تو جنت میں ہوں اور جنت میں ہم جہاں چاہیں پھرتے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا بدر کے دن تم قتل نہ ہو گئے تھے۔ اس نے کہا ہاں! تو میں نے یہ خواب رسول ؐ خدا سے بیان کیا تو حضور ؐ نے فرمایا :"ابو جابر یہ تو شہادت ہے۔"

حضرت خیثمہ جن کے بیٹے بدر میں شہید ہو گئے تھے' کہتے ہیں کہ میں بدر میں نہیں جا سکا۔ میں بدر میں جانے کے لئے بہت ہی بے تاب تھا۔ اس پر میں نے اپنے بیٹے کے ساتھ قرعہ اندازی کی تو اس کا قرعہ نکل گیا اور اسے شہادت نصیب ہوئی۔ میں نے کل رات اپنے بیٹے کو بہترین شکل میں دیکھا' وہ جنت کے پھلوں میں سے کھا پی رہا تھا اور نہروں میں سیر کر رہا تھا' اس نے مجھے کہا :آپ بھی آ جائیں اور جنت میں ہمارے ساتھ رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدہ کیا تھا وہ مجھے مل گیا ہے۔ "رسول خدا! مجھے یہ شوق دامن گیر ہے کہ میں اس کے ساتھ جنت میں رفیق بن جاؤں۔ اور حال یہ ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میری ہڈیاں پتلی ہو گئی ہیں' مجھے اپنے رب کے ساتھ ملاقات کا شوق ہے۔ اے اللہ کے رسول! آپ دعا فرمائیں کہ مجھے شہادت نصیب ہو' اور میں جنت میں سعد کا رفیق بن جاؤں۔ اس کے لئے رسول ؐ خدا نے دعا کی یہی وجہ ہے کہ وہ احد کے دن شہید ہوئے۔

اس دن کے بارے میں عبداللہ ابن جحش نے فرمایا :"اے اللہ میں تمہیں قسم دے کر یہ سوال کرتا ہوں کہ میں کل دشمن سے ضرور

ملوں اور وہ مجھے قتل کر دیں۔ پھر وہ میرا پیٹ چاک کریں اور وہ میری ناک کاٹ دیں اور میرے کان کاٹ دیں اور اس کے بعد اے اللہ آپ مجھ سے پوچھیں کہ ان لوگوں نے ایسا کیوں کیا تو میں کہوں کہ یہ محض تیری رضا کے لئے۔

عمرو بن الجموح ؓ بہت بڑے درجے کے لنگڑے تھے۔ ان کے چار جوان بیٹے تھے' جو رسول ؐ خدا کے ساتھ جنگوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ جب بھی آپ جنگ کے لئے نکلتے' جب حضور ﷺ احد کے لئے نکلے تو انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ خود حضور ؐ کے ساتھ چلیں' اسے اس کے بیٹوں نے کہا: "اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے رخصت دی ہے۔ مناسب ہے کہ آپ بیٹھے رہیں اور ہم جہاد کے لئے کافی ہیں عمرو بن الجموح رسول خدا ﷺ کے پاس آئے تو کہا! اے رسول خدا! یہ میرے بچے مجھے آپ کے ساتھ نکلنے سے روک رہے ہیں' خدا کی قسم میری یہ خواہش ہے کہ میں شہید ہو جاؤں۔ تو میں اپنے اس لنگڑے پن کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤں۔ اسے رسول ؐ خدا نے کہا: "جہاد تو اللہ تعالیٰ نے تم سے موقوف کر دیا ہے۔" اس کے لڑکوں کو کہا کہ کیا حرج اگر تم اسے چھوڑ دو' ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے شہادت نصیب کرے' تو اس پر وہ حضور ﷺ کے ساتھ نکلا اور احد کے دن قتل ہو کر شہید ہوا۔

اس معرکہ کے دار و گیر میں حذیفہ ابن الیمان نے' اپنے باپ کی طرف دیکھا اور مسلمان اسے قتل کرنا چاہتے تھے' وہ اسے نہ جانتے تھے اور یہ خیال کر رہے تھے کہ شاید وہ مشرکین میں سے ہے۔ حذیفہ نے کہا' اللہ کے بندو' یہ تو میرا باپ ہے' انہوں نے اس کی بات کو نہ سمجھا اور اسے قتل کر دیا۔ اس پر انہوں نے کہا اللہ تمہیں معاف کرے۔ اس پر رسول خدا ﷺ نے ارادہ کیا کہ وہ اس کی دیت ادا کریں' حضرت حذیفہ نے کہا کہ میں نے اس کی دیت مسلمانوں کو معاف کر دی ہے' اس کی وجہ سے حضور اکرم ؐ حذیفہ کی بہت مدد کرتے تھے۔

جبیر ابن مطعم کے غلام حبشی حضرت حمزہ کے قتل کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں۔ حضرت حمزہ کو سید الشہداء کا لقب ملا اور آپ جنگ احد میں شہید ہوئے۔ مجھے جبیر نے یہ پیشکش کی کہ اگر میں حضرت حمزہ کو قتل کر دوں تو میں غلامی سے آزاد ہوں۔ احد کے دن میں لوگوں کے ساتھ نکلا۔ میں ایک حبشی آدمی تھا۔ اور حبشیوں کی طرح نیزہ پھینکا کرتا تھا۔ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ میرا نیزہ خطا جاتا۔ جب لوگوں نے ایک دوسرے کے خلاف معرکہ شروع کیا تو میں نے حضرت حمزہ کو تلاش کرنا شروع کر دیا اور اسے دیکھتا رہا۔ اچانک میری نظر ان پر پڑ گئی۔ وہ سفید اونٹ کی طرح خوش رنگ تھے اور اپنی تلوار سے لوگوں کو اس طرح بھگا رہے تھے کہ کوئی ان کے سامنے ٹھہر نہ سکتا تھا میں نے اس پر وار کرنے کی تیاری شروع کر دی' اور میں نے ایک درخت کی اوٹ لی یا یہ کہ میں نے ایک پتھر کی اوٹ میں انتظار کیا تاکہ وہ میرے قریب آ جائے۔ مجھ سے پہلے سباع ابن عبد العزیٰ نے اس پر وار کرنا چاہا۔ جب حمزہ نے اسے دیکھا' اس پر ایسا وار کیا کہ گویا اس کا سر اچک کر لے اڑا۔ میں نے اپنے نیزے کو حرکت دی۔ جب نشانہ برابر ہوا تو میں نے ان پر پھینکا۔ یہ نیزہ ان کے پیٹ میں لگا اور دونوں پاؤں کے درمیان سے نکل گیا۔ اس نے میری طرف بڑھنے کا ارادہ کیا مگر نہ بڑھ سکے۔ میں نے اسے یونہی چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ اس کے بعد میں اس کے پاس گیا اور اپنا نیزہ لیا اور لشکر گاہ کی طرف چلا گیا۔ اور وہاں بیٹھ گیا۔ اس لئے کہ مجھے اس کے بغیر کوئی طلب نہ تھی۔ میں نے اسے اس لئے قتل کیا کہ میں آزاد ہو جاؤں۔

ہند بنت عتبہ زوجہ ابو سفیان آئی۔ اس نے حمزہ کا پیٹ پھاڑا۔ ان کا کلیجہ نکالا اور اس نے اسے چبایا مگر نگل نہ سکی۔ اس لئے اسے پھینک دیا۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد جب رسول خدا ﷺ حضرت حمزہ کی لاش پر کھڑے ہوئے تو آپ بہت ہی متاثر ہوئے اور آپ نے فرمایا: "آپ کے دکھ جیسا دکھ مجھے کبھی نہ ہو گا۔ میں نے آج کے منظر سے زیادہ المناک منظر کبھی نہیں دیکھا۔" اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: "کیا اس عورت نے کوئی چیز کھائی تھی؟" لوگوں نے کہا "نہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ کو یہ منظور نہ تھا کہ حمزہ کے جسم کا کوئی حصہ جہنم میں داخل ہو۔

حضور ﷺ نے حکم دیا کہ شہداء احد کو ان کی جائے شہادت ہی میں دفن کر دیا جائے۔ اور انہیں مدینہ کی طرف منتقل نہ کیا جائے۔ بعض صحابہ کرام نے اپنے مقتولوں کو مدینہ میں پہنچا دیا تھا۔ رسول خدا ﷺ کے منادی نے آواز دی کہ حضور ﷺ کا حکم ہے کہ مقتولین کو واپس لایا جائے۔ چنانچہ سب مقتول واپس لائے گئے۔ حضور ﷺ کی نگرانی میں ایک' دو یا تین تین افراد ایک ایک لحد میں دفن کئے گئے۔ تو دفن کرتے وقت آپ فرماتے ان میں سے قرآن کریم کا عالم کون زیادہ تھا' اگر کوئی بتاتا کہ فلاں زیادہ قرآن کا عالم تھا تو اسے آپ لحد میں آگے کر دیتے۔ عبد اللہ ابن عمرو ابن حرام اور عمرو بن الجموح ایک ہی قبر میں دفن ہوئے۔ اس لئے کہ ان دونوں کے درمیان گہری دوستی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "دنیا میں یہ دونوں دوست تھے' اس لئے انہیں ایک ہی قبر میں دفن کر دو۔"

○.....☆☆☆.....○

یہ ہیں اس معرکہ کی بعض جھلکیاں جن میں فتح و نصرت اور ہزیمت و شکست ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ فتح و ہزیمت کے درمیان وقت کا ایک مہین پردہ حائل تھا۔ پس صرف حکم رسول کی خلاف ورزی ہونا تھی کہ فتح شکست میں بدل گئی۔ خواہشات نفس کی ایک معمولی جنبش سے نقشہ بدل گیا۔ شہوت کی ایک جھلک نے جنگ کا رخ بدل دیا۔ ان جھلکیوں میں اعلیٰ اقدار اور گھٹیا تصورات کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ایمان کی تاریخ میں لازوال کارنامے بھی ہیں اور نفاق و شکست کے مناظر بھی ہیں۔

ان جھلکیوں سے یہ معلوم ہوگا کہ اس وقت جماعت مسلمہ میں پوری طرح ہم آہنگی پیدا نہیں ہوئی تھی' جیسا کہ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں کے تصور اسلام میں بھی کچھ کمزوریاں تھیں اور یہ واقعات جو نمودار ہوئے' یا جن کمزوریوں کا اظہار ہوا' یہ خداوند قدوس کی سنت کے عین مطابق تھا۔ یہ نتائج جن سے اہل اسلام دوچار ہوئے' وہ عظیم قربانیاں جو انہیں دینا پڑیں اور جن میں سرفہرست وہ مصائب تھے جن سے خود رسول خدا ﷺ کو دوچار ہونا پڑا۔ اور یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے کہ صحابہ کرامؓ اس وقت ان واقعات کا گہرا اور عمیق احساس بھی رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ گئے ہیں۔ اس معرکہ میں صحابہ کرامؓ نے بہت بڑی قیمت ادا کی لیکن اس معرکے کے ذریعہ انہیں عظیم سبق ملا۔ اور اعلیٰ تجربات حاصل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو خالص کر دیا' ان کی صفوں میں سے کھوٹے لوگوں کو چھانٹ کر الگ کر دیا۔ اور اس تجربے کے ذریعہ امت مسلمہ کو اس عظیم مقصد کے لئے تیار کیا جو اس کے ذمہ لگایا گیا تھا۔ وہ یہ مقصد تھا کہ اس امت نے انسانیت کی قیادت کرنی ہے اور اس دنیا میں اس نے اسلامی نظریہ حیات کے مطابق ایک مکمل اسلامی نظام زندگی قائم کر کے دنیا کے سامنے اسے بطور مثال پیش کرنا ہے۔ دیکھئے' قرآن کریم نے اس صورت حال کو اپنے مخصوص انداز میں کس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

قرآن کریم کا انداز یہ نہیں ہے کہ کسی واقعہ کو بطور تاریخ بیان کرے اور لوگوں کے سامنے صرف واقعات پیش کرے۔ قرآن کریم ان واقعات کی پشت پر نفس انسانی کے اندر جو شعور کارفرما تھا' اس سے بحث کرتا ہے' جو باتیں دلوں میں لہریں پیدا کرتی ہیں ان کی جھلکیاں دکھاتا ہے' اور پھر ان واقعات سے وہ امور سامنے لاتا ہے جن میں کوئی سبق ہوتا ہے' جن سے کوئی ہدایت ملتی ہے یا جن سے کسی پوشیدہ گوشے پر روشنی پڑتی ہے۔

قرآن ان واقعات کو تاریخی انداز میں بیان نہیں کرتا۔ اس طرح کہ واقعات میں تسلسل ہو اور مقصد یہ ہو کہ تاریخی واقعات قلمبند کر دیئے جائیں۔ واقعات کے بیان کے مقاصد یہ ہیں کہ ان سے عبرت حاصل کی جائے' مسلمانوں کی تربیت ہو' اور واقعات کے پس پردہ جو اقدار کارفرما ہوں ان کی وضاحت ہو۔ نفس انسانی کی خصوصیات ظاہر کی جائیں دلوں کی دھڑکنیں صفحہ قرطاس پر لائی جائیں اور اس فضا کی جھلکیاں دکھائی جائیں جو اس واقعہ کے اندر اہم تھیں۔ پھر قرآن کریم واقعات کے تکوینی اسباب بھی بتاتا ہے۔ پھر ان حوادث کے نتیجے میں جو

اصول سامنے آتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے اصول بن جاتے ہیں ان کا بیان ہوتا ہے۔ اس انداز بیان میں ایک واقعہ دراصل ایک محور بن جاتا ہے اور نقطہ ارتکاز بن جاتا ہے۔ اس محور کے ارد گرد شعور و احساس کا عظیم سرمایہ جمع ہو جاتا ہے۔ استدلال کے نکات اور نتائج اکٹھے ہوتے ہیں' سیاق کلام میں بات اس حادثہ سے شروع کی جاتی ہے' پھر اس محور کے ارد گرد بات چلتی رہتی ہے' پھر روئے سخن واقعات کی طرف مڑ جاتا ہے' اس کے بعد اچانک انسانی نفس اور ضمیر کی بات چھڑ جاتی ہے۔ پھر زندگی کی گہرائیوں سے حقائق سطح پر لائے جاتے ہیں اور بار بار اسی طرز پر واقعات پر بحث ہوتی رہتی ہے اور نتائج اخذ کئے جاتے ہیں اور پھر اس واقعہ اور حادثہ کے واقعات کو ختم کیا جاتا ہے لیکن اس واقعہ کے ذیل میں معانی' دلائل' اقدار اور اصولوں کا ایک ذخیرہ ریکارڈ کر لیا جاتا ہے۔ واقعات اور حوادث کا بیان دراصل ان نتائج اور حکمتوں کے بیان کے لئے ہوتا ہے۔ واقعات ان حکمتوں کے لئے محور کا کام دیتے ہیں۔ اس کے ارد گرد تمام نتائج جمع ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایک واقعہ کا پس منظر بھی بیان کر دیا جاتا ہے۔ اور اس واقعہ کے نتیجے میں دلوں کے اندر جو دشمنیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا بیان ہوتا ہے' ان دشمنیوں کو صاف کیا جاتا ہے اور واقعات منقح کر کے ہر بات کو اپنی جگہ پر لگا دیا جاتا ہے۔ واقعات اور ان کے نتائج بالکل فطری نظر آتے ہیں' کسی کو ان پر حیرت نہیں ہوتی اور کسی کو ان پر افسوس نہیں ہوتا۔ وہ محسوس نہیں کرتے کہ ان میں کوئی التباس ہے یا ان کا کوئی دخل ہے۔

انسان جب ان واقعات کی طرف نگاہ اٹھاتا ہے اور میدان جنگ کو دیکھتا ہے اور طویل اور متنوع واقعات پر نگاہ ڈالتا ہے' اور اس کے بعد جب ان واقعات پر تبصرے اور نتائج بیان کئے جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبصرے اور اخذ نتائج کا میدان اصل واقعات سے وسیع تر ہے۔ یہ نتائج ایسے ہیں جو ہمیشہ کے لئے باقی رہنے والے ہیں' دلوں میں پیوست ہو جانے والے ہیں' دلوں کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں' ان سے نفس انسانی کی ضروریات اچھی طرح پوری ہوتی ہیں' نیز یہ نتائج جماعت اسلامی کے لئے فکری غذا فراہم کرتے ہیں' یعنی اسلامی انقلاب کی راہ میں ہر موقف پر اور ہر دور میں اس کے لئے راہنما ہوتے ہیں۔ وہ واقعات جو پیش آتے ہیں' زائل ہو جاتے اور گزر جاتے ہیں لیکن ان واقعات پر قرآن کے تبصرے' لازوال ہیں۔ انفرادی واقعات سے کلی اصول اخذ کئے جاتے ہیں اور عارضی جھلکیوں سے دائمی اقدار اخذ کی جاتی ہیں اور علم و بصیرت کا ایسا سرمایہ ریکارڈ کر دیا جاتا ہے جو زمان و مکان کی قید سے باہر ہوتا ہے۔

غرض یہ نتائج جو قرآن اخذ کرتا ہے اور ان کو قرآن نصوص میں ریکارڈ کرتا ہے' دراصل اہل ایمان کے لئے لازوال سرمایہ ہوتے ہیں۔ اور ہر دور اور ہر جگہ ان سے اہل ایمان کے دل کھلتے ہیں۔ ان تجربات اور تبصروں کو اپنی اپنی تشریح کرنے کے بعد انشاء اللہ ہم ایک جگہ بھی جمع کریں گے۔

☆ ☆ ☆ ☆

# درس ۲۷ تشریح آیات

## آیت نمبر ۱۲۲ تا ۱۷۹

وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَ اللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

"اس وقت کو یاد کرو کہ جب تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے اور مسلمانوں کو جنگ کے لئے جابجا مامور کر رہے تھے' اور اللہ ساری باتیں سنتا ہے اور باخبر ہے۔ یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے حالانکہ اللہ ان کی مدد پر موجود تھا' اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔"

اس معرکے کا پہلا منظر سامنے آتا ہے جس میں معرکے کی تیاریاں ہو رہی ہیں' قرآن کریم کے پہلے مخاطب صحابہ کرام تو اس منظر کے کردار تھے' وہ ان کے نفوس کے قریب تھا' سب واقعات انہیں یاد تھے لیکن اس انداز میں بات شروع کرنا اور اس آیت کے ذریعے معرکہ احد کا پہلا منظر آنکھوں کے سامنے لانا' اس واقعہ کو زندگی اور حرکت سے مالا مال کر دیتا ہے۔ یہاں اس زیر نظر منظر کے ساتھ ایسے حقائق کا اضافہ کر دیا جاتا ہے' جو اس منظر میں نظر نہیں آتے' مثلاً یہ کہ اس متحرک منظر میں ذات باری بھی ان کے ساتھ موجود تھی' اور وہ اس سلسلے میں جو کچھ کر رہے تھے یا جو کہہ رہے تھے' اللہ تعالیٰ اس سے خبردار تھا اور سن رہا تھا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے اسلامی نظام تربیت ہر وقت پیش نظر رکھتا ہے' اس کی تاکید کرتا ہے' اور اسلامی تصور حیات میں اسے گہرائی تک بٹھاتا ہے۔ اور یہ وہ اساسی اور عظیم حقیقت ہے کہ اس کے اوپر اسلام نے اپنے نظام تربیت کی بنیاد رکھی ہے۔ اور یہ وہ حقیقت ہے کہ اسلامی نظام حیات کسی دل میں اس وقت تک جڑ نہیں پکڑ سکتا اور قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس میں یہ حقیقت جاگزیں نہیں ہو جاتی اور اپنی پوری قوت اور اپنی پوری حرکت اور بھرپور زندگی کے ساتھ جاگزیں نہیں ہو جاتی۔

وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ

............ "اے پیغمبر جب تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے اور مسلمانوں کو جنگ کے لئے جابجا مامور کر رہے تھے' اور اللہ ساری باتیں سنتا ہے اور نہایت باخبر ہے۔"

یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ حضور ﷺ صبح سویرے بیت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکلے اور آپ ﷺ نے زرہ اور خود پہن رکھا تھا' اور یہ تیاری آپ ﷺ نے جنگ کے بارے میں مشورہ کر لینے کے بعد فرمائی تھی' جس میں یہ طے ہو گیا تھا کہ جنگ مدینہ سے باہر جا کر لڑی جائے گی اور نکلنے کے بعد حضور ﷺ نے مسلمانوں کی جس طرح صف بندی فرمائی' اور تیراندازوں کو حکم دیا کہ وہ پشت کی جانب پہاڑی پر

مورچے سنبھالیں۔ یہ ایک ایسا منظر تھا‘ جس سے وہ باخبر تھے‘ ان کی لوح حافظہ پر وہ ابھی تک منقش تھا‘ البتہ اس کے ساتھ جس چیز کا اضافہ فرمایا گیا وہ یہ ہے وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ............... ”اللہ ساری باتیں سنتا ہے اور نہایت باخبر ہے۔“

وہ کیا عظیم منظر ہے جس میں اللہ حاضر ہو‘ اور وہ کیا ہی بلند موقف ہے جس کا مشاہدہ کرنے والوں میں اللہ ہو‘ اس منظر پر اللہ کا خوف اور رعب چھایا ہوا ہے جو مشورہ بھی ہو رہا ہے وہ خدا کے سامنے ہے‘ تمام راز اس کے سامنے کھلے ہیں‘ زبانوں سے جو کچھ نکلتا ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے۔ دلوں میں جو کچھ چھپایا ہوا ہے وہ بھی اللہ کے علم میں ہے۔

اس پہلے منظر کی دوسری اہم جھلکی یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے دو گروہ ہمت ہار بیٹھتے ہیں‘ ان پر کمزوری چھا جاتی ہے۔ اور یہ کمزوری اس وقت چھا جاتی ہے جب رئیس المنافقین اپنے تین سو آدمیوں کے ساتھ دغا کر جاتے ہیں اور یہ تقریباً پورے لشکر کی ایک تہائی تھی‘ یہ شخص حضور ﷺ سے محض اس لئے ناراض ہو گیا کہ حضور ﷺ نے اس کی رائے کو نہ مانا اور مدینہ کی نوخیز نسل کی بات کو مانا۔ اس نے کہا کہ اگر ہمارے علم میں کوئی جنگ ہوتی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ ہو لیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ شخص اسلامی نظریہ حیات کے قبول کرنے میں مخلص نہ تھا۔ اور اس کے دل میں ابھی تک اس کی شخصیت کا بت بیٹھا ہوا تھا‘ اس لئے وہ اسلامی نظریہ حیات کے مقابلے میں اپنی شخصیت کو زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔ وہ نظریہ جو اپنے ساتھ کسی دوسری شئی کا وجود گوارا نہیں کرتا۔ وہ اپنے ساتھ کوئی شریک نہیں چھوڑتا۔ اسلامی نظریہ حیات کا تقاضا تو یہ ہے کہ یا تو اسے پوری طرح اپنایا جائے اور یا پھر اسے پوری طرح چھوڑ دیا جائے۔

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَ اللّٰهُ وَلِیُّهُمَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

............... ”یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے‘ حالانکہ اللہ ان کی مدد پر موجود تھا اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔“

یہ دو گروہ کون تھے؟ صحیحین میں اس بارے میں سفیان بن عیینہ کی حدیث نقل ہے۔ وہ بنو حارثہ اور بنو سلیم تھے۔ وہ عبد اللہ ابن ابی کی دغابازانہ حرکت سے متاثر ہو گئے تھے‘ اس لئے کہ اس حرکت نے اسلامی صفوں میں پہلے ہی قدم پر اضطراب پیدا کر دیا تھا‘ قریب تھا کہ یہ دو گروہ بزدلی دکھاتے اور کمزور ہو کر بیٹھ جاتے لیکن اللہ کی مدد آپہنچی اور اللہ نے ان کے قدم مضبوط کر دیئے۔ جس طرح اس آیت میں صراحت ہے۔ وَ اللّٰهُ وَلِیُّهُمَا ............... ”اور اللہ ان کا مددگار تھا۔“

حضرت عمر فرماتے ہیں میں نے جابر بن عبد اللہ سے سنا‘ وہ کہتے تھے یہ آیت ہمارے متعلق نازل ہوئی ہے۔ ”یاد کرو جب دو گروہ تم میں سے بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔“ انہوں نے کہا یہ دو گروہ ہم تھے‘ بنو حارثہ اور بنو سلیم اور میں ایسا نہیں چاہتا (یا مجھے یہ بات اچھی نہیں آتی) کہ آیت نازل نہ ہوتی‘ اس لئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَ اللّٰهُ وَلِیُّهُمَا ............... یعنی اللہ ان کا دوست اور مددگار ہے۔“ (بخاری مسلم)

یوں دلوں کی گہرائیوں میں خفیہ اور پوشیدہ بات کو ظاہر کر دیا جاتا ہے اور اس بات کا علم صرف اللہ ہی کو تھا کہ یہ قبائل بزدلی پر آمادہ ہیں۔ اس لئے کہ یہ کمزوری ان کے دل میں ایک لحظہ کے لئے در آئی تھی اور فوراً ہی اللہ نے انہیں گرنے سے بچا لیا۔ ان کے دل سے اس کمزوری کو دور کر دیا‘ اور اللہ نے اپنی دوستی کی وجہ سے ان کی تائید فرمائی۔ اور وہ پیچھے لوٹنے کے بجائے آگے بڑھے۔ اس معرکہ کے واقعات کو بیان کرنے کے دوران اللہ نے اس کو دہرایا تاکہ اس معرکے کے واقعات اور مناظر کو زندہ و تابندہ صورت میں پیش کیا جائے۔ اور نفوس انسانی کے دلوں میں جو بات کھٹکتی ہے اسے ریکارڈ پر لایا جاتا ہے‘ اور لوگوں کو یہ شعور دیا جاتا ہے کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ تمہارے دلوں کی باتوں سے خبردار ہے‘ اسی لئے اللہ نے فرمایا وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ............... ”اللہ سننے والا ہے اور خبردار

ہے۔ "تاکہ ان کے دلوں میں یہ حقیقت اچھی طرح بیٹھ جائے اور انہیں بتایا جائے کہ نجات کی راہ کیا ہے اور ان کے احساس میں یہ بات بٹھائی جائے کہ اللہ ان کا مددگار ہے' معاون ہے اور ان کا دوست ہے اور کسی بھی کمزوری میں ان کا ہاتھ پکڑنے والا ہے۔ جب وہ گرنے کے قریب ہوں تو وہ ان کا دستگیر ہے۔ یہ اس لئے کہا کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ کمزوری اور ضعیفی کے وقت انہوں نے کہاں سے نصرت طلب کرنی ہے اور کہاں انہوں نے پناہ لینا ہے؟ اس لئے انہیں اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ جس جہت کے سوا مسلمانوں کے لئے اور کوئی جہت نہیں ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ............................ "اور اہل ایمان کو صرف اللہ ہی پر توکل کرنا چاہئے۔"

غرض پہلے ہی منظر کی یہ دونوں جھلکیاں نہایت ہی باموقع دکھائی گئی ہیں اور نہایت ہی موزوں فضا میں' یہ دونوں جھلکیاں اپنی موسیقی کے زیر و بم کو یکجا کرتی ہیں اور نہایت ہی مناسب موقعہ پر اپنے رمزیہ شان کے ساتھ نظروں کے سامنے آتی ہیں۔ ایسے ماحول میں کہ لوگوں کے دل لبیک کہنے' اثر لینے اور ان حقائق کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ان دو تمہیدی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم دلوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے' ان کی تربیت کرتا ہے اور انہیں صحیح سمت پر لگاتا ہے اور یہ اثر اندازی ایسے واقعات کے بعد بطور تبصرہ کی جاتی ہے کہ وہ ابھی تازہ ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ فرق معلوم ہو جاتا ہے جو روایت قصص اور بیان واقعات میں قرآن کریم اختیار کرتا ہے' اور جو طریق بیان عام انسانی مصادر تاریخ میں اختیار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ انسانی مصادر میں واقعات کی بڑی تفصیل ہوتی ہے۔ لیکن تفصیلات کے باوجود وہ واقعات دلوں میں نہیں اترتے۔ نہ ان کا انسانی زندگی سے کوئی تعلق ہوتا ہے' نہ ان سے دلوں کو زندہ کرنا' انہیں گرمی عطا کرنا مقصود ہوتا ہے اور نہ انسانوں کی ہدایت و تربیت مطلوب ہوتی ہے جیسا کہ قرآن مجید اپنے بیان قصص میں ان امور کو پیش نظر رکھتا ہے اور نہایت ہی مستحکم اسلوب بیان ہیں۔

○........☆☆☆.......○

یوں اس معرکے کے بیان کا آغاز ہوتا ہے جس میں مسلمانوں کو فتح نصیب نہ ہوئی اگرچہ وہ فتح و نصرت کے قریب پہنچ گئے تھے۔ اس معرکے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ ایک شخص (عبداللہ ابن ابی) اپنے نظریۂ حیات کے مقابلے میں اپنی ذات اور شخصیت کو ترجیح دیتا ہے اور اس کی اتباع میں وہ سب لوگ اس کے پیچھے چلے جاتے ہیں جن کے ذاتی اعتبارات ان کے عقیدے کے مقابلے میں زیادہ اہم تھے۔ پھر آغاز ہی میں دو گروہ بھی حالات سے قدرے متاثر ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ صالح تھے اور اس معرکے کا انجام یوں ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اپنی فوجی ڈیوٹی چھوڑ کر مال غنیمت کے لالچ میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے ان لوگوں کو بھی ہزیمت اٹھانی پڑتی ہے جنہوں نے اس معرکے میں قربانی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے۔ محض اس لئے کہ بعض لوگوں نے نظم کی خلاف ورزی کی یا ان کے نظریۂ حیات میں ابھی تک کچھ کمزوریاں موجود تھیں۔

اس سے پہلے کہ اس معرکے کی تفصیلات بیان کی جائیں اور ان پر تبصرہ کیا جائے' جس میں مسلمانوں کو شکست کھانا پڑی' اس معرکے کا ذکر کیا جاتا ہے' جس میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی یعنی غزوۂ بدر تاکہ اس شکست کے ساتھ اس فتح و نصرت کو بھی وہ پیش نظر رکھیں۔ اور دونوں کا موازنہ کر کے فتح و شکست کے اسباب پر غور کریں۔ اور یہ بھی یقین سے جان لیں کہ فتح و نصرت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہی کچھ پیش آتا ہے جو اللہ کے ہاں مقرر ہوتا ہے۔ اور تقدیر الٰہی جس طرح نصرت میں کارفرما ہوتی ہے' اسی طرح شکست بھی مقدر ہوتی ہے۔ فتح کی تہہ میں بھی حکمت ہوتی ہے اور شکست کے پس پشت بھی اللہ کی حکمت کارفرما ہوتی ہے۔ اور دونوں حالات میں نتیجہ کار اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے' ہر حال میں وہی ہے جو مسبب الاسباب ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا
اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ
رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَ
يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ
مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۗ وَ
مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ
يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ
۱۳ مَا فِي الْاَرْضِ ۗ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ
ع ۹ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾
۴

"اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تمہاری مدد کر چکا تھا حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے' لہٰذا تم کو چاہئے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو' امید ہے کہ اب تم شکرگزار ہو گے۔ یاد کرو جب تم مومنین سے کہہ رہے تھے "کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ اللہ تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کرے؟" بے شک اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ آئیں گے اسی آن تمہارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ یہ بات اللہ نے تمہیں اس لئے بتا دی ہے کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہارے دل مطمئن ہو جائیں۔ فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے جو بڑی قوت والا اور دانا اور بینا ہے تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک بازو کاٹ دے' یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں۔ اے پیغمبر فیصلے کے اختیارات میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اللہ کو اختیار ہے' چاہے انہیں معاف کرے' چاہے سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اس کا مالک اللہ ہے جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے۔ وہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔"

بدر میں مسلمانوں کو جو فتح نصیب ہوئی تھی وہ معجزانہ تھی' جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں۔ یہ فتح مادی اسباب کی نایابی کے باوجود حاصل ہوئی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کے پاس معروف مادی اسباب نہ تھے۔ اس جنگ میں ترازو کے دو پلڑے یعنی مومنین اور مشرکین متوازن نہ تھے' نہ ہی ان کی حالت ایسی تھی کہ وہ توازن کے قریب ہوں۔ مشرک ایک ہزار کی تعداد میں تھے' اور وہ جنگ کی خاطر بطور عام لام بندی نکلے تھے' اس لئے کہ ان سے ابوسفیان نے مدد چاہی تھی' اور ان کا ہدف بھی متعین تھا وہ یہ کہ ابوسفیان کے قافلے کو بچایا جائے اور یہ ہزار آدمی ہر قسم کے سازو سامان سے لیس تھے۔ وہ اپنی دولت کے بچاؤ کے لئے نکلے تھے۔ نیز اپنی عزت اور شرف کو بھی انہوں نے بچانا تھا۔ اس کے مقابلے میں مسلمان صرف تین صد تھے اور وہ اس لئے نہ نکلے تھے' سازو سامان سے لیس اس قدر عظیم فوج سے' ان کا مقابلہ

ہو گا۔ وہ ایک ہلکے پھلکے پروگرام کے لئے نکلے تھے' وہ ایک غیر مسلح قافلے پر ہاتھ ڈالنے کے لئے نکلے تھے' اور اس پر ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے' قلیل تعداد میں ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے پاس ساز و سامان بھی نہ تھا' اور ان کے پیچھے مدینہ میں ابھی تک مشرکین بھی موجود تھے اور وہ بھی اپنی جگہ پر قوت تھے۔ اس طرح مدینہ میں منافقین کا بھی ایک بڑا طبقہ موجود تھا اور وہ بھی مدینہ کے معاشرے میں اونچا مقام رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ مدینہ میں یہودی بھی تھے جو ہر وقت اس تاک میں لگے رہتے تھے کہ مدینہ میں مسلمانوں پر وار کریں۔ علاوہ ازیں وہ قلیل تعداد میں مسلمانوں کا ایک گروہ تھے جو جزیرۃ العرب کفر و شرک کی ایک عظیم قوت کے درمیان گھرے ہوئے تھے اور ان سب اسباب کے علاوہ ابھی وہ مظلوم پناہ گزیں تھے' جنہیں مکہ سے نکال دیا گیا تھا' کچھ انصار تھے جنہوں نے ان مہاجرین کو پناہ دی ہوئی تھی' بہ حال اس معاشرے میں ان کی حیثیت ایک نوخیز پودے کی تھی۔

ان سب حالات کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ بتاتے ہیں کہ ایسے حالات میں اس قدر عظیم فتح کا حقیقی سبب صرف اللہ تعالیٰ کی نصرت ہی ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

............ "اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کر چکا تھا' حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے' لہٰذا تم کو چاہئے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو۔ امید ہے کہ اب تم شکر گزار ہو گے۔"

صرف اللہ ہی نے انہیں نصرت بخشی اور انہیں اس وجہ سے نصرت بخشی جس کی حکمت کو ان آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ ناصرو مددگار نہ وہ خود تھے نہ کوئی اور تھا' اس لئے اگر انہوں نے کسی سے ڈرنا ہے اور کسی سے خائف ہونا ہے تو چاہئے کہ صرف اللہ سے ڈریں اور اس کا خوف اپنے اندر پیدا کریں۔ اس لئے کہ فتح و شکست اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہی اللہ ہے جو اقتدار و قوت کا سرچشمہ ہے۔ خدا خوفی ہی انہیں شکر پر آمادہ کر سکتی ہے۔ ہر حال میں ان پر اللہ کا جو انعام و اکرام ہو رہا ہے' اس پر ان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کا پورا پورا شکر ادا کریں' جو ان انعامات و اکرامات کے لائق ہو۔

یہ ایک جھلکی ہے' جس میں انہیں یاد دلایا جاتا ہے کہ بدر میں انہیں کیونکر فتح نصیب ہوئی' اس کے بعد' وہ مناظر پیش کئے جاتے ہیں جو میدان بدر میں وقوع پذیر ہوئے' ان مناظر کو ان کے پردۂ دماغ پر از سر نو اس طرح تازہ کیا جاتا ہے کہ گویا وہ ابھی پیش آئے۔ ذرا دیکھئے۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ............ "یاد کرو جب تم مومنین سے کہہ رہے تھے' کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ اللہ تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کرے؟" بے شک اگر تم صبر کرو' اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو' تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ آئیں گے اسی آن تمہارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔"

یہ کلمات بدر کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کئے تھے' اور ان مٹھی بھر اہل ایمان سے کہے تھے جو آپ کے ساتھ نکلے تھے' جنہوں نے مشرکین کی فوج کو دیکھ لیا' یہ مٹھی بھر مسلمان صرف قافلے کو پکڑنے کے لئے نکلے تھے' جس کے پاس سامان تجارت تھا' ان کے گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ ایک ایسی فوج کے ساتھ آمنا سامنا کریں گے جو ساز و سامان سے لیس تھی اور اس دن انہیں رسول خدا ﷺ نے ان امور سے مطلع کر دیا تھا' جن امور سے اللہ تعالیٰ نے رسول خدا ﷺ کو آگاہ کر دیا تھا' تاکہ ان کے دل مضبوط ہوں اور وہ ثابت قدم رہیں۔ وہ بہر حال انسان تھے' اور انہیں ایسی امداد کی ضرورت تھی جو ان کے تصورات اور ان کے شعور کے لئے قریب الفہم ہو' اور ایک ایسی صورت میں ہو' جس صورت میں وہ کسی معاونت کے عادی تھے' اور انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ خصوصی

امداد وہ شرائط کے ساتھ مشروط ہے' ایک یہ کہ تم صبر سے کام لو اور پرہیزگاری کا رویہ اختیار کرو' صبر اس لئے ضروری ہے کہ جب حملہ ہوتا ہے تو اس وقت حملے کے صدمات پر صبر کی ضرورت ہوتی ہے' اور تقویٰ وہ چیز ہے جو انسان کا رابطہ اللہ سے قائم کر دیتی ہے۔ چاہے فتح ہو یا ہزیمت ہو۔

بَلَىٰٓ ۚ إِن تَصْبِرُوا۟ وَتَتَّقُوا۟ وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَـٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ ءَالَـٰفٍ مِّنَ ٱلْمَلَـٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِينَ ﴿١٢٥﴾

"بے شک' اگر تم صبر کرو' اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ آئیں گے اس آن تمہارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔"

یہاں قرآن کریم انہیں سکھاتا ہے کہ آخر کار تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹتے ہیں' اور تمام اشیاء اور واقعات میں اصل فیکٹر اللہ کی ذات ہے' فرشتوں کا اتارا جانا تو اہل ایمان کے لئے خوشخبری ہے تاکہ ان کے دل خوش ہوں' ثابت قدم ہوں اور انہیں اطمینان و سکون نصیب ہو۔ رہی نصرت تو وہ براہ راست اللہ کی جانب سے ہے' اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے ارادے سے ہے' بغیر کسی واسطہ' بغیر کسی وسیلہ اور بغیر کسی سبب کے۔

وَمَا جَعَلَهُ ٱللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُم بِهِۦ ۗ وَمَا ٱلنَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ ٱللَّهِ ٱلْعَزِيزِ ٱلْحَكِيمِ

"اور یہ بات اللہ نے تمہیں اس لئے بتا دی ہے کہ تم خوش ہو جاؤ' اور تمہارے دل مطمئن ہو جائیں۔ فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے جو بڑی نصرت والا اور دانا و بینا ہے۔"

قرآن مجید کی یہ کوشش ہے کہ وہ تمام امور کو اللہ کی طرف پلٹتا ہے تاکہ ایک مسلمان کے تصور میں کوئی ایسی بات نہ آجائے جس سے اس کے عقائد کا یہ اصول خالص نہ رہے کہ تمام امور اللہ کی مشیت کے تابع ہیں اور اللہ کی مشیت پر کوئی قید نہیں ہے' اس کا ارادہ ہی کسی کام کو عملی شکل دے دیتا ہے' اور اس کی قدرت براہ راست ہے۔ اور اگر تمام اسباب بھی فراہم ہو جائیں تب بھی اس کی مشیت کے بغیر کوئی کام عملی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ غرض اللہ کی مشیت ہی قوت فاعلہ ہے۔ وہ جو چاہے اسے حقیقت بنا دے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَمَا ٱلنَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ ٱللَّهِ ٱلْعَزِيزِ ٱلْحَكِيمِ ............ "اور فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے جو بڑی قوت والا اور دانا و بینا ہے۔"

قرآن کریم نے اسلامی تصور حیات میں مشیت الٰہی کی کارفرمائی پر بہت زور دیا ہے۔ اور اسے ہر شک و شبہ سے پاک کرنے کی کوشش کی ہے اور اس بات کا بار بار ذکر کیا ہے کہ دنیاوی اسباب کسی صورت میں موثر نہیں ہوتے۔ اگر ان کے ساتھ اللہ کی مشیت شامل حال نہ ہو۔ اس تصور حیات کے مطابق انسان اور خدا کے درمیان ایک لازوال رابطہ ہو جاتا ہے۔ اللہ کی قدرت اور مومن کے دل و دماغ کے درمیان ایک خاص رابطہ ہو جاتا ہے۔ اللہ اور بندے کے درمیان حائل پردے اٹھ جاتے ہیں۔ اللہ اور بندے کے درمیان براہ راست تعلق قائم ہو جاتا ہے اور اس میں کبھی کوئی رکاوٹ قائم نہیں ہوتی۔ جس طرح عالم موجودات میں اور عالم حقائق میں ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں اس قسم کی ہدایات بار بار دہرائی جاتی ہیں' مختلف اسالیب میں ان کی تاکید کی جاتی ہے اور مسلمانوں کے دل میں یہ حقیقت اچھی طرح بیٹھ جاتی ہے' وہ اس حقیقت کا ایک عجیب گہرا' روشن اور سنجیدہ شعور رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اللہ وحدہ ہی اس

کائنات کے تمام امور میں فاعل اور موثر ہے' انہیں یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مامور ہیں کہ وہ اسباب و وسائل فراہم کریں' جدوجہد کریں اور ہر کام کے سلسلے میں اپنی سی کوشش کریں' لیکن اس حقیقت کا بھی انہیں پختہ شعور ہو کہ ہو گا وہی جو اللہ کی مشیئت چاہے لیکن اس پختہ یقین کے ساتھ ساتھ وہ اطاعت کرتے ہیں اور شعوری توازن کے ساتھ ہروقت متحرک رہتے ہیں۔ اس کے باوجود قرآن کریم نے یہ شعور ایک عرصہ کے بعد مسلمانوں کی فکر میں بٹھایا۔ کچھ واقعات پیش آئے' ان واقعات نے مسلمانوں کی تربیت کی' ان واقعات سے نتائج اخذ کئے گئے اور اس سورت میں اس تربیت کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

ان آیات میں بدر کا منظر نظروں کے سامنے ہے۔ اس منظر میں حضور اکرم ﷺ اہل ایمان کے ساتھ وعدہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی جانب سے خصوصی امداد نازل ہوگی بشرطیکہ وہ صبرو ثبات سے کام لیں اور معرکے میں انسانوں سے ڈرنے کے بجائے صرف تقویٰ اور خدا خوفی کی راہ اختیار کریں۔ عین اس وقت جب ان کا کفار کے ساتھ آمنا سامنا ہو' اس کے بعد یہاں قرآن کریم نزول ملائکہ کے بھی پس منظر میں جاکر یہ باور کراتا ہے کہ اصل قوت فاعلہ ذات باری ہے۔ تمام امور اس کے ہاتھ میں ہیں اور اس کے ارادے کے تابع ہیں اور صرف اس کے اذن اور اس کے ارادے سے فتح و نصرت نصیب ہوگی۔ وَاللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ............... "اور اللہ ہی بڑی قوت والا دانا اور بینا ہے۔" وہ بڑی قوت والا ہے' صاحب اقتدار ہے اور اس بات پر قادر ہے کہ نصرت اور فتح عطا کرے اور اس کے ساتھ وہ حکیم بھی ہے اور اس کی قدرت دانائی کے مطابق جاری و ساری ہے۔ اور وہ فتح اس لئے عطا کرتا ہے کہ اس میں اس کی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔

اس کے بعد اس نصرت کی حکمت بھی یہاں بیان کر دی جاتی ہے' کیسی فتح؟ وہ فتح جس کے مقاصد میں سے کوئی مقصد بھی انسان کی ذات سے وابستہ نہیں ہے۔

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ۞ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ

"تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک بازو کاٹ دے' یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں۔ فیصلہ کے اختیارات میں تمہارا کوئی حصہ نہیں' اللہ کو اختیار ہے چاہے انہیں معاف کر دے' چاہے سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔"

یہ حقیقت ہے کہ فتح اللہ کی جانب سے آتی ہے۔ وہ اللہ کی تقدیر کو ظاہر کرتی ہے۔ کسی رسول اور اس کے ساتھیوں کو فتح کی صورت میں کوئی ذاتی مفاد نہیں ملتا۔ نہ اس میں ان کی کوئی ذاتی غرض ہوتی ہے۔ نیز حصول فتح میں نہ رسول کا دخل ہوتا ہے نہ اس کے ساتھی اس میں دخیل ہوتے ہیں۔ وہ تو تقدیر الہی کے ظہور کے لئے ایک مظہر ہوتے ہیں۔ قدرت انہیں جس طرح چاہتی ہے' استعمال کرتی ہے۔ وہ اس فتح و نصرت کا نہ سبب حقیقی ہوتے ہیں نہ اس کے صانع ہوتے ہیں۔ وہ نہ فاتح ہوتے ہیں اور نہ ہی اس فتح کے نتیجے میں مفادات حاصل کرتے ہیں۔ دست قدرت اپنے بعض اشخاص کو حرکت میں لاتا ہے۔ پھر خود ان کی تائید کرتا ہے تاکہ اللہ کے پیش نظر جو حکمتیں ہوں ان کا ظہور ہو اور جو مقاصد ہوں وہ بروئے کار لائے جائیں۔

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ............... "تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک بازو کاٹ دے۔" وہ قتل ہوں اور ان کی افرادی قوت کم ہو' ان کی اراضی ان ہاتھوں سے نکلے اور ان کا رقبہ کم ہوتا جائے۔ یا ان کی جابرانہ حکومت کا دائرہ تنگ ہو جائے۔ ان کی دولت میں بوجہ مال غنیمت کمی آجائے اور ہزیمت اور شکست کے نتیجے میں ان کی سرگرمیوں میں کمی آجائے۔

أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنقَلِبُوا خَائِبِينَ ............................ "یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں۔" یعنی ذلیل ہو کر ہزیمت اٹھائیں اور اپنے مقاصد میں ناکام ہو کر لوٹیں جبکہ وہ دبے ہوئے ہوں۔

أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ............................ "یا انہیں معاف کر دے" اس لئے کہ بعض اوقات اہل اسلام کی فتح کے نتیجے میں کفار کو عبرت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ سبق حاصل کر لیتے ہیں اور اس فتح کے نتیجے میں وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں 'نتیجتاً' اللہ انہیں معاف کر دیتا ہے۔ ان سے صفت کفر چلی جاتی ہے اور وہ راہ ہدایت پاکر اسلام پر جم جاتے ہیں۔

أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ............................ "چاہے انہیں سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔" عذاب کی ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ اہل اسلام ان پر غالب آجاتے ہیں' دوسری صورت 'قید ہونے کی صورت میں وہ عذاب پاتے ہیں یا ان کا خاتمہ کفر پر ہو جاتا ہے اور انجام کار وہ سزائے جہنم کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ یہ سزا ان کو اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ کفر کر کے ظلم کا ارتکاب کرتے ہیں' مسلمانوں کو فتنے میں ڈالتے ہیں اور فساد فی الارض کے مرتکب ہوتے ہیں۔ نیز وہ اس اصلاحی نظام حیات کے مقابلے میں اتر کر ظلم کا ارتکاب کرتے ہیں جو اسلامی نظام حیات اور اسلامی شریعت کی صورت میں دنیا میں نافذ ہونے کے لئے آیا ہے۔ غرض وہ سب مظالم اس میں شامل ہیں جو کفر کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں اور جن کی وجہ سے اللہ کی راہ کو مسدود کیا جاتا ہے۔

بہر حال یہ سب پروگرام حکمت الہی کے تحت ہوتا ہے اور اس میں انسانی ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا یہاں تک کہ اس آیت کی رو سے خود رسول خدا ﷺ کی ذات کو بھی اس پروگرام میں دخل انداز ہونے سے خارج کیا جاتا ہے۔ اور ان امور میں فیصلے کا اختیار صرف اللہ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ ایسے فیصلے ذات باری کے شایان شان ہیں۔ ان میں ذات باری منفرد ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

یوں اہل ایمان کی ذات فتح و کامرانی کے اس منظر سے باہر آجاتی ہے۔ وہ خود فتح و کامرانی کے اسباب کے دائرے سے نکل جاتے ہیں اور اس کے نتائج میں بھی ان کا کوئی دخل نہیں رہتا۔ یوں وہ اس کبر و غرور سے محفوظ رہتے ہیں جو فاتحین کے دلوں میں بالعموم پیدا ہو جاتا ہے' نیز وہ سخت گیری' غرور اور احساس برتری سے بھی مامون ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے اکثر فاتحین پھولے نہیں سماتے اور ان کے روح اور طرز عمل غیر متوازن ہوتے ہیں۔ چنانچہ اہل ایمان محسوس کرتے ہیں کہ فیصلے کے اختیارات ان کے پاس نہیں ہیں۔ اختیارات تو سب کے سب اللہ کے پاس ہیں۔

غرض لوگ مطیع فرمان ہوں یا نافرمان ہوں ان سب کے امور کا مالک اللہ تعالی ہے۔ یہ کہ لوگوں کی قسمت کے فیصلے' خواہ وہ اچھے لوگ ہوں یا برے' اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ یہ ہے تحریک اسلامی کی حقیقت اور یہ ہے اس میں لوگوں کا مقام چاہے وہ اچھے ہوں یا برے ہوں۔ اس میدان میں خود حضور اکرم ﷺ اور اہل ایمان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اچھے طریقے سے اپنے فرائض سرانجام دیں۔ اور نتائج اللہ پر چھوڑ دیں۔ وہ اپنے کئے پر صرف اللہ سے اجر کے طلبگار ہوں' وہ انہیں پورا پورا اجر دے گا اور ان کا والی اور مددگار ہو گا۔

یہ آیت کہ "فیصلے کے اختیارات میں تمہارا کوئی دخل نہیں ہے" اس لئے بھی یہاں لائی گئی ہے کہ آنے والی آیات میں بعض لوگوں کی یہ بات نقل ہونے والی ہے۔ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ............ "اس کام کو چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے۔" (۳: ۱۵۴) اور یہ کہ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَا قُتِلْنَا هَاهُنَا ............................ "اگر اختیارات میں ہمارا کوئی حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے۔" (۳: ۱۵۷) اور یہ آیت دراصل ان مزعومات کا پیشگی جواب ہے کہ جی ہاں اختیارات

الہیہ میں کوئی شریک نہیں ہے' نہ فتح کسی کے اختیار میں ہے نہ شکست۔ تمہارا کام صرف اطاعت امر ہے' ادائے فرض ہے اور مکمل وفاداری ہے۔ یہی امور تم سے مطلوب ہیں۔ ان کے بعد نتائج کیا نکلتے ہیں تو بس یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ ان میں کسی کا دخل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ رسول خدا ﷺ کا بھی دخل نہیں ہے۔ یہ ہے وہ اصلی حقیقت جو اسلامی تصور حیات کے پیش نظر ہے اور اسے نفس انسانی کی گہرائیوں میں جاگزیں ہونا چاہئے اور اسے واقعات' حالات اور افراد کار سے بھی برتر اور بلند ہونا چاہئے۔

واقعہ بدر کی یہ یاد دہانی اور اسلامی تصور حیات کے ان اساسی حقائق کا اختتامیہ اس عام حقیقت کے اظہار سے ہوتا ہے کہ آخر کار فتح و ہزیمت دونوں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکیمانہ پالیسی کے تابع ہوتی ہیں اور یہاں آکر اس بیان کے خاتمہ پر' اس سے بھی زیادہ عمومی حقیقت کو سامنے لایا جاتا ہے کہ اس پوری کائنات میں اللہ کا امر جاری و ساری ہے۔ اس لئے وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ............ "زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اس کا مالک اللہ ہے' جس کو چاہئے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے' وہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔"

غرض یہ امور اللہ کی مشیت کے تابع ہیں جو بے قید ہے اور جو اس کی بے قید شہنشاہیت کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ اپنے بندوں کے معاملات میں بے قید متصرف ہے۔ جس طرح کہ وہ آسمانوں اور زمینوں کا مالک لاشریک ہے۔ وہ اپنے بندوں پر نہ ظلم کرتا ہے اور نہ ان میں سے کسی کی جانبداری کرتا ہے نہ مغفرت میں اور نہ سزا دہی میں۔ بندوں کے درمیان وہ فیصلے حکمت اور عدل کے ساتھ کرتا ہے اور حکمت اور عدالت کے ساتھ ساتھ اس کی صفات رحمت اور عفو بھی اپنا کام کرتی ہیں' اس لئے کہ عفو و درگزر ہی اس کے شایان شان ہے۔

وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ............ "وہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔" بندوں کے لئے اس کے دروازے کھلے ہیں' وہ ہروقت اس کی رحمت اور مغفرت سے فیض یاب ہو سکتے ہیں' ہروقت لوٹ سکتے ہیں' باز آ سکتے ہیں' اس لئے کہ تمام معاملات اس کے ہاتھ میں ہیں۔ فرائض جو اس نے عائد کئے ہیں ان کی ادائیگی اور فرائض سے آگے کے معاملات کو ترک کرنا' یہ اس کی حکمت اور مشیت کی وجہ سے ہے' جس پر کوئی قید و بند نہیں ہے۔ اور اس کی حکمت اور مشیت اسباب و وسائل کے پیچھے کام کرتی ہے۔

○ ...... ☆☆☆ ...... ○

اس سے قبل کہ سیاق کلام معرکہ احد کے مرکزی واقعات کے بیان کا آغاز کرے' ان واقعات کے نتائج ریکارڈ کرے' اور واقعات کی تفصیلات کا ذکر کرے۔ یہاں اس عظیم معرکہ کے بارے میں ہدایات دی جارہی ہیں' جس کا ذکر ہم نے اس بحث کے آغاز میں کیا ہے۔ وہ عظیم معرکہ وہ ہے جو انسانی نفسیات کے میدان میں برپا تھا اور ہے اور جو پوری انسانی زندگی کی سطح پر جاری و ساری ہے۔ اس سلسلے میں یہاں سود خوری اور سودی کاروبار کے بارے میں بات کی جاتی ہے۔ یہاں خدا خوفی' خدا کی اطاعت اور اس کے رسول کی فرمانبرداری سے متعلق بات کی جاتی ہے۔ یہ حکم دیا جاتا ہے کہ سہولت اور مشکلات کے ہردور میں انفاق فی سبیل اللہ پر عمل کیا جائے۔ اسلامی نظام معیشت کے کریمانہ نظام معاونت اور اس کے مقابلے میں سود کی ملعون نظام معیشت کا ذکر' غصہ پی جانا' لوگوں سے عفو و درگزر کرنا اور جماعت مسلمہ کے اندر بھلائی کی اشاعت' گناہوں سے معافی کی طلب گاری اور غلطیوں اور کوتاہیوں پر عدم اصرار کے مباحث کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّ اتَّقُوا

اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَ اَطِیْعُوا
اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ
جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ
فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ
اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَ الَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪ وَ مَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪۫ وَ
لَمْ یُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓىِٕكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ
رَّبِّهِمْ وَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَ نِعْمَ اَجْرُ
الْعٰمِلِیْنَ ﴿۱۳۶﴾

"اے ایمان لانے والو! یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو' امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے مہیا کی گئی ہے اور اللہ اور رسول کا حکم مان لو' توقع ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے' اور وہ ان خدا ترس لوگوں کے لئے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں مال خرچ کرتے ہیں' خواہ بد حال ہوں یا خوش حال' جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں' ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً" اللہ انہیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں' کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو۔ اور وہ دیدہ و دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزاء ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انہیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیا اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کے لئے۔

یہ تمام ہدایات یہاں مین اس وقت دی جا رہی ہیں کہ سیاق کلام میں جنگی معرکہ پر بحث شروع ہونے والی ہے۔ اور ان سے یہاں اسلامی نظریہ حیات کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت کی طرف اشارہ مطلوب ہے۔ اسلامی نظریہ حیات انسانی شخصیت اور اس کی سرگرمیوں کو ایک جامع نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اور انسان اور اس کی تگ و دو کو ایک ہی محور کے گرد گھماتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان کو اپنی پوری زندگی میں اللہ وحدہٗ لاشریک کی اطاعت اور پرستش کرنی ہے۔ ہر معاملے میں صرف اسی کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ اور صرف اسلامی نظام سیات ہی پوری زندگی پر حاوی رہتا ہے اور انسانی شخصیت کے تمام احوال اور تمام حالات پر اسلامی نظام حیات کو غالب کرنا ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں اسے رائج کرنا ہے۔ اس کے بعد یہ ہدایات انسانی زندگی کی بوقلمونیوں کے درمیان اس ربط کی طرف

اشارہ کرتی ہیں اور سعی انسانی کے آخری نتائج میں اس ربط کے اثرات بھی بیان کئے جاتے ہیں' جیسا کہ اس سے قبل ہم بیان کر آئے ہیں۔

اسلامی نظام زندگی نفس انسانی کے ہر پہلو کو اپنی گرفت میں لیتا ہے' وہ جماعت مسلمہ کی زندگی کو پوری طرح منظم کرتا ہے۔ وہ اس کے درمیان بخرے بخرے کر کے کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔ اس لئے وہ میدان کارزار کے لئے سازوسامان بھی تیار کرتا ہے اور افراد کار کے اندر صلاحیت جنگ بھی پیدا کرتا ہے۔ وہ اہل ایمان کے دلوں کو بھی پاک کرتا ہے۔ ان کے ذہنوں کی تطہیر کرتا ہے' انسان کے اندر ایسی اخلاقی قوت پیدا کرتا ہے کہ وہ ہوائے نفس اور جسمانی خواہشات پر قابو پاسکیں۔ جماعت مسلمہ کے اندر محبت' ملنساری پیدا کی جاتی ہے اور یہ تمام اوصاف ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ جب ہم ان تمام خصوصیات پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے اور ان ہدایات میں سے ہر ایک کی تفسیر کریں گے تو معلوم ہو گا کہ تمام اوصاف و ہدایات جماعت مسلمہ کی عملی زندگی کے ساتھ گہرا ربط ہے۔ اور یہ اوصاف میدان جنگ اور میدان حیات دونوں میں وہ جماعت مسلمہ کی تقدیر کے ساتھ مربوط ہیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٣٠﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿١٣١﴾ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿١٣٢﴾

"اے ایمان لانے والو! یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو' امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے مہیا کی گئی ہے اور اللہ اور رسول کا حکم مان لو' توقع ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔"

سود اور سودی نظام معیشت پر بحث فی ظلال القرآن پارہ سوئم میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہے۔ اس لئے یہاں ہم اس پوری بحث کو دہرانا مناسب نہیں سمجھتے۔ لیکن یہاں اضعاف مضاعفہ کے الفاظ پر غور کرنا مناسب ہو گا۔ اس لئے کہ ہمارے زمانے کے بعض لوگ ان الفاظ کی آڑ لے کر یہ مفہوم بیان کرتے ہیں کہ جو چیز حرام کی گئی ہے وہ اضعاف مضاعفہ ہے۔ رہا وہ سود جو چار فیصد ہو' پانچ فیصد ہو' سات فیصد ہو' نو فیصد ہو تو وہ اضعاف مضاعفہ نہیں ہے' لہٰذا وہ حرام نہیں ہے۔

اس کی تردید میں صرف یہی کہہ دینا کافی ہے کہ اضعاف مضاعفہ کی قید دراصل نزول قرآن کے وقت موجود واقعی صورت حال کا اظہار کرتی ہے' یہ قید اس حکم کو محدود اور مشروط نہیں کرتی۔ سورۂ بقرہ میں جو آیت وارد ہے وہ قطعی ہے۔ اور ربا کی ہر صورت کو حرام قرار دیتی ہے۔ اس لئے اس میں کوئی قید و حد نہیں ہے۔ وہاں یہ الفاظ ہیں **وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا** ...................
"سود میں سے جو کچھ باقی ہے اسے چھوڑ دو" چاہے وہ سود جس شرح سے بھی ہو۔"

اس اصولی بحث کے بعد اب ہم بتائیں گے کہ ربا کے ساتھ اس صفت اضعاف مضاعفہ کی قید کیوں عائد کی گئی ہے؟ نہ صرف یہ کہ یہ صفت سودی نظام کی تاریخ کی طرف اشارہ کر رہی جس میں سودی کاروبار دو چند چار چند شرح سے کیا جاتا تھا۔ بلکہ یہ بتاتی ہے کہ سود کی شرح جو بھی ہو سود کے تباہ کن نظام کے ساتھ یہ صفت اضعاف مضاعفہ ایک لازم صفت ہے۔

سودی نظام کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی سوسائٹی میں پوری دولت کی گردش اس نظام کے مطابق شروع ہوتی ہے' اس لئے سودی کاروبار میں سرگرمیاں سود مفرد کی طرح سادہ سرگرمیاں نہیں ہوتیں۔ اس گردش کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نظام میں مال کی منتقلی بار بار ہوتی رہتی' اس لئے وہ سود مرکب میں تبدیل ہو جاتا ہے' اس لئے بار بار سودی چارج کی وجہ سے بالآخر سود کی رقم کئی گنا ہو جاتی ہے۔ اور وہ بلا جدال "اضعافا" مضاعفہ بن جاتی ہے۔ اس لئے اپنے مزاج کے اعتبار سے سودی نظام میں دولت دوگنی چوگنی بنتی جاتی ہے۔ اس لئے اضعاف

مضاعفہ کا اطلاق اس صورت حال کے اندر منحصر نہ ہو گا جو نزول قرآن کے وقت عرب سوسائٹی میں مروج تھی بلکہ ہر دور میں ہر قسم کے سودی نظام کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ دوگنا چوگنا ہوتا رہتا ہے۔

اور جیسا کہ ہم نے تیسرے پارے میں تفصیلات دی ہیں' اس نظام کی خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ یہ لوگوں کی نفسیات اور اخلاق پوری طرح بگاڑ دیتا ہے۔ نیز یہ نظام ملک کی اقتصادی اور سیاسی صورت حال کو بھی پوری طرح خراب کر دیتا ہے۔ اس لئے اس سودی نظام کے اثرات امت کی اجتماعی زندگی پر پڑتے ہیں اور امت کے انجام پر اس کے اثرات ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے تیسرے پارے میں ذکر کیا ہے۔

اسلام جس وقت امت مسلمہ کی تخلیق کر رہا تھا' وہ اس امت کے لئے ایک اخلاقی اور نفسیاتی نظام حیات کی بنیاد بھی رکھ رہا تھا' وہ اس نئی امت کی سیاسی اور اقتصادی زندگی کو بھی صحت مندانہ اصولوں پر استوار کر رہا تھا' اس سلسلے میں اس نئی امت کو جو معرکے درپیش ہوئے اور ان کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ تاریخ اسلام کے معروف و مشہور واقعات ہیں' اس لئے جنگی واقعات کے درمیان میں اچانک حرمت ربا کا ذکر بھی قابل فہم ہے اس لئے کہ اسلامی نظام حیات ایک جامع اور حکیمانہ نظام ہے۔ نیز ربا کی ممانعت کے بعد یہ کہنا کہ اللہ سے ڈرو اور یہ امید رکھو کہ تم پر رحم کیا جائے گا اور پھر یہ کہنا کہ اس آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے' یہ دونوں باتیں بھی اس نقطہ نظر سے قابل فہم ہو جاتی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہو اور اس کے دل میں خدا کا خوف ہو وہ ہرگز سود نہیں کھا سکتا' نیز جس شخص کے دل میں عذاب جہنم کا خوف ہو' وہ بھی ہرگز سود خور نہیں ہو سکتا۔ بالفاظ دیگر جو شخص بھی ایمان رکھتا ہو اور اپنے آپ کو کافروں کی لائن سے نکالنا پسند کرتا ہو وہ کبھی سود خور نہیں ہو سکتا۔ ایمان صرف خالی خولی باتوں کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اسلامی نظام حیات کا اتباع بھی کیا جائے۔ اس لئے کہ اسلامی نظام حیات کا قیام ایمان کا عملی ترجمہ ہے۔ اور واقعی زندگی میں اسلامی نظام حیات کے قیام اور پوری زندگی کو اسلام کے رنگ میں رنگنے کے لئے ایمان کو ہراول دستہ قرار دیا گیا ہے۔

یہ بات محال ہے کہ ایمان اور سودی نظام ایک جگہ جمع ہو جائیں جہاں سودی نظام قائم ہو گا' وہ سوسائٹی پوری کی پوری دین اسلام سے خارج تصور ہو گی اور اس کا انجام اس آگ میں ہو گا جسے فی الحقیقت کافروں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اس مسئلے میں جو بھی بحث کی جائے گی وہ غیر ضروری بحث ہو گی' اس لئے کہ اس آیت میں پہلے سودی کاروبار کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس کے بعد اہل ایمان کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور اس حکم پر عمل کریں اور اس آگ سے بچیں جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ یہ مضمون اس نہج پر بے مقصد نہیں لایا گیا نہ اتفاقیہ طور پر اس طرح بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ سب ہدایات بامقصد ہیں' بطور تاکید لائی گئی ہیں اور مسلمانوں کے ذہن میں اس حقیقت کو اسی مفہوم میں بٹھانا مقصود ہے۔

انہیں یہ امید دلائی گئی ہے کہ اگر وہ سودی کاروبار ترک کر دیں گے تو وہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ کامیاب ہوں گے' اس لئے کہ کامیابی صرف خدا کے تقویٰ کے نتیجے میں مل سکتی ہے۔ تقویٰ کا طبعی انجام فلاح ہے۔ اور فلاح اس لئے ہے کہ انسانوں کی زندگی میں اسلامی نظام قائم کیا جائے۔ پارۂ سوئم میں ہم تفصیل سے بیان کر آئے کہ اس منحوس سودی نظام نے انسانی معاشروں کو کس طرح تباہ کیا ہے۔ اور پوری انسانیت کو اس نظام نے کن کن مصائب میں مبتلا کئے رکھا ہے۔ مناسب ہے کہ پارۂ سوئم میں دی گئی مباحث کو ایک بار پھر ذہن نشین کر لیا جائے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ اسلامی نقطہ نظر سے فلاح کا تصور کیا ہے اور یہ کہ کس طرح فلاح اس بات پر موقف ہے کہ ہم اس خبیث سودی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔

اس کے بعد یہ آخری تاکید آتی ہے وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ..................... "اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کی امید ہو سکے۔" یہ اللہ اور رسول کی اطاعت کا عام حکم ہے' اور اس اطاعت عامہ پر اللہ کے رحم کو موقوف کیا گیا ہے لیکن سودی کاروبار کی ممانعت کے بعد بطور نتیجہ اس رحمت خداوندی کا ذکر خالی از حکمت نہیں ہے۔ اس میں ایک خاص مفہوم اور اشارہ بھی مطلوب ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی ایسے معاشرے میں جس کی اقتصادیات سودی نظام پر استوار ہوں قطعاً" اللہ اور رسول کی اطاعت ممکن نہیں رہتی۔ نیز اس دل میں اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول کا جذبہ ہی نہیں رہتا جو سود کھاتا ہو' چاہے وہ کسی بھی شکل اور کسی بھی صورت میں ہو' اس طرح نہی عن الربا کا یہ نتیجہ اور تعقیب بھی ایک طرح کی تاکید مزید ہے کہ اس منحوس نظام کو ختم کر دیا جائے۔

یہاں اطاعت اللہ اور اطاعت رسول اللہ ﷺ کی اس تاکید کا تعلق کاروبار ربا کے علاوہ جنگ احد کے ان واقعات کے ساتھ بھی ہے جن میں حضور ﷺ کے واضح احکام کی خلاف ورزی کی گئی تھی۔ اشارہ یہ مقصود ہے کہ فلاح صرف اس صورت میں نصیب ہو سکتی ہے کہ تم لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو' صرف یہی جائے امید ہے اور یہی راہ نجات ہے۔

اس سے قبل سورۂ بقرہ پارہ سوئم میں جہاں ہم نے سودی نظام پر بحث کی تھی ہم نے بتایا تھا کہ ذکر ربا کے ساتھ ساتھ وہ انفاق فی سبیل اللہ اور فضیلت صدقہ کا بیان اس لئے کیا گیا ہے کہ اجتماعی اقتصادی نظام میں یہ دونوں باہم متقابل سمتیں ہیں' جن سے دو علیحدہ علیحدہ نظامہائے اقتصاد کی طرف اشارہ مطلوب ہے۔ ایک سودی اقتصادی نظام ہے اور دوسرا باہم تعاون پر مبنی نظام اقتصاد ہے۔ چنانچہ یہاں بھی جب ربا سے بحث کی گئی تو اس کے ساتھ ہی ہر حال میں انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب بھی دی گئی۔ چنانچہ ربا کی ممانعت، اور اس آگ سے ڈرانے کے بعد جو اہل کفر کے لئے تیار کی گئی ہے اور لوگوں کو خدا خوفی کی دعوت دینے اور انہیں ہر وقت رحمت خداوندی کے امیدوار رہنے کے ساتھ ساتھ انہیں دعوت دی گئی ہے کہ وہ اللہ کی مغفرت کی طرف دوڑ کر چلیں۔ وہ بھاگے بھاگے ان جنتوں میں داخل ہوں جو آسمانوں اور زمینوں کی وسعتوں سے بھی زیادہ وسیع ہیں اور جنہیں اہل تقویٰ کے لئے تیار کیا گیا ہے اور متقین کے اوصاف میں سے پہلی صفت یہ بیان کی گئی ہے الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ ..................... "وہ لوگ جو خوشحالی اور بدحالی دونوں حالتوں میں مال خرچ کرتے ہیں۔" اس لئے یہ لوگ ان لوگوں کے فریق مخالف ہیں جو سودی نظام میں سود کھاتے ہیں اور اس کے ذریعہ دوچند چہار چند رقم بٹورتے ہیں۔ اس کے بعد پھر متقین کی اور صفات بیان کی جاتی ہیں۔ پوری آیت یہ ہے:

وَ سَارِعُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۚ وَ الَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪۫ وَ لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ

"دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین و آسمانوں جیسی ہے' اور وہ ان خدا ترس لوگوں کے لئے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوشحال جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔ اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد

ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں...... کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہے....... اور وہ دیدہ و دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔"

اس آیت کا انداز تعبیر ایسا ہے کہ اس میں ان عبارات کو بالکل محسوس طور پر بیان کیا گیا ہے۔ گویا کچھ لوگ ہیں جو کسی انعامی مقابلے میں ایک مقررہ ہدف کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ............ "دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی مغفرت کی طرف جاتی ہے" وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ............ "دوڑ کر چلو اس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے۔" دوڑو! وہ ہے جنت وہاں ہے مغفرت! اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ........ "جو ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں۔"

اس کے بعد متقین کی صفات بیان کی جاتی ہیں اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ ............ "وہ لوگ جو بدحالی اور خوشحالی دونوں میں خرچ کرتے ہیں۔"

یعنی وہ انفاق پر ہروقت ثابت قدمی سے عمل پیرا ہیں' وہ اپنی روش پر رواں دواں ہیں' نہ خوشحالی میں آپے سے باہر ہوتے ہیں اور نہ بدحالی میں اپنی نہج سے پیچھے ہٹتے ہیں۔ خوشحالی انہیں مغرور کر کے غافل نہیں بنا دیتی اور بدحالی ان کی گوشمالی کر کے انہیں ان کا نصب العین بھلا نہیں دیتی۔ انہیں اپنی ذمہ داریوں کا شعور ہروقت دامن گیر رہتا ہے۔ وہ حرص و آز سے آزاد ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ ہروقت اللہ تعالیٰ کی نگرانی کا شعور رکھتے ہیں اور ان کے دل میں خدا کا خوف ہروقت زندہ رہتا ہے۔ نفس انسانی جو اپنے مزاج کے اعتبار سے بخیل ہوتا ہے اور جس کے اندر دولت کی طبعی محبت ہوتی ہے' اسے ہروقت انفاق فی سبیل اللہ پر قائم رکھنے کے لئے ایک قوی تر جذبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جذبہ مال کی محبت سے قوی تر ہونا چاہئے۔ تاکہ وہ حرص و آز کے فطری بندھن توڑ سکے۔ اور یہ جذبہ صرف خوف خدا کا جذبہ ہی ہو سکتا ہے۔ اور یہ کیا ہوتا ہے؟ یہ ایک نہایت ہی لطیف اور گہرا شعور ہوتا جس کے ساتھ روح اونچی پرواز کرتی ہے۔ وہ خالص ہو جاتی ہے اور قید و بند سے آزاد ہو جاتی ہے۔

معرکہ حق و باطل کی اس فضا میں اس صفت کی طرف یہاں اشارہ ایک خاص مناسبت سے کیا گیا ہے۔ اس معرکے پر تبصرے کے دوران بار بار انفاق فی سبیل اللہ کی تاکید کی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان سرمایہ داروں پر بھی بار بار تنقید کی جاتی ہے جو انفاق فی سبیل اللہ سے کنی کتراتے ہیں۔ اس نکتہ کی تفصیلات نصوص کی تفسیر کے دوران بیان ہوں گی۔ معرکہ حق و باطل کی اس فضا میں انفاق کی ایک خاص اہمیت ہے۔ اور یہاں اس کا بار بار ذکر اس لئے ہوا کہ انفاق فی سبیل اللہ کے سلسلے میں دعوت اسلامی کے بعض کارکنوں کا موقف اس کا متقاضی تھا۔

وَ الْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ............ "جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔" غرض خدا خوفی اس میدان میں بھی اپنے اثرات دکھاتی ہے۔ بعینہ وہی اسباب اور وہی اثرات جو انفاق کے لئے تھے' غصہ ایک ایسا طبیعی انفعال ہے جس کے بعد انسانی خون میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا وہ انسان کے عام فطری ردعمل کی ایک قسم ہے بلکہ وہ انسان کی ایک طبعی ضرورت ہے۔ اور اس فطری ردعمل کو انسان صرف اس روحانی قوت کے ذریعہ ہی قابو میں لا سکتا ہے جو نور تقویٰ کے نتیجے میں انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ قوت غضبی اس وقت رام ہوتی ہے جب انسان روحانی قوت سے مسلح ہو اور اس کی نظریں ذاتی ضروریات اور ذاتی وقائع سے بلند ہو کر ایک اعلیٰ انسانی افق پر مرکوز ہوں۔

ہاں غصہ پی جانا تو پہلا مرحلہ ہے اور یہ کافی نہیں ہے۔ بعض اوقات انسان غصہ تو پی جاتا ہے لیکن اس کے بعد اس کے دل میں کینہ

پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں جوش انتقام ولولہ پیدا کرتا ہے۔ ظاہری غصہ ٹھنڈا ہو کر خفیہ حسد جنم لیتا ہے۔ اور گہری دشمنی پیدا ہو جاتی ہے اور اس صورت میں یہ غیظ و غضب جو ظاہری ردعمل ہوتے ہیں بمقابلہ کینہ اور بغض نسبتاً زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعد میں فرماتے ہیں کہ غیظ و غضب کے نتیجے میں حسد اور بغض پیدا نہ ہونا چاہئے بلکہ اس کے بعد عفو و درگزر سے کام لینا چاہئے اور غلطیوں کو معاف کر دینا چاہئے۔ غصہ کو اگر دل میں چھپالیا جائے تو اس سے دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں بلکہ دلوں کے اندر کینہ کی آگ سلگنے لگتی ہے۔ انسانی ضمیر دخان آلود ہو جاتا ہے۔ جب انسان دل و جان سے معاف کر دیتا ہے اور درگزر کر دیتا ہے تو یہ پردہ دلوں سے ہٹ جاتا ہے اور انسان کی روح نور کی فضاؤں میں پرواز کرتی ہے۔ دل ٹھنڈک محسوس کرتے ہیں اور انسانی ضمیر کو امن و سکون نصیب ہوتا ہے۔

وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ......................... "ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔" "کیسے نیک لوگ" وہ جو بدحالی اور خوشحالی میں اپنی دولت اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں' وہ نیک ہیں۔ وہ لوگ جو غصہ پی جانے کے بعد لوگوں کو معاف کر دیتے اور درگزر کرتے ہیں وہ نیک لوگ ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ محبوب رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے لفظ محبت کا استعمال نہایت ہی خوبصورت' دل لگتا اور ضوپاش ہے۔ اور اس شریفانہ اور منور ماحول کے ساتھ خوب ہم آہنگ ہے۔

نیکی اور نیکوکاروں کے ساتھ اس اعلان محبت سے' اہل ایمان کے دلوں میں نیکی کے سرچشمے پھوٹتے ہیں' اور یہ سوتے مومن سے مومن تک منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں اور ان دلوں میں نیکی کے لئے جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے۔ غرض یہ صرف پرتاثیر طرز ادا ہی نہیں ہے بلکہ یہ زوردار انداز تعبیر اپنے پیچھے ایک عظیم حقیقت بھی رکھتی ہے۔

وہ جماعت جسے اللہ محبوب رکھتا ہے اور وہ اللہ کو محبوب رکھتی ہے جس کے اندر عفو و درگزر عام ہے۔ جس کے اندر کینہ اور حسد نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی جماعت ہے جو ایک دوسرے سے پیوستہ اور وابستہ ہے۔ اس کے افراد بھائی بھائی ہیں۔ یہ قوی اور متین جماعت ہے۔ اس لئے وہ اپنی اندرونی زندگی میں بھی متحد اور یکجا ہے اور میدان کارزار میں بھی بنیان مرصوص ہے۔ اس لئے عفو و درگزر کا یہ مضمون بعنوان کارزار سے بھی ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

اسی مناسبت سے اہل ایمان کی ایک دوسری اہم صفت کو بھی لیا جاتا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪۟ وَ لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

"جن کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں ........ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو ........ اور وہ دیدہ و دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت کس قدر کشادہ دل ہے' اللہ لوگوں کو صرف اس وقت کشادہ دلی اور باہم برداشت کی دعوت دیتا ہے جب وہ خود ان کے ساتھ نہایت ہی فیاضی کا سلوک کرتا ہے اور اس کی انہیں اطلاع بھی دے دیتا ہے' تاکہ وہ اپنے اندر فیاضی کا ذوق پیدا کریں اور نور خدا سے شمع روشن کریں اور اونچے اخلاق سیکھیں۔ متقین اہل ایمان میں سے بلند مرتبت لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دین اسلام کی بے مثال فیاضی ہے کہ یہ دین ان لوگوں کو بھی متقین میں شمار کرتا ہے "جن کا حال یہ ہے کہ اگر ان سے کوئی فحش کام سرزد ہو جاتا ہے یا گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں

کی معافی چاہتے ہیں۔" اور گناہوں میں سے "فحش" کام اسلامی نقطہ نظر سے بدترین گناہ اور بڑے گناہوں میں سے ہے لیکن یہ اس دین کی کشادہ دلی اور فیاضی ہے کہ وہ فحاشی جیسے گھناؤنے گناہ کے ارتکاب کرنے والے کو بھی راندۂ درگاہ نہیں بناتا۔ اور اس پر رحمت کے دروازے بند نہیں کیے جاتے۔ نہ یہ دین ایسے لوگوں کو دوسرے درجے کے مسلمان قرار دیتا ہے' بلکہ ان کو بھی متقین کے اعلیٰ مرتبے پر فائز کرتا ہے۔ ہاں اس مرتبے پر فائز کرنے کے لئے صرف ایک شرط ان پر عائد کی جاتی ہے اور اس شرط سے بھی اس دین کا مزاج اور اس کا رجحان اچھی طرح معلوم ہوتا ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ ارتکاب معصیت کے بعد معاً" وہ اللہ کو یاد کرلیں اور اپنے گناہوں کی مغفرت مانگ لیں۔ اور یہ کہ وہ اس گناہ پر اصرار نہ کریں حالانکہ وہ جانتے ہوں کہ وہ جو کچھ کررہے ہیں وہ ایک معصیت ہے۔ اور یہ کہ وہ معصیت میں بے شرمی اور بے باکی کے ساتھ غرق نہ ہو جائیں بالفاظ دیگر وہ اللہ کی بندگی کے دائرے کے اندر رہیں اور آخر کار اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوں۔ یوں وہ اللہ کی پناہ میں رہیں۔ وہ اس کے عفوودرگزر اور فضل و کرم کے دائرے کے اندر ہی رہیں۔

دین اسلام کو معلوم تھا کہ انسان کمزوریوں کا پتلا ہے' بعض اوقات ان بشری کمزوریوں کی وجہ سے اس سے فحاشی کا ارتکاب بھی ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات گوشت و پوست کے جسمانی میلانات جوش میں آتے ہیں اور وہ حیوانی تقاضوں کے تحت جسمانی خواہشات اور میلانات کی سطح تک اتر آتا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ جسمانی میلانات' خواہشات اور رجحانات کی گرمی اور دباؤ میں اللہ جل شانہ کے احکامات کی خلاف ورزی پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ دین اسلام انسان کی اس فطری کمزوری کو مدنظر رکھتا ہے' اس لئے اس کے ساتھ سخت رویہ اختیار نہیں کرتا۔ اور جب انسان ان خطاؤں کا ارتکاب کرکے اپنے اوپر ظلم کا ارتکاب کرے تو یہ دین اسے فوراً ہی رحمت خداوندی سے مار نہیں بھگاتا' خصوصاً جبکہ وہ فحاشی کا ارتکاب کرے یا کسی گناہ کبیرہ میں پڑ جائے۔ اس کے دل میں شمع ایمان روشن ہے تو وہ اس کی دستگیری کے لئے کافی ہے۔ اگر اس کے دل میں ایمان کے سوتے خشک نہیں ہوئے اور اس کا رشتہ تعلق باللہ بالکل کٹ نہیں گیا تو اس کے دل میں یہ احساس زندہ رہتا ہے کہ وہ انسان ہے' غلطی کا پتلا ہے اور اس کا رب غفور رحیم ہے۔ اس لئے یہ انسان ضعیف اور خطاکار پرامید رہتا ہے اور بخیروعافیت رہتا ہے اور اس دنیا میں اس کا سفر بند نہیں ہوتا۔ وہ ایک مضبوط رسی تھامے ہوئے ہوتا ہے اور اس کا سرا اس کے ہاتھ سے چھوٹ نہیں جاتا۔ اس کی انسانی کمزوریاں اسے چاہے جس قدر گرائیں' جب تک شمع ایمان اس کے دل میں روشن ہے' وہ منزل مقصود پالے گا۔ جب تک وہ اس مضبوط رسی کو تھامے ہوئے ہے وہ راہ راست پر آہی جائے گا۔ جب تک وہ خدا کو یاد رکھتا ہے اور اس کے دل میں خوف خدا پایا جاتا ہے' جب تک وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے اور اللہ کی بندگی کا اقرار کرتا ہے اور اس کی نافرمانی اکڑکر نہیں کرتا وہ راہ راست پر آسکتا ہے۔

یہ دین اس مخلوق کے لئے توبہ کا دروازہ بند نہیں کرتا اگرچہ یہ ضعیف مخلوق وقتی طور پر گمراہی کے گڑھے میں کیوں نہ گر جائے۔ یہ دین اس خطاؤں کے پتلے انسان کو کسی غیر آباد صحراء میں بے یارومددگار نہیں چھوڑتا۔ وہ اسے اپنے انجام کے بارے میں مایوس و پریشان بھی نہیں چھوڑتا۔ اسے ہروقت مغفرت کی امید دلائی جاتی ہے۔ اس کی راہنمائی کی جاتی ہے۔ اس کے کانپتے ہاتھوں کو ہاتھ میں لیا جاتا ہے۔ اس کے ڈگمگاتے قدم مستحکم اور ثابت ہو جاتے ہیں۔ اسے شمع امید عطا کی جاتی جس میں وہ اپنی راہ پالیتا ہے اور یوں وہ محفوظ اور مامون جائے قرار تک پہنچ جاتا ہے۔ اور پرامن سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس دین کا مطالبہ اس انسان سے صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ اس کے قلب سے ایمان کے سوتے خشک نہ ہوگئے ہوں۔ اس کی روحانی دنیا تاریک نہ ہوگئی ہو اور اس نے اپنے خالق حقیقی کو بھلا نہ دیا ہو۔ وہ اللہ کو یاد کر رہا ہو اور اس کی روح میں وہ راہنما مینار نور موجود ہو اور اس کے دل میں اس کے ضمیر کی آواز حدی خواں ہو اور اس کی زمین دل میں ایمان کا نم باقی ہو تو امید کی جاسکتی ہے کہ اس

کے دل میں شمع ایمان دوبارہ روشن ہو' امید کی جاسکتی ہے کہ وہ دوبارہ امن وسکون کے خطیرہ میں لوٹ آئے اور امید کی جاسکتی ہے کہ اس کے کشت زار دل میں دوبارہ ایمان کی تخم ریزی ہو سکے۔

ایک واضح مثال آپ کو بھی درپیش ہوئی ہوگی۔ تمہارا خطاکار بچہ اگر یہ یقین رکھتا ہو کہ جس غلطی کا ارتکاب اس سے ہو چکا ہے اس پر اب گھر میں ڈنڈے کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو وہ پیچھے نہیں دیکھے گا اور بھاگتا ہی رہے گا اور مزید بے راہ روی اختیار کرے گا۔ اور کبھی گھر کو واپس نہ آئے گا۔ لیکن اگر ڈنڈے کے ساتھ ساتھ گھر میں اس کے سر پر پھرنے والا پر شفقت ہاتھ بھی ہو جو معذرت پر اس کی اس کمزوری سے صرف نظر کرتا ہو اور اسے تھپکی دیتا ہو اور جب وہ معافی مانگے تو اس کی معافی قبول ہوتی ہو تو اس صورت میں اس بات کا امکان ہے کہ وہ واپس گھر آجائے۔

اسلام اس ضعیف اور خطاکار انسان کے ساتھ ایسا ہی رویہ اختیار کرتا ہے۔ خالق کو معلوم ہے کہ انسان کی شخصیت میں اگر ایک طرف ضعف اور کمزوری ہے تو دوسری جانب اس میں کچھ صلاحیت بھی ہے۔ ایک جانب اگر اس پر مادیت کا بوجھ لدا ہوا ہے تو دوسری جانب اس کے اندر روحانیت کی سبک رفتاری بھی ہے۔ ایک طرف اس کی ذات میں اگر نفوس حیوانی کے میلانات ہیں تو دوسری جانب اس کے اندر ربانی رجحانات بھی ودیعت کئے گئے ہیں۔ اس لئے جب بھی وہ حیوانی گندگیوں میں مبتلا ہو کر نیچے گرتا ہے تو دست قدرت اس کی دستگیری کرتا ہے اور اسے اوپر کی طرف اٹھاتا ہے اور پھسلنے پر اس کو تھپکی دے کر دوبارہ اسے کھڑا کرتا ہے کہ وہ راہ راست پر رواں ہو' بشرطیکہ اس کے دل میں خدا کی یاد ہو اور وہ اپنے خالق کو بالکل بھول نہ چکا ہو۔ اور وہ جان بوجھ کر غلطی پر اڑ نہ جائے۔ رسول خدا ﷺ فرماتے ہیں کہ "جو شخص استغفار کرے تو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ غلطی پر مصر نہیں ہے اگرچہ وہ دن میں ستر مرتبہ ایسا کرے۔"[۱]

ہاں توبہ کا دروازہ کھلا رکھ کر اسلام بہر حال بے راہ روی میں لوگوں کو آزاد نہیں چھوڑتا۔ اور نہ غلط کار اور گمراہیوں کے گڑھے میں گرنے والوں کو قابل تعریف سمجھتا ہے۔ اور نہ اس گندگی کو حسن سے تعبیر کرتا ہے' جس طرح بام نہاد "واقعیت پسندی" کے پیروکار کرتے ہیں' ہاں اسلام صرف لغزش اور انسان کی فطری کمزوریوں کو تسلیم کرتا ہے تاکہ انسان کے اندر مایوسی پیدا نہ ہو اور شمع امید روشن رہے۔ اس طرح اسلام شرم و حیاء کے انفعالات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور انسانی کوتاہیوں پر اللہ کی جانب سے مغفرت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو مغفرت کر سکے۔ اسلام گناہ کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا البتہ اگر کوئی شرمندہ ہوتا ہے تو اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ وہ استغفار کے لئے تو آمادہ کرتا ہے لیکن وہ گناہوں کے ارتکاب میں لاپرواہی کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ نہ مسلسل خطاکاری کرنے اور اسے شعار بنانے کی اجازت دیتا ہے' اس لئے کہ جو لوگ ارتکاب جرم کو اہمیت ہی نہیں دیتے اور مسلسل گناہ پر گناہ کئے جارہے ہیں تو وہ حدود سے نکل گئے ہیں۔ ان کے سامنے دیواریں حائل ہو گئی ہیں۔

یوں اسلام' اس انسانیت کو پکارتا ہے کہ وہ بلند افق کو نصب العین بنائے' لیکن اس دعوت و پکار کے ساتھ اس پر رحمت اور شفقت کے لئے بھی ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اس لئے کہ اسلام کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ انسان کی طاقت کی حدود کیا ہیں۔ اس لئے اسلام' انسان کے لئے' امید کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھتا ہے۔ اور انسان کی طاقت جہاں تک ساتھ دیتی ہے وہ اسے آگے بڑھاتا ہے۔[۲]

اس کے بعد ان متقین کے انجام کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

---

۱۔ روایت ابوداؤد' ترمذی اور بزاز۔ اس نے اپنی سند میں عثمان ابن واقد کی روایت سے نقل کیا ہے۔ اگرچہ اس کی سند میں ایک نامعلوم صحابی ہیں لیکن ابن کثیر نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور کہا ہے "حدیث حسن"

۲۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے میری کتاب "اسلام اور عالمی سلامتی" کی فصل "ضمیر کی سلامتی"

أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ

"ایسے لوگوں کی جزاء ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انہیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کے لئے۔"

ارتکاب معصیت سے استغفار کر کے وہ محض منفی کام نہیں کر رہے' اور نہ وہ خوشحالی اور بدحالی میں انفاق کر کے محض منفی کام کر رہے ہیں یا غصہ پی کر اور لوگوں سے عفو و درگزر کر کے وہ محض منفی کام کر رہے ہیں' بلکہ وہ مثبت کام بھی کرتے ہیں اور نیک عمل کرنے والے ہیں' اس لئے ان کے لئے ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے اور وہ ایسے باغات میں رہیں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی اور مغفرت کے بعد ان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے محبت کا اعزاز بھی حاصل ہو گا۔ یہاں ان کے نفس کی گہرائیوں میں بھی عمل ہے اور ظاہری زندگی میں بھی عمل ہے۔ دونوں عمل ہیں' دونوں میں حرکت ہے اور دونوں میں ترقی ہے۔

یہ تمام صفات جن کا یہاں ذکر ہو رہا ہے اور سیاق کلام میں آگے جس معرکہ کارزار کا ذکر ہونے والا ہے' ان دونوں کے درمیان ایک خاص مناسبت ہے۔ جس طرح سودی معیشت یا باہمی تعاون کے اسلامی نظام معیشت کا تعلق میدان جہاد کے معرکے سے تھا اور اسلامی جماعت کے شب و روز اس سے متاثر ہوئے تھے' اسی طرح ان نفسیاتی خصوصیات اور اجتماعی اوصاف کے اثرات بھی جماعت مسلمہ پر پڑتے تھے۔ ہم نے اس موضوع پر بات کا آغاز کرتے وقت اس طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً کنجوسی پر فتح یاب ہونا' غصے پر قابو پانا' ارتکاب معصیت کے مقابلے میں ضبط کرنا' اللہ کی طرف رجوع کرنا' اس کی جانب سے مغفرت کا طلبگار ہونا اور اس کی رضامندی کو نصب العین بنانا' ایسی فتوحات ہیں جو معرکہ کارزار میں دشمن پر فتح حاصل کرنے کے لئے اشد ضروری ہیں۔ یہ لوگ دشمنان اسلام اس لئے تو تھے کیونکہ وہ بخل کے نمائندے تھے۔ وہ اپنی خواہشات نفس کے پیرو کار تھے' وہ خطاکار اور بے حیا تھے اور وہ اسلام کے دشمن اس لئے تھے کہ وہ اپنی ذات' اپنی خواہشات' اور اپنے نظام زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکام' اس کی شریعت اور اس کے پسندیدہ نظام زندگی کے تابع نہ تھے۔ یہی تو ان کے ساتھ عداوت کی وجہ تھی اور یہی تو میدان کشمکش تھا۔ اور اسی وجہ سے ان کے خلاف جہاد شروع کیا گیا تھا۔ ان اسباب کے علاوہ مسلمانوں کی معرکہ آرائی اور عمل جہاد کے کوئی اسباب نہ تھے اور نہ اب ہیں۔ ایک مسلم کی عداوت بھی اللہ کے لئے ہے' اس کی معرکہ آرائی بھی فی سبیل اللہ ہے' اس کا جہاد بھی اللہ کے لئے ہے' اس لئے درج بالا تمام ہدایات اور ان کے بعد آنے والے معرکہ کارزار کے بیان کے درمیان مکمل مناسبت ہے۔ نیز ان باتوں کا ان حالات سے بھی تعلق تھا جن میں یہ معرکہ درپیش ہوا۔ مثلاً یہ کہ رسول ﷺ اللہ کی حکم عدولی' مال غنیمت جمع کرنے کا لالچ' اور اس کی وجہ سے حضور کی واضح ہدایات کو نظر انداز کرنا۔ عبداللہ ابن ابی اور اس کے ساتھیوں کی جانب سے محض انا کی خاطر لشکر اسلام سے علیحدہ ہو جانا۔ اور جیسا کہ سیاق کلام میں یہ بات واضح ہو گی کہ بعض لوگوں نے بڑی بڑی غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ نیز ان لوگوں کے نظریات اور تصورات میں بھی جھول اس لئے تھی کہ وہ ہر امر کو اللہ اور رسول کی طرف نہ لوٹاتے تھے اور بعض لوگ مایوس ہو کر یہ سوالات کرتے تھے کہ آیا ہماری اس تحریک کا کوئی نتیجہ برآمد ہو گا؟ اور بعض لوگوں کے یہ خیالات کہ ہماری کوئی حیثیت ہوتی تو ہم یہاں یوں نہ مارے جاتے وغیرہ۔

قرآن کریم ان تمام حالات سے بحث کرتا ہے۔ ایک ایک کر کے' بعض امور کی وضاحت کی جاتی ہے' بعض امور کے بارے میں وہ آخری فیصلے کر دیتا ہے۔ ان حقائق کے بارے وہ نفس انسانی کو چٹکی بھر کر جگاتا ہے' اس کے اندر جوش پیدا کرتا ہے اور ان حقائق کو نہایت

انسانی کے اندر زندہ کر دیتا ہے ۔ اور یہ کام قرآن کریم اپنے منفرد طریقہ کار کے مطابق کرتا ہے جس کے نمونے سیاق کلام کے اندر جابجا ملیں گے ۔

○......☆......○

غرض اس مضمون کے تیسرے فقرے میں اب معرکہ کے واقعات کا آغاز ہو جاتا ہے لیکن ان واقعات کے اندر بھی اسلامی تصور حیات کے بنیادی حقائق ذہن نشین کرائے گئے ہیں ۔ رہے واقعات معرکہ تو انہیں محض محور اور مدار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور یہ حقائق ان واقعات کے ارد گرد گھومتے ہیں ۔

اس پیراگراف کے آغاز میں اس طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی ایک سنت جاریہ ہے اور اس سنت کا تعلق ان اقوام سے ہے جو حق کو جھٹلاتی ہیں ۔ اس اصول اور سنت کے ذکر کا مقصد یہ بات مسلمانوں کے گوش گزار کرنا ہے کہ اس معرکے میں انہیں جو شکست ہو گئی ہے یہ ایک عارضی بات ہے اور یہ اس کائنات میں اللہ کی مستقل سنت نہیں ہے ۔ یہ عارضی شکست بھی ایک خاص حکمت پر مبنی تھی ۔ اس کے بعد انہیں تلقین کی جاتی ہے کہ وہ صبر سے کام لیں اور اس سرزمین پر بذریعہ قوت ایمان اپنے آپ کو سربلند رکھیں ۔ اگر اس معرکے میں انہیں شکست ہوئی ہے اور انہوں نے زخم کھائے ہیں تو اس سے قبل ایسے معرکے میں اہل شرک نے زخم کھائے تھے اور انہیں شکست ہوئی تھی لیکن اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی گہری حکمت کارفرما تھی اور جس کا بیان ان کے سامنے کھل کر آ جائے گا ۔ یہ حکمت کہ اہل اسلام کی صفوں میں سے کھوٹے لوگوں کو علیحدہ کر دیا جائے' ان کے دلوں سے کھوٹ نکال دیا جائے' اور شہداء اسلام کی ایک ایسی مثال تیار کی جائے جو اپنے نظریۂ حیات کے لئے جان دینے والے ہوں اور مسلمان موت کا مقابلہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کریں ۔ جبکہ اس سے قبل وہ راہ حق میں تمنائے موت اپنے دلوں میں لئے ہوئے تھے تاکہ وہ اپنے وعدوں اور اپنی آرزوؤں کو حقیقت کے ترازو میں تول کر دیکھیں ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ کفر کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں اور کافروں کے مقابلے میں ایک منظم اسلامی جماعت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کریں ۔ چنانچہ ان پورے واقعات کی تہہ میں ایک بلند حکمت پوشیدہ تھی چاہے یہ واقعات فتح ہوں یا حادثات شکست ہوں ۔ فرماتے ہیں : قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿١٣٧﴾ هَٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ

لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٣٨﴾ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٣٩﴾

إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا

بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَ

اللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿١٤٠﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ

الْكَافِرِينَ ﴿١٤١﴾ أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ

جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝١٤٢ وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ
قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۪ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝١٤٣

١٤ ع ١٤ ٥

"تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں' زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا' جنھوں نے (اللہ کے احکام و ہدایات کو) جھٹلایا۔ یہ لوگوں کے لئے ایک صاف اور صریح تنبیہ ہے اور جو اللہ سے ڈرتے ہوں ان کے لئے ہدایت اور نصیحت...... دل شکستہ نہ ہو' غم نہ کرو' تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا ہے کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں' ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی راستی کا گواہ ہوں...... کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں...... اور وہ اس آزمائش کے ذریعہ مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا تھا۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔ تم موت کی تمنا کر رہے تھے' مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب موت سامنے نہ آئی تھی' لو اب وہ تمہارے سامنے آگئی ہے اور تم نے اسے آنکھوں سے دیکھ لیا۔"

اس غزوہ میں مسلمانوں نے سخت چوٹ کھائی تھی۔ وہ ایک بڑی تعداد میں قتل ہوئے تھے اور انہیں ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔ انہیں عظیم روحانی اور جسمانی اذیت سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ ان میں سے ستر صحابی قتل ہو گئے تھے' رسول کریم ؐ کے دانت مبارک شہید ہو گئے تھے۔ آپ ؐ کا چہرہ مبارک زخمی ہوا تھا۔ آپ ؐ کو مشرکین نے گھیرے میں لے کر تنگ کیا اور صحابہ کرام کو گہرے زخم آئے۔ اس شکست کی وجہ سے اہل اسلام سخت جھنجوڑ دیئے گئے۔ اس لئے کہ یہ ایک ایسا صدمہ تھا جو جنگ بدر کی عجیب فتح کے بعد شاید بالکل ہی غیر متوقع تھا۔ یہاں تک کہ جب اہل اسلام کو یہ حادثہ پیش آیا تو وہ بے ساختہ کہنے لگے' یہ سب کچھ کیسے ہوا' ہم مسلمان ہوتے ہوئے بھی ایسے حالات سے دوچار ہو سکتے ہیں؟

یہاں قرآن کریم اہل ایمان کو اس کرۂ ارض پر سنت الٰہی کی طرف متوجہ کرتا ہے' یہاں انہیں وہ اصول یاد دلایا جاتا ہے جس کے مطابق اس کرۂ ارض پر واقعات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ یہ واقعات بالکل انوکھے نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اس کائنات میں انسانی زندگی کے لئے جو نوامیس فطرت وضع کئے گئے ہیں' یہاں زندگی ان کے مطابق چل رہی ہے۔ ان سے تخلف بالکل ممکن نہیں ہے اور نہ یہاں واقعات اتفاقیہ بغیر کسی اصول کے وقوع پذیر ہوتے ہیں جبکہ یہ واقعات نوامیس فطرت کے عین مطابق ہوتے ہیں' اگر وہ ان نوامیس فطرت کو پڑھیں' ان کے مغز تک پہنچیں تو انہیں باسانی وہ حکمت معلوم ہو جائے گی جو ان واقعات کے پشت پر تھی' اور پھر انہیں وہ مقاصد بھی واشگاف طور پر نظر آجائیں جو ان واقعات کی تہہ میں پنہاں تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ وہ نظام کس قدر پختہ ہے جس کے مطابق یہ واقعات و احداث ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ نیز ان کی تہہ میں جو حکمت پوشیدہ تھی اس کے بارے میں بھی انہیں اچھی طرح اطمینان ہو جائے اور وہ اچھی طرح معلوم کر لیں کہ گزشتہ واقعات کی روشنی میں' ان کے لئے آئندہ لائن کیا ہے۔ اب اس روشنی کے آجانے کے بعد وہ یہ توقع کریں گے کہ چونکہ وہ مسلمان ہیں اس لئے واقعات ایسے ہونے چاہئیں اور انہیں فتح اور نصرت حاصل ہونی چاہئے۔ بغیر اس کے کہ وہ فتح و نصرت کا سامان مہیا کریں' جن میں سے پہلا سبب اللہ اور رسول اللہ کی طاعت امر ہے۔

وہ سنت اللہیہ کیا ہے جس کی طرف سیاق کلام انہیں یہاں متوجہ کر رہا ہے؟ وہ ان لوگوں کا انجام ہے جنہوں نے پوری انسانی تاریخ میں حق کو جھٹلایا ہے اور یہ کہ دنیا میں لوگوں کے شب و روز بدلتے رہتے ہیں۔ لوگوں کو آزمائش میں ڈالا جاتا ہے تاکہ ان کی روح خالص ہو جائے۔ ان کی قوت صبر کو آزمایا جاتا ہے اور یہ آزمائش مصائب و شدائد کے پہاڑ توڑ کر کی جاتی ہے۔ اور یہ کہ جو لوگ صبر سے کام لیتے ہیں آخر کار انہیں فتح نصیب ہوتی ہے اور جو لوگ کفر کا رویہ اختیار کرتے ہیں انہیں صفحۂ ہستی سے مٹایا جاتا ہے۔

ان آیات میں سنن اللہیہ کے بیان کے درمیان اہل ایمان کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ مشکلات کو انگیز کریں' شدید حالات میں ایک دوسرے کے غم خوار ہوں اور انہیں جو چوٹ لگی ہے' اس پر صبر کریں' اس لئے کہ یہ چوٹ صرف انہیں نہیں آئی بلکہ ان دشمنوں نے بھی تو ان کے برابر چوٹ کھائی حالانکہ مومنین ان کے مقابلے میں بلند نظریات کے حاملین ہیں۔ وہ ان کے مقابلے میں راہ ہدایت پر ہیں اور ان کے مقابلے میں ان کا نظام زندگی زیادہ بہتر ہے۔ اور ان مشکلات کے بعد انجام کار فتح و کامرانی بھی اہل ایمان کو نصیب ہونے والی ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿۱۳۷﴾ هَٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ

"تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں' زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے (اللہ کے احکام و ہدایات کو) جھٹلایا۔ یہ لوگوں کے لئے ایک صاف اور صریح تنبیہ ہے اور جو اللہ سے ڈرتے ہوں ان کے لئے ہدایت و نصیحت۔"

قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ انسانیت کے حاضر کو اس کے ماضی سے مربوط کر دیتا ہے اور ماضی کو حاضر کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ اور ماضی اور حال کو باہم مربوط کر کے انسانیت کے مستقبل کی فکر کرتا ہے۔ عرب معاشرہ جو قرآن کے مخاطبین اول تھے ان کی زندگی کوئی زندگی نہ تھی' ان کے ہاں کوئی علمی ذخیرہ نہ تھا اور اسلام سے پہلے ان کے ہاں سرمایہ تجربات بھی نہ تھا تاکہ تحریک اسلامی ان کے سامنے خود ان کے ذخیرۂ ثقافت سے کوئی مکمل نمونہ پیش کرتا۔ یہ تو اسلام اور اسلام کی کتاب قرآن تھی جس نے یہ کارنامہ انجام دیا کہ اس نے عربوں کو حیات جدید سے نوازا اور ان کو ایک ایسی امت کی شکل دی جس نے ادوار مابعد میں پوری دنیا کی قیادت کی۔

وہ قبائلی نظام معاشرت جس کے سایہ میں عرب زندگی گزار رہے تھے' یہ اس قابل ہی نہ تھا کہ وہ ان کی فکر کو اس قدر وسعت دے دیتا کہ وہ جزیرۃ العرب کی زندگی کے واقعات کو کوئی منطقی ربط دے دیتے چہ جائیکہ وہ اس کرۂ ارض میں بسنے والی تمام انسانیت اور اس کے حادثات اور واقعات کے درمیان کوئی منطقی ربط تلاش کر سکتے اور پورے کرۂ ارض کے اندر پیش آنے والے عالمی واقعات اور اس کائنات کے اندر جاری نوامیس فطرت اور ان کے مطابق جاری و ساری انسانی زندگی کے اندر ربط کی تلاش کے بارے میں تو وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

قرآن کریم اور اسلام کے نتیجے میں عربوں کے اندر جو علمی اور ثقافتی انقلاب رونما ہوا' وہ ایک دور رس انقلاب ہے' یہ کوئی ایسا انقلاب نہ تھا کہ کسی معاشرے کے اندر تدریج کے ساتھ علمی و ثقافتی ترقی کی وجہ سے رونما ہوا اور نہ یہ انقلاب اس وقت کی رائج اور چلتی ہوئی زندگی کے تقاضوں اور صلاحیتوں کی وجہ سے رونما ہوا۔ بلکہ یہ عظیم انقلاب خالص اسلامی نظریۂ حیات کے نتیجے میں رونما ہوا بلکہ یہ عقیدہ ان کے لئے یہ تحفہ لایا اور انہیں اٹھا کر اسلامی نظریۂ حیات کی سطح تک بلند کیا۔ اور یہ سب کام اس نظریۂ حیات نے صرف ربع صدی کے قلیل عرصہ میں سرانجام دیا۔ جبکہ عربوں کے اردگرد بسنے والی ترقی یافتہ اور علمی سرمایہ سے مسلح اقوام افکار عالیہ کے اس مقام تک صدیوں بعد پہنچ پائیں اور کئی نسلیں گزرنے کے بعد ان اقوام نے معلوم کیا کہ اس کائنات کے اندر کچھ قوانین فطرت عمل پیرا ہیں اور یہ

ان اٹل فطری نوامیس کے تحت چل رہی ہے اور جب انہوں نے ان قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کو دریافت کر لیا تو وہ اس حقیقت تک پھر بھی نہ پہنچ سکیں کہ ان اٹل قوانین کے اوپر ایک اٹل مشیت الٰہیہ بھی ہے جو ان قوانین فطرت کی قید میں بھی مقید نہیں ہے۔ اور قوانین فطرت کے بعد بھی تمام امور کے اندر اختیار اللہ تعالیٰ کا ہے۔ رہی امت مسلمہ تو اس نے روز اول سے اس کا یقین حاصل کر لیا تھا۔ اس کائنات کے بارے میں اس کا تصور بہت وسیع ہو گیا تھا' اور اس کے احساس اور شعور کے اندر ان قوانین فطرت کے ثبات اور اللہ تعالیٰ کی بے قید مشیت کے اندر ایک توازن قائم ہو چکا تھا۔ اس لئے اس کی عملی زندگی تو قوانین فطرت کے اٹل اصولوں پر قائم تھی لیکن اس کے بعد اسے یہ اطمینان بھی حاصل تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی بے قید ہے۔ فرماتے ہیں :

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ............ "تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں" ان ادوار میں نوامیس فطرت زندگی پر حکمران تھے۔ اور یہ نوامیس فطرت اللہ کی بے قید مشیت نے جاری کئے تھے۔ اگر تمہارے دور سے پہلے کچھ واقعات ان نوامیس فطرت کے مطابق رونما ہوئے تو تمہارے دور میں بھی ایسے ہی واقعات رونما ہوں گے۔ اس لئے امم سابقہ کی تاریخ میں تمہاری جیسی صورت حال سے جو اقوام دوچار تھیں اور ان کے سامنے کچھ حقائق رونما ہوئے تو ایسے ہی نتائج کے لئے تم بھی تیار رہو۔

فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ............ "زمین میں چل پھر کر دیکھ لو" اس لئے کہ پورا کرۂ ارض ایک سیارہ ہے۔ اس سیارے میں انسانی زندگی رواں دواں ہے۔ یہ کرۂ ارض اور اس کے اندر انسانی زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔ بصارت اور بصیرت دونوں کے لئے اس میں وافر سامان عبرت موجود ہے۔

فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ............ "دیکھ لو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے (اللہ کے احکام وہدایات کو) جھٹلایا۔" یہ وہ انجام ہے جس کے آثار کرۂ ارض پر ہر جگہ قابل مشاہدہ ہیں۔ نیز ان کی تاریخ میں وہ آثار و شواہد بعد میں آنے والوں نے ریکارڈ کر دیئے ہیں۔ قرآن کریم نے ان سنن و سیر کی ایک بڑی تعداد کو اپنے ہاں نقل کیا ہے۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات پر ان کا ذکر ہے اور بعض جگہ واقعات کی جگہ' ان کا زمانہ اور واقعات کے اشخاص اور کرداروں کا تذکرہ بھی تفصیل سے کیا ہے۔ جبکہ بعض جگہ صرف اشارات سے کام لیا گیا ہے اور زمان و مکان کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ مجملاً" واقعہ بیان ہوا ہے۔ یہاں بھی ایک اجمالی اشارہ اس انسانی تاریخ کی طرف کیا گیا ہے اور اس سے ایک مجمل اور مجرد نتیجہ نکالا گیا ہے' وہ یہ کہ پیغمبروں کی تکذیب کرنے والوں کا جو انجام کل ہوا تھا' وہی انجام آج بھی مکذبین کے لئے طے ہو چکا ہے۔ اور کل بھی ان کا یہی انجام ہو گا۔ یہ اشارہ اس لئے کیا گیا ہے کہ جماعت مسلمہ اپنے انجام کے بارے میں مطمئن اور یکسو ہو جائے اور اس بات سے متنبہ ہو جائے کہ وہ مکذبین کے ساتھ پھسل نہ جائے۔ اس لئے کہ اس وقت ایسے حالات موجود تھے جن میں اس یقین دہانی کی ضرورت تھی نیز ایسے حالات بھی موجود تھے جن میں مسلمانوں کو لغزش کھانے سے ہوشیار کرنے کی ضرورت تھی۔ اور آنے والے سیاق کلام میں ان حالات پر تفصیلاً روشنی ڈالی گئی ہے۔

نوامیس فطرت اور انسانی تاریخ میں سنت الٰہیہ کی طرف اشارے کے بعد لوگوں کو پکارا جاتا ہے کہ وہ انسانی تاریخ کے ان واقعات سے عبرت اور نصیحت حاصل کریں۔ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ............ "یہ لوگوں کے لئے ایک صرف اور صریح تنبیہ ہے۔ جو اللہ سے ڈرتے ہوں ان کے لئے ہدایت و نصیحت۔" یہ تمام انسانوں کے لئے ایک بیان ہے۔ پس یہ انسانیت کے لئے ایک دور رس انقلاب ہے اور لوگ اس انقلاب سے اس وقت تک بہرور نہیں ہو سکتے جب تک یہ بیان نہ کیا جائے۔ لیکن اس بیان سے استفادہ صرف ایک خاص گروہ ہی کر سکے گا صرف یہی لوگ عبرت و نصیحت حاصل کر سکیں گے۔ صرف یہی لوگ بہرور ہوں گے۔ کون المتقون۔

یہ حقیقت ہے کہ کلمہ ہدایت کو شرف قبولیت صرف دل مومن بخشتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ہدایت کے لئے ہروقت کھلا ہوتا ہے اور فصیح و بلیغ نصیحت سے استفادہ متقی دل ہی کر سکتا ہے' جو ہروقت کلمہ ہدایت سنتے ہی دھڑکنے لگتا ہے اور قبولیت کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ صرف حق و باطل کا علم کسی کو فائدہ دے یا ہدایت و ضلالت کا صرف علم مفید ہو۔ سچائی اپنی فطرت کے اعتبار سے اس قدر واضح ہوتی ہے کہ اس کے لئے وہ کسی طویل کلام و بیان کی محتاج ہی نہیں ہوتی۔ دراصل جس چیز کی کمی ہوتی ہے وہ قبول حق کا داعیہ ہوتا ہے اور لوگوں کو حق کے قبول کرنے کا راستہ معلوم نہیں ہوتا۔ سچائی کی رغبت اور اس کے قبول کرنے کے راستے صرف اس صورت میں مل سکتے ہیں جب کوئی دل ایمان و یقین سے بھر جائے اور ایمان اس وقت محفوظ رہتا ہے جب اس کی پشت پر تقویٰ اور خدا خوفی موجود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بار بار اس قسم کی تاکیدیں کی گئی ہیں کہ اس کتاب میں جو سچائی' جو ہدایت' جو روشنی' جو وعظ اور جو عبرت آموز باتیں بیان کی گئی ہیں وہ مومنین اور متقین ہی کے مفید مطلب ہیں۔ اس لئے کہ ایمان اور تقویٰ ہی دل کے دریچے ہدایت' روشنی اور عبرت و نصیحت کے لئے کھول دیتے ہیں۔ صرف ایمان و تقویٰ کے بل بوتے پر ہی ایک انسان راہ حق کی تکالیف برداشت کر سکتا ہے۔

یہ اصلی بات ہے اور اس مسئلے کی یہی حقیقت ہے۔ صرف علم اور معلومات کے ساتھ مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ کئی ایسے لوگ دیکھے جاسکتے ہیں کہ وہ حق کے علم و معرفت کی ایک بڑی تعداد رکھتے ہوئے بھی باطل کے پرستار ہوتے ہیں اور اس میں گم گشتہ ہوتے ہیں۔ محض اس لئے کہ ان کی نفسانی خواہشات ان پر قابو پائے ہوئے ہوتی ہیں جن کے مقابلے میں علم و معرفت بے بس ہوتی ہے اور یا اس لئے کہ وہ ان مشکلات کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں جو حاملین حق اور داعیان حق کا ہمیشہ استقبال کرتی ہیں۔

اس کے بعد روئے سخن مسلمانوں کی طرف پھر جاتا ہے۔ ان کی دلجوئی کی جاتی ہے' تسلی دی جاتی ہے اور ثابت قدمی کی تلقین کی جاتی ہے۔ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ............ "دل شکستہ نہ ہو' غم نہ کرو' تم ہی غالب رہو گے' اگر تم مومن ہو۔"

وَلَا تَهِنُوا ...... یہ لفظ وھن سے نکلا ہے' جس کے معنی ضعیفی کے ہیں اور غم نہ کرو' یعنی ان مصائب پر جو تمہیں پیش آرہے ہیں یا ان مفادات کے لئے جو تم سے چھوٹ گئے۔ تم غالب اور برتر ہو' اس لئے کہ تمہارا نظریۂ حیات برتر ہے۔ تم صرف اللہ وحدہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہو اور وہ لوگ اللہ کی مخلوقات میں سے کسی مخلوق کے سامنے جھکتے ہیں یا کسی چیز کو اللہ کے ساتھ شریک کرکے اس کے سامنے جھکتے ہیں۔ اور تمہارا نظام حیات ان کے نظام حیات کے مقابلے میں افضل و برتر ہے۔ تم اس نظام کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہو جسے اللہ نے بنایا ہے۔ اور وہ اس نظام زندگی کے پیروکار ہیں جو انسانوں نے بنایا ہے۔ تمہارا رول ان کے مقابلے میں برتر ہے۔ تم پوری انسانیت کے لئے حاملین وصیت ہو' اس پوری انسانیت کے لئے ہادی اور رہبر ہو جبکہ وہ اللہ کے اس نظام سے دھتکارے ہوئے ہیں' گمراہ ہو چکے ہیں۔ اس کرۂ ارض پر تمہارا مقام بلند مقام ہے۔ تم اس وراثت کے حاملین میں سے ہو جس کا تمہارے ساتھ اللہ نے عہد کر رکھا ہے۔ اور ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ عدم اور فنا کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس لئے اگر تم سچے مومن بن جاؤ تو تم ہی اس دنیا میں اعلیٰ اور سربلند رہو گے۔ اور اگر تم سچے مومن ہو تو نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور نہ دل شکستہ ہو' اس لئے کہ یہ اللہ کی سنت ہے کہ کبھی تم پر مصیبت آئے گی اور کبھی تم کامران ہو گے اور جہاد' ابتلا اور کھرے کھوٹے کے درمیان تمیز ہو جانے کے بعد تمہاری عاقبت اچھی ہو گی۔

"اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا ہے کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہیں۔ کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں۔ اور وہ اس آزمائش کے

ذریعہ سے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا تھا۔"

یہاں اس چوٹ کا ذکر کیا گیا جو اہل اسلام کو لگی اور اس کا بھی ذکر کیا جو جھٹلانے والوں کو لگی تھی۔ مکذبین کی چوٹ سے مراد غزوۂ بدر ہے۔ اس لئے کہ اس موقعہ پر مشرکین کو چوٹ لگی تھی اور اہل اسلام صحیح و سالم بچ گئے تھے لیکن جھٹلانے والوں کی چوٹ سے مراد غزوۂ احد بھی ہو سکتا ہے جس میں ابتداءً گو مسلمانوں کو فتح ہوئی تھی۔ اہل کفر کو شکست ہوئی تھی اور ان میں سے ستر آدمی قتل ہو گئے تھے۔ اس کے بعد مشرکین بھاگ نکلے اور مسلمان ان کے تعاقب میں نکلے اور انکی کھوپڑیوں پر ضربات لگاتے رہے۔ مشرکین کا علم تک گر گیا اور کوئی ایسا شخص نہ رہا جو آگے بڑھ کر علم اٹھاتا۔ آخر کار ایک عورت نے علم اٹھایا۔ اس پر انہیں جرات ہوئی اور اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ اس کے بعد مشرکین کی باری آئی جب تیراندازوں نے حضور ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی کی۔ آپس میں اختلاف کیا اور اس معرکے کے آخری دور میں مسلمانوں پر وہ مصیبت آئی جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے اور یہ پوری پوری سزا تھی اس بات کی کہ انہوں نے حضور ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی کی اور آپس میں اختلاف کیا۔ یوں اللہ تعالیٰ کی وہ سنت ظاہر ہوئی جسے اس نے اس کائنات کے لئے مقدر فرمایا ہے۔ اس لئے کہ تیراندازوں کی جانب سے حضور ﷺ کے احکام کیخلاف ورزی اور مشورہ کے باوجود آپس میں اختلاف اس وجہ سے پیدا ہوئے تھے کہ ان کے دلوں میں مال غنیمت کا لالچ پیدا ہو گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے جہاد و قتال میں مسلمانوں کے لئے نصرت تو بہرحال لکھ دی ہے لیکن ان لوگوں کے لئے جو صرف فی سبیل اللہ جہاد کرتے ہیں۔ اور ان کا مطمع نظر اس دنیائے دنی کی کوئی بے وقعت فائدہ نہیں ہوتا۔ اس واقعہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ایک دوسری سنت کا ظہور بھی ہوا۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ فتح و نصرت کو لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں۔ کبھی اہل حق کو فتح ہوتی ہے تو کبھی کبھار اہل باطل کو فتح ہوتی ہے۔ ان کے اعمال اور ان کی نیتوں کے مطابق۔ ان ایام کی وجہ سے اہل ایمان اور اہل نفاق کو چھانٹ کر رکھ دیا جاتا ہے۔ نیز غلطیوں کا ارتکاب ہوتا ہے اور لوگوں کے دلوں سے نظریاتی کھوٹ نکل جاتا ہے۔

إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا

"اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا تھا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سے سچے مومن کون ہیں۔"

کشادگی کے بعد سختی اور سختی کے بعد کشادگی 'وہ حالات ہیں جو نفس انسانی کی خفیہ صلاحیتوں کو ابھارتے ہیں' اس سے لوگوں کے مزاج معلوم ہو جاتے ہیں اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کون نظریاتی لحاظ سے پاک ہو چکا ہے اور کس میں نظریاتی میل کچیل موجود ہے۔ کون ہے جو جلد باز ہے اور کون ہے جو ثابت قدم ہے۔ کون ہے جو مایوسی کا شکار ہوتا ہے اور کون ہے جسے اللہ پر مکمل بھروسہ ہے۔ کون ہے جو تن بتقدیر سپرد کرتا ہے اور کون ہے جو راضی برضا ہوتا ہے' یا خود سری اختیار کرتا ہے؟

یہاں آکر اسلامی جماعت کی تطہیر ہو جاتی ہے اور ظاہر ہو جاتا ہے کہ کون مومن ہے اور کون منافق ہے۔ دونوں فریقوں کی حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ اور لوگوں کی دلی کیفیات اس دنیا کے لوگوں پر بھی منکشف ہو جاتی ہیں۔ اس طرح اسلامی صفوں سے ہر قسم کی وہ کمزوریاں دور ہو جاتی ہیں جو لوگوں کے درمیان اخلاقی اور نظریاتی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں جبکہ جمعیت میں مختلف الخیال اور مبہم قسم کے لوگ ہوں۔

اللہ تعالیٰ تو مومنین کو بھی جانتے ہیں اور منافقین کو بھی جانتے ہیں۔ اللہ علیم بذات الصدور ہیں۔ لیکن واقعات زندگی' فتح و شکست کے نتیجے میں چھپے لوگ سامنے آجاتے ہیں' چھپے ہوئے اوصاف واقعات زندگی کی صورت میں برملا ہو جاتے ہیں۔ اب ایمان ایک ظاہری عمل کی صورت میں سامنے آجاتا ہے۔ اور نفاق بھی متشکل اور متجسم ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان امور پر حساب و کتاب ہو گا اور ان پر انعام و سزا بھی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ان امور پر حساب و کتاب نہیں لیتے جنہیں وہ جانتے ہیں بلکہ جزاء و سزا کا دارومدار ان امور پر ہوتا ہے جو عمل میں آجاتے ہیں۔

اور زندگی کے نشیب و فراز اور سختی اور نرمی کا یکے بعد دیگرے آنا ایک ایسی کسوٹی ہے جس کا نتیجہ غلط نہیں ہوتا' یہ ایک ایسا ترازو ہے جس میں کوئی کمی بیشی نہیں رہتی۔ اس میزان میں مشکلات اور امن دونوں برابر ہیں۔ کئی ایسی شخصیات ہوتی ہیں جو مشکلات کا مقابلہ کرتی ہیں' صبر اور مصابرت کرتی ہیں لیکن جب سہولت آتی ہے تو تن آسانی ہو جاتی ہیں لیکن اہل ایمان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ مشکلات میں جم جاتے ہیں اور صبر کرتے ہیں لیکن جب عیش و آرام کا وقت آتا ہے تو پھر بھی آپے سے باہر نہیں ہوتے۔ اور دونوں حالتوں میں ان کی توجہ اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ ان کا یقین اس بات پر پختہ ہوتا ہے۔ خوشحالی اور بدحالی دونوں میں عمل و دخل ذات باری کا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کی تربیت فرما رہے تھے اور یہ تربیت اس دور میں ہو رہی تھی جب جماعت مسلمہ پوری دنیا کی قیادت کا چارج لینے ہی والی تھی تو اللہ تعالیٰ نے بدر کی کامیابی اور خوشحالی کے بعد احد کی ناکامی اور برے حالات سے دوچار کر کے اسے آزمایا اور اس کی تربیت کی۔ حیرت انگیز کامیابی اور فتح و کامرانی کے بعد اسے اچانک غیر متوقع شکست سے دوچار کر دیا۔ اگرچہ یہ دونوں واقعات بے سبب نہ تھے اور دونوں' اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کے عین مطابق تحت الاسباب تھے' جو فتح و ہزیمت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں مقرر فرما رکھے تھے تاکہ اس نئی اٹھنے والی قیادت اور تحریک کو معلوم ہو جائے کہ فتح و ہزیمت کے اسباب کیا ہوتے ہیں؟ تاکہ وہ اللہ اور رسول کی اطاعت میں اور پختہ ہو جائے۔ اللہ پر اس کا توکل اور بھروسہ اور زیادہ ہو جائے۔ وہ ذات باری کے ساتھ مزید جڑ جائے اور اسلامی نظام زندگی کے مزاج اور اس کے فرائض سے حق الیقین کی طرح واقف ہو جائے۔

اب بات ذرا اور آگے بڑھتی ہے۔ امت مسلمہ کو حکمت الٰہیہ کے کچھ اور پہلو دکھائے جاتے ہیں۔ یہ حکمتیں اس معرکے کے واقعات کے بیان کے دوران اور زندگی کے نشیب و فراز کے آئینہ میں دکھائی جاتی ہیں یعنی مسلمانوں کی صفوں کی تطہیر اور اہل ایمان کو اہل نفاق سے چھانٹ دینے کے بعد بعض دوسری حکمتیں؟ وَ يَتَّخِذَ مِنۡكُمۡ شُهَدَآءَ "اور تم سے بعض کو شہید کر دے۔"

یہ عجیب طرز ادا ہے جس میں گہرے معانی پوشیدہ ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ خود شہداء کا انتخاب فرماتے ہیں۔ مجاہدین میں سے مقام شہادت کے لئے انتخاب ہوتا ہے اور یہ انتخاب اللہ تعالیٰ خود اپنے لئے کرتے ہیں۔ پس یہ گویا کوئی مصیبت اور خسارہ نہیں ہے کہ کوئی اللہ کے راستے میں شہید ہو جائے بلکہ اسے اللہ تعالیٰ اپنے لئے اختیار کر لیتے ہیں' چھانٹ لیتے ہیں۔ یہ گویا ان کے لئے خاص اعزاز ہوتا ہے۔ ان کو اللہ نے چھانٹ لیا اور ان کو مقام شہادت اور مرتبہ شہادت حق پر فائز کر دیا تاکہ وہ خالصتاً" اللہ کے ہو جائیں اور اس کی مقرب کابینہ میں شامل ہو جائیں۔ وَ يَتَّخِذَ مِنۡهُمۡ.......... "اللہ ان سے چن لے۔"

پھر ایک مفہوم کے مطابق یہ لوگ اللہ میاں کے گواہ ہیں اور یہ اپنی جان دے کر اس سچائی پر شہادت دیتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ پر اتارا ہے۔ یہ لوگ گواہی دیتے ہیں کہ یہ پیغام' پیغام حق ہے اور یہ شہادت وہ اس انداز اور اس اسلوب میں دیتے ہیں کہ پھر اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا اور جرح کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور اس کے بعد بات کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ یہ شہادت اس مسلسل جدوجہد کے ساتھ دیتے ہیں جس کا انجام جان کا نذرانہ پیش کرنے پر ہوتا ہے اس طرح وہ اپنے خون سے اس سچائی کو تسلیم کرتے

ہیں اور دنیا کے سامنے اسے فیصلہ کن شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان مختار لوگوں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ یہ شہادت دیں کہ اللہ کی جانب سے جو نظریۂ حیات نازل ہوا ہے وہ حق ہے۔ وہ اس پر ایمان لا چکے ہیں۔ وہ اس کے لئے خالص ہو گئے ہیں۔ وہ ان کو اس قدر عزیز ہو گیا ہے کہ عزیز تر از جان ہے۔ اور یہ کہ لوگوں کی زندگی اس وقت تک درست نہیں ہو سکتی جب تک وہ اس سچائی کے مطابق نہ ہو جائے۔ یہ کہ وہ اس پر پختہ یقین کر چکے ہیں۔ اس لئے وہ اس امر میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے کہ وہ لوگوں کی زندگیوں سے باطل کو ختم کر دیں' نکال دیں اور یہ حق پوری دنیا میں استوار ہو جائے اور لوگوں کے نظام حکومت میں بھی وہ رائج ہو جائے۔ غرض یہ شہداء ان سب امور کے شہداء ہیں اور ان کی شہادت عبارت ہے جہاد اور موت فی سبیل اللہ سے اور یہ ایک ایسی شہادت ہے جس میں کسی قیل و قال کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اب ذرا دوسرا پہلو دیکھیں' جب کوئی اپنی زبان سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت ادا کرتا ہے' یہ شہادت اس وقت تک شہادت نہیں ہوتی جب تک یہ مقر اس شہادت کے مفہوم اور تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ اور مفہوم یہ ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی کو الٰہ نہ سمجھے' یا یہی مفہوم کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کو ماخذ شریعت اور ماخذ قانون نہ بنائے۔ اس لئے کہ الٰہ کی خصوصیات میں سے مخصوص ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ لوگوں کے لئے قانون سازی کرے۔ اور بندوں کے حوالے سے مخصوص ترین بندگی یہ ہے کہ بندہ اپنا نظام حیات اور نظام قانون اللہ تعالیٰ سے اخذ کرے۔ اور جس کی عملی شکل یہ ہے کہ وہ قانون رسول خدا ﷺ سے اخذ کرے جو اللہ کے رسول اور اس کی جانب سے شارع ہیں۔ اور ان دو مصادر کے علاوہ ان کے نزدیک قانون کا کوئی اور مصدر اور ماخذ نہ ہو۔

پھر اس کلمہ شہادت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان وہ جدوجہد شروع کر دے جس کے نتیجے میں اس کرۂ ارض پر الوہیت اور حاکمیت صرف اللہ کی ہو جائے۔ جس طرح اس کی تبلیغ حضرت محمد ﷺ نے فرمائی۔ اور یہ شریعت اسلامی نظام حیات بن جائے۔ یہ نظام غالب ہو اور اس کی پیروی ہونے لگے اور یہ نظام لوگوں کی پوری زندگی میں متصرف ہو اور اس کے تصرف سے زندگی کا کوئی پہلو مستثنیٰ نہ ہو۔

اس مفہوم کے اعتبار سے' اس نظریۂ حیات نے یہ تقاضا کیا کہ یہ شخص اس کی راہ میں جان دے دے تو شہید نے جان دے دی۔ اس لئے وہ ایک ایسا گواہ بن گیا جس سے اللہ نے یہ مطالبہ کیا کہ وہ یہ شہادت ادا کرے۔ اس لئے کہ اسے اللہ نے گواہی کے مقام پر فائز کیا ہے۔ اس وجہ سے وہ شہید بن گیا ہے۔

یہ ہے اس عجیب انداز کلام کا گہرا فہم یعنی وَ يَتَّخِذَ مِنۡكُمۡ شُهَدَآءَ .......... اور یہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت کا مفہوم اور مقتضاء ہے۔ اس شہادت کا وہ مفہوم نہیں ہے' جس کے مطابق یہ شہادت محض ایک مذاق بن جائے' محض وقت کا ضیاع ہو اور اس سے رخصتیں برآمد ہوتی ہوں۔

وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيۡنَ .......... "اللہ کو ظالم لوگ پسند نہیں۔" قرآن کریم میں لفظ ظلم سے اکثر اوقات شرک مراد لیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ شرک در حقیقت ظلم عظیم ہے۔ اور سب سے زیادہ قبیح حرکت ہے۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ آتا ہے۔

اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ .......... "بے شک شرک ایک عظیم ظلم ہے۔" صحیحین میں حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں میں نے سوال کیا رسول خدا کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ آپؐ نے فرمایا یہ کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بناؤ حالانکہ صرف اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا ہے۔"

اس سے پہلے سیاق کلام میں جھٹلانے والوں کے بارے میں اللہ کی سنت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اور اب یہ فیصلہ سنایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ بالواسطہ اس بات کی تاکید ہے کہ جھٹلانے والے اپنے منطقی انجام کو ضرور پہنچیں گے'

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ محبت نہیں کرتا۔ اس انداز تعبیر کے یہ اثرات بھی سامنے آتے ہیں کہ ایک مومن ظلم اور ظالم سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اور ظلم اور ظالمین کے خلاف یہ فضا پیدا کرنا حدیث جہاد اور حصول شہادت کے لئے آمادہ کرنے کے اس موقعہ کے ساتھ گہرا ربط رکھتی ہے۔ اس لئے کہ مومن اس بات کے خلاف جہاد کرتا ہے جسے اللہ مٹانا چاہتا ہے اور ان لوگوں کے خلاف جہاد کرتا ہے جو اللہ کو سخت ناپسند ہیں۔ اور یہی شہادت گاہ مومن ہے۔ اس جگہ وہ نذرانہ جان پیش کرتا ہے اور ایسے ہی لوگوں سے اللہ شہداء کا انتخاب فرماتے ہیں۔

اس کے بعد اب مضمون اس طرف جاتا ہے کہ ان حادثات فاجعہ کے پس پشت کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ بتایا جاتا ہے کہ ان کے ذریعہ امت کی تربیت مقصود تھی' اسے پاک کر کے اس کے اعلیٰ کردار کے لئے تیار کرنا مقصود تھا تاکہ وہ اللہ کی تقدیر اور ہتھیار بن کر کافروں کو نیست و نابود کر دے اور وہ مکذبین کو سزا دینے کے لئے دست قدرت کے لئے پردہ بن جائے۔ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ.................. "اور وہ آزمائش کے ذریعہ سے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا تھا۔" تمحیص علیحدہ اور ممتاز کرنے کے بعد کا درجہ ہے۔ اور یہ وہ کارروائی ہے جو انسانی نفس کے اندر پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ ضمیر کے اندر اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا تجربہ ہوتا ہے جس سے شخصیت کے خفیہ گوشے کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ ان خفیہ گوشوں پر لائٹ فوکس ہو جاتی ہے تاکہ ان گوشوں سے میل کھوٹ اور ملاوٹ دور ہو جائے۔ وہ واضح اور صاف نظر آجائیں اور یہ شخصیت سچائی پر خوبی کے ساتھ جم جائے۔

بارہا ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی شخصیت کے بارے میں صحیح جائزہ نہیں لے سکتا۔ وہ اپنی خفیہ کمزوریوں اور اپنے نفس کے نشیب و فراز سے واقف نہیں ہوتا۔ اور یوں اسے نہ اپنی قوت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے اور نہ اپنی کمزوریوں کا صحیح پتہ ہوتا ہے۔ اس کی بعض ایسی خفیہ کمزوریاں ہوتی ہیں جن کا اظہار اس وقت ہوتا جب ان کو ابھارا جائے۔

چھانٹی کے اس عمل کا انتظام اللہ جل شانہ نے اپنے ہاتھ میں لیا ہوا تھا۔ اور یہ چھانٹی اس طرح کی جا رہی تھی کہ مسلمانوں کو زندگی کے نشیب و فراز سے دوچار کیا جائے' انہیں فتح بھی ہو اور شکست بھی ہو' سختی بھی آئے اور اچھے حالات بھی درپیش ہوں۔ انہیں خوب رگڑا دیا جائے۔ اور اس تلخ رگڑ کے بعد اہل ایمان اپنے بارے میں وہ کچھ جان لیں جو اس سے قبل وہ نہ جانتے تھے۔ حادثات' تجربے اور مختلف عملی مواقف سے دوچار کر کے ان کی یہ چھانٹی ہوئی۔

بعض اوقات انسان اس غرے میں مبتلا ہوتا ہے کہ وہ قوی و شجاع ہے اور حرص و آز کے پنجے سے آزاد ہے اور جب وہ عملی تجربات کی کسوٹی پر چڑھتا ہے اور جب وہ واقعی حالات سے دوچار ہوتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی شخصیت میں تو ابھی بڑی بڑی کمزوریاں ہیں' جو ابھی تک دور نہیں ہو سکیں۔ اور یہ کہ وہ ابھی تک مشکلات کے اس قدر دباؤ کے برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتا اس لئے یہ بات خود اس کے مفاد میں ہوتی ہے کہ اسے قبل از وقت اپنی کمزوریوں کا علم ہو جائے تاکہ وہ اپنی شخصیت کو از سر نو ڈھالنے کی کوشش کرے۔ اور وہ ان مشکلات کے برداشت کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لے جو اس دعوت کی راہ میں لازماً درپیش آنے والی ہیں۔ اور اس نظریۂ حیات کی وجہ سے وہ لابدی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی اسکیم یہ تھی کہ وہ اس پہلی جماعت اسلامی کی اچھی طرح تربیت کر دے۔ جسے اس نے پوری انسانیت کی قیادت کے لئے تیار کرنا تھا۔ اس اسکیم کے مطابق اس جماعت نے اس کرۂ ارض پر ایک عظیم کام سرانجام دینا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو اس طرح چھانا اور چھانٹا اور احد میں اسے ایسے حالات سے دوچار کیا جو غیر متوقع تھے تاکہ یہ جماعت اپنی سطح ذرا بلند کرے اور اپنے آپ کو

اس رول کے لئے تیار کرے جو اللہ نے طے کر دیا تھا کہ اس نے ادا کرنا ہے اور وہ یہ تھا وَ يَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ......... ''اور تاکہ وہ کافروں کی سرکوبی کرے۔'' اور یہ اس لئے کہ حق کے ذریعہ' باطل کی سرکوبی کرنا سنت اللہیہ میں سے ایک سنت ہے۔ لیکن یہ سرکوبی اس وقت ممکن ہوتی ہے جب حق ظاہر ہو جائے اور سخت تربیت اور چھانٹی کے ذریعہ اس کی کمزوریاں دور کر دی جائیں۔

اب اگلی حکیمانہ بات بصورت استفہام انکاری آتی ہے۔ دعوت اسلامی کے بارے میں مسلمانوں کی سوچ کو درست کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں سنت الٰہی کیا ہے؟ بتایا جاتا ہے کہ فتح و شکست' اعمال اور ان کے نتائج کے بارے میں اللہ کا ایک اٹل قانون ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جنت کی راہ میں تو کانٹے بھی بچھے ہوئے ہوتے ہیں' مشکلات بھی ہوتی ہیں' اور اس راہ کی مشکلات کو صبر و ثبات کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہے۔ محض خالی خولی تمناؤں اور نیک خواہشات رکھنے کے ذریعہ یہ گھاٹی عبور نہیں کی جاسکتی۔ تمہیں اس راہ میں مشکلات انگیز کرنی ہوں گی اور اپنی صفوں کو کمزور لوگوں سے صاف کرنا ہو گا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ

''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔ تم موت کی تمنائیں کر رہے تھے مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب موت سامنے نہ آئی تھی' لو اب وہ تمہارے سامنے آگئی ہے اور تم نے اسے آنکھوں سے دیکھ لیا۔''

صیغہ استفہام انکاری اس مقام پر استعمال ہوتا ہے جہاں مخاطب کو ایک نہایت ہی خطرناک فکری غلطی پر متنبہ کرنا مطلوب ہوتا ہے۔ یہاں فکری غلطی یہ تھی کہ لوگوں نے سمجھا کہ بس زبان سے اس قسم کا اعلان ہی کافی ہے کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور میں موت کے لئے تیار ہوں' اسلام کی راہ میں مر مٹنے کے لئے۔ صرف اس اعلان ہی سے گویا انہوں نے دعوت اسلامی کی راہ کی تمام مشکلات برداشت کر لیں اور اب وہ اللہ کی رضامندی اور جنت دونوں کے مستحق ہو گئے ہیں۔

یہاں انہیں سختی کے ساتھ بتایا گیا کہ تمہاری یہ سوچ درست نہیں ہے۔ تمہیں مشکلات کے واقعی تجربے سے گزرنا ہو گا' عملی امتحان ہو گا' جہاد میں شرکت کرنی ہو گی اور مصائب کو گلے لگانا ہو گا۔ اور اس کے بعد یہ کہ ان مشکلات کی حالت میں جزع و فزع نہیں بلکہ صبر کرنا ہو گا اور ان کو برداشت کرنا ہو گا۔

یہاں اس آیت کے بعض الفاظ چونکا دینے والے ہیں وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ ........
........ ''حالانکہ ابھی یہ تو اللہ نے دیکھا ہی نہیں ہے کہ تم میں سے کون لوگ ہیں جو اس راہ میں جانیں لڑانے والے ہیں۔
وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ........ ''اور کون ہیں جو اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔''

اس لئے اس راہ میں صرف جہاد کر لینا ہی کافی نہیں ہے' بلکہ مشکلات راہ پر صبر کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ مشکلات تو مسلسل ہوتی ہیں' مختلف نوعیت کی ہوا کرتی ہیں اور یہ اس وقت ختم نہیں ہو جاتیں جب میدان جنگ میں جہاد ختم ہو جاتا ہے' بلکہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ میدان جنگ میں مشکلات جہاد بہت ہی کم ہوتی ہیں بمقابلہ اس کے جو جہاد کے بعد آتی ہیں اور جن کی خاطر صبر کا تقاضا کیا گیا ہے اور جن میں ایمان کی

آزمائش ہوتی ہے۔ ہماری روز مرہ کی زندگی میں نہ ختم ہونے والی مشکلات ہوتی ہیں' افق ایمان پر مسلسل جمے رہنا' شعور اور عمل دونوں میں ایمان کے تقاضے پورے کرتے رہنا' زندگی کی راہوں میں انسانی کمزوریوں پر بذریعہ صبر قابو پاتے رہنا' روز مرہ زندگی میں ان تمام لوگوں کے ساتھ یومیہ معاملات میں اور اپنے نفس کے ساتھ تمام معاملات میں اسلام پر جمے رہنا اور خصوصاً ان مقامات پر صبرو ثبات کا مظاہرہ کرنا جن میں باطل قوتوں کو بظاہر کامیابی حاصل ہوتی ہے اور وہ یوں نظر آتی ہیں گویا بس فتح اب ان کے لئے مقدر ہے۔ پھر بعض اوقات جدوجہد طویل ہوتی ہے اور راستہ طویل اور کٹھن نظر آتا ہے اور مشکلات سے پر نظر آتا ہے' ایسے حالات میں صبر کرتے رہنا' جہاد اور مشکلات اور جنگ میں آرام طلبی کی تمنا' وسوسے اور نفس کی اکتاہٹ کے مقابلے میں صبرو ثبات کا مظاہرہ کرتے چلے جانا' غرض اس راہ میں جو نامعلوم اور پوشیدہ مشکلات ہوتی ہیں' اور ان میں سے میدان جنگ صرف ایک مشکل ہے' ان سب کو انگیز کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا وغیرہ یہ سب اس آیت کے تقاضے ہیں اور جنت کی راہ کی مشکلات ہیں۔ غرض ان مقاصد کا حصول صرف الفاظ اور تمناؤں سے نہیں ہوتا۔

وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَ اَنْتُمْ... تَنْظُرُوْنَ ............ "تم موت کی تمنائیں کر رہے تھے' مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب موت سامنے نہ آئی تھی' لو اب وہ تمہارے سامنے آگئی اور تم نے اسے آنکھوں سے دیکھ لیا۔"

یہاں قرآن مجید ان کو ایک بار پھر موت کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتا ہے' جس کی وہ تمنائیں کیا کرتے تھے۔ اور پھر جس کا معائنہ وہ معرکۂ احد کے میدان میں کر چکے تھے اور اس منظر کے سامنے انہیں اس لئے کھڑا کیا گیا ہے کہ وہ ذرا ان حقائق کے ساتھ جو عملی میدان میں در پیش آئے ہیں' ان الفاظ و کلمات کا مقابلہ کریں جو ان کی زبان پر ہوتے ہیں اور ان تمناؤں کا موازنہ کریں جو ان کے دلوں میں ہوتی ہیں تاکہ وہ انہیں سکھائے کہ وہ ہر اس کلمے اور لفظ کا جائزہ لیں جو ان کی زبانوں سے نکلتا ہے اور یہ دیکھیں کہ ان کلمات کے پیچھے مفہومات کا کس قدر سرمایہ موجود ہے اور یہ جائزہ وہ ان حقائق کی روشنی میں لیں جو معرکۂ احد کے اندر پیش آئے۔ اس طرح انہیں معلوم ہو گا کہ ان کلمات کی قدر و قیمت کیا ہے' جو اپنے منہ سے ادا کرتے ہیں اور ان تمناؤں کی حیثیت کیا ہے جو وہ اپنے دلوں میں بسائے ہوئے ہیں اور ان بھاری حقائق کے مقابلے میں ان وعدوں کا کیا مقام ہے جو انہوں نے کئے تھے۔ پھر یہاں انہیں یہ بھی سکھلایا جاتا ہے کہ صرف ہوا میں تحلیل ہونے والے الفاظ یا دل میں ابھرنے والی تمنائیں ہی انہیں جنت میں داخل نہیں کر سکتیں' بلکہ جنت میں وہ تب داخل ہو سکیں گے جب وہ ان کلمات کو حقیقت کا جامہ پہنائیں اور ان تمناؤں کو میدان عمل میں لائیں تاکہ وہ حقیقی جامہ کا روپ دھاریں اور اس راہ کی مشکلات میں وہ صبر کرتے ہوئے نظر آئیں اور اللہ کی راہ میں ان حقائق کو لوگوں کی واقعی اور عملی دنیا میں دیکھ لیں۔

اللہ تعالیٰ کے لئے یہ کام کوئی مشکل نہ تھا کہ وہ مومنین کو مشکلات میں ڈالے بغیر اور تکالیف دیئے بغیر ہی پہلے ہی دن اپنے نبی' اپنے اس پیغام ہدایت اور اپنے اس تجویز کردہ نظام حیات کو کامیابی سے ہمکنار کر دیتا۔ وہ اس بات پر قادر تھا کہ وہ فرشتے اتارتا اور وہ ان کے ساتھ لڑتے یا وہ اکیلے ہی مشرکین کو تباہ کر دیتے' جس طرح ان فرشتوں نے قوم عاد' قوم ثمود اور قوم لوط علیہم السلام کو تباہ کیا تھا۔

لیکن جو اہداف مقرر ہوئے تھے' وہ صرف فتح و نصرت نہ تھے۔ اہداف میں یہ امر بھی تھا کہ جماعت مسلمہ کی تربیت بھی کی جائے' اس لئے کہ اس جماعت نے پوری انسانیت کی قیادت کا فریضہ سر انجام دینا تھا۔ اس وقت انسانیت ضعیف و نحیف تھی' خواہشات نفسانی اور میلانات جسمانی کی غلام تھی' اور وہ عملاً جاہلیت اور فکراً انحراف کا شکار تھی اور اس مقصد کے لئے ایسی قیادت درکار تھی جو ذہین ہو' اور وہ قائدین سے اعلیٰ صلاحیتوں کا تقاضا کرتی ہو' ان تقاضوں میں سب سے پہلا تقاضا یہ ہو کہ وہ حق اور صداقت پر پختگی سے جمنے والے ہوں۔ وہ مشکلات پر صبر کرنے والے ہوں اور انہیں معلوم ہو کہ ان کی صفوں میں کہاں کمزوری ہے اور کہاں قوت ہے۔ اور انہیں

یہ بھی معلوم ہو کہ انسانی نفس کہاں کہاں ٹھوکر کھاتا ہے' کہاں راہ راست سے انحراف کا خطرہ ہوتا ہے اور یہ کہ پھر ان سب کمزوریوں کا علاج کیا ہے؟ پھر اگر اچھے حالات اور کامرانی ہو تو پھر بھی صبر کرنے والی ہو اور شدید حالات ہوں تو پھر بھی صبر ہو' اور حقیقت یہ ہے کہ کامیابی کے بعد ناکامی دیکھنا اور اس پر صبر کرنا ان حالات میں بہت ہی کڑوی اور ناخوشگوار صورت حال تھی۔

جماعت مسلمہ کو عالمی قیادت کے منصب پر فائز کرنے کے احکام دینے سے قبل' اللہ تعالیٰ نے جماعت مسلمہ کو ایسی سخت تربیت سے گزارا۔ یہ اس لئے کہ وہ اس عظیم اور خوفناک کام کرنے کے لئے تیار ہو جائے' جو اس نے اس کرۂ ارض پر سرانجام دینا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کی مشیئت یہ تھی کہ وہ اس عظیم مشن پر اس انسان کو بھیجے گا جس کے لئے اس نے اسے چھانٹ لیا ہے اور منتخب کر لیا ہے۔

اور مشیئت الٰہیہ، جماعت مسلمہ کی تیاری اور تربیت میں اب مختلف وسائل کو کام میں لاتی ہے۔ مختلف حالات اور واقعات سے اسے گزارا جاتا ہے۔ کبھی تو اس جماعت کو ایک فیصلہ کن فتح عطا کی جاتی ہے' تو پھر یہ خوش ہو جاتی ہے' اپنے اوپر اس کا اعتماد بحال ہو جاتا ہے' اور یہ کام خداوند تعالیٰ کی معاونت خاصہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اسے فتح و کامرانی کا تجربہ بھی کرایا جاتا ہے۔ تو وہ کامرانی کے اس نشے میں صبر اور سنجیدگی کا مظاہرہ کرتی ہے' وہ اس میں کبر و غرور بدمستی اور علو کے مقابلے میں بھی کامیاب ہوتی ہے۔ تواضع اور اللہ کے شکر کا دامن نہیں چھوڑتی۔ اور بعض اوقات اسے شکست شدت اور درد سے گزارا جاتا ہے' تو وہ اللہ کے جناب میں پناہ لیتی ہے۔ اسے اپنی ذاتی قوت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ جب وہ اسلامی نظام زندگی سے معمولی انحراف بھی کرے گی تو اس کے لئے اس کے نتائج کس قدر خطرناک ہوں گے۔ یوں وہ شکست کی کڑواہٹ بھی چکھ لے گی اور اس کے ساتھ وہ باطل پر غالب ہو گی اس لئے کہ وہ حق پر ہے۔ اسے اپنی صفوں کے اندر کمزوریاں اور نقائص معلوم ہو جائیں گے کہ کہاں سے خواہشات نفس در آتی ہیں' کہاں جاکر قدم پھسلتے ہیں تاکہ اگلے مرحلے میں وہ ان تمام کمزوریوں کو دور کر سکے۔ اور وہ فتح اور شکست دونوں سے تجربات کا ایک وسیع سرمایہ لے کر آگے بڑھے۔ یہ تھی سنت الٰہیہ اور اس کے مطابق قضا و قدر کا نظام چل رہا تھا۔ اس میں سرمو انحراف ممکن نہ تھا اور نہ اب ہے۔

یہ معرکۂ احد کے حاصلات تجربہ میں سے ایک قلیل زاد راہ تھا تجربات کا ایک حصہ تھا جسے جماعت مسلمہ کے لئے' ہر اسلامی انقلابی جماعت مسلمہ کے لئے' ہر دور' ہر زمان اور ہر مکان میں اٹھنے والی جماعت کے لئے یہاں آیات قرآنی میں قلم بند کیا گیا۔

اس کے بعد قرآن کریم اپنی خاص نہج کے مطابق' جماعت اسلامی کی تربیت کے لئے یہاں بعض عظیم اور اہم حقائق کو معرکۂ بدر کے واقعات کے حوالے سے پیش کرتا ہے تاکہ یہ حقائق اس جماعت کی فکر کا حصہ بن جائیں۔ نصوص قرآنیہ ان واقعات کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا ۗ وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُؤَجَّلًا ۗ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ ۝ وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قُتِلَ

مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ مَا
ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ
اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ
اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ
۱۵ ع ۵ ۶ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

"محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں' ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں' پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا' البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا۔ کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔ جو شخص ثواب دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا میں سے دیں گے' اور جو ثواب آخرت کے ارادے سے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا اور شکر کرنے والوں کو ہم ان کی جزا ضرور عطا کریں گے۔ اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزرے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے' انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی' وہ باطل کے آگے سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی "اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما' ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو تجاوز ہو گیا ہو اسے معاف کر دے' ہمارے قدم جمادے اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔" آخر کار اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثواب آخرت بھی عطا کیا۔ اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں۔"

اس ٹکڑے کی پہلی آیت ایک متعین واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور یہ واقعہ غزوۂ احد میں پیش آیا۔ جب تیراندازوں نے پہاڑ پر اپنا متعین مقام چھوڑ دیا' اور مشرکین وہاں سے ان پر چڑھ دوڑے' مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے' مسلمانوں کو شکست ہوئی اور حضورؐ کے دانت مبارک شہید ہو گئے اور آپ کے چہرے پر زخم آئے اور چہرۂ مبارک سے خون بہنے لگا' فریقین باہم گتھم گتھا ہو گئے' مسلمان منتشر ہو گئے' کسی کو کسی کا پتہ نہ رہا۔ ان حالات میں کسی پکارنے والے نے یہ آواز دے دی۔ لوگو! محمدؐ قتل ہو گئے۔ اس چیخ کا مسلمانوں پر بہت ہی برا اثر ہوا۔ ان میں سے بہت سے لوٹ کر مدینہ آ گئے۔ پہاڑ کے اوپر چڑھ گئے' شکست کھا گئے اور مایوس ہو کر میدان جنگ کو چھوڑ گئے۔ حضور ﷺ کے پاس چند افراد رہ گئے اور ان حالات میں آپ ﷺ ان چند افراد کے ساتھ جم گئے۔ اور مسلمانوں کو یہ آواز دینے لگے کہ واپس آؤ' چنانچہ وہ پھر سے مجتمع ہوئے۔ ان کے دل تھم گئے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ایک محسوس انداز سے ان پر اونگھ طاری کر کے انہیں طمانیت قلب اور امن و سکون عطا کر دیا جب کہ تفصیلات بعد میں آ رہی ہیں۔

یہ واقعہ جس نے ان لوگوں کو مکمل طور پر مدہوش کر دیا تھا' قرآن کریم اسے نکتہ توجہ بناتا ہے اور اس مناسبت سے وہ یہاں اسلامی تصور حیات کے اہم حقائق سامنے لاتا ہے۔ اس کو موضوع بنا کر یہاں حقیقت موت و حیات کے بارے میں اہم اشارات دیئے جاتے ہیں اور تاریخ ایمانی اور حالات قافلہ ایمانی پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَ سَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ

"محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں' ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں' پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو' جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا' البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا۔"

بے شک محمد صرف رسول ہیں' ان سے پہلے بھی رسول گزرے ہیں' یہ سب رسل فوت ہوئے ہیں اور محمد ﷺ بھی اس طرح فوت ہوں گے جس طرح وہ رسول فوت ہوئے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جب اس معرکہ میں یہ حقیقت (اگرچہ جھوٹی افواہ کے طور پر) تمہارے سامنے آئی تو کیوں تمہاری نظروں سے اوجھل رہی۔ یہ نہایت ہی حیرت انگیز بات ہے۔

محمد ﷺ اللہ کی طرف سے ایک پیغام لانے والے ہیں۔ وہ اس لئے آئے ہیں کہ اللہ کا پیغام پہنچا دیں۔ اللہ اپنی جگہ زندہ لایموت ہے۔ اس کا پیغام زندۂ جاوید ہے۔ اس لئے یہ کس طرح مناسب ہو گا کہ اگر پیغام لانے والے فوت ہو جائیں یا قتل ہو جائیں تو تم اپنے نظریۂ حیات کو چھوڑ کر الٹے پاؤں پھر جاؤ۔ یہ بھی ایک واضح حقیقت تھی جو اس معرکہ کی افراتفری میں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی حالانکہ مناسب نہ تھا کہ یہ اہل ایمان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے کیونکہ یہ نہایت ہی سیدھی سادھی بات تھی۔

انسان فانی ہے اور نظریۂ حیات باقی ہے۔ اسلامی نظام زندگی ایک علیحدہ حقیقت ہے' جو ان لوگوں سے بالکل مستقل حقیقت رکھتا ہے جو اس کے حاملین ہیں اور جو اسے لوگوں تک پہنچاتے ہیں' وہ رسول ہوں یا رسولوں کے بعد امت کے داعی اور مبلغین ہوں۔ وہ مسلمان جو رسول خدا ﷺ کے ساتھ محبت رکھتا ہے اور یہ محبت ایسی ہے جس کی پوری تاریخ انسانی میں کوئی نظیر نہیں ملتی' اس کا فرض ہے کہ وہ ذات رسول اور اس نظریہ حیات کے اندر فرق و امتیاز کرے جسے اس ذات نے لوگوں تک پھیلایا۔ اس لئے کہ جو نظریۂ حیات آپ ﷺ نے دیا وہ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ ...... ہے۔ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے جو حَيٌّ لَا يَمُوْتُ ...... ہے۔ یہ فرق کرنا ان کا فرض اس لئے بنتا ہے کہ وہ محب رسول ہیں۔ یہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ حضور ﷺ کو کانٹا تک بھی چبھے۔ ابودجانہ کو دیکھو کہ وہ اپنی پیٹھ کے ذریعہ رسول خدا ﷺ کے لئے ڈھال بنے ہوئے ہیں۔ ان پر تیروں کی بارش ہو رہی ہے اور وہ ہیں جو جمے ہوئے ہیں اور یہ دیکھو کہ آپ صرف نو آدمیوں کے ساتھ رہ گئے اور ان سے ایک کے بعد ایک شہید ہو رہا ہے' سب ختم ہو جاتے ہیں لیکن آپ ﷺ کو گزند پہنچنے نہیں دیتے۔ اور آج ہر جگہ اور ہر زمانے میں آپ کا نام سنتے ہی لوگ بوجہ محبت وجد میں آ جاتے ہیں اور ٹوٹ کر آپ سے محبت کرتے ہیں' اپنے پورے وجود کے ساتھ اور اپنے پورے جذبات کے ساتھ۔

اے محبان رسول! داعی سے دعوت کی قدر و قیمت زیادہ ہے۔ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ...... "محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں۔"

وہ سابق رسول بھی اسی دعوت کے حاملین تھے جس کی جڑیں زمانہ قدیم میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں' تاریخ کے بڑے بڑے میدانوں میں بارہا یہ دعوت سرسبز ہوتی رہی ہے۔ اس کا آغاز' آغاز انسانیت کے ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ اور یہ رسول زندگی کی گزرگاہوں میں اس کے حدی خواں رہے ہیں۔ قائدانہ انداز میں اور امن و سلامتی کے ساتھ۔

اس لئے یہ پیغام اور یہ نظام داعی سے بڑا ہے اور داعی سے زیادہ زندہ رہنے والا ہے۔ داعی تو آتے جاتے رہتے ہیں لیکن یہ پیغام زمانوں اور نسلوں سے جاری و ساری ہے۔ اس کے ماننے والے اس کے منبع اول کے ساتھ مربوط اور جڑے رہتے ہیں۔ وہ منبع اور مصدر جس نے خود ان رسولوں کو بھیجا وہ منبع باقی ہے۔ اس کی طرف مومنین کا رخ ہے۔ وہ نصب العین ہے اور اہل ایمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ الٹے پاؤں پھریں اور اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر مرتد ہو جائیں حالانکہ اللہ زندہ جاوید ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں ان کے رویے پر سخت نکیر کی گئی۔ فرماتے ہیں

**اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ**

"کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا۔"

تعبیر ایسی ہے کہ اس میں ارتداد کی زندہ تصویر سامنے آجاتی ہے۔ "تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔" **انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ** ............... اور **وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ** ............... "جو الٹا پھرے۔" یہ ایک حسی اور دیکھے جانے والی حرکت ہے' ایک زندہ شخص الٹے پاؤں مڑتا ہے۔ یہ انقلاب ارتداد کی ایک مجسم شکل ہے۔ اسلامی نظریۂ حیات چھوڑنا بعینہ اسی طرح ہے جس طرح ایک شخص اچانک واپس الٹے پاؤں مڑ جائے۔ حالانکہ یہاں اس انقلاب سے مراد یہ حسی حرکت نہیں ہے' بلکہ اس سے مراد وہ نفسیاتی حالت ہے جس میں ایک شخص نظریاتی پسپائی اختیار کرتا ہے۔ ایک شخص نے یہ آواز دے دی کہ محمد ﷺ قتل ہو گئے ہیں' یہ سنتے ہی بعض مسلمانوں کے ذہن میں یہ تصور اور یہ سوال آگیا کہ اب مشرکین کے ساتھ جنگ کا فائدہ کیا ہے؟ غرض اس ذہنی حرکت اور اس ذہنی انقلاب کا اظہار حسی حرکت سے کیا گیا۔ یعنی ان کے ذہن اس طرح واپس ہو گئے جس طرح وہ معرکۂ احد میں جسمانی طور پر پسپائی اختیار کر رہے تھے۔ یہ ہے وہ حقیقت جس کی طرف نضر ابن انس ؓ نے اشارہ کیا تھا۔ لوگوں نے ہتھیار چھوڑ دیئے اور ان سے کہا کہ حضور اکرم ؐ تو مارے گئے۔ اس پر انہوں نے ان سے کہا: "پھر محمد ﷺ کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کرو گے۔ اٹھو اور اس مقصد کے لئے شہید ہو جاؤ جس کے لئے آپ ؐ شہید ہوئے۔"

**وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا** ............... "یاد رکھو جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا۔" وہ تو خود خسارہ اٹھائے گا۔ وہ خود اپنے آپ کو ایذا دیتا ہے کہ وہ الٹا پھرتا ہے اور اس کے اس انقلاب موقف سے اللہ کو کوئی نقصان نہ ہو گا۔ اللہ تو لوگوں سے بے نیاز ہے۔ وہ ان کے ایمان کا محتاج نہیں ہے۔ یہ تو اس کی مہربانی ہے کہ اس نے لوگوں کے لئے یہ نظام تجویز کیا جس میں خود ان کی سعادت اور ان کا فائدہ ہے۔ اور جو شخص اس نظام سے روگردانی کرے گا وہ خود برے انجام سے اس دنیا میں دوچار ہو گا۔ وہ اپنی ذات میں حیران و پریشان ہو گا اور اپنی سوسائٹی میں بھی۔ اس کے اس فعل کی وجہ سے یہ نظام خراب ہو گا' حیات انسانی خراب ہو گی اور پوری انسانی آبادی خراب ہو گی۔ تمام معاملات بے ترتیب ہو جائیں گے' لوگ خود اپنے ہاتھوں گرفتار مصیبت ہوں گے۔ محض اس لئے کہ انہوں نے اس نظام سے روگردانی کی کہ صرف اس کے اندر پوری انسانی زندگی کا نظام درست طور پر چل سکتا ہے۔ انسان مطمئن ہو سکتا ہے اور صرف اس نظام کے زیر سایہ نفس انسانی اپنی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ اور اس پوری کائنات کے ساتھ چل سکتا ہے جس کے اندر وہ زندہ رہ رہا ہے۔

وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ........................ "جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا۔" یہ شکر گزار وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی قدر و قیمت جانتے جو اس نے انہیں اسلامی نظام زندگی دے کر ان پر کی۔ وہ شکر اس طرح ادا کرتے ہیں کہ وہ اس نظام کی اطاعت کرتے ہیں' وہ اس طرح بھی شکر کرتے ہیں کہ اللہ کی ثناخوانی کریں' اور اس کو قائم کر کے اس دنیا کی سعادت حاصل کریں اور یہی ان کی جزا اس دنیا میں ہے۔ ان کی شکر گزاری کی بہترین جزا اور اس کے بعد آخرت میں ان کو جزا دی جائے گی اور یہ اخروی سعادت ہوگی جو اس دنیاوی سعادت مندی سے بہت بڑی ہوگی اور جو ابدی ہوگی۔

گویا اس واقعہ پر اس تبصرے کے ذریعہ' اللہ تعالیٰ' مسلمانوں کی اس ذاتی دلچسپی کو' جو حضور اکرم ﷺ کی ذات کے ساتھ تھی' ہٹا کر اسے براہ راست ذات باری کے ساتھ جوڑتے ہیں جو اس دعوت کا اصل سرچشمہ ہے۔ اس لئے کہ دعوت اسلامی کا یہ چشمۂ صافی حضور ؐ نے نہیں جاری فرمایا تھا۔ آپ نے تو لوگوں کی راہنمائی اس طرف فرمائی اور لوگوں کو بلایا کہ وہ اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کے فیض سے فیض یاب ہوں' جس طرح آپ ؐ سے پہلے دوسرے رسول یہی راہنمائی کرتے رہے تھے۔ اور وہ مخلوق کے پیاسے قافلوں کو دعوت دیتے رہے کہ اس چشمہ صافی سے سیراب ہوں اور پیاس بجھائیں۔

گویا اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر ان کے ہاتھ میں وہ مضبوط رسی تھمادیں' جسے حضرت محمد ﷺ نے نہیں باندھا' بلکہ آپ تو اس لئے تشریف لائے تھے کہ لوگوں کو اس پختہ رسی میں باندھ دیں۔ ان کو اسی حالت میں چھوڑ دیں اور وہ اس دنیا سے اس حالت میں چلے جائیں کہ لوگ اس رسی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہوں۔

گویا اللہ تعالیٰ یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا رابطہ براہ راست اسلام سے ہو جائے اور ان کا عہد براہ راست اللہ کے ساتھ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے' اس عہد کے بارے میں ان کی شمولیت بلاواسطہ ہو جائے۔ براہ راست اللہ کے سامنے وہ جوابدہ ہوں تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس کر سکیں' ایسی ذمہ داریاں جو رسول اکرم ؐ کے فوت ہونے سے ختم نہیں ہو جاتیں۔ گویا انہوں نے براہ راست اللہ سے بیعت اور براہ راست اللہ کے سامنے وہ اس کے بارے میں جوابدہ ہیں۔

گویا اللہ کی مشیئت یہ تھی کہ امت مسلمہ اس صدمے سے دوچار ہو جائے جس سے ایک دن اس نے دوچار ہونا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ یہ صدمہ جب ہو گا تو ان کے لئے ناقابل برداشت ہو گا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر انہیں اس صدمے کی ریہرسل کرا دی۔ وہ انہیں عملاً پہنچا دیا یعنی حضور کی وفات کے بارے میں بھی انہیں یہ صدمہ پہنچا دیا' قبل اس کے کہ یہ صدمہ جب فی الواقعہ ہو تو انہیں بالکل ہی نڈھال نہ کر دے۔

اور جب حضور ؐ کی وفات کے وقت وہ اس صدمے سے دوچار ہوئے تو وہ فی الواقعہ اسے برداشت نہ کر سکے۔ حضرت عمرؓ جیسے تربیت یافتہ شخصیت اٹھ کھڑی ہوئی' تلوار سونت لی اور پکارا کوئی یہ لفظ منہ تک نہ لائے کہ محمد ؐ فوت ہو گئے ہیں۔

یہ ابو بکرؓ ہی تھے جو فوراً اٹھے' جو خدا رسیدہ تھے' جن کا تعلق تقدیر الٰہی سے براہ راست مضبوط تھا' انہوں نے اسی آیت کو پڑھا اور ان لوگوں کو یاد دلایا جو نڈھال ہو کر حواس کھو بیٹھے تھے۔ جب انہوں نے اس خدائی پکار کو سنا تو ان کے حواس بحال ہوئے اور وہ ہوش میں آئے۔

اس کے بعد نفس انسانی کے اندر پائے جانے والے فطری خوف کو ایک ٹچ دیتے ہیں یہ ایک نہایت ہی الہامی مس ہے۔ وہ یکدم اس خوف کو دور کر دیتا ہے اور موت و حیات کے بارے میں ایک اٹل حقیقت بیان کر دی جاتی ہے۔ نیز موت کے بعد لوگوں کے ساتھ اللہ کا سلوک اور جزا و سزا کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔

وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَ سَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ

"کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔ جو شخص ثواب دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دے دیں گے اور جو ثواب آخرت کے ارادے سے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا اور شکر کرنے والوں کو ہم ان کی جزا ضرور عطا کریں گے۔"

ہر شخص کی موت کے لئے ایک لکھا ہوا وقت مقرر ہے اور کوئی شخص اس لکھے ہوئے وقت تک زندگی گزارنے سے پہلے ہرگز مر نہیں سکتا۔ اس لئے ڈر' خوف' ہراس اور جزع و فزع ایک پل بھر زندگی کی میعاد کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔ شجاعت' ثابت قدمی' اقدام اور وفاداری سے عمر کم نہیں ہوتی۔ ناس ہو بزدلی کا! بزدلوں کی آنکھ نیند کو ترسے! جس کے لئے جو دن مقرر ہے' اس میں نہ ایک دن کی کمی ہو سکتی ہے اور نہ اضافہ!

اس حقیقت کے بیان سے نفس انسانی میں تقدیر اور اجل کی حقیقت بیٹھ جاتی ہے۔ اس لئے نفس انسانی اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی کوئی پرواہ ہی نہیں کرتا۔ اس کی سوچ تمام تر ادائے فرض' وفائے عہد اور ایمانی تقاضوں کے پورا کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے وہ حرص اور کنجوسی کے بندھنوں سے بھی آزاد ہو جاتا ہے اور خوف اور جزع و فزع پر بھی قابو پا لیتا ہے۔ اب وہ راہ حق کی تمام مشکلات کو انگیز کرتے ہوئے اور راہ حق کے فرائض پورے کرتے ہوئے بڑے صبر و سکون کے ساتھ اور توکل علی اللہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ کیونکہ اب اس کی اس نئی سوچ کے مطابق' موت کا وقت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور لکھا ہوا ہے۔

ذرا ایک قدم اور آگے جائیں۔ اس بات کا فیصلہ ہو گیا کہ عمر لکھی ہوئی ہے اور موت کا وقت متعین اور مقرر ہے تو بتایا جاتا ہے کہ اصل سوچ یہ ہے کہ تم اپنی کمائی کو دیکھو کہ اس وقت "آنے والے وقت" کے لئے تم نے کیا تیاری کی ہے اور کس مزید کمائی کا ارادہ ہے۔ اس نفس سے پوچھا جاتا ہے کہ اے نفس! کیا تم ایمان کے تقاضوں کو پس پشت ڈالنا چاہتے ہو اور کامیابی اور ناکامی کو اسی دنیا کے اندر محدود اور بند کرنا چاہتے ہو اور صرف اس دنیا کے لئے زندہ رہنا چاہتے ہو یا کہ تمہاری نظریں افق اعلیٰ پر بھی ہیں؟ کیا اس محدود دنیا کے مقابلے میں بہت بڑی دنیا کی فکر بھی تمہیں ہے۔ اس دنیا کی محدود عمر کے غم اور اہتمام کے ساتھ ساتھ کیا آخرت کا ارادہ بھی ہے؟

وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ

"جو شخص ثواب دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں دے دیں گے اور جو شخص ثواب آخرت کے ارادے سے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا۔"

اور ان دونوں زندگیوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اور ان دونوں ارادوں میں بہت بڑا امتیاز ہے جبکہ دونوں صورتوں میں موت کا وقت وہی ہے جو مقرر ہے۔ فرق یہ ہے کہ جو شخص صرف اس دنیا کے لئے زندہ ہے اور صرف اس دنیا کا عوضانہ چاہتا ہے اس کی زندگی اور کیڑوں مکوڑوں اور ڈھور ڈنگروں کی زندگیوں میں کیا فرق ہے۔ دونوں کا وقت مقرر ہے۔ اور جس شخص کی نظریں دار آخرت پر لگی ہوئی ہیں' وہ انسانوں جیسی شریفانہ اور کریمانہ زندگی بسر کرتا ہے' اسے اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے۔ وہ اس کرہ ارض پر اللہ کا خلیفہ ہے اور یہ بھی وقت مقرر پر اس دنیا سے رخصت ہو گا۔ وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ

........................ "کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت لکھا ہوا ہے۔"

وَ سَنَجْزِی الشّٰكِرِیْنَ "اور شکر کرنے والوں کو ہم ان کی جزا ضرور عطا کریں گے۔" یہ کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو مقام انسانیت کو پالیتے ہیں اور اللہ نے انسان کو جو شرف عطا کیا ہے اس کی قدر کرتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو حیوانی سطح سے ذرا اوپر رکھتے ہیں۔ اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اس شکریہ کی صورت یہ ہے کہ وہ ایمان کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔

غرض اس انداز میں حیات و ممات کی حقیقت ذہن نشین کرنے اور زندگی کے ان مقاصد اور ترجیحات کے حوالے سے اپنے لئے چن لیتے ہیں' قرآن کریم انسانوں کے سامنے دو راستے رکھتا ہے' ان کو دعوت فکر دی جاتی ہے کہ وہ اپنے لئے کون سا راستہ منتخب کرتے ہیں۔ وہ اپنے لئے محض کیڑے مکوڑوں کی زندگی پسند کرتے ہیں یا انسان مکرم کی زندگی پسند کرتے ہیں۔ یوں نفس انسانی خوف موت اور دنیا کی تکالیف پر جزع و فزع ترک کر کے ایک زیادہ مفید کام کی طرف منتقل ہونا پسند کرتا ہے اور یہ انتخاب وہ اپنے اختیار تمیزی سے کرتا ہے کیونکہ دونوں میں سے ہر راستہ وہ اختیار کر سکتا ہے۔ چاہے تو دنیا کا راستہ اختیار کرے اور چاہے تو آخرت کا راستہ اختیار کرے۔ جو راہ بھی وہ اختیار کرے' اس کا صلہ پائے گا۔

اس کے بعد قرآن کریم بطور مثل زمانہ ماقبل کے اہل ایمان کی مثال بیان کرتا ہے۔ اس لئے کہ انسانیت کی طویل تاریخ میں' زندگی کی گزرگاہوں میں قافلہ ایمان ہمیشہ رواں دواں رہا ہے۔ یہ مثال ان لوگوں کی ہے جو اپنے وعدہ ایمان پر سچے رہے۔ انہوں نے اپنے نبیوں کے ساتھ داد شجاعت دی۔ جب مصیبت میں مبتلا ہوئے تو جزع و فزع نہیں کی۔ اور اس مقام جہاد میں انہوں نے ایمانی آداب کی سخت پاسداری کی۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے رہے۔ اور ان کے منہ سے اف تک نہ سنی گئی بس صرف اللہ سے استغفار کرتے رہے۔ وہ اپنی معمولی غلطیوں کو بھی بڑا قصور تصور کرتے اور اسے "اسراف" سے تعبیر کرتے۔ وہ اپنے رب سے صرف صبر و ثبات کے ذریعہ کفار کے مقابلے میں نصرت طلب کرتے۔ اور ان کا یہی رویہ تھا جس کی وجہ سے وہ ثواب دارین حاصل کر پائے۔ یہ ثواب انہیں اس لئے دیا گیا کہ وہ نہایت ہی عاجزی سے دست بدعا ہوتے اور جہاد کے مواقف پر احسان اور حسن نیت سے قائم رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے مثال بن گئے۔

وَ كَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ۞ وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِیْۤ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ۞ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْیَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ

"اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے۔ انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی' وہ سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی کہ "اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما' ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو تجاوز ہو گیا ہو اسے معاف کر دے' ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔" آخر کار اللہ نے انہیں دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر آخرت کا ثواب بھی دیا۔ اللہ کو ایسے نیک عمل لوگ پسند ہیں۔"

احد میں مسلمانوں کو ہزیمت کا جو صدمہ ہوا' وہ اس قسم کا پہلا صدمہ تھا۔ اس سے قبل بدر میں اللہ نے انہیں فتح مندی عطا کی تھی' حالانکہ وہ مخالفین سے کئی گنا کم تھے۔ اس فتح کے بعد ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ گویا یہ فتح شاید ان کے حق میں ایک تکوینی سنت الٰہی ہے' لیکن احد کا تجربہ ان کے لئے اچانک تھا۔ وہ غیر متوقع ابتلاء سے دوچار ہو گئے۔

یہی وجہ ہے کہ واقعہ احد پر قرآن کریم نے طویل ترین تبصرہ کیا ہے۔ اس میں کبھی تو اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے اور کبھی ان پر سخت نکیر کی گئی ہے' کبھی ان کی بات کی تائید کی گئی اور کسی جگہ انہیں تمثیلات سے سمجھایا گیا ہے۔ یوں ان کے نفوس کی تربیت کی گئی ہے' ان کے تصور حیات کی تصحیح کی گئی ہے اور انہیں آنے والے معرکوں کے لئے تیار کیا گیا ہے' اس لئے کہ ان کی راہ طویل تھی' اور ان کے سامنے مشکل مراحل تھے' بھاری فرائض ان پر عائد ہوتے تھے اور وہ جس عظیم انقلاب کے نمائندے تھے وہ ایک عظیم الشان امر تھا۔

یہاں ان کے سامنے جو مثال پیش کی گئی ہے وہ ایک عام مثال ہے۔ اس مثال میں کسی ایک نبی کی بات نہیں کی گئی۔ کسی ایک قوم کی بات بھی نہیں کی گئی' بلکہ قافلہ ایمان کی بات کی گئی ہے۔ ذوات مؤمنین کی بات کی گئی۔ بتایا گیا ہے کہ ابتلا ایک ایسا مرحلہ ہے جو ہر دعوت اور ہر دین میں پیش آتا رہتا ہے۔ تمام انبیاء کے متبعین تمہارے اسلاف ہیں۔ اس لئے قافلۂ ایمان دراصل ایک ہے اور ایک ہی تسلسل ہے۔ یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ نظریۂ حیات ایک ہی ہے اور یہ سب کے سب ایک ہی ایمانی فوج کی رجمنٹ ہیں۔

وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ﴿١٤٦﴾

"اس سے پہلے کتنے ہی نبی گزرے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے' انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی اور نہ وہ باطل کے آگے سرنگوں ہوئے۔"

کتنے ہی نبی گزر چکے ہیں جن کے ساتھ اسلامی جماعتیں لڑ چکی ہیں۔ انہوں نے تو کمزوری نہیں دکھائی۔ ان پر جو مشکلات پڑیں' جو مصائب و شدائد پیش آئے' وہ جس درد و الم میں مبتلا ہوئے وہ تم سے کچھ کم نہ تھا لیکن انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی۔ انہوں نے اس جدوجہد کا سلسلہ ختم نہیں کر دیا۔ نہ وہ ان مشکلات کے سامنے جھکے اور نہ دشمنوں کے سامنے جھکے۔ مومنین کی شان تو ایسی ہوتی ہے' اس لئے کہ وہ ایمان اور نظریۂ حیات کے لئے جدوجہد کر رہے ہوتے ہیں۔ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ............ "ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔" جن کے نفوس ضعف نہیں دکھاتے' ان کی قوتیں مضمحل نہیں ہوتیں' ان کے عزائم نرم نہیں پڑتے۔ وہ نہ جھکتے ہیں اور نہ سرنگوں ہوتے ہیں۔ یہ تعبیر کہ اللہ صابرین کو محبوب رکھتے ہیں نہایت ہی موثر تعبیر ہے۔ اس میں خاص اشارہ پایا جاتا ہے۔ یہ محبت اور پیغام محبت تمام دردوں اور تمام دکھوں کے لئے مرہم ہے' اس سے تمام زخم مندمل ہو جاتے ہیں اور تمام تلخیاں اور تمام تھکاوٹیں ختم ہو جاتی ہیں۔

یہاں تک تو ان سابق اہل ایمان کے ظاہری موقف کا ذکر کیا گیا کہ وہ ظاہری مشکلات کے مقابلے میں یہ ثابت قدمی اختیار کرتے ہیں' لیکن آنے والی آیت ان کی داخلی کیفیات اور ان کے ایمان و شعور کی تصویر کشی بھی کرتی ہے۔ دکھایا جاتا ہے کہ وہ جناب باری میں کتنے مودب ہیں۔ وہ اس خوف کا مقابلہ کس طرح کرتے ہیں جو ان کے نفس پر طاری ہوتا ہے اور جو مدہوش کرنے والا ہوتا ہے' نہایت ہی دہشت ناک ہوتا ہے اور جو نفس انسانی کو پوری طرح گرفت میں لے لیتا ہے کیونکہ یہ خطرہ اٹل ہوتا ہے لیکن ایسا خوف و خطر بھی ان اہل ایمان کی توجہ الی اللہ پر اثر انداز نہیں ہو سکتا' وہ ایسے حالات میں بھی اللہ سے لو لگائے رکھتے ہیں۔ اور ایسے حالات میں بادی النظر میں کسی

انسان کا یہی مطالبہ ہو سکتا ہے کہ اے اللہ ہمیں فتح نصیب کر لیکن وہ صرف عفو و درگزر کا سوال کرتے ہیں' یوں وہ گویا ادائیگی فرض میں اپنی کوتاہیوں اور خطاکاریوں کا اعتراف کرتے ہیں اور کے بعد وہ ثابت قدمی اور دشمنوں پر فتح مندی کی دعا کرتے ہیں۔

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۱۴۷﴾

"ان کی دعا بس یہ تھی کہ "اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما' ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو تجاوز ہو گیا ہے' اسے معاف کر دے' ہمارے قدم جمادے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔"

ان کا سوال کسی دولت و نعمت کے لئے نہ تھا' بلکہ انہوں نے ثواب و جزا کا مطالبہ بھی نہیں کیا' نہ انہوں نے ثواب دنیا کا مطالبہ کیا اور نہ ہی ثواب آخرت کا۔ وہ تو جناب باری میں بڑے ادب سے کھڑے تھے۔ وہ ذات باری کی طرف متوجہ تھے' حالانکہ وہ حالت قتل میں تھے' انہوں نے اس حال میں بھی صرف اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کی اور صرف ثابت قدمی کی دعا کی۔ کفار کے مقابلے میں کامیابی کی دعا کی۔ یہاں تک کہ وہ یہ نصرت و کامرانی بھی اپنے لئے طلب نہیں کرتے۔ وہ اس میں بھی کفر کی شکست اور کفار کے لئے مناسب سزا کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ ہے جناب باری تعالیٰ کی درگاہ میں احترام وادب' جس کے وہ لائق ہے اور جو اہل ایمان کا شیوہ ہے۔

یہ مثال کہ اہل ایمان اپنے لئے کچھ نہیں مانگتے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سب کچھ دے دیا۔ انہیں وہ کچھ دے دیا جس کی طالب دنیا بھی تمنا کر سکتی ہے۔ نیز انہیں وہ سب کچھ بھی دے دیا جس کی تمنا کوئی طالب آخرت کر سکتا ہے۔ فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ..................... "آخر کار اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر آخرت کا ثواب بھی دیا۔"

اب اللہ تعالیٰ شہادت دیتے ہیں کہ یہ لوگ محسنین میں سے تھے' انہوں نے بارگاہ الٰہی میں بہترین ادب کا مظاہرہ کیا اور انہوں نے بہترین مظاہرہ دوران جہاد کیا' اس لئے اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا کہ وہ ان سے محبت کرتے ہیں اور یہ وہ نعمت ہے جو ہر قسم کے ثواب سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ..................... "اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں۔"

اس انداز میں یہ پیراگراف ختم ہوتا ہے' جس میں اسلامی تصور حیات کے نہایت ہی اساسی حقائق کو پیش کیا گیا' جن کی وجہ سے پہلی اسلامی جماعت کی بہترین تربیت ہوئی اور جو ہر نسل اور ہر دور میں اٹھنے والی تحریک اور ہر دور کی امت کے لئے سرمایہ بصیرت ہے۔

☆......○......☆

اب یہ تبصرہ ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے۔ اس معرکہ کے کچھ اور واقعات سامنے رکھے جاتے ہیں تاکہ ان سے بصیرت افروز نتائج اخذ کئے جا سکیں۔ اہل ایمان کی نظریاتی تصحیح ہو' ان کے نفوس کی تربیت ہو انہیں آگاہ کیا جائے کہ اس راہ میں کہاں کہاں پھسلنے کا خطرہ ہے' انہیں بتایا جائے کہ ان کے ارد گرد سازشوں کے جال بچھے ہوئے ہیں' اور دشمن گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ احد میں شکست کی وجہ سے مدینہ کے کفار' منافقین اور یہود کو از سر نو سازشیں کرنے کا موقعہ مل گیا تھا' اس لئے کہ اس وقت تک اہل مدینہ اہل اسلام کے لئے نیک نیت نہ ہوئے تھے۔ اس شہر میں ابھی تک مسلمان اجنبی تھے۔ اس اجنبی تحریک اور اس نئے پودے کے ارد گرد جنگ بدر نے رعب اور دبدبے کی ایک باڑ قائم کر دی تھی۔ کیونکہ بدر میں اہل اسلام کو نہایت ہی فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی تھی اور جب احد میں شکست ہوئی تو یہ صورت حال بدل گئی۔ اسلام کے ان خفیہ دشمنوں کو موقعہ مل گیا کہ وہ اپنے دلی کینہ اور

بغض و عناد کا اظہار کر سکیں۔ اور معاشرے کے اندر زہر آلود پروپیگنڈا کر سکیں۔ اور جن گھرانوں میں لوگ شہید ہو گئے تھے 'یا جن میں لوگ شدید زخمی تھے اور ایک کہرام مچا ہوا تھا ان میں اُن کے اِس زہر آلود پروپیگنڈے اور سازشوں کے لئے راہ ہموار ہو گئی تھی چنانچہ ان لوگوں نے اب کھل کر ریشہ دوانیاں شروع کر دی تھیں۔

آنے والے پیراگرافوں میں اس معرکہ کے اہم واقعات کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور اس کے بڑے بڑے واقعات قلم بند کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ کافروں کی پیروی مت کرو تمہیں فتح حاصل ہوگی اور کافروں کے دلوں میں تمہارا رب از سرنو پیدا ہو گا انہیں بتایا جاتا ہے کہ ابتدائے معرکہ میں تو تمہیں فتح ہوئی اور یہ میرے وعدے کے مطابق تھی جسے تم نے کمزوری دکھا کر ضائع کیا' آپس میں نزاع اور خلاف کیا' رسول خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی' اس کے بعد انہیں اس معرکے کے دونوں رخ زندہ اور متحرک صورت میں بتائے جاتے ہیں۔ ہزیمت کے بعد افراتفری' پھر اہل ایمان کے لئے تسلی و اطمینان کا سامان اور اہل نفاق کے دلوں میں حسرت و یاس' جن کے خیالات اللہ کے بارے میں اچھے نہ تھے۔ نیز انہیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس معرکہ میں واقعات کا رخ شکست کی جانب پھیرنے میں بھی اللہ تعالیٰ کی لطیف حکمت کارفرما تھی' نیز یہ کہ موت کا ایک دن متعین ہے اور اس سلسلے میں اہل کفر اپنے گمراہ کن پروپیگنڈے کے ذریعہ جو گمراہی پھیلا رہے ہیں ان سے بچ کر رہو اور آخر کار تمہیں بہرحال اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے وہ اپنی موت مریں یا شہید ہوں جانا تو ادھر ہی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡٓا اِنۡ
تُطِيۡعُوا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَرُدُّوۡكُمۡ عَلٰٓى اَعۡقَابِكُمۡ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِيۡنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ
اللّٰهُ مَوۡلٰٮكُمۡ ۚ وَهُوَ خَيۡرُ النّٰصِرِيۡنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلۡقِىۡ فِىۡ قُلُوۡبِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوا
الرُّعۡبَ بِمَآ اَشۡرَكُوۡا بِاللّٰهِ مَا لَمۡ يُنَزِّلۡ بِهٖ سُلۡطٰنًا ۚ وَمَاۡوٰٮهُمُ النَّارُ ؕ
وَبِئۡسَ مَثۡوَى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَقَدۡ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعۡدَهٗۤ اِذۡ تَحُسُّوۡنَهُمۡ
بِاِذۡنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلۡتُمۡ وَتَنَازَعۡتُمۡ فِى الۡاَمۡرِ وَعَصَيۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَآ
اَرٰٮكُمۡ مَّا تُحِبُّوۡنَ ؕ مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ
صَرَفَكُمۡ عَنۡهُمۡ لِيَبۡتَلِيَكُمۡ ۚ وَلَقَدۡ عَفَا عَنۡكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى
الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۵۲﴾ اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَلَا تَلۡوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّالرَّسُوۡلُ يَدۡعُوۡكُمۡ
فِىۡۤ اُخۡرٰٮكُمۡ فَاَثَابَكُمۡ غَمًّاۢ بِغَمٍّ لِّكَيۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا مَآ
اَصَابَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ الۡغَمِّ

أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِّنكُمْ ۖ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ
بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۖ يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ ۗ
قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ ۗ يُخْفُونَ فِي أَنفُسِهِم مَّا لَا يُبْدُونَ لَكَ ۖ يَقُولُونَ
لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا ۗ قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ
لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۖ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي
صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿١٥٤﴾
إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ
بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٥٥﴾ يَا أَيُّهَا
الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي
الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَّوْ كَانُوا عِندَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ
اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ
بَصِيرٌ ﴿١٥٦﴾ وَلَئِن قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ
خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿١٥٧﴾ وَلَئِن مُّتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللَّهِ تُحْشَرُونَ ﴿١٥٨﴾

١٦ ع ٧ ٧

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر تم ان لوگوں کے اشاروں پر چلو گے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو وہ تم کو الٹا پھیر لے جائیں گے اور تم نامراد ہو جاؤ گے۔ (ان کی باتیں غلط ہیں) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تمہارا حامی و مددگار ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ہم منکرین حق کے دلوں میں رعب بٹھا دیں گے، اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کو خدائی میں شریک ٹھہرایا ہے، جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے اور بہت ہی بری ہے وہ قیام گاہ جو ان ظالموں کو نصیب ہوگی۔

اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں (اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی

مال غنیمت ) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے.... اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔ تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظر عنایت رکھتا ہے۔

یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمہیں نہ تھا اور رسول تمہارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا۔ اس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے تاکہ آئندہ کے لئے تمہیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو۔ اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔

اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر ایسی اطمینان کی سی حالت طاری کر دی کہ وہ اونگھنے لگے۔ مگر ایک دوسرا گروہ' جس کے لئے ساری اہمیت بس اپنی ذات ہی کی تھی' اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلاف حق تھے۔ یہ لوگ اب کہتے ہیں کہ "اس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے؟" ان سے کہو "(کسی کا کوئی حصہ نہیں ) اس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔" دراصل یہ لوگ اپنے دلوں میں جو بات چھپائے ہوئے ہیں' اسے تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان کا اصل مطلب یہ ہے کہ "اگر (قیادت کے) اختیارات میں ہمارا کچھ حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے۔" ان سے کہہ دو کہ "اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے۔" اور یہ معاملہ جو پیش آیا' یہ تو اس لئے تھا کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ اسے آزمالے اور جو کھوٹ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے' اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیئے تھے۔ اللہ نے انہیں معاف کر دیا' اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' کافروں کی سی باتیں نہ کرو جن کے عزیز و اقارب اگر کبھی سفر پر جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں (اور وہاں کسی حادثہ سے دوچار ہو جاتے ہیں) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے۔ اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے' ورنہ دراصل مارنے اور جلانے والا تو اللہ ہی ہے اور تمہاری تمام حرکات پر وہی نگراں ہے۔ اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمہارے حصہ میں آئے گی وہ ان ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے۔ جنہیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں اور خواہ تم مرو یا مارے جاؤ بہرحال تم سب کو سمٹ کر جانا اللہ ہی کی طرف ہے۔"

آیات کے اس مجموعے کو اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ اپنے اندر زندگی سے بھرپور مناظر کی ایک بڑی مقدار لئے ہوئے ہے اور ان مناظر کے علاوہ انسانی زندگی اور اسلامی تصور حیات دونوں کے نہایت ہی اساسی حقائق اس میں ثبت کئے گئے ہیں۔ نیز اس میں اس کائنات کے بعض اٹل اصول بھی بیان کئے گئے ہیں۔ جہاں تک اس معرکے کا تعلق ہے' اس کی جھلکیاں زندگی سے بھرپور' بڑی تیزی کے ساتھ اور بڑی گہرائی کے ساتھ پیش کی گئی ہیں' اس معرکے کا کوئی اہم پہلو نہیں چھوڑا گیا اور وہ اس انداز میں قلم بند ہوا ہے کہ اسے پڑھ کر شعور اور جذبات میں ایک طلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پوری طرح زندہ' جزئیات پر مشتمل پوری فضائے جنگ اور اس کے حالات و واقعات ان میں ریکارڈ کئے گئے ہیں۔ اس کے اندر انسانی ضمیر میں پیدا ہونے والے خلجان اور شعوری اور لاشعوری حرکات کی طرف بھی اشارے کئے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے سیرت النبی کی مفصل کتابوں میں بیان کردہ تمام واقعات مستحضر ہو جاتے ہیں اور اس تبصرے کے نتیجے میں اسلامی تصور حیات کے اصلی حقائق' زندہ شکل میں' حرکت کرتے ہوئے اور مسلمانوں کے لئے صحیح تصور حیات تعمیر

کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس میں شک نہیں ہے کہ اس معرکے کے تمام مشاہدات اور پورے حقائق کو الفاظ و فقرات کی اس مختصر مقدار میں 'زندگی سے بھرپور انداز میں' حرکات اور اشارات کے اس مخصوص انداز میں ثبت کر دینا کسی انسانی تعبیر کے لئے نہ ممکن ہے اور نہ ہی تاریخ آداب انسانی میں اس کی کوئی مثال ہے اور اس کا ادراک وہی شخص کر سکتا ہے جسے اسلوب ادا کے اسرار اور انسان کی قوت ادا کی حدود کا علم ہوتا ہے' خصوصاً وہ لوگ جن کو مشکل تعبیرات سے واسطہ پڑتا ہے اور جو فن تعبیر میں درک رکھتے ہیں۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِن تُطِيعُوا۟ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰٓ أَعْقَٰبِكُمْ فَتَنقَلِبُوا۟ خَٰسِرِينَ ۝ بَلِ ٱللَّهُ مَوْلَىٰكُمْ ۖ وَهُوَ خَيْرُ ٱلنَّٰصِرِينَ

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم ان لوگوں کے اشاروں پر چلو گے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو وہ تم کو الٹا پھیر لے جائیں گے تو تم نامراد ہو جاؤ گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی تمہارا حامی و مددگار ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔"

جنگ احد میں مسلمانوں کو جو شکست ہوئی' ایک بڑی تعداد ماری گئی۔ ایک بڑی تعداد زخمی ہوئی۔ اس سے مدینہ کے کفار' منافقین اور یہودیوں کو یہ موقعہ مل گیا کہ وہ از سر نو اٹھیں اور مسلمانوں کو حضرت محمد ﷺ کا ساتھ دینے کے نتائج سے ڈرائیں۔ انہیں جنگ کی ہولناکیوں سے آگاہ کریں اور خصوصاً مکہ کے مشرکین اور قریش کے حلفاء کے ساتھ مزید معرکہ آرائی کے نتائج سے انہیں خائف کریں۔ ظاہر ہے کہ شکست و ریخت کی یہ فضاء دلوں کو متزلزل کرنے' اسلامی صفوں کو منتشر کرنے اور اسلامی قیادت کے خلاف بد اعتقادی پیدا کرنے اور اپنے مقابلے میں زیادہ طاقتور قوتوں کے ساتھ ٹکرانے پر اصرار کرنے کی پالیسی کو جاری رکھنے کے فوائد کو مشکوک بنانے اور اس پالیسی سے نکل آنے کی افادیت ظاہر کرنے' اور کامیاب ہونے والوں کے ساتھ مصالحت کی احادیث ظاہر کرنے اور اس سلسلے میں انفرادی درد و غم کو برانگیختہ کرنے کے لئے بہت زیادہ موزوں تھی۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ اس فضا سے فائدہ اٹھا کر اسے جماعت مسلمہ کی بیخ کنی کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس کے بعد اسلامی نظریۂ حیات کی بیخ کنی تک اسے پہنچایا جائے اور اہل اسلام کو اس پر آمادہ کر لیا جائے کہ وہ اپنے سے قوی تر لوگوں کے سامنے جھک جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس امر سے سخت الفاظ میں ڈرا کر منع فرمایا کہ وہ پالیسی کے معاملات میں اہل کفر کی اطاعت نہ کریں۔ اس معاملہ میں اگر وہ ان کی پیروی کریں گے تو اس کا نتیجہ لازماً خسارے کی شکل میں سامنے آئے گا۔ اس میں کوئی نفع اور کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ البتہ یہ ہو گا کہ وہ الٹے پاؤں پھر دوبارہ کفر میں داخل ہو جائیں گے۔ مومن کے لئے دو ہی راستے ہیں' یا تو وہ کفر اور اہل کفر کے ساتھ مسلسل بر سر جنگ رہے گا' باطل اور اہل باطل کے ساتھ بر سر پیکار رہے گا اور پھر یا الٹے پاؤں پھر کر مرتد ہو جائے گا۔ نعوذ باللہ منہا۔ ان دو راستوں کے سوا کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے کہ وہ علیحدہ ہو کر غیر جانبدار کھڑا ہو جائے' بین بین رہے اور اپنے موقف پر بھی جما رہے اور اپنے دین کی حفاظت کر رہا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی سوچ میں یہ بات آئی ہو خصوصاً اس معرکے میں شکست کی فضا میں' چوٹ اور زخم کھا کر وہ یہ سوچ رہا ہو کہ مومن کے لئے ممکن ہے کہ وہ غالب قوتوں کے ساتھ اس معرکہ آرائی سے نکل آئے' ان کے ساتھ مصالحت کرے' ان کی پیروی کرے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دین کی حفاظت بھی کرتا ہو' اس کا عقیدہ اپنی جگہ درست ہو' اس کا ایمان قائم ہو' اس کا وجود بھی قائم رہے لیکن یہ سوچ ایک خطرناک واہمہ ہے اس لئے کہ حق و باطل کے اس معرکے میں جو آگے نہیں بڑھتا وہ لازماً پیچھے کو پلٹتا ہے۔ اور جو شخص کفر' شر' باطل' گمراہی اور نافرمانی کے خلاف جدوجہد نہیں کرتا وہ لازماً ذلیل و خوار ہو گا' الٹے پاؤں

پھرے گا اور کفر' شر گمراہی' باطل اور بدقماشی میں داخل ہو جائے گا۔ جسے اس کا ایمان نہ بچا سکے' اس کا نظریۂ حیات نہ بچا سکے' اور اس کے ساتھ ساتھ وہ کفار کی پیروی کر رہا ہو' ان کی بات سن رہا ہو اور ان پر اعتماد کر رہا ہو تو در حقیقت اس شخص نے اپنے ایمان اور نظریۂ حیات کا موقف چھوڑ دیا ہے۔ وہ روحانی طور پر شکست کھا چکا ہے کیونکہ جب ایک نظریاتی شخص اپنے مخالفین کے سامنے جھکتا ہے تو وہ روحانی طور پر ٹوٹ چکا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اب وہ ان کی وسوسہ اندازی سے متاثر ہوتا ہے۔ ان سے ہدایات لیتا ہے۔ یہی تو ہے شکست۔ اب کسی بھی وقت دوبارہ عقیدہ کفر کی طرف پلٹ سکتا ہے۔ اسے اس آخری شکست سے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ اگرچہ ابتدا میں اسے احساس نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایسی راہ پر پڑ گیا ہے جس کا انجام حسرتناک ہو گا۔ صحیح مومن تو وہ ہوتا ہے جو اپنے عقیدے اور اپنی قیادت کی وجہ سے اپنے نظریاتی دشمنوں اور اپنی قیادت کے دشمنوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور جب بھی وہ ان دشمنوں کی طرف کان دھرے گا گویا اس نے الٹے پاؤں سفر کا آغاز کر دیا ہے۔ یہ ایک فطری حقیقت اور ایک عملی حقیقت ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے اہل ایمان کو آگاہ فرماتے ہیں' متنبہ کرتے ہیں اور پکارتے ہیں يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ ......

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم ان لوگوں کے اشاروں پر چلو گے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو وہ تم کو الٹا پھیر لے جائیں گے اور تم نامراد ہو جاؤ گے۔"

اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان الٹے پاؤں پھرے اور ایمان کے بعد کفر کی راہ از سر نو اختیار کرے۔ اگر ایمان چلا جائے تو پھر کون سا فائدہ اس کی کمی پوری کر سکتا ہے؟

سوال یہ ہے کہ تم کفار کی طرف مائل صرف اس لئے ہو سکتے ہو کہ تم ان سے حمایت کی امید رکھتے ہو گے اور یہ کہ ان کو اس وقت فتح حاصل ہے۔ یہ بہت بڑا وہم ہے جس میں تم مبتلا ہو' اس لئے اس وہم کو رد کرنے کے لئے اچانک روئے سخن اس طرف مڑتا ہے کہ منبع نصرت و حمایت کہاں ہے بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ ۖ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ ............................ "حقیقت یہ ہے کہ تمہارا حامی و مددگار صرف اللہ ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔"

مسلمانوں کی ولایت کا مرجع اللہ ہے۔ وہ اسی سے نصرت طلب کر سکتے ہیں اور جس کا مددگار اللہ ہو تو اسے کسی دوسرے مددگار کی ضرورت کیا رہتی ہے؟ جس کا ناصر اللہ ہو اسے بندوں کی جانب سے کسی نصرت کی ضرورت ہی کیا ہے؟

اس کے بعد مومنین کو تسلی دی جاتی ہے اور انہیں یہ خوش خبری دی جاتی ہے کہ جلد ہی وہ کفار کے دلوں میں تحریک اسلامی کا رعب ڈال دیں گے اور یہ اس لئے کہ وہ اللہ کی ذات میں دوسروں کو شریک کرتے اور نظریہ شرک کی پشت پر اس دنیا میں نہ قوت ہے نہ قوت دلیل ہے اور آخرت میں تو ان کے لئے بہت ہی برا ٹھکانا تیار کیا گیا ہے۔

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا ۖ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ

"عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ہم منکرین حق کے دلوں میں رعب بٹھا دیں گے' اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کو خدائی میں شریک ٹھہرایا ہے جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے اور بہت ہی بری ہے وہ قیام گاہ جو ان ظالموں کو نصیب ہو گی۔"

یہ وعدہ اللہ جل شانہ کی جانب سے ہے' جو غالب ہے اور قادر مطلق ہے۔ وہ اہل کفر کے دلوں میں رعب بٹھا سکتا ہے۔ وہ اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اس معرکے کا انجام کیا ہو گا' وہ ضمانت دیتا ہے کہ اس کے دوست فاتح ہوں گے اور اس کے دشمنوں کو شکست ہو گی۔

اللہ کا یہ وعدہ ہر اس معرکے کے لئے اب بھی قائم ہے جس میں فریقین معرکہ اہل کفر اور اہل ایمان ہوں۔ جب بھی اہل کفر اہل ایمان سے دوچار ہو جاتے ہیں' ان کے دل میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا رعب بٹھا دیتے ہیں۔ لیکن اہم بات اور اہم شرط یہ ہے کہ اہل ایمان کے دل میں ایمان کی حقیقت موجود ہو۔ ان کو اللہ کی نصرت کا حقیقی شعور ہو' انہیں پورا پورا یقین ہو کہ اللہ ان کا مددگار ہے اور ان کے دل میں ذرہ برابر شک اس بارے میں نہ ہو کہ اللہ کا لشکر ہی غالب رہتا ہے اور یہ کہ اللہ اپنے معاملات پر پورا کنٹرول رکھتے ہیں اور یہ کہ اہل کفر اللہ کو شکست نہیں دے سکتے اور نہ وہ اللہ سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اور ان کا معاملہ اللہ کے اس وعدے کے ساتھ ہو کہ وہ روبعمل ہو کر رہے گا چاہے ظاہری حالات اس کے خلاف نظر آئیں' اس لئے کہ اللہ کا وعدہ بہرحال سچا ہوتا ہے اگرچہ ہماری آنکھیں الٹ دیکھ رہی ہوں۔

اہل کفر رعب میں اس لئے آجاتے ہیں کہ ان کا تکیہ صحیح نہیں ہے۔ ان کا بھروسہ نہ قوت پر ہے اور نہ صاحب قوت پر۔ انہوں نے اللہ کے ساتھ ایسے خداؤں کو شریک کیا ہوا ہے جن کے ہاتھ میں کوئی قوت نہیں ہے کیونکہ اللہ نے ان شریکوں کو کوئی قوت دے کر اپنے ساتھ شریک نہیں کر لیا۔

یہ انداز تعبیر کہ اللہ نے ان پر کوئی "سلطان" نہیں اتاری' اپنے اندر گہرا مفہوم رکھتی ہے۔ قرآن میں اس انداز تعبیر کو بار بار اپنایا گیا ہے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ ان جھوٹے الہوں کے پاس کوئی سلطان نہیں ہے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ غلط عقیدہ پر کوئی سلطان نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی تصور' کوئی عقیدہ' کوئی نظریہ' کوئی شخصیت اور کوئی بھی تنظیم' اس قدر موثر ہوتی ہے جس قدر اس کے اندر پوشیدہ قوت اور غلبے کا داعیہ ہوتا ہے۔ اس اندرونی قوت کی مقدار کے مطابق ہی اس کی جدوجہد قائم اور دائم رہتی ہے۔ اور اس اندرونی قوت کا دارومدار اس کی اس سچائی یا سچائی کی اس مقدار پر ہوتا ہے جو اس کے اندر موجود ہوتی ہے اور یہ کہ اس قوت اور اس قوت کے اندر کی قدر ہم آہنگی ہے جس قوت اور سچائی پر اللہ نے اس پوری کائنات کو قائم کیا ہے۔ نیز یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کائنات کے سنن اور نوامیس کے ساتھ اس کی ہم آہنگی کی قدر ہے۔ کسی شخص یا ادارے کو اللہ اسی قدر قوت اور سلطان دیتا ہے جس قدر وہ ان نوامیس فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے' جو اس کائنات میں موثر ہیں اور کارفرما ہیں۔ اگر یہ ہم آہنگی نہیں ہے تو وہ شخص' نظریہ اور ادارہ' بودا' کھوٹا' ضعیف اور ختم ہونے والا ہے' چاہے بظاہر وہ بہت ہی قوی نظر آئے' بظاہر وہ جس قدر مزین کیا گیا ہو اور بظاہر وہ پھولا ہوا نظر آتا ہو۔

مشرکین کی حالت یہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ دوسرے الہوں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ یہ شرک مختلف الاقسام ہوتی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ لوگ پہلے اللہ کی خصوصیات میں سے کوئی خصوصیت غیر اللہ کو عطا کرتے ہیں' یا اللہ کے مظاہر میں سے کوئی مظہر غیر اللہ کو دیتے ہیں۔ ان خصائص میں سے اہم خاصہ خدا اس کا حق قانون سازی ہے' جو وہ اپنے بندوں کی زندگی کے مختلف حالات کے لئے کرتا ہے اور ان اقدار کے تعین کا حق ہے جن کے مطابق لوگوں کو اپنی زندگی کے معاملات' انفرادی اور اجتماعی کے فیصلے کرنے ہوتے ہیں اور یہ کہ بندوں پر حق حکمرانی صرف اللہ کو ہے اور یہ صرف اس کا حق ہے کہ وہ اپنے قوانین اور اپنے طے کئے ہوئے حسن و قبح کے معیارات اور پیمانوں کی اطاعت کرائے۔ اس کے بعد شرک پھر ان شعائر تعبدیہ کے اندر ہوتا ہے جو اللہ کے لئے مخصوص ہوتے ہیں یعنی عبادات۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ خدا جن کو مشرکین اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں اس کے ہاں اس سچائی کی کیا مقدار ہوتی جس پر

اللہ نے اس کائنات کو قائم کیا ہے؟ یہ صرف اللہ ہے جس نے اس کائنات کو حق پر قائم کیا ہے اور تمام مخلوق کو پیدا کیا ہے کہ وہ صرف اس کی بندگی کا اقرار کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور وہ شریعت اور حسن و قبح کے پیمانے صرف اس سے لیں۔ اور صرف اس کی عبادت اس طرح کریں جس طرح اس کی عبادت کرنے کا حق ہے۔ بغیر کسی شرک کے 'بغیر کسی شراکت کے۔ اس لئے جو نظریہ اصول توحید کے خلاف ہو جس پر یہ کائنات اپنی اساس سے قائم ہے وہ کھوٹا' باطل اور حق کے مخالف ہے۔ اور یہی راز ہے کہ اس کے کمزور اور واہیات ہونے کی اور یہی وجہ ہے کہ اس کے اندر نہ قوت ہوتی ہے اور نہ اس کے اندر سلطان ہوتی ہے اور وہ زندگی کے دھارے کو متاثر نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کے اندر سرے سے زندگی کے بنیادی عناصر (Potentials) نہیں ہوتے۔

جب تک مشرکین شرک میں مبتلا ہیں (اور شرک ایک ایسا نظریہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی سلطان نہیں ہے) یہ شرک وہ چاہے الٰہوں کی صورت میں کر رہے ہوں یا عقائد و تصورات میں کر رہے ہوں' تو وہ گویا کمزوری' خلا اور وہم پر بھروسہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ ذلیل و خوار اور ضعیف ناتواں رہیں گے اور وہ ہمیشہ مرعوب رہیں گے' جب بھی ان کا آمنا سامنا اہل ایمان کے ساتھ ہوا۔ اس لئے کہ اہل ایمان کا بھروسہ ایسی سچائی پہ ہوتا ہے جو پر شوکت اور پر قوت ہوتی ہے۔

اس وعدے کا مصداق ہمیں ہر وقت نظر آ سکتا ہے جب بھی حق و باطل کا آپس میں ٹکراؤ ہو' بارہا ایسا ہوا ہے کہ باطل زاد و عتاد اور کثر سامان جنگ کے ساتھ حق کے مقابلے میں آیا ہے' جبکہ حق غیر مسلح تھا لیکن اس صورت حال کے باوجود باطل خوفزدہ اور مرعوب ہو کر کانپنے لگا ہے۔ وہ ہر حرکت اور ہر نعرۂ تکبیر کے مقابلے میں تھر تھر کانپتا رہا ہے حالانکہ اس کے ساتھ عظیم مسلح لشکر رہے ہیں۔ لیکن جونہی ان عظیم لشکروں پر حق جھپٹا ہے تو باطل دبک گیا ہے' جزع و فزع کرتے ہوئے منتشر ہو گیا ہے۔ اس کی صفوں میں اضطراب پھیل گیا ہے۔ اگرچہ وہ تعداد اور زاد و عتاد میں بہت زیادہ تھا اور حق اس کے مقابلے میں قلت قلیلہ تھا۔ یوں اس فرمان کی سچائی بارہا ثابت ہوئی ہے۔

سَنُلْقِىْ فِىْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ........... "عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ہم منکرین حق کے دلوں میں رعب بٹھادیں گے' اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کو خدائی میں شریک ٹھہرایا ہے' جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔"

یہ بات تو دنیا سے متعلق تھی۔ آخرت میں کیا ہو گا تو وہاں ان کا انجام نہایت ہی پریشان کن اور برا ہو گا اور ان ظالموں کے لائق حال ہو گا۔ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ............ "ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے اور بہت ہی بری ہے وہ قیام گاہ جو ان ظالموں کے نصیب ہوگی۔"

یہاں اللہ تعالیٰ انہیں اس اصول کا مصداق خود جنگ احد میں بتاتے ہیں۔ اس جنگ کی ابتدائی جھڑپ ہی میں مسلمانوں کو فیصلہ کن فتح ہو گئی تھی۔ مشرکین مارے جا رہے' یہاں تک کہ وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنا مال غنیمت بھی چھوڑ دیا۔ ان کا علم گر گیا اور کوئی اسے اٹھانے والا نہ رہا۔ صرف ایک عورت کو ہمت ہوئی اور اس نے اس علم کو اٹھایا۔ یہ فتح شکست میں صرف اس وقت تبدیل ہوئی جب تیراندازوں کے دلوں میں ضعف پیدا ہو گیا۔ وہ مال غنیمت سمیٹنے کے لئے چڑھ دوڑے۔ آپس میں تنازعہ بھی ہوا اور انہوں نے رسول اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کی جو نبی وقت بھی تھے اور ان کے قائد بھی تھے۔ چنانچہ قرآن کریم اس معرکہ کے عروج پر جو واقعات پیش آئے' جو حادثات ہوئے' جن حالات میں ہوئے اور جس طرح ہوتے ہوئے نظر آئے' ان کی توجہ نہایت ہی عجیب اور زندگی اور حرکت سے بھرپور انداز میں' ان واقعات کی طرف مبذول کراتا ہے ذرا غور سے پڑھئے:

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى

الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَآ أَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّونَ ۚ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ
يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۞ إِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى أَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ أُخْرٰىكُمْ
فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ أَصَابَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ ۞ ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ
قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۖ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ
مِنْ شَيْءٍ ۗ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۗ يُخْفُوْنَ فِيْٓ أَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۖ يَقُوْلُوْنَ لَوْ
كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۗ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ
عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۗ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۞ إِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ إِنَّمَا
اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

"اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں (اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا' اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مال غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے.... اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔ تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظر عنایت رکھتا ہے۔

یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے' کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمہیں نہ تھا اور رسول تمہارے پیچھے سے تم کو پکار رہا تھا۔ اس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے تاکہ آئندہ کے لئے تمہیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو۔ اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔

اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر ایسی اطمینان کی سی حالت طاری کر دی کہ وہ اونگھنے لگے۔ مگر ایک دوسرا گروہ' جس کے لئے ساری اہمیت بس اپنی ذات ہی کی تھی' اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلاف حق تھے۔ یہ لوگ اب کہتے ہیں کہ "اس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے؟" ان سے کہو "(کسی کا کوئی حصہ نہیں) اس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔" دراصل یہ لوگ اپنے دلوں میں جو بات چھپائے ہوئے ہیں' اسے تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان کا اصل

مطلب یہ ہے کہ "اگر (قیادت کے) اختیارات میں ہمارا کچھ حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے۔" ان سے کہہ دو کہ "اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے۔" اور یہ معاملہ پیش آیا یہ تو اس لئے تھا کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ اسے آزما لے اور جو کھوٹ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے' اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیے تھے۔ اللہ نے انہیں معاف کر دیا' اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔"

یہاں قرآن مجید نے جنگ کی اسٹیج کے تمام مناظر کو پوری طرح' الفاظ کے ذریعہ منقش کر دیا۔ اس میں فتح اور شکست دونوں کے مناظر دکھائے گئے ہیں' الفاظ کی صورت میں ایک ریل چلتی ہوئی نظر آتی ہے' جس میں میدان جنگ کے تمام مناظر یکے بعد دیگرے سامنے آتے چلے جاتے ہیں' بلکہ دلی خیالات' جسموں کے انداز اور ضمیر کی کھٹک تک صاف نظر آتے ہیں۔ عبارات معانی کو اس طرح منتقل کرتی ہیں گویا ریل ہے جو مناظر دکھا رہی ہے۔ ہر حرکت میں جدید تصویر' متحرک اور زندہ نظر آتی ہے خصوصاً وہ منظر جب لوگ پہاڑ پر چڑھتے ہوئے بھاگ رہے ہیں اور رسول اللہ انہیں پکار رہے ہیں' لیکن وہ ایک نہیں سنتے۔ دہشت زدہ ہیں' پریشان ہیں' جنگ چھوڑ کر پیٹھ موڑ کر بھاگنے کے لئے اوپر ہی کی طرف جا رہے ہیں۔ ان تصاویر کے ساتھ ساتھ دلی وساوس' قلبی کیفیات' تاثرات اور خلجان بھی صاف نظر آتا ہے۔ اتنی بڑی مقدار میں زندہ' متحرک اور چلتی پھرتی تصاویر اور پھر ان کے اندر فیصلے' ہدایات اور بہترین تبصرے اور یہ سب کچھ اس مختصر سی عبارت میں۔ یہ ہے قرآن کریم کا منفرد اسلوب بیان اور یہ ہے قرآن کریم کی منفرد طرز تربیت۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُمْ بِإِذْنِهِ ...... "اللہ نے نصرت کا جو وعدہ تم سے کیا تھا' وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں اس کے حکم سے تم انہیں قتل کر رہے تھے۔" یہ معرکہ کی ابتدائی تصویر ہے جب مسلمانوں نے مشرکین کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا۔ تَحُسُّونَهُمْ سے مراد تَخْمُدُونَ حِسَّهُمْ ......... (تم اس کے احساس کو بجھا رہے تھے) یا تم ان کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ مال غنیمت کا لالچ انہیں بے راہ کر دے۔ اور رسول خدا نے انہیں کہہ دیا تھا "تمہیں فتح نصیب ہو گی لیکن اس وقت تک جب تک تم نے صبر کیا۔" چنانچہ یہی بات سچی نکلی۔

حَتَّى إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ

"مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا اور جونہی وہ چیز تمہیں اللہ نے دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے' تم نے اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ اس لئے کہ تم میں سے بعض لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔"

یہ تیراندازوں کے حالات کا جائزہ ہے۔ ان میں سے بعض لوگ مال غنیمت کے دھوکے میں آ گئے۔ ان کے اور ان میں سے ان لوگوں کے درمیان نزاع ہو گیا جو رسول خدا ﷺ کی مکمل اطاعت کرنا چاہتے تھے۔ بات یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے معصیت اور نافرمانی کا فیصلہ کیا خصوصاً اس وقت جب انہوں نے اپنی آنکھوں سے فتح مندی کے آثار دیکھ لئے۔ ان میں دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ نے مال غنیمت کا ارادہ کر لیا اور دوسرے نے ثواب آخرت کو ترجیح دی۔ ان کے دلوں کے اندر اختلاف پیدا ہو گیا۔ اور اسلامی صفوں میں وحدت نہ

رہی۔ اور نہ ہی ہدف ایک رہا۔ لالچ نے اخلاص کو مکدر کر دیا حالانکہ نظریاتی جنگوں میں خلوص شرط اول ہوتی ہے۔ اس لئے کہ نظریاتی جنگ دوسری جنگوں سے مختلف ہوتی ہے۔ یہ جنگ ایک طرف میدان جنگ میں لڑی جاتی ہے اور دوسری طرف خود انسانی ضمیر کے اندر بھی لڑی جاتی ہے اور جب تک ضمیر کے میدان میں فتح حاصل نہ ہو' جنگ کے میدان میں فتح ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی جنگ ہوتی ہے جو صرف اللہ کے لئے ہوتی ہے' اس لئے اس میں کامیابی سے ہمکنار وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے دل اللہ کے لئے خالص ہو جائیں۔ جب وہ اللہ کا جھنڈا بلند کرتے ہیں تو اللہ انہیں' تب ہی نصرت عطا کرتے ہیں جب اللہ ان کو چھانٹ کر خالص کر دیں اور وہ صرف اسی کے جھنڈے کے لئے لڑیں تاکہ اس جھنڈے کے ساتھ دھوکہ' طمع کاری اور ملاوٹ نہ ہو۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اہل باطل بعض معرکوں میں کامیاب رہتے ہیں حالانکہ وہ باطل کے جھنڈے اٹھارہے ہوتے ہیں۔ اس میں بھی حکمت ہوتی ہے' جس کا علم اللہ ہی کو ہوتا ہے۔ لیکن جو لوگ حق کا علم بلند کرتے ہیں اور پھر حق کے لئے یکسو نہیں ہوتے' مخلص نہیں ہوتے تو ایسے لوگوں کو اللہ کبھی بھی نصرت عطا نہیں کرتے۔ ان کو آزمائش میں ڈالا جاتا ہے' یہاں تک کہ ان کی چھانٹی ہو جاتی ہے اور وہ لوگ بالکل ستھرے ہو جاتے ہیں جو اللہ کے لئے کام کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ بات جسے قرآن مجید جماعت مسلمہ پر ان کے موقف کی روشنی میں واضح کرنا چاہتا ہے۔ یہ ہے وہ حقیقت جس کی تلقین پہلی جماعت اسلامی کو اس وقت کی جارہی ہے جب کہ وہ ہزیمت کے تلخ حقائق سے دوچار تھی' اسے دردناک چوٹ لگی ہوئی تھی اور یہ چوٹ اس کے اپنے ڈانواں ڈول موقف کی وجہ سے لگی تھی۔ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ...... ...... "تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔"

قرآن کریم یہاں دلوں کے خفیہ گوشوں پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ خود مسلمانوں کو اپنے دلوں میں ان خفیہ گوشوں کا پتہ نہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں "میرا یہ خیال نہ تھا کہ رسول ؐ خدا کے ساتھیوں میں سے کوئی ایک شخص بھی دنیا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ معرکہ احد کے دن ہمارے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ...... (ابن کثیر) یوں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کا حال کھول کر ان کے سامنے رکھ دیتے ہیں' ان کے دلوں کی بات ظاہر کر دی جاتی ہے اور انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ شکست کیوں ہوئی تاکہ آئندہ اس سے بچیں۔

اس کے ساتھ ساتھ اللہ اپنی حکمت اور تدبیر کا ایک پہلو بھی ان پر واضح فرماتے ہیں۔ یہ کہ انہیں جو تکالیف اٹھانی پڑیں اور یہ واقعات جو بالکل ظاہری اسباب کی وجہ سے پیش آئے لیکن اللہ کی قدر دیکھئے ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ...... ...... "تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔" حقیقت یہ ہے کہ انسان کے تمام افعال کی پشت پر تقدیر کارفرما ہوتی ہے۔ جب انہوں نے کمزوری دکھائی' آپس میں تنازعہ کیا' حکم عدولی کی' اللہ تعالیٰ نے ان کی قوت کو پھیر دیا' ان کی طاقت ختم ہو گئی' وہ مشرکین کی آمد کو معلوم نہ کر سکے' تیراندازوں کو گھاٹی سے ہٹا دیا۔ میدان میں لڑنے والوں کو بھی پیچھے ہٹا دیا۔ وہ بھاگنے لگے' یہ سب واقعات اس طرح پیش آئے کہ خود ان کے کئے کا نتیجہ تھے۔ لیکن ان ظاہری واقعات کے پیچھے بھی حکمت و تدبیر تھی' وہ یہ کہ اللہ اہل ایمان کو آزمائش میں ڈالنا چاہتے تھے تاکہ سخت ترین حالات' خوف و ہراس' قتل و جراح اور ہزیمت و شکست سے دوچار کر کے انہیں آزمایا جائے۔ اور ان مشکلات کے نتیجے میں ان کے دلوں کے خفیہ گوشے بھی سامنے آجائیں۔ دل صاف ہو جائیں اور صفوں سے کمزور لوگ دور ہو جائیں جیسا کہ آئندہ بیان ہو گا۔

ہوتا تو یہ ہے کہ واقعات بظاہر اپنے ظاہری اسباب کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں لیکن ان ظاہر اسباب کے ہوتے ہوئے بھی ان کے پیچھے تدبیر کام کر رہی ہوتی ہے۔ اس لئے ان دونوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے۔ ہر واقعہ کے پیچھے سبب ظاہری بھی ہوتا ہے اور اس

سبب ظاہری کے پیچھے اللہ کی حکمت و تدبیر بھی کام کر رہی ہوتی ہے اور یہ تدبیر لطیف و خبیر کی طرف سے ہوتی ہے۔

وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ........... "اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا۔" یعنی اللہ نے تمہاری کمزوری' باہم نزاع اور حکم عدولی کو معاف کر دیا۔ اسی طرح تم جو بھاگ نکلے' الٹے پاؤں پھرے۔ یہ سب کچھ اللہ نے معاف کر دیا۔ اور یہ معافی صرف اس کا فضل و کرم ہے۔ تمہاری بشری کمزوریوں کو اس نے معاف کر دیا' نظر انداز کر دیا کیونکہ تمہاری نیت بری نہ تھی' تم غلطی پر اصرار نہیں کر رہے تھے۔ کیونکہ تمہاری یہ کمزوری اور یہ غلطی دائرہ ایمان کے اندر ہے۔ تم اللہ کے سامنے بھی جھکتے ہو اور اپنی قیادت کے احکام کے سامنے بھی سر تسلیم خم کرتے ہو۔ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ........... "کیونکہ مومنین پر اللہ بڑی نظر عنایت رکھتا ہے۔"

اس کا پہلا فضل تو یہ ہے کہ اس نے انہیں معاف کر دیا۔ جب تک وہ اسلامی نظام پر قائم ہیں اس کی بندگی کا اقرار کرتے ہیں۔ وہ اللہ کے خصائص الوہیت و حاکمیت کے مدعی خود نہیں ہوتے۔ وہ اپنے لئے منہاج حیات' نظام قانون' اقدار حیات اور حسن و قبح کے پیمانے خود وضع نہیں کرتے بلکہ صرف اللہ سے لیتے ہیں۔ یہ اصول تسلیم کرتے ہوئے اگر ان سے بتقاضائے بشریت' بوجہ کمزوری' بوجہ عارضی جوش اور عارضی خواہشات کوئی غلطی ہو جائے تو وہ معاف ہو سکتی ہے لیکن غلطیوں پر ابتلا کی سزا ضرور دی جاتی ہے تاکہ وہ کھوٹ دور ہو اور وہ کمزوری دور ہو۔

اس کے بعد اس شکست کے ایک منظر کو یوں پیش کیا جاتا ہے۔ إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَى أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ ........... "یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے' کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے کا ہوش تک تمہیں نہ تھا' اور رسول تمہارے پیچھے تمہیں پکار رہا تھا۔" یہ اس لئے یاد دلایا جاتا ہے کہ ان کے پردۂ احساس پر یہ نقش گہرائی کے ساتھ منقش ہو جائے۔ وہ اپنی جگہ شرمندگی' حیاء اور پشیمانی محسوس کریں۔ اس کے اسباب پر غور کریں جو کمزوری' باہم تنازع اور حکم عدولی کی وجہ سے ان سے سرزد ہوئی۔

یہ آیت ان کی جسمانی حرکات اور ان کی نفسیاتی کیفیات کی اس قدر مختصر الفاظ میں نقشہ کشی کرتی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس تصویر میں صاف نظر آتا ہے کہ وہ پہاڑ پر اوپر کی طرف بھاگتے ہوئے چڑھتے ہیں' مرعوب ہو گئے ہیں' دہشت زدہ ہیں اور سخت اضطراب میں ہیں۔ کوئی کسی کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔ کوئی کسی کی پکار کا جواب نہیں دیتا۔ حضور پکار رہے ہیں تاکہ انہیں مطمئن کر دیں کہ آپ زندہ ہیں لیکن وہ نہیں سنتے۔ کیونکہ کسی نے یہ پکار دیا تھا کہ محمد ﷺ قتل ہو گئے ہیں اور اس وجہ سے ان کے دل متزلزل ہو گئے تھے۔ ان کے قدم اکھڑ گئے تھے۔ غرض ایک مکمل تصویر کشی ہے لیکن چند الفاظ میں۔

ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اللہ سے بھاگ کر اور رسول خدا کو اکیلا چھوڑ کر آپ ﷺ کو جو دکھ دیا' اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی بہت دکھ دیئے۔ وہ اپنے کئے پر پچھتاتے رہے کہ انہوں نے رسول خدا کو اکیلا چھوڑ دیا۔ آپ ﷺ کو زخم آئے' لیکن پھر بھی آپ ثابت قدم رہے جبکہ وہ بھاگ گئے تھے' تاکہ تم اس چیز پر حسرت نہ کرو جو چلی گئی ہے اور نہ اس اذیت پر حزن و ملال کا اظہار کرو جو اس وجہ سے تمہیں پہنچی۔ کیونکہ یہ تجربہ جس سے وہ گزرے اور یہ ضربات جو نبی ﷺ کو لگیں وہ ان کے لئے ناقابل برداشت تھیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے وہ خود اپنی تکالیف بھول گئے۔ اور وہ مصائب ان کی نظروں میں کم ہو گئے فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ........... "اس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے تاکہ آئندہ کے لئے تمہیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر

ملول نہ ہو۔"

اور اللہ تو خفیہ باتوں کا بھی علم رکھتا ہے۔ تمہارے اعمال کی حقیقت اسے اچھی طرح معلوم ہے اور تمہاری تمام حرکات کے پیچھے جو داعیہ ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ............... "اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔"

جب اس ہزیمت کا خوف و ہراس فرو ہو گیا اس کی افراتفری ختم ہو گئی تو اہل ایمان پر ایک عجیب سکون طاری ہو گیا۔ اہل ایمان جو اپنے رب کی طرف دوبارہ پلٹ آئے اور نبی ﷺ کے اوگرد جمع ہوئے تو ان پر ایک عجیب اونگھ طاری کر دی گئی۔ انہیں ایک ناقابل فہم سکون حاصل ہو گیا اور وہ مطمئن ہو گئے۔ اس نئی معجزانہ فضائے امن و سکون کی تعبیر نہایت ہی تعجب انگیز ہے۔ وہ نہایت شفاف' نرم اور خوشگوار فضا ہے اور اس کے زمزمہ اور خوشگوار چھاؤں کی تصویر کشی ان الفاظ میں ہے۔ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ............... "اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم پر ایسی اطمینان کی سی حالت طاری کر دی کہ وہ اونگھنے لگے۔" یہ ایک ایسی فضا تھی جس سے رحمت الٰہی کا اظہار ہو رہا تھا اور اللہ کے خاص مومن بندوں پر یہ خاص رحمت نازل ہوا کرتی ہے۔ یہ ایک اونگھ تھی اور خوفزدہ اور پریشان حال مجاہدین پر جب اونگھ آ جائے' اگرچہ ایک لحظہ کے لئے کیوں نہ ہو تو وہ ان کے جسم کے اندر ساحرانہ اثر کرتی ہے' اونگھ دور ہوتے ہی وہ تروتازگی محسوس کرتے ہیں' گویا وہ ایک نئی مخلوق ہیں' دلوں پر اطمینان کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ جسم آرام محسوس کرتا ہے۔ اس اونگھ کی کیا حقیقت ہے' اس کی حقیقت اور ماہیت اور کیفیت کا ادراک ہم نہیں کر سکتے۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے شدید پریشانی کے عالم میں ایسی حالت کو محسوس کیا ہے۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس میں اللہ کی رحمت کی شبنم ہے۔ اور اس قدر معجزانہ ہے کہ ہمارے الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہیں۔

ترمذی' نسائی' حاکم نے حماد ابن سلمہ کے واسطہ سے ثابت کی روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ابو طلحہ سے نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں "میں نے احد کے دن اپنا سر اٹھایا اور دیکھنے لگا' ہر شخص کا سر ہودج پر جھکا ہوا ہے۔ اور ایک دوسری روایت ابو طلحہ سے یہ ہے "ہم احد کے دن میدان جنگ میں تھے' کہ ہم پر ایک خاص اونگھ طاری ہو گئی۔ میری تلوار گرتی اور میں اسے اٹھاتا' گرتی اور میں دوبارہ اٹھاتا۔"

ایک گروہ کا حال تو یہ تھا اور دوسرے گروہ کا حال یہ تھا کہ وہ متزلزل الایمان تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں صرف اپنی جان کی فکر تھی' اسی کو اہمیت دیتے تھے۔ یہ لوگ ابھی تک جاہلیت کے تصورات سے نکل کر باہر نہیں آئے تھے۔ نہ انہوں نے پوری طرح اپنے آپ کو اس تحریک کے سپرد کر دیا تھا' نہ وہ پوری طرح تن بتقدیر الٰہی ہو گئے تھے۔ وہ اس بات پر مطمئن نہ تھے کہ انہیں جو چوٹ لگی ہے وہ ان میں چھانٹی کے لئے لگی ہے' آزمائش کے لئے یہ سب کچھ ہوا ہے۔ یہ اس لئے نہیں ہوا کہ اللہ نے اپنے دوستوں اور حامیوں کو دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے اور نہ کہیں اللہ نے یہ آخری فیصلہ کر دیا ہے کہ کفر' شر اور باطل کو اب آخری غلبہ حاصل ہو گیا ہے۔ اور انہیں اب پورا کنٹرول حاصل ہو گیا ہے۔

وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ

"مگر ایک دوسرا گروہ جس کے لئے ساری اہمیت بس اپنے مفاد ہی کی تھی' اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلاف حق تھے۔ یہ لوگ اب کہتے ہیں کہ "اس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے۔"

اسلامی نظریہ حیات' اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ان کی جان میں ان کا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ تو سب کے سب اللہ کے ہیں اور جب وہ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے نکلتے ہیں تو وہ اللہ کے لئے نکلتے ہیں' وہ اللہ کے لئے حرکت میں آتے ہیں اور اللہ ہی کے لئے جنگ کرتے ہیں۔ جہاد کے اس عمل میں ان کی ذات کے لئے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس میں پھر وہ اپنے آپ کو اللہ کی تقدیر کے سپرد کر دیتے ہیں اور اللہ کی تقدیر ان پر جو حالات بھی لاتی ہے وہ اسے قبول کرتے ہیں' مکمل تسلیم و رضا کے ساتھ جو بھی ہو سو ہو۔

رہے وہ لوگ جو اپنی ذات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور ان کی سوچ اور ان کے اندازے ان کی اپنی ذات کے ارد گرد گھومتے ہیں' ان کی سرگرمی اور ان کے تمام اہتمام صرف اپنی ذات کے لئے ہوتے ہیں' یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ ان کے دل میں ایمان کی حقیقت ابھی تک جڑیں ہی نہیں ہوتی۔ یہ دوسرا طائفہ جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے وہ ایسے ہی لوگوں پر مشتمل تھا۔ یہاں قرآن کریم نے ان پر تبصرہ کرنا ضروری سمجھا۔ اس گروہ کے نزدیک ساری اہمیت ان کی ذات کے لئے تھی۔ وہ نہایت کرب اور پریشانی میں مبتلا تھے۔ انہیں یہ احساس کھائے جا رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی صلاحیتوں کو ایسے کام میں ضائع کر رہے ہیں' جو ان کے ذہن میں واضح نہیں ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ بغیر ان کی مرضی کے اس معرکے میں شریک ہونے پر مجبور ہو گئے' انہیں اس میں خواہ مخواہ جھونک دیا گیا اس کے باوجود ان کو یہ تلخ چوٹ لگی اور وہ خواہ مخواہ اس قدر بھاری قیمت ادا کر رہے ہیں' قتل ہو رہے ہیں' زخمی ہو گئے ہیں اور پریشان کا تو حال نہ پوچھو۔ یہ لوگ اللہ کی صحیح معرفت سے محروم ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی بدگمانیاں کرتے ہیں' جس طرح جاہل لوگ کیا کرتے تھے اور سب سے بڑی بدگمانی یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس معرکہ میں ضائع کر رہا ہے' جس کے انتظام میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے بس انہیں تو یہاں دھکیل کر لایا گیا ہے تاکہ وہ مریں' زخمی ہوں۔ اللہ تو نہ انہیں بچاتا ہے اور نہ ان کی مدد کرتا ہے۔ اللہ نے انہیں دشمنوں کے لئے لقمہ تر بنا دیا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ "اس کام میں ہمارا بھی حصہ ہے۔"

ان کے اس اعتراض میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اس معرکے کے لئے قیادت نے جو منصوبہ بنایا اس میں ان کی ایک نہ سنی گئی۔ شاید اس گروہ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ کے اندر لڑا جائے اور باہر جا کر لڑنے سے پرہیز کیا جائے لیکن اس کے باوجود وہ عبداللہ ابن ابی کے ساتھ لوٹ نہ گئے تھے۔ لیکن ان کے دل اس منصوبے پر مطمئن نہ تھے۔

اس سے قبل کہ اس سیاق کلام میں ان کی ان بدگمانیوں کی بات ختم کی جائے' درمیان میں مختصر سا جواب دے دیا جاتا ہے اور اس میں ان کے اس اعتراض کو رد کر دیا جاتا ہے۔ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ............... "کہہ دو کہ اس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔" کسی کے لئے کوئی اختیار نہیں ہے' نہ ان کا کوئی اختیار اور نہ کسی اور کا کوئی اختیار ہے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے نبی کو یہ حکم دے دیا تھا لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ............... "اس کام کا کوئی اختیار تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔" لہٰذا اس دین کے تمام معاملات' اس کی خاطر جہاد' اس کے نظام کا قیام' لوگوں کے دلوں کے اندر ہدایت داخل کرنا وغیرہ یہ سب کام اللہ کے لئے ہیں۔ ان اختیارات میں کوئی انسان شریک نہیں ہے۔ بشر کا کام تو صرف یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض سرانجام دے۔ وہ اپنے وعدہ ایمان کے تقاضے پورے کرے۔ یہ اب صرف اللہ کا کام ہے کہ اس جدوجہد کے نتائج کیا نکلتے ہیں۔ اور وہ کیا نکالتا ہے۔ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ ان کے دل کے اندر ایک چھپی ہوئی کمزوری کو بھی طشت از بام کر دیتے ہیں يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ............... "یہ لوگ اپنے دلوں میں جو بات چھپائے ہوئے ہیں تم پر ظاہر نہیں کرتے۔" ان کے دل وسوسوں اور متنوع خدشات سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کے دلوں میں کئی اعتراضات ہیں اور کئی امور پر وہ احتجاج کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ سوال کہ "کیا ان کے لئے بھی اس معاملے میں کوئی اختیار ہے؟" اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کے شعور

اور لاشعور میں یہ بات تھی کہ انہیں ایک ایسے کام میں ڈال دیا گیا ہے جس میں وہ از خود نہیں آئے۔ یہ کہ قیادت کی غلطیوں کی وجہ سے وہ قربانی کا بکرا بن گئے ہیں۔ اگر وہ خود اس معرکے کا نقشہ تیار کرتے تو اس کا یہ انجام نہ ہوتا۔ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَا قُتِلْنَا هَاهُنَا ............ "ان کی اصل بات یہ ہے کہ اگر قیادت کے اختیارات میں ہمارا کوئی حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے۔"

یہ ایک وسوسہ ہے' جو اس وقت تک دلوں میں پیدا ہوتا ہے' جب تک وہ نظریہ کے لئے خالص اور یکسو نہیں ہو جاتے۔ جب ایسے لوگوں کو کسی موقعہ پر شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے' جب ان پر مصائب آتے ہیں' جب انہیں ان کے تصور اور توقع سے زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے' جب انہیں ناقابل تصور ناگوار نتائج کا سامنا ہوتا ہے' جب ان کے دل و دماغ میں وہ نظریۂ حیات اچھی طرح جاگزیں نہیں ہو جاتا اور جب وہ لوگ یہ سوچتے ہیں کہ ان پر یہ مصائب محض قیادت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ٹوٹ پڑے ہیں اور اگر وہ خود منصوبہ بندی کرتے تو بڑی کامیابی ہوتی۔ غرض جب لوگوں کی ذہنی صورت حال یہ ہوتی ہے تو اس گدلے تصور کے ہوتے ہوئے ایسا شخص یہ نہیں سوچ سکتا کہ تمام واقعات کے پیچھے حکمت خداوندی کارفرما ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں سوچ سکتے کہ اللہ کی طرف سے یہ آزمائش ہے۔ ان کے خیال میں ایسی صورت حال میں خسارہ ہی خسارہ ہوتا ہے۔ ہر طرح کا ضیاع اور ضیاع ہے۔

ایسے تصورات اور وسوسے رکھنے والوں کے خیالات کی درستگی کے لئے اللہ تعالیٰ ایک نہایت ہی گہری سچائی انکے سامنے رکھتے ہیں۔ وہ سچائی موت کی سچائی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ابتلا کے اندر جو حکمت پوشیدہ ہوتی ہے اس کے بارے میں بھی وضاحت ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ ۗ يُخْفُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ ۖ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَا قُتِلْنَا هَاهُنَا ۗ قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۖ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

"ان سے کہہ دو اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی' وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے۔ اور یہ معاملہ جو پیش آیا' یہ تو اس لئے تھا کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں پوشیدہ ہے۔ اللہ اسے آزمالے۔ اور جو کھوٹ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے' اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔"

اگر تم گھروں میں بھی ہوتے اور اسلامی قیادت کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے' اس معرکے میں نہ کود پڑتے' اور تمام معاملات تم خود اپنی مرضی سے طے کرتے' تو تم میں سے بعض لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنے مقتل کی طرف دوڑے آتے۔ اس لئے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ وہ اس سے نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔ ہر شخص کی موت کے لئے ایک جگہ بھی مقرر ہے اور ہر شخص لازماً اس جگہ کی طرف کھنچا آئے گا اور وہاں دم توڑے گا۔ جب موت کا وقت قریب ہو گا تو وہ شخص اپنے پاؤں پر چل کر وہاں پہنچے گا۔ دوڑتا ہوا آئے گا۔ کوئی اسے کھینچ کر نہ لائے گا نہ کوئی اسے اس طرف دھکیلنے والا ہو گا۔

یہ کیسا عجیب طرز ادا ہے؟ "اپنی جائے آرام کی طرف" گویا اس کا مقتل وہ نرم بستر ہے' جس پر اس نے آرام کرنا ہے۔ اس کے قدم وہاں آرام سے لمبے ہو جائیں گے۔ تمام لوگ' اس دنیا میں اپنی قتل گاہوں اور اپنے آخری آرام کی جگہ کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں

اور وہ ان مقامات کی طرف بعض اوقات ایسے محرکات کی وجہ سے آتے ہیں جو ان کے لئے ناقابل فہم ہوتے ہیں بلکہ یہ محرکات ان کے لئے ناقابل کنٹرول ہوتے ہیں۔ یہ محرکات صرف اللہ کے کنٹرول میں ہوتے ہیں اور وہی ان کے نتائج کو جانتا ہے۔ اور اس کا خاص تصرف ہوتا ہے' جس طرح چاہتا ہے وہ سرانجام دیتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اللہ کے مقرر کردہ جائے قرار پر راضی ہو جائیں تو یہ ہمارے لئے روحانی سکون اور نفسیاتی اطمینان اور ہمارے ضمیر کے مفاد میں ہو گا۔

یہ اللہ کی تقدیر ہے اور اس کے پس پشت جو حکمت کام کر رہی ہے وہ یہ ہے **لِيَبْتَلِيَ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ** ............... "اور یہ معاملہ جو پیش آیا' یہ تو اس لئے تھا کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ اسے آزمالے اور جو کھوٹ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے۔"

اس سے بڑی آزمائش اور کوئی نہیں ہے کہ دلوں کی بات کو ظاہر کر دیا جائے' اور جو دلوں کی تہہ میں ہے وہ اوپر آجائے۔ اس سے کھوٹ اور ریاکاری کو علیحدہ کر دیا جائے اور بغیر کسی ملمع کاری اور بغیر کسی کور کے اصل حقیقت سامنے آجائے۔ یہ بہت بڑی آزمائش ہے' ان باتوں کے لئے جو دل کے خزانے میں پوشیدہ رکھی ہوتی ہیں۔ حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ یہ ہے تطہیر القلوب اور تصفیہ القلوب' اس طرح کہ ان میں کوئی ملاوٹ اور کوئی کھوٹ نہ رہے۔ اس طرح نظریات صحیح ہو کر صاف صورت میں سامنے آجاتے ہیں اور ان میں کوئی نقص اور کوئی ملاوٹ نہیں رہتی۔

**وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ** ............... "اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔" ذات الصدور سے مراد وہ خفیہ راز ہیں جو دلوں کی تہہ میں ہوتے ہیں اور ہر وقت دل میں ہوتے ہیں جو دل سے جدا نہیں ہوتے اور نہ روشنی میں آتے ہیں۔ اللہ ان بھیدوں کو بھی خوب جانتا ہے۔ ان بھیدوں کو اللہ لوگوں پر اس لئے ظاہر کرتا ہے کہ لوگ خود بھی بعض اوقات ان خفیہ باتوں سے بے خبر ہوتے ہیں یعنی یہ ان کے لاشعور میں ہوتے ہیں' بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جو انہیں سطح پر لے آتے ہیں۔

اللہ کو ان باتوں کا علم ہے جو ذہن کے اندر تھیں۔ انہوں نے شکست کھائی اور جب اس غزوہ میں انہیں دشمن کے ساتھ آمنا سامنا ہوا تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ کمزوری دکھائی' پیٹھ دکھائی' کیوں اس لئے کہ انہوں نے اپنے کمانڈر کی نافرمانی کی تھی۔ اس کی وجہ سے ان کے نفوس متزلزل ہو گئے۔ اس راہ سے شیطان ان کے دلوں میں داخل ہو گیا اور انہیں لغزش میں ڈال دیا اور یہ لوگ پھسل پڑے۔ فرماتے ہیں:

**إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ**

"تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیئے تھے۔ اللہ نے انہیں معاف کر دیا' اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔"

اس سے مراد تیرانداز ہو سکتے ہیں جن کے دل میں مال غنیمت کی لالچ نے جوش مارا تھا۔ جس طرح ان کے دل میں یہ بات بھی آگئی تھی کہ شاید رسول خدا ﷺ انہیں ان کا حصہ نہ دیں گے۔ یہ وہ بات تھی جو انہوں نے اپنی کمزوریوں کی وجہ سے کمائی تھی۔ اور اسی وجہ سے شیطان نے انہیں لغزش میں مبتلا کر دیا تھا۔

لیکن اپنے عموم کے اعتبار سے وہ نفس انسانی کی اس حالت کی تصویر ہے جب اس سے کسی غلطی کا ظہور اور ارتکاب ہوتا ہے۔ اسے اپنے اوپر قابو نہیں رہتا۔ اللہ کے ساتھ اس کا رابطہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ اس کی شخصیت کا توازن ختم ہو جاتا ہے' اسے اپنے اوپر کنٹرول نہیں

رہتا۔ اور وہ خلجان اور وسوسوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس کا تعلق اللہ سے ختم ہو جاتا ہے اور اسے اللہ کی رضامندی کا بھروسہ نہیں رہتا۔ یہ مقام ہوتا ہے جہاں شیطان حملہ آور ہوتا ہے۔ وہ انسان کے نفس کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ اب یہ ایسے شخص کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور اس سے لغزشوں پر لغزشیں کرواتا ہے اور یہ نفس اللہ کی پر امن اور مضبوط بارگاہ سے دور چلا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جن خدا پرستوں نے نبیوں کے ساتھ مل کر جنگ کی انہوں نے کفار کے مقابلے میں سب سے پہلے جس ہتھیار کی طرف توجہ کی وہ استغفار تھا۔ کیونکہ استغفار کے ذریعہ ان کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف مڑ جاتی تھی۔ اللہ کے ساتھ ان کا تعلق اس کی وجہ سے مضبوط ہو جاتا۔ ان کے دلوں میں سے تمام خلجان اور غیر یقینی حالت ختم ہو جاتی۔ تمام وساوس دور ہو جاتے اور وہ دروازہ بند ہو جاتا جس میں سے شیطان در آتا۔ اور یہ دروازہ ہمیشہ تب کھلتا ہے جب اللہ سے رابطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ انسان اس کی حمایت اور پناہ گاہ سے باہر نکل آتا ہے اور اس سوراخ سے جب شیطان داخل ہوتا ہے تو وہ ان کے پاؤں کو متزلزل کر دیتا ہے۔ وہ بار بار ڈگمگانے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ انہیں اللہ کی پناہ گاہ سے بہت دور لے جاکر بے آب و گیاہ صحرا میں سرگرداں کر دیتا ہے۔

اللہ بتاتے ہیں کہ میری رحمت ان کے شامل حال ہوگئی۔ اس لئے شیطان انہیں مجھ سے کاٹ نہ سکا۔ لہٰذا وہ معاف کر دیئے گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے سامنے اپنا ذاتی تعارف بھی کراتے ہیں کہ وہ غفور ہیں' بخشنے والے ہیں اور بردبار ہیں۔ غلط کاروں کو راندۂ درگاہ نہیں کرتے اور نہ ہی سزا دہی میں جلدی کرتے ہیں۔ جب اللہ نے جان لیا کہ ان کے اندر اللہ کی تلاش کا داعیہ موجود ہے اور وہ اس سے جڑنا چاہتے ہیں اور اس نے جان لیا کہ وہ سرکشی نہیں چاہتے اور نہ ہی وہ جان چھڑانا چاہتے ہیں اور نہ ہی اللہ کی غلامی سے فرار چاہتے ہیں تو وہ پھر اپنی مغفرت سے نوازتا ہے۔

اب اس مضمون کا خاتمہ موت و حیات کی حقیقت کے بیان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اس بارے میں کفار اور منافقین کے خیالات کس قدر کھوٹے ہیں۔ اہل ایمان کو پکار کر کہا جاتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنا تصور حیات' ان کے تصور حیات سے بالکل جدا کر لیں۔ آخر میں مشکلات' تکالیف اور قربانیوں کی ایک مختلف قدر و قیمت بتائی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَ لَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ وَ لَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' کافروں کی سی باتیں نہ کرو جن کے عزیز و اقارب اگر کبھی سفر پر جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں (اور وہاں کسی حادثہ سے دوچار ہو جاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے) اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں کی حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے' ورنہ دراصل مارنے اور جلانے والا تو اللہ ہی ہے اور تمہاری تمام حرکات پر وہی نگراں ہے۔ اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمہارے حصے میں آئے گی وہ ان ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے جنہیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں اور خواہ تم مرو یا مارے جاؤ بہرحال تم سب کو سمٹ کر جانا اللہ ہی کی طرف ہے۔"

اس معرکے کے حالات کے بیان کے دوران ان آیات کی مناسبت ظاہر ہے۔ یہ منافقین مدینہ کے اقوال تھے۔ یہ لوگ اس معرکہ کے آغاز ہی میں لشکر اسلام سے جدا ہو گئے تھے۔ نیز مدینہ کے مشرکین بھی ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔ یہ لوگ ابھی اسلام میں داخل نہ ہوئے تھے لیکن ان لوگوں اور مسلمانوں کے درمیان قرابت کے تعلقات قائم تھے۔ جنگ احد میں جو لوگ مارے گئے ان کے منافق رشتہ داروں اور مشرک رشتہ داروں کے لئے یہ ایک موضوع بن گیا ان کو اپنے مسلم رشتہ داروں کے دلوں میں حسرت اور مایوسی پیدا کرنے کا موقعہ مل گیا۔ اور اس معرکہ میں ان لوگوں کے چلے جانے اور قتل ہو جانے کو یہ مشرک اور منافق ان کے رشتہ داروں میں از سرنو زخم تازہ کرنے کے لئے بار بار استعمال کرتے تھے۔ اس بات میں شک نہیں ہے کہ اسلامی صفوں پر اس قسم کی باتوں اور پروپیگنڈے سے بہت گہرے اثرات پڑتے تھے اور ان لوگوں نے اس طرح مایوسی اور ہیجان کی فضا پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ قرآن کریم کو ان کی غلط باتوں ان کے غلط عقائد اور ان کے غلط تصورات کو درست کرنے کے لئے یہاں ان کی تردید کرنا پڑی۔ اس طرح کہ ان کی وہ باتیں خود ان کے گلے پڑ گئیں۔

ایک بات کفار یہ کرتے تھے کہ اگر ہمارے ساتھ رہتے یا واپس آجاتے تو وہ نہ مرتے۔ ان کی اس بات سے یہ بات اچھی طرح سامنے آجاتی ہے کہ ایک شخص جو کسی نظریے کا علم بردار ہوتا ہے اور وہ شخص جس کا کوئی عقیدہ نہیں ہوتا ان دونوں میں کس قدر فرق ہوتا ہے۔ دونوں کا تصور' ان اصولوں کے بارے میں جن پر زندگی رواں دواں ہے' جس میں مشکلات بھی ہیں اور آسانیاں بھی ہیں' بہت مختلف ہوتا ہے۔ ایک نظریاتی شخص اس کائنات میں اللہ کے تکوینی اصولوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور قدر پر مطمئن ہوتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا اور مانتا ہے کہ اسے وہی کچھ پیش آسکتا ہے جو اللہ نے لکھ دیا ہے۔ اور یہ کہ جس دکھ نے اسے پہنچنا ہے وہ ٹل نہیں سکتا اور جو مصیبت اس پر نہیں آئی ہے وہ آنہیں سکتی۔ اس لئے وہ مصیبت پر جزع وفزع نہیں کرتا اور نہ ہی مسرت اور خوشی میں آپے سے باہر ہوتا ہے۔ اس کے نفس پر نہ اس کا اثر ہوتا ہے اور نہ اس کل وہ اس بات پر حسرت نہیں کرتا کہ اس نے یہ نہیں کیا اور وہ نہیں کیا تاکہ وہ فلاں مصیبت سے بچ جاتا یا فلاں فلاں مفادات حاصل کر لیتا۔ جبکہ کام ہو چکا ہوتا ہے اور وقت چلا گیا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ تقدیر و تدبیر اور تجاویز و آراء کا موقعہ و محل وہ ہوتا ہے جب کوئی واقعہ ابھی تک وقوع پذیر نہیں ہوا ہوتا کوئی اقدام اور کوئی حرکت ابھی ہونا ہوتی ہے۔ جب تدبیر اور مشورہ کے بعد وہ حرکت میں آجاتا ہے تو اس کے بعد جو نتائج بھی نکلتے ہیں وہ بڑے تسلیم و رضا اور اطمینان کے ساتھ انہیں قبول کرتا ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کی یہ حرکت اللہ تعالیٰ کے اوامر اور مناہی کے مطابق ضروری ہے۔ اس کو یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کی تدبیر کے مطابق ہوا ہے۔ عین اس کی حکمت کے مطابق ہوا ہے۔ اور یہ کہ جس طرح ہوا اسی طرح ہونا تھا۔ اگرچہ اس نے اپنی حرکت اور فعل سے اس کے اسباب فراہم کئے۔ یوں نظریہ عمل اور اس کے نتائج تسلیم کرنے کے درمیان ایک توازن ہوتا ہے۔ وہ توکل اور مثبت سوچ کے درمیان بھی توازن پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان کا ہر اقدام درست ہوتا ہے اور ضمیر مطمئن ہوتا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کا دل و دماغ نظریہ اور اس نظریہ کے تحت مثبت تصور حیات سے خالی ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ ہوا میں ہوتا ہے' ہمیشہ قلق و پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی "اگر مگر" "اے کاش" اور "اے افسوس" جیسے الفاظ میں گزرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ' جماعت مسلمہ کی تربیت کرتے ہوئے' واقعات احد کی روشنی میں' جن میں مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے' انہیں اس امر سے شدید الفاظ میں ڈراتے ہیں کہ ان کا رویہ کہیں ان بے عقیدہ اور بے نظریہ کافروں کی طرح نہ ہو جائے' جو ہر وقت حسرتوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ جب بھی ان کا کوئی رشتہ دار' کسی سفر پر برائے تجارت اور کاروبار جاتا ہے اور وہاں بقضائے الٰہی فوت ہو جاتا ہے یا کبھی کسی معرکے میں شریک ہوتا ہے اور قتل ہو جاتا ہے تو وہ یہ کہتے ہیں:

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَّوْ كَانُوا عِندَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا ۚ

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' کافروں کی سی باتیں نہ کرو' جن کے عزیز و اقارب اگر سفر پر جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں (اور وہاں کسی حادثہ سے دوچار ہو جاتے ہیں) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے۔" یہ باتیں وہ اس لئے کرتے ہیں کہ اس کائنات کے بارے میں ان کی سوچ غلط ہے۔ وہ یہ بات نہیں سمجھتے کہ اس کائنات کے واقعات کے پیچھے دست قدرت کام کر رہا ہے۔ وہ صرف اس قدر دیکھ سکتے جس قدر ظاہری اسباب نظر آتے ہیں۔ وہ صرف ان سطحی حالات کو دیکھ سکتے ہیں جن میں کوئی واقعہ رونما ہوا' یہ محض اس لئے کہ ان کا تعلق اللہ کے ساتھ نہیں ہے' اور وہ اس دست قدرت کو نہیں دیکھ سکتے جو اس کائنات میں جاری و ساری ہے۔

لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ۗ ................ "اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے۔" ان کا احساس یہ ہے کہ جو شخص تجارتی مقاصد کے لئے نکلتا ہے اور کسی حادثے کا شکار ہو جاتا ہے یا کسی معرکے کے لئے نکلتا ہے اور وہاں قتل ہو جاتا ہے' اس کا اصلی سبب گویا اس شخص کا خروج ہے اور یہی غلط احساس ہے۔ جس کی وجہ سے وہ حسرت و اندوہ میں ہر وقت ڈوبے رہتے ہیں کہ کیوں نہ انہوں نے انہیں اس سفر' اس معرکے کے لئے نکلنے سے منع کیا؟ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ اس کی حقیقی علت اور اصلی سبب تو یہ ہے کہ اس شخص کا وقت آپہنچا تھا' اسے اس کی جائے قتل تک جانا تھا' تقدیر اسے بلا رہی تھی' موت و حیات کے بارے میں سنت اللہیہ نے اپنا کام شروع کر دیا تھا تو وہ اس طرح حسرت و اندوہ میں نہ ڈوبتے۔ وہ اس ابتلا میں صبر و سکون سے رہتے' وہ اس میں راضی برضا اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتے اور کہتے وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۗ ................

"دراصل مارنے والا اور جلانے والا صرف اللہ ہے۔"

اسی کے ہاتھ میں ہے جسے زندگی دے' اسی کے اختیار میں ہے کہ خود دی ہوئی زندگی کو واپس لے لے۔ یہ سب کچھ اپنے مقررہ وقت پر ہوتا ہے اور ہر کام کے لئے اس نے وقت لکھا ہوا ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں رہیں' اپنے اہل و عیال میں رہیں' وہ کاروباری سفر میں ہوں یا نظریاتی جنگ میں ہوں۔ ثواب بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ معاوضہ بھی اسی کے ہاتھ میں اور وہ یہ سب کام بڑی خبرداری کے ساتھ' پورے علم کے ساتھ اور اچھی طرح دیکھتے ہوئے کرتا ہے۔ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١٥٦﴾ ................

"اور تمہاری تمام حرکات پر وہ نگراں ہے۔"

اب ایک دوسری حقیقت پر غور ہوتا ہے۔ موت اور قتل سے کیا زندگی ختم ہو جاتی ہے' نہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ کیا زندگی اس انعام سے بہتر ہے جو اللہ دے گا؟ نہیں۔ کچھ اور اقدار حیات بھی تو ہیں۔ کچھ پہلو بھی ہیں جو اللہ کے ترازو میں قابل غور ہیں:

وَلَئِن قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ وَلَئِن مُّتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللَّهِ تُحْشَرُونَ

"اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی رحمت اور بخشش جو تمہارے حصے میں آئے گی وہ ان ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے جنہیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں اور خواہ تم مرو یا مارے جاؤ۔ بہرحال تم سب کو سمٹ کر جانا اللہ ہی کی طرف ہے۔"

غرض اللہ کی راہ میں موت اور قتل ہونا' ان شرائط و قیود کے ساتھ' زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔ ان تمام دنیوی مفادات اور مال و

منال سے بہتر ہے جسے رات دن لوگ جمع کر رہے ہیں۔ اس عزت و احترام سے بہتر ہے جس کے لئے لوگ کوشاں ہیں۔ یہ موت اس لئے بہتر ہے کہ اس کے نتیجے میں اللہ کی رحمت اور مغفرت نصیب ہوتی ہے۔ اللہ کے میزان حقیقت نمامیں یہ بہتر ہے' ان تمام چیزوں سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ یہ مغفرت اور یہ رحمت ہی مطلوب مومن ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ موت وحیات کے اس مقام میں لوگوں کو شخصی برتری اور انسانی مقاصد اور سربلندیوں کے حوالے نہیں کرتے' بلکہ انہیں' وہ کچھ دکھایا جاتا ہے جو اللہ کے ہاں ہے' ان کے دلوں کو رحمت خداوندی سے جوڑا جاتا ہے۔ اور رحمت خداوندی کو یونہی دنیا کے مال و منال سے زیادہ خیر اور قیمتی قرار دیا جاتا ہے۔ دنیا کے تمام ممکنہ مقاصد سے' اسے برتر اور قیمتی قرار دیا جاتا ہے۔

سب لوگ لوٹ کر اللہ کی طرف جائیں گے' سب لوگ حشر کے دن اٹھا کر اس کے سامنے حاضر کئے جائیں گے۔ چاہے وہ اپنے بستر پر مریں' چاہے وہ اس کرۂ ارض پر کسی تجارتی سفر میں مریں اور چاہے وہ جہاد فی سبیل اللہ کے دوران شہید ہوں۔ جانا انہوں نے بہرحال اللہ کی طرف ہے۔ انجام کار انہوں نے وہاں حاضر ہونا ہے۔ فرق اگر کوئی ہے تو وہ صرف لوگوں کے نقطہ نظر' ان کے مطمح نظر اور طرز عمل میں ہے۔ رہا واقعی عملی انجام تو اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک مقررہ وقت میں' ایک مقررہ مقام پر' تحریر شدہ تقدیر کے مطابق جو اٹل ہے' ہر شخص کی موت واقع ہوگی۔ یوں وہ اللہ کی طرف لوٹ جائے گا' اور پھر ایک مقررہ وقت قیامت میں وہ حشر کے میدان میں اٹھے گا۔ وہاں یا وہ اللہ کی رحمت اور مغفرت پانے والوں میں ہوگا یا وہ غضب الٰہی اور عذاب الٰہی کے چنگل میں جائے گا۔ اس لئے وہ شخص احمق الحمقاء ہے' جو اپنے لئے برا انجام پسند کرتا ہے' جبکہ اسے ہر حال میں مرنا تو ہے ہی۔

یوں دلوں میں حقیقت موت و حیات بیٹھ جاتی ہے۔ اللہ کی تقدیر کا درس دیا جاتا ہے اور یوں قلوب مومنہ تقدیر کے رواں دواں واقعات کو دیکھتے ہوئے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ تقدیر کے پردے کے پیچھے جو حکمت کارفرما ہوتی ہے اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ابتلا میں جو ثواب آخرت ہے اسے پسند کرتے ہیں۔ اس پر غزوۂ بدر کے اہم واقعات یہاں ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی جو متعلقہ باتیں تھیں ان پر کلام ختم ہو جاتا ہے۔

☆......○......☆

اب سیاق کلام ایک نئے مضمون کو لیتا ہے۔ اس مضمون کا موضوع قائد انقلاب کی شخصیت ہے۔ رسول خدا ﷺ کی ذاتی صفات کے بارے میں' حقیقت نبوت کے بارے میں اور امت مسلمہ کی زندگی میں ذات نبوی اور حقیقت نبوت کے اہم کردار کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ اس امت کے ساتھ کس قدر رحیم و کریم ہیں۔ اس موضوع کے ساتھ کچھ اور تاریں بھی ملی ہوئی ہیں کہ جماعت مسلمہ کی تنظیم کے سلسلے میں ربانی طریق کار کیا ہے۔ اور یہ کہ اس تنظیم کی اساس کیا ہے۔ یعنی کن نظریات پر اسے قائم کیا گیا ہے اور کن حقائق پر وہ استوار ہے۔ نیز اس تصور حیات کی اہمیت کیا ہے اور تنظیم کے لئے اس ربانی منہاج کی اہمیت کیا ہے اور پھر اس منہاج کا اثر پوری انسانیت پر کیا ہو گا؟

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝ إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ

لَكُمْ ۚ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُؤْمِنُونَ ﴿١٦٠﴾ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ
يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿١٦١﴾ أَفَمَنِ
اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ
الْمَصِيرُ ﴿١٦٢﴾ هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿١٦٣﴾ لَقَدْ
مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ
يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا
النصف مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿١٦٤﴾

"(اے پیغمبر) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کردو' ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو' اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو' پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو' اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔ اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں' اور وہ تمہیں چھوڑ دے' تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو؟ پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔

کسی نبی کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ خیانت کر جائے.... اور جو کوئی خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا' پھر ہر متنفس کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر کچھ ظلم نہ ہو گا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص ہمیشہ اللہ کی رضا پر چلنے والا ہو وہ اس شخص کے سے کام کرے جو اللہ کے غضب میں گھر گیا ہو اور جس کا آخری ٹھکانا جہنم ہو جو بدترین ٹھکانا ہے؟ اللہ کے نزدیک دونوں قسم کے آدمیوں میں بدرجہا فرق ہے اور اللہ سب کے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔ درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے' ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے' حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔"

اس پیراگراف کا موضوع اور محور حقیقت نبوت اور ذات نبوی ہے۔ اور اس محور کے متعلقہ حقائق کو اس میں لیا گیا ہے۔ اس میں نظر آتا ہے کہ بڑے بڑے اصول چھوٹی چھوٹی عبارتوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ اللہ کی رحمت کو مجسم کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور طرز عمل کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ کی ذات کریمہ نہایت ہی مہربان' نہایت ہی رحم دل' نہایت ہی نرم اور نہایت ہی سہل شکل میں پیش کی گئی ہے۔ نظر آتا ہے کہ لوگ پروانوں کی طرح ان کے اردگرد جمع ہوتے ہیں۔ آپ کے اردگرد ہر وقت ایک بڑی تعداد جمع رہتی ہے۔ پھر اس محفل میں صاف صاف نظر آتا ہے کہ اس جماعت کا قیام جس نظام کے تحت ہے وہ اصول شوریٰ پر قائم ہے۔

حکم دیا جاتا ہے کہ یہ جماعت باہم مشورہ کر کے فیصلے کرے' اگرچہ اس مشورے کے تحت ہونے والے فیصلوں کے نتائج تلخ ہوں۔ پھر شوریٰ کے اصول کے ساتھ ساتھ یہ بھی نظر آتا ہے کہ دانشمندی اور شوریٰ کے ذریعہ فیصلے کئے جائیں اور پھر ان پر عمل کیا جائے۔ اور یہ عمل فیصلہ کن ہو۔ اور شوریٰ اور عزم کے بعد پھر توکل کر کے کام کیا جائے۔ جب منصوبہ تیار ہو جائے' اس پر شوریٰ ہو جائے اور پھر اس پر فیصلہ کن عمل اور اس کا اجراء (Execution) شروع ہو جائے اور اس کے لئے ہر قسم کا انتظام ہو جائے' تو پھر توکل علی اللہ کا مرحلہ آتا ہے اور پھر قدرت الہیہ اپنا کام شروع کر دیتی ہے۔ پھر مسلمان اپنا کام اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ تمام امور میں حقیقی فاعل اور حقیقی متصرف تو صرف اللہ کی ذات ہے۔ حقیقی تصرف اس کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ تمام نتائج اس کے ہاتھ میں ہیں۔ ان امور کے ساتھ ساتھ پھر یہ حکم بھی دیا جاتا ہے کہ مال غنیمت میں خیانت بہت ہی بڑا جرم ہے۔ اس سے طمع اور لالچ کا اظہار ہوتا ہے۔ جماعت کے اندر افراتفری پیدا ہوتی ہے۔ اس پیراگراف میں بتایا جاتا ہے جو شخص اللہ کی رضامندی کے لئے کام کرتا ہے اور جو اللہ کی نافرمانی اور غضب کی راہ پر ہے ان دونوں میں بہت بڑا فرق و امتیاز ہے۔ دونوں کی اقدار اور ترجیحات میں فرق ہوتا ہے۔ دونوں کے پیمانہ نفع و نقصان میں فرق ہوتا ہے۔ آخر میں اہل اسلام اور اہل دنیا کو یہ بتایا جاتا ہے کہ نبی ﷺ کی رسالت تمہارے لئے بڑی نعمت ہے اور تم پر ایک عظیم احسان ہے اور معمولی اموال غنیمت جس کے لئے تم دوڑتے ہو اس قیمتی اثاثے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ نیز اس عظیم خزانہ کے حصول کے لئے وہ مصائب کچھ نہیں جو تم پر آئے ہیں۔ یہ عظیم دولت تو عظیم قربانی کا تقاضا کرتی ہے۔

ہدایات و معانی کی یہ فوج ہے' جو چند فقروں اور آیات میں دریا کو کوزے میں بند کر کے پیش کر دی گئی ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ

"اے پیغمبر یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کر دو' ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو۔ اور اہم امور میں ان سے مشورہ کیا کرو۔ پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو' اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔"

یہاں روئے سخن رسول خدا کی طرف ہے۔ لیکن یہ بات رسول کی قوم کی کچھ کمزوریوں کو سامنے رکھ کر کی جا رہی ہے کہ پہلے وہ مدینہ سے باہر نکلنے میں بڑے پرجوش تھے۔ اس کے بعد ان کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ پورے لشکر کا ایک تہائی حصہ تو جنگ سے پہلے ہی واپس ہو گیا۔ اس کے بعد تیراندازوں نے حضور ؐ کے حکم کی مخالفت کی۔ انہوں نے مال غنیمت کو دیکھ کر کمزوری کا مظاہرہ کیا۔ پھر جب حضور ؐ کے قتل کی جھوٹی خبر عام ہو گئی تو یہ لوگ کمزور پڑ گئے اور الٹے پاؤں پھر گئے۔ اور ہزیمت قبول کر لی۔ حضور ایک قلیل تعداد کے ساتھ جم گئے' زخم پر زخم آتے رہے اور ساتھی چھوڑ گئے۔ پھر آپ پیچھے سے پکارتے رہے لیکن وہ بھاگے جا رہے تھے اور کسی کی طرف ان کی توجہ ہی نہ ہو رہی تھی۔ اس صورت حال میں روئے سخن آپ کی طرف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ ؐ کو تسلی دیتا ہے اور مسلمانوں کو یہ شعور و احساس دیا جاتا ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا کس قدر عظیم انعام ہے۔ حضور ﷺ اور مسلمانوں دونوں کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ یہ مجسم خلق کریم اللہ کی ایک عظیم نعمت ہے کہ وہ اس محور کے اردگرد جمع ہو رہے ہیں۔ اس طرح حضور ؐ کے دل میں پوشیدہ جذبات رحمت کو

جوش میں لایا جاتا ہے اور آپ صبر کر کے ان کی وہ تمام لغزشیں معاف فرماتے ہیں اور دوسری طرف سے ان کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اس رؤف و رحیم نبی کی صورت میں ان پر کس قدر انعام ہوا ہے۔ اور حضور ؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ بھی ان کے لئے عفو و درگزر کا سوال کریں۔ اور یہ کہ حسب سابق ان کے ساتھ مشورہ کرتے رہیں اور یہ نہ ہو کہ احد میں مشورے کے نتیجے میں جو معرکہ ہوا اور اس میں جو نامطلوب نتائج نکلے' اس کی وجہ سے باہم شوریٰ جیسے اہم کام کو بند کر دیں۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ ...... "اے پیغمبر یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر تم تنگ خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔"

یہ اللہ کی رحمت تھی جو حضور ﷺ کے بھی شامل حال تھی اور آپ کو ان کے لئے رحیم و شفیق اور نرم خو بنا دیا اور خود ان کے لئے بھی رحمت تھی کہ آپ نے بوجہ نرمی مزاج ان سے بازپرس نہ کی۔ اگر آپ سنگ دل ہوتے' تنگ مزاج ہوتے تو یہ جمعیت منتشر ہو جاتی' لوگوں کے خیالات آپ کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہوتے۔ عوام الناس کو تو ایک پرشفقت بارگاہ درکار ہوتی ہے' جہاں ان کے ساتھ نہایت رعایتی برتاؤ کیا جاتا ہو' جہاں خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا جاتا ہو' جہاں سے انہیں محبت ملتی ہو' جہاں ان کی غلطیوں' کمزوریوں اور نقائص سے درگزر کیا جاتا ہو۔ جہاں قائد اتنے بڑے دل کا مالک ہو کہ وہ انہیں سب کچھ دے رہا ہو' لیکن ان سے کچھ نہ لے رہا ہو' جہاں قائد اپنے پیروکاروں کی مشکلات اپنے سر لیتا ہو لیکن ان پر زیادہ بوجھ نہ ڈالتا ہو' اور جہاں پیروکاروں کو ہمیشہ رعایت' اہمیت' خندہ پیشانی' نرمی اور محبت اور رضامندی ملتی ہو اور حضور اکرم کا دل ایسا ہی دل تھا اور آپ کا برتاؤ لوگوں کے ساتھ بعینہ ایسا تھا۔ کبھی وہ اپنی ذات کے حوالے سے کسی پہ غصہ نہیں ہوئے' کبھی بھی انسانی کمزوری کی وجہ سے آپ نے تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کبھی آپ نے اس دنیا کے مفادات میں سے کسی مفاد کو' اپنی ذات کے لئے مخصوص نہیں کیا۔ بلکہ آپ کو جو کچھ بھی ملا آپ نے کھلے ہاتھوں سب کچھ ان پر تقسیم کر دیا۔ غرض آپ کے صبر' حلم' ہمدردی' محبت اور شرافت نے ہمیشہ انہیں ڈھانپے رکھا۔ اور ان میں سے جس نے بھی حضور ﷺ کے ساتھ یکجا زندگی کے کچھ ایام بسر کئے یا آپ کو محض ایک نظر دیکھ ہی لیا وہ آپ ؐ کا گرویدہ ہو گیا۔ اس لئے کہ ذات باری نے آپ کو ایک عظیم اور رحیم و کریم شخصیت عطا فرمائی تھی۔ اور یہ سب کچھ آپ ؐ پر بھی اللہ کی رحمت تھی اور دوسرے پہلو سے آپ کی امت پر بھی کرم تھا۔

اس کرم کو یاد دلا کر اللہ تعالیٰ آپ ؐ کو وہ اصولی بات بتاتے ہیں جس پر آئندہ جماعت مسلمہ کی تنظیم ہونا مطلوب تھی وہ یہ کہ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ ...... "اور ان کے ساتھ الامر میں مشورہ کرو۔" یہ ایک قطعی نص ہے اور تاکیدی ہے۔ "ان کے ساتھ الامر میں مشورہ کرو۔" اسلام یہ اصول نظام حکومت میں لازم قرار دیتا ہے۔ اگرچہ اس نظام حکومت میں ہیڈ آف سٹیٹ محمد ﷺ ہوں۔ یہ قطعی نص اس بارے میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتی کہ اسلامی نظام مملکت میں شوریٰ ایک اساسی اصول (Principle) ہے۔ اس کے سوا اسلام کا نظام مملکت قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ رہی یہ کہ شوریٰ کی شکل و صورت کیا ہو' شوریٰ کا مقصد کس طرح حاصل کیا جائے' تو یہ ایسے امور ہیں جن کی صورت اور شکل مختلف ہو سکتی ہے۔ ہر علاقے کے حالات کے مطابق مختلف شکل و صورت میں شوریٰ قائم کی جا سکتی ہے۔ ہر وہ شکل و صورت جس کے ذریعہ شوریٰ کے مقاصد پورے ہو سکیں۔ یہ نہ ہو کہ محض ایک دکھاوا ہو۔ جس صورت اور جس شکل میں صحیح اغراض پورے ہوں وہی اسلامی ہو گی۔

یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ جب یہ آیت اتری تھی تو اس سے پہلے مجلس شوریٰ کا انعقاد ہو گیا تھا اور شوریٰ کے اکثریت کے فیصلے کو تسلیم کرتے ہوئے احد کی جنگ لڑی گئی اور جس کے تلخ نتائج برآمد ہوئے۔ اس شوریٰ کے انعقاد کی وجہ سے پہلا نقصان تو یہ ہوا کہ

اسلامی صفوں میں اختلاف پیدا ہو گیا' آراء مختلف ہوئیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مسلمان مدینہ میں پناہ لیتے ہوئے لڑیں۔ جب دشمن حملہ کرے تو تنگ گلیوں کے اندر اسے آلیا جائے لیکن اس کے مقابلے میں ایک پر جوش گروہ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ سے باہر نکل کر میدان میں معرکہ آرائی کی جائے۔ ان اختلافی آراء ہی کی وجہ سے لشکر اسلام میں تفرقہ ہو گیا اور عبداللہ ابن ابی بن السلول کو موقع مل گیا کہ وہ ایک تہائی لشکر کو لے کر واپس ہو جائے۔ یہ اس وقت ہوا جب دشمن دروازے پر کھڑا تھا۔ یہ ایک بڑا حادثہ تھا' اور اسلامی صفوں میں بظاہر بڑی دراڑ تھی۔ پھر اس شوریٰ کے نتیجے میں جو فوجی منصوبہ تیار ہوا' وہ عملاً ظاہر ہو گیا کہ وہ کوئی محفوظ جنگی سکیم نہ تھی۔ خود جنگی نقطہ نظر سے۔ اس لئے کہ مدینہ کی دفاعی تاریخ سے یہ منصوبہ مختلف تھا جیسا کہ عبداللہ ابن ابی ابن السلول نے اس مجلس میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یہ تاریخی حقیقت بتائی تھی کہ وہ جب بھی مدینہ کے اندر لڑے ہیں کامیاب رہے ہیں اور غزوۂ احزاب میں خود مسلمانوں نے بھی جنگ احد کی اسکیم کی تصحیح کرتے ہوئے مدینہ کے اندر لڑنے کا فیصلہ کیا اور وہ کامیاب بھی رہے۔ انہوں نے خندق کھودی۔ دشمن کے مقابلے میں باہر نہ نکلے۔ اس لئے کہ جنگ احد سے انہوں نے جو تجربہ حاصل کیا تھا اس کا یہی تقاضا تھا۔

خود رسول خدا کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے کے نتائج خطرناک ہوں گے۔ آپ کے پاس رویائے صادقہ کے ذریعہ بھی کچھ اشارات آچکے تھے۔ آپ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آپ کے خواب بالکل سچے ہوتے ہیں۔ آپ نے اس کی یہ تاویل پہلے سے کر دی تھی کہ آپ کے خاندان میں سے کوئی ایک شہید ہونے والا ہے اور آپ کے ساتھی بھی شہادت پانے والے ہیں۔ نیز آپ کے خوابوں کی تعبیر کرتے ہوئے مدینہ کو محفوظ ڈھال قرار دیا تھا۔ ان حالات میں آپ کو یہ حق حاصل تھا کہ آپ مجلس شوریٰ کے فیصلے کو ویٹو کر دیتے لیکن آپ نے بادل ناخواستہ اس فیصلے کو نافذ (Execute) کیا۔ حالانکہ اس کے پیچھے جو مشکلات جو قربانیاں اور جو نقصانات پوشیدہ تھے' انہیں آپ کی پیغمبرانہ بصیرت دیکھ رہی تھی۔ اس لئے کہ اصول شوریٰ کی بنیاد رکھی جا رہی تھی' جماعت کو تعلیم دی جا رہی تھی' اور یہ امور ان وقتی خساروں سے زیادہ اہم تھے۔

حق تو یہ تھا کہ کم از کم معرکہ احد کے بعد اصول شوریٰ کو ترک کر دیا جاتا۔ کیونکہ اس شوریٰ کی وجہ سے اختلافات ہوئے' اسلامی صفوں میں انتشار پیدا ہوا۔ اور یہ انتشار مشکل حالات میں ہوا۔ اور معرکے کے بعد خوفناک نتائج سامنے آگئے۔ لیکن اسلام نے ایک امت کو برپا کرنا تھا' اس کی تربیت کرنی تھی' اسے پوری انسانیت کی قیادت کے لئے تیار کرنا تھا' اور اللہ تعالیٰ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کسی قوم کی بہترین تربیت اور اس کو ایک ہدایت یافتہ قیادت بنانے کے لئے صرف اصول شوریٰ پر تیار کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہ اسے شوریٰ کے نتائج برداشت کرنے کے لئے بھی تیار کرنا تھا۔ اس سے غلطیاں سرزد کرائی تھیں' چاہے وہ جس قدر عظیم ہوں تاکہ آئندہ وہ اپنے تجربات کی روشنی میں آگے بڑھے' چاہے یہ نتائج کتنے ہی تلخ ہوں' وہ اپنی تصحیح کر سکے۔ اور اپنی آراء کے نتائج' اچھے یا برے بھگت سکے۔ اس لئے کہ جب تک اس سے غلطی سرزد نہ ہوگی' وہ درستی کر ہی نہیں سکتی۔ اگر کسی نقصان کے نتیجے میں ایک ایسی امت وجود میں آتی ہے' جو تجربہ کار' فہیم اور نتائج کو برداشت کرنے والی ہو تو ان نقصانات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ اور اگر کسی قوم کے نقصانات غلطیوں اور لغزشوں کو محدود کر دیا جائے لیکن اسے تجربات سے بھی محروم کر دیا جائے تو یہ امت اسی طرح ناتجربہ کار رہے گی جس طرح بچہ ناتجربہ کار رہتا ہے۔ وہ ایک ایک قدم پر نگران کے تحت ہوتا ہے۔ اس حالت میں بچے کی طرح اس قوم کو مادی نقصانات سے بچایا جا سکتا ہے لیکن اور مادی مفادات بھی اسے دستیاب نہیں ہو سکتے ہیں' نفسیاتی لحاظ سے اس قوم کو خسارہ ہوتا ہے' اس کے وجود کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اس کی تربیت ناقص ہوتی ہے اور عملی زندگی کا اسے کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ اور اس کی مثال اس بچے کی سی ہوتی ہے جسے کوئی چیز ہاتھ میں نہیں دی جاتی۔

اسلام کی پالیسی یہ تھی کہ وہ ایک ایسی قوم تیار کرے جو ایک تجربہ کار قوم ہو۔ اور اس کا منصوبہ یہ تھا کہ اسے بشریت کی ہدایت یافتہ

قیادت کے لئے تیار کیا جائے۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ یہ امت ایک بالغ امت ہو اور اس کی عملی زندگی میں اسے گرنے پڑنے سے بچانے کے لئے کوئی مدد گار نہ دیا جائے تاکہ وہ تجربہ کار ہو۔ اور یہ تجربہ اسے رسول ﷺ اللہ کی زندگی میں حاصل ہو۔ اور آپ کی نگرانی میں ہو۔ اگر ایک بالغ النظر قیادت کی وجہ سے یہ مناسب ہوتا کہ اب شوریٰ کی ضرورت نہیں ہے' اور امت کی تربیت ضروری نہ ہوتی اور خطرناک واقعات میں اس کے ساتھ مشورے اور اس کی آراء پر چلنے کی ضرورت نہ ہوتی مثلاً معرکہ احد جیسے مراحل میں' کیونکہ یہ ایک فیصلہ کن مرحلہ تھا' اس وقت امت مسلمہ ایک نوخیز امت تھی' ہر طرف سے خطرات میں گھری ہوئی تھی' دشمن چار سو گھات میں تھے۔ اس لئے ایسے حالات میں اگر مناسب ہوتا کہ بالغ نظر قیادت سب فیصلے خود کرتی اور اسے حق بھی تھا اور ایسے حالات میں شوریٰ کی ضرورت نہ ہوتی کیونکہ حالات خطرناک تھے' اور پھر اس وقت حضرت محمد ﷺ بھی موجود تھے اور وحی بھی آرہی تھی تو ایسے حالات میں امت کو حق شوریٰ سے محروم کیا جاسکتا تھا۔ اور خصوصاً ان حالات میں جبکہ احد میں تمام تر واقعات تلخ واقعات شوریٰ ہی کی وجہ سے ظاہر ہوئے' حالانکہ اس وقت یہ امت نہایت ہی خطرناک اور ہنگامی حالات سے گزر رہی تھی لیکن حضور کے وجود مبارک کے باوجود' وحی الٰہی کے آنے اور آتے رہنے کے باوجود' اور اس قسم کے تلخ نتائج شوریٰ ظہور پذیر ہونے کے باوجود اور خطرناک اور ہنگامی حالات موجود ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حق شوریٰ کو ختم نہ فرمایا۔ چاہے جس قدر نقصان ہو جائے' چاہے اسلامی افواج میں جس قدر اختلاف و افتراق پیدا ہو جائے' چاہے اس کے جس قدر تلخ تجربات ظہور پذیر کیوں نہ ہوں' چاہے مدینہ کے اردگرد کے حالات اس نوخیز امت کے لئے بہت خطرناک اور ہنگامی کیوں نہ ہوں۔ اس لئے کہ یہ تمام امور ایک بالغ اور تجربہ کار امت کے بروئے کار لانے کے مقصد عظیم کے مقابلے میں ضروری واقعات ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ عملاً امت تجربہ کار ہو' اچھی یا غلط رائے کے نتائج ہضم کرنے کے اہل ہو۔ کسی رائے اور عمل کے نتائج کا ادراک کر سکتی ہو۔

یہی وجہ ہے اور یہی وجوہات ہیں کہ ایسے حالات میں یہ آیت نازل ہوئی فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ........................ "ان کے قصور معاف کر دو' ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو' ان کو شریک مشورہ رکھو۔"

فیصلہ یہ کیا گیا کہ خطرناک ترین حالات میں بھی اس اصول' اصول مشورہ کا بحال رکھنا ضروری ہے۔ اور احد جیسے حالات میں اور ان کے بعد جیسے حالات میں بھی اس پر عمل ضروری ہو گا۔ اور مقصود یہ تھا کہ آئندہ کے لئے کوئی یہ بہانہ نہ بنائے کہ چونکہ مشورہ کے بعد بعض برے نتائج ظاہر ہو سکتے ہیں اس لئے ہم اس اصول کو ساقط کرتے ہیں۔ مثلاً احد کے حالات اس کی بہترین مثال ہیں۔ کہ دشمن دروازے پر دستک دے رہا تھا لیکن مشورہ بھی جاری تھا۔ اس لئے کہ ایک بالغ النظر امت تب ہی پیدا ہو سکتی ہے جب اصول مشورہ لازمی ہو' اور پوری قوم کی بالغ النظری وہ قیمتی مقصد ہے جس کے لئے چھوٹے بڑے خسارے برداشت کئے جاسکتے ہیں۔

لیکن اسلامی نظام کی سیاسی تصویر اور تشکیل اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک ہم اس آیت کے اگلے حصے پر غور نہ کریں۔ یہ بات عیاں ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ مجلس شوریٰ کے نتیجے میں ہمیشہ قابل ترجیح اور دانشمندانہ فیصلہ ہو جائے۔ آخر کار فیصلہ یہی ہو گا کہ کسی ایک بات پر توکل علی اللہ کر کے عمل شروع کر دیا جائے۔ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ........................

"اور جب کوئی آخری فیصلہ ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو' اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اس کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔"

شوریٰ کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف آراء سامنے آجائیں اور مجلس میں جو آراء پیش ہوں ان سے ایک کو قبول کر لیا جائے۔ جب کوئی فیصلہ ہو جائے تو اس وقت شوریٰ کا کام ختم ہو جاتا ہے اور اب فیصلے کے نفاذ (Execution) کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس تنفیذی مرحلے کے لئے بڑے پختہ عزم اور فیصلہ کن اقدام کی ضرورت ہے۔ اس مرحلے پر پھر اللہ پر بھروسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور معاملہ اب اللہ کے ہاں چلا جاتا ہے۔ اللہ کی تقدیر کے سپرد ہو جاتا ہے۔ اب یہ اللہ کی مشیت کا کام ہوتا ہے کہ وہ کیا فیصلہ اور نتائج ظاہر

کرتی ہے۔

جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ربانی انداز میں شوریٰ کا سبق پڑھایا۔ امت کو دکھایا کہ اظہار رائے کا انداز کیا ہوتا ہے اور فیصلے کے بعد اس کے نتائج کو کس طرح برداشت کیا جاتا ہے خصوصاً خطرناک حالات میں۔ اسی طرح حضورؐ نے امت کو فیصلے' کسی شورائی فیصلے کی تنفیذ کے سلسلے میں بھی سبق دیا۔ اور توکل علی اللہ کا انداز بھی سکھایا۔ اور اپنے آپ کو تن بتقدیر اللہ کے حوالے کرنے کا طریقہ بھی سکھایا۔ حالانکہ واقعات کے رونما ہونے کا آپ کو اچھی طرح اندازہ تھا۔ واقعات کا رخ آپ کے علم میں تھا لیکن آپ نے مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے کے فیصلے کی تنفیذ فرمادی۔ آپ گھر میں داخل ہوئے اور زرہ اور خود زیب تن فرمائی۔ اور آپ کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ کہاں جارہے ہیں؟ آپ اور آپ کے صحابہ کو کن مصائب اور مشکلات سے دوچار ہونا ہے۔ یہاں تک کہ جب باہر لڑنے والے پرجوش لوگوں نے دوبارہ مشورہ دیا اور موقعہ فراہم کر دیا کہ فیصلے کو بدل دیا جائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کو پڑھ کر انہوں نے محسوس کرلیا کہ ان کے جوش و خروش نے حضورؐ کو باہر لڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔ حالانکہ آپ ایسا نہ چاہتے تھے اور انہوں نے دوبارہ اختیار آپ کو دے دیا کہ آپ مدینہ کے اندر لڑیں یا باہر لڑیں تو آپ نے اس پر دوبارہ غور کرنے کے موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ آپ انہیں ایک سبق دینا چاہتے تھے۔ آپ شوریٰ (Parliament) کے فیصلوں کی مثال قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ چاہتے تھے کہ جب فیصلہ پختہ اور آخری ہو جائے تو پھر دوبارہ غور کے بجائے اس کا نفاذ چاہئے۔ اللہ پر توکل کرنا چاہئے جو ہو' سو ہو۔ آپ یہ بھی دکھانا چاہتے تھے کہ شوریٰ کا ایک وقت ہوتا ہے۔ فیصلے کے بعد تردد اور ڈانواں ڈول نہیں ہونا چاہئے۔ دوبارہ غور کرکے از سرنو فیصلہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ اس طرح کوئی بات آخری نہ رہے گی' فیصلے بار بار بدلیں گے اور دوبارہ غور کی اگر مثال قائم ہو جائے تو یہ سلسلہ ختم ہی نہ ہوگا۔ بس شوریٰ (Parliament) کا فیصلہ ہو اور پھر نفاذ ہو اور توکل علی اللہ ہو اس لئے کہ اسے اللہ پسند کرتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ............ "بے شک اللہ تعالیٰ اس پر بھروسہ کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔"

اور وہ صفت جسے اللہ پسند کرتے ہیں اور اس صفت سے متصف لوگوں کو محبوب رکھتے ہیں تو اہل ایمان کا فرض ہے کہ وہ صفت ان کے اندر بدرجہ کمال پائی جائے اور وہ اس کے لئے بے حد حریص ہوں بلکہ وہ مومنین کی صفت ممتازہ ہونی چاہئے۔ توکل علی اللہ اور سپردم بتومایہ خویش را' اسلامی تصور حیات اور اسلامی زندگی کا خط توازن ہے۔ اب معاملہ اس کائنات کی عظیم حقیقت کے سپرد ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقت کہ آخری فیصلہ اللہ کے ہاں ہو گا اب وہ ہو گا جو وہ چاہے۔

احد کے عظیم تجربات میں سے یہ ایک عظیم تجربہ اور ایک عظیم سبق تھا۔ یہ سبق امت مسلمہ کے لئے اس کے ہر دور اور ہر زمانے میں ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ صرف ایک دور ہی کی بات نہیں ہے بلکہ ہر دور کے لئے ہے۔

حقیقت توکل کو مزید ذہن نشین کرانے کے لئے اور اس کے اصول کو ثابت اور مستحکم کرنے کے لئے اگلی آیت میں ذرا تفصیل سے واضح کرکے اس حقیقت کو ظاہر کیا جاتا ہے کہ حقیقی قوت فاعلہ ذات باری ہے۔ فتح و کامرانی اور شکست اور ذلت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے اگر نصرت چاہتے ہو تو اسی سے چاہو اور اگر شکست سے بچنا چاہتے ہو تو اسی کے آگے گڑگڑاؤ۔ اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ' اسی پر بھروسہ کرو' لیکن پوری تیاری کے بعد' نتائج سے بے فکر ہو جاؤ اور نتائج و عواقب اللہ پر چھوڑ دو۔

إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ

"اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں' اور وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو؟ پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔"

اسلامی تصور حیات کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ کی فاعلیت مطلقہ اور اس کی تقدیر کی کارفرمائی اور اس تقدیر کی رونمائی بذریعہ افعال انسانی اور بذریعہ انسانی سرگرمی کے ظاہر ہونے کا قائل ہے۔ وہ کسی ایسے تصور تقدیر الٰہی کا قائل نہیں ہے جو انسانی افعال اور سرگرمیوں کے علاوہ اور جدا ہو۔ اللہ کی سنت یوں چلتی ہے کہ نتائج اسباب پر مرتب ہوتے ہیں لیکن اسباب بذات خود نتائج کی تخلیق نہیں کرتے۔ حقیقی فاعل اور موثر بہرحال اللہ ہے۔ وہ اپنی قدرت اور مشیت کے ذریعہ اسباب پر نتائج مرتب کرتا ہے۔ اس لئے انسان سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے فرائض پورے کرے۔ اس طرح نتائج اگرچہ اسباب کے بعد آتے ہیں لیکن وہ تابع تقدیر الٰہی ہوتے ہیں۔ جب اسباب نتائج پیدا کرتے ہیں تو وہ اللہ کے اذن سے ایسا کرتے ہیں۔ اللہ اجازت دیتا ہے۔ تب یوں ہوتا ہے یوں ایک مسلمان کے عمل اور اس کے تصور حیات کے درمیان ایک قسم کا توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ پوری طرح عمل پیرا ہوتا ہے۔ اپنی پوری طاقت صرف کرتا ہے اپنے عمل اور جہد مسلسل کے نتائج اللہ پر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ یہ تصور نہیں کرتا کہ اس کی جدوجہد کے نتائج خواہ مخواہ نکلیں گے۔ اس لئے کہ ایک مسلمان اللہ تعالیٰ پر کوئی امر لازم نہیں کر سکتا۔

یہاں آکر فتح و شکست کے معاملہ میں مسلمان نتائج اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں اگرچہ فتح و شکست کا ظہور بہرحال کسی معرکے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ وہ معرکے میں کود پڑنے کے بعد نتیجہ اللہ کی مشیت اور قدرت پر چھوڑ دیتے ہیں اور ان کا تصور حیات اب معرکے میں کودنے کے بعد یہ ہوتا ہے کہ اگر اللہ انہیں فتح دے گا تو ان پر کوئی دوسری قوم غالب اور فاتح نہیں ہو سکتی۔ اور اگر اللہ کی مشیت یہ ہو کہ مسلمان ذلیل ہوں تو پھر کوئی دوسری قوت ان کی نصرت نہیں کر سکتی۔ اور یہ اس کائنات کی ایک اٹل حقیقت بلکہ حقیقت کبریٰ ہے۔ کوئی قوت اللہ کی قوت کے سوا یہاں نہیں ہے۔ کوئی تقدیر اللہ کی تقدیر کے سوا نہیں ہے۔ کوئی مشیت اللہ کی مشیت کے سوا یہاں کارفرما نہیں ہے۔ تمام چیزیں حکم ذات باری سے وجود میں آتی ہیں' تمام واقعات کے اسباب وہ فراہم کرتا ہے لیکن یاد رکھو کہ یہ حقیقت کبریٰ اس بات سے اہل اسلام کو بری الذمہ نہیں کر دیتی کہ وہ اسلامی نظام زندگی پر عمل پیرا نہ ہوں۔ وہ ہدایات پر عمل کریں' وہ فرائض سرانجام دیں' وہ جدوجہد کریں اور اس کے بعد توکل علی اللہ کریں۔ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ "پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔"

اس کی وجہ سے ایک مومن کا تصور اس بات سے پاک ہو جاتا ہے کہ کوئی چیز اللہ کے سوا کسی اور سے بھی طلب ہو سکتی ہے۔ ایک مومن کی سوچ براہ راست اس ذات کے ساتھ پیوست ہو جاتی ہے جو اس کائنات میں حقیقتاً متصرف ہے۔ اس لئے وہ ان تمام کھوٹے خداؤں اور تمام باطل اسباب سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور ان کی حمایت اور نصرت کی طلب نہیں کرتا۔ اور وہ اچھے نتائج کے لئے صرف اللہ وعدہ پر توکل کرتا ہے۔ اسی سے توقع کرتا ہے کہ وہ معاملات کو اچھے رخ پر ڈالے گا' اور اپنی حکمت سے درست کرے گا۔ اس عقیدے کے بعد پھر تقدیر الٰہی کے نتیجے میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے وہ اسے بڑی فراخدلی سے قبول کرتا ہے۔ فکر و نظر کا یہ' وہ توازن ہے جسے انسانی فکر نے' صرف اسلام کے زیر سایہ پایا۔

اس کے بعد بات نبوت اور خصائص نبوت کی طرف چلی جاتی ہے تاکہ اس موضوع کے بعد امانت و دیانت کے بارے میں کچھ ہدایات دی جائیں' مثلاً یہ کہ مال غنیمت میں کسی قسم کی بددیانتی اور چوری سخت معیوب چیز ہے۔ اور یہ کہ جو شخص بھی اجتماعی امانتوں میں بددیانتی کرے گا وہ اس کا حساب دے گا۔ اور ہر شخص کا حق اسے پورا پورا دیا جائے گا۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۱۶۱)

"کسی نبی کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ خیانت کر جائے.... اور جو کوئی خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا' پھر ہر متنفس کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہو گا۔"

احد کی پہاڑی اور گھاٹی سے تیراندازوں نے حکم عدولی کرتے ہوئے اپنی جگہ اس لئے بھی چھوڑ دی تھی کہ انہیں یہ خوف دامن گیر ہو گیا تھا کہ شاید بعد میں رسول خدا انہیں کوئی حصہ نہ دیں۔ اس طرح جنگ بدر کے اموال غنیمت کے بارے میں بعض منافقین نے یہ پروپیگنڈا کیا تھا کہ غنیمت کی کچھ چیزیں غائب ہو گئی ہیں۔ اور اس سلسلے میں انہیں یہ حیا بھی نہ آئی کہ وہ حضور کا نام لینے سے تو احتراز کریں۔

اس لئے اس آیت میں یہ حکم اور قاطع فیصلہ آیا کہ حضرت محمد کیا کوئی نبی بھی ہرگز یہ نہیں کر سکتا کہ وہ اموال غنیمت میں سے کوئی چیز ادھر ادھر کر دے۔ یعنی مال غنیمت میں سے کوئی چیز علیحدہ رکھ لیں اور یہ کہ وہ بعض فوجیوں کو زیادہ حصہ دیں یا غرض وہ کسی طرح کی کوئی خیانت کریں۔ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ .............. "نبی کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ مال غنیمت میں کوئی خیانت کرے۔"

یہ اس کی شان کے خلاف ہے۔ وہ اس کے مزاج اور طبیعت نبوت کے خلاف ہے۔ وہ اس کے اخلاق کے خلاف ہے کہ ایسا کرے۔ گویا ذات نبوت سے اس فعل کا وقوع ہی ممکن نہیں ہے۔ یہاں یہ نفی حلت اور حرمت کی نفی نہیں ہے۔ اس لئے کہ نبی کی امانت دار' منصف مزاج اور پاک طبیعت اور مزاج ہی کے یہ بات خلاف ہے کہ اس سے اس قسم کی کوئی بات وقوع پذیر ہو۔ بعض قرأتوں میں لفظ يُغَلَّ ہے۔ یعنی مجہول کا فیصلہ آیا ہے۔ یعنی یہ بات جائز نہیں ہے کہ نبی کے ساتھ خیانت کا برتاؤ کیا جائے۔ اور اس کے متبعین اس سے کوئی چیز چھپائیں۔ اس صورت میں یہاں اس بات کی ممانعت ہو گی کہ حضور ﷺ کے ساتھ اس کے پیرو کار خیانت نہ کریں اور یہ قرأت آیت کے آخری حصے کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔ حسن بصریؒ کی تلاوت ایسی ہی تھی۔

اس کے بعد ان لوگوں کو سخت تنبیہ کی جاتی ہے کہ جس نے خیانت کی مال غنیمت میں یا اور حکومتی اموال میں تو ان کا انجام یہ ہو گا۔

مِنْ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ .............. "اور جو خیانت کرنے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا' پھر ہر متنفس کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہو گا۔"

امام احمد نے 'سفیان' زہری' عروہ' ابو احمد ساعدی کی روایت نقل کی ہے۔ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے قبیلہ ازد کے ایک شخص ابن لتبیہ نامی کو زکوۃ کا تحصیلدار مقرر فرمایا۔ وہ جب واپس آیا تو کہا یہ مال آپ کا ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے۔ اس پر حضور منبر پر کھڑے ہوئے اور یہ تقریر فرمائی: "ان تحصیلداروں کا کیا حال ہے کہ ہم انہیں کام پر لگاتے ہیں اور واپس آکر وہ کہتا ہے کہ یہ تو تمہارا ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے۔ کیوں نہ وہ اپنے باپ یا ماں کے گھر بیٹھا اور انتظار کرتا کہ اسے ہدیہ دیا جاتا ہے یا نہیں۔ خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے جو شخص بھی اس مال سے کوئی چیز لے گا قیامت کے دن وہ اس کے کندھے پر ہو گی۔ اونٹ ہو گا اور وہ آواز دے رہا ہو گا' گائے ہو گی اور وہ آواز دے رہی ہو گی اور بکری ہو گی تو بھی وہ ممیا رہی ہو گی۔ (مسلم بخاری)

اور امام احمد نے اپنی سند کے ذریعہ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا رسول خدا ﷺ ایک دن ہم میں کھڑے ہوئے۔ انہوں نے غلول (غنیمت میں سے چوری) کا ذکر کیا۔ اسے عظیم امر قرار دیا اور اسے بہت ہی بڑا گناہ قرار دیا۔ اور فرمایا کہ قیامت

کے دن مجھے کوئی ایسا شخص نہ ملے جو آئے اور اس کے کندھوں پر اونٹ ہو اور وہ کہے اے رسول خدا ﷺ میری مدد کرو اور میں اسے یہ جواب دوں کہ میں تمہارے لئے اللہ کے ہاں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہیں پوری طرح پیغام پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے ایسے شخص کو بھی نہ ملوں جس کے کندھوں پر گھوڑا ہو' جو ہنہنا رہا ہو اور وہ شخص مجھے کہے رسول' خدا میری امداد کرو اور میں اسے جواب دوں میں تمہارے لئے اللہ کے ہاں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہیں پوری طرح تبلیغ کر دی تھی اور میں تم میں سے ایسے شخص کو بھی نہ ملوں جس کے کندھوں پر کوئی بے زبان جانور ہو اور وہ کہے رسول خدا میری امداد کرو اور میں اسے بھی یہ جواب دوں کہ میں اللہ کے ہاں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہیں پوری طرح تبلیغ کر دی تھی۔ (بخاری مسلم روایت ابوحیان)

امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عدی ابن عمیرہ الکندی سے روایت کی ہے۔ رسول' خدا نے فرمایا :"اے لوگو! تم میں سے کوئی شخص ہمارے لئے عامل مقرر ہوا اور اس نے اس سے ایک سوئی چرائی یا اس سے زیادہ تو وہ چور ہے اور قیامت کے دن وہ اسے لے کر آئے گا۔" اس پر انصار میں سے کالے رنگ کا ایک شخص اٹھا (مجاہد کہتے ہیں کہ وہ سعد ابن عبادہ تھے گویا میں اسے اب بھی دیکھ رہا ہوں) اور کہا اے رسول' خدا میں اپنے منصب سے مستعفی ہوتا ہوں آپ اپنا کام سنبھالئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا ہو گیا ہے؟ تو اس نے حضور ﷺ سے کہا میں نے آپ کو یہ اور یہ کہتے ہوئے سنا ہے اور میں یہ بات اب بھی کہتا ہوں :"جسے ہم نے کسی ڈیوٹی پر لگایا تو اس کو چاہئے کہ وہ کم ہو یا زیادہ لے کر آئے۔ اسے جو کچھ دیا جائے وہ لے لے۔ اور جو نہ دیا جائے' رک جائے۔ (مسلم ابوداؤد)

قرآن کریم کی اس آیت اور ان احادیث نے جماعت مسلمہ کی تربیت میں ایک عظیم کردار ادا کیا۔ یہاں تک کہ اس کے حیرت انگیز نتائج بر آمد ہوئے۔ ایک ایسا گروہ تیار ہوا' جو نہایت ہی امانتدار' دیانتدار اور اموال حکومت کے بارے میں اس قدر محتاط تھا جس کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ اور پوری انسانی تاریخ میں کبھی ایسی جماعت تیار نہیں ہوئی۔ یوں ہوتا کہ ایک عام مسلمان کے ہاتھ میں مال غنیمت میں سے ایک نہایت ہی قیمتی سامان پڑتا اسے کسی نے دیکھا ہی نہ ہوتا اور وہ اسے لاکر امیر کے حوالے کر دیتا۔ اور اس کا نفس اسے' اس کے بارے میں کسی طرح بھی بدراہ نہ کر سکتا۔ محض اس ڈر سے کہ قیامت کے روز اس کا وہ حشر نہ ہو جو قرآن و سنت کی ان نصوص میں مذکور ہے۔ اس ڈر سے کہ قیامت کے دن اس کی ملاقات نبی ﷺ سے ہو اور اس کی یہ حالت ہو جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اور یہ کہ وہ قیامت کے دن شرمندہ نہ ہو۔ جس سے اسے نبی ﷺ نے واضح طور پر خبردار کر دیا ہے۔ غرض مسلمانوں کی زندگی یوں تھی کہ فکر آخرت اور خوف آخرت ان کی زندگی کا عملی جزو ہوا کرتے تھے۔ ان کے احساس کا حصہ ہوا کرتے تھے اور ان کے تقویٰ' خدا خوفی اور غایت درجہ احتیاط کا راز یہی تھا۔ آخرت کا تصور ان کی زندگی میں ایک زندہ تصور تھا' خوابیدہ نہ تھا۔ وہ ایک وعدہ فردا نہ تھا۔ وہ ان کے یقین کا حصہ تھا جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ وہ یہ یقین کرتے تھے کہ ہر کسی کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کوئی ظلم نہ ہو گا۔

ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ جب مسلمان مدائن میں اترے تو انہوں نے مال غنیمت جمع کیا۔ ایک شخص آیا اور اس کے پاس کوئی چیز تھی اور اس نے اسے خزانچی کے حوالے کیا۔ اس کے ساتھیوں نے کہا ہم نے اس قدر قیمتی چیز کبھی نہیں دیکھی۔ ہمارے پاس جو بھی سامان جمع ہوا' وہ اس قدر قیمتی نہیں ہے جس قدر یہ چیز قیمتی ہے۔ تو انہوں نے سوال کیا کہ کیا تم نے اس سے کچھ لیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں نے کچھ نہیں لیا ہے اور خدا کی قسم اگر اللہ نہ ہوتا تو میں یہ تمہیں لاکر نہ دیتا۔ تب مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ یہ شخص ایک غیر معمولی شخص ہے۔ خزانچی کے ساتھیوں نے پوچھا تمہارا تعارف کیا ہے؟ تو اس نے کہا میں اپنا تعارف اس لئے نہیں کراتا کہ تم میری تعریف کرتے پھرو گے اور نہ دوسرے لوگوں کو بتاؤں گا تاکہ وہ میرے اس عمل کی تعریفیں کرتے پھریں' میں صرف اللہ کی تعریف کروں گا اور اس کے ثواب کا امیدوار رہوں گا۔ ان لوگوں نے اس کا پیچھا کیا اور جب وہ اپنے ساتھیوں میں پہنچا تو انہوں نے دیانت کہا

کہ وہ ثابت بن عبد قیس ہے۔ا۔

حضرت عمر کے دور میں جب اموال غنیمت لائے گئے 'جنگ قادسیہ کے بعد کا واقعہ ہے تو ان میں کسریٰ کا وہ تاج بھی تھا جسے وہ ایوان شاہی میں بیٹھ کر پہنتا تھا۔ یہ بہت ہی قیمتی تھا۔ حضرت عمر نے اسے دیکھا اور کہا کہ قابل قدر ہیں وہ فوجی جنہوں نے اسے خزانہ میں جمع کیا اور کہا "جس قوم نے یہ تاج لاکر اپنے امیر کو دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ حد درجے کے امین ہیں۔"

یہ تھی مسلمانوں کی اسلامی تربیت 'یہ اس قدر عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے کہ اس کی داستانیں افسانے معلوم ہوتے ہیں۔

اب اموال غنیمت اور اموال غنیمت کے اندر خیانت کی اس بحث کے بعد قرآن کریم اسی مناسبت سے اخلاقی قدروں کا ذکر کرتا ہے۔

"بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص ہمیشہ اللہ کی رضا پر چلنے والا ہو 'وہ اس شخص کے لئے کیسے کام کرے جو اللہ کے غضب میں گھر گیا ہو اور جس کا آخری ٹھکانا جہنم ہو 'جو بد ترین ٹھکانا ہے۔ اللہ کے نزدیک دونوں قسم کے آدمیوں میں بدرجہا فرق ہے اور اللہ سب کے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔"

یہ وہ دور رس تبدیلی ہے جس کے سائے میں 'تربیت پانے والوں کی نظروں میں اموال غنیمت کی کوئی حیثیت نہیں 'اس دنیا کے بارے میں سوچنا ہی حقیر ہو جاتا ہے اور قرآن منہاج تربیت کے خطوط میں سے ایک خط ہے۔ یہ عجیب نقوش ہیں جن پر یہ منہاج انسانی دلوں کی تربیت کرتا ہے۔ ان کی ترجیحات ہی بدل جاتی ہیں 'ان کے افق ہی بدل جاتے ہیں۔ اس لئے وہ دوسرے میدانوں کو چھوڑ کر زندگی کے اصل ہدف کی طرف آگے بڑھتے ہیں۔

أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوٰهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ............... "بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص ہمیشہ اللہ کی رضا پر چلنے والا ہو 'وہ اس شخص کے لئے کیسے کام کرے جو اللہ کے غضب میں گھر گیا ہو اور جس کا آخری ٹھکانہ جہنم ہو 'جو بد ترین ٹھکانا ہے۔"

یہ ہیں حقیقی اقدار۔ یہ ہے میدان جس میں امید ہونی چاہئے۔ یہ ہے وہ میدان جس میں کام ہونا چاہئے اور یہ ہے وہ فیلڈ جس میں کمائی یا خسارے کی بات ہونی چاہئے۔ اور کس قدر وسیع خلیج ہے اس شخص کے درمیان جو رضامندی باری تعالیٰ کا طلبگار ہو اور اس میں کامیاب بھی ہو اور اس شخص کے درمیان جو راہ غضب پر ہو اور اس میں گھر بھی چکا ہو اور جہنم کا مستحق ہو گیا ہو جو یقیناً بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

یہ بھی ایک مقام ہے اور وہ بھی ایک مقام ہے اور ان دونوں مقامات کے درمیان ایک وسیع خلیج ہے هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ............... "یہ درجے ہیں اللہ کے نزدیک" ہر شخص اپنے مقام تک استحقاق کی بنا پر پہنچتا ہے۔ اس لئے اس معاملے میں نہ کسی پر کوئی ظلم و زیادتی ہے اور نہ بے جا محبت اور طرفداری ہے۔ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ............... "اور اللہ اپنے بندوں کے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔"

اب یہ پیراگراف اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کی طرف۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ کو رسول بنا کر دراصل اللہ تعالیٰ نے مکہ مدینہ اور پوری دنیا کے اہل ایمان پر ایک عظیم احسان کیا ہے۔ اہل ایمان کو چاہئے کہ وہ رسالت کی اس اسکیم پر غور کریں۔

ا۔ طبری ج ۴۔ ص ۱۶

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ

"درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انھی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انھیں سناتا ہے' ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے' حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔"

اس پیراگراف کا اختتام حقیقت نبوت محمدیہ پر کرنا' اور آپ کی ذاتی حیثیت و مقام کو یہاں بیان کرنا اور اسے عظیم احسان جتانا' اور آپ اور آپ کی نبوت کا اس امت کی تعمیر و تشکیل میں اہم کردار جتلانا اور اس امت کی تعلیم و تربیت اور اس کی قائدانہ صلاحیت اور کھلی گمراہی سے نکل کر اس کا علم و حکمت اور تزکیہ اور طہارت کے اعلیٰ مقام تک پہنچ جانے کا تذکرہ ان سب امور کے اندر متنوع اور عمیق قرآنی احساسات ہیں جن پر غور ضروری ہے۔

یہ آیات ابتدا "مال غنیمت پر بطور تبصرہ آئی ہیں کہ مال غنیمت کا لالچ' اس سے کسی چیز کے چوری ہونے' اور اس معمولی کام کے اندر بہت زیادہ مشغول ہونے کی وجہ سے تم نے احد کی جیتی ہوئی جنگ ہاری۔ اور تمہاری فتح شکست میں بدل گئی۔ اور اس کی وجہ سے مسلمان ملت کے ساتھ وہ کچھ ہوا جو تم نے دیکھ لیا۔ اس ریفرنس میں رسالت کے عظیم منصب کے تذکرے اور اس عظیم احسان کے تذکرے سے جو احساس دلانا مقصود ہے وہ بہت ہی گہرا ہے۔ اور اس سے قرآن اپنے مخصوص انداز کے ساتھ امت کی تربیت کرنا چاہتا ہے۔ اس عظیم منصب کے ذکر اور یہ سمجھانے سے کہ یہ کس قدر عظیم احسان ہے تمہارے لئے یہ تاثر اور احساس دینا مطلوب ہے کہ تمام زمین کے اموال غنیمت' تمام کرۂ ارض سے چھینا ہوا مال اور تمام دنیا کے سامان و اسباب' اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں اور ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور یہ قابل ذکر ہی نہیں ہیں۔ اس عظیم منصب و نعمت کے ہوتے ہوئے ان حقیر چیزوں کے تذکرے سے بھی ایک مسلمان کو حیا آتی ہے بلکہ اس کے بارے میں سوچنا بھی شرمندگی ہے۔ چہ جائیکہ مسلمانوں میں سے کوئی اس کے اندر دلچسپی لے۔

پھر یہ فکر انگیز اشارہ اس وقت دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو شکست ہو چکی تھی' وہ رنج و الم میں مبتلا تھے اور اس معرکے میں مسلمانوں کی قیمتی جانیں ضائع ہو چکی تھیں۔ ایسے حالات میں نبوت کے عظیم منصب کے عظیم کام کو سامنے لا کر یہ فکر دلانا مقصود ہے کہ اس نبوت کے پیش نظر جو عظیم انقلاب ہے' اس کے مقابلے میں یہ رنج و الم' یہ نقصانات اور یہ قربانیاں کوئی بہت زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔ اس نبوت کے ذریعہ تم پر جو احسانات ہوئے ذرا ان پر بھی تو غور کرو۔ یہ وہ عظیم احسان ہے جس کو دنیا کے تمام دوسرے امور پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔"

پھر بتایا جاتا ہے کہ اس احسان عظیم کے نتیجے میں' تمہارے اندر جو تبدیلی آئی اس پر بھی ذرا غور کرو۔ تمہارے اندر اللہ کی آیات پڑھی جا رہی ہیں' تمہاری زندگیوں کو سنوارا جا رہا ہے' تمہیں کتاب سکھائی جا رہی ہے اور پھر دانائی اور حکمت اور ٹیکنالوجی سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ اس سے قبل تم صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ

"اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ایک حال سے بذریعہ انقلاب دوسری حالت میں منتقل کر دیا گیا تھا' ایک صورت حال

تبدیل ہو گئی تھی اور ایک بالکل نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ایک دور گزر گیا تھا اور ایک نیا دور آ گیا تھا۔ اس لئے امت کو یہ شعور دیا جا رہا ہے کہ یہ ایک عظیم انقلاب ہے جو اس امت کے اندر محض اللہ کی قدرت' مشیت اور فضل و احسان کے ذریعہ برپا کیا جا رہا ہے۔ اور پھر اس امت کے ذریعہ پوری انسانی زندگی کے اندر اور اس عظیم انقلاب کے برپا کرنے کا آغاز بعثت رسالت محمدیہ کے ساتھ ہوا ہے جس نے اس امت کو برپا کیا اور تربیت دی۔ اس لئے اس عظیم انقلابی قوت کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اموال غنیمت جیسی حقیر چیز کو پیش نظر رکھ کر کوئی فیصلہ کرے۔ یا وہ معمولی قربانیوں اور رنج والم اور شکست و ریخت پر کوئی جزع و فزع کرے۔ اس لئے کہ اس عظیم انقلاب کی راہ میں یہ چیزیں کچھ بھی نہیں ہیں۔

جنگ بدر کے واقعات کے بیان کے دوران رسالت محمدیہ کی اہمیت اور عظمت کے بیان میں یہ چند اشارات تھے جسے ہم اختصار کے ساتھ یہاں بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد مناسب ہے کہ ہم اس آیت قرآنی پر تفصیل سے روشنی ڈالیں جو حکمت و دانائی کے اشارات سے بھری ہوئی ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ ....

"درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک پیغمبر اٹھایا۔"..... یہ اللہ کا عظیم احسان تھا کہ ان میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا۔ پھر یہ دوسرا احسان تھا کہ رسول کریم بھی عربی تھے۔ خود ان میں سے تھے' اللہ کی جانب سے کسی قوم میں رسول مبعوث کرنا در اصل اس قوم پر اللہ کا محض فضل و کرم ہوتا ہے۔ یہ خالص احسان اس لئے ہوتا ہے کہ بعثت رسول کے لئے خود اس قوم میں کوئی استحقاق کی بات نہیں ہوتی۔ اگر ان کا کوئی استحقاق ہوتا تو اس کے لئے کوئی قابل ذکر لوگ ہوتے' لوگوں کے اندر کوئی گروہ ایسا نہیں ہے جس پر یہ عنایت ہو رہی ہو۔ یہ تو محض اللہ کا فضل و کرم ہے کہ ان میں رسول آگیا' جو ان پر آیات الٰہی کی تلاوت کرتا ہے' اللہ کے کلمات سناتا ہے' اور اس کرم عظیم کے لئے ان کے ہاں کوئی سبب یا استحقاق نہ تھا' یہ صرف اور صرف احسان الٰہی ہے۔

اور یہ احسان پھر اس پہلو سے اور زیادہ اور گہرا ہو جاتا ہے کہ یہ رسول خود ان میں سے ان کا ہی ایک بھائی ہے۔ "خود ان میں سے ایک رسول" کے الفاظ کے اندر نہایت ہی گہرے اشارے ہیں۔ مومنین اور رسول کے درمیان رابطہ ایک نفس کا ایک نفس کے ساتھ رابطہ ہے۔ یہ رابطہ نہیں ہے کہ ایک فرد ایک قوم کے ساتھ مربوط ہو۔ صرف یہ بات نہ تھی کہ وہ ان میں سے ایک ہے' بلکہ اس سے زیادہ گہرا اور اس سے زیادہ ارفع مفہوم مطلوب ہے۔ ایمان کی وجہ سے وہ بلند ہو کر رسول سے مربوط ہو جاتے ہیں اور صرف ایمان کی وجہ سے وہ شرف و سربلندی کے اس اونچے مقام تک پہنچ جاتے ہیں اور بے شک اہل ایمان پر یہ عظیم احسان ہے۔ اس طرح یہ احسان دو چند ہو جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ رسول بھیجا گیا اور دوسرا یہ کہ یہ رسول تمہارے اندر موجود ہے اور وہ اس رسول کے پاس موجود ہیں اور دونوں کے درمیان یہ محبوب رابطہ قائم ہے۔

اس کے بعد اس احسان عظیم کے عملی آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں' ان کی زندگی میں اور پھر ان کی تاریخ میں يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ............ "جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے' ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے' اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔" اب اس احسان کا ظہور بڑے وسیع اور عملی میدان میں ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ ان کی عزت افزائی کی شکل میں یہ احسان عظیم ظاہر ہوتا ہے کہ خود اس نے اپنی جانب سے' اپنے پروگرام کے مطابق رسول بھیجا جو ان سے اللہ کے کلام کے ذریعہ مخاطب ہے اور انہیں اللہ کی آیات سناتا ہے۔ اگر انسان اللہ کے صرف

اسی ایک احسان پر اچھی طرح غور کرے تو وہ اللہ کے خوف سے مدہوش ہو جائے' کانپ اٹھے اور اس کے لئے یہ ممکن بھی نہ رہے کہ وہ اللہ کے سامنے کھڑا ہو سکے اور فوراً سجدۂ شکر بجالائے۔

اگر وہ یہ سوچے کہ اس پر اللہ کرم کر رہا ہے' اس کے ساتھ بات کر رہا ہے' اس کو اپنی ذات و صفات کے بارے میں متعارف کرا رہا ہے تاکہ انسان اس کی الوہیت کی ماہیت اور اس کے خصائص کو جان لے۔ اس کے بعد وہ ذات باری اس سے مخاطب ہو رہا ہے اور مخاطب بھی اس انسان اور اللہ کے اس حقیر بندے سے اور خطاب بھی اس بندے کی زندگی کے بارے میں ہو' اس کے دلی سوالات کے جواب دے رہی ہو' اس کی حرکات و سکنات پر بحث ہو رہی ہو' اور بات اس پروگرام کی ہو رہی ہو جس میں اس حقیر انسان کی زندگی جاوید کا پروگرام مضمر ہے اور اس کی ہدایت کی بات ہو رہی ہو' اور یہ ہدایت بھی اس دستور و منشور کی طرف دی جا رہی ہو جس میں اس کے دل کی پاکیزگی ہے اور اس کے احوال کی بہتری ہے۔ اور اس کے بعد پھر اسے خوشخبری بھی دی جا رہی ہے کہ اگر وہ اس پروگرام پر چلے گا تو وسیع تر جنت میں جگہ پائے گا' کیا اس سے اور کوئی عظیم احسان ہو سکتا ہے' بلکہ یہ خالص فیضان جود و کرم ہے' اور خالص فضل و عطا ہے۔

اللہ تو غنی بادشاہ ہے' اور انسان کمزور اور محتاج ہے لیکن یہ غنی بادشاہ اس کمزور اور محتاج سے ہمکلام ہے۔ وہ اس پر عنایات کی بارش کر رہا ہے' اسے دعوت دے رہا ہے' یہ غنی بادشاہ بار بار ان فقراء کو پکار رہا ہے اور اپنے جود و کرم کی مسلسل دعوت دے رہا ہے۔ یہ عظیم کرم ہے' عظیم احسان ہے' عظیم فضل اور عطا ہے جو بے لوث ہے اور اس کے بالمقابل اس کا پورا شکر ادا نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس کی احسان کی وفاداری ممکن ہے۔

**وَيُزَكِّيهِمْ** ......... "ان کی زندگیاں سنوارتا ہے" پاک کرتا ہے' بلند کرتا ہے' منقح کرتا ہے اور ان کے دلوں' ان کے تصورات' اور ان کے شعور کو پاک کرتا ہے۔ وہ ان کے گھرانوں کو پاک کرتا ہے۔ ان کی عزتوں کو پاک کرتا ہے' اور ان کے باہم روابط کو پاک کرتا ہے۔ ان کی انفرادی زندگی کو پاک کرتا ہے' ان کے معاشرے کو پاک کرتا ہے اور ان کے اداروں کو پاک کرتا ہے۔ ان کو شرک بت پرستی کی گندگیوں سے پاک کرتا ہے۔ ان کو خرافات اور وہم پرستی سے پاک کرتا ہے اور ان کی وجہ سے زندگی کے اندر جو رسم و رواج پاتے ہیں' جو غلط بندگیاں ہوتی ہیں ان سے پاک کرتا ہے۔ اور شرف انسانیت سے فروتر گھٹیا درجے کی جو حرکات ہوتی ہیں ان سے انسان کو پاک کرتا ہے۔ ان کو جاہلیت کی زندگی کی تمام گندگیوں سے پاک کرتا ہے۔ نیز ان چیزوں سے پاک کرتا ہے جن سے انسانی شعور اور قومی شعائر ملوث ہو جاتے ہیں اور جن سے زندگی کے معانی' اقدار اور روایات گندی ہوتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر جاہلیت اپنے ماحول میں کچھ ناپاکیاں پھیلا دیتی ہے۔ اسی طرح عرب جاہلیت نے بھی بعض گندگیاں پھیلا دی تھیں اور ان سب سے اسلام انہیں پاک کر رہا تھا۔

اور جاہلیت کی گندگیوں میں سے بعض کا تذکرہ حضرت جعفر ابن ابی طالب نے کیا ہے' جب وہ نجاشی کے سامنے اسلام کا تعارف کرا رہے تھے۔ اور یہ تعارف وہ قریش کے نمائندوں کے سامنے کر رہے تھے۔ جو ان مہاجرین کے خلاف مہم پر آئے ہوئے تھے۔ مطالبہ یہ تھا کہ وہ ان مہاجرین کو ان کے حوالے کر دے۔ حضرت جعفرؓ فرماتے ہیں :

"شاہ محترم! ہم جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم تھے۔ بتوں کی پوجا کرتے تھے' مردار کھاتے تھے۔ فحاشی کی تمام حرکات کرتے تھے۔ صلہ رحمی کے تمام تعلقات کو کاٹتے تھے۔ پردیسی سے برا سلوک کرتے تھے۔ ہم میں سے طاقتور ضعیفوں کو کھائے جا رہا تھا۔ ہماری یہی حالت تھی کہ اللہ نے ہم ہی میں سے ہمارے پاس ایک رسول بھیجا۔ ہم اس کے شجرۂ نسب کو خوب جانتے ہیں' اس کی سچائی' اس کی امانت و دیانت سے بھی خوب واقف ہیں اور اس کی عفت مآبی بھی ہمارے سامنے ہے۔ اس نے ہمیں ایک ہی اللہ کی طرف بلایا تاکہ ہم اسے ایک ہی جانیں' صرف

اس کی بندگی کریں۔ اور اس کے علاوہ ہم اور ہمارے آباء واجداد جن پتھروں اور بتوں کی پوجا کرتے تھے ان کا جوا اپنے گلے سے اتار دیں۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ سچی بات کرو' امانت میں خیانت نہ کرو' صلہ رحمی کرو' پڑوسیوں کے حقوق کا خیال رکھو' حرام امور کا ارتکاب نہ کرو' قتل نہ کرو' فحاشی سے اس نے ہمیں منع کیا' جھوٹی بات سے منع کیا' یتیم کا مال کھانے سے منع کیا' پاکدامن عورتوں پر بہتان لگانے سے منع کیا اور اس نے حکم دیا کہ صرف اللہ کی عبادت کرو' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو' نماز قائم کرو' زکوۃ ادا کرو اور روزے رکھو۔"

اور ان گندگیوں میں سے ایک گندگی وہ تھی جس کا تذکرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے کیا ہے۔ وہ جاہلیت کے زمانے میں مرد و زن کے "تعلق جنسیت کا نقشہ روایت بخاری کے مطابق یوں کھینچتی ہیں: "جاہلیت میں نکاح کی چار اقسام مروج تھیں۔ ایک تو وہ نکاح تھا' جو آج کل ہمارے درمیان مروج ہے کہ ایک شخص دوسرے کی لڑکی کا پیغام دیتا ہے' مہر مقرر ہوتا ہے اور پھر نکاح ہو جاتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ جب کسی شخص کی عورت ایام ماہواری سے پاک ہو جاتی تو وہ کہتا فلاں کے پاس جاؤ اور اس کے ساتھ تعلق زن و شو قائم کرو۔ اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ اس وقت تک مباشرت نہ کرتا جب تک اس کا حمل واضح نہ ہو جاتا۔ یعنی جس شخص کے پاس اس نے اسے بھیجا تھا اس کے نطفے سے۔ اور جب حمل واضح ہو جاتا تو پھر خاوند اس کے ساتھ تعلقات جنسیت قائم کر لیتا اگر چاہتا۔ یہ اس لئے کیا جاتا تھا کہ اس شخص سے اچھی نسل پیدا ہو۔ اسے نکاح استبضاع کہا جاتا تھا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ دس افراد سے کم لوگ جمع ہوتے اور وہ ایک ہی عورت کے ساتھ تعلقات قائم کر لیتے۔ ہر ایک اس کے پاس جاتا' جب حمل ہو جاتا اور بچہ پیدا ہو جاتا اور کچھ شب و روز گزر جاتے تو وہ ان سب کو بلاتی۔ ہر ایک کو لازماً آنا پڑتا۔ وہ آتے اور اس کے ہاں اجتماع ہوتا۔ وہ کہتی تمہیں تو بات کا پتہ ہی ہے۔ اب بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ اے فلاں یہ بچہ تمہارا ہے اور وہ جس کے نام سے چاہتی اس کا نام رکھ دیتی۔ تو یہ اس کا بچہ ہو جاتا۔ اور وہ شخص اس کا انکار نہ کر سکتا۔ چوتھا نکاح یوں ہوتا کہ بہت سے لوگ ایک عورت کے پاس جاتے۔ یہ عورت کسی کو بھی منع نہ کرتی' جو بھی چاہتا اس کے پاس جاتا' یہ فاحشہ عورتیں ہوا کرتی تھیں۔ ان کے گھر کے دروازوں پر ایسے جھنڈے نصب ہوتے جو ان کے لئے علامت ہوتے۔ جو چاہتا ان کے پاس جاتا۔ ان میں سے اگر کوئی حاملہ ہو جاتی اور حمل وضع ہو جاتا تو یہ سب لوگ اس کے ہاں جمع ہوتے۔ قیافہ دانوں کو بلایا جاتا۔ یہ قیافہ دان جس کے بارے میں چاہتے' بچے کو اس کے ساتھ ملا دیتے۔ وہ اسے لیتا' اس کا وہ بیٹا تصور ہوتا اور ازروئے قانون وہ اس کا انکار نہ کر سکتا۔"

اب ذرا غور کیجئے کہ اس پیمانہ گرے ہوئے جنسی ضوابط پر کیا کسی مزید تبصرے کی ضرورت ہے۔ یہ کافی ہے کہ ہم ایک ایسے شخص کے بارے میں سوچیں کہ وہ اپنی بیوی کو کسی شخص کے پاس ایک اچھا بچہ پیدا کرنے کے لئے بھیجتا ہے۔ جس طرح ایک اونٹنی' اور گھوڑی اور ایک مادہ مویشی کو اچھا بچہ لانے کے لئے بھیجا جاتا ہے تاکہ بہترین نسل کشی ہو۔

رہی جسم فروشی کی چوتھی صورت تو وہ جسم فروشی کی ایک ایسی صورت ہے جس میں بچے کو کسی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اس میں وہ عار محسوس نہیں کرتے اور نہ اس سے رکتے ہیں۔

اور تیسری صورت بھی ویسی ہی ہے کہ دس افراد بیک وقت ایک عورت کے ساتھ گویا شادی کرتے ہیں' سب کے سب اس کے پاس جاتے ہیں اور پھر ان میں سے ایک بچے کو لے لیتا ہے۔

یہ کیا گندگی ہے' کیا بے حیائی ہے جس سے عربوں کو اسلام نے پاک کیا اور اگر اسلام نہ آتا تو وہ کانوں تک اس گندگی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

جنسی تعلقات میں یہ گندگی عربوں میں محض اس لئے پھیلی ہوئی تھی کہ ان کا نقطہ نظر عورت کے بارے میں نہایت ہی گرا ہوا تھا' ابو الحسن علی ندوی اپنی کتاب میں فرماتے ہیں:

"جاہلیت کے دور میں عورتوں پر بے حد ظلم ہوتا تھا۔ اور ان کے حقوق مارے جاتے تھے۔ اس کی دولت لوٹ لی جاتی تھی۔ اسے میراث سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ اور اگر اسے طلاق ہو جاتی یا اس کا خاوند فوت ہو جاتا تو اسے اپنی مرضی سے نکاح کرنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ اور وہ اسی طرح میراث میں ملا کرتی تھی جس طرح مویشی اور سامان میراث کے طور پر ملا کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے۔ اگر کسی کا باپ فوت ہو جاتا تو وہ اس کی منکوحہ کا سب سے پہلا مستحق ہو جاتا' وہ اگر چاہتا تو اسے اپنے نکاح میں لے لیتا' چاہتا تو اسے اس وقت تک بند رکھتا جب تک وہ اسے فدیہ نہ دلاتی یا مر نہ جاتی تاکہ یہ اس کی تمام مملوکات پر قابض ہو جاتا۔ عطا ابن رباح کہتے ہیں اہل جاہلیت کا رواج یہ تھا کہ جب کوئی مرد فوت ہو جاتا اور اس کی بیوی رہ جاتی تو اسے روک لیا جاتا یہاں تک کہ کوئی بچہ بالغ ہوتا اور یہ اس کے حوالے کر دی جاتی۔

سدی نے کہا ہے کہ جاہلیت میں جب باپ اور بھائی فوت ہو جاتے یا لڑکا فوت ہوتا اور اس کے پیچھے بیوہ رہ جاتی تو اگر کوئی وارث جلدی سے اس بیوہ پر کپڑا ڈال دیتا تو وہ اس کی ہو جاتی اور وہ اسی سابقہ مہر کے عوض اس کے ساتھ نکاح کر لیتا یا وہ اسے کسی کے نکاح میں دے دیتا لیکن اس کے مہر کا حقدار وہ شخص ہوتا۔ اور اگر بیوی خاوند کے مرتے ہی اپنے میکے بھاگ جاتی تو آزاد تصور ہوتی۔ جاہلیت میں عورت کے ساتھ اس کے حقوق کے بارے میں سخت عدم توازن تھا۔ خاوند اس کے حقوق تلف کر سکتا تھا' جبکہ وہ خاوند کی حق تلفی کرنے پر قادر نہ تھی۔ اس کا مہر اس سے چھین لیا جاتا۔ اور اسے نقصان پہنچانے کے لئے روکے رکھا جاتا۔ خاوند تو اس کے ساتھ برا سلوک کرتا' اس سے اعراض بھی کرتا اور بعض اوقات اسے معلق کر کے چھوڑ دیا جاتا۔ کھانے پینے کی چیزوں سے بعض چیزیں مردوں کے لئے مخصوص تھیں اور عورتوں پر وہ حرام تھیں۔ مرد کے لئے اجازت تھی کہ وہ جس قدر عورتوں سے نکاح کرنا چاہے کر سکتا تھا۔

لڑکیوں کو اس قدر برا سمجھا جاتا کہ انہیں زندہ درگور کر دیا جاتا۔ ہشیم ابن عدی نے الہمدانی کی روایت کے مطابق لکھا ہے کہ تمام قبائل عرب میں زندہ درگور کرنے کا رواج تھا' ہاں ایک شخص اگر اس پر عمل کرتا تو دس نہ کرتے۔ اسلام آیا تو اس وقت عربوں کے اندر زندہ درگور کرنے کے بارے میں مختلف آراء اور طریقے پائے جاتے تھے۔ بعض لوگ بہت غیرت مند ہونے کی وجہ سے لڑکیوں کو زندہ درگور کرتے۔ اور ان کی وجہ سے وہ اپنی شرمندگی چھپاتے۔ بعض لوگ ایسے تھے جو سبز آنکھوں والی لڑکیوں کو دفن کرتے یا سیاہ فام کو زندہ درگور کر دیتے یا برص زدہ کو دفن کر دیتے یا لنگڑی کو دفن کر دیتے۔ اس لئے کہ یہ لوگ ان صفات کو بہت ہی بدشگون سمجھتے تھے اور بعض ایسے بھی تھے جو فقر و فاقہ کے خطرات کی وجہ سے اولاد کو قتل کرتے۔

بعض اوقات وہ اپنی لڑکیوں کو بڑی سنگدلی کے ساتھ قتل کرتے یا زندہ درگور کرتے۔ مثلاً کبھی ایسا ہوتا کہ والد موجود نہ ہوتا' سفر میں ہوتا' یا کوئی اور مصروفیات ہوتیں تو لڑکی کو زندہ درگور کرنے کا موقعہ نہ ملتا' وہ بڑی ہو جاتی وہ سمجھتی کہ اسے قتل کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے خود اپنی کہانیاں بیان کی ہیں جو خون کے آنسو رلاتی ہیں۔ بعض لوگ لڑکیوں کو پہاڑی چوٹی سے گرا دیتے۔

ان گندگیوں میں سے ایک گندگی' اور سب سے بڑی گندگی' شرک تھی۔ پھر شرک کی بھی گری ہوئی شکل یعنی بت پرستی عربوں میں عام تھی۔ استاد ندوی اس کا خلاصہ یوں بیان کرتے ہیں: "عرب بت پرستی اور بتوں کی پوجا کی بدترین صورتوں میں مبتلا تھے۔ ہر قبیلہ بلکہ ہر درے کا ایک بت ہوا کرتا تھا۔ بلکہ ہر خاندان کا ایک بت ہوا کرتا تھا۔ کلبی کہتے ہیں۔ مکہ کے ہر گھرانے کا اپنا بت ہوتا تھا جسے وہ پوجتے تھے۔ جب کوئی سفر پر جاتا تو جانے سے پہلے آخری کام یہ کرتا کہ وہ اس سے تبرک حاصل کرتا۔ اور جب گھر لوٹتا تو سب سے پہلے اس کی پوجا کرتا۔ عرب بتوں کی پوجا کے اندر اس قدر غلو کر گئے تھے۔ بعض نے اپنے بت خانہ بنا رکھے تھے۔ بعض کا اپنا علیحدہ ایک ہی بت ہوتا تھا۔ اگر کوئی بت خانہ نہ بنا سکتا اور اپنا بت بھی نہ بنا سکتا تو وہ خانہ کعبہ کے سامنے ایک پتھر کھڑا کر دیتا یا کسی اور جگہ کھڑا کر دیتا' اس کا طواف کرتا جس

طرح وہ خانہ کعبہ کا طواف کرتا تھا۔ اور ایسے بتوں کو وہ انصاب کہتے تھے۔ خانہ کعبہ کے اندر' حالانکہ کعبہ صرف اللہ کی عبادت کے لئے تعمیر ہوا تھا' اس کے صحن کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ بتوں کی پوجا سے آگے بڑھ کر انہوں نے بتدریج پتھروں کی پوجا شروع کر دی تھی۔ امام بخاری نے ابو رجاء عطاردی سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم پتھروں کی عبادت کیا کرتے تھے۔ اگر ہمیں کوئی اچھا پتھر ملتا تو پہلے پتھر کو چھوڑ کر دوسرا لے لیتے۔ اگر پتھر نہ ملتا تو ہم مٹی کا ایک ڈھکیلا لے لیتے اس پر بکری کو دوہتے۔ اس کے بعد اس کا طواف کرتے۔ کلبی کہتے ہیں۔ اگر کوئی سفر کرتا اور کسی جگہ اترتا تو چار پتھر لیتا۔ ان میں سے دیکھتا کہ سب سے اچھا کون سا ہے تو اسے اپنا رب بنا لیتا اور بقیہ تین کو چولہے کے تین پتھر بنا لیتا۔ اور جب وہ اپنی منزل چھوڑتا تو اس پتھر کو بھی چھوڑ دیتا۔

عرب بھی دوسروں قوموں کی طرح' ملائکہ اور جنوں کی پوجا کرتے۔ اسی طرح وہ ستاروں کی پوجا بھی کرتے۔ چنانچہ وہ فرشتوں کو اللہ میاں کی بیٹیاں قرار دیتے اور انہیں اللہ کے ہاں سفارشی بناتے۔ ان کی عبادت بھی کرتے اور ان کے وسیلہ سے اللہ کے ہاں اپروچ کرتے۔ اسی طرح انہوں نے جنوں کو بھی شریک خدا کیا ہوا تھا۔ ان کی قدرت اور تاثیر کے وہ قائل تھے' بلکہ ان کی عبادت بھی کیا کرتے تھے۔ کلبی کہتا ہے قبیلہ خزاعہ کا بنو ملیح قبیلہ جنوں کی پوجا کرتا تھا۔ صاعد کہتے ہیں کہ حمیر سورج کی پوجا کرتے تھے۔ کنانہ چاند کے پجاری تھے۔ بنی تمیم دبران کے پجاری تھے۔ لخم مشتری کے پجاری تھے۔ بنی طی سہیل کے پجاری تھے' قیس شعریٰ اور بنو اسد عطارد کے پجاری تھے۔"[۱]

بت پرستی کے اس ابتدائی تصور کے ملاحظہ سے بسہولت معلوم ہو جاتا ہے کہ اس بت پرستی کی وجہ سے عربوں کے دل و دماغ اور ان کے تصورات اور ان کی عملی زندگی کے اندر کس قدر وسیع گندگی پھیلی ہوئی تھی۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ کس قدر عظیم انقلاب تھا جو اسلام نے عرب معاشرے کے اندر برپا کیا۔ ان کی زندگی کو کس قدر پاک کیا گیا' ان کے تصورات کی کس قدر تطہیر کی گئی۔ اور ان کو اخلاق اور اجتماعی گندگیوں سے کس قدر پاک کیا گیا' حالانکہ یہ تصورات اور یہ انفرادی اور اجتماعی گندگیاں ان کے لئے ایک قسم کے مفاخر تھے اور وہ اپنے اشعار اور اپنے میلوں اور بازاروں میں ان پر لمبی لمبی فخریہ تقریریں کیا کرتے تھے۔ مثلاً شراب نوشی' قمار بازی' قبائل کے اندر چھوٹے چھوٹے انتقام' ان کے نزدیک عظیم فضائل اخلاق تھے۔ اور یہ لوگ ان کے دائرے سے باہر قدم نہ رکھ سکتے تھے۔

رہی جنگ تو وہ ان کے لئے نہایت ہی معمولی بات تھی۔ خونریزی ان کے لئے روز مرہ کا کام تھا۔ ایک معمولی حادثہ بھی خونریزی کا باعث بن جاتا۔ قبیلہ بکر اور تغلب کے درمیان جنگ ہوئی اور چالیس سال تک ہوتی رہی۔ اس جنگ میں عظیم خونریزی ہوئی۔ جنگ یوں شروع ہوئی کہ کلیب رئیس معد نے تیر مارا اور بسوس بنت منقذ کی اونٹنی کے تھنوں میں لگا۔ خون اور دودھ مل گئے۔ جساس ابن مرہ نے کلیب کو قتل کر دیا۔ اس پر بکر اور تغلب قبائل کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اور جس طرح مہلہل برادر کلیب نے کہا ہے "اس جنگ نے زندگی کو فنا کر دیا۔ ماؤں کو رلا دیا۔ بچوں کو یتیم کر دیا۔ اس قدر آنسو بہے کہ رکنے کا نام نہ لیا اور اس قدر لوگ مارے گئے کہ دفن نہ ہو سکے۔ اور جنگ داحس کا حال بھی ایسا ہی تھا۔ قیس ابن زہیر کے گھوڑے کا نام داحس تھا۔ قیس ابن زہیر اور حذیفہ ابن بدر کے درمیان ہونے والے شرطیہ مقابلے میں داحس آگے تھا۔ ایک شخص جو اسد قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اس نے اس کے آگے رکاوٹ ڈالی اور حذیفہ آگے نکل گیا۔ اس نے اس کے چہرے پر طمانچہ مارا اور اس طرح اسے الجھا دیا۔ اور دوسرے گھوڑے آگے نکل گئے۔ اس کے بعد مقاتلہ شروع ہو گیا' پھر دلے پہ بدلہ لیا جاتا رہا۔ قبیلوں نے اپنے افراد کی نصرت کی۔ اس میں لوگ مارے گئے' قید ہوئے اور ہزاروں افراد کام آئے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کی زندگی میں عظیم اور بلند مقاصد کی کوئی اہمیت نہ تھی' اگر ان کے ہاں کوئی بلند نصب العین ہوتا تو

[۱] دیکھئے ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمون۔ ندوی ص ۳۴

وہ ان گھٹیا سرگرمیوں میں مشغول ہونے کا وقت ہی نہ پاتے۔ ان کی زندگی کا کوئی پیغام نہ تھا' انسانوں کی بھلائی کا کوئی منصوبہ ان کے پیش نظر نہ تھا۔ اس دنیا میں ان کے پاس کوئی بلند انسانی پروگرام نہ تھا تاکہ وہ زندگی کی ان بے قیمت اور گھٹیا سرگرمیوں میں مشغول نہ ہوتے۔ نیز ان کے پاس کوئی ایسا نظریہ حیات بھی نہ تھا جو انہیں ان اجتماعی مذموم گندگیوں سے باز رکھتا۔ اگر لوگوں تک الٰہی نظریۂ حیات نہ پہنچا ہو تو پھر ان کی ترجیحات کیا ہوتی ہیں؟ ان کا تصور حیات کیا ہوتا ہے؟ اور ان کے اخلاق کیا ہوتے ہیں؟

جاہلیت بہرحال جاہلیت ہوتی ہے۔ اور ہر جاہلیت کی گندگیاں اور غلط کاریاں الگ ہوتی ہیں۔ ہر زمان و مکان میں ان کے لئے الگ مواقع رہے ہیں۔ جب لوگوں کے دل الٰہی نظریۂ حیات سے خالی ہو جائیں اور ان پر خدائی فکر کی حکمرانی نہ رہے' جب لوگ الٰہی شریعت سے آزاد ہو جائیں تو خدائی نظریۂ حیات پر مبنی ہوتی ہے' تو ان کی زندگی پر جاہلیت کی حکمرانی ہوتی ہے اور وہ جاہلیت کی مختلف صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ آج ہمارے دور میں جس جاہلیت نے انسانیت کو کانوں تک گندگی میں ڈبو دیا ہے وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے زمانہ قدیم کی عرب جاہلیت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اور نہ ان جاہلیتوں سے مختلف ہے جو اس وقت اس دنیا کے اطراف و اکناف میں مروج تھیں اور جن سے انسانیت کو اسلام نے نجات دی تھی۔

آج دنیا ایک عظیم گندگی میں زندگی بسر کر رہی ہے اس کی صحافت کو دیکھیں' اس کی فلموں کو دیکھیں' اس کے لباس کی نمائشوں کو دیکھیں' اس کے مقابلہائے حسن کو دیکھیں' اس کی رقص گاہوں کو دیکھیں' اس کے حماموں کو دیکھیں' اس کے نشر و اشاعت کے اداروں کو دیکھیں' پھر ننگے گوشت اور ہیجان انگیز طور طریقوں کو دیکھیں' ادب اور فن میں اس کی بیمار رمزیت کو دیکھیں اور ذرائع اشاعت کے اندر اس کے گھٹیا اشاروں کو دیکھیں تو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ گندگی کے دلدل میں گرفتار اور بیمار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ معیشت پر ظالمانہ سودی نظام کی گرفت ہے۔ افراط زر اور دولت جمع کرنے اور اسے بڑھانے کے لئے غیر اخلاقی ذرائع کا استعمال عام ہے۔ اور قانون کے سایہ اور لباس کے اندر عوام کو لوٹا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی بے راہ روی اس قدر عام ہو گئی ہے جس کی لپیٹ میں ہر شخص اور ہر خاندان اور ہر نظام آ رہا ہے بلکہ ہر انسانی سوسائٹی پر اس کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ ان تمام امور پر غور کرنے سے یہ فیصلہ کرنا بہت ہی سہل ہو جاتا ہے کہ اس جدید جاہلیت کے زیر سایہ انسانیت ہلاکت خیز بیماری کی طرف بڑھ رہی ہے۔

انسان انسانیت کو کھائے جا رہا ہے۔ اس کی آدمیت تحلیل ہو رہی ہے' وہ حیوان کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ سانس پھولا ہوا ہے۔ وہ ایسی چیزوں کی دلدادہ ہو گئی ہے جو حیوانیت کو جگا رہی ہیں۔ اور انسان عالم حیوانات کی طرف اتر رہا ہے لیکن حیوان کو دیکھیں تو وہ اس انسان سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ کیونکہ وہ ضابطۂ فطرت کے اندر جکڑا ہوا ہے اور یہ ضابطہ اس قدر مضبوط ہے کہ کبھی بھی ڈھیلا نہیں پڑتا۔ نہ اس قدر گندہ ہوتا ہے جس طرح انسان اس وقت گندہ ہو جاتا جب وہ عقیدے اور نظریہ اور نظریاتی نظام کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور پھر سے اس جاہلیت میں داخل ہو جاتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اسے نجات دی ہے۔ اور جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ اس آیت میں اشارہ کرتے ہوئے اسے اپنا خصوصی انعام قرار دیتے ہیں۔

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ............ "ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔" اس آیت میں جن لوگوں کو خطاب کیا گیا ہے وہ ان پڑھ اور جاہل تھے۔ وہ لکھنا نہ جانتے تھے۔ عقل اور سمجھ بوجھ کے اعتبار سے بھی امی اور جاہل تھے۔ ابواب علم میں سے کسی باب میں بھی' اس وقت کے عالمی معیار علم و ثقافت کے مطابق کچھ درک نہ رکھتے تھے' نہ ان کی زندگی کے کچھ بلند مقاصد تھے' جو زندگی کے مختلف شعبوں میں سے کسی بھی شعبے میں عالمی وقعت رکھتے ہوں' لیکن اچانک اسلامی نظریۂ حیات آتا ہے' وہ دنیا کے استاد بن جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دنیا کے حکیم بن گئے۔ وہ ایک نظریاتی نظام زندگی کے حامل بن گئے' جس کے اندر

نظام فکر' نظام اجتماع اور زندگی کی تنظیم کا پورا نظام موجود تھا۔ اور جس نے اپنے دور میں پوری انسانیت کو اس وقت کی جاہلیت سے نجات دی۔ اور اب ہمارے دور میں بھی جدید جاہلیت سے اس جدید بشریت کو' ان شاء اللہ وہی نجات دے گی۔ اس لئے کہ ہماری اس جدید جاہلیت میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جن سے جاہلیت قدیمہ مرکب تھی۔ اخلاقی اعتبار سے بھی' اجتماعی اعتبار سے بھی' انسانی زندگی کے اہداف کے اعتبار سے بھی اور اعلیٰ مقاصد کے اعتبار سے بھی۔ اس کے باوجود کہ جدید انسانیت نے علم و معرفت کے میدان میں بڑی بڑی پیش قدمیاں کی ہیں اور صنعتی میدان میں اس نے ریکارڈ پیداوار دکھائی ہے۔ اور زندگی کی بہترین سہولیات فراہم کی ہیں لیکن یہ انسانیت بدستور جاہلیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔

**وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ** ................ "اگرچہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔" اعتقادات و تصورات کے اعتبار سے گمراہی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ زندگی کے مفاہیم اور قدروں کے اعتبار سے بھی ڈوبے ہوئے تھے اور مقاصد اور زندگی کی سمت کے اعتبار سے بھی راہ گم کئے ہوئے تھے۔ اپنی عادات و اطوار کے اعتبار سے بھی' اپنے نظم و نسق کے اعتبار سے بھی' اپنے اجتماعی نظام اور اپنے اخلاقی نظام کے اعتبار سے بھی گمراہ تھے۔

وہ عرب جو اس آیت کے مخاطبین اولین تھے' وہ اچھی طرح' بغیر کسی شک و شبہ کے اپنے ماضی اور حال ماضی کے رنگ ڈھنگ سے واقف تھے' یہ ماضی انہیں خوب یاد تھا۔ اور وہ انقلاب جو اسلام کی وجہ سے ان کی زندگیوں میں نمودار ہو گیا تھا وہ ان کی نظروں کے سامنے برپا ہوا تھا' اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اسلامی نظریۂ حیات کے بغیر ہرگز ان کی زندگی میں اس قدر عظیم انقلاب برپا نہ ہو سکتا تھا' جس کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔

وہ یہ جانتے تھے کہ یہ اسلام اور صرف اسلام تھا جس نے انہیں قبائلی طور طریقوں سے نکالا' قبائلی ترجیحات ان کے ذہن سے نکال دیں' قبائلی انتقام کے دلدل سے انہیں نکالا' صرف اس لئے نہیں کہ بس وہ ایک عظیم قوم بن جائیں بلکہ وہ اچانک بغیر کسی ابتدائی تیاریوں کے' بغیر کسی طویل زمانی منصوبے کے اچانک' ایسی قوم کی شکل اختیار کر لیں جو انسانیت کی قیادت کر رہی ہو' وہ انسانیت کے لئے نقشہ حیات تیار کر رہی ہو' اس کے لئے زندگی کا منہاج تیار کر رہی ہو' اس کی اجتماعی نظم بندی کر رہی ہو' ایسی صورت میں کہ اس کی کوئی سابقہ مثال ان کے سامنے نہ ہو اور پوری انسانی تاریخ میں بھی جس کی کوئی مثال نہ ہو۔

وہ علی وجہ البصیرت اس حقیقت کا ادراک رکھتے تھے کہ اسلام اور صرف اسلام نے انہیں قومی تشخص بخشا ہے۔ انہیں ایک سیاسی وجود بخشا ہے اور ایک بین الاقوامی حیثیت دی ہے۔ اور سب سے پہلے اور سب سے اہم یہ کہ انہیں ایک انسانی حیثیت عطا کی ہے' جس نے ان کی انسانیت' ان کی آدمیت اور اکرام انسانیت کو بلند کیا بلکہ ان کے پورے نظام حیات کو شرف انسانیت کی اساس پر منظم کیا۔ اور یہ تکریم ان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بطور ہدیہ اور بطور احسان عطا ہوئی۔ اور اس کے بعد انہوں نے اس تکریم انسانیت کی بارش پوری انسانیت پر کر دی۔ انہوں نے پوری انسانیت کو سکھایا کہ انسان کا اکرام کس طرح کیا جاتا ہے؟ کس طرح اسے اللہ کی تکریم کے ساتھ اشرف المخلوقات قرار دیا جاتا ہے۔ اور انسان کو یہ شرف عطا کرنے میں ان کے سامنے نہ جزیرۃ العرب میں کوئی مثال تھی اور نہ ہی دنیا کے کسی دوسرے خطے میں کوئی مثال تھی۔ اس سے پہلے اصول شوریٰ پر ہم جو بحث کر آئے ہیں' وہ اس نظام اور شرافت انسانیت کے پہلوؤں میں سے ایک پہلو تھا' جس کے اندر وہ محسوس کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ان پر غیر معمولی انعام تھا۔

وہ اس بات کا اچھی طرح ادراک کئے ہوئے تھے کہ یہ اسلام اور صرف اسلام ہے جس نے انہیں ایک پیغام عطا کیا' اور اب وہ اس پیغام کو تمام دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں' وہ انسانیت کو ایک نظریۂ حیات دے رہے ہیں۔ وہ انسانی زندگی کے لئے انہیں ایک راہ دکھا

رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ انسانی برادری کے اس وسیع کھیت میں اگر کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہے تو وہ وہی قوم ہوگی جس کے پاس کوئی پیغام ہو' جس کے پاس زندگی گزارنے کا کوئی طریقۂ حیات ہو اور وہ اس کے ذریعہ انسانیت کو آگے بڑھا رہی ہو۔

یہ اسلام تھا'اس کا تصور کائنات تھا' زندگی کے بارے میں اس کی آراء تھیں' معاشرے کے لئے اس کا اجتماعی اور قانونی نظام تھا' حیات انسانی کے لئے اس کی مخصوص تنظیم تھی اور اس کا مثالی مثبت اور واقعیت پسند نظام زندگی تھا جس کے زیر سایہ انسان کو خوشحالی نصیب ہوئی۔ اسلام اپنی ان خصوصیات کے ساتھ ایک مخصوص راہداری تھی جس کے ذریعہ وہ آگے بڑھے اور انہیں انسانیت نے پہچانا' ان کا احترام کیا اور انہیں انسانیت کی قیادت سپرد کی۔

آج ہو یا کل ان کے پاس یہی راہداری ہے۔ اس کے سوا اقوام عالم میں ان کی اور کوئی شناخت ہی نہیں ہے۔ ان کے لئے اب صرف یہی راستہ ہے کہ انسانیت انہیں پہچانے اور ان کی عزت کرے یا پھر وہ اس پیغام کو چھوڑ دیں اور دوبارہ مہمل زندگی بسر کریں۔ جس طرح کہ وہ اسلام سے پہلے تھے' کہ کوئی انہیں جانتا ہی نہ تھا اور نہ انہیں کوئی مانتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ اگر وہ انسانیت کو اسلامی نظام زندگی کا پیغام نہیں دینا چاہتے تو اور وہ کون سا پیغام ہے جو وہ دنیا کو دینا چاہتے ہیں۔ کیا وہ دنیا کو فنون' آداب اور سائنس میں کچھ دینا چاہتے ہیں؟ ان میدانوں میں تو دنیا ان سے کہیں آگے نکل گئی ہے۔ ان فروعی علوم و ثقافتوں کے میدان کے اندر انسانیت پہلے سے مالا مال ہوگئی ہے۔ نہ اسے کسی مزید چیز کی ضرورت ہے اور نہ اسے انتظار ہے کہ اس میدان میں عرب اسے کچھ دیں گے۔

کیا عرب دنیا کو صنعتی میدان میں کچھ اعجوبہ دینا چاہتے ہیں؟ حالانکہ اقوام عالم کے ہاں صنعت نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ اس کے مقابلے میں بڑے بڑے گردن فراز جھک گئے ہیں' انہوں نے صنعتی مصنوعات کے بازار بھر دیئے ہیں اور ہمارے ہاں جو صنعتی پیداوار ہوتی ہے اسے زیر سایہ (Over Shade) کر دیا ہے۔ عرب کے مقابلے میں بے شمار قومیں آگے ہیں' اس میدان میں۔ اور اس میدان میں ان کے ہاتھ میں زمام قیادت پہلے سے موجود ہے۔

کیا عرب دنیا کو اجتماعی مذہب کا کوئی فلسفہ دینا چاہتے ہیں؟ یا وہ دنیا کو کوئی ایسا اقتصادی اور تنظیمی نظام دینا چاہتے ہیں جو انہوں نے ایجاد کیا ہے۔ جو ان کی اپنی فکری کاوش کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہماری دنیا ان دنیاوی فلسفوں' مذاہب اور نظریات سے بھری پڑی ہے اور یہی دنیاوی نظریات ہیں جن کے تحت انسانیت نہایت ہی بدحالی کا وقت گزار رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ عرب اس انسانیت اور اقوام عالم کے سامنے کیا تحفہ پیش کرنا چاہتے ہیں' جس کی وجہ سے برادری اقوام میں ان کا تعارف ہو' انہیں امتیاز حاصل ہو اور اس میدان میں وہ برتر تصور ہوں؟

میں کہتا ہوں کہ ان کے پاس پیغام اسلام کے سوا اور کوئی پیغام نہیں ہے۔ یہی واحد نظام زندگی ہے جس کا پیغام وہ اس دنیا کو دے سکتے ہیں۔ ان کے پاس اللہ کے اس احسان کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے جس کا احسان انہوں نے مسلمانوں پر کیا۔ اور اس کے ساتھ انہیں اعزاز بخشا' اور ایک دن اسی پیغام کے ذریعہ انہوں نے پوری انسانیت کو نجات دی تھی' اور آج انسانیت سب سے زیادہ جس میدان میں مفلس ہے' سب سے زیادہ جس کی طرف محتاج ہے وہ یہی پیغام ہے۔ وہ جہنم کے گڑھے میں گرنے والی ہے۔ وہ حیرت' قلق اور بے اطمینانی کا شکار ہے۔

یہ وہ واحد پیغام تھا جسے انہوں نے کبھی انسانیت کو دیا تھا اور اس کے سامنے پوری انسانیت نے سر جھکا لیا تھا۔ آج یہی پیغام ہے جو عرب انسانیت کو دے سکتے ہیں اور اس میں انسانیت کی نجات مضمر ہے اور اسی میں اس کی کامیابی کا راز ہے۔

ہر قوم کے پاس کوئی نہ کوئی پیغام ہوتا ہے۔ تمام بڑی اقوام میں سے ہر قوم کے پاس کچھ نہ کچھ ہوتا ہے' سب سے بڑی قوم وہ ہوتی ہے جس کا پیغام بڑا ہوتا ہے' بڑی قوم وہ ہوتی ہے جو سب سے بڑا نظام دے۔ اور پھر دنیا میں اس نظام زندگی کے ساتھ منفرد تصور ہوتی ہے اور وہ نظام اس کی شناخت ہوتا ہے۔

عربوں کے پاس یہ پیغام موجود ہے۔ یہ ہے بھی ان کا اصلی پیغام۔ دوسری اقوام تو پیغام اسلام میں ان کی شریک حیات ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون شیطان ہے جو انہیں اس عظیم اور قیمتی سرمائے سے محروم کر رہا ہے۔ کون ہے وہ شیطان اسے پہچانو۔

اللہ کا عظیم اور عظیم احسان تھا' اس امت پر' اس پیغام کی وجہ سے' اس رسول کی وجہ سے اور اس کی رسالت کی وجہ سے۔ اس عظیم احسان سے انہیں صرف شیطان ہی پھیر کر گمراہ کر سکتا ہے حالانکہ ان کو اللہ نے حکم دیا ہے کہ اس شیطان کو دھتکاریں اور اس پر سنگ باری کریں۔

○ ..... ☆☆☆ ..... ☆

اس کے بعد معرکۂ احد کے واقعات کے بیان میں بات ایک قدم اور آگے بڑھتی ہے۔ اور اس پر مزید تبصرہ ہوتا ہے اور نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ ان کے تعجب کو پیش کیا جاتا ہے جس کا اظہار وہ ان نتائج کو دیکھ کر کرتے تھے' جو احد میں برآمد ہوئے۔ وہ ان واقعات کو انہونی تصور کرتے تھے۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ وہ مسلمان ہیں پھر بھی انہیں شکست ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کے بارے میں ان کا تصور ابھی بہت ہی ابتدائی ہے۔ ابھی وہ تجربات سے گزر کر فکری اعتبار سے پختہ نہ ہوئے تھے۔ وہ عملی تربیت سے ابھی نہ گزرے تھے تاکہ وہ اصل صورت حال کے ساتھ اور حقیقی واقعات کے ساتھ وہ برتاؤ کریں اور اس دنیا کے تکوینی قوانین فطرت کا ادراک کریں جن کے مطابق یہاں ہر شخص نے اپنی عملی زندگی بسر کرنی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انہیں کھلے میدان میں کھڑا کر کے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ انہیں جو کچھ درپیش ہوا' وہ خود ان کے اپنے افعال کا لازمی نتیجہ تھا۔ انہوں نے جو تصرفات اور اقدامات کئے ان کے یہی فطری اور سنت الٰہی کے مطابق نتائج تھے۔ لیکن قرآن کریم انہیں صرف اس نکتے پر ہی نہیں چھوڑ دیتا' اس لئے کہ یہ نکتہ اگرچہ حقیقت ہے لیکن یہ انتہائی حقیقت نہیں ہے بلکہ ان اسباب اور اسباب کے قدرتی نتائج کی پشت پر تقدیر الٰہی بھی کام کرتی ہے۔ قرآن انہیں اس کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے نیز اس سنن اللہ اور قوانین فطریہ کی پشت پر مشیت اللہ بھی کام کرتی ہے۔ یوں قرآن کریم انہیں ان واقعات کی حکمت بتاتا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان واقعات کی اس تدبیر کی پشت پر ان کے لئے بھلائی کا ارادہ کیا تھا۔ اس میں ان کے لئے خیر تھی۔ اس دعوت کے لئے بہتری تھی جس کی خاطر وہ جدوجہد کر رہے ہیں۔ مقصود یہ تھا کہ وہ اس تجربے سے انہیں زمانہ مابعد کے لئے تیار کرے۔ ان کے دلوں کو صاف کر دے۔ ان کی صفوں کی تطہیر کر دے۔ ان منافقین کو علیحدہ کر دیا جائے' جو ان واقعات کے نتیجے میں ننگے ہو گئے۔ آخر کار تمام امور بہرحال اللہ کی مشیت کے مطابق ہی سرانجام پاتے ہیں۔ اس کی تقدیر اور تدبیر کے مطابق ہی ظہور پاتے ہیں۔ یوں اس تبصرے سے ان کا تصور اور ان کا شعور مکمل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم کے نہایت ہی گہرے عمیق اور لطیف بیان واقعات پر ذرا نظر ڈالیں: ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

أَوَلَمَّآ أَصَٰبَتۡكُم مُّصِيبَةٞ قَدۡ أَصَبۡتُم مِّثۡلَيۡهَا قُلۡتُمۡ أَنَّىٰ هَٰذَاۖ قُلۡ هُوَ مِنۡ عِندِ أَنفُسِكُمۡۗ إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ قَدِيرٞ ﴿١٦٥﴾ وَمَآ أَصَٰبَكُمۡ يَوۡمَ ٱلۡتَقَى ٱلۡجَمۡعَانِ فَبِإِذۡنِ ٱللَّهِ وَلِيَعۡلَمَ

الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٦٦﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۚ وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي
سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ ادْفَعُوا ۖ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ ۗ هُمْ لِلْكُفْرِ
يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ
وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ﴿١٦٧﴾ الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا
مَا قُتِلُوا ۗ قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ أَنفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٦٨﴾

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

"اور یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے یہ کہاں سے آئی؟ حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں (فریق مخالف پر) پڑ چکی ہے۔ اے نبی ﷺ ان سے کہو' یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے' اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو نقصان لڑائی کے دن تمہیں پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا اور اس لئے تھا کہ اللہ دیکھ لے تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون؟ وہ منافق کہ جب ان سے کہا گیا "آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم (اپنے شہر کی) مدافعت ہی کرو" تو کہنے لگے "اگر ہمیں علم ہوتا کہ آج جنگ ہو گی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔" یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے اس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں' اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور ان کے جو بھائی بند لڑنے گئے اور مارے گئے ان کے متعلق انہوں نے کہہ دیا کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو نہ مارے جاتے۔ ان سے کہو اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو تو خود تمہاری موت جب آئے' اسے ٹال کر دکھا دینا۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر یہ لکھ دیا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کی مدد کرے گا' جو اس کا جھنڈا اٹھانے والے ہوں اور جو اس پر پختہ ایمان اور عقیدہ رکھنے والے ہوں۔ لیکن اس نے اس وعدے کو ایک شرط سے مشروط کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کی نصرت کے مستحق وہ اس وقت ہوں گے جب ان کے دلوں میں حقیقت ایمان اچھی طرح جاگزیں اور مستحکم ہو جائے۔ اور وہ اپنی تنظیم اور طرز عمل میں ایمان کے تقاضے پورے کر رہے ہوں۔ اور ان کی وسعت اور طاقت کے اندر جو کچھ ہو وہ انہوں نے تیار کیا ہو۔ ان کی طاقت میں جس قدر ممکن ہو وہ جدوجہد کر رہے ہوں۔ یہ ہے سنت الٰہیہ اور سنت الٰہیہ کی کسی کے ساتھ خاص دوستی نہیں ہوتی نہ وہ کسی کی رورعایت کرتی ہے۔ جب اللہ والے ان امور میں سے کسی میں بھی قصور اور کمی رکھتے ہوں تو ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی تقصیرات کے نتائج بھی قبول کریں۔ اس لئے کہ صرف مومن ہونے سے ان کے لئے ضابطہ سنن الٰہیہ معطل نہ کر دیا جائے گا۔ نہ ناموس اعلیٰ باطل ہو جائے گا۔ وہ تو مسلم ہی تب ہوں گے جب وہ اپنی زندگی کے اندر سنن الٰہیہ کو جاری و ساری کر دیں۔ اور اپنی فطرت کو ناموس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ کر دیں۔

لیکن ان کا نفس مسلمان ہونا بھی بیکار نہیں جاتا۔ نہ وہ بے اثر ہوتا ہے۔ ان کا اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا' اس کے جھنڈے اٹھانا' اس کی اطاعت کا عزم کر لینا اور اس کے نظام حیات کا التزام کرنا وغیرہ ان امور کا اثر یہ ضرور ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ان کی ان تقصیرات اور ان غلطیوں میں سے خیر اور برکت کا پہلو نکال دے۔ اگرچہ ان غلطیوں کی وجہ سے وہ چوٹیں کھائیں' قربانیاں دیں اور وقتی طور پر شکست

کھائیں۔ وہ ان غلطیوں سے ان کے تجربے میں اضافہ کرے گا۔ اس طرح ان کا عقیدہ صاف ہو جائے گا۔ ان کے دل صاف ہوں گے۔ ان کی صفوں کی تطہیر ہوگی اور اس طرح آخر کار وہ اس نصرت کے حق دار ہو جائیں گے جس کا وعدہ اللہ نے کیا ہے۔ آخری انجام خیر و برکت پر ہو گا' مسلمان اللہ کی بارگاہ سے' اس کی رحمت و عنایت سے دھتکارے نہیں جاتے بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں مزید زاد راہ سے نوازتا ہے۔ اگرچہ اثنائے راہ میں انہیں تکالیف پہنچیں' مشکلات کا سامنا ہو اور رنج و الم سے دوچار ہوں۔

اس وضاحت کے ساتھ اور فیصلہ کن انداز میں اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ سے خطاب فرماتے ہیں۔ ان کے اس سوالیہ انداز اور جو واقعات پیش آئے' ان پر ان کی حیرانی اور پریشانی کا جواب دیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ان واقعات کا قریبی سبب کیا تھا؟ نیز یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس میں تقدیر الٰہی کے اندر دور رس حکمت کیا پوشیدہ تھی؟ اور منافقین کو بتایا جاتا ہے کہ موت ایک حق راستہ ہے۔ ڈر سے موت ٹلتی نہیں اور نہ ہی جہاد میں شرکت نہ کرنے سے موت موخر ہو جاتی ہے۔

"اور یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے یہ کہاں سے آئی؟ حالانکہ اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں ان پر پڑ چکی ہے۔ اے نبی ان سے کہو' یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

جنگ احد میں مسلمانوں پر جو مصائب آئے وہ سب کے سامنے ہیں۔ ستر آدمی شہید ہوئے اور زخمی اور مزید مصائب ان کے علاوہ تھے۔ بہت ہی کڑوا دن تھا یہ ان کے لئے۔ ان پر یہ مصائب نہایت ہی شاق تھے اور ناقابل برداشت تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ مسلمان ہیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کر رہے ہیں اور ان کے مخالفین اللہ کے دشمن ہیں اور مشرک ہیں اور مسلمان جو اس مصیبت میں مبتلا ہوئے' اس سے پہلے وہ ان دشمنان اسلام کو دوگنا نقصان پہنچا چکے تھے۔ یہ اشارہ ہے بدر کی طرف وہاں انہوں نے ان کے ستر آدمیوں کو قتل کیا' جن میں قریش کے معتبر اور معززین شامل تھے۔ اور اسی طرح احد میں بھی معرکہ کی ابتداء میں انہوں نے کفار کو نقصان پہنچایا تھا جبکہ وہ اللہ کے حکم پر درست کھڑے تھے۔ وہ رسول' اللہ کے احکام پر عمل پیرا تھے۔ اس سے قبل کہ وہ مال غنیمت کو دیکھ کر بے راہ ہو جائیں۔ اور اس سے قبل کہ ان کے دلوں میں ایسے خیالات پیدا ہوں جو ایمان کے ساتھ لگا نہیں کھاتے۔

اللہ انہیں یہ سب باتیں یاد دلاتے ہیں اور ان کے اس حیرانی سے بھرے ہوئے سوال کا جواب یوں دیتے ہیں کہ اس کا براہ راست سبب تو خود ان کے اپنے افعال تھے۔ قُلۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِكُمۡ‌ؕ ................ "اے نبی ان سے کہو یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے۔"

یہ خود تمہارے نفوس تھے' جن میں خلل آگیا' تم متفرق ہو گئے اور باہم تنازعہ کرنے لگے اور یہ تم ہی تھے جنہوں نے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی شرائط پر عمل نہ کیا۔ یہ تمہارے ہی نفوس تھے جن میں طمع اور لالچ داخل ہو گئی' اور یہ تم ہی تھے جنہوں نے رسول خدا ﷺ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی اور آپ کے جنگی منصوبے کو سبوتاژ کیا۔ پس یہ نتائج جن سے تم دوچار ہوئے اور جنہیں تم انوکھی قرار دیتے ہو' اور تم کہتے ہو کہ یہ حالات کیسے پیش آگئے؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ تمہاری اپنی وجہ سے ہوا ہے۔ تم پر تو اللہ میاں کی سنت الٰہیہ کا انطباق ہوا ہے۔ جب تم نے اپنے آپ کو اس سنت کے سامنے پیش کیا۔ انسان جب اپنے آپ کو سنت الٰہیہ کے سامنے پیش کرتا ہے تو وہ سنت اس پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔ یہ شخص مسلم ہو یا مشرک ہو' اس سلسلے میں کسی کی رو رعایت نہ ہو گی۔ لہٰذا کسی کے اسلام کا کمال یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کی سنت کے مطابق ڈھال لے اور وہ یہ کام پہلے ہی کر لے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ............ "اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔" اور اس کی قدرت کا ہی یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنی سنت کو نافذ فرماتا ہے۔ وہ اس کائنات میں اپنے ناموس کی کارفرمائی قائم کرتا ہے۔ اور تمام کام اس کی قدرت اور ارادے کے

مطابق چلتے ہیں۔ اور یہ بھی اس کی قدرت کا تقاضا ہے کہ اس کی سنت معطل نہ ہو' جس پر اس نے اس کائنات اس زندگی اور زندگی کے ان واقعات کو چلایا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات پیش نظر رہے کہ تمام واقعات کی پشت پر اللہ کی تقدیر ہوتی ہے اور اس میں کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی' جس کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ ہر معاملہ جو پیش آتا اور ہر حادثہ جو واقعہ ہوتا ہے اس کی پشت پر اللہ کی تقدیر ہوتی ہے۔ ہر حرکت اور ہر سکوں کے پیچھے دست تقدیر ہوتا ہے اور اس کائنات میں جو وقوعہ بھی پیش آتا ہوتا ہے اس کی پشت پر تقدیر ہوتی ہے۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ ........................ "جو نقصان لڑائی کے دن جب دو گروہ باہم متقابل ہوئے 'تمہیں پہنچاوہ اللہ کے اذن سے تھا۔" یہ نقصان محض اتفاق سے یا سوئے اتفاق سے از خود پیش نہیں آیا۔ نہ وہ خواہ مخواہ بطور عبث پیش آیا۔ اس لئے کہ اس کائنات کے اندر ہونے والی ہر حرکت منصوبے اور دست قدرت کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کے اسباب بھی پہلے سے طے شدہ ہیں اور نتائج بھی پہلے سے مقرر ہیں اور مجموعی لحاظ سے ان واقعات کے پیچھے حکمت پوشیدہ ہوتی ہے اور مجموعی لحاظ سے یہ واقعات اس پوری کائنات کی اسکیم کے مطابق ہوتے ہیں۔ اور اس کے باوجود وہ اس کائنات کے اندر جاری سنن الٰہیہ کے مطابق اور ان اٹل قوانین کے مطابق ہوتے ہیں جن کا کبھی بھی نہ تخلف ہوتا' نہ ان میں کوئی تعطل ہوتا ہے اور نہ ہی وہ قوانین کسی کے ساتھ رو رعایت کرتے ہیں۔

تقدیر کے مسئلے میں اسلامی تصور حیات اس قدر کامل' شامل اور متوازن ہے' جس کا مقابلہ آغاز انسانیت سے لے کر آج تک کوئی تصور حیات نہیں کر سکتا۔

اسلامی تصور حیات کے مطابق اس کائنات کا ایک اٹل قانون ہے اور بعض ناقابل تعطل سنن الٰہیہ ہیں۔ ان اٹل قوانین فطرت اور ناقابل انحراف سنن الٰہیہ کے پیچھے اللہ کا ارادہ کام کرتا ہے اور اللہ کی آزاد مشیئت ہے' جو کسی قید میں مقید نہیں ہے۔ اور ان سب یعنی سنن الٰہیہ اور مشیئت الٰہیہ کی پشت پر پھر اللہ کی حکمت مدبرہ ہے۔ اور یہ تمام پھر اللہ کی حکمت مدبرہ کے موافق چلتے ہیں۔ ناموس کی حکمرانی ہے اور سنن الٰہیہ ہر چیز میں جاری ہیں۔ انسان بھی ان کا تابع و محکوم ہے۔ انسان ان سنن الٰہیہ کے دائرے میں اپنے فعل ارادی کے ساتھ اپنے دائرہ اختیار کے اندر کام کرتا ہے۔ اور وہ اپنی سوچ اور اپنی تدبیر کے مطابق جو کام کرتا ہے' یہ سنن ان افعال پر بھی منطبق ہوتی ہیں اور اس پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ اللہ کی تقدیر اور مشیئت کے مطابق ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں اللہ کی کوئی حکمت اور تدبیر بھی کام کرتی ہے۔ اس نظام میں انسان کا ارادہ' اس کی حرکت' اس کی سوچ' اس کی قوت عمل یہ سب کچھ سنن الٰہیہ کا ایک حصہ ہیں۔ وہ ناموس کائنات کا حصہ ہیں۔ ان انسانی افعال کے ساتھ بھی اللہ اپنا کام کرتے ہیں' ان کو بھی وہ موثر بناتے ہیں اور یہ سب کچھ پھر بھی اس کے دائرۂ قدرت کے اندر ہوتا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز نوامیس فطرت اور سنن الٰہیہ کے دائرے سے خارج نہیں ہوتی۔ اور نہ انسان کی کوئی حرکت اور سوچ ان سنن کے ساتھ متضاد ہوتی ہے یا ان کے بالمقابل ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کی سوچ یہ ہے کہ وہ ترازو کے ایک پلڑے میں اللہ کے ارادے' اللہ کی تقدیر کو رکھتے ہیں اور انسان کے ارادے اور انسان کی سوچ اور فاعلیت کو دوسرے پلڑے میں رکھتے ہیں۔ جو اللہ کے ارادے کے بالمقابل ہو۔ یہ صورت حال بالکل ممکن نہیں ہے۔ اسلامی تصور حیات ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان اس کا شریک بالمقابل نہیں ہے۔ نہ انسان اللہ کا دشمن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو اس کا وجود' اس کی فکر' اس کا ارادہ بخشا تھا' اس کی تقدیر' اس کی تدبیر اور زمین کے اندر اس کی فاعلیت اسے عطا کی تھی تو اس نے اس وقت ان انسانی قوتوں اور سنن الٰہیہ کے درمیان کوئی تضاد نہ رکھا تھا اور نہ ان کے درمیان کوئی مقابلہ رکھا تھا۔ نہ یہ چیزیں مشیئت

الٰہیہ کے خلاف تھیں۔ نہ اللہ کے نزدیک یہ سب امور اللہ کی گہری حکمت سے باہر تھے۔ جو اللہ کی تقدیر کی پشت پر کارفرما ہے۔ اللہ کی سنت اور اللہ کی تقدیر کے اندر یہ بات رکھی گئی تھی کہ انسان اپنی تدبیر سے کام لے۔ وہ متحرک ہو اور اس کائنات میں مؤثر ہو۔ وہ سنن الٰہیہ کے بالمقابل کھڑا ہو اور وہ اس پر منطبق ہوں اور اللہ کی سنن کے تحت اس دنیا میں اسے لذت والم' آرام و بے آرامی' سعادت و شقاوت سے دوچار ہونا پڑے اور پھر اس کی ان تمام سرگرمیوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کام کرے جس کے احاطے میں یہ پوری کائنات ہے' نہایت ہی توازن اور تناسق کے ساتھ۔

یہ واقعات جو احد میں وقوع پذیر ہوئے' وہ اسلامی تصور حیات کی مثال تھے' یعنی تقدیر کے حوالے سے جو ہم بات کر آئے ہیں۔ ان واقعات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سکھایا کہ فتح و شکست کے بارے میں اس کی سنت کیا ہے۔ انہوں نے اللہ کی سنت اور اس شرط کی خلاف ورزی کی جو اس نے فتح کے لئے رکھی ہوئی تھی تو اس نے انہیں ان آلام اور ان مصائب سے دوچار کیا جو احد میں انہیں پیش آئے۔ لیکن بات یہاں آکر ختم نہیں ہوگئی۔ اس مخالفت اور رنج و الم کے پیچھے یہ تقدیر کام کر رہی تھی کہ ان کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اسلامی صفوں میں سے منافقین کو چھانٹ کر علیحدہ کر دے۔ اہل ایمان کے دلوں کو صاف کر دے اور ان کے تصورات کے اندر جو ملاوٹ اور میل تھی اسے دور کر دے یا ان کے کردار میں جو ضعف اور کمزوری تھی وہ دور ہو جائے۔

بظاہر وہ رنج و الم سے دوچار ہوئے' لیکن اپنی جگہ اہل ایمان کے حق میں مستقبل کے اعتبار سے یہ خیر تھا۔ اگرچہ یہ رنج و الم بھی سنت الٰہی کے عین مطابق تھا' اللہ کے سنن میں سے ایک سنت یہ بھی ہے کہ جو مسلمان اسلامی نظام حیات کو قبول کر کے اس کے آگے سر تسلیم خم کریں گے اور عموماً اسلامی نظام کی اطاعت کریں گے' اللہ ان کی حمایت و رعایت کرے گا اور ان کی غلطیاں بھی' اپنی انتہا پر جاکر وسیلہ ظفر اور ذریعہ خیر ہوں گی۔ اگرچہ وہ رنج و الم سے دوچار ہوں' کیوں؟ اس لئے کہ رنج و الم اور مصائب و شدائد کے ذریعہ تربیت ہوتی ہے' اسلامی صفوں سے کھوٹ دور ہوتا ہے اور آئندہ مرحلے کی خوب تیاری ہوتی ہے۔

اس مضبوط اور کھلے موقف پر مسلمانوں کے قدم جم جائیں گے' ان کے دل مطمئن ہوں گے' ان میں کوئی تزلزل نہ ہوگا' کوئی حیرانی نہ ہوگی اور کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ اس طرح وہ اللہ کی تقدیر کو انگیز کریں گے' اس کائنات میں سنن الٰہیہ کے مطابق اپنے معاملات سرانجام دیں گے۔ انہیں یقین ہوگا کہ اللہ ان کی ذات اور ان کے ماحول میں فعال لمایرید ہے اور یہ کہ وہ تقدیر الٰہی کے آلات اور ذریعہ کار ہیں۔ اللہ جس طرح چاہے اپنے آلات کار کو استعمال کر سکتا ہے' یہ کہ ان کے درست فیصلے' ان کے صائب فیصلے اور درست فیصلوں کے اثرات اور غلط فیصلوں کے نتائج سب کے سب اللہ کی تقدیر کے پردے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان میں اس کی کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے اور جب تک وہ اس راہ انقلاب پر گامزن رہیں گے' ان کے لئے ہر مرحلہ خیر ہی خیر ہو گا۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّااتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِھِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ

"جو نقصان تمہیں اس دن پہنچا جس دن دو جماعتوں کے درمیان ٹکر ہوئی' وہ اللہ کے اذن سے تھا۔ اور اس لئے تھا کہ اللہ یہ

لے کہ تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون؟ وہ منافق کہ جب ان سے کہا گیا "آؤ" اللہ کی راہ میں جنگ کرو' یا کم از کم (اپنے شہر کی مدافعت ہی کرو۔ تو کہنے لگے "اگر ہمیں علم ہوتا کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔" یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے' اس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں۔ اور جو کچھ دلوں میں چھپاتے ہیں' اللہ خوب جانتا ہے۔"

اس آیت میں عبداللہ ابن ابی ابن السلول اور اس کے ساتھیوں کے موقف کی طرف اشارہ ہے۔ انہیں جو خطاب دیا گیا ہے وہ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ....... (وہ لوگ جنہوں نے نفاق کیا) کا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقعہ پر ان کا پردہ فاش کر دیا۔ اور اسلامی صفوں سے انہیں جدا کر دیا۔ اور ان کے اس دن کے موقف پر یہ تبصرہ کیا هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ........... (اس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے) یہ کہ وہ اپنے اس احتجاج میں سچے نہ تھے کہ آج مسلمانوں اور کافروں کے درمیان جنگ نہیں ہو رہی ہے۔ اس لئے وہ واپس ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی واپسی کا اصل حقیقت یہ سبب نہ تھا۔ بلکہ وہ "جو کچھ اپنے منہ سے کہہ رہے تھے وہ بات ان کے دل میں نہ تھی۔" ان کے دل میں تو نفاق کی بیماری تھی۔ اور یہ نفاق انہیں نظریہ حیات کے تابع نہ کرتا تھا بلکہ وہ ان کی شخصیات اور ان کی ذاتی حیثیات کو نظریہ حیات سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ ان لوگوں کے رئیس عبداللہ ابن ابی ابن السلول نے یہ اعتراض بھی کیا تھا کہ رسول ؐ خدا نے احد کے دن اس کی رائے کو قبول نہیں کیا۔ اور اس واقعہ سے پہلے کے اسباب یہ تھے کہ جب حضور اکرم ﷺ اپنی رسالت کے پیغام کو لے کر مدینہ طیبہ پہنچے تو اس وقت عبداللہ ابن ابی کی سربراہی میں ایک ریاست کی تشکیل کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس کے لئے تاج بن رہا تھا۔ آپ ؐ کی آمد کے نتیجے میں ریاست کا مقام حاملین اسلام نے حاصل کر لیا۔ یہ بات ان کے دل میں تیر کی طرح پیوست تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ احد کے دن واپس ہو گئے تھے۔ چونکہ دشمن مدینہ کے دروازے پر تھے' اس لئے یہ لوگ واپس ہو گئے اور مومن صادق کی یہ بات انہوں نے رد کر دی۔ یہ مومن صادق عبداللہ بن عمرو ابن حزام تھے۔ وہ انہیں پکار رہے تھے تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ............ (آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا دفاع ہی کرو) اس کے جواب میں ان کا احتجاج و استدلال یہ تھا کہ ان کے خیال میں کوئی جنگ نہیں ہے۔ اگر کوئی بات ہوتی تو وہ ضرور جاتے۔ اور ان کے اس موقف کی تردید یوں کی گئی وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ........................ "اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔"

یوں وہ اپنے تخلف اور پلٹنے کو حکمت اور مفید قرار دیتے ہیں اور رسول ؐ خدا کی اطاعت کو نقصان اور ضرر رساں قرار دیتے ہیں۔ اور اس سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اسلام کے صاف اور ستھرے تصور حیات کو خراب کرتے ہیں' کیونکہ اسلامی تصور حیات کے مطابق ہر شخص کی موت کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ موت و حیات کی حقیقت یہ ہے کہ ان کا تعلق تقدیر الٰہی کے ساتھ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ یہاں ان کے ان غلط تصورات کی تردید ضروری سمجھتے ہیں۔ فوراً ان کے اس تصور کی واضح تردید کر دی جاتی ہے' جس سے ایک طرف ان کی تیار کی ہوئی سازش کے تار و پود بکھر جاتے ہیں اور دوسری جانب سے اسلامی تصور حیات ہر قسم کے اجمال اور دھندلے پن سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ........................ ......"ان سے کہو اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو تو خود تمہاری موت جب آئے تو اسے ٹال کر دکھا دینا۔"

موت تو جس طرح مجاہد کو آتی ہے اسی طرح جو لوگ گھر میں بیٹھے رہتے ہیں' انہیں بھی آتی ہے' بہادر کو بھی آتی ہے اور بزدل کو بھی آتی ہے۔ نہ کوئی محافظ اسے ٹال سکتا ہے اور نہ کوئی احتیاطی تدبیر۔ نہ بزدلی اور جہاد سے غیر حاضری سے وہ ٹل سکتی ہے۔ اور یہ صورت حال

ایسی ہے' جو خود اپنی دلیل آپ ہے اور اس میں کسی شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ یہی حقیقی صورت حال ہے جس کو قرآن مجید خود ان کے خلاف پیش کرتا ہے ۔ یوں ان کی اس مکروہ سازش کو رد کر دیا جاتا ہے ۔ سچائی کو اپنی جگہ رکھ کر مستحکم کر دیا جاتا ہے ۔ مسلمانوں کے دل مطمئن اور مضبوط ہو جاتے ہیں ۔ انہیں اطمینان' آرام اور ذوق یقین سے سیراب کر دیا جاتا ہے ۔

واقعات احد کے بیان کے اس انداز کی طرف ذہن انسانی ملتفت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس بیان میں اس واقعہ یعنی عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کی روگردانی کو بہت ہی موخر کر کے لایا گیا ہے ۔ حالانکہ یہ واقعہ اس معرکے کے ابتدائی دور میں ہوا تھا اور معرکے کے آغاز ہی سے وہ واپس ہو گیا تھا ۔ اسے اول میں بیان کرنے کے بجائے آخر میں لایا گیا یہ کیوں؟

یہ تاخیر اس لئے کی گئی کہ اس میں بھی قرآن کریم کے انداز تربیت میں سے ایک خاص انداز کا اظہار کیا گیا ہے ۔ مقصد یہ تھا کہ اس حادثہ پر تبصرے سے قبل وہ تمام اساسی تصورات بیان کر دیئے جو اسلامی نظام زندگی کے بنیادی قواعد میں شمار ہوتے ہیں اور جب مسلمانوں کے ذہن میں وہ تمام احساسات جاگزیں ہو گئے' اور مسلمانوں کی اقدار کے لئے حقیقی پیمانے وضع ہو گئے تو آخر میں ان لوگوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا جنہوں نے نفاق اختیار کیا تھا ۔ ان کے کردار اور ان کی سرگرمیوں کو بے نقاب کیا گیا ۔ ایسے موقعہ پر ان لوگوں کے خلاف تنقید آئی جب مسلمانوں کے ذہن اس کے لئے تیار تھے اور اس قابل ہو گئے تھے کہ معلوم کر سکیں کہ ان کے افکار و تصورات کے اندر کیا کیا انحراف ہے اور کیا کیا کمزوریاں ہیں؟ اور یہ کہ ان کے پیمانے کس قدر غلط ہیں؟ اور یہ کہ ایک مومن کے دل و دماغ کے اندر افکار اور تصورات اور حسن و قبح کے پیمانے ایسے ہونے چاہئیں اور کسی فرد اور قوم کے اعمال کا جائزہ ان پیمانوں کے مطابق ہونا چاہئے اور اس کے بعد جب مومن پر اعمال اور افراد کو پیش کیا جاتا ہے تو وہ ایک روشن مزاج اور ایمانی احساس اور ایمانی سرمایہ حکمت کی روشنی میں ان پر فوراً حکم لگاتا ہے کہ کیا کمتر ہے اور کیا بہتر ہے ۔ کون صالح ہے اور کون برا ہے ۔

یہ قرآنی انداز بیان کا ایک خاص رنگ ہے ۔ عبداللہ ابن ابی اس وقت تک اپنی قوم کا سرکردہ لیڈر تھا جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے ۔ وہ اس لئے سوچ گیا کہ حضور اکرم ﷺ نے اس کی رائے کو قبول نہ کیا تھا ۔ اس لئے کہ نبی ﷺ نے اصول مشورہ کو رائج کرنا تھا ۔ پھر جو بات طے ہو جائے اسے نافذ کرنا تھا' چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو کیونکہ دوسری رائے کے سلسلے میں لوگوں کا رجحان ظاہر ہو گیا تھا ۔ اس شخص کی اس روگردانی کی وجہ سے اسلامی صفوں کے اندر بڑی افراتفری پیدا ہو گئی تھی ۔ ان کے افکار میں تزلزل پیدا ہو گیا تھا ۔ پھر اس کی رائے کی اہمیت اور بھی واضح ہو گئی جب شکست ہوئی اور لوگوں کو مزید حسرت اور افسوس ہونے لگا ۔ اور دلوں میں یہ بات آئی کہ اسی کے کہنے پر عمل کر لیا ہوتا ۔ اسلامی منہاج کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس کی رائے اور اس کے اس فعل کو قدرے نظرانداز کر کے اور غیر اہم کر کے پیش کیا جائے اور اس جنگ کے واقعات کا آغاز اس واقعہ سے نہ کیا جائے ۔ حالانکہ یہ حادثہ پہلے درپیش ہوا تھا ۔ اس واقعہ کو اس قدر موخر کرنے اور پھر اسے بیان کر کے اس گروہ پر نفاق کا لیبل چسپاں کر دینے اور پھر ان کے لئے غائب اور مجہول صیغے کا استعمال اور اس گروہ کے سرغنے کا ذکر نہ کرنے سے اور انہیں اَلَّذِيْنَ نَافَقُوْا ......... کہہ کر پکارنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان کی اہمیت کو کم کیا جائے اور یہ بات اصولاً ان تمام لوگوں پر چسپاں ہو' جو ایسی حرکات کرتے ہیں اور بات اس طرح اصولی رنگ اختیار کرے جس طرح آغاز کلام میں اسے اصولی رکھا گیا تھا ۔

○.....☆☆☆.....○

اہل اسلام کے دلوں کے اندر سکون پیدا کرنے' ان کے دلوں اور ان کے ضمیر کو' ان سنن الہیہ پر مطمئن کرنے کے بعد جو اس کائنات میں جاری اور ساری ہیں' انہیں یہ بتانے کے بعد کہ تمام کام اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوتے ہیں' اور یہ سمجھانے کے بعد کہ اللہ کی

تقدیر کے پیچھے اللہ کی حکمت اور تدبیر کام کر رہی ہوتی ہے۔ اور یہ بات ذہن نشین کرنے کے بعد کہ موت کے لئے وقت مقرر ہے' اس کا وقت پہلے سے طے شدہ ہے اور جنگ میں شریک نہ ہونا اسے موخر نہیں کر سکتا اور جنگ میں شرکت سے موت پہلے نہیں آسکتی اور یہ سمجھانے کے بعد کہ کوئی محافظ موت سے حفاظت نہیں دے سکتا اور کوئی تدبیر موت کو روک نہیں سکتی' غرض ان تمام امور کے بعد اب سیاق کلام میں ایک دوسری حقیقت کو لیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت اپنی ذات میں بھی عظیم ہے اور اس کے اثرات بھی نہایت ہی عظیم ہیں۔

یہ حقیقت کیا ہے؟ یہ کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں وہ مردہ نہیں ہوتے' وہ تو زندہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے رب کے ہاں مہمان خصوصی ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی' مرنے کے بعد' اسلامی جماعت کی زندگی سے منقطع نہیں ہوتی' وہ بعد کے واقعات سے لاتعلق نہیں ہوتے' وہ ان واقعات سے خود بھی متاثر ہوتے ہیں اور واقعات میں ایک موثر فیکٹر بھی ہوتے ہیں اور زندگی عبارت کس چیز سے ہے؟ تاثیر اور تاثر ہی تو زندگی ہے۔

یہاں معرکہ احد کے شہداء کی زندگی اور ان واقعات اور حادثات کے درمیان رابطہ قائم کر دیا جاتا ہے جو ان کی شہادت کے بعد پیش آئے۔ اس کے بعد گروہ مومن کی بات متصلاً" بیان کر دی جاتی ہے' جس نے اللہ اور رسول خدا ﷺ کی پکار پر لبیک کہا۔ در آنحالیکہ وہ زخموں سے چور چور تھے۔ وہ نکلے' انہوں نے قریش کا تعاقب کیا' یہ قریش اگرچہ جا چکے تھے لیکن یہ خطرہ موجود تھا کہ وہ دوبارہ مدینہ پر حملہ آور ہو جائیں۔ اس گروہ نے لوگوں کے اس ڈراوے کی کوئی پرواہ نہ کی کہ قریش پھر سے جمع ہو رہے ہیں۔ ذات باری پر توکل کی اور انہوں نے اس کارنامے کی وجہ سے اپنے ایمان کو حقیقت کا روپ دیا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

وَلَا
تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ
يُرْزَقُوْنَ ﴿١٦٩﴾ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ
لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿١٧٠﴾
۱۷ ع۱۶ ۸ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٧١﴾
اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَآ اَصَابَھُمُ الْقَرْحُ ړ لِلَّذِيْنَ
اَحْسَنُوْا مِنْھُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿١٧٢﴾ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ
قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِيْمَانًا ڰ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ
الْوَكِيْلُ ﴿١٧٣﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْھُمْ سُوْۗءٌ ۙ وَّ
اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿١٧٤﴾ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ
يُخَوِّفُ اَوْلِيَاۗءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْھُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٧٥﴾

"جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو' وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں' اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں' جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس پر خوش و خرم ہیں' اور مطمئن ہیں کہ جو اہل ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں ان کے لئے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں و فرحاں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ (ایسے مومنوں کے اجر کو) جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا..... ان میں جو اشخاص نیکو کار اور پرہیزگار ہیں ان کے لئے بڑا اجر ہے..... جن سے لوگوں نے کہا کہ "تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں' ان سے ڈرو" تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ "ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔" آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے' ان کو کسی قسم کا ضرر بھی نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف بھی انہیں حاصل ہو گیا' اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ اب تمہیں معلوم ہو گیا کہ وہ دراصل شیطان تھا جو اپنے دوستوں سے خواہ مخواہ ڈرا رہا تھا۔ لہٰذا آئندہ تم انسانوں سے نہ ڈرنا' مجھ سے ڈرنا اگر تم حقیقت میں صاحب ایمان ہو۔"

مومنین کے دل و دماغ میں تقدیر اور موت کے مقررہ وقت کے بارے میں صحیح تصورات بٹھانے کے بعد اور منافقین اسلامی صفوں کے اندر جو بے چینی' شکوک اور حسرتیں پیدا کرتے تھے ان کی تردید کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ مناسب سمجھا کہ اہل ایمان کے دلوں کے اندر مزید سکون اور پورا اطمینان پیدا کیا جائے۔ اس لئے کہ منافقین مسلسل یہ پروپیگنڈا کر رہے تھے کہ اگر تم اتنے ہی باتدبیر ہو تو خود اپنی موت کو روک لینا جب وہ آئے۔ لیکن سابقہ آیات میں پیدا کردہ ایمان و ایقان اور اس مسکت جواب کے بعد اللہ نے چاہا کہ ان کے دلوں میں شہداء کے مستقبل کے بارے میں مزید اطمینان پیدا کر دیا جائے۔ وہ شہداء جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے (اور شہداء ہوتے ہی وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہوں) اور ان کے پیش نظر یہی مقاصد ہوں۔ اور ان مقاصد کے ساتھ کوئی اور مقصد شریک نہ ہو۔ تو ایسے شہداء جو فی سبیل اللہ قتل ہوئے وہ فی الحقیقت زندۂ جاوید ہیں۔ ان کو ایسے خصائص حاصل ہیں جو زندہ لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ انہیں ان کے رب کے ہاں کھانے دیئے جاتے ہیں اور کھانے کے علاوہ ان پر فضل خداوندی ہے اور اس فضل پر وہ بہت خوش ہیں' اور ان کو پھر اہل ایمان کے معاملات کی رپورٹ دی جاتی ہے جن معاملات کے لئے انہوں نے اپنی جان دی۔ وہ پورے واقعات ان کو سنائے جاتے ہیں۔ ان کے بعد ان کے بھائیوں کے ساتھ جو واقعات پیش آتے ہیں وہ اُس کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ اور یہ سب خواص وہ ہیں جو زندہ لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں مثلاً ساز و سامان' خوشخبری' اہتمام اور تاثر اور تاثیر۔ یہ سب زندہ لوگوں کی صفا ہیں۔ لہٰذا ان کی جدائی وفات حسرت آیات نہیں ہے۔ وہ زندہ ہیں' ان کا رابطہ زندوں کے ساتھ قائم ہے اور اس کے علاوہ مزید فضل یہ کہ وہ فضل الٰہی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ فضل ان کے رزق اور مرتبے و مقام سے علیحدہ ہے۔ اس لئے لوگ شہداء اور ان کے بعد رہنے والے بھائیوں کے درمیان جو فرق کرتے ہیں وہ درحقیقت کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ اس لئے لوگوں کے ذہنوں میں عالم الحیاۃ اور عالم بعد الممات کے اندر جو فرق ہے وہ شہداء کے حوالے سے کچھ نہیں ہے۔ مومنین کے نقطہ نظر سے کوئی فرق نہیں ہے' اس لئے کہ ان کا معاملہ یہاں بھی خدا سے ہے اور وہاں بھی خدا سے ہے۔

اس حقیقت کو ذہن میں بٹھانے کے بعد اس دنیا کے واقعات پر سوچنے کے انداز بدل جاتے ہیں۔ یہ حقیقت انسان کی سوچ بدل دیتی ہے۔ اس کائنات کے بارے میں ایک مومن کے اندر ایک بالکل نئی سوچ پیدا ہوتی ہے۔ کائنات کی یہ حرکت ایک مومن کے نقطہ نظر سے اپنے اندر تسلسل رکھتی ہے۔ وہ کبھی منقطع نہیں ہوتی۔ یوں ایک انسان جب مر جاتا ہے تو اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں ہوتا بلکہ موت کی وجہ سے قبل الممات اور بعد الممات زندگی میں ایک پردہ سا حائل ہو جاتا ہے۔

یہ موت و حیات کے لئے ایک نیا نقطہ نظر ہے۔ اس سے ایک مسلمان کے شعور میں عظیم انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ مسلمان زندگی اور موت دونوں کا استقبال ایک مخصوص نقطہ نظر کے ساتھ کرتے ہیں۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ............ "اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو' وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں' اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں۔"

یہ آیت اس بارے میں نص قطعی ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے' جنہوں نے زندگی قربان کر دی' اور لوگوں کی نظروں سے غائب ہو گئے انہیں مردہ کہنا یا سمجھنا ممنوع ہے۔ اور یہ آیت اس امر میں بھی قطعی ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ اپنے رب کے ہاں رزق پا رہے ہیں۔ اور اس نہی اور اثبات کے بعد' اس آیت میں ان کے خصائص حیات کا ذکر ہوتا ہے اور ان کے رزق دیئے جانے کا ذکر ہے۔

ہم اس جہان فانی میں' شہداء کی زندگی سے صحیح معرفت نہیں پاتے۔ ہاں ان شہداء کی زندگی کے بعض اوصاف بعض احادیث میں ذکر ہوئے ہیں' لیکن اللہ جل شانہ کی طرف سے بذریعہ وحی آئی ہوئی یہ آیت ہمارے لئے اس ضمن میں کافی اور شافی ہے۔ اس لئے کہ اللہ علیم و خبیر ہے اور صرف اللہ ہی اس بات کا ضامن ہے کہ وہ موت و حیات کے بارے میں تصورات کو بدل دے۔ یہ کہ ان کے درمیان کس حد تک دوئی اور جدائی ہے اور کس قدر اتحاد و اتصال ہے۔ اور یہ بات اللہ ہی بتا سکتا ہے کہ معاملات بعینہ ایسے نہیں ہیں جس طرح بظاہر ہمیں ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں یا جس طرح ہم ان کا ادراک کر سکتے ہیں۔ اور ہم جب بے قید اور مطلق حقائق کے معانی اپنے اذہان میں مقرر کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ مفاہیم آخری مفہومات ہیں اور یہ کہ ہم نے حقائق بعد الممات کا کماحقہ ادراک کر لیا ہے۔ لہذا ہمارے لئے یہ بہتر ہے کہ ہم صرف ذات باری تعالیٰ کے بیان کا انتظار کریں کہ اللہ نے کیا کہا ہے' اور اس پر اکتفاء کریں۔

شہداء وہ لوگ ہیں جو بظاہر قتل ہو جاتے ہیں۔ بظاہر ان کی زندگی ان سے جدا ہو جاتی ہے اور وہ بھی زندگی سے جدا ہو جاتے ہیں' جس طرح ہمیں نظر آتا ہے لیکن چونکہ وہ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں' اور تمام دنیاوی اغراض کو ترک کر کے قتل ہوتے ہیں' دنیا کی چھوٹی چھوٹی اغراض کو وہ چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کی روحیں اللہ سے مل جاتی ہیں' اس لئے وہ اپنی روحوں کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیتے ہیں۔ اور وہ اسی طرح بظاہر قتل ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ جو مخبر صادق ہے ہمیں اطلاع دیتے ہیں کہ وہ مردہ نہیں اور ہمیں منع کرتے ہیں کہ انہیں زبان سے بھی مردہ نہ کہو۔ اور بتاکید مزید فرماتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں۔ انہیں باقاعدہ رزق دیا جاتا ہے اور وہ اللہ کا رزق اس طرح حاصل کرتے ہیں جس طرح زندہ لوگ حاصل کرتے ہیں۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی بعض دوسری خصوصیات کی بھی اطلاع دیتے ہیں' مثلاً

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ ............ "جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس پر خوش اور خرم ہیں۔" یعنی وہ اللہ کے ہاں سے آیا ہوا رزق بڑی فرحت کے ساتھ حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے کہ انہیں اچھی طرح ادراک ہو چکا ہوتا ہے کہ یہ تو اللہ کا فضل خاص ہے۔ یہ فضل خاص ان کے لئے ثبوت ہے اللہ کی رضامندی کا' اس لئے کہ وہ اس کی راہ میں قتل ہوئے۔ پس اس سے زیادہ ان کے لئے اور کیا چیز سامان فرحت ہو سکتی ہے کہ انہیں اللہ کا رزق اس احساس کے ساتھ ملے کہ وہ ان سے راضی بھی ہو چکا ہے۔

اس کے بعد یہ خصوصیت کہ ان کے دل ان لوگوں کے حالات کے اندر مشغول ہیں اور دلچسپی لے رہے ہیں جو اس دنیا میں زندہ رہ رہے ہیں اور وہ ان زندہ رہنے والوں کے انجام کے بارے میں بہت ہی مطمئن ہیں۔ اس لئے کہ انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ ان سے بھی

اللہ میاں راضی ہے۔

يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللهِ وَ فَضْلٍ وَّ اَنَّ اللهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ

"اور مطمئن ہیں کہ جو اہل ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے' ان کے لئے بھی کسی رنج و خوف کا موقعہ نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں اور فرحاں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔"

وہ اپنے ان بھائیوں سے منقطع نہیں ہو گئے' جو ابھی وہاں نہیں پہنچے اور ان سے جدا ہو گئے ہیں۔ وہ زندہ ہیں' ان کے ساتھ ہیں اور دنیا اور آخرت میں پیچھے آنے والوں کو جو کچھ ملنے والا ہے' اس پر وہ بہت ہی خوش ہیں اور وہ اس لئے شاداں و فرحاں ہیں کہ ان آنے والوں کے لئے بھی کسی رنج اور خوف کا موقعہ نہیں ہے۔ وہ اپنے رب کے ہاں جو اعلیٰ درجے کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس سے انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ آنے والوں کے بھی مزے ہیں۔ اس لئے کہ ان پر بے بہا فضل و کرم ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مومنین صادقین کے ساتھ یہی تعلق ہوتا ہے کہ وہ ان کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

سوال یہ ہے کہ زندگی کے خصائص میں سے وہ کون سا خاصہ ہے جو ان شہداء فی سبیل اللہ کو حاصل نہیں ہے؟ اور وہ کیا چیز ہے جو آنے والے مومنین سے ان کو ممتاز کرتی ہے اور یہ کہ ان کے اس انتقال کی وجہ سے پھر حسرت' فقدان اور وحشت اور افسوس کا کیا موقعہ ہے؟ یعنی پسماندگان کے لئے افسوس کا کیا موقع ہے کہ وہ افسوس کرتے ہیں۔ یہ تو نہایت خوشی کا موقعہ ہے۔ یہ تو رضامندی اور محبت کا موقعہ ہے کہ ایک شخص ہم سے جدا ہو کر اللہ کے ہاں پہنچ گیا۔ اور اس انتقال کے ساتھ ساتھ ہم سے ملحق بھی ہے۔

اگر موت فی سبیل اللہ ہے' تو وہ موت نہیں ہے اور خود مجاہدین کے اپنے شعور کے مطابق بھی وہ موت نہیں ہے۔ ان لوگوں کے لئے بھی موت نہیں ہے جو پیچھے رہ گئے ہیں بلکہ یہ زندگی کے میدان کی وسعت ہے۔ اس کے شعور کی وسعت ہے' اس کی صورتوں کی وسعت ہے۔ یہ حیات' شہید کی حیات' زندگی کی سرحدوں کے آگے چلی جاتی ہے۔ اسی طرح اس زندگی کے مظاہر بدل جاتے ہیں۔ یہ زندگی دنیا کی تنگ دامانی سے نکل کر ایک وسیع میدان میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس کے سامنے وہ پردے اور رکاوٹیں نہیں ہوتیں جو ہمارے ذہن میں ہوتے ہیں۔ گویا زندگی اپنی ایک شکل و صورت سے منتقل ہو کر دوسری شکل و صورت میں داخل ہو جاتی ہے۔ ایک زندگی ختم ہوتی اور دوسری شروع ہوتی ہے۔

اس آیت نے زندگی کو جو نیا مفہوم دیا ہے' یا قرآن کریم کی اس جیسی دوسری آیات شہداء کی زندگی کو جو مقام عطا کرتی ہیں' اس کے اثرات یہ ہوئے کہ مجاہدین کرام کے قدم طلب شہادت میں ہروقت رواں دواں رہے۔ اور ان کی ایک مثال وہ نمونے ہیں جو ہم نے جنگ احد کے بیان کے آغاز میں دیئے ہیں۔

اس حقیقت اور عظیم حقیقت کے بیان کے بعد کہ اہل ایمان کے لئے جو کچھ اللہ کے ہاں تیار کیا ہوا ہے' اس پر شہداء خوشیاں منا رہے ہیں' تو اللہ تعالیٰ یہاں وضاحت فرماتے ہیں کہ وہ اہل ایمان ہیں' کون ہیں اور ان کا ان کے رب کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۚ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ۞ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ

"وہ لوگ جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا ان میں جو اشخاص نیکو کار ہیں اور پرہیز گار ہیں ان کے لئے بڑا اجر ہے۔ جن سے لوگوں نے کہا کہ "تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں' ان سے ڈرو" تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ "ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔" آخر وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے' ان کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف ان کو حاصل ہو گیا۔ اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔"

یہ وہ لوگ تھے جنہیں جنگ احد کی دوسری صبح رسول خدا ﷺ نے پکارا نکلو کہ ابھی یہ تلخ معرکہ ختم نہیں ہے اور ان کی حالت یہ تھی کہ ان کے زخموں سے ابھی تک خون جاری تھا۔ اور وہ کل ہی جان لڑا کر موت کے منہ سے نکلے تھے۔ اور ابھی تک انہوں نے کل کے معرکہ کی ہولناکیوں کو بھولا نہ تھا۔ ہزیمت کی تلخی ان کے منہ میں باقی تھی' درد کی شدت میں ابھی تک کمی نہ آئی تھی۔ مزید یہ کہ انہوں نے اعزہ و اقارب کی قیمتی جانوں کا نذرانہ کل ہی تو پیش کیا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کی اکثریت بری طرح سے زخمی تھی۔

رسول خدا نے انہیں پکارا تھا اور صرف انہیں پکارا تھا اور یہ دعوت اور اس کے نتیجے میں لوگوں کی طرف سے لبیک کہنا' ایک ایسا فعل تھا جس کے اندر گہرے اشارات پائے جاتے ہیں۔ اور یہ بڑے حقائق پر مشتمل ہے۔ اور اس میں گہری حکمت پوشیدہ تھی۔

ممکن ہے رسول خدا یہ چاہتے ہوں کہ اس معرکے میں اہل ایمان کی آخری بات اور ان کا آخری شعور یہ نہ ہو کہ انہیں ہزیمت ہوئی ہے۔ اور وہ شکست کھا چکے ہیں اور اس زخموں کی حالت میں کراہ رہے ہیں۔ اس لئے رسول خدا نے انہیں حکم دیا کہ کپڑے جھاڑیں اور قریش کا تعاقب کریں۔ ان کا پیچھا کریں تاکہ ان کے ذہن میں یہ بیٹھ جائے کہ یہ تو ایک ابتلا تھی' ایک تجربہ تھا اور یہ اس معرکے کا کوئی آخری فیصلہ نہ تھا۔ اور اس کے بعد بھی مسلمانوں کی قوت اپنی جگہ موجود ہے۔ اور یہ کہ دشمن ابھی تک ضعیف ہیں۔ یہ تو ایک بار تھی جس میں اچانک شکست ہو گئی۔ اور ہم اس کا بدلہ لیں گے۔ اگر ہم نے کمزوری اور بے اتفاقی کو دور کر دیا اور اللہ اور رسول کے حکم کو تسلیم کیا۔

یہ بھی ممکن تھا کہ حضور قریش کے ذہنوں سے یہ بات نکالنا چاہتے ہوں کہ وہ فتح کے پھریرے اڑاتے ہوئے مکہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس لئے آپ نے اس معرکے میں شریک ہونے والوں کی معیت میں ان کا تعاقب کیا۔ اور اس سے قریش کو یہ جتلانا مقصود تھا کہ انہوں نے ابھی تک مسلمانوں کی قوت کو توڑا نہیں ہے۔ اور یہ کہ ابھی تک ان میں تعاقب یا دوسری جنگ کی قوت باقی ہے۔ جس طرح سیرت کی روایات میں آتا ہے اس تعاقب سے یہ دونوں مقاصد پورے ہو گئے۔

شاید حضور اکرم مسلمانوں اور پوری دنیا کو یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ اس دنیا میں ایک نئی حقیقت کا ظہور ہو چکا ہے اور وہ نئی حقیقت جو اپنے ظہور کے بعد اب قائم بھی ہو چکی ہے وہ یہ ہے کہ اس نئی تحریک کا اصل سرمایہ اس کا عقیدہ ہے۔ یہی اس کا نصب العین ہے اور اس کے سوا اس کا کوئی مقصد حیات نہیں ہے اور اس کے سوا اس کو زندگی میں کوئی اور ترجیح نہیں ہے۔ مسلمان اس نظریہ حیات ہی کے لئے زندہ ہیں' اس لئے اس نظریۂ حیات کے بعد ان کے نفوس کی کوئی اور تمنا نہیں ہے۔ اور وہ اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔

اس وقت اس کرۂ ارض پر یہ ایک بالکل نئی بات تھی۔ لہٰذا یہ بات ضروری تھی کہ پوری دنیا کو معلوم ہو جائے اور خود مسلمانوں کو بھی اس کا شعور ہو جائے کہ یہ جدید نظریہ اب قائم ہو چکا ہے اور اب یہ اس کرۂ ارض پر ایک اٹل حقیقت ہے۔ اور اس حقیقت کا اس سے بڑا اظہار نہ ہو سکتا تھا کہ احد میں اس قدر گہرے زخم کھانے کے بعد فدایان اسلام اپنے رستے زخموں کے ساتھ ایک غالب قوت

کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوں۔ ان کی جانب سے یہ اقدام ایک واضح' روشن اور بالکل ایک خوفناک اقدام تھا۔ اس میں توکل علی اللہ کی روشن مثال پائی جاتی تھی۔ اور لوگ ان جانبازوں کو جو ڈرا رہے تھے کہ قریش پھر جمع ہو رہے ہیں' جس طرح ابو سفیان کے نمائندوں نے انہیں یہ بات پہنچائی تھی اور منافقین نے بھی قریش کے اس منصوبے کو خوفناک انداز میں پیش کیا کہ وہ ایسا کرنے والے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌۚ ...................... "جن سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں ان سے ڈرو' تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔ اور انہوں نے جواب دیا' ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے۔"

اس خوفناک صورت حال میں یہ تعاقب دراصل یہ اعلان تھا کہ اس کرۂ ارض پر اب انقلاب اور یہ عظیم انقلاب اب حقیقت بن چکا ہے۔ غرض یہ تھے وہ بعض پہلو جو حضور ﷺ کے اس حکیمانہ اقدام سے واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ سیرت کی بعض روایات سے ان لوگوں کے حالات کا پتہ چلتا ہے جنہوں نے زخموں کے اندر چکنا چور ہونے کے باوجود حضور کی کال پر لبیک کہا۔

○.....☆☆☆.....○

محمد ابن اسحاق نے عبداللہ ابن خارجہ' ابو السائب سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب جو بنو عبدالاشہل سے تعلق رکھتے تھے' وہ احد میں شریک تھے۔ اس نے بیان کیا کہ ہم رسول خدا کے ساتھ احد میں شریک ہوئے تھے۔ میں تھا' میرا بھائی تھا' ہم لوٹے' اور دونوں زخمی تھے۔ رسول خدا ﷺ کے موذن نے اعلان کیا کہ نکلو' دشمن کا تعاقب کرنا ہے۔ میں نے اپنے بھائی سے کہا یا بھائی نے مجھ سے کہا کہ کیا اب ہم سے رسول خدا ﷺ کی یہ جنگ رہ جائے گی۔ ہمارے پاس کوئی سواری نہیں ہے اور ہم دونوں شدید زخمی بھی ہیں۔ ہم دونوں رسول خدا ﷺ کے ساتھ نکل پڑے۔ میرا زخم بھائی سے ذرا کم تھا۔ جب اس کی طبیعت خراب ہوتی تو میں اسے پیچھے سے تھامتا' یہاں تک کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچ گئے۔

محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ احد کی جنگ بروز ہفتہ ۱۵ شوال کو ہوئی تھی۔ دوسرے دن ۱۶ شوال کو حضور ﷺ کے موذن نے اذان دی۔ اور حکم دیا کہ دشمن کا تعاقب کرنا ہے۔ اور موذن نے یہ اعلان بھی کیا کہ ہمارے ساتھ صرف وہ لوگ جائیں جو کل کے معرکے میں شریک ہوئے تھے۔ آپ کے ساتھی جابر ابن عبداللہ ابن عمرو ابن حرام نے کہا کہ میرے باپ نے مجھے اپنی بہنوں کی نگرانی کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ میری سات بہنیں تھیں۔ میرے باپ نے مجھے کہا کہ "برخوردار نہ یہ میرے لئے مناسب ہے اور نہ آپ کے لئے مناسب ہے کہ آپ ان سات عورتوں کو چھوڑ کر جہاد کے لئے نکلیں۔" اور میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں رسول خدا ﷺ کے ساتھ جہاد کا شرف تمہیں دے دوں۔ اس لئے تم بہنوں کے پاس رہو۔ صرف ان کو حضور ﷺ نے اجازت دے دی اور وہ آپ کے ساتھ نکلے۔

جب اس عظیم حقیقت کا اعلان ہوا' تو اس قسم کے عظیم اور بے مثل واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ لوگوں کی ذہنی دنیا میں انقلاب آیا۔ ایسے تربیت یافتہ نفوس قدسیہ تیار ہوئے جو صرف اللہ کو اپنا وکیل و مددگار سمجھتے تھے۔ وہ صرف ذات باری پر راضی تھے' ذات باری ہی کو کافی سمجھتے تھے۔ وہ ذات باری ہی کو یاد کرتے تھے اور جب سخت سے سخت حالات پیش آتے تو ان کا ایمان اور پختہ ہو جاتا اور جب لوگ انہیں مشکلات سے ڈراتے تو ان کا جواب یہ ہوتا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ "ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔"

اور پھر انجام کیا ہو گا؟ وہی جو اللہ نے متوکلین کے لئے لکھ دیا ہے جو اللہ کے لئے خالص ہو جاتے ہیں اور جن کے لئے بس اللہ ہی کافی ہوتا ہے۔

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ

"آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے' ان کو کسی قسم کا ضرر بھی نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف بھی انہیں حاصل ہو گیا' اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔"

وہ مشکلات سے بچ کر بغیر کسی تکلیف کے واپس ہو گئے۔ اللہ کی رضامندی کے ساتھ واپس ہوئے اور کامیابی اور خوشی سے واپس ہوئے۔ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ ............ "اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ۔" اللہ تعالیٰ یہاں پھر ان کی توجہ جود اور بخشش کے سبب اول کی طرف مبذول کراتے ہیں' کہ سبب اول اللہ کی نعمت اور اس کا فضل ہوا کرتا ہے۔ اور اس میں یہ اشارہ بھی مقصود ہے کہ صحابہ کرام کا موقف قابل تعریف تھا۔ کیونکہ ان کا موقف یہ تھا کہ وہ صرف اللہ کا فضل اور اس کی نعمت کی تلاش میں تھے۔ تمام نعمتوں کا سرچشمہ یہی ہے کہ اللہ کا فضل ہو جائے اور ان کا موقف بھی ایسا تھا جہاں فضل خداوندی کی بارش تھی۔ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ............ "اور اللہ فضل عظیم کا مالک ہے۔" اس طرح اللہ اپنی ابدی کتاب میں یہ ثبت کر دیتے ہیں اور اپنے کلام میں ان کی یہ تصویر کھینچتے ہیں' ان کا یہ موقف پیش فرماتے ہیں اور اللہ کا کلام وہ کلام ہے جس کے ساتھ یہ پوری کائنات ہم آہنگ ہے۔ غرض ان کا موقف نہایت ہی شریفانہ ہے اور ان کی یہ تصویر بھی نہایت ہی خوبصورت ہے۔

جب انسان ان کے اس موقف اور ان کے اس نظارے پر غور کرتا ہے تو اسے احساس ہو جاتا ہے کہ صرف ایک ہی رات میں ان لوگوں کا نقطہ نظر یکسر بدل گیا ہے' وہ پختہ کار ہو گئے' باہم متناسق ہو گئے' وہ جہاں کھڑے تھے وہاں مطمئن ہو کر جم گئے۔ ان کے خیالات سے تمام دھند اور میل دور ہو گئی اور ان کی صورت حال بالکل نئی ہو گئی۔ کل ان کے تصورات میں اور ان کی صفوں کے اندر جو خلجان اور جو تذبذب پایا جاتا تھا' آج اس کا نام و نشان نہیں ہے۔ صرف ایک رات ہی گزری تھی کہ ان کے موقف میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا۔ عظیم فرق اور میلوں کی مسافت ایک لحظہ میں طے ہو گئی۔ اس تلخ تجربے نے ان کے نفوس کے اندر اپنا کام کر دکھایا۔ اس حادثہ نے انہیں خوب جھنجھوڑا جس کی وجہ سے ان کے تصورات سے ہر قسم کے غبار چھٹ گئے' ان کے دل از سر نو جاگ اٹھے' ان کے قدم جم گئے اور ان کے دل از سر نو عزم صمیم سے مالا مال ہو گئے۔ بالکل درست ہے یہ کہنا کہ اس ابتلا میں بھی اللہ کا عظیم فضل پوشیدہ تھا۔

اس پیراگراف کے آخر میں اس وقت کے موجودہ جزع و فزع اور خوف و ہراس کی علت بھی بتا دی گئی۔ بتایا گیا کہ یہ تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں کا ڈر اور رعب تمہارے دلوں میں بٹھاتا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کو رعب و دبدبہ کے لباس میں پیش کرتا ہے۔ اس لئے اہل ایمان کو شیطان کی اس چال سے خوب خبردار رہنا چاہئے۔ اور اس کے اس مکر کو بے اثر بنانے کی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ اس لئے وہ اہل قریش سے نہ ڈریں کیونکہ وہ اس وقت شیطان کے ساتھی ہیں۔ وہ شیطان سے دوستوں سے خائف ہونے کے بجائے اللہ سے ڈریں کیونکہ صرف وہی قوی قادر مطلق اور جبار ہے اور وہی اس بات کا مستحق کہ اس سے خوف کیا جائے۔

"اب تمہیں معلوم ہو گیا کہ وہ دراصل شیطان تھا' جو اپنے دوستوں سے خواہ مخواہ ڈرا رہا تھا لہٰذا آئندہ تم انسانوں سے نہ ڈرنا' مجھ سے ڈرنا اگر تم حقیقت میں ایمان لانے والے ہو۔"

شیطان اپنے دوستوں کو بہت بڑا کر کے اور پھولا کر پیش کرتا ہے۔ وہ انہیں ایسے لباس میں پیش کرتا ہے جس میں وہ قوی اور طاقتور نظر آئیں۔ وہ دلوں میں یہ رعب بٹھاتا ہے کہ شیطان کے ساتھی سب کچھ اپنے حق میں پھیر سکتے ہیں اور ان کے ہاتھ لمبے ہیں۔ وہ نفع بھی دے سکتے ہیں اور ضرر بھی دے سکتے ہیں تاکہ شیطان اس ذریعہ سے اپنی ضروریات اور اغراض پوری کرتا رہے۔ اور ان دوستوں کے ذریعہ دنیا

میں شر اور فساد پھیلائے۔ اور لوگوں کو اپنے دوستوں کے سامنے اس قدر جھکا دے کہ وہ ان کی اطاعت غیر مشروط طور پر کریں۔ کوئی ان کے سامنے کسی بات کا انکار نہ کر سکے۔ کوئی شخص ان پر تنقید نہ کر سکے اور ان کو شر و فساد سے روکنے کی جرأت ہی نہ کر سکے۔

شیطان کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ باطل کو خوب پھولا کر اور موٹا کر کے پیش کرے۔ اس طرح کہ وہ قوی صاحب قدرت 'قہار اور جبار اور سخت گرفت کا مالک نظر آئے۔ اس کی کوئی اپوزیشن نہ ہو۔ اس کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ ہو اور کوئی قوت ایسی نہ ہو جو اس پر غالب آ سکتی ہو۔ شیطان کی مصلحت یہ ہے کہ وہ صورت حال کو اس طرح قائم رکھے۔ خوف اور رعب کے پردے میں اور تخویف اور پکڑ کی فضا میں شیطان کے دوست دنیا میں سب کارروائیاں کرتے ہیں۔ وہ معروف کو منکر بناتے ہیں اور منکر کو معروف بناتے ہیں۔ شر' فساد اور گمراہی پھیلاتے ہیں۔ سچائی' ہدایت اور عدل کی آواز کو دھیما کرتے ہیں' بغیر اس کے کہ کوئی ان کو چیلنج کرے یا ان کے سامنے کھڑا ہو' یا قیادت کے مقام سے انہیں ہٹا سکے۔ غرض وہ جس باطل کی ترویج کرتے ہیں ان پر تنقید کی جرأت ہی اہل حق کو نہ ہو اور جس حق کو وہ مٹانا چاہتے اس کی وضاحت کرنے اور اسے غالب کرنے کی بھی کسی کو جرات نہ ہو سکے۔

شیطان سخت مکار' دغاباز اور غدار ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے لباس میں آتا ہے۔ اور جو لوگ شیطانی وساوس کے مقابلے میں احتیاط نہیں کرتے' وہ ان دوستوں سے انہیں خوب ڈراتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہاں اسے خوب ننگا کرتے ہیں۔ اور وہ یوں ننگا ہو جاتا ہے کہ اس کے جسم پر اس کے مکر و فریب کا کوئی لباس ہی نہیں رہتا۔ اہل ایمان شیطان کی حقیقت کو اچھی طرح جان لیتے ہیں۔ اس کے وسوسوں اور اس کے مکر و فریب کی حقیقت کو پالیتے ہیں تاکہ وہ اس سے محتاط ہو جائیں۔ اس کے دوستوں سے نہ ڈریں اور نہ ان سے خائف ہوں۔ جو مومن ذات باری پر مکمل بھروسہ کئے ہوئے ہے۔ اس کے مقابلے میں شیطان بہت ہی کمزور ہوتا ہے اس لئے کہ اس کی قوت کا سرچشمہ اللہ ہوتا ہے۔ وہ واحد قوت جس سے کسی انسان کو ڈرنا چاہئے وہ صرف وہی قوت ہوتی ہے جو نفع اور نقصان پہنچانے پر قادر ہو اور نفع اور نقصان دینے والی قوت صرف اللہ کی قوت ہے۔ اور ایک مومن صرف اللہ سے ڈرنے والا ہوتا ہے۔ اور جب تمام اہل ایمان صرف اللہ سے ڈرنے والے بن جائیں تو وہ سب قوتوں کے مقابلے میں قوی تر ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کے مقابلے میں دنیا کی کوئی قوت ٹھہر نہیں سکتی۔ نہ شیطانی قوت اور نہ شیطان کے دوستوں کی قوت فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ "پس تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرو' اگر تم مومن ہو۔" ......................

○.....☆☆☆.....○

اب اس سلسلے میں آخری نتیجہ اور آخری نچوڑ پیش کیا جاتا ہے۔ روئے سخن حضور اکرم ﷺ کی طرف کر کے بطور تسلی اور دلجوئی کہا جاتا ہے کہ آپ پریشان نہ ہوں' اور آپ اس بات کا غم نہ کھائیں کہ یہ اہل کفر کفر والحاد کی جانب بہت تیزی سے جا رہے ہیں۔ اور وہ اس کفر میں اس قدر تیز ہیں کہ گویا وہ کسی دوڑ کے مقابلے میں ہیں' کہا جاتا ہے کہ ذرا ان کی اس حرکت پر غور کرو کہ اس سے اللہ تعالیٰ کو نقصان کیا ہے؟ یہ تو خود ان کے لئے ایک مصیبت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مصیبت ان کی قسمت میں لکھ دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ کیا کریں گے اور کیا کیا کفر کرنے والے ہیں؟ اس لئے اس سے پہلے ہی یہ فیصلہ کر دیا کہ اچھا تم آخرت میں محروم ہو گے۔ اس لئے انہیں اس نے ان کے حال ہی پر چھوڑ دیا اور وہ ہدف کفر ہی کی طرف بڑی سارعت سے بڑھتے رہے۔ ان کے سامنے راہ ہدایت بھی واضح تھی' لیکن انہوں نے اپنے اختیار تمیزی کو استعمال کرتے ہوئے کفر کی راہ کو اپنایا۔ اس لئے انہیں ان کے حال ہی پر چھوڑ دیا گیا۔ اور ان کو مزید مہلت دی گئی کہ وہ خوب گناہ سمیٹ لیں زیادہ سے زیادہ۔ یہ مہلت ان کو وقت کے لحاظ سے بھی دی گئی اور خوشحالی کی صورت میں بھی دی گئی۔ لہذا یہ مہلت اور یہ خوشحالی ان کے لئے گویا بطور انجام کار ایک وبال اور مصیبت ہے۔ یہ حصہ آیات اس پر ختم ہوتا ہے کہ ان تمام

واقعات کی پشت پر کیا حکمت تھی؟ یہ کہ مومنین کو کیوں ابتلا میں ڈالا گیا' اہل کفر کو کیوں اس قدر مہلت دی جارہی ہے۔ یہ اس لئے کہ پاک لوگ گندے لوگوں سے الگ چھٹ کر رہ جائیں۔ اور یہ پاکیزگی اور تطہیر کامل آزمائش اور ابتلا ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ رسول کی بات کو بذریعہ آزمائش ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ وہ تو غیب ہے اور غیب کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ لوگوں کو اس کا پتہ نہیں ہوتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ مناسب سمجھا کہ ایک مناسب طریقہ کار کے مطابق غیب کا اظہار اہل ایمان پر ہو جائے' اہل ایمان کو دلوں کا حال معلوم ہو جائے' پاک لوگ گندے عناصر سے الگ ہو جائیں ہیں اور اللہ پر ایمان لانے والے' قطعی اور یقینی طور پر میدان میں آجائیں۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰي مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَي الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

(اے پیغمبر) جو لوگ آج کفر کی راہ میں بڑی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں ان کی سرگرمیاں تمہیں آزردہ نہ کریں' یہ اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے' اور بالآخر ان کو سخت سزا ملنے والی ہے۔ جو لوگ ایمان کو چھوڑ کفر کے خریدار بنے ہیں وہ یقیناً اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر رہے ہیں' ان کے لئے دردناک عذاب تیار ہے۔ یہ ڈھیل جو ہم انہیں دیئے جاتے ہیں اس کو یہ کافر اپنے حق میں بہتری نہ سمجھیں' ہم تو انہیں اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بار گناہ سمیٹ لیں' پھر ان کے لئے سخت ذلیل کرنے والی سزا ہے۔

اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم لوگ اس وقت پائے جاتے ہو۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔ مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم لوگوں کو غیب پر مطلع کر دے۔ (غیب کی باتیں بتانے کے لئے تو) اللہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔ لہٰذا (امور غیب کے بارے میں) اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھو۔ اگر تم ایمان اور خدا ترسی کی روش پر چلو گے تو تم کو بڑا اجر ملے گا۔"

غزوۂ احد کے واقعات کا یہ بہترین اختتامیہ ہے۔ اس لئے کہ اس غزوہ میں مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے تھے اور اس جنگ

میں کفار کو فتح اور غلبہ نصیب ہوا تھا۔ حق و باطل کی کشمکش میں ہمیشہ یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے اور اہل حق کے دلوں میں یہ بات ہمیشہ کھٹکتی ہے یا بعض اوقات کامیابی کی خواہش دلوں میں ابھرتی رہتی ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں حق کو کامیاب ہی ہونا چاہئے اور اگر کسی جگہ حق کو شکست ہو جس طرح احد میں اور کفر و باطل کو فتح و ظفر نصیب ہو تو یہ کیوں ہوتی ہے؟

یہ جھوٹا شبہ ہوتا ہے اور ہمیشہ دلوں میں انتشار رہتا ہے۔ اور انسان کی خواہش کامیابی اسے مسلسل دبا رہی ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اے رب! حق کو شکست اور باطل کو فتح کیوں ہوتی ہے؟ اہل حق مصائب میں مبتلا ہو رہے ہیں اور اہل باطل نجات پا رہے ہیں اور کامیاب ہو رہے ہیں اور اس طرح کیوں نہیں ہوتا کہ جب بھی حق و باطل کی باہم کشمکش ہو تو حق کو فتح نصیب ہو اور وہ غلبہ اور غنیمت لے کر واپس ہو؟ کیا حق اور سچائی اس بات کی مستحق نہیں ہے کہ اسے فتح نصیب ہو اور باطل کے لئے یہ قوت اور یہ رعب کیوں ہے کہ حق کے ساتھ ٹکراؤ میں اسے ایسی کامیابیاں ہوتی ہیں جس سے اہل حق کے دلوں میں فتنے پیدا ہوتے ہیں اور ان کے دل متزلزل ہو جاتے ہیں۔

اور یہ سوالات عملاً اس وقت سامنے آئے جب احد کے دن اہل ایمان نے نہایت ہی تعجب اور سراسیمگی میں یہ سوال کیا کہ **اَنّٰى هٰذَا؟** .......... "یہ کیسے ہو گیا"..... لہٰذا اس آخری اختتامیہ میں اس کا آخری جواب دیا جاتا ہے۔ آخری اور فیصلہ کن بات کر دی جاتی ہے اور یوں اللہ تعالیٰ پریشان دلوں کو سکون فراہم فرما دیتے ہیں اور اس پہلو سے جو بڑا وسوسہ بھی دلوں کے اندر راہ پاتا ہے' اسے صاف کر دیا جاتا ہے۔ اللہ کی سنت کا بیان ہوتا ہے۔ اللہ کی سنت کے تحت اس کی تقدیروں کا بیان ہوتا ہے اور پھر ان تمام سنن اور تقدیروں کے پیچھے جو اس کی وسیع تر تدبیر اور حکمت کارفرما ہوتی ہے' وہ بھی بتا دی جاتی ہے اور یہ حکمت کل بھی تھی' آج بھی ہے اور کل بھی ہوگی۔ اور ہر اس جگہ ہوگی جہاں حق و باطل کی کشمکش ہو اور احد جیسے نتائج نکلیں۔

دنیا کے کسی معرکے سے باطل کا فتح مندی کے ساتھ نکل کر چلا جانا اور ایک وقت کے لئے اس کا پھول جانا اور طاقتور نظر آنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ بس اللہ تعالیٰ نے اسے کھلی چھٹی دے دی ہے۔ یا یہ کہ وہ اس قدر طاقتور ہو گیا ہے کہ اس پر اب غلبہ نہیں پایا جا سکے گا یا یہ کہ باطل ہمیشہ کے لئے حق کے لئے معنری رہے گا۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح کسی معرکے میں سچائی کا شکست اور مصائب میں مبتلا ہو کر نکلنا یا سچائی کا کسی دور میں ضعف کا شکار ہو جانا' اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ کوئی ناانصافی فرما رہے ہیں یا اللہ نے حق کو بھلا دیا یا اس نے باطل کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ سچائی کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر تباہ کر دے۔

یوں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ تو اللہ کی گہری حکمت اور تدبیر ہوتی ہے جو ہر جگہ پر اپنا کام کر رہی ہوتی ہے۔ کبھی حکمت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ باطل کو مہلت دی جائے اور وہ اپنی آخری سرحد تک پہنچ جائیں۔ وہ اپنے تمام برے نتائج ظاہر کریں' وہ لوگوں پر ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیں اور آخر کار وہ اس بات کے مستحق ہو جائیں کہ ان پر سخت سے سخت حملہ کیا جائے اور پھر حق کو آزمائش میں اس لئے ڈالا جاتا ہے کہ حق و باطل کے درمیان فرق ہو جائے۔ طیب اور خبیث کے اندر امتیاز ہو جائے' اور ان آزمائشوں میں جو لوگ ثابت قدم رہیں انہیں عظیم اجر ملے اور وہ ممتاز مقام کے مستحق ہو جائیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ صورت حال سچائی کے لئے کمائی ہے اور باطل کے لئے خسارہ ہے۔ ادھر یہ کمائی زیادہ سے زیادہ ہو رہی ہو تو ادھر خسارہ زیادہ سے زیادہ ہو رہا ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَھُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِھِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَھُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ

"اے پیغمبر جو لوگ کفر کی راہ میں بڑی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں ان کی سرگرمیاں تمہیں آزردہ نہ کریں۔ یہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکیں گے۔ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے' اور بالآخر ان کو سخت سزا ملنے والی ہے۔"

یہ نبی ؐ کے لئے تسلی ہے' اس کے ذریعہ آپ کے غبار خاطر کو دور کیا جارہا ہے جو آپ کے دل پر ان واقعات کی وجہ سے تھا۔ آپ اس سے بے حد دلگیر تھے کہ جو لوگ کفر میں غلاٖی کر رہے ہیں وہ کفر میں سرپٹ بھاگے جارہے ہیں۔ وہ نہایت سرعت کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ گویا ان کے لئے کوئی ہدف مقرر ہے اور انہوں نے اسے حاصل کرنا ہے۔

یہ ایسے الفاظ ہیں اور ایسی تعبیر ہے' جن کے ذریعہ ان کی حقیقی نفسیاتی حالت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اکثر اوقات نظر آتا ہے کہ بعض لوگ کفر میں سخت متشدد ہوتے ہیں۔ وہ باطل' شر اور اللہ کی نافرمانی کو اپنا نصب العین بنا لیتے ہیں۔ اس طرح کہ گویا انہوں نے اس کے مقابلے میں گول تک پہنچنا ہے۔ اس لئے ایسے لوگ نہایت قوت' نہایت جرأت اور نہایت ہی تیزی سے آگے بڑھتے ہیں' بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید پیچھے سے انہیں کوئی دھکیل رہا ہے کہ آگے بڑھو یا آگے سے کوئی انہیں پکار رہا ہے کہ جلدی پہنچو یہ ہے تمہارا انعام۔

آپ کا یہ غبار خاطر اور رنج و غم اللہ کی اس مخلوق کے لئے تھا۔ آپ حسرت سے انہیں دیکھتے تھے کہ یہ لوگ آتشیں چڑھائے آگ کی طرف تیزی سے گامزن ہیں اور آپ وہ قوت نہیں پا رہے کہ انہیں بزور بازو روک دیں۔ یہ لوگ خدا کی طرف سے بار بار کے ڈراوے کی طرف بھی کان نہیں دھرتے۔ پھر آپ اس سے بھی پریشان ہوتے کہ یہ لوگ جو آستیں چڑھائے جہنم کی طرف سرپٹ دوڑ رہے ہیں' وہ صرف اپنے آپ ہی کو مصیبت میں مبتلا نہیں کر رہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اہل اسلام کے لئے بھی رنج و الم اور درد دکھ کا باعث بن رہے ہیں۔ یہ لوگ دعوت اسلامی کو بھی دکھ دے رہے ہیں اور جمہور کے اندر اس کے پھیلاؤ کو بھی روک رہے ہیں۔ اس لئے کہ جمہور عرب یہ دیکھ رہے تھے کہ مدینہ اور مکہ کی معرکہ آرائی کا انجام کیا ہوتا ہے تاکہ وہ بھی اس صف میں شامل ہو جائیں جس کا مستقبل روشن ہو۔ جب قریش مسلمان ہو گئے اور انہوں نے سر تسلیم خم کر لیا تو تمام لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو گئے۔ اور اس بات میں شک نہیں کہ اس صورت حال کی وجہ سے رسول خدا ﷺ کے دل پر اثرات تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول خدا ﷺ کو مطمئن کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ آپ کو تسلی دی گئی اور آپ کے غبار خاطر کو دور کیا گیا۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ ۚ إِنَّهُمْ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ۗ

"اے پیغمبر جو لوگ آج کفر کی راہ میں بڑی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں ان کی سرگرمیاں تمہیں آزردہ نہ کریں۔ یہ اللہ کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔"..... یہ کمزور بندے اس جوگے نہیں ہو سکتے کہ وہ اللہ کو کوئی نقصان پہنچائیں۔ اور یہ بات محتاج بیان ہی نہیں ہے' اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ نظریاتی جنگ نظریاتی رہے اور مشرکین کے ساتھ معرکہ اپنی جگہ رہے۔ اور یہ خود اس کی جنگ اور اس کا معرکہ رہے۔ اس لئے رسول ؐ خدا کے کندھوں سے اس ذمہ داری کو اٹھا لیا جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی بھی یہ ذمہ داری نہیں رہتی کہ وہ لوگوں کے نظریات تبدیل کرنے کے پابند ہوں۔ جو لوگ کفر کے اندر تیزی دکھا رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ کے ساتھ جنگ لڑ رہے ہیں۔ اور اللہ کے ساتھ اس جنگ میں انہیں ہرگز کامیابی نہیں ہو سکتی' اس لئے کہ وہ اس ذات باری کے مقابلے میں بہت ہی ضعیف ہیں۔ لہذا وہ دعوت اسلامی کو مآل کار کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ اور اس سے یہ نتیجہ خود بخود نکل آتا ہے کہ وہ ان حاملین دعوت اسلامی کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے ہیں جنہیں وہ اس وقت شکست خوردہ سمجھتے ہیں۔ چاہے جس قدر بھی وہ سرعت دکھائیں اور جس قدر بھی وہ اہل دعوت کو اذیتیں دے دیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے انہیں یہ کھلی چھٹی کیوں دے رکھی ہے کہ وہ کامیابی کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جائیں اور اپنے

غلبہ کی وجہ سے پھولے نہ سمائیں۔ حالانکہ وہ اللہ کے برابر راست ... ہیں۔ اس لئے کہ اللہ نے ان کے لئے نہایت ہی برا اور نہایت ہی رسوا کن انجام تیار کر رکھا ہے۔ يُرِيدُ اللَّهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْآخِرَةِ ............................

"اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے۔" اللہ یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنا تمام سرمایہ یہاں ہی ختم کر دیں اور اپنے تمام گناہوں کو اٹھائے ہوئے ہوں اور آخرت میں تمام عذاب کے سزاوار ہو جائیں اور یہ کفر کی راہ میں تیزی سے آگے بڑھ کر اپنی آخری منزل تک پہنچ جائیں۔ اس لئے کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ............ "ان کے لئے بڑا عظیم عذاب ہے۔"

اور ان لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس شرمناک انجام کا ارادہ کیوں کر لیا ہے؟ اس لئے کہ انہوں نے خود اپنی مرضی سے ایمان کے بدلے کفر خرید کر اپنے آپ کو اس کا مستحق بنا لیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ

............ "جو لوگ ایمان چھوڑ کر کفر کے خریدار بنے ہیں وہ یقیناً اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے لئے دردناک عذاب تیار ہے۔" ایمان تک ان کے ہاتھ پہنچ سکتے تھے۔ ایمان کے دلائل اس پوری کائنات میں بکھرے پڑے ہیں۔ خود انسانی فطرت اور نفس کے اندر دلائل الایمان موجود ہیں۔ خود انسان کے عجیب و غریب جسم کے منصوبے کے اندر' اس میں باہم مکمل ہم آہنگی کے اندر' اس میں ودیعت کردہ فطرت انسانی کے اندر' اور پھر انسانی فطرت اور اس کے اس طبیعی وجود میں پائی جانے والی ہم آہنگی کے اندر' پھر اس میں اس کے خالق اور صانع کے وجود کا فطری شعور ودیعت کئے جانے کے اندر اور پھر اس شعور کی بہترین نفسیاتی اور طبیعی مزاج کے اندر دلائل ہی دلائل ہیں۔ اور ان دلائل کے علاوہ رسولوں کی دعوت بھی تو موجود رہی ہے اور ہے۔ یہ دعوت اپنی اس فطری حالت میں موجود ہے جسے انسانی فطرت قبول کرتی ہے۔ اور اس فطرت اور اس دعوت رسل کے اندر پھر حسین ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور یہ دعوت لوگوں کی ضروریات اور ان کی زندگی کے لئے مکمل صلاحیت رکھتی ہے۔

ہاں' ایمان ان کے سامنے مکمل طور پر موجود تھا' ان کی دست رس میں تھا' انہوں نے اور انہوں ہی نے راہ ایمان کو چھوڑ کر کفر کی راہ خرید لی۔ اور یہ کام انہوں نے اچھی طرح جانتے بوجھتے کیا۔ اس لئے وہ اس بات کے مستحق ہو گئے کہ اللہ انہیں اس حال میں چھوڑ دے کہ وہ کفر کی راہ پر سرپٹ دوڑیں تاکہ وہ اپنا پورا سرمایہ حیات اس راہ میں لگا دیں اور ان کے لئے ثواب آخرت میں کوئی حصہ نہ رہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ وہ اللہ کو کوئی نقصان دے سکیں۔ اس لئے کہ وہ مکمل طور پر گمراہ ہو گئے ہیں اور ان کے پاس سچائی کی معمولی مقدار بھی نہیں رہی ہے۔ اور گمراہی کے حق میں اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل اور کوئی طاقت نازل ہی نہیں کی ہے۔ اس لئے اپنی حقیقت کے اعتبار سے باطل کے پاس کوئی قوت نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ اہل حق اور اہل دعوت اسلامی کو کبھی کوئی مضرت نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ ان کے پاس اگر کوئی قوت ہے بھی تو وہ بہت ہی کمزور اور نحیف ہے۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو پھولا کر دکھائے' اور وقتی طور پر مسلمانوں کو کسی شکست کی وجہ سے رنج و الم پہنچ جائے۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ............ "ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔" یہ اس قدر المناک ہو گا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور اس قدر رنج و الم وہ اس دنیا میں اہل اسلام کو نہیں دے سکتے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنْفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ

"جو ڈھیل ہم انہیں دے رہے ہیں اس کو یہ کفار اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں 'ہم تو انہیں اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بار گناہ سمیٹ لیں پھر ان کے لئے سخت ذلیل کرنے والی سزا ہے۔"

یہاں آکر اب بات اس عقدے پر پہنچ جاتی ہے جو بعض دلوں میں خلجان کا باعث بنا ہوا تھا۔ بعض دلوں میں یہ سوال پیدا ہو رہا تھا اور وہ خلجان جسے بعض لوگوں کی روح محسوس کر رہی تھی 'وہ دیکھ رہے تھے کہ بعض اللہ کے دشمن اور بعض سچائی کے دشمن مہلت پا رہے ہیں اور وہ عذاب الٰہی کی گرفت میں نہیں آرہے ہیں۔ بظاہر خوب کھاتے پیتے ہیں 'قوت 'حکومت اور مال و مرتبے سے بہرہ ور ہیں اور خود بھی فتنے میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ اور ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا میں بھی فتنہ سامانیاں کر رہے ہیں اور وہ اہل ایمان جن کے ایمان ضعیف ہیں 'وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں زمانہ جاہلیت کی طرح غیر مناسب تصورات اور خیالات رکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید اللہ تعالیٰ باطل 'شر' انکار حق 'کفر اور طغیان پر خوش ہوتا ہے 'نعوذ باللہ۔ اس لئے وہ اسے مہلت دیتا ہے اور ان کے لئے رسی ڈھیلی چھوڑتا ہے۔ وہ یہ بھی گمان کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ معرکہ حق و باطل میں کوئی مداخلت نہیں کرتے 'اس لئے وہ باطل کو اس کے لئے آزاد چھوڑتے ہیں کہ وہ حق کا سر پھوڑ دے اور اللہ اس کی نصرت و امداد کے لئے کچھ نہ کریں 'یا وہ یہ سمجھتے تھے کہ شاید یہ باطل ہی حق ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ اسے پھلنے' بڑھنے اور غالب ہونے نہ دیتے۔ یا وہ یہ سمجھتے تھے کہ باطل کا حق یہ ہے کہ وہ حق پر غالب آجائے اور جزیرۃ العرب کی پوزیشن یہی رہے۔ اور سچائی کے حق میں غلبہ نہیں ہے ورنہ کیوں اللہ اہل باطل 'ظالموں 'باغیوں اور مفسدوں کو یوں چھوڑ دے کہ وہ باطل میں سرگرم رہیں' کفر کی طرف شتابی سے بڑھیں 'طغیان میں سرگرداں رہیں اور یہ سمجھیں کہ وہ مستحکم ہو گئے ہیں اور اب کوئی قوت ان کے سامنے کھڑی نہیں ہو سکتی۔

یہ سب افکار باطلہ تھے۔ اللہ کے حق میں بری سوچ تھی۔ معاملہ ایسا نہ تھا اس لئے خود اللہ تعالیٰ اہل کفر کو متنبہ کرتے ہیں کہ ایسا ہرگز گمان نہ کرو۔ یہ جو اللہ تعالیٰ کی پکڑ تمہیں گھیرتی نہیں ہے حالانکہ وہ کفر میں تیزی دکھا رہے ہیں 'اور یہ کہ انہیں جو اس دنیا میں حظ وافر دیا جارہا ہے جس سے وہ لطف اندوز ہو رہے ہیں اور گمراہی میں آگے بڑھ رہے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ان کے لئے مزید فتنہ ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط اسکیم ہے اور یہ ان کے لئے ایک سخت آزمائش ہے کہ ان کی رسی ڈھیلی چھوڑی ہوئی ہے۔

**وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنْفُسِهِمْ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا**

............ "یہ ڈھیل جو ہم انہیں دیئے جاتے ہیں اس کو یہ کفار اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں 'ہم تو انہیں اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بار گناہ سمیٹ لیں۔ پھر ان کے لئے سخت ذلیل کرنے والی سزا ہے۔"

اگر وہ اس بات کے مستحق ہوتے کہ اللہ انہیں ان انعامات سے نکالے 'انہیں ایسی ابتلا میں ڈالے جو ان کی آنکھیں کھولنے والی ہو تو ضرور اللہ انہیں ایسی ابتلا میں ڈال دیتے 'لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ ان کے لئے کوئی بھلائی نہیں چاہتے۔ اس لئے کہ انہوں نے ایمان کے مقابلے میں کفر خرید لیا ہے۔ پھر وہ کفر کے میدان میں تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس لئے اب وہ اس بات کے مستحق ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس غفلت سے اور خواب خرگوش سے جگائے اور ابتلا میں ڈالے۔ یہ انعامات الٰہی اور سلطنت و قوت کے غرے میں ڈوبے ہوئے ہی بہتر ہیں۔ اس لئے **لَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ** ............ "ان کے لئے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔" اہانت آمیز عذاب ہے اور اس کے مقابلے میں اہل ایمان کے لئے بلند مقام 'مرتبہ اور انعامات ہوں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتلا بھی اللہ کی جانب سے ایک انعام ہوتا ہے اور یہ انعام بھی صرف اسی شخص پر ہوتا ہے جس کے لئے

اللہ نے خیر و فلاح کا ارادہ کیا ہو۔ اگر ابتلا اللہ کے دوستوں پر ہو تو اس میں ان کی کوئی بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اگرچہ اللہ کے ان دوستوں کے تصرفات کی وجہ ابتلا ابتداء آئی ہو اور ان کے اپنے اعمال کے نتیجے میں آئی ہو۔ بہرحال اس میں کوئی خفیہ حکمت کار فرما ہوتی ہے' کوئی نہایت ہی لطیف تدبیر ہوتی ہے اور اپنے دوستوں پر اللہ کا فضل و کرم مقصود ہوتا ہے۔

یوں دل اپنی جگہ ٹھہر جاتے ہیں' نفس انسانی مطمئن ہو جاتا ہے اور اسلام کے واضح اور سیدھے حقائق مسلمانوں کے تصور کا حصہ بن جاتے ہیں۔

اللہ کی حکمت کا یہ تقاضا تھا اور مسلمانوں کے ساتھ اللہ کی یہ ایک بڑی بھلائی تھی کہ اس نے انہیں چھانٹ کر ان منافقین سے علیحدہ کر دیا جو ان کی صفوں میں گھسے ہوئے تھے اور ان کے آنے کے مختلف اسباب تھے۔ وہ اس لئے نہیں آئے تھے کہ انہیں اسلام کے ساتھ کوئی محبت یا دلچسپی تھی بلکہ وہ مختلف حالات کی وجہ سے اسلامی صفوں میں گھس آئے تھے۔ اس لئے اللہ نے مسلمانوں کو احد میں ابتلا میں ڈالا اور یہ ابتلا بھی خود ان کی اپنی سوچ اور ان کے بعض اپنے کاموں کی وجہ سے ان پر آئی' لیکن اس میں حکمت یہ تھی کہ مجاہدین راہ حق کی صفوں میں سے خبیث اور طیب کے درمیان تمیز ہو جائے۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَي الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ

"اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم لوگ اس وقت پائے جاتے ہو' وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔ مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم لوگوں کو غیب پر مطلع کر دے۔ (غیب کی باتیں بتانے کے لئے تو) اللہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔ لہٰذا (امور غیب کے بارے میں) اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھو۔ اگر تم ایمان اور خدا ترسی کی روش پر چلو گے تو تم کو بڑا ہی اجر ملے گا۔"

یہاں یہ آیت قطعی طور پر یہ فیصلہ کر دیتی ہے کہ اللہ کی شان یہ نہیں ہے' اس کی الوہیت کا تقاضا یہ نہیں ہے اور اس کی اس کائنات میں مروجہ سنت یہ نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی صفوں میں منافقین کو اسی طرح چھپے ہوئے چھوڑ دے۔ حالت یہ ہے کہ منافقین بس دعوائے ایمان کریں' اسلام کا اظہار کریں اور اسلامی صفوں میں چھپے رہیں حالانکہ ان کے دل ایمان کی تروتازگی سے خالی ہوں' اور ان میں اسلام کی روح سرے سے نہ ہو۔ اس امت کو اللہ نے اس لئے برپا کیا ہے کہ وہ اس کائنات میں ایک عظیم کردار ادا کرے۔ ایک عظیم نظام زندگی کا علم لے کر اٹھے' اس زمین پر ایک منفرد صورت حال پیدا کر دے۔ ایک جدید نظام وجود میں آجائے۔ اس مشن اور عظیم نصب العین کا تقاضا یہ تھا کہ وہ پوری یکسوئی' پوری صفائی اور پوری تمیز کے ساتھ اس نصب العین کو پختہ طریقے سے پکڑے اور یہ تقاضا بھی تھا کہ اس کی صفوں کے اندر کوئی خلل اور کوئی کمزوری نہ ہو' اس کی بنیادوں میں کوئی کمزوری نہ ہو اور مختصر الفاظ میں یوں کہ ان مقاصد کا تقاضا تھا کہ یہ امت اس قدر عظیم ہو جس قدر اس کا یہ نصب العین عظیم ہے۔ جس نصب العین اور جس ٹارگٹ تک اسے اس کائنات میں پہنچنا ہے۔ اور آخرت کا بلند مقام و مرتبہ تو بہرحال ان کے لئے اللہ نے تیار کیا ہوا ہے۔

ان سب باتوں کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی صف ہر وقت جاگتی رہے تاکہ اس سے خبیث عناصر نکل جائیں۔ وہ کلر کنوں پر اس قدر دباؤ

رکھے کہ جو اینٹ کچی ہو' وہ پہلے دن ہی بیٹھ جائے۔ اور ان پر ہروقت روشنی پڑتی رہے تاکہ اندرونی کمزوریاں اور ضمیر کے اندر برے خیالات کی تطہیر ہوتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے بھی ان کی صفوں کو صاف کرنے کے لئے ان کی امداد فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کی شان کے یہ لائق نہ تھا کہ وہ اپنے دوستوں کی صفوں میں ایسے ناپاک لوگوں کو رہنے دے۔

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ بھی نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو غائبانہ باتوں کا براہ راست علم دے دے۔ اس لئے کہ غیب کا علم تو صرف اللہ کے شایان شان ہے۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے جس پر انہیں پیدا کیا گیا ہے' اس بات کے اہل نہیں ہیں کہ وہ غیبی اطلاعات کا ادراک کر سکیں۔ انسانی جسم کی مشینری جو ان کے اندر تخلیق ہوئی ہے وہ اس اسکیم کے مطابق تیار ہی نہیں کی گئی کہ وہ غائبانہ امور کا ادراک کر سکے۔ الا یہ کہ کوئی خاص مقدار اللہ کسی کو دے دے۔ اور یہ بھی خصوصی حکمت کے تحت ہوا کرتا ہے۔ یعنی اس قدر جس قدر اس دنیا میں ان کے خلافت فی الارض کے مقاصد کے لئے ضروری ہو۔ اور اس مقصد یعنی انسان کے وظیفہ خلافت فی الارض کے لئے علم غیب کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کی اس موجودہ مشینری پر علم غیب کے دروازے کھول دے تو یہ مشینری ختم ہو کر رہ جائے' اس لئے کہ وہ علوم غیب کے اخذ کے لئے سرے سے تیار ہی نہیں ہے۔ صرف اس قدر غیب کا علم اسے درکار ہوتا ہے جس میں اس کی روح کا ملاپ اس کے خالق کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کا وجود' وجود کائنات سے مل جاتا ہے۔ علم غیب پر اطلاع پانے کا کم سے کم نقصان تو یہ ہو گا وہ ہاتھ پاؤں ہلانا چھوڑ دے گا' ہروقت ان نتائج کے بارے میں سوچتا رہے گا جو واقع ہونے والے ہیں' اور وہ اس زمین میں کسی قسم کی ترقی کے لئے سوچ بھی نہ سکے گا۔

یہی وجہ ہے کہ یہ بات اللہ کے شایان شان نہ تھی کہ وہ لوگوں کو علم غیب کی اطلاع دے دے اور نہ یہ اس حکمت اور اسکیم کے مطابق تھی جس کے مطابق وہ اس زمین کو چلا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ پس اللہ خبیث کو طیب سے کیسے جدا کرتا ہے؟ اور اس کی سنت اور اس کی شان اس تطہیر کے عمل میں کس طرح کام کرتی ہے؟ اور کس طرح اسے چھانٹ کر رکھ دیتی ہے؟ وہ کس طرح غبار اور دھند کو دور کرتا ہے؟ کس طرح منافقین کو الگ کر کے اسلامی صفوں کو پاک کرتا ہے تاکہ مسلمان اس کرۂ ارض پر اپنا کردار ادا کر سکیں جس کے لئے مسلمانوں کو بطور امت برپا کیا گیا ہے۔

وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ......... "اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔" اللہ تو کھرے کو کھوٹے سے اس طرح جدا کرتا ہے کہ اس نے رسولوں کو بھیجا' کوئی ان پر ایمان لایا اور کسی نے ان سے انکار کیا۔ اور رسالت کے تقاضے پورے کرنے کے لئے سلسلہ جہاد فرض کیا گیا۔ اور جہاد کے اندر لوگوں کو آزمائشوں میں ڈال کر آزمایا گیا' ان تمام اقدامات سے شان الٰہی ظہور میں آتی ہے۔ یوں اللہ کی سنت کام کرتی ہے اور یوں کھرا کھوٹے سے الگ ہو جاتا ہے۔ دلوں کی تطہیر ہو جاتی ہے نفوس پاک ہو جاتے ہیں اور اللہ کی تقدیر میں جو ہوتا ہے وہ ظاہر ہوتا ہے۔

اس طرح اللہ کی حکمت کے ایک حصے سے پردہ اٹھتا ہے۔ یہ حکمت زندگی میں حقیقت بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ حکمت ایک مضبوط بنیاد پر' کھلے بندوں' روشن ستارے کی طرح زمین پہ استقرار حاصل کرتی ہے..... اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے جو روشن ہوتی ہے' جو واضح ہوتی ہے' جو سادہ اور قابل فہم ہوتی ہے' اب اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے اندر حقیقی ایمان پیدا کریں اور پھر اس حقیقی ایمان کے تقاضے پورے کریں اور انہیں بتایا جاتا ہے کہ آخرت میں ایک فضل عظیم ہے جو ان کا منتظر ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ..........................

"اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ اگر تم ایمان لاؤ اور خدا ترسی کی روش پر چلو تو تم کو بڑا اجر ملے گا۔"...... واقعات احد کے بیان اور اس کے بعد ان واقعات پر تبصروں اور تنقیدوں کے بیان کے بعد یہ بہترین ہدایت اور مشورہ ہے جو اہل ایمان کو دیا گیا ہے۔

○..... ☆☆☆ ..... ○

جنگ احد کے بارے میں قرآن کریم نے جو تبصرہ کیا ہے' اس میں بعض نہایت ہی اہم اور عظیم حقائق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ان تمام حقائق کو گنوا دیا جائے اور یہاں ان کے بارے میں پوری تفصیلات دی جاسکیں' لیکن مناسب ہے کہ ان حقائق میں سے جو زیادہ عمومی اور شامل اور زیادہ ظاہر ہیں ان کی طرف اشارہ کر دیا جائے تاکہ ان اشارات پر وہ تمام واقعات قیاس کر لئے جائیں جو اس غزوہ میں پیش ہوئے' جیسا کہ قرآن کریم نے انہیں عبرت کے طور پر پیش کیا ہے۔

۱۔ اس معرکے اور اس پر ہونے والے اس طویل تبصرے نے ایک بنیادی حقیقت کو بالکل کھول کر بیان کر دیا ہے کہ یہ دین جو درحقیقت انسانوں کے لئے ایک نظام زندگی ہے' اس کا اصل مزاج کیا ہے اور وہ انسانوں کی زندگیوں کے اندر کس طرح کام کرتا ہے۔ یہ نہایت ہی اساسی اور سادہ اور قابل فہم حقیقت ہے لیکن بسا اوقات اسے بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا ابتداء" ہی اس کا ادراک نہیں کیا جاتا اور اس کے بھول جانے اور اس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے اس دین کی فہم میں فاش غلطیاں کی جاتی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اس دین کی حقیقت کے سمجھنے میں بھی غلطی کی جاتی ہے بلکہ اس کی تاریخ کو سمجھنے میں بھی غلطی کی جاتی ہے اور انسانی زندگی میں اس نے جو کردار ادا کیا یا کرتا ہے یا آئندہ کرے گا اس کے سمجھنے میں بھی نہایت ہی فاش غلطی ہوتی ہے۔

ہم میں سے بعض لوگ یہ توقع رکھتے ہیں کہ دین اسلام جو انسانی زندگی کے لئے خدا کا تجویز کردہ نظام ہے' اسے معجزانہ طور پر کام کرنا چاہئے۔ اس میں اس کے انسانی مزاج' اس کی فطری قوت اور کسی وقت میں موجود مادی صورت حال کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے' چاہے انسان وہ ترقی کے کسی درجے میں ہوں' اور جس معاشرے اور ماحول میں بھی ہوں۔

جب یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ اسلام اس معجزانہ اور ساحرانہ انداز میں کام نہیں کرتا بلکہ اسلام لوگوں کی بشری طاقت کے مطابق کام کرتا ہے اور یہ انسانی محدود قوت اور انسان کی اصل بنیادی صورت حال باہم گرمل کر کام کرتے ہیں۔ بعض اوقات انسان اور اس وقت کی موجود صورت حالات اسلامی نظام سے واضح طور پر متاثر ہو جاتے ہیں' اور یا یہ دونوں مل کر لوگوں کی جانب سے اسلام کی جانب ردعمل کو متاثر کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان دونوں کے اثرات اسلام کے خلاف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے لوگ کیچڑ کی طرح بھاری کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کی نظروں میں لالچ' لذت اور شہوت اس قدر اہم ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام کے پیغام کے قبول کرنے کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے اور لوگ اسلامی سمت میں نہیں چلتے۔ جب یہ لوگ ایسی صورت حال دیکھتے ہیں تو وہ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ صورت حال ایسے لوگوں کی توقعات کے خلاف ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ دین اللہ کی جانب سے ہوتا ہے..... اور بعض اوقات وہ اس بات میں شبہ کرنے لگتے ہیں کہ آیا یہ دین فی الواقعہ لوگوں کے لئے کوئی مکمل نظام حیات ہے بھی اور اس سے بھی آگے بڑھ کر بعض لوگ سرے سے اس دین کی حقانیت میں شک کرنے لگتے ہیں۔

فکر و عمل کی ان غلطیوں کی بنیاد صرف ایک غلطی پر ہے۔ وہ یہ کہ ایسے لوگوں نے اس دین کے مزاج ہی کو نہیں سمجھا۔ اس کے طریقہ کار ہی کو نہیں سمجھا' یا وہ اس حقیقت کو سمجھ کر بھول گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دین انسانی زندگی کے لئے ایک منہاج ہے۔ اور اس کا انسانی زندگی کے اندر قیام خالص انسانی جدوجہد پر موقوف کیا گیا ہے۔ اور اس جدوجہد کو انسانی طاقت کے اندر محدود کیا گیا ہے۔ اور اس دین پر عمل پیرا ہونے کا آغاز وہاں سے کیا جاتا ہے

جہاں انسان اپنی مادی زندگی کی ترقی کے مدارج میں سے جس درجے میں موجود ہو' یہ دین انہیں جہاں پاتا ہے وہاں سے لے کر آگے چلتا ہے۔ اور انہیں اپنے آخری انجام تک پہنچاتا ہے۔ اور یہ سب کام انسان کی طاقت اور وسعت کے حدود میں کیا جاتا ہے۔ اور وہاں تک وہ انہیں آگے بڑھاتا ہے جس قدر ان کے اندر طاقت اور وسعت ہو اور جہاں تک وہ پہنچ سکتے ہوں اور پہنچنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہوں۔

اس کام میں اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک لحظہ بھی اس کام سے غفلت نہیں کرتا۔ کسی منصوبے میں غفلت نہیں کرتا۔ کسی اقدام میں غفلت نہیں کرتا۔ اور فطرت انسانی کے مطابق کام کرتا ہے' انسانی طاقت کے حدود کے اندر رہتے ہوئے کام کرتا ہے۔ انسان مادی اعتبار سے جہاں تک ترقی یافتہ ہو اس کے مطابق کام کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اسے اس مقام تک لے جاتا ہے جہاں تک وہ ابھی تک نہیں پہنچ پایا تھا اور تاریخ انسانی میں انسان کے وضع کردہ تمام نظامہائے زندگی کے ادوار میں سے کسی دور میں بھی نہیں پہنچ پایا تھا۔ اسلام نے اپنے یہ کمالات عملاً اس وقت دکھائے ہیں جب کبھی بھی ایک مختصر وقت کے لئے اسے نافذ کیا گیا اور آئندہ بھی وہ ایسا ہی کر کے دکھائے گا بشرطیکہ سچی کوشش اس کے نفاذ کی کی جائے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ غلطی کا آغاز اس دین کے مزاج کو نہ سمجھنے یا سمجھ کر اسے بھلا دینے کی وجہ سے ہوا ہے جس طرح ہم نے کیا۔ اور ہم نے نفاذ دین کے لئے معجزانہ اور ساحرانہ انقلاب کا انتظار شروع کر دیا' جو انسانی صورت حال کے مناسب نہیں ہے' جس سے فطرت انسانی بدل جاتی ہے' اور جس سے اسلام کا مزاج بدل جاتا ہے۔ اور یہ طریقہ کار اس کی فطرت حقیقی سے لگا نہیں کھاتا۔ اس کی استعداد اور اس کے رجحانات کے بھی خلاف ہے اور جو انسان کے مادی حالات کے بھی خلاف ہیں۔

کیا اسلام من جانب اللہ نہیں ہے؟ کیا وہ ایسی قوت قادرہ کی طرف سے ارسال کردہ نہیں ہے جسے کوئی قوت عاجز نہیں کر سکتی؟ تو پھر اسلام کے نفاذ کو کیوں انسانی طاقت کے حدود پر موقوف کر دیا گیا ہے اور کیوں اسے انسانی جدوجہد کا محتاج کیا گیا ہے؟ پھر کیوں ایسا نہیں ہوتا کہ انسان اس کے لئے کام کریں اور وہ ہمیشہ غالب ہی ہوں؟ کیوں اسلامی لوگ ہمیشہ کامیاب نہیں رہتے؟ انسان کی خواہشات نفسانیہ' ان کا مزاج اور اس کی مادی صورت حال کیوں اس پر غالب آجاتی ہیں اور کبھی ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اہل حق شکست فاش کھاتے ہیں حالانکہ وہ اہل حق ہوتے ہیں؟

یہ تمام سوالات جیسا کہ ہم نے بیان کیا حقیقی سوالات ہیں اور یہ اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ ہم نے اس دین کے اصل مزاج ہی کو نہیں سمجھا ہے باوجود اس کے کہ اس دین کا مزاج اور اس کا طریق کار نہایت ہی سادہ ہیں یا ہم نے انہیں سمجھتے ہوئے بھلا دیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور وہ انسانی فطرت کو بھی تبدیل کر سکتا ہے۔ چاہے وہ فطرت انسانی کو اس دین کے ذریعہ بدلے یا اس کے لئے کوئی اور طریق کار اختیار کرے اور وہ اس بات پر بھی قادر تھا کہ وہ ابتدائے آفرینش سے انسان کو کسی دوسری فطرت پر پیدا کرتا۔ لیکن اس کی مشیت یہ تھی کہ وہ انسان کو اس کی موجودہ فطرت ہی پر پیدا کرے۔ اور اللہ تعالیٰ نے پسند کیا کہ انسان کو ذی ارادہ بنائے اور اس کے اندر ہدایت و ضلالت قبول کرنے کی صلاحیت ہو۔ اور اس کی مشیت یہ بھی تھی کہ ہدایت کو انسان کی جدوجہد اور اس کی جانب سے طلب ہدایت اور اس کی استعداد و قبولیت پر موقوف کر دیا جائے۔ پھر اللہ کی مشیت نے چاہا کہ انسانی فطرت ہمیشہ کام کرتی رہے اور اسے کسی صورت میں بھی مٹایا نہ جا سکے' نہ تبدیل کیا جا سکے اور نہ معطل کیا جا سکے اور اس کی مشیت یہ بھی تھی کہ اسلامی نظام زندگی کو اس کرۂ ارض پر بذریعہ انسانی جدوجہد قائم کیا جائے اور انسانی طاقت اور وسعت کے حدود کے اندر قائم کیا جائے۔ اور یہ بھی مشیت الہٰی کا ایک حصہ تھا کہ انسان کو وہی کچھ ملے جس قدر وہ اپنی وسعت کے مطابق جدوجہد کرے۔ اس کی زندگی کے شب

دروز کے مطابق اور جو صورت حال فی الواقعہ موجود ہو اس کے دائرے میں۔

انسانوں میں سے کسی کے لئے یہ حق نہیں ہے کہ وہ پوچھے اللہ نے ایسا کیوں چاہا۔ جب تک انسان بندہ اور خدا اللہ ہے اس لئے کہ انسان کے پاس اس کائنات کے نظام کا کل علم نہیں ہے اور نہ اس علم تک بھی انسان کے پہنچنے کا امکان ہے۔ نہ انسان کو یہ علم دستیاب ہو سکتا ہے کہ اس کائنات کے ہر موجود کے حوالے سے نظام کائنات کے تقاضے کیا ہیں اور یہ کہ انسان کی موجودہ فطرت کی منصوبہ بندی اور تشکیل کے پیچھے کیا کیا حکمت کارفرما ہے۔ اس لئے ایسے مقامات پر ایک سچا مسلمان یہ سوال کر ہی نہیں سکتا کہ کیوں؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایک سنجیدہ ملحد بھی یہ سوال نہیں کر سکتا کہ کیوں؟ مومن تو اس لئے نہیں کر سکتا کہ اسے بارگاہ اللہ میں بڑا باادب ہونا چاہئے اس لئے کہ اس کا دل ذات باری کی حقیقت اور اس کی صفات سے واقف ہوتا ہے اور اسے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ انسانی ادراک کا یہ میدان عمل ہی نہیں ہے۔ اور کافر اس لئے یہ سوال نہیں کرتا کہ وہ سرے سے خدا کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اگر سے ذات باری کی معرفت ہوتی تو وہ اس کی ذات و صفات کا اعتراف کرتا۔ الوہیت کے تقاضوں کو جانتا۔

ہاں بعض ایسے لوگ جو سنجیدہ نہیں ہوتے اور اخلاقی لحاظ سے گرے ہوئے ہوتے ہیں وہ ایسے سوالات کرتے ہیں۔ وہ نہ سنجیدہ اور سچے مسلم ہوتے اور نہ ہی سنجیدہ اور سچے کافر ہوتے ہیں۔ اس لئے اس سوال میں زیادہ دلچسپی لینا ضروری نہیں ہے اور نہ ہی اسے سنجیدگی کے ساتھ لینا چاہئے۔

کبھی یوں ہوتا ہے کہ ایک جاہل شخص ذات باری کے متعلق سوال کرتا ہے۔ اس لئے ایسے جاہل کے سوال کا جواب براہ راست نہ دینا چاہئے۔ اسے صرف اللہ کی الوہیت کی حقیقت بتا دینا چاہئے' تو اگر وہ اسے پالے تو مومن ہے اور اگر نہ پاسکے تو کافر ہے۔ بس ایسے جاہل کے ساتھ بات یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ ورنہ یہ شخص بحث برائے بحث کر رہا ہو گا۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ کی مخلوقات میں سے کسی کو یہ سوال اٹھانے کا حق ہی نہیں ہے کہ اللہ نے حضرت انسان کو اس کی اس موجودہ فطرت کے مطابق کیوں پیدا کیا؟ کیوں اس کی یہ فطرت ہر وقت کام کرتی رہتی ہے' اسے مٹایا نہیں جاسکتا۔ اس میں تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ اسے معطل نہیں کیا جاسکتا اور پھر کیوں اللہ نے اسلامی نظام زندگی کے قیام کو انسانی جدوجہد پر موقوف کیا اور انسانی طاقت کے اندر جدوجہد کو ضروری قرار دیا۔

ہر انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کرے۔ وہ دیکھے کہ انسانی فطرت انسانی ماحول کے اندر کس طرح کام کرتی ہے۔ پھر وہ انسانی تاریخ کا مطالعہ اس فطری انداز میں کرے۔ اس طرح ایک تو وہ تاریخی واقعات کے حقیقی اسباب کو سمجھے گا اور دوسرے یہ کہ اسے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ تاریخ کا رخ کس طرح موڑا جاسکتا ہے۔

یہ نظام زندگی جسے ہم اسلام کہتے ہیں' جس طرح اسے حضرت محمد ﷺ نے پیش فرمایا' اس زمین پر' ان لوگوں کی دنیا میں' صرف اس بنا پر جاری و ساری اور قائم نہیں ہو سکتا کہ بس وہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ اور یہ صرف مجرد "تبلیغ" اور "بیان" سے بھی نافذ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ اس طرح بھی نافذ نہیں ہو سکتا کہ اسے اللہ تعالیٰ ناموس فطرت اور قوانین قدرت کی طرح نافذ کر دے' جو اس نے آسمانوں کی گردش' ستاروں کی رفتار اور طبیعی اسباب پر طبیعی نتائج مرتب کئے جانے والے کے سلسلے میں جاری کئے ہوئے ہیں۔ بلکہ اس کے لئے یہ منہاج رکھا گیا ہے کہ اسے ایک انسانی جماعت لے کر اٹھے' جو سب سے پہلے اس پر اچھی طرح ایمان رکھتی ہو' پھر خود اس پر پوری طرح عمل پیرا ہو اور اپنی طاقت کے مطابق اسے زندگی کا وظیفہ اور نصب العین قرار دے۔ پھر دوسروں کے دلوں میں اس ایمان کی منتقلی اور ان کی زندگیوں میں اس نظام کے قیام کے لئے یہ جماعت جدوجہد کرتی ہو' اور اس قدر جدوجہد کرے کہ اس سلسلے میں وہ اپنی پوری

طاقت لگا دے۔ وہ انسانی کمزوریوں کے خلاف جہاد کرے وہ انسانی خواہشات کے خلاف جہاد کرے اور وہ اپنے نفس کی جہالت اور دوسرے نفوس کی جہالت کے خلاف جہاد کرے۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ جہاد کرے جو انسانی کمزوریوں' خواہشات نفسانیہ اور جہالت کی وجہ سے اس نظام زندگی کی راہ روکے کھڑے ہیں اور اس نظام زندگی کو اس حد تک قائم کردے جس حد تک انسانی مزاج اور طاقت اسے برداشت کر سکتے ہیں اور وہ انسانوں کو اس مقام سے پکڑے جس مقام پر وہ درجہ ترقی کے حوالے سے عملاً موجود ہوں۔ وہ ان انسانوں کے حقیقی حالات زندگی کو نظرانداز نہ کرے۔ نیز وہ لوگوں کے حقیقی حالات کے تقاضوں کو بھی نظرانداز نہ کرے اور ان حالات اور تقاضوں کے مطابق اس نظام کو چلائے۔ لوگوں کی یہ جماعت پہلے خود اپنے نفس پر فتح حاصل کرے' اور پھر کبھی وہ اپنے ماحول کے لوگوں پر فتح حاصل کرے اور کبھی یوں ہو کہ وہ اپنے نفس اور اپنے ماحول کے لوگوں سے شکست کھاجائے۔ یہ بات اس کی جدوجہد کے عین مطابق ہو۔ ان عملی طریقہ ہائے کار کے عین مطابق ہو' جو اس جماعت نے اختیار کئے یا جس قدر اسے اختیار کرنے کی توفیق ہوئی۔ پھر اس جماعت کے لئے ہر چیز سے پہلے' ہر جدوجہد سے پہلے اور ہر وسیلہ و اسلوب سے پہلے ایک دوسرا بنیادی عنصر بھی ضروری ہے' وہ یہ کہ یہ جماعت اس نصب العین کے ساتھ کس قدر مخلص ہے اور وہ کس قدر اپنی ذات کے اندر اسے نافذ کر رہی ہے۔ اور یہ کہ اس نظام کے نازل کرنے والے خدا کے ساتھ اس کا تعلق کس قدر ہے؟ اسے اس پر کس قدر اعتماد ہے اور اسے اس پر کس قدر توکل اور بھروسہ ہے۔"

یہ ہے اس دین کی اصل حقیقت اور یہ ہے اس کا طریق نفاذ اور یہ ہے اس کی تحریک کا منصوبہ۔ اور یہی وہ بات ہے جسے اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کو اچھی طرح سمجھانا چاہتے ہیں۔ واقعہ جنگ احد کے تمام واقعات کے بیان' ان واقعات پر آنے والے تبصروں کا پورا ماحصل یہی ہے۔

اب یہ کہ احد کے موقعہ پر اسلامی جماعت نے جب مکمل اسلام کو' جس میں اس وقت حضور کے احکام شامل تھے' اپنے نفسوں میں عملی شکل پیش کرنے میں قدرے قصور کیا' اور بعض مواقف پر اس نے بعض عملی اقدامات کرنے میں کوتاہی کی' اور جب اس نے اس مذکورہ بالا عظیم اساسی حقیقت کو سمجھنے میں کوتاہی کی اور اس نے یہ خیال کیا کہ ہم تو بہرحال کامیاب ہوں گے' اس لئے کہ یہ دین اور یہ نظام خدا کی طرف سے ہے' اور اس بناپر اس نے اپنے تصرفات اور تدابیر کو نظرانداز کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ہزیمت سے دوچار کر دیا تاکہ وہ ذرا تلخ تجربات کا مزہ بھی چکھ لے۔ چنانچہ اس تجربے کے بعد قرآن مجید نے ان کی اس غلط فہمی کو اپنے تبصرے کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کی۔

**أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا ۖ قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ**

"اور جب تم پر وہ مصیبت آئی جس کے دو گنا تمہارے ہاتھوں سے ان پر آئی تھی تو تم نے کہا یہ کیسے؟ اے پیغمبر کہہ دو کہ یہ خود تمہارے اپنے نفوس کی وجہ سے ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

جیسا کہ اس سے قبل سیاق کلام میں ہم کہہ آئے ہیں' اللہ اہل ایمان کو اس مقام پر چھوڑ نہیں دیتے بلکہ انہیں اللہ کی تقدیر کے ساتھ پیوستہ فرماتے ہیں جو ان اسباب اور نتائج کے پس پشت کام کر رہے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں بتاتے ہیں کہ اس ابتلا کی پشت پر اللہ کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کے لئے بھلائی چاہتے ہیں' رہی ابتلا تو یہ تو ان پر ان کے اپنے تصرفات اور اسباب ظاہری کی وجہ سے آئی ہے۔

یہ فیصلہ کہ اسلامی نظام زندگی کا قیام' انسانی جدوجہد پر چھوڑ دیا گیا ہے اور اس پر ان انسانی اقدامات کا اثر ہوتا ہے جو وہ اس کے حوالے سے کرتے ہیں۔ اس میں انسان کے لئے بہت بڑی بھلائی ہے۔ اس لئے کہ اسلامی نظام انسانی زندگی میں فساد کے بجائے اصلاح چاہتا ہے۔ اسے معطل کرنا نہیں چاہتا۔ وہ انسانی فطرت کی اصلاح اس طرح چاہتا ہے کہ وہ اسے بیدار کرتا ہے اور اسے اعتدال پر لاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ کسی دل میں ایمان اس وقت تک مکمل اور پورا نہیں ہو سکتا جب تک یہ شخص اسلام کے حوالے سے لوگوں کا مقابلہ نہیں کرتا۔ یہ جہاد وہ سب سے پہلے تبلیغ اور بیان کے ذریعہ کرے گا۔ اس کے بعد وہ مجاہدہ ہاتھ سے کرے گا جبکہ مخالف اسلام قوت زبردستی راہ ہدایت کو مسدود کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں اس مومن پر ابتلا کا دور بھی آسکتا ہے جس میں اسے صبر سے کام لینا ہو گا' تکالیف برداشت کرنی ہوں گی' ہزیمت اٹھانی ہوگی اور اس پر صبر کرنا ہو گا۔ اگر فتح نصیب ہو تو سنجیدہ رہنا ہو گا۔ اس لئے کہ فتح کے وقت صبر اور سنجیدگی بہ نسبت شکست کے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ دل صاف ہو جائے' صفوف کے اندر سے کچا عنصر چھٹ جائے' جماعت اپنی صحیح راہ پر گامزن ہو جائے اور وہ اپنی راہ پر سیدھی اوپر کی طرف چڑھتی جائے اور اس تمام سرگرمی میں وہ متوکل علی اللہ ہو۔

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جب تک قلب مسلم ایمان کے معاملے میں لوگوں کے مقابلے میں مجاہدہ اور جہاد نہیں کرے گا ان کے دلوں میں حقیقت ایمان کا بیٹھنا نہایت ہی مشکل ہے۔ اس لئے کہ لوگوں کے ساتھ مقابلہ اور مجاہدہ سے قبل اس نے اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ کر لیا ہو گا۔ اور اس جہاد کے بعد اس کے سامنے ایمان کے وہ آفاق کھلیں گے جو اس کے سامنے کبھی نہیں کھل سکتے جب تک وہ بیٹھا ہوا ہو' پر امن زندگی گزارنے کا عادی ہو اور ہر کسی کے ساتھ مسالمت کر رہا ہو اور ہر حال میں نباہ رہا ہو۔ جب وہ جہاد شروع کرے گا تو اسے لوگوں کے اندر حقائق نظر آئیں گے' زندگی کے اندر کچھ حقائق اس پر روشن ہوں گے جو ہرگز اس پر روشن نہیں ہو سکتے تھے جب تک وہ مجاہدہ فی سبیل اللہ نہیں شروع کرتا۔ اس جہاد فی سبیل اللہ ہی کے نتیجے میں اس کا نفس' اس کا شعور' اس کے تصورات' اس کی عادات' اس کا مزاج' اس کے تاثرات اور اس کی قوت قبولیت حق اس مقام تک پہنچ جائیں گے جہاں تک اس کے بغیر وہ ہرگز نہ پہنچ سکتا تھا۔ غرض جہاد کا یہ شاق اور تلخ تجربہ انسان کو کندن بنا دیتا ہے۔

اسی طرح کسی جماعت مسلمہ کے اندر بھی ایمان کی حقیقت اس وقت تک مکمل اور مضبوط نہیں ہو سکتی جب تک وہ تجربہ' امتحان اور ابتلا میں نہ پڑے۔ اور جب تک اس کا ہر فرد اپنی قوت کی حقیقت سے واقف نہ ہو۔ جب تک اس کے ہر فرد کو اپنے نصب العین کا پتہ نہ ہو۔ اسی طرح اس جماعت کو بھی اپنی تمام اینٹوں کا پتہ نہ ہو جن سے وہ بنی ہے۔ یوں کہ ہر اینٹ کس قدر بوجھ سہار سکتی ہے' اور یہ کہ مشکل اور فکر کے وقت وہ اینٹیں ایک دوسرے کے ساتھ کس قدر پیوست ہیں۔

یہ تھی وہ حکمت جس کو اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کو سمجھانا چاہتے تھے' اور یہ حکمت اس کو تربیت کے اس کورس میں اسے سمجھائی گئی جو میدان احد میں اسے دیا گیا۔ اور اس کے بعد پھر واقعات احد پر اس سورت میں جو تبصرہ کیا گیا' اس میں بھی اسی حکمت کو اسے سمجھایا گیا۔ جبکہ ظاہری اسباب شکست کے بیان کے بعد اللہ نے فرمایا: "جو نقصان لڑائی کے دن تمہیں پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا' اور اس لئے تھا کہ اللہ دیکھ لے کہ تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون ہیں۔" اور دوسری جگہ فرمایا "اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم لوگ اس وقت پائے جاتے ہو۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔" اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں اللہ کی حکمت اور تقدیر کی طرف حوالے کرتا ہے' یعنی ان اسباب کی پشت پر جو تقدیر اور حکمت تھی۔ چنانچہ انہیں ایمان کی اس عظیم حقیقت اور سچائی کی طرف موڑتا ہے جو اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک وہ نفس انسانی کے اندر اچھی طرح بیٹھ نہیں جاتی۔ فرماتے: "اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم

لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی راستی کے گواہ ہیں کیونکہ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور وہ آزمائش کے ذریعہ مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کرنا چاہتا تھا۔"

تو گویا یہ اب اللہ کی تقدیر ہے' اس کی تدبیر ہے اور اس کی حکمت ہے' جو ان اسباب کی پس پشت پر کام کر رہی ہے' ان واقعات کے پیچھے کام کر رہی ہے۔ اور ان تمام اشخاص اور ان کی تمام حرکات کے پیچھے حقیقی موثر ہے۔ اور یہی اسلام کا کامل اور شامل اور جامع تصور ہے۔ اور یہ تصور ان واقعات کے نتیجے میں انسانی ذہن میں بیٹھ جاتا ہے۔ اور پھر ان واقعات پر جو تبصرہ کیا گیا ہے' اس میں بھی اس کی طرف واضح اشارات موجود ہیں۔

۲۔ اس معرکے کے واقعات اور ان پر تبصروں کے ذریعہ ایک دوسری حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ یعنی نفس انسانی' فطرت انسانی' انسانی جدوجہد کے مزاج' اور ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان میں فریضہ اقامت دین کے حصول کے امکانات..... حقیقت یہ ہے کہ نفس انسانی کامل نہیں ہے اور یہ اپنی حقیقت واقعیہ کے اعتبار سے کامل نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ارتقاء اور ترقی کے اہل بھی ہے اور وہ اس میدان میں ترقی و کمال کی انتہاؤں کو چھو سکتا ہے' جو انتہاء اور حد اس کے لئے مقرر کر دی گئی ہے۔

دیکھئے ہم انسانی جماعتوں میں سے ایک جماعت کا مطالعہ کرتے ہیں' اور یہ جماعت اپنی حقیقی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ جماعت گروہ صحابہ کی صورت میں ہے' جس کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے **كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ** ........... ........... (تم سب سے بہترین امت ہو' جسے لوگوں کے لئے نکالا گیا ہے) اور یہ خیر امت حضور اکرم ؐ کے صحابہ تھے۔ یہ تمام انسانیت کی روح اور زمین کا نمک تھے۔ لیکن اس جماعت صحابہ کا جو مطالعہ اس سورت میں پیش کیا گیا ہے "تم میں سے جو لوگ مقابلے کے دن پیٹھ پھیر گئے ان کی اس لغزش کا سبب یہ ہے کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے انکے قدم ڈگمگا دیئے تھے۔ اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔" اور بعض دوسرے صحابہ کے بارے میں ہے "مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور کام میں باہم اختلاف کیا' اور جونہی کہ وہ چیز تمہیں دکھائی دی' جس کی محبت میں تم گرفتار تھے تو تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے۔ اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔" **وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ** ........... "اور درا صل تمہاری اس لغزش کو اللہ نے معاف کر دیا۔" ... انہی کے بارے میں قرآن کہتا ہے "جب تم میں دو گروہوں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ کمزوری دکھائیں اور اللہ تو ان کا مددگار تھا' اللہ ہی پر اہل ایمان کو توکل کرنا چاہئے۔" انہی حضرات میں سے بعض لوگ شکست کھاتے ہیں اور وہ کھل کر سامنے آجاتے ہیں اور ان کی ہزیمت کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے' کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمہیں نہ تھا۔ اور رسول تمہارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا۔ اس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے تاکہ آئندہ کے لئے تمہیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو۔"

جنگ بدر کے شرکاء سب کے سب مومن اور مسلم تھے۔ لیکن یہ اسلام کا ابتدائی دور تھا۔ اس وقت جماعت کی تربیت اور تشکیل ہو رہی تھی۔ لیکن وہ اسلامی نظریۂ حیات اپنانے میں سنجیدہ اور سچے تھے۔ انہوں نے اپنا تمام معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔ اللہ کی راہنمائی پر راضی ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس کے نظام زندگی کے آگے سر تسلیم خم کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے انہیں اپنے جوار رحمت سے

دھتکار نہ دیا۔ بلکہ ان پر رحم فرمایا اور انہیں معاف کر دیا۔ اور حضور ﷺ کو بھی حکم دیا کہ وہ انہیں معاف کر دیں۔ اور ان کے لئے مغفرت طلب کریں۔ اور اللہ نے حضور ﷺ کو یہ حکم بھی دیا کہ آپ ﷺ ان سے مشورہ بھی لازماً کریں۔ باوجود اس کے کہ ان سے غلطیاں ہوئیں' باوجود اس کے کہ مشورے کے نتیجے میں' احد میں نقصان ہوا۔ اللہ نے انہیں اپنے معاملات اور تصرفات کے نتائج کا مزہ چکھنے دیا۔ اور انہیں ایسے سخت اور تلخ ابتلا میں ڈالا۔ لیکن ان غلطیوں کے باوجود انہیں اسلامی صفوں سے باہر نکال کر نہیں پھینک دیا۔ اور یہ حکم صادر نہیں کیا: "جاؤ تم اس کام کے لئے فٹ نہیں ہو' کیونکہ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ تم سے کمزوریاں سرزد ہوئیں اور تم نے غلطیاں کیں۔" بلکہ اسلام نے ان کی غلطیوں اور کمزوریوں کو قبول کر لیا۔ اس ابتلا میں ڈال کر ان کی تربیت کی۔ اس کے بعد ان کی غلطیوں پر تبصرہ کر کے مزید تربیت کی۔ اور اس کے بعد نصیحت کر کے اور ہدایات دے کر مزید تربیت کی۔ اور یہ نصیحت اور یہ وعظ بھی نہایت ہی مشفقانہ انداز میں اور عفو و درگزر کے ساتھ کیا۔ جس طرح ایک بزرگ اپنے بچوں کی تربیت کرتا ہے۔ وہ آگ سے جلائے جاتے ہیں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ آگ جلاتی ہے اور تاکہ وہ ہوشیار ہو جائیں۔ اللہ نے ان کے ضعف کو ان پر آشکارا کیا اور ان کے دلوں کی خفیہ سوچوں سے بھی انہیں آگاہ کر دیا۔ اس لئے نہیں کہ انہیں شرمندہ کیا جائے' یا ذلیل کیا جائے' یا حقیر سمجھا جائے یا یہ کہ انہیں مجبور کیا جائے اور ان پر وہ بوجھ ڈالا جائے جس کے وہ متحمل نہیں ہو سکتے' بلکہ اس لئے کہ ان کے ہاتھ پکڑے جائیں' انہیں ہدایت دی جائے۔ ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کی جائے اور وہ اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھیں اور کبھی بھی مایوس نہ ہوں جب تک وہ اللہ کی مضبوط رسی کو تھامے ہوئے ہے۔

اس تربیت کے بعد وہ اپنے اصل مقام پر آ گئے۔ اپنی آخری منزل پر پہنچ گئے اور ان کے اندر وہ رنگ پیدا ہو گیا جو احد کے معرکہ کے آغاز میں تھا۔ آج ہزیمت اور چوٹ لگنے پر ایک ہی رات گزری ہے۔ وہ رسول خدا ﷺ کے ساتھ تعاقب کے لئے نکل رہے ہیں۔ آج نہ ان کے دل میں ڈر تھا نہ تردد تھا۔ آج وہ ڈرانے والوں کی باتوں کو خاطر ہی میں نہ لا رہے تھے' جو انہیں ان الفاظ میں ڈرا رہے تھے:

**اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ**

"جن سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں' ان سے ڈرو۔ تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔"

اور اس کے بعد جب افراد جماعت بڑے اور بالغ ہوتے گئے تو ان کا معاملہ بھی بدل گیا اور ان کا محاسبہ اس طرح کیا جانے لگا جس طرح بڑے اور بالغ افراد کا کیا جاتا ہے۔ لیکن ابتداء میں ان کی تربیت اسی طرح تھی جس طرح بچوں کی تربیت کی جاتی ہے۔ جو شخص غزوہ تبوک کے حالات پڑھے گا (سورت برأت میں) چند افراد اس غزوہ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ رسول خدا ﷺ نے ان کا سخت محاسبہ کیا۔ یہ بہت ہی سخت محاسبہ تھا۔ اس سے احد اور تبوک کی پالیسی کے درمیان واضح فرق نظر آئے گا اس لئے کہ اب جماعت تربیتی لحاظ سے بہت ہی آگے جا چکی تھی۔ لیکن یہی لوگ جب احد میں تھے' تو ان سے نرمی کی گئی۔ اس لئے کہ اب تبوک کے معاملے میں وہ تربیت کے آخری مرحلے میں تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ تھے تو انسان۔ پھر بھی ان میں انسانی کمزوری تھی' غلطی ہو گئی' لیکن ان کے اندر غلطی کا اعتراف اور توبہ کا داعیہ موجود تھا' آخر کار معافی ہوئی۔

غرض اسلامی نظام زندگی کے اندر انسان کی بشریت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اسے تبدیل نہیں کیا جاتا' اسے معطل نہیں کیا جاتا' اس پر اس قدر بوجھ نہیں ڈالا جاتا کہ اس کی طاقت سے باہر ہو۔ اگرچہ اسلامی نظام زندگی اسے اس دنیا میں اس مقام بلند تک پہنچاتا ہے جو اس کے لئے مقدر ہو۔

اسلام کا یہ طرز عمل اس نقطہ نظر سے بہت ہی اہم ہے کہ وہ انسان کو ہمیشہ امید کی کرن سے نوازتا ہے تاکہ وہ سعی برائے کمال جاری رکھے اور آگے بڑھے۔ لیکن اسلامی نظام زندگی کے سائے میں 'یہ جماعت جس مقام بلند تک پہنچی وہ اس گرے ہوئے مقام سے اپنے سفر کا آغاز کر کے پہنچی جس میں وہ اس وقت پڑی تھی 'جب اسلام آیا۔ راستے میں اس سے لغزشیں ہوتی رہیں 'اس لئے کہ راستہ دشوار گزار تھا' اور وہ جماعت بہرحال ایک انسانی جماعت تھی اور ایک نہایت ہی پسماندہ سوسائٹی سے اٹھی تھی جو جاہلیت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہر لحاظ سے پسماندہ تھی جب کہ ہم نے اس کے نمونے تشریح آیات کے وقت پیش کئے۔ اسلام کی اس پالیسی کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کو اس مقام بلند تک پہنچنے کی امید سے مالا مال کر دیتا ہے۔ اگرچہ کسی معاشرے کے موجودہ حالات بد سے بدتر ہوں۔ پھر اس پسماندہ سوسائٹی سے امت کو اٹھا کر اسلام اس قدر ترقی دیتا ہے کہ اس کی مثال آج تک پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ابھی تک اس مثال کو دہرایا نہیں جاسکا حالانکہ یہ کوئی معجزانہ انقلاب نہ تھا' جو اب ناقابل اعادہ ہے بلکہ یہ ایک ایسا انقلاب تھا جو اسلامی نظام زندگی کے تحت رونما ہوا' جو انسانی جدوجہد کے نتیجے میں رونما ہوا۔ انسانی طاقت کے حدود کے اندر رونما ہوا۔ آج بھی یہ انقلاب اسی انسانی طاقت کے بل بوتے پر برپا کیا جاسکتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ انقلاب ممکن ہے۔

غرض اسلامی نظام زندگی پر سوسائٹی کو وہاں سے لیتا ہے جہاں وہ موجود ہوتی ہے اور جہاں تک وہ مادی ترقی کر چکی ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ اسے مزید ترقی دیتا ہے جب کہ اس نے عربوں کی جاہلیت زدہ اور پسماندہ سوسائٹی کے ساتھ کیا جو نہایت ہی ابتدائی مدارج پہ تھی۔ نہایت گری ہوئی اور اس سوسائٹی کو اسلام نے نہایت ہی ایک مختصر عرصے میں جو ربع صدی سے بھی کم تھا' اوج کمال تک پہنچایا۔

لیکن اس کے لئے واحد شرط ضروری ہے۔ وہ یہ کہ کوئی انسانی سوسائٹی اپنی تکیل اس نظام کے ہاتھ میں دے دے۔ اس پر ایمان لائے' اس کے آگے سر تسلیم خم کر دے۔ وہ اسے اصول حیات بنادے' وہ اسے اپنی تحریک کا شعار بنا دے' اور اس طویل اور دشوار گزار سفر میں اس کے ساتھ ہم قدم ہو جائے۔

۳۔ ایک تیسری حقیقت جسے اس معرکے نے چھانٹ کر رکھ دیا اور اس پر تبصرہ بھی کیا' یہ تھی کہ اسلامی نظام زندگی کے اندر فرد مسلم اور جماعت مسلمہ کے درمیان ایک نہایت ہی پختہ رابطہ ہوتا ہے۔ ایک مسلم فرد کا رابطہ اس معرکے سے بھی ہوتا ہے جس میں جماعت مسلمہ کود جاتی ہے خواہ یہ معرکہ جس میدان میں بھی ہو۔ یہ رابطہ عقائد و تصورات کے میدان میں بھی ہوتا ہے۔ اخلاق اور طرز عمل میں بھی ہوتا ہے اور سیاسی تنظیم اور اقتصادی معاملات کے اندر بھی ہوتا ہے۔ غرض تمام اجتماعی معاملات کے اندر ہوتا ہے۔ جب فتح ہو تو بھی ہوتا ہے اور شکست ہو تو بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلامی جماعت کی فتح و شکست کے یہ بنیادی عناصر ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی نفس انسانی اور حیات بشری کے وسیع اور عریض میدان میں کام کرتا ہے۔ یہ اس قدر وسیع میدان ہے کہ جس کی مختلف سمتیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ جس کے نقطے ایک دوسرے میں داخل ہیں اور جس کے خطوط اور جس کی تاریں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور مخلوط ہیں۔ ایک دوسرے کے لئے تکمیل کنندہ ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ شامل اور وابستہ نہیں۔ اور اگر ان خطوط اور نقاط کے اندر سمتوں اور تاروں کے درمیان خلل ہو جائے تو کوئی نقشہ یا کوئی منصوبہ درست طور پر کام نہیں کر سکتا۔

اسلام چونکہ مکمل نظام حیات ہے اس لئے یہ اس کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ یہ اس پوری زندگی کو ایک اکائی کی حیثیت سے لیتا ہے۔ وہ اس زندگی کو ٹکڑے کر کے یا اس کے اجزاء کر کے نہیں لیتا۔ وہ نفس انسانی اور حیات انسانی کو ہر طرف سے لیتا ہے اور اس زندگی کے مختلف تار و پود کو جو ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح مربوط ہوتے ہیں' اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اور ان تمام ڈوریوں کو

متناسق اور متوازن طور پر چلاتا ہے۔ وہ نفس انسانی کو اجتماعی زندگی سے نہیں کاٹتا اور نہ ہی زندگی کے ٹکڑے اور حصے بخرے کرتا ہے۔

اسلام کی اس جامعیت کی مثال اور اس کے باہم متداخل رابطوں کی مثال اس وقت سامنے آتی ہے جب قرآن مجید معرکہ بدر میں ان کی غلطیوں پر تبصرہ کرتا ہے۔ اور یہ بتاتا ہے کہ فتح و شکست میں اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ قرآن کریم کا فیصلہ یہ ہے کہ ہزیمت اس شیطانی عمل کی وجہ سے ہوئی جس میں شیطان نے بعض لوگوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا: "تم میں سے جو لوگ جو جنگ کے دن پیٹھ پھیر گئے' انہیں ان کی بعض غلطیوں کی وجہ سے شیطان نے لغزش میں مبتلا کر دیا۔"..... جبکہ وہ لوگ جو انبیاء کے ساتھ مل کر لڑے' ان کے ساتھ وفاداری کی' وہ ایک ایسا ماڈل اور نمونہ ہیں جن کی پیروی کی توقع مسلمانوں سے کی جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے معرکے کا آغاز اپنی کوتاہیوں کی طلب مغفرت سے کیا۔ "اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے' انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی۔ وہ سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی کہ اے ہمارے رب ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما' ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو' اسے معاف کر دے' ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔ آخر کار اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثواب آخرت بھی عطا کیا۔ اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں۔"..... جب اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کو ہدایات دیتے ہیں تو وہ انہیں میدان معرکہ میں پہلے کمزوری اور پریشانی سے منع فرماتے ہیں۔ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں ہدایات دیتے ہیں۔ وہ ذاتی پاکیزگی اختیار کریں اور استغفار کرتے رہیں: "دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے۔ اور وہ ان خدا ترس لوگوں کے لئے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوش حال ہو' جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو پسند ہیں اور جن کا حال یہ ہے کہ کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہے اور وہ کبھی دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔"

اس سے قبل قرآن نے اہل کتاب کی ذلت اور ان کی ٹوٹ پھوٹ کی علت یہ بتائی کہ انہوں نے معصیت کا ارتکاب کیا اور حد سے تجاوز کیا۔ یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار پڑی' کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں۔ ان پر محتاجی اور مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے۔ اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا اور یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔"

اس معرکہ کے واقعات کے درمیان غلطی اور غلطی سے رجوع اور توبہ کی بات بھی ہوتی ہے۔ اور تقویٰ اور خدا خوفی کی تلقین بھی بار بار کی جاتی ہے بلکہ تقویٰ اور خدا خوفی کی تلقین اس صورت میں بہت زیادہ ہے۔ اور توبہ اور خدا خوفی کے مضامین کا اس سورت کے مختلف النوع مضامین سے گہرا تعلق ہے۔ نیز یہ دعوت بھی یہاں دی جاتی ہے کہ سودی کاروبار کو ترک کرو' اللہ اور رسول کی اطاعت کرو' لوگوں کی غلطیوں کو معاف کرو' غصے پر قابو پاؤ اور ہر کسی کے ساتھ احسان کرو۔ یہ سب امور تقویٰ' تزکیہ نفس اور اجتماعی معاملات میں معاملات کے موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ غرض یہ پوری سورت باہم مربوط ہے اور ایک نہایت ہی اہم مقصد کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے۔

۴۔ چوتھی حقیقت اسلامی تربیت کے منہاج سے متعلق ہے۔ پہلے یہاں واقعات بیان کئے جاتے ہیں' پھر ان واقعات کے نتیجے میں ذہن انسانی میں جو تاثرات' جو سوچ' جو شعور اور جو خواہشات پیدا ہوتی ہیں' پھر قرآن ان سے بحث کرتا ہے' اور اس کے بعد ان سب پر

قرآن مجید تبصرہ کرتا ہے۔ جس طرح غزوۂ احد کے واقعات اور تاثرات کے بعد قرآن نے ان پر تبصرہ کیا ہے۔ اس تبصرے میں قرآن کریم نفس انسانی کے ہر اس پہلو کو لیتا ہے جو ان واقعات سے متاثر ہوا تاکہ اس میں اگر کوئی غلطی ہو تو اس کی تصحیح کر دے اور نفس کے اندر اصل حقائق کا ذخیرہ جمع کر دے جو اسلام جماعت مسلمہ کے نفوس کے اندر پختہ طور پر بٹھانا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم کسی پہلو کو بھی نظرانداز نہیں کرتا' کسی سوچ و خیال کو بھی نہیں چھوڑتا' کسی تصور کو نہیں چھوڑتا' کسی رجحان اور میلان کو نہیں چھوڑتا' لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرتا ہے اور ان پر روشنی ڈالتا ہے۔ انسانی نفس کے پوشیدہ ترین گوشوں کو سامنے لاکر ان میں پائے جانے والے خفیہ میلانات کو سامنے لایا جاتا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ انسان کا دل و دماغ بالکل عیاں اور ننگا ہو کر سامنے کھڑا ہے۔ اس طرح انسان کے اندرون کا تزکیہ ہوتا ہے۔ اسے پاک کیا جاتا ہے' اس کی تطہیر ہوتی ہے اور نہایت ہی روشنی میں' انسانی شعور اور تصور کی تصحیح کی جاتی ہے اور ان اصولوں کو برقرار رکھا جاتا ہے جن پر وہ اسلام کے متعین تصور حیات کو استوار کرنا چاہتا ہے اور جس پر قرآن کریم اسلامی زندگی کا ڈھانچہ استوار کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہ امور ہیں جن کے ذریعہ قرآن جماعت مسلمہ کی تربیت کرتا ہے۔ وہ کسی بھی واقعہ کو ذریعہ تربیت بناتا ہے اور یہ ہدایت دیتا ہے کہ یہ تربیت وسیع بنیادوں پر ہو اور عملی ہو۔

غزوۂ احد پر کئے جانے والے اس تبصرے پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بڑی جامعیت' بڑی دقت نظر اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ دقت نظر کے ساتھ ہر موقف' ہر حرکت اور ہر خلجان کو لیا گیا ہے۔ بڑی گہرائیوں کے اندر جاکر نفس انسانی اور اس کے شعور کے اندر خفیہ اور دفن احساسات کو لیا گیا ہے اور جامع اس قدر کہ نفس انسانی' اس کے تمام پہلوؤں اور تمام واقعات کو لیا گیا ہے۔ پھر ان واقعات کے اسباب کا گہرا تجزیہ کیا گیا ہے اور اس کے عمومی اسباب سامنے لائے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ کن عوامل اور کن اسباب نے کیا نتائج پیدا کئے ہیں اور پھر بیان واقعات کے اندر زندگی سے بھرپور' ہدایات و اشارات سے مالامال اور موثر تصویر کشی کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ گویا تصویر کشی کے اندر اور واقعات کے انداز تعبیر میں شعور اور سوچوں کا طلاطم برپا ہے اور موج پر موج اٹھ رہی ہے اور شعور کی یہ موجیں نہایت ہی گہری نہایت ہی خوفناک اور ساحل پر چڑھ دوڑنے والی ہیں۔ یہ بیان محض توصیفی تبصرہ نہیں ہے بلکہ یہ زندہ تبصرہ ہے' جو مناظر کو آنکھوں کے سامنے منقش کر دیتا ہے۔ یہ مناظر متحرک ہیں' ان کے اندر زندگی حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہے' نہایت ہی چمکدار اور نہایت ہی معانی آفریں۔

۵۔ پانچویں حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی ایک حقیقت پسند اور واقعیت پسند عملی نظام ہے۔ وہ اپنے آثار عالم واقعات میں پیدا کرتا ہے اور اس کے لئے وہ مسلسل عملی جدوجہد کی راہ اختیار کرتا ہے۔ وہ صرف نظریات اور محض عمل سے عاری اور مجرد اصولوں میں دلچسپی نہیں لیتا۔ وہ ہر مرحلے پر اپنی ہدایات کا عملی انطباق اور اطلاق چاہتا ہے۔ اس کی واضح ترین مثال غزوۂ احد کے واقعات میں اصول شوریٰ کا عملی انطباق اور مظاہرہ ہے۔

حضور ؐ کے لئے یہ ممکن تھا کہ آپ ؐ امت کو شوریٰ کے نتیجے میں سامنے آنے والے تلخ تجربے سے بچاکر لے جاتے جبکہ تحریک اسلامی نوخیز تھی' ہر طرف سے دشمنوں کے گھیرے میں تھی' اور دشمن نے مدینہ کی فصیل کے نیچے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ حضور ؐ کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ اس تلخ تجربے سے اس نوخیز تحریک کو بچاکر لے جاتے' جس سے وہ اس واقعہ کے اندر دوچار ہوئی۔ اگر آپ اپنی رائے پر ہی عمل فرماتے اور بطور استدلال اپنے سچے خوابوں کو پیش فرماتے' ان خوابوں کے اندر یہ اشارہ دیا گیا تھا کہ مدینہ ایک مضبوط ڈھال ہے' اور آپ سرے سے مشورہ ہی نہ کرتے' یا اس مشورے کو قبول نہ کرتے جو پارلیمنٹ نے کثرت رائے سے پاس کر دیا تھا اور بڑے پرجوش طریقے سے' جب آپ ؐ وردی میں نکلے تو بھی یہ پیش کش ہو گئی تھی کہ آپ اپنی رائے پر ہی عمل کریں جبکہ شوریٰ کے

پرجوش لوگ اپنی رائے واپس لے رہے تھے جنہیں احساس ہو گیا تھا کہ انہوں نے حضور کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن' باوجود اس کے کہ آپ ؐ کو نتائج کا اچھی طرح اندازہ تھا' آپ ؐ نے شوریٰ کے فیصلے کو نافذ کیا۔ جن امور تک وہ پہنچ گئی تھی ان پر عمل کیا گیا۔ اس لئے کہ حضور ؐ یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ جماعت کی اکثریت کا احترام اور پابندی کرو۔ یہ نتائج اچھے نہ ہوں۔ نیز آپ ؐ یہ بھی سمجھانا چاہتے تھے کہ اگر اجتماعی رائے اور عمل کے نتیجے میں کچھ تلخ نتائج بھی سامنے آجائیں انہیں برداشت کرو۔ اس لئے کہ آپ ؐ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ نقصانات اور خسارے کے مقابلے میں اصول شوریٰ کی اہمیت زیادہ ہے۔ اور یہ کہ جماعت کو شوریٰ کے اس عملی تجرباتی مرحلے سے محروم نہیں رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ اس طرح وہ علم و معرفت اور تربیت و تجربے کے اہم موقعہ سے محروم ہو جائے گی۔

اس کے بعد' اس معرکے میں تلخ نتائج دیکھنے کے بعد' اس اصول کے جاری رکھے جانے کے احکامات از سرنو آتے ہیں۔ اس لئے کہ اس طرح یہ اصول نہایت ہی موثر انداز میں پاس کیا جاتا ہے اور اسے بحال رکھا جاتا ہے اور اس طرح اسلامی نظام زندگی کے ایک اہم اصول کو استقرار نصیب ہوتا ہے۔

اسلام کا یہ انداز تربیت نہیں ہے کہ کسی اصول کے نفاذ کو اس وقت تک موقوف رکھے جب تک قوم اس کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اسلام جانتا ہے کہ وہ اس کے لئے ہرگز تیار نہ ہو سکے گی جب تک اسے عملاً نافذ نہ کر دیا جائے اور یہ کہ امت کو ان زریں اصولوں سے محروم رکھنا ان نتائج کے مقابلے میں بہت ہی برا اور نقصان دہ ہے جو اصول شوریٰ کے نفاذ کے ابتدائی ایام میں نکل سکتے ہیں یا ایسے نتائج کا محض اندیشہ ہے۔ غلطیاں جس قدر عظیم ہوں' وہ اس بات کا جواز نہیں ہیں کہ کسی اصول کو نافذ نہ کیا جائے بلکہ کسی اچھے اصول کو ایک مختصر عرصے کے لئے بھی موقوف رکھنا بہتر نہیں ہے۔ کیونکہ اس عمل سے اس اصول کے ذاتی نشوونما کو موقوف کر دیا جاتا ہے۔ پھر اس کے نفاذ سے جو عملی تجربہ شروع ہو جاتا ہے وہ موقوف ہو جاتا ہے اس طرح پوری امت کی ترقی رک جاتی ہے۔

جب یہ شوریٰ ہوئی' اس کے بعد معرکہ ہوا' اس کے برے نتائج سامنے آئے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ حکم آیا فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ............................ "انہیں معاف کر دیں' ان کے لئے مغفرت طلب کریں اور الامر میں ان سے مشورہ کریں۔"

غرض نظری اصولوں کے نفاذ کا طریق حضور ؐ کی سنت اور احد کے اقدامات سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آپ ؐ نے ایک رائے پاس ہو جانے کے بعد دوبارہ اس مسئلے کو شوریٰ کے سامنے پیش نہ کیا۔ اور اسے دوبارہ نظرثانی کے لئے پیش کرنے کو کمزوری' تردد اور غیر فیصلہ کن صورت تصور کیا گیا۔ یہ محض اس لئے کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ شوریٰ کا اصول لازمی نہیں ہے اور اس معاملے میں ہمیشہ کے لئے اختلاف رائے ہو جاتا اور عملی اقدامات کے لئے مشکوک صورت حال پیدا ہو جاتی۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "کسی نبی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ خدائی فیصلہ آجانے سے پہلے اپنی وردی اتار دے۔" اور ان تمام واقعات اور احد کے عملی تجربات کے بعد دوبارہ یہ حکم آتا ہے کہ جب عزم صمیم ہو جائے تو پھر توکل کر کے اسے نافذ کر دو فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ........................ "غرض اسلام میں اگر کوئی ہدایت ہے تو پھر نفاذ ہے' کوئی تعطل نہیں ہے۔"

۶۔ رسول ؐ خدا کے ساتھیوں پر مشتمل جماعت صحابہ اور اس دنیا کے مکرم ترین فدایان رسول پر قرآن مجید نے احد کے واقعات کے بعد جو تبصرہ کیا ہے' اس تبصرے سے ہمیں ایک ایسا سبق ملتا ہے جو آج ہمارے لئے بہت ہی اہم ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو آج ہماری دنیا میں از سرنو اسلامی زندگی کا احیاء چاہتے ہیں۔

وہ یہ ہے کہ اللہ کا نظام اپنی جگہ موجود ہے۔ اس کی اقدار اور حسن و قبح کے پیمانے موجود ہیں۔ رہے لوگ تو وہ کبھی اس نظام کے

قریب ہوں گے اور کبھی اس سے دور ہوں گے۔ اس نظام کے اصول اور طرز عمل اختیار کرنے میں وہ کبھی غلطی کریں گے اور کبھی درست موقف اختیار کریں گے۔ لیکن ان کا موقف اور ان کے کسی عمل کا اسلامی نظام ذمہ دار نہیں ہو گا۔ نہ لوگوں کے عمل یا بے عملی سے اسلام کے پیمانے بدل جائیں گے۔ اس لئے کہ ہمارے دور میں لوگ اسلام کو لوگوں کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ اب اگر کوئی غلط کام کرتا ہے تو اس غلط کام کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ اگر وہ منحرف ہوتے ہیں تو مسلمانوں کو کہا جائے گا کہ وہ منحرف ہو گئے۔ اسلام کسی کے انحراف اور غلطی سے چشم پوشی نہیں کرتا' اگرچہ وہ نہایت ہی محترم اور قابل قدر ہوں۔ اسلام اپنے اصولوں کے اندر ایسا انحراف نہیں کرتا کہ وہ ان محترم لوگوں کے عمل کے مطابق ہو جائے۔

ہم اس سے یہ سبق لیتے ہیں کہ کچھ شخصیات کو پاک اور بری الذمہ کرنے کے لئے ہمارے لئے یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم اسلامی نظام زندگی میں تبدیلی کر دیں۔ اس امت کی بھلائی اسی میں ہے کہ اسلامی نظام زندگی کے اصول و مبادی قطعی ہوں' صحیح و سالم ہوں' روشن اور واضح ہوں۔ جو لوگ ان سے انحراف کرتے ہیں انہیں منحرف کہا جائے۔ وہ لوگ جو بلند مرتبہ و مقام بھی رکھتے ہوں۔ ان کے انحراف اور بدعملی کے لئے کوئی وجہ جواز تلاش نہ کی جائے' خصوصاً اس طرح کہ اسلامی منہاج کے اندر تحریف کر دی جائے۔ اور اس کی اقدار اور پیمانوں کو بدل دیا جائے۔ اور حالت یہ ہو جائے کہ "خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔" ہمارے لئے یہ زیادہ خطرناک ہے کہ ہم بعض محترم شخصیات کو بچانے کے لئے اسلام کے اندر تحریف کریں۔ اس لئے کہ اسلامی نظام زندگی شخصیات کے مقابلے میں بہت ہی اہم اور ارفع ہے۔ اسلامی تاریخ اس سے عبارت نہیں ہے کہ تاریخ کے اندر مسلمانوں نے جو کمایا جو طرز عمل اختیار کیا وہ اسلامی تاریخ ہے۔ بلکہ صرف وہی افعال و اقدامات اسلامی تاریخ ہوں گے جو پورے طرح اسلام کے مطابق ہوں اور اسلام کے ثابت شدہ اصولوں کے خطوط پر ہوں۔ ورنہ تمام غیر اسلامی افعال کا اسلام سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ انہیں اسلام کے سرنہ تھوپا جائے گا اور نہ انہیں تاریخ اسلام کہا جائے گا۔ یہ افعال صرف لوگوں کے افعال تصور ہوں گے جنہوں نے ان کا ارتکاب کیا اور ان افعال کے مرتکب اشخاص کو ہی ان کا فاعل تصور کیا جائے گا۔ انہیں غلطی' انحراف اور اسلام سے خروج تصور کیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمانان ایک چیز نہیں ہے۔ اگرچہ لوگ اپنا نام اسلامی رکھیں اور زبان سے اقرار اسلام کریں۔ اسلامی تاریخ' اسلام کے عملی نفاذ کی تاریخ ہے۔ لوگوں کے تصورات میں اسلام کا نفاذ' لوگوں کے طرز عمل میں اسلام کا نفاذ' لوگوں کے طریقہ حیات میں اسلام کا نفاذ' ان کے معاشرے میں اسلام کا نفاذ' اس لئے کہ اسلام ایک قائم محور ہے۔ اس محور کے اردگرد' زندگی کی عملی چکی کو گھومنا چاہئے' ایک دائرے کے اندر رہ کر جب لوگ اس محور کے دائرے سے باہر نکل جائیں بلکہ وہ سرے سے اس محور ہی کو ترک کر دیں تو ان کا تعلق ہی اسلام کے ساتھ کیا رہ جاتا ہے۔ اور کیوں ہم ان کے اعمال اور ان کے عملی اقدامات کو اسلام کے سر تھوپے جائیں یا اسلام کی تشریح مسلمانوں کے انحرافات کی روشنی میں کیوں کی جائے؟ بلکہ میں پوچھتا ہوں کہ ایسے لوگوں کو مسلمان کیوں کہا جاتا ہے جبکہ نہ صرف یہ کہ وہ اسلام کے محور کے اردگرد نہیں گھومتے بلکہ اسلام کے دائرے سے بھی خارج ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگیوں میں اسلام کے نفاذ سے انکار کر دیا ہے۔ وہ مسلمان تو اس لئے کہلاتے تھے کہ وہ اسلام پر عمل کرتے تھے۔ اپنی زندگی میں اسلام کو نافذ کرتے تھے۔ اس لئے مسلمان نہ تھے کہ ان کے نام اسلامی تھے۔ اس لئے مسلمان نہ تھے کہ وہ زبان سے اقرار مسلمانی کرتے تھے۔

یہ تھا وہ سبق جو اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ مسلمانوں کو دیا جائے' اور امت مسلمہ کو دیا جائے' اسی لئے اللہ تعالیٰ نے پہلی جماعت مسلمہ کی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ ان کے نقائص اور ان کی کمزوریوں کو قلمبند کیا گیا اور اس کے بعد اللہ نے اعلان کر دیا کہ اللہ نے انہیں معاف کر دیا ہے۔ ان سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔ ان کا احترام بحال کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ دنیا میں اپنے کمزور موقف کی وجہ سے انہیں تلخ نتائج بھگتنے پڑے۔

# درس ۲۸ ایک نظر میں

یہاں تک معرکۂ احد کا بیان ختم ہو جاتا ہے لیکن جماعت مسلمہ اور اس کے ارد گرد نواح مدینہ میں پھیلے ہوئے دشمنان اسلام کے ساتھ معرکہ آرائی ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔ خصوصاً یہودیوں نے مباحثے اور مجادلے شروع کر رکھے تھے' تشکیک اور بے چینی پیدا کرنا' سازشیں اور کینہ پروری اور گھات میں بیٹھ کر وار کرنے کے مواقع تلاش کرنا۔ اس معرکے کے ارد گرد یہ اس سورت کے اکثر مباحث پھیلے ہوئے ہیں اور گھومتے ہیں۔

حضور اکرم ؐ نے قبیلہ بنی قینقاع کو مدینہ کے قرب و جوار سے جلاوطن کر دیا تھا کیونکہ غزوۂ بدر کے بعد وہ سخت بوکھلا گئے تھے اور انہوں نے سازشیں شروع کر دی تھیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی اور جو عہد و پیمان ان کے ساتھ ہوئے تھے ان کو وہ کھلے بندوں توڑتے تھے۔ یہ عہد ان کے ساتھ حضور کے مدینہ طیبہ میں ہجرت کرنے کے متصلاً بعد ہوئے تھے۔ اور اس وقت ہوئے تھے کہ اوس و خزرج کی اکثریت کے اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے مدینہ میں اسلامی ریاست قائم ہو گئی تھی۔ لیکن مدینہ کے ارد گرد بنی النضیر' بنو قریظہ ابھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ خیبر کے یہودی اور ان کے علاوہ جزیرۃ العرب کے دوسرے یہودی بھی موجود تھے۔ یہ سب لوگ باہم مراسلت کرتے تھے' فوجیں جمع کر رہے تھے۔ مدینہ کے منافقین کے ساتھ رابطے قائم کر رہے تھے اور مدینہ اور مدینہ کے ارد گرد کے کفار کے ساتھ اور مکہ کے مشرکین کے ساتھ ان کے روابط قائم تھے۔ اور مسلمانوں کے خلاف انہوں نے نہ ختم ہونے والی سازشوں کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔

سورۂ آل عمران کے آغاز ہی میں یہودیوں کو تنبیہ کر دی گئی تھی کہ مسلمانوں کے ہاتھوں تمہارا حشر بھی وہی ہو گا جو مشرکین کا ہوا۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ۝ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَ اللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝

"تمہارے لئے ان دو گروہوں میں نشان عبرت تھا' جو (بدر میں) ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ دیکھنے والے بچشم سر دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ مومن گروہ سے دوچند ہے۔ (مگر نتیجے نے ثابت کر دیا کہ) اللہ اپنی فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے مدد دیتا ہے۔ دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لئے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے۔"

جب رسول ؐ خدا نے ان کو اللہ کی جانب سے آیا ہوا یہ ڈراوا پہنچایا' جو اس لئے نازل ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں تھیں وہ تمام سرگرمیاں جو وہ ان دنوں دکھا رہے تھے اور جس غصے کا اظہار ان کی جانب سے ہو رہا ہے اور بدر کے بعد تو وہ مسلسل سازشوں میں لگے ہوئے تھے تو انہوں نے اس ڈراوے کو بہت ہی برے اور حقارت آمیز طریقے سے رد کر دیا۔ انہوں نے کہا: "محمد! اپنے آپ کو غرور میں نہ ڈالو' تم نے بے شک قریش کے بعض لوگوں کو قتل کر دیا۔ یہ لوگ ناتجربہ کار تھے۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ جنگ کس طرح لڑی جاتی ہے۔ خدا کی قسم! اگر تم نے کبھی ہم سے جنگ لڑی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کچھ لوگ ہیں۔ یقیناً تم ہم جیسے لوگ نہ پاؤ گے۔" اس جواب کے بعد

وہ سازشوں میں شریک ہو گئے۔ اس سورت میں ان کی سازشوں کے کچھ رنگ نقل کئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے جو عہد و پیمان کیا تھا' اسے انہوں نے توڑ دیا۔ حضور ﷺ نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ چنانچہ وہ حضور ﷺ کے فیصلے پر ہتھیار ڈالنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ حضورؐ نے انہیں مدینہ سے جلاوطن کر کے "اذرعات" بھیج دیا۔ یہودیوں کے مدینہ میں صرف دو گروہ رہ گئے بنو قریظہ اور بنو النضیر جو عہد کی پابندی بظاہر کر رہے تھے لیکن خفیہ طور پر یہ بھی سازشوں' مکاریوں' دھوکہ بازی' فتنہ بازی اور افواہیں پھیلانے میں مصروف تھے۔ غرض یہ لوگ وہ تمام کام کرنے لگے جو یہود اپنی پوری تاریخ میں بڑی مہارت سے کرتے آئے ہیں۔ اور کتاب اللہ میں اسے بالکل تفصیلات کے ساتھ ریکارڈ کیا گیا ہے اور پوری کرۂ ارض کی آبادی کو ان سے خبردار کیا گیا ہے کہ اس زمین پر یہ ایک ملعون قوم ہے۔

اس سبق میں بنی اسرائیل کے بعض اقوال و افعال کو لیا گیا ہے۔ نظر آتا ہے کہ وہ بارگاہ رب العزت میں بھی بے ادبی کرنے پر اتر آئے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ برا رویہ تو ان کے لئے کوئی بات ہی نہ تھی۔ یہ لوگ میثاق مدینہ کے مطابق اپنی مالی ذمہ داریاں ادا کرنے سے پہلوتہی کرتے تھے جو معاہدہ انہوں نے خود نبیؐ کے ساتھ کیا تھا' وہ کہتے تھے إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ ............... "اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔"

اس سبق میں یہودیوں کے وہ واہی دلائل بھی ملیں گے جو وہ دعوت اسلامی کے خلاف پیش کیا کرتے تھے' جب بھی یہ دعوت انہیں دی جاتی۔ یہ دلائل سب کے سب جھوٹے ہوتے اور تاریخی اعتبار سے بھی ان کی کوئی اصل نہ ہوتی۔ مثلاً یہ کہ وہ اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کی بھی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ وہ عہد یہ تھا وہ اللہ کے احکام اور سچائی کو بیان کریں گے اور کبھی نہیں چھپائیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو توڑ دیا تھا' پس پشت ڈال دیا تھا اور اس کے بدلے انہوں نے مالی فوائد حاصل کئے۔ اپنے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا' حالانکہ یہ پیغمبران کے پاس خارق عادت معجزات حسب المطلب ظاہر کر چکے تھے۔ نیز وہ پیغمبر واضح دلائل کے ساتھ آئے تھے مگر ان یہودیوں نے ان کو مسترد کر دیا۔

یہودیوں ان شرمناک اقوال و افعال کے ذکر کی وجہ سے' انبیاء کے ساتھ ان کے برتاؤ اور بارگاہ باری تعالیٰ میں ان کی گستاخیوں کے اظہار و بیان کی وجہ سے' مدینہ کے اردگرد بسنے والے یہودی اس نوخیز جماعت مسلمہ کے دشمن ہو گئے تھے۔ نیز اس سبق میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہودیوں اور مشرکین کی سازشوں اور ایذا رسانیوں سے مسلمانوں کو کس قدر تکلیف ہو رہی ہے۔ ان امور کا ذکر جماعت مسلمہ کی تربیت کے لئے یہاں نہایت ہی ضروری تھا۔ تاکہ وہ اپنے ماحول سے علی وجہ البصیرت خبردار ہوں کہ ان کے اردگرد جو لوگ رہ رہے ہیں وہ کون ہیں۔ تاکہ اہل ایمان کو اس سرزمین کے حالات اچھی طرح معلوم ہو جائیں جس میں وہ کام کر رہے ہیں۔ نیز یہ کہ ان کی راہ میں کیا کیا مشکلات ہیں' کہاں کہاں ان کے لئے دام زیر زمین بچھے ہیں۔ اور اس راہ میں ان کے لئے کیا کیا مصائب تیار ہیں۔ مدینہ طیبہ میں یہودی مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں کر رہے تھے' وہ ان عداوتوں سے کم خطرناک تھیں جو مکہ کے مشرکین مسلمانوں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ غالباً مسلمانوں کے خلاف پوری تاریخ اسلام میں جو سازشیں ہوتی ہیں وہ یہودی کرتے رہے ہیں۔ ہمیشہ یہ لوگ مسلمانوں کے لئے خطرناک رہے ہیں۔

اس اثر آفریں سبق میں پے درپے اس سلسلے میں ہدایات دی گئی ہیں۔ مسلمانوں کو بتایا جاتا ہے کہ کون سی اقدار ہیں جو دائمی ہیں اور کون سی اقدار زائل ہونے والی ہیں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں زندگی کی ایک محدود وقت کے لئے ہے۔ ہر نفس ایک دن موت سے دوچار ہونے والا ہے۔ اصل جزاء تو آخرت میں ملے گی۔ اصل کمائی اور خسارے کا پتہ تو وہاں لگے گا۔ وہاں جو شخص آگ سے بچا لیا گیا اور

جنت میں داخل ہو گیا تو گویا وہ کامیاب رہا۔ اور دنیا تو ایسے سازو سامان سے اٹی پڑی ہے جو ہر وقت دھوکے میں ڈال سکتا ہے۔ اور یہ ہمارے اموال' ہماری جانیں ہمارے پاس اللہ کی امانت ہیں۔ اہل کتاب اور مشرکین کی جانب سے اذیت تمہیں پہنچتی رہے گی۔ صرف صبر' خدا خوفی اور اسلام پر پختگی سے عمل ہی تمہیں آگ سے بچاسکتا ہے اور یوں ان سازشوں سے بھی بچاسکتا ہے۔

مدینہ کی پہلی جماعت کو جو ہدایات دی گئی ہیں' وہ آج بھی ہمارے لئے تازہ ہدایات ہیں۔ کل بھی ہمارے لئے یہی ہدایات ہیں۔ جو لوگ اسلام کو از سرنو قائم کرنا چاہتے ہیں اور جو لوگ اسلامی زندگی کا قیام چاہتے ہیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ ان کے دشمنوں کا وہی مزاج ہے جو مدینہ کے دشمنوں کا تھا۔ یہ دشمن وہی مشرکین اور اہل کتاب کے ملحدین ہیں۔ آج یہودی عالمی صیہونیت کی شکل میں آئے ہیں۔ عیسائی عالمی صلیب کی شکل میں ہیں۔ اور عالمی کیمونزم کی شکل میں ہیں۔ آج بھی تحریک اسلامی کو بتایا جاتا ہے کہ اس کی راہ میں جو مشکلات ہیں' جو دام رکھے ہوئے ہیں' ان کے لئے وہی قربانیاں ہیں' وہی اذیتیں اور وہی ابتلاء ہیں۔ لیکن تم اپنی نظریں آخرت پر رکھو۔ مالی اور جانی نقصانات آج بھی برداشت کرنے پڑیں گے۔ لیکن تمہیں پہلی جماعت اسلامی کی طرح آج بھی وہی سبق یاد کرنا ہو گا۔ "آخر کار ہر شخص کو مرنا ہے۔ اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو' کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔ رہی یہ دنیا' تو یہ محض ایک ظاہر فریب دینے والی چیز ہے..... مسلمانو! تمہیں مال اور جان دونوں آزمائشیں پیش آکر رہیں گی' اور تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اگر ان سب حالات میں صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم ہوئے تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔"

غرض قرآن وہی قرآن ہے جو تھا' اس کی حیثیت وہی ہے کہ یہ اس امت کے لئے دائمی ہدایات پر مشتمل کتاب ہے۔ یہ اس امت کا حدی خواں اور رہبر و رہنما ہے۔ یہ اس کے لئے قابل اعتماد قائد ہے..... لیکن اس کے دشمن بھی وہی دشمن ہیں' جو تھے اور انقلاب کی راہ بھی وہی ہے جو تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆

# درس تشریح آیات

## آیت نمبر ۱۸۰ تا ۱۸۹

وَلَا یَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ بِمَاۤ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ہُوَ خَیۡرًا لَّہُمۡ ؕ بَلۡ
ہُوَ شَرٌّ لَّہُمۡ ؕ سَیُطَوَّقُوۡنَ مَا بَخِلُوۡا بِہٖ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ وَ لِلّٰہِ مِیۡرَاثُ السَّمٰوٰتِ
۱۸ ع ۹ ۹ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ﴿۱۸۰﴾ لَقَدۡ سَمِعَ اللّٰہُ قَوۡلَ الَّذِیۡنَ
قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ فَقِیۡرٌ وَّ نَحۡنُ اَغۡنِیَآءُ ۘ سَنَکۡتُبُ مَا قَالُوۡا وَ قَتۡلَہُمُ
الۡاَنۡۢبِیَآءَ بِغَیۡرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوۡلُ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتۡ
اَیۡدِیۡکُمۡ وَ اَنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ ﴿۱۸۲﴾ اَلَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ عَہِدَ
اِلَیۡنَاۤ اَلَّا نُؤۡمِنَ لِرَسُوۡلٍ حَتّٰی یَاۡتِیَنَا بِقُرۡبَانٍ تَاۡکُلُہُ النَّارُ ؕ قُلۡ قَدۡ
جَآءَکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِیۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیۡ قُلۡتُمۡ فَلِمَ قَتَلۡتُمُوۡہُمۡ اِنۡ
کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنۡ کَذَّبُوۡکَ فَقَدۡ کُذِّبَ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِکَ جَآءُوۡ
بِالۡبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الۡکِتٰبِ الۡمُنِیۡرِ ﴿۱۸۴﴾

"جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لئے اچھی ہے۔ نہیں' یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لئے ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

اللہ نے ان لوگوں کا قول سنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ ان کی یہ باتیں بھی ہم لکھ لیں گے اور اس سے پہلے جو وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں وہ بھی ان کے نامہ اعمال میں ثبت ہے۔ (جب فیصلہ کا وقت آئے گا اس وقت) ہم ان سے کہیں گے کہ لو' اب عذاب جہنم کا مزا چکھو' یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے' اللہ اپنے بندوں کے لئے ظالم نہیں ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں "اللہ نے ہم کو ہدایت کر دی ہے کہ ہم کسی کو رسول تسلیم نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کرے جسے (غیب سے آکر) آگ کھالے۔" ان سے کہو "تمہارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں جو بہت سی روشن نشانیاں لائے تھے اور وہ نشانی بھی لائے تھے جس کا تم ذکر کرتے ہو' پھر اگر (ایمان لانے کے لئے یہ شرط پیش کرنے میں) تم سچے ہو تو ان رسولوں کو تم نے کیوں قتل کیا؟" اب اے نبی ﷺ 'اگر یہ لوگ تمہیں جھلاتے ہیں تو بہت سے رسول تم سے پہلے جھلائے جاچکے ہیں جو کھلی کھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشنی بخشنے والی کتابیں لائے تھے۔"

اس مجموعہ آیات میں سے پہلی آیت کے بارے میں کوئی ایسی روایت نہیں ہے کہ اس میں بخیلوں سے مراد کون لوگ ہیں اور یہ کہ بخل کے فعل مذموم سے کن لوگوں کو ڈرایا گیا ہے؟ اور یہ کہ قیامت میں ان کا انجام یہ ہو گا لیکن جس مقام پر یہ آیت ہے 'معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق بعد میں آنے والی آیات سے ہے جو یہودیوں کے بارے میں وارد ہیں' اس لئے کہ یہ یہودی ہی تھے جنہوں نے یہ کہا تھا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ اور یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے کہا تھا کہ اللہ نے ہم سے یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم اس وقت تک کسی رسول کو نہ مانیں جب تک وہ کوئی ایسی قربانی نہ لے آئیں جسے آگ جلا دے۔"

اصل بات یہ ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے بارے میں ہے جنہیں اس وقت یہ دعوت دی جارہی تھی کہ وہ میثاق مدینہ کے مطابق جن مالی ذمہ داریوں کے پابند ہیں' انہیں وہ ادا کریں۔ اور یہ دعوت بھی انہیں دی گئی تھی کہ وہ نبی آخر الزمان کی دعوت کو قبول کر لیں اور اللہ کی راہ میں انفاق کریں۔

چنانچہ یہ تہدید آمیز ڈراوا نازل ہوا' اور اس کے بعد یہودیوں کی ان کٹ حجتی دلائل کو رد کیا گیا جو وہ رسول خدا ﷺ پر ایمان نہ لانے کے لئے پیش کرتے تھے۔ ان دلائل میں نہایت ہی گستاخانہ طرز خطاب اختیار کرتے تھے اور یہ بے ادبی دراصل وہ اپنے رب کی کرتے تھے۔ یہودیوں کو تہدید آمیز تنبیہہ کے بعد حضور اکرم ﷺ کو تسلی دی جاتی ہے 'کہ ٹھیک ہے کہ یہ یہود آپ کی تکذیب کر رہے ہیں لیکن آپ سے قبل جو رسول گزرے ہیں ان کے ساتھ بہ نسبت آپ کے سخت رویہ ان کی اقوام نے اختیار کیا تھا۔ ان رسولوں میں سے انبیاء بنی اسرائیل بھی تھے جو ان کے پاس باقاعدہ دلائل لے کر آئے تھے' انہوں نے حسب طلب معجزات بھی پیش کئے جیسا کہ تاریخ بنی اسرائیل میں مشہور ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ

"جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لئے اچھی ہے۔ نہیں' یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں' وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لئے ہے۔ اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔"

اس آیت کا مفہوم عام ہے۔ اس سے یہودی بھی مراد ہو سکتے ہیں جو میثاق مدینہ کے تحت عائد ہونے والی مالی ذمہ داریوں میں بخل سے کام لیتے تھے اور دوسرے لوگ بھی اس کے مدلول میں شامل ہیں جو اپنے دیئے سے خرچ نہیں کرتے اور بخل سے کام لیتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بخل ان کے لئے خیر ہے کہ ان کے مال اس سے محفوظ ہوتے ہیں اور انفاق کی وجہ سے یہ اموال جاتے ہیں۔

یہ آیت انہیں اس قسم کے جھوٹے حساب وکتاب سے منع کرتی ہے' فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ جو کچھ جمع کرتے ہیں قیامت کے دن ان کے گلے کا طوق ہو گا اور یہ طوق آگ سے بنے گا۔ یہ ایک نہایت خوفناک تہدید ہے۔ انداز تعبیر اس طرح ہے کہ اس بخل کو زیادہ بدشکل کر کے پیش کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور وہ پھر بھی بخل کرتے ہیں۔ وہ اپنے ذاتی مال میں بخل نہیں کر رہے بلکہ اللہ کے دیئے میں بخل کرتے ہیں۔ وہ جب اس دنیا میں آئے تھے تو ان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ ان کے ہم قبیلہ لوگوں کے پاس کچھ تھا۔ تو اللہ نے ان پر اپنا فضل کیا اور ان کو سب کچھ دے دیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ خود اس کے دیئے سے اسے کچھ دیں تو انہوں نے اللہ کے فضل وکرم کو یاد نہ کیا اور تھوڑا واپس دینے میں بھی بخیلی کی۔ وہ یہ گمان کرنے لگے کہ یہ ذخیرہ اندوزی ان کے لئے مفید ہوگی حالانکہ یہ ان کے لئے سخت مضر ہے بلکہ شرمناک قسم کی مضرت ہے۔ اس لئے کہ وہ بہرحال اس جہاں سے جانے والے ہیں۔ اس مال اور دولت کو چھوڑنے والے ہیں۔ بعد کے لوگوں کے لئے ہے اور آخر کار اللہ ہی وارث ہو گا۔ اس لئے کہ "اللہ ہی کے لئے میراث ہے آسمانوں اور زمین کی۔" تو پھر یہ سونا اور جمع شدہ دولت تو نہایت ہی تھوڑے عرصے کے لئے رہتی ہے۔ اس کے بعد سب کی سب اللہ کی طرف لوٹتی ہے۔ اور ان کے کھاتے میں تو وہی کچھ ہے جو انہوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ اللہ کی رضا کے لئے خرچ کیا۔ اس کا اجر ان کو پورا پورا ملے گا اور صرف اس صورت میں وہ آگ کے طوق سے بچ سکتے جب وہ اپنی زائد دولت اللہ کی راہ میں خرچ کر دیں۔

اس کے بعد یہودیوں پر سخت تنقید کی جاتی ہے۔ جن کے ہاتھوں میں دولت تھی۔ یہ دولت انہیں اللہ نے دی تھی۔ اور یہ سمجھنے لگے اپنے آپ کو غنی اور اللہ سے مستغنی کہ انہیں اللہ کی جانب سے کسی اجر اور صلے کی حاجت نہیں ہے۔ اور نہ انہیں وہ چند سے چند ثواب کی ضرورت ہے جو اللہ ان لوگوں کو دیتا ہے جو اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جسے اللہ اپنا فضل کہتا ہے اور ان لوگوں کی جانب سے قرضہ سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن ان لوگوں نے ایک ذلیل شخص کی حیثیت سے یہ جواب دیا کہ اللہ کو کیا ضرورت ہے کہ وہ ہم سے ہمارا مال قرض مانگتے ہیں اور پھر ہمیں دوگنا کر دیتے ہیں' حالانکہ خود اللہ تعالیٰ ربا سے منع کرتے ہیں اور اضعاف مضاعفہ کو حرام قرار دیتے ہیں۔ ان کی یہ بات الفاظ کا کھیل ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت ہی رذیل اور بے ادب اور گستاخ لوگ ہیں۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ

"اللہ نے ان لوگوں کا قول سنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ ان کی یہ باتیں بھی ہم لکھ لیں گے اور اس سے پہلے جو وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں وہ بھی ان کے نامہ اعمال میں ثبت ہے۔ (جب فیصلہ کا وقت آئے گا اس وقت) ہم ان سے کہیں گے کہ لو' اب عذاب جہنم کا مزا چکھو' یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے' اللہ اپنے بندوں کے لئے ظالم نہیں ہے۔"

اللہ کی ذات کے بارے میں بدترین خیالات یہودیوں کی تحریف شدہ کتابوں کے اندر بھی درج ہیں۔ لیکن قرآن نے ان کا جو قول نقل کیا ہے یہ ان کا ذات باری کے متعلق نہایت گھٹیا تصور ہے۔ اور انتہائی بے ادبی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو اس قدر تہدید آمیز تنبیہ کی گئی سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا ............ "وہ جو کچھ کہتے ہیں ہم اسے لکھ لیں گے۔" تاکہ ان کا محاسبہ کیا جا سکے۔ ان کی یہ بات یونہی ہوا میں تحلیل نہ ہو جائے گی اور نہ ہی اسے مہمل اور لغو بات سمجھ کر چھوڑ دیا جائے گا۔ ان کی اس گستاخی کے بیان کے ساتھ ساتھ ان

کے سابق کرتوتوں کا ایک حصہ بھی یہاں ذکر کر دیا جاتا ہے۔ یہ وہ گناہ ہیں جو ان کے ہم قوم ماضی میں کرتے رہے ہیں۔ یہ سابقہ گناہ ان کے کھاتے میں اس لئے ڈالے جاتے ہیں کہ ان کی فطرت بدستور وہی ہے۔ وہ اسی طرح نافرمان اور خطاکار تھے۔

وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ........ "وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں۔"..... بنی اسرائیل کی تاریخ نے قتل انبیاء کے اس مکروہ کام کے واقعات کو محفوظ رکھا ہے اور ان کا آخری کارنامہ وہ تھا جس میں انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش کی۔ وہ تو اب بھی بہرحال یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو پھانسی دلوا دی تھی اور اس عظیم جرم پر وہ فخر کرتے ہیں۔

وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ........................ "ہم ان سے کہیں گے کہ چکھو آگ میں جلنے کا عذاب۔" لفظ حریق یعنی جلنا اس لئے استعمال ہوا ہے کہ اس عذاب کی خوفناکی نظروں میں آجائے۔ اور یہ بات ذہن میں آجائے کہ یہ عذاب پاتے وقت آگ کے شعلے بھڑک اٹھے ہوں گے اور وہ اپنا کام ہولناک انداز میں کر رہے ہوں گے۔ آگ میں خوفناک جوش ہو گا۔ یہ اس لئے کہ ان کا یہ فعل بھی اسی قدر مکروہ ہے۔ انبیاء کو قتل کر دینا اور بغیر کسی جواز کے قتل کر دینا اور پھر وہ جو بات کر رہے ہیں وہ بھی بہت ہی گھٹیا ہے کہ اللہ فقیر ہے اور وہ غنی ہیں۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ ..................... "یہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہے۔" پوری جزاء جس میں نہ ظلم ہے اور نہ ہی کوئی سنگدلی ہے۔

وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ.................. "اللہ اپنے بندوں کے لئے ظالم نہیں ہے۔" یہاں بندوں کے لئے عبید کا لفظ استعمال کرنے سے انسان کی اصل حیثیت بتادی گئی کہ وہ خدا کے مقابلے میں غلاموں کا غلام ہے۔ اور پھر بھی اگر وہ اللہ کی بارگاہ میں اس قدر بے ادبی کرتا ہے اور بندہ اور غلام ہو کر وہ کہتا ہے کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں تو یہ کس قدر گستاخی ہے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ انبیاء کے قتل جیسا شنیع کام۔

یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں پھر یہی قاتلین انبیاء بھی ہیں۔ ان کا مزید کارنامہ دیکھو کہ یہ کہتے ہیں کہ ہم محمد ﷺ پر اس لئے ایمان نہیں رکھتے کہ ہمیں خود اللہ نے یہ کہا ہے کہ وہ اس وقت تک کسی نبی پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ایسی قربانی نہ کرے جسے عالم غیب سے آگ آکر معجزانہ طور اسے کھا نہ لے۔ جس طرح انبیاء بنی اسرائیل میں سے بعض کے ہاتھوں اس قسم کے معجزے کا اظہار ہوا تھا۔ اور جب تک محمد ﷺ کوئی اس قسم کا معجزہ نہ دکھائیں گے وہ چونکہ اللہ کے ساتھ عہد کر چکے ہیں اس لئے وہ ایمان نہیں لاسکتے۔

یہاں قرآن کریم ان کی اس بات کا تاریخی حوالوں سے جواب دیتا ہے کہ انہوں نے جن انبیاء کو قتل کیا تھا انہوں نے تو ایسے معجزات دکھاوئے تھے جو خود انہوں نے طلب کئے تھے۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَاۤ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

"جو لوگ کہتے ہیں "اللہ نے ہم کو ہدایت کر دی ہے کہ ہم کسی کو رسول تسلیم نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کرے جسے (غیب سے آکر) آگ کھالے۔" ان سے کہو "تمہارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں جو بہت سی روشن نشانیاں لائے تھے

اور وہ نشانی بھی لائے تھے جس کا تم ذکر کرتے ہو' پھر اگر (ایمان لانے کے لئے یہ شرط پیش کرنے میں) تم سچے ہو تو ان رسولوں کو تم نے کیوں قتل کیا؟" یہ نہایت ہی قوی الزامی جواب تھا۔ جس سے ظاہر ہو گیا کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں اور بات توڑ موڑ کر بیان کرتے ہیں اور کفر پر اصرار کرتے ہیں۔ اور مزید یہ کہ سخت تکبر کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں اور اللہ پر افتراء باندھتے ہیں۔

یہاں آکر اب بات کا رخ رسول خدا کی طرف مڑ جاتا ہے' آپ کو تسلی دی جاتی ہے اور آپ کی دلجوئی کی جاتی ہے اور آپ کے لئے ان مخالفین کے رویے کو قابل برداشت بنایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ ایسا ہی سلوک اپنی تاریخ میں بے شمار رسولوں کے ساتھ کرتے آئے ہیں۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ............ "یہ لوگ اگر تمہیں جھٹلاتے ہیں تو بہت سے رسول تم سے پہلے جھٹلائے جا چکے ہیں جو کھلی کھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشنی بخشنے والی کتابیں لائے تھے۔"

گویا نبی ﷺ پہلے رسول نہیں جن کو اہل کتاب یہودیوں نے جھٹلایا ہو' بنی اسرائیل اپنی پوری تاریخ میں ہمیشہ رسولوں کی تکذیب کرتے آئے ہیں۔ حالانکہ وہ رسول ان کے پاس صحیح دلائل لے کر آئے تھے۔ انہوں نے معجزات پیش کئے تھے۔ انہوں نے ایسے صحائف پیش کئے جن میں الٰہی ہدایات موجود تھیں۔ یعنی زبر..... اور انہوں نے کتاب منیر بھی پیش کی تھی مثلاً تورات اور انجیل۔ غرض یہ رسولوں اور ان کی رسالتوں کا طریقہ کار رہا ہے۔ اور اس راہ میں مشقت اور مصائب ہیں اور یہ واحد طریق کار ہے۔

○.....☆☆☆.....○

اس کے بعد اب بات کا رخ جماعت مسلمہ کی طرف پلٹ رہا ہے۔ اسے بتایا جا رہا ہے کہ جن اقدار حیات کے بارے میں اسے بتایا جا رہا ہے ان کو وہ مضبوطی سے پکڑیں۔ اور ان اقدار کی خاطر قربانیاں دیں۔ پھر بتایا جاتا ہے کہ اس راہ میں کیا کیا مشکلات ہیں' کیا کیا کانٹے ہیں اور کیا کیا متاعب ہیں اور ان مشکلات پر صبر' تقویٰ' برداشت اور عزم صمیم کے ذریعہ قابو پایا جا سکتا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ۫ وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾

"آخر کار ہر شخص نفس کو مرنا ہے۔ اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو' کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔ رہی یہ دنیا' تو یہ محض ایک ظاہر فریب چیز ہے۔ مسلمانو تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی' اور تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اگر ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو' تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔"

اس حقیقت کا نفس انسانی کے اندر پوری طرح بیٹھ جانا ضروری ہے کہ اس دنیا کی زندگی بہرحال محدود' وقتی اور ایک متعین تاریخ تک ہے۔ اور اس کا خاتمہ لازمی ہے' یہاں اچھے لوگ بھی مرتے ہیں اور برے بھی رحلت کرتے ہیں۔ یہاں جہاد میں حصہ لینے والے بھی مرتے ہیں اور جو لوگ گھر میں بیٹھے رہتے ہیں وہ بھی مرتے ہیں۔ جو لوگ اپنے نظریات کی وجہ سے سربلند ہوتے ہیں وہ بھی مرتے ہیں جو کبھی ذلت برداشت نہیں کرتے اور وہ بزدل بھی مرتے ہیں جو ہر قیمت پر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ بھی رحلت کرتے ہیں جن کے عزائم بلند ہوتے ہیں اور جن کے مقاصد پاکیزہ ہوتے ہیں اور وہ مفاد پرست بھی مرتے ہیں جن کے پیش نظر دنیا کی حقیر چیزیں ہوتی ہیں۔

سب مرتے ہیں۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ............... "ہر نفس نے موت کا مزہ چکھنا ہے۔" یہ جام ہر کسی نے منہ سے لگانا ہے۔ ایک دن اسے اس زندگی کو خیر آباد کہنا ہے۔ اس سلسلے میں کسی ایک شخص اور ایک شخص کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے۔ جام اجل باری باری ہر ایک کے سامنے آتا ہے اور ہر شخص اس کے ساتھ منہ لگاتا ہے۔ فرق اگر ہے تو ایک دوسرے زاویے سے ہے۔ فرق صرف اقدار میں ہے اور فرق انجام میں ہے۔

وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَن زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ ... فَقَدْ فَازَ ............... "اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو۔ کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔"

یہ ہے ایک موت اور موت کے درمیان فرق۔ یہ انجام ہے جس کے ذریعے فلاں اور فلاں کے درمیان فرق ہو جاتا ہے۔ یہ ہے وہ قیمت جو باقی رہتی ہے اور جس کے لئے سعی اور جدوجہد ضروری ہے۔ اور وہ برا انجام جس سے بچنے کے لئے رات اور دن فکر کرنا چاہئے۔

فَمَن زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ............... "جو آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے تو وہ کامیاب ہے۔" زحزح کا لفظ اپنے زمزمہ ہی سے اپنے مفہوم کو ظاہر کر دیتا ہے۔ وہ ایک صورت حال کا نقشہ نظروں کے سامنے لاتا ہے۔ اس کا ایک خاص پرتو ہے۔ گویا آگ کے اندر کشش ہے' جو بھی اس کے قریب پہنچے وہ اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے دائرے میں آ جاتا ہے۔ اس لئے اس کو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی اسے اس جاذبیت سے آہستہ آہستہ چھڑائے تاکہ وہ اس کشش کے دائرے سے باہر آ جائے۔ اس لئے جس کے لئے یہ ممکن ہوا کہ اسے اُس دائرے سے کھینچ کر دور کر دیا گیا اور اس آگ کے دائرہ جاذبیت سے ہٹا دیا گیا اور وہ جنت میں داخل ہو گیا تو گویا وہ کامیاب ہو گیا۔

یہ ایک واضح تصویر کشی ہے' ایک زندہ منظر ہے۔ اس میں حرکت ہے اور کھینچا تانی ہے۔ اور حقیقت کے اعتبار سے بھی صورت حال یہی ہوتی ہے۔ آگ میں جاذبیت ہوتی ہے؟ کیا گناہ میں جاذبیت اور لذت نہیں ہوتی؟ کیا نفس انسانی کسی ایسے راہنما کا محتاج نہیں ہے جو اسے آہستہ آہستہ آگ کے دائرہ جاذبیت سے دور کر دے۔ ہاں ضرور ہے اور یہ اسے آگ سے بچاتا ہے۔ کیا انسان مسلسل کوششوں کے باوجود' ہمیشہ عمل میں قصور وار نہیں رہتا۔ الا یہ کہ اس پر خدا کا فضل و کرم ہو۔ ہاں یہ فضل باری تعالیٰ ہی ہے جو اسے آگ سے دور کر دیتا ہے۔ فضل خداوندی اسے آہستہ آہستہ آگ کے دائرے سے کھینچ لیتا ہے۔

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ............... "اس دنیا کا متاع تو ایک ظاہر فریب چیز ہے۔" دنیا کا سامان تو بہرحال سامان ہی ہے۔ لیکن یہ حقیقی سامان نہیں ہے۔ یہ حالت بیداری اور ہوشیاری کا سامان نہیں ہے۔ یہ دھوکے میں ڈالنے والا سامان ہے۔ انسان اس کے فریب میں آکر متاع سمجھتا ہے۔ یہ ایسا سامان ہے جو فریب اور دھوکہ پیدا کرتا ہے۔ رہا

وہ سامان جو سچائی پر مبنی ہے اور حقیقی سامان ہے' اور جس کے لئے حقیقتاً جدوجہد کرنا چاہئے' وہ آخرت کی کامیابی کا سامان ہے اور آخرت کی کامیابی یہ ہے کہ انسان دوزخ سے ہٹا دیا جائے۔

جب یہ حقیقت نفس انسانی کے اندر جگہ پکڑ لیتی ہے اور جب نفس انسانی اپنے حساب و کتاب سے زندہ رہنے کی تڑپ نکال دیتا ہے' کیونکہ ہر نفس نے بہرحال ایک دن مرنا ہے اور اسی طرح جب اس نے اپنی فہرست ترجیحات سے دنیا کے نظر فریب سامان کو بھی نکال دیا تو اس وقت پھر اللہ اہل ایمان سے بات کرتے ہیں کہ ان کے لئے مال اور جانی آزمائشیں آنے والی ہیں۔ اور اسی وقت پھر وہ ان قربانیوں کے لئے تیار ہوتے ہیں۔

لَتُبْلَوُنَّ فِیْٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ۫ وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِیْرًا ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ

"مسلمانو! تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی' اور تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اگر ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔"

عقائد اور نظریات اور دعوت اور تحریک کی سنت یہ ہے کہ ان میں ابتلا' جان کی ابتلا' مال کی ابتلا ضروری ہوتی ہے اور نفس انسانی کو اس میں ثابت قدمی' صبر اور عزم سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ جنت کی راہ ہے اور جنت تو تب ملتی ہے جب ناپسندیدہ کاموں سے اجتناب کیا جائے اور جنت ان کے اندر گھیری ہوئی ہے اور دوزخ شہوات نفس کے درمیان ہے۔

یہی ایک صورت ہے جس میں کسی دعوت کو لے کر اٹھنے والی جماعت کو برپا کیا جا سکتا ہے۔ اسی صورت میں دعوتی فرائض ادا کئے جا سکتے ہیں۔ یہی طریقہ ہے' ایسی جماعت کی تربیت کا۔ اور صرف اسی طریقے سے اس کی خفیہ قوتوں' بھلائی کی قوتوں' صبر و ثبات کی قوتوں کو جگایا جا سکتا ہے۔ یہ طریقہ کہ فرائض کو عملاً ادا کیا جائے اور لوگوں کی حقیقی حیثیت کو جانا جائے اور زندگی کی اصلیت بھی ذہن میں ہو کہ اس کی کیا حقیقت ہے؟ یہی ایک طریقہ ہے کہ دعوت کے اردگرد مضبوط لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ کسی دعوت کو لے کر چلتے ہیں اور اسی کی راہ میں آنے والی مشکلات پر صبر کرتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

کسی بھی دعوت کی قدر ایسے ہی لوگوں کے پاس ہوتی ہے اور وہ اسے اہم سمجھتے ہیں اور اس دعوت کی راہ میں وہ جس قدر مشکلات برداشت کریں گے' اس قدر وہ انہیں عزیز ہوگی۔ اس لئے وہ اس کو کبھی بھی نظرانداز نہ کریں گے' خواہ جیسے حالات بھی ہوں۔

آزمائش کو ہر دعوت کی سنت اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ اس سے داعی اور دعوت دونوں مضبوط ہو جاتے ہیں۔ مقابلہ ہی انسان کے اندر سے اس کی خفیہ قوتوں کو جگاتا ہے۔ ان کو نشوونما دیتا ہے' ان کو مجتمع کرتا ہے اور پھر ان کو ایک راہ پر لگاتا ہے۔ کسی بھی جدید دعوت کو چاہئے کہ وہ ان خفیہ قوتوں سے کام لے' انہیں جگائے تاکہ اس کی جڑیں مضبوط ہوں اور وہ معاشرے کے اندر گہری جڑیں رکھتی ہو۔ پھر نظریاتی اعتبار سے اسے چاہئے کہ وہ تروتازہ' اور انسانی فطرت کے اندر رچی بسی ہو۔

حاملین دعوت کو اپنے نفوس کی حقیقت اچھی طرح معلوم ہو' اور وہ جہاد فی سبیل اللہ اور اس زندگی کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہوں۔ انہیں معلوم ہو کہ نفس انسانی کی حقیقت کیا ہے اور اس کے اندر کیا کیا خفیہ قوتیں ہیں۔ انہیں معلوم ہو کہ ایک جماعت اور ایک معاشرے کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔ انہیں معلوم ہو کہ ان کی دعوت کے اصول اور ان کی نفسانی خواہشات کے درمیان کہاں کہاں اور

کس کس طرح جنگ ہوگی اور پھر تمام لوگوں کے ساتھ اس دعوت کی جنگ کس طرح ہوگی۔ پھر انہیں معلوم ہو کہ شیطان کن کن دروازوں سے نفس انسانی کے اندر داخل ہو جاتا ہے' راستے میں کہاں کہاں پھسلن ہے اور کہاں کہاں گمراہی کی دلدل ہے۔

اس جہد مسلسل کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس پر اس کے مخالفین بھی غور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ جو اس قدر قربانیاں دیتے ہیں لازماً اس میں کوئی خیر ہوگی کوئی راز تو اس میں ہوگا۔ یہ لوگ اس راہ میں اس قدر مشکلات برداشت کرتے ہیں اور وہ پرعزم طور پر اپنے موقف پر جمے ہوئے ہیں۔ ایک مقام ایسا ضرور آتا ہے کہ مخالفین کے دل پگھل جاتے ہیں' وہ ٹوٹ جاتے ہیں اور آخر کار فوج در فوج تحریک میں داخل ہوتے ہیں۔

غرض دعوت کی یہ سنت ہے۔ اس دعوت کی راہ جو پر مشقت حالات پیش آتے ہیں' ایسے حالات آتے ہیں جن حالات کے اندر تلخ کھینچاتانی قائم رہتی ہے اور اس راہ میں دشمنوں کے حملوں کا مقابلہ ہوتا ہے اور اس راہ میں ہر وقت مشکلات برداشت کر کے اللہ کی رحمت کی امید قائم رکھنا ہوتی ہے اور یہ سب کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو نہایت ٹھوس لوگ ہوں اور جو نہایت ہی اولوالعزم ہوں۔

وَإِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ ........................ "اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ ان لوگوں کے کاموں میں سے ہوگا جو اولوالعزم ہیں۔"

مدینہ کی اسلامی جماعت اس بات کی توقع کرتی تھی کہ اس راہ میں اسے بے پناہ مشکلات پیش آنے والی ہیں۔ وہ اذیت' مصیبت اور مشکلات کی توقع کر رہی تھی۔ چاہے یہ مشکلات جانی ہوں یا مالی۔ یہ ان اہل کتاب کی طرف سے ہوں جو مدینہ کے اردگرد بستے تھے یا ان دشمن مشرکین کی طرف سے ہوں جو مکہ میں تھے۔ لیکن یہ مشکلات ضرور ان کی راہ میں آئیں گی۔ وہ کبھی بھی شکست تسلیم نہ کریں گی اور کبھی بھی واپس ہو کر شکست تسلیم نہ کریں گی۔ اس جماعت کو یہ بھی یقین تھا کہ اس نے ایک دن ضرور مرنا ہے۔ اور یہ کہ اصل اجر تو وہ ہوگا جو آخرت میں ملے گا اور یہ کہ کامیاب وہی ہوگا جو آگ سے ہٹایا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا اور یہ کہ دنیا کی زندگی تو متاع غرور ہے۔ مدینہ کی یہ جماعت اس قدر مضبوط بنیادوں پر کھلی زمین پر کھڑی تھی اور وہ اسی شاہراہ پر گامزن تھی جو یقیناً منزل مقصود کو جاتی تھی۔ اور یہ پختہ اور مضبوط زمین اب بھی حاملین دعوت اسلامی کے لئے موجود ہے۔ اور یہ کھلی اور سیدھی شاہراہ ہر انسان کے سامنے ہے۔ اس دعوت کے وہی پرانے دشمن آج بھی اس کے دشمن ہیں۔ صدیوں وقت گزرنے کے باوجود یہ دشمن نہیں بدلے۔ وہ آج تک اس کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں' حالانکہ صدیاں بیت گئیں اور قرآن وہی قرآن ہے اور وہی اس کا پیغام ہے جو تھا۔

ہاں' یہ درست ہے کہ فتنہ و ابتلا کے اسٹائل ہر دور میں بدل جاتے اور اس تحریک کے خلاف پروپیگنڈے کے نئے نئے وسائل سامنے آجاتے ہیں۔ اس کو ایذا دینے کے طریقے بھی نئے آتے رہتے ہیں۔ اس کی شہرت کو خراب کیا جاتا ہے' اس کے تصورات کے بنیادی عناصر کو خراب کیا جاتا ہے۔ ان کی اہمیت کو ختم کیا جاتا ہے اور دعوت کے مقاصد کے بارے میں غلط تاثرات دیئے جاتے ہیں' لیکن اس سلسلے میں واحد اصول یہ ہے:

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ

"اے مسلمانو! تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی اور تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔"

اس سورت میں اہل کتاب کی سازشوں کے ایک بڑے حصے کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ ان کے پروپیگنڈے اور شکوک و شبہات پھیلانے کے نمونوں سے بھری پڑی ہے۔ کبھی یہ شکوک و شبہات اصل دعوت اور اس کے اصول کے اندر پیش کئے جاتے ہیں۔ کبھی اس دعوت کے حاملین اور کارکنوں کے خلاف شبہات پھیلائے جاتے ہیں۔ اور اس کام کا اسٹائل اور شکل و صورت ہر دور میں بدل جاتی ہے۔ اور جدید وسائل 'نشرو اشاعت کے بعد اس کے رنگ ڈھنگ بہت ہی بدل گئے ہیں۔ اور یہ تمام کام اسلام کے نظریاتی کام کے خلاف مسلسل ہو رہا ہے۔ نیز اس کا اول ٹارگٹ اسلامی جماعت اور اس کی قیادت ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مذکور بالا آیت میں جو فریم ورک دیا ہے یہ کام آج بھی بہرحال اسی کے اندر ہو رہا اور جس مزاج کا اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے اس مزاج سے ہو رہا ہے۔ اور دشمنوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو نشاندہی کی ہے اس کے رنگ ڈھنگ آج بھی وہی ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت دی ہے وہ ہر دور میں جماعت اسلامی اور تحریک اسلامی کے لئے ایک سرمایہ ہے 'جب بھی وہ اس دعوت کو لے کر اٹھے اور جب بھی وہ اس زمین کے کسی حصے میں اسلامی نظام کے قیام کا نصب العین لے کر اٹھے۔ جب بھی یہ کام شروع ہو گا تو اس کے خلاف فتنہ اور سازشوں کے وسائل حرکت میں آنا شروع ہوں گے 'جدید سے جدید پروپیگنڈے کے وسائل کے دروازے کھل جائیں گے۔ اس کے مقاصد کو غلط رنگ میں توڑ موڑ کر پیش کیا جائے گا۔ اور اس کی صفوں کو منتشر کرنے کی سعی کی جائے گی اور قرآن کی جانب سے تحریک اسلامی کی ہدایت اور اس کی آنکھیں کھولنے کے لئے یہ آیت سامنے آجائے گی۔ وہ اس تحریک کے مزاج سے داعیوں کو خبردار کرے گی 'اس کا طریق کار سمجھائے گی۔ اور اس کے مخالفین کا مزاج بھی تحریک کے سامنے رکھ دے گی جو راستے میں تحریک کی راہ پکڑے ہوئے ہیں اور یہ آیت تحریک اسلامی کے دل کو اطمینان سے بھر دے گی۔ اور اس راہ میں اسے جو مشکلات پیش آئیں انہیں انگیز کرے گی اور جب یہ بھیڑیئے ہر طرف سے اس کا گوشت نوچیں گے اور جب اس کے چاروں طرف نشرو اشاعت کے وسائل بھونکنے لگیں گے اور جب اس پر ہر طرف سے ابتلا آئے گی اور اسے فتنہ سامانیوں کا سامنا ہو گا تو یہ تحریک مطمئن ہو کر اپنی راہ پر گامزن رہے گی اور اسے یہ تمام نشانات راہ صاف صاف نظر آئیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ اسے ابتلا 'اذیت' فتنے اور باطل پروپیگنڈے سے پہلے ہی خبردار کر دیا گیا۔ بتا دیا گیا کہ وہ اس دعوت کی وجہ سے بہت کچھ سنے گی اور یہ اس لئے بتا دیا گیا کہ اس تحریک کو اس بات پر پہلے سے پختہ یقین ہے کہ صبر اور تقویٰ ہی زاد راہ ہیں۔ اور ان کے ذریعے تمام سازشیں 'تمام پروپیگنڈے ختم ہو جاتے ہیں 'ان کے ہوتے ہوئے اذیت و ابتلا کی اہمیت اور شدت ہی ختم ہو جاتی ہے اور تحریک اپنے ٹارگٹ کی طرف جاتی ہے 'رواں دواں ہوتی ہے 'نہایت ہی پرامید ہو کر 'نہایت عزم کے ساتھ اور صبر و تقویٰ کے زاد راہ کے ساتھ۔

○.....☆☆☆.....○

اس کے بعد روئے سخن اہل کتاب پر تنقید کی جانب ہو جاتا ہے۔ ان کے غلط موقف کی قلعی کھول جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جب ان کو کتاب دی گئی تھی تو ان سے تو عہد یہ لیا گیا تھا کہ تم یہ یہ کرو گے۔ مگر انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا اور جس بات کو ان کے پاس بطور امانت رکھا گیا تھا اس میں انہوں نے خیانت کی۔ ان سے پوچھا جاتا ہے:

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ
لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ٘ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا

قَلِيْلًا ۖ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

"اہل کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمہیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہو گا۔ مگر انہوں نے کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔ اور تھوڑی قیمت پر اسے بیچ ڈالا۔ کتنا برا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں۔"

اس سورت میں اہل کتاب کے بہت سے اقوال و افعال کو لیا گیا ہے خصوصاً یہودیوں کے۔ ان میں سے ممتاز ترین کردار ان کا یہ بیان ہوا ہے کہ ان لوگوں کی یہ عادت رہی ہے کہ یہ حق کو چھپاتے ہیں حالانکہ ان کو اچھی طرح یہ پتہ ہوتا ہے کہ یہ حق ہے۔ پھر یہ اس حق کو باطل کے ساتھ ملاتے ہیں اور اس طرح اپنے پروپیگنڈے کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں۔ اس طرح وہ دین کے مفہوم میں شکوک و شبہات پھیلاتے ہیں۔ وہ اسلام کی صحت پر اعتراضات کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا بھی انکار کرتے کہ اسلام اور ادیان سابقہ کے اندر بنیادیں مشترک ہیں۔ اسلام ادیان سابقہ کی تصدیق کرتا ہے اور وہ دین اسلام کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان کے پاس تورات موجود تھی جس میں حضرت محمد ﷺ کی سچائی ثبت تھی اور وہ جانتے تھے۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ قرآن مجید بھی اسی منبع سے آیا ہے جس سے تورات اتری ہے۔

اب وہ جو یہ موقف اختیار کر رہے ہیں وہ ان کے لئے نہایت ہی نامناسب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا ہے کہ وہ کتاب کی تبلیغ کریں گے اور اس میں جو کچھ ہے اسے چھپائیں گے نہیں وہ اسے بیان کریں گے اور تمام لوگوں کے سامنے بیان کریں گے۔ نہ چھپائیں گے اور نہ خفیہ رکھیں گے۔ لیکن انہوں نے اللہ کے اس عہد صریح کو پس پشت ڈال دیا۔ اس آیت کا انداز تعبیر نہایت ہی موثر ہے۔ اس کے اندر دینی فعل کے علاوہ ظاہری حرکت بھی ہے یعنی کسی چیز کو پس پشت پھینک دینا۔ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ ...... ........ (انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا) اور یہ حیاسوز کام انہوں نے کیا کیوں؟ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۖ ........... (انہوں نے تھوڑی سی قیمت پر اسے بیچ ڈالا)

یہ کام انہوں نے اس دنیا کے مفادات کے لئے کیا۔ یہ یہودیوں کے مذہبی راہنماؤں کے ذاتی مفادات اور ان کی قومیت کے بچاؤ کے لئے انہوں نے یہ کام کیا۔ اور یہ سب کچھ ثمن قلیل ہی ہیں۔ اگرچہ وہ تمام عرصے کے لئے تمام دنیا پر قابض ہو جائیں۔ یہ بھی اللہ کے عہد کے مقابلے میں ثمن قلیل ہو گا۔ اور اگر اللہ کے ہاں ان کے لئے جو اجر تھا وہ اسے نظروں میں رکھتے تو یہ انہیں واقعی ثمن قلیل نظر آتا۔ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ................. (کتنا برا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں)۔

○.....☆☆☆.....○

بخاری شریف میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضور ؐ نے یہودیوں سے کوئی بات پوچھی۔ انہوں نے اسے چھپا دیا اور انہوں نے غلط جواب دیا۔ وہ چلے گئے۔ وہ یہ تاثر دیتے ہوئے گئے کہ انہوں نے حضور ؐ کو وہ بات بتا دی جو انہوں نے پوچھی تھی اور اس پر وہ اپنی جگہ خوش تھے کہ ان کو حضور کے ہاں تعریف کا مستحق قرار دیا گیا لیکن خوش اس لئے بھی تھے کہ انہوں نے اصل بات چھپا دی تھی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

"تم ان لوگوں کو عذاب سے محفوظ نہ سمجھو جو اپنے کرتوتوں پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایسے کاموں کی تعریف انہیں حاصل ہو جو فی الواقعہ انہوں نے نہیں کیے۔ حقیقت میں ان کے لئے دردناک سزا تیار ہے۔"

ایک دوسری روایت میں امام بخاری نے ابوسعید الخدری سے نقل کیا ہے کہ منافقین میں سے بعض لوگ ایسے تھے کہ جب رسول خدا جہاد کے لئے نکلتے تو وہ ہمیشہ پیچھے رہ جاتے اور وہ یوں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے بہت ہی خوش ہوتے کیونکہ یہ رسول اللہ کی مرضی کے خلاف ہوتا۔ جب رسول خدا واپس آتے تو یہ لوگ عذرات پیش کرتے اور قسمیں اٹھاتے۔ اور وہ اس بات کو پسند کرتے کہ انہوں نے جو کام نہیں کئے اس پر ان کی تعریف کی جائے۔ اس پر یہ آیت نازل لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا

اصل حقیقت یہ ہے کہ کوئی آیت کس واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی؟ یہ کوئی قطعی بات نہیں ہے۔ ایسی روایات بعض اوقات ایسی صورت حال کو بیان کرتی ہیں جن میں کسی آیت سے کوئی دلیل حضور نے پیش کی ہوتی ہے۔ راوی کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ شاید یہ آیت ابھی نازل ہوئی ہے یا اگر کسی واقعہ پر کوئی آیت منطبق ہوتی ہے تو راوی کہتا ہے کہ یہ اس آیت کا مصداق ہے۔ اور یہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس لئے ان دو روایتوں کے بارے میں بھی قطعی بات نہیں کی جاسکتی۔

رہی پہلی روایت تو اس میں سیاق کلام کے ساتھ ہم آہنگی ہے اس لئے کہ بات اہل کتاب کی ہو رہی ہے۔ اہل کتاب کے اس دعویٰ کا ذکر ہے کہ ان کو جو کتاب دی گئی ہے اور اس میں جو ان کے پاس امانت ہے وہ اسے چھپائیں گے نہیں۔ لوگوں کے سامنے بیان کریں گے۔ وہ اسے چھپارہے ہیں اور جھوٹ اور فریب کاری کے طور پر کچھ اور بتاتے ہیں اور پھر یہ توقع بھی کرتے ہیں کہ ان کے اس جھوٹ اور افتراء پر ان کی تعریف ہوگی۔

اگر دوسری روایت درست ہے تو پھر بھی سیاق کلام میں منافقین کی بات موجود ہے اور یہ آیت بھی انہیں آیات کے ساتھ ملحق ہے۔ غرض یہ ان لوگوں کے نمونے ہیں جو رسول اللہ کے عہد میں پائے جاتے تھے۔ ایسے لوگ آج بھی ہر تحریک میں پائے جاتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے نظریات کے تقاضے اور ان کے فرائض پورے نہیں کرسکتے اور نہ ہی نتائج برداشت کرسکتے ہیں اور نہ ہی نظریہ کی ذمہ داریاں پوری کرتے ہے۔ جدوجہد سے پیچھے بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر جدوجہد کرنے والے ناکام ہوجائیں اور انہیں ہزیمت ہو تو یہ لوگ سر اٹھاتے ہیں اور ناک میں شکن ڈال کر اور ناک کھینچ کر بات کرتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ بہت ہی عقلمند ہیں اور موقع شناس ہیں اور خوددار ہیں۔ اور اگر مجاہدین کو فتح ہو جائے اور انہیں مفادات ملیں تو ہمارے ایسے ساتھی آگے بڑھتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ان کے اس منصوبے کے مؤید تھے اور یہ کہ اس فتح میں ہمارا بھی ہاتھ ہے۔ اور یہ لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ان کی مدح سرائی ان کاموں پر بھی ہو جو انہوں نے نہیں کئے۔

انسانیت میں سے یہ ان لوگوں کا نمونہ ہے جو ڈرپوک ہوتے ہیں اور بلند بانگ دعویٰ کرتے ہیں۔ قرآن کریم ان لوگوں کی پینٹنگ چند لکیروں کے اندر کر دیتا ہے اور ان کے خدوخال بہت ہی واضح طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر الفاظ کا جامہ پہنا کر قرآن کریم ان خدوخال کو دائمی ریکارڈ کے طور پر محفوظ کرلیتا ہے تاکہ اس آئینے میں آنے والے اپنا چہرہ دیکھیں۔ یہ ہے اسلوب قرآن کریم کا۔

اس قسم کے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ کو تاکید بتاتے ہیں کہ ان کے لئے نجات اخروی کی کوئی صورت نہیں ہے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ

(تم ان لوگوں کو عذاب سے محفوظ نہ سمجھو) وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ............ (بے شک ان کے لئے دردناک عذاب ہے) اور عذاب الیم کی یہ وعید اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ جو مالک السموت والارض ہے۔ وہ ہر چیز کی قدرت رکھنے والا ہے۔ تو

۱۹ ع ۹ ۱۰
پھر بچنے کی صورت ہی کیا رہتی ہے۔ اور نجات کب مل سکتی ہے؟ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۠...

(اور زمین و آسمانوں کا مالک اللہ ہے اور اس کی قدرت سب پر حاوی ہے)

☆ ☆ ☆

# درس نمبر۲۹ ایک نظر میں

یہ سورت جس قدر سبقوں اور دروس پر مشتمل تھی یہ ان میں سے آخری درس ہے۔ اس سورت میں اسلامی تصور حیات کے اساسی عناصر میں اہم عناصر کی ایک بڑی تعداد کا ذکر ہوا ہے۔ اور ان عناصر کو ہر قسم کے اجمال' اشتباہ اور اہل کتاب کے ساتھ مجادلوں اور مباحثوں کے بعد التباسات اور شبہات سے پاک کرکے ان اساسی عناصر کو موکد طور پر بیان کیا گیا ہے۔ پھر منافقین کے ساتھ مباحثوں اور مشرکین کے ساتھ مباحثہ کرکے ان اساسی عناصر کو منقطع کیا گیا ہے۔ اس پوری سورت میں اسلامی نظام زندگی کی نوعیت اور جان و مال کے حوالے سے اس کے تقاضوں کا بیان ہوا ہے۔ جماعت مسلمہ کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ ان فرائض کو کس طرح ادا کرے گی۔ اور مشکل حالات کے ابتلا میں اس کا رویہ کیا ہوگا اور خوشحالی کے حالات میں وہ ابتلا سے کس طرح عہدہ برآ ہوگی اور وہ اسلامی نظریۂ حیات اور اس کے عظیم فرائض اور ڈیوٹیوں کو کس طرح سرانجام دے گی' جو نفس کے حوالے سے بھی ہیں اور مال کے حوالے سے بھی ہیں۔ یہی وہ مضامین تھے جو اس پوری سورت کا محور تھے اور جنہیں ہم نے پارہ سوئم اور چہارم کی تفسیر فی ظلال القرآن میں بیان کیا۔

اب یہ آخری درس ایک طرح کی آخری ضرب یا آخری ضربات ہیں۔ یہ آخری ضربات اس سورت میں موضوع کے ساتھ نہایت ہی متناسب ہیں۔ اور یہ آخری ضرب بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے اور طرز ادا کے اعتبار سے سابقہ ضربات سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

اس کے اندر ایک نہایت ہی گہری حقیقت کا بیان ہوا ہے۔ یہ کہ یہ کائنات ایک کھلی کتاب ہے۔ اس کے اندر ایمان و یقین کے بے شمار دلائل اور علامات موجود ہیں۔ اس کائنات سے اس ذات کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے جو اسے بڑی حکمت کے ساتھ چلا رہی ہے۔ اس سے اظہار ہوتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی سے وراء ایک اخروی زندگی ہے۔ اس زندگی کا حساب و کتاب اور مکافات عمل وہاں ہوگا۔ ان دلائل کو کون پڑھ سکتا ہے' ان آیات و اشارات کو کون پا سکتا ہے' اس حکمت کا ادراک کون کر سکتا ہے؟ اور اس کائنات کی آواز کون سن سکتا ہے؟ یہ صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اولوالالباب ہیں' جو اصحاب دانش و بینش ہیں۔ وہ لوگ جو اس کتاب مفتوح پر سے یونہی نہیں گزر جاتے اور وہ ان ظاہر و باہر آیات اور نشانیوں سے آنکھیں بند نہیں کر لیتے۔

یہ حقیقت اس کائنات کے حوالے سے اسلامی تصور حیات کے اساسی عناصر میں سے ایک عنصر ہے۔ اور اس کے اور انسانی فطرت کے درمیان ایک عمیق ربط ہے۔ اور فطرت انسانی اور فطرت کائنات کے درمیان گہری داخلی مفاہمت اور ہم آہنگی ہے۔ یہ کائنات ایک جہت سے اپنے خالق کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔ اور دوسری جہت سے اس سے وہ ناموس اکبر معلوم ہوتا ہے۔ جو مقصدیت' گہری حکمت اور قصد و ارادے آپ کے حوالے سے اس کائنات کے اندر کارفرما ہے۔ اور اس کا روح رواں ہے۔ اور اس ناموس اکبر کا فہم و ادراک اس نقطہ نظر سے بہت ہی اہم ہے کہ اس کائنات' اس کے خالق اللہ العالمین کے بارے میں انسان کیا موقف اختیار کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات اس موجودہ دنیا کے بارے میں اسلامی افکار کا اہم خزانہ اور منبع ہے۔

اس کے بعد اس درس میں' صاحبان عقل و دانش اور عالمان علم کائنات کی اس پر خشوع دعا کی قبولیت کا ذکر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کائنات کی اس کتاب مفتوح کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور یہ کائنات جن دلائل کو پیش کرتی ہے یہ ان پر غور کرتے ہیں۔ اور یہ کائنات جو مقاصد بتاتی ہے۔ یہ اس پر بھی تامل کرتے ہیں۔ اور دعا کی قبولیت کے ساتھ ساتھ ہدایات کیا دی جاتی ہیں؟ یہ کہ عمل پیہم' جہاد مسلسل'

صبرو محبت اور ایمان کے تقاضوں کی بجاآوری ہی دراصل وہ تحفے ہیں جو ان لوگوں کو ملتے ہیں۔ جو اس کائنات کی کتاب مفتوح کو خدا ترسی کے ساتھ بڑھتے ہیں۔ اور پھر آخر میں اہل کفر کی پوزیشن کو حقیر بنایا گیا ہے۔ اگرچہ ان کے پاس اس دنیا کا سازو سامان زیادہ ہے۔ یہ کچھ بھی نہیں ہے' اصل دولت تو وہ ہے جو آخرت میں ملے گی۔ مومنین کو اس کی بات کرنا چاہئے۔

اس سورت میں اہل کتاب اور مسلمانوں کے خلاف ان کے موقف کے بارے میں تفصیلی بات کی گئی تھی۔ اس آخری سبق میں اہل کتاب میں سے بعض اچھے لوگوں کا ذکر بھی کر دیا گیا۔ اور آخرت میں ان کی جزا اور صفت خشوع کا ذکر خصوصی طور پر کیا گیا۔ اس نسبت سے کہ اہل ایمان میں سے ان لوگوں کا ذکر کیا گیا تھا جو اس کائنات کی کتاب مفتوح کا مطالعہ کرتے تھے اور ان کے اندر بھی صفت خشوع اور انابت سے دعا کی تھی۔ اور انہوں نے اس امر کو نہایت ہی شرمناک سمجھا کہ اللہ کی آیات کو معمولی دام کے عوض فروخت کیا جائے۔ جیسا کہ بعض اہل کتاب یہ کام کرتے تھے اور جن کا ذکر اس سورت میں ہو چکا ہے۔ اس کے بعد پوری سورت کا خاتمہ آتا ہے اور اس میں اس پوری سورت کی ہدایت کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ اور جماعت مسلمہ کو یہ کہا گیا ہے کہ یہ ہے ان کی زندگی کا خلاصہ ہے۔ یہ ان کے فرائض اور پروگرام کا خلاصہ ہے۔ اور اسی میں ان کی فلاح مضمر ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱصْبِرُوا۟ وَصَابِرُوا۟ وَرَابِطُوا۟ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٠٠﴾

"اے ایمان والو! صبر سے کام لو' باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ' حق کی خدمت کیلئے کمربستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو' امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔"

○.....☆☆☆.....○

# درس نمبر۲۹ تشریح آیات

## آیت نمبر ۱۹۰ تا ۲۰۰

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ
اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا
وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا
مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَا إِنَّكَ مَن
تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَا إِنَّنَا
سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا ۚ رَبَّنَا فَاغْفِرْ
لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَآتِنَا مَا
وَعَدتَّنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿۱۹۴﴾

"زمین و آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوشمند لوگوں کیلئے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے' بیٹھتے اور لیٹتے' ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں۔) پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب' ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے تو نے جسے دوزخ میں ڈالا اسے درحقیقت بڑی ذلت و رسوائی میں ڈال دیا' اور پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ مالک! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو' ہم نے اس کی دعوت قبول کرلی۔ پس اے ہمارے آقا! جو قصور ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگزر فرما' جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کردے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ خداوندا' جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال' بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔"

زمین و آسمان کی تخلیق میں' اور رات اور دن کی گردش میں وہ کیا آیات اور نشانیاں ہیں' اور جب یہ اولوالالباب آسمان اور زمین میں تفکر کرتے ہیں تو وہ کیا نشانیاں ہیں؟ جب وہ رات اور ان کی گردش میں غور کرتے ہیں تو انہیں کیا نظر آتا ہے؟ جبکہ پھر وہ اللہ کو یاد کرنے لگتے ہیں کھڑے ہو کر بھی' بیٹھ کر بھی اور کروٹ لیتے ہوئے بھی۔ اور پھر سوال یہ ہے کہ ان کے نتیجہ فکر کا تعلق اللہ کے ذکر کے ساتھ کیسے مربوط ہو جاتا ہے کہ وہ فوراً کھڑے' بیٹھے اور کروٹ لیتے اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ اور پھر وہ اس ذکر کو اس پر خشوع و خضوع اور پر سوز دعا پر کیسے ختم کرتے ہیں؟ وہ کہتے ہیں۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ...... ...................... (پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے پس اے رب ہمیں دوزخ کی آگ سے بچالے۔)

قرآن کریم یہاں ان لوگوں کی ایک زندہ اور متحرک تصویر کشی کرتا ہے جو اس کائنات کے اندر صحت مند غور کرتے ہیں اور ان کو اس کائنات کے موثرات کا ادراک ہوتا ہے۔ اور وہ پھر ان مدرکات اور موثرات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں' اور ان کی آنکھوں کے سامنے رات دن اس پوری کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کی طرف لبیک کہتے ہیں۔

قرآن کریم انسانی فکر و نظر کو بار بار دعوت نظارہ دیتا ہے اور بڑی تاکید سے حکم دیتا ہے کہ وہ اس کھلی کتاب کا مطالعہ کریں۔ جس کے صفحات رات اور دن خود الٹتے پلٹتے رہتے ہیں۔ ہر صفحے پر صانع قدرت کے نشانات میں سے ایک نشان نظر آتا ہے۔ اور وہ فطرت سلیمہ کے اندر ایک ایسی سچائی کے پہچاننے کا بے حد جوش پیدا کر دیتا ہے' جو سچائی اس کتاب کے صفحات کے اندر جمی ہوئی ہے۔ اس کائنات کی اساس میں وہ سچائی موجود ہے۔ اس کائنات کے خالق کے مطالبات کے تسلیم کرنے کی طرف یہ سچائی مائل کرتی ہے۔ اور جس خالق نے اس کائنات میں یہ ناموس ودیعت کیا ہے۔ اس کی طرف رجوع کی دعوت دی جاتی ہے۔ دل میں خالق کی محبت بھی پیدا ہوتی ہے' اس کے ساتھ ساتھ اس کا خوف اور خشیت بھی پیدا ہوتی ہے......... پھر یہ اولوالالباب کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو صحیح الفکر ہیں۔ جو آنکھیں کھول کر کتاب کائنات کی آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ آنکھوں پر پردے نہیں ڈالتے۔ وہ اپنے غور و فکر اور تدبر کے دریچے بند نہیں کرتے۔ اور اس طرح وہ اپنے دل کے حوالے سے' اپنے قیام میں' اپنے قعود میں اور کروٹ لیتے ہوئے اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یوں ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور ان کے ذرائع ادراک کھل جاتے ہیں اور وہ اس ناموس اکبر اور حقیقت کائنات کا ادراک کر لیتے ہیں جو اللہ نے اس کائنات میں ودیعت کی ہے۔ وہ اس کائنات کے مقصد وجود کو پالیتے ہیں۔ اس ایجاد کرنے کے اصل اسباب ان کے علم میں آجاتے ہیں اور وہ کائنات کے فطرت کے اجزائے ترکیبی اور نظام قیام سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ یہ تمام راز وہ اس الہام کے ذریعہ پاتے ہیں جو فطرت کے ان نوامیس اور انسانی دل کے درمیان رابطے کے ذریعے ہوتا ہے۔

زمین و آسمان کا مشہد' رات اور دن کی تبدیلی کا منظر اور سیاروں کی گردش کے مناظر ایسے مناظر ہیں کہ اگر ہم اپنی آنکھیں کھول کر دیکھیں' ہمارے دل کام کر رہے ہوں اور ہمارا ادراک اچھی طرح کام کرتا ہو اور ان کو ہم اس نظر سے دیکھیں جس طرح ایک انسان کسی مشہد اور منظر کو پہلی مرتبہ دیکھتا ہے اور اگر ہم اپنے احساس سے ان مناظر کے عادی ہونے کے تصور کو دور کر دیں' اور اس تکرار کے اثرات سے اپنی حس کو پاک کر دیں تو ہمارے احساس کیلئے یہ قابل ارتعاش ہوں' ہمارے شعور کے اندر زلزلہ آجائے اور ہمیں اچھی طرح احساس ہو جائے کہ اس نظام کے اندر جس قدر دقت نظر سے ہم آہنگی پیدا کی گئی ہے وہ کسی حکیمانہ ہاتھ کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ اس نظام کے پیچھے ایک مدبر عقل کام کر رہی ہے۔ اس نظام کے پیچھے ایک ناموس کام کر رہا ہے۔ جس کی خلاف ورزی ممکن نہیں ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک دھوکہ اور فریب نہیں ہو سکتا۔ نہ یہ کوئی بخت و اتفاق ہو سکتا ہے اور نہ یہ نظام محض فریب نظر ہو سکتا ہے۔

اور یہ بات بھی ہمارے شعور کے لئے کوئی کم زلزلہ خیز نہیں ہے کہ یہ زمین سورج کے اردگرد اور اپنے محور پر گردش کر رہی ہے۔ اور اس سے رات اور دن کے دو مناظر پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ کہ ان اجرام فلکی کے اندر کشش کام آرہی ہے۔ اور اس نے ہر ایک جرم کو اپنی جگہ ٹھہرایا ہوا ہے۔ یا کوئی اور نظام ہے۔ یہ تو ہمارے مقرر کردہ اصول موضوعہ میں کبھی درست ہوں گے کبھی غلط ہوں گے۔ جو صورت بھی ہو لیکن ہر صورت میں کائنات کا یہ عجوبہ' عجوبہ ہی رہتا ہے۔ اور نظر آتا ہے کہ ایک عظیم نظام ہے جس نے ان دیو ہیکل سیاروں اور اجرام کو تھام رکھا ہے۔ نہایت دقت سے 'نہ ٹوٹتے ہیں نہ باہم متصادم ہوتے ہیں' بنی نوع انسان میں سے ماہرین فلکیات چاہے اس کا جو نام بھی رکھیں' بہرحال یہ نظام قدرت کا نشان ہے' یہ سچائی کی برہان ہے' اور یہ سچائی گردش ایام اور دوران فلک سے عیاں ہے۔

قرآن کریم نے یہاں جو منظر کشی کی ہے' اس میں آسمانوں اور اجرام فلکی کی گردش اور رات اور دن کی پیہم تبدیلی کے مناظر اولوالالباب اور صاحبان عقل و دانش کے شعور اور فکر پر جو اثرات چھوڑتے ہیں' ان اثرات کے ایک ایک جزء کو بڑی دقت کے ساتھ قلم بند کر دیا ہے۔ یہ ایک قسم کی اثر انگیز تصویر ہے۔ اسے دیکھ کر دل اس کائنات کے ساتھ باہم معاملہ کرتے وقت بہت ہی صحیح نظام اور طریقہ کار اختیار کرتا ہے۔ یہ مناظر اپنی زبان میں بات کرتے ہیں اور یہ دل کائنات کی فطرت کے ساتھ ہم آہنگی اختیار کرتے ہیں' اس کی حقیقت کے ساتھ یکجا ہو جاتے ہیں۔ اور کائنات کے اشارات اور اثرات کو قبول کرتے ہیں۔ اس طرح کائنات کی یہ کتاب ایک مومن اور واصل باللہ انسان کیلئے کتاب علم و معرفت بن جاتی ہے۔ جسے اللہ نے تصنیف کیا ہے۔

اس مطالعہ کائنات کا انسانی شعور پر پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی یاد اور اس کی عبادت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جو لوگ مطالعہ کرتے ہیں وہ کھڑے ہو کر' بیٹھتے ہوئے اور کروٹ بدلتے ہوئے ہی اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ جبکہ وہ زمین اور آسمانوں کی تخلیق پر غور کرتے ہیں اور جبکہ وہ رات اور دن کے اختلاف کا مطالعہ بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ غور و فکر پھر عبادت بن جاتے ہیں۔ اور یوں یہ مشاہدات مشاہدات ذکر الٰہی بن جاتے ہیں۔ اس طرح' اس تصور انسان اور تصور کائنات کے مطابق دو حقائق ثابت ہو جاتے ہیں۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی تخلیق میں تدبر اور مشاہدہ کرنا اور اللہ کی اس کھلی کتاب کا مطالعہ کرنا اور اللہ کے تخلیقی ہاتھ کا مطالعہ کرنا بھی حرکت کائنات کا مطالعہ اور اس کائنات کے صفحات کو الٹنا پلٹنا' درحقیقت اصلی اور بنیادی عبادت ہے۔ اور یہ ایک ذکر الٰہی ہے جو نہایت ہی حقیقی ذکر الٰہی ہے۔ اگر کائناتی علوم' جن میں اس کائنات کی تنظیم اور تشکیل سے بحث ہوتی ہے۔ اور اس کائنات کے اندر جاری و ساری نوامیس و سنن کا مطالعہ اور ان قوتوں اور ذخائر کا مطالعہ جو اس کائنات کے اندر جمع شدہ ہیں اور اس کائنات کے اسرار و رموز کے علوم کو اگر اس کائنات کے خالق کے ذکر اور اس کی یاد کے ساتھ یکجا کر دیا جائے اور اس مطالعے سے اللہ کی جلالت قدر کا شعور پیدا کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا احساس اجاگر کیا جائے تو یہ تمام عمل اس کائنات کے خالق کی عبادت بن جاتا ہے۔ اور نماز کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور ان علوم کے ذریعہ زندگی درست ہو کر راہ مستقیم پر استوار ہو سکتی ہے۔ پوری انسانی آبادی اللہ کی طرف متوجہ ہو سکتی ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے مادی اور کافرانہ رجحان نے اس کائنات اور خالق کائنات کے درمیان تصوراتی بعد پیدا کر دیا ہے۔ انہوں نے تکوینی قوانین اور ازلی ابدی حقیقت کے درمیان تضاد پیدا کر دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ علم جو انسان کیلئے اللہ تعالیٰ کا خوبصورت ترین تحفہ تھا وہ خود انسان کیلئے ایک ایسی لعنت بن گیا ہے۔ جو انسان کا پیچھا کر رہا ہے۔ اور انسان کی زندگی کو جہنم میں تبدیل کر رہا ہے۔ اس کی زندگی قلق' روحانی خلا' اور عدم اطمینان کی صورت میں اس طرح بسر ہو رہی جس طرح انسان کا ایک قہار و جبار بھوت پیچھا کر رہا ہے۔

اور دوسری حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات میں جو آیات الٰہی ہیں' وہ اپنی الہامی صورت میں اسی شخص پر ظاہر ہوتی ہیں جس کا دل

ذکر الٰہی　اور عبادت الٰہیہ میں مشغول ہو۔ اور جو لوگ اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہو کر' بیٹھ کر اور کروٹ لیتے ہوئے' درحقیقت وہی لوگ ہیں جو زمین و آسمان کی تخلیق پر غور کرتے ہیں اور رات اور دن کے پیہم آنے پر غور و فکر کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر عظیم حقائق کھلتے ہیں۔ جو آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق کے اندر اور اختلاف لیل و نہار کے نظام میں لپٹے ہوئے ہیں۔ ان رازوں کے رازدان ہونے والے ہی پھر اسلامی نظام زندگی تک پہنچتے ہیں جو نجات اخروی' فلاح دنیوی اور خیر و صلاح کا ضامن ہے۔ رہے وہ لوگ جو صرف ظاہری دنیا کی زندگی ہی پر بس کرتے ہیں اور وہ اس کائنات کی بعض تکوینی چیزوں کو دریافت کر لیتے ہیں اور ان لوگوں کا کوئی ربط اسلامی نظام حیات سے نہیں ہوتا تو یہ لوگ تو پوری زندگی کی بربادی کی فکر کرتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کو شکست و ریخت سے دوچار کرتے ہیں اور ان تکوینی اسرار و رموز کو بربادی کیلئے استعمال میں لاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی زندگی کو ایک ایک ناقابل برداشت جہنم بنا رہے ہیں' وہ زندگی کے ایسے قلق سے دوچار کرتے ہیں جس میں سانس گھٹتی ہے۔ اور آخرت میں وہ اللہ کے غضب اور اس کے عذاب کی طرف لوٹیں گے۔

غرض یہ دونوں حقائق ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں' ان دونوں کو اس سورت نے موضوع بحث بنایا' جو اصحاب دانش کیلئے ان کے مطالعہ کائنات کے وقت اور تعلق باللہ کے قیام کی خاطر یہاں بیان کئے گئے ہیں۔ اور یہ ذکر و فکر کا وہ وقت ہوتا ہے' جس میں دلی صفائی حاصل ہوتی ہے' روح شفاف ہو جاتی ہے اور ادراک کے دروازے کھلتے ہیں' ہدایت اخذ کرنے کی استعداد بڑھ جاتی ہے' اور اس میں انسان قبولیت' تاثر اور اخذ کیلئے تیار ہوتا ہے۔

مطالعہ کائنات کا یہ وقت عبادت الٰہی　کا وقت ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اللہ کی جانب سے استقبال اور بندے کی جانب سے اتصال کا وقت ہوتا ہے۔ اس لئے اس وقت ادراک کائنات اور آیات کونیہ کی استعداد بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس وقت اس کائنات میں محض غور و فکر ہی اور اس کے نظام گردش لیل و نہار اور نظام ارض و سما ہی انسان کے ذہن میں القا کرتا ہے کہ اس کائنات کے اندر ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے اور یہ کہ یہ کائنات عبث نہیں ہے۔ نہ یہ محض فریب نظر ہے' یہی وقت اللہ کے ساتھ وصال کا وقت ہوتا ہے۔ اور براہ راست معرفت الٰہی　کا

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ............ "پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا' تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔" تو نے اس کائنات کو فضول پیدا نہیں کیا۔ بلکہ اس کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ حق ہو' سچائی اس کے قیام کا سامان ہو' سچائی اس کا قانون ہو' سچائی اس میں اصل ہو۔

سچ یہ ہے کہ اس کائنات کی ایک حقیقت ہے وہ "عدم" نہیں ہے جس طرح بعض فلسفے یہ کہتے ہیں کہ یہ عدم محض ہے۔ یہ حقیقت ہونے کے بعد ایک ناموس کے مطابق چلتی ہے لہٰذا یہ انارکی کے مطابق نہیں چل رہی ہے۔ وہ ایک مقصد کی طرف بڑھ رہی ہے اس لئے وہ بخت و اتفاق کے مطابق نہیں چلتی۔ غرض وہ اپنے وجود' اپنی حرکت اور اپنے مقاصد کے حوالے سے ایک عظیم سچائی کے کنٹرول میں چلتی ہے۔ اور اس کے ساتھ کوئی باطل ملاوٹ نہیں کر سکتا۔

یہ پہلا ٹچ ہے' جو اصحاب علم و دانش کے دلوں کو اس وقت دیا جاتا ہے جب وہ نظام تخلیق ارض و سما اور نظام گردش لیل و نہار پر غور کرتے ہیں اور اس ٹچ سے انہیں عبادت الٰہی' ذکر الٰہی　اور اتصال ذات کا احساس دلایا جاتا ہے۔ اس ٹچ سے ان کے پردۂ احساس پر حقیقی سچائی کا ایک نقش پڑ جاتا ہے جو اس کائنات کی نقشہ سازی میں کارفرما ہے۔ جب یہ اصحاب دانش اس سچائی تک پہنچ جاتے ہیں تو معاً وہ اللہ کی تسبیح اور تنزیہ کرنے لگتے ہیں اور ان کی اس تاویل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا............

"اے ہمارے رب' تو نے اس کائنات کو عبث نہیں پیدا کیا۔"

اس کے بعد یہ نفسیاتی سوچ ذرا اور آگے بڑھتی ہے۔ کچھ مزید تکوینی احساسات اور الہامات سامنے آتے ہیں فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ رَبَّنَآ إِنَّكَ مَن تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ .........

"ہمیں دوزخ کی آگ سے بچالے 'تو نے جسے دوزخ میں ڈالا اسے در حقیقت بڑی ذلت اور رسوائی میں ڈالدیا۔ اور پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا" ........ سوال یہ ہے زمین و آسمان کے اندر جو سچائی ہے اور اختلاف گردش لیل و نہار کے اندر جو سچائی ہے 'اس کے ادراک اور اس دعائیہ ارتعاش شعور کے درمیان کیا منطقی ربط ہے 'کہ صاحب ادراک نہایت ہی خدا ترسی 'نہایت ہی عاجزی اور نہایت ہی یکسوئی سے دعا کرنے لگتا ہے؟

جب اصحاب دانش اس سچائی کا ادراک کرلیتے ہیں' جو اس کائنات کی تہہ میں کام کرتی ہے تو ان کے نزدیک اس ادراک کا مفہوم یہ ہوتا کہ اس کائنات کے اندر ایک تقدیر ہے 'ایک تدبیر ہے 'اس کے اندر ایک حکمت کام کر رہی ہے اور اس کا ایک مقصد تخلیق ہے۔ یہ کہ لوگوں کی زندگی کے پس پشت 'ان ستاروں میں ایک سچائی اور عدل کام کر رہا ہے۔ اس لئے لوگ یہاں جو کچھ اعمال و افعال کرتے ہیں 'ان کا کسی دن حساب و کتاب ضروری ہے۔ مکافات عمل ہونا چاہئے 'اور مکافات عمل کی بنیاد پر عدالت اور انصاف کیلئے لازماً ایک دوسرا جہاں ہونا چاہئے۔ جس میں سچائی 'عدل اور جزا و سزا متحقق ہو۔

غرض اصحاب دانش کی دعا کے اندر جو حقائق سامنے آئے وہ فطرت کی بدیہی منطق ہے۔ جس کی کڑیاں اس طرح سرعت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتی چلی جاتی ہیں۔ اور ان کا شعور ایک ہی جمپ میں آگ اور جہنم کا شعور حاصل کرلیتا ہے۔ اور معاً دست بدعا ہوتے ہیں کہ اللہ! ہمیں اس سے بچا' یہ وہ پہلی بات ہوتی ہے جو ان کے دل میں آتی ہے۔ اور یہ آمد اس ادراک کا منطقی نتیجہ ہے جو اس کائنات کے اندر پنہاں سچائی کے حوالے سے وہ کرلیتے ہیں۔ کیفیت کے اعتبار سے یہ دعا نہایت ہی طویل 'خشوع و خضوع سے پر 'نہایت ہی مضطرب دل کے ساتھ نہایت ہی کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ اور پوری یکسوئی کے ساتھ 'دل مومن سے اٹھتی ہے اور الفاظ کے اعتبار سے وہ ایک میٹھا نغمہ ہے۔ جس کی ضربات ہم آہنگ اور نغموں کی پر سوز حرارت اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ خوبصورت الفاظ میں ہے۔

ذرا آپ ان صاحبان عقل و دانش کی ذہنی دنیا کا پہلا زلزلہ دیکھیں۔ وہ اس میں اپنے رب کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاتے ہیں تاکہ وہ انہیں آگ کے عذاب سے بچائیں ذرا غور فرمائیں رَبَّنَآ إِنَّكَ مَن تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ ......... ......... "تو نے جسے دوزخ میں ڈالا اسے در حقیقت بڑی ذلت اور رسوائی میں ڈالدیا۔ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ .... ......... "پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا"

اس دعا سے اظہار ہوتا ہے کہ ان کا خوف آگ کے عذاب سے تھا' اور اس سے بھی زیادہ ان کا خوف اس رسوائی سے تھا جو اہل دوزخ کو ہوا کرتی ہے۔ ان کی ذہنی دنیا میں یہ ارتعاش اس شرمندگی اور رسوائی کی وجہ سے آیا جو اہل دوزخ کی ہوگی۔ اس لئے یہ خوف انہیں محض اس سبب سے دامن گیر ہوا کہ انہیں اللہ سے حیالاحق ہوگئی۔ اس طرح وہ آگ سے داغے جانے کے مقابلے میں اللہ سے حیاء کرنے میں زیادہ حساس ہیں۔ اور یہ خوف اور کپکپی ان کے اس شعور کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ اللہ کے مقابلے میں کوئی کسی کی مدد نہیں کرسکتا' اس لئے کسی ظالم کا کوئی ناصر اور مددگار نہ ہوگا۔

اب یہ پر خشوع دعا ذرا اور آگے بڑھتی ہے:

رَّبَّنَآ إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا ۚ رَبَّنَا فَاغْفِرْ

لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ

"مالک! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا' جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو' ہم نے اس کی دعوت قبول کرلی' پس اے ہمارے آقا جو قصور ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگزر فرما' جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کردے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔"

اہل دانش کھلے دل لئے ہوئے ہیں' ان پر جو القاء ہوتا ہے وہ لبیک کہتے ہیں۔ ان کا احساس مزید تیز ہو جاتا ہے' اب ان کی نظریں اپنی تقصیروں' کوتاہیوں' گناہوں اور نافرمانیوں پر لگ جاتی ہیں۔ وہ فوراً اپنے رب سے اپنے گناہوں کی مغفرت کے طلبگار ہوتے ہیں' وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کیلئے تیار ہو جاتے اور اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی موت نیک لوگوں کے زمرے میں ہو۔

اس فقرے میں اس دعا کا جو پرتو ہے وہ اس پوری سورت کے مضامین کے شیڈ کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ تمام سورت کے مضامین تطہیر اخلاق' اللہ اور رسول ﷺ کی معصیت اور نافرمانی سے استغفار کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ اس پوری سورت میں شہوات نفسانیہ اور ذنوب و خطیئات کے خلاف ایک بھرپور جنگ کا سماں ہے۔ اور یہ وہ جنگ ہے کہ ہر میدانی معرکہ میں کسی بھی فتح مندی کا دارومدار اس جنگ میں کامرانی اور فتح مندی پر ہے۔ جب تک اس اخلاقی تطہیر کی جنگ میں فتح نصیب نہ ہو۔ اسوقت تک اللہ کے دشمنوں اور ایمان کے دشمنوں کے خلاف کوئی میدانی جنگ نہیں جیتی جاسکتی۔ اور اس پوری سورت میں یہی مضامین دیئے گئے ہیں جو باہم وابستہ' ہم آہنگ' متماثل' ہمسایہ اور ایک جیسے اثرات کے حامل ہیں۔

اس دعا کا خاتمہ توجہ الی اللہ اور فضل خداوندی کی امیدواری سے ہوتا ہے۔ اس بات پر اعتماد اور یقین کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر وعدے کی وفا ہوتی ہے رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ "خداوندا! جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال' بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا ہے۔"

یہاں اب دعائیہ انداز میں یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ رسولوں نے آپ کے جو وعدے ہم تک پہنچائے ہیں' اور ہمیں تو یقین ہے کہ آپ کے ہاں وعدہ خلافی نہیں ہوتی' وہ وعدے پورے کردے۔ یہ لوگ امید کرتے ہیں کہ قیامت کے دن وہ شرمندہ نہ ہوں۔ گ' یہ ان کے افکار کی دنیا میں پہلے جھٹکے کے نتیجے میں ان کے دین کی حالت ہے کہ وہ امید سے دامن بھرے ہوئے ہیں کہ وہ رسوا نہ ہوں گے۔ اور اسے وہ دعا کی ابتدا میں بھی لاتے ہیں اور آخرت میں بھی لاتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصحاب دانش کس قدر حساس ہونگے ہیں۔ ان کے دل کس قدر نرم ہو گئے ہیں۔ وہ کس قدر صاف ہو گئے ہیں۔ خدا کا ڈر اور معصیت کے شرم سے ان کے دل بھرے ہیں۔

اپنے مجموعی مضمون کے اعتبار سے' یہ دعا' ان اہل دانش کی جانب سے مطالعہ فطرت کے نتیجے میں مکمل قبولیت مکمل آمادگی کا اظہار ہے جو ان کے دل پر نظام کائنات کے مطالعہ سے القاء ہوئی۔

مناسب ہے کہ ہم اس دعا پر ایک بار پھر غور کریں' اس کی فنی خوبصورتی اور اس کی مناسب طرز ادا پر نگاہ ڈالنا بھی ضروری ہے۔

قرآن کریم کی ہر سورت میں' اس کی آیات کیلئے ایک متعین قافیہ اپنایا گیا ہے۔ اور قرآن مجید کے اندر قافیہ اور فواصل کا وہ طریقہ نہیں اپنایا گیا جو اشعار میں ہوتا ہے۔ کہ حرف سے حرف ملے۔ لیکن ان کا نغمہ اور زیروبم باہم متشابہ ہوتے ہیں۔ مثلاً الفاظ بصیر الحکیم' مبین اور مریب ایک جیسے صوتی اثرات رکھتے ہیں۔ یا مثلاً الباب' ابصار' النار اور قرار جیسے الفاظ کے صوتی اثرات یکساں ہیں یا مثلاً خفما'

شقیا' شرقیا اور شہیا جیسے الفاظ اگرچہ شعری قافیہ نہیں لیکن ان کا صوتی ایقاع ایک جیسا ہے۔ ان میں سے پہلا قافیہ اکثر پر زور تقریر جیسے مواقع پر ہوتا ہے۔ جہاں انداز بیانیہ ہوتا ہے........ دوسرا قسم کا قافیہ دعاؤں کے مواقع پر ہوتا ہے اور تیسری قسم کو حکایات اور بیان واقعات کے لئے لایا جاتا ہے۔

سورہ آل عمران میں پہلی قسم کا قافیہ ہے' صرف دو جگہ اس سے انحراف ہوا ہے۔ ابتداء میں جہاں دعا تھی' اور پھر ان آخری آیات میں جہاں پھر دعا ہے۔

یہ انداز بالکل ایک نیا اور انوکھا انداز ہے جو قرآن نے مخصوص تعبیرات کیلئے اختیار کیا ہے۔ دعا کیلئے جو انداز اختیار کیا گیا وہ دعا کو نرم آواز اور پر سوز لہجہ دیتا ہے۔ الفاظ کے اندر مٹھاس پایا جاتا ہے۔ جو عاجزی کے ساتھ عرض مدعا کیلئے نہایت ہی موزوں ہے۔

ایک دوسری فنی خصوصیت بھی ان آیات میں پائی جاتی ہے۔ کائنات میں سے تخلیق ارض و سما کا منظر اور گردش لیل و نہار کے جو مناظر انسان کے غور و فکر کیلئے پیش کیے گئے تھے' ان کے ساتھ مناسب یہ تھا کہ دعا ایسی ہو جس میں خشوع و خضوع خوش آوازی کے ساتھ ہو۔ اس کے نغمات طویل ہوں' اس کے آواز کے زیر و بم نہایت ہی گہرے ہوں۔ اس طرح اس منظر کے اثرات' اثرات طویل ہوں اور اعصاب سماعت اور خیال پر اس کے گہرے اثرات ہوں اور پھر یہ تاثر وجدان پر منتقل ہو جائے۔ کیونکہ ان کلمات کے صوتی حرکات کے اندر بھی نہایت خشوع' خوش گواری' توجہ اور خدا ترسی ہے۔ اس منظر کی جس طرح عبارت طویل ہے اس طرح نغمات بھی طویل ہیں۔ جن سے قرآن کریم کی تعبیرات کی اصل غرض و غایت پوری ہوتی ہے اور اس کے ساتھ قرآن کریم کی اصل نئی خوبیاں بھی سامنے آتی ہیں۔

جس طرح یہ دعا طویل ہے۔ اسی طرح جواب دعا بھی طویل ہے :

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۖ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝١٩٥ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۝١٩٦ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝١٩٧ لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۗ وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ ۝١٩٨

جواب میں ان کے رب نے فرمایا "میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنیوالا نہیں ہوں۔ خواہ مرد ہو یا عورت' تم سب ایک دوسرے

کے ہم جنس ہو۔ لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لئے لڑے اور مارے گئے ان کے سب قصور معاف کردوں گا اور انہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے۔"

اے نبی! دنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے' پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں ان کیلئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے' اللہ کی طرف سے یہ سامان ضیافت ہے ان کیلئے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کیلئے وہی سب سے بہتر ہے۔

یہ ایک مفصل جواب دعا ہے۔ طرز ادا بھی طویل ہے۔ اور یہ قرآن کریم کے طرز ادا کے عین مطابق ہے۔ تقاضائے حال اور فریقین کے موقف کے عین مطابق نفسیاتی اور شعوری دونوں زاویوں سے۔

اب ہم اللہ کی جانب سے آنیوالے جواب دعا اور قبولیت دعا کے مضامین کی طرف آتے ہیں۔ یہ جواب اسلامی نظام زندگی کے کن امور کو ظاہر کرتا ہے اور یہ کہ اس نظام کا مزاج کیا ہے' اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور یہ نظام انسان کی تربیت کیلئے کیا منہاج اختیار کرتا اور اس کی خصوصیات کیا ہیں؟

یہ اصحاب دانش جنہوں نے تخلیق ارض و سما میں غور کیا' جنہوں نے گردش لیل و نہار میں تدبر کیا اور جنہوں نے اس کائنات کی کتاب مفتوح سے دلائل و آیات اخذ کئے اور ان کی فطرت نے ان دلائل و آیات حق کو قبول کیا اور اس کے بعد وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے خشوع و خضوع سے بھرپور' سوز و ساز میں ڈوبی ہوئی طویل دعا کی۔ اور اس کے بعد ان کے رب رحیم و کریم کی طرف سے فوراً جواب دعا آیا کیونکہ ان کی دعا نہایت ہی پرخلوص تھی وہ محبت سے بھری تھی...... اب دیکھئے جواب دعا کیا ہے؟

یہ جواب دعا قبولیت دعا پر مشتمل ہے' اور اس میں اسلامی منہاج حیات کے اصل عناصر ترکیبی کی طرف ہدایت کی گئی ہے۔ اور اس کے فرائض بتائے گئے ہیں فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ ...................... جواب میں ان کے رب نے فرمایا۔

"میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنیوالا نہیں ہوں' خواہ مرد ہو یا عورت' تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔"

تم لوگوں کی جانب سے صرف تدبر اور تفکر ہی کافی نہیں ہے۔ خشوع و خضوع اور پرسوز دعا ہی کافی نہیں ہے۔ صرف اللہ کی طرف متوجہ ہو کر گناہوں سے معافی مانگنا ہی کافی نہیں ہے اور صرف نجات اخروی کی طلب ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ عمل ضروری ہے۔ مثبت عمل کی ضرورت ہے۔ اور یہ مثبت عمل نتیجہ ہے۔ اس غور و فکر اور توجہ الی اللہ کا' اس آمادگی اور اس احساس جس کا اظہار اس پرسوز دعا میں ہوگا۔ اس کا تقاضا ہے کہ انسان مثبت عمل پر آمادہ ہو' وہ عمل جسے اسلام اسی طرح عبادت تصور کرتا ہے جس طرح اسلام تفکر اور تدبر کو عبادت سمجھتا ہے۔ جس طرح اسلام ذکر و فکر' خوف و استغفار اور پرامید توجہ الی اللہ کو عبادت سمجھتا ہے۔ وہ عمل جسے اسلام تمام عبادات کا ثمرہ قرار دیتا ہے۔ اور یہ ثمرہ سب کی جانب سے قبول ہوگا۔ مرد یہ عمل کریں یا عورتیں یہ عمل کریں۔ اس عمل کے معاملے میں جنس و صنف کی کوئی شرط نہیں ہے۔ اس لئے کہ مرد اور عورت انسانیت میں بالکل مساوی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے اجزاء اور آباؤ واجداد ہیں اور قیامت کے ترازو میں برابر ہیں۔

اس کے بعد ان اعمال کی تفصیل دی جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اسلام کے نظریۂ حیات میں جان و مال کے ساتھ تعلق رکھنے والی

کیا ڈیوٹیاں ہیں۔ نیز ان اعمال کے ذکر سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس نظام زندگی کا مزاج کیا ہے؟ اور وہ کیا گراؤنڈ ہے جس کے اوپر یہ نظام تعمیر ہوتا ہے۔ اور اس کے طریق کار کا مزاج کیا ہے اور اس میں کیا کیا رکاوٹیں اور کیا کیا کانٹے ہیں۔ اور یہ کہ ان مشکلات پر قابو پانے کی اشد ضرورت ہے۔ ان کانٹوں کو ایک ایک کر کے چننے کی ضرورت ہے اور اس زمین میں پاک درخت کے لگانے کیلئے کس کس تیاری کی ضرورت ہے۔ پھر اسے اس زمین پر تمکنت دینے کیلئے کن کن اقدامات کی ضرورت ہے۔ چاہے جس قدر قربانیاں دینی پڑیں۔ چاہے جس قدر مشکلات کو انگیز کرنا پڑے۔

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ۝

"لہذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے' اور میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے' اور میرے لئے لڑے اور مارے گئے ان کے سب قصور معاف کر دوں گا اور انہیں باغوں میں داخل کر دوں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں اور بہترین جزا اللہ کے پاس ہے۔"

اس قرآن نے سب سے پہلے جن لوگوں کو خطاب کیا اور دعوت فکر دی' ان کے یہی خدوخال تھے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے مکہ سے ہجرت کی' یہی لوگ تھے جن کو محض اپنے نظریۂ حیات کی وجہ سے اپنے گھروں سے نکالا گیا۔ اس کے سوا ان کا اور کوئی قصور نہ تھا۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے اس نظریہ کی خاطر قتال کیا اور مارے گئے۔ لیکن یہ خدوخال ان تمام لوگوں کے ہونے چاہئیں جو دعوت اسلامی کو لیکر اٹھتے ہیں۔ جب بھی کوئی اٹھے اور جہاں بھی کوئی اٹھے۔ یہی خدوخال ہوں گے ان لوگوں کے جو جاہلیت کے اندر پل رہے ہوں' جو جاہلیت بھی ہو وہ..... جو دشمن کی سرزمین پر پل رہے ہوں جو دشمن بھی ہو وہ اور جو سرزمین بھی ہو وہ...... جو دشمن اقوام کے اندر ہوں۔ جو قوم بھی ہو وہ اور ان لوگوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو جائے۔ دشمنوں کی نیش زنی اور ان کی لالچ اور ان کی خواہشات نفسانیہ ان کے آڑے آرہی ہوں۔ اور جب وہ قلیل تعداد میں ہوں تو انہیں اذیت کا نشانہ بنایا جارہا ہو اور یہ حالات نہایت ہی ابتدائی دور میں تھے جبکہ وہ مستضعفین تھے۔ اس کے بعد اس پاک پودے نے ذرا قوت پکڑی اور ہر جگہ پر یوں یہ قوت پکڑتا ہے اور باوجود ان اذیتوں کے پکڑتا ہے۔ باوجود ہجرت اور جلاوطنی کے پکڑتا ہے۔ اس کے بعد یہ قوت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر مقابلے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر وہ اپنا دفاع کر سکتی ہے۔ اس مرحلے پر پھر قتال و مقاتلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ دشوار' تلخ اور مشکل جدوجہد ہی دراصل گناہوں کا کفارہ بنتی ہے اور یہ جزاء اور ثواب دنیا و آخرت کا سبب بھی بنتی ہے۔

یہ ہے طریق کار' یہ ربانی منہاج کار ہے۔ جس منہاج زندگی کیلئے اللہ نے یہ طریق کار وضع کیا ہے کہ اسے انسانوں کی زندگی میں عملاً نافذ کرنے کیلئے انسانی جدوجہد کے ذرائع کو استعمال کیا جائے گا۔ اسی طریق کار کے مطابق اور اسی مقدار جہاد کے مطابق جو مومنین اور مجاہدین فی سبیل اللہ' اللہ کی راہ میں خالص اس کی رضاجوئی کیلئے کرتے ہیں۔

یہ ہے مزاج اس نظام حیات کا' یہ ہیں اس کے عناصر ترکیبی اور یہ ہیں اس کے فرائض' یہ ہے اس منہاج کا طریق تربیت' یہ ہے اس کا طریقہ ہدایت وارشاد کہ وہ اس کائنات میں غوروفکر کے وجدانی مرحلے سے گزر کر انسان کو مثبت عمل کی طرف منتقل کرتا ہے۔ اور یہ عمل اس نظریاتی تاثرات کے مطابق ہوتا ہے اور اسی طرح یہ نظام زندگی قائم ہوتا ہے۔

اس کے بعد یہ جواب دعا میں ارض کفار کے اندر سازوسامان کے بھرے ہوئے بازاروں کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو اسلامی نظام عملاً

زندگی کے دشمن اور نافرمان ہیں۔ متوجہ کیا جاتا ہے کہ ایک مسلمان اس سازو سامان کو وہی وزن دیتا ہے جو فی الحقیقت اس کا اس دنیا کیلئے ہے۔ اور اسے اپنے لئے فتنہ نہیں بناتا ہے۔ اور نہ اسے اہل ایمان کیلئے فتنہ بننے کا موقعہ دیتا ہے۔ کیونکہ' اس لئے کہ اہل ایمان بہت بڑی قربانیاں دے رہے ہیں۔ انہیں ہدایت دی جارہی ہے۔ انہیں اپنے گھروں سے نکالا جارہا ہے اور انہیں قتل کیا جارہا ہے اس لئے دنیا کا سازو سامان ان کے لئے فتنہ نہ ہو جائے۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ﴿١٩٦﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٩٧﴾ لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۗ وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ ﴿١٩٨﴾

"اے نبی! دنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمانوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے' یہ صرف چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے' پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں ان کیلئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں' ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کے پاس سے یہ سامان ضیافت ہے ان کیلئے' اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کیلئے وہی سب سے بہتر ہے۔"

لوگوں کا ممالک میں چلنا پھرنا' سیاحتیں کرنا یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ دولتمند ہیں اور ان کے پاس کچھ ہے۔ نیز یہ ان کے مرتبے اور سیاسی قوت کی بھی علامت ہے۔ یہ ایسے مظاہر ہیں جو اہل ایمان کو کھٹک سکتے ہیں۔ وہ دل میں کسک محسوس کرسکتے ہیں۔ عام لوگ ایسا احساس بہرحال رکھتے ہیں جیسا کہ وہ مشکل معاشی حالات اور محرومیت کا شکار ہوں۔ انہیں اذیت دی جارہی ہو اور وہ جہد مسلسل کررہے ہوں انہیں جلاوطن کیا گیا ہو اور وہ بہتری کیلئے جہاد کررہے ہوں۔ ان پر ہر قسم کی تکالیف اور خوفناک حالات آرہے ہوں اور دشمنان اسلام اور باطل پرست نازو نعم میں پل رہے ہوں۔ یہ صورت حال ایک تو غفلت کا شکار جمہور عوام کو قلبی اذیت میں مبتلا کرتی ہے کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ سچائی اور اہل حق مشکلات میں ہیں اور باطل اور اہل باطل کامیاب ہیں بلکہ عیش میں ہیں۔ اور خود ان گمراہوں اور اہل باطل کے دلوں میں بھی یہ صورت حال غرور اور خود اعتمادی پیدا کرتی ہے اور وہ مزید گمراہ ہوتے ہیں۔ اور شروفساد میں اور سرکشی اور گمراہی میں مزید آگے بڑھتے ہیں۔ اس لئے یہاں یہ آیت آئی کہ "اے نبی! دنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے' اور پھر یہ جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔"........ متاع قلیل ہے۔ ختم ہونے والا اور جانے والا ہے۔ اور دائمی ٹھکانا ان کا جہنم ہے۔ جو بہت بری جگہ ہے۔ اور اس تھوڑے سے جانیوالے اور ختم ہونیوالے متاع قلیل کے مقابلے میں کیا ہے؟ باغات ہیں' ان میں دائمی زندگی ہے اور اللہ کی طرف سے عزت افزائی ہے۔ "ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔" ...... "ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" ...... "یہ سامان ضیافت ہے ان کیلئے۔" ........ "جو اللہ کے ہاں مزید ہے وہ نیکوکاروں کیلئے بہت بہتر ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ اگر اس حصے کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیں اور اس دوسرے حصے کو دوسرے میں تو جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ نیک لوگوں کیلئے بہت ہی بہتر ہے۔ اور یہ شک بھی کسی دل میں نہ ہوگا کہ جو لوگ اپنی زندگی میں تقویٰ کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کا پلڑا ان لوگوں سے بھاری ہوگا جنہوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا۔ اور اسی طرح کوئی ذی عقل انسان اس معاملے میں تردد نہ کرے گا کہ

اسے وہی حصہ اختیار کرنا چاہئے جو دانشور اپنے لئے اختیار کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ یہاں تعلیم و تربیت کے میدان میں اور اسلامی تصور حیات کی اساسی قدروں کے قیام میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی وعدہ نہیں فرماتے کہ وہ ان کی نصرت فرمائیں گے۔ یہ وعدہ بھی نہیں فرماتے کہ تمہارے دشمنوں کو میں مقہور اور مغلوب کرکے تمہیں دوں گا اور یہ وعدہ بھی نہیں فرماتے کہ تمہیں زمین کے اندر تمکن اور استقرار نصیب کیا جائے گا اور نہ وہ اس دنیا کی زندگی کی چیزوں میں سے کسی دوسری چیز کا وعدہ فرماتے ہیں۔ جیسا کہ بعض دوسرے مقامات پر اللہ نے وعدہ فرمایا ہے یا وہ جو اللہ تعالیٰ اپنے اوپر یہ فرض کرتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کی مدد کرے گا بمقابلہ دشمنان اسلام۔

یہاں اللہ تعالیٰ صرف ایک چیز کا وعدہ فرماتے ہیں' وہ جو اللہ کے ہاں ہے۔ دعوت اسلامی میں اصل اجر یہی ہے۔ اور یہی ہے اس دعوت کا نقطہ امتیاز۔ ہرہدف اور ہر مقصد سے بے نیازی' ہر سطح نظر سے استغنا۔ یہاں تک کہ وہ اس خواہش سے بھی بے نیاز ہو جائے کہ اس کا نظریہ حیات غالب ہو۔ اللہ کا حکم بلند ہو اور اللہ کے دشمن مقہور اور مغلوب ہوں۔ غرض اللہ کی مرضی یہ ہے کہ اہل ایمان اس غرض سے بھی بے نیاز ہو جائیں اور اپنے امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیں۔ اور ان کے دل اس سے بھی پاک ہو جائیں کہ یہ مقاصد ان کیلئے پسندیدہ ہوں' اگرچہ یہ صرف ان کی ہی خواہش نہیں ہوتی۔

یہ عقیدہ کہ جان دینی ہے' وفاداری کرنا ہے اور ادائیگی فرض بجالانا ہے اور بس بغیر کسی دنیاوی غرض اور لالچ کے۔ بغیر اس طلب کے کہ دنیا میں نصرت' غلبہ تمکن فی الارض اور سربلندی حاصل ہو۔ اور ہر چیز کا انتظار دار آخرت میں ہو۔

اور اس کے بعد نصرت بھی آتی ہے۔ تمکن فی الارض بھی نصیب ہوتا ہے اور دنیا میں اسلام کو سربلندی بھی نصیب ہوتی ہے۔ لیکن یہ تمام امور بیعت میں داخل نہیں ہیں۔ یہ امور سودے میں شامل نہیں۔ اس سودے میں مومنین نے قیمت کا کوئی حصہ اس دنیا میں وصول نہیں کرنا ہے۔ یہاں تو صرف ادائیگی فرض' وفائے عہد اور جان دینا ہے اور مشکلات کو برداشت کرنا ہے۔

مکہ مکرمہ میں دعوت اور دعوت کیلئے بیعت اسی اصول پر جاری تھی۔ یہی سودا وہاں ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں اللہ نے مسلمانوں کو نصرت' غلبہ اور سربلندی نصیب نہ کی تھی۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین کے اندر اقتدار کی چابیاں سپرد نہ کی تھیں۔ نہ انسانیت کی قیادت کا منصب ان کے حوالے کردیا تھا۔ ہاں جب وہ اس معیار کے مطابق مخلص ہو گئے اور اس معیار کے مطابق وفائے عہد کرنے لگے تو انہیں سب کچھ ملا۔

محمد ابن کعب قرظی فرماتے ہیں عبداللہ ابن رواحہ ؓ نے رسول ؐ خدا سے عقبہ کی رات کے موقعہ پر (اوس اور خزرج نمائندوں کے اسی رات بیعت کی اور فیصلہ ہوا کہ آپ ؐ مدینہ کو ہجرت فرمائیں گے۔) عرض کیا: حضور ؐ آپ اپنے رب کیلئے اور اپنے لئے جو شرائط چاہیں عائد کردیں۔ آپ ؐ نے فرمایا: میں رب کیلئے تو یہ شرط لگاتا ہو کہ تم اس کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے۔ اور اپنے لئے میں یہ شرط لگاتا ہوں کہ تم لوگ میری حفاظت اسی طرح کرو گے جس طرح تم اپنی جان و مال کی حفاظت کرتے ہو۔" اس پر انہوں نے کہا تو پھر ہمیں کیا ملے گا؟ تو آپ ؐ نے جواب دیا صرف "الجنۃ"۔ اس پر انہوں نے 'سب نے کہا اس سودے میں ہم بہت ہی نفع میں رہے۔ نہ ہم خود اس سودے کو واپس کرتے ہیں اور نہ فریق دوم سے اس کی منسوخی کا مطالبہ کرتے ہیں۔"

یہ تھی بات الجنۃ' فقط جنت اس میں ان سے یہ وعدہ نہ تھا کہ انہیں نصرت عزت' اتحاد' قوت' تمکن فی الارض' قیادت' مال اور دولت یا کوئی اور چیز ملے گی۔ اگرچہ یہ تمام چیزیں انہیں دی گئیں۔ لیکن یہ چیزیں سودے سے خارج تھیں....... اس کے باوجود ان کا خیال یہ تھا کہ وہ اس سودے میں کامیاب رہے۔ اور یہ کہ نہ اقالہ کرتے ہیں اور نہ دوسرے فریق سے اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

انہوں نے واضح سودا کیا۔ دو بیعت کرنیوالوں کے درمیان یہ سودا ہوا۔ معاملہ ختم ہوا۔ معاہدہ ہو گیا اور اس کے بعد اس میں کوئی سودا بازی نہیں ہوئی۔

یوں اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کی تربیت کی جس کے بارے میں اللہ کا فیصلہ یہ تھا کہ اس کرۂ ارض پر اقتدار کی چابیاں اس کے سپرد ہونی ہیں۔ زمام اقتدار اس کے ہاتھ میں ہوگی اور اسے یہ قیادت اس وقت سپرد ہوئی جب وہ ہر قسم کے لالچ سے پاک ہو گئے' ہر قسم کی خواہشات کو انہوں نے لات مار دی' ہر قسم کی خواہشات نفس پر انہوں نے ضبط کیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے اسلامی انقلاب کے حوالے سے بھی اپنی فطری خواہشات کو ترک کر دیا۔ اسلامی نظام کے قیام کی خواہش کو بھی انہوں نے دبا دیا۔ اور انہوں نے اس نظریۂ حیات کی کامیابی کیلئے بھی سوچنا بند کر دیا۔ جس کے لئے وہ جانیں دے رہے تھے۔ اس لئے کہ اس عظیم قیادت کی ذمہ داریاں اٹھانے کا اہل کوئی ایسا شخص یا جماعت نہیں ہو سکتی جس کے نفس کے اندر کوئی خواہش ہو یا اس کے نفس کے اندر کوئی نفسانیت ہو اور وہ پورا پورا اسلام میں داخل نہ ہو گیا ہو۔

○.....☆☆☆.....○

سورت کے مضامین ختم ہونے سے قبل روئے سخن پھر اہل کتاب کی طرف مڑ جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اہل کتاب میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو مومنین کی طرح صحیح العقیدہ ہیں۔ اور یہ لوگ قافلہ ایمان میں شامل ہو گئے ہیں۔ وہ اسی کے ساتھ جا رہے ہیں۔ اس لئے ان کی جزا بھی وہی ہوگی جو اہل ایمان کی ہوگی۔

وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَٰبِ لَمَن يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِمْ خَٰشِعِينَ لِلَّهِ لَا يَشْتَرُونَ بِـَٔايَٰتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۗ أُولَٰٓئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿١٩٩﴾

"اہل کتاب میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں' اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف بھیجی گئی ہے اور اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی طرف بھیجی گئی تھی' اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں' اور اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اللہ حساب چکانے میں دیر نہیں لگاتا۔"

یہ اہل کتاب کے ساتھ اختتامی خطاب ہے۔ اس سے قبل اہل کتاب کے فرقوں اور ان کے مختلف مواقف کے بارے میں اس سورت کے ایک بڑے حصے میں بات ہوئی تھی۔ یہاں بتایا جاتا ہے کہ ایمان کے اعلیٰ نمونوں کی اس نمائش گاہ اور دعا اور قبولیت دعا کے اس منظر میں اہل کتاب میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کے نمونے اس نمائش میں رکھنے کے قابل ہیں۔ اس لئے کہ اہل کتاب میں سے بعض لوگ صحیح راستے پر گامزن ہو گئے ہیں۔ وہ صحیح انجام تک آپہنچے ہیں۔ وہ تمام کتاب پر ایمان لے آئے ہیں۔ (موجودہ اور سابق) وہ اللہ اور اس کے درمیان بلحاظ اطاعت فرق بھی نہیں کرتے۔ وہ اللہ کے رسولوں میں سے بھی کسی میں فرق نہیں کرتے۔ وہ اس کتاب پر بھی ایمان لائے جو ان کی طرف نازل ہوئی اور اس کتاب پر بھی ایمان لائے ہیں جو مسلمانوں پر نازل ہوئی ہے۔ اور یہی اسلامی نظریۂ حیات کی خصوصیت ہے کہ وہ قافلہ ایمانی کی طرف قرب و محبت کی نظروں کے ساتھ دیکھتا ہے۔ اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ نظریہ کی ایک ہی لائن ہے جو ذات باری کے ساتھ موصول ہے۔ وہ اسلامی نظریہ حیات کو ایک وحدت سمجھتا ہے۔ اسے کلی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ یہاں اہل کتاب

مومنین کی خصوصیات میں سے جس اہم خصوصیت کو ظاہر کیا جاتا ہے وہ ان کی صفت خشوع و خضوع ہے اور ان کی یہ صفت کہ وہ اللہ کی آیات کے بدلے اس دنیا کے ثمن قلیل کو قبول نہیں کرتے۔ یہ صفات اس لئے ذکر کی گئیں کہ انہیں دوسرے اہل کتاب کی صفوں سے چھانٹ کر الگ کر دیا جائے جن میں یہ دونوں کمزوریاں موجود تھیں۔ یعنی متکبر بھی تھے اور بے حیا بھی تھے۔ آیات کو چھپاتے بھی تھے اور ان میں تحریف بھی کرتے تھے۔ اور یہ کام وہ نہایت ہی گھٹیا مقاصد کیلئے کرتے تھے۔ اور ان کے ساتھ وہی وعدہ اجر کیا جاتا ہے جو اہل ایمان کے ساتھ ہے اور یہ اجر دستی طور پر ادا ہو گا کوئی ٹال مٹول نہ ہو گی۔ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ............ (اللہ تعالیٰ حساب چکانے میں دیر نہیں لگاتا۔)

○.....☆☆☆.....○

اب آخری ضرب ہے۔ اللہ کی جانب سے ان لوگوں کو پکار دی جاتی ہے جو ایمان لائے ہیں۔ اس میں اس راہ کی مشکلات کا مختصر ترین نچوڑ اور خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے اور راستے کی ذمہ داریوں اور شرائط کا ذکر کیا جاتا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱصْبِرُوا۟ وَصَابِرُوا۟ وَرَابِطُوا۟ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٠٠﴾

۲۰ ع ۱۱ ۱۱

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' صبر سے کام لو' باطل پرستوں کے مقابلہ میں پامردی دکھاؤ' حق کی خدمت کیلئے کمربستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو' امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔"

عالم بالا سے یہ پکار' اہل ایمان کیلئے ہے۔ اور اس صفتی نام سے یہ پکار ہے جس صفت نے انہیں ذات باری سے مربوط کیا ہے۔ وہ ذات جو ان مومنین پر یہ ذمہ داریاں ڈال رہی ہے۔ جو انہیں اس پکار کے اہل بناتی اور جو انہیں ذمہ داریاں اٹھانے کی تربیت دیتی ہے۔ اور انہیں اس زمین پر بھی اس طرح مکرم بناتی ہے جس طرح انہیں آسمان پر مکرم بنایا گیا ہے۔ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ............ ............ (اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔)

اور پکار کس لئے ہے۔ صبر سے کام لو' جرات دکھاؤ' ہروقت دشمن کے مقابلے کیلئے تیار رہو' اور ہروقت خوف خدا کو پیش نظر رکھو...... اس پوری سورت میں صبر اور تقویٰ کی بار بار تلقین کی گئی ہے۔ ان کا تذکرہ الگ الگ بھی ہوا ہے اور یکجا بھی ہوا ہے۔ نیز اس پوری سورت میں یہ دعوت دی گئی ہے کہ راہ حق میں مشکلات برداشت کرو' مجاہدہ کرو' سازشوں کا مقابلہ کرو اور جو لوگ شکست کی طرف بلاتے ہیں اور ہمت شکنی کی باتیں کرتے ہیں ان کی طرف توجہ نہ کرو اور یہاں اس سورت کے آخر میں اس مضمون کو دہرا کر صبر اور مصابرت کی دعوت دی جاتی ہے۔ اللہ کی راہ میں ہروقت تیار رہنے اور خدا خوفی کو اختیار کرنے کی تلقین یہاں بہترین خاتمہ ہے۔

صبر اس راہ کا بہترین سامان ہے' راہ دعوت اسلامی کا اس لئے کہ یہ طویل اور پر مشقت راستہ ہے۔ یہ مشکلات سے پر اور کانٹوں سے اٹا پڑا ہے۔ جگہ جگہ ابتلاء و آزمائش ہے۔ ہروقت چوٹ لگنے اور جان کی قربانی کے مواقع ہیں۔ اور ہر موقع ایسا ہے جس میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی خواہشات پر صبر' نفس کے مرغوبات پر صبر' ہر قسم کی لالچوں اور آرزوؤں پر صبر' اپنے ضعف اور نقص پر صبر' نفس کی جلدبازی اور افسردگی پر صبر' لوگوں کی خواہشات پر صبر' لوگوں کے ضعف اور کمزوری پر صبر' لوگوں کے جہل اور بری سوچ پر صبر' ان کے مزاج کے انحراف پر صبر' ان کی نخوت اور غرور پر صبر' ان کی چالبازیوں اور جلدبازیوں پر صبر' باطل کے غرور پر صبر' کفر کی گندگی پر

صبر' شر کے پھیلنے پھولنے پر صبر' شہوت کے غلبے پر صبر' غرور اور کبر کی آگ پر صبر' مددگاروں کی قلت پر صبر' اعانت کنندگان کی قلت پر صبر' راستے کی طوالت پر صبر' کرب اور بے چینی کے اوقات میں شیطانی وسوسوں پر صبر' اور جہاد کی تلخی پر صبر اور ان تمام نفسیاتی تاثرات اور متنوع انفعالات پر صبر...... مثلاً رنج و الم' غیظ و غضب' دل تنگی اور گھٹن' بعض اوقات بھلائی پر بے اعتمادی اور انسانی فطرت کی اصلاح کی ناامیدی وغیرہ...... بعض اوقات رنج و ملال اور تھکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے اور انسان پر مایوسی کا غبار چھا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں صبر ہی کام دیتا ہے۔ پھر جب غلبہ نصیب ہوتا ہے تو انسان کو انتقام پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اس وقت پھر صبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ پھر بعض اوقات مادی سہولیات ملتی ہیں تو ان پر تواضع اور سنجیدگی کرنا ہوتی ہے۔ بغیر تکبر اور بغیر میلان انتقام اور بغیر اس کے کہ قصاص میں حد سے گزر جائیں...... پھر خوشحالی اور بدحالی دونوں میں اللہ سے لو لگائے رکھنا' اس کے فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنا' اور نہایت ہی اطمینان' نہایت ہی اعتماد اور منکسر المزاجی کے ساتھ اپنے تمام امور اس کے حوالے کر دینا۔

ان سب امور میں صبر کرنا اور ان جیسے دوسرے امور میں صبر کرنا' ایسے امور ہیں جو سالک راہ حق کو' اس کے اس طویل سفر میں پیش آتے رہتے ہیں۔ ایسی مشکلات اور ایسے حالات پیش آتے رہتے ہیں۔ جن کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان مشکلات کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔ ان مشقتوں کا مفہوم کلمات کے جامہ میں نہیں سماتا۔ اس مفہوم کا ادراک وہی شخص کر سکتا ہے جس پر وہ معانی گزرے ہوں اور جس نے اس راہ کی مشقتوں کو انگیز کیا ہو۔ اس نے ان تاثرات کو چکھا ہو اور وہ ان تلخ تجربوں سے خود گزرا ہو۔

وہ لوگ جو ایمان لائے تھے' انہوں نے ان مذکورہ بالا مشکلات کے اکثر پہلوؤں کی تلخی کو خود چکھ لیا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس پکار کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ وہ صبر کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے تھے جس کے بارے میں انہیں تلقین کی جا رہی ہے کہ وہ اسی پر گامزن ہوں۔

اب صبر کے بعد مصابرہ کیا ہے؟ یہ صبر کا باب مفاعلہ ہے۔ یعنی صبر میں باہم مقابلہ کرو۔ ان تمام امور میں جن کا اوپر ذکر ہوا۔ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ مصابرت جو اہل ایمان کے صبر کو اپنی تلواروں سے کاٹنا چاہتے ہیں۔ یعنی مذکورہ بالا جذبات کے ساتھ مصابرت یا دشمنوں کے ساتھ مصابرت' پس جہاد کے اس طویل سفر میں ان کا صبر ختم نہ ہونے پائے۔ بلکہ انہیں آخر دم تک اپنے اعداء سے زیادہ صبر کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ ان دشمنوں سے انہیں زیادہ صبر والا ہونا چاہئے جو دلوں کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ اسی طرح شر پسند دشمنوں کے مقابلے میں بھی۔ گویا اہل ایمان اور ان کے دشمنوں کے درمیان مصابرت کا مقابلہ ہے کہ اس میدان میں کون آگے نکلتا ہے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ صبر کا مقابلہ صبر سے کرو' مدافعت کا مقابلہ مدافعت سے کرو' جدوجہد کا مقابلہ جدوجہد سے کرو' اصرار کا مقابلہ اصرار سے کرو' اور آخری مقابلہ یہ ہو گا کہ اہل ایمان اس مقابلے میں سب سے آگے ہوں۔ اگر باطل اپنے نظریے پر اصرار کرتا ہے صبر کرتا ہے' اور اپنی راہ پر گامزن ہے تو حق اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ زیادہ مصر ہو' زیادہ صبرناک ہو اور اپنی راہ میں زیادہ جدوجہد کرنے والا ہو۔

اور رابطہ کیا ہے۔ جہاد کے مقامات پر مورچے لگانا۔ مورچہ زن ہونا۔ دشمنوں کے حملوں کے خطرناک مقامات پر چوکیاں قائم کرنا' اور اسلامی جماعت ہر وقت دشمن پر نظر رکھتی تھی۔ کبھی وہ سوتی نہ تھی' اس لئے کہ اس کے ساتھ اس کے دشمنوں نے کبھی مصالحت نہیں کی تھی۔ جب سے اس نے دعوت اسلامی کا بوجھ اٹھانے کا اعلان کیا۔ اور لوگوں پر اس دعوت کو پیش کیا' تو وہ میدان جنگ اور حالت جنگ میں رہی ہے۔ کسی جگہ بھی اور کسی دور میں بھی وہ رابطہ جہاد سے مستغنی نہیں رہی ہے' اور آخر الزمان اور قیامت تک یہ پوزیشن ایسی رہے گی۔

دعوت اسلامی لوگوں کے سامنے ایک حقیقت پسندانہ نظام زندگی پیش کرتی ہے۔ ایسا نظام جو ان کے ضمیر کے اندر بھی قائم ہوتا ہے' جو ان کے مال پر بھی حکمران ہوتا ہے' جو ان کی زندگی کے تمام امور پر حکمران ہوتا ہے' جو ان کی معیشت پر بھی حکمران ہوتا ہے اور جو ایک

منصفانہ اور سیدھا نظام ہوتا ہے۔ لیکن دنیا کا قانون ہے کہ شر ایسے منصفانہ 'عادلانہ اور خیر پر مشتمل سیدھے نظام کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرتا۔ کوئی باطل خیر 'عدل اور استواری کو محبوب نہیں رکھتا' اور کوئی ظلم عدل 'مساوات اور شرافت کو برداشت نہیں کرتا۔ اس لئے دعوت اسلامی کی مخالفت میں اصحاب شر' اصحاب باطل اور ظالم کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسلام کے خلاف تمام گندے اور مفاد پرست اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ تاکہ وہ لوگوں کو اپنے مفادات کیلئے استعمال کرتے رہیں۔ ظالم اور متکبر بھی اسلام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ظلم اور استکبار سے دست بردار ہونے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ اور اس کے مقابلے میں تمام بداخلاق اور بے راہ روی اختیار کرنے والے لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اپنی اخلاقی بے راہ روی اور شہوت رانی کو ترک نہیں کرسکتے۔ اس لئے ان سب کے ساتھ جہاد مسلسل ضروری ہے۔ اور ان کے مقابلے میں صبر اور مصابرت فرض عین ہے۔ اس لئے مسلسل چوکیداری اور اسلامی کوسٹ گارڈز کی ضرورت ہے تاکہ یہ نہ ہو کہ امت مسلمہ کے خلاف کوئی قوت اچانک حملہ آور ہو جائے' جبکہ ایسی قوتیں ہر سرزمین اور ہر نسل میں اس کے خلاف تاک لگائے ہوتی ہیں۔

یہ ہے اس دعوت کا مزاج' یہ ہے اس کا طریق کار اس کی پالیسی یہ نہیں ہوتی کہ وہ حد سے تجاوز کرے لیکن اس کی یہ پالیسی ضرور ہوتی ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر ایک مستحکم نظام زندگی اور ایک صحت مند منہاج قائم کرے۔ لیکن دعوت اسلامی کے مقابلے میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسی قوت اٹھ کھڑی ہوتی ہے جو اس منہاج اور اس نظام کو ناپسند کرتی ہے۔ اور پھر یہ قوت اس کی راہ میں اپنی پوری قوت لاکر کھڑی ہو جاتی ہے اور ہر قسم کی مکاری کرتی پھرتی ہے۔ وہ دعوت اسلامی کی ہر برائی پر خوش ہوتی ہے' جو ہاتھ' دل اور زبان سے دعوت اسلامی کے خلاف مسلسل جدوجہد کراتی ہے۔ اس لئے تحریک اسلامی کا بھی فرض ہے کہ وہ اس معرکے میں اپنے پورے فرائض اور واجبات کے ساتھ کود ے۔ اور اس کا فرض ہے کہ وہ ہروقت بیدار رہے اور کسی وقت بھی غافل نہ ہو۔

لیکن ان تمام کاموں میں خدا ترسی کا ہتھیار اس نے لازماً اپنی کمر کے ساتھ باندھا ہوا ہو۔ کیونکہ تقویٰ ایک بیدار چوکیدار ہے جو دل کے دروازے پر بیٹھا ہوتا ہے۔ وہ اسے غافل ہونے نہیں دیتا۔ وہ اسے ضعیف ہونے نہیں دیتا۔ اور وہ اسے حدود سے گزرنے بھی نہیں دیتا۔ اور وہ اسے راہ راست سے بھٹکنے بھی نہیں دیتا۔

اور تقویٰ کے اس بیدار' چوکیدار کی ضرورت کا احساس صرف اس شخص ہی کو ہوسکتا ہے جس نے اس راستے کی مشقتوں کو دیکھا ہوتا ہے۔ جس نے متضاد میلانات اور بکثرت اور پے درپے تاثرات کے دباؤ کا مقابلہ کیا ہو۔ مختلف حالات اور مختلف لحظات میں۔

اس سورت میں تار رباب پر یہ آخری ضرب تھی۔ جس میں اس قسم کے بے شمار مضراب استعمال کئے گئے۔ اور یہ ضربات سب کی سب ان تاروں پر لگائی گئیں ہیں جن کا تعلق دعوت اسلامی کی راہ میں عائد ہونیوالے فرائض اور واجبات سے تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آخر میں یہ فیصلہ دیا جاتا ہے کہ اگر تم ہمہ گیر فلاح چاہتے ہو اور مکمل انقلاب چاہتے ہو تو ان فرائض کا بطریق احسن پورا کرنا ضروری ہے۔

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ........................ (امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔)

○.....☆☆☆.....○

# فی ظلال القرآن

## پارہ ——— ۴

## سورۃ النساء ابتدائی حصہ

## ۱ تا ۲۳

# سورہ نساء ایک نظر میں

یہ سورت مدنی ہے اور یہ سورۂ بقرہ کے بعد طویل ترین سورت ہے' نزولی ترتیب کے اعتبار سے یہ سورۂ ممتحنہ کے بعد نازل ہوئی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ غزوۂ فتح مکہ' سنہ ۸ھ کے وقت نازل ہوا اور کچھ حصہ اس سے قبل صلح حدیبیہ کے وقت ۶ھ میں نازل ہوا۔ لیکن سورتوں کی ترتیب نزولی' جس طرح ہم نے سورۂ بقرہ کے آغاز میں بیان کیا' کوئی یقینی اور قطعی امر نہیں ہے۔ اس لئے کہ کوئی سورت بھی' لازمی نہیں ہے کہ ایک ہی جگہ ایک ہی وقت میں نازل ہوئی ہو بلکہ متعدد سورتوں کی آیات بیک وقت نازل ہوتی رہتی تھیں۔ اور حضور اکرم حکم فرماتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورت کی فلاں جگہ میں رکھ دو' چنانچہ ہر سورت کی تشکیل و تکمیل ایک عرصہ تک ہوتی رہی تھی۔ کبھی تو یہ عرصہ مختصر ہوتا تھا اور کبھی سالوں تک طویل ہوتا تھا' سورۂ بقرہ میں ایسی آیات بھی ہیں جو مدینہ کے ابتدائی عہد میں نازل ہوئیں۔ لیکن ایسی آیات بھی ہیں جو سلسلہ نزول قرآن کی آخری آیات ہیں۔

اس سورت میں بھی یہی حال رہا ہے۔ اس کا بعض حصہ ۶ھ کے بعد نازل ہوا' اور بعض حصہ ۸ھ کے بعد نازل ہوا۔ لیکن اس کا بڑا حصہ بہرحال ہجرت کے متصلاً" بعد نازل ہوا۔ مجموعی طور پر یہ بات نظر آتی ہے کہ یہ سورت غزوۂ احد ۳ھ کے بعد ۸ھ کے بعد تک نازل ہوتی رہی ہے۔ اور اس کے بعد سورۂ ممتحنہ کا ابتدائی حصہ نازل ہوا۔

مثال کے طور پر اس سورت کی آیات (۴:۱۵) جو زانی عورتوں کے عبوری احکام پر مشتمل ہے یعنی

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾

"تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو' اور اگر چار آدمی گواہی دیدیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا اللہ ان کیلئے کوئی راستہ نکال دے۔"

یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ یہ آیت سورہ نور کی اس آیت سے پہلے نازل ہوئی تھی جس میں زنا کی حد کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ سورۂ نور کی آیت یہ ہے۔

اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْیَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ

"زانیہ عورت اور زانی مرد' دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو' اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ اور ان کو سزا دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔"

یہ آیت ۵ھ میں واقعہ افک کے موقعہ پر نازل ہوئی۔ جس وقت یہ آیت نازل تو حضور ؐ نے فرمایا: "یہ لو مجھ سے' یہ لو مجھ سے' اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کیلئے کوئی راستہ نکال ہی دیا۔" (روایت امام احمد' امام مسلم' ابن ماجہ) اور وہ راستہ آیت نور کا حکم تھا۔

اس سورت میں اس قسم کے بہت سے نمونے اور مثالیں پائی جاتی ہیں' جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت اندازاً کب نازل ہوئی۔ جس طرح ہم سورۂ بقرہ کے آغاز میں اس اسلوب کا تفصیلاً ذکر کر آئے ہیں۔

○.....☆☆☆.....○

اس سورت میں اس جدوجہد کی تفصیلات دی گئی ہیں' جو اسلام نے جماعت مسلمہ کی تشکیل اور تربیت کے میدان میں کی' اور جس کے نتیجے میں ایک اسلامی معاشرہ پروان چڑھا' اس کے بعد اس معاشرے کے تحفظ اور اس جماعت کے بچاؤ کیلئے جو سعی کی گئی۔ اس کی پوری تفصیلات اس سورت میں موجود ہیں۔ اسلامی معاشرہ جس کی کونپلیں اس سورت کی آیات کے اندر سے پھوٹ کر نکلتی ہیں اور جس کا آغاز ربانی منہاج سے کیا گیا تھا' اس معاشرے کے ارتقا میں قرآن نے جس طرح کام کیا۔ اس کے واضح نمونے اس سورت میں ملتے ہیں۔ اس معاشرے اور اس کے اندر قرآن کریم کے اس کام کو دیکھ کر ایک واضح تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے جس میں قرآن کریم اس زندہ اور متحرک انسان کے ساتھ ایک خاص منہاج پر معاملہ کرتا ہے۔ نیز اس سورت میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ حضرت انسان کا مزاج اس ربانی نظام حیات کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرتا ہے۔ قرآن کریم انسان کا ہاتھ پکڑ کر قدم قدم پر اس کی راہنمائی کرتا ہے اور اسے تدریج کے ساتھ اس کی موجودہ گری ہوئی حالت سے نکال کر اسے مقام بلند تک اٹھاتا چلا جاتا ہے۔ قدم بقدم اور مرحلہ بمرحلہ' انسان خواہشات نفس' مرغوبات جسمانی' زندگی کے خوف و خطر میں گھرا ہے۔ بلندیوں تک پہنچ پانے کی اس راہ میں قدم قدم پر مشکلات کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس راستے پر جگہ جگہ انسان کا دشمن گھات میں بیٹھا ہے' لیکن قرآن اس کی راہنمائی کر رہا ہے۔

جس طرح اس سے قبل سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ مدینہ طیبہ میں جماعت مسلمہ جن خطرات سے دوچار تھی' ان خطرات کا مقابلہ قرآن مجید نے کس حکمت کے ساتھ کیا۔ جہاں تحریک اسلامی کی نشوونما کیلئے ربانی منہاج کا بیان ہوا۔ اس تصور حیات کا بیان ہوا جس کی اساس پر یہ تحریک اٹھائی گئی اور وہ اقدار اور پیمانے طے کئے گئے جو اس تصور حیات کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ جہاں بتایا گیا تھا کہ اس تصور حیات کے حاملین پر کیا کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اس نظام اور منہاج کے دشمنوں کا مزاج کیا ہوتا ہے۔ اور اس منہاج کی حامل جماعت کو اس کرۂ ارض پر کیسے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ جہاں جماعت مسلمہ کو اس کے دشمنوں کے وسائل اور ان کی سازشوں سے متنبہ کیا گیا تھا' یہاں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اسلامی نظریۂ حیات کے مقابلے میں خود ان کے عقائد و نظریات کس قدر بودے ہیں اور کس قدر گمراہ کن ہیں۔ اور تحریک اسلامی کی دشمنی میں وہ کس قدر اوچھے ہتھیار استعمال کر رہے ہیں۔ اور کس قدر ذلیلانہ حرکات پر اتر آئے ہیں۔ بعینہ اسی طرح اس سورت میں بھی قرآن کریم ان تمام موضوعات پر بات کرتا ہے اور ان حالات کے بارے میں تازہ ترین حقائق پیش کرتا ہے۔

ہاں یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ قرآن مجید کی تمام سورتوں کی اپنی جگہ مخصوص شخصیت اور اپنا علیحدہ موضوع ہوتا ہے' اس کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں' ایک محور ہوتا ہے جس کے اردگرد اس کے مباحث گھومتے ہیں' سورت کی اس شخصیت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ پوری سورت کے موضوعات باہم مربوط ہوں اور ایک خاص طریقے سے اس کے محور کے گرد گھوم رہے ہوں' یوں اس سورت کے خدوخال سامنے آجاتے ہیں اور اس کی شخصیت یوں ظاہر ہو جاتی ہے جس طرح ایک زندہ شخص کے مخصوص خدوخال اور چہرہ بشرہ ہوتا ہے۔ لیکن اپنے ان مخصوص خدوخال کے ساتھ ساتھ یہ پوری سورت بھی قرآن کریم کی دوسری سورتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے اور ان میں سے

ایک نظر آتی ہے۔

چنانچہ جب اس سورت پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک زندہ مخلوق ہے' اس کی ایک خاص غرض و غایت ہے' وہ اس ہدف کے حصول کیلئے کوشاں ہے' اور اس نصب العین کے حصول کیلئے یہ زندہ سورت مختلف وسائل کام میں لاتی ہے۔ زندہ فقرے' خوبصورت الفاظ اور متوازن آیات کو کام میں لایا جاتا ہے۔ اور یہ سورت اپنے ہدف کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے۔ اور یوں ہم اس کے اس ہدف کا شعور وادراک پالیتے ہیں۔ جس طرح پورے قرآن مجید کے نصب العین کا شعور ہم پالیتے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ ہم ایک زندہ شخصیت کے ساتھ ہمکلام اور ہمقدم ہیں۔ جس کے واضح خدوخال ہیں' جس کی ممتاز خصوصیات ہیں' جس کے متعین اہداف ہیں جس کی سمت متعین ہے۔ جو زندہ ہے' متحرک ہے' اور جو حس اور شعور کی مالک ہے۔

غرض یہ سورت انتہائی جدوجہد کے ساتھ جاہلی معاشرے کے بقیہ آثار اور خدوخال کو ایک ایک کر کے مٹا رہی ہے۔ پہلی جماعت مسلمہ کا انتخاب اسی جاہلی معاشرہ سے کیا گیا تھا اور اس جماعت نے اس وقت کے موجود جاہلی معاشرہ کے رسوم و رواجات کو ترک کر دیا تھا' یہ سورت اس جاہلیت کے آثار کو محو کر رہی ہے۔ اور یہ اسلامی معاشرہ کے خدوخال کو نمایاں کر رہی ہے۔ اور اس کی مخصوص شخصیت کو نمایاں کر رہی ہے۔ یہ لوگوں کو مسلسل اسلامی معاشرے کے وجود اور اس کے یا مخصوص تشخص کے دفاع کیلئے آمادہ کر رہی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ وہ عناصر کیا ہیں جو اس اسلامی معاشرہ کے دشمن ہیں اور ہروقت اس پر حملہ آور ہونے کیلئے گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مثلاً مشرکین مکہ اہل قریش' اہل کتاب خصوصاً یہودی اہل کتاب' ضعیف الاعتقاد' کمزور کردار کے مالک منافقین' پھر یہ سورت صاف بتاتی ہے کہ یہ دشمن اسلامی معاشرہ کے خلاف کیا کیا وسائل کام میں لاتے ہیں کیا کیا حیلے اور سازشیں کرتے ہیں۔ پھر یہ بتاتی ہے کہ ان دشمنوں کا طریق کار اور ان کا لائحہ عمل کس قدر مفسدانہ ہے۔ اس غرض کیلئے یہ سورت قانون سازی کر کے اسلامی معاشرے کیلئے حدود و قیود بھی وضع کرتی ہے۔ اور اسے مضبوطی سے نافذ بھی کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ سورت جاہلیت کے خدوخال کی وضاحت بھی کرتی ہے۔ وہ خدوخال جو جدید معاشرے کی راہ میں حائل ہیں اور اس سے متضاد ہیں جو جدید معاشرے میں رائج شدہ اقدار اور اہم باتوں کے ساتھ لگا نہیں کھاتے۔ اس کشمکش میں صاف نظر آتا ہے کہ جاہلی معاشرے کی یہ خصوصیات اسلامی معاشرے کی خصوصیات کے ساتھ بر سرپیکار ہیں اور جاہلیت اس نئے رنگ کے مٹانے کے درپے ہے۔ جو ایک نئی روشنی اور خوبصورت رنگ ہے۔ غرض اس سورت میں اسلامی نظام حیات جاہلیت کے ساتھ لڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور یہ معرکہ اس قدر وسیع ہے جو قرآن مجید کے تمام دوسرے معرکوں سے زیادہ وسیع عمیق اور شدید ہے۔ اور یہ بیک وقت ان دشمنوں کے خلاف ہے جو اسلام کے مخالف مورچے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ان دشمنوں کے بھی خلاف ہے جو اندر بیٹھ کر اسلام کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔

جب ہم ان گراوٹوں اور کمزوریوں کو دقتِ نظر سے دیکھتے ہیں' جو اس جدید اسلامی معاشرے میں اس جاہلی معاشرے سے وراثت میں منتقل ہوگئی تھیں۔ اس لئے کہ یہ اسلامی معاشرہ اس جاہلی معاشرے ہی سے نکل کر سامنے آیا تھا۔ اور یہ کہ یہ سورت ان کمزوریوں کے بعض شعبوں کا مداوا کر رہی تھی۔ جس طرح بعض دوسری سورتیں بعض دوسرے پہلوؤں سے ان کمزوریوں کا مداوا کر رہی تھیں' تو ہم یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ جاہلیت کی یہ گراوٹیں اور یہ خرابیاں کس قدر گہری ہیں۔ اور اس وقت تک اسلامی معاشرے میں چھائی ہوئی تھیں جس وقت ہماری ترجیح کے مطابق یہ سورت نازل ہو رہی تھی' اور فی الواقعہ یہ بات عجیب ہے کہ جاہلیت کی یہ کمزوریاں اس قدر سخت جان تھیں اسلامی اقدار اعلیٰ کے ہوتے ہوئے بھی' ابھی تک وہ اس جدید معاشرے میں موجود تھیں۔ اور اس دقت نظر کے بعد ہمیں ایک دوسری حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسلام کے اس منفرد منہاج اصلاح نے اس عرب جاہلی معاشرے کو کس قدر عمیق پستیوں

سے نکالا اور کس قدر اونچے اور ارفع مقام تہذیب و تمدن تک پہنچادیا۔ اس معاشرے کو قعر ذلت سے نکال کر بام عروج تک پہنچادیا۔ اس قدر مقام بلند تک کہ اس تک تاریخ انسانیت میں' نہ رہے اور نہ بعد میں انسانیت کو پہنچنا نصیب ہوا۔ یہ کام صرف اسلامی نظام زندگی میں ہوسکا اور یہ صرف اسلامی نظام زندگی کی مخصوص صلاحیت ہے کہ وہ انسانیت کو اس قعر ذلت سے اٹھا کر بڑی تدریج کے ساتھ' انتہائی رحمدلی اور نرمی کے ساتھ بام عروج تک پہنچائے۔ بڑی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کے ساتھ' نہایت ہی موزوں اور مربوط خطوط پر۔

جو شخص تاریخ انسانی کے اس منفرد منظر کو وقت نظر سے دیکھے۔ اس کی نظر میں اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ پالیسی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم کام کیلئے جزیرۃ العرب کی ان پڑھ امت کو منتخب کیا۔ اس لئے کہ وہ جاہلیت کی بدترین شکل میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے اندر جاہلیت اپنے تمام عناصر ترکیبی کے ساتھ موجود تھی۔ ان کے خیالات و تصورات' ان کا فہم و ادراک' ان کی اخلاقیات اور اجتماعی نظام' ان کا اقتصادی نظام اور سیاسی شکل سب کے سب مکمل طور پر جاہلی تھے۔ اور ان لوگوں کا انتخاب اس لئے کیا گیا تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ اس قسم کے بدترین لوگوں پر اسلامی نظام کا اثر کیا ہوتا ہے۔ اور معلوم ہوسکے کہ یہ معجزہ کس طرح حیران کن حالات میں نمودار ہوتا ہے۔ جس کی مثال دنیا کے کسی دوسرے نظام کے اندر موجود نہیں ہے۔ جو آغاز انسانیت سے آج تک لکھی جا رہی ہے۔ اور غالب آئے ہیں۔ یہ اس لئے تاکہ عربی جاہلی معاشرہ میں اسلامی انقلاب کے خطوط اچھی طرح کھینچے جاسکیں' اور اس انقلاب احوال کے تمام مراحل بھی اچھی طرح نقش پذیر ہو جائیں۔ جب یہ معاشرہ انتہائی پستیوں میں پڑا تھا اور اس کے بعد جب یہ معاشرہ بام عروج تک جا پہنچا۔ نیز وہ تمام تجربات ریکارڈ پر آجائیں جو اس انقلاب کے دوران وقوع پذیر ہوئے۔ وہ تمام علامات واضح ہو جائیں جن کی وجہ سے یہ تبدیلی ہوئی۔ تاکہ قیامت تک انسانیت کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ اس کرۂ ارض پر ترقی اور برتری حاصل کرنے کا نسخہ کیمیا کیا ہے۔ اور عروج حاصل کرنے کیلئے اسے کیا موقف اختیار کرنا چاہئے۔ چاہے وہ ترقی و تنزل کے جس حال اور جس درجے میں بھی ہو۔ اس طرح پس ماندہ جس طرح عرب تھے یا ان سے قدرے اچھی ہو۔

اسلامی نظام زندگی اپنے عناصر ترکیبی اور اپنے اصول کے مطابق ایک مستقل نظام ہے۔ وہ انسان کی اصلاح چاہتا ہے۔ اور انسانی وجود ایک مستقل وجود ہے۔ انسانی فطرت اور اس کی شخصیت طبیعی اعتبار سے بدلی نہیں جاسکتی۔ ہم انسان کی زندگی کے حالات' اس کے طور طریقے اس کے مزاج اور اس کی طبیعت تبدیل نہیں کرسکتے۔ نہ اس کی فطری عادات کو اس کی فطرت سے جدا کیا جاسکتا ہے۔ نہ اس کی فطرت کو یکسر بدلا جاسکتا ہے۔ انسانی زندگی کے طور طریقے اور اس کے رسوم و رواجات وہ سطحی حالات ہوتے ہیں جو اس کی فطرت کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے۔ مثلاً سمندر کی موجیں اور لہریں سمندر کی آبی حقیقت میں تغیر نہیں لاسکتیں۔ بلکہ یہ موجیں سمندر کے اندرونی بہاؤ اور حرکات کو بھی متاثر نہیں کرسکتیں جس کا تعلق سمندر کے مستقل نظام سے ہوتا ہے۔

چنانچہ قرآن کریم کے دائمی نصوص' انسان کی اس فطرت کی جانب متوجہ ہوتے ہیں جو ایک مستقل فطرت ہے۔ اس لئے کہ یہ قرآنی نصوص اسی ذات کی جانب سے نازل شدہ ہیں' جس ذات کی جانب سے ذات انسانی کی تخلیق ہوئی ہے۔ انسان کے تغیر پذیر حالات کے مطابق ان نصوص کا انسان سے ایک نیا مطالبہ ہوتا ہے' جس طرح جدید اور متغیر ظروف و احوال میں انسان کی ضروریات اور مطالبات بدلتے رہتے ہیں' لیکن آیات کے اساسی اصول اپنی جگہ قائم رہتے ہیں جس طرح انسانی فطرت اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی شخصیت میں ایک لچک ودیعت فرمائی ہے۔ اس میں کمال ہے کہ وہ حالات زمانہ کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالتا رہتا ہے۔ اس لئے کہ زمانے کے حالات میں ٹھہراؤ نہیں ہے' یہ حالات ہر وقت متغیر ہوتے رہتے ہیں' اگر انسان میں یہ لچک نہ ہوتی تو اس کیلئے متغیر حالات میں زندگی بسر کرنا مشکل ہو جاتا۔ بعینہ اسی طرح اسلامی نظام حیات میں بھی ایسی ہی لچک رکھی گئی ہے۔ اس لئے کہ اسلامی

نظام زندگی کی تشکیل اسی انسان کیلئے ہوئی ہے' اور انسان کا خالق اور اسلامی نظام کا شارع ایک ہی ذات ہے' اس نے جس طرح کی شخصیت انسان کو عطا فرمائی اسی طرح کے خصائص اسلامی نظام زندگی میں بھی رکھے ہیں۔ تاکہ حضرت انسان اس نظام پر ہر دور اور ہر قسم کے حالات میں عمل کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ قرآنی نصوص اور یہ قرآنی نظام حیات کچھ افراد کو چن لیتا ہے' کچھ مجموعہ افراد کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ چاہے لوگ تنزل اور ترقی کے جس درجے میں بھی ہوں' وہ بہت پسماندہ ہوں یا ترقی کے بام عروج پر ہوں' اور قرآن کریم ان افراد اور ان جماعتوں کو ان کے موجودہ حالات ترقی سے مزید ترقی یافتہ بناتا ہے۔ اسلام کسی فرد یا کسی جماعت یا کسی سوسائٹی کو پیچھے کی طرف نہیں موڑتا' وہ انہیں پستیوں کی طرف نہیں گراتا' بلکہ انہیں بلند سے بلند تر کرتا ہے' نہ اسلام کسی سوسائٹی پر عرصہ حیات تنگ کرتا ہے' اور نہ اسلام اس قدر کمزور ہے کہ اس میں پسماندہ سے پسماندہ سوسائٹی کو سربلند کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔

جاہلیت قدیم کے دور میں عرب سوسائٹی ایک انتہائی پسماندہ سوسائٹی تھی' اور جاہلیت جدید میں یورپ و امریکہ کی صنعتی سوسائٹی ترقی یافتہ اور مہذب ترین سوسائٹی ہے' یہ دونوں سوسائٹیوں کیلئے قرآنی آیات کے اندر ہدایت اور روشنی موجود ہے۔ اور دونوں قرآنی ہدایات کو اپنا کر مزید ترقی کر سکتی ہیں۔ اور بلند سے بلند ہو سکتی ہیں' اور اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں بار بار اسی حقیقت کو تجربہ کر کے بتایا ہے۔

جاہلیت یا دور جاہلیت تاریخ کے کسی ایسے دور کا نام نہیں ہے جو بس گزر گیا ہو' بلکہ ہر وہ نظام حیات دور جاہلیت ہے' جس میں ایک انسان انسان کی غلامی کر رہا ہو' اور یہ خصوصیت' اس وقت ہمارے اس ترقی یافتہ دور میں بھی تمام رائج الوقت نظامہائے حیات کے اندر پوری طرح پائی جاتی ہے۔

وہ تمام نظامہائے حیات جنہیں آج انسانیت نے اپنا رکھا ہے' ان میں ایک انسان بعینہ اپنی طرح کے ایک دوسرے انسان سے افکار و تصورات' اصول و قواعد' معیار اور پیمانے' رسوم و رواجات اور قوانین و ضوابط اخذ کرتا ہے' یہی تو عین جاہلیت ہے' جس میں ایک انسان دوسرے انسان کی اطاعت اور بندگی کرتا ہے' لوگ ایک دوسرے کی بندگی اور غلامی کرتے ہیں حالانکہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی جائز نہیں ہے۔

اسلام وہ واحد نظام حیات ہے کہ جس میں انسان دوسرے انسان کا بندہ اور غلام نہیں ہوتا' اس لئے کہ اسلام میں تمام لوگ اپنے افکار و تصورات' حسن و قبح کے تمام پیمانے' ترجیحات حیات اور اقدار حیات' قوانین و ضوابط اور تمام رسم و رواج اللہ جل شانہ کی ہدایات سے اخذ کرتے ہیں' اگر وہ جھکتے ہیں تو صرف اللہ کے سامنے جھکتے ہیں۔ اگر وہ کسی قانون اور ضابطے کی پابندی کرتے ہیں تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی حکومت کے مطیع فرمان ہوتے ہیں تو وہ گویا اللہ کے مطیع فرمان ہوتے ہیں' اسی نقطہ نظر سے گویا انسان انسان کی بندگی اور غلامی سے پوری طرح آزاد ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اسلامی نظام میں سب کے سب' بندہ و خواجہ' اللہ کے بندے ہوتے ہیں اور اس کی بندگی میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہوتا۔

یہی ہے وہ فرق و امتیاز جو اسلام اور دنیا کی تمام جاہلیتوں کے اندر پایا جاتا ہے چاہے وہ جدید جاہلیت ہو یا قدیم جاہلیت ہو' اور اس سورت میں اس نقطہ نظر سے اسلام اور جاہلیت کے اندر پوری طرح لکیر کھینچ کر رکھ دی گئی ہے۔ یہ لکیر اس قدر واضح ہے کہ اس کے بعد کوئی اجمال اور کوئی التباس نہیں رہتا۔ نہ کوئی شک کا موقعہ رہتا ہے۔

○.....☆☆☆.....○

یہ حقیقت کہ ہر امر اور نہی جو قرآن میں وارد ہے' وہ جاہلی معاشرہ کے حالات میں سے کسی حالت کے بارے میں وارد ہے... ...ں نے

یا تو کسی مروج حالت کو بدل کر ایک نئی صورت حال قائم کی ہے یا کسی غیر موجود صورت حالات میں ایک نئی صورت پیدا کی ہے۔ لیکن ایسے تمام حالات اور اوامر ونواہی کے بارے میں اسلامی قانون نے یہ اصول وضع کیا ہے کہ نصوص کا مفہوم صرف نص عام یا خاص الفاظ کو دیکھ کر متعین ہو گا' اس میں اسباب نزول نصوص کا کوئی اعتبار نہ ہو گا۔ اس لئے کہ نصوص قرآن ہر دور اور ہر زمانے کے حالات میں ہمارے لئے ہدایت ہیں۔ جیسا کہ اوپر ہم نے اس کی تفصیلات دے دی ہیں۔ یہی بات دراصل کمال اعجاز ہے۔ اس لئے کہ یہ آیات جن مخصوص حالات میں نازل ہوئی تھیں وہ ان کا تعلق پوری انسانیت کے ساتھ ابدالاباد تک ہے۔ دنیا کے مختلف حالات میں سے ہر حال میں یہ آیات حجت اور راہنما ہیں' اس لئے اسلام میں جس طرح اس وقت یہ قوت اور صلاحیت تھی کہ اس نے پسماندہ ترین عرب سوسائٹی کو ترقی کی راہ پر ڈالا' اسی طرح اس میں یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ وہ ہر اس سوسائٹی کی راہنمائی کرے اور اسے مزید ترقی کی راہ پر گامزن کرے' جو ترقی پذیر ہو یا نہایت ہی ترقی یافتہ ہو۔

جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں' تو اس کے دوران ایک تو ہمیں یہ حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ جس جاہلی سوسائٹی کو اسلام نے بدلا اس کے خدوخال کیا تھے۔ دوسرے یہ کہ آج کی ترقی یافتہ جاہلی سوسائٹی میں اسلام کیا کیا تغیرات لانا چاہتا ہے۔ اور کن کن اچھے امور کو اسلام بحال رکھنا چاہتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس سورت کے مطالعہ کے بعد' اس جاہلی سوسائٹی کے کیا خدوخال سامنے آتے ہیں' جس میں سے اللہ تعالیٰ نے اپنے ربانی منہاج کے مطابق امت مسلمہ کو چنا تھا؟ اور وہ کیا نقشہ ہے جس کے مطابق دور جدید میں اسلام از سر نو ایک نیا اسلامی معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔

اس سورت کے آئینہ میں ہمیں ایک ایسا معاشرہ نظر آتا ہے' جس میں یتیموں کے حقوق مارے جاتے ہیں' اور خصوصاً یتیم لڑکیوں کے حقوق مارے جاتے ہیں' والدین کی وفات کے بعد یہ لڑکیاں' ان کے اولیاء اور دوسرے ذمہ دار رشتہ داروں کی نگرانی میں ہیں۔ اپنی کھوٹی اشیاء دے کر یتیموں کی قیمتی جائیداد حاصل کر لی جاتی ہے۔ ان کی دولت کو اسراف سے اڑایا جاتا ہے۔ ہر وقت اسے للچائی نظروں سے دیکھا جاتا ہے' اور یہ کام اس لئے کیا جاتا ہے کہ اگر یتیم بڑے ہو گئے تو وہ خود مختار ہو جائیں گے اور یہ دولت ان کے قبضے میں چلی جائے گی' پھر وہ یتیم بچیاں جو دولتمند تھیں' انہیں روکے رکھا جاتا تھا تاکہ ان کے ولی یا رشتہ دار خود انہیں اپنی زوجیت میں لے لیں۔ انہیں ان کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ صرف دولت ہتھیانا مقصود ہے' بعض اوقات یہ اولیاء انہیں اپنے بچوں کی زوجیت میں دے دیتے ہیں۔

ہمیں ایک معاشرہ نظر آتا ہے جس میں چھوٹوں' ناتوانوں اور عورتوں پر مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو میراث میں سے ان کا مروجہ حصہ بھی نہ دیا جاتا۔ میراث کا ایک بڑا حصہ بااثر مرد حاصل کر لیتے تھے' جو اسلحہ اٹھا سکتے تھے' اور بچا کھچا ان مظلوموں کے حصے میں آجاتا' ان بچوں اور عورتوں کو پھر اس حقیر حصے کی وجہ سے بند رکھا جاتا تھا' اور ان عورتوں کا نکاح محض ان کی اس حقیر دولت کی وجہ سے اپنے چھوٹے بچوں سے کر دیا جاتا یا ان نوجوان عورتوں کو نہایت ہی بوڑھے مردوں کے حوالے کر دیا جاتا۔ محض اسی لئے کہ ان کی دولت دور نہ چلی جائے اور غیر لوگ اس پر قبضہ نہ کر لیں۔

ان نصوص میں ہم ایک ایسا معاشرہ دیکھتے ہیں جس میں عورت کو ذلیل و خوار کر کے رکھا ہوا ہے' یہ معاشرہ عورت کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتا ہے۔ اسے ہر دور میں حق وراثت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اور اگر اسے کچھ حقیر سا حصہ دیا بھی جاتا ہے کہ اس وجہ سے وہ بیچاری قید ہو جاتی ہے اور خود یہ عورت اپنے اس حقیر مال کے ساتھ کسی مرد کی وراثت میں چلی جاتی ہے گویا وہ بھی مال ہے' اگر اس کا خاوند فوت ہو جائے تو اس کا ولی اس کی جگہ لے لیتا ہے' وہ فوراً اس پر کپڑا ڈال دیتا ہے' اور یہ کپڑا ڈالتے ہی یہ معاشرہ اس عورت کو میت کیلئے

محبوس سمجھتا ہے' اب اس ولی کی مرضی ہے کہ وہ خود اس عورت کے ساتھ نکاح کرلے اور اس نکاح پر کوئی مہر بھی واجب نہ ہو گا اور اگر چاہے تو کسی دوسرے شخص کو نکاح میں دے دے اور مہر خود لے لے۔ اور اگر مرد عورت کو طلاق دینا چاہے تو وہ اسے طلاق دیتا ہے' پھر رجوع کرتا ہے پھر طلاق دیتا ہے' اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک یہ عورت معاوضہ دیکر اپنے آپ کو چھڑا نہیں لیتی۔

ہم ایک معاشرہ پاتے ہیں جس میں خاندانی روابط کے اندر ایک عظیم اضطراب پایا جاتا ہے۔ محض اس لئے کہ اس معاشرہ میں عورت ذات کو ایک ذلت آمیز حیثیت دی گئی ہے۔ اس معاشرہ میں ولایت اور متبنیٰ بنانے کے اصول بھی رائج ہیں' یہ اصول نسب اور حقیقی رشتہ داری کے اصول و قواعد کے ساتھ متصادم ہیں' اور ایک خاندان کے اندر جب بذریعہ ولاء یا بذریعہ متبنیٰ ایک اجنبی شخص داخل ہوتا ہے تو اس خاندان میں جنسی بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے اور ناجائز جنسی تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔

پھر یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں سودی نظام کے ذریعہ لوگوں کی دولت ناجائز طریقوں سے عام طور پر کھائی جاتی ہے۔ اس میں حقوق غصب ہوتے ہیں' اس میں امانت میں خیانت کی جاتی ہے۔ اس میں لوگوں کی دولت اور ان کی جان محفوظ نہیں ہے اور اس پر ڈاکے ڈالے جاتے ہیں۔ اس میں عدل و انصاف کا نام و نشان نظر نہیں آتا' اگر کسی کو انصاف ملتا ہے تو وہ زور آور کو ملتا ہے۔ اس معاشرے میں دولت کار خیر میں نہیں بلکہ دکھاوے کیلئے خرچ کی جاتی ہے' تاکہ خرچ کرنیوالے کا سر فخر سے بلند ہو' لیکن ضعفاء اور محتاج بھوکوں مرتے ہیں' جو کچھ خرچ ہوتا ہے وہ بھی مالداروں اور دولتمندوں پر خرچ کیا جاتا ہے۔

غرض جاہلیت عربیہ کے یہ بعض خدوخال تھے' اور انہی خصوصیات پر یہ سورت بحث کرتی ہے' ہاں اس کے علاوہ دوسری سورتوں میں اس جاہلیت کے دوسرے پہلوؤں سے بھی بحث کی گئی ہے' نیز عربی دنیا کے اردگرد دوسری اقوام کے اندر جو جاہلی عادات و تقالید پائی جاتی تھیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔[1]

ہاں! یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ یہ جاہلی معاشرہ فضائل اخلاق سے بالکل تہی دامن بھی نہ تھا' اس میں کچھ خوبیاں بھی تھیں اور اپنی ان خوبیوں ہی کی وجہ سے وہ اس دنیا کو وہ عظیم پیغام دے سکا جو اس نے دیا۔ لیکن اس کے ان فضائل اخلاق کو بھی اسلام نے مزید منقح کر دیا۔ ان فضائل اخلاق کو تعمیری خطوط پر ڈالا گیا' اگر اسلام کا پیغام نہ ملتا تو یہ فضائل بھی مٹی میں مل جاتے۔ اور ان پر جاہلیت کی تہیں جم جاتیں۔ یہ متفرق اور بکھرے ہوئے ہوتے اور ان کا کوئی تعمیری رخ نہ ہوتا' اور اگر اسلامی نظام حیات کا پیغام نہ ہوتا تو امت عربیہ دنیا کو وہ پیغام نہ دے سکتی جو اس نے دیا' اس لئے کہ اسلامی نظام حیات ہی نے امت عربیہ سے جاہلیت کے خدوخال مٹائے' جس نے اس قوم کے اصل فیچرز خراب کر رکھے تھے' اور ان کی جگہ اسلامی نظام زندگی کا خوبصورت چہرہ بشرہ' ان کے جسم پر نمودار ہوا' جو روشن تھا' جو فضائل اخلاق کا حامل تھا' جس نے امت عربیہ کی ضائع ہونیوالی متفرق صلاحیتوں کو یکجا کیا۔ ورنہ عرب قوم بھی اس دنیا پر بسنے والی دوسری اقوام کی طرح ایک قوم ہوتی' جو اس وقت عرب قوم کے قرب و جوار میں آباد تھیں اور یہ تمام اقوام آج صفحہ ہستی سے اس طرح مٹ چکی ہیں کہ ان کا کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ حالانکہ عرب قوم ان سے بہتر نہ تھی۔ اس لئے کہ یہ اقوام اس پیغام سے محروم رہیں جو امت عربیہ کی قسمت میں آیا۔

غرض اسی جاہلی معاشرہ سے' جس کے خدوخال اوپر بیان ہوئے' اسلام نے ان افراد کو چنا جن کی قسمت میں یہ بھلائی لکھی ہوئی تھی' جو انسانیت کی قیادت کیلئے چنے گئے تھے۔ ان افراد سے ایک انقلابی جماعت اسلامی تشکیل پائی' اس جماعت نے ایک جدید معاشرے کو جنم دیا' اور یہ معاشرہ عروج اور ترقی کی انتہاؤں تک جا پہنچا' جہاں تک کبھی کوئی قوم نہ پہنچ پائی تھی۔ جو آج اس دور جدید میں بھی امید کی کرن ہے۔

ا۔ تفصیلات کیلئے دیکھئے اسی پارہ کی آیت لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ....... کی تفسیر دیکھئے صفحہ نمبر

اور اگر یہ معاشرہ آج بھی عزم کر لے تو وہ انسانیت کی قسمت بدل سکتا ہے۔
نیز اس سورت میں بعض نئے خدو خال بھی ملیں گے' جو اسلامی نظام زندگی نے از سرنو جاری کئے اور جنہیں اس معاشرے کے خصائص میں داخل کر دیا گیا اور مستحکم کر دیا گیا' اور یہ نئی اخلاقیات اس وقت رائج کی گئیں جب اسلامی معاشرے کو جاہلی اخلاق رذیلہ سے پاک کر دیا گیا اور اس کے بعد اس نئے معاشرے میں کچھ نئے قوانین اور ضوابط بھی نافذ کئے گئے تاکہ وہ اس نئے معاشرے کے نقوش کو مستحکم کر دیں اور اس پر حملہ کرنے والے عناصر کے مقابلے میں اس کا دفاع کر سکیں۔
اس سورت کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت' اس کی وحدانیت کا اظہار کیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ پوری انسانیت کو اسی رب وحدہ لاشریک نے ایک ہی اصل سے پیدا کیا ہے۔ انسان کی تخلیق کے بعد یہاں اسکے نظام کی اساس خدائی نظام پر رکھی گئی ہے۔ انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بوجہ صلہ رحمی جوڑا گیا ہے۔ ان حقائق کے اظہار کے ساتھ انسانوں کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ رشتہ داریوں کے تعلقات کا احترام کریں اور انہیں مضبوط بنائیں۔ اور انسان کے اجتماعی نظام اور انسانی معاشرے کی نیو اس خاندانی حکمت عملی کے نظام پر رکھیں۔ یوں ایک خاندان کے ناداروں کا انتظام اور کفالت خود اس خاندان کے اندر کر دی گئی۔ ایک خاندان اور اس خاندان کے ہر فتنے' ہر ظلم اور ہر قسم کی فحاشی کے مقابلے میں بچاؤ' اس نہج پر ایک مسلم خاندان کی تنظیم' ایک مسلم معاشرے کی تنظیم اور پھر اس کے بعد ایک انسانی معاشرے کی تنظیم' اس نظریۂ حیات پر کہ سب کا مالک اور خالق اور رب ایک ہی ذات ہے اور ہم سب اس کے بندے ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا

"لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔ اسی خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو۔ اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔"
یہ عظیم حکیمانہ آیت جس سے اس سورت کو شروع کیا گیا ہے' اسلامی تصور حیات کے ایک اہم اصول کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اس اصول پر اسلام کا اجتماعی نظام قائم ہوتا ہے۔ مزید تفصیلات انشاء اللہ تفسیر کے وقت بیان ہوں گی۔
اس سورت میں اجتماعی کفالتی نظام (Social Security) کی تکمیل کیلئے کچھ عملی قانون سازی بھی کی گئی ہے۔ تاکہ اس خاندانی حکمت عملی کی اساس پر جماعت مسلمہ اس سے استفادہ کرے۔
یتیموں کے تحفظ کیلئے اس میں زوردار ہدایات دی گئی ہیں۔ اور سخت تنبیہہ بھی کی گئی ہے۔ اور مخصوص قانون سازی کی گئی ہے۔

وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ ۖ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا

"یتیموں کے مال ان کو واپس دو' اچھے مال کو برے مال سے نہ بدل لو' ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ' یہ بہت بڑا گناہ ہے۔"

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا

"اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو' یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل عمر تک پہنچ جائیں' پھر اگر تم ان کے اندر اہلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ ایسا کبھی نہ کرنا کہ حد انصاف سے تجاوز کرکے اس خوف سے انکے مال جلدی جلدی کھاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے۔ یتیم کا جو سرپرست مالدار ہو وہ پرہیزگاری سے کام لے اور جو غریب ہو وہ معروف طریقہ سے کھائے۔ پھر جب ان کے مال ان کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اس پر گواہ بنالو۔ اور حساب لینے کے لئے اللہ کافی ہے۔"

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا

"لوگوں کو اس بات کا خیال کرکے ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے۔ پس چاہئے کہ وہ خدا کا خوف کریں۔ اور راستی کی بات کریں۔ جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں۔ اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔"

عورتوں کے تحفظ اور خصوصاً یتیم بچوں اور ضعیف عورتوں کے تحفظ اور انکے حقوق میراث اور ان کی معاشی جدوجہد کے نتائج کے تحفظ اور ان کے حق خود اختیاری کے تحفظ اور ان کو جاہلیت کے مظالم سے بچانے کی خاطر اور جاہلیت کے توہین آمیز اور سخت گیر رسم و رواج سے نکالنے کی خاطر' اس سورت میں خصوصی ہدایات دی گئی ہیں۔ اور مختلف النوع قانون سازی کی گئی ہے۔ اور اس میں بڑی وسعت ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ وَاٰتُوا النِّسَاۗءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۭ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْۗئًا مَّرِيْۗئًا

"اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو' تین تین' چار چار سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ انکے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں' بے انصافی سے بچنے کیلئے یہ زیادہ قرین صواب ہے۔ اور عورتوں کے مہر خوشدلی کے ساتھ ادا کرو' البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمہیں معاف کر دیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔"

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ
وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا

"مردوں کیلئے اس مال میں حصہ ہے' جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو' اور عورتوں کیلئے بھی اس مال میں حصہ ہے' جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو' خواہ تھوڑا ہو یا بہت اور یہ حصہ مقرر ہے۔"

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ۖ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ
مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَن يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ
فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿١٩﴾ وَإِنْ أَرَدتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ
مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ۚ أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا
وَإِثْمًا مُّبِينًا ﴿٢٠﴾ وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنكُم
مِّيثَاقًا غَلِيظًا

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تمہارے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو' اور نہ یہ حلال ہے کہ انہیں تنگ کر کے اس مہر کا کچھ حصہ اڑا لینے کی کوشش کرو' جو تم انہیں دے چکے ہو۔ ہاں اگر وہ کسی صریح بدچلنی کی مرتکب ہوں۔ ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کر لو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو' اس میں سے کچھ واپس نہ لینا' کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے؟ اور آخر تم اسے کس طرح واپس لے لو گے جب کہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔"

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ ۖ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ وَمَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ فِي يَتَامَى
النِّسَاءِ اللَّاتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَن تَنكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ
الْوِلْدَانِ وَأَن تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِهِ عَلِيمًا

"لوگ تم سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں' کہو' اللہ تمہیں اس معاملے میں فتویٰ دیتا ہے اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے تم کو اس کتاب میں سنائے جا رہے ہیں۔ یعنی وہ احکام جو یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں' جن کے حق تم ادا نہیں کرتے۔ اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو اور وہ احکام جو ان بچوں کے متعلق ہیں جو بیچارے کوئی زور نہیں رکھتے۔ اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو' اور جو بھلائی تم کرو گے وہ اللہ کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی۔"

اس سورت میں' خاندان کی تنظیم کے سلسلے میں اور اسے دوامی فطرت کی محکم اساس پر منظم کرنے کی خاطر اور میاں بیوی کے

درمیان بعض اوقات عارضی طور پر شکر رنجی پیدا ہونے کی وجہ سے جو مشکل حالات پیدا ہو جاتے ہیں ان میں خاندان کے تحفظ اور بچاؤ کی خاطر تنظیمی ہدایات دی گئی ہیں' ان ہدایات کے علاوہ جو یتیم عورتوں اور مطلقہ عورتوں کے سلسلے میں دی گئی ہیں' جن پر اس سے پہلے بحث ہو چکی ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتًا
وَسَاءَ سَبِيلًا ﴿٢٢﴾ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَ
بَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ وَ
أُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُمْ مِنْ نِسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ
لَمْ تَكُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ
وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿٢٣﴾

"اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے ہرگز نکاح نہ کرو' مگر جو پہلے ہو چکا سو چکا' درحقیقت یہ ایک بے حیائی کا فعل ہے۔ ناپسندیدہ ہے اور برا چلن ہے............ تم پر حرام کر دی گئیں ہیں تمہاری مائیں' بیٹیاں' بہنیں' پھوپھیاں' خالائیں' بھتیجیاں' بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہو' اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں' اور تمہاری بیویوں کی لڑکیاں جنہوں نے تمہاری گود میں پرورش پائی ہو............ ان بیویوں کی لڑکیاں جن سے تمہارا تعلق زن و شو ہو چکا ہو ورنہ اگر تعلق زن و شو نہ ہوا تو تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہارے صلب سے ہوں اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا ہے کہ ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرو' مگر جو پہلے ہو گیا سو ہو گیا۔ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں۔ البتہ ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو جنگ میں تمہارے ہاتھ آئیں۔ یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازم کر دی گئی ہے......... ان کے سوا جتنی عورتیں ہیں انہیں اپنے اموال کے ذریعہ سے حاصل کرنا تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے' بشرطیکہ حصار نکاح میں ان کو محفوظ کرو' نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو' پھر جو ازدواجی زندگی کا لطف تم ان سے اٹھاؤ اس کے بدلے ان کے مہر بطور فرض کے ادا کرو' البتہ مہر کی قرارداد ہو جانے کے بعد آپس کی رضامندی سے تمہارے درمیان اگر کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں' اللہ علیم و دانا ہے۔"

وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا
صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ وَإِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ
بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١٢٨﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا
كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا

رَّحِيمًا ﴿١٢٩﴾ وَإِن يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِّن سَعَتِهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا

"جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر میاں بیوی آپس میں صلح کرلیں ، صلح بہرحال بہتر ہے ، نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو یقین رکھو کہ اللہ تمہارے اس طرز عمل سے بے خبر نہ ہو گا۔ بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ادھر لٹکتا چھوڑ دو۔ اگر تم اپنا طرز عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ چشم پوشی کرنیوالا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو اللہ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ کا دامن بہت کشادہ ہے اور وہ دانا اور بینا ہے۔"

ایک خاندان کے افراد کے درمیان باہم تعلقات کی تنظیم اور ان کے درمیان معاشی تکافل (Social Security) پیدا کرنے کیلئے۔ نیز مالکوں اور غلاموں کے درمیان معاشی تعلقات کی ضابطہ بندی کیلئے بھی اس سورت میں قانون سازی کی گئی ہے۔ اس لئے کہ غلاموں اور مالکوں کے درمیان نسب کی نسبت قانون سازی اور تبنی کی منسوخی کے قوانین کے نزول سے قبل باقاعدہ معاہدے ہوا کرتے تھے۔ یہ قانون سازی نہایت ہی جامع اصولوں پر مبنی ہے۔ یہ اصول اجتماعی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ یہ قطعی قوانین معاشرے کے اندر دور رس تبدیلیاں لاتے ہیں۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ
فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا
السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ
ۚ فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ آبَاؤُكُمْ وَ
أَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا
﴿١١﴾ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ
الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ
إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم ۚ مِّن بَعْدِ وَصِيَّةٍ
تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِن كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ
وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ ۚ مِن بَعْدِ
وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿١٢﴾

"تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ اگر دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو انہیں ترکے کا دو تہائی حصہ دیا جائے' اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے' اور اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملنا چاہئے۔ اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے ۔"

اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصے کی حقدار ہوگی۔ یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے جبکہ وصیت جو میت نے کی ہو پوری کردی جائے اور قرض جو اس پر ہو ادا کردیا جائے۔

تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کر دیئے ہیں اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف ہے' ساری مصلحتوں کو جاننے والا ہے۔

اور تمہاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو اس کا آدھا حصہ تمہیں ملے گا اگر وہ بے اولاد ہوں' ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکہ کا ایک چوتھائی حصہ تمہارا ہے جبکہ وصیت جو انہوں نے کی ہو پوری کردی جائے اور قرض جو انہوں نے چھوڑا ہو ادا کردیا جائے۔ اور وہ تمہارے ترکہ میں سے چوتھائی کی حقدار ہوں گی۔ اگر تم بے اولاد ہو' ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ان کا حصہ آٹھواں ہوگا۔ بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو وہ پوری کردی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کردیا جائے۔

اور اگر وہ مرد یا عورت بے اولاد ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں مگر اس کا ایک بھائی یا بہن موجود ہو تو بھائی بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور اگر بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکے کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے۔

"جبکہ وصیت جو کی گئی ہو پوری کردی جائے اور قرض جو میت نے چھوڑا ہو ادا کردیا جائے' بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو۔ یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا اور بینا اور نرم خو ہے۔" (آیت ۱۱' ۱۲)

يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَاِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

"لوگ تم سے کلالہ کے معاملے میں فتویٰ پوچھتے ہیں' کہو اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے' اگر کوئی شخص بے اولاد مرجائے اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے ترکہ میں سے نصف پائے گی اور اگر بہن بے اولاد مرجائے تو بھائی اس کا وارث ہوگا۔ اگر میت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکے میں سے دو تہائی کی حقدار ہوں گی اور اگر کئی بھائی اور بہنیں ہوں تو عورتوں کا اکہرا اور مردوں کا دوہرا حصہ ہوگا۔ اللہ تمہارے لئے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔" (آیت ۱۷۶)

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ

نَصِيْبَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا

"اور تم نے ہر اس ترکے کے حقدار مقرر کر دیئے ہیں جو والدین اور رشتہ دار چھوڑیں۔ اب رہے وہ لوگ جن سے تمہارے عہد و پیمان ہوں تو ان کا حصہ انہیں دو یقیناً اللہ ہر چیز کا نگران ہے۔"

اس سورت میں اسلامی معاشرے کو فحاشی سے بچانے کی تدابیر بھی کی گئی ہیں نیز اس میں ایسے اسباب فراہم کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے کہ لوگ شادیاں کر سکیں اور یوں وہ فحاشی سے بچ سکیں مثلاً درج ذیل تدابیر قابل لحاظ ہیں :۔

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَاۗىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْھُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىھُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِھَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْھُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا

"تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا ان کے لئے اللہ کوئی راستہ نکال دے۔ اور تم میں سے جو اس فعل کا ارتکاب کریں ان دونوں کو تکلیف دو' پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں تو انہیں چھوڑ دو کہ اللہ بہت توبہ قبول کرنیوالا اور رحم کرنیوالا ہے۔"

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِهِنَّ وَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَي الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۭ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

"اور جو شخص تم میں سے اتنی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکے۔ اسے چاہئے کہ تمہاری ان لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہوں اور مومنہ ہوں' اللہ تمہارے ایمان کا حال خوب جانتا ہے۔ تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو' لہٰذا ان کے سرپرستوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کر لو اور معروف طریقہ سے ان کے مہر ادا کر دو' تاکہ وہ حصار نکاح میں محفوظ ہو کر رہیں' نہ آزاد شہوت رانی کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں پھر جب وہ حصار نکاح میں محفوظ ہو جائیں اور اس کے بعد کسی بدچلنی کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا کی نسبت آدھی سزا ہے جو آزاد عورتوں کیلئے مقرر ہے۔ یہ سہولت تم میں سے ان لوگوں کیلئے پیدا کی گئی ہے جن کو شادی نہ کرنے سے بند تقویٰ کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ لیکن اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

اور اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان طریقوں کو واضح کرے اور انہی طریقوں پر تمہیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحا کرتے تھے۔ وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمہارے طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی۔"

یہاں پورے اسلامی معاشرے کی شیرازہ بندی کے لئے بھی ہدایات دی گئی ہیں تاکہ وہ باہم 'ہم آہنگی' باہم دلسوزی اور اجتماعی تکافل (Social Security) امانت داری' عدل و انصاف' محبت و خوش اخلاقی' احسان اور ایثار کی اساس پر پروان چڑھے۔ اور اس سلسلے میں مذکورہ بالا خصوصی ہدایات کے سوا درج ذیل ہدایات دی گئی ہیں اور قانون سازی بھی کی گئی ہے۔ یہاں ہم بطور مثال چند چیزوں کا ذکر کرتے ہیں' پوری تفصیلات یہاں نہیں دی جاسکیں۔ مفصل بحث اپنی جگہ ہوگی۔

**وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۗءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْھُمْ فِيْھَا وَاكْسُوْھُمْ وَقُوْلُوْا لَھُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (۴:۵)**

"اور اپنے وہ مال جنہیں اللہ نے تمہارے لئے قیام زندگی کا ذریعہ بنایا ہے۔ نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو' البتہ انہیں کھانے اور پہننے کیلئے دو انہیں نیک ہدایت کرو۔"

**وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْھُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَھُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (۴:۸)**

اور جب تقسیم کے موقعہ پر کنبہ کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔"

**يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا**

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ' لین دین ہونا چاہئے آپس کی رضامندی سے' اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے۔ جو شخص ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا اس کو ہم ضرور آگ میں جھونکیں گے اور یہ اللہ کیلئے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

**وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ وَسْـــَٔـلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِــيْمًا**

"اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو۔ جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے

مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے۔ ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو' یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔"

وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ۙ وَ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا ۚ وَ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ مَنْ یَّكُنِ الشَّیْطٰنُ لَهٗ قَرِیْنًا فَسَآءَ قَرِیْنًا

"اور اللہ کی بندگی کرو' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ' ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو' قرابت داروں' یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ' اور پڑوسی رشتہ دار سے' اجنبی ہمسایہ سے' پہلو کے ساتھی اور مسافر سے۔ اور ان لونڈیوں' غلاموں سے جو تمہارے قبضہ میں ہوں' احسان کا معاملہ رکھو' یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو' اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔ اور ایسے لوگ بھی پسند نہیں جو کنجوسی کرتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اسے چھپاتے ہیں۔ ایسے کافر نعمت لوگوں کیلئے ہم نے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنے مال کو محض دکھانے کیلئے خرچ کرتے ہیں اور در حقیقت نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ روز آخر پر۔ سچ یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہو اسے بہت ہی بری رفاقت میسر آئی۔"

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا

"مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو' اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔"

مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً یَّكُنْ لَّهٗ نَصِیْبٌ مِّنْهَا ۚ وَ مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا ۚ وَ اِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا

"جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور جو برائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور اللہ ہر

چیز پر نظر رکھنے والا ہے۔ اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمہیں سلام کرے تو اس کو اس سے بہتر طریقہ کے ساتھ جواب دو یا کم از کم اسی طرح' اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔"

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا

"کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسرے مومن کو قتل کرے' الا یہ کہ اس سے چوک ہو جائے اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے' الا یہ کہ وہ خون بہا معاف کر دیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم سے تھا جس سے تمہاری دشمنی ہو تو اس کا کفارہ ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے اور اگر وہ کسی ایسی غیر مسلم قوم کا فرد تھا جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو خون بہا دیا جائے اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہو گا۔ پھر جو غلام نہ پائے وہ پے درپے دو مہینے کے روزے رکھے۔ یہ اس گناہ پر اللہ سے توبہ کرنے کا طریقہ ہے اور اللہ علیم و دانا ہے۔ رہا وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے"۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاۗءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب' اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔"

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَــهْرَ بِالسُّوْۗءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِـيْمًا () اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْۗءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا (۴:۱۴۸-۱۴۹)

"اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے' الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو' اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ لیکن اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کیے جاؤ یا کم از کم برائی سے درگزر کرو' تو اللہ کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ بڑا معاف کرنیوالا ہے حالانکہ سزا دینے پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے۔"

○.....☆☆☆.....○

اسلامی معاشرے کو باہم تعاون اور سوشل سیکورٹی' باہم محبت اور ہمدردی باہم اصلاح اور نصیحت باہم امانت و دیانت باہم معاملات کی طہارت اور احسان کے اصولوں پر استوار کرنے کے عظیم مقصد کے ساتھ قرآن کریم کے پیش نظر یہ ہدف بھی تھا کہ اس معاشرے سے قدیم جاہلیت کے آثار باقیہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے اور ان کی جگہ اسلامی معاشرے کے روشن خدوخال اجاگر کئے جائیں۔ لیکن ایک دوسرا اہم مقصد جو اگرچہ درج بالا مقاصد کی اساس نہ بنتا ہو لیکن وہ مقصد بھی اسلامی معاشرے کی تشکیل میں ان سے پہلے مقاصد سے کوئی کم اہم نہیں ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ اس سورت میں "دین" کا مفہوم اور اس کی تعریف 'ایمان کا مفہوم اور اس کی تعریف' اسلام کی شرائط اور اس کی تعریفات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان کی روشنی میں اسلامی معاشرے کے مختلف اداروں اور قوانین کا ایک فرد اور معاشرے کی زندگی کے ساتھ تعلق و ربط کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ یہ تشریح و توضیح اور ایمان اور دین کی یہ تعریف نہایت ہی مضبوط تعریف ہے۔

دین وہ نظام حیات ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی پوری زندگی کیلئے وضع فرمایا ہے۔ یہ وہ نظام ہے جس پر زندگی کی تگ و دو رواں دواں ہے۔ اور یہ خاصہ صرف اللہ کا ہے کہ وہ بلاشرکت غیرے یہ نظام وضع کرے۔ اور دین کا مفہوم اور خلاصہ یہ ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ وحدہ کی قیادت ربانی کے اتباع اور اطاعت عامہ کا نام ہے۔ اور یہ کہ صرف یہی قیادت اس کی مستحق ہے۔ دین کے معاملے میں صرف اللہ کی ذات ہی سے ہدایت لی جاسکتی ہے۔ اور صرف اسی کے سامنے سر تسلیم خم کیا جاسکتا ہے۔ پس اسلامی معاشرہ وہ ہوگا جس کی اپنی مخصوص قیادت ہو' جس طرح اس کا اپنا مخصوص نظریۂ حیات ہے۔ اور جس طرح اس کا اپنا مخصوص تصور زندگی ہے۔ یہ ربانی قیادت رسول ؐ اللہ کی ذات کی صورت میں نمودار ہوئی' اس ذات پر رب تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایت نازل ہوئی وہ آج تک آپ کے بعد صحیح طرح باقی ہے۔ شریعت نبوی اور نظام مصطفیٰؐ کی صورت میں ہے۔ اسلامی معاشرے کی یہی صفت اطاعت رسول ہی اسے اسلامی معاشرہ بناتی ہے اور اس صفت سے اسلامی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اس صفت اطاعت کے بغیر کسی صورت میں بھی کوئی معاشرہ مسلم معاشرہ نہیں ہو سکتا۔ اور اسلامی قیادت کی اطاعت اور اتباع یوں متحقق ہو گا کہ تمام فیصلے اللہ اور رسول ؐ اللہ کے احکام کے مطابق کئے جائیں اور تمام امور میں فیصلہ اللہ تعالیٰ سے لیا جائے اور ایک مسلمان اللہ اور رسول ؐ کے فیصلے پر راضی برضا ہو اور تسلیم و رضا کے ساتھ اس کے آگے جھکے۔

اس سورت کی آیات اس حقیقت کے بیان میں اور اس اصول کی وضاحت میں اس قدر واضح اور اس قدر کثرت سے ہیں اور اس قدر جزم سے اس کا بیان کرتی ہیں کہ اس میں کسی مناقشے اور مجادلے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ نہ ان آیات کے مفہوم کے بیان میں کوئی حیلہ اور تاویل کر سکتا ہے۔ نہ کوئی ان میں التباس اور تحریف کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ قرآنی آیات غایت درجے واضح' قطعی اور فیصلہ کن ہیں اور وہ کسی مجادلے کی متحمل نہیں ہیں۔

اس عظیم اصول کو متعدد اور واضح آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ جس کی تفصیلی تشریح اپنی جگہ ہوگی جہاں ہم ان کی تفسیر بیان کریں گے۔ یہاں ہم بطور نمونہ چند ایک کو اجمالاً نقل کرتے ہیں۔ مثلاً اجمالاً اس اصول کو اس سورت کی آیت افتتاحیہ میں بیان کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ

"اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا" نیز اس مضمون کی آیات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے مثلاً

اعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا ............ "اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔" (آیت ۲۷)

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ........

"اللہ تعالیٰ اس فعل کی مغفرت نہیں فرماتے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اور اس کے سوا جسے چاہیں معاف کرتے ہیں۔" (آیت ۴۸)

اور درج ذیل آیات سے یہ نظریہ تخصیص کے ساتھ بطور قطعیت ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُوا۟ ٱلرَّسُولَ وَأُو۟لِى ٱلْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَٰزَعْتُمْ فِى شَىْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى ٱللَّهِ وَٱلرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝ أَلَمْ تَرَ إِلَى ٱلَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ ءَامَنُوا۟ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوٓا۟ إِلَى ٱلطَّٰغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوٓا۟ أَن يَكْفُرُوا۟ بِهِۦ وَيُرِيدُ ٱلشَّيْطَٰنُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلَٰلًۢا بَعِيدًا ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ وَإِلَى ٱلرَّسُولِ رَأَيْتَ ٱلْمُنَٰفِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا ۝

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔ اے نبی تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں۔ مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کیلئے طاغوت کی طرف رجوع کریں، حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسول کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں۔"

وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ ٱللَّهِ ۚ

"ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا کہ اذن خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔"

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا۟ فِىٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا۟ تَسْلِيمًا

"اے محمد! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں، بلکہ سربسر تسلیم کر لیں۔"

مَّن يُطِعِ ٱلرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ ٱللَّهَ ۖ وَمَن تَوَلَّىٰ فَمَآ أَرْسَلْنَٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا

"جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی اور جو منہ موڑ گیا، تو ............ بہرحال ہم نے تمہیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔"

وَمَن يُشَاقِقِ ٱلرَّسُولَ مِنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ ٱلْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ ٱلْمُؤْمِنِينَ

نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا

"مگر جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کوئی اور روش چلے' درآنحالیکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی ہو تو اس کو ہم اس طرف چلائیں گے جدھر خود وہ پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔"

یوں ان آیات میں دین و ایمان کی تعریف و تحدید کر دی جاتی ہے۔ اور اسلام کی شرائط وضع کر دی جاتی ہیں۔ اور ایک اسلامی معاشرے کے خدوخال وضع کر دیے جاتے ہیں۔ اور اسلامی نظام زندگی کا منہاج بتا دیا جاتا ہے۔ جن سے نظر آتا ہے کہ اسلام صرف افکار و تصورات سے عبارت نہیں ہے۔ نہ اسلام چند کلمات کی ادائیگی اور چند شعار اپنا لینے کا نام ہے۔ نہ وہ صرف کوئی نظام عبادت اور رسومات پرستش کا نام ہے۔ بلکہ ان امور کے ساتھ ساتھ بلکہ ان سب سے پہلے ایک نظام حیات ہے۔ جو حکمران ہے' وہ ایک منہاج ہے جو فیصلہ کن ہے۔ وہ ایک قیادت ہے جس کی اطاعت کی جارہی ہے اور وہ ایک طرز عمل ہے جو ایک متعین نظام پر مبنی ہے۔ ایک متعین منہاج ہے اور ایک متعین قیادت ہے۔ اور اس کے سوا ایمان کا وجود متصور نہیں ہے۔ اس کے سوا اسلام کالعدم تصور ہو گا اور نہ ان امور کے سوا کوئی ایسا معاشرہ ممکن ہے جو اپنے آپ کو صحیح اسلامی معاشرہ کہہ سکے۔

○.....☆☆☆.....○

اس اصل الاصول کے تسلیم کر لینے کے بعد' اسی صورت میں متعدد توجیہات اور ہدایات دی گئی ہیں۔ اور یہ سب ہدایات اس اصول کا لازمی نتیجہ ہیں۔

۱: یہ کہ تمام اجتماعی اداروں کی حیثیت' ایک اسلامی معاشرے میں' ویسی ہی ہونی چاہئے جس طرح مراسم عبودیت کی حیثیت ہوتی ہے۔ اس عظیم اصول کی نسبت سے ہونی چاہئے جو دین کی مذکورہ بالا تعبیر پر مبنی ہے۔ ایمان کی اس تشریح پر مبنی ہو جس کی نشاندہی کی گئی۔ اور اسلام کی ان شرائط پر مبنی ہو جو ذکر ہوئیں۔ بعینہ اسی طرح جس طرح ہم نے اوپر مثالوں میں بیان کیا۔ اس لئے کہ اسلام میں یہ ادارے مجرد ادارے ہی نہیں نہ اسلام میں قوانین کی وہی حیثیت ہے جو عام قوانین کی ہوتی ہے۔ بلکہ یہ ادارے اور یہ قوانین مقتضائے ایمان ہوتے ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا اعتراف ہوتے ہیں۔ حکومتی اداروں کے قیام کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ الوہیت (بمعنی حاکمیت) میں اللہ کی ذات کو منفرد تصور کیا جائے اور اس سلسلے میں ہدایت اس قیادت سے لینا ضروری ہے جسے اللہ جل شانہ متعین فرمائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تصور حیات میں تمام اجتماعی اداروں اور تمام قوانین کا رخ اس سمت کی طرف ہوتا ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ اور یہ ان منصوص دلائل کی بنا پر ہوتا ہے جن سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے۔

اس سورت کی آیت افتتاحیہ وحدت انسانیت پر نص ہے۔ یہ آیت مسلمانوں کو یہ تصور دیتی ہے کہ وہ انسانی واسطوں کا خیال رکھیں اور یہ آیت ان تمام اجتماعی اداروں اور قوانین کیلئے اصل الاصول ہے جو بعد میں اس سورت میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس سورت کے آغاز ہی میں لوگوں کو اس خدا کے خوف کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ جس نے تمام لوگوں کو ایک نفس سے پیدا کیا يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ............ "لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔" اور اس اختتامی آیت کے آخر میں لوگوں کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ وہ اللہ سے ڈریں اس لئے کہ وہ ہر وقت ان کی نگرانی کر رہا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ............ (اللہ تمہارا نگران ہے) اس کے بعد وہ آیات جن میں حکم دیا گیا ہے کہ یتیموں کے اموال کی حفاظت کی جائے اور ان کے اموال میں جو طریقہ تصرف وضع کیا گیا ہے' ان کے آخر

۲:۔ اس عظیم اصول کے اقرار کا دوسرا اہم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام اہل ایمان اپنی قیادت اور اپنی جماعت کے پوری طرح وفادار ہوں۔ اس لئے وہ کسی ایسی قوت کے دوست نہ بنیں گے جو ان کی طرح مومن نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس نظام حیات کی مطیع ہے جس کے وہ مطیع ہیں اور نہ وہ ان کے اجتماعی نظام کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور نہ ہی وہ اسے ماخذ ہدایت تصور کرتے ہیں۔ چاہے اس "قوت" کے ساتھ ان کی نسبت جو بھی ہو۔ اس قوت کے ساتھ ان کی رشتہ داری ہو' اس قوت کے ساتھ ان کو قومی اشتراک حاصل ہو۔ اس قوت کے وہ ہم وطن ہوں' یا اس قوت کے ساتھ ان کے مفادات وابستہ ہوں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو گویا وہ شرک و نفاق کے مرتکب ہوں گے۔ اور ہر صورت میں اسلامی صف سے خارج ہوں گے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (۱۱۵) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا (۱۱۶)

"مگر جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے در آنحالیکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی ہو' تو اس کو ہم اس طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ اللہ کے ہاں بس شرک کی بخشش نہیں ہے۔ اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا وہ تو گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔"

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا

اور جو منافق اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں انہیں یہ مژدہ سنا دو کہ ان کیلئے دردناک سزا تیار ہے۔ کہ یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ کیلئے ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ' کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے

میں بھی تلقین کی گئی ہے کہ تم نے اللہ کے سامنے پیش ہو کر حساب دینا ہے اور اللہ حساب لے سکتا ہے وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ...

اس کے بعد اس سورت میں تقسیم میراث کے احکام آتے ہیں۔ افراد و خاندان کے حصص کا تعین لفظ وصیت سے شروع کیا جاتا ہے۔ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ............ "اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے۔" اور کہا جاتا ہے کہ قانون میراث فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ............ (اللہ کی جانب سے عائد کردہ فرض ہے۔) اور آخر میں خاتمہ کلام یوں ہوتا ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْھَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْھَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ

"یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغوں میں جو ہمیشہ رہے گا۔ اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرے گا اسے آگ میں ڈالا جائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اس کیلئے رسوا کن سزا ہے۔"

اسی طرح ایک خاندان کی شیرازہ بندی مہر اور طلاق وغیرہ کی ضابطہ بندی کے آخر میں بھی ایسی ہی تعقیبات آتی ہیں مثلاً وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاۗءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ........ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ........................ (اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں...... یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازم کر دی گئی ہے۔)

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۲۶)

"اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان طریقوں کو واضح کرے اور انہی طریقوں پر تمہیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحاء کرتے تھے۔ وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی ہے۔"

......فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا (۳۴)

"......پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کیلئے بہانے تلاش نہ کرو، یقین رکھو کہ اوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالاتر ہے۔"

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَـيْـــًٔـا ...... (۳۶)

"تم سب اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔" ........ اور اس آیت کے بعد والدین کے ساتھ احسان کی تاکید کی گئی ہے۔ قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ ........... غرض اسلامی معاشرے میں ہر قسم کی تنظیم و تربیت اور ہر قسم کی قانون سازی اور ضابطہ بندی کو ذات باری کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ اور تمام امور میں حق اطاعت اور بندگی اسی ذات کے حوالے کی گئی ہے۔ جو اس ضمن میں وحدہ لاشریک ہے۔

دو؟ یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔ البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کیلئے خالص کر دیں۔ ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجر عظیم عطا فرمائے گا۔"

۳:۔ اس کا تیسرا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر دارالحرب سے ہجرت فرض ہو جاتی ہے۔ (اور دارالحرب ہر وہ مملکت ہے جس میں اسلامی شریعت نافذ نہ ہو اور اس میں ایسے لوگ برسر اقتدار نہ ہوں جو صحیح طرح مسلمان ہوں۔) تاکہ وہ ایک اسلامی جماعت میں مل جائیں جبکہ وہ جماعت موجود ہو اور کسی خطے میں برسر اقتدار ہو تاکہ وہ ایک اسلامی قیادت کی ماتحتی میں آجائیں اور انہیں کافرانہ جھنڈے کے تحت زندگی بسر نہ کرنا پڑے۔ اور کافرانہ قیادت اور جھنڈا ہر وہ قیادت ہے جو اسلام کے سوا ہے۔ اگر دارالکفر سے مسلمان ہجرت نہ کریں گے تو پھر وہ منافق تصور ہوں گے یا کافر تصور ہوں گے۔ اور دونوں صورتوں میں وہ اسلامی صفوف سے خارج ہوں گے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا
مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا
كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاۗءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا
وَّلَا نَصِيْرًا

"پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقین کے بارے میں تمہارے درمیان دو رائیں پائی جاتی ہیں' حالانکہ جو برائیاں انہوں نے کمائی ہیں' ان کی بدولت اللہ انہیں الٹا پھیر چکا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے ہدایت نہیں بخشی اسے تم ہدایت بخش دو؟ حالانکہ جس کو اللہ نے راستے سے ہٹا دیا اس کیلئے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں اسی طرح تم بھی کافر ہو جاؤ تاکہ تم اور وہ سب یکساں ہو جائیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے نہ آجائیں اور اگر وہ ہجرت سے باز رہیں تو جہاں پاؤ انہیں پکڑو اور قتل کرو۔ اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔"

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ
فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ
وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً
وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۝ فَاُولٰۗىِٕكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْھُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا
۝ وَمَنْ يُّھَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ
مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَ
كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا

"جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے' ان کی روحیں فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا' کہ خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔ ہاں جو مرد' عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے' بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے۔ اللہ بڑا معاف کرنیوالا اور درگزر فرمانے والا ہے۔ اور جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کیلئے بہت جگہ اور بسر اوقات کیلئے بڑی گنجائش پائے گا اور جو اپنے گھروں سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کیلئے نکلے۔ پھر راستہ میں اسے موت آجائے' اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا۔ اللہ بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے۔"

۴:۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ مسلمانوں پر ان قوتوں کے خلاف جہاد کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ جن کے ہاں ان کے مسلمان بھائی بند ہیں اور وہ دار الحرب اور کفر کے جھنڈے سے اپنے آپ کو نکالنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ یوں وہ دار السلام میں آکر جماعت مسلمہ کے ساتھ پیوست نہیں ہو سکتے۔ تاکہ وہ اپنے دین کے زاویے سے فتنے میں مبتلا نہ ہوں اور وہ اسلام کے سوا ہو دوسرے جھنڈے کی چھاؤں سے باہر نکل آئیں۔ اور اسلامی نظام کے سوا کسی دوسرے نظام کے تحت زندگی بسر کریں۔ اور اس کے مقابلے میں وہ اسلام کے بلند و برتر نظام کے تحت بہترین زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں۔ وہ ایک اسلامی معاشرے کے اندر رہ کر پاکیزہ زندگی بسر کر رہے ہوں۔ یہ ہر مسلمان کا ایک اساسی حق ہے۔ اور جو مسلمان اس سے محروم رہتا ہے وہ گویا اس کرۂ ارض پر اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت سے محروم ہو گیا ہے۔ وہ بہترین زندگی گزارنے کے مواقع سے محروم کر دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا

"آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں' عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں' اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔"

○.....☆☆☆.....○

اس کے بعد یہ سورت بے راہروی کرنے والوں' سست روی اختیار کرنیوالوں اور جہاد کو چھوڑ کر گھر بیٹھنے والوں پر حملہ آور ہوتی ہے اور ان کے رویئے پر سخت تنقید کر کے انہیں آمادہ کرتی ہے کہ وہ جان و مال کے ساتھ جہاد کیلئے اٹھیں۔ اس سورت کے ایک بڑے حصے تک یہ تنقیدات پھیلی ہوئی ہیں۔ اس سے سورت کے مضامین بڑی دھیمی رفتار سے چل رہے تھے لیکن یہاں آکر سورت کی نبض اچانک تیز ہو جاتی ہے۔ اس کا انداز بیان سخت ہو جاتا ہے اور وہ بڑی گرمی سے داعیان حق کی حمایت کرتی ہے اور اہل باطل پر تنقید کرتی ہے۔

ہم یہاں سورت کے اس طویل حصے کو اس کی مصحفی ترتیب کے ساتھ نقل نہیں کر سکتے اگرچہ اس کی مصحفی ترتیب بھی اپنے اندر مخصوص حکمت رکھتی ہے۔ البتہ اس حصے کے جستہ جستہ قطعات یہاں نقل کرنا کافی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ۝ وَ اِنَّ مِنْكُمْ
لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ
شَهِيْدًا ۝ وَ لَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ
مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ
يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَ مَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ
فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ
مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ
الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙۚ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ
فَقَاتِلُوْۤا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' مقابلے کیلئے ہروقت تیار رہو' پھر جیسا موقعہ ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔ ہاں' تم میں کوئی آدمی ایسا بھی ہے جو لڑائی سے جی چراتا ہے' اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو کہتا ہے اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ گیا' اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر فضل ہو تو کہتا ہے......... اور اس طرح کہتا ہے کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا کوئی تعلق تھا ہی نہیں......... کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑا کام بن جاتا۔ اللہ کی راہ میں لڑنا چاہئے ان لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو فروخت کر دیں' پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اسے ضرور ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی رہ میں ان بے بس مردوں' عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔ جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے' وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں۔"

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ
يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ وَ اللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّ اَشَدُّ تَنْكِيْلًا ۝

"پس اے نبی تم اللہ کی راہ میں لڑو' تم اپنی ذات کے سوا کسی اور کے لئے ذمہ دار نہیں ہو' اور اہل ایمان کو لڑنے کیلئے اکساؤ' بعید نہیں کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے۔ اللہ کا زور سب سے زیادہ زبردست اور اس کی سزا سب سے زیادہ سخت ہے۔"

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ

اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾

”مسلمانوں میں سے وہ جو معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں' اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں' دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے۔ اگرچہ ہر ایک کیلئے اللہ نے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے۔ مگر اس کے یہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے۔ اللہ کیلئے لڑنے والوں کے اللہ کے ہاں بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے۔ اور اللہ بڑا معاف کرنیوالا اور رحم فرمانے والا ہے۔“

وَلَا تَهِنُوْا فِى ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا

”اس گروہ کے تعاقب میں کمزوری نہ دکھاؤ' اگر تم تکلیف اٹھا رہے ہو تو تمہاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ اور تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں ہیں اور اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے۔“

جہاد فی سبیل اللہ پر آمادہ کرنے کی اس مہم کے درمیان بعض بین الاقوامی معاملات کے سلسلے میں قواعد بھی وضع کئے جاتے ہیں۔ یہ بین الاقوامی ضوابط دارالاسلام اور دوسرے ان تمام کیمپوں کے درمیان تعلقات پر نافذ ہوتے ہیں جو اس وقت قائم ہو چکے تھے۔ چاہے وہ تعلقات دوستی کے تھے یا مخالفت کے تھے۔

بتایا جاتا ہے کہ منافقین کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان دو آراء پائی جاتی ہیں۔ لیکن بطور نتیجہ کلام بتایا جاتا ہے کہ وہ منافق جو مدینہ کے اسلامی مرکز میں اپنے مفادات کیلئے داخل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً تجارت' نفع اندوزی اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ملاقات کیلئے اور یہ لوگ اسلام کا اظہار کرتے ہیں لیکن جب یہ لوگ مدینہ سے واپس جاتے ہیں تو یہ لوگ پھر کفر کے کیمپ کے دوست بن جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں حکم یہ ہے۔

فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْۤا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ

ثَقِفْتُمُوْهُمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾

"لہذا ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے نہ آئیں۔ اور اگر وہ ہجرت سے باز رہیں تو جہاں پاؤ انہیں پکڑو اور قتل کرو اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔ البتہ وہ منافق اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے جاملیں جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے۔ اسی طرح وہ منافق بھی مستثنیٰ ہیں جو تمہارے پاس آتے ہیں اور لڑائی سے دل برداشتہ ہیں۔ نہ تم سے لڑنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم سے۔ اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے۔ لہذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمہاری طرف صلح اور آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لئے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی۔ ایک اس قسم کے منافق تمہیں ایسے ملیں گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی۔ مگر جب کبھی فتنہ کا موقع پائیں گے اس میں کود پڑیں گے۔ ایسے لوگ اگر تمہارے مقابلہ سے باز نہ رہیں اور صلح و سلامتی تمہارے آگے پیش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو جہاں وہ ملیں انہیں پکڑو اور مارو۔ ان پر ہاتھ اٹھانے کیلئے ہم نے تمہیں کھلی حجت دیدی ہے۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم اللہ کی راہ میں جہاد کیلئے نکلو تو دوست دشمن میں تمیز کرو اور جو تمہاری طرف سلام سے تقدیم کرے اسے فوراً نہ کہہ دو کہ تو مومن نہیں ہے۔ اگر تم دنیوی فائدہ چاہتے ہو تو اللہ کے پاس تمہارے لئے بہت اموال غنیمت ہیں۔ آخر اسی حالت میں تم خود بھی تو اس سے پہلے مبتلا رہ چکے ہو' پھر اللہ نے تم پر احسان کیا' لہذا تحقیق سے کام لو' جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔"

اسی طرح جہاد کی گفتگو کے دوران صلوۃ الخوف کے بعض احکام بھی بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ اور حالت امن کے احکام بھی بیان ہوتے ہیں۔ اور ان احکام کے دوران بھی اہل اسلام کو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ تمہارے دشمن ہر وقت تمہارے خلاف گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں :

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ڰ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۱۰۱﴾ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۣ فَاِذَا سَجَدُوْا

فَلْيَكُونُوا مِن وَرَآئِكُمْ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا
حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۗ وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ
فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ
كُنتُم مَّرْضَىٰ أَن تَضَعُوا أَسْلِحَتَكُمْ ۖ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿١٠٢﴾
فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَوٰةَ فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَأْنَنتُمْ
فَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ ۚ إِنَّ الصَّلَوٰةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا ﴿١٠٣﴾

"اور جب تم لوگ سفر کیلئے نکلو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر نماز میں اختصار کر دو' جبکہ تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے۔ کیونکہ وہ کھلم کھلا تمہاری دشمنی پر تلے ہوئے ہیں۔ اور اے نبی! جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور حالت جنگ میں انہیں نماز پڑھانے کھڑے ہو تو چاہئے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور اسلحہ لئے رہے' پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے۔ آکر تمہارے ساتھ پڑھے اور وہ بھی چوکنا رہے اور اپنے اسلحہ لئے رہے۔ کیونکہ کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ البتہ اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو' تو اسلحہ رکھ دینے میں مضائقہ نہیں' مگر پھر بھی چوکنے رہو' یقین رکھو کہ اللہ نے کافروں کیلئے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو' اور جب اطمینان نصیب ہو جائے تو پوری نماز پڑھو' نماز در حقیقت ایسا فرض ہے جو پابندی وقت کے ساتھ اہل ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔"

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی میں نماز کی اہمیت کیا ہے۔ میدان جنگ کے خوف و ہراس کی انتہائی حالت میں بھی اسے موخر نہیں کیا جاتا۔ اور اس کی تفصیلی کیفیات دی جاتی ہیں۔ اور اس اہمیت کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اسلامی نظام زندگی ایک ہمہ گیر نظام ہے۔ اور وہ انسانی زندگی کے تمام حالات میں اس کی راہنمائی کرتا ہے۔ اور یہ نظام ایک مسلمان فرد اور مسلمان سوسائٹی دونوں کو اپنی نظر میں رکھتا ہے۔ اور راہنمائی کرتا ہے۔

یہاں جہاد و قتال کے بارے میں ہدایات دینے کے موقعہ پر منافقین پر سخت تنقید کی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ یہ منافقین یہودیوں سے ساتھ دوستی کے تعلقات قائم کر کے اسلام کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ اور یہ لوگ اسلامی تحریک اور اسلامی قیادت کے خلاف گہری سازشیں تیار کر رہے ہیں۔ یہ لوگ تحریک اسلامی کی صفوں میں اور اسلامی نظم و نسق اور اسلامی اقتدار کے خلاف منظم کھیل کھیل رہے ہیں۔ اس سے پہلے جہاد کے بارے میں ہم نے جو آیات نقل کی ہیں۔ ان میں جستہ جستہ منافقین کا ذکر بھی ہوا ہے۔ لیکن مناسب یہ ہے کہ یہاں ہم ایک مزید اقتباس دیدیں جو ان منافقین کی بہت ہی اچھی تصویر کشی کرتا ہے۔ اس میں ان کی مکمل خصوصیات دی گئی ہیں۔ نیز اس سے ان کا اصل مزاج عیاں ہوتا ہے اور اسلام کے مقابلے میں وہ جو وسائل میدان میں لاتے ہیں ان کی نقاب کشائی بھی ہوتی ہے۔

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِندِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۖ وَاللَّهُ

يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ ۖ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿٨١﴾ أَفَلَا
يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴿٨٢﴾
وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَ
إِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ
وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٨٣﴾

”وہ منہ سے کہتے ہیں کہ ہم مطیع فرمان ہیں مگر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ راتوں کو جمع ہو کر تمہاری باتوں کے خلاف مشورہ کرتا ہے۔ اللہ ان کی یہ ساری سرگوشیاں لکھ رہا ہے۔ تم ان کی پروا نہ کرو' اور اللہ پر بھروسہ رکھو' وہی بھروسہ کیلئے کافی ہے۔ کیا یہ لوگ قرآنی آیات پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی ...... یہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش یا خوفناک خبر سن پاتے ہیں اسے لیکر پھیلا دیتے ہیں' حالانکہ اگر یہ اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمے دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں۔ تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے۔“

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ
اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا ﴿١٣٧﴾ بَشِّرِ الْمُنَافِقِينَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٣٨﴾ الَّذِينَ
يَتَّخِذُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ أَيَبْتَغُونَ عِندَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ
لِلَّهِ جَمِيعًا ﴿١٣٩﴾ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ
يُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ إِنَّكُمْ إِذًا مِّثْلُهُمْ ۗ
إِنَّ اللَّهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِينَ وَالْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا ﴿١٤٠﴾ الَّذِينَ يَتَرَبَّصُونَ بِكُمْ فَإِن
كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللَّهِ قَالُوا أَلَمْ نَكُن مَّعَكُمْ وَإِن كَانَ لِلْكَافِرِينَ نَصِيبٌ قَالُوا
أَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُم مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ۚ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ
وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ﴿١٤١﴾ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَادِعُونَ
اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ يُرَاءُونَ النَّاسَ وَ
لَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٤٢﴾ مُّذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذَٰلِكَ لَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ وَلَا إِلَىٰ
هَٰؤُلَاءِ ۚ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا ﴿١٤٣﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا

الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾

"رہے وہ لوگ جو ایمان لائے' پھر کفر کیا' پھر ایمان لائے' پھر کفر کیا' پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے۔ تو اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا۔ اور نہ کبھی ان کو راہ راست دکھائے گا۔ اور جو منافق اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں انہیں یہ مژدہ سنادو کہ ان کے لئے دردناک سزا تیار ہے۔ کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ کیلئے ہے۔ اللہ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جارہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جارہا ہے وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں۔ اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہی کی طرح ہو۔ یقین جانوں کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک ہی جگہ جمع کرنیوالا ہے۔ یہ منافق تمہارے معاملہ میں انتظار کر رہے ہیں کہ اگر اللہ کی طرف سے فتح تمہاری ہوئی تو آکر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اگر کافروں کا پلہ بھاری رہا تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے۔ اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا؟ پس اللہ ہی تمہارے اور ان کے معاملہ میں فیصلہ قیامت کے روز کرے گا اور اللہ نے کافروں کیلئے مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی ہے............ یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ جب یہ نماز کیلئے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ کفر و ایمان کے درمیان ڈانواں ڈول ہیں۔ نہ پورے اس طرف نہ پورے اس طرف۔ جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو اس کیلئے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے............ اے لوگوں جو ایمان لائے ہو' مومنو کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ' کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دیدو؟ یقین جانوں کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔"

○.....☆☆☆.....○

اس سورت کے مباحث جہاد اور دوسرے عام مباحث میں سے' اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ تحریک اسلامی کے خلاف' اسلامی نظریہ حیات کے خلاف اور اسلامی لیڈر شپ کے خلاف' اہل کتاب اور خصوصاً یہودیوں اور ان کے حلیفوں یعنی مشرکین مکہ اور مدینہ کے منافقین کی جانب سے ایک عظیم اعصابی جنگ برپا کر رکھی گئی تھی۔ یہ وہی جنگ تھی جس کا ذکر ہم اس سے قبل سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران میں تفصیلاً کر آئے ہیں۔ اور یہاں بھی قرآن کریم خالص ربانی انداز میں اس کا ذکر کر رہا ہے۔ جماعت مسلمہ جس راہ پر جارہی تھی وہ کانٹوں سے پر تھی۔ اس کی راہ میں مکاری کے جال بچھے ہوئے تھے۔ ہر جگہ سازشیں تیار تھیں۔ ایسے حالات میں قرآن کریم اس کی دست گیری کرتا ہے' اس کی راہنمائی کرتا ہے۔ اسے فطرت سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ اسے ان کے اعداء کے مزاج سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ اسے بتاتا ہے کہ جس جنگ میں یہ جماعت کود گئی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ سرزمین عرب کے حالات کیا ہیں؟ اور کن حالات اور کن پہلوؤں پر اسے غور و فکر کی ضرورت ہے؟

قرآن کریم کے دلائل اعجاز میں سے یہ بھی ایک دلیل ہے کہ یہ آیات جو ایک مخصوص جنگ کے بارے میں نازل ہوئی تھیں' وہ اس قدر اصولی موقف پر مشتمل ہیں کہ آج اس کرۂ ارض پر جہاں بھی تحریک اسلامی برپا ہے' اس کے اعداء کا اس کے ساتھ وہی رویہ ہے جو

آج سے صدیوں پہلے تحریک اسلامی کے ساتھ اس کے روایتی دشمنوں کی جانب سے روا رکھا گیا تھا۔ وہی دشمن آج بھی ہر تحریک اسلامی کے دشمن ہیں' اس وقت وہ جو حملے کرتے تھے۔ آج بھی ان کے وہی حملے ہیں۔ اگرچہ آج کے دور میں آلات و وسائل تبدیل ہوگئے ہیں۔ اس وقت بھی وہ اسلامی نظریۂ حیات میں تزلزل پیدا کرتے تھے۔ آج بھی ان کا یہی کام ہے۔ اس وقت بھی وہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرتے تھے۔ آج بھی ان کی یہی سازش ہے۔ جس طرح اس وقت وہ اسلامی قیادت کے خلاف شکوک پیدا کرتے تھے۔ آج بھی وہ یہی کر رہے ہیں۔ یہی اہداف ہیں جن کے لئے آج بھی ان کی توپیں گولے برسا رہی ہیں۔ اور ان دشمنوں کا مقصد وحید یہ ہے کہ تحریک اسلامی کے حساس مقامات پر یہ لوگ اپنے آدمی بٹھا دیں' عالم اسلام میں تمام تصرفات ان کی مرضی سے ہوں' عالم اسلام کی سرزمین اس کی قوتوں اور اسکی صلاحیتوں کو وہ اپنے مفادات کیلئے استعمال کریں جس طرح مدینہ کے یہودی اسلام سے قبل مدینہ کے اوس اور خزرج کے قبائل کو استعمال کرتے تھے۔ جبکہ انہیں اسلامی قیادت میسر نہ تھی۔ اور اسلامی نظام زندگی سے محروم تھے۔ اور ابھی اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلامی نظام حیات کے ذریعہ معزز نہ بنایا تھا۔

یہ سورت بھی سورۂ آل عمران اور سورۂ بقرہ کی طرح' یہودیوں کی جانب سے' جماعت مسلمہ کے خلاف مسلسل سازشوں کے بے نقاب کرنے کے مضامین سے بھری پڑی ہے۔ ان سازشوں میں مدینہ کے اردگرد پھیلے ہوئے مشرکین اور منافقین بھی ان کے ساتھ ان کارناموں میں شریک ہیں۔ نصوص کی تشریح کے وقت اپنی جگہ پر ہم ان مضامین کی تشریحات دیں گے یہاں مناسب ہے ان کی سازشوں کی اس طویل مہم سے چند اقتباسات دیدیں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يَشْتَرُونَ الضَّلَالَةَ وَيُرِيدُونَ
أَن تَضِلُّوا السَّبِيلَ ﴿٤٤﴾ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَائِكُمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَلِيًّا وَكَفَىٰ بِاللَّهِ
نَصِيرًا ﴿٤٥﴾ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا
وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا
وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَقْوَمَ وَلَٰكِن لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا
يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٤٦﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُم مِّن قَبْلِ
أَن نَّطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ ۚ وَكَانَ
أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ﴿٤٧﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ
ۚ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا ﴿٤٨﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنفُسَهُم
ۚ بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿٤٩﴾ انظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۖ
وَكَفَىٰ بِهِ إِثْمًا مُّبِينًا ﴿٥٠﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ
وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا ﴿٥١﴾ أُولَٰئِكَ

الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ۝ أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ
الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ۝ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن
فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ۝ فَمِنْهُم
مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا

"تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جنہیں کتاب کے علم کا کچھ حصہ دیا گیا ہے؟ وہ خود ضلالت کے خریدار بنے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ گم کردو' اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور تمہاری حمایت اور مددگاری کیلئے اللہ ہی کافی ہے۔ جو لوگ یہودی بن گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دیتے ہیں اور دین حق کے خلاف نیش زنی کرنے کیلئے اپنی زبانوں کو توڑ موڑ کر کہتے ہیں **سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا** اور **اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ** اور **رَاعِنَا** حالانکہ اگر وہ کہتے سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا اور اسْمَعْ اور انْظُرْنَا تو یہ انہیں کیلئے بہتر تھا اور زیادہ راست بازی کا طریقہ تھا۔ مگر ان پر تو ان کی باطل پرستی کی بدولت اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے۔ اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔ اے وہ لوگو جنہیں کتاب دی گئی تھی! مان لو اس کتاب کو جو ہم نے اب نازل کی ہے اور جو اس کتاب کی تائید و تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی۔ اس پر ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں یا ان کو اس طرح لعنت زدہ کر دیں جس طرح سبت والوں کے ساتھ ہم نے کیا تھا' اور یاد رکھو کہ اللہ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے۔ اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا ہے' اس کے سوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کیلئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھہرایا اس نے بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا اور بڑے گناہ کی بات کی ...... تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جو بہت اپنی پاکیزگی کا دم بھرتے ہیں؟ حالانکہ پاکیزگی تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔" (اور انہیں جو پاکیزگی نہیں ملتی تو در حقیقت ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جاتا۔ دیکھو تو سہی' یہ اللہ پر جھوٹے افترا گھڑنے سے نہیں چوکتے اور ان کے صریح گناہ گار ہونے کیلئے یہی ایک گناہ کافی ہے۔ ...... کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کر دے پھر تم اس کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔ کیا حکومت میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو یہ دوسروں کو ایک پھوٹی کوڑی تک نہ دیتے۔ پھر کیا یہ دوسروں سے اس لئے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا؟ اگر یہ بات ہے تو انہیں معلوم ہو کہ ہم نے تو ابراہیم کی اولاد کو کتاب و حکمت عطا کی اور ملک عظیم بخش دیا۔ مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا اور منہ موڑنے والوں کیلئے تو بس جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے۔" إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ
أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَ
يُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا
لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں' اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں' اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں' وہ سب پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کیلئے ہم نے وہ سزا مہیا کر رکھی ہے جو انہیں ذلیل و خوار کر دینے والی ہوگی۔"

يَسْـَٔلُكَ أَهْلُ الْكِتٰبِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسٰى
أَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوٓا أَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ثُمَّ اتَّخَذُوا
الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ وَاٰتَيْنَا مُوسٰى سُلْطٰنًا
مُّبِينًا ۝ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّورَ بِمِيثٰقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ
قُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيثٰقًا غَلِيظًا ۝ فَبِمَا نَقْضِهِمْ
مِّيثٰقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْأَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا
غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ
عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتٰنًا عَظِيمًا ۝ وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ
اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي
شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ
اللّٰهُ إِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ
مَوْتِهِ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ۝ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا
عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ كَثِيرًا ۝ وَأَخْذِهِمُ الرِّبٰوا
وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوٰلَ النَّاسِ بِالْبٰطِلِ وَأَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا
أَلِيمًا ۝

"یہ اہل کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کراؤ تو اس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰ سے کر چکے ہیں...... اس سے تو انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو اعلانیہ دکھاؤ اور اس سرکشی کی وجہ سے یکایک ان پر بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔ پھر انہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا تھا' حالانکہ یہ کھلی کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔ اس پر بھی ہم نے ان سے درگزر کیا۔ ہم نے موسیٰ کو صریح فرمان عطا کیا اور ان لوگوں پر طور کو اٹھا کر ان سے عہد لیا۔ ہم نے ان کو حکم دیا کہ دروازہ میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو' ہم نے ان سے کہا کہ سبت کا قانون نہ توڑو اور اس پر ان سے پختہ عہد لیا۔ آخر کار ان کی عہد شکنی کی وجہ سے' اور اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا' اور متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ اور یہاں تک کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں...... حالانکہ

ان کی باطل پرستی کے سبب سے اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔............ غرض ان یہودی بن جانے والوں کے اسی ظالمانہ رویہ کی بنا پر 'اور اس بنا پر کہ یہ کثرت سے اللہ کے راستے سے روکتے ہیں 'اور سود لیتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا 'اور ان لوگوں کے مال ناجائز طریقے سے کھاتے ہیں 'ہم نے بہت سی وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کیلئے حلال تھیں۔ اور جو لوگ ان میں سے کافر ہیں ان کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

ان اقتباسات سے بنی اسرائیل کے اعمال بد کا ایک حصہ سامنے آجاتا ہے 'جن کے بارے میں یہاں قرآن کریم نے اس تنقیدی سلسلے کا آغاز فرمایا ہے۔ اور یہاں ان پر ان کی تکذیب اور ان کا احمقانہ رویہ کی وضاحت کی جا رہی ہے۔ اس تنقیدی حملے میں قرآن نے یہودیوں کی بابت خصوصاً یہ فرمایا ہے کہ یہ مسلمانوں کے گہرے دشمن ہیں اور ان کیلئے کفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہ تمام افعال اور کارناموں کا ہدف اس وقت جماعت مسلمہ تھی 'اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے سامنے ان کی حقیقت کو منکشف کیا جائے 'ان پر تنقید کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ یہ لوگ صریحاً جھوٹے ہیں۔ اور ان کی ان باتوں اور کرتوتوں کی تہ میں نہایت ہی خفیہ عزائم ہیں اور یہ لوگ یہ کام محض گھٹیا درجے کے مفادات کے حصول کیلئے کر رہے ہیں۔ اور یہ کہ یہ لوگ بدترین گروہ ہیں۔ اور انہوں نے اپنی طویل ترین تاریخ میں کبھی بھی ہدایت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ یہ گروہ کبھی بھی راہ ہدایت پر سیدھا نہیں چلا 'بلکہ انہوں نے ہدایت قبول کرنے کی بجائے خود انبیاء کو قتل کیا ہے۔ اور اب یہ ان کا دلی بغض و عداوت ہے جو انہیں ان سازشوں پر آمادہ کر رہی ہے۔ اس لئے کہ نبی ؐ اور اہل اسلام کا تعلق ان کی قوم سے نہیں ہے۔ اور یہ کہ اہل اسلام عرب ہدایت پر متحد و متفق ہو گئے ہیں۔ اور ان لوگوں کی یہ سازشیں اس وقت سے جاری ہے جب اسلام مدینہ طیبہ میں داخل ہوا تھا۔ اور آج بھی زوروں پر ہے۔ اور آئندہ بھی ہر اسلامی معاشرہ ان کی ان سازشوں اور بغض و عداوت کا شکار رہے گا۔ ہر اسلامی تحریک کے ساتھ ان کا یہی رویہ رہے گا۔ اور ہر دور اور ہر موڑ پر انہوں نے احیائے اسلام کی تحریکات کے ساتھ یہی سلوک کیا۔

یہودیوں کا سب سے پہلا حملہ خود رسول ؐ خدا کی رسالت میں تشکیک پیدا کرنا ہوا کرتا تھا۔ اس لئے کہ جب یہ لوگ حضور ﷺ کی رسالت میں شک پیدا کر لیں تو پھر ان کیلئے یہ بات بہت ہی آسان ہو جاتی ہے کہ اہل اسلام حضور ﷺ کی قیادت سے دور ہو جائیں 'اور اپنا فطری نظریۂ حیات چھوڑ دیں۔ یہی وہ مقصد ہے جو یہودیوں کو ہر دور میں اسلام کی مخالفت پر ابھارتا رہا ہے اور جس کیلئے وہ بڑی بڑی مشقتیں برداشت کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یہودی سب سے پہلے اسلامی نظریۂ حیات پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اور اہل اسلام کو اسلامی نظریہ سے برگشتہ کر کے از سر نو انہیں خواہشات نفسانیہ اور جاہلیت کی پیروی پر آمادہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں حضور ؐ کی نفس رسالت کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اور یہ فرمایا گیا ہے کہ آپ کی رسالت کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ دنیا میں پہلے بھی بہت سے نبی اور رسول بھیجے گئے ہیں۔ خود بنی اسرائیل میں ہزاروں نبی مبعوث ہوئے۔ آپ کی نبوت بھی سلسلہ رسالت کی ایک اہم کڑی ہے۔ اور نفس رسالت کا وجود اس لئے ضروری ہے کہ قیامت میں سزا دینے سے پہلے اتمام حجت ضروری ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت محمد ؐ پر اسی طرح وحی آئی جس طرح آپ سے قبل "رسل" پر آتی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی طرح نبوت اور سلطنت عطا کی جس طرح آپ سے پہلے انبیائے بنی اسرائیل کو عطا کی گئی تھی۔ اس لئے یہ واقعہ نہ انوکھا ہے اور نہ باعث تعجب اور انکار ہے۔ اور ایک نبی چونکہ قائد ہوتا ہے اور لوگوں پر اسکی حکمرانی قائم ہوتی ہے 'اس لئے حضور ؐ کی رسالت اور حکومت کا قائم ہونا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ تمام امور راہ و رسم رسالت کے اہم اجزاء ہیں۔ اس معاملے میں بنی اسرائیل کی تمام حجت بازیاں جھوٹی ہیں اور ان کے تمام شبہات بے اصل ہیں۔ نیز بنی اسرائیل اپنے بڑے نبی حضرت موسیٰ اور آپ کے

بعد آنیوالے تمام رسولوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے رہے ہیں۔ خصوصاً حضرت عیسیٰ ؑ کے ساتھ تو انہوں نے بہت ہی برا سلوک کیا۔ اس لئے اہل اسلام میں سے کوئی شخص بھی ان کی ان باتوں پر کوئی توجہ نہ دے اور نہ ہی ان کو کوئی اہمیت دے۔

اس سورت میں اس حقیقت کے اظہار کے لئے پے در پے آیات نازل ہوئی ہیں۔ یہاں مناسب ہے کہ بعض آیات پیش کر دی جائیں۔ تشریح و توضیح اپنی جگہ کریں گے۔

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَّالنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ
إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ وَٱلْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ
وَهَٰرُونَ وَسُلَيْمَٰنَ ۚ وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا ﴿۱۶۳﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَٰهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ
وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ ٱللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ
لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى ٱللَّهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ ٱلرُّسُلِ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿۱۶۵﴾ لَّٰكِنِ
ٱللَّهُ يَشْهَدُ بِمَآ أَنزَلَ إِلَيْكَ ۖ أَنزَلَهُۥ بِعِلْمِهِۦ ۖ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةُ يَشْهَدُونَ ۚ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ شَهِيدًا

"اے محمد! ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی۔ ہم نے ابراہیم' اسماعیل' اسحاق' یعقوب اور اولاد یعقوب' عیسیٰ' ایوب' یونس' ہارون اور سلیمان کی طرف وحی بھیجی۔ ہم نے داؤد کو زبور دی۔ ہم نے ان رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا۔ ہم نے موسیٰ سے اس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے۔ یہ سارے رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے۔ اور اللہ بہرحال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ اس نے تم پر نازل کیا ہے۔ اپنے علم سے نازل کیا ہے۔ اور اس پر ملائکہ بھی گواہ ہیں۔ اگرچہ اللہ کا گواہ ہونا بالکل کفایت کرتا ہے۔"

يَسْـَٔلُكَ أَهْلُ ٱلْكِتَٰبِ أَن تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَٰبًا مِّنَ ٱلسَّمَآءِ ۚ فَقَدْ سَأَلُوا۟ مُوسَىٰٓ
أَكْبَرَ مِن ذَٰلِكَ فَقَالُوٓا۟ أَرِنَا ٱللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْهُمُ ٱلصَّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ
ٱتَّخَذُوا۟ ٱلْعِجْلَ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ ٱلْبَيِّنَٰتُ فَعَفَوْنَا عَن ذَٰلِكَ ۚ وَءَاتَيْنَا مُوسَىٰ
سُلْطَٰنًا مُّبِينًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ ٱلطُّورَ بِمِيثَٰقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ٱدْخُلُوا۟ ٱلْبَابَ سُجَّدًا
وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا۟ فِى ٱلسَّبْتِ وَأَخَذْنَا مِنْهُم مِّيثَٰقًا غَلِيظًا فَبِمَا نَقْضِهِم
مِّيثَٰقَهُمْ وَكُفْرِهِم بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ وَقَتْلِهِمُ ٱلْأَنۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا

غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ وَّ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝ وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ

اے نبی ﷺ یہ اہل کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کراؤ تو اس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰ ؑ سے کر چکے ہیں۔ اس سے تو انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو اور اسی سرکشی کی وجہ سے یکایک ان پر بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔ پھر انہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنالیا' حالانکہ یہ کھلی کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔ اس پر بھی ہم نے ان سے درگزر کیا۔ ہم نے موسیٰ ؑ کو صریح فرمان عطا کیا اور ان لوگوں پر طور کو اٹھا کر ان سے (اس فرمان کی اطاعت کا) عہد لیا۔ ہم نے ان کو حکم دیا کہ دروازہ میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو۔ ہم نے ان سے کہا کہ سبت کا قانون نہ توڑو اور اس پر ان سے پختہ عہد لیا۔ آخر کار ان کی عہد شکنی کی وجہ سے' اور اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا' اور متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا' اور یہاں تک کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں ---- حالانکہ درحقیقت ان کی باطل پرستی کے سبب سے اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔ پھر اپنے کفر میں یہ اتنے بڑھے کہ مریم پر سخت بہتان لگایا' اور خود کہا کہ ہم نے مسیح' عیسیٰ ابن مریم' رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے ---- حالانکہ فی الواقع انہوں نے نہ اس کو قتل کیا' نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا"۔

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا () فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ

(۴: ۵۴ تا ۵۵ ابتدائی حصہ)

"پھر کیا دوسروں سے اس لئے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو انہیں معلوم ہو کہ ہم نے تو ابراہیم کی اولاد کو کتاب و حکمت عطا کی اور ملک عظیم بخش دیا۔ مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا۔"

○..... ☆☆☆ ..... ○

اس سورت میں اسلامی معاشرہ کو جاہلیت کی گندگیوں سے پاک و صاف کرنے کا عمل بھی مسلسل جاری رہا ہے۔ اس میں دین کا مفہوم بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ ایمان کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ اسلام کی شرائط کا ذکر ہوا ہے۔ اور ان مفہومات پر مرتب ہونے والے نتائج کا بھی تفصیلاً ذکر ہوا ہے۔ اور ان مفاہیم کے نتیجے میں جو تقاضے ابھر کر سامنے آتے ہیں ان کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں۔ جیسا کہ اوپر ہم عموماً بیان کر آئے ہیں۔ اس کے بعد اس سورت میں یہودیوں کے شبہات کو دور کرنے کی مسلسل کوشش کی گئی ہے۔ اور ان کی سازشوں سے بھی اہل ایمان کو خبردار کیا گیا ہے۔ خصوصاً وہ شبہات جو وہ رسول خدا ﷺ کی رسالت کی سچائی کے بارے میں پھیلاتے تھے۔ اس کے علاوہ اس میں اسلامی تصور حیات کے بعض اساسی باتوں کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ اور اس میں جو غلط فہمیاں پیدا کی گئیں تھیں ان کو زائل کیا گیا ہے۔ نیز اس کے مقابلے میں وہ غلو اور انتہاپسندی بھی دکھائی گئی ہے جو اہل کتاب کے بعض عقائد و تصورات میں پائی جاتی تھی۔ مثلاً یہودی حضرت عیسیٰ ؑ اور ان کی پاک دامن والدہ کے بارے میں جو ناگفتنی باتیں کرتے تھے' ان کے جوابات بھی دیئے گئے ہیں اور توحید الٰہی اور توحید عبودیت' تقدیر الٰہی' لوگوں کی تخلیق کی نسبت تقدیر الٰہی لوگوں کی وفات کے بارے میں فیصلہ الٰہی اور یہ کہ کس حد تک اللہ تعالیٰ لوگوں کی تقصیرات کو معاف کریں گے اور کس حد سے آگے جرم ناقابل معافی ہو گا' یہ کہ توبہ کی حقیقت کیا ہے اور اس کی حدود کیا ہیں۔ اسلام میں جزاء و سزا کے بارے میں نظام عدل کیا ہے۔ غرض یہ اور اس قسم کی دوسری اصولی باتیں اس سورت میں بیان کی گئی ہیں۔ بعض نصوص کو یہاں ہم بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولٰٓئِكَ
يَتُوبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ
السَّيِّئَاتِ ۚ حَتّٰىٓ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَ
هُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولٰٓئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٨﴾

"ہاں جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہی لوگوں کیلئے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی برا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظر عنایت سے پھر متوجہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ مگر توبہ ان لوگوں کیلئے نہیں ہے جو برے کام کئے چلے جاتے ہیں' یہاں تک کہ ان میں سے جب کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو وہ اس وقت کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی' اور اسی طرح توبہ ان لوگوں کیلئے بھی نہیں ہے جو مرتے دم تک کافر رہیں۔ ایسے لوگوں کیلئے تو ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔"

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ
عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦﴾ وَاللّٰهُ يُرِيدُ أَن يَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوٰتِ
أَن تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا ﴿٢٧﴾ يُرِيدُ اللّٰهُ أَن يُخَفِّفَ عَنكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْإِنسَانُ ضَعِيفًا ﴿٢٨﴾

"اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان طریقوں کو واضح کرے اور انہی طریقوں پر تمہیں چلائے جس کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحا کرتے تھے۔ اور وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی۔ ہاں اللہ تم پر رحمت کے ساتھ توجہ کرنا چاہتا ہے مگر جو لوگ خود اپنی خواہشات نفس کی پیروی کر رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ راست سے ہٹ کر دور نکل جاؤ۔ اللہ تم پر سے پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔"

إِن تَجْتَنِبُوا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُم مُّدْخَلًا كَرِيمًا ﴿٣١﴾
(۴:۳۱)

"اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو تمہاری چھوٹی موٹی برائیوں کو ہم تمہارے حساب سے ساقط کر دیں گے اور تم کو عزت کی جگہ داخل کریں گے۔"

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۖ وَإِن تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِن لَّدُنْهُ أَجْرًا
عَظِيمًا ﴿٤٠﴾

"اللہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا اگر کوئی ایک نیکی کرے تو اللہ اسے دو چند کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔"

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ فَلَمَّا
كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ
خَشْيَةً ۚ وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۗ قُلْ
مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿٧٧﴾ أَيْنَ مَا تَكُونُوا
يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۗ وَإِن تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ
مِنْ عِندِ اللَّهِ ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِكَ ۚ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِندِ
اللَّهِ ۖ فَمَالِ هَٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا ﴿٧٨﴾ مَّا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ
فَمِنَ اللَّهِ ۖ وَمَا أَصَابَكَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفْسِكَ ۚ وَأَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا ۚ وَكَفَىٰ
بِاللَّهِ شَهِيدًا ﴿٧٩﴾

"تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟ اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے اب ڈر رہے ہیں جیسا کہ خدا سے ڈرنا چاہئے یا کچھ اس سے بڑھ کر کہتے ہیں خدایا ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں کچھ اور مہلت دی؟ ان سے کہو کہ دنیا کا سرمایہ زندگی تھوڑا ہے اور آخرت ایک خدا ترس انسان کیلئے زیادہ بہتر ہے۔ اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر بھی نہ کیا جائے گا۔ رہی موت تو جہاں بھی تم ہو وہ بہرحال آکر رہے گی خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو۔ اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تمہاری بدولت ہے۔ کہو سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اے انسان! تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب عمل کی بدولت ہے۔ اگرچہ اللہ کا گواہ ہونا بالکل کفایت کرتا ہے۔"

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُشْرِكْ
بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١١٦﴾

"اللہ کے ہاں بس شرک کی بخشش نہیں ہے' اس کے سوا سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔"

لَّيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ ۗ مَن يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ
مِن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿١٢٣﴾ وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ
مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا

"انجام کار نہ تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو بھی برائی کریگا اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلہ میں اپنے لئے کوئی حامی و مددگار نہ پا سکے گا۔ اور جو نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت 'بشرطیکہ ہو وہ مومن' تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔"

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا

"آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکرگزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو' اللہ بڑا قدردان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے۔"

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں' اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں' اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کیلئے ہم نے وہ سزا مہیا کر رکھی ہے جو انہیں ذلیل و خوار کر دینے والی ہوگی.......... بخلاف اس کے جو لوگ اللہ اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں اور ان کے درمیان تفریق نہ کریں' ان کو ہم ضرور اجر عطا کریں گے اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا ہے۔"

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ۡ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ڟ وَ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۭ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَ مَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ اسْتَكْبَرُوْا

فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۙ وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿١٧٣﴾

"اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریمؑ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان تھا جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے۔ پس تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ "تین ہیں" باز آجاؤ' یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔ وہ بالاتر ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔ زمین و آسمان کی ساری چیزیں اس کی ملک ہیں اور ان کی کفالت و خبرگیری کیلئے بس وہی کافی ہے......... مسیح نے کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو' اور نہ مقرب ترین فرشتے اس کو اپنے لئے عار سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لئے عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا جب اللہ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرے گا۔ اس وقت وہ لوگ جنہوں نے ایمان لاکر نیک طرز عمل اختیار کیا ہے اپنے اجر پورے پورے پائیں گے اور اللہ اپنے فضل سے ان کو مزید اجر عطا فرمائے گا اور جن لوگوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا ہے ان کو اللہ دردناک سزا دے گا اور اللہ کے سوا جن جن کی سرپرستی اور مدد گار پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے۔"

○.....☆☆☆.....○

اس کے بعد ان اساسی اخلاقی اصولوں کا نمبر آتا ہے' جن پر ایک اسلامی معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ اس سورت میں ان اصولوں کی ایک بڑی تعداد پر بحث کی گئی ہے۔ اس کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر آئے ہیں کہ اسلامی تصور حیات میں اخلاقی اصولوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ نیز اسلامی معاشرے کی تعمیر میں بھی اخلاقی اصولوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرے میں زندگی کا ہر پہلو اور زندگی کی ہر جدوجہد اخلاقی ضوابط میں سے کسی ضابطے میں بندھی ہوئی ہوتی ہے۔ ہم یہاں ایک مجمل اور طائرانہ نظر اس سورت پر اس پہلو سے بھی ڈالتے ہیں' کہ وہ کیا اخلاقی اصول ہیں جن سے اس صورت میں بحث کی گئی ہے۔ جبکہ تفصیلات پہلے دیدی گئی ہیں۔

یہ کہ اسلامی معاشرہ ایک ایسا معاشرہ ہے کہ جو صرف ایک اللہ وحدہ لاشریک کی عبودیت کے تصور پر قائم ہوتا ہے۔ اس لئے اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہ ایک ایسا معاشرہ بن جاتا ہے جس میں انسان کیلئے کسی دوسرے انسان کی بندگی اور غلامی کا کوئی تصور نہیں ہوتا' چاہے یہ انسانی غلامی جس شکل و صورت میں بھی ہو' اور یہ انسانی غلامی اسلامی نظام زندگی کے ماسوا دنیا کے تمام نظاموں میں کسی نہ کسی شکل و صورت میں پائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ صرف اسلامی نظام ہی وہ نظام ہے جس میں بندگی صرف اللہ وحدہ کیلئے خالص کردی گئی ہے۔ اس نظام میں اللہ کی اس غلامی کے خواص میں سے کوئی خاصیت بھی اللہ کے سوا کسی اور بندے کو عطا نہیں کی جاتی۔ اور نہ لوگ اللہ کے سوا کسی اور کی ان معنوں میں اطاعت اور غلامی کرتے ہیں۔ اسلامی نظام کی یہی آزادی ہے جس سے تمام فضائل اخلاق کے سوتے پھوٹتے ہیں اور جس سے ایک اخلاقی نظام وجود میں آتا ہے جس کا مرجع صرف رضائے الٰہی کا جذبہ ہوتا ہے اور جس کا آخری ہدف اللہ کے اخلاق میں اپنے آپ کو رنگنا ہے۔ اس لئے اسلامی اخلاقی نظام نفاق' ریاکاری غیراللہ کی خوشنودی جیسے برے خصائل سے پاک و صاف ہوتا ہے۔ یہ ہے اسلامی نظام اخلاق کا اصل الاصول اور اجتماعی خصائل کا مدار المہام۔

اس بڑے اصول کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام میں بعض انفرادی عناصر پر بھی اس سورت میں بحث کی گئی ہے۔ اسلامی معاشرے میں امانت و دیانت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ نیز اس معاشرے کی ایک اہم خصوصیت اس کی عدالت ہے۔ اس میں لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے نہیں کھایا جاتا۔ اس میں ایک دوسرے کے خلاف نجویٰ اور خفیہ سازشوں کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس سلسلے میں صرف معروف اور

حسد اول انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ اس نظام میں کسی کی بدگوئی جائز نہیں ہوتی۔ الایہ کہ کسی کی حق تلفی کی گئی۔ اس معاشرے میں اچھے کاموں کی سفارش کی جاتی ہے۔ اچھی طرح سلام و کلام کیا جاتا ہے۔ جہاں فحاشی کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان دوستیاں اور حرام کاری سخت طور پر ممنوع ہوتی ہیں۔ تکبر' ریاکاری' بخل' حسد اور دھوکہ بازی کو ممنوع قرار دیا جاتا ہے اور اس معاشرے کا اجتماعی معاشی نظام باہم تعاون' سوشل سیکورٹی' ہمدردی' ایثار' جوانمردی اور مشکل حالات میں باہم دستگیری پر مبنی ہوتا ہے اور اس اجتماعی معاشرے میں صرف اس قیادت کو تسلیم کیا جاتا ہے جس کی اطاعت کا حق ہو۔

اس سے قبل ہم اکثر ایسی آیات کو نقل کر آئے جن میں اس اصول پر زور دیا گیا ہے۔ اور دوران تفسیر سیاق کلام میں ان پر دوبارہ تفصیلی بحث بھی ہوگی۔ یہاں مناسب ہے کہ ہم تاریخ اسلام کے ایک عدیم المثال واقعہ کی طرف اشارہ کر دیں۔ جس کی تلاش پوری انسانیت کو ہے لیکن یہ اونچا معیار اسے کہیں بھی نہیں ملتا۔ اور نہ آج تک انسانیت اس مقام بلند تک پہنچ سکی ہے۔ نہ آئندہ اسلامی نظام زندگی کے سوا کسی دوسرے نظام کے زیر سایہ انسانیت اس اونچے مقام تک پہنچ سکتی ہے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب یہودی سوسائٹی اس امت اسلامیہ اور نبی کریم ؐ کے خلاف رات دن سازشوں میں لگی ہوئی تھی۔ یہودی اسلامی اتحاد اور اسلامی قیادت کے خلاف قدم قدم پر سازشوں کا جال بچھا رہے تھے۔ اور قرآن کریم اپنی ذاتی نگرانی میں اس امت کی تربیت کر رہا تھا۔ اور یہ امت قرآنی تصور حیات اور قرآنی اخلاق کے ساتھ رات دن ترقی کر رہی تھی۔ اس کا نظام زندگی اور اس کے اجزاء تیار ہو رہے تھے۔ اس وقت اسلامی نظام ایک یہودی شخص کے ساتھ جو سلوک کرتا ہے وہ ہمارا موضوع ہے۔

قرآن کریم نے امت مسلمہ کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ ہر معاملے میں امانت و دیانت کے ساتھ کام کرے۔ لوگوں کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلے کرے۔ تمام لوگوں کے درمیان عدل چاہے وہ جس قوم اور جس مذہب سے تعلق رکھتے ہوں' چاہے وہ جس قبیلے اور جس وطن سے تعلق رکھتے ہوں۔ اللہ کا حکم یہ تھا :

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا

"مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانت اہل امانت کے سپرد کرو' اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو' اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔"

اور دوسری جگہ اللہ فرماتے ہیں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا ۚ وَإِنْ تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود

تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب' اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔"

اس کے بعد قرآن کریم کی چند آیات ایک یہودی فرد کے انفرادی معاملے میں انصاف کے طور پر اترتی ہیں' جس کے خلاف ایک ناجائز الزام میں تحقیقات ہو رہی تھی۔ یہ الزامات بعض انصار اہل اسلام نے عائد کئے تھے۔ جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور جن کے دلوں میں ابھی تک اعلیٰ اسلامی اصول و مبادی اچھی طرح راسخ نہ ہوئے تھے۔ اور نہ ہی ابھی تک ان کے دلوں سے جاہلیت کی میل دور ہوئی تھی۔ چنانچہ ان لوگوں نے 'خونی رشتہ داری اور قوم پرستی کے نتیجے میں ایک بے گناہ پر الزام عائد کر دیا اور اصل مجرم کو بری کروا دیا۔ انہوں نے بڑی کثرت سے اس یہودی شخص کے خلاف الزام عائد کیا اور اس کے خلاف گواہی تک دیدی۔ یہ مقدمہ زرہ کی چوری کا مشہور مقدمہ تھا جو خود حضور ﷺ کے سامنے پیش ہوا تھا' اور قریب تھا کہ ان شہادتوں کی بنا پر آپ اس یہودی کو سزائے حد سرقہ سنا دیتے اور اصل مجرم کو بری کر دیتے۔

چنانچہ اس واقعہ کے بارے میں آیات کی ایک بڑی تعداد نازل ہوئی۔ ان آیات میں حضرت نبی ؐ کو شدید تنبیہہ بھی کی گئی۔ نیز اس گروہ انصار کو بھی سخت ملامت کی گئی جنہوں نے حضور ؐ کو مشکل حالات میں پناہ دی تھی اور آپ ؐ کی امداد کی تھی۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا کہ ایک یہودی کے ساتھ انصاف کیا جائے' حالانکہ وہ شخص اس گروہ کا فرد تھا جو ہروقت حضور ؐ کو ایذا دیتا تھا' آپ ؐ کی دعوت کی مخالفت کرتا تھا' اور آپ ؐ اور مسلمانوں کے خلاف ہروقت گہری اور گھناؤنی سازشوں میں مصروف رہتا تھا۔ نیز ان آیات میں ان لوگوں کو بھی سخت ترین دھمکی دی گئی ہے جو برے افعال کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور پھر اس کا الزام ایک بے گناہ شخص پر دھرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان آیات میں عدل و انصاف کے معیار کو اس قدر بلند اور اونچا بنا دیا گیا جو اس دور میں تعجب خیز نظر آتا ہے۔ اور نیز ان آیات میں ایک روشن اشارہ اس جانب پایا جاتا ہے کہ عدل و انصاف کو اسلام کس مقام بلند تک پہنچانا چاہتا ہے۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن
لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ﴿﴾ وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿﴾ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ
يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ﴿﴾ يَسْتَخْفُونَ مِنَ
النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ ۚ
وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ﴿﴾ هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
فَمَن يُجَادِلُ اللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿﴾ وَمَن يَعْمَلْ
سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿﴾ وَمَن يَكْسِبْ
إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿﴾ وَمَن يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا
ثُمَّ يَرْمِ بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ﴿﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَ

رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَضُرُّوْنَكَ
مِنْ شَيْءٍ ؕ وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَ كَانَ
فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا۝ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ
مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ
نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا۝ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ
غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا
يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ
ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا

"اے نبی! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو' تم بددیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو' اور اللہ سے درگزر کی درخواست کرو' وہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے۔ جو لوگ اپنے نفس سے خیانت کرتے ہیں تم ان کی حمایت نہ کرو' اللہ کو ایسا شخص پسند نہیں ہے جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو۔ یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات چھپا سکتے ہیں۔ مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے۔ وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ راتوں کو چھپ کر اس کی مرضی کے خلاف مشورے کرتے ہیں۔ ان کے سارے اعمال پر اللہ محیط ہے۔ ہاں! تم لوگوں نے ان مجرموں کی طرف سے دنیا کی زندگی میں تو جھگڑا کر لیا' مگر قیامت کے روز ان کی طرف سے کون جھگڑا کرے گا؟ آخر وہاں کون ان کا وکیل ہو گا؟ اگر کوئی برا فعل کر گزرے یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے اور اس کے بعد اللہ سے درگزر کی درخواست کرے تو اللہ کو درگزر کرنے والا اور رحیم پائے گا۔ مگر جو برائی کمالے تو یہ اس کی یہ کمائی اسی کیلئے وبال ہوگی' اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے اور وہ حکیم و دانا ہے۔ پھر جس نے کوئی خطایا گناہ کر کے اس کا الزام کسی بے گناہ پر تھوپ دیا اس نے تو بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا۔ اے نبی! اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا' حالانکہ درحقیقت وہ خود اپنے سوا کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر رہے تھے' اور تمہارا کوئی نقصان نہ کر سکتے تھے۔ اللہ نے تم پر کتاب نازل کی ہے اور تم کو وہ کچھ بتایا جو تمہیں معلوم نہ تھا' اور اس کا فضل تم پر بہت ہے۔"

لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر و بیشتر کوئی بھلائی نہیں ہوتی' ہاں اگر کوئی پوشیدہ طور پر صدقہ و خیرات کی تلقین کرے یا کسی نیک کام کیلئے یا لوگوں کے معاملات میں اصلاح کرنے کیلئے کسی سے کچھ کہے تو البتہ یہ بھلی بات ہے۔ اور جو کوئی اللہ کی رضاجوئی کیلئے ایسا کرے گا اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے۔ مگر جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے' درآنحالیکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی ہو' تو اس کو ہم اس طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا۔ اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔

اللہ کے ہاں بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے' اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا۔ وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔

ذرا اب بتایئے؟ اس نظام کے بارے میں انسان کیا کہہ سکتا ہے؟ صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک بے مثال نظام حیات ہے۔ اسی نظام میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ انسان کی کسی سوسائٹی کو پسماندگی اور جہالت کی ان گہرائیوں سے اس قدر اونچے مقام و معیار تک پہنچا دے۔ اور یوں ایک نہایت ہی مختصر مدت میں اسے گہرائیوں سے نکال کر اس قدر مقام بلند تک پہنچا دے۔

○.....☆☆☆.....○

یہاں ہم اس سورت کے موضوع اور اس کے خطوط پر بحث کے سلسلے میں اسی قدر تعارف اور مقدمہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہاں ہم نے اس کے موضوعات و مباحث اور اس کی توجیہات و ہدایات کی طرف صرف اشارہ ہی کیا ہے۔ انشاء اللہ تشریح آیات کے وقت ہم کچھ تفصیلات دے سکیں گے۔

○.....☆☆☆.....○

# درس ۳۰ ایک نظر میں

سورت کا یہ پہلا پیراگراف' اپنی افتتاحی آیت کے ساتھ' لوگوں کو صرف رب واحد اور خالق واحد کی طرف رجوع کرنے کی دعوت سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ تمام لوگوں کو ایک ہی ماں باپ سے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ ایک ہی خاندان سے بکھرے ہیں' انسانی نفس ہی دراصل اصل انسانیت ہے۔ اور انسانی خاندان ہی دراصل انسانی معاشرے کی اکائی ہے۔ اس لئے نفس انسانی کے اندر خدا خوفی کے جذبات کو جوش میں لایا جاتا ہے اور خاندانی نظام کو جذبہ صلہ رحمی سے مستحکم کیا جاتا ہے' تاکہ اس مستحکم اساس پر ایک خاندان کے اندر باہم تکافل (Social Security) اور باہم محبت کے فرائض پروان چڑھیں۔ اس کے بعد پوری انسانیت کے اندر باہم محبت اور باہم پشتیبانی کے اصول رائج کئے جاسکیں۔ غرض اس سورت کے اندر کی جانے والی تمام قانون سازی اور انسانیت کی تمام شیرازہ بندی اسی اصول پر کی گئی ہے۔

آیات کا یہ حصہ' درج بالا اصول و قوانین کے ساتھ ساتھ کسی معاشرے یا کسی خاندان کے اندر پائے جانے والے یتیموں کے بارے میں معاشرتی اور اجتماعی ذمہ داریوں کے حوالے سے بھی ہدایات دیتا ہے۔ یتیموں کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں کہ ان کی نگرانی کس طرح کی جائے۔ ان کے مال کی نگہداشت کس طرح ہو' نیز افراد خاندان کے درمیان میراث کی تقسیم کے اصول بھی وضع کئے گئے ہیں۔ جن میں مختلف اطراف کے رشتہ داروں کے حصص کا تعین بھی کیا گیا ہے۔ مختلف حالات میں حصص کا فرق بھی بتایا گیا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس ہمہ گیر انسانی اصول کی روشنی میں کیا گیا ہے جس کا ذکر آیت افتتاحیہ میں بیان ہوا ہے۔ یہ ہمہ گیر انسانی اصول بعض آیات کی ابتداء میں' بعض کے درمیان میں اور بعض آیات کے خاتمہ پر اس سبق میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ اور اس حقیقت کی توثیق کی گئی ہے کہ ان تمام ہدایات' تعلیمات اور قانون سازی کے اصولوں کی تہہ میں یہی عظیم اور تابندہ اصول پوشیدہ ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ ہی ہمارا رب اور ہر قسم کی ہدایت اور قانون سازی اس کا خصوصی حق ربوبیت ہے۔ اسلامی نظام میں ہر قسم کی قانون سازی اللہ جل شانہ کی اس شان ربوبیت کا اظہار ہے۔

☆ ☆ ☆

# درس ۳۰ تشریح آیات

## آیت نمبر ۱ تا ۱۴

سُورَةُ النِّسَآءِ مَدَنِيَّةٌ (۹۲) آیاتها ۱۷۶ رکوعاتها ۲۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝۱

"لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے کو اپنا حق مانگتے ہو' اور رشتہ و قرابت کے تعلقات بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔"

یہ خطاب تمام انسانیت سے ہے۔ بحیثیت انسان ان سے خطاب ہے تاکہ وہ سب کے سب رب واحد کی طرف لوٹ آئیں۔ وہی تو ہے جس نے ان کی تخلیق کی ہے اور پھر اس نے ان سب انسانوں کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے۔ پھر اس جان سے اس کیلئے جوڑا تخلیق کیا اور پھر ان دونوں سے سلسلہ نسب چلا کر بہت سے مرد اور عورتوں کو پوری دنیا میں پھیلا دیا۔

بظاہر تو یہ باتیں بہت سادہ اور ابتدائی معلوم ہوتی ہیں لیکن در حقیقت یہ عظیم حقائق ہیں۔ یہ بہت ہی بھاری باتیں ہیں اور انسانی زندگی پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اگر یہ "لوگ" ان باتوں پر کان دھریں' اور انہیں سمجھنے کی کوشش کریں تو ان باتوں سے اس کرۂ ارض پر حیات انسانی کے اندر عظیم تغیر واقع ہو جائے اور لوگ جاہلیت یا مختلف جاہلیتوں سے نکل کر ایمانی زندگی' ہدایت یافتہ زندگی اور انسانیت کے لائق مہذب زندگی کی جانب بسہولت منتقل ہو جائیں' یہ مہذب زندگی نفس انسانی کے حسب حال ہوگی اور اس کے خالق اور رب کی مرضی کے مطابق بھی ہوگی۔

اس آیت میں جو ابتدائی حقائق بیان ہوئے ہیں' وہ قلب و نظر کیلئے درج ذیل وسیع میدان فراہم کرتے ہیں:

۱۔ اس میں پوری انسانیت کو یہ بتایا ہے کہ اس کی اصل کیا ہے؟ اور اسے یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اس خالق کی طرف رجوع کرے جس نے اسے پیدا کر کے اس زمین پر بسایا ہے۔ یہ آیات بتاتی ہے کہ "انسانیت" نے چونکہ اپنی اس اصلیت کو فراموش کر دیا ہے۔ اس لئے وہ سب کچھ بھول گئی ہے اور اس کا کوئی کام درست نہیں رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ اس کرۂ ارض پر تشریف لائے' جبکہ پہلے وہ اس پر نہ تھے۔ سوال یہ ہے کہ اس جہاں میں انہیں کون لایا ہے؟ یہاں وارد ہونے میں ان کے اپنے ارادے کا دخل نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہاں آنے سے قبل وہ معدوم تھے اور کسی معدوم کیلئے

ارادے کا تصور ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ معدوم تو اس جہاں میں آنے اور نہ آنے کا کوئی فیصلہ کر ہی نہیں سکتا۔ اس لئے لازماً انسان کے علاوہ کسی اور ذات نے انسانوں کو یہاں لاکر بسایا۔ یہ ارادہ ذات انسان سے علیحدہ ارادہ تھا۔ ایک بالا ارادہ تھا جس نے تخلیق انسانیت کا فیصلہ کیا۔ اور یہ "خالق ارادہ" انسانی ارادہ نہ تھا۔ اس بالائی ارادہ نے انسانیت کیلئے یہاں جینے اور زندگی بسر کرنے کے خطوط وضع کئے۔ اسی دوسرے ارادے نے انسان کو وجود بخشا' انسان کو انسانی خواص عطا کئے۔ انسان کو اس کے خواص اور صلاحیتیں دیں۔ انسان کو وہ قوانین عطا کیے کہ وہ انہیں کام میں لاکر اس کائنات کے ساتھ ہم آہنگی اختیار کرے۔ اس لئے کہ وہ اس کائنات میں نووارد تھا اور وہ جہاں سے آیا' اس کے بارے میں بھی انسان کو کچھ علم نہ تھا۔ نہ انسان کے اندر ان کے علاوہ صلاحیتیں تھیں جو اس ارادہ بالا نے انسان کو عطا کیں۔

یہ ہے وہ حقیقت کہ اگر موجودہ انسان اسے ذہن نشین کرلے تو وہ پہلے دن سے راہ راست پالے۔ جبکہ یہ حقیقت ہے بھی بالکل واضح' لیکن افسوس یہ ہے کہ انسان اس بدیہی حقیقت کبریٰ سے مکمل طور پر غافل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ برتر اور عظیم ارادۂ الٰہیہ' جو انسان کو یہاں لایا' یہاں اس نے انسان کو زندگی گزارنے کے خطوط دیئے اور اس کائنات میں زندگی بسر کرنے کی قدرت اور صلاحیت اسے عطا کی۔ یہی عظیم ارادہ انسان کی پوری کائنات کا مالک ہے۔ یہی ہے جو انسانی امور میں ہر قسم کا تصرف کر رہا ہے۔ اور یہی وہ ارادہ ہے جو انسانیت کیلئے ہر قسم کی تدبیر یہاں کرتا ہے۔ اس لئے یہی ارادہ الٰہیہ اس بات کا حق ہے کہ وہ انسان کیلئے نظام زندگی کے خطوط متعین کرے۔ انسان کیلئے ضابطے اور قوانین وضع کرے۔ اس کیلئے اقدار حیات اور حسن وقبح کے اصول وضع کرے۔ یہی ارادہ ہے جس کی طرف انسان کو رجوع کرنا چاہئے۔ یہی وہ ارادہ ہے کہ جس کے حسن وقبح کے پیمانوں اور جس کے قوانین کی طرف رجوع کرنا فرض ہے۔ اس وقت جبکہ اس امر کے بارے میں ان کے درمیان اختلاف واقع ہو جائے۔ اس لئے کہ وہ ارادہ رب العالمین ہے جو وحدہ لاشریک ہے۔

۲:۔ یہ حقائق جو اس آیت میں بیان ہوئے ہیں' اس بات کا مظہر ہیں کہ یہ بشریت ایک ہی ارادے کے نتیجے میں عالم وجود میں آئی ہے۔ تمام انسان ایک ہی رحم مادر سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کے درمیان ایک ہی رشتہ ہے۔ وہ ایک ہی جڑ سے پھیلے ہوئے ہیں اور یہ کہ ان کا نسب نامہ بھی ایک ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ

"اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا ہے اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔"

اگر لوگ اس ایک حقیقت کو ہی اچھی طرح ذہن نشین کرلیں تو بیشتر فرقہ بندیاں جو ان کے افکار پر چھائی ہوئی ہیں ختم ہو کر رہ جائیں' جو ان بعد کے ادوار میں انسانوں کی عملی زندگی میں پیدا ہو گئی ہیں' جنہوں نے ایک ہی جان سے پیدا ہونے والے عوام الناس کے اندر فرقے فرقے پیدا کر دیئے ہیں۔ اور ایک ہی ماں سے پیدا ہونے والوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھ دیا ہے۔ جبکہ انسانوں کے اوپر یہ حالات بعد میں طاری ہوئے اور مناسب نہ تھا کہ یہ حالات انسانوں کے درمیان رحم و محبت کے حقیقی جذبات کو ختم کر دیں۔ حالانکہ اس رحم و محبت کا پاس ضروری تھا۔ ایک جان کی اولاد ہونے کے ناطے باہم انسانی محبت ضروری تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے رب اور خالق کے ساتھ رابطہ اور اس کے حقوق کا لحاظ اور اس کا ڈر اور تقویٰ دل میں رکھنا ضروری تھا۔

اگر صرف اسی حقیقت کو مستحکم کر دیا جائے تو تمام فرقہ وارانہ کشیدگیاں ختم ہو جائیں ۔ اس وقت پوری انسانیت فرقہ وارانہ کشیدگی کی تباہ کاریوں کا مزہ اچھی طرح چکھ چکی ہے ۔ اس کرۂ ارض پر فرقہ وارانہ کشیدگیاں قائم ہیں اور رنگ و نسل کی اساس پر تقسیمیں قائم ہیں اور لوگوں نے اپنا انسانی شجرۂ نسب پوری طرح بھلا دیا ہے ۔ اور پھر اپنے رب کے ساتھ تعلق ربوبیت کو بھی پس پشت ڈال دیا ہے ۔

اگر اس حقیقت کو انسان قبول کر لیں اور اچھی طرح اپنے نظریات میں مستحکم کر دیں تو ہندوستان میں جو طبقاتی غلامی کا نظام رائج ہے وہ اس دنیا سے فی الفور مٹ جائے ۔ اسی طرح مشرق کے سوشلسٹ ممالک کے اندر طبقاتی جنگوں میں' جو خون پانی کی طرح بہہ رہا ہے وہ ختم ہو جائے اور قومیت کا وہ فتنہ بھی ختم ہو جائے جو جاہلیت جدیدہ کے فکری تصورات اور فلسفوں کا قاعدۂ اساسی ہے ۔ اور یہ دنیا سے طبقاتی کشمکش کے خاتمے کا نقطہ آغاز بن جائے جن میں ہمیشہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی ایک طبقے کو دوسرے طبقات پر قیادت و سیادت کا مقام حاصل ہو جائے ۔ اور جس میں اس حقیقت کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ انسان تو سب کے سب دراصل ایک ہی جان سے پیدا ہوئے ہیں اور ان کا پیدا کرنے والا رب ذوالجلال بھی ایک ہی ہے ۔

۳ :۔ تیسری حقیقت جس کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے ۔ وہ یہ ہے کہ انسانیت نفس واحد سے تخلیق ہوئی ہے ۔ اور اس نفس سے پھر اس کیلئے جوڑا پیدا کیا گیا' اگر انسانیت اس پر غور کرے اور اس کی حقیقت کو پالے تو وہ ہمت کر کے ان غلطیوں اور اذیت ناک تصورات کی تلافی کر لے گی' جن میں وہ صنف نازک کے بارے میں مختلف اوقات میں مبتلا رہی ہے ۔ انسانیت نے عورت کے ساتھ عجیب و غریب تصورات وابستہ کئے ۔ اسے گندگی اور گناہ کا منبع سمجھا گیا ۔ اسے ہر معصیت اور ہر شر کا سبب گردانا گیا ۔ حالانکہ وہ اپنی فطرت اور اپنے مزاج کے اعتبار سے نفس اول یعنی آدم کا جزء تھی ۔ اور اسے اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی اس لئے کیا تھا کہ وہ اس کی ہمنشین و ہمدم ہو اور اس کے ذریعہ سے انسان کی نسل کشی کی جائے ۔ اسی لئے مرد و عورت کی فطرت میں فرق نہیں ہے بلکہ ان کی استعداد اور ان کے صنفی فرائض میں فرق ہے ۔

اس معاملہ میں' انسانیت ایک عرصہ تک بادیہ پیمائی کرتی رہی اور گمراہ ہوتی رہی ۔ اس نے عورت کو تمام انسانی حقوق سے محروم رکھا اور اس کی خاصیت انسانی سے بھی انکار کیا ۔ ایک عرصہ تک بیچاری پر مظالم ہوتے رہے ۔ اور یہ محض ان غلط خیالات و تصورات کی وجہ سے جن کی کوئی حقیقت نہ تھی لیکن جب ان غلط خیالات کی تصحیح کی گئی تو ترازو کے دوسرے پلڑے کو بہت ہی بھاری کر دیا گیا ۔ عورت کو شتر بے مہار بنا دیا گیا ۔ وہ اپنی اس حیثیت کو بھول گئی کہ بے شک وہ انسان ہے لیکن اسے دوسرے انسانوں کیلئے پیدا کیا گیا ہے ۔ وہ ایک جان ہے لیکن اسے دوسری جان کیلئے پیدا کیا گیا ہے ۔ وہ انسانیت کا ایک حصہ ہے لیکن وہ دوسرے حصے کیلئے تکمیلی ہے ۔ مرد اور عورت دونوں علیحدہ مکمل شخصیات نہیں ہیں بلکہ وہ جوڑا ہیں اور ایک دوسرے کیلئے تکمیلی حیثیت کے حامل ہیں ۔

اس عظیم اور طویل گمراہی کے بعد اسلامی نظام زندگی نے انسانیت کو واپس لا کر اصل شاہراہ پر ڈالا اور اسے صحیح تصورات دیئے ۔

۴ :۔ اس آیت میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ زندگی کا ابتدائی سیل (Cell) خاندان ہے ۔ دنیا میں منشائے الٰہی یہ ہے کہ یہ انسانی پودا ایک خاندان میں پھلے پھولے' اس لئے ابتداء ایک جان پیدا کی گئی اس کے بعد اس جان ہی سے اس کیلئے جوڑا پیدا کیا گیا ۔ اس طرح یہ ابتدائی خاندان دو افراد پر مشتمل تھا ۔ اور اس کے بعد "ان دو سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کی گئیں ۔" اگر اللہ کی مرضی ہوتی تو وہ پہلے سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں پیدا فرما دیتا اور اس کے بعد انہیں بہت سے جوڑوں کی شکل دیدی جاتی ۔ اور ابتداء ہی میں بہت سے خاندان وجود میں آجاتے ۔ اور ابتداء ہی سے ان کے درمیان رحم مادر کا رشتہ نہ ہوتا اور ان کے درمیان صرف یہ رابطہ ہوتا کہ انہیں ایک ہی صانع کی مخلوق کی پہلی کھیپ ہونے کا مشترکہ

تعلق حاصل ہے اور بس۔ اور صرف یہی ان کے درمیان پہلا تعلق اور ربط ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ علیم و خبیر تھا' اس کے پیش نظر ایک حکمت تھی' اللہ تعالیٰ انسانوں کے درمیان پختہ رابطے قائم کرنا چاہتے تھے۔ پہلا رابطہ یہ تھا کہ ان کا رب ایک ہی تھا۔ اور یہی تمام انسانی رابطوں کا سرچشمہ تھا اور ہے۔ اس کے بعد باہم صلہ رحمی کا رشتہ آتا ہے' جس کی وجہ سے ایک خاندان وجود میں آتا ہے۔ جو ایک مرد اور ایک عورت سے شروع ہوتا ہے۔ یہ دونوں ایک ہی نفس سے پیدا ہوئے' ان کی طبیعت بھی ایک ہے۔ فطرت بھی ایک ہے' ابتدائی خاندان بھی ایک جس سے پھر بہت سے مرد اور عورت پھیلے۔ ان تمام افراد کے درمیان پہلا رابطہ وحدانیت ربوبیت' اس کے بعد ان کے درمیان وحدت خاندان کا رابطہ ہے۔ اور خاندان وہ ابتدائی سیل ہے' جس کے اوپر انسانی معاشرے کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ لیکن عقیدہ اور نظریہ اس خاندانی رابطے سے بھی پہلے نمبر پر آتا ہے۔

یہی حکمت ہے کہ اسلامی نظام زندگی میں خاندانی نظام کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اور خاندان کی شیرازہ بندی اور پختگی کیلئے تمام تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ اس کی اساس کو مستحکم کیا جاتا ہے اور اسے ان تمام عوامل اور موثرات سے بچایا جاتا ہے' جو کسی بھی طرح اس کی کمزوری کا باعث ہوں۔ خاندانی نظام کی تباہی میں سب سے پہلا موثر عامل یہ ہوتا ہے کہ انسان فطری روش کے خلاف طریق کار اختیار کرے۔ اور مرد کی صلاحیتوں اور عورت کی صلاحیتوں کا اچھی طرح ادراک نہ کرے نیز مرد اور عورت دونوں کی صلاحیتوں کے اندر توازن پیدا نہ کیا جائے اور ان قوتوں کو مرد اور عورت پر مشتمل ایک خاندان کی تشکیل اور تعمیر میں استعمال نہ کیا جائے۔

اس سورت میں اور اس کے علاوہ دوسری سورتوں میں بھی' اسلامی نظام میں خاندان کی تشکیل اور تقویت کے سلسلے میں بے شمار تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ لیکن خاندانی نظام کو اچھی طرح مضبوط بنیادوں پر اس وقت تک استوار نہ کیا جاسکتا تھا' جب تک عورت ذات کے ساتھ دور جاہلیت کا ظالمانہ سلوک روا رکھا جاتا۔ چاہے یہ جاہلیت قدیمہ ہو یا جدیدہ ہو' اور جب تک عورت کے بارے میں ان توہین آمیز افکار و خیالات کا قلع قمع نہ کر دیا جاتا جو دور جاہلیت میں اس سے وابستہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے سب سے پہلے عورت پر ہونے والے مظالم کو ختم کیا اور اس کے بعد قرآن نے اسے انسانی معاشرہ میں ایک معزز مقام دیکر اس کے بارے میں فرسودہ تصورات کو رفع کیا۔[1]

۵:۔ سب سے آخر میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ایک ہی جان اور ایک ہی خاندان میں پیدا کرنے کے بعد تمام افراد بنی نوع انسانی کے اندر اشکال اور صلاحیتوں کا یہ عظیم فرق' جس میں کوئی دو فرد' تاریخ انسانی کے پورے عرصے میں' کبھی بھی باہم کلی طور پر مماثل نہیں ہوئے' جبکہ گزشتہ تاریخی ادوار میں آنے اور جانے والے افراد کی تعداد کا بھی علم نہیں ہے' یہ شکلوں کا اختلاف' خدوخال کا تباین' طبیعت اور مزاج کا اختلاف شعور اور اخلاق کا اختلاف استعداد اور صلاحیتوں کا اختلاف' رجحانات اور دلچسپیوں کا اختلاف غرض یہ ہمہ گیر اور ہمہ پہلو اختلاف اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بے مثال خالق اور موجد ہے۔ وہ حکیم و علیم ہے اور اس کے اس پیدا کردہ انسانی باغ میں رنگارنگ پھولوں میں قلب و نظر کا غیر مختتم سامان ہے۔ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ ایک نئی شخصیت لئے ہوئے ہے۔ اور اپنی مثال آپ ہے' اور یہ کام صرف قادر مطلق ہی کا ہے' اور یہ کارگیری ذات باری تعالیٰ کے سوا کسی اور کے حیطۂ قدرت میں نہیں ہے۔ وہ ذات ہے جس کا ارادہ بے قید ہے۔ اور وہ جو چاہتا ہے ہوتا ہے۔ وہ کن فیکون ہے اور عظیم ہے اور لاتعداد انسانی شخصیت کے اندر یہ کلی امتیاز و تباین صرف وہی قائم کر سکتا ہے۔ جبکہ تمام انسان صرف ایک ہی باپ آدم سے پھیلے ہیں۔

اس نہج پر انسانی شخصیات و افراد پر غور و فکر اس بات کیلئے ضامن ہے کہ تقویٰ اور ایمان کے اساسی توشہ پر قلب مومن کو انس و

[1] ۔ دیکھئے میری کتاب "اسلام اور عالم امن" کا باب "گھر کی سلامتی"۔

محبت کا مزید سامان عطا کرے۔ یہ غور و فکر فطع کے اوپر مزید فطع ہے اور خیالات کی بلندی پر مزید سربلندی ہے۔

خیالات و افکار کے اس جم غفیر کے بعد اس آیت افتتاح کے خاتمے پر لوگوں کو خدا خوفی کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس خدا کی خشیت کی طرف لوگوں کو بلایا جاتا ہے جس کے نام پر وہ ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں۔ اور اس کے نام کا واسطہ دیتے ہیں' نیز لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ باہم تعلقات میں صلہ رحمی کا خیال رکھیں' اس لئے کہ تم سب لوگوں کی اصل تو بہر حال ایک ہی ہے۔

"اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو۔"

اس خدا سے ڈرو' جس کے نام پر تم ایک دوسرے کے ساتھ معاہدے کرتے ہو' ایک دوسرے کے ساتھ عقد کرتے ہو اور تم میں سے بعض لوگ بعض دوسروں سے اپنے حقوق اور وفاداری کا مطالبہ اس کے نام کے ساتھ کرتے ہیں' تم اس کے نام کے ساتھ قسمیں کھاتے ہو' غرض آپس کے روابط' تعلقات' رشتہ داریوں اور باہمی معاملات میں خدا خوفی کا طرز عمل اختیار کرو۔

قرآن کریم میں تقویٰ اور خدا خوفی کا مفہوم واضح ہے' اس لئے کہ قرآن کریم میں بار بار اس کا ذکر ہوا ہے' رہی یہ بات کہ رشتہ و قرابت کے تعلقات سے ڈرو' یہ ایک عجیب قسم کا انداز کلام ہے جس کا شعوری سایہ نفس پر سایہ فگن ہوتا ہے۔ اور اس شعوری پر تو کا نفس انسانی خود بخود مفہوم نکال لیتا ہے۔ یعنی رشتہ قرابت سے ڈرو' ان تعلقات کے بارے میں اپنے احساس کو تیز کرو' ان کے حقوق کا احساس کرو' ان حقوق کی پامالی اور ان میں ظلم سے بچو' ان کو چھونے اور خراش لگانے سے بچو' رشتہ میں اذیت نہ دو' رشتہ داروں کے جذبات مجروح نہ کرو اور ان کے حقوق تلف نہ کرو' غرض رشتہ کے معاملے میں احساس کو تیز رکھو' احترام کرو اور رشتہ کو محبت دو اور محبت کے سایہ میں رہو۔

اختتام اللہ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔

"یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔"

اور اس کی نگرانی کس قدر ہولناک ہوتی ہے' جب ذات باری خود نگران ہو! وہ رب ہے' خالق ہے اور اپنی تمام مخلوق کی بابت اچھی طرح باخبر ہے' وہ ایسا علیم و خبیر ہے جس پر کوئی بات مخفی نہیں رہتی۔ نہ ظاہری افعال اس سے پوشیدہ ہیں اور نہ خفیہ افکار اس سے پوشیدہ ہیں۔

○.....☆☆☆.....○

اس پر شوکت اور موثر افتتاح اور اس کے اندر بیان ہونے والے سادہ فطری حقائق اور پوری انسانیت کیلئے عظیم اساسی اصول کے بیان کے بعد' ایسی بنیادی باتوں کا تذکرہ شروع کیا جاتا ہے جن پر کسی معاشرے کا اجتماعی نظام اور اجتماعی زندگی استوار ہوتی ہے۔ مثلاً خاندان اور جماعت کا باہم معاشی تعاون و تکافل' معاشرہ میں ضعیفوں کے حقوق کا تحفظ' معاشرہ میں عورت کے حقوق کا تحفظ اور اس کیلئے مقام شرافت کا تعین' معاشرہ کی عمومی دولت کا تحفظ' میراث اور ترکہ کی ایسی تقسیم جو عدل و انصاف کی کفیل ہو اور جس میں تمام افراد معاشرے کی بھلائی ہو۔

سب سے پہلے ان لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے جو یتیموں کے اموال کے نگران مقرر ہوتے ہیں کہ جب وہ یتیم سن رشد کو پہنچ جائیں تو ان کی پوری دولت انہیں لوٹا دی جائے' اور یہ کہ یہ اولیاء ان یتیم لڑکیوں کے ساتھ محض اس لئے نکاح نہ کریں کہ ان کی دولت ان کے قبضے میں آجائے۔ ہاں یتیموں میں سے ایسے لوگ جن کے بارے میں یہ خوف ہو کہ اگر ان کی دولت ان کے حوالے کر دی گئی تو وہ اسے تلف کر دیں گے تو اس بات کی اجازت ہے کہ ان کی دولت انہیں نہ دی جائے' اس لئے کہ ہر شخص کی دولت دراصل معاشرے کی اجتماعی

دولت ہوتی ہے۔ اس میں معاشرے کی اجتماعی مصلحت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ مال ایسے شخص کے حوالے نہیں کیا جاسکتا جو اسے برباد کر دے۔ اگرچہ وہ مالک ہو' اور یہ کہ عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت عدل و انصاف کے اصولوں کے مطابق کی جائے۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝

"یتیموں کے مال ان کو واپس دو' اچھے مال کو برے مال سے نہ بدل لو' اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ نہ ملا کر کھاؤ' یہ بہت بڑا گناہ ہے۔"

اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو' تین تین' چار چار سے نکاح کر لو لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں۔ بے انصافی سے بچنے کیلئے یہ زیادہ قرین ثواب ہے۔

اور عورتوں کے مہر خوشدلی کے ساتھ ادا کرو' البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمہیں معاف کر دیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔

اور اپنے وہ مال جنہیں اللہ نے تمہارے لئے قیام زندگی کا ذریعہ بنایا ہے' نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو' البتہ انہیں کھانے اور پہننے کیلئے دو اور انہیں نیک ہدایات کرو۔

اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو' یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل عمر کو پہنچ جائیں پھر اگر تم ان کے اندر اہلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو' ایسا کبھی نہ کرنا کہ حد انصاف سے تجاوز کر کے اس خوف سے ان کے مال ہی جلدی جلدی کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے۔ یتیم کا جو سرپرست مالدار ہو وہ پرہیزگاری سے کام لے اور جو غریب ہو وہ معروف طریقہ سے کھائے۔ پھر جب ان کے مال ان کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اس پر گواہ بناؤ' اور حساب لینے کے لئے اللہ کافی ہے۔"

جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا درج بالا موکد ہدایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے جاہلی معاشرے میں عورتوں اور بچوں اور ضعفاء کو بری طرح پامال کیا جاتا تھا۔ مدینہ طیبہ کے اسلامی معاشرے میں دور جاہلیت کے یہ آثار ابھی تک باقی تھے' اس لئے کہ مدینہ کا اسلامی معاشرہ اصلاً عرب کے جاہلی معاشرے سے کٹ کر وجود میں آیا تھا۔ اور قرآن مجید اس کی تہذیب و تربیت کر رہا تھا' اور اسلامی جماعت کو نئی اقدار اور نئے تصورات سے مزین کیا جا رہا تھا' مسلمانوں کو نیا شعور دیا جا رہا تھا' ان کے اندر نئے خدوخال پیدا کئے جا رہے تھے اور جدید رسم و رواج پیدا کئے جا رہے تھے۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا

"یتیموں کے مال ان کو واپس دو' اچھے مال کو برے مال سے نہ بدل لو' اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ نہ ملا کر کھاؤ' یہ بہت بڑا گناہ ہے۔"

یتیموں کو وہ مال دیدو جو تمہارے تصرف میں ہیں' اور یہ نہ کرو کہ یتیموں کو مال دیتے وقت ردی اموال ان کو دیدو اور قیمتی اپنے پاس رکھ لو۔ مثلاً یہ کہ ان کی اچھی اراضی خود لے لو اور اپنی کم درجے کی اراضی انہیں دیدو' اسی طرح اچھے مویشی خود لے لو اور انہیں بے کار مویشی دیدو' یا تقسیم کرکے وہ انہیں گھٹیا حصہ دیدو' یا نقد مال میں انہیں کھوٹے سکے دیدو کیونکہ نقد میں قیمتی اور کھوٹے دونوں سکے ہوتے ہیں۔ نیز ان کی دولت کو اپنی دولت کے اندر ملا کر بھی نہ کھاؤ۔ سب کا سب یا اس کا کوئی حصہ۔ اللہ کے نزدیک یہ گناہ کبیرہ ہے۔ اللہ تمہیں اس گناہ کبیرہ سے متنبہ کرتا ہے۔

یہ سب واقعات اس وقت سوسائٹی میں بالعموم ہوا کرتے تھے جب اسلام آیا اور لوگوں کو ان ہدایات سے خطاب کیا گیا۔ اس خطاب ہی سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ مخاطبین کے اندر ایسے لوگ موجود تھے' جن سے اس قسم کی غلطیاں سرزد ہوا کرتی تھیں۔ اور یہ امور جاہلیت کے آثار باقیہ میں سے تھے۔ ہر جاہلی نظام میں ایسے ہی امور بالعموم پائے جاتے ہیں۔ آج ہم گاؤں اور شہروں میں جاہلیت جدیدہ کے نظاموں میں روز ان امور کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آج بھی مختلف طریقوں سے یتیموں کے مال کھائے جاتے ہیں' اور اس کیلئے مختلف حیلے اور بہانے تراشے جاتے ہیں۔ آج کل مفصل قانونی تدابیر اور افسران حکومت کی جانب سے یتیموں کے اموال کی کڑی نگرانی کے باوجود اولیاء زیر کفالت لوگوں کے مال و جائیداد میں خرد برد کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں جو مشکلات ہیں' انہیں قانون سازی اور حکومتی نگرانی کے ذریعہ سے حل نہیں کیا جاسکتا' اس مسئلہ میں یہ چیزیں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتیں اس لیے اس کا کوئی حل ہے تو وہ صرف تقویٰ اور خدا خوفی میں ہے۔ یہ تقویٰ ہی ہے جو دل اور ضمیر کے اندر ایک چوکیدار بٹھا دیتا ہے۔ اور اس کے بعد کبھی قانون سازی اور عمال حکومت کی نگرانی مؤثر ہو سکتی ہے۔ یہ تقویٰ ہی تھا' جس کی وجہ سے اس آیت کے نزول کے بعد حیران کن واقعات وجود میں آئے۔ یتیموں کے اولیاء نے اس قدر احتیاط شروع کردی کہ یتیموں کے اموال کو اپنے مالوں سے علیحدہ کردیا گیا' ان کا کھانا پینا جدا کردیا گیا' تاکہ صحابہ کرام اس گناہ کبیرہ میں مبتلا ہونے سے پوری طرح بچ نکلیں۔ جس کی بابت اللہ تعالیٰ نے ڈراتے ہوئے فرمایا۔ "یہ بہت بڑا گناہ ہے۔"

اس کرہ ارض پر صرف قانون سازی اور اجتماعی تنظیم کے ذریعہ کوئی اصلاحی اسکیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ قانون سازی اور تنظیم سے پہلے دلوں کے اندر خدا خوفی اور تقویٰ کا چوکیدار بٹھانا ضروری ہے۔ جس کا دل پر قبضہ ہو اور ضمیر خود نظم قائم کرنے اور قانون پر عمل کرنے پر آمادہ ہو' اور یہ تقویٰ اس وقت تک کسی نظم اور قانون کے بارے میں پرجوش نہیں ہو سکتا۔ جب تک یہ قانون ایسے منبع سے صادر نہ ہو جو تمام انسانی خفیہ رازوں سے واقف نہ ہو' وہ منبع ضمیر پر بھی حکمران نہ ہو' صرف ایسے حالات ہی میں ایک فرد کے دل کے اندر شدید احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ قانون کا احترام کرے۔ وہ اللہ جل شانہ سے خیانت نہ کرے وہ اس کے حکم اور اس کے ارادے کے ساتھ تصادم کا رویہ اختیار نہ کرے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس فرد کی نیت اور اس کے اعمال دونوں سے اچھی طرح باخبر ہوتا ہے۔ اس احساس کے دباؤ میں ارتکاب گناہ کے معاملے میں اس کے قدم متزلزل ہو جاتے ہیں۔ وہ ڈر کی وجہ سے کانپنے لگتا ہے۔ اور اس کے جذبہ خدا خوفی میں جوش آجاتا ہے۔

اللہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے اور ان کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ خود انسان کے نفس اور اس کے اعصاب کا خالق ہے۔ اور اسی نے ان کی تخلیق کی مناسبت سے ان کے لئے اپنے قانون کو قانون قرار دیا ہے۔ اپنی شریعت قرار دیا ہے۔ اس کیلئے اپنے نظام زندگی کو نظام قرار دیا ہے۔ اور اس کے نفاذ کیلئے خود اپنا منہاج اور طریق کار دیا ہے۔ تاکہ لوگوں کے دلوں میں ان چیزوں کا وزن ہو۔ اور وہ اس قانون اور منہاج کی خلاف ورزی کی جرات نہ کریں۔ اور اللہ سے ڈریں۔ اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح علم تھا کہ دنیا میں کوئی بھی قانونی

نظام اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس کی نسبت ذات باری کی طرف نہ ہو' اس لئے کہ لوگوں کے دلوں میں ذات باری کا خوف اور اس کی رحمت کی امید ہوتی ہے۔ نیز انہیں پورا یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دل کی خفیہ باتوں سے واقف ہیں اور وہ دلی بھیدوں کے جاننے والے ہیں۔ نیز انسان کا بنایا ہوا قانون اس وقت تک چلتا ہے اور اس پر عمل ہوتا ہے' جب تک پکڑ دھکڑ کا خوف قائم رہتا ہے۔ اور سخت ترین ظاہری نگرانی اپنا کام کر رہی ہوتی ہے۔ جس کا دخل اور اثر لوگوں کے دلوں پر نہیں ہوتا لیکن جونہی یہ ظاہری نگرانی کمزور ہوتی ہے' لوگ اس قانون کی خلاف ورزی شروع کر دیتے ہیں یا جب بھی انہیں حیلے اور بہانے کا موقعہ ملتا ہے' باوجود اس کے کہ انہیں پتہ ہو سکتا ہے کہ اگر وہ پکڑے گئے اور ان کی سخت سرزنش ہوگی اور جانی اور مالی نقصان ہو گا۔

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ﴿٣﴾

"اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں' دو دو' تین تین' چار چار سے نکاح کر لو' لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں' بے انصافی سے بچنے کیلئے یہ زیادہ قرین صواب ہے۔"

حضرت عروہ بن زبیر ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ ؓ سے دریافت فرمایا کہ آیت "اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو۔" کا مفہوم کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا بھانجے! یہ یتیم بچی وہ تھی جو اپنے ولی کی تحویل میں ہوتی تھی۔ یہ ولی کے ساتھ مال میں شریک ہوتی تھی' اسے اس کے مال اور اس کی خوبصورتی میں دلچسپی ہوتی تھی' اس طرح اس کا ولی یہ چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ نکاح کرلے بغیر اس کے کہ اسے مہر ادا کرے' اور اسے وہ حقوق دے جو اسے دوسرے دلچسپی رکھنے والے دینے کیلئے تیار ہوتے تھے۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان اولیاء کو یہ حکم دیا کہ ان کے زیر کفالت یتیموں سے صرف اس صورت ہی میں نکاح کر سکتے ہیں جب ان کے ساتھ عدل کر سکیں۔ ان کو ان کے معیار کے مطابق مہر ادا کر سکیں۔ اگر وہ نہیں کر سکتے تو وہ دوسری عورتوں سے نکاح کر لیں۔" عروہ فرماتے ہیں' حضرت عائشہ ؓ نے فرمایا "اس آیت کے نزول کے بعد لوگوں نے حضور ؐ سے فتویٰ دریافت کیا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔":

"لوگ عورتوں کے بارے میں تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں' کہو اللہ تمہیں ان کے معاملے میں فتویٰ دیتا ہے' اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سنائے جا رہے ہیں۔ یعنی وہ احکام جو ان یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں' جن کے حق تم ادا نہیں کرتے اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو۔" (۴: ۱۲۷) حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ جو کہا ہے۔ "اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو۔" یہ اس صورت میں ہوتا ہے کہ اس کے پاس نہ پیسے ہوں اور نہ خوبصورتی ہو' اس لئے انہیں صاحب مال و جمال یتیمہ سے بھی نکاح کرنے سے منع کر دیا گیا' الا یہ کہ اس کے ساتھ عدل و انصاف کیا جائے۔ اس لئے کہ مال و جمال نہ ہونے کی صورت میں تو وہ ایسی یتیموں سے نکاح نہ کرتے تھے۔" (بخاری)

حضرت عائشہ ؓ کی مذکورہ بالا حدیث سے ایام جاہلیت کی مروجہ رسومات میں سے بعض رسموں کی یہاں تصویر کشی کی گئی ہے۔ اور یہ

رسوم جاہلیت کے زمانہ سے اسلامی معاشرے میں بھی ابھی تک موجود تھیں۔ اس لئے قرآن کریم کی یہ آیات نازل ہوئیں اور ان کی ممانعت کرکے ان کی جڑ کاٹ دی گئی۔ غرض یہ رفیع الشان ہدایات دیکر معاملے کو پھر انسان کے ضمیر اور اس کے دلی تقویٰ کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا ............ (اگر تم یتیم عورتوں کے ساتھ بے انصافی سے ڈرتے ہو۔)

اس معاملے کا تعلق محض انسان کے قلب و ضمیر کے ساتھ ہے اور اس کے شعور خدا خوفی سے ہے۔ اگر ولی کو یہ خطرہ ہو کہ وہ عدل نہ کر سکے گا تو اسے چاہئے کہ وہ اس قسم کے نکاح سے اجتناب کرے۔ لیکن آیت کی عبارت عام ہے' حکم اور ہدایت یہی ہے کہ عدل کے ہر مقام پر عدل کا برتاؤ کیا جائے۔ چاہے اس کا تعلق مہر کے معاملے سے ہو یا اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے نشیب و فراز سے ہو' مثلاً یہ کہ وہ صرف مال کیلئے یہ نکاح کر رہا ہو اور عورت کی ذات سے اسے دلچسپی نہ ہو' یا اسے اس کے ساتھ حسن معاشرے کے سلسلے میں کوئی رغبت نہ ہو' یا یہ کہ مرد اور عورت کی عمر میں بہت زیادہ فرق ہو اور نباہ ممکن نہ ہو' اور نہ نکاح کے معاملے میں مرد سنجیدہ ہو اور بعض اوقات صورت حال یہ ہوتی ہے کہ لڑکی شرم و حیاء کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتی یا اسے یہ خطرہ ہوتا ہے کہ اگر اس کا نکاح باہر ہوا تو اس کا مال جاتا رہے گا وغیرہ وغیرہ' جن حالات میں عدل ممکن نہیں ہوتا' قرآن کریم کا یہ طریق کار یہ ہے وہ ضمیر کے اندر چوکیدار بٹھاتا ہے۔ اور تقویٰ کی نگرانی قائم کرتا ہے۔ اس کی پہلی آیت کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا تھا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا۝ ............ (اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔)

اگر اولیاء ان یتیم عورتوں کے ساتھ انصاف کرنے کی قدرت اپنے اندر نہیں پاتے' تو ان کے علاوہ دوسری عورتیں بہت ہیں' اس لئے بدگمانی اور شبہات سے اپنے آپ کو بچانے کیلئے' موزوں یہی ہے کہ وہ دوسری عورتوں سے نکاح کرلیں۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝

"اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں' ان سے دو دو' تین تین' چار چار سے نکاح کرلو' لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں' بے انصافی سے بچنے کیلئے یہ زیادہ قرین صواب ہے۔"

تعدد ازواج کی یہ رخصت مشروط ہے۔ یہ کہ اگر تمہیں بے انصافی کا خوف ہو تو نہ کرو صرف ایک کرو' یا اپنی مملوکہ عورتوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرلو۔

مناسب یہ ہے کہ ان تحفظات کے ساتھ تعدد ازواج کی رخصت کی حکمت اور مصلحت پر یہاں کچھ کہہ دیا جائے۔ خصوصاً ہمارے اس دور میں' جس میں لوگ اپنے آپ کو اپنے رب کے مقابلے میں زیادہ عالم سمجھتے ہیں' وہ رب جس نے انہیں پیدا کیا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ انسانی زندگی' انسانی فطرت اور انسانی مصلحتوں کی بابت خالق تعالیٰ کے مقابلے میں زیادہ بصیرت کے مالک ہیں۔ اور وہ ان معاملات میں محض اپنی ذاتی آراء اور خواہشات نفسانیہ کے تحت کلام کرتے ہیں اور جہالت اور تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔ گویا آج کے جدید حالات اور ضروریات کو خود انہوں نے پیدا کیا ہے۔ وہ انہیں اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ان حالات کا مقابلہ خود ہی کرسکتے ہیں اور گویا یہ حالات اللہ میاں کے پیش نظر نہ تھے۔ نہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اس وقت کوئی فیصلہ کیا ہے جس وقت وہ انسانوں کیلئے قانون سازی

کر رہا تھا۔

اس معاملے میں ایسے حضرات کا دعویٰ اور ان کے فیصلے جہالت اور کور چشمی پر مبنی ہیں' جبکہ ایک پہلو سے یہ ان کی جانب سے نہایت ہی کبرو غرور اور بارگاہ الٰہی میں کھلی گستاخی ہے۔ اور اپنے معنوی اعتبار سے یہ گمراہی اور بے راہ روی ہے اور ایک قسم کا کفر ہے۔ لیکن اس کے باوجود لوگ ایسی باتیں کئے چلے جاتے ہیں اور کوئی نہیں ہے جو ان جاہلوں' کور چشموں' متکبرین' بے راہ رو کفار کو چیلنج کرے۔ حالانکہ وہ اللہ اور اس کی شریعت کے مقابلے میں ایسی جسارت کر رہے ہیں جو ناقابل برداشت ہے۔ وہ اللہ اور اس کی جلالت شان پر ہاتھ ڈال رہے ہیں۔ اور اللہ کی ذات اور اس کے تجویز کردہ نظام حیات کے خلاف یہ قبیح حرکت کر رہے ہیں۔ اور بڑے امن و سکون اور کامیابی اور عافیت کے ساتھ کام کر رہے ہیں اور ان لوگوں کو ان حلقوں سے برملا امداد مل رہی ہے جن کی دلچسپی ہے کہ مسلمانوں اور ان کے دین کے خلاف یہ کام ہوتا رہے۔

یہ مسئلہ یعنی مسئلہ تعدد ازدواج جسے اسلام نے ان تحفظات اور شرائط کے ساتھ جائز رکھا ہے' مناسب ہے کہ اسے بڑی سادگی' وضاحت اور فیصلہ کن انداز میں لیا جائے۔ اور ان حالات اور واقعات کو پیش نظر رکھا جائے جو کسی معاشرے میں عملاً موجود ہوتے ہیں اور اس وقت بھی موجود تھے۔

امام بخاری ؒ نے اپنی مسند کے ساتھ یہ روایت کی ہے کہ غیلان ابن سلمہ ثقفی اسلام لائے۔ اس وقت اس کی دس بیویاں تھیں۔ اسے حضور ؐ نے حکم دیا: "ان میں سے چار کو چن لیں۔"

امام ابوداؤد نے روایت فرمائی ہے کہ عمیر اسدی نے فرمایا: جس وقت میں نے اسلام قبول کیا' میری آٹھ بیویاں تھیں۔ میں نے اس کا تذکرہ رسول ؐ خدا سے کیا تو آپ ؐ نے فرمایا: "ان میں سے چار کو چن لو۔"

امام شافعی ؒ نے اپنی مسند میں فرمایا' مجھے ایک شخص نے یہ اطلاع دی جس نے یہ بات ابوالزیاد سے سنی تھی' انہیں عبدالمجید نے بتایا تھا' انہیں سہیل ابن عبدالرحمٰن نے بتایا' انہوں نے عوف ابن الحارث سے نقل کیا' انہیں نوفل ابن معاویہ دیلمی سے انہوں نے کہا: "جس وقت میں اسلام لایا میرے ہاں پانچ بیویاں تھیں۔ مجھے رسول ؐ اللہ نے حکم دیا: "ان میں سے چار چن لو' جو بھی تمہیں پسند ہوں اور جس ایک کو چاہو علیحدہ کر دو۔"

جس وقت اسلام آیا' اس وقت لوگوں کے ہاں دس یا دس سے بھی زیادہ بیویاں ہوا کرتی تھیں۔ اور بیویوں کی تعداد پر کوئی قید و بند نہ تھا۔ ان حالات میں اسلام نے تعداد پر یہ پابندی عائد کر دی اور حکم دیا کہ کوئی مسلمان اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یعنی وہ صرف چار کی حد تک جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ اسلام نے مزید ایک اور پابندی عائد کر دی۔ وہ یہ کہ اگر تعداد زیادہ ہو تو ان کے درمیان مکمل عدل اور انصاف کا قائم کرنا بھی فرض ہے۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ وہ انصاف نہ کر سکے گا تو اس پر لازم ہے کہ وہ ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے۔ یا ان عورتوں پر اکتفا کرے جو کسی کی مملوکہ ہیں۔

اس پس منظر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے تعدد ازدواج کی اجازت بالکل نہیں دی۔ اسلام نے زیادہ بیویوں کی تعداد کی تحدید کر دی۔ اسلام نے اس معاملے کو مرد کی خواہش نفس ہی پر نہیں چھوڑ دیا بلکہ اسے عدل و انصاف کی شرط کے ساتھ مشروط کر دیا۔ اگر عدل نہ ہو گا تو تعدد ازدواج کی اجازت نہ ہو گی۔

اب سوال یہ ہے کہ اسلام نے تعدد ازواج کی رخصت اور اجازت ہی کیوں دی؟ اسلامی نظام زندگی انسانوں کیلئے وضع کیا گیا ہے۔ وہ ایک مثبت اور عملی نظام ہے۔ وہ انسان کی فطرت اور اس کے وجود کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ وہ انسان کے حالات اور انسان کی ضروریات

کے مطابق وضع کیا گیا ہے۔ وہ مختلف حالات، مختلف علاقوں اور مختلف زمانوں میں انسان کے تغیر پذیر شب و روز کو سامنے رکھ کر وضع کیا گیا ہے۔ وہ فی الواقعہ ایک مثبت اور حقیقت پسندانہ نظام ہے۔ وہ انسان کو یوں لیتا ہے جس طرح کسی دور میں انسان فی الواقعہ ہوتا ہے۔ انسان جہاں کھڑا ہوتا ہے یہ نظام اسی مقام سے اس کے سفر کا آغاز کرتا ہے۔ اور اسے وہاں سے لیکر ترقیوں کے اعلیٰ مدارج تک بلند کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسے بام عروج تک پہنچا دیتا ہے۔ وہ انسان کی فطرت حقیقی کا نہ انکار کرتا ہے نہ اسے کراہیت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ انسان کے حقیقی واقعات سے نہ صرف نظر کرتا ہے اور نہ ان سے لاپرواہی برتا ہے۔ وہ اس کی رفتار اصلاح و ترقی میں نہ تو تشدد کرتا ہے اور نہ بے اعتدالی کرتا ہے۔

اسلامی نظام زندگی خالی خولی ڈھینگ نہیں ہے، نہ وہ سوقیانہ گپ شپ ہے، نہ وہ خالی اور غیر واقعی مثالی تصور ہے۔ اور نہ ہی وہ محض تصورات اور امیدوں پر مبنی ہے۔ جن کا فطرت انسانی کے ساتھ تصادم ہو، جن کا انسان کے واقعات اور حالات کے ساتھ کوئی جوڑ نہ ہو اور جو اس طرح ہو جس طرح بخارات ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں......... بلکہ وہ ایک ایسا نظام ہے جو انسان کی تخلیق کو مدنظر رکھتا ہے۔ وہ انسانی معاشرہ میں پاکیزگی کا داعی ہے، اس لئے وہ انسانی معاشرہ میں صرف مادیت کو رواج نہیں دیتا۔ ایسی مادیت جو انسان کے چہرے بشرے کو خراب کردے۔ جو انسانی معاشرے کو آلودہ کردے اور یہ سب کچھ ان نام نہاد ضرورت کے پھندوں کی صورت میں جو حقائق سے متصادم بلکہ اسلام یہ ہدایت کرتا ہے کہ ایسی صورت حال پیدا کی جائے جس میں تخلیق انسانیت محفوظ ہو، جس میں معاشرہ پاکیزہ ہو، اور یہ سب کچھ بسہولت اور نہایت ہی قلیل جدوجہد سے حاصل کیا جائے اور اس کے لئے فرد اور معاشرے کو کم سے کم جدوجہد کرنا پڑے۔

اسلامی نظام زندگی کے ان اساسی تصورات کو جب ہم پیش نظر رکھیں اور پھر مسئلہ تعدد ازدواج پر غور کریں تو جو نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں :

ا:۔ سب سے پہلے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اکثر معاشروں میں ایسے حالات پائے جاتے ہیں جن میں شادی کے قابل عورتوں کی تعداد اور شادی کے قابل مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ یہ واقعات گزشتہ تاریخی معاشروں میں بھی رہے ہیں اور دور حاضر کے معاشروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ نیز عورتوں کی زیادتی کی نسبت ا:۴ سے کبھی بھی زیادہ نہیں رہی ہے۔ یہ کمی بیشی ہمیشہ ایک اور چار کے درمیان ہی رہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم ایسی صورت حال کا کیا حل کریں گے۔ کیونکہ ایسے حالات بار بار پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ اگرچہ ان میں مرد اور عورت کے درمیان نسبت میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ یہ ایسی صورت حال کا علاج ممکن ہے؟

کیا محض شانے ہلانے سے اس صورت حال کا علاج ممکن ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ایسی صورت حال سے لاتعلق ہو جائیں اور اسے یونہی چھوڑ دیں؟ اور جس طرح ممکن ہو حالات اپنا رخ خود متعین کریں اور جو صورت حال پیدا ہو اسے قبول کرتے چلے جائیں۔

محض شانے ہلانے سے مسائل حل نہیں ہوا کرتے اور کسی معقول انسان کیلئے یہ حل قابل قبول ہے کہ حالات جو بھی رخ اختیار کریں اسے قبول کر لیا جائے۔ کسی غیرت دار انسان اور کسی سنجیدہ شخص کے نزدیک یہ موقف قابل قبول نہ ہوگا جو نسل انسانی کو محترم سمجھتا ہو۔

اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ کوئی نظم اور ضابطہ موجود ہو اور اس مسئلے کے حل کیلئے کوئی عملی قدم اٹھایا جائے۔ غور و خوض کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس مسئلے کے صرف تین حل ممکن ہیں :۔

ا:۔ یہ کہ ہر شخص جو شادی کے قابل ہے وہ شادی کی ایک قابل عورت کے ساتھ شادی کرے۔ اور اس کے علاوہ ایک یا دو دو عورتیں رہتی ہیں ان کو بغیر خاوند کے یونہی چھوڑ دیا جائے اور انہیں ان کی پوری زندگی میں خاوند نہ ملے۔

۲:۔ یہ کہ ہر وہ شخص جو شادی کے قابل ہے ایک شادی کی قابل عورت کے ساتھ قانونی نکاح کرے اور اس کے ساتھ وہ جائز تعلقات قائم کرے لیکن دوسری عورتوں کے ساتھ وہ دوستی اور حرام اور ناجائز تعلقات قائم کرے یعنی ان عورتوں کے ساتھ جن کے خاوند نہیں ہیں۔ اس طرح ان کے تعلقات ناجائز تعلقات ہوں اور وہ تاریکی میں زندگی بسر کریں۔

۳:۔ تیسری صورت یہ ہے کہ شادی کے قابل لوگ ایک سے زیادہ شادی کے قابل عورتوں کے ساتھ شادی کریں۔ اور اسی طرح ایک مرد ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ جائز تعلقات قائم کرے اور اس کی بیوی ہو اور کھلے طور پر وہ روشنی اور دائرہ قانون کے اندر اس کے ساتھ زندگی بسر کرے اور چوری اور حرام کاری کا ارتکاب نہ ہو۔

ذرا غور فرمایئے' پہلی صورت خلاف فطرت ہے۔ اور ایک عورت کیلئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ پوری زندگی تنہائی میں بسر کرے۔ اور کسی مرد کے ساتھ تعلق قائم نہ کرے۔ اس حقیقت کو ان لوگوں کے دعاوی سے رد نہیں کیا جاسکتا ہے جو منہ پھٹ ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عورت محنت اور مزدوری کر کے مردوں سے مستغنی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ ایسے سطحی' غیر سنجیدہ اور جاہل گپیں ہانکنے والوں کے فہم و ادراک سے یہ مسئلہ بہت ہی اونچا ہے۔ اس لئے کہ یہ لوگ فطرت انسانی سے بے خبر ہیں۔ عورت کی ہزار محنت اور اس کی ہزار ملازمتیں بھی اسے اپنی فطری احتیاج اور اپنے فطری تقاضے سے مستغنی نہیں کر سکتیں۔ چاہے یہ تقاضے اس کے جسمانی تقاضے ہوں یا اس کی عقل اور روح کے تقاضے ہوں۔ وہ یہ کہ عورت امن و سکون کے ساتھ اپنے خاندان کے اندر رہے اور مرد کسب معاش کیلئے جدوجہد کرے۔ اسی طرح مرد بھی اپنی معاشی جدوجہد اور معاشی سرگرمیوں کے بعد اس بات کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک خاندان کی طرف لوٹے۔ اس معاملے میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ اس لئے کہ وہ ایک ہی جان سے پیدا ہوئے ہیں اور ان کی ایک ہی فطرت ہے۔

دوسری صورت اسلام کے پاکیزہ رجحانات کے بالکل متضاد ہے۔ اور اسلام کے پاکیزہ معاشرتی نظام سے بھی لگا نہیں کھاتا۔ نیز یہ صورت حال عورت کی اسلامی شرافت کے بھی خلاف ہے۔ جو لوگ معاشرہ میں عریانی اور فحاشی کے پھیلاؤ کے خلاف نہیں ہیں' یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنے آپ کو زیادہ عالم سمجھتے ہیں اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی شریعت پر دست درازی کرتے ہیں اور اس فعل کا ارتکاب یہ لوگ محض اس لئے کرتے ہیں کہ اس فعل قبیح سے ان کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کے لوگ شریعت اسلامیہ کے دشمنوں کی جانب سے ہر قسم کی حوصلہ افزائی پاتے ہیں۔

اب رہ گئی صرف تیسری صورت حال اور اسلام نے اسے اختیار کیا ہے۔ اسلام نے صرف تعدد ازواج کی اجازت دی ہے اور اس پر کئی حدود و قیود عائد کی ہیں اور یہ اجازت اسلام نے اس حقیقی صورت حال کے حل کرنے کیلئے دی ہے جس میں محض شانے ہلانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور نہ ایسے حقیقی حالات اور مشکلات کا حل محض متفلسفانہ ادعاء سے ممکن ہوتا ہے اور اس تیسری صورت کو اسلام نے اس لئے اختیار کیا ہے کہ یہی اس واقعی صورت حال کا مثبت حل ہے۔ اور ایک مثبت طرز عمل ہے۔ یعنی یہ کہ انسان کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے۔ جس طرح انسان ہے۔ اپنی موجودہ فطرت اور اپنے موجودہ حالات کے ساتھ۔ نیز پاکیزہ اخلاق اور ایک صاف اور ستھرے معاشرے کے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ نیز انسان کو بدکاری اور گندگی کے دلدل سے نکالنے کیلئے اسلام نے جو منہاج تجویز کیا ہے اس کے عین مطابق یعنی نہایت ہی نرمی اور محبت کے ساتھ انسان کا ہاتھ پکڑ کر اسے بام عروج تک پہنچانے کا طریقہ کار۔

یہ تو تھا ایک پہلو' اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی معاشروں میں چاہے وہ قدیم ہوں یا جدید' آج کے ہوں یا کل کے' ان میں ایک دوسری حقیقت نظر آتی ہے۔ نہ اس سے انکار کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہی اسے نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ مرد میں بچے پیدا کرنے کی قدرت اور صلاحیت ستر سال یا اس کے بھی آگے کی عمر تک طویل ہوتی ہے۔ جبکہ عورت میں یہ صلاحیت ۵۰ سال کے لگ بھگ ختم ہو جاتی

ہے۔ اس طرح بیس سال ایسے آجاتے ہیں جن میں مرد تو بچے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں عورت بچے پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اور یہ حقیقت بھی بالکل واضح ہے کہ مرد اور عورت کو الگ پیدا کرکے ان کے درمیان ملاپ کی زندگی اور نسل انسانی کو جاری رکھنے کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس کرۂ ارض کی آبادی کا انتظام انسان کی آبادی میں کثرت اور پھیلاؤ کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ امر خلاف فطرت انسانی ہو گا کہ ہم کوئی ایسی رسم ڈالیں جس سے ایک مرد بیس سال تک اپنے فطری وظائف پورے کرنے کا اہل ہی نہ رہے۔ جبکہ اسلام نے جو قانون بنایا ہے وہ ہر دور کے حالات میں ہر قسم کے معاشروں کیلئے موزوں ہے اور فطری تقاضوں کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے۔ جبکہ یہ قانون بھی محض اجازت کی شکل میں ہے۔ یہ بات لازم نہیں کی گئی کہ ہر شخص لازماً چار شادیاں کرے۔ بلکہ ایک عام اباحت دی گئی ہے اور لوگوں کیلئے ایک قسم کی وسعت پیدا کی گئی ہے کہ اگر ان کو ضرورت پڑے تو وہ حالت ضرورت میں اس سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ وہ ہم آہنگی ہے جو خدائی قانون اور انسانی فطرت کے اندر ہمیشہ پائی جاتی ہے۔ جبکہ اس تناسق اور ہم آہنگی کا خیال انسان کے بنائے ہوئے قوانین میں بالعموم نہیں رکھا جاتا۔ اس لئے کہ انسان کا معاملہ ہمیشہ محدود ہوتا ہے اور وہ دور رس انفرادی حالات اور جزئیات کا مطالعہ کرنے سے اکثر قاصر رہتا ہے۔ اس سے کئی گوشے پوشیدہ رہ جاتے ہیں اور زندگی کے کئی حالات و احتمالات اس کے دائرے سے باہر رہ جاتے ہیں۔

اس مذکورہ بالا حقیقت کے حوالے سے بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ مرد زیادہ بچے پیدا کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے جبکہ عورت کو مزید بچے پیدا کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہ عدم دلچسپی بعض اوقات کبرسنی کی وجہ سے ہوتی ہے اور بعض اوقات بیماری کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور ان حالات میں فریقین کی دلی خواہش بھی ہوتی ہے کہ وہ رشتہ زوجیت میں بندھے رہیں اور ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار نہ کریں۔ اب ایسے حالات میں ہم کیا حل پیش کریں گے۔

کیا محض شانے اچکانے سے یہ مسائل حل ہو جائیں گے؟ یا اس طرح مسئلہ حل ہو گا کہ زوجین میں سے کوئی فریق اپنے سر کو دیوار سے پھوڑ دے یا ان وسائل اور حقیقی سوالات کا جواب ہم محض گپ شپ میں ٹال دیں اور ظریفانہ بذلہ سنجیاں کرتے ہوئے آگے بڑھ جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بذلہ سنجیوں اور محض شانے اچکانے سے کبھی حقیقی مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔ زندگی اور اس کے فطری حقائق سنجیدہ امور ہیں۔ زندگی کی مشکلات حقیقی ہوتی ہیں اور ان کا حل بھی حقیقت پسندی سے ممکن ہے۔

اس سوال کا حل بھی صرف تین طریقوں سے ممکن ہے۔

۱:- یہ کہ ہم مرد پر یہ پابندی عائد کر دیں کہ وہ پچاس سال کے بعد اپنے فطری وظائف کی ادائیگی بند کر دے اور ہم اسے کہہ دیں کہ اے مرد، اب یہ بات تمہارے ساتھ نہیں جچتی۔ نیز آپ کے نکاح میں جو عورت موجود ہے اس کی کرامت و شرافت اور عزت و احترام اور حقوق کے یہ بات منافی ہے۔

۲:- دوسری صورت یہ ہے کہ ہم ایسے شخص کو آزاد چھوڑ دیں اور وہ جس عورت سے چاہے دوستیاں گانٹھتا پھرے۔

۳:- تیسری صورت یہ ہے کہ ہم اسے اجازت دیدیں کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکے۔ اپنے حالات اور اپنی ضروریات کے مطابق، اور یوں ہم پہلی بیوی کو طلاق دلوانے سے بھی بچ جائیں۔

جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے وہ انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ یہ تجرد انسانی نفس برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ انسانی اعصاب اور انسانی نفس اس پابندی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور اگر ہم بذریعہ قانون اور قوت یہ پابندی عائد کر دیں کہ اس صورت میں تو معاشرے کیلئے

عائلی زندگی عذاب جہنم بن جائے گی اور ہر شخص عائلی زندگی کو ان مشکلات و مصائب کی وجہ سے پسند نہیں کرے گا اور اس کے خوفناک نتائج نکلیں گے۔ اور یہ سب امور وہ ہیں جنہیں اسلام کسی معاشرے کیلئے پسند نہیں کرتا' اس لئے کہ اسلام کی پالیسی تو یہ ہے کہ وہ ایک گھر کو پرسکون بنادے اور مرد کیلئے اس کی بیوی کو محبوبہ اور لباس بنادے۔

دوسری صورت اسلام کے اخلاقی رجحانات کے خلاف ہے۔ اور انسانی زندگی کی ترقی جس نہج پر اسلام چاہتا ہے وہ اس کے بھی خلاف ہے۔ نیز انسانی معاشرے کی تطہیر اور پاکیزگی کیلئے اسلام نے جو منہاج اپنایا ہے' یہ اس کے بھی خلاف ہے۔ اس لئے کہ اسلام انسانی معاشرے کو اس لائق بناتا ہے جو ایک حیوانی مقام سے اس کو انسان کے اشرف مقام تک بلند کر دے۔

اب صرف تیسری صورت رہ جاتی ہے' جو انسان کی واقعی فطری ضروریات کو بھی پورا کرتی ہے۔ وہ اسلام کے اخلاقی نقطہ نظر سے بھی ہم آہنگ ہے۔ یہ صورت پہلی بیوی کے حقوق زوجیت کو بھی مد نظر رکھتی ہے' اور اس صورت میں بھی یہ ممکن ہے کہ زوجین اپنی خواہش کے مطابق اپنی ازدواجی زندگی جاری رکھ سکیں۔ اور ان کی ایک دوسرے کے ساتھ جو یادیں وابستہ ہیں وہ بھی اپنی جگہ قائم رہیں۔ اور انسان کیلئے یہ ممکن اور آسان ہو جائے کہ وہ نرمی' سہولت اور حقیقت پسندی کے ساتھ اپنی زندگی کو ترقی کی جانب گامزن رکھے۔

اور یہی صورت حال اس وقت درپیش آ جاتی ہے جب کسی کی بیوی بانجھ ہوتی ہے۔ اور مرد کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد ہو' ایسے حالات میں بھی صرف دو صورتیں ہوتی ہیں کوئی تیسری صورت نہیں ہوتی۔

۱:۔ یہ کہ اسے خاوند طلاق دیدے اور دوسری بیوی لاکر اس کے ذریعہ وہ حصول اولاد کی فطری خواہش کو پورا کرے۔

۲:۔ یہ کہ وہ دوسری بیوی بھی کرے لیکن پہلی کو بھی اپنی زوجیت میں رکھے اور اس کے حقوق ادا کرے۔

ہمارے دور میں بعض مرد اور عورتیں اپنے آپ کو دانشور ظاہر کر کے ایسے بکواس کرتے ہیں کہ تعدد ازدواج کے مقابلے میں پہلی صورت بہتر ہے لیکن کم از کم ۹۹% عورتیں ایسی ہوں گی جو طلاق کے مقابلے میں' ایسے حالات میں تعدد ازواج کو ترجیح دیتی ہیں۔ اور اگر ان کو کوئی یہ مشورہ دے کہ وہ طلاق لے لیں تو وہ اس کے منہ پر تھوکیں گی اور ان مشیران کرام پر لعنت بھیجیں گی جو ان کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ بستے گھر خراب ہوں اور اس خرابی کے عوض انہیں کچھ بھی ہاتھ نہ آئے۔ اس لئے کہ اگر کسی عورت کا بانجھ پن ظاہر ہو چکا ہو اور وہ طلاق لے لے تو کون ہے جو اسے نکاح میں لینے کیلئے تیار ہو گا؟ اس کے مقابلے میں اکثر یوں ہوتا ہے کہ ایک بانجھ عورت پر جب خاوند دوسری شادی کرتا ہے تو دوسری عورت کے جو بچے پیدا ہوتے ہیں ان کے ساتھ سابق بیوی کو بہت ہی انس و محبت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ کسی گھر میں بچے تو پھول کی طرح ہوتے ہیں اور جب اس قدر انتظار کے بعد وہ کسی گھر میں آتے ہیں تو اس سے احساس محرومی ختم ہو جاتا ہے اور گھر میں چہل پہل پیدا ہو جاتی ہے۔

غرض ہم جہاں بھی جائیں اور انسانی زندگی کا حقیقت پسندانہ عملی مطالعہ کریں' تو یہ حالات تعدد زوجات کے خلاف کسی بکواس کی تائید نہیں کرتے' نہ ان نام نہاد دانشوروں کی آراء کی کہیں سے تائید حاصل ہوتی ہے۔ زندگی کے واقعات و حقائق ان دانشوروں کی سطحی گپ شپ اور بے راہ روی اور آزادی فکر و عمل کی تائید نہیں کرتے اس لئے کہ یہ موضوع نہایت ہی سنجیدہ ہوتا ہے اور اس میں گپ کے بجائے قطعی اور فیصلہ کن موقف کی ضرورت ہوتی ہے۔......... غرض زندگی کے حقائق پر گہرے غور و فکر کے نتیجے ہی میں باری تعالیٰ کی وہ گہری حکمت واضح ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس نے تعدد زوجات کو قرآن کے عائد کردہ حدود و شرائط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

**فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً**

............ "تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو 'تین تین' چار چار سے نکاح کر لو 'لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو۔"

تعدد زوجات کی یہ رخصت اور اجازت زندگی کے عملی حقائق اور تقاضائے فطرت کے پیش نظر دی گئی ہے۔ اس کے ذریعہ شریعت نے انسانی معاشرے کو 'تقاضائے فطرت اور زندگی کے حقائق کے دباؤ میں' بے راہ روی اور نفسیاتی کشمکش میں مبتلاء ہونے سے بچالیا ہے۔ اور اس اجازت کو جس شرط سے مشروط کیا گیا ہے 'اس کے ذریعہ عائلی زندگی کو انارکی 'افراتفری سے بچالیا گیا ہے۔ نیز بیوی کو بھی خانگی ظلم و ستم سے بچالیا گیا ہے۔ نیز اس کی وجہ سے عورت کی عزت کو بھی محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اور غیر ضروری طور پر توہین آمیز سلوک سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اور احتیاط کامل کے ساتھ عورت کو ایسے مواقع سے بچالیا گیا کہ جن میں اس کے ساتھ توہین آمیز سلوک کیا جائے۔ اور ضروری حالات اور زندگی کے تلخ حقائق کے پیش نظر تعدد زوجات کی اجازت کے ساتھ ساتھ عورت کیلئے مکمل عدل و انصاف کی ضمانت دی گئی ہے۔

جو شخص اسلام کی روح اور اس کی پالیسی کا ادراک رکھتا ہو' وہ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ تعدد ازواج اسلام میں بذاتہ مطلوب ہے اور بغیر فطری اور اجتماعی معاشرتی ضروریات کے جائز ہے۔ اور اس کیلئے محض حیوانی لذتیت اور ایک بیوی کو چھوڑ کر دوسری اختیار کر لینا ہی وجہ جواز ہے۔ جس طرح ایک شخص ایک دوست کو چھوڑ کر دوسرے دوست کو اختیار کر لیتا ہے۔ بلکہ اسے ایک حقیقی صورت میں جائز کیا گیا ہے۔ بعض معاشرتی مشکلات پر قابو پانے کیلئے اسے جائز کیا گیا ہے۔ اور ایسی مشکلات ہر معاشرے میں زندگی کا لازمہ ہوتی ہیں۔

اب اگر انسانی تاریخ کے کسی دور میں بعض لوگوں نے اس اسلامی اجازت اور رخصت سے غلط فائدہ اٹھایا اور انہوں نے اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر عائلی زندگی کو حیوانی لذتیت کیلئے ایک اسٹیج بنادیا اور انہوں نے بیویوں کو اس طرح بدلنا شروع کر دیا جس طرح دوستوں میں تبدیلی آجاتی ہے 'تو اس صورت حال کا اسلام ذمہ دار نہیں ہے۔ اور نہ اس قسم کے عیاش لوگ اسلام کے نمائندے ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ پستی کے ایسے گہرے گڑھے میں محض اس لئے گر گئے ہیں کہ وہ اسلام سے دور ہو گئے تھے۔ اور اسلام کی پاک و صاف اور شریفانہ روح کا وہ ادراک نہ کر سکے۔ پھر ایسے لوگ ایسے معاشروں میں رہ رہے تھے 'جن پر اسلام کی حکمرانی نہ تھی۔ ان میں اسلام کا نظام قانون 'اسلامی شریعت نافذ نہ تھی' ان معاشروں پر اسلامی قوانین غالب نہ تھے۔ تاکہ وہ اسلامی پالیسی اور اسلامی شریعت کے مطیع فرمان ہوتے 'لوگ اسلام کی تعلیمات اور اسلام کی شریعت پر عمل پیرا ہوتے اور اسلام آداب اور اسلامی روایات کا لحاظ رکھتے۔

اسلام کی عائلی زندگی میں گزشتہ اسلامی تاریخ کے دوران جو نقائص پیدا ہوئے ان کے ذمہ دار وہ معاشرے ہیں جو اسلام کے دشمن تھے 'جنہوں نے اپنے آپ کو اسلامی شریعت اور اسلامی قانون سے آزاد کر لیا تھا' یہی معاشرے ان "محلات" اور ان "حریموں" کے ذمہ دار تھے جو انتہائی گھٹیا انداز میں وجود میں آئے۔ اور یہی معاشرے اس امر کے ذمہ دار تھے جنہوں نے عائلی زندگی کو حیوانی لذت کوشی کا اسٹیج ڈرامہ بنایا۔ اس لئے جو لوگ عائلی زندگی سے ان عیوب کو دور کرنا چاہتے ہیں اور اسے صحت مند اصولوں پر استوار کرنا چاہتے ہیں' انہیں چاہئے کہ وہ لوگوں کو اسلامی نظام حیات اور اسلامی شریعت کی حکمرانی کی طرف لوٹائیں۔ انہیں چاہئے کہ وہ معاشرے کو پاکیزگی 'طہارت' استقامت اور اعتدال کی اساس پر از سر نو استوار کرنے کی جدوجہد کریں............ جو بھی مصلح ہے اور اصلاح چاہتا ہے۔ اسے چاہئے کہ بس لوگوں کو اسلامی نظام حیات کی طرف لوٹائے۔ اگر کوئی صرف اس ایک عائلی پہلو میں اصلاح چاہتا ہے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ پورے نظام حیات کے اندر انقلاب ضروری ہے۔ اس لئے کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور وہ صرف اس صورت میں ہی قائم ہو سکتا ہے کہ اسے پورے طور پر اور ہر پہلو سے قائم کیا جائے۔

یہاں جس عدل کا ذکر کیا ہے اور جو مطلوب ہے 'وہ ہمہ گیر عدل ہے۔ معاملات میں عدل' خرچ میں عدل' حسن معاشرت میں بیویوں

کے درمیان عدل ' ہم بستری میں سب کے ساتھ عدل ' رہی یہ بات کی دلی احساسات میں عدل اور نفس انسانی میں پائے جانے والے گہرے میلان کے اندر عدل تو اسلام اس کا مطالبہ کسی انسان سے نہیں کرتا۔ اس لئے کہ گہرے نفسیاتی میلانات و رجحانات انسان کے دائرہ ضبط و ارادہ سے خارج ہوتے ہیں۔ اس عدل سے مراد وہ عدل ہے جس کی تشریح اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں دوسری جگہ خود کر دی ہے۔ "اور تم ہرگز تمام عورتوں کے درمیان مکمل عدل نہیں کر سکتے ہو ' اگرچہ تم بہت چاہو ' اس لئے پوری طرح ایک ہی طرف مائل نہ ہو جاؤ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ دوسری عورت معلق ہو کر رہ جائے۔" بعض تجدد پسندوں نے اس آیت سے یہ معانی نکالے ہیں کہ چونکہ مکمل عدل ممکن نہیں ہے ' اس لئے تعدد ازواج "نتیجتاً" حرام ہو گیا۔ حالانکہ مفہوم یہ نہیں ہے۔ اسلامی شریعت ایک نہایت ہی سنجیدہ قانون ہے ' اس میں اس قسم کا مزاح نہیں کیا جاتا کہ وہ ایک آیت میں ایک بات کو جائز قرار دیدے اور ساتھ ہی دوسری آیت میں بالواسطہ اس اجازت کو واپس لے لے۔ مثلاً دائیں ہاتھ سے کوئی کسی کو کچھ دے اور بائیں ہاتھ سے چھین لے۔ اس لئے پہلی آیت میں جس عدل کا ذکر ہے اور ہدایت دی گئی ہے کہ اگر تم ایسا عدل نہیں کر سکتے تو صرف ایک ہی بیوی پر اکتفاء کرو ' اس سے مراد معاملات زندگی ' نفقات ازواج ' معاشرتی سلوک ' اور مباشرت میں عدل ہے۔ نیز ان چیزوں کے علاوہ زندگی کے تمام مظاہر میں عدل و مساوات ہے۔ اسی طرح کے بظاہر کسی ایک بیوی کی حیثیت دوسری سے کم نہ نظر آئے۔ کسی ایک کو دوسری بیویوں پر ترجیح نہ دی جائے جس طرح حضور اکرم ؐ کی سیرت طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ آپ ؐ افضل البشر تھے۔ اور آپ کے تمام ساتھیوں اور پڑوسیوں کو یہ معلوم تھا کہ آپ کو حضرت عائشہ ؓ کے ساتھ زیادہ محبت تھی ' اور آپ کے قلبی جذبات میں عائشہ کی جگہ زیادہ تھی۔ اور اس مقام میں اس کے ساتھ آپ ؐ کی دوسری ازواج مطہرات میں سے کوئی شریک نہ تھا۔ اس لئے کہ کسی شخص کو اپنے دل پر کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ دل تو اللہ میاں کی دو انگلیوں کی گرفت میں ہوتے ہیں اور یہ اللہ میاں کی مرضی ہوتی ہے کہ قلوب کو جس طرح پھیر دے۔ حضور اکرم ؐ اپنے دین سے بھی اچھی طرح باخبر تھے۔ اور اپنے دلی جذبات سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے۔ "اللہ! یہ تو وہ تقسیم ہے جو میرے کنٹرول میں ہے ' اور میں نے کر دی ہے۔ بس آپ مجھے اس معاملے میں ملامت نہ کیجیو جس پر مجھے کنٹرول نہیں ہے ' جو تیرے ہاتھ میں ہے۔" [1]

اس موضوع پر بات ختم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم دوبارہ اس نکتے کی وضاحت کر دیں۔ اس دنیا میں اسلامی نظام حیات نے تعدد زوجات کے اصول کو رائج (Introduce) نہیں کیا۔ بلکہ موجودہ نظام لاتعداد تعدد زوجات میں چار کی حد تک تحریر کر دی۔ نیز اسلام نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم خواہ مخواہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھو بلکہ اسلام نے اس کی اجازت دی اور اس اجازت کو شرط و قیود میں مقید کیا۔ اور اجازت بھی اس لئے دی کہ انسانی زندگی کے حقیقی مسائل اور مشکلات کا حل نکالا جائے۔ اور بعض حالات میں انسانی فطرت کے تقاضوں کی ضرورت کو پورا کیا جائے۔ یہ فطری تقاضے اور حقیقی ضروریات زندگی ' جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے ' وہ ہیں جن میں سے کچھ کا معمولی ادراک ابھی تک نہیں ہوا ہے ' لیکن ان میں سے بعض حالات اور ضروریات ایسی بھی ہو سکتی ہیں ' جن تک ابھی تک ہمارے محدود فہم و ادراک نے رسائی حاصل نہیں کی۔ یا بعض ایسے حالات زندگی بھی ہوں گے جن کا وقوع مستقبل میں ہوگا۔ جن میں یہ رخصت کام آئے گی۔ جس طرح اسلامی نظام زندگی کی ہدایات اور اسلامی شریعت کی حکمتوں کا ظہور آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ یہ ربانی نظام زندگی ہے اور انسان کا فہم و ادراک اپنی گزشتہ تاریخ میں اس کی تمام حکمتوں اور مصلحتوں کے احاطے سے قاصر رہا ہے۔ اس لئے کہ ہر اسلامی قانون سازی میں مصلحت اور حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ چاہے انسانی فہم اس کا ادراک کر سکے یہ نہ کر سکے۔ یا اس کا ادراک انسانی تاریخ میں فہم انسانی کو پہلے حاصل ہو یا کچھ عرصہ بعد میں حاصل ہو ' اس لئے کہ یہ فہم نہایت ہی محدود ہے۔

---

[1] ابوداؤد ' ترمذی اور نسائی

اب ہم اس انتظام پر بحث کرتے ہیں جو مکمل عدل و انصاف نہ کر سکنے کی ضرورت میں اسلام نے کیا ہے۔ **فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ** ........................ "لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں۔"

یعنی اگر عدل قائم نہ رکھ سکنے کا اندیشہ ہو تو پھر یہ صورت متعین ہو جاتی ہے کہ ایک ہی بیوی پر اکتفاء کرو۔ اس صورت میں ایک سے زیادہ کی اجازت ختم ہو جاتی ہے یا ان عورتوں کو جو تمہارے قبضے میں ہیں۔" بطور لونڈی استعمال کرو یا زوجیت میں لو' اس لئے کہ آیت کے الفاظ نے کسی صورت کی تحدید نہیں کی ہے۔

فی ظلال القرآن کے پارۂ دوئم کی تفسیر میں ہم نے غلامی کے مسئلے پر ایک مختصر بحث کی تھی۔ یہاں مناسب ہے کہ غلام عورتوں کے ساتھ مباشرت کرنے کے مسئلے پر قدرے بحث ہو جائے۔

مملوکہ عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے سے ان کا اعتماد' ان کی شرافت اور انسانی عزت نفس بحال ہو جاتی ہے۔ اس نکاح کی وجہ سے انہیں آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس عورت کی اولاد بھی آزاد ہو جاتی ہے۔ اگر نکاح کے وقت اسے خاوند آزادی نہ بھی دے تو بھی بچہ پیدا ہونے کے بعد وہ ام ولد کہلاتی ہے۔ اس کا مالک اسے اب فروخت نہیں کر سکتا۔ مالک کی وفات کے بعد وہ آزاد ہو جاتی ہے۔ اس سے قبل اس کی اولاد پیدا ہوتے ہی آزاد ہوتی ہے۔

اور اگر کوئی مالک نکاح کے بغیر ہی اپنی مملوکہ کے ساتھ مباشرت کرے تو بھی جب وہ بچہ دیدے "ام ولد" بن جاتی ہے۔ اب اس کی فروخت ممنوع ہو جاتی ہے۔ اور مالک کی وفات کے بعد وہ آزاد ہو جاتی ہے۔ نیز اگر مالک اپنی لونڈی کے بچے کے نسب کا اعتراف کر لے تو وہ بھی آزاد تصور ہوتا ہے۔ اور یہ اعتراف بالعموم لوگ کرتے ہیں۔

لھذا غلام عورتوں کی آزادی کیلئے اسلام نے جو مختلف تدابیر (Devices) وضع کی ہیں' ان میں سے اپنی لونڈی کے ساتھ نکاح اور ہم بستری بھی ان کی آزادی کا ایک طریقہ ہے۔ البتہ بعض اوقات بغیر نکاح کے مملوکہ کے ساتھ ہم بستری کا فعل دل کو کھٹکتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ حقیقت پیش نظر رکھنا چاہئے کہ غلامی کا مسئلہ ایک اجتماعی ضرورت تھی اور اب بھی ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس سے قبل بیان کیا کہ اسلامی حکومت کا ایک سربراہ' جو شریعت کا نافذ کرنے والا ہو وہ اگر اعلان جنگ کر دیتا ہے تو اس صورت میں قید میں آنیوالی عورتوں کا غلام ہونا جس طرح ایک اجتماعی اور بین الاقوامی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ان عورتوں کے ساتھ ہم بستری کرنا بھی ایک اجتماعی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اسلامی کیمپ سے آزاد عورتیں جو دشمن کی غلامی میں جاتی تھیں ان کا انجام ان عورتوں سے برا ہوتا تھا جو کفار کے کیمپ سے گرفتار ہو کر اسلامی کیمپ میں آتی تھیں۔

پھر یہ بات بھی ہمارے پیش نظر رہنی چاہئے کہ ان گرفتار ہونیوالی عورتوں کے بھی تو کچھ فطری مطالبات اور خواہشات ہوا کرتی ہیں۔ اور ان خواہشات اور میلانات کا مد نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اور اسلام جیسا واقعیت پسند نظام زندگی ان حقیقی فطری جذبات کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ یہ نظام ہی بذات خود فطری اصولوں پر استوار ہے۔ اب عورت' اسیر عورت کے ان فطری خواہشات کو پورے کرنے کے طریقے یا تو یہ ہو سکتے ہیں کہ ان کو مالک یا غیر مالک کے نکاح میں دیدیا جائے یا مالک کو اگر ضرورت ہو تو وہ مملوکہ کے ساتھ ہم بستری کرے۔ جب تک غلامی کا نظام قائم ہو یا ان کو آزادانہ اجازت دیدی جائے کہ وہ جہاں چاہیں جنسی خواہش پوری کریں۔ اس آخری صورت میں پورے اسلامی معاشرے میں جنسی انارکی اور جنسی بے راہ روی کے پھیلنے اور عام ہونے کا خطرہ لازماً موجود ہو گا اور اس صورت میں جنسی تعلقات پر کوئی ضابطہ نافذ نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے کہ اس طرح انہیں جسم فروشی اور جنسی دوستی کی مکمل آزادی ہو گی۔

اور یہ صورت حال دور جاہلیت میں 'اسلام سے قبل عملاً موجود تھی۔

قرن اول کے بعد اسلامی تاریخ کے بعض ادوار میں لونڈیوں کی جو کثرت رہی۔ لونڈی کی یہ فوج خریداری' بردہ فروشی اور اغوا کے ذریعہ پیدا کی گئی۔ انہیں بڑے بڑے محلات میں جمع کیا گیا۔ اور انہیں حیوانی جنسی تلذذ کا ذریعہ بنایا گیا۔ اور ان لونڈیوں کے غولوں میں رنگین راتیں بسر ہوتی رہیں' رقص و سرود اور نائو نوش کے بازار گرم رہے اور اسلامی تاریخ میں بعض لوگوں نے اس کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی کی اور بعض نے اس میدان میں مبالغہ آرائی سے کام لیا تو یہ سب کچھ اسلام نہ تھا' نہ یہ اسلام کا کوئی کارنامہ تھا' نہ اسلام نے کسی کو ایسی کوئی ہدایات دی تھی۔ اور نہ یہ بات درست ہوگی کہ اس قسم کے واقعات کو اسلام کے کھاتے میں ڈالا جائے۔ اور نہ اس بات کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ ان واقعات کو اسلام کی حقیقی تاریخ کا حصہ قرار دیا جائے۔

اسلامی تاریخ کا حصہ وہ واقعات ہوں گے جو اسلامی نظریۂ حیات اسلامی تصور زندگی' اور اسلامی اقدار اور پیمانوں کے مطابق روبعمل لائے جائیں۔ رہے وہ واقعات جو ان معاشروں میں روبعمل لائے گئے جو اپنی نسبت اسلام کی طرف کرتے رہے ہیں اور جو اسلامی اصول و مبادی کے مطابق نہیں تھے' تو یہ بات بالکل قرین انصاف نہ ہوگی کہ ان واقعات کو اسلام کے کھاتے میں ڈالا جائے۔ اس لئے کہ یہ واقعات تو در پیش اس لئے ہوئے کہ لوگوں نے اسلامی نظام زندگی سے انحراف کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام 'مسلمانوں کی زندگی سے باہر اپنا ایک ڈھانچہ رکھتا ہے۔ اور ہر دور میں اسلام کا اپنا ڈھانچہ رہا ہے۔ اس لئے کہ مسلمانوں نے اسلامی نقشہ یا ڈھانچہ تیار نہیں کیا بلکہ یہ اسلامی نظام زندگی کا نقشہ ہے جس نے دنیا میں مسلمان تیار کئے ہیں اور مسلمانوں کی ایک سوسائٹی وجود میں آئی ہے۔ اسلام اصل ہے اور مسلمان اس کیلئے فرع کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسلام کے پیدا کرنے سے مسلمان پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے اسلام وہ نہیں ہے جسے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ اسلام ہے۔ نہ اسلام وہ افعال و اعمال ہیں جن کا ارتکاب اہل اسلام کرتے ہیں۔ بلکہ لوگوں کے وہی افعال و اطوار اسلام ہوں گے جو اسلامی اصول حیات اور اسلام تصور حیات کے مطابق ہوں گے۔ اور اصل ڈھانچہ اصولی اسلام ہے۔ جس کے مطابق ہم لوگوں کی عملی زندگی کو پرکھیں گے کہ وہ کس قدر اسلام کے مطابق ہے اور کس قدر اسلام کے خلاف ہے۔

لیکن دنیا میں چلنے والے دو نظامہائے زندگی جو انسانوں کے اپنے نظریات کی اساس پر بنائے جاتے ہیں یا ان کی اساس خود انسان کے بنائے ہوئے مذاہب پر ہوتی ہے' ان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اس لئے کہ جب یہ لوگ اسلام کو چھوڑ کر از سر نو جاہلیت میں داخل ہو جاتے ہیں تو یہ لوگ گویا اللہ کا انکار کر دیتے ہیں اگرچہ ان کا دعویٰ یہ ہو کہ وہ اللہ کے ماننے والے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ پر ایمان لانے کا پہلا مظاہرہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مومن اپنا اجتماعی نظام اسلامی منہاج سے اخذ کرے اور اسے اسلامی شریعت پر استوار کرے۔ اس عظیم اصولی قاعدے کے بغیر ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ یہ اس لئے کہ اس صورت میں لوگوں کے نزدیک تغیر پذیر مفاہیم اور بدلتے ہوئے اوضاع و اطوار کی تشکیل ہی ان مذاہب اور نظریات کا تعین کرتی ہے جس پر ان لوگوں کا ایمان ہوتا ہے۔ اور جسے وہ لوگ عملاً اپنی زندگیوں میں نافذ کرتے ہیں۔

رہی صورت حال اسلامی نظام حیات کی تو اسلامی نظام کو لوگوں نے خود اپنے لئے وضع نہیں کیا ہے۔ اس کی تشکیل اور تشریح رب الناس نے ان کیلئے کی ہے جو ان کا خالق بھی ہے' مالک بھی ہے اور رازق بھی ہے۔ تو اس نظام میں لوگ یا تو اس کی اطاعت کریں گے اور اپنے اوضاع و اطوار کو اس کے مطابق استوار کریں گے تو ان لوگوں کے شب و روز اسلامی تاریخ کے شب و روز ہوں گے۔ یا صورت حال یہ ہوگی کہ وہ اس سے انحراف کریں گے یا "کلیتاً" اسے ترک کریں گے تو اس صورت میں ان کے شب و روز اسلامی تاریخ کا حصہ

تصور نہ ہوں گے۔ اسے اسلامی تاریخ سے انحراف تصور کیا جائے گا۔

اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے اسی نقطہ نظر کا لحاظ رکھنا اشد ضروری ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے اسلام کے تاریخی تصور کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اسلام کا تاریخی تصور تمام دوسرے تاریخی تصورات سے مختلف ہے۔ اس لئے کہ دوسری سوسائٹیوں کے نظریات میں ان سوسائٹیوں کی عملی صورت حال کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اور اسے کسی نظریہ اور مذہب کی عملی تعبیر تصور کیا جاتا ہے۔ اس عملی منظر کے مطابق پھر اس مذہب یا نظریہ کے اندر نرمی اور تبدیلی پر بحث کی جاتی ہے۔ یعنی نظریہ پر بحث اس سوسائٹی کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے۔ جو سوسائٹی اس نظریہ ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ اور اس سوسائٹی کے اندر اس نظریہ کی بابت جو فکری تغیرات ہوتے ہیں اس پر بحث کی جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ اس منہاج بحث کو اسلامی نظام کے مطالعہ پر بھی منطبق کرتے ہیں حالانکہ اسلام کی اپنی منفرد نوعیت کی وجہ سے یہ منہاج بحث اس پر چسپاں نہیں ہوتا۔ اس لئے اس منہاج پر اسلام کا مطالعہ کرنیوالے اسلام کے حقیقی مفہوم کے تعین میں خطرناک غلطیاں کرتے ہیں۔

آخر میں اس آیت میں ان تمام انتظامات کی حکمت عملی کی وضاحت کر دی جاتی ہے کہ یہ تمام انتظامات اس لئے کئے جا رہے ہیں کہ تم ظلم و زیادتی کے ارتکاب سے بچ سکو **ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا** ............................ "بے انصافی سے بچنے کیلئے یہ زیادہ قرین صواب ہے۔" یعنی یہ کہ اگر تم انصاف نہیں کر سکتے تو ان یتیم بچیوں کو اپنے نکاح میں لینے سے باز رہو اور دوسری عورتوں سے نکاح کر لو۔ دو دو' تین تین اور چار چار۔ اور اگر عدل ممکن نہ ہو تو فقط ایک پر اکتفا کرو۔ یا اپنی مملوکہ عورتوں پر اکتفاء کرو۔ یہی صورت اس کے قریب ہے کہ تم بے انصافی سے بچو' اور ظلم نہ کر سکو۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر معاملے میں عدل و انصاف کی تلاش اسلامی نظام زندگی کا نصب العین ہے اور اسلام کی جزئیات میں سے ہر جزء میں عدل مطلوب ہے۔ اور ایک خاندان جس کے اندر اس کے تمام افراد رہائش پذیر ہوتے ہیں' اس کے اندر عدل و انصاف کا قیام دوسرے مقامات کے مقابلے میں زیادہ ضروری ہے۔ اس لئے کہ کسی سوسائٹی کی تعمیر اور کسی اجتماعی نظام کی تشکیل میں خاندان خشیت اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ خاندان اجتماعی زندگی کا نقطۂ آغاز ہے۔ قوموں کی تربیت خاندان کے قالب میں ہوتی ہے۔ یہاں انسانوں کی شخصیات کی تشکیل ہوتی ہے اور اسی میں رنگ بھرا جاتا ہے۔ اگر خاندانی نظام کی بنیاد عدل و انصاف اور اخوت و محبت پر نہ ہو تو پھر پورے معاشرے میں عدل و انصاف قائم نہ ہو سکے گا۔[۱]

○.....☆☆☆.....○

اسی مناسبت سے یہاں عورتوں کے بعض دوسرے حقوق بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اس سورت کے آغاز میں ان کا ذکر خصوصیت سے ہوا تھا' اس سورت کا نام بھی نساء رکھا گیا تھا۔ اس لئے یتیم عورتوں کی بابت بات ختم کرنے سے پہلے بعض حقوق کا بیان مناسب تھا۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۚ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ۝

۱۔ دیکھئے میری کتاب "السلام العالمی والاسلام" کی فصل "سلام البیت"۔

"اور عورتوں کے مہر خوشدلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو' البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمہیں معاف کر دیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔"

یہ آیت عورت کے لئے ایک واضح حق (Right) کی بنیاد رکھتی ہے جو اس کا ذاتی حق ہے۔ یعنی اس کا مہر' اس میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ دور جاہلیت میں عورت کے اس حق کو مختلف حیلوں بہانوں سے مارا جاتا تھا۔ ایک صورت یہ تھی کہ عورت کا ولی اس مہر کو لے لیتا اور پھر اسے وہ خود استعمال کرتا۔ اسی طرح جس طرح ایک شخص کوئی چیز فروخت کر کے زر ثمن وصول کرتا ہے۔ ایک صورت اس حق کو مارنے کی نکاح شغار کی صورت میں تھی۔ کہ ایک ولی الامر اپنی زیر تولیت لڑکی دوسرے شخص کو نکاح کر کے دیتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں دوسرا ولی الامر اپنی تولیت میں پائی جانے والی کسی لڑکی کا نکاح پہلے ولی کا کسی رشتہ دار سے کر دیتا۔ یعنی لڑکی کے مقابلے میں لڑکی آجاتی۔ یہ سودا دو اولیاء کے درمیان ہوتا اور اس سے ان دو لڑکیوں کو کچھ نہ ملتا۔ جس طرح دو مویشیوں کو آپس میں تبادلہ کر دیا جاتا ہے۔ اسلام نے نکاح شغار کو بالکل منع کر دیا۔ اور یہ حکم دیا کہ نکاح صرف اسی صورت میں ہو کہ دونوں فریق براہ راست اس پر رضامند ہوں اور اپنے اختیار سے معاملہ کریں۔ اور یہ کہ مہر صرف عورت کا حق ہے۔ وہ خود اسے وصول کرے گی۔ اس کے ولی کو وصول کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اسلام نے مہر کے تعین کو لازمی قرار دیا ہے تاکہ عورت اسے اپنے قبضہ میں لے سکے۔ کیونکہ یہ اس کیلئے ایک فریضہ ہے۔ یہ ایک لازمی اور واجبی حق ہے جو کسی طرح بھی منسوخ یا معطل نہیں ہو سکتا۔ یہ لازمی کیا گیا کہ مرد اس حق کو خوشدلی کے ساتھ ادا کرے۔ اور اسے اس طرح دلی آمادگی سے ادا کرے جس طرح شخص ھبہ صرف اپنی دلی رضامندی سے دیتا ہے یعنی ہے تو فرض لیکن اسے اس طرح طیب نفس اور خوشی سے ادا کیا جائے کہ گویا فرض نہیں ہے بلکہ عطیہ ہے۔ ہاں ادائیگی کے بعد اگر عورت اپنی مکمل رضامندی اور خوشدلی کے ساتھ یہ پورا مہر یا اس کا کوئی حصہ اپنے شوہر کو لوٹا دیتی ہے تو وہ اس معاملے میں پوری طرح آزاد ہے۔ وہ بھی جو واپس کرے وہ بھی مکمل آزادی اور طیب خاطر کے ساتھ ہو' کوئی جبر نہ ہو۔ اس صورت میں مرد کیلئے بھی اس مہر کا کھانا حلال ہے۔ بلکہ وہ اسے مزے سے کھا سکتا ہے۔ بغیر کسی قلبی خلجان کے۔ غرض زوجین کے درمیان تعلقات مکمل رضامندی کے ساتھ ہونے چاہئیں۔ فریقین مکمل طور پر مختار خود ہوں' وہ ایک دوسرے کے ساتھ جو معاملہ کریں دلی خوشی اور آزادی کے ساتھ کریں۔ اور محبت تو چیز ہی ایسی ہے جس میں کسی جہت سے بھی کدورت نہیں ہونی چاہئے۔

اس طرح اسلامی نظام حیات نے آثار جاہلیت میں سے ایک اور اثر کو ختم کر دیا۔ جو عورت کے مہر کے بارے میں عرب معاشرہ میں مروج تھا۔ اور عورت کیلئے اس کی ذات اور اس کے مہر و مال کے بارے میں مکمل حقوق (Rights) بحال کر دیئے گئے۔ اس طرح اس کی عزت و وقار کو بحال کیا گیا۔ لیکن ان قانونی حقوق کی بحالی کے ساتھ ساتھ زن و شو کے باہمی تعلقات کو خشک قانونی پیمانوں کے حوالے بھی نہیں کر دیا گیا۔ اور اس سلسلے میں رضامندی' محبت اور باہم فیاضی کے راستے بھی کھلے رکھے گئے ہیں۔ اس لئے کہ میاں بیوی نے مشترکہ طور پر زندگی گزارنی ہے۔ اور اس بات کی ضرورت ہے کہ ان تعلقات کو خشک قانونی فضا سے نکال کر باہم محبت اور برو احسان کی شبنم سے تروتازہ رکھا جائے۔

○.....☆☆☆.....○

جب یہ موضوع یہاں ختم ہوتا ہے تو بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے۔ چونکہ اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی تھی کہ یتیم عورتوں کے ساتھ عام عورتوں کی بات بھی ہو جائے۔ اب یہاں یتیموں کے مالی حقوق کا ذکر بھی مناسب تھا۔ مفصلاً حکم دیا جاتا ہے کہ ان کی دولت ان کو لوٹا کر دی جائے۔ جبکہ اس سے پہلے آیت نمبر ۲ میں مجملاً بتایا تھا کہ ان کی دولت انہیں دی جائے۔

دولت چاہے یہ یتیموں کی ہو یا بالغ مرد عورتوں کی ہو' یہ ان لوگوں کی انفرادی ملکیت ہونے سے بھی پہلے یہ پوری سوسائٹی کی دولت ہوتی ہے۔ اور کسی سوسائٹی کو جو دولت دی گئی ہوتی ہے' اس دولت پر اس پوری سوسائٹی کا قیام ہوتا ہے۔ اور اس دولت سے' جو اس سوسائٹی میں گردش کرتی ہے' پوری سوسائٹی استفادہ کرتی ہے۔ اور یہ استفادہ اس کے حسن انتظام سے ہوتا ہے۔ گویا تمام دولت کا ابتدائی مالک عام معاشرہ ہوتا ہے اور یتیم اور دوسرے وارث اس کے مالک محض اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ وہ اس دولت کو مزید ترقی دیں۔ اور یہ ترقی اجتماعی نظام کی اجازت سے ہو' وہ خود بھی اس سے استفادہ کریں اور سوسائٹی بھی اس سے مستفید ہو۔ یہ ان پرائیویٹ ہاتھوں میں اس وقت تک رہے گی جب تک وہ اسے بڑھانے اور اس میں اضافہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اور اسی دولت میں تصرف کرنے اور اس کا انتظام کرنے میں وہ صحیح طرز عمل اختیار کئے ہوئے ہوں۔ اس اجتماعی دائرے کے اندر انفرادی حقوق ملکیت قائم رہیں گے۔[۱]۔ رہے وہ نادان یتیم جو مالدار ہیں لیکن اپنے مالی انتظامات سے قاصر ہیں اور اسے ترقی نہیں دے سکتے تو ان کے کنٹرول میں ان کی دولت نہ دی جائے گی۔ ان کو ان کے اموال میں تصرف اور اپنے ہاتھ میں لینے اور اپنی نگرانی میں چلانے کے حق سے محروم کر دیا جائے گا۔ اگرچہ ان کی انفرادی ملکیت کا حق ان اموال پر باقی رہتا ہے۔ یہ دولت ان سے چھین لینے کی اجازت نہیں ہے۔ صرف اسی دولت کو سوسائٹی کے ان افراد کی تحویل میں دیدیا جائے گا جو ان میں اچھا تصرف کر سکتے ہوں۔ ہاں اس سلسلے میں ان لوگوں کو ترجیح دی جائے گی جو یتیم کے ساتھ قرابت اور رشتہ داری رکھتے ہوں۔ تاکہ خاندانی کفالت کا انتظام بھی ساتھ ساتھ چلتا رہے۔ اس لئے کہ خاندان کے کفالتی نظام ہی کے ذریعہ سوسائٹی کے بڑے خاندان کا کفالتی نظام قائم ہوتا ہے۔ ہاں نادان لوگوں کیلئے ان کے اخراجات اور اچھی طرح گزر بسر کا انتظام ہو گا۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿٥﴾

"اور اپنے وہ مال جنہیں اللہ نے تمہارے لئے قیام زندگی کا ذریعہ بنایا ہے' نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو' البتہ انہیں کھانے اور پہننے کیلئے دو اور انہیں نیک ہدایت کرو۔"

نادانی اور دانائی کا پتہ بلوغ کے بعد چل جاتا ہے۔ بالعموم نادان اور دانا کے درمیان تمیز ہو ہی جاتی ہے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت نہیں ہوتی کہ قانون کے اندر اس کیلئے کوئی فارمولا وضع کر دیا جائے۔ ہر خاندان اس بات کی تمیز اچھی طرح کر لیتا ہے کہ اس کے اندر نادان کون ہے اور دانا کون ہے۔ اسے اچھی طرح تجربہ ہوتا ہے کہ یہ راشد ہے اور یہ سفیہ ہے۔ نیز سوسائٹی سے بھی کسی شخص کے معاملات اور تصرفات پوشیدہ نہیں ہوتے۔ لہٰذا جانچ پڑتال اس بات کی ہو گی کہ یتیم بالغ ہو گیا ہے یا نہیں۔ یہاں آیت میں اس بلوغ کی تعبیر لفظ نکاح سے کی گئی ہے۔ کیونکہ آثار بلوغ میں سے نکاح ایک اہم اثر ہوتا ہے۔

وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَن يَكْبَرُوا ۚ وَمَن كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَن

۱۔ تفصیلات کیلئے دیکھئے میری کتاب العدالۃ الاجتماعیہ کی فصل "مالی پالیسی"

كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ﴿٦﴾

"اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان کے اندر اہلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ ایسا کبھی نہ کرنا کہ حد انصاف سے تجاوز کر کے اس خوف سے ان کے مال جلدی جلدی کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے۔ یتیم کا جو سرپرست مالدار ہو وہ پرہیزگاری سے کام لے اور جو غریب ہو وہ معروف طریقہ سے کھائے۔ پھر جب ان کے مال ان کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اس پر گواہ بناؤ' اور حساب لینے کیلئے اللہ کافی ہے۔"

اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے یتیموں کو ان کی دولت حوالے کرنے کے سلسلے میں شریعت نے کس قدر سخت کارروائی کی ہے۔ جب وہ بالغ ہو جائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت بلوغ اور سیانے ہونے کے بعد جلد از جلد ان کی دولت ان کے حوالے کرنے کیلئے کارروائی کرنے پر زور دیتی ہے۔ یعنی جونہی وہ بالغ ہوں' ان کی دولت ان کے حوالے کی جائے۔ اور یہ دولت پوری کی پوری صحیح سالم ان کے حوالے کی جائے۔ اور جب تک ولی کی حفاظت میں ہو اس کی حفاظت ایمانداری کے ساتھ کی جائے..... اور اسے بے دردی کے ساتھ خرچ نہ کیا جائے۔ اس ڈر سے کہ یتیم بالغ ہونے والے ہیں اور یہ دولت انہیں لوٹانی ہوگی۔ نیز شریعت کی پالیسی یہ ہے کہ اگر محافظ مالدار ہو تو وہ اس نگرانی اور حفاظت کا کوئی معاوضہ نہ لے اور اگر وہ نادار ہو تو اسے چاہئے کہ معروف طریقے کے مطابق کم سے کم ضرورت کی حد تک کھائے۔ اور شریعت یہ بھی لازمی قرار دیتی ہے کہ جب کسی یتیم کو اس کا مال حوالے کیا جا رہا ہو تو اس پر شہادت ضرور قائم کی جائے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اللہ کی شہادت تو ہر وقت پر قائم ہے اور اللہ کے سامنے جو حساب ہوگا وہ آخری حساب ہوگا

وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ﴿٦﴾ ............... "اور حساب لینے کیلئے اللہ کافی ہے۔"

یہ تمام تشدید و تاکید اور تمام تفصیلات و تشریحات اور یہ تمام تنبیہات و تذکیرات اس حقیقت کی مظہر ہیں کہ جس معاشرے میں اسلامی نظام نافذ ہوا۔ اس میں ہر طرف یتیموں کی حق تلفی ہو رہی تھی۔ یتیموں کے علاوہ دوسرے کمزوروں کے مال بھی کھائے جاتے تھے۔ اس لئے کہ اس رسم و رواج کو ختم کرنے کیلئے اس قدر تاکید و تشدید کی ضرورت پیش آئی۔ اور جزوی تفصیلات کو قرآن کریم کے اندر قلم بند کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ تاکہ آئندہ لوگ قانونی حیلوں اور بہانوں سے کام لیکر قانون شکنی نہ کر سکیں۔ اور قانون سے بچنے کی کوئی راہ کھلی نہ رہے۔

اس طرح اسلامی نظام حیات مسلمانوں کی فکری اور عملی دنیا سے جاہلیت کے ایک ایک نشان مٹاتا رہا اور اس کی جگہ اسلامی جھنڈے گاڑتا رہا۔ جاہلیت کے آثار مٹائے جاتے رہے اور معاشرے کے چہرے کو ان بدنما داغوں سے صاف کیا جاتا رہا۔ اور ان کی جگہ اسلام کے خوبصورت خدوخال ظاہر ہوتے رہے۔ اور یوں ایک جدید معاشرہ ڈھلتا رہا۔ جدید معاشرے کی رسوم اور روایات قائم ہوتی چلی گئیں۔ اس کے اصول و ضوابط اور قوانین و احکام نازل ہوتے رہے۔ اور یہ سب کچھ خدا خوفی کی فضا میں اور اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہوتا رہا۔ اور اسلامی قانون اور اسلامی احکام کے نفاذ کی آخری گارنٹی ذات باری کے خوف اور رضامندی کو قرار دیا جاتا رہا..... حقیقت یہ ہے کہ خدا خوفی' خدا کی رضامندی اور اللہ کی نگرانی کے تصور کے سوا' اس دنیا میں کسی بھی قانونی نظام کی استواری اور چلت کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ اصل مدار اس پر ہے کہ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ............... "اور حساب لینے کیلئے اللہ کافی ہے۔"

○.....☆☆☆.....○

جاہلیت کی رسم یہ تھی کہ وہ لڑکیوں اور بچوں کو وراثت نہ دیتے تھے۔ عام رواج یہی تھا۔ البتہ بعض جگہوں پر اس کے خلاف بھی تھا مگر شاذ۔ اس کی وجہ ان کے نزدیک یہ تھی کہ یہ لوگ گھوڑے پر سوار نہیں ہوتے تھے۔ دشمن کے مقابلے میں شریک نہ ہوتے تھے۔ گویا اصل مدار جنگ پر تھا۔ اسلامی نظام قانون نے میراث کو قرابت کے اصول پر استوار کیا۔ جو تقسیم میراث کا حقیقی سبب تھا۔ ہاں جس طرح قرابت کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اقرباء کے حصص اور فرائض میں بھی فرق ہے۔ جیسا کہ بعد میں تفصیلات آرہی ہیں۔ نظام میراث کو اسلام نے نظام قرابت پر اس لئے استوار کیا کہ اسلام اجتماعی تکافل کے نظام کی اکائی ایک خاندان کو قرار دیتا ہے۔ وہ سب سے پہلے ایک خاندان کے افراد کے درمیان باہم کفالت کا نظام قائم کرتا ہے۔ اور یہ خاندانی نظام بھی اجتماعی کفالتی نظام کے فریم ورک کے اندر ہوتا ہے۔ نیز اس اصول کے تحت کہ حقوق ذمہ داریوں کی نسبت سے متعین ہوتے ہیں تو اس طرح قریبی رشتہ داروں پر خاندان کے کسی غریب فرد کی بابت اس کی قرابت کے اعتبار سے ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ مثلاً قتل میں دیت کی ادائیگی بھی قرابت اور رشتہ داری کے اصول پر ہوتی ہے۔ نیز زخموں کی مرہم پٹی کی ادائیگی بھی قرابت کے اصول پر ہوا کرتی ہے۔ اس لئے پھر انصاف کا تقاضا ہے کہ اگر کوئی رشتہ دار فوت ہو جائے اور اس کا ترکہ رہ جائے تو اسے اصول قرابت پر تقسیم کیا جائے۔ کیونکہ اسلامی نظام زندگی ایک مکمل اور باہم متناسق نظام ہے۔ اور اس کی یہ ہمہ گیری اور ہم آہنگی اس وقت اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے جب اس کے اندر حقوق و فرائض متعین ہوتے ہیں۔

غرض میراث کی تقسیم میں شریعت نے عموماً ان قریبی ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ بعض لوگ اس قانون کے اصول تقسیم پر نکتہ چینیاں کرتے ہیں' یہ حرکت وہ اس لئے کرتے ہیں کہ درحقیقت ذات باری کی شان میں گستاخی کیلئے تیار ہیں۔ حالانکہ خود ان کا حال یہ ہے کہ وہ خود ذات انسانی سے بھی اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ اور نہ وہ انسانی زندگی کے مختلف احوال کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے نظام میراث کی اساس جن اصولوں پر رکھی گئی ہے اگر یہ لوگ ان کا اچھی طرح ادراک کر لیں تو یہ ہرگز یہ جسارت نہ کریں۔

اسلامی نظام میراث کا اصل الاصول سوشل سیکورٹی ہے۔ اس کفالتی نظام کو شریعت نے ان اصولوں پر استوار کیا ہے۔ جو نہایت ہی مستحکم ہیں اور ان اصولوں کو وضع کرتے وقت اسلام نے نفس انسانی کے فطری رجحانات کو بھی مد نظر رکھا ہے۔ اور یہ وہ رجحانات ہیں جن کا خالق اللہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی کے اندر ان رجحانات کو عبث طور پر پیدا نہیں کیا ہے۔ یہ فطری میلانات انسانی زندگی کے ارتقاء و بقا میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

ایک خاندان کے اندر قریبی یا دور کے رشتوں کے جو رابطے ہوتے ہیں' وہ چونکہ فطری روابط ہوتے ہیں اور نہایت ہی حقیقی روابط ہوتے ہیں اور وہ ایسے رابطے ہوتے ہیں' جن کی تخلیق کسی ایک نسل یا سوسائٹی نے نہیں کی ہے۔ اور نہ ہی ان رابطوں کی تخلیق میں پوری انسانی نسلوں کے اتفاق کا کوئی دخل ہے۔ اس لئے ان رابطوں کی حقیقت پسندی' ان کی گہرائی انسانی زندگی کے بچاؤ' اس کی ترقی اور اس کی سربلندی میں ان رابطوں کی اہمیت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی ان حقیقی رابطوں کی اہمیت کا انکار کرتا ہے تو ان کلیہ انکار نظر انداز کرنے کا مستحق ہے۔ اس لئے اسلام نے اپنے کفالتی نظام کی اکائی ایک خاندان کے کفالتی نظام کو قرار دیا ہے۔ اور اس کفالتی یونٹ کو پھر اپنے اجتماعی اور ملکی کفالتی نظام کا سنگ میل قرار دیا ہے۔ اسلام نے نظام میراث کو اس خاندانی کفالتی نظام کا ایک مظہر اور علامت قرار دیا ہے۔ جبکہ اقتصادی اور اجتماعی نظام معیشت و سیاست میں اس کے اور مفید اثرات بھی اپنی جگہ مسلم ہیں۔

اگر کسی شخص کے تکافل میں یہ پہلا قدم کامیاب نہیں ہوتا اور خاندان کسی شخص کی کفالت میں ناکام ہو جاتا ہے تو پھر مقامی مسلم سوسائٹی سامنے آتی ہے اور وہ اس شخص کی کفالت کرتی ہے۔ اور اگر محلہ اور مقامی سوسائٹی بھی ناکام رہیں تو اس کے بعد اسلامی حکومت ان

تمام لوگوں کی کفالت کی ذمہ دار ہے جو خود اپنا انتظام نہیں کر سکتے۔ اس انتظام کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تمام نادار لوگوں کا انتظام کرنا صرف حکومت کے نظم و نسق کے کاندھوں پر یکدم نہیں پڑتا۔ یہ انتظام اس لئے کیا گیا ہے کہ ایک خاندان اور ایک محدود سوسائٹی کے اندر باہم تکافل کے انتظام کے نتیجے میں افراد معاشرہ کے دلوں میں باہم دگر محبت' لطف و کرم اور رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور ان جذبات کی وجہ سے لوگوں کے درمیان باہم تعاون اور ہمدردی کے فطری فضائل اخلاق پروان چڑھتے ہیں اور یہ بالکل حقیقی ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی بناوٹ نہیں ہوتی۔ اس خاندانی کفالت کے علاوہ بھی رشتہ داروں کی امداد اور ہمدردی کے جذبات رکھنا ایک ایسا انسانی فعل ہے جسے ایک بدفطرت اور گھٹیا درجے کا خبیث شخص ہی نظرانداز کر سکتا ہے۔ ایک خاندان کے اندر کفالت کرنا تو ایک ایسا فعل ہے جس کے انسانی فطرت اور مزاج پر بہت ہی مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جو عین فطرت کے مطابق ہوتے ہیں۔ ایک شخص کلیہ شعور کہ اس کی شخصی جدوجہد اس کے تمام رشتہ داروں کیلئے مفید عمل ہے۔ خصوصاً اس کی اپنی اولاد کیلئے' تو اس شعور کی وجہ سے اس کی قوت عمل دوچند ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک شخصی جدوجہد بالواسطہ پورے معاشرے کیلئے مفید ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اسلامی نظام حیات میں فرد اور جماعت کے درمیان فاصلے نہیں رکھے جاتے۔ ۱۔ اس لئے کہ فرد کی تمام ملکیت بھی دراصل پورے معاشرے کی ملکیت ہوتی ہے۔ اگر معاشرے کو اس کی ضرورت پڑے۔

اس آخری اصول کی روشنی میں اسلامی نظام وراثت پر کئے جانے والے وہ تمام اعتراضات زائل ہو جاتے ہیں' جن میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ نظام ان لوگوں کو بھی وراثت منتقل کر دیتا ہے جنہوں نے اس کیلئے کوئی جدوجہد نہیں کی ہوتی۔ اس لئے کہ یہ وارث درحقیقت موروث منہ کا تسلسل ہوتا ہے اور اگر یہی موروث منہ محتاج ہوتا اور یہ وارث مالدار ہوتا تو اپنے اسلامی اور معاشرتی فرائض کے تحت وہ اس کی کفالت کرتا۔ اور ان امور کے بعد یہ قاعدہ اپنی جگہ مسلم ہے کہ یہ دولت جس کے پاس بھی ہو اور جس طرح بھی تقسیم ہو یہ پورے معاشرے کی اجتماعی دولت ہے اور اسے اجتماعی ضروریات کیلئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ۲۔

ان امور کے علاوہ وارث اور مورث کے درمیان جو رابطہ ہوتا ہے خصوصاً مورث اور اس کی اولاد کے درمیان وہ صرف مالی رابطہ نہیں ہوتا۔ اگر ہم وارث اور مورث کے درمیان مالی مفادات کو ازروئے قانون کاٹ بھی دیں تو بھی ان کے درمیان جو خونی رشتے موجود ہیں اور جو دوسرے رشتے موجود ہیں وہ کاٹنے سے نہیں کٹتے۔

آباؤ اجداد اور دوسرے رشتہ دار اپنے بچوں' پوتوں اور رشتہ داروں کو صرف مالی وراثت ہی منتقل نہیں کرتے' بلکہ وہ اپنی اچھی صلاحیتیں اچھی عادات' بری عادات اور کمزوریاں بھی منتقل کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے بچوں اور پوتوں کی طرف بعض موروثی بیماریاں بھی منتقل کرتے ہیں اور اگر وہ صحت مند ہیں تو اپنی صحت مندی بھی وراثت میں دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک شخص کے حسن اخلاق و بداخلاقی اس کی اچھائیاں اور برائیاں اور ذکاوت اور غبی ہونا بھی وراثتاً" منتقل ہوتا ہے۔ اور یہ تمام صفات وارثوں کی طرف منتقل ہو کر ہمیشہ کیلئے ان کی زندگی پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ اور ان کے نتائج ان وارثوں کو بھگتنے پڑتے ہیں۔ اس لئے انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ مورث کا مال اگر کوئی ہے تو وہ بھی وارثوں کی طرف منتقل ہو۔ اس لئے کہ اگر ہم کسی شخص کا مال اس کے وارثوں کو نہیں دیتے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم وارثوں کو موروثی بیماریوں' اخلاقی کمزوریوں' بدعملی اور ذہنی اور جسمانی کمزوریوں سے بھی نجات دلائیں اور یہ اس وقت بھی ممکن نہیں جب ہم اپنے پورے وسائل اس کام میں لگا دیں۔

---

تفصیلات کیلئے دیکھئے فصل "فرد اور معاشرہ" کتاب الانسان بین المادیۃ والاسلام۔ مصنفہ محمد قطب اور مصنف کی کتاب العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام' فصل اجتماعی تکافل اور مالی پالیسی اور میری کتاب "دراسات اسلامیہ۔" ۲۔ ایضاً ۳۔ ایضاً۔

انسانی زندگی کے ان فطری اور واقعاتی حقائق کی وجہ سے اور ان تمام دوسری حکمتوں کی وجہ سے جو شریعت الٰہیہ میں پوشیدہ ہوتی ہیں' اللہ تعالیٰ نے میراث کی تقسیم کا یہ موجودہ نظام وضع فرمایا ہے۔ ۳۔ فرماتے ہیں۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۷﴾

"مردوں کیلئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو' اور عورتوں کیلئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو' خواہ تھوڑا ہو یا بہت' اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔"

یہ وہ عام اصول ہے جس کی رو سے اسلام نے آج سے پورے چودہ سو سال قبل عورتوں کو وہ حقوق دیئے جو اس وقت مردوں کو حاصل تھے۔ یہ فیصلہ اصولی فیصلہ تھا۔ جس طرح یتیموں کے حقوق کا تحفظ کیا گیا تھا' جبکہ اس وقت کے معاشرے میں عموماً چھوٹوں اور یتیموں کے حقوق مارے جاتے تھے۔ اور یہ حقوق اس لئے مارے جاتے تھے کہ ایام جاہلیت میں انسانوں کی قدر و قیمت کا تعین انسانی لحاظ سے نہیں بلکہ اس کا تعین اس لحاظ سے کیا جاتا تھا کہ پیداواری عمل میں وہ کس قدر کام آتے ہیں اور پھر جنگ میں وہ کس قدر وہ کام آتے ہیں۔ ان حالات میں اسلام نے ایک ربانی نظام پیش کیا' جس نے سب سے پہلے انسان کو بحیثیت انسان دیکھا۔ اس لئے کہ انسان کو انسانی حیثیت اس سے کسی حال میں بھی علیحدہ نہیں کی جا سکتی۔ انسانی حیثیت بنیادی حیثیت ہوتی ہے اور' ایک خاندان کے اندر یا ایک سوسائٹی کے اندر تمام دوسری حیثیات کا لحاظ اس کے بعد آتا ہے۔

○.....☆☆☆.....○

جیسا کہ بعد میں تفصیلات ناظرین کے سامنے آ رہی ہیں' اسلام کے قانون میراث میں بعض رشتہ داروں کی موجودگی سے بعض دوسرے وارث محروم ہو جاتے ہیں۔ وہ رشتہ دار تو ہوتے ہیں لیکن ان کو وراثت میں سے کچھ بھی نہیں ملتا۔ اس لئے کہ ان کے مقابلے میں زیادہ قریبی رشتہ دار ان سے پہلے ہی حق لے لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو محجوب کہتے ہیں۔ اس لئے یہاں تقسیم میراث کے وقت ایسے لوگوں کیلئے غیر متعین حق رکھا جاتا ہے۔ جب وہ تقسیم میراث کے وقت موجود بھی ہوں اور مستحق بھی ہوں۔ یہ حق ایسے لوگوں کی دلجوئی کیلئے رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ دیکھیں گے کہ مال تقسیم ہو رہا ہے اور وہ محروم ہیں۔ اس لئے ان کی دلجوئی مطلوب ہے۔ نیز اس سے خاندانی رشتے دار اور رابطے بھی مضبوط ہوں گے اور دلی محبت میں اضافہ ہو گا۔ اسی طرح دوسرے یتیموں' مسکینوں کے بارے میں بھی یہاں مشورہ دیا جاتا ہے کہ تقسیم کنندگان انہیں بھی کچھ ضرور دیں۔

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۸﴾

"اور جب تقسیم کے موقع پر کنبہ کے لوگ جمع ہوں اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔"

اس آیت کے بارے میں علماء سے بہت سے اقوال نقل ہوئے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ اور اسے آیت میراث نے منسوخ کر دیا ہے۔ جس میں تمام لوگوں کے حصص مقرر ہو چکے ہیں۔ بعض نے اسے غیر منسوخ اور قائم کہا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا مفہوم اور مدلول پر عمل کرنا فرض اور واجب ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اس پر عمل کرنا مستحب ہے۔ یہ وارثوں کی مرضی ہے کہ وہ اس پر عمل کریں یا نہ کریں۔ میرے خیال میں اس کے منسوخ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ آیات محکمات میں سے ہیں اور اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ اس لئے کہ ایک تو بظاہر یہ مطلق ہے۔ دوسرے یہ کہ اسلامی نظام حیات میں عام کفالت اور بر و احسان کو بہت ہی پسند کیا جاتا ہے۔ بہرحال یہ ایک مستقل مد ہے اور ان حصص کے علاوہ ہے جو آنے والی آیات کے اندر متعین کر دیئے ہیں۔

○.....☆☆☆.....○

اس سے پہلے کہ وارثان کے حصص کا بیان شروع ہو' ایک بار پھر تاکید کی جاتی ہے کہ یتیموں کا مال کھانا بہت ہی خطرناک جرم ہے' یہ دوبارہ تاکید اس لئے کی جاتی ہے کہ اہل ایمان کے دلوں کو ایک دو شدید چٹکیاں بھریں۔ پہلی چٹکی سے ان کے دل کے اندر پوشیدہ پدری شفقت کو جگانا مطلوب ہے۔ بچوں کے ساتھ ہر باپ کو فطری محبت ہوتی ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ بہت ہی ضعیف اور ناتوانی کی حالت میں ہوں اور یہ کہ خدا خوفی کا جذبہ ہی بہترین محاسب اور نگران ہوتا ہے اور دوسری چٹکی سے ان کے دلوں میں جذبات خوف اور انجام بد کے ڈر کو جگایا جاتا ہے۔ جہنم کی آگ کا خوف اور یہ یہاں ایک محسوس' مشاہد اور خوفناک انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ
فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ
ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿١٠﴾

ع ١٠ ١ ١٢

"لوگوں کو اس بات کا خیال کرنے سے ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے...... پس چاہئے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔ جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں در حقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔"

یہ پہلی چٹکی دل کے پردے کو ذبح کرتی ہے۔ ایک حساس محبت سے بھر آنیوالے باپ کے دل کو اپنے چھوٹے اور کمزور بچوں کی نسبت سے یہ تصور دیا جاتا ہے کہ ذرا سوچیں تو سہی' تمہارے چھوٹے بچے ہوں' ناتواں ہوں اور ان پر کوئی ترس کھانے والا نہ ہو اور نہ کوئی ان کا محافظ و نگران ہو۔ جو ان کے سر پر رحم کا ہاتھ پھیرے۔ یہی حالت ان یتیموں کی ہے' جن کی تقدیر تمہارے سپرد ہے۔ ان کے باپوں کا سایہ ان کے سروں سے اٹھ چکا ہے۔ انہیں کیا معلوم ہے کہ کل تم نہ رہو تو خود تمہارے بچے دوسرے زندہ اولیاء کی تولیت میں ہوں' جس طرح یہ موجود بچے تمہاری ولایت میں ہیں۔ اس ذبح کے بعد انہیں نصیحت کی جاتی ہے کہ اس تصور کے ساتھ ساتھ ان بچوں کے بارے میں خدا کا خوف ہر وقت دل میں ان کو اور اس کا بدلہ یہ ہو گا کہ کل تمہارے بچوں کا انتظام بھی اللہ ایسے ہی خدا ترس اولیاء کے ذریعے کرانے کا انتظام کرے گا۔ جو خدا خوفی' احتیاط اور محبت سے یہ ڈیوٹی سرانجام دیں گے۔ پھر یہ نصیحت بھی کی جاتی ہے کہ وہ ان یتیموں کے بارے میں سیدھی سیدھی بات کریں۔ یعنی اس تربیت اور نگرانی اور ان کے متاع و اموال کی دیکھ بھال کے دوران۔

اور یہ دوسرا ذوق کیا ہے؟ نہایت ہی خوفناک ' کچھ لوگ ہیں جو دہکتے انگاروں کو اس طرح کھائے جا رہے ہیں جس طرح لقمہ رزق ' کیا خوفناک تصویر ہے یہ ' آخر کار جہنم میں اور پیٹ میں بھی جہنم ' یہ دولت جسے وہ کھا رہے ہیں ۔ یتیموں کا مال گویا وہ آگ کے دہکتے انگارے کھا رہے ہیں ۔ مآل کار وہ جہنم رسید ہوں گے ۔ وہ ان کے ان معدوں اور ان کی کھال کو بھسم کر کے رکھ دے گی ۔ ظاہر میں بھی آگ اور باطن میں آگ ۔ مجسمہ آگ جسے پیٹ اور کھال دونوں محسوس کرتے ہیں ۔ اس تصویر کو آنکھیں دیکھ رہی ہیں اور اس میں پیٹ اور جسم اور کھال سب جل رہے ہیں ۔

قرآن کریم کے اس موثر انداز تعبیر نے صحابہ کرام اور مسلمانوں کے دل و دماغ پر خوب اثر کیا ۔ ان نصوص کے موثر اشارات نے اہل ایمان کے دل و دماغ سے جاہلیت کی میل کچیل دھو کر رکھ دی ۔ ان کے دلوں کو اس قدر جھنجوڑا کہ جاہلیت کے ہر قسم کے گرد و غبار کو جھاڑ کر رکھ دیا ۔ اور اس جگہ ان مومن دلوں کے اندر خدا ترسی ' خدا خوفی اور احتیاط و احتساب کے جذبات پیدا کر دیئے اور ان کی حالت یہ ہو گئی کہ انہوں نے یتیموں کے مال کو اچھوت تصور کیا ۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس مال کے اندر آگ ہے اور یہ تصور ان کے دلوں میں ان آیات پر تاثیرات نے پیدا کر دیا تھا ۔ انکی حالت یہ ہو گئی کہ وہ اموال یتامیٰ کو چھونا تک گوارا نہ کرتے تھے ۔ اور ان اموال سے اس طرح دور بھاگتے تھے جیسے لومڑی ڈر کے مارے بھاگتی ہے ۔

عطاء ابن سائب کے واسطہ سے سعید ابن جبیر نے حضرت ابن عباس ؓ سے نقل کیا ہے ۔ فرماتے ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا ............................... تو جن لوگوں کے پاس یتیم تھے ' انہوں نے ان کا کھانا پکانا جدا کر دیا ۔ ان کا کھانا پینا علیحدہ کر دیا گیا ۔ بعض اوقات ان کے کھانے پینے سے کچھ چیز بچ جاتی تھی تو وہ ان کیلئے چھوڑ دی جاتی تھی کہ یا تو وہ دوسرے وقت کھائیں یا وہ چیز خراب ہو جاتی ۔ یہ معاملہ ان کیلئے تکلیف کا باعث بن گیا ۔ اس بات کی شکایت حضور ؐ کے سامنے ہوئی تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔

وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ

" پوچھتے ہیں یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے ؟ کہو جس طرز عمل میں ان کیلئے بھلائی ہو ' وہی اختیار کرنا بہتر ہے ۔ اگر تم اپنا اور ان کا خرچ اور رہنا سہنا مشترک رکھو ' تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ آخر وہ تمہارے بھائی بند ہی تو ہیں ۔ برائی کرنے والے اور بھلائی کرنے والے دونوں کا حال اللہ پر روشن ہے ۔ اللہ چاہتا تو اس معاملے میں تم پر سختی کرتا ۔ " ............ اس کے بعد صحابہ نے یتیموں کا کھانا اپنے کھانے کے ساتھ شامل کیا اور ان کا پینا اپنے پینے کے ساتھ ۔

یوں قرآنی انداز تربیت نے ان لوگوں کے ایمان و ضمیر کو بلند کر دیا اور وہ انسانیت کے افق کا روشن ستارہ بن گئے ۔ اور ان کے دل و دماغ کو جاہلیت کی تمام آلودگیوں سے پاک و صاف کر دیا اور یہ پاکی اور تطہیر اس معاشرے میں تعجب انگیز تھی ۔

○.....☆☆☆.....○

اب بات نظام وراثت تک آ پہنچتی ہے ۔ آغاز کلام اس طرح ہوتا ہے کہ اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے ۔ اس وصیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت ہی رحیم ' بہت ہی بھلائی کرنیوالے اور بہت ہی عادل ہیں ۔ اور وہ والدین سے بھی زیادہ رحیم و شفیق ہیں ۔ اور ان انداز خطاب میں یہ اشارہ بھی کیا جاتا ہے کہ اس پورے نظام کا مرجع و مآل آخر کار اللہ میاں کی ذات مبارک ہے ۔ اور

اللہ کی ذات ہی ہے جو ایک والد اور اس کی اولاد کے درمیان بھی فیصلہ کرنیوالی ہے۔ وہ رشتہ داروں کے درمیان بھی حقوق طے کرنیوالی ہے۔ اور لوگوں کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اللہ سے سیکھیں اور اخذ کریں اور اس کے احکام و وصیت کو نافذ کریں۔ یہی معنی دین کے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے آغاز سورت پر کلام کے وقت یہ نکتہ بیان کیا تھا کہ اس سورت کے موضوعات میں سے ایک اہم موضوع اور محور دین کے مفہوم کی وضاحت ہے۔ چنانچہ نظام میراث پر کلام کا آغاز یوں ہوتا ہے یُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ ............................ "تمہاری اولاد کے بارے میں تمہیں اللہ ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوگا۔" اور اس فقرے کے بعد پھر تمام وارثوں کے حصص کا بیان ہوتا ہے۔ اور یہ تقسیم اور تقرری اس عمومی اصول کے تحت ہے کہ یہ اللہ کی جانب سے ہدایت اور وصیت ہے۔ اس کی تفصیلات دو طویل آیات میں دی گئی ہیں۔ پہلی آیت میں اصول اور فروع کے درمیان تقسیم میراث ہے۔ یعنی آبا اور اولاد کے درمیان' اور دوسری آیت میں ازدواجی رشتہ اور کلالہ کے حصص میراث کا بیان ہے۔ اور پھر بعض تتمہ احکام اس سورت کے آخر میں کلالہ کے بارے میں آتے ہیں۔ (تفصیلات آرہی ہیں۔)

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ
مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَاۗءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَھُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ
وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَھَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ
مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ
الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِھَآ
اَوْ دَيْنٍ ۭ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّھُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ
اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ
لَّمْ يَكُنْ لَّھُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَھُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ
بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِھَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَلَھُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ
يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَھُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِھَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ
وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ

ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾

"تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت............ اور اللہ دانا و بینا اور نرم خو ہے۔"

یہ دو آیات اور اس سورت کی تیسری آیت میں علم میراث کے اصولی قواعد کو منضبط کیا گیا ہے۔ اس سورت کی تیسری آیت یہ ہے۔

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۭ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۭ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاۗءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

"لوگ تم سے کلالہ کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں کہو کہ اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص بے اولاد مرجائے اور اس کی بہن ہو تو وہ اس کے ترکہ میں سے نصف پائے گی اور اگر بہن بے اولاد مرے تو بھائی اس کا وارث ہوگا۔ اگر میت کی وارث دو بہنیں ہیں تو وہ ترکہ میں سے دو تہائی کی حقدار ہوں گی۔ اور اگر کئی بھائی بہنیں ہوں تو عورتوں کا اکہرا اور مردوں کا دوہرا حصہ ہوگا۔ اللہ تمہارے لئے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔"

ان تین آیات میں علم میراث کے اصولوں کو منضبط کر دیا گیا ہے۔ ان اصولوں کے مزید فروعی مسائل کی وضاحت سنت رسول میں اور اقوال صحابہ میں کی گئی ہے۔ اور اس کے بعد ان اصول و فروع سے فقہائے کرام نے اجتہاد کر کے تفصیلی مسائل بیان کئے ہیں۔ ان فروعی مسائل کی تفصیلات کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ تفصیلات کا مطالعہ کتب فقہ میں کیا جاسکتا ہے۔ یہاں فی ظلال القرآن میں ہم فقط ان آیات کی تشریح کریں گے۔ نیز ان آیات کے آخر میں جو تعقیبات ہیں اور ان میں اسلامی نظام زندگی کے جو اصولی نظریات بیان ہوئے ہیں ہم ان کی تشریح کریں گے۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ............................ "تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں وصیت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔"........ اس افتتاحی آیت سے معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں کہ علم میراث کا یہ اصل الاصول ہے۔ اور یہ کہ اس علم کا منبع کیا ہے۔ اور یہ کہ یہ علم کس مصدر سے نکلا ہے۔ اور اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ والدین سے بھی زیادہ رحیم اور شفیق ہے۔ اور اس نے ان کیلئے جو حصص تجویز کئے ہیں تو یہی ان کے مفاد میں ہیں۔ اور اس قسم کی تقسیم خود والدین بھی نہیں کر سکتے۔ یہ دونوں مفہوم ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

اللہ ہی ہے جو وصیت کرتا ہے۔ وہی حصص مقرر کرتا ہے۔ اور وہی لوگوں کے درمیان میراث تقسیم بھی کرتا ہے۔ بعینہ اسی طرح

وہ ہر معاملے میں وصیت بھی کرتا ہے۔ اور فرائض و واجبات بھی مقرر کرتا ہے اور اسی طرح وہ اس کائنات کے اندر مخلوقات کی روزی بھی تقسیم کرتا ہے۔ اور یہ تمام ضابطے اور شرائع و قوانین بھی اسی کی جانب سے آتے ہیں۔ یہ اللہ ہی ہے جس سے لوگ ان کے تمام حالات زندگی میں ضابطے اخذ کرتے ہیں۔ اور ان میں سے ایک حال لوگوں کے درمیان ترکے کی تقسیم بھی ہے۔ خود ان کی اولاد کے درمیان' اور یہی دین اسلام ہے۔ اور اگر لوگ اپنی زندگی کے تمام حالات میں اللہ تعالیٰ کی وصیت اور ضابطوں کو قبول نہیں کرتے تو یہ دین نہ ہو گا۔ اور یہ حالت اسلامی حالت نہ ہوگی کہ وہ اپنے امور حیات میں' چاہے وہ بڑے امور ہوں یا چھوٹے امور ہوں' کسی دوسرے ماخذ سے ضابطے اخذ کریں۔ یہ صورت حال یا شرک ہوگی یا کفر صریح ہوگی۔ اور یہ پھر وہی جاہلیت ہوگی جس کی جڑیں عوام الناس کی زندگیوں سے اکھاڑنے کیلئے اس دنیا میں اسلام آیا تھا۔

یہاں اللہ جس چیز کی وصیت فرما رہے ہیں' جسے فرض فرما رہے ہیں اور حکم دے رہے ہیں کہ لوگوں کی زندگیوں میں اس کے مطابق حکم چلے' وہ تمام احکام لوگوں کیلئے نہایت نفع بخش اور مفید ہیں۔ خصوصاً وہ چیزیں جو ان کی مخصوص شخصی امور کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں مثلاً ان کی دولت کی تقسیم ترکے کی تقسیم اور اس میں ان کی اولاد کے حصص وغیرہ اور یہ تقسیم ان تقسیمات سے زیادہ مفید ہے جو وہ آپس میں خود کر رہے ہیں۔ اور جن چیزوں کو وہ اپنی اولاد کیلئے پسند کرتے ہیں۔ اس لئے کہ لوگوں کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ یہ کہیں کہ ہم اپنے لئے خود جو چاہیں اختیار کریں گے اور یہ کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہمارے لئے کیا مفید ہے اور کیا غیر مفید ہے۔ اس لئے کہ یہ بات علاوہ اس کے کہ فی نفسہ باطل ہے' یہ بے جا جسارت ہے' خود سری ہے اور اللہ جل شانہ کے مقابلے میں زیادہ علم کا دعویٰ ہے۔ اور یہ ایک ایسا "ادعاء" ہے جو نہایت بے باک اور جاہل شخص ہی کر سکتا ہے۔

عوفی نے حضرت ابن عباس ؓ سے آیت **يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ** ............ کے بارے میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب احکام میراث نازل ہوئے اور ان میں اللہ تعالیٰ نے جو حصص مقرر کئے وہ کر دیئے۔ بیٹے کا حصہ' بیٹی کا حصہ اور والدین کا حصہ تو لوگوں نے اسے بہت ہی برا مانا۔ یا بعض لوگوں نے اسے ناپسند کیا۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ عورت کو چہارم اور ہشتم دیا جاتا ہے اور بیٹی کو نصف دیا جاتا ہے۔ اور چھوٹے بچے کا حصہ بھی مقرر ہو گیا حالانکہ ان لوگوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو لڑائی کے وقت کام آتا ہو اور کوئی بھی نہیں ہے جو لڑائی کے بعد مال غنیمت ہتھیا سکتا ہو۔ ان احکام کے بارے میں بالکل خاموش ہو جاؤ' شاید رسول اللہ ﷺ ان احکام کو بھول جائیں یا ہم ان کے بارے میں آپ ؐ سے سفارش کریں اور آپ ان میں تبدیلی کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا اے رسول خدا! آپ ایک لڑکی کو باپ کے ترکے میں سے نصف دیتے ہیں' حالانکہ وہ گھوڑے پر سوار نہیں ہوتی اور نہ وہ جنگ میں حصہ لیتی ہے۔ پھر ایک نابالغ بچے کو میراث دی جا رہی ہے اور وہ ہمارے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اور جاہلیت میں تو وہ اس طرح کرتے تھے کہ وہ میراث صرف ان لوگوں کو دیتے تھے جو جنگ میں حصہ لیتا تھا۔ اور وہ تقسیم میں سب سے بڑے کو اس کے بعد جس کا نمبر ہو اس کو دیتے تھے۔ (روایت ابن ابی حاتم و ابن جریر)

غرض عربی جاہلیت کی منطق یہ تھی' اس لئے قانون میراث کے احکامات ان میں سے بعض لوگوں کو کھٹکتے تھے۔ یہ لوگ اللہ کے فرائض اور اس کی عادلانہ تقسیم کے مقابلے میں آگئے حالانکہ یہ تقسیم نہایت حکیمانہ تھی۔ اور آج کی جاہلیت جدیدہ کی بھی یہی منطق ہے جو بعض لوگوں کے دل میں خلجان پیدا کرتی ہے۔ اس لئے یہ منطق بھی اللہ کے فرائض اور تقسیم کے مقابلے میں سامنے آتی ہے۔ اگرچہ جاہلیت جدیدہ بعض پہلوؤں سے جاہلیت عربیہ سے مختلف نوعیت رکھتی ہے۔ آج کی جاہلیت کی منطق یہ ہے کہ ہم ترکہ ان لوگوں کو تقسیم کر کے کیوں دیں جنہوں نے اس ترکے کی کمائی میں کوئی محنت و مشقت نہیں کی۔ اور نہ اس میں کوئی تکلیف برداشت کی۔ اور یہ ذہنیت بھی

ایسی ہے جس نے حکمت الٰہیہ کو نہیں پایا۔ نیز یہ منطق بھی دراصل سخت گستاخی اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور گستاخی اور جسارت میں جاہلیت قدیمہ اور جدیدہ دونوں برابر ہیں۔

لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ............ "مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہو گا۔" یعنی اگر مرد کی وارث صرف اس کی اولاد ہو بیٹے اور بیٹیاں تو سب ترکہ انہیں ملے گا اور مرد کا حصہ عورتوں کے حصے میں دوگنا ہو گا۔ یعنی لڑکی کا ایک حصہ اور لڑکے کے دو حصے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ ان دونوں کے حصوں میں یہ فرق و امتیاز اس لئے نہیں کیا گیا کہ کسی صنف کو دوسرے پر فضیلت ہے۔ بلکہ حصص کا یہ فرق اس لئے روا رکھا گیا ہے کہ اسلامی نظام نے عائلی زندگی میں مرد اور عورت پر جو ڈیوٹیاں رکھی ہیں یہ فرق حصص ان کے مطابق نہایت ہی متوازن اور عادلانہ ہے۔

عائلی زندگی سے آگے اسلامی معاشرے کے اجتماعی امور میں بھی عورت کے مقابلے میں مرد پر زیادہ فرائض عائد کئے گئے ہیں۔ ایک مرد عورت کے ساتھ نکاح کرتا ہے اور وہ اس کا نفقہ بھی دیتا ہے۔ اس کی اولاد کا نفقہ بھی دیتا ہے۔ اور یہ ذمہ داریاں اس وقت بھی اس کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ جب یہ مرد اس عورت کو طلاق بھی دے دیتا ہے۔ رہی عورت تو وہ یا تو خود اپنی ضروریات کی ذمہ دار ہوتی اور یا یہ صورت ہوتی ہے کہ شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی اس کے نفقے کا ذمہ دار مرد ہی ہوتا ہے۔ اور وہ خاوند اور اپنی اولاد کے نفقات کی کسی صورت میں بھی ذمہ دار نہیں ہوتی۔ اب صورت یہ ہے کہ مرد عورت کے مقابلے میں خاندان کی ضروریات کے دو حصے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی طرح اجتماعی معاملات میں بھی مرد کی ذمہ داریاں عورت کے مقابلے میں دوگنا ہیں۔ اس لئے اللہ کے مقرر کردہ یہ حصص ایک طرف عادلانہ بھی ہیں اور دوسری جانب بمصداق حصہ بقدر جثہ یہ تقسیم منصفانہ بن جاتی ہے۔ اور اس تقسیم پر ہر اعتراض یا تو جہالت پر مبنی ہے اور یا یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بے جا جسارت اور گستاخی کی وجہ سے وارد کیا گیا ہے۔ نیز اس سے مقصد یہ ہے کہ اسلام کے اجتماعی اور خاندانی نظام کی بنیادوں کو اکھیڑ دیا جائے اور پرسکون زندگی کے اندر افراتفری پیدا کر دی جائے۔

تقسیم کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ باپ دادا کی میراث اولاد پر کس طرح تقسیم ہوگی فرماتے ہیں فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ ............ "اگر میت کی وارث دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو انہیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے۔" یعنی اگر صرف دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں اور لڑکے نہ ہوں تو انہیں دو تہائی دیا جائے گا۔ اور اگر صرف ایک لڑکی ہو اور لڑکا نہ ہو تو پھر نصف اس کا ہو گا۔ بقایا عصبات کو ملے گا۔ قریب ترین عصبہ کو۔ عصبات یہ لوگ ہیں۔ باپ، دادا، بھائی حقیقی، باپ شریک بھائی، چچا اور پھر باپ دادا کی اولاد، اس آیت کی عبارت یہ ہے کہ "اگر وارث دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو ان کے دو تہائی ہے۔" سوال یہ ہے کہ اگر دو ہوں تو ان کیلئے حکم کیا ہے۔ ان کا حصہ بھی دو تہائی ہے، جو حدیث سے ثابت ہے۔ نیز وہ ان دو بہنوں کے حصے پر قیاس کرکے بھی ثابت ہوتا جس کا ذکر اس سورت کی آخری آیت میں مسئلہ کلالہ میں ذکر ہوا۔

ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے عبداللہ ابن محمد ابن عقیل کی روایت حضرت جابر سے نقل کی ہے۔ کہتے ہیں حضور کے پاس سعد ابن ربیع کی بیوی آئی اور عرض کیا حضور یہ سعد ابن ربیع کی دو لڑکیاں ہیں۔ وہ آپ کے ساتھ احد میں شہید ہو گئے ہیں۔ ان کے چچا نے سب مال لے لیا ہے۔ اگر ان کے پاس مال نہ ہو گا تو ان کے ساتھ شادی کون کرے گا؟ آپ نے فرمایا "اللہ اس کے بارے میں ضرور کوئی فیصلہ کرے گا۔" اس موقعہ پر آیت میراث نازل ہوئی۔ حضور نے ان کے چچا کو بلا بھیجا اور حکم دیا سعد کی دو بیٹیوں کو دو تہائی دیدو اور

بیوی کو آٹھواں دیدو اور باقی تمہارا ہے۔ یہ خود حضورؐ کی تقسیم ہے۔ آپؐ نے دو لڑکیوں کو دو تہائی دیا۔ اس لئے اگر دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو ان کو دو ثلث ملیں گے۔

رہا سورت کی آخری آیت پر قیاس تو اس میں بہنوں کے بارے میں ہے۔ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ ........................ "اور اگر وہ بہنیں دو ہیں تو انہیں ترکے میں سے دو تہائی ملے گا۔" لہٰذا کسی باپ کی اگر دو لڑکیاں ہوں تو انہیں بطریق اولی دو تہائی ملے گا۔ دو بہنوں پر قیاس کرتے ہوئے۔ اس لئے کہ اگر ایک لڑکی ہے تو بھی نصف حصہ ہے۔ اور اگر ایک بہن (کلالہ میں) تو بھی نصف حصہ ہے۔ اور دو لڑکیوں کا حصہ بھی وہی ہوگا جو دو بہنوں کا ہوگا۔

اولاد کے حصہ کے بیان کے بعد اب والدین کے حصص کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ بشرطیکہ وہ موجود ہوں۔ یہ حصص اولاد میت کی موجودگی اور عدم موجودگی کی صورت میں مختلف ہیں۔

"اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملنا چاہئے اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو مال کا تیسرا حصہ دیا جائے گا۔"

میراث میں والدین کے حالات متعدد ہوتے ہیں ............... پہلا حال یہ ہوتا ہے، کہ والدین بھی ہوں اور میت کی اولاد بھی ہو۔ اس صورت میں دونوں کو چھٹا چھٹا حصہ ملے گا۔ بقیہ میت کے لڑکے یا لڑکے لڑکیوں میں حسب حصص تقسیم ہوگا۔ مرد کا حصہ عورت کے مقابلے میں دوگنا ہوگا۔ اب اگر میت کی اولاد میں صرف ایک لڑکی ہو تو اسے بقیہ کا نصف ملے گا اور والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا ملے گا۔ اب بقیہ (۱/۶) والد کو بطور عصبہ مل جائے گا۔ اس صورت میں اولاد بطور ذوالفروض بھی حصہ پائے گا اور بطور عصبہ بھی حصہ پائے گا۔ ہاں اگر میت کی دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو وہ تو انہیں دو ثلث اور والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ میت کی اولاد' بھائی بہن اور خاوند بیوی نہ ہوں' اس صورت میں والدہ بطور ذوالفروض ثلث کی حقدار ہوگی اور باقی سب والد کو بطور عصبہ ملے گا۔ اس صورت میں والد کا حصہ والدہ سے دوگنا ہو جائے گا۔ اب اگر والدین کے علاوہ خاوند بھی ہو یا بیوی بھی ہو' تو خاوند کا نصف ہوگا' اور اگر بیوی ہو تو اس کا چہارم ہوگا اور والدہ کا ثلث ہوگا۔ (یا تو تمام ترکہ کا ثلث ہوگا یا بقیہ ترکہ یعنی خاوند یا بیوی کا حصہ نکال کر بقیہ کا ثلث ہوگا' جیسا کہ فقہا کے دو اقوال ہیں۔) اور ماں کے بعد جو بچے گا وہ والد کا ہوگا بطور عصبہ بشرطیکہ کہ والد کا حصہ والدہ سے کم نہ ہوگا۔

اور تیسری صورت یہ ہے کہ ماں باپ اور میت کے بھائی بہنوں کے ساتھ پائے جائیں۔ یہ بھائی ماں اور باپ دونوں میں شریک ہوں یا باپ میں شریک یا صرف ماں میں شریک ہوں۔ اس صورت میں باپ کی موجودگی میں ان بھائیوں کو کچھ نہ ملے گا اور یہ محروم ہوں گے۔ اس لئے کہ لڑکے کے بعد میت کیلئے والد قریب تر عصبہ ہیں اور قریب کی موجودگی میں دور کو نہیں ملتا۔ لیکن محروم ہونے کے باوجود یہ بھائی میت کی ماں پر اثرانداز ہوں گے اور اس کا حصہ ثلث سے چھٹے تک گھٹ جائے گا۔ اس صورت میں والدہ کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور بقیہ سب کچھ والد کو ملے گا' بشرطیکہ کہ میت کا خاوند یا بیوی نہ ہوں۔ ہاں اگر بھائی فقط ایک ہو تو والدہ کا حصہ ثلث ہی رہے گا' جس طرح اس صورت میں تھا جس میں میت کی اولاد اور بھائی نہ ہوں۔

لیکن والدین کے یہ حصص قرضے کی ادائیگی اور وصیت پورا کرنے کے بعد ہوں گے۔ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ........................ "یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے جبکہ وصیت جو میت نے کی ہو پوری کر دی جائے اور جو قرض اس پر ہو ادا کر دیا جائے۔" علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے۔ "علمائے جدید و قدیم نے اس بات پر اجماع کر لیا ہے کہ قرضہ وصیت پر مقدم

ہے۔ "اور وصیت پر قرضے کو مقدم کرنے کی حکمت بہرحال واضح ہے۔ اس لئے کہ قرضے میں ایک تیسرے شخص کے حقوق کا سوال ہوتا ہے' اس لئے کہ میت کے مال میں سے اس کی ادائیگی لازمی ہے کیونکہ خود اس نے قرضہ لیا ہوتا ہے۔ بشرطیکہ میت کا مال موجود ہو' یہ اس لئے کہ شریعت نے میت کو قرضے کی ذمہ داریوں سے بری الذمہ کرنے کی بہت تاکید کی ہے تاکہ معاشرے کی اجتماعی زندگی میں باہم اعتماد بحال رہے اور سوسائٹی کے اندر باہم اعتماد کی فضا باقی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شخص کی وفات کے بعد بھی شریعت اس کے ذمہ واجب الادا قرضوں کو موقوف نہیں کر دیتی۔

حضرت ابو قتادہ ؓ سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں: ایک شخص نے کہا: "حضور بتایئے اگر میں مارا گیا تو میرے سب گناہ معاف ہوں گے" تو حضور ؐ نے فرمایا: "ہاں' اگر آپ قتل ہو جائیں' جبکہ آپ مشکلات پر صبر کر رہے ہوں۔ آپ کی نیت ٹھیک ہو اور آپ آگے بڑھ رہے ہوں' بھاگ نہ رہے ہوں۔" ....... اسکے بعد اس شخص نے دوبار پوچھا" آپ ؐ نے کیا فرمایا' تو حضور ؐ نے دوبارہ اسی بات کو دہرایا اور مزید یہ فرمایا" "ہاں' ماسوائے قرضے کے' جبرائیل نے مجھے اس کی اطلاع دی ہے۔" (روایت مسلم' مالک' ترمذی اور نسائی)

ابو قتادہ ؓ سے روایت ہے۔ حضور کے پاس ایک شخص کو لایا گیا' آپ ؐ نے فرمایا "اس کا جنازہ تم لوگ پڑھو' اس پر تو قرضہ واجب ہے۔" "میں نے اس پر کہا" "حضور ' یہ قرضہ مجھ پر ہوا۔" تو حضور نے فرمایا۔ پورا کرو گے۔" "میں نے عرض کیا۔ "میں پورا کروں گا۔"

اور وصیت کا پورا کرنا اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ میت کا ارادہ اس کے ساتھ متعلق ہو گیا ہے۔ وصیت کی گنجائش شریعت نے اس لئے رکھی ہے کہ بعض حالات میں بعض رشتہ دار محروم ہو جاتے ہیں۔ اور یہ محرومی بعض دوسرے رشتہ داروں کی موجودگی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ محروم لوگ معذور اور مستحق ہوتے ہیں یا ان کو کچھ نہ کچھ دینے میں پورے خاندان کی مصلحت ہوتی ہے اور بعض اوقات اس کی وجہ سے حسد' کینہ اور خاندان کے اندر نزاع پیدا ہونے سے رک جاتے ہیں۔ البتہ یہ اصول مسلم ہے کہ کسی وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے۔ اور وصیت محدود بھی ترکہ کی ایک تہائی تک ہے۔ ان دو باتوں کی وجہ سے میت بھی کسی وارث کو محروم نہیں کر سکتا۔

آبَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا

"تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب ہے۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کر دیئے ہیں' اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔"

اس آیت کے آخر میں مختلف القاصد ٹچ دیئے گئے ہیں.......... پہلا ٹچ اس مقصد کیلئے ہے تا کہ محسوس کر کے قرآن کریم کی جانب سے حصص کے اس الاٹمنٹ سے خوش ہو جائیں اور اسے بطیب خاطر قبول کر لیں' ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ محبت کے جذبے سے مغلوب ہو کر باپ کے مقابلے میں اولاد کو ترجیح دیں۔ کیونکہ بچوں کی طرف ہر انسان کا فطری رجحان زیادہ ہوتا ہے۔ اور بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا اپنے والدین کی نسبت اخلاق اور آداب کا شعور زیادہ پختہ ہوتا اور وہ اولاد کے مقابلے میں والدین کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو والدین کے پاس ادب اور بچوں کی طرف فطری میلان کے درمیان فیصلہ نہیں کر پاتے.......... کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک خاندان رسم و رواج کی ذہنیت کی وجہ سے ایک متعین لائن اختیار کر لیتا ہے' جس طرح نزول قرآن کے وقت مروج قانون میراث میں صرف خاندانی ذہنیت اس وقت کے رسم و رواج کے تحت کام کر رہی تھی۔ اس سے پہلے ہم عربوں کے بعض رواجوں کا

تذکرہ کر چکے ہیں۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مناسب سمجھا کہ اہل ایمان کے دلوں کو تسلیم و رضا اور امن و سکون سے بھر دیں تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکامات کو خوشی خوشی قبول کرتے چلے جائیں۔ اللہ انہیں یہ شعور دیتے ہیں کہ ہر چیز کا مکمل علم اللہ کی ذات ہی کے پاس ہے۔ اور یہ کہ انہیں اس بات کا پورا علم نہیں ہے کہ اقرباء میں سے کون ان کیلئے زیادہ مفید ہے اور کون کم 'نہ انہیں اس بات کا علم ہے کہ کونسی تقسیم زیادہ مفید ہے۔ **اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا** ..........................

"تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہے۔"

دوسرا ٹچ جو اس مضمون کو دیا گیا وہ یہ ہے کہ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کون تمہارے لئے مفید ہے اور کون مفید تر ہے۔ اصل مسئلہ دین 'نظام قانون اور شریعت کا ہے۔ اور یہ جو حصص مقرر ہو رہے ہیں یہ **فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ** .................. "یہ حصص تو اللہ نے مقرر کر دیئے ہیں۔" اللہ وہ ذات ہے جس نے ماں باپ کو بھی پیدا کیا اور اولاد کو بھی پیدا کیا۔ وہی ہے جو مال و دولت دینے والا ہے۔ وہ فرائض و حصص عائد کرنیوالا ہے اور وہی تقسیم کنندہ ہے۔ اور وہی ہے جسے قانون بنانے کا حق ہے۔ انسان کو تو یہ اختیار ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے کوئی قانون بنائیں۔ نہ وہ اس میں آزاد ہیں کہ وہ اپنی خواہشات کے مطابق نظام حکومت تجویز کریں 'اس لئے کہ وہ نہیں جانتے کہ کس میں ان کی مصلحت ہے۔ یہ تو صرف وہی ہے **اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا** .................. جو سب حقیقتوں سے واقف ہے۔

یہ تیسری ٹچ ہے جو اس تبصرے کے اندر دی گئی ہے۔ کہ باوجود اس امر کے یہ قانون ایک خدائی فیصلہ ہے اور ہر حال میں بھی ان کیلئے واجب الاطاعت ہے 'لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ گہری حکمت اور وسیع تر مصلحت پر بھی مبنی ہے۔ اور اللہ نے یہ حکم اپنے وسیع علم کی بنا پر دیا ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں انسان کا علم محدود ہے۔ اس میں اس کی گہری حکمت کارفرما ہے جبکہ انسان محض خواہش نفس کے پیرو ہوا کرتے ہیں۔

اس قانون سازی کے اندر بار بار تبصرہ ہوتا ہے کہ معاملے کو اپنی اصل مدار کی طرف لوٹنا چاہئے۔ اور اس کی اصل مدار نظریاتی ہے۔ اور یہ نظریاتی اساس دین کے اس مفہوم پر مبنی ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے تمام فیصلے اللہ سے کرائے جائیں اور اس کی حکمت پر راضی ہو کر فرائض اسی سے اخذ کئے جائیں۔ "یہ حصے اللہ نے مقرر کر دیئے ہیں اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف ہے۔ اور سب مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔"

اس کے بعد باقی حصص یوں متعین ہوتے ہیں۔

**وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۗ**

"اور تمہاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو اس کا آدھا حصہ تمہیں ملے گا اگر وہ بے اولاد ہوں 'ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں

ترکہ کا ایک چوتھائی حصہ تمہارا ہے جبکہ وصیت جو انہوں نے کی پوری کر دی جائے۔ اور قرض جو انہوں نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے۔ اور وہ تمہارے ترکہ میں سے چوتھائی کی حقدار ہوں گی اگر تم بے اولاد ہو' ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ان کا حصہ آٹھواں ہو گا' بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو وہ پوری کر دی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کر دیا جائے۔"

اگر خاوند بلا اولاد مر جائے تو بیوی کا حصہ چوتھائی ہے' اگر اولاد ہو' لڑکے یا لڑکیاں ایک یا متعدد' اس عورت سے ہو یا کسی اور عورت سے' یا حقیقی بیٹے کے لڑکے ہوں تو ان صورتوں میں بیوی کا حصہ چوتھائی سے آٹھواں ہو جائے گا۔ قرض کی ادائیگی اور وصیت بہرحال پہلے ہو گی۔

نیز دو بیویاں' تین بیویاں اور چار بیویاں ایک ہی بیوی شمار ہوں گی۔ وہ سب کی سب چہارم یا ہشتم میں شریک ہوں گی ............ اور اب حکم میراث کے سلسلے میں آخری حکم ہے جو مسئلہ کلالہ کے نام سے مشہور ہے۔

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ

"اور اگر وہ مرد یا عورت جس کی میراث تقسیم ہو رہی ہے بے کلالہ ہو (بے اولاد بھی ہو' اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں) مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہو تو کل ترکہ کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے۔ جبکہ وصیت جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو میت نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے' بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو۔"

کلالہ کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص اپنے جواب سے میراث کا حقدار ہو' حقداری کا سبب اصول میں سے ہو نا یا فروع میں سے ہو نا نہ ہو' یعنی تعلق ضعیف ہو' اس قدر قوی نہ ہو جس طرح اصول و فروع کا تعلق قوی ہوتا ہے۔ کسی نے حضرت ابوبکر صدیق سے کلالہ کے بارے میں سوال کیا تھا تو انہوں نے فرمایا: "میں اس سلسلے میں بات اپنی رائے کے مطابق کروں گا' اگر یہ رائے درست ہو تو اللہ کی جانب سے ہوئی اور اگر غلط ہو تو شیطان کا القاء ہو گا۔ اور اللہ اور رسول اللہ اس کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ کلالہ وہ ہے جس کی نہ اولاد ہو اور نہ والدین ہوں۔" جو حضرت ابوبکر کے بعد حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے شرم آتی ہے کہ میں حضرت ابوبکر کی رائے کی مخالفت کروں۔" (اس روایت کو ابن جریر نے شعبی سے نقل کیا ہے۔)

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں "حضرت علیؓ' ابن مسعودؓ' ابن عباسؓ' زید ابن ثابتؓ سے منقول ہے۔ شعبی' نخعی' حسنؒ' قتادہؒ' جابرؒ' ابن زید اور حکم کی رائے بھی یہی ہے۔ اہل مدینہ' اہل کوفہ' اہل بصرہ کی بھی یہی رائے ہے۔ فقہائے سبعہ کی رائے بھی یہی ہے۔ ائمہ اربعہ کی رائے بھی یہی ہے۔ اور متقدمین و متاخرین سب کا اس پر اتفاق ہے بلکہ بہت سے لوگوں سے منقول ہے کہ اس پر اجماع منعقد ہو گیا ہے۔"

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ

"اور اگر مرد یا عورت جس کی میراث تقسیم طلب ہے کلالہ ہو (بے اولاد بھی ہو' اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں) مگر اس کا

ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہو تو کل ترکہ کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے۔"

یہاں "اس کا ایک بھائی اور ایک بہن" سے مراد وہ بھائی اور بہن ہیں جو میت کے ساتھ صرف ماں کی جانب سے رشتہ رکھتے ہوں یعنی اخیافی بہن بھائی۔ اگر حقیقی بہن بھائی ہوں یا یہ بہن بھائی صرف والد کی جانب سے ہوں تو ان کی وراثت اس سورت کی آخری آیت کے مطابق ہوگی اور اس میں بھائیوں کا حصہ بہن کے مقابلے میں دوگنا ہوگا اور اس آیت کی طرح نہ ہوگا کہ ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا چاہے مرد ہو یا عورت۔ تو یہ حکم گویا اخیافی بہن بھائیوں کیلئے ہوگا۔ اس لئے کہ اخیافی بہن بھائی صرف بحیثیت ذوالفروض (Sharer's) یعنی ہر ایک کیلئے چھٹا حصہ میراث پاتے ہیں' بطور عصبہ ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ذوالعصبات وہ ہوتے ہیں جو تمام ترکہ یا وہ جو ذوالفروض (Sharer's) سے بچ جائے کو بطور (Residue) پاتے ہیں۔

**وَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاۗءُ فِي الثُّلُثِ** ......................

"اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکہ میں سے ایک تہائی میں شریک ہوں گے۔" چاہے ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ ہو۔ اور معمول بہ قول یہی ہے کہ وہ بحیثیت شریک مساوی مساوی حصہ پائیں گے۔ اگرچہ فقہاء میں سے بعض کا یہ قول بھی ہے کہ اس صورت میں وہ مساوی طور پر تقسیم نہ کریں گے بلکہ وہ عام اصول "ایک مرد دو عورتوں کے برابر حصہ پائے گا" کے مطابق تقسیم کریں گے۔ لیکن پہلا معمول بہ قول ہی زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ایک بہن اور بھائی کی صورت میں اس آیت نے جو چھٹا حصہ ہر ایک کیلئے مقرر کیا ہے دوسرا قول اس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

اخیافی بھائی' جو میت کے ساتھ صرف ماں کے رشتے میں شریک ہوں' دوسرے ورثاء کے مقابلے میں کچھ امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱:۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ میراث میں ان کے مرد اور عورتوں کا حصہ برابر ہوتا ہے۔

۲:۔ ان کو صرف اس صورت میں میراث ملتی ہے جب میت کلالہ ہو' اس لئے اگر میت کا والد' دادا' لڑکا اور پوتا موجود ہو تو انہیں میراث میں سے کچھ بھی نہیں ملتا۔

۳:۔ یہ کہ ان کے حقوق ثلث سے زیادہ نہیں ہوتے اگرچہ ان کی تعداد بہت بڑھ جائے۔

**مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَاۗرٍّ** ...................... "جبکہ وصیت جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو میت نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے' بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو۔" اس آیت کے ذریعہ متنبہ کیا گیا ہے کہ وصیت اس لئے نہ کی جائے کہ ورثاء کو نقصان پہنچ جائے۔ بلکہ انصاف اور مصلحت کے مطابق وصیت ہونا چاہئے۔ اور وصیت سے بھی پہلے قرض ادا ہو اور تقسیم وراثت سے پہلے بہرحال دونوں طے ہوں' یعنی وصیت اور قرضہ۔

اب دوسری آیت کے آخر میں بھی وہی اختتامیہ آتا ہے' جو پہلی آیت کے آخر میں آیا تھا۔ **وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ** ...................... "یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا و بینا اور نرم خو ہے۔" اختتامیہ کا یہ مضمون مکرر اس لئے لایا گیا ہے کہ نظام میراث کے بارے میں تاکید مزید مطلوب ہے۔ اور احکام میراث کیلئے لفظ وصیت استعمال کیا گیا ہے۔ اور یہ وصیت اللہ کی جانب سے ہے اور اس کا حساب و کتاب بھی اسی کے سامنے ہوگا۔ نہ یہ وصیت کسی خواہش نفس کے مطابق ہے اور نہ ہی کسی کی خواہشات نفسانیہ کی پیروی میں ہے۔ یہ حقیقی علم و آگاہی پر مبنی ہے۔ اس لئے اس قانون میراث کی اطاعت فرض ہے۔ کیونکہ اس کائنات وہ ذات ہے جسے حق ہے کہ وہ انسانوں کیلئے قانون سازی اور ضابطہ بندی کرے۔ اور اس نظام اور ضابطے کو انسانوں کی جانب سے قبول کرنا

بھی لازمی ہے کیونکہ یہ علیم اور حلیم کی جانب سے ہے۔ حکیمانہ ہے اور مشفقانہ ہے۔

اسلامی نظریہ حیات کا اصول اساسی یہ ہے کہ اس میں تمام قوانین کا ماخذ ذات باری ہے۔ اس لئے اس پوری قانون سازی کے عمل کے دوران میں اس حقیقت کی بار بار تاکید کی جا رہی ہے۔ اگر اس اصولی قاعدے کو تسلیم نہ کیا گیا تو یہ کفر' نافرمانی اور دین سے خروج کے مترادف ہوگا...... آنے والی دونوں آیات اس بارے میں فیصلہ کر دیتی ہیں۔ اور یہ دونوں آیات اس سورت میں دیئے جانے والے پورے نظام میراث کے بارے میں زوردار اختتامیہ ہیں۔ ان میں بتایا جاتا ہے کہ نظام میراث در حقیقت حدود اللہ کے زمرے میں آتا ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

۲
ع ۴
۱۳

"یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائے گا اسے اللہ آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کیلئے رسوا کن سزا ہے۔"

یہ نظام میراث اور یہ قانونی شریعت جو تقسیم میراث کیلئے وضع کی گئی ہے اور جسے اللہ نے اپنے علم و حکمت کے مطابق وضع فرمایا ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ایک خاندان کے اندر خاندانی نظام کو منظم کیا جائے اور معاشرے کے اجتماعی اور اقتصادی تعلقات مستحکم ہو جائیں۔ "یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں۔" اور یہ حدیں اس لئے قائم کی گئی ہیں کہ وہ ان عائلی و اقتصادی تعلقات میں سنگ میل ہوں اور ترکہ کی تقسیم میں فیصلہ کن ہوں۔

جو لوگ اس معاملے میں اللہ کی اطاعت کریں گے' وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور یہ ان کی عظیم کامیابی ہے۔ اور جو لوگ ان حدوں کو توڑیں گے اور اس معاملے میں اللہ اور رسول اللہ کی نافرمانی کریں گے جہنم میں داخل ہوں گے' اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ ان کیلئے دردناک اور توہین آمیز عذاب ہوگا۔

یہ کیوں ہوگا؟ اس معاملے میں اللہ کی اطاعت یا اللہ کی معصیت کے نتیجے میں اس قدر عظیم نتائج کیوں مرتب ہوں گے' حالانکہ قانون میراث نظام شریعت کا بہرحال ایک چھوٹا سا حصہ ہی تو ہے۔ صرف ایک حصہ اور ایک حصے میں اس قدر شدید سزا؟

بظاہر یہ خوفناک سزا اس جرم سے بہت زیادہ نظر آتی ہے۔ لیکن یہ اس شخص کو زیادہ نظر آتی ہے جو اس بات کی حقیقت اور گہرائی تک نہیں پہنچ سکا ہے۔

اس حقیقت کے اظہار کیلئے اس سورت کی بہت سی آیات مسلسل گویا ہیں اور ان کی تشریح و تفسیر آگے آرہی اور اس امر کی جانب ہم

نے اس سورت کا تعارف پیش کرتے ہوئے اشارہ کیا تھا۔ یہ وہ آیات ہیں جن میں لفظ دین کا مفہوم سمجھایا گیا۔ ایمان کی شرائط بیان ہوئی ہیں اور جن میں اسلام کی تعریف کی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود مناسب ہے کہ ہم اس امر کے بارے میں مختصراً یہاں بھی ایک نوٹ دیدیں۔ جس قدر ان دو آیات کی تشریح و تفہیم کیلئے ضروری ہے' جو آیات میراث کا اختتامیہ اور تبصرہ ہیں۔

اس دین' دین اسلام بلکہ ان تمام ادیان جو اس پوری تاریخ انسانیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ بھیجے ہیں' یعنی تمام سماوی ادیان الٰہیہ کا بنیادی سوال یہی رہا ہے کہ اس کرۂ ارض پر حاکمیت کا حق کس کو حاصل ہے؟ ان لوگوں کا رب کون ہے؟ ان دو سوالوں کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے اور اس دین کے تمام معاملات ان جوابات کی روشنی میں طے ہوتے ہیں اور لوگوں کے تمام امور انہیں جوابات کی روشنی میں طے ہوتے ہیں۔

اب اس سوال کا کیا جواب ہے۔ اس کرۂ ارض پر حاکمیت اور ربوبیت کا حق کس کو حاصل ہے؟ صرف اللہ وحدہ کو' اس حق میں اس کے ساتھ' اس کی مخلوق میں سے کوئی بھی شریک نہیں ہے۔ یہی عین ایمان ہے۔ یہی عین اسلام ہے۔ اور یہی دین اسلام ہے۔ اور اگر حاکمیت اور ربوبیت کا یہ حق کسی مخلوق کو دیا جائے اور انہیں اللہ کے ساتھ شریک کیا جائے یا اللہ کے سوا مستقلاً میں یہ حق دیا تو یہ صریح شرک اور واضح کفر ہے۔

حاکمیت اور ربوبیت یا تو صرف اللہ وحدہ لاشریک کی ہوگی' تو اس صورت میں لوگ صرف اللہ وحدہ کے دین میں داخل ہوں گے اور صرف اللہ وحدہ کی اطاعت میں داخل ہوں گے اور اس کی عملی صورت یہی ہوگی کہ لوگ اسلامی نظام زندگی پر عمل پیرا ہوں۔ کیونکہ اس صورت میں یہ حق صرف اللہ ہی کو حاصل ہو گا کہ وہ لوگوں کیلئے نظام زندگی تجویز کریں اور یہ صرف اللہ وحدہ ہی ہو گا جو لوگوں کیلئے طور طریقے اور قوانین' اور ضابطے وضع کریں۔ پھر یہ صرف اللہ ہی ہو گا جو لوگوں کیلئے حسن و قبح کے معیار متعین کرے گا اور ان کی زندگی کے تفصیلی طور طریقے اور تنظیم کرے گا۔ اور اللہ کے سوا کوئی فرد ہو یا کوئی سوسائٹی ہو ان کیلئے ایسے کچھ حقوق بھی نہ ہوں گے اور ان کیلئے صرف یہی چارۂ کار ہو گا کہ وہ شریعت الٰہیہ کی اطاعت کریں کیونکہ یہ اطاعت اللہ کی الوہیت حاکمیت اور ربوبیت کا منطقی تقاضا ہے اور اس تقاضے کا واحد مظہر اور خاص رنگ نظام شریعت ہے۔

اور اگر یہ صورت حال نہیں ہے تو پھر دوسری صورت یہی ہے کہ حاکمیت اور ربوبیت کا حق اللہ کی مخلوق میں سے کسی کو حاصل ہو گا۔ یہ حق اللہ کے ساتھ شریک ہو کر ہو گا یا ان لوگوں کو مستقلاً حاصل ہو گا۔ اس صورت میں جو لوگ یہ حق قبول کریں گے وہ ان غیر اللہ کے دین میں داخل تصور ہوں گے' یوں وہ غیر اللہ کی بندگی کریں گے۔ پھر یہ انسان کی جانب سے غیر اللہ کی اطاعت ہوگی اور اس کی عملی شکل یوں ہوگی کہ یہ لوگ غیر اللہ کے تجویز کردہ منہاج حیات' ان کے ضابطوں' ان کے قوانین اور ان کے حسن و قبح کے معیاروں کے پیروکار ہوں گے اور یہ سب چیزیں بعض انسانوں نے وضع کی ہوں گی۔ اس قانون سازی اور ضابطہ بندی میں وہ اللہ کی حاکمیت اور اس کی کتاب کا کوئی حوالہ نہ دے رہے ہوں گے' بلکہ یہ تمام چیزیں بعض دوسرے حوالوں سے تشکیل پائیں گی۔ بعض دوسرے مصادر ان کے لئے مصادر قوت ہوں گے۔ اس لئے یہ صورت حال دین سے خالی ہوگی' ایمان مفقود ہو گا اور اسلام نہ ہو گا جبکہ یہ صورت حال شرک' کفر' فسوق اور معصیت کی صورت حال ہوگی۔

یہ ہے اس معاملے کی اصل حقیقت' لہٰذا اس میں اگر کوئی صرف اللہ کی حدود میں سے ایک حد کو توڑتا ہے یا پوری شریعت کی نفی کرتا ہے' اصل حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ ایک حد بھی دین ہے۔ اور پوری شریعت بھی دین ہے' لہٰذا اس میں اصل نکتہ یہ اصول ہو گا کہ لوگ حاکمیت اور ربوبیت میں اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک قرار دے رہے ہیں یا وہ اس میں کسی کو شریک کر رہے

ہیں یا ذات باری کو الگ چھوڑ کر بعض دوسرے لوگوں کی حاکمیت اور ربوبیت قبول کر رہے ہیں۔ رہی یہ بات کہ لوگ زبانی طور پر کیا دعویٰ کر رہے ہیں کہ وہ دین اسلام میں داخل ہیں اور مسلمان ہیں تو اگر یہ بات ان کے عمل میں نہیں تو اسلام نہ ہوگا۔

یہ ہے وہ عظیم حقیقت جس کی طرف آیات میراث کے اس اختتام میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ نظام میراث میں ورثاء کے حصص کی تقرری کا تعلق براہ راست اللہ کی اور رسول اللہ کی اطاعت سے ہے۔ یا اس معاملے میں اللہ اور رسول کی نافرمانی ہوگی۔ یا اس کا نتیجہ ایسے باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور یا اس کا انجام ایک توہین آمیز عذاب کی شکل میں ہوگا جو جہنم کی آگ میں داخل کیا جائے گا۔

اور یہ وہ عظیم حقیقت ہے جس کا اظہار اس سورت میں متعدد آیات کے اندر مکرر سہ کرر کیا گیا ہے اور اسے اس قدر واضح اور فیصلہ کن انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ اس میں کسی تاویل اور کسی نفاق کیلئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی گئی۔

وہ لوگ جو ابھی تک اپنا تعارف اسلام کے حوالے سے کراتے ہیں۔ میں ان کو یہ دعوت دوں گا کہ وہ اس بارے میں اپنا ذہن صاف کرلیں اور دیکھ لیں کہ وہ اسلامی نظام حیات اور دین اسلام سے کس قدر دور ہو چکے ہیں۔

○.....☆☆☆.....○

اس بحث کے بعد ' اب اس بات کی ضرورت ہے کہ اسلام کے نظام میراث کے بارے میں چند کلمات عرض کروں ' اس سے پہلے آیت لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ............................ "مردوں کیلئے وہی کچھ ہے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کیلئے بھی وہی کچھ ہے جو انہوں نے کمایا۔" کے ضمن میں ہم نے یہ عمومی اصول بیان کیا تھا۔ اسی طرح لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ............................ یہ کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہوگا۔" کے ضمن میں بھی ہم نے بحث کی تھی۔

اسلام کا نظام وراثت ایک نہایت ہی عادلانہ اور فطرت انسانی کے ساتھ نہایت ہی ہم آہنگ نظام ہے۔ نیز خاندانی زندگی کے عملی حالات و احوال کے ساتھ نہایت ہی موزوں ہے۔ اور اس بات کی اچھی طرح وضاحت اس وقت ہوتی ہے جب ہم اس نظام کا تقابلی مطالعہ ان تمام نظاموں سے کرتے ہیں ' جو انسانی تاریخ میں کبھی رائج رہے ہیں یا اب ہیں ' جاہلیت قدیمہ میں یا جاہلیت جدیدہ میں۔ دنیا کے کسی خطے میں اور کسی بھی قوم و ملت میں۔ اس نظام میں خاندان کی اجتماعی کفالت کے تمام مقاصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ہر شخص کا حصہ اور خاندان کے اندر اس کی ذمہ داریوں کو پیش نظر رکھ کر متعین کیا گیا ہے۔ مثلاً والدہ اور والد جو ذوی الفروض میں سے ہیں۔ ان کے بعد اس نظام میں عصبات کو اہمیت دی گئی ہے۔ اس لئے کہ والدین کے نہ ہونے کی صورت میں ' کسی یتیم کی کفالت عصبات ہی کے ذمہ ہوتی ہے۔ یہ عصبات ہی ہیں جو دیت اور دوسرے اجتماعی تاوان ادا کرتے وقت حصہ داریاں اپنے سر لیتے ہیں۔ اس لئے اسلامی نظام میراث غایت درجہ مناسب اور موزوں ہے۔

اس نظام کی اساس اس اصول پر ہے کہ یہ خاندانی نظام ایک ہی نفس بشر سے وجود میں آیا ہے۔ اس لئے نہ اس میں بچے محروم ہوں گے اور نہ عورتیں محروم ہوں گی۔ محض اس لئے کہ وہ عورتیں ہیں یا نابالغ ہیں۔ چنانچہ اگر یہ نظام عملی ذمہ داریوں میں فرق مراتب کرتا ہے تو نفس انسانیت کی اساس پر کوئی فرق بھی نہیں کرتا۔ اس لئے اس میں حقوق دیتے وقت اصناف مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ فرق اگر ہے تو اجتماعی ذمہ داریوں کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے ' جو ذمہ داریاں اجتماعی خاندانی کفالت کے حوالے سے عائد ہوتی ہیں۔

اس نظام کے اندر عام زندہ چیزوں کی فطرت اور خصوصاً انسانی فطرت کو پوری طرح مد نظر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ہر حصص اور حقوق

الاٹ کرتے وقت اولاد میت کو سب سے مقدم رکھا گیا ہے۔ یعنی والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلے میں اس فطری میلان کے علاوہ آنیوالی نوخیز نسل اس لئے بھی زیادہ مستحق ہے کہ اس کرۂ ارض پر وہی زندگی کے تسلسل کا ذریعہ ہے۔ وہی ہے جس کی وجہ سے بنی نوع انسان اس کرۂ ارض پر موجود رہ سکتا ہے۔ لہٰذا اس نوخیز نسل کا لحاظ ضروری ہے۔ لیکن اس نوخیز نسل کی رعایت کے ساتھ ساتھ آباء کو بھی محروم نہیں رکھا گیا۔ اور نہ ہی دوسرے رشتہ داروں کو محروم رکھا گیا ہے۔ ہر ایک کو حصہ دیا گیا ہے۔ فطرت کے منطقی تقاضوں کے عین مطابق۔

یہ ایک ایسا نظام ہے جو ہر زندہ چیز اور ہر انسان کے اس فطری تقاضے کے عین مطابق ہے جس کے تحت وہ اپنی نسل کے ساتھ گہرا ربط رکھنا چاہتا ہے۔ اور یہ کہ اس اولاد کے ذریعہ گویا اس کے وجود کو تسلسل مل رہا ہے۔ اس لئے اس نظام میراث کی وجہ سے ایک انسان مطمئن رہتا ہے کہ وہ جو اپنی سعی اور جدوجہد کو بحث کی شکل میں ذخیرہ کرتا رہتا ہے اور یہ اس کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ اس کے عمل کا ثمرہ اس کی اولاد کو ملے۔ اور یہ کہ اس کی آئندہ نسل اس سے محروم نہ رہے۔ اور یہ یقین کہ اس کی جدوجہد کا ثمرہ اس کی اولاد کو ملے گا" اس کی جدوجہد کیلئے مہمیز کا کام دے گا۔ وہ اپنی جہد و سعی میں مزید اضافہ کر دے گا اور یہ بات پوری سوسائٹی کیلئے بھی معاشی لحاظ سے مفید ہوگی۔ اور اس جہد مسلسل کی وجہ سے معاشرے کے اجتماعی نظام تکافل میں بھی کوئی فرق نہ آئے گا بلکہ اس نظام میں اسے پورا پورا ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اور آخری بات یہ ہے کہ اسلام کا نظام میراث کسی شخص کی جمع کردہ دولت کو اس وقت پاش پاش کر دیتا ہے جب وہ انتہاؤں کو چھو لیتی ہے۔ اور اسے از سر نو تقسیم کر دیتا ہے۔ اس لئے یہ نظام دولت کو کسی ایک جگہ جمع ہونے نہیں دیتا۔ اور نہ ہی چند ہاتھوں میں منجمد کر کے چھوڑتا ہے۔ مثلاً اس نظام کے حوالے سے جس میں پوری وراثت بڑے لڑکے کو مل جاتی ہے۔ یا اسے چند محدود رشتہ داروں کے دائرے کے اندر محدود کر دیا جاتا ہے۔ اس پہلو سے یہ نظام ایک ایسا ذریعہ ہے جو سوسائٹی میں اقتصادی عمل کی کارکردگی کی از سر نو تجدید کرتا ہے اور اسے اعتدال پہ رکھتا ہے۔ اور اس میں کسی انتظامیہ اور کسی اجتماعی نظام کا بھی کوئی ظاہری دخل نہیں ہوتا" جسے کوئی فرد خوشی سے قبول نہیں کرتا۔ اس لئے کہ انسان کی فطرت میں لالچ اور دولت کی محبت ودیعت کر دی گئی ہے۔ رہی اسلامی نظام میراث کی یہ مسلسل بت شکنی اور بار بار تقسیم جدید تو یہ اپنی جگہ جاری و ساری بھی رہتی ہے اور نفس انسانی بھی اسے خوشی خوشی قبول کرتا ہے۔ کیونکہ یہ نظام انسان کی فطرت اور اس کی فطری حب مال اور حرص و لالچ کے عین مطابق ہے۔ اور یہی ہے اصل فرق و امتیاز اس ربانی نظام زندگی اور دوسرے ان نظاموں کے درمیان جو انسان کیلئے انسان نے تجویز کئے ہیں۔ [1]

☆ ☆ ☆

ا۔ تفصیلات کیلئے دیکھئے میری کتاب "العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام" کی فصل "اسلام کی سیاسی پالیسی"

# درس ۳۱ ایک نظر میں

اس سورت کے پہلے سبق میں 'اسلامی معاشرے کے اندر اجتماعی زندگی کی تنظیم پر توجہ دی گئی اور اسے جاہلیت کی تمام آلائشوں سے پاک و صاف کر دیا گیا۔ اس میں معاشرے کے بے سہارا لوگوں' یتیموں کے حقوق اور ان کی جائیداد کی حفاظت کی ضمانت دی گئی اور یہ حفاظت اور تحفظ ان کو ایک خاندان کے فطری فریم ورک کے اندر فراہم کیا گیا' اجتماعی نگرانی کے اندر۔ اس کے بعد ایک خاندان کے اندر نظام میراث کے اصول بیان کئے گئے اور پھر ان تمام حقوق اور تحفظات کو اس نظریۂ حیات کے ساتھ مربوط کر دیا گیا کہ اللہ ہی تمام لوگوں کا حاکم اور رب ہے۔ اور یہ وہی ذات ہے جس نے اپنے حکم و ارادہ سے' ایک ہی جان سے اس مخلوق کو پیدا کیا ہے اور یہ کہ اللہ نے بشریت کے اجتماعی نظام کو ایک خاندان کی اکائی سے شروع کیا ہے۔ اور پھر اس خاندان کے اندر اجتماعی کفالتی ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں۔ اور زندگی کے تمام حالات کی اس ضابطہ بندی کو اللہ کے علم اور حکمت اور اس کے تجویز کردہ حدود و قیود کے ساتھ مربوط کیا گیا اور یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ اگر وہ اللہ کی اطاعت کریں گے تو انعام جنت کے مستحق ہوں گے اور اگر معصیت کا ارتکاب کریں گے تو سزائے جہنم کے سزاوار ہوں گے۔

اب اس دوسرے سبق میں اسلامی معاشرے کی اجتماعی زندگی کی تنظیم ایک دوسرے زاویہ سے کی گئی ہے اور ایک دوسرے پہلو سے اسے جاہلیت کی آلودگیوں سے پاک و صاف کیا گیا ہے یعنی اسے جاہلیت کی بے راہ روی اور فحاشی سے پاک کیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ان کو سوسائٹی سے علیحدہ کر دیا جائے۔ اور ان کی نقل و حرکت پر پابندی عائد کی جائے۔ الا یہ کہ وہ اپنے رویہ سے باز آ جائیں اور سچے دل سے توبہ کر لیں۔ اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہوں اور اسلامی معاشرے میں پاکیزہ اخلاق و کردار کے ساتھ از سر نو آنے کے لئے تیار ہوں۔ پھر اس دوسرے حصے میں عورت کو ان مظالم سے نجات دی گئی ہے جن کی چکی میں وہ ایام جاہلیت میں پس رہی تھی۔ اسے زندہ درگور کر دیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ توہین آمیز سلوک کیا جاتا تھا اور قسم قسم کے مظالم اس پر ڈھائے جاتے تھے تاکہ اسلامی معاشرہ صحت مند اور مضبوط بنیادوں پر استوار ہو سکے' جس کی عام فضا پاک و صاف ہو اور جس کی عمارت نہایت ہی پختہ اساس پر ہو۔ اور ایک خاندان اس کی پہلی اینٹ ہو۔ اور اس حصے کے آخر میں خاندان کے ایک خاص پہلو یعنی دائرۂ محرمات کی ضابطہ بندی کی گئی ہے۔ اس کے لئے شرعی قانون سازی کی گئی ہے۔ اور اس کا اسلوب یہ اختیار کیا گیا ہے کہ محرمات کا ذکر کر دیا گیا ہے اور ان کے علاوہ تمام بنات آدم کو انسان کے لئے جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ ان موضوعات پر یہ سبق بھی ختم ہو جاتا ہے اور قرآن کریم کا یہ پارہ بھی اپنی انتہا کو پہنچتا ہے۔

☆ ☆ ☆

# سبق ۳۱ تشریح آیات

## آیت نمبر ۱۵ تا ۲۳

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۱۶﴾

”تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو' اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آ جائے یا اللہ ان کے لئے کوئی راہ نکال دے ۔ اور تم میں سے جو اس فعل کا ارتکاب کریں ان دونوں کو تکلیف دو' پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں تو انہیں چھوڑ دو کہ اللہ بہت توبہ کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے ۔“

فحاشی کو روکنے کی خاطر اور اس کی پاکیزگی اور تنظیم کی خاطر بھی اسلام نے اپنا مخصوص انداز اختیار کیا ۔ سب سے پہلے اس نے فاحشہ عورتوں کو نظربند کرنے اور انہیں معاشرہ سے دور رکھنے کے اقدامات کئے بشرطیکہ ان پر یہ جرم ثابت ہو جائے ۔ اس کے بعد اس نے غیر فطری فعل کا ارتکاب کرنے والے مردوں یعنی لوطیوں کے بارے میں حکم دیا کہ انہیں ایذا د سزا دی جائے لیکن اس کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی ۔ اور اس کے بعد ان لوگوں کے لئے ایک ہی سزا فرمائی یعنی سزائے حد کی سزا جس کا ذکر سورۃ نور میں ہوا ۔ یعنی سو کوڑے سزا اور اس کے علاوہ وہ سزائے رجم مقرر کی جس کا ذکر احادیث میں آتا ہے ۔ ان سب اقدامات کا مقصد وحید صرف یہ تھا کہ معاشرے کو بدکاری سے پاک کیا جائے اور معاشرے کی پاکی' شرافت اور عفت مآبی کی حفاظت کی جائے ۔

لیکن سزا دہی کے تمام حالات میں' شریعت نے ملزموں کے لئے تحفظ کا پورا پورا انتظام کیا ہے ۔ ایسا انتظام کہ جس کے ہوتے ہوئے کسی غلطی' کسی ظلم اور محض ظن و گمان کی اساس پر سزا دہی ممکن ہی نہیں رہتی ۔ خصوصاً ان خطرناک جرائم میں جن کے اثرات لوگوں کی رواں دواں زندگی پر پڑتے ہیں ۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾

"تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو' اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا اللہ ان کے لئے کوئی راستہ نکال دے۔"

آیت میں نہایت ہی محتاط انداز میں قانون سازی کی گئی ہے۔ جن عورتوں پر یہ جرم عائد کیا گیا ہے' کی تحدید کر دی گئی ہے۔ **مِنْ نِّسَآئِكُمْ** ...... یعنی مسلم عورتیں۔ اسی طرح ان کے خلاف جو شہادت قائم ہوگی اس کی بھی تحدید کر دی گئی ہے۔ **مِّنْكُمْ** یعنی گواہ بھی مسلمان ہوں۔

چنانچہ جن ملزموں کو سزا دی جائے گی وہ صرف وہ ہوں گے جن کا جرم ثابت ہو جائے اور جن لوگوں کو بطور گواہ پیش کیا جائے گا' ان کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ اگر مسلمان عورتوں میں سے کوئی فحاشی کا ارتکاب کرے تو ان کے خلاف غیر مسلمانوں کی شہادت قبول نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ گواہ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ تعداد میں بھی چار ہوں۔ یعنی مسلم معاشرے سے ہوں' اس معاشرے میں بس رہے ہوں' وہ شریعت اسلامی کے تابع ہوں۔ وہ اسلامی قیادت کے مطیع ہوں۔ ان کے دلوں میں اسلامی شریعت کا احساس ہو۔ اور وہ اس معاشرے کے حقوق و ذمہ داریوں سے بھی آگاہ ہوں۔ اس لئے اس معاملے میں غیر مسلمانوں کی شہادت قبول نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک غیر مسلم ایک مسلمان عورت کو محض مقدمہ میں پھنسانے کے لئے شہادت دے دے۔ نیز ایک غیر مسلم کی امانت' دیانت' خدا خوفی اور مصلحت وغیرہ پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ ایک غیر مسلم کو اسلامی معاشرے کی پاکیزگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ نہ اسے یہ دلچسپی ہوتی ہے کہ اسلامی معاشرے میں نظام عدالت کامیاب ہو۔ شہادت کے سلسلے میں یہ حدود و قیود بہرحال اس وقت بھی باقی رہیں جب سزا میں تبدیلی ہو گئی یعنی بعد میں جب سزا کوڑوں اور رجم میں بدل گئی۔

**فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِى الْبُيُوْتِ** "اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو" ....وہ معاشرہ میں اختلاط نہ رکھیں' اسے مزید گندہ نہ کریں' اس میں نکاح نہ کریں اور نہ کوئی اور سرگرمی دکھائیں۔ **حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ** "یہاں تک کہ انہیں موت آجائے۔" وہ اسی طرح قید میں مر جائیں۔ گھروں میں بند ہوں۔ **اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا** "یا اللہ ان کے لئے کوئی راستہ نکال دے۔"..... یعنی ان کی حالت میں تبدیلی کر دے یا سزا میں تبدیلی کر دے۔ یا ان کے معاملات میں کوئی اور تبدیلی نہ آئے۔ ان الفاظ سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حکم انتہائی اور آخری نہ تھا۔ یہ خاص متعین وقت کے لئے تھا اور بعض خاص حالات کے لئے تھا اور اس وقت ایسے مجرموں کے لئے آخری حکم آنے کی توقعات تھیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ حکم سورۂ نور میں سو کوڑوں کی شکل میں بدل گیا اور احادیث رسول کے ذریعہ رجم میں بدل گیا لیکن شہادت اور ثبوت جرم کے سلسلے میں ملزموں کو جو ضمانتیں دی گئی تھیں وہ بدستور قائم ہیں۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے محمد ابن جعفرؒ' سعیدؒ' قتادہؓ' حسن' اور حطان بن عبداللہ الرقاشی کے واسطوں سے حضرت عبادہ ابن الصامتؓ کی یہ روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "حضور اکرمؐ پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو اس کا آپ پر اثر ہوتا تھا' آپ پریشان ہو جاتے تھے' آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔ ایک دن آپؐ پر وحی آرہی تھی تو جب حالت نزول وحی دور ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: "لو مجھ سے' اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے لئے راستہ نکال دیا۔ شادی شدہ' شادی شدہ کے ساتھ اور کنوارا کنواری کے ساتھ' شادی شدہ کو سو کوڑے اور پھر پتھروں کے ساتھ رجم اور غیر شادی شدہ سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی۔" اس روایت کو امام مسلم نے قتادہ' حسن' حطان اور عبادہ ابن الصامتؓ کے واسطے سے نبیؐ سے روایت کی ہے۔ الفاظ یہ ہیں: "لو مجھ سے' لو مجھ سے' اللہ تعالیٰ نے راستہ بنا دیا۔ غیر شادی شدہ' غیر

شادی شدہ کے ساتھ سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی اور شادی شدہ شادی شدہ کے ساتھ سو کوڑے اور پتھروں کے ساتھ رجم۔" ماعز اور غامدیہ کے عملی واقعات' جیسا کہ صحیح مسلم میں واقعات نقل ہوئے ہیں کہ حضورؐ نے انہیں رجم کی سزا دی لیکن کوڑے نہیں مارے۔ اسی طرح یہودی اور یہودیہ کے واقعات آپ نے ان کو رجم کرنے کا فیصلہ فرمایا اور انہیں کوڑے نہیں مارے۔ ان عملی واقعات سے معلوم ہوتا ہے' آخری فیصلہ یہی تھا۔

وَ الَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَ اَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۱۶﴾ ..................

"اور تم میں سے جو اس فعل کا ارتکاب کریں' ان دونوں کو تکلیف دو' پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں تو انہیں چھوڑ دو کہ اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا' رحم فرمانے والا ہے۔"

صحیح قول یہ ہے کہ اس آیت سے مراد وہ دو مرد ہیں جو بدفعلی کا ارتکاب کریں۔ یعنی عمل قوم لوط۔ یہ قول مجاہد کا ہے۔ حضرت ابن عباس' سعید ابن جبیر وغیرہ نے کہا ہے کہ اذیت یوں دی جائے گی کہ انہیں گالی گلوچ اور برا بھلا کہا جائے گا اور جوتے وغیرہ مارے جائیں گے۔

فَاِنْ تَابَا وَ اَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا .................. "پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کریں تو انہیں چھوڑ دو۔" جس طرح بعد میں آئے گا۔ توبہ و اصلاح سے مراد ان کی زندگی میں مکمل تبدیلی ہے۔ ان کے نقطہ نظر اور طرز عمل کی سمت کی مکمل تبدیلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مکمل اور ہمہ جہت اصلاح کے بعد ان کی سزا موقوف ہو جاتی ہے اور سوسائٹی بھی ایسے منحرف اور بے راہرو افراد کی سزا کو جاری رکھنے پر اصرار نہیں کرتی۔ یہاں ان کو چھوڑ دینے سے مراد یہی ہے کہ ان کی سزا کو موقوف کر دیا جائے۔

اور اس فقرے میں ایک لطیف اشارہ پایا جاتا ہے اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا .................. "اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" وہی ہے جس نے یہ سزا تجویز کی اور وہی ہے جو اصلاح احوال کے بعد اس سزا کو جاری رکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اس معاملے میں لوگوں کو نہ اختیار ہے کہ وہ سزا تجویز کریں اس معاملے میں قانون بنائیں اور نہ انہیں یہ اختیار ہے کہ اسے موقوف کریں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور قانون کے نفاذ کی کوشش کریں۔ وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور وہ اصلاح پذیری کرنے والوں پر رحم بھی کرتا ہے۔

اور اس میں دوسرا اشارہ اس طرف ہے کہ لوگوں کو بھی چاہئے کہ وہ تخلقوا باخلاق اللہ اختیار کریں۔ اپنے اندر ربانی اوصاف و اخلاق پیدا کریں۔ اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے اور رحم فرمانے والا ہے تو ان کا فرض بھی یہ ہے کہ وہ باہم تعلقات میں معذرت کرنے والے کو معاف کر دیں۔ چشم پوشی سے کام لیں کہ وہ گناہ تھا جو ہو چکا اور گزر گیا۔ اور اس کے بعد توبہ ہو گئی اور اصلاح ہو گئی۔ البتہ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ مجرموں کے ساتھ نرمی کی جائے' فحاشی پھیلانے والوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جائے۔ ان معاملات میں نرمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نرمی اور مہربانی صرف ان لوگوں کے ساتھ ہو گی جنہوں نے توبہ کر لی' اصلاح پذیر ہو گئے' ایسے لوگوں کے بارے میں حکم یہ ہے کہ انہیں معاشرے میں قبول کیا جائے' ان کو ان کے سابقہ گناہ یاد نہ دلائے جائیں' انہیں طعنہ نہ دیا جائے کیونکہ انہوں نے توبہ کر لی ہے اور اصلاح کر لی ہے۔ انہوں نے اصلاح احوال کے اس عمل میں ان کے ساتھ تعاون ہونا چاہئے اور ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔ ان کے جرائم کو بھول جانا چاہئے تاکہ سابقہ یادوں سے ان کو اذیت نہ ہو' اور معاشرے میں آتے ہوئے انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔

کیونکہ اگر معاشرہ ایسے لوگوں کے ماضی کو بھول نہ جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس جرم میں اصلاح کی راہ کو چھوڑ کر دوبارہ نہ مبتلا ہو جائیں۔ اور اس پر اصرار نہ کرنے لگ جائیں اور دنیا و آخرت کے خسارے میں نہ پڑ جائیں اور معاشرہ میں فساد پھیلا کر اسے مزید گندہ نہ کریں اور معاشرہ کے لئے مزید مصیبت کا باعث نہ بنیں۔

یہ سزا بھی زمانہ مابعد میں تبدیل ہو گئی تھی۔ حضرت ابن عباس سے مرفوع حدیث اصحاب سنن نے نقل کی ہے۔ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: "تم جسے لوطیوں کا فعل کرتے ہوئے پاؤ تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو۔"

ان احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ اپنی اخلاقی پاکیزگی کی خاطر کس قدر جدوجہد کرتا ہے، خصوصاً فاشی سے۔ چنانچہ پہلے اسلامی معاشرہ نے اخلاقی تطہیر کی طرف بہت ہی آغاز میں توجہ شروع کر دی تھی۔ اخلاقی تطہیر کے لئے اسلام نے مدینہ میں اسلامی حکومت کے قیام کا انتظار نہیں کیا، کہ حکومت قائم ہو جائے اور پھر یہ حکومت شرعی قوانین کے نفاذ کا کام شروع کر دے۔ نفاذ قانون سے پہلے سورت اسراء میں جو کی سورت ہے زنا سے ممانعت کر دی گئی تھی۔ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۗ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾ ........ "اور زنا کے قریب ہی نہ پھٹکو، یہ بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے۔" اور سورۃ المؤمنون میں

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ............ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓي اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ

"کامیاب ہو گئے وہ مومنین جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں ..... وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، مگر بیویوں اور ان عورتوں کے ساتھ جو ان کے قبضے میں آگئی ہیں۔ کیونکہ ان کے معاملے میں وہ قابل ملامت نہیں ہیں۔" اور مزید سورت المعارج میں دوبارہ اس کا ذکر ہوا۔

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مکہ میں نہ اسلامی حکومت تھی اور نہ اسلامی انتظامیہ تھی۔ اس لئے مکہ میں اسلام نے ان جرائم کی ممانعت کے باوجود ان کے لئے کوئی سزا تجویز نہیں کی۔ ہاں جب مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی اور اسلامی انتظامیہ قائم ہو گئی تو اس وقت جرائم کی بیخ کنی کے لئے پھر صرف وعظ و تبلیغ اور امر و نہی پر اکتفاء نہیں کیا گیا۔ اس لئے کہ اسلام ایک حقیقت پسندانہ دین ہے۔ اسے معلوم تھا کہ صرف ہدایات، تبلیغ اور امر و نہی ہی معاشرے کو گندگی سے بچانے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دین مملکت اور حکومت کے بغیر قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ کہ دین ایک مکمل منہاج اور پورا نظام زندگی ہے، جس پر لوگوں کی پوری عملی زندگی قائم ہوتی ہے۔ دین صرف نظریاتی شعور کا نام نہیں ہے جو صرف دین دنیا تک محدود ہوتے ہیں، جس کی پشت پر حکومت نہ ہو، جس کا کوئی قانونی نظام نہ ہو، جس کا ایک متعین منہاج نہ ہو اور جس کا معلوم و معروف دستور نہ ہو۔

اسلامی نظریۂ حیات مکہ مکرمہ کے اندر جونہی بعض برگزیدہ لوگوں کے ذہن میں بیٹھ گیا، اس نظریۂ حیات نے ان دلوں کے اندر جاہلیت اور جاہلی تصورات کو چیلنج کیا۔ اس نظریہ نے ان کی فکری تطہیر شروع کر دی۔ اور جب اسلام مدینہ میں ایک مملکت بن گیا جس کے اندر نظام شریعت نافذ ہو گیا اور اسلامی منہاج زندگی ایک متعین شکل و صورت میں سامنے آگیا، تب اسلامی حکومت نے معاشرے سے فحاشی کو مٹانا شروع کیا۔ اور اس کے لئے سزا کا نظام نافذ کیا گیا۔ لیکن وعظ و ارشاد کا نظام بھی اپنی جگہ کام کرتا رہا۔ اس لئے کہ اسلام فقط نظریہ ہی نہیں ہے جو صرف دل کی دنیا میں کام کرتا ہو، بلکہ وہ ایک نظام مملکت بھی ہے جسے لوگوں کی عملی زندگی میں نافذ کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا نظریہ اور عمل اسلام کے دو پاؤں ہیں، وہ کبھی بھی ایک پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔

یہ شکل ہر اس دین کی رہی ہے جو اس کرۂ ارض پر کبھی بھی اللہ کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ غلط خیال بیٹھا ہوا ہے کہ بعض دین ایسے بھی رہے ہیں جن کی کوئی شریعت نہ تھی؟ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ دین ہو' اس کی شریعت نہ ہو' اس کی حکومت نہ ہو' اس لئے کہ دین زندگی کا ایک مکمل نظام ہوتا ہے اور یہ ایک عملی نظام ہوتا ہے۔ اس میں لوگ صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں' صرف اسی کی ذات سے تمام ہدایات اخذ کرتے ہیں۔ اسی سے تصور حیات لیتے ہیں' اسی سے اخلاقی قدریں لیتے ہیں اور اسی سے قانون اور عملی ہدایات لیتے ہیں اور اسی سے قانون اخذ کر کے اسے حکومت کی قوت سے نافذ کرتے ہیں۔ جو لوگ اس نظام اور قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں' انہیں سزا دی جاتی ہے اور اس طرح معاشرے کو جاہلیت کی گندگی سے پاک کیا جاتا ہے۔ تاکہ دین صرف اللہ کے لئے خالص ہو جائے اور تمام اور پورا دین اللہ کا رائج ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہ ہو۔ کسی شکل میں بھی۔ یعنی ایسا الٰہ جو لوگوں کا قانون ساز ہو' ان کے لئے حسن و قبح کے پیمانے وضع کرتا ہو اور ان کی زندگی کی تنظیم کرتا ہو اور پھر یہ کہ انسانوں کے لئے قانون سازی کا مقام رکھتا ہو۔ کیونکہ الٰہ ہوتا ہی وہ ہے جو یہ سب کام کرتا ہو۔ انسانوں میں سے جو شخص بھی درج بالا حیثیات میں سے کوئی حیثیت اپنے لئے مخصوص کرتا ہو' سمجھ لو کہ اس نے گویا الوہیت کا دعویٰ کر لیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو نظام زندگی اللہ کی جانب سے ہو' وہ کسی بھی صورت میں ایسے شخص کو ایسے دعویٰ کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ ایسا دعویٰ کرے اور اس پر عمل پیرا بھی ہو۔

لہٰذا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو بھی دین آئے گا وہ ایک خالص نظریۂ حیات اور بعض وجدانی تصورات اپنے ساتھ لے کر آئے گا' اس کے ساتھ ایک عملی شریعت ہوگی اور اس کے بعد وہ ایک نظام حکومت حاصل کرے گا اور اس میں شریعت کا نفاذ ہو گا۔

یہی صورت حال تھی' جو مدینہ طیبہ میں اسلام نے پیدا کی۔ اس نے ایک مملکت کی بنیاد رکھی' اس کے لئے قانون سازی کی گئی اور جرائم پر سزا دی گئی۔ جس طرح اس سورت میں ان قوانین و احکام کی تفصیلات ایک ایک کر کے ہم دیکھ رہے ہیں۔ ان احکام میں وقتاً فوقتاً" تبدیلی بھی ہوتی رہی اور یہ احکام و قوانین آخری شکل اختیار کرتے رہے۔ جس طرح اللہ نے چاہا' ہوتا رہا۔

اور اس بات میں کوئی انوکھا پن نہیں ہے کہ اسلامی ریاست معاشرہ سے فحاشی کو مٹانے کے لئے اس قدر سخت قوانین وضع کر رہی ہے اور اس کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ قانون سازی' اس کے نفاذ' سزا دہی اور تربیت اور تہذیب کے ذریعہ اسلامی معاشرے کو پاک کیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ ہر دور میں جاہلیت کی پہلی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس میں جنسی انارکی کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے' جیسا کہ ہمارے دور کی جاہلیت جدیدہ میں ہم ہر طرف دیکھ رہے ہیں۔ انسان کو جنسی لحاظ سے حیوان بنا دیا گیا ہے۔ جنسی تعلق کے لئے کوئی ضابطہ اخلاق نہیں رہا ہے' کوئی قانون نہیں رہا ہے اور اس جنسی انارکی اور آزادانہ جنسی اختلاط کو محض آزادی تصور کیا جاتا ہے اور جو شخص اس کی مخالفت کرتا ہے اسے رجعت پسند کہا جاتا ہے۔

جاہلیت کے پرستار اپنی تمام آزادیوں کو نظر انداز کر سکتے ہیں لیکن وہ اس حیوانی آزادی سے دستبردار ہونے کے لئے کسی صورت میں بھی تیار نہیں ہوتے۔ وہ تمام دوسری آزادیاں تو چھوڑ سکتے ہیں لیکن جو شخص ان کی حیوانی جنسی آزادی کی ضابطہ بندی کرتا ہے اور اسے پاک کرتا ہے وہ اس کے مقابلے میں اکھڑے ہوتے ہیں۔

جاہلی معاشرے کی ایک اہم پالیسی یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کے تمام شعبے اخلاقی ضابطوں کی توڑ پھوڑ میں باہم معاون ہوتے ہیں۔ یہ تمام تنظیمیں نفس انسانی کے اندر پائے جانے والے تمام فطری ضابطوں کو برباد کرنے میں لگے ہوئے ہوتے ہیں' یہ لوگ لوگوں کی نظروں میں اس حیوانی جنسی بے راہ روی کو مزین بناتے ہیں اور اسے بڑے ہی خوبصورت اور پاکیزہ عنوانات کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور مختلف طریقوں

سے جنسی تعلقات کے اندر ہیجان پیدا کرتے ہیں اور اسے مجبور کرتے ہیں کہ یہ تعلق کسی ضابطے کا پابند نہ رہے۔ یہ جاہلی نظام ایک نوجوان پر سے خاندان کی طرف سے کنٹرول ختم کرتا ہے' بلکہ خود خاندانی نظام کو ختم کرتا ہے' اور صحت مند جنسی شعور کو ذلیل ننگی جنسی بے راہ روی میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ اسے قابل تعریف قرار دیتا ہے' بلکہ اس کی خاطر وہ عریانی کو رواج دیتا ہے اور یہ عریانی بیک وقت جسمانی' جذباتی اور انداز تعبیر یعنی ادب میں بھی رواج پاتی ہے۔ جسم ننگا' جذبات ننگے اور ادب ننگا ہو جاتا ہے۔

جب اسلام آیا تو اس وقت معاشرہ میں اس گری ہوئی جاہلیت کے تمام خدوخال موجود تھے اور اسلام کے اہداف میں سے ایک ہدف یہ تھا کہ انسانی تصورات اور انسانی سوسائٹیوں کو ان گندگیوں سے پاک کر دے اور یہ خدوخال ہر جاہلی نظام میں موجود ہوتے ہیں۔ جن لوگوں نے عرب جاہلیت کے سرخیل امرء القیس کے اشعار پڑھے ہیں تو بعینہ ویسے ہی نمونے یونانی جاہلیت میں موجود ہیں۔ ویسے ہی نمونے رومی جاہلیت میں بھی پائے جاتے ہیں اور یہی رخ ہے آج کے تمام جاہلی آداب کا جس میں آج کے عربوں کا جاہلی ادب بھی شامل ہے۔ اسی طرح کسی ایک جاہلی معاشرے کے رسم و رواج کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس میں عورت کا بازاری پن' عشاق چاک گریبانی' مرد و زن کا بے قید اختلاط پایا جائے گا اور یہی وہ صفات ہیں جو ہر قدیم و جدید جاہلیتوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔ اور یہی ان سب کے درمیان قدر مشترک ہے۔ اور یہ اوصاف ایک ہی فکر کی پیداوار ہوتے ہیں اور باہم بالکل مماثل ہوتے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ یہی جنسی بے راہ روی ہے' جس کی وجہ سے ہمیشہ تہذیبوں کے اندر توڑ پھوڑ کا عمل پیدا ہوا' جس سے اقوام زوال کے گڑھے میں گریں' یہی صورت حال یونانی تہذیب کو پیش ہوئی۔ اس کے بعد رومیوں کے ساتھ یہی حادثہ ہوا' قدیم فارسی تہذیب کو بھی انہی اسباب نے تباہ کیا اور آج بھی مغربی تہذیب کے یورپی اور امریکی معاشرے اس جنسی بے راہ روی کے ہاتھوں توڑ پھوڑ کا شکار ہو رہے ہیں۔ ان معاشروں کا تہذیبی زوال شروع ہو چکا ہے' حالانکہ ان کی صنعتی اور تمدنی ترقی اپنے عروج پر ہے۔ اہل غرب کے دانشمند اور دانشور اس تہذیبی زوال کے آغاز سے سخت پریشان ہیں لیکن جس طرح کہ ان کے اقوال اور تجزیوں سے معلوم ہوتا ہے وہ اس زوال پذیری کے عمل کے سامنے کسی قسم کا بند باندھنے سے عاجز ہیں۔ ا۔

اس امر کے باوجود کہ وہ اپنے انجام کو اچھی طرح جان رہے ہوتے ہیں' جاہلیت کے علمبردار ہر دور میں اور ہر جگہ میں اس زوال کی طرف دھکیلے چلے جاتے ہیں۔ وہ بعض اوقات تمام انسانی آزادیوں سے دستبردار ہو جاتے ہیں' یا اس کے لئے تیار ہو جاتے ہیں لیکن ان کی اس حیوانی آزادی کے سامنے اگر کوئی معمولی سی رکاوٹ آتی ہے تو وہ اس کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوتے۔ وہ مکمل غلامی کے لئے تو تیار ہو جاتے ہیں لیکن اس حیوانی جنسی آزادی کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

کیا یہ آزادی ہے۔ کیا یہ کوئی حقوق ہیں' میں سمجھتا ہوں کہ یہ تو انسانی مرتبے سے' حیوانی زندگی کی طرف لوٹنا ہے۔ اور حیوانی تقاضوں کی بدترین غلامی ہے۔ بلکہ یہ لوگ حیوانوں سے بھی زیادہ گر گئے ہیں۔ حیوانوں کی حالت تو یہ ہے کہ ان کی جنسی خواہش ایک فطری قید کے اندر مقید ہے۔ حیوانوں کے لئے اللہ نے ایک موسم مقرر کر دیا ہے جس کے اندر نر مادہ دونوں کے اندر جنسی ملاپ کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ جنسی ملاپ بھی محض تلذذ کے لئے نہیں ہوتا بلکہ فطرت کے مقاصد یعنی نسل کشی کے لئے ہوتا ہے۔ حیوان مادہ نر کو صرف متعین وقت میں قبول کرتی ہے۔ اور نر بھی اسی وقت آمادہ ہوتا ہے جب مادہ تیار ہو۔ رہا انسان تو اللہ تعالیٰ نے اس کی جنسی خواہش کو اس کی عقل کے کنٹرول میں دے دیا ہے اور اس کی عقل کو اس کے نظریہ کے تابع قرار دیا ہے جب بھی عقل انسانی اس کے نظریۂ حیات کے کنٹرول سے باہر نکلتی ہے۔ انسانی عقل فطری خواہش اور دباؤ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ جسمانی تقاضوں کے سامنے کمزور پڑ جاتی ہے۔ اور ایسے حالات

ا۔ دیکھئے مولانا سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ امیر جماعت اسلامی پاکستان کی کتاب ''الحجاب''

میں خواہشات نفسانیہ کا ضبط مشکل پڑ جاتا ہے اور معاشرے کو اس گندگی سے پاک کرنا محال ہو جاتا ہے۔ یہ کام صرف نظریۂ حیات ہی کر سکتا ہے جو راہوار نفس کی زمام کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔ اس کے بعد اس نظریۂ حیات کے بل بوتے پر ایک سیاسی قوت کا وجود ضروری ہوتا ہے جو اس عقیدے اور نظریۂ حیات پر مبنی ہو' اور اس قوت کے ہاتھ میں پھر حکومت کا آنا بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ یہ حکومت بذریعہ تربیت' راہنمائی اور سزا ہی منحرفین کی راہ روکے اور انسان کو برے راستوں سے موڑ کر' حیوانی مقام سے بلند کر دے اور وہ انسانیت کو اشرف المخلوقات کے مقام بلند تک پہنچا دے۔

جب بھی انسان جاہلیت کے دور میں داخل ہوتا ہے' اس کا کوئی نظریۂ حیات نہیں ہوتا۔ اس کے پاس جو اجتماعی حکومت بھی ہوتی ہے اس کا بھی کوئی نظریہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عرصہ سے مغربی جاہلیت کے دانشور چیخ رہے ہیں اور کوئی نہیں ہے جو ان کی طرف متوجہ ہو۔ اس لئے کہ انسان محض ہوائی باتوں کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتا۔ جب تک ان باتوں کی پشت پر قوت نافذہ نہ ہو' اسی طرح مغرب میں اہل کنیسا اور مذہبی لوگ مسلسل چیخ رہے ہیں لیکن کوئی نہیں جو ان کی بات سنے۔ اس لئے کہ لوگ محض نظریات کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ الا یہ کہ ان نظریات کی پشت پر حکومت ہو اور وہ ان کی حامی ہو۔ وہ ان نظریات کی راہنمائی پر عمل پیرا ہو' قوانین و ضوابط کو نافذ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانیت جہنم کے گڑھے کی طرف رواں دواں ہے' وہ اس فطری ضابطے سے بھی آزاد ہے جو حیوان کے لئے قدرت نے خود مقرر کر دیا ہے۔ وہ نظریہ' ایمان اور شریعت کے بندھنوں سے بھی آزاد ہے' جو اللہ نے انسان کے لئے نازل کی ہے۔

اس مغربی تہذیب کی بربادی اور تباہی اٹل ہے۔ ان سابقہ تاریخی تجربات کی روشنی میں جو تمام جاہلی تہذیبوں کی تاریخ میں پیش آئے' چاہے بظاہر وہ پختہ اور مستحکم نظر آئے' چاہے بظاہر وہ وسیع الاساس نظر آئے۔ اس لئے کہ انسان تہذیب سے بڑی اور اہم مخلوق ہے۔ جب انسان تباہ ہو جائے تو انسانی تہذیب کو محض صنعت اور کثرت پیداوار کے بل بوتے پر نہیں بچایا جاسکتا۔

یہ ہے اصل حقیقت اور جس وقت ہم اس کی گہرائیوں تک پہنچ گئے' ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کس قدر عظیم نظام زندگی ہے۔ اور کیوں اس نے جنسی بے راہ روی کے لئے اس قدر سخت ترین سزائیں تجویز کی ہیں؟ محض اس لئے کہ "انسان" کو ہلاکت سے بچایا جائے۔ انسانی زندگی کو اصل انسانی بنیادوں پر استوار کیا جائے اور اس سے ہمیں اس حقیقت کا بھی ادراک ہو جائے گا کہ جو ادارے اور حکومتیں ان انسانی اساسوں کا قلع قمع کر رہی ہیں' وہ انسانیت کے خلاف کس قدر عظیم جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ وہ محض فحاشی پھیلا کر' حیوانی شہوت رانی کے جذبات کو جگا کر اور عریانی کے ذریعہ جنسی بے راہ روی کو منظم کر کے' اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس کا نام کبھی وہ فن اور فنکاری رکھتے ہیں۔ کبھی وہ اسے آزادی کا نام دیتے ہیں۔ اور کبھی وہ اسے ترقی پسندی کہتے ہیں۔ لیکن ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسانیت کی تباہی کی ہر شکل و صورت اور ہر عنوان کے سامنے کھڑے ہو جائیں۔ نصیحت و تبلیغ اور جزا و سزا دونوں کے ذریعہ اس کو روکیں۔ یہ وہ کام ہے جسے اس دنیا میں صرف اسلام سرانجام دے رہا ہے اور یہ کام وہ اسلام کے مکمل نظام زندگی کے نفاذ کے ذریعہ کرتا ہے۔ جو نہایت ہی قوی الاساس ہے۔ ا۔

○.....☆☆☆.....○

ہاں جنسی بے راہ روی کے خلاف ان قانونی تدابیر کے باوجود اسلام خطاکاروں کے لئے واپسی کا دروازہ بند نہیں کرتا۔ اگر وہ توبہ کریں' پاکی کی راہ اپنائیں' اور واپس ہونا چاہیں تو توبہ کے دروازے کھلے ہیں بلکہ اسلام ان کی واپسی کے لئے کھلی راہ فراہم کرتا ہے۔ وہ ان کی

دیکھئے میری کتاب (الاسلام والسلام العالمی) کی فصل گھر کی سلامتی

واپسی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جب بھی وہ توبہ کریں اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرتا ہے' اور اللہ تعالیٰ اپنے اوپر مجرموں کے لئے یہ حق لازم کرتا ہے کہ وہ ضرور توبہ قبول کرے گا۔ صدبار اگر توبہ شکستی باز آ۔ یہ اللہ کا اس قدر عظیم کرم ہے جو انتہا کو پہنچا ہوا ہے اور اب اس میں مزید کوئی اضافہ ممکن ہی نہیں ہے۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٨﴾

"ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہی لوگوں کے لئے ہے جو نادانی کی وجہ سے برا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظر عنایت سے پھر متوجہ ہوتا ہے۔ اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ مگر توبہ ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جو برے کام کئے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آجاتا ہے اس وقت وہ کہتا ہے کہ میں نے توبہ کی۔ اور اسی طرح توبہ ان کے لئے بھی نہیں ہے جو مرتے دم تک کافر رہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے تو ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔"

اسی بارے میں ہم فی ظلال القرآن میں سورۂ آل عمران کی تشریح کرتے ہوئے توبہ پر بات کر آئے ہیں۔ وہاں آیت
**وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ** ..........
.......... "وہ لوگ جو کوئی فحش فعل کر لیتے ہیں یا اپنے نفسوں کے اوپر ظلم کر گزرتے ہیں' اللہ کو یاد کرتے ہیں اور فوراً اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں' وہ پوری بحث اس آیت کی تفسیر میں بھی نقل کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہاں توبہ کے لئے جو انداز کلام اختیار کیا گیا ہے' اس سے پیش نظر کوئی اور مقصد ہے۔ یہاں زیادہ زور اس پر ہے کہ توبہ کی حقیقت کیا ہے؟

وہ توبہ جسے اللہ قبول کرتا ہے اور جس کی قبولیت اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کر دی ہے (از راہ کرم) وہ توبہ وہ ہے جو نفس کی گہرائیوں سے اٹھے' جس سے معلوم ہو کہ اس نفس انسانی نے ایک نیا جنم لیا ہے' ندامت نے اسے گہرائیوں تک جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے اور اسے اس قدر ہلایا ہے کہ وہ اپنی سمت بدل گیا ہے' وہ اللہ کی طرف مڑ گیا ہے' توبہ اس معنی میں پوری عمر کے لئے رجوع ہے' ایک نئی امید کی کرن ہے۔ اس میں پاکیزگی اختیار کرنے کا عزم جدید ہوتا ہے۔ اور ایک حقیقی نیت پائی جاتی ہے کہ توبہ کرنے والا جدید راہوں پر صدق دل سے چلے گا۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧﴾

"ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہی لوگوں کے لئے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی برا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظر عنایت سے پھر متوجہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔"

وہ لوگ نادانی کی وجہ سے کوئی برا فعل کرتے ہیں' گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس بات پر تقریباً اجماع نظر آتا ہے کہ جہالت سے مراد یہاں نظریاتی گمراہی ہے' چاہے طویل ہو یا قصیر عرصے کے لئے ہو۔ بشرطیکہ مرتکب گناہ اس پر اصرار نہ کر رہا ہو اور یہ کہ حالت نزع نہ شروع ہو گئی ہو اور وہ لوگ جو جلدی توبہ کر لیتے ہیں وہ کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو موت نظریا سکرات الموت کے آغاز سے پہلے لوٹ آئیں۔ ابھی انہیں موت کی دہلیز نظر نہ آئی ہو۔ تو یہ توبہ' توبہ ندامت تصور ہو گی۔ گناہ سے نکل آنا' عمل صالح کا عزم کر لینا اور گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا عزم کر لینا ہی حقیقی توبہ ہے اور اس سے نفس انسانی گویا ایک نیا جنم لیتا ہے۔ اور ضمیر از سر نو جاگ اٹھتا ہے **فَأُوْلَٰٓئِكَ يَتُوبُ ٱللَّهُ عَلَيۡهِمۡ** ................ "ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظر عنایت سے پھر متوجہ ہوتا ہے۔" اور اللہ ساری باتوں کا خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ **وَكَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا" حَكِيمًا"** ................ وہ تمام اقدامات علم و حکمت کی بنیاد پر کرتا ہے اور اپنے ضعیف بندوں کو لوٹ آنے کا موقعہ فراہم کرتا ہے کہ وہ از سر نو پاک صفوں میں آ کر کھڑے ہو جائیں اور وہ اس طرح نہیں کرتا کہ گناہ گاروں کو دھتکار دے حالانکہ وہ حقیقتاً باز آنے کی نیت رکھتے ہوں۔ وہ اس کے در رحمت اور بارگاہ امن میں واپس آنا چاہتے ہیں۔

اللہ رحیم و کریم ہیں' وہ اپنے ضعیف بندوں کو دھتکارتے نہیں۔ اور نہ ہی ان کا پیچھا کرتے ہیں۔ اگر وہ باز آنا چاہیں۔ وہ تو بے نیاز ہے۔ اگر وہ باز آتے ہیں تو اسے کیا فائدہ ہے' یہ تو خود ان کا فائدہ ہے۔ خود ان کی زندگی' اس سے سلجھتی ہے' وہ معاشرہ اصلاح پذیر ہوتا ہے' جس میں خود وہ رہتے ہیں۔ یہی تو سبب ہے کہ وہ ان کو ان کی واپسی' توبہ اور پاکیزہ رویہ اختیار کرنے کے لئے وسیع مواقع فراہم کرتا ہے۔

**وَلَيۡسَتِ ٱلتَّوۡبَةُ لِلَّذِينَ يَعۡمَلُونَ ٱلسَّيِّـَٔاتِ حَتَّىٰٓ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ ٱلۡمَوۡتُ قَالَ إِنِّي تُبۡتُ ٱلۡـَٰٔنَ** ................ "مگر توبہ ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جو برے کام کئے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے اس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی۔" اس لئے کہ یہ توبہ گویا اب مضطر کی توبہ ہے جو گمراہی میں ڈوب گیا ہے۔ اور خطاکاری میں وہ گھرا ہوا ہے۔ یہ اس شخص کی توبہ ہے جس کے لئے اب ارتکاب گناہ کا کوئی موقعہ ہی نہیں رہا ہے۔ نہ اب وہ کسی غلط کاری میں پڑ سکتا ہے۔ اور اس حالت میں اللہ تعالیٰ کو یہ توبہ قبول نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس سے قلبی اصلاح اور زندگی کی عملی اصلاح کا اظہار نہیں ہوتا۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس شخص کے دل میں کوئی تبدیلی آ گئی ہے یا اس کے نقطۂ نظر اور سمت میں کوئی بہتر تبدیلی ہو گئی ہے۔

توبہ اس لئے قبول کی جاتی ہے کہ یہ ایک دروازہ ہے جو ان لوگوں کے لئے کھلا رکھا گیا ہے' جو اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں تاکہ وہ واپس آ کر اسلام کے حظیرۂ امن و سکون میں داخل ہو جائیں' وہ واپس آ جائیں' گمراہیوں کی تاریکی' دبیز تاریکی سے واپس آ جائیں۔ انسانیت انہیں شیطان کے جھنڈوں کے زیر سایہ کام کرنے والے گروہ سے نکال کر واپس لے آئے اور وہ صالح زندگی کا آغاز کریں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس واپسی کے بعد انہیں موقعہ ملتا ہے یا نہیں۔ کم از کم یہ موقعہ تو ہو کہ وہ یہ اعلان کر سکیں کہ ہدایت نے گمراہی پر فتح پا لی ہے۔ اگرچہ اس اعلان کے بعد انہیں مزید فرصت نہ ملے اور ان کی زندگی کا اختتام ہو جائے۔ اس لئے کہ موت کا علم کسی کو بھی نہیں

ہے۔ کہ وہ کب پہنچ آئے۔

وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَ هُمْ كُفَّارٌ ............................ "اور اسی طرح توبہ ان لوگوں کے لئے بھی نہیں ہے جو مرتے دم تک کافر ہیں۔" کیونکہ ان لوگوں نے اس تعلق ہی کو ختم کر دیا جو ان کے اور توبہ کے درمیان تھا۔ انہوں نے اس مہلت کو ضائع کر دیا جو انہیں توبہ اور حصول مغفرت کے لئے دی گئی تھی۔

اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝ ............................ "ایسے لوگوں کے لئے تو ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔" یہ تیار ہے پوری طرح مہیا کر دی گئی ہے، حاضر ہے، موجود ہے، ان کے انتظار میں ہے۔ تیاری کی ضرورت نہ ہوگی۔

غرض یہ درست ہے کہ اسلامی نظام نے فحاشی کے لئے سخت ترین سزا تجویز کی ہے لیکن اس نے توبہ کا دروازہ بھی پوری طرح کھلا چھوڑا ہوا ہے۔ چنانچہ اس طرح سزا کی سختی کے اندر ایک طرح کا توازن پیدا ہو جاتا ہے اور انسانی زندگی میں اس کی وجہ سے ایسے نتائج اور آثار پیدا ہوئے ہیں جو اس کرۂ ارض پر کسی بھی قدیم و جدید نظام کی وجہ سے نہیں پیدا ہوئے۔

○.....☆☆☆.....○

اس سبق کا دوسرا موضوع عورت ہے، عورت کی ذات۔ عربی جاہلیت میں بھی تمام دوسری ان جاہلیتوں کی طرح جو عرب کے ارد گرد پھیلی ہوئی تھیں، عورت کے ساتھ بہت ہی برا سلوک کیا جاتا تھا۔ اسے بنیادی انسانی حقوق حاصل نہ تھے۔ مرد کے مقابلے میں اس کی حیثیت بہت ہی نیچے تھی۔ وہ ایک انسان کے بجائے ایک سامان سمجھی جاتی تھی۔ اور اس کی یہ حیثیت اس وقت تھی جب مرد اس سے سکون بھی حاصل کرتا، اس سے حیوانی لذت بھی حاصل کرتا، اسے نفس کے لئے فتنہ بھی قرار دیتا اور اسے نیکی اور بھلائی کے اوصاف کے لئے شیطانی فتنہ قرار دیا جاتا۔ بس شہوت رانی اور تنگی غرضوں کا وہ موضوع ہوتی.... ایسے حالات میں جب اسلامی نظام زندگی آیا تو اس نے عورت سے ان تمام مظالم کو رفع کر دیا۔ اور اسے خاندان کے اندر ایک حقیقی مقام اور حیثیت دی گئی اور انسانی سوسائٹی میں اسے اپنے اصلی منصب پر فائز کیا گیا۔ وہ حیثیت جو اس منصب اور مقام کے عین مطابق تھی جس کا ذکر اس سورت کے آغاز میں کیا گیا تھا "جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد اور عورت دنیا میں پھیلائے۔"..... اس کے بعد عائلی زندگی کے اندر انسانی جذبات اور انسانی شعور کا درجہ بلند کیا گیا اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور احترام اور رحم و ہمدردی اور حسن سلوک کا حکم دیا گیا تاکہ دونوں کے یہ تعلقات محض حیوانی درجے سے بلند ہو کر انسانی مقام تک آ جائیں اور اس قدر پختہ ہوں کہ ایک ہی وار میں ٹوٹ پھوٹ نہ جائیں۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا
بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اِلَّاۤ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ ۚ وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ
فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْئًا وَّ یَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا كَثِیْرًا ۝۱۹ وَ اِنْ
اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا
مِنْهُ شَیْئًا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا ۝۲۰ وَ كَیْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَ قَدْ

أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا ﴿٢١﴾ وَلَا تَنكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُم مِّنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۚ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتًا وَسَاءَ سَبِيلًا ﴿٢٢﴾

۳۰ ع ۸ ۱۴

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمہارے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو۔ اور نہ یہ حلال ہے کہ انہیں تنگ کر کے اس مہر کا کچھ حصہ اڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انہیں دے چکے ہو۔ ہاں اگر وہ کسی صریح بدچلنی کی مرتکب ہوں (تو ضرور تنگ کرنے کا حق ہے)۔ ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کر لو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو' اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔ کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے؟ اور آخر تم اسے کس طرح واپس لے لو گے جبکہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔ اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں ان سے ہرگز نکاح نہ کرو' مگر جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا۔ درحقیقت یہ ایک بے حیائی کا فعل ہے' ناپسندیدہ ہے اور برا چلن ہے۔"

اس سے پہلے کہ اسلام عربوں کو قعر ذلت سے نکال کر عزت و شرافت کی بلند سطح تک پہنچاتا' عربوں کی حالت یہ تھی کہ جب کوئی فوت ہو جاتا تو اس کے ورثاء اس کی بیوی کے بھی حقدار بن جاتے اور وہ بھی انہیں اسی طرح میراث میں ملتی جس طرح دوسرے مویشی انہیں بطور ترکہ ملتے تھے۔ اب اگر وارث چاہتا تو عورت کے ساتھ بھی نکاح کر لیتا۔ اور اگر چاہتا تو اسے کسی دوسرے شخص کے نکاح میں دے کر اس کا مہر حاصل کر لیتا۔ جس طرح مویشی فروخت ہوتے تھے گویا یہ عورت بھی فروخت ہو جاتی۔ اور اگر یہ وارث چاہتے تو اسے گھر میں عضو معطل کی طرح رکھ چھوڑتے۔ نکاح بھی نہ کرتے' یونہی رہتی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے نفس کا معاوضہ دے کر جان چھڑاتی۔

بعض جگہ یہ رواج تھا کہ جب خاوند فوت ہوتا تو اس کا ولی دوڑ کر آتا اور اس عورت پر کپڑا ڈال دیتا۔ اس طرح وہ اسے گویا تمام لوگوں سے روک لیتا اور اس طرح سے اس پر قابض ہو جاتا جس طرح کوئی مال غنیمت پر قابض ہو جاتا ہے۔ اگر وہ خوبصورت ہوتی تو نکاح میں لے لیتا اور اگر بدصورت ہوتی تو قید رہتی اور موت کے بعد یہ شخص اس کا وارث قرار پاتا یا وہ مال دے کر اپنی گردن آزاد کر لیتی۔ لیکن اگر خاوند فوت ہونے کے بعد وہ فوراً اپنے والدین کے گھر چلی جاتی اور وارث اس پر کپڑا نہ ڈال سکتا تو وہ بچ جاتی اور وہ آزاد بھی جاتی۔

بعض جگہ یہ رواج تھا کہ ایک شخص بیوی کو طلاق دے دیتا اور یہ شرط عائد کر دیتا کہ وہ صرف اس جگہ نکاح کرے گی جس کی اجازت وہ دے گا۔ یوں وہ اس کو مال دے کر اپنے آپ کو آزاد کراتی۔ مہر لوٹاتی اور دوسرے ہدایا واپس کر دیتی۔

اگر کسی کی تحویل میں یتیم لڑکی ہوتی تو وہ اسے بند رکھتا تاکہ اس کا نابالغ بچہ بالغ ہو جائے اور وہ اس کے ساتھ نکاح کرے۔ اس طرح بعض اوقات بیوہ کو بھی ایک چھوٹے بچے کے لئے بند رکھا جاتا۔

یہ اور اس قسم کے اور رواج تھے' جو مقام شرافت اور عزت کے بالکل خلاف تھے۔ وہ شرافت اور عزت جو انسان کو اسلام دیتا ہے۔ حالانکہ عورت مرد کی شقیقہ ہے۔ ایک ہی نفس سے دونوں کو پیدا کیا گیا ہے۔ اور اس طرز عمل سے جس طرح عورت مقام عزت و

شرافت سے گری ہوئی تھی' اسی طرح مرد کے لئے بھی یہ صورت حال باعث شرم تھی۔ یوں نظر آتا تھا کہ مرد اور عورت کا تعلق کوئی تجارتی تعلق ہے یا محض حیوانی تعلق ہے۔

غرض مرد و زن کے تعلق کو اسلام نے ذلت کے اس گہرے گڑھے سے بلند کر کے انسانیت کے باعزت مقام تک پہنچایا۔ اسے ایسا مقام دیا جو انسانی شرافت کے لائق تھا۔ اس لئے کہ اسلام کے تصور انسانیت کے مطابق انسان عالمین کے اندر ذی شرف مخلوق ہے۔ لہذا یہ اسلام ہی تھا' جس نے اسے یہ مقام عالی دیا' اس قدر مقام عالی جو انسان کو صرف اسلام کے مصدر اور ماخذ سے ملا۔ا۔

اسلام نے عورت کو بطور سامان وراثت دوسرے سامان کے ساتھ حاصل کرنے کے فعل کو حرام قرار دیا۔ اسی طرح اسے قید کر کے عضو معطل بنانے کی بھی ممانعت کر دی۔ الا یہ کہ اس سے فحاشی کا جرم سرزد ہو جائے۔ اور یہ بھی اس وقت تھا جب حد زنا کا حکم نازل نہ ہوا تھا۔ اور اسلام نے ان حالات میں عورت کو یہ حق دیا کہ وہ جس کے ساتھ چاہے نکاح کرے۔ چاہے یہ ابتدائی شادی ہو یا دوسری شادی ہو' کنواری ہو یا بیوہ ہو' مطلقہ ہو یا اس کا خاوند فوت ہو گیا ہو۔ اور اس کے ساتھ معروف طریقے کے مطابق زندگی گزارنا مرد پر لازم کر دیا گیا۔ اگرچہ اس عورت کو مرد پسند نہ کرتا ہو۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اس عورت کے ساتھ اس کی معاشرت ممکن ہی نہ رہے۔ اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ عورت کو پسند نہ کرتا ہو لیکن اس میں اس کے لئے خیر پوشیدہ ہو۔ اس لئے اسے مناسب نہیں ہے کہ طبیعت کے اندر نفرت آتے ہی وہ اسے طلاق دے دے۔ اگر وہ بیوی کو رکھے تو آنے والے دور میں اسے اس سے فائدے بھی مل سکتے ہیں۔ اس لئے اسے چاہئے کہ امید کا دیا جلائے رکھے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔـا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تمہارے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو اور نہ یہ حلال ہے کہ انہیں تنگ کر کے اس مہر کا کچھ حصہ اڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انہیں دے چکے ہو' ہاں اگر وہ صریح بد چلنی کی مرتکب ہوں' ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو' اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔"

اس آیت کی یہ آخری فنشنگ ہے۔ اس میں نفس انسانی اللہ کی ذات سے وابستہ اور مربوط کر دیا جاتا ہے۔ اگر میاں بیوی کے تعلقات کے درمیان غصے اور غضب اور ہیجان کی حالت پیدا ہو جائے تو اسے ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ اگر بیوی ناپسند ہو تو اس ناپسندیدگی کی حدت کو قدرے نرم کر دیا جاتا ہے تاکہ انسانی نفس میں سکون پیدا ہو' اور یہ نہ ہو کہ تعلق زوجیت خشک پتے کی طرح ہوا کے معمولی جھونکے سے ادھر ادھر ہو جائے۔ کیونکہ تعلق زوجیت کو تعلق باللہ کی رسی سے مضبوطی سے باندھ دیا جاتا ہے۔ اس تعلق کو مومن اور اس کے رب کے پاکیزہ اور مضبوط تعلق سے جوڑ دیا جاتا ہے۔

اسلامی تصور حیات کے مطابق' ایک گھرانا بحیثیت ابتدائی اکائی انسان کے لئے امن و سکون اور محبت و رافت کی جگہ ہونا چاہئے۔

ا۔ "اسلام کا تصور خدا' تصور کائنات' تصور زندگی اور تصور انسان" یہ کتاب عنقریب شائع ہونے والی ہے۔

اس لئے وہ زوجین کے تعلقات کو بھی انس و محبت اور ہمدردی و ایثار کی اساس پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیاں تعلق مطلق رضامندی اور آزادی کی بنیاد پر قائم ہو تاکہ خاندان کے اندر محبت الفت اور ہمدردی کے جذبات ہر وقت موجود ہوں۔ اگر کبھی کدورت پیدا ہو جائے تو اسلام کی نصیحت یہ ہے کہ برداشت کرو۔ "اگر تم بیویوں کو ناپسند بھی کرتے ہو تب بھی اس بات کا امکان ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور اللہ تمہیں اس میں بھلائی دے دے۔" یہ تلقین اس لئے کی جاتی ہے کہ جذبات کے پہلے جھونکے ہی میں رشتہ زوجیت ختم ہو کر نہ رہ جائے۔ پہلے ہی جھٹکے میں ہی نکاح نہ ٹوٹ جائے اور یہ قیمتی انسانی ادارہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نہ رہ جائے اور انسان کے بدلتے ہوئے جذبات اور اڑتے ہوئے میلانات کا شکار نہ ہو جائے۔

حضرت عمر ﷺ نے ایک شخص کو کیا خوب نصیحت فرمائی جو اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا تھا اور طلاق کی وجہ صرف یہ تھی کہ اسے اس کے ساتھ محبت نہ تھی۔ "تم برباد ہو جاؤ کیا گھرانہ قائم ہونے کے لئے محبت کے سوا کوئی اور اساس نہیں ہوتی؟ پرورش اور ذمہ داریوں کا کیا ہو گا؟"

آج کل کے نام نہاد دانشور محبت کے نام سے جو بکواس کرتے ہیں' اس سے ان کی مراد بدلتے ہوئے ہیجانی اور وقتی جذبات ہوتے ہیں اور ان وقتی امور کی وجہ سے وہ اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ اس کی وجہ سے زوجین کے درمیان جدائی کر کے' اس اہم ادارے کو تباہ کر دیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر بیوی خاوند سے محبت نہیں کرتی تو اس کے ساتھ اس کی خیانت ہے۔ اور اگر مرد عورت کے ساتھ محبت نہیں کرتا تو یہ بھی اس کی جانب سے ایک قسم کی خیانت ہے۔

جو لوگ یہ باتیں کرتے ہیں وہ کم ظرف لوگ ہیں۔ ان کے دل و دماغ میں بدلتی ہوئی جسمانی خواہشات سے بلند کوئی ارفع اور اعلیٰ تصور سماتا ہی نہیں۔ وہ صرف حیوانی خواہشات ہی کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ بات نہیں سماتی کہ انسانی زندگی میں مروت' شرافت' حسن سلوک اور برداشت جیسے اوصاف بھی ہو سکتے ہیں' جو ان اوصاف اور میلانات اور گھٹیا سوچ سے بہت بلند ہیں جن کے یہ منہ پھٹ لوگ غلام ہیں۔ اور ان کی یہ سوچ اس لئے محدود ہے کہ اس کے اندر اللہ جل شانہ کی کوئی جگہ نہیں ہے اس لئے ان کے شعور میں یہ تصور نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنین کو دیا جا رہا ہے۔

**فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ..........**

"اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ صرف ایمان ہی سے انسان کی حیثیت بلند ہوتی ہے' انسان کی ترجیحات بلند ہوتی ہیں اور انسانی زندگی کے مقاصد بلند ہو جاتے ہیں۔ انسانی زندگی کا معیار محض حیوانی فطری میلانات سے ذرا اوپر اٹھتا ہے۔ انسان محض سود اگر نہیں رہتا۔ نہ وہ خالی اور بے معنی ڈھانچہ ہوتا ہے۔

اگر صبر' برداشت' حسن سلوک اور اصلاح کی سب امیدیں خاک میں مل جائیں اور زندگی کا خوش اسلوبی سے بسر ہونا ممکن نہ رہے اور جدائی ہر حال میں ضروری ہو جائے اور مرد مجبور ہو جائے کہ بیوی کا بدلنا ضروری ہے' تو ایسے حالات میں عورت نے جو مہر لیا ہے اور جو مال اسے ملا ہے وہ اس کا ہو گا اور یہ جائز نہ ہو گا کہ کوئی چیز اس سے واپس لی جائے۔ اگرچہ وہ مال بڑی مقدار میں ہو' قیمتی ہو' یہ مال اس سے واپس لینا صریح گناہ ہے اور ایک قابل نفرت فعل ہے۔

**وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ۚ أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا ۝**

"اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کر لو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو' اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔ کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے۔"

یہاں بھی ایک گہرا انسانی اور وجدانی ٹچ دیا جاتا ہے۔ عائلی زندگی کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے۔ عجیب انداز تعبیر اور اشارات سے بھرپور رموز ہیں۔

وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا ﴿٢١﴾

"اور آخر تم کس طرح لے لو گے جبکہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔"

یہاں افضی فعل کے مفعول کو متعین نہیں کیا گیا۔ لفظ کو عام چھوڑ دیا گیا' اس سے اس کے ہر قسم کے مدلول کا اظہار ہو سکتا ہے۔ تمام مفاہیم پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ تمام اشارات ذہن میں گردش کرتے ہیں' جسمانی لطف اندوزی بھی' جذبات و میلانات بھی' احساسات اور تصورات بھی' راز و نیاز بھی اور وہ تمام دلچسپیاں بھی جو میاں بیوی کے درمیان ہو سکتی ہیں۔ انسانی زندگی کے شب و روز کی ہر شکل و صورت اس لفظ افضی کے مفہوم میں آتی ہے۔ غرض وہ تمام باتیں پردۂ خیال پر آجاتی ہیں جن کا تعلق میاں بیوی کے اس اہم ادارے کی گزشتہ زمان و مکان کے ساتھ وابستہ رہی ہیں۔ دل کی ہر دھڑکن افضاء ہے' ہر مشتاقانہ نظر افضاء ہے' جسم کا ہر لمس افضاء ہے' غم اور امید میں شرکت افضاء ہے۔ حال و مستقبل کی ہر مشترکہ سوچ افضاء ہے۔ ہر پچھلی سوچ افضاء ہے اور سب سے اعلیٰ یہ کہ دونوں کی مشترکہ اولاد بھی افضاء ہے۔

تصورات و احساسات کا یہ ڈھیر ہے' جذبات و میلانات کی یادوں کی اس تازگی کو صرف چند الفاظ میں اسکرین پر لایا گیا۔ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ ............ "اور تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو۔" ان یادوں کے ہوتے ہوئے اب مرد کے لئے بعض حقیر چیزوں کا مطالبہ کرنا' نہایت ہی حقیر نظر آتا ہے اور اب شرم کے مارے وہ اس مفاداتی مطالبے سے باز آجاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ماضی قریب کی عملی زندگی کے خوشگوار تصورات کو اسکرین پر دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اب اسے وقت فراق میں یہ یادیں اذیت دیتی ہیں اور وہ یہ احساس کرتا ہے کہ یہ تمام واقعات بادل نخواستہ ہیں۔

ان یادوں کے ساتھ ساتھ ایک دوسری بات' ایک دوسرا فیکٹر بھی یاد دلایا جاتا ہے۔ گویا اسکرین پر ایک دوسری جھلک آتی ہے۔ ایک دوسرا رنگ نمودار ہوتا ہے۔ وَأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا ............ "اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔" میثاق نکاح اللہ کے نام سے اور خطبے کے ساتھ' نبی کی سنت کے مطابق۔ یہ عہد نکاح ایک عظیم عہد جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مومن کے نزدیک وہ بہت بڑی بات ہے۔ یہ نکاح اہل ایمان کے مابین ہے اور اہل ایمان اسے ایک عظیم عقد بلکہ میثاق سمجھتے ہیں۔ اس کا احترام ان پر لازم ہے۔

آخر میں ایک فعل شنیع کے بارے میں قطعی حرمت آتی ہے۔ یہ فعل جاہلیت میں مروج تھا۔ بیٹے باپ کی منکوحہ سے نکاح کر لیا کرتے تھے۔ اور بعض اوقات اس حق نکاح کی وجہ سے عورتیں معطل ہو کر رہ جاتی تھیں کہ بچہ بڑا ہو اور اپنے والد کی بیوی سے نکاح کرے۔ اور اگر بڑا ہوتا تو وہ منکوحہ والد کو مال میراث تصور کرتا۔ اسلام نے اس فعل کو سخت ترین الفاظ میں حرام قرار دیا۔

وَلَا تَنكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُم مِّنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۚ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتًا

وَ سَآءَ سَبِيۡلًا ﴿۲۲﴾

"اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں ان سے ہرگز نکاح نہ کرو مگر پہلے جو ہو چکا سو ہو چکا۔ درحقیقت یہ ایک بے حیائی کا فعل ہے' ناپسندیدہ ہے' اور برا چلن ہے۔"

اس تحریم کی حکمت کے حوالے سے دو تین باتیں ذہن میں آتی ہیں' اگرچہ انسان کے لئے یہ تو ناممکن ہی نہیں ہے کہ وہ شرعی احکام کی تمام حکمتوں اور رازوں کا احاطہ کر سکے۔ ہمارے لئے تو بس یہی کافی ہے کہ اللہ نے یہ قانون بنایا ہے جو ہمارے لئے بتا رہا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اس میں ضرور کوئی حکمت اور مصلحت ہو گی.... بہرحال جو تین چیزیں سمجھ میں آتی ہیں وہ یہ ہیں کہ سوتیلی ماں بھی ماں ہوتی ہے' یہ کہ باپ کی جگہ بیٹے کا آنا سوئے ادب ہے۔ کیونکہ اس شکل میں وہ باپ کا مساوی اور شریک ہو جاتا ہے۔ فطرۃً ایک انسان اپنی بیوی کے پہلے خاوند کو ناپسند کرتا ہے۔ یوں وہ اپنے باپ کو بھی ناپسند کرنے لگے گا۔ تیسری بات یہ ہے کہ منکوحہ اب کے ساتھ والد کے ترکہ کے تصورات کی وابستگی ہو سکتی ہے' جبکہ جاہلیت میں ایسے رواجات بھی تھے۔ اور یہ ایک ایسا کریہہ تصور ہے جو بیک وقت مرد اور عورت دونوں کے لئے مکروہ ہے۔ کیونکہ دونوں ایک ہی نفس سے پیدا کئے گئے ہیں اور ایک کی توہین دوسرے کی توہین ہے۔

یہ ہیں وہ ظاہری وجوہات جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو مکروہ' ناپسندیدہ اور شنیع اور بدچلنی قرار دیا ہے جبکہ ان کے علاوہ بھی بہت سے اسباب اور حکمتیں ہو سکتی ہیں۔ ہاں اور جاہلیت میں جو نکاح ہوئے وہ معاف ہیں اور ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

○.....☆☆☆.....○

اس سبق کے تیسرے پیرے میں عورتوں میں سے محرمات کی فہرست دی گئی ہے۔ یہ بھی خاندانی نظام کی تشکیل اور تنظیم کے اقدامات میں سے ایک اہم اقدام ہے۔ خاندان کے بعد اسلامی معاشرے کی ضابطہ بندی ہے۔

حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمۡ اُمَّهٰتُكُمۡ وَبَنٰتُكُمۡ وَاَخَوٰتُكُمۡ وَعَمّٰتُكُمۡ وَخٰلٰتُكُمۡ وَبَنٰتُ الۡاَخِ وَبَنٰتُ الۡاُخۡتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىۡۤ اَرۡضَعۡنَكُمۡ وَ اَخَوٰتُكُمۡ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمۡ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِىۡ فِىۡ حُجُوۡرِكُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِىۡ دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ فَاِنۡ لَّمۡ تَكُوۡنُوۡا دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ وَحَلَآئِلُ اَبۡنَآئِكُمُ الَّذِيۡنَ مِنۡ اَصۡلَابِكُمۡ ۙ وَاَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَيۡنَ الۡاُخۡتَيۡنِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ۙ ﴿۲۳﴾

وَّالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ

"تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں' بیٹیاں' بہنیں' پھوپھیاں' خالائیں' بھتیجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہو'

اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی لڑکیاں جنہوں نے تمہاری گودوں میں پرورش پائی ہے.... ان بیویوں کی لڑکیاں جن سے تمہارا تعلق زن و شو ہو چکا ہے ورنہ اگر تعلق زن و شونہ ہوا تو تم پر کوئی مواخذہ نہیں اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہارے صلب سے ہوں اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا ہے کہ ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرو مگر جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا۔ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں۔ البتہ ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو جنگ میں تمہارے ہاتھ آجائیں۔ ان کے سوا جتنی عورتیں ہیں وہ تمہارے لئے حلال ہیں۔"

محرمات' یعنی وہ عورتیں جن سے نکاح حرام ہے وہ تمام اقوام و امم میں معروف ہیں۔ چاہے پسماندہ اقوام ہوں یا ترقی یافتہ اقوام ہوں۔ تحریم کے اسباب اور تحریم کے درجات مختلف اقوام کے ہاں مختلف رہے ہیں۔ قدیم پسماندہ اقوام کے اندر یہ دائرہ بہت ہی وسیع رہا ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک کے اندر یہ سکڑتا رہا ہے۔

اسلام میں آیت زیر بحث اور اس سے پہلی آیت میں ان محرمات کی تحدید کی گئی ہے۔ بعض محرمات ابدی ہیں۔ اور بعض وقتی ہیں۔ بعض بہ سبب نسب ہیں' بعض بوجہ رضاعت ہیں اور بعض بوجہ مصاہرت ہیں۔

ان محرمات اور اسباب کے علاوہ اسلام نے تمام دوسری پابندیوں کو ختم کر دیا' جو دوسرے معاشروں کے اندر مروج تھیں' مثلاً وہ پابندیاں جو نسلی وجوہات کی بناء پر رائج تھیں۔ قومی حد بندیوں کی وجہ سے رائج تھیں یا رنگ کی وجہ سے رائج تھیں یا وہ پابندیاں جو طبقاتی درجات کی وجہ سے رائج تھیں حالانکہ ان میں زوجین ایک نسل' ایک وطن اور ایک علاقے کے باشندے ہوا کرتے تھے۔ [۱]

قرابت داری کی وجہ سے اسلام میں چار قسم کی عورتیں حرام ہیں۔

۱۔ کسی شخص کے اصول جس قدر اوپر چلتے جائیں' مثلاً ماں دادیاں' نانی اور یہ سب "امہات" کے لفظ میں شامل ہیں۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ ......................... "تم پر تمہاری مائیں حرام ہیں۔"

۲۔ دوسری قسم کسی شخص کے فروع ہیں جس قدر نیچے چلے جائیں۔ مثلاً بیٹیوں اور بیٹیوں کی اولاد سے نکاح حرام ہے اور یہ وَبَنٰتُكُمْ میں داخل ہیں۔

۳ ماں اور باپ کے فروع' جس قدر نیچے چلتے جائیں۔ بہن' بھائی' بھتیجی اور ان کی اولاد یہ أَخَوٰتُكُمْ بَنٰتُ الْأَخِ ............ اور بَنٰتُ الْأُخْتِ ............ میں داخل ہیں۔

۴۔ نانا دادا کی براہ راست اولاد' لہٰذا پھوپھیاں اور خالائیں حرام ہوں گی۔ ماں باپ کی پھوپھیاں اور خالائیں بھی حرام ہوں گی اور نانا دادا کی پھوپھیاں اور خالائیں بھی حرام ہوں گی وغیرہ۔ یہ سب عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ .................. میں داخل ہیں۔ لیکن اجداد کی وہ اولاد جو براہ راست نہ ہو درمیان واسطہ آجائے تو وہ جائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چچازاد بہن' خالہ زاد' پھوپی زاد کے ساتھ نکاح جائز ہے اور ان کی اولاد کے ساتھ بھی۔

مصاہرت کی بناء پر پانچ قسم کی عورتیں حرام ہیں۔

۱۔ بیوی کے اصول' جہاں تک اوپر کی طرف چلتے جائیں۔ چنانچہ بیوی کی ماں' بیوی کی دادی' بیوی کی نانی' جہاں تک اوپر چلے جائیں حرام ہیں۔ اور یہ حرمت نکاح کرتے ہی قائم ہو جاتی ہے۔ چاہے دخول ہوا ہو یا نہیں۔ اور یہ وَأُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ میں داخل ہیں۔

---

[۱] تفصیلات کے لئے دیکھئے ڈاکٹر عبدالواحد وافی کی کتاب "خاندان اور معاشرہ" ص ۴۶ تا ۵۶

۲۔ بیوی کی فروعات جس قدر بھی نیچے چلتے جائیں۔ مثلاً بیوی کی لڑکی حرام ہے' اس کی اولاد حرام ہے' مرد ہو یا عورت۔ لیکن یہ حرمت اس وقت قائم ہوتی ہے جب بیوی کے ساتھ مباشرت ہو گئی ہو۔ قرآن میں ہے

وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ

"اور تمہاری بیویوں کی لڑکیاں جنہوں نے تمہاری گود میں پرورش پائی جن سے تمہارا تعلق زن و شو ہو چکا ہو ورنہ اگر تعلق زن و شو نہ ہوا ہو تو تم پر کوئی مواخذہ نہیں۔"

۳۔ باپ دادا اور نانا کی بیویاں' جس قدر اوپر چلے جائیں۔ چنانچہ باپ کی بیوی' دادا اور نانا کی بیوی سے نکاح حرام ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ............ "اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں ان سے نکاح نہ کرو۔ مگر جو پہلے ہو چکا' سو ہو چکا۔" یعنی جاہلیت میں جو ہو چکا سو ہو چکا' اس لئے کہ جاہلیت میں یہ جائز تھا۔

۴۔ بیٹوں کی بیویاں اور پوتوں کی بیویاں جس قدر نیچے کو چلتے جائیں۔ اس لئے ایک شخص کے لئے اپنے صلبی بیٹے کی بیوی سے نکاح حرام ہے۔ اسی طرح صلبی پوتے کی بیوی کے ساتھ نکاح حرام ہے۔ اسی طرح لڑکی کے لڑکے کی بیوی کے ساتھ نکاح بھی حرام ہو گا۔ جس قدر نیچے چلتے جائیں۔ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ............ "اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہارے صلب سے ہوں۔" اصلابکم کی شرط اس لئے عائد کی گئی ہے کہ جاہلیت میں منہ بولے بیٹے کی بیوی بھی حرام بھی جاتی تھی' اس لئے اس کو صلبی بیٹے پوتے کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا۔ اور حکم دیا گیا کہ منہ بولے بیٹوں کو ان کے والدین کی طرف نسبت دو۔ (سورۃ احزاب)

۵۔ بیوی کی بہن بھی حرام ہے لیکن یہ تحریم وقتی ہے۔ اگر بیوی زندہ ہو اور اس کے نکاح میں ہو۔ حرام یہ ہے کہ بیک وقت دو بہنوں کو نکاح میں رکھا جائے۔ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ............ "اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا ہے کہ ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرو مگر جو پہلے ہو گیا سو ہو گیا۔" اس پر مواخذہ نہ ہو گا' اس لئے کہ نظام جاہلیت کے اندر وہ جائز تھا۔

اسی طرح رضاعت کے ذریعہ بھی وہ تمام عورتیں حرام ہو جاتی ہیں جو نسب اور مصاہرت کی وجہ سے حرام ہو جاتی ہیں اور یہ فہرست نو محرمات پر مشتمل ہے۔

۱۔ دودھ پلانے والی ماں اور اس کی ماں دادی نانی جس قدر بھی اوپر چلتے جائیں۔ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْ اَرْضَعْنَكُمْ ............ "اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہو۔"

۲۔ رضاعی بیٹی اور اس کی بیٹیاں جس قدر بھی نیچے چلتے جائیں۔ رضاعی بیٹی وہ ہوتی ہے' جسے کسی کی بیوی نے دودھ پلایا ہو اور وہ بیوی اس کے نکاح میں ہو۔

۳۔ رضاعی بہن اور اس کی بیٹیاں جس قدر نیچے بھی ہوں۔ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ ............ "اور تمہاری دودھ شریک بہنیں۔"

۴۔ رضاعی چچی اور رضاعی خالہ۔ رضاعی خالہ دودھ پلانے والی کی بہن ہوتی ہے اور رضاعی چچی دودھ پلانے والی کے خاوند کی بہن

ہوتی ہے۔

۵۔ بیوی کی رضاعی ماں۔ یہ وہ عورت ہے جس نے بیوی کو بچپن میں دودھ پلایا۔ اس طرح اس ماں کے اصول یعنی دادی نانی جس قدر بھی اوپر کو جائیں اور یہ تحریم محض نکاح سے قائم ہو جاتی ہے' جس طرح نسب میں ہوتی ہے۔

۶۔ بیوی کی رضاعی بیٹی' یعنی وہ لڑکی جس کو بیوی نے اس شخص کے ساتھ نکاح کرنے سے پہلے دودھ پلایا ہو۔ اسی طرح اس کی تمام پوتیاں' جس قدر بھی نیچے چلیں۔ البتہ یہ تحریم تب جاری ہو گی جب بیوی کے ساتھ مجامعت ہو گئی ہو۔

۷۔ یعنی رضاعی باپ اور دادا کی بیوی حرام ہے۔ رضاعی باپ وہ ہے جس کی بیوی نے دودھ پلایا ہو' اس لئے صرف وہ عورت ہی حرام نہ ہو گی جس نے دودھ پلایا' وہ رضاعی ماں ہو گئی بلکہ اس کے رضاعی باپ کی منکوحہ یعنی رضاعی ماں کی سوکن بھی حرام ہو گی۔

۸۔ رضاعی بیٹے کی بیوی' جس قدر نیچے چلے جائیں۔

۹۔ اسی طرح بیوی اور بیوی کی رضاعی بہن بھی حرام ہو گی' بیوی کی رضاعی چچی اور خالہ بھی حرام ہو گی یا ہر وہ عورت جو اس کے لئے رضاعت کی وجہ سے حرام ہوئیں۔

ان محرمات میں سے قسم اول اور قسم ثالث کے بارے میں تو صراحت اس آیت میں آگئی ہے۔ باقی فہرست حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے جس میں ہے۔ "رضاعت وہی محرمات ہیں جو نسب کی وجہ سے حرام ہیں۔"

**یَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ** ........................ (مسلم بخاری)

○.....☆☆☆.....○

یہ تو ہیں وہ حرام عورتیں جو شریعت نے حرام کی ہیں۔ آیت میں اس حرمت کے لئے کوئی علت اور حکمت نہیں دی گئی۔ نہ عام اور نہ کوئی خاص حکمت و علت جن لوگوں نے مختلف وجوہات و اسباب کا ذکر کیا ہے وہ ان کی جانب سے اجتہاد اور غور و فکر پر مبنی رائے ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان تمام محرمات کے لئے ایک ہی علت اور سبب ہو' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض محرمات کے لئے الگ مخصوص اسباب ہوں' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کئی اقسام کا باہم مشترکہ سبب بھی ہو۔ مثلاً قریبی رشتہ داروں کے اندر شادیوں کی وجہ سے بعض اوقات بچے کمزور ہوتے ہیں اور مرور زمانہ کے ساتھ ایک ضعیف نسل وجود میں آتی ہے یعنی موروثی کمزوریاں نسلاً بعد نسل جمع ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں اگر دور اقوام اور نسلوں میں شادیاں کی جائیں تو اس کے نتیجے میں ایک صحت مند نسل وجود میں آتی ہے اور دونوں کی صلاحیتیں ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بعض محرمات کے ساتھ نہایت ہی محبت' رواداری' احترام اور وقار کے تعلقات مطلوب ہوتے ہیں۔ اس لئے ان روابط کو میاں بیوی کے نازک تعلق سے دور رکھنا ضروری تھا تاکہ طلاق اور جدائی کی صورت میں تلخی پیدا نہ ہو' اور وہ جذبات مجروح نہ ہوں جنہیں شریعت دائما" رکھنا چاہتی ہے۔ مثلاً مائیں' بیٹیاں' بہنیں' خالائیں' پھوپھیاں' بھانجیاں' بھتیجیاں اور ان کے بالمقابل وہی رشتے رضاعت کی وجہ سے۔ یہ سب اسی زمرے میں آتی ہیں۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے بعض محرمات مثلاً بیوی کی بیٹی' بہنوں کا اجتماع' باپ کی منکوحہ' ان میں اگرچہ رشتے داری کے جذبات اور تعلقات میں کشیدگی کا احتمال نہیں ہے لیکن تعلقات کشیدہ ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ماں کو یہ خدشہ ہو گا کہ اس کی بیٹی بھی سوکن بن سکتی ہے۔ بہن اور اس کی بیٹی ایک جگہ اگر سوکن بن جائیں۔ اسی طرح باپ کے اندر یہ شعور جاگ سکتا ہے کہ اس کے بعد اس کا بیٹا اس کا شریک ہو سکتا ہے۔ یہی

ا۔ یہ تمام تفصیلات ڈاکٹر عبد الواحد وافی کی کتاب "خاندان اور معاشرہ" سے لی گئی ہیں۔

بات بہو کے بارے میں ہو سکتی ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قریبی رشتہ داروں کے باہم خاندانی تعلقات تو پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ دور دراز خاندانوں میں رشتے ناطے ہوں اور یوں خاندانی تعلقات کا دائرہ مزید وسیع ہو جائے اور رشتہ داروں کے اندر صرف اس حد پر جا کر اجازت دی گئی ہے جہاں خاندانی رشتہ کمزور ہو جاتا ہے۔ (Remote)

غرض جو علت بھی ہو' بہر حال ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی قانون بنایا ہے' وہ ہرگز خالی از حکمت نہ ہو گا۔ اس میں انسانوں کی مصلحت اور بھلائی ہو گی۔ رہی ہماری دانست کی بات تو کبھی ہمیں اس کا علم ہو گا اور کبھی نہ ہو گا۔ ہماری دانش و علم کا اثر اللہ کی شریعت پر نہیں پڑتا۔ نہ شریعت کے نفاذ اور اس کی اطاعت پر کوئی فرق پڑتا ہے۔ ہمیں تسلیم و رضا کے ساتھ شریعت کی اطاعت کرنا ہے۔ اس لئے کہ ایمان صرف دل ہی میں نہیں ہوتا۔ اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اللہ کی شریعت کی حکمرانی قائم کی جائے اور ہم مکمل طور پر سر تسلیم خم کر دیں اور ہمارے دلوں میں شریعت کے احکام کے بارے میں کوئی خلجان نہ ہو۔

○.....☆☆☆.....○

اب آخری بات اور آیات کی تشریح باقی رہ گئی' وہ یہ ہے کہ یہ محرمات دو کو چھوڑ کر سب کی سب جاہلیت کے رواج میں بھی محرمات تھیں۔ جاہلیت میں ایک منکوحہ اب کے ساتھ نکاح کر لیا جاتا تھا' دوسرے یہ کہ دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا جائز سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ جاہلی معاشرہ بھی انہیں مکروہ سمجھتا تھا۔ لیکن اسلام نے انہیں اس لئے نہیں حرام قرار دیا کہ دور جاہلیت میں ایسا ہوا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس حرمت کو اپنے حق حاکمیت کے حوالے سے پیش فرمایا **حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ** "تم پر میری جانب سے حرام کی گئی ہیں۔"

یہ معاملہ محض الفاظ کا نہیں ہے' نہ صرف شکل و صورت کا ہے بلکہ یہ پورے دین کا معاملہ ہے۔ اس کے عقدہ کو حل کر لینے سے پوری دین کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور وہ اصول ہمارے ہاتھ آجاتا ہے جس پر یہ دین قائم ہے۔ یعنی حاکمیت صرف اللہ وحدہ کا خاصہ ہے۔

اس دین [illegible] یہ ہے کہ حرام و حلال کی حدود کے تعین کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ اس لئے کہ حاکمیت الٰہیہ کی یہ ایک نہایت ہی بنیادی خصوصیت ہے۔ اس لئے حلال و حرام کے تعین کے لئے ضروری ہے کہ اس پر اللہ کی جانب سے کوئی سلطان و ثبوت ہو۔ یہ وہی ذات ہے جو لوگوں کے لئے بعض چیزوں کو حرام کر دیتی ہے۔ اور بعض کو حلال کر دیتی ہے اور اس ذات کے سوا کسی اور کو یہ اختیار اس نے نہیں دیا ہے۔ نہ یہ حق کوئی اپنے لئے مخصوص کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ اگر حاکمیت کے اس حق کا کوئی اپنے لئے مدعی ہو گا تو وہ گویا الوہیت کا دعویٰ کرے گا۔

یہی وجہ ہے کہ ہر جاہلی نظام اپنے لئے حلال و حرام خود مقرر کرتا ہے۔ اور اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق اس کے مقرر کردہ یہ حلال و حرام ابتداء ہی سے باطل (Void) اور کالعدم ہیں۔ اس لئے جب اسلام آتا ہے تو وہ جاہلیت کے تمام ضابطوں کو کالعدم کر دیتا ہے' جس میں حلال بھی شامل ہیں اور حرام بھی۔ اور ان میں سے کسی چیز کو قائم نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ یہ حلال و حرام اگر درست بھی ہوں' لیکن ان لوگوں نے مقرر کئے تھے جنہیں اس کا اختیار (Jurisdiction) نہ تھا۔ ان میں سے کوئی بھی نہ الٰہ ہے۔ اس منسوخی کے بعد اسلام از خود حلال و حرام کا تعین کرتا ہے۔ اگر جاہلیت میں کوئی چیز حلال قرار دی گئی تھی تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ وہی حلال ہے جسے اسلام حلال کر دے اور وہی حرام ہے جسے اسلام حرام کر دے۔ از جانب اللہ۔

اسلام کا یہ نظریہ حلال و حرام اس کائنات کی تمام اشیاء اور ان انسان کے تمام افعال و سرگرمیوں پر حاوی ہے۔ اس کے دائرہ سے

کوئی چیز باہر نہیں ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو حلال و حرام کے تعین کا اختیار ہی نہیں ہے۔ نکاح و طلاق میں کھانے و پینے میں' لباس و صورت میں' عمل و حرکت میں' تعلقات و معاملات میں' رسم و رواج میں اور قانون و ضوابط میں' غرض تمام معاملات میں مصدر قانون ذات باری ہے۔

اللہ کے علاوہ جس مصدر اور جس ادارے سے بھی حلال و حرام کا تعین ہو گا وہ اپنی اصلیت کے اعتبار سے باطل (Void) ہے۔ نہ اس کا اجراء ہو سکتا ہے' نہ اس کی تصحیح (Validation) ہو سکتی ہے۔ کیا اسلامی شریعت نے جاہلیت کے بعض احکام کو جاری رکھا ہے؟ نہیں یہ سوچ درست نہیں ہے۔ شریعت نے ہر چیز اپنی طرف سے از سر نو جاری کی ہے۔ اور اس کا اجراء اللہ کی طرف سے ہوا ہے۔ یہ سوچ درست نہیں ہے کہ بعض احکام جاہلیت کا تسلسل ہیں بلکہ اس نے از سر نو اپنے احکام جاری کئے' تمام رسوم و رواج جاری کئے' اور اللہ تعالیٰ کے اختیار حاکمیت کے تحت جاری کئے۔

قرآن کریم نے اس نظریہ کی بار بار تاکید کی ہے اور اس معاملے میں وہ اہل جاہلیت کے ساتھ بار بار بحث کرتا ہے۔ وہ بار بار چیلنج کرتا ہے کہ تمہیں کیا اختیار ہے کہ تم حلال و حرام کرتے پھرتے ہو۔ کون ہے حرام کرنے والا؟ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ........................ "پوچھو' کون ہے جس نے اللہ کے سامان زینت کو حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور پاکیزہ خوراک کو۔" قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ "کہہ دو' آؤ میں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے۔"

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ

"کہہ دو' جو کچھ میری طرف وحی کیا گیا ہے میں تو اس میں کوئی چیز نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر حرام کی گئی ہو' جو اس چیز کو کھاتا ہے' سوائے اس کے کہ وہ چیز بہا ہوا خون ہو یا خنزیر کا گوشت ہو۔"

اس بحث و تکرار کے ذریعہ قرآن کریم اہل جاہلیت کو اس اصول کی طرف لوٹا رہا تھا کہ حلال و حرام کے حدود کے تعین کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اور کسی انسان کو یہ اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ نہ کسی فرد کو' نہ کسی طبقے کو' نہ کسی قوم کو اور نہ تمام دنیا کی آبادی کو۔ یہ اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار حاکمیت کے تحت ہی استعمال ہو سکتا' اس کی شریعت کے مطابق استعمال ہو سکتا ہے۔ شریعت تو نام ہی اجازت و ممانعت کا ہے۔ یہی تو دین اسلام ہے' اس لئے جو حرام و حلال مقرر کرتا ہے گویا وہ دین کا مالک ہے۔ اگر یہ حلال و حرام کرنے والا اللہ ہے تو پھر لوگ جو اس کو مانتے ہیں' ہم کہیں گے کہ وہ اللہ کے دین پر ہیں' تو پھر وہ دین اسلام میں داخل ہوں گے۔ اگر حلال و حرام کی حدیں کسی معاشرے میں کوئی اور مقرر کر رہا ہے تو ہم کہیں گے یہ لوگ اس شخص کے دین پر ہیں۔ تو وہ پھر اس کے دین میں داخل ہوں گے۔ دین اسلام میں داخل نہ ہوں گے۔

یہ مسئلہ اپنے اس فریم ورک میں اللہ کی حاکمیت اور الوہیت کا مسئلہ ہے۔ یہ دین اور اس کے مفہوم کا مسئلہ ہے۔ یہ ایمان اور حدود ایمان کا مسئلہ ہے۔ میں پورے عالم اسلام میں مسلمانوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس نقطۂ نظر سے اپنی پوزیشن متعین کریں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں۔ ان کا دین سے تعلق کیا ہے؟ ان کا اسلام سے کیا تعلق رہا ہے؟ کیا اس کے باوجود وہ یہ دعویٰ کرتے ہی چلے جائیں گے کہ وہ مسلمان ہیں.....؟

# فی ظلال القرآن

سید قطب شہید

ترجمہ

سید معروف شاہ شیرازی

جلد دوم

پارہ ------ ۵ --- تا --- ۸

ادارہ منشورات اسلامی
بالمقابل منصورہ ملتان روڈ، لاہور

| | | |
|---|---|---|
| تفسیر | ------- | فی ظلال القرآن |
| مصنف | ------- | سید قطب شہید ؒ |
| مترجم | ------- | سید معروف شاہ شیرازی |
| ناشر | ------- | سید عارف شیرازی |
| جلد دوم | ------- | پارہ ۵ تا ۸ |
| مطبع | ------- | دین محمد پرنٹرز لاہور |
| ھدیہ | ------- | ۳۷۵ روپے |
| طبع اول | اکتوبر ۱۹۹۵ ء | ۵۰۰ |
| طبع دوم | جنوری ۱۹۹۷ ء | ۱۰۰۰ |

# شہید اسلام سید قطبؒ اور تفسیر فی ظلال القرآن

شہید اسلام سید قطب کا شمار امت مسلمہ کی ان چند برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریک ادوار میں روشنی کے چراغ جلائے اور اسلامی نظام زندگی کی کھیتی کو اپنے خون سے سینچا۔

سید قطبؒ ۱۹۰۶ء میں مصر کے ایک صوبہ "اسیوط" کے ایک گاؤں "موشاء" میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ دونوں عربی النسل تھے۔ سید قطبؒ اپنے والدین کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔

آپ نے ثانوی تعلیم "تجہیزیہ دار العلوم" نامی ایک اسکول میں حاصل کی۔ اس اسکول میں طلباء کو دار العلوم میں داخلہ کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر آپ ۱۹۲۹ء میں قاہرہ کے دار العلوم میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں آپ نے بی۔اے کی ڈگری اور ڈپلومہ ان ایجوکیشن حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے محکمہ تعلیم میں بحیثیت انسپکٹر تعلیم ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۵۲ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران ۱۹۵۳ء میں آپ اخوان المسلمون سے متعارف ہوئے۔ اور ۲ جولائی ۱۹۵۴ء میں آپ کو اخوان کے شعبہ نشر و اشاعت نے اخبار "الاخوان المسلمون" کا ایڈیٹر مقرر کیا۔

شہید اسلام سید قطبؒ ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک جیل میں رہے اور اگست ۱۹۶۴ء میں مرحوم عبد السلام عارف صدر عراق کی کوشش سے رہا ہوئے۔ رہا ہوتے ہی پوری دنیا کے نوجوانوں نے آپ کی طرف رجوع کیا، اور آپ کا لٹریچر جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیلنے لگا۔ چنانچہ لادین مغرب پرست کمیونسٹ اور سوشلسٹ عناصر چیخ اٹھے اور بیک وقت ماسکو اور واشنگٹن سے ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ چنانچہ آپ کو ایک سال بعد اگست ۱۹۶۵ء میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور ایک سال بعد ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء میں آپ کو شہید کر دیا گیا۔

سید قطب اخوان المسلمون میں آنے سے پہلے خالص ادبی کام کرتے رہے۔ لیکن تحریک اخوان المسلمون میں شامل ہونے کے بعد اسلامی انقلاب' اور تحریک اسلامی' ان کا خاص موضوع رہا۔

مصنف نے فی ظلال القرآن میں قرآن پاک کی اثر انگیزی' جس نے عرب کی کایا پلٹ دی تھی' کی راہ میں حائل پردوں کو چاک کر دیا ہے۔ اس کے ذریعے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والا اس تحریک کے ساتھ جا کھڑا ہوتا ہے جو ہبوط آدم علیہ السلام کے وقت سے روئے زمین پر برپا ہوئی اور انبیاء علیہم السلام کی قیادت میں چلتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک آپہنچی۔ آپ ؐ کے بعد بھی یہ تحریک زندہ ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ قاری توحید و رسالت اور آخرت کے عقیدے کو قافلے کے ایک رفیق اور تحریک کے ایک کارکن کی حیثیت سے سنتا اور سمجھتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان کو امت کے ایک فرد کی حیثیت سے پڑھ کر اس سے سبق لیتا ہے۔

فی ظلال القرآن میں علمی موشگافیوں اور فقہی باریکیوں سے ہٹ کر قرآن پاک کے اصل مقصد اور دعوتی رنگ کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے لئے جو زبان استعمال کی گئی ہے۔ وہ سید کا ہی حصہ ہے اور اسے بلاشبہ الہامی زبان کہا جا سکتا ہے۔ اپنے اس رنگ میں یقیناً یہ ممتاز ترین تفسیر ہے۔ تفسیر کیا ہے ایک دعوت عمل اور دعوت انقلاب ہے' الفاظ اور معنی کا دریا ہے۔ جس میں تحقیق' علمی' وجدانی' اور ادبی نکات جابجا موجود ہیں۔ پورے ذخیرہ تفاسیر میں یہ پہلی تفسیر ہے۔ جو خود قرآن کے اسلوب بیان میں لکھی گئی ہے۔ دوسری تفاسیر بالعموم منطقی انداز بیان میں لکھی گئی ہیں اور فی ظلال القرآن قرآنی اور انقلابی انداز بیاں میں ہے۔ اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ یہ اختلافی مسائل اور اسرائیلیات سے خالی ہے۔ اسلام کا جامع تصور لئے ہوئے' اس کے احیاء کا طریقہ کار نمایاں کرتی ہے۔ غرض اخلاص' روح ایمان' عمل صالح اور دعوت انقلاب اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ پندرہ پارے جیل سے باہر اور بقیہ جیل میں لکھے گئے ہیں۔ عربی میں اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

اردو ترجمہ کی تکمیل کے بعد اب فی ظلال القرآن کی دوسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس سلسلہ کی مزید مجلدیں' جلد شائع کرنے کی توفیق نصیب فرمائے آمین ثم آمین (ادارہ)

# جلد دوم

| | | |
|---|---|---|
| سورۃ النساء | آیات | ۲۴ -- تا -- ۱۴۷ |
| سورۃ المائدہ | آیات | ۱ -- تا -- ۱۲۰ |
| سورۃ الانعام | آیات | ۱ -- تا -- ۱۶۵ |
| سورۃ الاعراف | آیات | ۱ -- تا -- ۹۳ |

---ooo---

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

# فہرست جلد دوم

## پارہ نمبر- ۵------- سورۃ النساء

## پارہ نمبر- ۶ ........سورۃ النساء

## ..... سورۃ المائدہ ......



## پارہ نمبر- ۷ ...... سورۃ المائدہ

## .......سورۃ الانعام.......

## پارہ نمبر- ۸ ........... سورۃ الانعام

## .......سورۃ الاعراف.......



---ooo---

# فی ظلال القرآن

## پارہ نمبر------ ۵

## سورۃ النساء

## آیات ۲۴---تا--- ۱۴۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# پارہ نمبر ۵ ایک نظر میں

پارہ پنجم میں بھی ہم سورہ نساء کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس پارے میں سورہ نساء کے اہم موضوعات اور اہداف زیر بحث ہیں' جن کی طرف اجمالی اشارہ پارہ چہارم کے آغاز میں کیا گیا تھا۔ پارہ پنجم میں بھی یہی اساسی مقاصد ہیں۔ ان عقائد و مقاصد کے ضمن میں پھر متعدد موضوعات پر بحث چلی ہے۔

اس پارے کے پہلے سبق میں خاندانی معاملات کی تنظیم کے باقی ماندہ امور لئے گئے ہیں اور ان تمام معاملات میں خاندان کی تنظیم' نظام فطرت کے رجحانات اور تقاضوں کے مطابق کی گئی ہے۔ خاندانی زندگی میں جو عارضی مشکلات ہو جایا کرتی ہیں ان میں خاندان اور عائلی زندگی کو بچانے کی تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ اس طرح خاندانی نظام کو بچانے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ معاشرے میں فحاشی اور بے حیائی نہ پھیلے اور خاندانی نظام کو اور عائلی تعلقات کے تقدس کو ہر مضر اثر سے بچایا جائے.... اس کے ساتھ ساتھ' اس سبق میں بعض اجتماعی اور اقتصادی امور کی ضابطہ بندی بھی کی گئی ہے۔ مثلاً بعض مالی اور تجارتی امور پر بحث اور نظام وراثت کی ضابطہ بندی جس میں حقوق کا تعلق ایک خاندان پر منحصر ہوتا ہے۔ نیز مرد اور عورت کے لئے عائلی زندگی کے دوران میں اپنے اپنے حقوق ملکیت محفوظ کئے گئے ہیں۔

یہ تمام امور اور موضوعات' جس طرح کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں' وہ انتظامات ہیں' جن کے ذریعے سے اسلامی معاشرے کو تجارتی اور اقتصادی میدان میں نظام جاہلیت سے نکال کر اسلامی نظام حیات کے اندر لانا مطلوب ہے۔ نیز بتدریج جاہلی معاشرے کے رہے سہے نشانات کو مٹانا بھی مطلوب ہے' جو ابھی تک باقی تھے اور ان کی جگہ اسلامی معاشرے کے خدوخال کو اجاگر کر کے جماعت مسلمہ کو عمومی طور پر اس مقام مرتفع تک پہنچانا مقصود ہے جس میں وہ پورے عالم میں ممتاز نظر آئے۔ چنانچہ اسلامی نظام اس امت کو جاہلیت کی سطح سے بلند کرتا ہے اور اسے مزید بلندیوں پر اٹھاتا چلا جاتا ہے۔

دوسرے سبق میں دوبارہ اسلامی تصور حیات کے اصول طے کئے گئے ہیں۔ ان میں ایمان کی تعریف اور ایمان کی شرائط بیان کی گئی ہیں اور ایمان کے ان اصول کو دوبارہ اس لئے بیان کیا گیا ہے تاکہ جماعت مسلمہ کے اندر' اجتماعی کفالت کے بعض دوسرے ضابطے وضع کئے جائیں۔ اجتماعی کفالت کا یہ نظام پہلے خاندان کے محدود دائرے سے شروع ہوتا ہے اور پھر اس کی حدود پوری جماعت مسلمہ تک وسیع ہو جاتی ہیں۔ اس اجتماعی کفالت اور انفاق کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ بخل اور کنجوسی کی مذمت بھی کی گئی ہے' نیز دولت پر گھمنڈ کرنے' اللہ کی نعمت کو چھپانے اور انفاق فی سبیل اللہ

کے مقابلے میں ریاکاری کی مذمت کی گئی ہے۔ نیز اس سبق میں عبادت الٰہی کے ذریعے تہذیب نفس کا طریقہ بھی سکھایا گیا ہے' عبادت گزاری کے وقت جسمانی پاکیزگی کے احکام اور اسی طرح یہ حکم کہ عبادت کے وقت منکرات سے مکمل پرہیز کی ضرورت ہے اس لئے کہ شراب نوشی اور عبادت میں تضاد ہے۔ شراب نوشی کے متعلق یہ ابتدائی حکم تھا' بعد میں شراب نوشی پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی اور یہ قرآن مجید کا خاص منہاج ہے جو وہ اصلاح کے لئے اختیار کرتا ہے یعنی تدریجی اصلاح کا طریقہ۔

تیسرے سبق میں بتایا گیا ہے کہ اہل کتاب کی نسبت تمہارا موقف کیا ہونا چاہئے۔ یہ بھی اس سورہ کے اہم موضوعات میں سے ایک ہے' جس میں مسلمانوں کے حوالے سے ان کی نیت کے کھوٹ اور ان کے برے منصوبوں کو طشت ازبام کیا گیا ہے۔ ان کے اس طرز عمل پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے ان کی مکاری اور کینہ پروری کو واضح کیا گیا ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے دشمن ہیں اور انہیں خبردار کیا گیا ہے کہ انجام کار وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں۔

چوتھے سبق میں اسلام کی تعریف' دین کا مفہوم اور ایمان کی شرائط کو بیان کیا گیا ہے اور یہ بات نہایت ہی فیصلہ کن اور حتمی الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی نظام زندگی کا مزاج کیا ہے' اس نظام میں کس طرح مسلمان صرف اللہ وحدہ کی اطاعت' صرف اسی کی عبادت اور صرف اسی سے ہدایت اخذ کرتے ہیں اور اپنی زندگی کے تمام تنازعات کے فیصلے بھی اللہ کی کتاب اور رسول خدا کے احکام کے مطابق کرتے ہیں' نیز اس سبق میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ وہ امانت' اس کے حقداروں تک پہنچائیں اور اگر انصاف کا مسئلہ درپیش ہو تو عدل کے ساتھ حکم دیں اور لوگوں کی زندگیوں میں اسلامی منہاج کو رائج کریں' یہ مضامین اس انداز میں بیان کئے گئے ہیں کہ گویا یہ ایمان کی شرائط ہیں اور ساتھ ساتھ اس بات پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ایمان کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن وہ ایمان کی شرط اول بھی پوری نہیں کرتے یعنی اپنی پوری زندگی کے تنازعات کا فیصلہ مکمل تسلیم و رضا کے ساتھ خدا اور رسول کے احکام کے مطابق نہیں کراتے۔ پھر بار بار تاکید سے بتایا جاتا ہے کہ اگر اس شرط کو پورا نہیں کیا جاتا تو ایمان نہیں ہے' چاہے جس قدر دعوائے ایمان زبانی طور پر کیا جائے اس لئے کہ یہ صریح طور پر شرط ایمان کی خلاف ورزی ہے۔

چنانچہ درس پنجم میں اسلامی جماعت کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اسلامی نظام کی جماعت میں جہاد بالقتال کے لئے تیار ہو جائے اور ان لوگوں پر سخت تنقید کی گئی ہے جو منافق ہیں اور جہاد کے خلاف رکاوٹیں ڈالتے ہیں یا مومن ہیں اور جہاد سے سستی کرتے ہیں اور اس سبق میں جہاد و قتال کا اصل مقصد اور اس کی ضرورت کا بیان کرتے ہوئے قلوب اہل ایمان کو جوش دلایا جاتا ہے کہ جہاد اور قتال اس لئے ضروری ہے کہ ضعیف اہل اسلام اور ان کے بال بچوں کو دارالکفر سے نجات دلا کر دارالاسلام میں داخل کیا جائے اور اس ارفع و اعلیٰ اسلامی نظام زندگی کے زیر سایہ لا کر انہیں زندگی کی خوشیاں عطا کی جائیں۔ اس سبق میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے لئے ایک دن مقرر ہے جس میں اس نے اس دنیا کو چھوڑنا ہے' اس لئے اسے چاہئے کہ مشکل سے مشکل حالات و معاملات میں خوف نہ کھائے۔ سبق کے آخر میں حضور اکرم ؐ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ جہاد شروع کر دیں' اگرچہ اکیلے ہوں' اس لئے کہ اس دین کو غالب کرنے اور

اسلامی نظام زندگی کو مستحکم اور متمکن کرنے کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے ـ

مضمون جہاد فی سبیل اللہ کی مناسبت سے پھر چھٹے سبق میں بے شمار بین الاقوامی ضوابط کا ذکر بھی کیا گیا ہے یعنی ایک طرف اسلامی کیمپ ہے اور دوسری جانب اس کا دشمن کیمپ ہے' تیسری طرف غیر جانبدار کیمپ ہے' یا وہ لوگ ہیں جن سے اسلامی کیمپ کے معاہدے ہیں ـ معاملہ صرف طاقت' غلبے اور پکڑ دھکڑ کا ہی نہیں ہے بلکہ واقعیت پسندی کے ساتھ' قانون و اخلاق کی حدود کے اندر' انسانی تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور مختلف الخیال بین الاقوامی کیمپوں کے رجحانات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے عمل جہاد کو جاری رکھنا ہے ـ

جہاد فی سبیل اللہ کے مضمون کے ساتھ' جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کی اقسام کو بھی بیان کیا گیا ہے ـ یہ ساتواں سبق ہے اور اس میں ان لوگوں پر سخت تنقید کی گئی ہے جو دارالکفر میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ہجرت کر کے معرکہ حق و باطل میں شریک نہیں ہوتے حالانکہ دارالکفر میں ان کا دین محفوظ نہیں ہے' جبکہ دارالاسلام قائم ہو گیا ہے اور اس میں اسلامی جھنڈے بڑی عزت اور عدل سے لہرا رہے ہیں ـ اس سبق کے آخر میں مسلمانوں کو قتال فی سبیل اللہ پر ابھارا جاتا ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ دشمن کا پیچھا کرو اور دشمن کے تتبع اور تلاش میں ذرہ بھر سستی نہ کرو اور آخر میں واضح کر دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا موقف کیا ہے اور دشمنان اسلام کا موقف کیا ہے؟ اہل ایمان کا انجام کیا ہونے والا ہے او اہل کفر کس خوفناک انجام سے دوچار ہونے والے ہیں ـ

آٹھویں سبق میں ہم اسلامی نظام عدل کی معراج تک پہنچ جاتے ہیں ـ ہوتا یوں ہے کہ ایک یہودی پر ناجائز الزام لگایا جاتا ہے' شہادت اس کے خلاف آجاتی ہے' ملاء اعلیٰ سے قرآن کریم نازل ہوتا ہے اور اس یہودی کو بری کر دیا جاتا ہے ـ یہ انصاف ایسے حالات میں کیا جاتا ہے' جبکہ ہر طرف سے یہودی اہل اسلام کے خلاف رات اور دن سازشوں میں مصروف ہیں ـ لیکن اسلامی نظام عدل میں انصاف نہ کسی کی دوستی سے متاثر ہوتا ہے اور نہ کسی کی دشمنی اسے انصاف سے محروم کر سکتی ہے ـ یہ عدل و انصاف کا وہ معیار ہے جس پر انسانیت کبھی پوری نہیں اتر سکی ـ ہاں انسانیت اس مقام تک صرف اسلام کے ارفع اور بے مثال نظام زندگی کے سایہ ہی میں پہنچ سکی ـ

اب نواں سبق آتا ہے جس میں شرک اور مشرکین کے ساتھ پنجہ آزمائی کی جاتی ہے ـ شرکیہ خرافات اور ان کے اثرات' گمراہ کن شعائر دینی اور کھوٹے اور از کار رفتہ شرکیہ تصورات پر بحث ہوتی ہے' اور اللہ تعالیٰ کے نظام عدل کے بارے میں' نفسانی خواہشات اور کھوٹے خیالات اور اوہام کی تصحیح کی جاتی ہے ـ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے ہاں جزاو سزا اعمال پر ہے' اوہام اور اچھی خواہشات پر نہیں ہے ـ اور آخر میں بتایا جاتا ہے کہ اسلام واحد مقبول دین ہے اور یہی ملت ابراہیمی ہے ـ

نویں سبق میں پھر عورتوں کو موضوع بنایا گیا ہے ـ ان کے حقوق' خصوصاً یتامی اور ضعفاء کے حقوق سے بحث کی جاتی ہے بالخصوص بچوں کے بارے میں ـ اس سورہ کا آغاز بھی اسی مضمون سے ہوا تھا ـ یہ بیان کیا گیا کہ خاوند کی طرف سے بیوی کے بائیکاٹ اور بیوی کی جانب سے نافرمانی کے موقعہ پر کیا انتظامات اور کارروائیاں ہوں گی ـ عورتوں کے ساتھ عادلانہ معاشرت کے احکام' جس کے بغیر عائلی نظام درست ہی نہیں ہو سکتا اور اگر اصلاح نہ ہو سکے تو بہتر یہ ہوتا ہے کہ فریقین کے درمیاں جدائی ہو جائے ـ

خاندان کے متعلق جو احکام آئے ہیں' ان کا اختتامیہ یوں آتا ہے کہ عائلی احکام اور معاشرے کے اندر عدل و انصاف کے قیام کے مقصد کو اللہ کی ذات سے مربوط کر دیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ زمین اور آسمانوں کا مالک ہے۔ وہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ تمام موجود مخلوق کو ختم کر دے اور ان کی جگہ بالکل ایک نئی مخلوق پیدا کر دے۔ لہٰذا اللہ کے احکام و ہدایات پر عمل کا حکم کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اور ان احکام کا تعلق ذات باری کے ساتھ ہے' جو ایک عظیم ذات ہے۔ چنانچہ قدرتی طور پر دلوں میں خدا کا خوف پیدا ہو جاتا ہے اور وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں ان کے لئے اپنے معاملات میں عدل و انصاف کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور اپنے پورے معاملات میں خدا کا خوف ان پر غالب ہوتا ہے۔ جس طرح قرآن کریم کا انداز ہے کہ وہ ایک مخصوص و محدود موضوع کو بھی عام اور وسیع تر دائرے کے اندر لاکر بیان کرتا ہے۔

اب اس پارے کا آخری سبق آتا ہے جو تقریباً نفاق اور منافقین پر تنقید تک محدود ہے۔ اہل ایمان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ سچے مسلم ہو جائیں اور صراط مستقیم پر گامزن ہوں۔ انہیں اس بات پر متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ جماعت مسلمہ اور اس کی قیادت کے سوا کسی اور حلقے سے دوستانہ روابط قائم نہ کریں اور نہ منافقین اور دشمنان دین کی وجہ سے اور اجتماعی تعلقات' اور ذاتی مصلحتوں کی خاطر دین کے معاملے میں سستی یا نرمی کریں۔ کیونکہ ایسا کرنا بھی درحقیقت نفاق ہو گا۔ اور منافقین قیامت میں جہنم کی نچلی تہوں میں ہوں گے اور منافقین درحقیقت کافروں کے دوست ہیں۔ اس سبق کا خاتمہ صفات الٰہی کے بیان سے ہوتا ہے۔ اور یہ کہ اللہ کا اس کے بندوں کے ساتھ تعلق کیا ہے اور یہ کہ گمراہی اور انحراف کرنے والوں کو سزا دینے میں حکمت کیا ہے؟ اگر وہ ایمان لے آئیں اور شکر گزار ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کو خواہ مخواہ عذاب دینے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا (۴:۱۴۷)

(آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے' اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ بڑا قدر دان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے۔)

یہ عجیب انداز کلام ہے۔ دل پر رحمت کی بارش ہو جاتی ہے۔ اللہ کو کیا پڑی ہے کہ وہ سزا دے۔ وہ تو غنی بادشاہ ہے بشرطیکہ لوگ سیدھی راہ پر آ جائیں۔ اللہ تو شاکر ہے یعنی قدر دان ہے۔ وہ اپنے فضل اور احسان کی بارش کرتا ہے بشرطیکہ وہ شکر گزار بنیں۔ لیکن غلطی خود ان کی ہے کہ وہ اللہ کا عذاب خود خریدتے ہیں۔ اپنے کفر اور انکار کی وجہ سے اور اس فساد فی الارض کی وجہ سے جو زمین پر اور نفس انسانی اور حیات انسانی کے اندر ان کے اس کفر اور انکار کی وجہ سے برپا ہوتا ہے۔

یوں اس پارے نے اپنے پر پھیلا کر بے شمار مقاصد اور موضوعات کو اپنے اندر چھپا رکھا ہے۔ غرض بڑی طویل و عریض بحثیں ہیں۔ یہاں اس تبصرے میں صرف مجمل اشارات مطلوب ہیں۔ ان شاء اللہ ان موضوعات کو ہم جلد ہی تفصیل کے ساتھ لیں گے۔

پارہ نمبر ۵

# درس نمبر ۳۲ ایک نظر میں

یہ سبق ان مضامین کا تکملہ ہے' جو عائلی زندگی کی تنظیم اور قواعد فطرت کے مطابق اس کی تشکیل کے سلسلے میں اس سورت میں بیان ہوئے تھے ۔ اور اس سبق کے بعد' اس اہم موضوع پر صرف دو جگہ تکمیلی بحث ہوگی ۔ یہ موضوع اسلام کی نظر میں اہم اس لئے ہے کہ اس کی درستی پر پوری انسانی زندگی کی درستی اور استواری موقوف ہے ۔ کسی معاشرے میں اگر یہ درست ہو جائے تو پوری انسانی زندگی بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ جاری رہتی ہے اور اس کی تعمیر صحت مند بنیادوں پر ہوتی ہے ۔ اور اگر عائلی زندگی تباہ ہو جائے اور صراط مستقیم سے ہٹ جائے تو اس سے اس کرۂ ارض پر ایک عظیم اور ہمہ جہت فساد رونما ہو جاتا ہے ۔

اس سبق میں عورتوں کی وہ تکمیلی فہرست دی جا رہی ہے' جن سے نکاح حرام ہے ۔ اس کے بعد وہ منہاج وضع کیا جاتا ہے جس کی اساس پر ایک پاک خاندان کی صورت میں' عورت اور مرد کا اجتماع جائز کیا گیا ہے ۔ اور یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس منہاج کی پابندی سے پاکیزگی اور طہارت کے علاوہ 'لوگوں کے لئے بڑی آسانیاں اور سہولتیں پیدا ہوتی ہیں اور پھر وہ تنظیمی قواعد وضع کئے جاتے ہیں جن کی اساس پر ادارۂ خاندان کی عمارت استوار ہوتی ہے' اور اس ادارے میں زوجین کے کاندھوں پر جو ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں یا انہیں جو حقوق دیئے گئے ہیں ان کی توضیح ہے ۔ خاندان کی اس تنظیم کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے میں بعض مالی حقوق کے بارے میں احکام دیئے جاتے ہیں' چاہے ان کا تعلق حقوق مکتسبہ سے ہو یا حقوق موروثی سے ہو ۔ ان حقوق کا تعلق اجتماعی تعلقات سے بھی ہے اور ایک خاندان میں مرد اور عورتوں کے حقوق وراثت سے بھی ہے ۔ اسی طرح وہ مسائل بھی بیان ہوئے ہیں جن کا تعلق قرابت کے علاوہ بطور ولایت موروثی حقوق سے ہے ۔

یہ بات عمومی طور پر قابل لحاظ ہے کہ ان تمام ضابطہ بندیوں اور احکام کے درمیان ایک لطیف ربط پایا جاتا ہے ۔ اور یہ ربط دراصل وہ پہلا اصول ہے کہ یہ تمام احکام اور ضابطہ بندیاں اللہ جل شانہ' کی طرف سے صادر ہوئی ہیں اور یہ اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کا ذاتی مقتضاء ہیں کیونکہ اللہ کی ذات کے ساتھ مخصوص ترین صفات میں سے ایک صفت اس کی حاکمیت ہے اور اس حاکمیت کا مظہر انسان کے لئے قانون سازی ہے ۔ اور وہ اجتماعی نظام ہے' جس کی اساس پر وہ اپنی زندگی کو استوار کریں گے' اور اپنے اجتماعی تعلقات قائم کریں گے ۔

اس لطیف ربط کا سیاق کلام میں بار بار ذکر کیا جاتا ہے اور بار بار اللہ کی اس ذاتی خصوصیت کا ذکر کیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ ان تمام احکام کا نزول اور صدور ذات باری کی طرف سے ہو رہا ہے جو علیم و حکیم ہے ۔ یہ اشارہ ایک حکیمانہ اور معانی سے پر اشارہ ہے اس لئے کہ اسلامی نظام زندگی میں' جس ذات کی طرف سے اوامر و نواہی صادر ہوتے

ہیں' وہ علم کامل اور علم شامل رکھنے والی ذات کی طرف سے ہوتے ہیں' وہ ایسی ذات ہے جو حکمت و دانائی کی حامل ہے یہ وہ خدائی خصوصیات ہیں جو انسان میں نہیں پائی جاتیں' اس لئے کہ انسان اس بات کی صلاحیت نہیں رکھتا کہ وہ انسانی زندگی کے لئے کوئی ضابطہ خود وضع کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی انسان علیم و خبیر خدا کے بنائے ہوئے ضابطے سے منحرف ہوا' اس پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور وہ بے آب و گیاہ میدان میں گم گشتہ راہ ہو گیا اور بلا کسی مرشد و ہادی کے سرگرداں رہا۔ لیکن اپنی جہالت اور اپنی ہٹ دھرمی اور اپنی نفسانی خواہشات کی وجہ سے یہی سمجھتا رہا کہ وہ اس دشت کو عبور کرلے گا' اور اپنے لئے اور اپنی نجات کے لئے اس راہ سے اچھی راہ تلاش کرلے گا' جس کی طرف اسے اللہ بلا رہا ہے۔

سیاق کلام سے جس دوسری حقیقت کی طرف بار بار اشارہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی منہاج حیات انسان کے لئے نہایت ہی سہل' نہایت ہی حقیقت پسندانہ اور فطری رجحانات کے عین مطابق ہے' بمقابلہ ان نظامہائے زندگی کے جو انسان خود اپنے لئے بناتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ اس کے لئے آسان ہیں حالانکہ انسان کی ناتوانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی نظام اللہ کی عین رحمت اور مہربانی ہے کہ اس نے انسان کے لئے یہ نظام اور منہاج وضع کیا جو ایسا معتدل ہے کہ اس سے ذرہ بھر ادھر ادھر ہونے سے توازن اور اعتدال ختم ہو جاتا ہے اور انسان پر عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے اور وہ ایسی مشقت اور سختی میں مبتلا ہو جاتا ہے جسے جھیلنے کی اس میں قوت ہی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اس خود ساختہ نظام کی وجہ سے انسان اپنے انسانی مقام کو کھو دیتا ہے اور گندگی کے گڑھے میں اوندھے منہ جا گرتا ہے۔

جب ہم نصوص قرآن پر آئندہ صفحات میں تفصیلی بحث کریں گے تو موقعہ بموقعہ انسان کے تاریخی مراحل کی روشنی میں' اس حقیقت کے مصداق کی طرف اشارہ کریں گے اس لئے کہ یہ ایک تاریخی سچائی ہے۔ ہاں جب جاہلیت دلوں پر پردے ڈال دیتی ہے اور آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے تو پھر آنکھوں کی روشنی ختم ہو جاتی ہے اور دل بے نور ہو جاتے ہیں اور انسان کسی بھی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا چاہے وہ بہت ہی روشن کیوں نہ ہو۔

---ooo---

# درس نمبر ۳۲ تشریح آیات

## آیات ۲۴ ـــ تا ـــ ۳۵

وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ
وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا
اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا
تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾ وَمَنْ لَّمْ
يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ
مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ
بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ
لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ
مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَ اَنْ

تَصۡبِرُوۡا خَيۡرٌ لَّكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝ يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَـكُمۡ وَيَهۡدِيَكُمۡ
سُنَنَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَيَتُوۡبَ عَلَيۡكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۝ وَاللّٰهُ
يُرِيۡدُ اَنۡ يَّتُوۡبَ عَلَيۡكُمۡ وَيُرِيۡدُ الَّذِيۡنَ يَتَّبِعُوۡنَ الشَّهَوٰتِ اَنۡ تَمِيۡلُوۡا
مَيۡلًا عَظِيۡمًا ۝ يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّخَفِّفَ عَنۡكُمۡ‌ ۚ وَخُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِيۡفًا ۝

---

"اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں' جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں' البتہ ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو جنگ میں تمہارے ہاتھ آجائیں - یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازم کر دی گئی ہے - ان کے سوا جتنی عورتیں ہیں انہیں اپنے اموال کے ذریعے سے حاصل کرنا تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے' بشرطیکہ حصار نکاح میں ان کو محفوظ کرو' نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو - پھر جو ازدواجی زندگی کا لطف تم ان سے اٹھاؤ اس کے بدلے ان کے مہر بطور فرض کے ادا کرو' البتہ مہر کی قرارداد ہو جانے کے بعد آپس کی رضامندی سے تمہارے درمیان اگر کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں' اللہ علیم و دانا ہے - اور جو شخص تم میں سے اتنی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکے 'اسے چاہیے کہ تمہاری ان لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہوں اور مومنہ ہوں - اللہ تمہارے ایمان کا حال خوب جانتا ہے' تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو' لہٰذا ان کے سرپرستوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کر لو اور معروف طریقے سے ان کے مہر ادا کر دو' تاکہ وہ حصار نکاح میں محفوظ ہو کر رہیں' نہ آزاد شہوت رانی کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں - پھر جب وہ حصار نکاح میں محفوظ ہو جائیں اور اس کے بعد کسی بدچلنی کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے جو ان عورتوں (محصنات) کے لئے مقرر ہے - یہ سہولت تم میں سے ان لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے جن کو شادی نہ کرنے سے بند تقویٰ کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو - لیکن اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے - اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان طریقوں کو واضح کرے اور انہی طریقوں پر تمہیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحاء کرتے تھے - وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی - ہاں' اللہ تو تم پر رحمت کے ساتھ توجہ کرنا چاہتا ہے مگر جو لوگ خود اپنی خواہشات نفس کی پیروی کر رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ راست سے ہٹ کر دور نکل جاؤ - اللہ تم پر سے پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے -"

---

اس سے قبل پارۂ چہارم کے آخر میں ان عورتوں کی فہرست دی گئی تھی' جو ابدی اور ذاتی حرمت کی بنا پر حرام قرار دی گئی تھیں۔ یہاں مناسب ہے کہ وہ فہرست دوبارہ پیش نظر رکھی جائے۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا وَسَآءَ سَبِيْلًا (۲۲) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۲۳) (۴: ۲۲-۲۳)

"اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں ان سے ہرگز نکاح نہ کرو' مگر جو پہلے ہو چکا' سو ہو چکا۔ درحقیقت یہ ایک بے حیائی کا فعل ہے' ناپسندیدہ ہے اور برا چلن ہے۔ تم پر حرام کی گئیں تمہاری مائیں' بیٹیاں' بہنیں' پھوپھیاں' خالائیں' بھتیجیاں' بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہو' اور تمہاری دودھ شریک بہنیں' اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری بیویوں کی لڑکیاں جنہوں نے تمہاری گودوں میں پرورش پائی ہے۔ ان بیویوں کی لڑکیاں جن سے تمہارا تعلق زن و شو قائم ہو چکا ہو۔ ورنہ اگر صرف نکاح ہوا ہو اور تعلق زن و شو نہ ہوا ہو تو (انہیں چھوڑ کر ان کی لڑکیوں سے نکاح کر لینے میں) تم پر کوئی حرج نہیں ہے.... اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہارے صلب سے ہوں اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا ہے کہ ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرو مگر جو پہلے ہو گیا' سو ہو گیا۔ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" غرض پارۂ پنجم کی یہ آیات پارۂ چہارم کی آخری آیات کا تکملہ ہیں۔ (وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ "وہ عورتیں جو دوسروں کے نکاح میں ہوں۔"

ان کو محرمات میں اس لئے شامل کیا گیا ہے کہ یہ دوسرے مردوں کے حصار نکاح میں ہیں' اس لئے وہ اپنے خاوندوں کے علاوہ دوسروں پر حرام ہیں اور ان کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہے۔ اسلام کے اجتماعی نظام کی اساس چونکہ خاندان پر رکھی گئی ہے' اس لئے نکاح اور نکاح کے اوپر نکاح کی حرمت اسلامی نظام کی تعمیر میں خشت اول کا درجہ رکھتی ہے۔ گویا اسلامی نظام میں خاندان پہلی اکائی ہے اور خاندان کو ہر قسم کے اختلاط خصوصاً نسب کے اختلاط سے محفوظ رکھنا ضروری ہے' جو عموماً بے قید جنسی تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے' جس سے فحاشی پھیلتی ہے اور پورا معاشرہ اس میں ملوث ہو جاتا ہے۔

اسلامی معاشرے کی اکائی سے جو خاندان بنتا ہے' وہ اعلانیہ نکاح پر استوار ہوتا ہے' جس میں ایک عورت ایک مرد کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ اس مرد کے حصار میں آ جاتی ہے اور محصن ہو جاتی ہے یعنی محفوظ اور مامون۔ اور یہ نظام وہ مکمل ترین نظام ہے' جو انسانی فطرت اور انسان کی حقیقی ضروریات کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے' وہ حاجات و ضروریات جو انسان کے لئے بحیثیت انسان ضروری ہیں۔ یہ بات یہاں نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ انسانی زندگی کے بعض ایسے مقاصد ہیں جو اس کے حیوانی مقاصد سے زیادہ اہم' بڑے اور وسیع ہیں۔ اگرچہ ان کے ضمن میں حیوانی مقاصد بھی پورے ہو جاتے ہیں۔ غرض اسلام کا معاشرتی نظام انسانی سوسائٹی کے مقاصد عالیہ کو بطور اتم پورا کرتا ہے اور وہ اس معاشرے کے لئے امن و اطمینان کے پورے اسباب فراہم کرتا ہے۔ انسانی نفس اور ضمیر کا امن' انسانی گھرانے اور ان کے ذریعے انسانی سوسائٹی کا امن و سکون۔

یہ بات ایک کھلا مشاہدہ ہے کہ انسان کے بچے کو' کسی بھی اور حیوان کے مقابلے میں زیادہ عرصے تک دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور طفولیت کے بعد اس کی علمی اور اخلاقی تربیت کے لئے پھر مزید طویل عرصہ درکار ہوتا ہے تاکہ وہ انسان کی اجتماعی زندگی کے مقتضیات کا ایسا ادراک کر سکے جس کی وجہ سے انسان اور حیوان کے درمیان امتیاز کیا جا سکے۔

حیوانات کے درمیان جب جنسی اتصال ہوتا ہے اور توالد و تکاثر کا مقصد پورا ہو جاتا ہے تو ان کے جنسی مقاصد پورے ہو جاتے ہیں' لیکن انسان کا کیس یہ ہے کہ اس کے مقاصد صرف ان امور کے پورے ہونے سے پورے نہیں ہو جاتے' اس کے مقاصد اس سے آگے ہیں۔ ان میں مرد اور عورت کا دائمی ہم سفر ہونے اور میاں بیوی کے درمیان ایک دائمی رشتے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ پیدا ہونے والے بچے کو حفظ ذات' حفظ حیات انسانی' اور اس کی ضروریات خورد و نوش کی فراہمی کے لئے تربیت دی جائے اور تیار کیا جائے۔ اس کے علاوہ سب سے اہم مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک انسانیت نے اس دنیا میں علم اور ٹیکنالوجی کے میدان میں جو تجربات کئے ہوتے ہیں' انہیں بھی اس کی طرف منتقل کیا جائے تاکہ وہ انسانی معاشرے میں بھرپور حصہ لے سکے اور انسانی ترقی کے اس مسلسل عمل میں' جو صدیوں سے جاری ہے خود اپنے دور میں جس میں یہ بچہ پیدا ہوا اپنا فریضہ ادا کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں تک جنس انسانی کا تعلق ہے' اس کے معاملے میں جنسی لذت کا مقام ایک مرد اور عورت کے باہمی تعلقات میں بہت نیچے آتا ہے۔ جنسی لذت قدرت الٰہی نے مرد اور عورت میں محض اس لئے ودیعت فرمائی ہے تاکہ وہ خوشی اور دلچسپی سے باہم ملیں اور اس طرح بقائے بنی نوع انسان کے فریضہ کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کریں۔ مرد اور عورت کے باہمی میل کی تہہ میں صرف جنسی لذتیت عامل اول نہیں ہے بلکہ اس میں اصل فیکٹر فرائض نوع کی ادائیگی ہے' یعنی اس ناتواں آنے والی نسل کی دیکھ بھال جو اس جنسی ملاپ کی وجہ سے وجود میں لائی جاتی ہے۔ نیز اس سوسائٹی کے حقوق کی ادائیگی جس پر اس موجود نسل کی تربیت کی ذمہ داری ہوتی ہے' تاکہ یہ نسل اپنے انسانی اور اجتماعی فرائض ادا کر سکے اور یوں وہ انسانی وجود کے اصلی مقاصد پورے کر سکے۔

یہ تمام مقاصد یوں پورے ہوتے ہیں کہ جنسی تعلق کو ایک خاندان کی صورت میں منظم کیا جائے اور یہی وہ طریق کار ہے جو انسانی تجربات کے نتیجے میں صحیح ثابت ہوا ہے۔ اس طریق کار میں ایک عورت ایک مرد کے لئے مخصوص کر دی جاتی ہے اور یوں یہ تعلق دائما مستحکم بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ خاندان کی تشکیل میں صرف جنسی لذت ہی اصل فیکٹر

نہیں اور نہ صرف جنسی بے راہ روی ہی اصل اور فیصلہ کن عنصر ہوتا ہے' نہ اس تعلق کے برقرار رہنے میں اور اس کے قیام اور دوام میں پیش آنے والی مشکلات کے حل میں صرف یہی عامل کام کرتا ہے اور نہ ہی خاندان کے توڑنے کے عمل کی پشت پر صرف یہی جنسی عمل کام کرتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ خاندان کے مقدس نظام کی اس سے زیادہ اور کوئی توہین نہیں ہوسکتی کہ اسے ادائے فرض کے مقدس عامل کے بجائے صرف شہوت رانی' عارضی جنسی خواہشات کی تسکین اور محض لذتیت کی اساس پر منظم کیا جائے' جبکہ یہ سب عوامل بہت ہی عارضی ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا تصور پیش کرنا انسان اور انسانیت کے خلاف ایک مجرمانہ کوشش ہے۔ اس لئے کہ اس طرح معاشرے میں فحاشی' طوائف الملوکی' معاشرتی بے راہ روی' اور معاشرتی شتر بے مہاری جیسی خرابیاں طوفان کی طرح پھیل جاتی ہیں اور اس طرح پورا معاشرہ منہدم ہو جاتا ہے اور اس کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔

اس وقت دنیا میں بعض اہل قلم خاندانی نظام کے خلاف لکھ رہے ہیں۔ ایک وسیع میڈیا اس کے خلاف لگا دیا گیا ہے' جو نکاح اور خاندانی نظام کے خلاف مسلسل نشر و اشاعت میں مصروف ہے اور ان تعلقات کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے جو صرف جنسی لذتیت اور خوش وقتی پر مبنی ہوتے ہیں' جبکہ مستقل خاندانی نظام کی تحقیر کی جاتی ہے۔ اس بحث سے اچھی طرح معلوم ہو گا کہ ان خطوط پر کام کرنے والے اہل قلم انسانیت کے خلاف کس قدر عظیم جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ان حضرات کی کوششوں سے خاندانی نظام کی شکل بگڑ گئی ہے اور اس کی اہمیت ختم ہوگئی ہے۔

اس موضوع پر حضرت عمر ابن خطاب ؓ کے ایک قول میں بڑی گہرائی پائی جاتی ہے۔ ایک شخص اپنی بیوی کو محض اس لئے طلاق دینا چاہتا تھا کہ اب اسے اس کے ساتھ کوئی محبت نہیں رہی۔ حضرت عمر ؓ نے فرمایا! "کیا خاندان کی اساس صرف محبت پر ہے؟ اگر یہی ہے تو پھر بچوں کی پرورش کا کیا بنے گا اور پھر ذمہ داریاں کون سنبھالے گا۔" اور حضرت عمر ؓ نے یہ نظریہ زندگی قرآن کریم کی ہدایت اور تربیت سے اخذ کیا تھا۔ قرآن کریم نے اللہ کے ان مختار بندوں کی تربیت یوں کی تھی۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (۴:۱۹)

"ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو' مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔" اور یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ ممکن حد تک ایک گھرانے کو قائم رکھا جائے' اور قلبی جذبات اور میلانات کا مقابلہ کیا جائے اور ان کو کنٹرول میں رکھا جائے اور مرد و زن کے اس مقدس تعلق کو اس وقت تک نہ توڑا جائے جب تک اسے قائم رکھنے کی آخری کوششیں فیل نہ ہو جائیں۔ یہ کوشش اسلامی نظام نے اس لئے کی ہے کہ اس خاندان میں پیدا ہونے والے چھوٹے بچوں کا مستقبل تباہ نہ ہو جائے۔ وہ آنے والے طوفان کے تھپیڑوں اور سرکش جذبات کی رو' اور خواہشات نفسانیہ کی آندھیوں کی زد میں نہ آجائیں۔

اس بلند اور گہرے نقطہ نظر کی روشنی میں 'اس یاوہ گوئی کی سطحیت از خود ظاہر ہو جاتی ہے جو خاندانی نظام کے سلسلے میں آبرو باختہ لوگ کرتے ہیں۔ یہ لوگ مرد و زن کے ہر اس تعلق کے خلاف ہیں جو زوجین پر کچھ فرائض اور حقوق عائد کرتا ہو' جن کا تعلق انسانیت کی قیمتی جنس یعنی نوخیز نسل سے ہو یا اس نوخیز نسل کی ایسی تربیت سے ہو جس میں اس کو جدید ترقی یافتہ زندگی میں اپنے انسانی فرائض سرانجام دینے کے فطری وظیفہ سے ہو اور جس میں تمام نسلوں کے مفادات کو پیش نظر رکھا گیا ہو' جبکہ یہ لوگ ہر اس تعلق کی تعریف اور تمجید کرتے ہیں جس کی اساس وقتی جذبات اور زائل ہونے والی لذتیت پر ہو' اور جسے یہ لوگ ترقی کی علامت سمجھتے ہیں۔

آج کے اس دور میں گندی اور سستی فلمیں اور گندے گم کردہ راہ میڈیا کے ذرائع' ہر منکوحہ عورت کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ جب بھی اس کا دل خاوند سے اچاٹ ہو جائے وہ فوراً اپنے لئے دوست تلاش کر لے اور یہ ذرائع ابلاغ ایسی عورت کے فعل کو ایک مقدس فعل تصور کرتے ہیں' جبکہ اپنے حقیقی خاوند کے تعلق کو وہ "معاہدۂ بیع جسم" کہتے ہیں' حالانکہ اللہ تعالیٰ بیان محرمات کے سلسلے میں فرماتے ہیں ۔( وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ ) "وہ عورتیں جو حصار نکاح میں بند ہیں" اور انہیں حصار نکاح میں بند ہونے کی وجہ سے دوسرے مردوں کے لئے حرام قرار دیتے ہیں۔ یہ تو ہے اللہ کا فرمان اور وہ ہے فرمان ان آبرو باختہ لوگوں کا جنہیں اس مقدس حصار کے توڑنے کے لئے دشمنان اسلام نے قابو کر لیا ہے اور وہ حصار نکاح کو توڑ کر اسلامی معاشرے میں فحاشی پھیلانا چاہتے ہیں۔

( وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ ) "اللہ ہی حق کہتا ہے اور صرف وہی سیدھا راستہ بتلاتا ہے۔"

اس دنیا میں نہایت ہی منظم کوششیں اس لئے صرف کی جارہی ہیں کہ اللہ جل شانہ کی مرضی کے خلاف اقدار حیات' اخلاقی پیمانے اور تصورات ایجاد کئے جائیں اور انسانی زندگی میں ایسے اجتماعی روابط اور ایسی عمرانی بنیادیں رکھی جائیں جو ان روابط اور بنیادوں سے مختلف ہوں جنہیں اللہ نے رائج کیا۔ اور جو حضرات ان مساعی نامشکور میں رات دن مصروف ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مقصد صرف اسلامی ممالک کے اندر اسلامی معاشرے کی بنیادیں منہدم کرنے تک محدود ہے تاکہ وہ اسلامی ممالک میں اجتماعی زندگی کے نظام کو درہم برہم کر کے ان تمام رکاوٹوں کو ختم کر دیں جو ان ممالک میں ان کے مخصوص مقاصد کی راہ میں حائل ہوں ان اہداف کے تحت وہ مسلمانوں کے عقائد' ان کے اخلاق اور ان کے اجتماعی نظام کو تباہ کر رہے ہیں لیکن وہ سوچتے نہیں کہ ان کی ان غلط مساعی کے نقصانات خود ان کے حق میں کس قدر دور رس ہیں۔ وہ فقط اسلامی نظام معاشرت ہی کو تباہ نہیں کر رہے بلکہ وہ دراصل پورے عالم انسانیت کی اقدار کو تباہ کر رہے ہیں' وہ اقدار جن پر پوری انسانیت کی اعلیٰ اجتماعی قدریں استادہ ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی اس پالیسی کی وجہ سے پوری انسانیت کو ان عناصر سے محروم کر دیا ہے جن کی وجہ سے انسانیت نے اپنے کاندھوں پر امانت کبریٰ کا بوجھ اٹھا رکھا تھا۔ یعنی اس کرۂ ارض پر بہترین اور ترقی یافتہ نسل کو پروان چڑھانا۔ ان لوگوں کی اس پالیسی کی وجہ سے انسانیت تربیت یافتہ بچوں کی دولت سے محروم ہو گئی ہے' جنہوں نے ماں کی گود میں تربیت پائی ہو۔ یاد رہے کہ بچے کے لئے ماں کی گود ہی نرم' مطمئن اور پرامن گہوارہ ہوتی ہے اور اس تربیت میں بچہ بے لگام شہوانی جذبات سے مامون ہوتا ہے۔ نیز وہ

بدلتے ہوئے میلانات اور خواہشات کا شکار نہیں ہوتا اور نہ وہ ایسی خواہشات کا کھلونا بنتا ہے جو ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ رخ بدلتی رہتی ہیں۔ ماں کی گود میں تربیت یافتہ بچہ ہی بنی نوع انسان کی اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے اور یہ اہداف محض شہوت رانی کی خاطر دو افراد کے ملاپ اور مخصوص نسل کشی کی کافر نرسریوں میں بچوں کی پرورش کے اہداف سے بالکل جدا اور مقدس ہیں اور یہ اہداف مستقل 'پرسکون اور دور رس انسانی فرائض پر مبنی ہیں۔

اس صورت حال میں پوری انسانی نسل لعنت اور ملامت کی مستحق ہو جاتی ہے 'اس لئے کہ انسانیت کا ایک عضو' دوسرے اعضاء کو تباہ کر رہا ہے 'اور جس میں موجودہ نسل انسانی' آنے والی نسلوں کے مستقبل کو تباہ و برباد کر رہی ہے' محض اس لئے کہ خود اس کی ذات کا بھلا ہو جائے' اس کی ذاتی اور موجود خواہشات کماحقہ پوری کر دی جائیں چاہے مستقبل میں آنے والی نسلوں کی قسمت میں تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ رہے۔ اور اللہ کا عذاب ان نسلوں کے لئے قضائے مجرم بن جائے جو اللہ کے احکام کی نافرمان ہو رہی ہیں' جو اس کی تخلیق کردہ فطرت کے خلاف روش رکھتی ہیں اور جو اس کی صریح ہدایات کے خلاف جا رہی ہیں۔ اور جن کی وجہ سے پورا بنی نوع انسان ان مصائب میں گرفتار ہے۔ ہاں اس وبال اور عذاب الہی سے وہ مٹھی بھر مومن ضرور محفوظ رہیں گے جو اللہ کے احکام کا اقرار کرتے ہیں' جو اس زمین پر اللہ کی مملکت کے قیام کے لئے کوشاں ہیں اور لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اس کی دعوت دے رہے ہیں اور ان کو اس مٹا دینے والے فساد سے بچانا چاہتے ہیں' جسے انسانیت خود اپنے لئے تیار کر رہی ہے اور وہ یہ سمجھتی ہے کہ یہ سازش وہ صرف اسلامی ممالک کے خلاف کر رہی ہے تاکہ وہ رکاوٹیں دور ہوں جو ان کی راہ میں حائل ہیں۔ اور جس کے لئے انہوں نے خود عالم اسلام کے اصحاب قلم اور میڈیا میں کام کرنے والوں کو لگا رکھا ہے اور وہ اپنی ان مساعی کو صرف عالم اسلام کے اندر محدود تصور کرتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

(وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ) "اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو دوسروں کے حصار نکاح میں ہوں' البتہ ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو جنگ میں تمہارے ہاتھ آئیں۔" اس فقرے میں استثناء ان قیدی عورتوں کے بارے میں ہے جو اسلامی جنگوں میں گرفتار ہو کر آتی تھیں' لیکن وہ دارالحرب اور دارالکفر میں دوسرے لوگوں کے نکاح میں ہوتی تھیں۔ اس صورت میں ان کا تعلق نکاح' ان کے سابقہ خاوندوں کے ساتھ منقطع ہو جاتا تھا' کیونکہ دارالکفر سے دارالاسلام میں آجانے کی وجہ سے ان کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے' لہٰذا اس تبدیلی سے وہ محصنات نہیں رہتیں۔ اور دارالاسلام میں ان کا کوئی خاوند ہوتا نہیں اور ایک حیض کے آنے ہی سے ان کا رحم سابقہ خاوند کے آثار سے پاک تصور ہو گا۔ یعنی یہ نتیجہ اخذ کر لیا جائے گا کہ ان کا رحم حمل سے پاک ہے۔ اگر اب وہ اسلام میں داخل ہوتی ہیں تو ان کے ساتھ نکاح جائز ہو گا' یا جس شخص کے حصے میں وہ آجائیں' اس کے لئے بھی ان کے ساتھ مباشرت جائز ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اس کی مملوکہ ہو جاتی ہیں۔ اس صورت میں چاہے وہ اسلام لائیں یا نہ لائیں مباشرت جائز ہو گی۔

ظلال القرآن کے پارۂ دوئم میں' ہم تفصیل کے ساتھ مسئلہ غلامی کے بارے میں اسلام کے موقف پر بحث کر آئے ہیں۔ اس طرح اس سلسلے میں ایک تفصیلی بحث سورۂ محمد کی آیت

(حَتّٰی اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوْا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (۴۷:۴)

"یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو' اس کے بعد تمہیں اختیار ہے ' احسان کر دیا فدیے کا معاملہ کرو' تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے۔" کے تحت کی گئی ہے۔ وہاں ملاحظہ ہو۔

یہاں اس قدر کافی ہے کہ اسلامی کیمپ اس وقت غلامی کے معاملے میں اپنے مخالف کیمپ کے ساتھ وہی معاملہ کر رہا تھا' جو خود وہ کیمپ اس کے ساتھ کر رہا تھا۔ جبکہ اسلامی کیمپ بمقابلہ مخالفین کے غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کر رہا تھا۔ اسلامی کیمپ کا سلوک انسانی اخلاق کریمانہ پر مبنی تھا۔ اور اس کے سوا اسلامی کیمپ کے پاس کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا' اس لئے کہ غلام سازی کا قانون ایک بین الاقوامی مروجہ قانون تھا' اور اسلام کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ یکطرفہ طور پر اس قانون کو ختم کر دینے کا اعلان کرتا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو مسلمانوں میں سے جو لوگ غلام ہوتے وہ ہمیشہ کے لئے غلام رہ جاتے اور اہل کفر میں سے جو غلام ہوتے وہ آزاد ہو جاتے۔ یوں دشمن کے کیمپ کا پلڑا اسلامی کیمپ کے مقابلے میں بھاری ہو جاتا اور مخالف کیمپ کے حوصلے اسلامی کیمپ پر حملہ آور ہونے کے لئے بڑھ جاتے کیونکہ وہ ان حملوں کے نتائج سے ہر طرح مطمئن ہو جاتے بلکہ مخالف کیمپ کو ہر حال میں فائدہ ہوتا۔

اب یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام کے لئے بامر مجبوری کافر غلام عورتوں کو اپنے معاشرے میں رکھنا ضروری ہو گیا تھا' تو پھر ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا۔ ان عورتوں کے لئے محض کھانے پینے کے انتظام پر اکتفاء نہ کیا جا سکتا تھا' اس لئے کہ اس کے علاوہ ان کے ساتھ ایک دوسری فطری ضرورت بھی لگی ہوئی تھی۔ اس ضرورت کا سامان کرنا بھی ضروری تھا' اگر یہ سامان نہ کیا جاتا تو وہ یہ ضرورت غیر قانونی ذرائع سے پورا کرتیں اور یوں پورا اسلامی معاشرہ فحاشی کے سیلاب سے دوچار ہو جاتا اور یہ گندگی پھیل جاتی۔ پھر حالت شرک میں ہونے کی وجہ سے اہل اسلام کے لئے ان کے ساتھ نکاح جائز نہ تھا' نہ زبردستی انہیں اسلام میں داخل کرنا جائز تھا' اس لئے یہی ایک صورت رہ جاتی تھی کہ وہ جن لوگوں کی مملوکہ ہوں ان کے لئے ان کے ساتھ حالت شرک میں بھی مجامعت کرنا جائز ہو' جب تک وہ مشرکہ ہوں' بشرطیکہ ان میں سے جو دار الحرب میں منکوحہ تھیں ان کے رحم کی پاکیزگی کی شرط کو پورا کیا جائے اور دار الکفر میں ان کے خاوندوں کے ساتھ ان کے تعلق کو ختم کر دیا جائے۔

---○○○---

ان محرمات کے بعد' دوسری محرمات کے بیان سے پہلے اور باقی تمام عورتوں کی حلت کے اعلان سے پہلے' یہاں یاد دہانی کرنا ضروری ہے کہ اسلامی نظام حیات میں حرام قرار دینے اور حلال قرار دینے کے اختیارات صرف اللہ کے لئے ہیں۔ اللہ کے سوا یہ اختیارات اور کسی کے پاس نہیں ہیں۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ انسانوں کے لئے ان کی زندگی کے امور کے بارے میں قانون سازی کرے۔

(كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ) "یہ اللہ کا قانون ہے' جس کی پابندی تم پر لازم کی گئی ہے۔" یہ تمہارے ساتھ اللہ

کا عہد اور میثاق ہے جو اس کے اور تمہارے درمیان پختہ طور پر طے ہوا ہے' اور اس پر یہ اس کا فرمان ہے۔ معاملہ محض کسی خواہش کا نہیں ہے کہ اس کے پیچھے دوڑیں' نہ یہ کسی رسم و رواج کا معاملہ ہے جس کا اتباع کیا جاتا ہو اور نہ یہ خاندانی رواج کا معاملہ ہے جس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہو بلکہ یہ اللہ کے میثاق' اس کے عہد اور اس کی کتاب کا تقاضا ہے اور یہی وہ سرچشمہ ہے جس سے اہل ایمان قوانین حلت اور حرمت اخذ کرتے ہیں' اور جو کچھ وہ فرض کر دے اس پر عمل ضروری ہے' وہ جو لکھ دے وہ حرف آخر ہے' اور اس کے بعد یہ کہ اس نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر تم سے مواخذہ بھی ہو گا اور عمل پیرا ہونے کا مطالبہ بھی ہو گا۔

یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ قرآن کریم نے جن عورتوں کو محرمات کی فہرست میں داخل کیا ہے' ان میں سے اکثریت ایام جاہلیت میں بھی حرام تھی' اور ان میں سے ایام جاہلیت میں صرف باپ کی منکوحہ حرام نہ تھی' نیز دو بہنوں کے درمیان بیک وقت نکاح جائز تھا' البتہ "منکوحہ اب" کے ساتھ نکاح کو بھی ناپسند ہی کیا جاتا تھا۔ اس نکاح کو ان کے عرف میں نکاح "مقیت" کہتے تھے یعنی برا فعل۔ اسلام نے تقریباً انہی محرمات کو حرام قرار دیا جو جاہلیت میں حرام تھیں۔ اسلام نے علت تحریم یہ نہ بتائی کہ ایام جاہلیت میں بھی یہ حرام تھیں بلکہ قرآن کریم نے بصراحت یہ حکم دیا کہ "یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر واجب ہے۔"

اس مقام پر ہمیں قدرے توقف کر کے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اسلام میں تصورات اور عقائد اور افکار و نظریات کی اساس کیا ہے' نیز اسلام میں فقہ و قانون کے مصادر اور مآخذ کیا ہیں؟ یہ غور و فکر کرتے ہوئے اللہ کا یہ بیان ہمارے لئے بہت سے امور میں مفید ہے۔

اسلام اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ قانون سازی کا اصل الاصول اللہ کا امر اور اس کی اجازت ہے۔ اس اعتبار سے اللہ کی ذات ہی اس معاملے میں مقتدر اعلیٰ ہے اور اقتدار کا پہلا اور آخری مآخذ بھی وہی ہے اس لئے جو نظام زندگی بھی اس اصول اور بنیاد پر قائم نہ ہو گا وہ بنیادی طور پر باطل تصور ہو گا اور اس کی نہ تصحیح ہو سکتی ہے اور نہ اس کا اعادہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ جاہلیت بنیادی طور پر باطل (Void) ہے۔ اور جاہلیت ہر اس نظام کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ صحیح اور حقیقی سرچشمہ سے ماخوذ نہ ہو۔ اور اس جاہلیت کے تمام تصورات باطل ہیں' اس کے حسن و قبح کے تمام پیمانے باطل ہیں' اس کے تمام رسم و رواج باطل ہیں اور اس کے تمام ضابطے اور قوانین باطل ہیں۔ اسلام کو جب بھی اس زندگی کے نظام پر غلبہ حاصل ہوتا ہے وہ اسے مکمل طور پر تبدیل کر دیتا ہے۔ وہ اس زندگی کو مجموعی طور پر لیتا ہے' اور سب سے پہلے وہ اس سے جاہلیت کے تمام آثار کو ختم کرتا ہے' جاہلیت کی تمام اقدار' تمام پیمانے' تمام رسوم اور تمام قوانین کو کالعدم کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ یہ تمام قوانین باطل (Void) ہیں' نہ ان کی تصحیح ہو سکتی ہے اور نہ ان کو از سر نو جاری رکھا جا سکتا ہے۔ اگر اسلام دور جاہلیت کے کسی عرف' رسم و رواج کو بحال رکھتا ہے' تو وہ اس لئے برقرار نہیں رکھتا کہ وہ دور جاہلیت کے باقیات صالحات میں سے ہے یا یہ کہ وہ دور جاہلیت کا کوئی اچھا نمونہ ہے۔ بلکہ اسلام اسے اللہ کے امر اور اللہ کی اجازت سے برقرار رکھتا ہے اور اسے قانونی حیثیت اور جواز فراہم کرتا ہے۔ رہی وہ حیثیت جو اسے دور جاہلیت میں حاصل تھی' تو وہ ختم ہو چکی۔ اب اس کا اعادہ ممکن نہیں۔

اسلامی نظام قانون میں' بعض امور کو جو عرف کی تحویل میں دیا گیا ہے یا عرف پر موقوف کیا گیا ہے تو ان معاملات

میں خود اسلام اس عرف کو معروف ہونے کی وجہ سے قانونی حیثیت دیتا ہے اور یہ بھی اللہ کے فرمان (Ordinance) کے ذریعے ' یوں ان موضوعات میں عرف اور رواج کو قانونی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے لیکن یہ عرف اسلامی نظام میں اپنے لئے قوت نافذہ خدا اور رسول سے اخذ کرتا ہے ۔ ان لوگوں کے عرف سے اپنی قانونی حیثیت اخذ نہیں کرتا ہے ' جن میں وہ متعارف تھا ' نہ اس معاشرے سے لیتا ہے جس میں وہ رائج تھا ' اس لئے کہ لوگوں کی جانب سے کسی عرف اور رواج کی اطاعت کرتے رہنا اسلام میں اسے کوئی قانونی جواز فراہم نہیں کر سکتا ۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ۔ عرف اور رسم و رواج کو بعض مسائل میں جو قانونی حیثیت حاصل ہوتی ہے وہ اسے قرآن وسنت نے دی ہوئی ہوتی ہے ۔ اگر کسی عرف اور رسم و رواج کو اسلام بحال نہ رکھے اور اسے شارع قانونی حیثیت نہ دے تو وہ اصلیت کے اعتبار سے باطل ہو جائے گا ۔ اس لئے کہ اسلامی قانونی نظام کا اصل الاصول یہ ہے کہ ہر قسم کی قانون سازی کا مرجع اور منبع خدا اور رسول ہیں اور اسلام نے جاہلیت کے ایسے رسوم اور رواجات کے بارے میں جسے وہ بحال رکھنا نہیں چاہتا ' یہ کہا ہے کہ ان امور کی اجازت (Sanction) اللہ نے نہیں دی ۔

(اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ (۲۱:۴۲) "کیا ان کے ہاں ایسے شریک خدا ہیں جنہوں نے ان کے لئے دین کی حیثیت رکھنے والا قانونی نظام مقرر کیا ہے ' جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا ۔"

اس آیت میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک قانون ساز ہے ۔ اگر ان کے پاس کسی اور ایسے قانون ساز کا پتہ ہے جو اللہ کے مقابلے میں خودمختارانہ قانون سازی کر سکتا ہو تو وہ بتائیں تو ...؟

یہ ایک عظیم قاعدہ ہے ' جس کی طرف ' ایک چٹکی سے ' ان الفاظ میں اشارہ کر دیا گیا ہے ۔ ہر قانون سازی کے موقعہ و محل پر قرآنی نصوص نے اس کے بارے میں فیصلہ کیا ہے اور اس کی تاکید کی ہے ۔ اس لئے کہ قرآن کریم نے جہاں بھی کوئی قانون سازی کی ہے ' ہر جگہ اس قوت اور اس اتھارٹی کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے ' جس کی جانب سے یہ قانون صادر ہوا ہے ' لیکن اسلام جب دور جاہلیت کے قوانین اور رسوم و رواجات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ان کو منسوخ کرتا ہے تو وہاں کہا جاتا ہے ۔ (مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ) "اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کوئی قانونی جواز (Authority) نازل نہیں فرمایا ۔" تاکہ ابتداء ہی سے ان رسوم کے قانونی اثرات کو ختم کر دیا جائے اور ان کے باطل ہونے کی وجہ بھی بتلا دے کہ وہ محض اس لئے باطل ہیں کہ انہیں اسلامی نظام کے شارع اور مصدر قانون سے کوئی قانونی حیثیت فراہم نہیں کی گئی ۔

یہاں ہم جس قانونی اصول کا ذکر کر رہے ہیں ' وہ اس دوسرے عام قاعدے سے بالکل ایک علیحدہ چیز ہے ' جو اسلامی قانونی نظام میں مسلم ہے یعنی یہ کہ تمام امور میں اصل جواز ہے ۔ الا یہ کہ کسی امر کی حرمت کے لئے کوئی نص آ جائے اس لئے کہ اپنی اصل کے اعتبار سے تمام اشیاء کے حلال ہونے والا اصول بھی تو اللہ میاں نے وضع کیا ہے ۔ اور وہ اللہ کے اذن (Ordinance) سے وضع شدہ ہے ۔ لہٰذا اس کی قانونی حیثیت بھی اسی مصدر (Source) کی طرف راجع ہے جس کی بابت ہم یہاں بحث کر رہے ہیں ۔ یہاں بات ان جاہلی اصول قانون سے ہو رہی ہے جنہیں جاہلیت نے

اللہ کی نازل کردہ شریعت سے علیحدہ مستقل قانونی درجہ دے دیا ہو' ان امور میں' اصل الاصول یہ ہے کہ جاہلیت کے تمام امور کالعدم (Void) ہیں۔ الا یہ کہ اللہ اور رسول نے ان کے برقرار رکھے جانے کے بارے میں کوئی حکم' اذن (Ordinance) نافذ کیا ہو۔ اگر کیا ہو تو پھر وہ از سرنو نافذ ہونے والے قانون بن جاتے ہیں۔ اور اس وقت سے یہ از سرنو اسلامی شریعت سے اپنا قانونی جواز اکتساب کر لیتے ہیں۔

---ooo---

بیان محرمات کی تکمیل کے بعد اور یہ طے کرنے کے بعد کہ یہ تحریم محض حکم الٰہی کی وجہ سے ہے' اب یہاں موضوع سخن اس میدان میں داخل ہوتا ہے' جس میں لوگوں کے لئے یہ ضابطہ بندی کی گئی ہے کہ وہ اپنے فطری تقاضے نکاح کر کے پورے کریں' اس طریقے کے مطابق جو اللہ تعالیٰ نے مرد و زن کے درمیان' ایک خاندان کی تشکیل کے لئے' تعلقات قائم کرنے کے لئے پسند فرمایا ہے' تاکہ وہ ایک خاندان پر مشتمل ابتدائی ادارہ قائم کر دیں اور اس میں مرد و زن باہم مل کر خوشی حاصل کریں لیکن پاکیزگی' صفائی اور سنجیدگی کے ساتھ اور اس شان کے ساتھ جو اس عظیم مقصد کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (٤ : ٢٤)

”ان کے علاوہ جتنی عورتیں ہیں انہیں اپنے اموال کے ذریعے سے حاصل کرنا تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے' بشرطیکہ حصار نکاح میں ان کو محصور کرو' نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو۔ پھر ازدواجی زندگی کا جو لطف ان سے اٹھاؤ اس کے بدلے ان کے مہر بطور فرض کے ادا کرو' البتہ مہر کی قرارداد ہو جانے کے بعد آپس کی رضامندی سے تمہارے درمیان اگر کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں' اللہ علیم اور دانا ہے۔“

غرض محرمات مذکورہ کے علاوہ تمام عورتوں سے نکاح جائز ہے اور جو لوگ نکاح کرنا چاہتے ہیں وہ اپنا مال خرچ کر کے ان کا مہر ادا کریں اور نکاح کے بعد ان سے فائدہ اٹھائیں یہ جائز نہیں ہے کہ وہ صرف دولت خرچ کر کے عیاشی کریں۔ چنانچہ اس بات کی تصریح کر دی گئی (مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ) ”حصار نکاح میں لاتے ہوئے' نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرو۔“

مال خرچ کر کے عورتوں کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ یہ شرط عائد کی گئی کہ ان کے ساتھ نکاح کرو اور فقرہ ختم کرنے سے پہلے یہ بھی شرط عائد کی گئی تاکہ یہ شرط اس دفعہ کی جزء بن جائے بلکہ یہ مثبت شرط یعنی شرط نکاح عائد کرنے کے ساتھ ساتھ بطور تاکید منفی اس کی متبادل صورت کو متصلا بعد حرام کر دیا گیا اور (مُّحْصِنِيْنَ) کے بعد (غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ) کا لفظ بطور تاکید مزید اضافہ کیا گیا۔ کیونکہ ان فقروں میں قانون سازی ہو رہی تھی' اور اس میں کسی قسم کی

جھول مناسب نہ تھی تاکہ اسلام جس تعلق زن و شو کو نکاح کی اساس پر جائز کرتا ہے' اس کی پوری تصویر سامنے آجائے اور جس دوسری صورت کو وہ ناپسند کرتا ہے' وہ بھی واضح ہو جائے یعنی فحاشی اور ذاتی دوستی کے تحت مرد و زن کے تعلقات' اور یہ دونوں قسم کے تعلقات ایام جاہلیت میں معروف و مروج تھے۔ اور اس معاشرے میں ازروئے قانون جائز تصور ہوتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں آیا ہے :۔

"دور جاہلیت میں نکاح کی چار اقسام مروج تھیں۔ ایک نکاح تو وہ تھا جو آج کل دور اسلام میں مروج ہے۔ ایک شخص دوسرے شخص کی لڑکی یا اس کے زیر ولایت لڑکی کا پیغام دیتا' اس کو مہر ادا کرتا اور نکاح کر لیتا۔ اور دوسرا نکاح یہ ہوتا کہ جب کسی شخص کی بیوی ایام ماہواری سے پاک ہو جاتی وہ اسے حکم دیتا کہ وہ فلاں شخص کے پاس پیغام دے اور اس کے ساتھ جماع کرے۔ وہ خود اس سے علیحدہ رہتا' اور اسے چھوتا بھی نہ' یہاں تک کہ اس کا حمل اس شخص سے واضح ہو جاتا' جس سے وہ مباشرت کا مطالبہ کرتے تھے' اور جب حمل ظاہر ہو جاتا تو خاوند پھر اگر چاہتا تو اس کے ساتھ مباشرت کرتا' اور یہ حرکت وہ اس لئے کرتے تھے کہ بچے اچھے اور صحت مند پیدا ہوں۔ اس نکاح کو نکاح استبضاع (حمل طلب کرنا) کہتے تھے۔ ایک دوسری قسم یہ تھی کہ دس سے کم افراد جمع ہوتے' وہ ایک عورت کے ہاں آتے جاتے' ان میں سے ہر ایک اس کے ساتھ مباشرت کرتا' جب اس کا حمل ہو جاتا اور بچہ پیدا ہو جاتا اور کچھ راتیں گزر جاتیں یعنی بچے کی پیدائش پر' تو وہ سب کو بلاتی' کسی کو اس بات کی اجازت نہ ہوتی تھی کہ وہ غیر حاضر ہو' وہ سب اس کے پاس جمع ہوتے۔ وہ ان سے کہتی تم جانتے ہو جو معاملہ ہمارے درمیان تھا' اب میرا بچہ پیدا ہوا ہے' اے فلاں یہ تیرا بیٹا ہے۔ اور وہ جس شخص کا چاہتی نام لے لیتی۔ اس طرح اس شخص کا وہ بیٹا قرار پاتا اور کوئی شخص پھر اس بچے کا انکار نہ کر سکتا۔ اور چوتھا نکاح یہ تھا کہ بہت سے لوگ ایک عورت کے پاس آتے جاتے' یہ عورت کسی کو بھی روکتی نہ تھی۔ یہ عورتیں جسم فروش ہوا کرتی تھیں۔ وہ اپنے دروازوں پر خاص جھنڈے نصب کیا کرتی تھیں' جو ان کی خاص علامت ہوتے تھے۔ ان میں سے جو بھی چاہتا ان کے ہاں آتا جاتا۔ اور جب ان میں سے کوئی حاملہ ہو جاتی اور بچہ پیدا ہو جاتا تو سب لوگ جمع ہوتے اور قیافہ دان بلایا جاتا' اب وہ اس بچے کو جس کا بیٹا قرار دیتا یہ اس کا ہو جاتا۔ اور اس کا بیٹا پکارا جاتا۔ کوئی بھی اس کا انکار نہ کر سکتا۔" (بخاری کتاب النکاح)

ان میں سے تیسرا اور چوتھا نکاح زنا ہے جس کی حرمت آیات میں منصوص ہے۔ چاہے وہ دوستی ہو یا پیشہ ورانہ حرام کاری ہو۔ دوسرا نکاح ایک ایسی بدکاری ہے اور ایسی گھٹیا حرکت ہے جس کے لئے ہمارے پاس کوئی لفظ نہیں ہے۔ ہاں پہلا نکاح ہے جسے اسلام احصان قرار دیتا ہے اور اس نے اسے قانونی شکل دے دی ہے۔

قرآن کریم جس قسم کے نکاح کی اجازت دیتا ہے اس کی نوعیت کی اچھی تصویر کشی کر دیتا ہے۔ اس کی تعبیر لفظ "احصان" سے کی جاتی ہے جس کے مفہوم میں حفاظت اور بچاؤ داخل ہے۔ یعنی انسان کو برائیوں اور بدکاریوں سے بچانا۔ یہ نکاح مرد کے لئے بھی احصان ہے اور عورت کے لئے بھی احصان ہے۔ ایک قرات کے مطابق لفظ محصنین اسم فاعل کے مفہوم میں وارد ہے اور دوسری قراۃ میں محصنین اسم مفعول کے صیغے میں پڑھا گیا ہے۔ اور اسلامی طریقہ نکاح میں دونوں مفہوم متحقق ہو جاتے ہیں جو پاک' صاف اور عفت مآب طریقہ ہے۔ وہ ایک گھر کے لئے بھی احصان ہے ایک خاندان کے لئے بھی احصان ہے بچوں کے لئے بھی احصان ہے۔ اور خاندان کے ابتدائی انسانی اداروں کے لئے بھی

احسان ہے کیونکہ اس سے اس ادارے کی بنیاد مضبوط' پختہ اور گہری ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ دوسرے جس قدر طریقے ہیں ان کے لئے مسفاح کا لفظ استعمال ہوا' یعنی سفح سے باب مفاعلہ۔ یعنی جس میں عورتیں اور مرد شریک ہوں اور دونوں اپنا اپنا پانی گرائیں۔ مسافحہ کے معنی ہوتے ہیں نشیبی تنگ جگہ میں پانی گرانا۔ اور ان صورتوں میں مرد اور عورت ماء حیات کو گراتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے تسلسل اور ترقی کے لئے پیدا کیا ہے تاکہ مرد اور عورت مل کر نئی نسلیں پیدا کریں۔ ان کی پرورش کریں اور تربیت کریں لیکن وہ اس کے برعکس اس آب حیات کو محض وقتی لذت کے لئے گراتے ہیں جو وقتی میلان پر مبنی ہوتی ہے۔ وہ اسے نشیبی جگہ میں گراتے ہیں اس لئے وہ ان دونوں کو گندگی سے نہیں بچاتا۔ اور اس طرح بچے تلف ہونے سے محفوظ نہیں رہتے اور خاندان تباہ ہونے سے نہیں بچتا۔

قرآن کریم زندگی گزارنے کے دو طریقوں کی تصویر کشی کرتا ہے اور صرف دو الفاظ میں (محصنین و غیر مسافحین)' یہ الفاظ اس طرح استعمال ہوئے ہیں کہ اللہ کے پسندیدہ طریق زندگی کو تو بہترین انداز میں پیش کیا جاتا ہے اور ناپسندیدہ طریق نکاح کو نہایت ہی توہین آمیز الفاظ میں۔ جبکہ دونوں صورتوں کے بارے میں فیصلہ واقعی زندگی کے اندر ہوتا ہے اور یہ قرآن کریم کی بالکل منفرد اور انوکھا طرز تعبیر ہے۔ (دیکھیے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن فصل - التناسق اور فصل - طریقۃ القرآن) جب یہ حکم دیا جا چکا کہ تم ان عورتوں کے ساتھ نکاح کے سلسلے میں اپنا مال خرچ کرو تو یہاں غلط فہمی دور کرنے کے لئے بتا دیا کہ مال کس طرح خرچ کرو گے۔

(فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً (٤ : ٢٤)) "پھر جو ازدواجی زندگی کا لطف تم ان سے اٹھاؤ' اس کے بدلے ان کے مہر بطور فرض ادا کرو۔"

اسلامی قانون مہر کو عورت کا ایک فرض شدہ حق قرار دیتا ہے اور یہ حق لطف اندوزی کے عوض مقرر کیا گیا ہے۔ جو شخص کسی عورت سے جنسی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ اسے اپنے حصار نکاح میں لے' اور وہ عورت ان عورتوں میں سے نہ ہو' جن کو حرام قرار دیا گیا ہے اور جن کی فہرست اوپر دے دی گئی ہے۔ یعنی کوئی شخص صرف نکاح کے ذریعے کسی عورت کو زوجیت میں لے کر ہی اس سے تعلق قائم کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ تمام دوسرے طریقے ممنوع ہیں۔ اور نکاح کی صورت میں بھی خاوند پر مہر کی ادائیگی حتمی فرض ہے۔ یہ کوئی نفلی اور غیر لازمی شرط نہیں ہے۔ نہ عورت پر احسان ہے بلکہ یہ اس کا حق ہے اور از روئے شریعت فریضہ ہے۔ نیز مرد کے لئے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ دور جاہلیت کے بعض رواجوں کی طرح' عورت کو موروثی طور پر کسی طرح اور کسی صورت میں اپنی زوجیت میں لے لے۔ اور نہ ہی وہ نکاح شغار کی طرح عورت پر عورت کے بدلے قبضہ کر سکتا ہے۔ نکاح شغار یوں ہوتا تھا کہ ایک شخص ایک لڑکی دے اور اس کے بدلے دوسرے سے لڑکی حاصل کرے یوں کہ گویا دو جانوروں کا باہم تبادلہ ہو رہا ہے یا دو اشیاء کا تبادلہ ہو رہا ہے۔

عورت کے لئے مہر فرض کرنے کے بعد' معاملہ زوجین پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ ادائیگی اور معافی کے سلسلے میں باہم رضامندی سے کوئی بھی معاملہ طے کر سکتے ہیں۔ یعنی مشترکہ زندگی کے تقاضوں کے مطابق' ایک دوسرے کے ساتھ

موجود جذبات اور میلانات کے مطابق (وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرٰضَيْتُم بِهِ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيضَةِ (٤: ٢٤)) "اور البتہ مہر کی قرار داد ہو جانے کے بعد آپس کی رضامندی سے تمہارے درمیان اگر کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔"

اس لئے اگر عورت اپنا حق معاف کرتی ہے تو اس پر کوئی پابندی نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ قبول کرے۔ وہ پورا معاف کر دے یا بعض حصہ معاف کر دے وہ ایسا کر سکتی ہے لیکن یہ معافی یا کمی مہر کے مقرر ہونے کے بعد ہو سکے گی۔ یعنی جب یہ مہر اس کا حق بن جائے گا اور وہ اس میں اپنے دوسرے مملوکات کی طرح ہر قسم کے تصرف میں آزاد اور خود مختار ہو گی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ خاوند مقررہ مہر میں اضافہ کر دے یا مہر سے زیادہ ادائیگی کر دے۔ یہ بہرحال اس کا اپنا مقام اور مرتبہ ہو گا اور دونوں کی جانب سے فریق آخر کے ساتھ آزادی کے ساتھ احسان اور نرمی ہو سکے گی۔

اب پھر اس پر ایک اختتامیہ اور تعقیب آتی ہے اور ان تمام احکام کو ان کے مصدر سے وابستہ کر دیا جاتا ہے اور بتا دیا جاتا ہے کہ جس منبع سے یہ احکام صادر ہو رہے ہیں وہ وسیع علم رکھتا ہے اور اس کی بصیرت دور رس ہے۔ (اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا (٤: ٢٤)) "اللہ علیم اور دانا ہے۔" وہی ہے جس نے ان احکام کو قانونی شکل دی اور اس نے یہ قانون سازی علم و حکمت کی اساس پر کی۔ یوں ایک مسلم اچھی طرح یہ شعور رکھتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر موڑ پر کہاں سے احکام و ہدایات حاصل کر رہا ہے۔ اور یہ ہدایات یعنی میاں بیوی کے تعلقات کے بارے میں تو مخصوص اور شخصی ہیں۔ اس پر وہ اچھی طرح مطمئن ہوتا ہے' اس لئے کہ اللہ کی جانب سے جو احکام بھی دیئے جا رہے ہیں وہ علم و حکمت کی بنا پر دیئے جا رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ "علیم و دانا ہے۔"

---ooo---

اب اگر بعض عارضی حالات میں صورت حال یہ ہو گئی کہ کوئی مومن' اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے کسی آزاد مومن عورت کے ساتھ عقد نکاح کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے' جسے وہ اپنے حصار نکاح میں رکھ سکے اور وہ اس کے لئے سبب عفت بنے' تو اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات میں غیر آزاد عورت یعنی لونڈیوں سے بھی نکاح کی اجازت دے دی ہے' اگر وہ اس وقت تک انتظار نہیں کر سکتا کہ اس کے حالات درست ہو جائیں اور وہ آزاد عورت سے نکاح کرے یعنی اسے زیادہ مشکلات کا ڈر ہو یا اسے یہ ڈر ہو کہ وہ کسی اخلاقی فتنے کا شکار ہو جائے گا۔

(وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَانكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ

الْعَذَابِ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٤: ٢٥))

"اور جو شخص تم میں سے اتنی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں (محصنات) سے نکاح کر سکے ' اسے چاہئے کہ وہ تمہاری ان لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کر لے ' جو تمہارے قبضہ میں ہوں ' اور مومنہ ہوں ' اللہ تمہارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے ۔" تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو ' لہذا ان کے سرپرستوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کر لو ' اور معروف طریقے سے ان کے مہر ادا کر دو ' تاکہ وہ حصار نکاح میں محفوظ (محصنات) ہو کر رہیں اور آزاد شہوت رانی نہ کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں ۔ پھر جب وہ حصار نکاح میں محفوظ ہو جائیں اور اس کے بعد کسی بدچلنی کی مرتکب ہوں ' تو ان پر اس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے جو محصنات عورتوں کے لئے مقرر ہے ۔ یہ سہولت تم میں سے ان لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے جن کے شادی نہ کرنے سے بند تقویٰ ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو ' لیکن اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے ' اور اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے ۔"

اسلامی نظام زندگی ' انسان کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کرتا ہے ' جو اس کے فطری حدود کے اندر ہو ' اس کی وسعت اور طاقت کے مطابق ہو ' اس کی واقعی صورت حال کے متناسب ہو ' اور اس کی حقیقی ضروریات اور حاجات سے ہم آہنگ ہو ۔ اسلام کسی گمراہ انسان کو ہاتھ سے پکڑ کر گمراہی کے گڑھوں سے نکالتا ہے اور اسے اسلامی نظام حیات کی رفعت اور بلندی عطا کرتا ہے اور اس پورے عمل میں وہ اس کی فطرت ' اس کی قوت ' اس کے واقعی حالات ' اور اس کی حقیقی ضروریات کو ہر حال میں پیش نظر رکھتا ہے ۔ بلکہ وہ ان تمام دواعی کے تقاضے بھی پورے کرتا ہے اور اسے تدریج کے ساتھ مقام بلند تک بھی لے جاتا ہے ۔ البتہ یہ بات ایک حقیقت ہے کہ اسلام جاہلیت کی صورت کو کسی حالت میں بھی ایسی صورت حال تسلیم نہیں کرتا جس کے سوا چارۂ کار ہی نہ ہو ' اس لئے کہ جاہلیت تو نام ہی گراوٹ کا ہے اور یہ انسان کو بھی گراتی ہے جبکہ اسلام کا مقصد وجود ہی یہ ہے کہ وہ اس گراوٹ سے انسانیت کو اٹھا کر مقام بلند تک لے جائے ۔ ہاں اسلام انسان کی فطرت اور حقیقت کا اعتبار کرتے ہوئے واقعیت پسند ضرور ہے ۔ اور حقیقت واقعہ یہ ہے کہ انسان بلندی اور برتری کے مقام تک چڑھنے کی قدرت بھی رکھتا ہے اور فطری داعیہ بھی ۔ واقعیت پسندی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر انسان جاہلیت کی گندگی کے اندر لت پت ہے تو اسے ایسا ہی رہنے دیا جائے ۔ (چاہے وہ کوئی جاہلیت بھی ہو) بلکہ واقعیت یہ ہے کہ انسان کی قدرت و وسعت میں یہ بات ہے کہ سربلندی حاصل کرے اور ترقی کرے اور اس کا فطری داعیہ بھی ہے اور اللہ تعالیٰ انسان کے واقعات سے اچھی طرح باخبر ہے کیونکہ وہ انسان کا خالق ہے ' اور اس کی حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے ۔

اللہ ہی وہ ذات ہے جو ان تمام باتوں کو جانتا ہے جو انسانوں کے دلوں میں کھٹکتی ہیں ۔ (اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (٦٧: ١٤)) "کیا وہ ذات نہیں جانتی جس نے پیدا کیا اور حال یہ ہے کہ وہ نہایت ہی باریک بین

اور خبردار ہے۔"

اسلام کے ابتدائی معاشرے میں غلام موجود تھے' یہ غلام مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ہونے والی لڑائیوں کے نتیجے میں پیدا ہوتے تھے اور اس وقت تک غلام رہتے تھے جب تک ان کی غلامی کا معاملہ بین الاقوامی طور پر طے نہ ہو جائے' یعنی یا ان جنگی قیدیوں کو بطور احسان مفت رہا کر دیا جائے' یا ان کا تبادلہ مسلمان قیدیوں کے ساتھ ہو جائے یا مالی تاوان حاصل کر کے جنگی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے یعنی جس طرح کے حالات اہل اسلام اور ان کے مقابل دشمن قوت کے مابین پائے جائیں۔ جب تک قیدیوں اور غلاموں کا مستقل فیصلہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک اسلام ان غلاموں کا مسئلہ یوں حل کرتا ہے کہ وہ قیدی اور غلام عورت کے ساتھ اس کے مالک کی مباشرت کو جائز قرار دیتا ہے۔جس کی تشریح ہم سابقہ آیت میں کر آئے ہیں تاکہ مملوکہ عورتوں کے فطری تقاضوں کو ایک ضابطے کے مطابق پورا کیا جائے' اور دوسری صورت یہ ہے کہ ان غلام عورتوں کو کسی مومن کے نکاح میں دے دیا جائے بشرطیکہ وہ اسلام قبول کر چکی ہوں اور ان دونوں صورتوں میں ان کے ساتھ مجامعت دارالحرب سے دارالاسلام تک منتقل ہونے کے بعد' ایک حیض آنے کے بعد ان کے رحم کی پاکی کی پوری تحقیق کے بعد ہو سکے گی۔ لیکن ان لونڈیوں کے مالکان کے سوا دوسرے لوگوں کے لئے ان کے ساتھ مباشرت کی صرف ایک ہی صورت ہے' وہ یہ کہ ان کے ساتھ نکاح کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ ان کے لئے اس بات کا جواز نہیں ہے کہ معاشرے میں جسم فروشی کریں اور اجرت لیں۔ اور نہ ان کے لئے یہ جائز ہے کہ مالکان ان کو آزاد کر دیں اور وہ ان مالکان کے لئے جسم فروشی کرتی پھریں۔ اس آیت میں ایسی عورتوں کے ساتھ نکاح کا یہ طریقہ وضع کیا گیا ہے۔

(وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (٤: ٢٥))

"اور جو شخص تم میں سے اتنی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں (محصنات) سے نکاح کر سکے اسے چاہئے کہ تمہاری ان لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرے جو تمہارے قبضے میں ہوں اور مومنہ ہوں۔"

اسلام اس بات کو ترجیح دیتا ہے کہ نکاح آزاد عورت کے ساتھ کیا جائے' بشرطیکہ کسی شریف زادی سے نکاح کرنے کی استطاعت ہو' اس آزاد عورت کو محصنہ اس لئے کہا گیا کہ وہ حصار آزادی میں محفوظ ہوتی ہے۔ حریت اور آزادی اسے یہ آداب سکھاتی ہے کہ وہ اپنی عفت اور پاکدامنی کی حفاظت کس طرح کرے گی۔ نیز آزادی اور شرافت اسے یہ بھی سکھاتی ہے کہ خاوند کی عزت کی حفاظت کیسے کی جائے گی۔ اس لئے یہاں شریف زادیوں اور آزاد عورتوں کے لئے محصنات کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں محصنات سے مراد وہ عورتیں نہیں جو شادی شدہ ہوں اور کسی کے حصار نکاح میں ہوں۔ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ دوسروں کی بیویاں یعنی محصنات سب مردوں پر حرام ہیں۔ اور یہاں آزاد عورتوں کے لئے لفظ محصنات اس لئے استعمال کیا گیا کہ وہ حصار آزادی میں بند ہوتی ہیں۔ آزادی اور شرافت کی وجہ سے انسانی ضمیر اور شعور میں عزت نفس کا احساس ہوتا ہے اور زندگی میں آزاد عورتوں کو کچھ حقوق حاصل ہوتے

ہیں ۔ آزاد عورت کا ایک خاندان ہوتا ہے' ایک فیملی ہوتی ہے' اس کی شہرت ہوتی ہے' اس کے محافظ ہوتے ہیں اور وہ بھی اپنے خاندان کی عزت کا خیال رکھتی ہے ۔ پھر اس کی عزت نفس بھی اسے گھٹیا حرکات سے روکتی ہے ۔ اس لئے وہ بدکاری اور زناکاری سے اجتناب کرتی ہے اور یہ موانع اور رکاوٹیں عام بازاری عورتوں یا غلام عورتوں کے لئے نہیں ہوتیں' یہی وجہ ہے کہ وہ محصنہ نہیں ہوتیں ۔ اگر وہ نکاح بھی کریں تب بھی غلامی کے زمانے کے آثار ان کے اندر پائے جاتے ہیں' لہٰذا ایک آزاد عورت کی طرح اس کے کردار میں عزت نفس' عفت اور خودداری نہیں ہوتی ۔ اس کے علاوہ اس کے دل و دماغ پر خاندانی شرافت کا بھی کوئی احساس چھایا ہوا نہیں ہوتا' جس کے داغدار ہونے کا اسے کوئی خوف ہو' علاوہ ازیں اس میں آنے والی نسل کے جذبات کا بھی خیال رکھا گیا ہے اس لئے کہ غلام عورت کی اولاد کو ایک آزاد اور شریف زادی کی اولاد کے مقابلے میں فروتر سمجھا جاتا تھا ۔ اس طرح غلامی کا داغ ان کے ساتھ کسی نہ کسی صورت میں لگا رہتا تھا اور یہ تصورات عرب معاشرے میں بالعموم موجود تھے' جس میں قرآن کریم نازل ہو رہا تھا ۔ یہ تھے وہ اسباب جن کی وجہ سے اسلام نے اس بات کو ترجیح دی کہ جہاں تک ہو سکے مسلمان آزاد اور شریف زادیوں کے ساتھ نکاح کریں ۔ اور غیر محصنہ عورتوں یعنی لونڈیوں سے شادی کی اجازت اس شرط پر دی کہ جب حرہ اور آزاد عورت سے نکاح ممکن نہ ہو یا اس کی طاقت نہ ہو یا اس کے لئے انتظار کی جانکاہ گھڑیاں گزارنا پڑ رہی ہوں اور مزید انتظار نہ کیا جا سکتا ہو ۔

جب یہ مشکلات بھی ہوں اور ایک مرد کے لئے بے راہ روی کا بھی خطرہ ہو اور مرد کے لئے انتظار مشکل ہو تو اسلام اس کی راہ نہیں روکتا بلکہ اجازت دیتا ہے کہ آسانی' اطمینان اور آرام سے لونڈیوں سے نکاح کر لے اور نکاح کی اجازت بہرحال ان غلام عورتوں سے ہے جو ایمان لا چکی ہوں اور جو کسی دوسرے کی ملکیت میں ہوں ۔ ایمان کی شکل کو یہاں بھی متعین طور پر ثبت کیا گیا ہے جس طرح اس سے قبل آزاد اور محصنہ عورتوں کے ساتھ نکاح میں ایمان کو شرط قرار دیا گیا تھا ۔ اسی طرح کسی کافرہ لونڈی سے بھی کسی طور نکاح جائز نہیں ہے ۔ اس لئے پہلے یہ لازمی شرط لگائی جاتی ہے کہ وہ مومنات ہوں ۔ (فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (۴: ۲۵)) "جو تمہارے قبضے میں ہوں اور مومنہ عورتیں ہوں ۔" اور دوسری شرط یہ ہے کہ انہیں ان کے مہر ادا کئے جائیں جو فرض ہیں اور ان کی وصولی کا حق ان کے مالکان کو نہیں ہے ۔ یہ ان کا اپنا خالص حق ہے ۔ (وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ (۴: ۲۵)) "پس دو انہیں ان کے مہر" تیسری شرط یہ ہے کہ ان کا معاوضہ بطور مہر ہو' اور ان سے لطف اندوزی بطور نکاح ہو نہ کہ بطور دوستی یا بطور زن بازاری ۔ مخادنہ کا مفہوم ہے ایک مرد یا عورت سے دوستی اور سفاح کے معنی ہیں زن بازاری کا پیشہ جو ہر کسی کے لئے کھلا ہوتا ہے ۔ (مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (۴: ۲۵)) "تاکہ وہ حصار نکاح میں محصور ہو کر رہیں اور آزادانہ شہوت رانی یا چوری چھپے آشنائیاں نہ کرتی پھریں ۔"

جب اسلام آیا تو عرب معاشرے میں آزاد عورتوں کے اندر بھی اس قسم کی بے راہ روی متعارف تھی جیسا کہ اس سے پہلے بیان کردہ حدیث عائشہ میں آپ پڑھ چکے ہیں ۔ نیز اس دور میں غلام عورتوں میں جسم فروشی کا رواج بھی عام تھا ۔ اس وقت کے رؤساء اپنی لونڈیوں کو بازاروں میں چھوڑ دیتے تھے اور وہ ان کے لئے روپیہ کما کر لاتی تھیں ۔ عبداللہ بن ابی ابن سلول رئیس المنافقین نے مدینہ طیبہ میں اس مقصد کے لئے چار لونڈیاں رکھی ہوئی تھیں' حالانکہ وہ اپنی قوم کا رئیس تھا' اور وہ پیشہ کر کے اس کے لئے روپیہ کماتی تھیں ۔ جاہلیت کی گندگی کے یہ آثار مدینہ تک میں باقی تھے ۔ اسلام

نے عربوں پر احسان کر کے اس رسم کی بیخ کنی کر دی 'عربوں کا مقام بلند کر دیا انہیں اس گندگی سے پاک وصاف کر دیا اور عربوں کے بعد تمام انسانیت کو اس نجاست سے پاک کیا۔

اسلام نے مردوں اور ان نوجوان مومنہ عورتوں کے درمیان مباشرت کا صرف ایک ہی طریقہ جائز قرار دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک عورت کے لئے ایک مرد مخصوص کیا جائے یعنی طریقہ نکاح اور اس طرح ایک خاندان پر مشتمل دو افراد زندگی بسر کریں۔ اور یہ صورت نہ ہو کہ اس میں جانوروں کی طرح محض شہوت رانی ہو۔ چونکہ دولت مردوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس لئے عورت کے لئے مہر مقرر فرمایا ہے جو ازروئے شریعت فرض ہے تاکہ مرد و زن کا یہ تعلق محض دوستی اور پیشہ ورانہ اجرت پر مبنی نہ ہو۔ اسی طرح غلاموں کی دنیا میں بھی اسلام نے اس تعلق کو جاہلیت کی گندگیوں سے پاک کیا۔ انسان نے جب بھی جاہلیت کو اپنایا وہ اس گندگی میں مبتلا ہوا۔ آج اس دور جدید میں انسان چونکہ جاہلیت کے جھنڈے اٹھائے ہوئے ہے 'اور اس نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے اس لئے وہ اس گندگی میں پوری طرح لت پت ہے۔

اس آیت کے تحت اس موضوع پر بحث ختم کرنے سے پہلے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کے اس انداز تعبیر پر بھی ذرا غور کریں جس میں قرآن کریم نے غلاموں اور آزاد لوگوں کے درمیان 'اسلامی معاشرے میں انسانی تعلقات کے قیام کی نسبت سے بات کی ہے۔ قرآن کریم غلام عورتوں کے لئے 'رفیقات' جواری اور امہ کا لفظ استعمال نہیں کرتا جو اس وقت مروج تھے' اسلام ان کے لئے "فتیات" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ (فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (۴: ۲۵)) "جو تمہارے قبضے میں ہوں اور مومنہ جوان عورتیں ہوں۔"

اسلام آزاد عورتوں اور غلام عورتوں کے درمیان ایسا فرق نہیں کرتا جس سے وہ الگ الگ فرقے تصور ہوں۔ حالانکہ اس وقت جو تصورات رائج تھے 'ان کے مطابق غلام لوگوں کی ایک الگ دنیا تھی اور وہ دوسرے درجے کے شہری تصور ہوتے تھے۔ اسلام سب انسانوں کو ایک اصل و نسل کا حامل تصور کرتا ہے۔ جن کے درمیان ایک رابطہ ہے یعنی انسانیت اور ایمان کا رابطہ جو اجتماعی تعلقات کے لئے اسلام میں اساس بنتا ہے۔ (وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ (۴: ۲۵)) "اللہ تمہارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے 'تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو۔"

اسی طرح اسلام ان کے مالکان کے لئے لفظ سید یا مالک استعمال نہیں کرتا بلکہ ان کے لئے "اہل" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

(فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ (۴: ۲۵)) "لہٰذا ان کے سرپرستوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کرو۔" اور اس کے بعد پھر اسلام مہر کا حقدار ان کے مالکوں کو قرار نہیں دیتا بلکہ مہر صرف عورت کا حق ہوتا ہے لہٰذا مہر اس قاعدہ کلیہ سے خارج ہو جاتا ہے جس کے مطابق غلاموں کی ہر قسم کی کمائی ان کے مالکوں کی ملکیت ہوتی تھی' اس لئے کہ مہر کی رقم کمائی کی تعریف میں نہیں آتی بلکہ مہر تو مرد و زن کے رابطے کا ایک مقدس فریضہ ہے۔ (وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۴: ۲۵)) "پس معروف طریقے سے ان کے مہر ادا کرو۔"

اسلام غلام عورتوں کو یہ اعزاز دیتا ہے کہ وہ عام طور پر جسم فروشی نہ کرتی پھریں اور معروف طریقے کے مطابق نکاح کر کے جنسی تعلقات قائم کریں۔ (مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (۴: ۲۵)) "تاکہ وہ

حصار نکاح میں محفوظ ہو کر رہیں ' آزاد شہوات رانی نہ کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں ۔"

یہ تمام خدوخال اور تمام پہلو ان غلام نوجوان عورتوں کے لئے شان اعزاز اور کرامت لئے ہوئے ہیں ' اور جس طرح وقت کا تقاضا تھا ' ان کے اصل مقام انسانیت میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں کی گئی ۔

اس اعزاز اور عزت افزائی کا موازنہ ' اگر نزول قرآن کے وقت رائج اور مروج حالات کے ساتھ کیا جائے جن میں غلاموں کو بری نظروں سے دیکھا جاتا تھا ' اور جس طرح انہیں اعلیٰ انسانی شرف سے محروم کیا جاتا تھا اور اس انسانی شرف کی بنا پر ملنے والے تمام انسانی حقوق سے محروم کیا جاتا تھا ' تو معلوم ہو گا کہ اسلام نے اس سلسلے میں کس قدر دوررس تبدیلی کی ۔ اسلام نے ان عورتوں کو انسانی شرافت سے مشرف کیا ' ہرحال میں ان کے مقام انسانیت کا لحاظ رکھا ' قطع نظر اس سے کہ یہ مخلوق عارضی طور پر قید غلامی میں مقید ہے جسے اسلام محض ایک عارضی اور عبوری صورت حال تصور کرتا تھا ۔

آج کے جدید اور مہذب دور میں بھی فاتح افواج مفتوح اقوام کی عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ جو سلوک کرتی ہیں ' اگر اس کا مطالعہ کیا جائے اور اس کا تقابل اسلام کے اس پروقار سلوک کے ساتھ کیا جائے جو اس نے اس وقت کے حالات میں غلام عورتوں کے ساتھ کیا تو اس سے معلوم ہو گا کہ اس وقت اسلام نے غلامی کے عارضی طور پر موجود ادارے کے اندر کس قدر دوررس اصلاحات کیں ۔ ہمیں جدید دور کی فاتح افواج کے "جنسی ملاپ" اور اس گندگی کے قصے اور رپورٹیں اچھی طرح معلوم ہیں جن میں جاہلیت جدیدہ کے یہ فرزند ہر اس جگہ ملوث ہوئے جہاں بھی انہوں نے فتح حاصل کی ۔ اور جب یہ مفتوحہ علاقوں کو چھوڑ کر گئے تو انہوں نے اپنے پیچھے اس قدر گندگی چھوڑی جس سے وہ علاقے سالہاسال تک عہد برآ نہ ہو سکے ۔

اس طرح ان نوجوان عورتوں کی جانب سے اس نکاح کے بعد اگر کسی فحاشی اور بدکاری کا ارتکاب ہو تو ان پر آزاد اور شریف زادیوں کے مقابلے میں خفیف سزا تجویز کی گئی ہے ' اس لئے کہ ان غلام عورتوں کے حالات اور واقعات ایسے ہوتے ہیں جن میں ان کے لئے فحاشی اور بدکاری کے ارتکاب کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں اور یہ عورتیں آزاد عورتوں کے مقابلے میں کم قوت دفاع رکھتی ہیں اس لئے کہ غلامی میں ایک شخص کا ضمیر بدل جاتا ہے اور اسے عزت نفس کا کم احساس ہوتا ہے ۔ اسے کسی خاندان کی عزت و آبرو برباد ہونے کا احساس بھی نہیں ہوتا ' اس لئے کہ ذاتی عزت و آبرو اور خاندانی عزت و آبرو کا احساس ہی آزاد عورتوں کے اندر اپنے ناموس کی حفاظت کا جذبہ بیدار رکھتا ہے ۔ نیز ایک شخص کا معاشرتی مقام اور اس کی اقتصادی حالت بھی فحاشی و بدکاری میں مبتلا ہونے یا نہ ہونے کے معاملے میں ایک اہم فیکٹر ہوتا ہے اور آزاد عورت کے مقابلے میں غلام عورت کا سوشل سٹیٹس اور اقتصادی حالت بہرحال کم ہوتی ہے ۔ اس وجہ سے غلام عورت اس معاملے میں بہرحال بڑی آسانی سے ورغلائی جا سکتی ہے ۔ یعنی مال اور نسب کی کمی کی وجہ سے ۔ ان وجوہات اور اسباب کی بنا پر اسلام نے غلام عورتوں کے لئے سزائے حد ' جبکہ وہ شادی شدہ ہوں ' ان آزاد عورتوں کی حد کے نصف کے برابر رکھی جبکہ ان کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہوتی ہے ۔ فرماتے ہیں :

(فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ

الْعَذَابِ ( ٤ : ٢٥ )) "پھر اگر وہ حصار نکاح میں محفوظ ہو جائیں اور اس کی بعد کسی بدچلنی کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا کی نسبت آدھی سزا ہے جو آزاد عورتوں کے لئے مقرر ہے ۔"

اس کا مفہوم یہ ہے کہ آزاد عورتوں کی اس سزا کا نصف جو تقسیم ہو سکتی ہو' اور وہ کوڑوں کی سزا ہے اور رجم کی سزا میں تقسیم ممکن نہیں ہے ۔ اس لئے اس سزا سے مراد رجم کی سزا نہ ہوگی' لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ جب کوئی شادی شدہ لونڈی زنا کا ارتکاب کرے تو اس پر آزاد عورت' (جو شادی شدہ نہ ہو)' کی سزا کا نصف حصہ لازم ہو گا ۔ رہی اس لونڈی کی سزا جو شادی شدہ نہ ہو' تو اس بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا اس پر یہی حد جاری ہوگی یعنی غیر شادی شدہ آزاد عورت کی نصف سزا یا اسے محض تادیبی سزا دی جائے گی اور یہ تادیب صرف اس کا مالک کرے گا اور نصف حد نہ ہوگی ۔ اس اختلاف کی تفصیلات کتب فقہ سے معلوم کی جا سکتی ہیں ۔

ہم یہاں فی ظلال القرآن میں' صرف یہ نکتہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اسلامی نظام زندگی لوگوں کے حالات اور ظروف و احوال کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور اس طرح ان کے حقیقی حالات میں ترقی اور پاکیزگی کی طرف ان کی راہنمائی کرتا ہے ۔ وہ لوگوں کو بے کسی کی اس گری ہوئی حالت میں یہ فرض کر کے نہیں چھوڑتا کہ ان کے جو ظروف و احوال ہیں یہ ان کی تقدیر ہے اور وہ اس میں ہمیشہ کے لئے گم گشتہ ہیں ۔ اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو خوب جانتا تھا کہ اسلام کے دور اول میں غلام لوگ کن برے حالات سے گزر رہے ہیں' ان پر کیا کیا دباؤ ہیں اور ان حالات میں ایک لونڈی کو کس سہولت کے ساتھ بدکاری اور فحاشی کے لئے آمادہ کیا جا سکتا ہے ۔ اس لئے اسلام نے ان ظروف و احوال کو نظرانداز نہ کیا اور ان لونڈیوں کے لئے وہ سزا تجویز نہ کی جو اس نے آزاد عورتوں کے لئے تجویز کی تھی' اور نہ ہی اسلام نے اس حقیقی اور واقعی صورت حال کو تسلیم کیا بایں معنی کہ ان حالات میں غلام عورتوں کے لئے سرے سے کوئی تادیبی سزا ہی نہ مقرر کی جائے ۔ غرض اسلام نے نصف سزا رکھ کر ان حالات کا لحاظ بھی رکھا جو اس وقت اہم فیکٹر تھے ۔ سزا بھی تجویز کی اور یوں ایک عادلانہ طریق اختیار کیا ۔

ہاں یہ بات بھی ملاحظہ ہو کہ اسلام نے غلاموں کو کم درجہ سمجھ کر ان کی سزا میں سختی بھی روا نہیں رکھی ۔ جس طرح اسلام سے قبل دور جاہلیت میں مروجہ قوانین ان طبقات کے لئے بہت سخت ہوتے تھے جو مرتبہ و مقام کے اعتبار سے گرے پڑے ہوں' اور جو طبقات ترقی یافتہ ہوں' ان کے لئے یہ جاہلی قوانین نہایت ہی نرم ہوتے تھے جبکہ اسلامی قوانین ضعفاء اور کمزوروں کے لئے نرم اور شرفاء کے لئے سخت ہوتے ہیں ۔

روم کے قوانین میں یہ رویہ اختیار کیا گیا تھا کہ جس قدر ملزم گرے ہوئے اور کم تر درجے کے طبقات سے ہوتا' اسی قدر سزا میں شدت کی جاتی ۔ یہ قانون کہتا ہے "اگر کوئی شخص کسی پاک دامن بیوہ یا کسی کنواری کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب کرے گا' اگر وہ شخص کسی معزز خاندان کا فرد ہے تو اس کی نصف جائیداد ضبط ہوگی اور اگر وہ گھٹیا خاندان سے تعلق رکھتا ہو تو اس کی سزا کوڑے اور جلاوطنی ہوگی ۔ (دیکھئے مدونہ جسٹینائن ترجمہ عبدالعزیز فہمی) منو نے جو قانون ہند میں پاس کیا تھا' جسے منو شاستر کہا جاتا ہے اس میں یہ درج ہے کہ اگر کوئی برہمن واجب القتل ہو جائے تو اسے قتل نہ کیا جائے گا' حاکم صرف اس قدر سزا دے سکے گا کہ اس کا سر منڈوا دے ۔ ہاں اگر واجب القتل شخص برہمنوں کے علاوہ کوئی ہو' تو اسے قتل کیا جائے گا ۔ معمولی اور گرے ہوئے طبقات میں سے کوئی اگر برہمن پر ہاتھ اٹھائے گا

تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔" (ماذا خر العالم ۔۔۔۔۔ ندوی) اور یہودیوں کا قانون یہ تھا کہ ان میں سے کوئی شریف چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کم درجے کا انسان چوری کرتا تو وہ اس پر حد جاری کرتے۔

ان حالات میں اسلامی نظام نازل ہوا' اس نے سچائی کو اپنی جگہ پر کھڑا کیا۔ اس نے مجرم پر سزا نافذ کی لیکن نفاذ سزا میں اس نے حالات جرم کو مدنظر رکھا۔ اس نے شادی شدہ لونڈی کی سزا' اس شریف زادی کی سزا کے نصف کے برابر رکھی جس کی ابھی تک شادی نہ ہوئی ہو۔ اس نے اسے بالکل معاف بھی نہیں کیا کہ اس کے ارادۂ گناہ کا کوئی لحاظ ہی نہ رکھا جائے اور اسے حالات سے مجبور تصور کیا جائے' اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ بالکل خلاف واقعہ اور خلاف حقیقت ہوتا۔ اور نہ اس کے حالات جرم کو نظرانداز کرتے ہوئے' اس کے لئے آزاد اور شریف زادی عورتوں کے مساوی سزا تجویز کی۔ جبکہ اس کے حالات جرم شریف زادی کے حالات جرم سے بالکل مختلف تھے۔ اور نہ اسلام نے وہ جاہلانہ قوانین جاری رکھے جن میں اشراف کو تو معاف کر دیا جاتا تھا اور کم تر درجے کے لوگوں پر سزائے حد جاری ہوتی تھی۔

امریکہ' جنوبی افریقہ اور ان جیسے دوسرے ممالک میں آج تک یہ طبقاتی امتیاز مجرمین کے ساتھ' اس ترقی یافتہ دور میں بھی' روا رکھا جاتا ہے جہاں سفید فام اشراف کو معاف کر دیا جاتا ہے' جبکہ رنگ دار ضعیف اور ناتواں لوگوں کے لئے کوئی معافی نہیں ہوتی۔ یہ ہے جاہلیت اور جاہلیت جہاں بھی ہو اور جب بھی ہو اور جیسے بھی ہو وہ جاہلیت ہی ہے۔

لونڈیوں کے ساتھ آزاد لوگوں کا نکاح محض رخصت ہے' اس شخص کے لئے جو فتنے میں پڑنے سے ڈرتا ہو' یا جسے بہت زیادہ مشقت اٹھانی پڑ رہی ہو۔ جو شخص بغیر کسی مشقت یا بغیر کسی بدکاری میں پڑنے کے احتمال کے صبر کر سکتا ہو تو اس کے لئے یہ بہتر ہے اس لئے کہ غلام عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے سے بہرحال خاندان کا ماحول خراب ہو سکتا ہے۔

(لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۴: ۲۵)) "یہ سہولت ان لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے جن کو شادی نہ کرنے سے بند تقویٰ ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو' لیکن اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر حد سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا' نہ انہیں مشقت میں ڈالتا ہے' اور نہ انہیں فتنے میں ڈالتا ہے۔ بے شک اللہ کا وہ نظام زندگی جو اس نے ان لوگوں کے لئے پسند کیا ہے' ان لوگوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ ترقی کریں' بلند ہوں اور عالی شان ہوں' مگر وہ سب تقاضے انسان کے فطری حدود و قیود کے اندر کرتا ہے۔ یہ تقاضے ان کی حدود استطاعت کے اندر ہوتے ہیں اور ان کی حقیقی ضروریات کے دائرے کے اندر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی ایک سہل نظام زندگی ہے۔ وہ انسانی فطرت کو پیش نظر رکھتا ہے' وہ انسان کی حقیقی ضروریات سے بھی باخبر ہے' اور وہ انسانی ضرورت کی مقدار سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ ہاں اسلام یہ طرز عمل بہرحال اختیار نہیں کرتا کہ وہ ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کرے اور وہ گندگیوں میں گرتے چلے جائیں اور یہ بھی وہ برداشت نہیں کرتا کہ اس کے سامنے لوگ گندگی میں لت پت پڑے ہوں اور وہ اس گندگی پر ان کی تعریف کرے یا مبارکباد دے اور حوصلہ افزائی کرے۔ بلکہ وہ ان پر یہ فریضہ عائد کرتا ہے کہ وہ اس گندگی سے نکلنے کی سعی کریں اور سربلند ہونے کی کوشش کریں' یا وہ ان نتائج سے بری الذمہ ہوں جن تک وہ اس گراوٹ اور دھوکے خوری کا مقابلہ نہ کرنے کی وجہ سے پہنچے ہوں۔

یہاں مسلمانوں کو یہ تلقین بھی کی جا رہی ہے کہ وہ صبر کریں یہاں تک کہ انہیں آزاد عورتوں کے ساتھ نکاح پر قدرت حاصل ہو جائے۔ اس لئے کہ حصن نکاح میں آزاد عورتوں کو لانا ان کا پہلا حق ہے۔ وہ اس بات کی حقدار ہیں کہ خاندان کی تعمیر شریف زادیوں پر ہو' اور وہ شریف زادوں کو جنم دیں اور نوخیز نسلوں کے ساتھ یہ شریف زادیاں احسان کریں' اور اپنے خاوندوں کی عزت محفوظ رکھیں۔ ہاں اگر کسی کو یہ خطرہ ہو کہ وہ بدکاری میں مبتلا ہو جائے گا اور مقابلہ نہ کر سکے گا اور یہ کہ وہ صبر و انتظار کی مشقت برداشت نہیں کر سکتا تو اس کے لئے رخصت ہے کہ وہ لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرے اور اس رخصت میں بھی یہ کوشش کی گئی ہے کہ لونڈیوں کی حیثیت کو اونچا کیا جائے۔ اور ان کو پھر یہ اعزاز بخشا گیا ہے کہ وہ تمہاری جوان عورتیں ہیں اور تم ہی ان کے اہل ہو اور تم ایک ہی گروہ ہو' اور تمہارے درمیان ایمان کا مضبوط رشتہ موجود ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان کی ایمانی حالت کا اچھی طرح علم ہے' اور یہ کہ ان لونڈیوں کے لئے پھر مہر لازم اور فرض ہے' اور لونڈیوں کے ساتھ بھی تمہیں نکاح ہی کرنا ہو گا' نہ آزاد شہوت رانی ہو گی اور نہ ہی خفیہ دوستی اور اگر نکاح کے بعد یہ لونڈیاں بدکاری کا ارتکاب کریں تو وہ بھی مسئول ہوں گی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی سزا' ان کے ظروف و احوال کے لحاظ سے ذرا ہلکی ہو گی اس لئے کہ (وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۴: ۲۵)) "اللہ بخشنے والا اور رحم والا ہے۔" یعنی وہ غفور و رحیم ہے کہ اس نے تمہیں مجبوری کی حالت میں غلام عورتوں کے ساتھ نکاح کی اجازت دے دی اور پھر وہ رحیم ہے کہ اس نے لونڈیوں کی سزامیں ان کے ظروف و احوال کی وجہ سے تخفیف کی۔ جہاں بھی کسی غلطی کے ارتکاب کا ذکر ہو' یا جہاں بھی انسان کی ذاتی کمزوری اور مجبوری کے کسی امر کا تذکرہ ہو وہاں آخر میں غفور و رحیم کی تعقیب آتی ہے۔

---ooo---

اس کے بعد ان تمام مباحث اور احکام پر ایک جامع اختتامیہ آتا ہے' یعنی وہ تمام احکام جو اللہ تعالیٰ نے اسلامی نظام حیات میں ایک خاندان کی تنظیم سے متعلق صادر کئے' تاکہ وہ اس نوخیز اسلامی سوسائٹی کو جاہلیت کے نشیب سے نکال کر بلند کر دے' اس کی نفسیاتی' اخلاقی اور اجتماعی سطح کو بلند کر کے ایک روشن' پاک اور ممتاز مقام تک پہنچا دے۔ تو اب یہ جامع اختتامیہ آتا ہے' جس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کے لئے' اسلامی نظام زندگی میں ان احکام کے ذریعے کیا چاہتے ہیں' وہ اس کی تنظیم اور ضابطہ بندی کیوں کرتے ہیں اور اس کے مقابلے میں جو لوگ آزاد شہوات رانی (Free Sex) کے داعی ہیں ان کے مقاصد کیا ہیں؟

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۲۶) وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۟ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا (۲۷) يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (۲۸)

"اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان طریقوں کو واضح کرے اور انہی طریقوں پر تمہیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے

ہوئے صلحاء کرتے تھے ۔ وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے ' اور وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی ۔ ہاں ' اللہ تو تم پر رحمت کے ساتھ توجہ کرنا چاہتا ہے مگر جو لوگ اپنی خواہشات ' نفس کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ راست سے ہٹ کر دور نکل جاؤ ۔ اللہ تم پر پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے ۔ کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے ۔" اللہ جل شانہ اپنے بندوں کے ساتھ بہت ہی نرمی برتتے ہیں ' اس لئے وہ ان کے سامنے اپنی حکمت قانون سازی بھی کھول کر بیان فرماتے ہیں ۔ وہ ان کو بتاتے ہیں کہ اپنے بندوں کے لئے وہ جو نظام زندگی تجویز کرتے ہیں اس میں ان کے لئے خیر ہی خیر ہے اور سہولت ہی سہولت ہے ۔ وہ ان کو اس ممتاز اور بلند مقام پر فائز کر کے ان کی عزت افزائی کر رہے ہیں ' وہ بلند مقام جس میں وہ خود ان سے ہمکلام ہوتے ہیں ' اور ان کو اپنی حکمت تشریعی بتاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ وہ ان کے سامنے اظہار خیال کرتے ہیں ۔ (یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُبَیِّنَ (٤: ٢٦)) "اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان طریقوں کو واضح کرے ۔" اس کا ارادہ ہے کہ وہ تم پر اپنی حکمت و دانائی کا انکشاف کرے ۔ وہ چاہتا ہے کہ تم اس حکمت کو بچشم سر دیکھو ' اس پر غور کرو ' اور اسے اس حال میں قبول کرو کہ تمہاری آنکھیں کھلی ہوں ' تمہارے دل آمادہ ہوں اور تمہاری عقل انہیں تسلیم کر رہی ہو ' اس لئے کہ اسلامی نظام حیات کے احکام معموں اور پہیلیوں پر مبنی نہیں ہیں ۔ وہ محض آمرانہ احکام نہیں جن کی نہ حکمت ہو اور نہ ہی ان کے کچھ مقاصد ہوں ۔ تم تو ان احکام کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہو ' تم اس حکمت اور فلسفے کو بھی پا سکتے ہو جو ان احکام کی تہہ میں کارفرما ہے ۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اللہ حکیم ہے ' یہ انسان کے لئے ایک بڑا اعزاز ہے اور اس کی حقیقت کو وہی شخص جانتا ہے جو حقیقت الوہیت اور حقیقت بندگی کو اچھی طرح جان سکتا ہو ' غرض جو شخص یہ ادراک رکھتا ہو ' وہی اللہ کی اس شان کریمی اور مقام لطف و کرم کو سمجھ سکتا ہے ۔

(وَ یَهْدِیَكُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (٤: ٢٦) اور انہی طریقوں پر تمہیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحاء کرتے تھے ۔" تو گویا یہی وہ منہاج حیات ہے جسے اللہ نے تمام مومنین کے لئے جاری کیا ہے ۔ وہ ایک ایسا منہاج ہے جس کی بنیادیں بہت ہی مستحکم ہیں ' جس کے اصول ایک ہیں ' جس کے مقاصد اور اہداف ہم آہنگ ہیں ' اور یہی منہاج جماعت مومنہ کا نظام زندگی ہے ' زمانہ ماضی میں بھی اور زمانہ مستقبل میں بھی ' اور یہی امت مسلمہ کا منہاج ہے جو صدیوں سے ایک امت چلی آ رہی ہے ۔

یوں وہ تمام لوگ ' قرآن کریم کی نظروں میں ایک ہیں ' جنہوں نے راہ ہدایت کو پایا چاہے وہ جس دور میں ہوں اور جس جگہ ہوں اور پھر قرآن کریم یہ قرار دیتا ہے کہ ہر دور میں اور ہر جگہ اسلامی نظام زندگی بھی ایک رہا ہے ۔ اسی طرح زندگی کی طویل شاہراہ پر وہ قافلہ ایمان بھی ایک ہی ہے جو مسلسل حرکت میں ہے ۔ یہ وہ جھلک ہے ' جو ایک مسلمان کو یہ شعور عطا کرتی ہے کہ اس کی اصلیت کیا ہے ' اس کی امت اور پارٹی کیا ہے ' اس کا منہاج اور طریقہ زندگی کیا ہے ؟ ایک مومن یہ شعور پاتا ہے کہ وہ اس امت کا فرد ہے جو مومن باللہ ہے ' اس امت کا باہم رابطہ "الٰہی منہاج" زندگی ہے ۔ زمان و مکان کے بڑے اختلاف کے باوجود یہ رابطہ قائم رہتا ہے ' رنگوں اور ملکوں کے اختلاف اور دوری کے باوجود یہ تعلق قائم و دائم رہتا ہے اور ہر قوم اور ہر قبیلے کے مومنین کے درمیان یہ سنت الٰہی ایک مستحکم رابطے کا کام کرتی ہے ۔

(وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ) "وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔" وہ اللہ جل شانہ 'تمہیں ہربات کی تفصیلات بتاتے ہیں' ان اچھے راستوں کی نشاندہی کرتے ہیں' جن پر تم جیسے پہلے لوگ چل چکے ہیں۔ یہ کام وہ اس لئے کرتا ہے کہ وہ رحیم ہے' اس لئے کرتا ہے کہ تم واپس آجاؤ' تم راہ معصیت کو ترک کر دو' اور زندگی کی اس کھلی شاہراہ پر آجاؤ جو اس نے تمہارے لئے خوبصورتی کے ساتھ تیار کی ہے' اور اس راہ پر چلانے کے لئے وہ تمہارا معاون بھی ہے۔

(وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (٤ : ٢٦)) "وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی۔" اس لئے وہ تمہارے لئے جو قانون سازی کر رہا ہے وہ علم و حکمت پر مبنی ہے' وہ جو ہدایات دے رہا ہے' وہ علم و حکمت پر مبنی ہیں۔ وہ تمہاری نفسیات سے بھی آگاہ ہے اور تمہارے حالات بھی اس کی نظر میں ہیں۔ وہ ان تدابیر سے بھی باخبر ہے جن کے ذریعے تمہاری اصلاح بھی ہو سکتی ہے اور وہ تمہارے لئے مفید بھی ہیں۔ وہ اسلامی نظام کے مزاج سے بھی واقف ہے اور اسے اس کے نفاذ کا طریقہ کار بھی اچھی طرح معلوم ہے۔

---ooo---

(وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا (٤ : ٢٧)) "اللہ تو تم پر رحمت کے ساتھ توجہ کرنا چاہتا ہے' مگر جو لوگ اپنی خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ راست سے ہٹ کر دور نکل جاؤ۔"

اس مختصر اور ایک ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے لئے کیا چاہتے ہیں اور کیسے نظام کے ذریعے چاہتے ہیں' کس طریقے سے چاہتے ہیں؟ اور جو لوگ نظام زندگی کو صرف جنسی تعلقات (Sex) پر استوار کرنا چاہتے ہیں اور جو انسانوں کو اسلامی نظام زندگی سے ہٹانا چاہتے ہیں وہ انسان کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بھی اسلامی منہاج سے ہٹ کر کسی دوسرے منہاج کو اختیار کرتے ہیں' ان کا نظام شہوات پر مبنی ہوتا ہے۔ صرف ایک اسلامی نظام زندگی ہی ہے جو سنجیدگی' سچائی' راستی اور احساس ذمہ داری پر مبنی ہے۔ باقی جس قدر نظام ہیں وہ اتباع نفس' اطاعت شہوت اور فسق و فجور اور کج روی و گمراہی پر مبنی ہیں۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنے منہاج سے اچھی طرح آگاہ کر رہا ہے۔ اپنے طریقے تشریح کے ساتھ بیان کرتا ہے تو اس سے اس کی غرض کیا ہے؟ صرف یہ کہ وہ انسانوں پر رحمت اور شفقت کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ تمہیں راہ راست کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ تمہیں آگاہ کرتا ہے کہ زندگی کی راہوں میں فلاں فلاں مقامات ہیں جہاں پھسلنے کا خطرہ ہے۔ وہ سربلندی اور ترقی میں تمہاری امداد کرنا چاہتا ہے' تاکہ تم بلندی کی انتہاؤں کو چھو سکو۔ اس کے مقابلے میں جو لوگ اپنے نظاموں کو صرف شہوات کی تلاش پر رکھتے ہیں اور وہ لوگوں کے لئے شہوت پر مبنی نظامہائے زندگی تجویز کرتے ہیں اور انہیں خوب سجاتے ہیں' جن کی اسلامی نظام حیات کی رو سے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ نے ان کی اجازت دی ہے نہ اسے جائز قرار دیا ہے۔ یہ لوگ صرف یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان راہ راست سے ہٹ کر دور تک گمراہی کی راہوں پر نکل

جائیں اور اسلامی نظام زندگی اور اس کی انتہائی بلندیوں سے محروم ہو جائیں ۔

زندگی کے اس شعبے میں جس کی سابقہ آیات میں ہدایات دی گئیں 'یعنی خاندان کی شیرازہ بندی' سوسائٹی کی طہارت' مرد و زن کے باہمی تعلقات کے لئے واحد پاک و صاف طریقہ کار کے تعین اور اس کے سوا تمام طریقوں کے ساتھ جنسی ملاپ کی حرمت 'ان کی مذمت اور مسلمانوں کی فکر ونظر میں ان کی گراوٹ و قباحت کا شعور پیدا کرنے کے لئے اس شعبے میں اللہ تعالیٰ کا منصوبہ کیا ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور ان لوگوں کا منصوبہ کیا ہے جو صرف شہوت رانی پر انسانی سوسائٹی کو استوار کرنا چاہتے ہیں؟

اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا جو منصوبہ ہے 'اس کا بیان تو سابقہ آیات میں تفصیل کے ساتھ کر دیا گیا' جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرد و زن کے اس تعلق کو منظم کرنا چاہتے ہیں ۔اس تعلق کو پاک و صاف اور مقدس بنانا چاہتے ہیں اور اسے اس طرح استوار کرنا چاہتے ہیں کہ وہ جماعت مسلمہ کے لئے ہر حال میں خیر ہی خیر ہو۔

رہے وہ لوگ جو صرف شہوت رانی چاہتے ہیں تو وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ یہ فطری میلانات ہر طرح سے بے قید ہو جائیں ۔ ان پر نہ کوئی دینی پابندی ہو' نہ اخلاقی پابندی ہو اور نہ کوئی اجتماعی پابندی ہو۔وہ چاہتے ہیں کہ شہوت کی یہ بھٹی بلا روک وٹوک گرم سے گرم تر ہوتی چلی جائے 'اس پر کسی قسم کا قدغن نہ ہو' اور وہ اس قدر گرم ہو کہ ہر دل بے قرار ہو جائے 'اعصاب پر کوئی کنٹرول نہ رہے اور اس طرح کوئی گھر مطمئن نہ ہو۔کسی کی عزت محفوظ نہ رہے 'کسی خاندان کا وجود باقی نہ رہے اور انسانوں کی حالت یہ ہو جائے کہ وہ جانوروں کا گلہ بن جائیں اور پھر ان کے نر (Male) جانور مادہ (Female) جانوروں کو دیکھتے ہی ان پر ٹوٹ پڑیں' ان کے لئے قوت' وسائل اور تدبیر کے سوا کوئی ضابطہ نہ ہو' یوں پورا معاشرہ بگڑ جائے ۔ ہر طرف فساد ہی فساد ہو' آزادی کے نام پر ہر طرف شر و فساد برپا ہو آزادی کا اگر صرف یہ ہی مفہوم ہے تو وہ صرف آزادی شہوات ہے اور اس پر مبنی نظام صرف شہوانی نظام ہے ۔

یہ ہے وہ گمراہی اور کج روی جس سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ڈراتا ہے' وہ انہیں متنبہ کرتا ہے کہ اس شہوانی نظام حیات کے داعی انہیں کس چیز کی طرف بلا رہے ہیں۔ شہوانی نظام کے داعی اس وقت یہ جدوجہد کر رہے تھے کہ نوخیز اسلامی معاشرے کو پلٹا کر دوبارہ اخلاقی بے راہ روی کے نظام کی طرف لے جائیں جس میں وہ بہت دور جا نکلے تھے' اور اسلام کے پاک و صاف اور مستحکم معاشرتی نظام کی وجہ سے وہ اس میں اکیلے رہ گئے تھے' اور یہی وہ ہدف ہے جس کی طرف آج کے یہ بے راہ فنکار اور ادیب دعوت دے رہے ہیں اور جس میں آج کے تمام ذرائع ابلاغ و تفریح رات دن مصروف ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ آج اسلامی معاشرے میں' حیوانی شہوت رانی کی راہ میں جو تھوڑی بہت رکاوٹیں ہیں' انہیں بھی ختم کر دیں۔یہ حقیقت ہے کہ اس حیوانیت سے انسان کو صرف اسلامی نظام زندگی ہی نجات دے سکتا ہے جب اسلام کی انقلابی قوتیں 'اگر اللہ نے چاہا' اس نظام کو دنیا میں نافذ کر دیں گی۔

---ooo---

اس اختتامیہ کی آخری جھلک میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انسان ایک ضعیف مخلوق ہے اور اس کی ان کمزوریوں ہی کی وجہ سے اللہ کو اس پر رحم آتا ہے ۔اس لئے اللہ اس کے لئے جو منہاج حیات وضع کرتا ہے اور جو قانون بناتا ہے اس میں وہ اس ضعف کو ملحوظ رکھتا ہے' اس لئے ہلکے پھلکے احکام نازل کرتا ہے' اس کے لئے مشکلات پیدا کرنے کے بجائے

اس کے لئے آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ حرج' مشقت' مضرت سے بچاتا ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (۴ : ۲۸) "اللہ تم پر عائد شدہ پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔"

گزشتہ آیات میں خاندانی نظام کے بارے میں جو احکام دیئے گئے ہیں اور قانون سازی کی گئی ہے اور جو ہدایات دی گئی ہیں ان میں تو تخفیف بالکل واضح نظر آتی ہے۔ مثلاً انسان کے فطری میلانات اور جنسی خواہش کو تسلیم کیا گیا ہے۔ صرف اس جذبے کو منظم کر کے اس کا رخ تعمیری خطوط کی طرف موڑ دیا گیا ہے' جس کے استعمال کے لئے پاک و صاف دائرہ کار مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس کے لئے پاک و صاف اور بہترین ماحول بنایا گیا ہے' اور یہ حکم نہیں دیا گیا کہ انسان اپنی اس فطری خواہش کو دبائے یا اس کا قلع قمع کر دے یا اسے اس طرح آزاد چھوڑ دے کہ وہ حیوانی سطح تک گر جائے اور اس کے لئے کوئی حد اور قید نہ ہو۔

خاندانی زندگی کے علاوہ اسلامی نظام زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی قانون سازی کے سلسلے میں تخفیف اور آسانی ہر جگہ صاف نظر آتی ہے۔ انسانی فطرت کا لحاظ رکھا گیا ہے' انسان کی طاقت اور وسعت کو پیش نظر رکھا گیا ہے' انسانی حاجات اور ضروریات کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور انسان کی تمام تعمیری قوتوں کو آزاد چھوڑا گیا ہے۔ تاہم ان کے استعمال کے لئے ایسے حدود و قیود رکھے ہیں جن کی وجہ سے ان کے غلط استعمال کی نوبت ہی نہیں آتی۔

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ مرد و زن کے جنسی تعلقات پر اسلام نے جو قیود عائد کی ہیں ان کی پابندی بہت ہی دشوار ہے اور جو لوگ آزاد شہوت رانی کے اصول پر چلتے ہیں ان کے ساتھ چلنا آسان اور فرحت بخش ہے۔ یہ ایک عظیم غلط فہمی ہے اس لئے کہ جنسی تعلق کو بالکل آزاد چھوڑنا' مرد و زن کے تعلق میں صرف لذت اندوزی کو اختیار کرنا' اور عالم انسانیت میں جنسی ملاپ کو اس سطح تک لے آنا جس طرح حیوانوں میں جنسی ملاپ ہوتا ہے' اور اس طرح ان تمام فرائض اور واجبات اور اجتماعی ذمہ داریوں کو ختم کر دینا اور مرد و زن کے اس تعلق کو ہر قسم کے قید و بند سے آزاد کر دینا خواہ وہ اخلاقی قید ہو یا اجتماعی' یہ تمام باتیں بظاہر تو بہت آسان' پرکیف اور خوش کن تصور کی جائیں گی لیکن اپنے حقیقی نتائج کی روشنی میں وہ بہت ہی بھاری' جان توڑ اور تباہ کن ہیں اور ایک فرد اور ایک معاشرے پر اس کے جو برے اثرات پڑتے ہیں ان کے نتائج سخت اذیت ناک' مہلک اور تباہ کن ہوتے ہیں۔ وہ معاشرے' جنہوں نے جنسی آزادی کی اس بے راہ روی کو اپنایا ہے' اور دینی اخلاق اور شرم و حیا کے قیود سے آزاد ہو گئے ہیں' ان کے حالات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے دل کانپ اٹھتا ہے بشرطیکہ دل میں زندگی کی رمق باقی ہو۔

دنیا میں جو جو قدیم تہذیبیں نیست و نابود ہوئیں' ان کی بربادی کا عامل اساسی ان کی جنسی بے راہ روی ہی تھی۔ خواہ یہ تہذیب یونانی تہذیب ہو' رومی تہذیب ہو یا قدیم ایرانی تہذیب ہو' ان سب کے زوال کا اساسی سبب ان کی جنسی بے راہ روی ہی تھی۔ آج ہمارے دور میں مغربی تہذیب میں جو شکست و ریخت ہو رہی ہے وہ بھی اسی جنسی انارکی کی وجہ سے ہے۔ خصوصاً آج کے فرانسیسی معاشرے کی تباہی کے آثار تو بالکل ظاہر ہیں' جس نے اس جنسی انارکی کو سب سے پہلے اپنایا۔ تہذیب جدید کے دیگر ممالک' امریکہ' سویڈن' برطانیہ اور دوسری نام نہاد ترقی یافتہ مغربی سوسائٹیوں

میں اس شکست و ریخت کے آثار نمودار ہوگئے ہیں۔ فرانس میں اس جنسی انارکی کے آثار بہت پہلے نمودار ہوئے تھے۔ ۱۸۷۰ کے بعد فرانس نے جس قدر جنگوں میں بھی حصہ لیا' ان میں اسے دشمن کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ تمام آثار و شواہد اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ فرنچ سوسائٹی مکمل طور پر تباہی کے کنارے کھڑی ہے اور پہلی عالمی جنگ کے بعد یہ آثار اچھی طرح کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ مولانا مودودی ﷫ لکھتے ہیں :

''شہوانیت کے اس تسلط کا اولیں نتیجہ یہ ہے کہ فرانسیسیوں کی جسمانی قوت رفتہ رفتہ جواب دیتی چلی جا رہی ہے' دائمی جنسی ہیجانات نے ان کے اعصاب کمزور کر دیئے ہیں۔ خواہشات کی بندگی نے ان میں ضبط اور برداشت کی طاقت کم ہی باقی چھوڑی ہے۔ امراض خبیثہ کی کثرت نے ان کی صحت پر نہایت مہلک اثر ڈالا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے یہ کیفیت ہے کہ فرانس کے فوجی حکام کو مجبوراً ہرچند سال کے بعد نئے رنگروٹوں کے لئے جسمانی اہلیت کے معیار کو گھٹا دینا پڑتا ہے کیونکہ اہلیت کا جو معیار پہلے تھا اب اس معیار کے نوجوان قوم میں کم سے کم تر ہوتے جارہے ہیں۔ یہ ایک معتبر پیمانہ ہے جو تھرمامیٹر کی طرح قریب قریب یقینی صحت کے ساتھ بتاتا ہے کہ فرنچ قوم کی جسمانی قوتیں کتنی تیزی کے ساتھ بتدریج گھٹ رہی ہیں۔ امراض خبیثہ اس تنزل کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہیں۔ جنگ عظیم اول کے ابتدائی دو سالوں میں جن سپاہیوں کو محض آتشک کی وجہ سے رخصت دے کر ہسپتالوں میں بھیجنا پڑا ان کی تعداد ۷۵۰۰۰ تھی۔ صرف ایک متوسط درجے کی فوجی چھاؤنی میں بیک وقت دو سو بیالیس سپاہی اس مرض میں مبتلا ہوئے۔ ایک طرف اس وقت کی نزاکت کو دیکھئے کہ فرانسیسی قوم کی موت و حیات کا فیصلہ درپیش تھا اور اس کے وجود و بقا کے لئے ایک ایک سپاہی کی جانفشانی درکار تھی۔ ایک ایک فرانک بیش قیمت تھا' اور وقت 'قوت' وسائل ' ہر چیز کی زیادہ سے زیادہ مقدار دفاع میں خرچ ہونے کی ضرورت تھی' دوسری طرف اس قوم کے جوانوں کو دیکھیے کہ کتنے ہزار افراد عیاشی کی بدولت نہ صرف خود کئی کئی مہینوں کے لئے بیکار ہوئے بلکہ انہوں نے اپنی قوم کی دولت اور وسائل کو بھی اس آڑے وقت میں اپنے علاج پر ضائع کرایا۔

ایک فرانسیسی ماہر فن ڈاکٹر لیریڈ کا بیان ہے کہ فرانس میں ہر سال آتشک اور اس کی پیدا کردہ امراض کی وجہ سے تیس ہزار جانیں ضائع ہوتی ہیں اور دق کے بعد یہ مرض سب سے زیادہ ہلاکتوں کا باعث ہوتا ہے۔ یہ صرف ایک مرض خبیث کا حال ہے۔ اور امراض خبیثہ کی فہرست صرف اسی ایک مرض پر مشتمل نہیں ہے۔''

''فرانس میں سالانہ صرف سات آٹھ فی ہزار کا اوسط ان مردوں اور عورتوں کا ہے جو ازدواج کے رشتے میں منسلک ہوتے ہیں۔ یہ اوسط خود اتنا کم ہے کہ اسے دیکھ کر آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آبادی کا کتنا کثیر حصہ غیر شادی شدہ ہے۔ پھر اتنی قلیل تعداد جو نکاح کرتی ہے' ان میں بھی بہت کم لوگ ایسے ہیں جو باعصمت رہتے ہیں اور پاک اخلاقی زندگی بسر کرنے کی نیت سے نکاح کرتے ہیں۔ اس ایک مقصد کے سوا ہر دوسرا ممکن مقصد ان کے پیش نظر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ عامتہ الورود مقاصد میں ایک یہ بھی ہے کہ نکاح سے پہلے ایک عورت نے جو بچہ ناجائز طور پر جنا ہے نکاح کر کے اس مولود کو جائز بنا دیا جائے۔ چنانچہ پول بیورو لکھتا ہے کہ فرانس کے کام پیشہ لوگوں (Working Class) کا یہ عام دستور ہے کہ نکاح سے پہلے عورت اپنے ہونے والے شوہر سے اس بات کا وعدہ لے لیتی ہے کہ وہ اس کے بچہ کو اپنا بچہ تسلیم کرے گا۔ ۱۹۱۷ میں سین (Seine) کی عدالت دیوانی کے سامنے ایک عورت نے بیان دیا کہ میں نے شادی

کے وقت ہی اپنے شوہر کو اس بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ اس شادی سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے قبل از نکاح آزادانہ تعلقات سے جو بچے پیدا ہوئے ہیں ان کو "حلالی" بنا دیا جائے۔ باقی رہی یہ بات کہ میں اس کے ساتھ بیوی بن کر زندگی گزاروں تو یہ بات نہ اس وقت میرے ذہن میں تھی نہ اب ہے۔ اس بناء پر جس روز شادی ہوئی اسی روز ساڑھے پانچ بجے میں اپنے شوہر سے الگ ہوگئی اور آج تک میں اس سے نہیں ملی کیونکہ میں فرائض زوجیت ادا کرنے کی کوئی نیت نہ رکھتی تھی۔"

"پیرس کے ایک مشہور کالج کے پرنسپل نے پول بیورو سے بیان کیا کہ عموماً نوجوان نکاح میں صرف یہ مقصد پیش نظر رکھتے ہیں کہ گھر پر بھی ایک داشتہ کی خدمات حاصل کرلیں۔ دس بارہ سال تک وہ ہر طرف آزادانہ مزے چکھتے پھرتے ہیں۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ اس قسم کی بے ضابطہ آوارہ زندگی سے تھک کر وہ ایک عورت سے شادی کرلیتے ہیں تاکہ گھر کی آسائش بھی کسی حد تک بہم پہنچے اور آزادانہ ذواقی کا لطف بھی حاصل کیا جاتا رہے۔" ((دیکھئے الحجاب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ﷺ امیر جماعت اسلامی پاکستان ص ۱۱۳-۱۱۴(سید قطب ﷺ) دیکھئے پردہ طبع اسلامک پبلیکیشنز لاہور۔ طبع ۲۷ ص ۹۱ تا ۹۵ لاہور جون ۱۹۸۵)) یوں فرانس تباہ ہوا اور اس کے نتیجے میں فرانس نے ہر اس جنگ میں ہزیمت اٹھائی جس میں وہ شریک ہوا۔ اور اب اس کی حالت یہ ہوگئی ہے کہ وہ تہذیب و تمدن کے اسٹیج سے آہستہ آہستہ غائب ہو رہا ہے اور کسی بھی وقت اپنے وجود ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا اور یوں سنت الٰہیہ کا ظہور نہایت ہی دھیمی رفتار سے ہوتا ہے۔ اور انسان اگرچہ ہر معاملے میں جلد بازی سے کام لیتا ہے لیکن سنت الٰہیہ کی اپنی رفتار ہوتی ہے۔

رہے وہ ممالک جو ابھی تک پر شوکت نظر آتے ہیں یا ان میں تباہی اور ہلاکت کے آثار ابھی تک ظاہر ہو کر سامنے نہیں آئے ہیں تو ان کے نمونے یہ ہیں :

ایک صحافی جنہوں نے حال ہی میں سوئٹزرلینڈ کا دورہ کیا ہے۔ وہ اس ملک کے اشتراکی معاشرے، اس کی اجتماعی سہولتوں اور اس کی مادی ترقیات اور خوشحالیوں سے بحث کرتے ہوئے اس میں آزادی محبت کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

"اگر ہمارے خواب یہی ہوں کہ ہم اپنی قوم کے لئے وہی ممتاز اقتصادی مقام چاہتے ہیں جو ان مغربی ممالک میں ہے، اور ان کامیاب اشتراکی رجحانات کے مطابق، معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان امتیازات کو ختم کر دیں اور ہم اپنے اس ملک مصر کے ہر شہری کی راہ سے وہ تمام مشکلات حیات ختم کر دیں جن کے ختم کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اگر ہم اپنے اس خوش کن خواب تک پہنچ جائیں جس کے حقیقت بنانے میں ہم اپنی پوری قوت اور پوری امکانیت کو ختم کر رہے ہیں، تو پھر یہ اہم سوال پیدا ہوگا کہ ہم اس مادی ترقی کے تمام دوسرے نتائج کو بھی اپنے ہاں قبول کرلیں گے کیا ہم اس مثالی معاشرے کے تاریک پہلو کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔ کیا ہم آزادانہ تعلق مرد و زن کو قبول کرلیں گے اور خاندانی نظام پر پڑنے والے اس کے برے اثرات کو بھی قبول کرلیں گے۔"

"آیئے ذرا اعداد و شمار کی زبان میں بات کریں۔ زندگی کے اندر قرار و سکون پیدا کرنے کی موجودہ حوصلہ افزائیوں اور تشکیل خاندان کی حالیہ مساعی کے باوجود، سویڈن کی آبادی کا گراف مسلسل گر رہا ہے۔ باوجود اس کے کہ موجودہ حکومت عورت کو شادی کرنے کے لئے بہت امداد دے رہی ہے۔ پھر عورت کے بچے کی مفت کفالت کی جاتی ہے، یہاں

تک کہ وہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو جائے۔ان سہولیات کے باوجود سویڈن کا ہر خاندان بچے پیدا کرنے سے مکمل احتراز کر رہا ہے۔

"اس کے برعکس صورت حال یہ ہے کہ شادی کرنے والوں کی تعداد میں مسلسل کمی واقع ہو رہی ہے اور ناجائز بچوں کی پیدائش میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے بیس فیصدی بالغ لڑکے اور لڑکیاں سرے سے شادی ہی نہیں کرتے۔ سویڈن میں صنعتی دور ۱۸۷۰ میں شروع ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ اشتراکی دور بھی ۱۸۷۰ میں شروع ہوتا ہے۔ ۱۸۷۰ میں غیر شادی شدہ ماؤں کی تعداد سات فیصدی تھی' جبکہ ۱۹۲۰ میں یہ تعداد سولہ فیصدی ہوگئی۔اس کے بعد کے اعداد و شمار مجھے نہیں مل سکے' البتہ ان میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔علمی اداروں نے جو اعداد و شمار شائع کئے ہیں' اس کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ مرد اٹھارہ سال کی عمر میں جنسی تعلقات قائم کر لیتے ہیں اور عورت پندرہ سال کی عمر میں جنسی تعلقات قائم کر لیتی ہے۔اور اکیس سال کی عمر میں پچانوے فیصد نوجوانوں کے جنسی تعلقات قائم ہو چکے ہوتے ہیں۔مزید تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۷ فیصدی تعلقات ان لڑکیوں سے ہوتے ہیں جن کی منگنی ہو چکی ہوتی ہے' پینتیس فیصدی دوستوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور اٹھاون فیصدی ایسی عورتوں کے ساتھ ہوتے ہیں جو وقتی طور پر شناسا ہوتی ہیں۔اب ذرا عورتوں کے تعلقات جنسی کے اعداد و شمار ملاحظہ فرمائیں۔صرف تین فیصدی عورتوں کے تعلقات اپنے خاوند سے ہوتے ہیں' اٹھائیس فیصدی عورتوں کے تعلقات اپنے منگیتر سے ہوتے ہیں اور چونسٹھ فیصد عورتوں کے تعلقات صرف چالو دوستوں سے ہوتے ہیں۔مزید بتایا جاتا ہے کہ اسی فیصد عورتیں شادی سے قبل جنسی تعلقات قائم کر لیتی ہیں اور بیس فیصدی ایسی ہیں جو شادی کا تکلف ہی نہیں کرتیں۔""ان حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ اس جنسی آزادی کی وجہ سے بالعموم شادی بہت ہی لیٹ کی جاتی ہے' اور منگنی ہو جائے تو اس میں شادی کی میعاد بہت ہی طویل ہوتی ہے اور اس کے ساتھ غیر قانونی بچوں کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے۔"

ان سب حالات کے نتیجے میں خاندانی نظام کے بندھن ٹوٹ گئے۔سویڈن کے باشندے محبت کی آزادی کے حق میں درج ذیل دلائل پیش کرتے ہیں: یہ کہ سویڈن کا معاشرہ شادی کے بعد تمام دوسرے متمدن معاشروں کی نسبت خیانت کو بہت ہی بری نظروں سے دیکھتا ہے۔اور یہ بات درست ہے اور ہم اس کا انکار نہیں کرتے۔لیکن وہ اس بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے اور اس جنسی بے راہ روی کی وجہ سے نسلی تنزل اور طلاق کے اعداد و شمار میں بے حد اضافے کا کوئی تشفی بخش سبب نہیں بتا سکتے۔

اس وقت سویڈن میں طلاق کی شرح پوری دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔چھ سات شادیوں میں سے ایک طلاق پر منتج ہوتی ہے۔اور یہ اعداد و شمار سویڈن کی اجتماعی امور کی وزارت کے شائع کردہ ریکارڈ سے لئے گئے ہیں۔یہ نسبت ابتداء میں کم تھی مگر آہستہ آہستہ بڑھ گئی اور ۱۹۲۶ میں صورت حال یہ تھی کہ ایک ہزار شادیوں میں سے چھبیس طلاق پر منتج ہوئی تھیں۔ ۱۹۵۲ میں یہ تعداد ایک سو چار ہو گئی۔ ۱۹۵۴ میں ایک سو چودہ ہو گئی۔ ان واقعات کا سبب یہ ہے کہ ۳۰ فیصدی شادیاں محض ضرورت کے تحت مجبوری کے حالات میں ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسی شادیاں اصلی شادیوں کی طرح طویل المیعاد نہیں ہوتیں اور مجبوری یہ ہوتی ہے کہ ایک نوجوان عورت حاملہ ہو جاتی ہے۔عموماً ایسی شادیوں میں بعد میں طلاق ہو جاتی ہے' اس لئے کہ سویڈن کے قانون میں طلاق کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔جب بھی زوجین

درخواست کریں کہ وہ طلاق پر راضی ہیں تو قانون طلاق کی اجازت دے دیتا ہے اور اگر زوجین میں سے کوئی ایک فریق ہی طلاق کی درخواست کرے تو ایک معمولی بہانے پر طلاق ہو جاتی ہے۔"

"سویڈن میں ایک تو جنسی بے راہ روی کی پوری پوری آزادی ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو ایک دوسری آزادی بھی حاصل ہے۔ وہ یہ کہ ہر شخص کو دہری ہونے کی آزادی ہے۔ سویڈن کے باشندوں کی اکثریت منکر خدا ہے۔ سویڈن میں ایک وسیع تحریک چل رہی ہے اور لوگ کنیسہ سے پوری پوری آزادی حاصل کر رہے ہیں۔ ناروے اور ڈنمارک میں بھی انکار خدا عام ہے۔ مدارس اور یونیورسٹیوں میں انکار خدا کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اور نوجوانوں میں انکار خدا کے عقائد ایک منصوبے سے پھیلائے جاتے ہیں۔"

"سویڈن اور سکنڈے نیویا کے دوسرے ممالک کے لوگ پوری طرح اخلاق باختہ ہو چکے ہیں' یہ لوگ اپنے عقیدۂ انکار خدا اور خدا کا خوف نہ رکھنے کی وجہ سے ہر قسم کی اخلاقی قید و بند سے آزاد ہو گئے ہیں اور آخرکار یہاں کے نوجوان شراب نوشی اور دوسری تباہ کن منشیات کے عادی ہو گئے ہیں۔ ایسے بچوں کی تعداد ۱۷۵ ہزار ہے جن کے والدین منشیات کا استعمال کرتے ہیں اور یہ تعداد خاندانی بچوں کا دس فیصد بنتی ہے۔ مراہق بچوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے جو خود نشہ کرتے ہیں۔ جن نوجوانوں کو شدید نشہ کی حالت میں گرفتار کیا جاتا ہے ان کی تعداد گزشتہ پندرہ سالوں میں تین گنا زیادہ ہو گئی ہے اور پندرہ سے سترہ سال کی عمر کے نوجوانوں کے اندر شراب نوشی کی عادت بد سے بدتر ہی جا رہی ہے اور اس کے بہت برے نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔"

"سویڈن میں بالغ ہونے والوں میں ہر دسواں بچہ دماغی اور نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہوتا ہے۔ سویڈن کے ڈاکٹروں کا یہ کہنا ہے کہ ان نفسیاتی بیماروں کا پچاس فیصد وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی دماغی بیماری' ان کی جسمانی بیماری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انکار خدا کی آزادی اور اخلاقی قیود سے آزادی کا یہی نتیجہ ہو سکتا ہے کہ آبادی نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو اور خاندان نظام کی چولیں ڈھیلی پڑ جائیں اور اس کے نتیجے میں گھٹیا درجے کی نسل وجود میں آئے۔"

یہ تو حال تھا سویڈن کا' لیکن امریکہ کا بھی یہی حال ہے۔ اور برائی کے آثار خطرناک طور پر ظاہر ہو رہے ہیں' لیکن امریکی قوم کو اس طرف التفات ہی نہیں ہے۔ امریکی قوم کے وجود میں تباہی کے آثار در آئے ہیں' اگرچہ بظاہر وہ تروتازہ ہے۔ ظاہری قوت اور توانائی کے مظاہر کے باوجود یہ قوم بھی جسمانی اور اخلاقی انحطاط کی طرف جا رہی ہے اور اس کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ امریکہ میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اپنے ملک کے حساس فوجی راز اپنے دشمنوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں' اس لئے نہیں کہ انہیں روپے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ محض اس لئے کہ وہ جنسی بے راہ روی میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان کی یہ بے راہ روی اس عام جنسی آزادی اور بے راہ روی کا نتیجہ ہوتی ہے جو ان کے ملک میں رائج ہے۔ امریکہ میں بعض ریاستوں میں ازروئے قانون طلاق کے لئے یہ شرط ہے کہ خاوند یا بیوی میں سے کوئی زنا کی حالت میں پکڑا جائے۔ اس غرض کے لئے بعض وکلاء اور ڈاکٹروں نے ایک ایسی تنظیم بنائی تھی کہ جو ایسے مقدمات میں مرد یا عورت کو زناکاری میں پھانسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حال ہی میں امریکی پولیس نے ایک ایسی تنظیم کا پتہ چلایا جس کے شعبے کئی شہروں میں تھے۔ حالانکہ وکلاء اور ڈاکٹر مہذب ترین لوگ ہوتے ہیں۔ کئی جوڑے جو طلاق چاہتے تھے' پہلے ایسے اداروں کی خدمات حاصل کر کے اپنے شریک حیات کو زناکاری میں پھانستے اور پھر مقدمہ دائر کر

دیتے ۔ امریکہ میں ایسے دفتر عام ہیں جو بھاگی ہوئی عورتوں اور بھاگے ہوئے خاوندوں کی تلاش میں تعاون فراہم کرتے ہیں اس لئے کہ کسی خاوند کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ جب وہ شام کو گھر آئے گا تو اس کی بیوی موجود ہو گی اور اپنے کسی محبوب کے ساتھ چلی نہ گئی ہو گی ۔ نیز بیوی کو بھی یہ یقین نہیں ہوتا کہ اس کا خاوند شام کو واپس آئے گا یا اس سے زیادہ جاذبیت رکھنے والی کسی دوشیزہ نے اسے سنبھال لیا ہو گا ۔ ایسے معاشرے جن میں خاندانوں کی حالت یہ ہو' ان میں کسی کے اعصاب کیسے مضبوط اور درست رہ سکتے ہیں ۔ اور ایسے حالات میں امریکہ کے ایک صدر اعلان کرتے ہیں کہ ہر سات نوجوانوں میں سے چھ فوجی خدمات کے لئے نا اہل ہو چکے ہیں اس لئے کہ یہ سب جنسی بے راہ روی میں مبتلا ہوتے ہیں ۔

مولانا مودودی ﷫ لکھتے ہیں :

"ایک امریکی رسالے میں ان اسباب کو جن کی وجہ سے وہاں بداخلاقی کی غیر معمولی اشاعت ہو رہی ہے' اس طرح بیان کیا گیا ہے ۔ تین شیطانی قوتیں ہیں جن کی تثلیث آج ہماری دنیا پر چھا گئی ہے اور یہ تینوں ایک جہنم تیار کرنے میں مشغول ہیں ۔ فحش لٹریچر جو جنگ عظیم کے بعد حیرت انگیز رفتار کے ساتھ اپنی بے شرمی اور کثرت اشاعت میں بڑھتا چلا جا رہا ہے ۔ متحرک تصویریں جو شہوانی محبت کے جذبات کو نہ صرف بھڑکا رہی ہیں بلکہ عملی سبق بھی دیتی ہیں ۔ عورتوں کا گرا ہوا اخلاقی معیار جو ان کے لباس' اور بسا اوقات ان کی برہنگی اور سگریٹ کے روز افزوں استعمال اور مردوں کے ساتھ ان کے ہر قید و بند سے ناآشنا اختلاط کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ۔ یہ تین چیزیں ہمارے ہاں بڑھتی چلی جا رہی ہیں اور ان کا نتیجہ مسیحی تہذیب و معاشرے کا زوال اور آخر کار تباہی ہے ۔ اگر ان کو نہ روکا گیا تو ہماری تاریخ بھی روم اور ان دوسری قوموں کے مماثل ہو گی جن کو یہی نفس پرستی اور شہوانیت ان کی شراب اور عورتوں اور ناچ رنگ سمیت فنا کے گھاٹ اتار چکی ہے ۔"

((الحجاب' سید ابوالاعلیٰ مودودی ﷫' ص ۱۲۹ ۔ ۱۳۰ ☆☆☆ اردو ایڈیشن صفحات ۰۵ ۔ ۱ ۔ ۶ ۔ ۱ طبع ۲۷ جون ۱۹۸۵ اسلامک پبلیکیشنز لاہور))

لیکن واقعات کی دنیا میں جو کچھ ہوا' وہ یہ ہے کہ امریکہ اس مثلث کے سیلاب سے نہ بچ سکا بلکہ اس نے اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ۔ وہ اسی راہ پر چل نکلا ہے جس پر روم چلا ۔ ایک دوسرے صحافی امریکہ' برطانیہ اور فرانس کے نوجوانوں میں جنسی بے راہ روی کے سیلاب کے بارے میں لکھتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ہاں نوجوانوں کی بے راہ روی ان ممالک کی طرح شدید نہیں ہے ۔

"امریکہ کے نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان بے راہ روی کا ایک سیلاب آیا ہوا ہے ۔ نیویارک کے گورنر نے اعلان کیا کہ اس بے راہ روی کا علاج' اس ریاست میں' عنقریب قومی اصلاح کے مسائل میں سرفہرست آ جائے گا ۔ گورنر نے مشورہ دیا ہے کہ اصلاحی نرسریاں اور تہذیب اخلاق کی مجالس اور جسمانی تربیت کے اداروں کا قیام ازبس ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ اس نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء اور طالبات کے درمیان منشیات یعنی چرس اور کوکین کے رواج کو ختم کرنا ان کے پروگرام میں شامل نہیں ہے اور یہ معاملہ ہم محکمہ صحت عامہ کے حوالے کر رہے ہیں ۔"

''آخری دو سالوں کی رپورٹ کے مطابق انگلستان میں عورتوں اور نوجوان' چھوٹی نابالغ خواتین پر دست درازی کے واقعات میں بے حد اضافہ ہوا ہے خصوصاً دیہاتی راستوں میں۔ اکثر واقعات میں دست درازی کرنے والے مراھق یا نوجوان تھے اور ان واقعات میں سے بعض واقعات میں بچی یا لڑکی کا گلا گھونٹ کر اسے قتل بھی کر دیا گیا تھا اور اسے ٹھنڈی اور منجمد لاش کی شکل میں چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ بدکرداری کا راز فاش نہ ہو یا یہ کہ شناخت پریڈ کے وقت شناخت نہ ہو سکے۔''

''دو ماہ کا عرصہ ہوا ہے کہ ایک بوڑھا شخص اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ اس نے راہ گزر پر ایک درخت کے نیچے ایک نوجوان کو ایک لڑکی کے ساتھ مباشرت کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ بوڑھا ان کے قریب گیا۔ اس نے لڑکے کو اپنے عصا سے مارا۔ اور زجر و توبیخ کی اور اسے کہا کہ جس فعل کا وہ ارتکاب کر رہا ہے وہ سرعام جائز نہیں ہے۔ لڑکا اٹھا اور اس نے بوڑھے کے پیٹ میں ایک لات رسید کی۔ بوڑھا گرا۔ اس کے بعد وہ اپنے بوٹوں کے ساتھ اسے سر پر مارتا رہا یہاں تک کہ اس کا سر پھوڑ دیا۔ اس لڑکے کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ اور لڑکی کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔''

امریکہ کی ''انجمن چہاردہ'' جو ملک کی اخلاقی صورت حال کی نگران ہے' نے بتایا ہے کہ امریکہ کی نوے فیصد آبادی مہلک خفیہ جنسی امراض کا شکار ہے اور یہ صورت حال اس وقت تھی جبکہ جدید جراثیم کش ادویہ پنسلین اور سٹریپٹو مائیسین ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔

ڈنفر کے ایک جج لکھتے ہیں کہ ہر دو نکاحوں میں سے ایک طلاق پر منتج ہوتا ہے اور مشہور عالمی ڈاکٹر الکسیس کاریل اپنی مشہور کتاب ''انسان نامعلوم'' میں لکھتے ہیں :-

''ہم بچوں کے اسہال' سل' دق اور ٹائی فائیڈ جیسی بیماریوں کی بیخ کنی کے تو بالکل قریب جا پہنچے ہیں لیکن ان بیماریوں کی جگہ اخلاقی بے راہ روی اور اخلاقی بگاڑ کی بیماریوں نے لے لی ہے جس کے نتیجے میں اعصابی اور دماغی بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں امریکہ کی بعض ریاستوں میں عام مریضوں کے مقابلے میں دماغی مریضوں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے۔ جنون کے علاوہ اعصابی اور جسمانی ناتوانی کی بیماریوں میں بھی بے حد اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کے نتیجے میں ہر فرد معصیت زدہ ہو گیا ہے۔ اور خاندانی نظام قریب الاختتام ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ متعدی بیماریوں کے مقابلے میں امریکی تہذیب کے لئے عقلی انحطاط زیادہ مضر ثابت ہو رہا ہے۔ جبکہ ماہرین طب نے اپنی سرگرمیاں ان متعدی بیماریوں کے انسداد تک محدود کر رکھی ہیں۔

یہ ان مصائب اور تکلیفات کی معمولی سی جھلک ہے جو اس گمراہ انسانیت نے اپنے اوپر اس لئے لاد لئے ہیں کہ اس نے ان لوگوں کی پیروی شروع کر دی جو صرف شہوت کے پیروکار بن گئے تھے انہوں نے خدا کے بنائے ہوئے طریقہ زندگی کی پیروی ترک کر کے جدید جاہلیت کو اپنا لیا تھا۔ حالانکہ اسلامی نظام زندگی وہ منہاج تھا جس میں انسان کے ضعف اور کمزوری کو ملحوظ رکھ کر قانون سازی کی گئی تھی' اور اس نظام میں اسے اپنی خواہشات نفس اور شہوانی میلانات کی بندگی سے بچا کر ایک ایسے راستے کی طرف ہدایت دی گئی تھی جو پرامن بھی تھا اور اس پر چل کر انسان کے گناہوں سے رجوع آسان ہو جاتا تھا اور وہ راہ طہارت اختیار کر سکتا تھا۔

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا
عَظِيْمًا (۲۷) يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (۲۸)

"ہاں اللہ تو تم پر رحمت کے ساتھ توجہ کرنا چاہتا ہے مگر جو لوگ خود اپنی خواہشات نفس کی پیروی کر رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ راست سے ہٹ کر دور نکل جاؤ۔ اللہ تم پر سے پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔"

اس سبق کا دوسرا حصہ اسلامی معاشرے کے مابین بعض مالی معاملات پر بحث کرتا ہے' تاکہ باہم معاملات کے طریقے طے کر دیئے جائیں اور اسلامی معاشرے کے ممبران کے درمیاں باہمی معاملات پاک و صاف رہیں۔ نیز اس میں مالی حقوق عورتوں کو بھی ویسے ہی دیئے جائیں جس طرح مردوں کو دیئے گئے ہیں۔ ہر شخص کو اس کا مقرر کردہ حصہ ملے۔ نیز وہ مالی حقوق جو ولایت پر مبنی تھے اور جو دور جاہلیت میں عام طور پر مروج رہے' اور اسلام کے آنے کے بعد بھی ابتدائی دنوں میں وہ مروج تھے' ان کو ختم کر دیا جائے تاکہ اس سابقہ نظام کا تصفیہ کر دیا جائے اور اسلامی نظام میراث کے لئے راہ ہموار ہو جائے جس میں میراث صرف قریبی رشتہ داروں کا حق بنتی ہے اور آئندہ کے لئے قدیم موروثی ولایت کے نظام کو ختم کر دیا جائے۔

---

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ
تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ
عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ
وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ
عَلٰى بَعْضٍ ۚ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۚ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ

وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ﴿۳۲﴾ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدًا ﴿۳۳﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ۔لین دین ہونا چاہئے آپس کی رضامندی سے اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو' یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے۔جو شخص ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا اس کو ہم ضرور آگ میں جھونکیں گے اور یہ اللہ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے' اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو تمہاری چھوٹی موٹی برائیوں کو ہم تمہارے حساب سے ساقط کر دیں گے اور تم کو عزت کی جگہ داخل کریں گے۔اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی نسبت تمنا نہ کرو' جو کچھ مردوں نے کمایا ہے' اس کے مطابق ان کا حصہ ہے' اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے۔ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو' یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔اور ہم نے ہر اس ترکے کے حقدار مقرر کر دیے ہیں جو والدین اور رشتہ دار چھوڑیں' اب رہے وہ لوگ جن سے تمہارے عہد و پیمان ہوں تو ان کا حصہ انہیں دو' یقیناً اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔"

آیات کا یہ سلسلہ اسلامی معاشرے کی تربیت کے ساتھ بھی متعلق ہے ور اسلامی نظام کے شعبہ قانون سے بھی اس کا تعلق ہے۔اسلامی نظام زندگی میں تربیت' اصلاح اور قانون ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں' وہ ایک دوسرے کے ساتھ تکمیلی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ایک کے سوا دوسرا مکمل نہیں ہو سکتا۔قانون سازی سے غرض یہ ہوتی ہے کہ اسلامی معاشرے کی تربیت اور اصلاح کی جائے اور لوگوں کی زندگی کے معاملات کو ایک ضابطے کے تحت لایا جائے۔ قانون سازی کے اندر ایسی ہدایات بھی دی جاتی ہیں جن میں انسانی ضمیر کی تربیت مطلوب ہوتی ہے۔پھر اس قانون سازی میں اس بات کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ قانون کا نفاذ بھی اچھی طرح ہو سکے اور خود اسلامی معاشرے کا شعور قانون کے نفاذ کے لئے تیار ہو اور معاشرہ یہ سمجھتا ہو کہ اس قانون کے توڑنے میں نہیں بلکہ اس کے نفاذ میں ہماری مصلحت ہے۔اسی لئے اسلامی نظام حیات میں قانون سازی اور اصلاح و ہدایت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔دلوں کو اللہ سے جوڑا جاتا ہے اور ان میں یہ بات ڈالی جاتی ہے کہ یہ ضابطہ اور یہ قانون اسی رب ذوالجلال کی طرف سے ہے جو ہمیں ہدایت دے رہا ہے۔یہ صرف اسلامی نظام زندگی کا خاصہ ہے کہ اس میں اجتماعی نظام کی اطاعت از خود کی جاتی ہے۔اور اسلامی نظام کی یہ جامعیت انسان کی واقعی اور عملی زندگی کے لئے نہایت ہی مفید ہے۔اس سے انسانی ضمیر کی اصلاح بھی ہوتی رہتی ہے اور قانون پر عمل بھی۔

آیات کے اس حصے میں ہمیں حکم دیا جاتا ہے کہ اہل ایمان آپس میں ایک دوسرے کے مال ناجائز طور پر نہ کھائیں اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ دوسروں کا مال باہم رضامندی سے تجارتی لین دین کے ذریعے ہی لیا جاسکتا ہے اور دوسروں کے مال کو ناجائز طور پر کھانے کے فعل کو انسان کے قتل سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ فعل ہلاکت اور تباہی ہے ۔ اس کے ساتھ لوگوں کو عذاب آخرت سے بھی ڈرایا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ جو شخص ظالمانہ طور پر دوسروں کا مال کھائے گا وہ آگ کو ضرور چھوئے گا۔ اس وعید کے ساتھ ہی امید کی کرن بھی چمکتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ نرمی اور عفو و درگزر کا وعدہ بھی فرماتے ہیں اور انسان کی کمزوری اور اس کی تقصیرات کو معاف کرنے کی راہ بھی بتلاتے ہیں ۔ نیز دنیا میں احساس محرومی کو کم کرنے کے لئے خودی کا سبق دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر معاشرے میں کچھ لوگ خوش حال ہیں تو ان کی طرف للچائی ہوئی نظروں کے ساتھ نہ دیکھو ۔ ذات باری کو ہدف نظر بناؤ اس لئے کہ وہی تو ہے جو ان کو دینے والا ہے ۔ اس لئے تمہیں بھی جو کچھ مانگنا ہے اسی سے مانگو ۔ یہاں یہ بات بھی صاف کی جاتی ہے کہ اللہ سے مرد و عورت دونوں مانگ سکتے ہیں ۔ مردوں نے جو کچھ کمایا تو وہ انہی کا ہو گا اور عورتوں نے جو کچھ کمایا وہ انہی کا ہو گا ۔ اور مردوں اور عورتوں دونوں کی کمائی کے بارے میں اللہ کو خوب علم ہے ۔ اسی طرح اگر لوگوں نے ایک دوسرے کے ساتھ "ولایت ارث" کے معاہدے کر رکھے ہیں تو ان معاہدوں پر اچھی طرح عمل کیا جائے اس لئے کہ دوسرے گواہوں کے ساتھ ان پر اللہ بذات خود بھی گواہ ہے ۔ یہ ہیں موثر وجدانی اشارے اور جھلکیاں جن کے اندر قانون سازی بھی موجود ہے یہ ہیں وہ ہدایات جو انسان کی تربیت کے لئے اللہ علیم و خبیر نے بھیجی ہیں جو انسان کی جسمانی تخلیق سے بھی باخبر ہے ۔ اور اس کے نفسیاتی میلانات سے بھی اچھی طرح واقف ہے ۔ جو انسان کی ذہنی راہوں اور نشیب و فراز سے بھی اچھی طرح واقف ہے ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (۲۹) وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (۳۰)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے مت کھاؤ' اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو' یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے ۔ جو شخص ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا' اس کو ہم روز آخرت آگ میں جھونکیں گے اور اللہ کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے ۔"

یہ پکار اہل ایمان کے لئے ہے' انہی کو منع کیا گیا ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھائیں ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے مت کھاؤ" (۴ : ۲۹)

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی معاشرے کو جاہلیت کی باقی ماندہ گراوٹوں سے پاک و صاف کیا جا رہا ہے۔ اور "اے لوگو جو ایمان لائے ہو" کے الفاظ میں خطاب کر کے اہل اسلام کے ضمیر کو جگایا جاتا ہے اور انہیں جوش دلایا جاتا ہے کہ وہ جاہلیت کے تمام کاموں کو چھوڑ دیں۔ یوں ایمانی تقاضوں کو بیدار کیا جاتا ہے' ان تقاضوں کو جو ان کے لقب "اہل ایمان" کے تقاضے ہیں تاکہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے اموال ناجائز طریقوں سے نہ کھائیں۔

باطل طور پر ایک دوسرے کے اموال کھانے میں وہ تمام طریقے شامل ہیں جن کے ذریعے دولت ایک دوسرے کی طرف منتقل ہوتی ہے اور جن کے استعمال کی اجازت اللہ کی جانب سے نہ ہو یا یہ کہ اللہ نے بصراحت اس سے منع کیا ہو مثلاً دوسرے کا مال دبانا' رشوت لینا' قمار بازی کے ذریعے مال کھانا' ضروریات زندگی کا ذخیرہ کرنا تاکہ مہنگے داموں پر انہیں بیچا جائے اور خرید و فروخت کے وہ تمام طریقے استعمال کرنا جو ممنوع ہیں اور ربا ان سب میں سرفہرست ہے۔ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ آیت تحریم ربا سے پہلے نازل ہوئی ہے یا بعد میں۔ اگر یہ پہلے نازل ہوئی تو یہ تحریم ربا کے لئے بطور تمہید ہوگی' اس لئے کہ سود خواری باطل طریقوں میں سرفہرست ہے۔ اور اگر یہ آیت تحریم ربا کے بعد نازل ہوئی ہے تو اس میں ربا بھی شامل ہے اور ربا کے علاوہ دوسرے وہ تمام طریقے بھی شامل ہیں جن سے دوسروں کی دولت ناجائز طور پر حاصل کر لی جاتی ہے۔

ہاں یہاں یہ بتانا بھی ضروری سمجھا گیا کہ باہم رضامندی سے جو تجارتی لین دین ہوتا ہے' اس میں اگر دوسرے کی دولت بطور منافع آ جائے تو وہ جائز ہے۔

(اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (۴ : ۲۹)) "الا یہ کہ باہم رضامندی سے تجارتی لین دین ہو۔"

یہ استثناء منقطع ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اگر معاملہ باہم رضامندی پر مبنی لین دین کا ہو تو وہ صورت سابق آیت میں داخل نہیں ہے۔ یہاں تجارت کو استثنائی شکل میں اس لئے لایا گیا ہے کہ تجارت کے لین دین اور باقی باطل طریقوں کے لین دین میں بظاہر مماثلت پائی جاتی ہے۔ جو طریقے شریعت کے قانون میں ممنوع ہیں ان کے ذریعہ جو مال لیا جاتا ہے وہ باطل طریقے سے کھایا جاتا ہے۔ یہ مشاکلت اس وقت ظاہر ہو جاتی ہے جب سورۂ بقرہ میں آیت الرباء کا مطالعہ کیا جاتا ہے جہاں سود خواروں کا یہ اعتراض نقل کیا گیا ہے۔ (اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا) (۲ : ۲۷۵) "بے شک بیع اور ربا ایک ہی جیسے ہیں۔" اور ان کے اس اشکال کو یوں رد کیا گیا تھا۔ (وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا) (۲ : ۲۷۵) "اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربا کو حرام قرار دیا ہے۔" سود خوار یہ مغالطہ ڈالتے تھے' اور اپنے زیر رواج سودی کاروبار کا دفاع یوں کرتے تھے کہ بیع بھی تجارت ہے اور اس میں انسان کی دولت میں بذریعہ منافع اضافہ ہوتا ہے جبکہ ربا میں بھی مال میں بذریعہ منافع اضافہ ہوتا ہے' اس لئے اس کا کوئی خاص سبب سامنے نہیں آتا کہ تجارت کو جائز کیا جائے اور سود کو حرام قرار دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ تجارتی لین دین اور سودی کاروبار میں بہت بڑا فرق ہے۔ وہ بدترین نتائج بھی ہمارے سامنے ہیں جو سودی کاروبار کی وجہ سے تجارت و صنعت اور عوام کو درپیش ہوتے ہیں اور وہ خوشگوار اثرات بھی جو صاف ستھری

تجارت اور صنعت کی وجہ سے عوام الناس پر مرتب ہوتے ہیں۔

تجارت میں ایک تاجر ایک ضرورتمند اور خریدار اور ایک صنعت کار کے درمیان ایک ایسا واسطہ ہوتا ہے جو دونوں کے لئے مفید ہوتا ہے۔ تاجر اشیائے صرف کے لئے مارکیٹ تلاش کرتا ہے اور مصنوعات کو رواج دیتا ہے۔ وہ ان کو خوبصورتی کے ساتھ اہل ضرورت کے لئے مہیا کرتا ہے اور ان کے لئے سہولت فراہم کرتا ہے۔ یوں گویا وہ دونوں فریقوں کے لئے مفید ہوتا ہے اور اپنی خدمات کا صلہ لیتا ہے۔ اور اس کا صلہ اپنی جدوجہد اور اس کی مہارت کا بھی عوض ہوتا ہے۔ پھر تاجر ہروقت نفع اور نقصان دونوں کے لئے تیار رہتا ہے جبکہ سود خواری کا نظام اس صورت حال سے بالکل مختلف اور متضاد نظام ہے اس لئے کہ اس نظام میں مصنوعات پر اصل اخراجات کے علاوہ سودی واجبات کا اضافہ کیا جاتا ہے اور یہ اضافہ پھر تاجر اور خریدار' ضرورتمند سے وصول کیا جاتا ہے۔ یوں پورے معاشی نظام پر بوجھ پڑ جاتا ہے۔ اور جس طرح مغربی صنعتی ممالک میں عملاً یہ نتائج نکلے' یہ منحوس نظام آخرکار نہ تو بذات خود صنعت کے لئے مفید ہوتا ہے اور نہ خریداروں (Customers) کے لئے مفید ہوتا ہے اور نہ وہ ان دونوں کے مفادات کو پیش نظر رکھتا ہے' بلکہ اس کا ہدف صرف یہ ہوتا ہے کہ صنعتی قرضوں پر زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کیا جائے اور سرمایہ کار کو فائدہ دیا جائے۔ جمہور عوام کو ضروریات زندگی دستیاب ہوں یا نہ ہوں لیکن سامان تعیش کی فراوانی ہو اور ان چیزوں کی پیداوار میں اضافہ کر دیا جائے جو انسانی جذبات کو مشتعل کرنے والی ہوں' خواہ یہ انسانی جسم اور صحت کے لئے سخت مضر ہوں۔ نیز یہ کہ سرمایہ کے لئے دائما" منافع متعین کر دینا اور سرمایہ دار کے لئے کسی صورت میں بھی خسارہ میں شریک نہ ہونا' جیسا کہ تجارت میں ہوتا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں انسانی جدوجہد پر اعتماد نہ کرنا' جو تجارتی نظام کی جان ہوتی ہے۔ یہ اور اس طرح کے دوسری وہ وجوہات جو اس سودی نظام کے کھاتے میں آتی ہیں اس بات کے لئے کافی ہیں کہ اس نظام کو ختم ہونا چاہئے جس طرح اسلام نے اسے ختم کیا ہے۔

(تفصیلات کے لئے دیکھئے فی ظلال القرآن ج سوئم صفحات ..... نیز تفصیلات کے لئے دیکھئے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ؒ' امیر جماعت اسلامی پاکستان کی کتاب "الربا" (سید قطب))

نظام ربا اور نظام تجارت میں بعض پہلوؤں سے چونکہ یکرنگی نظر آتی تھی اس لئے قرآن کریم کو بطور استدراک یہ نوٹ دینا پڑا (اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (٤ : ٢٩)) "الا یہ کہ تمہارے درمیان باہم رضامندی سے تجارتی لین دین ہو۔" لوگوں کے اموال باطل طریقے سے کھانے کی ممانعت کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ ایک دوسرے کو قتل نہ کرو' اگرچہ نحویوں کی رائے کے مطابق یہ استثنائے منقطع ہے۔ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (٤ : ٢٩)) "اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو' یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے۔"

یہ فقرہ ایک دوسرے کے اموال ناجائز طور پر کھانے کی ممانعت کے بعد آتا ہے جس میں یہ اشارہ ہے کہ اگر تم ایک دوسرے کے اموال باطل طریقوں سے کھاتے ہو تو گویا تم ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہو' اور سودی نظام کے آثار تباہ کن ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اس سودی نظام کی ممانعت کر کے تم پر ظلم نہیں کر رہا ہے بلکہ یہ نہایت ہی رحیمانہ حکم ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ یہ اللہ کی جانب سے انسانیت پر بہت بڑا رحم ہے۔

جس سوسائٹی میں بھی ان امور کا رواج ہو جائے 'مثلاً سود خواری' چور بازاری' قمار بازی' ذخیرہ اندوزی' دھوکہ بازی' چوری' چھینا جھپٹی' سرقہ' رشوت' ناقابل فروخت اشیاء کی فروخت' مثلاً عزت و ناموس' ضمیر و اخلاق' ذمہ داری اور فرض منصبی' اور مذہب اور دین وغیرہ جیسا کہ یہ چیزیں قدیم جاہلی سوسائٹی میں بھی جاری تھیں اور آج کی جدید جاہلیت میں بھی یہ کام جاری ہیں ۔ غرض یہ امور جس سوسائٹی میں بھی پائے جائیں گے' وہ خود اس کی جانب سے خودکشی کے مترادف ہوں گے اور وہ سوسائٹی اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھے میں جانتے بوجھتے گرا رہی ہو گی ۔

اور اللہ کا منشاء یہ ہے کہ وہ اس تباہ کن خودکشی سے اہل ایمان کو بچائے اور ان پر رحم کرے ۔ یہ بھی دراصل اللہ کی جانب سے انسانیت پر ایک تخفیف ہے اور اس کے لئے ایک رعایت ہے انسان کی ضعیفی کا ایک علاج ہے اس لئے کہ انسان اپنی اس کمزوری کی وجہ سے اللہ کی ہدایات سے نکل کر ان لوگوں کی راہنمائی میں آجاتا ہے جو اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں ۔

عذاب آخرت کی دھمکی کے بعد' اب ان لوگوں کو دھمکی دی جا رہی ہے جو لوگوں کے مال ناجائز طریقے سے کھاتے ہیں ۔ جو حدود سے تجاوز کرتے ہیں اور دوسروں کے حقوق مارتے ہیں ۔ ایسے لوگوں کو عذاب آخرت کی دھمکی دی جاتی ہے ۔ یعنی نہ صرف یہ کہ دنیا میں دوسروں کا مال کھانے سے ایک سوسائٹی تباہ و برباد ہو گی بلکہ آخرت میں بھی ایسے ظالموں کو عذاب سے دوچار ہونا ہو گا ۔ دنیا میں جو تباہی ہے' وہ تمام لوگوں پر آئے گی' جو ظالم ہے اس پر تو اس لئے کہ اس نے ظلم کیا اور مظلوم پر اس لئے کہ اس نے ظلم کے خلاف کام نہ کیا اس لئے کہ دنیا میں انسان برائی کے نتائج کے لئے اجتماعی طور پر ذمہ دار ہوتے ہیں ۔ اس لئے جس سوسائٹی میں دوسرے کے حقوق مارے جاتے ہیں وہ سوسائٹی دنیا و آخرت دونوں میں برے نتائج بھگتے گی ۔ یہی سنت الٰہی ہے اور یہی اللہ کا فیصلہ ہے ۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ( ٤ : ٣٠ ) "اور جو شخص ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا' اس کو ہم ضرور آگ میں جھونکیں گے اور یہ اللہ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے ۔"

اسلامی نظام حیات نفس انسانی کو اس کے ایک وسیع دائرے تک لے جاتا ہے' یعنی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دونوں جہانوں کو پیش نظر رکھ کر اس کے لئے ضابطہ بندی کی جاتی ہے اور اسے ہدایات دی جاتی ہیں ۔ نفس انسانی کے اندر ایک بیدار اور محتاط چوکیدار بٹھایا جاتا ہے جو ہر ہدایت کو بسر و چشم قبول کرتا ہے اور ہر اسلامی قانون کو بطیب خاطر نافذ کرتا ہے ۔ پھر اسلامی سوسائٹی میں بھی ہر شخص کو دوسرے کے لئے نگران بنایا جاتا ہے اس لئے کہ وہ اجتماعی طور پر بھی مسئول ہیں ۔ اگر ظلم ہو گا تو سوسائٹی کے تمام افراد گویا قتل ہوں گے اور ان پر تباہی آئے گی ۔ یعنی اس دنیا میں اور آخرت میں تمام ان لوگوں سے محاسبہ ہو گا جنہوں نے اپنی سوسائٹی کو ظالمانہ روش پر رہنے دیا اور اس کے باطل طور طریقوں کے بدلنے کے لئے جدوجہد نہ کی ۔ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ( ٤ : ٣٠ )

"اور یہ اللہ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے ۔" اسے دنیاوی تباہی لانے اور آخری محاسبہ کرنے سے کوئی نہیں

روک سکتا۔ نہ اس کی راہ میں کوئی حائل ہو سکتا ہے اور جب تباہی کے اسباب مہیا ہو جائیں تو اللہ کی سنت یہی ہے کہ پھر وہ آکر رہتی ہے۔

لیکن اگر تم لوگ ممنوعات میں سے بڑی بڑی ممنوعہ چیزوں سے اجتناب کرو' جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگوں کے اموال کو ظالمانہ طریقے سے کھانا اور ان کا استحصال کرنا چھوڑ دو' تو اس کے نتیجے میں اللہ کی رحمت تمہارے شامل حال رہے گی۔ تمہارے ساتھ نرم سلوک کیا جائے گا' تمہارے دلوں کے اطمینان کے لئے اور آگ سے تمہیں بچانے کے لئے' تمہارے وہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے جو کبائر نہیں ہیں بشرطیکہ تم ارتکاب ظلم اور ارتکاب فواحش سے اجتناب کرو۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا (٤ : ٣١) ''اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو' جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو تمہاری چھوٹی موٹی برائیوں کو ہم تمہارے حساب سے ساقط کر دیں گے اور تمہیں عزت کی جگہ داخل کریں گے۔''

ذرا دیکھئے تو سہی! کس قدر فیاض ہے یہ دین اور اس نظام میں کس قدر سہولتیں دی گئی ہیں۔ بانگ دہل دعوت دی جا رہی ہے کہ انسانو! آؤ بلندیوں کی طرف' علو شان کی طرف' پاکیزگی کی طرف اور ڈسپلن کی طرف۔ یاد رکھو کہ تم پر جو فرائض عائد کئے جاتے ہیں' تمہارے لئے جو حدود بھی مقرر ہوتے ہیں' اور اوامر و نواہی کے جو جو احکام دیئے جاتے ہیں' ان سب کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس جہان میں پاک و صاف نفوس پیدا کئے جائیں اور پھر ان نفوس طیبہ سے ایک پاک و صاف معاشرہ وجود میں لایا جائے۔

لیکن یہ دعوت دیتے وقت اور یہ حدود و قیود عائد کرتے وقت انسان کی ضعیفی اور اس کی فطری کوتاہیاں بھی پیش نظر رکھی گئی ہیں۔ یہ فرائض و واجبات اس کی فطری طاقت کے دائرے کے اندر اندر ہیں۔ ان میں اس کی فطرت' اس کی طاقت کے حدود' اور اس کے رجحانات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ نیز انسانی زندگی کی راہوں کے نشیب و فراز کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی میں' فرائض و واجبات عائد کرتے وقت ان فرائض اور انسانی مقدرت کے اندر ایک حسین امتزاج اور توازن رکھا گیا ہے۔ انسانی ضروریات اور انسانی خواہشات کے درمیان بھی توازن موجود ہے' میلانات اور رکاوٹوں کے درمیان بھی توازن ہے' اوامر اور نواہی کے درمیان بھی توازن ہے۔ ترغیب اور ترہیب کے درمیان توازن ہے' اور اسی طرح ایک طرف عذاب الٰہی سے سخت ڈراوا ہے۔ اگر معصیت کا ارتکاب کیا گیا اور دوسری جانب اگر کوئی پشیمان ہو جائے اور واپس لوٹنا چاہئے تو اس کے لئے بھی معافی کا دروازہ بند نہیں کیا گیا۔

دین اسلام کا حقیقی مطلوب و مقصود صرف یہی ہے کہ وہ نفس انسانی کا قبلہ درست کر کے اس کا رخ اللہ کی طرف موڑ دے' اور اس قبلہ رخی میں اسے مخلص ہونا چاہئے۔ وہ حتی المقدور اپنے اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرے۔ اس کے بعد اللہ کی رحمت کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ اللہ کی رحمت ضعیف و ناتواں سب کے شامل حال رہتی ہے' وہ

تقصیرات سے درگزر کرتی ہے' وہ توبہ قبول کرتی ہے' کمزوریوں سے صرف نظر کرتی ہے' گناہ معاف کرتی ہے اور واپس آنے والوں کے لئے اپنے دروازے کھول دیتی ہے اور بڑے انس و محبت سے آنے والوں کا استقبال کرتی ہے۔

اس آیت میں حکم یہ دیا گیا ہے کہ تم کبائر سے اجتناب کرو۔ گناہ کبیرہ ہمیشہ واضح' کھلے اور عظیم ہوتے ہیں' اس لئے کوئی شخص یہ عذر نہیں کر سکتا کہ اس نے ان گناہوں کا ارتکاب کیا جن کا اسے علم نہ تھا کہ یہ گناہ ہیں' یا وہ سمجھا ہی نہیں ہے اور گناہ کا ارتکاب ہو گیا ہے' اس لئے کہ جو شخص ان گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے' وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے گناہ سے بچنے اور اجتناب کرنے کی سعی کی ہے' یا اس نے اس کے ارتکاب کے خلاف پورا مقابلہ کیا ہے' لیکن ان گناہوں کے ارتکاب کے بعد بھی اگر ایک شخص صحیح طرح پورے اخلاص کے ساتھ توبہ کرے تو بھی اللہ کے ہاں معافی ہو سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

(وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۳:۱۳۵))

"اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً" اللہ انہیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں..... کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو..... اور وہ دیدہ و دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزاء ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کے گناہ معاف کر دے گا۔" اور ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے متقیوں میں شمار فرمایا ہے۔

یہاں کبائر سے توبہ کی بحث نہیں' یہاں مدعا یہ ہے کہ اگر کوئی کبائر سے اجتناب کرے تو اس کے چھوٹے گناہ براہ راست اللہ تعالیٰ معاف فرماتے ہیں' یہاں اسی کا وعدہ کیا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو خوشخبری دی جا رہی ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کبائر کیا ہیں جن کے ارتکاب سے بچنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے' احادیث میں ان کا ذکر ہوا ہے' لیکن کسی حدیث میں ان کی پوری تعداد کا ذکر نہیں ہوا' بلکہ موقعہ و محل کے اعتبار سے جن گناہوں سے ممانعت کی زیادہ ضرورت تھی ان کا ذکر کر دیا گیا' اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی حدیث میں کبائر کی پوری فہرست دے دی گئی ہے۔ ہاں مختلف احادیث میں مختلف نوعیت اور مختلف تعداد کو کبائر کہا گیا ہے اور یہ جرائم مختلف معاشروں اور مختلف سوسائٹیوں میں مختلف ہو سکتے ہیں۔

یہاں ہم حضرت عمر بن خطاب ؓ کا واقع نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں' حضرت عمر ؓ معصیت کے معاملے میں بے حد حساس اور متشدد تھے اور وہ معاصی سے سخت اجتناب فرماتے تھے۔ اس واقعے سے معلوم ہو گا کہ اسلام نے ان کے اس تیز احساس کو کس طرح سیدھے راستے پر ڈال دیا تھا' اور ان کے ہاتھ میں یہ ترازو' حساس ہونے کے باوجود کس قدر اعتدال پر تھا' خصوصاً جبکہ ان کا واسطہ اجتماعی امور اور انسان کے نفسیاتی معاملات سے پڑا کرتا تھا۔

ابن جریر نے یعقوب ابن ابراہیم' ابن علیہ' ابن عون اور حسین کے واسطے سے نقل کیا ہے کہ مصر میں بعض لوگوں نے عبداللہ ابن عمرو سے پوچھا کہ ہم اللہ جل شانہ کی کتاب میں بعض احکام پاتے ہیں کہ ان کے بارے میں حکم دیا گیا

ہے کہ ان پر عمل کیا جائے' لیکن ان پر عمل نہیں کیا جاتا' اس لئے ہم نے ارادہ کیا ہے کہ اس سلسلے میں امیرالمومنین سے ملیں۔ چنانچہ عبداللہ بن عمرو مدینہ آئے اور وہ لوگ بھی ان کے ساتھ آئے' اور حضرت عمرؓ سے ملے۔ انہوں نے پوچھا تم کب آئے ہو؟ انہوں نے کہا میں فلاں فلاں تاریخ کو آیا ہوں' حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا تم اجازت لے کر آئے ہو؟ راوی کہتے ہیں کہ مجھے یاد نہیں کہ اس سوال کا حضرت عبداللہ ابن عمرو نے کیا جواب دیا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ امیرالمومنین! مجھے مصر میں بعض لوگ ملے تھے' انہوں نے سوال کیا تھا کہ ہم قرآن کریم میں بعض احکام پاتے ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے مگر ان پر عمل نہیں کیا جاتا' تو ان لوگوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: آپ ان لوگوں کو میرے لئے جمع کریں۔ انہوں نے ان لوگوں کو جمع کیا۔ ابو عون نے کہا: "میرا خیال ہے کہ اس نے کہا بیٹھک میں جمع کیا۔ اس پر انہوں نے ان میں سے ادنیٰ تر آدمی سے بات کی اور کہا: میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اور اسلام کا آپ پر جو حق اس کو مدنظر رکھتے ہوئے تم سے پوچھتا ہوں: "کیا تم نے پورے قرآن مجید کو پڑھ لیا ہے؟" اس نے جواب دیا: "ہاں۔" اس پر انہوں نے فرمایا: "کیا وہ پورا تمہارے ذہن میں ہے؟" اس نے جواب دیا: "خدا جانتا ہے نہیں۔" اگر یہ شخص کہتا ہاں سب قرآن میرے ذہن میں ہے تو حضرت عمر بھی اس کے ساتھ مباحثہ شروع کر دیتے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا: "کیا سب قرآن تمہارے پیش نظر ہے؟" کیا سب قرآن لفظاً تمہیں یاد ہے؟ کیا سب قرآن پر تم عمل پیرا ہو؟ غرض ایسے ہی سوالات انہوں نے سب سے کئے اور آخری شخص تک وہ سب سے یہ سوالات کرتے چلے گئے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا: "تمہیں تمہاری ماں روئے: کیا تم عبداللہ بن عمرو کو اس بات کا مکلف بناتے ہو کہ وہ لوگوں کو مکمل طور پر قرآن کریم کے مطابق استوار کر دے۔ ہمارے اللہ کو یہ معلوم تھا کہ ہم میں گناہ گار بھی ہوں گے۔" اس کے بعد حضرت عمر ؓ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (٤ : ٣١) "اگر تم ان کبائر سے اجتناب کرو جن سے تمہیں روکا جا رہا ہے تو ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے۔"

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا: "کیا اہل مدینہ جانتے ہیں۔" یا فرمایا: "کیا کسی ایک شخص کو معلوم ہے کہ تم یہاں کس لئے آئے ہو؟" تو انہوں نے کہا: "نہیں۔" تو فرمایا اگر اہل مدینہ کو علم ہوتا تو میں تمہیں ضرور وعظ کرتا۔"

(لفظ احصیتہ فی اثرک کا مفہوم یہ ہے کہ کیا تم نے اپنی پوری زندگی میں قرآن کو نافذ کر دیا ہے۔ اور ابن کثیر نے اسے نقل کیا ہے اور کہا ہے: "اسناد صحیح ہے' متن حسن ہے۔ اگرچہ یہ عمر سے حسن نے روایت کی۔ اس میں انقطاع ہے۔ بہرحال یہ مشہور ہے اور مشہور ہونے کی وجہ سے ہم اسے نقل کر رہے ہیں۔)

حضرت عمر جیسے حساس اور سخت گیر شخص بھی اس حکمت کے ساتھ معاشرے کی اصلاح کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے شعور کو قرآن کریم نے استوار کر دیا تھا' اور ان کو گہری حکمت و دانائی عطا کر دی تھی۔ انہوں نے کیا خوب کہا: "ہمارے اللہ کو پیشگی علم تھا کہ ہم سے گناہوں کا صدور ہو گا۔" اور ہم ظاہر ہے کہ اللہ کے علم کے خلاف تو ہو نہیں سکتے' اس لئے مدار فیصلہ اس پر ہو گا کہ ہم نے کیا ارادہ کیا؟ ہم نے کس قدر اپنے آپ کو درست کرنے کی نیت کی' کس

قدر کوشش کی 'کس قدر خواہشمند رہے 'کس قدر ہم نے پابندی شریعت کرنے کی سعی کی 'کس قدر جدوجہد اور وفاداری کرنے کی کوشش کی ؟ یہ ہے اسلامی نظام زندگی کا توازن 'سنجیدگی' اعتدال اور ہر معاملے میں آسانی پیدا کرنے کی کوشش ۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۳۲) وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا (۳۳)

(۴ : ۳۲ – ۳۳) "اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے 'اس کی تمنا نہ کرو' جو کچھ مردوں نے کمایا ہے ' اس کے مطابق ان کا حصہ ہے 'اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے ' ہاں اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو ۔ یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے ۔ اور ہم نے ہر اس ترکے کے حقدار مقرر کر دیئے ہیں جو والدین اور رشتہ دار چھوڑیں ۔ اب رہے وہ لوگ جن سے تمہارے عہد و پیمان ہوں تو ان کا حصہ انہیں دو' یقیناً اللہ ہر چیز پر نگران ہے ۔"

اللہ تعالیٰ نے دوسرے لوگوں کو جو فضیلت دی ہے اس کی تمنا کرنے سے اہل اسلام کو منع کیا گیا ہے اور یہ نص اس بارے میں عام ہے کہ یہ فضیلت کیسی بھی ہو' مثلاً عہدہ و مرتبہ میں فضیلت ' صلاحیت و قابلیت میں فضیلت ' مال و اسباب میں فضیلت ' غرض اس زندگی میں نصیبہ کے اعتبار سے جو بھی فرق و امتیاز موجود ہو' اس بارے میں دوسروں کے مقابلے میں تمنائیں نہیں کرنی چاہئیں ۔ جو کچھ مانگنا ہے ' اللہ سے مانگا جائے اور ہر امر کی طلب براہ راست اللہ سے ہونی چاہئے اور یہ نہ ہونا چاہئے کہ دوسروں کی فضیلتوں پر خواہ مخواہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ کر دل کو حسرتوں کی آماجگاہ بنا لے ' اور اس کے بعد اس غلط تمنا کے ساتھ حسد و کینہ اور بغض و انتقام کے برے جذبات اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ انسانوں پر حملہ آور ہوں 'یا ان کے اندر محرومیت ' ہلاکت اور تباہی کے جذبات اور مہلک احساسات پیدا ہوں ۔ ان جذبات کے بعد پھر ہر کسی کے خلاف بدظنی پیدا ہو' اور پھر خدا اور مخلوق دونوں سے یہ شکایت پیدا ہو کہ انہیں کم دیا گیا ہے ۔ یہ صورت حال اس قدر تباہ کن ہوگی کہ معاشرے میں امن و سکون کا نام و نشان نہ رہے گا' ہر شخص ذہنی پریشانی اور قلق کا شکار ہو گا 'انسانی قوتیں غلط رجحانات اور بدی کی راہوں میں صرف ہو کر ضائع ہوں گی جبکہ اس کے مقابلے میں یہ رجحان کہ سب کچھ عطا کرنے والا اللہ ہے 'وہی فضل و کرم اور داد و دہش کا منبع ہے کیا خوب ہے ۔ اور یہ عقیدہ کہ عطا اور داد و دہش سے اس کے خزانوں میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی ' اور اس کی درگاہ اس قدر وسیع ہے کہ اگر تمام کائنات کے سوالی اس پر اژدہام کر لیں تب بھی اس میں تنگی نہیں آتی ' امن و اطمینان بھی اس کی درگاہ سے ملتا ہے ' امید و آسرا بھی وہیں سے دستیاب ہے ۔ اسباب کی تلاش اور جدوجہد میں وہی مثبت راہ بتلاتا ہے 'جس راستے میں ایک دوسرے کے خلاف

عداوت ' جلن ' اختلاف اور دشمنی بھی پیدا نہیں ہوتی۔

ایک عام ہدایت دیتے ہوئے یہ آیت اپنے مفہوم میں عام ہے لیکن سیاق کلام میں اس کا مفہوم خاص ہو جاتا ہے اور اس کے اسباب نزول کے سلسلے میں بعض روایات بھی وارد ہیں جن کی وجہ سے آیت کا مفہوم عمومی کسی قدر خاص ہو کر اس میں فرق آ جاتا ہے اور بعض امور کی فضیلت متعین ہو جاتی ہے۔ یہ آیت انہی امور کو متعین کرتی ہے۔ مثلاً مردوں اور عورتوں کے حصے میں فرق ہے۔ مردوں کا حصہ میراث میں زیادہ متعین ہوا ہے 'جس کا اظہار اس آیت سے بھی ہوتا ہے اور سیاق کلام سے بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ پہلو یعنی بعض امور میں مرد و زن کے درمیان مقام و مرتبہ میں خصوصی تفاوت اس آیت کی عمومیت پر اثرانداز نہیں ہوتی' اس لئے کہ مرد و زن کے تعلقات کی درستی اور ان کے درمیان باہم مکمل تعاون اور تکافل اور اسلامی معاشرے میں ایک خاندان کی تشکیل اور افراد معاشرہ کی باہم رضامندی اور پورے معاشرے کے درمیان نظم کے قیام کے لئے اس تفاوت کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے کہ اس تفاوت اور فرق مراتب کی وجہ سے فریقین کے فرائض اور ذمہ داریاں متعین ہو جاتی ہیں لیکن اس خصوصی تفاوت کے باوجود آیت کی عمومیت متاثر نہیں ہوتی' اس لئے روایات میں جو خاص اسباب نزول بیان ہوئے ہیں وہ آیت کے عمومی مفہوم کو متاثر نہیں کرتے۔

امام احمد نے سفیان' ابونجیح' مجاہد کی سند کے ساتھ حضرت ام سلمہ سے یہ روایت کی ہے کہ ام سلمہ نے حضورؐ کے سامنے یہ عرض کی کہ حضور! مرد جہاد کرتے ہیں لیکن ہم عورتیں جہاد میں شریک نہیں ہوتیں' اور میراث میں بھی ہمارا حصہ نصف ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی "اور جو اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسرے کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو۔"

امام ابو حاتم' ابن جریر' ابن مردویہ اور حاکم نے مستدرک میں امام ثوری کی حدیث بروایت ابن نجیح' مجاہد حضرت ام سلمہ سے یوں روایت کی ہے کہ انہوں نے حضور سے کہا کہ ہم عورتیں جنگ میں حصہ نہیں لیتیں تاکہ ہم شہید ہوں اور میراث میں بھی ہمارا پورا حصہ نہیں ہے تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (اِنّیْ لَا اُضِیعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی) "میں تم میں کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا' مرد ہو یا عورت۔"

حضرت سدی اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے یہ کہا تھا کہ ہمارے لئے عورتوں کے ثواب کے مقابلے میں دوگنا ثواب ہونا چاہئے جس طرح میراث کے حصے میں ہمارے لئے دوگنا ہے۔ اور عورتوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہمارے لئے بھی شہداء کے ثواب جیسا ثواب ہونا چاہئے' اس لئے کہ ازروئے فطرت ہم جنگ نہیں لڑ سکتیں لیکن اگر اللہ نے ہم پر جہاد فرض کیا ہوتا تو ہم جنگ میں حصہ لیتیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان خیالات کی تردید فرمائی اور حکم دیا کہ وہ میرے فضل کے بارے میں دعا کریں' اور یہ فضل دنیا جیسا عارضی نہیں ہے ....... ایسی ہی روایت قتادہ سے بھی مروی ہے۔ بعض دوسری روایات بھی ہیں جو اس آیت کے مفہوم کی عمومیت کو ظاہر کرتی ہیں۔

علی ابن ابو طلحہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: "کوئی شخص یہ تمنا نہ کرے کہ فلاں شخص کا مال اور اس کی عورت اسے ملیں۔ اللہ نے اس سے منع کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ وہ اللہ کے فضل کے طلبگار

ہوں ـ حسن ' محمد بن سیرین ' عطاء اور ضحاک سے بھی ایسی ہی تفسیر مروی ہے ـ

مرد و زن کے درمیان زمانہ جاہلیت میں جو تعلقات پائے جاتے تھے ' ان کے حوالے سے دیکھا جائے تو محولہ بالا پہلے اقوال میں آثار جاہلیت کا پرتو نظر آتا ہے جبکہ دوسری جانب مرد و زن کے درمیان جذبہ مسابقت اور تنافس اس بات کا نتیجہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق عطا کئے اور جو آزادیاں عنایت کیں اس کے نتیجے میں اس قسم کے تنافس کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا' اس لئے کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق عطا کئے وہ اصول کرامت انسانی اور ہر جنس اور ہر گروہ کے ساتھ منصفانہ سلوک پر مبنی تھے ـ اور یہ منصفانہ رویہ ہر شخص کو یوں سکھایا گیا کہ اس نے خود اپنی ذات کے ساتھ بھی انصاف کرنا تھا ـ

اسلام کے اہداف یہ ہیں کہ وہ اپنے متکافل اور معاون نظام زندگی کو ...... نافذ کرنا چاہتا ہے ـ اس کا مقصد نہ مردوں کی حمایت ہے اور نہ عورتوں کی حمایت کرنا ہے ـ بلکہ اس کے پیش نظر انسان من حیث الانسان ہے ـ اور اسلامی معاشرہ کی تخلیق ہے ـ اسلام علی الاطلاق اور علی العموم انسانیت کی اصلاح اور بھلائی کے لئے کام کرتا ہے ـ وہ اس دنیا میں عمومی اور بے قید عادلانہ نظام چاہتا ہے ' جو ہمہ جہت اور ہمہ پہلو عادلانہ اسباب پر مبنی ہو ـ

اسلامی نظام زندگی ' فرائض و واجبات کے تعین میں راہ فطرت پر چلتا ہے ـ اسی طرح وہ مرد و زن کے حصہ رسدی کے تعین میں بھی دونوں کی فطری صلاحیتوں کو پیش نظر رکھتا ہے ـ اور فطرت نے ابتدائے تخلیق سے مرد کو مرد عورت کو عورت قرار دیا ـ ان میں سے ہر ایک کے اندر متعین صلاحیتیں پیدا کیں ـ اور ان خاص صلاحیتوں کے مطابق ان کے فرائض متعین کئے ـ ان فرائض کے تعین میں کسی مخصوص مقصد کو سامنے نہیں رکھا گیا' نہ کسی ایک جنس کو دوسری پر ترجیح دی گئی ہے ـ بلکہ انسان کی پوری زندگی کو پیش نظر رکھا گیا ہے ـ جس کا قیام اور تنظیم اور جس کی خصوصیات کی تکمیل اور جس کے مقاصد کی تکمیل اسی صورت میں ممکن ہے کہ مرد و زن کے درمیان فرق و امتیاز ہو ' اور یہ فرق و امتیاز ان دونوں کی خصوصیات اور صلاحیتوں اور فرائض و واجبات کے درمیان فرق و امتیاز کے مطابق ہو تاکہ وہ خلافت فی الارض اور اللہ کی بندگی کے اعلیٰ مقاصد پورے کر سکیں ـ اللہ تعالیٰ نے حیات انسانی کے عظیم ادارے کی تنظیم اور تکمیل کے لئے مرد و زن کے درمیان تنوع پیدا کیا ـ ان کو مختلف صلاحیتیں دیں ـ ان کے لئے مختلف فرائض منصبی مقرر کئے ـ اور ان کے لئے مختلف حقوق متعین کئے اور جدا جدا دائرہ کار کا تعین کیا ـ تاکہ کاروان زندگی صحیح سمت پر سفر جاری رکھ سکے ـ

انسان جب غیر جانبداری سے مکمل اسلامی نظام زندگی کا مطالعہ کرے ' خصوصاً اس نظام میں مرد و زن کے باہمی تعلقات کی نوعیت کا گہرا جائزہ لے تو نہ اس نزاع کا کوئی موقعہ رہتا ہے جو قدیم روایات میں پایا جاتا ہے اور نہ ان جدید مجادلات اور نزاعات کی کوئی حقیقت رہتی ہے ' جو آج کل کے دور میں مردوں اور عورتوں کے درمیاں بے فائدہ ہو جاتے ہیں اور جس کا شور و غوغا بھی اس قدر بلند ہو جاتا ہے جس میں سنجیدہ مردوں اور عورتوں کی آواز دب کر رہ جاتی ہے ـ

یہ ایک عبث کوشش ہوگی کہ ہم صورت حال کی تصویر کشی یوں کریں کہ گویا مرد اور عورت کے درمیان ایک معرکہ کارزار گرم ہے ـ اس میں ہر شخص اپنا اپنا موقف بیان کر رہا ہے ـ ہر شخص جنگ کو جیتنے کی سعی میں لگا ہوا ہے ـ کچھ سنجیدہ اہل قلم بھی بعض اوقات ایسا موقف اختیار کرتے ہیں کہ وہ عورت کی ذات میں نقائص نکالتے ہیں' اس سے

کمالات کی نفی کرتے ہیں اور اس کی طرف ہر عیب کی نسبت کرتے ہیں۔ یہ کام وہ علمی بحث و مباحثہ کے طور پر کریں یا اسلامی نقطہ نظر سے کریں۔ دونوں صورتیں حقیقت نفس الامری سے دور ہیں۔ مسئلہ دراصل دونوں فریقوں کے درمیان معرکہ آرائی کا نہیں ہے بلکہ مسئلہ دونوں اصناف کی نوعیت اور تقسیم کار کا ہے۔ ایک، دوسرے کے ساتھ تکافل اور تعاون کا ہے۔ اور اسلامی نظام زندگی کے مطابق ان کے درمیان قیام عدل کا ہے۔

یہ ممکن ہے کہ جاہلی معاشروں کے اندر مرد و زن کے درمیان کوئی معرکہ آرائی ہو۔ اس لئے کہ جاہلی معاشرت اپنے لئے نظام حیات از خود تجویز کرتے ہیں۔ ان جاہلی معاشروں کا نظام خالص ذاتی اور نبوی اغراض و مقاصد پر مبنی ہوتا ہے یا ان نظاموں میں بعض غالب طبقات کے مفادات کو مد نظر رکھا گیا ہوتا ہے یا بعض خاندانوں اور بعض افراد کے مفادات کی حفاظت مطلوب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان جاہلی نظاموں میں انسان کی اصلیت اور جاہلیت کی نسبت جہالت کی وجہ سے عورتوں کے حقوق کو غصب کیا گیا ہوتا ہے یا ان میں مرد و زن کے فرائض طبیعی کو نظرانداز کر کے ان کے حقوق و فرائض متعین کئے ہوتے ہیں یا ان میں کام کرنے والی عورت کے حقوق اس ہی جیسے کام کرنے والے مرد کے حقوق کے مقابلے میں کم رکھے گئے ہوتے ہیں۔ اور یہ کمی محض اقتصادی وجوہات سے ہوتی ہے یا مثلاً تقسیم میراث کے میدان اور مالی تصرفات کے شعبے میں عورتوں کے حقوق کم رکھے گئے ہوتے ہیں جس طرح جدید جاہلی معاشروں میں بھی صورت حال ایسی ہی ہے۔

رہا اسلامی نظام زندگی تو اس میں کہیں بھی ایسی صورت حال نہیں ہے۔ اس میں اولاً مرد و زن کے درمیاں کوئی معرکہ برپا نہیں ہوتا۔ اس میں دنیاوی مفادات کی بنا پر ایک دوسرے کے مقابلے میں کوئی دشمنی نہیں ہوتی۔ اس میں نہ مرد عورت کے مفادات پر حملہ آور ہو کر اسے لوٹتا ہے اور نہ عورت مرد کے مفادات پر حملہ آور ہو کر اسے لوٹتی ہے۔ نہ وہ ایک دوسرے کی کمزوریوں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں اور انہیں اجاگر کرتے ہیں۔ اسلامی نظام میں اس قسم کے افکار کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ مرد و زن کے درمیان طبیعی خصائص میں اس بین فرق و امتیاز کے باوجود مرد و زن کے درمیان فرائض اور واجبات کا کوئی فرق نہیں ہے اور یہ کہ ان فرائض واجبات کی وجہ سے مرد و زن کے منصب اور حیثیت پر کوئی اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ اس قسم کے افکار غلط فہمی پر مبنی ہیں' اور اپنی جگہ از کار رفتہ بھی ہیں۔ اسلامی نظام کے بارے میں یہ افکار جہالت پر مبنی ہیں' اور مرد و زن کی فطری ساخت اور طبیعی وظائف کے بارے میں گہری لاعلمی کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں ۔۔۔

ذرا جہاد کے معاملے پر غور فرمایئے! جہاد اور شہادت فی سبیل اللہ' اس میں عورت کی شرکت اور حصول ثواب کے مسائل کے معاملے میں دور اول کی صالح عورتوں کے دل میں تشویش تھی۔ ان صالح عورتوں کی تشویش کا تعلق صرف اخروی نقطہ نظر سے تھا۔ اس کا تعلق اس دنیا میں حیثیت یا برتری سے ہرگز نہ تھا۔ بعض اوقات اس فرق و امتیاز کا تعلق دنیاوی امور سے بھی تھا' مثلاً وراثت میں مرد کا حصہ عورت کے مقابلے میں زیادہ رکھا گیا تھا' زمانہ قدیم سے مردوں اور عورتوں کے دلوں میں اس امتیاز کے بارے میں تشویش تھی۔ آج کے دور جدید میں بھی یہ اور اس قسم کے دوسرے مسائل دلوں میں کھٹکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فعل جہاد نہ عورت پر فرض کیا ہے اور نہ ہی اس کے لئے جہاد میں شرکت کو حرام

قرار دیا ہے ۔ نیز اگر فریضہ جہاد میں عورت کی ضرورت ہو اور مرد آبادی اس کے لئے کفایت نہ کرتی ہو تو عورت کو اس سے منع بھی نہیں کیا گیا۔ نیز تاریخ اسلام سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض عورتیں جہاد میں شریک بھی ہوئیں ۔ انہوں نے تیارداری اور باربرداری کے علاوہ جہاد میں بھی حصہ لیا لیکن ایسے واقعات قلیل اور نادر ہیں اور انتہائی ضرورت کے اوقات میں پیش آئے ۔ عمومی اصول اور معمول یہ نہ تھا۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح مردوں پر جہاد فرض قرار دیا' اس طرح عورتوں پر اسے فرض نہیں کیا گیا۔

عورتوں پر جہاد اس لئے نہیں فرض کیا گیا کہ وہ مجاہدین کو پیدا کرنے کا ذریعہ (Producer) ہیں ۔ عورت کی تخلیق ہی اس لئے ہوئی ہے کہ وہ مردوں کو پیدا کرے ۔ اس کی عضویاتی ساخت اور نفسیاتی میلان ہی اس طرف ہے کہ وہ مجاہدین پیدا کرے اور انہیں جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیار کرے ' انہیں اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کرے ۔ اس میدان میں عورت زیادہ قوت اور خوش اسلوبی سے کام کر سکتی ہے اور اس کا کام زیادہ نفع بخش بھی ہو سکتا ہے ۔ اس میدان میں وہ زیادہ قوت سے اس لئے کام کر سکتی ہے کہ اس کی عضویاتی اور نفسیاتی تشکیل ہی اس مقصد کے لئے ہوئی ہے ۔ یہ بات صرف عورت کی عضویاتی ساخت کی بنا پر ہی نہیں کی جا رہی بلکہ علی الخصوص اس کے اندرونی نظام میں خلیات کی پیوند کاری یعنی ۔ یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی سے مرد ہے یا عورت ہے عورت پیدائش کے وقت سے ہی اس فریضہ کے لئے واحد ذمہ دار ہے ۔ ( دیکھئے فصل المراۃ وعلاقۃ الجنین ۔ جو کتاب الاسلام و مشکلات الحضارہ کا حصہ ہے ۔) ظاہری اعضاء کے افعال تو بعد میں یکے بعد دیگرے کام کرتے ہیں اور اس عرصہ کے بعد عظیم نفسیاتی اثرات حاملہ عورت پر مرتب ہوتے ہیں لہٰذا اس کی جانب سے امت مسلمہ کے لئے جہاد میں شرکت کے مقابلے میں یہ عظیم فریضہ سرانجام دینا زیادہ نفع بخش ہے ۔ اس لئے کہ جب جنگ کا طوفان بڑی تعداد میں مردوں کو فنا کر دیتا ہے تو عورت مزید آبادی کی پیداوار کے ذریعے کے طور پر اپنا فرض ادا کرتی ہے ۔ اور وہ مزید مرد پیدا کر کے خلا کو پر کرتی ہے ۔ لیکن اگر جنگ کا بھوت مرد اور عورت دونوں ہی کو کھا لے یا وہ مردوں کو چھوڑ کر صرف عورتوں کو اچک لے اور مردوں کو باقی رکھے تو یہ صورت باقی نہیں رہتی ۔ اس لئے کہ اسلامی نظام زندگی میں اگر ایک مرد ہے اور وہ پوری رخصت کو کام میں لائے تو وہ بیک وقت چار عورتوں سے شادی کر سکتا ہے ۔ اور بیک وقت وہ چار عورتیں آبادی میں اضافہ کر سکتی ہیں ۔ اور یوں وہ کمی پوری ہو سکتی ہے (اگرچہ ایک عرصہ بعد) جو جہاد و قتال کی وجہ سے واقع ہوا کرتی ہے ۔ لیکن اگر ایک ہزار افراد بھی ایک عورت کے ساتھ ہمبستری کریں تو بھی وہ عورت اسی مقدار میں بچے دے سکتی ہے جو ایک مرد کی ہمبستری سے دے سکتی ہے ۔ عورتوں کی کمی کی صورت میں آبادی کی کمی ہرگز پوری نہ ہو سکے گی ۔ اور یہ تو اللہ تعالیٰ کی بے پناہ حکمتوں میں سے ایک ہی نکتہ ہے جو اس حکم کی تہہ میں پوشیدہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو جہاد سے معاف رکھا ۔ اس حکم کے بے شمار منافع ہیں ۔ مثلاً اسلامی معاشرہ میں اخلاقی پاکیزگی کا اہتمام' اسلامی معاشرے کے مزاج کو مدنظر رکھنا' انسان کے دونوں اصناف کے لئے علیحدہ علیحدہ دائرہ کار کی نشاندہی وغیرہ جن کے بارے میں تفصیلات بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے ۔ اس لئے کہ اس نکتے پر خاص اور طویل بحث کی ضرورت ہے ۔ (دیکھئے کتاب "نحو مجتمع اسلامی" کی فصل "نظام عائلی")

رہا معاملہ اجر و ثواب کا تو اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت دونوں کو اس کی پوری پوری یقین دہانی کرائی ہے ' بشرطیکہ وہ اپنے فرائض و واجبات کو خدا خوفی سے بحسن و خوبی سرانجام دیں اور ان میں وہ درجہ احسان تک پہنچ جائیں ۔

رہا مسئلہ حصص میراث کا تو بادی النظر میں "مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر حصہ ہو گا" کے اصول سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورت پر مرد کو ترجیح دی گئی ہے۔ لیکن مرد اور عورت کے پورے فرائض اور واجبات پر اگر ایک نظر دوڑائی جائے تو بہت جلد اس رائے کی سطحیت آشکارا ہو جاتی ہے۔ آمدن اور حصص کا تعین ذمہ داریوں کو دیکھ کر کیا گیا ہے۔ اسلامی نظام زندگی کا یہ ایک مستقل اصول ہے کہ اس میں مفادات کا تعین ذمہ داریوں کی نسبت سے کیا جاتا ہے۔ مرد پر یہ بات فرض کی گئی ہے کہ وہ عورت کو مہر ادا کرے جبکہ اگر کوئی امیر سے امیر عورت بھی ہو تو اس پر مرد کے لئے مہر واجب نہیں کیا گیا۔ پھر مرد پر عورت اور اس کی اولاد دونوں کے اخراجات عائد کئے گئے ہیں جبکہ عورت پر یہ ذمہ داری عائد نہیں کی گئی اگرچہ وہ مالدار ہو۔ مرد اگر ان فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو اسے سزائے قید دی جا سکتی ہے۔ پھر مرد پر مختلف قسم کی دیات اور تاوان بھی عائد ہوتے ہیں (یعنی زخموں کے تاوان) اور یہ تاوان اسے اجتماعی طور پر خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے ادا کرنے ہوتے ہیں جبکہ دیات اور ارش کے تاوانوں سے عورت کو معاف رکھا گیا ہے۔ مرد پر اپنے خاندان کے ناداروں اور مساکین کا نفقہ بھی واجب ہے خواہ مرد ہوں یا عورتیں ہوں بشرطیکہ وہ کمانے پر قادر نہ ہوں۔ یہ فریضہ قریب سے قریب رشتہ داروں سے شروع ہوتا ہے اور عورت اس قسم کے عام خاندانی فرائض سے مستثنیٰ ہے۔ یہاں تک کہ جس خاوند سے اس کی اولاد پیدا ہوتی ہے' اس کے ساتھ بھی اگر اس کا معاشی اشتراک نہ ہو یا طلاق ہو گئی ہو تو بچے کی پرورش کے انتظامات بھی اس مرد پر عائد ہوتے ہیں اور وہ خود اس عورت کے اخراجات کے ساتھ اسے ادا کرنے کا پابند ہے۔ غرض اسلامی نظام ایک مکمل اور جامع نظام ہے اور اس میں تقسیم میراث کے وقت مرد و عورت کی مالی ذمہ داریوں کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ شریعت نے ذمہ داریوں کا جو بھاری بوجھ مرد پر ڈالا ہے' اس کی نسبت سے میراث میں مرد کا حصہ کوئی زیادہ نہیں ہے۔ ان تمام امور میں مرد کی معاشی سرگرمیوں کی زیادہ قدرت اور مہارت کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اور عورت کے زیادہ سے زیادہ آرام اور اطمینان کو پیش نظر رکھا گیا ہے تاکہ وہ دلجمعی کے ساتھ انسان کے قیمتی سرمائے یعنی بچوں کی نگہداشت کر سکے' جو ہر قسم کے مال' ہر قسم کے سازوسامان اور ہر قسم کی مفید عام ہنرمندی سے زیادہ قیمتی ہے۔

اس غوروفکر کے نتیجے میں معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی' جس کی تشکیل ایک حکیم و علیم ذات نے فرمائی ہے۔ اس میں وسیع توازن اور گہری حکمت پوشیدہ ہے اور اسلام نے اس آیت میں عورت کو انفرادی ملکیت کا حق ان الفاظ میں دیا ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (۴ : ۳۲) "جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے۔"۔۔۔۔ اور یہ وہ حق ہے جو عربی جاہلیت تمام دوسری جاہلیتوں کی طرح' عورت کو عطا کرنے میں ہمیشہ ہچکچاتی رہی ہے اور کبھی بھی عورت کے اس حق کو کھلے دل سے تسلیم نہیں کیا گیا۔ شاذ و نادر ہی کبھی عورت کو یہ حق دیا گیا اور آج بھی عورت کے اس حق کو مارنے کے حیلے کئے جاتے ہیں جبکہ خود عورت ذات کو اسی طرح وراثت میں پکڑا جاتا ہے اور میراث کی طرح تقسیم کیا جاتا ہے۔

یہ وہ حق ہے جو جاہلیت جدیدہ آج بھی عورت کو دینے میں ہچکچا رہی ہے' حالانکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس نے عورت کو وہ حقوق عطا کئے جو اس کو کبھی عطا نہ کئے گئے تھے۔ جاہلیت جدیدہ میں بعض قوانین ایسے ہیں کہ سب سے بڑے مرد وارث کو تمام میراث کا حقدار سمجھتے ہیں اور بعض قوانین یہ لازم کرتے ہیں کہ عورت جو مالی معاہدہ بھی کرے اس کی منظوری ولی کی طرف سے ازروئے قانون ضروری ہے۔ اور یہ قوانین بیوی کی جانب سے خاص اپنی جائیداد کے بارے میں بھی کسی قسم کا تصرف صرف اس وقت جائز کرتے ہیں جب خاوند اس کی منظوری دے۔ اور یہ ناقص حقوق جاہلیت جدیدہ نے اسے تب دیئے جب اس نے ان کے حصول کے لئے تحریکات چلائیں۔ عظیم انقلابات برپا کئے اور اس کے نتیجے میں عورت کی زندگی کا نظم برباد ہوا' خاندانی نظام ختم ہو گیا' اور عام اخلاقی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔

لیکن اسلام نے ابتداء ہی سے عورت کو یہ حقوق از خود دے دیئے۔ بغیر اس کے کہ وہ ان کے حصول کے لئے کوئی چارٹر آف ڈیمانڈ تیار کرے۔ قبل اس کے کہ وہ بغاوت پر اتر آئے' قبل اس کے کہ وہ ان کے حصول کے لئے عورتوں کی تنظیمیں قائم کرے اور قبل اس کے کہ وہ پارلیمنٹ کی ممبری تک پہنچ کر ان کا مطالبہ کرے۔ یہ حقوق اسلام نے اسے محض انسانیت کے احترام میں عطا کئے۔ یہ اسے محض اس لئے دیئے گئے کہ نفس انسانی کے دو اصناف ہیں مرد اور عورت' اور اس لئے دیئے گئے کہ اسلام نے اپنے اجتماعی نظام کی اکائی ایک خاندان کو قرار دیا ہے۔ اور اس خاندانی نظام کو باہم محبت' باہم الفت کے ساتھ مرد و عورت کے درمیاں مساوات کے اصول پر مربوط کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسب و کمائی اور ملکیت کے نقطہ نظر سے اسلام نے مرد اور عورت دونوں کو ازروئے اصول مکمل طور پر مساوی حقوق دیئے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالواحد وانی اپنی کتاب ''انسانی حقوق'' میں ' اسلام اور جدید مغربی ممالک میں عورت کے حقوق کے بارے میں تقابلی مطالعہ یوں پیش کرتے ہیں ''اسلام نے مرد اور عورت کو قانون کے نقطہ نظر سے مساوی حقوق دیئے' اور تمام شہری حقوق میں مرد اور عورت کو برابر قرار دیا' اور اس سلسلے میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے درمیان کوئی فرق امتیاز نہیں برتا گیا۔ اسلام اور پوری مسیحی دنیا کے درمیان شادی کی نوعیت میں بہت بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق شادی کی وجہ سے نہ عورت کا نام ختم ہوتا ہے نہ اس کی شخصیت ختم ہوتی ہے' نہ اس کے معاملات طے کرنے کی حیثیت میں کوئی فرق آتا ہے' اور نہ اس کا حق ملکیت محدود ہوتا ہے بلکہ ایک مسلمان عورت کا شادی کے بعد نام بھی وہی رہتا ہے' اس کی قانونی اور شہری حیثیت بھی اپنی جگہ بحال رہتی ہے اور تمام قانونی حقوق اسے حاصل رہتے ہیں۔ اس پر وہ تمام ذمہ داریاں عائد رہتی ہیں جو پہلے اس پر عائد تھیں۔ وہ اپنے معاملات میں ہر قسم کے فیصلے اور معاہدے کر سکتی ہے۔ مثلاً خرید و فروخت' رہن' ہبہ اور وصیت وغیرہ۔ وہ جن چیزوں کی مالک ہوتی ہے' نکاح کی وجہ سے اس کے حق ملکیت پر کوئی قید عائد نہیں ہوتی۔ غرض اسلام میں شادی کے بعد بھی عورت کو مستقل قانونی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور وہ مستقل شخصیت کی مالک ہوتی ہے' اس کی جائیداد اس کے شوہر کی جائیداد سے علیحدہ خود اس کی ملکیت ہوتی ہے۔ خاوند کو کوئی قانونی اختیار نہیں ہوتا کہ وہ کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر حاصل کرے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

(وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا (۲۰) وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (۲۱) (٤: ۲۰ - ۲۱))

"اور اگر تم بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کر لو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو' اس میں سے کچھ واپس نہ لینا' کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لوگے؟ اور آخر تم اسے کس طرح لے لو گے جب کہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو۔ اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔" اگر کسی خاوند کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی مطلقہ بیوی سے وہ دولت واپس لے جو اس نے خود اسے عطا کی تھی تو اس کے لئے خود اس عورت کی مملوکہ دولت کا ہڑپ کر لینا بطریق اولی جائز نہیں ہے الا یہ کہ یہ سب کچھ اس کی مرضی سے ہو' اور وہ کوئی چیز اپنی خوشی سے عطا کر رہی ہو اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے۔

(وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا (٤: ٤) "اور عورتوں کو ان کے مہر خوشدلی کے ساتھ ادا کرو' البتہ اگر وہ خود اپنی مرضی سے مہر کا کوئی حصہ تمہیں معاف کر دیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔"

اور مرد اپنی بیوی کی دولت میں کسی قسم کا تصرف بھی نہیں کر سکتا' الا یہ کہ وہ اسے اس کی اجازت دے دے یا اس نے اپنے خاوند کو کسی قسم کے تصرف اور معاہدے کی اجازت دے دی ہو۔ لیکن ایسے حالات میں بھی اس کو اجازت ہے کہ وہ اپنے دیئے ہوئے ان اختیارات کو واپس لے لے اور جس دوسرے شخص کو چاہے وہ اختیارات دے دے۔"

"یہ وہ مقام بلند ہے جس تک عورت آج کے جدید دور جمہوریت میں ان ممالک میں بھی نہیں پہنچ سکی جو اس کرۂ ارض پر انتہائی ترقی یافتہ ممالک ہیں۔ فرانس میں ماضی قریب تک عورتوں کی حالت یہ تھی کہ گویا وہ باندیاں اور لونڈیاں ہیں' بلکہ ابھی تک یہ صورت حال موجود ہے۔ قانون نے کئی شہری معاملات میں اس کے حقوق سلب کئے ہوئے ہیں۔ مثلاً فرانس کے سول کوڈ کی دفعہ ۲۱۷ میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ "شادی شدہ عورت' چاہے نکاح کی شرائط میں یہ طے کر دیا گیا ہو کہ عورت اور مرد کی ملکیت علیحدہ علیحدہ ہوگی اس کے باوجود وہ اپنی جائیداد ہبہ نہیں کر سکتی نہ اس کی ملکیت منتقل کر سکتی ہے' نہ رہن کر سکتی ہے' نہ وہ بالعوض یا بلا عوض تملیک کر سکتی ہے' الا یہ کہ اس کا شوہر کسی معاہدے میں اس کے ساتھ شریک ہو' یا یہ کہ وہ تحریری طور پر ان امور میں سے کسی امر کی اجازت دے دے۔"

"بعد کے ادوار میں اس دفعہ میں متعدد ترمیمیں اور تبدیلیاں کی گئیں لیکن اس قانون کے کافی آثار ابھی تک باقی ہیں اور فرانسیسی عورت پر قانونی پابندیاں عائد ہیں۔ مغربی عورت پر یہ قانونی غلامی مسلط کرنے کے بعد مغربی معاشرت کا رسم و رواج بھی اس پر یہ پابندی عائد کرتا ہے کہ عورت شادی ہوتے ہی اپنا اور اپنے خاندان کا نام کھو دیتی ہے' اس

کے بعد اس کا نام فلاں بنت فلاں نہیں لیا جاتا بلکہ اسے بیگم فلاں سے پکارا جاتا ہے یا اس کے نام کے ساتھ اس کے خاوند کا نام لگ جاتا ہے۔ لیکن اس کے نام کے ساتھ اس کے باپ اور اس کے خاندان کا نام نہیں لیا جاتا۔ اس طرح عورت کا نام ختم ہونے سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ شادی کے بعد عورت کی شہری اور قانونی حیثیت ختم ہو گئی ہے اور وہ اپنے خاوند کی شخصیت میں گم ہو گئی ہے۔"

"مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے اکثر خواتین ان مغربی خواتین کے ساتھ یک جہتی کے طور پر اپنے لئے بھی اس کم تر اور ثانوی حیثیت کو قبول کر لیتی ہیں اور اپنا نام لینے کے بجائے اپنے آپ کو بیگم فلاں ظاہر کرتی ہیں' یا اپنے نام کے ساتھ اپنے خاوند اور اس کے خاندان کا نام چسپاں کر لیتی ہیں اور اپنے نام کے ساتھ اپنے باپ اور اپنے خاندان کا نام لینا پسند نہیں کرتیں' جیسا کہ اسلامی نظام زندگی کی خواہش اور مزاج ہے۔ اس کو کہتے ہیں بھونڈی نقل یا اندھی تقلید۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ جو خواتین مغربی عورت کی غلامی کی بھی نقالی کرتی ہیں' ہمارے ہاں وہ عورت کی آزادی اور حقوق کا مطالبہ کرتی ہیں' اور عورتوں کو مردوں کے ساتھ تشبہ کرنے پر ابھارتی اور حقوق کا مطالبہ کرتی ہیں' حالانکہ درحقیقت وہ ان بہترین حقوق سے دستبردار ہو رہی ہوتی ہیں جو اسلام نے انہیں عطا کیے تھے حالانکہ اسلام نے ان کی قدر و منزلت میں اضافہ کیا تھا' اور ان حقوق میں انہیں مردوں کے برابر حیثیت دی تھی۔" (صفحات ۵۹ تا ۶۱)

---ooo---

اب ہم اس سبق کی آخری آیت کی طرف آتے ہیں۔ اس میں ان معاہدوں کے احکام بتائے گئے ہیں جو احکام میراث کے آنے سے پہلے ہوئے تھے۔ اسلام کے نظام وراثت کو رشتہ داری اور قرابت کے اساس پر مرتب کیا گیا' جبکہ دوستی اور ولایت کے یہ معاہدے قرابت داری کے دائرے سے باہر بھی ہوا کرتے تھے جیسا کہ تفصیلات آرہی ہیں۔

(وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا (۴ : ۳۳))

"اور ہم نے ہر اس ترکے کے حقدار مقرر کر دیئے ہیں جو والدین اور رشتہ دار چھوڑیں۔ اب رہے وہ لوگ جن سے تمہارے عہد و پیمان ہوں تو ان کا حصہ انہیں دو' یقیناً اللہ ہر چیز پر نگراں ہے۔"

اس کلیہ کے بعد کہ مردوں نے جو کمایا ان کا ہے اور عورتوں نے جو کمایا ان کا ہے اور اس حوالے کے بعد کہ قانون میراث کے مطابق مردوں اور عورتوں کے حصص بھی مقرر ہو چکے ہیں اب فرماتے ہیں کہ ہر شخص کے رشتہ داروں میں سے ہم نے اس کے وارث مقرر کر دیئے ہیں' جو اس کی میراث پائیں گے اور یہ وارث اس شخص کے اس ترکے کے حقدار ہوں گے جو اسے اپنے والدین اور اقرباء سے ملا۔ یہ مال اس نظام میراث کے مطابق نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا رہے گا۔ وراثت پانے والے پائیں گے پھر وہ اپنے اس موروثی مال میں مزید اپنی کمائی جمع کریں گے اور اس کے بعد جب وہ فوت ہوں گے تو ان کی اگلی نسل میں آنے والے اقرباء ان کی وراثت حاصل کریں گے۔ یہ ایک ایسی تصویر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں دولت کی گردش کس طرح عمل میں آتی ہے۔ یہ گردش کسی نسل میں نہیں

رکتی اور نہ یہ دولت کسی ایک گھرانے اور ایک فرد کے پاس جمع اور مرتکز ہوتی ہے بلکہ نظام میراث ہمیشہ اپنا کام کرتا رہتا ہے ۔ ایک مسلسل تقسیم ہے جو جاری و ساری ہے ۔ اموال کے مالک اس میں کوئی ترمیم نہیں کر سکتے ۔ نہ وارثوں کے حصص میں کمی بیشی کی جا سکتی ہے ۔ وقفے وقفے کے بعد تقسیم کا یہ خود کار عمل جاری رہتا ہے ۔

اس کے بعد ان سابقہ معاہدوں کی بات ہوئی جن کو شریعت اسلامیہ نے برقرار رکھا ہے اور جن کے مطابق میراث کے حقدار کبھی کبھار غیر اقرباء بھی ہو جاتے تھے ۔ ان معاہدوں کو عقود موالات کہا جاتا تھا ۔ جب اسلامی معاشرے کا آغاز ہوا تو اس میں ان میں سے بعض پائے جاتے تھے مثلاً :

۱۔ معاہدۂ موالات عتق' جو شخص غلام کو آزاد کرتا وہ اس کی جانب سے دیت بھی ادا کرتا' اگر کسی وقت اس پر عائد ہو جائے یعنی جب وہ کوئی جرم کرتا جیسا کہ اپنے اہل نسب کے درمیان دیت کی ادائیگی ہوا کرتی تھی ۔ اور اگر کوئی شخص مرجاتا تو اگر اس کے عصبات نہ ہوتے تو پھر یہ مالک اس کی میراث کا بھی حقدار ہوتا ۔

۲۔ دوسرا عقد موالات' وہ یوں کہ ایک غیر عربی کسی عربی کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کر لیتا جبکہ اس کے اقرباء عرب میں نہ ہوتے' اس معاہدے کے نتیجے میں یہ غیر عربی کسی بھی عرب خاندان کا ایک فرد ہو جاتا ۔ ولی بھی اس کی جانب سے دیت ادا کرتا اگر اس سے کوئی جرم سرزد ہو جاتا اور یہ شخص جب مرجاتا تو اس کی میراث کا حقدار وہ ولی ہوتا ۔

۳۔ وہ معاہدہ جو ابتدائے ہجرت کے ایام میں حضور ؐ نے انصار و مہاجرین کے درمیان کرایا تھا ۔ اس طرح مہاجرین اور انصار ایک دوسرے کے وارث بھی ہوتے' اگر انصار کے اہل مسلمان ہوتے ورنہ ان کے درمیان وراثت نہ ہوتی ۔

۴۔ ایسے معاہدے جاہلیت میں ہوتے تھے کہ دو شخص ایک دوسرے کے ساتھ معاہدہ کرتے کہ ہم ایک دوسرے کی وراثت کے حقدار ہوں گے ۔

اسلام نے ان تمام معاہدوں کو کالعدم کر دیا' خصوصاً تیسرے اور چوتھے معاہدے کو اور یہ قرار دیا کہ وراثت کے اندر حقیقی عامل قرابت اور صرف قرابت ہے لیکن اسلام نے اول الذکر دو معاہدوں کو بحال رکھا اور یہ حکم دیا کہ آئندہ ایسے معاہدے نہ کیے جائیں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ۔ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ (۴: ۳۳)

(وہ لوگ جن سے تمہارے عہد و پیمان ہوں ان کا حصہ انہیں دو) اور اس بارے میں سخت تاکید بھی کی گئی اور ان معاہدوں اور ان کے تصرفات کے بارے اپنی شہادت تحریر فرمائی ۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا (۴: ۳۳)

(یقیناً اللہ ہر چیز پر نگران ہے) رسول اللہ ؐ نے فرمایا ۔ لاحلف فی الاسلام ایما حلف فی الجاھلیہ لم یزدہ الاسلام الاشدہ (اسلام میں کوئی معاہدۂ ولا نہ ہو گا لیکن جو معاہدے جاہلیت کے دور میں ہوئے ہیں اسلام ان کو مزید پختہ کرتا ہے ۔ احمد و مسلم)

اسلام نے ان معاہدوں کے خاتمہ میں وہی پالیسی اختیار فرمائی جو وہ تمام مالی قوانین کے سلسلے میں ہمیشہ اپناتا ہے ۔ جب بھی وہ کوئی قانون مالی اصلاحات کے طور پر نافذ کرتا ہے' اسلام کی پالیسی وہی ہوتی ہے یعنی اسلام مالی اصلاحات کا کوئی قانون موثر بماضی (Retropective) نافذ نہیں کرتا ۔ مثلاً جب حرمت ربا کا قانون نافذ ہوا تو اس کا نفاذ اس تاریخ

سے ہوا' جس تاریخ کو حکم آیت کے اندر نازل ہوا۔ اور اس سے پہلے جو سود لیا جا چکا تھا' اسے نہ چھیڑا گیا۔ اور یہ حکم نہ دیا کہ جن لوگوں نے منافع لئے ہیں وہ واپس کریں۔ اگرچہ سابقہ معاہدے بھی منسوخ کر دیئے البتہ جنھوں نے معاہدوں کے مطابق قرض وصول کر لئے تھے وہ ان کے پاس رہنے دیئے تھے۔ یہاں ولایت کے معاملے میں معاہدوں کو منسوخ نہیں کیا گیا' البتہ یہ حکم دیا گیا کہ جدید معاہدے نہ کئے جائیں اس لئے کہ ان معاہدوں کی رو سے مالی ذمہ داریوں کے علاوہ معاہدہ کرنے والے اجنبی افراد اس خاندان کے فرد بن جاتے تھے۔ اور ان کے درمیان مختلف قسم کے پیچیدہ روابط قائم ہو جاتے تھے جن کا کاٹنا مناسب نہ تھا۔ البتہ جدید معاہدے کرنے سے منع کر دیا گیا اور سابقہ معاہدوں کے بارے میں حکم دیا کہ انہیں نافذ کیا جائے۔ جدید معاہدوں کو اس لئے منع کر دیا گیا تاکہ ان کی وجہ سے ایسے آثار اور مسائل پیدا نہ ہوں جن کا حل ضروری ہو جائے۔

اس فیصلے کی وجہ سے ایک تو لوگوں کو ایک سہولت دی گئی دوسرے یہ کہ اس کے اندر ان مسائل کا حل پایا جاتا ہے جو اس وقت اس معاشرے کے لئے اہم تھے۔ اور یہ حل زیادہ گہرائی' حکمت اور پورے حالات کے تقاضے پر مبنی تھا۔ خصوصاً ان حالات میں جن میں اسلام جدید اسلامی معاشرے کے خدوخال وضع کر رہا تھا' اور سابق جاہلی معاشرے کے نشانات ایک ایک کر کے مٹائے جا رہے تھے اور ہر قانون سازی کے عمل میں یہ کام ذرا اور آگے بڑھتا تھا۔ (حضرت ابن عباس ﷺ سے اس آیت کی تشریح میں یہ بات منقول ہے کہ وہ وراثت کو قانون وراثت کے مطابق دیتے' البتہ جن لوگوں کے ساتھ معاہدے تھے ان کی لداد 'اعانت اور ان کے ساتھ ہمدردی کا حکم دیتے تھے۔)

---○○○---

اس سبق کا آخری موضوع اسلام کے نظام خاندان کی تنظیم اور اس کے امور اور معاملات کی ضابطہ بندی ہے۔ خاندان کے اندر کس کی کیا حیثیت ہوگی اور یہ کہ خاندان کے اندر کس کی کیا ڈیوٹی ہوگی۔ اور وہ انتظامات جن کے ذریعے اس اہم ادارے کے امور کی ضابطہ بندی کی گئی ہے۔ اور یہ کہ اس ادارے کو اختلافات اور ذاتی خواہشات کے جھٹکوں سے کس طرح محفوظ کرنا ہے۔ نیز اسے ان عناصر سے کس طرح بچانا ہے جو اس کو منہدم کرنے اور اس کی جڑیں اکھاڑنے کا باعث بنتے ہیں۔ اس سلسلے میں پوری پوری کوشش کی گئی ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۭ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاهْجُرُوْھُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ

عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

"مرد عورتوں پر قوام ہیں' اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے' اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں ۔پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت اور نگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں ۔اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو تو انہیں سمجھاؤ' خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو اور مارو' پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لئے بہانے تلاش نہ کرو' یقین رکھو کہ اوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالاتر ہے ۔اور تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو' وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت پیدا کر دے گا' اللہ سب کچھ جانتا اور باخبر ہے ۔"

ان قرآنی نصوص کی تفسیر اور تشریح شروع کرنے سے پہلے اور ان کی نفسیاتی اور اجتماعی اغراض کے بیان سے پہلے' اس بات کی ضرورت ہے کہ خاندان کے بارے میں اسلام کا اجمالی نقطہ نظر بیان کر دیا جائے ۔اور یہ بتا دیا جائے کہ اسلام خاندان کی تعمیر کس منہاج پر کرتا ہے اور پھر اس کے بچاؤ کے لئے کیا تدابیر اختیار کرتا ہے ۔اور پھر یہ کہ اس انتظام سے اسلام کے پیش نظر کیا اہداف اور مقاصد ہیں ۔یہ بیان ہم حتی الوسع اجمالی طور پر کریں گے' اس لئے کہ اس موضوع پر مفصل بحث کے لئے زیادہ صفحات درکار ہوں گے ۔

جس ذات نے انسان کو پیدا کیا' اس نے اس کے اندر وہی ازدواجی فطرت ودیعت کی جو اس نے تمام چیزوں کے اندر رکھی ہے جو اس نے پیدا کیں ۔

(وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ) (اور جو چیزیں ہم نے پیدا کیں ان کے ہم نے جوڑے بنائے تاکہ تم نصیحت پکڑو) انسان کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے جوڑا پیدا کیا لیکن اس جوڑے کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ۔

(يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (۴ : ۱)) "لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا ۔" اس جوڑے کے ملاپ کے اندر اللہ تعالیٰ نے زندگی کے تمام راز رکھ دیئے ہیں ۔اس ملاپ کے اندر نفسیاتی سکون' اعصابی ٹھہراؤ' روحانی اطمینان اور جسمانی راحت اور آرام کا انتظام کیا ۔پھر اس ملاپ کے اندر دونوں کا پردہ' عفت مآبی اور گناہوں سے بچاؤ کا سامان رکھا ہے ۔اس کے علاوہ یہ ملاپ نسل کے لئے کھیت کا کام بھی دیتا ہے ۔اور اس کے ذریعے زندگی کے اندر تسلسل قائم ہوتا ہے اور اس کے بعد طریقہ ہائے زندگی کی ترقی کا راز بھی اسی میں ہے لیکن

اسلام نے اس پورے نظام کو ایک تربیت گاہ' ایک نرسری' ایک باپردہ اور پرسکون خاندان کی شکل میں بنایا جس کی ابتداء زوجین سے ہوتی ہے۔

(وَمِنْ اٰیٰتِهٖ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳۰ : ۲۱))

"اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تمہارے لئے تمہارے جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کی ۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں) (هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ) (وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو)

(نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ)

"تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو' جاؤ اور اپنے مستقبل کا بھی سروسامان کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو)

(يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ)

"اے لوگو' جو ایمان لائے ہو اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔"

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَاۤ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ) (اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کرتی رہی ان کی اس اولاد کو بھی ہم ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ہم ان کے اعمال کے صلے میں سے کچھ کم نہ کریں گے )

نفس انسانی کے دونوں اطراف مرد و زن کا مقام اللہ کے ہاں کیا ہے؟ انسانیت میں وہ دونوں برابر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نفس انسان کو مکرم بنایا جس میں عورت بھی شامل ہے اور مرد بھی۔ اللہ تعالیٰ مرد و عورت دونوں کو اپنے اپنے اعمال پر پوری جزاء دے گا۔ اللہ کے قانون میں جس طرح مرد ملکیت رکھ سکتا ہے' اسی طرح عورت بھی ملکیت رکھ سکتی ہے۔ مرد حق میراث رکھتا ہے تو عورت بھی حق میراث رکھتی ہے۔ مرد ایک قانونی شخصیت ہے تو عورت علیحدہ قانونی شخصیت ہے اور ان تمام نکات پر بحث ہم اس سبق میں اس سے پہلے کر آئے ہیں۔

چونکہ ادارہ خاندان کو وجود میں لانے کے لئے نفس انسانی کے دونوں اجزاء کا باہم ملاپ ضروری تھا اور اس کے نتیجے میں فرائض اور واجبات پیدا ہوتے تھے' اس لئے شریعت نے اس ادارے کے معاملات کے ہر جزء کے بارے میں تفصیلی ہدایات دیں۔ مقصد یہ تھا کہ مرد و زن کو سکون' اطمینان' پردہ پوشی اور برائی اور فحاشی سے بچنے کے لئے مواقع

حاصل ہوں۔ دوسرے یہ کہ اس خاندانی نظام کے ذریعے زندگی کو تسلسل حاصل ہو اور وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔ اس سورہ کے بڑے حصے میں خاندان کی شیرازہ بندی کی گئی ہے 'جس کا ایک حصہ ہم نے اس پارے کی ابتداء میں دیا تھا۔ اور پارہ چہارم میں بھی اس کے تکمیلی احکام دیئے گئے تھے۔ اسی طرح سورۂ بقرہ میں بھی یہ احکام بیان ہوئے تھے جس کی تشریح ہم نے دوسرے پارے میں پیش کی تھی۔ قرآن کریم کی کئی دوسری سورتوں میں بھی خاندانی نظام کے بارے میں تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں۔ مثلاً اٹھارہویں پارے میں سورۂ نور اور سورۂ احزاب (پارہ ۲۱-۲۲) سورۂ طلاق 'سورۂ تحریم (پارہ ۲۸) اور بعض دوسری سورتوں کے متفرق مقامات پر۔ ان تمام مقامات پر جو مباحث کئے گئے ہیں ان میں اسلام کے خاندانی نظام کا ایک مکمل دستور موجود ہے۔ ان طویل و عریض مباحث اور متنوع اور مفصل احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام انسانی زندگی کی تعمیر ایک خاندانی نظام کے مطابق کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ان سورتوں میں خاندانی زندگی کے ایک ایک گوشے کو لیا گیا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ اس صفحے کے پڑھنے والے ان تمام تفصیلات کو ذہن میں رکھیں گے جو ہم نے اس سلسلے میں پیش کی ہیں۔ مثلاً انسان کے بچوں کا طویل بچپن 'اس کے دوران بچوں کی طویل پرورش اور نگہداشت کی ضرورت 'اور پھر ان بچوں کے لئے ایک خاندان کی ضرورت تاکہ بچہ اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو کر 'زندگی کی معاشی جدوجہد میں داخل ہو سکے اس معاشی جدوجہد سے بھی زیادہ اہم بچے کی وہ تربیت ہے جو اسے اجتماعی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے تیار کرتی ہے اور معاشرے کا ایک اچھا فرد بننے کے اہل بناتی ہے تاکہ وہ انسانی ترقی کی رفتار میں اپنے فرائض سرانجام دے سکے۔ اور جب وہ اس معاشرے کو چھوڑے تو اس حالت سے بہتر کر کے چھوڑے جس میں اس نے اسے پایا تھا۔ غرض خاندانی نظام کے صحیح فہم کے لئے مذکورہ بالا نکات پر غور کرنا نہایت ہی ضروری ہے۔ نیز خاندان کے مقاصد 'خاندان کے فرائض 'خاندان کے بچاؤ اور تباہی اور بربادی کے ہر اثر سے اسے محفوظ اور مامون رکھنے نیز خاندان کی نشوونما کے سلسلے میں اسلامی نظام زندگی کے موقف اور پالیسی کو سمجھنے کے لئے یہ امور نہایت ہی اہم ہیں۔

اسلام کی نظر میں خاندان کی جو اہمیت ہے اور جس کے بارے میں ہم نے اوپر تفصیلی اشارات دیئے ہیں ان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک خاندانی نظام کے قیام 'اس کے استحکام اور اس کے اندر سکون اور ٹھہراؤ پیدا کرنے کے لئے اسلام نے جتنا زور دیا ہے اس کا تصور بھی دوسرے نظاموں میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ اسلام نے عورت کو بھی پہلی مرتبہ ایک باعزت مقام اور باعزت شخصیت عطا کی۔ عورت کو جو حقوق اسلام نے دنیا میں پہلی بار عطا کئے 'یہ وہ حقوق نہیں جن کے ذریعے وہ صرف محبت اور لذت حاصل کرے بلکہ وہ حقوق ہیں جن کے ذریعے عورت حیات انسانی کے حوالے سے اپنے بلند ترین فرائض سرانجام دے۔

ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اب اس سبق کی آخری آیت پر کلام کرتے ہیں جو اس سلسلے کی بہت سی اہم آیت ہے اور اسی وجہ سے اس کی تشریح سے پہلے ہم نے درج بالا تمہیدی اشارات دیئے ہیں۔

یہ آیت زوجین کے درمیان قائم ادارے کی تنظیم اور اس ادارے کے افراد کے درمیان اختیارات کی وضاحت کرتی ہے اور افراد خاندان کے درمیان تعلقات کی کشیدگی کو دور کرنے کی خاطر ان کو ہدایات دیتی ہے کہ تمام مسلمان خواہشات نفسانیہ اور ذاتی تاثرات و میلانات کے تابع ہونے کے بجائے اللہ جل شانہ کے احکام کی اطاعت کریں اور اللہ کا حکم یہ ہے کہ

خاندان کے اندر قوام اور سربراہ مرد ہو گا اور یہ کہ مرد کو سربراہ بنانے کے اسباب یہ ہیں کہ ایک تو مرد کو اللہ نے فضیلت دی ہے اور اس کے اندر وہ تنظیمی صلاحیتیں زیادہ رکھی گئی ہیں 'جن صلاحیتوں پر خاندانی نظام کا چلنا موقوف ہے ۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد پر یہ ڈیوٹی عائد کی ہے کہ وہ خاندان کی معاشی ضروریات کا کفیل ہو گا ۔ چونکہ خاندان کا قیم مرد کو بنایا گیا ہے' اس لئے مرد کو وہ خصوصی اختیارات بھی دیئے گئے ہیں جن سے وہ اس ادارے کو بچا سکے اور محض عارضی جذبات اور شہوات نفسانیہ اسے تباہ نہ کر سکیں اور یہ بھی بتایا گیا کہ ان وقتی شہوات سے بچاؤ کی تدابیر کیا ہوتی ہیں ۔علاج کی حدود بھی متعین کر دی گئی ہیں اور اگر داخلی علاج نہ ہو سکے تو پھر خارجی علاج بھی بتایا گیا ہے ۔ خصوصاً ان حالات میں جبکہ اس ادارے کو شدید خطرات لاحق ہوں اور نہ صرف یہ خطرہ ہو کہ اس کے دو اہم اطراف اور فریق ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں بلکہ ان کی جدائی کے نتیجے میں معصوم بچوں اور نوخیز نسل کی تربیت کو بھی خطرات درپیش ہوں بلکہ ان کے وجود تک کو خطرہ لاحق ہو گیا ہو ۔ ذرا غور سے دیکھئے کہ ہر اقدام اور تدبیر کی پشت پر کس قدر گہری حکمت ہے ۔ اور اس کی کس قدر ضرورت ہے ۔

(الرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (٤ : ٣٤)) (مرد عورتوں پر قوام ہیں' اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں ۔)

جیسا کہ ہم نے کہا خاندان انسانی زندگی کا ابتدائی ادارہ ہے ۔ ابتدائی ادارہ اس طرح کہ یہ ایک نکتہ آغاز ہے جو انسان کی پوری زندگی پر اثرانداز ہوتا ہے ۔ اس لحاظ سے بھی یہ نکتہ آغاز ہے کہ خاندان ہی سے آئندہ زندگی کے عناصر پیدا ہوتے ہیں اور اسلامی نقطہ نظر سے انسان اس کائنات کا اہم ترین عنصر ہے ۔

دنیا میں خاندان کے ادارے کے مقابلے میں کم اہم اداروں کی ادارت اور انتظام (Management) اہل ترین افراد کے سپرد کیا جاتا ہے مثلاً مالی ادارے بینک وغیرہ 'صنعتی ادارے اور کارخانے اور دوسرے تجارتی ادارے اور کمپنیاں ۔ ان اداروں کا انتظام و انصرام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں دیا جاتا ہے جو اپنے شعبے میں اچھی مہارت رکھتے ہوں اور انہوں نے اس شعبے میں وافر معلومات حاصل کر رکھی ہوں اور ان کے اندر تجربہ اور صلاحیت موجود ہو ۔

یہ تو ہے رواج ان اداروں کے انتظام کا جن کا مقام و مرتبہ اور اہمیت انسانی ادارے سے بہت ہی کم تر ہے ۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ خاندان کا انتظام اور انصرام سپرد کرنے میں بھی اسی اصول کو مدنظر رکھا جائے اس لئے کہ خاندان کا ادارہ اس کائنات کی اہم ترین پیداوار یعنی نسل انسانی کی افزائش کا ذمہ دار ہے ۔ ظاہر ہے کہ انسان کے نقطہ نظر سے انسان اہم ترین پیداوار ہے ۔

اسلامی نظام حیات اس اصول کو مدنظر رکھتا ہے ۔ وہ انسان کی فطرت کو بھی مدنظر رکھتا ہے اور پھر خاندان کے اجزاء یعنی مرد و زن دونوں کی صلاحیتوں کو بھی مدنظر رکھتا ہے ۔ وہ ان فرائض و واجبات پر بھی نظر رکھتا ہے جو مرد اور عورت پر ازروئے فطرت عائد کئے گئے ہیں ۔ اسلامی نظام نے مرد و زن دونوں پر فرائض عائد کرتے وقت دونوں کے ساتھ عدل

و انصاف کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور یہ عدل یعنی تقسیم وظائف ' مرد و زن کی فطرت کو دیکھ کر کی گئی ہے ۔ یہ بات تو ناقابل انکار ہے کہ مرد اور عورت دونوں ہی اللہ کی مخلوق ہیں اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے کسی پر ظلم نہیں کرتا ۔ جبکہ وہ ہر ایک کو اس کی مخصوص فطری ڈیوٹی کے لئے تیار کرتا ہے اور اسے اس کی ڈیوٹی کے لائق استعداد بھی عطا کرتا ہے ۔ یہ امور نہایت ہی بدیہی اور مسلم ہیں ۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو مرد اور عورت کی شکل میں پیدا کیا اور پھر ان کا جوڑا بنایا جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس پوری کائنات کو جوڑے جوڑے بنایا ہے ۔ یعنی اس کائنات کے اندر جمادات تک میں جوڑے ہیں ۔ اب عورت کا فطری فریضہ یہ ہے کہ وہ حاملہ بنے ' پھر وضع حمل ہو ' پھر وہ بچے کو دودھ پلائے اور مرد اور عورت کے ملاپ کا جو ثمرہ نکلے اس کی پوری طرح وہ ذمہ دار ہو ۔ اس فطری نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو عورت پر یہ ایک عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو ایک نہایت ہی اہم ذمہ داری ہے ۔ یہ کوئی معمولی اور آسان ذمہ داری نہیں ہے ۔ اور یہ ذمہ داری بغیر جسمانی 'نفسیاتی' اور گہری عقلی تیاری اور استعداد کے ادا بھی نہیں کی جاسکتی ۔ یہ سب خوبیاں عورت کی ذات کے اندر پائی جانی ضروری ہیں ۔ اس لئے یہ بات عین ترین انصاف تھی کہ اس شراکت کے دوسرے ساتھی کے ذمہ بھی ایک اہم ڈیوٹی لگائی جائے اور وہ یہ کہ خاندان کی تمام ضروریات کا کفیل وہی ہو اور اس طرح وہ والدہ او بچے دونوں کی حمایت اور بچاؤ کا بھی ذمہ دار ہو تاکہ عورت اپنی نہایت ہی اہم اور قیمتی ڈیوٹی کے لئے من کل الوجوہ فارغ ہو ۔ اس پر یہ زیادتی نہ ہو کہ وہ حمل بھی برداشت کرے ' وضع حمل کی تکلیفات بھی برداشت کرے ' اور بچے کی رضاعت اور کفالت بھی کرے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ مزدوری اور محنت بھی کرے اور اپنے بچے کے لئے اور اپنی ذاتی ضروریات کے لئے جاگتی بھی رہے ۔ بیک وقت دونوں ڈیوٹیاں اس پر عائد کر دی جائیں ۔ اس لئے یہ نہایت ہی منصفانہ تقسیم کار تھی کہ عورت کے لئے اس کی جسمانی اور فطری صلاحیتوں کے مطابق میدان کار وضع کیا جائے اور مرد کے لئے اس کے جسمانی 'نفسیاتی اور فطری صلاحیتوں کے مطابق میدان کار تجویز کیا جائے اور اسلام نے عملاً یہی کچھ کیا ' اس لئے کہ اسلام کسی پر ظلم نہیں کرتا ۔ رب ذوالجلال کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرتا ۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو جو صلاحیتیں دی ہیں ان میں نرمی 'مہربانی ' جلدی متاثر ہو جانا ' جلدی جواب دینا ' اور بچوں کی فوری ضروریات کے لئے تمام ضروری صفات فطرت نے ماں میں ودیعت کر دیں اور یہ ایسی صفات ہیں جو عورت کے اندر تعلیم و تربیت کے ذریعے پیدا نہیں کی گئیں بلکہ ان افعال کا ارتکاب عورت بے سوچے سمجھے کرتی ہے ۔ اس لئے کہ انسان کی اہم ضروریات یہاں تک کہ ایک فرد واحد کی اہم ضروریات کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس بات پر موقوف نہیں رکھا کہ کوئی سوچے ' غور کرے اور وقت گزارنے کے بعد فطری ضروریات کو پورا کرے ۔ جبکہ فطری ضروریات کا مطالبہ بھی غیر ارادی ہوتا ہے اور انہیں پورا بھی غیر ارادی طور پر کیا جاتا ہے تاکہ مطالبہ ہوتے ہی ان ضروریات کو پورا کر دیا جائے بلکہ بعض حالات میں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید ان فطری مطالبات کے پورا کرنے کا نظام کوئی جبری نظام ہے ۔ ہاں اگر اس میں جبر کا کوئی عنصر ہے تو وہ داخلی عنصر ہے ' خارج سے کوئی جبر نہیں ہے ۔ بعض اوقات تو یہ مطالبہ مستحب اور لذیذ ہوتا ہے تاکہ انسان جلدی اس مطالبہ فطرت کے پورا کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے ۔ وہ انسان کے لئے فرحت بخش ہو ' اگرچہ اس میں طویل مشقت اور بے بہا قربانی ہو ۔ یہ اللہ کی ساخت ہے جس نے ہر چیز کو بہت ہی اچھا کر

کے بنایا ہے۔

فطرت انسانی کے اندر ان خصوصیات کا پایا جانا کوئی سطحی چیز نہیں ہے۔فطرت کے یہ دواعی عورت کی عضویاتی' اعصابی' شعوری اور نفسیاتی ساخت کے اندر نہایت ہی عمق کے ساتھ ودیعت کیے گئے ہیں۔اس بارے میں ماہرین فن کا یہ کہنا ہے کہ یہ اوصاف اس خلیے کے اندر موجود ہوتے ہیں جن سے انسان پیدا ہوتا ہے۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے خلیے کی گہرائیوں کے اندر ان خصوصیات کو پیدا کر دیا تھا اور اس خلیے کی تقسیم اور بڑھوتری سے پھر بچہ نشوونما پاتا ہے اور اس کے اندر وہ تمام اساسی خصائص موجود ہوتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں مرد کو جو خصوصیات دی گئیں ان میں سے اہم ترین خصوصیت مرد کی سخت جانی اور مضبوطی ہے۔ مرد جلدی متاثر نہیں ہوتا اور کسی بھی صورت حال کو جلد قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔وہ ہر کام سوچ سمجھ کر کرتا ہے اور کوئی اقدام کرنے سے پہلے اس کے نتائج پر بھی غور کرتا ہے۔کیونکہ آغاز حیات میں اس کی زندگی کا فریضہ یہ تھا کہ وہ شکار کر کے لائے اور اپنے بچوں اور بیوی کے بچاؤ کے لئے مرنے مارنے پر اتر آئے۔بیوی بچوں کی معیشت کا انتظام کرے اور زندگی کے تمام فرائض سرانجام دے۔اس کے تمام فرائض اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ہر اقدام سے پہلے اچھی طرح سوچا جائے۔غور و فکر سے کام لیا جائے اور اگر کوئی کسی بات کی دعوت دے تو اسے بہت سوچ کر قبول کیا جائے۔ یہ سب خصوصیات مرد کی شخصیت کی ساخت کے اندر پائی جاتی ہیں جس طرح عورت کی خصوصیات اس کی شخصیت کی ساخت کے اندر موجود ہوتی ہیں۔

مرد کی یہ فطری خصوصیات اسے اس بات کا مستحق بنا دیتی ہیں کہ وہ گھرانے کا نگراں ہو اور مرتبے کے اعتبار سے خاندان میں سینئر ہو۔مزید یہ کہ چونکہ پورے خاندان کے اخراجات کا ذمہ دار بھی مرد ہی ہوتا ہے اس لئے اس کی نگرانی ضروری ہے کیونکہ وہی ہے جو پورے خاندانی ادارے کی معاشی ضروریات کا کفیل ہے۔چونکہ وہی خرچ کرنے والا ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہی مدیر ہو۔یہی دو خصوصیات ہیں جن کو قرآن کریم کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے اور انہی کی بنا پر اسلامی معاشرے میں مرد کو قوام بنایا گیا ہے۔

مرد کی نگرانی کے بعض اسباب تکوینی اسباب ہیں یعنی صلاحیت کے اعتبار سے اور بعض اسباب ذمہ داریوں کے حوالے سے ہیں۔نیز ذمہ داریوں کی تقسیم میں انصاف اور عدل کے حوالے سے بھی مرد نگراں بن جاتا ہے اور پھر شریعت نے مرد اور عورت پر ذمہ داریاں ڈالتے وقت اس امر کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ کس کے لئے کیا ذمہ داری باعث سہولت ہے اور کس کی فطرت کیا ذمہ داری چاہتی ہے اور کس ذمہ داری کے لئے معاون ہے۔

عورت کے مقابلے میں نگرانی کے لئے مرد کی افضلیت کے اپنے اسباب ہیں' جو صلاحیت اور تجربے کے حوالے سے ہیں اور نگرانی کے ان تمام اسباب کو لے کر ذمہ داریاں ادا ہوں گی۔اس لئے کہ کوئی ادارہ بھی منیجر اور نگراں کے بغیر نہیں چل سکتا یعنی وہ تمام ادارے جو خاندان کے ادارے کے مقابلے میں بہت کم اہم اور بہت کم قدر و قیمت کے حامل ہیں۔پھر مزید یہ کہ انسانیت کا ایک حصہ بعض خاص ڈیوٹیوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔از روئے فطرت ان ڈیوٹیوں کی ادائیگی اس کے لئے سہل ہے اسی لئے یہ ڈیوٹیاں اس پر عائد کی گئی ہیں۔اور انسانیت کا دوسرا حصہ از روئے فطرت ان کے لئے تیار نہیں کیا گیا۔ان ڈیوٹیوں کی ادائیگی اس کے لئے سہل نہیں ہے اور اگر اس پر وہ ڈیوٹیاں عائد کر دی جائیں تو

یہ اس پر صریح ظلم ہو گا۔ لیکن اگر اسے ان فرائض کی ادائیگی کے لئے تیار بھی کیا جائے' اسے ان کی ٹریننگ بھی دی جائے' علمی اور عملی تربیت بھی دی جائے پھر وہ انہیں سرانجام بھی دے پائے تو اس سے اس کی وہ صلاحیت بری طرح متاثر ہو گی جس کے لئے اسے پیدا اور تیار کیا گیا ہے۔ مثلاً عورت کے حوالے اس کی مادرانہ ذمہ داری ۔ یعنی اگر عورت پر دوسری تمدنی ذمہ داریاں عائد کر دی جائیں تو وہ مادرانہ فرائض کی ادائیگی کے قابل نہ رہے گی جو اس کی فطرت کا تقاضا ہیں اور جس کی اصل استعداد ہے سرعت انفعال اور سرعت قبولیت ۔ یہ عورت کی فطرت کے اندر مرکوز ہیں ۔ اس پر مزید یہ کہ عورت کی عضویاتی اور اعصابی ساخت کے اندر مادرانہ صلاحیتیں رکھی گئی ہیں اور ان کے اثرات عورت کے طرز عمل اور اس کی طرف سے بچے کی ضروریات کے لئے تڑپ رکھنے کا جذبہ وغیرہ۔

یہ نہایت ہی اہم مسائل ہیں' اس قدر اہم کہ ان کے بارے میں ٹھوس فیصلہ صرف انسانی خواہشات کے زاویے سے نہیں کیا جا سکتا اور یہ اس قدر خطرناک ہیں کہ ان کے جوابات محض تیر تکے چلانے سے نہیں دیئے جا سکتے ۔ جب قدیم اور جدید جاہلیتوں نے ان اہم مسائل کے فیصلے انسان کی گھٹیا خواہشات کے زاویے سے کئے تو انہوں نے انسان کے وجود تک کو خطرے میں ڈال دیا۔ انسان کے اندر انسانی خصائص کا باقی رہنا مشکل ہو گیا' جن انسانی خصائص پر انسان کی زندگی قائم ہے اور جن سے اسے امتیازی شان ملی ہے ۔

اس پر ایک دلیل تو یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ لوگ اس حقیقت کا انکار کر دیں اسے ترک کر دیں اور اسے بالکل انوکھا سمجھنے لگیں' انسان کے وجود کے اندر ان قوانین فطرت کو مکمل کنٹرول حاصل ہے اور انسانی فطرت اس کی طرف واضح اشارات کرتی ہے ۔

پھر یہ بھی ایک دلیل ہے کہ جب بھی انسانیت نے اس اصول کی خلاف ورزی کی ہے' اس کی وجہ سے انسانی زندگی کے اندر بے چینی' فساد اور اخلاقی گراوٹ پیدا ہوئی ہے اور انسانی زندگی سخت خلفشار سے دوچار ہوئی ہے۔ خاندان کے اندر نظم و نسق تباہ ہوا ہے ۔ انسانی زندگی کے نشانات اور امتیازات ختم ہو گئے ہیں اور وہ اپنے فطری اور اصلی مقام سے ہٹ گئی ہے ۔

اس پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ خود عورت کی یہ نفسیاتی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے اوپر کوئی مرد قوام اور حکمران ہو اس لئے کہ خاندان کے اندر مرد کی حاکمیت اور برتری ایک فطری امر ہے ۔ اگر عورت کو مرد کی سرپرستی حاصل نہ ہو تو وہ اپنے آپ کو محروم' ناقص اور بدحال سمجھتی ہے ۔ یہ صورت حال اس وقت مشاہدے میں آتی ہے جب وہ کسی ایسے مرد کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہو جس کے اندر سرپرستی اور قوام ہونے کی صلاحیت نہ ہو اور وہ یہ حیثیت عورت کے سپرد کر دے ۔ دور جدید کی گم کردہ راہ اور بے راہ رو عورتیں بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہیں کہ عورت کی فطرت میں ہے کہ اس کا کوئی سرپرست اور حاکم ہو۔

مزید یہ دلیل بھی ہے کہ ایسا خاندانی ادارہ جس میں باپ کی قوامیت نہ ہو' اس خاندان کے اندر بچوں کی پرورش صحیح نہیں ہوتی ۔ مثلاً اس صورت میں کہ مرد کی شخصیت کمزور ہو اور بچوں پر والدہ کی شخصیت چھا جائے ۔ یا ایسی صورتوں میں جہاں باپ موجود ہی نہ ہو' فوت ہو چکا ہو یا ایسے خاندان جن میں اولاد کا کوئی قانونی سرپرست اور باپ ہوتا ہی نہیں ۔ ایسے خاندانوں میں بچے بداخلاق اور ناقص شخصیت کے مالک ہوتے ہیں اور کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ انحراف اور

بے راہ روی سے بچ نکلیں ـ نیز ایسے بچے اعصابی اور نفسیاتی اعتبار سے اور اخلاقی اور عملی اعتبار سے کامل شخصیت کے مالک ہرگز نہیں ہوتے ـ

مرد کی نگرانی اور سرپرستی کے جواز پر یہ بعض اہم دلائل ہیں ' جن کی طرف خود انسانی فطرت ہماری رہنمائی کرتی ہے ـ مرد کی فطرت کے اندر یہ سرپرستی موجود ہوتی ہے اور انسان کے اندر اس کے اصول و قواعد پوری قوت کے ساتھ جاری ہیں ـ اگرچہ لوگ انکار کریں ' اسے ترک کردیں اور اسے انوکھا سمجھیں ـ

اس سے زیادہ مرد کی قوامیت پر یہاں بحث ممکن نہیں ہے ـ یہاں مرد کی سرپرستی ، نگرانی اس کے جواز اور اس کی معاشرتی ضرورت اور فطری تقاضوں پر اتنی ہی بحث کافی ہے ـ لیکن یہاں ہمارے لئے اس قدر کہنا مناسب ہے کہ مرد کی اس قوامیت اور نگرانی کا معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی خاندان یا معاشرے کے اندر عورت کی شخصیت کی نفی کردی جائے ـ نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت کی شہری حیثیت کو ختم کیا جارہا ہے جیسا کہ اس سے قبل ہم کہہ آئے ہیں بلکہ مرد کی یہ نگرانی خاندانی نظام کے اندر ' اس کی ایک ذمہ داری ہے ' جو اس اہم ادارے کے چلانے ' اس کی حفاظت اور اس کے بچاؤ کے لئے اس پر عائد کی گئی ہے ـ یہ بات عقل میں آنے والی ہے کہ کسی ادارے کا نگران مقرر کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ اس ادارے کے وجود کو ختم نہ کرے گا ـ اس کے کسی رکن کی شخصیت کو ختم نہ کرے گا ' نہ اس ادارے کے شرکاء کے حقوق تلف کرے گا اور نہ اس ادارے میں کام کرنے والوں کے فرائض کو ختم کرے گا ـ دوسرے مقامات پر اسلام نے مرد کی نگرانی کی حدود و قیود کو اچھی طرح بیان کیا ہے ـ اس پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ نہایت ہی نرمی اور اور نہایت ہی شفقت اور رحمت کے ساتھ اس فرض کو ادا کرے گا ـ نیز دوسرے مقامات پر مرد کے مالی اور جانی فرائض بھی بیان کئے گئے ہیں اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بیوی اور بچوں کے ساتھ مرد کا طرزعمل کیا ہونا چاہیے؟ (اس موضوع پر مزید وضاحت کے لئے درج ذیل مراجع زیرنظر رہیں ـ نحو مجتمع اسلامی کی فصل معاشرہ اور خاندان ــــــ فصل ''عورت اور زوجین کے باہم تعلقات '' از کتاب اسلام اور مشکلات تہذیب ' کتاب پردہ از مولانا مودودی ؒ ــــــ کتاب '' خاندان اور معاشرہ '' اور کتاب حق الانسان از عبدالواحد وافی ـ انسان ' مادیت اور اسلام کے درمیان ـ مصنفہ محمد قطب وغیرہ ) ـ

---ooo---

مرد کے حقوق اور فرائض کے بیان کے بعد اور اس عام نگرانی کے حوالے سے اس پر عائد شدہ پابندیوں اور اس کے فرائض کے بیان کے بعد ' اب صالح اور مومن عورت کی صفات کا بیان ہوتا ہے اور خاندان کے دائرے کے اندر اس کے طرز عمل خصوصاً اس کے ایمانی طرزعمل کا بیان شروع ہوتا ہے ـ

(فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ( ٤ : ٣٤ ) (پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت اور نگرانی میں ' ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں ـ)

مومنہ اور صالحہ عورت کا فطری مزاج اور اس کی لازمی خصلت یہ ہونی چاہیے کہ وہ اطاعت شعار ہو ' مطیع فرمان ہو اور یہ اس کے صاحب ایمان اور اس کے صالح ہونے کا عین تقاضا ہوتا ہے ـ القنوت کے معنی ہوتے ہیں توجہ ' ارادہ '

رغبت اور دلی چاہت سے اطاعت کرنا۔ جس میں کوئی جبر نہ ہو' کوئی دباؤ نہ ہو' اور جس میں کمزوری اور سستی نہ ہو۔ اس لئے قرآن کریم نے قانتات کہا اور طائعات نہیں کہا۔ اس لئے کہ پہلے لفظ کا مفہوم نفسیاتی ہے اور اس کے اوپر نرمی اور تازگی کا پرتو موجود ہے۔ یہ لفظ میاں بیوی کے محبت بھرے پرائیویٹ اور پرسکون تعلق کے عین مناسب ہے۔ ایک ایسے گہوارے کے لئے جس میں بچوں نے پرورش پائی ہے اور جس کی فضا' جس کے سائے' جس کے سانس اور جس کی تمام حرکات بچے کی زندگی پر اثرانداز ہوتی ہیں۔

ایک صالح اور مومن عورت کا یہ بھی مزاج ہوتا ہے اور یہ بھی اس کی لازمی صفت ہوتی ہے کہ وہ اپنے خاوند کی عزت اور اس کے حقوق کی محافظ ہوتی ہے۔ خاوند کی عدم موجودگی میں اس کے مقدس گھرانے کی حفاظت کرتی ہے اور یہ صفات بھی اس کے ایمان اور اس کی ذاتی اصلاح کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جب ایک مومنہ عورت صالحہ مرد کی عدم موجودگی میں اس کی عزت کی محافظ ہوتی ہے تو اس کی موجودگی میں وہ بطریق اولی اس کی عزت کی محافظ ہوگی۔ اس طرح وہ اپنی ذات کو کسی کی نظروں کا شکار ہونے بھی نہیں دیتی اور نہ ہی وہ اپنی عصمت اور عزت کو مٹاتی ہے' جو کچھ بھی شوہر کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے جائز نہ ہو اس لئے کہ مرد و عورت دونوں ہی ایک ذات ہیں اور ایک ہی نفس سے دونوں کو پیدا کیا گیا ہے۔

اور جو چیزیں شوہر کے سوا دوسروں کے لئے حرام ہیں' اس کا فیصلہ نہ عورت کر سکتی ہے اور نہ مرد کر سکتا ہے' یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ (بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (٤ : ٣٤)) (اس چیز کی جس کی اللہ نے حفاظت کی ہے) یعنی معاملہ ایسا نہیں ہے کہ مرد عورت کو اس کی ذات کے بارے میں کسی فعل کے ارتکاب کی اجازت دیتا ہے یا نہیں اس کی موجودگی میں یا اس کے پس پشت۔ ایسے افعال جس پر مرد برا نہیں مناتا یا کوئی معاشرہ ایسے افعال کے ارتکاب کے لئے اس مرد یا اس عورت کو آمادہ کرتا ہے۔ ایسے حالات میں جب معاشرہ اخلاقی انحطاط کا شکار ہو اور اسلامی نظام سے دور ہو چکا ہو۔

اس حفظ کے میدان میں ایک ہی حکم ہے' وہ یہ کہ عورت پر فرض ہے کہ وہ اللہ کے حفظ کی حدود میں اپنی حفاظت کرے۔ یہاں عورت کے حفظ ذات کے لئے قرآن کریم نے امر کا صیغہ استعمال نہیں کیا بلکہ ایسا انداز بیان اختیار کیا ہے جو صیغہ امر سے بھی زیادہ موکد ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ حفاظت ان ذرائع کے ساتھ ہے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ حفاظت فرماتے ہیں اور یہ انداز حفاظت صالحات کے مزاج اور صلاح و تقویٰ کا عین تقاضا ہے۔

یہاں آکر ذہنی طور پر شکست خوردہ مسلمان مردوں اور خواتین کے تمام حیلے اور بہانے کافور ہو جاتے ہیں' جنہوں نے جدید بے راہ معاشرے کے دباؤ کے مقابلے میں اپنے آپ کو ڈال دیا ہے۔ اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صالحات کے لئے حفظ ذات کی کیا حدود و قیود مقرر کی ہیں یعنی یہ کہ وہ نہایت ہی اطاعت شعاری اور دلی آمادگی سے مطیع فرمان ہوتی ہیں۔

رہیں وہ عورتیں جو صالحات نہیں ہیں تو وہ سرکش ہیں۔ (ناشزات کے معنی یہ ہیں کہ کوئی "نشز" پر کھڑا ہو' یعنی اونچے مقام پر جو ہر طرف سے نظر آتا ہو) اس لفظ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے نفسیاتی صورت حال کی حسی تعبیر کی ہے۔ ناشز دراصل اپنی نافرمانی کو جائز سمجھتا ہے' علی الاعلان گناہ کا ارتکاب کرتا ہے' اور سرکشی اختیار کرتا ہے۔

اسلامی نظام زندگی اس وقت تک انتظار نہیں کرتا کہ عملاً سرکشی کا ارتکاب ہو جائے' نافرمانی اور بغاوت کے علم بلند

ہو جائیں ' مرد کی نگرانی کا رعب اور ڈر ختم ہو جائے اور خاندان دو کیمپوں میں تقسیم ہو جائے 'اس لئے کہ اگر حالات اس مقام تک آ پہنچیں تو پھر علاج کا کوئی فائدہ ہی نہیں رہتا ۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ سرکشی کا خطرہ محسوس ہوتے ہی اور اس کے خطرناک حد تک بڑھ جانے سے پہلے ہی اس کا تدارک کیا جائے 'کیونکہ سرکشی کے انجام میں اس اہم ادارے کی ٹوٹ دپھوٹ ہوتی ہے جس کے بعد معاشرے کا امن اور سکون تباہ ہوتا ہے ۔ پھر اس ادارے کے ختم ہونے کے ساتھ ہی نئی نسل کی تربیت اور تیاری کا کام بھی ختم ہو جاتا ہے کیونکہ خاندان ہی نئی نسل کے لئے ایک بہترین گہوارہ ہوتا ہے ۔ اس ادارے کے باہر اگر کسی نسل کی تربیت ہوگی تو وہ نسل نفسیاتی امراض ' اعصابی امراض اور دوسرے جسمانی امراض کا شکار ہوگی اور نتیجتاً " ایک اخلاق باختہ نسل تیار ہوگی ۔

چنانچہ خاندان کے بچاؤ کا معاملہ چونکہ بہت ہی اہم معاملہ ہے ' لہٰذا اس سلسلے میں جلد از جلد اقدامات کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ سرکشی کے آثار نمودار ہوتے ہی ان پر حملہ کیا جائے ۔ اسی لئے اس ادارے کو شر و فساد سے بچانے کی خاطر یا اسے بالکل تباہ ہونے سے بچانے کی خاطر اس ادارے کے ڈائریکٹر کو اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ بعض تادیبی اقدامات کر سکے جو اکثر اوقات نہایت ہی مفید ثابت ہوتے ہیں ۔ یہ اقدامات محض انتقام 'توہین یا جسمانی اذیت کے لئے نہیں روا رکھے گئے بلکہ یہ اصلاحی اقدامات ہیں اور ابتدائی مراحل میں اصلاح کے لئے اور سرکشی کو ختم کرنے کے لئے ہیں ۔

(وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا (٤ : ٣٤)

"اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو' انہیں سمجھاؤ' خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو اور مارو' پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لئے بہانے تلاش نہ کرو ۔ یقین رکھو کہ اوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالاتر ہے )

جیسا کہ اس سے قبل ہم کہہ آئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکرم بنایا ہے اور اس میں مرد و زن دونوں شامل ہیں ' عورت کو وہی انسانی حقوق دیئے جو اس کی صفت انسانیت کے حوالے سے تھے ' اور ایک مسلمان عورت کو وہ تمام شرعی اور قانون حقوق دیئے جو مرد کو دیئے گئے تھے ۔ نیز اگرچہ مرد کو اس کا نگران بنایا گیا ہے لیکن مرد کی نگرانی عورت کو اپنے شوہر کے انتخاب کے حق سے محروم نہیں کرتی ۔ اس سلسلے میں وہ مکمل طور پر خود مختار ہے ۔ نیز وہ اپنے مال اور دولت میں بھی ہر قسم کا تصرف کر سکتی ہے ۔ وہ تمام دوسرے اختیارات جو اسلامی نظام زندگی میں بنیادی عناصر ہیں اور بنیادی حقوق ہیں ' اسے حاصل ہیں ۔

اگر یہ سب امور ہمارے ذہن نشین رہیں اور پھر وہ بحث بھی ذہن میں مستحضر رہے جو ہم نے ادارۂ خاندان کی اہمیت کے سلسلے میں سابقہ صفحات میں کی ہے ' تو ہمارے لئے یہ سمجھنا کوئی مشکل امر نہیں ہے کہ شریعت نے عورت کی تادیب اور خاندان کے بچاؤ کے لئے یہ اقدامات کیوں جائز رکھے ہیں اور وہ طریق کار کیوں تجویز کیا ہے جس کے مطابق یہ

تادیب کی جائے گی' بشرطیکہ ہمارے دل خواہشات نفسانیہ کی پیروی میں فاسد نہ ہوگئے ہوں اور ہمارے دماغ کبرو غرور سے پھر نہ گئے ہوں۔

یہ حقیقت ہے کہ شریعت اسلامی نے یہ اقدامات محض انسدادی تدابیر کے طور پر کئے ہیں۔ یہ اقدامات اس لئے کئے جاتے ہیں کہ ادارہ خاندان کے اندر انتظامیہ کو امن و امان کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور انتظامیہ پہلے ہی نفوس کی اصلاح کر کے حالات کو درست کر دیتی ہے تاکہ دلوں کا یہ فساد خطرناک صورت اختیار نہ کرلے اور میاں بیوی کے درمیان بغض اور نفرت زیادہ نہ ہو جائے اور دل ہی دل میں میاں بیوی کا تعلق ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر ختم نہ ہو جائے۔

خاندان کے اندر صرف مرد اور عورت کے درمیان معرکہ ہی نہیں ہوتا اور ان اقدامات سے یہ مقصود نہیں ہے کہ مرد اٹھے اور عورت کو کچل کر رکھ دے' جب بھی وہ عورت کی جانب سے نافرمانی کا خطرہ محسوس کرے اسے خوب پیٹے اور اسے پھر واپس لاکر ایک کتے کی طرح زنجیر سے جکڑ دے۔

اسلام میں ایسے طرز عمل کی اجازت ہرگز نہیں دی گئی۔ اگرچہ انسانوں میں بعض خاندانوں کے اندر ایسی عادات پائی جاتی ہیں لیکن مرد و زن کے مابین ایسا سلوک اور ایسا تعلق محض اس لئے پیدا ہوا کہ پوری انسانیت نے اپنے اصل مقام کو چھوڑ دیا۔ یہ اس لئے نہ تھا کہ مرد و زن میں سے کوئی ایک غلطی پر تھا۔ لیکن جب اسلامی معاشرہ صحیح طرح قائم ہو گا تو اس میں صورت حال بالکل مختلف ہوگی اور اس میں تادیب کے اغراض و مقاصد بھی مختلف ہوں گے۔

(وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ (٤: ٣٤)) "اور عورتیں جن سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ۔"

اسلام میں یہ پہلا اقدام ہے کہ ایسی عورت کو سمجھانے کی کوشش کی جائے گی۔ کسی خاندان کے سربراہ اور ڈائریکٹر کا یہ پہلا فریضہ ہے کہ وہ سمجھائے۔ ہر حالت میں اس سے توقع یہ ہے کہ وہ نہایت ہی مہذب انداز میں بیوی کو سمجھائے گا۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

یایھا الذین امنوا قوا انفسکم و اھلیکم نارا" وقودھا الناس والحجارۃ "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔"

اپنے بچوں اور اہل و عیال کو بچانا تو ہر حال میں مطلوب ہے لیکن ایسے حالات میں جہاں نشوز کا خطرہ ہو وہاں اہل و عیال کو ایک متعین بیماری یعنی سرکشی سے بچانا مطلوب ہوتا ہے' قبل اس کے کہ وہ حد سے تجاوز کر جائے۔

لیکن بعض اوقات صرف وعظ بھی مفید نہیں ہوتا' کبھی عورت پر ہوائے نفس غالب ہوتی ہے اور وہ خود سر تاثرات کی زد میں ہوتی ہے' کبھی یوں ہوتا ہے کہ اسے اپنی خوبصورتی پر ناز ہوتا ہے' کبھی اپنی دولتمندی کا گھمنڈ ہوتا ہے' کبھی اپنے خاندانی مرتبہ کی وجہ سے وہ خاوند کو خاطر میں نہیں لاتی یا بعض دوسری اقدار و اوصاف کی وجہ سے وہ تعلی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس بات کو بھول جاتی ہے کہ وہ ایک ادارے میں مرد کے ساتھ برابر کی ذمہ دار ہے۔ وہ مرد کے مقابلے میں اس کے مقابل قوت آزمائی کے لئے نہیں آئی ہے اور نہ یہاں کوئی موقعہ افتخار اور تعلی کا ہے اس لئے یہاں اس کے خلاف ایک دوسرا اقدام تجویز ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ مرد عورت کی جاذبیت' اس کی خوبصورتی اور تمام دوسری چیزوں کو جن پر وہ تعلی کرتی ہے' روندتا چلا جائے اور نفسیاتی طور پر ثابت کردے کہ وہ اس عورت سے برتر ہے۔ اور یہ کہ وہ ا...

ادارے کا مدیر اور ڈائریکٹر ہے۔ حکم ہوتا ہے کہ (وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ (٤:٣٤)) (خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو)۔ خواب گاہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں عورت اپنی فطری کشش کی وجہ سے مرد کو دھوکہ دیتی ہے' جہاں عورت انتہائی علوشان کے ساتھ اپنا حکم منواتی ہے۔ جب ایک مرد اپنی خواہشات پر قابو پاکر عورت کی اس فطری کشش کا مقابلہ کر لے تو وہ عورت کے موثر ترین ہتھیار کو کند کر دیتا ہے جو ہتھیار وہ مرد کے خلاف استعمال کرتی ہے۔ جب مرد اپنے اس موقف میں ڈٹ جاتا ہے اور اپنی شخصیت کی قوت کا اظہار کرتا ہے تو اکثر اوقات عورت ہتھیار ڈال دیتی ہے' البتہ عورتوں کو خواب گاہ سے علیحدہ کرنے کے اپنے مخصوص قواعد اور آداب ہیں۔ وہ یہ کہ خوابگاہ کے علاوہ عورت کے ساتھ دوسرے تعلقات بحال رہیں۔ مرد صرف خوابگاہ میں اس سے علیحدہ رہے۔ نیز بچوں پر میاں بیوی کے درمیان ہونے والی یہ کشیدگی ظاہر نہ ہو تاکہ ان پر نفسیاتی طور پر برے اثرات نہ پڑیں۔ نیز غیر لوگوں کے سامنے کوئی جدائی یا کشیدگی نہ ہو' جس کے نتیجے میں عورت کی تذلیل ہو یا اس کی عزت نفس مجروح ہو اور وہ زیادہ سرکشی اختیار کرے کیونکہ مقصد تو یہ ہے کہ وہ سرکشی سے باز آ جائے۔ اصل مقصد عورت کی تذلیل نہیں ہے اور نہ بچوں کو خلجان کا شکار کر کے انہیں خراب کرنا مطلوب ہے۔ اس دوسرے اقدام میں ان دونوں امور کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

لیکن بعض اوقات یہ دوسرا اقدام بھی کامیاب نہیں رہتا۔ تو پھر کیا اب ادارۂ خاندان کی تحلیل کر دی جائے۔ نہیں ایک کوشش مزید بھی ہے۔ اگرچہ یہ آخری تدبیر قدرے سخت ہے لیکن ایک خاندان کی تحلیل اور بربادی کے مقابلے میں وہ بہت ہی آسان اور معمولی ہے۔

(وَاضْرِبُوْهُنَّ) "اور انہیں مارو" اس سے پہلے ہم نے جو مطالب بیان کئے ہیں اور ان اقدامات کے جو اہداف سامنے رکھے ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مار سے مقصود عورت کو سزا دینا نہیں ہے اور نہ اس سے انتقام لینا مطلوب ہے' نہ محض غصے کو ٹھنڈا کرنا مطلوب ہے' اور نہ اس بات کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ یہ مار محض تذلیل' توہین اور تحقیر کے لئے ہو۔ اور نہ اس سے مقصود یہ ہے کہ عورت کو ایک ایسے خاندان میں زندہ رہنے پر مجبور کیا جائے جس پر وہ کسی صورت میں بھی راضی نہیں ہے۔ بلکہ یہ مار محض اصلاح کی خاطر ہو اور اس مار کے اندر بھی مرد کی جانب سے ہمدردی اور محبت ہو۔ مثلاً جس طرح باپ اپنی اولاد کو مارتا ہے' یا جس طرح استاد اپنے شاگردوں کو سزا دیتا ہے۔

اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ اگر ادارۂ خاندان کے دونوں فریقوں کے درمیان مکمل یک جہتی ہو تو پھر اس مار کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی ہے۔ البتہ ان اقدامات کی ضرورت اس وقت لاحق ہو سکتی ہے جب خاندان کے اندر فساد اور توڑ پھوڑ کا خطرہ ہو اور یہ تب ہی ہوتا ہے جب کسی نہ کسی خرابی کا آغاز ہو گیا ہو اور اسے ان اقدامات کے ذریعے دور کرنا مطلوب ہو۔

جب وعظ و نصیحت بھی کام نہ دے اور خواب گاہوں کے اندر تفریق بھی مفید نہ رہے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ انحراف اور فساد خطرناک نوعیت اختیار کر گیا ہے اور خطرناک سطح تک پہنچ گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے حالات میں وسیلہ ضرب تادیبی کامیاب ہو جائے۔

بعض عملی واقعات اور بعض نفسیاتی کیسوں سے معلوم ہوتا ہے اور ماہرین نفسیات اس بات کو مانتے ہیں کہ بعض

اوقات عورت کی سرکشی کے لئے اسے تادیبی مار دینا ہی اس کے لئے مفید ہوتا ہے۔ اس سے عورت کا نفسیاتی علاج ہوتا ہے اور وہ فوراً راہ راست پر آجاتی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عورت کو سرکشی کی ایک نفسیاتی بیماری لاحق ہوتی ہے اور علمائے نفسیات اسے ایک نام بھی دیتے ہیں۔ لیکن علم النفس نے جو نتائج اب تک پیش کئے ہیں وہ علمی اور سائنسی نتائج نہیں ہیں کہ انہیں علمی لحاظ سے ثابت شدہ حتمی نتائج کہا جا سکے 'جیسا کہ ڈاکٹر الیکنسیس کہتے ہیں۔ البتہ اکثر اوقات ایسا ضرور ہوتا ہے کہ بعض عورتیں مرد کی قوت کو محسوس نہیں کرتیں جبکہ ان کا نفس یہ چاہتا ہے کہ جو مرد ان کا نگران اور خاوند ہو وہ قوی تر ہو اور وہ اسے تب تسلیم کرتی ہیں جب مرد جسمانی طور پر ایسی عورت کو قابو میں رکھے۔ لیکن ہر عورت کا نہ یہ مزاج ہوتا ہے اور نہ ہی نفسیاتی خواہش ہوتی ہے۔ البتہ عورتوں میں سے بعض ایسی ضرور ہوتی ہیں جو خاوند کی طرف سے جبر اور قہر کی طالب ہوتی ہیں اور یہ ضرب کا اقدام ایسے ہی کیسوں کے لئے تجویز کیا گیا ہے تاکہ خاندان جیسا اہم ادارہ صحیح طرح استواری کے ساتھ کام کر سکے 'امن و سکون کے ساتھ۔

بہرحال یہ اقدامات جس ذات نے تجویز کئے ہیں 'وہی تو ہمارا خالق ہے اور وہ اپنی مخلوقات کے حال سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اور اللہ علیم و خبیر کی بات کے بعد اس میں قیل و قال کرنا نہایت گستاخی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں کسی قسم کی سرکشی اور کسی قسم کا انکار انسان کو دائرہ ایمان سے خارج کر سکتا ہے۔ اس بارے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے.....

جب اللہ تعالیٰ ان اقدامات کا فیصلہ فرماتا ہے تو اس کے لئے مناسب وقت اور حالات اور حدود کا تعین بھی فرماتا ہے۔ یہ بھی متعین فرماتا ہے کہ یہ اقدامات کرنے کے مقاصد کیا ہیں اور ان کی پشت پر اسباب کیا ہوتے ہیں تاکہ اسلامی نظام حیات پر ان مظالم اور بدسلوکیوں کا الزام عائد نہ کیا جا سکے 'جو دور جاہلیت میں عورتوں کے ساتھ روا رکھی جاتی تھیں۔ یہ نہ ہو کہ مرد جلاد بن جائے اور یہ کام وہ اسلامی عنوان سے کرے۔ عورت غلام بن جائے اور اس غلامی کا جواز اسلام سے لیا جائے یا یہ کہ مرد عورت بن جائے اور عورت مرد بن جائے یا دونوں ایک تیسری شکل اختیار کر لیں کہ نہ مرد' مرد رہے اور نہ عورت' عورت۔ اور یہ کام وہ دین کے ترقی یافتہ تصور کے عنوان سے کریں۔ یہ تمام ایسی شکلیں ہیں جنہیں اہل ایمان بڑی خوبی اور سہولت سے صحیح اسلام سے متمیز اور جدا کر سکتے ہیں۔

یہ اقدامات اسلام نے اس لئے روا رکھے ہیں کہ سرکشی کی بیماری کا علاج کیا جائے' قبل اس کے کہ یہ بیماری حد سے گزر جائے۔ اس علاج کے استعمال میں بھی سخت احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ یہ علاج تجویز کر کے اس کے استعمال میں حضور ؐ نے اپنے گھر میں اور اپنی عائلی زندگی میں اس پر عمل کر کے مسلمانوں کو اس کا انداز بھی سمجھایا ہے۔ حضور ؐ نے اپنے عمل اور اپنے احکام و فرامین کے ذریعے اس سلسلے میں متعدد ہدایات دی ہیں۔

سنن اور مسانید میں روایت ہے۔ حضرت معاویہ ابن حیدہ القشیری روایت فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضور ؐ سے دریافت کیا کہ عورت کا حق مرد پر کیا ہے تو آپ نے فرمایا یہ کہ اگر اسے کھانے کی ضرورت ہو تو اسے دیا جائے' کپڑے کی ضرورت ہو تو پہنایا جائے اور اسے چہرے پر نہ مارا جائے اور نہ چہرے کو بگاڑا جائے اور اس کو صرف گھر کے اندر خوابگاہ سے علیحدہ کیا جائے۔

ابو داوَد ' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے ۔ نبی ؐ نے فرمایا : "اللہ کی باندیوں کو نہ مارو ۔" حضرت عمر تشریف لائے تو انہوں نے رسول اللہ ؐ سے عرض کیا : حضور ؐ عورتیں تو مردوں پر جری ہوگئی ہیں تو حضور ؐ نے انہیں مارنے کی اجازت دے دی ۔ اس کے بعد حضور ؐ کی ازواج مطہرات کے پاس بہت سی عورتیں آئیں اور اپنے مردوں کے خلاف شکایت کی ' اس پر حضور ؐ نے فرمایا : "محمد کی ازواج کے پاس بہت سی عورتیں اپنے شوہروں کے خلاف شکایت لے کر آتی ہیں جو لوگ یہ کام کرتے ہیں وہ تم میں سے اچھے لوگ نہیں ہیں ۔"

ایک دوسری روایت میں حضور ؐ نے فرمایا 'کسی کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنی عورت کو گدھے کی طرح مارے ' وہ صبح کو تو اسے کوڑے مارے اور رات کو اس کے ساتھ ایک خوابگاہ میں سوئے ۔ (مصابیح السنہ)

اور ایک دوسری روایت میں ہے "تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہو ۔" (ترمذی ' وطبرانی)

ایسی روایات اور ہدایات اور وہ حالات جو ان ہدایات کے وقت موجود تھے ' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں اسلامی نظام زندگی کی ہدایات اور جاہلی عادات و رسوم کے درمیان مسلسل کشمکش برپا تھی اور یہ کشمکش اسی طرح تھی جس طرح زندگی کے تمام دوسرے میدانوں میں اسلام اور جاہلیت کے درمیان برپا تھی ۔ لیکن یہ کشمکش صرف اس وقت تک تھی جب تک اسلامی عادات اور رسومات زور نہ پکڑگئی تھیں اور جب تک اسلامی ہدایات کی جڑیں ' اہل ایمان کے دلوں اور اسلامی معاشرے کے اندر گہری نہ ہوگئی تھیں ۔

بہرحال ان تمام باتوں کے باوجود شریعت نے ان اقدامات اور تدابیر کے لئے بھی ایک حد متعین کر دی تھی اور اب بھی حکمت یہی ہے کہ اگر ابتدائی مرحلے میں ہی مقاصد پورے ہو جائیں اور اصلاح ہو جائے تو ضروری نہیں ہے کہ اگلے مرحلے میں قدم رکھا جائے ۔

(فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا (۴ : ۳۴)) "پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لئے بہانے تلاش نہ کرو ۔"

جب مقصد پورا ہو جائے تو ذرائع اپنی جگہ رک جاتے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مقصد اطاعت ہے اور یہ اطاعت ایسی ہے کہ جس کے لئے عورت خود آمادہ ہو جائے ۔ ایسی نہیں ہے کہ ڈنڈا سر پر رکھ کر اطاعت کرائی جائے ۔ اس لئے کہ ڈنڈے کے ذریعے اطاعت سے کوئی مضبوط خاندان وجود میں نہیں آسکتا ' جو اسلامی سوسائٹی کی پہلی اکائی ہوتی ہے اور اسلام میں جس کی بہت بڑی اہمیت ہے ۔

یہ آیت اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اگر عورت بطیب خاطر مطیع فرمان ہو جائے تو اس کے بعد ان اقدامات میں سے کوئی اقدام کرنا صراحتاً زیادتی ' تجاوز اور خودسری ہوگی ۔ (فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا (۴: ۳۴)) (ان پر دست درازی کے بہانے تلاش نہ کرو) لیکن بات یہاں ختم نہیں ہو جاتی ' بتایا جاتا ہے کہ اگر کسی کے دماغ میں ایسا کوئی بخار اٹھے تو اللہ کو یاد رکھو جو علی اور کبیر ہے ۔ اس معاملے میں وہ بھی فریق ہے تاکہ دل محفوظ اور مامون ہو جائیں ' سر جھک جائیں اور بغاوت اور سرکشی کے رجحانات نرم پڑ جائیں ۔ اور یہ قرآن کریم کا ترغیب اور ترہیب کا مخصوص انداز ہے ۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ( ٤: ٣٤ )) (بے شک اوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالا تر ہے۔)

---ooo---

یہ تو وہ اقدامات ہیں جو عورتوں کی جانب سے سرکشی کے آغاز یا خطرے کے آغاز کے موقعہ پر تجویز کئے گئے تھے۔ لیکن اگر سرکشی واقع ہو جائے تو اس صورت میں وہ اقدامات نہ کئے جائیں جن کا اعلان ہوا۔ اس لئے کہ سرکشی اور کشیدگی واقع ہو جانے کی صورت میں ان اقدامات کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ کشیدگی جب واقعہ ہو جائے تو پھر دو دشمنوں کے درمیان گویا جنگ اور مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر ہر ایک یہ کوشش کرتا ہے کہ دوسرے کا سر کچل دے۔ اور یہ شریعت کا نہ مقصود ہے اور نہ مطلوب۔

خصوصاً جب یہ معلوم ہو گیا کہ ان اقدامات سے اصلاح حال ممکن نہیں ہے بلکہ ایسے اقدامات سے حالات مزید ابتر ہو جائیں گے اور فریقین ایک دوسرے سے مزید دور ہو جائیں گے۔ عورت کی جانب سے نشوز مزید کھل کر سامنے آ جائے گا۔ وہ روابط بھی ٹوٹ جائیں گے جو ابھی تک قائم تھے' یا یہ کہ خاوند نے یہ اقدامات عملاً کئے اور کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ایسے حالات میں اسلام کا حکیمانہ نظام زندگی ایک دوسرا طریقہ استعمال کرتا ہے تاکہ اس نہایت ہی اہم ادارے کو مکمل تباہی سے بچانے کی آخری کوشش کی جائے اور اسے صرف بحالت مجبوری ہی ٹوٹنے دیا جائے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

"اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات صاف ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتے داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو' وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا' اللہ سب کچھ جانتا ہے اور باخبر ہے۔"

اسلام یہ مشورہ نہیں دیتا کہ عورت کی جانب سے سرکشی شروع ہوتے ہی تم اس سرکشی اور نفرت کے سامنے ہتھیار ڈال دو اور نہ اسلام یہ مشورہ دیتا ہے کہ بس فوراً معاہدۂ نکاح کو ختم کر دو اور خاندان کی ہنڈیا ان لوگوں کے سر پر لا کر پھوڑ دو جن کا اس معاملے میں کوئی قصور نہیں ہے' جن میں کم عمر بھی ہیں اور بڑے بھی ہیں۔ اس لئے کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے ادارۂ خاندان بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے اسلام اس کی اہمیت کی خاطر اسے از سر نو جدید اینٹوں کی مدد سے تعمیر کرتا ہے تاکہ وہ دوبارہ نشوونما حاصل کر سکے۔

اب اسلامی نظام ادارہ نکاح کے ٹوٹنے کا خطرہ لاحق ہوتے ہی اپنی آخری کوشش شروع کر دیتا ہے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ ایک ثالث مرد کی مرضی کا مقرر ہو اور ایک ثالث عورت کی مرضی کا مقرر ہو اور وہ دونوں ان کے درمیان مصالحت کرانے کی سعی کریں۔ یہ لوگ نہایت ہی ٹھنڈے ماحول میں جمع ہوں۔ وہ اپنے ذاتی میلانات کو سامنے نہ رکھیں' اپنے شعور اور احساس کے بوجھ سے الگ ہو جائیں اور معاشی حالات و مفادات کو نظر انداز کر دیں' جن کی وجہ سے زوجین کے درمیان

تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی۔یہ حکم ان حالات سے ہٹ کر سوچیں جن کی وجہ سے زندگی کے ماحول میں کدورت پیدا ہوئی یا جن کی وجہ سے فریقین کے درمیان پیچیدگی پیدا ہوئی' اور جن کی وجہ سے زوجین کے درمیان مشترکہ زندگی کے اچھے عوامل غیر موثر ہو گئے۔ان ثالثوں کو کوشش کرنا چاہئے کہ وہ زوجین کے دونوں خاندانوں کی شہرت اور عزت کا بھی خیال رکھیں اور زوجین کے چھوٹے بچے ہوں تو ان کے مستقبل کا بھی خیال رکھیں اور وہ اپنے دل سے یہ خواہش نکال دیں کہ ان میں سے کوئی فریق کامیاب رہتا ہے یا ناکام۔کیونکہ ایسے حالات میں زوجین میں سے ہر ایک اپنی بات منوانا اپنے لئے باعث عزت سمجھتا ہے۔بلکہ ان ثالثوں کو زوجین کے مفادات' ان کے بچوں کے مفادات اور اس ادارے کے مفادات کا خیال رکھنا چاہئے جو ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ یہ زوجین کے رازوں کے بھی امین ہوں گے کیونکہ یہ دونوں حکم' دونوں خاندانوں اور زوجین کے نمائندے ہوں گے۔فریقین کو یہ خوف نہ ہو گا کہ ان سے ان کے راز افشا ہوں گے اور نہ ہونا چاہئیں' کیونکہ رازوں کی تشہیر میں دونوں کی مصلحت نہیں ہوتی بلکہ دونوں کی مصلحت تو اس میں ہوتی ہے کہ ان کے راز پس پردہ ہی رہیں۔

ان ثالثوں کا اجتماع زوجین کے درمیاں اصلاح کی خاطر ہو گا بشرطیکہ زوجین کے درمیان اصلاح احوال کی حقیقی خواہش ہو' اور یہ خواہش اصلاح محض غصے کے نیچے دب گئی ہو۔اگر ثالثوں کے دلوں میں حقیقی خواہش ہو اور وہ مخلص ہوں تو اللہ تعالیٰ زوجین کو اصلاح احوال کی توفیق دے دے گا۔

(اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا (۴ : ۳۵)) "اگر وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا"....چونکہ وہ صدق دل سے اصلاح چاہتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو قبولیت بخشتا ہے اور اصلاح کی توفیق دیتا ہے۔

یہ ہے لوگوں کی سعی اور ان کے دلوں کا رابطہ اللہ کی تقدیر اور اس کی مشیت کے ساتھ۔درحقیقت اللہ تعالیٰ کی قضا ہی لوگوں کی زندگیوں میں موثر ہوتی ہے۔لیکن اللہ کی تقدیر نے لوگوں کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ کوشش کریں اور اصلاح احوال کی سعی کریں۔ان کی اس کوشش کے جو نتائج نکلیں گے وہ اللہ کی تقدیر کے مطابق ہی ہوں گے۔

جو نتائج بھی نکلیں گے وہ گہرے علم اور دور اندیشانہ مصلحت پر مبنی ہوں گے۔ (اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا (۴: ۳۵)) (اللہ سب کچھ جانتا ہے اور باخبر ہے)

غرض اس سبق میں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ اسلام زوجین کے درمیان اس تعلق کے نتیجے میں وجود میں آنے والے ادارۂ خاندان کو بہت ہی اہمیت دیتا ہے۔ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اسلام انسانی زندگی کے اس پہلو کی تنظیم پر کس قدر زور دیتا ہے۔پھر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ابتدائی دور کی تحریک اسلامی میں زندگی کے اس پہلو کو بہتر سے بہتر کرنے میں کس قدر کوششیں کیں اور تحریک اسلامی کا ہاتھ پکڑ کر اسے جاہلیت کی گندگیوں سے نکالا۔اسے راہ ترقی پر ڈال کر بتدریج بلند ترین مقام اور مرتبہ تک اللہ کی ہدایات کے مطابق پہنچایا اس لئے کہ اللہ کی ہدایت کے سوا کوئی اور ہدایت انسان کے مفید مطلب نہیں ہے۔

---ooo---

# درس ۳۲ ایک نظر میں

اس سبق کے ابتدائی حصے اور پوری سورت کے موضوع و مضامین کے درمیان کئی ربط ہیں ۔ نیز اس سبق اور سابق درس کے مضامین کے درمیاں بھی ربط پایا جاتا ہے ۔

اس سبق کے ذریعے اس مہم کا آغاز ہوا' جس کو پیش نظر رکھ کر' اسلامی معاشرے کی اجتماعی زندگی کی تنظیم کی گئی تھی اور اسے جاہلیت کی تمام آلائشوں سے پاک کر کے اس کے اندر جدید اسلامی خدوخال کو واضح اور مستحکم کرنے کا بیڑا اٹھایا گیا تھا ۔ اس مہم کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو ان اہل کتاب کی سازشوں سے خبردار رکھا جائے جو یہودیوں کی صورت میں مدینہ کے اردگرد اپنے پورے شر اور سازشوں کے ساتھ پھیلے ہوئے تھے' اور وہ ہروقت اسلامی معاشرے کے خلاف اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھے ۔ وہ رات دن اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ اس معاشرے کی تشکیل و تکمیل کی راہ میں ممکن حد تک رکاوٹیں پیدا کریں ۔ خصوصاً وہ مسلمانوں کی اخلاقی قدروں سے بہت ہی خائف تھے اور ان کی سعی تھی کہ وہ اخلاقی کمال حاصل نہ کریں ۔ نیز وہ مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق اور باہم تعاون و تکافل سے بھی خائف تھے' اس لئے کہ اخلاقی اقدار اور معاشرتی اتحاد و تکافل ہی کسی سوسائٹی کی اصل قوت ہوا کرتے ہیں ۔

یہ نیا سبق' دراصل ایک نئی مہم ہے اور اس کا آغاز اس اساسی اصول سے ہوا ہے جس کے اوپر اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھی گئی ہے' اور جس سے اسلامی نظام زندگی تشکیل پاتا ہے ۔ وہ اصول ہے خالص نظریہ توحید ۔ اسی اصول پر اسلامی نظام زندگی مبنی ہے ۔ اسلامی زندگی کا ہر پہلو اور اس کا ہر رخ اسی اصول سے پھوٹنے والی شاخ ہے ۔

اس سبق سے پہلے عائلی زندگی کی تنظیم پر متعدد پہلوؤں سے بات ہو چکی ہے ۔ اور اسی طرح اجتماعی زندگی کے معاملات بھی زیر بحث آ چکے ہیں ۔ اس سے پہلے گزرنے والے سبق میں خاندانی زندگی' اس کی تنظیم اور اس کے بچاؤ کی تدابیر کو زیر بحث لایا گیا تھا ۔ اور ان روابط سے بحث کی گئی تھی جو خاندان کو مستحکم اور مضبوط بناتے ہیں ۔ اب اس سے ذرا آگے بڑھ کر اس سبق میں پورے انسانی تعلقات اور روابط سے بحث کی گئی ہے ۔ یعنی وہ تعلقات جو اسلامی معاشرے میں خاندان کے محدود دائرے سے ذرا آگے بڑھ کر انسانی بنیادوں پر استوار ہوتے ہیں ۔ لیکن ان کا خاندانی نظام سے بھی تعلق ہوتا ہے ۔ مثلاً آغاز ہوتا ہے والدین کے متعلق ہدایات سے جس کا تعلق خاندان سے بھی ہے ۔ والدین کے علاوہ پھر مزید روابط کو بیان کیا گیا ہے اور یہ روابط اس پاکیزہ محبت کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں جو خاندان کے اندر پائی جاتی ہے اور جس کے اثرات دوسرے انسانی روابط تک وسیع ہو جاتے ہیں ۔ ان خوشگوار روابط کا لطف انسان کو سب سے پہلے خود اپنے خاندان کے اندر آتا ہے ۔ یہاں وہ اچھے تعلقات رکھنا سیکھتا ہے ۔ یوں اس کے لئے یہ تعلقات ایک محدود خاندان سے وسیع انسانی خاندان تک پھیل جاتے ہیں جبکہ پہلے ان خوشگوار تعلقات کو خاندان کے اندر بویا جاتا ہے ۔

زیر بحث سبق میں بعض ہدایات تو محدود عائلی خاندان کے بارے میں ہیں اور بعض ہدایات ایک وسیع تر انسانی خاندان کے بارے میں ہیں۔ اس زاویے سے اقدار اور پیمانوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ یعنی خرچ کرنے والوں کے کیا مراتب ہیں اور کنجوسوں کے کیا مراتب ہیں؟ درس کا آغاز اس اساسی قاعدے سے ہوا جس پر تمام اقدار اور پیمانے مبنی ہیں، جس طرح زندگی کی تمام تفصیلی ہدایات بھی اسی اساسی اصول پر مبنی ہیں۔ یعنی عقیدۂ توحید۔ مسلمانوں کی ہر حرکت اور ہر سرگرمی، ان کا ہر تصور اور ہر تاثر عقیدۂ توحید پر مبنی ہوتا ہے اور یہی اللہ کی بندگی ہے۔ اس کا مقصود اللہ کی پرستش ہے۔ انسان کی تمام سرگرمیوں کا منتہائے مقصود اللہ کی اطاعت اور بندگی ہے اور ایک مسلم اپنے عقیدے اور عمل کے اعتبار سے اللہ کا بندہ ہوتا ہے۔

چونکہ ہم نے اپنی پوری زندگی میں اللہ کی بندگی اور عبادت کرنی ہے، اس نسبت سے اللہ کی مخصوص پرستش اور عبادت یعنی نماز اور طہارت کے سلسلے میں بعض احکام بھی بیان کیے گئے۔ اور نماز چونکہ ایک مرحلہ تھی جس میں شراب کو حرام قرار دیا گیا تھا، اس سے قبل نماز کی حالت میں بھی یہ ممکن تھا کہ کوئی شراب پیے ہوئے ہو۔ اس لحاظ سے حکم دیا گیا کہ مدہوشی کی حالت میں نماز میں شریک نہ ہوا کرو۔ یہ اسلام کے ہمہ گیر تربیتی اقدامات میں سے ایک اقدام تھا جو نماز کی مناسبت سے دیا گیا۔ غرض اس سبق کی تمام کڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ درس سابق سے بھی تمام مضامین مناسبت رکھتے ہیں اور پھر اس سورہ کے پورے محور کے ساتھ بھی متناسب ہیں۔

---000---

# درس ۳۳ تشریح آیات

# ۳۶ ۔۔ تا ۔۔ ۴۲

وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ۙ وَ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۟ۙ﴿۳۶﴾ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا ﴿۳۷﴾ وَ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ مَنْ یَّكُنِ الشَّیْطٰنُ لَهٗ قَرِیْنًا فَسَآءَ قَرِیْنًا ﴿۳۸﴾ وَ مَا ذَا عَلَیْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِیْمًا ﴿۳۹﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً یُّضٰعِفْهَا وَ یُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۴۰﴾ فَكَیْفَ اِذَا

جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾ يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا ﴿٤٢﴾

"اور تم سب اللہ کی بندگی کرو' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ' ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو' قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ' اور پڑوسی رشتہ دار سے' اجنبی ہمسایہ سے' پہلو کے ساتھی اور مسافر سے اور ان لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضے میں ہوں' احسان کا معاملہ رکھو' یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔ ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں ہیں جو کنجوسی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اسے چھپاتے ہیں' ایسے کافر نعمت لوگوں کے لئے ہم نے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنے مال محض لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور درحقیقت نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ روز آخر پر' سچ تو یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہوا اسے بہت ہی بری رفاقت میسر آئی۔ آخر ان لوگوں پر کیا آفت آجاتی اگر یہ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے اور اگر یہ ایسا کرتے تو اللہ سے ان کی نیکی کا حال چھپا نہ رہ جاتا۔ اللہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اگر کوئی ایک نیکی کرے تو اللہ اسے دوچند کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔ پھر سوچو کہ اس وقت یہ لوگ کیا کریں گے جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر تمہیں (یعنی آپ کو اے محمدؐ) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔ اس وقت وہ سب لوگ جنہوں نے رسول کی بات نہ مانی اور اس کی نافرمانی کرتے رہے' تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔ وہاں یہ اپنی کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے۔"

یہ پیراگراف اس حکم سے شروع ہوتا ہے کہ صرف اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور یہ حکم واؤ کے ساتھ شروع ہوتا ہے جو حرف عطف ہے۔ حرف عطف اس امر اور نہی کو سابقہ احکام کے ساتھ مربوط کر دیتا ہے جو ادارۂ خاندان کی تنظیم اور شیرازہ بندی سے متعلق ہیں اور جن کا ذکر سابقہ سبق کے آخر تک ہوا۔ واو عطف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دین کا ایک ہی کلیہ اور اصول ہے اور وہی تمام امور کے درمیان رابطہ ہے یعنی پوری زندگی میں بندگی صرف اللہ کی' کی جانی چاہئے اور یہ کہ اسلام صرف عقیدے اور چند نظریات کا نام نہیں ہے جو کسی انسان کے ضمیر میں پختہ طور پر بیٹھے ہوں نہ اسلام چند مراسم عبودیت کا نام ہے جو مسجد میں سرانجام دیئے جاتے ہوں اور نہ اسلام صرف دنیوی کاروبار کا نام ہے جس کا تعلق عقیدے اور رسوم پرستش سے بالکل نہ ہو' بلکہ وہ ایک ایسا مکمل نظام ہے جس کے اندر یہ سب چیزیں موجود ہیں پھر اس کے تمام اجزاء بھی ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اور پھر یہ سب اجزاء اپنے اصل الاصول یعنی نظریہ

توحید کے ساتھ مربوط ہیں ۔ ان تمام سرگرمیوں میں صرف اللہ سے ہدایت حاصل کرنا اور اس کے سوا کسی سے کوئی ہدایت نہ لینا یعنی مراسم عبادت میں اللہ کو الہ و معبود سمجھنا اور اسی طرح حاکمیت اور قانون سازی میں بھی اسے الہ و حاکم سمجھنا یہ دونوں چیزیں نظریہ توحید میں شامل ہیں ۔ ان دونوں میں توحید اسلام کا جزء ہے اور یہی خدا کا دین ہے ۔

توحید کے حکم اور شرک کی نفی کے ساتھ ہی حکم دیا جاتا ہے کہ احسان کرو اور یہ حکم ایک خاندان کو بھی دیا جاتا ہے اور پورے انسانی خاندان یعنی معاشرے کو بھی دیا جاتا ہے ۔ بخل ' فخر اور تکبر کی مذمت کی جاتی ہے ' نیز لوگوں کو بخل پر آمادہ کرنے کی بھی مذمت کی جاتی ہے ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اللہ کے فضل کو چھپانا بھی ایک مذموم حرکت ہے ۔ اللہ کا فضل عام ہے ' چاہے مالی فضل ہو یا اخلاقی اور دینی فضل ہو ۔ پھر شیطان کی اطاعت سے ڈرایا جاتا ہے ۔ اب روئے سخن آخرت کی طرف پھر جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ وہ دن نہایت ہی شرمندہ کرنے والا اور توہین آمیز ہو گا ۔ ان سب امور کو عقیدہ توحید سے مربوط کر دیا جاتا ہے اور وہ مصدر و منبع متعین کر دیا جاتا ہے جس سے ان لوگوں نے ہدایت لینی ہے جو اللہ کی بندگی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے اور وہ مصدر ہے بھی یکتا ' اس میں تعدد ممکن نہیں ہے ۔ ہدایت لینے کا ذریعہ بھی وہ ہے اور قانون سازی بھی وہ ہے ۔ اس کی حاکمیت میں بھی کوئی شریک نہیں ہے اور اس کی بندگی اور عبادت میں بھی کوئی شریک نہیں ہے ۔

(وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (٤ : ٣٦))

"اور تم سب اللہ کی بندگی کرو ' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ ' ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو ' قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ ' اور پڑوسی رشتہ دار سے ' اجنبی ہمسایہ سے ' پہلو کے ساتھی اور مسافر سے ' اور ان لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضے میں ہوں ۔

اسلامی نظام حیات میں پرستش کے بارے میں ہدایات اور قانون سازی کے بارے میں ہدایات ایک ہی مرجع Source سے اخذ ہوتی ہیں اور وہ ایک ہی محور کے ارد گرد گھومتی ہیں ۔ یہ سب چیزیں ایمان باللہ سے اخذ ہوتی ہیں اور ایمان باللہ کا ارتکاز نقطہ توحید پر ہے اس لئے اسلام میں تمام ہدایات اور تمام تشریعات LawMaking باہم جڑی ہوئی اور ہم آہنگ ہیں ۔ اسلامی نظام میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کے ایک جزء کو دوسرے سے علیحدہ کر دیا جائے ۔ اور اگر کوئی شخص اسلام کے کسی جزء کو اس کے نقطہ ارتکاز یعنی عقیدہ توحید سے علیحدہ کر کے سمجھنے کی سعی کرے گا تو اس کی سمجھ ناقص ہو گی ۔ اسی طرح عملی میدان میں بھی اسلام کے ایک جزئیہ پر عمل کرنے اور دوسری جزئیات کو ترک کرنے سے بھی اسلام پوری طرح نافذ اور قائم نہیں ہو سکتا اور نہ انسانی زندگی میں اس طرح کے جزئی اسلام کے ثمرات نکل سکتے ہیں ۔

اس کائنات ' زندگی اور انسانی تعلقات کے اساسی تصورات صرف ایمان باللہ کے سرچشمے سے پھوٹتے ہیں اور ان

تصورات کے اوپر پھر اجتماعی طریقہ ہائے کار ' اقتصادی نظام ' سیاسی نظام ' اخلاقی نظام ' قانونی نظام اور عالمی روابط کا نظام استوار ہوتا ہے ۔ ان تصورات کا اس کرۂ ارض پر لوگوں کی زندگی کی تمام سرگرمیوں میں ان کے باہم روابط پر بھی اثر ہوتا ہے اور یہ تصورات ایک فرد کے ضمیر اور ایک معاشرے کی واقعی صورت حال کی کیفیات کا تعین بھی کرتے ہیں ۔ یہ تصورات معاملات دنیا کو عبادت میں منتقل کر دیتے ہیں ۔ اگر یہ معاملات خدا و رسول کی اطاعت کرتے ہوئے سرانجام دیئے جائیں تو یہ عبادات کو معاملات کی اساس قرار دیتے ہوئے ان میں ضمیر کی پاکیزگی اور عمل کی صفائی پیدا کرتے ہیں اور آخر کار یہ تصورات زندگی کو ایک اکائی بنا دیتے ہیں ' جو اسلامی نظام حیات سے پھوٹتی ہے ۔ اس میں ہدایات صرف رب واحد سے لی جاتی ہیں اور پوری زندگی دنیا اور آخرت میں اللہ کی طرف ہی لوٹتی ہے ۔

اسلامی نظریہ حیات ' اسلامی نظام حیات اور اللہ کے صحیح دین کی یہ خصوصیت کس بات سے معلوم ہوتی ہے ؟ یہ اس اصول سے معلوم ہوتی ہے کہ اس آیت میں والدین کے ساتھ احسان ' رشتہ داروں کے ساتھ احسان اور تمام لوگوں کے ساتھ احسان کرنے کے احکام سے پہلے یہ کہا گیا ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرو ۔ اس کے بعد والدین کی رشتہ داری اور دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلقات کو ایک ہی لڑی میں پرویا گیا ہے اور دونوں امور کو اللہ کی توحید اور بندگی کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے جبکہ اس سے ماقبل درس کے خاتمے پر نظریہ توحید اور اللہ کی بندگی کو خاندان کے اندر باہم تعلقات کے لئے دستور بنایا گیا تھا ۔ اس درس میں نظریہ توحید اور اللہ کی بندگی کو تمام انسانوں کے درمیان تعلقات کے لئے اساس بنایا گیا ہے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے تاکہ ان تمام امور میں یہ نظریہ مستحکم ہو اور رابطہ بن جائے اور تمام معاشرتی روابط اور قانون سازی کا مصدر ایک ہو جائے ۔

( وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا ( ٤ : ٣٦ ) ) " اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو " .... پہلا حکم یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کرو اور دوسرا حکم یہ ہے کہ اللہ کی بندگی میں اللہ کے سوا کسی اور کو شریک نہ کرو ۔ یہ قطعی اور عمومی ممانعت ہے اور اس کا اطلاق ان تمام معبودوں پر ہوتا ہے جو انسانی تاریخ میں ریکارڈ ہیں ۔ (اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ ) کسی بھی چیز کو ' چاہے وہ مادہ اور جمادات سے ہو ' حیوان ہو ' انسان ہو ' فرشتہ ہو اور یا شیطان ہو ۔ یہ تمام چیزیں (شئی) کے مفہوم میں داخل ہیں ۔ جب اس کا استعمال اس طرز پر ہو ۔

اس کے بعد حکم دیا جاتا ہے کہ والدین کے ساتھ احسان کرو ۔ والدین کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے اور اقرباء کا ذکر عموماً کیا گیا ہے ۔ زیادہ احکام اس بارے میں ہیں کہ اولاد اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے ۔ اگرچہ والدین کو بھی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے بچوں کا خیال رکھیں ۔ اللہ تعالیٰ چھوٹے بچوں پر ہر حال میں ان کے ماں باپ سے بھی زیادہ رحم فرمانے والے ہیں ۔ اولاد اس بات کی زیادہ محتاج ہے کہ اسے والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کی ہدایت کی جائے ' اس لئے کہ والدین اس دنیا سے جانے والے ہیں ۔ ایک ایسی نسل سے ان کا تعلق ہوتا ہے جو پس پشت اور پس منظر میں جارہی ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ اولاد بالعموم اپنی شخصیت ' اپنے جذبات ' اپنے رجحانات اور اپنے اہتمامات کے اعتبار سے ان بچوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے جو ان کے بعد میں آنے والے ہوتے ہیں ۔ وہ اس نسل کی طرف متوجہ نہیں ہوتے جو اس سے قبل گزر رہی ہے ۔ زندگی کی دوڑ میں ان لوگوں کا رخ آگے کی طرف ہوتا ہے اور پیچھے مڑ کر دیکھنے میں

وہ غفلت کرتے ہیں۔اس لئے اس اللہ رحمٰن و رحیم سے انہیں یہ ہدایات ملتی ہیں جو والدین کو بھی ہدایات دیتے ہیں اور بچوں کے لئے بھی ہدایات دیتے ہیں۔نہ اولاد کو بھلاتے ہیں اور نہ والدین کو بھلاتے ہیں اور جو اپنے بندوں کو یہ ہدایت دیتے ہیں کہ وہ آپس میں نہایت ہی مہربانی سے پیش آئیں خواہ والدین ہوں یا اولاد ہوں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے جیسا کہ دوسری متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نیکی کے سلسلے میں یوں ہدایات دیتا ہے کہ نیکی کا آغاز اپنے خاص اور عام رشتہ داروں سے کیا جائے اور اس کے بعد اس کا دائرہ بتدریج وسیع کیا جائے اور اسے ان تمام محتاجوں تک پھیلایا جائے جن کا تعلق وسیع تر انسانی خاندان کے ساتھ ہے۔یہ حکم انسانی فطرت کے مطابق اور انسانی فطرت کی سمت پر چلنے والا حکم ہے۔اس لئے کہ رحم' دکھ اور درد میں شرکت کے جذبات سب سے پہلے گھر سے شروع ہوتے ہیں' جو ایک چھوٹا خاندان ہوتا ہے۔جس شخص نے گھر کے اندر نیکی' رحم اور محبت نہیں سیکھی یا اس کا تجربہ نہیں کیا اس سے ایسے جذبات کی توقع کسی غیر کے حق میں ہرگز نہیں کی جا سکتی۔طبیعت اور فطرت کے اعتبار سے بھی نفس انسانی اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔اس جذبے میں کوئی برائی اور حرج نہیں ہے بشرطیکہ یہ جذبہ خیر خاندان کے محدود دائرے اور متعین نقطے سے آگے بھی بڑھے۔اس کے بعد پھر یہ منہاج' اسلام کی اجتماعی تنظیم کے ساتھ متفق ہے کہ باہم تعاون اور کفالت کا نظام گھر سے شروع کیا جائے اور پھر اسے جماعت اور سوسائٹی کے دائرے تک پھیلایا جائے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام اپنے سوشل سیکورٹی کے نظام کو حکومت کے وسیع نظام کے ہاتھ میں دینا نہیں چاہتا' الا یہ کہ گھر یا گاؤں کے لوگ ناکام ہو جائیں اس لئے کہ مقامی انتظام زیادہ موثر ہو سکتا ہے۔مقامی انجمن بہ نسبت حکومت کے غریبوں کے بارے میں سہولت کے ساتھ تحقیقات کر سکتی ہے اور بروقت امداد نہایت سہولت اور آسانی کے ساتھ مستحقین تک پہنچا سکتی ہے۔اس کی وجہ سے لوگوں کے اندر محبت اور باہم رابطہ بھی پیدا ہوتا ہے جو ایک انسانی سوسائٹی کے لئے ضروری ہے۔

یہاں بات کا آغاز اس طرح ہوا ہے کہ والدین کے ساتھ احسان کرو' اس کے بعد اسے رشتہ داروں تک وسعت دی گئی ہے۔اس کے بعد پھر یتیموں اور مسکینوں کا ذکر ہے چاہے یہ یتیم اور مساکین دور رہتے ہیں اس لئے کہ ان کی ضرورت بھی زیادہ اہم ہوتی ہے اور ان کا خیال رکھنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔اس کے بعد قریبی پڑوسی' پھر اجنبی پڑوسی' اس کے بعد پہلو میں رہنے والے ساتھی' اس لئے کہ قرابت دار پڑوسی ہمیشہ ملتا ہے جبکہ پہلو میں رہنے والے ساتھی کبھی کبھار ملتے ہیں' صاحب بالجنب کی تفسیر میں آیا ہے کہ اس سے مراد وہ دوست اور ہمنشین ہے جو ساتھ رہتا ہو' حضر اور سفر دونوں میں۔پھر وہ مسافر جو اپنے اہل و عیال سے دور ہو اور پھر ان غلاموں کا حق ہے جنہیں حالات نے غلام بنا دیا ہے لیکن ہیں تو وہ بہرحال انسان۔

احسان کے حکم کے بعد' دوسرا حکم یہ آتا ہے۔فخر و غرور بری خصلت ہے۔بخل اور دعوت بخل اور اللہ کی نعمت اور فضل کو چھپانا یہ بری خصلتیں ہیں۔اسی طرح انفاق فی سبیل اللہ میں ریاکاری کی بھی ممانعت کی گئی اور بتایا گیا کہ جو لوگ یہ کام کرتے ہیں درحقیقت ان کا اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں ہوتا۔اور وہ شیطان کے مطیع اور ہمنشین ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا (٣٦) اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ

بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا (۳۷)
وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَنْ يَّكُنِ
الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا (۳۸) (٤: ٣٦ تا ٣٨)

"یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے ـ اور ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں ہیں' جو کنجوسی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اسے چھپاتے ہیں ـ ایسے کافر نعمت لوگوں کے لئے ہم نے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے ـ اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنے مال محض لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور وہ درحقیقت نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں' نہ روز آخر پر ـ سچ یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہوا اسے بہت ہی بری رفاقت میسر آئی ـ

یہاں اگر دوبارہ اسلامی نظام حیات کی یہ خصوصیت ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس میں تمام معاملات' تمام طرز ہائے عمل' عقل و شعور کے تمام رجحانات اور سوسائٹی کے اندر پائے جانے والے تمام تعلقات کا ربط عقیدے اور تصور حیات کے ساتھ ہوتا ہے ـ جب انسان صرف اللہ کا بندہ بن جاتا ہے اور تمام ہدایات اللہ سے لیتا ہے تو وہ لوگوں پر احسان کرنا خود بخود شروع کر دیتا ہے' اللہ کی رضا کے حصول اور آخرت کے اجر کی امیدواری کے لئے ـ وہ یہ کام نہایت ہی عاجزی' نہایت ہی نرمی کے ساتھ کرتا ہے اور یہ مانتے ہوئے کرتا ہے کہ وہ جو کچھ دے رہا ہے وہ اللہ ہی کے دیئے سے دے رہا ہے ـ وہ خود اپنے رزق اور مال و دولت کا خالق نہیں ہے ـ اسے تو اللہ کے ہاں سے سب کچھ ملتا ہے ـ اور اللہ کے انکار اور یوم آخرت سے انکار کے نتیجے میں فخر اور غرور پیدا ہوتا ہے اور بخل اور دعوت بخل پیدا ہوتے ہیں ـ اور اللہ کے فضل کو چھپایا جاتا ہے کہ اس کے آثار بصورت داد و دہش ظاہر نہ ہوں اور اگر انفاق ہو بھی تو وہ ریاکاری کے لئے ہوتا ہے اور اس کے بعد لوگوں کے سامنے فخر و مباہات کا اظہار ہوتا ہے اس لئے کہ ایسے شخص کے سامنے نہ رضائے الٰہی ہوتی ہے اور نہ جزائے آخرت کی امیدواری ـ بس لوگوں کے سامنے فخر اور غرور کا اظہار مطلوب ہوتا ہے ـ

اس طرح ایمانی اخلاقیات اور کفر کی اخلاقیات کے حدود کا تعین بسہولت ہو جاتا ہے ـ مومنین کے نزدیک اچھے اعمال اور اچھے اخلاق کا باعث ایمان باللہ اور جزائے آخرت ہوتے ہیں ـ اور اللہ کی رضامندی کے حصول پر آنکھیں لگی ہوتی ہیں اور یہ ایک ایسا بلند داعیہ ہوتا ہے کہ انفاق کرنے والا لوگوں سے کسی بدلے کا منتظر نہیں ہوتا' اور نہ وہ عمل لوگوں کے عرف و رواج سے سیکھتا ہے ـ اگر کسی کے دل میں ایک خدا کا یقین نہ ہو جس کی رضامندی وہ چاہتا ہو اور اس رضامندی کے حصول کے لئے وہ جدوجہد کر رہا ہو اور اسی طرح یوم آخرت کا عقیدہ اور جزائے آخرت کا کوئی لالچ نہ ہو' تو ایسے لوگ اگر نیکی کا کوئی کام کرتے بھی ہیں تو وہ رسم و رواج کے مطابق دنیاوی اقدار کے لئے کرتے ہیں ـ ایسے شخص کے لئے پھر کسی نسل میں بھی کوئی ایک ضابطہ نہیں ہوتا چہ جائیکہ اس کے لئے ہر زمان و مکان میں کوئی ناقابل تغیر ضابطہ ہو' اس کے لئے پھر نیکی کرنے کا داعیہ وہی باتیں ہوں گی جن کا ذکر ہوا یعنی فخر و مباہات اور یہ داعیہ بھی ہمیشہ غیر مستقل اور غیر یقینی ہو گا اور لوگوں کی اقدار اور ان کی اغراض کے ساتھ ساتھ تغیر پذیر ہو گا ـ اور ہمیشہ یہ مذموم صفات انفاق کے

ساتھ پیوستہ رہیں گی۔ فخر' غرور' بخل اور بخل کی دعوت' لوگوں کو دکھاوا۔کبھی بھی انفاق فی سبیل اللہ اخلاص اور بے لوثی سے نہ ہو گا۔

قرآن کریم کہتا ہے اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کراہیت اور محبت کے انفعالات سے پاک ہے اس لئے ان الفاظ سے مراد یہاں کراہیت' اور محبت کے اثرات ہیں۔یعنی اللہ ان کو دھتکارے گا' اذیت دے گا اور انہیں ان کاموں پر سزا دی جائے گی۔ (وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا (۴:۳۷)) (اور ایسے کافروں کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسواکن عذاب تیار کیا ہے)۔یہاں فخر و غرور پر ان کے لئے رسواکن عذاب دیئے جانے کا ذکر ہے جو ان اوصاف بد کے مقابل ہے۔قرآن کریم کا انداز تعبیر ایسا ہے کہ وہ معانیے مقصود کے علاوہ بھی اپنا پرتو ڈالتا ہے۔اور قرآن کے یہ اشارات بھی بذات خود مقصود و مطلوب ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے زیر بحث اوصاف بد اور افعال مکروہیہ کے خلاف کراہیت اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔اس کے نتیجے میں ان چیزوں کو حقیر سمجھ کر انسان ان سے دور رہتا ہے خصوصاً اس صورت میں کہ اللہ تعالیٰ نے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اس قسم کے لوگ شیطان کے ساتھی ہیں اور جن لوگوں کا ساتھی شیطان ہو جائے تو سمجھ لیں کہ وہ بہت ہی برا ساتھی ہے۔ (وَمَنْ یَّكُنِ الشَّیْطٰنُ لَهٗ قَرِیْنًا فَسَآءَ قَرِیْنًا (۴:۳۸)) بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ آیات مدینہ کے بعض یہودیوں کے بارے میں وارد ہوئی ہیں کیونکہ ان میں جو صفات مذکور ہیں وہ یہودیوں پر پوری طرح منطبق ہوتی ہیں' جیسا کہ وہ منافقین پر منطبق ہوتی ہیں۔جس دور میں یہ آیات نازل ہوئیں اس دور میں اللہ نے ان پر جو فضل و کرم کیا تھا' وہ اسے چھپاتے تھے۔نیز اس سے مراد یہ بھی' ہو سکتا ہے کہ وہ سچائی ہو جو انہیں دی گئی تھی انہوں نے اسے چھپا لیا تھا۔یعنی حضور اکرم ؐ کی رسالت اور دین اسلام کے بارے میں جو پیشن گوئیاں ان کے ہاں تھیں۔لیکن آیت کی عبارت عام ہے اور بات یہاں مال اور فعل کے ذریعے احسان کی ہو رہی ہے' لہٰذا مناسب ہے کہ آیت کے مفہوم کو عام ہی رہنے دیا جائے' کیونکہ سیاق کلام کے ساتھ اس آیت کا عام مفہوم ہی زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

جب ان لوگوں کے نفوس کا سرچاک ہوا' جب ان لوگوں کے عمل کی فضیحت ظاہر ہو گئی اور ان کے اسباب یعنی انکار خدا' انکار آخرت اور شیطان کی ہم نشینی اور اس کا اتباع بھی بیان کر دیئے گئے اور اس کے بعد یہ بھی بتا دیا گیا کہ ان برائیوں کی سزا توہین آمیز عذاب ہے' تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ استفہام انکاری کے انداز پوچھتے ہیں۔

وَمَا ذَا عَلَیْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِیْمًا (۳۹) اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً یُّضٰعِفْهَا وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِیْمًا (۴۰) (۴:۳۹-۴۰))

"آخر ان لوگوں پر کیا آفت آ جاتی اگر یہ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے اور جو کچھ اللہ نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے۔اگر یہ ایسا کرتے تو اللہ سے ان کی نیکی کا حال چھپا نہ رہ جاتا۔ اللہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔اگر

کوئی ایک نیکی کرے تو اللہ اسے دوچند کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے ۔"

ہاں ' انہیں کیا ہو جاتا ۔ وہ کیا نقصان ہے 'جس کی بابت وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے سے ڈرتے ہیں ۔ جس کی بابت وہ انفاق کرنے سے ڈرتے ہیں 'یعنی اللہ کا دیا ہوا' اللہ کے راستے میں ' اللہ تو اس چیز کو بھی جانتا ہے جو وہ خرچ کرتے ہیں اور ان اسباب اور دواعی سے بھی باخبر ہے جن کی وجہ سے وہ خرچ کرتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ تو ذرہ برابر کسی پر ظلم نہیں کرتے ۔ اس لئے اس بات کا ڈر نہیں ہے کہ اللہ کو ان کے ایمان اور ان کے انفاق کے بارے میں علم نہ ہو سکے گا ۔ اس لئے اللہ انہیں جو جزاء دے گا اس میں ظلم نہ ہو گا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے اس میں خاص اضافہ فرمائے گا ۔ نیکیاں زیادہ کر دی جائیں گی اور اللہ اپنی جانب سے بلاحساب دے گا ۔

ایمان کا راستہ ہر صورت میں محفوظ اور مفید ہے ۔ یعنی مادی مفادات و نقصانات کے نقطہ نظر سے بھی ۔ اگر خالص مادی نقطہ نظر سے بھی دیکھا جائے تو ایمان پھر بھی مفید اور محفوظ راستہ ہے ۔ اس لئے پوچھا جاتا ہے کہ انہیں کیا نقصان ہو گا اگر وہ اللہ پر ایمان لائیں اور یوم آخرت پر یقین رکھیں اور انہیں اللہ نے جو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کریں ۔ اس لئے کہ وہ جو کچھ خرچ کر رہے ہیں 'اس میں سے کوئی چیز ان کی پیدا کردہ نہیں ہے ۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ بطور بر و احسان خرچ کرنے والوں کو کئی گنا اجر دیتا ہے 'اور اس پر اس کا فضل و کرم مستزاد ہو گا' حالانکہ وہ جو کچھ خرچ کر رہے ہیں وہ اللہ کے دیئے ہوئے سے خرچ کر رہے ہیں ۔ کیا ہی عظیم ہے اللہ کا فضل و کرم ۔ کیا ہی بہترین سودا ہے یہ ۔ اس سے تو کوئی جاہل ہی باز رہ سکتا ہے ۔

آخر میں اوامر و نواہی اور ترغیب اور تحریک کا خاتمہ مشاہد قیامت میں سے ایک منظر پر ہوتا ہے ۔ یہاں ان کے موقف کو مجسم شکل میں اور حرکت کرتے ہوئے زندہ کرداروں میں پیش کیا جاتا ہے 'جس طرح قرآن کریم ہمیشہ مشاہدات قیامت کو زندہ اور متحرک شکل میں پیش کرتا ہے ۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا (٤١) يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ وَ لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا (٤٢)((٤: ٤١ - ٤٢))

"پھر سوچو کہ اس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر تمہیں (یعنی اے محمد ﷺ آپ کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے ۔ اس وقت وہ سب لوگ جنہوں نے رسول کی بات نہ مانی اور اس کی نافرمانی کرتے رہے' تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں ۔ وہاں یہ اپنی کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے ۔"

پہلی آیت میں بطور تمہید کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا' اس لئے قیامت میں مکمل عدالت ہو گی اور اللہ کے ترازو میں بال برابر بھی کھوٹ نہ ہو گا ۔ اور یہ کہ اللہ حسنات کو کئی گنا کر دے گا اور اس پر مستزاد اللہ کی

جانب سے اہل ایمان پر فضل و کرم ہو گا۔ اللہ کی رحمت ہوگی مگر ان لوگوں پر جو رحمت کے مستحق ہوں گے اور وہاں اللہ کا فضل بھی ہو گا مگر صرف ان لوگوں پر ہو گا جو اپنے ایمان کے ذریعے اللہ کے فضل کے امیدوار ہوں گے۔

مگر ان دوسرے لوگوں کا حال کیا ہو گا جنہوں نے ایمان کی پونجی پیش نہیں کی اور انہوں نے عمل کا سرمایہ جمع نہیں کیا۔ انہوں نے کفر اور بداعمالیاں جمع کیں۔ اس دن پھر ان کا حال کیا ہو گا؟ اس وقت جب ہم ہر قوم سے اس قوم کے خلاف ایک گواہ لائیں گے اور اے محمد ؐ تمہیں امت مسلمہ پر گواہ لائیں گے۔

یہاں آکر قیامت کا منظر صاف صاف آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ یہ ایک وسیع میدان ہے۔ تمام امتیں جگہ جگہ موجود ہیں اور ہر امت کے اعمال پر ایک گواہ پیش ہو گا۔ یہ لوگ جنہوں نے کفر کیا' فخر کیا' غرور کیا' بخل کیا' بخل کے داعی رہے۔ اللہ کے فضل کو چھپاتے رہے اور دکھاوا کرتے رہے اور کوئی کام رضائے الٰہی کے لئے نہ کرتے تھے۔ یہ منظرکشی ایسی ہے کہ الفاظ کے اندر سے قریب ہے کہ ہم انہیں دیکھ لیں۔ وہ میدان میں کھڑے ہیں' ہر امت کے رسول کو شہادت کے لئے بلایا جاتا ہے اور ہمارے رسول ؐ کو بھی بلایا جاتا ہے اور یہ لوگ اپنے پورے کفر کے ساتھ' اپنے تمام پوشیدہ اور ظاہری اعمال کے ساتھ' اپنے پورے تکبر اور غرور کے ساتھ' اپنی پوری کنجوسی اور دعوت بخل کے ساتھ' اپنے خالق کی درگاہ میں کھڑے ہوں گے۔ اس رازق کی عدالت میں ہوں گے جس کے فضل کو انہوں نے چھپایا اور اس کے دیئے ہوئے سے خرچ نہ کیا۔ اب ان کے سامنے وہ دن (قیامت) ہے جس پر ان کا یقین نہ تھا۔ پھر اسی رسول کی موجودگی میں انصاف ہو گا جس کا انہوں نے انکار کیا تھا' پھر ان کا کیا حال ہو گا؟

بے شک یہ لوگ عظیم شرمندگی اور ذلت سے دوچار ہوں گے۔ شرمندگی اور ندامت سے انکے سر جھکے ہوں گے۔ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے کیونکہ انکار سے انہیں فائدہ ہی کیا ہو گا۔

قرآن کریم کی عبارت ان مضامین کو محض ظاہری انداز میں بیان نہیں کرتی بلکہ اسے ایک نفسیاتی تصویرکشی کے انداز میں بیان کیا جاتا ہے اور ان لوگوں کے اوپر شرمندگی' ذلت اور ندامت کے سائے صاف نظر آ رہے ہیں۔ ذرا الفاظ ملاحظہ کریں۔

(يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ وَ لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا (٤: ٤٢)) "اس وقت جنہوں نے رسول کی بات نہ مانی اور نافرمانی کی تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔ وہاں یہ اپنی کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے۔"

اس زندہ اور متحرک انداز تعبیر کی جھلکیوں کے درمیان سے ہم ان تمام معانی کو پاتے ہیں اور یہ سب تاثرات کو چشم تصور سے دیکھ لیتے ہیں جو حشر میں کھڑے ان لوگوں کے چہروں سے عیاں ہوں گے۔ یہ تاثرات ہم نہایت ہی گہرے ادراک کے ساتھ زندہ اور متحرک پاتے ہیں۔ دنیا کے تمام ادب پاروں کو کھنگال لیجئے! آپ کو کسی بھی بیانیہ کلام یا تجزیہ نگاری میں یہ تاثر نہ ملے گا۔ قیامت کے مناظر بیان کرتے ہوئے قرآن بطور خاص یہ انداز اختیار کرتا ہے اور قرآن میں بعض دوسرے مقامات پر بھی اس کے نمونے ملتے ہیں۔

---○○○---

اس درس کا آغاز اس مضمون سے ہوا تھا کہ اللہ کی بندگی اور عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ کرو' نماز چونکہ اللہ کی بندگی اور عبادت کی محسوس ترین شکل ہے' اس لئے اگلی آیت میں نماز کے بعض احکام کو بیان کیا جاتا ہے ۔ نیز نماز کی تیاری کے لئے طہارت کے بعض احکام بھی بیان ہوتے ہیں ۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ ۔ نماز اس وقت پڑھنی چاہئے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو ۔ اور اسی طرح جنابت کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک غسل نہ کر لو' الا یہ کہ راستے سے گزرتے ہو ۔ اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم بیمار ہو' یا سفر میں ہو' یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے' یا تم نے عورتوں سے لمس کیا ہو' اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو' بے شک اللہ نرمی سے کام لینے والا اور بخشش فرمانے والا ہے ۔"

یہ بھی جماعت مسلمہ کی تربیت کی ایک اہم کڑی ہے جسے اسلامی نظام حیات نے جاہلیت کی پستیوں سے سربلند کیا ۔ شراب نوشی جاہلی معاشرے کی ایک عام اور بنیادی عادت تھی بلکہ قدیم اور جدید جاہلیتوں کی یہ امتیازی خصوصیت رہی ہے ۔ رومی معاشرہ جب اپنی ترقی کے انتہائی عروج پر تھا تو شراب نوشی اس کی ممتاز ترین خصوصیات میں سے ایک تھی ۔ اسی طرح فارس کے جاہلی معاشرے کی اہم خصوصیات میں سے شراب نوشی ایک اہم خصوصیت تھی ۔ آج امریکی اور یورپین تہذیب اور جاہلیت اپنے عروج پر ہیں اور شراب نوشی ان کی ممتاز ترین صفت ہے ۔ افریقہ میں جو ترقی یافتہ معاشرے گزرے ہیں ان کی خصوصیات میں بھی یہ اہم خصوصیت رہی ہے ۔

سویڈن آج کے ترقی یافتہ جاہلی ممالک میں سب زیادہ ترقی یافتہ ہے ۔ گزشتہ صدی کے نصف آخر میں اس کا حال یہ تھا کہ اس کا ہر خاندان اپنے لئے مخصوص شراب استعمال کرتا تھا ۔ اور ان میں سے ہر فرد اوسطاً" بیس لیٹر شراب پیتا تھا ۔

حکومت سویڈن کو ان اعداد سے تشویش لاحق ہوئی کیونکہ اس کی وجہ سے لوگ نشے کے خطرناک حد تک عادی بنتے جا رہے تھے۔ حکومت نے یہ پالیسی اختیار کی کہ شراب خرید کر اسے سٹور کیا جائے اور انفرادی استعمال کے اعداد و شمار کی حد کو کم کرنے کی سعی کی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت نے عام مقامات پر شراب نوشی کی ممانعت کر دی۔ لیکن حکومت نے جلدی اپنے اقدامات سے رجوع کر لیا ہے اور عائد شدہ پابندیوں میں تخفیف کر دی گئی۔ ہوٹلوں میں شراب نوشی کی اجازت دے دی گئی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اگر کوئی کھانا کھائے تو شراب پی سکتا ہے۔ اس کے بعد پبلک مقامات میں سے بعض مقامات پر اجازت دے دی گئی اور یہ اجازت بھی نصف رات تک دی گئی۔ نصف رات کے بعد نبیذ اور بیر کے استعمال کی اجازت دی گئی لیکن نوجوانوں کے اندر شراب نوشی کی عادت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

امریکہ میں ایک دفعہ حکومت نے اس بری عادت کو ختم کرنے کا ارادہ کیا۔ ۱۹۱۹ء میں اس نے قانون تحریم شراب نوشی پاس کیا۔ اس قانون کو خشکی کا قانون کہا گیا۔ اس لئے کہ اس نے شراب نوشی کے ذریعے آبپاشی کو منع کر دیا۔ یہ قانون صرف ۱۴ سال تک چل سکا اور حکومت نے اسے ۱۹۳۳ء میں منسوخ کر دیا۔ اس قانون کی حمایت میں حکومت امریکہ نے ریڈیو، سینما، تقاریر اور نشر و اشاعت اور پروپیگنڈے کے جدید ترین وسائل استعمال کئے۔ صرف شراب نوشی کے خلاف نشر و اشاعت پر حکومت نے اس وقت ۶۰ ملین ڈالر خرچ کئے۔ اور جو کتابیں، رسالے اور پمفلٹ شائع کئے گئے وہ دسیوں بلین صفحات پر مشتمل تھے۔ اس قانون کے پاس کرنے کی وجہ سے حکومت کو ۲۵۰ بلین پونڈ کے اخراجات بشکل تاوان دینے پڑے۔ تین سو افراد لقمہ اجل بنے ۵۳۲۳۳۵ افراد قید ہوئے، ۱۶ ملین پونڈ جرمانے ہوئے، چار بلین اور ۴۰۰ ملین پونڈ مالیت کی جائیدادیں ضبط ہوئیں۔ لیکن ان اقدامات کے باوجود حکومت اس قانون کو منسوخ کرنے پر مجبور ہوئی اور اس نے پسپائی اختیار کی۔

جاہلیت میں شراب نوشی ایک عام عادت تھی لیکن اسلام نے چند آیات نازل کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔ یہ ہے وہ فرق نفس انسانی اور انسانی معاشرے کے ساتھ اسلامی طرز عمل اور جاہلی طرز عمل اور طریقہ تربیت کا۔ اور قدیم زمانے میں بھی یہ فرق تھا اور آج بھی یہ فرق اپنی جگہ قائم ہے۔

سوال یہ ہے کہ اسلام سے قبل دور جاہلیت میں شراب نوشی کا کیا حال تھا؟ اس کی حقیقی صورت حال اس شخص کو معلوم ہوگی جو دور جاہلیت کے اشعار کا قدرے گہرا مطالعہ کرے گا۔ ادبی موضوعات میں سے شراب اہم ترین موضوع رہا ہے جیسا کہ جاہلی زندگی میں یہ ایک اہم خصوصیت تھی۔ شراب اس قدر فروخت ہوتی تھی کہ تجارت کا لفظ عام تجارت کے بجائے شراب کی فروخت کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔ مشہور شاعر ولید کہتا ہے۔

قد بت سامرها و غاية تاجر
وافيت اذ رفعت وعز مدامها

(عیش و عشرت کی کئی ایسی راتیں میں نے قصہ گوئی میں بسر کیں اور ان میں شراب ایسے تاجروں کے پاس پہنچی جنہوں نے اپنی کالونی پر نئے نئے جھنڈے لگائے تھے اور پرانی شراب کے دام بہت ہی چڑھ گئے۔) عمرو ابن قمیہ کہتا ہے۔

اذا اسحب الريط و المروط الي
ادنى تجاري وانفض اللمما

(اس جوانی کے وقت کو یاد کرو جب ریشم کے قیمتی کپڑے پہن کر اپنے قریب ترین شراب فروش کے پاس پہنچ جاتا تھا اور اپنے سر کے لمبے لمبے بالوں کو سر کی حرکت کی وجہ سے جھاڑتا تھا نشہ 'شراب اور غرور کی وجہ سے ۔)

مجالس شراب نوشی کا بیان اور شراب نوشی پر فخر کے مضامین سے جاہلیت کے اشعار بھرے ہوئے ہیں اور یہ ان کی اہم ترین خصوصیات میں سے ایک ہے ۔امراء القیس کہتے ہیں ۔

١ – واصحبت ودعت الصباغير انني اراقب حلات من العيش اربعا
٢ – فمنهن قولي للندامى ترفقوا يداجون نشاجا من الخمر مترعا
٣ – ومنهن ركض الخيل ترجم بالقنا يبادرون سربا آمنا ان يفزعا

(۱) صبح ہوئی اور اس نے شراب کو الوداع کہہ دیا' لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو زندگی کی چار صفات کو بہت پسند کرتا ہوں ۔ ۔

(۲) پہلی یہ کہ میں اپنے ہم پیالہ مے خواروں کو یہ

(۳) ان میں سے ایک یہ کہ میں گھوڑا دوڑاؤں اور تیر پھینکتے ہوئے نیل گایوں کے ایسے گلے پر جھپٹ کر خوفزدہ کر دوں جو نہایت ہی امن و سکون سے چر رہا تھا ۔

اور طرفہ ابن العبد کہتے ہیں:

فلولا ثلاث هن من عيسة الفتيٰ
وجدك لم احفل متي قام عودي

اگر تین چیزیں نہ ہوتیں جو ایک نوجوان کے لئے سامان عیش ہیں تو تیرے سر کی قسم میں اپنی پوری زندگی میں کسی محفل میں شریک نہ ہوتا ۔

فمنهن سبق العاذلات بشربة
كميت متي ما تعل بالما تزبد

ان میں سے ایک یہ ہے کہ شرمسار کنندہ عورتوں سے بھی آگے بڑھ کر کلیجی رنگ کا جام اٹھالیتا ہوں جس میں اگر پانی ڈالا جائے تو کف آجائے ۔

ومازال تشرب الخمور ولذتي
وبذلي وانفاقي طريفي وتالدی

میں ہمیشہ شراب نوشی اور لذت نوشی کا عادی ہوں اور مسلسل اپنی جدی دولت اور تازہ جمع کردہ مال کو خرچ کرتا رہتا ہوں۔

الی ان تحامتنی العشیرہ کلھا
وافردت افراد البعیر المعبد

یہاں تک کہ ہر قبیلہ میری دشمنی پر اتر آیا اور میں اس طرح اکیلا ہو گیا ہوں جس طرح خارش زدہ اونٹ علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔

اور اعشیٰ کہتے ہیں:

فقدْ شرب الراح تعلمین
یوم المقام دیومالظعن

(میں شراب پیتا ہوں اور تمہیں خوب خبر ہے قیام کے دن بھی اور سفر کے دن بھی۔

واشرب بالریف حتی یقا
ل قدطال بالریف ما قد دجن

اور میں سرسبزی اور شادابی میں بہت پیتا ہوں یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ اب کے موسم بہار کی بارشوں میں بہت عوانت ہوگئی ہے۔

منخل لیشکری کہتے ہیں:

(۱) لقد شربت من المدامة بالصغیر وبالکبیر
(۲) فاذاسکرت فاننی رب الخورنق و السدیر
(۳) واذاصحوت فاننی رب الشویة و البعیر

(۱) میں ہمیشہ شراب نوشی کرتا ہوں' چھوٹوں کے ساتھ بھی اور بڑوں کے ساتھ بھی۔ (یعنی ہر محفل میں)
(۲) اگر میں بے ہوش ہو جاؤں تو خورنق اور سدیر نامی قلعوں کا مالک ہوں۔ (یعنی ان قلعوں میں داد عیش دیتا ہوں اور اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتا ہوں)
(۳) اور اگر میں ہوش میں ہوا تو پھر میں بکریوں اور اونٹوں کا مالک ہوں۔ (یعنی بکریاں اور اونٹ ذبح کرتا ہوں اور چراتا ہوں)۔

—○○○—

تحریم شراب کے مختلف مراحل میں جو واقعات پیش آئے اور ان واقعات کا تعلق جن لوگوں سے ہے ' مثلاً حضرت عمرؓ ' علیؓ ' حمزہؓ ' عبدالرحمٰنؓ ابن عوف اور ان جیسے دوسرے مشہور صحابہؓ ' ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریم شراب سے قبل اس کا رواج کس قدر زیادہ تھا ' خصوصاً دور جاہلیت میں بعض واقعات مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر کافی ہیں ۔

حضرت عمرؓ اپنے قصہ اسلام میں بیان فرماتے ہیں :"میں جاہلیت میں شراب نوشی کا عادی تھا ۔ میں نے سوچا کہ فلاں شراب فروش کے پاس جاؤں اور شراب پی لوں......" اسلام میں بھی حضرت عمر شراب استعمال کرتے رہے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی :

(يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲ : ۲۱۹)) "لوگ آپ سے جوئے اور شراب کے بارے میں سوال کرتے ہیں؟ کہہ دیں ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہیں اور ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے ۔" تو حضرت عمرؓ نے دعا کی :"اے اللہ ہمارے لئے شراب کے بارے میں کافی و شافی بیان نازل فرما دے ۔" اور آپ نے شراب نوشی کا سلسلہ جاری رکھا یہاں تک کہ شراب کی حرمت کا صریح حکم نازل ہوا :

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۹۰) اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (۹۱)(۵ : ۹۰ - ۹۱)) (شراب ' جوا اور آستانے اور پانسے شیطان کے ناپاک اعمال ہیں ' لہٰذا ان سے اجتناب کرو ' امید ہے کہ تم فلاح پا لوگے ' بے شک شیطان صرف یہ چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان شراب اور جوئے کے ذریعے بغض و عداوت پیدا کر دے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے ۔کیا تم اس سے باز آؤ گے ؟) اس پر حضرت عمرؓ نے کہا :ہاں ہم باز آگئے ' باز آگئے اور اس کے بعد وہ شراب نوشی سے رک گئے ۔اور آیت

(يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (۴ : ۴۳)) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو ' اس وقت تک نماز کے قریب مت جاؤ جب تک تم نشے کی حالت میں ہو) کے بارے میں دو روایات وارد ہیں ۔جن میں مہاجرین میں سے حضرت علی اور عبدالرحمٰن بن عوف اور انصار میں سے سعد بن معاذ شریک واقعہ ہیں ۔

ابن ابی حاتم ' یونس ابن حبیب ' ابو داؤد ' مصعب ابن سعد وہ اپنے والد سعد سے روایت کرتے ہیں کہ میرے بارے میں چار آیات نازل ہوئیں ۔ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک انصاری نے دعوت طعام تیار کی ۔اس نے کچھ لوگ مہاجرین کے اور کچھ انصار کے بلائے ۔ہم نے کھایا پیا یہاں تک کہ ہم مدہوش ہوگئے ' پھر اپنے اپنے بارے میں مفاخر بیان کرنے لگے ' ایک شخص نے اونٹ کے جبڑے کی ہڈی لی اور سعد کی ناک پر دے ماری ۔چنانچہ سعد مغروز الانف تھے ۔یہ واقعہ شراب

نوشی کی حرمت سے پہلے کا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (٤ : ٤٣)) یہ ایک طویل حدیث ہے جو امام مسلم نے شعبہ سے نقل کی ہے۔

ابن ابی حاتم، ابن عمار، عبدالرحمن ابن عبداللہ دشتکی ابو جعفر، عطا، ابو عبدالرحمن کی سند سے حضرت علی ﷺ سے روایت ہے کہ عبدالرحمن ابن عوف نے ہمارے لئے کھانا تیار کیا۔ اس نے ہمیں دعوت دی اور شراب پلائی، شراب نے ہمیں لے لیا، اور نماز کا وقت ہو گیا۔ لوگوں نے فلاں کو آگے کیا۔ اس نے پڑھا۔ (يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ مَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَنَحْنُ نَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ) اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ آیت نازل ہوئی۔

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ

(٤ : ٤٣)) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، نماز کے قریب مت جاؤ، جب تم نشے میں ہو یہاں تک کہ تم جو کچھ پڑھتے ہو اسے سمجھو۔" میں سمجھتا ہوں کہ دور جاہلیت میں شراب نوشی کی کثرت اور وسیع استعمال کے ثبوت کے لئے اس سے زیادہ روایات کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ روایات کافی ہیں۔ شراب نوشی اور جوئے بازی کا رواج نہایت ہی وسیع تھا اور دور جاہلیت کی عادات و تقالید میں سے یہ دونوں عادتیں نہایت ہی ممتاز تھیں۔

سوال یہ ہے کہ ربانی نظام حیات نے اس ممتاز اور نہایت ہی گہری صفت اور عادت کا علاج کس طرح کیا اور اس مصیبت کا دفعیہ کس طرح ہو گیا جس کے ہوتے ہوئے کوئی سنجیدہ استوار، صالح اور دانشمند معاشرہ اٹھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس قدیم اور بری لت کو اسلام نے کس طرح یکلخت ختم کر دیا جس کے بعض پہلو قومی اجتماعی عادات سے وابستہ تھے اور بعض پہلو قومی و ذاتی اقتصادیات سے وابستہ تھے۔

قرآن کریم نے اس بری عادت کو صرف چند آیات کے ذریعے جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ نہایت نرمی، نہایت ہمدردی کے ساتھ اور نہایت ہی تدریج کے ساتھ۔ بغیر اس کے کہ کوئی جنگ لڑی جائے، بغیر اس کے کہ اس کے لئے کوئی معرکہ آرائی کرنا پڑے اور بغیر اس کے کہ اس کے لئے کوئی بڑی قربانی دی جائے یا خونریزی کی جائے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی قربانی دی گئی تو صرف یہ تھی کہ شراب کے مٹکے اور جام و سبو ٹوٹ گئے یا شراب کے وہ گھونٹ جو پینے والوں کے منہ میں تھے اور انہوں نے تھوک دیئے تھے اور کوئی جانی یا مالی نقصان نہیں ہوا۔ یاد رہے کہ بعض لوگوں نے جب آیت تحریم شراب کے بارے میں سنا اور وہ شراب پی رہے تھے انہوں نے وہ گھونٹ بھی نہ پیا جو ان کے منہ میں تھا۔ تفصیلات آگے آ رہی ہیں۔

مکہ جہاں اسلامی حکومت نہ تھی، اور نہ مسلمانوں کو اقتدار حاصل تھا، وہاں شراب کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کی طرف ایک سرسری اشارہ کیا گیا تھا۔ یہ اشارہ سیاق کلام کے اندر ضمنی طور پر کیا گیا تھا لیکن صرف اشارہ ہی تھا مثلاً سورت نحل میں آیا تھا۔

(وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا (١٦ : ٦٧))

"اور پھلوں میں سے کھوریں اور انگور جس سے تم شراب اور رزق حسن حاصل کرتے ہو)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب کو' جو وہ کھجوروں اور انگوروں سے بناتے تھے' رزق حسن کے بالمقابل بیان کیا۔ گویا شراب رزق حسن نہ تھی' یا رزق حسن سے کوئی علیحدہ شے تھی۔ یہ دور سے ایک اشارہ تھا۔ اور اس کے ذریعہ ایک بات ایک نوخیز مسلمان کے شعور کے اندر غیر محسوس طور پر بٹھا دی گئی۔ لیکن شراب نوشی کی عادت ایک انفرادی بدعملی نہ تھی بلکہ یہ تو اس سے زیادہ بڑا اور گہرا معاشرتی جرم تھا اور عادت بد تھی جبکہ اس کا تعلق اقتصادی امور سے بھی تھا۔ اس لئے اس کا قلع قمع ایسے بالواسطہ اشارات کے ذریعے نہ کیا جاسکتا تھا۔

مدینہ طیبہ میں جہاں ایک اسلامی حکومت قائم ہوگئی تھی اور اسلام کی پشت پر اقتدار بھی تھا' تب بھی اسلام نے شراب کی حرمت کے احکام محض قانون کے ڈنڈے کے ذریعے بشکل فرمان حکومت نافذ نہیں کیے۔ اس میں سب سے زیادہ کام قرآن کی قوت تاثیر نے کیا۔ یہ کارروائی نہایت ہی نرمی اور محبت کے انداز میں شروع کی گئی اور انسانی نفسیات کے گہرے مطالعے کی اساس پر شروع کی گئی۔ نیز اجتماعی امور کے بعد بصیرت افروز حقیقی تقاضوں کے مطابق کی گئی۔ سب سے پہلے اس سلسلے میں سورہ بقرہ کی یہ آیت آئی ہے:

(يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَآ اِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲:۲۱۹)) (آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں' کہہ دیں ان میں بہت بڑا گناہ بھی ہے اور لوگوں کے لئے منافع بھی ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے نفع سے بہت بڑا ہے)۔ یہ ایک سوال کا جواب تھا جس کے ذریعے شراب اور جوئے کے خلاف مسلمانوں کے ضمیر اور شعور کو بیدار کرنا شروع کیا گیا۔

یہ پہلی گھنٹی تھی جو اسلامی معاشرے میں شراب نوشی کے خلاف سنی گئی۔ اسلامی احساس اور اسلامی شعور کے اندر ایک ارتعاش پیدا ہوا۔ اور اسلامی فہم اور ادراک کو شراب نوشی اور جوئے کے خلاف بیدار کیا گیا۔ یہ بتایا گیا کہ اسلام میں حلت اور حرمت کا مدار گناہ اور ثواب پر ہے۔ اگر اس کے منافع کے مقابلے میں نقصان بہت زیادہ ہے اور گناہ بہت بڑا ہے تو اب راستہ یہی ہے کہ اسے حرام ہونا چاہئے۔

لیکن یہ معاملہ نہایت ہی گہرا تھا' حضرت عمر ﷺ جیسے لوگ شراب کے عادی تھے' اس آیت کے نزول پر آپ نے دعا کی: "اے اللہ شراب کے بارے میں ہمیں کافی اور شافی بیان دے دے۔" یہ دعا حضرت عمر ﷺ کی طرف سے تھی اور اس سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ شراب نوشی عربوں کے رگ و پے میں کس قدر سرایت کر گئی تھی۔ اس کے بعد وہ واقعات پیش آئے جن کا ذکر ہم نے اوپر کر دیا ہے اور ان کے بعد میں یہ آیت آئی۔

(يٰاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (۴:۴۳)) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو' نماز کے قریب مت جاؤ' اس حال میں کہ تم نشے کی حالت میں ہو) اور یہ بصیرت افروز اور حکیمانہ نظام زندگی اپنا کام کرتا رہا' نہایت ہی نرمی کے ساتھ۔ یہ ایک درمیانی مرحلہ تھا' پہلے تو اس فعل شنیع کے خلاف نفرت پیدا کی گئی کہ یہ ایک گناہ اور ناپاک عمل ہے' لیکن اب ایک محدود پابندی عائد کر دی گئی اور نشے کے اوقات کے اندر تحدید کر دی

گئی - اس لئے کہ نماز کے اوقات ایک دوسرے کے بہت ہی قریب ہوتے ہیں - اور یہ پورے دن پر پھیلے ہوئے ہیں اور دو نمازوں کے درمیان اس قدر طویل وقفہ نہیں ہوتا کہ کوئی شراب پئے اور اس کا نشہ ٹوٹ جائے اور وہ نماز باجماعت پڑھ سکے اور اس حال میں واپس آجائے کہ وہ نماز میں جو کچھ پڑھے اسے اس کا اچھی طرح علم و شعور ہو - جبکہ یہ بات معلوم ہے کہ شراب نوشی کے لئے خاص اوقات ہوتے ہیں یعنی صبح و شام - صبح ہوتے ہی نماز کا وقت ہوتا ہے اور شام کے وقت بھی تین نمازوں کے اوقات جمع ہوتے ہیں - اس لئے ایک مسلمان کے ضمیر کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا تھا کہ وہ شراب پئے یا نماز پڑھے - اور نماز چونکہ ان کے نزدیک دین کا مرکزی ستون بن چکی تھی' اس لئے وہ نماز کے حق میں ہی فیصلہ کرتے تھے' لیکن اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے شافی و کافی بیان کی ضرورت محسوس کی -

وقت اسی طرح آگے بڑھتا رہا - کچھ مزید واقعات درپیش ہوئے اور وقت آگیا کہ شراب نوشی کو قطعاً " حرام کر دیا اجائے - یہ قرآنی نظام حیات کے عین مطابق کیا گیا اور نہایت ہی موزوں موقعہ پر شراب نوشی کی عادت پر یہ فیصلہ کن وار کیا گیا -

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۹۰) اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (۹۱) (۵ : ۹۰ - ۹۱) (بے شک شراب اور جوا' آستانے اور پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں' ان سے پرہیز کرو' امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی - شیطان تو چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہوگے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ (۵ : ۹)) تمام مسلمان ان چیزوں سے باز آگئے - شراب کے مٹکیرے انڈیل دیئے گئے اور ہر جگہ شراب کے خم توڑ دیئے گئے - یہ کام صرف آیت سنتے ہی عمل میں لایا گیا اور جن لوگوں کے منہ میں شراب کے گھونٹ تھے وہ بھی انہوں نے تھوک دیئے' عین اس وقت جب وہ شراب پی رہے تھے اور ان کے منہ کے ساتھ پیالہ تھا - یہ تھی قرآن کریم کی فتح و کامرانی اور اسلامی نظام زندگی کی کامیابی - نہ کوئی جبر ہوا اور نہ کوئی تشدد -

لیکن یہ کام کیونکر ہوگیا؟ یہ معجزہ کس طرح رونما ہوا' جس کی کوئی نظیر انسانی تاریخ کے اندر نہیں ملتی - قانون سازی' ضابطہ بندی اور حکومت کے اقدامات کے اندر اس کی کوئی مثال نہیں ہے - کسی زمانے میں بھی اور کسی دور میں بھی - بہرحال یہ معجزہ رونما ہوا' اس لئے کہ ربانی نظام حیات نے انسانی نفس کا علاج کیا' اپنے مخصوص انداز میں' نفس انسانی پر ربانی اقتدار نافذ کیا - اس پر خدا ترسی کا نگران بٹھایا اور اللہ کا خوف ایک ایسا خوف ہوتا ہے کہ جس کے دل میں بیٹھ گیا وہ کسی وقت کسی جگہ ایک لمحے کے لئے بھی اس سے غافل نہیں ہوسکتا - یہ ربانی نظام تربیت انسان کو بحیثیت مجموعی لیتا ہے اور اس کی تربیت نہایت ہی فطری انداز میں کرتا ہے -

شراب نوشی کی حرمت کی وجہ سے ان کی اجتماعی زندگی کے اندر جو خلا پیدا ہو گیا تھا' اسلام نے اس خلا کو بعض اونچے مقاصد عطا کر کے پر کر دیا اور ان کو اپنے خالی اوقات میں شراب کی مدہوشی اور جاہلانہ فخر و مباہات کے اظہار کے مواقع ہی نہ چھوڑے اور محافل میں کبر و غرور کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہنے دی۔

وہ بلند مقاصد کیا تھے؟ مثلاً یہ کہ اسلام نے اس گم کردہ راہ اور دھتکاری ہوئی انسانیت کو جاہلیت کے بے آب و گیاہ صحراء اور اس کی تپتی ہوئی دوپہر اور اس کے تاریک ترین اندھیروں اور اس کی حقارت آمیز غلامی اور تنگ راہوں کی گھٹن سے نکالا اور اسے اسلام کے تروتازہ گلستان' اس کی گھنی چھاؤں' اس کے روشن دنوں' اور اس کی عزت آب آزادیوں اور دنیا اور آخرت کی وسعتوں کے اندر داخل کر دیا۔

اسلام نے عربوں کی زندگی کے اس خلاء کو تروتازہ ایمان سے بھر دیا۔ عربوں کے دل میں ایک تازہ اور نوخیز شعور پیدا ہوا جو ان کے لئے نہایت ہی پیارا تھا۔ اس سے انہیں شراب نوشی کی آغوش میں پناہ لینے کی ضرورت ہی نہ رہی کہ وہ جھوٹے تخیلات میں گم ہو کر سکون پائیں' ان کے قلوب مشعل ایمان کے ساتھ ملاء اعلیٰ کی روشن دنیا کی طرف محو پرواز ہوں اور اللہ جل شانہ کے نور میں اور اللہ کے وصال اور اس کی معرفت میں زندگی بسر کر رہے ہوں۔ وصال باری تعالیٰ سے لذت آشنا ہوں اور اس لذت کی وجہ سے وہ اپنے منہ کے اندر موجود جرعہ شراب کو بھی زمین پر پھینک رہے ہوں۔ اور اس کے نشے اور مزے کو نظرانداز کر رہے ہوں' اور آخر کار اس کے جوش اور اس کے سکون دونوں سے نفرت کر رہے ہوں۔

اسلام نے ایک مسلمان کی شخصیت کو جاہلیت کی دبیز تہوں سے نکال دیا۔ اس کے لئے ایسی راہیں کھول دیں جو اسلام کی کنجی کے بغیر کھل ہی نہ سکتی تھیں۔ وہ اس کے میلانات اور رجحانات کے ساتھ چلا اور اسلام کے طریقوں اور راہوں پر چل کر پسندیدہ روش اختیار کی۔ نور پھیلاتے ہوئے' حیات نو عطا کرتے ہوئے' نظافت اور پاکیزگی پھیلاتے ہوئے' ہمت اور بیداری پیدا کرتے ہوئے' بھلائی کے لئے آگے بڑھتے ہوئے اور اللہ کے ساتھ عہد اور شرائط ایمان کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔

شراب جوئے کی طرح ہے اور یہ دونوں لہو و لعب کے جدید مظاہر و مشاہد کی طرح ہیں۔ مثلاً جمناسٹک کے جنونی طور طریقے' اور ان کے سٹیڈیم اور دوسرے اخراجات' دوڑوں کے مقابلے' سینما اور مرد و زن کے درمیان اختلاط' بیلوں کے مقابلے اور لہو و لعب کے وہ تمام نئے انداز جو جدید جاہلیت کے لوازمات ہیں' جسے صنعتی جاہلیت کہنا زیادہ مناسب ہے۔

یہ تمام مظاہر دراصل روحانی خلا کے مظاہر ہیں۔ یہ ایمان کی کمی کو پورا کرنے کی سعی لاحاصل ہے۔ بلند مقاصد اور بلند نصب العین کو پیش نظر نہ رکھنے کا نتیجہ ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ تہذیب جدید ایک مفلس اور تہی دامن تہذیب ہے اور اس جدید کلچر کے اندر انسان کی تمام ضروریات کا سازوسامان موجود نہیں ہے اور یہ روحانی خلا اور یہ بلند مقاصد کی تہی دامنی ہی ہے جس کی وجہ سے لوگ جوئے اور شراب کی گود میں پناہ لیتے ہیں۔ اس خلا کو جوئے' شراب اور دوسرے لہو و لعب سے بھرنے کی سعی کی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ مغربی کلچر اس خلا کو ہر قسم کے لہو و لعب اور غیر فطری سرگرمیوں سے بھر رہا ہے۔ جیسا کہ اوپر ہم نے تفصیلاً بتایا۔ یہ دو امور ایسے ہیں جن کی وجہ سے انسان بے شمار نفسیاتی

امراض میں مبتلا ہوتا ہے اور اخلاقی بے راہ روی اختیار کرتا ہے۔

یہ چند الفاظ تھے جن کے نتیجے میں شراب کے قلع قمع کرنے کا معجزہ صادر ہوا۔ یہ تو ایک نظام حیات تھا' یہ ایک منہاج تھا اور یہ منہاج ان کلمات کے اندر بیان ہوا تھا اور یہ منہاج اللہ رب العالمین کا بنایا ہوا تھا۔ یہ انسانوں کا بنایا ہوا نہ تھا اور یہ وہ نکتہ امتیاز ہے ان نظامہائے زندگی کے درمیان جو لوگوں کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں اور اس نظام کے درمیان جو اللہ کا بنایا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی نظام کامیاب نہیں ہوتے۔

یہ محض کلام اور طریقہ اظہار مقصد کا مسئلہ نہیں ہے۔ اظہار مافی الضمیر کے لئے تو بے شمار اسلوب ہیں۔ بعض فلاسفہ بہت ہی اچھا لکھتے ہیں' شعراء میں سے فلاں بہت ہی اچھا شعر کہتا ہے یا مفکرین میں سے فلاں بہت ہی اعلیٰ درجے کا فنکار ہے۔ یا فلاں بادشاہ ادب ہے اور ایسا لکھتا ہے کہ وہ صاحب طرز ہے' صاحب نظریات ہے اور فلسفے کی ایک نئی شاخ کا بانی ہے۔ لیکن لوگوں کے ضمیر پر اس کے الفاظ کا اثر نہیں ہوتا اس لئے کہ اس کلام پر اللہ کی جانب سے کوئی قوت القا نہیں ہوتی۔ (مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهٖ مِنْ سُلْطٰنٍ) حقیقت یہ ہے کہ ہر بات کے پیچھے ایک مقصد ہوتا ہے جو اسے قوت اور گرفت عطا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسانی منہاج حیات ضعیف' جہالت پر مبنی' نقائص سے بھرپور اور بنانے والے انسان کی ذاتی خواہشات پر مبنی ہوتا ہے۔

معلوم نہیں کہ اس حقیقت کو وہ لوگ کب پاسکیں گے جو لوگوں کی زندگیوں کے لئے خود نظام تجویز کرتے ہیں' جو اللہ علیم و خبیر کے نظام سے بالکل علیحدہ ہوتا ہے۔ اور وہ ایسے قوانین بناتے ہیں جو حکیم و خبیر نے نہیں بنائے اور وہ لوگوں کے لئے ایسے نشانات نصب کرتے ہیں جو خالق ارض و سما نے نصب نہیں کئے۔

معلوم نہیں کب یہ لوگ عقل کے ناخن لیں گے۔ وہ اپنے اس کبر و غرور سے کب باز آئیں گے؟ اب ہم اس آیت کریمہ کے متن کی طرف آتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا (۴:۴۳)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ نماز اس وقت پڑھنی چاہئے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔ اور اسی طرح جنابت کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جاؤ' جب تک غسل نہ کر لو الا یہ کہ راستہ سے گزرتے ہو۔)

آیت میں اہل ایمان کو جس طرح شراب نوشی کی حالت میں نماز سے روکا گیا ہے' اسی طرح جنابت کی حالت میں بھی نماز سے روکا گیا ہے الا یہ کہ راستہ سے گزرتے ہو۔ جنابت کی حالت میں غسل ضروری ہے۔ لفظ (عابری سبیل) کے مفہوم میں مختلف اقوال ہیں۔ اسی طرح نماز کے قریب مت جاؤ کے مفہوم میں بھی اختلاف ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ جنابت کی حالت میں مسجد میں نہیں جانا چاہئے نہ مسجد میں ٹھہرنا چاہئے یہاں تک کہ ایک شخص غسل کرے۔ الا یہ کہ کوئی مسجد سے محض گزر رہا ہو۔ بعض لوگوں کے دروازے مسجد نبوی میں کھلتے تھے' اور ان کے گھر

کے آنے اور جانے کا راستہ مسجد ہی سے ہو کر گزرتا تھا' ایسے لوگوں کو مسجد سے حالت جنابت میں صرف گزرنے کی اجازت دے دی گئی تھی مگر ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی گئی اور نماز تو بہرحال ممنوع تھی' جب تک غسل نہ کرتے۔

ایک قول کے مطابق مفہوم یہ ہے کہ اس سے مراد نماز ہے۔یعنی یہ ممانعت کی گئی ہے کہ حالت جنابت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔جب تک غسل نہ کر لو' ہاں اگر تم مسافر ہو تو پھر بغیر غسل کے تم مسجد میں جا کر نماز ادا کر سکتے ہو مگر تیمم کے بعد' جو غسل کے قائم مقام ہو گا جس طرح پانی نہ ہونے کی شکل میں وضو کی جگہ تیمم جائز ہوتا ہے۔

پہلا قول زیادہ ظاہر اور قریب الفہم ہے۔اس لئے کہ دوسرے قول کے مطابق جو تفسیر بیان ہوئی اس میں بیان شدہ صورت کو خود اگلی آیت میں واضح کیا گیا ہے۔اگر (عابری سبیل) کی تفسیر یہ کی جائے کہ اس سے مراد مسافر ہیں تو اس صورت میں تکرار لازم ہو گا اور ایک ہی آیت میں تکرار بلاضرورت ہو گا۔

(وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا (٤ : ٤٣))

"اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم بیمار ہو' یا سفر میں ہو' یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے' یا تم نے عورتوں سے لمس کیا ہو' اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو' بے شک اللہ نرمی سے کام لینے والا اور بخشش فرمانے والا ہے۔"

اس آیت میں مسافر کی حالت کے بارے میں احکام بیان ہوئے ہیں' کہ جب کسی کو حاجت غسل لاحق ہو جائے' یا وضو کی ضرورت لاحق ہو جائے' اور وہ نماز ادا کرنا چاہتا ہو.... اسی طرح کوئی مریض ہو' اور اسے وضو کی یا غسل کی ضرورت پیش آ جائے یا کوئی قضائے حاجت سے فارغ ہو کر آیا ہو اور اسے وضو کی ضرورت ہو' یا اس نے عورتوں سے لمس کیا ہو.... ان سب صورتوں میں اگر پانی نہ ملے تو وہ پاک مٹی سے تیمم کر کے نماز پڑھے۔

الغائط کا مفہوم ہے' نشیبی جگہ۔چونکہ دیہاتی لوگ قضائے حاجت کے لئے نشیبی جگہ کو جاتے ہیں' اس لئے فعل قضائے حاجت کی تعبیر مکان فعل سے کر دی گئی۔اور (لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ) کی تفسیر میں بھی کئی اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد مباشرت ہے' جس کی وجہ سے غسل واجب ہوتا ہے۔دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے حقیقی لمس مراد ہے یعنی چھونا۔یعنی مرد کے جسم کا کوئی حصہ عورت کے جسم سے مس کرے۔بعض فقہی مذاہب کے مطابق اس سے وضو لازم آتا ہے لیکن بعض کے نزدیک یہ ناقض وضو نہیں ہے' اس کی تفصیلات تو کتب فقہ میں پائی جاتی ہیں۔ہم یہاں اجمالاً" بعض نتائج کا ذکر کرتے ہیں۔

(الف) لمس سے مطلقاً" وضو واجب ہے۔

(ب) لمس سے اس وقت وضو واجب ہو گا جس لامس کے جسم میں اشتہاء پیدا ہو جائے اور اس طرح یہ بھی

شرط ہے کہ جس عورت کے ساتھ لمس ہو وہ بھی شہوت انگیزی کے قابل ہو۔

(ج) لمس سے وضو اس وقت واجب ہو گا جب لامس یہ محسوس کرے کہ اس لمس کی وجہ سے اس کا نفس متحرک ہو گیا ہے۔

(د) لمس سے مطلقاً" وضو واجب نہیں ہے اور نہ ہی بیوی سے معانقہ کرنے یا بوسہ لینے سے وضو واجب ہو گا۔

ان اقوال میں سے ہر قول کے قائلین نے نبی ؐ کے اقوال اور افعال سے استدلال کیا ہے جس طرح فقہی مسائل کے استدلال میں بالعموم کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں (لَمَسْتُمُ النِّسَآءَ) سے بطور کنایہ وہ فعل مراد ہے جس سے غسل لازم آتا ہے اس لئے ان اختلافات کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں ہے جو وضو کے سلسلے میں کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

ان تمام حالات میں' چاہے غسل واجب ہو یا وضو واجب ہو اور پانی دستیاب ہو یا پانی دستیاب نہ ہو لیکن اس کا استعمال موجب مضرت ہو اور انسان کے لئے اس کا استعمال ممکن نہ ہو تو وضو کرنے یا غسل کرنے کے بجائے انسان کے لئے تیمم جائز ہے۔ اور تیمم کا ذکر آیت کے الفاظ (فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا (٤: ٤٣)) (پس پاک مٹی سے تیمم کرو) میں آتا ہے۔ تیمم کے لفظی معنی قصد کرنے کے ہیں یعنی پاک مٹی کا ارادہ کر لو۔ صعید ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو مٹی کی قسم سے ہو مثلاً مٹی' پتھر' دیوار' اگرچہ مٹی سواری کی پشت پر ہو' یا فرش اور دوسری چیزوں پر جن پر غبار ہو اور جب ہاتھ مارا جائے تو غبار اڑ رہا ہو۔

تیمم کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھوں سے پاک مٹی کو تھپکی دے' پھر ہاتھوں کو جھاڑ دے اور چہرے پر مل دے۔ پھر دوسری تھپکی دے' ہاتھوں کو جھاڑ دے اور ان کو دونوں ہاتھوں پر کہنیوں تک مسح کر دے۔ اور یا صرف ایک ہی تھپکی سے چہرے اور دونوں ہاتھوں کو مسح کر دے۔ (مطابق اختلاف فقہاء) اس سے زیادہ مزید فقہی اختلافات کے لئے یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے کہ تیمم شروع ہی لوگوں کی آسانی کے لئے ہوا ہے اور یہ آسانی پیدا کرنے کی واضح مثال ہے۔

(اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا (٤: ٤٣)) (بے شک اللہ نرمی سے کام لینے والا اور معاف کرنے والا ہے۔) اس اختتامیہ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ اپنے بندوں کے ساتھ نرمی کرنے والا ہے۔ وہ ضعیف پر رحمدلی فرماتا ہے' قصوروں کو معاف فرماتا ہے' اور کوتاہیوں کو بخش دیتا ہے۔

---ooo---

اس سے پہلے کہ ہم اس آیت پر کلام ختم کریں یہاں چند امور پر نظر دوڑانا ضروری ہے۔ آیت نہایت ہی مختصر ہے لیکن اس پر غور ضروری ہے۔ مثلاً تیمم کی حکمت پر غور ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے دین میں کس قدر نرمی فرمائی ہے۔

بعض لوگ اسلامی شریعت کی حکمت اور اسلامی عبادات کے اسرار پر جب کلام کرتے ہیں تو وہ اس قدر آگے چلے جاتے ہیں اور احکام کے علل اور حکم بیان کرتے وقت یہ تاثر دیتے ہیں کہ گویا انہوں نے شریعت کے تمام رازوں کا استقصاء کر لیا ہے اور اب ان احکام اور عبادات کے پیچھے مزید کسی حکمت کی تلاش کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآنی آیات' شرعی احکام اور اسلامی عبادات پر کلام کرنے کا یہ انداز نہایت ہی غیر صحت مندانہ ہے۔ ہاں یہ اور بات کہ کسی شرعی حکم کی

علت اور حکمت خود منصوص ہو اور اس کی صراحت خود شارع نے کر دی ہو۔ مناسب یہ ہے کہ ہم کہیں کہ یہ ہے وہ بات جسے ہم بطور حکمت حکم یا بطور علت حکم سمجھ سکے ہیں۔ ایسے مزید اسرار بھی ہو سکتے ہیں کہ ابھی تک اللہ تعالیٰ نے ہم پر ان کو منکشف نہ کیا۔ صرف اسی طرح ہم عقل انسانی کو اپنے صحیح مقام تک محدود رکھ سکتے ہیں شرعی نصوص کے حوالے سے بغیر افراط اور تفریط کے اور اپنے دائرے اور حدود کے اندر رہتے ہوئے۔

میں یہ کہوں گا کہ بعض اہل اسلام لوگوں کے سامنے آیات و احادیث پیش کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ان کی متعین حکمت بھی بیان کرتے ہیں' ان لوگوں میں بعض مخلصین بھی شامل ہیں۔ یہ حکمت انسانی علم یا دور جدید کے سائنسی اکتشافات پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ بات بذات خود کوئی بری بات نہیں ہے لیکن اس حکمت کو اپنے حدود کے اندر رہنا چاہئے۔ وہ حدود یہ ہیں جس کی طرف گزشتہ سطور میں ہم نے اشارہ کیا ہے۔

اکثر اوقات اس بات کا ذکر کیا جاتا ہے کہ نماز سے پہلے وضو اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ یہ صفائی کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ مقصد بھی پیش نظر ہو سکتا ہے لیکن یہ کہنا کہ وضو سے مقصود صرف صفائی ہی ہے اور کچھ نہیں تو یہ نہج کلام غیر صحت مندانہ ہوگا اور ویسے بھی یہ کوئی صحیح طرز استدلال نہیں ہے۔ اس لئے کہ اب ایسا وقت بھی آگیا ہے کہ بعض نام نہاد دانشور یہ کہنے لگے ہیں کہ صفائی حاصل کرنے کا یہ نہایت ہی ابتدائی تصور اور طریقہ تھا' اب اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آج کل صحت و صفائی کے دوسرے ذرائع بہت ہی عام ہیں۔ آج لوگ صفائی و صحت کو اپنے روز مرہ کے پروگرام کا حصہ بنا رہے ہیں۔ اگر وضو کا مقصد صرف حصول صفائی ہے تو اب وضو کی ضرورت کیا ہے بلکہ اب تو نماز کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

اکثر لوگ نماز کی حکمت کے سلسلے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ ورزش کی حرکات ہیں جس سے پورا جسم حرکت کرتا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ لکھا ہے کہ نماز کی وجہ سے انسان کی زندگی منظم ہو جاتی ہے اور وہ ایک منظم زندگی گزارنے کا عادی ہو جاتا ہے کیوں کہ نماز مقررہ وقت پر ادا ہوتی ہے اور اس کے اندر مقررہ انداز میں رکوع اور سجود ہوتے ہیں۔ اس میں صفیں اور امامت ہوتی ہے۔ یہ حکمت بھی ہوتی ہے کہ نماز کے ذریعے انسان خدا تک پہنچتا ہے اور اللہ کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں۔ یہ تمام حکمتیں مقصود ہو سکتی ہیں لیکن ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ان میں سے کونسی حکمت مراد ہے یا یہی حکمت مقصود ہے؟ اگر ہم کوئی بات متعین کر کے کہیں تو یہ انداز غیر صحت مندانہ ہوگا اس لئے کہ ایک ایسا وقت بھی آیا کہ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ نماز کی ورزشی حرکات کی اب کیا ضرورت ہے۔ اب تو ورزش ایک فن بن چکی ہے اور ہر شخص اس پر عمل کر سکتا ہے۔

اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اب محض زندگی کو منظم کرنے کے لئے ہمیں نماز کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ نماز سے بھی زیادہ فوجی نظام کے ذریعے زندگی کو منظم اور باقاعدہ بنایا جا سکتا ہے۔

بعض لوگ تو ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے یہ قرار دیا ہے کہ تعلق باللہ کے لئے بھی نماز کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اتصال باللہ بذریعہ تنہائی اور مراقبہ بھی ممکن ہے اور اب نماز جیسی ورزشی حرکات کی ضرورت نہیں ہے' اس لئے کہ جسمانی حرکات بعض اوقات روحانی تصور اور مراقبے کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔

ان خطوط پر اگر ہم ہر عبادت اور ہر حکم کے اسرار و رموز متعین کرتے جائیں اور ہر حکم کی علت اپنے فہم و ادراک

سے متعین کرنے لگیں یا جدید سائنسی اکتشافات کے اندر حکمتوں کی تلاش کریں اور پھر یہ اعلان کریں کہ یہی وہ حکمت ہے جو اس حکم کے اندر پنہاں ہے یا اس حکم کا یہی سبب اور علت ہے تو یقیناً ہم صحت مند لائن سے ہٹ جائیں گے اور ان لوگوں کے لئے راہ کھول دیں گے جو نام نہاد دانشور ہیں' اور پھر خود ہماری یہ قرار دادیں اور فیصلے' ضروری نہیں ہے کہ درست ہوں۔ ان میں غلطی بھی ممکن ہے خصوصاً جب ہم ان حکمتوں کو سائنسی اکتشافات سے مربوط کر دیں' اس لئے کہ سائنسی علوم و نظریات آئے دن بدلتے رہتے ہیں اور ہر وقت یہ نظریات تصحیح اور تبدیلی کے قابل ہوتے ہیں اور ان میں ترمیم و تنسیخ کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔

یہاں زیر بحث موضوع تیمم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وضو اور غسل کی حکمت صرف نظافت ہی نہیں ہے۔ اگر یہی بات ہوتی تو ان دونوں کی جگہ تیمم نہ لیتا۔ کیونکہ اس سے کوئی صفائی حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم نظافت کے علاوہ بھی وضو اور غسل کی کوئی حکمت تلاش کریں جو وضو اور غسل کی طرح تیمم میں بھی ہو۔

ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہم خود اس غلطی کا ارتکاب کریں جس کی نشاندہی ہم خود کر رہے ہیں۔ لیکن ہم یہ کہیں گے کہ ہو سکتا ہے کہ حکمت یہ ہو کہ انسان اپنے آپ کو نفسیاتی اعتبار سے نماز کے لئے تیار سمجھے۔ اور یہ تیاری کسی سگنل پر مبنی ہو اور اس سگنل کے ذریعہ انسان اپنی روز مرہ کی حرکات و سکنات کو ترک کر کے اللہ کے دربار میں **حاضری اور ملاقات** کی فضا میں داخل ہو جائے اور وضو' غسل اور تیمم اس داخلہ کے لئے سگنل ہوں اور اگر وضو اور غسل نہ ہو تو تیمم ہی سگنل ہو جائے۔

اصل حقیقت تو اللہ تعالیٰ کے کامل اور ہر چیز پر حاوی علم ہی میں ہے' جو انسان کی اندرونی پوشیدہ باتوں پر بھی محیط ہے۔ انسان کے طور طریقوں اور خفیہ راہوں سے وہی باخبر ہے' جو لطیف و خبیر ہے۔ ہمارا فرض تو یہ ہے کہ ہم اللہ کے احکام کی اطاعت نہایت ہی ادب و احترام سے کریں جو نہایت ہی برتر اور بالا ہے اور عظیم اور بزرگ ہے۔

یہاں ہمارے لئے دوسرا لمحہ فکریہ یہ ہے کہ اسلامی نظام میں نماز کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اسلام ہر قسم کے عذر اور رکاوٹ کو دور کرنے کی سعی کرتا ہے۔ تیمم اس سلسلے کی ایک واضح مثال ہے کہ وضو اور غسل کی جگہ اس کی اجازت دی گئی جبکہ مشکلات ہوں۔ یہ ایک واضح مثال ہے جس سے معلوم ہوتا کہ اسلام ہر معاملے میں آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ مثلاً اگر پانی نہ ہو یا بیماری ہو یا پانی کم ہو اور پینے کی ضروریات سے زیادہ نہ ہو۔ سفر میں بعض اقوال کے مطابق پانی موجود ہونے کے باوجود تیمم جائز ہے۔

یہ باتیں ذہن میں رکھتے ہوئے اور اسی سورت میں صلوۃ الخوف کی کیفیات کا مطالعہ کرتے ہوئے' خصوصاً میدان جنگ میں' یہ بات بڑی سہولت سے معلوم ہو جاتی ہے کہ اسلامی نظام حیات نماز کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ مسلمان نماز سے کسی صورت میں بھی اور کسی وجہ سے بھی جدا نہیں ہو سکتا۔ مرض میں بھی نماز کی ادائیگی کے لئے یہ سہولت پیدا کی گئی ہے کہ بیٹھ کر پڑھا جائے۔ بصورت معذوری ایک پہلو پر لیٹ کر بھی پڑھی جا سکتی ہے اور اگر حرکت ممکن ہی نہ ہو تو آنکھوں کے اشارے سے بھی نماز ادا ہو سکتی ہے۔

یہ خدا اور بندے کے درمیان ایک رابطہ ہے۔ ایک ایسا رابطہ کہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتے کہ کسی طرح بھی ایک مومن کا خدا کے ساتھ یہ رابطہ ٹوٹ جائے اس لئے کہ اللہ کو معلوم ہے کہ خود بندے کو اس رابطے کی ضرورت ہے۔ اللہ تو

دونوں جہانوں سے مستغنی ہے۔ لوگوں کی نماز و عبادت سے اس کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ فائدہ اگر ہے تو بندے کا ہے کہ وہ نماز سے سلجھ جاتا ہے۔ یہ بھی بندوں کا فائدہ ہے کہ وہ اللہ سے رابطہ قائم کر لیں اور اپنی مشکلات میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کریں۔ ان کو دلی خوشی نصیب ہو' ان کے جسم اور شخصیت میں نورانیت پیدا ہو' ان کو یہ شعور اور احساس ہو کہ وہ اللہ کی حفاظت میں ہیں' اس کے قریب ہیں' اس کی نگہبانی میں ہیں اور وہ ایسی راہ پر ہیں جو ان کی فطرت کے عین مطابق ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی فطرت کا سب سے زیادہ علم ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہ بھی علم ہے کہ ان کے لئے اور ان کی فطرت کے لئے کیا کیا مفید ہے اور کیا کیا غیر مفید ہے؟ اس لئے کہ وہ خالق اور صانع ہے اور اپنی مصنوعات اور مخلوقات سے وہ اور لوگوں کے مقابلے میں زیادہ خبردار ہے۔ وہ نہایت ہی باریک بین اور بصیر ہے۔

اس آیت کی بعض دیگر تعبیرات میں بھی ہمارے لئے ایک سبق ہے۔ اگرچہ یہ نہایت ہی مختصر آیت ہے لیکن اس میں بہترین انداز تعبیر کے ساتھ معانی کا سیل رواں نظر آتا ہے۔ قضائے حاجت کے عمل کے لئے (اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ (٤: ٤٣)) (تم میں سے کوئی نشیبی جگہ سے آیا ہو) کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ نہ کہا کہ تم نے یہ فعل کیا ہو' صرف یہ کہا کہ تم نشیبی جگہ سے واپس آئے ہو۔ اشارہ و کنایہ اس طرف ہے کہ تم قضائے حاجت سے آئے ہو۔ اس میں بھی مخاطبوں سے نہیں کہا کہ تم آئے ہو بلکہ تم میں سے کوئی شخص آیا ہو (اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ (٤: ٤٣)) کہا ہے۔ یہ نہیں کہا (جِئْتُمْ مِنَ الْغَآئِطِ) قرآن کے الفاظ زیادہ ادیبانہ اور مہذبانہ ہیں اور ان میں کنایہ لطیف ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو اپنے درمیان اسی طرح کی سلجھی ہوئی گفتگو کرنا چاہئے۔

مرد اور عورت کے باہم تعلقات کے بارے میں کس قدر مہذب انداز گفتگو ہے۔ (اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (٤: ٤٣)) (یا تم نے بیویوں کے ساتھ لمس کیا ہو) تعلق زن و شو کی تعبیر چھونے کے لفظ سے زیادہ نرم' زیادہ پرکیف اور مہذبانہ محسوس ہوتی ہے۔ ملامست تو کبھی اصل فعل کے لئے مقدمہ یا آغاز ہے یا فعل ہی کو ملامست کہا جاتا ہے۔ بہرحال یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تعلیم تہذیب ہے کہ ایسے معاملات کے اندر یہ انداز گفتگو ہونا چاہئے' جبکہ ننگی زبان استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

پھر مٹی کے ساتھ صفت پاک (صَعِيْدًا طَيِّبًا) کا اضافہ کیا گیا۔ اشارہ یہ ہے کہ پاک چیز طیب ہوتی ہے اور ناپاک چیز خبیث ہوتی ہے۔ یہ نہایت ہی باریک اشاریت ہے اور لطیف مفہوم ہے جو ذہن کے اندر بہت جلد داخل ہو جاتا ہے۔ پاک ہے وہ ذات جو نفس انسانی کی خالق ہے اور ان کے بارے میں سب سے زیادہ جاننے والی ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۳۴ ایک نظر میں

اس سبق کے ساتھ ہی اس معرکہ آرائی کا آغاز ہو جاتا ہے ' جو قرآن کریم نے جماعت مسلمہ اور اس جاہلیت کے درمیان برپا کرا دی تھی جو مدینہ کے گرد و نواح میں پھیلی ہوئی تھی ۔ خصوصا مدینہ کے یہودی قبائل اور امت مسلمہ کے درمیان ۔ یہ وہی معرکہ ہے جسے اس سے پہلے سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران میں تفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں ' وہی میدان کارزار یہاں بھی ہے اور یہ وہی دشمن کیمپ ہیں ' جن کے بارے میں آغاز سورہ بقرہ ' سورہ آل عمران کے مقدمے اور اس سورہ کے مقدمے میں بھی ہم بیان کر آئے ہیں ۔

اس سبق سے اب اہل ایمان اور ان کے خارجی دشمنوں میں معرکہ آرائی شروع ہوتی ہے ۔ یہ دشمن مدینہ کی اسلامی ریاست اور اسلامی جماعت کے ارد گرد پھیلے ہوئے تھے لیکن خارجی معرکے کا آغاز ان معنوں میں نہیں ہے کہ پہلے جو مضامین گزر گئے ان کا ان دشمنوں کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا بلکہ اس سے قبل جو اجتماعی ' اقتصادی ' خاندانی اور اخلاقی کارروائیاں کی گئیں اور جدید اسلامی معاشرے کے جو خدوخال متعین کئے گئے تھے اور اس کے لئے جو خطوط کھینچے گئے تھے یہ سب امور تحریک اسلامی کے خارجی دشمنوں اور مخالف کیمپوں سے لاتعلق نہ تھے ۔ یہ کیمپ مدینہ کے ارد گرد اور جزیرۃ العرب میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے تھے ۔ یہ تمام اقدامات ان کیمپوں کے ساتھ بھرپور اور فیصلہ کن معرکے کے لئے بطور اخلاقی تیاری کے کئے گئے تھے اور اس کے لئے تمہید تھے ۔ اس سورہ کے اندر ذکر شدہ تنظیمی امور دراصل جدید اسلامی خطوط پر اس جدید معاشرے کی تعمیر کے لئے تھے تاکہ وہ ان کیمپوں کے ساتھ اچھی طرح مقابلہ اور معرکہ آرائی کر سکے ۔

سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کے مطالعے کے دوران ہم نے بتایا تھا کہ ان سورتوں میں اسلامی معاشرے کو داخلی طور پر مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی گئی تھی ۔ خصوصا اسلام کے نظریاتی تصورات کا بیان ' اسلام کے اخلاقی نقطہ نظر کی وضاحت ' اسلامی نظام قانون اور اسلامی معاشرے کا عام طرز عمل اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی جماعت کو دشمنوں کے بارے میں علمی اور تاریخی مواد سے مسلح کرنا وغیرہ وغیرہ ۔ یہ بھی بتایا گیا کہ وہ سچائی کے مقابلے میں کیا کیا ہتھیار لے کر آتے ہیں ۔ وہ کیا کیا مکاریاں کرتے رہے ہیں اور یہ کہ جماعت مسلمہ کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ ان دشمنوں کے مقابلے میں نہایت ہی اطمینان قلب ' نہایت ہی ہشیاری اور نہایت ہی پختہ عزم اور نہایت ہی بصیرت و عزیمت کے ساتھ میدان میں آئے ۔ وہ اس مقابلے کی نوعیت سے بھی باخبر ہو اور جن لوگوں کے ساتھ اس کا واسطہ ہے ان سے بھی باخبر ہو ۔ یہی مضامین اس سورہ میں بھی بیان ہوئے ہیں ۔

دشمنوں کے ان تمام کیمپوں میں گھری ہوئی تحریک اسلامی ' قرآن کریم کے زیر کمان ان کے ساتھ ہمہ جہت معرکہ آرائی میں مشغول تھی ۔ یہ معرکہ آرائی انسان کے ضمیر اور شعور میں بھی برپا تھی ' جہاں یہ تحریک ایک جدید عقیدے اور

اپنے رب کی ایک جدید معرفت اور پہچان پیدا کر رہی تھی اور انسانی فطرت کو جاہلیت کے افکار غلط کی گرد و غبار کے نیچے سے نکال رہی تھی۔ نفس انسانی اور شعور انسانی سے جاہلی خدوخال مٹا کر ان کی جگہ اسلام کے روشن اور خوبصورت خدوخال اجاگر کر رہی تھی۔ اس کے بعد پھر داخلی اور خارجی معرکے ان مخالف کیمپوں کے ساتھ برپا تھے' یہودی کیمپ' منافقین کے کیمپ اور پورے جزیرۃ العرب کے مشرکین کے کیمپ۔ داخلی تطہیر افکار کے بعد تحریک اسلامی ان کیمپوں کے ساتھ پنجہ آزمائی کے لئے اچھی طرح تیار تھی' بلکہ یہ ان پر فوقیت حاصل کر چکی تھی' کیونکہ داخلی طور پر اس نے جدید اسلامی کیمپ کو اخلاقی' نظریاتی' اجتماعی اور تنظیمی اعتبار سے نہایت ہی پختہ اور متین کر دیا تھا۔

اسلامی معاشرے کو مدینہ میں قائم اپنے اردگرد جاہلی معاشروں پر' جن میں مدینہ کا یہودی معاشرہ بھی شامل تھا' روحانی' اخلاقی' اجتماعی اور تنظیمی برتری حاصل تھی جو قرآنی اور ربانی تربیت کے نتیجے میں حاصل ہوئی تھی۔ یہ برتری اسلامی معاشرے کو عسکری' مادی اور اقتصادی اعتبار سے ان جاہلی معاشروں کے برتری حاصل کرنے سے قبل حاصل ہو گئی تھی۔

تحریک اسلامی مخالف کیمپوں پر عسکری اور مادی و اقتصادی ترقی کبھی بھی حاصل نہ کر سکتی تھی کیونکہ مخالف اسلام کیمپ ہمیشہ تعداد عساکر' مقدار اسلحہ اور مالی وسائل کے اعتبار سے اسلامی محاذ سے اکثر و بیشتر برتر رہا۔ جزیرۃ العرب کے اندر بھی یہی صورت حال رہی اور جزیرۃ العرب کے باہر کی عظیم فتوحات کے اندر بھی یہی کیفیت رہی۔ اسلامی کیمپ کو اگر برتری حاصل تھی تو وہ فقط روحانی' اخلاقی اور اجتماعی نظم و نسق کے اعتبار سے تھی۔ یہی بہتری اس کی سیاسی فتح کا سبب تھی اور یہ برتری تحریک اسلامی کو ربانی نظام تربیت کی وجہ سے حاصل ہوئی جو قرآن کی زیر نگرانی تھا۔

اس روحانی' اخلاقی اور اجتماعی برتری ہی کے نتیجے میں پھر سیاسی قیادت کی برتری تھی جس کی وجہ سے اسلام نے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی جاہلیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ پہلے اسلام نے جزیرۃ العرب سے جاہلیت کا استیصال کیا۔ اس کے بعد وقت کی دو عظیم سلطنتوں قیصر اور کسریٰ کو نیست و نابود کیا اور پھر پورے کرۂ ارض کے اطراف و جوانب میں گھوڑے دوڑائے۔ یہ تاخت و تاراج کبھی تو تلوار و سنان سے تھی اور کبھی اذان اور قرآن سے تھی۔

اگر یہ صریح برتری' تحریک اسلامی کو حاصل نہ ہوتی تو یہ معجزہ ہرگز برپا نہ ہوتا جس کی انسانی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ تاریخ کی مشہور فتوحات بھی اس کی نظیر نہیں ہیں۔ مثلاً تاتاریوں کی تاخت و تاراج اور جدید تاریخ میں ہٹلر کی فتوحات' اس لئے کہ اسلامی فتوحات محض فوجی فتوحات ہی نہ تھیں۔ اسلام نے نظریاتی اور ثقافتی فتح بھی حاصل کی اور لوگوں کی زبان اور تہذیب و تمدن کو بھی بدل ڈالا۔ اس اعتبار سے اسلامی فتوحات کو واضح برتری حاصل ہے۔ بغیر اس کے کہ کسی قوم پر کوئی جبر کیا گیا ہو' لوگوں کی زبانیں اور ان کے رسم و رواج بدل گئے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی کوئی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی' نہ قدیم میں اور نہ ہی جدید میں۔

اسلامی فتوحات دراصل ہمہ گیر انسانی برتری تھی' کیونکہ اس میں مکمل انسانی خصوصیات اور انسانی عناصر موجود تھے۔ اس کی وجہ سے گویا انسان کو دوسرا جنم ملا تھا۔ یہ ایک ایسا انسان تھا' جس سے یہ کرۂ ارض یقینی طور پر ناآشنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاں تک رسائی حاصل کی اس نے لوگوں کو اپنے رنگ میں رنگ دیا اور ان معاشروں پر اپنی پختہ چھاپ لگا دی۔ اسلامی نظریاتی اور سماجی تحریک نے ان سماجوں کو بھی بالکل نابود کر دیا جو صدیوں سے قائم تھے۔ مثلاً مصر میں

فرعونی تہذیب' بابل اور اشوریا کے قدیم معاشرے جو عراق میں قائم تھے' شام میں فنیقی اور سریانی سماج جو صدیوں سے قائم تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلام کے سماجی تصورات انسانی فطرت میں نہایت ہی گہرائی تک پیوستہ تھے اور نفس انسانی کے اندر وہ دور تک رچے بسے تھے۔ اس کے اصول عظیم اور اس کے رجحانات نہایت ہی وسیع تھے اور انسان کی زندگی کے لئے اسلامی نظام تمام نظریات اور تہذیبوں سے زیادہ اصولی تھا۔

اسلام جہاں گیا' لوگوں کی زبان تک بدل گئی اور پھر عربی ان علاقوں کی مادری زبان بن گئی۔ یہ ایک عجیب اور بے مثال انقلاب تھا۔ اس سلسلے میں جس قدر علمی تحقیقات کی ضرورت تھی اور جس قدر غور و فکر کی ضرورت تھی' مسلمانوں نے یہ ابھی تک نہیں کیا ہے۔ میرے خیال میں عقائد و نظریات کی وسعت اور پھیلاؤ کے مقابلے میں یہ امر نہایت ہی حیرت انگیز ہے۔ اس لئے کہ زبان انسان کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے۔ انسان کے اجتماعی سماجی تعلقات زبان کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں اور زبان کا ایسا تغیر ہمیشہ ایک معجزہ تصور ہوتا ہے۔ یہ معجزہ صرف عربی زبان کا معجزہ نہیں ہے۔ عربی زبان پہلے سے جزیرۃ العرب میں قائم تھی لیکن اسلام سے پہلے یہ زبان اس کرۂ ارض کے کسی خطے میں یہ معجزہ نہ دکھا سکی۔ یہی وجہ ہے کہ میں عربی کو اسلامی زبان کہتا ہوں اس لئے کہ عربی زبان میں قرآن کریم کے بعد جو قوت پیدا ہوئی اور جو اسلام کے ہاتھوں اس کرۂ ارض پر پھیل گئی تو یہ معجزہ عربی زبان کا نہ تھا بلکہ اسلامی نظام کا معجزہ تھا۔

ایک دوسرا معجزہ جو اسلامی فتوحات نے دکھایا وہ یہ تھا کہ ممالک مفتوحہ کے اندر خفتہ صلاحیتوں کو جگایا' ان صلاحیتوں کا اظہار اس جدید زبان میں ہونے لگا۔ ان مفکرین نے اپنی اصلی زبانوں کو استعمال نہ کیا۔ انہوں نے دین اسلام کی زبان کو یعنی عربی زبان کو استعمال کیا' اور ان مفکرین نے زندگی کے ہر شعبے میں وہ علمی اور ثقافتی ذخیرہ پیدا کیا جس کے اندر پوری اصلیت (Orignality) پائی جاتی ہے۔ حالانکہ ان مفکرین نے اپنی اصلی زبان کو چھوڑ کر جدید عربی زبان کو استعمال کیا' ان لوگوں کی زبان میں عربی زبان کی مشکلات کے باوجود کوئی تعقید نہیں ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ ان مفتوحہ علاقوں کے مفکرین اور ذہین لوگوں کی اصلی مادری زبان ہی عربی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی فتوحات کا مقصد حریت' آزادی اور نئی روشنی کو پھیلانا تھا' دوسرے عربی زبان کے اندر جو سرمایہ تھا وہ عظیم تھا' وہ انسانی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ فکری سرمایہ تھا' وہ لوگوں کے قلب اور ذہن کے بالکل قریب تھا۔ اس کے مقابلے میں قدیم ثقافتوں اور سماجوں کے اندر کچھ نہ تھا اور قدیم زبانیں تہی دامن تھیں۔

یہ سرمایہ بھی کیا تھا' جو زبان عرب کو ملا؟ یہ روحانی' عقلی' اخلاقی اور اجتماعی تعمیر و تربیت کا سرمایہ تھا جو اسلامی نظام حیات نے اس زبان کو عطا کیا تھا اور نہایت ہی مختصر عرصے میں۔ یہ سرمایہ اس قدر عظیم تھا' اس قدر گہرا تھا' فطرت انسانی کے ساتھ اس قدر پیوست تھا کہ اس نے اسلامی عساکر کی تاخت و تاراج کے ساتھ اسلامی زبان کو بھی فتوحات بخشیں اور اس زبان کے مقابلے میں کوئی زبان ٹھہر نہ سکی۔ یہ ہے وہ حقیقی وجہ اور اس کے بغیر ہم اس تاریخی معجزے کی تشریح نہیں کر سکتے۔ بہرحال یہ ایک طویل اور وسیع موضوع ہے۔ اور ظلال القرآن کے اس مقام پر ہمارے لئے بس اسی قدر کہنا کافی ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۳۴ تشریح آیات

# ۴۴ -- تا -- ۵۷

مدینہ کی نوخیز تحریک اسلامی کا جو گھیراؤ مخالف اسلام کیمپوں نے کر رکھا تھا' اس سبق کے ساتھ ان کیمپوں کے خلاف یہاں معرکہ آرائی شروع ہو رہی ہے ۔ اس سبق کے اندر اس بات پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے کہ مدینہ کے یہودی اس دین جدید اور جماعت مسلمہ کے خلاف کیا کیا اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں ۔ اس سے اگلے سبق میں بتایا گیا ہے کہ جماعت مسلمہ کے فرائض کیا ہیں اور یہ کہ اسلامی نظام کا مزاج کیا ہے' اسلام کی تعریف کیا ہے اور ایمان کی شرائط کیا ہیں جس کی وجہ سے اسلامی زندگی اور اسلامی نظام حیات دوسرے لوگوں کی زندگی اور نظام سے ممتیز ہوتا ہے ۔ اس سے پھر اگلے سبق میں جماعت مسلمہ کو خبردار کیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ وہ اسلامی نظام کے نفاذ' اپنی صورت حالات کی درستی اور اپنے وجود کو بچانے کے اقدامات کرے ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اس کے منافق دشمن اس کے خلاف خفیہ سازشوں میں مصروف ہیں ۔ جماعت مسلمہ کو بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے اندرونی اختلافات کی طرف بھی متوجہ ہو اور ان دفاعی اقدامات پر بھی غور کرے جو اسے اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے دشمن کیمپوں کے مقابلے میں کرنے ہیں ۔ اس میں قانون بین الاقوام کے سلسلے میں بعض ہدایات بھی ہیں ۔ اس کے اگلے سبق میں ایک یہودی کا معاملہ آتا ہے جس کے ساتھ اسلامی معاشرے میں' تمام دشمنیوں سے بلند ہو کر معاملہ کیا گیا ۔ اس سے اگلے سبق میں شرک اور مشرکین کے ساتھ دو دو ہاتھ کئے گئے ہیں اور ان بنیادوں کو حقارت آمیز انداز میں بیان کیا گیا ہے جن کے اوپر مشرک معاشرہ قائم تھا ۔ اس معرکے کے درمیاں بعض ہدایات داخلی تنظیم کے بارے میں بھی دی گئی ہیں جن کا تعلق' ابتدائے سورہ کے مضامین بابت خاندانی نظام کے ساتھ ہے ۔ اب اس پارے کا آخری سبق آتا ہے جو نفاق اور منافقین کے ساتھ خاص ہے ۔ یہ سبق فیصلہ کرتا ہے کہ منافقین آگ میں سب سے نیچے درجے میں ہوں گے ۔

ان سرسری اشارات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت تحریک اسلامی کو داخلی اور خارجی محاذوں پر کس قدر ہمہ جہت لڑائی کا سامنا تھا ۔ اور پہلی تحریک اسلامی کو کس طرح بیک وقت داخلی اور خارجی محاذوں پر کام کرنا پڑ رہا تھا ۔ اس لئے کہ داخلی محاذ اور خارجی محاذ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک اور پیوستہ تھے ۔ اور یہی معرکہ آج بھی عالمی تحریک اسلامی کو درپیش ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا ۔ اس لئے کہ اسلامی تحریک کی اساس اور حقیقت ایک ہے ۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يَشۡتَرُوۡنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَضِلُّوا السَّبِيۡلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاَعۡدَآئِكُمۡ‌ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيۡرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا يُحَرِّفُوۡنَ الۡـكَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوۡلُوۡنَ سَمِعۡنَا وَعَصَيۡنَا وَاسۡمَعۡ غَيۡرَ مُسۡمَعٍ وَّرَاعِنَا لَـيًّۢا بِاَ لۡسِنَتِهِمۡ وَطَعۡنًا فِى الدِّيۡنِ‌ؕ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا وَاسۡمَعۡ وَانۡظُرۡنَا لَـكَانَ خَيۡرًا لَّهُمۡ وَاَقۡوَمَ ۙ وَ لٰـكِنۡ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفۡرِهِمۡ فَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۴۶﴾

”تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جنہیں کتاب کے علم کا کچھ حصہ دیا گیا ہے؟ وہ خود ضلالت کے خریدار بنے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ گم کر دو۔ اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور تمہاری حمایت و مددگاری کے لئے اللہ ہی کافی ہے جن لوگوں نے یہودیت کا طریقہ اختیار کیا ہے ان میں کچھ لوگ ہیں جو الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دیتے ہیں اور دین حق کے خلاف نیش زنی کر کے اپنی زبانوں کو توڑ موڑ کر کہتے ہیں۔

(سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا) اور (وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ) اور (رَاعِنَا) حالانکہ اگر وہ کہتے۔ (سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا) اور (وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا) تو یہ انہی کے لئے بہتر تھا اور زیادہ راست بازی کا طریقہ تھا۔ مگر ان پر تو ان کی باطل پرستی کی بدولت اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں“

اس سورہ میں جن متعدد جگہ تعجب کا اظہار کیا گیا ان میں سے پہلی جائے تعجب تو یہ ہے کہ اس کا خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے اور اہل کتاب سے مراد یہودی ہیں جبکہ مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو ایسا موقف اختیار کرتے ہیں جو انوکھا اور تعجب خیز ہو۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ (۴۴) ”تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جنہیں کتاب کے علم کا کچھ حصہ دیا گیا ہے؟ وہ خود ضلالت کے

خریدار بنے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ گم کر دو۔"

چونکہ ان کو کتاب دی گئی تھی اس لئے ان کے شایان شان تو یہ تھا کہ وہ فوراً ہدایت قبول کرتے ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے بڑے پیغمبر تھے اللہ نے انہیں تورات دی تھی ۔ تاکہ انہیں وہ ان کی ضلالت سے نکالے اور ان کے لئے نور اور ہدایت ہو ۔ لیکن وہ اپنی اس قسمت سے انکاری ہیں اور ہدایت چھوڑ کر ضلالت کے خریدار بن گئے ہیں ۔ خریداری سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے ضلالت لینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے ' ان کی نیت ہی یہ ہے اسی لئے انہوں نے ہدایت کو ترک کر کے گمراہی کو پسند کیا ہے ۔ ہدایت ان کے ہاتھوں میں ہے لیکن وہ اسے چھوڑ کر گمراہی اخذ کر رہے ہیں ۔ گویا وہ قصد و ارادہ سے یہ سودا کر رہے ہیں ' جہل اور خطا سے ایسا نہیں کر رہے ۔ اس لئے ایک عقلمند آدمی سے ایسی حرکت تعجب خیز اور بالکل انوکھی ہے اور قابل استکراہ ہے ۔

لیکن اس قابل تعجب صورت حال میں ہوتے ہوئے بھی وہ سمجھتے ہیں کہ وہ نگران بنے ہوئے ہیں ' حالانکہ الٹا وہ اس سعی میں لگے ہوئے ہیں کہ ہدایت یافتہ لوگ گمراہ ہو جائیں ' اہل اسلام جو صحیح راہ پر ہیں ان کو وہ گمراہ کر دیں ۔ وہ اسی مقصد کے لئے متعدد ذرائع اور وسائل اختیار کر رہے ہیں ' جن کی تفصیلات سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران میں گزر چکی ہیں ۔ اور ان کے کچھ نمونے اس سورہ میں بھی آگے آ رہے ہیں ۔ انہوں نے خود جو گمراہی خریدی ہوئی ہے وہ اس پر اکتفا نہیں کر رہے بلکہ ان کے ارد گرد جو شمع ہدایت روشن ہو چکی ہے وہ اسے بھی بجھانا چاہتے ہیں اور اس کے آثار تک مٹانے کے درپے ہیں کہ نہ ہدایت رہے اور نہ ہدایت پانے والے ۔

اس پہلی اور دوسری جھلکی میں اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کو متنبہ کیا ہے کہ یہودی تمہارے خلاف کیا کھیل کھیلنا چاہتے ہیں اور یہ کہ اسلام کے خلاف وہ کیا کیا تدابیر اختیار کرنا چاہتے ہیں ۔ کیا ہی اچھی تدبیر ہے یہ کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے خلاف اہل ایمان کے دلوں میں نفرت بٹھانا چاہتے ہیں ' جو مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے تھے ۔ اس وقت مسلمان اس ہدایت پر فخر کرتے تھے اور وہ ان لوگوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے جو ان کو اس قابل فخر و عزت پوزیشن سے لوٹا کر پھر جاہلیت کی طرف لے جانا چاہتے تھے ' جس کو وہ خوب جانتے تھے اور اسلام بھی اس جاہلیت سے اچھی طرح واقف تھا اور جو شخص بھی انہیں جاہلیت کی طرف لوٹا رہا تھا ' وہ اسے بہت ہی برا سمجھتے تھے ۔ اس دور میں قرآن ان لوگوں سے مخاطب تھا ' اللہ کے علم کے مطابق نازل ہو رہا تھا ۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں اس کی وقعت اور اہمیت تھی ۔

اس لئے اس کے بعد قرآن صراحتاً " بتاتا ہے کہ یہودیوں کی یہ سازش ہے اور تصریح کر دی جاتی ہے کہ یہ یہودی مسلمانوں کے دشمن ہیں ۔ اہل ایمان کو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ان کی اس مذموم کوشش کے مقابلے میں اللہ کی ہدایت اور نصرت پر ہی بھروسہ کریں ۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآءِكُمْ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا (۴۵) "اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور تمہاری حمایت و مددگاری کے لئے اللہ ہی کافی ہے ...." یوں صراحت کے ساتھ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ مدینہ میں جماعت مسلمہ اور یہودیوں کے درمیان دشمنی ہے ۔ اور ان کے درمیان متوازی خطوط متعین ہو جاتے ہیں .... اگرچہ تعجب کا اظہار تمام اہل کتاب کے بارے میں ہے لیکن اس آیت میں مدینہ کے یہودی ہی مراد ہیں ۔

کلام الہٰی نے فقط اشارے پر اکتفا نہ کیا بلکہ یہودیوں کا ذکر صراحت کے ساتھ کیا اور اس کے بعد ان کی سرگرمیوں اور سازشوں اور رسول اللہ ؐ کے بارے میں ان کی گستاخیوں کا تفصیلاً ذکر کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات ہجرت کے ابتدائی دور کے تھے اور ابھی تک مدینہ طیبہ میں اسلام کو اس قدر شوکت اور غلبہ نصیب نہ ہوا تھا۔

(مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا وَ اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ (٤ : ٤٦))

"جن لوگوں نے یہودیت کا طریقہ اختیار کیا ہے ان میں کچھ لوگ ہیں جو الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دیتے ہیں اور دین حق کے خلاف نیش زنی کر کے اپنی زبانوں کو توڑ موڑ کر کہتے ہیں۔ (سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا) اور (وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ) اور (رَاعِنَا) کلام الہٰی کے اندر توڑ پھوڑ کرتے ہوئے وہ حد سے گزر گئے تھے۔ وہ اللہ کی شان میں بھی گستاخی کرتے تھے اور اس طرح وہ کلام الہٰی کا سیدھا مفہوم کچھ سے کچھ بنا دیتے تھے۔ اس آیت کے مفہوم میں راجح بات یہ ہے کہ وہ تورات کی عبارتوں کو اس طرح بدلتے تھے کہ اس کے الفاظ کا مفہوم بدل جاتا۔ اور اس تحریف کا بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ حضور اکرم ؐ کی رسالت کے بارے میں تورات میں جو دلائل تھے' ان کو تبدیل کر دیں اور ان احکام اور قوانین کو بدل دیں جن کو اسلامی شریعت نے بحال رکھا اور جن سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جس منبع سے تورات نازل ہوئی ہے' اسی سے قرآن کریم نازل ہو رہا ہے۔ اور نتیجتاً یہ بات ثابت ہو رہی تھی کہ نبی اکرم ؐ کی رسالت برحق ہے۔ اور وہ ان باتوں کو اپنے مدلول سے اس طرح بدل دیتے کہ ان کی خواہشات کے مطابق مفہوم بن جاتا اور یہ صفت ان تمام لوگوں میں پائی جاتی ہے جو اپنے دین سے منحرف ہو جاتے ہیں اور ایسی تحریفات کرتے ہیں کہ جس سے اقتدار پر قابض لوگوں کو خوش کریں' یا ان عوام الناس کو خوش کریں جو دین سے اپنے آپ کو چھڑانا چاہتے ہیں۔ یہودی ہمیشہ اس کام میں ماہر رہے ہیں اگرچہ ہمارے دور میں مسلمانوں کے اندر بھی بعض لوگوں نے یہ کام شروع کر دیا ہے اور یہ لوگ اس خصلت میں یہودیوں سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔

پھر یہ لوگ رسول خدا ؐ کی خدمت میں گستاخی کرتے ہوئے اس قدر آگے بڑھ گئے تھے کہ وہ کہتے "ہم نے سنا اور نافرمانی کی" اس لئے ہم نہ ایمان لاتے ہیں اور نہ اتباع کرتے ہیں اور نہ اطاعت کرتے ہیں۔ اس سے بھی اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ آیات مدینہ کے ابتدائی ایام میں نازل ہوئیں جہاں یہودیوں کو حضور ؐ کے مقابلے میں اس قدر بے باکانہ جرات ہو سکتی تھی۔ اس ظاہری انکار کے بعد وہ نہایت ہی بے ادبی' نہایت ہی بداخلاقی پر اتر آئے اور حضور اکرم ؐ کی شان میں گستاخی کرنے لگے۔

بظاہر کہتے۔ (اِسْمَعْ) (سنئے) (غَيْرَ مُسْمَعٍ) آپ کو کوئی یہ حکم نہیں دے سکتا کہ آپ (سنئے)۔ بظاہر تو یہ کلمہ تادیب تھا اور (رَاعِنَا) کا مفہوم یہ تھا کہ آپ ہماری رعایت کریں' ہمارے حال کو مدنظر رکھیں۔ یعنی یہ کہ وہ اہل کتاب ہیں اور ان کو اسلام کی طرف اس طرح دعوت نہیں دی جانی چاہئے جس طرح عام مشرکین کو دی جاتی ہے۔ ان

اصل معنوں کو وہ زبان کے ہیر پھیر سے اس طرح بگاڑتے کہ (غَيْرَ مُسْمَعٍ) کا معنی یوں بن جاتا کہ آپ کی بات کوئی نہ سنے اور نہ آپ سن سکیں ۔ (اللہ ان کو ذلیل کرے) اور (رَاعِنَا) کے لفظ کا اشتقاق وہ رعونت سے کرتے ۔ یہ تھی ان کی بے شرمی اور بے حیائی اور بے ادبی اور ہیر پھیر اور مداہنت اور بات کا مفہوم بدلنا اور لفظ کا محل بدلنا وغیرہ ۔

قرآن کریم یہودیوں کی ان کمزوریوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ بتاتا ہے کہ یہودی چونکہ اہل کتاب اور اہل ثقافت ہیں اور ان کا فرض یہ تھا کہ ان کا رویہ شریفانہ ہوتا اور تہذیب کے دائرے کے اندر وہ بات کرتے اس لئے کہ جن لوگوں کو کتاب کا حصہ ملا ہے' ان کو غیر اہل کتاب کے مقابلے میں نہایت ہی سلجھا ہوا ہونا چاہئے ۔ یہ کہنے کے بعد ان کو یہ امید دلائی جاتی ہے کہ وہ ہدایت پاکر اچھی جزاء' اللہ کی جانب سے بھلائی اور فضل و کرم کے مستحق ہوں گے بشرطیکہ وہ سیدھے رستے پر آجائیں ۔ لیکن ان کا مزاج ہی ایسا نہیں رہا ہے اور ان پر اللہ کی لعنت ہوگئی ہے اور ان کی حالت یہ ہے ۔

(وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (٤ : ٤٦))

"حالانکہ اگر وہ کہتے ۔ (سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا) اور (وَاسْمَعْ) اور (وَانْظُرْنَا) تو یہ انہی کے لئے بہتر تھا اور زیادہ راست بازی کا طریقہ تھا ۔ مگر ان پر تو ان کی باطل پرستی کی بدولت اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں ۔"

لیکن وہ سچائی کے مقابلے میں صاف اور قطعی بات نہیں کرتے اور اگر وہ صفائی کے ساتھ اس سچائی کو قبول کرتے اور صاف صاف بات کرتے اور کہتے "ہم نے سنا اور اطاعت کی" یا کہتے "سنئے اور ذرا ہمارا انتظار کیجئے" تو ان کے لئے یہ بہتر ہوتا اور ان کے مزاج اور ان کی نفسیات اور حالات کے زیادہ مطابق ہوتا ۔ لیکن وہ اپنے کفر کی وجہ سے ہدایت سے دور بھاگتے ہیں' کم لوگ ان میں سے ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں ۔

اللہ کی بات بہت ہی سچی ہے ۔ اسلامی نظام حیات کو یہودیوں میں سے بہت ہی کم لوگوں نے قبول کیا اور اسلام کی طویل تاریخ اس پر گواہ ہے اور یہ قلیل تعداد بھی وہ تھی جس کی قسمت میں اللہ نے یہ بھلائی لکھ دی تھی' اور یہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ راہ ہدایت پالیں ۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے سچائی تک پہنچنے کے لئے جدوجہد کی ۔ انہوں نے ہدایت پانے کے لئے سعی کی ۔ رہا یہودی فرقہ تو وہ چودہ سو سال سے اسلام کے خلاف بر سر جنگ ہے ۔ جب سے مدینہ میں' ان کے پڑوس میں اسلام نازل ہوا ہے' اس وقت سے لے کر آج تک' اسلام کے خلاف ان کی سازشیں غیر منقطع ہیں اور اسلام کے ساتھ انہیں جو بغض ہے وہ آج تک ختم نہیں ہوا ۔ ہاں اس کی شکل' اس کا رنگ اور اس کا فنی انداز بدلتا رہا ہے ۔ اور آج تک اسلام کے خلاف جو سازشیں بھی کی گئیں' جس میں صلیبی جنگیں اور جدید استعماریت بھی شامل ہے' اس کے پیچھے یہودیوں ہی کا ہاتھ رہا ہے' اور یہ سازشیں مختلف شکلوں میں رہی ہیں ۔ اگر براہ راست نہیں تو اس میں یہودیوں کا حصہ اور ہاتھ ضرور رہا ہے ۔

---ooo---

اس کے بعد خطاب اہل کتاب یہودیوں سے ہے ۔ انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اس کتاب کو قبول کر لیں جو اس کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے جو تمہارے ہاں موجود ہے ۔ انہیں سخت دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر بلاوجہ وہ قبول حق سے روگردانی کریں گے تو ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے اللہ انہیں مسخ کر کے ان کے چہرے پھیر دے گا اور ان پر اسی طرح لعنت ہوگی جس طرح سبت کی خلاف ورزی کرنے والوں پر ہوئی تھی ۔ ارتکاب شرک سے انہیں منع کیا جاتا ہے اور خالص توحید کو قبول کرنے کی دعوت دی جاتی ہے جس کی اساس پر خود ان کا دین بھی استوار ہوا ہے ۔ اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرماتے جبکہ اس کے علاوہ تمام گناہ معاف ہو سکتے ہیں' شرک بہرحال گناہ عظیم ہے ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ۝

"اے وہ لوگو جنہیں کتاب دی گئی تھی' مان لو اس کتاب کو جو ہم نے اب نازل کی ہے اور جو اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی ۔ اس پر ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں یا ان کو اسی طرح لعنت زدہ کر دیں جس طرح سبت والوں کے ساتھ ہم نے کیا تھا اور یاد رکھو کہ اللہ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے ۔ اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا' اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے ۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھہرایا ۔ اس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی ۔"

اہل کتاب کو ان کی صفت اہل کتاب سے پکارا گیا' اس لئے کہ اس صفت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے دعوت اسلامی کو قبول کرتے اور سب سے پہلے مسلمان بن جاتے ۔

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (٤ : ٤٧) "اے وہ لوگو جنہیں کتاب دی گئی تھی' مان لو اس کتاب کو جو ہم نے اب نازل کی ہے اور جو اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی ۔"

چونکہ ان کو کتاب دی گئی ہے' اس لئے ان کے لئے ہدایت قبول کرنا کوئی انوکھی بات نہیں ہے اس لئے کہ جس اللہ

نے انہیں کتاب دی ہے وہی اب انہیں دعوت ایمان دے رہا ہے کہ اس کتاب پر بھی ایمان لاؤ جو تمہارے پاس موجود کتاب کی تصدیق کر رہی ہے ۔ یہ ان کے لئے تو کوئی انوکھی بات نہیں 'جبکہ یہ کتاب ان کی کتابوں کی مصدق بھی ہے ۔

اگر ایمان دلائل پر موقوف ہوتا' یا ظاہری اسباب پر موقوف ہوتا تو یہودی سب سے پہلے مومنین میں سے ہوتے ۔ لیکن یہودی اپنے مخصوص مفادات اور مصلحتوں کا شکار ہوگئے ۔ نیز وہ کینہ اور عناد کی وجہ سے ایمان نہ لا سکے ۔ یہ لوگ اپنے مزاج کے اعتبار سے بھی نہ ماننے والے تھے ۔ مزاج میں آکڑ تھی ۔ تورات نے ان کے لئے "اکڑی ہوئی گردن رکھنے والی قوم" کے الفاظ استعمال کیے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ایمان نہ لائے ۔ اللہ کی طرف سے بھی ان کے حق میں سخت اور خوفناک تہدید آئی ۔

(مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (٤٧:٤))

"اس پر ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں یا ان کو اسی طرح لعنت زدہ کر دیں جس طرح سبت والوں کے ساتھ ہم نے کیا تھا' اور یاد رکھو کہ اللہ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے ۔

طمس الوجوہ 'کا مفہوم یہ ہے کہ چہرے کے وہ خدوخال مٹا دیئے جائیں' جن کی وجہ سے انسان انسان بنتا ہے اور چہروں کو بگاڑ کر پیچھے کی طرف موڑ دیا جانا' اس طرح کہ وہ پیچھے کی طرف چلے ۔ اس سے مراد انہیں خوفناک عذاب سے ڈرانا ہے جس میں ان کے چہروں کو پیٹھ کی طرف موڑ کر پیچھے کی طرف چلنے پر مجبور کرنا شامل ہے ۔ اس عذاب میں وہ لعنت بھی شامل ہے جو اصحاب السبت پر وارد ہوئی ۔ (یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے سبت کے دن شکار کرنے کی کوشش کی حالانکہ ان کی شریعت کے مطابق ان پر یہ شکار حرام تھا) اس جرم پر اللہ تعالٰی نے ان لوگوں کو عملاً بندر اور خنزیر بنا دیا تھا ۔ نیز اس سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالٰی ان کے تصورات اور دل و دماغ سے ہدایت اور بصیرت کے آثار مٹا دے اور ان کو دوبارہ کفر اور جاہلیت کی طرف لوٹا دے ۔ یعنی اس حالت کی طرف جب ان کے پاس کوئی کتاب ہدایت نہ تھی اور پھر یہ ایمان کے بعد کفر کی حالت میں چلے جائیں ۔ ایمان کے بعد دوبارہ کفر میں چلا جانا' ہدایت کے بعد گمراہی میں چلا جانا ہی دراصل چہروں کا بگاڑ دینا ہے ۔ اور انسان کا الٹے پاؤں پھرنا ہر قسم کے ارتداد سے برا ہے ۔

چاہے یہ مفہوم ہو یا وہ مفہوم ہو بہرحال یہ ایک خوفناک تہدید اور ڈراوا ہے جو یہودیوں کے کرخت اور متکبرانہ مزاج کے لئے مناسب سزا ہے ۔ اسی طرح ان کے برے اور خبیث اعمال کے لئے بھی یہی مناسب سزا ہے ۔

اس تہدید سے ڈر کر کعب الاحبار مسلمان ہوگئے تھے ۔ ابن ابی حاتم نے روایت نقل کی ہے اپنے والد' ابن نفیل' عمر ابن واقد' یونس ابن جلیس' ابو ادریس' عائذ الخولانی کی سند سے ۔ انہوں نے کہا کہ ابو مسلم خلیلی کعب کے استاد تھے اور وہ انہیں رسول خدا ؐ سے ملنے میں دیر کرنے پر ملامت کرتے تھے ۔ کہتے ہیں ابو مسلم نے کعب کو بھیجا کہ وہ حضور کو دیکھیں کہ آیا حضرت محمد "وہی ہیں ۔" کعب کہتے ہیں میں نے سواری کی اور مدینہ پہنچ گیا ۔ اچانک میں نے ایک تلاوت کرنے والے کو یہ تلاوت کرتے سنا ۔

(يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ (٤:٤٧))

(اے وہ لوگو جنہیں کتاب دی گئی تھی ' مان لو اس کتاب کو جو ہم نے اب نازل کی ہے اور جو اس کتاب کی تائید و تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی ۔ اس پر ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں ۔) میں بھاگا اور پانی سے غسل کیا اور میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر دیکھا کہ کہیں میرا چہرہ مسخ تو نہیں ہو گیا ہے ' اس کے بعد میں مسلمان ہو گیا ۔

اور اس تہدید پر آخری وعید وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (اور یاد رکھو کہ اللہ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے) ہے ۔ یہ مکرر تہدید اور ڈراوا ہے اور یہودیوں کے مزاج کے عین مطابق ہے ۔

اس کے بعد ایک اور تہدید آمیز اختتامیہ آتا ہے اور یہ آخرت کے متعلق ہے اور تنبیہ اور ڈراوا اس مقصد کے لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کے جرم کو کبھی معاف نہیں کرتا ' جبکہ اس کے سوا جس قدر اور جس قسم کے جرائم ہیں ان کی مغفرت کا دروازہ کھلا ہے ' بشرطیکہ اللہ کی مشیت ہو ۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا (٤٨)

"اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا ' اس کے ماسوائے دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے ۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھہرایا اس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی ۔"

سیاق کلام سے یہ بات ضمناً ثابت ہوتی ہے کہ یہودی بھی شرک میں مبتلا تھے اس لئے ان کو بھی دعوت دی جاتی ہے کہ وہ توحید خالص کو اپنائیں اور شرک کا ارتکاب نہ کریں ۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے کسی شرکیہ قول یا فعل کا ذکر نہیں کیا ۔ البتہ قرآن کریم کے دوسرے مواقع پر بعض تفصیلات موجود ہیں ۔ قرآن کریم نے ان کے اس عقیدے کا ذکر کیا ہے کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں جیسا کہ نصاریٰ مسیح کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ شرک ہے ۔ اسی طرح قرآن کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ دونوں طبقے یہود و نصاریٰ "کہ انہوں نے اپنے احبار اور رہبان کو اللہ کے سوا رب بنا رکھا ہے ۔" یہ لوگ احبار اور رہبان کو قانون سازی کا حق دیتے تھے ۔ ان کو حلال و حرام کے اختیارات بھی دیتے تھے ' حالانکہ یہ حقوق ایسے ہیں کہ یہ اللہ کے مخصوص حقوق ہیں اور یہ اللہ کی حاکمیت کا مخصوص ترین دائرہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اہل کتاب کو بھی قرآن نے مشرکین تصور کیا ۔ اس نقطہ نظر کو اسلامی تصور حیات میں بہت اہمیت حاصل ہے کیونکہ ایمان کی تعریف اور اس کی شرائط کی اس سے وضاحت ہوتی ہے جیسا کہ اس سورہ میں اس کی تفصیلات

آگے آرہی ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ حضور کے دور میں جو یہودی جزیرۃ العرب میں رہتے تھے ' ان کے نظریات میں کئی پہلوؤں سے بت پرستی داخل ہو چکی تھی اور ان کے اعمال بت پرستی سے بھرے پڑے تھے۔ یہ لوگ توحید سے منحرف ہو گئے تھے اس لئے یہاں ان کو سختی سے ڈرایا جاتا ہے کہ اللہ شرک کو ہرگز معاف نہیں کرتا اگرچہ شرک سے کم تر درجے کے ہر قسم کے گناہ وہ معاف کرتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے معافی کی کوئی صورت نہیں ہے جس نے دنیا میں شرک کیا ہو اور پھر توبہ کے بغیر مر گیا ہو۔

شرک اس لئے جرم عظیم ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ اور بندے کے درمیاں ربط ٹوٹ جاتا ہے۔ اور مشرک کو یہ امید نہیں ہوتی کہ اللہ اسے معاف کر دے گا۔ اگر ایسے لوگ اس دنیا سے اس حال میں جائیں کہ وہ مشرک ہوں اور ان کا اللہ تعالیٰ کی ذات سے کوئی رابطہ نہ ہو۔ ان کی مغفرت نہیں ہو سکتی۔ جو شخص بھی شرک کرے اور اسی شرکیہ حالت میں دنیا سے چلا جائے ' جبکہ اس کے سامنے دلائل توحید مظاہر کائنات اور رسولوں کی تعلیمات میں موجود ہوں تو وہ جہنمی ہو گا۔ اگر اس میں بھلائی کا ذرہ برابر عنصر بھی موجود ہوتا تو وہ ایسا ہرگز نہ کرتا۔ اس جرم کا ارتکاب وہی شخص کرتا ہے جو اس قدر فساد میں ڈوب گیا ہو ' جس سے واپسی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس کی وہ فطرت سلیمہ تلف ہو چکی ہوتی ہے جو اللہ نے اسے دی تھی۔ اور وہ شخص سب سے نچلے درجے میں چلا گیا ہے اور اس نے اپنے آپ کو گویا جہنم کی آگ کے لئے تیار کر لیا ہے۔

رہے وہ جرائم جو اس واضح ' ظاہر ' عظیم ' گندے اور کھلے ظلم سے کم درجے کے ہیں تو یہ تمام گناہ اگرچہ وہ کبائر ہی کیوں نہ ہوں ان کی مغفرت کا دروازہ اللہ کے ہاں کھلا ہے بشرطیکہ اللہ کی مشیت ہو۔ یہ جرائم حدود مغفرت کے اندر داخل ہیں۔ چاہے اس نے توبہ کی ہو اور اللہ معاف کر دے یا بغیر توبہ کے قیامت میں معاف ہوں۔ جس طرح بعض روایات میں آیا ہے ' بشرطیکہ بندہ اللہ کے فضل کا شعور اپنے اندر پاتا ہو۔ وہ اللہ کی مغفرت کا امیدوار ہو اور اسے یقین ہو کہ اللہ مغفرت کر سکتا ہے اور یہ کہ اللہ کی مغفرت اس کے گناہوں سے بہت زیادہ ہے۔ یہ ہے امیدواری اللہ کی رحمت کے بارے میں ' جو ختم نہیں ہوتی اور نہ محدود ہوتی ہے۔ وہ ایسی رحمت ہے جس کے آگے دروازے بند نہیں ہوتے اور نہ ہی ان دروازوں پر دربان ہوتے ہیں۔

امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے قتیبہ ' جریر ابن عبدالحمید ' عبدالعزیز ابن رفیع ' زید ابن وہب کی سند کے ذریعے حضرت ابوذر سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں : میں ایک رات نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضور ؐ اکیلے جارہے ہیں اور آپ کے ساتھ کوئی انسان نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سوچا کہ شاید حضور ؐ یہ پسند نہیں کرتے کہ ان کے ساتھ کوئی جائے۔ تاہم میں چاند کے سائے میں چلتا رہا۔ آپ نے میری طرف مڑ کر دیکھا اور مجھے دیکھ لیا۔ آپ ؐ نے فرمایا "کون ہو تم ؟" میں نے عرض کیا "ابوذر۔" مجھے اللہ آپ پر فدا کرے۔ آپ ؐ نے فرمایا ! "ابوذر آؤ۔" کہتے ہیں میں آپ کے ساتھ کچھ دیر کے لئے چلا۔ آپ ؐ نے مجھ سے کہا ! "بہت لوگ قیامت کے دن تہی دامن ہوں گے مگر وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور وہ اسے دائیں بائیں ' سامنے اور پیچھے پھیلاتے رہے اور اس میں اچھا تصرف کیا۔" اس کے بعد مزید کچھ دیر میں ان کے ساتھ چلا۔ اس کے بعد آپ ؐ مجھ سے کہا ! "ادھر بیٹھ جاؤ۔" مجھے اس کھلی جگہ بٹھایا جس کے ارد گرد پتھر

تھے ۔ مجھ سے کہا "تم ادھر بیٹھ جاؤ یہاں تک کہ میں لوٹ آؤں ۔" اس کے بعد آپ وادی میں آگے چلے گئے یہاں تک کہ آپ مجھے نظر نہ آ رہے تھے ۔ آپ کافی دیر تک نہ آئے یہاں تک کہ انتظار طویل ہو گیا ۔ اس کے بعد مجھے آپ کے آنے کی آواز آئی اور آپ یہ فرما رہے تھے !"اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور اگرچہ اس نے چوری کی ہو ۔" جب آپ ؐ واپس آگئے تو میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا :"اے رسول ؐ مجھے اللہ آپ پر قربان کر دے ' آپ اس وادی میں کس کے ساتھ باتیں کر رہے تھے ؟" میں نے تو کسی کو سنا کہ وہ آپ کے ساتھ بات کر رہا تھا ۔ آپ ؐ نے فرمایا !"یہ جبریل تھے ' یہ وادی کی طرف مجھے ملے اور مجھ سے کہا " آپ اپنی امت کو خوشخبری دے دیں کہ اس میں سے کوئی بھی اس حال میں مرا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر رہا ہو وہ جنت میں داخل ہو گا ۔ میں نے کہا کہ "اے جبریل اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری کی ہو ۔ تو انہوں نے کہا (ہاں ) میں نے پھر کہا کہ اگرچہ اس نے چوری کی ہو اور زنا کیا ہو؟" تو انہوں نے کہا :"اگرچہ اس نے چوری کی ہو ' زنا کیا ہو اور شراب پی ہو ۔"

ابن ابی حاتم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر ابن عبداللہ سے روایت کی ہے : حضور نے فرمایا ' جو شخص بھی مرجائے اس حال میں کہ وہ اللہ کے ساتھ شریک نہ کر رہا ہو تو اس کے لئے مغفرت جائز ہو جائے گی ' اگر اللہ نے چاہا تو اسے عذاب دے گا اور اگر اللہ نے چاہا تو اسے بخش دے گا ۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر ہرگز مغفرت نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے ۔ اس کے سوا جسے چاہے گا بخش دے گا ۔

ابن ابو حاتم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عمر سے روایت کی ہے ۔ وہ کہتے ہیں :"ہم اصحاب رسول ؐ زندہ جان کے قاتل ' یتیم کا مال کھانے والے ' بے گناہ عورتوں پر تہمت لگانے والے ' جھوٹی شہادت دینے والے میں شک نہ کرتے تھے (کہ وہ جہنمی ہیں ) یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی :"اللہ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا وہ جس کی چاہے مغفرت کر دے گا ۔" اس کے بعد اصحاب رسول ؐ نے شہادت دینا چھوڑ دیا ۔

طبرانی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عکرمہ ' حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ نبی ؐ نے فرمایا :"اللہ تعالیٰ نے کہا ہے ' جو شخص یہ جانتا ہو کہ میں گناہوں کی مغفرت کرنے پر قادر ہوں تو میں اس کے گناہ معاف کر دوں گا ۔ اور میں کوئی پرواہ نہیں کرتا جب تک وہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کر دے ۔"

اور اس آخری حدیث میں ہمارے لئے ایک بصیرت افروز لمحہ فکریہ ہے ۔ اصل اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ بھلائی ' امید ' خوف اور حیا کے پس پردہ دل کے اندر اللہ کا حقیقی شعور ہونا چاہئے ۔ اگر انسان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کا یہ شعور اور اس پر مبنی بھلائی کا جذبہ ' امید ' خوف اور حیاء انسان کے اندر خدا ترسی پیدا کرتے ہیں اور انسان مغفرت کا اہل ہو جاتا ہے ۔

اب قرآن مجید ذرا آگے بڑھتا ہے اور جماعت مسلمہ کو یہودیوں پر مزید آگے بڑھا کر حملہ آور کرتا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کا ایک اور تعجب خیز پہلو سامنے لاتا ہے ۔ یہ کہ یہ یہودی لوگ اپنے آپ کو اب بھی اللہ کی برگزیدہ قوم سمجھتے ہیں ' اپنی تعریفیں کرتے ہیں ' اپنی پاکی داماں کی حکایتیں سناتے ہیں ' جبکہ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ بات کو اپنے اصل مفہوم و مراد سے بدل دیتے ہیں اور اللہ اور رسول کے مقابلے میں گستاخی کرتے ہیں ' جبکہ وہ خود جبت (ہر قسم کے وہمیات ) اور طاغوت پر ایمان لاتے ہیں جیسا کہ آگے آتا ہے اور اپنی پاکی بیان کر کے اور اپنے آپ کو اللہ کا مقرب کہہ

کر' اگرچہ وہ بدعمل ہوں' اللہ پر افتراء باندھتے ہیں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنفُسَهُم ۚ بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَن
يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿٤٩﴾ انظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۖ وَكَفَىٰ
بِهِ إِثْمًا مُّبِينًا ﴿٥٠﴾ ع ۸ ۴

"تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جو بہت اپنی پاکیزگی نفس کا دم بھرتے ہیں؟ حالانکہ پاکیزگی تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے' اور (انہیں جو پاکیزگی نہیں ملتی تو درحقیقت) ان پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جاتا۔ دیکھو تو سہی' یہ اللہ پر بھی جھوٹے افتراء گھڑنے سے نہیں چوکتے۔ اور ان کے صریحا "گناہ گار ہونے کے لئے یہی ایک گناہ کافی ہے۔"

یہودیوں کا یہ قدیم دعویٰ ہے کہ وہ اللہ کے مختار اور برگزیدہ لوگ ہیں۔ ایک وقت تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس امانت کے اٹھانے اور فرائض رسالت اور دعوت کے لئے چنا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی خاطر فرعون اور ان کے ساتھیوں کو ہلاک کیا تھا۔ بنی اسرائیل کو ارض مقدس کا وارث بنایا تھا' لیکن اس کے بعد آنے والے ادوار میں انہوں نے سرے سے اسلامی نظام ہی کو ترک کر دیا۔ اور انہوں نے اس کرۂ ارض پر عظیم نافرمانیوں اور کبیرہ گناہوں کا ارتکاب شروع کر دیا۔ ان گناہوں سے زمین بھی کانپنے لگی۔ ان کے لئے ان کے احبار' علماء نے ان چیزوں کو حلال کر دیا جسے اللہ نے حرام کیا تھا' اور ان پر ان چیزوں کو حرام کر دیا جو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دی تھیں۔ انہوں نے ان غلط کاموں میں ان احبار کی پیروی شروع کر دی تھی۔ اور ان احبار نے اس طرح جو خدائی کا دعویٰ کیا تھا' اس کا انہوں نے انکار نہ کیا حالانکہ حلال و حرام کا تعین تو اللہ کا کام تھا۔ ان احبار نے اللہ کی شریعت میں تبدیلیاں کر دیں تاکہ بادشاہوں اور شرفاء کو خوش کریں اور جمہور عوام کے رجحانات اور میلانات کی پیروی و چاپلوسی کریں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے گویا ان کو اپنا رب بنا لیا تھا۔ پھر انہوں نے سود کھانا شروع کر دیا۔ ان کا تعلق اپنے دین اور اپنے رب کے ساتھ کمزور ہو گیا' ان جرائم اور ان کے ساتھ بے شمار دوسرے جرائم کے باوجود وہ بدستور اس زعم میں مبتلا ہیں کہ وہ اللہ کی برگزیدہ قوم ہیں' اور یہ کہ ان کو آگ فقط چند دن تک چھوئے گی اور یہ کہ اللہ کے نزدیک صرف یہودی ہی نجات کے مستحق ہیں۔ گویا دین صرف رشتہ داری تک محدود ہو گیا ہے یا دین میں بھی ذاتی تعلقات اور دوستیاں کام کرتی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند ہے۔ اس لئے کہ اللہ کو اپنے بندوں میں سے کسی کے ساتھ نہ قرابت داری ہے اور نہ نسبت ہے۔ اللہ کے ساتھ اس کے بندوں کا تعلق صرف درست عقائد کی وجہ سے قائم رہ سکتا ہے۔ عمل صالح کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے اور اسلامی نظام حیات پر ثابت قدمی سے رہ سکتا ہے۔ جس شخص نے اس تعلق میں خلل ڈالا' اس پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ اور اللہ کا غضب اس وقت بہت ہی جوش میں آتا ہے جب اللہ ایک گمراہ قوم کو ہدایت بخشے مگر وہ قوم ہدایت کے مقابلے میں انحراف کی راہ اختیار کر لے۔ ان یہودیوں کے حالات آج کے نام نہاد مسلمانوں سے مختلف نہیں ہیں' جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ امت محمدیہ میں سے ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ لازماً ان کی مدد کرے

گا اور یہودیوں کو ان کی سرزمیں سے نکالے گا' جبکہ وہ مکمل طور پر اسلام سے نکل گئے ہیں' حالانکہ اسلام ان کا دین اور نظام زندگی ہے لیکن انہوں نے اسے اپنی زندگیوں سے نکال دیا ہے اور وہ اللہ کی کتاب کے مطابق کوئی فیصلہ نہیں کرتے ۔ نہ اپنے مقدمات میں نہ اپنے اقتصادی مسائل میں ۔ نہ اپنے اجتماعی معاملات میں اور نہ اپنے آداب و عادات میں ۔ ان کا اسلام صرف مسلمانوں جیسے نام رکھنے تک محدود رہ گیا ہے ۔ اور یہ کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں پیدا ہوئے ہیں' جس میں وہ کبھی زندہ رہ رہے تھے اور کبھی انہوں نے اس میں دین اسلام قائم کیا تھا اور اسلامی نظام کے مطابق تمام فیصلے کیا کرتے تھے ۔

اللہ تعالیٰ رسول خدا ؐ کے سامنے تعجب کا اظہار فرمارہے ہیں کہ یہ یہودی بھی عجیب ہیں کہ وہ اپنے آپ کو بہت ہی پاک قوم سمجھتے ہیں ۔ لیکن آج کے مسلمانوں کا معاملہ تو اس تعجب انگیز صورت حالات سے بھی زیادہ تعجب انگیز ہے کیوں کہ ان کی اخلاقی حالت اس زمانے کے یہودیوں سے بھی زیادہ پست ہو چکی ہے ۔

یہ لوگوں کا کام نہیں ہے کہ وہ میاں مٹھو بن کر اپنی پاک دامنی کا ڈھنڈورا پیٹیں اور یہ شہادت خود اپنے حق میں دیں کہ وہ نیک ہیں' اللہ کے قریبی ہیں اور شعب مختار ہیں ۔ بلکہ یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ فیصلہ دے کہ اللہ کے نزدیک پاک اور برگزیدہ کون ہے ۔ اس لئے کہ وہ دلوں اور عملوں کو خوب جانتا ہے اور لوگوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ۔ اگر وہ اللہ کی طرف صحیح معنوں میں متوجہ ہو جائیں' نیک عمل کریں اور یہ تیر تکے چلانا چھوڑ دیں ۔ اگر وہ ادعاء چھوڑ دیں اور عمل کرتے رہیں نہایت ہی خاموشی' نہایت ہی تواضع کے ساتھ اور نہایت ہی ادب اور حیاء کے ساتھ اور بغیر پاکی دامن کے پروپیگنڈے کے اور بغیر فخر و غرور کے تو اللہ کے ہاں ان کے کسی عمل کا غبن نہ ہو گا' کوئی عمل بھول چوک کی وجہ سے حساب سے ساقط نہ ہو گا اور نہ ان کا کوئی حق مارا جائے گا ۔

اللہ تعالیٰ خود یہودیوں کے خلاف شہادت دیتے ہیں کہ وہ جو دعوے کر رہے ہیں کہ وہ برگزیدہ لوگ ہیں اور ان سے اللہ بہرحال راضی ہے تو یہ لوگ اللہ پر بہت بڑا افتراء باندھ رہے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس دعوائے باطل کی مذمت کرتے ہوئے اس طرح اسے لوگوں کی نظروں میں ساقط کر دیتے ہیں ۔

(انْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَكَفٰى بِهٖ اِثْمًا مُّبِيْنًا (٤ : ٥٠)) "دیکھو تو سہی' یہ اللہ پر بھی جھوٹے افتراء گھڑنے سے نہیں چوکتے اور ان کے صریحاً گناہ گار ہونے کے لئے یہی ایک گناہ کافی ہے ۔"

ذرا سوچئے تو سہی' ہم لوگ جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں' اس لئے کہ ہمارے نام مسلمانوں جیسے ہیں اور ہم ایسی سرزمینوں میں بستے ہیں جہاں کبھی مسلمان بسا کرتے تھے تو یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے ۔ ہم لوگ اسلام کو اپنی زندگی کے کسی بھی شعبے میں نافذ نہیں کرتے لیکن اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں ۔ اپنی سیرت اور صورت میں ہم اسلام کی شکل کو مسخ کر رہے ہیں اور اپنی عملی زندگی سے اسلام کے خلاف شہادت دے رہے ہیں اور پھر بھی ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم برگزیدہ لوگ ہیں اور نبی ؐ کے امتی ہیں اگرچہ ہم نے اپنی عملی زندگی سے اسلام کو مکمل طور پر بے دخل کر دیا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری صورت حال بھی اس صورت حالات سے مختلف نہیں ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ حضرت محمد ؐ کو تعجب کے ساتھ متوجہ فرماتے ہیں اور ایسے دعوے کرنے والوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ اللہ پر افتراء باندھتے ہیں اور ایک عظیم گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں

نعوذ باللہ۔

یاد رکھئے! کہ اللہ کا دین ایک نظام حیات ہے۔ اور اللہ کی اطاعت کے معنی یہ ہیں کہ پوری زندگی میں اس نظام کی حکمرانی قائم کی جائے۔ اللہ کا قرب اس وقت نصیب ہو گا جب اللہ کی اطاعت کی جائے۔ ذرا غور کیجئے کہ ہم اللہ' اس کے دین اور اس کے نظام زندگی سے کس قدر دور ہیں۔ پھر یہ بھی غور کیجئے کہ ہمارا اور یہودیوں کا حال بالکل ایک جیسا ہے جن کے حال پر اللہ اور رسول تعجب کرتے ہیں۔ ان کے بے بنیاد دعوے کو اللہ پر افتراء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لئے یہودیوں کے خلاف ضابطہ ہمارے خلاف ضابطہ ہو گا۔ ان کا حال اور ہمارا حال ایک جیسا ہو گا۔ اور یاد رکھئے کہ اللہ کی کسی کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہیں ہے اور نہ کسی کے ساتھ دوستی ہے۔

---○○○---

سلسلہ کلام بدستور انہی لوگوں کے بارے میں جاری ہے جو لوگ اپنے آپ کو برگزیدہ سمجھتے ہیں' حالانکہ وہ حق کے مقابلے میں باطل پر ایمان لاتے ہیں۔ ایسے احکام کو تسلیم کرتے ہیں جو ازروئے شریعت مستند نہیں ہیں اور ان احکام کے لئے کوئی ایسا ضابطہ نہیں ہے جو ان کو ظلم اور زیادتی سے باز رکھ سکے۔ یہ ہے ایمان بالجبت و الطاغوت جبکہ وہ شرک اور مشرکین کے حق میں یہ گواہی بھی دے رہے ہیں کہ یہ لوگ مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں حالانکہ اہل ایمان اللہ کی کتاب' اللہ کی شریعت اور اس کے نظام حیات پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے حال پر اس تعجب خیزی اور ان کی ذلالتوں کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر شدید تنقید فرماتے ہیں اور ان کو ذلیل و خوار قرار دیتے ہیں۔ ان کے مزاج کے خفیہ گوشے کھولتے ہیں کہ وہ سخت حاسد اور بخیل ہیں۔ ان کی طرف سے دین ابراہیمی سے منحرف ہو کر موجودہ موقف اپنانے کے اسباب بتائے جاتے ہیں' حالانکہ وہ دین ابراہیمی پر بے حد فخر کرتے تھے اور حضرت ابراہیم پر اپنے شجرۂ نسب ختم ہونے پر بھی وہ نہایت ہی فخر کرتے تھے۔ یہ تنقید اسی حتمی فیصلے پر اختتام پذیر ہوتی ہے کہ ان کے لئے جہنم کی دہکتی ہوئی آگ کافی ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يُؤۡمِنُوۡنَ
بِالۡجِبۡتِ وَالطَّاغُوۡتِ وَيَقُوۡلُوۡنَ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا هٰٓؤُلَاۤءِ اَهۡدٰى مِنَ الَّذِيۡنَ
اٰمَنُوۡا سَبِيۡلًا ۞ اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَمَنۡ يَّلۡعَنِ اللّٰهُ فَلَنۡ تَجِدَ
لَهٗ نَصِيۡرًا ۞ اَمۡ لَهُمۡ نَصِيۡبٌ مِّنَ الۡمُلۡكِ فَاِذًا لَّا يُؤۡتُوۡنَ النَّاسَ نَقِيۡرًا ۞
اَمۡ يَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ۚ فَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اٰلَ

إِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾

---

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کر دے پھر تم اس کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔ کیا حکومت میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو دوسروں کو ایک پھوٹی کوڑی تک نہ دیتے۔ پھر کیا یہ دوسروں سے اس لئے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا؟ اگر یہ بات ہے تو انہیں معلوم ہو کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی اور ملک عظیم بخش دیا، مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا، اور منہ موڑنے والوں کے لئے تو بس جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے۔"

جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی وہ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ اس آخری کتاب قرآن پر ایمان لے آئیں اور شرک سے باز آجائیں جو ان لوگوں کا شیوہ ہے جن کو اللہ کی طرف سے کوئی کتاب و ہدایت نہیں ملی۔ وہ اپنی زندگیوں میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کریں اور طاغوت کی اطاعت نہ کریں (طاغوت ہر وہ قانون ہے، جو اللہ کی طرف سے نہیں ہے اور ہر وہ حکم ہے جس کی پشت پر کوئی شرعی سند نہیں ہے)۔ لیکن یہودی جو ہر وقت پاکی داماں کے قصہ خواں تھے اور اس امر پر فخر کرتے تھے کہ وہ اللہ کے محبوب بندے ہیں، ان دعاوی کے ساتھ ساتھ وہ باطل اور شرک کے پیروکار تھے۔ وہ کاہنوں کی تابع داری کرتے تھے اور اپنے احبار کی اطاعت کرتے تھے جو ان کے لئے ایسے قوانین بناتے تھے جن پر اللہ کی جانب سے کوئی سند نہ ہوتی تھی۔ وہ طاغوت پر ایمان لاتے تھے (طاغوت وہ نظام حکومت اور قانونی نظام ہے جو شریعت پر مبنی نہ ہو) اسے طاغوت اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں طغیان اور دست درازی پائی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی انسان اپنے لئے ان خصوصیات کا مدعی ہو جاتا ہے جو اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کی اہم خصوصیات ہیں اور یہ انسان اپنے آپ کو شریعت کے ضابطے کی اطاعت سے باہر نکال لیتا ہے، جس کے مطابق عدل کرنا اس پر لازمی تھا۔ یہ عمل ہے طغیان کا اور ایسا شخص طاغوت ہے اور اس طاغوت کے مطیع اور اس پر ایمان لانے والے مشرک ہیں یا کافر ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ تعجب کا اظہار فرماتے ہیں کہ وہ یہ فعل مکروہ اس کے باوجود کرتے ہیں کہ ان کو اس سے قبل کتاب دی گئی تھی، لیکن انہوں نے اس کتاب کی پیروی نہ کی۔

جبت (ہر قسم کی وہمیات) اور طاغوت پر ایمان لانے پر مزید انہوں نے یہ کیا کہ کفار اور مشرکین کی صف میں جا کھڑے ہوئے اور ان مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو گئے جن کو اللہ نے کتاب دی ہے۔

(وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا (٤: ٥١)) ”اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔“

ابن اسحاق نے بواسطہ محمد ابن ابی محمد، عکرمہ اور سعید ابن جبیر، حضرت ابن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے کہ قریش، غطفان، بنی قریظہ کے جن لوگوں نے جنگ احزاب میں تمام پارٹیوں اور احزاب کو جمع کیا تھا ان میں حیی ابن اخطب، سلام ابن الحقیق، ابو رافع، ربیع ابن الحقیق، ابو عامر، وحوح ابن عامر اور ہوذہ ابن قیس تھے۔ جب یہ لوگ قریش کے پاس آئے تو انہوں نے کہا: ”یہ لوگ یہودیوں کے احبار اور علماء ہیں اور یہ لوگ پہلی کتاب کے ماہرین علماء ہیں آپ لوگ ان سے جو پوچھنا چاہیں پوچھ لیں کہ تمہارا دین اچھا ہے یا محمد ﷺ کا دین اچھا ہے۔ قریش نے ان سے پوچھا انہوں نے جواب دیا: تمہارا دین محمد کے دین سے بہتر ہے اور جو لوگ محمد کے تابع ہو گئے ہیں تم ان سے زیادہ ہدایت پر ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

(اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ) سے لے کر (وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (٤: ٥٤)) اور یہ ان لوگوں پر لعن طعن ہے اور اس بات کا اعلان ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں ان کا کوئی ناصر اور مددگار نہ ہوگا، اس لئے کہ یہ لوگ اب مشرکین سے امداد چاہتے ہیں۔ انہوں نے مشرکین کو زیادہ ہدایت یافتہ اس لئے کہا تاکہ ان کو اپنی امداد کے لئے مائل کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے ان کی دعوت قبول کر لی اور یوم الاحزاب میں یہ لوگ لشکر لے کر آ گئے۔ اس جنگ میں حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام نے مدینہ کے اردگرد خندق کھودی اور ان لوگوں کے اس عظیم شر کا دفعیہ صرف اللہ نے کیا اور (اللہ نے ان لوگوں کو بھاری غم و اندوہ کے ساتھ لوٹا دیا جنہوں نے کفر کیا تھا، اور وہ کچھ خیر نہ پا سکے اور اللہ تعالیٰ مومنین کی مدد کے لئے کافی تھا۔ وہ تو بہت قوی اور غالب تھا)۔

یہ بات تعجب انگیز تھی کہ یہودی یہ کہنے پر اتر آئیں کہ مشرکین کا دین، دین محمد ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے دین سے بہتر ہے۔ اور مشرکین ان لوگوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں جو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ پر ایمان لائے ہیں لیکن یہودیوں کی جانب سے یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ حق و باطل کے درمیان انہوں نے ہمیشہ باطل کو ترجیح دی ہے اور اہل حق اور اہل باطل میں سے ان کو ہمیشہ اہل باطل اچھے لگتے ہیں۔ یہ اس قدر لالچی ہیں جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ وہ اس قدر نفسانیت میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ ان کے مزاج میں اعتدال کا آنا ممکن ہی نہیں ہے۔ ان کے سینے بغض سے بھرے ہوئے ہیں جو کبھی صاف نہیں ہو سکتے۔ وہ اہل حق کے ہاں، اپنی خواہشات، اپنے لالچ اور اپنے کینے کا سامان نہیں پاتے۔ انہیں اگر کچھ ملتا ہے تو ہمیشہ اہل باطل سے ملتا ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ شہادت حق کے مقابلے میں شہادت زور کے عادی ہیں اور اہل حق کے مقابلے میں اہل باطل کے لئے شہادت دیتے ہیں۔

یہ ان کے دائمی حالات و عادات ہیں۔ ان حالات کی پشت پر جو اسباب تھے وہ اب بھی قائم ہیں اس لئے کہ یہ فعل ان کا طبعی اور منطقی فعل تھا کہ وہ کافروں کے متعلق یہ شہادت دیں، کہ وہ اہل ایمان مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ ہدایت پر ہیں۔

آج یہودی برملا کہتے ہیں کہ وہ اپنی اس قوت سے جو میڈیا کے حوالے سے ان کے قبضے میں ہے، اس کرۂ ارض پر

کامیاب ہونے والی ہر تحریک کو ناکام کر سکتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ اہل باطل کے ساتھ پوری پوری معاونت کرتے ہیں تاکہ وہ ہر تحریک اسلامی کو بدنام اور نیست و نابود کر سکیں۔ بعینہ اسی طرح انہوں نے قریش سے مدد لے کر دنیا کی پہلی تحریک اسلامی کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن یہ لوگ بعض اوقات اپنی ماہرانہ مکاری اور تجربہ کاری سے ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ جدید زمانے کے حالات و تصورات کی وجہ سے اہل باطل کی حمایت اگر کھل کر نہ کر سکیں تو وہ خفیہ طریقوں سے باطل کی حمایت کرتے ہیں تاکہ وہ اہل حق کو نیست و نابود کر دے۔ اور یہ راز داری وہ اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ اگر یہ کھل کر سامنے آتے ہیں تو دور جدید میں ان کے فریب کا پردہ چاک ہوتا ہے اور ان کے ایجنٹ عوام الناس میں بدنام ہوتے ہیں' جو درحقیقت ان کے اشاروں پر کام کرتے ہیں اور ہر جگہ اسلامی تحریکات کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے رات دن کام کرتے ہیں۔

بلکہ بعض اوقات ان کی مکاری اور ہشیاری اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ بظاہر اپنے ایجنٹوں کے ساتھ اپنی دشمنی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے ساتھ لڑتے نظر آتے ہیں لیکن دراصل وہ ان لوگوں کے مددگار ہوتے جو اسلامی تحریکات کا قلع قمع کرنے میں لگے ہوئے ہوتے ہیں اور سچائی کو مٹا رہے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اپنے ان ایجنٹوں کے ساتھ جھوٹی لڑائی شروع کر دیتے ہیں جو صرف زبان و کلام تک محدود رہتی ہے تاکہ ان کے یہ مخلص ایجنٹ عوام الناس کے اندر پاک و صاف ہو جائیں اور ان کے مفادات کے لئے کام کر کے ان کے دور رس مقاصد پورے کرتے رہیں۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کی شکل بگاڑنے کے کام کو کبھی نہیں چھوڑتے اس لئے کہ انہیں اصل بغض تو اسلامی نظریہ حیات سے ہے اور ان کی اصل دشمنی احیائے اسلام کی ہر اس تحریک کے ساتھ ہے' جو انہیں دور سے نظر آئے اور وہ اسے دھوکے میں نہ ڈال سکتے ہوں۔

یہ ایک ہی فطرت ہے' ایک ہی منصوبہ ہے اور ایک ہی مقصد ہے یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کو اللہ کی جانب سے مردود اور ملعون ہونے کا اعلان ہوتا ہے۔ ان کو راندہ درگاہ قرار دیا جاتا ہے اور یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ ان کے لئے کوئی نصرت نہ ہوگی اور نہ ان کا کوئی مددگار ہوگا۔

(أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا (٤ : ٥٢)) "ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کر دے پھر تم اس کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔"

آج یہ بات ہمیں ہولناک نظر آتی ہے کہ تمام مغربی ممالک یہودیوں کے ناصر و مددگار ہیں۔ اس لئے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اللہ کا یہ وعدہ کہاں گیا کہ اللہ نے یہودیوں پر لعنت کی اور جس کو اللہ نے ملعون قرار دے دیا' اس کا کوئی مددگار نہ ہوگا؟

حقیقت یہ ہے کہ حقیقی مددگار صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ حقیقی مددگار لوگ نہیں ہیں اور نہ حکومتیں ہیں۔ اگرچہ ان کے پاس ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم ہوں اور میزائل ہوں۔ حقیقی ناصر اللہ ہے اور وہ اپنے تمام بندوں کے اوپر کنٹرول کرنے والا ہے اور بم اور میزائل ان لوگوں کے پاس ہیں جو اللہ تعالیٰ کے مکمل کنٹرول میں ہیں۔ اللہ ہی حقیقی مددگار ہے ان لوگوں کا جو اس کی مدد کرتے ہیں۔ (وَيَنصُرُونَ اللَّهَ مَن يَنصُرُهُ) اور اللہ صرف ان لوگوں کی معاونت کرتا ہے جو

اللہ پر اس طرح ایمان لے آئیں جس طرح ایمان لانے کا حق ہے اور وہ اس کے نظام کی اس طرح اطاعت کرتے ہیں جس طرح اطاعت کا حق ہوتا ہے اور جو تسلیم و رضا کے ساتھ اپنے تمام فیصلے اسلامی منہاج اور اسلامی شریعت کے مطابق کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے ذریعے ایک ایسی امت کو خطاب کیا تھا جو صحیح معنوں میں اللہ پر ایمان لا چکی تھی۔ وہ اسلامی نظام زندگی کی مطیع تھی۔ وہ اپنے تمام فیصلے شریعت کے مطابق کرتی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس مومن امت کے مقابلے میں اس کے دشمنوں یعنی یہودیوں کو کمزور بنایا تھا اور اس وقت اہل ایمان کو یہودیوں پہ نصرت ملتی تھی اور فتح حاصل ہوتی تھی اس لئے کہ ان کا مددگار کوئی نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کئے ہوئے وعدے کو عملی شکل دے دی تھی اور اللہ کا وعدہ عملی شکل صرف ان لوگوں کے ذریعے اختیار کرتا ہے جو صحیح معنوں میں مومن ہوں۔

ہمیں اس وقت تمام ملحدین ' مشرکین اور اہل صلیب کی جانب سے بالاتفاق یہودیوں کی پشت پناہی سے خائف نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ وہ تو ہر دور میں اسلام کے خلاف یہودیوں کے ناصر و مددگار رہے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن ہمیں یہ بات دھوکے میں بھی نہ ڈال دے۔ نصرت کا وعدہ صرف مومنین کے ساتھ ہے۔ جب بھی ہم مومن بن جائیں گے فتح ہمارے قدم چومے گی۔

اہل اسلام کو چاہئے کہ وہ تجربہ کر لیں ' ایک بار تجربہ کریں کہ وہ صحیح مسلمان بن جائیں پھر دیکھیں کہ آیا یہودیوں کے لئے کوئی مددگار اس دنیا میں رہتا ہے اور کیا یہودیوں کو ان مشرکین اور اہل صلیب کی نصرت کوئی فائدہ دیتی ہے؟

اہل کتاب کے حالات ' ان کے موقف اور ان کی باتوں پر تعجب کا اظہار کرنے اور ان کو ذلیل اور ملعون قرار دینے کے بعد ' اس بات پر نکیر کی جاتی ہے کہ ان لوگوں کا موقف حضرت محمد ؐ اور مسلمانوں کے بارے میں قابل مواخذہ ہے۔ نیز یہ کہ وہ اس بات پر سیخ پا ہیں کہ اللہ نے حضور اکرم ؐ اور مسلمانوں پر یہ احسان کیوں فرمایا کہ ان کو دین ' نصرت اور فتح سے ہمکنار کیا اور پھر اللہ نے ان پر فضل و کرم کی جو بارش کی اس پر بھی وہ جل بھن گئے۔ حالانکہ اہل اسلام کو کوئی خیر یا بھلائی ان سے چھین کر نہ دی گئی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر سخت مزاج اور کس قدر لالچی تھے۔ وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے علاوہ بھی کسی کو کچھ ملے۔ حالانکہ اللہ نے ان پر بھی فیضان رحمت فرمایا۔ ان کے آباء پر بھی احسان کیا اور ان کو فیاضی اور رواداری سے منع نہ کیا تھا اور نہ ان کو یہ بغض اور حسد سکھایا تھا۔

اَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا (٥٣) اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (٥٤) (٤: ٥٣-٥٤)

"کیا حکومت میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو یہ دوسروں کو ایک پھوٹی کوڑی تک نہ دیتے۔ پھر کیا یہ دوسروں سے اس لئے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا؟ اگر یہ بات ہے تو انہیں معلوم ہو کہ ہم

نے تو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی اور ملک عظیم بخش دیا۔

یہ نہایت ہی تعجب انگیز بات ہے کہ یہ لوگ یہ برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ اللہ اپنے خزانوں سے کسی اور پر فضل و کرم کرے ۔کیا یہ لوگ اللہ کے ساتھ اس کے نہ ختم ہونے والے خزانوں میں شریک ہیں ۔کیا یہ لوگ اللہ کے اقتدار میں اس کے شریک ہیں ۔یہ تو اللہ ہی ہے جو دیتا ہے اور وہی ہے جو روکتا ہے ۔اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگ اپنی کنجوسی اور سختی کی وجہ سے کسی کو پھوٹی کوڑی بھی نہ دیتے ۔نقیر سے مراد وہ جھلی ہے جو گٹھلی کی پشت پر ہوتی ہے ۔اور یہودیوں کی کنجوسی اور ان کا بخل اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اتنا بھی کسی کو دے دیں اگر اللہ کی بادشاہی میں ان کا کوئی حصہ ہوتا ۔یہ خدا کا شکر ہے کہ خدائی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے ۔اگر ایسا ہوتا تو اگر تمام لوگ بھی بھوک سے ہلاک ہو جاتے تو وہ کسی کو گٹھلی کا چھلکا تک نہ دیتے ۔

شاید انہیں رسول خدا ﷺ سے اس بات پر حسد ہے کہ اللہ نے ان کو اپنے فضل سے نوازا ہے کہ ان کو یہ دین دیا جس سے ان عربوں کو جدید جنم نصیب ہوا اور وہ از سر نو ترقی کرنے لگے اور ان جاہل عربوں کو صاحب امتیاز قوم اور انسان بنا دیا ۔ان کو روشنی 'یقین' اطمینان اور اعتماد عطا کیا ۔ان کو پاکیزگی اور صفائی اور دنیا کے اندر اقتدار عطا کیا ۔یقیناً یہ صورت حال ان یہودیوں کے حسد کی وجہ ہے ۔وہ اس بات پر مرگئے تھے کہ جاہل 'متفرق' باہم متصادم عربوں پر ان کی ادبی اور ثقافتی اور اقتصادی برتری اب ختم ہونے والی ہے ۔یہ برتری اس وقت قائم تھی جب ان کے پاس کوئی دینی پیغام نہ تھا ۔

یہ لوگ اس بات پر کیوں حسد کرتے ہیں کہ اللہ کسی قوم کو نبوت اور زمین پر اقتدار اعلیٰ عطا فرمائے حالانکہ ان پر تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے ہی یہ فضل و کرم ہوتا رہا ہے جن کو اللہ نے کتاب اور حکمت (نبوت) عطا کی تھی ۔ان کی آل و اولاد میں نبوت جاری رہی تھی اور ان کو حکومت اور اقتدار اعلیٰ بھی دیا گیا تھا لیکن انہوں نے اس فضل و کرم کی کچھ قدر نہ کی ۔نہ اس نعمت کو سنبھالا 'نہ انہوں نے اس عہد قدیم کا پاس رکھا جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا 'بلکہ ان میں سے کئی لوگ تو سرے سے مومن ہی نہ تھے ۔جن لوگوں پر اس قدر فضل عظیم کیا گیا ہو 'ان کے لئے یہ تو مناسب نہیں ہے کہ ان میں منکر اور کافر پیدا ہوں ۔

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (٥٤) فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا (٥٥) (٤: ٥٤ — ٥٥)

"ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی اور ملک عظیم بخشا 'مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا 'اور منہ موڑنے والوں کے لئے تو بس جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے ۔"

حسد کا درد کس کے حصے میں آتا ہے ۔اگر کوئی نادار شخص کسی مالدار صاحب نعمت سے حسد کرے تو یہ حسد بھی فعل بد ہے ۔لیکن اگر کوئی مالدار صاحب نعمت کسی پر حسد کرنے لگے تو یہ رذالت سے بھی آگے نہایت گہرا شر ہے اور اس قسم کا شر و فساد صرف یہودیوں کا حصہ ہے 'یہی وجہ ہے کہ ان کو جہنم کی آگ کی دھمکی دی گئی ہے 'جو اس رذالت کے لئے نہایت ہی مناسب جزاء ہے ۔(وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا (٤: ٥٥)) (ان کے لئے جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے)۔

---○○○---

جب بات یہاں تک پہنچی کہ آل ابراہیم میں سے بعض لوگ مومن ہوئے اور بعض نے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا تو اس کے بعد ضروری ہو گیا کہ اہل ایمان کا انجام بھی بتا دیا جائے اور ان لوگوں کا انجام بھی بتا دیا جائے جو راہ ایمان سے روکتے ہیں۔ یہ سزا و جزاء ہر دین میں ہمیشہ اسی طرح رہی ہے اور اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں نہایت ہی شدید اور خوفناک مناظر قیامت کی صورت میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ۖ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿٥٦﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ لَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ ۖ وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ﴿٥٧﴾

”جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے انہیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ خوب عذاب کا مزا چکھیں‘ اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا اور نیک عمل کئے ان کو ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی‘ جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور ان کو پاکیزہ بیویاں ملیں گی اور انہیں ہم گھنی چھاؤں میں رکھیں گے۔“

(نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا (٤ : ٥٦)) ”اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے۔“

یہ ایک ایسا منظر ہے جو مسلسل چلتا ہے۔ ایک ایسا منظر جو نظروں کے سامنے ہے اور بار بار دہرایا جا رہا ہے۔ نظریں اس کے اوپر جم جاتی ہیں۔ خیال ایک جگہ مرکوز ہو جاتا ہے۔ اور اس سے ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ یہ یقیناً ایک خوفناک منظر ہے‘ اس کی خوفناکی فکر و نظر کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس مسلسل اور خوفناک منظر کو صرف ایک لفظ اسکرین پر لاتا ہے یہ لفظ (كُلَّمَا) ہے۔ اور یہ منظر صرف فقرے کے ایک حصے کے ذریعہ خوفناک اور ہولناک بن جاتا ہے۔ (كُلَّمَا

نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ) "جب ان کی کھال گل جائے گی۔" اس کے بعد جملے کے دوسرے حصے میں اس عمل کو خارق عادت عمل اور تعجب انگیز کر دیا جاتا ہے۔ (بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا) "تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے۔" اور یہ تمام ہولناک مناظر اور خوفناک عمل اور عجیب اور معجزانہ منظر صرف ایک جملہ شرطیہ کے اندر تمام ہوتا ہے' صرف ایک جملہ میں۔

یہ کفار کے لئے مناسب اور منصفانہ جزاء ہے۔"تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں۔" (لِيَذُوْقُوْا الْعَذَابَ) اللہ تعالیٰ ہر سزا دینے پر قادر ہے اور سزا سنانے میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔(اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا) اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔

کفار کے لئے اس بھڑکتی ہوئی خوفناک جہنم کے مقابلے میں مومنوں کا انعام کیا ہے۔ان جلتی ہوئی کھالوں' بھونی جانے والی کھالوں کے مقابلے میں کہ جب وہ گل جائیں تو بدل جائیں اور از سرنو جلنے لگیں اور از سرنو تعذیب شروع ہو۔ اس خوفناک منظر اور اس کربناک مشاہدے کے مقابلے میں مومنوں کا انعام و اکرام کیا ہے۔ہم دیکھتے ہیں۔

(وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ) "اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا اور نیک عمل کئے۔" وہ تروتازہ باغات میں ہوں گے۔ (جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ) "جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔" اور یہ منظر نہایت پرسکون' دائمی اور اطمینان بخش ہو گا۔ (خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا) "جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"..... ان باغات میں ان کو پاکیزہ بیویاں میسر ہوں گی۔ (اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ) اور ان باغات میں گھنی چھاؤں نظر آتی ہے نہایت ہی خوشگوار (وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا) "اور ہم انہیں گھنی چھاؤں میں رکھیں گے۔"..... ایک پہلے تھا جزاء کا منظر' ایک یہ جزاء کا منظر ہے۔ اور یہ منظر مشاہدات میں بھی' تصاویر میں بھی اور اثرات میں بھی پہلے منظر کا عین مقابل ہے۔ مناظر قیامت کے بیان میں قرآن کا یہی انداز ہوتا ہے کہ اس میں گہرے اشارے ہوتے ہیں اور موثر اور گہرے اثرات ہوتے ہیں' جو ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

---ooo---

# درس ۳۵ ایک نظر میں

یہ سبق نہایت ہی اہم موضوع پر مشتمل ہے اور یہ موضوع امت مسلمہ کی زندگی کا اساسی موضوع ہے۔ اس میں ایمان کی شرائط اور ایمان کی تعریف بیان کی گئی ہے وہ ایمان جو اس امت کے نظام اساسی کی صورت میں ظاہر ہو' اس موضوع کی اہمیت ایک تو اس کے نفس مضمون کی وجہ سے ہے اور دوسرے نظام اساسی کے ساتھ اپنے طریقہ ارتباط اور امتزاج کی وجہ سے بھی یہ اہم ہے۔

قرآن کریم نے اس امت کو وجود بخشا اور اس کی تربیت کی۔ اس امت کو پوشیدگی سے نکالا گیا' یا عدم سے وجود کی طرف نکالا گیا اور قرآن کریم نے اس کے لئے نہایت ہی جامع انداز تعبیر استعمال کیا۔ (کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳: ۱۱۰)) "تم خیر امت تھے اور تمہیں لوگوں کے لئے نکالا گیا۔"

غرض قرآن نے اس امت کو وجود بخشا' اس لئے کہ وہ قرآن سے پہلے موجود نہ تھی۔ پھر اس نے اس کی تربیت کی تاکہ وہ تاریخ انسانیت میں بے مثال امت بن جائے۔ وہ خیر امت ہو اور (اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ) "اسے لوگوں کے لئے نکالا گیا۔" بات آگے بڑھانے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اس حقیقت کی ذرا وضاحت کر دیں کہ قرآن نے اس امت کو کس طرح پیدا کیا اور کیسے تربیت دی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس امت کا پیدا کیا جانا اور پھر اس کو تربیت دیا جانا' اس کے لئے ایک نیا جنم تھا۔ بلکہ یہ پوری انسانیت کے لئے ایک نیا جنم تھا۔ اس امت کے آنے کے بعد' انسانیت بالکل ایک نئی شکل میں سامنے آئی۔ یہ امت ترقی کی راہ میں ایک مرحلہ نہ تھی' نہ ارتقاء کی منازل میں سے ایک منزل تھی۔ نہ یہ ترقیاتی عمل میں ایک لانگ جمپ تھی بلکہ یہ امت دراصل امت عربیہ اور پھر پوری انسانیت کے لئے ایک نیا جنم تھی۔

جب ہم جاہلیت کے دور کے اشعار پر نظر ڈالتے ہیں اور جاہلیت کے دور کے اکا دکا آثار کا مطالعہ کرتے ہیں جو درحقیقت عربوں کا دیوان ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں عربوں کا نظریہ حیات' ان کا نظریہ کائنات' ان کا نظریہ اخلاق اور سماجی طرز عمل ریکارڈ ہوا ہے۔ اور یہ ان کے دائمی اور بنیادی تصورات ہیں۔ ان اشعار میں ان کی زندگی کے نشانات' ان کے قومی جذبات اور ان کے تصورات کا کل اثاثہ موجود ہے۔ ان کی تہذیب و تمدن کا خلاصہ بھی ان کے اندر ریکارڈ شدہ ہے۔ غرض عربوں کی مکمل شخصیت ان جاہلی اشعار اور دوسرے اکا دکا آثار میں موجود ہے۔

ہم عربوں کے اس دیوان میں ان کے تصورات اور ان کے علم و ثقافت کا مجموعہ دیکھتے ہیں اور ان کے اس دیوان میں موجود ان کی اقدار کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں لیتے ہیں' پھر ہم' وجود' زندگی' کائنات اور انسان کے بارے میں ان کے نقطہ نظر کو دیکھتے ہیں اور ان کے نظام معاشرت اور وجود انسانی کے مقاصد کے بارے میں ان کے تصورات' اور ان تصورات کی اساس پر ان کی عملی تنظیم کو دیکھتے ہیں' پھر ہم عربوں کی عملی صورت حال کا جائزہ قبل از اسلام اور بعد از اسلام

لیتے ہیں اور یہ تقابلی جائزہ ان تصورات کی روشنی میں لیتے ہیں جو ان کے اس دیوان کے اندر پائے جاتے ہیں اور پھر اس کا تقابل ان حالات سے کرتے ہیں جو قرآنی تصورات کے تحت عربی معاشرے میں پیدا ہوئے تو ہمیں نہایت ہی قطعیت کے ساتھ معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآنی تصورات کے تحت یہ جدید معاشرہ عربوں کے لئے ایک جدید جنم تھا۔ یہ ترقی نہ تھی' نہ ترقی کا کوئی مرحلہ تھا' نہ یہ کوئی برق رفتار ترقی تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی صنعت کاری سے اس قوم کا ظہور ہوا' اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے جنم دیا گیا۔ قرآن کریم نے اس کے لئے (اُخْرِجَتْ) کا لفظ بالکل صحیح استعمال کیا ہے۔ اور یہ نشاۃ جدیدہ نہایت ہی حیران کن اور تعجب انگیز تھی اس لئے کہ یہ اس قوم کا پہلا اور آخری ظہور تھا۔ اور دنیا میں یہ واحد مثال ہے کہ ایک کتاب کے دونوں وقایوں کے درمیان سے ایک قوم جنم لیتی ہے۔ ایک امت پیدا ہو جاتی ہے اور ایک کتاب کے الفاظ سے اسے زندگی ملتی ہے لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ یہ کلمات اللہ کے احکامات ہیں۔

اس نکتے پر اگر کوئی ہم سے بحث و مباحثہ کرتا ہے تو بتائے کہ تاریخ کے جس موڑ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے ذریعے اس امت کو برپا کیا' اس سے پہلے یہ امت کہاں تھی۔ جب قرآن کریم نے اسے پیدا کیا اور یہ نکالی گئی تو یہ کہاں تھی؟

ہم جانتے ہیں کہ یہ جزیرۃ العرب میں تھی لیکن کیا اس کا کوئی انسانی وجود تھا؟ انسانی تمدن کے رجسٹر میں اس کا کیا ریکارڈ تھا۔ عالمی تاریخ میں اس کے بارے میں کتنے اوراق موجود تھے۔ انسانیت کے عالمی دسترخوان پر اس کا مقام کہاں تھا۔ اور اس دسترخوان پر اس کی جانب سے کیا تحفہ تھا تاکہ تاریخ یاد کرتی اور یہ ان کی پہچان ہوتی کہ یہ ہے عربوں کا تحفہ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس امت کی نشوونما صرف اس دین کے ذریعے ہوئی اور اس کی تربیت اسلامی نظام زندگی کے زیر سایہ ہوئی۔ اس نے اپنے نفس اور اپنی ذات کی قیادت اور پھر پوری انسانیت کی قیادت اس کتاب کے ذریعے سے کی جو اس کے ہاتھ میں تھی اور اس کتاب کے نظام حیات کے مطابق اس کی زندگی پر چھاپ پڑی۔ صرف قرآن اور صرف قرآن سے وہ وجود میں آئی۔ اس پر تاریخ گواہ ہے۔ اور اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔ (وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ..... اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ) (بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی جس میں تمہارا تذکرہ ہے.... کیا تم عقل نہیں رکھتے۔)

غرض اس کرۂ ارض پر امت عربیہ کا تذکرہ صرف اس کتاب کی وجہ سے ہوا اور تاریخ میں اس کا اہم کردار رہا۔ سب سے پہلے اس نے اپنا ایک انسانی وجود قائم کیا' اس کے بعد اس نے ایک عالمی تمدن و تہذیب کو وجود بخشا۔ لیکن بعض احمق اب یہ چاہتے ہیں کہ وہ امت عربیہ پر اللہ کے اس احسان کا انکار کر دیں اور اس بات کی ناشکری کی جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے انسانوں کے لئے اپنا آخری کلام عربی زبان میں نازل فرمایا اور عربوں کو اس کے اولین مخاطب قرار دیا۔ اس کلام کی وجہ سے ان کو ایک انسانی وجود بخشا' ان کو شہرت اور تاریخ اور تمدن عطا کئے۔ یہ احمق دراصل اس خلعت کو اتارنا چاہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے امت عربیہ کو پہنائی اور وہ اس جھنڈے کو پھاڑنا چاہتے ہیں' جس کی وجہ سے ان کو عزت اور شہرت نصیب ہوئی بلکہ ان کو ایک وجود ملا' جب اللہ نے ان کو بحیثیت امت اٹھایا۔

ہم کہتے ہیں کہ جب اسلام اس امت کی تخلیق کر رہا تھا اور اس کی تربیت کر رہا تھا' جماعت مسلمہ کے اندر اسلام کے جدید خدوخال کے خطوط کھینچ کر ان کو مستحکم کر رہا تھا' اسے جاہلیت کی گہری کھائی سے نکال کر اس کے وجود سے جاہلیت

کے تمام خدوخال مٹا رہا تھا' اس کی زندگی' ان کے نفوس اور اس کے معاشرے کو پاک کر رہا تھا' اس کو منظم کر رہا تھا 'اسے از سرنو کھڑا کر کے اسے جدید جنم دے رہا تھا اس جدید جماعت کو ایک معرکہ کار زار میں اتار رہا تھا اور وہ اپنے نفوس' اپنے اوضاع و اطوار سے سابقہ معاشرتی آثار جاہلیت مٹا رہا تھا۔ اور جس وقت قرآن جماعت کے اندر سے اور اس کے ماحول سے مدینہ منورہ کے اندر منافقین' مشرکین اور یہودیوں کی شکل میں پائے جانے والی جاہلیت کو ختم کر رہا تھا جاہلیت کے ساتھ یہ معرکے رات دن جاری تھے' ہر زمان و مکان میں جاری تھے۔ یہ سب کچھ کرتے ہوئے اس دوران میں قرآن نے سب سے پہلے اس امت کو ایک صحیح تصور حیات دیا۔ اس کے لئے ایمان کی شرائط و حدود وضع کیں' پھر اس تصور کے مطابق اسلام نے اس کے لئے ایک دستوری نظام تجویز کیا جس کی وجہ سے اس کے وجود اور اس کے اردگرد جاہلیت کے وجود کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیا گیا ان کے لئے وہ خصائص و مقاصد متعین کئے گئے جن کے لئے اسے برپا کیا گیا تھا تاکہ وہ لوگوں کے سامنے ان کی تبلیغ کرے اور ان کو اللہ اور اللہ کے ربانی نظام کی طرف دعوت دے۔

اس درس میں اس اساسی نظام کا بیان ہے۔ یہ نظام اس اساسی تصور حیات سے پھوٹتا ہے اور اس پر قائم ہے۔ اور انہی شرائط ایمان اور حدود اسلام کے مطابق ہے۔

پھر اس سبق میں وہ تجدید عہد ہے جس سے یہ امت اپنا نظام حیات لیتی ہے۔ وہ طریقہ بھی بتایا گیا ہے جس کے مطابق وہ اپنا نظام اخذ کرے گی۔ وہ نظام بھی بتایا گیا ہے جس کے مطابق وہ اس چیز کا ادراک کرے گی جسے وہ اخذ کر رہی ہے یا زندگی کے مسائل اور اس کی مشکلات میں اس نظام کی طرف رجوع کرے گی' ان امور میں جن کے بارے میں کوئی نص اور صریح حکم نہیں ہے اور جن میں رائے کا اختلاف ممکن ہے۔ پھر یہ بھی بتایا گیا کہ وہ انتظامیہ کون سی ہے جس کی اطاعت ہوگی اور اس انتظامیہ کی قوت کا مرجع کونسی چیز ہے اور یہ تمام امور ایمان کی شرائط اور تعریفات ہیں۔

یہاں آکر اس امت کا دستوری نظام اس کے نظریہ حیات کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے' یہ اتحاد پھر تحلیل نہیں ہوتا اور نہ ان کے عناصر ترکیبی ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔

یہ ہے وہ اہم موضوع جس کا حق یہ سبق ادا کرتا ہے۔ اس بارے میں مکمل ہدایات دی جاتی ہیں اور اس سے متعلق تمام سوالوں کا جواب دیا جاتا ہے۔ اس سبق کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ اس قدر واضح اور بدیہی ہے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس بارے میں کوئی مسلمان کس طرح مجادلہ کر سکتا ہے.... یہ درس امت کو واضح طور پر بتاتا ہے کہ رسولوں کو بھیجا ہی اس لئے گیا ہے کہ ان کی اطاعت کی جائے اور یہ اطاعت اللہ کے حکم سے ہے اور یہ کہ رسولوں کو محض تبلیغ یا لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا کہ وہ لوگوں کو مسکت دلائل سنا دیں بلکہ (وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ) (اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے وہ صرف اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔)

یہ سبق واضح کرتا ہے کہ لوگ مومن ہی نہ ہوں گے اگر وہ اپنے فیصلے اس نظام قانون کے مطابق نہیں کرتے جو اللہ نے اتارا ہے۔ یہ منہاج رسول اللہ ؐ کی عملی زندگی اور آپ کے احکام میں پایا جاتا ہے اور جو قرآن و سنت کی شکل میں قیامت تک باقی ہے۔ اور یہ بات بھی کافی نہیں ہے کہ وہ اس قانون کے مطابق اپنے فیصلے کرائیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے

کہ وہ دلی رضامندی سے ان فیصلوں کو قبول بھی کریں۔

(فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (٤ : ٦٥))

(نہیں' اے محمد ﷺ تمہارے رب کی قسم 'یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں' پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دل میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں' بلکہ سر تسلیم خم کر لیں۔)

اس سبق میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جو لوگ طاغوت کے پاس اپنے فیصلے لے جاتے ہیں یعنی اللہ کی شریعت کے سوا کسی اور قانون کے مطابق فیصلے کراتے ہیں تو ان سے ان کا یہ دعویٰ قبول نہ ہو گا کہ وہ اللہ کے کلام اور رسول اللہ ﷺ کے احکام پر ایمان لانے والے ہیں 'یا وہ پہلی کتابوں پر ایمان لانے والے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے اور اس پر دلیل ان کا یہ فعل ہے کہ وہ اپنے فیصلے طاغوت کے پاس لے جاتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (٤ : ٦٠))

(اے نبی! تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں' اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں۔ حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان تمہیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔)

اور اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نفاق کی علامت یہ ہے کہ لوگوں کو اس قانون کے مطابق فیصلے کرنے سے روکا جائے جو اللہ نے نازل فرمایا ہے اور جو سنت رسول ﷺ میں ہے۔

(وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (٤ : ٦١)) (اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسول کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں)

یہ سبق کہتا ہے کہ ایمانی طریق کار اور اس کا دستور اساسی یہ ہے کہ تم لوگ اللہ کی نازل کردہ کتاب کی پیروی کرو

اور رسول خدا ؐ کی سنت کی پیروی کرو اور ان اہل ایمان کی اطاعت کرو جو اولو الامر ہیں ۔

(یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (۴ : ۵۹))

(اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ؐ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں)۔

یہ سبق بتاتا ہے کہ جہاں نقطہ نظر مختلف ہو' اور مسائل بالکل نئے ہوں اور ان میں منصوص احکام موجود نہ ہوں تو پھر اللہ و رسول کی طرف رجوع کرو اور قرآن و سنت کی روشنی میں ان کا حل تلاش کرو۔ (فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ (۴ : ۵۹)) "اگر تم کسی چیز میں متنازع ہو جاؤ تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔" اس طریقے سے اسلامی نظام حیات ان مسائل اور حالات کا حل دریافت کر لیتا ہے جو بالکل پہلی مرتبہ نمودار ہوئے ہوں۔ اس قاعدے کے ذریعے اسلام ابدی طور پر نئے نئے مسائل کے حل کی تدبیر کرتا ہے۔ چونکہ اسلام کا دستوری قاعدہ یہ ہے کہ اس وقت تک کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے مسائل اسلامی نظام کے مطابق حل نہ کرے اس لئے اسلامی نظام زندگی کی وسعت کے ساتھ ان کے حل کا یہ طریقہ وضع کرتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ مسائل کو اللہ اور رسول اللہ کی طرف لوٹایا جائے 'کیونکہ یہاں اطاعت شرط ایمان ہے۔ ایمان واضح طور پر مشروط ہے۔ (اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (۴ : ۵۹)) "اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔"

ہمیں اس سے قبل بیان کردہ یہ فرمان الٰہی نہیں بھولنا چاہئے۔ (اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (۴ : ۴۸)) اللہ اس بات کو تو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کا ارتکاب کیا جائے اور اس کے سوا جس گناہ کو چاہے بخش دے۔" یہودیوں کو مشرک قرار دیا گیا' محض اس لئے کہ وہ اپنے احبار کو اللہ کے علاوہ رب قرار دیتے تھے' اس لئے نہیں کہ وہ اپنے ارباب کی عبادت اور بندگی کرتے تھے بلکہ اس لئے کہ انہوں نے ارباب کو حلال و حرام قرار دینے کے اختیارات دے رکھے تھے۔ انہوں نے احبار کو حق حاکمیت اور حق قانون سازی دونوں عطا کر دیئے اور یہ کام انہوں نے اپنی جانب سے کیا تھا۔ اس لئے انہوں نے ان کو اللہ کا شریک بنا لیا تھا جو ناقابل معافی جرم ہے اور اس کے علاوہ تمام جرائم معاف ہو سکتے ہیں۔ حضور ؐ فرماتے ہیں۔ (وَاِنْ زَنَا وَاِنْ سَرَقَ وَاِنْ شَرِبَ الْخَمْرَ) (اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری کی اور شراب نوشی کی)۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے عقیدے کی بات کو اس میں منحصر کر دیا ہے کہ اللہ کے ساتھ حاکمیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس میں وہ منفرد ہے اس لئے کہ الوہیت کی صفات میں سے یہ مخصوص ترین صفت ہے۔ اس کے اندر رہ کر ہی ایک مومن' مومن اور مسلم' مسلم رہ سکتا ہے اور وہ امید رکھ سکتا ہے کہ اس کے گناہ معاف ہوں' چھوٹے ہوں یا بڑے۔ اس سے باہر نکل جائیں تو شرک ہے' جسے اللہ کبھی بھی معاف نہیں فرماتے۔ اس لئے کہ یہ ایمان کی شرط اور اسلام کی تعریف (Definition) ہے۔ (اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (۴ : ۵۹)) (اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے ہو۔)

یہ ہے وہ اہم موضوع جو اس سبق میں زیر بحث ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کرۂ

ارض پر ایک مسلم امت کے فرائض کیا ہیں ۔ مثلاً یہ کہ انہوں نے اللہ کے درست نظام زندگی کے مطابق عدل و انصاف قائم کرنا ہے ۔

(اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (٤:٥٨))

(مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو' اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو' اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے ۔

یہ ہے اس سبق کا اجمالی خاکہ ۔ اب ذرا نصوص پر تفصیلی بحث دیکھئے ۔

---ooo---

# درس ۳ تشریح آیات

# ۵۸ --- تا --- ۷۰

اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا ۙ وَ اِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمۡ بِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا ﴿۵۸﴾

''مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو' اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو' اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔''

یہ ہیں امت مسلمہ کے فرائض اور یہ ہے اس کا ضابطہ اخلاق۔ وہ امانتوں کو ان لوگوں کے سپرد کرتی ہے جو اس کے اہل ہوں۔ اور اگر وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے تو عدل پر کرے گی اور اس نظام اور قانون کے مطابق کرے گی جو اللہ نے سکھایا ہے۔

امانتوں کا آغاز امانت کبریٰ سے ہوتا ہے۔ یہ وہ امانت ہے جس سے فطرت انسان مربوط ہے اور یہ امانت وہی ہے جس کے اٹھانے سے آسمان' زمین اور پہاڑوں نے معذوری کا اظہار کیا تھا' لیکن اسے انسان نے اٹھالیا تھا۔ انسان نے جس بار امانت کو اٹھایا' وہ ہدایت 'معرفت اور ایمان باللہ کی امانت تھی۔ یہ ایمان باللہ' بالقصد' بالارادہ اور کمال توجہ کے لائق ایمان ہے۔ یہ امانت انسان کی فطرت کا تقاضا بھی ہے۔ انسان کے سوا اور جس قدر مخلوق خدا ہے' اس کی جانب سے خدا پر ایمان' ہدایت 'معرفت' طہارت اور اطاعت بلا قصد و ارادہ اور بلا توجہ ہوتی ہے۔ اور وہ طوعا'' و کرہا'' ناموس الٰہی کے فرمان بردار ہوتے ہیں۔ انسان وہ واحد مخلوق ہے کہ اللہ نے اس کی فطرت' اس کی عقل' اس کی معرفت' اس کے ارادے اور اس کی توجہ پر ایمان کو موقوف کر دیا ہے اور اس پر فرض قرار دیا ہے کہ وہ ایمان کی منزل تک پہنچنے کی جدوجہد کرے۔ وہ یہ جدوجہد کرے گا تب اللہ اسے راستہ دکھائے گا۔

( وَ الَّذِیۡنَ جَاہَدُوۡا فِیۡنَا لَنَہۡدِیَنَّہُمۡ سُبُلَنَا ) (جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کی

راہنمائی اپنے راستوں کی طرف کریں گے )۔... یہ ہے وہ پہلی امانت جسے انسان نے دوسری امانتوں کے ساتھ اٹھایا ہے۔

اور پھر اس امانت کبریٰ سے دوسری ماتحت امانتیں اور ذمہ داریاں انسان پر عائد ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ان میں سے اہم امانت شہادت حق کی امانت ہے اور یہ شہادت انسان نے اس دین کی سچائی پر دینی ہے۔ سب سے پہلے مومن کا نفس یہ شہادت دے گا کہ وہ مومن ہے اسے ایمان اور اسلام کا عکاس ہونا چاہئے۔ ایک مومن اپنے شعور و تصورات اور اپنے سلوک اور عمل میں اسلام اور دین کا ترجمان ہو۔ لوگ دیکھتے ہی یہ کہیں کہ یہ ہے نمونہ اسلام اور دین اسلام کا۔ دیکھتے ہی لوگ کہیں کہ یہ دین و ایمان بہت ہی اچھا دین و ایمان ہے جس کے پیروکار ایسے اچھے ہیں' جس کے ماننے والے اس قدر اخلاق و کمالات کے مالک ہیں۔ یہ دین کی شہادت حق ہے جس سے تمام دیکھنے والے متاثر ہوں گے اور یہ بھی ایک امانت ہے۔ دوسری شہادت یہ ہے کہ ایک مومن دین کی دعوت لوگوں کو دے اور لوگوں کے سامنے دین کے فضائل بیان کرے جبکہ خود داعی کے اندر وہ پورے فضائل زندہ موجود ہوں۔ کسی مومن کی ذاتی پاکیزگی اور طہارت کی شہادت کافی نہیں ہے جب تک وہ لوگوں کو اس طرف دعوت نہ دے۔ اگر دعوت نہ دے تو اس نے امانت دعوت ادا نہ کی جو بذات خود امانت ہے۔ اس کے بعد اس دین کی شہادت قیام دین ہے اور اس امانت کی ادائیگی پورے کرۂ ارض پر فرض ہے۔ اس طرح کہ یہ جماعت مومنہ کا بھی منہاج ہو اور تمام بشریت کا بھی منہاج ہو اور اس کام کے لئے ایک مومن انسان کا فرض ہو گا کہ وہ اپنے پورے وسائل اس راہ میں جھونک دے۔ جماعت مسلمہ کے پاس جس قدر وسائل و ذرائع ہوں' وہ اس راہ میں صرف کر دے اور اس نظام کو انسانوں کی زندگی میں قیام کے مرحلے تک پہنچائے۔ اور یہ بھی ایک عظیم امانت ہے جسے ادا کرنا ہے۔ اور یہ ایک شخص کے ذاتی ایمان کی وسعت ہے اور یہ فریضہ اقامت دین نہ کسی فرد کے لئے معاف ہے اور نہ کسی جماعت کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ کہا گیا۔ (اَلْجِهَادُ مَاضٍ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ) (جہاد قیامت تک جاری رہے گا) اور یہ جہاد بھی امانات میں سے ایک اہم امانت ہے۔

ان امانات میں سے وہ امانتیں بھی ہیں جو لوگوں کے باہم معاملات میں پیش آتی ہیں۔ یہ فرض ہے کہ لوگوں کی امانتیں ان کو لوٹائی جائیں۔ معاملات کی امانت اور وہ مالی امانت جو کسی کے پاس رکھی گئی ہو' حکام اور رعایا کو نصیحت کرنے کی امانت' چھوٹے بچوں کی پرورش کی امانت' جماعت کی عزت کی حفاظت کی امانت' اجتماعی اموال کی امانت اور سرحدوں کی حفاظت کی امانت۔ غرض وہ تمام مناصب' فرائض اور تمام سروسز امانت ہیں اور یہ ان لوگوں کے سپرد کر دی جائیں جو ان کے اہل ہوں۔ یہ سب امانتیں ہیں اور اس آیت میں ان کا اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے۔

رہا یہ حکم کہ لوگوں کے درمیان عدل کرو' تو یہ عام ہے اور تمام لوگوں کے لئے ہے۔ یہ حکم نہیں ہے کہ اہل اسلام کے درمیان عدل کرو۔ یہ حکم بھی نہیں ہے کہ اور لوگوں کو چھوڑ کر صرف اہل کتاب کے ساتھ عدل کرو۔ انصاف ہر انسان کا حق ہے اور بحیثیت انسان اسے ملنا چاہئے۔ اسلامی نظام حیات کے اندر عدل کا تعلق اس صفت یعنی صفت الناس کے ساتھ ہوتا ہے اور اسی صفت الناس پر تمام لوگ متحد ہوتے ہیں۔ مومن ہیں تو وہ بھی الناس ہیں' کافر ہیں تو وہ بھی الناس ہیں۔ دوست ہیں یا دشمن' کالے ہیں یا گورے' عربی ہیں یا عجمی' سب کے سب الناس ہیں اور امت مسلمہ کو یہ نگرانی سپرد کی گئی ہے کہ وہ الناس کے درمیان عدل قائم کرے۔ جب بھی اسے لوگوں کے امور کے فیصلے کا موقع ملے۔ یہ

انصاف انسانیت کو اس صورت میں صرف اسلام کے ہاتھوں ملا' صرف مسلمانوں کی حکومت میں ملا' صرف اسلامی قیادت کے دور میں ملا ـ اس دور سے پہلے اور بعد میں انسانیت نے اسے گم پایا ـ اسے کبھی بھی اس کا چکھنا تک نصیب نہ ہوا ـ ایسی شریفانہ اور باعزت صورت میں کہ وہ سب انسانوں کے لئے مہیا ہو' اس لئے کہ وہ انسان ہیں ـ وہ صرف ان طبقات تک محدود نہ ہوں جو الناس کی صفت کے ساتھ کوئی اور صفت بھی رکھتے ہوں ـ

یہ ہے اسلام میں نظام عدالت کی اساس ـ جس طرح امانت اس کے حقدار تک پہنچانا' اسلامی معاشرے کی اساس اور اس کا اصل الاصول ہے ـ ((تفصیلات کے لئے دیکھئے کتاب "نحو مجتمع اسلامی" کا فصل "مجتمع عادل")) اور ان دو احکام یعنی امانت اس کے مستحق کو دینا اور لوگوں کے درمیان عدل کرنا' کے بعد جو تعقیب اور تبصرہ آتا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ یاد رکھو کہ یہ اللہ کی جانب سے ایک نصیحت ہے اور یہ اسی کی ہدایات ہیں' اور کیا ہی اچھی نصیحت اور کیا ہی اچھی ہدایات ہیں یہ ـ (إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ (٤ : ٥٨)) (اللہ تم کو نہایت ہی اچھی نصیحت کرتا ہے ـ)

اب ذرا یہاں توقف کیجئے ـ ذرا دیکھیں کہ اس فقرے کا انداز اور اسلوب کیا ہے ـ اصل بات اس جملے کی ساخت ہے ـ اصل ہے ـ (انَّهُ نَعِمَ ما يَعِظُكُمْ اللّٰه بِه) لیکن اس فقرے میں لفظ اللہ کو مقدم کر کے اسے ان کا اسم بنا دیا گیا ـ اور (نَعِمَ ما) یعنی (نعمّا) کو مع متعلقات (Propositions) خبر کی جگہ رکھا گیا اور اصل خبر کو محذوف کر دیا گیا ـ اس طرح طرز ادا سے یہ ثابت ہوا کہ اللہ کی ذات اور اس وعظ و نصیحت کے درمیان ایک مضبوط تعلق ہے ـ

یہ وعظ تو تھا نہیں بلکہ یہ حکم تھا لیکن امر کا اظہار بلفظ وعظ و نصیحت کیا گیا اس لئے کہ نصیحت اور وعظ کے الفاظ کے ساتھ بات کو انسان جلدی اخذ کرتا ہے اور انسانی وجدان اسے جلدی قبول کر لیتا ہے اور اس طرح یہ بات جلدی نافذ ہوتی ہے کیونکہ اس کے نفاذ میں اختیار' رغبت اور حیاء سب شامل ہوتے ہیں ـ

اس کے بعد آیت میں آخری تعقیب اور نتیجہ آتا ہے اور اس میں تمام معاملے کو اللہ کی نگرانی' اس کی خشیت اور اس سے امید کرم کے حوالے کر دیا جاتا ہے ـ (إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا (٤ : ٥٨)) "اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے ـ" یہاں مامور بہ' یعنی ادائیگی امانات اور قیام عدل بین الناس اور اس بات میں کہ اللہ سمیع و بصیر ہے ایک نہایت ہی لطیف اور واضح مناسبت ہے ـ اللہ سنتا اور دیکھتا ہے ـ وہ دیکھتا ہے کہ تم امانت صحیح ادا کرتے ہو ـ تم عدل صحیح طرح قائم کرتے ہو ـ عدالت کے عمل کو بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ اچھی طرح سنا جائے' اچھی طرح اندازہ کیا جائے اور حالات اور بادی النظر امور کے پیچھے عمیق اسباب کی تلاش کی جائے اور اس کے بعد تمام فیصلے بصیرت افروز سماعت کے بعد ہوں اور سامع صاحب بصیرت و بصارت ہو ـ

---ooo---

اب' امانت داری اور عدل کا معیار کیا ہے؟ امانت و عدل کا طریق اور تصور کیا ہے؟ عدل و امانت کی تعریف کیا ہے اور ان کا نفاذ کیسے ہو گا؟ یعنی زندگی کی ہر سرگرمی اور ہر معاملے میں ـ ـ کیا ہم امانت اور عدل کا مفہوم اور ان کے نفاذ و رواج کے طریقے اور وسائل کو عوام الناس میں مروج رسم و رواج اور اصطلاحات پر چھوڑ دیں اور ان کی عقل جو فیصلہ کرے اسے عدل قرار دیں یا ان کی خواہشات پر چھوڑ دیں ـ

بے شک انسانی عقل و خرد کی اپنی قدر و قیمت ہے اور انسان کی ہدایت اور علم و معرفت کے لئے وہ ایک مسلم ذریعہ

ہے ۔ یہ بات بالکل درست ہے ۔ لیکن یہ انسانی عقل بہرحال افراد اور جماعتوں کی عقل ہوتی ہے اور یہ افراد کسی مخصوص معاشرے کے فرد ہوتے ہیں اور ان پر متعدد چیزیں اثر ڈالتی ہیں ۔ انسانی عقل نام کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا کوئی مطلق اور بے قید مفہوم ہو ۔ اصل چیز یہ ہے کہ میری عقل ہوتی ' فلاں فلاں کی عقل ہوتی اور پھر ان عقلوں کا مجموعہ انسانی عقل ہوتی ہے اور یہ مجموعہ عقل زمان و مکان کے اندر محدود ہوتی ہے ۔ اس لئے یہ عقول مختلف موثرات سے تاثر لیتی ہیں اور کبھی اس طرف مائل ہو جاتی ہیں اور کبھی اس طرف مائل ہو جاتی ہیں ۔

لہٰذا کسی ایسے معیار اور میزان کی ضرورت ہے جو نہ بدلے اور نہ تاثر لے ۔ ان تمام عقول کو اس میزان پر تولا جائے اور اس معیار پر پرکھا جائے اور معلوم کیا جائے کہ ان میں سے کون سی عقل ٹھیک ہے اور کون سی غلط ہے ؟ کون سے احکام ٹھیک اور کون سے غلط ہیں ؟ کون سا تصور ٹھیک اور کون سا غلط ہے ؟ اور ان احکام اور تصورات میں کہاں کہاں غلو' تقصیر' کوتاہی اور انحراف کیا گیا ہے ۔ یہاں عقل کی قدروقیمت یہ ہے کہ وہ انسان کی بھلائی کے لئے ایک آلہ پیدا کیا گیا ہے ۔ تاکہ وہ اس کے ذریعے اپنے احکام اور تصورات کو اس میزان کے مطابق درست کرتا رہے ۔ اس لئے کہ یہ میزان ایک ایسا میزان ہے جو انسان کی خواہشات نفس سے متاثر نہیں ہوتا اور نہ دنیا کے موثرات اس پر اثرانداز ہو سکتے ہیں ۔

رہے وہ اوزان اور پیمانے جو خود انسانوں نے وضع کیے ہیں تو ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے کیونکہ بعض اوقات ان انسانی پیمانوں کے اندر غلطی ہوتی ہے اس لئے ان پیمانوں کے ساتھ ناپی ہوئی اقدار میں بھی غلطی واقع ہو جاتی ہے ۔ یہ غلطی اس وقت تک دہرائی چلی جاتی ہے جب تک لوگ اس اصل معیار اور پیمانے کی طرف واپس نہیں لوٹتے ۔

اللہ تعالیٰ نے یہ میزان انسانوں کے لئے نصب کیا ہے تاکہ اس کے اوپر وہ امانتوں اور نظام عدالت کو استوار کریں اور تمام دوسری اقدار کو بھی اس پر تولیں ۔ اپنے تمام احکام اور تمام حالات زندگی کو اس پر پرکھیں ' زندگی کے ہر میدان میں ۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُوا۟ ٱلرَّسُولَ وَأُو۟لِى ٱلْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَٰزَعْتُمْ فِى شَىْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى ٱللَّهِ وَٱلرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴿٥٩﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں' پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو ۔ اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو ۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے ۔"

اس مختصر آیت میں اللہ تعالیٰ ایمان کی شرط اور اسلام کی تعریف بیان کرتے ہیں ' اور اس میں امت مسلمہ کا اساسی دستور بھی آ جاتا ہے ۔ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام میں حاکمیت اور اقتدار کا منبع کونسا ہے ۔ یہ سب کام اللہ سے شروع ہوتے ہیں اور اللہ کی ذات پر ہی ان کا اختتام ہوتا ہے ۔ اگر شریعت میں کسی حکم کے بارے میں تفصیلات نہ ہوں تو پھر لازماً اسلام اس

دستوری اصول کی طرف رجوع کر کے اپنے تمام جزئی مسائل میں جواب حاصل کر سکتے ہیں اور قیامت تک یہ اساسی دستوری اصول قائم و دائم ہے۔ اس میں لوگوں کی آراء اور ان کی عقلی کاوشوں کے لئے اختلاف کی گنجائش بھی چھوڑی گئی ہے۔

انسانوں کی زندگی پر حاکمیت کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے، چاہے ظاہری امر ہو یا پوشیدہ ہو، چاہے بڑا معاملہ ہو یا چھوٹا۔ ان معاملات میں اللہ تعالیٰ نے شریعت کا حکم مقرر فرمایا ہے۔ اور رسول خدا ؐ کی سنت اس کے بارے میں موجود ہے اس لئے کہ حضور ؐ نے محض ہوائی باتیں نہیں کیں۔ آپ کی تمام باتیں وحی پر مبنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے جو قانون بنائے وہ بھی اللہ کے قوانین ہیں۔

اللہ واجب الاطاعت ہے۔ اللہ کی الوہیت کا اہم خاصہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کے لئے شریعت بنائے۔ اس لئے اس کی شریعت واجب النفاذ ہے اور جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کریں۔ اور پھر وہ رسول اللہ کی اطاعت کریں اس لئے کہ رسول جو کچھ کہتا ہے وہ بھی اللہ کے حکم سے کہتا ہے۔ رسول کی اطاعت میں اللہ کی اطاعت ہے کیونکہ اللہ ہی نے رسول کو یہ شریعت دے کر بھیجا ہے۔ اس نے اپنی سنت میں شریعت کو لوگوں کے لئے بیان کیا ہے اس لئے آپ کی سنت اور آپ کے فیصلے اس زاویے سے شریعت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ لوگوں کے ایمان کا تعلق شریعت کے اس نفاذ سے ہے وجوداً" اور عدماً" اس لئے کہ اللہ کا حکم ہے کہ (اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (۴:۵۹)) (اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔)

یہاں (وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ) (یعنی تم میں جو صاحب امر ہوں) سے مراد بھی متعین کر دی جاتی ہے۔ یعنی وہ تم میں سے ہوں، یعنی وہ لوگ جن کے اندر شرط ایمان اور اسلام کی تعریف (Definition) پائی جاتی ہو۔ یعنی وہ لوگ جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں جو حق قانون سازی اور حق اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کو دیتے ہیں اور ان معاملات میں صرف اللہ تعالیٰ سے ہدایات اخذ کرتے ہوں۔ ان حالات میں جن میں منصوص ہدایات آگئی ہیں نیز جن معاملات میں انسانوں کے فہم و ادراک میں اختلاف رائے ہو اور جن میں کوئی نص وارد نہ ہوئی ہو ان میں بھی وہ اللہ اور رسول اللہ ؐ کی طرف رجوع کریں اور ان مسائل میں ان اصولی احکام کو منطبق کریں جو وارد ہیں اور منصوص ہیں۔

اس نص میں بطور اصلیت اللہ کی اطاعت کو لازم کیا گیا ہے، نیز اس میں رسول اللہ ؐ کی اطاعت کو بھی اصل اطاعت قرار دیا گیا ہے۔ اس حیثیت سے کہ یہ اللہ کے فرستادہ ہیں (وَ اُولِي الْاَمْرِ) کی اطاعت اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کے تابع اطاعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ (وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ) کے ساتھ لفظ (اَطِيْعُوا) کو تیسری بار نہیں لایا گیا۔ جیسا کہ اللہ اور رسول اللہ ؐ کے ساتھ لفظ (اَطِيْعُوا) دہرایا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ (وَ اُولِي الْاَمْرِ) کی اطاعت اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت سے ماخوذ ہے۔ جبکہ (وَ اُولِي الْاَمْرِ) کے ساتھ (مِنْكُمْ) کے لفظ کے مطابق ان کا اہل ایمان میں سے ہونا ضروری ہے۔ یہ اولی الامر کے لئے شرط ہے۔

ان تمام تاکیدوں کے ساتھ ساتھ اولی الامر کی اطاعت ان اوامر میں سے ہے جو اللہ کی طرف سے منصوص اور مشروع ہوں اور حدود اللہ کے اندر ہوں اور ان اوامر کے خلاف کوئی نص وارد نہ ہو۔ نیز یہ اوامر اور احکام اصول شریعت کی روشنی میں بھی شریعت کے خلاف نہ ہوں۔ حضور ؐ کی سنت میں علی وجہ الیقین ان حدود و قیود کا تعین کر دیا گیا ہے جن کے مطابق اُولی الامر کی اطاعت کی جاتی ہے۔

صحیحین میں حضرت اعمش ﷺ کی حدیث میں ہے (اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِیْ مَعْرُوْفٍ) (اطاعت صرف معروف طور پر جائز کاموں میں)۔

صحیحین میں یحییٰ القطان کی حدیث ہے۔ (السمع و الطاعة علی المرء المسلم فیما احب او کره مالم یومر بمعصیة و اذا امر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة)

(سمع اور اطاعت ہر مسلم شخص پر لازم ہے ایسے امور میں بھی جو وہ پسند کرے اور ایسے امور میں بھی جنہیں وہ ناپسند کرے' اس وقت تک جب تک اسے معصیت کا حکم نہ دیا گیا ہو۔ اگر اسے معصیت کا حکم دیا گیا تو اس پر نہ سمع لازم ہے اور نہ اطاعت)۔

مسلم نے ام الحصین کی حدیث نقل کی ہے۔

(ولو استعمل علیکم عبد یقودکم بکتاب اللہ اسمعوا لہ و اطیعوا) (اگر تم پر کوئی غلام مقرر کر دیا جائے جو تمہاری قیادت کتاب اللہ کے مطابق کرے تو اس کی بات بھی سنو اور اطاعت بھی کرو)۔

اس طرح اسلام نے ہر شخص کو اللہ کی شریعت اور سنت رسول اللہ ؐ پر امین اور نگہبان بنا دیا ہے۔ اس کے ایمان اور اس کے دین پر اسے نگران مقرر کر دیا ہے۔ اس کے نفس اور اس کی عقل کا اسے نگران مقرر کر دیا ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں میں اس کے معاملات کا اسے نگران مقرر کر دیا ہے۔ اسلام نے انسان کو اس طرح نہیں چھوڑا ہے جس طرح کسی گلے میں ایک جانور ہوتا ہے کہ اسے یہاں سے روکا جائے اور وہاں سے روکا جائے اور وہ سمع و اطاعت نہ کرے اور ہروقت اسے ہش کہنے کی ضرورت ہو' اس لئے کہ اسلامی نظام واضح ہے۔ اطاعت کی حدود واضح ہیں۔ اسلامی قانون و شریعت اور قرآن و سنت واضح ہیں اور ایک ہیں۔ ان میں تعدد نہیں ہے' ان میں کوئی تفریق نہیں ہے اور کوئی فرد اس میں شکوک و شبہات کا شکار نہیں ہوتا۔

یہ تو ان امور کا معاملہ ہے جس میں نص صریح وارد ہو۔ لیکن وہ معاملات جن میں قرآن و سنت کی واضح نصوص وارد نہیں ہیں' اور مشکلات اور مسائل کی وجہ سے کوئی بالکل نیا معاملہ درپیش ہو' بعد میں آنے والے ادوار میں حالات کے اختلاف میں اور سوسائٹیوں کے اختلاف میں اور بدلتے ہوئے حالات ہوں اور ان میں کوئی نص قطعی نہ ہو یا بالکل کوئی نص ہی نہ ہو' جس میں مختلف لوگوں کے آراء اور اندازے مختلف ہوں' اور ہر شخص اپنی عقل کے مطابق رائے رکھتا ہو تو ایسے مسائل کو بھی بالکل آزادانہ نہیں چھوڑ دیا گیا' ان کو بھی بغیر کسی اصول اور قاعدے کے نہیں چھوڑا گیا۔ نہ اس طرح چھوڑ دیا گیا کہ ان میں اجتہاد و استنباط کے لئے کوئی ضابطہ نہیں ہے بلکہ اس مختصر نص میں اس کے لئے ایک شاندار منہاج رکھ دیا گیا ہے اور اس کے لئے بھی حدود مقرر کر دیئے گئے ہیں اور یہ آیت وہ اصول بتا دیتی ہے جس کے مطابق اجتہاد ہو سکتا ہے۔

(فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (۴ : ۵۹)) (پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو)۔ یعنی ان کو ان نصوص کی طرف لوٹا دو' جن پر یہ

نصوص ضمناً" منطبق ہوتی ہیں ۔ اگر ایسی نصوص نہ ملیں جن کا انطباق ان مسائل پر ہوتا ہو تو اسلامی شریعت میں جو بنیادی اصول اور عام قواعد ہیں ان کی روشنی میں ان کا حل نکالو' ان مسائل کو افراتفری کے عالم میں بے لگام نہیں چھوڑ دیا گیا' اور نہ یہ مسائل ان نامعلوم امور کی طرح ہیں جن میں انسانی عقول سرگردان رہتی ہیں جیسا کہ بعض دھوکہ باز اس طرح سمجھانے کی سعی کرتے ہیں ۔ اسلامی نظام میں بعض اساسی اور بنیادی اصول ہیں اور یہ اصول بالکل واضح اور منقح ہیں ۔ انسانی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہیں ۔ یہ اصول زندگی کے لئے ایسی باڑ اور ایسا دائرہ تجویز کرتے ہیں جن کے اندر رہ کر ہر وہ شخص جس کا ضمیر مسلم ہو سچائی تک بڑی سہولت کے ساتھ پہنچ سکتا ہے ۔

(اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (٤ : ٥٩)) (اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو)۔ یہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے ۔ یہ اولی الامر کی اطاعت ہے جو مومن ہوں اور اللہ کی شریعت پر قائم ہوں اور سنت رسول کے مطابق کام کر رہے ہوں ۔ یہ متنازع امور کا اللہ اور رسول اللہ کی طرف رد کرنا' یہ تمام امور شرائط ایمان باللہ اور یوم آخرت میں سے ہیں اور یہ سب امور ایمان باللہ اور ایمان بالاخرت کا تقاضا بھی ہیں ۔ اگر یہ شرائط مفقود ہوں تو سرے سے ایمان ہی نہ ہو گا ۔ اسی طرح ایمان اس صورت میں بھی موجود نہ ہو گا اگر ایمان کے لازمی تقاضے پورے نہ ہوں ۔

جب اس آیت نے اس مسئلے کو اس طرح قانونی انداز میں ہمارے سامنے رکھ دیا تو اس کے بعد پھر اسے بطور وعظ و نصیحت بھی دوبارہ لایا جاتا ہے اور محبت کے انداز میں انہیں آمادہ کیا جاتا ہے 'جس طرح امانت اور عدالت کے احکام کے ذکر کے بعد یہی رویہ اختیار کیا گیا تھا ۔

ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (٤ : ٥٩)) (یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے )۔ یہ طریق کار اور دستور العمل تمہارے لئے بہت ہی اچھا ہے ۔ دنیا میں بھی خیر ہے اور آخرت میں بھی خیر ہے ۔ دنیا میں بھی اس کا انجام اچھا ہو گا اور آخرت میں بھی اس کی جزاء اچھی ہوگی ۔ مسئلہ صرف یہ نہیں ہے کہ اس دستور العمل پر عمل کرنے کی وجہ سے اللہ راضی ہو گا اور آخرت میں ثواب ملے گا ۔ اگرچہ یہ بھی ایک عظیم اور اہم بات ہے لیکن اس کے علاوہ اس دستور العمل کو اختیار کرنے کی وجہ سے دنیا میں بھی بہتری ہے ۔ ایک فرد کی' ایک سوسائٹی کی اور اس پوری دنیاوی زندگی کی بھی اس میں بہتری ہے ۔

اسلامی نظام حیات ایک ایسا نظام ہے کہ اس کے زیر سایہ جن لوگوں کو زندگی بسر کرنے کا موقعہ ملتا ہے وہ خوش و خرم زندگی بسر کرتے ہیں کیونکہ یہ ایک ایسا نظام ہے جسے اس اللہ نے بنایا ہے ۔ وہ صانع 'حکیم 'علیم ' خبیر اور بصیر ہے ۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جو انسان کی جہالتوں سے پاک ہے' جو انسان کی خواہشات سے پاک ہے 'جو انسان کے نقائص سے پاک ہے ۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں کسی فرد کے ساتھ کوئی خصوصی برتاؤ نہیں کیا گیا' نہ کسی طبقے ' نہ کسی قوم' نہ کسی نسل اور نہ کسی خاص قبیلے کی رورعایت اس میں ملحوظ رکھی گئی ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کے رب ہیں 'اور اللہ تعالیٰ کسی کی محبت میں مبتلا نہیں ہوتے کسی طبقے ' نہ کسی رنگ و نسل اور نہ کسی قوم قبیلے کی محبت میں ۔

یہ ایک ایسا نظام ہے جس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا بنانے والا پوری کائنات کو بنانے والا ہے جو انسان کی فطرت کی ماہیت سے واقف ہے ۔ وہ انسان کے نفس کے رجحانات و میلانات سے بھی واقف ہے ۔ انسان کے ذرائع خطاب اور اس کے طریقہ اصلاح سے بھی واقف ہے اس لئے اللہ تعالیٰ سے کسی معاملے میں غلطی صادر نہیں ہو سکتی ۔ نہ اسے یہ ضرورت ہے کہ وہ کسی نظام کا تجربہ کر کے اس کی غلطیوں کو دور کرے اور نہ وہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ لوگوں پر نظاموں کے تجربے کر کے انہیں مشکلات سے دوچار کرے اور وہ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں اور پریشان ہوں ۔ اللہ تعالیٰ نے یہ قانونی اور اخلاقی نظام دے کر مادی ایجادات کا ایک وسیع میدان ان کے لئے چھوڑ دیا ہے کہ وہ اس میں تجربے کرتے رہیں ۔ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جو انسانی عقل کی جولانیوں کے لئے بہت ہی کافی ہے ۔ عقل کے لئے بس یہی کافی ہے کہ وہ اس نظام کو نافذ اور مسائل پر منطبق کرنے کا کام جاری رکھے اور اس میں جہاں جہاں قیاس اور اجتہاد کی ضرورت ہے وہاں کام کرتی رہے ۔

پھر اسلامی نظام کی واضع وہی ذات ہے جو اس کائنات کی خالق ہے اس لئے اس نے انسان کو ایک ایسا منہاج دیا ہے جو اس کائنات کے نوامیس فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔ یہ نظام فطرت کے ساتھ معرکہ آراء نہیں ہوتا بلکہ وہ فطرت کی ساتھ ہم نوا ہوتا ہے' اس کو مانتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے ۔ یہ نظام اس کی راہنمائی بھی کرتا ہے اور اس کو بچاتا بھی ہے ۔

اس نظام کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ انسانیت کی ہدایت اور حمایت کے ساتھ ساتھ یہ اس کا اکرام اور احترام بھی کرتا ہے ۔ اس نظام میں عقل انسانی کے لئے ایک وسیع دائرہ کار رکھا گیا ہے اور اس میں قرآن و سنت کی نصوص و ہدایات کے اندر تشریح و اجتہاد کی گنجائش موجود ہے ۔ پھر وہ معاملات جن میں واضح نصوص وارد نہیں ہیں ان کو اصول عامہ کے مطابق حل کرنے کی سعی کی گنجائش ہے ۔ اس کے علاوہ وہ اصل میدان کار بھی ہے جو اس نظام نے عقل کی بہتری کے لئے خالی رکھا ہے' جس پر اس کا مکمل کنٹرول ہے یعنی علمی تحقیقات اور سائنس کے میدان میں اکتشافات اور مادی ایجادات ۔ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (٤ : ٥٩) (یہ بہتر ہے اور اچھا طریقہ کار ہے)

---ooo---

اس سبق میں اس قاعدہ کلیہ کے بیان کے بعد نیز ایمان کی شرط اور اسلام کی تعریف کرنے کے بعد' امت کا دستور اساسی (GrundNorm) وضع کرنے کے بعد' امت کے لئے طریقہ قانون سازی اور اس کی اصل بتانے کے بعد' اب روئے سخن ان لوگوں کی طرف پھر جاتا ہے جو اس دستوری اساس سے انحراف کرتے ہیں اور پھر بھی وہ یہ زعم رکھتے ہیں کہ وہ مومن ہیں حالانکہ وہ ایمان کی شرط اور اسلام کی تعریف (Definition) کے خلاف جا رہے ہیں وہ اپنی عدالتوں میں فیصلے ایسے قانون کے مطابق کرتے ہیں جو اللہ کی شریعت کے مطابق نہیں ہے ۔ (اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ) (وہ اپنے فیصلے طاغوتی قانون کے مطابق کراتے ہیں حالانکہ ان کو حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ اس کا انکار کریں ۔)

روئے سخن اس طرف پھرتے ہی ایسے لوگوں پر سخت تعجب کیا جاتا ہے' ان لوگوں کو سخت ڈرایا جاتا ہے کہ وہ ذرا سوچیں کہ شیطان انہیں کس طرف لے جا رہا ہے۔ یہاں ایسے لوگوں کا حال بتایا جاتا ہے کہ جب انہیں اسلامی قانون کو نافذ کرنے اور اس کے مطابق فیصلے کرنے کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ نہایت ہی منافقانہ روش کے مطابق اسے روکنے کی سعی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی روش کو روش نفاق بتاتے ہیں۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ شیطانی قانون کے مطابق فیصلے کرانے کا ارادہ کرتے ہی انسان ایمان سے فارغ ہو جاتا ہے بلکہ یہ لوگ ابتداء ایمان میں داخل ہی تصور نہیں ہوتے۔ یہاں یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ ان کے عذرات کس قدر بورے ہیں اور کس قدر واہیات اور جھوٹے ہیں اور ان کا یہ منصوبہ نہایت ہی قابل نکیر و مذمت ہے اور اس کے نتیجے میں ان پر وبال آنے ہی والا ہے۔ اس کے باوجود حضورؐ کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ دعوت و موعظت جاری رکھیں۔ پھر بات کو اس پر ختم کیا جاتا ہے کہ رسولوں کو بھیجا ہی اس لئے گیا ہے کہ ان کی اطاعت کی جائے۔ اس کے بعد صریح اور قطعی الفاظ میں' ایک بار پھر ایمان کی شرط اور اسلام کی تعریف (Diffinition) بیان کی جاتی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ
قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ
وَ يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿۶۰﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى
مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾
فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖۗ
بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّ تَوْفِيْقًا ﴿۶۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا
فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ عِظْهُمْ وَ قُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا
بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ
اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ

لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ﴿۶۴﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ
فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ
يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾

"اے نبی ؐ تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں 'مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں' حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسول کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں۔ پھر اس وقت کیا ہوتا ہے جب ان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوئی مصیبت ان پر آپڑتی ہے؟ اس وقت یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کی قسم ہم تو صرف بھلائی چاہتے تھے اور ہماری نیت تو یہ تھی کہ فریقین میں کسی طرح موافقت ہو جائے ..... اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ ان سے تعرض مت کرو' انہیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو جو ان کے دلوں میں اتر جائے۔ (انہیں بتاؤ کہ) ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ اذن خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔ اگر انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے تو تمہارے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے' اور رسول بھی ان کے لئے معافی کی درخواست کرتا' تو یقیناً اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔ نہیں' اے محمد ؐ تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں' پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں' بلکہ سربسر تسلیم کر لیں۔"

بعض لوگوں کی یہ تصویر جو ان آیات میں کھینچی گئی ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات ہجرت کے ابتدائی ایام میں نازل ہوئی تھیں۔ اس دور میں جس میں نفاق کا بہت زور تھا اور یہودی منافقین کے ساتھ مل کر ایک زور آور قوت تھے۔

یہ لوگ جو یہ ارادہ رکھتے تھے کہ قانونی فیصلے طاغوت کے مطابق ہوں' یہ لوگ منافقین تھے جیسا کہ آیات کے اس مجموعے کی دوسری آیت میں اس کی تصریح بھی کر دی گئی ہے۔ ان سے مراد یہودی بھی ہو سکتے ہیں اس لئے کہ جب ان کو یہ دعوت دی جاتی تھی کہ وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرانا تسلیم کریں تو وہ انکار کر دیتے تھے اور اس بات کی خواہش رکھتے تھے کہ اس قانون کے مطابق فیصلے کرائیں جو دور جاہلیت میں رائج تھا۔ (اس لئے کہ یہودیوں کے آپس کے فیصلے تورات کے مطابق ہوتے تھے۔ یہاں کتاب سے تورات مراد ہو گا اور بعض اوقات یہودیوں کے فیصلے بھی رسول اللہ ؐ کرتے جیسا کہ بعض فیصلوں سے معلوم ہوتا ہے) لیکن یہاں صرف پہلی صورت ہی مراد ہے یعنی کتاب اللہ سے مراد قرآن کریم ہے کیونکہ

آیت - (یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ (۴: ۶۰)) (جن کا زعم یہ ہے کہ وہ ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور اس پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی ہے) لہذا یہاں مراد منافقین ہی ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ یہودیوں نے کبھی اپنے اس زعم کا اظہار نہیں کیا کہ وہ رسول ؐ خدا پر نازل کردہ کلام کو مانتے ہیں۔ یہ اظہار منافقین ہی کرتے تھے کہ وہ نبی ؐ اور آپ سے پہلے نازل ہونے والی تمام کتابوں پر ایمان لائے ہیں۔ یعنی ایسا ایمان جیسا کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ہم تمام رسل پر ایمان لاتے ہیں۔

اور یہ بات صرف ہجرت کے ابتدائی ایام ہی میں ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے کہ بنی قریظہ اور خیبر میں یہودیوں کی قوت کو توڑ دیا جائے اور قبل اس کے کہ یہودیوں کی قوت کو توڑنے سے خود منافقین کی قوت بھی ٹوٹ جائے۔

بہرحال ان آیات میں ہمیں شرائط ایمان کی ایک قطعی 'مکمل اور جامع مانع شرط اور اسلام کی مکمل تعریف مل جاتی ہے اور ہمیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ شہادت مل جاتی ہے کہ جو لوگ طاغوت کے مطابق فیصلہ کرنے کا ارادہ بھی کریں' وہ مومن نہیں ہیں' اس لئے کہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ طاغوت کا انکار کریں۔ (وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِه) اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس مجموعہ آیات میں ہمیں ایک حلفیہ بیان ملتا ہے اور ذات باری خود اپنی ذات کی قسم کھاتے ہیں کہ یہ لوگ اس وقت تک ایمان میں داخل نہیں ہو سکتے اور اس وقت تک مومن شمار نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ رسول اللہ ؐ کو اپنے مقدمات کے اندر حکم نہ بنائیں اور پھر آپ ؐ کے حکم کی اطاعت نہ کریں' آپ کے فیصلے کو نافذ نہ کریں اور یہ اطاعت کامل تسلیم و رضا کے ساتھ نہ ہو اور دل کی خوشی کے ساتھ نہ ہو یعنی ایسی حالت میں تسلیم کرنا کہ اس میں عجز و اضطرار نہ ہو بلکہ مکمل اطمینان و رضا ہو۔

(اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِه وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًا بَعِیْدًا (۴: ۶۰))

"اے نبی ؐ تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں 'مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں' حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔"

کیا آپ نے ایسی عجیب و غریب قوم کے لوگوں کو نہیں دیکھا جن کا زعم یہ ہے کہ وہ مومن ہیں اور پھر وہ آن واحد میں اپنے اس زعم کو باطل قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ (یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ (۴: ۶۰)) یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان لائے ہیں جو تیری طرف نازل ہوئی ہے اور اس پر بھی جو تجھ سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اس دعویٰ ایمان کے بعد وہ اپنے فیصلے اس کتاب کے مطابق نہیں کراتے جو آپ پر

نازل ہوئی ہے' نہ وہ اس کتاب کے مطابق فیصلے کراتے ہیں جو تم سے پہلے نازل ہوئی اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی اور چیز کے مطابق فیصلے کرائیں 'کسی اور نظام کے مطابق فیصلے کرائیں ۔ کسی اور حکم کے مطابق فیصلے کرائیں ۔ بلکہ وہ یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ طاغوت کے مطابق فیصلے کرائیں اور طاغوت وہ ہے جو اس کتاب سے ماخوذ نہ ہو جو آپ کی طرف نازل ہوئی یا اس کتاب سے ماخوذ نہ ہو جو آپ سے پہلے نازل ہوئی اور اس کا ضابطہ اور معیار تم پر نازل کردہ کتاب یا کتب سابقہ سے اخذ نہ ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ طاغوت' طاغوت ہے اور طاغوت اس لئے ہے کہ وہ اللہ کے خاصہ حاکمیت اور تشریع کا دعویٰ کرتا ہے اور وہ طاغوت اس لئے ہے کہ وہ کسی مستقل معیار پر قائم نہیں ہے ۔ یہ لوگ محض جہالت کی وجہ سے یہ حرکت نہیں کرتے نہ کسی شبہ کی بنا پر کرتے ہیں ۔ وہ اچھی طرح جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں حالانکہ اس طاغوت کے پاس اپنے فیصلے لے جانا حرام ہے ۔ (وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ (۴ : ۶۰))

ان کو حکم تو یہ دیا گیا ہے کہ وہ اس کا انکار کریں ۔ یہ لوگ جہالت یا شبہ کی وجہ سے ایسا نہیں کرتے ۔ بلکہ یہ لوگ قصداً ایسا کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ گمان درست نہیں ہے' یہ زعم درست نہیں ہے کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان لائے ہیں اور آپ سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں پر بھی ایمان لائے ہیں ۔ یہ تو شیطان ہے جو ان کو گمراہ کرنا چاہتا ہے' اس طرح کہ وہ اس سے باز نہ آسکیں ۔

(وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا (۴ : ۶۰)) (اور شیطان انہیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے) یہ وہ خفیہ سبب ہے جس کی وجہ سے وہ لوگ طاغوت کے مطابق فیصلہ کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور یہی وہ داعیہ ہے جو ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ایمان کی حدود اور ایمان کی شرائط سے نکل جائیں اور ارادہ کرلیں کہ وہ طاغوت کے مطابق فیصلے کرائیں گے ۔ یہی وہ سبب ہے جس کا اللہ تعالیٰ انکشاف فرماتے ہیں تاکہ وہ اپنے اس ارادے سے باز آجائیں ۔ اور جماعت مسلمہ کو بھی بتایا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی پشت پر کون ہے؟ اور اس کا اصل محرک کیا ہے؟

اب آگے کے مضمون میں وہ حالات بتائے جاتے ہیں جب ایسے لوگوں کو اس طرف بلایا جاتا ہے کہ آؤ اس قانون کی طرف جو اللہ نے حضرت محمد ﷺ کی طرف نازل کیا ہے یا اس قانون کی طرف جو آپ ﷺ سے پہلے نازل ہوا ہے' تو یہ لوگ جو زعم ایمان رکھتے ہیں' کھسکتے ہیں ۔

(وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (۴ : ۶۱)) "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسول کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں ۔"

سبحان اللہ' نفاق خود اپنے آپ کو آشکارا کر رہا ہے ۔ وہ اس بات پر تلا ہوا ہے کہ فطری سوچ کی واضح ترین باتوں کا بھی انکار کر دے ۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ نفاق کی صورت حال نہ ہوتی ۔

ایمان کا فطری اور واضح تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان اس قانون کے مطابق اپنے فیصلے کرے جس پر اس کا ایمان ہے

اور اپنے فیصلے اس عدالت میں لے جائے جس پر وہ ایمان لایا ہو۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لایا ہے اور جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس پر بھی ایمان لایا ہے' رسول پر ایمان لایا ہے اور جو کچھ اس پر نازل ہوا ہے اس پر بھی ایمان لایا ہے ' پھر ایسے شخص کو اگر بلایا جاتا ہے کہ وہ اپنے فیصلے اس حکم اور قانون کے مطابق کرائے جس پر وہ ایمان لایا ہے تو اس دعوت کا بدیہی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ اس کو تسلیم کرے اور یہی تقاضائے فطرت ہے ۔ لیکن اگر وہ انکار کرتا ہے اور اس راہ پر آنے سے لوگوں کو روکتا ہے تو وہ بالکل ایک واضح 'فطری اور بدیہی امر سے انکار کرتا ہے ۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ منافق ہے اور اس نے جو دعوائے ایمان کیا ہے ' وہ جھوٹا ہے ۔

یہی وہ فطری اور بدیہی صورت حال ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے ۔ چنانچہ یہ آیت انہی لوگوں کے بارے میں ہے جو دعوائے ایمان کرتے ہیں اور پھر اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے بلکہ ان کو کوئی بلائے بھی تو اس طرح فیصلے کرانے سے کتراتے ہیں ۔

اس کے بعد ان کے طرز عمل سے ایک اور منافقانہ چال کو ظاہر کیا جاتا ہے 'کہ جب ایسے لوگ کسی مشکل میں پڑتے ہیں یا ان کی غلط پالیسی کی وجہ سے کوئی حادثہ ہو جاتا ہے (اور یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی حاکمیت کی طرف نہیں آتے یا اس وجہ سے کہ وہ طاغوت کے مطابق کوئی فیصلہ کرانا چاہتے ہیں اور اس وجہ سے ان کی پوزیشن خراب ہو جاتی ہے ) تو پھر یہ لوگ اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے عذرہائے لنگ سے کام لیتے ہیں ۔

(فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا (٤ : ٦٢)) "پھر اس وقت کیا ہوتا ہے جب ان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوئی مصیبت ان پر آ پڑتی ہے؟ اس وقت یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کی قسم ہم تو صرف بھلائی چاہتے تھے اور ہماری نیت تو یہ تھی کہ فریقین میں کسی طرح موافقت ہو جائے ۔

یہ لوگ مصیبت میں یوں پڑ جاتے تھے کہ بہت سے لوگوں کے مجمع میں ان کا راز کھل جاتا تھا ۔ اور اسلامی معاشرہ میں ان کا مقاطعہ ہو جاتا تھا' یا اسلامی معاشرے میں ان کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا ۔ اس طرح یہ لوگ بڑی مشکل میں پھنس جاتے تھے 'اس لئے کہ اسلامی معاشرہ ایسے لوگوں کو دیکھ ہی نہ سکتا تھا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہوں کہ وہ اللہ اور اس کی کتاب اور رسول اللہ ؐ اور اس پر نازل شدہ کلام پر ایمان لائے ہیں اور پھر وہ اللہ کے قانون کے سوا کسی اور قانون پر فیصلے کراتے ہوں ۔ ایسے لوگوں کو ان معاشروں میں قبولیت حاصل ہوتی ہے جو نہ مومن ہوتے ہیں اور نہ مسلم ۔ اور جو اس قسم کے لوگوں کی طرح نام نہاد مسلمان ہوتے ہیں اور ان کا اسلام اور ایمان صرف دعوے اور نام تک محدود ہوتا ہے ۔

بعض اوقات وہ مصیبت میں یوں پڑتے ہیں کہ وہ طاغوتی عدالت میں جاتے ہیں اور ان پر ظلم ہو جاتا ہے اس لئے کہ وہاں اللہ کے قانون کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلے کر دیئے جاتے ہیں ۔ اب انہیں شرمندگی ہوتی ہے اور افسوس کے ساتھ لوٹتے ہیں کہ کیوں وہ طاغوت کی عدالت میں گئے اور ان پر ظلم ہوا ۔ اگر وہ اپنا مقدمہ اسلامی عدالت میں لاتے تو انصاف ہوتا ۔

بعض اوقات ان پر یہ مصیبت اللہ کی جانب سے بطور ابتلاء آتی ہے تاکہ وہ غور و فکر کر کے ہدایت قبول کر لیں۔ بہرحال جو صورت بھی ہو، قرآن کریم استفہام انکاری کی صورت میں سوال کرتا ہے کہ اس وقت ان کا حال کیا ہوتا ہے کہ یہ لوگ پھر لوٹ کر رسول اللہ ؐ کے پاس آتے ہیں۔

(يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا (٤ : ٦٢)) "خدا کی قسم ہم تو بھلائی چاہتے تھے، ہماری نیت تو یہ تھی کہ فریقین میں کسی طرح موافقت ہو جائے۔"

یہ نہایت ہی شرمناک صورت حال ہے۔ وہ لوٹتے ہیں اور ان کو شعور ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت ہی برا راستہ اختیار کیا۔ ان کی حالت شرمندگی سے ایسی ہوتی ہے کہ حضور ؐ کا سامنا نہیں کر سکتے۔ لیکن قسمیں کھا کر اپنے اندرونی جھوٹے ارادوں کو چھپاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ درحقیقت طاغوت کی عدالت میں تو جانا نہیں چاہتے تھے مگر رواج کے مطابق فیصلے کرا کے فریقین کے درمیان صلح صفائی چاہتے تھے۔ یہ ان تمام لوگوں کا دعویٰ ہوتا ہے جو اسلامی نظام حیات سے پہلوتہی کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ کہتے ہیں کہ وہ مشکلات سے بچنا چاہتے ہیں۔ اگر شریعت کے قانون کو نافذ کر دیا گیا تو ایک مصیبت آ جائے گی۔ لوگوں کے درمیان مخالفت پیدا ہو جائے گی حالانکہ یہ لوگ تمام طبقات کے درمیان توازن چاہتے ہیں۔ یہ حیلے بہانے ان لوگوں کے ہوتے ہیں جو دعوائے ایمان تو کرتے ہیں لیکن مومن نہیں ہوتے۔ اس قسم کے دلائل تو منافقین کے ہوتے ہیں اور ہر دور میں منافقین نے یہی کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اوپر سے ان کو چھپانے والی اس چادر کو اتار پھینکتے ہیں اور حضرت نبی کریم ؐ کو اطلاع فرماتے ہیں کہ اللہ ان جیسے لوگوں کی حقیقت قلبی اور ان کے اندرون سے واقف ہے۔ لیکن اس کے باوجود اللہ کا حکم یہی ہے کہ ان جیسے لوگوں کے ساتھ سختی نہ برتی جائے بلکہ ان کو نصیحت کی جائے کہ وہ اس قسم کے ہیر پھیر سے باز آ جائیں۔

(اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا (٤ : ٦٣)) "اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، ان سے تعرض مت کرو، انہیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو جو ان کے دلوں میں اتر جائے۔"

یہ لوگ وہ ہیں جو اپنی نیتوں اور اپنے اندرونی ارادوں کو چھپانا چاہتے ہیں اور جھوٹے دلائل اور غلط عذر پیش کرتے ہیں لیکن اللہ ان کے دلوں کی پوشیدہ باتوں سے بھی واقف ہے اور ان کے ضمیر کے اندرونی حالات سے بھی باخبر ہیں۔ لیکن جو پالیسی اس وقت طے شدہ تھی وہ یہ تھی کہ منافقین سے چشم پوشی کی جائے، ان کے ساتھ نرمی برتی جائے اور وعظ و نصیحت اور تعلیم و تربیت سے کام لیا جائے.... اس مقصد کے لئے عجیب انداز کلام اختیار کیا گیا ہے۔ (وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا (٤ : ٦٣)) "اور ان کو اس قدر بلیغانہ انداز میں سمجھاؤ کہ بات ان کے دل میں اتر جائے۔" یہ نہایت ہی مصورانہ انداز تعبیر ہے۔ گویا بات براہ راست ان کے دل میں رکھی جا رہی ہے اور وہ بات وہاں بیٹھتی جا رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کو توبہ کی طرف مائل کرتے ہیں تاکہ وہ سیدھی راہ پر آ جائیں اور اللہ اور رسول کی پناہ میں امن و سکون کی زندگی بسر کریں ۔ اگرچہ انہوں نے یہ کوشش کی کہ وہ طاغوت کی عدالت سے فیصلے کرائیں اور یہ بات ان سے ظاہر بھی ہو گئی ۔ انہوں نے حضور سے فیصلہ کرانے سے پہلوتہی اختیار کی حالانکہ ان کو اس کی جانب بلایا گیا تھا ۔ لیکن ان سب کوتاہیوں کے باوجود توبہ کا دروازہ کھلا ہے ' اور واپسی کا وقت ختم نہیں ہوا ہے اور وہ اب بھی اللہ اور رسول اللہ ؐ سے معافی طلب کر سکتے ہیں ۔ رسول اللہ کی جانب سے ان کے لئے استغفار قابل قبول ہے لیکن یہ استغفار تب قابل قبول ہو گی جب اصولی بات مان لی جائے اور وہ بات یہ ہے کہ رسولوں کو محض اس لئے بھیجا جاتا ہے کہ لوگ ان کی اطاعت کریں ورنہ پھر رسالت کا مطلب کیا ہوا ۔ نیز یہ کہ رسول محض واعظ نہیں ہوتا اور نہ محض مرشد ہوتا ہے ۔

(وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا

" (انہیں بتاؤ کہ) ہم نے جو رسول بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ اذن خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے ۔ اگر انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے تو تمہارے پاس آ جاتے اور اللہ سے معافی مانگتے ' اور رسول بھی ان کے لئے معافی کی درخواست کرتا ' تو یقیناً اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے ( ٤ : ٦٤ ))

یہ ایک وزن دار حقیقت ہے ۔ رسول محض واعظ نہیں ہوتا کہ وہ ایک تقریر کرے اور چلا جائے اور اس کی تقریر ہوا میں تحلیل ہو جائے ۔ اس کی بات کے اندر اور اس کی پشت پر کوئی قوت نافذہ نہ ہو جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں جو اس دین کے مزاج اور رسالت کے مزاج کو دھوکے سے بدلنا چاہتے ہیں یا جس طرح ان لوگوں کی رائے ہے جو سرے سے الدین کے لفظ کا مفہوم تک ہی نہیں جانتے ۔

بے شک دین نظام حیات کا نام ہے ' واقعی اور عملی نظام حیات کا نام ' جس کی اپنی انتظامی ' عملی اور قانونی ہیئت ہوتی ہے اور جس کے اپنے انداز اور اپنی اقدار ہوتی ہیں ۔ اس کے اپنے اخلاق و آداب ہوتے ہیں اور اس کے اندر مراسم عبودیت اور دینی شعائر ہوتے ہیں ۔

یہ تمام باتیں یہ تقاضا کرتی ہیں کہ رسالت کے ساتھ حاکمیت بھی ہو ۔ ایک نظام مملکت بھی ہو جو اس نظام اور دین کو نافذ کرے اور عوام الناس اس حکومت کے مطیع فرمان ہوں جن کے اندر یہ نظام نافذ ہو ۔ یہ اللہ کا وہ نظام ہے جس کے تصرف میں اللہ نے پوری زندگی دینے کا ارادہ کیا ہے اس لئے کہ اللہ نے جتنے رسول بھی بھیجے ہیں صرف اس لئے بھیجے ہیں کہ اللہ کے حکم سے ان کی اطاعت کی جائے ' پس ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت شمار ہو گی ۔ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو اس لئے نہیں بھیجا کہ لوگ ان سے کچھ وجدانی تاثرات لیں اور بعض امور کا عقیدہ رکھیں یا ان سے کچھ مراسم عبودیت سیکھ لیں اور بس ۔ فہم دین کے بارے میں یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے ۔ دین کا یہ فہم اس حکمت کے مطابق نہیں ہے جس کے مطابق اللہ نے رسولوں کو بھیجا ہے اور وہ حکمت اور مقصد صرف یہ ہے کہ واقعی اور عملی زندگی کے اندر اسلامی نظام نافذ کیا جائے ۔ ورنہ وہ "دین" تو کس قدر آسان دین ہے جس میں رسولوں کے فرائض صرف اس قدر ہوں کہ وہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر تقریر

کریں اور چلے جائیں ۔جس سے مذاق کرنے والے مذاق کریں اور حقیر سمجھنے والے حقارت کی نظر سے دیکھیں ۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ اس حکمت کا مظہر رہی ہے ۔اس میں دعوت و تبلیغ تھی' وہ نظام زندگی اور اسلامی حکومت تھی' اور رسول اللہ ؐ کے بعد تاریخ خلافت تھی ۔یہ خلافت شریعت کی قوت اور نظام کے بل بوتے پر قائم تھی اور اس نظام کا قیام مقصد اصلی تھا اور شریعت کا نفاذ اس خلافت کا مقصد تھا تاکہ رسول اللہ ؐ کی اطاعت دائماً ہوتی رہے اور اللہ کا وہ ارادہ پورا ہو جس کے لئے اس نے رسول مبعوث فرمائے ۔اس کے سوا کوئی اور صورت حال نہیں ہے جسے ہم اسلام کہہ سکیں یا اسے ہم دین کہہ سکیں ۔اگر اسلام اور دین ہو گا تو اس میں رسول کی اطاعت بشکل نظام زندگی ہوگی' چاہے اس اطاعت کی صورتیں قدرے مختلف کیوں نہ ہو جائیں لیکن اصلیت ایک ہونا چاہئے ۔اس کے بغیر اسلام اور دین کی حقیقت نہیں پائی جا سکتی ۔اسلامی نظام کی اطاعت' رسول اللہ ؐ کے نظام کو بروئے کار لانے' اللہ کی شریعت کے مطابق عدالت کرنے اور رسول نے اللہ کی جانب سے جس چیز کی تبلیغ کی اس کی اطاعت کرنے اور صرف اللہ وحدہ کو حاکم سمجھنے مطابق مفہوم ۔(لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) اللہ کے سوا کسی اور کو حاکمیت میں اللہ کا شریک نہ کرنے میں ہے جس میں قانون سازی کا حق اہم ترین حق ہے ۔پھر طاغوت کی عدالت میں مقدمات نہ لے جانا چاہئیں خواہ معمولی مقدمہ ہو یا بڑا ہو' اور جن مسائل میں کوئی نص نہ ہو' ان میں اللہ اور رسول اللہ ؐ کی طرف رجوع کرنا ۔خصوصاً ایسے حالات میں جو دور جدید میں نئے نئے درپیش ہوں اور ان میں اختلاف رائے ہو ۔

جن لوگوں نے طاغوت کے پاس جاکر اپنے مقدمات کے فیصلے کرانے کی سعی کی ہے اور اسلامی منہاج سے دور ہو گئے ہیں' ان کے لئے اب بھی موقع ہے کہ وہ واپس آجائیں جس طرح حضور اکرم ؐ کے دور میں منافقین کے لئے موقع تھا اور ان کو اللہ تعالیٰ ترغیب دے رہے تھے ۔

(وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَھُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰہَ وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا (۴ : ۶۴))

”اگر انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھتے تھے تو تمہارے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لئے معافی کی درخواست کرتا' تو یقیناً اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے ۔“

کوئی جس وقت بھی توبہ کرے اللہ بخشنے والا ہے 'کوئی کسی وقت بھی لوٹے اللہ رحیم و کریم ہے ۔یہ صفات اللہ تعالیٰ اپنے لئے ذکر کرتے ہیں' جو لوگ اس کی بارگاہ تک واپس آجاتے ہیں' اس سے معافی مانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرتے ہیں اور ان پر رحمت فرماتے ہیں ۔ابتداء میں اس آیت کا اطلاق جن لوگوں پر تھا' ان کو رسول خدا ؐ کی طرف سے طلب مغفرت کے مواقع حاصل تھے ۔اگرچہ اب یہ مواقع نہیں ہیں لیکن اللہ کی جانب سے توبہ و مغفرت کا دروازہ اب بھی کھلا ہے ۔اللہ کا وعدہ قائم ہے ۔اللہ کبھی اپنے وعدے کو نہیں توڑتے ۔پس جس شخص کا ارادہ ہو وہ آگے بڑھے 'جس کا عزم ہے وہ آگے آئے ۔

اب آخری اور فیصلہ کن انداز کی بات آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قسم اٹھاتے ہیں' اپنی ذات کی قسم کہ کوئی مومن اس وقت تک مومن نہیں بن سکتا جب تک وہ رسول اللہ ؐ کے پاس اپنے مقدمات فیصلے کے لئے نہیں لے جاتا۔ اس کے بعد' جب رسول فیصلہ کر دے تو وہ اس فیصلے کو تسلیم کر کے اس پر دل سے راضی نہیں ہو جاتا اور اس کی حالت یہ نہیں ہو جاتی کہ اس کے دل میں نہ تو کوئی تلخی ہے اور نہ اس کے دل میں کوئی تردد ہے۔

(فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (٤ : ٦٥))

"اے محمد ؐ تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں' پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں' بلکہ سربسر تسلیم کر لیں۔"

ایک بار پھر ہم شرط ایمان کے سامنے کھڑے ہیں' ایمان کی حدود ہمارے سامنے ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود فیصلہ فرماتے ہیں اور اس فیصلے پر اپنی ذات پاک کا حلف اٹھاتے ہیں' اس کے بعد اب کسی کے لئے کلام کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ اسلام کی شرط اور ایمان کی حدود کی نشاندہی کر دی جاتی ہے۔ اور اس کے جن الفاظ میں یہ نشاندہی کی گئی ہے ان میں کسی قسم کی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ہاں اگر کوئی خواہ مخواہ جھگڑا کرے تو اور بات ہے۔ اس کی بات میں کوئی وزن نہ ہو گا اور وہ بات یہ ہو سکتی ہے کہ یہ حکم حضور کے زمانے کے لئے تھا۔ اور صرف صحابہ کرام کے لئے تھا..... اگر کوئی یہ تاویل کرتا ہے تو معلوم ہو گا کہ اس شخص کو اسلام کا کوئی پتہ نہیں ہے اور وہ قرآن کے انداز کلام سے واقف نہیں ہے' حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے جسے حلفیہ بیان کے ساتھ بتاکید مزید لایا گیا ہے' جس کے اندر زمان و مکان کی کوئی تحدید نہیں ہے۔ نہ اس واہمہ کے لئے کوئی گنجائش ہے کہ رسول اللہ ؐ کے فیصلوں سے مراد آپ کی شریعت کے فیصلے ہیں۔ اگر یہی مفہوم لے لیا جائے تو حضور ؐ کے بعد آپ کی سنت اور آپ کی شریعت کا کوئی مقام نہ رہے گا۔ اور یہ قول تو ان لوگوں کا تھا جو عہد ابوبکر ؓ میں مرتد ہو گئے تھے۔ اور حضرت ابوبکر ؓ نے ان سے اس طرح جہاد کیا جس طرح مرتدین سے کیا جاتا ہے۔ بلکہ ان کے ساتھ مرتدین سے بھی سخت رویہ اختیار کیا گیا اس لئے کہ انہوں نے صرف زکوٰۃ کے معاملے میں انکار کیا تھا اور آپ کی وفات کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی بند کر دی تھی۔

اگر اسلام کے لئے یہ کافی ہے کہ لوگ اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے کرائیں تو ایمان کے لئے اس سے بھی زیادہ شرائط ہیں مثلاً یہ کہ وہ ان فیصلوں پر دل سے راضی ہوں اور دل سے انہیں قبول کریں اور خوشی اور اطمینان سے ان پر راضی ہوں۔

یہ ہے اسلام اور یہ ہے ایمان۔ ہر کسی کو اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ وہ اسلام سے کس قدر دور ہے اور اس کے ایمان کا کیا حال ہے اور اس کے بعد وہ اسلام اور ایمان کا دعویٰ کرے۔

پارہ نمبر ۵

یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ رسول اللہ ؐ سے اپنے فیصلے کرانے' اور پھر آپ جو فیصلہ فرمائیں اس کو بطیب خاطر قبول کرنے کے بعد اب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نظام جس کی طرف تمہیں دعوت دی جا رہی ہے' اور یہ شریعت جس کے مطابق تمہیں اپنے فیصلے کرانے کا حکم دیا جاتا ہے (اور اس کے سوا کسی اور قانون کے مطابق فیصلے کی اجازت نہیں ہے) اور یہ فیصلے جس پر راضی برضا ہونا ضروری ہے' یہ نظام دراصل نہایت ہی آسان' سیدھا اور منصفانہ اور رحیمانہ نظام ہے۔ یہ نظام تمہیں تمہاری طاقت سے زیادہ کسی چیز کا حکم نہیں دیتا' اور نہ تم پر کوئی ایسی مصیبت لاتا ہے جو تمہارے لئے ناقابل برداشت ہو' اور نہ تم سے کسی ایسی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے جو تم سے نہ دی جا سکے۔ اس لئے کہ انسان کی ضعیفی اللہ کی نظر میں ہے۔ وہ ان کی کمزوری کی وجہ سے ان پر بہت ہی رحم فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ اگر انسانوں پر بھاری فرائض عائد کئے گئے تو وہ انہیں ادا نہ کر سکیں گے۔ اس لئے اللہ نے یہ ارادہ ہی نہیں کیا کہ انسانوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالے اور نہ اللہ کا ارادہ تھا کہ لوگ معصیت کا ارتکاب کریں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بھاری احکام ان پر فرض ہی نہیں کئے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ زیادہ لوگ معصیت پر اتر آئیں۔ اگر لوگ ان آسان فرائض پر عمل پیرا ہوتے جو اللہ نے ان پر فرض کئے تھے' اور اس نصیحت سے فائدہ اٹھاتے جو اللہ تعالیٰ ان کے لئے نازل کر رہے ہیں تو وہ دنیا اور آخرت دونوں میں عظیم بھلائی جمع کر لیتے۔ اللہ تعالیٰ راہ ہدایت پر آنے میں ان کی امداد فرماتے' اور یہ اللہ کی سنت ہے کہ جو شخص بھی اپنے عمل' ارادہ اور عزم بالجزم سے اللہ کی راہ میں سعی کرے اپنی طاقت کے حدود کے اندر' تو اللہ اس کی پوری پوری معاونت کرتا ہے۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۝٦٦ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝٦٧ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝٦٨

"اگر ہم نے انہیں حکم دیا ہوتا کہ اپنے آپ کو ہلاک کر دو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو ان میں سے کم ہی آدمی اس پر عمل کرتے' حالانکہ جو نصیحت انہیں کی جاتی ہے اگر یہ اس پر عمل کرتے تو یہ ان کے لئے زیادہ بہتری اور زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا اور جب یہ ایسا کرتے تو ہم انہیں اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتے اور انہیں سیدھا راستہ دکھا دیتے۔"

اسلام ایک ایسا نظام زندگی ہے جس پر ہر وہ شخص عمل کر سکتا ہے جو مستقیم اور سلیم الفطرت ہو' اس پر عمل کرنے کے لئے کسی خارق العادت عزم اور کسی بڑے اولوالعزم شخص کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے لوگ تو دنیا میں چند ایک ہوتے ہیں اور اسلامی نظام حیات ان چند لوگوں کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ یہ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے بھیجا گیا ہے' اور دنیا میں ہر قسم

کے لوگ پائے جاتے ہیں جو مختلف درجات کے ہوتے ہیں۔ بعض کی طاقتیں اور صلاحیتیں زیادہ ہوتی ہیں اور بعض کی کم۔ یہ دین لوگوں کی اوسط تعداد کو مدنظر رکھ کر بھیجا گیا ہے' جو احکام پر عمل کر سکتے ہیں اور معاصی سے رک سکتے ہیں۔

قتل نفس اور جلاوطن دو ایسے احکام ہیں جو نہایت ہی شاق ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر یہ چیزیں بطور احکام و فرائض عائد کر دیتا تو ان احکام پر لوگوں کے لئے عمل کرنا مشکل ہو جاتا۔ لیکن اللہ نے یہ احکام اس لئے عائد نہیں کئے گئے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو شکست دینا نہیں چاہتا تھا اور یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ لوگ ان احکام سے انکار کر دیں بلکہ مقصد یہ تھا کہ سب لوگ احکام الٰہی پر عمل کریں۔ احکام ایسے ہوں جو سب کے دائرہ قدرت میں ہوں۔ قافلہ ایمان کے اندر تمام اوسط درجے کے لوگ بھی شامل ہوں اور یہ کہ اسلامی سوسائٹی میں مختلف طبقات کے لوگ' مختلف ہمتوں کے لوگ' مختلف استعدادوں اور صلاحیتوں کے لوگ شامل ہوں۔ یہ سب لوگ مل کر اسلامی سوسائٹی کو ترقی دیں۔ اور ایک ایسے کثیر التعداد قافلے کی شکل میں جو طویل و عریض ہو۔

ابن جریج' اسحاق ابوالازھر' اسماعیل' ابو اسحاق کی سند سے ابو الحاق کہتے ہیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ (وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ (۴: ۶۶)) تو ایک شخص نے کہا اگر اللہ حکم دیتا تو ہم ضرور ایسا کرتے لیکن اللہ کی بڑی مہربانی ہے کہ اس نے ہمیں معاف کر دیا۔ یہ بات حضرت نبی اکرم ؐ تک پہنچی تو آپ ؐ نے فرمایا: "میری امت میں ایسے لوگ ہیں کہ ان کے دل میں ایمان ان پہاڑوں سے بھی زیادہ بیٹھا ہوا ہے جو نہایت ہی اونچے ہیں۔"

ایک دوسری روایت ابن ابو حاتم نے حضرت مصعب سے روایت کی ہے۔ انہوں نے اپنے چچا عامر بن عبید ابن زبیر سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔

(وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ (۴: ۶۶))

رسول اللہ ؐ نے فرمایا: "اگر یہ حکم نازل ہوتا تو ابن ام عبد ان میں سے ہوتا۔" انہوں نے ایک روایت شریح ابن عبید سے نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں' جب حضور ؐ نے یہ آیت پڑھی۔ (وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ (۴: ۶۶)) تو رسول اللہ ؐ نے عبداللہ ابن رواحہ ﷺ کی طرف اشارہ فرمایا: "اگر اللہ تعالیٰ یہ فرائض عائد کرتا تو یہ ان قلیل لوگوں میں سے ہوتے۔"

رسول اللہ ؐ اپنے ساتھیوں کو نہایت ہی گہرائی سے اور نہایت ہی اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے خصائص اور صلاحیتیں آپ ؐ کی نظر میں اس قدر درست تھیں کہ وہ خود بھی اپنے بارے میں اس قدر نہ جانتے تھے۔ حضور اکرم ؐ کی سیرت میں ایسے بے شمار واقعات ہیں جن سے حضور اکرم ؐ کی یہ صلاحیت اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ آپ اپنے ساتھیوں کے بارے میں گہری معلومات رکھتے تھے۔ نیز حضور کو ان قبائل کی صلاحیتوں کا بھی علم تھا جن سے آپ بر سر پیکار تھے۔ آپ ایک بصیرت افروز قائد کی طرح اپنے ماحول سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور بعض اوقات یہ معلومات

نہایت ہی معجزانہ ہوتی تھیں ۔ کیونکہ یہ لدنی علم پر مبنی تھیں ۔

اس جگہ ہمارا یہ موضوع نہیں ہے ' یہاں ہم جو کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ حضور اکرم ؐ کو معلوم تھا کہ آپ کے ساتھیوں میں اور آپ کی امت میں ایسے لوگ ہوں گے ' جو ناقابل برداشت مشکلات کو برداشت کریں گے ۔ اگر یہ مشکلات ان پر فرض کر دی جائیں لیکن آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ آپ صرف ان چند ممتاز لوگوں کی طرف رسول بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے ۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے پیدا کئے ہوئے انسان کی فطرت کے بارے میں اچھی طرح علم تھا ' اس کی محدود طاقت کا بھی اسے علم تھا ' اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس دین کے احکام میں وہی کچھ فرض کیا جس پر سب لوگ عمل کر سکتے تھے ' اس لئے کہ یہ دین سب کے لئے آیا تھا ' بشرطیکہ کسی کے اندر عزم ہو ' اس کی فطرت معتدل ہو ' اور اس کے اندر اطاعت کا داعیہ ہو اور وہ اس دین کو مذاق اور غیر ضروری نہ سمجھتا ہو ۔

اس حقیقت کا ذہن نشین کرنا بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے ۔ خصوصاً ان تخریبی تحریکات کے حوالے سے جن کی دعوت یہ ہے کہ انسان مرتبہ حیوانیت تک اتر آئے اور وہ نفسانیت کے کیچڑ میں کیڑے کی طرح لت پت ہو ۔ اس کے لئے یہ لوگ دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہی انسان کی حقیقی صورت حالات ہے اور یہی اس کی طبیعت ' فطرت اور اس کی طاقت ہے اور یہ کہ دین تو اس مقام کی طرف دعوت دیتا ہے جو ایک مثالی مقام ہے ' جس کا اس کرۂ ارض پر حقیقت کا روپ اختیار کرنا نہایت ہی مشکل ہے ۔ اگر کوئی ایک فرد دین کے فرائض پر عمل پیرا ہو بھی جائے تو سو عمل پیرا نہیں ہو سکتے ۔

یہ نہایت ہی جھوٹا دعویٰ ہے ۔ یہ فریب پر مبنی ہے ۔ یہ جہالت پر مبنی ہے ۔ اس لئے کہ یہ مدعی انسان کو اس طرح نہیں سمجھ سکتا جس طرح اس کو خالق رب العالمین سمجھتا ہے ۔ جس نے اس کے لئے دینی فرائض مقرر کئے ۔ وہ ذات خالق یہ جانتی ہے کہ یہ احکام اس کے دائرہ خدمت میں ہیں ۔ اس لئے کہ دین چند ممتاز لوگوں کے لئے تو نہیں بھیجا گیا ۔

یہ تو صرف عزم کی بات ہے ' ایک عام آدمی کی عزیمت ' اخلاص نیت اور کام کے آغاز کی بات ہے اور جب عزم ' نیت اور آغاز ہو جائے تو ۔

(وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَأَشَدَّ تَثْبِيتًا (٦٦) وَإِذًا لَآتَيْنَاهُمْ مِنْ لَدُنَّا أَجْرًا عَظِيمًا (٦٧) وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا (٦٨)

" حالانکہ جو نصیحت انہیں کی جاتی ہے اگر یہ اس پر عمل کرتے تو یہ ان کے لئے زیادہ بہتری اور زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا اور جب یہ ایسا کرتے تو ہم انہیں اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتے اور انہیں سیدھا راستہ دکھا دیتے ۔ "

صرف کام کے آغاز ہی سے اللہ کی طرف سے امداد شروع ہو جاتی ہے اور اس راہ پر گامزن ہونے کے لئے ثابت قدمی نصیب ہوتی ہے جس کے بعد اجر عظیم نصیب ہوتا ہے ۔ اس کے بعد صحیح راستے کی طرف راہنمائی نصیب ہوتی ہے ۔

(صدق اللہ العظیم) کیا اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو دھوکہ دے رہے ہیں ؟ کیا وہ ان سے وہ وعدہ کر رہے ہیں جو پورا نہ ہو ؟ بلکہ اللہ تو ان سے بہت ہی سچی بات فرماتے ہیں ۔ (وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا) (اللہ سے زیادہ سچا اور کون ہے)

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اس دین میں آسانی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو چھوٹ دے دی جائے ۔ یہ دین ایسا نہیں ہے کہ اس میں ہر طرف سے چھوٹ دی جاتی رہے اور پھر بھی وہ نظام حیات ہو ۔ اس میں عزیمت بھی ہے اور رخصت بھی ہے ۔ عزیمت تو اصل دین ہے اور رخصت بعض عارضی حالات کی وجہ سے ہے ۔ ہمارے بعض مخلص لوگ جو لوگوں کو اس دین کی طرف بلاتے ہیں وہ ان کے سامنے رخصتیں پیش کرتے ہیں ۔ وہ ایک ایک رخصت تلاش کرتے اور اسے لوگوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہے دین اور پھر وہ لوگوں کو کہتے ہیں دیکھو اس دین میں یہ یہ سہولتیں ہیں ۔ بعض لوگ شیطان کی خواہشات یا عوام الناس کی خواہشات پوری کرنا چاہتے ہیں ' وہ ایک سوراخ تلاش کرتے ہیں جہاں سے نکلا جا سکے اور پھر وہ کہتے ہیں کہ یہ ہے دین ۔

یہ دین درحقیقت نہ رخصتوں کا نام ہے اور نہ ہی عزیمتوں کا نام ہے ۔ اس میں مجموعی طور پر دونوں چیزیں موجود ہیں اور یہ دین ایسا ہے کہ اگر ایک عام انسان اس پر عمل کے لئے عزم کر لے تو وہ اس پر عمل کر سکتا ہے ۔ وہ اپنی حدود بشریت کے اندر رہتے ہوئے اس کے اندر ذاتی کمال حاصل کر سکتا ہے ۔ جیسے ایک ہی باغ میں وہ انگور ' شہتوت ' انجیر ' خربوزہ ' تربوز اور دوسرے پھل پیدا ہوتے ہیں اور سب کے ذائقے جدا ہوتے ہیں ۔ کسی کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پختہ نہیں ہے ۔ بشرطیکہ وہ پک گیا ہو ' اگرچہ ایک کا ذائقہ دوسرے سے کم درجے کا ہو ۔

اس دین کے باغ میں ساگ ' ترکاری اور کھیرے ککڑی پیدا ہوتے ہیں ۔ کینو اور انار پیدا ہوتے ہیں ۔ سیب اور اخروٹ بھی پیدا ہوتے ہیں ۔ انگور اور انجیر پیدا ہوتے ہیں اور سب کے سب پکتے ہیں ۔ سب کے ذائقے مختلف ہوتے ہیں اور سب پختہ ہوتے ہیں ۔ اپنے اپنے درجے میں کمال کو پہنچ جاتے ہیں ۔ دنیا اللہ کا کھیت ہے ۔ اس میں انسان ' اللہ کی تربیت میں اللہ کی نگرانی میں سہولت کے ساتھ آگے بڑھتے رہتے ہیں ۔

اب آخر میں ' اس سبق کے خاتمے پر ترغیب دی جاتی ہے ' دلوں کے اندر جوش پیدا کیا جاتا ہے اور لوگوں کو محبوب مال و متاع کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے ۔ یہ دولت نبیوں ' صدیقین ' صالحین اور شہداء کے ساتھ ہم نشینی کی متاع ہے ۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿٧٠﴾

"جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین ۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں ۔ یہ حقیقی فضل ہے جو اللہ کی طرف سے ملتا ہے اور حقیقت جاننے کے لئے بس اللہ ہی کا علم کافی ہے ۔"

یہ ایک ایسا چ ہے جس سے تمام قلبی احساسات جاگ اٹھتے ہیں بشرطیکہ کسی دل میں بھلائی کا کوئی ذرہ موجود ہو ' بشرطیکہ

نیکی کا کوئی بیج موجود ہو بشرطیکہ اس میں کسی باعزت مقام اور اللہ کے جوار رحمت میں داخل ہونے اور اللہ کی شان کریمی کی تلاش کا کوئی داعیہ ہو۔ یہ مجلس ایسے ہی اولوالعزم اور بلندیوں کے متلاشیوں کے لئے ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے اور اس فضل وکرم کے مقام تک کوئی شخص صرف اپنی اطاعت شعاری اور اپنے عمل کے ذریعے نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ یہ تو صرف اللہ کا وسیع اور عمیق اور بھرپور فضل وکرم ہوتا ہے اور اس کا عمومی فیضان ہوتا ہے اور جس کی قسمت ہو اسے ڈھانپ لیتا ہے۔

یہاں مناسب ہے کہ ہم چند لمحے نبی ؐ کے صحابہ کی محفل میں گزاریں۔ یہ لوگ دنیا و آخرت دونوں میں حضور ؐ کی محفل کے مشتاق تھے۔ ان حضرات میں سے بعض تو ایسے تھے کہ وہ آپ کی جدائی کے تصور ہی سے پریشان ہو جاتے تھے' حالانکہ آپ ؐ اس وقت ان کے درمیان موجود تھے۔ اسی لئے یہ آیات نازل ہوئیں' جس سے ان کی محبت تروتازہ ہوگئی اور ان کا پاکیزہ جذبہ جوش میں آگیا۔ اور ان کی پاک و شفاف محبت اور پاک ہوگئی۔

ابن جریر نے حضرت سعید ابن جبیر سے روایت کی ہے۔ انصار میں سے ایک شخص آیا جو بہت ہی پریشان تھا۔ حضور ؐ نے فرمایا''اے فلاں تم پریشان کیوں ہو؟ اس نے جواب دیا اللہ کے نبی میں ایک معاملے میں سوچ رہا تھا۔ آپ نے دریافت کیا کہ کیا تھا؟ اس نے کہا وہ یہ تھا کہ ہم صبح و شام آپ سے آکر ملتے ہیں' آپ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہیں اور آپ کی مجلس میں بیٹھتے ہیں۔ کل آپ نبیوں کے ہاں چلے جائیں گے تو ہم آپ سے ملاقات نہ کرسکیں گے۔ حضرت نبی اکرم ؐ نے اس شخص کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں حضرت جبرائیل یہ آیت لے کر آئے۔

(وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ

(۴ : ۶۹)) نبی ؐ نے اس شخص کے لئے پیغام بھیجا اور اسے خوشخبری دی۔ حضرت ابوبکر ابن مردویہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے کہ ایک شخص نبی ؐ کے پاس آیا اور عرض کیا حضور آپ میرے لئے میری جان سے زیادہ محبوب ہیں' آپ میرے لئے میرے اہل خاندان سے زیادہ محبوب ہیں اور آپ میرے لئے میری بیٹیوں سے زیادہ محبوب ہیں اور جب میں گھر پہ ہوتا ہوں تو میں آپ کو یاد کرتا ہوں اور اٹھ کر آجاتا ہوں اور آپ کو دیکھ لیتا ہوں' صبر نہیں کر سکتا۔ جب میں اپنی موت اور آپ کی موت کے بارے میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ آپ جنت میں داخل ہو کر نبیوں کے گروہ میں داخل ہو جائیں گے اور میں اگر جنت میں چلا بھی جاؤں تو شاید آپ کو دیکھ نہ سکوں۔ اس شخص کے ان خدشات کا آپ نے کوئی جواب نہ دیا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

(وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (۴ : ۶۹))

''جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں۔''

صحیح مسلم نے ربیعہ کی حدیث نقل کی ہے ' فرماتے ہیں میں ایک رات نبی ؐ کے پاس تھا۔ میں نے آپ کو وضو کے لئے پانی اور دوسری ضروریات فراہم کیں تو حضور ؐ نے فرمایا: مانگو جو مانگتے ہو تو میں نے کہا کہ اے رسول خدا ؐ میں تو جنت میں آپ کی رفاقت چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا اس کے سوا کچھ اور؟ تو اس نے کہا بس صرف یہی۔ تو حضور ؐ نے فرمایا آپ کثرت سجود کے ذریعے اپنے نفس کے خلاف میری معاونت کریں۔

بخاری شریف میں متعدد طریقوں سے یہ روایت آئی ہے کہ ایک شخص ایک گروہ کو پسند کرتا ہے مگر ان سے ملاقات نہیں ہوتی تو اس کیا حال ہو گا؟ آپ نے فرمایا آدمی انہی لوگوں کے ساتھ ہو گا جن کو وہ محبوب سمجھتا ہے۔ یہی بات تھی ' جس میں ان کے دل و دماغ ہروقت مشغول تھے۔ محبت رسول اور آخرت میں صحبت رسول.... انہوں نے دنیا میں بھی صحبت رسول کا مزہ چکھا ہوا تھا۔ اور آج اس کا مزہ صرف وہی دل چکھ سکتا ہے جس کے اندر محبت رسول موجود ہو اور ہم لوگوں کے لئے اس آخری حدیث میں روشنی کی کرن ' اطمینان کا سامان اور امید کی شمع نظر آتی ہے۔

---ooo---

# درس ۳۶ ایک نظر میں

میں اس بات کو ترجیح دیتا ہوں کہ اس سبق میں آیات کا جو مجموعہ دیا گیا ہے 'وہ مدینہ کے ابتدائی دور میں غزوۂ احد کے بعد اور غزوہ خندق سے پہلے نازل ہوا ہو گا کیونکہ اس میں اسلامی سوسائٹی کی جو تصویر کشی کی گئی ہے 'اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابھی تک پختگی کے مقام تک نہ پہنچی تھی ۔ اس سوسائٹی میں مختلف قسم کے گروہ موجود تھے 'جن میں بعض ناپختہ تھے اور بعض ایسے لوگ بھی موجود تھے جو ایمان ہی نہ لائے تھے اور محض منافقت کر رہے تھے ۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی سوسائٹی کو اپنی تعلیم و تربیت کی مزید ضرورت تھی اور اس سلسلے میں عظیم جدوجہد اور گہری توجہ کی ضرورت تھی ۔ اسے اس عظیم مقصد کے لئے تیار کرنے اور وہ بوجھ اٹھانے کا اہل بنانے کی ضرورت تھی جو اسلام نے اس کے کاندھوں پر ڈال دیا گیا تھا 'نیز اسلامی انقلاب کے لئے جس سطح کے لوگوں کی ضرورت تھی 'اس سطح تک اس سوسائٹی کو بلند کرنا ضروری تھا ۔ چاہے یہ تربیت اور اصلاح عقائد و تصورات کے میدان میں ہو 'یا مخالف کیمپوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کے میدان میں ہو ۔

اور یہ جو ہم کہہ رہے ہیں کہ بعض لوگ ناپختہ تھے 'اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سوسائٹی میں نہایت ہی بلند معیار کے لوگوں کی کمی تھی ۔ یہاں ہم اس وقت کی اسلامی سوسائٹی کو مجموعی طور پر لے رہے ہیں ۔ اس سوسائٹی میں مختلف عناصر موجود تھے 'لیکن سب ایک جیسے نہیں تھے ۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت تھی کہ اس سوسائٹی کے تمام عناصر کو بلند سطح تک لانے کی سعی کی جائے تاکہ اس کے افراد کے درمیان مکمل ہم آہنگی پیدا ہو ۔ اس بات کا اظہار ان آیات و ہدایات سے اچھی طرح ہوتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ ان ہدایات کے گہرے مطالعے سے ہمیں اس وقت کی مسلم سوسائٹی کا جائزہ لینے کا موقع ملتا ہے اور جماعت مسلمہ کے ایسے خدوخال سامنے آتے ہیں جن میں یہ سوسائٹی ایک انسانی سوسائٹی نظر آتی ہے ۔ اس کا یہ پہلو ہم اکثر اوقات نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ اس سوسائٹی میں ہمیں اعلیٰ معیار کی تربیت اور قوت بھی نظر آتی ہے اور اس میں بعض کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں ۔ یہ بھی نظر آتا ہے کہ قرآن کریم انسانی کمزوریوں 'جاہلیت کے باقی ماندہ آثار اور اسلام کے مخالف کیمپ کے ساتھ کس طرح معرکہ آرائی کرتا ہے اور یہ سب کام بیک وقت ہوتا ہے ۔ ہم قرآن کریم کے انداز تربیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو قرآن عالم واقعہ میں زندہ انسانوں کے ساتھ معاملہ کرتا دکھائی دیتا ہے اور یہ بھی نظر آتا ہے کہ تربیت کے میدان میں قرآن کریم نے کس قدر کامیاب جدوجہد کر کے ایک ایسی سوسائٹی تخلیق کی جس کو جاہلیت کے معاشرہ سے لیا گیا تھا 'جس میں مختلف درجات اور مختلف طبقات کے لوگ موجود تھے اور جس میں مختلف خصوصیات کے لوگ موجود تھے 'قرآن نے انہیں اس قدر ہم آہنگ 'اس قدر بلند 'اس قدر متحد بنا دیا جس کا کامل رنگ حضور

ؐ کے آخری دور میں صاف نظر آتا ہے اور یہ اس قدر بلند اور کامل و مکمل سوسائٹی تھی جس سے آگے جانا انسانوں کے لئے ممکن نہیں ہے۔

کسی انسانی سوسائٹی' کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسانی نفس کے اندر کیا کیا صلاحیتیں ہیں' اور دنیا کی بہترین جماعت اور سوسائٹی میں ان کا ظہور کس شکل میں ہوتا ہے۔ وہ جماعت جس کی تربیت خود حضور ؐ نے فرمائی تھی اور یہ تربیت تھی بھی قرآنی منہاج کے مطابق۔

اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا منہاج تربیت کیا تھا اور یہ کہ قرآن کریم انسانی نفوس کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتا تھا۔ اس کا رویہ اس کے ساتھ کس قدر پرلطف تھا اور جماعت کے اندر مختلف سطح کے لوگوں کو اس نے کس طرح باہم متحد اور منسلک کر دیا تھا۔ ہم قرآن کریم کا مزاج تربیت دیکھتے ہیں اور ہمیں عالم واقعہ میں انسانی طبیعت کے مطابق یہ تربیتی نظام کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

اس سے ایک فائدہ ہمیں یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ ہم اپنے حالات اور دوسری انسانی سوسائٹیوں کے حالات کا مقابلہ اس انسانی جماعت سے کریں جو اللہ نے برپا کی ہے۔ اس کے بعد ان سوسائٹیوں کی انسانی اعتبار سے جو اصل صورت حال تھی اس کا مطالعہ کریں تاکہ اپنی کوتاہیوں کو دیکھ کر دور جدید میں اصلاح حال سے مایوس نہ ہو جائیں اور اپنی اصلاح کے لئے کوشش کرنا ترک نہ کر دیں۔ یہ بھی نہ ہو کہ اسلام کی یہ پہلی سوسائٹی ہمارے تصورات میں کہیں محض خیالی سوسائٹی ہی نہ بن جائے اور ہم کہیں یہ سعی ترک نہ کر دیں کہ اس جماعت کے نقش قدم پر ہمیں چلنا ہے اور دور جدید میں ان جدید سوسائٹیوں کو موجودہ گراوٹ سے اونچا کر کے مقام بلند تک پہنچانا ہے۔

یہ عبرتوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ اور ظلال القرآن میں زندگی بسر کر کے جب ہم یہ ذخیرہ اخذ کریں گے تو یہ ہمارے لئے بھلائی کا ایک عظیم سامان ہو گا۔

اس سبق میں دی گئی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی صفوں میں اس وقت درج ذیل قسم کے لوگ موجود تھے۔

(الف) ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے آپ کو جہاد میں پیچھے رکھتے تھے۔ اس سے دوسرے لوگوں میں بھی سستی پیدا ہوتی تھی۔ اور اگر وہ جہاد کو نہ جاتے اور گھروں میں صحیح و سالم رہتے تو اسے اپنے لئے کامیابی سمجھتے تھے جبکہ جہاد میں شریک ہونے والے مسلمانوں کو اس جہاد میں مشکلات اور تکالیف پیش آتیں۔ اسی طرح یہ لوگ اگر جہاد میں نہ جاتے اور مسلمانوں کو مال غنیمت مل جاتا تو ایسے لوگ محسوس کرتے کہ ان کو خسارہ ہو گیا کہ مال غنیمت میں سے ان کو حصہ نہ ملا۔ اس طرح یہ لوگ آخرت کے مقابلے میں دنیا کو خریدتے تھے۔

(ب) ان لوگوں میں بعض مہاجرین بھی تھے جب یہ لوگ مکہ میں تھے اور ان پر مظالم ہوتے تھے تو وہ جوش دفاع اور بہادری کے جذبے سے یہ کہتے تھے کہ کاش انہیں جہاد کرنے اور جنگ کرنے کی اجازت ہوتی لیکن وہاں ان کے لئے جنگ کرنا بالکل بند کر دیا گیا تھا۔ اب مدینہ طیبہ میں جب جہاد کا حکم آگیا اور یہ کہا گیا کہ کفار کے ساتھ جنگ شروع کر دو تو یہ لوگ تمنا کرنے لگے کہ کاش ابھی اور مہلت ملتی اور جنگ کا حکم نہ آیا ہوتا۔

(ج) ان میں ایسے لوگ بھی تھے کہ اگر کوئی بھلائی نصیب ہوتی تو کہتے کہ یہ اللہ کا فضل ہے اور مصیبت آتی تو کہتے کہ

یہ معیبت نبی ؐ کی ذات کی وجہ سے ہے۔ یہ بات وہ اس لئے نہ کہتے تھے کہ ان کا خدا تعالیٰ کی ذات پر پختہ ایمان اور بھروسہ تھا بلکہ وہ یہ باتیں اسلامی قیادت پر تنقید کرتے ہوئے کرتے تھے۔

(د) بعض ایسے لوگ بھی تھے کہ جو حضور ؐ کے سامنے اپنے آپ کو نہایت مطیع فرمان ظاہر کرتے مگر جب آپ کے پاس سے چلے جاتے تو مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے اور اپنے ہم نشینوں کے ساتھ کوئی اور بات کرتے۔

(ہ) بعض ایسے لوگ تھے جو افواہوں پر کان دھرتے تھے اور اسلامی صفوں میں انہیں پھیلاتے تھے۔ اس طرح وہ اسلامی محاذ میں بے چینی پیدا کر دیتے تھے حالانکہ انہیں چاہئے تھا کہ وہ بات کو ثبوت تک پہنچاتے یا خود اسلامی قیادت کی طرف رجوع کرتے۔

(ر) بعض لوگ ایسے بھی تھے جن کو اس بارے میں شک تھا کہ آیا ان ہدایات کا مصدر اور منبع اللہ کی ذات ہے یا نہیں، وہ یہ سمجھتے تھے کہ بعض باتیں نبی ؐ اپنی جانب سے کرتے ہیں۔

(ز) بعض ایسے تھے جو منافقین کی جانب سے مدافعت کیا کرتے تھے جیسا کہ اگلے سبق کے شروع میں بعض نمونے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی کہ منافقین کے بارے میں جماعت مسلمہ دو گروہوں میں بٹ جائے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے اسلامی تصور اور تنظیم میں ابھی تک مکمل ہم آہنگی نہ تھی اور یہ لوگ قیادت کے فرائض اور ایسے معاملات میں قیادت کے ساتھ رابطے کی ضرورت کو اچھی طرح نہ سمجھتے تھے۔

یہ تمام عناصر جو اسلامی صفوں میں موجود تھے یہ منافقین کے گروہ تھے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ایک ہی گروہ سے متعلق ہوں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مدینہ کی سوسائٹی میں یہ لوگ منافقین کے کئی گروہوں سے تعلق رکھتے ہوں یا ان لوگوں میں بعض ضعیف الایمان مسلمان بھی ہوں جن کی ایمانی حالت ابھی پختہ نہ ہوئی ہو۔ ان میں سے کچھ لوگ مہاجرین بھی ہوسکتے ہیں۔ بہرحال ایسے کئی گروپ اسلامی جماعت کے اندر موجود تھے اور یہ جماعت اس وقت مدینہ کے یہودیوں میں گھری ہوئی تھی، جبکہ مکہ میں وہ مشرکین کے نرغے میں تھی اور پورے جزیرۃ العرب میں یہ جماعت متربصین کے نرغے میں تھی جو انتظار کر رہے تھے کہ اس تحریک کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ یہ جماعت مسلسل مسلمانوں کی صفوں کے اندر بے چینی پیدا کر رہی تھی۔ لہٰذا اندرونی صفوں میں تربیت و تطہیر کی ضرورت تھی اور لوگوں کو جہاد پر ابھارنے کی ضرورت تھی۔

ان آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے یہ داخلی جہاد اور تربیت کس نہج پر کی۔ قرآن نے مسلمانوں کی صفوں سے مایوسی کو دور کیا اور جماعت کے ہر فرد کو مطمئن کر دیا۔ نہایت ہی گہرائی، دقت اور صبر کے ساتھ اور اس تحریک کے قائد حضرت محمد ؐ نہایت ہی صبر آزما حالات میں یہ تربیت فرما رہے تھے۔ ذرا اس کے نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

(الف) حکم دیا جاتا ہے کہ ہر وقت محتاط رہو۔ مجاہدین اور مومنین اکیلے نہ پھریں اور مہمات اور سرایا میں اکٹھے جائیں۔ یعنی سرایا اور دستوں کی شکل میں یا سب کے سب فوج کی شکل میں نکلیں۔ اس لئے کہ ان کے اردگرد کے علاقے میں مختلف قسم کی دشمنیاں ہیں اور دشمن گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں جن کے اندر منافقین ہیں یا ایسے دشمن ہیں جن کو منافقین پناہ دے رہے ہیں۔ نیز یہودی بھی پورے جزیرۃ العرب کے دشمنوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں جو موقع کے انتظار میں ہیں۔

(ب) بعض لوگ جو جہاد میں پیچھے رہ جاتے تھے ان کی بھی یہاں ایک قابل نفرت تصویر نظر آتی ہے۔ ان کی ہمت

جواب دے گئی ہے وہ مفاد پرست ہیں اور نہایت ہی متلون مزاج ہیں اور حالات کے ساتھ بہت جلد یہ لوگ بدل جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے حال پر تعجب ہوتا ہے کہ مکہ میں تو بہت ہی پرجوش تھے مگر اب جبکہ مدینہ میں جہاد فرض ہو گیا ہے تو وہ جزع و فزع کرتے ہیں۔

(ج) یہاں اللہ کی راہ میں مقاتلین کے لئے اللہ کی جانب سے وعدہ بھی صاف نظر آتا ہے کہ اللہ انہیں اجر عظیم عطا کرے گا اور انہیں دو اچھے انجاموں میں سے ایک ضرور ملے گا۔ یعنی "اور جو شخص اللہ کی راہ میں قتال کرتا ہے اور مارا جاتا ہے' یا غالب ہو جاتا ہے تو دونوں صورتوں میں اللہ اسے اجر عظیم دے گا۔"

(د) قرآن کریم مقاصد کی بلندی' اہداف کی پاکیزگی' اور کامرانی کے مقاصد کی نشاندہی بھی کرتا ہے جس کی وجہ سے جہاد و قتال فرض کیا گیا ہے کہ یہ "اللہ کے راستے میں 'ضعیف مردوں' عورتوں اور بچوں کی حمایت میں ہے' جو ہر وقت یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس گاؤں سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی جانب سے کوئی ولی مقرر کر اور اپنی جانب سے ہمارے لئے کوئی مددگار بنا۔"

(ہ) پھر قرآن مجید ان مقاصد کی سچائی کو بھی ریکارڈ پر لاتا ہے اور یہ طے کرتا ہے کہ ان کی پشت پر سند قوی ہے۔ اور ان مقاصد کا برسر باطل ہونا بھی بتاتا ہے جن کے لئے کافر لڑتے ہیں اور ان کی سند بھی ضعیف ہے۔ "وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں 'پس تم شیطان کے دوستوں کے ساتھ لڑو' بے شک شیطان کا مکر کمزور ہے۔"

(و) ان آیات میں قرآن کریم ان تصورات فاسدہ کا علاج بھی کرتا ہے جن کی وجہ سے دل و دماغ میں فاسد احساسات اور کردار میں فاسد اور ضعیف طرز عمل جنم لیتا ہے۔ اور یہ کام وہ غلط عقائد کی ن کے ذریعے کرتا ہے۔ ایک تو حقیقت دنیا اور حقیقت آخرت کے بیان کے ذریعے کرتا ہے۔ "کہہ دیجئے دنیا کا سامان بہت ہی قلیل ہے اور آخرت ان لوگوں کے لئے بہت ہی خیر ہے جو متقی ہیں اور تم پر ذرہ برابر ظلم نہ ہو گا۔" اور دوسری حقیقت موت اور مقررہ وقت کے اٹل ہونے کے بارے میں کہ انسان جس قدر بھی احتیاط کرے اور جس قدر بھی جہاد سے دور بھاگے' موت بہرحال اپنے وقت پر آپہنچتی ہے۔ "جہاں بھی تم ہو گے 'موت تمہیں پالے گی اگرچہ تم پختہ محلات میں بیٹھے ہو۔" پھر ان کے تصورات مسئلہ تقدیر کے بارے میں درست کئے جاتے ہیں کہ انسان کے عمل اور قضا و قدر کا تعلق کیا ہے۔ "اگر ان کو کوئی بھلائی نصیب ہو تو کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کی جانب سے ہے اور اگر کوئی برائی پہنچے تو وہ کہتے ہیں یہ تمہاری جانب سے ہے۔ کہو سب کچھ اللہ کی جانب سے آتا ہے۔ لیکن ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ بات کو سمجھنے والے نہیں۔ اگر تمہیں کوئی بھلائی ملے تو یہ اللہ کی جانب سے ہے اور اگر کوئی برائی تمہیں ملے تو یہ تمہارے نفس کی وجہ سے ہے۔"

(ز) قرآن کریم اللہ اور رسول ؐ کے درمیان گہرے تعلق کی نشاندہی کرتا ہے اور یہ کہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت تصور ہوتی ہے۔ پورے کا پورا قرآن مجید اللہ کی جانب سے ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ اس کے اندر پائی جانے والی مکمل وحدت فکر پہ غور کرو' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن ایک ہی منبع سے آیا ہے۔" "جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔"..., کیا وہ قرآن کریم پر غور نہیں

کرتے 'اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کی جانب سے آتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف فکر پاتے ۔"

(ح) ان آیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ مدینہ میں افواہیں پھیلانے والوں کو صحیح طریق کار اپنانے کی ہدایت کی جاتی ہے ۔ وہ طریق کار کسی بھی صحت مند جماعت کی قیادت اور تنظیم کے لئے مناسب ہے اور وہ یہ ہے کہ "اگر وہ کسی واقعہ کو رسول اللہ ؐ اور ان لوگوں کے پاس لاتے جن کے ہاتھ میں امور مملکت تھے تو جو لوگ اس سے صحیح نتائج اخذ کر سکتے تھے وہ ان کے علم میں آ جاتا ۔"

(ط) ان آیات میں اس غلط طریق کار سے انہیں ڈرایا جاتا ہے اور ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ اللہ نے اپنا کرم کیا کہ ان کو ہدایت سے نوازا "اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو تم لوگ شیطان کے تبع ہوتے مگر کم لوگ ۔

مدینہ کی اسلامی جماعت اور سوسائٹی کے جو حالات ان آیات میں بیان ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی وجہ سے اس جماعت کے اندر کس قدر انتشار اور بے چینی پیدا کر دی گئی تھی ۔ان حالات میں جب نبی ؐ کو جہاد و قتال کا حکم ہوا تو آپ کو کس قدر ہمہ جہت اور مختلف قسم کی جدوجہد کرنا پڑی ہوگی ۔جب ہم یہ سنتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نبی ؐ سے کہتے کہ وہ جہاد کریں اگرچہ وہ اکیلے ہوں اور یہ کہ اہل ایمان کو جہاد پر اکسائیں ۔ آپ اپنی ذات ہی سے مسئول ہوں گے اور اللہ خود ہی معرکے میں حصہ لے گا ۔"پس اے نبی ؐ تم اللہ کی راہ میں لڑو، تم اپنی ذات کے سوا کسی اور کے ذمہ دار نہیں ہو ۔ البتہ اہل ایمان کو لڑنے کے لئے اکساؤ، بعید نہیں کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے ۔ اللہ کا زور سب سے زیادہ زبردست اور اس کی سزا سب سے زیادہ سخت ہے ۔" اس انداز گفتگو سے اہل ایمان کے اندر بہت ہی زیادہ جوش پیدا ہوتا، اور ان کی ہمتیں بلند ہو جاتیں کیونکہ اس میں فتح و نصرت کی پوری امید بھی تھی، اور اللہ کی تائید اور اس کی قوت پر پورا یقین بھی ۔

قرآن کریم اس جماعت کو لے کر متعدد میدانوں میں بر سرپیکار تھا ۔پہلا معرکہ نفس انسانی کے اندر برپا تھا ۔یہ معرکہ وساوس، خواہشات نفسانی، بدظنی، غلط افکار، جاہلی تصورات اور انسانی اخلاق کی کمزوریوں کے خلاف تھا ۔اگرچہ یہ کمزوریاں نفاق کی وجہ سے نہ ہوں بلکہ بشری کمزوریاں ہوں ۔قرآن کریم اس جماعت کو ایسی پالیسی کے ساتھ چلا رہا تھا کہ وہ قوت اور شوکت کے مقام تک پہنچ جائے ۔پھر اس کے اندر ہر قسم کی ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا ہو جائے ۔اور یہ نہایت ہی دور رس اغراض و مقاصد تھے ۔اس لئے کہ اگر کسی جماعت کے اندر زور آور لوگ بھی ہوں تو بھی اسے بے فکر نہ ہونا چاہئے ۔اگر اس کی صفوں میں کمزور لوگ موجود ہوں ۔تو جماعت کے اندر مختلف سطح کے لوگوں کے اندر مکمل تناسق اور مکمل یک جہتی کی ضرورت ہوتی ہے ۔خصوصاً جب اسے مختلف قسم کے معرکوں سے سابقہ درپیش ہو ۔

اس تبصرہ کے بعد اب مناسب یہ ہے کہ ہم اس سبق کی آیات پر تفصیلی بات چیت کریں ۔

---ooo---

# درس ٣٦ تشریح آیات

## ٧١ -- تا -- ٨٦

---

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ فَانفِرُوا ثُبَاتٍ أَوِ انفِرُوا
جَمِيعًا ﴿٧١﴾ وَإِنَّ مِنكُمْ لَمَن لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَإِنْ أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَالَ
قَدْ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيَّ إِذْ لَمْ أَكُن مَّعَهُمْ شَهِيدًا ﴿٧٢﴾ وَلَئِنْ أَصَابَكُمْ
فَضْلٌ مِّنَ اللَّهِ لَيَقُولَنَّ كَأَن لَّمْ تَكُن بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُ مَوَدَّةٌ يَا لَيْتَنِي
كُنتُ مَعَهُمْ فَأَفُوزَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴿٧٣﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۗ وَمَن يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٧٤﴾

---

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' مقابلہ کے لئے ہروقت تیار رہو' پھر جیسا موقع ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔ ہاں' تم میں کوئی کوئی آدمی ایسا بھی ہے جو لڑائی سے جی چراتا ہے' اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو کہتا ہے اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ گیا' اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر فضل ہو تو کہتا ہے........ اور اس طرح کہتا ہے کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا تو کوئی تعلق تھا ہی نہیں........ کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑا کام بن جاتا۔"

یہ اہل ایمان کو نصیحت ہے۔ یہ عالم بالا کی قیادت سے ان کے لئے ہدایات ہیں' جن کے اندر ان کے لئے منہاج عمل درج کیا گیا ہے۔ مستقبل کا راستہ متعین کیا گیا ہے۔ جب انسان قرآن مجید کا مطالعہ کرتا ہے' تو اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کتاب اہل ایمان کے لئے معرکہ جہاد کی عمومی اسکیم بھی تیار کرتی ہے۔ جنگ کی اسٹریٹیجی بھی قرآن میں درج کی جا رہی ہے۔ایک دوسری آیت میں ہے۔

(يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُو ... كُمْ مِّنَ ... كُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ان لوگوں کے ساتھ قتال کرو جو کفار میں سے تمہارے قریب ہیں۔ اور چاہئے کہ وہ تم میں سختی پائیں۔" اسلامی تحریک کے لئے یہ ایک عام منصوبہ ہے۔ اس آیت میں اہل ایمان کو کہا جاتا ہے۔

(يٰۤاَيُّهَا ... ذِيْنَ ... مَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا (۴ : ۷۱))

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' مقابلہ کے لئے ہروقت تیار رہو' پھر جیسا موقع ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔" یہ عملی اقدام کی اسکیم کا ایک حصہ ہے جسے ٹیکٹکس کہتے ہیں۔ اور سورہ انفال میں بھی بعض ایسی ہدایات دی گئی ہیں جو میدان جنگ کے بارے میں ہیں۔

(فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ) "پس اگر تم انہیں لڑائی میں پاؤ تو انہیں ایسی سزا دو کہ جو لوگ ان کے پس پشت ہیں ان کو بھاگتے دیکھ کر خود بھی بھاگ کھڑے ہوں اور شاید وہ بدعہدی کے انجام سے عبرت پکڑیں۔"

یہ ہے قرآن مجید' اس میں مسلمانوں کو صرف عبادات اور مراسم عبودیت ہی نہیں سکھائے گئے اور نہ اس میں صرف انفرادی اسلامی آداب اور اخلاق ہی سکھائے گئے ہیں۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا اس دین کے بارے میں ایسا فقیرانہ تصور ہے بلکہ یہ قرآن کریم لوگوں کی زندگی کو پورے طور پر ( As a Whole ) لیتا ہے۔ یہ زندگی کے عملی واقعات میں سے ہر ایک واقعہ پر اپنا فیصلہ دیتا ہے۔ اور پوری زندگی کے لئے مکمل ہدایات دیتا ہے۔ یہ کتاب ایک مسلمان فرد اور ایک مسلمان معاشرے سے' اس سے کم کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتی کہ ان کی پوری پوری زندگی اس کتاب کے مطابق بسر ہو۔ اس کتاب کے تصرف میں ہو' اس کی ہدایات کے مطابق بسر ہو۔ خصوصاً یہ کتاب کسی مسلمان فرد اور سوسائٹی کو یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنی زندگی کے لئے متعدد نظام اختیار کر لیں جن

کے اصول مختلف ہوں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ذاتی نظام' عبادات اور اخلاق و آداب کا نظام تو وہ کتاب اللہ سے لے لیں' اور اقتصادی' اجتماعی' سیاسی اور بین الاقوامی معاملات میں ہدایات کسی دوسری کتاب یا کسی انسان کے دیئے ہوئے تصورات سے اخذ کرلیں۔ اس کتاب کے مطابق انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی فکر اور تصورات اس کتاب اور اس کے منہاج سے اخذ کرے اور اپنی زندگی کے لئے تفصیلی احکام اس کتاب سے لے کر زندگی کے واقعات پر ان کا انطباق کرے۔ اس لئے کہ زندگی کے اندر مسلسل نئے نئے مسائل اور حالات پیش آتے رہتے ہیں اور یہ احکام وہ اس طرح مستنبط کرے جس طرح اس سبق سے پہلے سبق میں اس کی تفصیلات خود اس کتاب نے دی ہیں۔ اس کے سوا کوئی اور راستہ اس کتاب نے کھلا نہیں چھوڑا ورنہ' نہ ایمان ہو گا اور نہ اسلام۔ سرے سے اسلام اور ایمان ہو گا ہی نہیں اس لئے کہ جو لوگ اس کتاب کا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کرتے وہ ایمان اور اسلام میں داخل ہی نہیں ہوتے اور گویا انہوں نے ارکان اسلام کا اعتراف ہی نہیں کیا ہے۔ ان ارکان میں سے پہلا کلمہ شہادت (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے اور اللہ کے سوا کوئی شارع نہیں ہے۔

یہ ہے قرآن کریم جو اس معرکے میں مسلمانوں کے لئے میدان جنگ کا منصوبہ بناتا ہے جو اس وقت ان کے موقف کے ساتھ شامل تھا' اور جو ان کے وجود کے لئے ضروری تھا کیونکہ ان کے اردگرد ہر طرف بے شمار مخالفتیں تھیں' جن میں وہ گھرے ہوئے تھے۔ اسلامی مملکت کے اندر یہودی اور منافقین مسلمانوں کے خلاف گہری سازشیں کر رہے تھے۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ مومنین کو خبردار کرتے ہیں۔

(يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا (۴ : ۷۱))

"اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' مقابلے کے لئے ہر وقت تیار رہو' پھر جیسا موقعہ ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔" ثبات ثبت کی جمع ہے 'یعنی مجموعہ' حکم یہ ہے کہ جہاد کے لئے اکیلے نکلنا جائز نہیں ہے۔ جہاد کے لئے یا تو چھوٹے چھوٹے دستوں کی شکل میں نکلو یا بڑے لشکر اور فوج کی شکل میں نکلو' جس طرح کا معرکہ درپیش ہو' اس لئے کہ افراد کو دشمن سہولت سے پکڑ سکتا ہے' اور اس وقت دشمن ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت بالخصوص یہ حکم تھا' اس لئے کہ اس دور میں دشمن اسلام کے مرکز میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور مدینہ میں یہودیوں اور منافقین کی صورت میں کھلے پھرتے تھے۔

(وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا (۷۲) وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا (۷۳) (۴ : ۷۲-۷۳)).

"ہاں تم میں کوئی کوئی آدمی ایسا بھی ہے جو لڑائی سے جی چراتا ہے' اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو کہتا ہے کہ اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ گیا' اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر فضل ہو تو کہتا ہے...... اور اس طرح

کہتا ہے کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا تو کوئی تعلق تھا ہی نہیں..... کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا یا بڑا کام بن جاتا۔"

منظم دستوں کی شکل میں نکلو یا سب کے سب نکلو' یہ نہ ہو کہ تم میں بعض لوگ تو نکلیں اور بعض لوگ سستی کریں۔ جیسا کہ بعض لوگ سستی کر رہے ہیں' اور ہروقت تیار رہو۔ صرف خارجی دشمن کے مقابلے میں نہیں بلکہ ان اندرونی دشمنوں کے مقابلے میں بھی' ان لوگوں کے مقابلے میں بھی تیار رہو جو پہلوتہی کرتے ہیں' لڑائی سے جی چراتے ہیں اور جو شکست خوردہ ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو جہاد سے روکتے اور سستی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی جنگ سے روکتے ہیں شکست خوردہ ذہنیت کے لوگوں کی عادت بالعموم ایسی ہی ہوتی ہے۔

(لَيُبَطِّئَنَّ) کا لفظ جو یہاں استعمال ہوا ہے اس کے اندر ایک قسم کا بھاری پن اور پھسلن پائی جاتی ہے۔ اس کے حروف کی ادائیگی اور صوتی حرکت کے اندر بھی ایک قسم کی پھسلن پائی جاتی ہے۔ اور جب زبان اس کے آخری اور مشدد حرف کو ادا کرتی ہے تو اس میں بھی کھچاؤ ہے۔ ایک لفظ کے ساتھ اس پوری نفسیاتی کشمکش کو ادا کر دیا گیا جو ایسے لوگوں کے ذہن میں ہوتی تھی اور خود لفظ جو اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے استعمال کیا گیا ہے پوری کشمکش اپنے اندر رکھتا ہے۔ جس طرح مفہوم بھاری ہے اس طرح لفظ بھی بھاری استعمال کیا گیا ہے اور یہ وہ کمال درجے کا اسلوب ادا ہے جو صرف قرآن کا خاصہ ہے۔ ((دیکھئے التصویر الفنی فی القرآن' فصل تناسق)) اس لفظ کے بعد پھر (وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ (۴: ۷۲)) کے پورے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح سست روی کا شکار ہیں' یہ لوگ معدودے چند ہیں اور ان کو اس پہلوتہی پر پوری طرح اصرار ہے۔ وہ اس میں سخت کوشاں ہیں اور یہ بات ان تاکیدی حروف سے معلوم ہوتی ہے جو اس فقرے میں استعمال ہوئے ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گروہ اپنے رویے پر مصر ہے اور اسلامی محاذ پر اس کا اثر پڑ رہا ہے اور بہت برا اثر ہو رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ان کے بارے میں تفصیلی وضاحتیں کرتا ہے۔ ان کے دلوں کے اندر پوشیدہ رازوں کا انکشاف کرتا ہے۔ ان کی قابل نفرت حقیقت کی خوب تصویر کشی کرتا ہے اور یہ قرآن کریم کا عجیب معجزانہ انداز ہے۔

یہ لو' یہ لوگ تمہارے سامنے ہیں' اپنے پورے ارادوں کے ساتھ' اپنے مکمل مزاج اور اپنے اقوال و افعال کے ساتھ' بالکل سامنے' آنکھوں کے سامنے بالکل ننگے کھڑے ہیں۔ گویا انہیں مائیکرواسکوپ کے نیچے کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اور یہ اندرونی مائیکرواسکوپ ان کے دلی رازوں کا انکشاف کر رہا ہے اور ان کے تمام اغراض و مقاصد اس سے واضح ہو رہے ہیں۔

دیکھو یہ لوگ ہیں' جو عہد رسول اللہ ؐ میں نظر آتے ہیں اور آپ کے عہد کے بعد ہر زمان و مکان میں یہ قسم یوں ہی باقی رہے گی۔ یہ کیا ہیں؟ کمزور' منافق اور آئے دن بدلنے والے' جن کے مقاصد نہایت ہی چھوٹے ہیں' نہایت پیش پا افتادہ' جو اپنے ذاتی مفادات اور شخصی فائدے سے اعلیٰ کسی اور فائدے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ اپنی شخصیت سے اونچے افق کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے' یہ لوگ پوری دنیا کو ایک ہی محور کے گرد گھماتے ہیں اور یہ محور ان کی ذات اور ذاتی مفادات کا محور ہے' اسے وہ کبھی نہیں بھولتے۔

یہ لوگ سست اور ڈھیلے ہیں اور آگے بڑھنے والے نہیں ہیں کہ اپنے اصل مقام پر جا کھڑے ہوں' اور نفع و نقصان

کے بارے میں ان کا جو تصور ہے وہ گھٹیا درجے کے منافقین کے لائق ہے۔

یہ لوگ معرکہ جہاد سے پیچھے رہنے والے ہیں' اگر مجاہدین پر مصیبتیں آجائیں اور وہ مبتلائے مشکلات ہو جائیں جس طرح اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے تو یہ پسماندہ لوگ بہت ہی خوش ہوتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ جہاد سے ان کا فرار اور مشکلات سے ان کا بچ نکلنا ان کے لئے مفید ہے۔

(فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا (۴:۷۲)) (اگر تم پر کوئی مصیبت آجائے تو کہتا ہے اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ گیا)

ایسے لوگوں کو اس بات سے شرم نہیں آتی کہ وہ بزدلی کی اس زندگی کو اللہ کی نعمت تصور کرتے ہیں اور پھر وہ اسے اس اللہ کا فضل کہتے ہیں جس کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہ لوگ پیچھے بیٹھ گئے ہیں۔ ایسے حالات میں اگر کوئی بچ بھی نکلے تو وہ کبھی نعمت خداوندی نہیں پا سکتا کیونکہ اللہ کی نعمت اللہ کے حکم کی خلاف ورزیاں کر کے نہیں ملتی اگرچہ بظاہر وہ صاحب نجات نظر آئیں۔

یہ بے شک ایک نعمت ہوگی مگر ان لوگوں کے نزدیک جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ نہیں کرتے۔ یہ ان لوگوں کے نزدیک بچنا ہے جو یہ نہیں سمجھتے کہ ان کا مقصد تخلیق کیا ہے؟ اور وہ اطاعت کر کے اور جہاد کر کے اللہ کی غلامی نہیں کرتے تاکہ وہ اسلامی نظام حیات کو دنیا میں قائم کریں۔ یہ ان لوگوں کے نزدیک نعمت ہے جن کی نظریں اپنے قدموں کے آگے بلند آفاق پر نہیں پڑ سکتیں۔ یہ چیونٹیوں کی طرح کے لوگ ہیں' یہ نجات ان لوگوں کے نزدیک نعمت ہے جو اس بات کا احساس نہیں رکھتے کہ اللہ کے راستے میں جہاد کی مشکلات برداشت کرنا اسلامی نظام کے قیام کے لئے اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے اور یہ اللہ کا خصوصی انتخاب ہے جس کے ذریعے وہ جسے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے منتخب کر لیتا ہے تاکہ وہ دنیا کی اس زندگی میں بشری کمزوریوں پر قابو پائیں۔ اس طرح وہ انہیں دنیا کی قید سے رہائی دلاتا ہے۔ وہ ایک برگزیدہ زندگی پر فائز ہو جاتے ہیں' وہ زندگی کے مالک ہو جاتے ہیں اور زندگی ان کی مالک نہیں ہوتی۔ تاکہ یہ آزادی اور یہ سربلندی ان کو ان بلندیوں تک لے جائے جو آخرت میں شہداء کے لئے مقرر ہیں۔ بے شک سب لوگ مرتے ہیں لیکن اللہ کی راہ میں جان دینے والے ہی شہید ہوتے ہیں اور یہ اللہ کا فضل عظیم ہے۔

اگر صورت حال دوسری پیش آجائے اور مجاہدین کامیاب ہو جائیں' وہ جو یہ تیاری کر کے نکلے تھے کہ اللہ کی راہ میں انہیں جو پیش آتا ہے' آئے اور انہیں اللہ کا فضل نصیب ہو جائے' فتح اور غنیمت کی صورت میں تو یہ پیچھے رہنے والے لوگ سخت نادم ہوتے ہیں کہ وہ کیوں نہ اس نفع بخش معرکے میں شریک ہوئے۔ اس فائدے میں ان کے نزدیک نہایت ہی گھٹیا معیار ہوتا ہے' خالص دنیاوی معیار۔

(وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا (۴:۷۳))

(اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر فضل ہو تو کہتا ہے .... اور اس طرح کہتا ہے کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا کوئی تعلق تھا ہی نہیں .... کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑا کام بن جاتا۔)

یہ نہایت ہی گھٹیا خواہش ہے محض مال غنیمت کی خواہش ' اور اسے یہ شخص فوز عظیم سے تعبیر کرتا ہے ۔ مومن بھی مال غنیمت کے ساتھ واپسی کو برا تو نہیں سمجھتا بلکہ اس سے توقع تو یہی ہے کہ وہ بھی اللہ سے ایسی کامیابی مانگے ۔ اور مومن سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ مشکلات کی طلب کرے بلکہ مطلوب تو یہ ہے کہ وہ عافیت کی دعا کرے ۔ مومن کا مجموعی تصور ان متخلفین کے تصور سے بالکل جدا ہوتا ہے ۔ اس لئے ان لوگوں کے تصور کو قرآن کریم نہایت ہی مکروہ صورت میں پیش کرتا ہے جو قابل نفرت ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ مومن بھی مشکلات اور مصائب کی تمنا نہیں کرتا بلکہ عافیت کا طلبگار ہوتا ہے لیکن اسے جب جہاد کی طرف بلایا جائے تو وہ بوجھل قدموں کے ساتھ آگے نہیں بڑھتا ۔ جب وہ نکلتا ہے تو وہ دو اچھے انجاموں میں سے ایک کا طالب ہوتا ہے یا نصرت و کامرانی یا شہادت فی سبیل اللہ کا اور یہ دونوں ہی اللہ کے فضل میں سے ہیں اور دونوں ہی فوز عظیم ہیں ۔ اہل ایمان کی قسمت میں یا تو شہادت آجاتی ہے تو پھر بھی وہ راضی برضا ہوتے ہیں اور اس گروہ میں جاتے ہیں جو شہادت کے مقام پر فائز ہوا ۔ یا وہ زندہ مال غنیمت کے ساتھ واپس آتا ہے تو اس صورت میں وہ اللہ کے فضل پر شکر گزار ہوتا ہے اور اس کی جانب سے آئی ہوئی فتح پر خوش ہوتا ہے مگر یہ خوشی محض زندہ بچ جانے کی وجہ سے نہیں ہوتی ۔

یہ ہے وہ اعلیٰ افق جس کے بارے میں اللہ کا ارادہ ہے کہ اہل ایمان اپنی نظریں اس پر رکھیں ۔ اللہ تعالیٰ ان اہل ایمان میں سے اس فریق کی تصویر ان کے سامنے کھینچتے ہیں اور یہ انکشاف فرماتے ہیں کہ تمہاری صفوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو جہاد سے پہلوتہی کرنے والے ہیں اور یہ انکشاف اس لئے کیا جاتا ہے کہ اہل ایمان ان سے چوکنے رہیں جس طرح وہ ظاہری دشمنوں سے چوکنے رہتے ہیں ۔

اس طرح متنبہ کرنے اور اس دور میں جماعت مسلمہ کو مواقع عبرت فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن کریم ایک ایسے انسانی ماڈل کا ایک عام نمونہ یہاں منقش کرتا ہے ' جو ہر دور اور ہر جگہ بار بار سامنے آتا رہتا ہے اور یہ تصویر کشی قرآن مجید چند الفاظ کے اندر کرتا ہے ۔

یہ حقیقت جماعت مسلمہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے اس لئے کہ اسلامی حلقوں کے اندر ہمیشہ ایسے لوگ پائے جاسکتے ہیں ۔ جماعت کو ایسے لوگوں کی حرکات سے مایوس نہیں ہونا چاہئے بلکہ اپنی تیاری کو ہر حال میں مکمل رکھنا اور آگے بڑھنا چاہئے ۔ ہر وقت تربیت ہدایت اور جہد مسلسل کے لئے تیار رہنا چاہئے تاکہ جماعت تمام نقائص سے پاک ہو ۔ اپنی کمزوریوں کا مداوا ہر وقت ہوتا رہے اور جماعت کے عملی اقدامات ' اس کے نظریات اور اس کی تمام حرکات کے درمیان باہم ربط ہو ۔

---ooo---

اب اگلی آیت میں یہ سعی کی جاتی ہے کہ یہ سست رو ' پہلوتہی کرنے والوں اور دنیاوی گندگیوں میں آلودہ لوگوں کو قدرے اٹھایا جائے اور ان کے حس و شعور میں اس دنیا سے آگے آخرت کا شعور پیدا کیا جائے ۔ ان کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ دنیا کو فروخت کر کے آخرت کو خریدنے والے بنیں ' اور اس کام میں انہیں دو اچھے انجاموں میں سے ایک

ضرور نصیب ہو گا یا تو فتح و نصرت سے ہمکنار ہوں گے یا شہادت ان کو نصیب ہو گی۔

(فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَوٰةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ وَمَن يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا (٤:٧٤))

"(ایسے لوگوں کو معلوم ہو کہ) اللہ کی راہ میں لڑنا چاہئے ان لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو فروخت کر دیں' پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اسے ضرور ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔"

اس لئے مومنین کو اللہ کی راہ میں لڑنا چاہئے' اسلام ماسوائے اس کے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کی جائے' کسی اور جنگ کا قائل ہی نہیں ہے۔ اس لئے جنگ نہ کی جائے کہ مصنوعات کے لئے خام مال فراہم کیا جائے' نہ اسلام غنیمت کے لئے جنگ کی اجازت دیتا ہے' نہ اقتدار کے حصول کے لئے اجازت دیتا ہے' نہ وہ ذاتی اور قومی برتری کے لئے جنگ کی اجازت دیتا ہے' نہ ملکوں کو فتح کرنے کے لئے جنگ کی اجازت دیتا ہے' نہ لوگوں کو غلام بنانے کے لئے اجازت دیتا ہے' اور نہ اسلام 'کسی ایسی جنگ کی اجازت دیتا ہے جو منڈیوں کے حصول کے لئے لڑی جائے' اور نہ اسلام کی جنگ اس بات کے لئے ہے کہ نو آبادیاتی علاقوں میں سرمایہ لگا کر مفادات حاصل کئے جائیں۔

اسلام ذاتی برتری کے لئے جنگ کی اجازت نہیں دیتا اور نہ کسی خاندان کی برتری کے لئے جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ نہ کسی طبقے اور کسی حکومت کی برتری کے لئے اسلام جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ نہ کسی قوم اور نہ کسی نسل کی برتری کے لئے اسلام لڑتا ہے۔ اسلام صرف اللہ کی راہ میں جنگ کی اجازت دیتا ہے' اور زمین پر اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے اسلام جنگ کی اجازت دیتا ہے اور یہ اس لئے کہ اس کرۂ ارض پر تمام انسانوں کی زندگی کو اللہ کا نظام کنٹرول کرے۔ انسانیت اس نظام کی برکات سے لطف اندوز ہو اور یہ نظام تمام انسانوں کے درمیان بے قید عدل و انصاف جاری کرے لیکن اس نظام کے تحت ہر شخص کو عقیدے اور نظریے کی مکمل آزادی ہو۔ یوں اس ربانی' انسانی اور عالمی نظام حیات کے تحت لوگ زندہ رہیں۔

جب ایک مسلمان اللہ کے راستے میں لڑنے کے لئے نکلتا ہے' اور یہ لڑائی وہ صرف اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے کرتا ہے اور زندگی میں اسلامی نظام حیات کی حکمرانی کے لئے لڑتا ہے اور پھر وہ قتل ہو جاتا ہے تو وہ شہید ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے نزدیک مقام شہداء پر فائز ہوتا ہے۔ اور اگر وہ اس مقصد کے سوا کسی اور مقصد کی خاطر لڑتا ہے تو وہ کسی صورت میں بھی شہید نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے لئے کوئی اجر اور صلہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا صلہ ان مقاصد کے زعماء کے پاس ہوتا ہے۔ جو لوگ ایسے لوگوں کو شہداء کہتے ہیں وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو اس چیز کے ساتھ تقدس دیتے ہیں جس کی ساتھ اللہ کسی کو مقدس نہیں بناتا۔ یہ اللہ پر ایک افتراء کے سوا کچھ نہیں ہے۔

لہذا اللہ کے راستے میں صرف اس ایک مقصد کے لئے لڑنا جائز ہے۔ اور یہ لڑائی وہ لوگ کرتے ہیں جو دنیا فروخت کر کے آخرت خریدتے ہیں اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم انتظار میں ہے۔ دونوں حالتوں میں ان پر فضل ہے۔ اگر وہ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں تو بھی فضل ہے اور اگر وہ اللہ کی راہ میں غالب ہو جائیں تو بھی اللہ کا فضل ہے۔

(وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (۴:۷۴))

"پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اسے ضرور ہم اجرِ عظیم عطا کریں گے۔"

اس طرح قرآنی نظام حیات ان نفوس قدسیہ کو بلند کرتا ہے اور وہ دونوں حالتوں میں اللہ کے عظیم فضل کے امیدوار ہو جاتے ہیں۔ ان پر اللہ کی راہ میں موت اور جان دینا آسان ہو جاتا ہے۔ وہ اس دنیا کے مال غنیمت کے حصول کی امید سے بھی بالا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ پوری کی پوری زندگی اور مال غنیمت کے بڑے بڑے ڈھیر بھی اللہ کے فضل عظیم کے مقابلے میں کچھ نہیں ہیں۔ اسی طرح یہ مختصر ٹچ' انسان کے دلوں میں اس سودے کے خلاف نفرت پیدا کر دیتا ہے جس میں کوئی شخص آخرت کے مقابلے میں دنیا کو خریدتا ہے۔ لفظ یشرون متضاد الفاظ میں سے ہے جو خرید کے معنی میں بھی آتا ہے اور فروخت کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن زیادہ تر یہ فروخت کے معنی میں آتا ہے' تو یہ سودا نہایت ہی خسارے کا ہو گا چاہے انہیں دنیا میں مال غنیمت ملے یا نہ ملے اس لئے کہ دنیا کا آخرت سے کیا مقابلہ ہے اور مال غنیمت کے حقیر مال کا اللہ کے فضل عظیم کے ساتھ کیا مقابلہ ہے۔ اللہ کے فضل میں مال بھی شامل ہے اور مال کے علاوہ دوسرے اکرام اور انعام بھی شامل ہیں۔

اب روئے سخن مسلمانوں کی طرف پھر جاتا ہے۔ جنگ سے پہلوتہی کرنے والوں اور جی چرانے والوں کی تصویر کشی کے انداز کو اب چھوڑ کر مسلمانوں سے خطاب کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی مروت اور جوانمردی کو ابھارا جاتا ہے۔ ان کے دلوں کے اندر احساس فرض پیدا کیا جاتا ہے۔ اس دنیا اور جزیرۃ العرب میں زیردست لوگوں کے حالات پر غور کرو۔ مرد' عورتیں اور بچے جو مکہ مکرمہ میں مشرکین کے ہاتھوں مظالم سہ رہے ہیں اور ان کے اندر اس قدر قوت بھی نہیں ہے کہ وہ دارالاسلام کی طرف ہجرت کر آئیں اور فرار اختیار کر کے اپنے دین اور نظریات کو بچالیں۔ وہ آزادی کی آس لئے ہوئے ہیں اور ہروقت دست بدعاء رہتے ہیں کہ اے پروردگار ہمیں اس گاؤں سے نکال جہاں کے رہنے والے ظالم ہیں۔ اس صورت حال کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کر کے انہیں بتاتا ہے کہ تمہاری جنگ بلند مقاصد کے لئے ہے۔ تمہارے اہداف بلند ہیں' اور یہ جنگ جس کے لئے تمہیں نکلنے کا حکم دیا جارہا ہے اس کے مقاصد نہایت ہی اونچے مقاصد ہیں۔ اس لئے انہیں اس کی طرف بوجھل قدموں سے نہ نکلنا چاہئے۔ یہ پکار نہایت ہی تاکیدی اور برانگیختہ کرنے کے انداز میں ہے۔ اور سستی اور پیچھے رہنے کو بہت ہی برا سمجھا گیا ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝۷۵

"آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں' عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پاکر دبالئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔"

قتال فی سبیل اللہ میں سستی کرنے کا تمہارے لئے کیا موقعہ ہے جبکہ ان مجبور اور ضعیف مردوں' عورتوں اور بچوں کا آزاد کرانا تمہارے فرائض میں سے ہے۔یہ لوگ جو قابل رحم حالت میں ہیں اور جن کی تصویر کشی قرآن کریم نہایت ہی اثر آفریں الفاظ میں کرتا ہے جس پر مسلمانوں کی حمیت جوش میں آتی ہے۔مسلمانوں کی عزت نفس جوش میں آتی ہے اور انسانی رحم اور ہمدردی کے جذبات جاگ اٹھتے ہیں' اس لئے کہ یہ لوگ شدید سے شدید تر مظالم کے شکار ہو رہے ہیں۔اس لئے بھی کہ ان پر یہ مظالم محض ان کے نظریات کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ان کے دین کی وجہ سے انہیں مبتلائے مصیبت کیا جارہا ہے۔اس کے سوا ان کا اور کوئی جرم نہیں ہے۔غرض نظریات اور دین کی وجہ سے جو مصائب آتے ہیں وہ جان و مال کی وجہ سے آنے والے مصائب سے زیادہ شدید اور سخت ہوتے ہیں۔اس لئے کہ یہ مصائب انسان پر انسانی خصوصیات کی وجہ سے آتے ہیں۔اور انسان کی عزت نفس' اس کی عزت اور اس کے حق ملکیت وغیرہ کے حوالے سے مصائب کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔

ایسی عورت کی تصویر جو ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو' ایسے بچوں کے مناظر جو نحیف و ناتواں ہوں' ایک ایسا منظر ہے جو جذبات کے اندر تلاطم پیدا کر دیتا ہے' خصوصاً وہ ضعیف لوگ اور بوڑھے جو اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے اور خصوصاً ایسے حالات میں جب اس دفاع کا تعلق دین اور عقیدے سے ہو۔یہ منظر ایسے وقت میں دکھایا جاتا ہے جس میں جہاد کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ایسے حالات میں جہاد کے لئے نہ اٹھنا نہایت ہی مکروہ فعل ہو گا' جبکہ مظلوموں کی یہ چیخ و پکار سنی جا رہی ہو۔یہ ایک ایسا اسلوب بیان ہے جو دلوں کو پگھلا دیتا ہے اور انسانی شعور اور احساس کے اندر گہرائی تک اتر جاتا ہے۔

لہٰذا ایک نظر اس پہلو پر بھی ڈالیں کہ اسلامی تصور کے مطابق ملک و وطن کی حیثیت کیا ہے۔یہاں ملک اور بلدہ کی تعریف یوں کی جاتی ہے۔(الظَّالِمِ اَهْلُهَا) جس کے لوگ ظالم ہیں' یہ اسلام کے نزدیک دار الحرب ہے۔اور مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس ملک کے ساتھ کمزور مسلمانوں اور ان کے بیوی بچوں کو چھڑانے کے لئے جنگ کریں۔اور یہ وطن مکہ ہے جو مہاجرین کا اصلی وطن تھا اور ان مہاجرین کو پرجوش دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اس ملک کے خلاف جنگ کریں اور ضعیف مسلمانوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ موقعہ پاتے ہی اس ظالم ملک سے نکل آئیں۔

یہاں اس علاقے اور ملک کا مہاجرین کا وطن اصلی ہونا کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور اس وجہ سے اسلامی نقطہ نظر سے اس کی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی' جب کہ اس میں اللہ کی شریعت بھی نافذ نہیں ہے۔وہ اسلامی نظام حیات کے تحت نہیں ہے جس میں مومنین کو ان کے ایمان کی وجہ سے فتنوں اور مصیبتوں میں ڈالا جاتا ہے اور ان پر محض ان کے عقیدے کی وجہ سے مظالم ڈھائے جاتے ہیں بلکہ خود ان اصلی باشندوں کے نقطہ نظر سے یہ ملک دار الحرب بن گیا ہے۔وہ اپنے اس اصل وطن کی مدافعت نہیں کرتے بلکہ یہ لوگ خود اپنے اصل ملک کے خلاف اس لئے جنگ کرتے ہیں کہ وہاں سے اپنے مومن بھائیوں کو نکال لیں۔غرض مسلمان کا جھنڈا وہ ہوتا ہے جو اس کے عقیدے کا جھنڈا ہوتا ہے اور ایک مسلمان صرف ایک جھنڈے کی حمایت کرتا ہے۔اس کا وطن جس کے لئے وہ لڑتا ہے وہ وطن ہے جس میں اسلامی نظام

تربیت نافذ ہو' اور اس کی وہ سرزمین جس کا وہ دفاع کرے گا وہ سرزمین ہے جو دارالاسلام ہے اور جس میں اسلامی شریعت اور اسلامی نظام جاری و ساری ہو۔ اس کے علاوہ کسی وطن کے بارے میں جس قدر تصورات ہیں وہ غیر اسلامی اور جاہلی تصورات میں اور اسلام ان تصورات کو ہرگز نہیں پہچانتا۔

اب ایک دو سرانچ اس موضوع کو دیا جاتا ہے' ہمتوں کو تازہ کرنے کا ایک اور موقع ہے' عزائم میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک نئی راہ میں روشنی کے قمقمے چمک اٹھتے ہیں۔ مقاصد' مفادات اور اقدار حیات کی ایک نئی تعریف (Definition) سامنے آتی ہے۔ ہر ایک گروہ اپنی اقدار کے لئے کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَاۗءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿٧٦﴾

"جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے' وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے' وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں' پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں۔" اچانک تمام انسان ایک دوراہے پر آکھڑے ہوتے ہیں' اہداف و مقاصد متعین ہو جاتے ہیں' خطوط واضح ہو جاتے ہیں اور لوگ دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں' دو ممتاز جھنڈوں کے نیچے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

(اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۴: ۷۶)) "جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے' وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔" اور (وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ (۴: ۷۶)) "اور جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے' وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔"

اہل ایمان کی صف آرائی اللہ کی راہ میں ہے اور وہ اللہ کا نظام حیات نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اللہ کی شریعت کا نفاذ چاہتے ہیں' وہ اللہ کے نام پر لوگوں کے درمیان قیام عدل چاہتے ہیں' وہ اللہ کے سوا کسی اور نام اور عنوان سے بات نہیں کرتے۔ وہ اس بات کا اعتراف کر چکے ہوتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی اور الہ نہیں ہے اس لئے وہی حاکم ہے۔

اور اہل کفر طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں' یہ مختلف قسم کے طاغوتی نظامہائے زندگی کے دلدادہ ہیں۔ اور یہ تمام طاغوتی نظام خدائی نظام زندگی کے متضاد ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ایسا قانونی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جو شریعت کے خلاف ہو۔ وہ ایسی اقدار کو رائج کرنا چاہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے جائز نہ ہوں۔ وہ ایسے پیمانوں سے اقدار حیات کو ناپتے ہیں جو اللہ کی میزان میں کوئی وزن نہیں پاتے۔

وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں وہ اللہ کی حمایت اور رعایت اور نگہبانی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ طاغوت سے مدد لیتے ہیں۔ ان کا مددگار شیطان ہوتا ہے اور شیطان کے جھنڈے مختلف ہوتے ہیں' طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ قوانین مختلف ہوتے ہیں' اقدار اور پیمانے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ سب لوگ شیطان کے ساتھی

ہوتے ہیں۔

(فَقَاتِلُوْآ اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا (٤ : ٧٦)) ”پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں۔“

یوں مسلمانوں کا موقف ایک پختہ جگہ پر ہوتا ہے اور ان کا تکیہ بھی مضبوط ہوتا ہے۔ وہ مضبوط اساس پر کھڑے ہوتے ہیں اور ایک مضبوط سہارا لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا وجدان اور شعور پختہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں لڑ رہے ہیں۔ وہ صرف اللہ کی جنگ ہے اور اس میں ان کی ذات کا کوئی حصہ بھی نہیں ہے۔ نہ اس میں ان کا کوئی ذاتی مفاد مضمر ہے۔ نہ اس میں ان کی قوم، ان کی نسل، ان کے رشتہ داروں اور ان کے خاندان کا کوئی مفاد ہے۔ یہ صرف اللہ کے لئے ہے، اس کے نظام کے لئے ہے اور اس کی شریعت کے لئے ہے۔ پھر ان کا یہ شعور بھی پختہ ہوتا ہے کہ ان کا مقابلہ اہل باطل سے ہے، اور ان کے مقابل باطل کو حق پر غالب کرنا چاہتے ہیں، اس لئے کہ وہ انسانوں کے جاہلی معاشروں کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اور یہ کہ تمام انسانی نظام جاہلی نظام ہوتے ہیں۔ صرف اللہ کی شریعت برحق نظام ہے۔ جبکہ وہ شریعت کو مغلوب کر کے انسانی قانونی نظام رائج کرتے ہیں اور انسانی قانون کے مطابق فیصلے کرانا چاہتے ہیں۔ ہر وہ فیصلہ ظلم ہے جو انسانی قانون کے مطابق ہو۔ یہ اللہ کے قانون کے ساتھ ظلم ہے، کیونکہ اللہ کا حکم تو یہ ہے کہ فیصلے اس کی شریعت کے مطابق ہوں۔

یہ اہل ایمان جب میدان جنگ میں اترتے ہیں تو اس یقین کے ساتھ اترتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کا ساتھی اور مددگار ہے۔ وہ یہ شعور رکھتے ہیں کہ وہ ایک ایسی قوت سے لڑنے جا رہے ہیں جس کا مددگار شیطان ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ شیطان کی تمام چالیں بمقابلہ رحمان ضعیف ہوتی ہیں۔

یہاں آکر ایک مومن کے احساس اور شعور میں اس معرکے کا فیصلہ ہو جاتا ہے اور اس کا انجام متعین ہو جاتا ہے تو اس کے بعد ایک مومن اس معرکے میں قدم رکھتا ہے۔ اب اگر مومن اس معرکے میں شہید ہو جاتا ہے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ اچھا رہے گا اور اگر وہ نصرت پاتا ہے اور اس معرکے میں اسے غلبہ نصیب ہوتا ہے تو اسے پختہ یقین ہوتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ اجر عظیم سے نوازے گا۔

اس مسئلے کے اس حقیقی فہم و ادراک ہی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام کی جماعت کے ہاتھوں وہ معجزات سرزد ہوئے جو اسلامی تاریخ کا حصہ ہیں اور صحابہ کرام کے بعد بھی مختلف نسلوں میں جابجا اس کے نمونے نظر آتے ہیں۔ یہاں اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم ان کے کچھ نمونے پیش کریں، کیونکہ یہ تو بہت ہی مشہور ہیں۔ یہی تصور تھا جس کے نتیجے میں اسلام کو وہ حیران کن پھیلاؤ نصیب ہوا، اور یہ پھیلاؤ تاریخ کے مختصر ترین عرصے کے اندر واقعہ ہوا۔ یہ تصور اس برتری کا ایک پہلو تھا، جو اسلامی نظام حیات کی وجہ سے امت مسلمہ کو نصیب ہوئی اور یہ برتری اسے اس وقت کے برسرپیکار دونوں بلاکوں کے مقابلے میں نصیب ہوئی اور اس برتری کی طرف ہم اس سے قبل اشارہ کر چکے ہیں۔ اس تصور اور ادراک کی نشوونما اس مہم کا ایک حصہ تھا جو قرآن کریم کے پیش نظر تھی۔ یہ مہم اہل ایمان کی نفسیاتی دنیا میں بھی جاری تھی اور ان دشمنوں کے ساتھ میدان جنگ میں بھی جاری تھی، جس میں اہل ایمان، اپنے مقابلے میں آنے والی فوجوں کی

تعداد اور سازوسامان کے حوالے سے بہت ہی زیادہ قوت کے ساتھ برسرپیکار تھے ۔ دشمن کو اس عظیم تعداد اور سازوسامان کے باوجود شکست ہوئی ۔ اس لئے کہ وہ تصور حیات کے لحاظ سے تہی دامن تھا ۔

ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ قرآن کریم نے اس تصور کی نشوونما اور اس کی پختگی کے لئے کس قدر جدوجہد کی ۔ یہ کام کوئی آسان کام نہ تھا ۔ یہ صرف ایک بات نہ تھی جو زبانی طور پر کہہ دی جاتی ۔ یہ تو جہد مسلسل تھی ۔ اس میں انسان کی ذاتی تنگ دلی ' ہرقیمت پر زندہ رہنے کی حرص اور نفع و نقصان کے بارے میں غلط تصورات کے خلاف مسلسل جدوجہد کی گئی ۔ اس سبق میں اس جہد مسلسل کے کچھ نمونے بھی ملاحظہ فرمائیں ۔

---ooo---

اس کے بعد سیاق کلام میں ' مسلمانوں کے کئی طبقات کے طرز عمل پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے ۔ (کہا گیا ہے کہ ان میں سے بعض لوگ مہاجرین تھے ) یہ لوگ جب مکہ میں تھے تو وہ کفار کے مقابلے کے لئے اپنے اندر جوش و خروش رکھتے تھے ' اس لئے کہ مکہ میں ان پر ناقابل برداشت مظالم ہو رہے تھے ۔ اس جوش و خروش کے نتیجے میں وہ مکہ میں جہاد و قتال کی اجازت چاہتے تھے ' جبکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجازت نہ تھی ۔ لیکن جب مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی اور ان پر جہاد و قتال من جانب اللہ فرض ہو گیا اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم تھا کہ اب ان کے لئے جہاد و قتال میں نہایت خیر و برکت ہے تو اب ان کی تصویر کشی قرآن نے ان الفاظ میں کی "تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ تھا کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا کہ خدا سے ڈرنا چاہئے یا کچھ اس سے بڑھ کر ' کہتے ہیں خدایا یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی؟" اور یہ لوگ وہ تھے کہ اگر ان کو کوئی بھلائی نصیب ہوتی تو کہتے یہ اللہ کی جانب سے ہے اور اگر کوئی مصیبت درپیش ہوتی تو رسول اللہ ؐ سے کہتے کہ یہ آپ کی جانب سے ہے ۔ اور ان میں سے ایسے بھی تھے کہ جب رسول اللہ کے سامنے ہوتے تو جی ہاں کہتے ' لیکن جب آپ سے علیحدہ ہوتے تو یہ لوگ اپنی مجلسوں میں کچھ اور باتیں کرتے ۔ اور بعض ایسے تھے کہ اگر کوئی اطمینان بخش یا خوفناک بات سنتے تو اسے فوراً پھیلا دیتے ۔

قرآن کریم ایسے لوگوں کے طرز عمل پر تعجب کا اظہار کرتا ہے اور یہ قرآن کریم کا اپنا مخصوص اسلوب اظہار ہے ' جس کے اندر انسان کی لطیف نفسیات کی تصویر کشی کی گئی ہے ۔ ان اندرونی نفسیات کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ گویا چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں ۔ ایسے لوگوں کی سوچ میں موت و حیات ' قضا و قدر ' خیر و شر ' نفع و ضرر ' فائدے اور خسارے ' اقدار و پیمانوں کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں جو غلطی اور کجی تھی اسے درست کیا گیا ۔ اور قرآن کے مخصوص اور نہایت ہی موثر اور اشاراتی انداز اور اسلوب میں اسے بیان کیا گیا ۔ ذرا ملاحظہ ہو ۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ

وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا

فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا
رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ قُلْ
مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۫ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾
اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ
وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ
سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰۤؤُلَاۤءِ
الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾ مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ
اللّٰهِ ۫ وَمَاۤ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ
رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ
اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿۸۰﴾ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۫ فَاِذَا
بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ؕ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ
مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾
اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ
اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا

بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾

تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوۃ دو؟ اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہئے یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر۔ کہتے ہیں خدایا' یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی؟ ان سے کہو' دنیا کا سرمایہ زندگی تھوڑا ہے' اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لئے زیادہ بہتر ہے' اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر بھی نہ کیا جائے گا۔ رہی موت' تو جہاں بھی تم ہو وہ بہرحال تمہیں آکر رہے گی خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو۔ اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے' اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ اے نبی' یہ آپ کی بدولت ہے۔ کہو' سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اے انسان' تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے' اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب و عمل کی بدولت ہے۔

اے محمدؐ ہم نے تم کو لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی۔ اور جو منہ موڑ گیا' تو بہرحال ہم نے تمہیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔

وہ منہ پر کہتے ہیں کہ ہم مطیع فرمان ہیں مگر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ راتوں کو جمع ہو کر تمہاری باتوں کے خلاف مشورے کرتا ہے۔ اللہ ان کی یہ ساری سرگوشیاں لکھ رہا ہے۔ تم ان کی پروانہ کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو' وہی بھروسہ کے لئے کافی ہے۔ کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔

یہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش یا خوفناک خبر سن پاتے ہیں اسے لے کر پھیلا دیتے ہیں' حالانکہ اگر یہ اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں۔ تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو (تمہاری کمزوریاں ایسی تھیں کہ) معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے۔"

آیات کے ان چار پیروں میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں نشاندہی کی گئی ہے اور ممکن ہے کہ یہ وہی لوگ ہوں جن کے بارے میں اس سبق کے سابقہ پیراگراف میں یہ کہا گیا تھا۔ (وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ (۴: ۷۲)) اور یہ لوگ منافق تھے' اور ممکن ہے کہ یہ تمام ریمارکس ان منافقین کے بارے میں ہوں' جن سے یہ افعال سرزد ہوتے تھے اور وہ

ایسی باتیں بھی کیا کرتے تھے۔

ہم اسی تفسیر کو ترجیح دیتے ہیں' اس لئے کہ ان آیات میں جن لوگوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان میں نفاق کے خدوخال زیادہ نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں کی صفوں میں منافق موجود تھے اور ایسے افعال اور اس قسم کے اقوال صرف منافقین ہی سے صادر ہونا قریب الفہم ہے جو ان کے مزاج اور سابقہ کردار کے مطابق ہے۔ اگرچہ ان پیراگرافوں کے انداز بیان باہم دگر گڈمڈ ہے..... تاہم ان میں سے پہلا پیراگراف جس میں کہا گیا ہے۔ (قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ (۴: ۷۷)) ہمیں تردد میں ڈال دیتا ہے کہ آیا یہ تمام پیراگراف صرف منافقین کے بارے میں ہیں۔ اگرچہ منافقین کے اندر بھی یہ صفات موجود تھیں اور اس کے باوجود کہ یہ آیات دوسری آیات سے ملی جلی ہیں اور طرز ادا بھی ایک ہی نظر آتا ہے۔ تاہم میرا میلان اس طرف ہے کہ یہ پیراگراف مہاجرین کے ایک ایسے گروہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو منافق تو نہ تھا مگر ضعیف الایمان تھا۔ اور ضعف ایمانی کا آخری درجہ بہرحال نفاق کے قریب ہو جاتا ہے۔ رہے دوسرے تین پیراگراف تو غالب یہی ہے کہ ان میں منافقین کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ لوگ اسلامی صفوں کے اندر گھسے ہوئے تھے' لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تمام پیراگراف منافقین ہی کے بارے میں ہوں جو ایسے کام اور ایسی باتیں کیا کرتے تھے۔

ہم نے یہ موقف کیوں اختیار کیا ہے کہ ان آیات کے پہلے پیراگراف سے مراد یا تو ضعیف الایمان مہاجرین ہیں اور یا ایسے لوگ ہیں جو ایمان کے اعتبار سے پختہ کار نہ تھے اور ان کے دلوں کے اندر ایمان کے نشانات اچھی طرح واضح اور پختہ نہ ہوئے تھے؟ اور ان کی ایمانی فکر مضبوط نہ ہوئی تھی؟

اس موقف کی وجہ یہ ہے کہ مہاجرین کے بعض گروہ مکہ مکرمہ میں لڑنے کے لئے نہایت ہی پرجوش تھے اور اس وقت لڑائی کی اجازت نہ تھی اور حکم یہ تھا۔ (كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ (۴: ۷۷))

بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر جن ۷۲ افراد نے حضور ؐ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ انہوں نے حضور ؐ کو پیش کش کر دی تھی کہ اگر آپ چاہیں تو ہم آج ہی منیٰ میں موجود کفار پر ٹوٹ پڑیں۔ اس پر حضور اکرم ؐ نے ان کو جواب دیا تھا کہ : "مجھے ابھی تک جنگ کی اجازت نہیں دی گئی۔" اس واقعہ کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو پھر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ پہلے پیراگراف سے جو لوگ مراد ہیں وہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں اگلے تین پیراگراف آتے ہیں یعنی منافقین۔ کیا یہ بیعت عقبہ ثانیہ والے لوگ ضعیف الایمان ہو سکتے ہیں' جیسا کہ پہلا پیرا بیان کر رہا ہے؟ ہرگز نہیں اس لئے کہ ان سابقین انصار سے بھی اسلامی تاریخ میں کسی کمزوری کا صدور منقول نہیں ہے۔ نہ کمزوری' نہ نفاق اس لئے کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا تھا۔

اس لئے اقرب الی الذہن یہی ہے کہ اس پہلے مجموعہ سے مراد ضعیف مہاجرین ہی ہیں۔ یہ لوگ مدینہ جا کر پرامن زندگی کے خوگر ہو گئے تھے۔ ان سے مشکلات دور ہو گئی تھیں اور جب جہاد و قتال فرض ہو گئے تو وہ ان مشکلات کے برداشت میں کمزوری دکھانے لگے۔ اور یہ بات بھی اقرب الی الذہن ہے کہ دوسرے تین پیراگرافوں کے اندر بیان کردہ اوصاف ان کمزور اہل ایمان مہاجرین کے نہ ہوں بلکہ وہ منافقین کے اوصاف ہوں۔ اس لئے کہ اگرچہ انسان بشری

کمزوریوں سے پاک نہیں ہوتا پھر بھی ہمارے لئے یہ مشکل ہے کہ ہم کسی مہاجر مومن کی طرف یہ بات منسوب کریں کہ وہ اگر مشکلات سے دوچار ہوں تو ان کو حضرت نبی اکرم ؐ کی جانب منسوب کرے اور بھلائی آپ ؐ کی طرف منسوب نہ کرے اور یہ کہ کوئی مہاجر مومن منہ پر حضور ؐ کی اطاعت کا دم بھرے اور گھر جاکر سازشیں کرے ۔ ہاں اگرچہ یہ ممکن تھا کہ کوئی نافہمی کی وجہ سے اچھی اور بری خبر کو پھیلا دے لیکن اس سے بھی اس بات کا اظہار ہو گا کہ یہ لوگ نظام جماعت کو اچھی طرح نہیں سمجھے 'لیکن اس اشاعت پر بھی کسی کو منافق نہیں کہا جاسکتا ۔

بہرحال ان آیات پر غور کرنے سے حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان آیات کی تفسیر میں جو روایات وارد ہیں ان میں بھی کوئی حتمی بات نہیں کی گئی حتیٰ کہ پہلے پیراگراف کے بارے میں بھی کوئی حتمی رائے وارد نہیں ہے ۔ بعض روایات میں ہے کہ اس سے مہاجرین کا ایک گروہ مراد ہے ۔ اور بعض میں ہے کہ اس سے مراد بھی منافقین تھے ۔

یہی وجہ ہے کہ ہم ان کے بارے میں محتاط موقف اختیار کرتے ہیں اس لئے کہ ہم مہاجرین کو جنگ میں پہلو تہی کرنے اور مسلمانوں کو پہنچنے والے مصائب سے دامن بچانے کے اوصاف سے متصف نہیں کر سکتے جس طرح ان پیراگرافوں سے سابق آیات میں آیا ہے ۔ نیز ہم ان پر یہ الزام بھی عائد نہیں کر سکتے کہ وہ رسول اللہ ؐ کی طرف برائی کی نسبت کر سکتے ہیں ' اور بھلائی کی نسبت وہ اللہ کی طرف کرتے ہیں اور یہ کہ وہ رات کو حضور ؐ کے خلاف کوئی مشورہ کر سکتے ہیں 'اگرچہ سیاق کلام اور قرآن کریم کے عمومی انداز بیان سے کسی واقف شخص کے لئے ان پیراگرافوں کا اس انداز سے تجزیہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے ۔ یہ تجزیہ وہی شخص کر سکتا ہے جس نے ایک عرصے تک قرآن کریم پر غور و خوض کیا ہو ۔ اور قرآن کریم کے اسلوب بیان سے خوب واقف ہو ۔

(اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ کَخَشْیَۃِ اللّٰہِ اَوْ اَشَدَّ خَشْیَۃً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ کَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ وَّ الْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا (۷۷) اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ (۴:۷۷-۷۸))

"تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟ اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہئے یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر 'کہتے ہیں خدایا' یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی؟ ان سے کہو' دنیا کا سرمایہ زندگی تھوڑا ہے اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لئے بہت زیادہ بہتر ہے ۔ اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر بھی نہ کیا جائے گا ۔ رہی موت 'تو جہاں بھی تم ہو وہ بہرحال تمہیں آکر رہے گی خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو"۔

ان لوگوں کے حال پر اللہ تعالیٰ تعجب کا اظہار فرماتے ہیں ـ یہ لوگ جب مکہ میں تھے تو لڑنے کے لئے پر جوش تھے ' وہ بہت جلد جہاد شروع کرنے والے تھے ـ اس وقت مشرکین کی طرف سے ان کے خلاف مظالم ڈھائے جا رہے تھے ' وہ فتنوں میں گھرے ہوئے تھے اور اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی مصلحت کی خاطر جہاد کی اجازت نہ دی تھی ـ لیکن جب مناسب وقت آگیا ' جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مقرر کیا ہوا تھا اور حالات ساز گار ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر جہاد فرض کر دیا ـ (اور یہ جہاد فی سبیل اللہ تھا) تو ان میں سے ایک فریق جزع و فزع کرنے لگا اور یہ فریق ان لوگوں سے ڈرنے لگا جن کے ساتھ انہیں لڑنے کا حکم دیا گیا تھا ' حالانکہ وہ لوگ بھی انہی جیسے انسان تھے اور یہ ڈر اس قدر شدید تھا جس طرح اللہ تعالیٰ کا ڈر شدید ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید ڈر تھا ' حالانکہ اللہ جیسا شدید عذاب کوئی نہیں دے سکتا ـ

اور نہ اللہ کی پکڑ جیسی اور کسی کی پکڑ ہو سکتی ہے ـ ایسے لوگ نہایت ہی حسرت آمیز الفاظ میں اور سخت جزع و فزع کی حالت میں یہ کہتے ہیں ـ (رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ (٤ : ٧٧)) (اے ہمارے رب ' تو نے ہم پر قتال کیوں فرض کر دیا؟) ایک مومن کی جانب سے یہ سوال عجیب و غریب لگ رہا ہے ـ اس سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فریق کے نقطہ نظر میں اس دین کے فرائض و واجبات کی نوعیت پوری طرح واضح نہ تھی اور یہ فریق اس سوال کے بعد جس خواہش کا اظہار کرتا ہے وہ نہایت ہی حقیر اور فقیرانہ خواہش ہے ـ (لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (٤ : ٧٧)) (کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی) ہمیں تھوڑا سا وقت اور مل جاتا ـ اور ہم اس خوفناک اور بھاری فریضہ سے دوچار نہ ہوتے ـ

بعض اوقات اس طرح ہوتا ہے کہ بہادری اور تہور اور تیزی سے کسی معاملے کے اندر گھس جانے والے لوگ نہایت تیزی سے جزع و فزع اور خوف و ہراس میں مبتلا ہو جاتے ہیں ـ ان کی یہ حالت اس وقت ہو جاتی ہے جب وہ واقعات کے اندر گھس جاتے ہیں اور معاملہ اپنی حقیقی شکل میں سامنے آتا ہے بلکہ یہ صورت حال عموماً قاعدہ کلیہ کی شکل میں پیش آتی رہتی ہے ـ اور یہ اس وجہ سے کہ یہ جوش اور جرأت اور تہور اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ایسے شخص نے مصیبتوں اور مشکلات کا حقیقی اندازہ نہیں لگایا ہوتا ـ یہ جوش و خروش حقیقی بہادری ' مشکلات کے انگیز کرنے اور ثابت قدمی کی وجہ سے نہیں ہوتا ـ کبھی یہ اس وجہ سے بھی ہوتا ہے کہ مشکلات تنگی اور تکالیف کے واقع ہونے کے احتمالات کم ہوتے ہیں اور ایسے شخص کو شکست اور ہزیمت نظر نہیں آتی ـ اس وجہ سے ایسے لوگوں کے اندر جوش و خروش زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ آگے بڑھتے ہیں ' جلدی حرکت میں آتے ہیں اور ہر قیمت پر فتح حاصل کرنا چاہتے ہیں ـ لیکن انہوں نے اپنی اس حرکت ' اقدام اور فتح کی راہ میں حائل مشکلات کا اچھی طرح اندازہ نہیں لگایا ہوتا ـ چنانچہ جب ان کا سامنا ان تکالیف سے ہوتا ہے تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ان کے اندازوں سے زیادہ مشکل ہیں ـ وہ ان کے تصور سے زیادہ شدید ہوتی ہیں تو وہ الٹے پاؤں پھرنے والوں اور جزع و فزع کرنے والوں کی پہلی صف میں ہوتے ہیں ' لیکن جن لوگوں کی طبیعت میں ٹھہراؤ ہوتا ہے اور جو لوگ مشکلات کو انگیز کر سکتے ہیں ' سختی و نرمی برداشت کر سکتے ہیں وہ ان مشکلات کے لئے قبل از وقت تیاری کرتے ہیں ـ حرکت اور اقدام کی مشکلات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ ان کے نفوس ان مشکلات کو کہاں تک برداشت کر سکتے ہیں ـ یہ لوگ صبر و ثبات سے کام لیتے ہیں اور کسی معرکے میں تیاری کے بعد کودتے ہیں ـ یہ پر جوش ' سر تیز اور آگے بڑھنے والے ایسے لوگوں کو کمزور سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کی سنجیدگی اور متوازن شخصیت ان کو

متاثر نہیں کرتی لیکن حقیقی معرکے کے وقت یہ بات نظر آتی ہے کہ ان میں سے کون زیادہ مشکلات کو انگیز کر سکتا ہے اور کون ہے جس کی نظر دور رس ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ ان آیات میں جس فریق کا ذکر ہے' وہ اس قسم لوگوں پر مشتمل تھا' کہ جن کو مکہ میں مشکلات اور اذیت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہ لوگ ان مشکلات پر صبر نہ کر سکتے تھے اور یہ لوگ اپنی توہین بھی برداشت نہ کر سکتے تھے' اس لئے کہ یہ شریف لوگ تھے' اس وجہ سے وہاں یہ لوگ جوش میں آکر حضور ﷺ سے یہ اجازت طلب کرتے تھے کہ آپ ان کو ان اذیتوں پر مدافعت کرنے کی اجازت دیں تاکہ وہ اپنی عزت و آبرو کے بچانے کے لئے کوئی اقدام کریں۔ اور حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ان لوگوں کو مشورہ دیتے تھے کہ وہ ذرا انتظار کریں' ہر کام اپنے وقت پر ہو گا۔ ہر کام کے لئے تربیت اور تیاری کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر اقدام وقت پر کیا جاتا ہے اور وقت آنے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے لوگ مدینہ میں امن و امان سے رہنے لگے' نہ وہاں ان کی تذلیل ہوتی اور نہ ہی وہاں اذیت ہوتی اور یہ حالت ان ذاتی اور شخصی نیش زینوں کے بعد انہیں نصیب ہوئی تھی جو مکہ میں معمول تھا' اس لئے ایسے لوگ جنگ میں دلچسپی نہ رکھتے تھے اور نہ ہی اس کے لئے کوئی جواز پاتے تھے' یاکم ازکم یہ لوگ چاہتے تھے کہ اس بارے میں کسی شتابی کی ضرورت نہیں ہے۔

(فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (۴ : ۷۷)

(اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہئے یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر۔ کہتے ہیں خدایا' یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں کچھ اور مہلت دی؟) یہ فریق غالباً مومنین تھے۔ اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ یہ لوگ نہایت ہی عاجزی سے اور غمگین انداز میں اللہ کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ ان کی اس عاجزی اور غم اندوز لہجے کو ہمیں مدنظر رکھنا چاہئے۔ لیکن ان لوگوں کا ایمان ابھی پختہ معلوم نہیں ہوتا' اور ان کے تصور حیات کے نشانات ابھی تک واضح نہ تھے۔ اس پیراگراف میں جس فریق کا ذکر ہے ان کے ذہن میں اسلامی نظام حیات کے اصل مقاصد ابھی تک واضح نہ تھے۔ یہ مقاصد چند لوگوں کی ذات کو بچانے یا کسی قوم کو بچانے اور یا کسی وطن کو بچانے سے زیادہ بڑے اور اونچے تھے۔ اسلامی نظام حیات کے مقاصد کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ اس پورے کرۂ ارض پر اسلامی نظام حیات کو قائم اور غالب کیا جائے اس کا بنیادی مقصد اس پورے کرۂ ارض پر ایک عادلانہ نظام کا قیام اور ایک ایسی سلطنت کا قیام ہے جو پوری قوت سے ان رکاوٹوں کو دور کر سکتی ہو' جو دعوت اسلامی کے پھیلاؤ کی راہ میں کھڑی ہیں اور جو لوگوں کو اس بات سے روکتی ہیں کہ دعوت اسلامی کی طرف کان دھریں۔ یہ حکومت اپنے اندر اتنی طاقت بھی رکھتی ہو کہ دنیا میں اگر کوئی اپنی خوشی اور اپنے اختیار سے کوئی عقیدہ اپنالے تو وہ اسے ہر قسم کے تشدد اور دباؤ سے بچا سکے۔ چاہے یہ تشدد کسی قسم کا بھی ہو۔ مثلاً یہ کہ کسی کو محنت و مزدوری سے نہ محروم کیا جائے اور معاشرے کے اندر اپنی مرضی کی تگ و دو سے محروم نہ کیا جائے۔ غرض یہ وہ اونچے مقاصد ہیں جو کسی کو ذاتی

اور شخصی طور پر اذیت پہنچانے یا نہ پہنچانے کے مقابلے میں بہت زیادہ اہم ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ میں نصیب ہونے والا امن و سکون (اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ کسی وقت تھا) اس قدر اہم نہ تھا کہ مسلمانوں کو اس مہم اور تحریک جہاد سے مزید کچھ عرصے کے لئے محروم رکھا جاتا ۔

ابھی تک اس فریق کا ایمان اس قدر پختہ نہ ہوا تھا کہ وہ اپنی ذات کو بیچ میں سے نکال دیں ۔ وہ اللہ کے احکام کو سنیں اور انہی احکام کو علت و معلول اور اسباب و اثرات قرار دیں ۔ ان کو قول فیصل قرار دیں ' چاہے کوئی اور گہری حکمت ان کی سمجھ میں نہ آئے 'لیکن ابھی تک اس فریق کا تصور دین اس قدر پختہ نہ ہوا تھا کہ یہ لوگ اس دین کی اصل مہم اور مقصد کو سمجھ سکتے ۔ مومن بحیثیت مومن اللہ کا دست قدرت ہے اور اللہ تعالیٰ اس دنیا کے انسانوں کی زندگی میں اس کے ذریعے جو رسم و رواج چاہتا ہے ' نافذ کرا دیتا ہے ۔ چنانچہ سیاق کلام سے ایسے لوگوں کے موقف کی تصویر کشی کی جاتی ہے اور ان کے اس موقف پر تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے اور اسے ناپسند کیا جاتا ہے ۔

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ میں اہل اسلام کو ' ان پر ہونے والے مظالم کے انتقام کی اجازت کیوں نہ دی ؟ انہوں نے اس دست درازی کو کیوں برداشت کیا اور قوت کے استعمال کی وجہ سے انہوں نے ان نیش زنیوں کا علاج کیوں نہ کیا حالانکہ مسلمانوں میں سے اکثر لوگ ایسا کر سکتے تھے ۔ کیونکہ تمام لوگ نہ تو کمزور تھے اور نہ بزدل ۔ وہ تو اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے تھے اور نہ مسلمان مکہ میں قلت قلیلہ تھے ۔ وہ اس انتقام سے باز رہنے اور صرف اقامت صلوٰۃ ' ادائیگی زکوٰۃ اور صبر و برداشت پر اکتفاء کیوں کرتے تھے ۔ حالانکہ بعض مسلمانوں پر ایسا تشدد ہو رہا تھا جو ناقابل برداشت تھا ۔ بعض ایسے تھے جو برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے اپنے دین کے بارے میں فتنے میں پڑ جاتے تھے ۔ اور بعض ایسے بھی تھے جو ان تکالیف کی وجہ سے جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے ۔

اس کی کیا حکمت تھی ؟ تو حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے میں ہم کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتے کیونکہ جو حکمت ہم بیان کریں گے اسے گویا ہم اللہ کی طرف منسوب کریں گے جبکہ اللہ نے خود وہ حکمت بیان نہیں کی ۔ اس طرح ہم اللہ کے احکام و فرائض کے وہ اسباب و علل بھی بیان کر سکتے ہیں جو درحقیقت ان احکام کے اسباب نہیں ہیں ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے بیان کردہ اسباب بھی وہی ہوں لیکن ان کے علاوہ اور اسباب اور حکمتیں بھی ہوں ' جن کا علم اللہ تعالیٰ نے ہمیں نہیں دیا ۔ اسی میں ہمارے لئے خیر اور بھلائی تھی کہ ہمیں اس کا علم نہ ہو ۔ یہ ہے ایک مومنانہ موقف جو کوئی اللہ کے احکام اور شریعت کے قوانین کے سامنے اختیار کر سکتا ہے ' جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے متعین اور مخصوص حکمت اور علت خود حتمی طور پر بیان نہیں کی ' چاہے ہمارے ذہن میں اس کی جو علت بھی آئے اور جو حکمت بھی ظاہری طور پر نظر آئے ۔ چاہے کسی حکم کی جو کیفیت تنفیذ بھی ہمارے ذہن میں آئے یا اس فرض کی ادائیگی کا جو طریقہ بھی ہمارے فہم میں آئے جہاں تک عقل اس کا ادراک کر سکتی ہو ' لیکن اچھا موقف یہی ہے کہ انسان مختلف احتمالات میں سے اسے ایک احتمال ہی سمجھے اور بالجزم یہ نہ کہے کہ یہی ہے وہ حکمت جو اللہ تعالیٰ کے پیش نظر تھی اور اس کے سوا کوئی اور حکمت نہیں ہے ۔ اگرچہ کسی کو اپنے علم و خرد پر پورا پورا اعتماد ہو اور اگرچہ اس نے احکام الٰہی میں نہایت ہی گہرا غور و خوض کیا ہو ' اس لئے کہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے پیش نظر ہونے والی تمام حکمتوں کا احاطہ کر لیا ہے ۔ یہ محتاط انداز جس کو ہم تجویز کر رہے ہیں بارگاہ ایزدی کے آداب سے زیادہ قریب ہے ۔ اور احتیاط کا بھی تقاضا ہے کہ اللہ

کے علم اور انسان کے علم کے درمیان طبیعت اور حقیقت کا امتیاز رہے۔

بارگاہ ایزدی کے ان آداب کا خیال رکھتے ہوئے 'میں اس موضوع پر اب بات کرتا ہوں کہ مکہ مکرمہ میں جہاد کیوں فرض نہ ہوا اور مدینہ میں جاکر کیوں فرض ہوا؟ اس موضوع پر میں وہ باتیں بیان کروں گا جو ہمیں نظر آتی ہیں کہ شاید یہی سبب اور حکمت ہو 'لیکن یہ سبب و حکمت دونوں بطور احتمال بیان کئے جارہے ہیں اور اصل حقیقت کیا ہے اسے ہم اللہ پر چھوڑتے ہیں۔ ہم اپنی جانب سے اللہ کے احکام کے لئے اسباب اور حکمتیں فرض نہیں کرتے۔ اصل حقیقت کا علم صرف اللہ جل شانہ کو ہے اور اس نے نص صریح کے ذریعے اس کی اطلاع ہمیں نہیں دی........ یہ اسباب جو ہم بیان کر رہے ہیں محض اجتہادی ہیں 'ان میں صحت کا بھی احتمال ہے 'اور غلطی کا بھی۔ زیادہ بھی ہو سکتے ہیں اور ان میں کمی بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں ان اسباب کے ذکر سے صرف یہ مقصد ہے کہ ہم اللہ کی آیات میں تدبر کریں اور یہ سمجھیں کہ ہمارے دور میں غور و فکر کے بعد ہم پر یہ اسباب واضح ہوئے۔

(الف) یہ سبب بھی ہو سکتا ہے کہ مکی زمانہ تربیت اور تیاری کا زمانہ تھا۔ یہ تیاری ایک متعین خاندان میں' ایک مخصوص قوم میں اور متعین ظروف و احوال میں ہو رہی تھی۔ اس تربیت اور تیاری کے اہداف یہ تھے کہ ایک عرب کی شخصیت کو ایسے حالات میں صبر کرنے پر تیار کیا جائے جن میں وہ کبھی صبر نہ کر سکتا تھا۔ مثلاً یہ کہ اس کی ذات یا اس کے زیر کفالت لوگوں پر زد پڑے اور وہ اس پر صبر کرے۔ تاکہ وہ عرب شخصیت اپنی قبائلی شناخت اور اپنی ذات کو بھول جائے اور اس کی زندگی کا محور اس کی ذات اور اس کے زیر کفالت لوگ ہی نہ ہوں اور وہ اپنی زندگی صرف اپنی ذات کے لئے متحرک نہ کرے۔ نیز ایک عرب مزاج کو یہ تربیت دینا مقصود تھا کہ وہ اپنے اعصاب پر قابو پا سکے۔ یہ نہ ہو کہ پہلے تاثر پر ہی وہ جوش میں آجائے اور پہلی ہیجان انگیز حرکت پر ہی آپے سے باہر نہ ہو جائے اس کی حرکت اور اس کے مزاج کے اندر اعتدال پیدا ہو جائے۔ اس کو یہ تربیت بھی دینا مقصود تھا کہ وہ ایک منظم سوسائٹی کا فرد ہو اور اس کی ایک قیادت ہو جس کی طرف وہ اپنی زندگی کے تمام امور میں رجوع کرنے کا عادی ہو جائے اور وہ کوئی کام بھی نہ کرے مگر اس قیادت کے اشارے کے مطابق اگرچہ یہ اوامر اس کی عادی زندگی کے خلاف اور متضاد ہوں۔ ایک عرب شخصیت کی تربیت کے باب میں یہ نہایت ہی بنیادی باتیں تھیں۔ اس سے ایک اسلامی سوسائٹی کی تشکیل مقصود تھی جو ایک قیادت کے تابع ہو 'جو ترقی پذیر اور مہذب سوسائٹی ہو اور قبائلی اور غیر مہذب (Barbarian) سوسائٹی نہ ہو۔

(ب) اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قریش کے ماحول میں پرامن دعوت زیادہ موثر ہو سکتی تھی 'اس لئے کہ یہ سوسائٹی شرفاء کی سوسائٹی تھی اور اگر اس سوسائٹی کے اندر مسلمان جنگ شروع کر دیتے تو اس کی وجہ سے یہ لوگ بغض و عناد میں اور تیز ہو جاتے۔ ایسے حالات میں جو مکہ میں اس وقت تھے 'خونریز لڑائیاں شروع ہو جاتیں اور جنگ داحس 'جنگ بسوس اور جنگ غبراء کی طرح قتل و مقاتلے کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ یہ جنگیں عربوں کی مشہور جنگیں تھیں اور سالہا سال تک مسلسل لڑی جاتی رہیں۔ اس جدید جنگ کا تعلق اسلام سے ہوتا اور تمام واقعات اسلام کے حوالے سے یاد کئے جاتے۔ ان جنگوں کا کبھی خاتمہ نہ ہوتا اور اسلام بجائے اس کے کہ ایک دعوت ہوتی 'وہ جنگ و جدال کی طویل داستان ہوتا اور ان داستانوں کے نتیجے میں اسلام کی

اصل دعوت پس منظر میں چلی جاتی۔اس دعوت کا یہ حال ابتدائی مرحلے ہی میں ہو جاتا اور کچھ عرصے کے بعد یہ ختم ہی ہو جاتی۔

(ج) یہ اس لئے بھی تھا کہ اگر مکہ میں جہاد کی اجازت دی جاتی تو گھر گھر میں جنگ شروع ہو جاتی۔اس لئے کہ مکہ مکرمہ کے اندر کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی جو لوگوں پر کنٹرول کر سکتی۔ نیز وہاں کوئی ایسی حکومت نہ تھی جو مسلمانوں کو تکلیفات دیتی تھی' بلکہ مسلمانوں کو جو اذیتیں دی جاتی تھیں وہ ہر مسلمان کے اپنے رشتہ داروں ہی کے ذریعے دی جاتی تھیں۔خود رشتہ دار ہی مسلمان ہونے والے لوگوں پر تشدد کرتے' انہیں اذیت دیتے اور اپنے خیال کے مطابق ان کی تربیت کرتے۔اگر مکہ میں جنگ کی اجازت دے دی جاتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ گھر گھر میں جنگ شروع ہو جاتی اور لوگ کہتے دیکھو یہ ہے اسلام' حالانکہ اسلام پر فتنہ ڈالنے کا الزام اس وقت بھی لگایا گیا تھا جب مسلمانوں کو حکم یہ تھا کہ ہاتھ روکے رکھو۔لیکن قریش حج اور عمرہ کے لئے آنے والوں اور تجارتی بازاروں کے اندر اسلام کے خلاف یہی پروپیگنڈا کرتے رہتے تھے۔وہ کہتے کہ محمد باپ بیٹے کے درمیان اور ایک شخص اور اس کے قبیلے کے درمیان عداوت ڈال دیتے ہیں۔اگر اسلام لڑکوں اور غلاموں کو یہ اجازت دے دیتا کہ وہ والدین کو اور اپنے آقاؤں اور اپنے سرپرستوں کو قتل کر دیں اور ہر گھر اور محلہ میں یہ جنگ شروع ہو جاتی تو قریش کے پروپیگنڈے کا عالم کیا ہوتا؟

(د) اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو لوگ اپنی اولاد پر بوجہ اسلام مظالم ڈھا رہے تھے' جو لوگ اپنے غلاموں کو اذیت دیتے تھے اور جو لوگ اپنے زیر سرپرستی لوگوں پر تشدد کرتے تھے' اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ یہ لوگ آگے جا کر اسلام کے حق میں عظیم خدمات سرانجام دینے والے ہیں' یہ اسلام کے سپاہی ہوں گے' مخلصین اور قائدین بنیں گے۔کیا آپ دیکھتے نہیں کہ حضرت عمرؓ بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔

(ہ) ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عربوں کی خود داری اور شرافت کا تقاضہ تھا کہ یہ لوگ ہمیشہ مظلوم کے حق میں آواز اٹھاتے تھے۔ایسا مظلوم جس پر ناحق تشدد کیا جا رہا ہو لیکن وہ اپنی بات کا اس قدر پکا ہو کہ وہ کسی قیمت پر بھی باز نہ آ رہا ہو۔خصوصاً اس صورت میں جبکہ نہایت ہی شریف لوگوں پر تشدد ہو رہا ہو اور ایسے کئی واقعات ہوئے جن سے اس نظریے کی صحت کا ثبوت ملتا ہے۔ابن الدغنہ اس کے لئے تیار نہ ہوئے کہ وہ حضرت ابوبکر کا ساتھ چھوڑ دیں اور وہ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کریں۔انہوں نے کہا کہ یہ بات عربوں کے لئے نہایت ہی شرم کی بات ہے۔انہوں نے حضرت ابوبکر کو پیشکش کی کہ وہ ان کی حمایت کریں گے۔اس کی ایک دوسری مثال شعب ابی طالب میں بنی ہاشم کا محاصرہ ہے۔یہ محاصرہ اس قدر طویل ہو گیا کہ لوگ بھوک سے مرنے لگے اور ان پر سخت مصائب ٹوٹ پڑے۔اگر قدیم زمانوں کی اور سوسائٹیوں میں یہ واقعہ ہوا ہوتا تو لوگ مظلوموں کو حقیر سمجھتے اور ان کے ساتھ مذاق کرتے اور ظالموں کو عزت اور وقار کی نظروں سے دیکھا جاتا (لیکن وہاں کچھ جو ہوا وہ تاریخ عرب کی زریں مثال ہے)۔

(و) اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مکہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم تھی' اور وہ مکہ مکرمہ ہی میں زندہ رہ سکتے تھے۔اس لئے کہ جزیرۃ العرب کے دوسرے علاقوں تک دعوت پہنچی ہی نہ تھی۔اگر پہنچی تھی تو اس کے

بارے میں کچی پکی خبریں ہی جابجا پہنچی تھیں - لوگ یہ سمجھتے تھے کہ تحریک اسلامی اور قریش کے اندر بعض لوگوں کے درمیان داخلی اختلافات ہیں اور اگر جنگ شروع ہوگئی ہوتی تو وہ غیر جانبدار ہوتے اور دیکھتے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے - ایسے حالات میں ممکن تھا کہ یہ معرکہ مسلمانوں کی اس قلیل تعداد کے مارے جانے کے بعد ختم ہی ہو جاتا - اگرچہ یہ قلیل تعداد اپنے مقابلے میں دوگنا کفار کو قتل کر دیتی 'لیکن ان کے ختم ہونے کے بعد شرک اپنی جگہ مزید مضبوط ہو جاتا اور اسلام کی یہ مختصر فوج صفحہ ہستی سے مٹ جاتی - اسلامی نظام حیات دنیا میں حقیقی روپ اختیار نہ کر سکتا حالانکہ اسلام ایک ایسا دین تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ دنیا میں بطور نظام زندگی قائم ہو اور عملاً لوگوں کی زندگیوں میں نافذ ہو -

(ز) ان تمام امور کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کی دور میں اس بات کی حقیقی ضرورت تھی ہی نہیں کہ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی جائے کہ وہ مقابلہ کر کے تشدد کی مدافعت کریں - اس لئے کہ دعوت اسلامی کا بنیادی کام ہو رہا تھا اور دعوت مسلسل جاری تھی - حضرت محمد ؐ کی ذات بابرکات موجود تھی اور بنی ہاشم کی تلواریں آپ کی حفاظت کے لئے ہروقت بے نیام تھیں - اگر کوئی شخص آپ پر ہاتھ اٹھاتا تو اسے یہ خطرہ لاحق تھا کہ اس کا ہاتھ کٹ جائے گا اور اس وقت کا قبائلی نظام موجود تھا جس میں ہر قبیلہ اس بات سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ خواہ مخواہ بنی ہاشم کے ساتھ لڑائی میں الجھ نہ جائے اور یہ خطرہ ہر اس صورت میں بالکل موجود تھا اگر کسی قبیلے کا کوئی فرد حضور ؐ پر ہاتھ اٹھاتا - چونکہ داعی کی شخصیت محفوظ تھی اور اس کی حفاظت ہو رہی تھی ' اور داعی بنی ہاشم کی امداد سے اور اس وقت کے موجودہ قبائلی نظام کے رسم و رواج کے مطابق شب و روز دعوت دے رہا تھا - داعی نہ دعوت کو خفیہ رکھ رہا تھا اور نہ اپنی بات کسی سے چھپاتا تھا کہ میں کسی شخص میں یہ جرأت نہ تھی کہ وہ آپ کو دعوت پھیلانے سے روک سکے - آپ قریش کی مجالس میں ' خانہ کعبہ میں ' جبل صفا پر اور عمومی اجتماعات میں دعوت اسلامی کا کام کر رہے تھے اور کسی شخص کی یہ جرأت نہ تھی کہ وہ آپ ؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ سکے - کوئی شخص یہ جرأت نہ کر سکتا تھا کہ آپ کو اغواء کر سکے ' آپ کو قید کر سکے ' اور آپ کو قتل کر سکے ' اور کوئی آپ کو اس کی مرضی کی بات کہنے پر مجبور نہ کر سکتا تھا کہ آپ اپنے دین کی بعض باتیں کہہ سکتے اور بعض باتوں پر خاموش رہتے - ایک بار جب انہوں نے آپ کو یہ پیشکش کی کہ وہ ان کے خداؤں اور الہوں کو برا بھلا نہ کہیں اور ان کی بدگوئی نہ کریں تو آپ نے ان کی اس پیشکش کو مسترد کر دیا - نیز جب انہوں نے یہ پیشکش کی کہ کچھ نرمی وہ کریں اور کچھ نرمی قریش کریں گے تو آپ ؐ نے اس کو بھی رد کر دیا - یعنی کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اپنانے سے انکار کر دیا - پیشکش یہ تھی کہ بعض باتیں حضور ؐ ان کی مان لیں اور بعض باتیں وہ اسلام کی مان لیں گے تو حضور نے اس کا بھی انکار کر دیا - غرض دولت اسلامی کا وجود قائم تھا - حضور اکرم ؐ موجود تھے اور بنی ہاشم بطور محافظ کام کر رہے تھے اور حضور ؐ ہر شکل و صورت میں اور تمام ذرائع سے اپنی دعوت پھیلانے میں آزاد تھے - ایسے حالات میں جنگ اور جہاد کی فی الواقعہ کوئی حقیقی ضرورت بھی نہ تھی کہ قبل از وقت جہاد و قتال شروع کر دیا جائے اور سب سے اہم وجہ یہی تھی کہ قریش کا خاندان اس دعوت کے لئے سازگار تھا اور اس کے اچھے نتائج نکلنے والے تھے -

یہ تمام پہلو' جہاں تک ہم سمجھتے ہیں' اس حکمت کے بعض پہلو ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے مکہ میں جہاد و قتال کا آغاز نہ ہوا اور وہاں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ ہاتھ روکے رکھیں' نماز قائم کریں' زکوٰۃ ادا کریں ۔ ان کاموں کی وجہ سے ان کی تیاری اور تربیت مکمل ہو جائے گی اور دعوت اسلامی کا کی منصوبہ بھی اپنے اختتام تک پہنچ جائے گا ۔ مسلمان اپنی قیادت کے احکام کا انتظار کریں گے اور جب وقت آئے گا تو اپنے آپ کو اس فریضہ سے عہدہ بر آکر سکیں گے اس لئے کہ اس فرض کی ادائیگی میں اب ان کی کوئی ذاتی غرض و غایت نہ ہو گی اور ان کا جہاد و قتال اب صرف اللہ کے لئے ہو گا ۔ فی سبیل اللہ ہو گا اور فی الوقت دعوت اپنی رفتار سے بہرحال جاری تھی' اس کی حمایت ہو رہی تھی ۔ اور اس سے محبت کرنے والے موجود تھے اور نگہبان تھے ۔

اس منصوبے کی جو حکمت بھی ہو بہرحال اس وقت ایسے پرجوش لوگ موجود تھے جو بظاہر اس گھڑی کا بڑی شدت سے انتظار کر رہے تھے کہ انہیں جنگ کی اجازت دی جائے ۔

(فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (٤:٧٧)

(جب ان پر جنگ فرض کر دی گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈر رہا ہے جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہئے یا اس سے بھی زیادہ اور کہتا ہے: ہمارے پروردگار' تو نے کیوں ہم پر قتال فرض کر دیا' کیوں نہ ہمیں کچھ اور مہلت دی؟)

اسلامی صفوں میں ایک ایسے گروہ کی موجودگی جو جہاد و قتال سے کتراتا ہو' ایک قسم کی بے چینی پیدا کرتی تھی اس طرح اسلامی صفوف میں ایک طرف یہ گروہ تھا جو جزع و فزع کرتا تھا ۔ دوسری طرف سچے اور کامل مومنین تھے جو پورے طور پر ثابت قدم تھے اور اپنے نصب العین پر مطمئن تھے اور راہ حق میں آنے والی بے چینیوں کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے تھے اور اس راہ کی مشقتوں کو برداشت کرتے تھے ۔ ظاہر ہے کہ ان دو گروہوں کے اندر ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکتی تھی ۔ اس فریق مومن کے اندر بھی سچائی کے لئے جوش و خروش پایا جاتا تھا' یہ عزم اور ارادے والے تھے' انہیں یقین و ثبات حاصل تھا' مگر یہ لوگ ہر جذبے کا اظہار اپنی جگہ کیا کرتے تھے ۔ اس لئے کہ جب جنگ شروع ہی نہ ہوئی ہو اور اس کے احکامات ہی نہ دیئے گئے ہو تو وہ محض تصور اور خالی نعرہ بازی ہو گی اور جب حقیقی خطرے کا سامنا ہو تو یہ بخار ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے ۔ ایسی صورت حال کا علاج قرآن کریم نے اپنے انداز میں کیا :

(قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (٧٧) اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (٧٨) (٤:٧٧-٧٨))

(کہو دنیا کا سرمایہ زندگی تھوڑا ہے' اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لئے بہتر ہے' اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر

بھی نہ کیا جائے گا' موت تو جہاں بھی تم ہو بہرحال آکر رہے گی' خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو۔) یہ لوگ موت سے ڈرتے ہیں' اور زندگی چاہتے ہیں اور نہایت ہی عاجزانہ حسرت کے انداز میں تمنا کرتے ہیں کہ انہیں کچھ مزید مہلت مل جاتی اور ان کے سرمایہ زندگی میں کچھ مزید اضافہ ہو جاتا۔

قرآن کریم کا کمال یہ ہے کہ ایسے جذبات جہاں سے پیدا ہوتے ہیں' وہیں سے ان کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور موت اور زندگی کی حقیقت واضح کر دیتا ہے۔ (قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ (٤: ٧٧) (کہہ دو زندگی کا سرمایہ تو بہت ہی تھوڑا ہوتا ہے) زندگی کا تمام سروسامان' بلکہ پوری زندگی کی حقیقت کیا ہے' چند دن' چند ہفتے' چند مہینے یا چند سال؟ اگر قدرے مہلت مل بھی جائے تو اس کی حقیقت کیا ہے؟ اگر پوری زندگی ہی ایک مختصر وقت ہے تو اس مختصر وقت میں وہ کیا سازوسامان جمع کریں گے۔ اس لئے کہ زندگی تو دنوں' ہفتوں اور مہینوں اور سالوں ہی کے اندر محدود ہے۔ اس لئے اس مختصر زندگی کا طول بھی مختصر ہے۔

(وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى (٤: ٧٧)) (اور آخرت ہی ایک خدا ترس انسان کے لئے بہتر ہے)

ایک تو اس لئے کہ معاملہ دنیا ہی میں ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ دنیا اس انسانی سفر کی آخری منزل نہیں ہے۔ یہ تو ایک مرحلہ ہے اور اس مرحلے کے بعد آخرت ہے اور سرمایہ وہی ہے جو آخرت کے لئے جمع ہو۔ پھر یہ کہ آخرت کا دور طویل ہے اور لا انتہا ہے' اور اس کا سرمایہ خیر ہے اور بہتر ہے۔ جو لوگ خدا ترس ہوں وہ اسے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہاں بات خوف اور ڈر کی ہو رہی تھی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا ذکر کیا جو اگرچہ ڈر ہی ہے لیکن خدا کا ڈر۔ یعنی اگر کوئی ڈرتا ہے تو اسے اللہ سے ڈرنا چاہئے' انسان سے کیا ڈرنا؟ لیکن ایک گروہ مسلمانوں کے اندر ایسا موجود ہے جو لوگوں سے اس طرح ڈرتا ہے جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہئے۔ ہاں جو خدا سے ڈرتا ہے تو پھر وہ لوگوں سے نہیں ڈرتا۔ جس کے دل میں خوف خدا بس جائے پھر اس دل میں کسی اور کے خوف کے لئے جگہ ہی نہیں رہتی۔ اس لئے کہ اگر اللہ نہ چاہے تو اس کا کوئی بھی کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتا۔

(وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (٤: ٧٧)) (اور تم پر شمہ برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا) تمہارے اجر میں کوئی غبن نہ ہو گا' کوئی نقصان نہ ہو گا اور کوئی کمی نہ کی جائے گی۔ اگر دنیا میں ان سے کوئی چیز رہ گئی تو دار آخرت تو آنے ہی والا ہے۔ وہاں وہ کمی پوری کر دی جائے گی جہاں کوئی ظلم نہ ہو گا اور حساب و کتاب میں کوئی کمی نہ ہو گی اور دنیا و آخرت کا فائنل بل مل جائے گا۔

ان حقائق کے باوجود بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے نفوس کے اندر یہ شدید خواہش ہوتی ہے کہ ان کو اسی زمین پر کچھ دن اور مہلت مل جائے۔ اس کے باوجود کہ یہ لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور آخرت میں جزائے خیر کے بھی امیدوار ہیں' تاہم وہ ایسی خواہش دل میں رکھتے ہیں' خصوصاً وہ لوگ جو ایمان کے ایسے درجے میں ہوں جس میں یہ فریق زیر بحث تھا۔

یہاں اب بات کو ایک آخری جھلکی میں دوبارہ پیش کیا جاتا ہے اور ایک ہی فقرے میں غلط تصور اور غلط سوچ کو

درست کر دیا جاتا ہے۔موت وحیات اور تقدیر اور اجل کے بارے میں سوچ کو درست کر دیا جاتا ہے' نیز جہاد و قتال کے زاویے سے موت و حیات کو ایک نچ دیا جاتا ہے۔اس فریق کا یہ جزع و فزع اسی لئے تو تھا کہ یہ سمجھتے تھے کہ موت قتال کے نتیجے میں آتی ہے حالانکہ (اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ------ (۴: ۷۸)) (موت تو جہاں بھی تم ہو بہرحال تمہیں آکر رہے گی خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو)۔موت تو ایک مقرر وقت پر آتی ہے۔اس کا تعلق قتال اور امن سے نہیں ہے۔اس کا تعلق جائے رہائش کی پختگی اور ناپختگی سے بھی نہیں ہے۔نیز اگر کوئی فریضہ جنگ سے پہلوتہی کرے تو بھی موت مؤخر نہیں ہو سکتی اور نہ فرائض جنگ اور جہاد کی وجہ سے موت وقت سے پہلے آتی ہے۔

موت کا ایک وقت مقرر ہے اور یہ معاملات اس سے بالکل جدا ہیں۔ان کے درمیان کوئی تعلق سبب و مسبب نہیں ہے۔بلکہ موت کا ایک وقت مقرر ہے اور جب وہ وقت پہنچ جائے تو سبب کوئی بھی فراہم ہو جاتا ہے۔وقت کے سوا اور کوئی سبب مرگ نہیں ہے۔اس لئے کہ یہ تمنا کرنا کہ قتال کا فرض ہوتا اگر قدرے مؤخر ہو جاتا ایک لغو تمنا ہے۔نیز قتال اور غیر قتال کے حالات میں اللہ کے سوا کسی اور سے ڈرنے کے بھی کچھ معانی نہیں ہیں۔

قرآن کریم ایک لطیف نچ کے ساتھ دل کی دنیا بدل دیتا ہے۔موت و حیات کے بارے میں ایک انسان کی سوچ ہی بدل جاتی ہے۔اور انسان کی سوچ اور شعور میں جو خوف و ہراس ہوتا ہے وہ یک لخت دور ہو جاتا ہے۔

لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ انسان احتیاطی تدابیر اختیار ہی نہ کرے اور اس کے دائرہ اختیار میں بچاؤ اور نگہداشت کے لئے جو تدابیر ہیں' انہیں کام میں نہ لائے۔ابھی ابھی یہ بات گزری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا۔(خُذُوْا حِذْرَکُمْ) تم بہت ہی محتاط رہو۔اور صلوٰۃ الخوف کے مسائل کے بیان کے موقعہ پر بھی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ایک دوسری جگہ (وَاَعِدُّوْا) کا حکم دیا گیا کہ خوب تیاریاں کرو۔یہ تمام احکام اپنی جگہ درست ہیں' البتہ ان تیاریوں کے ساتھ موت و حیات کا کوئی تعلق نہیں ہے۔احتیاطی تدابیر اور جنگی ساز و سامان کی فراہمی کی اپنی جگہ پر ایک حکمت ہے اور ان احکام کی پیروی ضروری ہے۔یہ اللہ کی تدابیر ہیں جن کا اللہ نے حکم دیا ہے۔لیکن موت بہرحال اپنے مقررہ وقت پر آتی ہے اور یہ بالکل ایک دوسرا عقیدہ اور حکم ہے اور اس پر یقین رکھنا بھی فرض ہے۔اگرچہ احتیاطی تدابیر بھی فرض ہیں اور جنگی تیاریوں کی بھی ظاہری اور باطنی حکمتیں ہیں۔لہٰذا دونوں احکام کی پیروی ضروری ہے' پورے توازن اور پورے اعتدال کے ساتھ۔تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے.... یہ ہیں اسلام کی ہدایات اور صحیح اسلامی پالیسیاں۔افراد اور جماعت کی تربیت کا یہ اسلامی منہاج ہے۔

---ooo---

غالباً یہاں آکر مہاجرین کے اس گروہ کی بات ختم ہو جاتی ہے اور اب اسلامی صفوں میں پھیلے ہوئے ایک دوسرے عنصر کی بات شروع ہوتی ہے۔اس دور میں اسلامی سوسائٹی کا دوسرے عناصر کے ساتھ یہ بھی ایک موجود عنصر ترکیبی تھا۔اگرچہ سابقہ بات کے اندر انقطاع اور نئی بات کا آغاز یہاں نظر نہیں آتا' نہ کوئی فصل ہے' نہ کوئی وقف ہے'جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ آنے والی بات ایک دوسرے عنصر کے بارے میں ہے۔الا یہ کہ پہلے فریق کی بات ختم ہو گئی ہے لیکن اس

بارے میں اس سے قبل ہم جو نکات بیان کر آئے ہیں وہ ہمارے پیش نظر ہیں۔

(وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا (۷۸) مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (۷۹) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا (۸۰)(٤:۷۸ تا ۸۰))

"اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے' اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ اے نبی' یہ آپ کی بدولت ہے۔کہو' سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی؟ اے انسان' تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب و عمل کی بدولت ہے۔

اے محمد ﷺ' ہم نے تم کو لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی اور جو منہ موڑ گیا' تو بہرحال ہم نے تمہیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔"

جن لوگوں کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں جو بھلائی پیش آتی ہے اس کی نسبت وہ اللہ کی طرف کرتے ہیں اور جو برائی انہیں درپیش ہوتی ہے' اس کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کرتے ہیں ان کے اس فعل کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ نبی ﷺ کے بارے میں بدفالی کا خیال کرتے ہیں۔ان کا گمان یہ ہے کہ نبی ﷺ کی وجہ سے ان پر مصائب نازل ہوئے۔اگر خشک سالی ہو جائے' اگر مویشی نسل کشی نہ کریں یا اگر کسی موقعہ پر ان پر مصیبت آ جائے تو وہ ان چیزوں کی نسبت حضور ﷺ کی طرف کرتے۔اور اگر انہیں کوئی بھلائی اور کامیابی ہوتی تو کہتے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ جان بوجھ کر نبی ﷺ کی قیادت پر الزام تراشی کرتے تھے۔اور یہ کام وہ اس لئے کرتے تھے کہ حضور ﷺ ان پر جو فرائض عائد فرماتے تھے' ان سے گلوخلاصی کرالیں۔ہو سکتا ہے کہ یہ قتال فی سبیل اللہ کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوں۔تو بجائے اس کے کہ وہ صاف صاف کہہ دیتے کہ بھائی ہم تو ضعیف ہیں اور بزدل ہیں اور جنگ سے ڈرتے ہیں' انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ حضور کی قیادت پر جرح و قدح کرنے لگے۔اور اگر بھلائی نصیب ہو تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا فضل ہے اور اگر برائی نصیب ہو تو اس کی نسبت نبی ﷺ کی طرف کرتے ہیں یا حضور ﷺ

کے احکام کی طرف کرتے ہیں کہ حضور ؐ کے ان احکامات کی وجہ سے یہ معیبت پڑی اور خیر سے ان کی مراد اس دنیا کی بھلائی ہوتی ہے اور شر سے مراد ان کی اس دنیا کا نقصان ہوتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس دنیا میں اللہ کی مشیت کے مطابق لوگوں کو جو حادثات اور واقعات پیش آتے ہیں اس کے بارے میں ان کا نقطہ نظر بہت ہی غلط ہے۔ نیز ان کا رسول اللہ اور خدا تعالیٰ کے درمیان پائے جانے والے تعلق کے بارے میں بھی بہت ہی گھٹیا تصور ہے۔

اگر یہ تیسری وجہ ہو تو یہ ان مہاجرین کی طرف سے ہو سکتی ہے جن کا موت و حیات کے بارے میں ابھی عقیدہ صاف نہ ہوا تھا اور اپنے اس تصور موت و حیات کی وجہ سے یہ لوگوں سے اس طرح ڈرتے تھے جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہئے۔ اور یہ لوگ کہتے تھے (رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (۴:۷۷)) (اے ہمارے رب تو نے ہم پر قتال کو کیوں فرض کر دیا کیا ہی اچھا ہوتا اگر تو اسے قریب وقت تک مؤخر کر دیتا) لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اس آیت سے مراد وہ لوگ نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد کچھ دوسرے لوگ ہیں جن میں ان چہروں کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی شامل تھے۔

یہ مسئلہ جو اس آیت میں لیا گیا ہے۔ یہ ایک عظیم اور مشکل مسئلہ کا ایک پہلو ہے اور وہ مسئلہ تاریخ ادیان اور تاریخ فلسفہ کا نہایت ہی مشکل مسئلہ ہے۔ یعنی مسئلہ جبر و قدر اور مسئلہ تقدیر۔ یہ مسئلہ یہاں بعض لوگوں کے حالات کے بیان میں ضمناً" آگیا ہے۔ ان لوگوں کے غلط تصورات کا رد یہاں کیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے اس فریق زیر بحث کی فکری غلطی کو درست کرتے ہوئے اس مسئلے کو نہایت ہی سادگی اور بغیر کسی پیچیدگی کے بیان کر دیا۔ ذرا قرآن کریم کے الفاظ میں سنئے۔

(وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَالِ هٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا (۴:۷۸))

(اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے' اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ تمہاری بدولت ہے۔ کہو سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔) بے شک اللہ ہی فاعل حقیقی اور فاعل اول ہے۔ وہی فاعل ہے جو کچھ اس کائنات میں وقوع پذیر ہوتا ہے وہ اسی سے ہے۔ لوگوں کے لئے جو کچھ ہوتا ہے یا لوگوں سے جو کچھ ہوتا ہے یہ سب کچھ اللہ سے ہے۔ لوگوں کا اختیار صرف اس قدر ہے کہ وہ توجہ کریں اور سعی کریں لیکن کسی فعل کا تحقق صرف اللہ کے ارادے اور تقدیر سے ہی ہو سکتا ہے۔

اس لئے کہ نیکی کی نسبت یا برائی کو وجود میں لانے کی نسبت اور برائی کو کسی کے اوپر لے آنے کی نسبت حضور ؐ کی طرف کرنا' حالانکہ آپ ایک انسان اور مخلوق ہیں اور ہم جیسے ہیں' یہ ایک غیر حقیقی نسبت ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس موضوع پر بات کو سمجھتے ہی نہیں۔

کبھی یہ ہوتا ہے کہ انسان ایک کام کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اپنے لئے بھلائی سمیٹنے کی سعی کرتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ

نے وسائل خیر کو استعمال کرنے کا جو فہم دیا ہے وہ اسے استعمال کرتا ہے لیکن اس کے باوجود کسی کو اگر بھلائی نصیب ہوتی ہے تو وہ ارادۂ الٰہی سے ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ اللہ کی تقدیر کے علاوہ کوئی اور تقدیر تو ہے نہیں جو اشیاء ' حادثات اور اس کائنات کے اندر وقوع پذیر ہونے والے حوادث کو پیدا کر سکتی ہو ۔ اب بھلائی بھی اگر کسی کو نصیب ہوتی ہے تو ان وسائل کی مدد سے نصیب ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس بھلائی کے لئے مقرر کئے ہیں ۔ اس لئے عملاً یہی تصور ہو گا کہ یہ بھلائی اللہ ہی کی وجہ سے نصیب ہوئی اور اسی کی تقدیر کا نتیجہ ہے ۔

بعض اوقات انسان ایک برائی کے ارتکاب کی طرف متوجہ ہوتا ہے یا وہ کوئی ایسا عمل کرتا ہے جس کے نتیجے میں برائی وجود میں آتی ہے ۔ لیکن عملاً برائی کا وارد ہونا اور وجود میں آنا محض اللہ کی قضا و قدر کے تحت ہوتا ہے ' اس لئے کہ اس کائنات میں اشیاء کے پیدا کرنے اور حادثات کو وقوع پذیر کرنے کی طاقت اللہ کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہے ۔

دونوں صورتوں میں 'خیر و شر میں کسی چیز کا وقوع پذیر ہونا من جانب اللہ ہوتا ہے اور اس آیت میں اسی حقیقت کا فیصلہ کیا گیا ہے ۔ رہی دوسری آیت یعنی (مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (۴ : ۷۹ )) (تمہیں جو بھلائی نصیب ہوتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور تمہیں جو برائی نصیب ہوتی ہے وہ تمہارے نفس کی طرف سے ہوتی ہے ) تو اس میں ایک دوسری حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے ۔ اس کا پہلی آیت میں بیان کردہ حقیقت سے نہ تعلق ہے اور نہ وہ اس سابقہ حقیقت قضا و قدر میں داخل ہے ۔ لہٰذا اس کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھنا ضروری ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق ایک منہاج کار وضع کیا ہے اور اس نے ہر کام کے لئے ایک طریقہ کار وضع کیا ہے ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو شر کے بارے میں اچھی طرح متنبہ کیا ہے ۔ جب انسان اس منہاج پر کاربند ہوتا ہے اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلتا ہے ' بھلائی کے لئے کوشاں ہوتا ہے اور شر سے لرزاں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ راہ ہدایت پر چلنے کے لئے اس کی مدد کرتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ۔ ( وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ) (جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں تو ہم ان کی راہنمائی اپنی راہوں کی طرف کر دیتے ہیں ) تب انسان بھلائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے ۔ بظاہر ایک شخص کسب اور محنت کرتے ہوئے نظر آتا ہے لیکن اس انسانی کسب و عمل کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ کسب و عمل کا منہاج تو خود اللہ نے متعین کیا ہے اس لئے انسان کی سعی میں ہی بھلائی ہوتی ہے ' وہ اللہ کے ترازو میں ہوتی ہے اور اللہ کی جانب سے ہوتی ہے اس لئے کہ بھلائی کا طریق کار وضع کرنے والا اور منہاج عمل متعین کرنے والا تو اللہ ہی ہے ۔ اسی نے تو بھلائی کی طرف راہنمائی فرمائی اور وہی تو ہے جس نے بھلائی کی توفیق دی اور برائی سے ڈرایا ۔ کوئی انسان جب اس منہاج پر نہیں چلتا جو اللہ نے متعین کیا ہے اور اس راہ کو نہیں اپناتا جسے اللہ نے مشروع قرار دیا ' وہ بھلائی کے لئے سعی نہیں کرتا اور جس برائی سے اسے ڈرایا گیا ہے اس سے نہیں ڈرتا ' تو یقیناً اسے برائی سے دوچار ہونا پڑے گا اور یہ ایک حقیقی برائی ہو گی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور یہ برائی خود اس کے نفس کی کمائی ہو گی اس لئے کہ وہ اپنے اختیار سے اللہ کے پسندیدہ منہاج عمل سے نکل گیا ۔ (یہ ہے اس کا کسب ) ۔ یہ مفہوم پہلے مفہوم سے مختلف ہے اور دونوں کا دائرہ بھی الگ الگ ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نکتہ اب واضح ہو گیا ہے ۔

اس دوسرے مفہوم کے اعتبار سے نظریہ تقدیر پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اچھائی اور برائی دونوں کا تعلق اللہ کی مرضی اور تقدیر سے ہے۔ اللہ ہی تمام مخلوقات کا پیدا کرنے والا ہے۔ ہر حادث کا پیدا کرنے والا وہی ہے۔ ہر ہونے والے واقعے کا موجد وہی ہے' چاہے اس بارے میں انسان کا ارادہ اور عمل جو ہو' سو ہو اور ہونے والے جیسے حالات میں بھی ہو۔

وہ اصل مسئلہ کیا ہے جو ان نصوص میں بیان کیا گیا ہے یا اس کا ایک پہلو لیا گیا ہے۔ وہ مسئلہ جبر و اختیار ہے۔ یہ کہ انسان سے جن افعال کا صدور ہوتا ہے' اس میں اس کے اپنے ارادے کا کس قدر دخل ہے یا اس کے لئے جو فائدے یہاں واقع ہوتے ہیں ان میں اس کے اپنے ارادے کا کس قدر دخل ہے اور یہ کہ اس کے افعال ارادی پر جزا و سزا کس طرح مرتب ہوگی جبکہ ہم کہتے ہیں کہ تمام افعال کا اصل خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ خود انسان کے ارادے' انسان کی توجہ' انسان کے عمل اور تمام دوسرے محدثات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ اور اس قسم کے تمام سوالات جن کا تعلق مسئلہ جبر و قدر کے ساتھ ہے۔ قرآنی آیات اس بات کی تصریح کرتی ہیں کہ ہر حادث اللہ کے ارادے سے حادث بنتا ہے۔ قرآن کریم سب کا سب اللہ کا کلام ہے اور قرآن کریم کی آیات ایک دوسرے کے ساتھ متعارض نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے ان دونوں امور کے درمیان ایک نقطہ اتصال ضروری ہے۔ انسان کے ارادے اور عمل کا ایک دائرہ ایسا ہے جس کے اندر وہ ذمہ دار ہے اور مسئول ہے' اور اسے سزا و جزاء کا سامنا کرنا ہو گا۔ اس دائرہ اختیار کا تعارض بھی تقدیر الہٰی اور ارادۂ ربانی کے دائرے کے ساتھ نہ ہو تو یہ دائرے کس طرح متعین ہوں گے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا بیان اور توضیح ممکن نہیں ہے' اس لئے کہ اللہ کا ارادہ اور اس کی قدرت کس طرح کام کرتی ہے اس کی کیفیات کا ادراک انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔

بہرحال اس کے بعد اللہ تعالیٰ حضور ؐ کے دائرۂ کار اور حدود ذمہ داری کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ کہ آپ لوگوں کے حوالے سے کیا موقف اختیار کریں گے اور لوگوں کا تعلق آپ کے ساتھ کس طرح ہو گا۔ اور تمام معاملہ انجام کار اللہ کی طرف لوٹ جائے گا۔

(مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (۷۹) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا (۸۰)(۴:۷۹ – ۸۰))

(اے محمد' ہم نے تجھے لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی اور جو منہ موڑ گیا' تو بہرحال ہم نے تمہیں لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے) رسول کا فریضہ یہ ہے کہ وہ رسالت کی ذمہ داری ادا کرے۔ اس کی ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ وہ خیر پیدا کرے یا کوئی شر پیدا کرے۔ یہ تخلیق کا کام تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اور اللہ اس پر گواہ ہے کہ اس نے حضرت محمد ؐ کو محض ادائے فریضہ رسالت کے لئے بھیجا ہے۔ (وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ) (اور خدا کی گواہی کافی ہے)۔

اور لوگوں کا معاملہ حضرت محمد ؐ کے ساتھ یہ ہے کہ جس شخص نے آپ کی اطاعت کی تو گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ لہٰذا اطاعت کے معاملے میں اللہ اور رسول کے درمیان کوئی جدائی نہیں ہے۔ نہ اللہ کے قول اور رسول اللہ کے قول کے درمیان کوئی فرق و امتیاز ہے۔ پس جو شخص منہ پھیرتا ہے اور رسول اللہ کی تکذیب کرتا ہے تو اس کا حساب و کتاب اور اس کی سزا و جزا کا کام اللہ کے سپرد ہے۔ اللہ نے رسول اللہ کو اس لئے نہیں بھیجا کہ آپ لوگوں کو ہدایت پر مجبور کر دیں یا انہیں دین کے اندر داخل ہونے پر مجبور کر دیں۔ نہ رسولوں کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ لوگوں کی اس طرح حفاظت کریں کہ وہ گناہوں میں مبتلا نہ ہوں۔ نہ یہ بات رسولوں کی قدرت میں دی گئی ہے کہ وہ لوگوں کے پاسبان بن جائیں۔

اس بیان کے ذریعے ان کے تصورات اور خیالات کو اس بارے میں درست کیا جاتا ہے کہ جو واقعات انہیں پیش آتے ہیں ان کا تعلق اور وجود اللہ کے ارادے سے ہے اور اللہ کی تقدیر کے عین مطابق ہے اور انہیں جو بھلائی اور برائی پیش آتی ہے' چاہے بھلائی اور برائی کو کسی معنی میں بھی لیا جائے' چاہے ظاہری بھلائی ہو یا حقیقی بھلائی ہو' یہ سب کچھ اللہ کی جانب سے ہے۔ اللہ کے سوا کوئی کسی چیز کو پیدا کر سکتا ہے' نہ اسے وجود میں لا سکتا ہے' نہ اسے باقی رکھ سکتا ہے اور نہ کسی چیز کو صنعت میں لا سکتا ہے۔ اللہ کے ہاں جو حقیقی بھلائی ہے وہ اللہ ہی سے ہے اور جو حقیقی برائی انہیں نصیب ہوتی ہے اس میں ان کے نفوس کا دخل ہوتا ہے۔ یہ برائی انہیں اس لئے نصیب ہوتی ہے کہ یہ لوگ اسلامی نظام زندگی سے منہ موڑتے ہیں اور اللہ کی ہدایات کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

رسول کی پہلی اور آخری ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ رسول ہے۔ وہ نہ منشی ہے' نہ خالق ہے اور نہ کسی حادثہ کو لا سکتا ہے۔ یہ اللہ کی خصوصیات ہیں اور ان میں رسول' اللہ کے ساتھ شریک نہیں ہوتا۔ وہ بس اللہ کے احکام پہنچانے والا ہے' تب اس کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ اللہ کی اطاعت کے لئے ماسوائے رسول اللہ کی اطاعت کے اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ رسول اس بات کا مکلف نہیں ہے کہ وہ ان لوگون کے لئے ہدایت کا سامان کرے جو اعراض کرنے والے ہیں اور نہ رسول انہیں اعراض اور نافرمانی سے روک سکتا ہے۔ وہ ابلاغ اور بیان کے بعد اور کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ ہیں فیصلہ کن اور تسلی بخش حقائق۔ واضح اور صریح حقائق۔ ان سے تصورات کی تعمیر اور شعور کی پختگی ہوتی ہے۔ اور یہ حقائق جماعت مسلمہ کو عظیم منصب اور ڈیوٹی کے لئے تیار کرنے کی جدوجہد کا ایک حصہ ہیں۔ اس کے بعد سیاق کلام ایک دوسرے گروہ کی طرف مڑ جاتا ہے۔ یہ گروہ اسلامی صفوف کے اندر گھسا ہوا ہے اور شاید یہ منافقین کا کوئی گروہ ہے۔ قرآن کریم ان کے کردار کو علیحدہ اور نئے عنوان کے ساتھ ذکر کرتا ہے لیکن انداز بیان کے اندر اس کردار سے نفرت بھی جھلکتی ہے۔ اس نفرت کے ساتھ ساتھ جماعت مسلمہ کی تعلیم' راہنمائی بھی کی گئی ہے۔

(وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا (۸۱) أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (۸۲) (۴: ۸۱-۸۲))

(وہ منہ پر کہتے ہیں کہ ہم مطیع فرمان ہیں مگر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ راتوں کو جمع ہو کر تمہاری باتوں کے خلاف مشورے کرتا ہے ۔ اللہ ان کی یہ ساری سرگوشیاں لکھ رہا ہے ۔ تم ان کی پروانہ کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو' وہی بھروسہ کے لئے کافی ہے ۔ کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے ؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس مین بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی )۔

یہ گروہ ایسا تھا کہ جب یہ رسول اللہ ؐ کے پاس موجود ہوتا اور آپ سے قرآن سنتا اور قرآنی فرائض کو سمجھتا تو کہتا کہ ہم مطیع فرمان ہیں' وہ اس طرح جامع اور مانع اطاعت کا اعلان کرتے' بے قید اطاعت کا اقرار کرتے ۔ اس میں نہ وہ کوئی اعتراض کرتے' نہ کسی قسم کی توضیحات طلب کرتے' نہ کوئی استثناء رکھتے' لیکن جونہی وہ حضور کی مجلس سے اٹھتے' ان میں سے ایک گروہ راتوں کو جمع ہو کر آپ کی باتوں کے خلاف مشورے کرنے لگ جاتا ۔ اور یہ فیصلہ کرتا کہ حضور نے جو کچھ فرمایا ہے اس پر عمل نہ کیا جائے اور کوئی ایسا منصوبہ اپنایا جائے کہ اس پر عمل نہ ہو اور گلوخلاصی ہو جائے ۔

اس کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت من حیث الجماعت تو یہ کہتی ہے کہ ہم اطاعت کریں گے لیکن ان میں سے ایک گروہ رات کے وقت نکل کر وہ سازش کرتا ہے جو جماعت مسلمہ کے قول کے خلاف ہوتی ہے ۔ اور اس گروہ منافقین کا مقصد اس جماعت کے اندر افراتفری اور بے چینی پیدا کرنا ہوتا ہے ۔ بہرحال دونوں صورتوں میں یہ گروہ منافقین سازش کر رہا ہوتا ہے ۔ ان کی سرگرمیاں اسلامی صفوں کے اندر بے چینی پیدا کرتی ہیں جبکہ جماعت مسلمہ ان سازشوں کے خلاف ہر میدان میں معرکہ آرا ہوتی ہے اور اپنی پوری قوت ان کے مقابلے میں صرف کرتی ہے ۔

اللہ تعالیٰ اہل ایمان اور حضور نبی کریم ؐ کو یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ اللہ کی نظروں سے یہ سازشی ٹولہ اوجھل نہیں ہے اور اس کی مکاری سے اللہ اچھی طرح باخبر ہے ۔ یہ شعور اور احساس کہ ان سازشیوں کی سازشوں سے اللہ اچھی طرح خبردار ہے اہل ایمان کے دلوں کے اندر اطمینان اور قوت پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے ۔ ان کے اندر یہ سکون پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی نظر ہوتے ہوئے یہ سازشیں ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتیں ۔ دوسری جانب سے ان سازشیوں کو بھی یہ سخت تنبیہ ہے کہ وہ ان سازشوں میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے ۔

( وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ) (اور اللہ ان کی یہ تمام سرگوشیاں لکھ رہا ہے )۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ؐ کو منافقین کے ساتھ معاملہ کرنے کا جو منصوبہ دیا تھا وہ یہ تھا کہ آپ ان کے ساتھ ان کی ظاہری حالت کے مطابق معاملہ کریں گے اور ان کے ساتھ ان کی نیتوں کے مطابق سلوک نہ ہو گا ۔ ان کی خفیہ سازشوں سے اغماض برتا جائے گا اور اعراض کیا جائے گا ۔ یہ ایک ایسا منصوبہ تھا جس کے مطابق آخرکار وہ منتشر ہو گئے' کمزور ہو گئے اور ان میں سے جو باقی رہ گئے تھے وہ تتر بتر ہو گئے اور چھپ گئے ۔ اس منصوبے کا ایک حصہ یہ تھا ۔ ( فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ ) (آپ ان کی پرواہ نہ کریں ) ان سے چشم پوشی کرنے کے ساتھ ساتھ رسول کو مطمئن کیا جاتا ہے کہ اللہ کی حفاظت اور پاسبانی پر مکمل بھروسہ رکھو ۔ (وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا) (اور اللہ پر بھروسہ رکھو' اللہ بھروسے کے لئے کافی ہے ) بالکل درست' اللہ بھروسے کے لئے کافی ہے' جس کا وکیل اللہ ہو اسے کوئی بھی گزند نہیں پہنچا سکتا ۔ نہ اسے کوئی سازش گزند پہنچا سکتی ہے' نہ خفیہ سازش ان کے خلاف چل سکتی ہے' اور نہ ظاہری سازش ۔

سوال یہ ہے کہ پھر گروہ حضور ؐ کے سامنے اقرار اطاعت کرتا اور واپس ہو کر رات کو سازش کرنے میں لگ جاتا ـ وہ ایسا کیوں کرتا تو دراصل یہ گروہ یہ رویہ اس لئے اختیار کرتا تھا کہ اسے اس بات میں شبہ تھا کہ آیا حضور اکرم ؐ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ اللہ کی جانب سے ہے یا نہیں ـ جب ایک لمحہ کے لئے اس قسم کا شک پیدا ہو جائے تو بات کی قوت اور شوکت ختم ہو جاتی ہے ـ قرآن اور کلام رسول کے اندر قوت اور شوکت اسی شعور سے پیدا ہوتی ہے کہ یہ کلام باری تعالیٰ کی طرف سے آرہا ہے اگرچہ عبداللہ کے حلقوم سے سنا جارہا ہے ـ اور یہ کہ آپ ہوائی باتیں نہیں کر رہے ہیں ـ یہی وجہ ہے کہ ان کو توکل علی اللہ کرنے کے بارے میں دو ٹوک حکم دیا گیا اور مکرر تاکید مزید کی گئی ـ

یہاں اللہ تعالیٰ ان کے سامنے ایک نکتہ پیش فرماتے ہیں ـ اور یہ نکتہ عزت و شرف کی وہ انتہا ہے جس تک قرآن کریم انسان کو پہنچانا چاہتا ہے کہ وہ عقل سے کام لے اور یہ سمجھ لے کہ وہ ایک ذی شرف مخلوق ہے ـ وہ صاحب عقل و ادراک ہے ' اور یہ عقل و ادراک اللہ ہی نے انسان کو عطا کیا ہے ـ اللہ تعالیٰ قرآن کے بارے میں فیصلہ ان کے شعور اور ان کی عقل و ادراک پر چھوڑتا ہے ـ اللہ ان کے لئے بصارت و بصیرت کا ایک منہاج متعین فرماتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اگر وہ اس منہاج کے مطابق معاملات پر غور کریں تو وہ کبھی بھی ٹھوکر نہ کھائیں گے ـ یہ منہاج فہم و ادراک قرآن میں نہایت ہی واضح طور پر متعین کیا گیا ہے ـ اور خود انسانی فہم و ادراک بھی اس منہاج تک پہنچ سکتا ہے ـ اور اس طرح انسان اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے کہ قرآن کریم اللہ کی جانب سے ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے ـ

(اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا

( ٤ : ٨٢ ) (کیا یہ لوگ قرآن مجید پر غور نہیں کرتے ' اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت کچھ خلاف بیانی پاتے ) اس بیان اور ہدایت کے اندر انسانیت کے لئے انتہائی عزو شرف کا مقام پوشیدہ ہے ـ اس میں انسان کے ادراک پر مکمل بھروسہ کیا گیا ہے ـ اور اس کی شخصیت کو بہت ہی اہمیت دی گئی ہے ـ نیز اس میں عدالت عقل میں فیصلہ لے جانے کا حکم دیا گیا ہے ـ اور یہ بھی ایک ایسے مظہر میں جس کا سمجھنا انسانی عقل کے لئے زیادہ دشوار نہیں ہے ـ

قرآن کے اندر پائی جانے والی مکمل ' جامع اور بے قید ہم آہنگی ایک ایسا مظہر ہے جو اس شخص کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا جو اس کتاب پر تدبر کرے ـ اس مظہر کی سطح اور اس کا دائرہ مختلف لوگوں کی فہم کے مطابق وسیع اور تنگ ہو سکتا ہے ـ مختلف نسلوں اور مختلف قسم کے ذہین لوگوں کے نتائج فکر مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ہر عقل اور ہر نسل اور ہر دور کے لوگوں کو اپنی بساط کے مطابق اس سے کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے اور یہ کمی بیشی لوگوں کے فہم ' ان کی عقل اور ان کے علم و ثقافت کے اعتبار سے ہو سکتی ہے ـ اس سلسلے میں مختلف لوگوں کا نتیجہ فکر ان کے تجربے ' صلاحیت اور تقویٰ کے مطابق محدود یا لامحدود ہو سکتا ہے ـ

یہی وجہ ہے کہ ہر شخص اس آیت کا مخاطب ہے ' ہر نسل اس کی مخاطب ہے ' اور درست منہاج فکر و تدبر کے مطابق وہ اس مظہر کا ادراک کر سکتا ہے ـ یعنی یہ وصف کہ قرآن کے اندر خلاف بیانی نہیں ہے اور اس کے اندر مکمل ہم آہنگی اور تناسق پایا جاتا ہے ـ البتہ جس طرح ہم نے کہا ' یہ فہم انسان کی صلاحیت ' اس کے علمی مقام ' تجربے اور تقویٰ

کے حدود کے اندر رہتا ہے - یہ گروہ' جسے اس وقت کی موجودنسل کی صورت میں مخاطب کیا گیا تھا' ایک ایسے کلام سے مخاطب کیا جا رہا تھا' جسے وہ خوب سمجھتا تھا۔ اور اپنے فہم و ادراک کے ذریعے وہ اسے عمل میں لاتا تھا' جس قدر اس کی طاقت کے حدود میں ہوتا تھا۔

یہ مظہر اور یہ صفت یعنی مکمل اتحاد فکر اور ہم آہنگی کی صفت کا اظہار سب سے پہلے قرآن کریم کے انداز تعبیر میں ہوتا ہے - قرآن کی طرز ادا اور فنی طریقہ اظہار مدعا کے اندر مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے - انسانی کلام ہمارے سامنے ہیں' بڑے سے بڑے ادب پاروں میں نشیب و فراز بھی ہوتے ہیں' ہم آہنگی بھی ہوتی ہے اور لغزش کلام بھی ہوتی ہے - ایک حصہ اگر پرزور ہوتا ہے تو دوسرے میں جھول ہوتی ہے - ایک میں اگر فکری تخلیق ہے تو دوسرا حصہ پیش پا افتادہ ہوتا ہے' ایک حصہ اگر رواں ہوتا ہے تو دوسرا نہایت ہی گنجلک ہوتا ہے - ایک اگر نہایت ہی روشن ہے تو دوسرا حصہ تاریک ہے' غرض کلام کی فصاحت و بلاغت اور نقص کے سلسلے میں جو اوصاف ہوتے ہیں ان کے اعتبار سے انسانی کلام میں نشیب و فراز ہوتا ہے - نقائص کلام میں سے اہم نقص کلام کے اندر روانی اور ہم آہنگی کا فقدان ہوتا ہے جس میں بات جلدی جلدی ایک معیار سے گرتی ہے یا گرے ہوئے معیار سے اوپر کو اٹھتی ہے - ہر انسانی کلام کے اندر یہ مظہر قدم قدم پر سامنے آتا ہے' کسی ایک ادیب کے اگر ادبی کردار کو لیں' یا اس کے افکار کو لیں' یا کسی ایک ہی ادیب کے فن پاروں کو لیں یا کسی ایک سیاست دان کی پالیسیوں کو لیں' یا کسی ایک جرنیل کی جنگی چالوں' یا کسی ایک شخص کی صنعت کاری کو لیں' اس میں معیار کا یہ تفاوت قدم قدم پر نظر آئے گا۔ معیار تعبیر کے اندر زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

قرآن کریم کے اندر یہ صفت نہایت ہی واضح ہے اور پوری طرح منعکس ہے' یعنی کلام میں پختگی اور ہم آہنگی - پورے قرآن کے اندر یہ صفت ملحوظ رکھی گئی ہے - ہم یہاں جو بات کر رہے ہیں وہ صرف لفظی اور تعبیر کی ہم آہنگی کے زاویے سے ہے - اس پوری کتاب کے اندر کلام اور اسلوب اظہار کا ایک ہی معیار ہے' اسی وجہ سے یہ کتاب معجزانہ شان لئے ہوئے ہے - یہ کتاب جن موضوعات پر کلام کرتی ہے' مضمون کے اعتبار سے اس کے رنگ مختلف ضرور ہوتے ہیں لیکن فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اس کا معیار ایک ہی رہتا ہے - اسلوب ادا میں اس کا کمال قائم رہتا ہے' اور کسی جگہ کلام اپنی معیاری سطح سے گرنے نہیں پاتا۔ کسی جگہ اس کی حالت ایسی نہیں ہوتی جس طرح انسانی کلام کی حالت ہوتی ہے کہ کبھی معیار کچھ ہوتا ہے اور کبھی کچھ - یہ کتاب اللہ کی شان کاریگری لئے ہوئے ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بات کے کہنے والا متغیر نہیں ہے اور وہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف متغیر نہیں ہوتا۔ اور نہ اس پر ایک حالت کے بعد دوسرا حال طاری ہوتا ہے - (دیکھئے 'التصویر الفنی فی القرآن)

اس کے فنی اسلوب کے بعد پھر یہ عدم اختلاف کی صفت اور مکمل ہم آہنگی اور عام وحدت فکر اس نظام کے اندر بھی پائی جاتی ہے جس کا اظہار و بیان قرآن کریم کی ان عبارات کے اندر کیا گیا ہے اور جس کا مفہوم ان ہم آہنگ عبارتوں کی اندر بیان ہوا ہے - یعنی وہ نظام فکر جس کے اوپر نفس انسانی کی تربیت کی گئی ہے یا انسانی معاشرے کی تربیت کی گئی ہے - نیز اس نظام زندگی کے تمام اجزاء اور اس کے تمام پہلوؤں کے اندر مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے - اسی طرح ایک فرد کی زندگی کی تمام سرگرمیوں اور پھر ایک معاشرے کے اندر فرد کی تمام سرگرمیوں اور نسلاً بعد نسل ایک فرد اور معاشرے کی زندگی کے اندر جو تغیر و تبدل ہوتا ہے اس کے تمام پہلوؤں کے اندر مکمل توافق اور توازن پایا جاتا ہے - پھر

انسان کی قوت مدرکہ کے لئے ایک منہاج اور تقویم ہے 'جس کے کئی پہلو ہیں اور انسان کے فہم و ادراک کی کئی قوتیں اور عمل اور اک میں کام آنے والی مختلف قوتیں۔ پھر خود حضرت انسان کی ذات اور اس کے تمام معاشروں' تمام نسلوں اور تمام سطحوں کے اندر بھی ایک مکمل ہم آہنگی رکھی گئی ہے۔ انسان اور اس کائنات کے اندر بھی مکمل آہنگی ہے جس کے اندر یہ انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر انسان کی دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی کے اندر بھی مکمل توافق اور ہم آہنگی ہے۔ پھر اس کتاب نے اس انسان اور اس پوری کائنات کے اندر اس کی زندگی بسر کرنے میں بھی پوری ہم آہنگی رکھی ہے۔

جب ایک انسان اور اللہ کی کاریگری کے اندر باعتبار اسلوب کلام اور لفظی تعبیر فرق ہے تو فکری نظریاتی اور قانون سازی کے میدانوں میں بھی 'ظاہر ہے کہ انسانی کام اور ربانی کام کے اندر نہایت ہی واضح فرق و امتیاز ہو گا۔ تمام انسانی نظریات' تمام انسانی مذاہب و مکاتب کے اوپر انسانی چھاپ بالکل واضح نظر آتی ہے۔ اور نقطہ نظر کے اندر جزئی اور انفرادی پن واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ان تمام پہلوؤں کے اندر وقتی حالات اور مشکلات سے انسان متاثر نظر آتا ہے۔ اور انسان اس بات کا ادراک نہیں کر سکتا کہ اس کے نظریے' اس کے مذہب و مکتب کے اندر اور اس کے منصوبوں کے اندر کوئی نہ کوئی تناقض موجود ہوتا ہے جو اس نظام فکر و عمل کے اندر کشمکش شروع کر دیتا ہے اور یہ کشمکش یا تو بہت جلد شروع ہو جاتی ہے یا کچھ عرصے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ پھر یہ انسانی مکاتب فکر و عمل انسان کی بعض خصوصیات کو بالکل دبا دیتے ہیں جبکہ خود انسان کو ان کا نہ علم ہوتا ہے اور نہ انسان انہیں پیش نظر رکھ سکتا ہے۔ یا پھر بعض شخصیات کے اندر ایسے اوصاف ہوتے ہیں جن کے بارے میں انسان سوچ ہی نہیں سکتا۔ خود انسانی ادراک کے اندر ہزاروں کمزوریاں اپنی جگہ ہوتی ہیں اور جس کا دائرہ عمل نہایت ہی محدود ہوتا ہے۔ چونکہ انسانی ادراک کا دائرہ محدود ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے بنائے ہوئے منصوبے سے آگے نہیں دیکھ سکتا بلکہ وہ خود اپنے موجود منصوبے کے (مَالَهُ وَمَا عَلَيْهِ) سے بھی اچھی طرح واقف نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس قرآنی منصوبہ چونکہ علیم و خبیر کا بنایا ہوا ہوتا ہے اس لئے قرآنی مندرجات و مفہومات ان تمام نقائص سے پاک ہوتے ہیں۔ یہ مفہومات اور منصوبے مستقل ہوتے ہیں اور پوری کائنات کے اندر مروج نوامیس فطرت کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ یہ نوامیس فطرت مستقل اور ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ مسلسل حرکت میں بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح قرآنی نظریات بیک وقت متحرک بھی ہوتے ہیں' اور ثابت بھی ہوتے ہیں۔

ان آفاق و حدود کے اندر قرآن کریم کی اس صفت پر غور و فکر سے بعض اوقات انسانی ادراک اس کے پورے آفاق کو نہیں پا سکتا اور نہ ہی بعض اوقات ایک پوری نسل اس کا مکمل ادراک کر سکتی ہے بلکہ تمام نسلوں کے ادراک میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہو گا۔ اس لئے کہ قرآن کریم سے ہر نسل اپنا حصہ پاتی ہے اور آنے والی ترقی یافتہ نسلوں کے لئے بھی کچھ نہ کچھ آفاق رہتے ہیں۔ بہرحال اس صفت کے ادراک میں مختلف درجات کے اعلیٰ انسانوں سے کچھ نہ کچھ ضرور باقی رہ جاتا ہے جس طرح دوسری چیزوں کے اندر کسی نہ کسی حد تک اختلاف موجود ہوتا ہے۔ اور اس باقی آفاق سے اگلی نسلیں بھی اپنا حصہ حاصل کرتی رہتی ہیں اس لئے کہ اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں اور انسان کی بنائی ہوئی چیزوں میں فرق ہے۔ اور اللہ کی بنائی ہوئی چیز میں نہ کوئی اختلاف ہوتا ہے اور نہ تفاوت اور فرق۔ اس میں مکمل اتحاد اور تناسق ہوتا ہے۔ ہاں لوگوں کی فہم و ادراک کے حدود میں ضرور فرق ہوتا ہے اور بعض لوگ اس تناسق کو بہت ہی اچھی طرح سمجھتے ہیں اور بعض ذرا کم سمجھتے ہیں۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے التصور الاسلامی خصائصہ و مقوماتہ۔ نحو مجتمع اسلامی' الاسلام و

مشکلات الحضارہ اور ھذا الدین وغیرہ)۔

لیکن جس قدر ایک عام انسان سمجھ سکتا ہے یا ایک گروہ سمجھ سکتا ہے یا ایک متعین نسل سمجھ سکتی ہے' اللہ تعالیٰ لوگوں کے فہم و ادراک کے سامنے 'جس قدر ان کو حاصل ہے' قرآن کریم کو پیش کرتے ہیں اور ان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ سوچیں کہ یہ قرآن کریم اللہ کا کلام ہے اور اگر غیراللہ کا کلام ہوتا تو لوگ اس میں بہت کچھ اختلافات پاتے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک مختصر سا توقف کریں اور یہ متعین کرلیں کہ اس مخصوص معاملے میں یا پورے دین کے معاملے میں انسانی ادراک کی حدود کار کیا ہیں؟ کوئی انسان اس بات سے غرے میں مبتلا نہ ہو جائے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ معاملہ خود انسانی ادراک کے سامنے فیصلے کے لئے پیش کیا ہے اس لئے گویا انسانی ادراک کوئی بہت ہی بڑی شئی ہے۔ انسانی غوروفکر اور ادراک کو بھی اپنی محفوظ حدود کے اندر رہنا چاہئے کہیں وہ اپنے محدود محفوظ دائرے سے باہر بھول بھلیاں میں پھنس نہ جائے۔

قرآن کریم کی ان ہدایات کو اچھی طرح نہیں سمجھا گیا اور نہ ہی ان کی حدود کو اچھی طرح سمجھا گیا ہے۔ ازمنہ قدیمہ اور دور جدید دونوں میں ایسے اسلامی اہل فکر رہے ہیں جنہوں نے عقل وقیاس کو شریعت کے مساوی درجہ دیا ہے بلکہ یہ لوگ عقل و ادراک کو شریعت کا پاسباں بناتے ہیں..... لیکن حقیقت ایسی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فہم و ادراک کا یہ آلہ بہرحال انسانی قوت مدرکہ ہے اگرچہ اپنی جگہ یہ نہایت ہی اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کے مسئلے کو بارگاہ عقل وتدبر میں پیش کیا ہے لیکن عقل کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کرے کہ یہ قرآن اور اس کے اندر وضع کردہ پورے کا پورا دین من جانب اللہ ہے۔ اس لئے کہ قرآن کے اندر ایسے اوصاف و مظاہر ہیں جنہیں عقل بشری بڑی سہولت سے سمجھ سکتی ہے۔ اور وہ مظاہر اور علامات اس بات کے ادراک کے لئے کافی ہیں کہ یہ دین من جانب اللہ ہے۔ جب یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ یہ دین من جانب اللہ ہے تو اس ادراک کا منطقی نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ اس دین کے اندر جو احکام ہیں انہیں انسان تسلیم کرے چاہے ان کی حکمت انسان کی سمجھ میں آرہی ہو یا نہ آرہی ہو' اس لئے کہ جب ہم نے یہ بات تسلیم کرلی کہ یہ دین اور قرآن من جانب اللہ ہے تو یہ بات ازخود تسلیم ہو جاتی ہے کہ اس کے اندر حکمت موجود ہے پھر یہ بات اہم نہیں رہتی کہ حالات حاضرہ کے اندر لوگوں کی مصلحت اس دین سے پوری ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ جب دین اللہ کی طرف سے ہے تو گویا مصلحت اس کے اندر موجود اور متحقق ہے۔ انسانی عقل شریعت کے مساوی نہیں ہوتی چہ جائیکہ کہ وہ شریعت پر حاکم اور مقتدر ہو جائے۔ اس لئے کہ خود شریعت کی حکمتوں کا ادراک ہر عقل نہایت ہی محدود پیمانے پر کرپاتی ہے اور یہ بات محال ہے کہ عقل شریعت کے تمام زاویوں اور تمام مصلحتوں کا احاطہ کرسکے۔ نہ ایک لحظہ میں نہ پوری انسانی تاریخ میں۔ جبکہ اللہ کی شریعت کی نظر ایک ایک لمحے کی مصلحتوں پر بھی ہوتی ہے اور زمان و مکان کے مصالح پر بھی ہوتی ہے۔ اس لئے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ شریعت کا کوئی ثابت شدہ حکم صرف انسانی عقل وقیاس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں عقل انسانی کا کام صرف یہ ہے کہ وہ نصوص شرعیہ کے ادراک اور ان نصوص کی دلالت اور مفہومات کے اخذ پر غور کرے۔ یہ اجازت عقل کو نہیں دی جاسکتی کہ وہ احکام کی مصلحتوں پر بھی کلام کرے۔ اس لئے کہ جب اللہ کی جانب سے کوئی آیت نازل ہوتی ہے تو اس میں لازماً کوئی مصلحت ہوتی ہے تب ہی تو وہ آتی ہے۔ عقل کا کام تو ان مسائل میں ہوتا ہے جن میں کوئی نص نہ

ہو' جدید مسائل ہوں ـ ایسے مسائل کے بارے جو طریقہ کار اختیار کیا جائے گا اس کے بارے میں ہم اس سے پہلے کہہ آئے ہیں کہ ایسے مسائل کو اللہ اور رسول اللہ کی طرف لوٹا دیا جائے گا ـ اور یہی وہ دائرہ کار ہے جو حقیقی اجتہاد کے لئے کھلا چھوڑا گیا ہے جبکہ نصوص قرآنی کا فہم و ادراک بہرحال ہر وقت عقل ہی کے ذریعے ہو گا ـ جب کسی نص کا مفہوم سمجھ لیا جائے تو بس اب وہاں توقف ہی بہتر ہوتا ہے اور عقل کو اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ فیصلہ دے کہ آیا اس مفہوم میں مصلحت ہے یا نہیں ہے ـ عقل انسانی کا اصل دائرہ کار کائنات کے قوانین قدرت ہیں اور یہ نہایت ہی وسیع دائرہ کار ہے ـ

ہمیں چاہئے کہ ہم عقل انسانی کو اسی قدر مقام و منزلت دیں جو اسے اللہ نے دیا ہے اور جو اس کے لئے مناسب ہے اور اس دائرے کے اندر اسے رکھا جائے جو اللہ نے عقل کے لئے رکھا ہے ـ اس دائرے کے حدود سے تجاوز نہ کیا جائے تاکہ وہ بھول بھلیاں میں جاکر پھنس نہ جائے اور اسے کوئی رہبر کامل نہ ملے ـ اور اگر کوئی رہبر ملے بھی تو وہ ایسے راستوں پر پڑ جائے جن کا اسے خود علم نہ ہو ـ یہ صورت حال ایک ایسے انسان کے لئے زیادہ خطرناک ہے جو صراط مستقیم کا متلاشی ہو ـ

---ooo---

اب سیاق کلام ذرا آگے بڑھتا ہے اور ایک دوسرے گروہ کو لیا جاتا ہے جو اسلامی معاشرے میں پایا جاتا ہے ـ

وَاِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْھُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۸۳)

(یہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش یا خوفناک خبر سن لیتے ہیں' اسے لے کر پھیلاتے ہیں' حالانکہ اگر یہ اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں ـ تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو (تمہاری کمزوریاں ایسی تھیں کہ) معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے ـ)

یہاں جس گروہ کے بارے میں کہا گیا ہے یہ بھی اسلامی کیمپ میں موجود ایک گروہ ہے لیکن یہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو ابھی تک اسلامی نظام کے راہ و رسم سے اچھی طرح واقف نہیں ہے ـ اور اس گروہ کو ابھی تک اس بات کی سمجھ نہ تھی کہ اسلامی کیمپ میں بے چینی پھیلنے کے نتائج کس قدر خطرناک اور کس قدر تباہ کن ہو سکتے ہیں ـ اس لئے کہ افواہیں افواہیں ہوتی ہیں' واقعات نہیں ہوتے ـ حالات بعض اوقات ایسے سنجیدہ ہوتے ہیں کہ ایک سرسری بات کے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے

ہیں ۔ کسی ایک شخص کے بارے میں' کسی گروہ یا جماعت کے بارے میں بعض ایسے نتائج رونما ہوتے ہیں کہ سرسری ریمارک پاس کرنے والا تصور بھی نہیں کر سکتا ۔ اگر یہ واقعات و نتائج بر آمد ہو جائیں تو پھر ان کا تدارک اور تلافی کسی صورت میں بھی نہیں کی جاسکتی اور یہ لوگ یہ باتیں اس لئے کرتے ہیں کہ اسلامی کیمپ کے افراد کے اندر پیدا ہونے والی اخوت اور بھائی چارے کا تصور ابھی تک ان کے ذہن میں واضح نہ تھا ۔ یہ لوگ اس بات کو اہمیت نہ دیتے تھے کہ آخر کار ایسی غیر ذمہ دارانہ گفتگوؤں کے کیا نتائج نکلنے والے ہیں اور ایسی باتوں کی اشاعت سے نقصان کیا ہوتا ہے کہ جب یہ باتیں ایک منہ سے دوسرے منہ میں چلتی رہتی ہیں' چاہے یہ باتیں امن کے حالات سے متعلق ہوں یا بے چینی اور خوف کے حالات سے متعلق ہوں ۔ دونوں حالات کے اندر بعض خبروں کا پھیل جانا نہایت ہی مہلک اور فساد انگیز ہوتا ہے ۔ مثلاً ایک چوکنے' تیار اور محتاط کیمپ کے اندر دشمن کی سرگرمیوں کو کم کر کے دکھانا غفلت کا باعث ہو سکتا ہے اور اس میں دشمن متحرک ہو سکتا ہے ۔ ایسے حالات میں امن کے بارے میں لوگوں کو مطمئن کر دینا لوگوں کو غافل اور سست بنا سکتا ہے اگرچہ متعلقہ ذمہ داران کی طرف سے بار بار احتیاط کی تنبیہ کی جاتی رہے ۔ اس لئے کہ اگر خطرہ سروں پر ہو تو ایک انسان کا دشمن کے مقابلے میں چوکنا ہو جانا' ایسی صورت حال سے بالکل مختلف ہوتا ہے کہ محض ذمہ داران کے احکام کی اساس پر احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں ۔ اس قسم کی سستی اور لاپرواہی بعض اوقات معاملے کا حتمی فیصلہ کر دیتی ہے ۔ اسی طرح اگر ایک کیمپ اپنی قوت پر مطمئن ہو اور اپنے اطمینان کی وجہ سے ثابت قدم ہو اس کے اندر خوف پھیلایا جائے' تو ایسے کیمپ میں خوفناک خبروں کی اشاعت سے بے چینی' افراتفری پیدا ہوتی ہے اور لوگ ایسی حرکات کرتے ہیں جن کی ضرورت نہیں ہوتی اور جن کی وجہ سے لوگوں میں خواہ مخواہ خوف و ہراس پیدا ہوتا ہے اور بعض اوقات ایسی چیزیں نہایت ہی برے نتائج پیدا کر دیتی ہیں ۔

بہرحال یہ ایک ایسے کیمپ کی خصوصیت ہے جس کا نظم و نسق ابھی تک مکمل نہیں ہوا یا اس کیمپ کے افراد کے اندر اپنی قیادت کے ساتھ وفاداری ابھی تک مکمل نہیں ہوئی' یا یہ دونوں کمزوریاں پائی جاتی ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اسلامی معاشرے میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی تھیں اس لئے کہ اس ابتدائی دور میں اسلامی معاشرے میں ایمان کے اعتبار سے مختلف سطح کے لوگ موجود تھے ۔ مختلف فہم و ادراک کے حامل لوگ موجود تھے اور محبت و وفاداری میں بھی یہ لوگ مختلف سطحوں اور درجوں کے تھے ۔ غرض اس قسم کی افراتفری اور بے چینی کو قرآن کریم اپنے خالص ربانی منہاج کے مطابق دور کر رہا تھا ۔

(وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ (۴ : ۸۳)) (اگر یہ اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کریں) ۔

یعنی اگر یہ لوگ امن اور خوف کی خبریں رسول اللہ ؐ کے گوش گزار کرتے' اس دور میں جب حضور موجود تھے' یا اہل ایمان میں سے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے' جبکہ حضور موجود نہ تھے' تو ان خبروں کی حقیقت یہ لوگ معلوم کر لیتے کیونکہ یہ ایسی چیزوں کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ان متضاد خبروں کے درمیان سے وہ حقیقت کو اخذ کر لیتے ہیں یا مختلف قسم کے حالات سے وہ بات سمجھ لیتے ہیں ۔

ایک مسلم سپاہی کا فریضہ یہ ہے کہ اگر وہ کوئی ایسی خبر سنے تو وہ اسے اپنے افسر تک پہنچا دے بشرطیکہ وہ بھی صحیح افسر ہو'

وہ اس خبر کو اپنے نبی تک پہنچائے اگر وہ موجود ہے اور اگر نبی کا دور ختم ہے تو اپنے اوپر تک پہنچائے - یہ رویہ درست نہ ہو گا کہ وہ یہ خبر صرف اپنے ساتھیوں کے اندر پھیلاتا پھرے یا ایسے لوگوں کے درمیان پھیلائے جن پر اسلامی جماعت کی ذمہ داری نہیں ہے اس لئے کہ اسلامی قیادت ہوتی ہی وہ ہے جو حقیقت کو سمجھ سکے - اور کسی خبر کے نشر کرنے کے صحیح موقع کو بھی سمجھے - یہاں تک کہ اگر ثابت بھی ہو جائے تو بھی بعض اوقات کسی خبر کا نشر کرنا مناسب نہیں ہوتا اور اس کا نشر نہ کرنا ہی اچھا ہوتا ہے -

یہ تھی قرآن کی تربیت' قرآن کریم مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کی پختگی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی قیادت کے ساتھ وفاداری بھی پیدا کر رہا تھا - قرآن نے صرف ایک آیت میں اسلامی فوجی نظام کے تمام اصول جمع کر دیئے بلکہ آیت کے بھی صرف ایک ٹکڑے میں - یہ آیت یہ سکھلاتی ہے کہ ایک فوجی مسلسل امن اور خطرے کی خبریں لیتا ہے اور اپنے افسران بالا تک پہنچاتا ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے - اس ایک آیت کی ابتداء میں ایک ایسے فوجی کی تصویر کشی کی گئی ہے جو خبریں لیتا ہے' امن کی بھی اور خوف کی بھی' اور وہ اسے مسلسل شائع کر رہا ہے بغیر سنجیدگی کے اور بغیر کسی تحقیق کے اور بغیر اس کے کہ اپنی قیادت کے سامنے پیش کر کے ہدایات لے لے - آیت کے وسطی حصے میں ایک فوجی کو یہ ہدایت دی جاتی ہے اور آخری حصے میں فوجیوں کے دلی تعلق کو اللہ سے جوڑ دیا جاتا ہے - اللہ کے فضل کا ذکر کیا جاتا ہے اور اسے آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کا شکر بجالائے - اسے شیطان کی اطاعت سے ڈرایا جاتا ہے' جو گھات میں بیٹھا ہوا ہے اور اگر اللہ کا فضل و کرم نہ ہو تو وہ فوراً دلوں کے اندر فساد پیدا کر دے -

(وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۴ : ۸۳)) (اگر تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے)-

یہ ایک آیت ہے اور اس کے اندر علم و معرفت کی وافر مقدار ثبت کر دی گئی ہے - اس قضیہ کے تمام پہلوؤں کا ذکر کر دیا گیا' یہ آیت ضمیر کے خفیہ ترین گوشوں تک اتر گئی اور دلوں کے اندر ہدایت اور علم بھر دیا گیا - یہ اس لئے کہ یہ کتاب اللہ کی جانب سے ہے - اور اگر یہ اللہ کی جانب سے نہ ہوتی - (لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا) (یہ لوگ اس میں بہت کچھ خلاف بیانیاں پاتے)-

---ooo---

جب بات یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو اسلامی صفوں کی کمزوریوں کی نشاندہی کر دی جاتی ہے' ایسی کمزوریاں جو اسلامی معاشرے کی زندگی پر اور عمل جہاد پر اثر انداز ہو سکتی ہیں یہ غلطیاں اور ان کی درستی کا کام اس سبق کے آغاز ہی سے چل رہا ہے - اب مسلمانوں کو جہاد و قتال پر ابھارا جاتا ہے جس کا ذکر اس سبق میں ہوتا رہا ہے - یہاں آکر حضور اکرم ؐ کو ذاتی طور پر قتال فی سبیل اللہ کا مکلف بنایا جاتا ہے - اب اس ذاتی ذمہ داری کے بعد کوئی شخص اس سے پیچھے نہیں رہ سکتا - نہ اسلامی جماعت میں پائے جانے والے کسی خلل اور نقص کی وجہ سے نہ راستے کی مشکلات کی وجہ سے - اس لئے کہ خطاب صرف ذات رسول ؐ کو ہے کہ آپ اٹھیں اور لڑیں اگرچہ اکیلے ہوں اس لئے کہ جہاد ہر شخص پر ذاتی طور پر فرض ہے - آپ بھی اپنی ذات کے ذمہ دار ہیں' ہاں اپنی ذات کے ساتھ آپ ؐ اہل ایمان کو بھی قتال پر ابھاریں - اللہ تعالیٰ

یہاں اہل ایمان اور آپ ؐ کو فتح و نصرت کی امید دلاتے ہیں اس لئے کہ یہ معرکہ خود اللہ کا معرکہ ہے اور اللہ تعالیٰ بہت ہی زبردست ہے۔

فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ ۚ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ ۖ عَسَى اللَّهُ أَن يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنكِيلًا ﴿٨٤﴾

"پس اے نبی ؐ تم اللہ کی راہ میں لڑو، تم اپنی ذات کے سوا کسی اور کے ذمہ دار نہیں ہو۔ البتہ اہل ایمان کو لڑنے کے لئے اکساؤ، بعید نہیں کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے، اللہ کا زور سب سے زیادہ زبردست اور اس کی سزا سب سے زیادہ سخت ہے۔"

اس آیت اور اس سے ماقبل کی آیت کے اندر ہمیں اس وقت کی موجود جماعت مسلمہ کے خدوخال اچھی طرح نظر آتے ہیں، جس طرح ہر دور میں پائے جانے والے انسانی نفوس کے خدوخال نظر آتے ہیں۔

(الف) ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت اسلامی صفوں کے اندر سخت بے چینی پائی جاتی تھی اور مکمل اتحاد نہ تھا۔ جنگ سے پہلوتہی، اس کی راہ میں رکاوٹیں اور جنگ سے پیچھے رہنے کی کمزوریاں ابھی تک اسلامی صفوں میں موجود تھیں۔ یہاں تک کہ لوگوں کو جہاد پر ابھارنے اور جوش دلانے کی خاطر یہاں نبی ؐ کی ذات مبارک کو حکم دیا گیا کہ آپ جہاد کریں اگرچہ آپ اکیلے ہوں۔ آپ خود اپنے نفس کے ذمہ دار ہیں۔ ہاں اس کے ساتھ ساتھ آپ مسلمانوں کو بھی ابھاریں لیکن آپ کی ذات کی طرف سے جہاد میں شرکت اس پر موقوف نہیں ہے کہ دوسرے لوگ اس کام کے لئے اٹھتے ہیں یا نہیں۔ اگرچہ عملاً یہ ممکن نہ تھا کہ اہل ایمان نبی ؐ کی پکار کو سب کے سب رد کر دیتے لیکن یہاں اس انداز میں کلام کرنے کا مقصد یہ تھا کہ فریضہ بنیادی طور پر آپ پر عائد ہوتا ہے، جس طرح اسلامی تصور حیات کا یہ ایک اساسی اصول ہے کہ ہر شخص اپنی ذات کا ذمہ دار ہے۔ کسی ایک کی ذمہ داری کسی دوسرے پر نہ ہوگی۔ ہاں دوسروں کو جنگ کے لئے ابھارنا اپنی جگہ پر ہے۔

(ب) اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مشرکین کے ساتھ جنگ چھیڑنے میں لوگ کس قدر خطرات محسوس کرتے تھے اور اس راہ میں کس قدر مشکلات تھیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خود مسلمانوں کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ وہ کافروں کا زور توڑ دے گا اور اس طرح مسلمان خود اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحفظ کے زیر سایہ ہوں گے۔ ساتھ ساتھ یہ یقین بھی دلایا جاتا ہے کہ اللہ زبردست قوت والا ہے اور جب وہ کسی کو سزا دیتا ہے تو اس کی سزا بہت ہی سخت ہوتی ہے۔ یہ الفاظ کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے گا، اس بات کا مظہر ہیں کہ اس وقت اہل کفر زور آور تھے۔

ان کی قوت کی وجہ سے اسلامی صفوں میں خوف محسوس کیا جاتا تھا اور یہ حالات احد اور خندق کے درمیانی دور سے تعلق رکھتے ہیں ـ احد سے لے کر خندق تک کا دور وہ دور ہے جس میں مدینہ طیبہ کے اندر مسلمان نہایت ہی مشکلات اور خطرات سے دوچار تھے ـ ان کے اندر منافقین گھسے ہوئے تھے ' ان کے اردگرد یہودی پھیلے ہوئے تھے اور ہروقت مشرکین کو فساد پر آمادہ کرتے رہتے تھے ـ اور اسلامی صفوں کے اندر اسلامی تصور حیات ابھی تک جاگزیں اور واضح نہ تھا ـ

(ج) اس سے ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جب انسان کو مشکلات میں قدم رکھنا ہوتا ہے تو اس کا سارا صرف ذات باری ہوتی ہے اور اللہ کا سایہ عاطفت ہی باعث اطمینان ہوتا ہے ـ اس وقت صرف اللہ کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور اللہ ہی پر بھروسہ کام دیتا ہے ـ جب خطرات اپنی آخری انتاؤں کو چھوتے ہیں اور تمام وسائل کام نہیں کرتے تو پھر ذات باری ہی کام دیتی ہے اور یہ تمام حقائق ایسے ہیں جن کو اسلامی نظام پیش نظر رکھتا ہے ـ اس لئے کہ نفس انسانی کا خالق اللہ ہے اور اللہ اپنے پیدا کردہ نفس انسانی کو اچھی طرح جانتا ہے کہ کس طرح اس کی تربیت کی جائے گی اور کس طرح اسے بچایا جائے گا اور کس طرح اسے جوش دلایا جائے گا ـ اور کس طرح وہ مشکلات کو انگیز کرنے کے لئے تیار ہو گا ـ

اس سبق کے آخر میں حضور ؐ کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ اہل ایمان کو جنگ پر ابھاریں ـ جنگ سے پہلوتہی کرنے والوں اور پیچھے رہنے والوں کا ذکر بھی ہوا تھا ـ اب یہاں ایک عام اصول بتا دیا جاتا ہے کہ ہر شخص نیکی اور بھلائی کے کام کے لئے سفارش کرے اور لوگوں کو نصیحت کرے ـ لوگوں کو بھلائی کی ہدایات دے ' نصیحت کرے اور بھلائی پر تعاون کی تلقین کرے ـ

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

"جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور جو برائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا ' اور اللہ ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے ـ" اب جو شخص لوگوں کو قتال پر ابھارتا ہے ' اس مقصد کے لئے حوصلہ افزائی کرتا ہے اور دعوت جہاد دیتا ہے ' اسے اس دعوت اور اس کے نتیجے میں ہونے والے کام کا پورا پورا اجر ملے گا ـ اور جو شخص پہلوتہی کرتا ہے اور پیچھے رہتا ہے اور اس کے اگر برے نتائج نکلتے ہیں تو یہ شخص بھی ذمہ دار ہے ـ "کفل" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیچھے رہنے والا نتائج بد کا ذمہ دار ہو گا ـ

اسی اصول کا اطلاق ہر اچھی سفارش پر ہو گا اور بری سفارش پر بھی یہی اصول منطبق ہو گا۔ اگرچہ یہ اصول خاص حالات کے اندر ذکر ہوا ہے لیکن یہ قرآن کریم کا انداز بیان ہے کہ وہ ایک مخصوص واقعہ کے ضمن میں ایک کلی قاعدہ بیان کر دیتا ہے اور اس جزئی واقعہ کو بھی اس قاعدہ کلیہ کے ایک جزو کے طور پر پیش کرتا ہے اور پھر تمام امور کو ذات باری سے مربوط کر دیتا ہے جو ہر چیز کا نگہبان اور رازق ہے۔ جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور لفظ (مقیت) میں یہ مفاہیم داخل ہیں۔

( وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا (٤ : ٨٥) (اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے) اچھے کاموں کی سفارش کے بعد یہ کہا جاتا ہے اگر کوئی تمہیں سلام کرے تو یا تو اس سلام جیسا جواب دو یا اس سے اچھا جواب دو۔ کسی بھی معاشرے میں سلام ایک ایسا فعل ہے جس سے زندگی کی گاڑی نہایت ہی سکون اور سہولت کے ساتھ چلتی ہے اگر آداب سلام کو اچھی طرح ملحوظ رکھا جائے۔ سلام اور اچھائی کی سفارش کے درمیان گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ اگر کسی معاشرے میں دو فرد ایک دوسرے کو سلام ہی نہیں کرتے تو وہ ایک دوسرے کو مزید کیا ہدایت دیں گے۔

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾

"اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمہیں سلام کرے تو اس سے بہتر طریقے سے جواب دو یا کم از کم اسی طرح لوٹا دو' اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔"

اسلام نے اپنا ایک خاص سلام اسلامی معاشرے کو دیا۔ جس سے ایک مسلمان اور مسلمان معاشرہ غیر مسلم اور غیر مسلم معاشروں سے ممتاز ہو گیا۔ یہ سلام ایک مسلمان کو بالکل منفرد اور متمیز بنا دیتا ہے' وہ اپنی روز مرہ کی زندگی میں ممتاز صفات کا مالک بن جاتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے دوسرے معاشروں میں مدغم اور گھل مل نہیں جاتا' نہ کان نمک میں نمک بن جاتا ہے۔

اسلام نے تین الفاظ دیئے ہیں۔ السلام علیکم' السلام علیکم و رحمۃ اللہ اور السلام علیکم و رحمۃ اللہ وبرکاتہ' اور جواب سلام یا تو ویسا ہو گا یا اس سے زیادہ ہو گا ماسوائے تیسرے لفظ کے۔ مثلاً السلام علیکم کا جواب یا تو وعلیکم السلام ہے یا اس سے بہتر وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ۔ دوسرے لفظ پر وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ وبرکاتہ ہو گا۔ اور تیسرے کا جواب ویسا ہی ہو گا۔ اس لئے کہ اس میں الفاظ پورے استعمال ہو گئے۔ اس لئے تیسرے کا جواب ویسا ہی ہو گا۔ حضور ؐ سے ایسی ہی روایت ہے۔

اس میں ایک تو وہ انفرادیت ہے' جو اسلامی معاشرے کا خاص رنگ ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ اس کے ماننے والوں کے خاص خدوخال ہوں' ان کی خاص عادات ہوں' جس طرح اسلام نے ایک مخصوص قانونی تنظیمی نظام دیا ہے۔ اس موضوع پر ہم تحویل قبلہ کے موقعے پر بات کر آئے ہیں کہ اسلام نے اس امت کو جس طرح ایک نظریہ حیات دیا ہے' اسی طرح اسے ایک مخصوص قبلہ بھی دیا ہے۔ (دیکھئے سورت بقرہ پارہ دوئم)

دوسری یہ کہ اسلام نے امت مسلمہ کے افراد کے اندر نہایت پختہ محبت اور بھائی چارہ پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ مثلاً سلام کا عام کرنا' اور سلام کا جواب سلام سے زیادہ اچھا ہو اور دوسرے تعلقات جن کی وجہ سے اسلامی سوسائٹی کے اندر نہایت ہی پختہ روابط اخوت و مودت پیدا ہوئے ۔ حضور ؐ سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل اچھا ہے ؟ تو آپ ؐ نے جواب دیا" یہ کہ تم کھانا کھلاؤ اور چاہے جاننے والا ہو یا نہ جاننے والا ہو' اسے سلام کرو۔" یہ تو حکم ہے کہ جماعت مسلمہ کے اندر سلام کرو' اور یہ سنت ہے' رہا سلام کا جواب تو وہ اس آیت کی رو سے فرض ہے ۔ اسلامی معاشرے میں سلام کرنے کی عادت کے اثرات کا اندازہ عملاً اس وقت ہوتا ہے جب سلام کے ذریعے غیر متعارف لوگ باہم متعارف ہو کر ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور جو لوگ ایک دوسرے کو علیک سلیک کرتے رہتے ہیں ان کے باہم روابط قائم ہو جاتے ہیں ۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جو ہر اس شخص پر ظاہر ہو جاتی ہے جو اس عادت کے آثار کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کے نتائج پر غور کرتا ہے ۔

تیسرے یہ کہ آیات قتال کے درمیان میں باہم دوستانہ تعلقات کے لئے یہ آیت باد نسیم ہے اور اس میں اسلام کے اصل الاصول کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ ملک کے اندر امن و امان قائم ہو' اس لئے کہ اسلام دین امن ہے ۔ اسلام کی جنگ بھی دراصل امن کے لئے ہے یعنی کرۂ ارض پر امن قائم کرنا ۔ اور یہ امن وسیع معنوں میں مطلوب ہے ۔ ایسا امن جو اسلامی نظام حیات پر مبنی ہو۔

---○○○---

# درس نمبر ۳ ایک نظر میں

اس سبق میں اسلامی تصور حیات کے ایک بنیادی اصول کا تذکرہ کیا گیا ہے یعنی عقیدۂ توحید اور اللہ تعالیٰ کو اس کی حاکیت میں وحدہ لاشریک سمجھنا۔ پھر اس اصول کے مطابق اسلامی سوسائٹی اور اسلامی معاشرے کے تعلقات دوسرے کیمپوں کے ساتھ متعین کئے گئے ہیں لیکن دوسرے معاشروں کے ساتھ اسلامی معاشرے کے تعلق کی نوعیت کے تعین سے بھی پہلے اس سبق میں خود مسلمانوں پر سخت تنقید کی گئی ہے کہ وہ منافقین کے بارے میں دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گروہ منافقین مدینہ میں رہنے والے منافقین سے کوئی علیحدہ گروہ تھا۔ یہ احکام اسلام کے اصل الاصول پر قائم ہیں اور یہ تنقید بھی اسی اصول کے مطابق ہے جس پر اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام قائم ہے۔ اس اصول کا ذکر ہر وقت ہوتا رہتا ہے جب بھی اسلامی نظام کوئی ہدایت دیتا ہے یا کوئی قانون سازی کی جاتی ہے۔

یہ احکام مختلف کیمپوں کے بارے میں ہیں اور یہ احکام ان اصول و قوانین کا حصہ ہیں جسے انسانی تاریخ میں سب سے پہلے اسلام نے متعارف کرایا۔ ان قوانین کا تعلق قانون 'بین الاقوام سے ہے۔ اسلام نے سب سے پہلے بین الاقوامی معاملات میں تلوار کے فیصلے سے ہٹ کر کچھ قواعد بنائے۔ قوت کی دلیل اور جنگل کے قانون پر مشتمل بین الاقوامی رولز میں اسلام نے سب سے پہلے مہذب ضابطے پیش کئے۔

یورپ کے اندر قانون بین الاقوام کا آغاز صرف سترہویں صدی عیسوی (مطابق گیارھویں صدی ہجری) میں ہوا لیکن یہ قانون ماسوائے کاغذ اور سیاہی کے اور کچھ حیثیت نہ رکھتا تھا اور جو بین الاقوامی ادارے تشکیل دیئے گئے تھے' وہ محض بین الاقوامی استعماری قوتوں کے خفیہ مقاصد کو قانونی مشکل دینے کے آلہ کار تھے۔ نیز یہ ادارے سرد جنگ کے لئے میدان کارزار تھے۔ ان کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ حق حقدار تک پہنچے۔ نہ یہ ادارے صحیح معنوں میں انصاف کرتے تھے۔ یہ ادارے وجود میں محض اس لئے لائے گئے تھے کہ اس دنیا میں بعض بڑے اور طاقت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ہم پلہ ممالک کے درمیان کچھ جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور جونہی ان ممالک کے مابین طاقت کا توازن ختم ہوا تو نہ ان بین الاقوامی قوانین کی کوئی حیثیت رہی اور نہ ہی ان بین الاقوامی اداروں کی کوئی قیمت رہی۔

جب اسلام آیا' جو انسانوں کے لئے رب ذوالجلال کا نظام زندگی ہے تو اس نے ساتویں صدی عیسوی میں بین الاقوامی معاملات کے اندر قانون سازی کی' یعنی پہلی صدی ہجری میں۔ یہ قانون اسلام نے از خود وضع کیا اور اس قانون کے بنانے کے لئے کسی ہم پلہ حکومت کی طرف سے کوئی دباؤ نہ تھا۔ یہ قانون اسلام نے از خود بنایا اور از خود اس پر عمل کیا تاکہ اسلامی معاشرہ اس کی بنیاد پر دوسرے کیمپوں کے ساتھ اپنے تعلقات قائم کرے' انسانیت کے لئے انصاف کے جھنڈے بلند کرے اور اس کے لئے نشانات راہ متعین کرے۔ اگرچہ اس دور کے جاہلی دشمن کیمپ مسلمانوں کے ساتھ ان اسلامی بین الاقوامی

قوانین کو سامنے رکھتے ہوئے معاملہ نہ کرتے تھے اس لئے کہ یہ اصول اور قوانین اسلام نے پہلی مرتبہ متعارف کرائے تھے ـ یہ بین القوامی قوانین قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کو یکجا کیا جائے تو بین الاقوامی قانون کا ایک مکمل ضابطہ سامنے آتا ہے ـ اس کے اندر ان تمام حالات کا حل موجود ہے جو کسی بھی وقت اسلامی مملکت اور دوسرے ممالک کو پیش آسکتے تھے ـ چاہے یہ ممالک بر سرجنگ اور محارب ہوں ' پرامن ہوں ' مخالف ہوں ' غیر جانبدار ہوں ' محارب کے حلیف ہوں ' پرامن معاہد کے حلیف یا مخالف اور غیر جانبدار کے حلیف ہوں ـ

یہاں ان اصولوں اور احکام کی تفصیلات کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے ـ اس قسم کی تفصیلی بحث تو بین الاقوامی قوانین کے ماہرین کا کام ہے ـ البتہ ان آیات کے اندر جو اصول آئے ہیں ہم ان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں ـ اس سبق میں درج ذیل لوگوں کے ساتھ معاملہ کیا گیا ہے ـ

(الف) وہ منافقین جو مدینہ میں مقیم نہ تھے ـ

(ب) وہ لوگ جو ایسی قوم سے متعلق ہیں 'جس کے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی میثاق ہے ـ

(ج) وہ غیر جانبدار لوگ جو مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑنا بھی پسند نہیں کرتے اور خود اپنی قوم کے ساتھ مل کر بھی لڑنا پسند نہیں کرتے لیکن وہ ہیں اپنے سابق دین پر ـ

(د) وہ لوگ جو اسلامی نظریہ حیات کے ساتھ کھیلتے ہیں ـ جب مدینہ آتے ہیں تو اپنے اسلام کا اظہار کرتے ہیں اور جب مکہ کو جاتے ہیں تو کفر کا اعلان کرتے ہیں ـ

(ہ) مسلمانوں کے اندر قتل خطا اور مختلف لوگوں یعنی مختلف شہریت کے مالک لوگوں کے مابین قتل عمد کے واقعات میں ضابطہ ـ ان تمام حالات میں ہمیں واضح احکام ملتے ہیں جو اپنے موضوع پر بالکل صریح ہیں ـ اور تمام حالات پر ان کا انطباق ہوتا ہے ـ اور یہ اصول بین الاقوامی معاملات کی ضابطہ بندی کا ایک حصہ ہیں اور ان کا حکم وہی ہے جو اس موضوع پر دوسرے احکام بین الاقوام کا ہے ـ

---ooo---

# درس نمبر ۷ ۳ تشریح آیات

# ۸۷ -- تا -- ۹۴

اس سبق کا آغاز اس اصول سے ہوتا ہے جس کے اوپر اسلامی نظام کی عمارت استوار ہے اور اس کے تمام پہلو اس اصول سے ماخوذ ہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾

"اللہ کے سوا کوئی اور حاکم نہیں ہے۔ وہ تم کو قیامت کے دن جمع کرے گا جس میں شک نہیں ہے اور اللہ سے بچی کس کی بات ہے۔" اسلامی نظام زندگی کا پہلا قدم عقیدۂ توحید ہے اور عقیدۂ توحید کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ وحدہ حاکم ہے۔ اس قدم سے آگے چاہے آپ نفس انسانی کی تربیت کے میدان میں جائیں یا اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے آگے بڑھیں یا اسلامی قانون وضع کریں، یا اسلامی انتظامیہ قائم کریں۔ قانون نظام کا تعلق اسلامی معاشرے کے داخلی امور سے ہو یا بین الاقوامی قانون سے ہو، جس کے مطابق اسلامی سوسائٹی دوسری سوسائٹیوں کے ساتھ برتاؤ کرتی ہے۔ چنانچہ زیر بحث آیت بعض داخلی اور بین الاقوامی قوانین کا افتتاحیہ ہے۔

نفس انسانی کی تربیت کا سفر اس عقیدے سے شروع ہوتا ہے کہ تمام بندوں کو ایک دن اللہ میدان حشر میں اپنے سامنے کھڑا کرے گا اور اس دنیا میں اس نے انسانوں کو جو اختیارات دیئے تھے ان کے صحیح استعمال کے سلسلے میں بازپرس کرے گا۔ وہاں اس بات کی پرسش بھی ہوگی کہ اللہ کی ہدایات اور اس کے قوانین پر تم نے کس حد تک عمل کیا اور دنیا میں اپنی زندگی کے چھوٹے بڑے معاملات کے اندر کس حد تک تم نے اسلامی ضوابط کی پابندی کی کیونکہ تمہیں بہرحال وہاں اسی آزمائش اور امتحان کے لئے تو بھیجا گیا تھا۔ آخرت میں صغیر و کبیر ہر معاملے کا حساب و کتاب ہو گا۔ حساب و کتاب اور جواب دہی کا یہی اخروی تصور ہے جو شریعت کے انتظامی اور قانونی ضابطوں پر عمل پیرا ہونے کا ضامن ہے اس لئے کہ ہر شخص کے ضمیر کے اندر ایک جیتا جاگتا چوکیدار بیٹھا ہوا ہوتا ہے اور اس وقت بھی نگران و نگہبان ہوتا ہے جب حکومت کے چوکیدار سو جاتے ہیں۔

اور یہ بات اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ( وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا ( ۴: ۸۷ ) ) (اور اللہ سے زیادہ سچی کس کی بات ہے ) اور یہ آپ کا وعدہ ہے جس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

---ooo---

مسلمانوں کے دلوں کو یہ احساس دینے کے بعد اب اصل بات شروع ہوتی ہے ۔ یہ احساس دلانا اسلامی منہاج تربیت کا ایک عام طریق کار ہے اور اس سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی کی پوری نظریاتی اور عملی عمارت اس عقیدے پر قائم ہے ۔ غرض یہ احساس دلانے کے بعد اب اس بات پر تعجب کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ مسلمان نفاق اور منافقین کے بارے میں یکسو نہیں ہیں ۔ وہ ان کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز اختیار نہیں کرتے حالانکہ حالات کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ فیصلہ کن اور دو ٹوک بات کی جائے ۔ یکسوئی تو اور بات ہے ' مسلمان ان کے بارے میں واضح طور پر دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں اور ہر ایک کی اپنی رائے ہے ۔ یہ اختلاف رائے مدینہ سے باہر بسنے والے بعض منافقین کے بارے میں پیدا ہو گیا تھا۔ جس کی تفصیلات آگے آ رہی ہیں ۔ استفہام انکاری کا صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان معاملات کے بارے میں فکری ہم آہنگی کیوں نہیں ہے ۔ اس سے اس بات کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ اسلام کی پالیسی یہ ہے کہ معاملات کے اندر فیصلہ کن اور دو ٹوک موقف اختیار کیا جائے اور منافقین کے ساتھ تعلق اور ان کی نسبت نقطہ نظر رکھنے میں یکسوئی اختیار کی جائے اور ان کے ظاہری امور کو دیکھ کر ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے بشرطیکہ کوئی منصوبہ طے شدہ ہو اور اس کے مطابق نرمی کی ضرورت ہو۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾

" پھر تم کو کیا ہوا کہ منافقوں کے بارے میں دو فریق ہو رہے ہیں ' اور اللہ نے تو ان کو ان کے اعمال کے سبب الٹ دیا ہے ' کیا تم ان لوگوں کو راہ پر لانا چاہتے ہو جن کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہے اور جس کو اللہ نے گمراہ کیا تم اس کے لئے کوئی راہ نہ

پاؤ گے' وہ تو چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کافر ہو جاؤ جس طرح وہ کافر ہوئے ہیں' اس طرح تم سب برابر ہو جاؤ- لہذا تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کرلیں - پھر اگر یہ اس شرط کو قبول نہ کریں تو ان کو پکڑو' مار ڈالو' جہاں بھی پاؤ اور ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ-" یہ لوگ کون تھے' ان کے بارے میں کئی روایات آتی ہیں جن میں سے دو روایتیں اہم ہیں-

امام احمد نے بہز' شعبہ' عدی ابن ثابت' عبداللہ ابن زید کی سند سے زید ابن ثابت ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اکرم ؐ احد کی طرف نکلے' کچھ لوگ جو آپ کے ساتھ نکلے تھے وہ واپس ہوگئے' ان کے بارے میں حضور ؐ کے ساتھی دو گروہوں میں بٹ گئے تھے- ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ ان لوگوں کو قتل کر دیا جانا چاہئے اور ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ قتل تو جائز نہیں ہے' اس لئے کہ وہ مومن ہیں- اس پر یہ آیت نازل ہوئی- (فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ ( ٤: ٨٨ )) اس پر حضور ؐ نے فرمایا: "یہ پاک ہے اور یہ ناپاک لوگوں کو اس طرح نکال پھینکے گا جس طرح بھٹی لوہے کے میل کو نکال دیتی ہے- (صحیحین نے اسے شعبہ سے روایت کیا ہے)-

عوفی نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ یہ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے اور مکہ میں مشرکین کی امداد بھی کرتے تھے- یہ لوگ مکہ سے اپنی کسی ضرورت کے لئے نکلے- وہ دل میں کہہ رہے تھے کہ اگر ہمیں حضرت محمد ؐ کے ساتھی مل گئے تو ہمیں ان کا کوئی ڈر نہ ہو گا' جب مسلمانوں کو اس بات کی اطلاع ہوئی کہ یہ لوگ سفر پر ہیں تو مسلمانوں کے ایک گروہ نے یہ کہا کہ نکلو اور ان بزدلوں کو قتل کر دو اس لئے کہ یہ لوگ ہمارے دشمن مشرکین کی امداد کرتے ہیں- لیکن مسلمانوں کے ایک دوسرے گروہ نے کہا: سبحان اللہ (یا جس طرح انہوں نے کہا) کیا تم ایسے گروہ کو قتل کرتے ہو کہ انہوں نے وہ الفاظ ادا کئے جو تم نے ادا کئے ہیں؟ محض اس لئے کہ انہوں نے ہجرت نہیں کی اور اپنے وطن کو نہیں چھوڑا ہم ان کی جان و مال کو حلال کرلیں- اس طرح اس مسئلے پر مسلمانوں کے دو فریق بن گئے- حضور ؐ موجود تھے- آپ نے دونوں میں سے کسی کی رائے کی تردید نہ کی- اس پر یہ آیت نازل ہوئی- (فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ ( ٤: ٨٨ )) (روایت ابن ابو حاتم) ابو سلمہ' عکرمہ' مجاہد اور ضحاک وغیرہ سے ایسی ہی روایات منقول ہیں-

اگرچہ سند اور روایت کے اعتبار سے پہلی روایت زیادہ قوی ہے' لیکن ہم دوسری روایت کے مضمون کو ترجیح دیتے ہیں اس لئے کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ منافقین مدینہ کے خلاف کسی وقت بھی قتال کا حکم صادر نہیں ہوا- رسول اللہ ؐ نے نہ ان کے ساتھ جنگ کی ہے اور نہ انہیں قتل فرمایا ہے- ان کے ساتھ معاملہ کرنے کا ایک دوسرا منصوبہ تھا- وہ منصوبہ یہ تھا کہ ان کی سرگرمیوں سے چشم پوشی کی جائے اور خود مدینہ کی اسلامی سوسائٹی کو یہ موقعہ دیا جائے کہ وہ ان کو الگ کر رکھ دے- حضور ؐ جو کچھ کر رہے تھے وہ یہ تھا کہ مدینہ کے اردگرد منافقین کے جو رابطے تھے انہیں کاٹ دیں- مثلاً یہودی جو ان منافقین کو ورغلاتے تھے اور ان کے حامی تھے ان کو مدینہ اور پھر پورے جزیرۃ العرب سے جلاوطن کر دیا جائے- رہی آیت زیر بحث تو اس میں تو حکم دیا جا رہا ہے کہ زیر بحث منافقین کو قید کیا جائے' جہاں ملیں انہیں قتل کر دیا جائے' لہذا یہ منافقین مدینہ کے اندر رہنے والے منافقین کے علاوہ کوئی اور گروہ ہو گا- یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان

کی پکڑ دھکڑ کا حکم ہجرت تک موقوف و مشروط ہے کیونکہ آیت میں ہے ۔

(فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (۴:۸۹)) (لہٰذا ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں' اگر وہ ہجرت سے منہ موڑیں تو ان کو پکڑو اور جہاں بھی ان کو پاؤ' قتل کرو) ۔ یہ تہدید ان لوگوں کے حق میں اس لئے آئی تاکہ وہ اس صورت حال سے نکل آئیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے حالات سے نکل آئے ہوں' اس لئے رسول اللہ ؐ نے ان کے بارے میں یہ حکم نافذ نہیں فرمایا تھا' لیکن (يُهَاجِرُوْا) کے لفظ سے یہ بات تو قطعاً" ثابت ہو جاتی ہے کہ زیر بحث منافقین اہل مدینہ سے نہ تھے ۔ مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ مدینہ کو ہجرت کر کے آجائیں ۔ یہ واقعہ لازماً فتح مکہ سے پہلے کا ہو گا اور ہجرت تھی بھی فتح مکہ سے پہلے کیونکہ ہجرت کی تعریف یہ ہے کہ دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کی جائے ۔ لوگ تحریک اسلامی سے آکر ملتے رہیں اور اسلامی نظام کے تحت آتے رہیں ۔ ورنہ ان کی زندگی یا تو کفر میں گزرے گی یا نفاق میں ۔ اسی سورت میں اس سبق کے بعد دوسرے سبق میں ایسے لوگوں پر سخت تنقید وارد ہے جو ابھی تک مکہ کے دارالکفر میں مقیم تھے بغیر کسی عذر یا ضعف کے اور تھے مسلمان ۔ اس وقت ان کے لئے مکہ دارالکفر اور دارالحرب تھا اگرچہ وہ ان کا اصلی وطن تھا اور وہ اس میں مقیم تھے ۔ یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر ہم دوسری روایت کو ترجیح دیتے ہیں اور یہ کہ منافقین کا گروہ زیر بحث مکہ میں مقیم تھا' یا مکہ کے اردگرد کسی آبادی میں تھا ۔ یہ لوگ اپنے منہ سے تو اسلام کا اقرار کرتے تھے اور اپنے عمل سے کافروں کی حمایت کرتے تھے ۔ غرض آیت زیر بحث کو ایک بار پھر پڑھئے :

(فَمَا لَكُمْ فِی الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا (۸۸) وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۸۹)(۴:۸۸-۸۹))

"پھر تم کو کیا ہوا کہ منافقوں کے بارے میں دو فریق ہو رہے ہو' اور اللہ نے تو ان کو ان کے اعمال کے سبب الٹ دیا ہے' کیا تم ان لوگوں کو راہ پر لانا چاہتے ہو جن کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہے اور جس کو اللہ نے گمراہ کیا تم اس کے لئے کوئی راہ نہ پاؤ گے' وہ تو چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کافر ہو جاؤ جس طرح وہ کافر ہوئے ہیں' اس طرح تم سب برابر ہو جاؤ ۔ لہٰذا تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر لیں ۔ پھر اگر یہ اس شرط کو قبول نہ کریں تو ان کو پکڑو' مار ڈالو' جہاں بھی پاؤ اور ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ ۔"

ان آیات میں اس بات پر سخت نکیر ہے کہ منافقین کے بارے میں اختلاف رائے واقعہ کیوں ہوا اور ان کے بارے میں یہ حیرت انگیز موقف ہر فریق نے کیوں اپنایا؟ اس لئے کہ اس موقف میں ایک فریق کی جانب سے بہت نرمی تھی اور اس بات کا اظہار ہو رہا تھا کہ ابھی مسلمانوں کا شعور اسلام کے بارے میں پختہ نہیں ہے ۔ان میں سے بعض لوگوں نے یہ کہا کہ تم ایسے لوگوں کو قتل کرتے ہو جنہوں نے وہی الفاظ ادا کئے ہیں جو تم نے ادا کئے ہیں اور محض اس لئے کہ انہوں نے اپنا وطن چھوڑ کر ہجرت نہیں کی؟ کیا یہی بات ان کی مال و جان کو مباح کرنے کے لئے کافی ہے؟ ان لوگوں کا تصور اسلام پختہ اس لئے نہ تھا کہ وہ صرف یہ بات پیش نظر رکھ رہے تھے کہ منافقین زیر بحث نے بھی اسی طرح کلمہ پڑھا ہے جس طرح ہم نے پڑھا ہے حالانکہ اس گروہ منافقین کے خلاف شواہد موجود تھے ۔ ایک تو ان کا اپنا قول کہ محمد کے ساتھی ہمیں کچھ بھی نہ کہیں گے' دوسرے یہ کہ اہل ایمان کے ایک گروہ نے بھی ان کے بارے میں یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے دشمنوں کی امداد کرتے ہیں ۔ ان شواہد کے باوجود ان لوگوں کا موقف ان منافقین کے بارے میں کمزور موقف تھا حالانکہ انہیں فیصلہ کن اور دو ٹوک موقف اختیار کرنا چاہئے تھا اس لئے کہ زبانی طور پر کلمہ شہادت پڑھنا اور عملاً کفار کی امداد کرنا منافقت کی بین دلیل تھی ۔ایسے لوگوں کے ساتھ کسی نرمی اور چشم پوشی کی ضرورت ہی نہ تھی ۔ یہ معمولی غلطی نہ تھی بلکہ اس سے تصور اسلام میں کمزوری کا اظہار ہو رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے اندر سخت تعجب کا اظہار کیا گیا اور سخت تنبیہ کی گئی ۔

رہے مدینہ کے منافقین تو ان کے بارے میں مسلمان فکری طور پر بالکل یکسو تھے کہ یہ منافق ہیں ۔ لیکن ان کے ساتھ چشم پوشی اس لئے اختیار کی گئی تھی کہ ایک خاص منصوبے کے تحت ایسا ہو رہا تھا' وہ یہ کہ ان کے ظاہری حالات پر ہی ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے اور ایک وقت تک انہیں مہلت دی جائے ۔

لیکن یہ ایک دوسری صورت حال تھی کہ اہل اسلام میں سے ایک گروہ ان کی طرف سے اس لئے مدافعت کر رہا تھا کہ انہوں نے بھی وہی کلمہ پڑھا ہے جو ہم نے پڑھا ہے اور زبان سے انہوں نے بھی شہادت دی ہے کہ اللہ ایک ہے اور محمد رسول اللہ ؐ ہیں حالانکہ یہ لوگ مسلمہ طور پر دشمنان اسلام کے امداد کنندہ تھے ۔ مسلمانوں کی اس فکری کمزوری کی وجہ سے اور ان کے درمیان اختلاف رائے کی وجہ سے (جبکہ منافقین کا نفاق بالکل واضح تھا) اس آیت میں شدید تنبیہ کی گئی ۔اور پھر تنبیہ کے بعد اس بات کی وضاحت بھی کر دی گئی کہ ۔ (وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا) (اللہ نے ان کو ان کے اعمال کی وجہ سے الٹ دیا ہے)۔ تم ان کے بارے میں جھگڑتے ہو اور اللہ نے ان کی بداعمالیوں اور ان کی بدنیتی کی وجہ سے انہیں ایسے حالات میں ڈال دیا ہے جن میں وہ الٹے نظر آ رہے ہیں ۔ اللہ کی جانب سے ان کے خلاف یہ گواہی ہے کہ وہ اپنی سوچ اور اپنے عمل کی وجہ سے ناقابل رشک صورت حال میں پڑے ہیں ۔

اس تنبیہ کے بعد ایک دوسری تنبیہ یہ کی گئی ۔ (اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ) (کیا تم ان لوگوں کو راہ پر لانا چاہتے ہو جن کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہے)۔یعنی مسلمانوں میں سے جو فریق ان کے ساتھ نرم رویہ اختیار کر رہا ہے اس کی منشا یہ تھی کہ انہیں راہ راست پر آجانے کا موقعہ دیا جائے تاکہ یہ منافقانہ رویہ اختیار کرنا چھوڑ دیں ۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے موقف کو نامناسب سمجھا اور منافقین کو ایسے حالات میں ان کے اعمال اور برے ارادوں کی وجہ سے ڈال دیا ہے لہٰذا ان کے ہدایت پانے کی امید فضول ہے ۔

( وَمَن يُضْلِلِ اللّٰهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا ) (جن کو اللہ نے گمراہ کیا تم ان کے لئے کوئی راہ نہ پاؤ گے )۔اور اللہ لوگوں کو گمراہ اس لئے کر دیتا ہے کہ وہ اپنی نیت وارادے سے گمراہی کی راہ اپناتے ہیں۔پھر وہ گمراہی کے لئے سعی کرتے ہیں اور اس راستے میں بہت ہی دور چلے جاتے ہیں۔اتنے دور کہ ان کے لئے راہ ہدایت بند ہو جاتی ہے کیونکہ انہوں نے الٹ راہ اختیار کی ہوتی ہے اور ہدایت کے لئے اللہ کی امداد کے وہ طالب ہی نہیں رہے اور انہوں نے نشانات راہ کو گم کر دیا۔

اب ایک قدم آگے چلئے! ان منافقین کے اصل موقف کا اظہار یوں ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ خود گمراہ ہو گئے ہیں اور اپنی نیت اور عمل کی وجہ سے وہ اس پوزیشن کے مستحق ہو گئے ہیں جس میں وہ پڑے ہیں بلکہ وہ تو خود اہل اسلام کے بارے میں یہ خواہش رکھتے ہیں کہ وہ بھی کفر ہی کا راستہ اختیار کر لیتے تو اچھا ہوتا۔( وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً ) (وہ تو چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کافر ہو جاؤ جس طرح وہ کافر ہوئے ہیں۔اس طرح تم سب برابر ہو جاؤ ) بے شک انہوں نے کفر کا راستہ اختیار کر لیا ہے 'اگرچہ انہوں نے بھی وہی کلمہ پڑھا ہے جو مسلمان پڑھتے ہیں اور انہوں نے دونوں باتوں کی شہادت دے دی ہے لیکن اس شہادت کو ان کا عمل جھٹلاتا ہے جس کے ذریعے یہ لوگ دشمنان اسلام کی امداد کرتے ہیں۔لیکن وہ اس حد پر بھی بس نہیں کرتے اس لئے کہ جو شخص کفر کو اپناتا ہے وہ کسی حد پر نہیں رکتا۔وہ اس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھتا جب تک اس پورے کرہ ارض پر سے اسلام اور مسلمان مٹ نہیں جاتے۔اس مذموم مقصد کو لئے وہ سعی مسلسل میں مصروف رہتا ہے۔وہ اس مقصد کے لئے جدوجہد کرتا ہے' سازشیں کرتا ہے تاکہ موجودہ اہل اسلام بھی لوٹ کر کافر ہو جائیں اور اس طرح تمام لوگ برابر ہو جائیں۔

زیر تبصرہ منافقین کے اس موقف کی یہ پہلی وضاحت ہے اور یہ وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ اس سے ان کے بارے میں اہل اسلام کی سوچ سے ہر قسم کی جھول دور ہو جاتی ہے۔یہ سوچ ان کے قول وعمل کی واضح شہادت پر قائم ہو جاتی ہے اور اب یہ سوچ تضاد سے خالی ہوتی ہے۔زبانی اظہار اسلام کی حقیقت کچھ نہیں رہتی جب تمام قرائن یہ بتاتے ہوں کہ ان لوگوں کا موقف منافقانہ ہے۔

قرآن کریم مسلمانوں کے شعور کو ایک چٹکی بھرتا ہے 'جس سے ان کے شعور میں ایک خوفناک احساس ابھرتا ہے اور یہ احساس قرآن کے ان الفاظ سے ابھرتا ہے' ( وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً ) (وہ تو چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کافر ہو جاؤ جس طرح وہ کافر ہوئے ہیں' اسی طرح تم سب برابر ہو جاؤ )۔یہ خوف اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اہل اسلام نے حال ہی میں کفر کو ترک کر کے اسلام کا مزہ چکھا تھا' اور ابھی تک انہیں اس بات کا شعور تھا کہ ان کی زندگی میں کس قدر عظیم تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ان کا شعور کس قدر بلند ہوا' ان کی عام سطح کس قدر بلند ہوئی اور جاہلیت کے مقابلے میں ان کی سوسائٹی کو اسلام میں کس قدر سربلندی نصیب ہوئی۔یہ فرق وامتیاز' ان کے شعور میں بھی تھا اور حقیقت واقعہ میں بھی 'اور یہ اشارہ ہی کافی تھا کہ وہ اس شخص کے دشمن بن جائیں جو انہیں دوبارہ ان سابقہ پستیوں کی طرف لے جانے کی تدابیر کر رہا تھا۔یعنی اس جاہلیت کی پستیوں کی طرف جس سے انہیں اسلام نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تھا۔پھر انہیں ایک عام سطح پر ہی نہ چھوڑ دیا تھا بلکہ انہیں عمومی ترقی کے ذریعے بلند ترین چوٹی پر پہنچا دیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنی نظام تربیت اس حقیقت کا سہارا لے کر خطرناک حالات کے مقابلے میں اور آگے بڑھنے کے

حالات میں مسلمانوں کو دشمن سے اس طرح خبردار کر کے سخت تاکیدی احکام دیتا ہے۔

(فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۴: ۸۹))

(لہٰذا تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ' یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر لیں پھر اگر یہ شرط قبول نہ کریں تو ان کو پکڑو' مار ڈالو' جہاں بھی پاؤ اور ان میں سے کسی کو دوست و مددگار نہ بناؤ۔)

اللہ تعالیٰ نے یہاں جو یہ کہا کہ ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ' تو اس سے محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان خاندانی' قبائلی روابط اور تعلقات باقی تھے' اور مسلمانوں کے دلوں میں ان روابط کی وقعت تھی اور ہو سکتا ہے کہ یہ روابط ابھی تک بعض اقتصادی مفادات کی خاطر بھی ہوں۔ اسلام کا یہ طریقہ تربیت جاہلیت کے تمام رہے سہے آثار و روابط کو بھی پوری طرح جڑ سے اکھاڑ کر پھینک رہا تھا۔ اور جس طرح قرآن کریم تطہیر افکار کر رہا تھا' اسی طرح امت مسلمہ کے لئے بین الاقوامی روابط کے اصول بھی طے کر رہا تھا۔

قرآن کریم امت کو بتا رہا تھا کہ کوئی امت کبھی بھی صرف خاندانی اور قبائلی روابط پر وجود میں نہیں آسکتی اور نہ خون اور رشتے کے روابط' ایک ہی ملک اور علاقے میں رہائش کے روابط' تجارتی اور دوسرے اقتصادی مفادات کے روابط کی اساس پر کوئی امت وجود میں آسکتی ہے۔ امت ہمیشہ ایک مخصوص نظریہ حیات اور اس نظریہ حیات کی اساس پر اٹھنے والی سوسائٹی اور اجتماعی نظام کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دارالاسلام کے باشندوں اور دارالحرب کے باشندوں کے درمیان دوستی اور ولایت کے تعلقات قائم نہیں رہ سکتے۔ اس وقت دارالحرب مکہ تھا جو مہاجرین کا وطن اصلی تھا اس لئے مکہ کے لوگوں' حتیٰ کہ زبانی طور پر اسلام کا اقرار کرنے والوں اور مدینہ کے مسلمانوں کے درمیان بھی دوستی اس وقت تک نہ ہو سکتی تھی جب تک وہ ہجرت نہ کرتے جو صرف اللہ کے لئے اور اللہ کی راہ میں ہو اور اس کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لئے نہ ہو' یعنی صرف ایسے معاشرے کے قیام کے لئے ہو جو اسلامی نظام حیات کے مطابق زندگی گزار رہا ہو اور اس کے سوا کوئی غرض نہ ہو۔ نہایت ہی پاک' نہایت ہی فیصلہ کن اور نہایت ہی متعین مقصد کے ساتھ' جس میں کوئی ملاوٹ نہ ہو' کوئی خلط ملط نہ ہو' اسلامی نظام حیات کے سوا کوئی ہدف نہ ہو اور نہ کوئی اور مصلحت ہو۔

اگر یہ زبانی طور پر کلمہ اسلام پڑھنے والے یہ شرط پوری کر دیں' اپنے لال و عیال کو چھوڑ دیں' اپنے ملک اور مصلحتوں کو خیرباد کہہ دیں اور دارالاسلام کی طرف ہجرت کر آئیں تاکہ یہاں وہ اسلامی نظام کے تحت زندگی بسر کریں' جو اسلامی نظریہ حیات پر مبنی ہے' جس کے اندر اسلامی شریعت جاری ہے تو پھر وہ اسلامی معاشرے کے ممبر بن جائیں گے۔ وہ امت مسلمہ کے ہم وطن ہوں گے۔ اگر وہ یہ شرط تسلیم نہ کریں' ہجرت کا انکار کر دیں تو پھر انہوں نے زبانی طور پر جو کلمہ پڑھا ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اگر وہ یہ شرط قبول نہ کریں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ (فَخُذُوْهُمْ) انہیں پکڑ کر قید کر دو اور جہاں بھی تمہیں ملیں انہیں۔ (وَاقْتُلُوْهُمْ) قتل کر دو اور ان میں سے کسی کو نہ دوست بناؤ اور نہ مددگار۔

اللہ تعالٰی نے ان لوگوں کے بارے میں یہ دو احکام جو دیئے ہیں' یہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ لوگ مدینہ کے منافقین نہ تھے' اس لئے کہ مدینہ کے منافقین کے ساتھ اسلامی انقلاب نے بالکل مختلف پالیسی اختیار کی تھی۔

اسلام کی یہ پالیسی ہے کہ وہ اسلام کے مخالف عقائد رکھنے والے لوگوں کے ساتھ نہایت ہی فیاضانہ پالیسی اختیار کرتا ہے۔ اسلام مخالف اسلام لوگوں کو ہرگز اس امر پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ اسلامی نظریہ حیات کو قبول کرلیں بلکہ اسلام مخالف اسلام مذاہب کے پیروکاروں کو یہ اجازت بھی دیتا ہے کہ وہ اپنے عقائد کا اظہار کریں' اسلام کے بارے میں اپنے مخالفانہ نظریات کا بھی اظہار کریں اور خود دارالاسلام میں ایسا کریں۔ہاں ان کو یہ اجازت نہ ہوگی کہ وہ مسلمانوں کے اندر اپنے نظریات پھیلائیں یا اسلام کو برا بھلا کہیں۔ اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ مسلمان اہل کتاب کو برا بھلا نہ کہیں۔ لہذا یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے کہ اسلام خود دارالاسلام کے اندر موجود اقلیتوں کو یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ خود اسلام کے بارے میں لعن طعن کریں۔اگرچہ ہمارے دور کے بعض لوگوں نے اس قدر توسع اور ڈھیل سے کام لیا ہے کہ وہ مخالف اسلام لوگوں کو دارالاسلام میں اسلام پر لعن طعن کرنے کی اجازت دینا چاہتے ہیں۔بہرحال اسلام کی یہ بھی بڑی فیاضی ہے کہ وہ انہیں اسلامی نظریہ حیات قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا اور دارالاسلام میں ان کو جان و مال اور آبرو کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔انہیں اس بات کی بھی اجازت دیتا ہے کہ عمومی نظام (Civil code) کے علاوہ اپنے مخصوص معاملات میں اپنی شریعت کے مطابق فیصلے بھی کریں۔

اسلام اپنے مخالفین کو کھلے بندوں اپنے نظریات پر قائم رہنے کی اجازت دیتا ہے'لیکن اسلام یہ رعایت منافقین کو نہیں دیتا جو زبانی طور پر تو اظہار اسلام کرتے ہیں لیکن ان کا عمل اسلام کے مخالف ہوتا ہے۔وہ ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی نرمی نہیں برتتا جو اللہ کی توحید کے قائل تو ہیں' اور کلمہ شہادت پڑھتے ہیں'لیکن اس کے بعد اللہ کی خاص صفت'صفت حاکمیت میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتے ہیں' مثلاً عوام کو حق قانون سازی دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے احبار و رہبان اور حضرت مسیح کو اللہ کے سوا رب بنایا ہے اس لئے نہیں کہ وہ ان لوگوں کی عبادت کرتے ہیں بلکہ اس لئے کہ انہوں نے ان کو حلال و حرام مقرر کرنے کے اختیارات دے رکھے ہیں اور یہ اہل کتاب اس معاملے میں ان کی مکمل اطاعت کرتے ہیں۔

نیز اسلام منافقین کے اس گروہ کے ساتھ بھی رواداری نہیں برتتا جو یہ شہادت دیتے ہیں کہ اللہ ایک ہے'حضرت محمد ؐ اللہ کے رسول ہیں اور اس کے بعد وہ دارالکفر اور دارالحرب میں مقیم ہیں اور مسلمانوں کے دشمنوں کی امداد بھی کرتے ہیں۔یہ بات رواداری نہ ہوگی بلکہ یہ بدکرداری ہوگی۔ اسلامی نظریہ حیات رواداری کا نظریہ ہے لیکن وہ بدکرداری اور عدم حمیت کا نظریہ نہیں ہے۔یہ ایک سنجیدہ تصور حیات اور ایک سنجیدہ نظام حیات ہے اور سنجیدگی اور حقیقت پسندی اور رواداری میں کوئی تضاد نہیں ہے۔البتہ حقیقت پسندی اور بدکرداری کے درمیان تضاد ضرور ہے۔یہ نکتے پہلی تحریک اسلامی کے لئے بھی قابل توجہ اور قابل غور تھے اور آج بھی ان میں تحریک اسلامی کے لئے اہم پیغام ہے۔

---ooo---

إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ أَوْ جَاءُوكُمْ
حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَن يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ
لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوكُمْ ۚ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا
إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ﴿٩٠﴾

(اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے۔ لہذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لئے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے)۔
ایسے لوگوں کو قید کرنے اور انہیں قتل کرنے کے حکم میں ایک استثنائی صورت بھی ہے۔ اگر یہ منافقین جو دشمنان اسلام کی معاونت کرتے ہیں اگر کسی ایسی مملکت یا ایسی سرزمین کے اندر رہائش پذیر ہیں جن کا اسلامی تحریک یا اسلامی حکومت کے ساتھ عہد و پیمان ہو چکا ہے' چاہے یہ عہد معاہدۂ امن ہو یا معاہدۂ تخالف ہو' تو اس صورت میں ان کے ساتھ وہی معاملہ ہو گا جو ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن سے عہد طے پا چکا ہے۔

(اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ) (البتہ وہ منافق اس سے مستثنٰی ہیں جو کسی ایسی قوم سے جا ملیں جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے)۔ اس حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر امن کے مواقع ہوں اور کوئی معاہدۂ امن اسلام کے اساسی نظریات کے ساتھ متعارض نہ ہو' اس کی وجہ سے اسلام کو قبول کرنے کی آزادی اور اسلام کی تبلیغ کی آزادی سلب نہ ہو رہی ہو اور دعوت اسلامی کی راہ میں بذریعہ قوت رکاوٹیں کھڑی نہ کی جاتی ہوں' اور اس کے ساتھ مسلمانوں کو امن نصیب ہو رہا ہو اور وہ فتنوں اور مشکلات سے بچ رہے ہوں اور دعوت اسلامی کو جمود کا خطرہ بھی نہ ہو تو ایسی صورتوں میں اسلام معاہدۂ امن کر سکتا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ جو دشمن بھی کسی ایسی قوم کے ساتھ مل جائے جس کے ساتھ معاہدۂ امن ہے یا معاہدہ دوستی ہے تو ایسی صورت میں ان معاہدات کا اطلاق اس شخص پر بھی ہو گا۔ ان کے ساتھ ویسا ہی معاملہ ہو گا اور وہ لوگ ویسے ہی امن میں رہیں گے۔ ایسے احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر امن اور سلامتی اور صلح کی روح نہایت ہی واضح ہے۔
اسی طرح قیدی بنائے جانے اور قتل کر دیئے جانے کے حکم سے وہ منافق لوگ بھی مستثنٰی ہیں جن کا تعلق ایسے لوگوں' ایسے قبائل اور ایسے گروہ کے ساتھ ہے جو اسلامی مملکت کے بارے میں غیر جانبدار ہیں۔ وہ نہ مسلمانوں کا ساتھ دیتے ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کے ساتھ محاربے کے وقت اپنی اقوام کی امداد کرتے ہیں یعنی یہ لوگ اپنی قوم کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑنا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ دونوں فریقوں کے ساتھ بھی نہیں ملتے۔ نہ ان کے ساتھ اور نہ ان کے ساتھ۔

(اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ) (اسی طرح وہ منافق بھی مستثنیٰ ہیں جو تمہارے پاس آتے ہیں اور لڑائی سے دل برداشتہ ہیں نہ تم سے لڑنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم سے)۔

اس حکم سے بھی اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اسلام ہر صورت میں قتل و مقاتلے سے اجتناب چاہتا ہے بشرطیکہ دوسرے لوگ لڑنا نہ چاہیں' دعوت اسلامی کے راستے میں روڑے نہ اٹکائیں اور تحریک اسلامی اور اس کے مخالفین کے درمیان غیر جانبدار ہو جائیں ۔ایسے لوگ جو نہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑنا چاہتے تھے اور نہ ہی اپنی قوم کے ساتھ مل کر لڑنا چاہتے تھے 'جزیرۃ العرب میں اس وقت موجود تھے بلکہ خود قریش کے اندر بھی موجود تھے۔ایسے لوگوں پر اسلام نے یہ پابندی عائد نہیں کی کہ وہ اسلامی کیمپ کے ساتھ مل کر لڑیں یا مخالف کیمپ کے ساتھ مل کر لڑیں۔اسلام کے لئے یہ بات بھی کافی تھی کہ وہ اسلام کے خلاف جنگ نہ کریں۔(فتح مکہ کے بعد جب سورہ توبہ نازل ہوئی تو عملی تجربے نے یہ ثابت کر دیا کہ مرکز اسلام جزیرۃ العرب میں اسلام کے مقابلے میں کسی دوسرے دین کا موجود رہنا درست نہیں ہے۔اس لئے ان احکام کے اندر معمولی تبدیلی کی گئی تھی) نیز یہ توقع تھی کہ اگر مشکلات دور ہو جائیں تو یہ لوگ اسلامی کیمپ میں آ جائیں گے جیسا کہ بعد میں عملاً ایسا ہی ہوا۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھاتے ہیں کہ ان غیر جانبدار لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ تمہارے لئے بہت ہی مفید ہے۔اگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے تو وہ فرض کر لیں کہ اس سے بہتر دوسری صورت کیا ہو سکتی ہے۔ظاہر ہے کہ دوسری صورت یہی ہو سکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ برسرپیکار دشمنوں کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے 'مسلمانوں کے خلاف عملاً جنگ شروع کر دیں' جو کسی صورت میں بھی مسلمانوں کے لئے بہتر نہیں ہے 'تو ایسے لوگوں کو اللہ نے جو غیر جانبدار بنا دیا ہے تو یہ تمہارے مفاد میں ہے لہٰذا وہ جس حال میں ہیں انہیں ان کے حال پر چھوڑنا ہی بہتر ہے۔

(اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا (۹۰)

(اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے۔لہٰذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لئے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے)۔

اس طرح قرآن مجید کا حکیمانہ منہاج تربیت پرجوش مسلمانوں کو بڑی حکمت سے ایسے منافقین کے بارے میں غیر جانبداری اختیار کرنے پر مائل کر دیتا ہے حالانکہ وہ اس موقف کو بسہولت قبول نہ کر سکتے تھے۔لیکن اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھاتے ہیں کہ اس میں تمہاری بہتری ہے۔یہ اللہ کا تم پر فضل ہے کہ کچھ لوگ تمہارے بارے میں غیر جانبدار ہو گئے ہیں۔ اگر وہ غیر جانبدار نہ ہوتے تو مسلمانوں پر عائد ہونے والی جنگی ذمہ داریوں میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا۔اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو بتاتے ہیں کہ اگر تمہیں کسی جانب سے کوئی خیر آتی ہے تو اس کو مسترد نہ کریں اور اگر کوئی شر تم سے پہلوتہی کر کے گزرتا ہے تو

خواہ مخواہ اسے نہ چھیڑیں۔ ان لوگوں کی غیر جانبداری کا کوئی اثر تمہارے دین پر نہیں پڑتا۔ تمہارے نظریہ حیات کے اندر اس کے ذریعے کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوتی' اور نہ ہی تم کوئی بھاری قیمت دے کر امن حاصل کرتے ہو۔

بے شک اللہ نے مسلمانوں کو بھاری قیمت ادا کر کے امن کے حصول سے منع فرمایا ہے اس لئے کہ مقاصد اسلام میں سے کوئی مقصد ترک کر کے امن خریدنے کی اجازت ہرگز نہیں ہے۔ اسلام جو امن چاہتا ہے وہ ایسا امن ہے جس سے دعوت اسلامی کے حقوق میں سے کوئی حق ضائع نہ ہو' نہ مسلمانوں کے حقوق میں سے کوئی حق ضائع ہو' (مسلمانوں کے ذاتی اور شخصی حق نہیں) بلکہ مسلمانوں کے وہ حقوق جن کا تعلق ان کے منہاج حیات سے ہے اور جس کی وجہ سے وہ مسلمان کہلاتے ہیں۔

اسلام کا حق یہ ہے کہ اس کے راستے سے تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے' جو دعوت و تبلیغ کی راہ میں حائل ہیں' کیونکہ دعوت و تبلیغ کی راہ میں اسلام اس کرۂ ارض پر کسی بھی جگہ میں کوئی رکاوٹ برداشت نہیں کرتا۔ اسلام اس بات کا بھی قائل ہے کہ دنیا میں اسلام کی پشت پر ایسی سیاسی قوت موجود ہو جس سے وہ تمام قوتیں خائف ہوں جو دعوت اسلامی کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہیں' چاہے وہ اس کے لئے جو صورت بھی اختیار کریں' یا جو اسلام کو قبول کرنے والوں کو کسی نہ کسی طرح نقصان پہنچاتی ہیں۔ اگر ایسی باتیں نہ ہوں تو پھر امن و سلامتی اسلام کی متاع گم گشتہ ہے۔ لیکن حضور ؐ کا یہ فرمان بھی ہمارے پیش نظر رہے کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔

---ooo---

اب ایک دوسرا گروہ سامنے آتا ہے اور اس کے ساتھ اسلام اس قسم کی رواداری کا رویہ اختیار نہیں کرتا جو مکمل طور پر غیر جانبدار لوگوں کے ساتھ اختیار کرتا ہے' اس لئے کہ یہ اصل منافقین کا گروہ ہے اور نفاق کے ساتھ ساتھ شریر بھی ہے۔ اور یہ فریق نہ کسی ایسی قوم سے ملا ہوا ہے جس کے ساتھ مسلمانوں کا عہد ہے اور نہ کسی حلیف قبیلے کے ساتھ ملحق ہے۔ اس گروہ کے بارے میں اسلامی مملکت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہی سلوک ہو گا جو اصل منافقین کے ساتھ ہو گا۔

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَ يَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَ يُلْقُوْۤا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَ يَكُفُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَ اُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝۹۱

(ایک اور قسم کے منافق تمہیں ایسے ملیں گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی' مگر جب

کبھی فتنہ کا موقعہ پائیں گے اس میں کود پڑیں گے۔ایسے لوگ اگر تمہارے مقابلے سے باز نہ رہیں اور صلح و سلامتی تمہارے آگے پیش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو جہاں وہ ملیں انہیں پکڑو اور مارو' ان پر ہاتھ اٹھانے کے لئے ہم نے تمہیں کھلی حجت دے دی ہے)

ابن جریر نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ یہ آیت اہل مکہ میں سے ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے' یہ لوگ حضور اکرم ؐ کے پاس آتے تھے اور ریاکاری کے طور پر مسلمان ہو جاتے تھے اور پھر قریش کے پاس واپس ہوتے تو الٹے پاؤں پھر کر دوبارہ بتوں کی پوجا شروع کر دیتے تھے۔ان کا مقصد اس پالیسی کے اختیار کرنے سے یہ تھا کہ ادھر بھی امن سے رہیں اور ادھر بھی امن سے رہیں۔تو اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے بارے میں یہ حکم دیا کہ اگر وہ اپنی یہ پالیسی چھوڑ کر اصلاح پذیر نہیں ہوتے تو انہیں قتل کر دیا جائے۔اس طرح اللہ کا یہ فرمان کہ اگر وہ تمہارے مقابلے سے باز نہ آئیں اور تمہارے سامنے مکمل صلح و سلامتی پیش نہ کریں اور تمہارے ساتھ جنگ سے ہاتھ نہ روکیں تو تمہیں اختیار ہے کہ تم انہیں پکڑ کر قید کر دو' اور جہاں بھی تمہیں ملیں وہاں پر انہیں قتل کر دو' اس لئے کہ ان پر حجت تمام ہو گئی ہے۔

یہ اسلام کا ایک حقیقت پسندانہ اور دو ٹوک پہلو ہے' جبکہ اس سے قبل کی دفعہ میں رواداری اور چشم پوشی سے کام لینے کی تلقین کی گئی تھی۔ ہر پالیسی اپنی جگہ پر مناسب اور ضروری تھی۔واقعات اور حالات کے تقاضوں کے مطابق مختلف موقف اور پالیسیاں اختیار کی گئیں۔

اس انداز میں اسلام کی بین الاقوامی پالیسی کے ان دو صفحات کے مطالعے سے ایک مسلم کے شعور میں بہت ہی اچھی طرح توازن پیدا ہوتا ہے۔نیز اس سے اسلامی نظام زندگی کے اندر بھی توازن پیدا ہوتا ہے اور یہ توازن اور ہم آہنگی اسلامی نظام زندگی کی اساسی اور امتیازی صفت ہے۔لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں ایک طرف سخت متشدد اور پر جوش لوگ ہیں جو ہر وقت مرو اور مارو کے لئے تیار رہتے ہیں حالانکہ یہ اسلام کی پالیسی نہیں ہے۔دوسری جانب نہایت ہی کمزور کردار کے پگھلنے والے لوگ ہیں جو سرے سے اسلام میں جہاد ہی کے قائل نہیں۔یہ لوگ اسلام کے بارے میں اس انداز سے بات کرتے ہیں گویا اسلام ایک ملزم ہے جو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہے اور یہ لوگ اس خطرناک ملزم کا مقدمہ لڑ رہے ہیں۔یہ لوگ اسلام میں صرف رواداری' امن' چشم پوشی اور عفو و درگزر ہی پاتے ہیں اگر اسلام میں کوئی جنگ ہوئی ہے تو یہ لوگ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ جنگ اسلامی حکومت اور اسلامی تحریک کے لئے ایک دفاعی جنگ تھی اور یہ اس مقصد کے لئے نہ تھی کہ دعوت اسلامی کی راہ سے رکاوٹیں دور ہوں اور اس کی تبلیغ دنیا کے چپے چپے پر بلا روک ٹوک کی جا سکے۔ان لوگوں کے نزدیک یہ مقصد بھی نہ تھا کہ اس کرۂ ارض کے کونے کونے پر وہ تمام لوگ پر امن زندگی بسر کریں' جنہوں نے اسلامی نظریہ حیات کو قبول کر لیا ہے۔نیز ان لوگوں کے نزدیک اس پالیسی کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ دنیا کے اندر ایک ایسا نظام مملکت ہو اور ایک ایسا قانونی اور دستوری نظام ہو جس کے تحت لوگ مکمل نظریاتی آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں' جو عقیدہ چاہیں اختیار کر سکیں' حالانکہ ایسے لوگوں کی سوچ ہرگز اسلامی سوچ نہیں ہے اور نہ یہ اسلام کی حقیقی پالیسی ہے....

اسلام نے جو درج بالا بین الاقوامی اصول دیئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی حقیقی پالیسی کیا ہے؟

---ooo---

یہ تو تھے مسلمانوں کے تعلقات دوسرے بین الاقوامی ممالک اور کیمپوں کے ساتھ۔رہے مسلمانوں کے باہم تعلقات

امت مسلمہ کے اندر' تو اگرچہ وہ بالکل مختلف ممالک کے باشندے ہوں اور اس وقت صورت حال ایسی تھی کہ مسلمان مختلف ممالک میں رہتے تھے 'جس طرح آج وہ مختلف ممالک میں رہتے ہیں 'تو ان کے درمیان قتل و مقاتلہ قطعاً" حرام ہے۔ کسی مسلمان کو صرف حد یا قصاص ہی میں قتل کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ دنیا میں ایسی کوئی چیز یا سبب نہیں ہے جو مسلمانوں کے عقیدے اور نظریے سے زیادہ اہم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مسلمان کو کسی صورت میں یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ دوسرے مسلم کو ناحق کو قتل کرے اس لئے کہ ان کے درمیان نظریہ حیات اور عقیدے کے اتحاد کا زبردست تعلق پایا جاتا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مسلم کے ہاتھوں دوسرے مسلمان کا قتل خطا کے طور پر ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں قتل خطا کے بارے میں قانون سازی کو ضروری سمجھا گیا۔ رہا قتل عمد تو اس کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسلام مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کے ناحق قتل کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ فعل حدود اسلام سے باہر کا فعل ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ
مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ
يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ
مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَھُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ
اِلٰٓى اَھْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ
مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِــيْمًا حَكِــيْمًا ﴿٩٢﴾ وَمَنْ يَّقْتُلْ
مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْھَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ
لَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿٩٣﴾

(کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسرے مومن کو قتل کرے' الا یہ کہ اس سے چوک ہو جائے۔ اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کر دے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے' الا یہ کہ وہ خون بہا معاف کر دیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم سے تھا جس سے تمہاری دشمنی ہو تو اس کا کفارہ ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے اور اگر وہ کسی ایسی غیر مسلم قوم کا فرد تھا جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس کے

وارثوں کو خون بہا دیا جائے گا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہو گا۔ پھر جو غلام نہ پائے وہ پے در پے دو مہینے روزے رکھے ۔ یہ اس گناہ پر اللہ سے توبہ کرنے کا طریقہ ہے اور اللہ علیم و دانا ہے ۔ رہا وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لئے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے )۔

ان احکام کا تعلق چار قسم کے حالات سے ہے ۔ تین کا تعلق جرم قتل خطا سے ہے ۔ یہ قتل دار الاسلام کے اندر بھی وقوع پذیر ہو سکتا ہے اور بین الاقوامی طور پر بھی ایسے افراد کے درمیان ہو سکتا ہے جو مختلف ممالک کے شہری ہوں ۔ چوتھی حالت کا تعلق قتل عمد بین المسلمین سے ہے جسے اسلام بالکل بعید الوقوع سمجھتا ہے ۔ اسلام مسلمانوں سے یہ توقع کرتا ہے کہ یہ جرم واقع ہی نہ ہو۔ اس لئے کہ اگر پوری دنیا کے مفادات کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دوسری جانب ایک بے گناہ مسلم کا خون رکھا جائے تو دم مسلم کا پلڑا بھاری ہو گا۔ اسلام اس دنیا میں کسی ایسی حالت کا تصور نہیں کرتا جس میں ایک مسلمان کی جانب سے مسلمان کے قتل کا جواز پیدا ہوتا ہو۔ اسلام ایک مسلمان اور دوسرے مسلمان کے درمیان اس قدر سنجیدہ 'اس قدر گہرے 'اس قدر عظیم 'اس قدر قیمتی 'اس قدر عزت و احترام کے تعلقات پیدا کرتا ہے کہ وہ یہ فرض ہی نہیں کرتا کہ ان کے درمیان تعلقات اس قدر خراب بھی ہو سکتے ہیں کہ نوبت قتل مقاتلے تک پہنچ جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید سب سے پہلے قتل خطا سے بات شروع کرتا ہے ۔

(وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَاً ( ٤ : ٩٢ )) (مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ دوسرے مومن کو قتل کرے 'اِلاّ یہ کہ اس سے چوک ہو جائے )۔ اسلامی شعور میں صرف اس صورت کا تصور آ سکتا ہے کہ بھول چوک سے یہ جرم واقع ہو سکتا ہے ۔ یہی حقیقی احتمال ہے 'اس لئے کہ کسی مسلمان کا دوسرے مسلمان کے پڑوس میں رہنا ایک عظیم بات ہے ۔ یہ ایک عظیم نعمت ہے 'بہت ہی عظیم ۔ لہٰذا اسلامی شعور اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کوئی مسلم دوسرے مسلم کو اپنے پڑوس سے علیحدہ کر دے اور یہ تو بہت ہی بری بات ہوگی کہ وہ قصداً" وارادتاً" ایک مسلمان کے خلاف قتل کے لئے ہاتھ اٹھائے اس لئے کہ یہ اس کرۂ ارض پر ایک مسلمان کے لئے ایک نہایت ہی قیمتی سرمایہ ہے ۔ اس قیمتی سرمائے کے بارے میں صرف مسلمان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس کی قدر و قیمت کو جانے ۔ اس لئے اسلامی اخلاقیات میں یہ بات بہت ہی مشکل ہے کہ ایک مسلم 'مسلم کو قتل کر دے ۔ یہ وہ معاملہ ہے جسے صرف اہل اسلام اور اسلام دوست ہی سمجھ سکتے ہیں ۔ وہ اپنے نفس اور اپنے شعور کے اندر اس کا احساس رکھتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی بھائی چارے کے ذریعے اہل اسلام کو یہ اخوت سکھائی ہے ۔ یہی وہ برادری ہے جس کی وجہ سے وہ سب رسول اللہ ؐ کے گرد جمع ہیں ۔ رسول اللہ ؐ کے بعد یہ نظریہ ان کو اللہ کے نام پر جمع اور متحد رکھتا ہے ۔ ان کے درمیان اسلامی اخوت اور محبت پیدا ہوتی ہے اور یہ سب کچھ زبانی ہدایات کی وجہ سے ہے ۔

اگر قتل خطا واقعہ ہو جائے تو اس کی تین حالتیں ہیں اور تینوں کے احکام یہاں بیان ہو گئے ہیں ۔

پہلی حالت یہ ہے کہ کسی مومن کے ہاتھوں غلطی سے دار الاسلام کے اندر دوسرا مومن قتل ہو جائے اور اس کا خاندان بھی مسلمان ہو۔ اس صورت مین اسے ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہو گا اور پوری دیت اس مسلمان کے خاندان کو

ادا کرنی ہوگی ۔ ایک مومن غلام کو آزاد کرنے کا تاوان گویا اسلامی معاشرے کو اس کے نقصان کی تلافی کے طور پر ادا کرے گا ۔ اس لئے غلام کو آزاد کر کے اس نے ایک مردہ انسان کو آزادی دلاکر زندہ کر دیا ۔ اس طرح گویا وہ کئی غلاموں کو آزاد کر دے گا ۔ رہی دیت تو اس کی وجہ سے مقتول کے ورثا کے جذبات ٹھنڈے ہوں گے ۔ لیکن اس معاوضے کے فرض کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام مقتول کے خاندان کو یہ اشارہ بھی دیتا ہے کہ اگر وہ دیت معاف کر دیں تو یہ ان کے حق میں اچھا ہے بشرطیکہ ان کے دل برضا اس کے لئے تیار ہوں ۔ اسلامی معاشرے اور اسلامی اخوت کے لئے عفو و درگزر نہایت ہی مفید عمل ہے ۔ حکم ہوتا ہے ۔

(وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَّصَّدَّقُوا

(۹۲:۴)) (اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کر دے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے الا یہ کہ وہ خون بہا معاف کر دیں) ۔

دوسری صورت یہ ہے کہ قتل خطا کا جرم ایک مومن پر واقع ہو اور اس کے وارث دارالاسلام کے ساتھ محارب ہوں ۔ اس حالت میں دارالاسلام کے نقصان کا معاوضہ یہ ہو گا کہ قاتل کو ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہو گا لیکن اس کے محارب خاندان کو دیت ادا نہ ہوگی کیونکہ اس صورت میں وہ اس دیت کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کریں گے اور یہاں یہ صورت بھی نہیں ہے کہ مقتول کے اہل و عیال کی دلجوئی مطلوب ہے یا ان کے ساتھ محبت کے رشتوں کی بحالی مطلوب ہے اس لئے کہ وہ مسلمانوں کے دشمن ہیں اور ان سے برسرپیکار ہیں ۔

تیسری حالت یہ ہے کہ مقتول کے وارث معاہد ہوں' ان کے ساتھ معاہدۂ امن ہو یا معاہدۂ دوستی ہو' ایسے حالات میں قرآن کریم نے مقتول کے مومن ہونے کی شرط عائد نہیں کی ۔ اس لئے بعض فقہاء اور مفسرین نے اس حالت میں آیت کے حکم کو مطلق رکھا ہے اور حکم دیا ہے کہ ایسے حالات میں بھی قاتل کو ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہو گا اور مقتول کے وارثوں کو دیت ادا کرنی ہوگی اگرچہ یہ مقتول مومن نہ ہو' اس لئے کہ مومنین کے ساتھ معاہدہ کرنے کی وجہ سے ان کے جان و مال کو بھی مومنین کی جان و مال کے ساتھ مساوی درجہ حاصل ہو گا ۔

لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ آغاز کلام سے بات ایک مومن کے قتل کے بارے میں چلی ہے ۔ آیت ہے "مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ مومن کو قتل کرے' الا یہ کہ اس سے چوک ہو جائے ۔" اس کے بعد وہ حالات بیان ہوئے ہیں جن میں مقتول مومن ہو اور دوسری حالت میں جب مقتول کا تذکرہ ہوا پھر کہا گیا ۔ (فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ) (اگر وہ ایسی قوم کا فرد ہو جو تمہاری دشمن ہے لیکن ہو مومن) یہاں (وَهُوَ مُؤْمِنٌ) اس لئے کہا گیا کہ اس سے پہلے (مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ) کے الفاظ آئے تھے ۔ اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ تیسری حالت کی دیت میں بھی (رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ) کی شرط ہے ۔ اگر مقتول میں مومن شرط نہ ہوتی تو رقبہ میں بھی مومن شرط نہ ہوتی صرف تحریر رقبہ کا لفظ ہوتا ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقتول یہاں بھی مومن ہے' ورنہ کفارہ میں بھی ایمان کی شرط نہ ہوتی ۔

روایات میں آتا ہے کہ اہل معاہدہ میں سے بعض لوگوں کی دیت حضور اکرم ؐ نے ادا فرمائی مگر آپ نے یہ حکم نہیں

دیا کہ مومن غلاموں کو آزاد کیا جائے (ایسی کوئی روایت نہیں ہے) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مقتول معاہد مومن نہ ہو تو صرف دیت واجب ہے اور یہ دیت اس آیت کی رو سے ثابت نہیں بلکہ حضور ؐ کے عمل سے ثابت ہے۔ اور اس آیت میں جن تین صورتوں کا ذکر ہوا ہے وہ تمام صورتیں قتل مومن سے متعلق ہیں چاہے وہ مومن دارالاسلام کا باشندہ ہو یا کسی محارب قوم کا باشندہ ہو اور دارالحرب میں ہو یا ان کے درمیان معاہدہ ہو۔ چاہے امن کا معاہدہ ہو یا حلیف ہونے کا معاہدہ ہو۔ یہ تفسیر سیاق کلام کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

---ooo---

یہ تو تھا حکم قتل خطا کا، رہا قتل عمد تو یہ قتل اس قدر بڑا گناہ ہے کہ ایمان کے ساتھ اس کے ارتکاب کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس کا کفارہ نہ دیت سے ہوتا ہے اور نہ غلام آزاد کرنے سے یہ گناہ معاف ہو سکتا ہے۔ اس شخص کی سزا یہ ہے کہ وہ اللہ کے عذاب کے حوالے ہو گا۔

(وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (۴: ۹۳)) (وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لئے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے)۔

یہ جرم قتل ہے، لیکن صرف کسی جان کے خلاف ہی نہیں بلکہ یہ ایک عظیم، مکرم، محبوب ترین اور عزیز ترین اخوت اسلامی کا بھی قتل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ایک مومن اور دوسرے مومن کے درمیان پیدا کیا تھا۔ یہ قتل ناحق، ہی نہیں نظریہ حیات اور ایمان کی بھی نفی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے کئی مقامات کے اندر اسے شرک کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اور بعض سلف نے یہ رائے اختیار کی ہے کہ یہ توبہ کے ذریعے بھی معاف نہ ہو گا۔ حضرت ابن عباس کی رائے یہی ہے۔ البتہ بعض دوسرے علماء کی رائے یہ ہے کہ معافی ہو سکتی ہے اور انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ (اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ) (اللہ تعالیٰ اس بات کو معاف نہیں کرتے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اور اس کے سوا وہ جسے چاہے بخشتا ہے) اس لئے قاتل اگر توبہ کرے تو اس کی مغفرت کی امید کی جاسکتی ہے۔ ایسے لوگوں نے خلود کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ اس سے مراد طویل زمانہ ہے۔

وہ لوگ جنہوں نے پہلے اسلامی مدرسہ میں تربیت پائی تھی وہ اپنے آباو اجداد، بیٹوں اور بھائیوں کے ان قاتلوں کو بچشم سر دیکھ رہے تھے، جنہوں نے یہ قتل اسلام سے پہلے کئے تھے اور اب اسلام میں داخل ہوگئے تھے۔ ان میں سے بعض کے دلوں میں وہ تلخیاں دوبارہ تازہ ہو جاتی تھیں لیکن وہ ان لوگوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچتے بھی نہ تھے۔ وہ کبھی بھی انتقام کے بارے میں نہ سوچتے تھے اور نہایت ہی سخت حالات اور سخت چبھن کے وقت بھی ان کے دل میں قتل کا خیال تک نہ آتا تھا۔ بلکہ ایسے لوگوں کو اسلام نے جو حقوق دیئے تھے، وہ ان میں سے کسی حق کو بھی مارنے کی کوشش نہ کرتے تھے۔

کسی مومن .. کو قتل ... سے بچنے کی خاطر اگرچہ چوک سے ہو، ور مسلمانوں کے .. لوں کو تمام خواہشات سے پاک کرنے

کی خاطر اور ان کے سامنے صرف فی سبیل اللہ جہاد کرنے کے مقصد کو اچھی طرح اجاگر کرنے کی خاطر مسلمانوں کو اب حکم دیا جاتا ہے کہ اگر وہ جہاد و قتال کے لئے نکلیں تو جنگ شروع کرنے سے پہلے یہ بات معلوم کر لیں کہ آیا لوگ مسلمان ہیں یا نہیں اور اگر کوئی بظاہر اظہار اسلام کر دے اور السلام علیکم کہہ دے تو حملہ نہ کریں۔ اس لئے کہ جنگ کے حالات میں وہ تفتیش نہیں کر سکتے کہ آیا یہ اظہار اسلام حقیقت پر مبنی ہے یا نہیں۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَتَبَیَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَیْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِیْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ فَتَبَیَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ﴿۹۴﴾

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلو تو دوست دشمن میں تمیز کرو اور جو تمہاری طرف سلام سے تقدیم کرے اسے فوراً نہ کہہ دو کہ تو مومن نہیں ہے۔ اگر تم دنیوی فائدہ چاہتے ہو تو اللہ کے پاس تمہارے لئے بہت سے اموال غنیمت ہیں۔ آخر اسی حالت میں تم خود بھی تو اس سے پہلے مبتلا رہ چکے ہو' پھر اللہ نے تم پر احسان کیا' لہٰذا تحقیق سے کام لو' جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے)۔

اس آیت کے نزول کے بارے میں کئی روایات وارد ہوئی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے گشتی دستے کو ایک شخص ملا جس کے ساتھ اس کی بکریاں بھی تھیں۔ اس شخص نے اس فوجی دستے کو السلام علیکم کہا۔ مقصد یہ تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ اس نے السلام علیکم محض اپنے آپ کو بچانے کے لئے کہا ہے۔ اس لئے انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس طرح نہ کریں۔ یوں ان کے دلوں سے تمام مفادات کا تصور ہی نکال دیا۔ ان کو یہ تاثر دیا گیا کہ وہ کسی فیصلے میں جلد بازی نہ کریں۔ اسلام ان دونوں باتوں کو پسند نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو یاد دلاتے ہیں کہ وہ دور اور وہ زمانہ دور تو نہیں ہے کہ تم بھی اسی جاہلیت کے اندھیروں میں تھے جس میں تمہارے فیصلے نہایت ہی جلد بازی اور سرکشی پر مبنی ہوتے تھے' تم صرف دولت کے متلاشی تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جتلاتے ہیں کہ یہ اسی کا احسان تھا کہ اس نے تمہارے دلوں کو پاک کر دیا اور تمہارا نصب العین بلند ہو گیا۔ اور اب وہ جاہلیت کی طرح دنیاوی مفادات کے لئے جہاد نہیں کر رہے اور یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے قانونی حدود اور ضابطے مقرر کئے اور اب یہ صورت نہیں ہے کہ پہلا اشتعال ہی آخری فیصلے صادر کر دے جس طرح جاہلیت میں ہوا کرتا تھا۔

اس آیت میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ دیکھو ایک وقت تھا کہ تم خود اپنی قوم سے اپنے ایمان کو چھپاتے تھے اس لئے کہ تم کمزور تھے اور خوفزدہ تھے۔ صرف مسلمانوں کو پتہ ہوتا تھا کہ کون مسلمان ہے اور کون نہیں۔ یہ مقتول اپنی قوم سے

اسلام کو چھپا رہا تھا اور جب وہ مسلمانوں سے ملا تو اس نے اپنا اسلام ظاہر کر دیا اور السلام علیکم کہا۔

(كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا

(۴ : ۹۴) (اسی حالت میں تم خود بھی تو اس سے پہلے مبتلا رہ چکے ہو' پھر اللہ نے تم پر احسان کیا' لہٰذا تحقیق سے کام لو' جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے)۔

یوں اسلام دل کی دنیا کو جھنجوڑتا ہے تاکہ دل زندہ ہوں' محتاط ہوں اور اللہ کی نعمت عظیمہ کا احساس کریں۔ اور اس احساس 'خدا ترسی کے سائے میں اللہ کے احکام و قوانین کو نافذ کریں اور حالات کی اچھی طرح چھان بین کرنے کے بعد فیصلے کریں۔ آپ نے دیکھا کہ اس سبق میں بعض مقامی اور بین الاقوامی معاملات کو کس قدر شرح وبسط اور تفصیل سے لیا گیا ہے اور بالکل نئے میدان میں یہ قانون سازی کی گئی ہے۔ کس قدر پاکیزہ جذبے اور پاکیزہ اہداف کے ساتھ اور یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے یہ کام ہوا تھا جبکہ دنیا میں قانون بین الاقوام کا وجود ہی نہ تھا۔

---ooo---

# درس نمبر ۳۸ ایک نظر میں

یہ سبق درس سابق اور اس سے بھی پہلے ایک سبق کے ساتھ گہری وابستگی رکھتا ہے اور اسی کے ساتھ پیوستہ ہے۔ گویا یہ ان دونوں اسباق کا تکملہ ہے۔ اگر بین الاقوامی معاملات اور قانون بین الاقوام کا پہلو پیش نظر نہ ہوتا' جس طرح اسلام نے پہلی بار اس شعبے میں قانون سازی کی تو ہم ان تینوں درسوں کو ایک درس شمار کرتے۔ کیونکہ ان کا موضوع اور مضمون ایک ہی ہے۔ اس سبق کا اساسی مضمون یہ ہے کہ تمام مسلمان ہجرت کر کے دارالاسلام میں جمع ہو جائیں۔ ابھی تک جو لوگ دارالحرب اور دارالکفر میں رہ گئے ہیں وہ فوراً ہجرت کریں اور دارالاسلام میں پہنچ کر جان و مال سے جہاد کریں اور مکہ میں انہیں نسبتاً جو آرام ہے اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے ہیں اور وہاں انہیں جو سہولتیں حاصل ہیں' انہیں چھوڑ دیں۔ اور یہی مقصد اس سبق کے افتتاحی کلمات میں ہے جن میں کہا گیا ہے :

(لَا يَسْتَوِى الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا (۹۵)

(مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہ نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے' اگرچہ ہر ایک کے لئے اللہ نے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے مگر اس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے۔) مدینہ میں تو کوئی بیٹھنے والا نہ تھا۔ مدینہ میں جہاد سے رکنے والے یا تو منافقین تھے یا وہ لوگ تھے جو روڑے اٹکاتے تھے اور دونوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے درس سابق میں بات کی ہے۔

ہاں اس آیت کے متصلاً بعد دوسری آیت میں ان لوگوں کو سخت تنبیہ کی گئی ہے جو ابھی تک دارالکفر میں بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ ہجرت کر کے مدینہ منتقل ہونے کی پوری پوری قدرت رکھتے ہیں اور ایسے ہی حالات میں وہ فوت ہو جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے جو بہت ہی بری جگہ ہے۔

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ضمانت دیتا ہے جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرتے ہیں اور یہ اسی وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب وہ گھر سے نکل پڑتے ہیں بشرطیکہ وہ یہ ہجرت خالصتہً اللہ کے لئے کرتے ہوں۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے ان کے وہ تمام خدشات دور کر دیئے ہیں جو یہ اقدام کرنے سے پہلے ان کو لاحق ہوتے ہیں' نیز اس وقت جو خطرات درپیش تھے اور جو

خوفناک حالات تھے ان حالات میں ہمت کرنا مشکل اور تشویش کا باعث تھا۔

ہجرت اور جہاد پر بات مزید آگے بڑھتی ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ دار الحرب میں مسلمانوں کا باہم معاملہ کیا ہو گا اور دار الحرب سے باہر دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا تعلق ہو گا۔ خصوصاً ان مسلمانوں کا انجام کیا ہو گا جو ہجرت نہیں کرتے ۔

اس سبق میں حالت خوف میں نماز کی کیفیات کا بھی ذکر ہے ۔ مثلاً ہجرت کے سفر کے دوران نماز اور میدان جنگ میں نماز' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی اسلام میں کس قدر اہمیت ہے کہ ایسے خطرناک حالات میں بھی اس کی معافی نہیں ہے ۔ نیز مسلمانوں کے اندر ایسی حالت پیدا کی جاتی ہے کہ وہ ذہنی طور پر ہروقت جنگ کے لئے تیار رہیں کیونکہ حالات ایسے ہیں کہ معمولی غفلت اور لاپرواہی سے دشمن سخت فائدہ اٹھا سکتا ہے ۔

آخر میں یہ سبق نہایت ہی موثر ٹچ دیتا ہے اور مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ابھارتا ہے کہ ٹھیک ہے کہ تم کو نہایت ہی المناک مصائب کا سامنا ہے لیکن دشمنوں کی حالت بھی کوئی اچھی نہیں ہے اور ان کے نصب العین اور تمہارے نصب العین اور ان کی امیدوں اور تمہاری امیدوں میں فرق ہے ۔

(وَ لَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ وَ تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ (٤ : ١٠٤) (اس گروہ کے تعاقب میں کمزوری نہ دکھاؤ ۔ اگر تم تکلیف اٹھا رہے ہو تو تمہاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں اور تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں ) ۔

اس تصویر کشی کے ساتھ ہی دونوں گروہوں کے راستے علیحدہ ہو جاتے ہیں ۔ دونوں کے منہاج علیحدہ ہو جاتے ہیں ۔ ہر دکھ اور ہر تکلیف مسلمانوں کے لئے آسان ہو جاتی ہے ۔ مسلمانوں کے دلوں سے سستی اور تھکاوٹ کا احساس ہی ختم ہو جاتا ہے اس لئے کہ آخر مخالف کیمپ کو بھی تو مشکلات کا سامنا ہے جبکہ ان کو اللہ کی جانب سے وہ امید نہیں ہے جو مسلمانوں کو ہے ۔

اس سبق میں جن موضوعات پر بات ہوئی ہے اور جو اسلوب تربیت اپنایا گیا ہے اس کے اندر یہ بتایا گیا ہے کہ جماعت مسلمہ کی تکوین و تشکیل کے اندر جو تغیرات ہو رہے تھے اور جماعت کی عملی تشکیل میں جو مشکلات پیش آ رہی تھیں اور جو نظریاتی اور عملی رکاوٹیں تھیں ان سے تحریک اسلامی کس طرح نمٹ رہی تھی ۔ لوگوں کے ذہنوں میں جو خدشات پیدا ہو رہے تھے اور جس طرح وہ کمزوری کا باعث بن رہے تھے یا سوسائٹی اور افراد جماعت کے نفوس کے اندر جاہلیت کے جو آثار باقی تھے اور وہ جس طرح مشکلات کا باعث بن رہے تھے نیز تحریک اسلامی کی راہ میں آنے والی نئی نئی مشکلات اور مصیبتوں کے باعث ذات انسانی کے قدرتی طور پر متاثر ہو جانے کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہو رہے تھے اور ان مشکلات کے باوجود جو لوگ وفاداری بشرط استواری پر اپنے آپ کو قائم رکھے ہوئے تھے' ایسے تمام مناظر و مشاہد کی تصویر کشی اس سبق میں کی گئی ہے ۔ ان تمام مسائل کو قرآن کے حکیمانہ منہاج نے لیا ہے اور انسانی ضمیر کو آمادہ کیا ہے اور جوش دلایا ہے کہ وہ ان مشکلات سے عہدہ بر آ ہو۔

یہ تمام باتیں اصل صورت حال کا صحیح نقشہ کھینچ کر بتائی گئی ہیں ۔ اور ان کا اظہار حوصلہ افزائی اور جوش دلانے کے مؤثر انداز سے بھی ہوتا ہے اور اس علاج سے بھی ہوتا ہے جو فطری خدشات اور عملی مشکلات کے حل کے طور پر تجویز کیا گیا ہے ۔ نیز عین میدان کارزار میں نماز پر جم جانے کے عمل سے بھی اس کا اندازہ اچھی طرح ہو جاتا ہے جبکہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عین نماز کے

وقت بھی وہ دشمن پر نظر رکھیں ۔پھر مہاجرین کو ثواب دارین کی ضمانت دی گئی ہے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں نکلتے ہیں ان کے لئے اجر اور کافروں کے لئے سخت دردناک عذاب کے اعلان کے ذریعے ان تمام آلام ومشکلات کی تصویر سامنے آتی ہے ۔

اس سبق سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی نفس کے ساتھ 'اس کی کمزوری کی حالت میں اور اس کی قوت کی حالت میں کس طرح برتاؤ فرماتا ہے ۔ نیز ایک انسانی جماعت کی تشکیل اور تربیت کس طرح کی جاتی ہے اور اس اسٹیج پر اس کے ساتھ معاملہ کس طرح کیا جاتا ہے ۔اس سلسلے میں ایک ہی آیت میں متعدد خطوط سامنے آتے ہیں ۔چند لفظوں میں جماعت کے دلوں کے اندر اس کی قوت اور برتری کا احساس اور شعور بھر دیا جاتا ہے اور اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اسے اپنا دشمن حقیر نظر آنے لگتا ہے اور ساتھ ساتھ اسے خطرے کے مقابلے میں احتیاط 'بیداری اور بروقت تیاری کا حکم بھی دیا جاتا ہے جبکہ اسی آیت میں ان مقامات کی نشاندہی بھی کر دی جاتی ہے جہاں کمزوری ہے ۔ اور مقامات کمزوری کے بارے میں شدید اور نہایت ہی سخت ہدایات بھی دی جاتی ہیں ۔

یہ ایک عجیب منہاج ہے 'نہایت ہی مکمل اور انسانی نفسیات کے عین مناسب ۔نفس انسانی کی لوح پر نئے خطوط کھینچے جاتے ہیں اور مختلف نقاط کے درمیان نئے وتر قائم ہوتے ہیں اور یہ تمام تار ِس زمزمہ آرا ہیں اور ہر تار مضراب ربانی کی ضرب پر فوراً حرکت میں آتی ہے ۔

واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ تمام موجودہ سوسائٹیوں سے مدینہ کی اسلامی سوسائٹی اپنے منہاج تربیت کے اعتبار سے اور اپنی اجتماعی تنظیم کے اعتبار سے بہت بڑی فوقیت رکھتی ہے اور اس تفوق کا مشاہدہ اس وقت کی پوری انسانیت بچشم سر کر رہی تھی اور یہ دیکھ رہی تھی کہ یہ نوخیز سوسائٹی ان مشکل حالات میں ایک طرف تو اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا علاج کر رہی ہے اور دوسری جانب اپنے اردگرد پھیلی ہوئی جاہلی سوسائٹیوں کو کھاتی چلی جاتی ہے ۔وہ بتدریج ان پر غالب ہوتی جارہی ہے اور یہ غلبہ محض جنگی غلبہ نہیں بلکہ یہ ایک تہذیبی غلبہ ہے جس طرح جوان تہذیب بوڑھی اور ازکار رفتہ تہذیبوں کو کھاتی چلی جاتی ہے ۔ ایک نیا نظام ہے جو پرانے نظاموں پر غالب ہو رہا ہے ۔ زندگی کا ایک نیا ماڈل دنیا کے سامنے شوروم میں سجایا گیا ہے ۔ ایک جدید دور اور ایک جدید انسان پیدا ہو رہا ہے ۔اس قدر تبصرے کے بعد اب آیات ونصوص کا سامنا کریں ۔

---ooo---

# درس نمبر ۸ ۳ تشریح آیات

# ۹۵-- تا-- ۱۰۴

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾

(مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں' دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے ۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہ نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے ۔ اگرچہ ہر ایک کے لئے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے' مگر اس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے ۔ ان کے لئے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے' اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے )۔

اس آیت میں' اسلامی معاشرے کی ایک خاص صورت حال پر بحث کی گئی ہے ۔ اس وقت مسلمانوں کی صفوں میں بعض لوگوں کی طرف سے سستی پیدا ہو رہی تھی ۔ وہ اسلامی انقلاب کی راہ میں جان اور مال کی قربانی نہ دے رہے تھے ۔ یہ لوگ وہ تھے جو مکہ میں اپنی دولت بچانے کے لئے ہجرت میں تاخیر کر رہے تھے' اس لئے کہ اہل مکہ کسی مہاجر کو اپنے ساتھ کوئی چیز لے جانے کی اجازت نہ دے رہے تھے ۔ یہ سستی اس وجہ سے بھی پیدا ہو رہی تھی کہ ہجرت کی راہ میں سخت مشکلات' مصائب اور خطرات تھے' اس لئے کہ مشرکین کمزور لوگوں کو سرے سے ہجرت کی اجازت ہی نہ دیتے تھے ۔ وہ انہیں پکڑ کر قید

کر دیتے' اذیت دیتے یا اگر پہلے سے اذیت دی جارہی ہوتی تھی تو جس کے بارے میں انہیں شبہ ہو جاتا کہ یہ بھاگنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اسے مزید سخت اذیت دی جاتی' چاہے ان آیات کا مدلول وہ لوگ ہوں جو دارالاسلام کو ہجرت کر کے منتقل نہ ہو رہے تھے۔ (میں اسی رائے کو ترجیح دیتا ہوں) یا اس سے مراد خود دارالاسلام کے اندر موجود بعض لوگ ہو سکتے ہیں جو مالی اور جانی جہاد میں زیادہ پرجوش نہ تھے۔ یہ لوگ ان لوگوں سے علیحدہ تھے جو جہاد کے معاملے میں سست رو اور پہلوتہی کرنے والے تھے اور جن کا ذکر سابقہ سبق میں ہو چکا ہے۔ ہو سکتا ہے ان آیات کے معنی میں وہ سب لوگ شامل ہوں جو دارالاسلام میں تھے اور جہاد سے پہلوتہی کر رہے تھے اور منافق تھے' یا مسلمان تھے مگر سست تھے یا وہ تھے جو سرے سے ہجرت ہی نہ کر رہے تھے کہ جہاد کریں۔ بہرحال بعض حلقے ایسے تھے جو سستی کر رہے تھے اور یہ آیت ایسی ہی صورت حال سے بحث کر رہی ہے۔ البتہ قرآن اس آیت میں مراد لوگوں کی تخصیص نہ کرتے ہوئے ایک عام قاعدے کے طور پر اصولی بات کرتا ہے' جس کو زمان و مکان اور کسی ایک خاندان کی قید کے اندر مقید نہیں کیا جاتا اور بتاتا ہے کہ یہ اصول ہے کہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ اس کا اطلاق اہل اسلام پر کرے گا' کہ جو لوگ بغیر عذر بیماری اور لاچاری کے جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ نہیں لیتے' چاہے مالی جہاد ہو یا جانی اور اس کے لئے اگر ہجرت کی ضرورت ہو تو ہجرت نہیں کرتے اور اس کے مقابلے میں جو لوگ ہجرت کرتے ہیں اور جانی اور مالی قربانی دیتے ہیں وہ اللہ کے نزدیک ایک ہی مقام و مرتبہ کے نہیں ہو سکتے۔ یہ ایک عام قاعدہ اور عام اصول ہے اور ہر زمان و مکان میں اس کا اطلاق ہو گا۔

(لَا يَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ (۴:۹۵)) (مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں' دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے)۔

اللہ تعالیٰ بات کو یہاں مجمل اور مبہم نہیں چھوڑتے بلکہ اس کی بھرپور وضاحت فرماتے ہیں اور یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ جانی اور مالی جہاد کرنے والوں کا درجہ بہت ہی بڑا ہے۔

(فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَی الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً (۴:۹۵))
(اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہ نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے)۔

مجاہدین کا جو درجہ اس آیت میں بیان ہوا ہے' رسول اللہ ؐ نے جنت میں ان کے مقام کی تفصیلات کو بتا کر واضح کیا ہے۔ صحیحین میں ابو سعید الخدری کی حدیث میں ہے۔ حضور ؐ نے فرمایا کہ جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کے لئے تیار فرمائے ہیں اور ہر ایک درجے ـــــــــ کے درمیان اس قدر مسافت ہے کہ جس طرح زمین اور آسمانوں کے درمیان فاصلہ ہے۔

اعمش نے عمرو ابن مرہ سے روایت کی' جنہوں نے ابوعبیدہ کے واسطے سے حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت فرمائی ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ جس نے ایک تیر مارا اسے ایک درجے کا اجر ملے گا۔ تو ایک شخص نے پوچھا کہ حضور ایک درجہ کس قدر ہو گا تو آپ ؐ نے فرمایا کہ یہ تمہاری ماں کے چوکھٹ یا سیڑھی کے مقدار کے برابر بہرحال نہ ہو گا۔ دو

،، جوں کے درمیان سو سال کے سفر کا فاصلہ ہو گا۔حضور ؐ نے جس مسافت کا ذکر کیا ہے' آج کے دور جدید میں ہم اس کا تصور بڑی سہولت سے کر سکتے ہیں۔اس لئے کہ اس کائنات کے اندر ہمارا علم بڑی دوری تک جا پہنچا ہے۔ایک سیارے سے دوسرے سیارے تک روشنی کی رفتار سے بھی فاصلہ کئی نوری سالوں میں طے ہوتا ہے۔جو لوگ رسول خدا ؐ کی بات اس وقت سنتے تھے وہ تو (اٰمنّا وصدّقنا) کہتے تھے لیکن ہم دور جدید کے لوگ تو ان فاصلوں کو ناپ چکے ہیں اور اس کائنات کے دور دراز فاصلوں کو قریب لا چکے ہیں اور عجیب و غریب معلومات سامنے آگئی ہیں۔

البتہ قرآن مجید میں مجاہدین فی سبیل اللہ کے درجات بلند کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ یہ بھی بتاتے ہیں کہ بغیر کسی عذر و مجبوری کے بیٹھنے والوں کے مقابلے میں اگرچہ مال و جان کے ساتھ جہاد کرنے والوں کے درجے بلند ہیں لیکن (وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی) (ہر ایک کے لئے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے) محروم کوئی بھی نہیں ہے۔بہرحال ایمان کا اپنی جگہ ایک بنیادی درجہ ہے۔ایمان کے تقاضے پورے کرنے والوں کے درجات حسب جدوجہد اور جہاد زیادہ ہیں۔خصوصاً جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کرنے والوں کے درجات سب سے بلند ہیں۔ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ درج بالا آیات میں بیٹھنے والوں سے مراد وہ منافقین نہیں ہیں جو جہاد سے پہلوتہی کرتے تھے یعنی (المبطئین) البتہ یہ کچھ دوسرے لوگ تھے جو نہایت ہی صالح اور مخلص تھے لیکن جہاد فی المال اور جہاد فی النفس کے پہلو میں کمزور تھے۔ قرآن کریم کی ان آیات میں روئے سخن انہی لوگوں کی جانب ہے۔ان کو جوش دلایا جاتا ہے کہ وہ اپنی ان کوتاہیوں کی تلافی کریں۔چونکہ ان لوگوں میں بھلائی کا مادہ موجود ہے اس لئے ان سے لبیک کہنے کی امید کی جاسکتی ہے۔

یہ نوٹ اب ختم ہوتا ہے اور پہلے اصولی قاعدے کو اب پھر دہرایا جاتا ہے۔بہت ہی تاکید کے ساتھ' ذرا مزید کھول کر اسے بیان کیا جاتا ہے تاکہ اس کے بدلے میں جو عظیم اجر ہے لوگ اس کے لوٹنے کے لئے دوڑیں۔

(--- وَفَضَّلَ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا (۹۵) دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۹۶) (۴:۹۵-۹۶))

(مگر اس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے' ان کے لئے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے' اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)۔

یہ عظیم تاکید' یہ خوبصورت وعدے' مجاہدین کی یہ عظیم قدردانی اور بیٹھنے والوں کے مقابلے میں برتری درجات اور اجر عظیم کے اعلیٰ مراتب کا ذکر جن کے لئے قلوب مومنین مشتاق رہتے ہیں۔پھر اللہ کی جانب سے تقصیرات اور گناہوں کی معافی کا یہ اعلان عام' غرض ان تمام باتوں سے دو امور کا اظہار ہوتا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہ آیات ایسے حالات میں نازل ہوئیں جو اس وقت اسلامی معاشرے میں عملاً موجود تھے اور یہ آیات ان کا مداوا کر رہی تھیں۔اس سے ہمیں ایک عمدہ سبق ملتا ہے وہ یہ کہ ہم انسانی فطرت کا صحیح طرح ادراک کر لیتے ہیں اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ انسانی جماعتوں کا مزاج کیا ہوتا ہے۔کوئی انسانی جماعت ایمان و عمل میں' تقویٰ و برتری کے

جس مقام پر بھی جا پہنچی ہو بہرحال اس پر ضعف 'حرص 'بخل اور کمزوریوں کے جو حالات بھی طاری ہوں اور فرائض اور خصوصاً جہاد کے فریضے میں اس سے جہاں بھی کوتاہی صادر ہو خواہ یہ کوتاہی جہاد بالمال کی ہو' جہاد بالنفس کی ہو یا فی سبیل اللہ جہاد میں خلوص کی کمی ہو تو ان کوتاہیوں کے ظہور کے وقت اسے تربیت اور اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے۔اسے ضعف 'حرص 'بخل اور تقصیرات سے پاک کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔یہ پالیسی مناسب نہیں ہے کہ ہم مایوس ہو کر اصلاح کے کام کو چھوڑ دیں اور سوسائٹی اپنی موجودہ گراوٹ سے مزید پستی میں گرتی چلی جائے۔اور ہم یہ کہہ دیں کہ سوسائٹی کی یہ واقعی صورت حال ہے اور ہمیں چاہئے کہ اسے قبول کرلیں اور معاشرے کے اندر جو ضعف 'حرص 'لالچ اور کوتاہیاں ہیں انہیں جوں کا توں چھوڑ دیں۔اور یہ نعرہ لگائیں کہ یہ تو معاشرے کے اندر موجود صورت حال ہے۔معاشرہ گرا ہوا ہے اور اسے اسی حالت میں رکھ کر اس کے ساتھ معاملہ کرنا چاہئے اصل بات یہ ہے کہ ہم معاشرے کے اندر اصلاح کی دعوت جاری رکھیں اور قرآنی منہاج کے مطابق معاشرے کو بلند سے بلند تر کرنے کی سعی کریں۔

دوسری جو بات ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کی کیا قدر و قیمت ہے۔ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام زندگی کے مزاج کے اندر جہاد فی سبیل اللہ کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔اقامت دین کے طریقوں میں جہاد کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ہر دور میں دین کے مخالفین کا مقابلہ جہاد ہی کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔اس کے سوا اور کوئی کامیاب طریقہ نہیں ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ حضور اکرم ؐ کے دور تک ہی محدود نہیں ہے۔جس دور میں بھی دعوت اسلامی کا کام شروع ہوگا' جہاد ضروری ہوگا۔بعض لوگوں کا یہ کہنا نہایت ہی غلط ہے کہ آغاز اسلام کے وقت دنیا میں دو بڑی شہنشاہتیں تھیں' اس لئے اس وقت اہل اسلام نے اپنے ماحول سے متاثر ہو کر یہ سوچا کہ ان کے زندہ رہنے کے لئے قوت قاہرہ کی ضرورت ہے تاکہ طاقت کا توازن قائم ہو۔

جو لوگ یہ خیالات رکھتے ہیں 'معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اسلام کو اچھی طرح نہیں سمجھا ہے اور ان کے یہ خیالات محض ظن و تخمین پر مبنی ہیں۔ لیکن اگر اسلام میں فریضہ جہاد اسی طرح عارضی حالات کی وجہ سے ہوتا تو کتاب اللہ میں اس کا اس انداز سے بار بار ذکر نہ کیا جاتا اور سنت رسول اللہ میں اس کی بار بار تاکید نہ کی جاتی۔

اگر جہاد اسی طرح ایک وقتی بات تھی تو حضور اکرم ؐ یہ نہ فرماتے کہ "جو شخص مرجائے اور غزانہ کرے اور اس کے دل میں قتال فی سبیل اللہ کی خواہش بھی پیدا نہ ہو تو یہ شخص نفاق کی مختلف حالتوں پر سے ایک حالت میں مرے گا۔" حضور ؐ کا یہ فرمان نہایت ہی عام اور کامل و شامل ہے۔جامع اور مانع ہے۔

ہاں یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ حضور اکرم ؐ نے بعض انفرادی حالات میں بعض لوگوں کو جہاد کی اجازت نہیں دی اور وہ بھی محض ان کے مخصوص خاندانی حالات کی وجہ سے۔صحیحین میں یہ حدیث موجود ہے کہ ایک شخص جہاد میں شمولیت کی غرض سے آیا تو حضور اکرم ؐ نے سوال کیا 'کیا تمہارے والدین زندہ ہیں تو اس نے کہا :ہاں۔تو حضور اکرم ؐ نے فرمایا تم ان دونوں میں جہاد کرو۔"

یہ ایک شخص کے لئے اس کے انفرادی حالات کے مطابق فیصلہ تھا۔اس سے عام قاعدہ مخصوص نہیں ہوتا۔پھر لاتعداد مجاہدین کے ہوتے ہوئے ایک شخص کی بعض اوقات ضرورت نہیں ہوتی۔ایک فرد سے قلت پیدا نہیں ہوتی۔نیز حضور اکرم ؐ

ایک ایک شخص کے حالات سے باخبر رہتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم ؐ کو معلوم ہوا ہو کہ اس شخص کے والدین کو سہارے کی بہت زیادہ ضرورت ہے اس لئے آپ ؐ نے اسے یہ ہدایت فرمائی۔

لہٰذا اس ایک شخص کی وجہ سے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جہاد ایک وقتی عمل تھا۔ اور حضور ؐ کے دور کے ظروف و احوال کے مطابق ضروری تھا اور اب حالات بدل گئے ہیں اس لئے اب جہاد کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاد اس لئے فرض نہیں کیا گیا کہ اسلام کی پالیسی ہی یہ ہے کہ ننگی تلوار لے کر نکلو اور کفار سامنے آئیں ان کے سر گاجر مولی کی طرح کاٹتے چلے جاؤ۔ لیکن لوگوں کی عملی زندگی اور اس دعوت اور تحریک کا مزاج یہی ہے کہ تلوار ہمارے ہاتھ میں ہو اور ہم ہروقت جہاد کے لئے تیار اور محتاط رہیں۔

اللہ تعالیٰ کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ اسلامی نظام حکومت ایک ایسا نصب العین ہے جسے بادشاہ لوگ پسند نہیں کرتے۔ اللہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ برسراقتدار لوگ ہمیشہ اسلام کی راہ روکیں گے اس لئے کہ اسلام ان کے طریق زندگی اور ان کے نظام زندگی کے خلاف ہے۔ یہ بات صرف کل تک محدود نہیں ہے۔ کل بھی اقتدار پر براجمان لوگ اسلامی نظام کو پسند نہ کرتے تھے اور آج بھی پسند نہیں کرتے اور کل بھی اسے پسند نہیں کریں گے۔ ہر زمان اور ہر مکان میں ایسا ہی ہوگا اور ایسا ہی ہو رہا ہے۔

اللہ کو علم تھا کہ شر اور بدی ہمیشہ خود سر اور بے حیا ہوتی ہے۔ بدی کبھی منصف نہیں ہوتی۔ بدی کا مزاج یہ ہے کہ وہ خیر اور نیکی کو پنپنے نہیں دیتی چاہے نیکی انتہائی پرامن اور دوستانہ طریقہ کار کیوں نہ استعمال کرے اس لئے کہ بھلائی کا پھیلنا ہمیشہ شر کے لئے خطرناک ہوتا ہے۔ حق کا وجود ہی باطل کے لئے خطرہ ہوتا ہے اور شر دست درازی کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا باطل کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ سچائی کا گلا گھونٹ دے اور اسے قوت کے بل بوتے پر ختم کر دے۔ یہ شر کی فطرت ہے اور شر پر یہ حالت عارضی طور پر طاری نہیں ہوتی..... یہ شر کی حقیقی فطرت اور طبیعت ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جہاد فرض کیا گیا ہے۔ ہر حالت میں جہاد فرض ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ جہاد انسان سب سے پہلے نفس کے خلاف شروع کرے۔ اس کے بعد اس کا میدان جنگ وسیع ہو اور اس ظاہری دنیا کے واقعات و حالات کے اندر عملاً بھی جہاد جاری ہو اور نظر آئے۔ یاد رہے کہ مسلح شر کے مقابلے میں مسلح خیر کی ضرورت ہے اور اگر باطل کے پاس دفاعی قوت ہے تو حق کو بھی مکمل طور پر تیار ہونا ضروری ہے۔ اگر باطل کے مقابلے میں تیاری نہ ہوگی تو سچائی خودکشی کرے گی اور اگر خودکشی نہ ہوگی تو محض گپ شپ ہوگی جو مومنین کے شایان شان نہیں ہے۔

اسلام کی راہ میں جان و مال کی قربانی ضروری ہے۔ یہی اللہ کا مطالبہ ہے 'اور اللہ نے تو اہل ایمان کے مال اور جان کو جنت کے بدلے خرید لیا ہے۔ یا تو وہ غالب رہیں گے یا درجہ شہادت پائیں گے۔ یہ ہے اللہ کا حکم اور اسی میں حکمت پوشیدہ ہے۔ رہے اہل ایمان تو ان کے لئے ان کے رب کے پاس دو اچھے انجام ہیں۔ لوگ سب کے سب مرتے ہیں جب وقت پورا ہوتا ہے' لیکن شہادت حق وہی ادا کرتے ہیں جو شہید ہوتے ہیں۔

اس نظریہ حیات میں ایک مرکزی نکتہ ہے' اور اسی نکتے کے اوپر اس کا عملی نظام قائم ہے' اور یہ عملی نظام اپنے مقررہ خطوط پر آگے بڑھتا ہے۔ اس خط اور مومن کا ایک مزاج ہے اور اس کی دوٹوک فطرت ہے اور اس کے اندر ظروف و احوال کے لحاظ سے اور زمان و مکان کے اعتبار سے کوئی تغیر نہیں ہوتا۔

یہ وہ نکتے ہیں جنہیں ایک حقیقی مومن کے تصور کے اندر روشن رہنا چاہئے چاہے حالات جیسے بھی ہوں۔ انہی بنیادی نکتوں سے جہاد کا عمل شروع ہوتا ہے 'جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات کہی ہے کہ یہ جہاد صرف اللہ کی راہ میں ہے ' صرف اللہ کے جھنڈے تلے ہے 'اس جہاد کے عمل میں جو مارے جاتے ہیں وہ شہداء ہوتے ہیں اور عالم بالا میں ان کا جنازہ بڑے دھوم سے اٹھتا ہے۔

---ooo---

اب جہاد کے عمل کے مقابلے میں بیٹھ جانے والوں میں سے ایک دوسرے فریق کو اسکرین پر لایا جاتا ہے۔ یہ لوگ ابھی تک مکہ کے دارالکفر میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ہجرت نہیں کرتے۔ ان کے کچھ مالی مفادات ہیں 'کچھ مصلحتیں ہیں ' یا ان کی فطری کمزوری انہیں بٹھائے ہوئے ہے۔ یہ ہجرت کی مشکلات اور راستے کی تکالیف کے مقابلے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتے۔ اگر وہ قربانی اور مشکلات کو برداشت کرنے کا عزم کرلیں تو وہ ہجرت کر سکتے ہیں۔ اسکرین پر یہ مکہ ' دارالحرب مکہ ' کی جگہوں میں یونہی پھرتے ہیں کہ حضرت عزرائیل آکر ان سے ان کا متاع عزیز چھین لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی حالت قرآن مجید کے اسکرین پر نہایت ہی خستہ حالت ہے ' نہایت ہی قابل نفرت ہے ' ہر وہ شخص جو جہاد سے دور بیٹھا ہے۔ وہ یہ چاہے گا کہ وہ اپنے دین ' اپنے نظریہ حیات اور اللہ کے ہاں انجام بد کی اس صورت حال سے دور بھاگے اور اس نہایت ہی کریہہ منظر میں وہ ہرگز کھڑا نظر نہ آئے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿٩٧﴾ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿٩٨﴾ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٩٩﴾

(جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں

مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے ۔فرشتوں نے کہا 'کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے ۔ہاں جو مرد 'عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے 'بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے ۔اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے )

یہ آیت جزیرۃ العرب میں بطور واقعہ موجود صورت حال سے بحث کرتی ہے اور یہ صورت حال مکہ وغیرہ میں حضور اکرم ﷺ کی ہجرت کے بعد عملاً موجود تھی 'جبکہ مدینہ میں اسلامی مملکت قائم ہوگئی تھی ۔ ابھی تک مکہ میں ایسے مسلمان موجود تھے جنہوں نے ہجرت نہ کی تھی ۔یہ لوگ وہاں اپنی کچھ مصلحتوں اور اپنی جائیداد کی وجہ سے رہ گئے تھے ۔حالات ایسے تھے کہ مشرکین مکہ کسی ایسے شخص کو جو ہجرت کر رہا ہوتا 'اپنے ساتھ کچھ لے جانے نہیں دیتے تھے 'یا یہ لوگ ہجرت کی تکالیف کی وجہ سے بیٹھے ہوئے تھے 'اس لئے کہ جو بھی ہجرت کرتا تھا اہل مکہ اس کی راہ روکتے اور اسے منع کرتے ۔بعض لوگ ایسے بھی تھے جو حقیقتاً ہجرت کرنے پر قادر ہی نہ تھے ۔بعض بوڑھے تھے 'بعض عورتیں تھیں اور بعض بچے تھے ۔ان لوگوں کے لئے ہجرت کرنے اور بھاگنے کی کوئی راہ سرے سے نہ تھی ۔

مسلمانوں میں جو لوگ مکہ میں رہ گئے تھے ان پر مکہ والوں نے بڑی سختیاں شروع کر دی تھیں کیونکہ وہ لوگ حضور اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر ؓ کو گرفتار کرنے میں ناکام ہوگئے تھے ۔حضور اکرم ﷺ نے مدینہ میں حکومت قائم کر کے قریش کے قافلوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا تھا اور پھر جنگ بدر میں مسلمانوں کو زبردست فتح نصیب ہوگئی جس کی وجہ سے اہل مکہ بپھرے ہوئے تھے ۔ وہ مکہ میں رہنے والے مسلمانوں پر سخت مظالم ڈھا رہے تھے 'ان کو مختلف قسم کی اذیتوں میں مبتلا کر رہے تھے ۔ اور سخت بوکھلاہٹ میں ظلم کر رہے تھے ۔

بعض لوگوں کو انہوں نے عملاً تشدد کر کے دین اسلام سے پھیر دیا تھا 'بعض لوگ تقیہ کر کے کفر کا اظہار کر رہے تھے اور مشرکین کے ساتھ شرکیہ عبادات میں بظاہر شریک ہوتے تھے ۔یہ تقیہ اس وقت ان کے لئے جائز تھا جب اسلامی حکومت نہ تھی اور ہجرت کرنے کے مواقع نہ تھے ۔لیکن جب اسلامی مملکت کا قیام مدینہ طیبہ میں ہوگیا تو پھر ان کا اس طرح فتنوں کے اندر قیام کرنا یا اپنے آپ کو تقیہ پر مجبور کرنا جائز اور معقول نہ تھا جبکہ وہ ہجرت بھی کر سکتے تھے اور دارالاسلام میں امن کی زندگی بھی بسر کر سکتے تھے ۔

ان حالات میں یہ آیات نازل ہوئیں ۔یہ لوگ محض دولت اور مصلحت کی وجہ سے ہجرت نہ کر رہے تھے 'یا وہ ہجرت کی تکالیف و مشکلات کی وجہ سے مکہ میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ ایسے حالات میں اگر ان کی موت واقعہ ہوگئی تو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ ظالم کا نام دیتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے آپ پر ظلم کر رہے تھے اس لئے کہ انہوں نے اپنے آپ کو دارالاسلام کی آزادانہ زندگی سے محروم رکھا 'جہاں وہ پاک و صاف اور شریفانہ اور اپنی مرضی کی زندگی بسر کر سکتے تھے ۔ جبکہ دارالکفر میں وہ ذلیل و خوار 'کمزور اور مظلوم ہوکر زندگی بسر کر رہے تھے ۔اور ان پر مظالم ہو رہے تھے ۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جہنم میں رہیں گے جو بہت برا ٹھکانا ہے ۔معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں کے لئے وعید ہے جنہوں نے فی الواقعہ ڈر کر کفر اختیار کر لیا تھا ۔

لیکن ایسے لوگوں کی تعبیر قرآن مجید نہایت ہی زندہ اور متحرک انداز میں کرتا ہے ۔ ان کے اور فرشتوں کے درمیان

مکالمہ ہو رہا ہے اور یہ مکالمہ گویا زندہ افراد کے درمیان ایک اسٹیج پر ہو رہا ہے ۔

(إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا (٤: ٩٧))

(جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین پر کمزور و مجبور تھے ۔ فرشتوں نے کہا کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟)

قرآن انسانوں کی تربیت کر رہا تھا' اس لئے اس کے پیش نظر یہ ہدف تھا کہ وہ ان کے بھلائی اور عزت و شرف کے جذبے کو جوش میں لائے اور ان کے اندر ضعف' بخل' حرص اور سستی کے پائے جانے والے اوصاف کو ختم کرنے کی سعی کرے ۔ چنانچہ اس منظر کی تصویر کشی میں قرآن کریم نے نہایت ہی حقیقی صورت حال کو پیش کیا ہے ۔ لیکن قرآن کریم اس تصویر کشی کو لوگوں کی اصلاح کے لئے استعمال کرتا ہے اور اس کے ذریعے نفوس انسانی کی اصلاح کی جاتی ہے ۔

موت کا وقت ہر انسان کے لئے خوفناک ہوتا ہے ۔ حالت نزع میں جو کچھ پیش آتا ہے انسان کے ذہن میں وہ تمام حالات بہت ہی تیزی کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں اور پھر اس منظر میں فرشتوں کا اسٹیج پر آنا مزید خوفناک صورت حال پیدا کر دیتا ہے اور انسان کے حواس بڑی تیزی سے کام کرتے ہیں ۔

یہ لوگ مکہ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور نظر آتا ہے کہ یہ لوگ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں اور ایسے ہی حالات میں فرشتے آ پہنچتے ہیں اور ان کی روح قبض کرنے لگتے ہیں ۔ چونکہ یہ لوگ اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں' اس صورت حال سے ہر زندہ شخص متاثر ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ ایسے مغلوبانہ حالات میں بیٹھے ہوئے ہیں اور فرشتے ان کی روح قبض کر رہے ہیں ۔ اب ان کے لئے کوئی موقعہ نہیں رہا ہے کہ وہ اپنے ساتھ انصاف کرتے ہوئے ہجرت کر لیں کیونکہ زندگی کا موقعہ تو ایک ہی بار آتا ہے ۔

اور یہ فرشتے ان کی روح کو خاموشی کے ساتھ قبض نہیں کرتے بلکہ وہ ان کے ماضی کو بھی سامنے لاتے ہیں اور نہایت ہی ناپسندیدہ انداز میں پوچھتے ہیں کہ تم نے اپنی زندگی کے قیمتی ایام کن کاموں میں ضائع کئے؟ دنیا میں ان کا شغل کیا تھا' وہ کیا بلند مقاصد تھے جن کے لئے وہ دوڑ دھوپ کر رہے تھے؟ (قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ (٤: ٩٧)) (تم کن حالات میں رہے)

کیونکہ یہ لوگ جن حالات میں رہے تھے ایسا رہنا تو نقصان ہی نقصان تھا ۔ یعنی ان کے لئے وقت ضائع کرنے کے سوا کوئی اور مشغلہ ہی نہ تھا اور یہ لوگ جن پر حالت نزع طاری تھی حالت نزع میں جواب دیتے ہیں اور نہایت ہی ناپسندیدہ صورت حالات میں نہایت ہی ذلت کے ساتھ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ ان کے لئے معذرت ہو حالانکہ وہ ذلت ہے ۔

(قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ (٤: ٩٧)) (ہم تو زمین میں کمزور لوگ تھے)

ہم کمزور تھے' طاقتور لوگوں نے ہمیں دبا رکھا تھا ۔ ہم ذلیل و خوار تھے ۔ ہمارے ہاتھ میں کچھ نہ تھا ۔ ہر شخص اس بات سے نفرت کرے گا کہ حالت نزع میں اس کے ساتھ یہ مکالمہ پیش آئے اس لئے کہ اس سے ان لوگوں کی انتہائی

بے بسی کا اظہار ہوتا ہے اور یہ کہ وہ پوری زندگی اس طرح بے بس ہو کر گزار گئے اور پھر بھی ملائکہ نے انہیں نہ چھوڑا۔ جب وہ حالت نزع سے دوچار ہوئے تو ان کو یہ کہا گیا کہ تم نے موقعہ سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

(اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا (۴:۹۷)) (کیا اللہ کی زمین بہت وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے۔) حقیقت یہ ہے کہ اس ذلت' مسکنت' فتنے اور کمزوری میں اپنے آپ کو وہ اس لئے مبتلا نہ کر رہے تھے کہ وہ فی الواقعہ ایسے حالات میں تھے اور لاچار تھے بلکہ کچھ اور اسباب تھے جن کی وجہ سے انہوں نے اس ذلت کو قبول کر رکھا تھا۔ وہ لالچی تھے۔ اور دنیاوی مصلحتوں کی وجہ سے وہ ہجرت نہ کر رہے تھے اور اسی وجہ سے وہ دارالکفر میں جمے ہوئے تھے جبکہ دارالاسلام موجود تھا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو تنگی میں رکھ رہے تھے حالانکہ اللہ کی سرزمین وسیع تھی۔ ہجرت وہ کر سکتے تھے اور مشکلات کو وہ برداشت کر سکتے تھے۔

(فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (۴:۹۷)) (یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔)

اس کے بعد مذکورہ بالا انجام سے ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے جو فی الواقعہ مجبور ہیں اور ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ وہ اس صورت حال سے نکل آئیں اور دارالاسلام تک پہنچ جائیں۔ یہ لوگ بچوں' ضعیف بوڑھوں اور عورتوں پر مشتمل ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگوں کے کیسوں پر غور کیا جا سکتا ہے شاید یہ معاف ہو جائیں کیونکہ بظاہر ان کا عذر معقول ہے اور وہ مکہ سے مدینہ منتقل نہیں ہو سکتے۔

(اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا (۹۸) فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا (۹۹)(۴:۹۸-۹۹)) (ہاں جو مرد' عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے' بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے) یہ حکم ابدالاباد تک رہے گا۔ یہ احکام ان حالات تک ہی محدود نہیں ہیں جو اس وقت ایک متعین سوسائٹی میں مکہ مکرمہ میں پائے جاتے تھے بلکہ یہ عام احکام ہیں۔ جس ملک میں بھی کوئی مسلمان اپنے دین کے معاملے میں مشکلات میں مبتلا ہو اور محض اپنی دولت اور جائیداد کی وجہ سے یا رشتہ داروں اور دوستوں کی وجہ سے وہ رہ رہا ہو اور محض اس ڈر سے رہ رہا ہو کہ اگر وہ اس ملک سے نقل مکانی کرے گا تو اسے مشکلات پیش آئیں گی بشرطیکہ دنیا کے کسی حصے میں دارالاسلام قائم ہو۔ اس میں لوگ امن سے رہ رہے ہوں اور اس ملک میں ایسا شخص اپنے عقیدے کا اظہار کھلے بندوں کر سکتا ہو' وہاں وہ اللہ کے احکام اچھی طرح بجا لا سکتا ہو اور اسلامی شریعت کے مطابق پاک زندگی بسر کر سکتا ہو اور شریفانہ اور معزز زندگی گزار سکتا ہو ورنہ وہ مجبور تصور ہو گا۔

---○○○---

سیاق کلام انسانی نفوس کی تربیت کرتے ہوئے مزید آگے بڑھتا ہے۔ وہ لوگ جو ہجرت کی مشکلات سے ڈرتے ہیں اور اس وجہ سے ہجرت کی ہمت نہیں کرتے ایسے لوگوں کے بارے میں آیات سابقہ میں تو ایک نہایت ہی مؤثر اور خوفناک منظر پیش کیا گیا تھا اور مسلمانوں کو اس صورت حال سے متنفر کیا گیا تھا۔ اگلی آیات میں امید کی کرن دکھائی جاتی ہے۔ کوئی ہجرت کرے چاہے دارالاسلام تک پہنچے یا راستے میں مرجائے اور حالت ہجرت میں اس کی موت واقعہ ہو جائے تو فرماتے ہیں کہ گھر سے نکلتے ہی 'اس کا اجر اس کا حق بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اسے بڑی وسعت نصیب ہوگی' وہ آزادی سے زندگی بسر کرے گا اور اسے تنگی اور ترشی سے نجات ملے گی۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾ ع

(جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لئے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لئے بڑی گنجائش پائے گا' اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لئے نکلے' پھر راستہ ہی میں اسے موت آجائے اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا' اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے۔)

اس آیت میں قرآن کریم حیات نفس انسانی کے اندر پیدا ہونے والے متنوع وسوسوں کا مداوا کرتا ہے۔ اس وقت کے موجودہ حالات میں ہجرت کرنے میں مشکلات نظر آتی تھیں اور ایسے ہی وسوسے ہر وقت لوگوں کے سامنے آتے رہتے ہیں' جب بھی کوئی شخص اللہ کی خاطر نکلتا مصائب کا شکار ہو جاتا۔

قرآن کریم ایسے نفوس کی تربیت نہایت ہی واضح طور پر کرتا ہے۔ ان کو صاف صاف بتایا جاتا ہے اور کوئی بات چھپائی نہیں جاتی۔ یہ نہیں کیا جاتا کہ اگر کوئی اقدام کرے تو اس سے پیش آنے والے خطرات کو چھپایا جائے بلکہ سب کچھ بتا دیا جاتا ہے' جن میں موت اور جان تک قربان کرنے کے خطرات شامل ہیں' لیکن قرآن کریم بعض دوسرے حقائق کے ذریعے اہل ایمان کو مطمئن بھی کرتا ہے اور ان حقائق کی ضمانت اللہ تعالیٰ خود دیتے ہیں۔

یہاں کہا جاتا ہے کہ یہ ہجرت فی سبیل اللہ ہے اور اس کے علاوہ کسی اور غرض کے لئے نہیں ہے اور اسلام میں یہی ہجرت معتبر ہے۔ یہ دولت کے لئے نہیں ہے' یہ مشکلات سے بھاگنے کے لئے نہیں ہے' یہ لذات و شہوات حاصل کرنے کے لئے بھی نہیں ہے۔ غرض یہ دنیاوی مقاصد میں سے کسی مقصد کے لئے نہیں ہے اور جو شخص بھی اللہ کی راہ میں اور صرف اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا' اسے دنیا میں بہت بڑی کشادگی ملے گی۔ زمین اس پر تنگ نہ ہوگی۔ رزق کی فراہمی کے معاملے میں بھی اس کے وسائل اور ذرائع محدود نہ ہوں گے اور ایمان اور اخروی نجات تو بہرحال حاصل ہوگی۔

وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيرًا وَّسَعَةً (٤ : ١٠٠)
(جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لئے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لئے بڑی گنجائش پائے گا)

یہ محض نفس انسانی کی کمزوری' اس کا لالچ اور بخل ہے جو اس کے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا کرتا ہے کہ وسائل رزق دنیا کی کسی ایک جگہ کے اندر محدود ہیں اور بعض حالات تک محدود ہیں۔ اگر ان حالات اور ظروف سے کوئی نکل گیا تو اس کا رزق بند ہو جائے گا۔

یہ دراصل رزق اور وسائل حیات کے سلسلے میں ایک نہایت ہی جھوٹا تصور ہے۔ یہی وہ سوچ ہے جس کی وجہ سے انسان ذلت' زیردستی اور دین اور ایمان کے فتنے کو قبول کرتا ہے اور پھر اس کا وہ انجام' وہ برا انجام ہوتا ہے جو ان آیات میں مذکور ہے کہ ملائکہ ایسے لوگوں کی جان لے لیتے ہیں اور وہ اس حال میں ہوتے ہیں کہ اپنے اوپر ظلم کر رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرتے ہیں اچھے انجام کی یقین دہانی کراتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو آزادی ملے گی اور وہ اللہ کی اس دنیا میں بہت ہی وسعت پائیں گے۔ وہ یقیناً دیکھ لیں گے کہ وہ جہاں بھی جائیں گے اللہ انہیں زندہ رکھے گا' رزق دے گا اور آخرت میں نجات دے گا۔

لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ دوران ہجرت ہی داعی اجل کو لبیک کہتے ہیں۔ موت تو ایک برحق واقعہ ہے اور اس کا تعلق اسباب ظاہرہ سے نہیں ہے۔ جب مقررہ وقت آتا ہے تو موت حتماً آتی ہے۔ چاہے کوئی قیام کرے یا ہجرت کرے۔ وہ نہ مقدم ہوتی ہے اور نہ مؤخر۔

ہاں یہ اور بات ہے کہ انسانی سوچ ظاہری ظروف واحوال کے اندر ہی رہتی ہے۔ اس کی نظر میں موت کے ظاہری اسباب ہوتے ہیں۔ اسلامی نظام ان کو بھی سامنے رکھ کر بات کرتا ہے' چنانچہ کہا جاتا ہے کہ راہ خدا میں گھر سے نکلتے ہی اللہ پر اجر لازم ہو جاتا ہے اور ایسے شخص کو مکمل ثواب ملے گا۔

(وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (٤ : ١٠٠)) (اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لئے نکلے' پھر راستہ ہی میں اسے موت آجائے اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا) ایسے شخص کو پوری تنخواہ ملے گی' ہجرت کا اجر' سفر کا اجر' دار الاسلام میں پہنچنے اور تمام مشکلات جو وہاں تھیں ان سب کا اجر اسے ملے گا۔ اس کا ضامن اللہ ہے' لیکن اس اجر کی ایسی ضمانت کے ساتھ یہ اشارہ بھی دیا جاتا ہے کہ اس کے گناہ بھی بطور پنشن اور الاؤنس معاف ہو سکتے ہیں اور مزید انعامات بھی مل سکتے ہیں۔ یہ تمام مراعات اصل تنخواہ کے علاوہ ہیں۔

( وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (٤ : ١٠٠)) (اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے) بے شک یہ نہایت ہی نفع بخش سودا ہے۔ اس میں ایک مہاجر فی سبیل اللہ پوری قیمت وصول کر لیتا ہے۔ جونہی وہ قدم رکھتا ہے اور اللہ کی راہ میں نکلتا ہے اسے اجر ملتا ہے۔ موت تو موت ہے اس کا جب وقت آتا ہے تو اس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔ ہجرت کرنے اور کسی جگہ جمے رہنے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ایک ہی جگہ جم جائے تو بھی موت آئے گی

اور سودے میں اسے نقصان ہو گا۔ اسے کوئی اجر اور بخشش نہ ملے گی بلکہ ملائکہ اسے ظالم سمجھتے ہوئے اس کی روح قبض کر لیں گے ..... دونوں حالتوں اور دونوں سودوں کے درمیان کس قدر فرق ہے؟ اور دونوں کا انجام کس قدر مختلف ہے؟۔

اس پورے سبق سے نتائج کیا نکلتے ہیں؟ اس سے ہمیں مختلف نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ اس سبق کے دوسرے موضوعات پہ کلام ہو ذرا ان نتائج پر غور و فکر مکمل کر لیا جائے تو اچھا ہے۔

۱۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت نہ کرنے کو بہت ہی برا سمجھتا ہے۔ نیز اسلام اسلامی جماعت سے علیحدہ اور دور رہنے کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا' الا یہ کہ کوئی عذر ہو اور عذر یہ ہو کہ کوئی ہجرت کے سفر پر قادر نہ ہو یا اس کے لئے کوئی راستہ نہ ہو۔

۲۔ اس سبق سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظریہ حیات کے اندر جہاد فی سبیل اللہ کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اور اسلامی نظام کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ عمل جہاد کو جاری رکھے۔ شیعہ مکتب فکر تو جہاد کو ارکان اسلام میں سے ایک رکن شمار کرتا ہے کیونکہ اس کے حق میں بڑے قوی قرآنی دلائل ہیں' جس سے ان کے مسلک کی توضیح اور تفسیر ہوتی ہے۔ اگر یہ حدیث نہ ہوتی جس کا مضمون ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے تو ان کا مسلک درست ہوتا۔ اس کے خلاف کوئی دلیل نہ ہوتی۔ لیکن اسلام میں جہاد پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اسلامی زندگی کے خطرات کے وقت اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔ ہر دور اور ہر جگہ اس کی ضرورت پڑتی رہتی ہے اور اس کی ضرورت اسلام کا نہایت ہی فطری تقاضا ہے۔ محض وقتی حالات کی وجہ سے نہیں ہے اس لئے کہ تمام دلائل و شواہد یہ بتاتے ہیں کہ اسلام میں جہاد ایک اساسی اور بنیادی فریضہ ہے۔

۳۔ اس سبق سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان بہرحال انسان ہی ہوتا ہے۔ نفس انسانی کے سامنے بعض اوقات مشکلات کا ہجوم ہو جاتا ہے۔ کبھی انسان خطرات سے ڈر جاتا ہے' کبھی وہ مشکلات کو دیکھ کر سست ہو جاتا ہے اور یہ کمزوریاں انسان سے نہایت ہی صالح ترین سوسائٹیوں اور خیرالقرون میں بھی صادر ہوتی رہتی ہیں۔ لہٰذا کمزوریوں کا مداوا کرنے کے معاملے میں کبھی بھی ہمیں مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس معاملے میں جہد مسلسل جاری رہنی چاہئے۔ لوگوں کو آمادہ کرنا چاہئے۔ ان کو انجام کار کامیابی کے امکانات بھی دکھانے چاہئیں۔ وعظ و ارشاد ہروقت جاری رہنا چاہئے اور یہ کام قرآن کے حکیمانہ اسلوب کے مطابق ہونا چاہئے۔

۴۔ سب سے آخر میں اس سبق سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم اس زندگی کی اصلاح کے لئے کس طرح جدوجہد کر رہا تھا۔ اور اس کے سامنے کس قدر واقعی مشکلات تھیں اور ان مشکلات میں قرآن نے اسلامی معاشرے کی قیادت کس طرح کی۔ قرآن کو جس معرکے کا سامنا تھا وہ ہر میدان میں جاری تھا۔ پہلا میدان نفس انسانی تھا۔ اس کی فطرت' اس کا مزاج اور اس کے اندر موجود جاہلی دور کی کمزوریاں وغیرہ' تو ہمیں یہ بھی غور کرنا چاہئے کہ ہم قرآن کا مطالعہ کس اسلوب کے ساتھ کریں اور جب ہم انسانی نفس اور زندگی کے واقعی حالات و مشکلات کے اندر دعوت الی اللہ دیں تو کس طرح دیں۔

اس کے بعد مہاجرین اور دوسرے مسافروں کے لئے نماز کے اندر قصر کرنے کی اجازت کا بیان آتا ہے۔ سفر چاہے جہاد کے لئے ہوں یا تجارتی سرگرمیوں کے لئے ہوں' نیز حالت خوف میں بھی قصر کی اجازت ہے' یعنی ایسے حالات میں دشمن حملہ

کر کے انہیں قید نہ کر لے اور اس طرح وہ فتنے میں مبتلا نہ ہو جائیں - یہ قصر اس قصر سے علیحدہ ہے جو محض سفر کی وجہ سے ہوتی ہے - یہ خاص قصر ہے اور حالت خوف سے متعلق ہے -

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَوٰةِ ۖ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ الْكَٰفِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا ﴿١٠١﴾

(اور جب تم لوگ سفر کے لئے نکلو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر نماز میں اختصار کر دو (خصوصاً) جبکہ تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے کیونکہ وہ کھلم کھلا تمہاری دشمنی پر تلے ہوئے ہیں)۔

جو شخص مسافر ہو' اسے اپنے رب کے ساتھ دائمی تعلق کی ضرورت ہے' تاکہ اللہ اس پر سفر کی مشکلات میں آسانیاں پیدا کر دے - اس کی تیاریوں میں اس کی امداد ہو' سامان سفر فراہم ہو اور راستے کی مشکلات اللہ اس کے لئے آسان کر دے - نماز تعلق باللہ کا مؤثر ترین ذریعہ ہے - اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ مشکلات اور تکالیف میں نماز سے امداد حاصل کریں - جب خوف کا مقام ہو اور جب زندگی کی مشقتوں کا سامنا ہو تو حکم ہے کہ نماز سے معاونت حاصل کرو - (وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ) (نماز اور صبر کے ذریعے اللہ کی امداد طلب کرو)۔

یہی وجہ ہے کہ سفر و جہاد کے اس موضوع کے متصلاً بعد للہ تعالیٰ نے نماز کا ذکر کیا - ایسے حالات میں نماز ایک مومن کا نہایت ضروری ہتھیار ہوتی ہے - اگر کسی کو راستے میں خوف اور خطرے کے حالات درپیش ہوں تو ایسے حالات میں اسے صرف اللہ کی یاد سے اطمینان ہوتا ہے - جو شخص اپنے ملک کو چھوڑتا ہے اس کے لئے اللہ کی درگاہ میں پہنچ جانا ہی باعث اطمینان ہوتا ہے - ہاں یہ بات اپنی جگہ ہے کہ کامل نماز اور پورے رکوع اور سجود کے ساتھ نماز کی وجہ سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک مومن پر دشمن حملہ آور ہو جائیں جو کہیں قریب ہی چھپے ہوں - اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دشمن اسے پہچان لیں - اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ طویل رکوع اور سجود میں اسے پکڑ لیں' چنانچہ جو لوگ جہاد کے لئے نکلیں ان کے لئے جائز ہے کہ وہ خوف کے وقت نماز کو مختصر کر دیں -

یہاں قصر کے مفہوم اور تفسیر میں ہم اسی بات کو ترجیح دیتے ہیں جسے جصاص نے لیا ہے کہ اس قصر سے مراد رکعات میں قصر نہیں ہے اس لئے کہ یہ تو مطلق مسافر کے لئے جائز ہے خواہ حالت خوف ہو یا نہ ہو' بلکہ سفر میں تو قصر لازمی ہے - جس طرح حضور اکرم ؐ نے قصر فرمائی اور ہر سفر میں فرمائی' اس لئے کہ سفر میں راجح اقوال کے مطابق پوری رکعات پڑھنا جائز ہی نہیں ہے -

لہٰذا یہاں حالت خوف میں قصر سے مراد بالکل دوسری ہوگی اور یہ قصر مسافر کی قصر سے مختلف ہوگی - یہ قصر نماز کی کیفیت میں ہوگی مثلاً رکوع' سجود اور قیام میں نہایت ہی سکون سے یہ ارکان سرانجام دینے میں قصر ہوگی - یوں حالت

خوف میں مسافر کے لئے چلتے ہوئے سواری کی حالت میں اور صرف اشارے سے بھی نماز جائز ہوگی اور اس طرح وہ اپنے رب کے ساتھ جڑا ہوا رہے گا۔ حالت خوف اور حالت فتنہ میں بھی وہ اس ضروری ہتھیار سے مسلح ہوگا اور دشمن کے مقابلے میں محتاط بھی ہوگا اس لئے کہ (اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا (۴: ۱۰۱)) (بے شک کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں)۔

---ooo---

مسافر اور مجاہد کی نماز میں حالت خوف میں قصر کے حکم کے بعد اور اسی مناسبت سے معرکہ کارزار میں اب صلوۃ الخوف کا حکم بھی یہاں دیا جاتا ہے۔ اس خالص فقہی حکم کے اندر بھی نفسیاتی اور تربیتی اشارات کا وافر ذخیرہ دستیاب اور موجود ہے۔

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۣ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَاۗىِٕكُمْ ۠ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۰۲﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾

(اور اے نبی' جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور (حالت جنگ میں) انہیں نماز پڑھانے کھڑے ہو تو چاہئے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور اپنے اسلحہ لئے رہے' پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے آ کر تمہارے ساتھ نماز پڑھے اور وہ بھی چوکنا رہے اور اپنے اسلحہ لئے رہے' کیونکہ کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ البتہ اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو تو اسلحہ رکھ دینے میں مضائقہ نہیں' مگر پھر بھی چوکنے رہو۔ یقین رکھو کہ اللہ نے کافروں کے لئے رسواکن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو اور جب اطمینان نصیب ہو جائے تو پوری نماز پڑھو۔ نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندی وقت کے ساتھ اہل ایمان پر لازم کیا گیا ہے)۔

جو شخص قرآن کے اسرار و رموز پر غور کرتا ہے اور جو شخص ربانی منہاج تربیت میں فکر کرتا ہے خصوصاً اس سبق پر' تو اس پر عجیب اسرار و رموز کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس سبق کے اندر ایسے لمحات فکر و احساس آتے ہیں جن کا اثر انسان کی روح کی گہرائیوں تک جا اترتا ہے۔ ذرا میدان معرکہ کی ایک جھلکی ملاحظہ فرمائیں :

قرآن کریم کی یہ آیت محض ایک فقہی اور قانونی مسئلہ نہیں بیان کرتی کہ صلوۃ الخوف اس طرح ہو گی' اس کے اندر تعلیم و تربیت کا بے شمار سامان ہے جس کے ذریعے ایک انقلابی جماعت کی اخلاقی تربیت ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ اسے انقلابی عمل سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے۔

اس آیت سے جو پہلی بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں نماز کی اس قدر اہمیت ہے کہ میدان کارزار کے اندر بھی نماز کو نہیں چھوڑا جاتا اور یہ بات ایمانی نقطہ نظر سے بالکل واضح ہے کہ نماز میدان کارزار کے اندر ایک بہترین ہتھیار ہے بلکہ یہ سب ہتھیاروں سے زیادہ اہم ہے اور ہر معرکے کے اندر اس ہتھیار سے فائدہ اٹھانا بہت ہی ضروری ہے۔ اس معرکے کے مزاج اور اس کی فضا کے ساتھ نماز کا گہرا تعلق ہے۔

یہ ابتدائی دور کے اسلامی دستے جن کی تربیت ربانی اور قرآنی منہاج کے ساتھ کی گئی تھی' وہ اپنے دشمن کا مقابلہ اس اسلحہ کے ساتھ کرتے تھے جس میں وہ دشمن پر فوقیت رکھتے تھے۔ وہ اپنے دشمنوں پر یہ فوقیت رکھتے تھے کہ وہ صرف ایک الٰہ وحدہ لاشریک کو مانتے تھے۔ انہوں نے اپنے رب کو اچھی طرح پہچان لیا تھا اور ان کو یہ احساس پوری طرح حاصل ہوتا تھا کہ ان کا وہ الہ پوری طرح ان کے ساتھ شریک جنگ ہے۔ وہ مقصدیت کے اعتبار سے بھی دشمن پر فوقیت رکھتے تھے۔ ان کا نصب العین بلند تھا اور وہ بھی اسے سب سے اونچا ہدف سمجھتے تھے۔ ان کا تصور کائنات' تصور حیات اور تصور غایت وجود انسانی ہر دشمن کے مقابلے میں بلند تھا۔ اس برتر نظام زندگی کے تحت ان کی جو تنظیم وجود میں آئی تھی اس میں بھی وہ دشمن کے مقابلے میں برتر تھے۔ میدان جنگ میں نماز ان تمام برتریوں کا اشارہ تھی اور ہر وقت ان کو یہ سبق اور شعور یاد دلاتی تھی کہ وہ برتر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نماز میدان کارزار میں ان کے لئے ایک اعلیٰ ترین اسلحہ تھی بلکہ ان کا انحصار ہی اس اسلحہ پر تھا۔

دوسری بات جو ان آیات کے ضمن میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اہل ایمان روحانی طور پر تیار اور بیدار ہیں اور دشمن کے مقابلے میں کھڑے ہیں۔ دشمن بھی گھات میں بیٹھا ہے اور اہل ایمان کی طرف سے غفلت کی ایک مختصر سی گھڑی کے انتظار میں ہے کہ ذرا وہ غافل ہو اور وہ ان کا اسلحہ اور سازوسامان سب پر قبضہ کر کے اچانک حملہ آور ہو جائے۔ اس تنبیہ'

ڈراوے اور ثابت قدمی اور اطمینان کی تلقین کے ساتھ ہی بتایا جاتا ہے کہ جن لوگوں سے تمہارا مقابلہ ہے ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک توہین آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے ۔ایک طرف سے سخت حکم ہے کہ حالت بیداری اور تیاری میں رہو اور دوسری طرف یہ یقین دہانی ہے کہ مطمئن رہو' ایک طرف سخت حساس اور چوکنا رہنے کی ہدایت اور دوسری جانب سے پورا اطمینان ۔یہ ہے وہ منہاج جس کے مطابق اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو تربیت دیتے ہیں اس لئے کہ دشمن سخت مکار ہے اور وہ اوچھے ہتھکنڈے اختیار کر سکتا ہے ۔

صلوٰۃ الخوف کی کیفیت میں فقہاء کا اختلاف ہے ۔یہ مسائل انہوں نے اسی آیت سے لئے ہیں ۔ہم صرف عام کیفیت بیان کریں گے اور فقہی تفصیلات میں نہیں جائیں گے ۔

(وَ اِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآءِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ اَسْلِحَتَهُمْ (٤ : ١٠٢))

(اور اے نبی' جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور (حالت جنگ میں) انہیں نماز پڑھانے کھڑے ہو تو چاہئے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور اپنے اسلحہ لئے رہے' پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے آکر تمہارے ساتھ نماز پڑھے اور وہ بھی چوکنا رہے اور اپنے اسلحہ لئے رہے)

مطلب یہ ہے کہ آپ موجود ہوں اور ان کے لئے امامت کر رہے ہوں تو ان میں سے ایک فریق آپ کے پیچھے پہلی رکعت پڑھ لے اور دوسرا فریق اسلحہ لے کر چوکیداری کرے اور جب پہلا فریق رکعت پڑھ لے تو پھر وہ چلا جائے اور چوکیداری پر بمعہ اسلحہ کھڑا ہو جائے اور دوسرا آجائے اور وہ آپ کے پیچھے ایک رکعت پڑھ لے ۔اس طرح آپ کی نماز تمام ہو جائے گی اور آپ سلام پھیر لیں گے ۔

اس کے بعد پہلا فریق آئے گا اور اس کی جو ایک رکعت رہتی ہے وہ پڑھ لے گا اور چلا جائے گا ۔یہ ایک رکعت اکیلی ہو گی' پھر یہ فریق جائے' چوکیداری پر کھڑا ہو اور دوسرا فریق آئے اور اس کی جو ایک رکعت رہ گئی وہ پڑھے جبکہ پہلا فریق چوکیداری کرے ۔

اس طرح دونوں فریق امام کے ساتھ نماز پڑھ لیں گے 'رسول اللہ ؐ کی امامت میں اور آپ کے بعد جو خلفاء اور امراء آئیں گے ان کے لئے بھی یہی حکم ہے ۔

(وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً (٤ : ١٠٢)) (کیونکہ کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں)

کفار کی جانب سے مومنوں کے خلاف یہ ایسی خواہش ہے جو ہمیشہ ان کے دلوں میں پائی جاتی ہے ۔ ماہ و سال گزر رہے ہیں، صدیاں بیت گئی ہیں اور آج بھی کفار کی خواہش یہی ہے، یہ ہے وہ حقیقت جو اللہ تعالیٰ نے پہلی جماعت مومنہ کے دل میں بٹھائی تھی اور آج بھی اسی کی تاکید ہو رہی ہے ۔ یہ درست ہے کہ اللہ اس وقت ان لوگوں کے لئے جنگی اسکیم تیار فرماتا تھا لیکن صلوۃ الخوف میں، جس طرح کہ ہم نے سمجھا، ہمارے لئے بھی جنگی اسکیم موجود ہے ۔

یہ احتیاط اور یہ نفسیاتی تیاری اور یہ مسلسل ہتھیار بند رہنا ہر وقت لازمی نہیں ہے، نہ مناسب ہے کہ مسلمانوں کو محض مشقت میں ڈالنے کے لئے دائمی حکم دیا جائے لیکن جس قدر ان سے ہو سکے وہ ایسا کریں ۔

(وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى اَنْ تَضَعُوْا اَسْلِحَتَكُمْ (٤ : ١٠٢)) (البتہ اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو تو اسلحہ رکھ دینے میں مضائقہ نہیں) ایسے حالات میں اسلحہ اٹھانا مشکل ہوتا ہے، اور مفید بھی نہیں ہوتا ۔ محض احتیاط ہی کافی ہوتی ہے ۔ اور اللہ کی مدد پر بھرپور اعتماد ۔

( وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا (٤ : ١٠٢)) (مگر پھر بھی چوکنے رہو یقین رکھو کہ اللہ نے کافروں کے لئے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے) ممکن ہے کہ یہی احتیاط، یہی بیداری اور یہی پاسداری اہل کفر کے عذاب کا وسیلہ بن جائے، جو اللہ نے ان کے لئے تیار کیا ہے اور سخت توہین آمیز ہے ۔ اس طرح اہل ایمان اللہ کی قدرت کا ذریعہ بن جائیں اور اللہ کی مشیت ان کے ذریعے پوری ہو ۔ مذکورہ بالا احتیاط کے ساتھ ساتھ یہ اہل ایمان کے لئے مژدۂ اطمینان ہے ۔ اس لئے کہ اہل ایمان کو پورا یقین تھا کہ دشمنان اسلام کے خلاف اللہ ان کا مددگار ہے اور دشمنان اسلام کے لئے توہین آمیز عذاب مقدر ہے ۔ اور ہو سکتا ہے کہ وہی دست قدرت ہوں ۔

(فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (٤ : ١٠٣)

(پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے، ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو ۔ اور جب اطمینان نصیب ہو جائے تو پوری نماز پڑھو، نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندی وقت کے ساتھ اہل ایمان پر لازم کیا گیا ہے) ۔ حکم دیا جاتا ہے کہ ہر حال میں دلوں کو اللہ کے ساتھ جوڑے رکھو، نماز میں بھی اور نماز سے باہر رہتے ہوئے بھی اس لئے کہ تعلق باللہ سب سے بڑی جنگی تیاری ہے اور وہ ہتھیار ہے جو کبھی زنگ آلود نہیں ہوتا ۔

اطمینان اور امن کے وقت حکم یہ ہے کہ نماز پوری کی پوری بمع جملہ ارکان اطمینان کے ساتھ ادا کرو اور اس میں قصر نہ کرو جیسا کہ کہا گیا اس لئے کہ قصر کی رخصت کچھ حالات کے تحت تھی ۔ اس لئے کہ نماز ایک ایسا فریضہ ہے جسے مقررہ وقت پر ادا کرنا لازمی ہے اور جب حالت خوف نہ رہے تو اس کی ادائیگی اسی طرح ہوگی جس طرح عام طور پر ہوتی ہے ۔

”نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندی وقت کے ساتھ اہل ایمان پر لازم کیا گیا ہے“ کے الفاظ سے ظاہریہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر نماز قضا ہو جائے تو پھر اس کی ادائیگی نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک قضا نماز پڑھنے سے فرض ادا نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں فرض نماز وقت مقررہ کے بعد نہیں ہوتی۔ اگر وقت چلا جائے تو پھر نماز پڑھنے اور ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ ادا ہو جاتی ہے۔ ہاں قضا کی ادائیگی بہت جلدی ہونا چاہئے اور خواہ مخواہ تاخیر کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مزید فروعی اختلافات میں ہم دخل اندازی نہیں کرتے۔

---○○○---

اب اس سبق کا خاتمہ قریب ہے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ جہاد کا عمل جاری رکھو' اگرچہ تمہیں رنج و الم کا سامنا کرنا پڑے اور وہ تمہارے لئے مشقت اور تھکاوٹ کا باعث ہو۔ ایک ایسا تیز احساس دلایا جاتا ہے اور اس قدر تیز جھٹکا دیا جاتا ہے کہ یہ احساس دلوں تک اتر جاتا ہے اور یہ احساس دلوں کی گہرائیوں تک اتر کر انسانی ضمیر کو روشن کرتا ہے اور اسی روشنی میں مقاصد اور رجحانات اور نصب العین متعین ہوتے ہیں۔

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ۖ إِن تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ ۖ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٠٤﴾

(اس گروہ کے تعاقب میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ اگر تم تکلیف اٹھا رہے ہو تو تمہاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں اور تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں ہیں۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور وہ حکیم و دانا ہے) یہ معدودے چند الفاظ ہیں' جن میں دو ٹوک اور واضح خطوط کھینچ دیے گئے ہیں' یہ بتاتے ہیں کہ ایک مومن کی راہ کس قدر طویل اور پرمشقت ہے۔ مومنین ہمیشہ چکی کے دو پاٹوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ بے شک اس دائمی معرکے میں وہ رنج و الم اور گہرے زخم پاتے ہیں لیکن وہ یہ سوچیں کہ کیا یہ تکالیف صرف ان پر ہی آئی ہیں یا دشمنوں کو بھی انہی جیسی تکالیف سے سابقہ درپیش ہے۔ دشمن بھی تو رنج و الم سے دوچار ہوتے ہیں۔ انہیں بھی تو زخم آتے ہیں۔ لیکن تم دونوں میں فرق یہ ہے کہ اہل ایمان تو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور اللہ سے شاندار جزا کے امیدوار ہیں اور ان کے دشمنوں کی حالت یہ ہے کہ وہ بے مقصد اور بے فائدہ جنگ لڑ رہے ہیں' وہ اللہ کے سامنے تو کچھ لے کر جانے والے نہیں' نہ انہیں اس دنیا میں اللہ کی جانب سے کوئی امید ہے اور نہ آخرت میں کوئی توقع ہے..... پس اگر کفار اس معرکے پر مصر ہیں تو مسلمانوں کے لئے تو مناسب ہے کہ وہ اس سے زیادہ اصرار کریں۔ اگر کفار اس معرکے میں گہرے زخم برداشت کرتے ہیں تو اہل اسلام کو چاہئے کہ وہ ان سے زیادہ زخم کھاتے جائیں اور صبر کریں۔ اور ان کو چاہئے کہ وہ ان اہل کفار کا پیچھا کریں' جہاد و قتال جاری رکھیں اور انہیں اس حالت تک پہنچا دیں کہ ان کی قوت ٹوٹ جائے اور وہ کسی مسلمان کے دین اور جان و مال کے لئے فتنہ نہ رہیں۔

ہر جدوجہد میں نظریہ حیات برتر رہتا ہے۔ بعض ایسے لحات بھی آتے ہیں کہ مصائب انسان کی قوت برداشت سے بڑھ جاتے ہیں۔ درد ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں مومن کو خاص زادو عتاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کا فیضان سرچشمہ ایمان اور نظریہ سے ہوتا ہے اور یہ اللہ کی یاد ہوتی ہے جو ہر زخم کے لئے بہتر مرہم ہوتی ہے۔

یہ ہدایات' اس وقت ایک متوازن اور برابری کی جنگ کے اندر دی جارہی تھیں۔ اس میں فریقین برسرپیکار تھے۔ دونوں کا رنج والم سے سابقہ تھا اور دونوں اسلحہ بند تھے...... لیکن اہل ایمان پر ایسا وقت بھی آسکتا ہے جس میں معرکہ متوازن نہ ہو' کھلی جنگ نہ ہو رہی ہو' ایسے حالات میں بھی یہی اصول ہے۔ باطل اہل اسلام کو کبھی بھی برداشت نہیں کرتا۔ اگرچہ باطل غالب ہو اور اسلامی عقیدہ مغلوب ہو اس لئے کہ باطل کے اندر ایک تضاد پایا جاتا ہے۔ اس داخلی تضاد کی وجہ سے وہ بے چین ہوتا ہے۔ وہ خود اپنے اندرون کی کشمکش سے دوچار ہوتا ہے پھر وہ فطرت انسانی اور فطرت اشیاء کے ساتھ بھی برسرپیکار ہوتا ہے۔

گروہ مومن کی راہ ایسے حالات میں بھی یہی ہے کہ وہ برداشت کرے اور ہمت نہ ہارے۔ اسے یہ حقیقت پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اگرچہ وہ مصائب کا شکار ہے' لیکن اس کا دشمن اندرونی تضاد کے روگ کا بیمار ہے۔ روگ کی بھی تو قسمیں ہیں۔ دلی چرکے بدن کے زخموں سے زیادہ گہرے ہوتے ہیں اور دشمن کو ایسے زخم آتے ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتے۔ (وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ (٤: ١٠٤) (اور تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں) اور یہ وہ مرہم ہے جو دشمن کو میسر نہیں ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے دونوں فریقوں کی راہیں جدا ہوتی ہیں اور اس بات کو اچھی طرح اللہ جانتا ہے۔ (وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (٤: ١٠٤) اللہ کو معلوم ہے کہ دلوں اور جذبوں کا مداوا کیا ہے اور ان کے ساتھ ڈیلنگ کس طرح ہوتی ہے اور دلوں کے زخموں کا علاج کیا ہے' روح کی مرہم کیا ہے؟ جس سے اہل کفر بے خبر اور محروم ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۳۹ ایک نظر میں

ان آیات میں ایک ایسی کہانی کی طرف اشارہ ہے جس کی کوئی مثال اس کرۂ ارض پر نہیں ملتی بلکہ انسانیت کی تاریخ میں اس کے ساتھ ملتی جلتی کوئی مثال نہیں ہے ۔ یہ مثال بھی شاہد عادل ہے کہ یہ دین من جانب اللہ ہے اور لازماً من جانب اللہ ہے ۔ اس لئے کہ انسانوں کا تصور انصاف اور عدالت جس قدر بھی بلند ہو' ان کی روح جس قدر بھی صاف ہو جائے اور ان کا مزاج جس قدر بھی صراط مستقیم پر قائم ہو وہ اپنے آپ کو اس مقام بلند تک نہیں پہنچا سکتے 'جس کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے ۔ یہ کام صرف وحی الہی کے ذریعے ہی ممکن ہے ۔ انسانی تاریخ کے افق پر کھینچا جانے والا یہ گراف اس قدر اونچا ہے کہ اس مقام تک انسانیت صرف اسلامی نظام زندگی کے زیر سایہ ہی پہنچ سکی اور آئندہ بھی یہ سربلندی صرف اسلامی نظام ہی کے زیر سایہ نصیب ہو سکتی ہے ۔

یہ واقعہ اس وقت ہوا جب مدینہ کے یہودی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وہ تمام زہریلے تیر اور ہتھیار استعمال کر رہے تھے جو ان کے ترکش میں موجود تھے اور جس کی تفصیلات اس سورہ 'سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران میں بیان ہو چکی ہیں ۔ حالات ایسے تھے کہ یہودی اسلام کے خلاف ہر قسم کا جھوٹا پروپیگنڈا کر رہے تھے ۔ وہ مشرکین کا ایک محاذ اسلام کے خلاف بنا رہے تھے اور مشرکین کی حوصلہ افزائی کرتے تھے ۔ ان کے لئے راہ ہموار کرتے تھے' پروپیگنڈے میں جھوٹی خبریں اڑاتے تھے' لوگوں کے ذہنوں کو خراب کرتے تھے ۔ حضور ؐ کی قیادت کی توہین کرتے تھے' وحی اور رسالت میں شکوک پیدا کرتے تھے ۔ وہ اسلامی معاشرے میں اندر سے انتشار پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے اور رات دن اس کام میں لگے ہوئے تھے کہ اسلام کے دشمنوں کو جمع کر کے مسلمانوں پر حملہ کرا دیں ۔ تحریک اسلامی مدینہ میں بالکل نئی تھی' اور انسانوں کے نفوس کے اندر ابھی تک جاہلیت کے آثار موجود تھے ۔ بعض مسلمانوں اور یہودیوں اور مشرکوں کے درمیان ابھی تک رشتہ داری اور دوسرے روابط بھی قائم تھے اور یہ تمام امور اسلامی صفوں کے لئے خطرے کا باعث تھے ۔

ایسے مشکل' خطرناک' اور ہنگامی حالات میں یہ آیات نازل ہوئیں اور رسول اللہ ؐ اور مسلمانوں کو یہ سخت ہدایات دی گئیں ۔ مقصد یہ تھا کہ ایک یہودی ملزم کے ساتھ انصاف کرو' اس پر چوری کا الزام جھوٹا ہے اور جن لوگوں نے جھوٹا الزام لگایا ہے ان کا فرض ہے کہ وہ اس کی تلافی کریں ۔ یہ مدینہ کے انصار کا ایک گھرانا تھا ۔ انصار ان دنوں رسول اللہ ؐ کا سرمایہ تھے' جو ان تمام یہودی سازشوں کے مقابلے میں آپ کے حامی و مددگار تھے اور آپ ؐ کی رسالت اور دین کے معاون تھے ۔

رواداری' سربلندی اور عدل و انصاف کا یہ کس قدر اونچا معیار ہے ۔ اس کی تعریف و توصیف کے لئے تو الفاظ نہیں ملتے ۔ تمام باتیں' تمام تبصرے اور تمام تشریحات اس معیار اور سطح سے نیچے رہ جاتی ہیں ۔ اس سطح اور معیار تک انسانی طاقتیں

اپنی کوشش نہیں پہنچ سکتیں ' صرف انسان یہ معجزہ نہیں دکھا سکتے ' یہ تو اسلامی منہاج کی قیادت اور راہنمائی ہے جو کسی انسان کو اس مقام بلند تک پہنچا سکتی ہے ۔

وہ کہانی جو ان آیات کے پس منظر کے سلسلے میں بیان ہوئی اور جسے متعدد مصادر نے نقل کیا ہے ' مناسب ہے کہ انصار سے سنی جائے ۔ قتادہ ابن النعمان اور ان کے چچا رفاعہ دونوں نے حضور ؐ کے ساتھ بعض غزوات میں جنگ فرمائی ۔ ان میں سے ایک کی زرہ گم ہوگئی ( رفاعہ کی ) ۔ عام طور پر انصار کے ایک خاندان بنو ابیرق کے ایک شخص کے بارے میں یہ شبہ ہونے لگا کہ اس نے یہ زرہ چوری کی ہے ۔ مالک نے حضور ؐ کے پاس یہ رپورٹ درج کرائی کہ طعمہ ابن ابیرق نے میری زرہ چرائی ہے ۔ بعض روایات میں بشیر ابن ابیرق کا نام آتا ہے ۔ اس کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ وہ صحابہ کرام کی ہجو میں اشعار لکھتا اور مشہور کرتا کہ یہ فلاں عرب شاعر کے ہیں ۔ جب چور کو معلوم ہوا کہ اس کے خلاف رپورٹ ہو چکی ہے تو اس نے جلدی سے یہ زرہ ایک یہودی زید ابن سمین کے گھر پھینک دی اور اپنے خاندان کے بعض لوگوں سے کہا کہ میں نے زرہ غائب کر دی ہے اور فلاں کے گھر میں پھینک دی ہے اور یہ جلد ہی اس کے گھر سے برآمد ہوگی ۔ تم رسول اللہ ؐ کے پاس جاؤ اور یہ کہو کہ ہمارے بھائی تو بے گناہ ہیں اور فلاں شخص چور ہے اور ہم نے ... اس سلسلے میں معلومات جمع کر لی ہیں ۔ آپ بر سر عام ہمارے آدمی کی برأت فرمائیں اور اس کی صفائی فرما دیں اس لئے کہ اگر اسے آپ کے ذریعے اللہ نے باعزت طور پر بری نہ کیا تو اس کی عزت خاک میں مل جائے گی ۔

جب حضور ؐ کو معلوم ہوا کہ فی الواقعہ زرہ یہودی کے گھر سے برآمد ہوگئی ہے تو آپ نے مجمع میں اعلان کر دیا کہ ابن ابیرق بے گناہ ہے ' اس لئے کہ اس کے خاندان نے حضور ؐ سے درخواست کی تھی کہ قتادہ ابن النعمان اور ان کے چچا ہمارے ایک مسلمان خاندان کے گھر آئے اور اسے چوری کا ملزم بنا دیا اور یہ کام انہوں نے بغیر کسی ثبوت اور شہادت کے کیا ۔ قتادہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ؐ کے پاس آیا ۔ میں نے آپ ؐ سے بات کی تو آپ ؐ نے فرمایا : "تم نے جان بوجھ کر ایک ایسے خاندان کے خلاف چوری کا الزام عائد کر دیا جن کا اسلام اور نیکی مشہور و معروف ہیں اور بغیر ثبوت کے" ۔ میں واپس ہوگیا ' لیکن میری حالت یہ تھی کہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر میری تمام دولت چلی جاتی اور میں حضور ؐ سے بات نہ کرتا تو کتنا اچھا ہوتا ۔ اس پر میرے چچا رفاعہ آئے تو مجھے کہا بھتیجے ! یہ تو نے کیا کیا ؟ تو میں نے اسے یہ بات بتائی جو حضور ؐ نے کہی تھی ۔ تو رفاعہ نے کہا اللہ ہی مددگار ہے ۔ اس پر زیادہ وقت نہ گزرا کہ یہ آیات نازل ہوئیں ۔

(إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتَٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرَٰكَ اللَّهُ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ( ٤ : ١٠٥ )) یعنی آپ بنی ابیرق کے لئے وکیل صفائی نہ بنیں ۔ "خصیم" کے معنی وکیل ' دفاع کرنے والے اور کسی کی جانب سے مجادلہ اور مباحثہ کرنے والے کے ہوتے ہیں ۔ آپ نے قتادہ کو جو کچھ کہا اس سے اللہ کی مغفرت طلب کریں ' بے شک اللہ غفور الرحیم ہے ۔ مزید یہ آیات ۔ ( وَلَا تُجَادِلْ ) سے ( رَحِيمًا ) تک .... اگر وہ معافی چاہتے تو اللہ ان کو معاف کر دیتا ..... اسی طرح ( وَمَن يَكْسِبْ ) سے ( إِثْمًا مُّبِينًا ) تک اور ( وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ ) سے ( أَجْرًا عَظِيمًا ) تک ..... جب یہ آیات نازل ہوئیں تو حضور ؐ زرہ لے کر آئے اور رفاعہ کو دے

دی ۔ قتادہ کہتے ہیں کہ جب میرے چچا کے پاس زرہ پہنچی ' وہ بوڑھے تھے اور جاہلیت ہی میں ان کی نظر ختم ہو گئی تھی ۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ مجبور ہو کر مسلمان ہو گئے ہیں ۔ جب میں نے ان کو زرہ دی تو انہوں نے کہا یہ اللہ کی راہ میں ہو گئی ۔ یہاں سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ صحیح طرح مسلمان تھے ۔ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو بشیر (چور) مشرکین کے ساتھ مل گیا ۔ اس پر مزید آیات کا نزول ہوا ۔

(وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا (۱۱۵) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا

(۱۱۶)(٤: ۱۱۵ – ۱۱٦)) مسئلہ صرف یہ نہ تھا کہ ایک بے گناہ بری کر دیا گیا جس پر سازش کی وجہ سے الزام لگایا گیا تھا ۔ اگرچہ اللہ کے ہاں کسی بے گناہ کا بری کرنا بھی ایک عظیم مسئلہ ہے ' مسئلہ تو اس سے بھی بڑا اور اہم تھا ۔ یعنی انصاف کی ترازو کو بالکل برابر کرنا مطلوب تھا کہ وہ کسی ایک طرف جھک نہ جائے ۔ نہ نفسانی خواہشات کی طرف اور نہ عصبیت کی وجہ سے ۔ نہ دوستی اور دشمنی کی وجہ سے ' میزان عدل میں کسی بھی طرح جھکاؤ نہ آ جائے ۔ غرض جو حالات بھی ہوں ' انصاف ہو اور بے لاگ ہو ۔

مسئلہ یہ تھا کہ اس جدید معاشرے کو تمام آلائشوں سے پاک کر دیا جائے اور اس کے اندر سے جاہلیت اور عصبیت کے باقی ماندہ آثار کو بھی مٹا دیا جائے چاہے یہ آثار جس شکل و صورت میں بھی ہوں ۔ خصوصاً جبکہ ان کا تعلق عوام الناس کے مسئلہ عدل سے ہو ۔ اس کے بعد ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھی جانی تھی جو بالکل منفرد ہو اور پوری تاریخ انسانی میں بے مثال ہو ۔ یہ بنیاد بالکل پاک و صاف اور مستحکم اصولوں پر رکھنی تھی جن میں تعصب ' ذاتی رجحان ' وقتی مصلحتوں اور ذاتی خواہشات کا کوئی دخل نہ ہو ۔

اس مقدمے میں بے شمار اسباب موجود تھے جن کی وجہ سے مجرموں کے ساتھ نرمی کی جا سکتی تھی یا کم از کم ان کے بارے میں یہ آیات نازل نہ ہوتیں اور ان پر تنقید نہ کی جاتی ۔ ان کو اس طرح سرعام رسوا نہ کیا جاتا یا ان کی سرعام پردہ دری نہ کی جاتی ۔

پہلی وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ اس مقدمے میں پہلا ملزم یہودی تھا اور یہودی وہ لوگ تھے کہ ان کے ترکش کا ہر تیر اسلام کے خلاف استعمال ہوتا تھا ۔ یہودی وہ لوگ تھے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کو ان کی جانب سے تلخ ترین اذیتیں دی جاتی تھیں اور خدا کا کرنا ایسا ہے کہ ہر دور میں وہ مسلمانوں کے خلاف نیش زنی کرتے رہتے ہیں ۔ پھر یہودیوں کا نظریہ یہ تھا کہ وہ نہ کسی کا حق تسلیم کرتے تھے ' نہ کسی کے ساتھ عدل و انصاف کرتے تھے ۔ ان کی حالت یہ تھی کہ اس کے ہاں کوئی اخلاقی قدر بھی نہ تھی اور مسلمانوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں تو وہ کسی اخلاقی اصول کے قائل ہی نہ تھے ۔

ایک سبب یہ بھی تھا کہ اصل ملزم انصاری تھے اور انصار وہ لوگ تھے جنہوں نے حضور کو پناہ دی اور آپ کی نصرت

کی ۔ پھر انصار کے بعض گھرانوں کے درمیان جاہلیت سے دشمنیاں چلی آرہی تھیں اور جس طرح الزام اور تفتیش کا رخ یہودیوں کی طرف مڑ گیا تھا اس وقت ان تحقیقات کو یہاں ہی ڈراپ کر کے اہل اسلام کی صفوں کے درمیان انتشار سے بچا جا سکتا تھا۔

ایک تیسرا جواز یہ بھی تھا کہ اس طرح یہودیوں کے ہاتھ میں انصار کو ورغلانے کی خاطر ایک نیا ہتھیار آرہا تھا۔ یہ کہ انصار اور مسلمان ایک دوسرے کی بھی چوریاں کرتے ہیں اور پھر یہودیوں پر الزام دھرتے ہیں ۔ یہودی اس واقعہ کو بھی اسلام کے خلاف استعمال کر سکتے تھے ۔

لیکن یہ معاملہ ان معمولی باتوں کی نسبت بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا' ان تمام خدشات اور اعتبارات سے یہ معاملہ بہت اہم اور بلند تھا۔ یہ باتیں اسلامی نقطہ نظر سے اہمیت نہ رکھتی تھیں ۔ اسلام کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ اس جماعت کو اس قدر تربیت دی جائے کہ وہ نظام خلافت ارضی اور منصب قیادت بشری کے لئے تیار ہو جائے ۔ یہ امت پوری انسانیت کی قیادت اور پورے کرۂ ارض پر خلافت کے لئے اس وقت تک تیار نہیں ہو سکتی تھی جب تک اس کی تربیت نہایت ہی مستحکم اور برتر اصولوں پر نہ کی جائے ۔ جب تک اسلامی نظام زندگی کے اصول اس کی زندگی کا جزء نہ بن جائیں اس کے وجود کو پوری طرح دھو کر اور نچوڑ کر پاک و صاف نہ کر دیا جائے اور اسے ہر قسم کی انسانی کمزوریوں سے پاک نہ کر دیا جائے' جو جاہلیت کے دور سے اس کی شخصیت کا جزء تھیں ۔ نیز جب تک خود اس امت کے درمیان پختہ نظام عدل قائم نہ کر دیا جائے تاکہ وہ اس کے مطابق تمام لوگوں کے درمیان انصاف کریں ۔ اور ان کا یہ انصاف اور ان کی یہ عدالت تمام انسانی کمزوریوں سے پاک ہو اور وہ تمام ظاہری مصلحتوں سے صرف نظر کرنے کے قابل ہو جائیں ۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات میں اور اس مشکل ترین مرحلے میں ایک یہودی کے واقعہ کے ذریعے امت مسلمہ کو عدل و انصاف کے راستے پر ڈالا ۔ ایسے حالات میں کہ اس دور میں مسلمان یہودیوں کی جانب سے بے شمار ریشہ دوانیوں کا شکار تھے اور وہ پورے عالم عرب میں مسلمانوں کے خلاف محاذ بنانے میں بھی مصروف تھے ۔ مدینہ کے منافقین کے بھی معاون و مددگار تھے' اور وہ دین اسلام کے خلاف اپنے ترکش کا ہر تیر استعمال کر رہے تھے اور اس کے خلاف ہر سازش کر رہے تھے ۔ مسلمانان مدینہ کے لئے مدینہ میں نہایت ہی خطرناک حالات تھے جہاں وہ دشمنیوں اور سازشوں میں گھرے ہوئے تھے اور یہ سب سازشیں یہودیوں کی طرف سے تھیں ۔ اللہ نے ان حالات میں اپنے بندوں کو ہدایت دینے اور نشان راہ متعین کرنے کے لئے ایک یہودی کو چنا۔

ان حالات میں ایک یہودی کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کو یہ سمجھا سکے کہ عدل کا معیار کیا ہے اور اللہ تعالیٰ اس امت کو جو سکھانا چاہتے تھے وہ سکھائے ۔ لہٰذا اس معاملے میں اللہ کی پالیسی میں کوئی سیاست' کوئی نام نہاد دانشوری اور کوئی زبانی ہیر پھیر نہ تھا۔ اور لیپا پوتی اور واقعات کو چھپانے کی مہارت سے بھی کام نہ لیا گیا اور صاف صاف بات کی گئی ۔

اس مقدمے کے فیصلے میں تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا اور تمام ظروف و احوال سے صرف نظر کیا گیا۔

معاملہ نہایت ہی حقیقت پسندانہ اور سنجیدہ تھا۔ اس میں کسی قسم کی ملمع کاری اور لیپا پوتی نہ تھی ۔ حقیقت پسندی اسلامی نظام زندگی کی خصوصیات میں سے اہم خصوصیت ہے اور اس امت کے اوصاف میں سے یہ ایک اہم وصف ہے ۔ یہ اس

امت کے مقاصد میں شامل ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان عدل پھیلائے اور عدل کو اس معیار پر پہنچا دے جہاں تک کبھی انسانیت نہ پہنچی اور صرف اللہ کی جانب سے وحی اور ہدایت ہی کے نتیجے میں یہ امت یہاں تک پہنچی۔

جب انسان اس مقام بلند تک پہنچا تو اس نے دیکھا کہ تاریخ کے تمام ازمنہ اور ادوار میں انسانی پستیوں کے گہرے گڑھے میں پڑے ہیں۔اس نے دیکھا کہ اس مقام بلند تک پہنچنے کی راہ میں نہایت ہی گہری کھائیاں ہیں۔اس راہ میں جگہ جگہ چالاکیاں' ظاہرداریاں' سیاست 'عیاری' بلاغت' مہارت 'حکومت کی مصلحت' ملک کی مصلحت اور پارٹی کی مصلحت وغیرہ کی بے پناہ رکاوٹیں ہیں جو مختلف ناموں اور مختلف عنوانوں کے ساتھ عدل و انصاف کی راہ روکے کھڑی ہیں۔اور اگر اس بلندی سے انسان تمام نظامہائے زندگی کو دقت نظر سے دیکھے تو اسے دنیا میں گندگی ہی گندگی نظر آئے۔

اس بلندی سے انسان جب نگاہ ڈالتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ امت مسلمہ اس میدان میں یکہ و تنہا نظر آتی ہے۔جو زندگی کی ان غلاظتوں سے بلند ہو کر اس پاکیزہ مقام تک پہنچی ہے اور صرف امت مسلمہ کے لینڈ مارک شاہراہ تاریخ میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں اور عدل و انصاف کی اس بلند چوٹی تک پہنچنے کے لئے صرف امت مسلمہ نے راہیں متعین کی ہیں اور وہ اس میدان میں منفرد ہے۔

رہی وہ گندگی اور وہ تعفن جسے جاہلیت قدیمہ اور جاہلیت جدیدہ میں عدالت کا نام دیا جاتا ہے تو مناسب یہی ہے کہ ہم اس گندگی کو دبی رہنے دیں کیونکہ اس پاکیزہ ماحول کو اس کا تعفن گندہ کر دے گا اور ہر طرف بدبو پھیل جائے گی۔

مناسب ہے کہ اب ہم آیات پر ذرا تفصیل سے بات کریں۔

---ooo---

# درس نمبر ۳۹ تشریح آیات

# ۱۰۵ -- تا -- ۱۱۳

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ
أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ﴿١٠٥﴾ وَٱسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ
غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٠٦﴾ وَلَا تُجَٰدِلْ عَنِ ٱلَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ
لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ﴿١٠٧﴾ يَسْتَخْفُونَ مِنَ ٱلنَّاسِ وَلَا
يَسْتَخْفُونَ مِنَ ٱللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ ٱلْقَوْلِ ۚ
وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ﴿١٠٨﴾ هَٰٓأَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ جَٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ
فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا فَمَن يُجَٰدِلُ ٱللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ أَم
مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿١٠٩﴾

(اے نبی ") ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے' تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ تم بددیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو' اور اللہ سے درگزر کی درخواست کرو' وہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے۔ جو لوگ اپنے نفس سے خیانت کرتے ہیں تم ان کی حمایت نہ کرو۔ اللہ کو ایسا شخص پسند نہیں ہے جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو۔ یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات چھپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں

چھپاسکتے ـ وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ راتوں کو چھپ کر اس کی مرضی کے خلاف مشورے کرتے ہیں۔ ان کے سارے اعمال پر اللہ محیط ہے ـ ہاں ' تم لوگوں نے ان مجرموں کی طرف سے دنیا کی زندگی میں تو جھگڑا کر لیا 'مگر قیامت کے روز ان کے لئے اللہ سے کون جھگڑا کرے گا؟ آخر وہاں کون ان کا وکیل ہو گا؟)

بات نہایت ہی سختی سے کی جا رہی ہے 'یوں نظر آتا ہے کہ سچائی کے حق میں غیظ و غضب سے کام لیا جا رہا ہے اور عدل قائم کرنے کے لئے سخت غیرت کا اظہار کیا جا رہا ہے اور جذبات ' بات کے ماحول اور فضا سے ظاہر ہو رہے ہیں ـ

اس کا اظہار اس بات سے بھی ہو رہا ہے کہ حضور ؐ کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ ہم نے یہ کتاب سچائی کے ساتھ نازل کی تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اللہ کی اس کتاب کے مطابق فیصلے کریں۔ آپ کو سختی سے منع کیا گیا کہ آپ خائن لوگوں کے طرفدار نہ ہو جائیں اور نہ ان کی جانب سے دفاع کریں اور آپ نے جو مجادلہ ان خائن لوگوں کی طرف سے کیا ہے اس پر اللہ سے مغفرت طلب کریں۔

( اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا (١٠٥) وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا

(١٠٦) (٤: ١٠٥ - ١٠٦)) (اے نبی ؐ، ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے ' تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ تم بد دیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو ' اور اللہ سے درگزر کی درخواست کرو ' وہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے ـ)

اس کے بعد اس ممانعت کو دوبارہ مکرر بیان کیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں کی طرف سے آپ نے خصومت کی وہ اپنے آپ سے خیانت کر رہے ہیں اور وجہ یہ ہے کہ چونکہ یہ خائن ہیں اور اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

(وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِـيْمًا

(٤: ١٠٧)) (جو لوگ اپنے نفس سے خیانت کرتے ہیں تم ان کی حمایت نہ کرو۔ اللہ کو ایسا شخص پسند نہیں ہے جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو۔)

بظاہر تو انہوں نے دوسرے لوگوں کے ساتھ خیانت کی تھی لیکن درحقیقت وہ اپنے ساتھ خیانت کر رہے تھے ـ انہوں نے اپنی جماعت اور اپنے نظام کے خلاف خیانت کی ـ اپنے اصولوں اور ان کی ممتاز حیثیت کے خلاف خیانت کی ' انہوں نے اس امت کے خلاف خیانت کی جس کے وہ بھی افراد تھے ..... پھر ایک دوسرے پہلو سے بھی وہ اپنے نفس کے خلاف خیانت کر رہے تھے ـ وہ اپنے نفوس کو ایسے جرم میں ملوث کر رہے تھے جس کی سزا بہت ہی سخت تھی ـ جہاں اللہ انہیں مجبور کرے گا اور پکڑ کر سزا دے گا ـ ظاہر ہے کہ یہ اپنے نفس کے خلاف بھی خیانت ہے ـ ایک تیسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے ضمیر کو

جھوٹ کہہ کر اور جرم کر کے خیانت میں ملوث کر رہے تھے۔

(اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا (۱۰۷:۴)) (اللہ کو ایسا شخص پسند نہیں ہے جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو) اور اللہ کی ناپسندیدگی تمام سزاؤں میں سے بڑی سزا ہے۔ اس کے اندر ایک دوسرا اشارہ بھی ہے 'کہ جو لوگ اللہ کے محبوب نہیں' چاہئے کہ کوئی ان کی حمایت نہ کرے۔ کوئی ان کی وکالت نہ کرے' اس لئے کہ ارتکاب جرم کرنے کی وجہ سے اللہ نے انہیں ناپسند کر لیا ہے۔ ان لوگوں کو خیانت کار اور معصیت پیشہ کہنے کے بعد اب ان کی تصویر کشی اس طرح کی جاتی ہے اور ان کا پردہ یوں چاک ہوتا ہے :

(يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ --- (۱۰۸:۴)) (یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات چھپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے۔ وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ راتوں کو چھپ کر اس کی مرضی کے خلاف مشورے کرتے ہیں)۔

ان کی یہ تصویر نہایت ہی کریہہ المنظر ہے۔ اس پر انسان کو بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ اس میں ان کی کمزوری اور سازش صاف صاف نظر آتی ہے۔ یہ راتوں کو جمع ہوتے اور اپنا جرم چھپانے کی سازشیں کرتے ہیں اور خیانت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ لوگوں سے یہ اپنا جرم چھپا سکتے ہیں مگر اللہ سے نہیں چھپا سکتے۔ لوگوں سے چھپنا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ لوگ تو انہیں نفع و نقصان سے نہیں بچا سکتے۔ اور جو ذات نفع و نقصان کی مالک ہے اس سے وہ چھپ نہیں سکتے۔ وہ تو ان کے ساتھ ہوتی ہے جب وہ سازشیں کرتے ہیں۔ وہ ان کے ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ وہ طمع کاری کرتے ہیں اور اللہ کی مرضی کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ ان کا موقف کیسا بودا ہے کہ جس سے چھپاتے ہیں اس سے تو چھپ نہیں سکتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ (وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا (۱۰۸:۴)) (ان کے سارے اعمال پر اللہ محیط ہے) اگر اللہ مطلقاً تمام اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہے تو وہ جو رات کو خفیہ سازشیں کرتے ہیں ان کا کیا فائدہ ہو گا۔ اللہ تو اس مجلس میں ان کے ساتھ ہوتا ہے ہر چیز اس کی نظر میں ہے اور اس کے قبضے میں ہے۔ اور یہ غضبناک حملہ ابھی جاری ہے اور اس کا اطلاق ان تمام لوگوں پر ہوتا ہے جو خائن لوگوں اور مجرموں کی طرف سے مجادلہ کرتے ہیں۔

(هٰاَنْتُمْ هٰؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا (۱۰۹:۴)) (ہاں' تم لوگوں نے ان مجرموں کی طرف سے دنیا کی زندگی میں تو جھگڑا کر لیا' مگر قیامت کے روز ان کے لئے اللہ سے کون جھگڑا کرے گا؟ آخر وہاں کون ان کا وکیل ہو گا؟ قیامت کے دن تو ان کا کوئی وکیل اور مجادل نہ ہو گا۔ اگر دنیا میں بذریعہ وکالت وہ بچ بھی گئے تو کیا فائدہ ہوا؟ اس بھاری دن سے تو وہ ہرگز نہ بچ سکیں گے۔

---ooo---

خائنوں اور معصیت پیشہ لوگوں پر اس حملے کے بعد اور ان کے حامیوں' مجادلوں اور وکیلوں کی مذمت کرنے کے بعد اب اس برے فعل کے بارے میں اور اس کے نتائج کے بارے میں اصولی بات کی جاتی ہے ۔ اس کا حساب و کتاب آخرت میں کیا ہو گا اور اس کی عمومی سزا کیا ہونا چاہئے اور اللہ تعالیٰ ایسے مجرموں کے ساتھ کیا معاملہ فرماتے ہیں اور پھر یہ کہ جو معاملہ اللہ فرماتے ہیں تم بھی مجرموں اور ایک دوسرے کے ساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھو اور اللہ کے بتائے ہوئے اخلاق اپناؤ خصوصاً عدل و انصاف کے معاملے میں ۔

وَمَنْ يَعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾

(اگر کوئی شخص برا فعل کر گزرے یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے اور اس کے بعد اللہ سے درگزر کی درخواست کرے تو اللہ کو درگزر کرنے والا اور رحیم پائے گا ۔ مگر جو برائی کمائے تو اس کی یہ کمائی اسی کے لئے وبال ہوگی ۔ اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے اور وہ حکیم و دانا ہے ۔ پھر جس نے کوئی خطا یا گناہ کر کے اس کا الزام کسی بے گناہ پر تھوپ دیا اس نے تو بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا ۔)

یہ تین آیات وہ قواعد کلیہ وضع کرتی ہیں جن کے مطابق اللہ اپنے بندوں کے ساتھ سلوک و انصاف کرے گا ۔ اور لوگ بھی اگر چاہیں تو وہ اس کے مطابق سلوک کر کے اچھا معاشرہ تعمیر کر سکتے ہیں اور انہی قواعد کے مطابق وہ اللہ کے ساتھ معاملہ کر کے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں ۔

پہلی آیت میں معافی کا دروازہ چوپٹ کھلا رکھا گیا ۔ اگر لوگ توبہ کر لیں ۔ تو اللہ تعالیٰ کی معافی کا دروازہ کھلا پائیں گے ۔ ہر گناہ گار تائب کو معافی کی امید دلائی گئی ہے ۔

(وَمَنْ يَعْمَلْ سُوْءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا

(٤ : ١١٠)) (اگر کوئی شخص برا فعل کر گزرے یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے اور اس کے بعد اللہ سے درگزر کی درخواست کرے تو اللہ کو درگزر کرنے والا اور رحیم پائے گا) ۔

اللہ تعالیٰ موجود ہے اور اس کی مغفرت اور رحمت موجود ہے بشرطیکہ کوئی معافی مانگنے والا ہو' کوئی رحمت کا طلب گار ہو

جو باز آ رہا ہو ۔ جو شخص برائی کرتا ہے کبھی غیر پر ظلم کرتا ہے اور کبھی اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے (نفس پر ظلم اس وقت ہوتا ہے جب اس کی برائی دوسرے تک متعدی نہ ہو' اس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود ہو ۔) بہرحال ظالموں کے لئے معافی کا دروازہ کھلا ہے ۔ اگر وہ استغفار کریں ۔ اگر وہ توبہ کر کے واپس آئیں تو وہ انہیں معاف کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر رحمت بھی کرتا ہے ۔ اس کا دروازہ کھلا ہے' اس پر کوئی دربان نہیں ہے' اور اس کا یہ اعلان' اعلان عام ہے ۔ بے قید اور بے شرط ہے ۔ جب بھی وہ توبہ کر کے لوٹ آئیں تو اللہ غفور و رحیم ہے ۔

دوسری آیت میں یہ اصول طے ہوا ہے کہ مسئولیت انفرادی ہے ۔ سزا میں اسلامی نظام زندگی کا یہ اساسی اصول ہے کہ ہر کوئی اپنے کئے کا خود ذمہ دار ہے اور اس اصول سے ہر شخص کے دل میں خوف بھی پیدا ہوتا ہے اور اطمینان بھی پیدا ہوتا ہے ۔ خوف اس لئے کہ وہ اپنے اعمال اور اپنے کاموں کو درست کرے گا اور اطمینان اس لئے ہو گا کہ دوسرے کے معاملات اور بدکاریوں کا وہ ذمہ دار نہ ہو گا ۔

( وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓـَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓــــًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا

(٤ : ١١٢)) (مگر جو برائی کمائے تو اس کی یہ کمائی اسی کے لئے وبال ہوگی' اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے اور وہ حکیم و دانا ہے) اس اصول کے مطابق جرائم میں اصول وراثت نہیں چلتا ۔ جس طرح اہل کنیسہ موروثی جرم کی بات کرتے ہیں ۔ اسلام میں یہ تصور نہیں ہے کہ کسی جرم کی سزا کوئی اور بھگتے گا یا کفارہ کوئی اور دے گا ۔ اسلام میں ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے ۔ اس تصور کے مطابق ہر شخص اپنے اعمال کے بارے میں محتاط ہو گا ۔ اور وہ اس بات سے مطمئن ہو گا کہ دوسروں کے جرائم میں اسے نہ پکڑا جائے گا ۔ یہ ایک عجیب متوازن قانون اور نہایت ہی متوازن تصور حیات ہے ۔ اسلامی تصور حیات کے اساسی عناصر میں سے یہ ایک اہم عنصر ہے (دیکھئے خصائص التصور الاسلامی) اس تصور پر فطرت مطمئن ہوتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا بے قید عدل نافذ ہوتا ہے اور انسان کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس اصول جرم و سزا کو دنیا میں اپنائے ۔

تیسری آیت اس بارے میں بات کرتی ہے کہ خود جرم کر کے دوسرے انسان پر تھوپنا بہت ہی بڑا جرم ہے اور قصہ زیر بحث میں جرم کا ارتکاب کیا گیا تھا ۔

( وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓـَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓــــًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا

(٤ : ١١٢)) (پھر جس نے کوئی خطا یا گناہ کر کے اس کا الزام کسی بے گناہ پر تھوپ دیا اس نے تو بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا) ۔

بہتان کے معنی یہ ہیں کہ ایک پاک دامن شخص پر الزام تھوپ دیا جائے اور گناہ وہ ہے جس کا اس نے ارتکاب کرنے کے بعد اسے بری الذمہ شخص کے سر تھوپ دیا ۔ گویا اس شخص نے ان دونوں کو اپنے سر پر اٹھا لیا ہے ۔ گویا ایک بوجھ ہے جسے یہ شخص اٹھا رہا ہے اور یہ قرآن کریم کا انداز کلام ہے کہ وہ حقائق اور مفاہیم کو مجسم شکل میں پیش کرتا ہے اور یہ قرآن کا معجزانہ انداز بیان ہے ۔ (دیکھئے التصویر الفنی فی القرآن) ۔

اسلام ان تین اصولوں کے مطابق اپنا نظام عدل استوار کرتا ہے اور انہی کے مطابق مجرمین کو سزا دیتا ہے۔وہ کسی بھی مجرم کو معاف نہیں کرتا اگر اس جرم کی زد میں کوئی غیر شخص آئے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام مغفرت اور توبہ کا دروازہ بھی کھلا چھوڑتا ہے۔اور یہ طے کرتا ہے کہ طلب مغفرت کرنے والوں اور توبہ کرنے والوں کے لئے ہروقت یہ دروازہ کھلا رکھا جائے۔جب بھی وہ چاہیں اسے کھٹکھٹائیں بلکہ اگر وہ اللہ کی درگاہ میں بلا اجازت ہی داخل ہو جائیں اور پناہ لے لیں تو بھی مغفرت اور رحمت ان کو ڈھانپ لے گی۔

---○○○---

اس کے بعد اللہ تعالیٰ رسول اللہ ؐ پر احسان مندی کا اظہار فرماتے ہیں کہ اگر اللہ نہ بچاتا تو آپ سازشیوں کی سازش کا شکار ہوتے اور کوئی غلط فیصلہ کر دیتے۔ لیکن اللہ نے وہ سازش طشت ازبام کر دی' جسے وہ لوگوں سے چھپانا چاہتے تھے۔ اسے وہ اللہ سے تو نہ چھپا سکتے تھے اس لئے کہ رات کے وقت بھی جب وہ ناپسندیدہ باتیں کرتے تھے اللہ ان کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد اللہ بطور احسان یاد دہانی کراتے ہیں کہ اللہ نے آپ پر احسان کیا کہ اس نے آپ پر حکمت اتاری اور وہ تعلیم دی جو آپ کے علم میں نہ تھی اور پھر یہ احسان پوری انسانیت پر تھا اور اس احسان کو آپ کی ذات مکرم میں مجسم کر دیا جبکہ آپ کی ذات باری تعالیٰ سے ہروقت قربت رکھتی تھی۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾

(اے نبی ؐ اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا' حالانکہ درحقیقت وہ خود اپنے سوا کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر رہے تھے۔ اور تمہارا کوئی نقصان نہ کر سکتے تھے۔اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور تم کو وہ کچھ بتایا ہے جو تمہیں معلوم نہ تھا اور اس کا فضل تم پر بہت ہے)۔

یہ کوشش ان مختلف النوع کوششوں میں سے ایک ہے جو رسول اللہ ؐ کے دشمن اسلام کے خلاف کر رہے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ حضور اکرم ؐ کو سچائی' انصاف اور صراط مستقیم سے بدراہ کر دیں لیکن اللہ کا فضل وکرم ہمیشہ آپ کے شامل حال رہتا اور آپ کو اللہ بچا لیتے اور جو لوگ سازشیں کرتے وہ خود سازش کا شکار ہو جاتے اور خود ہی گمراہ ہوتے۔اور سیرت الرسول ؐ میں اس قسم کے بے شمار واقعات موجود ہیں کہ سازشیوں نے سازش کی اور اللہ نے ان کی سازش کو ناکام بنا دیا

اور ان کی کوششیں ناکام ہوگئیں ..... اللہ تعالیٰ یہاں حضور کو اطمینان دلاتے ہیں کہ اس کا فضل اور رحمت رسول اللہ کے شامل حال رہے گی اور وہ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔

اس مناسبت میں کہ اللہ تعالیٰ نے سازشیں کرنے والوں کی سازش سے آپ کو محفوظ رکھا اور آپ اس سے بچ گئے کہ آپ کے احکام کی وجہ سے ظالم بچ جائے اور بے گناہ کو سزا ہو جائے ' اللہ تعالیٰ اپنے ایک عظیم فضل کو یاد دلاتے ہیں۔ وہ یہ کہ اللہ نے آپ کو تاج رسالت پہنایا۔

( وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ( ٤ : ١١٣ ) ) (اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور تم کو وہ کچھ بتایا ہے جو تمہیں معلوم نہ تھا' اور اس کا فضل تم پر بہت ہے ) یہ احسان دراصل جنس انسان پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری رسالت انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجی۔ یہ کوئی معمولی احسان نہ تھا بلکہ یہ انسان کے لئے ایک نیا جنم تھا اور اس سے انسانیت کو ایسی زندگی ملی جس طرح کوئی انسان پہلی مرتبہ انسانیت اور روح پاتا ہے۔ یہ احسان جس کی وجہ سے انسان کو جاہلیت کی پستیوں سے اٹھایا گیا اور اسے اسلامی نظام حیات کے ذریعے دنیا میں برتری اور ترقی دے کر نہایت ہی اونچے مقام تک پہنچایا گیا اسے اللہ تعالیٰ نے فضل عظیم سے تعبیر کیا۔

اسلامی نظام زندگی کے احسان اور بھلائی کا صحیح طرح اندازہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس نے اسلام اور جاہلیت کا تقابلی مطالعہ کیا ہو۔ ماضی اور حال کو دیکھا ہو اور جس نے اسلام کی طرح جاہلیت کو بھی چکھا ہو۔

اس احسان کا تذکرہ سب سے پہلے رسول اللہ ؐ سے کیا گیا' اس لئے کہ سب سے پہلے اسلام کو حضور اکرم ؐ نے پایا۔ سب سے پہلے اس کا مزہ چکھا اور سب سے پہلے آپ ؐ نے جانا اور آپ سب سے زیادہ اسلام کے جاننے والے اور اسے چکھنے والے تھے۔ (وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ( ٤: ١١٣ )) تم کو وہ کچھ بتایا جو تم نہ جانتے تھے اور اللہ کا فضل تم پر بہت بڑا ہے ) ۔

---ooo---

# درس نمبر ۴۰ ایک نظر میں

یہ سبق درس سابق کے ساتھ مربوط ہے اور ان دونوں کے درمیان کئی ربط ہیں۔اس میں بعض آیات تو درس سابق کے واقعہ کی بازگشت ہیں۔ اس واقعہ اور وحی الٰہی کے بعد بشر ابن ابیرق جو چوری میں ملوث تھا' مرتد ہو گیا تھا اور رسول اللہ ؐ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا تھا۔ اور اسلام کے بعد دوبارہ جاہلیت میں چلا گیا تھا۔چنانچہ اس حوالے سے اس سبق میں جاہلیت کی بات کی گئی ہے۔جاہلی خیالات 'تصورات اور اس نظام میں شیطان کی کارستانیاں وغیرہ۔بتایا جاتا ہے کہ اسلام اور جاہلیت کے درمیان سرحد شرکیہ عقاید ہیں۔اللہ کے نظام میں شرک کی معافی نہیں ہے۔

اس کے سواسب کچھ قابل معافی ہے..... اس سبق میں راتوں کو خفیہ سازشوں سے بھی منع کیا گیا ہے اور جو کام بھی خفیہ ہوتے ہیں ان میں زیادہ تر اچھے نہیں ہوتے۔مثلاً درس سابق میں چوری کے واقعہ میں جو نجویٰ ہوا۔نجویٰ کی ممانعت کے بعد اس میں بھلائی 'معروف مشورے اور لوگوں کے درمیان اصلاح وغیرہ کی اسکیموں کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا۔اس لئے کہ یہ تو کار ثواب ہے۔پھر آخر میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے ہاں جزا اس کے اپنے اصولوں کے مطابق ہوتی ہے اور اس میں کسی کی ذاتی چاہت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔نہ مسلمانوں اور نہ ہی اہل کتاب کی چاہت کا اس میں دخل ہو گا۔سب کام اللہ کے بے قید انصاف کے مطابق ہوں گے۔اور سچائی کے مطابق ہوں گے اور اگر سچائی لوگوں کی چاہتوں کے پیچھے چلے تو زمین و آسمان کا تمام نظام فاسد ہو جائے۔

غرض یہ سبق اپنے موضوع اور اپنے رخ کے اعتبار سے ــــ سابق کے ساتھ پوری طرح مربوط ہے...... اور اس کے علاوہ امت مسلمہ کی تربیت کی ایک نئی کڑی ہے جسے پوری انسانیت کی قیادت کے لئے تیار کرنا پیش نظر تھا۔اس طرح کہ وہ تنظیم میں فوقیت رکھتی ہو اور اس کی نظر میں ہو کہ اس کی صفوں میں کہاں کہاں کمزوریاں ہیں اور کہاں کہاں ابھی تک آثار جاہلیت باقی ہیں تاکہ وہ ان کی اصلاح کر سکے۔یہ وہ مقصد ہے کہ اس پوری سورہ میں اس کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔اس سے متعلق کئی موضوع زیر بحث آئے اور پورے قرآن کریم کے مقاصد میں سے بھی یہ ایک اہم موضوع ہے۔

---ooo---

# درس ۔ ۴۰ تشریح آیات

# ۱۱۴ ۔۔ تا ۔۔ ۱۲۶

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١١٤﴾

(لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر و بیشتر کوئی بھلائی نہیں ہوتی ۔ ہاں اگر کوئی پوشیدہ طور پر صدقہ و خیرات کی تلقین کرے یا کسی نیک کام کے لئے یا لوگوں کے معاملات میں اصلاح کرنے کے لئے کسی سے کچھ کہے تو یہ البتہ بھلی بات ہے ' اور جو کوئی اللہ کی رضا جوئی کے لئے ایسا کرے اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے ۔)

قرآن کریم میں نجویٰ کی بار بار ممانعت کی گئی ہے ۔ نجویٰ یہ ہے کہ کوئی گروہ اسلامی جماعت سے علیحدہ اور اسلامی قیادت سے علیحدہ کوئی بات سوچے اور اس کے لئے جمع ہو ۔ اسلامی تربیت کا طریق کار یہ تھا کہ لوگ اپنی تمام مشکلات اور مسائل کو لے کر اسلامی قیادت کے پاس آتے اور اگر بات ذاتی ہوتی تو وہ تنہائی میں پیش کرتے تاکہ عوام الناس میں بات پھیل نہ جائے اور اگر بات کی نوعیت عمومی ہوتی تو اسے علانیہ پوچھتے یعنی اگر بات کا خصوصاً پوچھنے والے سے تعلق نہ ہوتا ۔

اس پالیسی میں حکمت یہ تھی کہ اس کی وجہ سے جماعت مسلمہ کے اندر کوئی بلاک یا گروہ نہ بن سکتے تھے اور نہ ہی یہ ہو سکتا تھا کہ جماعت کے کچھ حصے اپنے تصورات اور اپنی مشکلات کو لے کر الگ ہو جائیں یا وہ اپنے رجحانات اور اپنے افکار کے مطابق اپنی راہ لیں ۔ یہ صورت حال بھی نہ ہو کہ جماعت کے کچھ لوگ رات کو مشورہ کر کے ایک بات کا فیصلہ کر لیں اور دن کے وقت جماعت کے اندر بطور ایک فیصلہ شدہ امر پیش کر دیں ۔ اگرچہ حضور ؐ کے دور میں تو کوئی بات مخفی نہ رہ سکتی تھی ' وہ جو کچھ مشورہ کرتے اللہ ان کے ساتھ ہوتا اور بوقت ضرورت حضور ؐ کو اطلاع دے دیتا ۔

مسجد نبوی جماعت مسلمہ کی پارلیمنٹ تھی ۔ وہاں لوگ باہم ملتے تھے ۔ نماز پڑھتے تھے اور زندگی کے تمام معاملات وہاں ہی طے ہوا کرتے تھے ۔ پھر اسلامی معاشرہ ایک کھلا معاشرہ (Open Society) تھا ۔ اس میں وہ تمام معاملات پیش ہوتے

تھے جو جماعت کے جنگی اسرار و رموز سے متعلق نہ ہوتے یا ایسے مسائل نہ ہوتے جس کا تعلق لوگوں کی ذلت اور خاندانوں سے ہو اور وہ پسند نہ کرتے ہوں کہ لوگوں کے علم میں آئیں ۔ اسلامی سوسائٹی چونکہ ایک کھلی سوسائٹی تھی اس لئے وہ آزاد اور پاک و صاف سوسائٹی تھی اور اس سوسائٹی میں علیحدہ جنبہ بنا کر راتوں کو مشورہ وہی لوگ کرتے تھے جو اس کے خلاف سازش کرتے تھے یا اس کے اصولوں میں سے کسی اصول کے خلاف جمع ہوتے تھے اور یہ لوگ عموماً منافقین ہوا کرتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی نجویٰ ہوا' اس میں منافقین شریک رہے ۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہمارے لئے بہت ہی مفید ہے ۔ ـــــ اسلامی معاشرہ اس سے پاک و صاف ہونا چاہئے ۔ اس میں جن لوگوں کو کسی چیز کے بارے میں کوئی بھی خلجان ہو' اسے چاہیے کہ وہ اسے قیادت عامہ کے سامنے پیش کرے ۔ یا اگر کوئی مشکل پیش آئے یا کوئی تجویز ان کے سامنے ہو یا کوئی رجحان نظر آئے تو ان معاملات میں اسے قیادت کی طرف رجوع کرنا چاہئے ۔

یہاں قرآن مجید نے نجویٰ کی ایک قسم کو جائز رکھا ہے ۔ دراصل وہ نجویٰ ہی نہیں ہے اگرچہ شکل نجویٰ کی ہے ۔

(إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ (٤ : ١١٤)) (ہاں اگر کوئی پوشیدہ طور پر صدقہ و خیرات کی تلقین کرے یا کسی نیک کام کے لئے یا لوگوں کے معاملات میں اصلاح کرنے کے لئے کسی سے کچھ کہے تو یہ البتہ بھلی بات ہے)۔

مثلاً دو اچھے اور نیک آدمی جمع ہوں اور ایک دوسرے کے ساتھ مشورہ کریں کہ کیا فلاں شخص کی مدد کے لئے یا فلاں کام میں روپیہ خرچ کرنا چاہیے اس لئے کہ اس شخص کو ضرورت ہے اور مجھے اس کی ضرورت کا علم ہے یا یہ کہ فلاں کام میں خرچ کرنے کی ضرورت ہے' آیئے یہ کام کریں ۔ یا یہ کہ فلاں اور فلاں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے ہیں ' آیئے ان کے درمیان مصالحت کرا دیں ۔ ایسے لوگوں کی کوئی انجمن یا سوسائٹی بھی بن سکتی ہے جو مشورہ کر کے کسی نیک کام میں باہم تعاون کر سکتی ہے بشرطیکہ یہ کام نہ نجویٰ ہوں اور نہ اسلامی نظام کے خلاف کوئی سازش ۔ اگرچہ ظاہری شکل میں یہ نجویٰ بھی ہو گا لیکن قرآن نے اسے "امر" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اس قسم کی محدود سوسائٹی بعض اوقات اپنے امور رات کو تنہائی میں طے کرتی ہے اور ان کا مقصد معروف اور بھلائی کا کام ہوتا ہے ۔

لیکن اس قسم کی سوسائٹی کے لئے بھی ضروری ہے کہ اس کی تشکیل اور سرگرمی اللہ کی رضامندی کے حصول کے لئے ہو۔

( وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (٤ : ١١٤)) (اور جو کوئی اللہ کی رضاجوئی کے لئے ایسا کرے گا تو اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے)۔

یعنی کسی شخص پر صدقہ کرنے اور فلاں اور فلاں کے درمیان اصلاح حال کرنے کا مقصد یہ نہ ہو کہ یہ کام کرنے والے لوگ اس طرح مشہور ہو جائیں کہ لوگ کہیں کہ خدا کی قسم یہ بہت ہی اچھے لوگ ہیں کہ صدقہ و خیرات کے لئے لوگوں کو آمادہ کرتے ہیں اور لوگوں کے درمیان اصلاح کا کام کرتے ہیں ۔ غرض اس کام میں ان کے پیش نظر رضائے الٰہی کے حصول کے سوا اور کوئی مقصد نہ ہو ۔ یہ ہے وہ فرق و امتیاز جو محض رضائے الٰہی اور اجر اخروی کے لئے کئے جانے والے

کام اور اس کام کے درمیان ہوتا ہے' جو کسی اور غرض کے لئے کیا جاتا ہے ۔ اگرچہ بظاہر دونوں کام ایک جیسے ہوتے ہیں لیکن ایک کا اندراج بھلائی کے رجسٹر میں ہوتا ہے اور دوسرے کا اندراج برائیوں کے رجسٹر میں ہوتا ہے ۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ
يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَآءَتْ
مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ
يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾

(مگر جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے' در آں حالیکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی ہو' تو اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بد ترین جائے قرار ہے ۔ اللہ کے ہاں بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے' اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا)۔

ان آیات کے نزول کے سلسلے میں یہ کہا گیا ہے کہ بشیر ابن ابیرق مرتد ہو گیا اور جاکر مشرکین مکہ کے ساتھ مل گیا حالانکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی تھی ۔ پہلے وہ اسلامی صفوں میں تھا لیکن اس نے اہل ایمان کی راہ کو چھوڑ کر دوسری راہ کو اپنا لیا ۔ لیکن یہ آیت مضمون اور اطلاق کے اعتبار سے عام ہے ۔ اس کا اطلاق ہر اس حالت پر ہو گا جس میں رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی جا رہی ہو ۔ جس میں آپ کی مخالفت میں کفر' شرک اور ارتداد اختیار کیا گیا ہو اور اس طرح کے قدیم وجدید تمام واقعات پر اس کا اطلاق ہو گا ۔

(المشاقہ) کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص ایک ٹکڑا لے اور دوسرا اس کے مقابلے میں دوسرا ٹکڑا لے لے ۔ اور جو شخص رسول کے ساتھ شقاق کرتا ہے وہ رسول کے بالمقابل جنبہ' بالمقابل صف' اور بالمقابل پارٹی کو اختیار کرتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے جنبے' پارٹی اور محاذ کی مخالفت کرتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے نافذ کردہ نظام زندگی کے بالمقابل نظام اختیار کرتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے طریقوں سے متضاد طریقے اختیار کرتا ہے ۔ رسول اللہ ﷺ اللہ کی جانب سے ایک مکمل نظام حیات لے کر آئے تھے جس کے اندر عقیدے اور نظریات بھی شامل تھے' جس کے اندر مراسم عبودیت بھی تھے ۔ جس کے اندر نظام قانون اور نظام حکومت بھی تھا اور یہ نظام زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھا ۔ اور یہ تمام امور اسلامی نظام کے مجموعی جسم کے اعضاء تھے ۔ اور اصول یہ ہے کہ اگر ان اعضاء کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے تو نظام قائم نہیں رہ سکتا ۔ اس کی روح نکل جائے گی ۔ جو شخص رسول کے ساتھ شقاق کرتا ہے یہ وہی شخص ہے جو یا تو اسلامی نظام حیات کو مکمل طور پر رد کرتا

ہے اور یا بعض حصوں کو مانتا ہے اور بعض کا انکار کرتا ہے۔یعنی ایک حصہ لیتا ہے اور دوسرا چھوڑتا ہے۔

اللہ کی رحمت کا تقاضا یہ ہوا کہ کہیں ان پر حجت تمام نہ ہو جائے اور وہ برے ٹھکانے جہنم کے مستحق نہ ہو جائیں اس لئے اللہ نے ان کی جانب رسول بھیجے۔رسولوں نے لوگوں کے سامنے سچائی بیان کی۔انہوں نے لوگوں پر راہ ہدایت کو بالکل واضح کر دیا۔پھر اگر وہ انکار کریں گے تو گمراہی کو اختیار کریں گے۔یہ اللہ کی وسیع رحمت تھی کہ اللہ نے اس ضعیف مخلوق کے لئے صراط مستقیم پر چلنے کا یہ اہتمام کیا۔پھر جب کسی پہ راہ حق واضح ہو جائے اور رسول موجود ہو اور پھر بھی وہ رسول کی راہ کے مقابلے میں دوسری راہ اختیار کرے اور آپ پر ایمان نہ لائے اور آپ کی اطاعت نہ کرے اور اسلامی نظام اور نظام مصطفیٰ ؐ پر راضی نہ ہو' تو اب حجت تمام ہوتی ہے اور اللہ ان کے حق میں گمراہی لکھ دیتے ہیں اور پھر اسی طرف اسے موڑ دیتے ہیں جس طرف وہ مڑ جاتا ہے۔پھر اسے اللہ کفار کے حوالے کر دیتا ہے۔وہ مشرکین کا ساتھی ہو جاتا ہے اور اب اس پر وہ عذاب حق بن جاتا ہے جس کا اللہ نے اعلان کیا۔

( وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (٤:١١٥))

(مگر جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے' در آں حالیکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی ہو' تو اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔) اس برے انجام کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اللہ کی مغفرت ہر گناہ کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے مگر شرک ایک ایسا گناہ ہے جس کے لئے ہرگز معافی نہیں ہے۔

(اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (٤:١١٦)) (اللہ کے ہاں بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے' اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے۔جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا)۔

جیسا کہ ہم اس سے قبل اسی مضمون کی آیت کی تفسیر میں کہہ آئے ہیں کہ شرک کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہوں کو شریک کیا جائے جس طرح عرب دور جاہلیت میں کیا کرتے تھے اور جس طرح عربوں کے علاوہ دوسری قدیم جاہلیتیں کرتی تھیں۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کے خصائص الوہیت خصوصاً صفت حاکمیت میں بھی کسی اور کو شریک کرنے کے سے شرک کا ارتکاب ہوتا ہے۔مثلاً کسی انسان کو حاکم سمجھا جائے۔جس طرح یہود و نصاریٰ کے شرک کے بارے میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ انہوں نے اپنے احبار اور رہبان کو اللہ کے سوا الٰہ بنا رکھا ہے۔

یہ لوگ احبار و رہبان کی عبادت اس طرح نہ کرتے تھے جس طرح وہ اللہ کی عبادت کرتے تھے بلکہ وہ ان احبار اور

رہبان کو حق قانون سازی دیتے تھے ۔ یہ لوگ ان کے لئے حلال و حرام کے حدود بھی متعین کرتے تھے اور یہود و نصاریٰ اس کام میں ان کی اطاعت کرتے تھے ۔ اس طرح وہ ان لوگوں کو خصائص الوہیت میں سے ایک حصہ عطا کر دیتے تھے اس لئے وہ مشرک قرار پائے ۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ انہوں نے توحید کے سلسلے میں اللہ کی ہدایات کی خلاف ورزی کر ڈالی تھی ' حالانکہ اللہ کی طرف سے انہیں حکم صرف یہ تھا کہ وہ صرف الٰہ واحد کی بندگی کریں ' صرف اللہ وحدہ کے مراسم عبودیت ادا کریں اور اوامر و نواہی کے ساتھ ساتھ قانون کا ماخذ حکم الٰہی کو قرار دیں ۔

اللہ کے صریح احکام و اعلانات کے مطابق گناہ شرک کے لئے کوئی معافی نہیں ہے بشرطیکہ کوئی حالت شرک میں مر جائے ۔ شرک کے سوا تمام گناہوں کی معافی ہو سکتی ہے اگر اللہ راضی ہو جائے ۔ سوال یہ ہے کہ شرک کو اس قدر عظیم جرم کیوں قرار دیا گیا ہے کہ وہ ناقابل معافی ہے ؟ اصل حقیقت یہ ہے کہ جو شخص شرک کا ارتکاب کرتا ہے وہ خیر اور بھلائی کے دائرے ہی سے خارج ہو جاتا ہے ۔ اور اس کی فطرت ہی بگڑ جاتی ہے اور اس کی اصلاح کی کوئی امید نہیں رہتی ۔

( وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ( ٤ : ١١٦ ) ) (جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا ) ...... اگر ایسے شخص کی فطرت کے تار و پود میں سے کوئی ایک دھاگہ بھی باقی ہوتا تو وہ اسے اللہ کے نظریہ وحدانیت کے ساتھ جوڑے رکھتا لیکن اس نے تمام رشتے توڑ دیئے ۔ اگر شرک سے کوئی تائب ہو جائے اور موت سے چند منٹ پہلے تائب ہو جائے تو بھی نجات پالے گا ' ہاں اگر حالت نزع طاری ہو اور وہ مشرک ہو تو اب اس کا انجام یہ ہو گا کہ ( وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ( ٤ : ١١٥ ) ) (ہم اسے واصل جہنم کریں گے اور یہ بہت ہی برا انجام ہے ) ۔

---ooo---

اس کے بعد اللہ تعالیٰ جاہلیت کے بعض اوہام و خرافات کا تذکرہ کرتا ہے ۔ عربی جاہلیت کے اندر جو شرکیہ خرافات جاری تھیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ وہ ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے ۔ یہ لوگ شیطان کی بھی پوجا کرتے تھے ' جس طرح انہوں نے ملائکہ کے بت بنا رکھے تھے ' پھر ان کے اندر ایسی رسوم بھی تھیں کہ جو جانور وہ نذر کرتے تھے ان کے کان کاٹ دیتے تھے یا پھاڑ دیتے تھے ۔ یہ ان کے الہوں کی نذر ہوتے تھے اور اس طرح وہ اللہ کی پیدائش اور تخلیق کو متغیر کرتے تھے ۔ اور اس طرح شرک کرتے تھے حالانکہ شرک کرنے کا معنی یہ ہے کہ جس طرح انسان فطرت کو بگاڑ دے ۔

إِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ إِلَّآ إِنٰثًا ۚ وَإِنْ يَّدْعُوْنَ إِلَّا شَيْطٰنًا
مَّرِيْدًا ﴿١١٧﴾ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿١١٨﴾
وَّلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ

فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ
فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾ يَعِدُهُمْ وَ يُمَنِّيْهِمْ ۚ وَ مَا يَعِدُهُمُ
الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾

(وہ اللہ کو چھوڑ کر دیویوں کو معبود بناتے ہیں ۔ وہ اس باغی شیطان کو معبود بناتے ہیں جس کو اللہ نے لعنت زدہ کیا ہے ۔ (وہ اس شیطان کی اطاعت کر رہے ہیں) جس نے اللہ سے کہا تھا کہ "میں تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ لے کر رہوں گا' میں انہیں بہکاؤں گا' میں انہیں آرزوؤں میں الجھاؤں گا' میں انہیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے جانوروں کے کان پھاڑیں گے اور میں انہیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے خدائی ساخت میں رد و بدل کریں گے ۔" اس شیطان کو جس نے اللہ کے بجائے اپنا ولی و سرپرست بنا لیا وہ صریح نقصان میں پڑ گیا ۔ وہ ان لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انہیں امیدیں دلاتا ہے' مگر شیطان کے سارے وعدے بجز فریب کے اور کچھ نہیں ہیں) ۔

دور جاہلیت میں عرب یہ سمجھتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں ۔ پھر وہ ان فرشتوں کی مورتیاں بناتے اور ان کے نام عورتوں کے ناموں سے رکھتے ۔ لات 'عزیٰ اور منات وغیرہ ۔ پھر وہ ان بتوں کو پوجتے تھے اور پوجتے اس لئے تھے کہ یہ اللہ کی بیٹیوں کے بت ہیں ۔ یوں وہ بارگاہ الٰہی میں ان کو تقرب کا ذریعہ بناتے تھے ۔ ابتداء میں اس طرح انہوں نے شرک کا آغاز کیا تھا ۔ اس کے بعد انہوں نے اس کہانی کی اصلیت کو بھلا دیا اور ان بتوں کی پوجا بذاتہ کرنے لگے ۔ اس کے بعد جب مزید آگے بڑھے تو مطلق پتھروں کی پوجا شروع کر دی ۔ پارہ چہارم میں ہم نے اس کی کچھ تفصیلات دی ہیں ۔

ان میں سے بعض بذات خود شیطان کے بھی پجاری تھے ۔ یہ آیت اس بارے میں نص ہے ۔ کلبی کہتے ہیں کہ خزاعہ کی شاخ بنو ملیح جنوں کی پوجا کرتے تھے ۔ لیکن اس آیت کا مفہوم بڑا وسیع ہے' اس طرح کہ وہ اپنے شرک میں شیطان کو پکارتے تھے اور اس سے امداد طلب کرتے تھے اور شیطان کا قصہ ان کے دادا آدم کے ساتھ مشہور تھا جسے اللہ نے ملعون قرار دیا تھا ۔ اس لئے کہ اس نے انسان کے ساتھ اپنی دشمنی کا اعلان کر دیا تھا ۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسے راندۂ درگاہ کیا تو اسے انسان پر بہت غصہ آگیا اور وہ اس کا سخت دشمن بن گیا ۔ اس نے اللہ سے مہلت مانگی کہ وہ اسے موقعہ دے کہ جو اللہ کے محفوظ قلعے میں پناہ نہیں لیتا وہ اسے گمراہ کر سکے ۔

(اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا وَ اِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا (۱۱۷) لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا (۱۱۸) وَّ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (۱۱۹) (۴:۱۱۷ تا ۱۱۹)) (وہ اللہ کو چھوڑ کر دیویوں کو معبود بناتے ہیں ۔ وہ اس باغی شیطان کو معبود بناتے ہیں جس کو اللہ نے لعنت زدہ کیا ہے ۔ (وہ اس شیطان کی اطاعت کر رہے ہیں جس نے اللہ سے کہا تھا کہ "میں تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ لے کر رہوں گا' میں انہیں بہکاؤں گا' میں انہیں آرزوؤں میں الجھاؤں گا' میں انہیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے جانوروں کے کان پھاڑیں گے اور میں انہیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے خدائی ساخت میں ردوبدل کریں گے ۔)

یہ لوگ شیطان کو پکارتے ہیں جو ان کا قدیمی دشمن ہے ۔ وہ اس سے ہدایات لیتے ہیں اور اس گمراہی میں اس سے امداد لیتے ہیں' حالانکہ یہ شیطان وہ ذات ہے جس پر اللہ نے لعنت بھیجی ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے تصریح کر دی ہے کہ اس کا ارادہ یہ ہے کہ وہ بنی آدم کے ایک بڑے حصے کو گمراہ کر کے رہے گا ۔ انہیں جھوٹی تمناؤں اور جھوٹی خواہشات کا گرویدہ بنا دے گا ۔ وہ جھوٹی لذتوں' موہوم کامیابیوں اور آخرت کی خوش آیند امیدوں میں گم رہیں گے ۔ نیز وہ شیطان جس نے اعلانیہ اپنے اس ارادے کا اظہار کیا تھا کہ وہ ان انسانوں سے نہایت ہی قبیح اور احمقانہ حرکات کا صدور کرائے گا ۔ وہ نہایت ہی بودے تصورات کے قائل ہوں گے اور محض قصے کہانیوں پر دین کا فیصلہ کریں گے ۔ مثلاً یہ کہ وہ بعض جانوروں کے کان پھاڑ کر کہیں گے کہ اب ان پر سواری حرام ہے یا ان کا گوشت کھانا حرام ہے حالانکہ اللہ نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا ۔ نیز وہ فطرت انسانی اور خلق الہی میں بے جا تغیرات کریں گے مثلاً جسم کے بعض اجزاء کاٹیں گے ۔ انسانوں اور حیوانوں کی شکلیں بدلیں گے مثلاً غلاموں کو خصی کریں گے اور ان کے چہرے پر نشانات بنائیں گے ۔ غرض یہ اور تمام دوسرے غیر فطری افعال و حرکات جس کی اجازت فطرت سلیمہ اور اسلام دونوں نہیں دیتے ۔

انسان کا یہ شعور کہ اس کا قدیم دشمن شیطان ہی شرک اور شرکیہ نظریات کا داعی ہے اور وہی ہے جو بت پرستی کی طرف لوگوں کو آمادہ کرتا ہے' انسان کو کم از کم ان کی کانا پھوسی سے محتاط کر دیتا ہے جو دشمن کی طرف سے ہوتی ہے ۔ اسلام نے زندگی کی اس جنگاہ کو انسان اور شیطان کے درمیان ایک معرکہ قرار دیا ہے ۔ اور انسان کی پوری قوتوں کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ اس جنگاہ میں شیطان اور اس کرۂ ارض پر اس کی پیدا کردہ تمام شرارتوں کے خلاف جدوجہد کریں ۔ وہ اللہ اور حزب اللہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں کیونکہ انسان اور شیطان کے درمیان برپا یہ معرکہ ایک دائمی معرکہ ہے جس کے اندر انسان ہروقت ہتھیار بند رہتا ہے ۔ شیطان نے مردود ہونے اور دھتکارے جانے کے بعد جب اس جنگ کا اعلان کیا تو وہ اس جنگ میں تھکتا ہی نہیں ہے ۔ مومن بھی اس سے غافل نہیں ہوتا' نہ مومن اس جنگ سے باہر آ سکتا ہے' اس لئے کہ اسے معلوم ہے کہ اس جنگ میں یا تو وہ اللہ کا ولی ہو گا یا وہ شیطان کا دوست ہو گا ۔ اس کے درمیان کوئی تیسرا موقف سرے سے ہے ہی نہیں ۔ شیطان کی ٹیکنیک یہ ہے کہ وہ انسان کے دلوں میں شہوت اور لذت اور عیش و طرب پیدا کرتا ہے ۔ پھر یہ اپنا کام مشرکین اور شرپسندوں اور عیاشوں کے روپ میں کرتا ہے ۔ ایک مسلمان اپنی ذلت اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اس کے مقابلے میں آتا ہے اور پوری زندگی کے اندر یہ طویل اور نہ ختم ہونے والی جنگ جاری رہتی ہے ۔

جو شخص اپنا مددگار اللہ کو بنا لے وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور جو شخص شیطان کا ساتھی اور مددگار بن جاتا ہے اور شیطان

اس کی امداد کرتا ہے تو وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔

( وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا (۴ : ۱۱۹))

(شیطان کو جس نے اللہ کے بجائے اپنا ولی و سرپرست بنا لیا وہ صریح نقصان میں پڑ گیا)

قرآن کریم شیطان کے اس کردار کی بھی تصویر کشی کرتا ہے جو وہ اپنے ساتھیوں کے حوالے سے ادا کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے کہ گمراہ کرنے میں اس کا طریقہ واردات کیا ہے؟

(يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (۴ : ۱۲۰)) (وہ ان لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انہیں امیدیں دلاتا ہے مگر شیطان کے سارے وعدے بجز فریب کے اور کچھ نہیں ہیں)

شیطان کا طریقہ گمراہی یہ ہے کہ وہ انسان کے برے اعمال کو اس کی نظروں میں بہت ہی خوشنما بنا دیتا ہے۔ یہ کام وہ نہایت ہی فریب کاری سے کرتا ہے۔ وہ یہ باور کراتا ہے کہ طریق معصیت میں ہی اس کا فائدہ اور دنیوی اور اخروی کامیابی ہے۔ اس طرح انسان شیطان کے ساتھ رفاقت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ اسے باور کراتا ہے کہ ان اعمال کے نتیجے میں اس کو نجات حاصل ہو گی اور یوں انسان خوشی خوشی ہلاکت کی طرف بڑھتا ہے۔ حالانکہ (وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (۴: ۱۲۰)) شیطان کا وعدہ محض فریب ہوتا ہے۔

جب شیطان کے طریقہ واردات کی اس قدر واضح انداز میں تصویر کشی کے باوجود یہ ازلی دشمن اپنے پھندے پھیلاتا ہے اور جال بچھاتا ہے اور شکار کو آہستہ آہستہ اس کی طرف ہانکتا ہے، تو اس کے جال اور پھندے میں وہی لوگ پھنستے ہیں جن کی فطرت بدل چکی ہو اور ان کے نفس سے صلاح کے تمام آثار مٹائے جا چکے ہوں۔ ایسے ہی لوگ مدہوش اور خفتہ ہوتے ہیں اور یہ بات نہیں سوچتے کہ انہیں کس راہ پر چلایا جا رہا ہے اور کس فریب میں ان کو پھنسایا جا رہا ہے۔

اہل ہدایت کو بیدار کرنے کے لئے جو پیچ دیا جا رہا تھا' وہ کام ہی کر رہا تھا اور راہوار خیال اس معرکے کی نوعیت کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ہی ان لوگوں کا انجام سامنے آ جاتا ہے جن کو شیطان نے اپنے پھندے میں پھنسا لیا ہوتا ہے اور جن کو اس نے اپنے منصوبے کے بارے میں پختہ یقین دہانی کرائی ہوتی ہے اور جن پر اس کا اعلان کردہ جادو چل چکا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کا انجام بھی اسکرین پر آتا ہے جو شیطان کے پھندے سے نکل گئے' اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر صحیح طرح ایمان لا چکے تھے۔ اور جن لوگوں کا ایمان پختہ ہوتا ہے وہ شیطان کے پھندے سے محفوظ ہوتے ہیں' اس لئے کہ شیطان کو اللہ نے ملعون قرار دیا ہے اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اسے لوگوں کے اغوا کرنے اور گمراہ کرنے کا موقعہ دیا تھا تو اس وقت ہی اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ دیا تھا کہ میرے مخلص بندوں کا تم کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اللہ کے مخلص بندوں کے معاملے میں کمزور رہا۔ جب تک انہوں نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ ذرا غور فرمایئے!

(وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا (۱۱۹) يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (۱۲۰)(۴: ۱۱۹ – ۱۲۰)) (جس نے

شیطان کو اللہ کے سوا اللہ بنا لیا' وہ صریح گھاٹے میں رہا۔ وہ ان لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انہیں امیدیں دلاتا ہے مگر شیطان کے سارے وعدے بجز فریب کے اور کچھ نہیں )

أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا ﴿١٢١﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ﴿١٢٢﴾

(ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے جس سے خلاصی کی کوئی صورت یہ نہ پائیں گے۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں' تو انہیں ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنی بات میں سچا ہو گا)۔

اور وہ ہے جہنم جس سے اولیاء الشیطان کو کبھی چھٹکارا نہ ہو گا۔ دوسری جانب جنت ہے جس میں خدا دوست ہمیشہ رہیں گے۔ (--- وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا (۴: ۱۲۲) (اور اللہ سے بڑھ کر سچی بات کس کی ہو گی)۔

اللہ کی بات مطلقاً سچی ہوتی ہے' جس کے مقابلے میں شیطان کی بات فریب اور جھوٹ ہوتی ہے اور جو لوگ شیطان کے جھوٹے وعدوں میں آ جاتے ہیں اور جو لوگ اللہ کے سچے وعدے پر یقین کرتے ہیں ان دونوں کے موقف میں بہت ہی بڑا فرق ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم عمل اور جزائے عمل کے بارے میں اللہ کے عظیم اور ناقابل تغیر اصول کو بیان کرتا ہے کہ ثواب و عقاب کا دارومدار محض خواہشات نفس اور تمناؤں پر نہیں ہوتا۔ ثواب و عقاب ایک مستقل سنت اور دائمی اصول پر مبنی ہوتا ہے اور وہ ایک نہایت ہی مثبت قانون ہے۔ اس قانون کا اطلاق تمام امتوں میں رہا ہے' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کا نہ نسب ملتا ہے اور نہ ہی کسی کے ساتھ اللہ کی رشتہ داری ہے اور دنیا میں کوئی نہیں ہے کہ اس کے لئے اس اصول میں کوئی نرمی کی جائے یا اس کی وجہ سے سنت الٰہیہ میں کوئی تبدیلی یا تخلف ہو گا۔ یا اس کے مفاد میں قانون بدل جائے گا۔ جو برا کرے گا وہ جزائے بد سے دوچار ہو گا اور جو اچھائی کرے گا وہ جزائے خیر پائے گا' غرض جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ اس میں نہ دوستی ہے اور نہ لحاظ۔

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ ۗ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا

يُجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ
مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ
الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ
لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ
اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾

(انجام کار نہ تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر ۔ جو بھی برائی کرے گا اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلے میں اپنے لئے کوئی حامی و مددگار نہ پاسکے گا ۔ اور جو نیک عمل کرے گا' خواہ مرد ہو یا عورت 'بشرطیکہ ہو وہ مومن' تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی ۔ اس شخص سے بہتر اور کس کا طریق زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویہ نیک رکھا اور یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقے کی پیروی کی) ۔ یہود اور نصاریٰ کہتے تھے ۔ (نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ) ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں ۔ اور وہ یہ بھی کہتے تھے ۔ (لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً) ہمیں آگ نہ چھوئے گی مگر چند دنوں کے لئے ...... اور یہودی تو آج تک اپنے آپ کو اللہ کی مختار قوم کہتے ہیں ۔

ہو سکتا ہے کہ بعض مسلمانوں کے دل میں بھی یہ بات آتی ہو کہ وہ ایک ایسی امت ہیں جسے تمام لوگوں کے لئے نکالا گیا ہے اور اللہ ان کی تمام غلطیوں کو معاف کر دے گا' اس لئے کہ وہ مسلمان ہیں ۔

چنانچہ یہ آیت ایسے ہی حالات کی تردید کے لئے اتری کہ دونوں فریقوں کے یہ خیالات درست نہیں ہیں ۔ عملوں پر سب کا بیڑا پار ہو گا ۔ تمام لوگوں کے لئے ایک ہی معیار ہے ۔ وہ یہ کہ لوگ سب کے سب اللہ کی طرف متوجہ ہو کر سر تسلیم خم کریں' نہایت ہی عاجزی کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں اور ملت ابراہیمی کے اصولوں کا اتباع کریں جو عین اسلام ہے ۔ اسی لئے ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے اپنا دوست بنایا تھا ۔

بہترین دین' دین ملت ابراہیمی ہے اور بہترین عمل 'عمل احسان ہے ۔ اور احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے ۔ اسلام نے ہر معاملے میں احسان کو مدنظر رکھا ہے' یہاں تک کہ ذبیحہ کے لئے بھی احسان تجویز کیا ہے کہ آلہ ذبح تیز ہو تاکہ ذبح کے وقت جانور کو تکلیف زیادہ نہ ہو ۔ اس آیت میں انسان کے دو اصناف کے درمیان بھی اعمال اور جزائے اعمال کے بارے میں مکمل

مساوات کا اظہار کیا گیا ہے۔

(وَ مَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا (٤: ١٢٤)) (اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی)۔

یہ نص صریح ہے کہ مرد اور عورتوں کے درمیان اعمال اور جزائے اعمال کے اعتبار سے کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے۔ اور یہ نص اس بات میں بھی صریح ہے کہ ایمان کے بغیر کوئی عمل مقبول نہ ہو گا اور یہ کہ اللہ کے نزدیک کسی ایسے عمل کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے جو ایمان پر مبنی نہ ہو یا جس کے ساتھ ایمان نہ ہو اور یہ بات نہایت ہی منطقی اور فطری ہے۔ اس لئے کہ صرف ایمان ہی سے اس بات کا تعین ہوتا ہے کہ عمل کرنے والا کس نظریے اور کس نیت سے یہ عمل کر رہا ہے اور صرف ایمان ہی کسی عمل کو دائمی اور فطری بنا سکتا ہے ورنہ عمل محض ذاتی اور شخصی جوش ہو گا۔

یہ صریح الفاظ اس رائے کے بالکل خلاف ہیں جس کا اظہار محترم مفتی محمد عبدہ نے تفسیر پارہ عم میں کیا ہے۔ آیت (مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ) کے تحت انہوں نے کہا ہے کہ اس آیت میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل ہیں۔ یہ اور تمام دوسری آیات اس کے خلاف ہیں۔ اسی طرح استاذ مراغی کی رائے بھی درست نہیں ہے جس پر ہم نے تیسویں پارے میں اظہار خیال کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مسلمانوں پر بہت ہی گراں گزرا تھا۔ (مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ وَلَا یَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا (٤: ١٢٣)) وہ انسانی مزاج کو اچھی طرح جانتے تھے اور ان کو یقین تھا کہ انسان سے برائیوں کا ارتکاب ہو گا چاہے کوئی کتنا ہی نیک کیوں نہ بن جائے اور ڈھیری سی نیکیاں کیوں نہ کرے۔

دور اول کے لوگ نفس انسانی سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ اپنے آپ کو بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو دھوکے میں نہ ڈالتے تھے اور اپنے آپ سے کچھ بھی نہ چھپاتے تھے۔ وہ اس سے بھی چشم پوشی نہ کرتے تھے کہ بعض اوقات ان سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اس لئے وہ اپنی کوتاہیوں کا نہ انکار کرتے تھے اور نہ ہی ان کو چھپاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کو سن کر وہ کانپ اٹھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ہر برے عمل کی انہیں سزا ملے گی تو وہ اس طرح کانپ گئے جس طرح گویا وہ میدان حشر میں ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ یہی صحابہ کرام کی امتیازی خصوصیت تھی کہ وہ آخرت کو اس طرح محسوس کرتے تھے جس طرح ہم عام محسوسات کو کرتے ہیں۔ وہ تصور آخرت اور فکر آخرت میں اس طرح زندہ رہتے تھے جس طرح ہم اس دنیا میں رہتے ہیں محض اس وجہ سے کہ وہ آنے والی ہے بلکہ اس طرح کہ گویا برپا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس آیت کو سنتے ہی کانپنے لگے تھے۔

امام احمد فرماتے ہیں: ”حضرت ابوبکر نے فرمایا رسول اللہ ؐ اس آیت کے بعد فلاح کس طرح ہو گی؟ اللہ فرماتے ہیں (لَیْسَ بِاَمَانِیِّكُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ (٤: ١٢٣)) (ہم نے جو برائیاں کی ہیں ان پر ہمیں سزا ہو گی۔ اس پر نبی ؐ نے فرمایا: ”ابوبکر اللہ تمہیں معاف کر دے کیا تم بیمار نہیں ہوتے، کیا تم تھکتے نہیں ہو، کیا تم

پریشان نہیں ہوتے ' کیا تم آہیں نہیں بھرتے ہو؟" تو انہوں نے کہا' ہاں! آپ نے فرمایا تو ان چیزوں پر بھی تمہیں جزا دی جائے گی ۔ (روایت حاکم بواسطہ سفیان ثوری)

ابوبکر ابن مردویہ کی روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر فرماتے ہیں جب یہ آیت اتری تو میں حضور ؐ کے پاس تھا۔

(مَنْ يَعْمَلْ سُوْءًا يُجْزَبِه وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (٤: ١٢٣)) (جو بھی برائی کرے گا اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلے میں اپنے لئے کوئی حامی و مددگار نہ پا سکے گا)

تو رسول اللہ ؐ نے فرمایا : "ابوبکر تمہیں بتاؤں کہ ابھی کیا آیت اتری ہے ؟ تو ابوبکر کہتے ہیں کہ میں نے کہا حضور ؐ بتایئے حضور ؐ نے مجھے یہ آیت پڑھ کر سنائی تو معلوم نہیں میں نے اس طرح محسوس کیا کہ میری پیٹھ میں کچھ ٹوٹ گیا اور میں سیدھا ہو گیا۔ اس پر رسول خدا ؐ نے پوچھا : "ابوبکر تمہیں کیا ہو گیا ہے ؟" میں نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں' ہم میں سے کس نے برا کام نہیں کیا ہے اور آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ ہمیں تمام برے کاموں کی سزا دی جائے گی ۔ اس پر رسول خدا ؐ نے فرمایا : "ابوبکر تم اور اہل ایمان کو اس دنیا میں جزا دی جائے گی یہاں تک کہ تم اللہ کو اس حال میں ملو گے کہ تمہارا ایک گناہ بھی نہ ہو گا' رہے دوسرے لوگ تو ان کی سیاہ کاریاں جمع ہوں گی اور قیامت کے دن انہیں اس کی جزا دی جائے گی ۔" (روایت ترمذی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور ؐ سے عرض کیا : حضور مجھے قرآن کی سخت ترین آیت معلوم ہے ۔ آپ ؐ نے فرمایا کون سی؟ تو میں نے کہا ۔ (مَنْ يَعْمَلْ سُوْءًا يُجْزَبِه (٤: ١٢٣)) تو آپ نے فرمایا : کہ بندۂ مومن پر مصائب آتے ہیں ۔" (روایت ابن جریر)

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی (مَنْ يَعْمَلْ سُوْءًا يُجْزَبِه (٤: ١٢٣)) (جس نے بھی برائی کی اسے اس کی جزا دی جائے گی) تو یہ بات مسلمانوں پر بہت ہی گراں گزری اس پر رسول خدا ؐ نے فرمایا : "درمیانی فاصلے بند کرو اور ایک دوسرے کے قریب ہو جاؤ' اس لئے کہ مسلمان کو جو مصیبت بھی آتی ہے اس کی وجہ سے اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں جو مصیبت بھی اس پر آئے یہاں تک کہ ایک کانٹا بھی اسے چبھے ۔" (مسلم' ترمذی' نسائی)

بہرحال یہ آیت اسلامی تصورات اور ایمانی طرز فکر کی درستی کے لئے ایک اہم کڑی تھی ۔ اس کی وجہ سے ایک تو اہل دین کی سوچ درست ہوئی اور دوسری جانب ان کا عمل درست ہوا۔ اس آیت نے ان کو خوب جھنجوڑا اور ان کے دل کانپ اٹھے' اس لئے کہ وہ تو ہر حکم کو نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ لیتے تھے ۔ وہ اللہ کے وعدے کی سچائی اور اس کے اوپر عمل کئے جانے کے بارے میں بہت ہی اچھی طرح جانتے تھے ۔ وہ زندگی ان وعدوں کے اندر رہ کر گزارتے تھے اور وہ آخرت میں بستے تھے حالانکہ وہ لوگ ابھی اس دنیا ہی میں تھے ۔

اور آخر میں اختتامیہ آتا ہے' یعنی ایمان و شرک اور اعمال اور جزائے اعمال کے بعد کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ اس دنیا اور آخرت دونوں میں تمام چیزوں پر محیط ہے ۔

# وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾

(آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے اور اللہ ہرچیز پر محیط ہے) قرآن کریم میں جہاں یہ بات آتی ہے کہ اللہ ایک ہے اور وہی الٰہ ہے تو اس کے ساتھ یہ بات بھی آتی ہے کہ وہی مالک اور نگہبان بھی ہے۔ (ملک - مہیمن) یعنی وہی بادشاہ اور کنٹرول کرنے والا ہے۔پس اسلام کا نظریہ توحید صرف یہ نہیں ہے کہ ذات میں اللہ وحدہ لاشریک ہے بلکہ وہ مثبت توحید ہے اور اس کائنات میں فاعل اور مؤثر بھی وہی ہے اور حکومت اور نگہبانی بھی اسی کی ہے۔

جب نفس انسانی کے اندر یہ شعور پختہ ہو جاتا ہے کہ زمین و آسمانوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے اور وہ ہرچیز کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔کوئی چیز خدا کے علم اور اس کی سلطنت سے باہر نہیں ہے' تو اس طرح ایک انسان اس امر پر بسہولت آمادہ ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کو الٰہ، اللہ اور حاکم تسلیم کرے اور صرف اسی کی بندگی کرے اور پھر اللہ کو راضی کرنے کی سعی کرے اور اللہ کے احکام کو تسلیم کرے۔اس لئے کہ سب کچھ اس کا ہے' اس کے قبضے میں ہے اور وہ ہرچیز پر محیط ہے۔

بعض فلسفے ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو واحد مانتے ہیں' لیکن اس عقیدۂ توحید کے بعد یہ فلسفے اس گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اللہ صاحب ارادہ نہیں ہے۔بعض یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا علم نہیں ہوتا۔بعض اللہ کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتے، بعض اللہ کی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتے۔(تفصیلات کے لئے دیکھئے فلاسفہ کے خرافات) چنانچہ فلاسفہ کے نزدیک خدا کا تصور ایک منفی تصور ہے۔اس تصور میں لوگوں کی زندگی کے ساتھ اللہ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔نہ ان کے طرز عمل اور ان کے اخلاق پر اس کا کوئی تصرف ہے' فلاسفہ کی توحید محض کلام ہی کلام ہے۔لیکن اسلام میں' اللہ وہ ذات ہے جو زمین و آسمان کا مالک ہے' لہٰذا وہ ہرچیز کا مالک ہے اور وہ ہرچیز پر محیط ہے اور وہ نگہبان ہے۔لہٰذا اس تصور کے زیر سایہ ضمیر کی اصلاح' طرز عمل کی اصلاح اور پوری زندگی کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۴ ایک نظر میں

اس سورہ کے آغاز میں اسلام نے جاہلی معاشرے کی اصلاح کے جس کام کا آغاز کیا تھا یہ سبق اسی کا ایک حصہ ہے ۔ اس اصلاح کا تعلق عورتوں کے حقوق اور خاندانی نظام کے ساتھ ہے ۔ ایک خاندان کے نتیجے میں جو بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں سے بعض یتیم رہ جاتے ہیں ۔ ان کے مسائل اس میں لئے گئے ہیں ۔ اسلامی معاشرے کو تنبیہ کی گئی ہے کہ ان مسائل کے اندر جاہلیت کے دور کی جو ناہمواریاں رہ گئی ہیں انہیں دور کیا جائے اور ایک گھرانے کو اس اساس پر اٹھایا جائے کہ اس کے اندر مرد اور عورت دونوں کا احترام ہو' دونوں کی مصلحتوں کا خیال رکھا جائے ۔ خاندان کے اندر جو اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں ان کی اصلاح کی تدابیر اس سبق کا موضوع ہے ۔ یعنی اگر اختلافات ہوں تو معاملات کے بگاڑ سے پہلے ان کی اصلاح کی جائے تاکہ گھرانے ٹوٹنے نہ پائیں ۔ خصوصاً وہ بچے جو ان گھرانوں میں پیدا ہو چکے ہوتے ہیں اور خاندان ان کے لئے نرسری ہوتا ہے ان کی صحیح ترتیب ہو سکے ۔ نیز عام معاشرے کے اندر زیردست لوگوں کی دیکھ بھال کی جائے تاکہ یہ نہ ہو کہ غالب اور زور آور لوگوں کا قانون چلے اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا دور دورہ ہو ۔

یہ سبق بعض معاملات کی اصلاح اس طرح کرتا ہے کہ انہیں نظام کائنات کے ساتھ مربوط کرتا ہے ۔ جس سے مخاطب کو یہ تصور دینا مطلوب ہے کہ عورتوں 'گھرانوں' خاندانوں اور معاشرے کے اندر کمزوروں کے مسائل معمولی مسائل نہیں ہیں ۔ ان کی بہت بڑی اہمیت ہے جس کی تفصیلات ہم اس پارے میں دے چکے ہیں ۔ پارۂ چہارم کے مقدمے میں' ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ اسلام میں خاندانی نظام کو کتنی عظیم اہمیت دی گئی ہے ۔ اور یہ کہ اسلامی نظام نے خاندانی ادارے کو جاہلیت کی رسوم بد سے پاک کرنے کے لئے کس قدر عظیم جدوجہد کی ہے اور کس قدر کوشش کی ہے کہ معاشرے کے اندر لوگوں کی اخلاقی 'نفسیاتی اور اجتماعی سطح کو بلند کیا جائے تاکہ اسلامی معاشرہ ان تمام معاشروں پر فوقیت حاصل کرلے جو اس وقت اس کے اردگرد پھیلے ہوئے تھے ۔ جو دین اسلام کو قبول نہ کرتے تھے اور جن کی تربیت اسلامی منہاج کے مطابق نہ تھی اور جو اسلامی نظام کے زیر حکومت نہ تھے ۔

اب ذرا تفصیلات کے ساتھ زیر بحث آیات کو لیجئے ۔

---○○○---

# درس نمبر ۴۱ تشریح آیات

# ۱۲۷ --- تا --- ۱۳۴

وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

"لوگ تم سے عورتوں کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ تعالیٰ تمہیں ان کے معاملے میں فتویٰ دیتا ہے' اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سنائے جا رہے ہیں۔ یعنی وہ احکام جو ان یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں جن کے حق تم ادا نہیں کرتے اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو (یا لالچ کی بنا پر تم خود ان سے نکاح کر لینا چاہتے ہو) اور وہ احکام جو ان بچوں کے متعلق ہیں جو بیچارے کوئی زور نہیں رکھتے۔ اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو' اور جو بھلائی تم کرو گے وہ اللہ کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی)۔

سورہ نساء کے ابتدا میں جو آیات نازل ہوئی تھیں' ان کی وجہ سے کئی سوالات پیدا ہو گئے تھے اور لوگ سوالات کیا کرتے تھے۔ مسلمانوں کی جانب سے' اسلامی معاشرے کی تشکیل کے ابتدائی دور میں مختلف مسائل کے بارے میں سوالات کرنا ایک عام پریکٹس تھی اور اس کی تہ میں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ وہ اسلامی نظام زندگی سے متعلق احکام معلوم کرنا چاہتے تھے اس لئے کہ جاہلیت سے اسلام کی طرف منتقل ہونے کا عمل دراصل ان کی زندگیوں میں ایک گہرا انقلاب تھا۔ اس کی وجہ سے ان کے شعور میں جاہلیت کے دور میں ہونے والے تمام افعال اور رسوم کے بارے میں شک پیدا ہو گیا تھا۔ وہ ہر وقت یہ محسوس

کرتے تھے کہ کسی پیش آمدہ معاملے میں اسلام نے سابق پریکٹس کو منسوخ نہ کر دیا ہو۔ یہ بیداری اور اسلامی احکام کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کا جذبہ ان حضرات کی ایک عام صفت تھی۔ اس کے باوجود بعض آثار جاہلیت ان کی زندگیوں میں باقی تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کے اندر ایک قوی جذبہ موجود تھا' جس کے مطابق وہ اپنی زندگی کے تمام حالات کو اسلام کے مطابق ڈھالتے تھے اور اس روح کے ساتھ وہ بعض احکام کے بارے میں استفسارات کرتے تھے۔ یہ کام وہ محض علم و ثقافت اور محض سوال کی خاطر نہ کرتے تھے جیسا کہ آج کل مفتی حضرات کے پاس اکثر سوالات محض حصول علم و ثقافت کے لئے ہوتے ہیں' کوئی عمل کرنے کے لئے نہیں پوچھتا۔

اس وقت مسلمانوں کو دینی مسائل کے پوچھنے کی حقیقی ضرورت بھی تھی' اس لئے کہ یہ دین ان کے لئے زندگی کا نظام تھا اور وہ اس کے مسائل پوچھنے کے معاملے میں بہت ہی سرگرم تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ان کی عملی زندگی احکام دین کے مطابق بن جائے۔ وہ جاہلیت سے نکلنے کے عمل سے گزر رہے تھے اور جاہلیت کی تمام عادات و تقالید اور اوضاع و اطوار سے خائف تھے کہ کہیں کوئی بات نظام اسلام کے خلاف نہ ہو۔ اسلام نے ان کے اندر جو تغیر اور انقلاب برپا کر دیا تھا اس کے بارے میں وہ بہت ہی حساس تھے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام نے انہیں جو دوسرا جنم دیا تھا' اس کے بارے میں وہ نہایت محتاط تھے۔

یہاں ہمیں ان کا وہ انعام و اکرام نظر آتا ہے جو انہیں ان کے اس سچے عزم اور اسلام کے بارے میں ان کے جوش و خروش کی وجہ سے ملا۔ وہ اس شکل میں کہ اللہ کی خاص عنایت اور توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی ذات باری نے خود براہ راست انہیں ان کے اس استفتاء کا جواب دیا۔

(وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ (۴:۱۲۷) (لوگ تم سے عورتوں کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں) وہ تو رسول اللہ ﷺ سے پوچھتے تھے اور اللہ تعالیٰ حضرت نبی ﷺ سے کہتے تھے: "کہو اللہ تمہیں فتویٰ دیتے ہیں' تمہارے سوال اور بقیہ دونوں امور کے بارے میں جن کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ عنایت ہے جس کی قدر و قیمت صحابہ کرام ہی جانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نہایت ہی مہربانی' نہایت ہی عزت افزائی کرتے ہوئے بذات خود جماعت مسلمہ کو فتویٰ دیتے ہیں اور یہ اللہ کی جانب سے نیابت یا بندہ پروری اور مہربانی ہے اور بندوں کی جدید زندگی کے لئے ضروری سوالوں کا جواب خود دیا جا رہا ہے۔ یہ سوال ان عملی حالات کے بارے میں تھا جو جاہلیت میں روز مرہ کا معمول تھے۔ وہ جاہلیت جس سے پوچھنے والوں کو اللہ اور اللہ کے نظام نے نکالا تھا۔ دوسرے یہ سوالات ان امور کے بارے میں تھے جن کے ذریعے جدید اسلامی معاشرے کو مزید ترقی دینا مطلوب تھا۔

(قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ (۴:۱۲۷))

(کہو اللہ تمہیں ان کے معاملے میں فتویٰ دیتا ہے اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سنائے جا رہے ہیں ۔ یعنی وہ احکام جو ان یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں جن کے حق تم ادا نہیں کرتے اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو (یا لالچ کی بناء پر تم خود ان سے نکاح کر لینا چاہتے ہو) اور وہ احکام جو ان بچوں کے متعلق ہیں جو بیچارے کوئی زور نہیں رکھتے اللہ تمہیں ہدایت دیتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو۔)

علی ابن ابو طلحہ نے حضرت ابن عباس سے اس آیت کے بارے میں نقل کیا ہے کہ جاہلیت کے دور میں جس کے پاس یتیم لڑکی ہوتی' وہ اس پر اپنا کپڑا ڈال دیتا' جب وہ ایسا کر لیتا تو اس یتیم لڑکی کے ساتھ کوئی شخص بھی کبھی نکاح نہ کر سکتا۔ اگر وہ خوبصورت ہوتی اور وہ اسے پسند کرتا تو وہ اس کے ساتھ خود نکاح کر لیتا اور اس کا مال کھاتا رہتا۔ اور اگر بدصورت ہوتی تو دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی اس کا نکاح کرنے کی اجازت نہ دیتا یہاں تک کہ وہ مر جاتی اور یہ اس کے مال کا وارث ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو حرام قرار دیا اور آئندہ کے لئے اس سے منع فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا! (وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ (۴:۱۲۷)) (اور بچوں میں سے کمزور لوگ) کون تھے؟ جاہلیت میں دراصل کمزور بچوں کو وراثت میں سے حق نہ دیا جاتا تھا اور نہ لڑکیوں کو دیا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں! (لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ (۴:۱۲۷)) تم ان کو وہ حق نہیں دیتے جسے اللہ نے فرض قرار دے دیا ہے۔ اللہ نے اس سے بھی روک دیا اور ہر حقدار کا حصہ قرآن میں مقرر کر دیا اور کہا کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے خواہ عورتیں چھوٹی ہوں یا بڑی ہوں۔

سعید ابن جبیر کہتے ہیں آیت۔ (وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ (۴:۱۲۷)) کی تفسیر یہ ہے کہ اگر یتیم لڑکی مالدار اور خوبصورت ہو تو ولی کہتا کہ میں اسے اپنے لئے چن لیتا ہوں اور اس کے ساتھ نکاح کر لیتا اور اگر صاحب مال و جمال نہ ہوتی تو اسے دوسروں کے نکاح میں دے دیتا۔

(وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ) تا آیت (وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ) کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ یہ اس شخص کے بارے میں ہے جس کے پاس یتیم لڑکی ہوتی۔ وہ اس کا ولی اور وارث ہوتا۔ وہ اسے اپنے مال میں شریک کر لیتی یہاں تک کہ کھجور کے اس گچھے میں بھی جو کھانے کے لئے توڑ لیا جاتا۔ وہ اس کے ساتھ نکاح کرنا بھی پسند نہ کرتا تھا اور کسی دوسرے شخص کے نکاح میں بھی نہ دیتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ مال میں شریک نہ ہو جائے۔ اس طرح وہ عورت معطل رہتی۔ (بخاری مسلم)

ابن ابو حاتم نے عروہ ابن زبیر سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک دوسری روایت نقل کی ہے' فرماتے ہیں: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "اس آیت کے بعد لوگوں نے رسول اللہ ؐ سے اس آیت کے بعد دوبارہ ان عورتوں کے بارے میں پوچھا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ (۴:۱۲۷))

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ اس آیت میں یہ جو کہا گیا ہے کہ جو تم پر کتاب میں پڑھا جاتا ہے (یعنی سابقہ احکام) تو

اس سے مراد وہ سابقہ آیت ہے یعنی (وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتَامٰی فَانْکِحُوْا مَاطَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَاءِ) یعنی اگر وہ صاحب مال و جمال نہ ہوں اور تم ان کے ساتھ نکاح نہ کرنا چاہتے ہو۔ اور اگر وہ صاحب مال و جمال ہوں اور تم ان کے ساتھ نکاح کرنا چاہتے ہو صرف مال کی غرض ہو تو نکاح نہ کرو الا یہ کہ عدل کے ساتھ نکاح کرنا چاہو۔

ان احادیث اور قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت کے دور میں کیا ہو رہا تھا۔ خصوصاً یتیم نوجوان عورتوں کے ساتھ۔ یتیم لڑکی کے ساتھ ولی کی طرف سے مال و دولت میں بھی بے ایمانی ہوتی اور اس کے مہر میں بھی اس کے ساتھ زیادتی ہوتی۔ اس کا مال لٹایا جاتا اور اگر وہ بدصورت ہوتی تو اس کا مال بھی ہڑپ ہوتا اور اس کے ساتھ نکاح بھی نہ ہوتا۔ کسی دوسرے کے نکاح میں بھی نہ دی جاتی کہ کہیں وہ ولی کے ساتھ مال میں شریک نہ ہو جائے کیونکہ مال ولی کے تصرف میں ہوتا۔

یہی حال چھوٹے بچوں اور لڑکیوں کا ہوتا۔ ان کو میراث سے محروم کر دیا جاتا۔ اس لئے کہ وہ ضعیف ہوتے تھے اور وہ اس مال کی مدافعت نہ کر سکتے تھے یا وہ جنگ نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے ان کے لئے کوئی حق یا حصہ نہ ہوتا اور یہ قبائلی تصور حیات کے مطابق ہوتا جن کے مطابق قبیلے کے تمام اموال جنگ کرنے والوں کے لئے ہوتے اور ضعیفوں کے لئے کچھ نہ ہوتا۔

یہ تھے وہ بدوی اور بدشمار رسم و رواج جن کو اسلام نے تبدیل کرنا شروع کیا اور ان کی جگہ ترقی یافتہ قرآنی رسم و رواج کی بنیاد ڈالی اور یہ تبدیلی ایسی نہ تھی کہ گویا بہت ہی تیزی سے بطور لانگ جمپ یہ انقلابی تبدیلی کی گئی اور عربی معاشرے کو ایک ترقی یافتہ معاشرہ بنا دیا گیا بلکہ یہ عربوں کے لئے ایک نیا جنم تھا۔ ان کی حقیقت کو بدل کر ایک نئی حقیقت ان کو دی گئی۔

یہاں جو اہم بات ہم ریکارڈ پر لانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ نشاۃ جدیدہ کسی منصوبے کے تحت نشاۃ ثانیہ نہ تھی اور نہ اس کے لئے کوئی خاص منصوبہ بنایا گیا تھا اور نہ منصوبے کے لئے کوئی ابتدائی تیاری کی گئی تھی یا یہ ترقی کسی مادی تبدیلی کی وجہ سے ہوئی تھی اور صرف عربوں کی زندگی میں ہوئی تھی۔

اس لئے کہ حقیقت ملکیت کے جاہلی سبب محاربت کو منسوخ کر کے' اس کی جگہ انسانی اساس پر حق ملکیت کو استوار کرنا' بچے' یتیم اور عورت کو بھی انسانی حقوق عطا کرنا محض اس وجہ سے نہ تھا کہ معاشرے کے اندر تبدیلی آگئی تھی اور اس معاشرے کے اندر جنگی قوت رکھنا یا دفاع کرنا ہی اہم عامل نہ رہا تھا' اس وجہ سے جنگی قوت رکھنے والے افراد خاندان کی امتیازی حیثیت کو ختم کر دیا گیا۔ اب خاندان والوں کے لئے جنگی قوت رکھنے والے افراد کی سرے سے ضرورت ہی نہ تھی اور نہ ان کی امتیازی حیثیت کی ضرورت تھی۔

ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسلامی دور میں بھی جنگی افراد کی اہمیت اپنی جگہ قائم تھی۔ ان کی ضرورت بھی تھی لیکن جو فرق پڑا وہ یہ تھا کہ اسلامی نظام آگیا تھا اور یہ انسان کے لئے ایک جدید جنم تھا۔ یہ جنم ایک کتاب کے ذریعے ملا تھا۔ ایک نظام سے انہیں یہ جنم ملا تھا اور جدید معاشرہ اس جدید نظام نے قائم کیا تھا اور اسی سرزمین پر قائم کیا تھا جس پر جاہلیت قائم تھی اور انہی حالات میں جن میں ذرائع پیداوار کے اندر کوئی تبدیلی نہ کی گئی تھی۔ نہ مادے اور اس کے خواص میں کوئی تبدیلی کی گئی تھی بلکہ تصور حیات اور نظریہ حیات کے اندر انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ اور یہ انقلاب محض اس نظریہ جدیدہ کی وجہ سے ہوا تھا۔

یہ بات بھی حقیقت تھی کہ اسلامی نظام نے لوگوں کے ذہنوں اور طرز عمل سے جاہلیت کے آثار کو مٹانے کے لئے طویل ترین جدوجہد کی اور ان کی جگہ اسلامی تصورات اور اسلامی عادات و اطوار بٹھانے کیلئے سخت محنت کی۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ جاہلیت

کے بعض اطوار ابھی تک اپنے آپ کو بچانے کے لئے کوشاں تھے اور بعض انفرادی حالات میں ان کا پھر سے ظہور ہو جاتا تھا۔ یہ عادات و اطوار مختلف شکلوں میں اپنے آپ کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ نظام جو آسمانوں سے نازل ہوا اور وہ تصورات جو اس نظام نے عطا کئے ہی تو جاہلیت کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کی سعی میں مصروف تھے اور یہ بات نہ تھی کہ مادی صورت حال یا اس کے اندر موجود تضادات اس تبدیلی میں مؤثر تھے یا ذرائع پیداوار میں کوئی تبدیلی ہو گئی تھی یا کوئی اور مارکسی فیکٹر تھا جو مادے یا ذرائع پیداوار میں تبدیلی کی وجہ سے معاشرے میں تغیر لا رہا تھا۔

عرب قوم کی زندگی میں جو نئی چیز تھی وہ دین تھی جو عالم بالا سے ان پر نازل ہوئی تھی۔ اس پر بعض نفوس نے لبیک کہا اس لئے کہ وہ انسانی فطرت سے ہمکلام تھی اور یہ فطرت ہر انسان کے اندر موجود تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ عظیم انقلاب رونما ہوا بلکہ انسان کو یہ نیا جنم ملا، جس نے زندگی کے تمام خدوخال بدل دیئے، ہر پہلو سے بدل دیئے اور جاہلیت کے تو تمام نشانات مٹا دیئے۔

معاشرے کے جدید و قدیم خدوخال کے درمیان جس قدر تنازع بھی نظر آئے اور اس تطہیر اور تجدید کی راہ میں جس قدر رنج و الم اور قربانیاں بھی دی گئی ہوں، یہ سب کچھ آسمانی رسالت کی وجہ سے ہوا۔ ایک نظریاتی اور اعتقادی تصور تھا جو اس انقلاب کے لئے پہلا اور آخری فیکٹر تھا۔ بلکہ اس نئے جنم کے لئے وہی اول و آخر عامل تھا۔ پھر کیا ہوا؟ پھر اس انقلاب کا طوفان صرف اسلامی معاشرے تک ہی محدود نہ رہا بلکہ اس نے پوری انسانی اقدار اور تمام انسانی معاشروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

یہی وجہ ہے کہ اہل اسلام نے رسول سے تو صرف عورتوں کے بارے میں پوچھا تھا، اور اللہ نے ان عورتوں کے علاوہ یتیم لڑکیوں، چھوٹے بچوں اور ضعیفوں کے حق کے بارے میں بھی جواب دیا تھا، تو اس سوال و جواب کو اللہ تعالیٰ نے اس مصدر کے ساتھ باندھ دیا جس کے ذریعے سے یہ انقلاب آیا تھا۔

( وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا (٤: ١٢٧) ) (اور جو بھلائی تم کرو گے وہ اللہ کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی)

جو کچھ بھی تم کرو گے وہ نامعلوم نہ رہ جائے گا، ضائع نہ ہو گا۔ اللہ کے ہاں ریکارڈ ہو گا اور جو چیز اللہ کے ہاں ریکارڈ ہو جائے وہ ہرگز ضائع نہ ہو گی۔

یہ ہے وہ آخری مرجع جس کی طرف ایک مومن اپنے اعمال بھیجتا ہے اور یہی وہ قبلہ ہے جس کی طرف مومن کے فکر و عمل کا رخ ہوتا ہے۔ اس مرجع کی قوت اور گرفت ہی ان ہدایات اور اس نظام کی قوت اور گرفت ہوتی ہے اور اس کا انسانی نفس، اور اس کی عادات و اطوار بلکہ پوری زندگی پر اثر ہوتا ہے۔

یہ بات اہم نہیں ہوتی کہ کوئی بہت سی ہدایات دے یا لکھ دے، یا کوئی نظام حیات تجویز کرے یا کوئی نیا نظم و نسق قائم کرے۔ اصل اہمیت اس گرفت اور قوت کی ہوتی ہے جو کسی ہدایت، کسی نظام اور کسی تنظیم کی پشت پر ہوتی ہے۔ وہ گرفت جس سے یہ تمام تصورات اور یہ تمام ادارے قوت نافذہ حاصل کرتے ہیں۔ ان نظامہائے زندگی اور ان اقدار میں جو ایک انسان اللہ سے لیتا ہے اور ان میں جو ایک انسان اپنے جیسے انسانوں سے لیتا ہے، زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ یہ اس صورت میں جیسے

دوسری صفات کے حوالے سے انسانی نظام اور الہی نظام کے درمیان مساوات فرض کر لی جائے اور یہ بات فرض کر لی جائے کہ یہ دونوں نظام نہایت بلند اور ترقی یافتہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا فرض کرنا بھی محال اور جنون ہے۔ الا یہ کہ انسان سوچ لے کہ یہ بات کس کے منہ سے نکلی اور یہ کہ اس کے بارے میں ہماری سوچ کیا ہے اور اس کے بارے میں ہماری رائے کیا ہے۔ ایک طرف اللہ العلی العظیم کی بات ہے اور دوسری جانب انسان ابن انسان کی بات ہے۔ اجتماعی ضابطہ بندی کا ایک قدم اور یہ بھی خاندان کے دائرے میں اور اس معاشرے میں جسے اسلام نیا جنم دے رہا تھا اور یہ جنم ملاء اعلیٰ سے اسلامی نظام حیات کے ذریعے ہو رہا تھا اور اس کے اندر کسی زمینی فیکٹر یا عامل کا کوئی دخل نہ تھا۔ مادی ہو یا پیداوار سے متعلق ہو۔ ملاحظہ ہو۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿١٢٨﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاۗءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٢٩﴾ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿١٣٠﴾

(اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں کہ میاں اور بیوی (کچھ حقوق کی کمی بیشی پر) آپس میں صلح کر لیں۔ صلح بہرحال بہتر ہے۔ نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں' لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو یقین رکھو کہ اللہ تمہارے اس طرز عمل سے بے خبر نہ ہو گا۔ بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ لہذا (قانون الہی کا منشا پورا کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ) ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ادھر لٹکتا چھوڑ دو۔ اگر تم اپنا طرز عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ چشم پوشی کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ لیکن اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہی ہو جائیں تو اللہ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ کا دامن بہت کشادہ

ہے اور وہ دانا و بینا ہے)

اسلامی نظام نے اس سے قبل عورت کی طرف سے بدسلوکی اور نافرمانی کے بارے میں قانون سازی کر دی تھی ۔ اور وہ تمام انتظامات کر دیئے تھے کہ اس پہلو میں نقصان پیدا ہونے کے خلاف کیا تدابیر اختیار کی جائیں گی ۔ (ملاحظہ ہو اس پارہ کی ابتدائی آیات)۔ یہاں اس بے رخی اور نافرمانی کا ذکر کیا جاتا ہے جو خاوند کی طرف سے ہو' اور جس کی وجہ سے عورت کے احترام اور عزت نفس کو خطرہ ہو اور اس کے نتیجے میں خاندان کے تباہ ہونے کا خدشہ ہو اس لئے کہ دل بدل سکتے ہیں اور میلانات اور رجحانات کے اندر تبدیلی آسکتی ہے ۔ اسلام ایک ایسا نظام ہے جو معاشرتی معاملات کے اندر زندگی کے تمام اجزاء کا احاطہ کرتا ہے اور جو مشکلات اور خطرات پیش آسکتے ہیں ان کو حل کرتا ہے ۔ اسلام ان تمام مسائل کو اپنے رجحانات اور اصول کے مطابق حل کرتا ہے اور اپنی اسکیم کے مطابق تمام اقدامات کرتا ہے ۔

اگر عورت اور مرد کے اندر باہم تعلقات میں کشیدگی سی پیدا ہو جائے اور طلاق کا خطرہ ہو' یا یہ خطرہ ہو کہ خاوند بیوی کو معطل اور معلق چھوڑ دے گا ۔ نہ وہ بیوی ہو گی اور نہ وہ مطلقہ ہو گی تو اس صورت میں دونوں کے لئے اس امر میں ممانعت نہیں ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف مالی اور دوسرے حقوق کے اندر کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اختیار کر لیں ۔ مثلاً یہ کہ عورت اپنے مالی اخراجات میں سے کچھ معاف کر دے یا سب معاف کر دے ۔ یا یہ کہ اگر زیادہ عورتیں ہوں تو بیوی اپنی باری وغیرہ سے دست بردار ہو جائے ۔ مثلاً اگر کوئی دوسری بیوی مرد کو زیادہ پسند ہو تو اس کے حق میں کوئی بیوی دست بردار ہو جائے یا مثلاً اس صورت میں کہ معاف کرنے والی بیوی کو بعض حقوق کے اندر زیادہ دلچسپی نہ رہتی ہو ۔ یہ اس صورت میں کہ عورت تمام احوال اور معاملات کو دیکھ کر' سوچ کر کامل آزادی کے ساتھ یہ فیصلہ کرے کہ اس کے لئے یہ حالت طلاق سے بہتر ہے ۔

(وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا (۴:۱۲۷)) (اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں کہ میاں اور بیوی (کچھ حقوق کی کمی بیشی پر) آپس میں صلح کر لیں) یہ وہی صلح ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ۔

اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ مقدمہ بازی سے صلح ہر صورت میں بہتر ہوتی ہے ۔ بے رخی' خشک تعلقات اور طلاق' سب حالات کے مقابلے میں صلح خیر ہے ۔ (وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (۴:۱۲۷))

(صلح بہرحال بہتر ہے) صلح کی وجہ سے خشک اور جفا پیشہ دلوں کے اوپر باد نسیم کے ٹھنڈے جھونکے چلنے لگتے ہیں ۔ انس و محبت کی شبنم سے باہم تعلقات کو طراوت نصیب ہوتی ہے اور ازدواجی تعلقات کو باقی رکھنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور اگر ختم ہو چکے ہوں تو ازدواجی تعلقات پھر سے استوار ہو سکتے ہیں ۔

اسلام نفس انسانی کے ساتھ حقیقت پسندانہ معاملہ کرتا ہے ۔ وہ تمام ذرائع اور وسائل کو کام میں لا کر نفس انسانی کو ایک ایسی سطح تک سربلند کرتا ہے جس کے لئے اس نے اس کے مزاج اور فطرت کو تیار کیا ہے ۔ لیکن اسلام ان تمام وسائل کو کام میں لاتے ہوئے یہ بھی پیش نظر رکھتا ہے کہ انسانی فطرت کے بھی کچھ حدود و قیود ہوتے ہیں ۔ اسلام فطرت انسانی اور

انسانی مزاج کو ایسے کاموں پر مجبور نہیں کرتا جو اس کی قدرت اور وسعت سے باہر ہوں ۔ اسلام لوگوں کو یہ حکم نہیں دیتا کہ تم اپنے سروں کو دیواروں سے ٹکراؤ اور یہ ہے میرا حکم بس السلام علیکم! یہ کرو چاہے قدرت ہے یا نہیں ہے ۔

اسلامی نظام نفس انسانی کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ ضعیفی کی حالت پر رہے یا تقصیرات پر راضی ہو ۔ وہ یہ بھی نہیں کرتا کہ انسان گندگی کے دلدل میں کانوں تک ڈوبا ہو' اور وہ اس کی تعریف و تمجید کرے اور اس کے لئے جواز یہ ڈھونڈے کہ انسان بطور حقیقت واقعہ اسی طرح ہے ۔ وہ اس طرح بھی نہیں کرتا کہ اسے عالم بالا کے ساتھ بذریعہ رسی باندھ کر لٹکا دے اور پھر وہ جدھر چاہے جھولتا پھرے کیونکہ اس صورت میں اس کے پاؤں بھی زمین پر نہ ہوں گے اور ہم اس صورت حال کو یہ کہیں کہ یہ رفعت اور سربلندی ہے ۔

اسلام ان انتہاؤں کے درمیان دین وسط ہے ۔ یہ ایسا نظام ہے جس کے اندر حقیقت پسندانہ واقعیت پائی جاتی ہے یا سنجیدہ حقیقت پسندی ہے ۔ یہ نظام انسان کے ساتھ معاملہ کرتا ہے اور انسان کو انسان سمجھ کر معاملہ کرتا ہے ۔ اپنی فطرت کے اعتبار سے انسان ایک عجیب مخلوق ہے ۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کے پاؤں زمین پر ہیں لیکن اس کی روح آسمانوں پر ہے ۔ اس کی روح اس کے جسم میں بھی ہوتی ہے اور آسمانوں پر بھی ہوتی ہے ۔ غرض جسم زمین پر اور روح آسمانوں پر ہوتی ہے ۔

یہ حکم دیتے ہوئے اسلامی نظام ایک انسان کے ساتھ معاملہ کرتا ہے اور اس معاملے میں انسان کی ایک عام خصوصیت کا ذکر کرتا ہے ۔ (وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ (۴:۱۲۷)) (نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں) مطلب یہ ہے کہ تنگ دلی دائماً نفوس کے اندر موجود ہوتی ہے ۔ نفس کے اندر تنگ دلی قائم رہتی ہے ۔ تنگ دلی کی کئی اقسام ہیں ۔ مال میں تنگ دلی ۔ جذبات میں تنگ دلی' زوجین کی زندگی میں بعض اوقات ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے بخل اور تنگدلی ابھر آتی ہے ۔ ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ خاوند عورت کے بارے میں سخت تنگ دل ہو جاتا ہے ۔ اب عورت اگر اپنا بقایا مہر چھوڑ دے یا نفقات معاف کر دے یا مالی تاوان ادا کر دے اور نکاح کو باقی رکھوا لے تو معاملہ خراب ہونے سے ٹل سکتا ہے ۔ اس لئے کہ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ عورت اپنے حقوق زنا و شوئی بھی معاف کر دیتی ہے مگر طلاق لینا پسند نہیں کرتی ۔ اگر صورت یہ ہو کہ خاوند کی کوئی دوسری زیادہ محبوب بیوی ہو اور پہلی بیوی کے اندر کشش اور تازگی باقی نہ رہی ہو اور عورت خاوند کے جذبات کا احترام کر کے اس کو راضی کر لے اور اس طرح نکاح باقی رہ جائے ۔ غرض ان تمام حالات میں معاملہ بیوی کے اختیار میں دے دیا گیا ہے ۔ وہ مختار ہے کہ اس کی مصلحت جس صورت میں ہو وہ اسے اختیار کر لے ۔ اسلامی نظام اس پر کچھ لازم نہیں کرتا بلکہ اختیار ہے کہ وہ اپنے معاملے میں تدبر کر کے کوئی بہتر فیصلہ اپنے حق میں کر لے ۔

لیکن اسلام معاملے کو بخل کے حوالے ہی نہیں کر دیتا بلکہ اسے ایک دوسرے طرز عمل کی طرف بھی بلاتا ہے' اس لئے کہ بخل ہی انسانی فطرت کا خاصہ قائمہ نہیں ہے بلکہ احسان اور خدا ترسی بھی فطرت انسان کے اندر ہیں ۔

(وَإِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۴:۱۲۷)) (لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو یقین رکھو کہ اللہ تمہارے اس طرز عمل سے بے خبر نہ ہو گا)۔

احسان اور تقویٰ پر ہی آخری دارومدار ہے اور احسان اور تقویٰ کا کوئی عمل ضائع نہ ہو گا۔ اس لئے ضائع نہ ہو گا کہ اللہ کا علم سب چیزوں پر محیط ہے۔ وہ ہر انسان کے عمل سے بھی خبردار ہے اور اس عمل کی تہ میں پائے جانے والی نیت سے بھی خبردار ہے۔ نفس انسانی کو اس طرف پکارنا کہ تم احسان اور تقویٰ کو اپنا شعار بناؤ اور یہ کہ اللہ تمام اعمال سے خبردار ہے' یہ ایک ایسی پکار ہے جس کا نفس انسانی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس پکار پر ہر انسان لبیک کہتا ہے۔ بلکہ یہ وہ واحد دعوت و تلقین ہے جس کے لئے ہر نفس بہت جلدی تیار ہو جاتا ہے۔

ایک بار پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی نظام حیات انسانی زندگی کے حالات اور اس کی واقعی صورت حال کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ یہ معاملہ مثالی طور پر حقیقت پسندانہ ہے یا حقیقت پسندانہ مثالیت ہے۔ اسلام ان باتوں کا اعتراف کرتا ہے جو فطرت انسانی کا لازمی حصہ ہیں اور ہیں بھی پوشیدہ اور یہ اعتراف نہایت ہی تعجب خیز انداز میں ہے۔

(وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۱۲۹)
وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ۭوَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا (۱۳۰)

بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا (قانون الٰہی کا منشا پورا کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ) ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ادھر لٹکتا چھوڑ دو۔ اگر تم اپنا طرز عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ چشم پوشی کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ لیکن اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہی ہو جائیں تو اللہ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ کا دامن بہت کشادہ ہے اور وہ دانا و بینا ہے)

اللہ وہ ذات ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور وہ اپنی پیدا کردہ مخلوقات کے بارے میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے بعض میلانات ایسے ہیں جن پر اس کے لئے قابو پانا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسان کے ہاتھ میں تکیل دے دی کہ وہ ان میلانات کو قابو میں رکھے' ان میلانات کی حرکت کو حدود میں رکھے لیکن انہیں بالکل ختم کرنے کی کوشش بھی نہ کرے۔

ان میلانات میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی انسان اپنی متعدد بیویوں میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ مائل ہو۔ یہ میلان ایسا ہوتا ہے جو انسان کی طاقت سے باہر ہوتا ہے۔ انسان اسے ختم نہیں کر سکتا تو اس کا حل کیا ہے؟ اسلام کسی شخص سے اس بات پر مؤاخذہ نہیں کرتا جو اس کی وسعت سے باہر ہو۔ نہ اسے گناہ قرار دیتا ہے اور نہ اس پر سزا دیتا ہے۔ اس بات کو اسلام اس کھاتے میں ڈالتا ہے جو اس کی قدرت سے ہی باہر ہو۔ چنانچہ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ تم اپنی بیویوں کے درمیان ہرگز مکمل عدل نہیں کر سکتے اگرچہ تم ایسا کرنے کی کوشش کرو۔ اس لئے کہ یہ تمہاری قدرت سے باہر ہے۔ تمہارے ارادے میں جو چیز داخل ہے وہ یہ ہے کہ تم معاملہ کرنے میں انصاف کرو' تقسیم میں انصاف کرو' خرچہ دینے میں انصاف کرو' حقوق زناشوئی میں انصاف کرو' یہاں تک کہ مسکرانے میں بھی انصاف کرو' زبانی الفاظ کہنے میں بھی انصاف کرو۔ یہ ہے وہ چیز جس کا

تم سے مطالبہ کیا جا رہا ہے ۔ یہ ہے وہ تکمیل جو ان میلانات کو کنٹرول میں رکھے گی ۔ ضبط مطلوب ہے ' میلانات کا قتل مطلوب نہیں ہے ۔ (فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (۴ : ۱۲۹)) (ایک بیوی کی طرف اس طرح مائل نہ ہو جاؤ کہ دوسری کو ادھر لٹکتا چھوڑ دو)

یہ ہے وہ بات جس سے منع کیا گیا ہے ۔ یعنی ظاہری معاملات میں ایک طرف جھک جانا ۔ اس طرح جھکنا کہ دوسری کے حقوق مارے جائیں کہ نہ بیوی ہو اور نہ مطلقہ ۔ اس کے ساتھ ہی اہل ایمان کو ایک نہایت ہی مؤثر آواز سے پکارا جاتا ہے ۔

(وَ اِنْ تُصْلِحُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۴ : ۱۲۹)) (اگر تم اپنا طرز عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ چشم پوشی کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)۔

اسلام انسانی نفس کے ساتھ اس طرح معاملہ کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی ذات ہے جو ایک مٹھی بھر مٹی اور اس میں نفخ روح سے پیدا کی گئی ہے اور اس کے اندر جو قوتیں اور صلاحیتیں ہیں ان کے بالکل مطابق ۔ نیز وہ انسان کے ساتھ ایک مثالی حقیقت پسندی یا حقیقی مثالیت کے مطابق اس کے ساتھ ڈیلنگ کرتا ہے کہ وہ ایک انسان ہو 'جس کے قدم زمین پر ہوں اور اسے روحانی بلندی حاصل ہو جس میں نہ تو تناقض ہو اور نہ ٹوٹ پھوٹ ہو ۔

یہی ہے اسلام 'حضور اکرم ؐ انسانی اعتبار سے اوج کمال پر تھے ۔ آپ کے اندر تمام قوتیں متوازن تھیں ' باہم متناسق تھیں اور انسان کی حدود فطرت کے اندر تھیں ۔

حضور اکرم ؐ ازواج مطہرات کے درمیان تقسیم اور منصفانہ تقسیم پر تو قادر تھے ایک بیوی کو دوسری بیوی پر ترجیح نہ دیتے تھے ۔ لیکن دلی جذبات پر کنٹرول کسی کی طاقت میں نہیں ہوتا ۔ ( الهم هذا قسمي فيما املك فلا تلمني فيما لا املك ) (اے اللہ یہ ہے میری تقسیم جن معاملات میں میرا اختیار ہے اور آپ مجھے ملامت نہ کریں ان معاملات میں جو میرے اختیار سے باہر ہیں) یعنی دل (ابوداؤد)

ہاں جب دل خشک ہو جائیں تعلقات بہت ہی خراب ہو جائیں اور زوجین کے درمیان باہم زندگی گزارنا مشکل ہو جائے تو پھر جدائی ہی بہتر ہے ۔ اسلام زوجین کو رسیوں اور زنجیروں میں باندھ کر اکٹھا رکھنا مناسب نہیں سمجھتا ۔ نہ قید و بند کے ذریعے زوجین کو اکٹھا رکھا جا سکتا ہے ۔ صرف محبت اور باہم رحم دلی کے جذبات میں فریقین کو باندھا جا سکتا ہے یا پھر ان کو واجبات اور فرائض کی انجام دہی اور حسن سلوک کے ذریعے یکجا رکھا جا سکتا ہے ' خصوصاً ایسے دلوں کو جن کے درمیان نفرت پیدا ہو چکی ہو ' اس لئے کہ نفرت کے قلعوں میں دلوں کو بند نہیں کیا جا سکتا ۔ نیز یہ تعلق کہ بظاہر تو باہم تعلق ہو اور اندرونی طور پر مکمل کاٹ ہو ۔

(وَ اِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ وَ كَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا (۴ : ۱۳۰))

(اور اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہی ہو جائیں تو اللہ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا) اللہ تعالیٰ دونوں سے وعدہ فرماتے ہیں کہ وہ اپنے فضل اور رحمت سے دونوں کو غنی بنا دے گا ۔ اللہ تعالیٰ اپنے

بندوں پر بہت ہی وسعت کرنے والے ہیں' اور وہ اپنے حدود حکمت کے اندر اور بندوں کی مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے لئے کشادگی کی حد مقرر فرماتے ہیں' ہر شخص کے حالات کے مطابق۔

اسلام انسانی شعور اور نفس کے پوشیدہ میلانات کے ساتھ جس طرح برتاؤ کرتا ہے اور جس طرح زندگی کے طور طریقوں کو حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھتا ہے وہ اس قدر حیران کن ہے کہ اگر لوگ رات دن اللہ کا شکر ادا کریں تو بھی ان کے لئے اس کا حق ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں انسانی سہولت کا بہت ہی خیال رکھا گیا اور نظر آتا ہے کہ یہ نظام انسانوں کے لئے تجویز ہوا ہے۔وہ انسانوں کا ہاتھ پکڑ کر ان کو نہایت ہی گری ہوئی حالت سے اٹھاتا ہے اور انہیں نہایت ہی سربلندی تک لے جاتا ہے اور یہ عمل انسان کی فطرت کے عین مطابق ہوتا ہے۔ وہ ان کے لئے بلندی اور رفعت کا کوئی ٹارگٹ اس وقت تک تجویز نہیں کرتا جب تک ان کی فطرت میں اس کے حصول کے لئے داعیہ نہ ہو اور ان کے مزاج میں اس کی کوئی نہ کوئی جڑ موجود نہ ہو۔اس طرح اسلام ان کو پھر اس بلند مقام تک لے جاتا ہے جہاں تک انہیں کوئی دوسرا نظام نہیں لے جاسکتا۔ یہ کام وہ اس طرح مثالی واقعیت پسندی یا ایسی واقعیت کے ساتھ کرتا ہے جس کی کوئی مثال نہ ہو اور پھر ایسی صورت میں کہ اس عجیب مخلوق انسانی کی اصل طبیعت اور مزاج کے مطابق۔

---OO---

خاندانی نظم کے یہ احکام جن کا تعلق خاص زوجین کی ازدواجی زندگی سے ہے' اسلامی نظام حیات کا ایک حصہ ہیں اور اسلامی نظام حیات اس کائنات کے ناموس اکبر کا ایک حصہ ہے جو اللہ نے اس پوری کائنات کے اندر جاری فرمایا ہے۔اس لئے اسلامی نظام بھی اس کائنات کی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہے جبکہ دوسری طرف وہ انسانی فطرت کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے۔اس لئے کہ انسان بھی اس کائنات ہی کا ایک حصہ ہے اور یہ اسلامی نظام زندگی کا نہایت ہی گہرا راز ہے اس لئے عائلی اور خاندانی نظام کے مسائل کے متصلاً بعد اللہ تعالیٰ کائنات کا ذکر فرماتے ہیں جس سے یہ عائلی احکام پوری کائنات کے نظام فطرت کے ساتھ مربوط ہو جاتے ہیں۔گویا جس طرح انسانی زندگی میں اللہ کی حاکمیت ہے' اسی طرح اس کائنات میں بھی وہی حاکم ہے۔ وہی ہے جو زمین و آسمان کا مالک ہے اور یہ وہی ذات ہے جس نے تمہیں یہ احکام دیئے ہیں۔ وہی ہے جس نے تم سے پہلی امتوں کو یہ احکام دیئے تھے اور یہ تمام احکام اور وصایا ایک ہیں اور ایک ہی منبع سے ہیں۔اور اسلامی نظام اس پر قائم ہے کہ اس کے نتیجے میں دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی نصیب ہوتی ہے اور یہ وہ اصول ہیں جو سچائی' عدل اور خدا ترسی پر استوار ہیں۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَاِنْ
تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ

غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى
بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَ يَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ
وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا
فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾

(آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ تم سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی تھی انہیں بھی یہی ہدایت کی تھی اور اب تم کو بھی یہی ہدایت کرتے ہیں کہ خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو لیکن اگر تم نہیں مانتے تو نہ مانو' آسمان و زمین کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہی ہے اور وہ بے نیاز ہے۔ ہر تعریف کا مستحق۔ہاں' اللہ ہی مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور کارسازی کے لئے بس وہی کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو ہٹا کر تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے' اور وہ اس کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ جو شخص محض ثواب دنیا کا طالب ہو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کے پاس ثواب دنیا بھی ہے اور ثواب آخرت بھی اور اللہ سمیع و بصیر ہے)۔

قرآن کریم میں احکام و نواہی کے بیان کے بعد بار بار یہ تعقیب آتی ہے کہ اللہ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کا مالک ہے۔ یا یہ لفظ آتا ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے لئے ہے۔ یہ دونوں امور ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں اس لئے کہ جو بادشاہ اور مالک ہوتا ہے' اپنی مملکت میں امر اور نہی بھی اسی کا چلتا ہے۔ اس کی مملکت میں جو لوگ بستے ہیں وہ اس کے محکوم ہوں گے اور اس کائنات میں چونکہ اللہ وحدہ مالک ہے تو اس وجہ سے اس دنیا میں صرف اس کا حکم چلے گا اور وہی لوگوں کے لئے قانون بنانے کا حقدار ہو گا۔ دونوں امور ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔

جن لوگوں پر کتاب اتاری گئی ہے یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کو وصیت کی ہے کہ وہ خدا سے ڈریں اور یہ وصیت اس نشاندہی کے بعد کی ہے کہ زمین اور آسمانوں کے اندر جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے اس لئے وصیت کا حق بھی اللہ کو ہے اور قانون سازی کا حق اللہ کو ہے لہٰذا اس سے ڈرو۔

(وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ اِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ (۴ : ۱۳۱)) (آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ تم سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی تھی' انہیں بھی یہی ہدایت کی تھی اور اب تم کو بھی یہی ہدایت کرتے ہیں کہ خدا سے

ڈرتے ہوئے کام کرو۔)

واقعہ یہ ہے کہ جس کو حقیقی اقتدار حاصل ہو لوگ اسی سے ڈرتے ہیں اور خدا ترسی ہی وہ واحد سبیل ہے جس سے "دلوں" کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ پھر خدا ترسی ہی وہ واحد سبیل ہے جس کے ذریعے کسی "نظام" کی اصلاح ہو سکتی ہے اور اس کی جزئیات پر عمل کرایا جا سکتا ہے۔ جو لوگ اللہ کی اس ملکیت میں اپنی حیثیت کو نہیں پہچانتے ان کو اللہ خبردار فرماتے ہیں کہ اللہ انہیں اس دنیا سے دور کر کے ان کی جگہ دوسری آبادی کو لا کر اپنی ملکیت میں بسا سکتے ہیں۔

( وَاِنْ تَكْفُرُوا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا (۱۳۱) وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (۱۳۲) اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا (۱۳۳) (٤ : ۱۳۱ تا ۱۳۳)) (لیکن اگر تم نہیں مانتے تو نہ مانو' آسمان و زمین کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہی ہے اور وہ بے نیاز ہے۔ ہر تعریف کا مستحق۔ ہاں' اللہ ہی مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور کارسازی کے لئے بس وہی کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو ہٹا کر تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے' اور وہ اس کی پوری قدرت رکھتا ہے)۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو وصیت کرتے ہیں کہ اللہ سے ڈرو' اگر وہ اللہ سے نہ ڈریں تو اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اور وہ سب کفر کا رویہ اختیار کر لیں تو بھی اللہ کا اس میں کچھ نقصان نہیں ہے اس لئے کہ لوگوں کے کفر کی وجہ سے اللہ کی ملکیت میں سے کوئی چیز کم نہیں ہوتی۔ ( فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (٤ : ۱۳۱)) (اللہ تو مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں) اور وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تمہیں یہاں سے چلتا کرے اور کسی اور کو لا بسائے۔ وہ جو ان کو وصیت کرتا ہے تو وہ ان کی بھلائی کے لئے کرتا ہے۔ اور ان کے حالات کو درست کرنے کے لئے کرتا ہے۔

اسلام انسان کو جس طرح اس پوری کائنات کا سرتاج قرار دیتا ہے اور انسان کی کرامت کا اعلان کرتا ہے' اور تمام زمین کی مخلوقات سے اسے برتر قرار دیتا ہے' اسی طرح اگر انسان اللہ کا کفر کر لے تو اللہ انسان کو اس کائنات کی بدترین مخلوق قرار دیتا ہے اس لئے کہ وہ اللہ کے حکم سے منہ موڑتا ہے بلکہ وہ سینہ زوری کر کے اللہ کی صفت حاکمیت میں شریک ہو کر اپنے آپ کو یہاں کا حاکم قرار دیتا ہے۔ اور وہ بغیر کسی استحقاق کے ایسا کرتا ہے۔ اسلامی تصور حیات میں یہ دونوں باتیں برابر ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے۔

یہ آیات اس تعقیب پر اختتام کو پہنچتی ہیں کہ جو لوگ صرف دنیاوی مقاصد کے لالچ میں گرفتار ہیں' ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کا فضل بہت ہی وسیع ہے۔ اللہ کے ہاں دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی ہے اور جو لوگ دنیا پر ہی نظریں جمائے بیٹھے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ اپنی نظریں ذرا اونچی کریں اور دیکھیں کہ اللہ کے ہاں دنیا و آخرت کی بھلائی ہے۔

(مَنْ كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيعًا بَصِيرًا (٤ : ١٣٤)) (جو شخص محض ثواب دنیا کا طالب ہو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کے پاس ثواب دنیا بھی ہے اور ثواب آخرت بھی' اور اللہ سمیع و بصیر ہے)۔ یہ امر ایک واضح حماقت اور ایک واضح کم ہمتی ہوگی کہ انسان دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی حاصل کر سکتا ہو اور اسے دنیا اور آخرت دونوں کا اجر مل سکتا ہو اور اس کامیابی کی ضمانت اسے اسلامی نظام زندگی دے بھی رہا ہو' جو ایک واقعیت پسند عملی اور مثالی نظام ہے' لیکن وہ اس گارنٹی کے باوجود صرف دنیا ہی کی طلب کرے۔ اپنی پوری ہمت دنیا طلبی ہی میں لگا دے۔ اور بالکل اس طرح زندگی بسر کرے جس طرح حیوان' چوپائے اور کیڑے مکوڑے زندگی بسر کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ شخص انسانوں کی طرح بسہولت زندگی بسر کر سکتا ہے اس طرح کہ اس کے قدم زمین پر چلتے ہوں اور اس کی روح آسمانوں میں سیر کرتی اور پھڑپھڑاتی ہو۔ اور اس طرح کہ وہ ایک جاندار موجود کی طرح جو اس کرۂ ارض کے اوپر طبیعی قوانین کے مطابق تگ و دو بھی کر رہا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ عالم بالا کے ساتھ بھی اس کی زندگی کا رابطہ ہو۔

غرض یہ جزئی اور فروعی احکام پوری طرح اسلامی نظام حیات کے اصولوں کے ساتھ مربوط ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں خاندانی نظام کی بہت ہی اہمیت ہے' اس قدر اہمیت کہ ان احکام کو اس کائنات کے عظیم معاملات کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے اور ان تمام امور پر یہ تعقیب اور تبصرہ کیا گیا ہے کہ اگر تم لوگ اللہ کی ان وصیتوں کو قبول نہیں کرتے تو اللہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ تمہیں ختم کر دے اور تمہاری جگہ کوئی دوسری مخلوق آباد کر دے۔ یہ ایک نہایت ہی خطرناک تبصرہ ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک ایک خاندان کے نظام کے معاملے میں وارد ہونے والے احکام بھی اسی قدر اہم ہیں جس قدر تمام ادیان کو دی جانے والی عظیم ہدایات کی اہمیت ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۴ ایک نظر میں

یہ سبق بھی امت مسلمہ کے لئے دست قدرت کی تربیت کا ایک نمونہ ہے جس کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ یہ ایک اچھی امت ہے اور جسے لوگوں کے لئے نکالا گیا ہے ۔ یہ سبق بھی اس اسلامی نظام زندگی کی ایک اہم کڑی ہے جو نہایت ہی مستحکم نظام ہے ۔ جس کے مقاصد اور اہداف متعین ہیں اور یہ نظام نفس انسانی کی بہتری کے لئے نازل کیا گیا ہے ۔ اس کے ذریعے نفس انسانی کا اس طرح علاج کیا گیا ہے کہ جس دست قدرت نے ذات انسان کو بنایا ہے ' وہی اس کی کمزوریوں کا علاج بھی کر رہا ہے ۔ یہ علاج اس لئے کامیاب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی اس ممتاز مخلوق اور صنعت کے پرزے پرزے سے واقف ہے ' یہ اس کی حقیقت اور ماہیت کو اچھی طرح جانتا ہے ' اس کے رجحانات و میلانات سے واقف ہے اور اس کی ضروریات اور اس کے اندر پوشیدہ ترین صلاحیتوں اور کمزوریوں سے بھی آگاہی رکھتا ہے ۔

اس سبق میں اسلامی نظام حیات کے اصول ' نہایت ہی اٹل اصول بتائے گئے ہیں جو مستقل ہیں ۔ ہر دور ' ہر جگہ اور ہر زمانے کے لئے ہیں تاکہ انسانیت کو جاہلیت کی پستیوں سے بلند کر کے نہایت اونچی بلندیوں تک پہنچائے اور جہاں تک انسان ترقی کر چکا ہو اس سے اسے مزید آگے بڑھائے ۔ ان اصولوں کے ساتھ ساتھ اس سبق میں پہلی جماعت مسلمہ کے بھی کچھ خدوخال بیان کئے گئے ہیں جو اس قرآن کی پہلی مخاطب جماعت تھی ۔ ان آیات کے آئینے کے اندر پہلی تحریک اسلامی نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ بحیثیت ایک انسانی جماعت نظر آتی ہے ۔ اس میں بشری کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں اور اعلیٰ پاکیزگی کا معیار بھی نظر آتا ہے ۔ اس جماعت کے اندر جاہلی دور کی باقیات اور فطری کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں ۔ قرآن کریم اس جماعت کی تربیت کرتے ہوئے ایک ایک کمزوری کو لیتا ہے اور ان کا علاج کرتا ہے ' پھر اس جماعت کو تقویت دے کر اسے ایک مثالی جماعت بنا رہا ہے ۔ تلقین کی جاتی ہے کہ وہ سچائی پر جم جائیں اور راہ حق میں جدوجہد کریں اور قربانیاں دیں ۔

سبق کا آغاز اس پکار سے کیا جاتا ہے جو جماعت مسلمہ کے نام ہے ۔ اسے کہا جاتا ہے کہ تم خیر امت ہو اور اس دنیا میں تمہارا ایک مقرر کردار ہے ' اسے ادا کرنے کے لئے کمربستہ ہو اور دنیا میں عدل و انصاف کا وہ معیار قائم کرو جو انسانیت کی تاریخ کا سب سے اونچا معیار اور مثالی عدل ہو ۔ اور عدل قائم کرنے میں تمہارا مطمح نظر اور نصب العین ذات باری کی رضا کا حصول ہو ' اور اس معاملے میں کسی اور جذبے ' کسی اور خواہش اور کسی اور مصلحت کو پیش نظر مت رکھو ۔ اس معاملے میں خود اپنی جماعت ' اپنی حکومت اور اپنی امت (Nation) کے مفادات کو بھی پیش نظر نہ رکھو ۔ اس میں خدا ترسی اور رضائے الٰہی کے سوا تمہارے پیش نظر کوئی اور جذبہ نہ ہو ۔ امت نے فی الواقعہ ایسا کیا اور اس کا ایک نمونہ ایک یہودی کے اوپر جھوٹے الزام کے واقعہ کی شکل میں خود قرآن کریم نے ریکارڈ کیا اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی

"کو بذریعہ وحی انصاف کرنے کی تنبیہ اور تاکید کی جس کا تذکرہ ہم تفصیلاً کر آئے ہیں۔

سبق کا آغاز اس حکم سے ہوتا ہے کہ عدل کرو' مطلق اور خالص عدل کرو۔ مطلق اور خالص عدل کس قدر مشکل کام ہے' اس کو رب کائنات ہی جانتا ہے۔ جس نے انسان کو پیدا کیا۔ رب کو معلوم ہے کہ اس راہ میں کیا کیا مشکلات پیش آتی ہیں۔ اللہ کو معلوم ہے کہ انسان میں کمزوری کے کیا کیا پہلو ہیں۔ انسان کے جذبات اس کی ذات کے لئے اور اقارب کے لئے' کمزوروں اور زبردستوں کے لئے' خصوصاً والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لئے' فقراء اور اغنیاء کے لئے' دوست اور دشمن کے لئے کیسے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے بے شمار جذبات اور یہ سب کے سب یا ان میں کوئی ایک بات عدل کے معاملے میں اثرانداز ہو سکتی ہے اور ان کو نظرانداز کرنا نہایت ہی مشکل کام ہے۔ یہ کام اسی طرح مشکل ہے جس طرح ایک آدمی نہایت ہی عمودی چڑھائی پر چڑھ رہا ہو اور اس میں اس کے پیش نظر صرف رضائے الہی اور حبل اللہ رہے۔ کس قدر مشکل ہے یہ کام۔

دوسری دعوت اس سبق میں یہ ہے کہ مکمل ایمان لے آؤ۔ اللہ' کتابوں' ملائکہ' رسول اور یوم آخرت پر ایمان لاؤ۔ یہ ہے مکمل ایمان۔ اس کے تمام اجزاء کی اپنی اپنی جگہ بہت بڑی اہمیت ہے۔ یہ تمام اجزاء مل کر ایمان کو مکمل کرتے ہیں اور انہی اجزاء سے مجموعی اسلامی تصور حیات وجود میں آتا ہے' جو تمام دوسرے تصورات کے مقابلے میں زیادہ فوقیت رکھتا ہے' جو کسی زمانے میں انسانی معاشروں کے اندر رائج و معروف رہے ہیں۔ اسلام سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ یہ نظریہ حیات بذات خود ہر نظریے سے قوی اور برتر ہے اور اس سے تمام دوسری قدریں وجود میں آتی ہیں چاہے وہ اخلاقی ہوں' اجتماعی ہوں یا تنظیمی ہوں اور جن کا مکمل مظاہرہ پہلی جماعت اسلامی کی زندگی میں ہوا تھا اور آئندہ کے ادوار میں بھی جس جماعت نے اس نظام پر صحیح طرح ایمان کا اظہار کیا اور اس کے تقاضوں کو پورا کیا تو اس کی زندگی کے اندر بھی یہی تفوق اور برتری پیدا ہوئی۔ قیامت تک یہ اصول اپنی جگہ قائم رہے گا اور قیامت میں تو بہرحال اللہ کا کلمہ ہی حق اور برتر ثابت ہو گا۔ یہی ہے مفہوم اس آیت کا (وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (۴: ۱۴۱)) (اللہ نے کافروں کے لئے مسلمانوں کے مقابلے میں برتری کی کوئی سبیل نہیں رکھی)۔

ان دو دعوتوں کے بعد اب اللہ تعالیٰ منافقین پر تنقیدی حملہ شروع کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو وہ ہیں جو ابھی تک اپنے نفاق کو چھپائے ہوئے ہیں اور بعض وہ ہیں جو منافق رہنے کے بعد دوبارہ کفر کا اعلان کر چکے ہیں۔ اس تنقیدی بیان میں منافقین کے مزاج کی قابل نفرت صورت' اسلامی صفوں کے اندر ان کی سرگرمیوں کی جو صورت حال ہے۔ اس کی تفصیلات' ان کا متلون موقف' کہ اگر مسلمانوں کو فتح ہو تو وہ ان کی چاپلوسی کرتے ہیں اور اگر اہل کفر کو فتح نصیب ہو تو یہ ان کے ہاں نیچے ہوتے ہیں اور ہر جگہ خود اپنے آپ کو سبب فتح قرار دیتے ہیں۔ نماز کے لئے نہایت ہی بوجھل قدموں کے ساتھ جاتے ہیں۔ اور دکھاوے کے لئے پڑھتے ہیں' ان کا رویہ نہایت ہی مذبذب ہوتا ہے۔ نہ ادھر کے اور نہ ادھر کے۔

اس تنقیدی حملے کے درمیان جابجا اہل ایمان کو بھی ہدایات دی گئی ہیں جن سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ منافقین اس وقت اسلامی صفوں میں کس طرح گھسے ہوئے تھے اور کیا کیا کارستانیاں کر رہے تھے۔ اسلامی صفوں میں

منافقین کو کس قدر اثر و رسوخ حاصل تھا۔ ان حالات میں اس قسم کے تنقیدی حملے کی ضرورت اس لئے پیش آئی تاکہ اس وقت کے موجود حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے تحریک اسلامی کو قدم بقدم آگے بڑھایا جائے اور اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ منافقین سے آہستہ آہستہ دور ہوتے جائیں اور ان کے ساتھ تعلقات رکھنے سے اجتناب کریں۔ان کی مجالس میں نہ بیٹھیں' جہاں وہ اکثر کفریہ گفتگوئیں کرتے ہیں اور اللہ کی آیات کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔البتہ اس دور میں قرآن کریم نے منافقین کے ساتھ بائیکاٹ کا حکم تو بہرحال نہیں دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ آیات نازل ہو رہی تھیں اس وقت منافقین کا جتھا بڑا مضبوط تھا اور وہ اس قدر سرگرم تھے کہ اہل اسلام کے لئے ان کا مکمل بائیکاٹ ممکن ہی نہ تھا۔

مسلمانوں کو اس تحذیر اور تنبیہ کرنے کے درمیان ہی یہ بتا دیا گیا کہ نفاق کی علامات کیا ہیں اور نفاق کا آغاز کس طرح شروع ہوتا ہے۔تاکہ وہ خود بھی نفاق کی علامات سے اپنے آپ کو بچانے کی سعی کریں۔سب سے پہلی ہدایت یہ دی جاتی ہے کہ تم منافقین کے ساتھ دوستی ہرگز نہ کرو اور منافقین کے ہاں اپنی عزت اور احترام بڑھانے کا لالچ نہ کرو' اس لئے کہ عزت تو صرف اللہ کے ہاں ہے۔ اللہ کو ہرگز یہ بات پسند نہیں کہ وہ کافروں کو اہل اسلام پر برتری دے اور منافقین تو دنیا و آخرت دونوں میں ذلیل ہوں گے۔یہ ہے ان کی تصویر ذرا ملاحظہ کرو اور پھر آخرت میں وہ دوزخ کے اندر سب سے نیچے پڑے ہوں گے۔

اس انداز میں یہ ہدایات اور تنبیہات بتلاتی ہیں کہ اسلامی نظام زندگی نفس انسانی اور اس کے اندر رچی بسی عادات کو کس طرح درست کرتا ہے اور کسی موجود عملی صورت حال کے اندر اسلام اصلاح کی کاروائی کا آغاز کس طرح کرتا ہے؟ اسلام نہایت ہی تدریج کے ساتھ کوئی تبدیلی لاتا ہے اور آخر کار کسی موجودہ صورت حال کو یکسر تبدیل کر کے اس کی جگہ نہایت ہی جدید صورت حالات لے کر آ جاتا ہے۔ نیز اس سے اس بات کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اس دور میں مسلمانوں کے حالات کیا تھے۔کفر و نفاق کے محاذ ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح معاون تھے اور وہ کس طرح جماعت مسلمہ اور دین اسلام کے خلاف گٹھ جوڑ کیے ہوئے تھے۔

ان تمام تبصروں کے اندر غور کرنے سے یہ بات نظر آتی ہے کہ وہ کیا عظیم معرکہ تھا' جس کے اندر قرآن کریم نے جماعت مسلمہ کو ڈال دیا تھا۔اور اس معرکہ میں ڈال کر قرآن کس نظام اور منہاج کے مطابق جماعت مسلمہ اور نفس انسانی کی قیادت اور راہنمائی کر رہا تھا۔ یہ معرکہ وہی معرکہ ہے جو ہر زمان و مکان کے اندر اسلام اور جاہلیت کے درمیان برپا رہا ہے اور کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔وسائل بدل سکتے ہیں اور چہرے بدل سکتے ہیں لیکن اسلام اور جاہلیت کے درمیان جو جنگ ہے اس کی نوعیت آج بھی وہی ہے جو قرن اول میں تھی۔نیز ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کی سرگرمیوں میں قرآن کریم کی قیادت اور راہنمائی کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ قرآن کریم یہ قیادت جس طرح حضور کے دور میں کرتا تھا' وہی راہنمائی اور قیادت وہ آج بھی کرتا ہے۔قرآن کریم کسی ایک دور یا کسی ایک نسل کی راہنمائی کے لئے تو آیا ہی نہیں ہے' یہ تو اس امت کا قائد ہے' اس کا مرشد ہے اور اس کا ہادی ہے اور ہر دور اور ہر نسل کے لئے ہے۔

اور اس سبق کے آخر میں ایک لمحہ فکریہ! یہ کہ اللہ کو کیا پڑی ہے کہ وہ لوگوں کو خواہ مخواہ عذاب دے۔اس کا

مطالبہ تو صرف یہ ہے کہ ایمان لاؤ اور اللہ کا شکر بجالاؤ۔ اگر لوگ ایمان نہیں لاتے اور شکر گزار بندے نہیں بنتے تو اسے کوئی پرواہ نہیں۔ وہ تو ان کے ایمان اور شکر گزاری دونوں سے بے نیاز ہے۔ اللہ جو ہدایات دے رہا ہے وہ تو ان کی اصلاح کے لئے ہے۔ ان کو نرمی دینے کے لئے ہیں تاکہ وہ اس بات کے مستحق ہو جائیں کہ ان کو جنت میں انعامات ملیں۔ اگر وہ ان ہدایات کی خلاف ورزی کریں گے اور الٹے پاؤں پھریں گے تو وہ خود عذاب جہنم کے مستحق ہو جائیں گے۔ اس میں صرف ان ہی کا ذاتی نقصان ہے اور منافقین تو اس جہنم کے بھی سب سے خطرناک "درک اسفل" میں ہوں گے، سب سے نیچے والے درجے ہیں۔

---○○○---

# درس نمبر ۴۲ تشریح آیات

# ۱۳۵ -- تا -- ۱۴۷

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' انصاف کے علمبردار اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب' اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو' اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔

یہ اہل ایمان کو خصوصی پکار ہے۔اس پکار میں ان کے لئے ایک جدید لقب اور ایک نئی صفت کو استعمال کیا گیا ہے اور اس لقب اور صفت میں وہ بالکل منفرد ہیں۔اور الذین آمنوا کی روح بدل گئی ہے۔ان کے تصورات بالکل نئے ہو گئے ہیں۔ان کے اصول اور مقاصد بدل کر نئے ہو گئے ہیں۔وہ اس جدید انقلابی مہم کے راہنما بن گئے ہیں اور ان کے کاندھوں پر عظیم ذمہ داریاں عائد کر دی گئی ہیں' اب وہ پوری انسانیت کے لئے پاسبان و نگہبان ہیں۔وہ لوگوں کے درمیان اب فیصلہ کرنے والے ہیں۔اس لئے یہاں (یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا) کے الفاظ نہایت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔یعنی اس صفت ایمان ہی کی وجہ سے ان پر عالمی قیادت کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے اور پورے عالم کی قیادت کرنا گویا تقاضائے ایمان ہے اور صفت ایمان ہی کے تقاضے کے طور پر مسلمان اس قیادت کے مقام کا چارج لینے کے لئے یہ تیاری کر رہے تھے۔

اسلامی منہاج تربیت کی یہ ایک نہایت ہی موثر جھلکی ہے۔اور امت مسلمہ کو ایک نہایت ہی بھاری ذمہ داری کا

چارج دینے سے قبل ہی یہ جھلکی دکھائی گئی اور وہ بھاری ذمہ داری یہ ہے ۔

(یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا (۴:۱۳۵))

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنو، اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے ۔

یہ امانت اور ذمہ داری یہ تھی کہ تم نے عدل قائم کرنا ہے اور یہ عدل مطلق ہو گا جس کا علمبردار تم نے بننا ہے ۔ ہر حال اور ہر میدان میں تم نے انصاف کرنا ہے ۔ ایسا عدل جس کے ذریعے ظلم اور عدوان کی خود بخود نفی ہو جائے اور پورے کرۂ ارض پر کہیں بھی ظلم نہ رہے اور یہ ایسا عدل ہو کہ ہر حقدار کو اس کا حق ملے ۔ اس حق رسیدگی میں مومن اور غیر مومن دونوں برابر ہوں جیسا کہ یہودی کے قصے میں واضح طور پر کہا گیا ہے ۔ اس میں رشتہ دار اور غیر رشتہ دار سب برابر ہوں۔ دوست اور دشمن سب برابر ہوں ۔ غنی اور فقیر کا درجہ ایک ہی ہو ۔

(کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ) (انصاف کے علمبردار اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنو) یہ انصاف اور شہادت صرف اللہ کے لئے ہو، اور اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہو اور شہادت نہ ان کے لئے دی جائے جن کے حق میں دی جا رہی ہو اور نہ ان کی وجہ سے دی جائے جن کے خلاف دی جا رہی ہے ۔ یہ شہادت نہ کسی فرد اور نہ کسی جماعت کے مفادات کے لئے ہو اور نہ شہادت ان حالات سے متاثر ہو کر دی جائے جو اس وقت موجود ہوں یا مقدمہ زیر بحث پر اثر انداز ہو رہے ہوں خالصتاً اللہ کے لئے اور خالصتاً اللہ کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے، صرف اس کی رضا کے لئے دی جائے اور ایسے حالات میں کہ کوئی میلان، کوئی رجحان، کوئی مصلحت اور کوئی خواہش اسے متاثر نہ کر رہی ہو۔ نہ کسی کا لحاظ رکھا جا رہا ہو۔

(وَلَوْ عَلٰی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ (۴:۱۳۵)) (اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو) یہاں اسلامی نظام نفس انسانی کو خود اسکے اپنے خلاف مسلح کر رہا ہے ۔ اپنے جذبات کے ساتھ، اپنی ذات کے خلاف، اپنے والدین کے خلاف اور اپنے رشتہ داروں کے خلاف، اور یہ نہایت ہی دشوار مرحلہ ہے کہ کوئی اپنی ذات کے خلاف فیصلہ کرے ۔ محض زبانی جمع خرچ تو آسان ہوتا ہے لیکن عملاً ایسا کرنا نہایت ہی مشکل ہوتا ہے ۔ انسان ذہنی لحاظ سے اس کے بارے میں سوچ تو سکتا ہے کہ ایسا ہونا چاہئے مگر عمل دشوار ہوتا ہے اور اس بات کی اصل مشکلات کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب انسان عملاً یہ کام کرے ۔ اس کے باوجود کہ یہ مشکل کام ہے، اسلامی نظام نفس مومنہ کو تقویٰ کے ذریعے خود اپنی ذات کے خلاف مسلح کر رہا ہے کہ وہ اس

خطرناک تجربے میں کو دپڑے 'اس لئے کہ دنیا کے اندر عدل و انصاف کا یہی معیار ہونا چاہئے کہ کوئی اپنی ذات کے خلاف بھی فیصلہ کر گزرے اگر حق و انصاف اس کا تقاضا کرتے ہوں ۔اور کچھ لوگ یہ فیصلہ عملاً کر کے دکھائیں ۔

اس کے بعد نفس انسانی کو اپنے فطری اور اجتماعی شعور کے خلاف بھی مسلح کیا جاتا ہے کہ جس شخص کے حق میں یا خلاف گواہی دی جارہی ہو وہ غریب ہو ۔اگر وہ غریب ہے تو مشکل یہ ہوتی ہے کہ کوئی رحمدل انسان اس کے خلاف شہادت دینا ازروئے رحمدلی 'پسند نہیں کرتا اور یہ پسند کرتا ہے کہ اس کی کمزوری کی وجہ سے اس کے حق میں شہادت دے ۔یا کسی اجتماعی مرتبہ و مقام کی وجہ سے یا کسی سوسائٹی کی طبقاتی منافرت کی وجہ سے کوئی کسی زیر دست کے ساتھ نفرت کرتا ہو یا اگر مدمقابل غنی ہو تو اس کی وجاہت کا لحاظ رکھے اور اس کے خلاف شہادت نہ دے ۔جاہلیت کے تمام نظاموں میں ایسا ہوتا رہا ہے ۔ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک گواہ ایک مالدار شخص کے ساتھ نفرت کرے اور اس کی مالداری اور برتری اسے پسند نہ ہو اور اس وجہ سے وہ شہادت حق نہ دے بلکہ مالدار کے خلاف شہادت دے دے ۔یہ تمام فطری میلانات ہوئے اور جب عملاً کسی کو واسطہ پڑتا ہے تو انصاف اور شہادت کے وقت یہ اپنا وزن انسان پر ڈالتے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے تمام امور کو لے لیا کہ ذات ہو' اقرباء ہوں' غریب ہو یا امیر تم شہادت حق دو ۔

(اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا (٤:١٣٥)) (فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے ) یہ نہایت ہی مشکل اور بھاری کام ہے ۔اسلام نے اہل ایمان کو عملی زندگی میں ڈالا اور اسے اس قدر بلندی تک پہنچایا کہ انہیں پوری انسانیت نے دیکھا لیا کہ اسلام نے اس کرۂ ارض پر عالم انسانیت کے اندر یہ ایک عظیم معجزہ دکھایا تھا ۔یہ ایک ایسا معجزہ تھا کہ صرف اسلامی نظام کے سایہ ہی میں رونما ہو سکتا تھا ۔

(فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى اَنْ تَعْدِلُوْا (٤:١٣٥)) (لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو) خواہشات نفسانیہ کی کئی اقسام ہوتی ہیں جن میں سے بعض کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے ۔ذات کی محبت 'اہل و عیال کی محبت' رشتہ داروں کی محبت 'کسی فقیر کے ساتھ رحمدلی' (شہادت کے وقت ) کسی غنی کی رعایت اور وجاہت کا لحاظ 'کسی امیر یا فقیر سے نفرت وغیرہ سب خواہشات نفسانیہ ہیں ۔خاندان' قبیلے 'قوم' وطن اور حکومت کی طرفداری (شہادت کے وقت ) دشمن سے نفرت اگرچہ دین کے دشمن ہوں ۔غرض خواہشات کی بے شمار قسمیں اور رنگ ہیں ۔ان تمام خواہشات سے اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے متاثر ہونے کو پسند نہیں کرتے ۔اور اس تاثر کے تحت انصاف اور شہادت حق سے باز رہنے سے منع کرتے ہیں ۔سب سے آخر میں اس بات پر متنبہ کیا جاتا ہے کہ شہادت کے اندر تحریف ہرگز نہ کرو اور شہادت سے منہ بھی نہ پھیرو ۔

( وَاِنْ تَلْوٗا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (٤:١٣٥)) (اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے ) اس معاملے میں صرف یہ یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے تاکہ اہل ایمان کے اندر یہ تاثر پختہ ہو جائے کہ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو اس کا انجام بہت ہی برا ہو گا تاکہ ان کا دل کانپ اٹھے اس لئے کہ قرآن کریم کی ان آیات کے مخاطب اہل ایمان ہی تو تھے ۔

روایات میں آتا ہے کہ جب عبد اللہ ابن رواحہ کو حضور ؐ نے خیبر کی محصولات کی وصولی کے لئے بھیجا (یاد رہے کہ ان کے ساتھ رسول اللہ ؐ نے نصف محصولات پر فیصلہ کیا تھا) اور وہ فتح خیبر کے بعد وہاں گئے تو یہودیوں نے ان کو اس امر کے لئے رشوت دینا چاہی کہ وہ ان کے ساتھ نرمی کریں تو انہوں نے یہودیوں سے کہا: "خدا کی قسم میں تو ایک ایسے شخص کا نمائندہ ہوں جو اس پوری دنیا سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔ خدا کی قسم تم کو میں بندروں اور خنزیروں سے بھی زیادہ برا سمجھتا ہوں لیکن حضور ؐ کی محبت اور تمہاری نفرت مجھے اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ میں تمہارے درمیان عدل کے سوا کچھ اور کروں۔" اس پر یہودیوں نے کہا کہ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے زمین و آسمان کا نظام قائم ہے

عبداللہ ابن رواحہ مدرسہ رسول اللہ ؐ کے تعلیم یافتہ تھے' اور ان کی تعلیم و تربیت ربانی منہاج پر ہوئی تھی ۔ وہ انسان تھے اور پورے انسانی جذبات کے ساتھ کسی عدالت کی کرسی پر بیٹھے اور کامیاب رہے ۔ اور ان کے سوا دوسرے بھی کچھ کم نہ تھے جنھوں نے اسلامی نظام کے زیر سایہ معجزہ دنیا کو کر کے دکھایا۔

سالوں پر سال گزرتے رہے ۔ صدیاں بیت گئیں اور یہ دور بہت دور چلا گیا ہے اور لائبریریاں فقہ اور قانون کی کتابوں سے بھر گئی ہیں ۔ قانونی ضابطوں اور انصاف کے رولز ریگولیشن کی بہتات ہوگئی اور قانون اور انصاف کے محکمے اور وزارتیں تشکیل دے دی گئیں ۔ اور دماغ عدل و انصاف کا نام سن سن کر پھر گئے ۔ دنیا میں عدل کرنے کے بارے میں طویل ترین تقاریر اور مقالات پڑھے جانے لگے ۔ عدل و انصاف کے سلسلے میں کئی نظریات پیدا ہوئے اور کئی تنظیمیں وجود میں آئیں اور کانفرنسیں ہوئیں لیکن وہ حقیقی عدل کہاں ہے؟ اس کا ذائقہ کسی نے نہیں چکھا ۔ یہ عدل لوگوں کے ضمیروں اور ان کی زندگی میں عنقا ہی رہا ۔ اور یہ عدل ان انتظامات کے باوجود اس اعلیٰ معیار تک نہ پہنچ سکا جو خیر القرون کا طرۂ امتیاز تھا ۔ اس کا حقیقی وجود اگر کہیں تھا تو صرف اسلامی نظام کے دور میں تھا ۔ اس مختصر دور میں عدل کا گراف اس قدر بلندی تک پہنچا اور نبوت اور خلافت راشدہ کے بعد اگر وہ کہیں ملا تو صرف اسلامی معاشرے کے اندر ملا اور صرف ان دلوں میں ملا جن میں اسلام جاگزین تھا اور ان افراد اور ان سوسائٹیوں میں ملا جن کی تربیت اسلامی نظام کے زیر سایہ ہو چکی تھی ۔ جو یقیناً ایک واحد اور مثالی عادلانہ نظام ہے ۔

وہ لوگ جو آج کل جدید سے جدید عدالتی نظام تشکیل دیتے ہیں' عدل و انصاف کے لئے جدید سے جدید ذرائع استعمال کرتے ہیں اور عدلیہ کے لئے نہایت ہی پیچیدہ طریقہ کار طے کرتے ہیں' ان لوگوں کو چاہئے کہ وہ ان امور کو بھی مدنظر رکھیں جو ہم نے اوپر دیئے ہیں ۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ کار پیچیدہ ہے اور یہ نہایت ہی منظم عدالتی ڈھانچے اس سادہ اور نہایت ہی ابتدائی انتظامات سے زیادہ مفید ہوں گے جو اسلامی دور میں اختیار کئے گئے تھے ۔ یہ جدید لوگ جن کے ہاتھوں میں عدلیہ کا اہتمام ہے' وہ سمجھتے ہوں گے کہ وہ بہت ہی کامیاب ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے ۔

یہ ایک وہم ہے اور یہ وہم اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ لوگ ظاہری شکلیں اور ظاہری حجم کو دیکھ کر حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ اشیاء کی حقیقت ان کے ظاہری حجم سے معلوم نہیں ہوتی ۔ یہ اسلامی نظام ہی ہے جو ان سادہ حالات کے اندر اس قدر بلند معیار تک پہنچا اور آج بھی اسلام ہی ہے جو اس سطح تک عدل کے معیار کو پہنچا سکتا ہے' بشرطیکہ اسے اختیار کیا جائے ۔

لیکن اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہم جدید ترقی یافتہ دور میں نظام عدالت کے جدید انتظامات اور ضابطہ ہائے دیوانی اور

فوجداری سے فائدہ نہ اٹھائیں یا محکمہ انصاف کی جدید تنظیم اور ترقی یافتہ اشکال کو ختم کر کے ان کی جگہ خلافت راشدہ کی سادہ شکل جاری کر دیں۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ اصل مقصد شکل اور تنظیم نہیں ہے بلکہ اصل مطلوب وہ روح ہے جو ظاہری شکل کے اندر کارفرما ہوتی ہے چاہے اس کی ظاہری شکل اور جسامت جو بھی ہو اور وہ نظام کیسے ہی حالات اور کیسے ہی زمان و مکان میں ہو۔

---ooo---

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۱۳۶

(اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ہر اس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے۔ جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روز آخرت سے کفر کیا وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا)

یہ ایک دوسری پکار ہے' جو صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لا چکے ہیں اور یہاں اس صفت اور لقب کے ساتھ ان کو آواز دی گئی ہے جو ان کو ان کے اردگرد پھیلی ہوئی جاہلیت سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ صفت ان کے واجبات و فرائض کا تعین کرتی ہے اور ان کو اس منبع اور ذریعے سے مربوط کرتی ہے جو ان کی قوت اور برتری کا اصل ماخذ (Source) ہے جس ماخذ سے وہ تمام قوتیں اور ہمتیں حاصل کرتے ہیں۔

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (۴ : ۱۳۶)) (اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ہر اس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے)۔

یہاں ایمان کے عناصر ترکیبی کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ وہ امور ہیں جن کا ہر شخص کے ایمان اور عقیدے میں موجود ہونا ضروری ہے۔ گویا یہ وہ اساس ہے جس پر ایمان کے اعتقادی تصورات قائم ہوتے ہیں۔ اللہ پر ایمان اور رسولوں پر ایمان انسان کو اس ذات سے مربوط کر دیتا ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اللہ نے پھر رسول کو بھیجا ہے تاکہ وہ انسان کو ہدایت دے۔ ایمان بالرسالت میں یہ امر شامل ہے کہ رسول اللہ نے اللہ کی جانب سے جو پیغام دیا ہے وہ صحیح دیا ہے۔

ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کا لازمی نتیجہ صدق ایمانی ہے۔ اللہ نے جو کتاب رسول کے ذریعہ ارسال کی ہے وہ بالکل سچی ہے۔ اس کتاب کے اندر اللہ نے انسانوں کو زندگی بسر کرنے کے تمام طریقے بتائے ہیں اور یہ کتاب تمام اہل ایمان

کے درمیان ایک مشترکہ رابطہ ہے اور انسانوں نے اس پوری کتاب کو بطور ہدایت لینا ہے ۔ یہ جائز نہیں کہ اس میں سے بعض امور کو لے لیا جائے اور نافذ کیا جائے اور اس کے بعض حصوں کو چھوڑ دیا جائے ۔

ایمان کے اساسی عناصر میں تمام کتب سابقہ پر ایمان لانا بھی ضروری ہے ۔ اس لئے کہ سابقہ انبیاء بھی اللہ کے رسول تھے اور وہ کتب بھی اللہ کی کتابیں تھیں اور ان سب میں جو نظام زندگی تجویز ہوا تھا وہ اسلام ہی تھا ۔ سب کی تعلیم یہ تھی کہ اللہ ہی الٰہ ہے الوہیت کے تمام خصائص کے اندر اس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں ہے اور سب کی تعلیم یہ تھی کہ اس نظام زندگی کی اطاعت اور نفاذ واجب ہے اور اللہ کی وحدانیت کے عقیدے کا یہ تقاضا بھی ہے کہ یہ کتب اپنی تحریف سے قبل سب کی سب اللہ کی طرف سے تھیں ۔ ان میں ایک ہی نظام درج تھا اور بشر کے بارے میں سب کے اندر اللہ ہی کا ارادہ درج تھا ۔ ایک ہی راستہ تھا جو صراط مستقیم تھا اور باقی تمام راستے اس کے اردگرد تھے اور ٹیڑھے تھے ۔

تمام کتابوں پر ایمان لانے کا مقصد یہ ہے کہ دراصل تمام کتب ایک ہی کتاب ہے جو الکتاب ہے ۔ اور یہ وحدت فکر صرف امت مسلمہ کی خصوصیت ہے ۔ اس کا تصور یہ ہے کہ تمام کتب سماوی ایک کتاب ہے ' تمام ادیان سماوی ایک دین ہے ' ان کے اندر بیان کردہ ضابطہ ایک نظام ہے اور طریق کار بھی ایک ہے ۔ یہی تصور حقیقت الوہیت کے ساتھ حقیقی لگا کھاتا ہے اور یہی بشریت کے لئے بھی درست ہے ۔ یہ تصور ثابت کرتا ہے کہ سچائی ایک ہوتی ہے اور سچائی میں تعدد ممکن نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ گمراہی ہے ۔ (فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ) ایمان لانے کا حکم دینے کے بعد ایک سخت تنبیہ آتی ہے یہ کہ ان عناصر ایمان میں سے کسی کا انکار ہرگز قابل برداشت نہیں ہے اور منفی بیان کے اندر بھی عناصر ایمان کی پوری تفصیل دے دی گئی ۔

(وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا

( ٤ : ١٣٦ )) (جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روز آخرت سے کفر کیا وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا) ۔ پہلی آیت میں ایمان باللہ اور ایمان بالکتب اور ایمان بالرسل کا ذکر کیا گیا اور ملائکہ کا ذکر نہ تھا ۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی کتابوں میں ملائکہ اور ذکر آخرت دونوں آجاتے ہیں ۔ اور کتابوں پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ فرشتوں اور یوم آخرت پر ایمان لایا جائے لیکن اس دوسری آیت میں ان کا ذکر کر دیا گیا' اس لئے کہ کفر کے بعد تہدید اور وعید آتی ہے اور عذاب سے ڈرایا جاتا ہے ۔ جس کی تصریح اور وضاحت ضروری تھی تاکہ کل یہ کوئی نہ کہے کہ قیامت اور ملائکہ کا ذکر علی التخصیص نہ تھا ۔ اس آیت میں "ضلال بعید" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ راہ گمراہی میں یہ لوگ اس قدر دور نکل گئے ہیں کہ اب ان کا راہ ہدایت پر آنا ممکن نہیں ہے اور نہ اس بارے میں ان سے امید کی جاسکتی ہے ۔

سوال یہ ہے کہ جو شخص اللہ کا منکر ہے ' حالانکہ ذات باری پر ہر شخص ذاتی اور طبعی طور پر ایمان لاتا ہے بلکہ ہر شخص کی فطرت اس پر ایمان لاتی ہے انکار خدا کے بعد وہ ملائکہ ' کتب ' یوم آخرت کا انکار کرتا ہے تو وہ درحقیقت ذات باری کے انکار ہی کو آگے بڑھاتا ہے ۔ ایسے شخص کی اصل فطرت فساد' تعطل اور خرابی کا شکار ہو چکی ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے کفر

کے لئے ضلال بعید کا لفظ استعمال کیا گیا۔

---○○○---

مسلمانوں کو صفت ایمان سے پکار کر دوبار آواز دینے کے بعد اب منافقین پر حملہ شروع ہو جاتا ہے اور یہ حملہ اس وقت ان کے جو حقیقی حالات تھے ان کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ ان کا یہ موقف ایسا ہے جو آج کل کے منافقین کے ساتھ بالکل ملتا جلتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا ﴿١٣٧﴾

(رہے وہ لوگ جو ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے تو اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا اور نہ کبھی ان کو راہ راست دکھائے گا)۔ وہ کفر جو ایمان سے پہلے ہو، اس کے آثار کو ایمان بالکل مٹا دیتا ہے۔ جس شخص نے کبھی روشنی دیکھی ہی نہ ہو وہ اگر اندھیرے میں رہتا ہے تو وہ معذور ہے۔ لیکن ایمان کے بعد کفر کا رویہ اختیار کرنا اور بار بار ایسا کرنا کبیرہ گناہ ہے، اس قدر بڑا گناہ کہ اللہ تعالیٰ ہرگز اس کی مغفرت نہ کرے گا اور نہ اس حرکت کا کوئی عذر ہو سکتا ہے۔ کفر تو ایک حجاب ہے، جب پردہ ہٹ جائے تو فطرت اپنے خالق کے ساتھ مربوط ہو جاتی ہے اور گمراہ شخص پھر ہدایت کے ساتھ بندھ جاتا ہے۔ پودا اپنی تر سری میں آجاتا ہے اور روح ایمان کی مٹھاس کو چکھ لیتی ہے اس لئے جو لوگ ایمان کے بعد بار بار مرتد ہوتے ہیں گویا وہ فطرت سے بھاگتے ہیں، علم سے بھاگتے ہیں اور عمداً جہالت میں جاگرتے ہیں اور وہ عمداً راہ ضلالت اور گم شدگی پر چل نکلتے ہیں۔ اور پھر وہ اس راہ پر اس قدر دور نکل جاتے ہیں کہ آگے سے راہ ہی ختم ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے حکم دیا کہ اب وہ انہیں معاف نہ کرے گا اور اب وہ انہیں دوبارہ لوٹا کر راہ ہدایت پر نہ لائے گا اس لئے کہ انہوں نے قصداً راہ حق کو چھوڑا۔ پہلے وہ اس راہ پر چل چکے تھے اور منزل پا چکے تھے۔ انہوں نے قصداً اندھے پن اور برائی کو اختیار کیا جبکہ پہلے وہ صاحب نظر تھے اور صراط مستقیم کے راہ رو تھے۔

---○○○---

جب تک نفس انسانی اللہ کے لئے خالص نہ ہو جائے، اس وقت تک وہ اوضاع و اقدار اور مصالح اور مفادات کے دباؤ سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ وہ حرص اور لالچ سے پاک ہو سکتا ہے اور نہ وہ مصلحتوں اور امیدوں سے پاک ہو سکتا ہے۔ اور یہ نفس کبھی بھی عزت نفس، بلندی ہمت اور آزادی سے سرشار نہیں ہو سکتا جس طرح وہ نفس ہوتا ہے جو محبت الٰہی سے بھرا ہوا ہو۔ جب کوئی دل محبت الٰہی سے بھر جائے تو وہ دنیاوی اقدار، دنیاوی طور طریقوں، دنیا کے واقعات، دنیا کے لوگوں، دنیا میں پائے جانے والی تمام قوتوں، حکومتوں اور ان کے اہالی و موالی کے مقابلے میں برتر ہوتا ہے۔

یہاں سے پھر نفاق کا پودا پھوٹتا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ نفاق کی حقیقت کیا ہے؟ نفاق صرف یہ ہے کہ انسان

سچائی پر بظاہر تو ثابت ہو جائے مگر اس کے لئے لڑنے اور باطل کے ساتھ مقابلہ کرنے میں ضعیف ہو۔ یہ ضعف اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں خوف اور لالچ پیدا ہو جاتا ہے اور یہ خوف اور لالچ دونوں اللہ سے نہیں ہوتے بلکہ غیر اللہ سے ہوتے ہیں۔ انسان پھر زمین کے حالات اور زمین کی شخصیات کا قیدی بن جاتا ہے اور اسلامی نظام سے دور ہو جاتا ہے۔

لہٰذا اس سبق میں ایمان کی بات بھی ہوئی ہے' قیام شہادت اور عدل کی بات بھی ہوئی اور نفاق کی بات بھی ہوئی اور تینوں کے درمیان گہرا ربط ہے۔ عمومی مناسبت تو یہ ہے کہ یہی اس سورہ کے اصل موضوعات ہیں' یعنی جماعت مسلمہ کی اسلامی نظام حیات میں تربیت اور اس کی اجتماعی زندگی سے جاہلیت کے آثار کو مٹانا' جماعت کے افراد کے نفوس کو بشری فطری کمزوریوں کے مقابلے میں تیار کرنا اور پھر اسے ارد گرد پھیلے ہوئے مشرکین اور منافقین کے ساتھ ہونے والے معرکے کے اندر اتارنا۔ اس پوری سورہ کے اندر یہی مرکزی مضمون ہے جس کے ارد گرد یہ سورہ گھومتی ہے' اول سے آخر تک۔

یہی وجہ ہے کہ اس سبق کے باقی ماندہ حصے میں بات منافقین تک محدود ہے اور اس پر یہ پارہ بھی ختم ہوتا ہے جبکہ اس سے قبل منافقین کی ایک خاص جماعت کا تذکرہ ہوا کہ وہ بار بار اعلان اسلام کرتے ہیں اور پھر کفر کرتے ہیں۔ چنانچہ اب یہاں سے منافقین پر تنقید شروع ہوتی ہے جن کے بارے میں قرآن نے تفصیلات بیان کر دی ہیں اور مختلف انداز میں ان کی بیماری کا مطالعہ کیا ہے تاکہ اسلامی نظام کا مزاج اچھی طرح سامنے آجائے فطرت کے مطابق اس پر عمل ہو اور دلوں میں اور عمل میں اسلامی نظام واضح طور پر نظر آئے۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ﴿١٣٨﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ
الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ
الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿١٣٩﴾ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ
اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ
حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْكٰفِرِيْنَ
فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ﴿١٤٠﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ
اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ

نَسۡتَحۡوِذۡ عَلَيۡكُمۡ وَ نَمۡنَعۡكُمۡ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحۡكُمُ بَيۡنَكُمۡ يَوۡمَ
الۡقِيٰمَةِ ؕ وَلَنۡ يَّجۡعَلَ اللّٰهُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ سَبِيۡلًا ﴿۱۴۱﴾ اِنَّ
الۡمُنٰفِقِيۡنَ يُخٰدِعُوۡنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمۡ ۚ وَاِذَا قَامُوۡۤا اِلَى الصَّلٰوةِ
قَامُوۡا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوۡنَ النَّاسَ وَلَا يَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيۡلًا ۙ ﴿۱۴۲﴾
مُّذَبۡذَبِيۡنَ بَيۡنَ ذٰلِكَ ۖ لَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ وَلَاۤ اِلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ ؕ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ
اللّٰهُ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ سَبِيۡلًا ﴿۱۴۳﴾

(جو منافق اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں' انہیں یہ مژدہ سنا دو کہ ان کے لئے دردناک سزا تیار ہے ۔ کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کی لئے ہے ۔ اللہ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جارہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جارہا ہے وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں ۔ اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہی کی طرح ہو۔ یقین جانو کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے ۔

یہ منافق تمہارے معاملے میں انتظار کر رہے ہیں (کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے ) اگر اللہ کی طرف سے فتح تمہاری ہوئی تو آکر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اگر کافروں کا پلہ بھاری رہا تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا؟ بس اللہ ہی تمہارے اور ان کے معاملے کا فیصلہ قیامت کے روز کرے گا اور (اس فیصلے میں ) اللہ نے کافروں کے لئے مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی ۔

یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے ۔ جب یہ نماز کے لئے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں ۔ کفر و ایمان کے درمیان ڈانواڈول ہیں ۔ نہ پورے اس طرف ہیں نہ پورے اس طرف ۔ جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو اس کے لئے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے ۔)

منافقین پر یہ تنقیدی جملہ اس طنز کے ساتھ شروع ہوتا ہے یہاں ارتداد کے بجائے لفظ بشر سے ان پر تنقید شروع کر دی جاتی ہے ۔ انہیں اس عذاب کی خوشخبری دی جارہی ہے جو ان کے انتظار میں ہے ۔ اس کے بعد سبب عذاب بھی بتا دیا جاتا

ہے' وہ یہ ہے کہ یہ لوگ اہل ایمان کے ساتھ دوستی کرنے کے بجائے کافروں کو دوست بنا رہے ہیں - دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کو اللہ سے بدظنی ہے - تیسرے یہ کہ ان کو معلوم نہیں ہے کہ عزت اور ذلت دینے والا کون ہے -

(بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۱۳۸) الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (۱۳۹)

(٤: ۱۳۸ - ۱۳۹)) (جو منافق اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں' انہیں یہ مژدہ سنا دو کہ ان کے لئے دردناک سزا تیار ہے - کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کی لئے ہے) - یہاں جن کفار کا ذکر کیا گیا ہے' راجح روایات کے مطابق ان سے مراد یہودی ہیں' منافقین ان کے ہاں پناہ لیتے تھے اور ان کے ہاں راتوں کو چھپتے تھے - ان کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف مشورے کرتے تھے اور مسلمانوں کے خلاف قسم قسم کی سازشیں کرتے تھے -

اللہ تعالیٰ سوالیہ انداز میں پوچھتے ہیں کہ یہ لوگ دعوائے ایمان بھی کرتے ہیں اور اس کے باوجود کفار کے ساتھ دوستی کرتے ہیں' اپنے آپ کو یہ لوگ کس لئے ایسے موقف میں کھڑا کرتے ہیں - کیا یہ لوگ کفار سے عزت کے طلبگار ہیں؟ حالانکہ عزت تو اللہ کے ہاں ہوتی ہے اور عزت صرف اسے ملتی ہے جو اللہ کا دوست ہو اور جو اللہ کی درگاہ سے عزت کا طلبگار ہو اور اللہ کے ہاں وہ پناہ لینے والا ہو -

اس طرح ان آیات میں منافقین کی ایک جھلکی دکھائی جاتی ہے - یہ ان کی پہلی صفت ہے کہ وہ مومنین کے ساتھ دوستی نہیں رکھتے اور کافروں کے دوست ہوتے ہیں - وہ عزت اور قوت کافروں کے ہاں ڈھونڈتے ہیں حالانکہ عزت اور قوت کا سرچشمہ اللہ ہے - اس لئے ضروری ہے عزت کی تلاش اور قوت کی تلاش اللہ کے ہاں سے کی جائے اور اگر وہ یہ تلاش کسی دوسری جگہ کریں گے تو یہ تلاش عبث ہوگی' اس لئے کہ یہ جنس دوسری جگہ ہے ہی نہیں -

یہ بات نوٹ کرلیں کہ اس کائنات میں نفس انسانی کے لئے ایک ہی سہارا ہے' جہاں سے وہ عزت پاسکتا ہے - جب اس سہارے کے آگے یہ نفس جھکے گا تو دوسروں کے مقابلے میں سربلند ہو جائے گا - یہ ایک ہی بندگی اور ایک ہی سجدہ انسان کو تمام سجدوں سے بے نیاز کر دیتا ہے - اگر نفس انسانی نے اللہ کے سامنے جھکنا نہ شروع کیا تو اسے بہت سے خداؤں کی بندگی کرنا ہوگی' اسے کئی اشخاص کی بندگی کرنا ہوگی - وہ مختلف قسم کے لحاظ رکھے گا' مختلف جہتوں کا اسے خیال کرنا ہوگا اور وہ مختلف خطرات سے دوچار ہوگا اور یہ سب لحاظ و ملاحظے اور مختلف لوگوں کی بندگی اور غلامی بھی اسے بچا نہ سکے گی - اس لئے کہ یا یہاں تو اللہ کی بندگی ہوگی اور پھر انسان سربلند اور معزز ہو جائے گا اور یا پھر انسانوں کی بندگی ہوگی جو عبارت ہے' غلامی اور ذلت سے اور جس میں آزادی کے بجائے قید و بند ہے - اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ ان میں سے کس کو اختیار کرتا ہے' غلامی کو یا آزادی کو؟

کوئی شخص مومن ہوتے ہوئے یہ نہیں کر سکتا کہ وہ ماسوئ اللہ کے ہاں عزت کا طلبگار ہو - اگر ایسا کرے گا تو وہ مومن نہیں ہو سکتا - اسی طرح اگر مومن اللہ کے دشمنوں سے عزت' نصرت اور قوت طلب کرتا ہے' تو وہ مومن نہ ہوگا - آج جو

لوگ اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں اور مسلمانوں جیسے نام رکھتے ہیں اور وہ اس کائنات کے اندر دشمنان اسلام سے مدد لیتے ہیں تو سب لوگوں کی نسبت ان کو اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ وہ ذرا قرآن کی ان ہدایات پر تدبر کریں بشرطیکہ ان کے دلوں میں صحیح مسلمان ہونے کی خواہش ہو۔ اگر ان کو اس بارے میں کوئی رغبت ہی نہیں ہے تو اللہ تو عالمین سے غنی ہے۔

علاوہ دوسری باتوں کے یہ بھی کفار سے عزت طلب کرنے کے مترادف ہے کہ انسان اپنے ان آباء و اجداد پر فخر کرے جو کفر پر مر گئے تھے اور یہ لحاظ رکھے کہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان نسبت اور قرابت کا تعلق ہے۔ جس طرح بعض لوگ فرعونوں پر فخر کرتے ہیں' بعض لوگ اشوریوں پر فخر کرتے ہیں' بعض فنیقیوں پر فخر کرتے ہیں' بعض بابلیوں پر فخر کرتے ہیں اور عرب اپنی جاہلیت عربیہ اور جمعیت جاہلیہ کا لحاظ رکھتے ہیں۔

امام احمد نے ابو ریحانہ سے روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں نبی ؐ نے فرمایا : "جو شخص (۹) نو کافر آباؤ اجداد کی طرف اپنی نسبت کرے گا اور اس سے اس کا مقصد یہ ہو کہ وہ ان پر فخر کرتا ہے تو یہ شخص دسواں شخص ہو گا جو ان کا جہنم میں ساتھی ہو گا۔"

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں آئیڈ صرف نظریہ حیات پر ہے۔ اسلام میں امت صرف اسلام و ایمان کی اساس پر ہے اور آغاز اسلام سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ آغاز اسلام سے آج تک ہر سرزمین' ہر جگہ اور ہر نسل میں اسلام کا یہی موقف رہا ہے۔ امت کا معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی دور میں کسی نسل کی ایک جگہ رہائش ہو اور وہ ایک امت بن جائے۔

مراتب نفاق میں سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ ایک مومن کسی ایسی مجلس میں بیٹھا رہے جس کے اندر اللہ کی آیات کا انکار کیا جا رہا ہو' ان کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہو اور یہ شخص خاموش بیٹھا ہو اور چشم پوشی کرے۔ پھر اس کو وہ رواداری کا نام دے یا اسے ہوشیاری' یا وسعت قلبی یا آزادی رائے کا نام دے حالانکہ یہ موقف دراصل داخلی شکست ہے جو اس کی رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔ یہ نام وہ اس لئے رکھ رہا ہے کہ لوگ اسے کمزور اور ضعیف الایمان ہونے کا طعنہ نہ دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ ان الفاظ میں اپنی کمزوری کو چھپاتے ہیں۔

اللہ کے لئے حمیت' اللہ کے دین کے لئے حمیت اور آیات الٰہی کے لئے 'حمیت' درحقیقت ایمان کی بڑی نشانی ہے۔ جب یہ حمیت ختم ہو جاتی ہے تو پھر بند ٹوٹ جاتا ہے اور تمام پردے ہٹ جاتے ہیں۔ تمام رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں اور جب زیادہ دباؤ پڑتا ہے تو وہ کچا دھاگہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ پہلے پہل اسلامی حمیت دب جاتی ہے جس طرح چنگاری کو راکھ میں دبا دیا جاتا ہے۔ پھر وہ ٹھنڈی ہو کر بجھ جاتی ہے۔

جو شخص بھی کسی مجلس میں اپنے دین کے ساتھ مذاق سنے اسے چاہیے کہ یا تو وہ دین کا دفاع کرے یا مجلس سے اٹھ کر چلا جائے لیکن اگر وہ چشم پوشی کرتا ہے اور خاموش رہتا ہے تو یہ اس کی پہلی شکست ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہوتی ہے کہ انسان نفاق کے پل پر بالکل بیچ میں' ایمان اور کفر کے درمیان کھڑا ہوتا ہے۔

مدینہ میں بعض مسلمان ایسے تھے جو بڑے بڑے منافقین کی محفلوں میں بیٹھتے تھے اور یہ منافقین بڑے بااثر تھے۔ حضور ؐ کی ہجرت کے بعد بھی ان کو معاشرے میں اثر و رسوخ حاصل تھا۔ اس لئے قرآن کریم نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ ایسی مجالس میں جانا اور پھر ان مجالس میں جو گفتگوئیں اسلام کے خلاف چلتی ہیں ان کو خاموشی سے سنتے چلے جانا' شکست کا پہلا مرحلہ ہے۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ مسلمان ان مجالس سے باز آ جائیں لیکن حالات ایسے نہ تھے کہ قرآن ایسی مجالس میں بیٹھنے

سے مطلقاً روک دیتا اس لئے یہاں صرف یہ حکم دیا گیا کہ جب اللہ کی آیات کا انکار کیا جا رہا ہو اور ان کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہو تو مسلمانوں کو ان کا بائیکاٹ کر دینا چاہئے۔ اگر اس صورت حال میں بھی ایک مسلم شریک ہوتا ہے تو وہ منافق ہے۔

(وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِىْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِىْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا (٤: ١٤٠))

(اللہ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں۔ اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہی کی طرح ہو۔ یقین جانو کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے)۔ یہاں الکتاب کا جو ریفرنس دیا گیا ہے۔ وہ سورہ انعام کی یہ آیت ہے۔ (وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِىْۤ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِىْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ) یہاں جو سخت بات کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ (اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ) (اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہی کی طرح ہو) اور اس کے بعد جو سخت وعید آتی ہے وہ ایسی ہے کہ جو بات کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ (اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِىْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا (٤: ١٤٠)) (یقین جانو کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے)۔

لیکن صرف ان مجالس سے منع کیا گیا ہے جن میں آیات الٰہی کا کفر کیا جا رہا ہو۔ ان کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہو اور اس وقت جماعت مسلمہ جن حالات سے گزر رہی تھی اللہ نے ان حالات میں مکمل بائیکاٹ کا حکم نہیں دیا۔ ایسے حالات دوسرے معاشروں اور آنے والی نسلوں میں بھی پیش آ سکتے ہیں اور اسلامی نظام حیات کا طریقہ کار بھی یہی ہے کہ وہ اگر کوئی تحریک برپا کرتا ہے تو اسے نہایت ہی حکمت اور تدریج کے ساتھ لیتا ہے۔ وہ معاشرے کے اندر پائے جانے والے حالات، واقعی صورت حال اور لوگوں کے افکار و خیالات کو مدنظر رکھتا ہے لیکن ہدف یہی ہوتا ہے کہ اس واقعی صورت حال کو تبدیل کر کے چھوڑا جائے گا اور اس سمت پر مسلسل آگے بڑھا جائے گا۔

اس کے بعد منافقین کے کچھ خدوخال بیان کئے جاتے ہیں۔ یہاں منافقین کی بہت ہی بھونڈی صورت حال کی سینری (Oilpainting) بنائی جاتی ہے کہ وہ جب مسلمانوں کے ہاں کھڑے ہوں تو ان کے چہرے کے خدوخال دوسرے ہوتے ہیں اور اس سینری میں جب وہ منافقین کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں تو ان کے چہرے کے خدوخال بالکل دوسرے ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی عجیب حالت بنا رکھی ہے۔ وہ کیڑے مکوڑوں اور سانپوں کی طرح پہلو بدلتے چلتے ہیں۔ نہ ادھر کے ہیں نہ ادھر کے۔

(اَلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْۤا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ وَاِنْ

كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (٤: ١٤١))

(یہ منافق تمہارے معاملے میں انتظار کر رہے ہیں (کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے) اگر اللہ کی طرف سے فتح تمہاری ہوئی تو آکر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اگر کافروں کا پلہ بھاری رہا تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا؟ بس اللہ ہی تمہارے اور ان کے معاملے کا فیصلہ قیامت کے روز کرے گا اور (اس فیصلے میں) اللہ نے کافروں کے لئے مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی)

یہ عجیب تصویر اور سینری ہے۔ اس میں دکھایا جاتا ہے کہ منافقین مسلمانوں کے خلاف کس قدر گہری چال چل رہے ہیں اور کس قدر برے ارادے ہیں ان کے۔ وہ ہر وقت اس گھڑی کے انتظار میں ہیں کہ اہل اسلام پر کوئی مصیبت آئے۔ لیکن بظاہر وہ مسلمانوں کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو فتح نصیب ہو اور کوئی غنیمت ملے تو وہ اس وقت کہیں گے۔ (اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ (٤: ١٤١)) (کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے) اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ ہم جنگ کے موقعہ میں تمہارے ساتھ تھے۔ اس لئے کہ منافقین کبھی کبھار مسلمانوں کی صفوں میں جاکر اپنی ریشہ دوانیاں جاری رکھتے تھے یا اس سے مراد یہ ہے کہ ہم کہیں گے کہ ہم بھی تمہارے حامی اور ناصر تھے۔ اور اگر جنگ پر نہ گئے تو پشت پر تمہارے ہی مددگار تھے۔

(وَ اِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (٤: ١٤١)) (اگر کافروں کا پلہ بھاری رہا تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا) ان کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ان سے تعاون کیا' لمداد کی اور ان کی پشتیبانی کی اور مسلمانوں کے ساتھ سچ نہ کہا اور مسلمانوں کی صفوں کے اندر بے چینی اور افراتفری پیدا کی۔

اس طرح یہ لوگ کیڑوں اور سانپوں کی طرح پہلو بدلتے تھے اور ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف زہر بھرا ہوا تھا۔ ان کے منہ میں چکنی چپڑی باتیں تھیں لیکن یہ کمزور کردار کے لوگ تھے۔ ان کی اس سینری سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت ہی خستہ حال اور بدشکل ہیں اور ان کو اہل ایمان نظرانداز کر رہے ہیں۔ اہل ایمان کی روح کے لئے اسلامی نظام حیات کی یہ پہلی جھلکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور ہدایت کے زیر سایہ منافقین کے ساتھ حضور کا منصوبہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ چشم پوشی اور نرمی کا رویہ اختیار کیا جائے اور اہل اسلام کو ان کے مقابلے میں متنبہ اور خبردار کر دیا جائے۔ ان کو ان کے اصل عزائم سے آگاہ کر دیا جائے اور اس طرح ان کو زہر کا میٹھا پیالہ پلایا جائے اسی لئے ان کی سزا کے لئے یہ کہا جاتا ہے سزا دینے میں شتابی نہ کرو' ان کا فیصلہ اللہ آخرت میں کرے گا۔ (فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (٤: ١٤١)) (اللہ ان کا

فیصلہ قیامت کے روز کرے گا) جہاں کوئی سازش نہ چلے گی' جہاں کوئی عیاری اور مکاری کام نہ دے گی اور جہاں کوئی شخص کوئی بات دل میں نہ چھپا سکے گا۔

اس موقعہ پر اہل ایمان کے ساتھ بھی ایک قطعی وعدہ کر کے ان کو مطمئن کر دیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو مکاری اور عیاری کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اور اس کے ذریعے اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی اور کافروں کے ساتھ ان کی سازش ان کو کوئی فائدہ نہ دے گی۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ اس نے کافروں اور منافقوں کے لئے یہ تکھا ہی نہیں ہے کہ وہ اہل ایمان پر غالب ہوں۔

(وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (٤ : ١٤١)) (اور اللہ نے کافروں کو مسلمانوں پر غالب آنے کی کوئی سبیل نہیں رکھی)۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ اس آیت میں کافروں کے غلبے سے مراد قیامت کے روز غلبہ ہے جہاں اللہ اہل ایمان اور منافقین و کافرین کے درمیان فیصلہ کرے گا اور مومنین کے بارے میں اچھا فیصلہ ہو گا۔ لیکن ایک دوسری روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ اس سے مراد کہ مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کافروں کو اس طرح کا غلبہ نہیں دے گا کہ کافر انہیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں اگرچہ بعض معرکوں اور بعض علاقوں میں ان کو غلبہ نصیب ہو سکتا ہے۔ اس آیت کو اگر دنیا اور آخرت دونوں کے لئے لیا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے' اس لئے کہ اس میں کوئی اخروی تحدید و تخصیص نہیں ہے۔

اگر اس سے اخروی کامیابی لی جائے تو پھر اس میں تو کوئی شک و شبہ ہی نہیں ہے۔ البتہ اگر دنیاوی غلبہ لیا جائے تو اس میں بعض اوقات اشکال پیش آسکتے ہیں اور غلط فہمی بھی لاحق ہو سکتی ہے جس کی تشریح کی ضرورت ہے۔

یہ اللہ کا ایک قطعی وعدہ ہے اور اللہ کا ایک جامع حکم ہے۔ جب اہل ایمان کے دلوں میں ایمان کی حقیقت بیٹھ جائے اور ان کی زندگی کی اصل صورت حال میں اس حقیقت کا ظہور ہو جائے' اور پھر یہ حقیقت ان کے لئے نظام زندگی بن جائے اور اس کے اوپر نظام حکومت قائم ہو جائے اور ان کی ہر حرکت اور ہر سوچ اللہ کے لئے ہو جائے اور وہ چھوٹے اور بڑے سب امور میں اللہ کے بندے بن جائیں تو پھر کافروں کو مسلمانوں پر غالب آنے کی کوئی صورت سنت الہی میں نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کے خلاف تاریخ اسلامی میں کوئی ایک واقعہ بھی بطور مثال پیش نہیں کیا جا سکتا۔

میں بڑے وثوق سے کہتا ہوں کہ اللہ کے اس وعدے کے بارے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ صحیح اہل ایمان کو کبھی شکست نہیں ہو سکتی۔ اور ان کو تاریخ میں کبھی بھی ایسی کسی شکست سے دوچار ہونا نہیں پڑا۔ اور جب کبھی بھی ایسا ہوا ہے تو صرف اس وقت جب ان کے ایمان میں کمزوری ہوئی ہے۔ یا تو شعوری طور پر ایمان کمزور ہوا ہے یا عقیدے میں کمزوری پائی گئی ہے یا پھر عمل میں کوئی نہ کوئی کمزوری رہی ہے۔ یاد رہے کہ ایمان کا یہ مطالبہ ہے کہ اہل ایمان ہر وقت جہاد کے لئے تیار رہیں اور یہ جہاد بھی خالصتاً فی سبیل اللہ ہو اور اس میں کوئی اور مقصد پیش نظر نہ ہو۔ اور اگر اس میں کوئی لوپ ہول ہو تو پھر اس کمزوری کے مطابق ہی شکست ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جونہی اہل ایمان' ایمان و عمل سے یہ کمزوری دور کر لیں' فتح و کامرانی پھر ان کے قدم چومتی ہے۔

دیکھئے احد میں کمزوری یہ تھی کہ تیراندازوں نے حضور ؐ کی اطاعت کے بجائے آپ ؐ کے حکم کی خلاف ورزی کا

ارتکاب کیا اور اس کی وجہ صرف مال غنیمت کا لالچ تھا۔ اور جنگ حنین میں یہ کمزوری تھی کہ مسلمانوں کو اپنی کثرت پر ناز ہو گیا اور وہ اپنی قوت کے اصل سرچشمے کو پیش نظر نہ رکھ سکے۔ اگر ہم اپنی پوری تاریخ میں ہر اس واقعے کا تجزیہ کریں جس میں ہمیں شکست ہوئی تو معلوم ہو گا کہ وہاں اس قسم کی کوتاہیوں میں سے کوئی نہ کوئی کوتاہی تھی۔ اگر کہیں کوتاہی نظر نہ آئے تو یہ ہماری فہم کا قصور ہو گا۔ رہا اللہ کا یہ وعدہ تو وہ دنیا و آخرت دونوں میں برحق ہے۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ بعض اوقات ابتلاء محض حکمت خداوندی کی وجہ سے ہوتی ہے اس میں حکمت یہ ہوتی ہے کہ مسلمان اپنے ایمان اور ایمان کے تقاضے میں عائد ہونے والے لازمی اعمال میں اپنی کمزوریوں کا اچھی طرح احساس کر لیں۔ جیسا کہ احد میں پیش آیا اور اس پر اللہ نے طویل تبصرہ فرمایا۔ اور جب اس ابتلا کی وجہ سے حقیقت ایمان لازمی اعمال اور تیاریاں درست ہو گئیں تو اللہ کی مدد آپہنچی اور نصرت سامنے آگئی' بالکل کھلی نصرت۔

رہا یہ کہ ہزیمت سے مراد وہ ہزیمت ہے جو کسی ایک معرکے اور جھڑپ میں ہزیمت نہیں ہے۔ اس کے معنی بھی بہت ہی وسیع ہیں۔ اس سے مراد روحانی شکست ہے' عزم کا ٹوٹ جانا ہے۔ کسی معرکے میں شکست تب تسلیم ہو گی جب اس کے زیر اثر شکست خوردہ جماعت کی ہمت ٹوٹ جائے اور وہ تھک ہار کر بیٹھ جائے۔ لیکن اگر وہ اپنے اندر از سر نو ہمت تازہ پیدا کر لے' از سر نو مشعل روشن کر لے اور اپنی کمزوری کے مقامات تلاش کر لے اور اسے معلوم ہو جائے کہ اس معرکے کا مزاج کیا ہے' اس نظریہ حیات کا مزاج کیا ہے' اور اس راہ میں کیا کیا مشکلات ہیں تو فتح و نصرت کے لئے یہ شکست ایک تمہید ہو گی اگرچہ راہ طویل ہو جائے۔

جب اس آیت میں یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ نے اہل ایمان کے اوپر اہل کفر کے غلبے کی کوئی صورت ہی نہیں رکھی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مومن روحانی طور پر غالب ہوتا ہے اور فتح بھی ہوتی ہے جب روح اور ایمان غالب ہوں۔ فتح دراصل افکار مومنانہ کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دعوت دیتا ہے کہ اپنے شعور اور تصور کے اعتبار سے وہ کامل اور مکمل مومن ہوں۔ اپنی عملی زندگی میں وہ برتر اور کامل ہوں۔ ان کا عمل و کردار برتر ہو اور ان کا اعتماد صرف عنوان پر ہی نہ ہو۔ اس لئے کہ نصرت صرف نام اور عنوان کو نہیں ملتی بلکہ نام اور عنوان کے پیچھے جو حقیقت ہوتی ہے فتح اسے نصیب ہوتی ہے۔

ہماری فتح اور شکست کے لئے صرف ایک ہی شرط ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ ہم حقیقت ایمان کو مکمل کریں اور اس کے بعد اس حقیقت ایمانیہ کے تقاضے میں جو عملی زندگی میں تبدیلیاں لاتی ہیں وہ لائیں۔ حقیقت ایمان یہ ہے کہ ہم پوری طرح تیاری کریں اور سامان جنگ اور تجربہ جنگ سے لیس ہوں۔ ایمان کی حقیقت کی تکمیل میں یہ بات بھی ہے کہ ہم دشمنوں کے آگے ہرگز نہ جھکیں' اور عزت کے طلبگار صرف اللہ سے ہوں۔

اللہ کا یہ مؤکد وعدہ پوری طرح حقیقت ایمانیہ کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے اور اس طرح حقیقت کفر کے ساتھ بھی یہی وعدہ ہے۔ ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کا رابطہ اس عظیم قوت سے ہو جائے جو نہ کمزور پڑتی ہے اور نہ ضعیف ہوتی ہے۔ کفر کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی اس عظیم قوت سے اپنا رابطہ کاٹ دے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ محدود' ٹوٹی پھوٹی' بکھری قوت ایک ایسی قوت پر غالب آجائے جو لامحدود ہو' جو اپنے سرچشمہ قوت سے مربوط ہو اور جو قوت اس پوری کائنات کی قوت ہو۔

لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا چاہئے کہ حقیقت ایمان اور محض مظہر ایمان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ حقیقت ایمانیہ تو وہ

قوت ہے جو ٹھوس ہے 'اور اس طرح مستحکم اور اٹل ہے جس طرح اس کائنات کے قوانین طبیعی ٹھوس اور اٹل ہیں۔اور وہ حقیقت ایمانی حضرت انسان کی شخصیت پر مکمل کنٹرول رکھتی ہے اور اس کی ہر حرکت پر اثرانداز ہوتی ہے۔یہ ایک عظیم حقیقت ہوتی ہے اور وہ اس بات کی ضامن ہوتی ہے کہ جب اس کا سامنا کفر کی قوت کے ساتھ ہو جو یکہ و تنہا ہوتی ہے' جو حقیقی منبع قوت سے کٹی ہوئی ہوتی ہے اور محدود ہوتی ہے تو یہ ایمانی حقیقت 'حقیقت کفر پر غالب آ جاتی ہے۔لیکن ایمان اگر حقیقت نہ ہو محض صورت ہو تو اس صورت پر کفر غالب آ سکتا ہے جبکہ کفر اپنی حقیقت کے اندر فعال ہو اور کفر اپنے حقیقت کفر میں مخلص ہو محض صورت نہ ہو اس لئے کہ کسی بھی چیز کی حقیقت محض صورت کے مقابلے میں بھاری ہوتی ہے اگرچہ ایک طرف صورت ایمان اور دوسری طرف صورت کفر ہو۔

اللہ کے ہاں باطل کو مغلوب کرنے کا اصول یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں حق اور سچائی اٹھے اور جب سچائی اپنی حقیقت کے اعتبار سے موجود ہو تو پھر سچائی اور باطل کے درمیان کشمکش کا فیصلہ اسی وقت ہو جاتا ہے۔اگرچہ باطل بظاہر بہت ہی بڑا اور عظیم نظر آئے اور آنکھوں کو چکاچوند کرنے والا ہو۔

( بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَاِذَا هِيَ يَدْمَغُهُ مَا ذَا هُوَ زَاهِقٌ ) (بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینکتے ہیں اور وہ باطل کا سر پھوڑ دیتا ہے اور وہ اچانک زائل ہو جاتا ہے )صدق اللہ العظیم (اور اللہ نے کافروں کے لئے مومنین پر غلبے کی کوئی صورت نہیں رکھی ہے )۔

اس قطعی اور فیصلہ کن وعدے کے بعد کہ کافر مومنین پر غالب و برتر نہیں ہو سکتے اور منافقوں کو جو کافروں کے ساتھ دوستی کرتے ہیں اور جو کافروں کے ہاں عزت ڈھونڈتے ہیں 'اللہ تعالیٰ منافقین کی ایک دوسری تصویر پیش کرتا ہے اور اس تصویر کے ساتھ ان کی ہجو اور ان کی گوشمالی بھی ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَاۗءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۴۲) مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا (۱۴۳) ( ۴ : ۱۴۲ - ۱۴۳ ) (یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔جب یہ نماز کے لئے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔کفر و ایمان کے درمیان ڈانواڈول ہیں۔نہ پورے اس طرف ہیں نہ پورے اس طرف۔جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو اس کے لئے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔)اسلامی نظام کی تجلیوں میں سے یہ ایک اور جھلکی مومن دلوں کو دکھائی جا رہی ہے تاکہ اہل ایمان ایسے لوگوں سے ذرا دور رہیں جو اللہ اور رسول اللہ کو بھی دھوکہ دیتے ہیں اور اہل ایمان جانتے ہیں کہ اللہ تو کسی کو دھوکہ نہیں دیتا' اس لئے کہ اللہ تو دل کے رازوں کو بھی جانتا ہے اور جو شخص اللہ کو دھوکہ دینے کی جسارت کرتا ہے وہ بہرحال ایک احمق' جاہل اور نہایت ہی بدفطرت شخص ہو گا۔یہی وجہ ہے کہ یہاں ایسے لوگوں کو نہایت ہی حقیر' قابل نفرت اور گھٹیا قرار دیا جا رہا ہے۔

اس جھلکی اور رنج کے بعد یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ اللہ بھی ان لوگوں کو دھوکے میں ڈال رہا ہے' انہیں مہلت دے رہا ہے اور اس گمراہی کی حالت ہی میں انہیں چھوڑ رہا ہے ۔ ان پر کوئی ایسی مصیبت نہیں لا رہا ہے جس سے وہ متنبہ ہو کر راہ راست پر آجائیں اور نہ ایسی کھٹک سے انہیں دوچار کر رہا ہے جس سے متنبہ ہو کر ان لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں ۔ اللہ انہیں کھلی چھٹی دے رہا ہے کہ وہ اس راستے پر چلتے رہیں جس میں گڑھے ہیں تاکہ یہ لوگ ان میں گر جائیں ۔ یہ ہے وہ خدع جو اللہ کی طرف سے ان کے ساتھ ہو رہی ہے ۔ حادثات اور مشقتیں بعض اوقات اللہ کی رحمت بن کر آتی ہیں ۔ جب بعض بندوں پر مصیبتیں آتی ہیں تو وہ راہ خطا سے باز آجاتے ہیں اور انہیں وہ راز معلوم ہو جاتے ہیں جن کا پہلے انہیں کوئی علم و شعور نہیں ہوتا۔ اور بعض اوقات امن و عافیت انسان کے لئے اللہ کی جانب سے مہلت ہوتی ہے اور گناہگار بری راہ پر مزید آگے بڑھ جاتے ہیں اس لئے کہ یہ لوگ گناہ اور گمراہی کی راہ میں اس قدر آگے جا چکے ہوتے ہیں کہ اللہ انہیں عافیت دے کر مزید آگے جانے دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ برے انجام تک جا پہنچتے ہیں ۔

اب بات ذرا اور آگے بڑھتی ہے اور ان کی اس کریہہ المنظر تصویر میں کچھ اور دھبے دکھائی دیتے ہیں ۔ (وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا (۴ : ۱۴۲)) (جب یہ نماز کے لئے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھاوے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں) وہ نماز کے لئے اس لئے نہیں اٹھتے کہ انہیں اللہ سے ملاقات کرنے کا شوق ہوتا ہے' وہ اللہ کے سامنے دست بستہ کھڑے ہونا چاہتے ہیں' اللہ کے ساتھ جڑنا چاہتے ہیں اور اللہ سے مدد لینا چاہتے ہیں ۔ یہ صرف لوگوں کو دکھانے کے لئے نماز پڑھتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ نماز کی طرف نہایت ہی بوجھل قدموں سے اٹھتے ہیں' مثلاً جیسے کوئی شخص کسی بھاری کام کے لئے اٹھ رہا ہو' یا اسے کسی بھاری بیگار کے لئے بلایا جا رہا ہو اور ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اللہ کو بہت ہی کم یاد کرتے ہیں ۔ وہ اللہ کو یاد نہیں کرتے بلکہ لوگوں کو یاد کرتے ہیں ۔ وہ اللہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے بلکہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔

بے شک مومنین کی نظر میں ان کی یہ نہایت ہی کریہہ المنظر صورت ہے ۔ اس نے ان کی نظروں میں حقارت اور ناپسندیدگی کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں اور ان جذبات اور اس سوچ کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اہل ایمان اور اہل نفاق کے درمیان بعد پیدا ہو جاتا ہے ۔ ذاتی اور مفاداتی تعلقات کمزور پڑتے ہیں اور اہل ایمان اور اہل نفاق کے درمیان مکمل بائیکاٹ کے مراحل میں سے یہ ایک مرحلہ ہے اور اسلامی منہاج تربیت امت مسلمہ کو اس کی طرف بڑھا رہا ہے ۔

ذرا مزید خدوخال اور دھبے دیکھئے : (مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا (۴ : ۱۴۳)) (کفر و ایمان کے درمیان ڈانواڈول ہیں ۔ نہ پورے اس طرف نہ پورے اس طرف اور جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو اس کے لئے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے)۔

ان کا موقف مذبذب اور ڈانواڈول ہے ۔ وہ کسی ایک قطار میں ثابت قدمی کے ساتھ کھڑے نہیں ہوتے ۔ نہ مومنین کی صف میں ہیں اور نہ کافروں کی صف میں ۔ یہ ایک ایسا موقف ہے جو اہل ایمان کے دلوں میں کوئی جذبہ ماسوائے حقارت اور کراہت کے پیدا ہی نہیں کرتا۔ اس سے اہل نفاق کی ذاتی کمزوری بھی سامنے آتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کوئی

دو ٹوک اور فیصلہ کن موقف اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی وہ علی الاعلان کسی عقیدے اور رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔ نہ ادھر کے اور نہ ادھر کے۔

اب اس بدنما تصویر اور اس عاجزانہ موقف کا اختتامیہ یہ آتا ہے کہ ان لوگوں پر اللہ کا فیصلہ قطعی ہو چکا ہے اور اللہ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ راہ ہدایت کے حصول میں ان کے ساتھ کوئی معاونت نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی انہیں راہ ہدایت پر نہیں لا سکتا اور نہ ان کے لئے کوئی راہ ہدایت تلاش کر سکتا ہے۔ (يُضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيْلًا (٤:١٤٣))

---○○○---

یہاں تک قرآن کریم نے اہل ایمان کے دلوں میں منافقین کے خلاف کراہت اور حقارت کے جذبات پیدا کر کے ان کو باور کرایا کہ وہ بہت ہی کمزور لوگ ہیں۔ یہ مقصد اچھی طرح حاصل کرنے کے بعد اب روئے سخن اہل ایمان کی طرف ہوتا ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ کہیں تم بھی اہل نفاق کی راہ پر نہ چل نکلو اور اہل نفاق کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کفار کے ساتھ دوستی کرتے تھے جبکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی دوستی نہ کرتے تھے۔ اللہ مومنین کو اپنی پکڑ سے ڈراتے ہیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ منافقین کے اخروی انجام کی ایک جھلک دکھا کر ان کو ڈراتے ہیں۔ یہ جھلک نہایت ہی خوفناک ہے اور نہایت ہی ذلت آمیز ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح

حجت دے دو؟یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے ۔ البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر دیں 'ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے ۔اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو۔اللہ بڑا قدر دان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے )۔یہ دوبارہ اہل ایمان کو پکار اور دعوت ہے اور یہاں پھر اس صفت اور لقب سے پکارا گیا جو ان کو انہیں اس وقت کے ماحول سے ممیز کرتی ہے اور جس کی وجہ سے ان کا منہاج صاف 'ان کا طرز زندگی اور ان کا طرز عمل متمیز ہوتا ہے اور یہی وہ صفت ہے جس کی وجہ سے وہ اللہ کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور ہدایات الٰہیہ پر عمل کرتے ہیں ۔

اس صفت اور لقب سے ان کو اس لئے پکارا جاتا ہے کہ منافقین کی راہ اختیار نہ کریں ۔ اور وہ اس بات سے ڈریں کہ وہ اہل ایمان کو چھوڑ کر اہل کفر کو دوست بنائیں ۔ یہ پکار اس لئے دی گئی کہ اس وقت اسلامی معاشرے کو اس کی اشد ضرورت تھی 'کیونکہ ابھی تک اہل ایمان اور اہل کفر مثلاً مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان مدینہ میں سماجی تعلقات موجود تھے اور بعض مسلمانوں اور کفار اہل قریش کے درمیان بھی بدستور تعلقات موجود تھے اگرچہ یہ تعلقات محض دینی طور پر ہوں ۔ہم نے بعض مسلمانوں کا اس لئے کہا ہے کہ بعض نے تو ازخود اہل جاہلیت کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات توڑ لئے تھے یہاں تک کہ انہوں نے آباء اور ابناء کو بھی چھوڑ دیا تھا اور صرف اسلامی برادری تک اپنے آپ کو محدود کر لیا تھا جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو تعلیم دی تھی ۔

اور یہی وہ بعض لوگ تھے جن کو متنبہ کرنے کی ضرورت تھی کہ یہ تعلق رکھنا گویا نفاق کی راہ ہے اور یہ تنبیہ اس وقت کی گئی جب یہ کہہ دیا گیا کہ یہ ہے تصویر ان منافقین کی ۔ اور ان کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ اگر تم باز نہ آئے تو اللہ کے غضب اور انجام بد سے نہ بچ سکو گے ۔

(اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا (۴ : ۱۴۴)) (کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو) اہل ایمان کا دل تو اللہ کی پکڑ کی دھمکی اور اس کے عذاب کے اشارے ہی سے کانپ اٹھتا ہے 'یہی وجہ ہے کہ یہاں بشکل استفہام ان کو متنبہ کیا گیا کہ اللہ کے عذاب سے ڈرو اور اپنے خلاف حجت قائم نہ کرو۔

ایک بار پھر جھنجوڑا جاتا ہے 'لیکن بالواسطہ یعنی منافقین کے انجام بد کو دوبارہ دہرا کر کہ قیامت کے دن حال یہ ہو گا اور کس قدر خوفناک ہو گا۔

(اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا (۴ : ۱۴۵))
(یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے )۔

درک اسفل یعنی سب سے نچلا طبقہ 'یہ اس صورت حال سے زیادہ مناسب ہے کہ دنیا میں وہ زمین کی آلائشوں کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے 'اور سب سے نیچے تھے 'اس طرح وہ قیامت میں بھی سب سے نیچے ہوں گے ۔ دنیا میں بھی انہوں نے رفعت اور بلندی درجات حاصل نہ کی لہٰذا وہاں بھی ان کا یہی حال ہو گا۔یہ لوگ طمع 'لالچ 'ضعف اور حیرانی کا شکار تھے اور

اسی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ رکھ رکھاؤ اور اہل کفر کے ساتھ دوستی کرتے تھے اور انہوں نے یہ توہین آمیز موقف اختیار کیا ہوا تھا کہ نہ ادھر کے تھے اور نہ ادھر کے۔

دنیا میں اس انجام بد کے لئے انہوں نے کام کیا۔ آج وہ سب سے نچلے درجے میں ہیں۔ اب یہاں ان کا کوئی یار و مددگار نہیں ہے۔ اہل کفر کے ساتھ دوستی وہ مدد اور نصرت کی خاطر ہی تو کرتے تھے لیکن اب یہ لوگ کہاں مدد کر سکتے ہیں۔
ہاں توبہ کا دروازہ اب بھی کھلا ہے اور ان کے لئے موقع ہے کہ وہ باز آکر اخروی نجات حاصل کر لیں۔

(إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَاعْتَصَمُوا بِاللَّهِ وَأَخْلَصُوا دِينَهُمْ لِلَّهِ فَأُولَئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ أَجْرًا عَظِيمًا (٤: ١٤٦))

(البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر دیں' ایسے لوگ تو مومنین کے ساتھ ہوں گے اور اللہ عنقریب اہل ایمان کو اجر دے گا)۔

دوسری جگہوں پر صرف اس قدر کہا گیا تھا۔ (إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا (٤: ١٤٦)) اس لئے کہ توبہ اور اصلاح پذیری کے ضمن میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑا جائے اور دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے۔ لیکن یہاں توبہ' اصلاح اور اعتصام باللہ اور اخلاص دین کا بھی ذکر کیا گیا۔ اس لئے کہ یہاں بات ان لوگوں سے ہو رہی تھی جو مذبذب تھے' منافق تھے' اور اللہ کے سوا اور لوگوں کے دوست تھے۔ چنانچہ یہاں توبہ و اصلاح کے ساتھ خلوص دین اور اعتصام باللہ کا ذکر کیا گیا تاکہ یہ لوگ ڈانواڈول ایمان اور بودے کردار سے باز آ جائیں۔ اس طرح اعتصام باللہ سے انہیں قوت ملے گی اور اخلاص سے انہیں نیت کی صفائی ملے گی۔ وہ دنیا میں بداعمالی کی گراوٹوں اور آخرت میں آگ کے درجہ اسفل سے نجات پالیں گے۔ دنیا میں یہ توبہ کرنے والے لوگ مسلمانوں اور صرف اللہ کی درگاہ سے عزت طلب کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو جائیں گے اور وہ دنیا اور زمین کی آلودگیوں سے ایمان کی قوت کے ذریعے پاک و صاف ہو کر بلند ہوں گے۔

اور ایسے لوگوں کی جزاء کیا ہے۔ (وَسَوْفَ يُؤْتِ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ أَجْرًا عَظِيمًا (٤: ١٤٦)) (اللہ عنقریب اہل ایمان کو اجر عظیم عطا کرے گا)۔ ان جھلکیوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ اسلامی معاشرے میں منافقین کی حقیقت کو واضح فرماتے ہیں۔ ان کی شان گرتی ہے۔ اہل ایمان کو نفاق کی لغزشوں سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ انجام بد سے ڈرایا جاتا ہے۔ منافقین کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا جاتا ہے تاکہ ان میں سے جس کے اندر شمہ برابر خیر بھی ہو وہ اسلامی صفوں میں شامل ہو جائے' نہایت سچائی اور نہایت اخلاص کے ساتھ۔

اور سب سے آخر میں ایک عجیب جھلکی دکھائی جاتی ہے' جس کا اثر نہایت ہی گہرا ہے۔ خوفناک عذاب کے ذکر کے بعد اور عظیم اجر کے اعلان کے بعد' تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ بندوں کے عذاب سے غنی ہے۔ اللہ کو ان کے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ انہیں عذاب دے۔ اور نہ اس تعذیب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنی قوت کا اظہار چاہتا ہے۔ نہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے اندر ایسی کوئی خواہش ہے کہ وہ لوگوں کو تکلیف دے جیسا کہ بت پرستانہ

تصورات میں ایسی باتیں پائی جاتی ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ ایمان اور شکر خداوندی کے ذریعے لوگوں کی اصلاح ہو۔ ایمان اور شکر ان کو محبوب ہو اور اللہ وہ ذات ہے جو نیک اعمال کا بدلہ دیتا ہے اور تمام خفیہ باتوں سے واقف ہے۔

(مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا

(٤ : ١٤٧)) (آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکرگزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ بڑا قدر دان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے)۔ اگر تم شکرگزار بندے بنے رہو تو اللہ کو کیا پڑی ہے کہ وہ تمہیں عذاب دے۔ اللہ تو کفر اور نافرمانی پر سزا دیتا ہے۔ یہ ایسی تہدید ہے جو لوگوں کو ایمان اور شکر پر آمادہ کر سکتی ہے۔ اللہ کو نہ انتقام کا کوئی داعیہ ہے اور نہ تعذیب میں کوئی مزہ آتا ہے۔ نہ اللہ اس طریق کار کے مطابق اپنی قوت اور سلطنت کا اظہار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان باتوں سے بہت ہی بلند ہے' اگر تم ایمان لاؤ اور شکر کرو تو یہ اللہ کے ہاں موجب مغفرت اور رضامندی ہے۔ اللہ کی جانب سے بندوں کا شکریہ۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو دل پر گہرا اثر کرتی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ اللہ کی جانب سے شکر کے معنی یہ ہیں کہ اللہ راضی ہے۔ اور رضامندی کا لازمی نتیجہ ثواب دارین ہے۔ لیکن یہ تعبیر کہ اللہ شکر کرتا ہے نہایت ہی گہری اور اشاراتی تعبیر ہے۔

اگر وہ ذات جو خالق ہے' برتر ہے' دونوں جہانوں سے بے نیاز ہے' بندوں کا شکر ادا کرتا ہے اس بات پر کہ یہ بندے نیک ہوگئے ہیں' اچھے مومن ہیں' شکر بجالاتے والے ہیں اور اللہ کے احسانات کو ماننے والے ہیں۔ حالانکہ وہ غنی بادشاہ ہے اور اس کو بندوں کے شکر' احسان مندی اور صلاح کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر اس جہان کا پیدا کرنے والا' وجود میں لانے والا' برتر اور غنی بادشاہ اگر شکر بجالاتا ہے تو پھر بندوں کا کیا فرض بنتا ہے جو مخلوق بھی ہیں اور ان پر رات دن انعامات کی بارش ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے بندوں کو اپنے خالق کا وفادار ہونا چاہئے.... بے شک یہ ایک نہایت ہی شرمسار کنندہ جھلکی ہے اور بندہ مومن ایک گہرا تاثر لے کر شکر نعمت کے لئے اٹھتا ہے۔ یہ ایک روشن اشارہ ہے جو نشانات منزل متعین کرتا ہے۔ وہ منزل جو اللہ تک جاتی ہے' جو بخشندہ' منعم' شاکر اور علیم ہے۔

یہ ہے قرآن کریم کے تیس پاروں میں سے ایک پارہ۔ اور یہ اپنے دونوں بازوؤں کے نیچے اصلاح' نظرثانی' درستی اور پاکیزگی پر مشتمل ہدایات کا ایک عظیم ذخیرہ لئے ہوئے ہے۔ اس میں عالم نفس کی اصلاح' اسلامی معاشرے کی اصلاح' نظام حیات کی اصلاح اور دوسری تعمیری ہدایات ہیں جو اس کے طول و عرض میں پیوستہ ہیں۔ ان ہدایات کے اندر انسان کو بالکل ایک نیا جنم دیا گیا ہے اور ایک ایسا انسان وجود میں لایا گیا ہے کہ جس کی مثال انسانیت نے نہ پہلے کبھی دیکھی تھی اور نہ بعد میں دیکھی۔ حقیقت پسند مثالی انسان' نظافت اور تطہیر میں مثالی۔ ایک ایسا انسان جو زندگی کے مختلف میدانوں میں کام کرتا ہے اور یہ ایک ایسا انسان ہے جسے اسلامی نظام زندگی نے جاہلیت کے گہرے گڑھوں سے نکال کر نہایت ہی عمودی بلندی پر سربلند کیا اور اعلیٰ ترین بلندیوں پر پہنچا دیا۔ نہایت ہی آسانی کے ساتھ' نہایت ہی نرمی کے ساتھ اور نہایت ہی ہمدردی کے ساتھ۔

اسلام آباد' ۱۷ دسمبر ۱۹۸۹ء رات ۵۵ : ۱۰

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ــــ ۶

### سورۃ النساء ــــ آخری حصہ

آیت نمبر ۱۴۸ ــ تا ــ ۱۷۶

### سورۃ المائدہ ــــ ابتدائی حصہ

آیت نمبر ۱ ــ تا ــ ۸۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

# پارہ نمبر ۶ ایک نظر میں

پارۂ ششم دو حصوں پر مشتمل ہے ۔ پہلا حصہ سورۂ النساء کے بقیہ حصہ پر مشتمل ہے ۔ سورۂ النساء کا آغاز پارۂ چہارم کے آخر سے ہوا تھا۔ پورا پارۂ پنجم بھی اس پر مشتمل ہے اور پارۂ ششم میں بھی اس کا کچھ حصہ آگیا ہے ۔ اس پارے کا دوسرا حصہ ' جو اس کا تقریباً تین چوتھائی حصہ ہے سورۂ مائدہ پر مشتمل ہے ۔

یہاں ہم اپنی بات کو صرف اس پارے کے حصہ اول ہی تک محدود رکھیں گے ۔ حصہ دوئم یعنی سورۂ مائدہ پر بحث سورۂ مائدہ کے موقع پر ہوگی ۔ جہاں ہم سورۂ مائدہ کی اہمیت اور اس کے موضوعات پر اسی طرح بحث کریں گے جس طرح ہم اس سے پہلے کی سورتوں پر کر چکے ہیں ۔ اگر اللہ کا تعاون شامل حال رہا۔

سورۂ نساء پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے اس سورہ کے جس منہاج بحث کے سلسلے میں کچھ کہا تھا اس حصے میں بھی وہی منہاج چل رہا ہے ۔ یہاں مناسب ہے کہ نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے دوبارہ قارئین کے پیش نظر رکھ دیا جائے ۔

یہ سورہ اسلامی تصور حیات سے بحث کرتی ہے اور اسے اس نوخیز اسلامی جماعت کے ذہن نشین کرنے کے درپے ہے جسے اس نے جاہلیت کی گہری اور تنگ وادیوں سے اٹھایا اور اسے بتدریج بام عروج تک پہنچا دیا۔ انتہائی بلندیوں تک اور اس جماعت کے ضمیر کو جاہلیت کے افکار کے ڈھیروں کے نیچے سے نکالا اور اسکے ان افکار کو چھانٹ کر رکھ دیا جن کی وجہ سے اس کے ضمیر کے خدوخال دھندلے پڑ گئے تھے ۔ اس صفائی کے ساتھ ساتھ جس طرح ہم نے اوپر کہا اسلامی فکر و شعور سے جاہلیت کے خدوخال مٹا کر ان کی جگہ اسلامی رنگ بھرے گئے ۔

اس کے بعد اس جدید تصور حیات کی روشنی میں ' یہ سورہ امت مسلمہ کے ضمیر ' اس کے اخلاق اور اس کی اجتماعی عادات کو لیتی ہے اور ان کو جاہلی اخلاق و عادات سے ایک ایک کر کے چھانٹتی چلی جاتی ہے ۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح افکار و تصورات کے اعتبار سے اس کی تطہیر کی گئی ۔ نیز فکری اور اخلاقی تطہیر کے علاوہ اس سورہ نے امت کی اجتماعی زندگی اور اس کے عائلی روابط کو اسلام کے مضبوط ربانی نظام زندگی کی اساس پر استوار کیا۔

اس تربیت اور تطہیر کے دوران ' اس سورہ میں منحرف اور غلط عقائد کو بھی لیا گیا ہے ۔ غلط عقائد و تصورات کے حاملین پر بھی تنقید کی گئی ہے اور اصلاح کی کوشش کی گئی ہے ۔ چاہے یہ لوگ مشرکین میں سے ہوں یا یہود و نصاریٰ یعنی اہل کتاب ہوں ۔ ان کے عقائد کی تصحیح اور اصلاح کی گئی ہے ۔ حق اور سچائی کو نکھارا گیا ہے جسے ان انحرافات نے بگاڑ دیا

تھا ـ جو ان لوگوں نے اپنی کتب میں اور عقائد میں داخل کئے ہوئے تھے ـ

اس کے بعد مضامین سورہ اس معرکے میں داخل ہو جاتے ہیں جو اہل کتاب اور جماعت مسلمہ کے درمیان مسلسل برپا تھا' خصوصاً یہودیوں کے ساتھ ـ اس لئے کہ جب سے حضور اکرم ؐ اپنی جماعت کو لیکر مدینہ پہنچے تھے' ان لوگوں نے دعوت اسلامی کا بڑی شدت کے ساتھ مقابلہ شروع کر دیا تھا' اس لئے کہ تحریک اسلامی کا مرکز مدینہ منتقل ہوتے ہی یہودیوں کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ اب مدینہ کے معاشرے میں ان کی سابقہ ممتاز حیثیت قائم نہیں رہ سکتی ان کے ملی وجود کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا حتیٰ کہ ان کا یہ ادعا بھی ختم ہو رہا تھا کہ وہ واحد ممتاز لوگ ہیں جنہیں اللہ کی قربت حاصل ہے اور وہ ایسی قوم ہیں جو اللہ کے ہاں برگزیدہ ہے ـ ان وجوہات کی بناء پر وہ تحریک اسلامی کے مقابلے میں ہر قسم کے ہتھیار لیکر اٹھ کھڑے ہوئے تھے ـ چنانچہ اس سورہ نے ان کی ذہنیت' ان کے وسائل حرب اور خود ان کے اپنے انبیاء کے ساتھ ان کا تاریخی رویہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا تاکہ معلوم ہو کہ انہوں نے ہمیشہ ہر دعوت حق کے ساتھ یہی برتاؤ کیا چاہے اس کا پیش کرنے والا کوئی بھی ہو اگرچہ وہ پیش کرنے والا خود ان کا اپنا نبی' ان کا اپنا قائد اور ان کا اپنا نجات دہندہ ہو ـ

اس کے بعد یہ سورہ خود امت مسلمہ کو بتاتی ہے کہ اس کے کاندھوں پر جو بوجھ ڈال دیا گیا ہے' اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں ـ اس نے اس کرۂ ارض پر جو کردار ادا کرنا ہے وہ کس قدر عظیم کردار ہے اور وہ حکمت عملی کیا ہے جس کے مطابق اسے جاہلیت کی تمام الائشوں سے پاک کرنا مقصود ہے' اس کے ضمیر کو پاک کرنا مطلوب ہے' اس کی پوری زندگی کو پاک کرنا مطلوب ہے ـ اس غرض کیلئے کس قدر بیدار مغزی کی ضرورت ہے اور کس قدر عظیم قربانیوں کی ضرورت ہے ـ مثلاً اپنے نفس کی دنیا کے ساتھ مسلسل جہاد' اور اپنے اردگرد پھیلے ہوئے پورے ماحول کے ساتھ مسلسل جہاد اور مسلسل قربانیاں ـ

یہ پوری سورہ مسلسل اپنی اس راہ پر گامزن ہے ـ گزشتہ حصے میں بھی یہی مضامین ہیں اور یہ حصہ بھی اسی راستے کے نشیب و فراز پر مشتمل ہے اور وہی اسلوب ہے جو سابقہ پارے میں تھا ـ

---OOO---

اس پارے کا آغاز ہی تطہیر نفس اور تطہیر معاشرہ سے ہوتا ہے' یہ کوشش کی گئی ہے کہ افراد جماعت کے درمیان باہم مکمل اعتماد کی فضا قائم رہے ـ لوگ یہودیوں کے الزامات سے متاثر نہ ہوں اور مسلمان یہ حق رکھتے ہیں کہ وہ بدلہ لیں لیکن عفوو درگزر اور فراخدلی بہرحال انصاف کے ترازو سے بھی زیادہ اونچا مقام ہے ـ اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ غیبت اور بدگوئی کو ناپسند فرماتے ہیں ـ اگر اس نئے معاشرے میں ایک بھائی دوسرے بھائی پر ظلم کرتا ہے اور مظلوم بھائی معاف کر دیتا ہے تو یہ فعل اللہ تعالیٰ کو بہت ہی پسندیدہ ہے ـ اللہ خود بھی معاف کر دیتا ہے حالانکہ وہ انتقام پر قادر ہوتا ہے ـ

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اسلامی تصور حیات یہ ہے کہ وہ اللہ کے دین کو ایک نظام زندگی قرار دیتا ہے اور یہ تصور دیتا ہے کہ انسانی تاریخ میں رسولوں کا قافلہ صرف اس ایک دین کا حامل رہا ہے ـ اسلامی عقائد کے مطابق ان رسولوں کے درمیان فرق کرنا اور وہ جو ادیان لیکر آئے ان کے درمیان فرق کرنا صریح کفر ہے ـ یہ بیان اس لئے آتا ہے کہ اہل

کتاب میں سے یہودیوں کے اس نظریے کی تردید کی جائے کہ ان کے نبی کے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے اور یہ نظریہ انہوں نے محض دینی اور قومی تعصب اور کینہ پروری کی وجہ سے اپنایا ہے۔

اس حصے میں یہودیوں کے ساتھ ایک راؤنڈ شروع ہو جاتا ہے' جس میں بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے نبی اور اپنے قائد اور نجات دہندہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا کیا نافرمانیاں اور بدسلوکیاں کیں۔ ان واقعات سے یہ عیاں کرنا مطلوب ہے کہ یہودی اپنی فطرت کے اعتبار سے برے لوگ ہیں۔ سچائی اور اسلامی دعوت کے ساتھ ان کا ہمیشہ یہی رویہ رہا ہے۔ چاہے کوئی نبی ہی یہ دعوت دے رہا ہو۔ اگرچہ وہ ان کے عظیم نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کیوں نہ ہوں۔ نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام' ان کی والدہ کے بارے میں ان کے نازیبا الفاظ کی تردید بھی کی گئی ہے جسے اللہ تعالیٰ بہت ہی ناپسند فرماتے ہیں۔ ان واقعات کے بیان سے نبی آخر الزمان ؐ کے ساتھ ان کا رویہ اور عناد قابل فہم ہو جاتے ہیں اور لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس رویئے کے حقیقی اسباب کیا ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں یہودیوں کے غلط دعوؤں اور غلط الزامات کی مناسبت سے اور خصوصاً اس دعوے کے حوالے سے کہ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے' قرآن کریم اظہار حقیقت کر دیتا ہے۔ ان کے دعوائے قتل مسیح علیہ السلام کی صاف صاف تردید کر دی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو ان کے مظالم کرنے' ارادۂ حق میں رکاوٹ بن جانے اور ان کی سود خوری کی وجہ سے (حالانکہ انہیں ان حرکات سے روکا گیا تھا) کیا کیا سزائیں دیں۔ نیز ان کی حرام خوری اور لوگوں کے معاشی استحصال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر بطور سزا ان بعض چیزوں کو حرام قرار دے دیا جو ساری دنیا کے لئے حلال تھیں اور یہ کہ اس دنیاوی عذاب کے علاوہ انہیں وہ عذاب الیم بھی دیا جائے گا جو آخرت میں ان کا انتظار کر رہا ہے۔ ہاں البتہ اس عذاب سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو علم میں پختہ کار ہیں اور جو حضور اکرم ؐ پر ایمان لائے ہیں۔ جنہوں نے سچائی کو پہچان لیا ہے اور اس کی پیروی کرنے لگے ہیں۔

یہودی' نبی آخر الزمان ؐ کی رسالت کے انکار پر جو اصرار کر رہے تھے' انکے اس موقف کی تردید کرتے ہوئے کہا گیا کہ یہ رسالت تو معمول کی بات ہے۔ یہ کوئی عجیب و غریب امر تو نہیں ہے کہ خود ان میں سے ایک رسول مبعوث ہو گیا ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے کہ لوگوں کی ہدایت کیلئے ایک انسان رسول بن کر آ گیا ہے۔ یہ تو سنت الٰہی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لیکر آج تک رسول آتے رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت اسماعیل علیہ السلام' حضرت اسحاق علیہ السلام' حضرت یعقوب علیہ السلام' حضرت عیسیٰ علیہ السلام' حضرت ایوب علیہ السلام' حضرت ہارون علیہ السلام' حضرت سلیمان علیہ السلام' اور حضرت داؤد علیہ السلام اسی سنت الٰہی کے مطابق بھیجے گئے۔ نیز وہ تمام دوسرے انبیاء جن کی رسالت کے یہود قائل ہیں اور وہ جن کی رسالت کا وہ محض بغض اور حسد کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت اور اسکیم ہے کہ یہاں لوگوں کی ہدایت کیلئے رسول آئیں جو ڈرانے والے اور خوشخبری دینے والے ہوں۔ (لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (۴: ۱۶۵) "تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے خلاف کوئی حجت نہ ہو۔" نہ صرف یہ کہ یہ منطقی امر ہے بلکہ ضروری بھی ہے۔

یہودیوں کے انکار حق کے مقابلے میں' اللہ تعالیٰ اسلام کی سچائی پر خود شہادت دیتے ہیں' ملائکہ کی شہادت قلم بند

ہوتی ہے اور اللہ کسی بھی امر پر کافی گواہ ہے ۔ چنانچہ انکار حق کی وجہ سے اور راہ حق کو مسدود کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان ظالموں اور کافروں کو سخت دھمکی دیتے ہیں ۔ یہ کہ اللہ کبھی ان کی مغفرت نہ کرے گا کبھی ان کی راہنمائی صراط مستقیم کی طرف نہ کرے گا اور اگر ان کی راہنمائی کرے گا تو وہ جہنم کی طرف ہوگی جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے ۔ اس کے بعد تمام لوگوں کو پکارا جاتا ہے کہ لوگو! یہ رسول تمہارے پاس رب کی طرف سے سچائی لیکر آیا ہے ۔ تم اس پر ایمان لاؤ' اگر تم ایسا نہ کر سکو تو جو کچھ زمین اور آسمانوں کے درمیان ہے وہ سب کچھ اللہ کا ہے ۔ مالک ارض و سما نے اس پیغمبر کی رسالت کی شہادت دے دی ہے ۔ اور وہ خود تمہیں دعوت ایمان دے رہا ہے اس لئے وہ خود اپنے لئے جو راہ متعین کر رہے ہیں وہ مالک ارض و سما کے مقابلے کی راہ ہے ۔

اہل کتاب کے ساتھ یہ راؤنڈ ختم ہو جاتا ہے ۔ اس میں ان کا مزاج' ان کے وسائل کار' اور قدیم زمانے سے ان کی بری عادتوں کا پردہ چاک کر دیا جاتا ہے ۔ اس پردہ دری سے ان کے تمام مکاریاں قیل ہو جاتی ہیں اور یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ حضرت محمد ؐ کی رسالت برحق ہے اس لئے کہ اس پر اللہ کی جانب سے شہادت دی جاچکی ہے ۔ تمام سلسلہ رسل اور سلسلہ اصحاب دعوت بھی اس پر گواہ ہیں ۔ یوں لوگوں پر اللہ کی جانب سے حجت قائم ہوتی ہے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ لوگوں کی نجات کا دارومدار رسولوں کی رسالت پر پختہ ایمان پر ہے ۔ اگر وہ عذاب جہنم سے نجات چاہتے ہیں یا یہ کہ وہ بتقاضائے منطق اپنے آپ کو اس کا مستحق قرار دیتے ہیں ۔ یہ ان کی مرضی ہے لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ یہ نہایت ہی خطرناک انجام ہے ۔

---ooo---

یہودیوں کے ساتھ اس راؤنڈ کے اختتام' ان کے مقابلے میں حضرت عیسیٰ اور ان کی والدۂ ماجدہ کو انصاف دینے اور حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کے بارے میں ان کے غلط دعوؤں کی تردید کرنے کے بعد' اب خود عیسائیوں کے ساتھ ایک راؤنڈ شروع ہوتا ہے' جو اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیروکار کہتے ہیں ۔ ان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ تم لوگ حضرت عیسیٰ کے بارے میں غلو نہ کرو ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اصل سچائی یوں ریکارڈ کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور وہ خود بھی اس بات کے اقرار سے نہیں ہچکچاتے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں ۔ اسی طرح ملائکہ بھی اللہ کے بندے ہیں لہٰذا تم روح القدس کو خدا نہ سمجھو' تثلیث کا عقیدہ غلط ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اللہ کے درمیان باپ بیٹے کا تعلق نہایت ہی غلط تصور ہے ۔

تصحیح عقائد نصرانیت کے درمیان اسلام کا صحیح عقیدہ بھی بتا دیا جاتا ہے ۔ اور اس بات کو چھانٹ کر رکھ دیا جاتا ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کے لئے ہے اور غلامی بندوں کے لئے اور اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے جو کوئی بھی ہے وہ اللہ کا بندہ اور غلام ہے اور یہ اسلامی تصور حیات کا اساسی عقیدہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان کو یہاں فلاح کی خوشخبری دی جاتی ہے اور اہل کفر کو سخت الفاظ میں ڈرایا جاتا ہے اور یہاں بھی' یہودیوں کی بحث کے خاتمے کی طرح' تمام لوگوں کے نام اعلان جاری کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ لوگوں کے پاس اللہ کی جانب سے برہان آچکا ہے' اس لئے اب جو لوگ اس کی قبولیت سے رہ گئے ان کے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی' کوئی شبہات وہ پیش نہ کر سکیں گے اور نہ ان کی کوئی معذرت قبول ہوگی ۔

---ooo---

سورہ کا خاتمہ احکام میراث میں سے کلالہ کی ایک صورت کے بیان پر ہے جو پہلے احکام میں بیان نہ ہوئی تھی۔اس سورہ میں کلالہ کی بعض صورتوں کا ذکر ہو چکا ہے یہ انہی کا بقیہ ہے۔اس لئے اس کو یہاں دے دیا کیونکہ یہ جماعت مسلمہ کی اقتصادی تنظیم نو کا بقیہ حصہ تھا جس پر اسلام اس جدید اسلامی سوسائٹی کو استوار کرنا چاہتا تھا۔اسے ایک ایسی سوسائٹی میں تبدیل کرنا چاہتا تھا جس کا اپنا نظام اقتصادیات ہو' اپنے امتیازی خصائص ہوں جو مستقل ہوں تاکہ یہ جدید سوسائٹی اور یہ نئی جماعت پوری انسانیت کے حوالے سے اپنا وہ عظیم کردار ادا کر سکے جس کے لئے اللہ نے اسے برپا کیا ہے۔یعنی قیادت' انقلاب اور تنظیم و اصلاح کا کردار۔

یوں اس پوری سورہ کے مطالعے اور جائزے سے اور خصوصاً زیر بحث حصے کے جائزے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں اجتماعی تنظیم' اقتصادی اصلاحات اور سیاسی ضابطہ بندی کے ساتھ ساتھ اخلاق' تہذیب' تصور حیات کی اصلاح اور عقائد کی تصحیح بھی ہوتی رہتی ہے۔اس اخلاقی اور نظریاتی تربیت کے ساتھ ساتھ جماعت مسلمہ کے دشمنوں کے ساتھ میدان جنگ میں بھی معرکہ آرائی جاری رہتی ہے۔اس کے باوجود کہ اس جماعت کے کاندھوں پر ذمہ داری کا عظیم بوجھ ڈالا گیا ہے اور اس کرۂ ارض پر اس کیلئے عظیم کردار ادا کرنے کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔یہ بھی فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ قرآن کریم اس جماعت کا دستور العمل ہے۔یہ اس کی دعوت کا ماخذ ہے۔اس جماعت کا فرض ہے کہ وہ ان تمام ذمہ داریوں کو ایک ساتھ ادا کرتے ہوئے آگے چلے' نہایت گہری' متوازن اور عمومی صورت میں۔یہ ہدایات اور یہ امور ایسی صورت میں بیان کئے جاتے ہیں کہ جو شخص یا جماعت بھی اس امت کی تعمیر جدید کا بیڑا اٹھائے اس کیلئے یہ منہاج لازمی اور حتمی ہو تاکہ وہ اپنے فرائض کو پورا کرے۔اس قرآن کو اپنی دعوت کا منہاج بنائے۔اس کی تحریک کا منہاج اس قرآن سے اخذ ہو۔احیائے اسلام' بعث جدید اور تعمیر جدید کا ہر قدم اس منہاج کے مطابق ہو۔اگر ان خطوط پر سوچا جائے تو یہ قرآن بعینہٖ وہ کردار ادا کرنے کیلئے اب بھی تیار کھڑا ہے جو اس نے پہلے ادا کیا تھا۔یہ قرآن پوری انسانیت کیلئے اللہ کا خطاب ہے' اور وہ اس کے تمام طور و اطوار کے لئے قیامت تک راہنما ہے۔اس کے عجائبات تو کبھی ختم نہ ہوں گے اور اس کے بار بار پڑھے جانے سے وہ پرانا نہیں ہوتا' جیسا کہ اس کے بارے میں حضور ؐ فرماتے ہیں۔ وہ حضور ؐ جنہوں نے اس قرآن کے ذریعہ کفار اور منافقین کے خلاف جہاد کیا۔اس کے ساتھ منحرف اور بھٹکے ہوئے اہل کتاب کے ساتھ جہاد کیا اور اس کے ذریعے انسانیت کی تاریخ میں امت مسلمہ جیسی عظیم امت کی بنیاد رکھی' اسے اٹھایا اور سربلند کیا۔

---ooo---

# درس نمبر ۳۴ تشریح آیات

# ۱۴۸ ـــ تا ـــ ۱۷۰

قرآن کریم کے پیش نظر یہ نصب العین تھا کہ وہ اس کرۂ ارض پر ایک بالکل جدید امت پیدا کرے ـ چنانچہ اس امت کو قرآن نے ان لوگوں سے تشکیل دیا جو جاہلیت کی اندھیری وادیوں میں بھٹک رہے تھے ان میں سے جو قرآن کی دعوت پر لبیک کہہ چکے' ان مومنین کو قرآن کریم نے ہاتھ سے پکڑ کر آناً فاناً عمودی بلندی پر چڑھا کر تہذیب و تمدن کی چوٹیوں' بلند ترین چوٹیوں تک پہنچا دیا ـ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اس کی تشکیل اور تربیت کے بعد اسے پوری انسانیت کی قیادت کا فریضہ سپرد کیا جاسکے اور اس دنیا کی قیادت میں اس کا عظیم رول متعین کیا جاسکے ـ تاریخ گواہ ہے کہ ایسا ہوا ـ

اس جماعت کی تشکیل اور تعمیر کے اہم مقاصد میں سے ایک اہم مقصد اس جماعت کے ضمیر کی تطہیر بھی تھا' اس ماحول کی تطہیر بھی تھا جو اس جماعت کے اردگرد پایا جاتا تھا اور اس جماعت کی اس اخلاقی اور ذہنی سطح کو بلند کرنا بھی تھا جس پر اس وقت یہ جماعت تھی ـ

اور جب یہ جماعت اس مطلوبہ سطح اور معیار تک پہنچ گئی' اپنے انفرادی اخلاق میں اونچی ہوگئی' اپنے اجتماعی اخلاق میں معیاری ہوگئی جس قدر اپنے عقائد و تصورات میں وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں برتر ہوگئی ـ تو اس وقت پھر اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس کرۂ ارض پر وہ انقلاب برپا کیا جو اللہ کے پیش نظر تھا ـ اس کے بعد اللہ نے اس امت کو اپنے دین اور اپنے نظام زندگی کا محافظ اور چوکیدار مقرر فرمایا ـ اس کی یہ ڈیوٹی قرار پائی کہ وہ اس پوری انسانیت کو گمراہی اور اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائے اور مسلسل اس پوری انسانیت کی قیادت کی امانت دار رہے اور اس کی راہنمائی کرتی رہے اور فی الواقع ایسا ہی ہوا ـ

جب کوئی جماعت اس کرۂ ارض کے پورے انسانوں پر ان خصوصیات کے اندر فوقیت حاصل کر لیتی ہے تو انسانیت کے لئے اس کی قیادت بالکل ایک فطری اور طبیعی امر بن جاتا ہے اور یہ امر اپنی صحیح اساسوں پر قائم ہوتا ہے ـ اس صورت حال کے نتیجے میں ایسی جماعت پھر علم و ثقافت اور تہذیب و تمدن اور اقتصادیات اور سیاسیات میں بھی دوسری اقوام سے برتر ہو جاتی ہے اور یہ دوسری برتری اسے پہلی برتری کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے یعنی اخلاقی اور نظریاتی برتری کے نتیجے میں اور یہی ہے سنت الہٰی اس کرۂ ارض کے تمام افراد کیلئے بھی اور تمام جماعتوں اور سوسائٹیوں کیلئے بھی ـ اسی نفسیاتی اور اجتماعی تطہیر کے ایک پہلو کو درج ذیل دو آیات کے اندر لیا گیا ہے ـ

---○○○---

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾

"اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے ' الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔(مظلوم ہونے کی صورت میں اگرچہ تم کو بدگوئی کا حق ہے۔) لیکن اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کئے جاؤ' یاکم ازکم برائی سے درگزر کرو' تو اللہ (کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ بڑا معاف کرنیوالا ہے حالانکہ سزادینے پر) پوری قدرت رکھتا ہے۔"

معاشرہ ہمیشہ نہایت ہی حساس ہوتا ہے اس لئے اسے بعض ایسے اجتماعی آداب کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی اس حساسیت کے مناسب حال ہوں۔ بعض اوقات ایک شخص ایک سرسری سی بات کہتا ہے لیکن معاشرے پر اس کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں' ان کا وہ اندازہ نہیں کر سکتا۔ اور بعض اوقات ایک عام بات ہوتی ہے لیکن اس کے قائل کی مراد صرف ایک شخص سے ہوتی ہے لیکن ان باتوں کے اثرات معاشرے کی نفسیات 'اس کے اخلاق اور اس کے رسوم و رواجات پر نہایت ہی مہلک ہوتے ہیں۔ اس بات سے صرف وہ ایک فرد ہی متاثر نہیں ہوتا بلکہ اس سے پوری جماعت متاثر ہوتی ہے۔

کوئی شخص کسی کے بارے میں بدگوئی کرنا چاہے اس کی جو شکل و صورت بھی ہو' اگر اس کے دل میں خدا ترسی نہ ہو اور اس کا ضمیر محتاط نہ ہو تو یہ بدگوئی انسان کیلئے بہت ہی آسان ہوتی ہے۔ لیکن اس بدگوئی اور بدزبانی کے آثار معاشرے میں بہت ہی برے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ بعض اوقات اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ معاشرے سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ لوگوں کا یہ خیال ہو جاتا ہے کہ اب معاشرے میں شر کو غلبہ حاصل ہو گیا ہے۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے اندر شر کی استعداد پوشیدہ ہوتی ہے لیکن وہ معاشرتی دباؤ کی وجہ سے شر کا ارتکاب نہیں کرتے وہ اس کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں کیونکہ اب اس کا ارتکاب عام طور پر کیا جاتا ہے اس لئے وہ اس سے پاک نہیں کرتے اور نہ ہی انہیں کوئی معاشرتی خوف لاحق ہوتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ صرف وہی اس کا ارتکاب نہیں کر رہے اور لوگ بھی ایسا ہی کر رہے ہیں۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ کسی برائی کا ارتکاب دیکھتے دیکھتے انسان کے دل سے اس برائی کی کراہت میں کمی آجاتی ہے۔ انسان پہلے پہل برائی کو بہت ہی شدت سے محسوس کرتا ہے اور جب اس کا بار بار ارتکاب ہوتا رہے یا بار بار ذکر ہوتا رہے تو اس کی نظروں میں اس کی قباحت کم ہو جاتی ہے اور اس کی جانب سے اس کراہت میں کمی آجاتی ہے۔ لوگوں کیلئے ایسی برائی کا سننا آسان ہو جاتا ہے اور پھر وہ اسے مٹانے کیلئے فوراً اٹھتے بھی نہیں ہیں۔

بدگوئی میں انسان سب سے پہلے انفرادی الزامات عائد کرتا ہے۔ انفرادی گالی گلوچ ہوتی ہے۔ اس کے بعد

اجتماعی نقصان اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اخلاقی بے راہ روی پھیل جاتی ہے۔ اس میں بعض لوگوں کے بعض دوسرے لوگوں کے بارے میں اندازے بدل جاتے ہیں' بعض لوگوں کا بعض دوسرے لوگوں میں اعتماد نہیں رہتا' اور اسی طرح بعض جماعتوں کا دوسری جماعتوں پر اعتماد نہیں رہتا۔ الزامات پر الزامات آتے ہیں اور زبانیں انہیں بلا کسی جھجک کے چاٹتی رہتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جماعت مسلمہ کیلئے ایک دوسرے کی بدگوئی کو حرام قرار دیا ہے۔ صرف وہی شخص بدگوئی کرسکتا ہے' جس پر ظلم ہوا ہو۔ وہ صرف اس قدر برے لفظ استعمال کرسکتا ہے جن سے ظالم کے حقیقی ظلم کا اظہار ہو رہا ہو ان حدود کے اندر جن کے اندر ظلم ہوا ہے۔ (لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (۴:۱۴۸) اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی بدگوئی پر زبان کھولے الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو۔"

ظلم کے حالات میں بدگوئی کے ذریعے دشمن سے بدلہ لیا جاتا ہے اور اسی طرح ظلم کے مقابلے میں مدافعت کی جاتی ہے۔ اس بدگوئی میں وہ امور بھی شامل ہیں' جنہیں قانونی اصطلاح میں سب و شتم کہا جاتا ہے۔ اس بدگوئی کے ذریعے ایک فرد' اس انفرادی بدسلوکی کو مسترد کرتا ہے جو فی الواقعہ ہو چکی ہے۔ اس طرح یہ مظلوم اس ظلم اور ظالم کے خلاف پروپیگنڈا کرتا ہے۔ جس کا اسے حق حاصل ہوتا ہے تاکہ سوسائٹی اس مظلوم شخص کے ساتھ انصاف کرسکے۔ وہ ظالم کے ہاتھ کو روک سکے اور معاشرے کے اندر ایک ایسی فضاء قائم ہو سکے جس میں ہر ظالم ظلم سے پہلے اپنے انجام کے بارے میں اچھی طرح سوچے اور اس ظلم کے دوبارہ ارتکاب سے باز آجائے۔ اعلانیہ بدگوئی کا حق بالکل محدود ہے اسے صرف وہی شخص استعمال کرسکتا ہے جس پر ظلم ہوا ہو۔ اس کے جواز کا سبب بھی محدود ہے۔ یعنی صرف وہ ظلم جو کسی متعین شخص کے ساتھ کیا گیا ہو اور یہ بدگوئی صرف اس شخص کے خلاف کی جاسکتی ہے جس نے ظلم کیا ہو۔ ان محدود حالات میں اس بدگوئی کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ اس سے ایک بڑی بھلائی کو رواج دینا مقصود ہے۔ نیز اس بدگوئی سے ظلم اور ظالم کے خلاف صرف تشہیر ہی مقصود نہیں ہے بلکہ اصل ہدف یہ کہ مظلوم کو عدل و انصاف مل سکے۔

اسلامی قانون لوگوں کی شہرت اور عزت کی حفاظت صرف اسی حد تک کرتا ہے' جب تک وہ ظلم و زیادتی نہ کریں۔ جب وہ ظلم کا ارتکاب کریں تو پھر وہ اس بات کے مستحق نہیں ہیں کہ ان کی حیثیت عرفی کو قانونی تحفظ دیا جائے۔ ظلم کے ارتکاب کے بعد مظلوم کو یہ قانونی حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائے اور ایک حد تک بدگوئی بھی کرے۔ یہ واحد استثناء ہے جو مظلوم کے سلسلے میں ہے' ورنہ اسلام کا عام قانونی اور اخلاقی ضابطہ یہی ہے کہ کسی کے خلاف بدگوئی کی اجازت نہ ہوگی۔

اس طرح اسلام کے ان دونوں مقاصد کے درمیان ایک قسم کا توازن قائم ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا نظام انصاف قائم کرنا چاہتا ہے جس میں ظلم کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ ایک ایسا نظام اخلاق بھی رائج کرنا چاہتا ہے جس میں حیائے چشمی اور اجتماعی رواداری پر بھی خراش نہ آئے۔

اس پر قرآن کریم یہ اختتامیہ لاتا ہے۔ (وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا (۴:۱۴۸)) (اور اللہ سب کچھ جاننے والا ہے۔) اور انتہائے کلام پر بھی بات اللہ جل شانہ کی ذات سے مربوط ہو جاتی ہے۔ جبکہ آغاز ذکر محبت الٰہی سے

ہوا تھا۔ (لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ (۱۴۸:٤)) (اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے) یہ اس لئے کہا گیا تاکہ انسان کے دل میں یہ شعور زندہ رہے کہ انسان کی نیت' انسان کی جانب سے بدگوئی کے اسباب اور پھر اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ اور الزامات کی صحت اور ان کی موزونیت کا اللہ تعالیٰ کے ہاں اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے کیونکہ اللہ سنتا ہے اور جو بات کہی جاتی ہے اس کے تمام پس منظر سے وہ اچھی طرح آگاہ ہے۔ جو بات بھی سینوں میں ہے اس پر عیاں ہے۔

قرآن کریم یہاں بات کو بدگوئی کی صرف ممانعت یعنی صرف منفی حکم پر ہی ختم نہیں کر دیتا بلکہ وہ مثبت بات کر کے بھلائی کا حکم دیتا ہے۔ اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ برائی پر عفو و درگزر سے کام لینا بہرحال بہت ہی پسندیدہ ہے۔ عفو و درگزر کو صفات الٰہیہ میں سے ایک اہم صفت ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ہر خطاکار سے مواخذہ کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ یہاں اشارہ دیا جاتا ہے کہ اہل ایمان کو اللہ کے اخلاق و صفات اپنے اندر پیدا کرنا چاہئیں۔ جہاں تک ان میں قدرت ہو اور جہاں تک وہ ایسا کر سکیں۔

(اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا

(۱٤۹:٤)) (لیکن اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی کیے جاؤ' یا کم از کم برائی سے درگزر کرو' تو اللہ تعالیٰ کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ بڑا معاف کرنیوالا ہے حالانکہ سزا دینے پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے۔)

یوں اسلام کا منہاج تربیت نفس مومن اور جماعت مسلمہ کو ایک قدم اور بلند کر دیتا ہے۔ پہلا مرحلے میں کہا جاتا ہے کہ کسی شریف انسان کیلئے بدگوئی کے ساتھ منہ کھولنا اچھا نہیں ہے۔ اس مرحلے میں ایک استثنائی صورت یہ رکھی جاتی ہے کہ مظلوم بدگوئی کر کے بدلہ بھی لے سکتا ہے اور حصول انصاف کو بھی ممکن بنا سکتا ہے۔ دوسرے مرحلے پر اہل ایمان کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ سب کے سب بھلائی کیلئے ہروقت کوشاں رہیں اور جس شخص پر ظلم کیا گیا ہے اور وہ بدگوئی کر کے اپنا بدلہ لے سکتا ہے اسے بھی یہ کہا گیا ہے کہ اگر وہ معاف کر دے اور صرف نظر کرے تو یہ نہایت ہی اچھا فعل ہے۔ یہ نہایت ہی بلند اخلاقی ہے' بشرطیکہ وہ انتقام پر قادر ہو اور وہ انتقام کے بجائے عفو و درگزر کو ترجیح دے۔ کیونکہ قدرت انتقام کے بغیر عفو کیا معنی؟ گدا اگر تواضع کند خوائے اوست۔

اگر عفو و درگزر کی نیکی کھل کر کریں تو معاشرہ میں عفو و درگزر کی رسم چلے گی اور نیکی پھیلے گی اور اگر وہ یہ نیکی خفیہ طور پر کریں گے تو بھی تزکیہ نفوس کا کام ہوگا۔ بھلائی اگر اعلانیہ کی جائے تو بھی مفید ہے اور اگر خفیہ کی جائے تو بھی مفید ہے۔ جب لوگوں کے درمیان عفو و درگزر عام ہوگا تو بدگوئی کرنے کے مواقع خود ہی کم ہوتے چلے جائیں گے بشرطیکہ یہ عفو و درگزر وہ شخص کرے جو انتقام پر قدرت رکھتا ہو۔ لیکن اگر کسی شخص کی کمزوری اسے عفو پر مجبور کر رہی ہو تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ یہ عفو و درگزر اللہ تعالیٰ کے اخلاق کو اپناتے ہوئے ہونا چاہئے۔ اللہ قدرت کے باوجود عفو سے کام لیتا ہے۔ (فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا (۱٤۹:٤)) (اللہ بڑا معاف کرنیوالا ہے حالانکہ وہ سزا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔)

---ooo---

اس کے بعد بات کا رخ اہل کتاب کی طرف پھر جاتا ہے ۔ پہلے تمام اہل کتاب کے حوالے سے بات ہوتی ہے ۔ اس کے بعد خصوصاً یہودیوں کے بعض کارناموں کا تذکرہ ہوتا ہے اور آخر میں نصاریٰ پر تنقید ہوتی ہے ۔ یہودی حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں سخت بدگوئی کرتے تھے اور ان کی ذات کے بارے میں بہتان باندھتے تھے ۔ اس حصہ کلام میں ان کی ان بدگوئیوں کا ذکر بھی ہوتا ہے ۔ اس طرح یہودیوں پر کی جانے والی تنقید کا رابطہ دو سابقہ آیات سے بھی واضح ہو جاتا ہے ' جن میں بدگوئی کی ممانعت کی گئی ہے ۔

اہل کتاب اور یہود و نصاریٰ پر یہ تنقید ' بھی اس معرکے کا حصہ ہے جو مدینہ میں جماعت مسلمہ کو اس کے دشمنوں کے ساتھ درپیش تھا جس کا ایک بہت بڑا حصہ اس سورہ میں اور سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران میں تفصیلاً بیان ہوا ہے ۔ اس معرکے کی تفصیلات قرآنی ترتیب کے مطابق ملاحظہ ہوں ۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ﴿١٥٠﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿١٥١﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٥٢﴾

" جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں ' اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے ' اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ سب پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کیلئے ہم نے وہ سزا مہیا کر رکھی ہے جو انہیں ذلیل و خوار کر دینے والی ہوگی بخلاف اس کے جو لوگ اللہ اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں اور ان کے درمیان تفریق نہ کریں ' ان کو ہم ضرور ان کے اجر عطا کریں گے اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے ۔ "

یہودیوں کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ اپنے نبیوں پر ایمان رکھتے ہیں لیکن وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کی رسالتوں کا انکار کرتے تھے ۔ جبکہ نصاریٰ کا موقف یہ تھا کہ وہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت پر ایمان لاتے تھے اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت کے وہ بھی منکر تھے ۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو الٰہ بھی سمجھتے تھے ۔

قرآن کریم نے ان دونوں کے موقف پر سخت گرفت کی ۔ اور اللہ اور اس کے انبیاء و رسل پر ایمان لانے کا جامع تصور پیش فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنا بھی غلط ہے اور خود اللہ کے تمام رسولوں کے درمیان فرق کر کے بعض پر ایمان لانا اور بعض کا انکار کرنا بھی غلط ہے بلکہ اللہ اور اللہ کے تمام رسولوں پر بلا امتیاز ایمان لانا ضروری ہے ۔ اور یہی دین اسلام ہے اللہ کو اس کے سوا کوئی اور دین قبول نہیں ہے کیونکہ اللہ کی وحدانیت اور اس کے تقاضوں کو صرف اسی صورت میں پورا کیا جاسکتا ہے ۔

اللہ کی وحدانیت مطلقہ کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کا دین بھی ایک ہو' جس کے حامل وہ تمام رسول قرار دیے جائیں جو انسان کی ہدایت کیلئے کسی بھی وقت بھیجے گئے ہوں اور جن جن رسولوں کو یہ امانت سپرد کی گئی ان کا درجہ اور مقام بھی ایک ہونا ضروری ہے ۔ رسولوں کے ایک ہی منصب اور ایک ہی مقام کا جو بھی انکار کرے گا وہ اللہ کی توحید کا انکار تصور ہوگا ۔ اس سے اللہ کی وحدانیت کا ایک بڑا تصور سامنے آئے گا اس لئے کہ انسانوں کیلئے اللہ کا پسندیدہ دین بہرحال وہی ایک ہے' اس کی بنیاد ایک ہے' اور اس کا مصدر و منبع ایک ہے' لہٰذا اس کے نمائندوں کے درمیان تفریق کس طرح معقول ہو سکتی ہے ۔

قرآن کریم نے اللہ اور رسولوں کے درمیان تفریق کرنے کو ان الفاظ میں بیان کیا ۔ "کہ وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور رسولوں کا انکار کرتے ہیں ۔" اور رسولوں کے درمیان تفریق کو یوں بیان کیا ۔ "ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے ۔" اور ان دونوں فریقوں کے بارے میں کہا ۔ (اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِه (۴: ۱۵۰))

(جو لوگ اللہ اور رسولوں سے کفر کرتے ہیں ۔) اس طرح قرآن کے نزدیک اللہ اور رسولوں کے درمیان فرق کرنا بھی کفر ہے اور رسولوں میں سے کسی کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا بھی کفر ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان ایک مستقل اکائی ہے اور اسکے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیے جاسکتے ۔ ایمان کا پہلا قدم اللہ کی وحدانیت کا اقرار ہے ۔ اللہ کو وحدہ لاشریک تسلیم کرنے کا لازمی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے انسانوں کیلئے جو نظام زندگی اور جو دین پسند فرمایا ہے وہ بھی ایک ہے جو عقیدۂ توحید کی اساس پر ہے ۔ جو رسول ، اس دین کو لیکر آتے رہے ہیں وہ بھی ایک ہیں اس لئے کہ یہ سب اسی کے بھیجے ہوئے ہیں اور یہ خود سے نہیں آئے نہ وہ اللہ کے ارادے اور اس کی وحی سے علیحدہ رہے ہیں ۔ ان کا موقف ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اس لئے ایک پوری اکائی کی تحلیل اور تجزیہ نہیں ہو سکتا ۔ جو بھی ایمان کی اس وحدت اور اکائی میں فرق کرے گا وہ کفر مطلق کا ارتکاب کرے گا اگرچہ وہ یہ خیال کرتا ہو کہ بعض اجزاء پر ایمان لایا ہے اور بعض سے کفر کیا ہے ۔ ایسے لوگوں کی جزاء اللہ کے نزدیک یہ ہوگی کہ انہیں توہین آمیز عذاب دیا جائے گا ایسے سب لوگوں کو ۔

(اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا (۴: ۱۵۱))

"وہ سب پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کیلئے ہم نے وہ سزا مہیا کر رکھی ہے جو انہیں ذلیل و خوار کر دینے والی ہوگی ۔"

رہے مسلمان تو ان کے اعتقادی تصورات میں اللہ کی ذات اور تمام رسولوں پر ایمان لانا شامل ہے ۔ رسولوں کے درمیان کسی قسم کا تفرقہ جائز نہیں ہے ۔ مسلمانوں کے ہاں تمام رسولوں کی عقیدت اور احترام پایا جاتا ہے ۔ مسلمانوں کے نزدیک

تمام سماوی ادیان برحق ہیں' ہاں اگر ان کے اندر تحریف کر دی جائے تو پھر وہ دین نہ رہیں گے اگر چہ ان ادیان کے بعض حصے اپنی اصل شکل میں موجود ہوں' اس لئے کہ دین ایک ہی وحدت ہے اور اہل کتاب اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ دین میں ایک اللہ ہے' اس ایک اللہ نے لوگوں کیلئے ایک ہی دین تجویز کیا ہے ۔ یہ دین ان کی زندگی کا ایک مکمل منہاج ہے ۔ اللہ نے رسولوں کو بھیجا ہے تاکہ یہ تمام رسول اس منہاج اور اس نظام کی طرف لوگوں کو بلائیں ۔ مسلمانوں کے تصور میں قافلہ ایمان ایک دوسرے کے ساتھ قطار کی شکل میں جڑا ہوا ہے ۔ حضرت نوح علیہ السلام' حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت موسیٰ علیہ السلام' حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ اس قافلے کی قیادت فرما رہے ہیں جن کے درمیان ان کے بھائی مزید ایسے رسول بھی گزرے ہیں جن کے نام یہاں مذکور نہیں ۔ ان تمام رسولوں کا نسب نامہ اسی قافلے کے ساتھ ملتا ہے ۔ یہ سب ایک ہی عظیم امانت کے حامل رہے ہیں اور یہ تمام رسل ایک ہی سچائی و بھلائی کے وارث رہے ہیں جس کا سلسلہ طویل اور مبارک ہے ۔ اس سلسلے میں کوئی تفرقہ نہیں ہے' اس میں سے کوئی رسول علیحدہ نہیں ہے اور اس سلسلے کے درمیان کوئی انقطاع نہیں ہے اور دین حق کی وراثت کا مصدر یہی لوگ رہے ہیں ۔ ان رسولوں کے سلسلے سے ہٹ کر جو دین اور جو نظریہ بھی ہے وہ باطل اور گمراہی ہے ۔

یہ ہے اسلامی نظریہ حیات جس کے سوا اللہ تعالیٰ کو کوئی دین اور نظریہ حیات قبول نہیں ہے ۔ اور یہ ہیں اہل اسلام جو اپنے اعمال پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجر و ثواب کے مستحق ہیں اور اس کی جانب سے رحمت اور مغفرت کے بھی مستحق ہیں اگر ان سے اپنی زندگی میں کوئی قصور سرزد ہو گیا ۔

(وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۴ : ۱۵۲)) "بخلاف اس کے جو لوگ اللہ اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں اور ان کے درمیان تفریق نہ کریں' ان کو ہم ضرور ان کے اجر عطا کریں گے اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے ۔"

اسلام نے اللہ اور رسل کے بارے میں عقائد کو ایک اکائی قرار دینے کے بارے میں اس قدر تشدد کیوں کیا؟ اسی لئے کہ ایک مومن کے تصور اللہ میں عقیدۂ توحید ایک اساسی حیثیت کا حامل ہے ۔ اور یہ عقیدہ اس کائنات کے اندر ایک مدبر و منتظم کے تصور کے ساتھ بھی لگا کھاتا ہے جو نہ تعدد کو قبول کرتا ہے اور نہ اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا منتظم ہو سکتا ہے ۔ یہی عقیدہ کوئی ذی شعور انسان اختیار کر سکتا ہے جو اس کائنات کے اندر جاری و ساری ناموس اکبر کو محسوس کرتا ہے اور جب تک اس کی نظر کو رسائی حاصل ہے ۔ یہی تصور حیات اہل ایمان کو ایک متحد قافلے کی شکل دے سکتا ہے جو کفر کی صفوں اور حزب الشیطان کی پارٹی کے مقابلے میں' ایک جماعت کی شکل میں کھڑے ہوتے ہیں ۔ لیکن یہ اہل ایمان ان نظریات کے حامل لوگوں کی طرح متفرق اور بکھرے ہوئے نہیں ہوتے' جن کا دین اور نظریہ اگر چہ اپنی اصل کے اعتبار سے تو سماوی تھا مگر انہوں نے اس میں تحریف کر لی اور اب وہ صحیح اہل ایمان کی طرح ایک ہی صف میں کھڑے نہیں ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم صرف اسلام کو دین قرار دیتا ہے ۔ صرف اہل اسلام کو خیرامت قرار دیتا ہے جسے لوگوں کی خاطر برپا کیا گیا ہے ۔ وہ مسلمان جن کا عقیدہ درست ہو' جن کا عمل اور کردار اس عقیدے اور نظریئے کے مطابق ہو' یہ نہ ہو کہ بس وہ ایک مسلمان کے گھر پیدا ہوئے ہوں اور نہ صرف یہ ہو کہ انھوں نے اسلام کے کلمے کو یاد کر لیا ہو اور زبان سے ادا کر دیا ہو ۔

اس تشریح و بیان کے بعد معلوم ہو گیا کہ وہ کون ہیں جو ایک طرف اللہ اور رسولوں میں جدائی کرتے ہیں اور دوسری جانب رسولوں میں سے بعض کو مانتے ہیں اور بعض دوسروں کا انکار کرتے ہیں ۔ وہ تاریخی قافلہ ایمانی کے سلسلے کے اندر گیپ پیدا کرتے ہیں' اس وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں جو اللہ نے پیدا کی ہے اور یوں وہ اس وحدانیت کا انکار کر دیتے ہیں جس پر عقیدۂ ایمان باللہ قائم ہے ۔

---OOO---

رسولوں اور انکی رسالت کے بارے میں اسلامی تصور حیات کی خشت اول کو مضبوط کرنے کے بعد اور حقیقت ایمان اور حقیقت کفر کو واضح کر دینے کے بعد' اس سلسلے میں یہودیوں کے بعض غلط موقف زیر بحث لائے جاتے ہیں' جن کا تعلق اس بدگوئی سے بھی ہے جس کا ذکر اس پارے کے آغاز میں کیا گیا ہے ۔ اس میں نبی ؐ اور آپ کی رسالت کے بارے میں ان کے موقف کی تردید کی جاتی ہے اور اس بات کی مذمت کی جاتی ہے کہ وہ حضور اکرم ؐ سے معجزات اور نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ وہ اپنے اس موقف اور عقیدے اور حضرت موسیٰ ؑ کے بارے میں اپنے موقف اور عقیدے کے درمیان فرق کرتے ہیں ۔ پھر حضرت مسیح ؑ اور ان کی والدہ محترمہ کے بارے میں ان کا موقف حضرت موسیٰ ؑ سے مختلف ہے ۔ حالانکہ ان تمام پیغمبروں کی حقیقت پوری انسانی تاریخ میں ایک ہی ہے ۔ یہاں سیاق کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید جو یہودی اور اہل کتاب حضرت محمد ؐ کے سامنے کھڑے ہیں وہی لوگ حضرت عیسیٰ ؑ کے سامنے بھی کھڑے تھے اور یہی لوگ حضرت موسیٰ ؑ کے سامنے بھی کھڑے تھے ۔ اس سے اس مفہوم کی تاکید مطلوب ہے کہ جس طرح رسل ایک ہیں اسی طرح ہم بھی ایک ہیں ۔ چنانچہ قرآن کریم ان کی اس جبلت کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے ۔

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا

مُّبِينًا ﴿١٥٣﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّورَ بِمِيثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا
الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ وَأَخَذْنَا مِنْهُم
مِّيثَاقًا غَلِيظًا ﴿١٥٤﴾ فَبِمَا نَقْضِهِم مِّيثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِم بِآيَاتِ اللَّهِ وَ
قَتْلِهِمُ الْأَنبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَلْ طَبَعَ اللَّهُ
عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٥٥﴾ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ
مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا ﴿١٥٦﴾ وَّقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ
رَسُولَ اللَّهِ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ
اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ
وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ﴿١٥٧﴾ بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿١٥٨﴾
وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ
يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ﴿١٥٩﴾ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ
طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَن سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا ﴿١٦٠﴾ وَّأَخْذِهِمُ
الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۚ وَأَعْتَدْنَا
لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٦١﴾

اے نبی! یہ اہل کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کراؤ تو اس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰ سے کر چکے ہیں۔ اس سے تو انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو اور اسی سرکشی کی وجہ سے یکایک ان پر بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔ پھر انہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا حالانکہ یہ کھلی کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔ اس پر بھی ہم نے ان سے درگزر کیا۔ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو صریح فرمان عطا کیا اور ان لوگوں پر طور کو اٹھا کر ان سے اس فرمان کی اطاعت کا عہد لیا۔ ہم نے ان کو حکم دیا کہ دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو۔ ہم نے ان سے کہا کہ اللہ کا قانون نہ توڑو اور اس پر ان سے پختہ عہد لیا۔ آخر کار ان کی عہد شکنی کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا' اور یہاں تک کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں حالانکہ درحقیقت ان کی باطل پرستی کے سبب سے اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں پھر اپنے کفر میں یہ اتنے بڑھے کہ مریم پر سخت بہتان لگایا' اور خود کہا کہ ہم نے مسیح' عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم' رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے حالانکہ فی الواقع انہوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان کیلئے مشتبہ کر دیا گیا اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں۔ ان کے پاس اس معاملے میں کوئی علم نہیں ہے۔ محض گمان ہی کی پیروی ہے۔ انہوں نے مسیح کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا' اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔ اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہو گا جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے گا اور قیامت کے روز وہ ان پر گواہی دے گا' ........ غرض ان یہودیوں کے اسی ظالمانہ رویے کی بناء پر اور اس بناء پر کہ یہ بکثرت اللہ کے راستے سے روکتے ہیں' اور سود لیتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں' ہم نے بہت سی وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کیلئے حلال تھیں' اور وہ لوگ جو ان میں سے کافر ہیں ان کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

جزیرۃ العرب میں یہودیوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے مقابلے میں کھلا معاندانہ دشمنی کا موقف اختیار کیا۔ وہ آپ کے خلاف مسلسل خفیہ اور نہایت ہی معاندانہ سازشیں تیار کرتے رہے جن کی تفصیلات کو قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔ اور جن کے کچھ رنگ ہم سورہ بقرہ' سورہ آل عمران اور خود اسی سورہ کے پارۂ پنجم میں دکھا چکے ہیں۔ ان آیات میں جو باتیں کی جا رہی ہیں وہ بھی ان کے اس مسلسل موقف کا ایک رنگ ہے۔

ان کی پہلی ہٹ دھرمی یہ ہے کہ وہ حضور ؐ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ آسمانوں سے ایک کتاب نازل فرما دیں' یہ لکھی ہوئی ہو' وہ مجسم طور پر آسمانوں سے ان کے سامنے آ رہی ہو اور وہ اسے اپنے ہاتھوں کے ساتھ چھو لیں۔

(يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ (٤ : ١٥٣))

(اے نبی! یہ اہل کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کراؤ۔) اس سوال کا جواب' حضرت نبی اکرم ؐ کی جانب سے خود اللہ تعالیٰ عنایت فرماتے ہیں اور حضور ؐ اور مسلمانوں کے سامنے' یہودیوں کی تردید کرتے ہوئے خود یہودیوں کی اپنی تاریخ سے' ان کا اپنے نجات دہندہ اور قائد اور عظیم نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کے رویے کی ایک جھلک پیش فرماتے ہیں۔ حالانکہ ان یہودیوں کا زعم یہ ہے کہ وہ حضرت موسیٰ

ﷺ پر ایمان لاتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ؐ کی نبوت کی تصدیق نہیں کرتے ......... ان کی تاریخ کا یہ صفحہ الٹ کر بتایا جاتا ہے کہ ان کی یہ عادت کوئی نئی عادت نہیں ہے ۔موجودہ مدینہ کے یہودی ہی ایسے سوالات نہیں کر رہے بلکہ ازمنہ قدیمہ سے انکی ایسی ہی عادت رہی ہے ۔

ان کی جبلت آج بھی وہی ہے جو عہد موسیٰ میں ہوا کرتی تھی حالانکہ وہ ان کے قائد بھی تھے 'نبی بھی تھے اور ان کے نجات دہندہ بھی تھے ۔وہ موٹے دماغ کے لوگ ہیں۔ ان کو صرف محسوس چیزوں کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے ۔جس طرح یہ لوگ حضرت موسیٰ کے دور میں ہٹ دھرم تھے 'عناد کرنیوالے تھے اور ماسوائے اس کے کہ انہیں کسی کی بات کو زبردستی تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا جائے 'یہ مان کر نہیں دیتے ۔یہ آج بھی ویسے ہی کفر پیشہ اور غدار ہیں اور دوڑ کر وعدہ توڑنے والے ہیں ۔نہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ وعدہ خلافی کرتے ہیں بلکہ یہ لوگ اپنے رب کے ساتھ بھی عہد شکنی کرتے ہیں۔ یہ وہی ہیں جھوٹے اور گندے لوگ ۔وہ کسی موقف پر ثابت قدم رہنے والے نہیں ہیں۔ اور نہ ہی یہ لوگ بدگوئی سے چوکتے ہیں ۔یہ ہروقت لالچ کے بندے ہیں اور دنیا پرستی ان کا شعار ہے ۔لوگوں کے مال باطل اور ناجائز طریقے سے کھانا ان کا وطیرہ ہے۔ یہ بھی ان کی قدیم عادت ہے کہ یہ لوگ اللہ کے حکم سے روگردانی کرتے ہیں اور اس کے ہاں جو ثواب آخرت میں ملتا ہے اسے خاطر ہی میں نہیں لاتے ۔

ان آیات میں ان کے خلاف یہ مہم اسی لئے چلائی گئی ہے کہ ان کی حقیقت کھول کر سامنے رکھدی جائے ۔انہیں شرمندہ کر دیا جائے ۔اس مہم کے زور اور اس کے تنوع کو دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت یہودی سازش کو بے نقاب کرنے کی کس قدر ضرورت تھی جو سازش وہ اسلام اور وقت کے نبی کے خلاف کر رہے تھے ۔یہودیوں کی یہی حیثیت اور ناپاک سازشیں ہیں جو آج تک اس دین اور اس کے ماننے والوں کے خلاف بدستور جاری ہیں ۔

(يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ (۴:۱۵۳)) (اے نبی اہل کتاب تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کراؤ ۔) آپ ان کی اس ہٹ دھرمی سے پریشان نہ ہوں' اس لئے کہ ان کی یہ ہٹ دھرمی تعجب انگیز نہیں ہے 'نہ یہ کوئی نئی بات ہے ۔

فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (۴:۱۵۳))"تو اس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰ علیہ السلام سے کر چکے ہیں ۔اس سے توانہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو"..... حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے جو بے شمار معجزات نازل فرمائے تھے وہ ان کے احساس کو نہ جگا سکے ۔ ان عظیم معجزات سے بھی ان کے وجدان کے اندر کوئی ارتعاش پیدا نہ ہوا ۔اور یہ حیران کن معجزات بھی ان کے دلوں کو مائل بہ ہدایت و اطاعت نہ کر سکے اور یہ بدبخت آگے بڑھے اور ذات باری کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ کر دیا ۔ بالکل کھلے بندوں دیکھنے کا۔ یہ ان کا ایک متکبرانہ مزاج اور مطالبہ تھا' جس میں ایمان کی تروتازگی سرے سے موجود ہی نہ تھی بلکہ ان کی اس جبلت میں سرے سے ایمان کی استعداد ہی موجود نہ تھی ۔

(فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ) اور اسی سرکشی کی وجہ سے یکایک ان پر بجلی ٹوٹ پڑی تھی ۔لیکن پھر بھی

اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف ہی کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں حضرت موسیٰ ﷺ کی دعا اور اپنے آپ سے ان کے بارے میں عاجزانہ التماس کو قبول ہی کر لیا۔اس دعا کی تفصیلات سورہ اعراف (۱۵۵) میں ہیں۔

(فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۭ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ۭ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاۗءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ (۱۵۵) وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ۭ (۱۵۶)(۷:۱۵۵ — ۱۵۶))

(جب ان لوگوں کو ایک سخت زلزلے نے آپکڑا تو موسیٰ ﷺ نے عرض کیا۔"اے میرے سرکار' آپ تو پہلے ہی ان کو اور مجھے ہلاک کر سکتے تھے' کیا اس قصور میں جو ہم میں سے چند نادانوں نے کیا تھا ہم سب کو ہلاک کر دیں گے؟ یہ تو آپکی ڈالی ہوئی آزمائش تھی جس کے ذریعے سے آپ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت بخش دیتے ہیں۔ہمارے سرپرست تو آپ ہی ہیں۔پس ہمیں معاف کر دیجئے اور ہم پر رحم فرمایئے۔آپ سب کو معاف فرمانے والے ہیں۔اور ہمارے لئے اس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجئے اور آخرت کی بھی۔ہم نے آپ کی طرف رجوع کر لیا ہے۔")

(ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ (۴:۱۵۳)) (پھر انہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنالیا حالانکہ یہ کھلی کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔) یہ بچھڑا سونے کا بنا ہوا تھا۔اسے سامری نامی شخص نے بنایا تھا۔یہ اس نے سونے کے ان زیورات سے بنایا تھا' جو انہوں نے مصری عورتوں سے لئے تھے جب وہ وہاں سے نکل رہے تھے۔یہ لوگ اس بچھڑے کے ارد گرد جمع ہوگئے اور انہوں نے اسے اپنا معبود بنالیا۔حضرت موسیٰ ﷺ اس وقت کوہ طور پر گئے ہوئے تھے جہاں انہوں نے اپنے رب سے ایک مقررہ وقت میں بات کرنی تھی۔جہاں ان کو تورات کی الواح اور ہدایت اور نئی روشنی عطا ہونی تھی۔(فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ) (اس پر بھی ہم نے ان سے درگزر کیا۔) لیکن یہودی' یہودی ہی تو تھے۔ان کے ساتھ معاملات کرنے میں صرف خوف اور جبر مفید رہتا ہے۔

( وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا (۱۵۳) وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (۱۵۴)(۴:۱۵۳ — ۱۵۴)) (ہم نے موسیٰ کو صریح فرمان عطا کیا اور ان لوگوں پر طور کو اٹھا کر ان سے (اس فرمان کی اطاعت کا) عہد لیا۔ہم نے ان کو حکم دیا کہ دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو۔ہم نے

ان سے کہا کہ سبت کا قانون نہ توڑو اور اس پر ان سے پختہ عہد لیا۔)

یہاں سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے جو سلطان عطا فرمایا وہ کیا چیز ہے۔ غالباً وہ وہی شریعت ہے جو الواح میں موجود تھی' تو اللہ کی شریعت گویا اللہ کی جانب سے سلطان اور حاکیت ہے اور اللہ کے سوا جو شریعت اور قانون بھی ہوگا اس پر اللہ کی جانب سے کوئی سلطان اور سند قبولیت نہ ہوگی۔ عملاً بھی غیر اللہ کی شریعت اور قوانین کو دلوں پر کوئی حکمرانی حاصل نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنے لئے جو قوانین خود بناتے ہیں ان کی کوئی وقعت عوام الناس کے دلوں میں نہیں ہوتی۔ ان قوانین کا نفاذ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ داروغہ سر پر کھڑا ہو یا جلاد کی تلوار سر پر ہو۔ رہی اللہ کی شریعت تو لوگ اس کے سامنے نہایت ہی عاجزی سے سرتسلیم خم کرتے ہیں اور ان کے دل مائل باطاعت ہوتے ہیں۔ دلوں کے اندر شریعت کے خلاف ورزی کا خوف ہوتا ہے اور اللہ کی سزا کا ڈر نظروں میں ہوتا ہے۔ لیکن یہودی جن کے دل شعور ایمان سے محروم تھے انہوں نے حضرت موسیٰ ؑ کو اللہ کی جانب سے دی گئی الواح شریعت کے ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ اس مقام پر پھر ان پر اللہ کا غضب آتا ہے' اس لئے کہ وہ اپنی فطرت اور اپنے مزاج کے اعتبار سے اس کے لائق تھے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ایک عظیم چٹان ان کے سروں پر لٹک رہی ہے۔ یوں نظر آتا تھا کہ ابھی ان کے سروں پر گری کہ گری۔ وہ چونکے' فوراً انہوں نے اس شریعت کو تسلیم کرنے کا اقرار کیا اور وعدہ کر لیا۔ پختہ میثاق طے ہو گیا۔ اور بڑی بڑی یقین دہانیوں کے ساتھ طے ہو گیا۔ حالانکہ پہلے وہ نہ تسلیم کرنے تھے نہ عہد کرنے کیلئے تیار تھے اور نہ ہی اس عہد قدیم کو لینے کیلئے تیار تھے ....... اللہ تعالیٰ یہاں انہیں ان کی اس صفت قدیمہ کو یاد دلاتے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ اس منظر میں ایک سخت پتھر جو ان کے سروں پر لٹک رہا تھا اور دوسری طرف ان کے سینوں میں سخت پتھر کی طرح دل رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس منظر میں ان دو قسم کے پتھروں کے درمیان مناسبت پیدا کر دی گئی ہے۔ اس طرح انداز تعبیر پختہ' متعین اور مجسم ہو جاتا ہے۔ جس طرح قرآن کریم کا عمومی انداز تعبیر ہے کہ وہ مجرد ذہنی مفاہیم کو حسی اور جسمانی شکل دیدیتا ہے۔ (دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن۔) یہ میثاق کیا تھا یہ کہ وہ بیت المقدس میں سجدہ ریز ہو کر داخل ہوں اور یہ کہ وہ سبت کا احترام کریں جسے خود ان کے مطالبے پر ان کیلئے خوشی کا دن بنایا گیا تھا۔

لیکن ہوا کیا؟ پتھر لٹکنے کے خوف و ہراس کے غائب ہوتے ہی اور اس قاہرانہ فضا کے ختم ہوتے ہی ان کے قدم پھسل گئے اور فخر سے یہ کہنے لگے کہ ہمارے دل تو کسی نصیحت سے متاثر نہیں ہوتے۔ وہ مردوں میں ہیں اور ان تک کوئی بات پہنچتی ہی نہیں ہے کیونکہ ان کے دروازے بند ہیں۔ اور یہ کہنے کے بعد انہوں نے ان تمام برے افعال کا ارتکاب کیا جس کی تفصیلات اللہ میاں یہاں نبی ؐ کو بتاتے ہیں۔ یہ یہاں اس لئے گنوائے گئے ہیں تاکہ حضور ؐ یہودیوں کو ذرا آئینہ دکھا دیں کہ وہ ہیں کیا؟

(فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ (۴ : ۱۵۵)) آخر کار ان کے عہد شکنی کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ کی آیات

کو جھٹلایا اور متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا اور یہاں تک کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں۔........... ان کی اس بات پر کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں۔" (قُلُوبُنَا غُلْفٌ (٤: ١٥٥)) ان پر تنقید ختم ہوتی ہے اور اگلی آیت میں ان کی اس بات کا جواب دیا جاتا ہے۔ وہ یہ بات اس وقت کہتے تھے جب حضور ؐ ان پر دعوت اسلامی پیش کرتے۔ یہ لوگ یہ جواب یا تو اس لئے دیتے تھے کہ حضور ؐ ان سے مایوس ہو جائیں اور آئندہ ان پر دعوت پیش نہ کریں اور یا وہ حضور ؐ کی جانب سے تبلیغ پر آپ کے ساتھ بطور مزاح یہ بات کرتے تھے اور آپ کی دعوت کو رد کر کے گویا وہ بڑے لوگ بننے کی کوشش کرتے تھے کہ ہم تو ان باتوں پر کان ہی نہیں دھرتے۔ یہ دونوں باتیں ہی ان کے پیش نظر ہو سکتی ہیں، بہرحال اللہ کا جواب یوں آتا ہے۔

(بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (٤: ١٥٥)) (حالانکہ درحقیقت ان کی باطل پرستی کے سبب سے اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں.....) مطلب یہ ہے کہ ان کے دل ملفوف نہیں ہیں، بلکہ وہ دعوت اسلامی کا انکار اس لئے کر رہے ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے۔ یہ ٹھپہ بھی ان کے دلوں پر اس لئے لگایا گیا ہے کہ انہوں نے کفر کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے اس لئے ان کے دل سخت ہو گئے ہیں، وہ جمادات کی طرح ہو گئے ہیں، اور کفر کے نیچے دب گئے ہیں۔ انہیں ایمان کی تروتازگی کا کوئی احساس ہی نہیں ہوتا، ان کے اندر ایمان کی مٹھاس کی حس ہی نہیں رہی ہے۔ اس لئے شاذونادر ہی یہ ایمان قبول کرتے ہیں۔ یہ شاذ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مذکورہ بالا افعال بد کا ارتکاب نہ کیا تھا، اسی لئے ان کے دلوں پر مہر نہیں لگائی گئی تھی۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے اپنے دلوں کے دروازوں کو قبول حق کیلئے کھلا رکھا اور حق کو قبول کر کے عزت دار بن گئے۔ ان کو اللہ نے ہدایت دی اور ایمان نصیب کیا۔ یہودیوں میں سے ایسے لوگ بہت ہی کم تھے بلکہ کم سے کم، مثلاً عبداللہ بن سلام، ثعلبہ ابن سعیہ، اسد ابن سعیہ اور اسد ابن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

اس تنقید اور استدراک کے بعد، اللہ تعالیٰ ان اسباب کو گنواتے ہیں جن کی وجہ سے یہ یہودی اس سلوک کے مستحق ہوئے جو ان کے ساتھ کیا گیا۔ دنیا میں ان پر بعض نہایت ہی پاک چیزوں کو حرام قرار دے دیا گیا، آخرت میں ان کیلئے آگ کا عذاب تیار کیا گیا تاکہ وہ آخرت اور قیامت آنے سے پہلے ہی اس کا انتظار کریں۔

(وَّ بِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا (١٠٦) وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ (١٥٧)(٤: ١٥٦–١٥٧)) (پھر اپنے کفر میں یہ اتنے بڑھے کہ مریم پر سخت بہتان لگایا، اور خود کہا کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم، رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے۔).....جب بھی ان کے برے افعال میں سے کسی بات کا ذکر کیا جاتا ہے قرآن کریم ان کی صفت کفر کو ضرور ساتھ لاتا ہے۔ قتل انبیاء کے ذکر کے وقت بھی یہ صفت دہرائی گئی کہ انہوں نے انبیاء کو ناحق قتل کیا، انبیاء کا قتل جب بھی ہوا ناحق ہی ہوا۔ ناحق کا لفظ بطور حقیقت واقعہ لایا گیا ہے۔ اسی طرح جہاں اس بات کا ذکر ہوا کہ انہوں نے حضرت مریم علیہا السلام پر عظیم بہتان باندھا وہاں بھی اس صفت کا ذکر ہوا۔ مریم پر انہوں نے جو بہتان باندھا اس کے قائل صرف یہودی تھے۔ انہوں نے مریم پر یوسف

نجار کے ساتھ زنا کرنے کا الزام باندھا (ان پر خدا کا غضب ہو!) اس کے بعد انہوں نے یہ ڈینگ ماری کہ انہوں نے حضرت مسیح کو سولی پر چڑھایا اور طنزاً یہ کہا کہ "انہوں نے مسیح ابن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے۔"

یہاں تک آکر سیاق کلام ایک بار پھر رک جاتا ہے اور ان کے اس دعوے کی لگے ہاتھوں تردید کر دی جاتی ہے۔ اور سچائی کو ثابت اور مستحکم کر دیا جاتا ہے۔

(وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا (۱۵۷) بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۱۵۸)(۴:۱۵۷-۱۵۸)) "حالانکہ فی الواقع انہوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان کیلئے مشتبہ کر دیا گیا اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں۔ ان کے پاس اس معاملے میں کوئی علم نہیں ہے محض گمان ہی کی پیروی ہے۔ انہوں نے مسیح کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا' اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔"...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے معاملے میں اہل یہود سخت خبط میں پڑے ہوئے تھے اور خود عیسائیوں کو بھی اس بارے میں سخت غلط فہمی لاحق تھی۔ یہودی یہ کہتے تھے "ہم نے عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ" کو قتل کر دیا ہے۔ لفظ رسول اللہ وہ حضرت عیسیٰ کے لئے بطور مزاح استعمال کرتے تھے۔ اور عیسائیوں کا کہنا یہ تھا "انہیں سولی پر چڑھایا گیا اور دفن کر دیا گیا لیکن تین دنوں کے بعد آپ دوبارہ اٹھ گئے۔" اور ان کی تاریخ حضرت مسیح کی ولادت اور وفات سے اس طرح خاموش ہے کہ شاید اس واقعہ کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ ان دونوں فریقوں نے اس عظیم واقعہ کے بارے میں وثوق کے ساتھ کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس لئے کہ یہ واقعات بہت ہی تیزی سے وقوع پذیر ہوتے رہے اور نظروں سے اوجھل ہوتے رہے۔ مختلف روایات پھیلتی رہیں اور سچ اور جھوٹ ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ ہوگئے۔ کوئی بات یقین کے ساتھ کوئی نہ کہہ سکتا تھا' نہ کسی نے کہی' لہٰذا صرف وہی بات یقینی ہے جو اللہ رب العالمین نے فرمائی۔

جن چار مروجہ اناجیل کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کا قصہ بیان ہوا ہے' آپ کی موت اور سولی پر چڑھانے کا جو قصہ اور پھر دفن کرنے اور پھر اٹھنے کا جو قصہ بیان ہوا ہے' یہ تمام واقعات حضرت عیسیٰ کے اٹھائے جانے کے بہت ہی بعد کے ادوار میں لکھے گئے ہیں۔ اس دور میں حضرت مسیح کے شاگردوں پر مظالم ہوتے رہے اور دین مسیح کو دبایا جاتا رہا۔ اس خوف' راز داری اور تشدد اور جلاوطنی کی فضا میں یہ بات نہایت ہی مشکل تھی کہ کوئی صحیح اور تحقیقی بات لکھی جاسکے۔ اس دور میں بے شمار انجیلیں لکھی گئیں۔ جبکہ ۲۰۰ء کے آخر میں جاکر ان میں سے ان مروجہ چار کو منتخب کیا گیا۔ ان کو سرکاری اناجیل قرار دیا گیا۔ اور ان کو سرکاری اناجیل قرار دینے کے بھی بعض خاص مقاصد تھے اور شک و شبہ سے بالاتر نہ تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جو اناجیل تحریر ہوئیں ان میں سے ایک انجیل برناباس بھی تھی۔ یہ انجیل ان چار منتخب اور تسلیم شدہ اناجیل سے مختلف تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے واقعہ کے بارے میں یہ انجیل کہتی ہے۔

"جب سپاہی یہوداہ کے ساتھ اس جگہ پہنچے' جہاں یسوع تھا' تو مسیح نے جم غفیر کو پاس آتے سنا اور وہ گھر کے ایک گوشے میں ڈر کر سمٹ گیا' گیارہ شاگرد (بدستور) سو رہے تھے' جب خدائے تعالیٰ نے دیکھا کہ اس کا بندہ (یسوع) خطرے میں ہے تو اس نے اپنے فرشتوں' جبرئیل' میکائیل' رفائیل اور اوریل کو حکم دیا کہ وہ یسوع کو دنیا سے نکال لائیں' پاکیزہ فرشتے آئے اور وہ یسوع کو اس کھڑکی سے' جس کا رخ جنوب کی طرف تھا' نکال کر اور اٹھا کر لے گئے اور اسے تیسرے آسمان میں ان فرشتوں کی صحبت میں لے جا کر رکھ دیا' جو تاابد اللہ کی تسبیح کرتے ہیں' یہوداہ وقت کے ساتھ اسی کھڑکی سے گھر میں داخل ہوا' جس سے یسوع کو اٹھا لیا گیا تھا مسیح کے شاگرد سب کے سب (اب بھی) سو رہے تھے' اب عجیب و غریب خدا نے ایک عجیب و غریب کام کیا اور وہ یہ کہ یہوداہ کی بولی اور اس کا چہرہ دونوں بدل گئے اور وہ یسوع کی طرح ہو گیا یہاں تک کہ ہمیں یقین ہو گیا کہ وہی یسوع ہے۔ یہوداہ ہمیں جگانے کے بعد ڈھونڈنے لگا تاکہ معلوم کرے کہ "استاد" (یسوع) کہاں ہے' ہمیں اس پر حیرت ہوئی اور ہم نے اس سے کہا: اے ہمارے آقا! تو ہی تو ہمارا استاد ہے' کیا تو نے ہمیں اس وقت بھلا دیا ہے..."

غرض عیسائیوں کے پاس موجودہ ریکارڈ سے کوئی ایسا شخص جو اس معاملے میں تحقیق کرنا چاہے کوئی قابل یقین اور پختہ بات نہیں پاتا اس لئے کہ یہ واقعہ صبح صادق سے پہلے رات کی تاریکی میں پیش آیا تھا۔ بعد میں آنے والے لوگوں نے جو دلائل پیش کئے وہ روایت در روایت پر مبنی تھے۔ قرآن کریم اس بارے میں کہتا ہے۔

( وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا (۱۵۷) بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۱۵۸) (۴:۱۵۷-۱۵۸)) "اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں۔ ان کے پاس اس معاملے میں کوئی علم نہیں ہے محض گمان ہی کی پیروی ہے۔ انہوں نے مسیح کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا' اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔"

اور اس سے قبل قرآن کریم نے فیصلہ کن انداز میں فرمایا۔ ( وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (۴:۱۵۷)) (حالانکہ انہوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان کیلئے مشتبہ کر دیا گیا۔)

قرآن کریم یہاں رفع عیسیٰ علیہ السلام کی تفصیلات نہیں دیتا کہ آیا یہ رفع جسمانی تھا یا روحانی تھا۔ بحالت حیات تھا' یا فقط روحانی بعد الوفات تھا اور یہ کہ یہ توفی کب واقعہ ہوئی اور کہاں ہوئی لیکن قرآن یہ کہتا ہے کہ انہوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ ہی اسے سولی پر چڑھایا۔ یہ قتل اور سولی پر چڑھانے کا فعل اس شخص کے ساتھ ہوا جس کے بارے میں انہیں اشتباہ میں ڈال دیا گیا تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اس کے سوا قرآن کریم یہاں مزید کچھ تفصیل نہیں بتاتا۔ البتہ دوسری

سورہ (سورہ آل عمران) میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ (يَا عِيْسٰى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ) (اے عیسیٰ میں تجھے واپس لے لوں گا اور تجھ کو اپنی طرف اٹھالوں گا۔) اس آیت میں بھی اٹھائے جانے اور واپس لے لینے (وفات) کی تفصیلات نہیں دی گئیں نہ اس توفی کا وقت دیا گیا ہے اور نہ ہی "توفی" کی نوعیت بتائی گئی ہے۔ظلال القرآن میں ہم نے جو طریقہ اختیار کیا ہے ہم بھی اس میں قرآن کریم کے سائے میں رہتے ہوئے تفصیلات میں نہیں جاتے اس لئے کہ کیفیت توفی پر ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔نہ اب تفصیلات کیلئے کوئی سبیل ہے۔محض اقاویل و اساطیر نقل کرنے کا فائدہ ہی کیا ہو گا۔

اب ہم واپس اصل موضوع کی طرف آتے ہیں اور قرآن کریم نے اہل کتاب پر جو استدراک کیا ہے اس کی طرف لوٹتے ہیں۔

(وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (٤ : ١٥٩)) "اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہو گا جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے گا اور قیامت کے روز وہ ان پر گواہی دے گا۔" اس آیت کے مفہوم میں سلف صالحین کے اندر اختلاف رائے رہا ہے۔ اس اختلاف کے پیدا ہونے کی وجہ یہ رہی ہے کہ "موتہ" میں جو ضمیر ہے اس کے مرجع میں اختلاف ہوا ہے۔ اگر اس کا مرجع حضرت عیسیٰ ہوں تو مفہوم یہ ہو گا کہ اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہو گا جو حضرت عیسیٰ کی موت سے قبل حضرت عیسیٰ پر ایمان نہ لائے گا۔اس صورت میں یہ حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ کا نزول ہو گا....... دوسری تعبیر کے مطابق "موتہ" کی ضمیر کا مرجع اہل کتاب ہیں۔یعنی یہ کہ اہل کتاب میں سے ہر شخص اپنی موت سے قبل حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے گا۔وہ یوں کہ موت سے قبل سکرات الموت کے اندر ہی میت پر حق واضح ہو جاتا ہے لیکن اس وقت اگر کوئی ایمان لے آئے تو اس کے لئے وہ ایمان مفید نہیں ہوتا۔

میرے خیال میں یہ دوسرا قول زیادہ قابل ترجیح ہے اور اس کی طرف حضرت ابی کی قرات بھی اشارہ کر رہی ہے۔ (اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهِمْ (٤: ١٥٩)) (اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہو گا جو ان کی موت سے قبل اس پر ایمان نہ لائے۔) اس قرات کے مطابق اس ضمیر کا مرجع صرف اہل کتاب ہی ہو سکتے ہیں۔اس صورت میں مفہوم یہ ہو گا کہ جو یہودی حضرت عیسیٰ ؑ کا انکار کرتے ہیں اور اب تک وہ اپنے اس موقف پر قائم ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انہوں نے ان کو قتل کر دیا ہے اور سولی پر چڑھایا ہے ان میں سے جو بھی موت پائے گا اسی وقت اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی (یعنی بوقت نزع) کہ حضرت عیسیٰ ؑ تو حق پر ہیں ان کی رسالت برحق ہے۔ تو وہ حالت نزع میں حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے گا لیکن اس وقت تو ایمان لانا مفید نہیں ہوتا۔قیامت کے دن حضرت عیسیٰ ان پر خود گواہ ہوں گے۔

یہاں آکر قصہ صلیب ختم ہو جاتا ہے۔اس کے بعد یہودیوں کے دیگر منکرات کا ذکر شروع ہوتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کے ان منکرات پر اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ان کو کیا سزا دی اور آخرت میں ان کیلئے کیا کچھ تیار ہے۔

(فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَٰتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا (١٦٠) وَأَخْذِهِمُ الرِّبَوٰا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَٰلَ النَّاسِ بِالْبَٰطِلِ ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَٰفِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (١٦١)(٤: ١٦٠ – ١٦١))

"غرض ان یہودیوں کے اسی ظالمانہ رویے کی بناء پر اور اس بنا پر کہ یہ بکثرت اللہ کے راستے سے روکتے ہیں' اور سود لیتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں' ہم نے بہت سی وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کیلئے حلال تھیں' اور جو لوگ ان میں سے کافر ہیں ان کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔"...... چنانچہ اس آیت کے ذریعے ان کے سابقہ منکرات میں کچھ مزید منکرات کا اضافہ کر دیا گیا۔ اور یہ بتا دیا گیا کہ اللہ کی راہ میں سے لوگوں کو روکنے کے سوا ان کا اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ گویا وہ رات دن ایسی کام میں لگے ہوئے ہیں۔ نیز یہ رات دن سودی کاروبار میں لگے رہتے ہیں اور یہ کام وہ محض کم علمی کی وجہ سے نہیں کر رہے یا یہ کہ انہیں اس سلسلے میں متنبہ نہیں کیا گیا' بلکہ انہیں صاف الفاظ میں اس سے روکا گیا تھا لیکن انہوں نے پھر بھی اس پر اصرار کیا اور لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھاتے رہے۔ یہ ربا کے ذریعے بھی کھاتے رہے اور دوسرے ذرائع سے بھی۔

ان منکرات اور اس سے پہلی سورتوں میں مذکورہ جرائم کی وجہ سے اللہ نے ان پر بعض حلال چیزوں کو حرام کر دیا جو ان کیلئے حلال تھیں اور یہ کہ اللہ نے کافروں کیلئے سخت دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

یہودیوں کے خلاف اس مہم میں یہودیوں کے چہرے سے نقاب اتار کر پھینک دیا گیا' اور ان کی تاریخ سے بعض واقعات بھی پیش کئے گئے تاکہ معلوم ہو کہ ان کی تاریخ کیا ہے۔ ان کی بہانہ سازیوں اور ان کی ہٹ دھرمی کا پردہ چاک کیا گیا اور یہ بتایا گیا کہ وہ کسی طرح مان کر دینے والے نہیں ہیں اور یہ کہ انہوں نے اپنے قائد' اپنے نجات دہندہ اور اپنے عظیم نبی کے ساتھ یہی رویہ اختیار کئے رکھا۔ ان کی عادت یہ رہی ہے کہ وہ ہمیشہ صالحین اور انبیاء کے ساتھ برے سلوک اور ان کے خلاف بدگوئی کرنے میں بہت ہی جری و سریع رہے ہیں۔ وہ انبیاء کو بھی قتل کرتے رہے ہیں اور پھر ندامت کے بجائے اس قتل پر فخر کرتے رہے ہیں۔ ان جملوں کے نتیجے میں' یہودیوں کے مکر و فریب کا جال تار تار ہو گیا جو انہوں نے اسلامی صفوں کے خلاف بچھا رکھا تھا۔ ان کی سازشیں ناکام ہو گئیں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کی خفیہ دوستیاں کٹ گئیں۔ یوں اہل اسلام نے یہودیوں کے اصل مزاج کو اچھی طرح جان لیا۔ اسلام کے خلاف ان کی سازشوں اور ان میں استعمال ہونے والے وسائل و ذرائع کو پہچان لیا۔ اس بات کا انہیں علم ہو گیا کہ وہ کس طرح ہر سچائی کے مقابلے میں جتھہ بندی کر لیتے ہیں چاہے یہ سچائی خود ان کے اندر ان کی اپنی صفوں سے اٹھے یا ان سے باہر دوسری اقوام کے اندر پائی جائے۔ اس لئے کہ وہ ہمیشہ سچ اور اہل حق کے دشمن رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ ہدایت اور ہادیوں کی بیخ کنی کرتے رہے ہیں۔ ہر دور میں اور ہر زمانے میں وہ یہ کام کرتے رہے ہیں۔ اپنے دشمنوں کے ساتھ تو ان کا یہ رویہ بہرحال تھا ہی' وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بھی یہی کچھ کرتے رہے ہیں' اس لئے ہر دور میں ہر اسلامی تحریک اور اسلامی سوسائٹی کا یہ فرض ہے کہ وہ یہودیوں سے چوکنا رہے اس لئے کہ ان کی جبلت ہی ایسی ہے کہ وہ ذاتی طور پر سچائی کے دشمن ہیں۔ ان کے دل کے

اندر حق کی دشمنی بھری ہوئی ہے ۔ان کے کلیجے سخت ہو گئے ہیں ۔وہ اپنے سر صرف اس شخص کیلئے جھکاتے ہیں جو ان پر ڈنڈے برسائے اور وہ سچائی کو تب تسلیم کرتے ہیں جب ان کے سروں پر تلوار لٹک رہی ہو ۔

اس قسم کے لوگوں کا یہ تعارف صرف اس جماعت اسلامی کیلئے نہ تھا جو مدینہ طیبہ میں کام کر رہی تھی اس لئے کہ قرآن اس امت کے لئے گائیڈ ہے جب تک کہ یہ امت موجود رہے گی ۔اگر قرآن سے یہ امت اپنے دشمنوں کے بارے میں ہدایات لینا چاہے تو اس میں اسے ہدایات مل جائیں گی ۔اس سے جب بھی یہ امت کوئی نصیحت لینا چاہے یہ کتاب اسے نصیحت دیتی ہے ۔اس کتاب نے امت کو یہودیوں کے بارے میں ہدایت دی ۔نصیحت کی اور فہم دیا تو اس کے نتیجے میں یہودیوں کی گردنیں مسلمانوں کے مقابلے میں جھک گئیں ۔جب اس امت نے قرآن مجید کو چھوڑا تو یہ امت یہودیوں کی غلام بن گئی ۔ہم دیکھتے ہیں کہ یہ امت پوری طرح جمع ہوتی ہے اور یہودیوں کی ایک مختصر جمعیت اس پر غالب آجاتی ہے ۔کیوں؟ اس لئے کہ وہ اپنی کتاب اور گائیڈ بک سے غافل ہے ۔ وہ قرآن کی ہدایات سے دور بھاگ رہی ہے ۔اس نے اسے پس پشت ڈال دیا ہے ۔اور یہ امت فلاں اور فلاں کے اقوال کی اطاعت کر رہی ہے ۔یہ امت اسی طرح یہودی سازش کا شکار رہے گی اور اسی طرح وہ یہودیوں کے عتاب میں رہے گی جب تک وہ قرآن کی طرف نہیں لوٹتی ۔

یہ بیان اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک یہودیوں میں سے نکل کر آنیوالے بعض اچھے لوگوں کی حوصلہ افزائی نہیں کر دی جاتی اور ان کی جسارت رندانہ کی تعریف کی جاتی ہے کہ چھلانگ لگا کر نکل آئے اور سچائی کو قبول کر لیا ۔ قرآن کریم ان لوگوں کے علم و ایمان کی تصدیق کرتا ہے جن کی وجہ سے وہ اہل اسلام میں داخل ہوئے اور رسول اللہ ؐ پر نازل شدہ دین کو قبول کیا ۔یہ علم وہ تھا جو رسول اللہ ؐ پر اترا اور جو آپ سے قبل انبیاء پر اترا تھا ۔وہ اس علم میں زیادہ رسوخ رکھتے تھے جس کی وجہ سے ایمان لے آئے ۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾

مگر ان میں جو لوگ پختہ علم رکھنے والے ہیں اور ایماندار ہیں وہ سب اس تعلیم پر ایمان لاتے ہیں جو اے نبی ' تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھی ۔اس طرح کے ایمان لانے والے اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی کرنیوالے اور اللہ اور روز آخرت پر سچا عقیدہ رکھنے والے لوگوں کو ہم ضرور اجر عظیم عطا کریں گے ۔

غرض پختہ علم اور اس پر روشن ایمان انسان کو اسی طرح ہدایت دیتے ہیں کہ انسان پورے دین پر ایمان لانے والا بن جاتا ہے۔انسان اپنے علم کی پختگی اور صاف ایمان کی وجہ سے اس نتیجے تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ دین اللہ وحدہ کی طرف سے آیا ہے اور یہ کہ اپنے مزاج کے اعتبار سے دین ایک ہی ہے۔

قرآن کریم کی جانب سے یہ اشارہ دینا کہ علم کی گہرائی کے نتیجے میں صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے اور دل کے دروازے نور ایمان کے لئے کھل جاتے ہیں' نزول قرآن کے دور میں نہایت ہی معنی خیز ہے۔ یہ قرآن کریم کے اشارات میں سے ایک اہم اشارہ ہے اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کریم کے نزول کے زمانے میں صورت حال کیا تھی۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں نفس انسانی کی صورت حال کیا ہوتی تھی۔ سطحی علم کی مثال اس طرح ہوتی ہے جس طرح کفر اور انکار۔یہ کفر اور انکار ان کے دل کے اندر صحیح معرفت کے اترنے میں حائل ہوجاتے ہیں۔ ہر دور میں یوں ہوتا ہے کہ سطحی علم کی وجہ سے حقیقت کی معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ جو لوگ علم میں گہرائی تک چلے جاتے ہیں اور انہیں حقیقی علم حاصل ہو جاتا ہے تو ان کی آنکھوں کے سامنے شواہد آجاتے ہیں جو اس کائنات کے اندر پنہاں ہیں۔اگر ان کے سامنے شواہد نہیں آتے تو کم از کم ایسے سوالات آجاتے ہیں جن کا جواب ان کے پاس نہیں ہوتا اور محض کسی سماوی نظریہ حیات کو قبول کر کے ہی وہ ان سوالات کے جواب سے جان چھڑا سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کائنات کا ایک اللہ ہے۔وہ اس پر حاوی ہے' اس کا مدبر ہے' اور اس پر پوری طرح متصرف ہے۔اس کا ایک ہی ارادہ ہے۔اس نے اس کائنات کے اندر یہ ناموس اعظم جاری کیا ہے۔اسی طرح وہ لوگ جن کے دل ہدایت کیلئے بے تاب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر راز کھول دیتے ہیں اور ان کی روح ہدایت کو پالیتی ہے۔وہ لوگ جو ادھرادھر سے کچھ معلومات چن لیتے ہیں اور اپنے آپ کو علماء سمجھنے لگتے ہیں' ان کے اس سطحی علم کا پردہ ان کے اور ان دلائل ایمان کے درمیان حائل ہو جاتا ہے جو اس کائنات میں پوشیدہ ہوتے ہیں' اس لئے وہ ایمان تک نہیں پہنچ پاتے۔ ان پر ایمان ظاہر ہی نہیں ہوتا' اس لئے کہ ان کا علم ناقص اور سطحی ہوتا ہے اور یہ سطحی علم اس کائنات کے سوالات کا ادراک نہیں کر سکتا۔ان کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ ان کے دل مائل بہ ایمان وہدایت نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ اس کے شائق ہوتے ہیں۔یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ جس دل میں ہوں وہ ایمان کا ذوق نہیں رکھتا اور نہ اسے نورایمان کی ضرورت ہوتی ہے۔اگر وہ ایمان رکھتا ہے تو اس دین پر رکھتا ہے جو اسے بطور عصبیت جاہلیہ وراثت میں ملا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اس دین سے دور ہو جاتا ہے جو خدائے متعال کی جانب سے نازل ہوا ہے اور جسے سلسلہ رسل کے ذریعے بھیجا گیا ہے۔جس کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں صلی اللہ علیہم وسلم اجمعین۔

تفسیر ماثور میں یہ روایات آئی ہیں' کہ یہ اشارہ سب سے پہلے ان لوگوں کی طرف ہے جو لوگ یہودیوں میں سے اپنے رسوخ فی العلم کی وجہ سے ہدایت پاگئے تھے۔جنہوں نے رسول کی دعوت پرلبیک کہا اور جن کے نام ہم نے گذشتہ سطور میں دے دیئے ہیں لیکن یہ آیت عام ہے اور اس کے مفہوم میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو کبھی بھی اپنے رسوخ فی العلم کی وجہ سے اس دین میں شامل ہوں گے یا وہ اپنی ایمانی بصیرت کی وجہ سے دین اسلام کو قبول کرلیں گے ہیں خواہ تاریخ کے کسی بھی دور میں ہوں۔ ((مثلاً ڈاکٹر محمد اسد 'حقیقت حال اللہ ہی جانتا ہے۔))

(لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا (٤:١٦٢))

مگر ان میں سے جو لوگ پختہ علم رکھنے والے ہیں اور ایماندار ہیں وہ سب اس تعلیم پر ایمان لاتے ہیں جو اے نبی' تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھی - اس طرح کے ایمان لانے والے اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی کرنیوالے اور اللہ اور روز آخرت پر سچا عقیدہ رکھنے والے لوگوں کو ہم ضرور اجر عظیم عطا کریں گے -

(الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ) جو اگلی پچھلی کتابوں پر ایمان لاتے ہیں اور ایمان لانے والے اور اقامت صلوٰۃ کرنے والے' یہ صفات اہل ایمان مسلمانوں کی ہیں اس لئے کہ مسلمانوں کی صفت عظیمہ ہی اقامت صلوٰۃ' ایتائے زکوٰۃ' ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہے - ان دونوں کیلئے اجر کا اعلان ہوتا ہے کہ ان کو ہم اجر عظیم عطا کریں گے -

یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کے والمقیمین میں عطف المومنوں پر ہے - جبکہ المومنوں کا اعراب رفعی ہے - اس لحاظ سے والمقیمون ہونا چاہئے - لیکن اسے اعراب حالت نصبی کا دیا گیا یعنی اخص المقیمین (میں نماز قائم کرنیوالوں کا ذکر خصوصیت سے کرتا ہوں -) یہ اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ اقامت صلوٰۃ کی اہمیت دین میں کس قدر عظیم ہے - اس طرز ادا کے نظائر کلام عرب اور قرآن مجید میں بالعموم پائے جاتے ہیں اور اس سے سیاق کلام میں کسی بات کی تائید مطلوب ہوتی ہے - عام قراءت تو یہی ہے - البتہ ایک قراءت والمقیمون بھی آتی ہے اور یہ عبداللہ ابن مسعود ﷺ کے مصحف میں وارد ہے -

---ooo---

سیاق کلام کی مناسبت سے اہل کتاب کے ساتھ مکالمہ جاری ہے اور اس جگہ یہ بات بالخصوص یہودیوں کے ساتھ ہو رہی ہے - یہ بات حضرت محمد ؐ کی رسالت کے بارے میں ہو رہی ہے جس کی وہ تکذیب کرتے تھے - اسی طرح وہ اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق کرتے تھے اور اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے رسول اللہ ؐ سے نشانات و معجزات کا مطالبہ کرتے تھے - مثلاً یہ کہ آپ آسمان سے ایک کتاب اتار کر لائیں ........ چنانچہ یہاں کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد ؐ پر وحی کا آنا کوئی نئی بات نہیں ہے نہ یہ کوئی اعجوبہ ہے - رسول بھیجنا تو اللہ کی سنت ہے اور اس سنت پر اللہ تعالیٰ حضرت نوح سے لیکر حضرت محمد ؐ کے دور تک عمل پیرا رہے ہیں - یہ سب رسول' اللہ نے خوشخبری دینے اور ڈرانے کیلئے بھیجے ہیں - یہ اپنے بندوں کے ساتھ اللہ کی شفقت اور رحمت کا تقاضا تھا - نیز اللہ تعالیٰ نے رسول اس لئے بھی بھیجے کہ وہ اپنے بندوں پر حجت تمام کرنا چاہتا تھا اور یوم الحساب آنے سے پہلے انہیں خبردار اور متنبہ کرنا چاہتا تھا - یہ سب حضرات ایک ہی وحی لیکر آئے - ان کا مقصد ایک تھا' اس لئے ان کے درمیان تفریق کرنا محض ضد اور ہٹ دھرمی ہے اور اس کی کوئی دلیل نہیں ہے - اگر وہ ضد اور ہٹ دھرمی کرکے انکار کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ خود اس پیغمبر کی وحی پر شاہد عادل ہے - اس

کی شہادت کے بعد اب کسی اور کی شہادت اور تصدیق کی ضرورت ہی نہیں رہتی ۔ اور اس اللہ کی گواہی پر پھر فرشتے بھی گواہ ہیں ۔ فرماتے ہیں ۔

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَّ النَّبِيِّـۧنَ مِنۢ
بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَـٰعِيلَ وَإِسْحَـٰقَ وَيَعْقُوبَ
وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَـٰرُونَ وَسُلَيْمَـٰنَ ۚ وَءَاتَيْنَا
دَاوُۥدَ زَبُورًا ﴿۱۶۳﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَـٰهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَ
رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ﴿۱۶۴﴾ رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ
وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ
اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿۱۶۵﴾

”اے نبی! ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوح علیہ السلام اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی ۔ ہم نے ابراہیم علیہ السلام ' اسماعیل علیہ السلام ' اسحاق علیہ السلام ' یعقوب علیہ السلام اور اولاد یعقوب علیہ السلام ' عیسیٰ علیہ السلام ' ایوب علیہ السلام ' یونس علیہ السلام ' ہارون علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی ۔ ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور دی ۔ ہم نے ان رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا ۔ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے اس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے ۔ یہ سارے رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے اور اللہ بہرحال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے ۔“

غرض یہ ایک قافلہ ہے جو شاہراہ تاریخ پر چلتا ہوا نظر آتا ہے اور اس سلسلے کی کڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہیں ۔ یہ ایک ہی رسالت ہے اور اس کا ایک ہی نصب العین ہے کہ انسان کو قبل از وقت خبردار کر دیا جائے اور اچھے لوگوں کو قبل از وقت ہی اچھے انجام کی خوشخبری دیدی جائے ۔ اس قافلے میں آگے پیچھے مختاران درگاہ الٰہی اور انسانوں میں سے چیدہ لوگ آگے پیچھے چلے آرہے ہیں ۔ یہ رہے حضرت نوح علیہ السلام ' یہ رہے حضرت ابراہیم علیہ السلام ' یہ آئی سواری حضرت اسماعیل کی ۔ ان کے بعد یہ چلے آرہے ہیں حضرت اسحاق علیہ السلام ان کے بعد متصلاً حضرت یعقوب آرہے ہیں ۔ اب

کچھ مختلف گروہ نمودار ہوئے۔ حضرت ایوب علیہ السلام ' یونس علیہ السلام ' ہارون علیہ السلام ' سلیمان علیہ السلام ' داؤد علیہ السلام ' موسیٰ علیہ السلام ' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے۔ اپنی اپنی باری پر اور بعض ایسے لوگ بھی چلے آئے ہیں جن کے نام سے ہم واقف نہیں ہیں۔ آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین تشریف لا رہے ہیں اور اب اس قافلے کا آخری سرا اختتام کو پہنچا۔ اس قافلے میں بعض لوگ ایسے ہیں جن کا ذکر قرآن کریم نے پیش کیا۔ اس قافلے میں مختلف رنگوں اور مختلف نسلوں کے نبی ہیں اور کرۂ ارض کے مختلف علاقوں میں یہ قافلہ نظر آتا ہے۔ اور مختلف ادوار اور مختلف زمانوں میں ' مختلف معاشروں اور مختلف خاندانوں میں یہ رسول کام کرتے رہے۔ یہ سب ایک ہی مصدر اور منبع سے پیغام لاتے رہے۔ یہ سب راہ دکھانے والی ایک ہی روشنی کے حامل رہے۔ سب کے سب متنبہ اور خبردار کرتے رہے اور خوشخبری دیتے رہے۔ یہ سب کے سب قافلہ انسانیت کی زمام اپنے ہاتھ میں لیکر اسے نور ہدایت میں داخل کرتے رہے۔ چاہے کوئی کسی ایک خاندان کیلئے آیا ہو' چاہے کوئی کسی ایک قوم کیلئے آیا ہو' چاہے کوئی ایک شہر اور ایک علاقے کیلئے آیا ہو' چاہے کوئی تمام انسانوں کیلئے آیا ہو اور خاتم النبیین کا لقب پایا ہو۔

یہ سب کے سب اللہ وحدہ سے وحی پاتے رہے۔ ان میں سے کسی نے کوئی بات اپنی طرف سے پیش نہیں کی۔ ان میں سے اگر اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے براہ راست بات کی تو وہ بھی وحی کا ایک رنگ تھا۔ اس کیفیت سے ہم آگاہ نہیں ہیں نہ اس کا ادراک کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ قرآن کریم آخری وحی کا ریکارڈ ہے اور یہ اس قدر درست ریکارڈ ہے جو ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا ہے اور قرآن نے اس ہم کلامی کی کوئی تفصیل یا کیفیت بیان نہیں کی ہے۔ اس کی کیفیت کیا تھی؟ موسیٰ علیہ السلام اپنے کن خواص اور کس قوت ادراک سے اسے پا رہے تھے۔ یہ سب باتیں غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ قرآن کریم نے ان کے بارے میں کوئی بات بیان نہیں کی ہے۔ اور قرآن کریم کے علاوہ اس موضوع پر جو کوئی بھی اپنے ذہن سے بات کرے گا وہ بے سند' فلسفہ یا قصہ کہانی ہوگی۔

یہ رسول' جن میں سے بعض کے نام ذکر ہوئے اور بعض کے نام نہیں لئے گئے کیوں بھیجے گئے؟ اللہ کی شفقت اور رحمت اور عدالت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ رسول بھیجے۔ تاکہ وہ اللہ کے بندوں میں سے مومنین اور اطاعت کنندگان کو خوشخبری دیدیں کہ اللہ نے ان کیلئے کیا کیا نعمتیں تیار کی ہوئی ہیں۔ بے شمار نعمتیں اور اللہ کی رضامندی ان کے انتظار میں ہے۔ اور کافروں اور نافرمانوں کو ڈرائیں کہ اللہ کا غضب اور ایک دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔ اور یہ سب کچھ کیوں کیا گیا۔ (لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (۴: ۱۶۵)) "تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے۔" اور یہ رسول لوگوں کو بتا دیں کہ انکے نفس اور انکے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کے اندر کیا کیا دلائل ہیں۔ انہیں بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے جنس بشر کو متاع عقل سے نوازا ہے اور ان کا فرض ہے کہ وہ اس کے ذریعے اپنے نفسوں اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کے اندر دلائل تلاش کریں۔ عقل کے ہوتے ہوئے بھی ان کے پاس رسول بھیجے گئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے بندوں پر خاص شفقت اور رحمت تھی کہ اس نے رسول بھیجے کیونکہ اسے معلوم تھا کہ انسان کی ذاتی خواہشات اور اس کے میلانات اس کی عقل پر غالب آجائیں گے اور ان کے نتیجے یہ عظیم قوت دب کر رہ جائے گی۔ اسی لئے اللہ نے اپنی رحمت خاصہ کے تحت ان کے پاس رسول بھیجے جو مبشرین اور منذرین تھے۔ وہ ان کے سامنے یاد دہانی کراتے رہے۔ انہیں بصارت اور بصیرت دیتے

رہے۔ وہ ان کی فطرت اور ان کی قوت عقلیہ کو شہوات نفسانیہ کے ڈھیروں کے نیچے سے نکال کر آزاد کراتے رہے۔ جن ڈھیروں کے نیچے رہتے ہوئے اس کی عقل اور فطرت کیلئے دلائل ہدایت اور ایمان کے تقاضوں کو پانا مشکل ہو گیا تھا۔ چاہے یہ دلائل خود نفس انسانی کے اندر ہوں یا اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی اس کائنات کے اندر ہوں۔

(وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (٤: ١٦٥)) "اور اللہ بہرحال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے۔" وہ غالب اس طرح ہے کہ اس کے بندے جب جرائم کا ارتکاب کریں ان پر وہ گرفت کرسکتا ہے۔ حکیم و دانا اس طرح ہے کہ وہ اس کائنات کے تمام امور کو اپنی حکمت کے مطابق چلاتا ہے۔ ہر معاملے کو اپنی جگہ پر طے کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کیلئے جو تقدیرات اور جو اندازے طے کئے ہیں وہ سب حکمت اور اپنی مشیت کے مطابق کئے ہیں۔

---ooo---

اب ذرا اس منظر کے سامنے رکئے! (لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (٤: ١٦٥)) "تاکہ ان رسولوں کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے۔" اس منظر میں تو ہدایات و اشارات کا ایک ذخیرہ پنہاں ہے۔ گہرے اشارے اور واضح ہدایات۔ ہم ان میں سے دو تین کا ذکر کرتے ہیں اور وہ بھی ظلال القرآن کی مناسبت سے نہایت ہی مختصر۔

اس آیت سے پہلی بات جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ نظام دین میں انسانی عقل کا مقام کیا ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ اور انسان کے اہم ترین مسائل مثلاً مسئلہ ایمان کے سلسلے میں عقل کی اہمیت کیا ہے؟ اس لئے کہ ایمان کی بنیادوں پر لوگوں کی زندگی کا نظام استوار ہونا تھا۔ اور زندگی کے تمام عناصر' اس کے تمام رجحانات' اس کی پوری عملی شکل اور اس کی کائنات میں اس کے تمام تصرفات کو ایمانی نظریے پر استوار ہونا تھا' جس طرح عالم آخرت میں اس کا انجام تمام کا تمام اس ایمان پر موقوف تھا۔

اگر اپنی قوتوں کے بل پر (اور اللہ انسان اور اس کی قوتوں کے بارے میں سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہے' اور ان قوتوں کو انسان کے اندر خود اللہ نے ودیعت کیا ہے) یہ انسان صرف اپنی اس عقل کے ذریعہ ہدایت پا سکتا اور اپنی ذات اور اپنی حیات کیلئے راہ مصلحت تلاش کر سکتا' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اپنے لئے خیر ڈھونڈ سکتا تو اللہ تعالیٰ پوری انسانی تاریخ میں اس طویل سلسلہ رسل کو ہرگز نہ جاری فرماتا اور لوگوں پر بذریعہ رسل حجت تمام نہ کرتا اور انسان اپنی اس عقل کے بل بوتے پر اپنے لئے دلائل ہدایت اور ایمان و یقین کے اشارات تلاش کر لیتا۔ یہ دلائل وہ اپنے نفس سے بھی معلوم کر لیتا اور اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کے آفاق کے اندر سے بھی وہ ان کو ڈھونڈ لاتا۔ وہ اپنے لئے ایک ایسا نظام زندگی بھی گھڑ لیتا جس سے اس کی زندگی کے تمام مسائل ہو جاتے۔ وہ راہ حق اور صراط مستقیم پر سیدھا چلتا۔ سلسلہ رسل کی سرے سے ضرورت نہ رہتی' ان کی تبلیغی سرگرمیوں کی ضرورت نہ رہتی' اور اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتے کہ اگر رسول نہ ہوتے تو لوگوں کے پاس حجت ہوتی۔ جیسا کہ کہا گیا۔ (لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (٤: ١٦٥)) "تاکہ ان رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے خلاف کوئی حجت نہ رہے۔" لیکن اللہ تعالیٰ کو خوب علم تھا کہ اس نے انسان کو عقل کا جو ذریعہ ادراک اور آلہ فہم دیا ہے وہ بذات خود ان امور کے ادراک

سے قاصر ہے اور محض عقل انبیاء کی راہنمائی کے بغیر' رسولوں کی تنظیم اور معاونت کے بغیر ہدایت تک نہیں پہنچ سکتی۔ نیز رسولوں کی راہنمائی کے بغیر اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ پوری انسانی زندگی کیلئے کوئی اور منہاج حیات وضع کر لیں جس میں ان کی پوری پوری مصلحت ہو اور وہ ان کیلئے دنیا اور آخرت دونوں میں اچھے انجام کا ضامن ہو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کو عقل انسانی کی کوتاہ دامنی کا اچھی طرح علم تھا' اسی لئے اللہ کی حکمت اور اس کی شفقت کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ لوگوں کیلئے رسول بھیجے اور یہ کہ رسالت اور تبلیغ ہدایت کے بغیر لوگوں سے کوئی مواخذہ نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ (وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا) ''ہم اس وقت تک عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک ہم رسول نہ بھیج دیں۔'' اور یہ بات اس قدر بدیہی ہے کو آیت سے قطعاً ثابت ہوتی ہے اور اگر قطعاً ثابت نہیں ہوتی تو اس آیت کا لازمی تقاضا ضرور ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایمان و ہدایت کے میدان میں اور ایمان و ہدایت کی اساس پر تفصیلی نظام زندہ قیام کے معاملے میں پھر عقل کا کردار ہی کیا رہ جاتا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عقل انسانی کا کردار یہ ہے کہ وہ رسولوں سے ہدایت اخذ کرنے کے سلسلے میں اپنے فرائض ادا کرے۔ عقل کا فرض ہے کہ رسولوں کی دعوت پر غور و فکر کرے۔ رسولوں کے فرائض صرف اس حد تک ہیں کہ وہ پہنچا دیں اور سمجھا دیں اور انسانی فطرت کے اوپر جو غلط افکار کے تہہ بہ تہہ ڈھیر ہیں انہیں صاف کر کے فطرت کو ان کے نیچے سے نکال دیں' اور انسان کو اس طرف متوجہ کر دیں کہ اس کے نفس اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کے اندر معرفت کردگار (خالق) کے واضح دلائل موجود ہیں۔ اس کیلئے یہ رسول صحیح نظام تربیت اور صحیح منہاج مطالعہ کائنات وضع کر دیں اور انسانوں کیلئے نظام زندگی تجویز کر دیں جس پر ان کی زندگی کا قافلہ رواں اور دواں ہو جائے اور جس میں ان کی دنیا اور آخرت کی خیر ہو۔

عقل کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ دین اور الہیات کے معاملے میں' ان موضوعات کی صحت اور بطلان کے بارے میں مفتی اور جج بن جائے۔ اسے اختیار ہو کہ جو چاہے وہ قبول کرے اور جس چیز کو چاہے اسے رد کر دے جبکہ وہ بات قرآن و سنت سے یقینی طور پر ثابت شدہ ہو یہ بعد کہ اس بات کا مفہوم واضح طور پر سمجھ میں آگیا ہو۔ یعنی نصوص قرآنی کے لغوی اور اصطلاحی مدلولات کی روشنی میں۔ اگر عقل انسانی کو رد و قبول کا یہ اختیار ہوتا یعنی صحیح مفہوم و مدلول کے ادراک کے بعد' بایں طور کہ ہماری عقل اس مدلول کو قبول نہیں کرتی' یا اسے قبول کرنا نہیں چاہتی تو پھر خدا اور رسول کے بیان کے بعد انسان مستحق عذاب قرار نہ پاتا۔ لہٰذا عقل اس بات کی پابند ہے کہ وہ ضروریات دین کو قبول کرے۔ اگر یہ عقائد اس تک صحیح طرح پہنچ جائیں اور جب عقل صحیح طور پر ان نصوص کے مفہوم و مراد کو سمجھ بھی جائے۔

حضور اکرم ؐ کی رسالت عقل کو مخاطب کرتی ہے۔ وہ عقل کو جگاتی ہے' اس کیلئے فکر و نظر کا ایک درست منہاج وضع کرتی ہے اور اسے صحیح راہ پر ڈالتی ہے۔ لیکن یہ خطاب اس مفہوم میں نہیں ہے کہ عقل کو اس رسالت کے صحیح ہونے یا اس کے باطل ہونے کا فیصلہ صادر کرنے کا اختیار ہے یا وہ ایسا کر سکتی ہے۔ یا امور رسالت میں اسے رد و قبول کا اختیار حاصل ہے' بلکہ یہ خطاب اس مفہوم میں ہے کہ جب نص سے کوئی امر ثابت ہو جائے تو وہی اللہ کا حکم ہو گا اور عقل انسانی کا فرض ہے کہ اسے قبول کرے۔

اس کی اطاعت کرے اور اسے اس کرۂ ارض پر نافذ کرے - چاہے نص کا یہ مفہوم اس کے ذہن کیلئے مالوف و مقبول ہو یا اس کیلئے عجیب و غریب ہو۔

عقل انسانی کا کردار اس بات میں صرف اس قدر ہے کہ وہ نصوص کو سمجھنے کی صحیح کوشش کرے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ لغت عربی اور اصطلاحات شریعت کے مطابق اس نص کا مفہوم کیا بنتا ہے - یہاں آکر عقل کا کام ختم ہو جاتا ہے اور نص شریعت سے جو صحیح مفہوم اخذ ہوتا ہے اسے کسی عقلی دلیل اور قیاس سے رد نہیں کیا جاسکتا' اس لئے کہ جہاں تک نص کا تعلق ہے وہ اللہ کی جانب سے ہے - محض عقلی توجیہ نص سے برتر نہیں ہو سکتی اس لئے کہ عقل اللہ کا درجہ نہیں رکھتی نہ وہ اللہ کی نصوص کے اوپر رد و قبول کا درجہ رکھتی ہے -

اس اہم نکتے پر خیالات کے اندر ایک عظیم التباس پیدا ہو جاتا ہے - بعض لوگ ایسے ہیں جو عقل انسانی کو اللہ کا درجہ دیدیتے ہیں - اپنے معاملات پر بھی اسے حکم قرار دیتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو ایمان و ہدایت کے میدانوں میں عقل کو دخل اندازی کی ذرہ بھر اجازت نہیں دیتے - صحیح منہاج وہی ہے جو اوپر ہم نے بیان کر دیا ہے - وہ یہ کہ رسالت نے عقل کو مخاطب کیا ہے تاکہ وہ رسالت کے فیصلوں کو سمجھنے کی کوشش کرے - رسالت اپنے عملی اور نظریاتی فیصلوں کے بارے میں عقل کیلئے بھی ایک منہاج بناتی ہے تاکہ وہ بھی اپنے دائرے کے اندر کام کرے - پوری زندگی میں رسالت کے فیصلوں کا ادراک کرے - جب عقل نے رسالت کے فیصلوں کو سمجھ لیا کہ نصوص شریعت و رسالت کا مفہوم کیا ہے تو پھر عقل کیلئے تصدیق' اطاعت اور ان کے نفاذ کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں رہتا - شریعت یہ لازم نہیں کرتی کہ وہ مفاہیم نصوص سمجھے بغیر ان پر عمل کرے بلکہ شریعت کا مدعا یہ ہے کہ نصوص شریعت پر سمجھ کر عمل کیا جائے - لیکن جب عقل ان کا ادراک کر لے تو اس پر فرض ہو جاتا ہے کہ پھر ان پر عمل پیرا ہو اور کوئی چون و چرا نہ کرے - نصوص کے مفاہیم کے مطابق بات کو قبول کرے - اور نصوص کا مقابلہ اور چون و چرا یہ ہوگا کہ ان میں سے بعض کو قبول کرے اور بعض کو رد کرے - بعض کو صحیح قرار دے اور بعض کو غلط قرار دے' باوجود اس علم کے کہ یہ نصوص و ہدایات اللہ کی جانب سے آئی ہوئی ہیں - اللہ وہی بات کرتا ہے جو حق ہوتی ہے اور وہ جو حکم بھی دیتا ہے اس میں بھلائی ہوتی ہے -

اسلامی منہاج حیات میں اللہ سے ہدایت پانے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ نصوص قرآن و سنت کا صحیح مفہوم پا لینے کے بعد اس میں عقلی گھوڑے نہ دوڑائے جائیں یہ فہم اصول فہم کے مطابق ہو - انسان قرآن و سنت کا مطالعہ اپنے ذہن میں بعض فیصلے پہلے سے طے کرکے نہ کرے - اس طرح کہ اپنے دین میں بعض منطقی نتائج طے کر لے یا اپنے محدود ملاحظے سے کچھ باتیں طے کر لے یا اپنے ناقص تجربات کے مطابق بعض چیزوں کو حقائق سمجھ لے اور اس کے مطابق قرآن و سنت کو ڈھالنے کی سعی کرے - صحیح منہاج مطالعہ یہ ہے کہ وہ نصوص کو اس طرح لے جس طرح کہ وہ ہیں اور نصوص نے جو فیصلے کر لئے ہیں وہ بہرحال فیصلے ہیں اور وہ اس کی ذاتی سوچ سے بہتر ہیں اور ان کا نظام اور ان کا منہاج اس کے ذاتی منہاج سے زیادہ مضبوط ہے اس لئے عقل دین کے فیصلوں پر کوئی محاکمہ نہیں کر سکتی - جب عقل کے نزدیک یہ بات ثابت ہو جائے کہ یہ فیصلہ دین کا ہے - لوگوں کے بتائے ہوئے فیصلے اصول دین پر برتری حاصل نہیں کر سکتے ہیں - عقل بہرحال ان دینی ضوابط کی تابع ہوگی - بشرطیکہ دین کے ضوابط اور پیمانے اچھی طرح ثابت ہو کر سامنے آجائیں -

عقل کو اللہ کا درجہ حاصل نہیں ہے کہ وہ یہ قرار دے کہ اس نے جو نتائج اخذ کر لئے ہیں وہ اللہ کے فیصلے ہیں ہاں

عقل انسانی کو یہ حق ضرور حاصل ہے کہ وہ کسی نص کا کوئی مفہوم انسانی عقل کے مطابق 'کسی دوسرے مفہوم کے مقابلے میں پیش کرے جو بذات خود بھی عقلی مفہوم ہو۔ یہ تو عقل انسانی کا دائرہ کار ہے اور اس میں عقل پر کوئی پابندی نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی حرج ہے بشرطیکہ نصوص کا یہ مفہوم و ادراک صحیح اور اصولوں کے دائرے کے اندر ہو مقصود تاویل نصوص اور افہام و تفہیم ہو اور نصوص کے اندر تاویل کی گنجائش موجود ہو۔ یہ تاویل اور تفہیم بھی ان قواعد اور ضوابط کے اندر ہو' جو اس مقصد کیلئے خود دین نے وضع کئے ہیں۔ یہ قواعد ایسے ہیں جو انسانوں کی حریت فکر کی تمام ضروریات کو پورا کرتے ہیں اور انسان کے فہم و ادراک کیلئے ایک وسیع میدان فراہم کرتے ہیں۔ اسلامی نظام میں کوئی ایسا ادارہ 'کوئی ایسی اجتماعی پابندی اور کوئی ایسا عہدیدار نہیں ہے جسے ذہنوں پر تالے لگانے کا اختیار ہو کہ لوگ نصوص شرعیہ کے اندر غور و فکر نہیں کر سکتے۔ ان کے انطباق کیلئے کوئی اچھی رائے نہیں دے سکتے یا کوئی معقول وجوہ پیش نہیں کر سکتے۔ بشرطیکہ کوئی شرعی نص ان آراء' ان تاویلات اور وجوہات کی متحمل ہو اور یہ تاویلات بھی اسلامی نظام کے حدود کے اندر ہوں اور اصول دین پر مبنی ہوں۔ یہ ہے مفہوم اس بات کا کہ رسالت محمدیہ عقل کو خاطب کرتی ہے۔

بے شک اسلام ایک عقلی دین ہے۔ وہ اپنے مسائل 'عقائد اور فیصلے عقل کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور اسلام یہ فیصلے اور عقائد انسانوں سے فوق الفطری انداز میں نہیں منواتا کہ ماننے کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہ رہے بلکہ وہ عقلی دین اس مفہوم میں ہے کہ وہ عقل سے مخاطب ہوتا ہے اور اسے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ وہ اس کے سامنے ہدایت اور صراط مستقیم پر آنے کے دلائل پیش کرتا ہے کہ وہ اپنے نفس اور اپنے آفاق کے اندر پائے جانے والے ان نشانات راہ پر غور کرے اور انسان کی اصلی فطرت کو ان عادات و تقالید کے تہ بہ تہ جمے ہوئے پردوں اور ڈھیروں کے نیچے سے نکالے۔ نیز یہ کہ عقل اپنے آپ کو گمراہ کن خواہشات اور عقل و فطرت پر چھا جانے والے موثرات سے نکال لے۔ قرآن کریم عقل کو اس لئے خطاب کرتا ہے کہ قرآن نے اپنے نصوص کے اندر جو امور طے کر دیئے ہیں وہ ان پر غور و فکر کر کے ان کو تسلیم کرے۔ اور قرآن کریم کا یہ انداز نہیں ہے کہ وہ بغیر سمجھانے کے لوگوں کو بات تسلیم کرنے پر مجبور کرے۔ ہاں جب عقل کو کام میں لاکر انسان کسی نص کا مفہوم و مدلول پالے اور حقائق کا ادراک کرے تو پھر اس کیلئے سر تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے۔ سمجھنے کے بعد اگر وہ تسلیم کرلیں تو مومن ہیں اور اگر تسلیم نہ کریں تو کافر ہیں۔ رہے قرآنی اور اسلامی فیصلے تو وہ عقل کے سامنے پیش کئے جانے سے پہلے ہو چکے ہیں۔ عقل کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ وہ درست ہیں یا غلط ہیں۔ نہ عقل کو اختیار ہے کہ فہم و ادراک کے بعد اسلامی فیصلوں کو رد کر سکے۔ آج کل بعض لوگ عقل کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ اسلامی فیصلوں کو رد کرے۔ ایسے لوگوں کے نزدیک ان کی عقل ان کا الٰہ بن جاتی ہے۔ اب ان کا یہ الٰہ شریعت کے جن فیصلوں کو چاہے قبول کرلے اور جن کو چاہے انہیں رد کر دے۔ جن امور کو چاہے چن لے اور جن کو چاہے چھوڑ دے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ (اَفَتُؤمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتَابِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ) کیا تم کتاب کے بعض حصے پر ایمان لاتے ہو اور بعض سے کفر کرتے ہو۔" یہ طرز عمل کافرانہ ہے اور ایسے لوگوں کو آخرت میں سخت سزا دی جائے گی۔

اب اللہ تعالیٰ نے چاہے اس کائنات کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا' یا انسان کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا' یا کسی بھی

دوسری مخلوق کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا یا اللہ تعالیٰ نے قانون میراث کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا یا فرائض و نواہی کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا تو اللہ کے یہ تمام فیصلے واجب القبول ہیں اور جن تک یہ فیصلے پہنچیں اور وہ ان فیصلوں کے مدلولات کا ادراک کرلیں تو ان کیلئے ان فیصلوں کو قبول کرنا فرض ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

(اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ) (۶۵ : ۱۲)) "اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہیں کے مانند....." (وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ) (۲۴ : ۴۵)) "اور اللہ نے ہر جاندار ایک طرح کے پانی سے پیدا کیا۔" (خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (۱۴) وَ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (۱۵)(۵۵ : ۱۴-۱۵)) (انسان کو اس نے ٹھیکری جیسے سوکھے سڑے گارے سے بنایا، اور جن کو آگ کی لپٹ سے پیدا کیا۔) یہ اور اس قسم کی بے شمار آیات ہیں جن کا تعلق اس کائنات کی نوعیت اور زندہ اور مردہ اشیاء کی ماہیت سے ہے۔ پس اللہ نے جو کچھ کہہ دیا وہ حق ہے۔ اب عقل کیلئے یہ مجال نہیں ہے کہ وہ یہ کہے کہ یہ باتیں تو میرے فیصلوں کے اندر اس طرح نہیں ہیں یا میرے فہم و ادراک میں یہ بات نہیں سماتی یا یہ بات ابھی میرے تجربے کے اندر نہیں آئی۔ اس لئے کہ ان معاملات میں عقل نے جو فیصلے کئے ہیں وہ درست بھی ہوسکتے ہیں اور غلط بھی ہوسکتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کہہ دیا ہے وہ درست ہی ہوسکتا ہے اور اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ البتہ ہماری فہم نصوص کے صحیح مفہوم کا ادراک کرنے میں غلطی کرسکتی ہے اور یہ بات اس صورت میں ہے کہ نصوص کے صحیح مفہوم کا ہم ادراک کرلیں۔ اسی طرح دوسری آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ (وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ) (۵ : ۴۴)) (جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں۔

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۲۷۸) فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲۷۹) (۲ : ۲۷۸-۲۷۹))

"اے لوگوں جو ایمان لائے ہو، خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اب بھی توبہ کرلو (اور سود چھوڑ دو) تو اپنا اصل سرمایہ تم لینے کے حقدار ہو۔ نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

(وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى) (۳۳ : ۳۳)) "اپنے گھروں

میں تنگ کر رہو اور سابق دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔" (وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ (۲۴: ۳۱)) "اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں۔" یہ اور انسانی زندگی کے بارے میں دوسری آیات و ہدایات ایسی ہیں کہ ان میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہی سچ ہے اور ان کے بارے میں عقل کو یہ کہنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ عقل کے مطابق فلاں اور فلاں باتوں میں مصلحت زیادہ ہے' جو اللہ کے فیصلوں کے خلاف ہوں یا وہ ایسی باتیں ہوں جن کی اجازت اللہ تعالیٰ نے نہ دی ہو اور اسے لوگوں کیلئے قانون قرار نہ دیا ہو۔ جس امر میں عقل کو مصلحت نظر آتی ہے اس میں خطا اور صواب دونوں کا امکان ہے اور وقتی جذبات اور خواہشات نفسانیہ کا دخل اس میں عین ممکن ہے اس لئے اللہ تعالیٰ جو فیصلہ فرماتے ہیں وہ درست ہی ہوسکتا ہے اور اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے جن عقائد اور تصورات کی تلقین کی ہے' یا زندگی کا جو منہاج اور طریق کار تجویز کیا ہے ان کے بارے میں عقل کا موقف جو ہو سو ہو' جب تک نص صحیح ہے' قطعی الدلالت ہے اور کسی وقت کے ساتھ موقت نہیں ہے۔ اس بارے میں ہم عقل کو یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ یہ کہے کہ جہاں تک عقائد و نظریات کا تعلق ہے وہ تو ہم نصوص کے مطابق لیتے ہیں۔ رہا زندگی کا تفصیلی نظام تو اس بارے میں بات یہ ہے کہ اب زمانہ بہت ہی بدل گیا ہے اور نہایت ہی ترقی یافتہ ہے۔ اس لئے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کہ نصوص شرعیہ کسی خاص وقت تک ہی موثر ہوں تو اللہ تعالیٰ اسی طرح کرسکتا تھا۔ جب تک کوئی نص مطلق ہے تو وہ جس طرح زمانہ نزول کے وقت موثر تھی اسی طرح وہ آخری زمانے میں بھی موثر ہوگی ورنہ یہ بات لازم آئے گی کہ ہم اللہ میاں کو قصوروار ٹھہرانے کی جسارت کریں جو ہر قسم کے نقائص سے پاک و صاف ہے۔

سوال یہ ہوگا کہ کیا اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا ہے؟ نہیں اجتہاد اس میں ہوگا کہ ہم کسی جزئی صورت حال پر کسی نص کی تطبیق کریں۔ یہ اجتہاد نہیں ہے کہ ہم ایک عام اصول میں یا حکم میں کوئی تبدیلی کریں یا اسے رد کردیں' کسی دور میں یا کسی نسل میں اصول عقل میں سے کسی اصول کے تحت کوئی بات کریں۔

درج بالا جو معروضات ہم نے پیش کی ہیں' ان میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو حیات انسانی کے اندر عقل و خرد کی اہمیت کو کم کر رہی ہو اس لئے کہ اسلامی نصوص اور اصولوں کو جدید سے جدید تر حالات پر منطبق کرنے کا ایک وسیع میدان کار عقل کیلئے کھلا ہے۔ جبکہ عقل اسلامی نقطہ نظر اور اسلامی پیمانوں کا اچھی طرح ادراک کرے جو صحیح خطوط پر فہم دین سے مستفاد ہیں۔ اس سے بھی زیادہ وسیع میدان اس کائنات کے اصول طبیعی' اس کی قوتوں اور اس کے اندر پوشیدہ ذخائر کا ہے۔ اس کائنات کا مزاج' اس کے اندر رہنے والی مخلوقات کا علم' ان قوتوں کے استفادے کے ذرائع اور اس میں زندہ مخلوقات کیلئے زندگی آسان بنانے کے ذرائع و اسباب عقل کیلئے وسیع تر میدان ہیں جن میں صرف عقل ہی کام کرسکتی ہے۔ یہاں انسان کو ترقی دی جاسکتی ہے اور حدود اللہ میں رہتے ہوئے اس کی زندگی کے شب و روز بدل سکتے ہیں۔ بہرحال عقل کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ انسانیت کی لگام ہوا و ہوس اور لذت و شہوت کے ہاتھ میں دیدے جہاں عقل ٹھوکر کھاتی ہے اور فطرت خواہشات کے دبیز مادے کے نیچے دب جاتی ہے۔

---○○○---

ذرا پھر رکئے اور اس آیت پر دوبارہ نظر ڈالئے (لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (٤: ١٦٥)) "تاکہ رسولوں کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے۔" اس آیت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کے کاندھوں پر کس قدر عظیم ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں اور اس کے بعد جو لوگ انبیاء علیہم السلام کی رسالت پر ایمان لانے والے ہیں ان پر تمام انسانوں کے حوالے سے کس قدر عظیم ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں۔ فی الواقعہ یہ عظیم اور بھاری ذمہ داریاں ہیں۔

تمام لوگ جو اس دنیا میں آباد ہیں ان کے انجام' دنیا اور آخرت دونوں میں' رسولوں اور رسولوں کے متبعین کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مثلاً رسول اور ان کے متبعین اللہ کے پیغام کو ان تک پہنچانے کے ذمہ دار ہیں اور اس تبلیغ کے نتیجے ہی میں لوگوں کی خوش بختی اور بد بختی کا فیصلہ ہو گا' اس تبلیغ اور دعوت ہی کے نتیجے میں ثواب اور عتاب کے وہ مستحق ہوں گے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

بے شک یہ ایک ہولناک اور خوفناک اور عظیم ذمہ داری ہے لیکن اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام رسل علیہم السلام اپنی اس عظیم ذمہ داری کا شدید احساس رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ بھی ان کو اس بوجھ سے اچھی طرح آگاہ فرما دیتے تھے جو ان پر ڈالدیا گیا تھا۔ یہی وہ بات ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے کہتے ہیں۔ (اِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا (٧٣: ٥)) "ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنیوالے ہیں۔" اور اس کیلئے تیاری یوں ہوگی۔ (يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (١) قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيلًا (٢) نِّصْفَهُ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا (٣) اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيلًا (٤) اِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا (٥) (٧٣: ١-٥)) "اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے' رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم' آدھی رات' یا اس سے کچھ کم کر لو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنیوالے ہیں۔"

(اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيلًا (٢٣) فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (٢٤) وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيلًا (٢٥) وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا (٢٦) (٧٦: ٢٣ تا ٢٦)) "اے نبی! ہم نے تم پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے۔ لہٰذا تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو' اور ان میں سے کسی بد عمل' یا منکر حق کی بات نہ مانو۔ اپنے رب کا نام صبح اور شام یاد کرو۔ رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو' اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو۔" یہ ہے وہ بات جس کا احساس اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو دلاتے ہیں اور اسے حکم دیتے کہ وہ یہ بات کریں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ اس کی حقیقت اور اہمیت کیا ہے۔

(قُلْ اِنِّي لَنْ يُّجِيرَنِي مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (٧٢: ٢٢)) "کہو

مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی بچا نہیں سکتا اور نہ میں اس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ پاسکتا ہوں۔ میرا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی بات اور اس کے پیغامات پہنچا دوں۔"

(عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا (۲۶) اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا (۲۷) لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (۲۸) (۷۲: ۲۶ تا ۲۸))

"وہ عالم الغیب ہے۔ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا' سوائے اس رسول کے جسے اس نے پسند کرلیا ہو' تو اس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے تاکہ وہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے' اور وہ ان کے پورے ماحول کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے۔"

بے شک یہ ایک خوفناک اور عظیم فریضہ ہے۔ لوگوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ ان کی خوش بختی اور بدبختی کا معاملہ ہے۔ ان کے ثواب اور عذاب کا مسئلہ۔ یہ پوری انسانیت کے انجام کا معاملہ ہے۔ اس فریضے کا خلاصہ یہ ہے کہ اس پیغام کو یا تو لوگوں تک پہنچایا جائے گا تاکہ وہ اسے قبول کریں' اس کی پیروی کریں جس کے نتیجے میں وہ دنیا و آخرت میں فلاح پائیں گے یا ان تک یہ پیغام پہنچے گا تو وہ اسے دور پھینک دیں گے اور دنیا و آخرت دونوں میں بدبختی کا شکار ہوں گے اور یا یہ پیغام ان تک نہ پہنچے گا اور نتیجہ یہ ہو گا کہ لوگوں کے ہاتھ ان کے رب کے خلاف ایک حجت ہاتھ آجائے گی اور ان لوگوں کی اس دنیاوی بدبختی کی ذمہ داری اور ان کی گمراہی کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہوگی جو اس دنیا میں ان تک خدا کا پیغام پہنچانے کے ذمہ دار ہیں اور وہ یہ ذمہ داری پوری نہیں کرتے۔

رہے اللہ کے رسول تو انہوں نے تو اپنی ذمہ داری پوری طرح ادا کر دی۔ انہوں نے اللہ کا پیغام اور امانت لوگوں تک پہنچا دی۔ وہ اپنے رب کے پاس اس حال میں گئے کہ انہوں نے اپنی ذمہ داریاں پوری طرح ادا کر دی تھیں۔ انہوں نے یہ ذمہ داریاں صرف زبانی تبلیغ کی حد تک ہی پوری نہ کی تھیں بلکہ انہوں نے اللہ کے پیغام کو اپنی زندگیوں میں عملی شکل دیکر لوگوں کو دکھایا اور وہ رات اور دن اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے ان مشکلات اور رکاوٹوں کو دور کرتے رہے جو اس پیغام کی راہ میں حائل تھیں۔ یہ مشکلات چاہے شبہات کی شکل میں تھیں جو لوگوں کے ذہنوں میں کھٹک رہے تھے یا گمراہی کی شکل میں تھیں جو لوگوں پر مسلط تھیں یا ایسی قوتوں کی شکل میں تھیں جو طاغوتی قوتیں تھیں اور جو لوگوں کو اس دعوت پر کان دھرنے سے روکتی تھیں اور ان کے دین کیلئے فتنہ بنی ہوئی تھیں۔ خاتم النبیین ؐ نے اپنی عملی زندگی میں اسلام کو پوری طرح نافذ کر کے دکھایا اس لئے کہ آپ آخری مبلغ تھے۔ آپ کی رسالت تمام رسالتوں کا اختتامیہ تھی' تو آپ نے محض زبانی تبلیغ پر اکتفاء نہ کیا۔ آپ نے تلوار اور قوت کے زور سے بھی ان مشکلات اور رکاوٹوں کو دور کیا۔ (حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (۲: ۱۹۳)) "تاکہ کوئی فتنہ نہ رہے اور دین صرف اللہ کیلئے ہو جائے۔" اب یہ بھاری ذمہ داری آپ کے بعد ان لوگوں پر آپڑتی ہے جو آپ کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں۔ زمانے

گزر گئے 'نسلوں کی نسلیں گزر گئیں اور گزرتی رہیں گی - حضور ؐ کے بعد تبلیغ کا سلسلہ آپ کے متبعین کی ذمہ داری میں آگیا ہے اور ان کیلئے اس مشکل اور بھاری ذمہ داری سے بری الذمہ ہونے کی کوئی سبیل نہیں ہے - انہوں نے لوگوں پر حجت قائم کرنی ہے - انہوں نے لوگوں کو دنیا کی بدبختی اور آخرت کی ناکامی سے بچانا ہے - یہ فریضہ اور یہ ذمہ داری صرف تبلیغ کرنے سے ہی ادا کی جاسکتی ہے - اور یہ اسی منہاج پر ادا ہو سکتی ہے جس پر اسے رسول خدا ؐ نے ادا فرمایا - اس لئے کہ رسالت وہی ہے اور اہل ایمان بھی وہی ہیں - گمراہیاں' خواہشات نفسانیہ اور شبہات اور اعتراضات بھی وہی ہیں - وہ طاغوتی قوتیں بھی اسی طرح موجود ہیں جو لوگوں تک دعوت اسلامی کے پہنچنے کی راہ میں حائل ہیں - یہ قوتیں مسلمانوں کو ان کے دین کے بارے میں فتنے میں ڈال رہی ہیں اور قوت کے بل بوتے پر ان کو گمراہ کر رہی ہیں - وہی موقف ہے جو تھا' وہی مشکلات ہیں جو تھیں - لوگ بھی وہی ہیں جو تھے -

دعوت اسلامی وہ فریضہ ہے جس سے ہم روگردانی اور انکار نہیں کر سکتے - اس لئے ضروری ہے کہ ہم تبلیغ کریں' یہ بہت ضروری ہے کہ ہم یہ فریضہ ادا کریں - تحریر و تقریر سے تبلیغ کریں - اپنے عمل سے تبلیغ کریں تاکہ مبلغین اپنے عمل اور کردار کی وجہ سے چلتی پھرتی تبلیغ ہوں اور تبلیغ اور دعوت کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہوں ان کو دور کرنے کی کوشش کریں کہ یہ بھی تبلیغ ہی کی ایک صورت ہوگی جو لوگ فتنے میں پھنسے ہوئے ہوں انہیں رہائی دلائیں - اگر یہ کام نہ کیا گیا تو کوئی تبلیغ نہ ہوگی اور نہ ادائیگی فرض ہوگی اور نہ لوگوں پر اللہ کی حجت تمام ہوگی -

یہ ذمہ داریاں اٹھانے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے ورنہ اس کے بھاری نتائج بر آمد ہوں گے - تمام دنیا گمراہی میں مبتلا ہوگی - وہ اس دنیا میں بدبختی کا شکار ہوگی اور آخرت میں اس کے خلاف اللہ کے ہاں حجت نہ ہوگی اور ان کے ہاتھ حجت آجائے گی - اگر امت یہ ذمہ داری ادا نہ کرے گی تو اس کی وجہ سے لوگ نجات نہ پائیں گے -

کون ہے جو اس بوجھ کو ہلکا سمجھے گا؟ یہ کمر توڑ بوجھ ہے' اس سے جسم کا ہر جوڑ اور ہر عضو کانپ رہا ہے جو شخص بھی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ "مسلم" ہے یا تو وہ اس فریضے کو ادا کرے گا اور دعوت دین کا کام کرے گا ورنہ خود اس دنیا اور آخرت میں اس کیلئے فلاح ممکن نہیں ہے - جب وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مسلم ہے اور پھر دعوت دین کا کام نہیں کرتا اور اپنا فرض ادا نہیں کرتا' ان تمام طریقوں کے مطابق جو دعوت دین اور ادائیگی فرض کیلئے مسنون ہیں تو وہ گویا اس اسلام کے خلاف شہادت دے رہا ہے جس کا اس نے دعویٰ کیا ہے - اس کی شہادت اسلام کے حق میں نہیں ہے بلکہ اسلام کے خلاف ہے' حالانکہ اسے اس لئے اٹھایا گیا ہے کہ وہ اسلام کے حق شہادت دے -

(وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲ : ۱۴۳) اور اسی طرح ہم نے تم مسلمانوں کو امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو - (تفصیلات کیلئے دیکھئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب شہادت حق (سید قطب ))

شہادت حق اور اسلام کے حق میں شہادت کا آغاز یوں ہوگا کہ ایک مسلمان بذاتہ' پھر اس کا گھر اور خاندان' پھر اس کی قوم اور اس کے رشتہ دار اس دین کا عملی نمونہ ہوں جس کی وہ دنیا کی دعوت دے رہا ہے - اس کے بعد اس کی

یہ شہادت ایک قدم اور آگے بڑھے اور ایک ایسی امت پیدا ہو جسے امت دعوت کہا جا سکے ۔ وہ اپنے گھر' خاندان' اور رشتہ داری کے حدود میں اسلام اور دعوت اسلامی کو عملی شکل میں پیش کرنے کے بعد شخصی معاملات اور ملک کے سیاسی معاملات کے اندر بھی اس دعوت کے قیام کی ذمہ داری لے ۔ اس کے بعد وہ ایسی شہادت دے کہ ان رکاوٹوں کو دور کر دے جو اسلام کی راہ میں حائل ہیں' جو لوگوں کو گمراہ کر رہی ہیں اور اس دعوت کے حوالے سے ان کو فتنے میں ڈال رہی ہیں ۔ چاہے یہ رکاوٹیں جس قسم کی بھی ہوں ۔ اگر کسی مسلمان نے اس مفہوم میں شہادت دی تو پھر وہ صحیح معنوں میں شاہد بھی ہو گا اور شہید بھی ہو گا ۔ وہ گواہی دیکر اپنے رب کے پاس پہنچ جائے گا ۔ یہ ہے وہ حقیقی شہید ۔

---ooo---

سب سے آخر میں ہم دست بستہ اللہ کے حضور اس کی درگاہ عظمت وجلالت میں کھڑے ہوتے ہیں ۔ یہ درگاہ' درگاہ عدل ہے اور گہرے علم پر مبنی ہے ۔ اس درگاہ میں اللہ کا فضل اور اس کی رحمت سایہ فگن ہوتے ہیں اور اس میں ہر کسی کے ساتھ رعایت اور احسان ہوتا ہے اور یہ سب کچھ اس حضرت انسان کے ساتھ ہوتا ہے جو کبھی منکر حق کے روپ میں آتا ہے اور کبھی سخت نافرمانی بھی کرتا ہے ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت انسان کو اللہ تعالیٰ نے زیور علم سے آراستہ کیا ہے اور اس کی ذات کے اندر بے پناہ قوتیں ودیعت کی ہیں ۔ اس کی ذات میں ہدایت اور ضلالت دونوں کی استعداد پیدا کی ہے ۔ اگر اس علم کو عقل کے تابع نہ کیا جائے تو اس کے نتائج کیا نکلتے ہیں ۔ نیز اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم کا ایک عظیم ہتھیار دیا ہے اور یہ کہ انسان کے انفس اور اس کے آفاق میں ہدایت اور قبول ایمان کے بے شمار دلائل موجود ہیں ۔ اللہ کو علم تھا کہ انسان کے پاس علم کا جو عظیم ہتھیار ہے اس کے مقابلے میں انسان کے اندر قوت شہوانیہ اور حیوانیہ بھی موجود ہے ۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ انفس و آفاق کے اندر جو کثیر التعداد دلائل و شواہد پائے جاتے ہیں انہیں انسان کی خواہشات نفسانیہ دبالیں اور اس کی کوتاہیاں اور اس کی جہالت انہیں اس کی نظروں سے اوجھل کر دیں ۔ انسان کیلئے ان دلائل پر تب ہی غور و فکر کرنا ممکن ہو گا جب اس کے پاس رسول بھیجے جائیں اور اسے بار بار یاد دہانی کرائی جائے ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے بیان کے بعد بھی انسان کے ذمے یہ بات نہیں ڈالی کہ وہ اپنے لئے کوئی نظام زندگی بنائے بلکہ اسے نظام زندگی بنا کر دیا اور اس کا فرض یہ قرار دیا کہ وہ اس نظام کو دنیا میں نافذ کرے ۔ اس کے بعد اسے پھر اس دنیا میں آزاد چھوڑ دیا ۔ ان حدود و قیود کے بعد بھی اس کیلئے اس عظیم مملکت میں ایک وسیع دائرہ کار رہ گیا ۔ اسے اجازت دی گئی کہ وہ اس میں جو چاہے نئی نئی ایجادات کرے ۔ جو تغیرات چاہے کرے اور جو ترکیبات چاہے کرے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے جس طرح اس پوری کائنات کو مسخر کیا ہے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے ۔ اس میں یہ انسان کبھی درست فیصلے کرے گا اور کبھی غلط' کبھی وہ پھسلے گا اور کبھی صراط مستقیم پر رواں دواں ہو گا ۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اللہ کے ہاں انصاف کی کیا اہمیت ہے جسے اس آیت میں بیان کیا گیا ہے ۔ اگر رسول نہ بھیجے جاتے تو لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے خلاف ایک حجت ہوتی ۔ لیکن اللہ نے رسول بھیجے جو لوگوں کو خوشخبری دیتے تھے اور انجام بد سے ڈراتے تھے ۔ حالانکہ اس کائنات میں اللہ کی ذات پر ایمان لانے کے تکوینی دلائل موجود تھے اور یہ کائنات سب کے سامنے کتاب مفتوح تھی ۔ نیز نفس انسانی بھی ایک کھلی کتاب کے طور پر انسان کے سامنے موجود

تھا۔جس کے اندر کر دگار کے وجود پر بے شمار دلائل تھے۔

جن سے اللہ کی وحدانیت کو اچھی طرح معلوم کیا جاسکتا تھا۔جن سے اللہ کی تقدیر' اللہ کی تدبیر' اللہ کی قدرت اور اس کے علم کے بارے میں اچھی طرح معلوم ہو سکتا تھا۔نیز فطرت انسانی کے اندر بھی ایک قوی اور حقیقی داعیہ موجود ہوتا ہے جس سے انسان کو اس کائنات کے خالق تک رسائی کا ایک نہایت پختہ شوق ملتا ہے اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا کوئی خالق ضرور ہے پھر اس فطرت اور دلائل کونیہ کے درمیان ایک قسم کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ان دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق اور مدبر موجود ہے۔پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا فرمائی تھی جو مشاہدات کے ذریعے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ انسان کی ان تمام قوتوں پر ضعف طاری ہو جاتا ہے۔کبھی کبھی یہ قوتیں معطل ہو جاتی ہیں'کبھی یوں ہوتا ہے کہ بعض اثرات ان قوتوں کو بگاڑ دیتے ہیں۔کبھی تو ان عقلی قوتوں کو مٹا دیا جاتا ہے۔کبھی عقل کے فیصلوں میں غلطی واقعہ ہوتی ہے اور عقل پریشان ہو جاتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس ڈیوٹی سے معاف کر دیا کہ وہ اس کائنات کے دلائل و شواہد ہی سے راہ ہدایت حاصل کریں یا محض فطری دلائل سے اپنی عقل کے بل بوتے پر راہ حق پائیں' جب تک ان کے پاس کوئی رسول نہیں آجاتا تاکہ یہ رسالت انسان کی ان تمام خوبیوں اور قوتوں کو ان تمام آلودگیوں سے پاک کر دے اور ان عقلی قوتوں کو ان ضوابط کے اندر لے آئے جو اللہ کی رسالت نے بھیجے۔انسان کی یہ تمام فطری قوتیں جب اسلامی منہاج فکر کے اندر منضبط ہو جاتی ہیں تو ان قوتوں کے ذمے اب صرف یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ اس رسالت کا اقرار کریں اور اللہ کی بندگی کریں اور رسول کا اتباع کریں۔یا اگر وہ انکار کر دیں تو پھر ان پر حجت تمام ہو جائے اور قیامت کے دن سزا کی مستوجب ہو جائیں۔

پھر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کس قدر مہربان ہے۔وہ ان کی کس قدر دیکھ بھال کرتا ہے اور ان کو اپنے فضل و کرم سے نوازتا ہے ان کو کس قدر مکرم اور مختار بناتا ہے۔اس کے باوجود کہ اسے علم ہے کہ انسان خطا اور نقص کا پتلا ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ پھر بھی اس جہان کو اس کے حوالے کر دیتا ہے۔اسے خلیفہ فی الارض بناتا ہے۔ حالانکہ یہ کائنات اس کی نسبت سے بہت ہی بڑی ہے۔اور اللہ تو بے نیاز ہے کہ اگر ایک ذرہ بھی اس کی اس عظیم کائنات میں ہے تو وہ ضائع نہیں ہو سکتا۔

اللہ کی رحمت' اس کا فضل' اس کا احسان اور اس کی نظر کرم انسان کو محض اس کی فطرت اور اس کی عقل کے حوالے ہی نہیں کرتی' اس لئے کہ فطرت کبھی بگڑ جاتی ہے' عقل کبھی دب جاتی ہے اور گمراہ ہو جاتی ہے۔ایسی صورت میں اللہ اپنے فضل و کرم سے رسولوں کا ایک طویل سلسلہ شروع فرماتے ہیں۔لیکن یہ حضرت انسان ان کی بھی تکذیب کرتا ہے اور انکے ساتھ دشمنی پر اتر آتا ہے۔گمراہ ہوتا ہے اور رسولوں سے دوری اختیار کرتا ہے۔لیکن پھر بھی اللہ اس کو اس کی ان عظیم غلطیوں اور کوتاہیوں پر نہیں پکڑتے اور اللہ تعالیٰ اپنی داد و دہش اور بر و احسان جاری رکھتے ہیں۔ رسولوں کے ذریعے حجت تمام کر کے اللہ تعالیٰ اپنا احسان بند نہیں کرتے۔دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ اسے اس وقت سزا دیتے ہیں جب اس کے رسول اچھی طرح ان تک پیغام پہنچا دیتے ہیں۔پھر وہ اعراض کرتا ہے'کفر کرتا ہے' کافر مرتا ہے اور بروقت توبہ نہیں کرتا رجوع نہیں کرتا۔

عجب زمانہ ہے کہ یہ انسان اب یہ زعم کرنے لگا ہے کہ اسے رب کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔وہ اپنے آپ کو اللہ

کے فضل و کرم' اور اس کی رحمت و احسان سے مستغنی سمجھتا ہے۔ وہ اللہ کی ہدایت' اس کے نظام زندگی اور اس کی راہنمائی سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ وہ اس قوت کے بل بوتے پر بے نیاز ہو گیا ہے جس کے بارے میں اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اس قوت کے بل بوتے پر وہ راہ ہدایت نہیں پاسکتا۔ جب تک یہ قوت (عقل) الہی منہاج فکر سے مسلح نہ ہو جائے۔ اللہ نے تو اسے سزا دینے کا فیصلہ تب کیا ہے کہ رسول آئیں اور تبلیغ کریں اور وہ ان کا انکار کرے۔ اللہ کے نزدیک تو عقل کی مثال اس بچے کی سی ہے جو اپنے اندر قدرے قوت محسوس کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کا نگران اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دے اور ہاتھ کھینچ لے تاکہ وہ خود کفیل ہو کر چلے۔ مگر جونہی نگران ہاتھ اٹھاتا ہے بچہ گر جاتا ہے۔ اس خود سر انسان سے تو یہ بچہ زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ وہ فطرت کے دواعی کو لبیک کہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے سہارا دینے والا ہاتھ ہٹ جائے اور وہ خود اپنی قوتوں کے بل بوتے پر چلے۔ یقیناً یہ بچہ اس گمراہ عقلمند سے زیادہ صحیح راہ پر ہے۔ یہ اپنی پوشیدہ قوتوں کو کام میں لاتا ہے۔ وہ اپنی ان قوتوں کو بڑھاتا ہے جو بڑھ سکتی ہیں۔ وہ اپنے اعصاب کو مشق کراتا ہے تاکہ وہ اس مشق سے قوت حاصل کرے۔ لیکن آج کا انسان جو دست قدرت سے اپنے آپ کو چھڑاتا ہے۔ جو اللہ کی راہنمائی سے منہ موڑتا ہے' اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کے وجود کے اندر ودیعت کردہ تمام قوتیں (جو قوتیں اس کے اندر دست قدرت نے رکھی ہیں۔) اسے اللہ کی دستگیری سے مستغنی اور بے نیاز نہیں کر سکتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان قوتوں کے باوجود اسے ربانی ہدایت کی ضرورت ہے۔ مختصراً یہ کہ انسان کی تمام قوتیں رسالت کی مدد سے مضبوط ہوتی ہیں۔ اسی سے وہ راہ مستقیم اور راہ ہدایت پاتی ہیں۔ لیکن اگر انسان رسالت الہیہ سے بے نیاز ہو جائے اور اس کی ہدایت سے منہ موڑے تو اس کی یہ قوتیں گمراہ ہو جاتی ہیں' ان کے اندر خلل واقع ہو جاتا ہے اور وہ اضطراب کا شکار ہو جاتی ہیں۔

اگر ہم اسے فریب کاری اور مغالطہ انگیزی نہ کہیں تو یہ امر غلطی اور گمراہی ضرور ہے کہ انسان یہ سوچنے لگے کہ بڑے دماغ بغیر تبلیغ اور رسالت کے بھی ان نتائج تک پہنچ سکتے ہیں جن تک رسالت کی راہنمائی میں پہنچا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسالت کی تعلیمات سے عقل ایک منضبط انداز اختیار کرلیتی ہے۔ اس کا نقطہ نظر صحیح ہوتا ہے۔ اس کے بعد اگر جزئیات مسائل کے اطلاق و انطباق میں وہ غلطی کرتی ہے تو اس کی غلطی اس طرح ہوگی جس طرح وہ گھڑی غلطی کرتی ہے جسے ملایا نہ گیا ہو' اس کے بعد عقل اپنے ماحول اور ماحول کے اندر جمائے جانے والے موثرات سے متاثر ہوتی ہے۔ نیز اس کے کل پرزے بھی ماحول سے متاثر ہوتے ہیں لیکن اس غلطی کی تصحیح ممکن ہے۔ ہاں جس گھڑی کو صحیح ٹائم کے ساتھ ملایا ہی نہ گیا ہو تو وہ وہی ٹائم بتائے گی جس پر اس کی سوئیاں برابر ہوگئیں۔ وہ منضبط نہ ہوں گی۔

سوال یہ ہے کہ آخر اس پر کیا دلیل ہے کہ عقل رسالت کی راہنمائی کے بغیر حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی؟ اس کا جواب انسانی تاریخ دیتی ہے اس لئے کہ پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایک عقلمند آدمی بھی نہیں ملتا جو اس مقام ہدایت تک پہنچ گیا ہو جہاں رسالت کی راہنمائی میں ایک اوسط درجے کا عقلمند آدمی پہنچتا ہے۔ نہ اعتقادی نظریات و تصورات کے میدان میں اور نہ ہی اخلاقی نفسیات کے میدان میں اور نہ ہی موزوں نظام حیات کی تشکیل کے میدان میں اور نہ ہی قانون سازی کے میدان میں۔

افلاطون اور ارسطو کے دماغ درحقیقت مسلّم طور پر بڑے دماغ تھے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ ارسطو پوری انسانی تاریخ میں ایک عظیم دماغ کا مالک تھا۔ لیکن وہ اللہ کی رسالت اور ہدایت سے محروم تھا۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے خدائی کی

جو تعریف کرتا ہے' جس طرح اس نے خود یہ تعریف کی ہے تو اس کے تصور الٰہیہ اور ایک عام آدمی کے تصور اللہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے جو رسالت پر ایمان رکھتا ہے اور کسی نبی کا ماننے والا ہے۔

مصر قدیم میں اخناتون ایک ایسا فلسفی ہے جو عقیدۂ توحید تک پہنچا ہے۔اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے عقیدہ توحید سے متاثر نہیں ہوا تو بھی اس کے عقیدۂ توحید اور ایک عام مسلمان کے عقیدۂ توحید کے اندر زمین و آسمان کا فرق ہے۔اخناتون کے عقیدۂ توحید کے اندر بڑے بڑے خلا ہیں اور ان کو قصوں اور کہانیوں سے بھرا گیا ہے۔حضور اکرم ﷺ کے پروردہ عام لوگوں کے اندر ایسے لوگ پائے جاتے ہیں کہ ان کے تصور الٰہیہ تک انسانی تاریخ کے بڑے بڑے فلسفی نہیں پہنچ سکے۔خصوصا وہ فلسفی جن تک کوئی آسمانی رسالت نہیں پہنچی۔

زندگی کے ابتدائی تصورات' زندگی کے اصولوں' اس کی تنظیم' اور اس کیلئے قانون سازی کے میدان میں بھی ہمیں کوئی انسانی نظام نہیں ملتا جس کے اندر اس قدر ہم آہنگی توازن' بلندی اور ترقی پائی جاتی ہو جس قدر اسلامی نظام زندگی میں پائی جاتی ہے۔اسلامی نظام زندگی نے تاریخ میں جب بھی کوئی معاشرہ پیدا کیا ہے اس کی مثال پوری تاریخ انسانی کے اندر نہیں ملتی اور نہ آئندہ اسلامی نظام کے نفاذ کے سوا کوئی اور نظام ایسا معاشرہ وجود میں لاسکتا ہے۔ غرض اسلامی نظام اس قدر متوازن' اس قدر ہم آہنگ اور زندگی کیلئے اس قدر سہل اور قابل عمل ہے جس کی مثال کسی اور نظام میں نہیں ہے۔

کسی نظام قانون کا تجزیہ صرف اس کی ترقیات اور خصوصا مادی ترقیات کو دیکھ کر نہیں کیا جاتا اس لئے کہ مادی ترقیات تو سائنس اور علم کی ترقی پر موقوف ہوتی ہیں۔جس قدر یہ مادی علوم ترقی کریں گے اسی قدر مادی ترقیات سامنے آئیں گی اس لئے کہ مادی ترقیات کا دارومدار مادی وسائل پر ہے۔لیکن قافلہ حیات کے کسی موڑ پر اسے جو توازن اور زندگی کے تمام اجزاء کے اندر مکمل ہم آہنگی' زندگی کے سازو سامان اور اس کے اوضاع و اطوار کے اندر ہم آہنگی اور اس ہم آہنگی کے نتیجے میں پیدا ہونے والا سکون و اطمینان جس کے اندر تمام انسانی قوتوں کو مکمل آزادی ہو اور وہ ہر پہلو سے پوری آزادی اور سکون کے ساتھ کام کرسکیں،یہ معیار صرف اس مختصر عرصے میں حاصل ہوا جو اسلامی نظام زندگی نے اس دنیا میں ایک رسالت کی تعلیمات کے زیر اثر عملاً دکھایا۔اسلامی رسالت کی روشنی کے بغیر دنیا کی طویل تاریخ میں کوئی معاشرہ یہ معیار پیش نہیں کرسکا' انسانی تاریخ کے کسی بھی دور میں۔زندگی کے اندر افراتفری اور اس کے اندر ہمہ گیر عدم توازن ہمیشہ ان تمام نظاموں کی خصوصیت رہی ہے جو اسلام کے سائے سے دور رہے ہیں۔اگرچہ ان معاشروں کے بعض پہلو نہایت ہی چمکدار نظر آئیں' اگرچہ ان معاشروں کے بعض پہلو ظاہر اور نمایاں نظر آئیں۔یہ درست ہے کہ جاہلی معاشروں کے بعض پہلو چمکدار ہوتے ہیں اور روشن نظر آتے ہیں لیکن بعض دوسرے پہلو نہایت ہی تاریک اور گم شدہ ہوتے ہیں اور بعض پہلو' بعض دوسرے نہایت ہی اہم پہلوؤں کے تنزل کی قیمت پر ترقی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔لیکن انسانیت کی کشتی ان نظاموں میں ڈانواڈول رہتی ہے' حیران رہتی ہے اور آخر کار بد نصیبی کا شکار ہوتی ہے اور غرق ہو جاتی ہے۔

---ooo---

یہاں آکر مناسب ہے کہ ہم رک جائیں۔ظلال القرآن کی مناسبت سے اس آیت پر اسی قدر کہنا کافی ہے۔اور اللہ

کا یہ فرمان۔ ( رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (۴: ۱۶۵)
"یہ سارے رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے نہایت واضح ہے اور اس آیت میں نہایت گہری اور قوی ہدایات اور اشارات ہیں۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾

" لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ اے نبی ؐ جو کچھ اس نے تم پر نازل کیا ہے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور اس پر ملائکہ بھی گواہ ہیں' اگرچہ اللہ کا گواہ ہونا بالکل کفایت کرتا ہے۔"

اہل کتاب اس آخری رسالت کا انکار کرتے ہیں' حالانکہ یہ رسالت اللہ کی سنت کے عین مطابق ہے کہ اللہ تعالیٰ خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے رسولوں کو بھیجتے رہتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو ہدایت دیں اور تاکہ لوگوں کے پاس قیامت کے دن کوئی حجت نہ رہے اور یہ کہ اہل کتاب حضرت محمد ؐ سے قبل کے تمام رسل کو مانتے ہیں اور یہودی بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل کے تمام رسولوں کو مانتے ہیں اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ سے پہلے کے تمام رسولوں کو مانتے ہیں۔ اگر باوجود ان حقائق کے یہ لوگ مان کر نہیں دیتے تو نہ سہی ۔ (مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ اے نبی جو کچھ اس نے تم پر نازل کیا ہے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور اس پر ملائکہ بھی گواہ ہیں اگرچہ اللہ کا گواہ ہونا بالکل کفایت کرتا ہے۔)

اس آیت میں قرآن کی سچائی پر اللہ کی گواہی ہے' اللہ کے بعد فرشتوں کی گواہی ہے اور ان فرشتوں میں وہ بھی شامل ہیں جنہوں نے اس قرآن کو رسول ؐکریم پر اتارا۔ ان دو گواہیوں سے وہ دعویٰ ساقط ہو جاتا ہے جو اہل کتاب کرتے ہیں۔ اگر اللہ گواہی دیتا ہے تو ان لوگوں کے انکار کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ اگر فرشتے گواہ ہیں تو ان کا انکار چہ معنی دارد۔ جبکہ اللہ کی شہادت ہی کفایت کرتی ہے۔ اس شہادت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضور ؐ کو تسلی دیدی کیونکہ یہودی انکار حق کے ساتھ ساتھ رات دن سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں بھی مصروف تھے۔

نیز اس شہادت کی وجہ سے اہل اسلام کو اطمینان دلانا بھی مطلوب ہے تاکہ وہ اپنے موقف پر اچھی طرح جم جائیں۔ یہ یقین دہانی انہیں اس دور میں کی گئی جب وہ مدینہ میں نووارد تھے۔ اس دور میں مدینہ کے یہودیوں نے اسلام اور اہل اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کا ایک طوفان برپا کر رکھا تھا اور وہ مختلف طریقوں' مختلف اسالیب سے اسلام کو ختم کرنے کے درپے تھے۔ اور قرآن کریم نے بھی اس دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں اس کا بھرپور جواب دیا۔

---ooo---

یہاں آکر اب منکرین حق کو ایک تہدید آمیز دھمکی دی جاتی ہے۔ اور اللہ اور فرشتوں کی شہادت کے بعد اب دھمکی ہی ان کے خلاف مناسب انداز ہے اس لئے کہ اس شہادت کے باوجود لوگ ہٹ دھرمی اور روگردانی میں مبتلا تھے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ قَدْ ضَلُّوا ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١٦٧﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ﴿١٦٨﴾ إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿١٦٩﴾

"جو لوگ اس کو ماننے سے خود انکار کرتے ہیں اور دوسروں کو خدا کے راستے سے روکتے ہیں وہ یقیناً گمراہی میں حق سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ اسی طرح جن لوگوں نے کفر و بغاوت کا طریقہ اختیار کیا اور ظلم و ستم پر اتر آئے اللہ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا اور انہیں کوئی راستہ بجز جہنم کے راستہ کے نہ دکھائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کیلئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

یہ اوصاف اور یہ فیصلے ' باوجود اس کے کہ یہ عام ہیں ان کا اطلاق سب سے پہلے یہودیوں پر ہوتا ہے ' اور دین اسلام اور اس کے پیروکاران کے ساتھ یہ موقف ان کا رہا ہے۔ بلکہ یہودیوں نے ہر سچے دین کے ساتھ یہی رویہ اختیار کیا۔ یہ یہودی وہ ہوں جو آغاز اسلام کے وقت مدینہ میں موجود تھے یا وہ ہوں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت موجود تھے۔ یا ان کے بعد آج تک وہ بھی موجود رہے ہوں یا وہ جو آج ہمارے دور میں موجود ہیں ' ان میں سے شاذ و نادر ہی ایسے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اپنے دل اسلام کیلئے کھول دیئے تھے اور ہدایت سے سرفراز ہوئے۔

یہ یہودی ہوں یا وہ لوگ ہوں ' جن پر بھی صفت کفر اور دین اسلام کی راہ روکنے کی صفت کا اطلاق ہوتا ہے وہ یقیناً گمراہ ہوگئے ہیں اور راہ حق سے بہت دور نکل گئے ہیں ' انہوں نے اس راہ کو بھلا دیا جس کی طرف اللہ نے ان کی راہنمائی کی تھی اور انہوں نے وہ راستہ ترک کر دیا جو زندگی کا راہ مستقیم تھا۔ وہ فکری ' تصوراتی اور اعتقادی لحاظ سے گمراہ ہوگئے۔ وہ اپنے طرز عمل ' اپنے معاشرے اور اپنے اطوار کے لحاظ سے گمراہ ہوگئے۔ وہ دنیا میں بھی گمراہ ہوگئے اور آخرت میں بھی گمراہ ہوگئے۔ وہ اس قدر دور چلے گئے کہ ان کی واپسی کی کوئی امید نہیں رہی ہے۔ (ضَلُّوا ضَلَالًا بَعِيدًا (٤: ١٦٧) (وہ راہ حق سے بہت ہی دور نکل گئے ہیں۔)

(إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا (٤: ١٦٨) "جن لوگوں نے کفر کیا اور ظلم کرنے لگے۔" کفر بذات خود ظلم ہے۔ یہ حق کے ساتھ ظلم ہے۔ یہ نفس انسانی کے ساتھ ظلم ہے اور تمام لوگوں کے ساتھ ظلم ہے۔ قرآن کریم بعض اوقات کفر پر ظلم کا اطلاق بھی کرتا ہے۔ مثلاً (إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ) "بے شک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے۔" اور دوسری جگہ ہے۔ (وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ) "جو اللہ کے نازل کردہ

قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ ظالم ہیں۔" اس آیت سے پہلی آیت میں ایسے لوگوں کے بارے میں کہہ دیا گیا تھا کہ جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ (اس کے بارے میں تفصیلی بحث اس پارے کی سورہ مائدہ میں ہوگی۔) ان لوگوں نے صرف شرک کے ظلم ہی کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ انہوں نے اللہ کی راہ روکنے کا ارتکاب بھی کیا۔ اس طرح گویا یہ لوگ کفر میں بہت ہی دور نکل گئے یا ظلم میں حدوں سے نکل گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کیلئے اخروی سزا بھی مقرر فرما دیتے ہیں۔

(اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِیْدًا (۱۶۷) اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ یَکُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِیَهْدِیَهُمْ طَرِیْقًا (۱۶۸) اِلَّا طَرِیْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ، وَکَانَ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرًا (۱۶۹)

"جو لوگ اس کو ماننے سے خود انکار کرتے ہیں اور دوسروں کو خدا کے راستے سے روکتے ہیں وہ یقیناً گمراہی میں حق سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ اسی طرح جن لوگوں نے کفر و بغاوت کا طریقہ اختیار کیا اور ظلم و ستم پر اتر آئے اللہ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا اور انہیں کوئی راستہ بجز جہنم کے راستہ کے نہ دکھائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کیلئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ایسے لوگوں کو بخش دے، جبکہ وہ بہت ہی دور نکل گئے ہیں اور انہوں نے اپنے اوپر خود رحمت و مغفرت کے دروازے بند کرلیے ہیں۔ اب اللہ کی شان کے یہ لائق نہیں ہے کہ جہنم کی راہ کے سوا انہیں کسی اور راستے کی طرف راہنمائی کرے۔ اس لئے کہ انہوں نے خود اپنے لئے ہدایت کے تمام راستے بند کرلیے ہیں اور انہوں نے ان تمام راستوں میں رکاوٹیں خود قائم کرلی ہیں اور صرف اپنے لئے جہنم کی راہ کھلی رکھی ہے۔ اور جہنم کی راہ پر بھی وہ بہت دور نکل گئے ہیں اور اس راہ کے اب وہ دائمی مسافر بن گئے ہیں۔ یہ لوگ اسی پر چلتے رہیں گے اس لئے کہ انہوں نے کفر، ظلم اور اللہ کی راہ کو روکنے کو اپنا مستقل مشغلہ بنا رکھا ہے اور ان سے اب صرف یہی توقع ہے کہ یہ لوگ صرف اسی راستے پر آگے جائیں گے۔

( وَکَانَ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرًا (۴:۱۶۹) "اور اللہ کیلئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔" وہ اپنے بندوں پر پوری طرح حاوی ہے۔ اس کے اور اس کے بندوں میں سے کسی کے درمیان نہ نسب ہے اور نہ رشتہ داری ہے۔ اس کے لئے سب کو سزا دینا بہت ہی آسان ہے۔ کسی بندے کے پاس اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی قوت ہے اور نہ کوئی تدبیر، جس کے ذریعہ وہ اللہ کیلئے کوئی مشکلات پیدا کرسکے۔

یہودی بھی عیسائیوں کی طرح یہ کہتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ اور وہ یہ بھی کہتے تھے۔ (لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ) "ہمیں آگ نہیں چھوئے گی مگر چند گنے چنے دن" اور وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہم

اللہ کی پسندیدہ قوم ہیں - جب قرآن نازل ہوا تو اس نے ان تمام باتوں کی نفی کر دی اور ہر کسی کو اپنے مقام پر کھڑا کر دیا کہ سب بندے ہیں اگر انہوں نے اچھے کام کیے تو اس پر انہیں ثواب ملے گا اور اگر انہوں نے برے کام کئے اور توبہ و استغفار کا موقعہ نہ ملا تو انہیں عذاب دیا جائے گا اور یہ کام اللہ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے -

---ooo---

ان تصریحات کے بعد یہاں آکر پوری انسانیت کو دعوت عام دی جاتی ہے کہ یہ رسول تمہارے پاس ایک سچائی لیکر آیا ہے - اگر اس پر کوئی ایمان لائے گا تو یہ خود اس کیلئے ایک قسم کی بھلائی ہوگی اور جو شخص کفر اختیار کرے گا تو اس سے اللہ کو کوئی نقصان نہ ہو گا - وہ تو سب سے مستغنی ہے - اس کی قدرت سب پر حاوی ہے - اور زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے' اسی کیلئے ہے - وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور تمام معاملات کو اپنے علم اور حکمت کے مطابق چلاتا ہے -

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ ٱلرَّسُولُ بِٱلْحَقِّ مِن رَّبِّكُمْ فَـَٔامِنُوا۟ خَيْرًا لَّكُمْ ۚ وَإِن تَكْفُرُوا۟ فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧٠﴾

لوگو! یہ رسول تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق لے کر آگیا ہے' ایمان لے آؤ' تمہارے ہی لئے بہتر ہے اور اگر انکار کرتے ہو تو جان لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اور اللہ علیم بھی ہے اور حکیم بھی ہے -

اس دعوت عامہ سے پہلے 'اہل کتاب کی تمام افترابازیوں کا رد کیا گیا تھا اور یہودیوں کی فطرت اور ان کے منکرات اور ان کی تاریخی بداعمالیوں کا تذکرہ کیا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ یہ لوگ ہمیشہ ہٹ دھرم رہے ہیں - انہوں نے یہی سلوک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی کیا حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے قائد' عظیم نبی اور ان کے نجات دہندہ تھے - نیز اس دعوت عامہ سے قبل اللہ تعالیٰ نے رسالت کی حقیقت بھی بیان کر دی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ رسالت کے مقاصد کیا ہوتے ہیں - ان مقاصد کیلئے رسولوں کا بھیجنا ضروری تھا اور یہ بھی ضروری تھا کہ سب سے آخر میں حضرت محمد ؐ کو بھیجا جائے اس لئے کہ یہ آخری نبی تمام جہانوں کیلئے ہے - آپ کی دعوت کافة للناس ہے جبکہ آپ سے قبل جتنے رسول آئے تھے وہ اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے تھے - لیکن جب سلسلہ رسالت کا خاتمہ طے ہوا تو ضروری تھا کہ خاتم النبین تمام دنیا کیلئے پیغام لانے والے ہوں - (لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (٤: ١٦٥) "تاکہ رسولوں کے مبعوث کرنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے خلاف حجت نہ رہے -" اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت عام نہ ہوتی اور اس کا اطلاق پوری دنیا کے لوگوں پر نہ ہوتا تو آپ کے بعد جو لوگ اور جو اقوام آتیں' قیامت تک کیلئے ان پر حجت تمام نہ ہوتی بلکہ ان کے ہاتھ اللہ کے خلاف یہ حجت آجاتی کہ ان تک تو کوئی رسول سرے سے بھیجا ہی نہیں گیا - اس لئے حضور اکرم ؐ کی رسالت کو تمام لوگوں اور تمام زمانوں کیلئے عام کر کے اور آخری رسالت قرار دے

کر اس حجت کو تمام کر دیا گیا۔ چنانچہ یہ بات کہ حضرت موسیٰ ؑ کے بعد کوئی نبی نہ ہو گا یا یہ کہ حضرت عیسیٰ ؑ کے بعد کوئی نبی نہ ہو گا اللہ تعالیٰ کی صفت عدل و انصاف کے خلاف ہو گا۔ کیونکہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول بھیجے کے بغیر ہی لوگوں کو جزا و سزا دیں۔ یہ بات ناقابل انکار ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل کسی نبی اور رسول کی رسالت، رسالت عامہ نہ تھی اس لئے رسالت عامہ کی ضرورت تھی۔ یہ رسالت عامہ اللہ کی صفت عدل اور لوگوں کے ساتھ اس کی رحمت کا تقاضا تھی اور اللہ کی یہ بات سچ تھی کہ ہم نے آپ کو رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ آپ اس دنیا میں بھی رحمت تھے اور آخرت میں بھی رحمت ہوں گے۔ جیسا کہ اس آیت کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۴۴ ایک نظر میں

اس سبق میں اہل کتاب میں سے نصاریٰ کے ساتھ ایک راؤنڈ ہے جیسا کہ اس سے پہلے سبق میں یہودیوں کو لیا گیا تھا۔ بہرحالت روئے سخن دونوں فرقوں کی طرف ہے جو مسیح اور مریم کے بارے میں افراط و تفریط میں مبتلا تھے۔

اس سے پہلے سبق میں قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کی جانب سے یہودیوں کی خرافات کا جواب دیا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھانے کے بارے میں صحیح صورت حال بیان کی تھی۔ یہودیوں، انکے اقوال و عقائد اور ان کی ہٹ دھرمی کے مقابلے میں سچائی کی مدافعت کی گئی تھی۔

اس سبق میں بھی موضوع سخن سچائی ہے اور روئے سخن خود نصاریٰ کی طرف ہے کہ وہ خود بھی حضرت مسیح کے بارے میں غلو سے کام لیتے ہیں اور یہ کہ بعض اقوام کے اندر نصرانیت کے سادہ عقائد کے ساتھ ساتھ بت پرستی بھی انکے نظریات کا جزو بن گئی تھی۔ جس وقت ان اقوام نے عیسائیت کو قبول کیا اور مضبوط تعلقات قائم ہوگئے تو خصوصاً یونانی دیومالائی تصورات اور رومی قصے اور کہانیاں اور قدیم مصریوں کی توہم پرستی اور ہندوؤں کی بت پرستی وغیرہ ان کے عقائد میں داخل ہوگئے۔

قرآن کریم جس وقت نازل ہوا، اس وقت اہل کتاب کے عقائد میں بے حد تحریفات ہوگئی تھیں۔ انکے عقائد کے اندر جو دیومالائی قصے داخل ہوگئے تھے قرآن کریم نے ان کا بطلان کیا اور ان کے تمام منحرف عقائد کی نشاندہی کی۔ اسی طرح دین ابراہیم علیہ السلام پر جو لوگ قائم تھے اور جو اپنے آپ کو دین حنیف پر سمجھتے تھے، ان کے عقائد کے اندر بھی گہرا انحراف پیدا ہوگیا اور ان کے تصورات میں بھی قصے کہانیاں اور جاہلیت کے باطل طور طریقے داخل ہوگئے تھے۔ یہ لوگ بھی جزیرۃ العرب میں موجود تھے۔

اسلام اس لئے آیا کہ تمام انسانوں کیلئے، ان کے اللہ کے بارے میں انکے عقائد درست کردے اور انسانوں کو ہر قسم کے انحراف اور خلل سے نجات دلائے۔ عقائد کے اندر ہر قسم کے غلو اور افراط و تفریط کو ختم کردے اور فکر انسانی کو سیدھی راہ پر ڈال دے۔ اس طرح اسلام نے ارسطو کے تصور توحید میں اصلاح کی جو اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے یونان میں پیش کیا تھا۔ اسی طرح اسکندریہ میں افلاطون نے ولادت مسیح کے بعد جو افکار پیش کئے ان میں بھی اصلاح کی۔ نیز ان دونوں کے بعد الٰہیات کے میدان میں جو افکار بھی نام نہاد بڑے دماغوں نے پیش کئے وہ سب کے سب گمراہی اور مخبوط الحواسی کی واضح مثال تھے۔ یہ انسانی عقل کا نتیجہ تھا اور یہ تمام افکار اس بات کے محتاج تھے کہ اللہ کی جانب سے ارسال کردہ پیغام ان کی راہنمائی کرے اور ان گم کردہ راہ لوگوں کو سراب سے نکالے۔

یہاں جو مسئلہ پیش کیا جاتا ہے وہ تثلیث کا مسئلہ ہے، جس میں عیسائیوں نے یہ کہانی گھڑی تھی کہ حضرت مسیح خدا

کے بیٹے ہیں' اس غلط عقیدے کی تردید کر کے درست اور سیدھے طریقے سے عقیدۂ توحید کو سمجھایا گیا۔

جس وقت اسلام آیا اس وقت عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے درمیان جو عقیدہ رائج تھا وہ یہ تھا کہ اللہ اقانیم ثلاثہ کے اندر ایک ہے۔ باپ' بیٹا اور روح القدس ۔ ان تینوں میں سے مسیح بیٹا تھا۔ اس کے بعد مسیح کے بارے میں ان کے مذاہب و مکاتب فکر مختلف تھے ۔ آیا وہ لاہوتی طبیعت رکھتے تھے یا ناسوتی طبیعت کے مالک تھے یا دونوں کا امتزاج تھے ۔ پھر ان کی اپنی حیثیت اختلاف طبعی کے باوجود ایک تھی یا مختلف حیثیات تھیں یا یہ کہ باپ کی طرح قدیم تھے یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان اختلافی مذاہب فکر کے درمیان پھر تصادم بھی ہوتے رہے اور ایک دوسرے پر سخت مظالم بھی کئے گئے ۔ (اس کی تفصیلات اس سورہ میں تشریح آیات کے وقت دی جائیں گی ۔) تاریخی تحقیقات اس بات کی مظہر ہیں کہ عقیدۂ تثلیث ' عقیدۂ ابنیت مسیح عقیدہ الوہیت مریم ' اور تثلیث کی متعدد شکلوں میں مریم کی شمولیت وغیرہ یہ تمام عقائد ابتدائی مسیحیت کا حصہ نہ تھے ۔ یہ عقائد تاریخ کے مختلف ادوار میں مسیحیت میں داخل ہوتے رہے ہیں اور مختلف بت پرست اقوام فوج در فوج مسیحیت میں داخل ہوتی رہیں اور بت پرستی ساتھ لاتی رہیں اس لئے کہ قبول عیسائیت کے ساتھ ان کی نظریاتی تطہیر نہ ہو سکی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تثلیث مصر کے بعض قدیم مذاہب سے لی گئی ہے مثلاً ان میں "اوزوریس ' ایزلیس اور حوریس" اور ان مذاہب میں دوسری متعدد تثلیثات اس عقیدے کا ماخذ ہیں۔

نصاریٰ میں بھی عقیدۂ توحید کے حامل فرقے ہمیشہ رہے ہیں اور پوری تاریخ مسیحیت میں ان موحدین پر سخت مظالم ہوتے رہے ہیں۔ خصوصاً رومی کلیسا کی طرف سے اور ان لوگوں نے جیسا کہ ہمیشہ اہل توحید کا شیوہ رہا ہے' ان مظالم کا بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ یہ مظالم چھٹی صدی عیسوی تک مختلف سوسائٹیوں کی طرف سے ہوتے رہے جو حکومت کی حامی تھیں ۔ ان موحدین پر جو مظالم ڈھائے گئے ان میں قتل عام' جلا وطنی اور تمام دوسرے مظالم شامل تھے ۔

آج تک نصاریٰ کے عقلمند لوگوں کے ذہنوں میں عقیدۂ تثلیث کے بارے میں ایک شدید خلجان موجود ہے ۔ اور اہل کنیسہ اسے مختلف طریقوں سے لوگوں کے ذہنوں میں بٹھاتے ہیں اور ان کا آخری حربہ یہ ہے کہ یہ لوگ اسے یکے از مجہولات قرار دیتے ہیں اور ان کا کہنا یہ ہے کہ ان کا صحیح انکشاف اس وقت ہو گا جب زمین و آسمان کے تمام راز کھول دیئے جائیں گے ۔

رسالہ "اصول وقوع" کے مدیر مسٹر پیٹر جو عقیدہ تثلیث کے شارحین میں سے ممتاز شخص ہیں' وہ کہتے ہیں کہ "ہم نے اپنی عقل کی حدود کی حد تک اس کو یوں ہی سمجھا ہے اور امید ہے کہ مستقبل میں ہم اس عقیدے کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے جب اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کے رازوں سے پردہ اٹھائیں گے ۔" (دیکھئے ۔ نصرانیت پہ معاملات ' ابو زہرہ)۔

---ooo---

# درس نمبر ۴۴ تشریح آیات

# ۱۷۱ -- تا -- ۱۷۵

يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لَا تَغْلُوا۟ فِى دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا۟ عَلَى ٱللَّهِ إِلَّا ٱلْحَقَّ ۚ
إِنَّمَا ٱلْمَسِيحُ عِيسَى ٱبْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ ٱللَّهِ وَكَلِمَتُهُۥٓ أَلْقَىٰهَآ إِلَىٰ
مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ ۖ فَـَٔامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرُسُلِهِۦ ۖ وَلَا تَقُولُوا۟ ثَلَٰثَةٌ ۚ ٱنتَهُوا۟
خَيْرًا لَّكُمْ ۚ إِنَّمَا ٱللَّهُ إِلَٰهٌ وَٰحِدٌ ۖ سُبْحَٰنَهُۥٓ أَن يَكُونَ لَهُۥ وَلَدٌ ۘ لَّهُۥ مَا
فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلْأَرْضِ ۗ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ وَكِيلًا ﴿١٧١﴾

""اے اہل کتاب ' اپنے دین میں غلو نہ کرو ۔ اور اللہ کی طرف حق کے سواء کوئی بات منسوب نہ کرو ۔ مسیح عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک فرمان تھا جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے (جس نے مریم کے رحم میں بچہ کی شکل اختیار کی) پس تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ تین ہیں ۔ باز آجاؤ' یہ تمہارے ہی لئے بہتر ہے ۔ اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے ۔ وہ پاک ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو ۔ زمین و آسمان کی ساری چیزیں اس کی ملک ہیں ' اور ان کی کفالت و خبرگیری کیلئے بس وہی کافی ہے ۔)""

نصرانیوں کا عقیدۂ تثلیث غلو فی الدین 'حدود سے تجاوز اور حق سے روگردانی ہے اس لئے اہل کتاب کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اللہ کے بارے میں وہی کچھ کہیں جو حق ہو 'مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہے یا یہ کہ وہ تین میں سے ایک ہے ۔

ان کے ہاں نظریہ تثلیث مختلف ادوار کے اندر ان کے فکری اتار چڑھاؤ کے مطابق بدلتا رہا ہے ۔ لیکن اللہ کی طرف بیٹے کی نسبت کرکے انسان کی فطری ناپسندیدگی کی وجہ سے اور دور جدید کی عقلیت پسندی کی وجہ سے وہ اس ابنیت کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ اس بیٹے کی ولادت اس طرح نہیں ہوئی جس طرح عام بشر کی ولادت ہوتی ہے بلکہ اس کی

حقیقت اس طرح ہے جس طرح باپ کو بیٹے سے محبت ہوتی ہے اور تین میں سے ایک کی تشریح وہ اس طرح کرتے ہیں جس طرح ایک کی تین صفات ہوتی ہیں۔ اگرچہ آج تک وہ ان ناقابل فہم اور متضاد تصورات کو انسانی فہم وادراک کے اندر داخل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ آخر کار انہوں نے یہ قرار دیا ہے کہ وہ غیبی معمے ہیں اور ان کی حقیقت کا ادراک اس وقت ہو گا جب اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کے رازوں سے پردہ اٹھائیں گے۔

اللہ کی ذات شرکت اور مشابہت سے پاک ہے اور یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ خالق ہے اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کی ذات اپنی مخلوق سے علیحدہ ذات ہو۔ خالق اور مخلوق کے درمیان جدائی اور مالک اور مملوک کے درمیان علیحدگی ایک قابل فہم تصور ہے جس کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔

(اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۴ : ۱۷۱) "اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔ وہ پاک ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔ زمین و آسمانوں کی ساری چیزیں اس کی ملک ہیں۔"

اگر لوگوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بن باپ پیدا ہو جانا عجیب لگتا ہے اور وہ اس دنیا میں رات دن جو کچھ دیکھتے ہیں' اس کے خلاف لگتا ہے تو یہ تعجب اس لئے ہوتا ہے کہ یہ واقعہ معروف اور معتاد طریقہ کار سے ذرا ہٹ کر ہے۔ لیکن لوگ جس چیز کو روز دیکھتے ہیں وہ بھی پوری حقیقت نہیں ہے اور انکے سامنے یہ کائنات جن قوانین کے مطابق چل رہی ہے اللہ کی پوری سنت ان کے اندر محدود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ان سنتوں اور قوانین کا خالق ہے۔ وہ ان کو دہراتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے ان میں تصرف بھی کر سکتا ہے۔ اس کی مشیت پر کوئی حد اور قید عائد نہیں ہے۔

(اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ (۴ : ۱۷۱) مسیح عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان تھا جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے (جس نے مریم کے رحم میں بچہ کی شکل اختیار کی)۔

مختصراً یہ کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور انکی پوزیشن اور دوسرے رسولوں کی پوزیشن میں کچھ فرق و امتیاز نہیں ہے۔ وہ وہی حیثیت رکھتے ہیں جو حضرت نوح علیہ السلام ' حضرت ابراہیم علیہ السلام ' حضرت موسیٰ علیہ السلام ' اور حضرت محمد ﷺ کی ہے اور وہ اسی برگزیدہ گروہ اور مختاران برائے منصب رسالت میں سے ایک ہیں جو انسانی تاریخ کے طویل ترین دور میں وقتاً فوقتاً مبعوث ہوتے رہے ہیں۔

(وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ (۴ : ۱۷۱) "ایک فرمان تھا جو مریم کی طرف بھیجا" اس کی قریب الفہم تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو براہ راست اپنے فرمان سے پیدا کیا۔ اس تکوینی حکم اور فرمان کے لئے قرآن کن فیکون کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اللہ نے مریم کی طرف یہ حکم متوجہ کیا اور اس کے بطن میں حضرت عیسیٰ

ﷺ کی تخلیق ہوگئی اور یہ کسی باپ کے نطفے کے بغیر ہوئی۔یعنی اس طرح نہ ہوئی جس طرح انسان کی عمومی زندگی کی روٹین میں ہوتا ہے اور اللہ کا یہ فرمان اور یہ کلمہ وہ ہے جو ہر چیز کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔اس لئے یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ ﷺ کو بطن مریم میں اپنے حکم اور نفخ روح سے پیدا کر دیں۔(وَرُوْحٌ مِّنْهُ) "وہ اللہ کی طرف سے ایک روح تھی۔"

تمام کتب سماوی کے ماننے والے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ نے آدم کو مٹی سے بنایا اور بنانے کے بعد اس میں روح پھونکی۔اس طرح وہ انسان کی شکل اختیار کر گئے۔دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

(اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ (۷۱) فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ (۷۲)(۳۸ آیت ۷۲ – ۷۲) "جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا۔"میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں' پھر جب میں اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ۔" اور یہی بات حضرت عیسیٰ ﷺ کے بارے میں فرمائی۔

(وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا (۲۱ : ۹۱) "اور وہ خاتون جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی۔ہم نے اس کے اندر اپنی روح سے پھونکا۔" اس لئے قرآن مجید کے مطابق مریم کے اندر جو روح پھونکی گئی اور اس کی جو تعبیر قرآن نے کی ویسی ہی تعبیر حضرت آدم کے بارے میں بھی کی ہے۔اور دونوں جگہ نفخ روح کا ذکر ہے اور اہل کتاب میں سے کوئی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ حضرت آدم ابن اللہ ہیں حالانکہ وہ سب تخلیق آدم کی کہانی اور آدم میں نفخ روح کے قائل ہیں۔نہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ آدم اقانیم الٰہیہ میں سے کوئی اقنوم ہیں۔جس طرح وہ حضرت عیسیٰ ﷺ کے بارے میں قائل ہیں۔حالانکہ حضرت آدم اور حضرت عیسیٰ ﷺ کے درمیان تخلیق اور نفخ روح کے لحاظ سے مکمل مشابہت پائی جاتی ہے۔بلکہ آدم علیہ السلام بغیر باپ اور بغیر ماں کے پیدا ہوئے تھے جبکہ عیسیٰ ﷺ کے کیس میں بالاتفاق ماں تو موجود تھی۔یہی حقیقت قرآن کریم دوسری جگہ پیش کرتا ہے۔

(اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ

(۳ : ۵۹) "اللہ کے نزدیک عیسیٰ ﷺ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جاؤ اور وہ ہوگیا۔" انسان اس بات پر متعجب ہوتا ہے کہ ذاتی خواہشات اور بت پرستی کے غلط افکار نے حضرت عیسیٰ ﷺ کی ولادت کے نہایت ہی سادہ اور قابل فہم مسئلے کو کس قدر چیستان بنا دیا ہے۔جس نے صدیوں تک کئی نسلوں کے ذہن کو پریشان کئے رکھا۔ لیکن جب قرآن آتا ہے تو وہ بڑی سادگی کے ساتھ ایک چٹکی سے اس مسئلے کو حل کر دیتا ہے۔اور اصل حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

جو ذات باری حضرت آدم کو بغیر والدین کے پیدا کر کے اسے روح دے سکتی ہے اور اسے تمام مخلوقات میں سے

ممتاز اور برتر بناسکتی ہے تو وہی ذات ہے جس نے حضرت عیسیٰ ؑ کو بن باپ پیدا کر دیا اور یہ تمہیں کیوں حیرت انگیز نظر آتا ہے ۔ یہ بھی زندگی ہے اور وہ بھی زندگی ہے ۔ اور اللہ کا یہ کلام نہایت ہی واضح اور سادہ اور قابل فہم ہے ۔ بہ نسبت ان چیستانوں کے جو عیسائیوں کے ہاں رائج ہوئے اور ان کی انتہا الوہیت مسیح کی قرار داد پر ہوئی ۔ اس نتیجے تک وہ محض اس لئے پہنچے کہ ان کا کوئی باپ نہ تھا ۔ اور اسی کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کے تین اقنوم کے قائل ہوئے حالانکہ وہ اس تصور سے پاک اور بلند تر ہے ۔

( فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِه ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ( ۴ : ۱۷۱ ) "پس تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ "تین" ہیں ۔ باز آجاؤ یہ تمہارے لئے بہتر ہے ۔" اللہ اور رسولوں پر ایمان لانے کی اسی دعوت میں حضرت عیسیٰ ؑ بحیثیت رسول اور حضرت محمد ﷺ بحیثیت خاتم النبین شامل ہیں اور اس میں یہ بھی شامل ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ کے بارے میں تم جن اساطیر اور جھوٹے دعوؤں پر یقین رکھتے ہو' ان سے باز آجاؤ ۔ اس کی تفصیلات بعد میں مناسب مقام پر آرہی ہیں ۔

( اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ( ۴ : ۱۷۱ ) ( بے شک اللہ تو ایک ہی خدا ہے ) اور اس کی وحدانیت پر اس کائنات کے اندر جاری و ساری واحد ناموس گواہی دے رہا ہے ۔ اس پوری مخلوقات کی وحدت' اس پوری کائنات کی فطرت کو ایک ہی نہج پر ڈال رہی ہیں ۔ اور یہ نہج یہ ہے کہ اللہ نے کن کہا اور پھر سب کچھ ہو گیا ۔ پھر انسانی عقل بھی واحد الٰہ پر گواہ ہے اس لئے کہ ایک واحد مدبر الٰہ کا وجود انسان کیلئے قابل فہم ہے ۔ عقل انسانی کسی ایسے خالق کا تصور نہیں کر سکتی جو مخلوقات جیسا ہو' نہ وہ تین خالقین کا تصور کر سکتی ہے اور یہ بات تو سمجھ میں آتی ہی نہیں کہ تین بھی ہوں اور ایک بھی ہو ۔

( سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ( ۴ : ۱۷۱ ) ( وہ اس سے پاک ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو ۔ ) بیٹا تو اس لئے ہوتا ہے کہ باپ فانی ہوتا ہے اور اس صورت میں نسل کا تسلسل مطلوب ہوتا ہے ۔ اللہ تو ابد الاباد تک باقی ہے ۔ اسے کیا ضرورت ہے کہ ایک فانی کو اپنا بیٹا بنائے جب تمام وہ چیزیں جو زمین میں ہیں یا آسمانوں میں ہیں وہ اللہ کی ملکیت میں ہیں ۔

(لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ( ۴ : ۱۷۱ ) "آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں اس کی ملک ہیں ۔" اور بندوں کیلئے یہ کافی ہے کہ وہ سب کے سب اللہ کے ساتھ رابطہ بندگی قائم کریں ۔ وہ تو سب کا نگہبان اور محافظ ہے ۔ اور سب کا پالنے والا ہے ۔ اس لئے اللہ کے ساتھ رشتہ نکالنے کی کیا ضرورت ہے ۔ اللہ اور بندوں کے درمیان یہ تعلق قائم ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کا کفیل اور وکیل ہے ۔ ( وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ( ۴ : ۱۷۱ ) "بندوں کی کفالت اور خبرگیری کیلئے وہی کافی ہے ۔"

یوں قرآن مجید اس حقیقت کو اس حد تک اجاگر کر دیتا ہے اور حضرت عیسیٰ ؑ کے عقیدے کے بارے میں فیصلہ کر دیتا ہے ۔ ساتھ ساتھ لوگوں کو یہ احساس اور یہ شعور بھی دلایا جاتا ہے کہ اللہ ان کا کفیل اور نگہبان بھی ہے ۔ اللہ ہر وقت ان کی دیکھ بھال کر رہا ہے ۔ ان کی ضروریات کا بھی وہ کفیل ہے ۔ ان کے مفادات کا بھی وہ بندوبست کرنیوالا ہے

تاکہ وہ اپنے تمام امور اطمینان کے ساتھ اس کے حوالے کر دیں۔

---ooo---

اب سیاق کلام میں بات ذرا آگے بڑھتی ہے۔ اب ہم نہایت ہی عظیم اور اہم نظریاتی مسئلہ کی طرف آتے ہیں۔ وہ اعتقاد اور نظریہ جو ایک انسان کے دل و دماغ میں عقیدۂ توحید کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے یعنی یہ کہ اللہ خالق اور مالک ہے اور اس کے جواب میں انسان مملوک اور بندہ ہے۔ اس لئے دو حقائق عقیدہ یا دو اجزاء عقیدہ توحید کے لازمی حصے ہیں یہ کہ اللہ حاکم ہے اور لوگ محکوم' اللہ الہ ہے اور معبود ہے اور لوگ عابد اور غلام' اور یہ کہ بندگی اور غلامی اس کرۂ ارض کی تمام موجودات کیلئے ہے اور موجودات کی تمام اقسام و انواع اس کی بندگی میں ہیں۔

یہاں قرآن کریم نصاریٰ کے اس عقیدے کی تصحیح کرتا ہے جس کے مطابق وہ فرشتوں کو بھی اللہ کے بیٹے اور اولاد تصور کرتے تھے یا ان کو خدا کے ساتھ خدائی میں شریک کرتے تھے۔ جس طرح وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو الوہیت میں شریک کرتے تھے۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

"مسیح نے کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ مقرب ترین فرشتے اس کو اپنے لئے عار سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لئے عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا جب اللہ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرے گا۔ اس وقت وہ لوگ جنہوں نے ایمان لا کر نیک طرز عمل اختیار کیا ہے اپنے اجر پورے پورے پائیں گے اور اللہ اپنے فضل سے ان کو مزید اجر عطا فرمائے گا۔ اور جن لوگوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا ہے ان کو اللہ دردناک سزا دے گا اور اللہ کے سوا جن جن کی سرپرستی و مددگاری پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں' ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے۔"

قرآن کریم نے عقیدۂ توحید لوگوں کے ذہنوں میں بٹھانے کی بڑی کوشش کی ہے۔ ایسی وحدانیت جس کے اندر

شرک کا کوئی شائبہ نہ ہو اور نہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ کیلئے کسی قسم کا تشبہ لازم آتا ہو۔ قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ اللہ جیسا کوئی بھی نہیں ہے اور نہ کوئی چیز اس جیسی ہے۔ نہ اللہ کی ماہیت میں اس کا کوئی شریک ہے۔ نہ صفت میں اس کے ساتھ کوئی شریک ہے۔ نہ خاصیت میں اس کے ساتھ کوئی شریک ہے۔ اور قرآن کریم نے خالق اللہ اور مخلوقات کے درمیان ایک ہی رابطہ جائز رکھا ہے۔ اور وہی حقیقت ہے کہ اللہ کے سوا تمام اشیاء (جس میں زندہ مخلوق بھی ہے۔) اس کے بندے اور تابع فرمان ہیں۔ جو شخص بھی قرآن کا مطالعہ کرے گا وہ دیکھے گا کہ قرآن کریم نے اس حقیقت کو ذہن نشین کرانے کیلئے بہت ہی زور دیا ہے۔ اس حقیقت کے ہر پہلو کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس طرح کہ انسان کے دماغ میں کوئی شیڈ' کوئی شک اور کوئی پیچیدگی نہ رہے۔

پھر قرآن نے مزید یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ یہ وہ حقیقت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں کو مبعوث فرمایا ہے اس لئے قرآن کریم نے ہر رسول کی سیرت کے واقعات بیان کرتے وقت اور ہر رسول کی دعوت کا خلاصہ پیش کرتے وقت یہ کہا ہے کہ تمام رسولوں کی دعوت عقیدۂ توحید کی طرف رہی ہے۔ نوح علیہ السلام کی رسالت کا یہی عقیدہ رہا ہے اور نبی آخر الزماں حضرت محمد ؐ کی رسالت کا محور بھی عقیدۂ توحید رہا ہے۔ ہر رسول کی دعوت میں یہ فقرہ بنیادی رہا ہے۔ (یَا قَوْمِ اعْبُدُوْا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ) "اے قوم! اللہ کی بندگی کرو' تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔" لہٰذا یہ بات نہایت ہی تعجب انگیز تھی کہ ان سماوی ادیان کے پیروکاروں میں سے کوئی شخص یا قوم عقیدۂ توحید کے اندر تحریف کرے' حالانکہ ان ادیان میں عقیدۂ توحید مرکزی نکتہ رہا ہے اور ان ادیان نے اسے نہایت ہی قطعی اور فیصلہ کن انداز میں پیش کیا ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ کسی دین سماوی کے پیروکار اللہ کے لئے کسی کو بیٹے یا بیٹیاں قرار دیں۔ یا یہ کہ ذات باری اقانیم کی صورت میں کسی مخلوق کے اندر امتزاج اختیار کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسے عقائد صرف باہر کے بت پرستوں ہی سے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

اسلام میں تو الوہیت اور عبودیت باہم متقابل ہیں۔ یہی اسلام کی اساس ہے۔ اللہ اور بندے کے درمیان حاکم و محکوم اور معبود اور عابد کے سوا کوئی اور تعلق نہیں ہو سکتا تھا۔ محکوم اور عابد مخلوق ہوگی اور حاکم اور معبود اللہ ہوگا۔ جب تک لوگ اس سیدھے نظریے اور عقیدے کو قبول نہ کریں گے نہ ان کی زندگی درست ہو سکتی ہے اور نہ ہی ان کے تصورات درست ہو سکتے ہیں ورنہ ان کے خیالات میں خواہ مخواہ کوئی شیڈ' کوئی ملاوٹ اور کوئی شبہ موجود رہے گا۔

ہاں یہ درست ہے کہ لوگوں کی زندگی اس وقت تک درست نہیں ہو سکتی اور نہ ان کی سوچ میں ٹھہراؤ پیدا ہو سکتا ہے جب تک انہیں اپنے اور اپنے رب کے درمیان اس رابطے کا یقین نہ ہو جائے کہ رب ان کا حاکم ہے اور وہ اس کے محکوم ہیں۔ رب خالق ہے اور وہ مخلوق ہیں۔ رب ان کا مالک ہے اور وہ اس کے مملوک ہیں۔ یہ سب بندے اور مخلوقات اپنی اس حیثیت میں ایک جیسے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اللہ کا بیٹا نہیں ہے۔ کسی کے ساتھ اللہ کا امتزاج نہیں ہے اس لئے اللہ کے ساتھ کسی کی کوئی قرابت نہیں ہے۔ الا یہ کہ کسی کے پاس ایمان اور عمل کی کوئی پونجی ہو اور وہ اس پونجی کو اللہ کے سامنے قلبی رجحان کے ساتھ پیش کرے اور یہ تقرب وہ ہے جو اللہ کے ساتھ اس کی مخلوق میں ہر شخص حاصل کر سکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ کوئی اللہ کا بیٹا ہے یا یہ کہ کسی کے ساتھ اللہ نے امتزاج اختیار کر لیا ہے تو یہ کسی بشر کو بھی حاصل نہیں ہے۔

جب تک لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں یہ حقیقت نہیں بیٹھ جاتی کہ وہ سب کے سب ایک ہی رب کے بندے اور غلام ہیں' اس وقت تک ان کی زندگی درست ہو سکتی ہے' نہ ان کے باہمی رابطے قائم ہو سکتے ہیں اور نہ وہ فرائض حیات کو اچھی طرح سرانجام دے سکتے ہیں۔اس تصور کا نتیجہ یہ ہے کہ احکم الحاکمین کے ساتھ سب کا موقف برابر فاصلے پر ہوگا اور اس کے ساتھ قرب حاصل کرنا سب کیلئے کھلا ہوگا۔یوں تمام بنی نوع انسان کے درمیان مرتبہ کے اعتبار سے مکمل مساوات ہوگی۔اس طرح کہ مالک الملک کے ساتھ ان کا فاصلہ برابر ہوگا اور یہاں پر وہ کھوٹا اور غلط دعویٰ بالکل باطل ہو جائے گا کہ یہاں اللہ اور بندے کے درمیان کوئی واسطہ بھی ہو سکتا ہے۔اس تصور کے مطابق کسی فرد یا کسی نسب یا کسی طبقہ حاکمہ کی جانب سے اپنے لئے حاصل کردہ وہ تمام حقوق بے اصل ہو جاتے ہیں کہ وہ دوسرے لوگوں سے رب کے ساتھ تعلق کے حوالے سے کسی طرح ممتاز ہیں۔اس تصور کے سوا' عوام الناس کے اندر حقیقی مساوات قائم نہیں ہو سکتی نہ انسانوں کا کوئی نظام حیات یا ان کی کوئی سوسائٹی اصول مساوات پر قائم ہو سکتی ہے۔

اس لئے عقیدۂ توحید اس نقطہ نظر سے محض ایک ایسا مسئلہ ہی نہیں رہتا کہ وہ ایک وجدانی تصور ہے جو کسی شخص کے قلب میں مضبوطی سے بیٹھ جائے اور بس 'بلکہ عقیدہ توحید ایک نظام زندگی' معاشرتی رابطہ اور بنی نوع انسان کی مختلف نسلوں اور اقوام کے درمیان روابط یعنی سوشیالوجی اور بین الاقوامی مسئلہ بھی بن جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے انسان کو عقیدۂ توحید دیکر اسے ایک جدید زندگی اور نشاۃ ثانیہ عطا کی ہے۔اس کی رو سے انسان تمام انسانوں کی غلامی سے آزاد ہو کر صرف ایک رب ذوالجلال کا غلام بن جاتا ہے۔یہی سبب ہے کہ اسلام کی تاریخ میں کوئی ایسا کنیسہ قائم نہیں ہوا جو لوگوں کو اپنا محکوم اس تصور حیات کی اساس پر بنائے کہ وہ ابن اللہ کا نمائندہ ہے۔یا وہ اس اقنوم کا نمائندہ ہے جو اللہ کے اقانیم کیلئے متمم ہے۔اس وجہ سے اسلامی تاریخ میں مسلمانوں پر تھیاکریسی کا نظام کبھی قائم نہیں ہوا جس میں کوئی بادشاہ اپنے لئے ظل اللہ فی الارض کا لقب اختیار کرے اس طرح کہ اسے حکومت کا حق من جانب اللہ ہے یا یہ کہ وہ از جانب اللہ قانون سازی کر سکتا ہے اس لئے کہ وہ اللہ کا قرابت دار ہے یا اللہ نے اپنے اختیارات اسے تفویض کر دیئے ہیں۔

کنیسہ اور پوپ نے اپنے لئے یہ حق محفوظ کئے رکھا۔اسی طرح پیٹر کے پیرو بھی اپنے لئے اس حق کا دعویٰ کرتے تھے۔یہ حق یورپ میں ابنیت اور امتزاج اقانیم کے نظریات کے تحت لوگ اپنے لئے مخصوص کرتے رہے۔جب صلیبیوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگیں شروع کیں اور مسلمانوں سے لڑتے رہے۔تو وہ صلیبی جنگوں میں شکست کے ساتھ ساتھ اسلام کے نظریہ توحید سے بھی شکست کھا گئے۔ان جنگوں کے نتیجے میں یورپ کے اندر تحریک اصلاح مذہب شروع ہوگئی اور مارٹن لوتھر' کالون اور زنجلی کی تحریکات شروع ہوئیں۔جنہوں نے کنیسہ کے باطل تصورات کی دھجیاں بکھیر دیں۔یہ سب مصلحین اسلام کے سیدھے سادھے تصور حیات سے متاثر ہوئے۔انہوں نے انسان کے تقدس کے نظریے یا اس تصور کی نفی کی کہ اللہ نے اپنے اختیارات کسی کو تفویض کئے ہیں اس لئے کہ انہوں نے دیکھا کہ اسلام میں ایک الہ ہے اور مقابلے میں تمام لوگ بندے ہیں اور ان کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔

---ooo---

یہی وجہ ہے کہ یہاں قرآن کریم میں الوہیت مسیح کے نظریے کی فیصلہ کن انداز میں تردید کر دی گئی۔اسی طرح روح

القدس کی خدائی کی بھی تردید کر دی کہ وہ اقانیم ثلاثہ میں سے ایک ہیں۔ غرض کسی شکل میں بھی کسی کیلئے نظریہ الوہیت کی تردید کر دی گئی۔ چاہے کوئی یہ نظریہ کسی کیلئے بھی اختیار کرے۔ قرآن کریم فیصلہ کن انداز میں یہ اعلان کرتا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم اللہ کے بندے ہیں اور انہوں نے کبھی بھی اللہ کا بندہ ہونے کو اپنے لئے عار نہیں سمجھا۔ اسی طرح ملائکہ مقربین بھی اللہ کے بندے ہیں اور انہوں نے بھی اپنے لئے اپنی اس حیثیت کو کبھی عار نہیں سمجھا۔ تمام مخلوقات اس کی بندگی میں ہے اور عنقریب ان کو اللہ کے سامنے اجتماعی طور پر اٹھایا جائے گا۔ جو لوگ اللہ کی بندگی کو اپنے لئے عار اور توہین سمجھتے ہیں وہ عذاب الیم کا انتظار کریں اور جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کا بندہ و غلام سمجھتے ہیں وہ انعام و اکرام کے امیدوار ہوں۔

(لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا (۱۷۲) فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ڏ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۱۷۳) (٤: ۱۷۲ - ۱۷۳) "مسیح نے کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ مقرب ترین فرشتے اس کو اپنے لئے عار سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لئے عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا جب اللہ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرے گا۔ اس وقت وہ لوگ جنھوں نے ایمان لاکر نیک طرز عمل اختیار کیا ہے اپنے اجر پورے پورے پائیں گے۔ اور اللہ اپنے فضل سے ان کو مزید اجر عطا فرمائے گا۔ اور جن لوگوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا ہے ان کو اللہ دردناک سزا دے گا اور اللہ کے سوا جن جن کی سرپرستی و مددگاری پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے۔"

حضرت مسیح ابن مریم اپنے آپ کو اللہ کی بندگی کے مقام سے بلند نہیں سمجھتے۔ اس لئے کہ وہ اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔ وہ تمام لوگوں سے زیادہ مقام الوہیت اور مقام عبودیت سے واقف ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ الوہیت اور عبودیت الگ الگ حقائق ہیں اور ان کے درمیان امتزاج ممکن نہیں ہے۔ وہ سب سے زیادہ جانتے تھے کہ وہ اللہ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہیں' اور اللہ کی مخلوق اللہ جیسی نہیں ہو سکتی۔ نہ وہ اللہ کا جزو ہو سکتی ہے اور وہ سب سے زیادہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ بندگی کے فرائض صرف اللہ کے سامنے بجالائے جانے چاہئیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے اللہ کی بندگی بجالانا ایک حقیقت ہے اور اس کی اس قدر تاکید کی گئی ہے کہ اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ اللہ کی بندگی کا انکار صرف کافر کر سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور انشاء کو نہیں مانتے اور یہ کہ بندگی وہ مرتبہ ہے اور وہ اعزاز ہے جو اللہ اپنے رسولوں کو اس وقت دیتے ہیں جب وہ اعلیٰ اور افضل مراتب پر فائز ہوتے ہیں۔ یہی حال ملائکہ مقربین کا ہے جن میں روح القدس شامل ہیں۔ ان کا حال بھی یہی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور تمام

دوسرے رسل کا ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں۔ لہٰذا اب حضرت مسیح کے ان پیروکاروں کو کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت مسیح کے حوالے سے اس بات کی نفی کرتے ہیں جس کے وہ خود مقرر ہیں۔

(وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا (۴ : ۱۷۲)

"اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لئے عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا جب اللہ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرلے گا۔" اس لئے اگر وہ خدا کی بندگی کو اپنے لئے عار سمجھتے ہیں اور اللہ کے مقابلے میں بڑائی کرتے ہیں تو ان کا فعل انہیں اللہ کے سامنے لا کھڑا ہونے سے ہرگز نہ بچا سکے گا کیونکہ اللہ تمام لوگوں پر حاکم مطلق ہے اور اللہ کی حاکمیت کے مقابلے میں مقرب بندے اور تمام لوگ ایک ہی جیسے ہیں۔

جن لوگوں نے حق کو پہچان لیا اور انہوں نے اللہ کی عبودیت کا اقرار کر لیا اور انہوں نے نیک کام کئے' اس لئے کہ نیک کام کرنا اللہ کی عبودیت کے اقرار کا لازمی ثمرہ ہے تو اللہ تعالیٰ انہیں ان کے صلہ پورا پورا دے گا اور اس صلے سے مزید ان پر اپنا فضل بھی کرے گا۔

(وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۴ : ۱۷۳) اور جن لوگوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا۔ ان کو اللہ

دردناک سزا دے گا اور اللہ کے سوا جن جن کی سرپرستی و مددگاری پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے۔" اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کی جانب سے بندگی کا اقرار اور اس کی بندگی و عبادت کا مطالبہ اس لئے نہیں کرتے کہ اللہ کو ان کے اقرار غلامی یا بندگی کی کوئی خاص ضرورت ہے۔ وہ تو غنی بادشاہ ہے یا یہ کہ اگر یہ لوگ بندگی کریں گے تو اس کی حکومت اور سلطنت میں کوئی اضافہ ہو جائے گا یا یہ کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو اس کی مملکت میں کوئی کمی ہو جائے گی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ لوگ اللہ کی ربوبیت اور حاکمیت کا مفہوم سمجھ لیں۔ وہ اپنے تصورات و عقائد کی تصحیح کرلیں اور وہ اپنے جذبات اور اپنے شعور کے اندر اصلاح کرلیں جس کے نتیجے میں ان کی زندگی اور زندگی کے طور طریقوں کی اصلاح از خود ہو جائے گی۔ اس لئے کہ کوئی نظام زندگی اس وقت تک پرسکون اور پرامن نہیں ہو سکتا اور کوئی تصور اور عقیدہ اس وقت تک مستحکم اور مستقر نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی بنیاد میں مستحکم نہ ہو۔ زندگی کا کوئی تصور اور کوئی نظام اللہ کی حاکمیت اور اللہ کی بندگی کے بغیر مستحکم نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے بغیر زندگی میں اچھے آثار نمودار کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ یہ حقیقت' اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ جس کا بیان اوپر کر دیا گیا ہے لوگوں کے ذہن نشین ہو جائے اور اس پر ان کی زندگی کا تفصیلی نقشہ مرتب ہو جائے تاکہ وہ انسانوں کی بندگی سے نکل کر صرف اللہ کی بندگی میں داخل ہو جائیں۔ انہیں معلوم ہو جائے کہ اس پوری کائنات اور اس کرۂ ارض پر اصل حاکم کون ہے۔ وہ اس کے سوا

کسی کے آگے نہ جھکیں۔ وہ اسی کے نظام زندگی اور اسی کے منہاج کے پیرو ہو جائیں۔ وہ اسی کی شریعت کی اطاعت کریں۔ صرف ان حکمرانوں کی اطاعت کریں جو اللہ تعالیٰ کا نظام زندگی نافذ کرنیوالے ہوں۔ اللہ کا ارادہ صرف یہ ہے کہ وہ یہ جان لیں کہ بندے سب کے سب اللہ کے بندے ہیں۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ اللہ کے بندے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں سراٹھاکے چلیں اور اگر وہ سرجھکاتے ہیں تو صرف اللہ کے سامنے سرجھکائیں۔ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ لوگ جبار' قہار اور اللہ کے باغی حکمرانوں کے مقابلے میں اپنی عزت نفس کا شعور حاصل کریں۔ جب لوگ اللہ کے سامنے رکوع و سجود کریں تو ان کا فرض ہے کہ وہ صرف اللہ کو یاد کریں اور اللہ کے سواکسی کو یاد نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کی منشاء یہ ہے کہ یہ لوگ اچھی طرح سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کا قرب رشتہ داری اور نسب کی وجہ سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہ قرب صرف تقویٰ اور عمل صالح کی وجہ سے نصیب ہوتا ہے۔ اس زمین کی تعمیر اور نیک کام اللہ کی قرابت اور نزدیکی کا باعث ہیں۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ لوگوں کو حقیقت ربوبیت اور حاکیت کا ادراک ہو اور وہ اپنے مقام بندگی کو اچھی طرح پہچان لیں۔ وہ اللہ کی حاکیت کیلئے غیرت اور حمیت رکھتے ہوں اور جو شخص بھی اللہ کے حق حاکیت میں شریک ہونا چاہتا ہے وہ اس کیلئے سد راہ بن جائیں اور تمام حقوق حاکیت صرف اللہ کے ساتھ خاص کر دیں۔ اس طرح ان کی زندگی کی اصلاح ہو جائے گی۔ وہ ترقی کریں گے۔ اور اساس بندگی پر مکرم ہوں گے۔

اس عظیم حقیقت کا ادراک' تمام انسانوں کی جانب سے صرف اللہ کی طرف دیکھنا' تمام لوگوں کے قلوب کا اللہ کے ساتھ مربوط ہوجانا۔ تمام لوگوں کے اعمال کا خدا خوفی پر مبنی ہوجانا' تمام لوگوں کے نظام زندگی کا سب کو چھوڑ چھاڑ کر اللہ کے اذن اور حکم پر مبنی ہو جانا وغیرہ یہ سب ایسے امور ہیں جو اس دنیا میں بھلائی' آزادی' عدل اور استقامت کا عظیم سرمایہ ہیں۔ جس سے انسانیت کے سرمایہ میں اس دنیاوی زندگی میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور آخرت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ غرض یہ ایک ایسا سروسامان ہے جس سے اس دنیا میں حریت' شرافت' عدل اور استقامت کا دور دورہ ہو گا اور ایسے نیکوکار لوگوں کا انجام آخرت میں کیا ہو گا' ان پر اللہ کا کرم ہو گا' ان پر اس کا فضل خاص ہو گا۔ اور وہ اللہ کے فیض خاص سے فیض یاب ہوں گے۔

ہمارا فرض ہے کہ درج بالا نکات کی روشنی میں اسلام اور ایمان کے تقاضوں پر غور کریں' اور یہ فیصلہ کریں کہ ایسا ایمان تمام رسولوں کی رسالتوں کی اساس رہا ہے۔ بعد کے ادوار میں ایمان کی اس اصلی صورت میں تحریف اور تبدیلی ہو گئی۔ ایمان کے اس حقیقی نقطہ نظر سے معلوم ہو گا کہ ایمان لانے کی وجہ سے بشریت کو ایک نیا جنم نصیب ہو گا اور اس صورت میں ایمان مقام شرافت اور اعلان حریت ہو گا۔ اس کے نتیجے میں عدل و انصاف کا قیام ہو گا اور انسان انسان کی بندگی اور غلامی سے نکل آئے گا۔

جو لوگ اللہ کی بندگی کو اپنے آپ سے فروتر سمجھتے ہیں اور پھر وہ اس کرۂ ارض پر دوسری لاتعداد اور نہ ختم ہونے والی بندگیوں میں پھنس جاتے ہیں' آخر کار وہ اپنی نفسانی خواہشات کے بندے بن جاتے ہیں۔ پھر وہ اوہام اور خرافات کے غلام بن جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنے جیسے انسانوں کے غلام بن جاتے ہیں اور پھر ان کی پیشانیاں ان انسانوں کے سامنے جھکتی ہیں۔ پھر ان کی زندگی میں' ان کے نظم و نسق میں' ان کے قانون میں' اور ان کے حسن و قبح کے پیمانوں پر بھی انہی جیسے انسان حاکم ہو جاتے ہیں حالانکہ حقیقت نفس الامری میں وہ دونوں برابر اور ایک جیسے انسان ہوتے ہیں لیکن اس

طرح غیر اللہ کی اطاعت کر کے انہوں نے غیر اللہ کو اپنا الٰہ تسلیم کر لیا۔ یہ تو ان کی پوزیشن ہوگی ہیں اس دنیا میں کہ وہ اپنے جیسے لوگوں کے غلام ہوگئے اور آخرت میں ان کی پوزیشن یہ ہوگی۔

(فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (٤ : ١٧٣) "ان کو اللہ دردناک سزا دے گا اور اللہ کے سوا جن جن کی سرپرستی اور مددگاری پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہاں نہ پائیں گے۔" اسلامی نظریہ حیات میں یہ ایک اہم مسئلہ ہے جسے قرآن نے اس آیت میں پیش کیا ہے۔ اس کے ذریعے اس وقت اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کی تردید کی گئی ہے اور اب قیامت تک یہ ہمارے لئے سنگ میل ہے۔

---ooo---

سابقہ سبق میں یہودیوں پر تنقید کر کے بتایا گیا تھا کہ لوگو! حضرت محمد ؐ کی رسالت پر اللہ گواہ ہیں جس کی شہادت قطعی برہان ہے۔ اسی طرح یہاں نصاریٰ کی تردید کر کے پھر تمام لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ یہ رسالت اللہ کی جانب سے برہان ہے۔ اور یہ ایک نئی روشنی ہے جس سے جہالت کی تاریکیاں چھٹ جائیں گی اور تمام شبہات دور ہو جائیں گے۔ جس شخص نے اس سے ہدایت حاصل کی اور اسے پختگی سے پکڑا تو اس پر اللہ کی رحمت ہوگی اور اللہ کا فضل اس کے شامل حال ہوگا اور اس روشنی اور ہدایت میں وہ صراط مستقیم پائے گا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿١٧٤﴾

"لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس دلیل روشن آگئی ہے۔ اور ہم نے تمہاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمہیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔ اس قرآن کریم میں اللہ رب العالمین کیلئے برہان ہے۔

(يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (٤ : ١٧٤)) "اے لوگو! تمہارے پاس رب کی طرف سے دلیل روشن آگئی ہے۔" قرآن کریم ایک ایسا کلام ہے جس کے اندر ایسے شواہد موجود ہیں کہ وہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ اس کے اندر ربانی کاریگری کے شواہد پائے جاتے ہیں اور اس کو یہ شواہد انسانوں کے کلام سے ممتاز کرتے ہیں۔ کلام الٰہی میں الفاظ کی نشست و برخاست اور روانی قابل دید ہوتی ہے۔ اور کلام اللہ کی فصاحت اور بلاغت ایک ایسا معاملہ ہے کہ جس سے نہ صرف یہ کہ انکار نہیں کیا جاسکتا بلکہ بعض واقعات ایسے بھی دیکھنے میں آئے ہیں جو ناقابل یقین نظر آتے ہیں مثلاً وہ لوگ جو عربی زبان سے بالکل ناواقف ہیں وہ بھی جب قرآن مجید کی تلاوت سنتے ہیں تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ہم لوگ بحری جہاز پر سوار تھے۔ بحراوقیانوس میں جانب امریکہ سفر کر رہے تھے۔ ہم نے عرشہ پر جمعہ کی نماز کا اہتمام کیا۔ ہم میں سے چھ آدمی مختلف عرب ممالک کے باشندے تھے اور کچھ دوسری قومیتوں اور نوبہ کے حبشی بھی تھے جو جہاز کے عملے میں شامل تھے۔

میں نے خطبہ جمعہ دیا اور خطبے میں قرآن کریم کی بعض آیات تلاوت کیں۔ اس جہاز کے تمام باشندے ہماری نماز کے اس اجتماع کو گھیرے ہوئے تھے۔ یہ مختلف قومیتوں کے لوگ تھے۔ غور سے دیکھ رہے تھے۔

نماز کے بعد بہت سے لوگ ہمارے پاس آتے اور اپنے تاثرات بیان کرتے رہے۔ لیکن ان میں یوگوسلاویہ کی ایک محترمہ بہت ہی متاثر تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ اپنی کمزور انگریزی میں ہم سے یوں کہنے لگی کہ تمہاری عبادت کے اندر جو خشوع و خضوع ہے میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ مجھے تمہاری زبان کا ایک لفظ بھی نہیں آتا لیکن اس زبان کے اندر ایک ایسا صوتی ترنم ہے جو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ خطیب کے خطبہ میں بعض جملے نہایت ہی ممتاز ہیں اور ان کا مجھ پر بہت ہی اثر ہوا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ خاص فقرے قرآنی آیات کے وہ حصے اور ٹکڑے تھے جو اپنی فصاحت و بلاغت کے اندر نہایت ہی ممتاز ہوتے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ جو لوگ عربی نہیں جانتے ان کے ہاں یہ قاعدہ کلیہ ہے اور ہر قاری کی تلاوت قرآن کا سامعین پر ضرور ایسا ہی اثر ہوتا ہے لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ یہ قرآن کا بالکل ایک واضح وصف ہے کہ اس کی آواز ایسے لوگوں کو بھی مسحور کر دیتی ہے جو بالکل عربی نہیں جانتے۔

رہے وہ لوگ جو عربی کا خاص ذوق رکھتے ہیں اور جو عربی کے مختلف اسالیب سے واقف ہیں' ان پر قرآن کے اثرات کی عجیب و غریب حکایات تاریخ کا حصہ ہیں۔ جب حضور خود اہل کعبہ پر قرآن کریم کی تلاوت فرماتے تھے۔ تو اخنس ابن شریق' ابوسفیان ابن حرب' اور ابوجہل کا قصہ بہت ہی مشہور ہے۔ سیرت ابن ہشام میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک رات ابوسفیان ابن حرب' ابوجہل اور اخنس ابن شریق ثقفی' بنی زہرہ کے حلیف رات کے وقت اپنی اپنی جگہ سے چل پڑے تاکہ حضور کا کلام سنیں جبکہ آپ رات کے وقت اپنے گھر میں نماز کے وقت تلاوت فرماتے تھے۔ ہر شخص ایک جگہ بیٹھ گیا اور قرآن کریم کی تلاوت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ ان میں سے کسی کو بھی دوسرے کے بارے میں خبر نہ تھی۔ وہ رات کے وقت کلام الہٰی سنتے رہے یہاں تک کہ فجر طلوع ہوگئی۔ جب واپس ہونے لگے تو یہ سب ایک دوسرے سے راستے میں مل گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو سخت سست کہا اور یہ بات نوٹ کی گئی کہ اگر کسی عام شخص نے دیکھ لیا تو وہ اس تحریک کا شکار ہو جائے گا' پھر وہ واپس چلے گئے۔ جب دوسری رات ہوئی تو پھر تینوں نہ رہ سکے اور پھر اپنے اپنے خفیہ مقامات پر بیٹھ گئے' رات کو قرآن کریم سنتے رہے' جب صبح ہونے لگی تو اتفاقاً پھر راستے میں تینوں کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے پہلے کی طرح ایک دوسرے کو ملامت کی۔ جب تیسری رات ہوئی تو پھر یہ تینوں قرآن کریم کو سننے کیلئے پہنچ گئے۔ رات گئے تک قرآن کریم سنتے رہے اور جب صبح کو لوٹنے لگے تو پھر راستے میں ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔ اب کے انہوں نے کہا کہ جب تک ہم حلف نہ اٹھالیں گے ہم رک نہ سکیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے حلف پر معاہدہ کیا اور گھروں کو چلے گئے۔

یہ تو ایک قصہ تھا' ان لوگوں کا جن کو زبان عربی اور قرآن کریم کے اندر ایک ذوق ہے۔ وہ جس دور میں بھی ہوں

وہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم بذات خود ایک سلطان اور برہان ہے اور لفظی اور معنوی لحاظ سے معجزہ ہے۔

جہاں تک معنوی اعجاز کا تعلق ہے تو قرآن کریم نے جو فکر پیش کی ہے' جو نظام زندگی اس نے پیش کیا ہے' اور زندگی کا جو نقشہ اس نے تجویز کیا ہے اس جگہ ہم اس کی تفصیلات نہیں دے سکتے۔ لیکن ان تمام پہلوؤں سے بھی قرآن کریم معجزہ ہے اور اس کے اندر برہان اور سلطان موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا مصدر اور منبع کیا ہے اور یہ کہ وہ انسانی کلام نہیں ہے۔ اس کا انداز اور طرز ادا ایسی ہے جو کسی انسانی کلام کے اندر نہیں ہوتی۔ اس لئے (وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ نُوْرًا (۴: ۱۷۴)) "اور ہم نے تمہاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمہیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔" ...... ایسی روشنی جس کی شعاعوں میں اشیاء کی صحیح حقیقت نظر آتی ہے اور بہت ہی واضح نظر آتی ہے اور جس کی روشنی میں زندگی کے دوراہے پر انسان کو حق و باطل کے راستوں میں سے حق کا راستہ صحیح نظر آتا ہے۔ نفس کی داخلی راہوں کے اندر بھی اور زندگی کی خارجی شاہراہوں پر بھی۔ جو نفس قرآن کی روشنی سے منور ہوا اسے اپنا ماحول اچھی طرح نظر آتا ہے۔

اس نور کے مقابلے میں دھند چھٹ جاتی ہے' فضا کھل جاتی ہے اور پھر حقیقت واضح اور کھلی نظر آتی ہے۔ جب یہ روشنی نفس انسانی کو حاصل ہو جاتی ہے تو انسان اپنے اوپر ہنسنے لگتا ہے کہ حقیقت تو بہت ہی کھلی تھی' لیکن تعجب ہے کہ اسے نظر نہ آرہی تھی۔

اور جب کوئی انسان اپنی روح کے ساتھ کچھ عرصہ قرآنی فضا کے اندر رہے اور قرآن سے اپنے تصورات' حسن و قبح کے پیمانے اور اپنی اقدار اخذ کرلے تو وہ تمام معاملات کو نہایت ہی آسانی' نہایت ہی سادگی اور نہایت ہی وضاحت کے ساتھ دیکھتا ہے اور پھر اسے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ کئی ایسے فیصلے جو اس نے کئے اور جو اس کے لئے خلجان کا باعث تھے' اور وہ اسے سمجھ نہ آتے تھے' اب بڑی آسانی سے اس کی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اب حقائق بڑی آسانی سے نکھر جاتے ہیں اور حقائق کے ساتھ جو مزید آلودگیاں تھیں ختم ہو جاتی ہیں اور تمام حقائق اس طرح ذہن میں اتر جاتے ہیں جس طرح ابھی اللہ کی جانب سے صاف و شفاف ہو کر سامنے آئے ہوں۔

کس قدر کم الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ (وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا (۴: ۱۷۴)) "اور ہم نے تم پر واضح کرنے والی روشنی اتاری ہے۔" میں نے ان الفاظ کی تشریح اور ان پر تبصرہ صرف اس شخص کی خاطر کیا ہے جس نے اپنے اندر کتاب اللہ کی کچھ روشنی پائی ہو' اس شخص کیلئے نہیں جس کے اندر اس روشنی کی کوئی چمک ہی نہ ہو۔ یہ روحانی روشنی اس وقت حاصل کی جاسکتی ہے جب انسان اس کیلئے دلی کوشش کرے اور ذاتی ذوق پیدا کرے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ قرآنی علوم کے اندر تجربہ رکھتا ہو اور براہ راست قرآن سے روشنی پانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَیُدْخِلُهُمْ

فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ یَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ﴿۱۷۵﴾

"جو لوگ بات مان لیں گے اور رب کی پناہ ڈھونڈیں گے ان کو اللہ اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کے دامن میں لے لیگا اور اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ ان کو دکھا دے گا۔"

جب کسی انسان کے اندر ذوق ایمان پیدا ہو جائے تو وہ فوراً اللہ کی پناہ میں آنے کی سعی شروع کر دیتا ہے۔بشرطیکہ ایمان صحیح ہو اور نفس انسانی اللہ کی حقیقت کو پا چکے اور اسے معلوم ہو جائے کہ اللہ کی بندگی کا مفہوم کیا ہے۔جب یہ حقیقت کوئی پالے تو اس کے سامنے اللہ کی پناہ میں پہنچ جانے کے سوا اور کوئی راہ ہی نہیں رہتی اس لئے کہ اللہ ہی بادشاہت اور قدرت کا مالک ہے۔اور ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور فضل کے سائے میں لے لیتا ہے۔اس دنیا میں بھی ان پر اللہ کی رحمت سایہ فگن ہوتی ہے اور آخرت میں بھی ان پر رحمت اور فضل و کرم ہوتا ہے' وہ عاجلہ میں بھی کامیاب اور آجلہ میں بھی کامیاب۔پس صحیح ایمان ایک گھنے سائے والا ایک ایسا پر نم باغ ہے جس کے اندر انسانی روح' بے چین روح' حیران و پریشان روح نہایت ہی خوشگوار باد نسیم پاتی ہے اور اطمینان و سکون حاصل کرتی ہے۔جبکہ اجتماعی لحاظ سے ایمان ایک ایسا اصول حیات ہے جس کے اوپر اجتماعی زندگی پاکیزگی' احترام شرافت' آزادی اور استحکام کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔ ہر انسان کو یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ وہ صرف اللہ کا بندہ ہے اور اس کے سوا جس قدر اشیاء اس کائنات میں ہیں ان کا وہ سردار ہے۔اسلام کے ایمانی نظام زندگی کے سوا کسی اور نظام کے اندر یہ تصور ناپید ہے۔صرف اسلام اس دنیا میں ایک ایسا نظام ہے جس کا مقصد وحید صرف یہ ہے کہ لوگوں کو اپنے جیسے لوگوں کی غلامی سے نکالا جائے اور صرف اللہ کی بندگی میں داخل کیا جائے۔ یہ نظریہ انسان کو اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ صرف اللہ کو اپنا حاکم سمجھتا ہے اور لوگ' تمام کے تمام لوگ' اللہ کے بندے ہو کر ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ بادشاہت اور حاکمیت صرف اللہ کیلئے خاص ہو جاتی ہے اور انسان انسان کا غلام نہیں رہتا۔دوسرے نظاموں میں اگرچہ بظاہر وہ آزاد نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً وہ دوسروں کا غلام ہوتا ہے۔

پس جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ بہرحال اللہ کی رحمت اور فضل میں ہوتے ہیں۔وہ اپنی اس زندگی میں بھی رحمت میں ہوتے ہیں اور اخروی زندگی میں بھی رحمت میں ہوتے ہیں۔ (وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا (٤: ١٧٥)

"اللہ ان کو اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ دکھا دے گا۔" ........ اس فقرے میں لفظ الیہ "اپنی طرف" سے یوں نظر آتا ہے کہ انسان قدم بہ قدم اس کی طرف بڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہاتھ پکڑ کر مومنین کو اپنی طرف آگے بڑھا رہے ہیں۔ان کو اللہ کی طرف آنے کے لئے بالکل سیدھے راستے کے ذریعے لے جایا جا رہا ہے۔وہ قدم بہ قدم اللہ کی طرف بڑھتے ہیں۔اس ایک لفظ سے عبارت کی خوبی اور حسن کو صرف وہ شخص ہی پاسکتا ہے جس نے علی وجہ البصیرت اللہ پر ایمان اپنے اندر پیدا کر لیا ہو اور اس نے راہ ایمان کو پختہ طور پر پکڑ لیا ہو۔اسے راہ حق پر ہونے کا پختہ یقین ہو۔اسے ہر لمحہ یہ بات محسوس ہوتی ہو کہ وہ راہ حق کا مسافر ہے۔اور راستے اس کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور وہ ہر لمحہ آگے ہی بڑھ رہا ہے۔سیدھے راستے پر واضح پالیسی کے ساتھ۔یہ ایک مفہوم ہے جس کا تعلق ذوق یقین کے ساتھ ہے اور اس کا احساس اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ذوق اور ذائقہ درست نہ ہو۔

# درس نمبر ۵۴ تشریح آیت ۱۷۶

يَسْتَفْتُونَكَ ۖ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۚ إِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ
لَهُ وَلَدٌ وَّلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَا إِنْ لَّمْ يَكُنْ
لَّهَا وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۚ وَإِنْ كَانُوا
إِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۗ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ أَنْ
تَضِلُّوا ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١٧٦﴾

اے نبی 'لوگ تم سے کلالہ کے معاملے میں فتویٰ پوچھتے ہیں 'کہو اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص بے اولاد مر جائے اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے ترکہ میں سے نصف پائے گی ۔ اور اگر بہن بے اولاد مرے تو بھائی اس کا وارث ہوگا ۔ اگر میت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکے میں سے دو تہائی کی حقدار ہوں گی ۔ اور اگر کئی بھائی بہنیں ہوں تو عورتوں کو اکہرا اور مردوں کا دوہرا حصہ ہوگا ۔ اللہ تمہارے لئے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے ۔

یہ اس سورہ کا آخری سبق ہے ۔ اس سورہ کا آغاز خاندانی تعلقات کی استواری سے ہوا تھا ۔ افراد خاندان کے درمیان تعلقات کی درستی سے ہوا تھا اور اس کے درمیان بعض اہم اجتماعی معاملات کا بیان بھی ہوا تھا ۔ اب یہ آخری سبق میراث کلالہ کے بارے میں ہے ۔ حضرت ابوبکر ﷺ عنہ اور دوسرے اصحاب کے مطابق کلالہ وہ ہے جس کی کوئی اولاد نہ ہو اور نہ اس کے والدین ہوں ۔

کلالہ کے بارے میں بعض احکام سورہ کے آغاز میں بیان میراث کے وقت آگئے تھے ۔ مثلاً یہ کہ اگر کلالہ کے عصبات نہ ہوں اور اس کی میراث کے حقدار صرف ماں کی طرف سے بہن بھائی ہوں ۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا ۔

وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَاِنْ كَانُوْا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ (سورہ نمبر ۴ آیت نمبر ۱۲ آخری حصہ)

''اگر وہ مرد یا عورت جس کی میراث تقسیم طلب ہے بے اولاد بھی ہو' اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں' مگر ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور بھائی اور بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکہ کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے۔ جبکہ وصیت جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو میت نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا و بینا اور نرم خو ہے۔''

اب کلالہ کی دوسری شکل کا بیان کیا جاتا ہے جو وہاں نہ کیا گیا تھا۔ اگر متوفی کے والدین اور اولاد نہ ہو اور صرف ایک حقیقی بہن ہو یا باپ کی طرف سے بہن ہو تو وہ نصف ترکہ کی حقدار ہوگی۔ لیکن اگر ایسی بہن مرجائے تو اس کا تمام ترکہ یہ بھائی لے گا۔ اصحاب فروض کے حصص کے سوا۔ اگر اس عورت کے والدین اور اولاد نہ ہو...... ہاں اگر میت کی ایک کے بجائے دو بہنیں ہوں حقیقی ہوں یا صرف باپ کی طرف سے ہوں تو وہ دو تہائی کی حقدار ہوں گی۔ اگر بہت سے بھائی بہن موجود ہوں تو مطابق اصول مرد کا حصہ عورت کے دو حصوں کے برابر ہو گا۔ ہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اگر حقیقی بہن بھائی موجود ہوں تو پھر صرف باپ میں شریک بہن یا بھائی محروم ہو جائیں گے۔

یہ آیت میراث ختم ہو جاتی ہے اور اس پر اس سورہ کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور آخر میں وہی قرآنی تنبیہ اور اختتامیہ آتا ہے کہ تمام باتوں کا مآل اور مرجع اللہ ہی کی طرف ہے۔ اس طرح تمام حقوق و واجبات اور تمام مالی اور غیر مالی امور میں شریعت کی پابندی کو لازمی کر دیا جاتا ہے۔

(يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۴ : ۱۷۶) ''اللہ تمہارے لئے احکام کی توضیح کرتا ہے کہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔'' یہ نہایت ہی جامع آیت ہے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ میراث کا بھی اور دوسرے امور کا بھی۔ خاندانی تعلقات کا بھی اور اجتماعی امور کا بھی۔ احکام کا بھی اور قانون سازی کا بھی۔ یا تو تم ہر معاملے میں اللہ کے احکام کی تابعداری کرو گے یا پھر گمراہی میں پڑو گے۔ تمہاری زندگی بسر کرنے کے صرف دو طریقے ہیں۔ کوئی تیسرا طریقہ نہیں ہے۔ یا تو طریقہ ہدایت ہے۔ جو اللہ نے بیان کیا ہے اور یا کوئی دوسرا طریقہ ہے جو گمراہی ہے۔ اللہ نے سچ کہا ہے۔ (فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ) ''سچائی کے علاوہ گمراہی کے سوا اور کیا ہے۔''

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ۔۔۔۔۔ ٦

## سورہ المائدہ

## آیات ١ ۔۔۔۔۔ تا ۔۔۔۔۔۔ ۸۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# سورہ مائدہ ایک نظر میں

اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن کریم حضرت محمد ؐ کے قلب مبارک پر اس لئے نازل فرمایا کہ اس کے ذریعے وہ ایک امت کو برپا کریں۔ وہ امت ایک مملکت کی بنیاد رکھے۔ ایک معاشرے کو منظم کرے اور لوگوں کے ضمیر' ان کے اخلاق اور ان کے اذہان کی عقلی تربیت کرے۔ اس قرآن کے ذریعے اس معاشرے کے اجتماعی تعلقات کے حدود و قیود وضع ہوں اور اس مملکت کے اندر لوگوں کے آپس کے تعلقات کے حدود و قیود وضع ہوں اور اس مملکت کے اندر لوگوں کے تعلقات بھی منضبط ہوں اور پھر دوسرے ممالک کے ساتھ بھی اس مملکت کے تعلقات استوار ہوں۔ نیز امت مسلمہ کے تعلقات دوسری امتوں اور ملتوں کے ساتھ قائم ہوں۔ اور اس طرح قرآن اس پوری امت کو ایک مضبوط رسی کے اندر باندھ دے۔ اس کے متفرق اجزاء کو جمع کرے۔ اس کے فرقوں کو جمع کر دے اور اسے ایک مضبوط محور کے اندر پختہ کر دے۔ اس کو اپنی بادشاہت کے اندر لے آئے۔ اور اس کا رخ ایک سمت میں ہو جائے۔ یہ ہے دین اسلام جیسا کہ درحقیقت وہ اللہ کے نزدیک ایسا ہے اور جسے مسلمانوں نے ایسا ہی سمجھا جس وقت مسلمان صحیح مسلمان ہوا کرتے تھے۔

جیسا کہ سابقہ تین طویل سورتوں میں ہم نے یہ حقیقت دیکھی ہے اس سورہ میں بھی مختلف موضوعات کو لیا گیا ہے۔ ان تمام موضوعات کے درمیان قدر مشترک کیا چیز ہے؟ وہی جس کے حصول کیلئے اس دنیا میں پیغام اسلام کی ضرورت محسوس کی گئی یعنی ایک امت کی تشکیل' ایک مملکت کا قیام اور ایک مثالی اسلامی معاشرے کا قیام۔ اس معاشرے کا قیام بھی ایک حساس نظریہ' ایک خاص تصور حیات اور ایک بالکل جدید انداز میں مطلوب تھا اور اس معاشرے کی روح عقیدہ توحید تھی۔ عقیدہ توحید اس کا پہلا اصول قرار پایا۔ عقیدہ توحید کی اہم عناصر یہ ہیں کہ الہ اور حاکم فقط اللہ ہے۔ وہی اس کائنات کا تھامنے والا ہے۔ اسی کا حکم چلتا ہے۔ زندگی گزارنے کے طریقے صرف اسی سے اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ وہی شارع ہے' وہی زندگی کی اعلیٰ قدریں متعین کرنے کا حق رکھتا ہے اور حسن و قبح کے پیمانے صرف وہی متعین کر سکتا ہے۔

اس سورہ میں اعتقادی افکار کی توضیح کی گئی ہے اور اسے بت پرستانہ خرافات اور انحرافات سے پاک کیا گیا ہے۔ نیز اہل کتاب نے جو تحریفات کیں انہیں بھی دور کیا گیا ہے۔ جماعت مسلمہ کے سامنے خود اس کا اپنا تعارف پیش کیا گیا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ اس کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے اور اس کے راستے میں جو کانٹے اور جو جال بچھے ہوئے ہیں ان سے بچنے کا کیا طریقہ ہے۔ کہاں کہاں اس کے دین کے دشمن گھات لگائے بیٹھے ہیں اور کہاں کہاں پھسلن ہے۔ اس

کے ساتھ ساتھ' اس سورہ میں عبادات اور شعائر اسلام بھی بتائے گئے ہیں جن کے ذریعے مسلم کی روح پاک ہو جاتی ہے اور اس کا رابطہ اس کے رب کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ نیز اعتقادات و عبادات کے ساتھ ساتھ اس میں اجتماعی روابط' حکومت کیلئے قانون سازی اور پھر اسلامی حکومت کے تعلقات دوسری حکومتوں کے ساتھ بھی بتائے گئے ہیں۔ نیز اسلامی معاشرے میں حلال و حرام کا بھی ذکر ہے کہ مسلمانوں کیلئے کن چیزوں کا کھانا حرام ہے۔ کن مشروبات کا پینا حرام ہے اور کن عورتوں سے نکاح حرام ہے۔ کیا کیا اعمال برے ہیں اور کیا کیا طرزہائے عمل غیر اسلامی ہیں۔ غرض یہ ایک گٹھڑی (Package) ہے' ایک ہی سورہ ہے جس میں یہ تمام امور ایک ہی جگہ آگئے ہیں۔ اور یہ گٹھڑی (Package) مجموعہ دین ہے اور اسی نقطہ نظر سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ دین ان تمام امور پر مشتمل ہے۔

جیسا کہ اس سورہ کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے' اور جس طرح' اس سے پہلے سورہ آل عمران اور سورہ نساء کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام تمام افعال شرعیہ کا نام ہے۔ دین ایک مکمل نظام زندگی ہے جس کے اندر زندگی کے ہر پہلو کے احکام شامل ہیں اور یہ کہ یہ سب امور دین ہیں۔ سیاق قرآنی نے صرف اس استنباطی اور نصوص شریعت کے اس التزامی مفہوم پر ہی اکتفاء نہ کیا کہ کوئی صرف یہ سوچ سکے کہ چونکہ مختلف النوع مضامین اور موضوعات کو ایک ہی سورہ میں لیا گیا ہے یا بعض دوسری صورتوں کے اندر جابجا ان مضامین کو لیا گیا ہے اس لئے یہ سب دین اسلام کا حصہ ہیں۔ یہ سوچ تو محض ایک ضمنی اور استنباطی سوچ ہے اس لئے اس سورہ کے اندر اللہ نے بالکل واضح اور صریح طور پر واضح کیا کہ یہ تمام امور دین ہیں اور تصریح کے بعد قرآن کریم اس مفہوم کی بہت تاکید بھی کرتا ہے۔ وہ دین اور اسلام کے مفہوم کو ان سب امور پر موقوف کرتا ہے اور یہ حکم صادر کرتا ہے کہ اگر یہ امور نہ پائے گئے تو دین نہ ہوگا۔ ان تمام امور کا اقرار ایمان ہے اور ان تمام باتوں کا اپنے عدالتی نظام میں جاری کرنا اور ان کے مطابق فیصلے کرنا عین اسلام ہے۔ جو لوگ اپنی پوری زندگی میں اللہ کے احکام کے سامنے نہیں جھکتے اور اپنے تمام فیصلے اللہ کے حکم کے مطابق نہیں کرتے تو وہ کافر' ظالم اور فاسق ہیں اور اگر وہ غیر اللہ کے احکام کے مطابق فیصلے کرتے ہیں تو وہ جاہلی احکام ہوں گے اور مسلمان کبھی بھی جاہلیت کے احکام کا رواج نہیں چاہتے۔

یہ عظیم اصول اس سورہ میں نہایت ہی واضح اور قطعی شکل میں سامنے آجاتا ہے اور فیصلہ کن انداز میں اس کی تصریح کر دی جاتی ہے۔ اس تصریح کے ساتھ مسلمانوں کے نظریات کو درست کر دیا جاتا ہے اور نظریات کی درستی بھی اسی عظیم اصول پر ہوتی ہے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم قرآن کی ان آیات کی تفصیلات دے کر یہ بات سمجھائیں کہ اسلام کے عقیدہ اور عمل میں یہ دونوں اصولی باتیں شامل ہیں اور کس طرح ان آیات سے یہ منطقی اور طبیعی نتائج اخذ ہوتے ہیں۔ نکتہ کیونکہ اہم ہے اس لئے اس موضوع پر ذرا تفصیلی مطالعے کی ضرورت ہے۔

قرآن کریم اس بات کو فیصلہ کن انداز میں لیتا ہے کہ اسلام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کے ذریعے اتارا۔ اللہ تعالیٰ نے شریعت کے اندر جو حلال اور حرام مقرر کئے ہیں وہی دین ہے' جبکہ اللہ وحدہ اس جہان کا الٰہ اور حاکم ہے۔ اس کی الوہیت اور حاکمیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ کہ اللہ واحد خالق ہے اور اس تخلیق میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک مالک ہے۔ اس میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ چنانچہ یہ

بات بطور منطقی نتیجہ قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ صرف اسی کے قانون اور اس کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا جائے اس لئے کہ وہ اس جہاں کا خالق اور مالک ہے۔ اس کی مشیت میں اسی کی مرضی اور اسی کی شریعت کو چلنا چاہیئے۔ وہ اپنی سلطنت میں خود قانون بنانے والا ہے۔ اس کی مملکت میں اسی کی شریعت کو نافذ ہونا چاہیئے۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو یہ بغاوت ' نافرمانی اور کفر ہوگا۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ انسان کیلئے لائحہ عمل تجویز کرے۔ اس پر ایمان لانے کا مفہوم یہ ہے کہ جو عقیدہ اس نے دیا ہے اسے تسلیم کیا جائے۔ جو نظام حیات اس نے تجویز کیا ہے اس پر عمل کیا جائے۔ یہ دونوں باتیں اسلامی نظام کے اہم ترین اساسی اصول ہیں اور برابر ہیں۔ جس طرح مراسم عبودیت بجالا کر اس کی عبادت کی جاتی ہے اسی طرح اس کی شریعت پر عمل کر کے بھی اسی کی عبادت کی جاتی ہے۔ اسلامی شعار اور اسلامی شریعت دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں اللہ کی جانب سے ہیں' جس کے ساتھ اس کی سلطنت اور اس کی عبادت دونوں میں کوئی شریک نہیں ہے اس لئے کہ اس کے سواء کوئی الہٰ نہیں ہے۔ وہی وحدہ لاشریک ہے۔ وہی مالک ہے' وہی آسمانوں اور زمینوں کا علیم و بصیر ہے۔ اس لئے ہر نبی کا دین یہی ہوتا ہے کہ اس کی شریعت پر عمل کیا جائے' اس لئے کہ نبی کی شریعت ہی اصل دین ہوتا ہے جو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس کے سوا کوئی دین مقبول نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس سورہ میں بہ تکرار ایسی آیات وارد ہیں جن میں یہ تلقین کی گئی کہ اللہ کے سواء کوئی الٰہ اور حاکم نہیں ہے۔ اللہ کی ذات کے ساتھ ہر قسم کی شرک اور تثلیث کی اس سورہ میں سخت ممانعت کی گئی ہے۔ اسی طرح اللہ کی ذات کے ساتھ کسی قسم کے امتزاج کو بھی منع کیا گیا ہے۔ نیز غیر اللہ کیلئے خصائص الوہیت ' حاکمیت اور عبودیت کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔

(يٰأَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۚ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (۱۵) يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۶) لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۷) وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ۚ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۱۸) يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ؗ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۹)

"اے اہل کتاب' ہمارا رسول تمہارے پاس آگیا ہے جو کتاب الٰہی کی بہت سی ان باتوں کو تمہارے سامنے کھول رہا ہے جن پر تم پردہ ڈالا کرتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر بھی کر جاتا ہے۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف ان کی راہنمائی کرتا ہے۔"

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم خدا ہے۔ اے نبی! ان سے کہو کہ اگر خدا مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اس کو اس ارادے سے باز رکھ سکے؟ اللہ تو زمین اور آسمانوں کا اور ان سب چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان پائی جاتی ہے۔ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اس کی قدرت ہر چیز پر جاری ہے۔

یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ ان سے پوچھو' پھر تمہارے گناہوں پر وہ تمہیں سزا کیوں دیتا ہے؟ درحقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان خدا نے پیدا کئے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے۔ زمین و آسمان اور ان کی ساری موجودات اس کی ملک ہیں اور اس کی طرف سب کو جانا ہے۔

"اے اہل کتاب' یہ رسول ایسے وقت تمہارے پاس آیا ہے اور دین کی واضح تعلیم دے رہا ہے جبکہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ ایک مدت سے بند تھا' تاکہ تم یہ بات کہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ سو دیکھو' اب وہ بشارت دینے اور ڈرانے والا آگیا......... اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

(لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۷۲) لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۷۳)) (۵: ۷۲ - ۷۳)) "یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن

مریم ہی ہے حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ "اے بنی اسرائیل 'اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی -" جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں - یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے حالانکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے - اگر یہ لوگ ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے اس کو دردناک سزا دی جائے گی -"

اس لئے کہ اللہ ہی الٰہ اور حاکم ہے' وہی خالق ہے' وہی مالک ہے - وہی شارع ہے اور وہی حلال اور حرام کے قیود و حدود وضع کرنے والا ہے - وہی اس بات کا مستحق ہے کہ حلال و حرام کے اندر اس کی اطاعت کی جائے جیسا کہ وہ واحد الٰہی ذات ہے جس کی عبادت کی جانی چاہئے' اور وہی ہے جس کی طرف بندے مراسم عبودیت میں رجوع کرتے ہیں - اور اللہ نے اپنے تمام بندوں سے ان باتوں پر عہد لیا ہوا ہے - اللہ تعالیٰ انہیں اس کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو توڑنے سے سخت ڈراتے ہیں جیسا کہ بنی اسرائیل تاریخ میں ہمیشہ ایسا کرتے آئے ہیں لیکن قرآن کہتا ہے -

( یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْیَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (۵ : ۲)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو - حرام مہینوں میں سے کسی کو حلال نہ کر لو' قربانی کے جانوروں پر دست درازی نہ کرو' ان جانوروں پر ہاتھ نہ ڈالو جن کی گردنوں میں نذر خداوندی کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوئے ہوں اور نہ ان کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور خوشنودی کی تلاش میں مکان محترم کی طرف جا رہے ہوں -"

(وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَمِیْثَاقَهُ الَّذِیْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۷) یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ؗ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ؗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۸) (۵ : ۷-۸))

"اللہ نے جو نعمت تم کو عطا کی ہے اس کا خیال رکھو اور اس پختہ عہد و پیمان کو نہ بھولو جو اس نے تم سے لیا ہے' یعنی تمہارا یہ قول کہ "ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی۔" اللہ سے ڈرو' اللہ دلوں کے راز تک جانتا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو' یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔"

(وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ (۱۲) فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰي خَاۗىِٕنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۳) وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰي يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۱۴)

"اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان میں بارہ نقیب مقرر کئے تھے۔ اور ان سے کہا تھا کہ "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقین رکھو کہ میں تمہاری برائیاں تم سے زائل کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی مگر اس کے بعد جس نے تم میں سے کفر کی روش اختیار کی تو درحقیقت اس نے سواء السبیل گم کر دی۔" پھر یہ ان کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اور ان کے دل کو سخت کر دیا۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ الفاظ کا الٹ پھیر کر کے بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔ جو تعلیم انہیں دی گئی تھی اس کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں' اور آئے دن تمہیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ ان میں سے بہت کم لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں۔ لہٰذا انہیں معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو' اللہ ان لوگوں کو

پسند کرتا ہے جو احسان کی روش رکھتے ہیں ......... اسی طرح ہم نے ان لوگوں سے بھی پختہ عہد لیا تھا جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں مگر ان کو بھی جو سبق یاد کرایا گیا تھا اس کا ایک بڑا حصہ انہوں نے فراموش کر دیا۔ آخر کار ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کیلئے دشمنی اور آپس میں بغض و عناد کا بیج بو دیا اور ضرور ایک وقت آئے گا جب اللہ انہیں بتائے گا کہ یہ دنیا میں کیا کیا بناتے رہے ہیں۔"

اس سورہ میں متنوع احکام شریعت بیان ہوئے ہیں۔ بعض احکام کا تعلق شکار میں سے حلال و حرام کے ساتھ ہے۔ بعض کا تعلق ان حلال و حرام کے ساتھ ہے جو خصوصاً حج اور ایام حج کے دوران ہوتے ہیں۔ بعض حلال و حرام وہ ہیں جو نکاح کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ بعض احکام ایسے ہیں جو نماز اور طہارت کے ساتھ متعلق ہیں' بعض احکام ایسے ہیں جن کا تعلق عدلیہ کے ساتھ ہے یعنی وہ قیام انصاف سے متعلق ہیں۔ بعض کا تعلق حد سرقہ اور جماعت مسلمہ سے خارج' اور مرتد ہونے سے متعلق ہے۔ بعض کا تعلق شراب نوشی' جوئے بازی اور لاٹری سے ہے۔ بعض احکان ان کفارات کے بارے میں ہیں جو احرام کی حالت میں شکار کرنے کی وجہ سے عائد ہوتے ہیں۔ بعض احکام موت کے وقت وصیت کے ساتھ متعلق ہیں۔ بعض احکام بعض جانوروں کے بارے میں ہیں۔ یعنی بحیرہ' سائبہ' وصیلہ ' حام وغیرہ' بعض کا تعلق قصاص کے بارے میں تورات کے قوانین سے ہے جسے اسلام نے بحال رکھا ہے۔ غرض اس سورہ میں نظام عبادات اور نظام قانون دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان کے درمیان کوئی دوئی یا کوئی حد فاصل نہیں ہے۔

ان احکام کے ساتھ ساتھ یہ اہم حکم بھی دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ شریعت کی اطاعت کریں اور اللہ کے اوامر و نواہی پر عمل کریں اور منہیات سے رکیں اور حلال و حرام اسی کو قرار دیں جسے اللہ نے حلال یا حرام قرار دیا ہے۔ پھر آخر میں تصریح کر دی جاتی ہے کہ یہی ہے اصل دین جسے اللہ تعالیٰ نے اس امت کیلئے وضع فرمایا ہے اور وضع کرنے کے بعد اسے کامل' شامل اور مکمل بنایا ہے۔ یہ مسلمانوں پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔

( يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ اٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا (۵:۲))

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو۔ حرام مہینوں میں سے کسی کو حلال نہ کر لو۔ قربانی کے جانوروں میں سے کسی پر دست درازی نہ کرو' ان جانوروں پر ہاتھ نہ ڈالو جن کی گردنوں میں نذر خداوندی کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوئے ہوں نہ ان لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکان محترم کی طرف جا رہے ہوں۔"

( وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا (۵:۹۲)) "اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول خدا کی اطاعت کرو اور ڈرو۔"

(اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِ ، اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ، فَمَنِ اضْطُرَّ فِىْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ، فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵:۳))

"آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔پس جو شخص شدت بھوک سے بے قرار ہو جائے بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور بڑا مہربان ہے۔"

قرآن کریم نے حلال و حرام میں اللہ و رسول کی اطاعت کرنے کو مجمل نہیں چھوڑا ہے بلکہ قرآن کریم اللہ کے نازل کردہ احکام پر عملاً فیصلے کرنے کی تصریح کرتا ہے اور اس کی تاکید اس طرح کی جاتی ہے کہ اللہ کے قانون کے سوا کسی اور قانون پر تم فیصلے نہ کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو یہ فسق، ظلم اور کفر ہو گا۔اس نکتے پر قرآن کی آیات قطعی طور پر بار بار آتی ہے اور نہایت ہی فیصلہ کن انداز میں آتی ہیں۔

(يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ، وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ، سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ، لَمْ يَاْتُوْكَ ، يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ، يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ، وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ، لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ ، وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۴۱) سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ، فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ، وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ، وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۴۲) وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ، وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ (۴۳) ع اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ، يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ

اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (٤٤) وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۭ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (٤٥) وَقَفَّيْنَا عَلٰٓي اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (٤٦) وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (٤٧) وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۭ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (٤٨) وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ (٥٠) اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (٥٠) (٥: ٤١ تا ٥٠) ”اے پیغمبر ؐ تمہارے لئے باعث رنج نہ ہوں وہ لوگ جو کفر کی راہ میں بڑی تیز گامی دکھا رہے ہیں خواہ وہ ان میں سے ہوں جو منہ سے کہتے ہیں ہم ایمان لائے مگر دل ان کے ایمان نہیں لائے ' یا ان میں سے جو یہودی ہیں ' جن کا حال یہ ہے کہ جھوٹ کیلئے کان لگاتے ہیں ' اور دوسرے

لوگوں کی خاطر جو تمہارے پاس کبھی نہیں آئے سن گن لیتے پھرتے ہیں' کتاب اللہ کے الفاظ کو ان کا صحیح محل متعین ہونے کے باوجود اصل معنی سے پھیرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو نہیں تو نہ مانو۔ جسے اللہ ہی نے فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو اس کو اللہ کی گرفت سے بچانے کیلئے تم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہ چاہا' ان کیلئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں سخت سزا۔

یہ جھوٹ سننے والے اور حرام کے مال کھانے والے ہیں' لہٰذا اگر یہ تمہارے پاس (اپنے مقدمات لے کر) آئیں' تو تمہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہو ان کا فیصلہ کرو ورنہ انکار کر دو۔ انکار کر دو تو یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے' اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے..... یہ تمہیں کیسے حکم بناتے ہیں جبکہ ان کے پاس تورات موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے اور پھر یہ اس سے منہ موڑ رہے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے۔"

ہم نے توراۃ نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ ہمارے نبی جو مسلم تھے' اسی کے مطابق ان یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے۔ اور اسی طرح ربانی اور احبار بھی (اسی پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے۔) کیونکہ انہیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے۔ پس (اے گروہ یہود)' تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے سے بیچنا چھوڑ دو۔ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔ تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان' آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے بدلے ناک' کان کے بدلے کان' دانت کے بدلے دانت' اور تمام زخموں کیلئے برابر کا بدلہ' جو قصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریم علیہا السلام کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا۔ تورات میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا وہ اس کی تصدیق کرنیوالا تھا اور ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں راہنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی تورات میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا اس کی تصدیق کرنے والی تھی اور خدا ترس لوگوں کیلئے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔ ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس پر نازل کیا ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔

پھر اے نبی ﷺ ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنیوالی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے۔ لہٰذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم "انسانوں" میں سے ہر ایک کیلئے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی۔ اگر تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا' لیکن اس نے یہ اس لئے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے' پھر وہ تمہیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو' پس اے نبی ﷺ تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر

اس ہدایت سے ذرہ بھر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے' پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے ان کے بعض گناہوں کی پاداش میں ان کو مبتلائے مصیبت کرنے کا ارادہ ہی کر لیا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں۔ اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں' حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنیوالا کون ہو سکتا ہے؟"

یوں حتمی انداز میں اس مسئلے کو بیان کیا جاتا ہے کہ الہ ایک ہے' خالق ایک ہے' مالک ایک ہے تو پھر حاکم بھی ایک ہے اور قانون ساز بھی ایک ہے اور تمام امور کے اندر تصرف کرنیوالا بھی ایک ہے۔ ان باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ شریعت بھی ایک ہے اور نظام زندگی بھی ایک ہے اور قانون بھی ایک ہے لہذا یہ بات لازمی نتیجے کے طور پر سامنے آتی ہے کہ اللہ کے حکم کی اطاعت اور اس کے احکام کے مطابق زندگی کے تمام فیصلے کرنا ضروری ہے تو یہی ایمان اور یہی اسلام ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہوگی تو وہ خروج از اسلام اور اللہ کے نازل کردہ قانون کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ ہوگا جو ظلم' فسق اور کفر ہے۔ یہ ہے وہ دین جس پر قائم رہنے کا اللہ تعالیٰ نے سب اہل ایمان سے عہد لیا ہے۔ اور تمام رسول یہی دین لیکر آتے رہے ہیں۔ حضرت محمدؐ اور آپ سے قبل تمام امم کا مشن یہی رہا ہے۔

دین اللہ' اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس میں یہ بات لازمی ہو کہ اس کے مطابق تمام فیصلے کئے جائیں۔ یہی صورت ایسی ہے جس میں اللہ کی حاکمیت کا اظہار ہو سکتا ہے۔ اللہ کی سلطنت قائم ہو سکتی ہے اور اسی صورت میں (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کا صحیح اظہار ہو سکتا ہے۔

یہ حتمی فیصلہ یعنی اللہ کا دین قائم ہونے کی یہی صورت ہے کہ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کیے جائیں اور یہ کہ اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ جو قانون اللہ نے نازل کیا ہے وہ ان تمام قوانین سے بہتر ہے جو خود انسان اپنے لئے بناتے ہیں اپنے لئے طرز عمل اور اوضاع و اطوار خود تجویز کرتے ہیں۔ صرف یہ بات نہیں ہے کہ اللہ کا قانون ان سے بہتر ہے' یہ تو ان اسباب میں سے ایک سبب ہے اور یہ بات یعنی محض بہتری سبب اول بھی نہیں ہے۔ بلکہ نفاذ شریعت ہی سبب اول ہے اور یہ اسلامی نظام کا سنگ میل اور سنگ اساس ہے کہ جب کوئی اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے کرتا ہے تو گویا وہ اللہ کی الوہیت اور حاکمیت پر ایمان لاتا ہے' اور وہ شخص اللہ کے سوا تمام دوسرے الہوں اور حاکموں کا انکار کرتا ہے اور یہ ہے حقیقی اسلام جس کا لغوی مفہوم سر تسلیم خم کرنا ہے اور جس اصطلاحی مفہوم کو جیسا کہ تمام ادیان الہیہ کا یہ مفہوم رہا ہے کہ دین اللہ کیلئے خالص ہو جائے۔ اور اس کے ساتھ کسی اور کو حاکم تسلیم نہ کیا جائے گا' نہ کسی اور کیلئے اس اہم ترین خصوصیت الہیہ میں شرکت روا رکھی جائے۔ اللہ تعالیٰ کے حق اطاعت کا ظہور اس طرح ہو کہ اس کے تمام بندے اس کی شریعت اور اس کے قانون کے مطیع ہوں۔

یہ بات بھی کافی نہیں ہے کہ لوگ اپنے لئے کوئی ایسا قانون بنائیں جو شریعت کے مشابہ ہو۔ بلکہ وہ اگر بعینہٖ کسی منصوص شرعی قانون کو نافذ کریں مگر اسے اپنے قانون کا نام دیں' اور اس پر اپنی علامات وضع کریں اور اسے شریعت کا نام نہ دیں اور نہ اسے الہٰی قانون کے نام سے اور اللہ کے عنوان سے نافذ کریں تو اس صورت میں بھی وہ اسلامی قانون نہ ہوگا۔ اسلامی قانون اس طرح ہوگا کہ اللہ کی حاکمیت اور اللہ کی حکومت کو تسلیم کرتے ہوئے اور الوہیت اور حاکمیت کو حق

خدا قرار دیتے ہوئے' اس طرح کہ اس کا کوئی حصہ کسی انسان کیلئے جائز نہ ہو۔ صرف اس صورت میں وہ اسلامی قانون رہے گا۔ اور صرف اس صورت میں نفاذ شریعت کا تقاضا پورا ہو گا کہ لوگ شریعت کے نفاذ کو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے قیام کے عنوان سے اسے نافذ کریں۔

اس فیصلہ اور انداز کلام سے وہ احکام ثابت ہوتے ہیں جن کا فیصلہ اس سورہ میں سنایا گیا ہے۔ (وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ) "اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قوانین کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو ایسے لوگ ہی کافر ہیں۔" اور (وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ) "اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ لوگ ظالم ہیں۔" اور (وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ) "اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو وہی لوگ فاسق ہیں۔" وہ لوگ جو اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ اللہ کی حاکمیت کا انکار کرتے ہیں اور اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ صرف اللہ ہی کو حاکم نہیں سمجھتے بلکہ اس میں دوسروں کو بھی شریک کرتے ہیں اور اس انکار شریعت اور ترک شریعت کا یہ گناہ وہ اپنے عمل سے کرتے ہیں۔ اگرچہ منہ سے وہ اس کا اعلان نہیں کرتے اور ظاہر ہے کہ عمل کی زبان محض الفاظ کی زبان سے زیادہ قوی اور موثر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان آیات میں قرآن کریم ایسے لوگوں پر کفر' فسق اور ظلم کا اطلاق کرتا ہے اس لئے کہ انہوں نے اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کو ترک کر دیا' اس میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کر دیا اور خود اپنی جانب سے قانون سازی اور شریعت سازی کرنے لگے جس کی اجازت ان کو اللہ تعالیٰ نے نہیں دی۔

---ooo---

ان صحیح اعتقادی تصورات کی تفصیلی وضاحت اور ان کے اندر اہل کتاب اور اہل جاہلیت کے اشتباہات کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بیان کہ دین کا مفہوم یہ ہے کہ عقیدہ اور نظریہ حیات صحیح ہو اور اس کے مفہوم میں اللہ کی اطاعت بھی شامل ہے اور حلال و حرام اور قانون کے دائرے میں اللہ کی حاکمیت کا اقرار بھی شامل ہے اور پھر اللہ کی شریعت کا نفاذ بھی اس میں شامل ہے۔ ان کے علاوہ اس سورہ کے اندر ایک دوسری اہم حقیقت کو بھی بیان کیا گیا ہے اور مذکور بالا تمام امور سے وہ اہم ہے۔

وہ اہم حقیقت کیا ہے؟ وہ ہے امت مسلمہ کی شان اور اس کا مقام' اور اس کرۂ ارض پر اس کا حقیقی کردار اور یہ کہ اس دنیا میں امت کے دشمنوں کے بارے میں اس امت کا موقف کیا ہونا چاہئے۔ نیز وہ کون لوگ ہیں جو اس امت کے حقیقی دشمن ہیں اور یہ کہ وہ لوگ اس امت اور اس دین کے خلاف کیا کیا دشمنیاں کرتے ہیں اور کیا کیا سازشیں کرتے ہیں۔ یہ کہ ان دشمنوں نے کیا کیا گمراہیاں اختیار کر رکھی ہیں اور کہاں کہاں یہ دشمن صحیح عقیدے سے انحراف کر گئے ہیں اور کس کس جہت سے وہ امت کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا معرکتہ الآرا مضمون ہے جو اس سورہ میں بھی ہے اور اس سے پہلے کی تین طویل سورتوں میں بھی اسے بار بار لیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس امت کی کتاب انسانوں کیلئے آخری کتاب ہے۔ یہ کتاب سابقہ کتب سماوی کی اصل اسلامی اعتقاد اور تصور حیات کے مسئلے میں تصدیق کرتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ آخری کتاب ہے' اس لئے یہ ان تمام تعلیمات پر مشتمل

ہے جو اس کتاب سے پہلے اللہ کی جانب سے نازل ہوئیں - اس کتاب میں وہ شریعت درج ہے جو قیامت تک کیلئے اب آخری شریعت ہے - اس کتاب نے سابقہ شرائع میں سے جس قانون کو بحال رکھا ہے وہ قانون اب اس شریعت کا حصہ بن گیا ہے اور اگر کسی قانون کو اس شریعت نے منسوخ کر دیا ہے تو بھی اس شریعت نے اس کی تصریح کر دی ہے - اگرچہ وہ سابقہ شریعتوں میں نافذ رہا ہو - اب اس کی قانونی حیثیت ختم ہو گئی ہے -

(اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

(۵:۳)) "آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے -"

(وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ

(۵:۴۸)) "پھر اے نبی ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لیکر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ اور نگہبان ہے -"

اس لئے امت مسلمہ کا اصل کردار اس دنیا میں یہ ہے کہ اس پوری انسانیت پر نگراں ہو' وہ دنیا میں عدل قائم کرے اور اس سلسلے میں کسی کی محبت اور کسی کی دشمنی اسے متاثر نہ کر سکے - یہ خیال نہ کرے کہ قیام عدل سے وہ خود متاثر ہوتی ہے یا اس سے لوگ متاثر ہوتے ہیں اس لئے کہ قیام عدل اس کے فرائض میں سے ہے - اس کی اب حیثیت یہ ہے کہ وہ تمام اقوام کی نگران' محافظ اور منصف ہے - اسی طرح اس امت کو دوسری امم کی گمراہیوں اور خواہش پرستیوں سے بھی متاثر نہ ہونا چاہئے - اور اسے شریعت الہیہ' اسلامی نظام حیات اور اسلام کے صراط مستقیم سے ذرہ برابر بھی دور نہیں ہٹنا چاہئے - اسے اپنا یہ سفر محض اللہ کی رضا اور اس کی پکڑ سے ڈرتے ہوئے جاری رکھنا چاہئے اور اس میں کسی اور کی رضامندی' تالیف قلب کا کوئی لحاظ نہیں رکھنا چاہئے -

(وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۵:۲)

"اور ایک گروہ نے جو تمہارے لئے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا تو اس پر ...... تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو - جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو - اللہ سے ڈرو اس کی سزا بہت سخت ہے -"

(یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ ز وَ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا قف ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ز وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۵:۸))

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو' کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ - عدل کرو' یہ خدا ترسی سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے - اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو' جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے -"

(وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْکِتٰبِ وَ مُھَیْمِنًا عَلَیْهِ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الْحَقِّ ط لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْھَاجًا ط وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰکِنْ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ ط اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ

(۵:۴۸) "پھر اے نبی ہم نے تیری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنیوالی اور اس کی محافظ اور نگہبان ہے - لہذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو -"

(وَاَنِ احْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ وَاحْذَرْھُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْکَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکَ ط فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّصِیْبَھُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِھِمْ ط وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ (۵:۴۹))

"پس اے نبی تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو- ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے - پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے ان کے بعض گناہوں کی پاداش میں ان کو مبتلائے مصیبت کرنے کا ارادہ ہی کر لیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں -"

یہ حقیقت ہے کہ یہ امت تمام سابقہ رسالتوں کی وارث اور امین ہے اور یہ بات کہ حضرت محمد ﷺ کی رسالت آخری رسالت ہے

اور آپ کا دین آخری دین ہے اور یہ کہ یہ امت تمام امم پر نگران و نگہبان ہے اس بات کی متقاضی ہے کہ یہ امت ان لوگوں کے ساتھ دوستی قائم نہ رکھے جو اس دین کا انکار کرتے ہیں۔ خصوصاً ان لوگوں کے ساتھ جو اسلامی شعائر اور فرائض کو مذاق کا نشانہ بناتے ہیں اور ان کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ اس امت کا فریضہ ہے کہ وہ صرف اللہ اور رسول کے ساتھ دوستی رکھے اور وہ ایسی اقوام اور گروہوں کی حلیف نہ بنے جو اللہ اور رسول پر ایمان نہیں رکھتے اس لئے کہ یہ امت ایک نظریاتی امت ہے۔ یہ کوئی قومی اور نسلی امت نہیں ہے۔ نہ یہ وطنی امت ہے نہ اپنی جاہلی روایات کی حامل امت ہے۔ یہ تو اس نظریہ جدید کی پیدا کردہ امت ہے جس کا طریق کار ربانی منہاج ہے۔ اور وہ اس آخری رسالت کی حامل ہے اور یہ رسالت اس کیلئے واحد اساس اجتماع ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

(اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِ ، اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵ : ۳))

”آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔“

(يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ، وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ، اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۵ : ۵۱))

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں سے ہے۔ یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی راہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔“

(اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (۵۵) وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۵۶)(۵ : ۵۵ ـ ۵۶))

”تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور رسول اللہ اور اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنالے اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔“

(يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۵۷) وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ (۵۸)

(۵:۵۷ – ۵۸)) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تمہارے پیش رو اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنالیا ہے۔ انہیں اور دوسرے کافروں کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ۔ اللہ سے ڈرو' اگر تم مومن ہو' جب تم نماز کیلئے منادی کرتے ہو تو وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس سے کھیلتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔"

(يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ اِلَى مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵:۱۰۵)) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنی فکر کرو' کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہ راست پر ہو تم سب نے اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے پھر وہ تمہیں خبر دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

اس امت کے دشمنوں کا حال یہ ہے کہ وہ مطلق ہدایت کے دشمن ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ صحیح نظام زندگی کے ساتھ عداوت کی ہے۔ وہ سچائی کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اور نہ وہ کبھی اس پر تیار ہوں گے کہ سچائی کے ساتھ اپنا دائمی مخاصمانہ رویہ ختم کر دیں۔ اس لئے امت مسلمہ کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو اچھی طرح جان لے۔ ان کی تاریخ سے ان کے خدوخال معلوم کرنے کی کوشش کرے اور اس آخری نبی ﷺ اور اس کے دین کے سلسلے میں ان کا جو تازہ ترین موقف ہے' اسے بھی اچھی طرح سمجھ لے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

(وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۚ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ۚ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (۱۲) فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا

حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۳) وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصٰرٰى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۪ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۱۴) (۵: ۱۲ تا ۱۴))

"اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان میں بارہ نقیب مقرر کیے تھے اور ان سے کہا تھا کہ "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقین رکھو کہ میں تمہاری برائیاں تم سے زائل کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی مگر اس کے بعد جس نے تم میں سے کفر کی روش اختیار کی تو درحقیقت اس نے سواء السبیل گم کر دی۔" پھر یہ ان کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اور ان کے دل سخت کر دیئے۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ الفاظ کا الٹ پھیر کر کے بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں' جو تعلیم انہیں دی گئی تھی اس کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں اور آئے دن تمہیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ ان میں سے کم لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں۔ لہٰذا انہیں معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو' اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کی روش رکھتے ہیں ........ اسی طرح ہم نے ان لوگوں سے بھی پختہ عہد لیا تھا جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں' مگر ان کو بھی جو سبق یاد کرایا گیا تھا اس کا ایک بڑا حصہ انہوں نے فراموش کر دیا' آخر کار ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کیلئے دشمنی اور آپس کے بغض و عناد کا بیج بو دیا' اور ضرور ایک وقت آئے گا جب اللہ انہیں بتائے گا کہ وہ دنیا میں کیا بناتے رہے ہیں۔"

(وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (۲۰) يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ (۲۱) قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ (۲۲) قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ

عَلَيۡهِمَا ادۡخُلُوۡا عَلَيۡهِمُ الۡبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلۡتُمُوۡهُ فَاِنَّكُمۡ غٰلِبُوۡنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوۡۤا
اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ (۲۳) قَالُوۡا يٰمُوۡسٰۤى اِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوۡا فِيۡهَا فَاذۡهَبۡ
اَنۡتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ (۲۴) قَالَ رَبِّ اِنِّىۡ لَاۤ اَمۡلِكُ اِلَّا نَفۡسِىۡ وَاَخِىۡ
فَافۡرُقۡ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِيۡنَ (۲۵) (۵: ۲۰ تا ۲۵))

”یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ ”اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی اس نعمت کا خیال کرو جو اس نے تمہیں عطا کی تھی۔ اس نے تم میں سے نبی پیدا کئے' تم کو فرمان روا بنایا اور تم کو وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا۔ اے برادران قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے۔ پیچھے نہ ہٹو ورنہ ناکام و نامراد پلٹو گے۔“ انہوں نے جواب دیا ”اے موسیٰ وہاں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں' ہم وہاں ہرگز نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں اگر وہ نکل آئے تو ہم داخل ہونے کیلئے تیار ہیں۔“ ان ڈرنے والوں میں دو شخص ایسے بھی تھے جن کو اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا' انہوں نے کہا کہ ”ان جباروں کے مقابلے میں دروازے کے اندر گھس جاؤ جب تم اندر پہنچ جاؤ گے تو تم ہی غالب رہو گے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو اگر تم مومن ہو۔“ لیکن انہوں نے پھر یہی کہا۔ ”اے موسیٰ ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے۔ جب تک وہ وہاں موجود ہیں۔ بس تم اور تمہارے رب دونوں جاؤ اور لڑو' ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔“ اس پر موسیٰ نے کہا ”اے میرے رب میرے اختیار میں کوئی نہیں ہے مگر میری اپنی ذات یا میرا بھائی' پس تو ہمیں ان نافرمان لوگوں سے الگ کر دے۔“ اللہ نے جواب دیا ”تو وہ ملک اب چالیس سال تک ان پر حرام ہے۔ یہ زمین میں مارے مارے پھریں گے' ان نافرمانوں کی حالت پر ہرگز ترس نہ کھاؤ۔“

(مِنۡ اَجۡلِ ذٰلِكَ ۛۚ كَتَبۡنَا عَلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اَنَّهٗ مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَيۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ
فِى الۡاَرۡضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا ؕ وَمَنۡ اَحۡيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحۡيَا النَّاسَ جَمِيۡعًا ؕ
وَلَقَدۡ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُنَا بِالۡبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ بَعۡدَ ذٰلِكَ فِى الۡاَرۡضِ لَمُسۡرِفُوۡنَ

(۵: ۳۲)) ”اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ ”جس نے کسی انسان کو بغیر اس کے کہ وہ کسی کا قاتل ہو یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔“ مگر ان کا حال یہ ہے کہ ہمارے رسول پے در پے ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات لیکر آئے پھر بھی ان میں بکثرت لوگ زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں۔“

(يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ۭ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ۭ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ۭ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ښ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (٤١) سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ---- (٤٢)(٥: ٤١-٤٢))

”اے پیغمبر' تمہارے لئے باعث رنج نہ ہوں وہ لوگ جو کفر کی راہ میں بڑی تیز گامی دکھا رہے ہیں خواہ وہ ان میں سے ہوں جو منہ سے کہتے ہیں ہم ایمان لائے مگر دل ان کے ایمان نہیں لائے' یا ان میں سے ہوں جو یہودی ہیں' جن کا حال یہ ہے کہ جھوٹ کیلئے کان لگاتے ہیں اور دوسرے لوگوں کی خاطر جو تمہارے پاس کبھی نہ آئے' سن گن لیتے پھرتے ہیں' کتاب اللہ کے الفاظ کو ان کا صحیح محل متعین ہونے کے باوجود اصل معنی سے پھیرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو نہیں تو نہ مانو۔ جسے اللہ نے فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو اس کو اللہ کی گرفت سے بچانے کیلئے تم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا چاہا' مگر ان کیلئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں سخت سزا............ یہ جھوٹ سننے والے اور حرام کے مال کھانے والے ہیں۔“

(قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ (٥٩) قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَاۗءِ السَّبِيْلِ (٦٠)(٥: ٥٩ - ٦٠))

”ان سے کہو: اے اہل کتاب' تم جس بات پر ہم سے بگڑے ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم اللہ پر اور دین کی اس تعلیم پر ایمان لائے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور ہم سے پہلے بھی نازل ہوئی تھی اور تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔ پھر کہو: کیا میں ان لوگوں کی نشاندہی کر دوں جن کا انجام خدا کے ہاں فاسقوں کے انجام سے بدتر ہے' وہ جن

پر خدا نے لعنت کی' جن پر اس کا غضب ٹوٹا' جن میں سے بندر اور سور بنائے گئے' جنہوں نے طاغوت کی بندگی کی - ان کا درجہ اور بھی زیادہ برا ہے - اور وہ سواء السبیل سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں -"

(وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ (٦١) وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (٦٢) لَوْلَا يَنْھٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (٦٣) وَقَالَتِ الْيَھُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ۭ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۭ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰي يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (٦٤)

(٥: ٦٢ تا ٦٤))

"جب یہ لوگ تم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ' حالانکہ کفر لیے ہوئے آئے تھے اور کفر ہی لیے ہوئے واپس گئے اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں - تم دیکھتے ہو کہ ان میں سے بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں پر دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں اور حرام کے مال کھاتے ہیں - بہت ہی بری حرکات ہیں جو یہ کر رہے ہیں - ان کے علماء و مشائخ انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے منع نہیں کرتے - یقیناً بہت ہی برا کارنامہ زندگی ہے جو یہ تیار کر رہے ہیں ....... یہودی کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں ....... باندھے گئے ہیں ان کے ہاتھ اور لعنت پڑی ان پر اس بکواس کی بدولت جو یہ کرتے ہیں ....... اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں' جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ جو کلام تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے وہ ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی و باطل پرستی میں الٹا اضافہ کا موجب بن گیا ہے اور ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کیلئے عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے - جب کبھی جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اس کو ٹھنڈا کرتا ہے - یہ زمین میں فساد پھیلانے کی سعی کر رہے ہیں مگر اللہ فساد پھیلانے والوں کو پسند نہیں کرتا -"

(قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ لَیَزِیْدَنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْیَانًا وَّ كُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ (۶۸) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِئُوْنَ وَ النَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۶۹) لَقَدْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَ اَرْسَلْنَاۤ اِلَیْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِیْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِیْقًا یَّقْتُلُوْنَ (۷۰) وَ حَسِبُوْۤا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ (۷۱) (۵:۶۸ تا ۷۱))

"صاف کہہ دو کہ اے اہل کتاب ' تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تورات و انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں ۔" ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے ان میں اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھادے گا۔ مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔ مسلمان ہوں یا یہودی ' صابی ہوں یا عیسائی جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا بے شک اس کیلئے نہ کسی خوف کا مقام ہے اور نہ رنج کا .... ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے ۔ مگر جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ' ان کی خواہشات نفس کے خلاف کچھ لیکر آیا تو کسی کو انہوں نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا ۔ اور اپنے نزدیک یہ سمجھے کہ کوئی فتنہ رونما نہ ہو گا ۔ اس لئے اندھے اور بہرے بن گئے ۔ پھر اللہ نے انہیں معاف کیا تو ان میں سے اکثر لوگ اور زیادہ اندھے اور بہرے بنتے چلے گئے ۔ اللہ ان کی سب حرکات دیکھ رہا ہے ۔"

(لُعِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ (۷۸) كَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ (۷۹) تَرٰى كَثِیْرًا مِّنْهُمْ یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَ فِی الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ (۸۰) وَ لَوْ كَانُوْا یُؤْمِنُوْنَ

بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۸۱)

(۵:۷۸ تا ۸۱)) "بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہوگئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے' انہوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا' برا طرزعمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا تھا۔ آج تم ان میں بکثرت ایسے لوگ دیکھتے ہو جو کفار کی حمایت ورفاقت کرتے ہیں۔ یقیناً بہت برا انجام ہے جس کی تیاری ان کے نفسوں نے ان کیلئے کی ہے' اللہ ان پر غضبناک ہوگیا ہے اور وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہونیوالے ہیں۔ اگر فی الواقعہ یہ لوگ اللہ اور پیغمبر اور اس چیز کو ماننے والے ہوتے جو پیغمبر پر نازل ہوئی تھی تو کبھی کافروں کو اپنا رفیق نہ بناتے مگر ان میں سے بیشتر تو خدا کی اطاعت سے نکل چکے ہیں۔"

(لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۵:۸۲)) "تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے' اور ایمان لانے والوں کیلئے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں' یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار اور عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرور نفس نہیں ہے۔"

---ooo---

جماعت مسلمہ کے دشمنوں کے خلاف یہ مہم نہایت ہی زوردار ہے۔ اس میں خصوصاً یہود اور مشرکین پر تنقید کی گئی ہے اور اس میں منافقین اور نصاریٰ کا بھی جابجا ذکر ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ اس سورہ میں مدینہ طیبہ میں اس وقت کی جماعت مسلمہ کے موقف کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مدینہ طیبہ میں جماعت مسلمہ کن حالات سے دوچار تھی۔ اور مخالفین کے ساتھ کس کشکش میں مصروف تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے ہر تحریک اسلامی ایسے ہی حالات سے دوچار ہوتی رہی ہے۔ مدینہ طیبہ میں جو حالات تھے ہمیشہ اہل حق کو ان حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ سوال یہ ہے یہ سورہ مدینہ طیبہ میں کب نازل ہوئی تھی؟ تاکہ معلوم ہوسکے کہ اس کا اصل تاریخی پس منظر کیا ہے۔

متعدد روایات میں یہ بات آئی ہے کہ یہ سورہ سورہ فتح کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اور سورہ فتح ۶ھ میں واقعہ حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی تھی۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ یہ سورہ آیت ۳ کے سوا سب کی سب ایک ہی دفعہ نازل ہوئی ہے۔ یعنی آیت (اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ) جس کے بارے میں روایت ہے کہ یہ سن دس ہجری میں حجۃ الوداع کے

موقع پر نازل ہوئی۔
لیکن اس سورہ کے مضامین اور موضوعات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان روایات کے اندر جو یہ کہا گیا ہے کہ یہ سورہ سورہ فتح کے بعد پوری کی پوری ایک بار نازل ہوئی شاید درست نہیں ہے۔ سیرت النبی میں غزوہ بدر کے موقع پر ایک واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ ﷺ کے ساتھ جنگ کیلئے بیت المقدس میں داخل ہونے سے جو انکار کیا تھا' اس کی بابت مسلمانوں کو بدر کے وقت اچھی طرح علم تھا اور بدر کا واقعہ ۲ ھ میں ہوا تھا۔ بدر کے موقع پر حضرت سعد بن معاذ انصاری ﷺ اور بعض روایات میں حضرت مقداد بن عمرو نے یہ کہا تھا۔ "اے رسول اللہ' ہم آپ کو ایسا جواب نہ دیں گے جو قوم موسیٰ نے حضرت موسیٰ کو دیا تھا کہ "تم اور تمہارا رب جاؤ اور لڑو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔" بلکہ ہمارا جواب یہ ہے کہ نکلیں آپ اور آپ کا رب اور ہم آپ کے اتباع میں نکلنے والے ہیں........"
موضوعات اور مضامین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ آیات نازل ہو رہی تھیں' اس وقت یہودی طاقت ور اور مضبوط لوگ تھے اور ان کو مدینہ میں اثر و رسوخ حاصل تھا۔ خود اہل اسلام کی صفوں میں بھی ان سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ قرآن مجید نے ان کے خلاف یہ تنقیدی مہم شروع کر کے ان کی سازشوں سے ان کو خبردار کیا۔ جبکہ تاریخی صورت حال یہ رہی ہے کہ غزوۂ بنو قریظہ اور غزوہ خندق کے بعد ان کو یہ اثر و رسوخ حاصل نہ تھا۔ اور مدینہ کے قرب و جوار سے یہودیوں کے تینوں قبیلے بنی قینقاع و بنو نضیر اور بنو قریظہ کو نکال کر جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ اس لئے صلح حدیبیہ کے بعد یہودیوں کو اس قدر اہمیت حاصل نہ تھی جو اس سورہ میں ان کو دی گئی ہے۔ پھر اس دور میں ان کے ساتھ عدم دشمنی اور دوستی کا جو معاہدہ تھا' وہ بھی ختم ہو گیا تھا اور حدیبیہ کے بعد سابقہ عہد کی جگہ ان کے ساتھ کوئی جدید عہد بھی نہ ہوا تھا۔ اس لئے اللہ کا یہ فرمان (وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۳) "اور آئے دن تمہیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ ان میں سے بہت کم لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں۔ لہذا انہیں معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو۔ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کی روش رکھتے ہیں....... ضروری ہے کہ وہ اس دور سے پہلے کا ہو' نیز یہ کہ آپ ان کے درمیان فیصلہ کریں اور ان کے ساتھ چشم پوشی کریں۔"
اس داخلی مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس سورہ کے بعض حصے ایسے ہیں کہ سورہ فتح سے پہلے نازل ہوئے اور بعض ایسے ہیں جو اس کے بعد نازل ہوئے۔ نیز آیت (اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ) لازماً سورہ الفتح کے بعد نازل ہوئی ہے اس لئے کہ راجح اقوال کے مطابق یہ آیت قرآن کریم کی آخری آیات میں سے ہے۔ لہذا یہ بات ثابت ہوئی کہ جس طرح بعض روایات میں آتا ہے ان کے برعکس یہ سورہ سب کی سب ایک ہی بار نازل نہیں ہوئی۔
جس طرح ہم نے سورہ بقرہ' سورہ آل عمران اور سورہ نساء کے آغاز میں کہا کہ قرآن نے مسلمانوں کو لیکر' ان کے دشمنوں کے ساتھ کشمکش شروع کر دی تھی اور ان میں سرفہرست یہودی' اور مشرکین مکہ تھے جو مسلمانوں اور ان کے دین کے سخت دشمن تھے۔ اس کشمکش میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی نظریاتی تطہیر بھی فرما رہے تھے اور ان کیلئے جدید معاشرے کے خدوخال بھی وضع ہو رہے تھے اور بیک وقت ان کیلئے اخلاقی اور قانونی اور تمدنی اصول بھی وضع کئے جا رہے تھے۔ یہ

تمام کام ایک ہی وقت میں ایک ہی طریق کار کے مطابق ہو رہے تھے۔

کسی معاشرے کی تعمیر میں پہلا کام اس کی نظریاتی تطہیر ہوتی ہے اس لئے اس سورہ میں بھی قرآن کریم نے سب سے زیادہ زور نظریۂ توحید پر دیا ہے اور توحید کو ہر قسم کے شرکیہ شائبہ سے پاک کیا گیا ہے۔ پھر اس سورہ میں (الدین) کا مفہوم واضح کر کے بتایا گیا ہے کہ دین سے مراد زندگی کا پورا نظام ہے اور یہ کہ دین پوری زندگی کا منہاج ہے اور یہ کہ کسی بھی اسلامی معاشرے اور تمدن میں لازم ہے کہ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کئے جائیں۔ زندگی کے تمام معاملات میں ہدایات اللہ وحدہ لاشریک سے اخذ کی جائیں۔ یہی ایمان ہے اور یہی اسلام ہے۔ اس کے سوا توحید کا کوئی وجود ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ توحید کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ وحدہ حاکم ہے اور ربوبیت کی تمام صفات اور حقوق صرف اللہ کو حاصل ہیں۔ ان میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ حاکمیت اور قانون سازی اللہ تعالیٰ کی اہم ترین خصوصیات میں سے ہیں۔ حاکمیت اور قانون سازی اللہ ہی کا حق ہے جس طرح پرستش اور عبادت صرف اللہ کا حق ہے۔ اس پوری سورہ میں اس نکتے پر بہت ہی زور دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے تفصیلاً کہا ہے جس طرح اس سے قبل کی طویل سورتوں کے موضوعات ایک جیسے تھے اسی طرح اس سورہ کے بنیادی موضوعات بھی وہی ہیں۔ لیکن ہر سورہ میں ان موضوعات پر بات حالات و مواقع کی مناسبت سے مختلف انداز میں کی گئی ہے۔ ہر سورہ کا وجود' اس کا رنگ اور اس کا اسلوب کلام بالکل مختلف ہے لیکن موضوع سخن ایک ہی ہے۔ جبکہ زاویہ بحث وہ نہیں ہوتا جو دوسری سورتوں میں ہوتا ہے۔ اسی طرح موضوع پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اور بیان کے اندر بعض نئے موثرات لائے جاتے ہیں۔ اس طرح ان عارضی تبدیلیوں سے ہر سورہ کی شخصیت الگ ہو جاتی ہے اور اس کی خصوصیات سامنے آجاتی ہیں۔

اس سورہ کا انداز خطیبانہ ہے اور بات نہایت ہی فیصلہ کن انداز میں کی گئی ہے چاہے بات احکام شرعیہ کی ہو جہاں عموماً بات فیصلہ کن انداز میں ہوتی ہے' یا اصولوں کی بات ہو یا عام ہدایات کا بیان ہو جہاں مختلف انداز اختیار کئے جاتے ہیں۔ بہرحال اس سورہ کے اندر تمام بیانات فیصلہ کن شکل میں ہیں۔ اور بیان کا انداز خطیبانہ ہے۔ غرض اس پوری سورہ کی یہی دو خصوصیات ہیں فیصلہ کن بات اور زور دار خطیبانہ کلام۔

اس سورہ پر بات ختم کرنے سے پہلے یہ بات ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس کی آیت ۳ پر مزید روشنی ڈالی جائے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تمہارے لئے میں نے نظام زندگی کے طور پر اسلام کو پسند کر لیا ہے اور تم پر تمام انعامات مکمل کر دیئے ہیں............... اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ یہ امت جس منبع اور مرجع سے اپنے لئے نظام حیات اور اپنے معاشرے اور تمدن کا نظام لے گی وہ صرف ایک ہے۔ مسلمان اپنا قانون' اپنی پالیسی' اور اپنے اجتماعی روابط قیامت تک صرف اللہ سے لیں گے۔ اور یہ کہ یہ دین مکمل طور پر قائم و دائم ہو گا۔ یہ بات لازم ہے کہ اسے اپنی تمام جزئیات کے ساتھ قائم کیا جائے۔ اس کے نظریات بھی زندہ رہیں اور اس کے مراسم عبودیت بھی قائم ہوں۔ نہ شریعت و قانون میں تبدیلی ہو گی اور نہ عبادت میں تبدیلی ہو گی۔ یہ دین اب مکمل صورت میں آگیا۔ اس کا معاملہ پورا ہو گیا ہے اور اس میں کسی تبدیلی کا مطلب یہ ہو گا کہ اس کا انکار کر دیا جائے۔ اس لئے کہ جو شخص دین میں کوئی تبدیلی کرتا ہے' وہ گویا بالواسطہ دین کے مکمل ہونے کا انکار کرتا ہے اور دین کے مکمل ہونے کا انکار لازماً کفر ہے۔ رہی یہ بات کہ کوئی شخص دینی نظام اور اسلامی منہاج کو مکمل طور پر چھوڑ کر کسی کافرانہ منہاج کو اختیار کر

لے 'کوئی دوسری شریعت اپنا لے تو اس کے بارے میں کسی فیصلے کی کسی کو ضرورت ہی نہیں ہے۔اسی سورہ کے اندر خود اللہ نے ایسے شخص کی تعریف کی ہے۔اس پر زیادتی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ آیت ناقابل انکار انداز میں یہ فیصلہ کرتی ہے کہ دین اسلام دائمی ہے۔اسلامی قانون دائمی ہے۔یہ صورت جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کیلئے بطور دین تجویز کی ہے یہ آخری صورت ہے۔یہ صورت اس وقت بھی شریعت تھی 'آج کی بھی شریعت ہے اور ہر دور میں یہی شکل ہماری شریعت کی ہے۔اب نہ کسی زمانے کیلئے کوئی الگ قانون ہوگا نہ کسی دور میں کوئی نیا دین آئے گا۔حضرت محمد ؐ کی رسالت آخری رسالت ہے۔اب دین کامل اور تمام ہوگیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بحیثیت آخری دین اس کی منظوری دیدی ہے۔اب جو شخص اس میں تبدیلی لاتا ہے 'اس کے طور طریقے بدلتا ہے' اس کے اندر تغیر پیدا کرتا ہے یا اس کو نئی شکل وصورت یا نئے رنگ دیتا ہے تو گویا وہ اسلام کے علاوہ کوئی نیا دین تلاش کر رہا ہے اور اللہ کو یہ ہرگز قبول نہ ہوگا۔( وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ) یہ نظام زندگی وہ ہے جس کے اندر نظریات و اعتقادات موجود ہیں 'جس کے اندر مراسم عبودیت موجود ہیں 'جس کے اندر زندگی کی تفصیلات اور قوانین موجود ہیں۔یہ پوری زندگی کی سرگرمیوں پر حکمرانی کرتا ہے' پوری زندگی کے امور میں متصرف ہوتا ہے اور پوری زندگی پر محیط ہوتا ہے۔وہ اپنے دائرے کے اندر اس زندگی کیلئے نشوونما اور ترقی کے مواقع فراہم کرتا ہے۔لیکن وہ اس ترقی اور تبدیلی کی خاطر نہ اسلامی نظام کے اصول قربان کرتا ہے اور نہ جزئیات میں سے کوئی جزئیہ تبدیل کرتا ہے اس لئے کہ یہ دین آیا ہی اس لئے ہے کہ وہ اسلامی اصول قائم کرے اور اسلامی نظام کی جزئیات کو اپنی جگہ استوار کرے۔

اسلامی نظام میں زندگی کے اندر تغیر و تبدل اور حرکت اور ترقی کا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ اسلامی اصول یا فروع میں سے کسی چیز کو ترک کر دیا جائے یا انہیں بے کار چھوڑ دیا جائے بلکہ تمام اصول و فروع پر عمل کرتے ہوئے بھی اسلامی نظام کے اندر تغیر و تبدل اور زندگی کی ترقی کے مواقع موجود ہیں۔یہ ترقی اسلامی زندگی کے کسی اصول اور کسی جزئیہ پر اثرانداز نہیں ہوتی۔غرض اسلامی نظام نے پہلے سے ترقی کے دروازے اپنی اسکیم کے مطابق کھلے رکھے ہیں اس لئے کہ اللہ کی نظروں سے کوئی چیز اوجھل نہ تھی۔اور ہر چیز اور مستقبل کے تمام تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اللہ نے اسلامی نظام حیات کو آخری شکل دی اور اس کو لوگوں کیلئے قیامت تک کیلئے پسند کرلیا۔اللہ کو علم تھا کہ آئندہ بعض تبدیلیاں ہوں گی بعض ضروریات انسانوں کو نئی لاحق ہوں گی۔اور ان ضروریات اور ان تبدیلیوں کے نتیجے میں نئے نئے تقاضے سامنے آئیں گے۔لہٰذا یہ بات ضروری تھی کہ اللہ تعالیٰ اسلامی نظام کے اندر یہ تمام سہولتیں پہلے سے فراہم کردیں۔

آج جو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اسلامی نظام میں دور جدید کے تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ان لوگوں نے نہ ذات باری کو اچھی طرح سمجھا ہے اور نہ اس پر یقین کیا ہے 'اس لئے کہ یہ تصور اللہ کے شایان شان ہی نہیں ہے ........میں سمجھتا ہوں سورہ مائدہ پر اس قدر اجمالی تبصرہ کافی ہے۔اب ہم اس کے دروس کو تفصیلاً لیں گے۔

---ooo---

# درس نمبر ۴۶ تشریح آیات

# ۱ -- تا -- ۱۱

(یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ -- )

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' بندشوں کی پوری پابندی کرو)- زندگی کے بسر کرنے کے لئے کچھ ضوابط کی ضرورت ہوتی ہے۔ خود انسان اور اس کے نفس کے درمیان جو تعلق ہے اس کے لئے بھی کچھ اصول اور ضوابط ہوتے ہیں۔ پھر ایک انسان اور انسان کے درمیان تعلق کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور پھر انسان اور تمام دوسری زندہ مخلوق اور غیر زندہ اشیاء کے درمیان بھی تعلق کے ضابطے ہوتے ہیں۔ لوگوں میں سے رشتہ داروں سے تعلقات' غیر رشتہ داروں اور دور کے لوگوں کے ساتھ تعلقات' خاندان اور قوم کے لوگوں کے ساتھ تعلقات' جماعت کے ساتھ تعلقات اور پھر پوری امت کے ساتھ ایک فرد کا تعلق' دشمنوں کے ساتھ تعلق' دوستوں کے ساتھ تعلق' دنیا کی ان زندہ چیزوں کے ساتھ تعلق جنہیں اللہ نے انسان کے قابو میں رکھا ہے اور ان کے ساتھ تعلق جو بے قابو ہیں اور اس وسیع وعریض کائنات کی تمام اشیاء کے ساتھ انسان کے تعلق کے اصول و ضوابط اسلامی نظام زندگی کے اندر پورے کے پورے موجود ہیں۔ پھر انسان کی زندگی کا ربط اپنے رب کے ساتھ' اپنے آقا کے ساتھ تو ایک ایسا تعلق ہے جو زندگی کی بنیادی قدر ہے۔ یہ تمام امور اس نظام کے اندر مقرر اور منضبط ہیں۔

اسلامی نظام ان تمام ضوابط اور تعلقات کو انسانی زندگی کے اندر عملاً ثابت کرتا ہے۔ وہ ان تعلقات کو قائم کرتا ہے' ان کے لئے حدود و قیود متعین کرتا ہے اور ان کی پوری پوری وضاحت کرتا ہے۔ اور یہ تمام رابطے رب ذوالجلال کے عنوان سے ہوتے ہیں۔ وہ ان تمام رابطوں کے احترام کی ضمانت دیتا ہے۔ ان کی بے حرمتی اور ان کے ساتھ مذاق کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ان روابط کے بارے میں اسلامی نظام یہ صورت حال برداشت نہیں کرتا کہ انہیں بدلتی ہوئی خواہشات نفسانیہ کے حوالے کر دے یا ان اغراض و مقاصد کے تابع کر دے جن کا تعلق کسی ایک فرد کی خواہش اور سوچ سے ہو۔ یا کوئی جماعت ان اغراض اور خواہشات میں دلچسپی رکھتی ہو یا اقوام عالم میں سے کسی قوم میں یہ اغراض پائی جاتی ہوں یا تاریخ انسانی کی نسلوں میں سے کوئی نسل ان میں دلچسپی رکھتی ہو اور ان اسباب کی وجہ سے انہیں توڑ دینا چاہتی ہو۔ ان تمام روابط ہی میں انسان کی مصلحت ہے بشرطیکہ ان روابط کو اللہ اور رسول نے لوگوں کے لئے وضع کیا ہو' اگرچہ کوئی فرد' کوئی جماعت' کوئی قوم یا کوئی نسل یہ سمجھتی ہو کہ ان میں انسانوں کی مصلحت نہیں ہے اس لئے کہ اللہ خوب جانتا ہے

اور لوگوں کا علم محدود ہے۔ جو فیصلہ اللہ کرتا ہے وہ بہتر ہے اس سے جو خود لوگ کرتے ہیں۔ اللہ میاں کے ادب و احترام کا پہلا زینہ یہ ہے کہ انسان اپنے ذاتی اندازے کو اللہ کی تقدیر کے مقابلے میں نہ لائے اور یہ سمجھے کہ بہتر وہی ہے جو اللہ نے قرار دیا۔ اور جو اللہ نے قرار دیا' اس کے آگے سر تسلیم خم کر دے' نہایت ہی رضامندی' نہایت ہی وثوق اور پورے اطمینان کے ساتھ۔

یہ تمام ضوابط جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا' ان کی تعبیر اللہ تعالیٰ لفظ "العقود" سے فرماتے ہیں اور اہل ایمان کو حکم دیتے ہیں کہ وہ ان عقود کی پوری پوری پابندی کریں۔ اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ بندشوں اور عقود کی پابندی کرو اور اس کے بعد پھر حلال و حرام کا بیان شروع کر دیا۔ کھانے پینے میں سے محرمات کو بیان کر دیا۔ نکاح میں جو محرمات ہیں ان کو بیان کر دیا اور ان کے بعد دوسرے شرعی احکام اور عبادات کے طریقوں کی تفصیلات بیان کیں۔ اس کے علاوہ صحیح عقائد و نظریات کی تشریح بھی کی گئی۔ بندگی اور عبادت کے طریقے بھی بیان ہوئے اور اللہ کی حاکمیت کی تفصیلات بھی دی گئیں۔ پھر امت مسلمہ اور دوسری امم کے درمیان تعلقات کی نوعیت کا تذکرہ بھی ہوا اور احکام بھی ذکر ہوئے۔ امت مسلمہ کا فریضہ ہے کہ وہ شہادت حق ادا کرے۔ دنیا میں انصاف قائم کرے۔ پوری انسانیت کی نگرانی کرے' اس لئے کہ اس کی کتاب بھی تمام کتب پر حاوی اور نگہبان ہے۔ اور پھر یہ حکم کہ اسلامی معاشرے میں فیصلے اللہ کے قانون کے مطابق ہوں اور یہ حکم کہ فتنے میں نہ پڑو اور ذاتی اور شخصی وجوہات کی بنا پر عدل و انصاف کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ یہ تمام امور العقود کی تشریح کرتے ہیں۔

غرض اس سورہ کا افتتاح لفظ العقود سے اور اس کے بعد تمام احکام و عقائد و عبادات کی تشریح اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ لفظ عقود اور عقد کا مفہوم اس لغوی مفہوم سے بہت ہی وسیع ہے جو اس لفظ کے سنتے ہی ذہن میں آ جاتا ہے بلکہ اس سے مراد وہ تمام ضابطہ حیات ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ انسان کے لیے اللہ نے جو ضابطہ حیات مقرر فرمایا ہے اس کی اساس ایمان باللہ اور اس معرفت پر ہے کہ اللہ کی الوہیت کا مفہوم کیا ہے اور اللہ کی الوہیت' حاکیت اور معبودیت کے تقاضے کیا ہیں؟ یہ عقد اس ایمان اور تصور حاکیت الہیہ سے پھوٹتا ہے اور زندگی کے تمام ضوابط اس ایمان اور عقیدہ اور پابندی عقود پر استوار ہوتے ہیں۔

اللہ پر ایمان لانے کا عقد' اللہ کی حاکیت' ربوبیت اور اس کے قوام اور نگران ہونے کا اعتراف اور اس عقد و اعتراف کے نتیجے میں اللہ کی مکمل بندگی کرنے کے تقاضے اور ہمہ گیر اور عمیق اطاعت اور سر تسلیم خم کر دینے کے وعدے وہ امور ہیں جن پر اسلام کی عمارت استوار ہے۔ یہ عہد سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم سے اس وقت لیا تھا جب اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب خلافت فی الارض کی چابیاں سپرد فرمائی تھیں۔ اس معاہدے اور میثاق کو قرآن کریم نے ان الفاظ اور شرائط کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

(قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۳۸) وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ

هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۳۹) (۲: ۳۸ - ۳۹))

(ہم نے کہا تم سب یہاں سے اتر جاؤ پھر جب میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے' تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے' ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہو گا۔ اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے' وہ آگ میں جانے والے ہیں' جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔) حضرت آدم اور آپ کے بعد مطلق انسان کو جو مقام خلافت فی الارض دیا گیا ہے وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اللہ کے رسول جو ہدایت لے کر آئیں گے ان کو قبول کیا جائے گا۔ اگر اللہ کے رسولوں اور ان پر نازل شدہ ہدایات کو قبول نہ کیا گیا تو یہ عہد کی صریح خلاف ورزی ہو گی اور پھر انسان کو اس کرۂ ارض پر زندہ رہنے کا کوئی حق نہ ہو گا نہ وہ اس زمین کا مالک ہو گا۔ اگر اس عہد کی خلاف ورزی کی گئی تو جو کام بھی اس عہد کے خلاف ہوں گے وہ باطل (Void) اور کالعدم ہوں گے۔ ان کی کوئی قانونی حیثیت نہ ہو گی اور نہ ان افعال کو از سر نو درست کیا جا سکے گا اس لیے جو شخص بھی اللہ پر صحیح ایمان رکھتا ہو' اللہ کے ساتھ اپنے کیے ہوئے عہد کو پورا کرنا چاہتا ہو' اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اس باطل کی مدافعت کرے' اس کو ہرگز قبول نہ کرے اور اس باطل کی اساس پر کوئی معاملہ نہ کرے۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو وہ ہرگز وفائے عہد نہ کر رہا ہو گا۔

اللہ کے ساتھ اس عقد اور اس عہد کی ذریت آدم کے ساتھ تجدید ہوتی رہی ہے۔ آدم علیہ السلام کی جو جو نسل وجود میں آتی رہی ہے اس کے ساتھ یہی عہد از سر نو ہوتا رہا ہے۔ ایک دوسری آیت میں ہے۔

(وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ (۱۷۲) أَوْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِنْ بَعْدِهِمْ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُونَ (۱۷۳) (۷: ۱۷۲ - ۱۷۳))

(اور اے نبی لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" انہوں نے کہا: "ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔" یہ ہم نے اس لئے کہا کہ کہیں قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ "ہم اس بات سے بے خبر تھے۔" یا یہ نہ کہنے لگو کہ "شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے۔ پھر کیا آپ ہمیں اس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا؟")

غرض یہ ایک دوسرا صریح معاہدہ تھا جو ہر فرد کے ساتھ طے ہوا۔ اور یہ عہد ایسا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ

فرماتے ہیں کہ یہ تمام بنی آدم کے ساتھ طے پایا تھا اور یہ اس وقت ہوا جب وہ اپنے باپوں کی پشتوں میں تھے ۔ ہم یہاں یہ سوال نہیں کر سکتے کہ یہ عہد کیسے طے پایا کیونکہ یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ کیسے طے پایا۔ لوگوں کے ساتھ اللہ نے کس طرح خطاب کیا۔ یہ اللہ ہی جانتا ہے جبکہ وہ آباء کی پشتوں میں تھے ۔ بہرحال اللہ نے ان سے خطاب کیا اور ان پر اتمام حجت کیا۔ اور ان سے عہد یہ لیا گیا کہ وہ ان کا رب ہے اور انہوں نے اس کا اقرار کیا جس طرح اللہ نے بیان کیا ہے ۔ اب اگر لوگ اللہ کی الوہیت کو تسلیم نہ کریں گے تو یہ ان کی جانب سے عہد کی خلاف ورزی ہوگی ۔

پھر آگے چل اس سورہ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بھی ایسا ہی عہد لیا تھا' اس وقت جب پہاڑ کو ان کے اوپر ابر کی طرح لٹکا دیا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ یہ پہاڑ ان کے اوپر گرنے ہی والا ہے ۔ آگے بتایا جائے گا کہ انہوں نے کس طرح اس عہد و میثاق کی خلاف ورزی کی اور پھر ان پر خدا کا عذاب کس طرح نازل ہوا۔

اسی طرح حضرت محمد ؐ پر ایمان لانے والے لوگوں نے بھی درحقیقت ' آپ پر ایمان لا کر اللہ سے معاہدہ کیا۔ انہوں نے سمع اور اطاعت پر عہد کیا۔ خوشی میں بھی اور مشکلات میں بھی اور یہ کہ اس عہد کو ہر چیز پہ مقدم رکھیں گے اور کسی کام کے اہل شخص اور مستحق شخص کے استحقاق کو چیلنج نہ کریں گے ۔

اس عام عہد اور عقد کے بعد خصوصی عہد بھی ہوتے رہے ۔ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقعہ پر جس کے نتیجے میں ہجرت کا عمل شروع ہوا اور آپ ؐ مکہ سے مدینہ کی طرف منتقل ہوئے ' انصار کے نمائندوں کے ساتھ ایسا ہی عقد ہوا تھا اور حدیبیہ میں بھی ایک عقد بیعت الرضوان کے نام سے ہوا تھا۔

غرض اللہ پر ایمان لانے کے عقد ' اور اللہ کی بندگی کرنے کے عہد پر تمام دوسرے عقود مرتب ہوتے ہیں ' چاہے ان کا تعلق اللہ کے اوامر سے ہو یا نواہی سے ہو یا ان کا تعلق عام لوگوں ' زندہ چیزوں یا اس کائنات کی دوسری چیزوں سے ہو یا ان حدود میں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کوئی شرعی حکم دیا ہے ۔ یہ سب عقود ہیں اور اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو بحیثیت مومن یہ حکم دے رہے ہیں کہ وہ ان عقود کو پوری طرح سرانجام دیں اس لئے کہ ایمان لاتے ہی ان پر یہ پابندی عائد ہوگئی ہے اور ایمان کا یہ تقاضا ہے کہ وہ ایسا کریں اور یہی وجہ ہے کہ خطاب یوں ہوا (یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ) اور اس کے بعد اب مزید تفصیلات ان عقود کی اس طرح آتی ہیں ۔

سُوْرَةُ الْمَآئِدَةِ (۵) مَدَنِيَّةٌ (۱۱۲)
اٰیَاتُهَا ۱۲۰ رُکُوْعَاتُهَا ۱۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِیْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا یُتْلٰى عَلَیْكُمْ غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَحْكُمُ

مَا يُرِيدُ ۝١ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ
وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ اٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا
مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ
قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى
الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝٢ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ
وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَ
النَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۫ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ
وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ
اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ
مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٣

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' بندشوں کی پوری پابندی کرو۔ تمہارے لئے مویشی کی قسم کے سب جانور حلال کئے گئے' سوائے ان کے جو آگے چل کر تم کو بتائے جائیں گے لیکن احرام کی حالت میں شکار کو اپنے لئے حلال نہ کر لو' بیشک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو..... حرام مہینوں میں سے کسی کو حلال نہ کر لو' قربانی کے جانوروں پر دست درازی نہ کرو' ان جانوروں پر ہاتھ نہ ڈالو جن کی گردنوں میں نذر خداوندی کی علامت

کے طور پر پٹے پڑے ہوئے ہوں نہ ان لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکان محترم (کعبہ) کی طرف جا رہے ہوں۔ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو شکار تم کر سکتے ہو..... اور دیکھو' ایک گروہ نے جو تمہارے لئے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔نہیں' جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔اللہ سے ڈرو' اس کی سزا بہت سخت ہے۔

تم پر حرام کیا گیا مردار' خون' سور کا گوشت' وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو' وہ جو گلا گھٹ کر یا چوٹ کھا کر' یا بلندی سے گر کر' یا ٹکر کھا کر مرا ہو' یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو.... سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پاکر ذبح کر لیا اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا۔ نیز یہ بھی تمہارے لئے ناجائز ہے کہ پانسوں کے ذریعے اپنی قسمت معلوم کرو۔یہ سب افعال فسق ہیں۔ آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے پوری مایوسی ہو چکی ہے لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔(لہٰذا احرام و حلال کی جو قیود تم پر عائد کی گئی ہیں ان کی پابندی کرو) البتہ جو شخص بھوک سے مجبور ہو کر ان میں سے کوئی چیز کھا لے' بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو تو بیشک اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)

قابل ذبح جانوروں میں تحریم و تحلیل' مختلف چیزوں میں سے حلال و حرام مختلف جگہوں میں حلال و حرام' مختلف اوقات میں حلال و حرام کی یہ حدود و قیود سب کی سب عقود ہیں۔یہ تمام عقود اور عہد و پیمان ایمان کی بنیاد پر قائم ہیں اس لئے جو لوگ ایمان لائے ہیں' ان کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حلال و حرام کی بابت تمام ہدایات اللہ تعالیٰ سے اخذ کریں اور اس معاملے میں غیر اللہ سے کچھ نہ لیں۔یہی وجہ ہے کہ بیان کے آغاز ہی میں کہا گیا کہ عقود اور بندشوں کی پوری طرح پابندی کرو اب اس کے بعد حلال و حرام کا بیان شروع ہوتا ہے۔(أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ) (تمہارے لئے مویشی کی قسم کے سب جانور حلال کئے گئے' سوائے ان کے جو آگے چل کر تم کو بتائے جائیں گے)

یعنی اس وجہ سے کہ اللہ نے تمہارے لئے حلال کیا اور اس وجہ سے کہ اس حلت کو اللہ نے تمہارے لئے بیان کیا ہے' کسی اور حلال و حرام کرنے والے نے نہیں کیا' تمہارے لئے ان تمام جانوروں کا کھانا جائز ہو گیا جو مویشیوں کی قسم کے ہوں یعنی مذبوحہ جانور اور شکار کے جانور سوائے ان کے جن کی حرمت آگے خود اللہ تعالیٰ بیان فرما رہے ہیں اور آئندہ جن کی حرمت بیان کی جانے والی ہے' وہ یا تو کسی وقت کے ساتھ مخصوص ہے یا کسی جگہ کے ساتھ مخصوص ہے۔یا وہ مطلق حرمت ہے اور ہر زمان و مکان کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔بہیمۃ الانعام کے لفظ میں اونٹ' گائے اور بکری وغیرہ آتے ہیں۔ان جیسے وحشی جانور بھی ان میں داخل ہیں مثلاً وحشی گائے' ہرنی اور جنگلی گدھے وغیرہ۔

اب اس عمومی حلت کے حکم سے بعض استثنائی صورتوں کو پیش کیا جاتا ہے اور پہلی صورت یہ ہے کہ احرام میں شکار کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔(غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ (۵: ۱) (لیکن احرام کی حالت میں شکار کو اپنے

لئے حلال نہ کر لو) اس تحریم کا اطلاق شکار کرنے کے فعل پر ہو گا۔ حج اور عمرہ کے لئے احرام باندھتے ہی انسان معمول کی زندگی ترک کر کے اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی کے نئے انداز سے اللہ کے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس گھر کے لئے کچھ آداب مقرر فرمائے ہیں۔ اسے دارالامن اور دارالامان قرار دیا ہے۔ اس کی حدود کے اندر جو شخص بھی آتا ہے' اس کے لئے کسی بھی زندہ چیز پر ہاتھ اٹھانا حرام قرار دیا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی وقفہ ہوتا ہے اور نفس انسانی کے لئے ایسے وقفے ضروری ہوتے ہیں۔ اس طرح تمام زندہ اشیاء کا تعلق زندگی بخشنے والے کے ساتھ استوار ہوتا ہے۔ اس عرصے میں اور اس مقام کے حدود کے اندر کوئی زندہ کسی زندہ پر کسی قسم کی دست درازی نہیں کر سکتا۔ اس حکم کے ذریعے انسانی ضروریات کا دائرہ بھی محدود کر دیا جاتا ہے' جس کی وجہ سے شکار کا کھانا جائز قرار دیا گیا تھا اور دوسرے حیوانات کا کھانا حلال کیا گیا تھا تاکہ انسان اس عرصے میں عام جاری زندگی سے ذرا بلند ہو کر اللہ کے گھر میں زمینی کثافتوں سے اوپر اٹھے اور اس کی نظریں بلند اور روشن افق پر ہوں۔

اور آگے بڑھنے اور حلال و حرام کی تفصیلات میں جانے سے پہلے اس عقد کو اس عظیم عقد سے مربوط کر دیا جاتا ہے جو ہر مومن اور ہر انسان نے اللہ کے ساتھ کیا تھا۔ اہل ایمان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ وہ بڑا معاہدہ اللہ کے ساتھ ہوا تھا اور اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ (اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ (۵: ۱)) (بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے) اللہ کی مشیت آزاد ہے۔ اس کا ارادہ ہی اصل حاکم ہے' وہ اس حق حکمرانی میں اکیلا ہے لہذا جو چاہے حکم دے۔ کوئی دوسرا نہیں ہے جو اس کے ارادے میں شریک ہو۔ اس کے علاوہ دوسرے کسی کو بھی حق حکمرانی نہیں ہے۔ کوئی اس کے احکام کو مسترد کرنے والا نہیں ہے اور یہاں بھی وہ جسے چاہے حرام کر دے اور جسے چاہے حلال کر دے کیونکہ وہی قانون ساز ہے۔ اس کے بعد مزید بیان ہوتا ہے اور تاکید کی جاتی ہے کہ اللہ کے ہاں محترم چیزوں کی بے حرمتی تمہارے لئے جائز نہیں ہے۔

(یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰہِ وَلَا الشَّھْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْھَدْیَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا (۵: ۲) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو' خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو...... حرام مہینوں میں سے کسی کو حلال نہ کر لو' قربانی کے جانوروں پر دست درازی نہ کرو' ان جانوروں پر ہاتھ نہ ڈالو جن کی گردنوں میں نذر خداوندی کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوئے ہوں' نہ ان لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکان محترم (کعبہ) کی طرف جا رہے ہوں۔ ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو شکار تم کر سکتے ہو۔)

یہ شعائر اللہ کیا ہیں؟ یہاں جس چیز کی طرف ذہن جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد حج' عمرہ ہیں اور وہ محرمات ہیں کہ حج اور عمرہ کے دوران جن کا ارتکاب حرام قرار دیا گیا ہے اور فرائض وہ ہیں جو ان میں ادا ہوتے ہیں یہاں تک کہ حج اور عمرہ ختم ہو جائیں یعنی قربانی کرنے کے بعد۔ احرام کی حالت میں احرام باندھنے والے کے لئے جائز نہیں ہے کہ

وہ ان شعائر اللہ کو حلال قرار دے یا ان کا احترام ملحوظ نہ رکھے کیونکہ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ اس احترام کا لحاظ نہ رکھے گا جو اللہ نے ان چیزوں کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ ان شعائر کی نسبت اللہ کی طرف اس لئے کی گئی ہے کہ اللہ کے ہاں یہ نہایت ہی محترم چیزیں ہیں اور ان کا استخفاف نہایت ہی خطرناک جرم ہو گا۔

حرام مہینے کون سے ہیں۔ رجب' ذوالقعدہ' ذوالحجہ اور محرم چار مہینے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان مہینوں کے اندر جنگ کو حرام کیا ہے۔ اسلام سے قبل عرب بھی ان مہینوں میں جنگ کو ناجائز سمجھتے تھے لیکن وہ حسب خواہش ان حرام مہینوں میں رد و بدل کر دیتے تھے۔ اس میں وہ نسئ کا عمل کرتے تھے یعنی کسی مہینے کی حرمت کو کچھ عرصے کے لئے موخر کر دیتے تھے اور اس تاخیر کا فتویٰ وہ کاہنوں سے لیتے تھے یا بعض مضبوط جنگی قبائل سے اس کا اعلان کروا دیتے تھے۔ یہ تاخیر ایک سال سے دوسرے سال تک کر دی جاتی۔ جب اسلام آیا تو اسلام نے اس عمل نسئ کو حرام قرار دیا اور ان مہینوں کو اس طرح حرام قرار دیا جس طرح اللہ نے انہیں حرام قرار دیا تھا اور جس طرح یہ مہینے آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش کے وقت سے اللہ نے رکھے تھے۔ سورہ توبہ کی آیت میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے۔

(اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۹:۳۶)

(حقیقت یہ ہے کہ مہینوں کی تعداد جب سے اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے اللہ کے نوشتے میں بارہ رہی ہے اور ان میں سے چار مہینے حرام ہیں یہی ٹھیک ضابطہ ہے تم ان مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو اور تم تمام مشرکوں سے جہاد کرو جیسا کہ وہ تم سب سے لڑتے ہیں۔)

اس سے اگلی آیت میں فیصلہ کیا گیا کہ نسئ کا عمل کفر کے اندر مزید کافرانہ فعل ہے اور صحیح بات اللہ کا حکم ہے اور وہ یہ کہ اس میں قتال حرام ہے بشرطیکہ ان مہینوں میں کوئی مسلمانوں پر حملہ آور نہ ہو۔ اگر ان پر حملہ ہو تو وہ دفاع کر سکتے ہیں۔ یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ حملہ آور ان مہینوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کریں اور خود ان مہینوں کے احترام کا لحاظ نہ رکھیں۔ ہاں اگر ان کی اسکیم یہ ہو کہ وہ ان مہینوں کو ڈھال بنا کر مسلمانوں کی طرف جوابی کارروائی سے بچ جائیں تو یہ اجازت نہ ہو گی۔ اشہر حرام کے اندر قتال کا حکم اس سے قبل سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

"ہدی" وہ جانور ہے' جسے حاجی یا عمرہ کرنے والا ساتھ لاتا ہے اور حج اور عمرہ سے فارغ ہو کر اسے ذبح کرتا ہے۔ اسے نحر کہتے ہیں اور اس پر حج اور عمرہ کرنے والے کے مناسک ختم ہو جاتے ہیں یہ یا تو اونٹ ہوتا ہے یا کوئی مویشی ہوتا ہے یا بھیڑ بکری ہوتی ہے۔ اور یہ کہ "ہدی حلال نہیں ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ جس غرض کے لئے اسے خریدا گیا یا لایا گیا' اس کے سوا کسی اور غرض کے لئے اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔ اسے اس وقت تک ذبح نہ کیا جائے گا جب تک حج میں یوم النحر کا دن نہیں آ جاتا اور عمرہ کے مناسک ختم نہیں ہو جاتے۔ ان قربانیوں کے گوشت' چمڑوں'

بالوں اور اون وغیرہ سے (بشکل قیمت) کوئی شخص خود نفع اندوز نہیں ہو سکتا اور ضروری ہے کہ وہ ان چیزوں کو فقراء پر صرف کرے۔

قلائد سے مراد وہ جانور ہیں جن کے گلے میں اس کا مالک پٹہ ڈال دیتا تھا۔ یہ پٹہ ان جانوروں کے ہدی ہونے کی علامت ہوا کرتا تھا۔ یہ پٹہ ڈال کر حاجی جانور کو آزاد چھوڑ دیتے تھے اور یوم النحر پر اسے ذبح کرتے تھے۔ جانوروں کے گلوں میں جب پٹے ڈال دیئے جاتے اس کے بعد وہ کسی دوسری غرض کے لئے حلال نہ ہوتے اور اس غرض کے سوا انہیں ذبح نہ کیا جاسکتا۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ قلائد وہ ہیں جن کے گلوں میں پٹے ڈال دیئے جاتے تھے اور مقصد یہ ہوتا تھا کہ یہ جانور حج اور عمرہ کے لئے خریدے گئے ہیں۔ اس طرح ان کو ڈاکوؤں، دشمنوں وغیرہ سے بچایا جاتا تھا۔ وہ حرم کے درختوں سے ایسی چیزیں بناتے تھے جن کو ان جانوروں کی گردنوں میں ڈال دیتے تھے۔ ان جانوروں کو عام طور پر علاقے میں چھوڑ دیا جاتا تھا اور کوئی بھی ان پر دست درازی نہ کرتا تھا۔ جن لوگوں نے قلائد کا یہ مفہوم بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے اس لئے کہ اس کے بعد نازل ہونے والی آیت:

(یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِھِمْ ھٰذَا وَاِنْ خِفْتُمْ عَیْلَۃً فَسَوْفَ یُغْنِیْکُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ اِنْ شَآءَ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ (۹:۲۸)

(مشرکین ناپاک ہیں، لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکیں اگر تمہیں مفلسی کا خوف ہے تو اللہ تمہیں دولتمند کر دے گا اپنے فضل سے اگر چاہے بے شک اللہ علم و حکمت والا ہے۔)

اور دوسری جگہ (فَخُذُوْھُمْ وَاقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ) (پس انہیں پکڑو، قتل کرو، جہاں بھی تم انہیں پاؤ) لیکن پہلا قول زیادہ قوی ہے اور ظاہر ہے کہ قلائد وہ جانور ہیں جو اللہ کے نام پر نحر کرنے کے لئے نذر کر دیئے گئے ہیں اور ان کے گلے میں پٹے ڈال دیئے گئے ہیں اور اس پر یہ بھی دلیل ہے کہ ان کا تذکرہ ہدی کے بعد آیا۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے بھی ہدی مقلد مراد ہے اور یہ حج اور عمرے کے لئے مقلد جانور ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو بھی حرام قرار دیا ہے جو "آمین البیت" ہوں یعنی جنہوں نے بیت اللہ کی طرف جانے کا ارادہ کر لیا ہو اور جن کا مقصد اللہ کے فضل کی تلاش اور اس کی رضامندی ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حج کا ارادہ رکھتے ہوں یا عمرے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اس میں ان کے پیش نظر دو چیزیں ہو سکتی ہیں، تجارت اور رضائے الٰہی کا حصول۔ اس سفر میں اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو امن کی گارنٹی دی ہے۔

آخر میں وضاحت کر دی گئی کہ شکار کرنا تمہارے لئے مستقلاً حرام نہیں کر دیا گیا۔ جب تم احرام سے باہر آجاؤ تو تمہارے لئے شکار کرنا جائز ہے لیکن حدود حرم سے باہر کیونکہ حدود حرم کے اندر شکار ہر حالت میں حرام ہے۔ (وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا) (اور جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو تم شکار کر سکتے ہو) لیکن حدود حرم سے باہر، اس لئے

کہ حرم کے حدود کو اللہ تعالیٰ نے علاقہ امن قرار دے دیا ہے' جیسا اس نے حرام مہینوں کو امن کا عرصہ (Period) قرار دیا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جس میں لوگ' حیوانات' پرندے اور درخت سب کے سب پر امن رہتے ہیں اور ان کو کسی کی جانب سے دست درازی کا کوئی ڈر نہیں ہوتا۔ غرض ایک ہمہ گیر امن ہے جو اس گھر کے اوپر ایک گھنے سایہ دار درخت کی طرح ہمیشہ لہلہاتا رہتا ہے۔ حدود حرم پر یہ ہمہ گیر "سایہ امن" اس لئے چھایا ہوا ہے کہ اس امت کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کی تھی کہ اللہ اس گھر کو پر امن بنا دے اور اس دعا کو اللہ نے قبول فرمایا تھا اور امن کی یہ فضا چار ماہ تک پوری سرزمین عرب پر بھی چھائی رہتی ہے اور پورے چار ماہ تک یہ امن و سلامتی اسلامی نظام کے سائے میں اپنی شان دکھاتی ہے۔ یہ اس قدر ہمہ گیر سلامتی ہوتی ہے کہ ہر انسانی دل اس کے اطمینان' سکون کو اور ہر صاحب ذوق اس کی مٹھاس کو محسوس کرتا ہے۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم امن و سلامتی کی یہ فضا پیدا کرنے میں نہایت ہی سرگرم ہوں اور ان چار مہینوں کے بعد پوری زندگی کے شب و روز میں' سال کے ۱۲ مہینوں میں اور ہر جگہ ایسی ہی فضا پیدا کرنے کی سعی کریں۔

اس منطقہ امن کے اندر' ان حرمتوں کی فضا میں' اب اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دعوت دیتے ہیں جو اللہ پر ایمان لائے ہوئے ہیں اور جنہوں نے اللہ کے ساتھ عہد کر رکھا ہے کہ وہ اپنے عہد کو پورا کریں گے اور اپنے مقام اور پروگرام اور موقف کو اتنی بلندی تک لے جائیں گے جہاں تک اس عظیم مقصد اور نصب العین کے لئے ضروری ہو جو ان کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ وہ عظیم نصب العین اور مقصد کیا ہے؟ یہ کہ امت مسلمہ اس دنیا پر بسنے والی تمام امم کے لئے نگران ہے اور اسے اپنی زندگی کے اس مشن کو شخصی جذبات' ذاتی رجحانات اور عارضی حالات سے متاثر ہوئے بغیر ادا کرنا چاہئے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ ان لوگوں پر بھی ظلم و زیادتی نہ کرو جنہوں نے حدیبیہ کے موقعہ پر تمہیں مسجد حرام میں جانے سے روک دیا تھا اور اس سے پہلے بھی جب وہ مکہ میں تھے وہ ایسی رکاوٹیں پیدا کیا کرتے تھے۔ ان کے لگائے ہوئے زخم ابھی تک اگرچہ مسلمانوں کے دلوں میں تازہ تھے' اور مسلمانوں کے دلوں میں مسجد حرام سے روکنے کی وجہ سے ان لوگوں کے خلاف نفرت تازہ تھی۔ اگرچہ یہ صورت حال موجود تھی' لیکن امت مسلمہ کے فرائض اور مقاصد ان چیزوں سے بالاتر تھے۔ امت کے مقاصد و فرائض اس امت کے عظیم کردار کے زاویے سے تھے۔ فرماتے ہیں :

(وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۵ : ۲))

(اور دیکھو' ایک گروہ نے جو تمہارے لئے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔ نہیں' جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو' اللہ سے ڈرو' اس کی سزا بہت سخت ہے)

ضبط نفس کے میدان میں یہ بلند ترین مقام ہے۔ دریا دلی میں یہ سب سے اونچا درجہ ہے اور اس مقام تک اس امت کے لئے پہنچنا فرض ہے جسے اب اللہ تعالیٰ نے پوری انسانیت کا نگران اور اتالیق مقرر کیا ہے۔ جسے عوام الناس کی تہذیب اور ترقی کا فریضہ سپرد کیا گیا ہے اور جسے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ پوری انسانیت کو اس بلند اور روشن افق اور نصب العین کی طرف متوجہ کر دے۔

یہ وہ فرائض ہیں جو منصب قیادت 'نگرانی اور احتساب کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ یہ مومنین کا فرض ہے کہ وہ ان تمام مصائب و شدائد کو بھول جائیں جو ان کو ان دشمنوں کے ہاتھوں پہنچے تھے۔ یہ اس لئے کہ وہ اس نمونے کو دنیا کے سامنے عملاً پیش کریں جو اسلام کو مطلوب ہے تاکہ وہ رواداری عملاً انسانوں کے سامنے پیش ہو جسے اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ صرف اسی طرح امت مسلمہ اسلام کے حق میں شہادت حق دے سکتی ہے۔ اور لوگ اسلام کی طرف متوجہ ہو کر اسے پسند کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک عظیم ذمہ داری ہے 'لیکن اس شکل میں وہ نفس انسانی کے لئے گراں بار نہیں ہوتی اور نہ وہ انسان کی قوت اور وسعت سے باہر ہوتی ہے۔ اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ انسان کو غصہ آئے۔ یہ انسان کا حق ہے کہ وہ بری چیز کو ناپسند کرے لیکن انسانوں کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی چیز کو ناپسند کرتے ہی وہ فوراً ردعمل ظاہر کر دیں یا یہ کہ دشمنی اور کینہ کے ہاتھوں بالکل مجبور ہو جائیں۔ اسلام ان کو حکم دیتا ہے کہ وہ نیک اور تقویٰ کے کاموں میں تو فوراً اٹھ کھڑے ہوں اور جلدی ردعمل ظاہر کریں لیکن گناہ اور ظلم کے کام میں جتھہ بندی نہ کریں۔ وہ اللہ سے ڈریں اور اس کی سزا سے اپنے آپ کو بچائیں اور تقویٰ اور خدا خوفی کے ذریعے اپنے نفس پر قابو پائیں۔ اس کی لگام کھینچ کر رکھیں اور اپنے اندر برداشت اور رواداری پیدا کریں۔ اللہ سے ڈریں اور اس کی رضا ہمیشہ ان کے پیش نظر رہے۔

یہ اسلام کا کمال تھا کہ اس کی تربیت نے عرب قوم جیسی اجڈ اور جاہل قوم کو ضبط نفس عطا کر کے ان کے اندر اس سلسلے میں نہایت ہی قوی شعور پیدا کر دیا اور انہوں نے نہایت ہی مشفقانہ اور کریمانہ رویہ اپنایا حالانکہ وہ ایسی قوم تھی کہ ان سے اس سطح تک بلند اخلاقی اور حسن سلوک کی کم ہی توقع کی جا سکتی تھی کیونکہ ان کے تمدن کا رخ ہی اس سمت کے خلاف تھا۔ عربی طرز عمل اور اس بارے میں ان کا رویہ یہ تھا۔ ( اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا ) (اپنے بھائی کی امداد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو) یہ جاہلانہ حمیت تھی اور دور جاہلیت کی عصبیت تھی۔ ان کے نزدیک گناہ اور ظلم پر باہم تعاون کرنا 'نیکی اور تقویٰ کے معاملات میں تعاون کرنے سے زیادہ پرکشش تھا۔ وہ ہمیشہ باطل و گمراہی پر باہم تعاون کے معاہدے کر لیتے تھے اور حق اور سچائی پر ان کا اجتماع بہت ہی کم ہوا کرتا تھا۔ تاریخ جاہلیت میں سچائی پر کم ہی حلف منعقد ہوئے۔ اور یہ ہر اس معاشرے کا قدرتی خاصہ ہے جس کا رابطہ اور تعلق اللہ کی ذات کے ساتھ نہ ہو اور جس کی عادات اور تقالید اسلامی منہاج اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق نہ ہوں۔ یہ اصول جاہلیت کے اس مشہور مقولے کے اندر پوری طرح منضبط تھا کہ بھائی کی مدد کرو چاہے ظالم ہے یا مظلوم۔ اور اس اصول کو ایک جاہلی شاعر نے اس طرح پیش کیا ہے۔

وهل انا الا من غزية ان غوت غويت
وان ترشد غزية ارشد

(میں تو بس غزیہ قبیلے کا ایک فرد ہوں، اگر وہ گمراہ ہو جائے تو میں گمراہ ہوں گا اور اگر وہ راہ ہدایت پالے تو میں بھی پالوں گا) اسلام آیا، اسلامی نظام تربیت آیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا :

(وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۵ : ۲))

(اور دیکھو، ایک گروہ نے جو تمہارے لئے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔ نہیں، جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، اس کی سزا بہت سخت ہے)

اسلام نے آکر دلوں کو اللہ کے ساتھ جوڑ دیا۔ اخلاق اور اقدار حیات کے لئے اللہ کے پیمانے میدان میں آگئے۔ اسلام نے عربوں اور پوری انسانیت کو حمیت جاہلیہ سے نکالا۔ نعرۂ عصبیت سے منع کیا، ذاتی میلانات، شخصی تاثرات، خاندانی اور قبائلی محدود سوچ سے نکالا اور دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت صرف انسانیت کو محور بنایا۔

غلبہ اسلام کے بعد جزیرۃ العرب کے اندر ایک نیا انسان پیدا ہوا، یہ انسان الٰہی اخلاق سے مزین تھا۔ یوں عربوں کو ایک نیا جنم ملا اور جب یہ روشنی دنیا میں پھیلی تو تمام کرۂ ارض پر انسانیت کو ایک جدید جنم ملا۔ اسلام سے قبل جزیرۃ العرب پورے کا پورا جاہلیت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ جس کا نعرہ یہ تھا "بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم ہو" بلکہ پوری دنیا اسی نعرۂ جاہلیہ کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

جاہلیت کے گہرے گڑھے اور اسلام کے روشن افق کے درمیاں بہت ہی دوری اور بعد ہے اور یہ دوری ان دو اقوال سے کس قدر خوبصورتی سے واضح ہوتی ہے۔ ایک بات یہ کہ "بھائی کی مدد کرو ظالم ہے یا مظلوم" اور دوسرا قول باری تعالیٰ کا ہے (اور دیکھو، ایک گروہ نے جو تمہارے لئے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔ نہیں، جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، اس کی سزا بہت سخت ہے۔)

ان دونوں اقوال میں کس قدر فرق ہے زمین و آسمان کا فرق!

---ooo---

اب یہاں مویشیوں میں سے حلال جانوروں کے کھانے کے اجازت عامہ سے بعض ایسی شکلوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو حلال نہیں ہیں۔

(حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَآ أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ قف وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ۚ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ۗ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۚ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ ۙ فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۵ : ۳)

تم پر حرام کیا گیا مردار' خون' سور کا گوشت' وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو' وہ جو گلا گھٹ کر یا چوٹ کھا کر' یا بلندی سے گر کر' یا ٹکر کھا کر مرا ہو' یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو.... سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پاکر ذبح کر لیا۔ اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا۔ نیز یہ بھی تمہارے لئے ناجائز ہے کہ پانسوں کے ذریعے سے اپنی قسمت معلوم کرو۔ یہ سب افعال فسق ہیں۔ آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے پوری مایوسی ہو چکی ہے لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔ (لہٰذا حرام و حلال کی جو قیود تم پر عائد کی گئی ہیں ان کی پابندی کرو) البتہ جو شخص بھوک سے مجبور ہو کر ان میں سے کوئی چیز کھا لے' بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو تو بیشک اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)۔

مردار' خون اور خنزیر کے گوشت کا حکم اس سے پہلے بھی گزر چکا ہے۔ (دیکھئے بقرہ آیت ۱۷۲) نیز انسانی علم جس قدر حکمت تشریع اسلامی کا ادراک کر سکتا ہے' اس کا بیان بھی وہاں ہوا۔ انسانی علم چاہے قانون الٰہی کی حکمت کا ادراک کر سکے یا نہ کر سکے اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ بہرحال کر دیا ہے کہ یہ چیزیں خوراک کے لئے پاکیزہ نہیں ہیں۔ ہمارے لئے تو صرف حکم الٰہی ہی کافی ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ صرف انہی چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں جو ناپاک ہوتی ہیں' اور ان میں انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کے اعتبار سے ضرر بھی ہوتا ہے چاہے لوگوں کو اس مضرت کا علم نہ ہو۔ سوال تو یہ ہے کہ کیا لوگوں نے ان تمام چیزوں کو معلوم کر لیا ہے جو ان کے لئے مضر ہیں یا مفید ہیں۔-----اسی طرح

(وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِ (۵ : ۳)) یعنی جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کئے گئے ہوں اس لئے حرام ہیں کہ وہ بنیادی طور پر ایمانی تصور کے خلاف ہیں۔ ان کی بنیاد ہی اس عقیدے کے خلاف ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے' وہی حاکم اور الٰہ ہے اور وہی نفع و نقصان کا مالک ہے۔ اس عقیدۂ توحید کے پھر کچھ تقاضے ہیں۔ اس کا پہلا

تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے ہر ارادے ' ہر نیت اور ہر عمل کا رخ صرف اللہ کی طرف کر دے - وہ ہر چیز پر صرف اللہ کا نام لے - ہر عمل اور ہر حرکت کو صرف اللہ کے نام سے شروع کرے - اس لئے ہر وہ حرکت و عمل جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو ' ہر وہ چیز جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لگ جائے ' اسی طرح ہر وہ ذبیحہ جس پر کسی کا نام ہی نہ لیا جائے ' نہ غیر اللہ کا اور نہ اللہ کا تو وہ بھی حرام ہے اس لئے کہ یہ عمل ایمان کی بنیادوں کے ساتھ متضاد ہے - اگر کسی کے دل میں صحیح ایمان ہو تو اس سے یہ فعل صادر ہی نہیں ہو سکتا - اس لئے کہ یہ ناپاک عمل ہے اور چونکہ یہ فعل عقیدۃً ناپاک ہے اس لئے اس کو بھی ان ناپاک چیزوں کے ساتھ شامل کیا گیا ہے جو جسمانی طور پر ناپاک ہیں مثلاً خون اور خنزیر کا گوشت -

( وَالْمُنْخَنِقَةُ ) (وہ جسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہو یا خود مر گیا ہو) ( وَالْمَوْقُوْذَةُ ) (جو کسی اونچی جگہ سے گر جائے ' کسی پہاڑ سے یا کنوئیں میں گر کر مر جائے ) ( وَالنَّطِيْحَةُ ) (وہ جسے دوسرا جانور مار کر ہلاک کر دے ) ( وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ ) (جسے درندے نے پھاڑ کھایا ہو) یہ سب مردار کی اقسام ہیں اور حرام ہیں - ہاں اگر وہ زندہ ہوں اور انہیں ذبح کر لیا جائے تو کھانا جائز ہے - یہاں ذبح کو اس لئے مستثنیٰ کیا گیا ہے کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ کہیں گرنے ' گلا گھٹنے ' جانور کے پھاڑنے وغیرہ کی وجہ سے یہ حرمت ہے - اس بارے میں فقہاء کے اقوال میں اختلافات ہیں کہ کب کوئی جانور مذبوحہ تصور ہو گا اور اس کا کھانا حلال ہو جائے گا - بعض اقوال کے مطابق ان تمام ذرائع سے مارا ہوا جانور حرام ہوتا ہے جو بہت جلدی اس کی روح نکال دیں یا مکمل طور پر اسے مردہ کر دیں - ان کے نزدیک اگر ایسے جانور کو ذبح بھی کر دیا جائے تو بھی حرام ہو گا جبکہ بعض اقوال کے مطابق یہ حلال ہوتا ہے بشرطیکہ اس کے اندر زندگی ہو اور اسے ذبح کر دیا جائے چاہے جس طرح بھی ذبح کیا جائے - تفصیلات کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہیں - ( وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ ) (وہ جانور جو آستانوں پر ذبح کئے جائیں - ) مشرکین بتوں پر جانور ذبح کرتے تھے اور جاہلیت میں ان کا خون بتوں پر ملتے تھے - عربوں کے علاوہ دوسری اقوام میں بھی ایسی رسومات ہوتی ہیں - یہ حرام ہیں اس لئے کہ ایسے جانوروں کو بتوں پر ذبح کیا گیا اگرچہ ان پر ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو اس لئے کہ بت پر ذبح کرنے سے بہرحال شرک لازم آتا ہے -

یہ بھی حرام ہے کہ پانسوں کے ذریعہ تقسیم کرو - ازلام وہ تیر ہیں جن کے ذریعہ عرب فال گیری کرتے تھے کہ یہ کام کریں یا نہ کریں - بعض اقوال کے مطابق یہ تیر تین تھے اور بعض کے مطابق سات تھے - اسی طرح جوئے میں بھی یہ تیر استعمال ہوتے تھے - ان کے ذریعے لوگ ذبح کئے ہوئے جانور کا گوشت بھی تقسیم کرتے تھے - ہر شخص کا ایک تیر ہوتا اور جانور کا جو حصہ جس تیر کے لئے مخصوص ہوتا اگر وہ نکل آتا تو وہ گوشت اس کا ہو جاتا - اللہ تعالیٰ نے اس طریقے سے گوشت کی تقسیم کو حرام قرار دے دیا کیونکہ یہ بھی جوئے کی ایک شکل تھی جسے حرام قرار دیا جا چکا تھا - چنانچہ اس طرح تقسیم کئے ہوئے گوشت کو بھی حرام قرار دے دیا گیا -

(فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵ : ۳)

(البتہ جو شخص بھوک سے مجبور ہو کر ان میں سے کوئی چیز کھا لے ' بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو تو بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے )

وہ شخص جو بھوک کی وجہ سے اضطرار کی حالت میں ہو (یعنی مخمصہ میں) اور اس کی زندگی خطرے میں ہو' اس کے لئے ان محرمات میں سے کھانا جائز ہے' بشرطیکہ وہ عمداً گناہ کا ارتکاب نہ کر رہا ہو۔ اس بارے میں فقہاء کی آرا مختلف ہیں کہ وہ کس قدر کھائے۔ آیا اس قدر کھائے کہ زندگی بچ جائے یا بقدر ضرورت سیر ہو کر کھائے یا اگر آئندہ بھی قلت غذا کا خطرہ ہو تو ذخیرہ بھی کرے۔ ہم ان تفصیلات میں نہیں جاتے' یہاں صرف یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ دین اسلام میں یسر اور سہولت رکھی گئی ہے۔ ضرورت کے وقت اسلامی احکام میں سختی نہیں کی جاتی نہ لوگوں کے لئے مشکلات پیدا کی جاتی ہیں۔ معاملات کو لوگوں کی حالات پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور خدا خوفی اور خدا ترسی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی گناہ کا ارتکاب مضطر ہو کر کرتا ہے اور اس کی نیت احکام شکنی کی نہیں ہے اور نہ ہی وہ بالارادہ ایسا کرتا ہے تو اس پر کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵: ۳) (اللہ غفور و رحیم ہے)۔

اب یہاں آکر ہم ایک اہم موڑ پر کھڑے ہیں۔ محرمات کے ذکر کے بعد قبل اس کے کہ حلال چیزوں کی فہرست شروع ہو اچانک یہ آیت بیچ میں آجاتی ہے۔

(اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵: ۳)) (اور آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے پوری مایوسی ہو چکی ہے لہذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے)۔

یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو سب سے آخر میں نازل ہوئی ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ منصوبہ رسالت اپنے آخری مراحل کو پہنچ گیا اور اس طرح لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم مکمل ہو گیا۔ اس آیت کے نزول سے حضرت عمر ﷺ کی تیز بصیرت اور ان کی خدا دادہ فہم نے معلوم کر لیا اب حضور ؐ کے دن دنیا میں کم رہ گئے ہیں' کیونکہ آپ نے امانت لوگوں کے سپرد کر دی' اللہ کا پیغام پہنچا دیا۔ اب صرف اللہ کے ساتھ ملاقات باقی ہے۔ چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد آپ رونے لگے اور سمجھ گئے کہ حضور ؐ کی جدائی کا وقت اب بہت ہی قریب آگیا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ اس آیت کو حلال و حرام کے احکام کے عین وسط میں لایا گیا ہے اور اسے اس سورہ میں رکھا گیا ہے جس کے مقاصد اور موضوعات پر ہم بحث کر آئے ہیں۔ اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی شریعت ایک مکمل نظام ہے جو ایک کل ہے اس کے اجزاء نہیں کئے جا سکتے۔ اس کے اجزاء باہم اس طرح پیوستہ ہیں کہ ان کو جدا نہیں کیا جا سکتا چاہے وہ اجزاء اعتقادی اور نظریاتی ہوں یا وہ مراسم عبودیت ہوں یا وہ سوسائٹی کے لئے اجتماعی احکام ہوں یا بین الاقوامی امور سے متعلق ہوں۔ یہ تمام امور (الدین) میں شامل ہوں جس کی تکمیل کی بابت اس آیت میں اعلان کیا گیا ہے اور اس پر مزید یہ اعلان بھی کیا گیا ہے کہ اس دین کی تکمیل کر کے اللہ تعالیٰ نے تم پر اتمام نعمت بھی کر دیا ہے۔ اس دین میں اعتقادی امور' مراسم عبودیت کے احکام اور طریقوں' حلال و حرام کے احکام اور اجتماعی اور بین الاقوامی قوانین کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ سب کے سب ایک مجموعے کے اجزاء ہیں جن کے متعلق اللہ نے

اپنی رضامندی صادر فرمائی ہے اور اس نے ہمارے لئے اسے پسند فرمایا ہے اور اہل ایمان اگر اس دین کے کسی جزء سے خارج ہوں اور اس کا انکار کریں گے تو وہ تمام دین کے انکار کے مترادف ہو گا۔ یہ دین سے بغاوت ہو گی اور نتیجۃً ایک شخص مومن نہ رہے گا۔

اگر کوئی کسی ایک جزء کا انکار کرے گا تو اس کا حکم وہی ہو گا جس کا بیان ہم نے اس سے پہلے کیا ہے کہ اس دین کے کسی ایک حصے کو ترک کرنا اور اس کی جگہ کسی انسان کے بنائے ہوئے ضابطے کو رکھنا گویا اللہ کی حاکمیت کا انکار ہے۔ اس طرح ایک انسان کسی ایک ضابطے میں اللہ کی اس خصوصیت کی نسبت کسی انسان کی طرف کرتا ہے جو شرک ہے اور اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے حق حکمرانی پر دست درازی ہے اور خود اپنے لئے حاکمیت اور حکمرانی کا دعویٰ ہے جسے اللہ ہرگز ہرگز جائز نہیں رکھتے۔ اس طرح گویا ایک شخص صراحتاً دین سے بغاوت کرتا ہے اور دین سے بغاوت کے نتیجے میں انسان دین سے خارج ہو جاتا ہے۔

(اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ (۵ : ۳)) (آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے پوری مایوسی ہو چکی ہے) وہ اس بات سے مایوس ہو گئے ہیں کہ اس دین کو باطل کر دیں' اس کو ناقص کر دیں یا اس کے اندر کسی قسم کی تحریف کر دیں۔ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ وہ کامل اور مکمل رہے گا۔ اللہ نے اس بات کو ریکارڈ کر دیا ہے کہ یہ دین ہمیشہ باقی رہے گا۔ اہل کفر کسی موقعہ پر مسلمانوں پر غالب آ سکتے ہیں' وہ کچھ عرصہ تک غالب رہ سکتے ہیں لیکن وہ دین اسلام پر غالب نہیں رہ سکتے۔ یہ سارے ادیان میں سے واحد دین ہے جو محفوظ ہے اور کبھی مٹ نہ سکے گا۔ نہ اس کے اندر تحریف کی جا سکے گی اس کے باوجود کہ اس دین کے دشمن ہمیشہ اس میں تحریف کرنے کے لئے اپنی مساعی جاری رکھیں گے۔ وہ اس دین کے خلاف سخت سے سخت سازشیں کرتے رہیں گے مگر کامیاب نہ ہونگے۔ یہ بھی ہو گا کہ بعض ادوار میں اہل اسلام اپنے دین سے بے حد غافل بھی رہیں گے اور انہیں اپنے دین کے بارے میں بہت ہی کم علم ہو گا۔ ہاں اس کی حفاظت اللہ یوں کرتا ہے کہ وہ اس دین کا حامل گروہ ہمیشہ اس دنیا میں رکھتا ہے' جو اس دین کو اچھی طرح جانتا ہے اور وہ ہر وقت اس کا دفاع کرتا رہتا ہے اور یہ دین اس گروہ میں کمال درجے پر موجود رہتا ہے اور ان کی زندگیوں میں محفوظ رہتا ہے اور وہ اس امانت کو آگے منتقل کرتا رہتا ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ سچا ہوتا رہتا ہے کہ اہل کفر ہر دور میں اس دین کی بابت مایوس رہتے ہیں۔ (فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِ (۵ : ۳)) (لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو) اس لئے کہ اہل کفر کی یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ اس دین کا کچھ بگاڑ سکیں۔ اور وہ اہل اسلام کا بھی صرف اتنا بگاڑ سکتے ہیں وہ انہیں اس دین سے قدرے منحرف کر دیں اس قدر کہ وہ اس دین کی زندہ تصویر نظر نہ آئیں اور اس کے فرائض اور تقاضے پورے نہ کرتے ہوں اور اس دین کے مقاصد اور فرائض کو اپنی زندگیوں میں عملاً نافذ نہ کرتے ہوں۔

اہل اسلام کو مدینہ طیبہ میں یہ جو ہدایت دی گئی تھی کیا یہ صرف اہل مدینہ کے لئے تھی؟ ہرگز نہیں کیا یہ اس نسل کے لئے تھی؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ ایک عام خطاب ہے جو ہر زمان و مکان کے مومنین کے لئے ہے۔ ہم اہل ایمان کی خدمت میں یہ عرض کرتے ہیں کہ اہل ایمان حقیقتاً وہی لوگ ہیں جو اس دین پہ راضی ہو جائیں جسے اللہ نے ان کے لئے پسند

فرمایا ہے اور وہ پورے کا پورا دین اپنی زندگیوں میں نافذ کریں اور اسے اپنے لئے نظام زندگی قرار دیں۔

(اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (۵ : ۳)) (آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے)

یہ آیت حجۃ الوداع کے موقعہ پر نازل ہوئی۔مطلب یہ ہے کہ اللہ نے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اب اس میں کسی بات کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔اور اہل ایمان پر رب کی نعمت مکمل ہو گئی اور وہ ان کے لئے دین اسلام کو بطور دین قبول کرنے پر راضی ہو گیا ہے اور آج سے جو شخص اس کے سوا کسی اور دین کو پسند کرے گا تو گویا وہ اللہ کی پسند کو ترک کرتا ہے۔

---ooo---

یہ ایک نہایت اہم آیت ہے۔ایک مومن کو قدرے توقف کر کے اس کے ان ہولناک الفاظ پر غور کرنا چاہئے۔اگر اس پر اچھی طرح غور کیا جائے تو وہ معارف و حقائق کبھی ختم نہ ہوں گے جو اس کے اندر پنہاں ہیں۔اس کے اندر گہری ہدایات اور اس دور کے فرائض اور تقاضے ذہن میں آئیں گے۔

سب سے پہلی حقیقت جو اس غور و فکر سے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے دین کو مکمل کر دیا ہے اور پھر ایک مومن تاریخ انسانیت میں حضرت آدم علیہ السلام کی رسالت سے لے کر حضرت محمد ؐ کی آخری رسالت تک تمام رسالتوں کا جائزہ لیتا ہے اور تمام ادوار میں قوافل ایمان کا جائزہ لیتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ یہ ایک طویل اور غیر منقطع سلسلہ رسل ہے۔یہ ہدایت اور روشنی کا قافلہ ہے جو اس طویل سفر میں مشعل لئے ہوئے ہے۔اس طویل سفر میں اس کے نشانات راہ صاف صاف نظر آتے ہیں لیکن اس جائزے میں ہمیں صاف صاف نظر آتا ہے کہ ہر رسول کسی خاص قوم یا کسی خاص زمانے کے لئے بھیجا گیا ہے۔اس آخری رسالت سے قبل کی تمام رسالتیں کسی خاص دور یا خاص مرحلے کے لئے بھیجی گئی تھیں۔ایک خاص پیغام' ایک خاص مرحلے اور ایک خاص معاشرے کے لئے۔یہی وجہ ہے کہ ان رسالتوں پر مخصوص زمانے اور مخصوص معاشرے کا رنگ غالب تھا۔وہ ان ظروف و احوال سے متاثر تھیں جن میں ان کو بھیجا گیا۔یہ سب رسالتیں صرف ایک خدا کی طرف دعوت دے رہی تھیں۔وہ سب صرف ایک الٰہ کی بندگی اور حاکمیت کی طرف دعوت دے رہی تھیں کیونکہ یہی دین اسلام ہے کہ ہم صرف ایک اللہ کو اپنا حاکم اور معبود سمجھیں اور اسی کی اطاعت کریں۔ لیکن ان نبیوں کو جو شریعت اور جو قانون اور جو نظام دیا گیا تھا وہ ان کی قوم' ان کے دور اور ان کی سوسائٹی کے لئے مناسب تھا اور ان کے ظروف و احوال کے مطابق تھا۔

جب اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ وہ سلسلہ رسل کو ختم کر دے اور انسانوں تک خاص خاص رسالتیں بھیجنے کا سلسلہ بند کر دے تو اللہ نے ایک آخری رسالت پوری انسانیت کے لئے بھیجی اور ایک رسول خاتم النبیین تمام انسانوں کے لئے ارسال فرمایا جس کی رسالت کسی خاص معاشرے' کسی خاص قوم یا کسی خاص زمانے تک محدود نہ تھی اور نہ کسی دور کے ظروف

و احوال سے خصوصیت رکھتی تھی۔ یہ رسالت کسی زمان و مکان کی قید میں مقید نہ تھی اور نہ وہ کسی معاشرے کے ظروف و احوال تک محدود تھی۔ اس رسالت کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی حقیقی فطرت کی اساس پر اٹھایا، جس میں کوئی تغیر اور تبدل نہیں ہوتا نہ فطرت انسانی اپنی ڈگر سے ہٹتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں!

(فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰ : ۳۰)

(پس تو یکسو ہو کر اپنا چہرہ دین کی طرف متوجہ کر لے وہ فطرت جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے' اللہ کی بنائی ہوئی فطرت بدل نہیں سکتی۔ یہی بالکل راست اور درست دین ہے لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے)۔

پھر اس آخری رسالت کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر مفصل شریعت عطا کی جس میں زندگی کے ہر پہلو کے مسائل کا حل موجود ہے' زندگی کی ہر سرگرمی کا ضابطہ اس کے اندر درج ہے۔ اس شریعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے کلی ضوابط اور اصول درج کئے جن کی روشنی میں وہ ہر دور کے مسائل حل کرتی چلی جاتی ہے۔ ہر زمان و مکان میں وہ ان قواعد کی روشنی میں یوں نظر آتی ہے جیسے ابھی نازل ہوئی ہے۔ اس شریعت میں ایسے ضوابط و احکام صراحت سے مذکور ہیں جو کبھی بدلتے نہیں ہیں۔ اس طرح یہ شریعت اپنے اصول و مبادی کے ساتھ اور اپنے تفصیلی اور دائمی احکام کے ساتھ ان تمام اصولوں اور تقاضوں پر حاوی ہے جن کی ضرورت کبھی بھی کسی انسان کو لاحق ہو سکتی ہے۔ یہ آخری رسالت آغاز آفرینش سے لے کر قیامت تک کے لئے ہے۔ اس کے ضوابط' اس کی ہدایات' اس کی قانون سازی اور اس کے نظم و نسق کے ادارے قیامت تک کے لئے ہیں تاکہ وہ ہمیشہ زندہ رہے' ترقی کرے' اس کی تجدید اور نشوونما ان اصولوں کی روشنی میں ہو لیکن اس محور کے اردگرد اور اس دائرے کے اندر جو اس کے لئے اول روز سے وضع کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں!

(اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵ : ۳)) (آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے)

اس آیت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا کہ تمہارا نظریہ حیات مکمل ہو گیا ہے۔ تمہاری شریعت مکمل ہو گئی ہے اور یہ ہے دین۔ اس لئے اب اہل ایمان کے لئے ایسا کوئی موقعہ ہی نہیں رہا ہے کہ اس دین میں کوئی نقص رہ گیا ہے اور وہ اسے دور کریں گے۔ نہ اس میں کوئی کمی ہے جسے وہ پورا کریں گے۔ نہ اس میں کسی زمان و مکان کا رنگ ہے کہ وہ اس میں جدید زمان و مکان کا رنگ بھریں گے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو نہ تو وہ مومن ہوں گے اور نہ ان کا بنایا ہوا دین' دین اسلام ہو گا اور نہ وہ اللہ کو قبول ہو گا اور نہ ہی صحیح اہل ایمان اسے قبول کریں گے۔

جس دور میں قرآن کریم نازل ہوا' اس دور کی شریعت ہر دور کے لئے ہے۔ اس لئے کہ یہ اس دین کی شریعت ہے جو تمام ادوار کے لئے اس جہان میں آیا ہے اور یہ ابدی دین ہے۔ یہ انسانوں کی کسی خاص جماعت کے لئے نہیں آیا۔ نہ یہ کسی خاص دور کے لوگوں کے لئے آیا ہے اور نہ کسی خاص علاقے کے لئے آیا ہے جس طرح اسلام سے پہلے کی رسالتوں کا حال تھا کہ وہ محدود زمان و مکان کے لئے تھیں۔

اسلام کے تفصیلی احکام ایسے ہیں کہ یہ دائمی احکام ہیں اور اسلام کے جامع اصول ایسے ہیں کہ ان کے دائرے کے اندر ہر دور میں زندگی کے لئے ایک مفصل نظام وجود میں آسکتا ہے اور تاقیامت ان کی روشنی میں انسانی زندگی نشوونما پا سکتی ہے' بغیر کسی مشکل کے۔ الا یہ کہ زندگی ان اصولوں کے دائرے کے تابع ہو جائے اور پھر ایمان کے دائرے سے خارج ہو جائے۔

انسان کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور اللہ جانتا ہے کہ اس نے کیا پیدا کیا ہے۔ اللہ نے انسان کے لئے یہ دین پسند کیا ہے جو اس کی دائمی شریعت پر قائم ہے۔ اس لئے جو شخص یہ کہتا ہے کہ کل کا قانونی نظام آج کے لئے قانون اور شریعت کیسے ہو سکتا ہے' وہ دراصل یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ انسان کی ضروریات کی بابت اللہ تعالیٰ سے زیادہ جانتا ہے اور وہ انسان کے طور طریقوں کا علم اللہ سے زیادہ رکھتا ہے۔

غور و فکر کے اس وقفے میں ہمیں نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے اور یہ نعمت یوں تمام ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دین کو مکمل کر دیا ہے۔ بے شک یہ ایک مکمل' ایک عظیم اور بھاری نعمت ہے۔ اس نعمت کے ذریعے انسان کو ایک جدید جنم ملا ہے۔ اور اس کے ذریعے اس کی نشوونما اور اس کے کمالات کے لئے راہیں کھل گئی ہیں۔ اس لئے کہ انسان جب تک اللہ کی معرفت اس طرح حاصل نہیں کر لیتا جس طرح یہ دین اللہ کی معرفت کے دروازے کھولتا ہے تو انسان اس وقت تک انسان ہوتا ہی نہیں ہے۔ جب تک وہ اس کائنات کی حقیقت اس طرح معلوم نہ کر لے جس طرح اسے یہ دین سکھاتا ہے اور جب تک وہ اپنے نفس کی معرفت اس طرح حاصل نہ کر لے جس طرح اسے یہ دین سکھاتا ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک ایک مکرم مخلوق ہے۔ انسان صحیح معنوں میں موجود ہی نہیں ہوتا جب تک وہ اللہ کی غلامی کے سوا تمام غلامیوں کا انکار نہ کر دے اور ان سے نکل نہ آئے۔ اور جب تک وہ اس حقیقی مساوات کو حاصل نہیں کر لیتا جو اللہ کی بنائی ہوئی شریعت کے تحت انسان کو حاصل ہوتی ہے' جسے نہ کسی انسان نے دیا ہوتا ہے اور نہ اس میں کسی انسان کا دخل ہوتا ہے۔

انسان کی جانب سے ان عظیم حقائق کا ادراک کر لینا ہی دراصل اس کے لئے ایک نیا جنم ہے' بشرطیکہ وہ ان حقائق کا ادراک اسی انداز پر کرے جس پر اسے اس دین نے ادراک کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس معرفت کے سوا انسان کے لئے ممکن ہے کہ وہ ایک حیوان ہو یا وہ زیر تعمیر اور زیر تشکیل انسان کا کوئی منصوبہ ہو لیکن اسے ایک مکمل انسان نہیں کہا جا سکتا۔ وہ مکمل انسان تب ہی ہو گا جب وہ اس معیار کے مطابق جس کی تصویر قرآن نے کھینچی ہے' ان حقائق کا ادراک نہ کر لے۔ انسان کے اس قرآنی تصور اور ان تمام تصورات کے درمیان بہت بڑا فرق ہے جو تصورات خود انسانوں نے از خود گھڑے ہیں۔ (دیکھئے جزء اول اور کتاب خصائص التصور الاسلامی)۔

انسانی زندگی کے اندر اس تصویر کے نقوش بٹھا دینا ہی دراصل اس بات کا ضامن ہے کہ انسان کو مکمل انسانیت

حاصل ہوگئی ہے اور یہ تصویر اس وقت مکمل ہوگی جب ایک انسان اللہ پر پورا عقیدہ رکھے' اللہ کے فرشتوں' کتابوں' رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان لائے تو اس وقت انسان حیوانی دائرہ محسوسات سے نکل کر انسانی عالم الغیب والشہادۃ میں داخل ہوگا۔ وہ محسوسات سے بھی واقف ہو گا اور محسوسات سے بالا دنیا سے بھی واقف ہو گا۔ وہ مادہ کا بھی عالم ہو گا اور فوق المادہ کا بھی عالم ہو گا اور اس طرح وہ حیوان کے محدود حسی دائرے سے باہر نکل آئے گا۔ یہ کمال وہ عقیدۂ توحید کے ذریعے حاصل کرے گا۔ اس طرح وہ خود دوسرے انسانوں کی بندگی کے دائرے سے بھی نکل آئے گا اور صرف اللہ وحدہ کی بندگی کرے گا۔ یوں اسے حقیقی مساوات' حقیقی آزادی اور ماسوا اللہ کے مقابلے میں حقیقی سربلندی نصیب ہوگی۔ اب وہ صرف اللہ کی عبادت کرے گا' صرف اللہ ہی ۔ ے شریعت اور نظام زندگی اخذ کرے گا۔ وہ صرف اللہ ہی پر توکل کرے گا اور صرف اللہ سے ڈرے گا۔ یہ مقام اسے اس وقت حاصل ہو گا جب انسان اسلامی نظام زندگی کے مطابق اپنی ترجیحات کی سطح کو بلند کر لے گا۔ اپنے میلانات کو مہذب' اپنی قوتوں کو تعمیر' ترقی کے لئے وقف کر دے اور حیوانی خواہشات کے مقابلے کے لئے اپنی قوتوں کو صرف کرے اور حیوانوں اور بہائم کی طرف محض حصول لذتیت کے پیچھے نہ بھاگے۔ (دیکھئے کتاب ہذا الدین)۔

جس شخص نے جاہلیت کی زندگی میں وقت نہ گزارا ہو اور جس نے جاہلیت کی تباہ کاریاں نہ دیکھی ہوں' وہ شخص نہ دین اسلام کی نعمت کا ادراک کر سکتا ہے اور نہ ہی وہ اس نعمت کی صحیح قدر کر سکتا ہے۔ جاہلیت ہر دور اور ہر مکان میں وہ نظام رہا ہے جو اللہ نے نہ بھیجا ہو' لہٰذا جس شخص نے جاہلیت کو دیکھا ہے اور اس کا مزہ چکھا ہے' تصورات اور نظریات میں اور عملی زندگی کے حالات میں وہ شخص صحیح معنوں میں جاہلیت کا احساس کر سکتا ہے اور اس کے بارے میں شعور رکھ سکتا ہے۔ وہ اسکو اچھی طرح جان سکتا ہے اور صحیح معنوں میں وہی اس دین کی عظیم نعمت کا ادراک کر سکتا ہے۔

جو شخص اندھے پن اور گمراہی کے مصائب میں مبتلا رہا ہو' جو شخص ٹوٹ پھوٹ اور حیرانی و پریشانی کا شکار رہا ہو' جو شخص تباہی اور ذہنی خلا کی مصیبت میں گرفتار ہوا ہو اور جس شخص کو کسی بھی دور میں اور کسی بھی جگہ جاہلی تصورات نے دکھ پہنچائے ہوں صرف وہی شخص ذوق ایمان کی قدر کر سکتا ہے۔ (دیکھئے خصائص التصور الاسلامی کی فصل تیہ و رکام)۔

جو شخص خود سری اور ظلم کی چکی میں پس چکا ہو' جو ضبط اور اضطراب کا شکار رہا ہو' جس کی زندگی افراط و تفریط میں گزری ہو اور جس نے جاہلیت کے طور طریقوں میں زندگی بسر کی ہو صرف وہی شخص اسلامی اور ایمانی نظام حیات کی قدر کر سکتا ہے۔ (الاسلام و مشکلات الحضارہ کی فصل ضبط اور اضطراب)۔

قرآن کریم نے عربوں کو سب سے پہلے خطاب کیا۔ وہ اس کے الفاظ و کلمات کو اچھی طرح جانتے تھے' اس کے الفاظ کے مفاہیم اور مدلولات ان کی زندگیوں میں عملاً قائم رہے تھے۔ یہ تمام چیزیں اس نسل میں تھیں جس کو قرآن نے خطاب کیا تھا۔

وہ خود جاہلیت کے کل پرزے تھے۔ انہوں نے جاہلی تصورات کو اپنے ذہنوں میں عرصے تک بسائے رکھا تھا۔ انہوں نے جاہلیت کے اجتماعی روابط کو برتا تھا' انہوں نے جاہلیت کے اجتماعی اور انفرادی اخلاق کے مظاہرے بار بار کئے تھے اور انہوں نے اس دین کے ذریعے جو کچھ پایا تھا اور اس کے ذریعے ان پر جو فضل و کرم ہوا تھا اسے بھی اپنی زندگی میں آزمایا تھا۔

انہوں نے جاہلیت کی گراوٹوں کو بھی دیکھا تھا اور اسلام کی رفعتوں کو بھی آزمایا تھا۔ اسلام انہیں عرصے تک ساتھ لے کر چلا تھا اور انہیں اس دین نے شارٹ کٹ میں بلندیوں تک پہنچا دیا تھا۔ (دیکھئے مقدمہ سورۂ نساء) اور وہ نہایت ہی بلندیوں سے نہایت ہی مسرت سے اقوام عالم پر نگاہ ڈال چکے تھے اور ایک نظر پیچھے مڑ کر وہ ماضی کو بھی دیکھ رہے تھے۔

اسلام نے انہیں کن کن پہلوؤں سے بلند کیا۔ اعتقادات و تصورات میں جبکہ وہ پتھر کے بتوں کو رب سمجھتے رہے تھے' ملائکہ' جنوں' ستاروں اور اپنے اسلاف کو رب سمجھتے رہے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ احمقانہ اور غلط تصورات کو سینے سے لگائے ہوئے تھے' ان تصورات سے اسلام نے انہیں نکال کر عقیدہ توحید میں داخل کیا' ایک اللہ واحد پر یقین ان کو عطا کیا جو رحیم وودود' قادر و قاہر' سمیع و بصیر' علیم و خبیر' عادل و کامل' قریب اور مجیب اور بلاواسطہ الہ و معبود تھا۔ سب اس کے بندے بن گئے۔ وہ کاہنوں کی حکومت سے باہر آگئے' وہ انسانوں کی ریاست سے نکل آئے اور وہم و خرافات کی حکمرانی سے باہر آگئے جس طرح اندھیرے سے روشنی میں آگئے ہوں۔

پھر اسلام نے اجتماعی طور طریقوں کے اندر بھی انہیں جاہلیت سے نکالا۔ طبقاتی امتیازات ختم کر دیئے' قابل نفرت عادات چھڑا دیں' وہ ظلم و ستم سے باز آگئے کیونکہ جاہلیت میں وہ ہر برا کام کر لیتے جو بس میں ہوتا (یہ بات غلط مشہور ہے کہ عربی زندگی اسلام سے قبل ایک جمہوری زندگی تھی) میں یہاں استاد العقاد کی کتاب سے کچھ اقتباسات دیتا ہوں :

"جزیرۃ العرب کے شمال سے لے کر جنوب تک تمام امراء اور سرداران کے ہاں ظلم پر قدرت رکھنا عزت اور مرتبے کی نشانی تصور کی جاتی تھی۔ مشہور شاعر نجاشی اپنے مخالف کی ہجو کرتے ہوئے' ان کی ہجو میں یوں طنزیہ انداز میں مبالغہ کرتا ہے کہ وہ کمزور ہیں :

قبیله لا یغدرون بذمة
ولا یظلمون الناس حبه حردل

(اس کا قبیلہ کسی ذمہ داری میں کبھی غداری نہیں کرتا اور اس کے قبیلے کے لوگ کسی پر رائی برابر بھی ظلم نہیں کرتے) حجر ابن الحارث عربی بادشاہ نے جب یہ فیصلہ کیا کہ بنی اسد کو غلام بنا لے تو بنی اسد کے شاعر ان کی سفارش کے لئے آئے۔ انہوں نے کہا :

انت الملك فيهم
وهم العبيد الى القيامة

ذلو لسوطك مثلما
ذل الاشيقر ذو الخزمة

(آپ ان کے بادشاہ ہیں اور وہ قیامت تک تمہارے غلام ہیں' وہ آپ کے کوڑے کے سامنے اس قدر بے بس ہیں جس طرح گہرے زرد اور سرخ رنگ کا اونٹ اس شخص کے سامنے بے بس ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں اس کی نکیل ہوتی ہے)

اور عمر ابن ہند بھی بادشاہ تھا جس نے لوگوں کو اس بات کا عادی بنا دیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ پس از پردہ خطاب کرے۔ اور تمام عرب روساء کی مائیں اس کے گھر میں اس کی خدمت کرتیں۔

نعمان ابن منذر بھی عربی بادشاہ تھا۔ وہ اس قدر ظالم اور احمق تھا کہ اس نے اپنے لئے دو دن مقرر کر رکھے تھے۔ ایک خوشی کا دن جس میں جو بھی آتا اسے مویشی عطا کرتا اور ایک غم کا دن مقرر کیا ہوا تھا' جس میں جو کوئی اس کے پاس آتا' اسے وہ قتل کر دیتا اور صبح سے شام تک یہی معمول رہتا۔

کلیب ابن وائل کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اسے کلیب اس لئے کہا جاتا تھا کہ جہاں اسے شکار پسند آتا وہ وہاں کتوں کا جھنڈ چھوڑ دیتا تھا۔ اب کوئی شخص جو ان کتوں کے بھونکنے کی آواز سنتا وہ اس علاقے کے قریب جانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وادی عوف کے اندر کوئی شخص آزاد نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ وادی عوف میں کسی آزاد شخص کو رہنے نہ دیتا تھا تاکہ اس کے پاس اس کی طرح اور کوئی آزاد شخص نہ رہے۔ وہ تھے تو آزاد لیکن تھے غلاموں کی طرح۔ (حقائق الاسلام ' العقاد ص ۱۵۰ ' ۱۵۱)

ان عربوں کو اسلام نے اپنی عادات ' رسوم ' اخلاق اور اجتماعی تعلقات کے میدان میں جاہلیت سے اٹھایا۔ انہیں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے ' عورتوں پر ظلم کرنے ' شراب نوشی اور جوا کھیلنے ' جنسی انارکی ' فحاشی و عریانی ' عورت کو حقیر سمجھنے اور اس کی توہین کرنے ' انتقام لینے ' ڈاکے ڈالنے ' تاخت و تاراج کرنے اور ہر حملہ آور کے مقابلے میں بزدلی دکھانے وغیرہ کی جاہلی کمزوریوں سے پاک کیا۔ جہاں تک بیرونی حملہ آوروں کے مقابلے میں بزدلی اور بے اتفاقی کا معاملہ ہے تو اسلام سے قبل حبشیوں کا حملہ اس پر شاید عادل ہے۔ تمام عرب قبائل جو ایک دوسرے کے مقابلے میں سخت ترین موقف رکھتے تھے وہ اس لشکر کا مقابلہ نہ کر سکے۔ (دیکھئے تفسیر سورۂ فیل)۔

پھر ان گندگیوں سے پاک کر کے اسلام نے عربوں کو ایک امت بنایا اس قدر سربلند امت کہ وہ نہایت ہی بلند مقام سے پوری انسانیت پر نظر ڈالتی تھی اور یہ انسانیت اس وقت گراوٹوں کے اسفل السافلین میں تھی۔ زندگی کے ہر شعبے میں اس وقت کی بشریت گری ہوئی تھی۔ اس وقت یا اسلام کی سربلندی تھی اور یا جاہلیت کی گراوٹ تھی۔ یہ نسل جانتی تھی کہ جاہلیت کیا ہے اور اسلام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ خدا کے اس فرمان کا مفہوم اچھی طرح جانتے تھے۔

(اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵ : ۳)) (آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت تمہارے دین کے قبول کر لیا ہے)

اور ایک بار پھر ہم ایک لمحہ فکریہ کے طور پر ذرا غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے ایک دین پسند فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس امت پر کیا کیا عنایات اور مہربانیاں ہیں۔ خود ان کے لئے دین تجویز کرتا ہے اور پھر اسے قبول بھی کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا انداز تعبیر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اس امت کے ساتھ بے حد محبت کرتا ہے اور اس امت سے بہت راضی ہے کہ وہ اس امت کے لئے ایک نظام زندگی تجویز کرتا ہے۔

یہ عظیم فرقان ' اس امت کے کاندھوں پر بہت ہی بھاری بوجھ ڈال دیتا ہے جو اس ذمہ داری کے برابر ہے۔ نعوذ باللہ ....... اللہ تعالیٰ کی اس عظیم رعایت اور مہربانی کے مقابلے میں اس امت کے پاس ہے ہی کیا کہ وہ اللہ کے سامنے

پیش کرے بلکہ اس امت کی تمام اگلی پچھلی نسلوں کے پاس بھی اس نعمت کی برابری کے لئے کچھ نہیں ہے کہ وہ پیش کر سکے۔ ہاں امت پر اس شکر نعمت کے بدلے میں اپنی حد تک جدوجہد فرض ہے۔ اللہ کے انعامات کی پہچان اس پر فرض ہے یعنی اپنے فرض کا ادراک واجب ہے۔ اس کے بعد اس کے لئے بقدر وسعت جدوجہد لازمی ہے اور اس کے اندر اپنی تقصیرات اور کوتاہیوں پر طلب مغفرت کرنا لازم ہے۔

اللہ کی جانب سے اس امت کے لئے اسلام کو بحیثیت دین قبول کرنا' اس امت سے سب سے پہلے مطالبہ یہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کی اس پسند کی قدر و قیمت کو سمجھے۔ اس کے بعد وہ اس دین پر اپنی طاقت اور وسعت کے مطابق جم جائے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ بہت ہی کوتاہ بیں 'بہت ہی احمق ہے کہ اس نے اللہ کی پسند اور اس کے انتخاب کو رد کر دیا اور اپنے لئے خود کوئی دین اور نظام اختیار کر لیا۔ یہ نہایت ہی خطرناک جرم ہو گا اس امت کی طرف سے اور اس پر اسے ضرور سزا دی جائے گی۔ کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایسا شخص نجات پا جائے جبکہ اس نے اللہ کے انتخاب کو ٹھکرا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بعض اوقات ان لوگوں کو چھوڑ دیتے ہیں جنہوں نے اسلام کو بطور دین قبول نہیں کیا' کہ وہ جو چاہیں کریں اور ایک وقت تک انہیں مہلت دیتے ہیں لیکن جن لوگوں نے اس دین کو اچھی طرح پہچان اور جان لیا اور پھر اسے ترک کر دیا اور انہوں نے اپنی زندگی کے لئے اس نظام کے سوا کوئی اور نظام از خود منتخب کر لیا تو ایسے لوگوں کو اللہ ہرگز نہ چھوڑے گا اور نہ انہیں مہلت دے گا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بداعمالیوں کے وبال کو چکھ لیں جس کے وہ مستحق ہیں۔

بس اس سے زیادہ تکمیل دین کے بارے اور ان عظیم کلمات کے بارے میں' یہاں کہنا مناسب نہیں ہے' بات بہت لمبی ہو گئی ہے۔ اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔ یہ تو قرآن کے پرتو ہیں' اب ہم اس سورہ کے سیاق کلام سے اگلا ٹکڑا لیتے ہیں۔

---ooo---

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴﴾ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ

إِذَآ ءَاتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَٰفِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِىٓ أَخْدَانٍ ۗ وَمَن يَكْفُرْ بِٱلْإِيمَٰنِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُۥ وَهُوَ فِى ٱلْءَاخِرَةِ مِنَ ٱلْخَٰسِرِينَ ﴿۵﴾

(لوگ پوچھتے ہیں کہ ان کے لئے کیا حلال کیا گیا ہے؟ کہو تمہارے لئے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور جن شکاری جانوروں کو تم نے سدھایا ہو.... جن کو خدا کے دیئے ہوئے علم کی بنا پر تم شکار کی تعلیم دیا کرتے ہو.... وہ جس جانور کو تمہارے لئے پکڑ رکھیں اس کو بھی تم کھا سکتے ہو' البتہ اس پر اللہ کا نام لے لو اور اللہ کا قانون توڑنے سے ڈرو' اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی۔

آج تمہارے لئے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے۔ اور محفوظ عورتیں بھی تمہارے لئے حلال ہیں خواہ وہ اہل ایمان کے گروہ سے ہوں یا ان قوموں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی' بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے نکاح میں ان کے محافظ بنو' نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرو اور جو کسی نے ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کیا تو اس کا سارا کارنامہ زندگی ضائع ہو جائے گا اور وہ آخرت میں دیوالیہ ہو گا)۔

یہ سوال ان لوگوں کی طرف سے ہے جو ایمان لائے اور یہ اس بارے میں ہے کہ ان کے لئے کیا کیا حلال ہے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت امت مختارہ کی نفسیاتی کیفیت کیا تھی۔ یہ امت جو پہلی مرتبہ خطاب الہی کا اعزاز پا رہی تھی اس کے اس سوال سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نفوس طیبہ کے اندر ہروقت احتیاط اور خدا ترسی کے جذبات موجزن تھے اور وہ ان تمام کاموں کے بارے میں حرج محسوس کرتے تھے جو دور جاہلیت میں معمول بہ تھے۔ ان کے دل میں یہ خوف رہتا تھا کہ کہیں اسلام نے ان چیزوں کو حرام قرار نہ دے دیا ہو' اس لئے یہ امت ہروقت پوچھنے پر مجبور تھی کہ آیا کوئی درپیش بات جائز ہے یا ناجائز ہے۔

تاریخ اسلام کا آج کا طالب علم اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ اسلام نے امت مسلمہ کے اندر کس قدر عظیم انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اسلام نے اس امت کو اس قدر سختی سے جھنجوڑا کہ اس پر سے دور جاہلیت کا تمام گرد و غبار جھاڑ دیا۔ جن مسلمانوں کو اسلام نے جاہلیت کی پستیوں سے اٹھایا تھا' ان کے ذہن میں یہ احساس تازہ تھا کہ اسلام کے ذریعے انہیں بالکل ایک نیا جنم ملا ہے۔ وہ از سرنو نشو و نما پا رہے ہیں' نیز ان لوگوں کو گہرا احساس اور شعور تھا کہ ان کے اندر ایک عظیم انقلاب پیدا ہو گیا ہے' انہوں نے ایک بہت بڑی چھلانگ لگائی ہے' وہ بہت رفیع الشان بلندیوں تک پہنچ گئے ہیں اور ان کو بلند مرتبہ نعمت سے نوازا گیا ہے۔ اس گہرے اور پختہ شعور اور اس شدید جھٹکے نے ان کے اندر ایک شدید

بیداری اور احتیاط پیدا کر دی تھی اور وہ جاہلیت کی ہر چیز کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ جب انہوں نے ان آیات کو سنا جن میں بعض چیزوں کو حرام قرار دیا گیا تھا تو انہوں نے حضور سے حلال چیزوں کے بارے میں بھی پوچھنا شروع کر دیا۔

(یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَآ اُحِلَّ لَھُمْ) (ان کے لئے کیا حلال کیا گیا ہے) اور اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے۔ (قُلْ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ) (کہو تمہارے لئے تمام پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں)۔ یہ ایک ایسا جواب ہے جو قابل غور ہے۔ ان کے احساس میں یہ بات ڈال دی گئی کہ تمہارے لئے کوئی پاک چیز حرام نہیں کی گئی اور نہ انہیں پاک چیزوں کے استعمال سے منع کیا گیا ہے۔ تمام پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے حلال ہیں۔ صرف نجس اور ناپاک اشیاء حرام کر دی گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے' ازروئے طبیعی احساس بھی انسان ان کو پسند نہیں کرتا۔ مثلاً مردار' خون اور خنزیر۔ یا دل مومن ان کو پسند نہیں کرتا مثلاً وہ چیزیں جن کو اللہ کے نام کے سوا کسی اور کے نام اور استھان پر ذبح کیا گیا ہو یا بتوں پر ان کو ذبح کیا گیا ہو یا جن کے گوشت کی تقسیم بذریعہ ازلام ہوئی ہو' اس لئے کہ یہ بھی ایک قسم کا جوا ہے۔

اب طیبات کی عمومی اجازت کے بعد ان میں سے ایک محسوس چیز کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ تخصیص بعد از تعمیم ہے۔ یعنی وہ شکار' جس کو سدھائے ہوئے کتے یا درندے پکڑتے ہیں۔ مثلاً کتے' باز اور شکرے یا مثلاً سدھائے ہوئے چیتے اور شیر پکڑتے ہیں جن کو مالکوں نے سدھایا ہو کہ شکار کو اس طرح پکڑا جاتا ہے اور اس طرح اسے قید میں رکھا جاتا ہے۔

(وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُکَلِّبِیْنَ تُعَلِّمُوْنَھُنَّ مِمَّا عَلَّمَکُمُ اللّٰہُ ز فَکُلُوْا مِمَّآ اَمْسَکْنَ عَلَیْکُمْ وَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْہِ ص وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ

(۵ : ۴) (اور جن شکاری جانوروں کو تم نے سدھایا ہو..... جن کو خدا کے دیئے ہوئے علم کی بنا پر تم شکار کی تعلیم دیا کرتے ہو..... وہ جس جانور کو تمہارے لئے پکڑ رکھیں اس کو بھی تم کھا سکتے ہو' البتہ اس پر اللہ کا نام لے لو اور اللہ کا قانون توڑنے سے ڈرو' اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی)۔

حلال ہونا اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ یہ شکاری جانور اس قدر سدھائے ہوئے ہوں کہ شکار کو پکڑ کر قید میں رکھیں۔ اور مالک کے آنے تک اسے کھائیں نہیں۔ اسے مالک کے لئے محفوظ رکھیں۔ الا یہ کہ یہ جانور بھوکے ہوں اور مالک اس جگہ سے دور رہ گیا ہو..... اگر یہ شکاری جانور شکار کو پکڑ کر کھانے لگ جائیں تو ایسے جانور کے بارے میں یہ نہ کہا جائے گا کہ وہ سدھائے ہوئے ہیں انہوں نے تو شکار اپنے لئے کیا ہو گا اس لئے وہ حلال نہ ہو گا' اگرچہ شکار کا تھوڑا حصہ کھایا گیا ہو' اور اس کا زیادہ حصہ باقی ہو' اگرچہ یہ جانور اسے زندہ لائے ہوں لیکن اس کا کچھ حصہ انہوں نے کھا لیا ہو تو پھر بھی وہ پاک نہ ہو گا۔

اللہ تعالیٰ یہاں اہل ایمان کو یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ جن جانوروں کو تم سدھاتے ہو اور علم سکھاتے ہو وہ علم بھی

تمہارا اپنا نہیں ہے بلکہ یہ علم تمہیں اللہ نے سکھایا ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے ان کو تمہارے لئے مسخر بنایا اور پھر تمہیں یہ قوت دی کہ تم ان کی تربیت کرو۔ اللہ ہی نے تمہیں حکمت تربیت دی۔ یہ قرآن کریم کا ایک انداز تربیت ہے کہ وہ ہر ہر مرحلے پر اہل ایمان کو اللہ کی طرف متوجہ کرتا ہے اور کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ وہ اس اساسی اور بنیادی حقیقت کی طرف انہیں متوجہ کرتا رہتا ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں یہ سب کچھ دیا ہے۔ وہی خالق ہے' وہی معلم ہے' وہی ہے جس نے انسان کے لئے اس جہان کو مسخر کیا ہے۔ تمام کمالات و فضائل کا مرجع وہی ہے۔ تمام مخلوقات اپنی ہر حرکت' ہر محنت اور ہر امکان میں اسی کی طرف رجوع کرتی ہے۔ چنانچہ کوئی مومن ایک لحظہ کے لئے بھی اس بات کو نہیں بھولتا کہ اس کے جسم میں اور اس کی شخصیت میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کی طرف لوٹتا ہے۔ اس کے اردگرد جو حادثات و واقعات رونما ہوتے وہ سب اللہ کی جانب سے ہیں۔ اور ایک مومن ہروقت اللہ کے کمالات دیکھتا رہتا ہے' اس معاملے میں اللہ کے فضل و کرم کو دیکھتا ہے۔ ہر سانس میں وہ دیکھتا ہے کہ اللہ کا کیا کیا کرم ہے' غرض ہر حرکت اور جسم کے ہر حصے میں اسے حکمت نظر آتی ہے۔ وہ پوری طرح ربانی ہوتا ہے اور کسی لحظہ بھی غافل نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ یہ حکم دیتا ہے کہ سدھائے ہوئے جانور جو شکار کو تمہارے لئے روکتے ہیں' اس پر اللہ کا نام لو اور یہ نام اس وقت لیا جائے جب کسی جانور کو چھوڑا جاتا ہے اس لئے کہ ممکن ہے کہ دانتوں اور پنجوں سے وہ شکار کو ہلاک کر دے۔ یہ بمنزلہ ذبح ہو گا' اس لئے کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔ اس طرح اسے حکم دیا گیا کہ جانور کو چھوڑتے ہی اس پر اللہ کا نام لے لیا جائے۔

آخر کار انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ ہروقت خداخوفی کو مدنظر رکھو اور اللہ کے حساب و کتاب سے ڈرو۔ اس طرح حلال و حرام کے احکام کو خداخوفی اور تقویٰ کے شعور سے مربوط کر دیا جاتا ہے جو مومن کی زندگی میں ہر نیت اور ہر عمل کا محور ہوتا ہے اور اسی شعور کی وجہ سے پوری زندگی کا ربط اللہ' اللہ کی بزرگی کے احساس اور کھلے بندوں اور پوشیدہ حالات میں خداخوفی سے ہو جاتا ہے۔ (وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۵ : ۴) (اور اللہ سے ڈرو' بے شک اللہ جلدی حساب لینے والا ہے) حلال چیزوں کا بیان جاری ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ تمہارے لئے کن عورتوں سے نکاح جائز ہے:

(اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۭ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۠ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۡ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ

(۵ : ۵)) (آج تمہارے لئے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے۔ اور محفوظ عورتیں بھی تمہارے لئے حلال ہیں خواہ وہ اہل ایمان کے گروہ سے ہوں یا ان قوموں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی' بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے نکاح میں ان کے محافظ بنو' نہ یہ کہ آزاد

شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرو)

اب پھر وہ چیزیں گنوائی جاتی ہیں جو حلال ہیں۔..... (آج تمہارے لئے پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں) اس سے اس مفہوم کی طرف تاکیدی اشارہ ملتا ہے جس کی طرف ہم نے قارئین کو اوپر متوجہ کیا تھا۔اب طیبات کی فہرست میں کچھ مزید چیزوں کو شامل کیا جاتا ہے۔کیونکہ وہ بھی طیب ہیں۔

یہاں اسلام کی رواداری کا ایک نمونہ سامنے آتا ہے۔اسلامی معاشرے میں غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ کی ایک خصوصی صورت بتائی جاتی ہے۔ایسے لوگ جو دارالاسلام میں رہتے ہیں اور اہل الذمہ ہیں اور مملکت اسلامیہ کے شہری ہیں اور ہیں اہل کتاب میں سے۔

اسلام اہل کتاب غیر مسلموں کو صرف مذہبی آزادی دے کر معاشرے کے اندر الگ تھلگ نہیں کر دیتا نہ انہیں اسلامی معاشرے میں قابل نفرت حد تک دور پھینک دیتا ہے۔ وہ انہیں اجتماعی شرکت اور محبت کا احساس بھی دیتا ہے اور انہیں اسلامی معاشرے میں ضم ہونے کے مواقع بھی فراہم کرتا ہے۔اسلام ان کا کھانا اہل اسلام کے لئے حلال قرار دیتا ہے۔ اہل اسلام کے لئے یہ بھی جائز قرار دیتا ہے کہ وہ اپنا کھانا بھی اہل کتاب کو پیش کر سکتے ہیں تاکہ وہ ایک دوسرے سے ملاقات کر سکیں ' ایک دوسرے کے مہمان بن سکیں اور باہم مل کر کھا پی سکیں اور معاشرے کے اندر محبت اور رواداری کی فضا وجود میں آئے۔اسی طرح اسلام اہل کتاب میں سے پاک دامن عورتوں کے ساتھ اہل اسلام کو نکاح کی بھی اجازت دیتا ہے بشرطیکہ وہ محصنات ہوں یعنی پاکدامن ہوں۔یہ مسلمانوں کے لئے جائز ہیں۔یہاں مسلمان پاک دامن عورتوں کے ساتھ اہل کتاب پاکدامن عورتوں کا ذکر یکجا کیا جاتا ہے۔یہ ایک ایسی رواداری ہے جو اسلام کے سوا کسی اور مذہب کے ہاں شاذو نادر ہی ملتی ہوگی۔اس لئے کہ عیسائیوں میں سے بھی کیتھولک فرقہ آرتھوڈکس کے ساتھ نکاح کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔اسی طرح پروٹسٹنٹ اور مارونیہ کے ساتھ بھی وہ نکاح جائز نہیں سمجھتے اور اگر عیسائی معاشرے میں کوئی ایسے نکاح کرتا ہے تو عیسائی آرتھوڈکس اسے صحیح عیسائی نہیں بلکہ بدعمل سمجھتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ یہ صرف اسلام ہی ہے جو ایک عالمی معاشرہ قائم کرنے کی اجازت دیتا ہے۔اسلام نے اہل اسلام اور اہل کتاب کے درمیان مکمل علیحدگی قائم نہیں کی نہ مختلف عقائد رکھنے والوں کے درمیاں مستقل پردے ڈالے ہیں۔وہ اہل عقائد جو اسلامی مملکت کے شہری ہوتے ہیں حسن معاشرت کے نقطہ نظر سے وہ مسلمانوں کے ساتھ اور مسلمان ان کے ساتھ رابطہ رکھ سکتے ہیں۔(رہی یہ بات کہ ان لوگوں کے ساتھ خفیہ دوستیاں قائم کرنا جائز ہیں یا نہیں تو اس کا حکم آگے آرہا ہے) رہی یہ شرط کہ کتابیات محصنہ ہوں تو یہ شرط مومنات کے لئے بھی ہے کہ وہ محصنہ ہوں۔

(اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ

(۵:۵)) (بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے نکاح میں ان کے محافظ ہو' نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنایاں کرو)۔

وہ اس طرح کہ انہیں مہر ادا کرو' ان کے ساتھ شرعی نکاح کرو'جس میں مرد عورت کو حصار نکاح میں لاتا ہے اور

اس کی حفاظت کرتا ہے۔یہ نہ ہو کہ اجر دے کر تم ان کے ساتھ آزاد شہوت رانی کرو یا چوری چھپے دوستیاں کرو۔السفاح کا مفہوم یہ ہے کہ عورت کسی بھی مرد کے ساتھ معاہدہ کرے اور المخادنہ کا مفہوم یہ ہے کہ عورت بغیر شرعی نکاح کے کسی ایک شخص کو دوست بنالے۔یہ دونوں صورتیں عرب میں دور جاہلیت میں مشہور اور متعارف تھیں اور جاہلی معاشرہ ان دونوں قسم کے تعلقات کو تسلیم کرتا تھا۔اسلام آیا اور اس نے معاشرے کو ان گندگیوں سے پاک و صاف کر دیا اور اسے ان گراوٹوں سے اٹھاکر سربلند کر دیا۔

( وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ

( ۵:۵ )) (اور اگر کسی نے ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کیا تو اس کا سارا کارنامہ زندگی ضائع ہو جائے گا اور وہ آخرت میں دیوالیہ ہو گا)۔

یہ تمام قانون سازی ایمان کے ساتھ منسلک ہے۔اس کا نافذ کرنا اسی طرح اہم ہے جس طرح ایمان لانا اہم ہے۔یہ دلیل ایمان ہے' اس لئے کہ جو شخص ان احکام کے نفاذ سے روگردانی کرتا ہے وہ گویا ایمان کا انکار کرتا ہے' ایمان کو چھپاتا ہے' ایمان پر پردہ ڈالتا ہے۔اس طرح جو شخص ایمان کا انکار کرے اس کا عمل باطل ہو جاتا ہے اور وہ مسترد کر دیا جاتا ہے اور نہ وہ شخص اس عمل پر ہمیشہ کے لئے عمل پیرا ہوتا ہے۔الحبوط عربی میں کسی مویشی کے پھول جانے کو کہتے ہیں' جب وہ کوئی زہریلی گھاس چرلیتا ہے اور اس سے مرجاتا ہے۔یہ عمل باطل کی اچھی تصویر کشی ہے کہ بظاہر وہ پھول جاتا ہے لیکن درحقیقت اس کا جسم زہر آلود ہو گیا ہوتا ہے اور وہ مرجاتا ہے۔اسی طرح عمل باطل بھی زیادہ نظر آتا ہے لیکن اس کا اثر نہیں ہوتا اور دنیا میں بے اثر اور بے کار ہونے کے بعد آخرت میں غیر نافع اور سخت خسارے کا سودا ہو گا۔

یہ سخت 'شدید اور خوفناک اختتامی ڈراوا ایک شرعی حکم کے بعد آتا ہے۔یہ شرعی حکم طعام و نکاح کے حوالے سے حلال و حرام کی بابت وارد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام حیات کے ہر جزو پر عمل کرنا ضروری ہے اور یہ کہ اسلامی نظام کا ہر جزئیہ بھی دین ہی ہے اور اسی لئے اس کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں ہے۔شریعت کی مخالفت میں اگر کوئی عمل تھوڑا ہو یا زیادہ اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

پاکیزہ کھانوں اور پاکیزہ بیویوں کے بیان کے ضمن میں نماز کا حکم آجاتا ہے اور نماز کے لئے تیاری اور پاکی کے احکام بتائے جارہے ہیں :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ

اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡكُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً فَتَيَمَّمُوۡا صَعِيۡدًا طَيِّبًا فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡهِكُمۡ وَاَيۡدِيۡكُمۡ مِّنۡهُ ؕ مَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيَجۡعَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ وَّلٰـكِنۡ يُّرِيۡدُ لِيُطَهِّرَكُمۡ وَلِيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ۞ ۶

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم نماز کے لئے اٹھو تو چاہیے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لو' سروں پر ہاتھ پھیر لو اور پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔ اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔ اگر بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا ہو' اور پانی نہ ملے' تو پاک مٹی سے کام لو' بس اس پر ہاتھ مار کر اپنے منہ اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو۔ اللہ تم پر زندگی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا' مگر وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے' شاید کہ تم شکر گزار بنو)۔

رزق حلال اور پاکیزہ عورتوں کے احکام کے متصلاً بعد نماز اور نماز کے لئے طہارت کا بیان آتا ہے۔ مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکنے والوں کے ساتھ معاملہ کرنے' شکار کرنے کے احکام کے ساتھ نماز کے لئے طہارت کے احکام کا ذکر محض اتفاقاً نہیں کیا گیا ہے کہ ایک بیان ختم ہوا تو دوسرا شروع کر دیا گیا اور نہ یہ سیاق کلام اور مقاصد کلام کے ساتھ غیر مناسب ہے بلکہ یہ ذکر بھی اپنے صحیح مقام پر ہے اور قرآن کریم کی حکمت بیان کے عین مطابق ہے۔

سب سے پہلے تو یہ پاکیزہ چیزوں میں سے ایک نئے رنگ کی پاکیزگی ہے' روحانی پاکیزگی یعنی پاکیزہ طعام و شراب اور پاکیزہ عورتوں کے ساتھ ایک پاکیزہ چیز' روح کی پاکیزگی کے سامان اور انتظام کا بھی یہاں ذکر کر دیا گیا۔ یہ وہ رنگ ہے جس میں قلب مومن وہ کچھ پاتا ہے جو کسی دوسرے ساز و سامان میں نہیں پاتا۔ یہ وہ ساز و سامان ہے جو ذریعہ ملاقات محبوب ہے۔ پاکیزگی' طہارت اور عاجزی کی فضا میں جب دنیا کے سامان طعام و شراب کا بیان ختم ہوا اور پاکیزہ ازواج کا ذکر بھی ہو گیا تو پھر روحانی پاکیزگی اور طہارت کا ذکر ہوا جو وضو اور نماز کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ انسان کی زندگی میں پاکیزگی کے تمام رنگ جمع ہو گئے جن کے ساتھ انسان کی تصویر مکمل ہوتی ہے۔

اس سے یہ بتلانا بھی پیش نظر ہے کہ طہارت اور نماز کے احکام بھی اسی طرح دین کا حصہ ہیں جس طرح کھانے کے احکام اور نکاح کے احکام' شکار کے احکام اور حرام اور حلال کے احکام اور جس طرح امن اور جنگ میں لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے کے احکام ہیں یا جس طرح اس پوری سورہ میں مذکور دوسرے احکام ہیں۔ یہ سب احکام اللہ کی عبادت اطاعت اور بندگی ہیں۔ یہ سب دین کا حصہ ہیں۔ اسلام میں ان احکام کے اندر کوئی ایسا فرق نہیں ہے جو فقہاء نے بعد کے

ادوار میں اپنی اصطلاحات کے اندر قائم کر دیا ہو۔یعنی یہ ہیں احکام عبادات اور یہ ہیں احکام معاملات۔

یہ اصطلاحات جو فقہاء نے محض تصنیفی تقاضوں کے تحت قائم کئے تھے اور کتابوں کے ابواب و فصول کے تعین کے لئے کئے تھے' ان کا اصل نظام زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔اور نہ اصل شریعت کے اندر اس تفریق کے لئے کوئی جواز ہے۔اسلامی نظام میں عبادات اور معاملات دونوں موجود ہیں اور ان دونوں کا حکم بھی ایک ہے۔یعنی یہ دونوں امور اسلامی نظام حیات' شریعت اور دین کا حصہ ہیں۔اطاعت اور اتباع میں دونوں کے درمیان شریعت نے کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا ہے۔بلکہ شریعت کا قیام ہی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان دونوں حصوں پر عمل در آمد نہ کیا جائے اور دین اسلام اس وقت تک درست طور پر قائم نہیں ہو سکتا' جب تک جماعت مسلمہ کی زندگی میں یہ دونوں پہلو برابری کے طور پر نافذ نہ ہو جائیں۔

یہ سب معاہدے ہیں جن کے بارے میں اللہ کا حکم یہ ہے کہ انہیں پورا کیا جائے۔یہ تمام عبادات ہیں جن پر ایک مسلمان رضائے الہی کے لئے عمل کرے گا۔یہ تمام امور اسلام کا حصہ ہیں اور ہر ایک پر مسلمان عمل پیرا ہو گا تاکہ وہ اپنی بندگی کا اقرار کرے۔

اسلام میں عبادات اور معاملات کوئی الگ الگ حیثیت نہیں رکھتے۔ان کا بیان صرف فقہی تصنیفات میں الگ الگ کیا گیا ہے۔معاملات اور عبادات دونوں ہی درحقیقت عبادات ہیں۔یہ سب اللہ کی جانب سے فرائض ہیں اور ہم نے اللہ کے ساتھ یہ عہد (عقود) کیا ہے کہ ہم ان پر عمل کریں گے۔ان میں سے کسی ایک کی خلاف ورزی کا مفہوم یہ ہو گا کہ ہم نے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے ایمان کے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔

یہ ہے وہ اہم نقطہ نظر جس کی طرف قرآن یہاں اشارہ کر رہا ہے۔وہ پے در پے مختلف قسم کے احکام کو اس سورہ میں بیان کر رہا ہے جو سب کے سب دین کا حصہ ہیں۔

---ooo---

يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ (۵:۶))

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم نماز کے لئے اٹھو تو چاہئے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لو' سروں پر ہاتھ پھیر لو اور پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔اگر بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا ہو' اور پانی نہ ملے' تو پاک مٹی سے کام

لو' بس اس پر ہاتھ مار کر اپنے منہ اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو)

اسلام میں نماز کی حیثیت 'اللہ کے ساتھ ملاقات کی ہے۔ انسان اللہ کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوتا ہے' اللہ سے دعا کرتا ہے۔ اللہ کے ساتھ راز و نیاز ہوتا ہے اس لئے اس مقام پر کھڑا ہونے کے لئے مناسب تیاری کی ضرورت ہے۔ روحانی تطہیر سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ جسمانی پاکیزگی بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وضو کا حکم دیا گیا۔ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں اصل حکمت تو اللہ کے علم میں ہے۔ بہرحال وضو میں درج ذیل چیزیں شامل ہیں: چہرے کا دھونا' ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونا اور سر کا مسح کرنا اور پاؤں کو ٹخنوں تک دھونا۔ ان فرائض کے بارے میں معمولی فقہی اختلافات بھی ہیں۔ اہم اختلاف یہ ہے کہ آیا یہ فرائض وضو اسی طرح ادا کئے جائیں گے جس ترتیب سے ان کا ذکر قرآن میں ہوا ہے یا اس ترتیب کے سوابھی وضو ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں دو اقوال ہیں۔

یہ وضو تو اس ناپاکی سے ہے جس میں وضو فرض ہے۔ رہی جنابت چاہے وہ عورت کے ساتھ مباشرت کی وجہ سے لازم ہو یا احتلام کی وجہ سے تو اس پر غسل واجب ہے۔ فرائض غسل اور فرائض وضو بیان کرنے کے بعد یہاں تیمم کا ذکر بھی کر دیا گیا۔ تیمم کی اجازت درج ذیل حالات کے ساتھ مشروط ہے۔

مثلاً یہ کہ پانی سرے سے موجود ہی نہ ہو یا یہ کہ کوئی شخص مریض ہو اور وہ وضو پر قادر نہ ہو یا اس پر غسل واجب ہو پانی اس کے لئے موجب اذیت ہو۔ مسافر جو محتاج وضو ہو یا اس پر غسل واجب ہو اور پانی میسر نہ ہو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے وضو کی موجب ناپاکی کی تعبیر کی ہے۔ (اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ (۵: ۶)) (یا تم میں سے کوئی نشیبی جگہ سے آیا ہو) غائط کے معنی نشیبی جگہ کے ہوتے ہیں جہاں اکثر لوگ قضائے حاجت کے لئے جاتے ہیں' چاہے وہ پیشاب ہی کرے اور نشیبی جگہ نہ جائے۔

اور غسل واجب ہونے کی ناپاکی کی تعبیر (اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (۵: ۶)) (یا تم عورتوں کے ساتھ ہاتھ لگاؤ) یہ شریفانہ انداز بیان مباشرت کے لئے ہے۔ ایسے حالات میں جن میں حاجت وضو ہو یا حاجت غسل کسی کو نماز کے قریب جانے کی اجازت نہیں' الا یہ کہ وہ تیمم کر لے اور پاک مٹی کا ارادہ کرے۔ یعنی ایسی چیز پر تھپکی دے جو زمیں سے ہو اور پاک ہو۔ چاہے یہ مٹی سواری کی پشت پر ہو' یا دیوار کے ساتھ ہو' چاہے کہ اپنی ہتھیلیوں کے ساتھ مٹی وغیرہ پر تھپکی دے' پھر دونوں ہاتھ کو جھاڑ دے اور منہ پر مسح کر لے اور پھر اپنے ہاتھوں پر کہنیوں تک مسح کر لے۔ ایک بار تھپکی دے پورے تیمم کے لئے یا دو بار تھپکی دے۔ دو فقہی اقوال کے مطابق لفظ (اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (۵: ۶)) کے مفہوم میں بھی اختلاف ہے۔ کیا اس سے مراد صرف لمس ہے یا مباشرت ہے۔ یا اس سے مراد مطلق لمس ہے چاہے شہوت اور لذت کے ساتھ ہو یا اس کے بغیر ہو۔ اس میں بھی فقہی اختلافات ہیں.... اسی طرح اس میں بھی اختلاف ہے کہ مطلق مرض میں تیمم جائز ہے یا ایسے مرض میں جس میں تکلیف ہو یا تکلیف بڑھ جانے کا خطرہ ہو۔

پھر یہ بھی مختلف فیہ ہے کہ مرض نہ ہو لیکن پانی شدید ٹھنڈا ہو اور اس سے بیماری لاحق ہونے کا خطرہ ہو تو تیمم جائز ہے۔ راجح بات یہی ہے کہ جائز ہے۔ اس آیت کے اختتام پر یہ تعقیب آتی ہے۔

(مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ

عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۵ : ٦)) (اللہ تم پر زندگی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا‘ مگر وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے‘ شاید کہ تم شکر گزار بنو)۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا اللہ کی ملاقات کی حالت میں صفائی شریعت میں واجب کی گئی ہے۔ وضو اور غسل میں جسمانی اور روحانی صفائی حاصل ہوتی ہے۔ رہا تیمم تو اس میں کم از کم روحانی صفائی حاصل ہوتی ہے۔ اور صفائی کے لئے وہ وضو اور غسل کا قائم مقام ہوتا ہے جب پانی نہ ملے یا پانی کے استعمال میں ضرر کا احتمال ہو۔ یہ اس لئے جائز کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر خواہ مخواہ سختی اور شدت نہیں چاہتے اور نہ لوگوں کو مشقت، اور مشکلات میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو پاک کر دے۔ یہ پاکی ان پر بطور انعام آئے اور اس کے بعد وہ اس نعمت کا شکر ادا کریں اور اس شکر کے بدلے اللہ اپنے فضل و کرم اور انعام و اکرام میں مزید اضافہ فرمائیں۔ یہ ہے نرمی‘ مہربانی اور اسلامی نظام کی واقعیت پسندی اور مستقل سہولت کی فراہمی۔ وضو‘ غسل اور تیمم کی حکمت۔ اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتے ہیں :

( وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۵ : ٦)) (مگر وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے‘ شاید کہ تم شکر گزار بنو)۔ اسلامی نظام حیات مسلمانوں کو مراسم عبودیت اور نظام قانون دونوں میں ایک حسین ہم آہنگی عطا کرتا ہے۔ وضو اور غسل سے محض جسمانی تطہیر کا فائدہ ہی حاصل نہیں ہوتا کہ آج کل کے نام نہاد منکرین اسلام یہ اعتراض وارد کر سکیں کہ اس دور جدید میں ہمیں محض صفائی کے لئے اس قسم کے انتظامات کی ضرورت نہیں ہے جس طرح پسماندہ عربوں کو ضرورت تھی اس لئے کہ اب تو حماموں میں صحت و صفائی کے اچھے انتظامات ہیں اور ہم مہذب ہونے کی وجہ سے بھی صفائی کا بہت ہی خیال رکھتے ہیں..... یہ اعتراض اس لئے نہیں وارد کر سکتے کہ وضو اور غسل کے ذریعے اسلام نے جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے ہمارے لئے تطہیر کا نظام وضع کیا ہے۔ پھر اس نظام کو عبادت کے ساتھ منسلک کر کے باقاعدہ بنا دیا ہے کہ تمام لوگ پاک اور صاف و ستھرے ہوں۔ جب وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وضو اور غسل میں جسمانی صفائی سے روحانی صفائی کا پہلو زیادہ مدنظر رکھا گیا ہے تو ان کے عوض تیمم کو رکھا گیا ہے اس لئے کہ جب پانی کا استعمال ممکن نہ ہو تو ان کے عوض تیمم کو رکھا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ تیمم کے اندر ظاہری صفائی حاصل ہی نہیں ہوتی۔ اس پر مزید یہ کہ اسلامی نظام زندگی ایک عام نظام ہے اور وہ ہر قسم کے حالات کے لئے ہے۔ ہر خاندان‘ ہر طور طریقے کے لئے ایک ہی نظام اور طریقہ ہے‘ اس لئے اس کا فائدہ ہر قسم کے حالات اور ہر قسم کے ماحول اور ہر قسم کی سوسائٹی میں ہوتا ہے۔ ہر صورت میں اور ہر مفہوم میں اس کی حکمت اور فائدہ موجود ہوتا ہے اور کسی صورت میں بھی اس سے تخلف نہیں ہوتا۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم سب سے پہلے اسلامی نظریہ حیات کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں اور بعد میں اس کے بارے میں اظہار خیال کریں ورنہ ہمارا فتویٰ بغیر علم اور بغیر روشن کتاب کی ہدایات کے ہو گا۔ پھر ہماری سعی یہ ہونا چاہئے کہ ہم اللہ کے ساتھ نہایت ہی ادب و احترام سے پیش آئیں اور جو بات ہم جانتے ہیں اور جو باتیں نہیں جانتے دونوں میں احترام سے پیش آئیں۔ (اس کی ایک مثال زکوٰۃ اور ٹیکس کے درمیان فرق ہے۔ اس لئے ٹیکس کی وجہ سے

ہم زکوٰۃ کو ختم نہیں کر سکتے۔ یہ بحث بھی جلد ہی آئے گی)۔

یہ مسائل کہ جب وضو ممکن نہ ہو یا غسل ممکن نہ ہو عذر اور ضرر کی وجہ سے تو اس وقت تیمم جائز ہے۔ اس میں ہمارے لئے ایک لحہ فکریہ ہے اور وہ یہ کہ اسلامی نظام حیات کے اندر نماز کی کس قدر اہمیت ہے اور اس کی راہ میں جو رکاوٹیں اور مشکلات حائل ہوں اسلامی نظام انہیں کیسے حکیمانہ انداز میں حل کرتا ہے۔ تیمم کے اس حکم اور پھر اس کے ساتھ نماز کے بارے میں دوسرے احکام مثلاً صلوٰۃ الخوف، صلوٰۃ المریض کے احکام کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو ثابت ہو گا کہ بیٹھ کر، لیٹ کر، پہلو پر جیسے بھی ممکن ہو نماز کی ادائیگی ضروری ہے۔ اسلام اس پر بہت تاکید کرتا ہے۔ ان تمام احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام حیات مسلمانوں کی اخلاقی اور نفسیاتی تربیت میں نماز کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اس لئے کہ اللہ کے سامنے کھڑے ہونا اور اللہ سے ملاقات کرنا، انسان پر بے حد اثر انداز ہوتا ہے۔ اسلام سخت سے سخت حالات میں بھی اور نہایت ہی مشکل اوقات میں بھی اسے چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کی راہ میں کسی مشکل کو حائل ہونے نہیں دیتا۔ دن میں پانچ بار بندے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے رب سے ملے اور اس ملاقات کو کسی وجہ سے بھی نہ چھوڑے۔ یہ دل کی تازگی ہے اور آنکھوں کا سرور ہے اور اللہ کا سایہ اور خوشگوار سایہ ہے۔

---ooo---

احکام طہارت، اور اس سے پہلے دیئے جانے والے احکام کے بعد اب یہ اختتامیہ آتا ہے جس میں نعمت ایمان کے بارے میں یاد دہانی ہے۔ اور اس عہد کی تذکیر جو انہوں نے اللہ کے ساتھ باندھا تھا اور جس میں انہوں نے سمع اور اطاعت کا اقرار کیا تھا۔ یہ وہی میثاق تھا، جس کے ذریعے وہ اسلام میں داخل ہوئے تھے، جیسا کہ اس سے پہلے ہم بیان کر آئے ہیں، نیز مسلمانوں کو خدا خوفی کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان تمام باتوں کے بارے میں علم ہے، جو ان کے دلوں میں پوشیدہ ہیں۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۞

(اللہ نے تم کو جو نعمت عطا کی ہے اس کا خیال رکھو اور اس پختہ عہد و پیمان کو نہ بھولو جو اس نے تم سے لیا ہے، یعنی تمہارا یہ قول کہ "ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی" اللہ سے ڈرو، اللہ دلوں کے راز تک جانتا ہے)۔

جن لوگوں کو سب سے پہلے قرآن نے خطاب کیا تھا وہ اس دین کی قدر و قیمت کو اچھی طرح جانتے تھے جیسا کہ اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں اس لئے کہ وہ اس دین کی حقیقت اپنی ذات اور شخصیت کے اندر زندہ طور پر دیکھ رہے تھے۔ یہ دین ان کی زندگی، ان کی سوسائٹی اور ان کے اردگرد پوری بشریت میں اس کے مقام کے حوالے سے ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسمت کی طرف صرف اشارہ ہی ان کے لئے کافی تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بسہولت اس عظیم حقیقت کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے جو ان کی زندگی اور ماحول میں موجود تھی۔

اسی طرح اس میں اس میثاق کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان سے لیا تھا۔ اور یہاں اس کی طرف اس لئے اشارہ کیا گیا کہ یہ بھی ایک واضح حقیقت تھی جسے وہ جانتے تھے اور اس پر وہ بہت فخر کرتے تھے۔ اس معاہدے کا فریق اول اللہ تھا اور فریق دوئم وہ تھے اور یہ بات ان کے لئے نہایت ہی قابل قدر اور قابل عزت تھی' اور یہ بات نہایت عظیم تھی اور وہ اس کی اہمیت اور حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو خدا ترسی کے حوالے کرتے ہیں اور دل کے اندر اللہ کے خوف کا احساس کرنے اور خفیہ خطرات کے مقابلے میں ان کو بیدار کیا جاتا ہے۔

( وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ) (اللہ سے ڈرو' اللہ ان باتوں سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو) انداز تعبیر بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۵: ۷) بالتصویر اور مفہوم کو تیزی سے منتقل کرنے والی ہے۔ مناسب ہو گا کہ اس میں جو خوبصورتی' معنی خیزی اور گہرائی ہے اس کی طرف اشارہ کیا جائے۔ ذات الصدور کا مفہوم عربی میں "دلوں کی مالک" جو دلوں میں چھپاں ہو' کنایتہً مراد وہ خفیہ جذبات ہیں جو دلوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ پوشیدہ میلانات' دلوں کے خلجان' خفیہ راز ایسے راز جو دلوں کے ساتھ چسپاں ہیں۔ یہ خفیہ راز بھی اللہ کے سامنے بالکل کھلے ہیں۔ اس لئے کہ وہ دلوں میں چھپی باتوں کا بھی جاننے والا ہے۔

---ooo---

وہ عہد جو اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ سے لیا ہے' اس میں یہ بات بھی ہے کہ یہ امت پوری انسانیت کے لئے عدل و انصاف کی نگران ہو گی۔ ایسا انصاف کہ اس کے ترازو کا کوئی پلڑا دوستی اور دشمنی کی وجہ سے جھک نہ جائے۔ اس پر رشتہ داری اور خواہشات نفسانیہ کے اثرات بھی نہ ہوں اور نہ وہ کسی مصلحت سے متاثر ہو۔ یہ عدل صرف ذات باری کی رضا کے لئے ہو اور اس میں انصاف کرنے والا موثرات دنیا میں سے کسی موثر سے اثر نہ لے اور یہ انصاف اس شعور کے تحت ہو کہ اللہ رقیب اور نگہبان ہے اور خفیہ ترین گوشوں سے باخبر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کی پکار یہ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو' یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسب رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو' جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے)

اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اس بات سے روکا تھا کہ وہ کسی قوم کے ساتھ دشمنی کی وجہ سے 'کہ انہوں نے مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکا تھا' بے انصاف کرنے سے ہاتھ کھینچ لیں اور کسی کے ساتھ زیادتی نہ کربیٹھیں ضبط نفس اور رواداری کی یہ انتہا تھی جہاں تک اللہ تعالیٰ ان کو پہنچانا چاہتے تھے اور یہ اللہ کا نہایت ہی مضبوط منہاج تربیت تھا۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اس بات سے روکتے ہیں کہ وہ دشمنی کی وجہ سے عدل سے رک نہ جائیں - یہ ایک نہایت ہی اعلیٰ چوٹی ہے اور اس قدر مشکل اور دشوار گزار راہ ہے کہ اس پر چلنا نفس کے لئے نہایت ہی باعث مشقت ہے - پہلی آیت میں تھا کہ تم دشمنی کی وجہ سے ظلم نہ کرو اور یہ مرحلہ اس سے آگے کا ہے کہ دشمنی کے باوجود انصاف کرو' یعنی باوجود اس کے کہ ان کے خلاف تمہارے جذبات مشتعل ہیں اور تم کراہت محسوس کرتے ہو پھر بھی عدل کرو۔ پہلا حکم بہت ہی آسان تھا اس لئے کہ وہ منفی کام تھا' انسان اس سے رک سکتا تھا کہ ظلم نہ کرے - رہا دوسرا حکم کہ ان ظالموں کے ساتھ اور دشمنوں کے ساتھ عدل و انصاف کرو یہ ایک مثبت اور پر مشقت کام ہے - یعنی نفس انسانی کو ایسے مبغوض اور قابل نفرت لوگوں کے ساتھ انصاف کرنے پر مجبور کرنا۔

اسلام کا حکیمانہ نظام تربیت اپنے تربیت یافتہ لوگوں سے ایسا مشکل کام کروا سکتا تھا اس لئے اسلام حکم دیتا ہے -

(يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ، وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَلَّا تَعْدِلُوْا ، اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (۸:۵))

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو - کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ - عدل کرو' یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے - اور اس کے بعد وہ بات بتائی جاتی ہے جو اس مشکل کام کے لئے معین و مددگار ہے -

(وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ، اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۸:۵)) اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو' جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے) انسان کا نفس اس قدر بلندی تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا' الا یہ کہ اس کام کا معاملہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ براہ راست ہو' جس وقت انسان صرف اللہ کے لئے کھڑا ہو جائے اور اللہ کے سوا ہر چیز کو چھوڑ دے - جس وقت انسان کو خدا خوفی کا شعور ہو اور اسے یہ احساس ہو کہ اللہ کی نظروں سے کوئی خفیہ بات بھی اوجھل نہیں ہے -

دنیا کے معیاروں میں سے کوئی معیار انسانیت کو یہ رفعت اور بلندی عطا نہیں کر سکتا اور نہ اس بلندی پر کسی قوم کو ثابت قدم رکھ سکتا ہے - صرف للہیت کا جذبہ اور اللہ کے ساتھ براہ راست معاملہ کرنے کا جذبہ ہی یہ معیار دے سکتا ہے' جس میں اللہ کے سوا کوئی اور سوچ (Consideration) نہیں ہوتی اور صرف یہی للہیت ہی انسان کو اس مقام تک بلند کر سکتی ہے -

دنیا میں کوئی ایسا نظام نہیں ہے جو انسانوں کو ایسا انصاف دے سکتا ہو جس میں دوست اور دشمن برابر ہوں - یہ

صرف دین اسلام کا کام ہے جو اہل ایمان کو یہ دعوت دیتا ہے کہ انصاف کے معاملے میں محض اللہ کے لئے کھڑے ہو جائیں اور وہ انصاف کے لئے 'ماسوائے انصاف کے ہر سوچ (Consideration) ترک کر دیں۔

یہی وہ بنیادی عناصر ہیں جن کی وجہ سے اس دین کو دین انسانیت اور عالمی دین قرار دیا گیا ہے۔اس کا نظام تمام لوگوں کے لئے بالکل کافی ہے' چاہے وہ لوگ اس دین کے ماننے والے ہوں یا نہ ماننے والے ہوں۔تمام لوگ اس کے زیر سایہ عدل و انصاف کی زندگی گزار سکتے ہیں۔انصاف قائم کرنا ان لوگوں پر فرض ہے جو اس دین کے ماننے والے ہیں اور اس قیام عدل میں ان کا معاملہ اپنے رب کے ساتھ ہے'اگرچہ وہ انصاف چاہنے والوں کے ظلم و عدوان کا شکار رہے ہوں اور ان کے دل میں ان کی دشمنی ہو۔یہ اس امت کا فریضہ ہے جسے اس پوری انسانیت کا نگران بنایا گیا ہے اگرچہ اس عدل کے قیام میں اسے مشکلات پیش آئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس امت نے یہ فریضہ تاریخ میں بہت ہی اچھی طرح ادا کیا ہے۔ اس نے اس کی راہ میں عظیم مشقتیں برداشت کی ہیں'جبکہ اسلام قائم تھا اور یہ اس امت کی زندگی میں محض وعظ اور نصیحت کا کام نہ تھا۔نہ اعلیٰ نمونوں کی چند مثالیں تھیں'بلکہ یہ اس کی روز مرہ زندگی کی صورت حالات تھی۔یہ ایسی صورت حالات تھی جس کو انسانیت نے نہ کبھی پہلے دیکھا تھا اور نہ بعد میں دیکھا۔ اس معیار پر صرف اسلامی نظام زندگی ہی میں انسانیت نے یہ انصاف دیکھا۔اس کی مثالیں اور بلند ترین مثالیں اسلامی تاریخ میں لاتعداد ہیں اور تاریخ کا حصہ ہیں۔ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی ہدایات اور اس کی مقرر کردہ ڈیوٹیاں امت مسلمہ کی زندگی میں ایک واقعی اور عملی نظام کی شکل میں دیکھی گئیں جو بڑے سادہ طریقے سے ادا ہوتی رہیں۔اور اس امت کی روز مرہ کی زندگی میں وہ منقش اور مجسم تھیں۔یہ محض خیالی اعلیٰ معیاروں کی باتیں نہ تھیں' نہ کچھ انفرادی اعلیٰ نمونے تھے بلکہ وہ عملی زندگی کا ایک نقش دل پذیر تھا جس کے سوا آج تک اعلیٰ معیار کے نقوش انسان کو نظر نہ آئے۔

جب اس اعلیٰ مقام سے اور بلند ترین چوٹی سے دنیا کی جاہلیت پر نگاہ ڈالی جائے چاہے وہ جس زمان میں ہو اور جس مکان میں ہو'جن جاہلیتوں میں دور جدید کی پالش شدہ جاہلیت بھی شامل ہے تو نگاہ ڈالنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ اسے اللہ نے انسانوں کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ وہ نظام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لئے بنایا ہے۔اس مقام بلند سے نظر آتا ہے کہ اسلامی نظام حیات اور ان تمام جاہلی نظامہائے حیات کے درمیان اس قدر طویل فاصلے ہیں جنہیں عبور نہیں کیا جاسکتا۔عملی زندگی کے اعتبار سے بھی اور انسانی ضمیر اور عقائد کے اعتبار سے بھی۔

بعض اوقات لوگ اصول تو پہچان لیتے ہیں اور اصول پسندی کے نعرے بھی لگاتے ہیں لیکن اصولوں کو عملی شکل میں برتنا اصل چیز ہے۔یہ فطری بات ہے کہ لوگ اصولوں کی بات کرتے ہیں اور یہ بات وہ اور لوگوں کے لئے کرتے ہیں لیکن یہ اصول عالم عمل میں موجود نہیں ہوتے۔اصل بات یہ ہے کہ لوگوں کو اصولوں کی طرف دعوت دی جائے بلکہ دیکھنا چاہیے کہ جہاں سے دعوت آ رہی ہے'جو دعوت کا مقصد ہے اور جو داعی ہے وہ کیسا ہے' چاہیے تو یہ کہ دعوت داعی کے ضمیر اور اس کے اندرون پر حکمران ہو۔اصل بات وہ مرجع ہے جہاں سے دعوت جاری ہوتی ہے اور داعی کی جدوجہد اور داعی کی وہ محنت ہے جو وہ دعوت اور اصولوں کو عملی شکل دینے میں خرچ کرتا ہے۔

دعوت اسلامی کی اصل قدر و قیمت یہ ہے کہ چند دینی اصولوں کی طرف یہ دعوت دی جاتی ہے۔ان کی قدر و قیمت

دین اسلام کی سند سے ہوتی ہے۔ دین اسلام کی قدر و قیمت یہ ہے کہ وہ اللہ کا دین ہے اس لئے جو شخص دین کی دعوت دیتا ہے تو وہ اللہ کے سوا کسی اور کا سہارا اور سند نہیں لیتا اور اگر کسی کی مدد سے کبھی ایسا ہو بھی جائے تو اس سند کا لوگوں کے ایمان و ضمیر پر اثر کیا ہوتا ہے۔ اور لوگوں کو کیا پڑی ہے کہ وہ کسی اور کے اصولوں کو نافذ کرنے کے لئے جدوجہد کریں اور کسی اور کے پاس ہے کیا کہ وہ لوگوں کو بطور اجر دے گا۔

ہزارہا لوگ عدل کے حق میں نعرے لگاتے ہیں' پاکیزگی کے نعرے لگاتے ہیں' آزادی کے لئے نعرے لگاتے ہیں' رواداری' اولوالعزمی' محبت' قربانی اور ایثار کے نعرے لگاتے ہیں لیکن ان نعروں کے نتیجے میں لوگوں کا ضمیر اپنی جگہ سے نہیں ہلتا' اور دلوں پر ان کا اثر نہیں ہوتا' اس لئے کہ وہ ایک ایسی دعوت دے رہے ہوتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی سند نہیں ہوتی ہے۔ غرض اصل بات صرف زبانی جمع خرچ کی نہیں ہے بلکہ اصل حقیقت وہ چیز ہے جو بات کے پیچھے ہوتی ہے۔

لوگ اپنے جیسے لوگوں کے منہ سے اصول' بلند نمونے اور بلند علامات کی بات سنتے رہتے ہیں لیکن ان کی پشت پر اللہ کی جانب سے کوئی سند نہیں ہوتی۔ پس ان کی اس بات کا اثر کیا ہوتا ہے۔ ان کی فطرت یہ کہتی ہے کہ یہ ایک بات ہے جو ان جیسے لوگوں کی طرف سے ہے۔ اور یہ بات کرنے والے میں وہ تمام نقائص' عیوب اور کوتاہیاں موجود ہیں جو دوسرے لوگوں میں موجود ہوتی ہیں۔ انسان ان باتوں کو صرف اس اساس پر لیتے ہیں اس لئے ان کی فطرت پر ان باتوں کی حکمرانی نہیں ہوتی نہ یہ باتیں ان کی شخصیت کو جھنجوڑ سکتی ہیں۔ ان باتوں کے اثرات' ان لوگوں پر نہیں ہوتے' اگر کوئی اثر ہوتا بھی ہے تو وہ تار عنکبوت کی طرح کمزور ہوتا ہے۔

پھر یہ دینی اصولوں کی ہدایات اس وقت تک مکمل نہیں ہوتیں جب تک ان کو زندگی میں عملی شکل نہ دی جائے۔ اسلام ان ہدایات کو محض ہوامیں بکھیر نہیں دیتا بلکہ ان کو عملی زندگی میں نافذ کرتا ہے اس لئے کہ دین جب صرف مشورہ بن جائے اور صرف چند مراسم عبودیت کا نام رہ جائے تو پھر اس کے یہ مشورے حقیقت کا روپ اختیار نہیں کرتے۔ یہ صورت حال ہمیں آج ہر جگہ نظر آتی ہے کہ اہل دین صرف مشورے دیتے ہیں مگر ان کے پاس قوت نافذہ نہیں ہے۔

لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ دین کے لئے ایک نظام حیات ضروری ہے جو دین کے منہاج کے مطابق ہو اور اس نظام کی روشنی میں اسلامی ہدایات پر عمل کیا جائے۔ یہ نظام ان ہدایات کو زندگی کے تمام طور طریقوں میں علمی اور عملی اقدامات کے درمیان مکمل توازن کے ساتھ نافذ کر دے۔ اسلامی نقطہ نظر سے دین کا بھی مفہوم ہے۔ یعنی دین سے مراد وہ نظام زندگی ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حکمران ہو۔ اس کی پشت پر قوت نافذہ ہو۔

جماعت مسلمہ کی زندگی میں جب دین اپنے اس مفہوم کے ساتھ حقیقت کا روپ اختیار کر لے' تب ہی وہ اس دنیا میں بلندی تک پہنچ سکتی ہے اور پھر وہاں سے پوری انسانیت کا جائزہ لے سکتی ہے۔ اس انسانیت پر جو ابھی تک جدید جاہلیت کے گڑھوں میں افتادہ ہے' جس طرح نزول قرآن کے وقت عربوں کی قدیم جاہلیت کے گڑھوں میں لوگ اوندھے گرے ہوئے تھے لیکن جب دین کو منبر پر وعظ اور مساجد کے اندر چند مراسم عبودیت تک محدود کر دیا جائے اور زندگی کے وسیع عملی میدان سے اسے خارج کر دیا جائے تو اس صورت میں انسان کی عملی زندگی میں دین کی کچھ حقیقت بھی نہ ہوگی۔ نہ اسے نافذ کیا جا سکے گا' نہ اس کی عملی شکل سامنے آئے گی۔

مومنین کے لئے اللہ کی جانب سے اجر ضروری ہے۔ وہ مومنین جو معاملہ صرف اللہ کی ذات کے ساتھ کرتے ہیں تاکہ وہ مزید جوش و خروش اور پوری قوت کے ساتھ اپنی ڈیوٹی برائے نگرانی بشریت ادا کریں۔ اللہ کے ساتھ انہوں نے جو پختہ عہد کیا ہے اسے پورا کریں۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اسلام کی راہ میں کام کرنے والوں اور نیک عمل کرنے والوں اور ان لوگوں کے انجام میں فرق ہو جو اسلام سے انکار کرتے ہیں۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۹﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۰﴾

(جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ' اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کی خطاؤں سے درگزر کیا جائے گا اور انہیں بڑا اجر ملے گا اور وہ لوگ جو کفر کریں اور اللہ کی آیات کو جھٹلائیں ' تو وہ دوزخ میں جانے والے ہیں)۔

یہ وہ جزاء ہے جو ان برگزیدہ لوگوں کے لئے ہے جن سے دنیاوی لذات اور مفادات فوت ہو جاتے ہیں۔ انہیں دنیا میں عیش کوشی کا موقع نہیں ملتا۔ وہ دنیا میں اسلامی انقلاب کے فرائض سرانجام دیتے رہتے ہیں اور اس انعام کے ہوتے ہوئے دنیا میں بشریت کی نگہبانی کے فرائض بہت ہی کم نظر آتے ہیں اور انسان بشری میلانات ' انسانی حسد و عناد اور اس دنیا کے لالچ کو خاطر میں نہیں لاتا۔ پھر اس سے اللہ کی صفت عدل کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیک لوگوں اور اشرار کو ایک ہی سطح پر نہیں رکھتے۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ انقلابی مومنین کی نظریں اللہ کی اس جزاء کے ساتھ اٹکی ہوئی ہوں اور ان کا معاملہ اللہ کے ساتھ اس طرح ہو کہ ان کی راہ میں دنیا کی رکاوٹوں میں سے کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو سکے۔ زندگی کے حالات میں اور مختلف احوال میں بھی۔ بعض دل تو ایسے ہوتے ہیں کہ محض جذبۂ حصول رضائے الٰہی ان کے لئے کافی ہوتا ہے اور وہ اس کو چکھ کر خوب چٹخارے لیتے ہیں جس طرح انہیں اللہ کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کو ایفا کرنے میں خوب مزہ آتا ہے۔ لیکن اسلامی نظام ان اولوالعزم لوگوں کے علاوہ عوام الناس کو بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ عام انسانوں کا مزاج بھی اللہ کے پیش نظر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ عام لوگوں کے لئے امید مغفرت کا ہونا بھی ضروری ہے اور عوام الناس کے ساتھ اجر عظیم کا وعدہ بھی ضروری ہے۔ اسی طرح عوام الناس کو اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ وہ یہ جانیں کہ جھٹلانے والوں کا انجام و سزا کیا ہوگی اس لئے کہ عوام الناس اسی پر راضی ہوتے ہیں اور یہی ان کا مزاج ہوتا ہے۔ اس لئے عوام الناس اپنی جزا اور کفار کی سزا کا حکم سن کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اشرار کے کاموں پر ان کے دل میں جو غیض و غضب پیدا ہوتا ہے وہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ایسے مواقع پر جب اہل ایمان کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی عدل و انصاف کریں۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ ان کے ہاتھوں اہل ایمان نے مکر و فریب اور ایذاء رسانی اور نیش زنی کو برداشت کیا ہو۔ اسلامی نظام زندگی انسانیت کو اسی طرح لیتا ہے جس طرح انسانوں کی فطرت ہے اور اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتے ہیں۔ اسلام انسانوں کو ایسا نعرہ اور ایسی دعوت دیتا ہے کہ جس سے ان کے شعور کے دریچے کھلتے ہیں اور

جس پر ان کی جان اور روح لبیک کہتی ہے - پھر یہ انعام یعنی مغفرت اور اجر عظیم اللہ کی رضامندی کی دلیل ہے -
سیاق کلام میں ذرا آگے جائیں اور عدل' انصاف اور رواداری کی روح اب جماعت مسلمہ کے اندر نہایت ہی قوی پائیں - اس کے اندر زیادتی' کینہ پروری' اور یک رخی کا شعور ختم کر دیا جاتا ہے - اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو یاد دلاتے ہیں کہ ان پر اللہ کا یہ کس قدر عظیم کرم ہے کہ اللہ نے ان کے خلاف مشرکین کی تمام کاروائیاں بند کرا دیں' جبکہ حدیبیہ کے موقع پر اور دوسرے مواقع پر وہ مسلمانوں کے خلاف کوئی جارحانہ اقدام نہ کر سکے -

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١١﴾

(اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے (ابھی حال ہی میں) تم پر کیا ہے' جب کہ ایک گروہ نے تم پر دست درازی کا ارادہ کر لیا تھا مگر اللہ نے ان کے ہاتھ تم پر اٹھنے سے روک دیئے - اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو ایمان رکھنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے)-
اس آیت کے مفہوم میں اختلاف ہے لیکن راجح بات یہ ہے کہ اس سے مراد وہ واقعہ ہے' جو یوم حدیبیہ پر پیش آیا جب ایک گروہ مسلمانوں اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف غداری کر کے چاہتا تھا کہ غفلت میں ان پر حملہ کر دے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو مسلمانوں کے ہاتھوں میں قیدی بنا دیا - (تفصیلات کے لئے دیکھئے سورہ فتح)-
غرض حادثہ کیسا بھی ہو' بہرحال یہاں اعتبار اور اہمیت اس بات کی ہے جو یہاں اسلام کے نظام تربیت میں پیش نظر ہے اور وہ یہ کہ غصے اور دشمنی کو فرو کرنا چاہئے اور اس طرح دشمنوں کے خلاف اپنے دلوں میں پائے جانے والے کینے اور دشمنی کو نکالنا چاہئے تاکہ مسلمانوں کے دل مطمئن ہو جائیں اور وہ ٹھنڈے دل سے سوچیں اور یہ یقین رکھیں کہ اللہ ان کا نگہبان ہے اور ان کا محافظ ہے - اس نرمی' سنجیدگی اور اطمینان کی وجہ سے مسلمانوں کو ضبط نفس حاصل ہوتا ہے' ان کے دلوں میں رواداری پیدا ہوتی ہے اور وہ سہولت سے عدل و انصاف قائم کرتے ہیں - مسلمان اس بارے میں ندامت محسوس کریں گے اگر وہ پھر بھی اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو پورا نہ کریں' حالانکہ وہ ہر وقت ان کا نگہبان اور محافظ ہے' اور ان کی طرف بڑھنے والے ہاتھ کو پکڑ رہا ہے - دوسری جگہ آیت یہ ہے :

(اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ (۵ : ۱۱)) (جب ایک قوم نے تم پر دست درازی کا ارادہ کر لیا تھا مگر اللہ نے ان کے ہاتھ تم پر اٹھنے سے روک دیئے)-
ہاتھوں کا آگے بڑھنا اور پکڑنا اور پھر ان کا روک دیا جانا' یہ انداز تعبیر ایک زندہ اور مصور انداز تعبیر ہے اور یہ

معنوی انداز سے زیادہ موثر ہے۔اس تعبیر کے اندر تصویر اور حرکت اسکرین پر سامنے آجاتی ہے۔یہ انداز تعبیر بات کو زوردار اور وزنی بنا دیتا ہے۔یوں نظر آتا ہے کہ یہ بالکل ایک نیا اسلوب ہے جو پہلی مرتبہ استعمال ہوا ہے اور اس میں ایک محسوس صورت حال بھی نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔اور وہ متحرک صورت میں تصور کے اسکرین پر دوڑتی ہے۔ یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز بیان ہے اور اسی وجہ سے قرآن معجز ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۴۷ ایک نظر میں

سابقہ سبق کے آخر میں اس معاہدے کا تذکرہ ہوا تھا جو اللہ تعالیٰ اور مسلمانوں کے درمیاں طے پایا تھا اور یہ معاہدہ کر کے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جو عظیم احسان کیا تھا وہ انہیں یاد دلایا تھا۔ یہ اس لئے کہ وہ اس معاہدے کی رو سے ان پر عائد ہونے والی ڈیوٹیوں کو اچھی طرح ادا کریں اور اس بات سے ڈریں کہ وہ اس معاہدے کو توڑ دیں اور اس کی خلاف ورزی نہ کریں۔

اس پورے سبق میں وہ تفصیلات دی گئی ہیں جن میں اہل کتاب نے اپنے ان معاہدوں کی خلاف ورزیاں کیں جو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کئے تھے۔ یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ ان خلاف ورزیوں کے نتیجے میں انہیں اس دنیا میں جو سزائیں دی گئیں وہ کس قدر سخت تھیں۔ یہ اس لئے کہ ایک طرف تو یہ وضاحت جماعت مسلمہ کے لئے ایک تاریخی نصیحت اور عبرت کا کام کرے اور اہل کتاب کی حقیقی صورت حال کی تفصیلات ان کی آنکھوں کے سامنے آ جائیں اور دوسری جانب انہیں بتایا جائے کہ اللہ کی سنت اٹل ہوتی ہے اور وہ اپنے فیصلوں میں کسی کے ساتھ کوئی رو رعایت نہیں کرتا۔ تیسرے یہ کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اہل کتاب کی اصل حقیقت کیا ہے اور تاریخ میں ہمیشہ ان کا موقف کیا رہا ہے ' تاکہ مسلمانوں کے خلاف ان کی جانب سے کی جانے والی سازشوں کا اچھی طرح دفعیہ کیا جائے اور ان کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کو ناکام کیا جا سکے۔ یہ سازشیں وہ اپنے دینی لباس اور دینی ثابت قدمی کے رنگ میں کرتے تھے حالانکہ وہ ہمیشہ ان معاہدوں کو توڑتے رہے تھے۔

اس سبق میں اللہ کے اس معاہدے کا جائزہ بھی لیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کے ساتھ اس وقت کیا تھا' جب اس کو مصر کی محکومانہ اور رسواکن زندگی سے نجات دی گئی تھی۔ اس میثاق کو بھی بنی اسرائیل نے توڑ دیا تھا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس عہد شکنی کے نتیجے میں ان پر کیا گزری۔ خدا کی لعنت کے ساتھ انہیں جلاوطن کر دیا گیا اور ہدایت اور انعام سے محروم کر کے انہیں راندۂ درگاہ قرار دیا گیا۔ پھر اس معاہدے کا جائزہ بھی لیا گیا ہے جو ان لوگوں سے کیا گیا تھا' جنہوں نے کہا تھا کہ وہ نصاریٰ ہیں۔ انہوں نے اس معاہدے کو توڑا اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان نفرت اور عداوت پیدا کر دی اور اعلان کر دیا گیا کہ یہ عداوت تاقیامت بحال رہے گی۔ پھر بنی اسرائیل کا موقف ' ارض مقدس کے حوالے سے بھی ایکسرے ہوا ہے جس میں انہوں نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اس پر حملہ آور ہوں گے۔ انہوں نے اس عہد کو توڑا اور الٹے پاؤں پھر گئے۔ محض بزدلی کی وجہ سے انہوں نے اللہ کے ساتھ بدعہدی کی اور معاہدے کی ذمہ داریاں ادا نہ کیں۔ انہوں نے حضرت موسیٰ سے صاف صاف کہہ دیا کہ آپ جائیں ' آپ اور آپ کا خدا دونوں لڑیں' ہم تو یہیں بیٹھتے ہیں۔

اہل کتاب کے ان معاہدوں اور مواقف کے جائزے کے بیچ میں ' یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان عہد شکنیوں کے نتیجے میں اہل کتاب کے اندر کس قدر فکری انحراف پیدا ہو گیا تھا۔ ان معاہدوں میں یہ طے ہوا تھا کہ وہ صرف ایک اللہ کو تسلیم کریں گے اور اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کریں گے۔ اس کے بدلے اللہ نے ان کو انعامات و اکرامات سے نوازنا تھا اور یہ وعدہ کیا تھا کہ تمہیں اس سرزمین کا اقتدار اعلیٰ دیا جائے گا لیکن انہوں نے خدا کی نافرمانی کر کے اپنے آپ کو ان تمام چیزوں سے محروم کر لیا۔ چنانچہ وہ اللہ کی جانب سے ملعون ہو کر اور فرقہ پرستی میں پڑ کر جلاوطنی کی زندگی بسر کرتے رہے۔

ان تبصروں کے بعد از سر نو ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ہدایت کو قبول کر لیں۔ یہ ہدایت جو نہایت ہی اہم ہے ' جسے اس آخری رسالت نے پیش کیا ہے اور جسے نبی آخر الزمان خاتم النبیین نے پیش کیا ہے اور جس کی وجہ سے انسانوں پر حجت تمام ہو گئی کہ وہ یہ کہہ سکیں کہ ایک طویل عرصہ گزر گیا ہے اور کوئی نبی نہیں آیا اور آخری نبی گزرنے کے بعد طویل عرصہ گزر گیا ہے۔ اس لئے وہ ہدایت بھول گئے اور اب ان پر مواخذہ کیا ہو گا۔ لو حضرت محمد ؐ بشیر و نذیر بن کر آگئے ہیں ' اب کیا بہانہ ہے بتاؤ؟

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ بھی از خود بر آمد ہوتا ہے کہ دین اسلام ' اپنی اساس کے اعتبار سے ایک ہے۔ اللہ کا اپنے تمام بندوں کے ساتھ عہد و میثاق بھی ایک ہے کہ وہ ایمان لائیں ' اللہ کو وحدہ لا شریک سمجھیں ' زکوٰۃ ادا کریں اور اللہ نے ان کو جو رزق دیا ہے ' اس میں سے اللہ کے لئے خرچ کریں۔ یہ ایک ایسا میثاق ہے جو صحیح نظریات کو متعین کر دیتا ہے ' جو صحیح عبادات کو متعین کر دیتا ہے اور اسلام کے اجتماعی نظام کی بنیادوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس مختصر جائزے کے بعد اب ذرا آیات پر تفصیلی بحث کرتے ہیں۔

---○○○---

# درس نمبر ۴۷ تشریح آیات

# ۱۲ --- تا --- ۲۶

وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ
وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا ۖ وَقَالَ اللَّهُ إِنِّي مَعَكُمْ ۖ لَئِنْ أَقَمْتُمُ
الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَآمَنْتُمْ بِرُسُلِي وَعَزَّرْتُمُوهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ
اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي
مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ
السَّبِيلِ ﴿۱۲﴾ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً ۖ
يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ ۙ وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۚ وَلَا تَزَالُ
تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۚ إِنَّ
اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۳﴾ وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ
فَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ
يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللَّهُ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ﴿۱۴﴾

(اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان میں بارہ نقیب مقرر کیے تھے اور ان سے کہا تھا کہ "میں تمہارے ساتھ ہوں' اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقین رکھو کہ میں تمہاری برائیاں تم سے زائل کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی' مگر اس کے بعد جس نے تم میں سے کفر کی روش اختیار کی تو درحقیقت اس نے سواء السبیل گم کر دی۔" پھر یہ ان کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اور ان کے دل سخت کر دیئے۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ الفاظ کا الٹ پھیر کر کے بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں جو تعلیم انہیں دی گئی تھی اس کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں اور آئے دن تمہیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ ان میں سے بہت کم لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں (پس جب یہ اس حال کو پہنچ چکے ہیں تو جو شرارتیں بھی یہ کریں وہ ان سے عین متوقع ہیں) لہٰذا انہیں معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو۔ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کی روش رکھتے ہیں۔

اسی طرح ہم نے ان لوگوں سے بھی پختہ عہد لیا تھا' جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں' مگر ان کو بھی جو سبق یاد کرایا گیا تھا اس کا ایک بڑا حصہ انہوں نے فراموش کر دیا' آخر کار ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے دشمنی اور آپس کے بغض و عناد کا بیج بو دیا اور ضرور ایک وقت آئے گا جب اللہ انہیں بتائے گا کہ وہ دنیا میں کیا بناتے رہے ہیں)

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا وہ دو فریقوں کے درمیان معاہدہ تھا۔ اس معاہدے کی عبارت شرط اور جزائے شرط کے انداز میں تھی۔ قرآن کریم نے اس معاہدے کی شرط اور جزاء کو بعینہٖ نقل کیا ہے۔ یہ اصل عبارت عہد کے حالات اور واقعہ عقد کے ذکر کے بعد دی گئی ہے۔ یہ عہد اللہ تعالیٰ اور بنی اسرائیل کے ۱۲ نمائندوں کے درمیان ہوا تھا۔ یہ نمائندے بنی اسرائیل کے ۱۲ قبائل کے نمائندے تھے۔ یہ ۱۲ قبائل حضرت یعقوب علیہ السلام (جن کا نام اسرائیل تھا) کے پوتے اور ان کی اولاد تھے۔ ان نمائندوں کی تعداد ۱۲ تھی اور اس معاہدے کی عبارت یہ تھی:

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ

(۵ : ۱۲) اور ان سے کہا تھا کہ "میں تمہارے ساتھ ہوں' اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقین رکھو کہ میں تمہاری برائیاں تم سے زائل کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی' مگر اس کے بعد جس نے تم میں سے کفر کی روش اختیار کی تو درحقیقت اس نے سواء السبیل گم کر دی۔"

( اِنِّیْ مَعَکُمْ ) میں تمہارے ساتھ ہوں' کس قدر عظیم عہد ہے۔جس کی حمایت میں اللہ ہو' اس کے خلاف کون ہو سکتا ہے۔اور جو چیز بھی اس کے خلاف ہو' نہ اس کی کوئی حقیقت ہو گی' نہ اثر ہو گا اور جس کے ساتھ اللہ ہو گا تو وہ ہرگز راستہ نہ بھولے گا' اس لئے کہ اللہ جس کا ساتھی ہو وہ ہدایت پر ہی ہو گا۔پھر اللہ اس کے لئے کافی بھی ہو گا۔ جس کے ساتھ اللہ ہو تو نہ وہ پریشان ہو گا اور نہ نامراد ہو گا کیونکہ اللہ کے ساتھ اس کی نزدیکی اور قرب اسے مطمئن کر دیتا ہے اور اسے کامیاب کر دیتا ہے۔غرض جو اللہ کا ساتھی ہوا اور جس کا ساتھی اللہ ہوا تو اس کا ضامن اللہ ہوتا ہے۔ وہ مراد کو پہنچ جاتا ہے۔اس مقام بلند پر اسے مزید کسی چیز کی ضرورت یا طلب نہیں رہتی۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی رفاقت کا یہ اعلان محض گپ اور مزاح میں نہیں کیا یا ان کے ساتھ کسی خاص دوستی کی وجہ سے نہیں کیا اور نہ یہ ان کی کوئی ذاتی بزرگی کا استحقاق ہے کہ جس کے نہ کوئی اسباب ہیں اور نہ اس کے لئے کچھ شرائط و قیود ہیں۔بلکہ یہ رفاقت ایک باقاعدہ معاہدے کے تحت طے پائی ہے۔یہ شرط و جزاء پر مبنی ہے۔

وہ شرط یہ ہے کہ وہ نماز قائم کریں گے۔صرف نماز کی ادائیگی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا قیام اس طرح ضروری ہے کہ اس کے پورے اصول اس کے اندر قائم ہو جائیں اور وہ اللہ اور اس کے بندے کے درمیان پورا رابطہ ہو۔نماز ان کے لئے ایک تہذیبی' تربیتی عنصر ہو' اللہ تعالیٰ کے سیدھے نظام تربیت اور نظام حیات کے مطابق۔اس طرح کہ یہ نماز انہیں تمام فحاشیوں سے روکتی ہو' تمام برائیوں سے منع کرتی ہو اور نماز کو اس بات سے حیا آتی ہو کہ وہ فحاشی اور ناپسندیدہ افعال کے ذخیرے کے ساتھ اللہ کے دربار میں حاضر رہے' منکرات لئے ہوئے۔

اللہ نے انہیں جو رزق اور دولت دی ہے اس کا حق نعمت ادا کرتے ہوئے وہ زکوٰۃ کی ادائیگی باقاعدگی کے ساتھ کرتا ہو اور یہ خیال کرتا ہو کہ اصل مالک اللہ ہے اور وہ اس مال کے تصرف میں اللہ کی پیروی کر رہا ہے۔اس لئے کہ اللہ اصل مالک ہے اور اللہ کے مال میں لوگ بطور وکلاء اور ایجنٹ تصرفات کرتے ہیں۔پھر زکوٰۃ کی ادائیگی اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ اسلامی معاشرے کی اجتماعی ضروریات کو اس کے ذریعے پورا کیا جا سکے۔نیز اسلامی نظام معیشت کے اس زرین اصول کو بروئے کار لایا جا سکے کہ دولت صرف مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتی رہے بلکہ معاشی زندگی کو اجتماعی کفالتی نظام کے اصول پر قائم کیا جائے۔نیز دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں نہ ہو' جس کی وجہ سے عام معاشرے میں کساد بازاری پیدا ہوتی ہے اور لوگوں کی قوت خرید ختم ہو جاتی ہے۔اور جس کا آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرے کے اندر پیداواری عمل معطل ہو جاتا ہے یا کم از کم بہت ہی سست پڑ جاتا ہے۔اس کا واضح نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک قلیل تعداد عیاشی کرتی ہے اور عوام کی کثیر تعداد مفلوک الحال رہتی ہے اور غربت کی زندگی بسر کرتی ہے' جس کے نتیجے میں معاشرتی بگاڑ اور فساد پیدا ہوتا ہے اور یہ بگاڑ مختلف رنگوں میں ظاہر ہوتا ہے۔یہ تمام فساد ادائیگی زکوٰۃ سے رکتا ہے اور اس فساد کو دفع کرنے میں اسلامی نظام کا تقسیم دولت کا نظام بہت بڑا کام کرتا ہے اور اسلام اپنا اقتصادی کردار ادا کرتا ہے۔

اللہ کے رسولوں پر ایمان' تمام رسولوں پر بغیر کسی تفرقہ اور جدائی کے کہ یہ سب اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور سب کے سب اللہ کا دین لے کر آئے ہیں اور ان میں سے کسی بھی ایک کا انکار مستلزم کفر ہے۔کیونکہ یہ اس ذات کا انکار ہے جس نے ان سب کو بھیجا ہے۔

یہ عہد صرف ایمان اور مجرد عقیدہ ہی نہ ہو بلکہ ایک مثبت اقرار ہو اور اس کے ساتھ عملاً رسولوں کی نصرت ہو۔ان

فرائض میں ان کے ساتھ مدد اور تعاون بھی ہو جو فرائض ان پر اللہ نے عائد کئے ہیں اور جن کو بروئے کار لانے کے لئے ان رسولوں نے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیا ہے۔ اللہ کے دین پر ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ دین کو قائم کرنا چاہتے ہیں ہر مومن اٹھے اور ان کی بھرپور امداد کرے۔ اس دین کو اس کرۂ ارض کی کسی سرزمین پر قائم کر دے اور یہ دین لوگوں کی زندگیوں میں ایک حقیقت بن کر اٹھے۔ اس لئے کہ اللہ کا دین محض اعتقادی تصورات کا نام نہیں ہے' نہ یہ دین صرف مراسم عبادت کا نام ہے بلکہ یہ زندگی کا ایک واقعی اور عملی نظام ہے۔ یہ ایک متعین نظام ہے جو زندگی کے تمام امور میں تصرف اور عمل کرتا ہے۔ اور جو نظام بھی ہو اور جو منہاج بھی ہو وہ نصرت اور امداد اور تعاون کا محتاج ہوتا ہے۔ اسے قوت کی فراہمی ضروری ہوتی ہے۔ اس کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے تاکہ وہ قائم ہو' اس کی حمایت ہو اور اسے بچایا جائے۔ اگر ایسی صورت حال نہ ہو تو مومن نے' یہ سمجھا جائے گا' کہ اپنے کیے ہوئے عہد کا ایفا نہیں کیا ہے۔

زکوٰۃ کے بعد اب عام انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس نے یہ عام انفاق فرض کیا ہے لیکن یہ قرض ہے۔ حالانکہ اللہ خود تمام دولت کا مالک ہے اور وہی داتا ہے۔ لیکن یہ اس کا فضل و کرم ہے کہ وہ اپنی دی ہوئی چیز کو اپنے لئے بطور قرض مانگتا ہے۔ یہ تمام امور تو شرط تھے۔ اب اس شرط کی جزاء کیا ہے؟

پہلی جزاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے۔ انسان سے خطا کا صدور خواہ مخواہ ہوتا ہے اور وہ برائی پر مائل ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ بہت ہی نیکوکار ہو۔ اس کی خطاؤں کو معاف کرنا بھی اس کے لئے ایک بہت ہی بڑا انعام ہے۔ اور اللہ کی وسیع رحمت کی وجہ سے اس کے ضعف' اس کی کمزوری اور اس کے عجز و قصور کا تدارک ہوتا ہے۔

پھر اس کی جزاء میں ایسے باغات آتے ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں اور یہ اللہ کا خالص فضل و کرم ہے۔ کوئی انسان اللہ کے اس درجہ فضل و کرم تک محض اپنے عمل کے بل بوتے پر نہیں پہنچ سکتا۔ یہ محض اللہ کا فضل ہے جو کسی انسان کو اس مقام تک پہنچا سکتا ہے اور یہ مقام اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان اس کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ جہاں تک اس کا بس چلے اور جس قدر اس کی وسعت میں ہو۔

اور اس عہد و میثاق میں ایک جزئی شرط یہ بھی تھی۔ (فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (۵: ۱۲) "مگر اس کے بعد تم میں سے جس نے کفر کی روش اختیار کی تو درحقیقت اس نے سواء السبیل گم کر دی۔" اس لئے اب اس کے لئے کوئی ہدایت نہ ہوگی اور نہ وہ گمراہی سے واپس ہو گا۔ جب اس کے لئے ہدایت واضح ہو اور اس کے ساتھ معاہدہ ہو جائے اور راستہ واضح ہو جائے اور اس پر چلنے کی جزاء بھی متعین ہو جائے تو اب اس کی خلاف ورزی لازماً گمراہی ہے۔

یہ تھا اللہ تعالیٰ کا معاہدہ بنی اسرائیل کے نمائندوں کے ساتھ اور یہ لوگ پوری قوم بنی اسرائیل کے نمائندے تھے۔ وہ سب ان کی نمائندگی پر راضی تھے۔ اس طرح یہ میثاق گویا بنی اسرائیل کے ہر فرد کے ساتھ ہو گیا۔ اس جماعت اور امت کے ساتھ بھی ہو گیا جو بنی اسرائیل پر مشتمل تھی لیکن ملاحظہ فرمائیں کہ بنی اسرائیل نے اس عہد کے ساتھ کیا کیا۔

انہوں نے اپنے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے اس عہد کو کھلے بندوں توڑ دیا۔ انہوں نے اپنے نبیوں کو ناجائز طور پر قتل کیا۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل اور سزائے موت دلوانے کی سازش کی حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان

کے انبیاء میں سے آخری نبی تھے ۔ انہوں نے اپنی کتاب توراۃ میں تحریف کی ۔ انہوں نے اپنی شریعتوں کو بھلا دیا اور کسی بھی شریعت کو نافذ نہ کیا ۔ انہوں نے نبی آخر الزماں حضرت محمد ؐ کی بابت نہایت ہی مکارانہ ' معاندانہ اور غیر شریفانہ موقف اختیار کیا ۔ انہوں نے رسول اللہ ؐ کے ساتھ خیانت کی اور حضور ؐ کے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں کی خلاف ورزی کی اس لئے وہ اللہ کی ہدایت سے نکل گئے ۔ ان کے دل سخت ہوگئے اور وہ اس قابل ہی نہ رہے کہ وہ ہدایت قبول کر سکیں ۔

(فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ (۵ : ۱۳))

(پھر یہ ان کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اور ان کے دل سخت کر دیئے ۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ الفاظ کا الٹ پھیر کر کے بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں جو تعلیم انہیں دی گئی تھی اس کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں)۔

اللہ کا فرمان کس قدر سچا ہے ۔ آج بھی یہودیوں کی خصوصیات یہی ہیں ۔ یہ وہ لعنت ہے جو ان کے ماتھے سے ہر وقت عیاں ہے ۔ اس سے ان کی اصل فطرت اور جبلت ظاہر ہوتی ہے ۔ جس پر خدا کی لعنت ہے وہ درگاہ ہدایت سے راندہ ہے ۔ ان کے خدوخال میں بدبختی چمکتی ہے ۔ ان کے چہرے پر اللہ کی رحمت کا نشان نہیں ہوتا ہے ۔ ان کے معاملات انسانی جذبات سے خالی ہوتے ہیں ' اگرچہ وہ مکاری سے یا خوف کی وجہ سے زبردستی اپنے چہروں پر مسکراہٹ لائیں اور بات میں نرمی پیدا کریں اور باہم ملاقات میں نہایت شرافت سے کام لیں ۔ اس لئے کہ چہرے مہرے کی سختی اور خدوخال میں خشکی اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ اس شخص کا دل خشک اور اس کا مزاج کرخت ہے ۔ اس کے علاوہ ان کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ وہ بات کو اپنی جگہ سے ہٹاتے ہیں ۔ انہوں نے پہلے اپنی کتاب تورات میں تحریف کی اور اس کی وہ شکل بگاڑ دی جس پر وہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی تھی ۔ یہ تحریف یا تو اس طرح کی گئی کہ انہوں نے اس کتاب میں اپنی مرضی کی چیزوں کا اضافہ کر دیا اور یہ ظاہر کیا کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے اور یا یہ تحریف اس طرح ہوئی کہ آیات تو اصلی ہی باقی رہیں لیکن انہوں نے ان کا مفہوم اپنی مرضی کے ساتھ بدل دیا اور اپنے گھٹیا مقاصد کے حصول کے لئے ان آیات کے مفہوم کے اندر زبردست تبدیلی کر دی اور اس طرح انہوں نے اللہ پر افتراء باندھا ۔ یا تحریف اس طرح کی کہ انہوں نے اللہ کے احکام کو بھلا دیا ' اسلامی نظام حیات اور شریعت کو موقوف کر دیا اور اپنی زندگیوں میں شریعت پر عمل کرنا بند کر دیا ۔ اپنے معاشرے کو آزاد کر دیا اس لئے کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے بعد ان کو اللہ کے اس پاک و صاف اور سیدھے دین کے مطابق سیدھا طرز عمل اختیار کرنا پڑتا تھا ' جس کے وہ عادی نہ تھے ۔

(وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ (۵ : ۱۳)) (اور آئے دن تمہیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کا پتہ چلتا رہتا ہے ان میں سے بہت کم لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں)

یہ حضور اکرم ؐ کو خطاب ہے ۔ آپ ؐ کو بتایا جاتا ہے کہ مدینہ کے اسلامی معاشرے میں یہودیوں کے حالات کیا

ہیں - وہ ہمیشہ خائن رہیں گے اور نبی ﷺ کے ساتھ خیانت سے کبھی بھی باز نہ آئیں گے - وہ بارہا عملاً خیانت کا ارتکاب کرتے رہے - جب تک وہ مدینہ میں رہے وہ آئے دن کچھ نہ کچھ کرتے رہے - اس کے بعد وہ جزیرۃ العرب میں جب تک رہے ان کی سازشیں جاری رہیں - اور اس کے بعد پوری تاریخ میں اسلامی معاشرہ کے ساتھ یہودی اسی خیانت پر گامزن رہے حالانکہ اسلامی معاشرہ وہ واحد معاشرہ تھا جس نے ان کو پناہ دی - اور ان کو دوسروں کے مظالم سے نجات دی' ان کے ساتھ حسن سلوک کیا اور اسلامی معاشرے میں وہ ہمیشہ خوشحالی کی زندگی گزارتے رہے - لیکن انہوں نے ہمیشہ بعینہٖ انہی خطوط پر جن پر وہ حضرت محمد ﷺ کے ساتھ معاملے کرتے رہے' وہی معاملہ اسلامی معاشرے کے ساتھ کیا - بچھوؤں' سانپوں' بھیڑیوں اور گیدڑوں کی طرح وہ مسلمانوں کے خلاف سازش اور ان کے ساتھ خیانت کرتے رہے اور آج بھی وہ اسی مکاری و فریب کاری میں مصروف ہیں - جب بھی کبھی انہیں قوت نصیب ہوئی انہوں نے مسلمانوں سے سخت انتقام لیا - ان کے لئے پھندے رکھے' اور ان کے خلاف سازشیں کیں' اور مسلمانوں کے ہر دشمن کے وہ دوست بن گئے - جہاں بھی انہیں فرصت ملی اور موقعہ ملا انہوں نے مسلمانوں پر وار کیا - نہایت سنگدل اور نہایت ہی بے رحم واقع ہوئے ہیں وہ مسلمانوں کے حوالے سے - کبھی بھی انہوں نے مسلمانوں پر رحم نہ کیا اور مسلمانوں کے بارے میں انہوں نے ہمیشہ اپنے عہد اور ذمہ داری کو بھلا دیا - ان کی اکثریت ایسی ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ان کے بارے میں کہا ہے - اور جس طرح ان کی اس جبلت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ عہد شکن رہے ہیں اور قدیم الایام سے ان کا یہ وطیرہ ہے -

انداز بیان ایسا ہے کہ حضور کو خطاب کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ آپ ان کو ایسا پائیں گے - مدینہ کے حوالے سے - (وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ (۵: ۱۳)) "آپ ہمیشہ ان میں سے خائن لوگوں پر مطلع ہوتے رہیں گے الا یہ کہ ان میں سے کم لوگ ایسے نہ ہوں گے -"

ان کے افعال خیانت کارانہ ہوں گے' ان کی نیت میں فتور ہو گا' ان کی بات مکارانہ ہو گی اور ان کی نظر بھی خائن ہو گی - یہاں آیت میں موصوف کو حذف کر کے اس کی جگہ صفت کو رکھ دیا یعنی (خائنہ) اور اس سے اس کے مفہوم میں عمومیت پیدا ہو گئی - مجرد خیانت' خیانت سے بھرپور فضاء اور خیانت کا سایہ ان پر ہر وقت چھایا ہوا ہو گا - ان کی جبلت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ خائن ہیں - یہ ان کے موقف کا جوہر ہے اور رسول اللہ اور جماعت مسلمہ کے ساتھ ان کا یہی برتاؤ رہا ہے - خائن ... خائن ... خائن -

یہ قرآن اس امت کا معلم' مرشد' راہنما اور زندگی کی راہوں کے نشیب و فراز میں اس کا حدی خواں ہے - وہ امت کو اس کے دشمنوں کے حالات بتاتا ہے اور دشمنوں کے مزاج اور ان کی تاریخ بھی امت کے سامنے رکھتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اسلامی ہدایات بھی دیتا ہے - اگر یہ امت اپنے قرآن سے مشورہ کرتی رہے' قرآن کی ہدایات پر کان دھرے اور اپنی زندگی میں قرآنی اصولوں اور قوانین کو عملاً نافذ کرے تو اس کے دشمن کبھی بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں - لیکن جب امت مسلمہ نے خود اپنے اس عہد کو توڑ دیا جو اس نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا اور جب اس نے قرآن کریم کو پس پشت ڈال دیا تو اسے اس صورت حال سے دوچار ہونا پڑا جس میں وہ بالفعل ہے' اگرچہ یہ امت قرآن کریم کو نہایت ہی ترنم اور وجد انگیز انداز میں پڑھتی ہے - اس سے تعویذ اور گنڈے بھی بناتی ہے اور اسے دم اور جھاڑ کے لئے

استعمال بھی کرتی ہے۔

بنی اسرائیل پر جو گزری اس کی پوری داستان اللہ تعالیٰ نے امت کو سنائی۔ کس طرح وہ ملعون ہوئے، راندہ درگاہ ہوئے، سنگ دل بن گئے اور انہوں نے کتاب اللہ میں کیا کیا تحریفیں کیں، انہوں نے اللہ کے ساتھ اپنے عہد و پیمان توڑے۔ یہ سب داستان اس لئے بیان ہوئی کہ یہ امت اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کو نہ توڑے تاکہ اس کا انجام بھی وہ نہ ہو جائے جو اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کے ہر توڑنے والے کا ہوتا ہے۔ ہر اس شخص کا ہوتا ہے جو اپنی بات سے پھر جاتا ہے۔ لیکن جب ان قرآنی تنبیہات سے امت مسلمہ نے غفلت برتی اور صحیح راستے کو چھوڑ کر غلط راستے پر پڑ گئی تو اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ سے انسانیت کی قیادت کا مقام منصب ضبط کر لیا اور قافلہ انسانیت میں یہ امت پیچھے چلنے والوں کی صف میں چلی گئی۔

جب تک یہ امت اپنے رب کی طرف رجوع نہ کرے گی، جب تک یہ اپنے عہد و پیمان پر پختگی سے قائم نہ ہو گی، اور جب تک معاہدے کی شرائط کو پورا نہ کرے گی، اس وقت تک اللہ کا وعدہ ان کے حق میں معطل رہے گا۔ اگر وہ شرائط پوری کر دے تو اللہ تعالیٰ از سرنو اس امت کو تمکن فی الارض عطا کرے گا۔ وہ پوری انسانیت کی قائد ہو جائے گی اور تب وہ لوگوں پر شاہد حق ہو گی۔ اگر وہ یہ شرائط پوری نہ کرے گی تو وہ قافلہ انسانیت میں پیچھے چلنے والوں ہی میں رہے گی۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کے خلاف کبھی نہیں کرتا۔ اس وقت جب یہ آیات نازل ہوئیں اللہ کی جانب سے اس کے نبی کے لئے درج ذیل ہدایات تھیں :

(فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۵:۱۳)) (پس جب یہ اس حال کو پہنچ چکے ہیں تو جو شرارتیں بھی یہ کریں وہ ان سے عین متوقع ہیں) لہٰذا انہیں معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو۔ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کی روش رکھتے ہیں یعنی آپ ان لوگوں کے ان تمام برے افعال کو معاف کر دیں۔ یہ طریقہ احسان ہے۔ وہ جو خیانتیں کرتے ہیں ان سے بھی صرف نظر کریں اور یہ بھی احسان ہے۔

یہ تو اس وقت کی بات تھی جب یہ سورت نازل ہو رہی تھی، بعد کے ادوار میں حالات ایسے ہو گئے کہ عفو و درگزر کی گنجائش ہی انہوں نے نہ چھوڑی اور نبی ﷺ نے ان کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا اور اس کے بعد خلافت راشدہ کے دور میں ان کو پورے جزیرۃ العرب سے جلاوطن کر دیا گیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کو یہ بتاتے ہیں کہ عیسائیوں سے بھی اس نے عہد لیا تھا۔ انہوں نے بھی اس عہد کو توڑ دیا۔ اور نتیجۃً ان کو بھی اس نقض عہد کی سزا بھگتنی پڑی۔

(وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۵:۱۴)) (اسی طرح ہم نے ان لوگوں سے بھی پختہ عہد لیا تھا، جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں،

مگر ان کو بھی جو سبق یاد کرایا گیا تھا اس کا ایک بڑا حصہ انہوں نے فراموش کر دیا' آخر کار ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے دشمنی اور آپس کے بغض و عناد کا بیج بو دیا اور ضرور ایک وقت آئے گا جب اللہ انہیں بتائے گا کہ وہ دنیا میں کیا بناتے رہے ہیں)

یہاں ایک خاص انداز تعبیر ہے اور اس کے اندر ایک خاص اشارہ ہے۔ (وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى (۵: ۱۴)) "اس طرح ان لوگوں سے بھی عہد لیا تھا جنہوں نے کہا ہم نصاریٰ ہیں۔"

اس انداز کے اندر اشارہ یہ ہے کہ انہوں نے نصاریٰ ہونے کا دعویٰ تو کیا تھا' لیکن عملاً انہوں نے اس عہد کو پورا نہ کیا تھا۔ اس عہد و پیماں کی اساس یہ تھی کہ ہم اللہ کو صرف وحدہ لاشریک سمجھیں گے۔ لیکن انہوں نے اپنی گمراہی کا آغاز ہی اپنے اساسی عقیدہ توحید سے کیا۔ اس لائن پر وہ آگے بڑھ گئے اور یہی وہ سبق (حظ) تھا جو انہوں نے بھلا دیا حالانکہ یہ سبق انہیں اچھی طرح یاد کرایا گیا تھا۔ اور اس سبق کو بھلانے کے نتیجے میں وہ غلط راہ پر دور نکل گئے اور ان کے درمیاں فرقہ وارانہ اور گروہی اختلافات پیدا ہوئے اور پھر ان کے اندر بہت سے مذاہب اور مکاتب فکر پیدا ہو گئے۔ یہ مکاتب فکر اس قدر بڑھے کہ آج ان کا شمار ممکن نہیں ہے۔ قدیم زمانے میں بھی ان کے بے شمار فرقے تھے اور جدید دور میں بھی ان کے بے شمار فرقے ہیں۔ (اجمالی بحث عنقریب آئے گی) ان فرقوں کے درمیان اس قدر بغض و عداوت پیدا ہو گیا جس کی کوئی مثال تاریخ مذاہب میں نہیں ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ اختلافات قیامت تک رہیں گے اور اس لئے رہیں گے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے ہوئے اپنے عہد کا کوئی پاس نہ رکھا۔ انہوں نے اس سبق اور نظریہ حیات ہی کو بھلا دیا جو انہیں اچھی طرح یاد کرایا گیا تھا۔ آخرت میں جب ان کو اللہ وہ تفصیلات بتائے گا کہ اس دنیا میں وہ کیا کیا بناتے رہے ہیں تب ان کی جزاء کا وہاں ہی فیصلہ ہو گا۔ اس وقت اللہ کو ان کی تمام صنعت کاریوں کو ان کے سامنے رکھ کر ان کو خوب شرمندہ کرے گا اور پھر سزا دے گا۔

جو لوگ نصاریٰ (مددگار) ہونے کا دعویٰ کرتے تھے ان کے درمیان اس قدر اختلافات' تفرقہ بازی اور بغض و عداوت پیدا ہوئی جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ان کی تاریخ قدیم میں بھی اور جدید تاریخ میں بھی' جس کی حکایت اللہ تعالیٰ یہاں اپنی کتاب کریم میں فرماتے ہیں۔ ان فرقہ وارانہ جنگوں میں اس قدر خون بہا کہ اس قدر خونریزی ان کی ان تمام تاریخی جنگوں میں نہ ہوئی جو انہوں نے اپنی پوری تاریخ میں لڑیں۔ چاہے دینی عقائد سے پیدا ہونے والے اختلافات کے نتیجے میں یہ خونریزی ہوئی یا دینی سربراہی کے حصول کے لئے ہوئی یا سیاسی' اقتصادی اور اجتماعی اختلافات کے نتیجے میں ہوئی۔ یہ خونریز آویزش اس قدر طویل اور اس قدر گہری تھی کہ اس کے آثار صدیوں تک باقی رہے اور وہ زخم صدیوں بعد بھی مندمل نہ ہوئے اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو اصدق القائلین ہیں۔ یہ اختلافات قیامت تک رہیں گے اور ان کا سبب حقیقی صرف یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے اپنے عہد کو پس پشت ڈال دیا اور انہوں نے اس نظریاتی سبق کو بالکل بھلا دیا جو انہیں اچھی طرح یاد کرایا گیا تھا۔ اس عہد و پیمان کی پہلی دفعہ یہ تھی کہ وہ عقیدۂ توحید پر قائم رہیں گے' جس سے انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے اٹھنے کے بہت تھوڑے عرصے بعد ہی انحراف کر لیا تھا اور اس کے اسباب اور واقعات کی تفصیلات یہاں پیش کرنا مشکل ہے۔

(تفصیلات کے لئے دیکھئے محاضرات فی النصرانیہ ' ابوزہرہ اور فی ظلال القرآن پارۂ سوئم)

---ooo---

یہودیوں اور عیسائیوں کی جانب سے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد وپیمان کی خلاف ورزی اور اس پر کئے جانے والے تبصروں کا بیان یہاں تک پہنچ کر اب خطاب یہود و نصاریٰ دونوں سے ہے۔ دونوں کے سامنے اب حضرت محمدؐ کی رسالت کا اعلان کیا جاتا ہے کہ یہ رسالت تمہارے لئے بھیجی گئی ہے۔ جس طرح یہ رسالت امی عرب اقوام اور تمام جہان کے لئے ہے۔ دنیا کے سب لوگ اس رسالت اور دعوت کے مخاطب ہیں۔ سب کو اللہ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس آخری رسول پر ایمان لائیں۔ یہ بات اللہ کی جانب سے یہود و نصاریٰ دونوں کے ساتھ کئے ہوئے عہد وپیمان کی ایک دفعہ ہے' جیسا کہ ہم اس کی تفصیلات پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس نبی آخر الزماں نے بعض ایسی باتوں کے انکشافات بھی کئے ہیں جنہیں وہ چھپاتے تھے' حالانکہ وہ منکشف کردہ امور ان کے ہاں موجود کتابوں میں موجود تھے۔ انہوں نے ان باتوں کو نہایت ہی حفاظت میں خفیہ رکھا' جو ان کی جانب سے وعدہ خلافی تھی۔ کئی ایسی اور باتیں بھی تھیں کہ رسول خداؐ نے عفو و درگزر کرتے ہوئے ان کا انکشاف نہ کیا' اس لئے کہ اسلام کے جدید قانونی نظام میں ان کے بارے میں انکشافات کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کی بعض گمراہیوں اور انحرافات کا ذکر فرماتے ہیں جو انہوں نے اپنے صحیح اسلامی عقائد کے اندر کئے مثلاً نصاریٰ کا یہ قول کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم خدا ہیں اور یہودیوں کا یہ کہنا کہ ہم اللہ کے محبوب ہیں اور آخر میں بتایا جاتا ہے کہ اس آخری رسالت کے ان انکشافات اور اعلانات اور کھلی روشنی پھیلا دینے کے بعد تمہارے لئے اللہ اور انسانوں کے نزدیک کوئی حجت نہ رہے گی اور ان کے لئے اب یہ ممکن نہ ہو گا کہ وہ یہ کہہ سکیں کہ ہم پر چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک طویل دور گزر گیا تھا' اس لئے خدا تعالیٰ کی تعلیمات ہم بھول گئے اور معاملہ ہم پر مشتبہ ہو گیا۔

يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ ٱلْكِتَٰبِ وَيَعْفُوا۟ عَن كَثِيرٍ ۚ قَدْ جَآءَكُم مِّنَ ٱللَّهِ نُورٌ وَكِتَٰبٌ مُّبِينٌ ﴿١٥﴾ يَهْدِى بِهِ ٱللَّهُ مَنِ ٱتَّبَعَ رِضْوَٰنَهُۥ سُبُلَ ٱلسَّلَٰمِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِ بِإِذْنِهِۦ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٦﴾ لَّقَدْ كَفَرَ

الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ
شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ
جَمِيْعًا ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ
وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا
اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ
يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ
وَمَا بَيْنَهُمَا ۫ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ
لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۫
فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۹﴾ ع

(اے اہل کتاب' ہمارا رسول تمہارے پاس آگیا ہے جو کتاب الہٰی کی بہت سی ان باتوں کو تمہارے سامنے کھول رہا ہے جن پر تم پردہ ڈالا کرتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر بھی کر جاتا ہے۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں' سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے۔ اے نبی '' ان سے کہو کہ اگر خدا مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اس کو اس ارادے سے باز رکھ سکے؟ اللہ تو زمین اور آسمانوں کا اور ان سب چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں' وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے۔

یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ان سے پوچھو' پھر وہ تمہارے گناہوں پر تمہیں سزا کیوں دیتا ہے؟ درحقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان خدا نے پیدا کئے ہیں۔وہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے' زمین اور آسمان اور ان کی ساری موجودات اس کی ملک ہیں اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔

اے اہل کتاب' ہمارا یہ رسول ایسے وقت تمہارے پاس آیا ہے اور دین کی واضح تعلیم تمہیں دے رہا ہے جبکہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ ایک مدت سے بند تھا' تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔سو دیکھو' اب وہ بشارت دینے اور ڈرانے والا آگیا..... اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے)

اہل کتاب اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ ان کو اسلام کی طرف دعوت ایک ایسا نبی دے جو ان میں سے نہ ہو۔پھر یہ ان کو کب گوارا تھا کہ ان کے پاس نبی ایک ایسی امت سے آجائے جو ایک امی امت ہے اور جس کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو برتر اور ان کے مقابلےمیں اپنے آپ کو زیادہ عالم سمجھتے تھے۔اس لئے کہ وہ اہل کتاب تھے اور یہ عرب امی تھے۔جب اللہ تعالیٰ نے ان امیوں کو سربلند کرنا چاہا تو ان میں ایک نبی مبعوث فرمایا' اسے خاتم النبیین اور آخری رسول قرار دیا اور اس کی رسالت کو خاتم الرسالات قرار دیا۔اسے تمام انسانیت کے لئے عام رسالت قرار دیا گیا۔اللہ نے ان ان پڑھ لوگوں کو تعلیم دی اور ایک مختصر عرصے میں وہ تمام انسانیت کے مقابلے میں سب سے اونچے علمی مقام پر فائز ہو گئے۔وہ اپنے تصورات اور اعتقادات کے لحاظ سے ترقی یافتہ اور اپنے طریقہ کار اور نظام حیات کے لحاظ سے سب سے زیادہ درست' اپنے نظم ونسق اور قانون کے اعتبار سے سب سے زیادہ افضل اور اپنے اخلاق اور معاشرت کے لحاظ سے سب سے زیادہ صالح تھے۔اور یہ سب باتیں اس میں شامل ہیں کہ یہ ان پر اللہ کا فضل وکرم تھا۔یہ دین ان کو بطور انعام دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے دین پسند فرمایا تھا۔اگر عرب کے امیوں کو یہ نعمت نہ ملتی تو وہ ہرگز پوری انسانیت کے نگہبان نہ بن سکتے تھے۔اگر اس دین کو الگ کر دیا جائے پھر عربوں کے پاس اور کیا تحفہ ہے جو وہ اس انسانیت کو دیں گے۔

ان حالات میں اللہ تعالیٰ اہل کتاب کو پکارتا ہے۔یہ بات ریکارڈ پر لائی جاتی ہے کہ ان کو خصوصی طور پر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جارہی ہے۔اس رسول پر ایمان لانے اور اس کی مدد کرنے کی دعوت ان کو دی جارہی ہے۔اس عہد وپیمان کے عین مطابق جو ان سے لیا گیا تھا کہ وہ نبی آخر الزمان کی مدد اور نصرت کریں گے۔اللہ تعالیٰ یہ بات بھی ریکارڈ پر لاتا ہے کہ یہ رسول امی اللہ نے ان کے پاس بھیجا ہے۔وہ عربوں کا بھی رسول ہے۔اہل کتاب کے لئے بھی رسول ہے اور پھر پوری انسانیت کے لئے بھی رسول ہے۔اس لئے تم اس کی رسالت کا انکار نہیں کر سکتے اور نہ یہ کہہ سکتے ہو کہ آپ کی رسالت صرف عربوں کے لئے ہے یا یہ کہ اس رسالت میں اہل کتاب کو خصوصیت کے ساتھ کوئی دعوت نہیں دی گئی ہے۔

(يَٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (٥ : ١٤) (اے اہل کتاب' ہمارا رسول تمہارے پاس آگیا ہے جو کتاب الٰہی کی بہت سی

ان باتوں کو تمہارے سامنے کھول رہا ہے جن پر تم پردہ ڈالا کرتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر بھی کر جاتا ہے)

یعنی حضرت محمد ؐ تمہاری جانب ایک رسول ہیں اور تمہارے بارے میں اس کے فرائض میں یہ بات شامل ہے کہ تم نے صدیوں تک جن حقائق کو چھپایا' جو تمہاری کتابوں میں تھے' وہ ان کا کھل کر بیان کرے۔ رازوں کا انکشاف کرے اور مجمل باتوں کی وضاحت کرے اور اس باب میں یہود و نصاریٰ دونوں برابر ہیں۔ نصاریٰ نے تو دین کی پہلی اساس ہی کو چھپا دیا تھا یعنی عقیدۂ توحید کو۔ اسی طرح یہودیوں نے کئی شرعی احکام کو چھپا دیا تھا۔ مثلاً زانی کے لئے رجم کی سزا اور تمام لوگوں کے لئے سود کی حرمت۔ نیز انہوں نے نبی آخرالزماں حضرت محمد ؐ کے بارے میں وارد ہونے والی بشارت کو بھی چھپا دیا تھا جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے (الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ) "وہ جسے وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔" اور یہ کہ رسول کریم ؐ نے بہت سی ایسی باتوں کو نہیں چھیڑا جو انہوں نے چھپائی تھیں۔ لیکن چونکہ وہ اسلامی شریعت میں داخل نہ تھیں یعنی ان کو اللہ نے سابقہ شریعتوں کی دوسری چیزوں کی طرح منسوخ کر دیا' جو انسانی معاشروں سے متروک ہوگئی تھیں اگرچہ وہ کبھی مشروع تھیں لیکن انبیائے سابقہ کے چھوٹے چھوٹے معاشروں میں' جن کے لئے اس سے پہلے رسول بھیجے گئے تھے مگر محدود وقت کے لئے۔ یہاں تک کہ یہ آخری اور آفاقی رسالت آگئی جو تمام انسانیت کے لئے تھی۔ یہ آخری رسالت دنیا میں جم گئی اور اللہ نے اسے مکمل کر دیا اور اسے بطور نعمت لوگوں کے لئے مکمل دین کے طور پر پسند کر لیا۔ اب اس کا فسخ' اس میں کسی قسم کی تبدیلی اور کسی قسم کی ترمیم ممنوع ہوگئی۔

اب یہاں یہ بھی بیان کر دیا جاتا ہے کہ رسالت آخری کے اہداف کیا ہیں اور اس کی نوعیت کیا ہے اور یہ رسالت لوگوں کی زندگیوں میں کیا کیا تبدیلیاں لائے گی۔

(---- قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِیْنٌ (۱۵) یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَیَهْدِیْهِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۱۶)(۴:۱۵-۱۶))

(تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں' سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے)

اس کتاب پر اس سے زیادہ نہ کوئی اور لفظ صادق آتا ہے' نہ اس سے زیادہ پوری طرح منطبق ہوتا ہے اور نہ اس سے زیادہ اس کی حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ یہ کتاب' قرآن' ایک نور ہے اور ایک نئی روشنی ہے..... یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اسے ایک مسلمان اپنے دل' اپنے وجود' اپنی پوری زندگی' اپنے نقطہ نظر اور اپنی اقدار اور اپنے واقعات اور معاشرے کے تمام افراد کے بارے میں اچھی طرح محسوس کرتا ہے۔ جونہی ایک مسلمان کے دل میں شمع ایمان روشن

ہوتی ہے وہ اپنے اندر ایک روشنی اور ایک نور محسوس کرتا ہے۔اس نور سے اس کی شخصیت منور ہوتی ہے' وہ مطمئن ہو جاتی ہے۔اس کے ماحول میں جو چیز بھی آتی ہے وہ منور ہو جاتی ہے۔واضح ہو جاتی ہے' صاف صاف دکھائی دیتی ہے اور درست ہو جاتی ہے۔

انسان کی شخصیت کا کیچڑ' اس کی مٹی کی تاریکی' اس کے گوشت و پوست کی کثافت' اس کی شہوت و لذت کا جوش و خروش سب منور ہو جاتے ہیں۔سب کے سب چمکتے ہیں' روشن ہو جاتے ہیں اور واضح ہو کر نکھر جاتے ہیں۔مادیت کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔کثافت اور جوش میں لطافت اور ٹھنڈک آ جاتی ہے۔انسان کی فکر و نظر سے غبار اور اجمال دور ہو جاتا ہے۔اس کے اقدام سے تردد اور خلجان ختم ہو جاتا ہے۔اس کی جہت نظر سے حیرانی اور پریشانی دور ہو جاتی ہے۔وہ مویشیوں کے راستے پر نہیں چلتا جس کی کوئی منزل ہوتی ہے نہ نشان منزل۔اس کا راستہ واضح' سیدھا اور روشن ہو جاتا ہے۔اس کا نصب العین واضح اور مقاصد حیات متعین ہو جاتے ہیں اور نفس انسانی اس راہ پر مطمئن ہو جاتا ہے۔

"یہ نور اور واضح کتاب ہے" یہ دونوں اوصاف نور اور مبین ایک چیز کے اوصاف ہیں اور یہ وہ کتاب ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آتے ہیں۔

(يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (٤ : ١٦)) (جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں' سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے)

اللہ نے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا ہے اور جو لوگ اللہ کی اس رضامندی اور پسند کے تابع ہوں گے اور اسے اپنے لئے پسند کریں گے تو اللہ ایسے لوگوں کو سلامتی کے راستوں پر ڈال دیتا ہے۔

یہ انداز اظہار قرآن پر سو فیصدی منطبق ہے اور قرآن اس بات کا نہایت ہی صحیح مصداق ہے کہ وہ سلامتی کا واسطہ ہے۔اسلام ایک فرد کے لئے جو راہ متعین کرتا ہے وہ سلامتی کا راستہ ہے۔وہ ضمیر کی سلامتی ہے' وہ عقل کی سلامتی ہے' وہ اعضاء کی سلامتی ہے۔وہ گھر اور خاندان کی سلامتی ہے۔وہ معاشرے کی سلامتی ہے' وہ بشریت و انسانیت کی سلامتی ہے۔وہ اس زندگی کے ساتھ سلامتی ہے' وہ اس کائنات کے ساتھ سلامتی ہے' وہ اللہ رب کائنات کے ساتھ سلامتی' غرض ہمہ گیر اور ہمہ جہت سلامتی ہے جسے اس انسانیت نے نہ کبھی پایا ہے اور نہ کبھی پا سکے گی مگر صرف اسلامی نظام حیات میں' صرف اسلامی منہاج میں' صرف اسلامی شریعت کے قانون میں اور صرف اس معاشرے میں جو اسلامی شریعت اور اسلامی نظریہ حیات کی اساس پر قائم ہو۔

یہ عظیم سچائی ہے کہ اللہ اس دین کی طرف اس شخص کی راہنمائی کرتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوا ہو۔اور وہ شخص ہوتا ہے جو خود بھی اللہ ہی کی مرضی کا خیال کرتا ہے اور اللہ ہی کی مرضی میں سلامتی کے راستے ہیں یعنی اسلام۔سلامتی کے تمام راستے اسلام میں ہیں۔اور اس سچائی کی گہرائی اور عمق کا ادراک وہی کر سکتا ہے جس نے جاہلیت قدیمہ

اور جاہلیت جدیدہ کے وہ تمام راستے دیکھے ہوں جو جنگ جدال کے راستے ہیں۔ اس حقیقت کی گہرائی کا ادراک وہی شخص کر سکتا ہے جس نے جاہلیت کی وجہ سے ضمیر کی گہرائیوں میں پیدا ہونے والی بے چینی کو خود دیکھا ہو اور اس کا مزا چکھا ہو۔ اسی طرح جس نے جاہلی رسم و رواج اور جاہلی نظامہائے حیات اور طور طریقوں سے پیدا ہونے والی بے چینیوں کو دیکھا ہو اور اس افراتفری کو دیکھا ہو جو یہ نظام انسانی زندگی کے معاملات میں پیدا کر دیتا ہے۔

ان آیات کے ساتھ سب سے پہلے جن لوگوں کو خطاب کیا گیا تھا وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ سبل السلام کا مفہوم کیا ہے کیونکہ جاہلیت میں رہ کر ان لوگوں کو اچھی طرح تجربہ تھا کہ سلامتی کیا چیز ہے؟ اس لئے وہ ذاتی طور پر سبل السلام کے مفہوم سے واقف تھے۔ وہ ذاتی طور پر اس کے مزے لے رہے تھے اس لئے کہ وہ جاہلیت کی اس ناآشنا زندگی سے نکلے تھے۔

اس وقت ہمیں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اسلام کے امن و سلامتی کے اس پہلو کا ادراک کریں کیونکہ ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی جاہلیت میں انسانیت ظلم و ستم کا شکار ہو رہی ہے۔ صدیوں سے ہر قسم کی جنگ برپا ہے' میدان میں بھی اور انسانی ضمیر میں بھی اور معاشروں کے اندر بھی۔

ہم لوگ جو اسلام کی سلامتی کے زیر سایہ تاریخ اسلام کے ایک دور میں زندگی بسر کر چکے ہیں اب اس سلامتی کو ترک کر کے' اس نہ ختم ہونے والی کشمکش اور جنگ میں داخل ہو گئے ہیں جس نے ہمارے دلوں اور ارواح کو توڑ پھوڑ دیا ہے' جس نے ہمارے اخلاق اور طرز عمل کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا ہے' جس نے ہمارے معاشرے اور ہماری اقوام کو تہس نہس کر دیا ہے' حالانکہ ہم بڑی سہولت سے دوبارہ اس سلامتی میں داخل ہو سکتے ہیں اس لئے کہ اس سلامتی کا پیغام ہمارے پاس محفوظ ہے۔ یہ اس وقت اپنا معجزہ دکھا سکتا ہے کہ جب ہم اللہ کی مرضی پر راضی ہو جائیں اور اپنے لئے اس کو پسند کر لیں کیونکہ اسے اللہ نے ہمارے لئے پسند کر لیا ہے۔

ہم اس وقت جاہلیت کے مصائب جھیل رہے ہیں حالانکہ اسلام ہمارے قریب ہے' ہمارے پاس ہے۔ ہم جاہلیت کی مسلسل جنگ اور بے امنی میں مبتلا ہیں۔ اگرچہ اسلام کی سلامتی ہماری دست رس میں ہے۔ کیا ہی برا سودا ہے جو ہم کر رہے ہیں کہ ہم ایک اعلیٰ چیز دے کر ایک ادنیٰ چیز خرید رہے ہیں۔ ہم گمراہی لے کر ہدایت چھوڑ رہے ہیں اور ہم امن و سلامتی دے کر جنگ اور بے امنی قبول کر رہے ہیں۔

ہم جو اس وقت تمام انسانیت کو جاہلیت کی ہمہ گیر اور متنوع جنگ و جدال سے نکال کر اسے امن و سلامتی کی راہ دکھا سکتے ہیں خود سخت انتشار کا شکار ہیں۔ ہم انسانیت کو جاہلیت کی بدامنی سے اس وقت نکال سکیں گے جب پہلے ہم خود اپنے نفوس کو جاہلیت سے نکال کر باہر لائیں۔ پہلے ہم خود اسلامی سلامتی کی چھاؤں میں پناہ لے لیں۔ جب ہم اللہ کی رضامندی کی چھاؤں میں داخل ہو جائیں۔ اور اس دین کے تابع ہو جائیں جو اللہ نے ہمارے لئے پسند کیا ہے تو ہم ان لوگوں میں داخل ہو جائیں گے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ سلامتی کی راہوں (سبل السلام) پر سیدھے گئے ہیں اور انہیں اللہ نے ان راہوں پر ڈالا ہے۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے الاسلام والسلام العالمی - الاسلام و مشکلات الحضارہ اور تفسیر فی ظلال القرآن پارہ دوئم تفسیر آیت ادخلوا فی السلم)

(وَ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ (۴:۱۶)) "اور اپنے اذن سے ان کو

اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے۔" ...... جاہلیتیں سب کی سب اندھیرے ہیں۔ ان میں شکوک و شبہات کے اندھیرے ہوتے ہیں' ان میں خرافات' داستانوں اور تصورات کے اندھیرے ہوتے ہیں اور شہوت پرستی' میلانات اور رجحانات کے اندھیرے اور صحرا ہوتے ہیں' حیرانی' بے چینی اور وحشت اور سرگردانی کے اندھیرے ہوتے ہیں۔ لوگ اس میں درگاہ امن و سلامتی سے بہت ہی دور ہو جاتے ہیں۔ پھر اقدار میں اضطراب' حسن و قبح کے پیمانوں میں اضطراب اور حکومت کی ہدایات میں اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ اسلامی نظام کی روشنی ان تاریکیوں کے بالمقابل ہے اور روشنی بہرحال روشنی ہے جو اندھیروں میں دور سے نظر آتی ہے۔ اس میں عقل روشن' ضمیر روشن' شخصیت روشن اور زندگی اور اس کے تمام امور روشن ہوتے ہیں۔

(وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۵ . ۱۶)) "اور راہ راست کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔" یہ راستہ نفس انسانی کی فطرت کے ساتھ ساتھ سیدھا ہے اور ان قوانین کے ساتھ ساتھ جاتا ہے جن کی فطرت پر حکمرانی ہے۔ یہ راستہ اس کائنات کی فطرت کے بھی ساتھ ساتھ جاتا ہے اور جن نوامیس کے مطابق یہ کائنات جاری ہے' اس کے ساتھ بھی سیدھا جا رہا ہے۔ یہ راستہ سیدھا اللہ کی طرف جاتا ہے۔ نہ اس میں بھول بھلیاں ہے اور نہ اس میں موڑ ہیں۔ نہ اس میں مختلف پگ ڈنڈیاں ہیں اور نہ مختلف رجحانات ہیں۔

اللہ ہی ہے جس نے اس انسان اور اس کی فطرت کو پیدا کیا ہے۔ اس نے اس کائنات اور اس کے نوامیس کو پیدا کیا ہے۔ اسی نے پھر انسان کے لئے اسلامی نظام حیات وضع کیا ہے۔ وہی ہے جس نے اہل ایمان کے لئے یہ دین پسند کیا ہے۔ اس لئے یہ بات قدرتی اور واضح ہے کہ یہ نظام لوگوں کو صحیح اور سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرے۔ جبکہ تمام دوسرے نظام اور مناہج جو عاجز' جاہل اور فانی انسان نے بنائے ہیں وہ اس سے بالکل قاصر ہیں۔

اللہ عظیم ہے اور سچا ہے' اور دونوں جہانوں سے بے نیاز ہے۔ ان کی ہدایت سے اسے کوئی فائدہ ہے نہ ان کی ضلالت میں اس کا کوئی نقصان ہے لیکن وہ محض اپنی شفقت سے انہیں اس راستے پر لانا پسند کرتا ہے۔

یہ ہے صراط مستقیم۔ رہا یہ راستہ کہ اللہ مسیح ابن مریم ہے تو یہ کفریہ راہ ہے۔ یہ عقیدہ کہ یہود و نصاریٰ اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے محبوب ہیں تو یہ افتراء ہے اور اس پر کوئی دلیل ان کے پاس نہیں ہے۔ اہل کتاب میں یہ دونوں عقائد پائے جاتے تھے اور یہ دونوں عقیدے توحید کے خلوص میں ملاوٹ پیدا کرتے تھے۔ اور نبی آخر الزماں آئے ہی اس لئے ہیں کہ لوگوں کے غلط عقائد کو درست کریں۔ اور جو لوگ اصل حقیقت سے منحرف ہو کر ادھر ادھر ہو گئے ہیں انہیں صحیح راستے پر لے آئیں۔

(لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

(یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے - لے نبی "ان سے کہو کہ اگر خدا مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اس کو اس ارادے سے باز رکھ سکے؟ اللہ تو زمین اور آسمانوں کا اور ان سب چیزوں کا ملک ہے جو زمین اور آسمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں' جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی طرف سے جو عقیدہ لے کر آئے تھے وہ وہی عقیدہ توحید تھا جسے ہر رسول لے کر آیا۔ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کرنا وہ اقرار ہے جو ہر رسول نے کیا ہے لیکن اس صاف اور ممتاز عقیدے کے اندر تحریفات کر لی گئیں - یہ تحریفات اس وقت ہوئیں جب عیسائیت کے اندر بت پرستی داخل ہوئی اور عیسائیوں نے بت پرستی کے غلط مواد کو لاکر عقیدہ توحید کا جزء بنا دیا اور اس کو اس کے اندر اس قدر گڈمڈ کر دیا کہ عیسائیوں کے عقیدۂ توحید کا اصلی جوہر نکالنا ممکن ہی نہ رہا۔

عیسائیت کے اندر یہ انحرافات اچانک ایک ہی دفعہ نہیں آگئے - یہ شرکیہ عقائد آہستہ آہستہ عیسائیت کے اندر داخل ہوتے رہے - ایک ایک کر کے عیسائیوں کی مذہبی مجالس نے ان کو دین میں داخل کیا جو یکے بعد دیگرے منعقد ہوتی رہیں - عیسائیوں کے عقائد عجیب و غریب شکل اختیار کر گئے جن میں دیومالائی کہانیاں داخل ہوگئیں' جن کو سن کر انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے - یہاں تک کہ خود عیسائیوں میں سے اہل ایمان لوگوں کے لئے اس عقیدے کی تشریح مشکل ہوگئی -

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے بعد کچھ عرصے تک آپ کے شاگردوں اور متبعین کے اندر عقیدہ توحید رائج رہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات کے بارے میں جو اناجیل لکھی گئیں' ان میں سے ایک اہم انجیل' انجیل برناباس ہے - یہ انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ کہتی ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے رسول تھے - اس کے بعد ان کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے - بعض نے یہ کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام رسولوں کی طرح ایک رسول تھے - بعض نے کہا کہ ٹھیک ہے وہ رسول ہیں لیکن ان کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے - بعض لوگ کہتے تھے کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں اس لئے کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے ہیں - لیکن اس قول کے مطابق وہ اللہ کی مخلوق ہیں - بعض کا قول یہ تھا کہ وہ اللہ کے بیٹے تھے مگر مخلوق نہ تھے' بلکہ وہ باپ کی طرح قدیم تھے -

ان اختلافات کو ختم کرنے کے لئے ۳۲۵ء میں بمقام نیقیا ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ۴۸ ہزار مذہبی لیڈر اور ۰۰ ۰ شامل ہوئے - ان کے بارے میں ایک مذہبی لیڈر جو تاریخ عیسائیت کے مشہور ماہرہیں' کہتے ہیں :

"یہ لوگ آراء و مذاہب میں مختلف تھے - بعض یہ کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ اور ان کی ماں اللہ کے علاوہ دو خدا ہیں - ان کو بربری کہا جاتا تھا اور عام طور پر ریمنین کے نام سے مشہور تھے - بعض یہ کہتے تھے کہ مسیح باپ سے اس طرح پیدا ہوئے جس طرح آگ کے ایک شعلے سے دوسرا شعلہ پیدا ہوتا ہے - کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اصل شعلہ دوسرے جدا ہونے والے شعلے کی وجہ سے کم ہوگیا ہے - یہ قول سابلیوس اور اس کے متبعین نے اختیار کیا ہے - بعض یہ کہتے ہیں کہ مریم حاملہ نہیں ہوئی یعنی دس ماہ تک - حضرت عیسیٰ آپ کے پیٹ سے اس طرح ہوکر نکل آئے جس طرح پانی پرنالے سے نکل آتا ہے - اس لئے کہ کلمہ آپ کے کان میں داخل ہوا اور وہاں سے نکلا جہاں سے بچہ پیدا ہوتا ہے اور یہ عمل فوراً ہوا - یہ قول الیان اور اس کے ساتھیوں کا ہے - ان میں سے بعض کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ انسان تھے اور وہ

انسانی جوہر ہی سے پیدا ہوئے تھے ۔ ان کے ساتھ اللہ کی رحمت شامل ہو گئی اور اپنی مرضی سے اس میں حلول کر گئی اور اسی وجہ سے ابن اللہ کا لقب انہوں نے پایا ۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ جوہر قدیم ہے اور ایک ہے ۔ وہ ایک اقنوم ہے جس کے تین نام ہیں ۔ یہ لوگ کلمہ' روح القدس پر ایمان نہیں لاتے ۔ یہ پولس شمشاطی کا قول ہے ۔ یہ انطاکیہ کا پیٹر تھا ۔ اور ان لوگوں کو بولیقانیوں کہا جاتا ہے ۔ ان میں سے بعض یہ کہتے تھے کہ یہ تین خدا تھے اور اب بھی ہیں ۔ ایک صالح' لیگ طالح اور ایک عادل ۔ یہ قول لعین مرقیون اور اس کے ساتھیوں کا ہے ۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ مرقیون حواریوں کا صدر تھا ۔ یہ لوگ پطرس کو نہیں مانتے ۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو حضرت مسیح کو خدا سمجھتے تھے اور یہ پطرس کا عقیدہ تھا جسے پیغام بر کہا جاتا ہے ۔ یہی عقیدہ تین سو اسی اسقفوں نے اختیار کیا تھا ۔"

(محاضرات فی النصرانیہ شیخ ابو زہرہ)

شہنشاہ قسطنطین نے یہ آخری عقیدہ اپنا لیا جو حال ہی میں عیسائی بنا تھا اور عیسائیت کے بارے میں زیادہ علم نہ رکھتا تھا ۔ اس نے اپنی فوجوں کو مخالفین کے خلاف چھوڑ دیا ۔ یہ لوگ جلاوطن کر دیئے گئے ۔ خصوصاً ان لوگوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے قائل نہ تھے ۔ وہ صرف باپ کو اللہ سمجھتے تھے اور حضرت عیسیٰ کو مخلوق اور ناسوتی سمجھتے تھے ۔

تاریخ اقوام قبط کے مصنف اس فیصلے کے متن کے بارے میں لکھتے ہیں :

"یہ مقدس مجلس اور رسول کا کنیسہ ہر اس عقیدے کو حرام قرار دیتا جس میں یہ تسلیم کیا گیا ہو کہ ایک ایسا زمانہ تھا جس میں ابن اللہ موجود نہ تھا ۔ اور یہ کہ ولادت سے پہلے وہ موجود نہ تھا ۔ یہ کہ وہ عدم سے وجود میں آیا ۔ یا یہ بیٹا ایسے مادے اور جوہر سے پیدا کیا گیا جو باپ سے الگ تھا ۔ پھر یہ عقیدہ کہ اسے پیدا کیا گیا یا یہ کہ وہ تغیر پذیر ہے اور اس پر سایہ گردش طاری ہوتا ہے ۔"

لیکن یہ مجلس عیسائیوں میں اہل توحید کو ختم نہ کر سکی اور ان میں سے آریوس کی شاخ قائم رہی ۔ یہ شاخ قسطنطنیہ' انطاکیہ' بابل اور اسکندریہ اور پورے مصر پر قابض ہو گئی ۔

اس کے بعد روح القدس کے بارے میں اختلافات شروع ہو گئے ۔ بعض نے کہا کہ وہ بھی اللہ ہے ۔ بعض نے کہا کہ وہ اللہ نہیں ہے ۔ اس پر قسطنطنیہ کی پہلی مجلس ۳۸۱ میں منعقد ہوئی تاکہ ان اختلافات کو ختم کرے ۔

اس مجلس میں اسکندریہ کے اسقف نے مقالہ پڑھا اور اس کے مطابق یہ فیصلہ دؤیبو ثاوس بطریق اسکندریہ کہتے ہیں ۔ ہمارے نزدیک روح القدس اللہ کی روح کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ اور اللہ کی روح' اس کی زندگی کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ اگر ہم کہیں کہ روح القدس مخلوق ہے تو ہمارا قول یہ ہو گا کہ اللہ کی روح مخلوق ہے اور جب ہم اس کے قائل ہو گئے کہ اللہ کی روح مخلوق ہے تو ہم اس کے قائل ہو جائیں گے کہ اللہ کی زندگی مخلوق ہے اور جب ہم نے کہا کہ اللہ کی زندگی مخلوق ہے تو سارا عقیدہ یہ ہو جائے گا کہ اللہ زندہ نہیں ہے ۔ جب ہم نے یہ عقیدہ اختیار کر لیا کہ اللہ زندہ نہیں ہے تو ہم نے کفر اختیار کر لیا ۔ اور جو کافر ہو جائے اس پر لعنت واجب ہے ۔"

یوں اس مجلس میں حضرت مسیح کی الوہیت کے بارے میں قطعی فیصلہ کر دیا گیا' جس طرح نیقیا کی مجلس میں اس بارے میں فیصلہ ہوا تھا ۔ اس طرح باپ' بیٹے اور روح القدس پر مشتمل تثلیث ثابت ہو گئی ۔ اس کے بعد ایک اور اختلاف

شروع ہوا۔ یہ اختلاف یہ تھا کہ طبیعت الٰہیہ اور طبیعت انسانی کے درمیان امتزاج کیسے ہوگیا یا لاہوت اور ناسوت کے اندر امتزاج کیسے ہوگیا؟ قسطنطنیہ کے پادری نسطور کی رائے یہ تھی کہ ایک اقنوم ہے اور ایک طبیعت ہے۔ اقنوم کی الوہیت باپ سے ہے اور اس کی نسبت باپ کی طرف ہوگی اور انسانی طبیعت مریم سے ولادت میں منتقل ہوئی اور مریم الٰہ نہ تھی اس لئے کہ وہ ایک انسان کی والدہ تھی وہ الٰہ کی والدہ نہ تھی۔۔۔۔ کے بیٹے لکھتے ہیں کہ مسیح جو لوگوں کے اندر آیا اور اس نے لوگوں کے ساتھ بات چیت کی:

"یہ انسان جو کہتا ہے کہ وہ مسیح ہے اور محبت کے ساتھ بیٹے سے متحد ہے اور کہا جاتا ہے وہ اللہ اور ابن اللہ ہے۔ یہ حقیقت میں نہیں ہے بلکہ یہ وہبی ہے۔"

پھر کہتا ہے:

"نسطور کا عقیدہ یہ تھا کہ ہمارا رب یسوع المسیح الٰہ نہ تھا۔ یعنی اپنی ذات کے اعتبار سے بلکہ' وہ انسان تھا جو برکت اور نعمت سے پر تھا یا وہ ملہم من اللہ تھا تو اس نے کوئی غلطی نہیں کی ہے اور نہ اس نے کفریہ بات کی ہے۔"

اسقف روم نے اس کی رائے کی مخالفت کی' اسی طرح اسکندریہ کے صدر پادری نے اور انطاکیہ کے اسقفوں نے بھی مخالفت کی اس لئے انہوں نے ایک چوتھی مجلس پر اتفاق کیا۔ یہ مجلس افس میں ۴۳۱ء میں منعقد ہوئی اس مجلس نے فیصلہ کیا جس طرح ابن بطریق کہتے ہیں:

"مریم اللہ کی والدہ ہیں اور حضرت مسیح سچے اللہ اور انسان ہیں اور وہ دو طبیعتوں کے ساتھ مشہور ہیں اور یہ دونوں ایک ہی اقنوم میں ایک ہوگئی ہیں۔" اس مجلس نے نسطور پر لعنت بھیجی۔

اس کے بعد اسکندریہ کے کنیسہ نے ایک نئی رائے اختیار کی۔ اس کے لئے پھر افس میں ایک دوسری مجلس منعقد ہوئی اور اس نے فیصلہ کیا:

"مسیح ایک ہی طبیعت ہے جس میں لاہوت اور ناسوت جمع ہوگئے ہیں۔" لیکن اس رائے کو تسلیم نہ کیا گیا اور اس بارے میں شدید اختلاف جاری رہے۔ اس پر خلقدونیہ کی مجلس ۴۵۱ء میں منعقد ہوئی اس نے فیصلہ کیا: کہ مسیح کی دو طبیعتیں ہیں' ایک نہیں ہے۔ لاہوت ایک طبیعت ہے جو علیحدہ ہے اور ناسوت ایک جدا طبیعت ہے۔ اور دونوں کا التقاء مسیح کی ذات میں ہوگیا ہے۔" ان لوگوں نے افس کی مجلس دوئم پر لعن طعن کیا۔

لیکن مصریوں نے اس مجلس کے فیصلوں کو تسلیم نہ کیا۔ اس کے نتیجے میں مصر کے مذہب متوفیسیہ اور ساہی مذہب جو قیصر روم کی حکومت کا پروردہ تھا' کے درمیان خونریز اختلافات ہوئے جس کے بارے میں اس سے پہلے ہم آرنولڈ کے مقالے کا حوالہ دے چکے ہیں۔ دیکھئے اس کی کتاب "دعوت اسلامی"۔ آغاز سورہ آل عمران میں۔

ہمارا خیال ہے کہ الوہیت مسیح کے بارے میں اسقدر افکار باطلہ کے حوالے کافی ہیں کہ اس غلط عقیدے کی وجہ سے کس قدر خونریز فسادات ہوتے رہے اور کس قدر طویل عداوتیں ہوئیں اور کس قدر فرقے وجود میں آئے جو آج تک موجود ہیں۔

اس کے بعد آخری رسالت آتی ہے تاکہ وہ اس مسئلے کا سچائی کے ساتھ فیصلہ کر دے اور فیصلہ کے ساتھ ناقابل تردید بات کرے۔ چنانچہ آخری رسول آتا ہے اور وہ اہل کتاب کو صحیح عقیدے کی تلقین یوں کرتا ہے۔ "وہ لوگ بھی

کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ مسیح ابن مریم ہیں۔" اور "وہ لوگ بھی کافر ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تینوں کا ایک ہے" (تفصیلات آگے آرہی ہیں)۔

اللہ تعالیٰ ان کو متوجہ کرتے ہیں کہ ذرا عقل سے تو کام لو اور ذرا واقعی صورت حالات پر بھی غور کرو (ان سے کہو کہ اگر خدا مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اس کو اس ارادے سے باز رکھ سکے؟)۔

اس طرح اللہ کی ذات' اس کی طبیعت' اس کی مشیت' اس کی قوت اور حضرت عیسیٰ کی ذات کے اندر مکمل طور پر جدائی کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح اس کی والدہ کی ذات اور تمام دوسری ذاتوں کو اللہ سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ نہایت ہی قطعیت اور نہایت ہی وضاحت کے ساتھ۔ یوں کہ اللہ کی ذات وحدہ لاشریک ہے۔ اس کی مشیت بے قید ہے۔ اس کی حکومت صرف اس کی ہے۔ کوئی بھی اس کی مشیت کو رد نہیں کر سکتا نہ اس کے احکام کو رد کر سکتا ہے۔ وہ مسیح ابن مریم' اس کی والدہ اور تمام باشندگان زمین کو ہلاک کر سکتا ہے۔ وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ وہ ہر چیز کا خالق ہے اور خالق لازماً مخلوق سے جدا ہوتا ہے اور ہر چیز اس کی مخلوق ہے۔

( وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ، يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ، وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۵:۱۷) ) (اللہ تو زمین اور آسمانوں کا اور ان سب چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں' جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے)

یوں اسلامی عقیدہ صاف ہو کر خالص ہو جاتا ہے۔ نہایت ہی واضح اور نہایت ہی سادہ اور وہ بے راہ روی' افکار پریشاں' بے حقیقت داستانوں اور بت پرستوں کے مقابلے میں جو اہل کتاب کے ایک گروہ کے عقائد کے ساتھ شامل تھے' ان کے تہ بہ تہ ڈھیروں کے مقابلے میں بالکل صاف اور معقول بن جاتا ہے اور اسلامی عقیدے اور نظریے کا پہلا خاصہ یعنی یہ کہ الوہیت اور حاکمیت صرف اللہ کے لئے ہے اور بندگی صرف اللہ کی ہوگی' بلاکسی شبہ' بلاکسی پیچیدگی اور بغیر کسی گرد و غبار کے دونوں حقیقتوں کے درمیان فیصلہ کن اور واضح فرق ہو جاتا ہے۔

یہودی اور عیسائی کہتے تھے کہ وہ اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں۔ (وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (۵:۱۸) (یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں) انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے ابوت (والد ہونا) کا عقیدہ اپنایا' اگرچہ اس ابوت کے لئے وہ کئی تصورات کے قائل تھے۔ اگر وہ جسمانی ابوت نہ بھی مانتے ہوں روحانی ابوت کے وہ بہرحال قائل تھے۔ بہرحال جس قسم کی ابوت کے وہ قائل ہوں' اس کا پرتو عقیدہ توحید پر بہرحال پڑتا ہے اور اللہ کی الوہیت اور مسیح کی عبدیت کے درمیان فیصلہ کن فرق کمزور پڑ جاتا ہے اور جب تک اللہ اور بندوں کے درمیان واضح فرق نہ ہو اس وقت تک نہ عقائد درست ہو سکتے ہیں اور نہ زندگی درست راہ پر استوار ہو سکتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ وہ سمت متعین ہو جائے جس کی طرف تمام بندوں کا رخ ہو اور وہ اس ایک ہی سمت کی بندگی کریں اور اس قبلے اور ماخذ کا بھی تعین ہو جائے جس سے انسان اپنے لئے قانون اور تمدن کے اصول اخذ کریں

اور اس سے وہ اقدار حیات اور حسن و قبح کے پیمانے اخذ کریں ـ بغیر اس کے کہ ان جہات میں کوئی التباس اور باہم تداخل ہو یا بندے اور خدا کے اوصاف باہم گڈمڈ ہوں اور بندے اور خدا کے درمیان امتزاج کا کوئی تصور پیدا ہو ـ لہذا شرک صرف نظریاتی مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ شرکیہ عقائد کے نتیجے میں پوری زندگی کے اندر ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے ـ

یہودیوں اور عیسائیوں نے جب یہ دعوے کیے کہ وہ اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں تو پھر ان تصورات کے لازمی نتیجے کے طور پر یہ عقیدہ بھی وہ رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے گناہوں پر کوئی عذاب نہ دے گا' اگرچہ وہ گناہ کریں ـ وہ آگ میں داخل نہ ہوں گے اور اگر داخل بھی ہوں تو وہ صرف چند دن آگ میں رہیں گے ـ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ کا انصاف صحیح طرح کام نہ کرے گا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے بعض کے ساتھ خصوصی دوستانہ تعلق رکھتا ہے' اس لئے وہ ان کو کھلا چھوڑتا ہے کہ وہ اس زمین میں جو فساد چاہیں پھیلاتے پھریں ـ اور ان کو دوسرے مفسدوں کی طرح سزا نہ دی جائے گی ـ ہر انسان سوچ سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے تو اس کی وجہ سے کسی سوسائٹی میں کیا کیا فسادات ہوں گے اور یہ غلط نظریہ حیات کسی سوسائٹی میں کیسے کیسے اضطرابات پیدا کرے گا ـ

یہاں اسلام اس غلط تصور پر ایک فیصلہ کن وار کر کے اس کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے ـ اور ان تمام فسادات کا دروازہ بند کر دیتا ہے جس سے یہ فسادات کسی معاشرے میں داخل ہو سکتے تھے اور فیصلہ کرتا ہے کہ اللہ کے عدل میں کوئی رو رعایت نہیں ہے اور بجائے خود یہ عقیدہ بھی غلط ہے ـ

(قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ ۖ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِمَّنْ خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ (۵ : ۱۸) (ان سے پوچھو' پھر وہ تمہارے گناہوں پر تمہیں سزا کیوں دیتا ہے؟ درحقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان خدا نے پیدا کئے ہیں ـ وہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے' سزا دیتا ہے ـ

اس کے ذریعے عقیدے اور ایمان کے زاویے سے ایک فیصلہ کن حقیقت سامنے آجاتی ہے ـ یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ ابن ہونے کا دعویٰ سرے سے باطل ہے بلکہ انبیاء اسی طرح کے مخلوق بندے ہیں جس طرح اور لوگ ہیں اور یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ اللہ کے ہاں عدالت اور انصاف اور سزا و جزاء اور مغفرت صرف ایک اصول کے مطابق ہے ـ اس میدان میں اللہ نے دوہرے معیار نہیں رکھے ـ یہ اللہ کی مشیت کا کام ہے جس میں سزا بھی کچھ اسباب اور اصول کے مطابق ہوتی ہے اور خرابی کے لئے بھی اسباب اور اصول ہیں ـ

یہ جزاء اور سزا نہ تو ذاتی تعلقات کے اصول پر ہوگی اور نہ ابن ہونے کی کوئی حقیقت ہے ـ اس کے بعد اس بات کو تکرار لایا جاتا ہے کہ اللہ ہی ہر چیز کا مالک ہے اور تمام چیزوں کو اس کی طرف لوٹنا ہے ـ

(وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ (۵ : ۱۸) (زمین اور آسمان اللہ کی ساری موجودات اسی کی ملک ہیں' اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے ـ

یقیناً مالک اپنے غلام سے علیحدہ ہوتا ہے ـ دونوں کی ذات میں فرق ہوتا ہے ـ اس کی مشیت جدا ہوتی ہے ـ اور تمام لوگ مالک کی طرف رجوع کرتے ہیں ـ

اب یہ بیان اپنے اختتام کو پہنچتا ہے اور اہل کتاب کو ایک بار پھر دعوت دی جاتی ہے تاکہ ان پر حجت تمام ہو' ان کے لئے معذرت کا کوئی موقع نہ ہو۔ اہل کتاب کو ان کے انجام کے بالکل سامنے لاکھڑا کر دیا جاتا ہے بغیر کسی میل و غبار کے اور بغیر کسی پیچیدگی کے ۔ ان کا انجام روشن ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ز فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

(۱۹) (اے اہل کتاب ' ہمارا یہ رسول ایسے وقت تمہارے پاس آیا ہے اور دین کی واضح تعلیم تمہیں دے رہا ہے جبکہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ ایک مدت سے بند تھا' تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ سو دیکھو' اب وہ بشارت دینے والا اور ڈرانے والا آگیا..... اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے)

اس فیصلہ کن مقابلے کی وجہ سے اب اہل کتاب کے پاس کوئی حجت نہیں رہتی کہ یہ رسول امی ان کی طرف نہیں بھیجا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلُنَا (۵:۱۹) اے اہل کتاب ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا ہے۔

اور ان کی یہ حجت ختم ہو جاتی ہے کہ ایک طویل عرصہ گزر گیا کہ انہیں کوئی یاد دہانی نہیں کرائی گئی' نہ کوئی بشارت دی گئی ہے اور نہ کوئی ڈراوا ان تک پہنچا ہے اس لئے ہم بھول گئے اور بے راہ روی اختیار کر لی۔ اب ان کے پاس بشیر و نذیر آچکا ہے۔

یہاں ان کو یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ اللہ کو کوئی چیز بھی شکست نہیں دے سکتی۔ اور اس کے لئے یہ بات بھی کوئی مشکل نہیں ہے کہ وہ امیین میں سے رسول بھیج دے اور یہ بات بھی اسے عاجز نہیں بنا سکتی کہ وہ اہل کتاب کا ان گناہوں پر مواخذہ کرے جن کا وہ ارتکاب کرتے ہیں۔

(وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۵:۱۹)) (بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے) اہل کتاب کے ساتھ یہ نشست اب ختم ہوتی ہے' جس میں ان کے تمام انحرافات اور بے راہ رویاں کھل کر سامنے آجاتی ہیں جن کے مطابق انہوں نے اپنے صحیح دین کو ترک کر دیا جو خود ان کی قوم کے رسول لے کر ان کے پاس آئے تھے ان اعتقادی تصورات کا بھی فیصلہ کر دیا جاتا ہے' جو اللہ نے اہل ایمان کے لئے پسند فرمائے ہیں اور نبی ؐ کے بارے میں انہوں نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ باطل ہو جاتا ہے اور قیامت میں وہ جو عذر لنگ پیش کر سکتے تھے اللہ نے دنیا ہی میں اس کا راستہ بند کر دیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ ایک طرف ان کو راہ ہدایت کی طرف دعوت دیتے ہیں اور دوسری جانب اسلامی صفوں کے اندر ان کی ریشہ دوانیوں کی راہ بند ہو جاتی ہے۔ جماعت مسلمہ کی راہ روشن ہو جاتی ہے اور تمام طالبان ہدایت کو سیدھی راہ صاف صاف نظر آنے لگتی ہے۔

اس سبق کے آخر میں بات اس طرف رخ کرتی ہے کہ بنی اسرائیل کا رویہ اپنے نبی اور نجات دہندہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا رہا اور یہ رویہ انہوں نے عین اس وقت اختیار کیا جب وہ اس سرزمین کی دہلیز پر تھے جس کا وعدہ ان کے ساتھ خود اللہ تعالیٰ نے کیا تھا اور اس طرح انہوں نے خود اپنے رب کے ساتھ جو پیمان کیا تھا' اس کا حشر انہوں نے کیا کیا؟ کس طرح انہوں نے اسے توڑا' اور اس نقض عہد پر پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں کیسی سزا دی؟

---

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ
جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا وَآتَاكُمْ مَا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا
مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿۲۰﴾ يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ
وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ ﴿۲۱﴾ قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّ فِيهَا
قَوْمًا جَبَّارِينَ وَإِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنْ يَخْرُجُوا
مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ ﴿۲۲﴾ قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْعَمَ اللَّهُ
عَلَيْهِمَا ادْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غَالِبُونَ وَعَلَى
اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۲۳﴾ قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا أَبَدًا
مَا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ﴿۲۴﴾
قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ
الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿۲۵﴾ قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً

يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ۛ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِينَ ﴿٢٦﴾

(یاد کرو جب موسیٰ ؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "اے میری قوم کے لوگو' اللہ کی اس نعمت کا خیال کرو جو اس نے تمہیں عطا کی تھی۔ اس نے تم میں نبی پیدا کئے' تم کو فرمانروا بنایا' اور تم کو وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا۔ اے برادران قوم' اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ' جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے' پیچھے نہ ہٹو ورنہ ناکام و نامراد پلٹو گے۔" انہوں نے جواب دیا "اے موسیٰ' وہاں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں' ہم وہاں ہرگز نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں اگر وہ نکل گئے تو ہم داخل ہونے کے لئے تیار ہیں۔" ان ڈرنے والوں میں دو شخص ایسے بھی تھے جن کو اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ان جباروں کے مقابلے میں دروازے کے اندر گھس جاؤ' جب تم اندر پہنچ جاؤ گے تو تم ہی غالب رہو گے' اللہ پر بھروسہ رکھو' اگر تم مومن ہو۔" لیکن انہوں نے پھر یہی کہا کہ "اے موسیٰ' ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں موجود ہیں بس تم اور تمہارا رب دونوں جاؤ اور لڑو' ہم یہاں بیٹھے ہیں۔" اس پر موسیٰ نے کہا "اے میرے رب' میرے اختیار میں کوئی نہیں مگر میری اپنی ذات یا میرا بھائی' پس تو ہمیں ان نافرمان لوگوں سے الگ کر دے۔" اللہ نے جواب دیا "اچھا تو وہ ملک چالیس سال تک ان پر حرام ہے' یہ زمین میں مارے مارے پھریں گے' ان نافرمانوں کی حالت پر ہرگز ترس نہ کھاؤ ")۔

یہ بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک حصہ ہے اور اسے یہاں تفصیل سے لیا گیا ہے۔ یہ تفصیلات جس حکمت کے تحت دی گئی ہیں اس کے کئی پہلو ہیں۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ بنی اسرائیل ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے دعوت اسلامی کی مخالفت کی' اس کے خلاف سازش کی' مدینہ میں اس کے خلاف برسرپیکار رہے اور پورے جزیرۃ العرب میں اس کے ساتھ محاربت کرتے رہے۔ وہ پہلے ہی دن سے جماعت مسلمہ کے خلاف برسرجنگ تھے۔ انہوں نے مدینہ میں نفاق پیدا کیا اور منافقین کی پرورش کرتے رہے۔ یہ لوگ ان منافقین کی امداد کرتے رہے اور یہ امداد اسلامی نظریہ حیات کے خلاف بھی تھی اور مسلمانوں کے خلاف بھی۔ انہوں نے مشرکین کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا' ان کے ساتھ لمبے چوڑے وعدے کئے اور ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیں۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف افواہ سازی کا کام کیا' خفیہ ریشہ دوانیاں کیں' مکاریوں سے کام لیتے رہے اور اسلامی صفوں میں بے چینی پیدا کرتے رہے۔ انہوں نے شکوک و شبہات بھی پھیلانے کی کوشش کی۔ اسلامی عقائد میں بھی اور اسلامی قیادت کے خلاف بھی اور کچھ عرصہ بعد یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف پوری طرح کھل کر سامنے آگئے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ جماعت مسلمہ کے سامنے ان کی پوری حقیقت کو کھول کر رکھ دیا جائے تاکہ اسے معلوم ہو کہ اس کے دشمن کس قماش کے لوگ ہیں' ان کا مزاج کیا ہے' ان کی تاریخ کیا ہے' ان کے وسائل عداوت کیا ہیں اور اس معرکے کی نوعیت کیا ہے جو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف برپا کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم تھا کہ یہ لوگ آنے والی پوری اسلامی تاریخ میں ملت اسلامیہ کے دشمن رہیں گے' جیسے

اسی طرح جس طرح یہ لوگ خود اپنی تاریخ میں ہمیشہ حق کے دشمن رہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی تاریخ ملت اسلامیہ کے سامنے رکھ دی اور اچھی طرح کھول کر رکھ دی اور ملت اسلامیہ کے خلاف یہ لوگ جو ذرائع کام میں لاتے تھے وہ بھی ان کے سامنے رکھ دیئے۔

اس حکمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بنی اسرائیل اس دین کے حامل تھے جو حضرت محمد ؐ کے آخری دین سے پہلے سچا دین تھا اور اسلام سے قبل بنی اسرائیل ایک طویل تاریخ رکھنے والی ملت تھے۔ ان کے عقائد میں انحراف واقعہ ہو گیا تھا اور انہوں نے اس عہد و پیمان کی بار بار خلاف ورزی کی تھی جو انہوں نے اللہ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس نظریاتی انحراف اور اس عہد کی خلاف ورزی کی وجہ سے ان کی زندگی پر برے اثرات مرتب ہو گئے تھے اور ان تمام امور کا تقاضا یہ تھا کہ امت مسلمہ ان کی پوری تاریخ سے آگاہ ہو کیونکہ وہ اس سے قبل کی تمام رسالتوں کی امین اور وارث ہے اور ربانی نظریہ حیات اور صحیح عقائد کی نگہبان ہے۔ ان وجوہات کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ امت مسلمہ کو ان تمام تاریخی انقلابات کا علم ہو اور اس کو معلوم ہو کہ کہاں کہاں ان لوگوں نے ٹھوکر کھائی اور اس کے کیا نتائج نکلے۔ بنی اسرائیل کی زندگی اور ان کے اخلاق پر اس کے کیا نتائج مرتب ہوئے تاکہ اس تجربے کی وجہ سے تحریک اسلامی ان مقامات میں سنبھل کر چلے جہاں ٹھوکریں لگتی ہیں' جہاں سے شیطان حملہ آور ہوتا ہے اور جہاں سے انحراف شروع ہوتا ہے تاکہ ان تاریخی تجربات کے نتیجے میں وہ صحیح راہ پر گامزن رہے۔

اور اس حکمت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل کے تجربات کے کئی پہلو تھے۔ یہ بہت طویل تجربات تھے اور اللہ تعالیٰ کو اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ جب اقوام و ملل پر ایک طویل عرصہ گزر جاتا ہے تو وہ سنگدل ہو جاتی ہیں اور ان کی بعد کی نسلیں اصل راہ سے ہٹ جاتی ہیں اور یہ کہ امت مسلمہ کی تاریخ قیام قیامت تک طویل رہے گی اور اس پر ایسے ادوار آئیں گے جن میں وہ بعینہ بنی اسرائیل جیسے حالات میں مبتلا ہو جائے گی۔ اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ تاریخ اسلام میں پیدا ہونے والے قائدین اور تجدید و احیائے دین کرنے والے مجددین کے سامنے بھی ایسے تجربات کے نمونے ہونے چاہئیں کہ اقوام و ملل کے اندر کس طرح انحراف اور گمراہی سرایت کر جاتی ہے۔ ان مجددین کو معلوم ہونا چاہئے کہ جب بیماری کی تشخیص ہو جائے تو اس کا علاج کیسے ہو گا' اس لئے کہ ہدایت اور صراط مستقیم سے دور چلے جانے میں وہ لوگ بہت ہی سنگدل ہوتے ہیں جو جان بوجھ کر ایسا کریں۔ غافل' خام اور کم علم لوگ بہت جلد ہدایت قبول کرتے ہیں کیونکہ ان کے سامنے ایک جدید دعوت آتی ہے جو انہیں پسند آ جاتی ہے اور وہ اسے قبول کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے اوپر سے گرد و غبار جھاڑ لیتے ہیں' کیونکہ یہ ان کے لئے ایک نئی چیز ہوتی ہے۔ چونکہ یہ جدید دعوت ان کی فطرت کے لئے ایک نئی چیز ہوتی ہے اس لئے ان کی زندگی میں بہار آ جاتی ہے۔ لیکن جن لوگوں کے سامنے پہلے دعوت آ جاتی ہے' ان کے لئے دوبارہ وہ دعوت پرکشش نہیں ہوتی۔ نہ وہ ان کے اندر حرکت پیدا کرتی ہے نہ ان کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ یہ کوئی عظیم دعوت ہے' اور اسے سنجیدگی سے لینا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے زیادہ محنت اور طویل اور صبر آزما جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔

قصہ بنی اسرائیل کی تفصیلات کی حکمتوں میں سے یہ بہت اہم پہلو تھے' اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان قصص کو ہمیشہ تفصیلات کے ساتھ دیا ہے اس لئے کہ امت مسلمہ ان تمام عقائد کی وارث تھی۔ اسے اب انسانیت کی قیادت کے فرائض

سرانجام دیئے تھے۔ اس کے کئی اور پہلو بھی ہو سکتے ہیں لیکن یہاں ان اشارات سے زیادہ دینا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اس سبق میں ہم اس مجلس کی طرف واپس آتے ہیں۔

---ooo---

(وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (۲۰) يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ (۲۱) (۵: ۲۰ ـ ۲۱)) (یاد کرو جب موسیٰ ؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "اے میری قوم کے لوگو' اللہ کی اس نعمت کا خیال کرو جو اس نے تمہیں عطا کی تھی۔ اس نے تم میں نبی پیدا کیے' تم کو فرمانروا بنایا' اور تم کو وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا۔ اے برادران قوم' اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے' پیچھے نہ ہٹو ورنہ ناکام و نامراد پلٹو گے)۔

یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلمات کے اندر ایسا اشارہ پایا جاتا ہے کہ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کی قوم اس جہاد کے سلسلے میں متردد ہے اور انہیں خطرہ تھا کہ وہ الٹے پاؤں پھر جائے گی۔ انہوں نے بنی اسرائیل کے مصر سے واپسی کے طویل سفر کے اندر اچھی طرح تجربہ کر لیا تھا کہ یہ لوگ بار بار نافرمانی کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو مصر سے نکالا تھا اور ان کو اس ذلت اور بدبختی کی زندگی سے آزاد کیا تھا' جس میں عرصہ غلامی مصر میں وہ مبتلا تھے۔ یہ آزادی انہیں اللہ کے نام پر ملی تھی اور اللہ تعالیٰ کی قوت قاہرہ نے ان کے لئے سمندر کو چیر دیا تھا اور اس میں فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا تھا۔ اس کے بعد جب وہ ایک ایسی قوم سے ہو کر گزرے جو بتوں کی پوجا کرتی تھی۔ تو انہوں نے فوراً مطالبہ کر دیا تھا کہ اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایسا ہی الٰہ بنا دو جیسا کہ ان لوگوں کا الٰہ ہے (يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ) اور جب حضرت موسیٰ ؑ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مقررہ میعاد پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ سرگوشی کے لئے کوہ طور پر چلے گئے تو پیچھے سے سامری نے ان زیورات سے جو آتے ہوئے ان کی عورتوں نے مصریوں کی عورتوں سے چرا لئے تھے' ایک بچھڑا بنا دیا۔ یہ بچھڑا ایسا ہی آواز کرتا تھا جس طرح ایک بچھڑا آواز کرتا ہے۔ یہ لوگ اس بچھڑے پر ٹوٹ پڑے اور کہا کہ یہ تو وہی خدا ہے جس کی ملاقات کے لئے حضرت موسیٰ کوہ طور پر چلے گئے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک واضح معجزہ یہ تھا کہ انہوں نے ان کے لئے تپتے ہوئے صحرا کے اندر سے ایک پتھر سے ۱۲ چشمے نکالے۔ ان پر من اور سلویٰ جیسے طعام نازل ہوئے جو نہایت ہی لذیذ تھے لیکن انہوں نے ان لذیذ و مفید کھانوں کو چھوڑ کر ان کھانوں کا مطالبہ کر دیا جو مصر میں وہ کھاتے تھے حالانکہ وہاں وہ بڑی ذلت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہاں انہوں نے ساگ' ترکاری' گیہوں' لہسن اور پیاز کا مطالبہ کیا اور اس کھانے پر صبر نہ کیا جو ان پر نازل ہو رہا تھا حالانکہ وہ عزت' اخلاص اور اعلیٰ مقاصد کے لئے کام کر رہے تھے۔ حضرت موسیٰ ان کو ان اعلیٰ مقاصد کی طرف کھینچ لا رہے تھے

اور وہ پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے ۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو گائے کے معاملے میں بھی آزمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا اور وہ اس میں پس و پیش اور بہانہ بازی کرتے اور مدت تک اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے ۔ اور بالآخر مجبور ہو کر انہوں نے اس حکم پر عمل کیا لیکن وہ کرنے والے نہ تھے ۔

( فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ) پھر انہوں نے ان کا تجربہ اس وقت بھی کیا تھا جب وہ کوہ طور سے واپس ہوئے اور ان کے پاس وہ تختیاں تھیں جن میں وہ میثاق اور عہد تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان سے لیا تھا ۔ انہوں نے اس عہد سے انکار کر دیا اور عہد شکنی پر ثابت قدم رہے ۔ ان انعامات اور ان کے جواب میں ان نافرمانیوں اور اس کے بعد اس پر پھر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کی معافی کے باوجود پھر بھی انہوں نے اس عہد کو تسلیم نہ کیا اور اللہ تعالیٰ کو ان کے سروں پر پہاڑ اس طرح لٹکانا پڑا جس طرح کہ بادل کا ایک ٹکڑا ہو اور وہ اس حالت میں آ گیا کہ انہوں نے یقین کر لیا کہ اب یہ ان کے اوپر گرنے ہی والا ہے ۔ ( وَظَنُّوْا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ) حضرت موسیٰ ﷺ نے اس طویل سفر آزادی میں ان کو اچھی طرح آزمایا تھا ۔ آپ ان کو لے کر ارض مقدس کی دہلیز تک آ پہنچے تھے جس کا وعدہ ان کے ساتھ خود اللہ نے کیا تھا اور اس زمین کے لئے ہی وہ مصر سے نکلے تھے ۔ وہ زمین جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے عہد کیا تھا کہ یہ لوگ اس میں بادشاہت قائم کریں گے اور اللہ اس میں پھر ان پر انبیاء بھیجے گا تاکہ وہ اللہ کی نگرانی اور قیادت میں زندگی کے بہترین دن گزاریں ۔

حضرت موسیٰ نے ان کو اچھی طرح آزما لیا تھا' اس لئے ان کا یہ حق تھا کہ وہ ایک بار پھر ان کی جانب سے بدعہدی سے ڈریں ۔ یہی وجہ ہے کہ اس آخری دعوت میں حضرت موسیٰ نے ان کے سامنے وہ تمام باتیں رکھ دیں جو ان کی سابقہ تاریخ میں سے قابل ذکر تھیں اور ان کے سامنے وہ تمام بشارتیں رکھ دیں جو مستقبل میں ان کو حاصل ہونے والی تھیں ۔ ان کے سامنے وہ تمام امور رکھ دیئے جن سے ان کے حوصلے بڑھ سکتے تھے اور وہ سخت سے سخت ڈراوا بھی رکھ دیا :

(وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ( ۲۰ ) يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ( ۲۱ )

(اے میری قوم کے لوگو' اللہ کی اس نعمت کا خیال کرو جو اس نے تمہیں عطا کی تھی' اس نے تم میں نبی پیدا کیے' تم کو فرمانبردار بنایا اور تم کو وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا ۔ اے برادران قوم اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے' پیچھے نہ ہٹو ورنہ ناکام و نامراد پلٹو گے ) اللہ کا انعام اور وہ وعدے پورے ہو گئے ۔ اللہ نے ان میں انبیاء بھیجے اور بادشاہ پیدا کیے ۔ اس باب میں اللہ نے انہیں وہ کچھ دیا جو اقوام عالم میں کسی کو نہ دیا گیا تھا' تاریخ کے اس پوائنٹ تک' اور وہ ارض مقدس جسے فتح کرنے جا رہے تھے جو ان کے لئے لکھ دی گئی تھی ۔ اور یہ تحریر اللہ کی تھی' لہٰذا اس کا پورا کیا جانا حق الیقین تھا ۔ اس سے پہلے اللہ نے ان کے ساتھ جو بھی وعدے کئے تھے وہ ایک ایک کر

کے پورے کر دیئے گئے تھے اور یہ ایک ایسا وعدہ تھا جس کی طرف وہ بڑھ رہے تھے ۔ اس سے پیچھے ہٹنا ان کے لئے دنیا و آخرت کا خسران تھا..... لیکن بنی اسرائیل بہرحال بنی اسرائیل تھے ۔ بزدل' ست اور پیچھے کی طرف پلٹنے والے اور بار بار وعدہ خلافی کرنے والے :۔

(قَالُوْا يٰمُوْسٰىٓ اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ (۵ : ۲۲) (انہوں نے جواب دیا "اے موسیٰ' وہاں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں' ہم وہاں ہرگز نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں ۔ ہاں اگر وہ نکل گئے تو ہم داخل ہونے کے لئے تیار ہیں)

یہاں آکر یہودیوں کی اصل فطرت سامنے آتی ہے' وہ بالکل ننگے ہو جاتے ہیں اور ان پر بالکل مہین سا پردہ بھی نہیں رہتا ۔ یہ اس لئے کہ اب وہ ایک حقیقی خطرے کے سامنے کھڑے تھے ۔ اب وہ کسی قسم کی ظاہرداری بھی نہ کر سکتے تھے ۔ نہ وہ جھوٹی بہادری کا مظاہرہ اور بڑھکیں مار سکتے تھے' نہ منافقت کر سکتے تھے ۔ خطرہ ان کی آنکھوں کے سامنے مجسم تھا اور قریب تھا ۔ اس لئے ان کو یہ بات بھی بچا نہ سکی کہ وہ اس سرزمین کے مالک ہیں اور یہ کہ اللہ نے وہ ان کی قسمت میں لکھ دی ہے' اس لئے کہ وہ تو نہایت ہی سستی فتح چاہتے تھے' جس کی انہیں کوئی قیمت ادا کرنی نہ پڑے نہ اس کی راہ میں کوئی جدوجہد کرنی پڑے ۔ وہ اس قدر آرام دہ فتح چاہتے تھے جو ان پر من اور سلویٰ کی طرح نازل ہو سکتے ہیں :

(---- قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ (۵ : ۲۲) لیکن فتح اور نصرت کی ذمہ داریاں وہ نہیں ہیں جو بنی اسرائیل کے ذہن میں تھیں ۔ ان کے دل تو ایمان سے فارغ تھے ۔ ان کے رجال مومن ان کو کہتے ہیں :۔

(قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۵ : ۲۳) (ان ڈرنے والوں میں دو شخص ایسے بھی تھے جن کو اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا ۔ انہوں نے کہا کہ ان جباروں کے مقابلے میں دروازے کے اندر گھس جاؤ' جب تم اندر پہنچ جاؤ گے تو تم ہی غالب رہو گے' اللہ پر بھروسہ رکھو اگر تم مومن ہو)۔

یہاں آکر معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ پر بھروسے اور خدا خوفی کی قدر و قیمت کیا ہے؟ یہ دو شخص وہ تھے جو اللہ سے ڈرتے تھے اور ان کی خدا خوفی ان کے اندر اس قدر جرأت پیدا کر رہی تھی کہ وہ جباروں کو خاطر میں نہ لاتے تھے ۔ اور ان کے اندر ایک موہوم خطرے کے مقابلے میں بے مثال شجاعت تھی ۔ یہ دونوں یہ شہادت دیتے تھے کہ شدت اور خطرات کے اوقات میں ایمان اور یقین کی کیا اہمیت ہوتی ہے ۔ ان دونوں کا موقف یہ بتاتا ہے کہ اللہ سے ڈرنے والے لوگوں کا موقف جباروں سے ڈر کے مواقع پر کیا ہوتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کے دل میں دو ڈر نہیں ڈالتا کہ

ایک شخص اللہ جل شانہ سے بھی ڈرے اور وہ لوگوں سے بھی ڈرے۔پس جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔وہ کس جرأت سے کہتے ہیں۔

(ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ (۵:۲۳) (ان جباروں کے مقابلے میں دروازے میں گھس جاؤ۔جب تم اندر پہنچ جاؤ گے تو تم ہی غالب رہو گے) دلوں کی دنیا اور پھر معرکہ آرائی کی دنیا کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ اقدام کرو اور گھس جاؤ' جب تم کسی قوم پر خود ان کے گھر کے اندر جا پہنچے تو ان کے دل ٹوٹ جائیں گے اور اسی قدر تمہارے حوصلے بڑھ جائیں گے۔اس طرح ان لوگوں کی نفسیات کے اندر شکست داخل ہو جائے گی اور تمہارے لئے فتح مقدر ہو جائے گی۔

رہے اہل ایمان تو ان کا بھروسہ صرف اللہ پر ہوتا ہے۔ (وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۵:۲۳) (اور صرف اللہ پر بھروسہ رکھو اگر تم مومن ہو) یہ ایمان کی خاصیت اور ایمان کی علامت ہے اور یہی ایمان کی منطق اور ایمان کا تقاضا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ دو مومن یہ بات کس سے کہہ رہے ہیں۔افسوس کہ ان کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں۔

(قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (۵:۲۴) (لیکن انہوں نے پھر یہی کہا کہ "اے موسیٰ ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے' جب تک وہ وہاں موجود ہیں۔بس تم اور تمہارا رب' دونوں جاؤ اور لڑو ہم یہاں بیٹھے ہیں) یوں بزدل صفوں سے نکل جاتے ہیں اور شرمندہ ہو جاتے ہیں۔وہ خطرات سے ڈر کر پابزنجیر ہو جاتے ہیں' جس طرح گدھوں کے پاؤں باندھ دیئے جاتے ہیں اور پھر وہ کوئی اقدام نہیں کرتے۔بزدلی اور بے شرمی آپس میں متضاد نہیں ہیں نہ ایک دوسرے سے دور ہیں۔یہ اوصاف بعض اوقات اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ایک بزدل جب اپنے فرائض کی طرف آگے بڑھتا ہے تو وہ بزدلی دکھا کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔وہ اس طرح نکل جاتا ہے جس طرح اس نے فرض کو ترک کر دیا۔پھر وہ اس مقصد ہی کو برا کہتا ہے' اس دعوت کو بھی برا بھلا کہتا ہے' جو اس سے اس بات کا مطالبہ کرتی ہے جو وہ کرنا نہیں چاہتا۔

(فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (۵:۲۴) (بس تم اور تمہارا رب دونوں جاؤ اور لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں) یہ تھی ایک کمزور اور بزدل کی عاجزی' اس کی زبان بہت ہی تیز ہے لیکن مقصد کی طرف بڑھنے کے لئے اس کے قدم بوجھل ہیں اور وہ تیروں کی چبھن محسوس کرتا ہے۔(فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ (۵:۲۴) (جاؤ تم اور تمہارا رب) اگر وہ اب ہمیں جنگ پر مجبور کرتا ہے تو ہم اس کی الوہیت کو قبول نہیں کرتے۔یہ تمہارا رب ہے۔ (اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (۵:۲۴) (ہم تو یہاں ہی بیٹھے ہیں) ہمیں نہ تو مملکت کی ضرورت ہے' نہ عزت کی ضرورت ہے' نہ ارض موعودہ کی ضرورت ہے۔اس وقت تک جب تک اس میں جبار قوم موجود ہے...... یہ تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عظیم جدوجہد کا انجام---طویل سفر' اس میں ذلت و خواری' اور بنی اسرائیل کی جانب سے بار

بار انحراف، پہلوتہی اور قدم قدم پر نافرمانی...... یقیناً یہ ان کا انجام ہے کہ وہ ارض مقدس کی فتح سے الٹے پھرتے ہیں، حالانکہ حضرت موسیٰ ان کے ساتھ ہیں اور وہ اس سرزمین کی دہلیز پر ہیں۔ وہ اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان سے پھرتے ہیں۔ حالانکہ اس عہد قدیم کا اس عہد یعنی فتح بیت المقدس سے گہرا ربط تھا۔ اب حضرت موسیٰ اس مایوسی کے عالم میں کریں تو کیا کریں؟

(قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ (۵: ۲۵) (اس پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا "اے میرے رب، میرے اختیار میں کوئی نہیں مگر میری اپنی ذات یا میرا بھائی، پس تو ہمیں ان نافرمان لوگوں سے الگ کر دے۔"

یہ ایک ایسی پکار ہے جو رنج و الم سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں ایک طرف التجاء ہے تو دوسری جانب مکمل تسلیم و رضا ہے اور اس کے بعد فیصلہ کن پختگی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اچھی طرح علم تھا اور یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اب حضرت موسیٰ کا ان کے بھائی کے سوا اور کوئی کا حامی نہیں رہا ہے۔ حضرت موسیٰ ایک شرمندہ انسان کے ضعف اور ایک نبی جو کلیم اللہ ہے، اس کے ایمان کے بیچ میں کھڑے ہیں اور ایک راست باز مومن کی طرح عزم صمیم کئے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہے کہ صرف اللہ کی طرف متوجہ ہوں اور اس کے سامنے اپنے درد دکھ کا اظہار بشکل سرگوشی کریں اور یہ مطالبہ کریں کہ اے اللہ مجھے اجازت دے دے کہ میں اس فاسق قوم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاؤں اس لئے کہ جب انہوں نے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے اپنے پختہ عہد سے روگردانی اختیار کر لی تو اب ان کے ساتھ نبی کلیم کا تعلق ہی کیا رہ گیا ہے؟ وہ ان کے ساتھ بوجہ نسب نامہ مربوط نہ تھے، نہ یہ کہ ان کی تاریخ ایک ہے، نہ ان کا واسطہ ان کے ساتھ اس اساس پر تھا کہ انہوں نے ایک جگہ مل کر جدوجہد کی تھی اور رفیق کار تھے۔ ان کے درمیان رابطہ تو دعوت الی الحق کی اساس پر ہی تھا۔ ان کے درمیان رابطہ یہی عہد قدیم تھا اور یہ عہد انہوں نے توڑ ڈالا تھا۔ اس لئے ان کے درمیان مکمل قطع تعلق ہو گیا اور نہایت ہی گہرائی تک چلا گیا۔ اب حضرت موسیٰ اور ان کے درمیان کوئی رابطہ ہی نہیں رہا ہے۔ حضرت اپنے عہد و میثاق کے پابند ہیں اور قوم نے اس سے نافرمانی اختیار کر لی ہے۔ وہ عہد پر پختہ جمے ہوئے ہیں اور قوم اس سے برگشتہ ہو گئی ہے۔

یہ ہے حضرت موسیٰ کی جانب سے ادب اور احترام۔ اور یہی ہے ان کی سنت اور یہی ہے ایک سچے مومن کا منصوبہ۔ اور یہی ہے وہ اساس اور رابطہ جس پر لوگ جمع ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ اس راہ میں قوم، نسب، نسل اور مشترکہ تاریخ کچھ چیز نہیں ہے۔ اس میں اس زمین کے تعلقات میں سے کوئی تعلق کام نہیں دیتا۔ راہ میں جب نظریات کا تعلق ٹوٹ جائے تو تمام تعلقات ٹوٹ جاتے ہیں اور جب عقیدے جدا ہو جائیں تو راستے اور منہاج بھی جدا ہو جاتے ہیں۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی پکار کا جواب دیتے ہیں اور فاسقوں کو پوری پوری سزا دے دی جاتی ہے۔

(قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۚ یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَی

الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ (٢٦) ع (اللہ نے جواب دیا "اچھا تو وہ ملک چالیس سال تک ان پر حرام ہے' یہ زمین میں مارے مارے پھریں گے' ان نافرمانوں کی حالت پر ہرگز ترس نہ کھاؤ۔")

اللہ تعالیٰ نے ان بدبختوں کو صحراؤں کے حوالے کر دیا حالانکہ وہ ارض مقدس کی دہلیز پر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر وہ سرزمین حرام کر دی جو ان کے لئے لکھ دی گئی تھی اور راجح قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس وقت موجود نسل پر اس سرزمین کو حرام کر دیا تھا' اور جب تک ان کے نطفوں سے جدید نسل تیار نہ ہوئی وہ اسی طرح مارے مارے پھرتے رہے۔ چنانچہ ان پر ارض موعود میں داخلہ اس وقت تک ممنوع رہا جب تک نئی نسل تیار نہ ہو گئی' ایسی نسل جو نصیحت قبول کرتی ہو' یہ نسل خالص صحرانوردی کی حالت میں تیار ہوئی اور یہ بالکل آزاد منش اور حریت پسند تھی۔ یہ وہ نسل نہ تھی جسے ذلت' غلامی اور مصریوں کے مظالم نے کمزوری کا خوگر بنا دیا تھا۔ اس لئے وہ نسل اس کام کے لئے موزوں نہ تھی جو اولوالعزم لوگوں کا کام ہے۔ ذلت' غلامی اور ظلم انسان کی فطرت کو خراب کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ان چیزوں سے قوموں کی فطرت بھی خراب ہو جاتی ہے اس لئے کہ غلامی میں قوموں کے ضمیر بدل جاتے ہیں۔

یہاں آکر بات ختم ہو جاتی ہے اور ان لوگوں کو صحرا کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اس پر مزید ان کے بارے میں یہاں کچھ نہیں کہا جاتا۔ یہ ایک ایسا انداز ہے جس میں نفسیاتی عبرت آموزی اور فنی خوبصورتی دونوں ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ قرآن کریم کا خاص انداز بیان ہے۔

---ooo---

اس سبق کو مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا' اللہ نے ان کے سامنے یہ پوری کہانی اسی انداز میں رکھ دی تھی جس طرح وہ پیش آئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے نبی سے کہا: اے محمد! آج ہم وہ بات نہ کہیں گے جو بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہی تھی کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا لڑو تم دونوں' ہم تو یہاں ہی بیٹھے ہیں۔ ((فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (٥: ٢٤) (قرآن کریم کے انداز تربیت کے یہ بعض نمونے ہیں۔ قرآن عام قصص کے انداز میں تربیت کرتا ہے' یہ تھے قصہ بنی اسرائیل کے بیان کی حکمت کے بعض پہلو)۔

---ooo---

# درس نمبر ۴۸ ایک نظر میں

اس سبق میں انسانی زندگی کے لئے بعض نہایت ہی اساسی قوانین وضع کئے گئے ہیں وہ احکام جو جان کی حفاظت کے لئے ہیں۔ یہ احکام اس معاشرے کے لئے ہیں جس میں اسلامی نظام زندگی رائج ہو۔ ان قوانین کا مقصد اسلامی نظام زندگی کی حمایت اور اس نظام کے خلاف بغاوت کے راستوں کو بند کرتا ہے اور اس حکومت کو بچانا ہے جو اللہ کے حکم کے مطابق قائم ہو اور شریعت کے زیر سایہ کام کر رہی ہو۔ نیز اس سے اس سوسائٹی کا تحفظ مطلوب ہے جو شریعت اسلامی کے زیر سایہ اور ایک اسلامی حکومت کے زیر سایہ کام کر رہی ہو۔ ان احکام سے اسلامی حکومت کی رعایا کے مال اور جان دونوں کی حفاظت مطلوب ہے 'بشرطیکہ یہ معاشرہ' یہ حکومت اور یہ نظام اسلامی شریعت کے مطابق چل رہے ہوں۔

اس پورے سبق میں 'سوسائٹی کی اجتماعی زندگی کے بچاؤ کے سلسلے میں نہایت ہی اساسی احکام دیئے گئے ہیں لیکن اس سبق کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کے قصے سے کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ قتل و غارت کے اس جرم کے ارتکاب کے وقت مجرمین کی نفسیات کیا ہوتی ہیں۔ وہ کیا اسباب اور فیکٹر ہوتے ہیں جن کی وجہ سے مجرم جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ نیز اس سبق میں بتایا جاتا ہے کہ یہ جرم نہایت ہی گھناؤنا ہے اور یہ کہ اس کا تدارک اور سدباب کرنا نہایت ہی ضروری ہے۔ اس جرم کے مجرم کو سزا دینا بھی بہت ضروری ہے اور ان اسباب اور موثرات پر قابو پانا بھی ضروری ہے جس کی وجہ سے ایک شخص اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس قصے کے تمام اشارات مکمل طور پر ان احکام کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں جو اس قصے کے بعد آتے ہیں۔ ایک غور و فکر سے پڑھنے والا اس بات کو بسہولت محسوس کر سکتا ہے کہ اس سیاق کلام میں اس قصے کو لانے کا مقصد کیا ہے؟ اور وہ کس قدر عمیق اور تشفی بخش اشارہ ہے' جو یہ قصہ نفس انسانی پر انڈیلتا ہے اور اسے اس میں پیوست کر دیتا ہے۔ یہ قصہ انسان کے دل و دماغ کو ان احکام کو قبول کرنے کے لئے آمادہ کر دیتا ہے کہ وہ ان سخت سزاؤں کو قبول کرے جو اسلام محاربت اور جان کے خلاف جرائم اور نظام ملکیت کے خلاف جرائم کے لئے تجویز کرتا ہے اور انفرادی ملکیت کے خلاف جرائم کے لئے مقرر کرتا ہے۔ یہ سزائیں اسلامی نظام مملکت میں 'اسلامی عدالتوں کی طرف سے نافذ ہوں گی جو اسلامی شریعت کے مطابق کام کرتی ہیں۔

اسلامی معاشرے کا فرض ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی کو اسلامی نظام کے مطابق شریعت محمدیہ کے تحت چلائے۔ وہ اپنے معاملات' اپنے روابط اور تعلقات اسلامی نظام اور اسلامی قانون شریعت کے مطابق منظم کرے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے مطابق یہ معاشرہ ایک فرد کا کفیل بھی ہو گا' ایک جماعت کا بھی وہ کفیل ہو گا اور فرد اور سوسائٹی دونوں کو انصاف' سیکورٹی' اطمینان اور سکون عطا کر سکے گا۔ وہ ان تمام عناصر کے فساد کے دروازے بند کر سکے گا جو افراتفری'

بے چینی ' دباؤ اور گھٹن پیدا کرتے ہیں اور وہ تمام اسباب ختم ہو جائیں گے جن کی وجہ سے معاشرے کے اندر ظلم و زیادتی ہوتی ہے۔ اسی طرح لوگوں کی حاجات اور ضروریات بھی بڑی آسانی سے پوری ہو سکیں گی۔ اسی طرح اس قسم کے باہم متکافل ' متوازن ' منصفانہ اور فاضلانہ معاشرے کے اندر کسی کی جان اور مال پر ' کسی کی انفرادی ملکیت پر یا نظام مملکت کے خلاف اس قسم کے جرائم کا ارتکاب نہایت ہی بری حرکت اور سخت جرم سمجھا جاتا ہے۔ اس کے لئے کوئی وجہ جواز یا عذر یا ایسے حالات نہیں ہوتے جو اس جرم کے لئے مخفف (Mit gating) ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جرم اور مجرم کے خلاف اسلام کی جانب سے یہ سختی اس وقت کی جاتی ہے جب ایک فرد کے لئے صحیح راہ پر چلنے کے تمام مواقع فراہم کر دیئے جائیں ' یعنی معتدل مزاج لوگوں کے لئے درست طور پر زندگی بسر کرنے کے حالات موجود ہوں اور ایسے حالات موجود ہوں کہ ایک فرد اور ایک جماعت اگر چاہیں تو پاکیزہ زندگی بسر کر سکتے ہوں۔ ان تمام باتوں کے باوجود اسلامی نظام حکومت اور اسلامی نظام عدالت مجرم کو مکمل قانونی تحقیقات اور قانونی فیصلے کے حقوق دیتا ہے۔ اگر ذرا بھی شبہ پیدا ہو جائے تو شبہات کی وجہ سے حدود ساقط کر دیئے جاتے ہیں۔ نیز اس کے لئے توبہ کا دروازہ بھی کھلا چھوڑا جاتا ہے ' جس کے مطابق بعض حالات میں اس کا جرم اس دنیا میں بھی معاف ہو سکتا ہے جبکہ آخرت میں اس کے تمام کے تمام جرائم اور گناہوں کو بہرحال اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں گے ..... اس درس میں ہم اس کے تمام پہلو اور نمونے پائیں گے اور متعدد احکام اور قوانین کا ذکر ہو گا۔

لیکن آیات کی تفسیر اور براہ راست احکام پر کلام کرنے سے پہلے ' اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک عام اور اہم بات یہاں نوٹ کر لی جائے یعنی وہ معاشرہ کیسا ہو گا جس میں یہ سخت قوانین نافذ ہوں گے اور قوت نافذہ کے لئے حدود و قیود کیا ہیں؟

اس سبق میں جو احکام اور قوانین وارد ہیں ' چاہے ان کا تعلق ان جرائم سے ہو جو نفس کے خلاف ہوں یا ان احکام سے ہو جو نظام مملکت کے خلاف ہوں یا ان احکام سے ہو جو کسی کے مال کے خلاف ہوں ' ان کی حیثیت ان دوسرے شرعی احکام جیسی ہی ہے جو جرائم 'حدود ' قصاص اور تعزیرات میں وارد ہیں۔ یعنی یہ تمام احکام تب نافذ ہوں گے جب ان کی قوت نافذہ اسلامی معاشرے کی شکل میں ' دارالاسلام میں موجود ہو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ شریعت کے مطابق دارالاسلام کی تعریف بھی کر دی جائے۔

اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک پوری دنیا دو بلاکوں میں تقسیم ہے اور ہم کوئی تیسرا بلاک تسلیم نہیں کرتے۔

پہلا بلاک دارالاسلام ہے اور اس سے مراد وہ مملکت ہے جس کے اندر اسلامی احکام نافذ ہوتے ہیں۔ جس کا قانونی نظام شریعت پر مبنی ہو ' چاہے اس کے باشندے سب کے سب مسلمان ہوں یا مسلمانوں اور ذمیوں دونوں پر مشتمل ہوں یا اس کے لوگ سب کے سب غیر مسلم ہوں اور حکمران مسلمان ہو اور اسلامی شریعت ملک کا قانون ہو اور فیصلے شریعت کے مطابق ہوتے ہوں۔ (اگرچہ ذمی پر تمام احکام اسلامی شریعت لازمی نہیں ہیں ' اسلام کے صرف سول اور فوجداری احکام لازم ہیں) یا صورت یہ ہو کہ تمام آبادی مسلم ہے یا مسلم اور غیر مسلم مشترکہ آبادی ہو لیکن اس ملک پر حربی غیر مسلموں کا قبضہ ہو جائے لیکن ملک کا قانونی نظام نہ بدلا گیا ہو اور ملک کے باشندے بدستور اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کرتے ہوں۔ اس لئے کسی ملک کے دارالاسلام ہونے کا مکمل دارومدار صرف اس بات پر ہے کہ اس کا قانونی نظام شریعت کے

مطابق ہے یا نہیں اور یہ کہ اس کے اندر تنازعات کا فیصلہ شریعت پر ہوتا ہے یا کسی دوسرے قانون پر۔

دوسرا دارالحرب ہے اور دارالحرب ہروہ ملک ہے جس میں اسلامی شریعت نافذ نہ ہو اور جس میں فیصلے شریعت کے مطابق نہ ہوتے ہوں۔ رہے اس کے باشندے تو وہ جس مذہب وملت کے پیروکار ہوں' چاہے وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوں' چاہے وہ اپنے آپ کو اہل کتاب کہتے ہوں' یا وہ دوسرے کفار ہوں وہ دارالحرب کے باشندے ہوں گے۔ اس لئے کسی ملک کے دارالحرب ہونے کا مدار بھی مکمل طور پر صرف اس بات پر ہے کہ اس کے اندر اسلامی قوانین کا نفاذ نہ ہو اور اس کے اندر عدالتوں میں فیصلے اسلامی شریعت کے مطابق نہ ہوں۔ ایسے ملک کو ایک مسلمان اور ایک اسلامی جماعت کے نقطہ نظر سے دارالحرب کہا جائے گا۔

مسلم معاشرہ وہ ہوتا ہے جو دارالاسلام میں قائم ہو' اپنے درج بالا مفہوم کے مطابق ...... اور یہ اسلامی معاشرہ جو اسلامی منہاج کے مطابق ہو' جس پر شریعت اسلامی کی حکمرانی ہو وہ اس بات کا حقدار ہے کہ اس میں لوگوں کی جانوں کو تحفظ دیا جائے' اس میں لوگوں کے اموال کو تحفظ دیا جائے' اس کے نظام مملکت کو بچایا جائے اور اس میں اور صرف اس میں ان مجرموں پر یہ منصوص سزائیں جاری کی جائیں جن کا ذکر ان آیات میں ہو گا اور جو ان لوگوں کے خلاف نافذ ہوں جو لوگوں کی جان' مال اور مملکت میں خلل انداز ہو رہے ہوں۔ اس درس اور اس کے علاوہ دوسری قرآنی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت ہی بلند اور صاحب فضیلت معاشرہ ہو گا۔ اس میں عدل اور آزادیاں ہوں گی۔ اس معاشرے میں روزگار اور ضروریات زندگی کی ضمانت ہو گی چاہے کوئی کام کرنے پر قادر ہو یا معذور ہو۔ یہ ایک ایسا معاشرہ ہو گا جس میں بھلائی پر آمادہ کرنے والے عوامل زیادہ ہوں گے اور برائی پر آمادہ کرنے والے فیکٹر بہت ہی کم ہوں گے۔ اس لئے ایسے معاشرے کا ان تمام لوگوں پر حق ہو گا جو اس کے اندر رہتے ہیں اور اس سے نفع اندوز ہوتے ہیں کہ وہ اس معاشرے کی دل و جان سے حفاظت کریں اور وہ دوسرے باشندگان ملک کے تمام مالی' جانی' عزت کے اور اخلاق کے حقوق کی رعایت و حفاظت کریں۔ یہ تمام باشندے اس دارالاسلام کی حفاظت کریں جس میں وہ صحیح و سالم اور امن و امان سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ جس میں ان کو مکمل سیکورٹی حاصل ہے' جس میں ان کو تمام بنیادی حقوق حاصل ہیں اور جس میں ان کو تمام خصائص انسانی کے مراتب حاصل ہیں' جس میں ان کو تمام سوشل اور اجتماعی حقوق حاصل ہیں بلکہ تمام باشندوں کا فرض ہے کہ وہ ان تمام حقوق کی حفاظت کریں۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی دارالاسلام کے اس نظام کے مقابلے میں بغاوت پر اتر آتا ہے تو وہ ظالم' گناہ گار' شرپسند اور تخریب کار ہے اور اس بات کا مستحق ہے کہ اسے سخت سے سخت سزا دی جائے۔ لیکن اس میں بھی اسے یہ حقوق دیئے گئے ہیں کہ کسی کو محض ظن اور شبہے کی بنا پر نہ پکڑا جائے اور یہ اصول اس قانون پر بھی لاگو ہو گا کیونکہ شبہات کی وجہ سے حدود ساقط ہو جاتے ہیں۔

رہا دارالحرب جس کی تعریف اوپر کر دی گئی ہے تو وہ اور اس کے باشندے اس بات کے مستحق ہی نہیں ہیں کہ ان کو اسلامی شریعت کے اندر نافذ کردہ سزاؤں کا فائدہ دیا جائے' اس لئے کہ وہاں تو سرے سے شریعت کا نفاذ ہی نہیں ہوتا۔ نہ یہ معاشرہ اسلام کی حاکمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ پھر یہ دارالحرب ان مسلمانوں کو بھی تحفظ فراہم نہیں کرتا جو دارالاسلام میں رہتے ہیں اور جو اپنے ہاں اسلامی شریعت کو نافذ کرتے ہیں۔ ان دارالکفر اور دارالحرب والوں کے نزدیک مسلمانوں کی جان و مال مباح ہے۔ اس لئے اسلام کے نزدیک ایسے لوگوں کا کوئی احترام نہیں ہے الا یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ کسی کا

کوئی عہد ہو' اور ان کے اور دارالاسلام والوں کے نزدیک معاہدے طے ہو جائیں۔ اسلامی شریعت یہ تمام سہولتیں جو دارالاسلام میں مسلمانوں کو حاصل ہیں ان افراد کو بھی فراہم کرتی ہے جو دارالحرب سے دارالاسلام کو ہجرت یا سفر کر کے آتے ہیں۔ جب وہ دارالاسلام میں معاہدۂ امن کے ساتھ داخل ہو جائیں اور اس میں عہد کی مدت طے ہو اور وہ دارالاسلام کے حدود کے اندر آجائیں جس کا حاکم مسلمان ہو اور مسلمان حاکم وہی ہوتا ہے جو دارالاسلام میں شریعت حقہ کو نافذ کرے۔

---ooo---

# درس نمبر ۴۸ تشریح آیات

# ۲۷ ---تا--- ۴۰

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنِّىْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْۗاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۭ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۝

(اور ذرا انہیں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بھی بے کم و کاست سنا دو۔ جب ان دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی نہ کی گئی۔ اس نے کہا "میں تجھے مار ڈالوں گا۔" اس نے جواب دیا "اللہ تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہ

اٹھاؤں گا۔ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے اور دوزخی بن کر رہے۔ ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے۔" آخر کار اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل اس کے لئے آسان کر دیا اور وہ اسے مار کر ان لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔ پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تاکہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا "افسوس مجھ پر! میں اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر نکال لیتا۔" اس کے بعد وہ اپنے کئے پر بہت پچھتایا)۔

یہ ایک قصہ ہے جو بطور نمونہ شر اور ظلم یہاں لایا گیا ہے۔ یہ ایک ایسے صریح ظلم کا نمونہ ہے جس کے لئے کوئی وجہ جواز نہ ہو اور یہی قصہ ایک ایسا نمونہ بھی پیش کرتا ہے جو نیک نفسی اور رواداری کا اعلیٰ نمونہ ہے اور یہ نمونہ نہایت ہی پاک طینت اور صلح کل نمونہ ہے۔ اس قصے میں یہ دونوں نمونے ایک دوسرے کے بالمقابل پیش کئے جاتے ہیں۔ ہر ایک اپنے مزاج کے مطابق اور اپنی فطرت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ یہ قصہ اس جرم کی نقشہ کشی کرتا ہے' جو بدی اور صریح ظلم کا مظہر ہے اور اسے پڑھ کر انسانی ضمیر میں جوش آتا ہے اور وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ایسے صریح ظلم کے خلاف قانون قصاص ضروری ہے۔ ایک عادلانہ قانونی نظام ہی اس بدی کو صریح ظلم کے ارتکاب سے روکتا ہے جس کے بعد یہ بدی ظلم کے ارتکاب سے رک جائے گی اور اسے ارتکاب جرم سے خوفزدہ کر کے باز رکھا جا سکے گا۔ اگر اس تخویف کے بعد بھی بدی جرم کا ارتکاب کرتی ہے تو اسے منصفانہ سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہی سزا جو اس بدی کے جرم کے بالکل مناسب ہو' تاکہ معاشرے کے نیک نفس لوگوں کو بچایا جائے اور نیک نفس لوگوں کی جان و مال محفوظ ہوں' اس کے لئے اس قصے میں جس قسم کے نیک نفس لوگوں کا نمونہ پیش کیا گیا ہے وہ اس کے مستحق ہیں کہ انہیں تحفظ دیا جائے' وہ زندہ رہ سکیں' امن سے رہیں اور ایک عادلانہ قانونی نظام و انتظام کے تحت رہیں۔

قرآن کریم نے ان دو بھائیوں کے نام اور زمان و مکان کے بارے میں تفصیلات نہیں دی ہیں' اگرچہ بعض روایات اس سلسلے میں ہابیل اور قابیل کے بارے میں وارد ہیں۔ یہ دونوں حضرت آدم کے بیٹے تھے اور ان کے درمیان تنازعہ کی تفصیلات بھی ان روایات میں دی گئی ہیں کہ ان دونوں کا تنازعہ دو بہنوں کے سلسلے میں تھا۔ لیکن ہم اس قصے کو اسی طرح مجمل چھوڑنے ہی کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ یہ تمام روایات قطعی الثبوت نہیں ہیں۔ یہ اہل کتاب سے لی گئی ہیں۔ یہ قصہ عہد قدیم میں آیا ہے جہاں دونوں کے نام بھی لئے گئے ہیں اور اس میں اس واقعہ کا زمان و مکان بھی دیا گیا ہے جیسا کہ روایات میں آتا ہے۔ اس قصے کے متعلق جو ایک صحیح حدیث وارد ہے اس میں بھی تفصیلات نہیں دی گئیں۔ یہ روایت حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ حضور ؐ نے فرمایا "کہ کوئی شخص بھی اگر ظلماً قتل ہو گا تو حضرت آدم کے پہلے بیٹے پر اس خون کی ذمہ داری میں سے ایک حصہ ہو گا کیونکہ اس نے سب سے پہلے قتل انسان کا رواج ڈالا" (روایت امام احمد) اس کا سلسلہ سند یہ ہے اعمش' عبداللہ ابن مرہ' مسروق' عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ' ابوداؤد کے سوا دوسرے محدثین نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ اس کے بارے میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت انسان کی زندگی کے ابتدائی دنوں میں پیش آیا۔ اور یہ قتل عمد کا پہلا واقعہ تھا اور قاتل کو اس قدر بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اب میت کو کس طرح دفنائے۔

اس قصے کو اسی طرح مجمل چھوڑنا جس طرح قرآن کریم میں آیا ہے' مقصد قصہ پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ جس غرض

کے لئے اسے لایا گیا ہے وہ اچھی طرح سے پوری ہو جاتی ہے اور اس کے اشارات و ہدایات پوری طرح سمجھ میں آجاتے ہیں۔ قصے کے جو بنیادی مقاصد ہیں' روایات کی تفصیلات ان پر کوئی چیز زیادہ نہیں کرتیں اس لئے ہم بھی اسے یہاں چھوڑ دیتے ہیں۔ نہ تفصیلات کی ضرورت ہے اور نہ اختصار کی۔

(وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (۵:۲۷)

(اور ذرا انہیں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بھی بے کم و کاست سنا دو' جب ان دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی نہ کی گئی۔ اس نے کہا "میں تجھے مار ڈالوں گا۔" اس نے جواب دیا "اللہ تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے)۔

یعنی ان لوگوں کو انسانوں کے ان دو نمونوں میں سے دونوں کی مثال پیش کرو' یعنی حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے ان واقعات کے بعد سچائی پر مبنی یہ دو نمونے ان کے سامنے رکھو۔ یہ قصہ اپنی روایت کے اعتبار سے بالکل سچا ہے اور یہ اس لحاظ سے بھی حق ہے کہ انسانی فطرت کے اندر یہ دو نمونے ہر زمان و مکان میں پائے جاتے ہیں۔ پھر یہ اس پہلو سے بھی حق ہے کہ یہ ایک منصفانہ نظام عدل کا تقاضا کرتا ہے جس سے شرپسند لوگ ارتکاب جرم سے باز آجائیں۔

حضرت آدم کے ان دو بیٹوں کے حالات ایسے تھے کہ ان میں کسی ایک کا قتل کے لئے آمادہ ہو جانا اپنے اندر کوئی جواز نہیں رکھتا۔ یہ دونوں اللہ کے مطیع فرمان ہیں۔ دونوں قربانی کرتے ہیں۔ (اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا (۵: ۲۷) (جب دونوں نے قربانی کی) لیکن ہوا یہ کہ ایک سے قبول کی گئی اور دوسرے سے قبول نہ ہوئی۔ (فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ (۵: ۲۷)۔

یہاں فتقبل میں فعل مجہول استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قربانی کا قبول کیا جانا یا نہ کیا جانا' ایک ایسا معاملہ ہے جو غیبی قوت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اس کی کیفیت بھی غیبی ہے۔ غائب کا صیغہ استعمال کرنے کے دو فائدے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمیں اس قبولیت اور عدم قبولیت کی کیفیت کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تفاسیر میں ان آیات کی تشریح میں بہت سے قصے بیان کئے گئے ہیں اور یہ قصے عہد نامہ قدیم سے لئے گئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس کی قربانی قبول ہوئی' اس نے کوئی جرم نہ کیا تھا کہ اس کے ساتھ عناد کیا جائے اور اس کے قتل کی سازش کی جائے' اس لئے کہ قربانی کی قبولیت میں اس کا کوئی دخل نہ تھا' بلکہ یہ قبولیت انسانی نقطہ نظر سے ایک غیبی قوت کی جانب سے ایک غیبی کیفیت کے مطابق ہوئی۔ یہ قوت ان دونوں کے ادراک سے وراء ہے اور اس کی مشیت بھی انسان کی مشیت سے وراء ہے۔ لہٰذا اس فعل پر اپنے بھائی کا گلا گھونٹنے کا اس کے پاس کوئی جواز نہ تھا یا یہ جواز بھی نہ تھا کہ بھائی کے قتل کے لئے کوئی جوش میں آجائے۔ اس معاملے میں قتل پر آمادہ ہو جانا کسی بھی سلیم الفطرت انسان سے مستبعد ہے کیونکہ معاملہ عبادت کا ہے اور قبولیت اور عدم قبولیت قوت غیبیہ کی طرف سے ہے جس میں کسی انسان کا کوئی داخل نہیں ہے۔

(قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ (۵:۲۷) (میں تجھے مار ڈالوں گا) نظر آتا ہے کہ قاتل اس فعل کے ارتکاب پر تلا ہوا تھا اس لئے اس نے نہایت ہی مؤکد صیغہ استعمال کیا ہے۔ قاتل یہاں جوش و خروش کا اظہار بغیر کسی معقول وجہ کے کر رہا ہے یعنی اس کا یہ غصہ بالکل بلاوجہ ہے۔ اس کی اگر کوئی وجہ ہے تو وہ اس کا خبیث ارادہ اور برا احساس ہے، جو حسد اور بغض سے بھرا ہوا شعور ہے جس کی نشوونما کسی پاک نفس میں نہیں ہوتی۔ قصے کے اس منظر میں پہلے ہی مرحلے میں ہم اپنے آپ کو ظلم کے سامنے پاتے ہیں۔ اگرچہ آیت مکمل نہیں ہوئی لیکن اس لفظ ہی سے ارتکاب جرم کے اشارے مل جاتے ہیں۔

اب بات آگے بڑھتی ہے اور اس ظلم کو مزید بھیانک شکل دے دی جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ دوسرا نمونہ قابل قبول ہے، پاک فطرت اور صلح کل ہے۔

(قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (۵:۲۷) (بے شک اللہ متقیوں کی نذر قبول کرتا ہے)

یہاں علی الاعلان بات کو اصلیت اور حقیقت کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے۔ ایمان پر بھروسہ کیا جاتا ہے جسے قبولیت حاصل ہوتی ہے اور نہایت ہی لطیف انداز میں ظالم کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ سے ڈرے اور اسے اس راہ کی طرف بلایا جاتا ہے جو قبولیت کی راہ ہے اس صورت حال کی طرف بھی لطیف اشارہ کر دیا جاتا ہے جو اس کے دل میں کھٹک رہی ہے اور اسے جوش دلاتی ہے اور بدی پر آمادہ کرتی ہے۔

اس کے بعد مومن بھائی، جو خدا ترس، صلح کل اور پرامن شخصیت ہے وہ اپنے شریر بھائی کے دل میں پائے جانے والی وحشیانہ شرپسندی کے جوش کو کس طرح کم کرنا چاہتا ہے۔

(لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِیَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (۵:۲۸) (اگر تو مجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں)۔

یوں امن، تقویٰ اور صلح کل کے نمونے کو مصور انداز میں یہاں پیش کر دیا جاتا ہے۔ یہ نمونہ ایک ایسے وقت میں پیش کیا جاتا ہے، جس میں ایک عام انسانی ضمیر بھی نہایت اشتعال میں آجاتا ہے اگرچہ وہ بہت ٹھنڈا ہو۔ ایسے حالات میں ہر غیر جانبدار انسان، ہر باضمیر انسان ظالم کے مقابلے میں اور مظلوم کے حق میں اٹھ جاتا ہے۔ ان حالات میں بھی یہ مظلوم، نہایت سنجیدہ، نہایت مطمئن ہے حالانکہ وہ کھلی جارحیت کے خطرے سے دوچار ہے لیکن اس کا دل رب العالمین کے خوف سے بھرا ہوا ہے، اس لئے وہ مطمئن ہے۔

یہ نرم اور دلنواز بات اس کے لئے کافی تھی کہ اس دشمنی کو دوستی میں بدل دے۔ حسد کو ٹھنڈا کرے، شر کا جوش کم کر دے، ہیجان زدہ اعصاب کو ٹھنڈا کر کے اس شخص کو بھائی چارے کی محبت کے اندر لے آئے اور اس کے دل میں تقویٰ کا احساس پیدا ہو جائے۔ ہاں یہ طرز عمل اس کے لئے بالکل کافی تھا لیکن یہ شخص باز نہیں آیا چنانچہ نیک بھائی اسے متنبہ کرتا ہے اور آخرت کے برے انجام سے اسے ڈراتا ہے۔

اِنِّىْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِىْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ (۵ : ۲۹) (میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے اور دوزخی بن کر رہے 'ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے)

اگر تم میری طرف قتل کے لئے ہاتھ بڑھاؤ تو میرا مزاج تو یہ نہیں ہے کہ میں یہی کام تمہارے ساتھ کروں۔ نہ یہ میری طبیعت ہے اس لئے کہ میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ میں اپنے بھائی کو قتل کر دوں۔ میرا ذہن ہی اس طرف نہیں جاتا۔ میں یہ کام اس لئے نہیں کرتا کہ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ یہ بات نہیں ہے کہ میں اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دے سکتا۔ اس لئے میں تمہیں چھوڑتا ہوں کہ تم اپنے سابقہ گناہوں کے ذخیرے میں جن کی وجہ سے تمہاری نذر ہی مسترد ہوئی' میرے قتل کے گناہ کا اضافہ بھی کر لے۔ اس طرح تمہارا گناہ بھی بڑھے گا اور پھر سزا بھی بڑھتی چلی جائے گی۔ ( وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ (۵: ۲۹) (ظالموں کا یہی انجام ہوتا ہے)۔

اس طرح اس صالح بھائی نے ظالم کے سامنے جرم قتل کے ارتکاب سے اپنے خوف کو مصور کر کے پیش کیا تاکہ یہ ظالم بھائی اس ظلم کے ارتکاب سے باز آجائے جس پر اس کا نفس اسے بار بار آمادہ کرتا ہے اور پھر اسے اس طرز عمل پر شرمندہ کر دے کہ ایک بھائی' صلح کل بھائی' خدا ترس بھائی کے خلاف وہ کس قدر بری طرح سوچ رکھتا ہے۔

اس خدا ترس بھائی نے ظالم کے سامنے جرم قتل کے بھیانک نتائج پیش کئے تاکہ وہ اس گناہ سے متنفر ہو جائے اور اسے دوچند سہ چند گناہ سے نکل آنے میں بہتری نظر آجائے اور وہ اللہ رب العالمین کا خوف اپنے دل کے اندر رکھے۔ اس سلسلے میں یہ خدا ترس بھائی اس مقام تک چلا جاتا ہے جہاں تک کوئی انسان نہیں جا سکتا اور اس سے آگے شر کے دفعیہ کے لئے اور کوئی صورت ہی نہیں رہتی۔

لیکن جب تک ہمیں معلوم نہ ہو کہ اس کا انجام کیا ہوا اُس شریر بھائی اور مفسد بھائی کی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی' اس انتہائی مثبت طرز عمل کا جواب وہ کیا دیتا ہے؟

(فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۵ : ۳۰) (آخر کار اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل اس کے لئے آسان کر دیا اور وہ اسے مار کر ان لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔)

ان تمام کوششوں کے باوجود' اس وعظ' اس نصیحت اور ڈراوے کے باوجود یہ شریر شخصیت جرم پر آمادہ ہو جاتی ہے اور جرم کا ارتکاب ہو جاتا ہے۔ اس کے نفس نے اس کے لئے تمام نتائج آسان کر دیئے۔ تمام رکاوٹیں دور کر دیں۔ قتل پر وہ آسانی سے آمادہ کر دیا گیا۔ اس نے قتل کر ہی دیا لیکن کسے؟ اپنے بھائی کو اور اب وہ خوفناک انجام کا مستحق ہے۔ (فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۵: ۳۰) (وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گیا)۔

اس نے اپنے نفس کا نقصان کیا۔ اسے ہلاکت میں ڈال دیا۔ وہ اپنے بھائی کا نقصان کر گیا' جو اس کا ناصر اور ساتھی تھا۔ اس نے دنیا کا نقصان اس طرح کیا کہ اس کی زندگی اس دنیا میں تلخ ہو گئی اور آخرت کا نقصان یوں ہو گا کہ آخرت

میں اپنے اس قتل کا بھی بدلہ بھگتے گا اور بعد میں آنے والے تمام قاتلوں کے گناہ میں بھی حصہ دار ہو گا۔

اب اس کے لئے اس کے جرم کو ایک نئی شکل میں لایا جاتا ہے۔ بھائی کا لاشہ پڑا ہے' روح نکل چکی ہے۔ گوشت کا ڈھیر ہے اور متعفن ہو رہا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو ناقابل برداشت ہے' ایک لاش ۔ اس کا گناہ اب لاش کی صورت میں ہے۔

اب اللہ کی مشیت یہ ہے کہ یہ ذات شریر اپنے کئے کے سامنے عاجز کھڑی ہو' سمجھ نہ آئے کہ اب اس لاش کے ساتھ کیا کرے۔ ابھی تو وہ قاتل' خونریز اور سخت گیر تھا۔ اور اب بے بس۔ سمجھ نہیں آتی کہ اس لاش کو کس طرح ٹھکانے لگائے' اب تو وہ ایک پرندے سے بھی عاجز ہے۔

(فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۭ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ (۵ : ۳۱) (پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تاکہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا "افسوس مجھ پر! میں اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر نکال لیتا۔" اس کے بعد وہ اپنے کئے پر بہت پچھتایا)۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک کوے نے دوسرے کو قتل کر دیا یا اس نے دوسرے کوے کی لاش کو پایا۔ یہ کوا زمین کھودنے لگا۔ اس کے بعد اس نے گڑھے میں ڈال کر اس پر مٹی ڈالنا شروع کیا۔ اس موقع پر اس قاتل نے افسوسناک انداز میں اپنی اس ندامت کا اظہار کیا اور پھر اپنے بھائی کی لاش کو دفن کر دیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قاتل نے اس سے قبل کسی کو دفن ہوتے نہ دیکھا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ضرور لاش کو دفن کر دیتا اور یہ ممکن ہے کہ اس زمین پر یہ پہلی میت ہو یعنی حضرت آدم کی اولاد میں سے۔ یا یہ کہ یہ قاتل نوجوان تھا اور اس نے اس سے قبل کسی کو میتوں کو دفناتے نہ دیکھا تھا۔ دونوں باتیں اپنی جگہ درست ہیں۔ نیز یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس قاتل کی ندامت ایک تائب کی ندامت نہ تھی ورنہ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتے بلکہ وہ نادم اس بات پر ہوا کہ اس کو اس فعل کا کوئی فائدہ نہ ہوا اور اس فعل کے بعد اس کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا' اس کی زندگی تلخ ہو گئی اور وہ نفسیاتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔

جس طرح کوے نے دوسرے کوے کی لاش کو دفن کیا' اس طرح اس نے بھی دفن کیا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ کوے ایسا کرتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قاتل کو سکھانے کے لئے ایک کوے کو بھیج دیا ہو اور یہ خارق عادت کام تھا جو اللہ نے کوے سے کروایا۔ یہ دونوں باتیں اللہ کے لئے برابر ہیں جو ذات باری زندہ انسانوں میں کمالات ودیعت کرتی ہے' وہ ذات اس پر بھی قادر ہے کہ وہ ان کمالات کا صدور کسی بھی زندہ چیز سے کرا دے۔ یہ دونوں امور اس کی قدرت میں ہیں۔

اس مسلسل قصے کو پڑھنے اور دیکھنے کے بعد ذہن انسانی پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں' قرآن یہاں ان کو ریکارڈ پر لاتا

ہے تاکہ ان کو ایک شعوری سوچ بنا دے اور اس سوچ کی اساس پر اگر کوئی شخص قتل کا ارتکاب کر بھی لے تو اس سے منصفانہ قصاص لیا جائے اور مجرم کو معلوم ہو کہ اگر اس نے جرم کیا تو قانون قصاص اس کے انتظار میں ہے۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ
قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ
جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ
رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِى الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾

(اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ "جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔" مگر ان کا حال یہ ہے کہ ہمارے رسول پے در پے ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات لے کر آئے پھر بھی ان میں بکثرت لوگ زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں)۔

اس وجہ سے 'یعنی انسانیت کے اندر ایسے لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے 'امن پسند' صلح کل' نیک فطرت اور پاک طینت لوگوں کے خلاف ایسے جرائم کے ارتکاب کی وجہ سے 'جو شر اور ظلم سے بہت دور بھاگتے ہیں' اور اس وجہ سے کہ بعض نہایت ہی فطری شرپسندوں پر وعظ و نصیحت اور ڈراوا کوئی اثر نہیں کرتا اور اس وجہ سے کہ اگر شر انسان کے رگ وپے میں سرایت کر جائے تو ایسے لوگوں کے ساتھ امن اور آشتی مفید مطلب نہیں ہوتی 'اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قتل نفس کو گناہ کبیرہ اور جرم عظیم قرار دیا۔ اسے اس قدر عظیم جرم قرار دیا کہ گویا اس مجرم نے تمام موجودہ انسانی نسل کو قتل کر دیا۔ پھر جس عمل کے ذریعے ایک شخص کی جان بچ جائے تو گویا اس شخص اور اس عمل نے تمام لوگوں کو زندگی بخش دی۔ یہ بات ہم نے بنی اسرائیل کے لئے شریعت لکھتے وقت مقرر کر دی تھی۔ (تفصیلات احکام قصاص میں آرہی ہیں)

کسی کے قصاص میں قتل کیے جانے کے علاوہ قتل کر دینا یا فساد فی الارض کو دور کرنے کے لئے کسی کے قتل کے علاوہ' قتل اس قدر عظیم جرم ہے جس طرح کوئی تمام انسانوں کو قتل کر دے۔ ہر نفس دوسرے نفس کے برابر ہے۔ زندگی کا حق ہر ایک نفس کو حاصل ہے۔ لہذا کسی ایک نفس کا قتل کرنا گویا تمام نفوس سے حق زندگی چھین لینے کے برابر ہے اس لئے کہ حق حیات میں تمام نفوس شریک ہیں۔ اسی طرح قتل سے تحفظ کا حق بھی تمام نفوس کو حاصل ہے اور زندگی کا بچانا سب کے لیے لازمی ہے۔ چاہے حالت زندگی میں دفاع کیا جائے یا مرنے کے بعد قصاص جاری کر کے زندگی کا دفاع کیا جائے تاکہ مجرم دوسرے نفوس پر دست درازی نہ کرے۔ اس طرح گویا قانون قصاص تمام زندہ

لوگوں کو زندگی دینے کا مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے۔ کیونکہ قانون قصاص سے زندہ رہنے کا حق فراہم ہوتا ہے جس میں تمام لوگ شریک ہیں۔

ان احکام کے سلسلے میں ہم نے جو تشریح کی ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف دارالاسلام کے باشندوں پر منطبق ہوتا ہے۔ مسلم ہوں' ذمی ہوں یا مستامن ہوں۔ رہے اہل حرب (وہ لوگ جن سے مسلم حکومت بر سر جنگ ہے) تو ان کا خون مباح ہے الا یہ کہ ان کے اور دارالاسلام کے باشندوں کے درمیان کوئی معاہدہ ہو جائے۔ اسی طرح ان کے مال اور جائیداد کو بھی تحفظ حاصل نہ ہو گا' اس لئے ہمیں اس قانونی اصول کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہئے۔ یہ بات بھی ہمیں ذہن نشین کرنا چاہئے کہ دارالاسلام وہ مملکت ہے جس میں اسلامی شریعت نافذ ہو' اور حکومت کے تمام ادارے اس کے مطابق چلتے ہوں اور دارالحرب وہ سرزمین ہے جس میں شریعت نافذ نہ ہو اور کاروبار مملکت میں شریعت کے احکام نہ مانے جاتے ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر یہ اصول فرض کر دیا تھا' اس لئے کہ یہ لوگ اس وقت اہل کتاب تھے۔ جب تک توراۃ کے مطابق وہ کاروبار حکومت چلاتے اس وقت تک وہ دارالاسلام تصور ہوتے بشرطیکہ وہ احکام شریعت تحریف شدہ نہ ہو۔ لیکن بنی اسرائیل نے ہمیشہ حدود شریعت سے تجاوز کیا حالانکہ ان کے رسول ان کے سامنے واضح طور پر شریعت کے احکام لے کر آئے تھے۔ خود رسول اللہ ؐ کے دور میں اور ان کے بعد کے ادوار میں بھی آج تک ان میں ایسے لوگ بکثرت ہیں جو ان کی شریعت توراۃ کی حدود سے تجاوز کرتے تھے۔ قرآن کریم ان کے اس اسراف' تجاوز اور دست درازی کو یہاں ریکارڈ کر رہا ہے جو بلاسبب تھی اور یہ بھی ریکارڈ پر لایا جاتا ہے کہ اللہ کے مقابلے میں اب ان کے پاس کوئی حجت نہیں ہے' اس لئے کہ ان کے پاس اللہ کے رسول آئے اور ان رسولوں نے شریعت کے احکام ان کے سامنے بیان کر دیئے تھے۔

(وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ؗ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ (۳۲) (مگر ان کا حال یہ ہے کہ ہمارے رسول پے در پے ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات لے کر آئے پھر بھی ان میں بکثرت لوگ زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں)

اور اس سے بڑا اسراف اور زیادتی اور کیا ہو گی کہ کوئی حدود اللہ سے تجاوز کرے اور اللہ کی شریعت پر دست درازی کرے۔ اس طرح کہ یا تو اس میں تغیر و تبدل کرے اور یا اس کو معطل چھوڑ دے۔

---ooo---

سابقہ آیت میں یہ کہا گیا تھا کہ کسی کی جان لینا فساد فی الارض کے ضمن میں آتا ہے اور قاتل اور مفسد دونوں کی زندگی کو تحفظ سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ اور یہ کہا گیا تھا کہ کسی کی ناحق جان لینا نہایت ہی گھناؤنا جرم ہے۔ اس لئے کہ دارالاسلام میں ایک مسلم سوسائٹی کا امن و امان' اور اس کی جانب سے بھلائی کے کاموں کو امن و امان اور سکون و اطمینان کے ساتھ سرانجام دینا بعینہٖ اسی طرح ضروری ہے جس طرح اسلامی مملکت میں افراد کا امن و سکون سے زندگی

گزارنا ضروری ہے۔ بلکہ اجتماعی امن کی ضرورت انفرادی امن سے زیادہ ہے اس لئے کہ افراد کو امن و سکون تب ہی نصیب ہوتا ہے جب سوسائٹی کو امن و سکون حاصل ہو۔ نیز یہ بات اس سے بھی اہم ہے کہ اس قسم کی اعلیٰ اور فاضلانہ سوسائٹی کا امن متاثر نہ ہو اور ایسی سوسائٹی کو ہر قسم کے امن اور استحکام کی ضمانت حاصل ہو۔ کیونکہ اس ضمانت سے اس قسم کی سوسائٹی میں افراد کو امن و سکون ملتا ہے اور وہ آزادی سے سرگرم رہ سکتے ہیں اور امن کے زیر سایہ ہی انسانی زندگی سکون کے ساتھ نشو و نما پاتی ہے۔ امن کی پر سکون فضا ہی میں ہر قسم کی بھلائی' اخلاق فاضلہ' پیداوار اور ترقی تسلسل کے ساتھ جاری رہ سکتی ہے۔ ایسی ہی سوسائٹی اپنے افراد کو ضروریات زندگی کی ضمانت بھی دے سکتی ہے اور امن ہی ایسا ماحول اور ایسی فضا فراہم کرتا ہے جس کے اندر بھلائی کے بیج بوئے جاتے ہیں اور نشو و نما پاتے ہیں۔ اور اسی میں برائی کے بیج ختم کئے جا سکتے ہیں۔ ایسی سوسائٹی کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ وہ بیماریوں کا علاج کرنے سے بھی پہلے حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق کام کرتی ہے اور جہاں حفظان صحت کے اصول کام نہ کر سکیں وہاں پھر یہ علاج کرتی ہے۔ یہ سوسائٹی ایک سلیم الفطرت شخص کے لئے کوئی ایسا موقع ہی باقی نہیں چھوڑتی جس میں وہ شر اور دست درازی پر آمادہ ہو' ایسے حالات کے اندر اور ایسی سوسائٹی کے اندر پھر بھی اگر کوئی امن و امان کو تباہ کرنے پر آمادہ ہوتا ہے تو سمجھو کہ وہ مادۂ خبیثہ ہے اور اسے بذریعہ آپریشن سوسائٹی کے وجود سے خارج کرنا ضروری ہے بشرطیکہ علاج کے دوسرے تمام طریقے ناکام ہو جائیں..... یہ ایسے ہی عناصر ہیں جن کے بارے میں اس آیت میں احکام آئے ہیں :

إِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۳۳ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۴

(جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کئے جائیں' یا سولی پر چڑھائے جائیں' یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں' یا وہ جلاوطن کر دیئے جائیں۔ یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لئے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لئے اس سے بڑی سزا ہے۔ مگر جو لوگ توبہ کر لیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ...... تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)

یہ جرم جس کے بارے میں یہ آیت آئی ہے اس کی حدود کیا ہیں؟ یعنی کسی مسلم سربراہ مملکت کے خلاف بغاوت کرنا' جو حکومت شریعت کے مطابق چلا رہا ہو۔ یہ خروج ایک جمعیت کی شکل میں ہو اور کوئی گروہ اس مملکت کے خلاف بغاوت پر اتر آیا ہو اور اس نے ایسی روش اختیار کر لی ہو جس سے دارالاسلام کے لوگوں کے اندر خوف و ہراس پیدا ہو اور اس گروہ کی جانب سے باشندگان دارالاسلام کو مالی' جانی اور عزت کے نقصان کے خطرات لاحق ہوں۔ بعض فقہاء نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ اس قسم کی واردات شہری علاقوں سے دور ہو جہاں مملکت کی انتظامیہ کی دسترس نہ ہو۔ بعض فقہاء نے یہ بھی شرط رکھی ہے کہ اس قسم کے باغیوں کے گروہ کا جمع ہو جانا اور درست درازی کا آغاز کرنا اور عملاً اگر نہ بھی ہو تو بالقوہ یہ پوزیشن اختیار کر لینا ہی اس آیت کے انطباق کے لئے کافی ہے چاہے یہ گروہ شہروں کے اندر ہو یا باہر ہو اور یہ آخری رائے عملاً زیادہ قریب الفہم ہے تاکہ باغیوں کو کیفرکردار تک پہنچایا جا سکے۔

یہ باغی وہ لوگ تصور ہوں گے' جو ایسے حاکم کے خلاف ہوں جو شریعت کے مطابق حکومت کر رہا ہو اور یہ باغی دارالاسلام کے ان باشندوں پر دست درازی کی پوزیشن میں ہوں' جن کے ہاں شریعت جاری ہو' (چاہے یہ لوگ ذمی ہوں' مسلمان ہوں یا مستامن ہوں)۔ یہ لوگ صرف حکم کے خلاف باغی نہ ہوں اور صرف لوگوں کے خلاف بغاوت نہ ہو' بلکہ اللہ اور رسول کے خلاف بھی بغاوت ہو۔ اللہ کی شریعت سے محاربت ہو اور ایک ایسی سوسائٹی کے ساتھ محاربت ہو جو اس شریعت کی اساس پر قائم کی گئی ہو۔ نیز ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے دارالاسلام کو خطرہ لاحق ہو گیا ہو' ان کی یہ جنگ اللہ اور رسول اللہ ؐ کے خلاف تصور ہو گی۔ یہ جنگ شریعت کے خلاف تصور ہو گی اور اس مملکت کے خلاف تصور ہو گی جو شریعت کا نفاذ کر رہی ہوتی ہے۔ ان لوگوں کا یہ فعل فساد فی الارض تصور ہو گا اس لئے کہ اللہ کی شریعت کو معطل کرنے سے بڑا فساد اس دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس سے زیادہ بڑا فساد کوئی ہو سکتا ہے کہ دارالاسلام کے وجود کو خطرہ لاحق ہو جائے۔

یہ لوگ چونکہ اللہ اور رسول اللہ ؐ سے محاربت کرتے ہیں' اگرچہ بظاہر وہ جماعت مسلمہ' اسلامی سوسائٹی اور اس کے سربراہ کے خلاف برسرپیکار ہوتے ہیں' وہ اللہ تعالیٰ کے خلاف تو تلوار اٹھا ہی نہیں سکتے' اور نہ ہی رسول اللہ ؐ کی ذات کے خلاف تلوار اٹھا سکتے ہیں' جبکہ آپ اس دنیا سے اٹھ چکے ہیں۔ لیکن اگر کوئی جنگ اللہ کی شریعت کے خلاف ہو تو گویا وہ جنگ اللہ اور رسول کے خلاف ہو رہی ہے۔ یہ جنگ اس سوسائٹی کے خلاف تصور ہو گی جس نے اللہ اور رسول کی شریعت کو اپنایا ہے اور اس علاقے کے خلاف ہو گی جس میں یہ شریعت نافذ ہو رہی ہو۔

اس آیت کا ایک اور مفہوم بھی درج بالا مفہوم کے مطابق یہاں متعین ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ جس سربراہ مملکت کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق باغیوں کے خلاف آیت میں درج سزائیں دینے کا اختیار ہے وہ وہی سربراہ مملکت ہے جو اسلامی شریعت کے مطابق سربراہ بنا ہو اور جو شریعت کا نافذ کنندہ ہو۔ ایسے بادشاہ کے علاوہ کسی اور بادشاہ یا سربراہ مملکت کو ایسے اختیارات نہ ہوں گے۔

اس بات کی ہم فیصلہ کن وضاحت اس لئے کر رہے ہیں کہ حکومتوں کے بعض پٹھو جو ہر حکومت کو دستیاب ہو جاتے ہیں' وہ بعض حکومتوں کے لئے ایسی سزاؤں کے اختیارات ثابت کرتے ہیں' جو شریعت کی نافذ کنندہ نہیں ہوتیں حالانکہ وہ حکومتیں اپنے علاقے میں دارالاسلام قائم نہیں کرتیں اگرچہ وہ سمجھتی ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ ایسے پٹھوؤں نے ہمیشہ ان

حکومتوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ان حکومتوں کے خلاف اٹھنے والوں کو یہ قرآنی سزائیں دیں' اور انہیں اللہ کی شریعت کے عنوان سے نافذ کریں' حالانکہ ان لادین حکومتوں کے ارکان اللہ اور رسول کے باغی ہوتے ہیں بلکہ وہ ایسی حکومتوں کے ارکان ہوتے ہیں جو اللہ اور رسول کی باغی ہوتی ہیں۔

غرض اگر کوئی حکومت دارالاسلام میں اسلامی شریعت کی اساس پر قائم نہ ہو' تو اسے اپنے باغیوں پر وہ سزائیں نافذ کرنے کا شرعی اختیار نہیں ہے۔ ایسی لادین حکومتوں کا شریعت کے ساتھ تعلق ہی کیا ہوتا ہے؟ یہ حکومت ایسی ہوتی ہے جنہوں نے اللہ کے حق الوہیت اور حق حاکمیت پر دست درازی کی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کا قانون شریعت کے ساتھ تعلق ہی کیا رہتا ہے؟

ایسے باغی دستوں کے لئے یہ سزائیں تب ہوں گی جب وہ اسلامی خلیفہ کے خلاف بغاوت کریں اور وہ خلیفہ اسلامی شریعت کا نافذ کنندہ اور حامی ہو۔ یہ لوگ دارالاسلام کے باشندوں کے لئے خطرہ ہوں' ان کی جان' مال اور آبرو ان سے محفوظ نہ ہو' تو تب ان کو قتل کیا جانا جائز اور فرض ہو گا اور ان کو سزائے موت دی جا سکے گی۔ بعض فقہاء نے یہ کہا ہے کہ قتل کرنے کے بعد لاشوں کو لٹکا دیا جائے گا تاکہ وہ دوسروں کے لئے نمونہ عبرت ہوں اور یہ کہ ان کے ہاتھ کاٹے جائیں یعنی دائیں ہاتھ کے ساتھ بایاں پاؤں اور بائیں ہاتھ کے ساتھ دایاں پاؤں۔ ( مِّنْ خِلَافٍ ) کا مفہوم یہ ہے۔

اس آیت کے بارے میں فقہاء کے درمیان بہت ہی وسیع اختلاف رائے واقعہ ہوا ہے۔ کیا امام کو اختیار ہے کہ باغیوں کو وہ ان سزاؤں میں سے جو چاہے سزا دے' یا یہ کہ ان جرائم میں سے ہر جرم کی الگ سزا ہے۔

امام ابو حنیفہ' امام شافعی اور امام احمد سے مروی ہے کہ یہ سزائیں ان جرائم کے مطابق دی جائیں گی جو ان باغیوں سے صادر ہوئے۔ اگر کوئی شخص صرف قتل کا ارتکاب کرے اور لوٹ میں حصہ نہ لے تو اسے صرف قتل کیا جائے گا۔ جس شخص نے لوٹ میں حصہ لیا مگر قتل کا ارتکاب نہ کیا تو اسے قطع ید کی سزا دی جائے گی۔ جس نے قتل اور لوٹ دونوں میں حصہ لیا تو اسے قتل اور لٹکانے دونوں کی سزا دی جائے گی۔ اور جس شخص نے محض خوف و ہراس پھیلایا مگر نہ قتل کیا اور نہ مال کی لوٹ میں حصہ لیا تو اسے ملک بدری کی سزا دی جائے گی۔

امام مالک سے روایت ہے کہ باغی نے اگر قتل کا ارتکاب کیا تو اسے لازماً سزائے موت دی جائے گی اور امام وقت کو یہ اختیار نہ ہو گا کہ وہ اسے قطع ید یا ملک بدری کی سزا دے' البتہ اسے یہ اختیار ہے کہ اسے قتل کرا دے یا سولی پر لٹکا دے۔ اسی طرح اگر اس نے قتل کا ارتکاب نہ کیا ہو تو اسے ملک بدری کا اختیار نہ ہو گا۔ امام کو اختیار اس میں ہے کہ وہ قتل کرے یا سولی پر لٹکائے' یا اگر قطع اعضاء کا فیصلہ کرے تو اعضائے مخالفہ میں سے جو بھی اختیار کرے۔ اگر مجرموں سے یہ ڈر ہو' کہ انہوں نے راستوں کو پر خطر بنا دیا ہے تو امام کو اختیار ہے کہ انہیں قتل کرے یا سولی پر چڑھائے یا ہاتھ کاٹ دے یا ملک بدری کی سزا دے اور اختیار تمیزی کا مفہوم امام مالک کے نزدیک یہ ہے کہ معاملہ امام کے اجتہاد پر موقوف ہے۔ اگر باغی صاحب الرائے آدمی ہو اور بغاوت کی تدبیر کر سکتا ہو تو اجتہاد کا تقاضا یہ ہو گا کہ اسے قتل کر دیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے کیونکہ محض قطع ید سے اس کی مضرت دفع نہ ہو سکے گی۔ اگر وہ باغی صاحب رائے نہ ہو محض ایک قوی اور بہادر شخص ہو تو اسے صرف قطع ید من خلاف کی سزا دی جائے گی اور اگر اس میں یہ دونوں صفات کسی قدر پائی

جاتی ہوں تو اسے ملک بدری اور تعزیری سزا دی جائے گی۔ (التشریع الجنائی الاسلامی 'عبد القادر عودہ)۔

ہمارے خیال میں امام مالک کی رائے زیادہ موزوں ہے کہ سزا کبھی تو محض بغاوت اور محاربہ پر یا قطع الطریق کے خطرے اور راستوں کو پرخطر بنانے پر ہوتی ہے اور یہ سزا محض امتناعی (Preventive) ہوتی ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ جرائم کا ارتکاب نہ ہو اور ان لوگوں کو ڈرانا مقصود ہو جو دارالاسلام کے امن و امان کو تباہ کرتے ہیں اور وہ اس سوسائٹی کو خوفزدہ کرتے ہوں جو دارالاسلام میں اسلامی شریعت کی اساس پر قائم ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ سوسائٹی اور دارالاسلام کا علاقہ اس بات کا سب سے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کے اندر امن و اطمینان قائم ہو۔

اسی طرح فقہاء کے اندر ملک بدری کے مفہوم کے اندر بھی اختلاف واقع ہوا ہے۔ کیا ملک بدری صرف اس علاقے سے ہوگی جس میں جرم کا ارتکاب ہوا ہے یا اسے اس علاقے سے ملک بدر کر دیا جائے گا جس میں اسے پھرنے کی اجازت ہوتی ہے اور یہ مقصد قید سے پورا ہو سکتا ہے یا یہ کہ اسے پورے کرۂ ارض سے رخصت کر دیا جائے اور یہ تو سزائے موت ہی سے ممکن ہے..... میں سمجھتا ہوں کہ یہی مفہوم اقرب ہے کہ اس مجرم کو اس سرزمین سے باہر نکالا جائے گا جس کے اندر اس نے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اسے اس قدر دور پھینک دیا جائے گا کہ وہ وہاں اپنے آپ کو غریب الوطن سمجھے۔ وہ دھتکارا ہوا اور کمزور ہو اور یہ اس کے اس جرم کی پوری سزا ہے کہ اس نے لوگوں کو پریشاں کیا' خوفزدہ کیا اور اپنی قوت کے بل بوتے پر لوگوں پر دست درازی کی۔ یہ ملک بدری اس طرح ہو کہ وہ جہاں جائے وہاں جرم سے باز آ جائے اور اس کا جتھا بھی وہاں نہ ہو یا وہ اپنے جتھے سے دور ہو جائے۔

(ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۵:۳۳) "یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لئے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لئے اس سے بڑی سزا ہے۔

اس دنیا میں انہیں جو سزا ملے گی' اس سے ان کی سزائے آخرت ساقط نہ ہو جائے گی اور آخرت میں وہ گناہ کی اس گندگی سے پاک نہ ہوں گے' جس طرح بعض دوسرے حدود کے اندر انسان کو سزا ہو جائے تو وہ آخرت کے لیے پاک ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اس سزا میں سختی کرنے کا ایک پہلو ہے اور اس سے اس جرم کو مزید گھناؤنا ظاہر کرنا مقصود ہے۔ یہ اس لئے کہ دارالاسلام میں اسلامی سوسائٹی اس بات کی مستحق ہے کہ وہ پرامن زندگی بسر کرے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جو حکومت اسلامی شریعت کے مطابق قائم ہوتی ہے اس کا لوگوں پر یہ حق ہے کہ لوگ اس کے احکام کو تسلیم کریں۔ اسلامی نظام حکومت کا ماحول ایک بھلائی کا ماحول ہوتا ہے اور وہ اس بات کا مستحق ہوتا ہے کہ اسے پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کئے جائیں نیز اسلامی نظام زندگی ایک ایسا عادلانہ اور مکمل نظام ہے جس کی حفاظت مسلمانوں پر واجب ہوتی ہے۔

اب یہ باغی اگر اپنی گمراہی کو ترک کر دیں اور فساد کو چھوڑ دیں اور وہ اپنے اس جرم کو برا اور منکر سمجھ کر باز آ جائیں اور صدق دل سے تائب ہو کر راہ راست پر آ جائیں اگرچہ وہ اب بھی ایسی پوزیشن میں ہوں کہ وہ اپنی مہم کو جاری رکھ سکتے ہوں اور اسلامی مملکت ان پر ہاتھ ڈال سکتی ہو' تو ان کا جرم اور اس کی سزا دونوں معاف تصور ہوں گے۔ اب حکومت کے لئے جائز نہ ہوگا کہ توبہ کرنے والے لوگوں پر ہاتھ ڈال دے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ غفور و رحیم ہے' اس لئے حساب آخرت میں بھی انہیں معاف کر دے گا۔

(اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

(۵ : ۳٤) "مگر جو لوگ توبہ کرلیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ ..... تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

توبہ کرنے والوں کی سزا اور جرم معاف کرنے میں جو حکمت پوشیدہ ہے وہ بالکل واضح ہے اور اس کے دو پہلو ہیں۔ پہلا یہ کہ ان کی توبہ کی حوصلہ افزائی کی جائے' جبکہ وہ پرقوت تھے' بغاوت جاری رکھ سکتے تھے اور یہ ان کی جانب سے اصلاح پذیری اور ہدایت پر آجانے کی قوی دلیل ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہو گا انہیں دیکھ کر اس قسم کے دوسرے لوگ بھی توبہ کرنے اور راہ راست پر آنے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے۔ اس طرح جنگ و جدل اور مقابلے کے ذریعے انہیں مغلوب کرنے کے بجائے آسان طریقوں سے انہیں راہ راست پر لے آنا ممکن ہو جائے گا۔

اسلامی نظام زندگی انسان کی اصلاح کے لئے اس کے تمام جذبات' میلانات' اور تمام ذرائع اور احتمالات کو کام میں لاتا ہے اور یہ ایک ایسا نظام ہے جو خود انسانی مزاج اور فطرت کے بنانے والے نے بنایا ہے۔ وہ ذات انسانی ذات کے نشیب و فراز سے خوب واقف ہے۔ وہ ذات جانتی ہے کہ انسان کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے اور کس ذریعے سے ہو سکتی ہے۔ کیا وہ ذات نہیں جانتی جس نے انسان کو پیدا کیا ہے' وہ تو لطیف و خبیر ہے۔ (اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ)

---ooo---

اسلامی نظام زندگی لوگوں پر صرف اسلامی قانون نافذ نہیں کرتا۔ وہ قانون کی تلوار اٹھا کر لوگوں پر اس طرح مسلط کرتا ہے کہ وہ ڈر کر دوبارہ جرم کا ارتکاب نہ کریں۔ سزا صرف ان لوگوں کو دی جاتی ہے جو ڈنڈے کے بغیر کسی صورت میں بھی اصلاح کی راہ پر نہیں آتے۔ اسلام سب سے پہلے لوگوں کی قلبی تربیت پر زور دیتا ہے۔ لوگوں کے مزاج کو درست کیا جاتا ہے اور ان کی روح کو راہ اصلاح پر لایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسے معاشرے اور ایک ایسی سوسائٹی کا قیام بھی ضروری ہے جس کے اندر اصلاح' نیکی اور بھلائی کے بیج بار آور ہو سکیں۔ یہ بیج اسی زمین میں بار آور ہو سکتے ہیں جس کے اندر سے گندے پودوں اور جڑی بوٹیوں کو ختم کر دیا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی اقدامات کرتے ہی' اصلاح روح اور تقوائے دل کی طرف آجاتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں روحانیت اور خدا ترسی پیدا کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لیے اور اصلاح کی راہ اختیار کرنے کے لیے دوسرے وسائل بھی اختیار کئے جائیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا سب سے بڑا وسیلہ اصلاح ہے۔ اسلامی سوسائٹی کو کفر کے انجام سے ڈرایا جاتا ہے اور آخرت کے عذاب کی ایسی تصویر کشی کی جاتی ہے جو نہایت ہی خوفناک ہوتی ہے اور ہر شخص اس کو دیکھ کر عبرت پکڑ سکتا ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ

وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۳۵﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُمْ
مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ
الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۳۶﴾ يُرِيدُونَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنَ
النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُقِيمٌ ﴿۳۷﴾

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے ڈرو اور اس کی جناب میں باریابی کا ذریعہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو' شاید کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو جائے۔ خوب جان لو کہ جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے اگر ان کے قبضے میں ساری زمین کی دولت ہو اور اتنی ہی اور اس کے ساتھ اور وہ چاہیں کہ اسے فدیہ میں دے کر روز قیامت کے عذاب سے بچ جائیں' تب بھی وہ ان سے قبول نہ کی جائے گی اور انہیں دردناک سزا مل کر رہے گی۔ وہ چاہیں گے کہ دوزخ کی آگ سے نکل بھاگیں مگر نہ نکل سکیں گے اور انہیں قائم رہنے والا عذاب دیا جائے گا)۔

اسلامی نظام زندگی نفس انسانی کی اصلاح کے لیے ہر ذریعہ استعمال کرتا ہے اور اسے ہر پہلو سے گھیرتا ہے۔ اسلامی نظام انسانی شخصیت کے باطن کی اصلاح بھی ضروری سمجھتا ہے۔ وہ تمام ذرائع استعمال کر کے اسے اللہ کی اطاعت پر آمادہ کرتا ہے اور معصیت کردگار سے روکتا ہے۔ اسلامی نظام زندگی کا مقصد اولیں اصلاح فرد ہے اور ایک فرد کو ہر قسم کے انحراف سے بچانا مطلوب ہے۔ اور سزا دہی کا نظام بھی ایک فرد بشر کی اصلاح ہی کا ایک ذریعہ ہے۔ سزا دہی اصل مقصد ہے ہی نہیں۔

ذرا اس سبق پر غور کیجئے کہ یہ حضرت آدم کے دو بیٹوں کے واقعہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس سبق میں جابجا اشارات ہیں۔ اس کے بعد اس میں سزا کا اعلان کیا جاتا ہے تاکہ دلوں کو اس کی طرف جانے سے روکا جائے۔ پھر خدا خوفی کی دعوت دی جاتی ہے اور خدا کے عذاب آخرت سے ڈرایا جاتا ہے اور سزا کی اس خوفناک تصویر کشی کے ساتھ ساتھ کہا جاتا ہے۔

(يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ (۵:۳۵) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے ڈرو)

یعنی مناسب یہی ہے کہ اصل خوف اللہ کا خوف ہے' اور انسان جو اکرم المخلوقات ہے' اس کے شایان شان بھی یہ ہے کہ وہ خدا سے ڈرے۔ کوڑے اور تلوار اور ڈنڈے سے ڈرنا تو ایک گرا ہوا مقام ہے اور ڈنڈے کے ذریعے اصلاح کی تو صرف ان لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے جو لوگ گرے ہوئے ہوتے ہیں۔ خدا ترسی تو ایک بہتر' پاکیزہ تر اور شریفانہ مقام ہے۔ پھر خدا ترسی ایک ایسا چوکیدار ہے جو دلوں میں بیٹھا ہوتا ہے جو اعلانیہ اور خفیہ دونوں حالتوں میں سر پر بیٹھا ہوتا ہے۔

جن حالات میں انسان لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ اس وقت بھی تقویٰ اس کا نگران ہوتا ہے۔ ایسے معاملات میں صرف تقویٰ ہی بدی اور شر سے روکتا ہے' جن میں انسان قانون کی گرفت سے دور ہوتا ہے۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھنے کے لائق ہے کہ تقویٰ کے بغیر قانون کی گرفت ڈھیلی ہوتی ہے' کیونکہ جو مجرم قانون کی گرفت سے بچ نکلتے ہیں ان کی تعداد ان لوگوں سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے جو قانون کی گرفت میں آ جاتے ہیں۔ جو معاشرہ صرف قانون پر قائم ہوتا ہے اس میں نہ کسی فرد کی اصلاح ہوتی ہے اور نہ اس معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے۔ قانون کے پیچھے ایک پوشیدہ چوکیدار کا ہونا ضروری ہے اور یہ چوکیدار صرف خدا خوفی کا چوکیدار ہوتا ہے جو ہر دل میں بوجہ خدا ترسی اور تقویٰ بیٹھا ہوتا ہے۔

( وَ ابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ (۵: ۳۵) (اور اس کی جناب میں باریابی کا ذریعہ تلاش کرو)۔

اللہ سے ڈرو اور اس تک جانے کا وسیلہ تلاش کرو' اور ان اسباب کی تلاش کرو جو تمہیں اللہ کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ حضرت ابن عباس سے ایک روایت ہے' وَابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ (۵: ۳۵) (یعنی اس سے اپنی حاجات طلب کرو) کا مطلب یہ ہے کہ انسان جب اللہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور پھر اپنی حاجات اللہ سے طلب کرتے ہیں تو وہ اس وقت بندگی کی صحیح پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ اس وقت اللہ کی ربوبیت پر انہیں پورا پورا یقین ہو جاتا ہے اور ایسے حالات میں وہ اصلاح اور فلاح دونوں کے قریب تر پہنچ جاتے ہیں۔ یہ دونوں تفسیریں اس آیت کے الفاظ کے ساتھ لگا کھاتی ہیں۔ دونوں کے ذریعے دل کی دنیا کی اصلاح' ضمیر اور روح کی زندگی اور وہ فلاح اخروی حاصل ہوتی ہے جو ہمارا نصب العین ہے۔

( وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۵: ۳۵) (اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو' شاید کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو جائے)

اس کے مقابلے میں کفار کا منظر آتا ہے' جو اللہ سے نہیں ڈرتے اور جو اللہ تک پہنچنے کے لیے ذریعے کی تلاش نہیں کرتے۔ اور آخرت میں کامیاب نہیں ہوتے۔ یہ زندہ اور متحرک منظر ہے' نظروں کے بالکل سامنے۔ قرآن اس آیت کے بیان میں بیانیہ اور احکام قانون کا انداز اختیار نہیں کرتا بلکہ ان کے بارے میں حرکات اور تاثرات پیش کیے جاتے ہیں۔ شاید قیامت کے بیان میں قرآن کریم کا یہ ایک خاص اسلوب ہے اور اس سے بیان کے تمام اغراض و مقاصد حاصل ہو جاتے ہیں۔

(اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لِیَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۳۶) یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنْهَا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ (۳۷)

"خوب جان لو کہ جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے 'اگر ان کے قبضے میں ساری زمین کی دولت ہو اور اتنی ہی اور اس کے ساتھ 'اور وہ چاہیں کہ اسے فدیہ میں دے کر روز قیامت کے عذاب سے بچ جائیں 'تب بھی وہ ان سے قبول نہ کی جائے گی اور انہیں دردناک سزا مل کر رہے گی ۔ وہ چاہیں گے کہ دوزخ کی آگ سے نکل بھاگیں مگر نہ نکل سکیں گے اور انہیں قائم رہنے والا عذاب دیا جائے گا)

بطور فرض انسان جو تصور کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ اہل کفر کے پاس زمین کے تمام خزانے ہوں اور اسی قدر مزید ان کے لیے فرض کیا جا سکتا ہے ۔ قرآن کریم ان کے لیے یہ بھی فرض کرتا ہے کہ اس جہان جیسا ایک دوسرا جہان بھی ان کے پاس ہو ۔ اس کے بعد قرآن کریم یہ فرض کرتا ہے کہ یہ لوگ قیامت کے دن یہ تمام مفروضہ دولت بطور فدیہ اور کفارۂ کفر دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں ۔ قرآن کریم ایک ایسا منظر نظروں کے سامنے لاتا ہے کہ وہ آگ سے کس طرح نکلنا چاہتے ہیں مگر وہ نکل نہیں سکتے ۔ وہ اپنے اس مقصد اور ہدف میں ناکام رہتے ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ میں زندہ رہتے ہیں ۔

یہ ایک ایسا منظر ہے جس کے اندر کئی مناظر ہیں اور جس میں کئی مسلسل حرکات ہیں ۔ ایک منظر کفار کا ہے ۔ وہ اپنے پاس اس پورے جہان کی دولت لیے ہوئے ہیں پھر اچانک یہ دولت دوگنی ہو جاتی ہے ۔ پھر وہ اس دولت کو لے کر اسے بطور فدیہ دینے کی پیشکش کرتے ہیں ۔ پھر ان کا یہ منظر سامنے آتا ہے کہ وہ یہ مقصد حاصل کرنے میں ناکام لوٹتے ہیں اب انہیں یہ مقصد حاصل کرنے کی کوئی آس بھی نہیں رہتی ۔ پھر وہ اچانک آگ میں داخل ہوتے ہیں اور وہ اس سے باہر بھاگنا چاہتے ہیں مگر بھاگ نہیں سکتے ۔ پھر ان کو مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ وہاں باقی رہیں ۔ اب پردہ گرتا ہے اور وہ یہاں ہی فروکش ہو جاتے ہیں ۔ (دیکھئے کتاب التصویر الفنی میں فصل طریقۃ القرآن)

اور اب اس سبق کے آخر میں چوروں کے احکام :

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا
نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ
وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۹﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ
اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ
لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۰﴾

(اور چور خواہ عورت ہو یا مرد دونوں کے ہاتھ کاٹ دو 'یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرتناک

سزا۔ اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔ پھر جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کر لے تو اللہ کی نظر عنایت پھر اس پر مائل ہو جائے گی' اللہ بہت درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اللہ زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک ہے؟ جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے' وہ ہر چیز کا اختیار رکھتا ہے۔

اسلامی معاشرہ' باشندگان دارالاسلام کے لیے ایک ایسا ماحول فراہم کرتا ہے جس میں کوئی معتدل شخص چوری کے بارے میں سوچ ہی نہ سکے' چاہے ان باشندوں کے عقائد و نظریات جو بھی ہوں۔ اسلامی معاشرہ اپنے باشندوں کو معاشی کفالت' اخلاقی تربیت اور درست طرز عمل اختیار کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔ نیز انصاف اور دولت کی منصفانہ تقسیم کا انتظام کرتا ہے اور وہ یہ انتظام بھی کرتا ہے کہ اس کے اندر انفرادی ملکیت کی شکل ایسی ہو کہ وہ پوری سوسائٹی کے لیے نفع بخش ہو اور وہ معاشرے کے لیے باعث اذیت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے حالات پیدا کر دینے کے بعد بھی اگر کوئی چوری کرتا ہے تو اسلام اسے سخت ترین سزا دیتا ہے۔ اسی طرح انفرادی ملکیت پر دست درازی کرنے والے اور سوسائٹی کا امن و امان تباہ کرنے والے کو عبرت ناک سزا دیتا ہے۔ ان سخت ترین سزاؤں کی تجویز کے ساتھ ساتھ اسلام شبہات کی بنا پر حدود کو ساقط بھی کرتا ہے اور ملزم کو مکمل قانونی دفاع کا اختیار اور حق عطا کرتا ہے تاکہ کسی شخص کو مکمل ثبوت کے بغیر سزا نہ دی جا سکے۔ اب مناسب ہے کہ اس اجمال کے بعد قدرے تفصیلی بحث کر دی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام ایک باہم مربوط کل ہے۔ اس نظام کے کسی ایک جزء کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کسی کے پیش نظر وہ تمام اصولی مباحث نہ ہوں اور وہ ضمانتیں نہ ہوں جو یہ نظام اسلامی معاشرے کو فراہم کرتا ہے اور جن اصولوں اور قواعد پر اس کی جزئیات قائم ہیں۔ پھر اسلامی نظام کا ایک ایک جزء نافذ بھی نہیں ہو سکتا جب تک اسے مکمل طور پر نافذ نہ کیا جائے' اور اسے مجموعی طور پر روبعمل نہ لایا جائے۔ رہی یہ صورت کہ اس نظام کے کسی ایک جزء کو نافذ کرنا یا اس کے اصولوں میں سے کسی ایک اصول کو نافذ کرنا اور یہ نفاذ ایک ایسے معاشرے اور ایک ایسے نظام کے اندر کرنا جو مجموعی طور پر اسلامی نظام نہیں ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔

اسلام سے کٹا ہوا یہ جزء بھی اسلام کا نفاذ تصور نہ ہو گا' اس لیے کہ اسلام' اسلام کے اجزاء اور ٹکڑوں کا نام نہیں ہے۔ اسلام ایک ایسا نظام ہے جو تمام شعبہ ہائے حیات پر حاوی ہے اور اس کے احکام باہم مربوط ہیں..... یہ تو ایک عمومی بات تھی۔

رہی یہ بات کہ چوری کے قانون اسلامی کے بارے میں بات قدرے مختلف ہے تو حقیقت یہ ہے کہ دارالاسلام میں اسلام ہر فرد کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ زندہ رہے' اور اپنی زندگی کے حفظ اور بقاء کے لیے تمام وسائل سے کام لے۔ ہر شخص کھا پی سکتا ہے' ہر شخص کو مکان اور لباس کا حق ہے جہاں وہ آرام اور سکون سے رات گزارے۔ ایک فرد کا اسلامی سوسائٹی پر یہ حق ہے کہ وہ اسے اس کی یہ بنیادی ضروریات فراہم کرے اور ظاہر ہے کہ ایک حکومت پوری سوسائٹی کی طرف سے نمائندہ ہوتی ہے۔ یہ حق اس طرح فراہم ہو گا کہ حکومت ان تمام لوگوں کو روزگار فراہم کرے جو کام کرنے کے قابل ہوں۔ یہ حق ایک فرد کا سوسائٹی پر ہے اور پھر حکومت پر ہے۔ یہ سوسائٹی اور حکومت لوگوں کو کام کرنے کی تربیت بھی دے گی اور لوگوں کو کام کرنے کے مواقع اور کام کے اوزار بھی فراہم کرے گی۔ اگر کوئی بے روزگار ہو جاتا ہے اس طرح کہ اسے کام نہیں ملتا' یا کام کے اوزار نہیں ملتے' یا وہ محنت کے قابل نہیں رہتا اور یہ بیکاری جزئی ہے یا

کل ہے، وقتی ہے یا دائمی ہے، یا صورت یہ ہے کہ وہ کام تو کرتا ہے لیکن یہ کام اس کی ضروریات کے لیے کافی نہیں ہے تو اس فرد کا یہ حق ہے کہ وہ اجتماعی نظام یا سوسائٹی اس فرد کو یہ ضروریات خزانہ سے فراہم کرے یا ان لوگوں کے ذریعے فراہم کرائے جن پر ایسے افراد کا نفقہ فرض ہے۔ اہل محلہ سے ایسے لوگوں کی ضروریات فراہم کرائے ورنہ جیسا کہ کہا گیا بیت المال اور خزانہ سے فراہم کرے۔ بیت المال کی ایک مد زکوۃ تو ہے ہی اس کے لیے۔ اگر زکوۃ فنڈ سے بھی پورا نہ ہو تو پھر پورے دارالاسلام پر اس سلسلے میں ٹیکس عائد ہو سکتا ہے جس کے ذریعے غرباء کو اس قدر دیا جائے کہ ان کی ضروریات پوری ہوں۔ لیکن یہ ٹیکس بھی غرباء کی ضرورت کے مطابق ہی عائد ہو اور ضرورت سے زیادہ نہ ہو اور ایسی انفرادی ملکیت پر ظلم نہ ہو جو بالکل حلال ذرائع سے کمائی گئی ہو۔

پھر اسلام دولت کے ارتکاز پر بھی سخت پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اسلامی نظام میں انفرادی دولت صرف حلال ذرائع سے جمع کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں انفرادی ملکیت کو بغض و حسد کا سامنا کرنا نہیں پڑتا یعنی ان لوگوں کی طرف سے جو نادار ہیں۔ اسی طرح اسلامی معاشرے میں کوئی شخص دوسرے کی جائیداد چھین لینے کے بارے میں بھی نہیں سوچتا خصوصاً اس وقت جب اسلامی نظام ان کے لیے بقدر کفایت انتظام کرتا ہے اور ان کو بالکل محروم نہیں چھوڑتا۔

اسلام لوگوں کے ضمیر اور ان کے اخلاق کی تربیت پر بھی زور دیتا ہے۔ اس لیے اسلام لوگوں کو کسب و عمل پر آمادہ کرتا ہے اور یہ کسب و عمل اسلامی طریقے کے مطابق چاہتا ہے۔ اگر عمل اور روزگار نہ ملے تو اسلامی نظام لوگوں کی ضروریات کی فراہمی کا انتظام کرتا ہے، اور پاک و صاف ذرائع سے ان کی کفالت کرتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایسے معاشرے اور ایسے حالات میں ایک شخص اگر چوری کرتا ہے تو کیوں کرتا ہے؟ یہ شخص ضروریات کے لیے چوری نہیں کرتا بلکہ یہ دولت جمع کرنے کے لیے چوری کرتا ہے۔ یہ دولت وہ کسب اور محنت کے ذریعہ جمع نہیں کرنا چاہتا بلکہ چوری کے ذریعہ دولت جمع کرنے کی خواہش کرتا ہے جس سے پورے دارالاسلام کے امن و امان اور اطمینان کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ اسلامی سوسائٹی کا یہ حق ہے کہ وہ امن و سکون سے جاری و ساری رہے لیکن یہ چوری کا فعل ایک حلال مال کے مالک کو اپنے حق اطمینان سے محروم کر دیتا ہے اور پھر پوری سوسائٹی کو بھی۔

اسلامی معاشرے میں جو شخص حلال دولت کماتا ہے، سود خوری نہیں کرتا، دھوکہ دہی نہیں کرتا، ذخیرہ اندوزی نہیں کرتا، مزدوروں کی مزدوری نہیں مارتا، زکوۃ ادا کرتا ہے، اور اسلامی معاشرے کو وہ ٹیکس بھی ادا کرتا ہے جس کی اس معاشرے کو ضرورت ہو تو ایسے شخص کا بھی اسلامی معاشرے اور دارالاسلام پر یہ حق ہے کہ اس کا مال محفوظ ہو اور اس کی یہ دولت چوری اور ڈاکے سے محفوظ رہے۔

ایسے تمام حالات اور سہولتوں کے بعد بھی اگر کوئی چوری کرتا ہے، وہ اس حال میں چوری کرتا ہے کہ اس کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں، اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ چوری ایک سنگین جرم ہے اور اسے دوسروں کا مال لوٹنے کی ضرورت اور احتیاج بھی نہیں ہے اور ان مالداروں نے نہ لوٹ مار کے ذریعہ یہ مال جمع کیا ہے اور نہ حرام ذرائع سے جمع کیا ہے۔ اگر کوئی ایسے حالات میں سرقے کا ارتکاب کرتا ہے تو یہ سرقہ بلاجواز ہے۔ ایسے حالات میں کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے۔ وہ ایسے شخص پر رحم کرے بشرطیکہ اس پر جرم ثابت ہو جائے۔

اگر حالات مقدمہ ایسے ہوں کہ جن میں یہ ثابت ہو جائے کہ چور ضرورت مند تھا' یا کوئی اور عذر تھا تو اسلامی قانون کا عام اصول یہی ہے کہ حدود شبہات کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہیں - یہی وجہ ہے کہ قحط سالی کے سال میں حضرت عمرؓ نے قطع ید کی سزا کو موقوف فرمایا تھا - اس موقعہ پر حالات ایسے تھے کہ لوگ بالعموم بھوکے ہوتے تھے - اسی طرح حضرت عمرؓ نے ایک خاص حادثے میں بھی سزائے قطع ید نہ دی تھی - حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں نے مزینہ کے ایک شخص کی اونٹنی چوری کر لی تھی - حضرت عمرؓ نے ان کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تھا' لیکن جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ ان غلاموں کا مالک ان کو بھوکا رکھتا ہے تو آپ نے حد کی سزا ساقط کر دی اور غلاموں کے مالک پر اونٹنی کی قیمت سے دوگنا قیمت بطور تاوان عائد کر دیا -

مناسب یہ ہے کہ ہم اسلامی حدود کو اس انداز سے سمجھنے کی کوشش کریں اور انہیں اسلام کے مکمل اور مربوط نظام کی شکل و صورت میں سمجھیں جو افراد معاشرہ کو زندگی کی ضمانتیں فراہم کرتا ہے - یہ ضمانتیں کسی ایک طبقے کو دوسرے طبقے کے خلاف نہیں فراہم کرتا بلکہ اسلام سزا کے اسباب فراہم کرنے سے پہلے سزا سے بچانے کے اسباب فراہم کرتا ہے - اسلام صرف ان لوگوں کو سزا دیتا ہے جو بلاجواز جرم کا ارتکاب کرتے ہیں -

اس عمومی حقیقت کے اظہار کے بعد اب ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ حد سرقہ کی تفصیلات دی جائیں - سرقہ کی تعریف یہ ہے کہ دوسرے کا مال خفیہ طور پر لیا جائے جو مال حرز کے اندر ہو - یہ بھی ضروری ہے کہ مال متقوم ہو یعنی مالیت رکھتا ہو - مال کے نصاب کے سلسلے میں فقہاء کے درمیان متفق علیہ بات یہ ہے کہ جو مال لیا گیا ہو اور خفیہ طور پر حرز کے اندر سے لیا گیا ہو' اس کی مقدار ۱/۴ ۱ دینار کے برابر ہونا چاہیے - یعنی ہمارے دور کے ۲۵ مصری قرش کے برابر - یہ نہایت ہی ضروری ہے کہ یہ مال حرز کے اندر ہو اور چور اسے حرز کے اندر سے لے لے - اور وہ لے کر حرز سے نکل جائے - اب اگر کوئی کسی کے پاس مالی امانت رکھتا ہے اور وہ اسے چوری کر لیتا ہے تو اس پر حد سرقہ نہ ہوگی - اسی طرح جو شخص ملازم ہے اور وہ گھر یا دکان و گودام میں آتا جاتا ہے تو بھی اس پر حد سرقہ جاری نہ ہوگی - اس طرح اگر کوئی کسی سے کوئی چیز مانگ کر لے جاتا ہے اور پھر انکار کر دیتا ہے اور اس سے برآمد ہو جاتی ہے تو بھی اس پر حد سرقہ جاری نہ ہوگی - نیز ان پھلوں پر بھی حد سرقہ نہ ہوگی جب تک کھلیان میں انہیں جمع نہ کر لیا جائے - نہ ایسے مال پر یہ حد ہوگی جو گھر سے باہر ہو یا اس صندوق سے باہر ہو جو اس کی حفاظت کے لیے بنایا گیا ہو - یہ بھی ضروری ہے کہ یہ مال محفوظ کسی دوسرے شخص کی ملکیت میں ہو' اس لیے اگر کوئی شریک چوری کر لے تو اس پر حد سرقہ نہ ہوگی - اس لیے کہ اس میں وہ خود بھی شریک ہے اور وہ خالص طور پر دوسرے کا نہیں ہے - اسی طرح اگر کوئی سرکاری مال چرائے یعنی دارالاسلام کے خزانے سے تو اسے بھی قطع ید کی سزا نہ ہوگی کیونکہ اس مال میں اس کا بھی حصہ ہے اور وہ خالص مال الغیر نہیں ہے - ایسے حالات میں سزا قطع ید نہ ہوگی بلکہ تعزیری سزا ہوگی (یاد رہے کہ تعزیری سزا سزائے حد سے کم ہوتی ہے' مثلاً کوڑے' قید' ڈانٹ ڈپٹ اور وعظ و نصیحت بھی اور یہ سزا ظرف احوال کے مطابق قاضی کے اختیار تمیزی پر ہوگی) -

''قطع ید'' دائیں ہاتھ کا ہوگا یعنی کلائی تک اگر دوبارہ چوری کرے تو بایاں پاؤں ٹخنے تک کاٹا جائے گا - یہاں تک تو تمام لوگوں کا اتفاق ہے تیسری اور چوتھی بار چوری کرنے کی صورت میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے -

شبہات کی وجہ سے حدود معاف ہو جاتی ہیں - حد سرقہ میں شبہات درج ذیل ہو سکتے ہیں' مثلاً بھوک اور شدید

ضرورت کی وجہ سے حد ساقط ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر مال میں شرکت کا شبہ ہو تو بھی حد ساقط ہو گی' اگر کسی نے اعتراف کیا ہو اور باقی شہادت نہ ہو تو بھی اعتراف جرم سے رجوع کرتے ہی حد ساقط تصور ہو گی۔ اسی طرح اگر کسی نے شہادت دی ہو لیکن بعد میں وہ شہادت سے پھر جائے تو یہ بھی ایک طرح کا شبہ ہو گا۔

اور فقہاء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کیا چیز ہے جسے شبہ تصور کیا جائے گا۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ جو چیز مباح ہو اصلاً تو اس میں قطع ید کی سزا نہ ہو گی اگرچہ وہ حرز اور حفاظت میں ہو۔ مثلاً ایک شخص کسی کے حرز سے پانی چوری کرتا ہے یا مثلاً ایک شخص شکار کرے اور اسے محفوظ کر لے اور دوسرا اسے چرا لے۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جو اپنی اصلیت کے اعتبار سے سب کے لیے مباح ہیں اور جو چیز اصلیت کے اعتبار سے سب کے لئے مباح ہے اس میں یہ شبہ لاحق ہو سکتا ہے کہ حرز اور حفاظت میں آنے کے بعد بھی اباحت جاری ہو۔ اسی طرح عوام الناس کی مشترکہ دولت اگرچہ کسی خاص شخص کے حرز اور حفاظت میں آ جائے' اس میں بھی شبہ لاحق ہو سکتا ہے کہ وہ اب بھی مفاد عامہ کی چیز ہے۔ جبکہ امام شافعی' امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ ایسے حالات میں شبہ کے قائل نہیں ہیں اور حد کو ساقط نہیں کرتے۔ امام ابو حنیفہ ان تمام چیزوں کی چوری میں حد ساقط فرماتے ہیں جن میں گلنے سڑنے کا عمل تیزی سے آتا ہے مثلاً کھانا' پھل' سبزیاں' گوشت' روٹی اور ان جیسی دوسری اشیاء۔ ہاں امام ابو یوسف' امام ابو حنیفہ سے اختلاف کرتے ہیں۔ اور وہ ان میں قطع ید کے قائل ہیں جس طرح ائمہ ثلاثہ قائل ہیں۔

یہاں ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم فقہاء کے اختلافات میں تفصیل سے بحث کریں' یہ تفصیلات کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ چند مثالیں اس بات کے اظہار کے لئے کافی ہیں کہ اسلامی قانون کی پالیسی یہ نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ سزا نافذ کرے بلکہ اسلام شبہات کی وجہ سے حدود کو ساقط کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ حضور ؐ فرماتے ہیں۔ (ادروا الحدود بالشبہات) (حدود کی سزاؤں کو شبہات کی وجہ سے ساقط کر دو) اور حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ شبہات کی وجہ سے حدود کو معطل کر دوں بہ نسبت اس کے کہ میں ایسے حالات میں حدود کو نافذ کروں۔

لیکن قطع ید کے بارے میں مناسب ہے کہ ذرا تفصیلی بات ہو جائے' یہ بات تو ہم کہہ چکے ہیں کہ دارالاسلام میں' ملزم کے بچاؤ اور اسے پورے پورے عدالتی تحفظات دینے کے بعد چور کے ساتھ سختی کیوں کی گئی ہے۔ یہاں مناسب ہے کہ ہم جناب عبدالقادر عودہ کی مشہور کتاب سے کچھ اقتباسات دے دیں۔

"سارق کے لئے قطع ید کی سزا اس لئے تجویز کی گئی ہے کہ چور جب چوری کرتا ہے تو اس کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کی کمائی حاصل کر کے اپنی کمائی میں اضافہ کرے۔ وہ خود حلال طریقے سے جو کماتا ہے اسے ناکافی تصور کرتا ہے۔ اس طرح وہ حرام طریقے سے اپنی کمائی بڑھانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے عمل اور کسب کے نتائج پر اکتفا نہیں کرتا' اور دوسرے کی کمائی ہتھیانے کا لالچ کرتا ہے۔ اور اس کام کے پس پشت وہ یہ خواہش رکھتا ہے کہ اس طرح وہ زیادہ خرچ کرے یا زیادہ دولتمندی کا مظاہرہ کرے یا یہ جذبہ ہوتا ہے کہ وہ کام کرنے اور مشقت کرنے سے بچ جائے یا اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اس کا مستقبل محفوظ ہو جائے۔ غرض چوری پر مائل کرنے کا عامل صرف یہ ہوتا ہے جو اوپر ہم نے بیان کیا یعنی

زیادہ کمائی اور دولتمندی۔ اسلامی شریعت نے ان کی نفسیات کے اندر اس بیماری کا علاج اس طرح شروع کر دیا کہ اس نے اس جرم کے لئے قطع ید کی سزا تجویز کی۔ اس قطع ید یا قطع پا سے اس شخص کی کمائی پر اثر پڑے گا اس لئے کہ ہاتھ اور پاؤں دونوں کمائی کے آلات ہیں۔ اب کمائی کم ہو گی تو دولت کم ہو گی اور دولت کم ہو گی تو زیادہ انفاق اور زیادہ دولتمندی کا اظہار بھی کم ہو گا۔ اس کی وجہ سے اب ایسے شخص کو زیادہ محنت کرنے کی ضرورت پڑے گی اور وہ زیادہ وقت کے لئے کام کرے گا اور اسے اپنے پورے مستقبل سے ہاتھ دھونے کا خطرہ درپیش ہو گا۔"

"اس طرح شریعت نے قطع ید کی سزا مقرر کر کے ان نفسیاتی عوامل کو ختم کر دیا جو اس جرم پہ کسی کو آمادہ کرتے ہیں اور مجرم کی نفسیات کے اندر اس جرم پر آمادہ کرنے کے مخالف نفسیاتی عوامل داخل کر دیئے۔ تاہم اگر پھر بھی کسی کی نفسیات میں پائے جانے والے چوری پر آمادہ کنندہ عوامل غالب آ جائیں اور انسان یہ جرم کر بیٹھے تو اس صورت میں اسے جو تلخ سزا ملے گی وہ ان مؤثرات پر غالب آ جائے گی جو اسے چوری پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ہرگز دوبارہ اس جرم کے ارتکاب کے لئے آمادہ ہو گا۔"

"یہی وہ بنیاد ہے جس پر اسلامی نظام قانون میں قطع ید کی سزا رکھی گئی ہے۔ اور یہ خدا کی قسم 'آغاز انسانیت سے لے کر آج تک اس جرم کے لئے بہترین سزا ہے۔"

"دور جدید کے قوانین چور کو سزائے قید دیتے ہیں۔ یہ وہ سزا ہے جو ہر قسم کے جرائم کو ختم کرنے میں بالکل ناکام رہی ہے اور خصوصاً چوری کی سزا کو یہ ختم نہیں کر سکی۔ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ سزائے قید چور کی نفسیات کے اندر وہ عوامل داخل نہیں کر سکتی جو اسے اس جرم سے باز رکھے اس لئے کہ یہ سزا چور کو صرف اسی عرصہ میں جرم سے باز رکھ سکتی ہے جس عرصے کے لئے وہ قید میں ہوتا ہے۔ جب وہ قید ہوتا ہے تو اسے کمانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی' اس لئے کہ جیل کے اندر اس کی تمام ضروریات و حاجات کا انتظام ہوتا ہے اور جب وہ جیل سے نکلتا ہے تو وہ کمانے اور محنت کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ اس کو از سرنو موقعہ مل جاتا ہے کہ وہ اپنی کمائی میں اضافہ کرے۔ اپنی دولت کو بڑھائے۔ اور اس میں حلال اور حرام دونوں ذرائع استعمال کرے۔ وہ پھر لوگوں کو دھوکہ دے سکے' اپنے آپ کو شریف ظاہر کر سکے' لوگ اس کی طرف سے مطمئن ہو جائیں اور اس کے ساتھ تعاون کریں۔ اگر وہ اچھا رویہ اختیار کرے جو اسے کرنا چاہئے تو وہ ایسا کرے گا۔ اور اگر وہ اپنے مقاصد حاصل نہ کر سکے تو اس کو کوئی نقصان بھی نہیں ہوا ہے اور وہ بڑی سہولت سے دوبارہ برے راستے پر جا سکتا ہے۔"

"رہی یہ صورت کہ اسے قطع ید کی سزا دے دی جائے تو وہ دوبارہ کسب و عمل پر سرے سے قادر ہی نہ ہو گا یا اس کی کسب و عمل کی صلاحیت بڑی حد تک کم ہو جائے گی اور اس طرح اس کی زیادہ کمائی کے مواقع بہرحال کم ہوں گے۔ بعض اوقات تو یہ مواقع بہت ہی محدود ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات بالکل ختم ہو جاتے ہیں۔ اب وہ لوگوں کو دھوکہ بھی نہ دے سکے گا اور وہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ نہ کر سکے گا کہ وہ اس پر کوئی اعتبار اور اعتماد کریں۔ اس لئے کہ اس کے جسم پر جرم کے آثار موجود ہوں گے۔ اس کا سابقہ کردار اس کے کٹے ہوئے ہاتھ سے عیاں ہو گا۔ اگر قطع ید کی سزا نافذ ہو تو اس صورت میں چور کے لئے خسارہ یقینی اور حتمی ہو گا۔ اگر اسے سزائے قید دی جائے تو اسے فائدہ زیادہ ہو گا اور نقصان کم۔ اور چور ہی کا نہیں بلکہ تمام لوگوں کا یہ اصول ہے کہ وہ اسی طرف جھکتے ہیں جس میں نفع کا احتمال

زیادہ ہو۔ اور ایسا کام وہ ہرگز نہیں کرتے جس میں خسارہ یقینی ہو۔"

"اس بحث کے بعد ان لوگوں کی باتیں نہایت ہی عجیب ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ سزائے قطع ید آج کل کے ترقی یافتہ دور اور مہذب دنیا کے ساتھ لگا نہیں کھاتی۔ گویا تہذیب و تمدن اس چیز کا نام ہے کہ جدید علم اور گہری حکمت کا انکار کر دیا جائے۔ انسان کے مزاج کو بھلا دیا جائے اور تمام اگلی پچھلی امتوں کے تجربات سے انکار کر دیا جائے۔ ہم اپنی عقل کو یک دم معطل کر دیں' اور ہماری فکر واضح طور پر جن نتائج تک پہنچ چکی ہے اسے ترک کر دیں' اور ان باتوں کو لے لیں جن کے قائل کے پاس ان پر بے راہ روی اور گمراہی کے سوا اور کوئی دلیل نہیں ہے۔"

"اگر تہذیب و تمدن کا تقاضا یہ ہے کہ جو بھی سزا ہو وہ تہذیب و تمدن کے مطابق ہو تو پھر سزائے قید اس بات کی مستحق ہے کہ اسے سرے سے ختم کر دیا جائے اور سزائے قطع ید کو نافذ کر دیا جائے۔ اس لئے کہ سزائے قطع ید نفسیاتی محرکات اور علم النفس کے مسلمہ اصولوں کے عین مطابق ہے۔ یہ انسان کے مزاج کے عین مطابق اور تمام اقوام عالم کے تجربات کی روشنی میں بھی نہایت ہی مفید ہے۔ یعنی تمام چیزوں کا ادراک اور ان کی حکمت۔ تہذیب و تمدن بھی اسی اصول ادراک اور اصول حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ رہی سزائے قید تو وہ ہرگز علم النفس' حکمت و تجربہ پر قائم نہیں ہے اور نہ یہ عقلی منطق اور دنیا کی مخلوقات کے مزاج سے متفق ہے۔

"سزائے قطع ید کی بنیاد انسان کی نفسیات اور اس کی عقلمندی پر ہے۔ یہ سزا افراد کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ یہ معاشرے اور سوسائٹی کے لئے بھی مفید ہے۔ اس کی وجہ سے جرائم میں ایک دم کمی آجاتی ہے۔ معاشرے میں امن قائم ہو جاتا ہے۔ جب ایک سزا ایک فرد کے لئے مناسب اور ایک سوسائٹی کے لئے مفید ہو تو وہ تمام سزاؤں سے زیادہ بہتر ہوتی ہے۔"

"لیکن یہ سب دلائل بھی بعض لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتے کہ سزائے قطع ید مفید ہے۔ ان کی رائے پر ان کے پاس صرف یہ دلیل ہے کہ یہ سنگدلانہ سزا ہے۔ یہ ان کی اول اور آخر دلیل ہے اور ان کی یہ دلیل اس طرح قابل رد ہے کہ لفظ عقوبت (سزا) عقاب کے مشتق ہے۔ اور سزا اس وقت سزا ہی نہیں رہتی اگر وہ نرم اور محض تفریح ہو' بلکہ وہ محض ایک کھیل تماشا یا اس جیسی کوئی اور چیز ہو گی۔ لہذا سزا ہونی ہی ایسی چاہئے جس میں مجرم پر سختی ہو تاکہ سزا کو سزا کہا جا سکے۔"

اللہ تعالیٰ تو ارحم الراحمین ہے۔ اللہ کا فرمان یہ ہے اور بہت ہی سخت فرمان ہے۔

(فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ (۵:۳۸) (اور چور خواہ عورت ہو یا مرد دونوں کے ہاتھ کاٹ دو' یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا)۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبرتناک اور جرائم سے روکنے والی سزا ہے۔ جس شخص کے دل میں ارتکاب جرم کا داعیہ ہو اور وہ اس سے رک جائے تو یہ اس پر اللہ کی رحمت ہو جاتی ہے۔ یہ رحمت ربانی اسے روکتی ہے' اور پھر یہ پوری سوسائٹی پر ایک قسم کی رحمت ربانی ہوتی ہے کہ اس سے جرم کم ہوتا ہے اور وہ مطمئن زندگی بسر کرتی ہے۔ کسی کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے خالق سے بھی زیادہ ان پر مہربان ہے الا یہ کہ کوئی دلی طور پر اندھا ہو' اور اس کی روح مسخ ہو چکی ہو اور یہ امر واقعہ ہے کہ اسلام کے دور اول میں ایک صدی گزر جانے کے باوجود صرف چند لوگوں کا

ہاتھ کٹا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی نظام حیات کی برکات اور اسلامی سوسائٹی میں لوگوں کی ضروریات کی کفالت کی وجہ سے صرف چند لوگوں پر ہی اس سزا کا اجراء ہوا۔

پھر اللہ تعالیٰ تائب ہونے والوں کے لئے بھی دروازہ کھلا چھوڑتے ہیں کہ اگر وہ تائب ہو جائیں اور شرمندہ ہو جائیں اور ارتکاب جرم سے باز آجائیں تو اللہ بھی معاف کرنے والا ہے بشرطیکہ وہ صرف توبہ ہی نہ کریں بلکہ اپنے اندر مثبت تبدیلی پیدا کریں اور نیک کام شروع کر دیں۔

(فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

(۳۹) (اور وہ دانا و بینا ہے پھر جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کر لے تو اللہ کی نظر عنایت پھر اس پر مائل ہو جائے گی' اللہ بہت درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)

ظلم ایک منفی عمل ہے اور اس سے زمین میں فساد پھیلتا ہے' اس لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ ایک شخص ظلم سے باز آجائے اور بیٹھ جائے بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس ظلم کے بدلے وہ مثبت نیکیاں بھی کرے بلکہ اسلامی نظام میں معاملہ اس سے بھی زیادہ گہرا ہے۔ نفس انسانی تو ہروقت متحرک رہتا ہے۔ اگر وہ شروفساد سے باز آجائے اور بھلائی میں شروع نہ ہو' بھلائی کے لئے جدوجہد نہ کرے تو یہ نفس خلا کا شکار ہو گا اور اس بات کا امکان رہتا ہے کہ انسان دوبارہ شروفساد کی طرف مڑ جائے۔ لیکن جب یہ نفس خیراور بھلائی کی سمت میں حرکت شروع کر دے گا تو یہ شروفساد سے مزید دور ہوتا چلا جائے گا اور اس کی واپسی کا کوئی امکان نہ رہے گا۔ یہ عدم امکان محض ایجابیت اور عدم خلا کی وجہ سے ہو گا۔ اس نظام تربیت کے مطابق' جو ذات تربیت دیتی ہے وہ ذات وہی ہے جو خالق ہے اور جانتی ہے کہ اسے اپنی مخلوق کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہئے۔

جرم و سزا کے تذکرے اور توبہ اور مغفرت کے بیان کے بعد اب قرآن کریم وہ اصول اور قاعدے کا بیان کرتا ہے جس کے مطابق اس دنیا اور آخرت میں جزاء و سزا کا نظام جاری کیا گیا ہے۔ اس جہان کا خالق و مالک اللہ ہے اور وہ سزا و جزا کے لئے جو نظام تجویز کرے یہ اس کی مشیت ہے جو بے قید ہے۔ وہ کلی اختیارات کا مالک ہے' وہی ہے جو اس کائنات کے انجام اور اس میں بسنے والوں کے انجام کا فیصلہ کرتا ہے۔ وہی ہے جو اس مخلوقات کے لئے قانون سازی کرتا ہے اور پھر ان کے اعمال پر اس دنیا اور آخرت میں جزا و سزا کا فیصلہ کرتا ہے۔

(اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۴۰) (کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اللہ زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک ہے؟ جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے' وہ ہر چیز کا اختیار رکھتا ہے۔

اللہ کی حکمرانی ایک ہے' وہ مالک الملک ہے' وہی ہے جو اس دنیا کے لئے قانون بناتا ہے اور آخرت میں پھر اس قانون کے مطابق جزا و سزا مقرر کرتا ہے۔ ان معاملات میں نہ تعدد ہے' نہ کوئی تقسیم ہے اور نہ یہ معاملات ایک دوسرے

سے جدا ہیں۔لوگوں کے معاملات اس وقت تک درست نہیں ہو سکتے جب تک حق قانون سازی اور نظام جزا و سزا دنیا اور آخرت دونوں میں ایک ہی ذات باری میں مرتکز نہ کر دیا جائے۔اس لئے کہ اگر اس کائنات میں صرف اللہ اللہ نہ ہوتا اور متعدد الٰہ ہوتے تو یہ کب کی تباہ ہو چکی ہوتی۔پس وہی ہے جو آسمانوں میں بھی الٰہ ہے اور زمین میں الٰہ۔

---○○○---

# درس نمبر ۹۴ ایک نظر میں

اس سبق میں اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام حیات کا نہایت ہی اہم مسئلہ لیا گیا ہے۔ اس پر اسلامی نظام حکومت اور اسلامی زندگی کا دارومدار ہے۔ سورۂ آل عمران اور سورۂ نساء میں بھی اس مسئلے کا بار بار ذکر ہوا ہے لیکن یہاں اس سبق میں اسے نہایت ہی واضح اور قطعی شکل میں لے لیا گیا ہے۔ یہاں اس مسئلے کو اشارۃ النص یا مفہوم آیت کے طور پر نہیں لیا گیا نہ بطور اقتضاء النص لیا گیا۔ یہاں اسے عبارۃ النص اور قطعی الدلالت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

یہ مسئلہ نظام حکومت، قانونی نظام اور عدالتی نظام سے متعلق ہے اور اس کی اساس پر مسئلہ توحید، مسئلہ حاکمیت الہیہ اور ایک شخص کے ایمان کے ہونے نہ ہونے کا دارومدار ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہمارا نظام حکومت، ہمارا قانونی نظام اور ہمارا نظام عدالت آیا اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہو گا، شریعت کے مطابق ہو گا اور ان شرائع کے مطابق ہو گا جو ادیان سماوی میں محفوظ رہی ہیں۔ سابقہ رسل اور اس رسول آخر الزماں کی شریعت کے مطابق ہو گا یا ہماری خواہشات، بدلتی ہوئی خواہشات یا ہمارے مصالح اور بدلتے ہوئے مصالح کے مطابق ہو گا جو اللہ کی شریعت کے مطابق نہیں ہیں یا صرف کسی دور یا کسی نسل کے رسم ورواج کے مطابق متغیر اور متبدل ہوتا رہے گا۔ آیا لوگوں کی زندگی اور اس کرۂ ارض پر حاکمیت، ربوبیت اور قیومیت اللہ کی ہو گی یا اس میں سے بعض چیزیں اللہ کی اور بعض دوسرے لوگوں کی ہوں گی؟

اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی اور الہ نہیں ہے۔ اس نے لوگوں کے لئے ایک شریعت نازل کی ہے اور یہ شریعت اور قانون اس کی حاکمیت کے مطابق ہے۔ اس نے لوگوں سے یہ عہد لیا ہے کہ وہ اللہ کی شریعت پر قائم رہیں گے اور اس کرۂ ارض پر یہی شریعت حاکم رہے گی۔ اور لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اسی شریعت کے مطابق اپنی عدالتیں چلائیں اور انبیاء کا بھی فرض ہے کہ وہ اس کے مطابق کام کریں۔ انبیاء کے بعد حکام کا فرض بھی یہی ہے کہ وہ اس کے مطابق فیصلے کریں۔

اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اس مسئلے میں کوئی چھوٹ اور کوئی خود مختاری نہیں ہے۔ اس مسئلے میں زندگی کے معاملات میں سے چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں انحراف ناقابل برداشت ہے۔ اگر کوئی پوری نسل کسی بھی دور میں کوئی قانون اس کے مقابلے میں وضع کرے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ نہ کسی قبیلے یا کسی قوم کا کوئی اصول اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت رکھتا ہے الا یہ کہ اللہ نے کسی چیز کا اذن دے دیا ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہاں سوال یا تو ایمان وکفر کا ہے یا اسلام اور جاہلیت کا یا شریعت ہو گی یا نفسانیت۔ اس معاملے

میں نہ کوئی بین بین مقام ہے' نہ نرمی ہے اور نہ مصالحت ہے۔ مومنین وہی لوگ ہیں جو اللہ کے قانون کے مطابق حکم کرتے ہیں۔ اس سے ذرہ برابر انحراف نہیں کرتے اور اس میں ایک حرف کی تبدیلی نہیں کرتے۔ ظالم' فاسق اور کافر وہ لوگ ہیں جو اس معاملے میں انحراف کر کے فیصلے اللہ کے قانون شریعت کے مطابق نہیں کرتے۔ حکمران اگر اللہ کی شریعت کے مطابق حکمران ہوں گے تو وہ دائرہ ایمان میں داخل ہوں گے یا وہ کسی دوسرے آئین و دستور و قانون پر چلتے ہوں گے جس کی اجازت اللہ نے نہ دی ہو گی تو وہ کافر' فاسق اور ظالم ہوں گے۔ لوگوں کے لئے دو ہی راستے ہیں' یا تو وہ حکام اور ججوں کی جانب سے اللہ کے قانون کے مطابق جاری کردہ فیصلے قبول کریں گے اور اپنی زندگی کے تمام امور میں ایسا کریں گے تو وہ مومن ہوں گے اور اگر وہ یہ راہ اختیار نہ کریں گے تو وہ مومن نہ ہوں گے۔ ان دو راستوں کے درمیان کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔ نہ اس معاملے میں کوئی حجت بازی کام دے گی' نہ کوئی معذرت قبول ہو گی' نہ کوئی مصلحت قبول ہو گی۔ اللہ تعالیٰ بہرحال لوگوں کا رب ہے اور وہی جانتا ہے کہ لوگوں کی مصلحت کس میں ہے؟ اللہ تو لوگوں کی حقیقی بہبود کے لئے قانون سازی کرتا ہے لہٰذا اللہ کی شریعت اور اللہ کے احکام سے کوئی قانون اور کوئی آرڈر بہتر نہیں ہو سکتا۔ اللہ کے بندوں میں سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اللہ کی شریعت کو تسلیم نہیں کرتا۔ یا یہ کہ وہ اللہ سے زیادہ لوگوں کی مصلحت کے بارے میں جانتا ہے۔ اگر کوئی اپنی زبان اور اپنے عمل سے ایسا کہے تو وہ دائرہ ایمان سے خارج تصور ہو گا۔

یہ ہے وہ عظیم مسئلہ جو اس سبق میں فیصلہ کن انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس سبق میں یہودیوں کے حالات بھی بیان کئے گئے ہیں جو مدینہ کے ارد گرد پھیلے ہوئے تھے جو منافقین کے ساتھ مل کر اسلام کے خلاف سازشیں کر رہے تھے اور داؤ پیچ لڑا رہے تھے۔

مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ (۵ : ۴۱) (ان لوگوں سے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ ان کے دل ایمان نہ لائے تھے) اس میں وہ حالات بھی بیان کئے گئے ہیں جن کے مطابق حضور اکرم ؐ ان سازشوں کا مقابلہ کر رہے تھے اور جن سے یہودی حضور اکرم ؐ کے زمانہ سے آج تک باز نہیں آئے۔

اس سبق میں قرآن کی عبارتوں سے کئی باتیں نکلتی ہیں۔ پہلا فیصلہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام ادیان جو اللہ کی جانب سے نازل ہوئے ان میں تمام فیصلے اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ہوتے رہے۔ ان کے اندر زندگی کا پورا نظام اللہ کی شریعت پر قائم ہوتا رہا۔ یہ بات اسلام اور کفر کے اندر حد فاصل رہی' اسلام اور جاہلیت کے اندر فرق و امتیاز کی بنیاد رہی اور شریعت اور ہوائے نفس کے درمیان جدائی کی اساس رہی کہ کون شریعت کے مطابق فیصلے کراتا ہے اور کون نہیں کراتا ہے۔ توراۃ کو بھی اللہ نے اس لئے نازل فرمایا کہ اس میں ہدایت اور نور تھا۔

(يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ (۵ : ۴۴))

(سارے نبی جو مسلم تھے 'اسی کے مطابق ان یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے اور اسی طرح ربانی اور احبار بھی ۔ (اسی پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے )کیونکہ انہیں کتاب کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے ) اور دوسری جگہ ہے ۔ (وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ (۵:۴۳)) (اور ان کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا حکم ہے) اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ۔ ( وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ) (اور ہم نے اس میں ان پر یہ فرض کر دیا کہ جان کے بدلے جان ہوگی ) اور حضرت ابن مریم عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل دی گئی ۔

(مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰتِ وَهُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (۴۶) وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ (۴۷)(۵:۴۶-۴۷)) (اور وہ تورات میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا اس کی تصدیق کرنے والی تھی اور خدا ترس لوگوں کے لئے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی ۔ ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون کے مطابق فیصلے کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے) ۔پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی پر قرآن کریم نازل فرمایا۔

(بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (۵:۴۸)) (سچائی کے ساتھ ' اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ اور نگہبان ہے ) اور نبی آخرالزماں کو حکم دیا گیا :

(فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ (۵:۴۸)) (لہذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو) اور پھر کہا :

(وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۵:۴۷)) (جو لوگ اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ فاسق ہیں ) اور یہ حکم دیا :

(اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۔ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۵:۵۰)) (تو پھر کیا جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے ) ان آیات سے صاف نظر آتا ہے کہ تمام ادیان کا اس نکتے پر بڑا پورا اتفاق رہا ہے ۔ یوں اسلامی حدود متعین ہو جاتی ہیں اور اسلام کی شرائط کا تعین ہو جاتا ہے ۔ محکموں اور عدالتوں کے لئے بھی اور حکام کے لئے بھی ۔ اصل بات یہ ہے کہ تمام فیصلے اللہ کے احکام کے مطابق کئے جائیں اور عوام الناس ان فیصلوں کو قبول

کریں۔ اور اسلامی قانون کو چھوڑ کر دوسرے قوانین اور احکام کے پیچھے نہ بھاگیں۔

اس فریم ورک میں یہ مسئلہ نہایت ہی اہمیت اختیار کر جاتا ہے اور اس زاویے سے اس پر زور دینے کے اسباب بھی لازماً نہایت ہی اہم ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ اسباب کیا ہیں؟ چاہے ان اسباب کی تلاش ہم ان نصوص کے اندر کریں یا پوری قرآنی آیات و عبارات میں کریں یہ اسباب ہمیں بالکل واضح نظر آتے ہیں۔

ان میں پہلا سبب یہ ہے کہ یہ دراصل اللہ کی الوہیت اس کی ربوبیت اور حاکمیت کے اقرار کا مسئلہ ہے اور یہ کہ اس کے ساتھ ان امور میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس کے انکار کا مسئلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ معاملہ ایمان اور کفر کا معاملہ بن جاتا ہے۔ اسلام اور جاہلیت کا مسئلہ ہے۔ یا جاہلیت ہوگی یا اسلام ہوگا۔

آپ پورے قرآن پر نگاہ ڈالیں۔ یہ ایک نمائش گاہ ہے لیکن اس میں جہاں دیکھو اس ایک ہی حقیقت کو برائے مشاہدہ پیش کیا گیا ہے..... یہ کہ اللہ وحدہٗ ہی خالق ہے' اسی نے اس پوری کائنات کو پیدا کیا' اسی نے اس انسان کو پیدا کیا' اسی نے اس زمین و آسمان کو اور ان کے درمیان پائے جانے والی تمام اشیاء کو اس انسان کے لئے مسخر کیا۔ تخلیق صرف اللہ کی ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے' چاہے یہ مخلوق چھوٹی ہو یا بڑی' تھوڑی ہو یا زیادہ ہو..... یہ کہ اللہ ہی مالک ہے اور وہ مالک اس لئے ہے کہ وہی خالق ہے۔ زمینوں اور آسمانوں اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ بھی ہے اس کا مالک اللہ ہے' وہ منفرداً مالک ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے..... پھر یہ کہ اللہ رازق ہے۔ اللہ کے سوا کوئی اور ذات انسان کو یا دوسرے جانداروں کو رزق فراہم نہیں کر سکتی نہ کم اور نہ زیادہ۔

اور پھر یہ کہ اللہ اس کائنات کا شہنشاہ اور اس کے اندر متصرف ہے اور وہ لوگوں کے لئے بھی متصرف الامور ہے۔ اس لئے کہ وہی خالق' وہی مالک اور وہی رازق ہے اور وہ اس قدر قدرتوں کا مالک ہے جس کی قدرت کاملہ کے بغیر نہ تخلیق ہو سکتی ہے اور نہ رزق مل سکتا ہے اور نہ نفع و نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس پوری کائنات پر اس کی حکمرانی ہے۔

اب ایمان کیا ہے' ان مذکورہ بالا امور کا اقرار ایمان ہے یعنی یہ کہ حاکمیت' ملکیت اور ربوبیت میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ خصائص صرف ذات باری کو حاصل ہیں۔ اسلام درحقیقت سر تسلیم خم کر دینے کا نام ہے اور ان خصوصیات کے تقاضوں کے اندر اللہ کی اطاعت کا نام اسلام ہے یعنی الوہیت' ربوبیت' قیومیت اور حاکمیت کا حق صرف ذات باری کو حاصل ہے' اس پوری کائنات پر جس کے اندر انسان اس کا ایک جزء ہے۔ اللہ کے قضا و قدر کے فیصلوں کا اعتراف اور اس کی شریعت کے قوانین کا اعتراف اس میں شامل ہے۔ بس اللہ کی شریعت کا اعتراف ہی دراصل اللہ کی الوہیت' ربوبیت اور اس کی حاکمیت اور نگہبانی کا اعتراف ہے۔ اس شریعت کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کے معنی سب سے پہلے یہ ہیں کہ ہم اللہ کی الوہیت' ربوبیت اور اس کی حاکمیت و قیومیت کا انکار کر رہے ہیں بایں معنی کہ کوئی اپنی زندگی کے تمام جزئی معاملات میں فیصلے کسی اور شریعت و قانون کے مطابق کرے۔ اسلام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا یا اس کا انکار کرنا چاہے زبان سے ہو یا عمل سے ہو دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مسئلہ کفر و ایمان کا مسئلہ ہے' جاہلیت اور اسلام کا مسئلہ ہے اور اسی وجہ سے یہ آیت آئی ہے:

(( وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (٥ : ٤٤) )) (جو لوگ بھی اللہ

کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو وہی لوگ کافر ہیں) اور دوسری آیات میں فاسق اور ظالم کے الفاظ آئے ہیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلامی شریعت دوسرے شرائع اور قوانین کے مقابلے میں قطعاً برتر اور افضل ہے۔ اور اس سبق کی آخری آیت اسی کی جانب اشارہ کر رہی ہے۔

(وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۵ : ۵۰)) (جو لوگ یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے)۔

اسلامی شریعت کی افضلیت کا یہ اعتراف بھی مسئلہ ایمان کے اندر شامل ہے اور ایک سچے مومن کے نزدیک زندگی کے تمام حالات اور طریقوں میں اللہ کے قانون اور شریعت کو ہی افضل ہونا چاہئے۔ اس لئے کوئی مومن انسان تو یہ دعویٰ کر ہی نہیں سکتا کہ انسانی قوانین اللہ کی شریعت سے افضل یا اس کے مماثل ہو سکتے ہیں۔ کسی پیمانے کسی حال اور کسی رسم و رواج کے اعتبار سے۔ اگر کوئی ایسا دعویٰ کرے گا تو وہ مومن نہ ہو گا نہ وہ مسلم ہو گا' بلکہ اس کے اس دعوے کا مفہوم یہ ہو گا کہ وہ شخص اللہ سے زیادہ لوگوں کے حالات کا جاننے والا ہے اور وہ ان کے حالات کی بابت اللہ سے زیادہ اچھے فیصلے کرنے والا ہے یا اس کے اس دعوے کا مفہوم یہ ہو گا کہ لوگوں کو بعض حالات پیش آئے لیکن ان حالات کا علم اللہ تعالیٰ کو نہ تھا۔ لوگوں کو بعض ضروریات درپیش تھیں' جو اللہ کی نظروں سے اوجھل تھیں (نعوذ باللہ) اور پھر بھی اللہ نے لوگوں کے لئے قانون سازی کی یا یہ کہ اللہ کو ان کا علم تھا لیکن اس کے باوجود اللہ نے ان کے لئے قانون نہ بنایا۔ ظاہر ہے کہ ایسے دعوؤں کے ساتھ ایمان اور اسلام جمع نہیں ہو سکتے اگرچہ بظاہر اپنی زبان سے کوئی ایمان اور اسلام کا دعویٰ کرے۔

اب اس فضیلت کا عملی اظہار کس طرح ہو گا تو اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کی حقیقت تک پوری طرح پہنچ ہی نہیں سکتے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قوانین کی پوری حکمت کا اظہار کسی دور میں بھی پوری طرح نہیں فرمایا۔ جن حکمتوں کا ذکر ہوا ہے' یہاں ہم فی ظلال القرآن میں ان پر پوری بحث نہیں کر سکتے لہٰذا یہاں ہم چند جھلکیاں ہی دے سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی شریعت ایک کامل اور باہم مربوط نظام حیات ہے۔ اس کے اندر انسان کے لئے راہنمائی' اس کی زندگی کی تنظیم اور ہر جہت سے اس کی تعمیر و ترقی کا سامان موجود ہے۔ یہ نظام اس انسانی زندگی کے ہر قسم کے حالات اور ہر زمان و مکان میں اس کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔

یہ ایک ایسا نظام ہے جو اس انسان کی شخصیت اور اس کے نفس کے بارے میں نہایت ہی گہرے علم پر مبنی ہے اور اس میں اس کی پوری ضروریات کا حل موجود ہے۔ یہ نظام اس پوری کائنات کی ماہیت کو پیش نظر رکھ کر وضع کیا گیا ہے اور اس نظام کی تشکیل میں انسانوں کی فطرت اور اس کائنات کے طبیعی قوانین کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے جو اس پوری کائنات کے اندر کارفرما ہیں اس لئے اس نظام میں انسانی زندگی کے معاملات کے اندر کوئی افراط و تفریط نہیں ہے اور اس میں فطرت انسانی کے ساتھ کوئی تصادم نہیں ہے۔ نہ یہ فطری میلانات کے اندر توڑ پھوڑ کرتا ہے اور نہ انسان کی فطری سرگرمیوں پر بندشیں عائد کرتا ہے۔ اس نظام اور نوامیس فطرت کے اندر کوئی تصادم بھی نہیں ہے بلکہ اس نظام پر عمل

کرنے کے نتیجے میں اس کے اندر اور نوامیس فطرت کے اندر نہایت ہی بہترین توازن' اعتدال اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے ۔ یہ وہ چیز ہے جو کسی دوسرے انسانی نظام کے اندر کبھی بھی پیدا نہیں ہوئی ۔ انسان تو محض ظاہری باتوں ہی کو جانتا ہے اور ایک انسان' ایک متعین دور میں زندگی پاتا ہے ۔ وہ اپنے دور کے حالات کے مطابق ہی کچھ ظاہری باتوں کو سمجھ سکتا ہے ۔ انسان خود جو نظام بھی وضع کرتا ہے اس کے اندر انسانی جہالت کے آثار بہرحال پائے جاتے ہیں اور اس کے وضع کردہ نظام کے بعض تباہ کن اثرات بھی انسانی زندگی کے بعض پہلوؤں پر ظاہر ہو جاتے ہیں ۔ انسان کی فطرت اور ان دشمنی قوانین کے اندر تباہ کن تصادم کے نتیجے میں انسانیت تباہ کن جھٹکوں سے دوچار ہوتی رہتی ہے ۔

سب سے پہلے یہ کہ اسلامی نظام' عدل مطلق پر قائم ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہی صحیح طرح اس بات کو جانتا ہے کہ عدل کن ذرائع سے قائم کیا جا سکتا ہے اور کس طرح وہ بار آور ہو سکتا ہے ۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی سب کا رب ہے اس لئے سب کے درمیاں انصاف کرنا بھی اسی کا حق ہے ۔ اللہ کا نظام ذاتی خواہش' کسی خاص رجحان اور ہر قسم کے نقص سے ایسے ہی پاک ہوتا ہے جس طرح وہ نظام جہالت' نقص اور افراط و تفریط سے پاک ہوتا ہے ۔ یہ وہ اوصاف ہیں کہ جو کسی ایسے نظام زندگی میں جمع نہیں ہو سکتے جو انسان کا بنایا ہوا ہو' اس لئے کہ انسان کے اندر شخصی خواہشات بھی ہوتی ہیں' ذاتی رجحانات بھی اس کے اندر ہوتے ہیں اور انسان کے اندر جہل اور دوسرے نقائص بھی ہوتے ہیں، چاہے یہ قانون کوئی فرد بنائے یا کوئی طبقہ بنائے یا کوئی پوری قوم بنائے یا کسی خاص زمانے کی پوری نسل انسانی بنا دے یا انسانوں کے تمام ادوار کی نسلیں اسے بنائیں اس لئے کہ ان تمام قانون سازوں کے اپنے میلانات اور رجحانات ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی ذاتی خواہشات اور مفادات ان پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام حالات میں قانون ساز جہالت' نقص اور عجز سے پاک نہیں ہوتے اور وہ کسی ایک زمان و مکان کے اندر بھی معاملے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کر سکتے ۔

پھر اسلامی نظام ایک ایسا نظام ہے جو اس پوری کائنات کے ناموس کے ساتھ ہم آہنگ ہے اس لئے کہ اسلامی نظام اللہ کا نظام ہے اور ناموس کائنات بھی اللہ کا جاری کردہ ہے ۔ اللہ کی ذات ہی اس کائنات کی صانع ہے اور وہی اس انسان کی بھی صانع ہے ۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جب انسان کے لئے کوئی ضابطہ بنایا ہے تو وہ ایسا ہی ہے جس طرح اس نے کائنات کے ایک حصے کے لئے ضابطہ بنایا ہے ۔ ذات باری اس پوری کائنات کے تمام عناصر پر غالب ہے اور ان پر نگہبان ہے ۔ یہ تمام عناصر اللہ کی ہدایت پر رواں دواں ہیں اور یہ تمام عناصر ان قوانین کو جانتے ہیں جو ان پر حکمران ہیں ۔ یہ قوانین ان پر ان کے خالق کے حکم سے حکمران ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام میں ایک انسان اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی اس کائنات کے اندر ایک قسم کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے ۔ اس طرح ضابطہ شریعت جو اس انسان کی زندگی کی تنظیم کرتا ہے ایک کائناتی مزاج اپنے اندر رکھتا ہے اور یہ ضابطہ صرف انسانی نفس کے ساتھ معاملہ نہیں کرتا نہ صرف اپنے بنی نوع انسان کے ساتھ ہی نہیں کرتا بلکہ یہ معاملہ زندہ اور غیر زندہ اشیاء کے ساتھ ہوتا ہے اور اس پوری کائنات کے ساتھ ہوتا ہے جس میں وہ زندہ وجود رہ رہا ہے اور اس سے وہ نکل نہیں سکتا اور اسے اس کائنات کے اندر اس کے ساتھ جڑ کر زندہ رہنا ہے ۔ امن اور آشتی کے ساتھ ۔

پھر یہ واحد نظام زندگی ہے جس میں ایک انسان تمام دوسرے انسانوں کی غلامی سے پوری طرح آزاد ہو جاتا ہے ۔

اسلام کے سوا، تمام نظام ہائے زندگی میں انسان انسانوں کے غلام ہوتے ہیں اور صرف اسلامی نظام ہی میں تمام لوگ تمام دوسرے لوگوں کی غلامی سے نکل آتے ہیں اور اس میں وہ صرف اللہ کے بندے ہوتے ہیں سب کے سب۔

جیسا کہ اس سے پہلے ہم بار بار بیان کر آئے ہیں اللہ کی خصوصیات میں سے اہم ترین خصوصیت اللہ کی حاکمیت ہے۔ اور جو شخص خود انسانوں کے لئے قانون بناتا ہے وہ یہ خصوصیت اپنے لئے خاص کر لیتا ہے اور ان انسانوں کے اندر ایک طرح کی الوہیت کا مدعی بن جاتا ہے۔ یہ لوگ جو اس کو انسان کا قانون مانتے ہیں وہ اس انسان کے بندے بن جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی بندگی سے نکل آتے ہیں۔ یہ لوگ اس شخص کے دین پر ہوتے ہیں ۔ اللہ کے دین پر نہیں ہوتے۔

اسلام جب حق قانون سازی صرف اللہ کے سپرد کرتا ہے تو وہ لوگوں کو تمام انسانوں کی بندگی سے خارج کر کے اسے صرف اللہ کی بندگی میں داخل کر دیتا ہے۔ انسان کی آزادی کا اعلان کرتا ہے بلکہ اسلام انسان کے لئے ایک نئے جنم کا اعلان کرتا ہے۔ اس طرح کہ انسان کی گردن جب تک دوسرے انسان کے حق سے آزاد نہ ہو، اس وقت تک وہ آزاد تصور نہیں ہوتا اور جب تک یہ تمام انسان رب الناس کے سامنے مساوی سطح پر کھڑے نہیں ہو جاتے۔

یہ مسئلہ جو ان آیات میں لیا گیا ہے یہ اسلامی عقیدے اور اسلامی نظریہ حیات کا نہایت ہی اہم اور خطرناک مسئلہ ہے۔ یہ الوہیت اور عبودیت کا مسئلہ ہے۔ یہ عدالت اور اصلاح کا مسئلہ ہے۔ یہ حریت اور مساوات کا مسئلہ ہے۔ یہ پوری انسانیت کی آزادی اور نئے جنم کا مسئلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے کفر اور ایمان کا مسئلہ قرار دیا گیا ہے اور اسے اسلام اور جاہلیت کے امتیاز کا مسئلہ قرار دیا گیا ہے۔

جاہلیت کسی ایک دور کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی حالت کا نام ہے جس کے کچھ بنیادی عناصر ترکیبی ہیں۔ جہاں بھی اس کے یہ عناصر اور مقومات پائے جائیں وہاں جاہلیت موجود ہو جاتی ہے۔ اس کے یہ عناصر جس نظام اور جس صورت حالات میں پائے جائیں وہ نظام جاہلی نظام ہو گا اور اس حالت کو حالت جاہلیت کہیں گے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی یہ ہے کہ کوئی قانون سازی اور حکمرانی میں انسانی خواہشات کا تابع ہو جائے اور اسلامی نظام اور اللہ کی شریعت کے تابع نہ ہو۔ یہ خواہشات چاہے کسی فرد کی خواہشات ہوں، چاہے کسی طبقے کی خواہشات ہوں چاہے کسی ایک قوم کی خواہشات ہوں یا پوری نسل انسانی کی خواہشات، اس لئے کہ یہ سب خواہشات اور یہ سب لوگ جب تک اللہ کی شریعت کے تابع نہ ہوں گے یہ نفسانی خواہشات ہی رہیں گی۔

اگر ایک فرد کسی سوسائٹی کے لئے قانون سازی کرے تو یہ جاہلیت ہے، اس لئے کہ اس صورت میں اس کی خواہش قانون ہو گی۔ اس کی رائے قانون ہو گی، اور اس ضمن میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف الفاظ کا ہے۔ اصل حقیقت وہ ہے جو ہم کہہ رہے ہیں۔

یا کوئی ایک طبقہ تمام طبقات کے لئے قانون سازی کر رہا ہو تو یہ صورت حال بھی جاہلیت ہو گی۔ اس صورت میں اس طبقے کے مفادات قانون کی شکل اختیار کر لیں گے۔ یا اس طبقے کی پارلیمنٹ میں اکثریت کی رائے قانون بن جائے گی۔ اس صورت میں فرق اگر کوئی ہے تو صرف الفاظ کا ہے۔

یا پھر اگر حق قانون سازی تمام طبقات کے نمائندوں کو حاصل ہے اور امت کے تمام گروہوں کو حاصل ہے تو بھی یہ صورت حال جاہلی صورت حال ہے، اس لئے کہ لوگوں کی آراء کسی وقت بھی ذاتی خواہشات سے پاک نہیں ہوتیں۔ پھر

اس قانون سازی میں جہالت بھی شامل ہوگی کیونکہ لوگ جاہلیت سے کبھی پاک نہیں ہوتے یا پھر اگر ریفرنڈم کی صورت ہو تو پوری قوم کی اغلبیت کی رائے قانون ہو جائے گی۔ اب بھی فرق اگر کوئی ہوگا تو صرف الفاظ کا ہوگا۔

اس سے بھی وسیع دائرے میں پوری اقوام کا مجموعہ اگر کوئی قانون سازی کرتا ہے تو وہ بھی جاہلیت ہوگی کیونکہ ان اقوام کے قومی مقاصد قانونی صورت اختیار کر لیں گے یا بین الاقوامی مجالس کی جو رائے بنے گی وہ قانون ہو جائے گی اور یہ نظام بھی جاہلی ہوگا۔ فرق اگر کوئی ہوگا تو صرف الفاظ کا ہوگا۔

اب تمام افراد، تمام سوسائٹیوں، تمام اقوام اور تمام نسلوں کا خالق اگر کوئی قانون بناتا ہے تو یہ قانون تمام لوگوں کے لئے ہوگا اور یہ اللہ کی شریعت ہوگی۔ اس میں کسی ایک کو نقصان دے کر دوسرے کو فائدہ نہیں پہنچایا جاتا۔ اس میں کسی فرد، کسی سوسائٹی اور کسی بین الاقوامی انجمن یا کسی پوری نسل انسانی کے ساتھ مخصوص باتوں کو مدنظر نہیں رکھا جاتا اس لئے کہ اللہ سب کے لئے رب العالمین ہے اور اس کے ہاں سب کا رتبہ برابر ہے۔ پھر وہ سب کی مصلحت اور مفاد کو بھی اچھی طرح جانتا ہے اور یہ سب امور افراط اور تفریط سے بھی پاک ہوتے ہیں۔

اب اگر کوئی اور قانون سازی کرے تو یقیناً لوگ اس غیر کے غلام ہوں گے چاہے یہ غیر اللہ جو بھی ہو۔ فرد ہو، سوسائٹی ہو یا طبقہ ہو یا قوم ہو یا انجمن اقوام ہو...... لیکن اللہ کی قانون سازی میں تمام لوگ آزاد ہو جاتے ہیں، مساوی سطح پر آجاتے ہیں۔ ان کے ماتھے اللہ کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتے۔ وہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں کرتے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ مسئلہ انسانوں کی زندگی میں نہایت ہی اہمیت رکھتا ہے اور خود اس نظام کائنات کے اندر بھی اس کی اہمیت ہے۔

(لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ) (اگر سچائی لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو آسمانوں اور زمینوں اور ان کے درمیان میں ان کے معاملات میں بھی فساد ہو جائے) اس لئے اللہ کے سوا کسی اور قانون کے مطابق فیصلے کرنے کے معنی ہیں شر و فساد اور آخر کار اس کی وجہ سے انسان دائرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ ذرا قرآنی آیات کو غور سے پڑھیں۔ یہ اس نص کا تقاضا ہے۔

---0O0---

# درس نمبر ۹ ۴ تشریح آیات

# ۴۱ ــــ تا ــــ ۵۰

(اے پیغمبرؐ تمہارے لئے باعث رنج نہ ہوں وہ لوگ جو کفر کی راہ میں بڑی تیز گامی دکھا رہے ہیں خواہ وہ ان میں سے ہوں جو منہ سے کہتے ہیں ہم ایمان لائے مگر دل ان کے ایمان نہیں لائے' یا ان میں سے جو یہودی ہیں' جن کا حال یہ ہے کہ جھوٹ کے لئے کان لگاتے ہیں' اور دوسرے لوگوں کی خاطر جو تمہارے پاس کبھی نہیں آئے' سن گن لیتے پھرتے ہیں' کتاب اللہ کے الفاظ کو ان کا صحیح محل متعین ہونے کے باوجود اصل معنی سے پھیرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو نہیں تو نہ مانو۔ جسے اللہ ہی نے فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو تو اس کو اللہ کی گرفت سے بچانے کے لئے تم کچھ نہیں کر سکتے' یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہ چاہا' ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں سخت سزا۔

یہ جھوٹ سننے والے اور حرام کے مال کھانے والے ہیں' لہٰذا اگر یہ تمہارے پاس (اپنے مقدمات لے کر) آئیں تو تمہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہو ان کا فیصلہ کرو ورنہ انکار کر دو۔ انکار کر دو تو یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اور یہ تمہیں کیسے حکم بناتے ہیں جبکہ ان کے پاس تورات موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے اور پھر یہ اس سے منہ موڑ رہے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے )۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ہجرت کے بعد ابتدائی سالوں میں نازل ہوئیں' اس دور میں جب یہودی بدستور مدینہ میں موجود تھے' کم از کم غزوہ احزاب سے پہلے کے زمانہ میں اور اس سے پہلے جب بنی قریظہ کو سزا دی گئی یا اس سے بھی زیادہ پہلے یعنی یہ اس دور میں نازل ہوئی ہیں جب بنی نضیر اور بنی قینقاع مدینہ کے ارد گرد موجود تھے۔ ان میں سے اول الذکر احد کے بعد اور آخر الذکر احد سے پہلے جلاوطن ہوئے۔ اس دور میں یہودی مسلمانوں کے خلاف اپنی سازشوں میں مصروف تھے اور اس دور میں منافقین ان کے ہاں اس طرح پناہ لینے کے لئے گھستے تھے جس طرح سانپ اپنے سوراخ میں گھستا ہے اور یہ دونوں کفر میں بہت ہی آگے بڑھنے والے تھے۔ اگرچہ منافقین منہ سے یہ کہتے تھے کہ ہم ایمان لائے ہیں مگر ان لوگوں کا طرز عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ہی پریشان کئے ہوئے تھا اور اس سے آپ کو بہت ہی اذیت پہنچتی تھی۔

اللہ تعالیٰ رسول اللہؐ کی تعزیت اور دلجوئی فرماتے ہیں اور ان کے لئے لوگوں کے یہ کرتوت قابل برداشت بناتے

ہیں۔ ساتھ ہی جماعت مسلمہ کے سامنے ان لوگوں کی حقیقت کھول دیتے ہیں کہ یہ کفر میں بہت تیز ہیں اور ان میں یہ دونوں فرقے شامل ہیں۔ آپ کو اس طرز عمل کی ہدایت دی جاتی ہے جو ان کے ساتھ اختیار کیا جانا ضروری ہے جبکہ وہ آپ کے پاس فیصلے کرانے کے لئے آتے ہیں اور اس کے بعد آتے ہیں جب آپ ؐ پر ان کی سازشیں بھی طشت ازبام ہو جاتی ہیں جو انہوں نے حضور ؐ کے پاس آنے سے قبل ہی آپس میں کی ہوئی ہوتی ہیں۔

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ۭ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ۭ

(اے پیغمبر ؐ تمہارے لئے باعث رنج نہ ہوں وہ لوگ جو کفر کی راہ میں بڑی تیز گامی دکھا رہے ہیں خواہ وہ ان میں سے ہوں جو منہ سے کہتے ہیں ہم ایمان لائے مگر دل ان کے ایمان نہیں لائے' یا ان میں سے ہوں جو یہودی ہیں' جن کا حال یہ ہے کہ جھوٹ کے لئے کان لگاتے ہیں' اور دوسرے لوگوں کی خاطر جو تمہارے پاس کبھی نہیں آئے سن گن لیتے پھرتے ہیں' کتاب اللہ کے الفاظ کو ان کا صحیح محل متعین ہونے کے باوجود اصل معنی سے پھیرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو نہیں تو نہ مانو)

روایات میں آتا ہے کہ یہ آیات ان یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں' جنہوں نے بعض جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ ان جرائم کے تعین میں روایات کے اندر اختلاف ہے' بعض میں ہے کہ یہ جرم سرقہ تھا۔ بعض میں ہے کہ یہ جرم زنا تھا اور یہ دونوں جرائم تورات کے مطابق جرائم حدود تھے لیکن یہودیوں نے اپنے ہاں کچھ دوسرے قوانین وضع کئے ہوئے تھے۔ اس کا پہلا سبب تو یہ تھا کہ یہ لوگ تورات کی حدود اپنے ہاں شرفاء پر نافذ نہ کرتے تھے۔ اس کے بعد تمام لوگوں پر انہوں نے نرمی کر کے ان سزاؤں کو موقوف کر دیا تھا۔ ان حدود کی جگہ انہوں نے از خود کچھ تعزیری سزائیں مقرر کر لی تھیں۔ جس طرح آج کے نام نہاد مسلمانوں نے اپنے ہاں ایسا ہی کر رکھا ہے۔ جب حضور ؐ کے دور میں ان سے ان جرائم کا صدور ہوا تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ان کے بارے میں حضور ؐ سے دریافت کریں گے۔ اگر حضور ؐ نے بھی انہی خفیف تعزیری سزاؤں کے بارے میں حکم دیا تو وہ انہیں نافذ کر دیں گے اور اللہ کے ہاں ان کے لئے عذر ہو

گا کہ ایک رسول نے ان کا فتویٰ دیا تھا اور اگر رسول اللہ ؐ نے بھی وہی فتویٰ دیا جو تورات میں ہے تو وہ اسے رد کر دیں گے ۔ انہوں نے اپنے کچھ لوگوں کو حضور ؐ کے پاس فتویٰ کے لئے بھیجا اور انہی کے بارے میں یہ آتا ہے :

(اِنْ اُوْتِیْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا (۵ : ۴۱ ) (اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو ورنہ نہیں)

اس طرح ان لوگوں کی بیہودگی ' حماقت اور پہلوتہی کی حد ہوگئی کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملے میں دھوکہ بازی سے کام لیتے ہیں اور رسول اللہ ؐ کے ساتھ ان کے معاملے میں یہ حد ہوگئی ہے کہ اگر خدا کا یہ صحیح حکم دیں تو انکار کر دو ۔ یہ حالت ان تمام لوگوں کی ہو جاتی ہے جب ان پر ایک طویل عرصہ گزر جاتا ہے ۔ ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں ۔ ان میں سے عقیدے کی حرارت ٹھنڈی پڑ جاتی ہے ۔ نور کے شعلے ماند پڑ جاتے ہیں اور پھر یہ لوگ مختلف طریقوں سے اس کتاب کے عقائد و نظریات اور اس کے اصول و شرائع سے جان چھڑانے کے درپے ہو جاتے ہیں اور اس مقصد کے لئے حیلے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں ۔ اس کے بارے میں وہ ہر جگہ سے فتوے مانگتے رہتے ہیں کہ شاید ان کو کسی طرح کوئی راہ فرار مل جائے ۔ کیا آج ان لوگوں کے حالات ایسے ہی نہیں ہیں جو زبانی طور پر تو دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں ۔

(مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ (۵ : ۴۱ ) (ان لوگوں میں سے جو اپنے منہ سے کہتے ہیں ہم ایمان لائے حالانکہ ان کے دل مومن نہ تھے ) کیا یہ لوگ دین کے خلاف فتوے طلب نہیں کرتے ' نفاذ کے لئے نہیں بلکہ دین سے پھیرنے والے ۔ کیا یہ لوگ دین پر ہاتھ محض اس لئے نہیں پھیرتے کہ وہ ان کی خواہشات کو پورا کرے اور ان کی مرضی کے مطابق اس پر سائن کر دے ۔ اگر دین ان کو حق بات کہہ دے اور ان کو سچائی کے مطابق اپنا فیصلہ سنا دے تو ان لوگوں کو پھر دین کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ پھر یہ کہتے ہیں :

(یَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِیْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا (۵ : ۴۱ ) (اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو ورنہ نہیں ) یہ ہے ان کا حال ۔ اور اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا یہ قصہ اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ محض اس لئے بیان کیا تاکہ آنے والی نسلیں اس سے عبرت پکڑیں اور سمجھدار لوگ اس راہ میں پھسلنے کے مقامات کے بارے میں قبل از وقت متنبہ ہوں ۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے بارے میں جو کفر میں بہت تیزی دکھا رہے ہیں اور ان لوگوں کے بارے میں جو اسلام کے خلاف رالوں کے وقت سورہ کرتے ہیں اور خفیہ کھیل کھیلتے ہیں یہ فیصلہ سناتا ہے کہ یہ لوگ فتنے کی راہ پر چل پڑے ہیں اور اس فتنے کے گڑھے میں انہیں خواہ مخواہ گرنا ہے ۔ اس میں آپ کا کوئی اختیار نہیں ہے ۔ آپ ان لوگوں سے یہ فتنہ دور نہیں کر سکتے اس لئے کہ یہ اس راستے میں بہت آگے نکل گئے ہیں ۔

وَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَیْــًٔا ---- (۴۱)

(جسے اللہ نے فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو' اس کو اللہ کی گرفت سے بچانے کے لئے تم کچھ نہیں کر سکتے ۔) ان لوگوں کے دل ناپاک ہو گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے انکار کی تطہیر نہیں چاہتے' اس لئے یہ لوگ اسی طرح گندگیوں میں پڑے رہیں گے ۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ ---- (۴۱)

(یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہ چاہا) جلد ہی اللہ ان کو اس دنیا میں شرمندہ کرے گا اور آخرت میں تو ان کے لئے عذاب عظیم تیار ہے ۔

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۴۱﴾

(ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں سخت سزا) اس لئے آپ ؐ پر ان لوگوں کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور آپ ان کی کفریہ روش سے پریشان نہ ہوں ۔ آپ ان کے معاملے میں کوئی بات نہ کریں اس لئے کہ ان کے معاملے کا فیصلہ ہو چکا ہے ۔

اس کے بعد ان لوگوں کے مزید حالات بیان کئے ہیں اور یہ بتایا گیا کہ یہ لوگ اپنے طرز عمل اور اخلاقی بگاڑ سے اگرچہ بہت دور نکل گئے ہیں لیکن پھر بھی اگر یہ لوگ آپ کے پاس فیصلہ لے کر آتے ہیں تو ان کے درمیان فیصلہ نہایت عادلانہ کریں ۔

سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ أَكَّالُونَ لِلسُّحْتِ ۚ فَإِنْ جَاءُوكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ ۖ وَإِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَضُرُّوكَ شَيْئًا ۖ وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴿۴۲﴾

(یہ جھوٹ سننے والے اور حرام کے مال کھانے والے ہیں' لہٰذا اگر یہ تمہارے پاس (اپنے مقدمات لے کر) آئیں تو تمہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہو تو ان کا فیصلہ کرو ورنہ انکار کر دو ۔ انکار کر دو تو یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)۔

مکرر طور پر یہاں بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹ سننے کے عادی ہیں' جس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ اس کے عادی ہو گئے ہیں ۔ جھوٹ اور باطل اور ناحق سننے کے لئے ان کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور خوشی سے لپکتے ہیں

اور سچائی اور حق سننے سے انہیں سخت انقباض ہوتا ہے۔ اور اس قسم کی گمراہ اور منحرف سوسائٹیوں میں ہمیشہ باطل اور جھوٹ کو خوب کان لگا کر سنا جاتا ہے اور انسان کے دل و دماغ اگر فساد کا شکار ہو جائیں تو ان کی یہی حالت ہوتی ہے۔ روح جب بجھ جاتی ہے تو وہ باطل کی تلاش میں رہتی ہے اور سچائی اسے بہت ہی ناپسند ہوتی ہے۔ ایسے ادوار میں باطل کو خوب رواج نصیب ہوتا ہے' اس کا چرچا ہوتا ہے اور سچائی ان ملعون ادوار میں بدحال ہوتی ہے۔

یہ لوگ نہایت ہی دلچسپی سے باطل کی طرف کان دھرتے ہیں' کیونکہ ان کا عمل حرام خوری ہوتا ہے۔ السحت کا مفہوم ہے ہر وہ چیز جو حرام ہے۔ مثلاً سود' رشوت' تقریر کی اجرت اور فتویٰ کی اجرت وغیرہ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو ان کی حرام خوریوں میں سرفہرست ہیں اور ہر دور میں جب کوئی معاشرہ اسلامی قدروں سے منحرف ہو جائے تو اس میں یہ زمائم بہت ہی زیادہ ہو جاتے ہیں اور حرام چیزوں کو السحت کے لفظ سے اس لئے ادا کیا گیا ہے کہ حرام کی وجہ سے مال سے برکت ختم ہو جاتی ہے اور تمام منحرف اور بے راہ رو معاشروں سے ہر قسم کی برکات ختم ہو جاتی ہیں۔ جیسا کہ آج ہم لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ آج ان تمام معاشروں میں جو اللہ کے نظام حیات سے انحراف اختیار کئے ہوئے ہیں' کوئی برکت نہیں رہی ہے۔ ہر طرف کمی ہی کمی ہے۔

ان لوگوں کے معاملے میں اللہ تعالیٰ حضرت محمد ؐ کو اختیار دیتے ہیں کہ اگر یہ لوگ فیصلے لے کر آپ کے پاس آئیں تو آپ یا تو اعراض کر لیں اور ان کے درمیان کوئی فیصلہ نہ کریں تو بھی یہ لوگ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اگر آپ چاہیں تو ان کے درمیان نہایت ہی منصفانہ فیصلہ کریں۔ ان کی خواہشات سے ہرگز متاثر نہ ہوں۔ اس بات سے بھی متاثر نہ ہوں کہ یہ لوگ کفر کی راہ میں بہت تیز ہیں اور یہ کہ وہ سازشیں کرتے اور مسلمانوں کے خلاف ہر چال چلتے ہیں۔ اس لئے کہ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (۵: ۴۲) (اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)

رسول اللہ ؐ ' ایک مسلمان حاکم اور ایک مسلمان جج انصاف کے حوالے سے معاملہ اللہ کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ انصاف اللہ کے خوف سے اور اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے اس لئے کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اگر لوگ ظلم کریں' خیانت کریں اور راہ حق سے منحرف ہو جائیں تو پھر بھی' عدل اس سے بالا ہے کہ ان کا طرز عمل کیا ہے؟ اس لئے کہ انصاف لوگوں کی خاطر نہیں ہوتا' بلکہ اللہ کی خاطر ہوتا ہے۔ اسلامی شریعت میں اس کی پوری پوری ضمانت دی گئی ہے اور اسلامی عدلیہ نے ہر زمان و مکان میں اس پر عمل کیا ہے۔

یہودیوں کو یہ اختیارات دینا کہ وہ اپنے فیصلے خود کریں' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات بہت ہی ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہیں۔ بعد کے ادوار میں اسلامی شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا لازمی ہو گیا تھا اس لئے کہ دارالاسلام میں صرف اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے کئے جا سکتے ہیں۔ دارالاسلام کے باشندوں پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے فیصلے شرعی قانون کے مطابق کریں۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی معاشرے میں اہل کتاب کے متعلق یہ خاص اصول وضع کیا گیا ہے کہ ان کے فیصلے خود ان کی شریعت کے مطابق کئے جائیں گے مثلاً یہ کہ ان کے لئے وہ معاملات جائز ہوں گے جو ان کی شریعت میں جائز ہیں۔ مثلاً خنزیر کی ملکیت' اس کا گوشت کھانا' شراب کی ملکیت اور شراب پینا (ہاں مسلمانوں پر فروخت کرنے کی اجازت نہ ہو گی) نیز ان پر سودی کاروبار کرنا حرام ہو گا' اس لئے کہ اہل کتاب کے ہاں بھی سودی کاروبار کرنا حرام ہے۔ اسی طرح حد زنا' حد سرقہ بھی ان پر نافذ ہوگی' کیونکہ ان کی کتابوں میں بھی یہ حدود

نافذ ہیں۔ بغاوت، فساد فی الارض اور دوسری عام تعزیری سزائیں ان پر بھی اسی طرح نافذ ہوں گی جس طرح عام مسلمانوں پر نافذ ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ امور دارالاسلام کے امن و امان کے لئے ضروری ہیں چاہے مسلمان ہوں یا غیر مسلم اور اس معاملے میں کسی کے ساتھ کوئی نرمی نہیں کی جاسکتی۔

اس اختیاری دور میں، جس میں ان کو یہ چھوٹ تھی کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے فیصلے خود اپنے قوانین کے مطابق کر سکتے ہیں، یہ لوگ اپنے بعض تنازعات حضور ؐ کے پاس لے کر آتے تھے۔ مثلاً امام مالک نے حضرت نافع کے رابطے سے عبداللہ ابن عمر ؓ سے روایت کی ہے: "یہودی حضور ؐ کے پاس آئے۔ انہوں نے حضور ؐ سے ذکر کیا کہ ان میں سے ایک مرد اور عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ تو آپ ؐ نے ان سے پوچھا کہ رجم کے بارے میں تورات کے اندر کیا پاتے ہو؟ تو انہوں نے کہا ہم ان کو شرمندہ کریں گے اور اس کے بعد کوڑے ماریں گے۔ عبداللہ ابن سلام نے کہا تم جھوٹ بولتے ہو۔ توراۃ میں تو سزائے رجم مذکور ہے۔ وہ تورات لائے اور اسے کھولا۔ ان میں سے ایک نے رجم کی آیت پر ہاتھ رکھ دیا۔ سابق اور لاحق کو پڑھ لیا۔ عبداللہ ابن سلام نے کہا ذرا ہاتھ اٹھاؤ۔ اس نے ہاتھ اٹھایا تو نیچے آیت رجم لکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے یہ آیت رجم ہے۔ اس پر حضور ؐ نے حکم دیا کہ ان کو رجم کر دیا جائے۔ میں نے خود دیکھا کہ مرد اس عورت پر جھکتا تھا اور اسے پتھروں سے بچاتا تھا۔ (بخاری مسلم، الفاظ بخاری کے ہیں)۔

اسی طرح امام مسلم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس ؓ سے روایت کی ہے.... یہ آیات یہودیوں کے دو گروہوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ ایک گروہ نے جاہلیت میں دوسرے کو اس فیصلے پر مجبور کر دیا تھا کہ جو مقتول کسی ذلیل طبقے سے ہو اور اسے معزز قاتل نے قتل کیا ہو تو اس کی دیت ۵۰ وسق ہوگی اور اگر کوئی ذلیل شخص کسی معزز شخص کو قتل کر دے تو اس کی دیت ایک سو وسق ہوگی۔ مدینہ میں یہ لوگ اسی طرح فیصلے کرتے تھے یہاں تک کہ حضور ؐ وارد مدینہ ہوئے۔ انہی دنوں ایک ذلیل طبقے کے شخص نے ایک معزز شخص کو قتل کر دیا۔ اس پر معزز قبیلہ نے مطالبہ کیا کہ اسے سو وسق دیت ادا کی جائے۔ اس پر ذلیل قبیلے کے لوگوں نے کہا، کیا یہ فرق ان دو قبائل کے اندر جائز ہے جن کا دین ایک ہے، نسب ایک ہے، شہر ایک ہے اور بعض کی دیت بعض دوسروں سے نصف ہے۔ یہ دیت جو ہم ادا کرتے رہے ہیں یہ تو تمہاری جانب سے مظالم کی وجہ سے ادا کرتے رہے ہیں اور تم نے زبردستی یہ فرق و امتیاز قائم کر دیا تھا۔ اب چونکہ حضرت محمد ؐ تشریف لا چکے ہیں اس لئے ہم دگنی دیت ادا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ان دو قبائل کے اندر جنگ شروع ہونے والی تھی لیکن ان کے درمیان گفتگو کے نتیجے میں یہ فیصلہ ہوا کہ حضور ؐ ہمارے درمیان حکم ہیں۔ اس پر معزز قبیلے کے لوگوں نے کہا، خدا کی قسم محمد ہم کو اس سے دگنی ادا نہ کریں گے جو ہم ادا کرتے ہیں۔ ان کی بات سچ ہے کہ ذلیل قبیلے والے ہمیں تو مجبور ہو کر دگنی دیت ادا کرتے تھے اور وہ ہم سے مجبور تھے۔ اس لئے مناسب ہے کہ حضرت کے پاس خفیہ مشن بھیج کر معلوم کر لو کہ اگر وہ تمہاری مرضی کا فیصلہ کرتے ہیں تو اسے ثالث بنا لیں اور اگر خطرہ یہ ہو کہ وہ تمہاری مرضی کا فیصلہ نہ کریں گے تو حکم ہی نہ بناؤ۔ چنانچہ انہوں نے منافقین پر مشتمل خفیہ مشن حضور کے پاس روانہ کیا۔ جب یہ لوگ رسول اللہ ؐ کے پاس آئے تو اللہ نے حضور ؐ کو خبردار کر دیا کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

(يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ (۵: ۴۱)) (اے رسول آپ کو وہ لوگ پریشان نہ کر دیں جو کفر میں بہت تیز ہیں) الفاسقون تک - غرض یہ آیات صرف انہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور ان سے یہی لوگ مراد ہیں - (ابو داؤد بروایت ابو الزناد عن ابیہ) ابن جریر نے ایک روایت میں معترز قبیلے کا نام بھی لیا ہے وہ بنو النضیر تھے - اور ذلیل قبیلہ بنو قریظہ تھے - اس سے معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ یہ آیات ان قبائل کی جلاوطنی اور سرزنش سے پہلے ہی نازل ہوگئی تھیں -

اس کے بعد یہودیوں کے موقف کے بارے میں سخت انداز کلام میں 'یعنی استفہام انکاری کے طور پر کہا جاتا ہے' کہ یہ یہودیوں کا عام رویہ ہے کہ وہ قانون تورات کے نفاذ سے پہلوتہی کرتے ہیں -

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ

(.... اور یہ تمہیں کیسے حکم بناتے ہیں جبکہ ان کے پاس تورات موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے اور پھر یہ اس سے منہ موڑ رہے ہیں)۔

یہ تو عظیم گناہ ہے کہ ان کے پاس خدا کی شریعت موجود ہے اور وہ اس سے منہ موڑتے ہیں اور حضور کے پاس اس توقع سے آتے ہیں کہ آپ شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں اور ان کے ہاں جو تورات میں انہوں نے لکھا اس پر فیصلہ کریں - حالانکہ قرآن کے احکام بھی تورات ہی کے اصلی احکام ہیں - اور یہ لوگ جس طرح تورات کے احکام سے پہلوتہی کرتے ہیں اسی طرح حضور کے حکم سے بھی اعراض کرتے ہیں - یہ اعراض اس طرح کہ حضور کے احکام کی اطاعت نہیں کرتے یا یوں کہ ان پر پھر راضی نہیں ہوتے - لیکن یہاں سیاق کلام تو صرف استفہام انکاری پر ہی ختم نہیں کر دیا بلکہ اس موقف پر اسلامی نقطہ نظر سے فیصلہ صادر ہوتا ہے -

وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴۳ؒ (اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے)۔

یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے اور پھر بھی مومن ہو' یا وہ اللہ کے قانون پر راضی نہ ہو اور پھر بھی یہ زعم رکھتا ہو کہ وہ مومن ہے - یہ ہرگز ممکن نہیں ہے - اگر کوئی ایمان لاتا ہے تو اسے اپنی پوری زندگی میں شریعت کا نفاذ کرنا ہوگا - اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کا دعوائے ایمان جھوٹا ہے اور اس کا موقف اس قطعی نص کی بالکل ضد ہے - (وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ (۵: ۴۳) (یہ لوگ ایمان نہیں رکھتے) یہ معاملہ فقط اس حد تک نہیں ہے کہ حکام کی جانب سے اسلامی شریعت کا نفاذ نہیں ہے بلکہ اگر محکوم لوگ بھی جن پر شریعت کا نفاذ ہوتا ہے' شریعت کے نفاذ پر راضی نہیں تو بھی وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوں گے اگرچہ زبانی طور پر وہ ایمان کا دعویٰ کریں -

یہ آیت سورہ نساء کی آیت کے عین مطابق ہے جس میں کہا گیا ہے -

(فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (٥:٦٥)

(خدا کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے تنازعات کا فیصلہ آپ سے نہ کرائیں ۔ پھر یہ اپنے دل میں آپ کے فیصلے پر کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور پوری طرح سر تسلیم خم نہ کر دیں) ان دونوں آیات کا تعلق محکوم عوام الناس سے ہے' حکام سے نہیں ہے جبکہ دونوں ایمان سے نکل جاتے ہیں۔ جو لوگ اللہ اور رسول کے فیصلوں پر راضی نہیں ہوتے ان کے بارے میں یہ آیات کہتی ہیں کہ یہ مومن نہیں رہتے یا اگر رسول فیصلہ کریں اور یہ لوگ روگردانی کر دیں اور تسلیم نہ کریں۔

خلاصہ کلام یہ ہے جیسا کہ اس سبق کے آغاز میں ہم نے کہا تھا کہ یہ مسئلہ اللہ کی حاکمیت کے اقرار کا مسئلہ ہے ۔ اللہ کی حاکیت' اس کی قیومیت اور انسان پر اس کی نگرانی و نگہبانی کے اقرار کا مسئلہ ہے یا اس کے انکار کا مسئلہ ہے اور اللہ کی شریعت کو قبول کرنا اور اس کے مطابق فیصلے کرانا اللہ کی حاکیت' اس کی نگہبانی کے اقرار کا ایک مظہر اور ثبوت ہے اور شریعت پر فیصلے نہ کرانا اس کے انکار کا مظہر اور ثبوت ہے۔

---ooo---

یہ تو فیصلہ ان لوگوں کے بارے میں تھا جو اللہ تعالیٰ کی شریعت کے فیصلے قبول نہیں کرتے ۔ اب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو حکام اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے ان کے بارے میں فتویٰ کیا ہے اور یہ فتویٰ ان تمام ادیان کا ہے جو اللہ کی جانب سے نازل ہوتے ہیں سب سے پہلے تورات کا فتویٰ۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَ اخْشَوْنِ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ

وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۭ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

(ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ سارے نبی' جو مسلم تھے اسی کے مطابق ان یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے اور اسی طرح ربانی اور احبار بھی (اسی پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے) کیونکہ انہیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے۔ پس (اے گروہ یہود) تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے لے کر بیچنا چھوڑ دو جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان' آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے بدلے ناک' کان کے بدلے کان' دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لئے برابر کا بدلہ۔ پھر جو قصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

اللہ کی جانب سے جو دین بھی آیا ہے وہ اس لئے آیا ہے تاکہ وہ نظام زندگی بنے اور لوگوں کی عملی زندگی کا وہ نظام ہو۔ ہر دین اس لئے آیا ہے کہ وہ انسانیت کی قیادت کرے۔ انسان کو منظم کرے' اسے صحیح راستہ دکھائے اور اسے غلطیوں اور سیاہ کاریوں سے بچائے۔ دین محض اس لئے نہیں آتا کہ وہ انسانی شعور میں ایک عقیدہ اور نظریہ ہو' یا وہ محض اس لئے بھی نہیں آتا کہ کلیسا اور مساجد میں چند مراسم عبودیت کے طور پر جاری رہے۔ یہ دونوں باتیں اگرچہ انسان کے عقیدہ و عمل کے لئے ضروری ہیں لیکن صرف عقیدہ اور مراسم عبودیت سے انسانی زندگی کی تنظیم' توجیہ اور سیاہ کاریوں سے بچاؤ ممکن نہیں ہے۔ جب تک دین کی اساس پر پورا نظام زندگی' نظام قانون اور نظام معاشرت نافذ نہ ہو' جب تک ان چیزوں کو عملاً نافذ نہ کیا جائے' جب تک مسند اقتدار پر ایسے لوگ نہ پائے جائیں جو اس حاکمیت اور قانون کے مطابق حکمرانی کریں اور جب تک ایسی حکومت نہ ہو جو اسلامی قوانین اور ہدایات کی خلاف ورزی پر گرفت کرنے والی ہو اور اسلامی سزائیں نافذ کرنے والی ہو اس وقت تک قانون اسلام کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔

انسانی زندگی اس وقت تک استوار نہیں ہو سکتی جب تک نظریہ حیات' مراسم عبودیت اور قانون ایک ہی منبع سے اخذ نہ کئے جائیں۔ اس منبع کی حکمرانی دلوں پر بھی ہو' ذات الصدور پر بھی ہو اور انسان کی عملی حرکات و سکنات پر بھی ہو۔ وہ اس دنیا میں بھی لوگوں کو اجر دیتا ہو اور آخرت میں بھی وہ لوگوں کو اجر دیتا ہو اور حساب و کتاب لیتا ہو۔

جب انسانی زندگی پر حکمرانی مختلف ہو جائے اور رشد و ہدایت کے منابع مختلف ہو جائیں مثلاً ضمیر اور ایمان پر حکمرانی ایک اللہ کی ہو اور ظاہری نظم و نسق اور قانون پر حکمرانی دوسرے حاکم کی ہو اور آخرت کی جزاء کا مالک اور ہو اور دنیا میں سزا دینے والی طاقت کوئی اور ہو تو ایسے حالات میں انسان کی ذات دو مختلف حکمرانوں کے درمیان ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ اس کی شخصیت کے اندر دو مختلف رجحانات ہوتے ہیں اور اس کی زندگی دو طرح کے متضاد طرز ہائے عمل میں بٹ جاتی

ایسے حالات میں زندگی کے اندر وہ بگاڑ پیدا ہوتا ہے جس کی طرف قرآن کریم نے مختلف طریقوں سے اشارہ کیا ہے۔

(لَوْ كَانَ فِيهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا) (اگر زمین و آسمان میں زیادہ الٰہ ہوتے تو ان میں فساد برپا ہو جاتا)

(لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ) (اگر حق ان کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو زمین' آسمانوں اور ان کے اندر جو کچھ ہے وہ فساد کا شکار ہو جائے)۔

(ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ) (پھر ہم نے آپ کو شریعت پر قائم کیا ہے پس آپ اس کی اطاعت کریں اور ان لوگوں کی خواہشات کی اطاعت نہ کریں جو نہیں جانتے)۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو دین بھی آیا ہے وہ اس لئے آیا ہے کہ وہ زندگی کا نظام بنے۔ یہ دین کسی گاؤں کے لئے ہو' کسی قوم کے لئے ہو یا پوری کی پوری انسانیت کے لئے ہو' بشرطیکہ وہ دین حق ہو اور اس کے ساتھ شریعت ہو۔ ہر دین میں ایک طرف تو ایک نظریہ حیات ہوتا ہے اور دوسری جانب اس میں زندگی کی تفصیلی ہدایات کے لئے ایک شریعت ہوتی ہے۔ اس میں اللہ کی بندگی کے لئے کچھ مراسم عبودیت ہوتے ہیں۔ یہ تین پہلو ہر دین کے بنیادی عناصر ترکیبی ہوتے ہیں جہاں بھی کوئی دین اللہ کی طرف سے آیا ہے' اس میں یہ تین پہلو ضرور ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی تب ہی استوار اور درست ہو سکتی ہے جب دین کو زندگی کا نظام بنا دیا جائے۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے میری کتابیں الاسلام و مشکلات الحضارہ اور المستقبل لھذا الدین اور خصائص التصور الاسلامی ومقوماتہ)

قرآن کریم میں ایسے شواہد موجود ہیں کہ سابقہ ادیان میں سے بعض ایک محدود علاقے کے لئے تھے مثلاً ایک گاؤں کے لئے یا ایک شہر کے لئے یا کسی ایک قبیلے کے لئے لیکن یہ ادیان بھی مکمل نظام زندگی پر مشتمل تھے اور وہ اس گاؤں اور قریہ کے اس وقت کے حالات کے لئے ایک پورا نظام حیات تھے۔ یہاں قرآن کریم بڑے ادیان یہودیت' نصرانیت اور اسلام کے بارے میں کہتا ہے۔

(اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ (۵: ۴۴) (ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔

تورات' جس شکل میں اسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا' ایک کتاب تھی' جسے بنی اسرائیل کی راہنمائی کے لئے بھیجا گیا تھا۔ یہ جادۂ حق پر ان کے لئے روشنی کا مینار تھی اور ان کے لئے زندگی گزارنے کا ایک ماڈل تھی۔ اس میں نظریہ حیات' مراسم عبودیت اور ملک کے لئے سول لا تینوں شعبے تھے۔

يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ (۵: ۴۴) (سارے نبی' جو مسلم تھے اسی کے

مطابق ان یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے اور اسی طرح ربانی اور احبار بھی (اسی پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے ) کیونکہ انہیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے )۔

اللہ تعالیٰ نے تورات کو صرف اس لئے نہیں نازل کیا تھا کہ اس میں صرف نظریہ حیات اور عقائد کے بارے میں راہنمائی ہو۔ اس کے اندر عقائد اور مراسم عبودیت کی تفصیل بھی تھی' بلکہ وہ نور و ہدایت تھی اس معنی میں کہ اس کے اندر ایک قانونی نظام کی تفصیلات تھیں اور ایک مکمل نظام تھا کیونکہ انسان کی پوری زندگی کو اس نظام کے حدود کے اندر رکھنا ضروری تھا۔ تورات کے مطابق وہ تمام نبی فیصلے کرتے رہے جو اپنے آپ کو مسلم سمجھتے تھے اور انہوں نے سر تسلیم خم کر لیا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کا کوئی حصہ اپنے لئے محفوظ نہ کر رکھا تھا بلکہ پوری زندگی اللہ کے حوالے کر دی تھی - وہ کسی معاملے میں اپنی مرضی نہ کرتے تھے' نہ اپنی حکمرانی کرتے تھے' نہ وہ اللہ کے حق حاکمیت میں اپنے آپ کو شریک کرتے تھے - یہ ہے اسلام اپنے حقیقی مفہوم میں - یہ پیغمبر یہودیوں اور اس تورات کے ذریعہ حکومت کرتے تھے اور تورات اس سلسلے میں ان کا دستور اور قانون شریعت تھی - نبیوں کے علاوہ ربانی اور احبار بھی اسی کے مطابق فیصلے کرتے رہے - یہ لوگ ان کے علماء اور قاضی تھے اور ان کا یہ فریضہ تھا کہ وہ تورات کی حکمرانی کو قائم رکھیں - وہ اس بات کے گواہ رہیں کہ انہوں نے یہ حق ادا کر دیا تھا - یہ شہادت وہ اس طرح دیں کہ ان کی اپنی زندگی تورات کے نظام کے مطابق گزرے اور وہ یہ شہادت بھی دیں کہ ان کی قوم نے تورات کو قائم کیا تھا - انہوں نے اس کے مطابق فیصلے کئے تھے -

تورات کے بارے میں بات ختم ہونے سے پہلے ہی روئے سخن جماعت مسلمہ کی طرف پھر جاتا ہے تاکہ انہیں اس بات کی طرف متوجہ کیا جا سکے کہ آیا وہ بھی اپنی کتاب کے مطابق فیصلے کرتے ہیں یا نہیں - کہیں ایسا تو نہیں کہ بعض اوقات لوگوں کی ذاتی خواہشات' ان کا عناد اور ان کی جدوجہد اس راہ میں رکاوٹ بنتی ہو - ایسے مشکل حالات میں پھر کتاب اللہ کے محافظین کے فرائض کیا ہوتے ہیں اور لوگوں کی مخالفت اور کتاب اللہ سے روگردانی کی سزا کیا ہے -

(فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ، وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵ : ۴۴) (پس (اے گروہ یہود) تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے لے کر بیچنا چھوڑ دو جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں)۔

اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات بہرحال تھی کہ اللہ کے احکام کے مطابق فیصلے کئے جانے کی راہ میں بہرحال ہر دور میں رکاوٹیں پیدا ہوں گی اور بعض لوگ اس کی مخالفت کریں گے - بعض انسان ایسے بھی ہوں گے جو خوشی اور تسلیم و رضا کے ساتھ اسے قبول نہ کریں گے نیز بعض بااثر اور بڑے لوگ اور بعض نافرمان اور موروثی طور پر حکومتوں پر قابض ہو جانے والے لوگ اس کی مخالفت کریں گے - یہ مخالفت وہ اس لئے کریں گے کہ انہوں نے اللہ کے حق حاکمیت کی چادر خود اپنے اوپر اوڑھ رکھی ہوتی ہے - اب اسلامی نظام میں انہیں یہ چادر اترتی نظر آتی ہے اور حاکمیت کا حق صرف اللہ کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے - یہ لوگ لوگوں کے لئے جو قوانین بناتے ہیں اور جن کا اذن اللہ نے نہیں دیا ہوتا اب وہ ایسا

نہیں کر سکتے۔ اسی طرح مفاد پرست اور مادہ پرست عناصر کے مفادات بھی اس کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں جو لوگوں کا استحصال کرتے ہیں اور عوام پر مظالم ڈھاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا عادلانہ نظام ایسے مظالم کو جاری رکھنے کی کبھی اجازت نہ دے گا۔ اسی طرح اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ میں وہ لوگ بھی آڑے آتے ہیں جو عیاش اور نفس پرست اور لذت کام و دہن کے دلدادہ ہوتے ہیں' جو دنیا کے ساز و سامان پر فخر کرتے ہیں اور ذاتی مفادات کے بندے ہوتے ہیں۔ ان کو یہ خطرہ ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت انہیں پاکیزہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے گی اور اگر وہ پاکیزہ زندگی بسر نہ کریں گی تو انہیں سزا کا سامنا کرنا ہو گا۔ ان اطراف و جہات کے علاوہ اور بھی کئی قسم کے موانع اور رکاوٹیں سامنے آیا کرتی ہیں علی الخصوص ایسے لوگوں کی طرف سے جو ازروئے فطرت بھلائی نہیں چاہتے اور نیکی اور انصاف کا دور دورہ دیکھ نہیں سکتے۔

یہ بات اللہ کے علم میں تھی کہ اسلامی شریعت کے نفاذ کی راہ میں مختلف اطراف سے یہ رکاوٹیں سامنے آئیں گی۔ اللہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ اسلام کے محافظین اور مجاہدین و شہداء کو ان رکاوٹوں کا سامنا کرنا ہو گا اور ان کو ان کے بالمقابل بڑی مضبوطی سے کھڑا ہونا ہو گا اور جانی و مالی نقصانات انہیں برداشت کرنے ہوں گے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ انہیں پکارتے ہیں :

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ (۵ : ٤٤) (تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو) اس طرح جب وہ اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں گے تو وہ کسی کے ڈر کی وجہ سے شریعت کے نفاذ میں سستی نہ کریں گے۔ یہ ڈر کئی جہات سے ہو سکتا ہے' ایک تو ان لوگوں کی طرف سے جو سرے سے اسلامی نظام قانون کے آگے جھکتے ہی نہیں اور وہ اسلامی شریعت کو تسلیم ہی نہیں کرتے' وہ اللہ کو قانون ساز تسلیم ہی نہیں کرتے یا وہ لوگ شریعت کا نفاذ اس لئے نہیں چاہتے کہ اس کی وجہ سے ان کے استحصالی نظام پر زد پڑتی ہے جس کے ساتھ ان کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں' اور جس کے وہ عادی ہو چکے ہیں۔ یا یہ لوگ عام گمراہ اور منحرف طبقات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جن کے اوپر شریعت کے احکام بہت ہی بھاری ہوتے ہیں اور وہ اس سے پریشان ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان تمام طبقات سے نہ ڈرتے ہوئے یا دوسرے لوگوں سے ڈرتے ہوئے وہ اللہ کے احکام کے نفاذ سے نہیں رکتے اس لئے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی اس بات کا مستحق ہے کہ ہم اس سے ڈریں اور ڈرنا بھی اسی سے چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کو اس بات کا بھی علم تھا کہ کتاب کی حفاظت کرنے والے اور اسلام کی راہ میں شہادت دینے والے ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ دنیا کی اس مختصر زندگی کی خواہشات انہیں ورغلا دیں' یہ محافظین اسلام دیکھتے ہیں کہ اہالیان حکومت' مالدار طبقات اور شہوت پرست اور عیاش لوگ اسلام کے نفاذ کی راہ میں حائل ہیں۔ اس بات کا امکان تھا کہ اہل دین ان طبقات کے ساتھ ریاکاری کرتے ہوئے دنیا کے مفادات کی غرض سے ان کے آلۂ کار بن جائیں' جیسا کہ ہر دور میں' ہر دین کے علمائے سوء ایسا ہی کرتے چلے آئے ہیں اور خصوصاً علمائے بنی اسرائیل یہ بری حرکت ہمیشہ کرتے آئے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو پکارا۔

وَلَا تَشْتَرُوا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (۵ : ٤٤) (اور میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے پر بیچنا چھوڑ دو)۔

اس کی متعدد صورتیں ہوتی ہیں مثلاً سچائی کے مقام پر خاموش ہو جانا' یا احکام میں تحریف کرنا یا ایسے فتوے جاری کرنا جس میں حق باطل دونوں ملے جلے ہوں۔

رہی یہ بات کہ ثمن قلیل سے مراد کیا ہے؟ تو ہر قیمت 'قیمت قلیلہ ہے اگرچہ دین میں تحریف کر کے پوری دنیا کسی کی ملکیت میں آجائے۔ لیکن ان علمائے سوء کی حاصل کردہ قیمت صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ کچھ مفادات 'کچھ وظائف' کچھ القاب اور دوسرے چھوٹے چھوٹے مفادات حاصل کرتے ہیں اور ان کے عوض دین بیچتے ہیں' لیکن اس فعل پر انہیں یقیناً جہنم رسید ہونا ہو گا۔

اگر باڑ فصل کو کھانے لگے اور اگر چوکیدار ہی ڈاکو بن جائے اور اگر گواہ جھوٹ بکنے لگے تو اس سے برا اور کیا ہو گا۔ جن لوگوں کے لئے "دینداروں" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں' جن لوگوں کو علماء کہا جاتا ہے' اگر وہ خیانت کرنے لگیں' اگر وہ زیادتی کرنے لگیں' دین کے احکام چھپائیں' اللہ کی شریعت کے نفاذ کے بارے میں سکوت اختیار کر لیں' آیات کا مفہوم بدل دیں اور بااثر لوگوں کے لئے احکام شریعت میں تبدیلی کر دیں تو پھر ایسے لوگوں کے لئے اللہ کا نہایت ہی موزوں فیصلہ ہے۔

( وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵ : ۴۴ ) (اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تو وہی لوگ کافر ہیں) دو ٹوک بات ہے لفظ من استعمال کر کے اس کے مفہوم کے اندر عمومیت (Generalization) پیدا کر دی گئی ہے۔ من موصولہ اور شرطیہ ہے اور آگے فا کے بعد جملہ جواب شرط ہے۔ یوں یہ حکم مخصوص حالات اور زمان و مکان کی قید سے نکل آتا ہے اور ایک عام حکم بن جاتا ہے' جو بھی اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے' خواہ وہ کسی نسل اور قبیلے سے ہو' کافر سمجھا جائے گا۔

اس حکم کی علت وہی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے' کہ جو شخص اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ اللہ کے حق حاکمیت کا انکار کرتا ہے۔ حاکمیت اللہ کی خصوصیات میں سے اہم خصوصیت ہے اور حاکمیت کا براہ راست تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی شریعت ماخذ قانون ہو۔ اور جو اس کے مطابق فیصلے نہ کرے اور اللہ کے حق حاکمیت کا انکار کرے اور اللہ کی اس خصوصیت کا حق اپنے لئے حاصل کرے تو پھر وہ کافر ہو جائے گا۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اسلام اور ایمان کے معنی کیا رہ جاتے ہیں۔ زبان سے تو ایمان و اسلام کا دعوی ہو اور عمل جو اظہار مافی الضمیر کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے' اس سے انسان کفر کا اظہار کرے' تو زبانی اظہار اسلام یقیناً بے معنی ہو جاتا ہے۔

اس دو ٹوک' قطعی اور عام حکم کے بارے میں لیت و لعل سے کام لینا محض حقیقت کا سامنا کرنے سے فرار ہے۔ اس قسم کے قطعی اور دو ٹوک حکم میں تاویلات کرنے کا مقصد صرف یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کے واضح احکام کا مفہوم بدل کر رکھ دیا جائے۔ لہٰذا کوئی شخص جس پر یہ قطعی حکم منطبق ہوتا ہے وہ اس صریح اور مؤکد حکم کے نتائج سے کسی طرح بھی فرار اختیار نہیں کر سکتا۔

دین اسلام کے اس اصولی اور اساسی قاعدے کے بیان کے بعد اب روئے سخن تورات کی طرف پھر جاتا ہے۔ تورات میں بھی اللہ تعالیٰ نے احکام شریعت نافذ کئے تھے اور نبیوں' اہل دین اور علماء کو یہ حکم تھا کہ قانون تورات کے

مطابق فیصلے کریں اس لئے کہ ان کو شریعت تورات پر محافظ بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ بھی تھے ۔

( وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ، وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَ الْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ، وَ الْجُرُوحَ قِصَاصٌ (۵:۴۵)

(تورات میں ہم نے یہودیوں کے لئے یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان 'آنکھ کے بدلے آنکھ ' ناک کے بدلے ناک 'کان کے بدلے کان ' دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے برابر کا بدلہ ۔

یہ احکام جو تورات میں نازل ہوئے تھے 'اسلامی شریعت میں بحال رکھے گئے تھے اور اسلامی شریعت کا جزء بن گئے تھے ۔ یوں وہ قیامت تک شرعی احکام قرار پائے کیونکہ مسلمانوں کی شریعت قیامت تک کے لئے ہے ۔ اگرچہ ان احکام کا نفاذ صرف دارالاسلام میں ہو سکے گا ۔ اس لئے کہ عملاً صرف ایسا ہی ممکن ہے اور جو حکومت ان احکام کو نافذ کرتی ہے 'اس کا اقتدار دارالاسلام کے حدود کے اندر ہوتا ہے ۔ لیکن مسلمانوں کی استطاعت میں جب بھی یہ بات آئے تو ان پر فرض ہے کہ وہ اسلامی شریعت کو دارالاسلام سے باہر بھی نافذ کریں اس لئے کہ اسلامی شریعت تمام انسانوں کے لئے ہے اور وہ حدود و قیود کی پابند نہیں ہے کیونکہ اللہ کا ارادہ یہی ہے ۔

مذکورہ بالا احکام تورات کو اسلامی شریعت کا جزء بناتے وقت ان احکام کے ساتھ 'ایک قانونی دفعہ کا اضافہ کر دیا گیا ۔ (فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ (۵:۴۵) (پس جو قصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے ) ۔

تورات میں یہ دفعہ نہ تھی ۔ احکام تورات کے مطابق یہ جرائم قابل راضی نامہ Compoundable نہ تھے ان میں مستغیث نہ معافی دے سکتا تھا اور نہ صلح ممکن تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کفارہ نہ تھا ۔

یہاں مناسب ہے کہ فی ظلال القرآن کی مناسبت سے جرائم قصاص کے بارے میں ایک مختصر بات کر دی جائے ۔

اسلامی شریعت قصاص کے بارے میں پہلا اصول مساوات کا متعین کرتی ہے ۔ خون سب کا یکساں ہوتا ہے اور سزا بھی سب کے لئے یکساں ہے ۔ اسلام کے بغیر کسی دوسری شریعت میں جان کے بدلے جان کی مساوات نہیں ہے ۔ چنانچہ اسلام میں جان کے بدلے جان اور عضو کے بدلے وہی عضو ہے ۔ اس بارے میں علاقے ' طبقے 'نسب ' خون اور قوم کا کوئی امتیاز یا لحاظ نہیں ہے ۔

جان کے بدلے جان ' آنکھ کے بدلے آنکھ ' ناک کے بدلے ناک 'کان کے بدلے کان ' دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں پورا پورا بدلہ ہے ۔ اس بارے میں کوئی امتیاز 'کوئی نسلی ' طبقاتی اور قومی فرق نہیں ہے ۔ حاکم و محکوم کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے ۔ سب کے سب اسلامی شریعت کی نظر میں برابر ہیں ۔ اور یہ اس لئے کہ سب کے سب ایک جوڑے آدم و حوا سے پیدا ہوئے ہیں ۔ ابوکم آدم والام حواء ۔

اسلامی شریعت نے اس دنیا کو جس زریں اصول سے متعارف کرایا وہ اصول مساوات ہے اور مساوات دے کر اسلام نے انسان کو گویا ایک نیا جنم دیا ۔ اس سے پہلے انسان کو حقیقی مساوات نصیب نہ ہوئی تھی ۔ اس مساوات کا پہلا اصول یہ تھا کہ تمام لوگ قانون کی نظروں میں برابر ہوں گے ۔ وہ ایک ہی پلیٹ فارم سے انصاف حاصل کریں گے ۔

دوسرے یہ کہ سب سے ایک ہی پیمانے کے مطابق قصاص لیا جائے گا۔ اور سب کی قدر ایک ہی ہوگی۔

انسان نے بنائے ہوئے نظام اور قوانین کو اس درجہ مساوات تک پہنچنے کے لئے صدیاں سفر کرنا پڑا اور اسلامی شریعت ہی سے متاثر ہو کر دنیا کے قانونی نظاموں نے صرف بعض پہلوؤں کے اعتبار سے اسلامی مساوات کو حاصل کیا۔ اگرچہ عملاً وہ ایسی مساوات قائم نہیں کر سکے جو اسلام نے قائم کی۔

یہود جن پر نازل شدہ تورات میں انسانی مساوات کے زریں اصول درج تھے' انہوں نے ان قوانین سے روگردانی کی۔ اور یہ روگردانی انہوں نے اپنے اور دوسرے لوگوں ہی کے درمیان نہ کی جس طرح قرآن ان کا یہ قول نقل کرتا ہے۔

(لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ) (ہم پر امی لوگوں کے بارے میں کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا) بلکہ وہ خود اپنے اندر بھی مساوات قائم نہ کر سکے۔ خصوصاً وہ قانونی مساوات پر عمل پیرا نہ تھے جیسا کہ وہ بنو نضیر کو برتر اور بنو قریظہ کو ذلیل قبیلہ سمجھتے تھے اور دونوں کے لئے سزائیں علیحدہ علیحدہ تھیں اور جب حضور اکرم ؐ مبعوث ہوئے تو آپ نے ان کے درمیان قانونی مساوات قائم فرمائی۔ آپ نے ان میں سے ذلیل لوگوں کی جان کو معزز لوگوں کی جان کے برابر قرار دیا۔

اس عظیم اصول پر قانون قصاص نافذ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ سخت غیرت آموز سزا ہے اور اس کے ہوتے ہوئے ہر شخص اقدام قتل' اقدام ضرر شدید اور اعضاء کے توڑنے کے بارے میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے بار بار سوچتا ہے کہ وہ یہ اقدام کرے یا نہ کرے۔ اس لئے کہ اسے علم ہوتا ہے کہ اگر اس نے قتل کیا تو اسے سولی پر چڑھنا ہوگا' اور اس کا نسب' اس کی سماجی حیثیت اور اس کا رنگ و نسل اسے کوئی فائدہ نہ دے سکے گا۔ اسے ویسی ہی سزا ملے گی جیسا وہ جرم کرے گا۔ اگر وہ کسی کا ہاتھ' پاؤں یا دوسرے اعضاء ضائع کرے گا تو اس کے بھی وہی اعضاء ضائع ہوں گے۔ اگر وہ آنکھ' کان اور ناک ضائع کرے گا تو اس کے یہی اعضاء ضائع ہوں گے۔ اور اگر کوئی یہ سمجھے کہ اسے صرف قید ہوتا ہے تو وہ کبھی بھی ایسے جرائم سے باز نہ آئے گا چاہے سزائے قید لمبی ہو۔ اس لئے کہ جسمانی سزا' جسمانی نقص اور شکل کا بگڑنا بمقابلہ مصائب سزائے قید زیادہ اذیت ناک ہے جیسا کہ ہم حد سرقہ کے بیان میں قطع ید کے ضمن میں تفصیلات بیان کر آئے ہیں۔

پھر مزید یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ سزائے قصاص ایک ایسی سزا ہے کہ انسان کی فطرت اس کے اجراء کے بعد مطمئن ہو جاتی ہے اور نفس انسانی سے بغض اور کینہ دور ہو جاتا ہے۔ دل کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں اور انتقام کی آگ بجھ جاتی ہے' جتنے عرصہ اور جاہلی انتقام بھڑکتا رہتا ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ بعض لوگ قتل میں دیت اور زخموں کا تاوان وصول کر لیتے ہیں لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اجرائے سزائے قصاص پر اصرار کرتے ہیں۔

اسلام نے قانون سازی کرتے وقت فطرت انسانی کے جذبات کو ملحوظ رکھا ہے' جیسا کہ تورات کی شریعت نے اس کی سختی سے پابندی کی اور مکمل قصاص کے نفاذ سے فطرت انسانی کو مطمئن کیا۔ لیکن اسلامی شریعت میں قصاص لینے والے کے لئے یہ اصول بھی رکھا کہ وہ معاف کر سکے بشرطیکہ قصاص لینے پر اسے اختیار حاصل ہو جائے۔ (فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ (۵:۴۵) (اور جو قصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے)۔

یعنی جو خوش دلی کے ساتھ قصاص معاف کر دے' چاہے وہ قتل کی صورت میں ولی الدم ہو' یا جرح اور زخم کی صورت میں خود مجروح ہو' پہلی صورت میں ولی الدم خون کی صورت میں معافی دے کر دیت قبول کر سکتا ہے یا دیت اور

سزائے موت دونوں معاف کر سکتا ہے۔ (فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ (۵: ۴۵) کے معنی یہ ہیں کہ اس معافی سے معاف کرنے والے کے گناہ معاف ہوں گے۔

اس ترغیب کی وجہ سے اگر کوئی صدقہ کر دے اور معاف کر دے تو اس کے عوض اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے کے گناہ معاف کر دے گا۔ بعض اوقات لوگ عفو و درگزر کی طرف مائل ہو سکتے ہیں' انہیں اللہ کی جانب سے عفو و درگزر کی امید ہو سکتی ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کی طرف سے جن لوگوں کو مالی معاوضے کی ضرورت نہیں ہوتی' اور قصاص کے نفاذ سے بھی ان کی تسلی نہیں ہوتی کیونکہ ان کا جو عزیز ان سے جدا ہو گیا یا انہیں ذاتی طور پر جو نقصان ہوا وہ ناقابل تلافی تھا اس لئے کہ مقتول کے وارث کو کیا ملے گا اگر قاتل کو قتل بھی کر دیا جائے۔ یا اگر اس کا بھائی وغیرہ جدا ہو گیا تو مالی مفادات سے اسے کیا حاصل ہو گا؟ اس سے تو صرف اس دنیا میں انصاف اور امن و امان حاصل ہو سکتے ہیں لیکن ورثاء یا مجرم کے دل میں احساس ہمیشہ کے لئے زندہ رہتا ہے۔ اگر لوگوں کو اللہ کی جانب سے مغفرت کی امید ہو تو ان کے دل صاف ہو سکتے ہیں اور دلوں سے کینہ کی میل دور ہو سکتی ہے۔

امام احمد نے وکیع' یونس' ابو السفر کے واسطے سے روایت کی ہے۔ ابو السفر کہتے ہیں کہ ایک قریشی نے ایک انصاری کا دانت توڑ دیا۔ اس نے حضرت معاویہ سے تعاون چاہا۔ معاویہ نے کہا' ہم اسے راضی کر دیں گے' لیکن انصاری نے اصرار کیا کہ قانون قصاص نافذ کیا جائے' تو امیر معاویہ نے کہا کہ تم جانو اور یہ انصاری جانیں' اس مجلس میں ابو الدرداء ﷺ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے فرمایا میں نے حضور ؐ سے سنا کوئی مسلمان اگر دوسرے مسلمان کے ہاتھوں کوئی زخم اٹھائے اور پھر اسے معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ بلند کر دیں گے یا اس کی کوتاہیوں میں سے کوئی کوتاہی معاف کر دیں گے۔ اس پر انصاری نے کہا میں معاف کرتا ہوں۔"

یوں اس شخص کا دل راضی ہو گیا اور مطمئن ہو گیا حالانکہ وہ حضرت معاویہ کی جانب سے کسی بھی مالی تاوان پر راضی نہ ہوا تھا جس کی طرف حضرت معاویہ نے اشارہ فرمایا تھا۔

یہ تو ہے اللہ علیم و خبیر کی شریعت جو اس نے اپنی مخلوق کے لئے وضع فرمائی ہے جس میں لوگوں کے میلانات اور احساسات کا لحاظ رکھا گیا ہے' جس میں لوگوں کی دلی رضامندی کا بہت بڑا دخل ہے اور جس کی وجہ سے لوگوں کے اندر اطمینان' سلامتی اور دلی رضا پیدا ہوتی ہے۔

یہ بتانے کے بعد کہ یہ تورات کی شریعت تھی اور اب یہ اسلامی شریعت کا جزء ہے' ایک عام حکم دے دیا جاتا ہے

(وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۵: ۴۵) (جن لوگوں نے اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کیا وہ لوگ ظالم ہیں) یہ ایک عام تعبیر ہے۔ یہاں کوئی ایسا قرینہ نہیں ہے جس کی وجہ سے ہم اسے مخصوص کہہ سکیں لیکن ایسے لوگوں کی جدید صفت الظالمون لائی گئی ہے۔

الظالمون سے تعبیر کرنے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ شاید اس تعبیر اور پہلی تعبیر الکافرون کے درمیان کوئی فرق ہے۔ بلکہ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہونے کے ساتھ ظالم بھی ہیں۔ وہ کافر اس لئے ہیں کہ وہ اللہ کی حاکمیت کے منکر ہیں' اس لئے کہ حاکمیت خاصہ خدا ہے اور قانون سازی صرف اللہ کر سکتا ہے اور اگر

کوئی خود اپنا قانون بناتا ہے تو وہ خود حاکمیت کا مدعی ہے اور اپنے لئے حق قانون سازی حاصل کرتا ہے۔ وہ ظالم اس لئے ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی شریعت کے بجائے اپنی شریعت پر چلاتا ہے۔ حالانکہ اللہ کی شریعت ان کے لئے مناسب ہے اور ان کے حالات کی اصلاح اس سے ہو سکتی ہے۔ اور ظلم وہ اس لئے بھی کر رہا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے اور اپنے آپ کو کفر کی سزا کا مستحق بناتا ہے اور اپنی ذات اور تمام لوگوں کی زندگیوں کو فساد میں مبتلا کرتا ہے۔

یہ مفہوم عربیت کے قواعد کا تقاضا ہے کیونکہ عربیت کی رو سے مسند الیہ اور فعل شرط ایک ہے یعنی وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (۴۵) اب اس شرط کا ایک پہلا جواب ہے اور ایک دوسرا جواب ہے۔ یہاں دوسرا جواب شرط پہلے جواب شرط پر مستزاد ہوگا اور دونوں کا مسند الیہ شرط میں "من" ہوگا جو مطلق ہے اور عام ہے۔

---○○○---

اب یہ بتایا جاتا ہے کہ تورات کے بعد بھی یہ حکم جاری ہی رہا۔

وَ قَفَّیْنَا عَلٰۤی اٰثَارِهِمْ بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۪ وَ اٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ فِیْهِ هُدًی وَّ نُوْرٌ ۙ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ هُدًی وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ ؕ۴۶ وَلْیَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیْهِ ؕ وَ مَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۴۷

(پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا۔ تورات میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا وہ اس کی تصدیق کرنے والا تھا۔ اور ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں رہنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی تورات میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا اس کی تصدیق کرنے والی تھی اور خدا ترس لوگوں کے لئے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔ ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں)۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت عیسیٰ ابن مریم کو انجیل عطا ہوئی تاکہ وہ لوگوں کے لئے نظام زندگی قرار پائے۔ انجیل میں بذات خود کوئی نیا شرعی نظام نہ تھا، البتہ انجیل میں تورات کے قانونی نظام میں نہایت ہی خفیف تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ انجیل نے خود تورات کے نظام قانون اور نظریات کی تصدیق کی، صرف چند تبدیلیاں لائی گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے انجیل کے اندر امت مسلمہ کے لئے ہدایت، نئی روشنی اور نصیحت اتاری۔ یہ کس کے لئے؟ ان لوگوں کے لئے جو خدا ترس تھے۔ اس لئے متقی

لوگ وہ ہوں گے جو ہدایت ' روشنی اور وعظ و نصیحت اللہ کی کتابوں سے اخذ کرتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں کو یہ کتابیں ہدایات دیتی ہیں - رہے وہ دل جو خشک ' پتھر کی طرح بے جان اور سخت ہوتے ہیں تو کوئی نصیحت ان تک نہیں پہنچتی - ان دلوں کو کلام کے اندر کوئی مفہوم نظر نہیں آتا - ان کو ہدایات کے اندر روح نظر نہیں آتی - ان کو ایمان کے اندر کوئی ذائقہ نظر نہیں آتا - وہ ان ہدایات ' ان انوار سے کوئی راہ نہیں پاتے اور نہ ہی دعوت و پکار پر لبیک کہتے ہیں - نور اور روشنی موجود ہوتی ہے لیکن ان کی بصارت اور بصیرت کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا - راہنمائی موجود ہوتی ہے لیکن اس راہنمائی کا ادراک صرف بلند روحوں کو ہوتا ہے - نصیحت موجود ہوتی ہے لیکن صرف فہم رکھنے والے دل ہی نصیحت لیتے ہیں -

اللہ تعالیٰ نے انجیل میں بھی ہدایت ' نور اور اہل تقویٰ کے لئے نصیحت درج فرمائی اور اہل انجیل کے لئے اسے نظام حیات قرار دیا - اور ان کے لیے قوانین کا ماخذ بنایا یعنی انجیل صرف اہل انجیل کے لئے نظام حیات تھی - وہ تمام لوگوں کے لئے نہ تھی ' کیونکہ انجیل کی دعوت عام نہ تھی لیکن اس کا نفاذ تورات کی طرح ' ہر رسالت کی طرح اور ہر رسول کی دعوت کی طرح ضروری تھا ' جو رسول کریم ؐ سے پہلے گزرے تھے اور جن کی دعوت نبی ؐ کی دعوت اور شریعت کے مطابق تھی - لہذا شرائع سابقہ کا جو حصہ اسلام کے مطابق ہے وہ اسلام کی شریعت اور قرآن کی شریعت کا حکم رکھتا ہے ' جیسا کہ حکم قصاص کے ضمن میں ہم کہہ آئے ہیں -

یعنی اہل انجیل سے بھی مطالبہ یہی تھا کہ وہ انجیل کی شریعت کے مطابق اپنے فیصلے کریں -

(وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ (۵ : ۴۷) (ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جسے اللہ نے اتارا) یعنی اصل الاصول یہی تھا کہ اللہ کے احکام کے مطابق فیصلے کئے جائیں - اہل انجیل اور یہودیوں دونوں کی کوئی حیثیت نہ تھی جب تک وہ اسلام سے قبل تورات کو نافذ کرتے تھے - اسلام کے آنے کے بعد اب تو سب دنیا کے انسانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اسلامی شریعت نافذ کریں - یہ شریعت اب سب کی شریعت ہے اور یہ اب آخری رسالت اور آخری شریعت ہے -

بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۵ : ۴۷

(جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں -)

یہاں بھی آیت نہایت ہی عام اور مطلق ہے - اور اس سے قبل اس قسم کے فعل پر صفت کفر اور ظلم کا جو اطلاق ہوا تھا ' صفت کفر ان دونوں پر مستزاد ہے - یہاں فاسقوں سے مراد کوئی اور لوگ نہیں ہیں بلکہ وہی کافرون اور ظالمون ہیں جنہیں یہاں صفت فاسقوں سے بھی متصف کیا گیا ہے اور جو بھی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کرے گا وہ اس صفت سے متصف ہو گا -

کفر اس لئے ہو گا کہ اللہ کی شریعت کا انکار کرنے سے اللہ کی حاکمیت کا انکار ہو گا - ظلم اس لئے لازم ہو گا کہ لوگوں پر اللہ کے سوا کوئی اور قانون نافذ کر کے ظلم ہو گا اور اس قانون کے ذریعے ان کی زندگیوں میں فساد برپا ہو گا اور فسق اس لئے ہو گا کہ اللہ کے نظام حیات سے خارج ہونے والا خود بخود فاسق ہو جاتا ہے - غرض یہ تمام صفات اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے نہ کرنے کے فعل کے ساتھ لازم ہیں اور ایسا فاعل ان تمام صفات کا مرتکب ہوتا ہے

اور ان میں کوئی تفریق نہیں ہے۔

---ooo---

اب بات حضور اکرم ؐ کی آخری رسالت تک آپہنچی ہے۔ اب آخری شریعت یعنی اسلامی شریعت کے بارے میں بات ہوتی ہے۔ اس میں اسلام کو اپنی آخری شکل میں پیش کر دیا گیا تاکہ وہ تمام انسانوں کا دین بن جائے اور اسلام کی شریعت تمام لوگوں کی شریعت ہو۔ نیز اس کے اندر ان تمام ہدایات کو جمع کر کے محفوظ کر دیا جائے جو اس سے پہلے کسی بھی رسول کو دی گئی تھیں اور یہ شریعت اس وقت تک نافذ رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کو لپیٹ نہیں لیتا۔ یہ ایک ایسا نظام زندگی ہے جس پر اسلامی زندگی ہر پہلو کے اعتبار سے قائم ہوتی ہے۔ اس کے دائرے کے اندر زندگی محدود ہو جاتی ہے اور اس کے محور کے اندر گھومتی ہے۔ انسان اپنے اعتقادات و تصورات اسی سے اخذ کرتا ہے۔ اپنا اجتماعی نظام بھی اس کے مطابق استوار کرتا ہے' اور وہ اپنے انفرادی اور سوشل روابط اسی کے مطابق ڈھالتا ہے۔ اور یہ شریعت اس لئے اتاری گئی ہے کہ یہ عدالتوں میں رائج ہو' اس کے مطابق نظام تعلیم استوار ہو' کتابوں اور دفتروں کے اندر اس کا دور دورہ ہو اور اس کی پیروی اور اس کا نفاذ نہایت دقت کے ساتھ ہو۔ اس کا کوئی جزء متروک نہ ہو' اس کا کوئی جزء بدلا نہ گیا ہو' چاہے چھوٹے معاملات سے متعلق ہو یا بڑے معاملات سے اس لئے کہ یا تو شریعت اسلامی ہوگی اور یا جاہلیت ہوگی۔ اس شریعت کے نفاذ کے سلسلے میں اس نیت سے تساہل اور مداہنت کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ اس بہانے بہت سے لوگوں کو اسلام کے نام پر جمع کر دیا جائے' اس لئے کہ اگر اللہ چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ اس کی شریعت کی حکمرانی قائم ہو' پھر جو ہوتا ہے ہو۔

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ مُہَیۡمِنًا عَلَیۡہِ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الۡحَقِّ ؕ لِکُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡکُمۡ شِرۡعَۃً وَّ مِنۡہَاجًا ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّ لٰکِنۡ لِّیَبۡلُوَکُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰىکُمۡ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ ؕ اِلَی اللّٰہِ مَرۡجِعُکُمۡ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ فِیۡہِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۴۸﴾ وَ اَنِ احۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ وَ احۡذَرۡہُمۡ اَنۡ یَّفۡتِنُوۡکَ عَنۡۢ بَعۡضِ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ اِلَیۡکَ ؕ

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُصِيبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ ۝٤٩ أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝٥٠

(پھر اے نبی' ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے۔ لہٰذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو..... ہم نے تو (انسانوں) میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی ہے۔ اگر تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا لیکن اس نے یہ اس لئے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے' پھر وہ تمہیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو.... پس اے نبی ' تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو' اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنے میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے۔ پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے ان کے بعض گناہوں کی پاداش میں ان کو مبتلائے مصیبت کرنے کا ارادہ ہی کر لیا ہے' اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں (اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں) تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟)۔

انسان جب اس تعبیر کی صفائی پر غور کرتا ہے اور اس دوٹوک فیصلے پر نگاہ ڈالتا ہے اور اس مکمل اختیار پر غور کرتا ہے کہ اس میں ان تمام امور کی پیش بندی کر دی گئی ہے جو ترک شریعت کے بارے میں کسی انسان کے دل میں آ سکتے ہیں۔ جب انسان غور کرتا ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے کہ کوئی مسلمان ان ہدایات کے باوجود کس طرح شریعت کو ترک کر سکتا ہے۔ یہ ترک وہ حالات اور ضروریات کے بہانے سے کرتا ہے اور پھر بھی دعوائے اسلام کرتا ہے۔ اس سے زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ کوئی شخص اسلامی شریعت کو کلیۃً ترک کر دے اور پھر بھی یہ کہے کہ وہ مسلمان ہے۔ ان لوگوں کی جرأت کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے اپنے گلے سے اسلام کا طوق اتار پھینکا ہے لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو بدستور مسلمان کہتے ہیں۔ پوری کی پوری شریعت کو انہوں نے اپنی زندگی سے یکسر خارج کر دیا ہے۔ وہ اللہ کی حاکمیت کا اقرار ہی نہیں کرتے اور یہ یوں کہ وہ قانون سازی کو اللہ کے ساتھ مخصوص نہیں کرتے اور یہ بات نہیں مانتے کہ اسلامی شریعت ہر قسم کے حالات اور ہر قسم کے اوقات میں قابل عمل ہے اور یہ کہ ہم پر یہ فرض ہے کہ ہم تمام حالات میں شریعت کو نافذ کریں۔

( وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ (٥:٤٨) ) (پھر اے نبی ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے)۔

یہ حق اس طرح ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے آئی ہے اور اللہ تعالیٰ اس بات کا مستحق ہے کہ وہ شریعت نازل کرے اور لوگوں پر قانونی ڈیوٹیاں عائد کرے۔ پھر اس کتاب کے مشمولات تمام حق ہیں' نظریات سچے ہیں' قوانین سچے ہیں' جو قصے اور خبریں اس میں درج ہیں وہ سچے ہیں اور جو ہدایات اس میں دی گئی ہیں وہ برحق دی گئی ہیں۔

( مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَیۡمِنًا عَلَیۡهِ (٥:٤٨) ) (اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے)۔

اس طرح یہ دین الٰہی کی آخری مکمل شکل ہے اور آخری ماخذ اور مرجع ہے۔ یہ آخری نظام زندگی ہے' آخری قانون ہے اور اس کے بعد قانون و شریعت اور نظام و دستور میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی اور نہ کوئی ترمیم و تنسیخ ہوگی۔

اس اصول کا قدرتی تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے تمام اختلافات اس کتاب کی طرف لوٹائیں تاکہ یہ کتاب اس بارے میں فیصلہ کرے' چاہے ان اختلافات کا تعلق اعتقادات اور تصورات کے ساتھ ہو' جو عموماً ادیان سماوی کے حاملین اور علماء کے درمیان ہوتا رہا ہے یا یہ اختلاف خود مسلمانوں کے اندر پایا جاتا ہو تو وہ مرجع اور ماخذ جس کی طرف وہ اپنی پوری زندگی کے امور میں رجوع کریں گے وہ یہی کتاب ہے۔ اور ان معاملات میں انسانوں میں سے بڑے سے بڑے افراد کی ذاتی رائے کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اگر اس رائے کی پشت پر قرآن و سنت سے کوئی دلیل نہیں ہے۔

چنانچہ اس اصول اور حقیقت کا براہ راست تقاضا یہ سامنے آتا ہے ...

فَاحۡكُمۡ بَیۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الۡحَقِّ

(٥:٤٨) ) (لہٰذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو) ابتداءً یہ حکم رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا ہے' یعنی ان اہل کتاب کے بارے میں جو آپ کے پاس فیصلے لے کر آتے تھے۔ لیکن یہ حکم اس سبب نزول کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ایک عام حکم ہے اور ہر زمان و مکان کے لئے ہے اس لئے کہ آپ کے بعد کوئی جدید رسول آنے والا نہیں ہے۔ نہ آپ کے بعد کوئی جدید رسالت بھیجی جانے والی ہے کہ اس حکم میں کوئی تبدیلی لائی جا سکے کہ اب قرآن مرجع نہیں رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دین کو مکمل کر دیا ہے اور اس طرح مسلمانوں پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے اور ان تمام اہل ایمان کے لئے یہ اسلامی نظام حیات پسند کر لیا ہے۔ اب اس میں کسی ترمیم اور تبدیلی کا کوئی راستہ نہیں ہے اور نہ ہی کسی اصول کے مطابق اللہ کے کسی حکم کو تبدیل کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم نافذ کر سکتے ہیں۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے اس دین کو لوگوں کے لئے پسند فرمایا تو اللہ کو علم تھا کہ یہ دین تمام لوگوں کے لئے اپنے اندر گنجائش رکھتا ہے اور جب اس دین کو ہدایت کا مرجع بنایا گیا تو اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ اس میں سب کے لئے فلاح اور بھلائی ہے۔ یہ تمام لوگوں کی زندگی کے تمام مسائل قیامت تک حل کر سکتا ہے اور یہ کہ اس کے اندر کوئی تبدیلی (اس سے روگردانی تو بڑی بات ہے)

موجب کفر ہے۔ ایسا فعل کرنے والا دین سے خارج ہے اگرچہ زبانی طور پر وہ لاکھ مرتبہ اپنے آپ کو مسلمان کہے۔ یہ اس دین کی اس نوعیت کا لازمی نتیجہ ہے۔

اللہ کو علم تھا کہ اس راہ میں لوگ لمبی چوڑی معذرتیں پیش کریں گے اور یہ معذرتیں اس لئے پیش کی جائیں گی کہ اللہ کے نازل کردہ قانون سے پھر کر ان لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کیا جائے جو جعلی طور پر حاکم بن گئے یا محکوم ہیں۔ بعض حالات میں مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کے متعلق بعض لوگوں کے دلوں میں اندیشے پیدا ہوں گے، لیکن ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نبی اکرم ؐ کو دو بار اس بارے میں متنبہ کیا کہ آپ ایسے لوگوں کی خواہشات اور خدشات کی پیروی نہ کریں اور ایسے لوگوں کے فتنے سے بچیں۔

ان خدشات میں سے پہلا خدشہ یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک فطری جذبہ ہوتا ہے کہ اس سے سب لوگ خوش رہیں اور تمام طبقات اور تمام رجحانات کے لوگوں کا لحاظ رکھا جائے۔ ان کے وہ رجحانات جن کا اسلامی شریعت کے ساتھ تضاد آتا ہے ان میں ان کا لحاظ رکھا جائے اور معمولی باتوں میں نرمی کی جائے یا ان معاملات میں تساہل کیا جائے جو بظاہر شریعت کے دائرۂ اثر میں نہیں آتے۔

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ ؐ کو یہودیوں نے یہ پیشکش کی کہ وہ ایمان لے آئیں گے اگر آپ بعض احکام کے بارے میں ان کے ساتھ مصالحت کرلیں ان میں سے ایک رجم کا حکم تھا اور یہ تنبیہ خصوصاً ایسے موقع پر نازل ہوئی جیسا کہ اس سے ظاہر ہے۔ لیکن ان آیات میں جو حکم دیا گیا ہے وہ کسی خصوصی سبب کے ساتھ مخصوص نہیں ہے عام ہے۔ یہ حکم مختلف احوال کے لئے ہو سکتا ہے اور حاملین شریعت کو ہر دور میں ایسے حالات پیش آسکتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ وہ اس معاملے میں نہایت ہی دوٹوک بات کر دیں اور انسانی خواہش کا ہر خفیہ راستہ بند کر دیں جن میں انسان حالات اور واقعات کے مطابق پوری شریعت کے نفاذ میں تساہل کرتا ہے یا بعض لوگوں کی دلجوئی کے لئے تساہل کرتا ہے جبکہ لوگوں کی خواہشات اور میلانات مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ نے اپنے نبی ؐ سے کہا کہ اگر اللہ چاہتا تو لوگوں کو ایک امت بنا دیتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کے لئے ایک نظام اور منہاج مقرر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جو شریعت عنایت فرمائی تھی انہیں اس کے بارے میں آزمائش میں ڈال دیا اور اس دنیا کی زندگی کے لئے انہیں جو کچھ دیا گیا اس کے بارے میں بھی ان کی آزمائش ہوگی۔ ہر ایک اپنے لئے ایک طریقہ وضع کر لیتا ہے۔ اس کے بعد تمام لوگ لوٹائے جائیں گے۔ اللہ ان کو حقیقت سے آگاہ فرمائے گا اور انہوں نے جو جو طریقے اختیار کئے ان پر ان کا محاسبہ کرے گا۔ اس لئے ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ شریعت میں کوئی سستی اور تساہل برتیں اور اس طرح مختلف مسالک اور مشارب کے لوگوں کو جمع کرنے کی سعی کریں، اس لئے کہ یہ اجتماع ممکن ہی نہیں ہے۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۚ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (۵:۴۸)

(ہم نے تم (انسانوں) میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی۔ اگر تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا' لیکن اس نے یہ اس لئے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ للذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے' پھر وہ تمہیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اس طرح شیطان کی تمام راہیں بند کر دیں۔ یعنی وہ سب راہیں جو بظاہر اچھی تھیں اور ان کے ذریعے تالیف قلب ہو سکتی تھی۔ خصوصا ایسی صورت میں جبکہ شریعت کے نفاذ میں بعض امور پر سودا بازی کی جائے اور اس تساہل کے ذریعہ تمام لوگوں کو راضی رکھا جائے۔ یا شریعت میں تساہل کے ذریعہ "قومی اتحاد کا حصول" جیسے نعرے لگائے جائیں۔

اسلامی شریعت ایک نہایت ہی قیمتی سرمایہ ہے۔ وہ اس سے زیادہ قیمتی ہے کہ اس کے بعض اجزاء کی قیمت پر کسی ایسے مقصد کو حاصل کرنے کی سعی کی جائے جسے اللہ کی تقدیر نے نہیں چاہا۔ اللہ ہی نے تو لوگوں کو پیدا کیا ہے اور ان میں سے ہر شخص کو علیحدہ علیحدہ استعداد دی ہے اور لوگوں کے مسالک و مشارب بالکل مختلف اور متنوع ہیں۔ ہر ایک کا اپنا طریقہ اور اپنا منہاج ہے۔ اور یہ اللہ کی حکمت کا تقاضا تھا کہ لوگوں کو اس طرح مختلف طبائع کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ اللہ نے ان پر ہدایت پیش کی اور انہیں اسی طرح چھوڑ دیا کہ وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی سعی کریں۔ یہ مسابقت ان کے درمیان ایک قسم کا ابتلاء ہے اور اسی ابتلاء اور آزمائش کی وجہ سے قیامت کے دن جب سب لوگ اللہ کے ہاں جائیں گے تو انہیں جزاو سزا ہوگی۔

اس لئے کہ یہ کٹ حجتی ہوگی اور ایک ناکام کوشش ہوگی کہ کوئی شخص لوگوں کو اسلامی شریعت کے کسی حصے کو قربان کر کے جمع کرے یا لوگوں کی اصلاح اور ان کے معاشی حالات درست کرنے کے لئے شریعت کی کوئی انوکھی تعبیر کی جائے۔ اسلامی شریعت میں تبدیلی یا اس سے روگردانی کی وجہ سے دنیا میں فساد ہی برپا ہو سکتا ہے' اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس طرح تو صرف یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ لوگ اللہ کے درست اور سیدھے منہاج سے روگردانی کر لیں۔ لوگوں کی زندگیوں میں عدل و انصاف کا نام و نشان نہ رہے اور بعض لوگ بعض دوسروں کے غلام بن جائیں۔ پھر ان میں سے بعض 'بعض دوسروں کے لئے الہ اور رب کا مقام حاصل کر لیں۔ یہ ایک عظیم شر و فساد ہو گا اور اس عظیم شر کو محض ایک موہوم مقصد کے لئے برپا ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی جبکہ یہ مقصد ہو بھی ناممکن الحصول ' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تو یہ اصول رکھا ہی نہیں ہے کہ تمام لوگ ایک ہی راہ پر آ جائیں۔ یہ مقصد اس حکمت اور اسکیم کے بھی خلاف ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے مختلف راستے مختلف منہاج اور مختلف ذوق پیدا کئے ہیں۔ وہی تو ہے جو سچائی کا بھی خالق ہے' اور تمام امور اول اور آخر سب اس کے ہاتھ میں ہیں اور اسی کی طرف تمام لوگوں کو لوٹنا ہے۔

ایسے مقاصد کے لئے شریعت کے کسی حصے کو حذف کر دینے کی کوئی کوشش اس آیت کی رو سے ایک ناکام کوشش ہے اور انسانوں کی عملی زندگی اس بات کی شاہد ہے۔ اس کے لئے کسی عملی جواز کی ضرورت نہیں ہے اور اس بات پر ارادۂ الہی سے بھی کوئی دلیل نہیں ہے اور اسلامی شعور کے اندر بھی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اسلامی شعور اور احساس تو یہ ہوتا ہے کہ اللہ کا ارادہ بروئے کار آئے۔ بعض لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں' وہ یہاں تک کہتے ہیں ہم اسلامی نظام شریعت اس لئے نافذ نہیں کرتے کہ اس سے ہمارے ملک میں سیاحوں کی آمد کم ہو جائے گی۔ بالکل وہ ایسا ہی کہتے ہیں۔

چنانچہ قرآن کریم اس حقیقت کی دوبارہ وضاحت کرتا ہے۔پہلی آیت تو یہ تھی

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ

(۵:۴۸) (پس آپ ان کے درمیان فیصلہ کریں اس سچائی کے مطابق جو اللہ نے نازل کی ہے اور اتباع نہ کریں ان کی خواہشات بمقابلہ اس کے جو سچائی تمہارے پاس آئی) اس سے یہ مراد ہو سکتی تھی کہ پوری شریعت کو نہ چھوڑ دیا جائے، محض لوگوں کی خواہشات کی وجہ سے۔لیکن اگر شریعت کا حصہ چھوڑنا پڑے تو اس کے بارے میں یہاں حکم دیا جاتا ہے کہ بعض بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵:۴۸) کا بھی چھوڑنا منع ہے۔

(وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ

بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (۵:۴۹) (پس اے نبی ؐ، تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے)

یہ تنبیہ بہت ہی شدید ہے اور بہت ہی مفصل ہے۔یہ صورت حال کی حقیقی تصویر کشی ہے اس لئے کہ یہ ایک عظیم فتنہ ہے۔ہمیں چاہئے کہ ہم اس سے خبردار رہیں اور تمام فیصلے اللہ کی شریعت کے مطابق کریں۔اگر مکمل شریعت نہ ہوگی تو پھر مکمل خواہش پرستی ہوگی جس سے اللہ تعالیٰ ڈراتے ہیں۔

اگلی آیت میں بعض خدشات اور پریشانیوں کو دور کیا جاتا ہے اور رسول خدا ؐ کو تسلی دی جاتی ہے کہ اگر یہ لوگ شریعت کے بڑے احکام سے پہلے شریعت کے چھوٹے احکام نافذ کرنا پسند نہیں کرتے اور اگر یہ لوگ اسلام کو مکمل دین کے طور پر اختیار نہیں کرتے۔یا اسلامی شریعت کے مطابق اپنے فیصلے نہیں لے جاتے (یہ اس دور کی بات ہے جب شریعت کے مطابق فیصلے اختیاری تھے ابھی تک شریعت کا نظام حتمی طور پر نافذ نہ ہوا تھا۔جب دارالاسلام مکمل طور پر قائم ہوگیا تھا تو پھر شریعت کے مطابق فیصلے کرانا لازم کر دیا گیا) تو پھر یہ لوگ اللہ کے عذاب کے لیے تیار رہیں۔

(فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ

النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ (۵:۴۹) (پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے ان کے بعض گناہوں کی پاداش میں ان کو مبتلائے مصیبت کرنے کا ارادہ ہی کر لیا ہے' اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں)

اگر یہ لوگ منہ پھیرلیں تو آپ پر کیا ذمہ داری ہے۔آپ اپنی جگہ شریعت کو پوری قوت کی ساتھ تھامے رہیں اور اللہ کے احکام نافذ کریں۔ان لوگوں کا اعراض اور روگردانی آپ کی گرفت کو ڈھیلا نہ کر دے اور آپ کو اپنے موقف سے ہٹانہ دے۔یہ لوگ تو اعراض اس لئے کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے بعض گناہوں کی پاداش میں سخت مصیبت میں ڈالنے والے ہیں۔یہ اللہ کی اسکیم ہے کہ یہ لوگ برے نتائج کا شکار ہوں' نہ آپ' نہ اللہ کی شریعت اور نہ

اللہ کا دین متاثر ہو گا اور نہ اسلامی محاذ متاثر ہو گا جس نے شریعت کو پوری طرح پکڑ رکھا ہے۔ ہاں یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ لوگوں کی اکثریت فسق و فجور میں مبتلا رہتی ہے اس لئے وہ اسلام سے نکلتے ہیں اور منحرف ہو جاتے ہیں۔ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ (۵: ۴۹) بے شک لوگوں کی اکثریت فسق و فجور میں مبتلا رہتی ہے۔ یہ لوگ اسی طرح رہیں گے اور آپ اس صورت حال کو بدل نہیں سکتے۔ اس میں شریعت کا بھی کوئی قصور نہیں ہے اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اکثریت کو راہ مستقیم پر استوار کر دیا جائے۔

اس طرح ایک مومن کے نفس کے اندر شیطان کی وسوسہ اندازی کے تمام راستے بند کر دیئے جاتے ہیں اور ایک مومن اپنی راہ پر دلیل کے ساتھ چلتا ہے۔ اسلامی شریعت اور اسلامی احکام میں سے کسی حکم کے چھوڑنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کام کسی دنیاوی غرض کے لئے بھی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ حالات میں سے کسی حال میں ہو سکتا ہے۔

یہاں آکر قرآن کریم انسانوں کو دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ یا تو انہیں اللہ کے حکم اور قانون کی راہ اختیار کرنی ہو گی یا وہ جاہلیت کی راہ اپنائیں گے۔ ان دو راہوں کے درمیان نہ تیسری راہ ہے اور نہ ان کے متبادل اور کوئی راہ ہے۔ دنیا میں اللہ کے احکام نافذ ہوں گے اور لوگوں کی زندگی میں اسلامی شریعت نافذ ہو گی یعنی یا انسانیت کی قیادت اسلامی نظام کرے گا اور یا احکام جاہلیت نافذ ہوں گے، قانون سرکشی نافذ ہو گا اور غلامی کا نظام جاری رہے گا۔ اب اس دوراہے پر لوگوں نے فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

(اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ، وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۵: ۵۰)

(اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں) تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے)۔

یہاں یہ آیت جاہلیت کے مفہوم اور مدلول کو متعین کر دیتی ہے۔ یہ اللہ کا قرآن ہے جو جاہلیت کے مفہوم کو متعین کر دیتا ہے اور اس کے مطابق جاہلیت یہ ہے کہ مملکت میں انسان کی حکومت انسان پر چلے۔ یہ دراصل انسانوں کی جانب سے انسانوں کی غلامی ہے۔ اللہ کی حاکمیت کا انکار ہے اور اللہ کی حاکمیت کے نظریہ کو ترک کرنا ہے۔ یہ انکار اور ترک اصل انسانوں کی حاکمیت کا اقرار ہے اور انسانوں کی بندگی اور پرستش ہے۔

اس آیت کی روشنی میں جاہلیت کا تعلق زمان و مکان سے نہیں ہے بلکہ جاہلیت ایک صورت حال کا نام ہے جو کل بھی تھی، آج بھی ہے اور کل بھی ہو گی۔ لہٰذا جس چیز کی ممانعت ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کے مقابلے میں جاہلی صورت حال نہ اختیار کی جائے جو اسلام سے متصادم ہے۔

لوگوں کے مختلف حالات ہو سکتے ہیں، ہر جگہ اور ہر دور میں، یا تو وہ اللہ کی شریعت کے مطابق عمل کریں گے، ماسوائے اس کے کہ وہ اس کے کچھ اجزاء کو ترک کر دیں یا پھر نظام شریعت کو مکمل طور پر تسلیم و رضا کے ساتھ قبول کریں گے۔ ایسی صورت میں لوگ اللہ کے دین میں متصور ہوں گے۔ یا وہ اپنے فیصلے کسی ایسے قانون کے مطابق کر رہے ہوں جو انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے، چاہے اس کی جو شکل و صورت بھی ہو، اور وہ اسے قبول کریں گے لہٰذا یہ لوگ ان لوگوں کے دین کے اندر متصور ہوں گے، جن کے قانون کو یہ لوگ مانتے ہیں۔ ایسے حالات میں یہ لوگ ہرگز دین اسلام

میں داخل نہ ہوں گے۔ جو شخص اللہ کے حکم کے مطابق فیصلے نہیں کراتا وہ دراصل جاہلیت کے مطابق فیصلے کراتا ہے۔ اور جو شخص اللہ کی شریعت کا انکار کرتا ہے' وہ دراصل جاہلیت کی شریعت چاہتا ہے اور جاہلیت میں بستا ہے۔

یہ ہے ایک دوراہہ جس پر اللہ تعالیٰ لوگوں کو لاکر کھڑا کر دیتا ہے اور اس کے بعد لوگوں کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ جس راہ پر جانا چاہیں اس راہ کو اختیار کر لیں۔

اس کے بعد ذرا درشت نظروں کے ساتھ دیکھ کر پوچھا جاتا ہے ان لوگوں سے جو جاہلیت کے مطابق فیصلے کرانا چاہتے ہیں۔ یہ استفہام انکاری ہے لیکن سوالیہ انداز میں احکام الٰہی کی برتری کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

( وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۵ : ۵۰ )) (حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟ )..... ہاں یہ بالکل درست ہے کہ اللہ کے قانون اور احکام کے علاوہ اور کوئی قانون اور حکم نہیں ہے۔ کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ لوگوں کا قانون ساز ہے۔ یا وہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں زیادہ اچھا قانون بنا سکتا ہے۔ وہ اس عظیم دعوے کے حق میں کیا دلیل رکھتا ہے۔

کیا کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ لوگوں کے خالق کے مقابلے میں لوگوں کے بارے میں زیادہ جاننے والا ہے۔ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ لوگوں کے رب کے مقابلے میں ان کا زیادہ ہمدرد ہے اور کوئی ہے جو یہ کہہ سکتا ہو کہ وہ الٰہ العالمین کے مقابلے میں لوگوں کی مصلحتوں سے زیادہ باخبر ہے؟ کیا کوئی یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو لوگوں کے لئے آخری شریعت بنا رہا تھا' جو اپنے رسول ؐ کو خاتم النبیین بنا رہا تھا' جو ان کی رسالت کو خاتم الرسالات بنا رہا تھا' اور ان کی شریعت کو شریعت ابدی بنا رہا تھا۔ کیا اللہ قیامت تک آنے والے حالات میں سے کسی حال سے بے خبر تھا کہ ایسا حال بھی آئے گا۔ کیا وہ اس سے بے خبر تھا کہ لوگوں کی نئی نئی ضروریات پیدا ہوں گی' نئے حالات پیدا ہوں گے اور اللہ نے اس قانون سازی میں ان کا کوئی خیال نہ رکھا۔ مطلب پھر یہ ہو گا کہ اللہ کو ان حالات کا علم نہ تھا اور یہ علم اب آخری زمانے میں لوگوں پر منکشف ہوا۔

اس سوال کا وہ شخص جواب دے جو زندگی کے دھارے سے اسلامی شریعت کو نکالنا چاہتا ہے۔ اس کی جگہ جاہلیت کی شریعت نافذ کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی خواہشات کو قانون میں بدلنا چاہتا ہے' یا کسی قوم کی خواہشات کو قانون سمجھتا ہے یا کسی نسل کی خواہشات کو اللہ کے حکم اور اللہ کے قانون سے اونچا سمجھتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ ایسا شخص درج بالا سوالات کا جواب کیا دیتا ہے اور خصوصاً اگر یہ شخص اپنے بارے میں یہ زعم بھی رکھتا ہے کہ وہ مسلمان ہے۔

حالات' ماحول' لوگوں کا دلچسپی نہ لینا' دشمنوں کا خوف وغیرہ کیا یہ تمام امور اللہ کے علم میں نہ تھے؟ خصوصاً اس وقت جب اللہ مسلمانوں کو یہ حکم دے رہا تھا کہ وہ اپنے معاشرے میں شریعت نافذ کریں' اسلامی نظام کے مطابق زندگی بسر کریں اور اللہ تعالیٰ نے جو احکام نازل کئے ہیں ان میں سے کسی ایک کو بھی نہ چھوڑیں۔

کیا یہ بات اللہ کے علم میں نہ تھی۔ نئے نئے حالات پیدا ہوں گے اور ان میں کوئی شرعی حکم نہ ہو گا۔ نئی نئی عادات پیدا ہوں گی اور انسان کو حالات مجبور کریں گے۔ یہ سب باتیں اللہ کے علم میں تھیں جب اللہ تعالیٰ بڑی سختی سے یہ حکم دے رہے تھے کہ شریعت کو نافذ کرو اور اگر وہ نافذ نہ کریں تو انہیں اس قدر سخت نتائج سے ڈرا رہا تھا۔

ایک غیر مسلم تو جو چاہے کہہ سکتا ہے لیکن مسلمان ' جو اسلام کے داعی ہیں ' وہ ان سوالات کا کیا جواب دیں گے ۔ کیا وہ اسلام پر قائم رہ سکتے ہیں یا ان کے پاس اسلام سے کوئی چیز رہ سکتی ہے اگر وہ یہی سوچیں اور یہی کہیں ؟

لار یب یہ ایک فیصلہ کن اور دو ٹوک معاملہ ہے ' انسان دوراہے پر کھڑا ہے ۔ کوئی اور راہ نہیں ہے اور اس میں کوئی بحث و تکرار ممکن نہیں ۔ اور نہ کوئی حجت بازی کام کر سکتی ہے یا ایک راہ ہے اور یا دوسری راہ ہے..... یا اسلام ہے اور یا جاہلیت ہے یا ایمان ہے اور یا کفر ہے ' یا اللہ کا حکم ہو گا اور یا جاہلیت کی حکمرانی ہوگی ۔ اور جو لوگ اللہ کے احکام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ' ظالم اور فاسق ہوں گے ۔ اور محکوموں میں سے جو لوگ اللہ کے احکام کو قبول نہیں کرتے وہ مومن نہیں رہتے ۔

ایک مومن کے دل اور فکر میں یہ مسئلہ نہایت ہی واضح اور دو ٹوک ہونا چاہئے ۔ اسے چاہئے کہ وہ نفاذ شریعت میں کسی زمان و مکان کے اثر کو قبول نہ کرے ۔ نہ تردد کرے اور وہ اس معاملے میں دوست اور دشمن کا کوئی لحاظ نہ کرے ۔ جب تک اس مسئلے میں اہل اسلام اپنے ضمیروں میں دو ٹوک فیصلہ نہیں کرتے تو ان کے حالات درست نہیں ہو سکتے نہ ان کا کوئی ایک معیار اور میزان ہو گا نہ ان کا نظام واضح ہو گا نہ ان کے ضمیر کے اندر حق اور باطل کی کوئی تمیز ہوگی اور نہ وہ اسلام کی شاہراہ پر ایک قدم بھی آگے بڑھ سکیں گے ۔ اگر یہ اجازت دی جاتی ہے کہ یہ مسئلہ جماہیر کے ذہنوں میں واضح نہ ہو مجمل ہی رہے ' اور لوگوں اور عوام الناس کے ہاں یونہی ڈھیل رہے جس طرح کہ ہے ۔ لیکن جو لوگ صحیح طرح مسلمان بننا چاہتے ہیں ان کے ذہن تو صاف ہونے چاہئیں ۔ ان کو تو چاہئے کہ وہ اپنے اندر یہ صفت پیدا کریں ۔

---ooo---

# درس نمبر ۵ ایک نظر میں

اس سورہ کے زمانہ نزول کے بارے میں' مقدمہ میں ہم نے جو کچھ کہا تھا' اس سبق کی آیات اس کی تصدیق کرتی ہیں' یعنی یہ کہ یہ سورہ تمام کی تمام سورہ فتح کے بعد نازل نہیں ہوئی' جو صلح حدیبیہ کے بعد چھٹی صدی ہجری میں نازل ہوئی تھی۔ اس سورہ کے کئی ٹکڑے ایسے ہیں جو اس سے بہت پہلے نازل ہو چکے ہوں گے۔ یعنی کم از کم بنی قریظہ کی جلاوطنی سے پہلے جو چار ہجری میں ہوئی' یعنی عام الاحزاب میں اگرچہ اس سے مزید پہلے یعنی بنی نضیر کی جلاوطنی (بعد جنگ احد) اور بنی قینقاع کی جلاوطنی (بعد جنگ بدر) کے دور تک ہم اسے قدیم نہ کہہ سکیں۔

بہرحال یہ آیات کچھ واقعات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں اور جماعت مسلمہ کے اندر پیش آنے والے بعض واقعات کی طرف ان میں اشارہ ہے۔ ان میں وہ حالات لئے گئے ہیں جو مدینہ میں منافقین اور یہودیوں کے حوالے سے موجود تھے اور یہ حالات اس وقت ہرگز نہیں رہ سکتے تھے جب کہ یہودیوں کی قوت اور شوکت کو توڑ دیا گیا تھا اور ان پر آخری وار واقعہ بنو قریظہ کی صورت میں ۴ ہجری میں ہو چکا تھا۔

یہ ممانعت کہ یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ اور یہ ڈراوا بلکہ یہ دھمکی کہ جو لوگ ان کو دوست بنائیں گے وہ انہی میں سے ہوں گے' اور یہ اشارہ کہ جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے' وہ ان کے ساتھ دوستی کرتے ہیں اور وہ اس پر اپنی یہ مجبوری بیان کرتے ہیں کہ وہ مصیبتوں سے ڈرتے ہیں اور یہ مسلمانوں کو نفرت دلانا کہ ان لوگوں سے اس لئے دوستی نہ کرو کہ یہ تمہارے دین کو لہو ولعب سمجھتے ہیں اور یہ اشارہ کہ یہ لوگ اقامت صلوٰۃ کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ یہ سب واقعات ممکن ہی تب ہو سکتے ہیں کہ مدینہ میں یہودیوں کو پوری قوت اور شوکت حاصل ہو۔ اگر یہ قوت نہ ہوتی تو اس قسم کے حالات کا مدینہ میں پیش آنا ممکن ہی نہ تھا۔ نہ ایسے واقعات پیش آ سکتے تھے' اور نہ اس قدر شدید دھمکی اور ڈراوے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ اور اس مکرر سہ کرر مخالفت کی ضرورت نہ ہوتی' نیز یہودیوں کی جبلت کو بیان نہ کیا جاتا اور ان کی اس طرح تشہیر نہ ہوتی اور نہ ہی ان پر اس قدر تنقید ہوتی۔ نہ ان کے مکر و فریب کا پردہ چاک کرنے کی ضرورت ہوتی۔ نہ ان کے حالات کو اس قدر دہرایا جاتا یا اس قدر روشنی ڈالی جاتی۔

بعض روایات ایسی بھی ہیں' جن میں ان میں سے بعض حالات و واقعات کا تعلق واقعہ بنی قینقاع سے بتایا گیا ہے' حالانکہ یہ واقعہ غزوۂ بدر کے بعد پیش آیا تھا۔ ان کے بارے میں عبداللہ ابن ابی ابن السلول کا موقف اور اس کا یہ کہنا کہ یہودی اس کے دوست ہیں اور یہ کہ وہ یہودیوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے' مثلاً اس کا یہ کہنا کہ میں ایک آدمی ہوں کہ میں برے حالات سے ڈرتا ہوں اس لئے میں اپنے حلیفوں کی حمایت نہیں چھوڑ سکتا۔

یہ روایات اگر نہ بھی ہوں تب بھی سورہ کے موضوع اور مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے موضوعات' اس کے اندر بیان کردہ واقعات' سیرت النبی کے واقعات اور مدینہ طیبہ میں اس کے مراحل' ادوار سب کے سب اسی بات

کو ترجیح دیتے ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا نیز سورہ کے مقدمہ میں بھی یہی موقف اختیار کیا۔

---ooo---

اس سبق کی تمام آیات سے وہ اسلوب معلوم ہوتا ہے جس کے مطابق قرآنی منہاج تربیت نے جماعت مسلمہ کو اس رول کے ادا کرنے کے لئے تیار کیا جو اس نے من جانب اللہ اس دنیا میں ادا کرنا تھا۔ نیز ان آیات سے وہ بنیادی عناصر بھی معلوم ہوتے ہیں جن کا ایک نفس مسلم اور ایک جماعت مسلمہ کی فکر اور سوچ کے اندر ہونا ضروری تھا۔ یہ بنیادی عناصر ہر دور کے لئے وہی ہیں۔ یہ مستقل عناصر ہیں اور مستقل اصول ہیں اور یہ کسی دور یا کسی نسل کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ یہی وہ اصول ہیں جن کے اوپر ایک فرد کی تعمیر ہوتی ہے۔ نیز ایک جماعت کی تنظیم بھی انہی اصولوں پر ہوتی ہے۔

قرآن کریم ہر مسلم فرد کی تعمیر اس اساس پر کرتا ہے کہ اس کی تمام ہمدردیاں پورے خلوص کے ساتھ اللہ 'رسول' نظریہ اور اس پر قائم ہونے والی جماعت کے ساتھ ہوں۔ ایک مسلم فرد اور جماعت اور اس فرد اور جماعت کے درمیان مکمل بائیکاٹ ہونا چاہئے جو اسلامی صفوں کے بالمقابل کھڑی ہے اور جس نے اسلام کے مخالف جھنڈے اٹھا رکھے ہیں یعنی جو جماعت حضرت نبی ؐ کی قیادت کو تسلیم نہیں کرتی اور اس جماعت میں ضم نہیں ہوتی جو حزب اللہ کے مقام پر کھڑی ہے۔ قرآن کریم انسان کو یہ شعور دیتا ہے کہ وہ خوش قسمت ہے کہ اسے اللہ نے اپنے کام کے لئے چنا ہے اور وہ پردۂ تقدیر الٰہی ہے اور اس کے ذریعے اللہ کی تقدیریں پردے سے ظاہر ہوتی ہیں' ان تاریخی واقعات کی صورت میں جو پیش آتے ہیں اور یہ اللہ کا وہ کرم عظیم ہے کہ جس کے حصے میں آگیا سو آگیا۔ الا یہ کہ اسلامی جماعت کے سوا تمام دوسری جماعتوں کے ساتھ دوستی گانٹھنا دین اسلام سے ارتداد کے مترادف ہے اور اس مقام کو ترک کر دینا ہے جو اللہ نے ان کو عطا کیا اور اس خلعت فضیلت کو اتار پھینکنا ہے جو اللہ نے اسے پہنائی تھی۔

یہ ہدایات اس سبق کی آیات میں بہت ہی واضح طور پر دی گئی ہیں مثلاً "اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ' یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے' یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی راہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔"

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہو گا جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے' جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے' جسے چاہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔"

"تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنا لے اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب ہونے والی ہے۔"

اس کے بعد قرآن کریم ایک مسلم کے شعور میں اس کے دشمنوں کی حقیقت بھی بٹھاتا ہے' اور اس کشمکش کی حقیقت سے بھی انہیں آگاہ کرتا ہے جو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان برپا ہے۔ یہ کشمکش نظریاتی کشمکش ہے۔ عقیدہ اور نظریہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ایک مسلمان اور اس کے دشمنوں کے درمیان ہر وقت برپا رہتا ہے۔ مسلمانوں کی دشمنی تمام

دوسری چیزوں سے پہلے اپنے عقیدے اور دین کے لئے ہوتی ہے۔ اہل کفر مسلمانوں کے ساتھ یہ دشمنی اس لئے رکھتے ہیں کہ انہوں نے اس دین کی نافرمانی کی ٹھانی ہوئی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص بھی اس دین پر سیدھا چل رہا ہو وہ اسے سخت ناپسند کرتے ہیں۔

"ان سے کہو اے اہل کتاب، تم جس بات پر ہم سے بگڑے ہو، وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم اللہ پر اور دین کی اس تعلیم پر ایمان لے آئے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور ہم سے پہلے بھی نازل ہوئی تھی، اور تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔" یہ ہے نظریہ اور یہ ہے نظریاتی اختلاف اور یہ ہیں اختلافی محرکات۔

اس نظام تربیت اور اس میں دی جانے والی ہدایات کی اہمیت بہت ہی بڑی ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے ساتھ محبت اور رسول اور اس کے دین کے ساتھ والہانہ لگاؤ اور اس کی اساس پر قائم ہونے والی جماعت کے ساتھ لگاؤ اور محبت اور اس دین اور اس کے دشمنوں کے درمیان قائم ہونے والی کشمکش کی اصل نوعیت کو سمجھنا اور اس کے دشمنوں کو اچھی طرح جان لینا ہی اصل دین ہے۔ یہ ایسے امور ہیں کہ جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ ان کے بغیر ایمان کی ضروری شرائط پوری نہیں ہوتیں، ایک مسلمان کی ذاتی تربیت بھی نہیں ہوتی اور اس دین کے لئے کسی محرک جماعت کی تشکیل بھی ممکن نہیں ہے۔ جو لوگ اس دین کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں وہ اس وقت تک پکے مسلمان نہیں ہو سکتے، اس وقت تک وہ ٹھوس شخصیت کے مالک نہیں ہو سکتے اور اس وقت تک وہ اس کرۂ ارض پر کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے جب تک ان کے دلوں کے اندر ان تمام لوگوں کے مقابلے میں دوری نہیں پیدا ہو جاتی جو اس اسلامی محاذ کے خلاف جھنڈے اٹھائے ہوئے ہیں۔ جب تک اہل ایمان کی محبت اور دوستی اللہ، رسول اور اہل ایمان کے لئے مختص نہیں ہو جاتی اور جب تک وہ اس کشمکش کی اصل حقیقت کو پا نہیں لیتے اس وقت تک دین کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ اور جب تک ان کو یہ یقین نہیں ہوتا ہے کہ وہ محض اس غرض کے لئے جمع ہوئے ہیں، اور یہ کہ ہمارے دشمن سب کے سب اسلامی جماعت اور اسلامی عقائد کے خلاف متحد و متفق ہیں۔

ان آیات میں اس پر اکتفاء نہیں کیا گیا کہ مسلمانوں کو وہ اسباب بتا دیئے جائیں جن کی وجہ سے دشمنان دین اسلام کے خلاف جنگ برپا کئے ہوئے ہیں بلکہ ان آیات میں دشمنوں کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔ ان کے فسق و فجور کی مقدار کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ وہ دین سے کس قدر منحرف ہو گئے ہیں تاکہ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کو کیسے دشمنوں سے واسطہ پڑا ہے اور اس کا ضمیر بھی مطمئن ہو جائے کہ وہ اس معرکے میں حق بجانب ہیں۔ اس جنگ کی سخت ضرورت ہے۔ اور اس سے کوئی مفر نہیں ہے۔ "اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، یہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔"

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تمہارے پیش رو اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنایا ہے انہیں اور دوسرے کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ جب تم نماز کے لئے منادی کرتے ہو تو وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس سے کھیلتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔"

"جب یہ تم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، حالانکہ کفر لئے ہوئے آئے تھے اور کفر ہی لئے واپس گئے اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں تم دیکھتے ہو کہ ان میں سے بکثرت لوگ گناہ اور

ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں اور حرام کے مال کھاتے ہیں بہت ہی بری حرکات ہیں جو یہ کر رہے ہیں۔"

"یہودی کہتے ہیں اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں' باندھے گئے ان کے ہاتھ۔ اور لعنت پڑی ان پر اس بکواس کی بدولت جو یہ کرتے ہیں۔ اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں' جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔"

اس وجہ سے کہ ان کی یہ صفات ہیں اور اس وجہ سے کہ جماعت مسلمہ کے ساتھ ان کا یہ رویہ ہے' اور اس وجہ سے کہ یہ جماعت مسلمہ کے خلاف سب اکٹھے ہو چکے ہیں' اور اس وجہ سے کہ وہ مسلمانوں کے دین اور خصوصاً نماز کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں' ایک صحیح مسلمان کے لئے اور کوئی چارۂ کار بھی نہیں ہے کہ وہ پوری سنجیدگی اور پورے اطمینان کے ساتھ' ان لوگوں کی مدافعت کرے۔

ان نصوص کے اندر اس معرکے کے انجام کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے اور اس کا پورا نتیجہ بھی یہاں دے دیا ہے۔ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ آخرت سے بھی پہلے خود اس دنیا میں اسلام کیا رنگ لاتا ہے :"اور جو اللہ اور رسول اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنا لے اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔" .... "اگر یہ اہل کتاب ایمان لے آتے' اور خدا ترسی کی روش اختیار کرتے' تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے۔ اور ان کو نعمت بھری جنتوں میں پہنچاتے۔ کاش انہوں نے تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں' ایسا کرتے تو ان کے لئے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے ابلتا۔"

نیز ان آیات میں ایسے مسلمانوں کی صفات کا بھی تذکرہ ہے جن کو اللہ اپنے دین کی خدمت کے لئے چن لیتا ہے اور ان کو یہ فضل عظیم عطا کرتا ہے کہ انہیں اس عظیم کردار کے لئے اس نے چن لیا۔

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے' (تو پھر جائے ) اللہ اور بہت سے ایسے لوگ پیدا کر دے گا جو اللہ کے محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہو گا' جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے' جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔"

یہ تمام فیصلے اور قراردادیں اسلامی نظام کے قیام کے لئے اقدامات ہیں اور ان سے مقصود یہ ہے کہ ایک مسلم فرد اور مسلم جماعت کی ٹھوس بنیادوں پر تربیت کی جائے۔

---ooo---

# درس نمبر ۵ تشریح آیات

# ۵۱ ـــ تا ـــ ۶۶

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ
أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ
مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿﴾ فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم
مَّرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَن تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ ۚ فَعَسَى اللَّهُ
أَن يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِّنْ عِندِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا فِي أَنفُسِهِمْ
نَادِمِينَ ﴿﴾ وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ
أَيْمَانِهِمْ ۙ إِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۚ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَأَصْبَحُوا خَاسِرِينَ ﴿﴾

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ' یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے۔ یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے وہ انہی میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں۔ کہتے ہیں "ہمیں ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہم کسی معیبت کے چکر میں نہ پھنس جائیں"۔ مگر بعید نہیں کہ اللہ جب تمہیں فیصلہ کن فتح بخشے گا یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کرے گا تو یہ لوگ اپنے اس نفاق پر جسے یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں' نادم ہوں گے۔ اور اس وقت اہل ایمان کہیں گے "کیا یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں؟" ..... ان کے سب اعمال ضائع ہوگئے اور آخر کار یہ ناکام و نامراد ہو کر رہے)۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ولایت اور رفاقت کا مفہوم متعین کر دیا جائے 'جس سے اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ سختی سے منع کرتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ ایسی رفاقت نہ ہونی چاہئے۔

اس رفاقت کا مفہوم یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ حلیفانہ اور باہم تعاون اور امداد کا معاہدہ نہ ہونا چاہئے۔ اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ تم ان کے دین کا اتباع کرو اس لئے کہ یہ تو سوچنا بھی ممکن نہیں ہے کہ مسلمانوں میں ایسا بھی کوئی ہو سکتا ہے کہ وہ یہودیوں اور نصرانیوں کے دین کی اتباع کرتا ہو۔ یہ درحقیقت باہم تحالف اور معاونت کی دوستی ہوتی تھی 'جس کے بارے میں اس وقت مسلمانوں کا ذہن صاف نہ تھا کہ یہ بھی حرام ہے۔ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ ایسے تحالف اور تعاون ابھی تک جائز ہیں۔ اور یہ التباس اس لئے تھا کہ اسلام سے پہلے ان لوگوں کے درمیان ایسے دوستی کے معاہدے ہوا کرتے تھے اور اسلام کے ابتدائی ایام میں بھی ایسا ہوتا تھا خصوصاً مدینہ کے ابتدائی ایام میں۔ ان نصوص کے ذریعے اللہ نے اس سے منع کر دیا اور ایسے معاہدوں کو باطل قرار دے دیا۔ خصوصاً جبکہ میثاق مدینہ کے مطابق مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ہونے والے معاہدے پر یہودیوں نے عمل نہ کیا تھا اور اس سے ظاہر ہو گیا تھا کہ اہل اسلام اور ان کے درمیان اب کوئی معاہدۂ ولا ممکن نہیں ہے۔

یہ مفہوم اور مدلول قرآن کی تعبیرات سے اچھی طرح واضح ہے۔ (دیکھئے مسلمانان مدینہ اور ان مسلمانوں کے بارے میں جو ابھی تک مکے میں تھے اور انہوں نے ہجرت نہ کی تھی' (مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا) یعنی تمہارے اور ان کے درمیان کوئی دوستی اور رفاقت نہیں ہے۔ الا یہ کہ وہ ہجرت کریں۔ ظاہر ہے کہ اس ولایت سے مراد ولایت فی الدین یعنی اسلامی بھائی چارہ نہیں ہے۔ یہاں ولایت سے مراد وہ دوستی ہے جس میں از روئے معاہدہ ایک دوسرے کے ساتھ نصرت اور تعاون کا اقرار کیا جاتا ہے۔ یہ معاہدہ ان لوگوں کے درمیان بھی نہیں ہو سکتا جو اگرچہ مسلمان ہوں لیکن انہوں نے دارالاسلام کی طرف ابھی تک ہجرت نہ کی ہو۔ یہی قسم ہے 'جس سے ان آیات میں اہل اسلام کو منع کیا گیا ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ اس قسم کی دوستی نہ کریں جبکہ مدینہ کے ابتدائی دنوں میں یہ عہد قائم تھا۔

اہل کتاب کے ساتھ رواداری کا رویہ اور بات ہے اور ان کے ساتھ دوستی کے معاہدے کر کے ان کو اپنا دوست بنانا اور چیز ہے۔ لیکن اہل اسلام کے دماغ کے اندر ابھی تک دین کی حقیقت نہیں اتری اور ابھی تک انہوں نے دین کے فرائض و وظائف کو نہیں سمجھا کہ دین ایک منظم اور حقیقت پسندانہ منہاج ہے۔ یہ مسلسل حرکت میں رہتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر ایک واقعی صورت حال پیدا کر دے جو اسلامی تصور حیات کے مطابق ہو۔ یہ تصور حیات ان تمام تصورات سے مختلف ہے جو انسانیت کے اندر متعارف رہے ہیں۔ اس طرح اس اسلامی صورت حالات کا پھر ان تمام تصورات و حالات کے ساتھ تصادم ہوتا ہے جو اس کے خلاف ہوتے ہیں۔ نیز اس کا لوگوں کی خواہشات کے ساتھ' لوگوں کے فسق و فجور اور ان کے انحرافات کے ساتھ بھی تصادم ہوتا ہے اور یہ نظام پھر ایسی کشمکش میں داخل ہو جاتا ہے کہ اس سے کوئی چھٹکارا نہیں ہوتا۔ یہ تصادم اس لئے ہوتا ہے کہ اسلامی نظام ایک جدید صورت حال پیدا کرتا ہے اور اپنے اس ہدف کی طرف وہ مسلسل مثبت طور پر حرکت کرتا رہتا ہے۔

ایسے لوگ جن کے شعور و احساس کے اندر اسلامی نظریہ حیات کا یہ پہلو واضح نہیں ہوتا اور جن کے شعور کے اندر اسلام اور دوسرے ملل و نحل کے اندر برپا معرکے کا اچھی طرح ادراک نہیں ہوتا اور جو اس قسم کی واضح قرآنی ہدایات

سے غافل ہیں تو وہ ان ہدایات جن کے اندر اسلامی معاشرے میں رہنے والے اہل کتاب کے ساتھ رواداری کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے تمام حقوق محفوظ کئے گئے ہیں اور ان ہدایات کے درمیان جو معاہدات تحالف اور باہم نصرت کے بارے میں ہوتے ہیں اور جن کے مطابق ولایت اور دوستی صرف اللہ اور رسول اللہ اور جماعت مسلمہ کے ساتھ ہی ہو سکتی ہے وہ ان دونوں کے درمیان فرق نہیں کرتے ۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ جب اسلام اور اہل کتاب کے درمیان کوئی معرکہ درپیش ہو تو اس میں اہل کتاب اور تمام دوسرے اہل کفر ایک دوسرے کے حلیف ہوتے ہیں اور یہ ان کی ایک مستقل پالیسی اور صفت ہے ۔ ان کو مسلمانوں کے ساتھ محض ان کے اسلام کی وجہ سے دشمنی ہوتی ہے اور یہ کہ وہ کسی مسلمان سے اس وقت تک راضی نہیں ہوسکتے جب تک وہ اپنے دین کو چھوڑ کر ان کے دین کی اطاعت اختیار نہیں کر لیتا ۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اہل کتاب اسلام اور اسلامی جماعتوں کے خلاف مسلسل بر سرپیکار ہیں ۔ تاہم ان کے منہ سے بھی کبھی کبھی یہ بات نکل جاتی ہے اور ان کے دلوں میں جو کچھ چھپا ہوا ہے وہ تو بہت ہی بڑا ہے ۔ یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں ۔

ایک مسلمان کو بہرحال یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اہل کتاب کے ساتھ رواداری کا رویہ اختیار کرے ۔ لیکن اسے اس بات سے روکا گیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کرے ۔ یعنی باہم نصرت اور حلیفانہ دوستی ۔ اس کی راہ جس پر چل کر اس نے دین کو قائم کرنا ہے اور اسے دنیا پہ غالب کرنا ہے اہل کتاب کی راہ سے بہت دور ہے اگرچہ وہ بہت بڑی رواداری اور محبت کا اظہار کیوں نہ کریں ۔ اس لئے کہ یہ لوگ اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوسکتے کہ مسلمان اپنے دین پر قائم رہیں اور اسلامی نظام کو روبعمل لائیں اور یہ رواداری انہیں اس بات سے نہیں روک سکتی کہ وہ اسلام کے خلاف یکجا ہو کر نہ لڑیں ۔ وہ ہمیشہ ایسا کرتے ہیں ۔

یہ ایک عظیم سادہ لوحی ہوگی اور یہ ایک عظیم غفلت ہوگی کہ ہم یہ سمجھ بیٹھیں کہ ہمارے لئے دین کے غلبے کی راہ وہی ہے جس پر اہل کتاب یہود و نصاریٰ چل رہے ہیں اور اس راہ پر چل کر ہم کفار اور ملحدین کا مقابلہ کریں گے جب کہ کفار اور ملحد تو آج کل سب سے زیادہ یہی اہل کتاب ہیں ۔ چنانچہ اب معرکہ بھی مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان ہے ۔

ہم میں سے جو سادہ لوح لوگ ہیں وہ اس ساری حقیقت کو سمجھ نہیں پاتے اور ہر دور میں ایسے مسلمان رہے ہیں کہ جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ مسلمان اور اہل کتاب مل کر الحاد اور مادیت کے خلاف جنگ کر سکتے ہیں اس لئے کہ اہل کتاب بھی اہل دین ہیں اور ہم بھی اہل دین ہیں ۔ لیکن یہ سادہ لوح لوگ قرآن کریم کی ان تمام تعلیمات کو بھول جاتے ہیں بلکہ پوری اسلامی تاریخ کو بھول جاتے ہیں ۔ اہل کتاب تو وہی لوگ ہیں جو ملحد اور مشرک لوگوں سے کہتے تھے (هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا) (یہ مشرک ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ہدایت پر ہیں جو ایمان لائے ہیں) اور یہ اہل کتاب ہی تھے جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف احزاب کو جمع کیا تھا اور مدینہ پر چڑھ دوڑے تھے ۔ یہ تمام احزاب کو پروپیگنڈہ دیتے تھے ۔ یہ اہل کتاب ہی تھے جنہوں نے دو صد سال تک اسلام کے خلاف صلیبی جنگیں لڑیں اور یہی اہل کتاب ہی تو تھے جنہوں نے اندلس میں مسلمانوں کے خلاف ناقابل تصور جرائم کا ارتکاب کیا ۔ یہی اہل کتاب ہیں جنہوں نے حال ہی میں فلسطین سے عرب مسلمانوں کو نکالا اور ان کی جگہ یہودیوں کو بسایا اور اس سلسلے میں وہ تمام ملحدوں اور زندیقوں سے تعاون کرتے رہے ۔ یہ اہل کتاب ہی ہیں جو ہر جگہ سے مسلمانوں کو خانہ بدر کر رہے ہیں ' حبشہ میں ' صومالیہ میں ' اریٹیریا میں اور الجزائر میں غرض ہر جگہ وہ اس ملک بدری اور اس ظلم میں وہ ملحدین ' مشرکین اور بت پرستوں کے

ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ یوگوسلاویہ 'چین' ترکستان اور ہندوستان اور ہر جگہ وہ دشمنان اسلام کے ساتھ معاون ہیں۔

قرآن کریم کی ان مکمل اور جامع ہدایات اور فیصلوں کے بعد بھی ہم میں ایسے لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں اور ان اہل کتاب کے درمیان ملحدانہ مادہ پرستی کے خلاف تعاون اور دوستی ہو سکتی ہے۔ ایسے لوگوں نے درحقیقت قرآن کریم کا مطالعہ اچھی طرح نہیں کیا اور اگر کیا ہے تو پھر ان کے ذہنوں میں اسلام کے نظریہ مذہبی رواداری اور نظریہ ولایت اور دوستی کے درمیان خلط واقعہ ہو گیا ہے۔

یہ اس قسم کے لوگ ہیں کہ ان کے شعور میں اسلام کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اسلام ایک نظریہ حیات ہے جو لوگوں سے کوئی دوسرا نظریہ قبول نہیں کرتا۔ نہ ان کے ذہن میں یہ بات ہے کہ اسلام ایک مثبت تحریک ہے جو اس دنیا کی صورت حال کو یکسر بدلنا چاہتا ہے اور یہ کہ اہل کتاب نے ہمیشہ اسلام کی راہ روکی ہے' جس طرح وہ آج بھی اسلام کی راہ روکے کھڑے ہیں اور یہ اہل کتاب کا وہ موقف ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتا کیونکہ یہی ان کے لئے واحد طبعی موقف ہے۔

ہم ان لوگوں کو ان کی اسی پوزیشن میں چھوڑے ہوئے ہیں کہ وہ غافل رہیں اور یا متغافل رہیں اور ہم خود اللہ کی ان ہدایات پر غور کریں جو بالکل واضح اور صریح ہے۔

(يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ ٱلْيَهُودَ وَٱلنَّصَٰرَىٰٓ أَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُۥ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّٰلِمِينَ (۵ : ۵۱))

"اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ' یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے' یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔" اس پکار کا رخ مدینہ طیبہ کے اندر کام کرنے والی جماعت مسلمہ کی طرف ہے لیکن یہی ہدایات ان تمام جماعتوں کے لئے بھی ہیں جو اس کرہ ارض پر کسی بھی جگہ کام کرتی ہیں۔ اور یہی ہدایات قیامت تک رہیں گی۔ ان تمام لوگوں پر جن پر یہ لقب درست طور پر استعمال ہو۔ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ نزول قرآن کے وقت ان ہدایات کی ضرورت اس لئے پیش آگئی تھیں اور اہل ایمان کو یہ ہدایات اس لئے دی گئی تھی کہ اس وقت مسلمانوں اور مدینہ کے اردگرد بسنے والے یہودیوں کے درمیان مکمل قطع تعلق نہ تھا۔ ان کے درمیان ولایت کے اور حلیفانہ تعلقات ابھی تک باقی تھے۔ اقتصادی اور دوسرے معاملات ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے تھے اور پڑوس اور ہم نشینی کے تعلقات بھی دونوں کے درمیان موجود تھے۔ مدینہ کے جو تاریخی اور اقتصادی حالات تھے یہ صورت حالات ان کا طبعی نتیجہ تھی کیونکہ وہاں عربوں اور یہودیوں کے درمیان تعلقات قائم تھے۔ ان حالات کی وجہ سے یہودیوں کو یہ موقع مل رہا تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف سازش کر سکیں۔ اور دین اسلام کے خلاف اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔ ان کی یہ سازشیں مختلف نوعیت کی ہیں اور گزشتہ پانچ پاروں کی تفسیر میں ان کی پوری تفصیلات دے دی گئی ہیں اور اس سبق میں بھی اس سازش کے بعض پہلو لئے گئے ہیں۔

قرآن کریم کا نزول صرف اس غرض کے لئے ہوتا رہا کہ مسلمان کو اس دنیا میں اپنے عقیدے اور نظریہ حیات کے

حوالے سے ' جو معرکہ درپیش ہے ' اور اس کے پیش نظر جو مقصد اقامت دین ہے ' اس بارے میں اس کی سوچ اور لازمی حد تک اس کا شعور پختہ ہو جائے - نیز ایک مسلم شعور اور ان تمام لوگوں اور قوتوں کے درمیان مکمل خلیج ہو جائے جو اس دین اور اس کے نظام کی راہ روکے ہوئے ہیں اور جو کسی صورت میں بھی اسلامی جھنڈے کے نیچے نہیں آنا چاہتے - ہاں یہ اور بات ہے کہ اس مکمل بائیکاٹ کے دائرے میں اخلاقی رواداری یا سماجی بائیکاٹ نہیں آتا - اخلاقی برتاؤ اور سماجی روابط بہرحال ایک اچھے مسلمان کی صفات ہیں جو کسی بھی وقت اس سے جدا نہیں ہوتیں - ہاں ان ہدایات میں ان کے ساتھ دوستی اور حلیفانہ تعلقات سے منع کیا گیا جو صرف اللہ ' رسول اللہ اور اہل ایمان کے ساتھ ہی ہو سکتے ہیں اور علیحدگی کا یہ وہ شعور ہے جو ایک مسلمان کے اندر ہر جگہ ' ہر زمانے اور ہر نسل کے اندر ہونا چاہئے - قرآن کے الفاظ پر ذرا غور کیجئے -

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو ' یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ ' یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں - اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی انہی میں ہے ' یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی راہنمائی سے محروم کر دیتا ہے -"

یہ لوگ خود ایک دوسرے کے رفیق ہیں - یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو زمان و مکان کی قید سے باہر ہے اس لئے کہ یہ حقیقت ایک طبعی حقیقت ہے اور یہ ان کے مزاج کا تقاضا ہے - یہ لوگ کسی جگہ اور کسی دور میں بھی اہل ایمان کے دوست نہیں بنے - صدیاں بیت گئیں اور ایک مثال بھی ان کی دوستی کی سامنے نہیں آئی اور اللہ کی یہ بات سچی رہی ہے - حضرت محمد ؐ کے خلاف جنگ میں بھی اہل کتاب باہم متحد تھے - آپ کے بعد ہر اسلامی جماعت کی دشمنی میں یہ متحد رہے ہیں اور تاریخ کی طویل کڑیوں میں پورے کرۂ ارض پر یہ اسلام کے خلاف متحد رہے ہیں - ایک بار بھی اس قاعدے کے اندر کبھی استثناء نہیں ہوا اور دنیا میں ہمیشہ وہی ہوتا رہا جو قرآن کریم نے بطور صفت یہاں اہل کتاب کے لئے استعمال کیا - قرآن کریم نے ان کی یہ صفت متفرق حادثات کے حوالے سے بیان نہیں کی ہے - قرآن نے جس انداز میں یہ جملہ اسمیہ یہاں استعمال کیا ہے - بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۵: ۵۱)) یہ محض انداز تعبیر نہیں ہے بلکہ اس سے یہ ظاہر کرنا مطلوب ہے کہ یہ باہم ولایت اور دوستی ان کا دائمی وصف ہے -

اس کے بعد قرآن کریم اس حقیقت کے فطری نتائج مرتب کرتا ہے - جب یہود و نصاریٰ صرف ایک دوسرے کے دوست ہیں تو ان کے ساتھ جو مسلمان بھی دوستی کرے گا وہ ان میں سے تصور ہو گا - اسلامی صفوں کا جو شخص ان کا دوست ہو گا وہ اسلامی صف میں نہیں رہے گا - وہ عملاً اپنے آپ سے صفت "اسلامی" کی نفی کرتا ہے - وہ عملاً اپنے اوپر صفت یہودیت اور نصرانیت کا لباس اوڑھتا ہے حالانکہ یہ ایک فطری نتیجہ ہے - وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ (۵: ۵۱)) (اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی انہی میں ہے )-

ایسا شخص اپنے اوپر ظلم کرتا ہے ' اپنے دین پر ظلم کرتا ہے اور جماعت مسلمہ پر بھی ظلم کرتا ہے اور اس ظلم ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو زمرۂ یہود و نصاریٰ میں شمار کرتا ہے - اس لئے کہ اس نے اپنی محبت ان کو دے دی ہے - پھر اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو نہ ہدایت دیتا ہے اور نہ اس کو واپس اسلامی صفوں میں قبول کرتا ہے - اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۵: ۵۱)) (یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی راہنمائی سے محروم کر دیتا ہے )-

مدینہ کی اسلامی جماعت کے لئے یہ ایک نہایت ہی خوفناک دھمکی تھی۔ یہ دھمکی اگرچہ سخت ہے لیکن بالکل قدرتی ہے اور اس کے اندر کوئی مصنوعی تشدد نہیں ہے۔ اس لئے جو شخص بھی یہ ممنوع حرکت کرتا ہے وہ ان میں سے ہے اگر وہ ان میں سے نہ ہوتا تو ایک مسلمان کسی صورت میں بھی یہود و نصاریٰ کا ولی اور دوست نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی اسلامی صفوں میں ایسے شخص کی ممبر شپ رہ سکتی ہے اس لئے کہ کسی اسلامی جماعت کے افراد کی دوستی اور ان کا حلیفانہ تعلق صرف اللہ اور رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ ہے ایک دو راہا اور فیصلہ طلب پوائنٹ۔

ایک مسلمان اور اسلامی نظام کے مخالفوں اور دوسرے نظاموں کے داعیوں کے درمیان مکمل علیحدگی کے معاملے میں کوئی نرمی اختیار نہیں کی جا سکتی۔ ایک نے اسلامی جھنڈا اٹھا رکھا ہے اور دوسرے نے مخالف اسلام جھنڈا اٹھا رکھا ہے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کرۂ ارض پر وہ اسلام کا منفرد نظام قائم نہ کر سکے گا نہ اس سلسلے میں کوئی قابل ذکر سرگرمی دکھا سکے گا'

جب ایک مسلمان کو یہ پختہ یقین ہوتا ہے کہ اس کا دین ہی وہ واحد دین ہے جسے اللہ لوگوں کی جانب سے قبول کرے گا تو اس یقین کے اندر کوئی جھول اور کوئی نرمی نہیں رہتی۔ اسے یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ حضرت محمد ؐ کی رسالت کے بعد اب کوئی رسالت نہیں ہے اور یہ کہ یہ اسلامی نظام زندگی ہی وہ منفرد نظام ہے جسے اس نے لوگوں کی زندگیوں میں قائم کرنا ہے اور اس کے مقابلے میں دنیا کا کوئی نظام قابل عمل نہیں ہے۔ اس کرۂ ارض پر انسان کی زندگی اس وقت تک درست نہیں ہو سکتی جب تک مسلمان اس نظام کو قائم نہ کر دیں اور یہ کہ اللہ اسے معاف نہ کرے گا اگر وہ اپنی پوری قوت اس دین کی اقامت اور غلبے کی راہ میں خرچ نہیں کرتا' جب تک نظریاتی اور عملی طور پر اسے قائم نہیں کرتا اور اس راہ میں اپنی پوری سعی نہیں کرتا' حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نظام کے بدلے میں کوئی دوسرا نظام بطور متبادل قبول نہیں کرتا' بلکہ اسلامی نظام کے کسی جزء کیلئے بھی کوئی متبادل اسے قبول نہیں ہے۔ اور یہ کہ جب تک وہ اسلامی عقائد و تصورات کو خالص کر کے ان کے درمیان میں سے ہر غلط اور ملاوٹ کو پاک نہیں کرتا' جب تک وہ تفصیلی نظام اور قانونی امور سے تمام ملاوٹوں کو ختم نہیں کرتا' الا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ شرائع میں سے کسی چیز کو باقی رکھا ہو اس وقت تک اسلام غلبہ نہیں حاصل کر سکتا۔ غرض ان تمام امور میں جب تک ایک مومن مکمل طور پر یکسو اور یقین محکم کا حامل نہیں ہوتا وہ اس بوجھ کو اٹھا ہی نہیں سکتا اور نہ عملاً اس منہاج حیات کو قائم کر سکتا ہے جس کا بھاری فریضہ اللہ تعالیٰ نے اس کے کاندھوں پر ڈالا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فریضہ اقامت دین ایک مشکل فریضہ ہے۔ اس کی راہ میں سخت مشکلات ہیں' اور اس راہ کی ذمہ داریاں کمر توڑ ہیں۔ اس راستے میں کینہ پرور دشمن بیٹھے ہیں۔ خفیہ پھندے نصب ہیں اور رنج و الم کے وہ مقامات ہیں جو بعض اوقات ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر اس وقت دنیا میں جو جاہلیت قائم ہے اس میں کیا تکلیف ہے۔ چاہے بت پرستانہ جاہلیت ہو' اہل کتاب کی مخلوط جاہلیت ہو یا الحاد و زندقہ کی جدید جاہلیت ہو۔ نیز اگر اسلامی نظام کے اندر کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اختیار کر کے اس کے اور اہل کتاب اور دوسروں کے قائم شدہ نظاموں کے درمیان فرق ہی کو ختم کر دیا جائے یا اسلام اور دور جدید یا قدیم کی جاہلیت کے درمیان امتزاج اور اتحاد کر کے کوئی نظام لایا جائے اور اس پر مصالحت کر لی جائے تو یقیناً پھر اس راہ میں کوئی مشکلات نہیں ہیں۔

یہ ایک فیصلہ کن جدائی اور امتیاز ہے اور جو لوگ ان حدوں کو مٹانا چاہتے ہیں اور اپنی کوششیں رواداری اور "تقریب بین الادیان السماویہ" کے دل لگتے عنوان کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہیں وہ نہایت ہی غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ یہ لوگ نہ "ادیان" کے مفہوم کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی "تسامح" اور رواداری کے مفہوم کو سمجھتے ہیں۔ یاد رہے کہ رواداری محض شخصی اور ذاتی معاملات میں ہوتی ہے۔ اسلامی عقائد و تصورات اور اسلام کے اجتماعی نظام کے ڈھانچے کے اندر کوئی رواداری ممکن نہیں ہے۔ یہ لوگ دراصل مسلمانوں کے اندر پائے جانے والے اس یقین کو متزلزل کرنا چاہتے ہیں جو ان کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اللہ اسلام کے سوا کسی اور دین کو قبول نہیں کرتا اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اقامت دین کے لئے جدوجہد کرے اور اسلام کے مقابلے میں کوئی اور متبادل دین قبول نہ کرے نہ اس کے اندر کوئی تبدیلی اور ترمیم قبول کرے اگرچہ یہ ترمیم نہایت ہی معمولی ہو۔ اس یقین کو قرآن کریم بار بار ایک مومن کے دل و دماغ میں بٹھانا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ (اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ) (اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی دین ہے) (وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ) (اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا تو اس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا)۔ (وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (۵: ۴۹)) (ان سے ہوشیار رہو کہ وہ تم کو فتنے میں ڈال دیں ان میں سے بعض چیزوں کی نسبت جو اللہ نے تیری طرف نازل کیں) (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ (۵: ۵۱)) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور تم میں جو شخص بھی ان کو دوست بنائے گا، اس کا شمار بھی ان میں ہو گا)۔

قرآن کریم اس صورت حال کی ایک جھلکی دکھاتا ہے جو اس وقت موجود تھی اور جس کی وجہ سے قرآن کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ۭ

(۵: ۵۲)) (تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے وہ انہی میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں۔ کہتے ہیں "ہمیں ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہم کسی معیبت کے چکر میں نہ پھنس جائیں۔"

ابن جریر نے اپنی سند سے ابن سعد کی یہ روایت نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں عبادہ ابن صامت جو حارث ابن الخزرج کی اولاد سے تھے حضور ؐ کے پاس آئے اور کہا: یا رسول اللہ! میرے یہودیوں میں بے شمار لوگ دوست ہیں اور میں یہودیوں کی دوستی سے براءت اختیار کر کے اللہ اور رسول اللہ کی دوستی اختیار کرتا ہوں۔ اس پر عبداللہ ابن ابی رئیس المنافقین نے کہا، میں تو ایک ایسا آدمی ہوں کہ میں مختلف چکروں سے ڈرتا ہوں۔ میں تو اپنے حلیفوں اور دوستوں سے براءت کا اعلان نہیں کرتا۔

رسول اللہ نے عبداللہ ابن ابی مذکور سے کہا: ابو الحباب، یہودیوں کی دوستی کے بارے میں آپ کو عبادہ ابن صامت کے ساتھ چشمک تھی تو اب وہ دوستی بھی تم قبول کر لو، اس پر رئیس المنافقین نے کہا مجھے قبول ہے۔ اس

موقعہ پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

(یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰی اَوْلِیَآءَ (۵: ۵۱)) ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ زہری کی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ جب بدر والوں کو شکست ہوئی تو مسلمانوں نے یہودیوں میں سے اپنے دوستوں سے کہا، مناسب ہے کہ تم اسلام قبول کر لو' اس سے پہلے کہ تم پر بھی بدر والوں کا دن آئے۔ اس پر مالک بن الصیف نے کہا: تمہیں اس بات نے بہت ہی غرے میں ڈال دیا ہے کہ تم نے قریش کے کچھ لوگوں کو شکست دے دی ہے جن کو جنگ کے بارے میں کچھ علم ہی نہ تھا۔ اگر ہم ہمت باندھتے اور تمہارے خلاف جمع ہو جاتے تو تمہارے اندر اتنی سکت نہ ہوتی کہ تم ہم سب کے خلاف لڑتے۔ اس پر عبادہ ابن صامت نے رسول اللہؐ سے کہا کہ یہودیوں میں میرے جو دوست ہیں وہ نہایت ہی مضبوط لوگ ہیں۔ ان کے پاس اسلحہ بھی بہت تھا۔ وہ نہایت بارعب ہیں لیکن میں ان کی دوستی اور معاہدہ و حلیفانہ ربط سے براءت کا اعلان کرتا ہوں۔ اب میرا اللہ اور رسول کے سوا کوئی اور دوست اور حلیف نہیں ہے۔ اس پر عبداللہ ابن ابی نے کہا میں تو یہودیوں کی دوستی سے براءت کا اعلان نہیں کر سکتا۔ میں ایک ایسا آدمی ہوں کہ میرے لئے وہ بہت ہی ضروری ہیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: "اے ابو الحباب تمہیں معلوم ہے کہ تم عبادہ ابن صامت کے ساتھ منافست رکھتے تھے کہ یہودیوں میں ان کے دوست زیادہ تھے۔ اب یہ سب دوستیاں تمہاری۔" تو اس پر اس نے بھی کہا: "اچھا تو میں پھر قبول کرتا ہوں۔"

محمد ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ پہلا یہودی قبیلہ جس نے رسول اللہؐ اور اس کے درمیان پائے جانے والے عہد و میثاق کو توڑا وہ بنو قینقاع تھے۔ مجھے عاصم ابن عمر ابن قتادہ نے بتایا کہ رسول اللہؐ نے ان کا محاصرہ کر لیا ہے۔ ان لوگوں نے رسول اللہ کے فیصلے پر ہتھیار ڈال دیئے۔ اس پر عبداللہ ابن ابی ابن السلول اٹھا۔ (جب یہ لوگ حضورؐ کے قابو آگئے تھے) تو اس نے کہا: اے محمدؐ میرے دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ یہ لوگ خزرج کے حلیف تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے دوبارہ کہا: اے محمدؐ! میرے دوستوں کے ساتھ نرمی کرو۔ اس پر پھر حضورؐ نے اس سے روگردانی کر لی۔ اس نے حضورؐ کی زرہ کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس پر حضورؐ نے اسے کہا' چھوڑو مجھے' اور حضورؐ کو بہت ہی غصہ آیا یہاں تک کہ آپؐ کے چہرے پر اس کا پرتو آگیا۔ اب کے بعد حضورؐ نے پھر کہا کہ تمہارا بیڑا غرق ہو مجھے چھوڑو۔ اس کے بعد اس نے کہا خدا کی قسم میں تمہیں ہرگز نہ چھوڑوں گا جب تک تم میرے دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرو۔ چار سو سادہ اور تین سو زرہ پوش دوستوں نے میری حفاظت سرخ اور سیاہ اقوام کے مقابلے میں کی ہے اور میں چھوڑ دوں کہ آپ ایک ہی صبح میں ان کی فصل کو کاٹ دیں۔ میں ایک ایسا شخص ہوں کہ میں مختلف چکروں سے ڈرتا ہوں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: "اچھا وہ سب تیرے ہوئے۔"

محمد ابن اسحاق نے عبادہ ابن صامت کی ایک روایت نقل کی ہے کہ جب بنو قینقاع نے حضورؐ کے ساتھ جنگ کی تو عبداللہ ابن ابی ابن السلول ان کے معاملے میں بڑھ گئے اور ان کے سامنے کھڑے ہوگئے اور عبادہ ابن صامت حضورؐ کے پاس گئے اور یہ بھی بنو عوف ابن الخزرج میں سے تھے۔ اور بنو قینقاع میں ان کے بھی اسی قدر حلیف تھے جس قدر عبداللہ ابن ابی کے تھے۔ عبادہ ابن الصامت نے ان کا اختیار حضورؐ کو دے دیا اور کہا کہ میں ان کی دوستی سے براءت کا

انکار کرتا ہوں اور اب میرا دوست اور حلیف صرف اللہ اور رسول اللہ ہیں۔ اب میں صرف اللہ اور رسول اللہ ہی کو دوست رکھتا ہوں اور کفار کے حلیفانہ تعلقات کے خاتمہ کا اعلان کرتا ہوں۔ تب اللہ نے عبادہ ابن الصامت اور عبداللہ ابن ابی کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی

(یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤی اَوْلِیَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ---- تا ---- وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ) امام احمد نے اپنی سند سے 'اسامہ ابن زید کی روایت نقل کی ہے۔ میں رسول ؐ کے ساتھ عبداللہ ابن ابی کے پاس گیا۔ آپ اس کی عیادت کے لئے جا رہے تھے۔ اس کو رسول خدا ؐ نے کہا: "میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ یہودیوں سے محبت نہ رکھو۔ اس پر عبداللہ نے کہا: "اسعد ابن زرارہ ان سے بغض رکھتے تھے اور وہ مر گئے۔"

یہ روایات ان حالات کی اچھی طرح وضاحت کرتی ہیں جو اس وقت اسلامی معاشرے کے اندر عملاً موجود تھے۔ یہ معاشرہ ان روایات کے خلاف تھا جو اسلام سے پہلے مدینہ کے اندر موجود تھیں۔ نیز ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک یہ سوچ فیصلہ کن مرحلے تک نہ پہنچی تھی کہ مدینہ کے ارد گرد پھیلے ہوئے یہودیوں کے ساتھ کیسے تعلقات رکھے جائیں اور کیسے نہ رکھے جائیں۔ ہاں ایک بات ظاہر ہے کہ ان تمام روایات کا تعلق یہودیوں سے ہے اور عیسائیوں کے بارے میں کوئی ایسی روایت مذکور نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم مسلمانوں اور تمام دوسری جماعتوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کے لئے ایک دائمی ضابطہ 'معیار اور ایک مستقل سوچ دینا چاہتا تھا۔ چاہے اس کا تعلق اہل کتاب سے ہو یا مشرکین سے ہو جیسا کہ اس درس پر تفصیلی بات کرتے وقت بتایا جائے گا۔ ہاں یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مسلمانوں کی نسبت یہودیوں کے موقف اور طرز عمل اور عیسائیوں کے موقف اور طرز عمل کے درمیان کافی فرق تھا اور یہ فرق عہد نبوی میں تھا۔ اور اس سورہ میں ایک دوسری جگہ قرآن کریم نے اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَهُوْدَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰی (۵: ۸۲)) (تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے۔ اور اہل ایمان والوں سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔)

اس اختلاف کے باوجود جو اس وقت موجود تھا 'اس آیت میں یہود و نصاریٰ ایک ہی سطح پر رکھا گیا ہے جس طرح اگلی آیت میں اہل کتاب اور کفار کو بھی ایک ہی سطح پر رکھا گیا۔ یہ مساوات دوستی اور ولایت کی حد تک ہے اور یہ بات اسلام کے ایک دوسرے اصول پر مبنی ہے۔ وہ اصول یہ ہے کوئی مسلم دوستی کا عہد اور حلیفانہ تعلقات صرف ایک مسلم ہی سے قائم کر سکتا ہے اس لئے کہ ہر مسلم صرف اللہ 'رسول اللہ اور اسلامی جماعت کے ساتھ دوستی کے تعلقات قائم کر سکتا ہے اور اس اصول کے تحت تمام گروہ اور فرقے برابر ہیں 'اگرچہ دوسرے ظروف و احوال میں ان کا موقف

مسلمانوں کے مقابلے میں باہم مختلف ہو۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ یہ قاعدہ کلیہ اور دو ٹوک اصول وضع کرتے ہوئے ' اللہ تعالیٰ کو تو تمام ادوار اور ازمنہ کا علم تھا اور یہ قاعدہ صرف حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے لئے نہ تھا اور نہ ان حالات کے لئے تھا جو اس وقت موجود تھے بعد کے حالات نے اس بات کو ثابت کر دیا کہ دین اسلام اور جماعت مسلمہ کے ساتھ عیسائیوں کی عداوت ' دنیا کے مختلف علاقوں میں یہودیوں سے کم نہ تھی۔ اگر ہم عرب اور مصر کے عیسائیوں کے موقف کو مستثنیٰ کر دیں ' جنہوں نے اسلام کا خوب استقبال کیا تو باقی دنیا میں ' خصوصاً یورپ میں عیسائیوں نے اہل اسلام اور دین اسلام کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا وہ یہودیوں کے مقابلے میں بہت خراب تھا یا ان سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اسلام کے ساتھ سخت کینہ پروری کی ' اسلام کے خلاف سازشیں کیں اور اس کے خلاف جنگیں برپا کیں۔ حبشہ جیسے ملک کو لیجئے کہ اس کے اسی زمانے کے بادشاہ نے مسلم مہاجرین کو پناہ دی اور اسلام کو خوش آمدید کہا۔ وہاں بھی اہل اسلام کے خلاف سخت مظالم کئے گئے جو یہودیوں سے بھی زیادہ تھے۔

اللہ تعالیٰ کو تو تمام ادوار کا علم تھا۔ اس لئے اللہ نے اہل اسلام کے لئے یہ قاعدہ کلیہ وضع کر دیا۔ اس میں ان حالات کو نظرانداز کیا جو اس وقت دور اول میں موجود تھے اس لئے کہ وہ حالات مستقل اور دائمی نہ تھے اس قاعدہ کلیہ پر عمل کرتے وقت اہل اسلام بعض ممالک کی پالیسی کو نظرانداز بھی کر سکتے ہیں جن کا رویہ اسلام کے خلاف نہیں ہے یا نہ ہو گا ' آخر الزمان تک۔

آج تک اسلام کے خلاف اور ان لوگوں کے خلاف جو اپنا نام مسلمانوں جیسا رکھتے ہیں اور جن کو صفت اسلام کے ساتھ موصوف کیا جاتا ہے اگرچہ اسلام کے ساتھ ان کا کوئی حقیقی تعلق نہیں ہے ' یہودیوں اور عیسائیوں کی جانب سے ایک عظیم معرکہ آرائی جاری ہے۔ یہ معرکہ آرائی ان کی ذات اور ان کے دین کے خلاف ہے اور دنیا کے ہر حصے میں جاری ہے۔ اور یہ اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ (بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ) ان میں سے بعض ' بعض دوسروں کے دوست ہیں اور یہ بات ہر عقلمند انسان پر لازم کر دیتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس نصیحت کو پلے باندھ لے کہ نصیحت نہیں بلکہ اللہ کی جانب سے اس قطعی ممانعت پر عمل کرنا ہے کہ اللہ کے صحیح بندوں کی دوستی صرف اللہ کے دوستوں اور رسول اللہ سے ہو گی اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جس قدر کیمپ بھی ہوں ' جو اسلام کا علم بلند نہ کر رہے ہوں ان سے کوئی دوستانہ تعلق نہ ہو گا اور نہ حلیفانہ تعلق ہو گا۔ یہ اللہ کا دو ٹوک فیصلہ اور قطعی حکم ہے۔

اسلام مسلمانوں کو یہ ہدایت کرتا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں سے اپنے تعلقات صرف عقیدے اور نظریے کے اساس پر قائم کریں اور ایک مسلمان کے تصور حیات کے اندر دوستی کا عہد اور حلیفانہ عہد یا دشمنی کا تعلق صرف نظریات کے زاویے سے ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان باہم امداد اور نصرت کا معاہدہ (یعنی ولایت) کا قیام جائز نہ ہو گا اس لئے کہ ایک مسلمان اور ایک کافر کے درمیان عقائد و تصورات کے میدان میں کوئی تعاون اور نصرت نہیں ہو سکتی۔ الحاد کے مقابلے میں بھی وہ اکٹھے نہیں ہو سکتے جیسا کہ ہم میں سے بعض سادہ لوح سوچتے ہیں۔ بعض ایسے مسلمان اس لائن پر سوچتے ہیں جو قرآن کریم کو پڑھتے ہی نہیں اس لئے کہ دونوں کے درمیان کوئی مشترکہ بنیاد ہی نہیں ہے۔ لہٰذا وہ کس بنیاد پر حلیف بن سکتے ہیں؟

بعض لوگ جو قرآن مجید کا مطالعہ نہیں کرتے' اور جن کو اسلام کی حقیقت کا ادراک بھی حاصل نہیں ہے اور بعض وہ لوگ جو فریب خوردہ ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام ادیان دین ہیں جس طرح تمام الحاد الحاد ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ تمام اہل دین مل کر الحاد کے مقابلے میں کھڑے ہوں کیونکہ الحاد جنس دین کا منکر ہے اور وہ مطلق دینداری کے خلاف ہے۔

لیکن اسلامی تصور حیات کے مطابق معاملہ اس طرح نہیں ہے اور نہ ایک ایسے مسلمان کا شعور اسے قبول کرتا ہے جس نے اسلام کا مزہ صحیح طرح چکھا ہے۔ اسلام کا مزہ صرف وہی شخص چکھ سکتا ہے جو اسلام کو بطور نظریہ حیات قبول کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ اس نظریہ حیات کے لئے ہروقت متحرک رہتا ہے اور اس کا ہدف یہ ہوتا ہے کہ نظام اسلامی کو قائم کیا جائے۔

ایک صحیح الفکر مسلمان کے ہاں یہ بات بالکل واضح اور متعین ہے کہ اللہ کے ہاں دین صرف اسلامی نظام حیات ہے۔ اسلام کے بغیر کسی سوچ یا نظام کو اللہ دین نہیں مانتا کیونکہ اللہ نے جو فقرہ استعمال کیا ہے وہ یہ ہے۔ (اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ) اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی دین ہے۔ اسلام کے علاوہ اگر کوئی کسی اور عقیدہ وعمل کا اتباع کرتا ہے تو اللہ اسے قبول نہ کرے گا۔ (وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلُ مِنْہُ) حضور اکرم ؐ کے بعد تو کوئی دین دنیا میں ایسا نہیں رہا ہے جو اللہ کو مقبول ہو۔ اب تو تمام دنیا کو اسلام ہی قبول کرنا ہوگا اور اس صورت میں اسے قبول کرنا ہوگا جس صورت میں اسے حضرت محمد ؐ نے ہم تک پہنچایا ہے۔ حضور اکرم ؐ سے قبل نصاریٰ کا جو دین صحیح مانا جاتا تھا وہ اب مقبول نہ ہوگا جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد یہودیوں کا دین غیر مقبول قرار پایا تھا۔

حضور اکرم ؐ کی بعثت کے بعد یہود و نصاریٰ کا وجود یہ معنی نہیں رکھتا کہ جس دین پر وہ عمل کر رہے ہیں وہ اللہ کو مقبول ہے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ بھی الٰہی دین پر ہیں۔ بے شک ان کا دین الٰہی تھا مگر حضور اکرم ؐ کی بعثت سے پہلے اور حضور ؐ کی بعثت کے بعد صورت حال یہ ہے اور اس کا تمام مسلمان اعتراف کرتے ہیں کہ اب صرف اسلام ہی دین کی حیثیت رکھتا ہے اور مذکورہ بالا آیت اس سلسلے میں نص قطعی ہے جس میں کسی قسم کی کوئی تاویل نہیں ہوسکتی۔

ہاں یہ بات مسلمہ اصولوں میں سے ہے کہ اسلام یہود و نصاریٰ پر جبر کر کے ان کو دین اسلام کے اعتراف پر مجبور نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اصول یہ ہے کہ (لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ) (دین میں کوئی جبر نہیں ہے) لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ جن امور پر عمل پیرا ہیں وہ دین ہے یا اللہ تعالیٰ ان کو بھی صحیح دین پر سمجھتا ہے۔

اس لئے اسلام کسی ایسے محاذ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا جو دینی محاذ ہو اور اس محاذ کے اندر اسلام بھی شامل ہو' اور وہ الحاد کا مقابلہ کر رہا ہو۔ دین تو فقط ایک ہے جس کا نام اسلام ہے اور اس کے علاوہ تمام محاذ لادین ہیں' جو اسلام سے علیحدہ ہیں۔ اب یہ لادینی نظام چاہے اپنی اصل میں الٰہی دین ہو اور اس کے اندر انحراف ہو گیا ہو یا وہ بت پرستانہ دین ہو اور اپنی بت پرستی پر قائم ہو یا الحاد ہو اور سرے سے تمام ادیان کا منکر ہو' اور ان کے درمیان حلیفانہ معاہدہ ہو گیا ہو' لیکن یہ تمام لادین دین اسلام سے متضاد ہیں اور ان کے اور اسلام کے درمیان کوئی حلیفانہ تعلق قائم نہیں ہو سکتا اور نہ ان کے درمیان دوستی ہو سکتی ہے۔

ایک مسلمان اہل کتاب کے ساتھ معاملات رکھ سکتا ہے اور اسلام اس سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ ان معاملات کو بر و احسان پر استوار کرے۔ جب تک وہ اسے دین کے معاملے میں اذیت نہ دیں۔ اسلام ایک مسلمان کو یہ اجازت بھی دیتا

ہے کہ وہ ان میں سے پاکدامن عورتوں کے ساتھ نکاح بھی کر سکتا ہے۔ہاں ان میں سے ان لوگوں کے بارے میں فقہی اختلاف ہے۔جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا تسلیم کرتے ہیں اور جو لوگ تثلیث کے قائل ہیں کہ آیا ایسی عورتیں کتابی قرار پاکر حلال ہوں گی یا انہیں بت پرست قرار دے کر حرام قرار دیا جائے گا۔بہرحال اگر ہم یہ اصول ہی لیں کہ نکاح عموماً جائز ہے، تو بھی حسن سلوک یا جواز نکاح سے اس بات پر دلیل نہیں دی جاسکتی کہ ان کے ساتھ دین میں حلیفانہ تعلقات قائم ہو سکتے ہیں اور دوستی بھی کی جاسکتی ہے۔اور اس کا یہ مفہوم بھی نہیں ہے کہ اہل کتاب کا دین حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بعد بھی اسلام کے ہاں معتبر ہے اور پھر اس کے ساتھ ایک ہی محاذ پر کھڑے ہو کر اسلام الحاد کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

اسلام تو آیا ہی اس لئے ہے کہ وہ اہل کتاب کے اعتقادات کو درست کرے اور بعینہٖ وہ اس لئے بھی آیا ہے کہ بت پرستوں کے عقائد کو درست کرے۔دونوں کو اسلام کی دعوت دے۔اس لئے کہ اب تو اسلام ہی وہ دین ہے جس کے سوا اللہ تعالیٰ کسی دین کو قبول نہیں کرتا۔جب یہودیوں نے یہ سمجھا کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بھی دین اسلام کی طرف دعوت دیتے ہیں تو ان کو یہ بات نہایت ہی گراں گزری کہ حضور ﷺ ان کو بھی اسلام کی طرف دعوت دیں تو قرآن کریم نے ان کی اس غلط فہمی کو دور کیا اور کہا کہ اللہ تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہے اور اگر تم اعراض کرو تو تم بھی کافر ہو۔

ایک مسلمان تو اس بات کا مکلف ہے کہ وہ اہل کتاب کو اسلام کی طرف دعوت دے جس طرح وہ مکلف ہے کہ بت پرستوں اور ملحدوں کو دین اسلام کی دعوت دے۔ہاں اگر وہ مکلف نہیں ہے تو اس بات کا نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں کو زبردستی اسلام کے اندر داخل کرے اس لئے کہ کسی کے دل و دماغ میں عقائد بذریعہ جبر و اکراہ نہیں جمتے۔"دین میں جبر" صرف یہ نہیں ہے کہ ازروئے قرآن وہ ممنوع ہے۔اگر ممنوع نہ ہوتا تو بھی اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔

یہ بات درست نہ ہوگی کہ ایک مسلمان حضرت نبی ﷺ کی بعثت کے بعد اس بات کا اعتراف کرے کہ جس دین پر اہل کتاب ہیں وہ مقبول دین ہے اور پھر بھی وہ انہیں دعوت دے کہ وہ اسلام کی طرف آجائیں۔ایک مسلمان صرف اس اساس پر اس بات کا مکلف ہو سکتا ہے کہ وہ ان کو اسلام کی طرف دعوت دے کہ وہ ان کے دین کو دین تسلیم نہ کرے۔اگر وہ ایسا کرتا ہے تو پھر منطقی بات یہ ہوگی کہ وہ مکلف نہیں ہے۔اس لئے کہ یہ بھی دین ہے اور وہ بھی دین ہے۔اگر یہ بات بطور اصولی موضوع تسلیم کر لی جائے تو اب ایک مسلمان اور ایک اہل کتاب کے درمیان یہ محاذ کہ وہ دین اسلام کو غالب کریں ایک غیر منطقی محاذ ہو گا۔اس لئے کہ وہ تو دین اسلام کو دین تسلیم ہی نہیں کرتے۔غرض اسلام میں یہ مسئلہ دین و ایمان کا مسئلہ ہے اور پھر یہ منطقی اور فطری اتحاد و تنظیم کا بھی مسئلہ ہے۔

جہاں تک ایمان و اعتقاد کا تعلق ہے تو معاملہ بالکل واضح ہے۔ہم نے اس پر بہت طویل بحث کر لی ہے اور اوپر ہم نے قرآنی آیات سے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان کوئی دوستی یا حلیفانہ تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔

رہی یہ بات کہ یہ ایک انتظامی اور تحریکی مسئلہ بھی ہے تو یہ بھی مذکورہ بالا بحث سے واضح ہو گیا ہے۔اس لئے کہ ایک مومن کی پوری جدوجہد یہ ہوگی کہ اسلامی نظام حیات کو زندگی کے تمام معاملات کے اندر نافذ کیا جائے اور ان تفصیلات کے ساتھ نافذ کیا جائے جن کا بیان حضرت محمد ﷺ نے کیا ہے۔اپنی تمام تفصیلات اور تمام پہلوؤں کے ساتھ اور زندگی کے تمام معاملات میں، تو اس میدان میں ایک مسلم اس شخص کے ساتھ متحد اور ہم رکاب کس طرح ہو سکتا ہے جو سرے سے اسلام کو دین ہی نہیں مانتا۔نہ اسلامی شریعت کو شریعت مانتا ہے اور جس کے اہداف و مقاصد ہی دوسرے

ہیں۔اگرچہ یہ اہداف و مقاصد اسلام کے خلاف نہیں ہیں لیکن وہ اسلام کے اہداف بھی نہیں ہیں۔اس لئے کہ اسلام کسی ہدف اور کسی عمل کو اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک وہ اسلامی عقیدے پر قائم نہ ہو۔

(مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ

( ۱۴ : ۱۸ )) جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اڑا دیا ہو۔

اسلام ایک مسلمان پر یہ فریضہ عائد کرتا ہے کہ وہ اپنی جدوجہد صرف اسلام کے لئے کرے اور رات اور دن کی جدوجہد میں اپنی زندگی کے کسی بھی حصے کو اسلام سے باہر نہ رکھے۔اس ڈیوٹی کے ہوتے ہوئے' مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان اتحاد کو صرف وہی شخص تسلیم کرے گا جس نے نہ اسلام کے مزاج کو سمجھا ہو اور نہ دین اسلام کو سمجھا ہو۔یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ ایک مسلمان کی زندگی کا کوئی حصہ اسلام سے خارج بھی ہو سکتا ہے۔جس کے اندر ایک مسلمان ان لوگوں کے ساتھ تعاون کرے جو دشمنان اسلام ہوں اور دشمن بھی ایسے ہوں جو مسلمانوں سے تب ہی راضی ہو سکتے ہوں جب وہ اسلام کو خیرباد کہہ دیں۔یاد رہے کہ اس بات پر قرآن نے واضح طور پر منصوص ہدایات دی ہیں کہ یہود و نصاریٰ تم سے اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے دین و ملت کو تسلیم نہ کر لو۔غرض یہ اتحاد اعتقادی اور نظریاتی طور پر بھی محال ہے جس طرح یہ عملی طور پر ممکن نہیں ہے۔

عبداللہ ابن ابی ابن السلول نے جو معذرت کی' (یہ شخص ان لوگوں میں سے تھا جن کے دل میں بیماری تھی) اور اس نے آگے بڑھ کر یہودیوں کے ساتھ دوستی اور حلیفانہ تعلقات قائم کئے اور اس نے جو یہ کہا کہ وہ یہودیوں کے ساتھ اپنے حلیفانہ معاہدے توڑ نہیں سکتا کہ وہ ایک ایسا آدمی ہے جو چکروں سے ڈرتا ہے یعنی اسے ڈر یہ تھا کہ حالات ایسے نہ ہو جائیں کہ خود اس پر سختی ہو۔یہ عذر اس بات کا مظہر ہے کہ اس کے دل میں بیماری تھی۔اور وہ ضعیف الایمان تھا۔اس لئے کہ ولی اور مددگار تو صرف اللہ ہوتا ہے۔ناصر تو صرف اللہ ہے۔اور اللہ کے سوا کسی اور سے نصرت طلب کرنا گمراہی ہے۔اگر کوئی طلب کرتا ہے تو اس کا یہ کام ہی عبث ہے اس کا کوئی فائدہ نہ نکلے گا لیکن ابن ابی کی حجت اور اس کا عذر ہر اس شخص کا عذر ہے جو کسی بھی دور میں ابن ابی ابن السلول کا کردار ادا کرتا ہے۔اس کا تصور بھی ہر اس منافق کا تصور ہے جو مریض القلب ہے اور جس نے حقیقت ایمان کو نہیں پایا ہے۔دوسری جانب حضرت عبادہ ابن الصامت کا دل یہودیوں کی دوستی سے بھر گیا جب اس نے دیکھا کہ یہ لوگ غدار ہیں اس لئے کہ وہ خود سچے مومن تھے۔انہوں نے یہودیوں کی دوستی اور حلیفانہ معاہدوں کو توڑ دیا۔جبکہ عبداللہ ابن ابی نے ان معاہدوں کو گرمجوشی سے لیا' ان کو سینے سے لگایا اور ان کو اپنے دانتوں میں مضبوط پکڑ لیا اس لئے کہ وہ منافق تھا۔

یہ دو طریق کار ہیں اور دو طرز ہائے عمل ہیں' یہ دونوں دو مختلف عقائد و تصورات سے پیدا ہوئے۔ان دونوں کی تہ میں دو مختلف شعور کام کر رہے تھے اور یہی اختلاف دو مختلف طرز ہائے عمل کے درمیان قیامت تک رہے گا۔ایک قلب مومن ہو گا اور دوسرا قلب ایسا ہو گا جس نے ایمان کو نہ پہچانا ہو گا۔

جو لوگ دین کے ایسے دشمنوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرتے ہیں اور ان کے ساتھ اکٹھ کرتے ہیں' جو منافق

ہیں اور جن کا نظریہ، جن کی دوستی اور جن کا اعتماد اللہ اور رسول اللہ کے لئے مخلصانہ نہیں ہے' ان کو اللہ تعالیٰ نہایت ہی سختی سے تنبیہ کرتے ہیں کہ اللہ کی جانب سے یا تو اہل اسلام کو فتح نصیب ہوگی یا اور کوئی ایسی بات ظاہر کر دی جائے گی جو فیصلہ کن ہوگی اور اس طرح ان کا نفاق ظاہر ہو جائے گا۔ اور وہ پھر بہت شرمندہ ہوں گے۔

( فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ( ۵ : ۵۲ )) "مگر بعید نہیں کہ اللہ جب تمہیں فیصلہ کن فتح بخشے گا یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کرے گا تو یہ لوگ اپنے اس نفاق پر جسے یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں' نادم ہوں گے۔

اس وقت یعنی مکمل فتح کے قریب جیسے فتح مکہ ہوئی یا کسی اور ذریعے سے حق و باطل کے درمیان فیصلہ کے وقت اور امر الہٰی کے آجانے کے وقت' وہ لوگ سخت شرمندہ ہوں گے جن کے دل میں نفاق کی بیماری ہے کہ کیوں انہوں نے جلد بازی سے کام لیا اور یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ دوستی اور حلیفانہ معاہدے کر لئے۔ وہ نفاق کرتے رہے اور اب ان کا راز کھل گیا۔ ایسے حالات میں پھر اہل ایمان کو منافقین کے حال پر تعجب ہو گا کہ کس طرح یہ لوگ اپنے سینوں میں نفاق لئے ہوئے تھے اور اب یہ لوگ کس قدر گھاٹے میں ہیں۔

( وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ( ۵ : ۵۳ )) "اور اس وقت اہل ایمان کہیں گے "کیا یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں؟" ....... ان کے سب اعمال ضائع ہو گئے اور آخر کار یہ ناکام و نامراد ہو کر رہے۔

ہاں پھر ایک دن آگیا کہ فتح نصیب ہوئی۔ کئی لوگوں کے خفیہ راز کھل گئے اور ان کے اعمال ضائع ہو گئے اور کئی گروپ سخت گھاٹے میں رہے۔ اور آج بھی ہم اللہ کے اس وعدے کے انتظار میں ہیں کہ فتح آئے گی بشرطیکہ ہم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ رکھیں۔ بشرطیکہ ہماری دوستی صرف اللہ سے ہو' بشرطیکہ ہم اسلامی نظام کو سمجھیں اور اس کے مطابق اپنے افکار اور اپنے اعمال استوار کریں' بشرطیکہ ہم معرکے کے اندر اللہ کی ہدایات اور راہنمائی میں اتریں اور ہم اللہ اور رسول کے سوا کسی کو دوست نہ بنائیں۔

---ooo---

پہلی پکار اہل ایمان کو یہ تھی کہ وہ یہود و نصاریٰ کی دوستی اور ان کے ساتھ حلیفانہ تعلقات قائم کرنے سے باز آجائیں' ورنہ یاد رکھیں کہ ان کا شمار بھی ان میں ہو گا اور اس طرح وہ اسلام سے مرتد ہو جائیں گے۔ ان کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ وہ کیا سے کیا بن گئے بالکل غیر ارادی طور پر۔ اب یہاں ان کو دوسری کال دی جاتی ہے کہ خبردار! ان میں سے کوئی مرتد نہ ہو جائے۔ یہ ارتداد اس دوستی سے بھی ہو سکتا ہے اور دوسرے اسباب کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ اگر وہ مرتد ہو گئے تو اللہ کے ہاں ان کا کوئی مقام نہ رہے گا اور یہ بات بھی نوٹ کر لیں کہ ان کا یہ ارتداد اور الٹا پھرنا' نہ اللہ کو مجبور

کر سکتا ہے اور نہ اللہ کے دین کو نقصان دے سکتا ہے۔ اللہ کے دین کے دوست اور بہت لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ کے علم میں ہیں۔ اگر مسلمان سب کے سب پھر گئے تو وہ لوگ آ جائیں گے اور یہاں ان لوگوں کے کچھ خدوخال بھی بتا دیئے جاتے ہیں جو کہ اللہ کے علم میں ہیں اور ریزرو ہیں اور جو اس کے دین کے حامی و مددگار ہوں گے اور یہ خدوخال نہایت ہی پسندیدہ' خوشنما' خوبصورت اور چمکدار ہیں۔ اور وہ قبلہ بھی بتا دیا جاتا ہے جس کی طرف ایک مسلم اپنی دوستی اور محبت کا رخ کرے گا اور اس دوسری پکار میں اس معرکے کا وہ حتمی انجام بھی ذکر کر دیا جاتا ہے' جو حزب اللہ اور تمام دوسری احزاب کے اندر جاری ہے۔ اس انجام تک وہ لوگ اور صرف وہی لوگ پہنچیں گے جن کی محبت صرف اللہ اور رسول اللہ اور اہل ایمان کے ساتھ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي
اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى
الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ
لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝
اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ
وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ
وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ ع

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہو گا' جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے' جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے' جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسول ؐ اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنالے اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔"

اس صورت میں اور اس مقام پر مسلمانوں کو یہ تنبیہ کرنا کہ وہ مرتد نہ ہو جائیں' اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ارتداد اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی اور تعلق موالات کے درمیان گہرا ربط ہے۔ خصوصاً اس ریمارک کے بعد کہ جو شخص ان کے ساتھ محبت و موالات کا تعلق قائم کرے گا وہ انہی میں شمار ہو گا۔ وہ جماعت مسلمہ سے خارج تصور ہو گا اور ان کا فرد اور آدمی شمار ہو گا۔ (وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ) (تم میں سے جو ان کے ساتھ موالات کرے گا وہ ان میں سے ہو گا)۔ اس مفہوم کی رو سے یہ دوسری پکار پہلی ہی تاکید و تائید ہو گی اور اس پکار کے بعد جو تیسری پکار آ رہی ہے وہ بھی اس مفہوم پر دلالت کرتی ہے کیونکہ وہاں اہل کتاب اور کفار دونوں کے ساتھ تعلق موالات کی ممانعت کا ذکر ہے اور ان کو ایک صف میں کھڑا کر دیا گیا ہے کہ اہل کتاب اور کفار کے ساتھ موالات کا درجہ ایک ہی ہے اور یہ کہ اسلام میں اہل کتاب اور دوسرے کفار کے ساتھ بعض تعلقات میں جو فرق کیا گیا ہے وہ ہدایات تعلق موالات پر لاگو نہیں ہیں ان میں موالات شامل نہیں ہے۔

يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (۵:۵۴)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہو گا' جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے' جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے' جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔"

کسی ایک گروہ اور جماعت کو اللہ کے کام پر لگانا اللہ کی منشا کو پورا کرنا ہے۔ اگر ایسا گروہ اس کرۂ ارض پر اللہ کے دین کی اقامت کے لئے دست قدرت کا آلہ کار ہو' اور اس کے ذریعے دنیا میں عوام الناس پر اللہ کی حکومت قائم ہو' ان کی زندگی میں اللہ کے احکام و ہدایات نافذ ہوں' انہی کے مطابق ان کی انتظامیہ ہو' ان کی عدالتوں میں اسلامی شریعت نافذ ہو اور بھلائی' خیر' پاکیزگی اور ترقی کا دور دورہ ہو اور یہ اسلامی نظام کی وجہ سے دنیا کو حاصل ہو تو اس گروہ کا اس کام کے لئے منتخب ہونا اور کیا جانا ہی اللہ تعالیٰ کا عظیم فضل و کرم ہے۔ اب اگر کوئی اپنے آپ کو اللہ کے اس فضل و کرم سے محروم کرتا ہے تو یہ اس کی اپنی بدبختی ہو گی۔ اللہ تو غنی بادشاہ ہے اور ان محروم ہونے والوں کے علاوہ بھی اللہ کے علم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس فضل و کرم کے مستحق ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ ان مختاران الہی کی جو تصویر کشی فرماتے ہیں اس کے خد و خال نہایت ہی واضح ہیں اور ان کی صفات کا ذکر بھی نہایت ہی واضح طور پر کر دیا گیا ہے۔ یہ تصویر نہایت ہی روشن اور پرکشش ہے۔

(فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّونَهُ (۵:۵۴) "اللہ بہت سے لوگ پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب

ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہو گا۔" یعنی ان کے اور ان کے رب کے درمیان رابطہ اور تعلق محبت کے متبادل تحفے ہوں گے۔ محبت کیا ہے؟ ایک روح ہے جو نہایت ہی لطیف، روشن، پر رونق اور نہایت ہی ہشاش و بشاش روح ہے۔ جو اس قوم اور اللہ تعالیٰ کے درمیان رابطے کا کام دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ محبت کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس کی قدر و قیمت کا ادراک صرف اس شخص کو ہو سکتا ہے جس کو معرفت ربانی حاصل ہو اور انہی صفات سے متصف ہو جو اللہ نے خود بیان کی ہیں۔ نیز صرف وہی شخص اس کا تصور کر سکتا ہے جس کے حس، شعور اور نفس و شخصیت پر ان صفات کا پرتو پڑا ہو۔ یہ فضل و کرم اسی شخص کے ادراک میں آسکتا ہے جو اس داتا کی حقیقت سے واقف ہو، جو جانتا ہو کہ اللہ کون ہے؟ اس عظیم کائنات کا مالک اور صانع کون ہے؟ اور اس کائنات میں اس چھوٹے سے کیڑے انسان کا بھی وہ خالق ہے جو نہایت اونچی عظمتوں والے کے اقتدار میں ہے اور وہ اس کی خدمت میں ہے جو خالص اسی کا ہے اور اس کی بادشاہی میں ہے۔ اور وہ ذات کون ہے اور یہ انسان کیا ہے جس پر وہ ذات فضل و کرم کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ محبت کر رہی ہے حالانکہ انسان خود اس کا بنایا ہوا ہے۔ وہ پاک ہے، جلیل القدر، عظیم المرتبہ، الحی، الدائم، للارفع، الابدی، الاوّل، الآخر اور الظاہر والباطن ہے۔

کسی بندے کا اپنے اللہ کے ساتھ محبت کرنا اس بندے کے لئے ایک نعمت ہے اور اس کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کو اس کا ذوق ہو اور اللہ کی جانب سے کسی بندے کے ساتھ محبت کرنا تو ایک عظیم بات ہے اور یقیناً عظیم اور بھرپور اور فضل جزیل ہے۔ اسی طرح اللہ کا اپنے بندوں کو ہدایت دینا، ان کی تعریف کرنا بھی ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ ان کے اندر اس ذوق جمیل کا پیدا ہونا اور ایک ایسا ذوق محبت پیدا ہونا جس کی دنیا کی محبتوں میں کوئی نظیر نہ ہو، تو یہ بھی ایک عظیم انعام و اکرام ہے اور ایک عظیم فضل و کرم ہے۔

جس طرح اللہ کی جانب سے بندے کے ساتھ محبت ناقابل بیان ہے اسی طرح بندے کی جانب سے اللہ کے ساتھ محبت بھی ناقابل بیان ہے۔ دنیا کے محبت کرنے والوں کے کلام میں اور عبادات میں اس کا اظہار ممکن نہیں ہے۔ اور یہ وہ شعبہ ہے جس میں صوفیا میں سے واصل باللہ لوگ ہی برتری کے حامل ہیں۔ لیکن صوفیوں کے لباس میں، نام نہاد صوفیوں کی جو فوجیں پھرتی نظر آتی ہیں اور عوام کے درمیان معروف ہیں ان میں ایسے واصل باللہ بہت ہی کم نظر آئیں گے۔ اس سلسلے میں رابعہ عدویہ کے کچھ اشعار میرے ذہن کی اسکرین پر آتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں :

فلیتک تحلوا والحیاۃ مریرۃ

ولیتک ترضی والانام غضاب

(اے کاش کہ آپ میٹھے ہوں اور زندگی کڑوی ہو اور اے کاش کہ آپ راضی ہوں اور تمام لوگ مجھ پر غضبناک ہوں)۔

ولیست الذی بینی وبینک عامر

وبینی وبین العلمین خراب

(اے کاش کہ جو میرے اور آپ کے درمیان ہے وہ بستا رہے اور میرے اور لوگوں کے درمیاں جو ہے وہ خراب ہو) یعنی تعلق و رابطہ۔

اذا صح منك الحب فالكل هين
وكل الذى فوق التراب تراب

(اگر آپ کی جانب سے محبت درست ہو جائے تو پھر سب کچھ آسان ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس مٹی کے اوپر جو مخلوق بھی چلتی پھرتی ہے وہ مٹی ہی ہے)۔

اللہ جل شانہ کی طرف سے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کے ساتھ یوں اظہار محبت اور پھر ایک عاجز بندے کی طرف سے اللہ کے ساتھ اظہار محبت جو منعم حقیقی ہے اور جو حقیقی فضل کرنے والا ہے ایک انعام ہے۔ یہ محبت اس پوری کائنات میں پھیل جاتی ہے اور یہ محبت بھی ہر زندہ چیز کا مزاج بن جاتی ہے۔ پھر ایک فضا ہوتی ہے اور ایک سایہ ہوتا ہے جو اس پورے وجود کائنات پر چھا جاتا ہے اور انسان جو محب بھی ہے اور محبوب بھی' اس کی زندگی کا پیمانہ تو اس محبت سے پوری طرح بھر جاتا ہے۔

اسلامی تصور حیات ایک مومن اور اس کے رب کے درمیان اس طرح کا محبوب رابطہ قائم کرتا ہے جو نہایت ہی عجیب اور نہایت ہی پیارا ہوتا ہے۔ یہ دائمی محبت کا رابطہ ایسا نہیں ہوتا کہ اچانک قائم ہو جائے یا ایک چمک پیدا ہو اور چلی جائے۔ یہ اسلامی تصور حیات میں ایک بنیادی اور حقیقی عنصر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

(اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا) "وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کے لئے رحمٰن محبت پیدا کر دے گا" اور دوسری جگہ ہے۔ (اِنَّ رَبِّىْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ) "بے شک میرا رب رحم کرنے والا اور محبت کرنے والا ہے) اور دوسری جگہ ہے (وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ) (اور وہ بخشنے والا اور محبت کرنے والا ہے) اور دوسری جگہ ہے۔ (وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ) "اور جب تم سے میرے بندے' میرے بارے میں پوچھیں تو بے شک میں قریب ہوں' میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں' جب وہ مجھے پکارتا ہے۔" (وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ) "اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کے ساتھ شدید محبت رکھتے ہیں۔"

اور دوسری جگہ ہے۔ (قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ) "کہہ دیجئے' اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اطاعت کرو' تم سے اللہ محبت کرے گا) وغیرہ وغیرہ بے شمار ایسی آیات ہیں جو اس مضمون کو ظاہر کرتی ہیں۔

ان لوگوں پر تعجب ہے کہ وہ اس مضمون کی آیات پڑھتے ہیں اور پھر بھی کہتے ہیں کہ اسلامی تصور حیات ایک خشک' سخت اور کرخت تصور ہے اور اس میں خدا اور بندے کے درمیان تعلق قہر و غضب' سزا و گوشمالی اور سختی اور دوری کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی ایسا تصور نہیں جس طرح مسیحی تصور میں مسیح کو اقانیم الوہیت میں سے ایک اقنوم تصور کیا جاتا ہے اور لوگوں میں اور اللہ میں ایک گہرا رابطہ بلکہ من تو شدم تو من شدی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تصور حیات کی صفائی اور اس میں حقیقت الوہیت اور مقام بندگی کے اندر مکمل فرق و امتیاز کرنے کی وجہ سے 'الفت و محبت کی پر نم فضا میں کوئی کمی نہیں آتی ۔ اللہ اور بندے کے درمیان اس تصور میں نہایت ہی گہرا ربط موجود ہے لیکن یہ ربط و تعلق رحمت اور عدل کا تعلق ہے ۔ اس تعلق کا ایک رخ باہم محبت ہے تو دوسرا رخ مکمل پاکیزگی کا ہے ۔ ایک طرف محبت ہے اور دوسری جانب اللہ کی ذات کے لئے مکمل پاکیزگی ہے ۔ یہ نہایت ہی جامع اور مانع تصور ہے ۔ اور اس سے وہ تمام بشری تقاضے پورے ہوتے ہیں جو اپنے رب کے حوالے سے انسان کو درکار ہیں ۔

چنانچہ اس ''مومن رجمنٹ'' کی صفت سے متعلق 'جسے اس دین کے لئے اٹھایا گیا ہے اس آیت میں یہ الفاظ آتے ہیں اور بار بار ذہن میں پھرتے ہیں ۔ ( يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ ) (وہ اللہ سے محبت کرتا اور اللہ اس سے محبت کرتے ہیں) اس فضائے محبت میں جب یہ رجمنٹ اپنے عظیم فرائض کی ادائیگی کے لئے نکلتی ہے اور یہ بوجھ اٹھاتی ہے تو اس کے دل میں یہ شعور ہوتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے اس خصوصی خدمت کے لئے بھرتی کیا ہے اور وہ اللہ جل شانہ کی خصوصی رجمنٹ ہے ۔

اس کے بعد اس رجمنٹ کی باقی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں ۔ ( اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (۵ : ۵۴) (مومنوں پر نرم ہوں گے ) یہ ایک ایسی صفت ہے جو اطاعت 'نرمی اور یسر سے لی گئی ہے اور لفظ یہ استعمال کیا ہے کہ وہ مومنین کے مقابلے میں اپنے آپ کو ذلیل کر کے رکھیں گے ۔ لیکن اگر کوئی مومنین کے مقابلے میں اپنے نفس کو ذلیل کرتا ہے تو وہ ذلت نہیں ہے اور نہ اس میں توہین کا پہلو ہے اس لئے کہ ایک مومن دوسرے مومن کے مقابلے میں نہایت ہی نرم ہوتا ہے' سخت اور نافرمان نہیں ہوتا ۔ آسان اور نرم 'جلدی لبیک کہنے والا 'رواداز 'محبت کرنے والا ہوتا ہے ۔ اس لئے اس کے لئے اس لفظ کے استعمال میں ذلت بمعنی حقارت کا مفہوم نہیں ہے 'بلکہ اس سے اخوت 'محبت' عدم تکلف 'نفسیاتی اتحاد اور نظریاتی لگاؤ کے معانی کا اظہار ہوتا ہے ۔ ایک مومن اور دوسرے مومن کے درمیاں کوئی پردہ اور راز نہیں رہتا ۔

جب انسان بعض چیزیں اپنی ذات کے لئے اٹھا رکھتا ہے تو یہ جذبہ اسے اپنے دوسرے بھائی کے مقابلے میں زیادہ نمایاں 'بخیل اور کنجوس بنا دیتا ہے ۔ لیکن جب ایک شخص اپنے آپ کو ایک کمپنی یا رجمنٹ کا فرد بنا لیتا ہے تو وہ اپنا سب کچھ اس کے لئے قربان کر دیتا ہے اور اس کی انفرادیت کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے ۔ پھر اس کمپنی کے علاوہ وہ اپنے لئے کچھ اٹھا نہیں رکھتا جبکہ ان کی کمپنی اخوت اسلامی کی کمپنی ہوتی ہے اور وہ اللہ کے نام اور نظام پر جمع ہوئے ہیں ۔ اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں ۔ محبت الٰہی ہی ان میں مشترک ہے اور یہ اسے باہم تقسیم کرتے ہیں ۔

(اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۵ : ۵۴) (جو کفار پر سخت ہوں گے )یعنی کافروں کے مقابلے میں ان کے اندر برتری 'ناپسندیدگی اور برتری کے جذبات پائے جاتے ہیں اور چونکہ مقابلہ کفار کے ساتھ ہے اس لئے ان کے مقابلے میں ان جذبات کا ہونا مناسب ہے ۔ ان جذبات کا اظہار ان کے مقابلے میں محض ذاتی عزت کے اظہار کے لئے نہیں ہے اور نہ صرف اپنی خودی بلند کرنا مطلوب ہوتا ہے بلکہ ان کی جانب سے عزت کا اظہار اسلامی نظریہ حیات کی طرف سے عزت کا اظہار ہو گا اس جھنڈے کی برتری ہو گی جس کے نیچے اہل ایمان کھڑے ہوں گے اور اہل کفار کے مقابلے میں ہوں گے ۔ اس سے اس بات کا اظہار ہو گا کہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ خیر ہے اور ان کا مقام یہ ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے ساتھ لے کر اس بھلائی کے تابع کر دیں ۔ یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر اس چیز کے تابع ہو جائیں جس کے وہ

دوسرے حامل ہیں اور وہ خیر نہیں ہے۔ اس اظہار برتری اور سختی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے اندر دین کے بارے میں خود اعتمادی ہے اور وہ ہوا و ہوس کے دین پر قابو پا چکے ہیں۔ ان کے ہاں اللہ کی قوت تمام دوسری قوتوں پر غالب ہے اور اللہ کی جماعت تمام احزاب پر غالب ہے۔ اگر وہ بعض معرکوں میں شکست بھی کھا جائیں تو پھر بھی وہ بلند عزم لئے ہوئے ہیں کیونکہ اسلامی جدوجہد کی طویل راہ میں کبھی لغزش بھی تو ہو سکتی ہے۔

(يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ (۵: ۵٤) "وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔" یہ جہاد فی سبیل اللہ ہو گا' یہ اس لئے ہو گا کہ زمین پر اسلامی نظام قائم کیا جائے' یہ اس لئے ہو گا کہ لوگوں پر اللہ کی بادشاہت کا اعلان کیا جائے' یہ اس لئے ہو گا کہ ملک کے اندر اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے ہوں اور ملک کے اندر بھلائی' ترقی اور اصلاح بین الناس کا دور دورہ ہو۔ یہ ہے ایک دوسری صفت اسلامی رجمنٹ کی۔ اور اسے اللہ تعالیٰ نے محض اس لئے قائم کیا ہے کہ وہ اس کی زمین پر وہ فریضہ سرانجام دے جو اللہ کو مطلوب ہے۔

یہ رجمنٹ فی سبیل اللہ جہاد کرے گی' اپنے کسی ذاتی مقصد کے لئے نہ کرے گی۔ نہ اپنی قوم کے کسی مقصد کے لئے لڑے گی' نہ اپنے وطنی مقاصد میں سے کسی مقصد کے لئے لڑے گی' نہ وہ کسی نسل کے لئے کام کرے گی۔ اس رجمنٹ کے ارکان صرف اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور یہ جہاد اسلامی نظام حیات کے قیام کے لئے ہے' اللہ کی حکومت کے قیام کے لئے ہے' اور اللہ کی شریعت کے نفاذ کے لئے ہے اور اس راہ میں تمام لوگوں کی بھلائی ہے۔ اس میں ان کی ذاتی کوئی غرض نہیں ہے' نہ ان کا اپنا کوئی حصہ ہے۔ یہ گروہ صرف اللہ کے لئے ہے اور اس میں کوئی اور شریک نہیں ہے۔

یہ رجمنٹ اللہ کے راستے میں لڑنے مرنے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا کوئی لحاظ نہ رکھے گی۔ اس کو لوگوں کا کیا خوف ہو گا اور وہ کیا پرواہ کرے گی وہ تو اللہ کی محبت میں سرشار ہو گی اور یہی محبت اس کے لئے امام ضامن ہے۔ لوگوں کے ہاں رائج مقامات قیام پر وہ شاپ نہ کرے گی۔ سوسائٹی کی اقدار اس کی نظروں میں ہیچ ہوں گی اور جاہلیت کے ہاں معروف اس کے لئے معروف نہ ہو گا۔ وہ تو سنت الٰہی کی رجمنٹ ہو گی اور وہ اسلامی نظام حیات پیش کرنے والی ہو گی۔ لوگوں کی ملامت سے تو وہ لوگ ڈرتے ہیں جو اپنی اقدار اور ہدایات لوگوں کی خواہشات کے مطابق تشکیل دیتے ہیں اور جن کی قوت اور طاقت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں۔ لیکن جس جماعت کا رخ اللہ کی اقدار اور پیمانوں کی طرف ہو گا وہ تو کلمہ حق کو عوام کی اقدار اور پیمانوں پر غالب کرنے کی سعی کرے گی اور لوگوں کی خواہشات کے برعکس کام کرے گی تو وہ لوگوں سے کیا ڈرے گی۔ جس شخص کی قوت اور اقتدار کا سرچشمہ ذات باری ہو' تو اسے کیا پرواہ ہو سکتی ہے کہ لوگ کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ وہ تو یہ سمجھے گا کہ گویا لوگ سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ ان لوگوں کی صورت حالات جو ہو سو ہو' ان لوگوں کی تہذیب و تمدن جو ہو سو ہو' وہ اپنی راہ پر رواں دواں رہے گا۔

ہم لوگ تو دیکھتے ہیں کہ لوگ کیا کہتے ہیں' لوگ کرتے کیا ہیں' لوگوں کے پاس کیا فکر و عمل ہے' لوگ کن اصطلاحات میں بات کرتے ہیں' لوگوں کی عملی زندگی کیا ہے اور ان میں کیا اقدار اور پیمانے ملحوظ ہیں۔ ہمارا یہ رویہ اس وجہ سے ہے کہ ہم نے اصل اصول کو بھلا دیا ہے جس کے مطابق ہم نے ان اعتبارات کے مقابلے میں ایک پیمانہ بنانا ہے' جس کے مطابق

ہم نے اپنے حساب کو درست کرنا ہے اور جس کے مطابق ہم نے آپ کو تولنا ہے۔ اور وہ اصول ہے اسلامی نظام حیات' اسلامی شریعت اور اللہ کے احکام۔ اصل بات یہ ہے کہ یہی ہے اصول حق اور اس کے ماسواسب باطل ہے۔ اگرچہ یہ لاکھوں کروڑوں کے لئے معروف و متداول ہو۔ اگرچہ کئی نسلیں اسے صدیوں تک مانتی چلی آئی ہوں۔

کسی صورت حال' کسی رواج' کسی عادت یا کسی قدر کی یہ کوئی قیمت (Value) نہیں ہے کہ وہ موجود ہے یا وہ امر واقعہ ہے یا لاکھوں لوگ اس کے ماننے والے ہیں یا لاکھوں لوگ اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں یا تمام لوگ اسے اصول حیات تسلیم کرتے ہیں۔ اس قسم کے پیمانے کو اسلامی تصور حیات تسلیم نہیں کرتا بلکہ کسی صورت حال' کسی رواج' کسی عادت' کسی قدر کی قیمت یہ ہوگی کہ اسلامی تصور حیات میں اس کی کوئی قیمت ہے یا نہیں ہے اس لئے کہ تمام اقدار اور پیمانوں کا معیار اسلامی نظام ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ اسلامی رجمنٹ اللہ کی راہ میں جہاد کرے گی اور وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف نہ کھائے گی۔ یہ ہے نشانی ان مومنین کی جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس رجمنٹ میں بھرتی کیا ہو گا۔ اور یہ بھرتی بھی اللہ کرے گا اور پھر اس رجمنٹ کے سپاہیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو بہت گہرا پیار ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ اپنے ان بہادروں کی نشانیاں بتا رہا ہے۔ ان کے پتے بتا رہا ہے..... ان بہادروں کے دلوں میں جو اطمینان ہو گا اور جس ثابت قدمی کے ساتھ راہ جہاد پر وہ رواں دواں ہوں گے یہ بھی اللہ کا فضل و کرم ہو گا۔

( ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (٥ : ٥٤ ) "وہ جسے چاہتا ہے ذرائع دے دیتا ہے اور علم کے مطابق دیتا ہے۔ اور اللہ کا دین بہت ہی وسیع ہے اور اس کے لئے اللہ جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔" اب اللہ تعالیٰ 'اس دھمکی کے بعد' اس بات کا تعین فرماتے ہیں کہ اہل ایمان کی دوستی اور موالات کس کے ساتھ ہوگی۔ اس کی تصریح کی جاتی ہے۔

(اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (٥ : ٥٥ )) "تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسولؐ اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔" بطریق حصر یہ فیصلہ دیا جاتا ہے جس میں کسی تاویل اور لیپا پوتی کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اور نہ اسلامی تحریک کو پگھلانے اور اسلامی تصور حیات کو ڈھیلا کرنے کی کوئی گنجائش رہتی ہے۔

اس کے سوا کوئی اور بات ممکن بھی نہ تھی اس لئے کہ یہ مسئلہ اپنی اصلیت کے اعتبار سے نظریاتی مسئلہ ہے۔ پھر اس نظریے کو لے کر ایک تحریک برپا کرنے کا مسئلہ ہے اور اس میں دوستی اور موالات کا خالصتہً اللہ کے لئے ہونا ضروری ہے۔ صرف اللہ ہی پر بھروسہ کرنا ضروری ہے تاکہ دین صرف اسلام ہو جائے اور اسلامی صفوں میں اور ان صفوں کے درمیان مکمل جدائی ہو جائے جو صفیں اسلام کو دین تسلیم نہیں کرتیں جو اسلام کو منہاج حیات نہیں بناتیں۔ یہ تمام دو ٹوک پالیسیاں اس لئے ہیں کہ اسلامی تحریک کے اندر سنجیدگی ہو اور اس کا اپنا نظام ہو۔ اس میں صرف ایک ہی قیادت کے لئے دوستی

اور وفاداری ہو اور اتحاد و یقین ایک ہی رجمنٹ کے افراد کے اندر ہو اس لئے کہ یہ اتحاد اس گروہ کے درمیان ہے جسے نظریات کی اساس پر اٹھایا گیا ہے۔

اب اس رجمنٹ کے بعض دوسرے اوصاف گنوائے جاتے ہیں۔ یہ اس کے ممتاز اوصاف ہیں اور یہ اس لئے گنوائے جاتے ہیں کہ اسلام محض ایک عنوان ہی نہ ہو' محض جھنڈا اور علامت ہی نہ ہو' محض زبانی جمع خرچ نہ ہو یا اس طرح نہ ہو کہ وہ ایک نسب کی طرح پشت در پشت سے منتقل ہوتا ہو یا محض ایک صفت ہو جو اچھے لوگوں میں پائی جاتی ہے بلکہ وہ ایک عملی دین ہو۔

(الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (۵:۵۵) "وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں" ان کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں۔ صرف نماز ادا نہیں کرتے بلکہ قائم کرتے ہیں۔ اقامت صلوٰۃ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ نماز پورے طور پر ادا کرتے ہیں اور ان کی نماز سے وہ آثار نمودار ہوتے ہیں جن کا ذکر اللہ نے فرمایا ہے۔

(اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ) (نماز فحاشی اور منکر سے روکتی ہے) اور جس شخص کی نماز اسے فحاشی اور برائیوں کے ارتکاب سے نہیں روکتی' اس نے گویا نماز ادا نہیں کی۔ اگر اس نے نماز قائم کی ہوتی تو نماز اسے برائیوں سے روکتی۔

ان کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ دیتے ہیں۔ یعنی اللہ کی عبادت کرتے ہوئے مال میں سے اللہ کا حق ادا کرتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی مالی عبادت ہے اور اسے دل کی رغبت اور رضامندی سے ادا کیا جانا چاہئے اس لئے کہ زکوٰۃ محض ٹیکس نہیں ہے کہ اسے بادل ناخواستہ ادا کیا جائے۔ زکوٰۃ بھی عبادت ہے بلکہ یہ مالی عبادت ہے اور یہ اسلامی نظام کی خصوصیت ہے کہ وہ ایک حکم کے ذریعے مختلف مقاصد کو حاصل کر لیتا ہے۔ رہے انسانوں کے بنائے ہوئے نظام تو ان میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں ہے کہ ایک پہلو میں ہدف کو پورا کر لیں اور دوسرا پہلو سرے سے غائب ہو۔

کسی معاشرے کی اصلاح صرف اس بات سے نہیں ہوتی کہ اس میں لوگوں سے مال محض ٹیکس کے طور پر لیا جائے یا دولت مندوں سے مال لیا جائے اور فقراء کو دیا جائے اور یہ کام حکومت اور قوم کے نام پر کیا جائے یا اسے مالیے کا نام دیا جائے۔ ایسی صورتوں میں صرف ایک مقصد پورا ہوتا ہے وہ یہ کہ محتاجوں تک دولت کا ایک حصہ پہنچ جاتا ہے۔ رہی زکوٰۃ تو اس کے نام اور مفہوم دونوں سے پاکیزگی اور نشوونما کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سے ایک طرف سے انسانی ضمیر کے لئے پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور دوسری طرف مال کی پاکیزگی بھی حاصل ہوتی ہے کیونکہ یہ اللہ کی عبادت ہوتی ہے اور اس میں ادا کرنے والے کے جذبات اپنے فقراء بھائیوں کی طرف نہایت ہی محبت کے ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ دینے والا ایک عبادت کر رہا ہوتا ہے اور اس پر اسے قیامت میں اجر اور جزاء ملتی ہے۔ نیز اس سے اس دنیا میں بھی معاشی ترقی ہوتی ہے اور مال میں برکت اور اضافہ ہوتا ہے۔ پھر اس کے ذریعے جو فقراء مال لیتے ہیں ان کے جذبات بھی مجروح نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ یہ لوگ اس کو اللہ کا فضل سمجھتے ہیں کہ اللہ نے ان کے لئے اغنیاء کی دولت میں حصہ رکھ چھوڑا ہے۔ اس طرح ان کے دلوں میں اغنیاء کے خلاف عداوت و بغض پیدا نہیں ہوتا۔ (اور یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ اسلامی معاشرے

میں اغنیاء بھی حلال ذرائع سے مال کماتے ہیں۔ وہ کسی کا حق نہیں مارتے۔ وہ اپنا نصیب جمع کرتے ہیں) سب سے آخر میں یہ کہ زکوٰۃ کی شکل میں بڑے خوشگوار انداز میں ایک مالی ٹیکس بھی عائد ہو جاتا ہے اور نہایت ہی پاکیزگی' نہایت ہی طہارت اور بڑھوتری کے ساتھ۔

غرض زکوٰۃ کی ادائیگی ان لوگوں کی نہایت ہی ممتاز علامت ہے جو شریعت کا اتباع کرتے ہیں۔ یہ ان کی جانب سے عملی اقرار ہے کہ وہ اللہ کی حکومت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں۔

( وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (۵:۵۵) (اور وہ رکوع کرتے ہیں) یہ ان کی شان اور صفت ہے' یعنی یہ گویا ان کا وصف لازم ہے اور ان کی اصلی حالت ہی یہ ہے کہ وہ رکوع میں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یقیمون الصلوٰۃ پر اکتفاء نہ کیا گیا اور راکعون بھی کہا گیا' اس لئے کہ راکعون گویا ان کی ایک منفرد اور نہایت ہی ممتاز صفت ہے۔ اسم فاعل کے ساتھ یہ صفت لاکر یہ تاثر دیا گیا کہ وہ دائماً ایسا کرتے رہتے ہیں اور اس لئے اسے نمایاں کر کے بیان کیا گیا...... ایسے مقامات پر قرآن کی تعبیرات کے اندر نہایت ہی گہری اشاریت پائی جاتی ہے اگر کسی کو ادبی ذوق ہو۔

اب اس رجمنٹ کے ساتھ اللہ کا وعدہ کیا ہے؟ وہ اللہ پر اعتماد کرتی ہے' وہ اللہ سے دعا کرتی ہے' وہ اللہ سے موالات کرتی ہے' وہ رسول اللہ ﷺ اور مومنین کی دوست ہے۔ پھر دوسری جانب اسلامی صفوں کے سوا تمام صفوں سے کٹ چکی ہے اور خالص اللہ کے لئے ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ اب کیا وعدہ ہے؟

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۵:۵۶)

"اور جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنا لے اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔"

ایمان کے اصول کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے غلبے کا وعدہ کیا ہے۔ اور ایمانی اصل اور ایمانی قاعدہ یہ ہے کہ موالات اور دوستی صرف اللہ' رسول اللہ ﷺ اور مومنین کے لئے ہو۔ پہلے یہ حکم دیا گیا کہ اگر تم یہودیوں کے ساتھ موالات کرو گے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تم اسلامی صفوں سے خارج تصور ہو گے' تمہارا اشار یہود و نصاریٰ میں ہو گا اور معنوی اعتبار سے تمہارا یہ عمل دین سے ارتداد ہو گا۔

یہ لحہ فکریہ قرآن میں بار بار آتا ہے' وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ایک مسلمان سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ اسلام کو مطلقاً خیر سمجھے اور اس پر چلے۔ اس لئے نہیں کہ وہ غالب ہو گا یا اسے زمین کے اندر اقتدار اعلیٰ نصیب ہو گا۔ تمکن فی الارض اور غلبہ تو ایمان کے آثار ہیں اور اپنے وقت پر ضرور نمودار ہوتے ہیں اور یہ اس لئے نمودار ہوتے ہیں کہ اللہ کی تقدیر پردے سے ظاہر ہو کہ اس نے اس دین کو اس کرۂ ارض پر غالب کرنا ہے۔ غلبے کا یہ وعدہ اس لئے نہیں ہے کہ لوگ اس وعدے کے بل بوتے پر دین میں داخل ہو جائیں۔ محض غلبہ مقصود نہیں ہے' نہ اس میں ان کی ذات اور شخصیت کا کوئی فائدہ ہے' یہ تو اللہ کی تقدیر ہوتی ہے جو مسلمانوں کے ہاتھوں ازپس پردہ تقدیر نمودار ہوتی ہے۔ یہ غلبہ جو انہیں نصیب ہوتا ہے تو یہ ان کے نظریہ حیات کے لئے ہوتا ہے' ان کی ذات کے لئے نہیں ہوتا۔ ان کے لئے اگر کچھ ہے تو وہ اس راہ میں جدوجہد کرنے کا ثواب اخروی ہے اور یہ اخروی ثواب انہیں اس جدوجہد کے ان نتائج پر بھی ملے گا۔ مثلاً کرۂ ارض پر

اگر دین غالب ہو جاتا ہے تو اس زمین پر جو اصلاحی کام ہوتا ہے' اس تمام کا ثواب انہیں ملے گا۔

بعض اوقات اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ساتھ غلبے کا وعدہ کرتا ہے تاکہ وہ ثابت قدم ہو جائیں اور ان کے سامنے جو مشکلات بھیانک صورت میں کھڑی ہیں ان کے اثرات سے وہ آزاد ہو جائیں۔ یہ مشکلات بعض اوقات نہایت ہی تباہ کن ہوتی ہیں۔ جب وہ انجام کا یقین حاصل کر لیتے ہیں تو ان کے دل قوی ہو جاتے ہیں اور وہ مشکلات کو انگیز کر لیتے ہیں۔ وہ مشکل گھاٹی کو سر کر لیتے ہیں اور پرامید ہو جاتے ہیں کہ اللہ ان کے ہاتھوں اس امت کے لئے کوئی بھلائی برپا کر دے گا۔ ان کو جہاد کا ثواب ملے گا اور دین کے غلبے کا ثواب ملے گا اور اس پر جو نتائج مرتب ہوں گے ان کا ثواب بھی ملے گا۔

غرض اس مقام پر اس آیت کے لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں جماعت مسلمہ کے شب و روز کیا تھے اور یہ کہ انہیں ایسی خوشخبری کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہ فیصلہ دیا گیا کہ غلبہ حزب اللہ ہی کا ہو گا۔ یہ بات اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یہ آیات کس دور میں نازل ہوئیں۔

ان حالات میں ہمارے لئے تمام نتائج کا خلاصہ اس مختصر فیصلے میں دے دیا جاتا ہے کہ حزب اللہ کو غلبہ ہو گا اور ایک مومن مطمئن ہو جاتا ہے کہ بس یہی ہے سنت الٰہیہ کہ حزب اللہ غالب ہوگی اگرچہ بعض معرکوں میں اسے بظاہر شکست بھی ہو جائے' اس لئے کہ بعض ظاہری حالات کے ہوتے ہوئے بھی اللہ کا وعدہ سچا ہوتا ہے۔ ہاں بعض مراحل تحریک میں شکست بھی نظر آتی ہے۔ اس وعدے کے تحقق کی راہ بہرحال ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ موالات صرف اللہ' رسول اللہ ؐ اور اہل ایمان کے لئے ہو۔

---○○○---

اب ذرا اس امر پر غور کریں کہ قرآن مجید نے اہل ایمان کو ان لوگوں کے ساتھ تعلق موالات قائم کرنے سے بار بار منع کیا ہے جو اہل ایمان کے نظریے کے خلاف ہیں۔ اور اس کے لئے نئے نئے انداز اختیار کئے ہیں تاکہ یہ بات ان کے احساس و شعور کا حصہ بن جائے اور یہ اصول ان کے ایمان کا حصہ بن جائے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تصور حیات میں اس اصول کی کس قدر زیادہ اہمیت ہے۔

اس سلسلے میں جب اہل ایمان کے نام پہلی پکار جاری ہوئی تو وہ براہ راست تھی اور اس میں ان کو منع کیا گیا کہ اہل کتاب کے ساتھ تعلق موالات قائم کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ فتح لے آئیں گے یا کوئی اور حکم جاری کر دیں گے اور اس طرح تمام راز فاش ہو جائیں گے۔ دوسری پکار میں ان کو اس بات سے ڈرایا گیا کہ اگر وہ اللہ اور رسول ؐ اللہ کے دشمنوں سے تعلق موالات کریں گے تو مرتد ہو جائیں گے بلکہ چاہئے کہ تم ایک ایسی رجمنٹ کے سپاہی بن جاؤ جو اللہ کی خاص رجمنٹ ہے۔ جس سے اللہ کو پیار ہے اور اس کو بھی اللہ سے محبت ہے۔ اور یہی اللہ کی پارٹی ہے جسے غلبہ نصیب ہو گا۔

اب یہاں ایک تیسری پکار ہمارے سامنے آتی ہے اس میں اہل ایمان کے جذبہ حمیت دین کو ابھارا جاتا ہے کہ دیکھو یہ لوگ تو تمہارے دین' تمہارے طریقہ عبادت کے نہ صرف یہ کہ مخالف ہیں بلکہ وہ تمہارے طریقوں کے ساتھ سخت مذاق بھی کرتے ہیں۔ اس تیسری پکار میں اللہ تعالیٰ نے ان کو منع کیا کہ وہ اہل کتاب کے ساتھ ساتھ دوسرے کفار کے ساتھ بھی تعلق موالات نہ رکھیں اور خدا خوفی کا رویہ اپنائیں۔ اگر وہ مومن ہیں تو اللہ کی ان ہدایات پر اچھی طرح غور

کریں اور اس پکار میں اہل کتاب اور کفار کی ایک دائمی صفت کا ذکر کیا ہے کہ یہ لوگ بے عقل ہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَ اِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

"ہاں یہ صورت حال سخت ہیجان انگیز ہوتی بشرطیکہ کسی کے اندر ایمانی حمیت کا جذبہ موجود ہو اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ اگر اس کے سامنے اس کے دین کی توہین کر دی گئی' اس کی عبادت کی توہین کر دی گئی اور اس کے نظریہ حیات اور موقف کی توہین کر دی گئی تو اس کی کوئی عزت اور آبرو نہ رہے گی لہٰذا ایسے لوگوں سے ترک تعلق ہی ایک خدائی امر ہے۔ اہل ایمان اور ایسے لوگوں کے درمیان دوستی یا تعلق موالات کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ یہ حرکات وہ لوگ کرتے بھی اس لئے ہیں کہ ان کی عقل و خرد میں خرابی ہے اس لئے کہ اللہ کے دین اور مسلمانوں کے طریقہ عبادت کے ساتھ مذاق تو وہ لوگ کرتے ہیں جن کی عقل متوازن نہیں ہوتی۔ جب عقل صحت مند اور درست ہو تو وہ اپنے ماحول سے ایمان کے اشارات پاتی رہتی ہے اور جب عقل اور فہم میں خلل واقعہ ہو جاتا ہے تو وہ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے اشارات ایمان کا ادراک نہیں کر سکتی۔ اس خلل کی وجہ سے انسان اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کے درمیان' تعلقات میں بھی خلل پیدا ہو جاتا ہے اس لئے کہ یہ پوری کائنات ہی اس بات پر شاہد عادل ہے کہ اللہ ہی انسان کی بندگی کا مستحق ہے اور اگر عقل صحت مند ہو اور اس میں کوئی خلل نہ ہو تو اس کے اندر اس کائنات کی عظمت اور اس کے بنانے والے کی عظمت و جلالت پیدا ہوتی ہے اس لئے کوئی درست اور سلیم عقل اہل اسلام کے طریقہ عبادت کے ساتھ مزاح نہیں کر سکتی۔

اسلامی عبادات کے ساتھ یہ مذاق اہل کتاب یہودیوں کی طرف سے بھی ہوتا تھا اور اہل کفر کی طرف سے بھی۔ یہ مزاح اس وقت ہو رہا تھا جب یہ قرآن حضور اکرم ؐ کے قلب پر اتر رہا تھا اور جماعت مسلمہ اسے اخذ کر رہی تھی' البتہ سیرت رسول ؐ سے کوئی ایسا واقعہ منقول نہیں ہے کہ نصاریٰ کی طرف سے بھی یہ مذاق ہوا ہو۔ لیکن قرآن کریم جماعت مسلمہ کے لئے ایک دائمی اصول وضع کر رہا تھا' مسلمانوں کی زندگی کا ایک دائمی منہاج اور دائمی نظریہ تشکیل پا رہا تھا اور اللہ کو یہ بھی علم تھا کہ زمانے کی گردشیں کیا ہوں گی اور دیکھئے کہ بعد کے ادوار میں دین کے دشمنوں اور تحریک اسلامی کے دشمنوں نے اس امت کے ساتھ کیا سلوک کیا اور یہ سلوک ان لوگوں نے کیا جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے تھے اور یہ لوگ تعداد میں یہودیوں کے مقابلے میں بہت ہی زیادہ تھے۔ بلکہ یہود اور دوسرے کفار سے مل کر بھی زیادہ تھے۔ یہ لوگ اسلام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور صدیوں تک اسلام کی دشمنی دلوں میں اٹھائے پھرے۔ اسلام کے خلاف انہوں

نے جنگیں جاری رکھیں اور یہ محاربت اس وقت سے شروع ہوگئی جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دور میں سلطنت روم کے ساتھ مسلمانوں کی مڈبھیڑ ہوئی اور یہ مڈبھیڑ صلاح الدین ایوبی کے وقت تک صلیبی جنگوں کی شکل میں جاری رہی۔ اس کے بعد عالم اسلام کے خلاف تمام مغربی ممالک نے جمع ہوکر یہاں سے خلافت اسلامیہ کو ختم کیا۔ اس کے بعد مغربی استعمار پیدا ہوا' جس کی آغوش میں صلیبیت چھپی ہوئی تھی اور کبھی کبھار اس استعمار کی زبان سے اس کا اظہار بھی ہو جاتا تھا۔ اس استعمار کے زیر سایہ مسیحی تبلیغ آئی اور مسیحی تبلیغ اور استعمار دونوں اندر سے ملے ہوئے تھے۔ آج بھی ان لوگوں کے خلاف یہود و نصاریٰ کی یہ جنگ جاری ہے جو اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور احیائے اسلام کے لئے کسی بھی جگہ کام کرتے ہیں اور ان حملوں میں یہودی' عیسائی اور تمام مشرکین بحیثیت ملت واحدہ شریک ہیں۔

قرآن اس لئے آیا کہ یہ مسلمانوں کے لئے کتاب ہدایت ہے اور قیامت تک کے لئے ہے اور یہ کتاب ہی اس امت کے تصورات کو تشکیل دیتی ہے۔ امت کے لئے اجتماعی نظام بناتی ہے اور اس کے لئے تحریکی خطوط وضع کرتی ہے۔ چنانچہ یہاں اس نے ایک مستقل اصول رکھ دیا کہ امت مسلمہ کا کوئی فرد اللہ' رسول اللہ اور مومنین کے سوا کسی اور کے ساتھ تعلق موالات قائم نہ کرے گا اور یہ اصول منفی طور پر ان کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ اور کافروں کے ساتھ کوئی تعلق موالات قائم ہی نہ کرے اور اس بات کا فیصلہ نہایت ہی سختی سے کیا جاتا ہے اور اسے اس طرح مختلف انداز سے بار بار لایا جاتا ہے۔

دین اسلام اہل اسلام کو رواداری کا حکم دیتا ہے۔ اہل کتاب کے ساتھ اسلام عموماً حسن معاملہ کا حکم دیتا ہے۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں' ان کے ساتھ اسلام خصوصی طور پر رواداری کا حکم دیتا ہے لیکن اسلام ان لوگوں کے ساتھ بھی تعلق موالات کی ممانعت کا حکم دیتا ہے اس لئے کہ رواداری اور حسن معاملہ اور حسن سلوک اخلاقی معاملات ہیں اور موالات کا تعلق نظریہ حیات اور تنظیم کے ساتھ ہے۔ تعلق موالات دراصل ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا معاہدہ ہوتا ہے اور اس سے دونوں فریق ایک دوسرے کی مدد کرنے اور باہم تعاون کرنے کے پابند ہو جاتے ہیں اور مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان تعاون ممکن نہیں ہے۔ کفار کا حال تو اس سے بھی زیادہ بدتر ہے جیسا کہ اس سے قبل ہم وضاحت کر چکے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ موالات صرف دین' اقامت دین اور جہاد میں ہو سکتی ہے اور ان معاملات میں ایک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان تعاون کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

یہ مسئلہ نظریاتی اور دوٹوک ہے۔ اس معاملے میں صرف فیصلہ کن اور سخت موقف ہی اختیار کیا جا سکتا ہے اور یہی ایک مسلم کے شایان شان ہے' دوٹوک سنجیدگی۔

---ooo---

اہل ایمان کے نام ان سخت نداہائے ثلاثہ سے فارغ ہوکر اب حضور نبی کریمؐ کو پکارا جاتا ہے کہ آپ خود اہل کتاب کی طرف متوجہ ہوکر ذرا ان سے پوچھیں کہ آخر تم بتاؤ کہ ہمارے ساتھ تمہاری جانب سے کی جانے والی اس دشمنی کے اسباب کیا ہیں؟ تم ہم سے کیوں ناراض ہو؟ محض اس لئے کہ ہم اللہ وحدہ پر ایمان لائے ہیں اور موجودہ کتاب کے ساتھ ان کتب پر بھی ایمان لائے ہیں جو ہم سے پہلے تم پر نازل ہوئی ہیں اور اب جو باران رحمت آ رہا ہے ہم اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دشمنی بس یہی تو ہے کہ ہم مسلمان پورا پورا ایمان لاتے ہیں اور تم اہل کتاب فسق و فجور

میں مبتلا ہو۔ حضور ؐ کا یہ خطاب ان کے لئے نہایت ہی رسوا کن ہے لیکن اس خطاب سے اس معاملے کی اچھی طرح وضاحت بھی ہوتی ہے اور یہ فیصلہ کن خطاب ہے اور اس سے تعین ہو جاتا ہے کہ مابہ الافتراق کیا ہے۔

یہ سوال اہل کتاب سے اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق کیا جا رہا ہے۔ ایک جانب سے یہ سوال مظہر حقیقت ہے کہ اہل کتاب اور اہل ایمان کے درمیان اصل صورت حال ہے کیا؟ اور یہ کہ وہ کیا اسباب اور وجوہات ہیں جن کی وجہ سے اہل کتاب نے دین اسلام اور جماعت مسلمہ کے خلاف یہ موقف اختیار کیا ہے۔ دوسری جانب سے یہ استفہام انکاری ہے اور بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے جو موقف اختیار کیا ہے' وہ ان کے شایان شان نہیں ہے۔ جن اسباب کی وجہ سے وہ اس دشمنی پر تلے ہوئے ہیں ان کا تقاضا یہ نہیں ہے جو وہ کرتے ہیں۔ یہ اہل اسلام کے لئے ایک فہمائش بھی ہے اور ان کو یہ نفرت دلائی جاتی ہے کہ وہ اس قوم سے ہرگز تعلق موالات قائم نہ کریں اور یہ بالواسطہ اسی موقف کی تائید ہے جو اس سے قبل ندا ہائے ثلاثہ کے تحت بیان کیا گیا کہ ہرگز ان لوگوں سے یہ تعلق قائم نہ کرو۔

اہل کتاب حضور ؐ کے وقت بھی حضور ؐ اور تحریک اسلامی کے ساتھ محض اس لئے دشمنی رکھتے تھے کہ یہ لوگ ایمان باللہ پر جمے ہوئے تھے۔ قرآن کریم پر ایمان لاتے تھے' اور سابقہ کتب پر بھی ایمان لاتے تھے اور اس کے سوا اہل ایمان کا اور کوئی جرم نہ تھا' اور آج بھی وہ یہی دشمنی رکھتے ہیں۔

یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ محض اس لئے دشمنی کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور یہود و نصاریٰ نہیں ہیں اور یہود و نصاریٰ کی حالت یہ ہے کہ وہ خود ان کتب سے بھی روگردانی اختیار کر چکے ہیں جو ان کی طرف نازل ہوئیں۔ ان کے فسق و فجور کی اور دلیلوں کے علاوہ یہ بھی ایک بڑی قوی دلیل ہے کہ وہ آخری رسالت پر ایمان نہیں لاتے حالانکہ یہ آخری رسالت تمام سابقہ رسالتوں کی تصدیق کرتی ہے۔ اور ان کی ہدایات کے لئے مہیمن ہے ماسوائے اس کے کہ جو خرافات انہوں نے اپنائے ہیں اور جو تحریفات انہوں نے اس میں خود کی ہیں۔

وہ اسلام کے خلاف یہ شعلہ بار جنگ کیوں جاری رکھے ہوئے ہیں جو کبھی ٹھنڈی نہیں ہوتی اور گزشتہ چودہ صدیوں سے وہ اسے بھڑکا رہے ہیں یہ جنگ اس وقت سے برپا ہے جب سے مدینہ میں ایک اسلامی ریاست قائم ہوئی ہے' اسلامی شخصیت نمودار ہوئی ہے اور مسلمانوں کا نقشہ عالم پر ایک مستقل وجود بنا ہے۔ یہ وجود ان کے دین کی وجہ سے نمودار ہوا ہے۔ ان کے تصور حیات کی وجہ سے بنا ہے اور اسلامی نظام حیات کی وجہ سے بنا ہے اور اسلامی منہاج حیات کے قیام کے لئے بنا ہے۔

غرض مسلمانوں کے خلاف وہ یہ چومکھی لڑائی اس لئے لڑ رہے ہیں کہ وہ سب سے پہلے مسلمان ہیں اور یہ لوگ اپنی اس جنگ کو اس وقت تک ختم نہ کریں گے جب تک مسلمانوں کو اپنے دین سے الٹے پاؤں پھیر کر نہ لے جائیں اور جب تک ان کو غیر مسلم نہ بنا دیں۔ ان کی یہ خواہش اس لئے ہے کہ وہ خود اپنے دین کو چھوڑ کر فاسق ہو گئے ہیں اس لئے وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ کوئی دوسرا بھی صحیح مومن اور دین پر اچھی طرح چلنے والا دنیا میں رہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری جگہ اس حقیقت کو رسول اکرم ؐ کو مخاطب کرتے ہوئی بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

(وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ) "اور آپ سے یہود و نصاریٰ

ہرگز راضی نہ ہوں گے 'جب تک آپ ان کی ملت کے تابع نہ ہو جائیں" اور یہی وجہ ہے کہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور اہل کتاب کے سامنے ان کے اصل اغراض و مقاصد رکھ دیئے ہیں کہ وہ دشمنی کیوں کرتے ہیں۔

قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

"ان سے کہو "اے اہل کتاب 'تم جس بات پر ہم سے بگڑے ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم اللہ پر اور دین کی اس تعلیم پر ایمان لے آئے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور ہم سے پہلے بھی نازل ہوئی تھی' اور تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں؟" اللہ تعالیٰ اپنے سچے کلام میں اس حقیقت کو بار بار دہراتے ہیں اور اہل کتاب اس حقیقت کو پگھلا کر ختم کرنا چاہتے ہیں' اسے دبانا چاہتے ہیں۔ اس کا انکار کرنا چاہتے ہیں اور اہل کتاب کے علاوہ اکثر نام نہاد مسلمان بھی اس حقیقت کے خلاف ہیں اور وہ مادیت اور الحاد کے عنوان سے اہل اسلام اور اہل کتاب کے درمیان دوستی اور موالات قائم کرنا چاہتے ہیں' جو قرآن کی اس پالیسی کے خلاف ہے۔

آج بھی اہل کتاب اسی برف کو پگھلانا چاہتے ہیں بلکہ اسے دبا کر اس کے آثار تک کو مٹانا چاہتے ہیں۔ اور یہ کام وہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اسلامی ممالک کے باشندوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں یا ان باشندوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں جن کے آباؤ اجداد مسلمان تھے۔ یہ اہل کتاب اس فہم کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو مسلمانوں کے اندر ربانی منہاج تربیت نے پیدا کر دیا تھا اور جب تک مسلمانوں کے اندر یہ فہم و شعور زندہ ہے صلیبی استعمار ان کے مقابلے میں جم نہیں سکتا چہ جائیکہ وہ خود عالم اسلام میں کالونیاں بنائے۔ اہل کتاب کو جب صلیبی جنگ میں شکست فاش ہوئی اور اس کے بعد جب وہ عیسائیت کی تبلیغ میں بھی ناکام رہے' تو ان کے سامنے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا کہ مکر و فریب کی راہ اختیار کریں اور ان آبادیوں کے درمیان یہ تصورات پھیلائیں' جو مسلمانوں کی وارث ہیں' کہ اب دین کے نام پر تمام جنگ جوئیاں ختم ہو چکی ہیں اور یہ تو ایک تاریک دور تھا جس کے اندر تمام اقوام کے اندر مذہبی جنگیں ہوئیں۔ اب تو دنیا کو نئی روشنی مل گئی ہے' اب تو ترقی کا دور ہے اور اب تو کسی دینی نظریہ حیات کے مطابق لڑنا نہ جائز ہے' نہ مناسب' اور نہ ہی اس دنیا کے مفاد میں ہے۔ آج تو مادی دور ہے اور اب جنگ منڈیوں اور خام مال پر ہو گی۔ لہٰذا مسلمانوں یا مسلمانوں کے وارثوں کو چاہئے کہ وہ کسی دینی کشمکش یا کسی تحریک احیائے دین کے متعلق نہ سوچیں۔

اور جب اہل کتاب اس بات سے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اہل اسلام اب اپنی سرحدوں کے بارے میں بے فکر ہو گئے ہیں اور ان کے فکر و شعور سے یہ ترک موالات محو ہو گئی ہے تو اب وہ اپنا استعماری جال پھیلاتے ہیں۔ خصوصاً پھر وہ بڑی آزادی سے عالم اسلام کے اندر استعماری جال پھیلاتے ہیں۔ اب وہ عالم اسلام میں مسلمانوں کے غیظ و غضب سے محفوظ ہو گئے ہیں اور جب انہوں نے مسلمانوں کو تھپکی دے کر سلا دیا تو اب ان کو محض نظریاتی فتح ہی حاصل نہ ہو گئی 'بلکہ اب ان کے لئے عالم اسلام میں ہر قسم کی لوٹ اور مار کے راستے بھی کھل گئے 'تب انہوں نے اپنی نو آبادیاں قائم کر لیں'

مسلمانوں کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور نظریاتی فتح کے بعد اب وہ مادی دنیا پر بھی قابض ہوگئے اور صورت حال یہ ہوگئی کہ مسلمانوں اور اہل کتاب کے اندر کوئی فرق ہی نہ رہا۔ دونوں قریب قریب ایک جیسے ہوگئے۔ عالم اسلام کے اندر اب اہل کتاب کے ایجنٹ کام کر رہے ہیں جو استعماری طاقتوں نے جگہ جگہ بٹھا رکھے ہیں۔ بعض اعلانیہ طور پر بٹھا رکھے ہیں اور بعض ان کے خفیہ ایجنٹ ہیں۔ وہ بھی یہی بات دہراتے ہیں کیونکہ اہل کتاب کے ایجنٹ ہیں اور یہ لوگ اسلامی حدود کے اندر یہ کام کرتے ہیں۔ یہ ایجنٹ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ صلیبی جنگیں دراصل صلیبی جنگیں ہی نہ تھیں وہ مسلمان جنہوں نے اسلامی جھنڈوں کے نیچے یہ جنگیں لڑیں وہ مسلمان ہی نہ تھے۔ وہ تو قوم پرست تھے۔ سبحان اللہ۔

ایک تیسرا فریق جو نہایت کم عقل فریق ہے، اسے مغرب میں صلیبیت کی جانشیں استعماری قوتیں یہ دعوت دیتی ہیں کہ آؤ ہم بھائی بھائی بن جائیں۔ مذہب کا دفاع کریں اور ملحدین کی تردید کریں۔ یہ فریب خوردہ ان کی اس دعوت کو قبول کرتے ہیں لیکن یہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ صلیبیوں کی یہ مغربی اولاد جب بھی اسلام اور الحاد کی جنگ ہوتی ہے، یہ ملحدین کے ساتھ صف آراء ہو جاتی ہے۔ ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں، جب بھی مسلمانوں کا مقابلہ ملحدین کے ساتھ ہو۔ صدیوں سے ان کا یہ طرز عمل بالکل جاری ہے۔ آج بھی ان کے لئے مادیت کی جنگ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ زیادہ تر اہمیت اس جنگ کو دیتے ہیں جو وہ اسلام کے خلاف برپا کئے ہوئے ہیں اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ مادی اور ملحد دشمن ایک وقتی اور عارضی دشمن ہے اور اسلام ایک مستقل اور ٹھوس نظریہ ہے جو ان کے لئے ایک مستقل دشمن ہے۔ یہ جنگ انہوں نے اس لئے شروع کر رکھی ہے کہ اسلامی قوتوں کے اندر بظاہر جو بیداری پیدا ہو رہی ہے، اسے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ نیز یہ لوگ الحاد کے خلاف جنگ میں بے وقوف مسلمانوں کو جھونک کر اپنا مفاد محفوظ کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ ملحدین مغربی اور صلیبی استعمار کے سیاسی مخالف ہیں اور یہ دونوں معرکے گویا اسلام کے خلاف ہوں گے۔ اور یاد رہے کہ صلیبیوں اور ملحدین دونوں کے خلاف مسلمانوں کے پاس صرف نظریاتی ہتھیار ہے اور وہ فہم و فراست ہے جو ان کے اندر قرآن کریم کی یہ آیات پیدا کرنا چاہتی ہیں۔

یہ ایک گہرا کھیل ہے اور یہ اہل اسلام کو دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔ بظاہر اہل کتاب اور صلیبی دوستی کا اظہار کرتے ہیں اور یہ فریب خوردہ مسلمان ان اہل کتاب کو مخلص سمجھتے ہیں۔ وہ اہل اسلام کو اتحاد، بھائی چارے اور موالات کی دعوت دیتے ہیں اور مقصد یہ بتاتے ہیں کہ مذہب کا دفاع کرتے ہیں لیکن فریب خوردہ مسلمان چودہ سو سال کی تاریخ کو بھول جاتے ہیں جس میں ان کا رویہ عداوت کا رہا ہے اور اس میں کوئی استثناء بھی نہیں ہے۔ پھر تاریخ تو بڑی بات ہے اور بہت طویل ہے لیکن یہ لوگ اللہ کی ان واضح تعلیمات کو بھی بھول جاتے ہیں جو انہیں ان کا رب براہ راست دے رہا ہے۔ یہ ایسی تعلیم ہے کہ یہ لاریب ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس سے کوئی پہلوتہی نہیں ہو سکتی بشرطیکہ اللہ پر اعتماد ہو، اور اس بات کا یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان نہایت ہی سنجیدہ ہے۔

یہ فریب دینے والے اور فریب خوردہ لوگ اس سلسلے میں اپنی پالیسی کے حق میں قرآن کریم کی وہ آیات پیش کرتے ہیں اور حضور اکرمؐ کی وہ احادیث پیش کرتے ہیں جن کے اندر اہل کتاب کے ساتھ حسن معاملہ کرنے پر زور دیا گیا ہے اور یہ کہ معیشت اور طرز عمل میں ان کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا جائے۔ لیکن یہ لوگ قرآن کریم کی ان تنبیہات و تحذیرات اور فیصلہ کن ممانعت کو بھلا دیتے ہیں جو قرآن کریم اہل کتاب کے ساتھ تعلق موالات قائم کرنے کے

خلاف کرتا ہے اور تفصیل کے ساتھ بتاتا ہے کہ اس حکم کے اسباب کیا ہیں اور یہ کہ اس سلسلے میں اسلامی تحریک کا منصوبہ کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے۔ اسلامی تنظیم کن خطوط پر ہونا چاہئے اور ان کے ساتھ دوستی اور موالات کے تعلقات کو بالکل ختم کرنا چاہئے کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک باہم موالات اور باہم دگر نصرت صرف اسلامی نظام کے قیام کے لئے ہوتی ہے اور اسلام کو عملی زندگی میں قائم کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ تحریک امامت دین کے نصب العین کے بارے میں ہمارے اور اہل کتاب کے درمیان کوئی نکتہ اشتراک سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اگرچہ مسلمانوں اور اہل کتاب کے دین میں ان کی تحریفات سے پہلے کئی نکات مشترک تھے۔ لیکن اب تو صورت حالات یہ ہے کہ وہ ہمارے دشمن ہی اس لئے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور اقامت دین کے نصب العین کے حامل ہیں اور وہ ہم سے راضی تب ہی ہو سکتے ہیں کہ ہم اس نصب العین کو چھوڑ کر یہودی یا عیسائی بن جائیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نص صریح (البقرہ : ۱۲۰) میں فرمایا۔

یہ لوگ قرآن مجید کے حصے بخرے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس سے وہ اجزاء لیتے ہیں جو انہیں پسند ہیں اور ان کی دعوت کی تائید کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو غافل کرتے ہیں' اگرچہ وہ اپنی جگہ درست کیوں نہ ہوں اور یہ لوگ ان آیات کو چھوڑ دیتے ہیں جو ان کی اس فریب کارانہ پالیسی کے بالکل خلاف ہیں۔

ہم اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ ہم اس مسئلے میں اللہ کی بات سنیں۔ اللہ کا کلام اس سلسلے میں نہایت ہی دو ٹوک اور قطعی ہے۔ رہا ان فریب کاروں کا کلام تو وہ ہم سنیں یا نہ سنیں برابر ہے۔

ذرا چند منٹ کے لئے ٹھہریئے! اور اس موضوع پر غور کیجئے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی ازلی دشمنی کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کے ایمان باللہ' ایمان بالرسول اور ایمان بالکتب کے جامع عقیدے کی وجہ سے یہ لوگ ان کے دشمن بنے ہوئے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ایک اور اہم بات بھی بتاتے ہیں۔

(وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ (۵ : ۵۹) "اور تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔" ان کا یہ فسق و فجور بھی اس عداوت اسلام کے اسباب میں سے ایک سبب ہے اس لئے کہ ایک کج رو شخص کو راست رو شخص بہت ہی برا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے اور اس کی تصدیق قرآن کا یہ فقرہ کرتا ہے۔ یہ ایک گہرا نفسیاتی اشارہ ہے اس لئے کہ جو شخص کسی راہ سے کجروی اختیار کرتا ہے وہ یہ دیکھ ہی نہیں سکتا کہ کچھ اور لوگ اس راہ پر چلیں۔ اگر وہ ایسے لوگوں کو دیکھے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا ہے اور صحیح راہ سے منحرف ہو گیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں کا راہ حق پر قائم رہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ منحرف ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ منحرف شخص جادۂ حق پر مستقیم شخص کا دشمن ہوتا ہے اور پھر اس سے محض اس لئے انتقام لیتا ہے کہ وہ سچا ہے۔ یہ انتقامی کارروائی اس لئے ہوتی ہے کہ یہ منحرف شخص اس صالح کو بھی گھیر گھار کر اپنی راہ پر ڈال دے اور اگر وہ بہت ہی سخت ہو اور بات مان کر نہ دیتا ہو تو اسے سرے سے ختم کر دے۔

یہ ایک دائمی اصول ہے اور یہ حضور اکرمؐ کے دور میں اہل کتاب اور اہل اسلام کے تعلقات کے بارے ہی میں درست نہیں ہے بلکہ یہ مطلق اہل کتاب اور اہل اسلام کی پالیسیوں پر صادق آتا ہے۔ جو شخص بھی کسی صالح گروہ اور اصول پسند جماعت سے نکلتا ہے اس کی سعی یہی ہوتی ہے کہ وہ تمام لوگوں کو اس جماعت سے منحرف کر دے اور فساق و فجار

اور اشرار کے معاشرے میں جنگ ہمیشہ صالح لوگوں کے خلاف ہوتی ہے۔ تمام فساق صالحین کے خلاف جمع ہو جاتے ہیں اور جو لوگ اصولوں سے منحرف ہو چکے ہوتے ہیں' وہ تمام لوگ ان کے دشمن ہوتے ہیں جو اصولوں پر جمے ہوتے ہیں۔ یہ جنگ ایک قدرتی جنگ ہوتی ہے اور یہ اسی اصول پر برپا ہوتی ہے جس کی طرف اس قرآنی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اللہ کے علم میں یہ بات پہلے سے تھی کہ شر کی طرف سے ہروقت بھلائی کی دشمنی ہوتی رہے گی اور حق کے مقابلے میں باطل ہمیشہ کھڑا ہو گا اور ثابت قدمی کے مظاہر کو دیکھ کر فساق و فجار جلیں گے اور جو لوگ اصولوں پر جمے ہوئے ہوں گے ان پر ان فساق و فجار اور منحرفین کو بہت ہی غصہ آئے گا۔

اللہ کو یہ بھی علم تھا کہ بھلائی' سچائی' استقامت اور اصول پرستی کو اپنی مدافعت کرنا ہو گی اور ان کو شر' باطل' فسق اور انحراف کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ لڑنی ہو گی۔ یہ ایک ایسا حتمی معرکہ ہو گا کہ جس میں اہل حق کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہ ہو گا کہ بس وہ اس معرکے میں کود جائیں اور باطل کا مقابلہ کریں۔ اگر وہ یہ معرکہ آرائی نہ کریں گے تو باطل از خود ان پر حملہ آور ہو جائے گا اور سچائی اس سے کسی طرح جان نہ چھڑا سکے گی کیونکہ باطل کا مقصد اسے سرے سے مٹانا ہوتا ہے۔

یہ ایک نہایت ہی غافلانہ اور احمقانہ سوچ ہو گی کہ کوئی حق پرست' اصلاح پسند' صاحب استقامت اور اصولی شخص یہ سوچے کہ' شر' باطل اور فسق و فجور کے داعی اسے آرام سے چھوڑ دیں گے اور وہ حق و باطل کے اس معرکے سے بچ نکلیں گے یا حق و باطل کے درمیان کوئی مصالحت یا معاہدۂ صلح ہو سکتا ہے۔ اگر نہیں تو ان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ ہر وقت اس اٹل معرکے کے لئے تیار رہیں اور خوب سوچ کے ساتھ اور اچھی تیاری کے ساتھ رہیں اور موہوم امن کے لئے دشمن کی چالوں میں نہ آئیں ورنہ دشمن انہیں کھا کر چاٹ جائے گا۔

اس کے بعد جب ہم مطالعہ جاری رکھتے ہیں تو حضور اکرم ؐ کو اہل کتاب کے مقابلے کے لئے ہدایات دی جاتی ہیں۔ یاد رہے کہ اس سے پہلے یہ بات واضح طور پر بتا دی گئی تھی کہ اہل کتاب کے دل میں اسلامی نظام اور مسلمانوں کے خلاف اس قدر گہری دشمنی کیوں ہے؟ اب یہاں بنی اسرائیل کی تاریخ قدیم کے کچھ اوراق الٹے جاتے ہیں اور یہ کہ انہوں نے اپنے رب کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا؟

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذَٰلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللَّهِ ۚ مَنْ لَعَنَهُ اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ ۚ أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ ﴿٦٠﴾

پھر کہو کیا میں ان لوگوں کی نشاندہی کروں جن کا انجام خدا کے ہاں فاسقوں کے انجام سے بھی بدتر ہے؟ وہ جن پر خدا نے لعنت کی' جن پر اس کا غضب ٹوٹا' جن میں سے بندر اور سور بنائے گئے' جنہوں نے طاغوت کی بندگی کی۔ ان کا

درجہ اور بھی زیادہ برا ہے اور وہ سواء السبیل سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔"

یہاں ہمیں اب یہودیوں کی تاریخ کا مطالعہ کرایا جاتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہوئی اور ان پر اللہ کا غضب ہوا اور ان کی شکلیں بگاڑ کر' ان سے بندر اور خنزیر بنائے گئے اور پھر بھی ان لوگوں نے طاغوت ہی کی بندگی اختیار کی۔ ان کے ملعون ہونے اور ان پر اللہ کا غضب آنے کے قصے' قرآن کریم میں بار بار ذکر ہوئے ہیں۔ نیز قرآن کریم میں ان کے وہ واقعات بھی مذکور ہیں کہ ان میں سے کچھ لوگوں کو بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ کیا گیا۔ لیکن یہاں ان پر بندگی طاغوت کی جو فرد جرم عائد کی گئی ہے' اس سورہ کے مضامین کے زاویے سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کی ہم قدرے تفصیلات دیں گے کیونکہ یہ لفظ نہایت اہم اور خاص معنی کے لئے استعمال ہوا ہے۔

طاغوت کا لفظ ہر اس اقتدار کے لئے استعمال ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے ماخوذ نہ ہو' ہر حکم' حکم طاغوت ہے اور ہر وہ کام طاغوت ہے جو شریعت اسلامی سے ماخوذ نہ ہو۔ ہر وہ ظلم طاغوت ہے جو برحق نہ ہو' نیز اللہ کی حاکمیت ' اللہ کی الوہیت اور اس کے قانون سازی پر دست درازی کرنا طاغوت کی سب سے بڑی قسم ہے اور جو لفظاً اور معناً طاغوت پر صادق آتی ہے۔

کی عبادت کرتے تھے' یہ بات نہ تھی کہ وہ ان کی عبادت کرتے تھے۔ حقیقت یہ تھی انہوں نے ارباب اور رہبان کی بنائی ہوئی شریعت کو اپنا لیا تھا اور اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت کو چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے اللہ نے یہ کہا کہ انہوں نے ارباب و رہبان کی بندگی شروع کر دی ہے اور یہ لوگ مشرک ہوگئے ہیں۔ لفظ طاغوت میں یہ گہرا مفہوم شامل ہے۔ یعنی وہ اس حکومت کے مطیع تھے جو شریعت پر مبنی نہ تھی اور سرکش تھی۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ اس حکومت یا ارباب و رہبان کے سامنے سجدے نہ بجالاتے تھے بلکہ وہ عبادت اس طرح کرتے تھے کہ وہ ان کی اطاعت کرتے تھے۔ طاغوت کی جب کوئی اطاعت کرتا ہے تو وہ اللہ کے دین اور اللہ کی اطاعت کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں رسول اللہ کو اس طرف متوجہ فرمایا ہے کہ آپ اہل کتاب کا مقابلہ ان کی اس تاریخ کو پیش نظر رکھ کر کریں اور یہ کہ وہ اسی جزا کے مستحق ہیں جو انہیں ان کی تاریخ میں ملی۔ گویا یہ یہودی نسلاً بعد نسل وہی قوم ہیں اس لئے کہ ان کی جبلت ایک ہے اور ان کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔

(قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذَٰلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللَّهِ (۵: ۶۰) "پھر کہو کیا میں ان لوگوں کی نشاندہی کروں جو انجام کار خدا کے ہاں فاسقوں کے انجام سے بھی بدتر ہے۔"

جھٹکا

یعنی اہل کتاب کی جانب سے اہل اسلام کی دشمنی سے بھی زیادہ خطرناک ' وہ اسلام کے خلاف جو سازشیں کرتے ہیں اور اہل ایمان کو محض ایمان کی وجہ سے سزا اور اذیت دیتے ہیں' اس سے بھی زیادہ بری بات ہے اور وہ ہے خدا کی دشمنی اور خدا کا عذاب۔ بندے کی دشمنی سے خدا کی دشمنی اور عذاب بہت ہی خطرناک ہے۔ اور اس کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ شرپسند ہیں' گمراہ ہیں' اور صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

(أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ (۵: ۶۰) "ان کا درجہ اور بھی زیادہ برا ہے اور وہ سواء السبیل سے زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔"

یہاں قرآن کریم ان کی کچھ نشانیوں کی صفات کا ذکر کر کے ان کے ساتھ دوستی کرنے اور تعلق موالات قائم کرنے سے مسلمانوں کو متنفر فرماتے ہیں۔ جبکہ اس سے قبل ان کے تاریخی کردار اور ان کے برے انجام کا ذکر ہوا۔ اب مسلمانوں کو' ان کے بعض راز افشاء کر کے' ان سے ڈرایا جاتا ہے اور اس تصویر کشی میں یہودیوں کو زیادہ نمایاں کیا جاتا ہے اس لئے کہ بات اس وقت کے حالات کے بارے میں چل رہی تھی اور اس وقت سب سے بڑا فتنہ یہودی فتنہ ہی تھا۔

---

وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ
وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَتَرٰى
كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ
لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۲﴾ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ
قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَقَالَتِ
الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ
مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ
مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ؕ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِى
الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۴﴾

"جب یہ تم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے' حالانکہ کفر لئے ہوئے آئے تھے اور کفر ہی لئے ہوئے واپس گئے اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ ان میں سے بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں اور حرام کے مال کھاتے ہیں۔ بہت بری حرکات ہیں جو

یہ کر رہے ہیں۔ کیوں ان کے علماء اور مشائخ انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے' یقیناً بہت ہی برا کارنامہ زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں۔

یہودی کہتے ہیں اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں..... باندھے گئے ان کے ہاتھ اور لعنت پڑی ان پر اس بکواس کی بدولت جو یہ کرتے ہیں........ اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں' جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کلام تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے وہ ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی و باطل پرستی میں الٹا اضافہ کا موجب بن گیا ہے اور (اس کی پاداش میں) ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے۔ جب کبھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اس کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ یہ زمین میں فساد پھیلانے کی سعی کر رہے ہیں مگر اللہ فساد برپا کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

یہ ایسی عبارتیں ہیں جن کے اندر کچھ چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں اور یہ قرآن مجید کا منفرد اسلوب ہے۔ صدیاں گزر گئیں لیکن ان لوگوں کی تصاویر آج بھی ان عبارات میں واضح ہیں' جن کے بارے میں قرآن کریم ان آیات میں بحث کرتا ہے۔ یہاں جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ یہودیوں کا ہے' اس سے آگے پیچھے بات انہی کی ہو رہی ہے۔ اگرچہ اس میں بعض وہ لوگ بھی نظر آتے جو مدینہ کے منافقین ہیں۔ نظر آتا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ گفتگو شروع کرتے ہیں "بھائی ہم بھی تو ایمان لا چکے ہیں" لیکن اپنی بغل میں کفر چھپائے ہوئے ہیں۔ جب آئے تو یہ کفر ان کے ساتھ تھا۔ لیکن ان کے منہ میں رام رام ہے اور بغل میں کفر کی چھری ہے۔

یہ گروہ غالباً گروہ تھا یہودیوں کا جو اتوں کو اسلام کے خلاف سازشیں تیار کرتے تھے' اور ان میں سے بعض دوسروں سے یہ کہتے تھے کہ صبح اس قرآن پر اپنے ایمان کا اعلان کرو اور شام کو پھر کفر کا اعلان کر دو' اور اس طرح اسلامی صفوں میں بے چینی پیدا کرو۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ مسلمان بھی قرآن کو ترک کر دیں اور اپنے دین کو چھوڑ دیں یہ اس افراتفری اور شک و شبہ کی فضا کی وجہ سے ہے۔

(وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ (٥: ٦١)) "اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ چھپاتے ہیں۔" یہ اللہ کا کہنا ہے اور اللہ حقائق کے جاننے والے ہیں۔ اور اس اعلان سے اہل ایمان کو اطمینان نصیب ہوتا ہے کہ ان کا رب ان کا محافظ اور نگہبان ہے۔ وہی انہیں یہودیوں کی سازشوں سے بچا سکتا ہے کیونکہ اللہ کا علم ان کی خفیہ سازشوں پر محیط ہے اور یہ اللہ کی جانب سے ان کو ایک دھمکی ہے کہ اگر وہ باز نہ آئے تو.....

سیاق کلام کو لے کر ذرا آگے بڑھئے۔ اس منظر میں ان کی کچھ اور تصاویر آتی ہیں۔

(وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭلَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (٥: ٦٢)) "تم دیکھتے ہو کہ ان میں سے بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں اور حرام کے مال کھاتے ہیں۔ بہت بری حرکات ہیں جو یہ کر رہے ہیں۔"

مسارعہ باب مفاعلہ ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جو باہم مقابلہ کر رہے ہیں' گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے سے آگے

بڑھ رہے ہیں اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر حرام مال کھاتے ہیں۔ یہ تصویر نہایت ہی مکروہ اور بدنما ہے۔ لیکن جب کسی قوم کی اخلاقی حالت بگڑ جائے اور اس میں فساد سرایت کر جائے تو اس میں ایسی ہی صورت حالات پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ زندگی کی اعلیٰ اقدار ختم ہوتی ہیں، معاشرے پر شر غالب ہو جاتا ہے اور جب بھی انسان کو ایسے معاشروں کو دیکھنے کا موقعہ ملتا ہے تو یہ پایا جاتا ہے کہ ان میں لوگ شر، گناہ اور ظلم کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس معاشرے کے طاقتور لوگ اپنے دائرے میں اور زبردست لوگ اپنے دائرے میں ظالم ہوتے ہیں۔ گناہ میں آلودگی اور ظلم ایسے گرے ہوئے فاسد معاشروں میں صرف طاقتور لوگوں تک محدود نہیں ہوتے بلکہ ضعفاء بھی ان جرائم میں ملوث ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ سب لوگ اثم و عدوان کے سیلاب میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ضعفاء بے شک زبردستوں پر ظلم کرنے پر قادر نہیں ہوتے لیکن یہ ضعفاء پھر آپس میں ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں اور اگر ایک دوسرے پر ظلم نہ بھی نہ کر سکیں تو یہ لوگ پھر اللہ کی حرمتوں پر ہاتھ ڈالتے ہیں اس لئے کہ فاسد معاشروں کے اندر پھر اللہ کے حدود ہی رہ جاتے ہیں جن کو توڑنے کے لئے ان کے سامنے میدان کھلا ہوتا ہے۔ ایسے میں نہ طاقتور حکام اور نہ ضعفاء محکوم حدود اللہ کی حفاظت کرتے ہیں۔ غرض جو معاشرہ بھی اخلاقی بگاڑ کا شکار ہو جائے اس میں گناہ کی زندگی اور ظلم کی حرکات کا دور دورہ ہوتا ہے بلکہ گناہ اور ظلم کی طرف دوڑنے کے مقابلے (مسارعت) ہوتے ہیں۔ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۵: ۶۲) "بہت بری حرکات ہیں جو یہ کر رہے ہیں۔"

یہاں سیاق کلام فاسد معاشروں کی ایک دوسری خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کے علماء اور مشائخ گنگ ہیں، بولتے ہی نہیں۔ علماء جو شریعت اور قانون کے نگران اور نگہبان ہیں، ان کے سامنے قانون توڑے جاتے ہیں۔ مشائخ جو علم دین کے استاد ہیں ان کے سامنے غلط افکار پھیل رہے ہیں اور وہ منع نہیں کرتے اور ان کے سامنے لوگ گناہ اور ظلم کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

( لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۵: ۶۳)) "کیوں ان کے علماء اور مشائخ انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے، یقیناً بہت ہی برا کارنامہ زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں۔" جب کوئی معاشرہ اخلاقی اعتبار سے ٹوٹ پھوٹ اور فساد کا شکار ہوتا ہے تو اس کی ایک بڑی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس میں قانون کے نگران قانون شکنی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ (علماء)، اخلاقی رہبر (مشائخ) بداخلاقیوں اور ظلم پر سکوت کرتے ہیں اور بنی اسرائیل کی کیا خصوصیات تھیں؟ ( كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ) "وہ اس برائی سے ایک دوسرے کو منع نہ کرتے تھے جو وہ کرتے تھے۔" یہ قرآن ہی نے دوسری جگہ ان کے بارے میں کہا ہے۔

ایک صحت مند، زندہ، قوی اور فاضلانہ معاشرے کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ہر طرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اور اس میں ہر وقت ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کا مشن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوتا ہے اور اس کے عوام کے اندر بھی ایسے عناصر غالب ہوتے ہیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف کان

دھرتے ہیں۔ اور معاشرے کے اوپر اس قسم کی روایات کی گرفت ہو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ختم نہ کیا جا سکتا ہو اور نہ ایسے لوگوں کا بال بیکا کیا جا سکتا ہو جو یہ کام کرتے ہیں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کی شکل میں برپا ہونے والے ایک صحت مند معاشرے کے بارے میں فرمائی ہے۔

( كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ) "تم خیر امت ہو، حکم دیتے ہو نیکی کا اور منع کرتے ہو منکر سے اور اللہ پر ایمان لانے والے ہو۔" اور بنی اسرائیل جو ایک فاسد معاشرے کے خوگر تھے ان کے بارے میں ہے ( كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَن مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ ) "وہ اس برائی سے ایک دوسرے کو منع نہ کرتے تھے جس کا وہ ارتکاب کرتے تھے۔" یہ بات گویا دو قسم کے معاشروں کا مابہ الامتیاز ہے۔

یہاں یہودیوں کے علماء اور مشائخ کو ملامت کی جاتی ہے کہ وہ کیوں گنگ ہو گئے ہیں اور وہ ان لوگوں کے خلاف آواز کیوں نہیں اٹھاتے جو گناہ کی زندگی، باہم ظلم کی روش اور حرام خوری میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ رہے ہیں اور کتاب اللہ کی حفاظت کا جو فریضہ ان پر عائد کیا گیا تھا اسے وہ پورا نہیں کرتے۔

یہ ان تمام لوگوں کے لئے ڈرانے والے کی پکار ہے جو اہل دین اور علماء کہلاتے ہیں۔ معاشرے کی اصلاح یا فساد ان لوگوں پر موقوف ہے جو اس معاشرے، دین اور قانون کے نمائندے ہوتے ہیں یعنی علماء و مشائخ۔ اگر وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض ادا کرتے ہیں تو اصلاح ہو گی اور اگر وہ خاموش رہتے ہیں تو بگاڑ ہو گا اور جس طرح ہم نے اس سے قبل ظلال القرآن میں کہا ہے کہ اس کام کے لئے ایک حکومت درکار ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرے اور یہ نظام دعوت و تبلیغ سے علیحدہ ہو اس لئے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے اقتدار کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا اقتدار جس کے ذریعے امر بالمعروف اور عن المنکر ایک بامعنی چیز ہو۔ محض زبانی جمع خرچ نہ ہو۔

اب ان لوگوں کی فکری کجی اور اخلاقی بے راہ روی کی ایک مثال دی جاتی ہے۔ قرآن کریم ان گمراہ اور ذلیل یہودیوں کی کج فکری اور بدروی کی ایک نہایت ہی گھاؤنی مثال دیتا ہے۔

(غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا ۘ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ ۚ يُنفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ( ٥ : ٦٤ )) "یہودی کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں..... باندھے گئے ان کے ہاتھ، اور لعنت پڑی ان پر اس بکواس کی بدولت جو یہ کرتے ہیں....... اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں، جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔"

یہ یہودیوں کا اللہ کے بارے میں نہایت ہی برا تصور تھا۔ ان کی بہت سی بدظنیاں قرآن نے جگہ جگہ نقل کی ہیں۔ ایک جگہ انہوں نے کہا "اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔" اور یہ انہوں نے اس وقت کہا کہ جب ان سے اسلامی مقاصد کے لئے چندہ مانگا گیا۔ اللہ کے ہاتھ بندھے ہونے سے عربی محاورے کے مطابق مراد یہ تھی کہ اللہ بخیل ہے۔ ان کے خیال کے مطابق اللہ لوگوں کو بہت کم ضروریات دیتا ہے۔ انہیں بھی کم دیا جاتا ہے اس لئے وہ کس طرح خرچ کریں؟ ان کا

شعور اس قدر بگڑ گیا تھا اور ان کے دل اس قدر سخت ہو گئے تھے کہ انہوں نے اللہ جل شانہ کے لئے لفظ بخیل بھی استعمال نہ کیا' بلکہ اس سے بھی برا لفظ استعمال کیا جو زیادہ توہین آمیز ہے ـ یعنی اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں ـ

اللہ یہی جواب ان کو ان کے الفاظ میں دیتے ہیں ـ ان پر لعنت بھیجی جاتی ہے ـ اور ان کو راندۂ درگاہ قرار دیا جاتا ہے ـ (غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا (۵: ۶۴)) ان کے ہاتھ باندھ دیئے گئے اور اس لئے باندھ دیئے گئے کہ انہوں نے یہ بکواس کی اور ان پر لعنت کر دی گئی اور ایسا ہی ہوا کہ تاریخ میں بنی اسرائیل سے زیادہ کوئی بخیل اور زرپرست قوم نہیں ہے ـ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کی گری ہوئی سوچ درست فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی ذات کبریا کے بارے میں وضاحت فرماتے ہیں کہ وہ بڑا کریم ہے ـ اس کے ہاتھ کھلے ہیں اور وہ اپنے بندوں پر بلاحساب فیضان رحمت کرتا ہے ـ

(بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ (۵: ۶۴)) "اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے ـ" اللہ کے عطیے تو جاری ہیں' اور تمام مخلوقات پر ان کی بارش ہو رہی ہے' دیکھنے والوں کے لئے بالکل واضح ہیں ـ یقیناً اللہ کے ہاتھ کھلے ہیں' اس کا فضل و کرم بھرپور ہے' اس کے عطیے عظیم ہیں' اپنی زبان سے خود بولتے ہیں' ہاں یہودیوں کو وہ نظر نہیں آتے' اس لئے کہ وہ رات دن دولت جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں ـ رات دن انکار و نافرمانی میں غرق ہیں اور رات دن اللہ کی ذات کے بارے میں ان کا رویہ توہین آمیز ہے ـ

اللہ تعالیٰ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کے مستقبل کے بارے میں ایک منظر پیش فرماتے ہیں کہ ان کا حشر کیا ہونے والا ہے اور یہ حشر ان کا اس لئے ہونے والا ہے کہ یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پروانہ رسالت آنے پر جل بھن گئے' خصوصاً اس وجہ سے کہ اس رسالت کے ذریعے ان کے خلاف قدیم و جدید فرد جرم عائد کر دی گئی ـ

(وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا (۵: ۶۴))

"حقیقت یہ ہے کہ جو کلام تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے وہ ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی و باطل پرستی میں الٹا اضافہ کا موجب بن گیا ہے ـ"

اس کینہ اور حسد کی وجہ سے کہ رسالت حضور ؐ کو کیوں مل گئی اور پھر مزید اس وجہ سے کہ اس رسالت نے ان کی تمام گندی باتوں کو بے کم و کاست ریکارڈ کر دیا یہ لوگ سرکشی اور کفر و انکار کی راہ پر مزید آگے ہی بڑھیں گے ـ اس لئے کہ انہوں نے ایمان لانے سے انکار کر دیا ـ لہٰذا ایمان کے برعکس راہ کفر ہی پر یہ لوگ آگے بڑھتے چلے جائیں گے ـ اپنے آپ کو بڑا سمجھنے اور مزید کفر کرنے کی وجہ سے اور اپنی فطری سرکشی اور طغیان کی وجہ سے یہ لوگ اس راہ میں مزید آگے بڑھیں گے اور حضور اکرم ؐ ان کے لئے روز وبال جان بنتے چلے جائیں گے ـ

مستقبل کے لئے ان کی ایک دوسری خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کے بھی دشمن ہوں گے ـ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ سخت بغض ہو گا اور جب بھی وہ اسلام کے خلاف کوئی زبردست سازش تیار کریں گے اور جنگ کی آگ بھڑکائیں گے اور تحریک اسلامی کے خلاف کوئی جنگی اسکیم تیار کریں گے اللہ تعالیٰ اس کو ختم کر دے گا

اور جماعت مسلمہ کو بچالے گا۔

وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ، كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ

اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (۵: ٦٤) "ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے جب کبھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اس کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔" آج تک یہودی فرقے ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ اگرچہ آج کے دور میں بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ عالمی یہودیت متحد ہوگئی ہے۔ اور اسلامی ممالک میں وہ جابجا جنگ کے شعلے بھڑکا رہی ہے اور کامیاب ہے۔ لیکن بات یہ نہیں ہے کہ ہم تاریخ کے ایک مختصر عرصے کو سامنے رکھ کر بات کریں یا کسی ایک منظر کو اور کسی صورت حال کے ایک پہلو ہی کو دیکھ کر فیصلہ کر دیں۔ گزشتہ چودہ سو سال کے اندر بلکہ اسلام سے پہلے کے ادوار میں بھی' یہودی ذلیل اور باہم دست و گریبان رہے ہیں اور اس کی وجہ سے ہمیشہ جلاوطن اور دربدر پھرتے رہے ہیں۔ ان کا آخری انجام بھی وہی ہو گا جس پر وہ پہلے تھے چاہے ان کے اردگرد جس قدر سہارے ہوں۔ لیکن اصل کنجی تو یہ ہے کہ آیا دنیا میں کوئی اسلامی رجمنٹ بھی ہے یا نہیں؟ یہ اسلامی رجمنٹ ہی ہے جس کے ہاتھوں ان کی ذلت لکھی ہوئی ہے۔ چونکہ اس وقت ایمان میں پختہ کار لوگوں کی رجمنٹ مفقود ہے' جو اللہ کے وعدوں پر بھروسہ کرتی ہے اور جو دست قدرت کا آلہ اور ذریعہ بنتی ہے اور اس رجمنٹ کے ذریعے اللہ وہ کچھ کرتے ہیں جو وہ چاہتے ہیں۔

ہاں جب یہ امت اسلامی نظریہ حیات پر جمع ہو گی' ایمان کی حقیقت اپنے اندر پیدا کر لے گی' اپنی پوری زندگی کو اسلامی نظام حیات کے مطابق بنائے گی اور اسلامی شریعت کو نافذ کرے گی' اس دن پھر اللہ کا وعدہ اس کی مخلوقات میں سے ان شریر ترین لوگوں پر صادق ہو گا اور یہودیوں کو اس بات کا اچھی طرح احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ترکش میں شرارت اور سازش کے جو تیر بھی ہیں وہ اسلامی صفوں کے خلاف چلاتے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں جس قدر گرفت ہے وہ اسے ان اسلامی دستوں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں جو احیائے علوم کی تحریک کے ہراول دستے بن رہے ہیں۔ یہ یہودی تمام دنیا میں چھان بین کر رہے ہیں اور اپنے گماشتوں کے ذریعے یہ جگہ جگہ ان اسلامی رجمنٹوں کا سر کچل رہے ہیں۔ نہایت ہی وحشیانہ جرائم اور نہایت ہی ناپسندیدہ کاروائیاں وہ اسلامی لیڈرشپ کے خلاف کر رہے ہیں۔ وہ اس اسلامی رجمنٹ کے خلاف کسی بھی عہد موالات اور کسی بھی ذمے اور کسی بھی قومی اور بین الاقوامی چارٹر کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ لیکن اللہ نے اپنے معاملات اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے ہیں اور اس کا وعدہ سچا ہے کہ حزب اللہ ہی غالب ہوگی۔

(وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ، كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ

اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (۵: ٦٤)) "اور ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے۔ جب کبھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں 'اللہ' اس کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔"

یہ شر و فساد جس کے نمائندے اور جس کے ماڈل یہود ہیں' دائمی امر نہیں ہے۔ ایک دن آئے گا کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسا دستہ اٹھائے گا جو اسے پاش پاش کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ فساد فی الارض کو پسند نہیں کرتا اور جس چیز کو اللہ پسند نہیں

کرنا تو ضروری ہے کہ ایک ایسی قوت اٹھائے جو اسے پاش پاش کر دے۔

( وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (٥ : ٦٤)) "یہ زمین میں فساد پھیلانے کی سعی کر رہے ہیں مگر اللہ فساد برپا کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

اس سبق کے آخر میں ایک عظیم ایمانی اصول کا ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ خطہ ارض پر دین کے قیام اور اسلامی نظام کے قیام کے معنی یہ ہیں کہ اس میں اصلاحی کام ہوں گے 'لوگوں کو روزگار کے مواقع ملیں گے' ان کی دنیاوی فلاح و بہبود کے کام زوروں پر ہوں گے اور فلاح دنیا کے ساتھ ساتھ انہیں فلاح آخرت بھی نصیب ہوگی۔ اس خطہ ارض پر پھر دنیا اور آخرت میں فرق نہ ہو گا اور نہ وہاں دین دنیا میں تضاد ہو گا یہ نظام بیک وقت دنیا اور آخرت کا ضامن ہو گا اور اس میں دین اور دنیا علیحدہ نہ ہوں گے۔ اس عظیم تبدیلی کا ذکر اس بات کے بعد کیا جاتا ہے کہ اہل کتاب نے اللہ کے دین سے انحراف کر لیا ہے۔ وہ حرام خور ہو گئے ہیں اور انہوں نے احکام شریعت کے مفہوم کو بدل دیا ہے۔ یہ کام انہوں نے محض دنیاوی مفادات کے حصول کے لئے کیا ہے حالانکہ اگر وہ اپنے اصل دین کا اتباع کرتے تو یہ ان کے لئے دنیا و آخرت اور آسمان و زمین دونوں میں ان کے لئے اچھا ہوتا بشرطیکہ وہ صحیح راہ اختیار کرتے۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٦﴾

"اگر (اس سرکشی کے بجائے) یہ اہل کتاب ایمان لے آتے اور خدا ترسی کی روش اختیار کرتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور ان کو نعمت بھری جنتوں میں پہنچاتے۔ کاش انہوں نے توراۃ اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ ایسا کرتے تو ان کے لئے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے ابلتا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ راست رو بھی ہیں' لیکن ان کی اکثریت سخت بدعمل ہے۔"

ان دو آیات کے اندر اسلامی تصور حیات کا ایک عظیم اصول بیان کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دو آیات سے انسانی زندگی کی ایک اساسی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں اس اصول کی مناسب وضاحت کی ضرورت ہے اور دور جدید میں اس وضاحت کی ضرورت پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ عقل انسانی اور انسانی پیمانے اور انسانی حالات بدلتے رہتے ہیں اور ان میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ دور جدید کے ان اضطرابات اور فکری انتشار کی وجہ سے اس عظیم حقیقت کے سمجھنے میں بھی انسان صحیح راہ گم کر سکتا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ اہل کتاب کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ ایمان لائیں اور اگر وہ ایمان لے آئیں تو اللہ ان کی تمام

تقصیرات معاف کر دے گا اور انہیں جنت نعیم میں داخل کر دے گا اور یہ تو ہے جزائے آخرت۔ لیکن اگر انہوں نے اپنی اس دنیا کی زندگی میں اللہ کا وہ نظام رائج کیا ہوتا جو تورات اور انجیل میں ان کے ہاں موجود تھا اور جو تعلیمات اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل کی تھیں جن میں انہوں نے بعد میں تحریف کر دی تھی' تو اگر وہ ایسا بھی کرتے تو ان کی کم از کم یہ دنیاوی زندگی تو اچھی طرح گزرتی۔ ان کے ہاں ترقی ہوتی اور ان کے رزق حلال میں اضافہ ہوتا اور ان کے اوپر آسمان سے رزق نازل ہوتا اور ان کے نیچے سے زمین ان کے لئے سونا اگلتی' پیداوار زیادہ ہوتی اور ان کے درمیان وہ خوب تقسیم ہوتی اور ان کے دنیاوی امور و مسائل سب کے سب حل ہو جاتے۔ لیکن افسوس کہ نہ تو وہ ایمان لاتے ہیں' نہ خدا ترسی کی روش اختیار کرتے ہیں اور نہ ہی وہ اسلامی نظام زندگی نافذ کرتے ہیں........ ہاں ان میں سے قلیل لوگ ان کی تاریخ میں ایسے رہے ہیں جو صراط مستقیم پر چلنے والے تھے اور اپنے نفوس کے خلاف انہوں نے ظلم نہ کیا تھا لیکن ان میں سے زیادہ تر لوگ بدعمل تھے۔ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ (٥:٦٦) یوں ان دو آیات سے بالکل واضح نظر آتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی کا قیام اور اس دنیا کی زندگی میں اسلام پر عمل پیرا ہونا صرف اس بات کا ضامن نہیں ہے کہ وہ ایسا کرنے والوں کے لئے اخروی زندگی کی بھلائی کے اسباب فراہم کر دے گا۔ اگرچہ اسلامی نظام کے قیام کا بڑا اور دائمی مقصد فلاح اخروی کا حصول ہے۔ وہ بھی نہایت ہی اہم اور دائمی مقصد ہے لیکن اقامت دین اس دنیا کے مسائل کا بھی حل ہے اور دین قائم کرنے والوں کی دنیا بھی اچھی ہوگی۔ اس دنیا کے وسائل زیادہ ہوں گے' ان کی تقسیم بہت ہی اچھی طرح ہوگی۔ معاشرے کے اندر ایک کفالتی نظام قائم ہو گا اور معاشرہ دنیاوی اعتبار سے خود کفیل ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسلامی معاشرے کے اندر پائی جانے والی معاشی خوشحالی کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔ اس تصویر کشی میں فیضان اور کثرت کا اظہار ہے۔ (لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم (٥:٦٦)) "تو ان کے اوپر سے رزق برستا اور وہ کھاتے اور نیچے سے ابلتا" یہاں یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق یہ بات نہیں ہے کہ ایک راستہ علیحدہ ہے جو فلاح اخروی پر منتج ہوتا ہے بلکہ صرف ایک ہی راستہ ہے جس کے ذریعے دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی نصیب ہوتی ہے اور جس وقت انسان اس راستے سے ادھر ادھر ہو گیا تو سمجھو کہ اس کی دنیا و آخرت خراب ہو گئی۔ یہ واحد راستہ ایمان' خدا ترسی اور اقامت دین کا راستہ ہے اور دینی نظام کے تحت زندگی گزارنے کا راستہ ہے۔

یہ نظام صرف عقیدے' صرف نظریئے اور صرف قلبی شعور کا نام نہیں ہے۔ بے شک یہ چیزیں بھی اس کے اندر ہیں لیکن درحقیقت یہ قلبی شعور کے ساتھ انسانی زندگی کے لئے ایک عملی نظام بھی ہے جس کی اقامت فرض ہے اور اس کے مطابق زندگی کو تبدیل کرنا فرض ہے۔ اور اقامت دین کے ساتھ ساتھ تقویٰ کی بھی ضرورت ہے۔ تقویٰ ہی وہ معیار ہے جس کے ذریعے اس دنیا میں زندگی کو درست کیا جاسکتا ہے۔ اسی کے ذریعے اس دنیا کی زندگی کا نظام درست ہو سکتا ہے اور رزق کی فراوانی ہو سکتی ہے۔ ملک کے اندر پیداوار بڑھ سکتی ہے' اس کی اچھی تقسیم ہو سکتی ہے تاکہ سب لوگ کھائیں اور پئیں اور اس نظام کے اندر ان کے لئے آسمان سے رزق برسے اور زمین ابلے۔

ایمانی نظام حیات میں دین داری کے لئے ترک دنیا لازمی نہیں ہے اور نہ ہی سعادت اخروی کے حصول کے لئے دنیا میں ذلت اور خواری ضروری ہے۔ آخرت کے لئے اس دنیا سے گزرنے کے سوا کوئی اور راہ نہیں ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جنہوں نے آج دنیا کے لوگوں کے افکار کو دھندلا کر دیا ہے اور ان افکار کی وجہ سے لوگوں کی عملی زندگی بھی متاثر ہوتی ہے۔

لوگوں کی سوچ میں دنیا اور آخرت کے راستے جدا جدا ہیں اور اس کی وجہ سے ان کے طرز عمل میں بھی ایک عظیم فرق واقع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک عام آدمی کی سوچ میں دنیا اور آخرت کے امتزاج کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ اس طرح اس کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی دنیا کی سوچ میں بھی کوئی ایسی صورت نہیں ہے کہ دنیا اور آخرت کی راہ ایک ہو جائے۔ ان لوگوں کی سوچ یہ ہے کہ یہ لوگ یا تو دنیا اختیار کریں گے اس صورت میں انہیں آخرت کو ترک کرنا ہو گا اور یا وہ آخرت کی راہ لیں گے اور اس کے لئے انہیں دنیا ترک کرنا پڑے گی۔ ایسا کوئی تصور نہیں ہے جس میں دنیا اور آخرت ایک ہی نظام میں جمع ہو جائیں اس لئے کہ اس دور میں لوگوں کی حقیقی صورت حال' اس کے طور طریقے انسان کو اس طرح سوچنے پر مجبور کرتے تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ گمراہ جاہلیت' بے خدا جاہلیت اور اسلامی نظام سے بے خبر جاہلیت نے دنیا اور آخرت کے راستوں کو دور دور اور جدا کر دیا ہے۔ وہ ان دونوں راستوں کے درمیان فاصلے بڑھاتی چلی جاتی ہے اور دین کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتی ہے۔ اس جاہلیت نے یہ لازم کر دیا ہے کہ معاشرے کے اندر نمایاں ہونے اور دنیا کے مفادات حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ راہ آخرت کو سرے سے بھلا دیا جائے۔ ان دینی ہدایات کو قربان کر دیا جائے بلکہ اخلاقی قدروں کو ترک کر لیا جائے اور بلند تصورات اور پاکیزہ طرز عمل کو چھوڑ دیا جائے اور یہی وہ امور ہیں جن پر ہمارا دین زور دیتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ آخرت کے طلبگار ہیں انہوں نے اپنے اوپر لازم کر دیا ہے کہ وہ اس زندگی کی تگ و دو سے علیحدہ ہو جائیں کیونکہ اس زندگی کے طور طریقے گندے ہیں اور ان ذرائع سے جو لوگ معاشرے میں نمایاں ہوتے ہیں اور منافع کماتے ہیں وہ غلط طور طریقوں میں ملوث ہیں۔ کاروبار کے تمام ذرائع گندے ہیں اور انہیں صاف نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کو دین و اخلاق کے مطابق بنایا جا سکتا ہے۔ یہ ذرائع اللہ کی مرضی کے مطابق بن ہی نہیں سکتے اس لئے اگر دین میں کمال حاصل کرنا ہے تو دنیا سے قطع تعلق کرنا ہو گا۔

یہ جدید جاہلیت اس موجودہ صورت حالات کو حتمی سمجھتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ اس بری صورت حال سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ دنیا و آخرت کے درمیان اتحاد ممکن نہیں' نہ ان دو راستوں کا ملانا ممکن ہے' حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ کوئی ناقابل اتحاد صورت حال نہیں ہے۔ دنیا و آخرت کے درمیان تضاد اور دنیا اور آخرت کے راستوں کے درمیان یہ جدائی جو جاہلیت نے پیدا کر دی ہے یہ کوئی آخری اور فیصلہ کن حقیقت نہیں ہے' نہ یہ صورت حال ناقابل تغیر اور ناقابل اصلاح ہے بلکہ موجودہ صورت حال نہایت ہی غیر فطری ہے اور اس کا تبدیل کیا جانا لازمی ہے۔ یہ تو ایک عارضی چیز ہے اور موجودہ حالات انسانیت پر مسلط کئے ہوئے حالات ہیں۔

اصل حقیقت وہ ہے جس میں دنیا و آخرت کی راہ ایک ہو۔ آخرت کی بھلائی کی راہ بھی وہی ہو' جس میں دنیا کی بھلائی ہو' اور جس میں دنیا کا پیداواری عمل' ترقی اور نشوونما' کثرت پیداوار اور زراعت اور زمین کی ترقی کی راہ ہی ثواب آخرت کا باعث اور ذریعہ ثابت ہو۔ جس طرح یہ کام اس دنیا کی بھلائی کے کام ہیں اسی طرح ایمانداری' خدا ترسی اور عمل صالح بھی اس دنیا کی تعمیر و ترقی کا باعث ہوں۔ جس طرح یہ امور اللہ کی رضا کا سبب ہوں اور ان پر آخرت میں ثواب ملے اسی طرح یہ امور ہماری دنیاوی ترقی کا بھی باعث ہوں۔

انسانی فطرت اور مزاج کے مطابق اور اصلی راہ اور سیدھی راہ یہی ہے۔ اس فطری اور اصلی راہ پر انسانیت کا

گامزن ہونا صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانی زندگی اس نظام کے مطابق ڈھل جائے جو اللہ کا پسندیدہ ہے اس لئے کہ یہ نظام ہی تمام اعمال کو عبادت بنا دیتا ہے اور یہی تو وہ نظام ہے جو انسان کے عمل خلافت فی الارض کو عبادت بنا دیتا ہے۔ خلافت فی الارض کیا چیز ہے 'یہ عبارت ہے عمل اور پیداوار سے' زیادہ سے زیادہ ترقی اور نشو و نما سے۔ انسان کو جو رزق آسمانوں کے ذریعے ملتا ہے اس کی منصفانہ تقسیم خلافت ہے۔ ذرا غور کیجئے اللہ تعالیٰ اس آیت میں کیا فرماتے ہیں۔

اسلامی تصور حیات کے مطابق اس زمین پر انسان اللہ کا خلیفہ ہے۔ یہ خلافت اسے اللہ کے اذن سے حاصل ہوئی ہے اور یہ ایک مشروط خلافت ہے۔ وہ یہ کہ عمل خلافت اسلامی منہاج کے مطابق ہو اور نظام خلافت نظام شریعت کے مطابق چلے۔ انسان اللہ کا مطیع ہو اور آخرت کے ثواب کا طلبگار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کا کوئی عمل جس سے دنیا میں کوئی پیداوار حاصل ہو یا وہ عمل جس سے خام مال کام میں لایا جائے اور لوگوں کے لئے اسے مفید بنایا جائے 'خواہ وہ زمین کے اندر ہو یا مافوق کائنات کے اندر ہو' یہ تمام کام اس نظریہ خلافت فی الارض کے تحت آتے ہیں اور عبادت قرار پاتے ہیں۔ اس خلافت کے عمل ہی کا نتیجہ ہے کہ اگر انسان اس پر درست طور پر چلے تو اسے زمین کے اندر سے بھی رزق ملے گا اور آسمانوں سے بھی اس پر فیضان اور نزول برکات ہو گا۔ یہ بات قرآن کریم کے انداز تعبیر سے اچھی طرح معلوم ہو سکتی ہے۔

اسلامی تصور حیات کے مطابق جو انسان زمین کے سینے کو نہیں چیرتا' اس سے چشمے اور نہریں نہیں نکالتا اور اس کائنات کے دوسرے قدرتی وسائل کو کام میں نہیں لاتا' وہ اللہ کا نافرمان اور گنہگار ہے اور وہ فریضہ خلافت فی الارض کی ادائیگی سے پہلوتہی کرتا ہے جس کے لئے اسے اللہ تعالیٰ نے خلیفہ بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا۔ (اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً) "میں زمین کے اوپر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔"

اور دوسری جگہ ہے۔ (وَسَخَّرَلَکُمْ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ) "اور اس نے مسخر کیا تمہارے لئے وہ سب کچھ جو آسمانوں اور زمینوں میں ہے خود اپنی جانب سے۔" اگر کوئی شخص ترقیات کا کام نہیں کرتا تو وہ گویا اس رزق کو معطل رکھتا ہے جو اللہ نے اس کے لئے پیدا کیا ہے اور جب اس نے اپنی دنیا کو خسارے میں ڈال دیا تو اس کے ساتھ ہی آخرت کا خسارہ بھی ہو گیا۔

اس نظریے کے مطابق اسلامی منہاج حیات دنیاوی عمل اور اخروی کامیابی کے درمیان ایک حسین امتزاج اور ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔ اس لئے اسلام انسان کو یہ مشورہ نہیں دیتا کہ وہ ترک دنیا کرے تاکہ اسے آخرت ملے۔ وہ یہ مشورہ بھی نہیں دیتا کہ وہ آخرت ترک کر دے تاکہ اس کی دنیا بہتر ہو جائے۔ اس لئے کہ دنیا اور آخرت کے درمیان' اسلامی تصور حیات کے مطابق کوئی تضاد نہیں ہے۔ یہ نہ متضاد ہیں اور نہ متبادل ہیں۔

اس دنیا کے تمام انسان اسلامی تصور حیات کے مطابق اللہ کی جانب سے مقام خلافت فی الارض پر فائز ہیں۔ تمام اقوام و ملل کے انسان خلیفۃ اللہ ہیں۔ جنس انسان خلیفہ ہے لیکن کیا ایک فرد انسان کی ذمہ داری اس دنیا کے معاملے میں کوئی مختلف ہے۔ نہیں وہ بھی خلیفہ ہے' اسلامی تصور حیات کے مطابق جو انسانی جماعت کا فریضہ ہے وہ ایک انسان پر بھی فرض ہے۔ فرد اور معاشرے کے فرائض میں کوئی فرق' کوئی تضاد اور تعارض ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اسلام ہر فرد پر یہ فرض کرتا ہے کہ وہ اپنی پوری جسمانی اور عقلی قوت کو زمین و آسمان کے قدرتی وسائل رزق کی ترقی میں صرف کرے

لیکن یہ عمل و انتاج اور یہ کثرت پیداوار اللہ کے لئے ہواس عمل میں وہ کوئی ظلم نہ کرے، کسی کے ساتھ غداری نہ کرے۔ اس میں چوری نہ کرے، خیانت نہ کرے، حرام نہ کھائے، اپنے دوسرے بھائی کا حق نہ مارے، اور اس کے پاس جو وسائل جمع ہوں ان کو تقسیم کرے اگرچہ یہ وسائل اس کی انفرادی ملکیت میں ہوں اور اسے ان کے رکھنے کا پورا پورا حق ہو۔ معاشرے کو اس کے وسائل سے اور اس کی پیداوار سے وہی کچھ لینے کا حق ہو جو اللہ نے مقرر کیا ہے۔ ان حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے کام کرنے والے کے اس کام کو اسلامی نظام ایک عبادت قرار دیتا ہے۔ اس عبادت کا فائدہ اسے دنیا میں بھی ہو گا اور آخرت میں بھی ہو گا۔ پھر یہ اسلامی نظام حیات ایک فرد اور اس کے رب کے درمیان ایک مخصوص رابطہ بھی پیدا کرتا ہے اور یہ مخصوص رابطہ ان عبادات کے ذریعے ہوتا ہے جو اسلامی نظام نے تعلق باللہ کے لئے تجویز کی ہیں تاکہ اس فرد انسان کا تعلق اپنے رب کے ساتھ قائم رہے۔ مثلاً بذریعہ فرضیت نماز دن میں پانچ مرتبہ یہ تعلق تازہ سے تازہ ہوتا رہے۔ رمضان شریف میں سال میں ایک ماہ بذریعہ صیام رمضان قوی سے قوی تر ہوتا رہے۔ پھر ساری عمر میں کم از کم ایک بار حج کر کے یہ رابطہ اب مزید مستحکم سے مستحکم ہوتا چلا جائے اور وہ مذکورہ بالا جو پیداواری عمل کرتا ہے اس سے سال میں ایک بار زکوۃ ادا کر کے یہ رابطہ مضبوط ہوتا رہے۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عبادات کی اسلامی نظام میں کیا قدر و قیمت ہے۔ یہ گویا اللہ کے ساتھ ایک قسم کا تجدید عہد ہے اور ان کے ذریعے انسان اللہ کے نازل کردہ مکمل نظام حیات سے مربوط ہو جاتا ہے۔ اس مکمل نظام کے نفاذ کے لئے اس کی جو ذمہ داریاں ہیں ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے وہ گویا تجدید عہد کرتا ہے۔ اس نظام حیات کی ذمہ داریوں میں وہ ذمہ داریاں بھی شامل ہیں جو اس نے اس کرۂ ارض پر پیداواری عمل، دولت کی منصفانہ تقسیم اور لوگوں کے درمیان جب اختلافات پیدا ہو جائیں تو ان کے مقدمات کے فیصلوں کے سلسلے میں ادا کرنی ہیں۔ ان عبادات کے ذریعے اس کے اندر از سر نو یہ شعور تازہ ہوتا ہے کہ اللہ اس کا اس سلسلے میں مددگار ہے۔ وہ تمام فرائض جو اسلام کے اجتماعی نظام کے قیام اور اس کے انتظام و انصرام کے سلسلے میں اس پر عائد ہوتے ہیں اللہ ان میں اس کا مددگار ہے۔ اس راستے میں اس کی اپنی خواہشات، نفسانی تقاضے، لوگوں کا بغض و عناد، لوگوں کا انحراف اور فسق و فجور وغیرہ جو رکاوٹیں پیدا کریں گے اللہ اس میں معاون ہو گا۔

یہ اسلامی عبادات اور اس دنیا کی سرگرمیاں مثلاً پیداواری عمل، تقسیم دولت اور انتظامیہ اور عدلیہ کے کام اور اللہ کے نظام کے قیام کے سلسلے میں اقدام و دفاع اور اسلامی مملکت کے قیام وغیرہ کے تمام کاموں سے کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے۔ ایمان، خدا ترسی اور تقویٰ بھی اس اسلامی نظام کا ایک حصہ ہیں جس طرح کا حصہ دوسرے امور حیات ہیں۔ چنانچہ یہی وہ تصور حیات ہے جس کے مطابق ایمان اور تقویٰ اس دنیا میں فراوانی رزق اور کثرت پیداوار کا باعث بنتے ہیں اور جس کی صراحت یہ دو آیات کرتی ہیں۔

اسلامی تصور حیات اور اس سے مستنبط ہونے والا اسلامی نظام زندگی کو اخروی زندگی کو اس زندگی پر ترجیح دیتا ہے اور نہ اس زندگی کو اخروی زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔ اسلامی تصور کے مطابق دنیا و آخرت سفر انسانی کے دو مراحل ہیں اور یہ ایک ہی راستے کی دو منزلیں ہیں۔ ایک ہی راہ اور ایک ہی جدوجہد سے دونوں کا حصول ہوتا ہے لیکن دنیا و آخرت کا یہ معجون صرف اسلامی نظام زندگی کے طریق کار کے مطابق تیار ہو سکتا ہے۔ یہ مقصد صرف اسلامی نظام کے اتباع میں

حاصل ہو سکتا ہے اور وہ بھی صرف اس صورت میں کہ دنیا میں خالص اسلامی نظام رائج کیا جائے ۔ اس کے اندر کوئی دوسرا نظام داخل نہ کیا جائے ' نہ اس کے اندر کوئی ایسی چیز ہو جو اسلامی نظام کی نہ ہو ۔ نہ اس کے اندر کسی شخص کے ذاتی رجحانات کو شامل کیا جائے ۔

اسلامی نظام اور اس پر اسلامی تصور حیات ایمان 'تقویٰ اور صالحیت کی ایسی تعبیر نہیں کرتا کہ وہ دنیاوی سرگرمیوں ' پیداوار ' نشوونما ' زندگی کی تحسین و تجمیل کے مخالف یا متبادل ہو ' یا ایسا بھی تصور نہیں دیتا کہ وہ آخرت اور حصول جنت کے لئے ان کو اخروی راہ کی نشاندہی تو کرے مگر ان کے لئے دنیاوی بہتری اور دنیا کو جنت بنانے کے لئے آزاد چھوڑ دے کہ وہ اپنے لئے خود ہی کوئی راہ بنائیں جس طرح چاہیں ۔ یہ تصور ان لوگوں کا ہے جنہوں نے اس دور جدید میں اسلام کا محض سطحی مطالعہ کیا ہے ۔ رہا اسلامی تصور حیات تو اس کے اندر تمام سرگرمیاں ' تمام پیداواری اعمال ' نشوونما کے طریقے ' اور اس زندگی کی ہر قسم کی تحسین و تجمیل اسلام کا تقاضا ہیں اور تصور خلافت فی الارض کے فرائض ہیں جبکہ یہ خلافت تمام انسانوں کا حق ہے ۔ ایمان ' عبادت ' اصلاح اور تقویٰ وہ رابطے ' وہ ضابطے ' وہ محرکات اور وہ دواعی ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کی زندگی میں اسلامی نظام عملاً قائم ہوتا ہے ۔ یہ دونوں چیزیں مل کر انسان کو جنت ارضی اور جنت سماوی کا اہل اور مستحق بناتی ہیں ۔ یہی ہے صحیح راستہ اور اس کے مطابق الدین اور عملی مادی زندگی کے درمیان کوئی دوئی اور تضاد نہیں ہے ۔ جس طرح اس وقت تمام کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی مادی جاہلیتوں نے یہ صورت حال بنا دی ہے کہ دین اور مادیت کے درمیان فرق کر دیا گیا ہے ۔ اس سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ الجھن پیدا ہوتی ہے کہ آخرت کے حصول کے لئے ترک دنیا لازمی ہے اور یہ کہ کسی تصور اور کسی عملی نظام کے مطابق دنیا و آخرت کے درمیان اجتماع ممکن نہیں ہے اور نہ ہی دنیا و آخرت اکٹھے ہو سکتے ہیں ۔

یہ مکروہ فرق جو دنیا اور آخرت کے راستوں کے اندر روا رکھا گیا ہے ' دنیاوی اعمال اور اخروی اعمال کے درمیان جو لائن کھینچ دی گئی ہے ' روحانی ترقی اور مادی ترقی کے درمیان جو بعد المشرقین پیدا کر دیا گیا ہے اور دنیاوی زندگی میں کامیابی اور اخروی زندگی کی فلاح کے درمیان جو بعد پیدا کر دیا گیا ہے ۔ یہ مکروہ جدائی انسان پر تقدیر الٰہی نے نہیں عائد کی ۔ نہ قضا و قدر کے احکام الٰہیہ نے ایسی کوئی تفریق کی ہے ۔ یہ تو ایک نہایت ہی مکروہ بوجھ ہے جو انسانیت نے خود اپنے اوپر عائد کیا ہے اور یہ اس نے اس لئے عائد کر لیا ہے کہ اس نے اسلامی نظام زندگی کو اپنی زندگی سے جلاوطن کر دیا ہے اور اپنے لئے ازخود نظامہائے زندگی گھڑ لئے ہیں جو اسلامی زندگی سے متضاد اور مخالف ہیں ۔

یہ وہ بوجھ ہے جس نے انسان کے اعصاب کو توڑ دیا ہے اور اس کی دنیاوی زندگی بھی تلخ ہو گئی ہے ۔ اس کی وجہ سے انسان کو جو اخروی ہلاکت ہو گی وہ اس سے بھی زیادہ سخت اور بہت ہی تلخ ہو گی ۔ لیکن یہ لوگ اس ازخود عائد کردہ فریضے کو تسلسل کے ساتھ پورا کرتے چلے جاتے ہیں ۔

اس وجہ سے ان کی زندگی نہایت تلخ ہو گئی ہے ۔ وہ تحیر ' دل تنگی اور فکری پریشانی میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔ ایسا کیوں ہے اس لئے کہ وہ اللہ پر ایمان لانا بھی چاہتے ہیں اور ایسے معاشرے میں بھی زندہ رہ رہے ہیں اور ایسے بین الاقوامی حالات میں بھی رہ رہے ہیں جس کے طور طریقے ' جس کے افکار و تصورات اور جس کا تمام کاروبار اور جس کے تمام وسائل کسب و معاش اور جس میں کامیابی کے تمام راستے اللہ کے راستے سے متضاد ہیں ۔ اس میں دینی تصورات اور دینی

عقائد اور مروجہ اخلاقیات کے درمیان تضاد ہے' اس کا طرز عمل اس کے قوانین اور ضابطے اور اس کی اقدار اور ترجیحات تمام کی تمام دین اور ضمیر کے خلاف ہیں۔

اس وقت پوری انسانیت اس بدبختی کا شکار ہے' چاہے وہ مادی اور الحادی مذاہب کی پیرو ہو یا کسی ایسے مادی مذہب کے تحت زندگی بسر کر رہی ہو جس کے پیروکار اگرچہ مذہب کو مانتے ہوں لیکن مذہب کو عملی زندگی کے دائرے سے دور رکھے ہوئے ہوں۔یہ مذاہب ایسا سوچتے ہیں یا ان کے لئے انسانیت کے دشمن ایسی سوچ رائج کرتے ہیں کہ "دین" اللہ کے لئے ہے اور یہ زندگی لوگوں کے لئے ہے اور یہ کہ دین' اخلاق اور شعور اور عبادت پر مشتمل ہوتا ہے اور لوگوں کی عام زندگی کا نظام قانون اور طرز عمل اور پیداواری مشغولیات سب کی سب دین کے دائرے سے باہر ہوتی ہیں۔

اس وقت پوری دنیا ایک جبری ٹیکس کے طور پر یہ بھاری قیمت ادا کر رہی ہے۔بدبختی'انتہائی قلق' حیرانی' پریشانی اور زندگی کا روحانی خلا ایک ایسا ٹیکس ہے جو انسان نے خود اپنے اوپر عائد کر رکھا ہے۔یہ ٹیکس اسے اس لئے ادا کرنا پڑتا ہے کہ یہ دنیا اسلامی نظام زندگی کو قبول نہیں کرتی جس میں دنیا اور آخرت کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے بلکہ اس نظام کے اجزائے ترکیبی میں دنیا اور آخرت دونوں شامل ہیں۔اس نظام میں دنیا میں حاصل ہونے والی سہولت و آرام اور آخرت میں حاصل ہونے والے آرام کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے بلکہ ان کے اندر مکمل ہم آہنگی ہے۔

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے' یہ کہ بعض اقوام جو ایمان سے بھی محروم ہیں' نہ ان کے اندر خدا خوفی ہے اور نہ وہ اسلامی منہاج حیات کو تسلیم کرتی ہیں لیکن ان کے ہاں دنیاوی پیداوار' دنیاوی سہولتیں ۔۔ریات زندگی کی بڑی کثرت پائی جاتی ہے۔بے شک بعض ادوار میں دنیا کی تاریخ میں بعض عارضی وقفے ایسے رہے ہیں لیکن یہ وقفے دیرپا نہیں رہے۔اس لئے ہم ان وقفوں کے اندر پائی جانے والی زندگی کو اللہ کی سنن ثانیہ قرار نہیں دے سکتے۔بہت جلد ہی ایسی امتوں اور سوسائٹیوں کے اندر دین و دنیا کی اس تفریق کے برے نتائج نمودار ہوئے ہیں اور آج کے دور میں لادینی معاشروں کے اندر درج ذیل برے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔

۱۔ ان معاشروں کے اندر دولت کی تقسیم کے اندر توازن نہیں رہا' بعض لوگ زیادہ امیر اور بعض زیادہ غریب ہو گئے ہیں۔ان معاشروں کے اندر بے پناہ مشکلات اور کینہ پروریاں پیدا ہو گئیں اور پھر خفیہ ایجنسیوں اور طبقاتی کشمکش کی وجہ سے آنے والے انقلابات کے خوف چھائے رہتے ہیں اور تمام لوگوں کی زندگیاں تلخی کا شکار ہیں۔

۲۔ بعض قوموں کے اندر نہایت گھٹن 'جبر اور دباؤ کی فضا قائم ہو گئی ہے۔ان اقوام نے چاہا کہ زبردستی دولت کو غیر فطری طریقے کے مطابق لوگوں کے اندر تقسیم کیا جائے۔اس غیر فطری تقسیم دولت کے نتیجے میں سخت توڑ پھوڑ اور خوف و ہراس اور قتل و غارت معاشروں کی عادت بن گئی۔اس جبری تقسیم دولت کے نتیجے میں ان معاشروں میں نہایت ہی تشدد کا رواج ہوا۔یہ جبری نظام انسانیت پر وہ مصیبت لایا کہ تمام لوگوں کا اطمینان غارت ہو گیا اور لوگ آرام اور اطمینان کی ایک رات کے لئے ترس گئے۔

۳۔ ان معاشروں کے اندر نفسیاتی اور اخلاقی بیماریوں نے جنم لیا اور اس کی وجہ سے جلد یا بدیر ان مادی معاشروں کو ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونا پڑے گا اس لئے کہ ہر سرگرمی' مادی ترقیاں اور تقسیم دولت کے نظام کو بھی تو اخلاقی ضوابط درکار ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مادی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں لوگ قانون کی دھجیاں

بکھیر دیتے ہیں اور اس وقت ان تمام ممالک کے قانونی نظام کو عوام کی جانب سے کوئی اخلاقی تائید حاصل نہیں ہے۔

۴۔ ان نظاموں میں جہاں دین و دنیا کی تفریق ہوئی ہے لوگ اعصابی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آج دنیا کے نہایت ہی ترقی یافتہ ممالک کے اندر اعصابی بیماریاں سب سے زیادہ پائی جاتی ہیں اور ان کی اس بے اخلاق مادی ترقی نے ان کی ذہنی قوتوں اور قوت برداشت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ اس کی وجہ سے ان ممالک کے اندر پیداواری عمل اور پیداوار بھی متاثر ہو رہی ہے' خود اقتصادی ترقی اور مادی سہولیات میں کمی ہو رہی ہے اور یہ وہ بڑے بڑے نتائج ہیں جو کافی واضح ہو کر ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

۵۔ اس کے علاوہ وہ عظیم تباہی 'جس سے تمام انسانیت لرزاں ہے' جس کا خطرہ ہر وقت سروں پر کھڑا ہے اور جس کی وجہ سے دنیا مضطرب ہے وہ خطرہ تباہ کن 'مکمل طور پر تباہ کن جنگ کا ہے۔ یہ خطرہ ہر انسان کے اعصاب کو متاثر کر رہا ہے' چاہے وہ جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں اور اس کی وجہ سے بھی کئی قسم کی بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ سکتہ' عارضہ قلب' دماغی عارضہ اور اقدام خودکشی جیسی امراض جس طرح مغربی معاشرہ کے اندر پھیلی ہوئی ہیں' اس طرح دنیا کے دوسرے ممالک میں نہیں ہیں۔

۶۔ یہ تمام آثار تمام ترقی یافتہ ممالک کے اندر واضح طور پر ظاہر ہو رہے ہیں اور جو قومیں اس کے نتیجے میں تباہی اور ٹوٹ پھوٹ کی طرف بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں ان میں سے ممتاز ترین فرانس ہے جو ہر لحاظ سے زوال کی طرف بڑھ رہا ہے۔ فرانس کی تباہی دوسروں کے لئے عبرت ہے اور اس تباہی کا سبب صرف یہ ہے کہ لوگوں نے اللہ کے ربانی نظام کو دنیاوی ترقی کے میدان سے خارج البلد کر دیا ہے۔ دنیا اور آخرت کی راہیں جدا کر دی گئی ہیں۔ دین کو انسان کی زندگی سے نکال دیا گیا ہے۔ لوگوں نے آخرت کے لئے زندگی کا نظام اللہ سے لینا شروع کر دیا ہے اور دنیا کے لئے زندگی کا نظام وہ لوگوں سے لیتے ہیں اور اسلامی نظام اور لوگوں کے درمیان مکمل دوئی ہو گئی ہے۔

قرآن کریم نے اس عظیم اصول کو جس طرح وضع کیا ہے اس پر اپنے اس تبصرے کو ختم کرنے سے پہلے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اسلامی نظام جس نے ایمان' تقویٰ اور انسان کی واقعی زندگی کے درمیان جو حسین امتزاج پیدا کیا ہے اور جس طرح اخلاقیات کو عمل پیہم اور نظریہ خلافت فی الارض سے منسلک کیا ہے' تو یہی وہ توازن ہے جو اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب اور دنیا میں بسنے والی تمام انسانی سوسائٹیوں کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔ اگر وہ اپنے اندر یہ حسین امتزاج پیدا کریں گے تو وہ رزق وافر پائیں گے۔ آسمان ان کے لئے اپنے خزانے برسائے گا اور زمین اپنے خزانے اگل دے گی۔ اس امتزاج کی صورت میں اگر ان سے دنیا میں کوئی اخلاقی کوتاہیاں بھی ہوں گی تو بھی آخرت میں وہ جنت میں داخل ہوں گے اور دنیا میں ان کو فردوس ارضی ملے گی جس میں وافر ضروریات' امن و سلامتی اور اطمینان قلب ہو گا اور آخرت میں جنت ملے گی جس میں نعیم مقیم ہو گا اور رضائے الٰہی ہو گی۔

لیکن ان تمام حقائق کے ہوتے ہوئے بھی اور اس کی تاکید کرتے ہوئے بھی ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ اسلامی نظام کا مرکزی ستون اور پہلا قاعدہ ایمان' تقویٰ اور اسلامی نظام کا قیام ہی ہے۔ جب اسلامی نظام قائم ہو جائے تو فعالیت' پیداوار' ترقی اور تبدیلی جیسے عوامل خودبخود وجود میں آ جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ

ربط پیدا ہو جانے سے زندگی کے تمام امور کے اندر انسان کا ذوق بدل جاتا ہے۔ تمام اقدار بلند ہو جاتی ہیں۔ زندگی کے پیمانے درست ہو جاتے ہیں۔ اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام حیات کا یہ اصل الاصول ہے۔ تمام دوسری چیزیں اسی اصول بلکہ اصل الاصول کے بعد وجود میں آتی ہیں۔ تمام شاخیں اس سے پھوٹتی ہیں اور اس اصول کی طرف راجع ہوتی ہیں اور دنیا و آخرت کے تمام معاملات نہایت ہی توازن اور تناسق میں طے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اب یہ بات آپ پلے سے باندھ لیں کہ ایمان 'تقویٰ' عبادت 'اللہ سے ربط' عمل الی اللہ اور زندگی میں شریعت کے قیام سے اللہ کو کیا فائدہ ہے۔ یہ سب امور تو انسان ہی کی بھلائی کے لئے ہیں۔ انسانی زندگی کے درست کرنے ہی کے لئے تو ہیں۔ اللہ تو غنی بادشاہ ہے۔ اسلامی نظام زندگی نے تمام امور کو ایمان باللہ اور تقویٰ پر موقوف کر دیا ہے۔ اگر ایمان نہیں ہے تو عمل باطل ہے۔ تمام سرگرمیاں جو اس اصول پر مبنی نہ ہوں کالعدم ہیں' محض ہوا و غبار ہیں' نسیاً منسیاً ہیں اور ہوا میں تحلیل ہونے والی ہیں' یہ کیوں؟ کیا ان سے اللہ کو کوئی فائدہ ہے اگر تمام لوگ ایمان لائیں تو اللہ کو کوئی چیز ملتی ہے' کیا لوگوں کے تقویٰ اور اسلامی نظام حیات کے مقام سے اللہ کو کوئی فائدہ ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ ان چیزوں کے سوا لوگوں کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس کے سوا ان کی فلاح ممکن بھی نہیں ہے۔

حضرت ابوذر غفاری ﷺ ایک حدیث قدسی میں حضور ؐ سے روایت فرماتے ہیں' اللہ نے فرمایا!

"اے میرے بندو! میں نے تو اپنے اوپر ظلم حرام کر لیا ہے' اور اسے میں نے تمہارے درمیان بھی حرام قرار دے دیا ہے۔ اس لئے باہم ظلم نہ کرو۔ اے بندو! تم میں سے صرف وہی ہدایت پر ہو گا جسے میں نے ہدایت دی باقی سب گمراہ ہوں گے۔ اس لئے ہدایت مجھ ہی سے طلب کرو میں تمہیں ہدایت دوں گا۔ اے میرے بندو! تم میں سے سب بھوکے رہیں گے الا وہ شخص کہ اسے میں نے کھانا دیا۔ لہذا مجھ ہی سے رزق طلب کرو۔ میں تمہیں ضرور رزق دوں گا۔ اے میرے بندو! تم میں سے سب ننگے ہیں' ماسوائے اس شخص کے جسے میں پہنا دوں۔ اس لئے مجھ ہی سے پوشاک طلب کرو' میں تمہیں پوشاک دوں گا۔ اے میرے بندو! تم رات اور دن غلطیاں کرتے ہو اور میں تمہارے سب گناہ معاف کرتا ہوں۔ لہذا تم مجھ ہی سے مغفرت طلب کرو' میں تمہیں بخش دوں گا۔ اے میرے بندو! تم مجھے نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہیں رکھتے کہ مجھے نقصان پہنچاؤ اور تم مجھے نفع پہنچانے کی طاقت ہی نہیں رکھتے کہ مجھے نفع پہنچاؤ۔ اے میرے بندو! اگر تم سے پہلا شخص اور آخری شخص اور تمہارے سب انسان اور سب جنات اس معیار پر پہنچ جائیں جس پر تم میں کوئی ایک زیادہ سے زیادہ متقی ہو سکتا ہے تو اس سے میری شہنشاہیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اے میرے بندو! اگر تم سے پہلا شخص اور آخری شخص اور تمہارے سب انسان اور سب جن اس قدر برے ہو جائیں جس طرح تم میں کوئی ایک شخص ہو سکتا ہے تو وہ میری ملکیت میں سے کوئی چیز کم نہیں کر سکتا۔ اے میرے بندو! اگر تمہارا پہلا شخص اور آخری شخص اور تمہارے سب انسان اور سب جن ایک ہی میدان میں جمع ہو جائیں اور مجھ سے مانگیں اور میں ہر ایک کے سوال کو قبول کروں تو میرے خزانوں میں کوئی کمی نہ ہوگی' صرف اس قدر کمی ہوگی جس طرح کوئی سوئی دریا میں ڈالے (اور نکالے)۔ اے میرے بندو! یہ تو تمہارے اعمال ہیں کہ میں تمہارے لئے گنتا ہوں اور پھر میں ان پر تمہیں جزا دیتا ہوں۔ اگر کسی کو کوئی بھلائی نصیب ہو تو اسے چاہئے کہ اس پر میرا شکر ادا کرے۔ اور اگر کسی کو بھلائی کے سوا کچھ ملے تو وہ صرف اپنے نفس کو ملامت کرے۔ (روایت مسلم)

صرف یہ اساس ہے جس پر ہمیں ایمان 'تقویٰ' عبادت اور اسلامی نظام حیات کے قیام اور نفاذ شریعت کو سمجھنا چاہئے۔ یہ سب چیزیں تو ہمارے لئے ہیں' انسانوں کے لئے ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ ان تمام امور کی ضرورت اس لئے درپیش ہوتی ہے کہ یہ انسان کی اصلاح وفلاح کے لئے ضروری ہیں' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اب اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ شرط جو اہل کتاب کے لئے عائد کی گئی ہے' صرف ان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اس لئے کہ اہل کتاب کے لئے جس شرط کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان کی فلاح ایمان اور تقویٰ اور ان کے ہاں نازل کردہ کتب میں اسلامی نظام کے قیام پر موقوف ہے یعنی اقامت نظام تورات و انجیل پر' ان ہدایات پر جو ان کے نبیوں کی زبانی دی گئیں۔ تو یہ شرط ان کے لئے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کے دور کے لئے لگائی گئی ہے۔ یہی شرط اب ہمارے لئے بھی ہے جن کی طرف قرآن کریم نازل کیا گیا ہے۔ یہ شرط خود بخود ان لوگوں پر عائد ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اس لئے کہ مسلمان تو منصوص طور پر قرآن کریم پر بھی ایمان لاتے ہیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے اور دوسری کتابوں پر بھی ایمان لاتے ہیں جو ان سے پہلے نازل کی گئیں۔ ان کے لئے ان احکام پر عمل کرنا بھی ضروری ہے جو ان پر نازل ہوئے اور ان پر بھی جو ان سے پہلے کی شریعتوں میں نازل ہوئے تھے اور اسلامی نظام نے ان کو منسوخ نہیں کیا ہے۔ وہ تو مسلمان ہیں اور اسلام ان کا دین ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں تو دین اسلام کے سوا کوئی اور دین سرے سے مقبول ہی نہیں ہے۔ نہ وہ اب اس دین کے سوا کوئی اور دین کسی کی جانب سے قبول کرتا ہے۔

لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل کتاب کے لئے جو شرط برائے فلاح دنیا و آخرت مقرر کی گئی تھی وہ ہمارے لئے بطریق اولیٰ شرط فلاح ہے۔ اس کے ساتھ جو عہد کیا گیا تھا وہ ہمارے ساتھ بھی عہد ہے۔ اور یہ لوگ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ اللہ کی اس پسند کو قبول کریں جو اللہ نے ان کے لئے پسند کیا تھا۔ اللہ کی اس شرط سے فائدہ اٹھائیں جس سے ان کے گناہ معاف ہوئے اور آخرت میں وہ جنت میں داخل ہوئے۔ اور یہ کہ ان پر آسمان سے رزق کی بارش ہوئی اور زمین نے ان کے لئے سونا اگلا۔

اہل اسلام تو اہل کتاب کے مقابلے میں زیادہ اس بات کے مستحق ہیں کہ اللہ کی اس شرط کو پورا کر کے فائدہ اٹھائیں' اس لئے کہ وہ اس وقت عالم اسلام میں بھوک' افلاس' خوف' بیماری اور غربت میں مبتلا ہیں اور پورے عالم اسلام کی یہی حالت ہے۔ یا اس ملک میں جو کبھی عالم اسلامی تھا اللہ کی شرط قائم ہے اور اس پر عمل کا طریقہ معلوم ہے اگر وہ سمجھیں یا سمجھنے کی کوشش کریں مگر افسوس کہ وہ نہیں سمجھتے۔

---○○○---

# درس نمبر ۱۵ ایک نظر میں

اس سبق میں بھی اہل کتاب کے حالات کو لیا گیا ہے ۔ یہود و نصاریٰ دونوں کے حالات کو ۔ ان کے نظریاتی انحراف کا اظہار کیا گیا ہے اور ان کی تاریخی بداعمالیوں کا ذکر کیا گیا ہے ۔ خصوصاً یہودیوں کا ذکر تفصیل سے ہوا ہے ۔ ان کے اور رسول اللہ کے باہمی تعلق کی تحدید کی گئی ہے ۔ نیز مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلق کو طے کیا گیا ہے ۔ پھر ان کے حوالے سے حضور اکرم ؐ اور مسلمانوں کے فرائض کا تعین کیا گیا ہے ۔ اس ضمن میں ان عظیم نظریاتی امور کو بھی طے کیا گیا ہے جو اسلامی تصور حیات کی اساس کا درجہ رکھتے ہیں ۔ نیز جماعت مسلمہ کے لئے تحریکی اصول کار اور حدود بھی وضع کئے گئے ہیں ۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ان منحرف مقاصد و تصورات کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے ۔

حضور اکرم ؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ تک جو تعلیم آ رہی ہے آپ اسے لوگوں تک پہنچا دیں ۔ پوری کی پوری تعلیمات لوگوں تک منتقل کر دیں ۔ ان میں سے کوئی چیز رہنے نہ پائے اور حالات سے متاثر ہو کر کسی چیز کو مؤخر نہ کیا جائے ۔ نیز ان لوگوں کی خواہشات کے ساتھ ان تعلیمات کے اندر جو تضاد ہے کہیں اس سے ڈر کر یا جاہلی معاشرے کے طور طریقوں سے متاثر ہو کر کوئی چیز ترک یا مؤخر نہ کی جائے ۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ نے فریضہ تبلیغ کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہے ۔

اور یہ جو حضور ؐ کو حکم دیا ہے کہ آپ بے کم و کاست پہنچا دیں اس میں سرفہرست یہ ہے کہ اہل کتاب کو یہ صاف صاف کہہ دیا جائے کہ جب تک تم توراۃ اور انجیل کو قائم نہ کرو اس وقت تک تمہاری کوئی پوزیشن نہیں ہے ۔ اس کے بعد جو اللہ کی طرف سے ہدایات آئی ہیں ان کی تبلیغ بھی ضروری ہے ۔ یہ تبلیغ اس طرح قطعی ' کھل کر ' صریح اور دو ٹوک انداز میں ہو کہ اس میں کسی قسم کا احتمال نہ ہو ۔ آپ یہ بھی اعلان کر دیں کہ یہودیوں نے انبیاء کو قتل کیا اور اللہ کے ساتھ طے پا جانے والے میثاق کو توڑ کر کفر کا ارتکاب کیا ۔ نصاریٰ نے بھی عقیدہ توحید میں تحریف کر کے حضرت مسیح کو خدا سمجھا اور پھر یہ کہ عقیدہ تثلیث اختیار کیا ۔ یہ بھی صریح کفر کے مترادف ہے ۔ آپ یہ بھی اعلان کر دیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ عقیدہ شرک کے نتیجے میں ان پر جنت حرام ہو گی اور یہ بھی اعلان کر دیں کہ بنی اسرائیل پر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کے ذریعے بھی لعنت و ملامت کی گئی اس لئے کہ وہ نافرمان اور بے عمل ہو گئے تھے ۔

اس سبق کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اہل کتاب اہل اسلام کے مقابلے میں اہل شرک کی حمایت کر رہے ہیں ۔ یہ بری حرکت وہ اس لئے کر رہے ہیں کہ ان کا اللہ کی ذات پر صحیح طرح ایمان نہیں ہے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تو وہ بہرحال نہیں مانتے ۔ لیکن اگر وہ اب نبی آخر الزمان پر ایمان نہ لائیں گے تو وہ مومن نہ ہوں گے ۔ اس اجمالی تبصرے کے بعد آپ تفصیلات ملاحظہ فرمائیں ۔

# درس نمبر ۵۱ تشریح آیات

## آیت نمبر ۶۷ ۔۔ تا ۔۔ ۸۲

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٧﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٨﴾

”اے پیغمبرؐ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔ اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔ یقین رکھو کہ وہ کافروں کو ہدایت کی راہ ہرگز نہ دکھائے گا۔ صاف کہہ دو کہ ”اے اہل کتاب، تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔“ ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دے گا۔ مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔ (یقین جانو کہ یہاں اجارہ کسی کا بھی نہیں ہے)

رسول اللہؐ کے لئے قطعی حکم یہ ہے کہ آپ تمام پیغام کی جو اللہ نے نازل کیا ہے پوری پوری تبلیغ کریں، دنیا کے اندر پائے جانے والے حالات میں سے کسی حال کو بھی کوئی اہمیت نہ دیں اور اپنی دعوت کو بالکل کھل کر صاف بیان کر دیں۔ یہ آپ کا فریضہ رسالت ہے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے فریضہ رسالت کا حق ادا نہ کیا

اور اپنے فرائض پوری طرح سرانجام نہ دیجئے۔رہی یہ بات کہ دشمن تمہارا کچھ بگاڑ لیں گے تو یقین رکھو کہ اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا اور جس کو بچانے کا ذمہ اللہ نے لے تو لوگ اللہ کے مقابلے میں حیثیت کیا رکھتے ہیں کہ اس کو کوئی نقصان پہنچا سکیں گے۔

سچائی کے حاملین کو شف شف کرنا مناسب نہیں ہے۔انہیں چاہئے کہ صاف صاف اور دو ٹوک بات کریں۔رہے اہل باطل اور مخالفین حق تو وہ جو چاہیں کہیں جو چاہیں کرلیں۔اس لئے کہ سچوں کو لوگوں کی خواہشات کا لحاظ رکھتے ہوئے نرم بات نہیں کرنا چاہئے اور نہ اس سلسلے میں لوگوں کی خواہش کا لحاظ رکھنا چاہئے۔سچی بات کو نہایت ہی قوت اور زوردار طریقے سے کہنا چاہئے تاکہ وہ سیدھی لوگوں کے قلوب کے اندر اتر جائے۔حاملین حق جب اپنی بات زوردار طریقے سے کرتے ہیں تو جن لوگوں کے دل میں ہدایت قبول کرنے کی ذرا سی استعداد بھی ہوتی ہے تو وہ بات ان تک پہنچ جاتی ہے۔اور اگر سچائی کو دو ٹوک الفاظ مین پیش کیا جائے تو اس کے لئے وہ دل نرم نہیں ہوتے جن میں قبول حق کی استعداد نہیں ہوتی اور یہ اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں کہ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ داعی ان کے ساتھ نرمی کرے اور کچھ مطالبات واپس لے لے تب وہ دعوت کو قبول کریں گے۔وہ اپنی طرف سے شرائط عائد کرتے ہیں۔

(انَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ (۵:۶۷)) ”اللہ کافروں کو ہدایت کی راہ دکھانے والا نہیں ہے۔“ لہٰذا آپ سچائی کو دو ٹوک الفاظ میں بیان کریں، جامع اور مانع الفاظ میں بیان کریں۔رہی یہ بات کہ کون مانتا ہے اور کون نہیں مانتا، یہ موقوف اس امر پر ہے کہ سننے والے کے اندر قبول حق کی استعداد ہے یا نہیں یا یہ کہ اس کا دل اس سچائی کے لئے کھلا ہے یا نہیں۔مداہنت اور لحاظ و ملاحظہ کرنے اور سچ بات پوری طرح نہ کہنے پر ہدایت کا دارومدار نہیں ہے نہ اس سے کچھ فائدہ ہوتا ہے۔

نظریاتی اعتبار سے فیصلہ کن بات کرنے کا مقصد یہ بھی نہیں ہے کہ انسان نہایت خشک اور سخت لہجے میں بات کرے۔اللہ نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم بھی دیا ہے کہ آپ نہایت ہی حکمت اور اچھے انداز میں نصیحت فرمائیں۔اس لئے قرآنی ہدایات میں کوئی تعارض نہیں ہے یعنی کلمہ حکمت اور موعظہ حسنہ اور دو ٹوک اور فیصلہ کن بات کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ایک تو نفس بات ہے یا کسی بات کے عناصر ترکیبی ہیں اور دوسرا وہ انداز ہے جس انداز میں اس بات کو لوگوں تک پہنچانا مطلوب ہے۔جہاں تک نفس بات اور پیغام حق کا تعلق ہے وہ بے کم و کاست پہنچایا جائے۔پوری پوری بات پہنچائی جائے اور اس میں کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اختیار نہ کی جائے۔اس لئے کہ عقیدہ اور نظریہ ایک ایسی حقیقت ہوتی ہے جس کے اجزاء نہیں ہوسکتے۔ہاں بات کے پہنچانے کے انداز میں نرمی ہوسکتی ہے۔ابتدائے بعثت سے حضور ؐ نہایت ہی حکمت سے وعظ فرماتے تھے اور بات نہایت ہی اچھے انداز سے کرتے تھے لیکن بات دو ٹوک ہوتی تھی۔آپ اللہ کے حکم سے اس طرح فرمایا کرتے تھے۔”اے لوگو! جنہوں نے کفر کیا ہے، میں ان بتوں کی بندگی نہیں کرتا جن کی بندگی تم کرتے ہو۔“ آپ صاف کہتے کہ تم کافر ہو' اور بات بھی صاف کہتے کہ میں تمہارے معبودوں کی بندگی نہیں کرتا اور نہ ہی آپ نے وہ مصالحتی کوششیں منظور کیں جن کا مقصد یہ تھا کہ کچھ لو اور کچھ دو' نہ آپ نے کبھی مداہنت کی حالانکہ وہ تمنائیں کرتے تھے کہ آپ ایسا کریں۔آپ نے کبھی کفار سے یہ نہ کہا کہ تم جس نظام

پر عامل ہو' میں تو اس میں چند معمولی تبدیلیاں لاتا ہوں بلکہ آپ یہ فرماتے کہ تم لوگ سراسر باطل پر ہو اور یہ کہ وہ کامل سچائی لے کر آئے ہیں۔ آپ سچائی کی بات نہایت ہی زور سے کرتے' پوری پوری کرتے لیکن ایسے انداز میں کرتے کہ اس میں کرختگی نہ ہوتی اور نہ سخت مزاجی ہوتی۔ قول لین ہوتا۔ یہاں اس سورہ میں آپ کو حکم یہ دیا جاتا ہے

(يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ءوَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ء وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ء اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (٥:٦٧))

"اے پیغمبر' جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے' وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا' اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔ یقین رکھو کہ وہ کافروں کو (تمہارے مقابلہ میں) کامیابی کی راہ ہرگز نہ دکھائے گا۔"

یہاں اس آیت سے پہلے اور بعد میں آنے والی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مقصد یہ ہے کہ اہل کتاب کو واضح الفاظ میں اور دو ٹوک انداز میں بتایا جائے کہ وہ جس موقف پر جمے ہوئے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔ اور یہ بتا دیا جائے کہ ان کا موقف حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتا۔ نہ ان کا دین' دین ہے نہ ان کا عقیدہ صحیح عقیدہ اور نہ ان کا ایمان مقبول ہے۔ اس لئے کہ ان کی یہ چیزیں خود تورات اور انجیل کے مطابق نہیں ہیں۔ نہ ربانی ہدایات کے مطابق ہیں۔ اس لئے ان کے یہ دعاوی سراسر باطل ہیں کہ وہ اہل کتاب ہیں یا یہ کہ وہ کوئی نظریہ رکھتے ہیں یا یہ کہ وہ دیندار ہیں اور دین سماوی کے پیروکار ہیں۔

(قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَىْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (٥:٦٨)) صاف کہہ دو کہ "اے اہل کتاب' تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ توراۃ اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔"

جس وقت حضور ؐ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپ ؐ اہل کتاب کے سامنے ان کے دین' ان کے عقیدے اور ان کے ایمان کے بارے میں یہ حقیقت واشگاف الفاظ میں بیان کریں کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور نہ وہ کسی ٹھوس حقیقت پر مبنی ہیں' تو اس وقت وہ اپنی کتابیں باقاعدہ پڑھتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو یہودی اور نصرانی کہتے تھے۔ ان کا دعوے یہ تھا کہ وہ اہل ایمان ہیں لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے موقف پر جو فیصلہ کن تبصرہ کرنے کو کہا گیا اس میں یہ اعلان مضمر تھا کہ اپنے بارے میں ان کے تمام دعاوی غلط ہیں' اس لئے کہ "دین" صرف الفاظ کا نام نہیں ہے جسے کوئی زبان سے ادا کر دے۔ نہ دین کتابوں کا نام ہے جنہیں ترتیل اور خوش الحانی سے پڑھ لیا جائے۔ نہ دین کوئی ایسی صفت ہے جو موروثی طور پر مل جاتی ہو۔ بلکہ دین تو ایک نظام زندگی ہوتا ہے اور دین کے اجزاء میں وہ عقیدہ اور نظریہ بھی شامل ہوتا ہے جو دلوں کے اندر ہوتا ہے' وہ عبادات بھی ہوتی ہیں جو مراسم عبودیت کی شکل میں ادا ہوتی ہیں۔ اس میں وہ نظام بندگی بھی ہوتا ہے جس پر ایک مکمل نظام زندگی استوار ہوتا ہے۔ جب تک وہ اس پورے نظام تورات کو قائم نہیں کرتے تو ان کی

حیثیت یہ ہوگی کہ وہ سرے سے دین پر نہیں ہیں ۔ نہ اہل کتاب میں اور نہ اہل دین و عقیدہ میں اور یہی اعلان رسول اللہ کو کرنے کا حکم دیا گیا کہ ان سے کہہ دیں کہ وہ اپنے لئے ان چیزوں میں سے کسی شے کو Claim نہ کریں۔

اقامت تورات کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ اہل کتاب حضرت محمد ؐ کے لائے ہوئے دین پر عمل کریں اس لئے کہ ان سے اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لیا تھا کہ وہ تمام رسولوں پر ایمان لائیں اور جو رسول بھی آیا' اس کی نصرت کریں گے اور مدد دیں گے ۔ ان کے ہاں تورات اور انجیل میں حضرت محمد ؐ کی صفت واضح طور پر موجود ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کریم کے اندر اس کا تذکرہ فرمایا۔ نیز ان کو حکم بھی دیا گیا تھا کہ وہ تورات' انجیل اور اس کلام پہ ایمان لائیں جو اللہ نے نازل کیا ہے (چاہے اس ماانزل اللہ سے مراد قرآن ہو یا دوسری کتب ہوں مثلاً زبور داؤد وغیرہ) ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ تورات اور انجیل کو قائم نہیں کرتے ۔ اب ان کو اس نئے دین میں داخل ہو جانا چاہیے اس لئے کہ یہ دین تورات و انجیل کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے اندر تورات و انجیل کی اصل تعلیمات محفوظ کر دی گئی ہیں ۔ اگر یہ دین اسلام میں داخل نہ ہوں گے تو ان کی کوئی دینی حیثیت نہ ہوگی' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تو حضور ؐ کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ ایسا اعلان کر دیں ورنہ سمجھا جائے گا کہ آپ نے تبلیغ کا حق ادا نہیں کیا اور یہ ایک شدید ترین تہدید ہے جو حضور اکرم ؐ کو دی گئی ۔

اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم تھا کہ جب اہل کتاب کی دینی حیثیت کو ان فیصلہ کن اور دو ٹوک الفاظ میں چیلنج کیا جائے گا تو وہ کفر و طغیان میں مزید آگے بڑھیں گے ۔ وہ مزید عناد میں مبتلا ہوں گے اور کج بحثیاں کریں گے ۔ لیکن ان خطرات کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ بس وہ یہ اعلان کر ہی دیں اور اس اعلان کے نتیجے میں ہونے والے کفر و سرکشی' گمراہی اور بغاوت کی کوئی پرواہ نہ کریں اور مایوس نہ ہوں کیونکہ حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ حق کا اعلان بہانگ دہل کیا جائے اور اس پر جو نتائج مرتب ہوتا ہیں وہ ہو جائیں ۔ جو شخص راہ ہدایت کو اختیار کر لیتا ہے وہ کھل کر راہ ہدایت پر آ جائے اور جو راہ ضلالت کا انتخاب کرتا ہے وہ کھل کر راہ ضلالت اختیار کرے ۔

(وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِينَ (۵ : ۶۸)) "ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دے گا۔ مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔"

ان ہدایات کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے داعی کے لئے منہاج دعوت کے نقوش متعین فرما دیئے اور یہ بھی بتا دیا کہ اس کی حکمت کیا ہے ۔ جو لوگ ہدایت قبول نہیں کرتے اور کفر و سرکشی میں مزید آگے بڑھتے ہیں ۔ ان کے بارے میں آپ کی دلجوئی بھی فرما دی کہ یہ لوگ تو اس انجام کے مستحق ہو گئے ہیں' اس لئے کہ ان کے دل سچی بات کے متحمل ہی نہیں ہوتے ۔ ان کے دلوں کی گہرائیوں سے سچائی کا مادہ ختم ہو چکا ہے ۔ اس لئے ان لوگوں کے سامنے کلمہ حق بہانگ دہل کہہ دیا جائے تاکہ ان کے دلوں کی گندگی ظاہر ہو جائے اور وہ مزید کفر و سرکشی میں آگے بڑھ جائیں اور سرکشوں اور کافروں کے انجام تک پہنچ جائیں ۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب کی کچھ دینی حیثیت نہیں ہے اگر وہ تورات' انجیل اور ماانزل اللہ کو قائم نہیں کرتے ۔ اور نتیجۃً " دین جدید میں داخل نہیں ہو جاتے' جیسا کہ اس آیت اور متعدد دوسری آیات میں حکم دیا گیا ہے ۔

اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو نہ مومن ہوں گے اور نہ کسی اور سماوی دین پر ہوں گے اور نہ ایسے دین والے ہوں گے جسے اللہ قبول کرے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور ؐ کی اس انداز کی تبلیغ سے یہ لوگ مزید سرکشی اور کفر میں مبتلا ہو رہے تھے لیکن اس کے باوجود حضور ؐ کو حکم دیا گیا کہ وہ کھل کر اعلان کر دیں اور اس سلسلے میں کوئی توریہ نہ کریں اور نہ نتائج سے گھبرائیں۔

جب یہ ایک فیصلہ کن بات ہے اور اسے فیصلہ کن الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ (لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ (۵:۶۸)) تو اب اہل کتاب کو اہل دین کہنے کی سرے سے گنجائش ہی نہ رہی اور نہ اس بات کی گنجائش رہی کہ اہل اسلام اہل کتاب سے دوستی اور موالات کے تعلقات استوار کریں چہ جائیکہ ان کے ساتھ مل کر ملحدین اور الحاد کے خلاف محاذ بنائیں جیسا کہ آج کل ہمارے بعض فریب خوردہ اور فریب کارر اہل ثقافت ایسا کرتے ہیں۔ اہل کتاب نے نہ تورات کو قائم کیا' نہ انجیل کو قائم کیا اور نہ ان دوسری تعلیمات کو قائم کیا جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں اس لئے کوئی مسلمان ان کی کسی دینی حیثیت کا اعتراف نہیں کر سکتا۔ نہ کوئی مسلمان ان کو وہ حیثیت دے سکتا ہے جو اللہ نے ان کو نہیں دی۔ ''اور کسی مومن اور کسی مومنہ کی یہ شان نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ؐ کسی امر کا فیصلہ کر دیں' تو پھر ان کو اس امر میں کوئی اختیار ہو۔'' یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اسے کسی قسم کے ''ظروف و احوال'' نہیں بدل سکتے۔

جب ہم یہ طے کر دیں کہ اللہ کی بات فیصلہ کن ہے جیسا کہ وہ فی الحقیقت حق اور فیصلہ کن ہے تو ہمیں یہ بات خاطر میں نہیں لانا چاہئے کہ ہمارے اس اعلان حق سے اہل کتاب کے اندر کس قدر ہیجان پیدا ہوتا ہے اور وہ ہمارے خلاف کس قدر شدید جنگ شروع کرتے ہیں۔ نہ ہمیں یہ کوشش کرنا چاہئے کہ ہم ان کی دوستی حاصل کرنے کے لئے سعی کریں اور ان کی دینی حیثیت کا اعتراف کریں یا انہیں راضی کر کے اور ان کے ساتھ باہم نصرت اور موالات کا معاہدہ کریں اور پھر ہم دونوں ملتیں مل کر کفر و الحاد کا مقابلہ کریں جبکہ ان کا دین کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اللہ تو ہمیں ایسی کوئی ہدایت نہیں دے رہا ہے اور نہ اللہ کو یہ بات قبول ہے کہ ہم لال کتاب کی دینی حیثیت کا اعتراف کریں۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس موالات اور باہم نصرت کے فعل کو بھی معاف نہیں کرے گا۔ نہ یہ سوچ قابل معافی ہے جس کے نتیجے میں یہ موالات وجود میں آتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ہم وہ فیصلہ کریں گے جو اللہ نے نہیں کیا اور اپنے لئے وہ کچھ اختیار کریں گے جو اللہ نے نہیں کیا ہے۔ اس طرح ہم یہ تسلیم کریں گے کہ اہل کتاب کے مسخ شدہ اور تحریف شدہ عقائد بھی دین ہیں اور یہ دونوں الٰہی دین ایک جگہ جمع ہو کر کفر کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ اللہ کا کہنا یہ ہے کہ وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے جب تک کہ وہ تورات' انجیل اور ان تمام ہدایات کو قائم نہیں کرتے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئیں' اور ظاہر ہے کہ وہ عملاً ایسا نہیں کر رہے۔

اب ذرا ان لوگوں کو لیجئے جو کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں اور ان کے رب کی طرف سے جو کچھ نازل ہوا ہے وہ اسے قائم نہیں کرتے۔ یہ بھی ہمیشہ اسی طرح ہوں گے جس طرح اہل کتاب ہیں۔ یہ بھی کچھ دینی حیثیت نہیں رکھتے۔ اہل کتاب پر ایک کلام نازل ہوتا ہے اور وہ اسے اپنی زندگیوں میں نافذ نہیں کرتے' نہ اسے اپنے نفوس پر نافذ کرتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص مسلمان بننا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ وہ اسلام اور کتاب اللہ کو پہلے اپنے نفس میں قائم کرے۔ اس کے بعد اپنی پوری زندگی پر قائم کرے اور پھر تمام ان لوگوں کے سامنے یہ اعلان حق کر دے کہ جو لوگ قرآن کو قائم نہیں کرتے ان کی کوئی دینی حیثیت نہیں ہے جب تک کہ وہ قرآن کو اپنی زندگیوں میں نافذ نہیں کرتے۔ اگر وہ اس کے سوا دعوائے دین کرتے

ہیں تو ان کے اس دعوے کی تردید اس دین کے رب فرمارہے ہیں۔ لہٰذا اس معاملے میں ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ فیصلہ کن بات کرے۔اس قسم کے لوگوں کو از سرنو اسلام کی دعوت دینا ہر مسلمان پر واجب ہے بشرطیکہ اس نے اپنے نفس اور اپنی زندگی میں ماانزل اللہ کو قائم کر دیا ہو۔ محض زبانی طور پر اسلام کا دعویٰ کرنا یا محض موروثی طور پر اسلام کا دعویٰ کرنا کوئی مفید مطلب بات نہیں ہے۔نہ اس سے اسلام وجود میں آتا ہے اور نہ حقیقت ایمان نفس کے اندر پیدا ہوتی ہے اور نہ ایسا شخص اللہ کے دین کے ساتھ متصف ہو گا۔ ہر زمان و مکان میں اصول و فیصلہ یہی ہو گا...... اگر اہل کتاب ان معنوں میں تورات و انجیل اور ما انزل اللہ کو قائم کر دیں اور مسلمان ان معنوں میں قرآن کو قائم کر دیں تب وہ دین دار ہوں گے اور اہل کتاب بھی اپنے خیال کے مطابق دیندار ہوں گے۔ایسے حالات میں وہ کوئی معاہدہ کر سکتے ہیں اگر وہ کسی الحاد کے خلاف ہو ورنہ دھوکہ ہو گا' خود فریبی ہوگی اور خود اپنی دینی حیثیت کو پگھلا کر بہا دینا ہو گا۔

اللہ کا دین نہ کوئی جھنڈا ہے اور نہ کوئی یونیفارم ہے' نہ کوئی وراثت ہے' دین اسلام تو دل میں بیٹھتا ہے' زندگی میں نمودار ہوتا ہے۔یہ کچھ نظریات ہیں جو دل کو بھر دیتے ہیں' کچھ عبادات ہیں جو سرانجام دی جاتی ہیں اور ایک نظام ہے جو پوری زندگی پر متصرف ہوتا ہے۔دین اسلام تب قائم ہوتا ہے جب اس کے یہ تمام اجزاء ایک ساتھ کام کر رہے ہوں اور انسانوں کی زندگیوں میں جاری و ساری ہوں۔اس کے سوا جو صورت بھی ہوگی اس میں اسلام کی ٹھوس شکل کو پگھلا کر بہانا مقصود ہو گا۔ ضمیر کا فریب ہو گا اور کوئی پاک دل مسلمان اس فریب میں نہیں آسکتا۔

ایک مسلمان کو تو چاہئے کہ وہ مذکورہ بالا حقیقت کا بآواز بلند اعلان کر دے اور جو نتائج اس کے نکلتے ہیں' نکلیں۔ اللہ ہے بچانے والا۔ کافروں کو تو اللہ کبھی راہ راست نہیں دکھاتا۔

ایک داعی اس وقت تک حق دعوت ادا نہیں کر سکتا اور اس وقت تک لوگوں پر اللہ کی جانب سے حجت قائم نہیں کر سکتا جب تک وہ ان تک دعوت کی پوری حقیقت اچھی طرح واضح نہیں کر دیتا۔لوگوں پر اچھی طرح واضح نہیں کر دیتا کہ وہ اس وقت کس پوزیشن میں کھڑے ہیں اور یہ بات وہ بغیر کسی مداہنت اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کہہ نہیں دیتا۔ اگر داعی لوگوں کو صاف صاف یہ نہیں کہتا کہ وہ کس مقام پر کھڑے ہیں' وہ غلط ہے' وہ باطل موقف پر جمے ہوئے ہیں۔وہ انہیں جس موقف کی طرف دعوت دیتا ہے وہ ان کے موجودہ موقف سے سراسر الگ ایک دوسری چیز ہے اور یہ کہ وہ ایک مکمل تبدیلی کی دعوت دیتا ہے۔ وہ ایک طویل سفر اور طویل جدوجہد کی طرف بلاتا ہے وہ مکمل تبدیلی چاہتا ہے۔یہ تبدیلی ان کے افکار میں بھی ہے' ان کے طور طریقوں میں بھی ہے۔ان کے نظام زندگی اور ان کے اخلاقی نظام میں بھی وہ مکمل تغیر چاہتا ہے۔گویا وہ ان کو اذیت دیتا ہے اس لئے کہ ایک داعی سے لوگوں کی توقع بھی یہ ہوتی ہے کہ وہ واضح طرح بتائے کہ لوگوں کا موجودہ موقف غلط ہے تاکہ جو انکار کرتا ہے وہ واضح طور پر انکار کر دے اور جو اقرار کرتا ہے وہ واضح اقرار کرے۔جو مرتا ہے مرے اور جو زندہ ہوتا ہے وہ زندہ ہو۔

جب ایک صاحب دعوت اور داعی شش و پنج کرتا ہے اور لوگوں کو صاف صاف نہیں بتاتا ہے کہ ان کی زندگی میں کیا کیا باطل ہے اور یہ کہ وہ حق کیا ہے جس کی طرف وہ دعوت دے رہا ہے اور یہ کہ دعوت حق اور ان کے موقف باطل کے درمیان حد فاصل کیا ہے؟ اور یہ کام وہ محض مشکل ظروف و احوال کی وجہ سے کرتا ہے تو اس وقت گویا وہ لوگوں کو اذیت دیتا ہے اور ان کو فریب دیتا ہے کیونکہ وہ صاف صاف بتا نہیں رہا ہے کہ وہ چاہتا کیا ہے۔دوسرا جرم وہ یہ کر رہا

ہوتا ہے کہ اللہ نے اسے جو بات صاف صاف کہہ دینے کا حکم دیا ہے اس پر بھی وہ عمل نہیں کر رہا ہوتا۔

لوگوں کے ساتھ دعوت میں اگر نرمی کی جاسکتی ہے تو وہ صرف اس امر میں کی جاسکتی ہے کہ وہ انداز نرم اختیار کرے۔ بات پوری کرے مگر نہایت ہی سلیقے سے اور نرم انداز میں۔ بات پوری ہو مگر سلیقہ مندی سے اور حکمت سے' جس کی ہدایت حکمت اور موعظہ حسنہ میں دی گئی ہے۔

آج کل ہمارے بعض دوست یہ دیکھتے ہیں کہ اہل کتاب دنیا میں ایک بڑی تعداد میں بستے ہیں۔ ان کے پاس بہت بڑی مادی قوت ہے۔ پھر یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں بے شمار لوگ بت پرست ہیں اور دنیا کے ممالک کے اندر ان کی بات بھی سنی جاتی ہے۔ پھر جب یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ مادی نظریات کے حامل ممالک کے پاس بڑی قوت ہے۔ نیز ان لوگوں کے پاس تباہ کن اسلحہ جات بھی موجود ہیں اور پھر یہ دوست جب دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ اور ان کے پاس اللہ کی جو کتاب ہے وہ اسے نافذ نہیں کرتے تو ایسے لوگوں پر یہ بات نہایت ہی شاق گزرتی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس قدر زیادہ لوگوں کو یہ حق بات کس طرح کہیں کہ وہ سب گمراہ ہیں۔ اتنی عظیم تعداد کو گمراہ کہنے کا فائدہ کیا ہے اور اس قدر عظیم آبادی کو کس طرح دین حق سمجھایا جاسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ طریق کار یہی ہے۔ جاہلیت اگر پوری کائنات میں پھیل جائے تو بھی جاہلیت ہوگی۔ اس دنیا کے عملی حالات چاہے جیسے بھی ہوں' وہ اس وقت تک کچھ حیثیت نہیں رکھتے جب تک وہ حق پر استوار نہ ہوجائیں۔ ایک داعی کے سامنے اگر لوگوں کی ایک بہت بڑی آبادی گمراہ کھڑی ہو تو اس کے فرائض میں کچھ کمی نہیں ہوتی' نہ باطل کا حجم اور اس کا ڈھیر سا ہونا دعوت پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔ جس طرح اس دعوت کا آغاز ہوا تھا اور اس نے تمام انسانوں کو خطاب کیا تھا' کہ وہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے' اسی طرح ہمیں آج بھی کام شروع کرنا ہوگا۔ گردش ایام کے بعد بات وہیں تک آپہنچی ہے' جہاں حضور ؐ کے دور میں تھی۔ آپ ؐ کو مبعوث فرمایا گیا تھا اور آپ کو اللہ نے پکارا تھا۔

(يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۵:۶۷)) "اے پیغمبر ؐ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔ اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔ یقین رکھو وہ کافروں کو کامیابی کی راہ ہرگز نہ دکھائے گا۔ صاف کہہ دو کہ "اے اہل کتاب تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تورات اور انجیل اور دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔"

---ooo---

اس حصہ آیات کا خاتمہ اس بات پر ہوتا ہے کہ اللہ کے ہاں جو دین مقبول ہے وہ کیا ہے۔ حضور ؐ کی بعثت سے پہلے لوگوں کی شناخت جو ہو سو ہو اور وہ چاہے جس دین پر بھی ہوں اور جس ملت کے بھی پیرو ہوں' اب حکم یہ ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٩﴾

"مسلمان ہوں یا یہودی' صابی ہوں یا عیسائی' جو بھی اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا بے شک اس کے لئے نہ کسی خوف کا مقام ہے نہ رنج کا۔"

الذین امنوا سے مراد اہل ایمان مسلمان ہیں۔ الذین ھادو سے مراد یہودی ہیں۔ الصابئون سے مراد وہ طبقہ ہے جو بتوں کی عبادت نہ کرتا تھا۔ یہ لوگ حضور ؐ کی بعثت سے پہلے موجود تھے اور صرف ایک اللہ کی عبادت کرتے تھے لیکن ان کا فرقہ کوئی متعین فرقہ نہ تھا۔ اس قسم کے لوگ عرب میں معدودے چند تھے۔ نصاریٰ سے مراد عیسائی ہیں جو حضرت عیسیٰ کی اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اس آیت میں فیصلہ یہ کیا گیا ہے کہ پہلے چاہے کوئی جس عقیدے اور دین پر بھی ہو' اب اگر اللہ پر ایمان لائے گا' آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک کام کرے گا اور یہاں اس میں ضمناً یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ اب نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ شریعت پر بھی ایمان لائے جیسا کہ دوسری جگہوں پر تصریح کر دی گئی ہے' تو ایسے شخص کو نجات ملے گی اور اس کے لئے کوئی خوف و رنج نہ ہو گا۔ اس بات کا کہ اس سے قبل وہ صحیح راہ پر نہ تھے۔ ان سے ان کے سابق مذہب اور عنوان کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا۔ اعتبار آخری بات کا ہو گا۔

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی عقیدے کی ضروریات اور بدیہات میں یہ بات شامل ہے کہ حضرت محمد ؐ خاتم النبیین ہیں اور یہ کہ آپ کو تمام انسانوں کی طرف مبعوث فرمایا گیا ہے اور یہ کہ تمام لوگ چاہے' ان کی ملت' دین' اعتقادات' نسل اور وطن جو بھی ہو ان کو یہ دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ حضرت محمد ؐ پر ایمان لائیں اور اپنے تصورات اور اپنی زندگیوں کو حضور اکرم ؐ کی ہدایات کے مطابق ڈھالیں۔ جو شخص آپ کو رسول ؐ نہیں مانتا اور جو شخص اجمالاً اور تفصیلاً آپ پر ایمان نہیں لاتا وہ گمراہ ہے اور اس کا دین اور مسلک مقبول نہ ہو گا اور وہ اس اعلان کا مستحق نہ ہو گا۔ (فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۵: ۶۹)) "کہ ان کے لئے نہ خوف کا مقام ہو گا اور نہ رنج کا" یہ وہ بنیادی حقیقت ہے جو اس دین سے بطور لازمی نتیجہ برآمد ہوتی ہے' اس لئے ایک سچے مسلمان کے لئے اس بارے میں شش و پنج کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خصوصاً اس عظیم جاہلیت سے متاثر ہو کر جو اس کے سامنے پھیلی ہوئی ہے جاہلیت کے ساتھ تعلقات استوار کرتے ہوئے ایک مسلمان کو غافل نہیں ہونا چاہئے جو مختلف ملتوں اور مسلکوں میں بٹی ہوئی ہے۔ مسلمان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ مجبور ہو کر اور متاثر ہو کر ان گمراہ ملتوں میں سے کسی کے پیروکاروں کو "اہل دین" سمجھے اور یہ سمجھے کہ ان کا دین عنداللہ مقبول ہے اور یہ کہ اس کے ساتھ تعلق ولایت قائم ہو سکتا ہے۔

اہل ایمان کا ولی اور ناصر فقط اللہ ہے اور جو شخص بھی اللہ کو' اللہ کے رسول ؐ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں

دوست بنائے گا تو اسے یقین رکھنا چاہئے کہ حزب اللہ ہی غالب رہے گی -" چاہے ظاہری حالات کتنے ہی ناموافق نظر آئیں اور جو شخص بھی ایمان لائے اللہ پر' اور یوم آخرت پر اور نیک عمل کرے اور یہ اس دین آخری کے اصولوں کے مطابق کرے تو اس کے لئے رنج و خوف کا کوئی موقع نہ ہو گا -نہ دنیا میں اس کے لئے خوف ہو گا اور نہ آخرت میں اس کے لئے کوئی خوف ہو گا -جاہلیت کی تہ بہ تہ قوتوں سے بھی اسے کوئی ڈر نہ ہو گا اور نہ انہیں اہل ایمان سے ڈر ہو گا -

---ooo---

اب تاریخ بنی اسرائیل کا ایک باب کھلتا ہے اور اس باب میں بتایا جاتا ہے کہ یہ یہودی کیوں اور کس طرح بے حقیقت ہیں؟ اور کیوں ضروری ہے کہ ان کو دعوت اسلامی سے روشناس کر دیا جائے اور ان کو اس دین جدید کی دعوت دی جائے تاکہ وہ اس دین کی پناہ گاہ میں داخل ہو جائیں -یہ باب اس لئے کھولا جاتا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ ان کی حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے -وہ وہی ہیں جو تھے -مقصد یہ ہے کہ اہل اسلام کی نظروں میں ان کا کوئی اعتبار ہی نہ رہے اور مسلمان اس امر پر توجہ ہی نہ دیں کہ ان کے ساتھ تعلق موالات قائم ہو سکتا ہے یا وہ ان کے ساتھ کوئی نصرت کر سکتے ہیں جب تک کہ وہ اس حال پر قائم ہیں اور سچائی کے مقابلے میں اپنا رویہ انہوں نے تبدیل نہیں کیا -

---

لَقَدْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَ اَرْسَلْنَاۤ اِلَیْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا
جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤی اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِیْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِیْقًا یَّقْتُلُوْنَ ۟ۗ
وَ حَسِبُوْۤا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ ثُمَّ
عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ۟

"ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے مگر جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی خواہشات نفس کے خلاف کچھ لے کر آئے تو کسی کو انہوں نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا' اور اپنے نزدیک یہ سمجھے کہ کوئی فتنہ رونما نہ ہو گا' اس لئے اندھے اور بہرے بن گئے -پھر اللہ نے انہیں معاف کیا تو ان میں سے اکثر لوگ اور زیادہ اندھے اور بہرے بنتے چلے گئے -اللہ ان کی یہ سب حرکات دیکھتا رہا ہے -"

یہ ان کی قدیم تاریخ ہے -حضور اکرم ؐ کے مقابلے میں انہوں نے جو موقف اختیار کیا وہ پہلا اور آخری موقف نہیں ہے -یہ لوگ سرکشی اور روگردانی کے عادی مجرم ہیں -یہ وعدہ خلافی کے پرانے خوگر ہیں -انہوں نے ہمیشہ اپنی خواہشات نفس ہی کو اپنا الٰہ اور حاکم مانا ہے -کبھی انہوں نے اللہ کے دین اور رسول ؐ کے آگے سر تسلیم خم نہیں کیا -یہ

لوگ ہمیشہ داعیان حق کے لئے سرکش اور ظالم رہے۔

(لَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَاءِيلَ وَأَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ رُسُلًا كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ (۵: ۷۰)) "ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے مگر جب بھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی خواہشات نفس کے خلاف کچھ لے کر آئے تو کسی کو انہوں نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا۔"

بنی اسرائیل کی قدیم تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے رسولوں کو جھٹلایا اور ان کی تعلیمات سے روگردانی کی۔ انہوں نے کئی ایک پر دست درازی کی اور کئی ایک کو قتل کر دیا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی خواہشات ہی کی پیروی کی...... یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی طویل داستانیں امت مسلمہ کو سنائیں تاکہ وہ بھی کہیں بنی اسرائیل کی راہ پر چل نہ نکلے۔ تاکہ امت مسلمہ کو معلوم ہو جائے کہ اس راہ کی مشکلات کیا ہیں اور ان لوگوں کو جو فہم و فراست کے مالک ہیں اور جن کا تعلق باللہ قائم ہے وہ ان مقامات لغزش کا اچھی طرح ادراک کر لیں اور جب انہیں ویسے ہی حالات درپیش ہوں جو انبیائے بنی اسرائیل کو پیش آئے تو وہ ان سے حوصلہ پکڑیں اور یہ کہ آئندہ اہل اسلام کی آنے والی نسلیں بھی اسی راہ پر چلنے والی تھیں اور انہوں نے بھی عرصہ گزرنے کے بعد ویسی ہی سنگ دلی کا مظاہرہ کرنا تھا جو بنی اسرائیل نے کیا تھا۔ انہوں نے بھی ہدایت کی راہ ترک کر کے اپنی خواہشات نفس کو الٰہ بنانا تھا۔ آنے والے داعیان حق کو جھٹلانا تھا اور بعض کو قتل کرنا تھا' بعینہ اسی طرح جس طرح بنی اسرائیل کے باغیوں اور نافرمانوں نے کیا تھا۔

بنی اسرائیل کے یہ سرکش جب یہ سرکشیاں کر رہے تھے تو انہیں یقین تھا کہ ان پر اللہ کا کوئی عذاب نہ آئے گا اور ان سے کوئی مؤاخذہ نہ ہو گا۔ یہ سوچ ان کی اس لئے پختہ ہو گئی تھی کہ وہ سنت الٰہیہ کو بھول گئے تھے اور وہ اس غرور میں گرفتار تھے کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی پیاری قوم ہیں۔

(وَحَسِبُوا أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُوا وَصَمُّوا (۵: ۷۱)) "اور اپنے نزدیک یہ سمجھے کہ کوئی فتنہ رونما نہ ہو گا' اس لئے اندھے اور بہرے بن گئے۔"

ان کی آنکھوں کی بصارت چلی گئی' اس لئے وہ جس کو بھی دیکھتے اسے نہ سمجھتے اور ان کے کانوں پر پردے پڑ گئے' اس لئے جو چیز بھی سنتے اس سے فائدہ نہ اٹھاتے تھے۔

(ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ (۵: ۷۱)) "اس کے بعد اللہ نے انہیں پھر معاف کیا۔" یہ اللہ کی خاص رحمت تھی مگر انہوں نے اس کا بھی کچھ پاس نہ کیا۔ (ثُمَّ عَمُوا وَصَمُّوا كَثِيرٌ مِنْهُمْ (۵: ۷۱)) "پھر وہ اندھے اور بہرے بن گئے' ان سے اکثر لوگ۔"

(وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ (۵: ۷۱)) "اللہ ان کی سب حرکات کو دیکھتا رہا ہے۔" اس لئے وہ انہیں ان کی تمام حرکات پر ان کو جزاء دے گا اور وہ بچ نہ سکیں گے۔

اہل ایمان کے لئے یہاں اس قدر کافی ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے بارے میں جان لیں اور اپنے جدید موقف کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں تاکہ اہل ایمان اس بات میں یکسو ہو جائیں اور ان کے ساتھ تعلق موالات کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیں۔جس طرح حضرت عبادہ ابن الصامت نے کہا کہ انہوں نے متنفر ہو کر تعلق موالات کے خاتمہ کا اعلان کر دیا اور عبداللہ ابن ابی ابن السلول جیسے منافقین نے اس تعلق کو جاری رکھا۔

---ООО---

یہ تو تھے حالات یہودیوں کے۔رہے نصاریٰ تو ان کے شب و روز بھی ایسے ہی تھے۔ان کے بارے میں بھی قرآن کریم ایک فیصلہ کن اور دو ٹوک تبصرہ کرتا ہے۔اور یہ تبصرہ اس سورہ کے موضوع اور مقصد کے ساتھ بالکل مناسب ہے۔ اس لئے کہ قرآن یہاں اہل دین کو جو موقف دینا چاہتا ہے اس کے ساتھ یہی مناسب ہے۔

اس سے پہلے اس سورہ میں ان لوگوں کے بارے میں کہا گیا تھا' جن کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ ہیں کہ یہ لوگ کافر ہیں۔اب اس بات کو یہاں دوبارہ دہرایا جاتا ہے کہ جن کا عقیدہ ہے کہ صرف عیسیٰ خدا ہیں یا جن کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ تینوں میں سے ایک ہیں۔یہ دونوں کافر ہیں اور یہ کہ ان کے کفر پر یہاں حضرت مسیح کے قول سے استدلال کیا گیا ہے۔ان کو خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ تعلیم دی تھی کہ خبردار اللہ کے سوا کسی اور کو الٰہ نہ بناؤ۔آپ نے ان کو یہ تعلیم دی تھی کہ اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے اور اس معاملے میں 'میں اور تم سب برابر ہیں' آخر میں لوگوں کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ حضرت مسیح کے بارے میں ان غلط عقائد کو ترک کر دیں اور ان کے بارے میں وہ عقائد اپنائیں جو اہل ایمان کے ہیں۔

---

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۴﴾ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَ

أُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَأْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۷۶

"یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے حالانکہ مسیح علیہ السلام نے کہا تھا کہ "اے بنی اسرائیل ' اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔" جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا۔ اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے ' حالانکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس نے کفر کیا ہے اس کو دردناک سزا دی جائے گی۔ پھر کیا یہ اللہ سے توبہ نہ کریں گے اور اس سے معافی نہ مانگیں گے؟ اللہ بہت درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

مسیح ابن مریم اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول تھا ' اس سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے ' اس کی ماں راست باز عورت تھی اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو ہم کس طرح ان کے سامنے حقیقت کی نشانیاں واضح کرتے ہیں ' پھر دیکھو یہ کدھر الٹے پھرے جاتے ہیں۔

ان سے کہو ' تم اللہ کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرتے ہو جو نہ تمہارے لئے نقصان کا اختیار رکھتا ہے نہ نفع کا؟ حالانکہ سب کی سننے والا اور سب کچھ جاننے والا تو اللہ ہی ہے۔

---

اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیان کردہ عقیدۂ توحید کے اندر یہ شرکیہ عقائد کب اور کس کانفرنس کے ذریعہ داخل ہوئے۔ حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا عقیدہ وہی تھا جو اس کے دوسرے بھائی رسولوں کا تھا ' جو خالص توحید کے داعی تھے اور اس میں شمہ بھر شرک نہ تھا۔ اس لئے کہ نوح علیہ السلام کے بعد تمام رسالتوں کی بعثت کا مقصد توحید کی تبلیغ اور شرک کی تردید ہی تھا۔

یہاں مختصراً ہم وہ عقیدہ درج کرتے ہیں جس تک یہ کانفرنسیں بالاتفاق پہنچیں اور اس کے بعد ان کے اوپر جو اختلافات مرتب ہوئے ان کی تفصیلات پہلے گزر گئی ہیں۔

"نوفل ابن نعمت اللہ ابن جرجیس نصرانی کی کتاب "سوسنہ سلیمان" میں ہے کہ عیسائیوں کا وہ عقیدہ جس میں کسی کنیسہ کو اختلاف نہیں ہے اور جسے نیقیا کی مجلس نے بطور اصل عقیدہ طے کیا ہے ' وہ یہ ہے کہ اللہ صرف ایک ہے ' اب باپ اللہ ہے جو سب پر کنٹرول کرنے والا ہے۔ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے ' جو چیز نظر آئے یا نہ آئے اس کا پیدا کرنے

والا ہے۔ پھر ایک رب واحد یسوع پر ایمان لاتا ہے جو اکلوتا بیٹا ہے اور ایک باپ سے ہے اور یہ زمانوں سے پہلے نور سے پیدا ہوا ہے۔ یہ بھی الٰہ ہے' الٰہ حق سے ہے' مولود ہے اور غیر مخلوق ہے' اپنے جوہر میں باپ کے برابر ہے' جس سے تمام مخلوقات پیدا ہوئی اور جس کی وجہ سے ہم انسان پیدا ہوئے اور یہ باپ ہماری کوتاہیوں کی وجہ سے آسمان سے نازل ہوا۔ روح القدس کو اس کا درجہ ملا۔ اور پیلاطس کے عہد میں کنواری مریم سے اس کا تولد ہوا۔ انسان کی شکل میں آیا۔ عہد پیلاطس میں سولی پر چڑھا۔ دکھ پہنچا' قبر میں دفن ہوا اور مردوں سے تیسرے دن اٹھ کھڑا ہوا جیسا کہ کتابوں میں ہے۔ آسمان کی طرف اٹھا اور رب کے دائیں طرف بیٹھا اور عنقریب اس کا نزول عزت ہو گا اور تمام زندوں کو دین میں داخل کرے گا۔ اس کی بات ختم نہ ہو گی۔ روح القدس اور باپ سے نکلنے والے خدا پر ایمان لانا ضروری ہے جو خدا کے ساتھ موجود ہے اور ان دونوں کے لئے سجدہ ہوتا ہے اور جو انبیاء کے ساتھ باتیں کرتا ہے۔"

ڈاکٹر پوسٹ اپنی کتاب تاریخ کنیسہ میں کہتے ہیں کہ ذات باری تین اقانیم سے عبارت ہے جو مساوی ہیں۔ اللہ باپ' اللہ بیٹا' اللہ روح القدس۔ بیٹے کے ذریعے لوگ باپ سے منسوب ہیں کہ وہ مخلوق ہیں' بیٹے نے قربانی دی اور روح القدس پاک ہے۔"

اب یہ تصور کس قدر دشوار ہے کہ تین ایک بھی ہیں اور توحید اور تثلیث کا ایک ساتھ تصور کس قدر مشکل ہے۔ نصاریٰ کے لاہوتی مصنفین نے یہ تجویز کیا ہے کہ اس عقیدے کے عقلی پہلو پر غور و خوض کو ملتوی رکھا جائے' اس لئے کہ عقل تو اسے سنتے ہی مسترد کر دیتی ہے۔ ان میں سے ایک پادری بوطر اپنے رسالہ "اصول و فروع" میں لکھتے ہیں "ہم نے اپنی عقل کی طاقت کے مطابق اسے یوں سمجھا ہے اور آئندہ اسے ہم واضح طور پر سمجھ سکیں گے جب اللہ آسمانوں اور زمینوں کے رازوں سے پردہ اٹھا لے گا۔ فی الحال اس قدر کافی ہے۔"

اللہ کا کہنا ہے کہ یہ تمام معقولات کفر ہیں۔ اس لئے کہ ان تمام میں حضرت مسیح علیہ السلام کو الٰہ مانا گیا ہے۔ نیز تینوں میں سے ایک کہنا بھی کفر ہے۔ لہٰذا اللہ کی بات کے بعد کوئی اور بات نہیں ہے۔ اللہ کا فرمان واضح ہے۔

(لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۵ : ۷۲)) "یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے حالانکہ مسیح علیہ السلام نے کہا تھا کہ "اے بنی اسرائیل' اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔" جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔"

حضرت مسیح علیہ السلام نے اسی طرح انہیں صاف صاف ڈرایا تھا مگر وہ باز نہ آئے۔ آپ ؑ کی وفات کے بعد وہ اسی غلطی میں پڑ گئے تھے جس سے آپ نے انہیں متنبہ کر دیا تھا۔ حالانکہ آپ ؑ نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ اگر انہوں نے عقیدۂ توحید کو چھوڑ کر شرک اختیار کیا تو وہ جنت سے محروم ہو کر جہنم کی آگ کے مستحق ہو جائیں گے۔ انہوں نے حضرت

مسیح کے اس قول کو بھلا دیا "اے بنی اسرائیل صرف اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔" اس قول کے مطابق آپ نے انہیں کہا تھا کہ اللہ کے سامنے میں اور تم برابر کے بندے ہیں اور اللہ جو سب کا رب ہے اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ یہاں قرآن کریم ان کے تمام کفریہ معقولات کا ذکر کرتا ہے۔

(لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۵:۷۳))

"یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے' حالانکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔" اور ان تمام باطل عقائد کی تردید کرکے یہ بتا دیتا ہے کہ تمام رسول جو عقیدہ لے کر آئے ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور اگر عیسائی اپنے ان معقولات سے باز نہ آئے اور ذات باری اور ذات مسیح کے بارے میں ایسی ہی کفریہ باتیں کہتے رہے تو بعید نہیں کہ ان پر دردناک عذاب آجائے اور قیامت کا دن دور نہیں ہے۔

( وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

(۵:۷۳)) "اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے اس کو دردناک سزا دی جائے گی۔" اور اللہ کی اس تنبیہ کے باوجود کافروں نے ان معقولات سے توبہ نہ کی' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا تھا کہ یہ کافر ہو گئے ہیں تو اس ترہیب کے ساتھ ساتھ اللہ ان کو ترغیب بھی دیتے ہیں کہ اللہ معاف کرنے والا ہے اگر اب بھی یہ لوگ باز آ جائیں۔

(اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵:۷۴)) "پھر کیا یہ اللہ سے توبہ نہ کریں گے اور اس سے معافی نہ مانگیں گے؟ اللہ بہت درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" اور یہ اس لئے کہا گیا کہ توبہ کا دروازہ بند نہ ہو اور ہر کسی کو وقت ختم ہونے سے پہلے واپسی کا موقع ہو۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کا حقیقی مقام کیا ہے؟ تو مضبوط منطقی انداز میں بتایا جاتا ہے کہ مسیح کون ہیں اس امید سے کہ شاید ان کی فطرت سلیمہ مقام مسیح کے ادراک میں ان کی مدد کرے۔ اور مسیح کی حقیقت بتانے کے بعد اللہ تعالیٰ تعجب خیز انداز میں کہتے ہیں کہ اس کے باوجود یہ لوگ روگردانی کرتے ہیں۔

(مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا

يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۵:۷۵)) "مسیح ابن مریم اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول تھا' اس سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے' اس کی ماں ایک راست باز عورت تھی' اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو ہم کس طرح ان کے سامنے حقیقت کی نشانیاں واضح کرتے ہیں' پھر دیکھو یہ کدھر الٹے پھرے جاتے ہیں۔"

حضرت مسیح علیہ السلام اور آپ کی والدۂ صدیقہ کی زندگی میں کھانا کھانا ایک واقعی امر تھا۔ زندوں کی خصوصیات میں

سے یہ ایک اہم خصوصیت ہے کہ وہ کھانا کھاتے ہیں اور یہی حضرت مسیح اور ان کی والدۂ صدیقہ کی بشریت پر سب سے بڑی دلیل ہے۔ اور ان کی مابعد الطبیعیاتی تعبیرات کے مطابق ان کے ناسوت ہونے پر یہ بڑی دلیل ہے۔ کھانا کھانا بے شک انسان کی جسمانی طلب اور جسمانی احتیاج کی دلیل ہے۔ اور جو ذات زندہ رہنے کے لئے کھانے کی محتاج ہو وہ الٰہ کس طرح بن سکتی ہے۔ اللہ تو بذات خود زندہ ہے۔ بذات خود قائم ہے' بذات خود باقی ہے' وہ کھانا کھانے کا محتاج نہیں ہے اور کھانے کی قسم کی اشیاء نہ اللہ کی ذات میں داخل ہوتی ہیں اور نہ خارج ہوتی ہیں۔

اس سیدھی سادی حقیقت کو دیکھتے ہوئے اور صاف ستھری بات کو دیکھتے ہوئے چونکہ کوئی معقول انسان اس میں مجادلہ نہیں کر سکتا اس لئے اس کے ہوتے ہوئے ان کے موقف پر سخت تعجب کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس منطق سلیم سے پھر بھی منہ موڑتے ہیں۔ "دیکھو ہم کس طرح ان کے سامنے حقیقت کی نشانیاں واضح کرتے ہیں اور پھر ان کو دیکھو کہ یہ لوگ کدھر الٹے پھرے جا رہے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو الوہیت کا جامہ پہنانا چاہا ان کے لئے حضرت مسیح کی انسانی زندگی ہمیشہ تھکا دینے والی حقیقت رہی۔ یہ بات آپ کی تعلیمات کے بھی خلاف تھی' اس لئے یہ لوگ ہمیشہ بحث و مباحثے اور جدل و جدال میں مبتلا رہے۔ اور عیسائیوں کی اثبات میں حضرت مسیح کی لاہوتیت اور ناسوتیت ہمیشہ لاینحل مسئلہ رہی۔

اب قرآن کی منطق سلیم کو ایک دوسرے زاویے سے ملاحظہ کے لئے پیش کیا جاتا ہے اور تعجب خیر استکراہ کے ساتھ۔

(قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ؕ وَ اللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۵ : ۷۶)) "ان سے کہو' کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرتے ہو جو نہ تمہارے لئے نقصان کا اختیار رکھتا ہے' نہ نفع کا؟ حالانکہ سب کی سننے والا اور سب کچھ جاننے والا تو اللہ ہی ہے۔" یہاں قرآن کریم نے لفظ "ما" استعمال کیا ہے۔ حالانکہ یہاں مسیح کے لئے لفظ من استعمال کیا جانا چاہئے تھا' تاکہ اس میں وہ تمام مخلوقات آ جائیں جن جن چیزوں کی پوجا کی گئی۔ ان میں ذوی العقول بھی شامل ہیں۔ اور لفظ "ما" اس عام چیز کی اصل ماہیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ان معبود اشیاء کی اصل ماہیت مخلوق ہے لہٰذا ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام' روح القدس' حضرت مریم صدیقہ' سب کے سب شامل ہوں گے اس لئے کہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے یہ سب مخلوق ہیں۔ چنانچہ اس انداز تعبیر میں بھی ایک خاص اشاریت پائی جاتی ہے اور نتیجہ یہی نکلے گا کہ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی عبادت کا مستحق نہ رہے گا' جبکہ کوئی مخلوق نفع و نقصان کی مالک بھی نہ ہوگی۔

(هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۵ : ۷۶)) (وہ سننے والا اور جاننے والا ہے) یہی وجہ ہے کہ وہ نفع و نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کی پکاروں کو سنتا ہے۔ وہ بندوں کی عبادت کو دیکھتا ہے۔ وہ ان کے دلوں کے بھیدوں کو جانتا ہے۔ ان کی اس پکار و عبادت کے پیچھے جو جذبہ ہے اس کا بھی اسے علم ہے اور اللہ کے سوا جس قدر اور مخلوق ہے وہ نہ سنتی ہے' نہ جانتی ہے اور نہ قبولیت کی طاقت رکھتی ہے۔

اب اس بحث کو اس جامع دعوت کے ساتھ ختم کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضور ؐ کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اہل کتاب کے

سامنے یہ تجویز رکھیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿٧٧﴾

"کہو' اے اہل کتاب' اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کے تخیلات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور "سواء السبیل" سے بھٹک گئے ۔" حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں غلو کرنے کی وجہ ہی سے نصاریٰ کے عقائد کے اندر خرافات داخل ہوئے اور اس کے بعد جب سلطنت روما کے حکمران عیسائیت میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنی بت پرستی کو عیسائیت کے اندر داخل کر دیا۔ اس کے بعد مسائل کو حل کرنے کے لئے جو کانفرنسیں منعقد ہوئیں ان کے مندوبین نے بھی اللہ کے دین میں یہ غلط معقولات شامل کر دیئے حالانکہ حضرت مسیح کو اللہ نے جو دین دے کر بھیجا تھا اور جس کی تبلیغ آپ ؑ نے فرمائی تھی وہ بالکل صاف تھا۔ قرآن مجید میں ہے "اے بنی اسرائیل اللہ کی بندگی کرو جو میرا اور تمہارا سب کا رب ہے' بے شک جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا تو اللہ نے اس پر جنت کا داخلہ حرام کر دیا ہے۔ اس کا ٹھکانا جہنم ہے' اور ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہو گا۔"

یہ پکار بنی اسرائیل کو بچانے کی آخری کوشش ہے تاکہ وہ اختلافات' انحرافات' خواہشات نفس کے اتھاہ سمندر سے نکل آئیں' جس کے اندر وہ لوگ گر گئے جو ان سے پہلے گزرے تھے' خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی راہ حق سے بھٹکایا۔

مندرجہ بالا آیات کا یہ حصہ جو یہاں ختم ہوا اس پر ذرا دوبارہ غور کریں۔ اس کے تین حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہاں اجمالاً ان کا تذکرہ ضروری ہے۔

۱۔ یہاں حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی کے اندر اعتقادی تصورات کی درستی کے لئے کس قدر عظیم جدوجہد کی گئی ہے اور تمام اعتقادات کو خالص نظریہ توحید کی اساس پر استوار کیا گیا ہے۔ اس کو بت پرستی کی تمام ملاوٹوں سے پاک کیا گیا ہے۔ شرک کی ہوا بھی اسے لگنے نہیں دی' جس طرح اہل کتاب کے عقائد کے اندر شرک داخل ہو گیا تھا۔ اسلام نے لوگوں کو ذات باری کی حقیقت اچھی طرح سمجھائی۔ اللہ کو اپنی ذات اور اپنی صفات میں منفرد قرار دیا گیا' اور اس بات کی سختی سے نفی کی گئی کہ اللہ کی ذات اور اللہ کی صفات میں کوئی اس کا شریک ہو سکتا ہے۔ اعتقادی تصورات کی تصحیح کے اس شاندار اہتمام سے اور عقیدۂ توحید کے فیصلہ کن بیان اور توضیح سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں صحیح عقائد کی کس قدر اہمیت ہے' اور یہ کہ انسانی زندگی کی اصلاح میں درست عقائد کا کس قدر گہرا اثر ہوتا ہے۔ نیز اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اسلام نے تمام اعمال کو صحیح اعتقادات پر موقوف کیا ہے اور تمام انسانی تعلقات کو عقائد سے مربوط کر دیا گیا ہے۔

۲- دوسری یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ قرآن نے ان لوگوں کے کفر کی تصریح کر دی ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ مسیح ابن مریم اللہ ہے یا جن کا عقیدہ یہ ہے کہ مسیح ابن مریم 'تین خداؤں میں سے ایک ہے۔ اس تصریح کے بعد کسی مسلمان کے لئے جواز باقی ہی نہیں رہتا کہ وہ اہل کتاب کو دین پر سمجھے اس لئے کہ یہ لوگ ان عقاید کی وجہ سے خود اپنے دین کے بھی منکر ہوگئے ہیں۔

اسلام اگر لوگوں کو اس بات پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ جس دین پر ہیں اسے چھوڑ دیں تو اسلام یہ بھی نہیں کرتا کہ کسی ایسے شخص کو جو دین سے خارج ہو چکا ہو 'محض اسے خوش کرنے کے لئے یہ کہہ دے کہ وہ دین پر ہے اور یہ کہ اس کا دین اللہ کو مقبول ہے 'بلکہ اسلام ایسے لوگوں کے دین پر کفر کا اطلاق کرتا ہے اور کفر بھی اللہ کا دین نہیں ہو سکتا۔

۳- تیسری حقیقت جو پہلی دونوں حقیقتوں پر بطور لازمی نتیجہ مرتب ہوتی ہے یہ ہے کہ ان عقائد کے حاملین اہل کتاب اور اسلام کے بیان کردہ عقیدۂ توحید کو تسلیم کرنے والے اہل اسلام کے درمیان کوئی تعلق موالات قائم نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ایک مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ اب دین صرف وہی ہے جس کی تعلیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب یہ بات کہ تمام ادیان کے پیروکاروں کو اتحاد کرکے کفر اور الحاد کا مقابلہ کرنا چاہئے ایک لغو بات ہوگی۔ اسلامی زاویے سے اس بات کے اندر کوئی وزن نہ ہوگا۔ جب اعتقادات کے اندر اس قدر فیصلہ کن جدائی اور دوری ہو تو دونوں فریقوں کا کسی بات پر متحد ہونا ممکن نہیں ہے اس لئے کہ دنیا میں ہر چیز کا قیام نظریات پر ہوتا ہے اور اسلام اس کا داعی ہے۔ اصل چیز نظریہ اور عقیدہ ہی ہوتا ہے۔

---○○○---

آخر میں یہ بتایا جاتا ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل کا موقف کفار بنی اسرائیل کے سلسلے میں کیا رہا ہے؟ ان کی تاریخ کی ایک دوسری فصل۔ بتایا جاتا ہے کہ ذرا حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تبصرہ بنی اسرائیل کے بارے میں کیا تھا۔ اور اللہ نے بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے ان کے اس موقف کو تسلیم کر لیا۔ مزید یہ کہ ان کے اجتماعی فساد کی وجہ سے اور ان کی جانب سے اس اجتماعی فساد اور بگاڑ پر مکمل سکوت اختیار کرنے کی وجہ سے اور پھر اس وجہ سے کہ یہ لوگ کفار کے ساتھ دوستی اور موالات کرتے تھے 'اللہ نے انہیں ملعون قرار دے دیا اور یہ فیصلہ کر دیا کہ یہ لوگ جہنم میں رہیں گے۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَ
عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا
يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ تَرٰى
كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ

أَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ أَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

"بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہوگئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے' انہوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا' برا طرز عمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔ آج تم ان میں بکثرت ایسے لوگ دیکھتے ہو جو (اہل ایمان کے مقابلے میں) کفار کی حمایت و رفاقت کرتے ہیں۔ یقیناً بہت برا انجام ہے جس کی تیاری ان کے نفسوں نے ان کے لئے کی ہے' اللہ ان پر غضبناک ہوگیا ہے اور وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں۔ اگر فی الواقع یہ لوگ اللہ اور پیغمبر ؐ اور اس چیز کے ماننے والے ہوتے جو پیغمبر پر نازل ہوئی تھی تو کبھی (اہل ایمان کے مقابلے میں) کافروں کو اپنا رفیق نہ بناتے مگر ان میں سے تو بیشتر لوگ خدا کی اطاعت سے نکل چکے ہیں۔"

نظر آتا ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ 'کفر' معصیت اور لعنتی افعال سے اٹی پڑی ہے اور ان کی ہدایت اور ان کی نجات کے لئے جن انبیاء کو بھیجا گیا تھا انہی نے آخر کار ان پر لعنت کی بارش کر دی اور ان کو اللہ کی راہ ہدایت سے دھتکار دیا۔ اللہ نے بھی ان کی اس دعاء اور پکار کو قبول کر لیا۔ اور ان پر لعنت لکھ دی اور قیامت تک وہ ملعون قرار پائے۔

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر اختیار کیا' یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی کتابوں کے اندر تحریف کی۔ یہ وہی لوگ تھے جو اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلے نہ کرتے تھے جیسا کہ اس سورہ میں اور دوسرے مقامات پر قرآن مجید نے تصریح کی ہے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے اللہ کے ساتھ کیے ہوئے اس عہد کو توڑا جو ان سے اللہ نے لیا تھا کہ وہ ہر رسول پر ایمان لائیں گے اور اس کے ساتھ تعاون کریں گے اور اس کی نصرت کریں گے۔

( ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (۵:۷۸) ) "کیونکہ وہ سرکش ہوگئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے۔" بنی اسرائیل کی پوری تاریخ سرکشی اور زیادتیوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان کے تصورات' عقائد اور طرز عمل میں ہر جگہ سرکشی اور زیادتیوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور قرآن کریم نے اس کی پوری تفصیلات دی ہیں۔

سرکشی کرنا اور زیادتی کرنا بنی اسرائیل میں کوئی انفرادی فعل نہیں رہا تھا' بلکہ ان کے معاشرے کی اجتماعی روایات ہی سرکشی اور زیادتی کے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ پورے معاشرے کی یہ فطرت بن گئی تھی اور پورا معاشرہ ان برائیوں کے ارتکاب کو دیکھتا اور خاموش رہتا اور ان کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھاتا۔

(كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۵:۷۹) ) "انہوں

نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا' برا طرز عمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔" سرکشی اور ظلم ہر معاشرے میں ہوتے رہتے ہیں اس لئے کہ ہر معاشرے میں شریر' مفسد اور منحرف لوگ موجود ہوتے ہیں۔ یہ زمین کسی بھی وقت شر و فساد سے خالی نہیں رہ سکتی۔ معاشرے کے اندر ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی روش نرالی ہوتی ہے' لیکن معاشرے کا اجتماعی مزاج شر اور منکر کو برداشت نہیں کرتا اور سرکشی اور ظلم کو معاشرے کے مسلمات قرار پانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے سرکشی اور ظلم کا ارتکاب کسی بیدار معاشرے کے اندر بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح زندہ معاشروں کے اندر برائی کا ارتکاب مشکل ہوتا ہے اور معاشرہ اجتماعی طور پر شر کے خلاف ردعمل ظاہر کرتا ہے اور مجرم کو ڈر ہوتا ہے کہ اسے اجتماعی سزا ملے گی۔ ایسی صورت حال میں شر محدود ہوتی ہے اور اس کے اسباب بھی کم ہو جاتے ہیں۔ معاشرے کے اجتماعی بندھن مضبوط ہوتے ہیں اور برائی چند افراد کے اندر محدود ہوتی ہے۔ معاشرہ ان کا پیچھا کر رہا ہوتا ہے اور انہیں پھنے نہیں دیتا۔ ایسے حالات میں فحاشی اور منکر شائع نہیں ہوتے۔ پھیلتے نہیں بلکہ سکڑتے ہیں اور یہ معاشرے کے اجتماعی ضمیر اور مزاج کی وجہ سے ہوتا ہے۔

بنی اسرائیل کے اس اجتماعی منظر کو یہاں اس مکروہ شکل میں پیش کر کے اور اس پر تنقید کر کے قرآن' اسلامی نظام جماعت کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ اس کا ایک مضبوط اجتماعی وجود ہونا چاہئے اور اس وجود کے اندر اس قدر قوت دفاع ہونی چاہئے کہ وہ سرکشی اور ظلم کو برداشت ہی نہ کرے' چہ جائیکہ وہ معاشرے کی ایک عام روش ہو جائے۔ اسلامی معاشرے کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ اسے بڑی سختی سے سچائی پر قائم ہونا چاہئے اور باطل کے بارے میں سخت حساس ہونا چاہئے۔ دین کے ذمہ داران کو چاہئے کہ وہ اس امانت کی حفاظت کریں جس کے وہ امیں اور محافظ ہیں۔ اور شر' فساد' سرکشی اور ظلم کی راہ روکیں اور اس معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔ چاہے یہ شر ایسے حکام کی جانب سے ہو جن کا حکومت پر تسلط ہو یا ایسے سرمایہ داروں کی طرف سے ہو جنہوں نے دولت جمع کر کے اثر و رسوخ حاصل کر لیا ہو یا ایسے شرپسندوں کی طرف سے ہو جن کو معاشرے میں ایذا رسانی کی قوت حاصل ہو یا ایسے عوام کی جانب سے ہو جو بے راہ رو ہیں۔ اسلامی نظام بہرحال خدائی نظام ہے اور اس کے خلاف اٹھنے والے بااثر ہوں یا بے اثر ہوں وہ سب باغی تصور ہوں گے۔

اسلام اس فرض کی ادائیگی پر بہت ہی زور دیتا ہے۔ اگر معاشرے کا اجتماعی وجود کسی شر کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا تو اسلام پورے معاشرے کو مجرم گردانتا ہے۔ جس طرح ایک ایک فرد ذمہ دار ہے اسی طرح برائی کے خلاف اٹھنے کی ذمہ داری بھی پورے معاشرے پر عائد ہوتی ہے۔

امام احمد نے حضرت عبداللہ ابن مسعود کی یہ روایت نقل فرمائی ہے۔ حضور ؐ نے فرمایا "جب بنی اسرائیل نے برائیوں کا ارتکاب شروع کیا تو ان کے علماء نے انہیں منع کیا۔ وہ منع نہ ہوئے' ان علماء نے بھی ان معصیت پیشہ لوگوں کے ساتھ بیٹھنا اٹھنا اور ان کے ساتھ کھانا پینا شروع کر دیا۔ اللہ نے سب کو باہم ملا دیا۔ حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ ان پر لعنت کی اس لئے کہ یہ لوگ سرکشی کرتے تھے اور ظلم کرتے تھے۔ یہ بات کرتے وقت رسول ؐ جو تکیہ سے ٹیک لگا کر لیٹے ہوئے تھے' اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا: "نہیں' خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم ان کو حق پر سختی سے مجبور کرو گے۔"

ابوداؤد نے حضرت عبداللہ ابن مسعود کی روایت نقل کی ہے۔رسول ﷺ اللہ نے فرمایا "بنی اسرائیل میں جو پہلا نقص داخل ہوا وہ یہ تھا کہ ایک آدمی دوسرے سے ملتا تو کہتا: اے فلاں اللہ سے ڈرو اور جو کچھ تم کر رہے ہو' اسے چھوڑ دو اس لئے کہ یہ جائز نہیں ہے۔پھر دوسرے دن اسے ملتا تو اس کی یہ بری بات اسے اس بات سے نہ روکتی کہ وہ اس کا ہم نوالہ اور ہم پیالہ بنے اور اس کا ہمنشیں ہو' جب انہوں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے سب کو باہم ملا دیا۔" اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا "ملعون کر دیا اللہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا۔حضرت داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے۔" لعن سے فاسقون تک۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا "ہرگز نہیں تمہیں امر بالمعروف کرنا ہو گا اور نہی عن المنکر کرنا ہو گا اور تمہیں ظالم کا ہاتھ پکڑنا ہو گا اور تمہیں ان کو حق پر کھڑا کرنا ہو گا یا تمہیں انہیں سچائی پر مجبور کرنا ہو گا۔"

صرف امر اور نہی سے مسئلہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اصرار کرنا ہو گا کہ ظالم باز آجائیں۔ان کے ساتھ مقاطعہ کرنا ہو گا اور شر کو قوت سے مٹانا ہو گا۔فساد' معصیت اور زیادتیوں کی راہ روکنی ہو گی۔

امام مسلم نے اپنی سند کے ساتھ ابو سعید خدری کی حدیث نقل کی ہے۔حضور ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جس نے بھی منکر کو دیکھا' اسے چاہئے کہ وہ ہاتھ سے اسے روکے' اگر طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر طاقت نہ ہو تو دل میں برا جانے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔"

امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ عدی ابن عمیرہ سے نقل کیا ہے۔فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا "اللہ خاص گناہگاروں کی وجہ سے عام لوگوں کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔ہاں جب وہ اپنے درمیان برائی کو دیکھیں اور وہ اس کے خلاف احتجاج کر سکتے ہوں مگر نہ کریں۔اگر وہ ایسا کریں گے تو اللہ خاص مجرموں کی وجہ سے عام لوگوں کو بھی مبتلائے عذاب کرتے ہیں۔"

امام ترمذی نے ابو سعید سے نقل کیا ہے: "حضور ﷺ نے فرمایا! "بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق ہے۔"

قرآن و سنت کی نصوص اس مفہوم میں بکثرت وارد ہیں۔اسلامی معاشرہ ایسا ہونا چاہئے کہ اس میں صورت یہ نہ ہو کہ ایک شخص برائی دیکھے اور کہے مجھے اس سے کیا واسطہ؟ بلکہ اسلامی معاشرے کے اندر برائی کے خلاف حمیت اور جذبہ ہونا چاہئے۔جب بھی کوئی مسلمان کسی برائی کو دیکھے تو یہ نہ کہے کہ میں کیا کر سکتا ہوں بلکہ اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔وہ حدود شریعت کے حق میں اٹھ کھڑا ہو اور یہی وہ جذبہ ہوتا ہے جس پر ایک اسلامی جماعت کی اساس ہے' اس کے سوا ایک مسلم معاشرے کے وجود کا تصور ہی نہ ہو گا۔

یہ حمیت اور جذبہ قلب میں تب پیدا ہو گا جب انسان میں اللہ کے اوپر پختہ یقین پیدا ہو جائے اور اسے یہ شعور ہو کہ اس ایمان کے تقاضے کیا ہیں۔پھر اسے اسلامی نظام زندگی کا صحیح فہم حاصل ہو اور اسے یہ احساس ہو کہ اسلامی نظام زندگی ایک مکمل نظام ہے وہ اس نظریے کو سنجیدگی کے ساتھ لے اور اس کے قیام کے لئے جدوجہد شروع کر دے۔اسلامی معاشرہ ہوتا ہی وہ ہے جس میں قانون کا ماخذ شریعت الہی ہو۔اس کی اٹھان اسلامی منہاج پر ہو' اور یہ معاشرہ ایک مسلمان کو اس بات کا موقع دیتا ہو کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر سکے۔یہ اس کا انفرادی عمل نہ ہو کہ وہ اصلاح کی لہریں اٹھائے اور سمندر کے اندر گم ہو جائیں۔حالات ایسے نہ ہوں کہ ایک مسلمان سرے سے اصلاح کر ہی نہ سکے' جیسا کہ آج

کل عالم اسلام کے اکثر اوطان میں صورت حال ایسی ہے کہ انفرادی طور پر بھی کوئی امر بالمعروف کا فریضہ ادا نہیں کر سکتا کیونکہ عالم اسلام کا اجتماعی نظام اس اصول پر قائم ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے معاملات میں دخل ہی نہیں دے سکتا اور اسلامی معاشروں میں فسق وفجور اور اللہ کی معصیت کو لوگوں کے شخصی معاملات سمجھتا ہے۔ کوئی کسی کے کام میں دخل نہیں دے سکتا بلکہ اسلامی معاشروں میں ظلم 'مار دھاڑ' سرکشی اور زیادتی اس قدر طاقتور ہیں کہ ڈر کے مارے لوگوں کے منہ بالکل بند ہیں۔ زبانوں پر تالے لگے ہوئے ہیں اور جو شخص بھی برائی کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اس پر مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ حقیقی جدوجہد اور بھاری قربانیاں اس امر کے لئے دینی چاہئیں کہ ایک فلاحی اور خیرپسند معاشرہ قائم ہو اور فلاح اور خیر پر مشتمل معاشرہ صرف اسلامی نظام کے زیر سایہ ہی قائم ہو سکتا ہے اور یہ نیک معاشرہ دوسری جزوی اصلاحات اور شخصی بھلائی کے معاملات سے بھی پہلے بذریعہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قائم ہونا چاہئے۔

اگر پورا معاشرہ گندہ ہو تو کسی فرد کو ستھرا نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ جاہلیت کی سرکشی غالب ہو اور معاشرے کا اجتماعی ڈھانچہ جاہلیت پر قائم ہو۔ اس میں قانون شریعت نافذ نہ ہو' تو ایسے حالات میں ابتدائی کام شروع کرنا چاہئے اور نیکی کو جڑوں سے اٹھنا چاہئے اور وہ اس طرح ممکن ہے کہ کسی خطے میں اسلامی سلطنت قائم ہو اور جب یہ اقتدار قائم ہو جائے تو پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام بنیاد سے شروع ہو گا۔

یہ تمام امور پختہ ایمان کے متقاضی ہیں اور اس بات کے محتاج ہیں کہ نظام زندگی کی تبدیلی میں عزم ویقین کا کام شروع کیا جائے۔ جب ایمان کامل ہو گا تو اللہ پر اعتماد ہو گا۔ اور جب اللہ پر اعتماد ہو گا تو راستہ جس قدر طویل ہو' پرواہ نہ ہو گی اور انسان اپنے اجر کا امیدوار اللہ سے ہو گا۔ پھر یہ مومن اس شخص کا انتظار نہیں کرتا جو اس دنیا میں بھی کچھ چاہتا ہے۔ نہ مومن گمراہ معاشرے کو خاطر میں لاتا ہے اور نہ وہ اہل جاہلیت سے کوئی نصرت طلب کرتا ہے۔

وہ تمام نصوص قرآنی اور احادیث نبوی جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں وارد ہیں وہ ایک اسلامی معاشرے میں ایک مسلم کے فرائض کا تعین کرتی ہیں۔ وہ معاشرہ جس نے اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے اصول کو تسلیم کر لیا ہوتا ہے' جس میں اللہ کی شریعت نافذ ہو چکی ہوتی ہے' اگرچہ اس میں حکومت ظالمانہ ہو' اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ گناہ پھیل جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "افضل جہاد ظالم سلطان کے سامنے کلمہ حق ہے۔ امام جائر بہرحال امام ہوتا ہے اور جب تک یہ ظالم بادشاہ بھی اللہ کی حاکمیت کو تسلیم نہ کرے وہ امام بن ہی نہیں سکتا۔ جب تک وہ شریعت قائم نہ کرے وہ امام نہیں ہے۔ وہ تو کچھ اور ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ( وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ) "جس نے اس قانون کے مطابق فیصلے نہ کیے تو ایسے لوگ ہی کافر ہیں۔" جاہلی معاشرے وہ ہوتے ہیں جو شرعی قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں۔ جاہلی معاشروں کے اندر ہونے والا بڑا منکر' جس سے تمام منکرات پیدا ہوتے ہیں وہ یہی منکر ہے جس کی رو سے اللہ کے حق حاکمیت کو مسترد کیا ہوا ہوتا ہے اور اللہ کی شریعت کے قانون کو نافذ نہیں کیا جاتا۔ اب اگر ایسے معاشرے سے واسطہ ہے تو اہل ایمان کو سب سے پہلے اس عظیم منکر کا قلع قمع کرنا چاہئے کیونکہ یہ ایک بنیادی منکر ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اس کے خلاف نکیر کریں اور دوسرے جزوی منکرات میں وقت ضائع نہ کریں جو اس بڑے منکر کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں۔ وہ تو اس کے فروعات ہیں اور ان کا وجود ہی اس بڑے منکر کا مرہون منت ہے۔

اس میں کوئی فائدہ نہ ہو گا کہ ہم اپنی قوتیں ان جزوی منکرات کے خلاف جدوجہد میں ضائع کریں۔ بہت سے نیک فطرت اور صالح لوگ ان جزوی منکرات کے خلاف جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں' حالانکہ یہ منکرات اس منکر اکبر کی پیداوار ہیں۔ وہ منکر یہ ہے کہ لوگ اللہ کے حقوق پر دست درازی کر کے اللہ کے حق حاکمیت کو سلب کرتے ہیں' اور اللہ کی شریعت کا انکار کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں اپنی قوتیں ان جزوی منکرات کے ازالے میں ضائع نہیں کرنا چاہئیں' جو اس منکر اول یعنی طاغوتی اقتدار اعلیٰ کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک اور بحث نہیں ہے کہ یہ اسی کا نتیجہ ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک طاغوتی معاشرے میں جب ہم لوگوں کو نہی عن المنکر کرتے ہوئے کہیں کہ یہ برا کام ہے' ایسا مت کرو' تو ہمارے سامنے معیار اور پیمانہ کیا ہو گا۔ مثلاً ایک اسلامی آدمی کہے کہ یہ منکر ہے اور ادھر ادھر سے دس افراد اٹھ کھڑے ہو جائیں گے اور کہیں گے ہرگز نہیں' یہ تو برا کام نہیں ہے۔ ہاں پرانے زمانے کی باتیں کرتے ہوئے' یہ بات کبھی ایسی تھی۔ اب دنیا بدل گئی ہے۔ معاشرہ ترقی کر گیا ہے اور اب اقدار بدل گئی ہیں۔

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ایک پیمانہ ہو اور تمام لوگ اچھائی اور برائی کو اس کے مطابق جانچیں۔ اب یہ پیمانہ اور یہ اقدار ہم کہاں سے اخذ کریں۔ یہ میزان اور معیار کہاں سے لائیں؟ کیا لوگوں کے اندازے' لوگ کے رواج' ان کی خواہشات پیمانہ حسن و قبح قرار پائیں۔ یہ چیزیں تو بدلتی رہتی ہیں۔ اس طرح تو ہم ایک ایسے صحرا میں داخل ہو جائیں گے جس میں کوئی راہنما نہ ہو گا اور ایسے سمندر میں داخل ہوں گے جو بے کنار ہو گا۔

لہٰذا میزان عدل کا قیام پہلے ضروری ہے۔ اس میزان اور پیمانے کو مستقل ہونا چاہئے جو لوگوں کی خواہشات کے مطابق بدلتا ہوا نہ ہو۔ اور یہ ہے اللہ کا ترازو' مستقل اور دائمی۔

اب اگر کوئی معاشرہ سرے سے اللہ کے میزان ہی کو تسلیم نہیں کرتا تو ...... جب لوگ اپنے فیصلے شریعت کے مطابق ہی نہیں کرتے تو ...... بلکہ صورت یہ ہو کہ جو شخص اسلامی نظام کا داعی ہو' اس پر ظلم ہو رہا ہو' اس سے انتقام لیا جا رہا ہو' اس کے ساتھ تمسخر اور مزاح ہو رہا ہو تو ...... کیا ایسے حالات میں جزوی اصلاح کی جدوجہد ضائع نہ ہو گی محض مذاق ہو کر نہ رہ جائے گی' کیا فائدہ ہو گا کہ تم ایسے معاشرے میں اٹھو اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو اور بعض جزئیات کی اصلاح کے لئے انجمن بنا کر جدوجہد شروع کر دو جن کے تولنے کے بارے میں لوگوں کے پیمانے اور میزان مختلف ہوں جن کے اندر لوگ مختلف الرائے ہوں' ہر شخص اپنی خواہشات کے مطابق راہ لینے میں آزاد ہو۔

لہٰذا ضروری ہے کہ اصولاً ایک جج پر اتفاق ہو' ایک پیمانے پر اتفاق ہو' ایک مقتدر اعلیٰ اور حاکم پر اتفاق ہو' اس فورم پر اتفاق ہو جو فیصلہ کرے گا اور اختلاف رائے کی صورت میں اس کا جو فیصلہ ہو اور اسے تسلیم کیا جائے۔

یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے معروف اکبر کو قائم کیا جائے اور معروف اکبر یہ ہے کہ اللہ کے حق حاکمیت کو تسلیم کرایا جائے اور اسلامی نظام حیات کے نفاذ کی جدوجہد کی جائے۔ سب سے پہلے نہی عن المنکر الاکبر کیا جائے اور منکر اکبر یہ ہے کہ اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا انکار ہو رہا ہو۔ اللہ کی شریعت متروک ہو۔ اس اساس کو استوار کر کے ہی صالح معاشرے کی تعمیر ممکن ہے۔ اس کے بعد پھر ہر طرف سے اصلاح معاشرہ کی کوششیں شروع کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام کوششوں کو مجتمع کر لیا جائے' ان کو ایک سمت میں لگا دیا جائے اور اس اساس کو قائم کیا جائے یعنی اسلامی نظام حکومت۔

بعض اوقات انسان دیکھتا ہے کہ بہت ہی اچھے لوگ' نہایت ہی عظیم جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں اور وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں۔ لیکن فروعی منکرات میں۔ جبکہ وہ اساس جس پر اسلامی معاشرہ کی تعمیر ہوتی ہے اور جس کے اوپر امر بالمعروف و نہی عن المنکر قائم ہوتا ہے وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوتی ہے۔

کیا فائدہ ہو گا کہ ہم ایک ایسے معاشرے میں لوگوں کو زنا سے روکیں جو زنا کو سرے سے جرم ہی تصور نہیں کرتا۔ صرف جبری مباشرت کو جرم تصور کرتا ہے' اور جبری مباشرت میں بھی شریعت کے مطابق سزا نہیں دیتا اس لئے کہ وہ اللہ کی حاکمیت کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ نہ وہ شریعت کو نظام زندگی تسلیم کرتا ہے۔

کیا فائدہ ہے کہ لوگوں کو شراب نوشی سے منع کیا جائے اور ایک ایسے معاشرے میں جس میں شراب نوشی جائز ہو۔ صرف وہ شراب نوشی ممنوع ہو جو شارع عام پر کی جائے۔ اس پر بھی حد جاری نہ ہوتی ہو' اس لئے کہ معاشرہ ایسی حدود کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔

کیا فائدہ ہے کہ ہم لوگوں کو اسلام کے خلاف لعن طعن کرنے سے روکیں ایک ایسے معاشرے میں جس میں اللہ کی حکومت کا اعتراف نہ ہو' جس میں اللہ کی بندگی نہ ہوتی ہو' بلکہ اس میں انسانوں کو رب بنایا گیا ہو۔ انسان لوگوں کے لئے پارلیمنٹ سے قانون نازل کرتے ہوں' لوگوں کے لئے نظام زندگی اور زندگی کے طور طریقے وضع کرتے ہوں' ان کے لئے اقدار حیات اور حسن و قبح کے پیمانے وضع کرتے ہوں اور گالیاں دینے والا اور جسے گالیاں دی جا رہی ہیں وہ دونوں اللہ کے دین سے خارج ہوں۔

حالات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فائدہ کیا ہو گا؟ صغائر تو صغائر میں کہتا ہوں ان کبائر سے روکنے کا فائدہ کیا ہو گا؟ جبکہ اکبر الکبائر سے کوئی کسی کو نہ روکتا ہو' کفر عام ہو اور اللہ کی شریعت اور نظام زندگی متروک ہو۔

یہ معاملہ اس سے بہت برا اور بہت ہی اہم ہے۔ یہ نیک لوگ جو سعی اور جہد کر رہے ہیں اس سے یہ بہت ہی بڑا ہے۔ یہ ایسا مرحلہ نہیں ہے جس کے اندر ہم فروعی معاملات اور جزوی اصلاحات کے اندر اپنی قوتیں ضائع کریں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر جزوی معاملات نہ ہوں بڑے معاملات ہوں بلکہ حدود اللہ کیوں نہ ہوں لیکن حدود اللہ بھی تب قائم ہوں گی کہ ہم اللہ کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کا اعتراف کر لیں اور یہ مسئلہ طے ہو جائے کہ اقتدار اعلیٰ اللہ کا ہو گا۔ اللہ کے سوا کسی کو حق حاکمیت حاصل نہ ہو گا۔ جب تک یہ اعتراف حقیقت واقعیہ نہیں بن جاتا' جب تک شریعت کو ماخذ قانون قرار نہیں دے دیا جاتا' جب تک اللہ کی ربوبیت اور اللہ کی حاکمیت حکومت اور قوت کے ماخذ نہ بن جائیں تو فروعات کے اندر تمام کوششیں اور تمام انفرادی مساعی ضائع ہوں گی اور ہوتی رہیں گی۔ مناسب یہی ہے کہ ہم سب سے پہلے منکر اکبر کے خلاف جدوجہد شروع کر دیں اور تمام دوسرے منکرات کو بعد میں لیں۔

حضور ؐ کا فرمان یہ ہے کہ جو بھی تم میں سے کسی منکر کو پائے تو اسے چاہئے کہ وہ اسے ہاتھ سے روکے اگر طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اس کی بھی طاقت نہ ہو' دل سے برا جانے اور یہ ضعیف الایمان کا درجہ ہے۔

اہل دین پر ایسا وقت بھی آتا ہے کہ وہ منکر کو ہاتھ سے نہیں روک سکتے۔ وہ زبان و قلم سے بھی منکر کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد اضعف الایمان کا درجہ ہی رہ جاتا ہے۔ دل سے برا جاننا۔ دل کی دنیا میں تو کوئی مداخلت کر ہی نہیں سکتا۔ اس لئے دل کی دنیا والے ہمیشہ اضعف الایمان کے درجے میں ہوتے ہیں' یعنی برائی کو دل سے برا

جانتا۔اگر وہ سچے مسلمان ہوں اور دل سے برائی کو برا سمجھتے ہیں۔

یہ کوئی منفی موقف نہیں ہے جو کوئی برائی کے خلاف اختیار کرے گا۔جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے۔حضور ؐ نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے وہ مثبت انداز ہے۔مثلاً دل سے برائی کو برا سمجھنا ہی دل کی جانب سے ایک مثبت کام ہے۔مثلاً دل اسے برا سمجھتا ہے' اس سے نفرت کرتا ہے اور منکر کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا۔اور دل و دماغ ایسی صورت حال کو جائز قانونی صورت نہیں سمجھتے۔اور جب دل و دماغ کسی صورت حال کو تسلیم نہیں کرتے تو یہ بھی درحقیقت اس صورت حالات کو ختم کرنے کی طرف ایک مثبت اقدام ہوتا ہے۔دل میں یہ عزم ہوتا ہے کہ جب بھی فرصت ملے گی اس منکر صورت حال کی جگہ معروف صورت حال کو قائم کر دیا جائے گا اور ایسا شخص انتظار میں بیٹھا ہو گا کہ کس وقت وہ منکر پر حملہ آور ہو اور یہ تمام کام ایجابی اور مثبت کام ہیں اگرچہ یہ ایک ضعیف درجہ ہے۔کسی برے وقت میں ایک مسلمان کے لئے یہ بھی کیا کم ہے کہ وہ اس درجے پر قائم رہے۔کم ازکم وہ منکر کے سامنے ہتھیار تو نہیں ڈالتا کہ منکر ایک واقعہ ہے اسے مان ہی لو۔اور بعض اوقات جب احساس زیاں ختم ہو جاتا ہے تو انسان اضعف الایمان کے مقام سے بھی گر جاتا ہے......... اور پھر کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ بنی اسرائیل کی طرح پورا معاشرہ لعنت کا مستحق ہو جاتا ہے اور اللہ کا یہ قول ان پر صادق آتا ہے

"بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہوگئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے۔انہوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔

---ooo---

اب اس سے آگے بھی بات بنی اسرائیل ہی کی چلتی ہے اور اس پر ہمارے اس پارے کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔حضور ؐ کے دور میں ان کے جو شب و روز تھے وہ بتائے جاتے ہیں۔کم و بیش ہر دور میں ان کے حالات ایسے ہی رہے ہیں۔ان لوگوں نے ہمیشہ اہل اسلام اور جماعت مسلمہ کے خلاف کفار اور بت پرستوں کے ساتھ ایکا کیا اور اس کا سبب یہ ہے' باوجود اس کے کہ وہ اہل کتاب ہیں' وہ اللہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے۔چونکہ وہ اس آخری دین میں داخل نہیں ہوئے وہ مومن نہیں ہیں۔اگر یہ مومن ہوتے تو کافروں کے ساتھ تعلق موالات قائم نہ کرتے۔

(تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ (۸۰) وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۸۱)

"آج تم ان میں بکثرت ایسے لوگ دیکھتے ہو جو (اہل ایمان کے مقابلے میں) کفار کی حمایت و رفاقت کرتے ہیں۔یقیناً بہت برا انجام ہے جس کی تیاری ان کے نفسوں نے ان کے لئے کی ہے' اللہ ان پر غضبناک ہو گیا ہے اور وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں۔اگر فی الواقعہ یہ لوگ اللہ اور پیغمبر ؐ اور اس چیز کے ماننے والے ہوتے جو پیغمبر پر

نازل ہوئی تھی تو کبھی (اہل ایمان کے مقابلے میں) کافروں کو اپنا رفیق نہ بناتے مگر ان میں سے تو بیشتر لوگ خدا کی اطاعت سے نکل چکے ہیں۔

"تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کے لئے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرور نفس نہیں ہے۔"

یہ بات جس طرح حضور اکرم ؐ کے دور میں یہودیوں پر منطبق ہوتی تھی اسی طرح آج کے یہودیوں پر بھی منطبق ہے اور کل بھی ہوگی۔ ہر دور میں اہل کتاب یہودی اور عیسائی جو دنیا کے اطراف و اکناف میں پھیلے ہوئے ہیں' ایسے ہی رہیں گے۔اس سے ہمیں یہ نصیحت ملتی ہے کہ ہم قرآن کریم کے اسرار و رموز پر غور کریں۔ قرآن کریم میں امت مسلمہ کے لئے عجیب ہدایات موجود ہیں اور اسلامی تحریک کو چاہئے کہ وہ ہروقت قرآن سے ہدایات اور پالیسیاں اخذ کرے۔

یہودی مشرکین کے ساتھ' اس دور میں تعلق موالات قائم کئے ہوئے تھے۔ ان کو مسلمانوں کے خلاف جمع کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ کفار اور مشرکین ان مسلمانوں سے زیادہ سیدھی راہ پر ہیں۔جیسا کہ قرآن کریم نے اس کی صراحت کی ہے' اور اس کا اظہار غزوہ احزاب میں اچھی طرح ہو گیا تھا۔اس غزوہ سے پہلے اور بعد میں بھی وہ اسی پالیسی پر گامزن رہے اور آج تک وہ اسی موقف پر قائم ہیں۔فلسطین میں اسرائیل کا قیام ہی ان جدید ملحدین اور کفار کی مساعی سے ہوا ہے۔

رہے عیسائی تو ان کا حال یہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں کا معاملہ پیش آتا ہے تو عیسائی مشرکین کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بت پرستوں کے حامی و مددگار ہوتے ہیں۔جب بھی مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان کوئی معرکہ پیش آیا۔ان لوگوں کا دلی بغض اسلام کے خلاف کھل کر سامنے آگیا اور اب تک قائم و دائم ہے۔ اگرچہ معاملہ ان لوگوں کا ہو جو نام نہاد مسلمان ہوں۔کیا سچ کہا اللہ تعالیٰ نے' (تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۵: ۸۰)

"تم ان میں سے بکثرت ایسے لوگ دیکھتے ہو جو کفار کی حمایت و رفاقت کرتے ہیں۔"

(لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ

(۵: ۸۰) "یقیناً بہت برا انجام ہے جس کی تیاری ان کے نفسوں نے ان کے لئے کی ہے۔اللہ ان پر غضبناک ہو گیا ہے اور وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں۔"

یہ وہ کمائی ہے جو انہوں نے کی ہے اور وہ اللہ کا غضب ہے جو ان کے لئے جمع ہو رہا ہے اور نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ دائماً جہنم میں رہیں گے اور یہ کس قدر برا انجام ہے۔کس قدر برا اپس انداز ہے جو یہ کر رہے ہیں۔کس قدر تلخ پھل ہے۔کفار کے ساتھ تعلق موالات کا ہے یہ پھل!

کیا ہم مسلمان اللہ کی اس بات کو نہیں سن رہے؟ کیا ہمیں باز نہیں آنا چاہئے ان اقدامات سے جو ہم مسلسل کر رہے ہیں اور اللہ نے ان کی اجازت نہیں دی ہے۔پھر بھی ہم مسلمان، اہل کتاب دشمنوں کے ساتھ تعلق موالات کے بارے میں سوچتے ہیں یا متحدہ محاذ بناتے ہیں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ سبب تو یہی ہے کہ اللہ اور رسول پر ایمان نہیں ہے۔

(وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ أَوْلِيَاءَ وَلَٰكِنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ (۵: ۸۱)) "اگر فی الواقعہ یہ لوگ اللہ اور پیغمبرؐ اور اس چیز کے ماننے والے ہوتے جو پیغمبر پر نازل ہوئی تھی تو کبھی (اہل ایمان کے مقابلے میں) کافروں کو اپنا رفیق نہ بناتے مگر ان میں سے تو بیشتر لوگ خدا کی اطاعت سے نکل چکے ہیں۔"

یہ ہے اصل سبب کہ وہ اللہ اور نبی آخر الزمان پر ایمان نہیں لائے۔ ان کی اکثریت فسق و فجور میں مبتلا ہے۔ یہ اپنے شعور اور اپنے رخ کے اعتبار سے کفار کے ہم جنس ہیں۔ اس لئے یہ لوگ کفار کے دوست ہو گئے ہیں اور اہل ایمان سے دوستی نہیں کرتے۔

اس قرآنی تبصرے سے ہمیں تین حقائق واضح طور پر ملتے ہیں۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ اہل کتاب سب کے سب ' ماسوائے ان کے جو حضرت محمدؐ پر ایمان لائے ' مومن نہیں ہیں اس لئے کہ وہ رسول آخر الزمان پر ایمان نہیں لائے۔ قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ وہ نبی پر ایمان نہیں لائے بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ خدا پر بھی ایمان لانے والے نہیں ہیں اس لئے کہ "اگر یہ لوگ خدا اور نبی پر ایمان لائے ہوتے تو ان کافروں کے ساتھ دوستی و محبت نہ کرتے۔" یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اس میں تاویل کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ چاہے زبانی طور پر اہل کتاب جس قدر دعوائے ایمان کریں۔ اور اگر ہم خدا تعالیٰ کے بارے میں ان کے منحرف اور فاسد عقائد و تصورات پر بھی غور کریں جن کی تفسیر ہم نے اسی سبق میں ابھی ابھی دی ہے تو ان کے اندر اللہ پر بھی ایمان نہیں ہے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ تمام اہل کتاب کو اسلام دعوت دیتا ہے کہ وہ اسلام میں داخل ہوں۔ اور یہ دعوت انہیں حضرت محمدؐ کی زبان سے دی گئی ہے۔ اگر وہ اس دعوت کو قبول کریں تو مومن ہیں ورنہ نہیں ہیں۔

اور تیسری حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ اہل اسلام اور اہل کتاب کے درمیان موالات اور دوستی کا تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ اور یہ تعلق کسی بھی معاملے میں نہیں ہو سکتا اس لئے کہ مسلمان کے تمام حالات زندگی دین کے تابع ہوتے ہیں اور یہ لوگ دین اسلام کے دشمن ہیں۔

رہی یہ بات کہ اسلام اہل کتاب کے ساتھ حسن معاشرت اور اچھا طرز عمل اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے' ان کے جان و مال اور ان کی عزت و آبرو کی حفاظت کا حکم دیتا ہے جب تک وہ دار الاسلام میں ہوں اور یہ کہ وہ ان کو اجازت دیتا ہے کہ ان کے جو عقائد ہیں وہ ان پر قائم رہیں اور یہ کہ ان کو حکمت اور حسن ادا کے ساتھ اسلام کی طرف دعوت دی جائے اور ان سے بحث و مباحثہ بھی اچھی طرح ہو جب تک وہ اسلامی ریاست کے وفادار رہیں اور یہ کہ ان کو کسی حال میں بھی اپنے عقائد کو ترک کرنے کا حکم نہ دیا جائے تو یہ اسلام کی وہ پالیسی ہے جو اسلام نے دار الاسلام میں رہنے والی تمام اقلیتوں کے لئے وضع کی ہے۔ یہ ہے اسلام ' بات واضح اور صاف ہے۔ اسلام نیکی چاہتا ہے۔ رواداری کو رائج کرتا ہے اور بات دوٹوک کرتا ہے کیونکہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اللہ صحیح راہ دکھانے والا ہے۔

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَ

الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کے لئے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے کہا تھا کہ ہم نصاری ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرور نفس نہیں ہے۔

منصورہ ۷ ۲ دسمبر ۱۹۸۹' ۱۲ بجے دن

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ------- ۷

## سورہ المائدہ ------ آخری حصہ

آیت نمبر ۸۳ --- تا --- ۱۲۰

## سورہ الانعام ------ ابتدائی حصہ

آیت نمبر ۱ --- تا --- ۱۱۰

# سورہ المائدہ کا آخری حصہ ایک نظر میں

اس پارے میں سورۂ مائدہ کا بقیہ حصہ ہے' اس کے ابتدائی حصوں کے بارے میں تفصیلات پارۂ ششم میں گزر چکی ہیں۔ نیز اس میں سورۂ انعام کے آغاز سے لے کر آیت (وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ) تک کا حصہ بھی مذکور ہے' جس کے بارے میں تفصیلی بحث سورہ انعام کے آغاز میں ہو گی۔ یہاں صرف اس حصے پہ تبصرہ کیا جا رہا ہے جو سورہ مائدہ سے رہ گیا تھا۔

پارہ ششم میں اس سورہ کے تعارف میں ہم نے کہا تھا:

"اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر اس لئے نازل فرمایا کہ اس کے ذریعے وہ ایک امت کو برپا کریں' وہ امت ایک مملکت کی بنیاد رکھے' ایک معاشرے کو منظم کرے اور یہ مملکت لوگوں کے ضمیر' ان کے اخلاق سنوارے اور ان کی عقلی تربیت کرے۔ اس قرآن کے ذریعے اس معاشرے کے اجتماعی تعلقات کے حدود و قیود وضع ہوں اور اس مملکت کے اندر لوگوں کے تعلقات بھی منضبط ہوں اور پھر دوسرے ممالک کے ساتھ بھی اس مملکت کے تعلقات استوار ہوں۔ اس امت کے تعلقات دوسری امتوں اور ملتوں کے ساتھ قائم ہوں۔ قرآن اس تمام پوری امت کو ایک مضبوط رسی کے اندر باندھ دے' اس کے متفرق اجزاء کو جمع کر دے' اس کے فرقوں کو جمع کر دے اور اسے ایک مضبوط محور کے اندر پختہ کر دے' اسے اللہ کی اس بادشاہت کے اندر لے آئے اور اس کا رخ ایک سمت میں ہو جائے۔ یہ ہے دین اسلام جیسا کہ درحقیقت وہ اللہ کے نزدیک ایسا ہی ہے اور جسے مسلمانوں نے ایسا ہی سمجھا جب وہ صحیح مسلمان ہوا کرتے تھے۔

جیسا کہ سابقہ تین طویل سورتوں میں ہم نے دیکھا اس سورہ میں بھی مختلف موضوعات کو لیا گیا ہے۔ ان تمام موضوعات کے درمیان قدر مشترک کیا چیز ہے؟ وہی جس کے حصول کے لئے اس دنیا میں پیغام اسلام کی ضرورت محسوس کی گئی۔ یعنی ایک امت کی تشکیل' ایک مملکت کا قیام اور ایک مثالی اسلامی معاشرے کا قیام۔ اس معاشرے کا قیام بھی ایک خاص نظریہ کے مطابق' ایک خاص تصور حیات کی روشنی میں اور بالکل جدید انداز میں مطلوب تھا۔ اس معاشرے کی روح عقیدۂ توحید تھی۔ عقیدۂ توحید اس کا پہلا اصول قرار پایا اور عقیدۂ توحید کے اہم عناصر یہ ہیں کہ الٰہ اور حاکم فقط اللہ ہے' وہی اس کائنات کا تھامنے والا ہے۔ اسی کا حکم چلتا ہے' زندگی گزارنے کے طریقے صرف اسی سے اخذ کئے جا سکتے ہیں' وہی شارع ہے' وہی زندگی کی اعلیٰ قدریں متعین کرنے کا حق رکھتا ہے اور حسن و قبح کے پیمانے صرف وہی متعین کر سکتا ہے۔"

"اس سورہ میں اعتقادی افکار کی توضیح کی گئی ہے اور اسے بت پرستانہ خرافات اور انحرافات سے پاک کیا گیا ہے۔ نیز اہل کتاب نے جو تحریفات کیں انہیں بھی دور کیا گیا ہے اور جماعت مسلمہ کے سامنے خود اس کا اپنا تعارف پیش کیا گیا ہے

کہ اس کی حقیقت کیا ہے' اس کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے' اور اس کے راستے میں جو کانٹے ہیں اور جو جال بچھے ہوئے ہیں ان سے بچنے کا کیا طریقہ ہے۔ کہاں کہاں اس دین کے دشمن گھات لگائے بیٹھے ہیں اور کہاں کہاں پھسلن ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ' اس سورہ میں عبادات اسلام اور شعائر اسلام بھی بتائے گئے ہیں جن کے ذریعے ایک مسلم کی روح پاک ہو جاتی ہے اور اس کا رابطہ اس کے رب کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ نیز اعتقادات و عبادات کے ساتھ ساتھ اس میں اجتماعی روابط' حکومت کے لئے قانون سازی اور پھر دوسری حکومتوں کے ساتھ اسلامی حکومت کے تعلقات کے اصول بھی بتائے گئے ہیں۔ نیز اسلامی معاشرے میں حلال و حرام کا بھی ذکر ہے کہ مسلمانوں کے لئے کن چیزوں کا کھانا حرام ہے' کن مشروبات کا پینا حرام ہے اور کن عورتوں سے نکاح حرام ہے۔ کیا کیا اعمال برے ہیں اور کیا کیا طرز ہائے عمل غیر اسلامی ہیں۔ غرضیکہ یہ سورہ ایک مکمل گٹھڑی ہے جس کے اندر' یہ تمام امور ایک ہی جگہ آ گئے ہیں اور یہ گٹھڑی مجموعہ دین ہے۔ اسی نقطہ نظر سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ دین ان تمام امور پر مشتمل ہے۔"

اس سورہ کی نوعیت اور اس کے مشمولات و موضوعات کی اس عام تصویر کشی کی روشنی میں ہم اس کے اس بقیہ حصے کا بھی بڑی خوبی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اس حصے میں بھی وہ مباحث اور موضوعات یا ان کے ساتھ ملتی جلتی بحثیں موجود ہیں جن کی تفصیلات پارہ ششم میں گزر چکی ہیں۔

امت مسلمہ کی مخالفت کرنے والے عناصر بعض دوسرے کیمپوں کا تعارف ان مباحث میں کرایا گیا ہے' جن کے بارے میں وہاں اشارات رہ گئے تھے۔ یہ بات نہایت ہی تعجب خیز ہے کہ یہ وہی کیمپ ہیں جو ہمیشہ تحریک اسلامی یا احیائے اسلام کی تحریکات کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس تحریک کے دشمنوں کے رنگ مختلف ہیں لیکن اصل کینہ ایک ہی ہے جو ان کے دلوں میں جاگزین ہے۔ نیز ان میں ایک نہایت ہی قلیل تعداد ہدایت کے طالب لوگوں بھی ہے' مثلاً بعض عیسائی گروہ' جو ہدایت قبول کر رہے ہیں اور جب اس وقت حضور کی جانب سے انہوں نے یہ دعوت پرسوز سنی تو ان کے دل پگھل گئے اور انہوں نے لبیک کہہ کر اپنے آپ کو ثواب آخرت اور جنت کا مستحق کر لیا۔

ان باقی مباحث میں سے ایک بحث یہ بھی ہے کہ حلال و حرام کے موضوع پر قانون سازی کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے اور اہل ایمان کے لئے سخت ممانعت ہے کہ وہ اس موضوع پر اللہ تعالیٰ کے حق اقتدار اور قانون سازی پر دست درازی کریں۔ اہل ایمان کو خدا کا خوف کرنا چاہئے کیونکہ یہ معاملہ ایمان و کفر کا ہے اور انہوں نے ایمان لانے کا اعلان تو کر ہی دیا ہے۔

اس کے علاوہ قسموں' جوے' شراب' پانسوں' بتوں اور حالت احرام کے اندر شکار جیسے قانونی اور فقہی احکام' خانہ کعبہ' حرام مہینوں' ہدی اور وہ جانور جن کے گلوں میں پٹے ڈالے ہوئے ہوتے ہیں بطور علامت' قربانی کی بابت مسائل نیز اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ شرعی احکام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے دی جانے والی ہدایات کی پیروی کی تاکید اور خدا اور رسول کی مخالفت سے ڈرانے کے مضامین بھی دیئے گئے ہیں اور تنبیہ کی گئی ہے کہ اللہ کے عذاب اور اس کے انتقام سے ڈرو اور ہروقت اس ذات باری کو پیش نظر رکھو جس کے پاس تم نے لوٹ کر جانا ہے۔

اس کے بعد جماعت مسلمہ کی تربیت کے بعض پہلو بھی لئے گئے ہیں' وہ اقدار جن کے مطابق اس نے پوری دنیا کے ساتھ معاملہ کرنا ہے' مثلاً یہ کہ خبیث چیزوں کی کثرت سے انہیں متاثر نہ ہونا چاہئے۔ انہیں یہ دیکھنا چاہئے کہ پاک اور طیب چیزیں ہمیشہ کم ہوتی ہیں۔ نیز ان اقدار اور آداب میں سے اہم ادب یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ اور رسول اللہ سے ہر بات کے بارے میں نہ پوچھا جائے اور اگر خدا تعالیٰ نے کسی بات کو مجمل چھوڑ دیا ہے تو اہل ایمان کو اس کے بارے میں پوچھنے سے گریز کرنا چاہئے۔

اس حصے میں یہ اعلان بھی کیا گیا ہے کہ جاہلیت کی عادات اور رسوم کو باطل قرار دے دیا گیا ہے۔ بت پرستی کی ممانعت کر دی گئی ہے اور بعض قسم کے جانوروں اور ذبیحوں کے حوالے سے جو شرک اور بت پرستی باقی ہے اسے ختم ہونا چاہئے۔ مثلاً بحیرہ' سائبہ' وصیلہ' اور حام وغیرہ اور یہ کہ حلال و حرام کے تعین کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ پوری زندگی کے لئے قانون سازی کا اختیار اللہ کو حاصل ہے اور کوئی قانون سازی لوگوں کے رواج اور لوگوں کی اصلاحات کے مطابق نہیں ہو سکتی۔ یہ کام صرف اللہ کا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کو تنبیہ کی گئی کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے۔ اس کے افراد کے اندر باہم مکمل تکافل ہو اور وہ دوسرے لوگوں سے مکمل طور پر جدا اور کٹے ہوئے ہوں۔ اسے اپنی مخصوص ذمہ داریوں کو ادا کرنا چاہئے اور دوسرے اہل باطل کی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو مکمل طور پر بری الذمہ رکھنا چاہئے۔ اور اپنے انجام اور دوسرے لوگوں کے انجام کو بھی مکمل طور پر اللہ کے حوالے کر دینا چاہئے' جس کا فیصلہ قیامت کے دن اللہ کے ہاں ہو گا۔

اسلامی قانون سازی کرتے ہوئے مضمون کا خاتمہ اس امر پر ہوتا ہے کہ اگر کوئی سفر میں ہو اور اپنے خاندان سے دور ہو اور وہ وصیت کرنا چاہتا ہو تو اس پر شہادت مقرر کرے۔ اس طرح نظر آتا ہے کہ یہ قانون سازی اس لئے ضروری تھی کہ مسلمان جہاد فی سبیل اللہ اور تلاش وسائل اور فضل اللہ کے لئے باہر نکلیں گے۔ لیکن اس قانون سازی میں بھی تمام معاملات کو خوف آخرت کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔

باقی سورہ میں اہل کتاب میں سے نصاریٰ کے عقائد کے بعض دوسرے پہلوؤں کو لیا گیا ہے اور اس مقصد کے لئے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ ؑ کے قصے کے بعض گوشوں کو لایا گیا ہے۔ اور ان معجزات کو بیان کیا گیا ہے جو حضرت عیسیٰ ؑ سے ظاہر ہوئے۔ حواریوں نے جو کھانا طلب کیا تھا' حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ کی الوہیت کے مسائل' اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہرگز ایسے دعاوی نہیں کئے تھے' اور قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کی جھلکی بھی دکھائی گئی ہے جس میں حضرت عیسیٰ ؑ کی قوم کا معاملہ تمام انسانیت کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور وہ اللہ رب العالمین کے لئے پیش ہوتا ہے اور اس خوفناک منظر میں تمام اقوام و رسل موجود ہیں۔

سورہ کا خاتمہ اس موقف پر ہوتا ہے کہ زمین و آسمانوں کا اصل مالک اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت پر کوئی قید و بند نہیں ہے۔

(وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ) "زمین و آسمانوں اور تمام موجودات کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

سورہ کے اس بقیہ حصے کے اس سرسری جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی طریق کار اور اسی منہاج بحث کے مطابق اس کے مباحث آگے بڑھ رہے ہیں' جس کی طرف ہم نے محولہ بالا اقتباسات میں اشارہ کیا ہے۔ اب ہم بقیہ اسباق پر تفصیلی بحث کرتے ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۵۲ ایک نظر میں

یہ سبق یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے بارے میں ہونے والی طویل گفتگو ہی کا حصہ ہے' جو پارۂ ششم میں چل رہی تھی اور جس میں یہ بتانا مقصود تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امت مسلمہ کے بارے میں ان لوگوں کا موقف کیا ہے۔ یہ بات چیت اس سورہ میں نصف سے بھی زیادہ حصے پر مشتمل ہے۔ اس بات چیت میں عموماً یہود و نصاریٰ دونوں کے نظریاتی فساد سے پردہ اٹھایا گیا ہے' اور خصوصاً یہودیوں کی بری نیت اور برے کردار سے بحث کی گئی ہے۔ یہ کردار ان کا خود ان کے انبیائے سابقہ کے ساتھ رہا۔ حضرت نبی ؐ کے ساتھ بھی رہا اور وہ اس پورے عرصہ میں اہل اسلام کے بجائے مشرکین کے معاون و مددگار رہے۔ وہاں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ یہود نصاریٰ جن عقائد تک پہنچے ہوئے ہیں وہ صراحتہً کفریہ عقائد ہیں اس لئے کہ انہوں نے تورات' انجیل اور قرآن کریم تینوں میں آئے ہوئے عقائد چھوڑ دیئے ہیں' جب تک وہ تورات' انجیل اور اب نازل ہونے والے کلام الٰہی کو قائم نہ کریں اس وقت تک ان کی کوئی دینی حیثیت نہ ہو گی۔ اب بات کا رخ حضور اکرم ؐ کی طرف ہو جاتا ہے کہ آپ کی طرف جو کچھ بھی نازل ہوتا ہے آپ اسے یہود و نصاریٰ اور مشرکین سب تک پہنچا دیں' اس لئے کہ ان سب لوگوں نے دین الٰہی کو چھوڑ دیا ہے اور اب ان سب کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں اور امت مسلمہ کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اللہ اور رسول اللہ اور اہل ایمان ہی کو دوست اور ولی بنائے اور یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے ساتھ تعلق موالات قائم نہ کرے کیونکہ یہ لوگ خود ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ یہودی تو اہل کفر اور اہل شرک کے ساتھ بھی دوستی کا تعلق قائم کئے ہوئے ہیں حالانکہ حضرت داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کے ذریعہ ان پر لعنت ہو چکی ہے۔ یہ تو تھا سابقہ مضمون' اب یہاں حضور ؐ کے حوالے سے ان سب گروہوں نے جو موقف اختیار کر رکھا ہے' وہ بیان کیا جاتا ہے اور امت مسلمہ کے ساتھ انہوں نے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ اور آخرت میں ان کا جو انجام ہونے والا ہے وہ بیان کیا جاتا ہے۔

نزول قرآن کے وقت امت مسلمہ قرآن کریم کو یوں لیتی تھی کہ وہ اپنے تمام منصوبے' اپنی تمام سرگرمیوں اور لوگوں کے متعلق اپنے تمام مواقف اور رویے اس کے مطابق ڈھالتی چلی جاتی تھی اور حالت یہ تھی کہ قرآن کریم' ان کا ہادی' محرک' مرشد اور لیڈر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر معرکے میں وہ غالب رہتی اور اس کے مخالف مغلوب رہتے' اس لئے کہ ہر معرکے میں براہ راست وہ ربانی کمانڈ میں لڑتی تھی' اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم امت کی قیادت عالم بالا کی ربانی ہدایات کے مطابق فرماتے تھے۔

کیا وہ ربانی ارشادات ہمارے سامنے موجود نہیں؟ کیا وہ کتاب کریم جس کے اندر وہ ہدایات رقم ہیں موجود نہیں ہے؟ موجود ہے اور آج جو لوگ دعوت اسلامی دے رہے ہیں یا کل جو لوگ یہ کام کریں گے ان کو چاہئے کہ وہ ان ہدایات اور فیصلوں کو اس طرح لیں جس طرح کہ گویا یہ ہدایات ابھی نازل ہو رہی ہیں اور وہ تمام لوگوں کے مقابلے میں

اپنا موقف ان ہدایات کی روشنی میں متعین کر رہے ہیں۔ تمام مذاہب و مسالک اور تمام آراء اور نظریات اور تمام طور طریقوں اور تمام اقدار اور پیمانوں کے مقابلے میں ان کا موقف اس کی روشنی میں متعین ہو رہا ہے اور یہ کام آج بھی اسی طرح ہونا چاہئے اور کل بھی۔

(لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا)

"تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے۔" عربیت کے اعتبار سے اس آیت کے مخاطب رسول اللہ ؐ بھی ہو سکتے ہیں' اور عام اہل ایمان بھی' اس لئے کہ یہ ایک ایسی حقیقت اور ایسا مفہوم ہے جو سب کو بچشم سر اب بھی نظر آتا ہے اور یہ انداز کلام ایسا ہے کہ اسالیب عربی کے اندر اس کے نظائر موجود ہیں خواہ مخاطب حضور ہوں یا ایک عام مسلمان دونوں صورتوں میں آیت کے ظاہری معنی بالکل واضح ہیں۔

البتہ جو نکتہ قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اس عبارت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین سے بھی پہلے یہودیوں کو لیا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مشرکین کے مقابلے میں یہودیوں کی اسلام دشمنی زیادہ ہے اور تاریخی اور واقعاتی اعتبار سے یہ بات بھی بالکل واضح ہے' اگر غور کیا جائے۔

یہ بات درست ہے کہ گرائمر کے قواعد کے مطابق واو سے جو عطف ہوتا ہے' اس میں تعاقب یا ترتیب کا لحاظ نہیں ہوتا اور معطوف اور معطوف علیہ حکم میں برابر ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں یہودیوں کو مشرکین سے پہلے اس لئے لایا گیا ہے کہ وہ اصلاً اہل کتاب تھے اور ہو سکتا ہے کہ کوئی یہ گمان کرے کہ وہ مسلم دشمنی میں شاید مشرکین سے کم ہوں گے' اس لئے یہاں قواعد نحو سے ہٹ کر اس تقدیم سے یہ تاثر دینا مقصود ہے کہ یہ لوگ مسلم دشمنی میں کم نہیں ہیں۔ اگرچہ قواعد نحو میں اس تقدیم سے یہ تاثر نہیں ملتا لیکن اس بات کا احتمال ضرور ہے کہ یہ اشارہ مقصود ہو کہ یہ لوگ مشرکین سے بھی اسلام دشمنی میں شدید تر ہیں۔

آغاز اسلام سے آج تک جب ہم اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس میں اسلام کے حوالے سے یہودیوں کے طرز عمل پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے مشرکین عالم کے مقابلے میں یہودی اسلام دشمنی میں بہت ہی آگے رہے ہیں۔

جونہی مدینہ میں اسلامی ریاست قائم ہوئی' یہودی اس کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے اور جب امت مسلمہ ایک امت بنی' انہوں نے اس کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ قرآن کریم نے ان کی ان سازشوں اور مکاریوں کے بارے میں نہایت ہی واضح فیصلے کئے اور اشارات دیئے جو اس معرکہ آرائی کا ایک واضح ثبوت ہیں جو یہودیوں نے اسلام اور رسول اسلام کے خلاف اور امت مسلمہ کے خلاف اس کی طویل تاریخ میں برپا کئے رکھی اور جس کے شعلے گذشتہ چودہ سو سال میں کسی بھی وقت فرو نہیں ہوئے اور جس کی گرمی آج بھی چاردانگ عالم میں ہر سو محسوس کی جا رہی ہے۔

جب رسول اللہ ؐ مدینہ تشریف لائے تو آپ نے سب سے پہلے یہودیوں کے ساتھ معاہدۂ امن اور معاہدۂ پرامن بقائے باہمی (Co-existance) کیا۔ آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی جو ان کے پاس موجود کتاب تورات کی تصدیق کرتا تھا لیکن یہودیوں نے اس عہد کو وفا نہ کیا۔ انہوں نے وہی رویہ اختیار کیا جو انہوں نے اس سے پہلے اپنے اللہ' اپنے نبیوں کے ساتھ اختیار کیا تھا اور جس کی وجہ سے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ تبصرہ کیا۔

(وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ) "ہم نے تمہاری طرف ایسی آیات نازل کی ہیں جو صاف صاف حق کا اظہار کرنے والی ہیں اور ان کی پیروی سے صرف وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو فاسق ہیں۔ کیا ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا رہا ہے کہ جب انہوں نے کوئی عہد کیا' تو ان میں سے ایک نہ ایک گروہ نے اسے ضرور بالائے طاق رکھ دیا؟ بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں' جو سچے دل سے ایمان نہیں لاتے۔ اور جب ان کے پاس 'اللہ کی طرف سے کوئی رسول' اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی' تو ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو اس طرح پس پشت ڈالا' گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔"

جس دن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے' اوس اور خزرج اسلام پر جمع ہوئے' یہودی مسلمانوں کے دلی دشمن بن گئے' اس لئے کہ اسلام کی وجہ سے ان قبائل کے اندر یہودیوں کا عمل دخل یکسر ختم ہو گیا۔ اس مشکل اور عظیم اتحاد کی وجہ سے ہی امت مسلمہ کی قیادت وجود میں آگئی اور اس کی زمام اختیار حضرت محمد ؐ نے اپنے ہاتھ میں لی اور پورے علاقے سے یہودیوں کے اقتدار کے مواقع ختم ہو گئے۔

یہودیوں کی مکارانہ ذہنیت کے بس میں جو وسائل اور جو ہتھیار تھے' انہوں نے وہ سب مسلمانوں کے خلاف استعمال کئے۔ بابل کی اسیری' مصری غلامی اور رومن عروج کے زمانے میں گزرنے والی غلامانہ زندگی کے شب و روز میں انہوں نے جو مکاری اور عیاری سیکھی تھی وہ سب انہوں نے اسلام کے خلاف استعمال کی۔ حالانکہ تمام اقوام اور ملتوں نے ان کے ساتھ جس تنگ دلی کا رویہ اختیار کیا تھا' اسلام نے اس کے برعکس ان کے ساتھ نہایت ہی فراخدلی کا ثبوت دیا۔ لیکن انہوں نے اسلام کے اس حسن سلوک کا بدلہ اس مکر و فریب سے دیا جو فجر اسلام سے آج تک جاری ہے اور جو نہایت ہی گھٹیا ذہنیت کا غماز ہے۔

انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جزیرۃ العرب کی تمام قوتوں کو اکٹھا کیا اور رات دن عرب کے متفرق قبائل کو اس مہم کے لئے جمع کرتے رہے۔

(وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا) "وہ ان لوگوں سے کہتے جنہوں نے کفر کی راہ لی کہ یہ ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ہدایت کی راہ پر ہیں۔"

• اور جب اسلام یہودیوں کی سازشوں کے برعکس غالب ہو گیا تو انہوں نے اپنی سازشوں کا رنگ بدلا۔ انہوں نے اسلامی لٹریچر کے اندر اپنی جانب سے گھڑی ہوئی باتیں داخل کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ صرف کتاب اللہ ان کی دسترس سے باہر رہی' اس لئے کہ اس کی حفاظت کی ضمانت خود اللہ تعالیٰ نے دی تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کی صفوں کے اندر

اپنے ایجنٹ داخل کئے۔ جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور ابھی ان کے ذہن میں پختگی پیدا نہ ہوئی تھی ان کے اندر انہوں نے فتنہ پردازی شروع کر دی یہ کام وہ مختلف علاقوں میں کرتے رہے اور آج تک وہ مسلمانوں کے خلاف دنیا کے اطراف و اکناف میں لوگوں کو جمع کرتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت دنیا کے چپے چپے پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہودیوں نے جال بچھا رکھے ہیں۔ اس جنگ میں وہ عیسائی اور بت پرست دونوں اقوام کو استعمال کر رہے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے اندر غیر اسلامی طور طریقے رائج کرتے ہیں اور مسلمان ممالک کے اندر ایسی لیڈر شپ سٹیج پر لاتے ہیں جن کے صرف نام مسلمانوں جیسے ہوتے ہیں اور ان کے ذریعے وہ دین اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینکنے کے عمل میں مصروف ہیں۔

ذرا پھر اللہ تعالیٰ کے اس کلام پر غور فرمائیں: ”تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے۔“

☆ جس شخص نے مدینہ کی نوخیز اسلامی مملکت کے خلاف تمام قبائل کو جنگ احزاب میں جمع کیا اور بنی قریظہ اور دوسرے یہودیوں کو جمع کیا اور قریش مکہ اور دوسرے قبائل کو جمع کیا یہ کون تھا؟ یہودی۔
☆ وہ شخص جس نے عوام کو برانگیختہ کیا' اشرار کو مدینہ میں جمع کیا' اور مکروہ پروپیگنڈا کیا جس کے نتیجے میں حضرت عثمان شہید ہوئے اور اس کے بعد نہایت ہی تباہ کن واقعات پیش آئے وہ کون تھا؟ یہودی۔
☆ وہ لوگ جو احادیث رسول میں موضوعات داخل کرتے رہے وہ کون تھے؟ یہودی۔
☆ اسلام کی آخری خلافت' خلافت عثمانیہ کے دور میں قومیت کے نعرے کس نے بلند کئے' عالم اسلام میں انقلابات برپا کر کے اسلامی شریعت اور اسلامی دساتیر کو کس نے منسوخ کیا اور جس شخص نے خلافت عثمانیہ کو ختم کر کے سلطان عبد الحمید کے بعد لادینی نظام رائج کیا' وہ کون تھا؟ اتاترک یہودی۔
☆ وہ تمام اقدامات جو پورے عالم اسلام میں اور پوری دنیا میں اسلامی تحریکات کے خلاف کئے جاتے ہیں ان کی پشت پر کون ہے؟ یہودی۔
☆ اس کرۂ ارض پر مادیت اور ملحدانہ نظریات کا موجد کون ہے؟ یہاں حیوانی اور میلانات' جنسی بے راہ روی کے پھیلانے کی تحاریک کی پشت پر کون ہے؟ ان تمام نظریات کا پرچار کون کرتا ہے جو تمام مذہبی مقدسات اور شعائر کے خلاف ہیں؟ صرف اور' صرف یہودی۔

غرض یہودیوں نے اسلام کے خلاف پوری اسلامی تاریخ میں جو معرکہ آرائی کی ہے اس کی داستان نہایت ہی طویل ہے۔ اور اس کے مقابلے میں مشرکین اور بت پرستوں نے اسلام کے خلاف جو کچھ کیا وہ بہت ہی کم ہے۔ زمانہ قدیم میں بھی اور دور جدید میں بھی۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ مشرکین عرب کے ساتھ اسلام کی معرکہ آرائی مجموعی طور پر صرف بیس سال تک رہی؟ اس طرح اہل فارس کے ساتھ بھی ایک مختصر عرصہ جنگ رہی۔ دور جدید میں اگرچہ ہندستان کے مشرکین بظاہر اسلام کے خلاف لڑتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی دشمنی اور جنگ یہودیوں کے مقابلے کچھ بھی نہیں ہے۔ عالمی صیہونیت (یاد رہے کہ سوشلزم اور کیمونزم عالمی صیہونیت کی شاخیں ہی تصور ہوتی ہیں) ہمیشہ سے اسلام دشمنی میں پیش پیش رہی ہے اور اس سے قبل یہودیوں نے اسلام کے خلاف جو محاذ آرائی کی اور یہ جس قدر طویل اور وسیع رہی ہے'

اس کے مقابلے میں صرف صلیبی جنگیں ہی کسی قدر وقعت رکھتی ہیں جن پر ہم آگے چل کر بات کریں گے۔

اگر ہم اللہ تعالیٰ کے ان الفاظ پر بار بار غور کریں "تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت "یہود اور مشرکین" کو پاؤ گے" تو بات کا حق ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں مشرکین کے مقابلے میں یہودیوں کو پہلا نمبر دیا گیا ہے اور پھر جب ہم یہودیوں کے اس تاریخی رول کو بھی پیش نظر رکھیں جو انہوں نے اسلام کے خلاف ادا کیا، جس کے کچھ واقعات کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس فقرے میں یہودیوں کو کیوں پہلے نمبر پر رکھا ہے۔

بے شک یہودی نہایت ہی بدفطرت لوگ ہیں، ان کے مزاج میں شر ہے، ان کے دلوں کے اندر اسلام اور نبی اسلام کے خلاف کینہ بھرا ہوا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ یہاں مسلمانوں اور نبی اکرم کو خبردار فرماتے ہیں اور ان لوگوں کی اس بری اور شریر فطرت پر اگر دنیا میں کسی نے قابو پایا تو وہ اسلام اور مسلمان تھے، لیکن اس وقت جب مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان تھے۔ صرف اسلام ہی تھا، جس نے اس بدفطرت مخلوق سے لوگوں کو نجات دلائی تھی لیکن اس وقت جب اہل اسلام، اسلام کا حق پورا پورا ادا کرتے تھے۔

(لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۸۲) وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (۸۳) وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ (۸۴) فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ (۸۵) وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۸۶))

"تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کے لئے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرور نفس نہیں ہے۔ جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔ وہ بول اٹھتے ہیں کہ "پروردگار، ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔" اور وہ کہتے ہیں کہ "آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اسے کیوں نہ مان لیں جب کہ ہم اس بات کی خواہش

رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے؟" ان کے اس قول کی وجہ سے اللہ نے ان کو ایسی جنتیں عطا کیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزاء ہے نیک رویہ اختیار کرنے والوں کے لئے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا اور انہیں جھٹلایا، تو وہ جہنم کے مستحق ہیں۔"

ذرا ان آیات پر غور کیجئے۔ یہ ایک مخصوص صورت حال کی نشاندہی کر رہی ہیں اور ان میں جو فیصلہ ہے یہ بھی ایک مخصوص صورت حال میں ہے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں میں سے ایک فریق کے بارے میں ایک تبصرہ ہے جو کہتے تھے کہ ہم "نصاریٰ" ہیں اور تبصرہ ان الفاظ میں ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ محبت میں یہ لوگ قریب تر ہیں۔

لیکن یہ بات یہاں ذہن میں رہنا چاہئے کہ یہ ایک متعین صورت حال پر تبصرہ ہے اس لئے یہ صرف مخصوص صورت حالات پر ہی منطبق ہو گا۔ اکثر لوگوں نے اس تبصرے کو اچھی طرح نہیں سمجھا ہے۔ بعض لوگ اس تبصرے کو اس مقصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں کہ اہل اسلام بعض مخالف کیمپوں کے ساتھ اپنے موقف میں نرمی پیدا کر لیں حالانکہ اپنے موقف میں نرمی کرنا اہل اسلام کے لئے نہایت ہی مضر ہے۔ اس سے دشمن کی پالیسی اور موقف کے سمجھنے میں بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ اس لئے ہم یہاں مناسب سمجھتے ہیں کہ ظلال القرآن میں اس صورت حال کی وضاحت کر دیں جس کی تصویر کشی ان آیات میں کی گئی ہے۔

ان آیات میں جن لوگوں کی تصویر کشی کی گئی ہے وہ ایسے لوگ ہیں جو کہتے تھے کہ ہم "نصاریٰ" ہیں، اور وہ مسلمانوں کی دوستی میں قریب تر ہیں اور یہ لوگ عالم دین اور تارک الدنیا قسم کے فقیر ہیں اور وہ متکبر اور مغرور بھی نہیں ہیں۔

( ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۸۲) "یہ اس لئے کہ ان میں عالم دین اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔" لیکن قرآن مجید بات کو یہاں ہی ختم نہیں کر دیتا۔ نہ بات کو مجمل چھوڑا جاتا ہے۔ نہ اسے ہر اس شخص کے لئے عام چھوڑ دیا جاتا ہے جو کہتا ہے کہ میں نصرانی ہوں۔ اس گروہ کی تصویر میں کچھ مزید رنگ بھرے جاتے ہیں اور اس گروہ کے موقف کو یوں واضح کیا جاتا ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۵۲ تشریح آیات

## ۸۳ ----- تا ----- ۸۶

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾

"جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔ وہ بول اٹھتے ہیں کہ "پروردگار ' ہم ایمان لائے ' ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔" اور وہ کہتے ہیں کہ "آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اسے کیوں نہ مان لیں جب کہ ہم اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے۔"

یہ ایک زندہ منظر ہے اور اس میں اس گروہ کی مکمل تصویر نظر آتی ہے۔ یہ گروہ جو اہل ایمان کے ساتھ دوستی میں دوسرے کے مقابلے میں قریب تر ہے۔ یہ ایسا گروہ ہے کہ جب قرآن مجید کا تازہ ترین حصہ نازل ہوتا ہے تو اس گروہ کے جذبات جوش میں آجاتے ہیں۔ ان کے دل نرم ہو جاتے ہیں اور وہ اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔ یہ بات اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ اس قرآن سے نہایت ہی گہرا اثر لیتے ہیں۔ وہ اس تاثر کا اظہار صرف آنسوؤں کی زبان میں کرتے ہیں اور اس قسم کا اظہار اس وقت کیا جاتا ہے جب انسان کے لئے الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے اس تاثر کا اظہار آنسوؤں کے ذریعے کیا جاتا ہے اور اس طرح دباؤ اور گھٹن ختم ہو جاتی ہے کیونکہ جذبات کا دباؤ نہایت ہی سخت اور گہرا ہوتا ہے۔

یہ لوگ محض آنسو بہا کر رک نہیں جاتے بلکہ قرآن کو سن کر جس سچائی سے وہ متاثر ہو چکے ' اس کے بارے میں منفی رویہ اختیار نہیں کرتے۔ قرآن کریم جس سچے شعور کا حامل ہے ' اور جو شدید احساس وہ پیدا کرتا ہے ' اس کے مقابلے میں خاموش نہیں رہتے۔ وہ صرف اتنا ہی نہیں کرتے کہ بس سن کر متاثر ہوئے اور آنسو بہا کر رک گئے بلکہ وہ اس سے آگے بڑھتے ہیں اور مثبت رویہ اختیار کر کے اس سچائی ' اس شعور اور احساس کو قبول کر لیتے ہیں۔ وہ ایمان لاتے ہیں ' یقین کر لیتے

ہیں اور یہ بھی نہیں بلکہ وہ اپنے ایمان اور یقین کا اعلان بھی کرتے ہیں اور یہ اعلان وہ بڑے جوش و خروش سے کرتے ہیں۔

(یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (۸۳) وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ (۸۴)) "اور وہ بول اٹھتے ہیں کہ پروردگار، ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لیجئے۔" اور وہ کہتے ہیں "آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اسے کیوں نہ مان لیں جب کہ ہم اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے۔"

دیکھئے یہ لوگ اس سچائی کا اعلان کرتے ہیں جو ان تک پہنچی اور وہ اسے پہچان گئے۔ اس کے بعد وہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں گواہوں کی فہرست میں شامل فرما دے اور ہمیں اس لڑی میں شامل کر دے جو اس کرۂ ارض پر اس سچائی کو قائم کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ اس امت میں داخل کر دے جس پر یہ قرآن گواہ ہے کہ وہ امت حقہ ہے اور جو اپنی زبان، اپنے عمل اور اپنی جدوجہد کے ذریعے فریضہ شہادت حق ادا کر رہی ہے اور لوگوں کی زندگیوں میں اس سچائی کو جاری و ساری دیکھنا چاہتی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ فریضہ شہادت حق ادا کرنے والوں میں خود شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ اللہ کو اس بات پر گواہ ٹھہراتے ہیں کہ وہ اس امت میں داخل ہو گئے ہیں اور پھر یہ درخواست بھی کرتے ہیں کہ ہمارا نام رجسٹر کر لیا جائے۔

یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ خود آپ سے بطور استفہام انکاری پوچھتے ہیں کہ اب ہماری راہ قبولیت میں کیا رکاوٹ ہو سکتی ہے؟ کہ سنیں، یقین کریں اور ایمان نہ لائیں تاکہ ان کا رب ان کی دعا قبول کرے، ان کو درجات بلند عطا کرے اور انہیں صالح لوگوں میں درج کرے، کیوں وہ ایسا نہ کریں؟ اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

(وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ (۸۴)) "آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اسے کیوں نہ مان لیں جب کہ ہم اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے۔"

یہ ایک صریح، دو ٹوک اور فیصلہ کن موقف ہے، جس میں وہ علی الاعلان قرآن کریم میں جو سچائی اتری ہے اس کو قبول کرتے ہیں۔ غرض یہ لوگ سنتے ہیں، سمجھتے ہیں، گہرا تاثر لیتے ہیں اور ایمان کا اعلان کرتے ہیں۔ اسلام کو قبول کرتے ہیں اور امت مسلمہ کا جزء بن جاتے ہیں اور پھر بھی دعا کرتے ہیں کہ وہ انہیں توفیق دے کہ وہ فریضہ شہادت حق ادا کر سکیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہو جائیں جو اپنے عمل سے، اور جہاد فی سبیل اللہ کر کے اقامت دین کی جدوجہد کرتے ہیں اور دین کو لوگوں کی زندگیوں میں قائم کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی نظر میں راستہ اس قدر صاف ہو جاتا ہے کہ وہ یہ یقین کر لیتے ہیں کہ یہی راہ ہے اور اس کے سوا ان کے لئے کسی دوسری راہ پر چلنا جائز نہیں ہے۔ یہ اللہ پر ایمان لانے کا راستہ ہے اور اس سچائی کا راستہ ہے جو اب اللہ نے اتاری ہے۔ اس امید کا راستہ ہے کہ اللہ انہیں صالحین میں

شامل کرے گا۔

قرآن کریم یہاں آکر بھی نہیں رکتا۔ یہ لوگ کون ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں اور مسلمانوں کی دوستی میں قریب تر ہیں۔ ان کا سلوک اور طرز عمل یہ ہے کہ وہ قرآن کی بیان کردہ سچائی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں' نہایت ہی مثبت طرز عمل اختیار کرتے ہیں' ایمان کا اعلان کرتے ہیں' اسلامی صفوں میں داخل ہوتے ہیں' جان و مال کی جدوجہد کے ذریعے شہادت حق ادا کرتے ہیں' اللہ کی جناب میں دست بدعا ہوتے ہیں کہ وہ ان کا نام فہرست شاہدین حق میں درج کرے اور یہ توقع کرتے ہیں کہ اللہ ان کو صالحین میں شامل کرے' قرآن کریم ان کی صرف ان صفات پر ہی بات ختم نہیں کر دیتا بلکہ ان کی تصویر مکمل کرنے کے لئے کچھ رنگ اور بھرے جاتے ہیں اور یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ قیامت میں ان لوگوں کا انجام کیا ہو گا۔

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِیْنَ ۝۸۵

"ان کے اس قول کی وجہ سے اللہ نے ان کو ایسی جنتیں عطا کیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزاء ہے نیک رویہ اختیار کرنے والوں کے لئے۔"

اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ ان کے دل سچے ہیں اور ان کی زبان صداقت شعار ہے۔ وہ صراط مستقیم پر چلنے کا عزم کئے ہوئے ہیں' وہ اس دین کے لئے فریضہ شہادت حق ادا کرنے کے لئے تیار ہیں جس میں وہ داخل ہوئے ہیں۔ وہ صداقت کے ساتھ اسلامی صفوں میں داخل ہوئے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شہادت حق کی ادائیگی اللہ کا ایک احسان ہے جو اپنے بندوں میں سے کسی پر وہ کرتا ہے۔ یہ بات اللہ کے علم میں تھی کہ اب وہ صرف اسلامی راہ پر ہی چلنا چاہتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ اللہ ان کو نیکوں میں شامل کرے گا۔ چونکہ یہ سب باتیں اللہ کے علم میں تھیں اسی لئے اللہ نے ان کی اس بات کو قبول کر لیا اور ان کے لئے جزائے آخرت لکھ دی۔ اس پر اپنی گواہی قائم کر دی کہ یہ لوگ نیک ہیں اور یہ ہے جزائے محسنین :

(فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِیْنَ) "ان کے اس قول کی وجہ سے اللہ نے ان کو ایسی جنتیں عطا کیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزاء ہے احسان کا رویہ اختیار کرنے والوں کے لئے۔"

احسان ایمان اور اسلام کے اعلیٰ درجات کو کہتے ہیں اور اللہ بذات خود شہادت دیتے ہیں کہ یہ لوگ گروہ محسنین میں سے ہیں۔ لہٰذا یہ آیات ایک خاص گروہ کے بارے میں ہیں' جس کے خدوخال بالکل واضح ہیں اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ حکم ہے :

(وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصٰرٰى) "اور ایمان لانے والوں کے لئے دوستی میں قریب تر تم ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔" یہ ایک ایسا گروہ ہے کہ جب وہ حق بات کو سنتا ہے تو سرکشی نہیں کرتا بلکہ وہ دل کی گہرائیوں سے اسے قبول کرتا ہے اور اس قبولیت کا برملا اعلان کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا فریق ہے کہ وہ اپنے اعلان اسلام میں ایک لمحے کے لئے بھی تردد نہیں کرتا' فوراً اسلامی صفوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہ اس نظریہ حیات کے حوالے سے عائد ہونے والے تمام فرائض کی ادائیگی کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے اور وہ اسلامی نظام حیات کے قیام کی راہ میں جدوجہد کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ نیز یہ ایک ایسا فریق ہے کہ جن کی باتوں کی تصدیق اللہ کرتا ہے اور اعلان کر دیتا ہے کہ یہ محسنین ہیں اور یہ ہے ان کی جزاء۔

لیکن قرآن مجید اس پر اکتفا نہیں کرتا' وہ اس گروہ کے خدوخال میں مزید اضافہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ کون ہیں جو اہل ایمان کے لئے محبت کے جذبات رکھتے ہیں۔ یہ وضاحت اب اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ اس گروہ نصاریٰ کے بالمقابل ایک دوسرے گروہ نصاریٰ کا ذکر کرتا ہے جن کے خدوخال یہ ہیں کہ وہ سچائی کو سن کر' سمجھ کر اس کا انکار کرتے ہیں' وہ اس پر لبیک نہیں کہتے اور وہ گواہی دینے والوں کے ساتھ شامل نہیں ہوتے۔

۱۱ ع ۹ ۱

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾

"رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا اور انہیں جھٹلایا' تو وہ جہنم کے مستحق ہیں۔"

یہاں (وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا) سے مراد قطعیت کے ساتھ وہی لوگ ہیں' جو نصاریٰ میں سے سچائی کو سنتے ہیں لیکن مان کر نہیں دیتے۔ سچائی کو سن کر نہ ماننے والے نصاریٰ کے بارے میں قرآن یہاں کافرین کا لفظ استعمال کرتا ہے' لہٰذا نصاریٰ جب بھی ایسا موقف اختیار کریں گے ان پر کفر کا اطلاق ہو گا۔ اس میں یہود و نصاریٰ کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے اور جب تک وہ حضرت محمد ؐ پر نازل شدہ کلام کو تسلیم نہیں کرتے جو کلام برحق ہے ان میں اور مشرکین اور یہودیوں میں کوئی فرق نہیں ہو گا۔ جب تک وہ منکر رہیں گے اور اسلام میں داخل نہ ہوں گے' اس لئے کہ اب اللہ کے ہاں دین اسلام کے سوا کوئی اور دین مقبول نہیں ہے' اور یہ مضمون قرآن مجید کی متعدد آیات میں دہرایا گیا ہے۔

(لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ (۹۸ : ۱)) "اہل کتاب اور مشرکین سے جو لوگ کافر تھے' وہ باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس دلیل روشن نہ آجائے۔"

(اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ (۹۸ : ۶)) "اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ یقیناً جہنم

کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے - یہ لوگ بدترین خلائق ہیں -"

(لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (۵:۷۳)) "یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے -"

(لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (۵:۷۲)) "یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے -"

(لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ (۵:۷۸)) "بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی -" غرض قرآن کریم کا یہ ایک عام انداز بیان ہے اور یہ بات معہود فی الذہن ہے لیکن یہاں جو بات ہو رہی ہے وہ نصاریٰ میں سے دو فریقوں کے رویے کے بارے میں ہے. اصل میں یہ بتانا مقصود ہے کہ نصاریٰ میں سے دو فریقوں کا موقف اسلام اور اہل اسلام کے بارے میں بالکل مختلف ہے اس لئے ان دونوں کا انجام بھی مختلف ہو گا - ایک گروہ کے لئے جو ایمان لائے گا ایسے باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور دوسروں کا انجام یہ ہو گا کہ وہ جہنمی ہوں گے - اس بحث سے معلوم ہو گیا کہ وہ تمام لوگ جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں اس آیت میں داخل نہیں جس میں کہا گیا ہے :

(وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا) "تم اہل ایمان کے ساتھ دوستی میں زیادہ قریب ان لوگوں کو پاؤ گے -" آیات کا یہ مفہوم وہی لوگ لیتے ہیں جو ہر آیت کو علیحدہ لے کر پڑھتے ہیں - خلاصہ یہ ہے کہ آیت زیر بحث کا حکم محدود ہے' اور اس سے متعین طور پر وہ لوگ مراد ہیں جو ایمان لاتے ہیں - قرآن کریم نے ان لوگوں کی اچھی طرح وضاحت کر دی ہے اور کوئی غلط فہمی نہیں چھوڑی - دونوں فریقوں کو نکھار کر رکھ دیا ہے -

قرآن کریم کے علاوہ اس مفہوم کی وضاحت اور تائید میں بہت سی روایات بھی آئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے مراد نصاریٰ کے چند متعین لوگ تھے -

قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے :"یہ آیت نجاشی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں ہے' اور یہ اس وقت نازل ہوئی تھی جب ہجرت اول میں مسلمان حبشہ کو گئے تھے' جیسا کہ ابن اسحٰق اور دوسرے اہل سیر نے لکھا ہے - یہ لوگ مشرکین کے خوف اور تشدد کی وجہ سے گئے تھے اور بڑی تعداد میں تھے - اس کے بعد حضور نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو یہ لوگ ہجرت کرنے مدینہ نہ آسکے' اس لئے کہ جنگوں کی وجہ سے حالات ایسے ہو گئے کہ وہ حضور سے نہ مل سکے - جب بدر کی جنگ ہوئی اور اس میں کفار کے بڑے بڑے لیڈر مارے گئے تو قریش کے لوگوں نے کہا کہ ہم ان لوگوں سے انتقام لے سکتے ہیں جو حبشہ گئے ہوئے ہیں' اس لئے کچھ ہدایات دے کر نجاشی کے پاس دو عقلمند آدمیوں کو بھیجو - نجاشی ان لوگوں کو تمہارے حوالے کر دے گا اور تم ان کو قتل کر کے اہل بدر کا بدلہ لے سکو گے - اہل قریش نے عمرو ابن

العاص اور عبداللہ ابن ابو ربیعہ کو ہدیے دے کر بھیجا۔ حضور کو ان خبروں کی اطلاع ہو گئی۔ آپ نے عمر ابن امیہ ضمری کو بطور ایلچی بھیجا اور اسے ایک خط دیا۔ وہ نجاشی کو ملے‘ اس نے حضور کے نامہ مبارک کو پڑھا۔ اس کے بعد حضرت جعفر ابن ابو طالب اور مہاجرین کو بلایا اور اپنے علماء اور فقراء کو بھی بلایا اور حضرت جعفر کو حکم دیا کہ ان کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کریں۔ انہوں نے سورہ مریم کی تلاوت کی۔ یہ علماء اور مشائخ اس حال میں اٹھے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

( وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ) ”تم مسلمانوں کے ساتھ دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں ہم نصاریٰ ہیں۔“ یہ آیت انہوں نے ”الشاہدین“ تک پڑھی۔ (اس حدیث کو ابوداؤد نے محمد ابن مسلمہ‘ ابن وہب‘ یونس‘ ابن شہاب‘ (انہوں نے ابوبکر ابن عبدالرحمٰن اور سعید ابن مسیب کے واسطے سے ) عروہ ابن زبیر سے روایت کیا۔ انہوں نے اس حدیث کا آغاز اس سے کیا کہ حبشہ کی پہلی ہجرت کا یہ واقعہ ہے )۔

بیہقی نے ابن اسحٰق سے روایت کی ہے کہ حضور کے پاس بیس افراد آئے۔ اس وقت آپ مکہ میں تھے یا مکہ کے قریب تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ کے بارے میں اطلاعات حبشہ پہنچی تھیں۔ یہ لوگ نصاریٰ تھے۔ ان لوگوں نے مسجد میں حضور کے ساتھ ملاقات کی۔ سوالات وجوابات ہوئے اور قریش کے لوگ کعبہ کے ارد گرد محفلیں جمائے بیٹھے تھے۔ جب ان کے سوالات ختم ہوئے اور جو پوچھنا چاہتے تھے‘ پوچھ لیا تو حضور نے ان کو دعوت دی اور قرآن مجید پڑھ کر انہیں سنایا۔ جب انہوں نے قرآن سنا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ انہوں نے آپ کی دعوت کو قبول کیا‘ آپ کی تصدیق کی۔ انہوں نے حضور ؐ کو ان پیش گوئیوں کی روشنی میں پہچان لیا جو ان کی کتابوں میں تھیں۔

جب یہ لوگ جانے کے لئے اٹھے تو ابوجہل اور قریش کے چند لوگوں نے مداخلت کی۔ ابوجہل نے کہا تم جیسا بے وقوف کوئی بھی نہ ہو گا۔ تمہیں تمہاری قوم نے تو اس لئے بھیجا تھا کہ تم واپس جاؤ اور اس شخص کے بارے میں ان تک اطلاعات پہنچاؤ لیکن چند منٹ کی بات چیت میں تم نے اپنے دین کو چھوڑ دیا اور اس کی تصدیق کر دی۔ میں نے تم سے زیادہ احمق مسافر کوئی اور نہیں دیکھا یا اس نے اس جیسی کوئی اور بات کی۔ انہوں نے کہا السلام علیکم ہم تمہارے ساتھ جاہلانہ رویہ اختیار نہیں کرتے۔ ہمارے اعمال ہمارے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو بھلائی سے محروم نہیں کرتے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ یہ لوگ اہل نجران میں سے تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ہی کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔

( اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ) آیت (لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ) (۲۸:۵۳ تا ۵۵)) تک۔ ان آیات کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جعفر اور ان کے ستر افراد پر مشتمل ساتھی رسول اللہ ؐ کے ساتھ ملاقات کے لئے آئے۔ یہ لوگ اونی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سے باسٹھ افراد حبشہ سے تعلق رکھتے تھے اور آٹھ شامی تھے۔ شامیوں میں بحیرا راہب‘ ادریس‘ اشرف‘ ابرہہ‘ ثمامہ‘ قثم‘ درید

اور ایمن تھے ۔ ان کے سامنے حضورؐ نے سورہ یٰسین تلاوت فرمائی ۔ انہوں نے جب قرآن مجید سنا تو خوب روئے اور حضورؐ پر ایمان لائے ۔ انہوں نے کہا یہ کلام ویسا ہی ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا ۔ ان لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ۔

(لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ آمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصٰرٰى (۵ : ۸۲) ''تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کے لئے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں ۔'' اس سے مراد حبشہ کے وفد سے ہے اور یہ لوگ کینسوں کے انچارج تھے ۔ سعید ابن جبیر نے کہا ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں یہ آیت اتری :

(اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ) ۔۔تا۔۔ (اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ) آخر آیت تک ۔ مقاتل اور کلبی نے کہا ہے کہ ان لوگوں میں سے چالیس افراد نجران کے قبیلہ بنی الحرث ابن کعب سے تھے ۔ اور بتیس حبشہ کے تھے اور اڑسٹھ شامی تھے ۔ قتادہ کہتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو حضرت عیسیٰ کی سچی شریعت پر قائم تھے اور جب حضورؐ مبعوث ہوئے تو وہ حضورؐ پر ایمان لائے ۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کی ۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو قتادہ نے کہا ہے یہی اس آیت کا مفہوم ہے اور سیاق کلام بھی اسی کا اظہار کرتا ہے ۔ سابقۃ الذکر تمام روایات اس کی تائید کرتی ہیں اور اس سورہ میں دوسری آیات اور قرآن کریم کی دوسری تصریحات کے ساتھ بھی یہ مفہوم متفق ہے ۔ یہ مفہوم اس موقف سے بھی متفق ہے جو یہود و نصاریٰ نے اہل اسلام اور خود اسلام کے مقابلے میں اختیار کیا ۔ نیز گزشتہ ۱۴سو سال کی تاریخ میں ان لوگوں نے اسلام کے مقابلے میں جس قسم کا رویہ اختیار کیا ۔ اس کے ساتھ بھی یہ مفہوم درست بیٹھتا ہے ۔

یہ سورہ اپنے رجحان' اپنی فضا اور اپنے مقاصد کے اعتبار سے ایک اکائی ہے ۔ اللہ کے کلام میں تناقض ممکن نہیں ہے ۔ (وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۴ : ۸۲)) ''اگر قرآن مجید اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت اختلاف پاتے ۔'' خود اس سورہ کے اندر بھی بعض فیصلے اور ایسی آیات موجود ہیں جن سے اس آیت کی تشریح اچھی طرح ہو جاتی ہے ۔

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۵ : ۵۱))

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ' یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق

ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے۔ یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی راہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔"

(قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۵ : ۶۸)) "کہہ دو' اے اہل کتاب' تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو' جب تک تورات اور انجیل اور دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو' جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔ ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دے گا' مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔"

اسی طرح سورہ بقرہ میں اس سے پہلے کہا گیا تھا :

(وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۲ : ۱۲۰)) "یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔ صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے ورنہ اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آ چکا ہے' تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لئے نہیں ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو ان آیات میں جو تنبیہ کی تھی' بعد کے ادوار میں پوری تاریخ اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں دونوں نے کبھی اہل اسلام کو معاف نہ کیا۔ تاریخ نے یہودیوں کی اسلام دشمنی کے واقعات کو اس وقت سے ریکارڈ کیا ہے جب سے اسلام مدینہ طیبہ میں داخل ہوا' اور اس وقت سے آج تک ان کا یہی ریکارڈ مسلسل چلا آ رہا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ اپنی ان خبیث سرگرمیوں کو انہوں نے کسی بھی دور میں موقوف نہیں کیا۔ تاریخ نے یہ واقعہ بھی ریکارڈ پر محفوظ کیا ہے کہ جب سے جنگ یرموک میں اہل اسلام اور عیسائیوں کے درمیان جھڑپ ہوئی ہے اس کے بعد عیسائیوں نے بھی اسلام کے خلاف صلیبی جنگیں مسلسل جاری رکھیں' ماسوائے ان چند استثنائی واقعات کے جن کا ذکر ان آیات میں ہوا ہے اور ماسوائے بعض ایسے عیسائی فرقوں کے جو خود دوسرے عیسائی فرقوں کے وبال سے تنگ آ کر اسلامی حدود میں آ بسے۔ رہا عیسائیوں کا عام رویہ تو اس کی اصلی تصویر صلیبی جنگوں ہی میں نظر آتی ہے۔ یاد رہے کہ صلیبی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی' یہ آج تک جاری ہے۔ جب سے اسلام اور مسیحیت کا مقابلہ یرموک کے میدان میں ہوا ہے اس وقت سے یہ جنگ جاری ہے' اگرچہ بظاہر کبھی کبھی امن بھی نظر آ جاتا ہے۔

عیسائیوں کو اسلام کے ساتھ کس قدر بغض و عداوت تھی' اس کا اظہار دو صدیوں تک ہوتا رہا یعنی مشہور صلیبی جنگوں کے دوران۔ نیز اس ذہنیت کا اظہار اس تحریک بیخ کنی سے بھی ہوتا ہے جو عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف اندلس میں جاری رکھی۔ اس کی استعماریت اور تبلیغ مسیحیت کی مہم اسلامی افریقہ میں چلائی گئی اور اس کے بعد اس استعمار اور تبلیغ مسیحیت کو تمام عالم اسلام تک پھیلا دیا گیا۔

اسلام کے خلاف جنگ میں یہودیت اور عیسائیت دونوں باہم حلیف رہے حالانکہ دونوں فرقے ایک دوسرے کے بھی دشمن تھے لیکن اسلام کے خلاف تمام جنگوں میں وہ ایک دوسرے کے دوست بھی رہے۔ جیسا کہ اللہ علیم و خبیر نے آج سے ۱۴سو سال پہلے کہہ دیا تھا کہ (بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ) "وہ خود ایک دوسرے کے دوست ہیں" اور ان کی یہ دوستی اس وقت تک قائم رہی جب انہوں نے خلافت اسلامیہ کو ختم کیا۔ اس کے بعد وہ اس دین کی ایک ایک رسی کو توڑتے رہے اور جب انہوں نے اسلامی نظام حکومت کو ختم کر لیا تو اب وہ اسلام کی اساس نماز کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔

اب دور جدید میں دیکھئے' مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کا جو موقف تھا کہ وہ اہل اسلام کے مقابلے میں مشرکین کو پسند کرتے تھے اب پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے۔ اب عالمی عیسائیت ان تمام بت پرست اقوام کی پشت پر کھڑی ہے بشرطیکہ وہ اسلام کے خلاف لڑ رہے ہوں۔ بعض اوقات تو یہ لوگ تائید کرتے ہیں اور بعض اوقات یہ لوگ براہ راست بین الاقوامی اداروں میں مسلمانوں کے خلاف بت پرستوں کی تائید کرتے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان پائے جانے والے مسئلہ کشمیر میں انہوں نے وہی کردار ادا کیا ہے۔

اس کے علاوہ یہ یہودی و عیسائی احیائے اسلام کی تمام تحریکات کی بیخ کنی میں باہم معاون ہیں۔ انہوں نے عالم اسلام کے اندر ایسے نام نہاد عظیم لیڈر پال رکھے ہیں جو ان کی مرضی اور خواہشات کے مطابق اپنے اپنے ممالک میں اسلام کی بیخ کنی پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ عالمی قوتیں بونے لیڈروں کے ارد گرد اژدہام کئے ہوئے ہیں اور زندہ باد کے نعرے لگا رہی ہیں۔ اس غوغا آرائی نے ان لوگوں کو عظیم لیڈر بنا دیا ہے حالانکہ یہ لوگ نہایت ہی بونے قد کے لوگ ہیں۔

یہ ہے خلاصہ اس ریکارڈ کا جو گذشتہ چودہ سو سال سے اسلامی تاریخ نے قلم بند کیا ہے اور اس میں یہودیوں اور عیسائیوں کا موقف اسلام کے خلاف رہا ہے اور دونوں کی دشمنی کے درمیان کوئی کمی بیشی نہیں ہے۔ نہ ان کے کیمپوں میں فرق کیا جا سکتا ہے اور نہ تحریک اسلامی کے خلاف ان کی اس مسلسل جنگ میں کبھی کمی آتی ہے۔ ایک زمانہ گزر گیا اس صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

یہ ہے وہ صورت حال جسے سمجھنے والوں کو سمجھ لینا چاہئے اور انہیں ان تحریکات کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہئے جو فریب خوردہ لوگ چلا رہے اور جن کا مقصد اسلامی صلابت اور پختگی کو پگھلانا ہے۔ یہ تحریکات اسلام کو ختم کرنے کے لئے اس آیت سے استدلال کرتی ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ اس کا مفہوم دوسری آیات سے کاٹ کر' اور صرف نظر کر کے وہ مفہوم نکالتی ہیں جو ان کا مفید مطلب ہے۔ اس آیت کے مفہوم کے تعین کے لئے یہ لوگ نہ پوری سورہ کے مضامین کو دیکھتے ہیں نہ قرآن کریم کی دوسری تصریحات سے استفادہ کرتے ہیں' نہ وہ اس سلسلے میں اسلامی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں اور اس طرح وہ اہل ایمان کے شعور کو سلانا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کیمپوں کے مقابلے میں بے حس اور بے فکر ہو جائیں۔ ان کے دل اسلام کے خلاف بغض و عداوت سے بھرے پڑے ہیں اور وہ ہر وقت عالم اسلام کے خلاف سازشوں میں

معروف رہتے ہیں۔وہ اس ثقافتی یلغار کے ذریعے اسلامی نظریہ حیات پر اپنا آخری وار کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام کے یہ دشمن کیمپ جس امر سے بہت خائف ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر دین حق کا فہم و ادراک اور شعور واحساس ترقی نہ کر جائے اگرچہ یہ شعور ایک قلیل تعداد ہی کے اندر پایا جاتا ہو۔جو لوگ مسلمانوں کے اس شعور اور بیداری کے بدترین دشمن ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں جو فریب خوردہ ہیں اور دشمنان اسلام کے جال میں آگئے ہیں۔ یہ فریب خوردہ لوگ مسلمان ہونے کے باوجود اسلام کے کھلے دشمنوں سے کم خطرناک نہیں ہیں بلکہ یہ لوگ اسلام اور تحریک احیائے اسلام کے لئے زیادہ مضر ہو سکتے ہیں۔بے شک یہ قرآن اس بات کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو نہایت ہی مضبوط اور قائم ہے۔قرآن خود اپنی تردید ہرگز نہیں کرتا۔ہمیں چاہئے کہ ہم قرآن کا مطالعہ دینی بصیرت کے ساتھ کریں۔

---ooo---

# درس نمبر ۵۳ ایک نظر میں

یہ پورا سبق ایک ہی مسئلے کو لیتا ہے۔ اگرچہ موضوعات مختلف ہیں لیکن یہ تمام موضوعات ایک ہی محور کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی نظام حیات میں قانون سازی کا مسئلہ ذات باری سے تعلق رکھتا ہے اور یہ حق صرف اللہ کا ہے کہ وہ حلال و حرام کے حدود و قیود کا تعین کرے۔ یہ اللہ ہی ہے جو جواز اور عدم جواز کے فیصلے کر سکتا ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ اس کا امر ہے اور یہ اس کی جانب سے نہی ہے۔ اس اصولی قاعدے کے ساتھ تمام چھوٹے اور بڑے امور یکساں ہیں' اس لئے زندگی کے تمام معاملات کا حل اس قاعدے کے مطابق ہونا چاہئے۔

انسانوں میں سے جو شخص اپنے لئے قانون سازی کے حق کا دعویٰ کرتا ہے اور اس حق کو استعمال کرتا ہے تو وہ غلطی پر ہے۔ اسلامی نظریے کی رو سے یہ حق صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔ اگر کوئی اللہ کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتا تو گویا وہ اللہ کی الوہیت اور اس کی حاکمیت کو چیلنج کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس قسم کی دست درازی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو شخص لوگوں کے رواج' ان کی اصطلاحات اور ان کے اقوال کے مطابق قانون سازی کرتا ہے وہ اللہ کے کلام کے خلاف بغاوت کرتا ہے اور اس طرح وہ دائرہ ایمان اور حدود اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اور وہ دین اسلام میں نہیں رہتا۔

اس سبق کے تمام فقرے (یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا) سے شروع ہوتے ہیں مثلاً :

(یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (۵ : ۸۷)) — (یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ (۵ : ۹۰)) — (یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ) — (یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ) — (یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَھَادَۃُ بَیْنِکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ حِیْنَ الْوَصِیَّۃِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْکُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِکُمْ (۵ : ۱۰۶))

اس سبق کا موضوع چونکہ مسئلہ قانون سازی ہے' اس لئے اس حوالے سے ان الفاظ کے ساتھ خطاب یہاں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس میں ایک خاص اشارہ پیش نظر ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس مسئلے کا تعلق الوہیت' حاکمیت اور

ایمان اور دین کے ساتھ ہے۔اہل ایمان کو صفت ایمان کے ساتھ پکارا جاتا ہے' اس لئے کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی الوہیت 'حاکمیت کا اقرار کیا جائے۔اس پکار کی وجہ سے اسلام اور دین کا پہلا قاعدہ اور سبق مسلمانوں کے ذہن نشین کرانا مطلوب ہے۔اس مناسبت کے ساتھ حکم دیا جاتا ہے کہ لوگ اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کریں اور اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت سے روگردانی نہ کریں ورنہ ان کو شدید عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔جو شخص یہ اطاعت کرے گا وہ آخرت میں بہت بڑے انعام کا مستحق ہو گا۔

اس کے بعد صفت ایمان کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکم دیا جاتا ہے۔اہل ایمان اور اہل کفر کے درمیان مکمل جدائی ہو گی' اس لئے کہ اہل کفر اہل ایمان کے منہاج کو قبول نہیں کرتے۔اہل ایمان کا منہاج تو یہ ہے کہ وہ چھوٹے بڑے معاملات میں حق قانون سازی اللہ کو دیتے ہیں اور اللہ کے حق حاکمیت پر دست درازی نہیں کرتے۔

(يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵ : ۱۰۵)) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنی فکر کرو' کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا' اگر تم خود راہ راست پر ہو۔اللہ کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے' پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔" اہل ایمان ایک امت ہیں' جس کا اپنا دین' اپنی شریعت' شریعت کے اپنے مصادر ہیں اور وہ ان کے سوا کسی اور ذریعے سے قانون نہیں اخذ کرتی۔اگر یہ امت تمام اقوام و ملل پر اپنا یہ موقف واضح کر دے اور پھر بھی وہ گمراہ ہوں تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں' اگر وہ ان سے مکمل جدائی رکھے اور انہیں ان کی جاہلیت اور ضلالت پر چھوڑ دے۔سب نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔

یہ ہے اس پورے سبق کا محور۔رہے وہ موضوعات جو اس سبق کے اندر ہیں اور جو اس دائرے کے اندر گھومتے ہیں تو وہ مختلف ہیں۔اب اس عمومی دائرے کے اندر ان موضوعات کو ہم ذرا تفصیل کے ساتھ لیتے ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۵۳ تشریح آیات

## ۸۷ --- تا --- ۱۰۸

---

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تُحَرِّمُوا۟ طَيِّبَٰتِ مَآ أَحَلَّ ٱللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوٓا۟ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلْمُعْتَدِينَ ﴿٨٧﴾ وَكُلُوا۟ مِمَّا رَزَقَكُمُ ٱللَّهُ حَلَٰلًا طَيِّبًا ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ٱلَّذِىٓ أَنتُم بِهِۦ مُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ ٱللَّهُ بِٱللَّغْوِ فِىٓ أَيْمَٰنِكُمْ وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا عَقَّدتُّمُ ٱلْأَيْمَٰنَ ۖ فَكَفَّٰرَتُهُۥٓ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَٰكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ۖ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَٰثَةِ أَيَّامٍ ۚ ذَٰلِكَ كَفَّٰرَةُ أَيْمَٰنِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ ۚ وَٱحْفَظُوٓا۟ أَيْمَٰنَكُمْ ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمْ ءَايَٰتِهِۦ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٨٩﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں انہیں حرام نہ کر لو اور حد سے تجاوز نہ کرو' اللہ کو زیادتی کرنے والے سخت ناپسند ہیں۔ جو کچھ حلال و طیب رزق اللہ نے تم کو دیا ہے اسے کھاؤ پیو اور اس خدا کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔

تم لوگ جو مہمل قسمیں کھالیتے ہو' ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا' مگر جو قسمیں تم جان بوجھ کر کھاتے ہو ان پر وہ ضرور تم سے مواخذہ کرے گا۔ (ایسی قسم توڑنے کا) کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو' یا انہیں کپڑے پہناؤ' یا ایک غلام آزاد کرو' اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو' وہ تین دن کے

روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب کہ تم قسم کھا کر توڑ دو۔ اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو۔ اس طرح اللہ اپنے احکام تمہارے لئے واضح کرتا ہے شاید کہ تم شکر ادا کرو۔"

"اے ایمان لانے والو' تمہارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تم انسان اور اللہ کے غلام ہوتے ہوئے' اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کے حقوق پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہ کرو' اس لئے تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے حلال کردہ کاموں اور اشیاء کو حرام قرار دو' خصوصاً پاکیزہ چیزوں کو۔ اس لئے تم پاک چیزوں کے کھانے اور پینے سے اس طرح نہ رکو کہ تم ان کو اپنے لئے حرام قرار دے لو۔ اس لئے کہ اللہ نے یہ پاک چیزیں تمہارے لئے ہی تو پیدا کی ہیں اور پھر یہ کہ حلال و حرام کے حدود کا تعین کرنے والا تو اللہ ہی ہے۔

(یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (۸۷) وَکُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْٓ اَنْتُمْ بِہٖ مُؤْمِنُوْنَ (۸۸)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں انہیں حرام نہ کر لو اور حد سے تجاوز نہ کرو' اللہ کو زیادتی کرنے والے سخت ناپسند ہیں۔ جو کچھ حلال و طیب رزق اللہ نے تم کو دیا ہے اسے کھاؤ پیو اور اس خدا کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ قانون سازی کے مسئلے کا تعلق خاص مسئلہ حاکمیت اور الوہیت کے ساتھ ہے۔ قانون سازی کا حق اللہ کی حاکمیت کے ساتھ مخصوص اس لئے ہے کہ اللہ ہی انسانوں کا مالک اور خالق ہے اور وہی ہے جو انسانوں کو رزق فراہم کرتا ہے۔ اس لئے یہ حق صرف اللہ کا ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے لئے' اپنے پیدا کردہ رزق میں سے بعض چیزوں کو حلال کر دے اور بعض کو حرام کر دے۔ یہ ایک ایسی دلیل ہے جس کو انسانوں کی عقل بڑی آسانی سے مان لیتی ہے۔ انسانوں کے نزدیک بھی کسی چیز کا مالک ہی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی مملوکہ چیز میں جس طرح چاہے تصرف کرے اور جو شخص بھی کسی کے حق ملکیت پر دست درازی کرتا ہے تو اسے ظلم و زیادتی کا مرتکب تصور کیا جاتا ہے۔ جو لوگ ایمان لا چکے' ظاہر ہے کہ ان سے یہ توقع نہیں ہے کہ وہ اللہ کے حقوق پر دست درازی کریں گے اس لئے کہ اللہ پر ایمان اور پھر اللہ سے بغاوت دونوں ایک دل میں کس طرح جمع ہو سکتے ہیں۔

یہ ہے وہ مسئلہ جسے یہ دو آیات ایسے واضح اسلوب میں پیش کرتی ہیں کہ کوئی معقول شخص اس بارے میں کوئی مباحثہ اور مجادلہ نہیں کر سکتا اس لئے کہ اللہ دست درازی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ مسئلہ ایک عام قاعدے اور اصول کو طے کرتا ہے کہ تمام لوگ اللہ کے بندے اور غلام ہیں اور اس مسئلے کے مطابق اپنا طرز عمل ڈھالنا تقاضائے ایمان ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ دو آیات اور ان سے اگلی آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئیں۔ یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں پیش آیا لیکن آیت عام ہے اور اسباب نزول کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اسباب نزول کے ذریعے فہم قرآن میں اچھی مدد ملتی ہے۔

ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ ایک دن حضور تشریف فرما تھے۔ آپ نے لوگوں کو یاد دہانی کی۔ آپ اٹھ کر چلے گئے

اور آپ نے اس دن انہیں بہت نہ ڈرایا۔ آپ کے جو ساتھی بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے کہا کہ ہم لوگ کچھ باتیں اور اعمال اپنی طرف سے کیوں نہ شروع کر دیں' نصاریٰ نے تو ایسا کیا کہ بعض چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا' ہمیں بھی چاہئے کہ ہم اپنے اوپر بعض چیزیں حرام کر لیں۔ بعض نے کہا کہ وہ گوشت اور سرین نہ کھائے گا۔ بعض نے کہا کہ وہ دن کو نہ کھائے گا۔ بعض نے اپنے اوپر عورتیں حرام کر لیں' یہ بات رسول اللہ تک پہنچی۔ آپ نے فرمایا کہ لوگ بھی عجیب ہیں کوئی اپنے اوپر عورتوں کو حرام کرتا ہے کوئی کھانا حرام کرتا ہے کوئی نیند حرام کرتا ہے۔ خبردار میں تو سوتا بھی ہوں' کھڑا بھی ہوتا ہوں' روزے بھی رکھتا ہوں' کھاتا بھی ہوں' عورتوں کے ساتھ نکاح بھی کرتا ہوں' پس جو شخص میری اس سنت سے منہ موڑے گا وہ مجھ سے نہ ہو گا۔" اس پر یہ آیات نازل ہوئیں

(یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا) صحیحین میں حضرت انس ؓ سے ایک روایت منقول ہے' وہ بھی ابن جریر کی روایت کی موید ہے۔ انس۔ فرماتے ہیں کہ تین افراد ازواج مطہرات کے گھر آئے' انہوں نے حضرت نبی ؐ کی عبادت کے بارے میں پوچھا۔ جب ان کو حضور کی عبادات کے بارے میں معلومات دی گئیں تو گویا انہوں نے ان عبادات کو کم سمجھا۔ انہوں نے کہا ہم حضور کے رتبے تک کب پہنچ سکتے ہیں؟ اللہ نے حضور کے سابقہ اور آیندہ تمام گناہوں کو معاف کر دیا ہے۔ ایک نے کہا میں تو تمام رات نماز پڑھوں گا' دوسرے نے کہا کہ میں تو ہمیشہ کے لئے روزے رکھوں گا اور کبھی افطار نہ کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں تو کبھی بھی عورتوں کے پاس نہ جاؤں گا اور نہ نکاح کروں گا۔ حضور کو جب علم ہوا تو آپ ان کے پاس آئے اور ان سے پوچھا کہ تم لوگ ہو جنہوں نے یہ یہ باتیں کیں۔ خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ متقی ہوں لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں' نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں کے ساتھ نکاح بھی کرتا ہوں۔ لہٰذا جو میری سنت سے ہٹا وہ مجھ سے نہ ہو گا۔"

ترمذی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس ؓ سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص حضور کے پاس آیا اور کہا حضور میں جب گوشت کھاتا ہوں تو مجھ پر شہوت غالب آجاتی ہے اور میں عورتوں کے لئے اٹھتا ہوں اس لئے میں نے اپنے اوپر گوشت حرام کر لیا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی

(یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ) اب رہی وہ آیت جس میں قسموں کا ذکر ہے اور جو ان دو آیات کے بعد آتی ہے تو وہ بھی ایسے ہی حالات میں ہدایت دیتی ہے۔

(لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ فَکَفَّارَتُہٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَۃِ مَسٰکِیْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَھْلِیْکُمْ اَوْ کِسْوَتُھُمْ اَوْ تَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَۃِ اَیَّامٍ ذٰلِکَ کَفَّارَۃُ اَیْمَانِکُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ

وَاحْفَظُوْا اَیْمَانَکُمْ کَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (۸۹) ”تم لوگ جو مہمل قسمیں کھا لیتے ہو ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا‘ مگر جو قسمیں تم جان بوجھ کر کھاتے ہو‘ ان پر وہ ضرور تم سے مواخذہ کرے گا۔ (ایسی قسم توڑنے کا) کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو‘ یا انہیں کپڑے پہناؤ یا ایک غلام آزاد کر دو‘ اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب کہ تم قسم کھا کر توڑ دو۔ اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو۔ اس طرح اللہ اپنے احکام تمہارے لئے واضح کرتا ہے شاید کہ تم شکر ادا کرو۔“

یہ آیت ایسے حالات کے لئے ہے کہ کوئی مباح چیزوں کے استعمال کرنے کے خلاف حلف اٹھائے مثلاً جن تین افراد نے قسم اٹھائی تھی کہ وہ یہ یہ کام نہیں کریں گے‘ اور انہیں رسول اللہ نے قسم کو جاری رکھنے سے منع کر دیا تھا۔ اور قرآن نے ان کو اس بات سے روک دیا تھا کہ وہ اپنے لئے حلال و حرام خود مقرر نہیں کر سکتے۔ یہ ان کا کام نہیں ہے‘ یہ تو اس اللہ کا کام ہے جس پر وہ ایمان لائے ہیں۔ اس طرح یہ ان تمام صورتوں کے لئے ہدایت ہے جن میں کوئی کسی اچھے کام سے بذریعہ حلف اپنے آپ کو روک لیتا ہے۔ اس لئے کہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی نیک کام کے نہ کرنے کی قسم اٹھاتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ نیک کام جاری رکھے اور قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرے جس کی تفصیلات اس آیت میں دی گئی ہیں۔

حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہوا کہ جن لوگوں نے اپنے اوپر بعض کھانے‘ بعض لباس اور عورتوں کے ساتھ نکاح حرام کر لیا تھا‘ انہوں نے اس پر حلف بھی اٹھایا تھا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی ”اللہ کی پاک چیزیں اپنے اوپر حرام نہ کرو“ تو انہوں نے پوچھا کہ ہماری قسموں کا کیا بنے گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر لغو قسموں کے بارے میں کوئی مواخذہ نہیں کرتا۔ یعنی محض زبان پر لفظ قسم جاری ہو جائے لیکن دل سے پختہ ارادہ قسم نہ ہو‘ البتہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم یہ ہے کہ خواہ مخواہ ہر بات پر اللہ کی قسم نہ اٹھائی جائے‘ اس لئے کہ اللہ کی قسم کا کچھ تو احترام ہونا چاہئے۔ اللہ کی قسم کا وقار ہونا چاہئے اس لئے لغو قسم بھی بار بار اٹھانا ناپسندیدہ ہے۔ رہی وہ سچی قسم جو قصداً ہوتی ہے اور اس کے پیچھے پختہ ارادہ ہوتا ہے‘ کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کا تو وہ لغو کی طرح معاف نہیں ہے۔ اس پر کفارہ واجب ہے اور یہ آیت اسی کو بیان کرتی ہے۔ ”سچی قسموں کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ یا انہیں کپڑے پہناؤ یا ایک غلام آزاد کرو اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے۔ اگر تم قسم کھا کر توڑ دو۔“

دس مسکینوں کے لئے اوسط درجے کا کھانا ایسا ہو گا کہ قسم اٹھانے والا جس قدر کھانا اپنے اہل و عیال کو دیتا ہے۔ اوسط کا مفہوم احسن بھی ہو سکتا ہے اور متوسط بھی ہو سکتا ہے کیونکہ لفظ اوسط احسن اور متوسط دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اوسط سے دونوں مفہوم مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ اسلام کے پیمانے میں اوسط ہی احسن ہوتا ہے۔

(اَوْ كِسْوَتُهُمْ) سے مراد یہی ہے کہ دس مسکینوں کو اوسط درجے کی پوشاک پہنائی جائے یا ایک غلام آزاد کیا جائے اور یہاں اس بات کی تصریح نہیں کی گئی کہ غلام کو مومن ہونا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بارے میں فقہاء کے

درمیان اختلاف رائے ہوا ہے۔ ہم تو فی ظلال القرآن میں فقہی اختلافات کا ذکر نہیں کرتے۔ اگر استطاعت نہ ہو تو پھر تین روزے رکھے۔ یہ اس صورت میں ہوں گے کہ دوسرے بیان کردہ کفارات میں سے کسی کی ادائیگی ممکن نہ ہو۔ اس طرح یہ تین روزے مسلسل ہوں گے یا مسلسل نہ ہوں گے' اس بارے میں بھی فقہی اختلافات ہوئے ہیں اس لئے کہ یہاں متتابعات کی تصریح نہیں ہے۔ فی ظلال القرآن میں ہمارے طریقہ کار میں فقہی تفصیلات میں جانا ممکن نہیں ہے۔ اگر کسی کو شوق ہو تو کتب فقہ میں تلاش کرے۔ تمام فقہی اختلافات اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کفارہ اس لئے عائد کیا گیا ہے کہ حالف نے پختہ عقد کو توڑا ہے۔ دوسرے یہ کہ قسموں کو ہلکا نہ سمجھا جائے اس لئے کہ قسمیں بھی دراصل ایک عہد ہوتی ہیں اور اللہ کا حکم یہ ہے کہ عقد اور عہد کو پورا کیا جائے۔ اور اگر صورت یہ ہو کہ کوئی قسم اٹھالے اور جس بات سے اس نے قسم اٹھائی ہے وہ اچھا کام ہے تو اس پر فرض ہے کہ قسم توڑے اور اچھے کام کو جاری رکھے۔ اور اگر اس نے ایسی قسم اٹھائی ہے جس میں اس کا کوئی حق نہیں ہے مثلاً حلال کرنا یا حرام کرنا تو اس پر فرض ہے کہ وہ قسم توڑ دے اور کفارہ ادا کرے۔

اب ہم اس اصل موضوع کی طرف آتے ہیں جس کی وجہ سے یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ ان آیات کے اسباب نزول کے زاویے سے دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ یہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے تو وہ طیب ہیں اور جن چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے تو جان لو کہ وہ خبیث اور ناپاک ہیں۔ انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے وہ کچھ اختیار کرے جو اللہ نے اس کے لئے اختیار نہیں کیا ہے۔ اور اس کی دو وجوہات ہیں۔

ایک یہ ہے کہ حرام و حلال کے قیود مقرر کرنا اللہ کے خصوصی حقوق میں سے ہے' جو رازق ہے۔ جب رازق وہ ہے تو اس رزق میں تحریم و تحلیل بھی اسی کا کام ہے۔ اگر کوئی اللہ کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتا تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے۔ اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا اور نہ اس طرح ایمان درست ہو سکتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ نے طیبات کو حلال قرار دیا ہے لہٰذا کسی کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنے اوپر پاکیزہ چیزوں کو حرام کرلے اس لئے کہ یہ چیزیں اس شخص کے لئے بھی مفید ہیں اور اس کرۂ ارض پر زندگی کے تسلسل کے لئے بھی مفید ہیں۔ انسان کی سوچ و بصیرت وہاں تک نہیں پہنچ سکتی جہاں تک علیم و خبیر کی بصیرت کی رسائی ہے جس نے ان طیبات کو حلال قرار دیا ہے۔ اگر ان طیبات میں کوئی خرابی ہوتی تو اللہ اس سے اپنے بندوں کو ضرور بچاتا۔ اگر ان کے حرام کر دینے میں کوئی بھلائی ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان کو حلال ہی نہ کرتا۔ یہ دین تو آیا ہی اس لئے ہے کہ خیر' بھلائی اور بہتری کو روبکار لائے اور انسانیت کی تمام قوتوں کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور توازن قائم کرے۔ اسلام انسانی فطرت کی ضروریات میں سے کسی ضرورت سے غافل نہیں ہے اور نہ اس نے انسان کی تعمیری قوتوں میں سے کسی قوت کو مہمل چھوڑا ہے۔ اسلام نے وسط کو اختیار کیا ہے اور جادۂ مستقیم پر رواں دواں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے رہبانیت کے ساتھ جنگ کی' اس لئے کہ رہبانیت کا مقصد فطرت کشی تھا۔ اس سے زندگی کی نشوونما رک رہی تھی حالانکہ اللہ کی اسکیم یہ تھی کہ کرۂ ارض پر زندگی کو نشوونما حاصل ہو' اور طیبات کو حرام کرنے سے اسلام نے اس لئے منع کیا کہ طیبات موجب ترقی حیات ہیں جن سے اس دنیا میں زندگی کی تجدید ہوتی چلی جاتی ہے۔ اللہ نے اس زندگی کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ تسلسل سے رہے اور اللہ کے نظام حیات کے مطابق اس کی تجدید ہوتی رہے۔ رہبانیت جو طیبات کو حرام قرار دیتی ہے وہ اسلامی نظام

حیات کی اسکیم کے ساتھ متصادم ہے۔ رہبانیت انسانیت کو ایک متعین مقام پر روک دیتی ہے اور یہ رکاوٹ وہ بلندی اور علو مرتبت کے نام سے پیدا کرتی ہے حالانکہ بلندی اور علو شان اسلامی نظام حیات کے اندر داخل ہیں جو ایک ایسا نظام ہے جس کے اندر دواعی فطرت پوری طرح موجود ہیں اور یہ علم الٰہی کے مطابق رکھے گئے ہیں۔

کسی آیت کے نزول کے مخصوص واقعات اس آیت کو ان حالات کے اندر محدود نہیں کر دیتے۔ آیت بہرحال عام رہتی ہے اور آیت کی یہ عمومیت بتاتی ہے کہ قانون سازی کے اندر بھی حلال و حرام کے حدود و قیود مقرر کرنا اللہ ہی کا کام ہے اور یہ بات صرف کھانے اور پینے تک محدود نہیں ہے یا نکاح تک محدود نہیں ہے۔ زندگی کے تمام امور میں یہ حق اللہ کو حاصل ہے' شریعت کو حاصل ہے۔

ہم اس مفہوم پر بار بار زور اس لئے دے رہے ہیں کہ ایک طویل عرصہ گزر گیا ہے کہ لوگوں نے اسلام کو زندگی کے عملی دھارے سے نکال دیا ہے' حالانکہ اسلام کی شان یہ ہے کہ وہ پوری زندگی پر حکمران ہو۔ حلال و حرام کے الفاظ اور ان کے پرتو کو محدود کر دیا گیا ہے اور اب اس کے وہ معنی نہیں لئے جاتے جو قرآن کو مطلوب تھے۔ لوگوں کے ذہنوں میں اب حلال و حرام کا مفہوم صرف ذبیحوں' کھانے' پینے کی چیزوں' لباسوں اور نکاح کے اندر محدود ہو گیا ہے۔ لوگ عموماً حلال و حرام کے متعلق صرف انہی باتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ کیا حلال ہے' اور کیا حرام ہے؟ رہے وہ عمومی اور بڑے بڑے معاملات تو ان کے بارے میں فتویٰ وہ جدید دساتیر اور جدید قوانین سے پوچھتے ہیں جو انہوں نے شریعت کی جگہ جاری کر دیئے ہیں۔ غرض تمام اجتماعی معاملات میں' تمام سیاسی نظاموں کے بارے میں' تمام بین الاقوامی معاملات میں اور اللہ کے حق حاکمیت اور الوہیت کے بارے میں اب لوگ اسلام سے فتویٰ طلب نہیں کرتے۔

یاد رہے کہ اسلام ایک مکمل منہاج حیات ہے جو شخص پورے پورے اسلام کا اتباع کرے گا وہی اللہ کے دین میں ہو گا اور جو شخص کسی ایک بھی معاملے میں شریعت کو چھوڑ کر کسی دوسرے قانون کی اطاعت کرے گا تو وہ دین سے خارج ہو جائے گا۔ چاہے وہ ہزار بار اسلامی عقیدے کا اظہار کرے اور یہ اعلان کرے کہ وہ مسلمان ہے' اس لئے کہ اس کے اعلان اسلام کو اس کا یہ عمل جھٹلا دیتا ہے۔ جب وہ اللہ کی شریعت کو چھوڑ کر کسی اور قانون کا اتباع کرتا ہے اور اس طرح وہ دین اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

یہ ہے وہ اصول اعظم جس کا تعین یہ آیات کرتی ہیں' اسے ایمان کا مسئلہ قرار دیتی ہیں' اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے تو اسے اللہ کے حقوق پر دست درازی قرار دیتی ہیں' اور یہی ہے ان آیات کا مفہوم و مدعا۔ یہی مفہوم اس دین کی سنجیدگی اور قرآن کریم کی سنجیدگی کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور اسی کے مطابق الوہیت کا مفہوم اور معنی حقیقی روپ اختیار کرتا ہے۔

---ooo---

اسی سلسلۂ قانون سازی میں جوے اور شراب کے بارے میں آخری اور قطعی حکم آ جاتا ہے تاکہ جماعت مسلمہ کی تربیت ہو اور اسے جاہلیت کی تمام آلودگیوں سے پاک کر دیا جائے' اسے جاہلیت کی گندی اجتماعی عادات سے پاک کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ہی آستانوں اور پانسوں کو بھی حرام قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ بھی شرکیہ افعال ہیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ
وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۹۰﴾
إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ
وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ
مُنْتَهُونَ ﴿۹۱﴾ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ
فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴿۹۲﴾ لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا
وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَآمَنُوا وَعَمِلُوا
الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَآمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوْا وَأَحْسَنُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ
۱۲ ع ۷ ۲ الْمُحْسِنِينَ ﴿۹۳﴾

---

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے' یہ سب گندے شیطانی کام ہیں' ان سے پرہیز کرو' امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟ اللہ اور اس کے رسول کی بات مانو اور باز آجاؤ' لیکن اگر تم نے حکم عدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسول پر بس صاف صاف حکم پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی۔

جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے انہوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا تھا' اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی بشرطیکہ وہ آئندہ ان چیزوں سے بچے رہیں جو حرام کی گئی ہیں اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور اچھے کام کریں' پھر جس چیز سے روکا جائے اس سے رکیں اور جو فرمان الٰہی ہو اسے مانیں' پھر خدا ترسی کے ساتھ نیک رویہ رکھیں۔ اللہ نیک کردار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔"

شراب' جوا' آستانے اور پانسے جاہلی معاشرے کی سب سے بڑی علامات تھیں اور یہ ایسی عادات تھیں جن کا جاہلی معاشرے کے اندر بہت زیادہ رواج تھا۔ یہ تمام عادات دراصل ایک معاشرتی کل تھیں اور باہم مربوط تھیں اور جاہلی

معاشرے کی پہچان تھیں ۔ اہل جاہلیت بڑی مقدار میں شراب استعمال کرتے تھے اور اس میں وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے ۔ ان کی فخریہ حکایات اور فخریہ اشعار کا موضوع کثرت شراب نوشی ہوا کرتی تھی ۔ مجالس شراب کے ساتھ پھر جانوروں کا ذبح کرنا اور شراب کے ساتھ کباب اور تکے کھلانا بھی لازم تھا ۔ اس میں پینے اور پلانے والے سب شریک ہوتے اور اس طرح اس قسم کی مجالس میں سب کے لئے دلچسپی کا سامان ہوتا ۔ یہ ذبیحے وہ بتوں کے نام اور آستانوں پر کرتے تھے اور ان ذبیحوں کا خون بتوں پر ڈالتے تھے ۔ نیز وہ اپنے الہوں اور کاہنوں کے نام پر بھی بعض جانوروں کو ذبح کرتے تھے ۔ شراب نوشی اور دوسرے مواقع پر جو جانور ذبح کرتے تھے ' ان کے گوشت کو پھر وہ پانسوں کے ذریعے تقسیم کرتے تھے ۔ ہر شخص اپنے پانسے کے مقررہ حصے کا گوشت لیتا تھا' جس کا پانسہ اونچا نکلا اس کا حصہ بھی زیادہ ہوتا تھا ۔ اسی طرح گوشت تقسیم ہوتا' یہاں تک کہ بعض اوقات جانور ذبح کرنے والے کے حصے میں کچھ نہ آتا اور وہ مکمل خسارے میں پڑ جاتا ۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی رسوم اور عادات باہم مربوط اور متعلق تھیں اور یہ عادات انہی جاہلی طریقوں پر جاری تھیں ........ اسلامی نظام زندگی نے تحریک کا آغاز ان رسوم کی اصلاح سے شروع نہیں کیا اس لئے کہ یہ رسوم اور عادات بعض فاسد نظریاتی تصورات پر قائم تھیں ۔ اگر محض اصلاح رسوم کی سطحی تحریک شروع کر دی جاتی اور اصل اعتقادی نظریات کی بیخ کنی نہ کی جاتی تو یہ کام نہایت ہی سطحی ہوتا ۔ اسلام سے ہرگز یہ توقع نہ کی جاسکتی تھی کہ وہ جڑوں کو چھوڑ کر محض سطحی امور تک اپنے آپ کو محدود کر دے ۔ اسلام نے سب سے پہلے نفس انسانی کی پہلی گرہ یعنی عقائد و نظریات پر کلام کیا ۔ اس نے سب سے پہلے جاہلی عقائد و تصورات کو لیا اور انہیں جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا ۔ ان کی جگہ پاک و صاف اسلامی نظریہ حیات دیا اور یہ تصور اور نظریہ فطرت انسانی کی گہرائیوں تک اتار دیا ۔ اسلام نے متعدد الہوں کے بارے میں ان کے تصورات کے فساد کو ظاہر کیا اور ان کو ایک اللہ حق کے عقیدے پر مجتمع کر دیا ۔ جب ان کے دل و دماغ پر یہ عقیدہ توحید چھا گیا تو اب وہ فطری طور پر سوچنے کے لئے تیار ہو گئے کہ ان کا اللہ الحق کس بات کو پسند کرتا ہے اور کس بات کو پسند نہیں کرتا ۔ اس نظریاتی اصلاح سے پہلے وہ کب اپنی عادات و رسومات کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو سکتے تھے وہ نظریاتی تبدیلی کے بغیر اپنے جاہلی پسندیدہ طریقوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے ۔ اگرچہ انہیں بار بار نصیحت کی جاتی ۔ فطرت کی گرہ درحقیقت عقیدے کی گرہ ہوتی ہے ۔ جب تک سب سے پہلے اس گرہ اور عقدے کو حل نہ کیا جائے اس وقت تک کوئی اخلاقی تعلیم' کوئی تہذیب اخلاق کا پروگرام اور کوئی اجتماعی اصلاحی سکیم کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ نظریہ دراصل انسانی فطرت کی کنجی ہے ۔ جب تک یہ کنجی لگا کر فطرت انسانی کو کھول کر نہیں دیا جاتا اس وقت تک اس کے نہاں خانے اور اس کی راہ و رسم کی تہ تک رسائی ممکن نہ ہو گی ۔ جب ہم اس کی ایک تنگ گلی کو کھولیں گے تو کئی اور تنگ گلیاں سامنے آئیں گی اور اگر ہم اس کا ایک پہلو روشن کر لیں گے تو دس اور تاریک پہلو سامنے آئیں گے ۔ ہم ایک گرہ کھولیں گے اور مزید دس گرہیں لگ جائیں گی ۔ ہم ایک راہ کھولیں گے تو دس راہیں بند ہو جائیں گی اور اس طرح ہم ایسی بھول بھلیوں میں پڑ جائیں گے کہ نکلنے کی راہ نہ ملے گی ۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام حیات نے جاہلیت کی بری رسموں اور گندی عادات سے اپنے اصلاحی کام کا آغاز نہ کیا ۔ اسلام نے سب سے پہلے نظریاتی اصلاح سے کام شروع کیا ۔ سب سے پہلے یہ مطالبہ ہوا کہ تم کلمہ طیبہ کو قبول کرو اور

مکہ کے ابتدائی تیرہ سال اسی نظریاتی اصلاح اور عقائد کی درستی میں صرف ہوئے ۔ان طویل سالوں میں تحریک اسلامی کا نصب العین ہی شہادت لا الہ الا اللہ رہا۔اس عرصے میں لوگوں کو رب العالمین سے متعارف کرایا گیا' ان کو صرف اسی کی بندگی کی دعوت دی جاتی رہی' اور لوگوں کو صرف اسی کی بادشاہت کی طرف بلایا جاتا رہا یہاں تک کہ ان کے نفوس صرف رب واحد کے لئے خالص ہو گئے ۔ان کی حالت یہ ہو گئی کہ وہ اپنے لئے وہی کچھ پسند کرنے لگے جو ان کے لیے ان کا خدا پسند کرتا تھا۔جب نظریاتی اصلاح اس ڈگری تک پہنچ گئی تو اب فرائض کا آغاز ہوا' مراسم عبودیت فرض ہوئے' اب جاہلیت کی گندی عادات اور رسوم کی اصلاح کا آغاز ہوا' اجتماعی طور طریقوں کے بدلنے کے احکام صادر ہونا شروع ہوئے' اقتصادی اصلاحات نافذ کی گئیں 'نفسیاتی اور اخلاقی طرز عمل کی اصلاح شروع ہوئی اور یہ کام ایسے وقت میں شروع ہوا کہ ادھر سے اللہ کا حکم آتا ادھر سے مسلمان اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے' بغیر کسی حیل وحجت کے' اس لئے کہ انہوں نے امر و نہی کے تمام اختیارات اللہ العالمین کے سپرد کر دیئے تھے ان کا اپنا کچھ اختیار نہ تھا۔

دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اوامر اور نواہی کی تلقین اس مرحلے کے بعد شروع ہوئی جب لوگوں نے مکمل انقیاد سے سر تسلیم خم کر دیا۔ ہر ایک مسلم نے اپنا سب کچھ اللہ کے حوالے کر دیا' اور یہ بات تسلیم کر لی کہ اللہ کے اوامر و نواہی کے بالمقابل اس کا کوئی اختیار نہیں ہے جیسا کہ استاد ابوالحسن علی ندوی نے کہا ہے وہ اپنی کتاب عالم اسلام میں مشرقیت اور مغربیت کی کشمکش میں کہتے ہیں۔

"کفر و شرک کا عظیم عقدہ کھل گیا۔بے شک یہ ایک عظیم عقدہ تھا۔اس عقدے کا کھلنا تھا کہ تمام عقدے کھل گئے ۔حضور ؐ نے ان کے ساتھ یہ پہلا جہاد کیا اور اس لئے انہیں مزید کسی جہاد کی ضرورت نہ رہی ۔ ہر امر اور ہر نہی کے لئے آپ کو کوئی جدوجہد کرنا نہ پڑی۔اس پہلے نظریاتی معرکے میں اسلام کو جاہلیت پر فتح نصیب ہوئی اور اس کے بعد ہر معرکے میں کامیابی نے آپ کا ساتھ دیا۔یہ اس لئے ہوا کہ یہ لوگ اپنے دلوں' اپنی روح' اپنے اعضاء کے ساتھ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو گئے تھے ۔جب ان پر ہدایت نازل ہوتی تو وہ حضور ؐ کے ساتھ مخالفت اور مخاصمت نہ کرتے تھے ۔حضور ؐ جو فیصلہ کرتے اس پر وہ اپنے دلوں میں کوئی خلجان نہ پاتے اور سوال کے فیصلے کے بعد ان کے لئے کوئی اختیار یا دائرہ اختیار نہ رہا تھا۔جب معاملات میں ان سے ضمیر اور عقیدے کے خلاف کوئی بات سرزد ہو جاتی تو وہ کھلے طور پر حضور ؐ کو بتلا دیتے' اور اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کر دیتے ۔جب ان سے غلطی ہوتی تو ان پر حد نافذ ہو جاتی۔تحریم شراب کا حکم آتا ہے' شراب سے بھرے ہوئے جام ان کے ہاتھوں میں ہیں اور اللہ کا حکم حائل ہو جاتا ہے اور وہ ہونٹوں تک نہیں جاتے ۔ہونٹ خشک اور جگر پیاسے رہ جاتے ہیں۔شراب کے مٹکے توڑ دیئے جاتے ہیں اور شراب مدینہ کی گلیوں میں سیلاب کی طرح بہ نکلتی ہے۔"

لیکن اس کے باوجود تحریم شراب اور اس کے ساتھ دوسری اشیاء کی تحریم کوئی اچانک کام نہ تھا۔اس آخری تحریم سے پہلے اس عام اور نہایت ہی گہری بیماری کا علاج بڑی تدریج کے ساتھ کیا گیا' اس لئے کہ لوگ اس کے رسیا تھے۔ اور یہ ان کے لئے ایک نہایت ہی عادی نشہ تھا۔اس کے ساتھ ان کے معاشرتی اور اقتصادی مفادات وابستہ ہے۔

شراب کی یہ آخری حرمت تیسرے یا چوتھے مرحلے میں نازل ہوئی۔پہلے مرحلے میں محض اس سمت میں ایک تیر پھینکا گیا جس کی طرف اسلامی نظام کا رجحان تھا سورۂ نحل کی ایک آیت میں کہا گیا :

(وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا

(۱۶: ۶۷)) "کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے جن سے تم شراب اور رزق حسن حاصل کرتے ہو۔" یہاں سکر یعنی مسکرات کو رزق حسن کے مقابلے میں رکھا گیا جس سے یہ اشارہ مطلوب تھا کہ مسکرات رزق حسن کی کی تعریف میں نہیں آتے ۔ گویا مسکرات کوئی اور چیز ہے اور رزق حسن کوئی اور چیز ہے ۔ اس کے بعد سورۂ بقرہ میں مسلمانوں کے دینی وجدان کو شراب کے خلاف ایک قانونی اور منطقی استدلال کے ذریعے جگایا گیا۔

(يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ

اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲: ۲۱۹)) "آپ سے شراب اور جوے کے بارے میں پوچھتے ہیں' کہہ دیجئے ان میں گناہ بھی ہے اور لوگوں کے لئے منافع بھی ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے منافع سے بہت ہی بڑا ہے۔" اس آیت میں یہ اشارہ کیا گیا کہ جب ان سے ان کا گناہ بڑا ہے تو قلیل منافع کو نظرانداز کر کے ان کو ترک کرنا ہی اولیٰ ہے ۔ اس لئے کہ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی فائدہ تو ضرور ہوتا ہے ۔ البتہ حلال اور حرام ہونے کا دارومدار اکثریت پر ہوتا ہے ۔ نفع اور نقصان کا غلبہ دیکھا جاتا ہے۔

تیسرا اقدام یہ کیا گیا کہ شراب نوشی کی عادت میں اوقات کی کمی کر دی گئی اور شراب نوشی کو حالت صلوٰۃ کے منافی قرار دیا گیا۔ سورہ نساء کی مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی :

(يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ

(۴: ۴۳)) "اے ایمان لانے والو' جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب مت جاؤ' یہاں تک کہ تم جو کچھ کہو اسے سمجھو۔" اب پانچ وقت کی نمازیں چونکہ اکثر باہم بہت ہی قریب ہیں اور ان کے درمیان اس قدر وقفہ نہیں ہوتا کہ کوئی شراب پئے اور نشے میں ہو کر پھر اسے افاقہ ہو جائے' چنانچہ ان اوقات کے اندر عملاً شراب نوشی کا امکان ہی نہ رہا اور اس عمل کے لئے دائرہ تنگ ہو گیا۔ خصوصاً (صبوح) صبح کے وقت کی شراب اور "غبوق" یعنی بعد عصر اور بعد مغرب کی شراب کے لئے اوقات تنگ ہو گئے' اس لئے کہ دور جاہلیت میں انہی اوقات میں شراب پی جاتی تھی اور اس اسکیم کے ذریعے شریعت نے نشے کے اوقات میں خواہش کو توڑ دیا۔ ایک مسلمان کے لئے یہ ایک بہترین تدبیر ثابت ہوئی اس لئے کہ اس وقت کسی مسلم کے بارے میں یہ سوچا بھی نہ جا سکتا تھا کہ وہ نماز چھوڑ کر شراب نوشی کرے گا۔ اس وقت ہر مسلمان اپنے وقت پر نماز ادا کرتا تھا۔ اس طرح شراب کا نشہ ٹوٹ جاتا۔ اس کے بعد چوتھا اور آخری اقدام اس آیت کے ذریعے کیا گیا۔ اب اس آخری وار کے لئے فضا تیار تھی' لوگوں کے نفوس تیار تھے' چنانچہ حکم آتے ہی لوگوں نے یقین کیا اور تعمیل کر ڈالی۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا اے اللہ ہمارے لئے شراب کے سلسلے میں کافی اور شافی بیان دے دے ۔ اس پر سورہ بقرہ کی یہ آیت نازل ہوئی:

(يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲ : ۲۱۹)) "آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں' کہہ دیجئے ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے منافع بھی ہے اور ان کا گناہ ان کے نفع سے بہت زیادہ ہے) حضرت عمرؓ کو بلایا گیا اوران پر یہ آیت پڑھی گئی۔ اس پر انہوں نے دوبارہ کہا اے اللہ ہمارے لئے شراب کے بارے میں کافی و شافی بیان نازل فرما۔اس پر سورہ نساء کی یہ آیت نازل ہوئی :

(يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (۴ : ۴۳)) "اے ایمان لانے والو! نماز کے قریب مت جاؤ جب تم نشے کی حالت میں ہو' یہاں تک کہ تم جو کچھ کہو اسے سمجھو۔" جب حضرت عمرؓ کو یہ آیت سنائی گئی تو انہوں نے پھر سوال کیا کہ اے اللہ شراب کے بارے میں کافی و شافی بیان نازل فرما۔ اس پر سورۂ مائدہ کی یہ آیت نازل ہوئی :

(اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (۵ : ۹۱)) "شیطان یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے' پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے۔" اس پر حضرت عمرؓ کو بلایا گیا اوران کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی تو انہوں نے کہا جی ہاں ہم رک گئے' ہم رک گئے۔" (اصحاب السنن)

جب واقعہ احد کے بعد سن تین ہجری میں یہ آیات نازل ہوئیں تو اس کے سوا کسی اوراقدام کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ بس ایک منادی نے مدینہ میں اعلان کیا :"اے قوم! شراب حرام کر دی گئی۔" یہ سننا تھا کہ جس کے ہاتھ میں پیالہ تھا اس نے اسے توڑ دیا' جس کے منہ میں گھونٹ تھا' اس نے اسے تھوک دیا' شراب کے مشکیزے پھاڑ ڈالے گئے اور شراب کے مٹکے توڑ دیئے گئے اور صورت حال اس طرح ہوگئی کہ گویا لوگوں نے نشے اور شراب کو کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔

اب ذرا قرآن کی آیات کی بناوٹ (Construction) دیکھئے اور وہ انداز تربیت دیکھئے جو قرآن نے اختیار فرمایا۔

(يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۹۰) اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (۹۱) وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ

فَاعْلَمُوْا اَنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (۹۲)) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے' یہ سب گندے شیطانی کام ہیں' ان سے پرہیز کرو' امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہو گی۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟ اللہ اور اس کے رسول کی بات مانو اور باز آ جاؤ۔ لیکن اگر تم نے حکم عدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسول پر بس صاف صاف حکم پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی۔"

آغاز اور لہجہ وہ معروف آواز ہے جس میں لوگوں کو ان کے محبوب لقب اہل ایمان سے پکارا جاتا ہے۔ (یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا) — یوں مسلمانوں کے جذبہ ایمان کو جگایا جاتا ہے اور انہیں یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ ان کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ آنے والے احکام کی مکمل اطاعت کریں۔

اس کے بعد آیت کا انداز بیان نہایت ہی دو ٹوک اور حصر کے انداز میں آتا ہے۔

(اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ) "بے شک یہ شراب اور جوا' آستانے اور پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں۔ یہ گندے کام ہیں اور ان کاموں پر طیب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اور اللہ نے صرف طیبات کو حلال کیا ہے اور پھر یہ شیطانی اعمال ہیں اور شیطان انسان کا قدیمی دشمن ہے۔ ایک مومن کے لئے تو بس یہی کافی ہے کہ اسے معلوم ہو جائے کہ کوئی کام شیطانی ہے' یہ سنتے ہی وہ اس سے بدکتا ہے' اس کا پورا وجود کانپ اٹھتا ہے اور وہ ڈر کر اس سے دور ہو جاتا ہے۔

ایسے حالات میں اب قطعی ممانعت صادر ہو جاتی ہے لیکن اس ممانعت کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس پر عمل سے تمہیں فلاح اخروی نصیب ہو گی۔ یہ ایک دوسری جھلکی ہے' جس کے ذریعے یہ دکھایا جاتا ہے کہ قرآن کریم کس طرح انسانی نفسیات کی گہرائیوں تک احساسات اتار دیتا ہے۔

(فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ) اس سے مکمل اجتناب کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔" اب یہ بتایا جاتا ہے کہ اس گندگی کو جاری رکھ کر شیطان اپنے کیا مقاصد پورے کرنا چاہتا ہے: "شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد اور نماز سے روک دے۔"...... یہ ہے شیطان کا اصل منصوبہ اور یہ ہیں شیطان کے مقاصد جو وہ ان ناپاکیوں اور بداخلاقیوں کے ذریعے بروئے کار لانا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی صفوں کے درمیان بغض و عداوت پھیل جائے اور یہ کام وہ شراب و کباب اور جوئے بازی کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دوسرا مقصد اس سے وہ یہ حاصل کرنا چاہتا ہے کہ اہل ایمان کو یاد الٰہی اور صلوٰۃ سے روکتا ہے' اس سے بڑی سازش اور کیا ہو سکتی ہے؟

یہ شیطانی مقاصد جو قرآن کریم نے بیان کئے ہیں' یہ تو وہ واقعی امور ہیں جنہیں مسلمان اپنی تاریخ میں اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں جبکہ قرآن کریم بذات خود سچا ہے اور اسے کسی تاریخی تصدیق کی ضرورت نہیں ہے۔ اس مسئلے پر کسی بحث اور تفتیش کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شیطان کا یہ منصوبہ کس طرح کام کرتا ہے۔ شراب نوشی سے انسان کا فہم و

اور اک ختم ہو جاتا ہے۔گوشت اور خون کا نقصان اور جذبات اور میلانات کا ہیجان اس کے فوری اثرات ہیں اور جوئے کی وجہ سے لوگوں کو جو مالی نقصان ہوتا ہے' اس کی وجہ سے دلی بغض اور عداوت پیدا ہوتی ہے' اس لئے کہ جوئے میں جو ہارتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ جیتنے والا اس کی دولت کو اس کی آنکھوں کے سامنے بطور مال غنیمت لے کر جارہا ہے جبکہ وہ شکست خوردہ اور دولت بریدہ ہے۔یہ ایسی باتیں ہیں جن کے نتیجے میں بغض و عداوت کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ اگرچہ شرابی اور جوئے باز بظاہر یار اور دوست نظر آتے ہیں اور ایک ہی مجلس میں خوش و خرم نظر آتے ہیں۔ایک دوسرے کے دوست ہیں اور پختہ ہم نشیں ہیں۔

دوسری برائی کہ یہ دونوں چیزیں ذکر الہی سے روکنے والی ہیں اور نماز سے روکتی ہیں۔تو یہ ایسی باتیں ہیں جن کے ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔شراب بے ہوش کرتی ہے اور جوا مدہوش کرتا ہے اور جوئے میں جس طرح مت ماری جاتی ہے وہ شراب نوشی کی بے ہوشی سے کم نہیں ہے۔جوئے بازی کی دنیا اور شراب خوری کی دنیا ایک ہی دنیا ہے اور یہ شراب و کباب اور جام و سبو سے آگے نہیں ہے۔

جب بات یہاں تک آ پہنچتی ہے اور یہ بتا دیا جاتا ہے کہ اس گندگی کے پھیلانے سے شیطان کے اصل مقاصد کیا ہیں تو ایک مومن کا دل جاگ اٹھتا ہے اور اس کا احساس تیز ہو جاتا ہے۔وہ فیصلہ کن اقدام کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے اور جب یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا تم اس سے باز آنے والے ہو؟ تو ہر مومن کے دل میں وہی جواب تیار ہو چکا ہوتا ہے جو حضرت عمرؓ نے دیا تھا۔ہاں! بے شک ہم باز آگئے' ہم باز آگئے۔

اب بات مزید آگے بڑھتی ہے اور ایک آخری چوٹ لگائی جاتی ہے۔

(وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۹۲)) "اللہ اور اس کے رسول کی بات مانو اور باز آجاؤ' لیکن اگر تم نے حکم عدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسول پر بس صاف صاف حکم پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی۔" یہ وہ اصول ہے جس کی طرف تمام معاملات لوٹتے ہیں' اللہ کی اطاعت اور رسول اللہ ؐ کی اطاعت اور یہی ہے اسلام۔اسلام کے اندر اللہ اور رسول اللہ ؐ کی بے قید اطاعت کے علاوہ کسی اور چیز کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔اگر کوئی اللہ اور رسول اللہ ؐ کی اطاعت سے روگردانی کرے گا تو اس کے نتائج کا ذمہ دار وہ خود ہو گا۔

(فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۹۲)) "اگر تم نے حکم عدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صاف صاف حکم بتا دینے کے سوا کوئی اور ذمہ داری نہیں ہے۔ اور رسول ؐ نے تو اللہ کا پیغام بہت ہی اچھے طریقے سے پہنچا دیا۔اس صاف صاف بتا دینے کے بعد تمام تر ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوگی جو مخالفت کر رہے ہیں۔

یہ بالواسطہ طور پر ایک سخت دھمکی ہے۔ایک مومن کا بدن کانپ اٹھتا ہے اس لئے کہ اہل ایمان اگر نافرمانی کرتے ہیں اور اللہ و رسول کی اطاعت نہیں کرتے تو گویا صرف اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔حضور نے تو تبلیغ کر دی اور اپنا فریضہ اچھی طرح

ادا کر دیا اور ان کے معاملے سے فارغ ہو گئے' ہاتھ جھاڑ دیئے۔ اب اگر وہ عذاب کے مستحق ہوتے ہیں تو رسول ان سے عذاب کو دفعہ نہیں کر سکتے۔ خصوصاً جبکہ انہوں نے ان کی نافرمانی کی اور آپ کی اطاعت نہ کی اور اللہ سرکشوں اور نافرمانوں کو سزا دینے پر پوری طرح قادر ہے۔

یہ اسلامی منہاج اصلاح ہے جو انسان کے دلوں میں اترتا ہے' دلوں کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے' دلوں کے بند دروازے کھولتا ہے۔ اس کے بعد پھر اس پر نہایت ہی خفیہ راستے اور نشیب و فراز کھلتے ہیں۔

یہاں مناسب ہے کہ ہم ذرا اس شراب کی تفصیلات دے دیں جسے یہاں حرام قرار دیا گیا ہے۔ امام ابو داؤد نے حضرت ابن عباس ؓ سے اپنی سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے کہ "ہر نشہ دلانے والی چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔"

حضرت عمر ؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر خطبہ دیا اور اس خطبے میں حضور ؐ کے صحابہ کی ایک جماعت موجود تھی۔ "اے لوگو' شراب کی حرمت کا حکم جس وقت نازل ہوا تمہیں معلوم ہے' شراب پانچ چیزوں سے ہے' انگور سے 'کھجور سے 'شہد سے 'گندم سے اور جو سے اور شراب کی تعریف ہے "وہ جو عقل کو ڈھانپ لے۔"

ان دونوں روایات سے یہ معلوم ہوا کہ ہر وہ چیز خمر کی تعریف میں آتی ہے جو بے ہوش کرتی ہو۔ خمر سے مراد شراب مسکر کی کوئی خاص قسم مراد نہیں ہے جو مشروب بے ہوش کرتا ہو وہ خمر ہے۔

کسی بھی نشہ آور چیز کے ذریعے انسان کی ہوش کا غائب ہونا' اس دائمی بیداری کے ساتھ متضاد ہے جو اسلام نے ہر شخص کے لئے لازمی کر دی ہے۔ اسلام کی پالیسی یہ ہے کہ انسان بیدار رہے اور مسلسل اللہ کے ساتھ مربوط رہے۔ ہر لحظہ وہ اللہ کی طرف دیکھتا رہے۔ پھر اس مسلسل بیداری کی حالت میں وہ اس دنیا کی ترقی اور نشوونما میں لگا رہے۔ کمزوری اور فساد سے اس زندگی کو بچاتا رہے اور اپنے نفس اپنے مال اور اپنی عزت کی حفاظت کرتا رہے۔ جماعت مسلمہ کے امن و امان' نیز اسلامی شریعت اور اسلامی نظام زندگی کا محافظ ہو تاکہ اس پر کوئی بھی دست درازی نہ کر سکے اس لئے کہ ایک مسلمان فرد صرف اپنی ذات اور اپنی لذتوں کے اندر غرق نہیں رہ سکتا۔ اس پر اس قسم کے فرائض عائد کئے گئے ہیں جن کی ادائیگی کے لئے اسے ہر وقت بیدار رہنا پڑتا ہے۔ کچھ فرائض اس پر اس کے رب کی جانب سے ہیں' کچھ فرائض اپنے نفس کی طرف سے ہیں' کچھ فرائض اس کے اہل و عیال کی طرف سے ہیں' کچھ فرائض اس اسلامی سوسائٹی کی طرف سے ہیں جس میں وہ رہ رہا ہے۔ اس کے بعد پوری انسانیت کی جانب سے بھی اس پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں تاکہ وہ اسے اسلامی دعوت دے اور راہ ہدایت سکھائے۔ اس وجہ سے اسلام اس سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ اور ہر وقت بیدار رہے۔ نیز جب وہ پاک چیزوں سے بھی استفادہ کر رہا ہو تو بھی اس سے مطالبہ یہ ہے کہ وہ بیدار رہے' خوددار رہے اور لذات اور شہوات کا بندہ اور غلام نہ بن جائے۔ اسے چاہئے کہ وہ اپنی خواہشات اور رغبات کو لگام میں رکھے۔ وہ اپنی خواہشات کا بندہ و غلام نہ ہو بلکہ مالک اور آقا ہو۔ جو لوگ مدہوشی میں پناہ لے کر اس دنیا سے اوجھل ہونا چاہتے ہیں' ظاہر ہے کہ ایسے لوگ مذکورہ بالا فرائض میں سے کوئی فریضہ بھی ادا نہیں کر سکتے۔

پھر اپنے آپ کو عالم مدہوشی میں داخل کرنے کی حقیقت کیا ہے۔ کچھ وقت کے لئے نشے باز اپنے آپ کو حقیقی دنیا سے علیحدہ کر دیتا ہے اور وہ ایک طرح حقیقی زندگی سے فرار کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ ان تصورات کی دنیا میں پناہ لیتا ہے جو خمار اور نشے کی حالت میں ذہن میں آتے ہیں۔ اسلام انسان کے لئے اس قسم کی موہوم دنیا اور خیالی تصورات

میں گھومنے کو حرام قرار دیتا ہے۔ اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ لوگ حقائق کو دیکھیں ' حقائق کا مقابلہ کریں ' حقائق میں زندہ رہیں اور اپنی زندگی کو حقائق پر چلائیں۔ ان کی زندگی محض اوہام اور تخیلات پر قائم نہ ہو۔ جب انسان حقائق کا سامنا کرتا ہے تب اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کے عزم و ارادے کا کیا حال ہے۔ رہا یہ طریق کار کہ کوئی حقائق سے فرار اختیار کر کے محض تخیلات اور اوہام کی زندگی میں جالے تو یہ ناقص اور بیمار انداز حیات ہے۔ اس صورت میں عزم کمزور ہوتا ہے' ارادہ تحلیل ہو جاتا ہے۔ اسلام انسان کے ارادے کو بہت ہی بڑی اہمیت دیتا ہے' اور اس کی پالیسی یہ ہے کہ اس کا ارادہ آزاد ہو اور اس کے اوپر کوئی جابر اور قاہر قوت نہ ہو۔ مذکورہ بالا اسلامی پالیسیاں ہی اس بات کے لئے کافی ہیں کہ تمام نشہ آور چیزوں کو حرام قرار دیا جائے اس لئے کہ یہ ناپاک اور شیطانی اعمال ہیں اور ان سے انسانی زندگی میں فساد اور بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

اس بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا شراب تمام نجاستوں کی طرح نجس بھی ہے یا نہیں ہے؟ یا صرف پینا حرام ہے۔ پہلا قول کہ وہ نجس ہے یہ جمہور کا قول ہے اور دوسرا قول ربیعہ' لیث' مزنی (امام شافعی کے ساتھی) اور بعض متاخرین بغدادی علماء کا ہے۔ بس ہمارے لئے اسی قدر ذکر کافی ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں شراب کو حرام کر دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ یہ نجس ہے اور شیطانی عمل ہے اس وقت اسلامی سوسائٹی کے اندر دو سوال پیدا ہوئے' ایک یہ کہ بعض نہایت ہی پاک فطرت اور محتاط صحابہ کرام نے یہ سوال اٹھایا کہ ہمارے ان ساتھیوں کا کیا بنے گا جنہوں نے ایسے حالات میں انتقال کیا کہ وہ شراب پیتے تھے۔ بعض نے یہ کہا کہ ان لوگوں کا کیا بنے گا کہ جو احد میں شہید ہوئے اور ان کے پیٹوں میں شراب تھی۔ (اس وقت شراب حرام نہ تھی) اور جو لوگ اسلامی صفوں میں انتشار اور افراتفری پیدا کرنا چاہتے تھے انہوں نے بھی اسی قسم کے خدشات کا اظہار کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا اسلام کے عمل قانون سازی کے اندر شبہات اور شکوک پھیلائیں۔ یہ لوگ یہ اشارہ دیتے کہ جو لوگ پہلے فوت ہوئے ان کا ایمان ضائع ہو گیا اس لئے کہ وہ تو شراب پیتے تھے جو ناپاک ہے اور اعمال شیطانیہ میں سے ہے۔ ان میں سے بعض لوگ اس حال میں فوت ہوئے کہ ان کے پیٹ میں یہ ناپاک شے موجود تھی۔

ان دونوں قسم کے خدشات و اعتراضات کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی :

(لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۵ : ۹۳)) "جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے انہوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا تھا اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی بشرطیکہ وہ آئندہ ان چیزوں سے بچے رہیں جو حرام کی گئی ہیں اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور اچھے کام کریں' پھر جس جس چیز سے روکا جائے اس سے رکیں اور جو فرمان الہی ہو اسے مانیں' پھر خدا ترسی کے ساتھ نیک رویہ رکھیں۔ اللہ نیک کردار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔"

اس آیت میں فیصلہ یہ کیا گیا کہ جسے حرام نہ کیا گیا ہو' وہ حرام نہیں ہے۔ اور یہ کہ تحریم کا اطلاق حکم الہی کے بعد ہوتا ہے

پہلے نہیں ہوتا' اور یہ کہ تحریم موثر بماضی نہ ہوگی' لہٰذا کوئی سزا اس وقت تک نہ ہوگی جب تک کوئی نص وارد نہ ہو' چاہے یہ سزا دنیا کی سزا ہو یا آخرت کی سزا' اس لئے کہ اللہ کا کلام ہی حکم کو وجود میں لاتا ہے۔ جو لوگ مر گئے' شراب پیتے رہے یا ان کے پیٹ میں شراب تھی اور اس وقت حرام نہ تھی تو ان پر کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔ اس لئے کہ انہوں نے کوئی حرام چیز استعمال نہیں کی۔ نہ انہوں نے کوئی نافرمانی کی۔ وہ تو اللہ سے ڈرنے والے تھے۔ معاصی سے بچنے والے تھے' نیک کام کرتے تھے اور اللہ سے اچھے انجام کی امید رکھتے تھے' ان کو اچھی طرح یقین تھا کہ اللہ ان کی نیتوں سے خوب واقف ہے' ان کے اعمال کو جانتا ہے۔ جن لوگوں کے حالات ایسے ہوں وہ محرمات کا ارتکاب کیسے کر سکتے ہیں اور وہ معصیت کا ارتکاب کیسے کر سکتے ہیں۔

ہم یہاں ان مباحث میں پڑنا ہی نہیں چاہتے' جو معتزلہ نے اس حکم کے بارے میں کیے ہیں۔ معتزلہ نے یہ بحثیں کیں کہ آیا شراب کے اندر نجاست ذاتی ہے یا اس کے اندر نجاست اللہ کی اس آیت کی وجہ سے پیدا ہوگئی۔ نیز تمام محرمات کے اندر حرمت ذاتی ہے یا وارد حکم کی وجہ سے حرمت لاحق ہو جاتی ہے۔ یہ بے نتیجہ بحث ہے اور اسلامی شعور اس بحث کو سرے سے قبول ہی نہیں کرتا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو حرام قرار دیتے ہیں' تو یہ بات اللہ کے علم میں ہوتی ہے کہ اللہ اس چیز کو کیوں حرام قرار دے رہے ہیں چاہے اللہ حرمت کے سبب کی تصریح کرے یا نہ کرے' چاہے حرمت اس لئے ہو کہ سبب حرام چیز کی ذات کے اندر ہو یا اس چیز کو استعمال کرنے والے کے اندر سبب حرمت ہو یا محض سوسائٹی کے مفادات کے لئے اسے حرام قرار دیا گیا ہو' تمام چیزوں کا علم تو صرف اللہ ہی کو ہوتا ہے۔ اللہ کے احکام کی اطاعت واجب ہے اور احکام آنے کے بعد اس قسم کے مباحث کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے۔ اسلامی نظام زندگی کا مزاج ہی واقعیت پسندانہ ہے لہٰذا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اگر حرمت کسی ایسے سبب کی وجہ سے تھی جو محرم کی ذات میں تھی تو پھر حرمت سے پہلے وہ چیز حلال کیوں تھی؟ اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ایسی مصلحت ہو جس کی وجہ سے اللہ نے کچھ عرصہ کے لئے اسے حرام قرار نہ دیا ہو' ہر بات اللہ کے اختیار میں ہے۔ یہی اس کی حاکمیت کا تقاضا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ انسان کسی چیز کو اچھا سمجھے تو اچھی ہے برا سمجھے تو بری ہے۔ بعض اوقات انسان کسی چیز کو حکم کی علت سمجھتا ہے اور وہ علت نہیں ہوتی۔ اللہ کی بارگاہ میں باادب طریقہ یہی ہے کہ حکم کو سنا جائے' قبول کیا جائے اور نافذ کیا جائے' چاہے کوئی اس کی علت اور حکمت کو سمجھے یا نہ سمجھے۔ علت معلوم ہو یا مخفی ہو' اس کو اللہ ہی جانتا ہے اور ہم نہیں جانتے۔

اسلامی شریعت پر عمل کی بنیاد اللہ کی بندگی اور غلامی کے اصول پر ہے۔ اللہ کی اطاعت اس لئے ہے کہ ہم اللہ کے غلام ہیں' اور یہی ہے اسلام بمعنی سر تسلیم خم کرنا۔ یہ تو اطاعت کے بعد کا درجہ ہے کہ کوئی عقلمند شریعت کی حکمتوں کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اپنی سمجھ کے مطابق یہ کام وہ تمام اوامر و نواہی میں کر سکتا ہے' چاہے وہ حکمتیں منصوص ہوں یا منصوص نہ ہوں' اسے عقل انسانی سمجھ سکتی ہو یا نہ سمجھ سکتی ہو۔ اس لئے کہ شریعت اسلامی کے متحقق ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کنندہ انسان نہیں ہے۔ یہ اللہ ہے جو یہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ جب اللہ نے حکم فرما دیا یا منع کر دیا تو اطاعت لازم ہوگی۔ اگر اللہ اسلامی شریعت کے بارے میں آخری فیصلہ کنندہ عقل انسانی کو قرار دے دیتا تو عقل انسانی کا مقام اسلامی شریعت سے اونچا ہو جاتا۔ اس صورت میں مقام الوہیت اور مقام عبودیت کے اندر پھر فرق کیا رہ جاتا۔

اب ذرا عربیت کے اعتبار سے اس آیت کی ترکیب (Construction) پر بات ہو جائے۔ اس آیت میں تقویٰ کو تین

مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ (اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) یعنی تقویٰ ایمان اور عمل صالح۔ پھر (اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا) تقویٰ اور ایمان فقط۔ پھر (اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا) تقویٰ اور احسان کا ذکر کیا ہے۔ اس عبارت میں اس انداز میں تقویٰ کی تکرار کیوں کی گئی۔ اس سلسلے میں کسی مفسر کی توجیہ تشفی بخش نہیں رہی ہے۔ اسی طرح فی ظلال القرآن کے پہلے ایڈیشن میں' میں خود بھی کوئی تشفی بخش توجیہ نہیں کر سکا اور ابھی تک کوئی تسلی بخش بات سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ تفاسیر کی توجیہات میں سے دوسروں کے مقابلے میں جو بہتر توجیہ مجھے ملی ہے وہ ابن جریر کی ہے اگرچہ تشفی بخش نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں :

"پہلے تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ خدا ترسی کے ساتھ اللہ کے حکم کو قبول کیا جائے' اس کی تصدیق کی جائے اور اس پر دینداری کے ساتھ عمل کیا جائے' دوسرے تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ خدا خوفی سے اس پر ثابت قدم رہا جائے' اور تیسرے سے مراد وہ خدا خوفی ہے جس میں احسان اور نوافل کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کیا جائے۔ اس کتاب کے طبع اول میں خود میں نے جو کچھ کہا تھا' وہ یہ تھا :

"یہ مزید تفصیل دے کر تاکید کرنا ہے۔ پہلے فقرے میں ایمان' عمل صالح اور تقویٰ کا ذکر ہوا' دوسرے فقرے میں تقویٰ کا ذکر ایمان کے ساتھ ہوا۔ اور تیسرے میں تقویٰ اور احسان یعنی عمل صالح کے ساتھ ذکر ہوا۔ اس تاکید کا مقصد یہ ہے کہ تمام امور کا مدار تقویٰ پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اعمال کی اصل قدر و قیمت اس باطنی شعور کی وجہ سے ہوتی ہے جو ان کی پشت پر ہوتا ہے اور یہ باطنی شعور تقویٰ ہے' جس کا اظہار خدا ترسی کے ذریعے ہوتا ہے اور اس شعور کی وجہ سے انسان اللہ کی ذات کے ساتھ ہروقت جڑا رہتا ہے۔ اللہ پر ایمان' اس کے اوامر و نواہی کی تصدیق اور عمل صالح جو اس باطنی عقیدے اور خفیہ شعور کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس عمل صالح اور اس باطنی شعور کے درمیان ایک ربط ہوتا ہے۔ یہ تمام باطنی شعور اور تقویٰ اصل مطلوب ہیں اور انہی پر مدار حکم ہے۔ اعمال کی ظاہری اشکال و صور پر مدار حکم نہیں ہے۔ یہ بات کہ اصل مدار نیت' روح اور باطنی شعور پر ہے اس قدر اہم اور اصولی بات ہے کہ اس کے لئے بار بار تکرار کی ضرورت ہے۔"

ابھی تک میں خود اپنی بات سے بھی مطمئن نہیں ہوں لیکن اس کے سوا کوئی اور بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ واللہ ھو المستعان۔

---ooo---

آگے بات بھی حلال و حرام کے موضوع پر ہی جاری ہے۔ حالت احرام میں شکار کے مسئلے پر بات ہو رہی ہے۔ شکار کے قتل کا کفارہ' یہ حکمت کہ اللہ تعالیٰ کے بیت' اشہر حرام' ہدی اور پٹے ڈالے ہوئے جانوروں کا احترام کیوں فرض کیا ہے؟ اور اس سورہ کے آغاز میں ان چیزوں کو چھیڑنے سے منع کیا گیا ہے۔ آخر میں ایک فرد مسلم اور ایک اسلامی سوسائٹی کے لئے ایک عام اصول اور پیمانے کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ ایسا پیمانہ کہ اس میں پاک چیز کی قدر و قیمت زیادہ ہے اگرچہ قلیل ہو اور ناپاک چیز اگرچہ بہت ہی زیادہ ہو اس کی کوئی قدر نہیں ہے۔

---ooo---

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ
الصَّيْدِ تَنَالُهٗۤ اَيْدِيْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ
بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾ يٰۤاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا
فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا
بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ
وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَ
اللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَ طَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ
وَ لِلسَّيَّارَةِ ۚ وَ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ
الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ
وَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ الْهَدْيَ وَ الْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا
فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾ اِعْلَمُوْۤا اَنَّ
اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۸﴾ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ
وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ
وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ
تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع ۱۳ ع ۷ ۳

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ تمہیں اس شکار کے ذریعے سے سخت آزمائش میں ڈالے گا جو بالکل تمہارے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں ہو گا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ تم میں سے کون اس سے غائبانہ ڈرتا ہے' پھر جس نے اس تنبیہ کے بعد اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے تجاوز کیا اس کے لئے دردناک سزا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' احرام کی حالت میں شکار نہ مارو' اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور اس نے مارا ہو اسی کے ہم پلہ ایک جانور اسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہو گا جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے اور یہ نذرانہ کعبہ پہنچایا جائے گا' یا نہیں تو اس گناہ کے کفارے میں چند مسکینوں کو کھانا کھلانا ہو گا' یا اس کے بقدر روزے رکھنے ہوں گے' تاکہ وہ اپنے کئے کا مزا چکھے۔ پہلے جو کچھ ہو چکا اسے اللہ نے معاف کر دیا' لیکن اب اگر کسی نے اس حرکت کا اعادہ کیا تو اس سے اللہ بدلہ لے گا' اللہ سب پر غالب ہے اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہے۔

تمہارے لئے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا' جہاں تم ٹھہرو وہاں بھی اسے کھا سکتے ہو اور قافلے کے لئے زادِ راہ بھی بنا سکتے ہو۔ البتہ خشکی کا شکار' جب تک تم احرام کی حالت میں ہو' تم پر حرام کیا گیا ہے۔ پس بچو اس خدا کی نافرمانی سے جس کی پیشی میں تم سب کو گھیر کر حاضر کیا جائے گا۔

اللہ نے مکان محترم کعبہ کو لوگوں کے لئے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ بنایا اور ماہ حرام اور قربانی کے جانوروں اور قلادوں کو بھی (اس کام میں معاون بنا دیا) تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کے سب حالات سے باخبر ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔ خبردار ہو جاؤ! اللہ سزا دینے میں بھی سخت ہے اور اس کے ساتھ بہت درگزر اور رحم بھی کرنے والا ہے۔ رسول پر تو صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے' آگے تمہارے کھلے اور چھپے سب حالات کا جاننے والا اللہ ہے۔

اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ پاک اور ناپاک بہرحال یکساں نہیں ہیں' خواہ ناپاک کی بہتات تمہیں کتنا ہی فریفتہ کرنے والی ہو' پس اے لوگو جو عقل رکھتے ہو' اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو' امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہو گی۔" ذرا پیچھے دیکھ کر اس سورہ کی ابتدائی آیات کو ایک بار پھر پڑھئے۔

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (۱) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا (۲) (۵ : ۱ - ۲))

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' بندشوں کی پوری پابندی کرو' تمہارے لئے مویشی قسم کے سب جانور حلال کئے گئے ہیں' سوائے ان کے جو آگے چل کر تم کو بتائے جائیں گے۔ لیکن احرام کی حالت میں شکار کو اپنے لئے حلال نہ کر لو' بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ اے ایمان لانے والو' خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو' حرام مہینوں میں سے

کسی کو حلال نہ کر لو' قربانی کے جانوروں پر دست درازی نہ کرو' ان جانوروں پر ہاتھ نہ ڈالو جن کی گردنوں میں نذر خداوندی کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوئے ہوں۔ نہ ان کو چھیڑو جو اپنے رب اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکان محترم کی طرف جا رہے ہوں' ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو تم شکار کر سکتے ہو)۔

یہ ممانعت اس شکار کے بارے میں تھی جب شکاری حالت احرام میں ہو' اور یہ ممانعت خدا پرستی کی نشانیوں (شعائر) کی بے حرمتی کے بارے میں تھی' قربانی کے جانوروں' پٹے ڈالے ہوئے نذر کے جانوروں' حاجیوں کے ساتھ چھیڑ کی ممانعت کی گئی تھی' لیکن ان ممنوعات پر دنیا میں کوئی سزا نہ سنائی گئی تھی۔ صرف یہ کہا گیا تھا کہ یہ کام گناہ گاری کے کام ہیں۔ اب دنیا میں بطور سزا کفارے کا بیان کیا جاتا ہے تاکہ خلاف ورزی کرنے والا اپنے کیے کا مزہ چکھے۔ البتہ سابقہ غلطیوں کی معافی کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اگر کسی نے پہلے ان ممنوعات کا ارتکاب کیا ہو تو وہ معاف ہیں لیکن آئندہ اس ہدایت کے اعلان وبیان کے بعد جو دوبارہ اس کا ارتکاب کرے گا اسے سخت سزا دی جائے گی اور وہ انتقام الہی سے بچ نہ سکے گا۔ آیات کے اس مجموعے کا آغاز بھی اسی شناسا آواز کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

( یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ) اس خطاب کے بعد ان کو کہا جاتا ہے کہ اب تمہاری آزمائش ہونے والی ہے۔ یعنی اس شکار کے بارے میں جس سے تم کو حالت احرام میں منع کیا گیا ہے۔

( یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّکُمُ اللّٰہُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ تَنَالُہٗٓ اَیْدِیْکُمْ وَرِمَاحُکُمْ لِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّخَافُہٗ بِالْغَیْبِ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَلَہٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۹۴))

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ تمہیں اس شکار کے ذریعے سے سخت آزمائش میں ڈالے گا جو بالکل تمہارے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں ہو گا یہ دیکھنے کے لئے کہ تم میں سے کون اس سے غائبانہ ڈرتا ہے۔ پھر جس نے اس تنبیہ کے بعد اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے تجاوز کیا اس کے لئے دردناک سزا ہے۔"

یہ بہت ہی آسان شکار ہوتا ہے' اللہ اسے خود ان کی طرف چلاتا ہے' ایسا شکار ہوتا ہے کہ وہ اسے ہاتھوں کے ساتھ بھی پکڑ سکتے ہیں' ان کے نیزے اور تیر بھی اسے بسہولت مار سکتے ہیں۔ ایسے واقعات سامنے آئے ہیں کہ حرم میں شکار خود خیموں کے اندر آ جاتا ہے' ان کے گھروں کے اندر آ جاتا ہے اور یہ اللہ کی جانب سے آزمائش ہوتی ہے اور یہ وہی آزمائش ہے جس میں بنی اسرائیل فیل ہوئے اور پھر وہ اپنے پاؤں پر کھڑے نہ رہ سکے۔ انہوں نے پہلے اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے باصرار یہ مطالبہ کیا کہ ان کے لئے ایک ایسا دن مقرر کریں جس میں ان کے لئے معاشی سرگرمیوں میں مشغول ہونا ممنوع ہو۔ اس دن وہ مکمل آرام کریں' نماز پڑھیں اور کسی دنیاوی اور معاشی کام میں مشغول نہ ہوں۔ اللہ نے ہفتے کا دن مقرر کر دیا لیکن اللہ نے شکار ان کی آزمائش کے لئے وافر مقدار میں ساحلوں تک چلایا۔ یہ شکار ان کی نظروں کے سامنے پھرتا اور جب ہفتہ نہ ہوتا تو شکار نظر ہی نہ آتا۔ جس طرح مچھلی بالعموم پانی میں چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ اب یہ دیکھ کر بیچارے اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو نہ نبھا سکے۔ یہودیوں کی معروف رگ پھڑکی' ان کی اصل فطرت جاگی۔

انہوں نے اللہ کے ساتھ حیلے بہانے کرنے شروع کر دیئے ۔ چنانچہ انہوں نے ہفتے کے دن شکار کو گھیرنا شروع کر دیا جسے وہ بعد کے دنوں میں شکار کرتے ۔ ان کی یہی حرکت تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ ان کے سامنے رکھیں ۔ اللہ تعالیٰ حضور کو خطاب کر کے فرماتے ہیں ۔

(وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (۷ : ۱۶۳)) "اور ذرا ان سے اس بستی کا حال بھی پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھی ' انہیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں لوگ سبت کے دن احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سبت ہی کے دن ابھر ابھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں ۔ یہ اس لئے ہوتا تھا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے ۔"

امت اسلامیہ بھی ایسے ہی ابتلاء میں مبتلا کی گئی تھی اور یہ کامیاب رہی جبکہ یہودی ناکام و نامراد رہے ۔ اور قرآن کریم کی اس آیت کا یہی مفہوم ہے :

(كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۳ : ۱۱۰)) "اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو ' جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے ۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو ' بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو ' اگر یہ اہل کتاب ایمان لاتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا ' اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایماندار بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں ۔"

بے شمار مراحل ایسے آئے جن میں امت اسلامیہ آزمائشوں میں کامیاب رہی اور بنی اسرائیل ناکام رہے اور یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر سے خلافت کا مقام بنی اسرائیل سے سلب کر لیا اور امت مسلمہ کو اس مقام پر فائز کر دیا ۔ اور امت مسلمہ کو زمین پر وہ عروج عطا کیا جو اس سے قبل کسی کو بھی نہ دیا تھا ۔ اس لئے کہ اسلامی نظام زندگی کسی سابقہ امت کے دور میں اس طرح متمکن نہ ہوا تھا ' جس طرح امت مسلمہ کے دور میں پوری طرح ظاہر ہوا ۔ لیکن یہ اس دور میں ہوا جس میں امت مسلمہ فی الواقع امت مسلمہ تھی اور جس دور میں وہ یہ سمجھتی تھی کہ اسلام وہ ہے جو لوگوں کی عملی زندگی کے اندر نمودار ہو اور لوگوں کی زندگی اسلامی شریعت کے مطابق بسر ہو رہی ہو ۔ اس دور میں امت مسلمہ کو یہ احساس تھا کہ اسے یہ عظیم امانت سپرد کی گئی ہے اور اسے اس کا امین قرار دیا گیا ہے ۔ یہ کہ امت مسلمہ کو پوری انسانیت کا نگہبان مقرر کیا گیا ہے اور اس کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ لوگوں کی زندگیوں کو اسلامی نظام حیات کے مطابق استوار کرے اور ان پر اللہ کی اس امانت کو قائم کرے ۔

یہ آزمائش کہ حالت احرام میں لوگ بسہولت شکار کر سکتے تھے لیکن بطور آزمائش انہیں شکار سے روک دیا گیا ان آزمائشوں میں سے ایک ہے جن میں یہ امت کامیاب رہی ۔ایسی آزمائشوں کے ذریعے اس امت کو آزمانا اور آزما کر تربیت دینا یہ اللہ تعالیٰ کی بہت ہی بڑی اور کھلی مہربانی تھی ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو منتخب کر لیا ہے ۔

اس امتحان کی حکمت کی تصریح بھی اللہ تعالیٰ نے فرما دی ہے ۔ (لِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَخَافُهُ بِالْغَيْبِ ) ”تاکہ وہ دیکھے کہ تم میں سے کون ہے جو اس سے غائبانہ ڈرتا ہے ۔“ ایک مسلمان کے ضمیر کے اندر جو اصول رکھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ سے غائبانہ کون ڈرتا ہے ۔ یہ ایک نہایت ہی مضبوط قاعدہ ہے جس کے اوپر اسلامی نظریہ حیات کی عمارت کھڑی ہے ۔اسی قاعدے کے مطابق ایک مسلمان کا طرز عمل طے پاتا ہے اور یہ طرز عمل نظریہ خلافت فی الارض اور اسلامی نظام زندگی کے مطابق ہوتا ہے ۔

لوگ اللہ کو نہیں دیکھتے ' لیکن جب وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں تو اللہ ان کے نفس کے اندر موجود ہوتا ہے ۔ ایک انسان کے تصور اور فہم میں اللہ غیب ہوتا ہے لیکن دل مومن اس پر غائبانہ ایمان لا کر ' اللہ سے ڈرتا ہے ۔ جب کسی کے دل و دماغ کے اندر یہ عظیم حقیقت 'حقیقت ایمان بالغیب بیٹھ جاتی ہے اور انسان اللہ سے ڈرنے لگتا ہے اور حسی رویت اور حسی مشاہدے سے مستغنی ہو جاتا ہے لیکن اس کے شعور میں یہ عظیم حقیقت بیٹھ جاتی ہے تو پھر اس کا یہ شعور ' مشاہدے اور حسی ادراک سے زیادہ اہم بن جاتا ہے اور یہ مومن لا الہ الا اللہ کی شہادت دیتا ہے ' جبکہ اس نے اللہ کو بچشم سر دیکھا نہیں ہوتا ۔ وجود انسانی کے اندر اس عظیم حقیقت کا بیٹھ جانا ' اس کے اندر ایک عظیم انقلابی تبدیلی پیدا کر دیتا ہے ۔ اس کی فطری قوتیں آزاد ہو جاتی ہیں اور اس کی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو مشنری سپرٹ ودیعت کی ہے وہ بدرجہ اکمل کام کرتی ہے اور وہ جس قدر بھی عالم غیب کے قریب پہنچتا ہے ( جو انسان کے لئے تیار کیا گیا ہے ) اسی قدر وہ عالم حیوانات سے دور ہوتا جاتا ہے اور اس سطح تک بلند ہو جاتا ہے جو انسان کے لئے تیار کی گئی ہے ۔اگر کوئی محسوسات کے ماوراء ادراک کے دروازے اپنے اوپر بند کر لیتا ہے اور اپنے آپ کو دائرہ محسوسات کے اندر سکیڑ لیتا ہے تو وہ اپنے آپ کو مادی دنیا کے اندر محدود کر کے محض حیوانی دائرے کے اندر چلا جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہاں تصریح فرماتے ہیں کہ اس ابتلاء میں حکمت کیا ہے تاکہ اہل ایمان کے نفوس اسے حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اللہ کو علم لدنی کے ذریعے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے غائبانہ طور پر کون ڈرتا ہے ' لیکن اللہ تعالیٰ اپنے علم کے مطابق دنیا میں لوگوں کو نہیں پکڑتا ۔ اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور گرفت صرف ان باتوں پر ہوتی ہے جو واقع ہو جائیں ۔

(فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ) ”پھر اس تنبیہ کے بعد بھی جس نے حدود سے تجاوز کیا تو اس کے لئے دردناک سزا ہے ۔“ اللہ تعالیٰ نے امتحان کی اطلاع دے دی اس کی حکمت سے بھی آگاہ کر دیا اور اس بات سے متنبہ کر دیا کہ وہ اس آزمائش میں نہ پڑیں اس لئے کہ کامیابی کے تمام اسباب بھی اس کے لئے فراہم کر دیئے گئے ۔ اب بھی اگر کوئی اللہ کی حدود سے تجاوز کرتا ہے تو اس کے لئے دردناک سزا کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ۔ اس کے سوا وہ اور کس انجام کا مستحق ہے اس لئے کہ وہ خود اپنے لئے یہ سزا اختیار کرتا ہے ۔ اس کے بعد اگر کوئی پھر خلاف ورزی کرتا ہے تو اس پر عائد شدہ کفارے کی تفصیلات دے دی جاتی ہیں ۔ دوبارہ بطور تاکید ممانعت بھی کر دی جاتی ہے ۔

(یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ قَتَلَہٗ مِنْکُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ یَحْکُمُ بِہٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْکُمْ ھَدْیًا بٰلِغَ الْکَعْبَۃِ اَوْ کَفَّارَۃٌ طَعَامُ مَسٰکِیْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِکَ صِیَامًا لِّیَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِہٖ عَفَا اللّٰہُ عَمَّا سَلَفَ وَمَنْ عَادَ فَیَنْتَقِمُ اللّٰہُ مِنْہُ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ (۵:۹۵)) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' احرام کی حالت میں شکار نہ مارو' اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور اس نے مارا ہو اسی کے ہم پلہ ایک جانور اسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہو گا جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے' اور یہ نذرانہ کعبہ پہنچایا جائے گا' یا نہیں تو اس گناہ کے کفارے میں چند مسکینوں کو کھانا کھلانا ہو گا' یا اس کے بقدر روزے رکھنے ہوں گے' تاکہ وہ اپنے کئے کا مزا چکھے۔ پہلے جو کچھ ہو چکا' اسے اللہ نے معاف کر دیا' لیکن اب اگر کسی نے اس حرکت کا اعادہ کیا تو اس سے اللہ بدلہ لے گا' اللہ سب پر غالب ہے اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہے۔''

ممانعت اس بات کی کی گئی ہے کہ کوئی محرم عمداً کسی شکار کو قتل نہ کرے۔ اگر غلطی سے اس کے ہاتھوں کوئی شکار ہو جائے تو نہ وہ گنہگار ہے اور نہ اس پر کفارہ ہے۔ اگر عمداً اس نے شکار کیا تو اس پر جانور ذبح کرنا فرض ہے۔ اور یہ اس قدر ہو کہ شکار کی قیمت کے برابر ہو' مثلاً ہرن کے شکار کے بدلے اونٹنی کا بچہ یا بکری۔ اگر اونٹ کو شکار کرے تو گائے ذبح کرے۔ لومڑی اور زرافہ کے شکار میں اونٹ کا بچہ' بلی اور خرگوش کے بدلے خرگوش۔ اور جس جانور کے مقابلے میں خانگی جانور نہ ہو تو اس کی قیمت کا جانور ذبح کرے۔

اس کفارے کا فیصلہ دو عادل مسلمان کریں گے۔ اگر دو منصفوں نے کسی جانور کے ذبح کے بارے میں فیصلہ کیا تو جنایت کرنے والا اس جانور کو چھوڑ دے گا کہ وہ کعبے تک پہنچے اور وہاں اسے ذبح کر کے مساکین کو کھلایا جائے۔ اگر کوئی جانور نہ ملے تو دو منصف پھر مساکین کے کھانے کے بارے میں بھی فیصلہ کریں گے اور یہ کھانا اس شکار کی قیمت کے برابر ہونا چاہئے اگرچہ اس کے بارے میں فقہی اختلافات ہیں۔ اگر طعام مساکین کی قدرت بھی نہ ہو تو جنایت کرنے والے محرم کو روزے رکھنے ہوں گے۔ یعنی ایک مسکین کے مقابلے میں ایک روزہ۔ اب مسکین کے کھانے کی قیمت کیا ہو گی اس میں فقہی اختلافات ہیں۔ بہرحال اصل بات یہ ہے کہ اس کا تعین ہر زمانے میں الگ ہو گا۔

اور اس کفارے کی حکمت بھی قرآن کریم نے منصوص طور پر بتلا دی ہے۔ (لِّیَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِہٖ) ''تاکہ وہ اپنے کئے کا مزہ چکھے۔'' کفارہ عائد کرنے میں سزا دہی کا پہلو بھی موجود ہے اس لئے کہ اس شخص نے جس حرمت کی ہتک کی ہے' اسلام اس کے بارے میں سخت متشدد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں حکم دیا جاتا ہے کہ جو ہو چکا سو ہو چکا اور آئندہ کے لئے جو باز نہ آئے گا اسے سخت انتقام کا سامنا کرنا ہو گا۔

(عَفَا اللّٰہُ عَمَّا سَلَفَ وَمَنْ عَادَ فَیَنْتَقِمُ اللّٰہُ مِنْہُ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ (۵:۹۵))
''لیکن اگر کسی نے اس حرکت کا اعادہ کیا تو اس سے اللہ بدلے لے گا' اللہ سب پر غالب ہے اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہے۔

یہ تو تھے احکام خشکی کے شکار سے متعلق ۔رہا سمندری شکار تو وہ حالت احرام اور حالت غیر احرام دونوں میں جائز ہے ۔

(أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ (۵ : ۹۶)) "تمہارے لئے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا' جہاں تم ٹھہرو وہاں بھی اسے کھا سکتے ہو اور قافلے کے لئے زاد راہ بھی بنا سکتے ہو ۔"
سمندری حیوانات محرم اور غیر محرم دونوں کے لئے جائز ہیں ۔شکار بھی کیا جاسکتا ہے اور سٹاک بھی کیا جاسکتا ہے ۔یہاں چونکہ سمندری حیوانات کے شکار اور استعمال کی اجازت دی گئی تھی اس لئے بری حیوانات کے شکار کی دوبارہ ممانعت کر دی گئی ۔

(وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا (۵ : ۹۶)) "البتہ خشکی کا شکار' جب تک تم احرام کی حالت میں ہو' تم پر حرام کیا گیا ہے ۔"
جس بات پر اجماع ہے وہ یہ ہے کہ محرم کے لئے بری شکار کرنا حرام ہے ۔لیکن اگر کوئی غیر محرم کوئی شکار کرے تو آیا اس کا کھانا بھی جائز ہے یا نہیں ۔نیز شکار کے معنی میں بھی اختلاف ہے ۔پھر یہ بھی ایک اختلافی مسئلہ ہے کہ اس سے مراد وہی جانور ہیں جن کا عموماً شکار کیا جاتا ہے یا تمام حیوانوں کا شکار حرام ہے ۔چاہے ان کا شکار کیا جاتا ہو یا نہ کیا جاتا ہو یا یہ کہ یہ نہی تمام حیوانات کے لئے ہے ۔
حلال و حرام کی اس بحث کو پھر اس بات پر ختم کیا جاسکتا ہے کہ اصل مدار تقویٰ پر ہے ۔چنانچہ یہاں بھی خدا ترسی اور خدا خوفی کے جذبات کو ابھارا جاتا ہے ۔

(وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ (۵ : ۹۶)) "پس بچو اس خدا کی نافرمانی سے جس کی پیشی میں تم سب کو گھیر کر حاضر کیا جائے گا ۔" سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حرم کے اندر اور محرم کے لئے یہ پابندیاں کیوں ہیں؟ اصل میں یہ دنیا جو لوگوں کے لئے کشمکش کا ایک میدان ہے' اس میں اللہ تعالیٰ حرم کو ایک منطقہ امن قرار دینا چاہتے ہیں اور یہ منطقہ امن اور زمانہ امن خانہ کعبہ اور اشہر حرام ہیں ۔اس دنیا میں باہم کشمکش جاری رہتی ہے ۔دشمن ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے رہتے ہیں ۔ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی سعی ہر وقت جاری رہتی ہے ۔یہ کشمکش تمام زندہ چیزوں میں جاری ہے اور سب کے لئے یہ خطہ امن اور زمانہ امن اسلام مہیا کرتا ہے جس کی وجہ سے خوف کے بجائے اطمینان ملتا ہے' جنگ کے بجائے امن ملتا ہے اور تمام لوگوں کے سروں پر امن' آشتی' اطمینان اور سلامتی کا سایہ آجاتا ہے ۔نفس انسانی ایک عملی دنیا میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھتا ہے' محض آئیڈیل نہیں بلکہ عملی ۔اب وہ محض تخیلات اور خوابوں کی دنیا میں نہیں ہوتا جو واقعی دنیا پر بہت بھاری ہوتی ہے ۔

(جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ
ذَٰلِكَ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَنَّ بِكُلِّ

شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۹۷) اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹۸) مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ (۹۹))

"اللہ نے مکان محترم' کعبہ کو لوگوں کے لئے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ بنایا اور ماہ حرام اور قربانی کے جانوروں اور قلادوں کو بھی (اس کام میں معاون بنا دیا) تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کے سب حالات سے باخبر ہے۔ اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔ خبردار ہو جاؤ! اللہ سزا دینے میں بھی سخت ہے اور اس کے ساتھ بہت درگزر اور رحم بھی کرنے والا ہے۔ رسول پر تو صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے' آگے تمہارے کھلے اور چھپے سب حالات کا جاننے والا اللہ ہے۔"

بیت الحرام کے اندر یہ حرمتیں اس قدر وسیع ہیں کہ ان کے دائرے میں انسان' پرندے' حیوان اور حشرات الارض سب آتے ہیں اور اگر کوئی احرام کی حالت میں حرم کے حدود میں پہنچا ہو' تب بھی اس کے لئے یہ سب چیزیں ممنوع ہیں۔ اس کے علاوہ چار مہینوں کو بھی اشہر حرام قرار دیا گیا ہے۔ ان میں قتل و قتال سخت ممنوع ہے۔ یہ چار مہینے ذوالقعدہ' ذوالحجہ' محرم اور رجب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عربوں کے دل میں ان چار مہینوں کا احترام بٹھا دیا تھا' یہاں تک کہ وہ دور جاہلیت میں بھی ان مہینوں کا احترام کرتے تھے۔ ان مہینوں میں وہ کسی نفس کو ڈراتے دھمکاتے بھی نہ تھے۔ ان مہینوں میں وہ خون کا بدلہ بھی نہ لیتے تھے اور نہ ہی ان میں کوئی شخص انتقام کی توقع کرتا تھا یہاں تک کہ ایک شخص اپنے باپ' بیٹے اور بھائی کے قاتل کو پاتا مگر اسے کوئی اذیت نہ دیتا۔ چنانچہ اس عرصے میں لوگ کھلے بندوں پھرتے اور تجارتی سفر کرتے اور رزق حلال تلاش کرتے۔ یہ امن کے احکامات اللہ نے اس لئے بھی جاری کئے کہ اللہ تعالیٰ خانہ کعبہ کو خطہ امن و سلامتی قرار دینا چاہتے تھے جہاں لوگوں کے اندر ٹھہراؤ پیدا ہو اور کوئی خوف اور بے چینی نہ ہو۔ کعبے کی طرح ان چار مہینوں کو اللہ نے زمانہ امن قرار دیا تھا جس طرح کعبہ مقام امن تھا۔ اس کے بعد اس امن کی حدود کے اندر مزید توسیع کر دی گئی اور اس ہدی کو بھی مامون اور محفوظ کر دیا گیا ہے جسے خانہ کعبہ کی طرف روانہ کر دیا گیا ہو۔ یہ جانور حج اور عمرہ کے موقع پر چلائے جاتے تھے۔

چنانچہ دور جاہلیت میں بھی ان جانوروں کو نہ چھیڑا جاتا تھا۔ اسی طرح اس شخص کو بھی مامون قرار دے دیا گیا جو خانہ کعبہ میں پناہ لے لیتا ہے اور اپنے گلے میں بیت الحرام کے درختوں کا ہار ڈالتا ہے۔

خانہ کعبہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ حرمت حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے ہاتھوں اس کے تعمیر کے وقت ہی سے رکھی تھی اور اللہ نے اس وقت سے خانہ کعبہ کو لوگوں کے آنے جانے کی جگہ قرار دے دیا تھا۔ یہ اللہ کا وہ عظیم فضل و احسان تھا' جس کی یاد دہانی اللہ نے مشرکین کو بھی کرائی اس لئے کہ ان کے لئے بھی بیت اللہ گھومنے پھرنے اور امن کی جگہ تھا۔ اس کے اردگرد بسنے والے لوگوں کی حالت یہ تھی کہ وہ اچک لئے جاتے تھے جبکہ مشرکین یہاں نہایت ہی امن سے رہتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اللہ کا شکریہ ادا نہ کرتے تھے۔ اس خانہ توحید میں اللہ واحد کی بندگی نہ کرتے تھے اور حضور ؐ سے یہ کہتے تھے کہ اگر ہم عقیدۂ توحید کو اپنائیں تو ہمیں اپنی جا اور جاگیر چھوڑنی پڑے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی

یہ بات نقل کر کے اس کی تردید کی اور انہیں بتایا کہ امن اور خوف ہوتا کیا ہے۔

(وَقَالُوا إِن نَّتَّبِعِ الْهُدَىٰ مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَا ۚ أَوَلَمْ نُمَكِّن لَّهُمْ حَرَمًا آمِنًا يُجْبَىٰ إِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّن لَّدُنَّا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۲۸ : ۵۷))

"وہ کہتے ہیں 'اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کر لیں تو اپنی زمین سے اچک لئے جائیں گے۔کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پر امن حرم کو ان کے لئے جائے قیام بنا دیا جس کی طرف ہر طرف کے ثمرات کھنچے چلے آتے ہیں' ہماری طرف سے رزق کے طور پر مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں۔"

صحیحین میں حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے فتح مکہ کے دن یہ فرمایا: "یہ شہر حرام ہے' اس کے درخت نہ کاٹے جائیں گے' اور یہاں کے سبزے کو بھی خراب نہ کیا جائے گا' یہاں کے شکار کو نہ بھگایا جائے گا اور یہاں کی گمشدہ چیز کو نہ اٹھایا جائے گا مگر وہ شخص جو اعلان کرنا چاہے۔

حضور اکرم ؐ نے حرم میں محرم کے لئے زندہ چیزوں میں سے صرف کوے' چیل' بچھو' چوہے اور کاٹنے والے کتے کو مستثنیٰ فرمایا۔ حضرت عائشہ ؓ کی حدیث میں ہے "حضور اکرم ؐ نے پانچ چیزوں کے قتل کا حکم دیا۔ یہ مضرچیزیں ہیں اور حالت حلت اور احرام دونوں میں یہ حکم دیا۔ کوا' چیل' بچھو' چوہا اور کاٹنے والا کتا۔

صحیحین میں حضرت ابن عمر ؓ سے سانپ کا اضافہ آیا ہے۔

حضرت علی ؓ کی روایت کی رو سے یہی حرمت مدینہ کے لئے بھی عائد ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ؐ نے "عیر" سے لے کر "ثور" مدینہ کو حرم قرار دیا ہے۔ اور صحیحین ہی میں ایک دوسری روایت ہے۔ یہ حضرت عبادہ ابن تمیم سے وارد ہوئی ہے۔ کہ حضور اکرم ؐ نے فرمایا "حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا اور اس کے لئے دعا فرمائی اور میں نے مدینہ کو اسی طرح حرم کر دیا ہے جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا تھا۔"

اس کے علاوہ مزید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ علاقہ اور یہ مہینے ہی صرف امن کے لئے مخصوص نہیں اور صرف یہ بات نہیں ہے کہ اس امن و امان کا دائرہ صرف انسان اور حیوان تک ہی محدود ہے بلکہ اس امن اور سکون کا دائرہ انسانی ضمیر تک وسیع ہو جاتا ہے اس لئے کہ انسانی ضمیر انسانی نفس کی گہرائیوں کے اندر ایک معرکہ کارزار ہے۔ ضمیر کے اندر جنگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو اس کے شعلے اور اس کا دھواں زمان و مکان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ پھر تمام انسان اور حیوان اس کی زد میں آ جاتے ہیں۔ حرمین اس اندرونی معرکہ کارزار میں بھی امن کا سامان پیدا کر دیتے ہیں اور جب ضمیر کے اندر امن و سکون پیدا ہو جاتا ہے تو ایک محرم کسی جاندار کی طرف ہاتھ بڑھانے میں بھی حرج محسوس کرتا ہے اگرچہ یہ شکار حرم سے باہر ہو۔ یہ عرصہ نفس انسانی کی تربیت کا عرصہ ہے تاکہ وہ صاف و شفاف ہو جائے۔ وہ ہلکا ہو جائے اور بلند ہو کر ملاء اعلیٰ سے واصل ہو جائے اور ملاء اعلیٰ کے ساتھ معاملہ کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔

یہ انسانیت' یہ خوفزدہ' مصیبت زدہ' پسی ہوئی انسانیت کس قدر محتاج ہے' اس علاقہ امن کی۔ وہ منطقہ امن جس کو اللہ نے اس دین کے پیروکاروں کے لئے بنایا ہے' اور جس کا اعلان عام قرآن کریم کے اندر کر دیا گیا۔

( ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۵ : ۹۷ ) "تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ آسمانوں اور زمین سب کے حالات سے باخبر ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔ اس جگہ یہ عجیب اختتامیہ ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ اللہ جو شریعت مقرر کرتا ہے اور لوگوں کے لئے یہ جائے امن جو قرار دیتا ہے' یہ اس لئے بتاتا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اللہ ان تمام حالات سے باخبر ہے جو آسمانوں اور زمینوں کے اندر ہیں اور اسے ہر چیز کا علم ہے' تاکہ انہیں معلوم ہو کہ اللہ انسانوں کے مزاج سے باخبر ہے' وہ ان کی خفیہ نفسیات سے بھی خبردار ہے۔ وہ ان کی روح کی پکار کو سنتا ہے اور وہ ایسا قانون بناتا ہے جس کے ذریعے ان کے مزاج کے تقاضے' ان کی ضروریات اور ان کے میلانات پورے ہوتے ہیں۔ جب لوگ یہ محسوس کریں گے کہ قانون سازی میں اللہ نہایت ہی شفیق و رحیم ہے۔ اور جب لوگوں کے دلوں نے اس شریعت اور ان کی فطرت کے درمیان پوری ہم آہنگی کا مزہ چکھا تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ان تمام امور کو جانتا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کے اندر ہیں اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔

دین اسلام انسانی فطرت اور اس کے میلانات اور خواہشات کے پورے پورے تقاضے ملحوظ رکھنے میں بہت ہی عجیب ہے۔ وہ انسانوں کی تمام ضروریات کا لحاظ رکھتا ہے۔ اسلامی شریعت کی اسکیم انسانی فطرت کی اسکیم کے عین مطابق ہے۔ شریعت کی تشکیل اور انسان کی فطرت کے اندر مکمل ہم آہنگی ہے۔ جب انسان کو اس دین کے بارے میں شرح صدر ہو جاتا ہے تو پھر وہ جس قدر غور کرتا ہے اسے کمال و جمال ہی نظر آتا ہے' پھر اسے انس و محبت ہی نظر آتی ہے اور اسے وہ سکون ملتا ہے جس کا تصور وہ شخص نہیں کر سکتا جس کو شریعت پر شرح صدر حاصل نہ ہو۔

اب حالت احرام اور حالت غیر احرام میں جائز و ناجائز امور کا خاتمہ اس بات پر ہوتا ہے کہ اللہ کا عذاب سخت ہے اور دوسری جانب وہ غفور و رحیم بھی ہے۔

(اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹۸ ) "خبردار ہو جاؤ کہ اللہ سزا دینے میں سخت ہے اور اس کے ساتھ بہت ہی درگزر اور رحم کرنے والا ہے۔" اور اس ڈراوے کے ساتھ ساتھ بتا دیا جاتا ہے کہ اپنے کئے کی ذمہ داری ہر شخص کے اپنے کاندھوں پر ہے اور جو راہ راست پر نہ ہو وہ خود اپنی گمراہی کا ذمہ دار ہے۔

(مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ (۹۹ ) "رسول پر تو صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔ آگے تمہارے کھلے اور چھپے حالات کا جاننے والا اللہ ہے۔ اب یہ مضمون ایک عام پیمانے اور اصول پر ختم ہوتا ہے اور یہ پیمانہ تمام اصول و اقدار کے وزن کے لئے ایک ترازو ہے۔ اس کے مطابق ایک مسلم فیصلے کرتا ہے۔ اس میزان میں طیب بھاری رہتا ہے اور خبیث ہلکا ہو جاتا ہے تاکہ خبیث اپنی ظاہری اور جسمانی کثرت کی وجہ سے کسی مسلم کو کسی بھی وقت متاثر نہ کر سکے۔

(قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي

الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۵: ۱۰۰) "اے پیغمبر' ان سے کہہ دو کہ پاک اور ناپاک بہرحال یکساں نہیں ہیں خواہ ناپاک کی بہتات تمہیں کتنا ہی فریفتہ کرنے والی ہو' پس اے لوگو جو عقل رکھتے ہو' اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو' امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہو گی۔"

یہاں پاک و ناپاک کے ذکر کی مناسبت یہ ہے کہ اس سے پہلے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا مضمون چل رہا تھا' شکار میں سے حلال و حرام کا ذکر ظاہر ہے کہ حلال طیب ہوتا ہے اور حرام خبیث ہوتا ہے۔ طیب اور خبیث برابر نہیں ہو سکتے اگرچہ خبیث اپنی کثرت کی وجہ سے انسان کو دھوکے میں ڈالتا ہے اور عجیب معلوم ہوتا ہے' لیکن طیب نہایت ہی خوشگوار ہوتا ہے اور اس کے نتائج بھی اچھے نکلتے ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اس کے نتیجے میں امراض اور آلام سے بھی نجات ملتی ہے۔ خبیث میں اگرچہ لذت ہوتی ہے' اگر طیب کا استعمال اعتدال کے ساتھ کیا جائے تو اس میں اس سے بھی زیادہ لذت ہوتی ہے اور طیب کا انجام دنیا و آخرت میں اچھا ہوتا ہے۔ جب نفس انسانی خواہشات نفسانیہ سے آزاد ہو جاتا ہے اور نفس پر تقویٰ اور دل کی نگرانی قائم ہو جاتی ہے تو وہ خبیث کے مقابلے میں طیب کو اختیار کرتا ہے اور اس طرح وہ دنیا و آخرت میں کامیاب رہتا ہے۔

(فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۵: ۱۰۰)) (پس اے صاحبان عقل و خرد اللہ ہی سے ڈرو' امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے) یہ تو تھی ظاہری مناسبت لیکن اس آیت کا افق اور مطالب اس سے بھی زیادہ وسیع ہیں۔ یہ تمام زندگی کو اپنے دائرے میں لیتی ہے اور اس کے مفہوم کی تصدیق مختلف مقامات پر ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس امت کو میدان میں لایا اور اسے خیر امت قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ کی اسکیم یہ تھی کہ اسے ایک عظیم امر کے لئے تیار کیا جائے۔ یہ عظیم امر یہ تھا کہ یہ امت اس کرۂ ارض پر اسلامی نظام کی امانت کی حامل ہو گی۔ وہ اسلامی نظام حیات پر اس طرح قائم ہو کہ اس سے پہلے کوئی امت اس طرح قائم نہ ہوئی ہو۔ وہ اس نظام کو لوگوں کی زندگیوں میں اس طرح قائم کرے کہ کبھی کسی دوسری امت کے اندر یہ نظام اس طرح قائم نہ کیا جا سکا ہو۔ اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ اس امت کو اس قدر طویل تربیت دی جائے کہ اس سے پہلے کسی امت کو نہ دی گئی ہو۔ پہلی تربیت یہ ہو کہ اسے آثار جاہلیت سے مکمل طور پر نکال دیا جائے اور اسے جاہلیت کی گراوٹوں سے اٹھا کر سیدھا اعلیٰ منزل مقصود تک بلند کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ اسلام کی بلند ترین چوٹی پر فائز ہو جائے۔ اس کے بعد یہ امت اپنے تصورات و افکار کو درست کرے' اور اپنی عادات' اپنے شعور' اور اپنے افکار کو جاہلیت کے آثار اور آلودگیوں سے پاک کرے۔ اس کے بعد اس کے اندر اس قدر عزم پیدا کر دیا جائے کہ وہ اس سچائی کو قبول کر لے اور پھر اس قبولیت کے نتیجے میں آنے والی ابتلاؤں کو برداشت کرے۔ اس کے بعد وہ پوری زندگی کو اسلامی اقدار اور پیمانوں کے مطابق استوار کرے یہاں تک کہ یہ ایک ربانی امت بن جائے اور اس کی انسانیت اعلیٰ مدارج انسانیت تک بلند ہو جائے۔ جب یہاں تک اس کی تربیت ہو جائے تو پھر اس کی نظروں میں اچھا اور برا برابر نہ ہوں گے' پاک اور ناپاک برابر نہ ہوں گے۔ اگرچہ خبیث و ناپاک زیادہ اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا ہو اور آنکھوں کو چکاچوند کر دینے والا ہو۔ لیکن جب انسان طیب اور خبیث میں فرق کر لیتا ہے اور اشیاء کو الٰہی میزان میں تولتا ہے تو اس وقت باوجود کثرت اور حجم کے خبیث کا وزن

طیب کے مقابلے میں کم ہوتا ہے اور طیب کا پلڑا باوجود قلت کے بہت بھاری ہوتا ہے۔اس مقام پر آکر یہ امت امین اور امانت دار بن جاتی ہے۔وہ درست اور قابل اعتماد ہوتی ہے۔اب وہ تمام انسانیت کی نگہبان ہوتی ہے۔اب وہ لوگوں کے لئے اللہ کا ترازو استعمال کرتی ہے اور اللہ کی قدر کے ساتھ اقدار کا تعین کرتی ہے' وہ طیب کو اختیار کرتی ہے اور اس کی آنکھیں خبیث کو دیکھ کر خیرہ نہیں ہوتیں۔بعض اوقات ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ ان میں یہ میزان نہایت ہی مفید ہوتا ہے۔ایسے حالات میں کہ جب باطل پھولا ہوا ہو' اور انسان یہ سمجھتا ہو کہ شاید یہ ترقی کر رہا ہے آنکھیں صرف یہ دیکھتی ہیں کہ بظاہر وہ پرقوت اور صاحب کثرت ہے۔ایک مومن اس پھولے ہوئے باطل کو اللہ کے ترازو میں تولتا ہے۔اس طرح اس کے ہاتھ مضطرب نہیں ہوتے' نہ اس کی آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں' نہ اس کا معیار خراب ہوتا ہے چنانچہ وہ اس باطل کے مقابلے میں سچائی کو اختیار کرتا ہے جس میں کوئی جھاگ اور کوئی سوجن نہیں ہے۔نہ اس کے ارد گرد کوئی زاد و عتاد ہے۔بس وہ تو فقط حق ہے۔وہ مجرد حق ہے اور اس کے سوا اس کے ساتھ کوئی غرض نہیں ہے۔اللہ کے ترازو میں اس کا وزن زیادہ ہے اور ذاتی طور پر وہ حسین و جمیل ہے۔اس کی ذات کے اندر ایک قوت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کی تربیت عین قرآنی منہاج کے مطابق کی۔اور امت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیم اور نگران مقرر کیا۔پھر وہ اس سطح پر پہنچی کہ وہ اللہ کے دین پر ایمان لانے والی تھی۔محض نفسیاتی ایمان نہیں اور نہ دل کے اندر کا ایمان بلکہ اپنی عملی زندگی میں ایمان اور اس کرۂ ارض پر اپنی تمام سرگرمیوں کے اندر ایمان۔زندگی کے تمام اضطرابات میں' تمام خواہشات اور امیدوں میں' تمام رغبتوں اور مسلکوں میں' تمام مفادات اور مصالح میں اور افراد اور گروہوں کی تمام کشمکشوں میں ایمان' غرض اس کا ایمان اس طرح ہو کہ وہ اس پوری کائنات کے اوپر نگہبانی میں بھی ایماندار ہو' اور اس زندگی کے اتھاہ سمندر میں اپنی عظیم ذمہ داریوں کے اندر بھی وہ ایماندار ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو مختلف ہدایات' مختلف موثرات' مختلف آزمائشوں اور مختلف ضابطہ بندیوں کے ذریعے تربیت دی اور ان تمام امور کو ایک ہی مجموعی شکل میں ایک گھڑی کی طرح ایک نظام بنا دیا جس کے آخری مقاصد ایک ہی تھے۔یعنی اس امت کو اپنے عقائد و تصورات' اپنے شعور اور میلانات اپنے طرز عمل اور اخلاق اور اپنی شریعت اور نظام اس طرح تیار کرنے چاہئیں کہ وہ اللہ کے دین کے اوپر قائم ہو' وہ اس پوری انسانیت پر نگران ہو' اور یہ اللہ کا حق ہے کہ وہ اپنے بندوں سے جو کام لینا چاہے وہ لے۔اللہ اپنے معاملات میں خود مختار ہے۔چنانچہ اس کرۂ ارض پر اسی روشن شکل میں اللہ کا دین چمکتا ہوا قائم ہوا۔وہ ایک تصور تھا جس نے زندگی میں واقعیت اختیار کی اور یہ رسم ڈالی گئی کہ جب بھی ——— اس دین کے قیام کے لئے یہ امت جہاد کرے گی اللہ کی مدد اسے حاصل ہوگی۔

اس کے بعد جماعت مسلمہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بعض آداب سکھائے جاتے ہیں۔بتایا جاتا ہے کہ حضور ؐ نے جو کچھ نہیں بتایا اس کے بارے میں آپ سے سوالات نہ کئے جائیں۔ہو سکتا ہے کہ اگر آپ سوال کریں اور حضور جواب دیں تو آپ لوگوں کو وہ جواب پسند نہ آئے اور یا حرج واقعہ ہو جائے اور جواب کے ذریعے ایسے فرائض عائد ہو جائیں جن پر عمل کرنا ممکن نہ ہو۔یا یہ ہو کہ کسی معاملے میں اللہ تعالیٰ نے وسعت کی تھی اور سوال کی وجہ سے تنگی ہو جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ بندوں پر رحم کرتے ہوئے انہیں زیادہ سے زیادہ آزادی دیتے ہیں۔

---ooo---

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ ۖ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٠١﴾ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ ﴿١٠٢﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں' لیکن اگر تم انہیں ایسے وقت پوچھو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہو تو وہ تم پر کھول دی جائیں گی۔ اب تک جو کچھ تم نے کیا اسے اللہ نے معاف کر دیا ہے' وہ درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔ تم سے پہلے ایک گروہ نے اسی قسم کے سوالات کئے تھے' پھر وہ لوگ انہی باتوں کی وجہ سے کفر میں مبتلا ہو گئے۔"

بعض صحابہ کرام، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سوالات کرتے تھے' اور یہ سوالات ان باتوں کے متعلق ہوتے تھے جن میں کوئی امر یا نہی نازل نہ ہوئی تھی۔ یہ لوگ بعض ایسے معاملات کی تفصیل میں زیادہ دلچسپی لیتے جن کو قرآن نے مجمل چھوڑا تھا اور اس اجمال کی وجہ سے لوگوں پر ایک قسم کی سہولت تھی۔ بعض اوقات وہ ایسے معاملات کے بارے میں پوچھتے جن کے جوابات کی ضرورت ہی نہ تھی' کیونکہ یہ ممکن تھا کہ خود سائل کو وہ انکشاف اچھا نہ لگے۔ یا اس سے دوسرے مسلمانوں کو اذیت ملے۔

روایات میں آتا ہے کہ فرضیت حج کی آیت پر کسی نے یہ پوچھا کہ کیا ہر سال حج فرض ہو گیا ہے؟ تو حضور نے اس سوال پر بہت ہی ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ کیونکہ آیت حج میں اجمال تھا۔

(وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا) "اللہ کی جانب سے لوگوں پر حج بیت اللہ فرض ہے' اس پر جو راستے کی استطاعت رکھتا ہو۔ زندگی میں ایک بار حج کر کے اس آیت پر عمل ہو سکتا تھا۔ اس طرح اگر حضور اس آیت کی یہ تفسیر کر دیتے کہ "ہر سال" تو اس سے بہت سی مشکلات پیدا ہو جاتیں حالانکہ اللہ نے لوگوں کو ان میں ڈالنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

ترمذی اور دارقطنی نے حضرت علی ؓ سے ایک حدیث مرسل روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا) تو لوگوں نے پوچھا حضور ہر سال میں؟ تو آپ خاموش ہو گئے۔ انہوں نے دوبارہ پوچھا کیا ہر سال میں؟ تو آپ نے فرمایا "نہیں اگر میں کہتا کہ "ہاں" تو یہ ہمیشہ کے لئے فرض ہو جاتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی :

(یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ) دارقطنی نے حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت کی ہے کہ حضور نے فرمایا لوگو تم پر حج فرض کر دیا گیا ہے۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور سوال کر دیا کہ کیا **ہر سال**؟ حضور نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بعد اس نے پھر سوال کیا "حضور ہر سال؟" تو حضور نے **پوچھا یہ سائل** کون ہے؟ تو لوگوں نے بتلایا کہ فلاں فلاں ہے۔ تو حضور نے فرمایا خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر میں کہہ دیتا ہاں تو یہ ہر سال واجب ہو جاتا اور اگر ہر سال واجب ہوتا تو تم ہرگز اسے ادا نہ کر سکتے۔ اور اگر تم نہ کرتے تو کافر ہو جاتے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

(یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ) ایک دوسری حدیث کا مضمون یہ ہے' اور یہ امام مسلم نے صحیح مسلم میں نقل کی ہے۔ وہ حضرت انس ؓ سے روایت کرتے ہیں' آپ نے فرمایا: آپ ؐ نے ایک موقعہ پر فرمایا جب تک میں اس جگہ کھڑا ہوں پوچھو جو پوچھتے ہو۔ میں تمہیں اطلاع دوں گا" ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے پوچھا: حضور میں کہاں داخل ہوں گا؟ تو آپ نے فرمایا "آگ میں"۔ عبداللہ ابن حذافہ نے پوچھا: میرے باپ کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا تمہارا باپ حذافہ ہے۔ (ابن عبد البر لکھتے ہیں کہ عبداللہ ابن حذافہ قدیم الاسلام تھے۔ انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی' بدر میں شریک ہوئے' یہ نہایت ہی خوش مزاج تھے۔ حضور نے انہیں کسریٰ کے پاس پیغام دے کر بھیجا تھا۔ جب حضور کے ساتھ اس کا یہ سوال و جواب ہوا کہ میرا باپ کون ہے اور آپ نے فرمایا کہ حذافہ تو اس کی ماں نے کہا میں نے تم جیسا نافرمان بیٹا نہیں دیکھا۔ "کیا تم کو یہ اطمینان تھا کہ میں نے جاہلیت کی عورتوں کی طرح گناہ کا ارتکاب نہیں کیا؟ تم مجھے مجمع عام میں شرمندہ کرنا چاہتے تھے؟ اس پر عبداللہ نے کہا "خدا کی قسم اگر حضور مجھے ایک کالے غلام کا بیٹا بتلاتے تو میں اس کے ساتھ اپنا نسب ملا دیتا۔"

ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت کی ہے۔ ایک دن حضور نہایت ہی جلال میں تھے۔ آپ کا چہرہ سرخ تھا۔ آپ منبر پر بیٹھے۔ ایک شخص نے پوچھا حضور ؐ میں کہاں ہوں گا تو آپ نے فرمایا "آگ میں"۔ ایک دوسرا اٹھا اور پوچھا میرا باپ کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا تمہارا باپ "حذیفہ" ہے۔ اس پر حضرت عمر بن خطاب اٹھے اور فرمایا حضور ہم اس بات پر راضی ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے نبی ہیں اور قرآن ہمارا امام ہے۔ حضور ہم تو ابھی ابھی جاہلیت سے اور شرک سے نکلے ہیں۔ اللہ ہی کو علم ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد کون ہیں؟ اس پر حضور کا غضب ٹھنڈا ہوا اور یہ آیت نازل ہوئی

(یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ایسی باتیں نہ پوچھا کرو کہ اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں۔ مجاهد نے حضرت ابن عباس سے روایت فرمائی ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام کے بارے میں پوچھا تھا۔ سعید ابن جبیر نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس آیت کے بعد اسی وجہ سے یہ آیت نازل ہوئی

(مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِیْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِیْلَةٍ وَّلَا حَامٍ (۵: ۱۰۳) ان روایات

میں وہ تمام سوالات آگئے ہیں جن کے بارے میں پوچھنے سے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو منع فرمایا۔

قرآن کریم کا مقصد یہ نہ تھا کہ محض عقیدہ اور نظریہ ہی بیان کر دے یا ایک شرعی قانون نافذ کر دے ۔بلکہ قرآن کریم کے پیش نظر ایک امت کی تربیت کرنا تھا۔ایک معاشرہ وجود میں لانا تھا۔قرآن کریم افراد کو بتا رہا تھا کہ ان کی نشو و نما اور تربیت معقول اخلاقی اصولوں پر کی جانی مطلوب تھی۔ یہاں قرآن کریم نے سوالات کے آداب بتلائے ہیں ۔بحث و مباحثہ کی حدود کا تعین کیا ہے ۔علم و معرفت کا طریق کار بتلایا ہے۔ خصوصاً اس عرصے کے لئے جس میں باران رحمت کا نزول ہو رہا تھا۔غیب سے خبریں آ رہی تھیں ۔حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ لوگ شریعت کی تفصیلات نہ پوچھیں اور نصوص کو مجمل ہی رہنے دیں ۔ نیز غیبی امور کو غیب ہی رہنے دیا جائے ۔اور وہ غیبی امور میں اسی حد تک علم کی تمنا کریں جس قدر اللہ علیم و خبیر دے ۔ان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ نئی نئی نصوص طلب کر کے اپنے اوپر مزید مشکلات ڈالتے چلے جائیں ۔محض احتمالات اور فرضی مسائل نہ پوچھیں اور وہ ان غیبی امور کے پیچھے نہ پڑیں جن کا انکشاف اللہ نے نہیں کیا ہے اس لئے کہ اللہ کو انسان کی طاقت اور قدرت کا اچھی طرح علم ہے ۔وہ ان کی حد برداشت کو جانتا ہے ۔وہ ان کی طاقت کے مطابق ان کے لئے قانون بنا رہا ہے ۔ اور ان پر ان ہی امور کو منکشف کرتا ہے جس کا ادراک ان کا مزاج کر سکتا ہے ۔بعض امور کو اللہ ارادۃً مجمل چھوڑتا ہے ۔لوگوں کے لئے اس میں کوئی نقصان نہیں ہے کہ وہ امور اسی طرح مجمل رہیں ۔نزول قرآن کے وقت ایسا جواب آسکتا ہے جو انہیں پسند نہ ہو یا بعض لوگ اسے پسند نہ کریں اور وہ سب پر بوجھ بن جائے ۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس بات سے منع کر دیا کہ وہ ایسے امور کے بارے میں نہ پوچھیں کہ اگر بتا دیئے جائیں تو انہیں ناگوار ہوں اور انہیں متنبہ کر دیا گیا کہ اگر وہ پوچھیں گے تو جواب آئے گا۔اس لئے کہ وحی جاری ہے ۔اس طرح فرائض کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔

(يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا (۵ : ۱۰۱)) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں' لیکن اگر تم انہیں ایسے وقت پوچھو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہو تو وہ تم پر کھول دی جائیں گی ۔ان چیزوں کو اللہ نے معاف کر دیا۔“

یعنی ان امور کے بارے میں نہ پوچھو جو اللہ نے معاف کر دیئے اور اس کا فرض کرنا موقوف رکھا۔ اس لئے کہ اجمال ہی میں وسعت ہوتی ہے ۔مثلاً حج کی تعداد کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کوئی بات نہیں کی یا ایسی چیزیں جن کا اللہ نے ذکر ہی نہیں کیا۔

اس کے بعد اللہ نے ان کے سامنے امم سابقہ یعنی اہل کتاب کی مثال پیش کی کہ انہوں نے بار بار سوالات کر کے اپنی آزادی کا دائرہ تنگ کیا اور اس طرح ان پر زیادہ فرائض اور احکام عائد ہوتے چلے گئے اور جب ان پر احکام فرض ہوئے تو انہوں نے ان کی تعمیل سے انکار کر دیا اور کفر کا راستہ اختیار کیا۔اگر وہ خاموش رہتے اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان پر آسانی کی تھی اسے جاری رہنے دیتے تو ان پر سختی نہ ہوتی اور نہ شدت کے نتیجے میں انہیں انکار کرنا پڑتا۔

سورۂ بقرہ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ جب بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ وہ گائے ذبح کریں اور گائے کے ساتھ تو کوئی قیود و شروط عائد نہ تھے بلکہ صرف یہی کہا گیا تھا کہ بس وہ گائے ذبح کر دیں۔ اگر وہ کوئی گائے ذبح کرتے تو حکم کی تعمیل ہو جاتی۔ انہوں نے گائے کے اوصاف گنانے شروع کر دیئے۔ انہوں نے اس کے رنگ تک تحقیقات شروع کر دیں۔ ہر تحقیق و سوال کے نتیجے میں ان پر سختی ہوتی گئی۔ اگر وہ سوالات کی بوچھاڑ نہ کرتے تو ان کے لئے کوئی مشکل پیدا نہ ہوتی۔

یہی حال تھا ان کا سبت کے بارے میں کہ پہلے انہوں نے خود ایک تعطیل کا مطالبہ کیا اور پھر اس کی پابندی کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کی اس خصلت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر بطور سزا کئی اشیاء کو حرام کر دیا۔

صحیح بخاری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے "میں نے جو احکام نہیں دیئے ان کے بارے میں مجھے چھوڑ دو۔ اس سے پہلے جو قومیں ہلاک ہوئیں وہ زیادہ پوچھنے کی وجہ سے ہلاک ہوئیں اور مزید اس لئے کہ انہوں نے اپنے نبیوں کے ساتھ اختلافات کئے۔

صحیح مسلم میں عامر ابن سعید نے اپنے باپ سے روایت کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمانوں میں سے خود مسلمانوں کے خلاف سب سے بڑا جرم کرنے والا وہ شخص ہے کہ جو کسی ایسی چیز کے بارے میں پوچھے جسے مسلمانوں پر حرام نہیں کیا گیا اور اب اس کے سوالات کی وجہ سے وہ مسلمانوں پر حرام ہو جائے۔

یہ آیات اور ان کے بعد احادیث نبوی کا یہ مجموعہ اسلامی معاشرے میں حصول علم کے لئے ایک منہاج وضع کر دیتا ہے۔ اسلام میں طلب علم کا مقصد واقعی ضروریات کے لئے مسائل کا حل معلوم کرنا ہے اور ضرورت کے دائرے تک کرنا ہے۔ اس لئے عالم غیب میں دلچسپی نہ رکھنے کا فائدہ یہ ہے کہ انسانی طاقتیں ایسے کام کو روشنی میں لانے کے اندر خرچ نہ کی جائیں جن کی حقیقت تک پہنچنے کی انسان کو کوئی عملی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی عملی زندگی اس حقیقت کی محتاج نہیں ہے اور انسانی ذہن کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ عالم غیب پر اسی طرح ایمان لائے جس طرح اللہ علیم و خبیر نے کہہ دیا ہے۔

جب کوئی ایمان کو چھوڑ کر غیبی حقائق پر بحث شروع کر دے تو اس بحث کے نتیجے میں کچھ حاصل نہیں ہوتا اس لئے کہ انسانی ذہن کو یہ قوت اور صلاحیت ہی نہیں دی گئی کہ وہ عالم غیب کے میدان میں کسی چیز کا ادراک کر سکے۔ اس کا ادراک اسی حد تک محدود ہے جس حد تک اسے بتایا گیا ہے لہٰذا اس قسم کی کوئی کوشش بھی بے سود رہے گی۔ یہ اور بات ہے کہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار کر ایسا شخص اپنے آپ کو تھکا ڈالے گا اور آپ ہی ضلال بعید میں جا پڑے گا۔

اسلام کی پالیسی یہ ہے کہ جب کوئی مسئلہ درپیش ہو تو اس وقت اس کے بارے میں سوال کیا جائے' اور یہی ہے اسلامی منہاج۔ آپ دیکھتے نہیں کہ پورے مکی دور میں کوئی ایسا شرعی حکم نازل نہیں ہوا جس کا نفاذ ضروری ہو۔ اگرچہ بعض اشیاء اور بعض انفرادی اعمال کے بارے میں احکام آتے رہے' لیکن ایسے احکام جن کے نفاذ کی ضرورت ہو مثلاً حدود' تعزیرات' کفارات اور قصاص یہ سب کے سب مدینہ میں نازل ہوئے کیونکہ مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی تھی اور نفاذ احکام حکومت ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

ابتدائی اسلامی سوسائٹی نے اس حقیقت کو پا لیا تھا۔ وہ کسی مسئلے کے بارے میں اس وقت تک نہ پوچھتے تھے جب تک وہ واقع نہ ہو جائے اور یہ سوال بھی واقعہ کی حد تک ہوتا' مفصل قانونی دفعات کے وضع کرنے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آتی تاکہ سوال و جواب بھی اسلام کے نظام تربیت کے مطابق ہوں۔

حضرت عمرؓ کا طریقہ یہ تھا کہ اگر کوئی قضیہ درپیش نہ ہوتا تو خواہ مخواہ سوال کرنے والے پر وہ لعنت بھیجتے - دارمی نے اپنی مسند میں اور زہری نے اس کا ذکر کیا ہے کہ زید ابن ثابت انصاری سے جب کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو وہ پہلے پوچھتے کہ کیا ایسا کوئی واقعہ ہوا ہے - اگر وہ کہتے کہ ہاں ایسا وقوعہ ہو گیا ہے تو وہ پھر اپنے علم کے مطابق بات کرتے - اور اگر وہ کہتے کہ واقعہ نہیں ہوا ہے تو وہ جواب دیتے کہ ایسا ہونے دو پھر بات کریں گے -

اسی طرح عمار ابن یاسر سے بھی روایت ہے کہ ان سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ کیا اس سلسلے کا کوئی واقعہ ہوا ہے تو انہوں نے کہا کہ نہیں تو انہوں نے کہا کہ دیکھو جب ایسا کوئی واقعہ ہو تو پھر بات کریں گے -

دارمی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے - فرماتے ہیں کہ میں نے صحابہ رسول سے اچھے لوگ نہیں دیکھے - انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی وفات تک صرف ۱۳ مسئلے پوچھے - اور یہ سب مسئلے قرآن کریم میں ذکر ہوئے ہیں جن میں یہ یسئلون شامل ہیں -

(يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ ....... يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ) اور وہ اسی بات کے بارے میں پوچھتے تھے جو ان کے لئے نفع بخش ہوتی -

امام مالک فرماتے ہیں کہ جب میں مدینہ میں آیا تو اہل مدینہ کے پاس کتاب و سنت کے سوا کوئی علم نہ تھا - جب کوئی معاملہ پیش آتا تو امیر مدینہ موجود علماء کو جمع کرتے اور جس بات پر ان کا اتفاق ہو جاتا وہ اسے نافذ کر دیتے - تم لوگ بہت ہی سوالات کرتے ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہیں فرمایا -

علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں کہا ہے : امام مسلم نے حضرت مغیرہ ابن شعبہ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : " اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی حرام کر دی ہے بیٹیوں کا دفن کرنا حرام کر دیا ہے دوسروں کے حقوق منع کرنے اور اپنے حقوق طلب کرنے کو حرام قرار دیا ہے اور تین چیزوں کو ناپسند کیا ہے - زیادہ قیل و قال منع ہے ' زیادہ سوالات کرنا منع ہے اور دولت کو ضائع کرنا ناپسند ہے - اکثر علماء کا کہنا یہ ہے کہ کثرت سوال سے مراد فقہی مسائل میں زیادہ سوالات کرنا ہے - یعنی ان معاملات میں جن میں کوئی نص نہیں ہے - یعنی فقہی پہیلیاں اور مسائل سے جزئیات اور مشتقات نکالنا - سلف صالحین اس کو ناپسند کرتے تھے اور اسے محض تکلف سمجھتے تھے - وہ کہتے تھے کہ جب کوئی واقعہ پیش آ جائے تو سوال کا جواب خود توفیق الٰہی سے ذہن میں آ جاتا ہے -

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام ایک حقیقت پسندانہ نظام ہے - یہ عملاً موجود اور واقعی حالات میں اصول شریعت سے احکام وضع کرتا ہے - یہ نظام مسئلے کا جائزہ لیتا ہے - اس کی شکل ' اس کے حجم اور اس کے حالات کا تعین کرتا ہے - پھر وہ حالات اور ظروف پر غور کرتا ہے ' اس کے بعد یہ نظام حالات کے مطابق ایسا حل تجویز کرتا ہے جو اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے -

اگر کوئی مسئلہ درپیش ہو تو اس کے بارے میں سوال کرنا تو ایک متعین صورت حالات کے بارے میں سوال ہو گا ' لیکن اگر کوئی واقعہ پیش آیا ہی نہ ہو تو اس کا تعین ممکن ہی نہیں ہوتا اور اس کے بارے میں جو بھی فتویٰ دیا جائے گا وہ عملاً اچھی طرح منطبق نہ ہو گا - اگر ہم فرضی حالات کے جوابات دینے لگیں تو یہ فعل شریعت کی حقیقت پسندی کے خلاف

ہو گا۔ اور اسلام کے منہاج کے متصادم ہو گا۔

آج کے دور میں اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ لوگ ایسے ممالک میں شریعت کے قوانین کے بارے میں سوالات کرتے ہیں جہاں شریعت کے قیام کا مقصد پیش نظر نہیں ہوتا۔ نہ فتویٰ اس لئے طلب کیا جاتا ہے کہ شریعت کے کسی حکم کو نافذ کرنا ہے۔

اسلامی شریعت کا طریق کار یہ ہے کہ اس میں فتویٰ نفاذ قانون کے لئے طلب کیا جاتا ہے۔ اگر پوچھنے والے اور جواب دینے والے دونوں جانتے ہیں کہ وہ ایک ایسے ملک کے باشندے ہیں جس میں شریعت کا نفاذ نہیں ہو رہا ہے۔ اس میں اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو نہ تسلیم کیا جاتا ہے اور نہ اس پر کوئی یقین رکھتا ہے نہ اسے لوگوں کی زندگیوں اور اجتماعی امور میں نافذ کیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر اللہ کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا اور اللہ کے اقتدار اعلیٰ کی اطاعت نہیں کی جاتی تو ایسے حالات میں فتویٰ طلب کرنے کے کیا معنی؟ اور جواب دینے والے کے جواب کا کیا فائدہ؟ یہ دونوں دراصل شریعت کے ساتھ مذاق کرتے ہیں چاہے انہیں اس کا شعور ہو یا لاشعوری طور پر وہ ایسا کر رہے ہوں۔

اسی طرح اسلامی فقہ کی جزئیات کی خیالی تعلیم اور تحقیق ' خصوصاً ان شعبوں میں جن کا انطباق اور نفاذ نہیں ہوتا ' ایک ایسا مطالعہ اور تحقیق ہے جو محض کھیل کے طور پر کیا جاتا ہے اور اس سے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اسلامی فقہ اور اسلامی شریعت کا اس کرۂ ارض پر ایک مقام ہے اور وہ مقام صرف یہ ہے کہ اسے مدارس کے اندر پڑھایا جائے ' عدالتوں کے اندر ان فقہی جزئیات کا نفاذ ضروری نہیں ہے۔ یہ تاثر جو شخص دیتا ہے وہ اپنے آپ کو ایک بڑے گناہ میں ملوث کرتا ہے ' اس لئے کہ یہ شخص لوگوں کو یہ شعور دے کر ان کے جذبہ نفاذ شریعت کو سرد کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دین سنجیدہ دین ہے اور یہ آیا ہی اس لئے ہے کہ لوگوں کی زندگی پر کنٹرول کرے۔ یہ اس لئے آیا ہے کہ لوگ صرف اللہ کی بندگی اور غلامی کریں۔ اس دین کے آنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کے اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت کے حق کو چھین لیا ہے ' ان سے یہ حق واپس لے لیا جائے اور اسے دوبارہ اللہ کے حوالے کیا جائے اور تمام امور میں اللہ کی شریعت اور حکومت جاری ہو۔ اللہ کے سوا کسی اور کی شریعت نافذ نہ ہو ' اس لئے کہ یہ شریعت آئی ہی اس لئے ہے کہ وہ زندگی پر حکمرانی کرے اور زندگی کے واقعی اور عملی مسئلوں کے حل پیش کرے اور ہر معاملے کی شکل و صورت اور اس کے حجم کے مطابق صحیح صحیح فیصلے دے۔ حالات اور واقعات کے مطابق۔

یہ دین اس لئے نہیں آیا کہ اسے بطور علامت اور شعار لیا جائے۔ اس لئے نہیں آیا کہ اس کے شرعی نظام پر محض علمی مباحث ہوں ' اس لئے نہیں کہ اس کا نفاذ کیسے ہو۔ یہ نظام خیالی مفروضات کے حل پیش کرتا ہے اور فرضی واقعات کے فرضی احکام وضع کرتا ہے۔

یہ ہے اسلام کی حقیقت پسندی۔ علمائے دین کو چاہئے کہ وہ اس دین کا مطالعہ حقیقت پسندانہ انداز میں کریں اور اس مطالعے کے ساتھ ساتھ نفاذ شریعت کے امکانات کا مطالعہ بھی کریں۔ اگر وہ نفاذ شریعت کی جدوجہد نہیں کر سکتے تو ہوا میں محض خیالی فتوے کیوں جاری کرتے ہیں؟

---ooo---

ابن عباس ؓ سے مجاہد نے جو روایت کی ہے اور اس آیت کے شان نزول کے بارے میں سعید ابن جبیر نے کہا ہے کہ آیت (یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ) سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ جاہلیت میں مروج بعض باتوں کے بارے میں پوچھتے تھے۔ البتہ متعین طور پر یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ سوال کیا تھا' لیکن اس آیت کے بعد بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں اور آیت سابقہ کے درمیان کوئی تعلق ضرور ہو گا۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

"اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ نہ وصیلہ اور نہ حام۔ مگر یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر بے عقل ہیں (کہ ایسے وہمیات کو مان رہے ہیں) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس قانون کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور آؤ پیغمبر کی طرف تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لئے تو بس وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید کیے چلے جائیں گے خواہ وہ کچھ نہ جانتے ہوں اور صحیح راستہ کی انہیں خبر ہی نہ ہو؟"

انسانوں کے دل و دماغ یا تو اس صورت پر قائم ہوں گے جس پر انہیں اللہ نے پیدا کیا۔ وہ صرف ایک اللہ کی معرفت پائیں گے 'ایک رب العالمین کی غلامی کریں گے' اسی کی شریعت کے تابع ہوں گے اور اللہ کے علاوہ تمام دوسرے شرائع و قوانین کو ترک کر دیں گے۔ تمام دوسرے الہوں کی ربوبیت کو ترک کر دیں گے اور کسی اور سرچشمے سے اپنے قوانین اور ضوابط نہ لیں گے۔ یہ ایک نہایت ہی فطری صورت حال ہوگی 'بندے کا اپنے رب کے ساتھ جوڑ ہو گا' اس کی عبادت اور رب کریم کے ساتھ اس کے روابط نہایت ہی سادہ ہوں گے ورنہ وہ جاہلیت کی پیچ در پیچ گزر گاہوں میں سرگرداں رہے گا۔ کبھی بت پرست ہو گا اور بے بنیاد کلمات کے اندر گم کردہ راہ رہے گا۔ زندگی کے ہر موڑ پر ایک وہم اور تخیل اسے نچا رہا ہو گا۔ جاہلیت کا ہر بت اس سے اپنے مراسم عبودیت ادا کرنے کا مطالبہ کر رہا ہو گا' ہر بت کا مطالبہ یہ ہو گا کہ وہ اسے راضی کرے۔ پھر عبادات اور قربانیوں کے مراسم بھی متعدد اور متضاد ہوں گے اور ایک بت پرست کے ذہن میں کوئی اصول نہ ہو گا۔ وہ عبادات کے مراسم کو ادا کرتا چلا جائے گا اور اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے گی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ مختلف اور متفرق ارباب کی بندگی اسے تھکا کر چور چور کر دے گی اور اس کی انسانیت کا وہ شرف بھی ختم ہو جائے گا جو اللہ نے انسان کو دیا تھا۔

جب اسلام آیا تو انسانیت مؤخر الذکر حالت میں تھی۔ اس نے لوگوں کے سامنے نظریہ توحید پیش کیا اور بتایا کہ قوت

حاکم ایک ہے جس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ اس نے صرف ایک رب کی بندگی کا نظریہ دیا تاکہ لوگ ایک دوسرے کی بندگی اور غلامی سے نجات پالیں۔ نظریہ توحید کے ذریعے انسان کو متفرق الہوں کی بندگی سے نجات ملی اور انسانی ضمیر اوہام و خرافات کے ناقابل برداشت بوجھ سے نجات پاگیا۔

انسانی فہم و ادراک اور عقلمندی نے اپنا اصل مقام و مرتبہ پایا اور انسان کو مختلف اور متضاد مراسم عبودیت سے نجات ملی۔ پھر انسان نے بت پرستی کے خلاف جہاد شروع کیا اور اس کی تمام شکلوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد زندگی کے تمام نشیب و فراز میں اس کا پیچھا کیا' دل کی گہرائیوں' عبادت کے طریقوں' زندگی کی رسومات اور نظام قانون اور نظام حکومت ہر جگہ سے بت پرستی کا قلع قمع کر دیا گیا۔

افکار جاہلیت میں سے یہ ایک ٹیڑھی فکر تھی' جس کا قرآن کریم یہاں علاج کر رہا ہے تاکہ اسے سیدھا کر دے' دیا جلا کر اس ٹیڑھی راہ کو روشن کر دے اور فکر و نظر کے اسلامی اصولوں کا دیا جلا دے۔ اصول شریعت اور اصول نظام زندگی۔

(مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۵:۱۰۳) "اللہ نے کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ نہ وصیلہ اور نہ حام۔ مگر یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔" یہ جانوروں کی اقسام تھیں جنہیں وہ اپنے الہوں کے لئے چھوڑ دیتے تھے۔ ان کی کچھ خاص شرائط ہوتی تھیں اور یہ شرائط انہوں نے فکر و نظر کی تاریخ کے تہ بہ تہ پردوں اوہام اور خرافات سے اخذ کی تھیں۔ بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام کیا تھے؟ اور ان کے بارے میں جو اوہام و خرافات عربوں میں رائج تھے ان کا مصدر اور منبع کیا تھا؟

ان کی تعریف میں روایات مختلف ہیں۔ بعض روایات کا یہاں نقل کرنا مناسب ہو گا۔ زہری نے سعید ابن مسیب سے یہ روایت کی ہے۔ بحیرہ اونٹوں میں سے وہ قسم ہوتی ہے جس کا دودھ مالک خود استعمال نہیں کرتا تھا۔ یہ صرف الہوں کے لئے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ الہوں کا مال مذہبی پیشواؤں ہی کے لئے ہوتا ہو گا۔ سائبہ وہ ہے جو وہ اپنے بتوں کی نذر کرتے تھے۔ وصیلہ وہ ہوتی تھی جس کا پہلی بار کا بچہ مادہ ہو پھر دوبارہ بھی بچہ مادہ ہو یعنی دونوں کے درمیان اتصال ہو گیا۔ یعنی درمیان میں نر پیدا نہ ہوا۔ ایسی اونٹنی کو وہ بتوں کے نام پر ذبح کر دیتے تھے اور حام اس اونٹ کو کہتے تھے کہ جس کی نسل سے کئی بچے پیدا ہوئے ہوں۔ اس کی تعداد مقرر تھی جب وہ اس تعداد تک پہنچ جاتا تو اسے حام اس لئے کہتے تھے کہ اس نے اپنی پشت کو مزید استعمال سے بچالیا۔ اب اس پر سوار نہ ہوتے۔

اہل لغت کہتے ہیں: بحیرہ وہ اونٹنی ہے جس کے کان پھاڑتے تھے۔ وہ کہتے (بحرت اذن الناقه بحرا) (میں نے اپنی اونٹنی کے کان پھاڑ دیئے) ایسی اونٹنی کو بحورہ بھی کہتے تھے اور بحیرہ بھی۔ اور یہ کان آخری حصے تک پھاڑ دیئے جاتے تھے اور بحر کو بھی بحر اس لئے کہتے ہیں کہ یہ وسیع ہوتا ہے۔ اہل جاہلیت کے نزدیک بحیرہ کا گوشت کھانا حرام ہوتا تھا اور اسے بحیرہ اس طرح قرار دیتے کہ جب وہ پانچ بار بچہ دے اور وہ نر ہو۔ اب وہ اس کے کان پھاڑ دیتے' اس کا گوشت حرام قرار دے دیتے اور اس کی قربانی اور اس پر سواری ممنوع ہوتی۔ کوئی شخص اسے اپنے پانی سے نہ روکتا اور کوئی شخص اسے اپنی چراگاہ سے بھی نہ روکتا۔

سائبہ وہ اونٹنی ہوتی جسے پن کر دیا جائے اور اسے مسیبہ بھی کہتے ہیں ۔ جاہلیت کے زمانے میں اگر کوئی نذر مانتا کہ وہ سفر سے خیریت سے لوٹا یا بیماری سے تندرست ہوا' تو وہ یہ نذر دے گا ۔ تو وہ کہتا میری اونٹنی سائبہ ہوئی' حرمت اور آزادانہ چرنے چگنے میں وہ بھی بحیرہ کی طرح ہوتی ۔ اور وصیلہ کے بارے میں بعض اہل لغت نے یہ لکھا ہے کہ اگر بکری کے دو بچے ہوں ایک نر ہو اور دوسرا مادہ ہو تو عرب کہتے کہ اس مادہ نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر ولادت کی تو وہ اس بکری کو ذبح نہ کرتے تھے ۔ بعض کہتے تھے کہ اگر بکری مادہ جنے تو یہ ان کی ہے ۔ اور اگر نہ جنے تو وہ اسے اپنے الٰہوں کے نام ذبح کر دیتے تھے اور اگر نر اور مادہ دونوں یکجا پیدا ہوں تو کہتے کہ چونکہ یہ بھائی بہن اکٹھے ہوئے ہیں اس لئے وہ بکری کو ذبح نہ کرتے ۔ حام وہ اونٹ ہوتا جس کے نطفے سے دس بچے پیدا ہوتے تو اس کے بارے میں وہ کہتے کہ اس نے اپنی پیٹھ کو بچالیا ہے اس لئے وہ اس کو چراگاہ اور پانی سے نہ روکتے ۔" (دیکھئے احکام القرآن جصاص) ۔

ان جانوروں کی تعریف کے بارے میں اور بھی کئی روایات وارد ہیں اور ان کے پیچھے بس یہی تصور ہے جو اوپر ہم نے ذکر کیا ۔ ان جانوروں کے تقدس کے لئے ان اسباب سے کوئی ارفع اور معقول سبب کسی روایت میں نہیں آیا ہے ۔ جیسا کہ درج بالا اقتباس سے معلوم ہو گیا ہو گا یہ تمام اسباب بت پرستی اور جاہلیت کے اوہام اور اندھیروں کا نتیجہ تھے ۔ جب فیصلے اوہام اور تاریک خیالی کے زاویے سے ہوتے تو پھر وہم پرستی اور تاریک خیالی کی نہ کوئی حد رہتی ہے اور نہ کوئی اصول اور معیار رہتا ہے ۔ اس کے نتیجے میں چند مذہبی رسومات پیدا ہو جاتی ہیں کبھی ان رسومات میں کمی آ جاتی ہے اور کبھی اضافہ ہو جاتا ہے ۔ یہ اصول جاہلیت عربیہ کے اندر بھی رائج تھا اور یہی صورت ہر دور اور ہر جگہ واقعہ ہو سکتی ہے ۔ جب بھی توحید سے لوگ ہٹیں گے وہ ایسی ہی وہمیات کا شکار ہوں گے اس لئے کہ توحید ہی وہ نظریہ ہے جس میں نہ ٹیڑھ ہے اور نہ تاریکی ہے ۔ تمام جاہلی نظاموں میں رسوم و توہمات کی ظاہری شکلیں تو مختلف ہوتی ہیں لیکن خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ بنیاد تاریک خیالی پر ہوتی ہے یعنی زندگی کے معاملات میں اللہ کے سوا کسی اور جگہ سے ہدایات لینا ۔

جاہلیت کسی مخصوص زمانے کا نام نہیں ہے بلکہ جاہلیت ایک صورت حال کا نام ہے جو بار بار رنگ بدل کر سامنے آتی رہتی ہے ۔ مختلف شکلوں میں آتی ہے ۔ مختلف ادوار میں آتی ہے ۔ اب صورت حال یا تو ایسی ہو گی کہ ایک اللہ حاکم ہو گا اور اس کے مقابلے میں تمام مخلوق اس کی غلام اور محکوم ہو گی ۔ ہر قسم کا اقتدار اللہ کے لئے ہو گا' شعور و فکر اللہ سے لیا گیا ہو گا' نیت اور عمل اللہ کے حوالے سے ہو گا ۔ نظم و نسق اور اجتماعی طور طریقے اللہ کی مرضی سے ہوں گے ۔ اقدار اور پیمانے اللہ کے تصور سے وضع ہوں گے' قوانین اور ضوابط اللہ کے نافذ ہوں گے اور تمام تصورات فلسفے اور ہدایات اللہ ہی سے اخذ ہوں گے یا پھر جاہلیت ہو گی' کسی بھی رنگ ڈھنگ میں' اس میں بندہ بندے کا غلام ہو گا یا بندہ اللہ کے سوا کسی اور مخلوق کا غلام ہو گا' اس جاہلیت کے نہ حدود ہوں گے اور نہ ضابطے ہوں گے اس لئے کہ کوئی انسان کوئی ایسا ضابطہ بنا ہی نہیں سکتا جسے الٰہی ضابطہ اور اصول کہا جا سکے اس لئے کہ عقل انسانی پر بے شمار چیزیں اثرات ڈال دیتی ہیں ۔ ہر دور میں جب انسان نے کوئی تصور اور کوئی نظم دینے کی کوشش کی ہے وہ بے شمار عوامل سے متاثر ہوا ہے اور وہ مختلف اطراف سے پریشر اور دباؤ کا مقابلہ نہیں کر سکا' جب تک کہ وہ موزوں ترین ضابطے کے سامنے جھکا نہیں ہے ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کے اس بیان اور توضیح کو چودہ سو سال گزر گئے ہیں اور جب بھی عقل انسانی نے عقیدۂ توحید سے روگردانی کی وہ پیچیدہ راہوں میں گم ہو گیا اور بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ گیا ۔ وہ مختلف' متعدد اور متفرق

ارباب کا معتقد ہوتا رہا۔ اس نے اپنی آزادی' اپنی شرافت اور اپنی قوت مقابلہ سے ہاتھ دھویا۔ صرف اس زیر بحث مسئلہ تقدس حیوانات ہی کو اگر لیا جائے تو آج بھی مصر کے اندر دسیوں خرافات ملیں گے جن میں بعض حیوانات کو تقدس کے خیال سے چھوڑ دیا جاتا ہے اور یہ بعض اولیاء اور مقدس لوگوں کے نام پر' بعینہ اسی طرح چھوڑ دیئے جاتے ہیں جس طرح قدیم زمانوں میں الہوں کے نام پر حیوانات چھوڑے جاتے تھے۔

ان مراسم عبودیت اور جاہلیت کے مسئلے کا تعلق صرف ایک اصول کے ساتھ ہے اور یہ اصول نقطہ آغاز ہے۔ اس نقطے سے دو راستے نکلتے ہیں یا تو اسلام کا راستہ ہو گا اور یا جاہلیت کا۔ نقطہ یہ ہے کہ لوگوں کی زندگیوں میں حاکیت کس کی چلے گی؟ اسلامی شریعت کے مطابق حاکیت اللہ کی ہوگی یا غیر اللہ کی حاکیت ہوگی اور لوگ اپنے لئے احکام اور طریقے خود وضع کر رہے ہوں گے۔ یا وہ مراسم عبودیت اور اقدار و پیمانے خود متعین کریں گے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ لوگوں پر الوہیت اللہ کی ہوگی یا اللہ کی مخلوق میں سے کسی اور کی ہوگی۔ غیر اللہ میں سے جو بھی اللہ کی حاکیت کا دعویدار بن جائے گا بس وہ الہٰ تصور ہو گا۔

یہی وجہ ہے کہ آیت کا آغاز ہی اس مضمون سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان مراسم کی اجازت نہیں دی ہے۔ اگر اللہ نے بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام جیسے مراسم کی منظوری نہیں دی ہے تو سوال یہ ہے کہ پھر کس نے یہ نام نہاد جانور حرام کئے ہیں۔

(مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ (۵:۱۰۳) "اللہ نے بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام نامی جانوروں کو وہ حیثیت نہیں دی۔" اور وہ لوگ جو اس شریعت اور قانون کی اطاعت کرتے ہیں وہ کفار ہیں۔ یہ لوگ اس لئے کفار ہیں کہ یہ لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ کبھی وہ خود اپنی طرف سے ایک بات بناتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی شریعت ہے اور کبھی وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے معاملات کے اندر اللہ کی شریعت کا دخل قبول نہیں کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے نافرمان نہیں ہیں۔ یہ سب کفر ہے۔

(وَلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۵:۱۰۳)) "مگر یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔ مشرکین عرب کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں اور یہ دین حضرت ابراہیم پر اللہ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ یہ لوگ اللہ کی ذات کے منکر نہ تھے' بلکہ وہ ذات باری کے وجود کا اعتراف کرتے تھے۔ وہ اللہ کی قدرت کے بھی معترف تھے اور اس بات کا بھی اعتراف کرتے تھے کہ اللہ ہی متصرف فی الامور ہے۔ لیکن ان اعترافات کے باوجود وہ اپنے لئے قوانین خود بناتے تھے اور اس کے بعد وہ یہ یقین کرتے تھے کہ یہ قوانین اللہ کی جانب سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کافر بن گئے اور یہی بات ان تمام لوگوں پر صادق آئے گی جو کسی بھی وقت جاہلیت میں زندگی بسر کرتے ہوں اور اپنے لئے قانون خود بناتے ہوں۔ پھر وہ یہ گمان کرتے ہوں کہ یہ اللہ کی شریعت ہے۔

اللہ کی شریعت تو وہی ہے جو کتاب اللہ کے اندر موجود ہے۔ جو اللہ نے اتاری اور نبی نے بیان کی - وہ نہ مبہم ہے اور نہ پیچیدہ ہے۔ اللہ کی شریعت اس بات کی متحمل نہیں ہے کہ اپنی جانب سے شریعت کے اوپر افتراء باندھے اور یہ زعم کرے کہ وہ شریعت ہے یا کتاب اللہ ہے جیسا کہ جاہلیت کے پیروکاروں کا وطیرہ ہوتا ہے کہ وہ خود ایک شریعت بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ایسے دعوے کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کفر کے ساتھ متصف کرتا ہے اور کافر کہنے کے بعد ایسے لوگوں کو اللہ بے عقل بھی کہتا ہے اس لئے کہ وہ عقلمند ہوتے تو اللہ پر افتراء نہ باندھتے۔ اگر وہ عقلمند ہوتے تو یہ گمان نہ کرتے کہ ان کا یہ افتراء چل سکے گا۔ اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کے قول و فعل میں بھی تضاد ہے۔

(وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۵:۱۰۴)) "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس قانون کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور آؤ پیغمبر کی طرف تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لئے تو بس وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید کئے چلے جائیں گے خواہ وہ کچھ نہ جانتے ہوں اور صحیح راستہ کی انہیں خبر ہی نہ ہو؟"

اللہ تعالیٰ نے جو شریعت نازل کی ہے وہ واضح ہے۔ وہ قرآن کریم اور سنت رسول کی شکل میں ریکارڈ ہے - یہی وہ معیار ہے، اور یہی وہ پوائنٹ ہے جس سے اسلام اور جاہلیت کے راستے جدا ہوتے ہیں۔ ایک ہے ایمان کا راستہ اور دوسرا ہے کفر کا راستہ۔ اس جہاں میں یا تو صورت حال یہ ہوگی کہ لوگوں کو ما انزل اللہ کی طرف دعوت دی جائے گی اور وہ اس پر لبیک کہیں گے اور اس صورت میں وہ مسلمان کہلائیں گے یا وہ اس دعوت کا انکار کریں گے، اس صورت میں وہ کافر ہوں گے اور ان دو صورتوں کے درمیان کوئی تیسری صورت نہیں ہے۔

یہ لوگ ایسے تھے کہ جب انہیں اللہ اور رسول اللہ کی طرف دعوت دی جائے تو یہ کہتے ہیں ہمارے لئے وہی راستہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ یہ لوگ اس طرح بندوں کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کرنے لگے اور انہوں نے ان قوانین کو ترک کر دیا جو بندوں کے رب نے وضع کئے تھے۔ انہوں نے آزادی کے اس نعرے کو ترک کر دیا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ انسانوں کی غلامی کو ترک کر دو اور عقل و ضمیر کی پیروی اختیار کرو چاہے یہ عقل و ضمیر ان کی اپنی ہو یا آباؤ اجداد کی ہو۔

اس کے بعد قرآن مجید ان کے موقف پر تعجب اور تاسف کا اظہار کرتا ہے۔

(اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۵:۱۰۴)) "اگرچہ ان کے آباؤ اجداد کسی چیز کو نہ سمجھتے ہوں اور نہ ہی راہ ہدایت پر ہوں۔"

اس استفہام کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ آباؤ اجداد کے اتباع سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ وہ عقلمند نہیں ہیں اور اگر عقلمند ہوں تو پھر آباؤ اجداد کی اطاعت جائز ہے اور اس صورت میں اللہ اور رسول اللہ کے احکام کو ترک کرنا جائز ہے۔

یہ بات نہیں ہے بلکہ اس اظہار تعجب میں محض ان کی واقعی صورت حال کو بیان کرنا مطلوب ہے کہ اس سے قبل ان کے آباؤ اجداد نامعقول باتوں کو مانتے تھے - اس لئے کہ ان کے آباء پھر اپنے آباء کو ماننے والے تھے اور ان آباء نے بھی خود اپنے لئے قواعد و ضوابط وضع کیے تھے اور شریعت الہی کے ہوتے ہوئے اگر کوئی شخص اپنے آباء اور اجداد کے رسم و رواج کا اتباع کرتا ہے تو وہ یقیناً بے عقل ہے اور راہ ہدایت پر نہیں ہے - چاہے وہ اپنے آپ اور اپنے قوانین کے بارے میں جو چاہے کہے - جبکہ اللہ بہت ہی علیم و خبیر ہے اور سچا ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم بہرحال یہی ہے کہ یہ لوگ کچھ بھی نہیں جانتے اور یہ اللہ کی شہادت ہے - جو شخص اللہ کی شریعت سے حکم عدولی کرتا ہے وہ جاہل بھی ہے اور گمراہ بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ پر افتراء باندھنے والا اور کافر بھی ہے -

---ooo---

اہل کفر کے اقوال و افعال کے بیان کے اختتام کے بعد اب روئے سخن ان لوگوں کی طرف مڑ جاتا ہے جو ایمان لائے ہیں - یہاں اہل کفر سے ان کی مکمل علیحدگی کر دی جاتی ہے اور ان کو ممیز کر دیا جاتا ہے - ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہارے فرائض اور واجبات کیا ہیں اور یہ کہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ان کا موقف کیا ہے اور یہ کہ وہ اللہ کے سپرد ہیں اور ان کی زندگیاں اس فانی دنیا کے سپرد نہیں ہیں - نہ ان کا مقصد اس دنیا کے مفادات کا حصول ہے -

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا ٱهْتَدَيْتُمْ ۚ إِلَى ٱللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٠٥﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنی فکر کرو' کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہ راست پر ہو' اللہ کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے' پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو -“ یہ اہل ایمان اور ان کے مخالف کیمپ کے درمیان ایک مکمل جدائی ہے اور ان کے اپنے درمیان باہم کفالت اور ضمانت ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ مکمل ہمدردی اور یہ کہ وہ ایک امت اور ایک جماعت ہیں -

(يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا ٱهْتَدَيْتُمْ

(۵:۱۰۵)) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنی فکر کرو' کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا - تم ایک اکائی ہو اور تم دوسروں سے علیحدہ اور ممتاز ہو - تم باہم متضامن اور متکافل ہو' اس لئے تم اپنے محور کے گرد جمے رہو - اپنے آپ کو پاک رکھو - اپنا تزکیہ کرو' اپنی جماعت اور اپنی جمعیت کی فکر کرو' اگر تم راہ ہدایت پر جمے رہے تو کسی کی گمراہی تمہیں کوئی نقصان نہ دے سکے گی - اس لئے کہ تم ایک علیحدہ جمعیت ہو اور دوسروں سے الگ ہو - تم ایک دوسرے کے دوست ہمدرد اور باہم کفیل ہو - تمہاری دوسری امتوں کے ساتھ دوستی نہیں ہے اور نہ ان کے ساتھ دلی ربط ہے -

یہ ایک آیت ہی واضح کر دیتی ہے کہ اس امت اور دوسری امم کے باہم ربط و تعلق کے اصول کیا ہوں گے ؟ اور

دوسری اقوام کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی۔

امت مسلمہ اللہ کی پارٹی ہے اور امت کی علاوہ جو بھی امتیں ہیں وہ شیطان کی پارٹیاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ اور دوسری امتوں کے درمیان دوستی اور باہم تضامن قائم نہیں ہو سکتا اس لئے کہ امت مسلمہ اور دوسری امم کے درمیاں کوئی نظریاتی اشتراک نہیں ہے۔ نہ مقاصد کا اشتراک ہے اور نہ وسائل و مقاصد میں ان کے درمیان یگانگت ہے۔ نہ ذمہ داریوں اور نہ ان کی جزاء میں اتحاد ہے۔

امت مسلمہ کا فرض یہ ہے کہ وہ باہم متضامن اور کفیل ہوں اور اس کے افراد ایک دوسرے کے ہمدرد اور مخلص ہوں۔ وہ اللہ کی ہدایت پر چلتے رہیں اس لئے کہ اللہ ہی نے تو انہیں ایک علیحدہ امت قرار دیا ہے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو دنیا کی کوئی قوت انہیں نقصان نہ پہنچا سکے گی اگرچہ ان کے اردگرد تمام لوگ گمراہی کو اختیار کرلیں۔ لیکن یہ اصول اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک امت ہدایت پر ہو اور قائم ہو۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امت مسلمہ فریضہ دعوت دین سے ہاتھ کھینچ لے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو دین اور ہدایت کی طرف بلائے کیونکہ لوگوں کو راہ ہدایت کی طرف بلانا ہی ہمارا دین ہے۔ یہی ہمارا نظام ہے۔ جب امت اس کرۂ ارض پر کہیں اپنا نظام قائم کرلے تو پھر اس کا فرض ہے کہ وہ تمام انسانوں کو اس دین کی طرف دعوت دے۔ اور پھر انہیں ہدایت دینے کی سعی کرے۔ یہ فرض اس پر بہرحال رہتا ہے کہ وہ انہیں عدل و انصاف کی راہ پر چلائے۔ عدل کی نگرانی کرے اور انسانوں کو مزید گمراہی کے راستے پر چلنے سے بچائے۔ انہیں اس جاہلیت میں داخل ہونے کی اجازت نہ دے جس سے اللہ نے انہیں نکالا۔

یہ بات کہ امت اپنے نفس ہی کی ذمہ دار ہے اور اگر وہ ہدایت پر ہو تو دوسروں کی گمراہی سے اس کو کوئی نقصان نہ ہو گا۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کوتاہی کرے تو اس سے کوئی محاسبہ نہ ہو گا۔ اس پر یہ فرض ہے کہ پہلے امت کی صفوں کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے اور اس کے بعد پورے کرۂ ارض پر یہ فریضہ ادا کرے۔ یہاں سب سے پہلا اور اہم معروف یہ ہے کہ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کیا جائے اور اللہ کی شریعت کو قانون تسلیم کیا جائے۔ سب سے بڑا منکر جاہلیت اور اللہ کے حق حاکمیت پر دست درازی ہے۔ جاہلیت کا حکم بھی طاغوت کا حکم ہے اور طاغوت کی حکومت ہوتی ہی وہ ہے جس میں اللہ کے سوا کسی اور کی حکمرانی ہو جبکہ امت مسلمہ پہلے خود اپنے اوپر قوام ہے اور پھر پوری انسانیت پر قوام ہے۔

اس آیت کا مفہوم و مراد وہ نہیں ہے جس طرح بعض قدیم مفسرین نے سمجھا ہے اور جس طرح بعض جدید لوگ سمجھتے ہیں یعنی یہ کہ ایک فرد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مکلف نہیں ہے بشرطیکہ وہ خود درست طرز عمل اختیار کئے ہوئے ہو۔ نہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ امت مسلمہ بھی اس کرۂ ارض پر اللہ کی شریعت کے قیام کی مکلف نہیں ہے' بشرطیکہ وہ بذات خود راہ راست پر ہو اگرچہ اس کے اردگرد لوگ گمراہ ہوں۔

یہ آیت نہ ایک مومن کو اور نہ پوری امت کو دنیا میں پائے جانے والی برائی کے مقابلے سے بری الذمہ قرار دیتی ہے۔ ضلالت اور نافرمانی کا مقابلہ فرض ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ کوئی اللہ کے حق حاکمیت پر دست درازی کرے اور اللہ کا حق قانون سازی غصب کرے۔ یہ ایک ایسا منکر ہے جس سے نہ کسی فرد کو فائدہ

ہوتا ہے اور نہ امت کو اور جب تک یہ منکر قائم رہے کوئی امت فلاح نہیں پا سکتی۔

اصحاب سنن نے یہ روایت کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک بار تقریر فرمائی اور کہا: "لوگو! تم یہ آیت پڑھتے ہو (یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵:۱۰۵)) اس آیت کا اطلاق تم ایسی صورت حال پر کرتے ہو جو اس کی مراد نہیں ہے میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ لوگ جب برائی کو دیکھیں اور اسے روکنے کی کوشش نہ کریں تو ممکن ہے کہ اللہ سب کو عذاب میں مبتلا کر دے۔"

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نہایت ہی وقت پر اس غلط فہمی کا ازالہ فرمایا۔ یہ غلط فہمی ان کے دور میں بعض لوگوں کے ذہن میں پیدا ہو گئی تھی۔ آج ہم تو اس نصیحت کے بہت ہی محتاج ہیں کیونکہ آج منکر کو دور کرنے کے فرائض بہت ہی مشکل ہو گئے ہیں اس لئے ہم جیسے ضعیف لوگ اس آیت کے اس مفہوم کی طرف بہت جلد مائل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح وہ جہاد کی مشقت اور مشکلات سے نجات پا لیں گے اور ان کو جہاد فی سبیل اللہ کی مشکلات کو برداشت نہ کرنا پڑے گا۔

ہرگز یہ مفہوم مراد نہیں ہو سکتا' اس لئے کہ یہ فریضہ صرف جدوجہد اور جہاد ہی کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے۔ یہ جہد مسلسل کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے اس لئے اس دین کے لئے کچھ ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو عوام کو اس دین کی طرف دعوت دیں۔ لوگوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کریں اور دنیا میں اللہ کی حاکمیت کو قائم کریں۔ اللہ کا حق حاکمیت جن لوگوں نے چھین لیا ہے' ان سے وہ حق چھین لیں۔ لوگوں کی زندگیوں پر اللہ کی شریعت نافذ کریں اور انہیں شریعت پر استوار کریں۔ اس مقصد کے لئے جدوجہد لازمی ہے تاکہ گمراہ افراد تک نیکی اور روشنی پہنچانے کی جدوجہد کی جائے۔ اگر کوئی قوت لوگوں کو راہ ہدایت پر آنے سے روک رہی ہو تو اس کا مقابلہ قوت سے کیا جائے۔ اس قوت کے اثرات کو ختم کیا جائے جو دین اسلام کو معطل رکھتی ہے اور اسلامی نظام اور اسلامی شریعت کے قیام کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہے۔

اسلام کی راہ میں آڑے آنے والی اس رکاوٹ کو دور کرنے کے بعد اہل ایمان کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے اور تب ہی گمراہ اپنی سزا خود بھگتیں گے جب وہ اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے۔

(اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵:۱۰۵)) "اگر تم خود راہ راست پر ہو' اللہ کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے' پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔"

اب ان احکام شرعیہ میں سے آخری حکم بیان کیا جاتا ہے' جو اس سورہ میں ذکر ہیں اور اس حکم کا تعلق اسلامی معاشرے کے بعض اجتماعی امور سے ہے۔ یہ حکم اس بارے میں ہے کہ اگر کوئی سفر میں وصیت کر رہا ہوں تو اس پر دو منصف اور عادل قسم کے گواہ ٹھہرائے' ایسے حالات میں کہ جب وہ اپنے معاشرے اور خاندان سے دور ہو۔ یہ گواہی اس لئے قائم کی جاتی ہے تاکہ حق حقدار تک پہنچ سکے۔

---ooo---

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ
حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ
ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ
الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّ لَوْ كَانَ
ذَا قُرْبٰى ۙ وَ لَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاِنْ عُثِرَ
عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ
عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَ مَا
اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى
وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اسْمَعُوْا ؕ
وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ ۱۴ ع ۸ ۴

---

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور وہ وصیت کر رہا ہو تو اس کے لئے شہادت کا نصاب یہ ہے کہ تمہاری جماعت میں سے دو صاحب عدل آدمی گواہ بنائے جائیں' یا اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور وہاں موت کی مصیبت پیش آجائے تو غیر لوگوں ہی میں سے دو گواہ لے لیے جائیں۔ پھر اگر کوئی شک پڑ جائے تو نماز کے بعد دونوں گواہوں کو (مسجد میں) روک لیا جائے اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ ”ہم کسی ذاتی فائدے کے عوض شہادت بیچنے والے نہیں ہیں' اور خواہ کوئی ہمارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو (ہم اس کی رعایت کرنے والے نہیں) اور نہ خدا واسطے کی گواہی کو ہم چھپانے والے ہیں' اگر ہم نے ایسا کیا تو گناہ گاروں میں شمار ہوں گے۔“ لیکن اگر پتہ چل جائے کہ ان دونوں نے اپنے آپ کو گناہ میں مبتلا کیا ہے۔ تو پھر ان کی جگہ دو اور شخص جو ان کی بہ نسبت شہادت دینے کے لئے اہل تر ہوں ان لوگوں میں سے کھڑے ہوں جن کی حق تلفی ہوئی ہو' اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ ”ہماری شہادت ان

کی شہادت سے زیادہ برحق ہے اور ہم نے اپنی گواہی میں کوئی زیادتی نہیں کی ہے' اگر ہم ایسا کریں تو ظالموں میں سے ہوں گے ۔" اس طریقے سے زیادہ توقع کی جاسکتی ہے کہ لوگ ٹھیک ٹھیک شہادت دیں گے' یاکم ازکم اس بات ہی کا خوف کریں گے کہ ان کی قسموں کے بعد دوسری قسموں سے کہیں ان کی تردید نہ ہو جائے ۔ اللہ سے ڈرو اور سنو' اللہ نافرمانی کرنے والوں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے ۔"

ان تین آیات میں جو حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص یہ محسوس کرے کہ اس کی موت قریب ہے اور وہ اپنے اہل و عیال کے نام وصیت لکھنا چاہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ دو عادل گواہ اہل اسلام میں سے بلائے ۔ اگر وہ مقیم ہو اور ان کو وہ وصیت دے دے جو وہ اس کے ورثاء کے سامنے رکھیں گے اور اگر یہ سفر میں ہو اسے مسلمان گواہ نہ مل رہے ہوں تو پھر یہ بات جائز ہے کہ وہ غیر مسلم دو افراد کو شاہد مقرر کرے ۔

اگر اہل اسلام یا اہل میت ان دو افراد کی شہادت بابت وصیت میں شک کریں کہ انہوں نے وصیت کے بارے میں جو شہادت دی ہے وہ درست نہیں ہے' اور وہ جس چیز پر مامور کئے گئے تھے وہ ٹھیک طور پر ادا نہیں کر رہے تو ان گواہوں کو نماز کی ادائیگی کے بعد یا ان کے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کے بعد یہ حلف دیا جائے گا کہ وہ یہ شہادت اپنی یا کسی اور کے کسی مفاد کے لئے نہیں دے رہے اگرچہ کوئی رشتہ دار ہو اور یہ کہ انہوں نے کوئی امر مخفی نہیں رکھا ہے اور اگر وہ ایسا کریں گے تو یقیناً گناہگار ہوں گے ۔ اس قسم کے حلف کے بعد ان کی شہادت ثابت اور نافذ تصور ہوگی ۔

اب اس حلف کے بعد اگر یہ ثابت ہو جائے کہ انہوں نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور جھوٹی شہادت دی ہے اور امانت میں خیانت کی ہے تو وارثان میں سے دو افراد یہ حلف اٹھائیں گے کہ ان کی شہادت پہلے دو گواہوں کی شہادت سے زیادہ سچی ہے اور یہ کہ وہ یہ حلف اٹھاکر زیادتی نہیں کر رہے ہیں ۔ اس ثبوت اور حلف کے بعد پہلے دو گواہوں کی شہادت ختم تصور ہوگی اور ان دوسرے گواہوں کی شہادت نافذ ہوگی ۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان انتظامات کے ذریعے کسی امر کی اچھی طرح چھان بین ہو سکے گی اور لوگ شہادت دے سکیں گے اور نیز لوگوں کو یہ خوف نہ رہے گا کہ ان کی شہادت کے خلاف اور شہادت قائم ہوگی ۔

(ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ اَوْيَخَافُوْا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ (۵:۱۰۸)) "اس طریقے سے زیادہ توقع کی جاسکتی ہے کہ لوگ ٹھیک ٹھیک شہادت دیں گے' یاکم ازکم اس بات ہی کا خوف کریں گے کہ ان کی قسموں کے بعد دوسری قسموں سے کہیں ان کی تردید نہ ہو جائے ۔"

آخر میں تمام لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ خدا ترسی کا رویہ اختیار کریں اور اس بات کا احساس کریں کہ اللہ دیکھ رہا ہے ۔ اس سے ڈریں اور اس کے احکام کی اطاعت کریں ۔ اس لئے کہ اللہ ان لوگوں کو راہ راست نہیں دکھاتا جو اس کے نافرمان ہیں اور نہ ان کی راہنمائی بھلائی کی طرف کرتا ہے ۔

(وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۵:۱۰۸)) "اللہ سے ڈرو اور سنو' اللہ نافرمانی کرنے والوں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے ۔"

ان تین آیتوں کی شان نزول کے بارے میں امام قرطبی فرماتے ہیں :"اس بارے میں کوئی اختلاف میرے علم کی حد تک نہیں ہے کہ یہ آیات تمیم داری اور عدی ابن بداء کے بارے میں نازل ہوئیں۔ بخاری اور دارقطنی نے حضرت ابن عباس ؓ سے روایت کی ہے کہ تمیم داری اور عدی ابن بداء مکہ کو آتے جاتے تھے۔ان کے ساتھ ایک نوجوان جو بنی سہم قبیلے کا تھا' سفر پر نکلا۔ وہ ایسی سرزمین میں فوت ہوا جہاں کوئی مسلمان نہ تھا۔ اس نے ان دونوں کو وصیت کی اورانہوں نے اس کا ترکہ اس نوجوان کے وارثوں تک پہنچایا۔انہوں نے ایک چاندی کا جام روک لیا جسے سونے سے مزین کیا گیا تھا۔ان دونوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم دی کہ نہ تو انہوں نے اسے چھپایا ہے اور نہ ان کو اس کے بارے میں کوئی علم ہے۔اس کے بعد یہ جام مکہ میں پایا گیا تو جن لوگوں سے ملا انہوں نے کہا کہ ہم نے تمیم اور عدی سے خریدا ہے۔اب سہمی متوفی نوجوان کے وارث آئے۔انہوں نے یہ حلف اٹھایا کہ یہی جام سہمی کی ملکیت تھا۔ اور یہ کہ ہماری شہادت ان کی شہادت سے زیادہ معتبر ہے اور یہ کہ ہم کوئی زیادتی نہیں کر رہے۔اس کے بعد سہمیوں کو جام دے دیا گیا۔یہ آیات اسی بارے میں نازل ہوئیں۔ (الفاظ دارقطنی کے ہیں)۔

یہ بات ظاہر ہے کہ یہ آیات جس معاشرے کی اصلاح کے لئے نازل ہوئیں' اس معاشرے کے حالات کی چھاپ ان تدابیر کے اندر موجود ہے اوران انتظامات کی نوعیت بھی ایسی ہو سکتی ہے۔اس خاص انداز شہادت اور خاص طریقہ ثبوت پر لازماً اس وقت کے معاشرتی حالات اثرانداز ہوئے ہیں۔ خصوصاً نماز کے بعد حلف دینا۔کیونکہ نماز کے بعد انسان کا دینی شعور اور وجدان تازہ ہوتا ہے۔ انسان اس بات سے بھی ڈرتا ہے کہ وہ بعد نماز مجمع عام میں حلف لے رہا ہے اور اگر یہ بات جھوٹی نکل جائے تو اسے بہت ہی بڑی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ سب باتیں بتاتی ہیں کہ ان انتظامات کے اندر عربوں کے معاشرتی حالات کی جھلک موجود ہے اور اس وقت ایسے ہی اقدامات کی ضرورت تھی۔

آج کل کے جدید معاشروں میں اثبات کے جدید وسائل بھی موجود ہیں اور انتظامات ثبوت کی نئی شکلیں بھی موجود ہیں مثلاً کتابت' رجسٹری' امانت اور لاکرز۔ سوال یہ ہے کہ آیا آج کے جدید معاشروں میں یہ انتظامات قابل عمل نہیں رہے؟

ہم بعض اوقات کسی متعین معاشرے کو ذہن میں رکھ کر بات کرتے ہیں اور یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ فلاں فلاں انتظامات اب اس دور جدید میں قابل عمل نہیں رہے ہیں۔ اب ان کی ضرورت نہیں ہے اور یہ ان معاشروں کے بقیہ آثار ہیں جن کا دور گزر گیا ہے'کیونکہ دور جدید کے وسائل بہت ہی ترقی کر گئے ہیں۔

اکثر لوگوں کو ایسا دھوکہ ہوتا ہے اور یہ اس لئے ہوتا ہے کہ ہم اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ یہ دین تمام انسانیت کے لئے آیا ہے۔ ہر دور کے لئے آیا ہے اور آج کے اس جدید دور میں بھی انسانیت کی ایک بڑی تعداد اور آبادی بالکل ابتدائی اور پسماندہ حالت میں ہے۔ وہ پسماندگی میں کانوں تک ڈوبی ہوئی ہے۔ انسانیت کے اس بڑے حصے کو ایسے انتظامات کی ضرورت ہے جن پر اس کی اس پسماندہ حالت کے اندر ہی عمل کیا جا سکے۔ دین اسلام کے اندر ایسے انتظامات بھی موجود ہیں جو ایسی پسماندہ سوسائٹیوں کے اندر بھی چل سکتے ہیں۔ اور جوں جوں یہ سوسائٹیاں ترقی کرتی جاتی ہیں' اسلام ان کی ترقی یافتہ ضروریات پوری کرتا جاتا ہے۔ اسلامی شریعت کے اندر امانت اور ثبوت کے لئے ضوابط

موجود ہیں اور اسلامی شریعت پھر ان کو مزید ترقی کی راہ پر گامزن کرتی ہے ۔ یہ اسلامی نظام حیات اور اسلامی شریعت کا ایک معجزانہ کمال ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ شریعت من جانب اللہ ہے اور اسے اللہ جل شانہ' نے انسانیت کے لئے نازل فرمایا ہے ۔

نیز ہم اس بات کے سمجھنے میں بھی دھوکہ کھاتے ہیں کہ ہر ترقی پذیر معاشرے کی ضروریات اسلامی نظام میں پوری ہوتی ہیں ۔ اسلامی نظام حیات ہر معاشرے کے لئے اس کے حسب حالات انتظامات کرتا ہے جس میں جامعیت بھی ہوتی ہے اور لوگوں کے لئے یسر اور سہولت بھی ہوتی ہے ۔ اس طرح یہ دین ہر معاشرے کے حالات کے مطابق وسائل اور طریقے اختیار کرتا ہے ۔ پسماندگی میں بھی اور ترقی یافتہ صحراء اور جنگل میں بھی ' اس لئے کہ یہ دین تمام انسانوں کا دین ہے ۔ یہ ہر علاقے اور ہر زمانے کا دین ہے اور یہ بات بھی اس دین کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے ۔

اور ہماری سب سے بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ ہم انسان یہ سمجھتے ہیں کہ ہم رب الناس کے مقابلے میں بھی لوگوں کے مفادات کو زیادہ سمجھتے ہیں اور جب ہم عملی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں تو ہمیں سخت شرمندگی ہوتی ہے ۔ لیکن واقعات و حوادث سے دوچار ہونے سے پہلے ہی ہمارے لئے یہ سمجھنا اچھا نہیں ہے ۔ ہمیں چاہیے کہ ہم انسانوں کے خالق کا احترام کریں اور بارگاہ اللہ میں ایک بندے اور ایک غلام کی طرح بات کریں ۔ کاش کہ ہم نصیحت حاصل کریں ۔ کاش کہ ہم اپنی کوتاہ دامنی کا اعتراف کریں ۔

---ooo---

# درس نمبر ۵۴ ایک نظر میں

یہ سبق اگرچہ نسبتاً طویل ہے لیکن اس کا تعلق بھی نظریاتی اصلاح کے مضمون کے ساتھ ہے۔ نصاریٰ کے عقائد میں جو انحرافات پیدا ہو گئے تھے ان کی اصلاح مقصود ہے۔ یہ انحرافات اس قدر دور رس تھے کہ ان کی وجہ سے نصاریٰ اپنے بنیادی نظریات میں سماوی دین کے اصولوں سے منحرف ہو گئے تھے۔ اور وہ اس عقیدۂ توحید ہی سے نکل گئے تھے جس کی تعلیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اور ان سے پہلے آنے والے رسولوں نے دی تھی۔ انہوں نے شرک کے وہ رنگ ڈھنگ اختیار کر لئے تھے جن کا کوئی تعلق دین اسلام سے نہ تھا۔

چنانچہ اس سبق کا مقصد بھی یہی ہے کہ لوگوں کے دین میں اللہ کی الوہیت اور بندوں کی عبودیت کا صحیح مفہوم بٹھایا جائے۔ یہ اصلاح اس طرح کی جاتی ہے کہ ایک عظیم جلسے میں جس میں حضرت عیسیٰ، تمام رسول اور تمام انسان موجود ہیں، اس میں خود حضرت عیسیٰ اعلان کرتے ہیں کہ میں نے ہرگز یہ تعلیم نہ دی تھی کہ لوگ مجھے، میری والدہ اور دوسرے لوگوں کو الٰہ تسلیم کریں اور یہ کہ عیسائیوں کے مزعومات میں سے کسی بات کی تعلیم انہوں نے نہیں دی ہے۔

قرآن کریم اس منظر کی خوب تصویر کشی کرتا ہے، اور یہ منظر، ان مناظر قیامت میں سے ایک ہے جسے قرآن کریم زندہ و تابندہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ نہایت ہی موثر، چلتا پھرتا منظر ہے، دلوں کی گہرائیوں تک اتر جانے والا، جس کے اثرات کا عالم یہ ہے کہ انسان کا وجود کانپ اٹھتا ہے۔ انسان اس طرح محسوس کرتا ہے کہ گویا نظروں کے سامنے ہے، سب کچھ دیکھا جا رہا ہے، سنا جا رہا ہے اور اس کے اندر تاثرات کی کیفیت بالکل متحرک ہے۔ ذرا قرآن کے الفاظ میں غور کیجئے۔

(یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَاعِلْمَ لَنَا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (۵:۱۰۹)) ”جس روز اللہ سب رسولوں کو جمع کر کے پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب دیا گیا تو وہ عرض کریں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں، آپ ہی تمام پوشیدہ حقیقتوں کو جانتے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ ان تمام رسولوں کو جمع کرے گا جو مختلف زمانوں میں مبعوث ہوئے تھے۔ یکے بعد دیگرے آئے تھے، یا ایک ہی دور میں تھے مگر ان کا دائرہ کار علیحدہ تھا۔ ہر ایک اپنے زون میں کام کر رہا تھا۔ یا ہر شخص کسی قوم کے لئے مبعوث ہوا تھا اور اپنی قوم ہی میں کام کر رہا تھا۔ ان سب کی دعوت ایک ہی تھی، اگرچہ زمان، مکان اور اقوام علیحدہ تھیں۔ یہاں تک کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم آ گئے۔ انہوں نے تمام جہانوں کے لئے مکمل آخری دعوت دے دی جو ہر مکان، ہر زمان اور ہر قوم اور ملت کے لئے ہے، ہر رنگ و نسل کے لئے ہے۔

یہ سب رسول، جو مختلف اقوام و ملل میں مبعوث ہوئے، مختلف زمانوں میں آئے، اب ان کا بھیجنے والا انہیں ایک ہی جگہ

جمع کر کے ان تمام سے ایک ہی سوال کر رہا ہے۔یہ سب لوگ دنیا میں انسانیت کے نمائندے ہیں اور ہر ایک کو ایک زون کی رسالت دی گئی ہے۔ مختلف ادوار اور مقامات کے لئے۔اب یہ نمائندے سب کے سب رب البشریت کے سامنے حاضر ہیں اور ایک عظیم اجتماع کا عظیم منظر ہے۔اور یہ منظر زندگی کے ساتھ ہر سو حرکت کرتا نظر آتا ہے۔

(یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ (۵: ۱۰۹)) ”جس روز اللہ سب رسولوں کو جمع کر کے پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب دیا گیا۔“ سوال یہ تھا ماذا اجبتم (تمہیں کیا جواب دیا گیا) یہ رسول انسان اور بشر تھے۔ ان کا علم حضوری تھا۔ اور وہ پوشیدہ چیزوں کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے۔انہوں نے اپنی اقوام کو راہ ہدایت کی طرف بلایا۔ان میں سے جس نے دعوت کو قبول کیا' کر لیا۔جس نے منہ پھیرا' پھیر لیا۔اگرچہ رسول منکرین کے جواب کے بارے میں جانتے تھے کہ انہوں نے انکار کیا ہے لیکن ماننے والوں کی حقیقت سے باخبر نہ تھے کہ انہوں نے دل سے مانا ہے یا نہیں۔وہ تو صرف ظاہری بات پہ حکم لگا سکتے ہیں۔رہی پوشیدہ بات تو اس کا علم انہیں نہیں ہے اور اب وہ جناب باری میں حاضر ہیں اور وہ سب جاننے والوں سے زیادہ جاننے والا ہے اور وہ اللہ سے اس قدر ڈرتے ہیں جس قدر کوئی کسی سے ڈر سکتا ہے۔ نیز یہ رسل باری تعالیٰ کی معرفت میں بھی بہت ہی اونچا مقام رکھتے ہیں اور وہ اس بات سے حیا کرتے ہیں کہ باری تعالیٰ کے حضور کھڑے ہو کر اپنے علم کا اظہار کریں جو علیم و خبیر ہے۔

یہ ایک عظیم اجتماع میں ایک عظیم مسئولیت کا دن ہے۔عالم بالا کے دربار میں' سب لوگوں کے سامنے کھلے دربار میں اور یہ ایک ایسی جواب طلبی ہے جس کا مقصد یہ بھی ہے کہ سب کے سامنے جواب طلب کیا جائے اور ان لوگوں کے سامنے یہ سوال و جواب ہو جو دنیا میں رسولوں کی تکذیب کرتے تھے تاکہ علی الاعلان یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ رسول از خود نہ آئے تھے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اللہ کا دین لے کر آئے تھے۔یہ دکھانا بھی مطلوب تھا کہ یہ کام وہ ذمہ داری سے کرتے رہے تھے محض شوق کے طور پر نہ کرتے تھے۔اب دیکھئے وہ اپنی مسئولیت کے مطابق جواب دے رہے ہیں۔اپنی ڈیوٹی' فریضہ رسالت' اپنی قوم کی بابت جواب دے رہے تھے جنہوں نے ان کی تکذیب کی تھی۔

رہے رسول تو وہ اعلان کر رہے ہیں کہ سچا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔اس لئے ان کے پاس جو تھوڑی سی معلومات ہیں ان کا اظہار وہ علام الغیوب خدا کے سامنے نہیں کرنا چاہتے یہ عدم واقفیت کا اظہار وہ محض ادب اور حیاء کی وجہ سے کر رہے ہیں اور اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

(قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (۵: ۱۰۹)) ”تو وہ عرض کریں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں' آپ ہی تمام پوشیدہ حقیقتوں کو جانتے ہیں۔“

---ooo---

رہے تمام دوسرے رسول' جن کو بعض لوگوں نے مانا اور بعض نے ان کی تکذیب کی' ان کی جانب سے سوال کا اصولی جواب ہی قبول کر لیا گیا۔انہوں نے کہہ دیا کہ صحیح علم تو اللہ کے پاس ہے جو علام الغیوب ہے۔انہوں نے اپنا اور اپنی قوم کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا۔اس منظر میں ان رسولوں سے مزید کوئی سوال نہیں پوچھا جاتا۔مزید ضمنی سوال صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہوتا ہے۔ان سے یہ مزید سوال اس لئے کیا جاتا ہے کہ ان کے بارے میں' ان کے

بعد ان کی قوم سخت فتنے میں پڑگئی ۔ ان کے بارے میں فضا کے اندر پیچیدگی پیدا ہوئی اور ان کی ذات کے بارے میں لوگ اوہام اور خرافات کا شکار ہو گئے ۔ ان کی ذات ' ان کی صفات ' ان کی ولادت اور ان کی پرورش کے بارے میں ان کی قوم نے عجیب و غریب نظریات گھڑ لیے ۔

اب ان سے ان لوگوں کے سامنے پوچھا جاتا ہے ' جو انہیں الٰہ سمجھتے تھے ۔ ان کی عبادت کرتے تھے اور ان کی ذات اور ان کی والدہ کے ارد گرد انہوں نے غلط افکار کے ہالے قائم کیے تھے ۔ ان کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ دیکھو تم پر اور تمہاری والدہ پر میں نے کس قدر انعامات اور اکرامات کیے ۔ یہ کہ تمہیں بہت سے معجزات عطا کیے کہ لوگ تم پر ایمان لے آئیں ۔ بعض لوگوں نے ان کی سخت تکذیب کی ۔ بعض لوگ ان آیات و معجزات کو دیکھ کر سخت فتنے میں پڑ گئے اور انہیں الٰہ بنا دیا ۔ حالانکہ یہ آیات و معجزات تو اللہ کے عطا کردہ تھے اور جن باتوں کا ظہور ان کے ہاتھوں ہوا تھا وہ اللہ کی تائید و نصرت سے ہوا تھا ۔

---○○○---

# درس نمبر ۵۴ تشریح آیات

## ۱۰۹ ـــــ تا ـــــ ۱۲۰

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۫ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

جس روز اللہ سب رسولوں کو جمع کر کے پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب دیا گیا' تو وہ عرض کریں گے کہ ہمیں علم نہیں' آپ ہی پوشیدہ حقیقتوں کو جانتے ہیں۔

"پھر تصور کرو اس موقع کا جب اللہ فرمائے گا کہ "اے مریم کے بیٹے عیسیٰ' یاد کر میری اس نعمت کو جو میں نے تجھے اور تیری ماں کو عطا کی تھی۔ میں نے روح پاک سے تیری مدد کی' تو گہوارے میں بھی لوگوں سے بات کرتا تھا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی' میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دی' تو میرے حکم سے مٹی کا پتلا پرندے کی شکل کا بناتا اور اس میں پھونکتا تھا اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا۔ تو مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا

کرتا تھا' تو مردوں کو میرے حکم سے نکالتا تھا۔ پھر جب تو بنی اسرائیل کے پاس صریح نشانیاں لے کر پہنچا اور جو لوگ ان میں سے منکر حق تھے انہوں نے کہا کہ یہ نشانیاں جادوگری کے سوا اور کچھ نہیں ہیں تو میں نے ہی تجھے ان سے بچایا اور جب میں نے حواریوں کو اشارہ کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تب انہوں نے کہا "ہم ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں۔"

یہ حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ پر ہونے والی انعامات کی یاد دہانی ہے۔ یہ کہ روح القدس کے ذریعہ ان کی امداد کی گئی۔ یہ کہ گہوارے کے اندر انہیں لوگوں کے ساتھ بات کرنے کی قدرت دی گئی اور اس طرح انہوں نے اپنی ماں کو تہتوں سے بری الذمہ قرار دیا۔ کیونکہ ان کی بے مثال ولادت کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں بے شمار شبہات پیدا ہو گئے تھے اور پھر بڑے ہو کر بھی ان سے ہمکلام ہوئے اور انہیں دعوت الی اللہ دی۔ دعوت اسلامی میں بھی حضرت جبرائیل ان کی تائید کرتے رہے اور آپ کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے رہے۔ جب وہ اس جہان پر اترے تھے تو ان کے پاس کوئی علم نہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں لکھنا سکھایا' انہیں معاملات کے اندر فیصلے کرنے کی حکمت عطا کی۔ اللہ نے انہیں تورات کا علم بھی عطا کیا' جو بنی اسرائیل کے پاس موجود تھی۔ انجیل کا علم بھی دیا جو ان پر نازل ہوئی اور اس نے بھی تورات کی تصدیق کی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انکو ایسے خارق العادات معجزات دیئے جن کا صدور اذن الٰہی کے سوا ممکن نہ تھا۔ دیکھئے کہ وہ کیچڑ سے پرندہ بناتے ہیں اور پھر یہ اذن الٰہی سے ہوتا ہے کہ آپ اس کے منہ میں پھونکتے ہیں اور وہ زندہ ہو جاتا ہے۔ ہمیں ان معجزات کی ماہیت کا پتہ نہیں ہے' اس لئے کہ ہم تو آج تک یہ نہیں جان سکے کہ حیات کی حقیقت کیا ہے؟ اور یہ حیات زندہ چیزوں کے اندر کس طرح پھیل جاتی ہے۔ اب دیکھئے مادر زاد اندھا آتا ہے اور اللہ کے حکم سے اسے بینائی ملتی ہے جبکہ آج تک اطباء اس بات کو پا نہیں سکے کہ مادر زاد اندھے کو بینائی کس طرح مل گئی۔ لیکن اللہ جس نے بینائی کا اصل نظام پیدا کیا وہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ کسی کو از سر نو بینائی دے دے۔ مرض کا علاج آپ بغیر کسی دوائی کے کرتے تھے۔ دوا تو ایک وسیلہ ہے جس کا اثر بھی اللہ کے اذن سے ہوتا ہے لیکن اللہ کے حکم سے وسیلہ بدل بھی سکتا ہے' اور اللہ بلا وسیلہ براہ راست بھی ایک حقیقت کو وجود میں لا سکتا ہے۔ اللہ اپنے حکم سے مردے کو زندہ کر سکتا ہے' وہ زندگی بخشنے والا ہے۔ وہ دوبارہ بھی زندہ کر سکتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو یہ یاد دہانی کراتے ہیں کہ وہ دلائل و بینات اور خوارق و معجزات لے کر بنی اسرائیل کے پاس آئے اور انہوں نے پھر بھی آپ کو جھٹلایا اور انہوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ یہ معجزات واضح سحر ہے۔ اس لئے کہ وہ ان معجزات کے وقوع کا انکار تو کر نہ سکتے تھے۔ ہزاروں انسانوں نے ان معجزات کو دیکھا ہوا تھا۔ یہ لوگ محض عناد اور غرور کی وجہ سے ان معجزات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ پھر انہوں نے آپ کو قتل کرنا چاہا تو اللہ نے آپ کو بچایا۔ پھر اللہ تعالیٰ انہیں یاد دلاتے ہیں کہ ایسے مشکل حالات میں حواریوں نے جرأت کی اور وہ ایمان لائے اور شہادت دی اور صحیح مسلمان بن گئے اور اللہ کو گواہ ٹھہرایا کہ وہ سر تسلیم خم کرنے والے ہیں۔

(وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ قَالُوْا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ (۵: ۱۱۱)) "اور جب میں نے حواریوں کو اشارہ کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تب

انہوں نے کہا "ہم ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں۔" یہ ہیں وہ انعامات جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ ابن مریم پر کیے اور یہ ان کے لئے شواہد و بینات تھے لیکن ان کے متبعین کی اکثریت کے لئے یہ گمراہی اور ضلالت کا باعث بن گئے۔ اور ان کی وجہ سے انہوں نے عظیم گمراہیاں گھڑ لیں اور دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے عالم بالا کے اس منظر میں اس کی جواب طلبی کرتے ہیں' اس منظر میں انبیاء و رسل موجود ہیں اور تمام دنیا کے لوگ بھی حاضر ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی تمام قوم بھی موجود ہے۔ ان کے سامنے یہ حقائق پیش کیے جاتے ہیں تاکہ ان کی قوم بھی سنے اور ان کے لئے شرمساری ذرا اور سخت ہو جائے۔ وہ تمام جہانوں کے سامنے شرمندہ ہوں۔

اب بات اسی لائن پر آگے چلتی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کے اوپر کئے جانے والے احسانات کے ساتھ۔ وہ احسانات بھی گنوائے جاتے ہیں جو آپ کی قوم پر کیے گئے۔ انہیں بھی معجزات دکھائے گئے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا اور حواری ایمان لائے اور انہوں نے شہادت دی۔

---

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ
يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ أَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ۖ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ
إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا نُرِيْدُ أَنْ نَّأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ
الربع أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ
اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّأَوَّلِنَا
وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالَ اللّٰهُ إِنِّيْ
مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّيْ أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَّآ أُعَذِّبُهُ أَحَدًا
۱۵ ع ۷ ۵ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

(حواریوں کے سلسلے میں) یہ واقعہ بھی یاد رہے کہ جب حواریوں نے کہا "اے عیسیٰ ابن مریم' کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتار سکتا ہے؟" تو حضرت عیسیٰ نے کہا اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ انہوں نے کہا "ہم بس یہ چاہتے ہیں کہ ہم اس خوان سے کھانا کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپ نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ سچ ہے اور ہم اس پر گواہ ہوں۔" اس پر عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی "خدایا! ہمارے رب' ہم پر

آسمان سے ایک خوان نازل کر' جو ہمارے لئے اور ہمارے اگلوں پچھلوں کے لئے خوشی کا موقع قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو' ہم کو رزق دے اور تو بہترین رازق ہے۔" اللہ نے جواب دیا "میں اس کو تم پر نازل کرنے والا ہوں مگر اس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے گا اسے میں ایسی سزا دوں گا جو میں نے کسی کو نہ دی ہوگی۔"

اس گفتگو سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کا مزاج کیسا تھا اور ان میں سے مخلص لوگ کس مزاج کے تھے یعنی آپ کے حواری۔ ان حواریوں اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے درمیان بہت بڑا فرق تھا۔ ان حواریوں کے دلوں میں اللہ نے بطور الہام ایمان کا القاء کر دیا تھا۔ وہ ایمان لائے اور انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے ایمان پر گواہ ٹھہرایا۔ ان حقائق کے ساتھ ساتھ اب دیکھئے کہ اس الہام اور معجزات کے دیکھتے ہوئے وہ پھر ایک نئے معجزے کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ ان کے دل مطمئن ہو جائیں اور وہ جان لیں کہ حضرت عیسیٰ سچے ہیں اور اب وہ عیسیٰ کے بعد اس دعوت کو پھیلائیں گے۔

اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ ہے کہ اسلام لانے کے بعد وہ آپ سے کوئی ایک معجزہ بھی طلب نہیں کرتے۔ جونہی ان کے دلوں میں ایمان داخل ہوا وہ مطمئن ہو گئے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی اور اس تصدیق پر انہوں نے کسی برہان و دلیل کا مطالبہ نہیں کیا۔ انہوں نے حقانیت رسول کی شہادت صرف قرآن کو پڑھ کر دے دی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حواریوں کے درمیان یہ ایک عظیم فرق ہے۔ وہ ایک سطح پر ہیں اور یہ دوسری سطح پر ہیں۔ لیکن یہ بھی مسلمان ہیں اور وہ بھی مسلمان ہیں۔ یہ بھی اللہ کے ہاں برگزیدہ ہیں اور وہ بھی برگزیدہ ہیں لیکن جس طرح اللہ نے چاہا دونوں کی سطح میں بہت ہی فرق رکھا بہت بڑا فرق۔

"کھانے کے اس خوان کا ذکر قرآن میں ہوا ہے لیکن نصاریٰ کے لٹریچر میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ نہ ان اناجیل میں اس کا ذکر ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد لکھی گئیں اگرچہ بہت بعد میں لکھی گئیں۔ اس قدر طویل عرصے میں نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے اندر واقعات کی صحیح رپورٹنگ کی گئی ہوگی۔ نیز ان اناجیل کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض علماء نے ان روایات کو نقل کیا ہے اور ان میں انہوں نے حضرت عیسیٰ کی سیرت کے واقعات نقل کئے ہیں۔ اس لئے یہ روایات اس کلام پر مشتمل نہیں جو اللہ نے اتارا تھا اور اس کا نام انجیل رکھا تھا۔

البتہ ان اناجیل میں اس خوان کے قصے کو دوسرے انداز میں نقل کیا ہے "متی کی انجیل کے اصحاح ۱۵ کے آخر میں آتا ہے۔ یسوع نے اپنے شاگردوں کو بلایا اور کہا مجھے سب کے بارے میں اندیشہ ہے کیونکہ ان کے لئے صرف تین دن ہیں جو میرے ساتھ چلیں گے اور ان کے پاس خوراک بھی نہیں ہے۔ اور میں یہ بھی نہیں کر سکتا کہ انہیں روزے کی حالت میں واپس کروں کیونکہ راستے میں ان کے لئے پریشانی ہوگی۔ ان سے اس کے تلامذہ نے کہا ہماری تعداد زیادہ ہے اور ہم کہاں سے کھانا پا سکتے ہیں۔ ان سے یسوع نے کہا تمہارے پاس کس قدر روٹیاں ہیں۔ انہوں نے کہا: سات روٹیاں اور کچھ چھوٹی مچھلیاں۔ آپ نے سب سے کہا کہ وہ زمین پر سہارا لے کر بیٹھ جائیں۔ آپ نے روٹی اور مچھلیاں لیں۔ شکر ادا کیا اور انہیں توڑا۔ انہوں نے یہ روٹیاں شاگردوں کو دیں اور انہوں نے سب کو کھلائیں اور سب سیر ہو گئے اور جب روٹیاں اٹھائیں تو سات تھال بھرے ہوئے تھے اور کھانے والے چار ہزار تھے جن میں عورتوں اور بچوں کا شمار نہ

کیا گیا تھا' ایسی ہی روایات دوسری اناجیل میں بھی آئی ہیں۔

بعض تابعین کا خیال ہے کہ یہ مائدہ نہیں اترا۔ مجاہد اور حسن اس طرف گئے ہیں' کیونکہ جب حواریوں نے یہ سنا "میں اتارنے والا ہوں لیکن اس کے بعد جس نے کفران نعمت کیا تو اسے میں ایسی سزا دوں گا جیسی تمام جہان والوں میں کسی کو نہ دی گئی تھی۔" تو وہ ڈر گئے اور انہوں نے اپنا یہ مطالبہ واپس لے لیا تھا۔

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں "لیث نے بذریعہ ابن سلیم مجاہد سے یہ روایت کی ہے کہ یہ ایک مثال تھی جو اللہ نے یہاں بیان کی ورنہ کوئی طعام اترا نہیں تھا۔" ابن جریر نے حارث' قاسم' حجاج ابن جریج کے ذریعہ مجاہد سے یہ روایت کی ہے کہ یہ ایک دستر خوان تھا جس کے اوپر کھانا ہو۔ انہوں نے اس مطالبے کو واپس لے لیا تھا جب انہیں بتایا گیا کہ ان پر عذاب آ جائے گا اگر اس کھانے کے آنے کے بعد انہوں نے ناشکری کی۔ انہوں نے ابو اللیث' محمد ابن جعفر' شعبہ' منصور ابن زاذان کے واسطہ سے حسن سے یہ روایت کی ہے کہ مائدہ نازل نہیں ہوا تھا۔ بشر' یزید اور سعید کے واسطہ سے قتادہ کی یہ روایت ہے کہ حسن کہتے تھے کہ جب انہیں کہا گیا کہ اگر اس کے بعد انہوں نے کفران نعمت کیا تو انہیں ایسی سزا دی جائے جو عالمین میں سے کسی کو نہ دی گئی تھی تو انہوں نے ڈر کر کہا کہ ہمیں ایسے مائدہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر پھر یہ مائدہ نازل نہ ہوا۔

لیکن سلف صالحین میں سے اکثریت کی رائے یہ ہے کہ یہ کھانا نازل ہوا تھا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے الفاظ یہ استعمال کئے ہیں۔ (اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ (۵:۱۱۵)) (میں اسے تم پر نازل کرنے والا ہوں) یہ اللہ کی طرف سے ایک قسم کا وعدہ ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ خود قرآن کریم کے الفاظ اس رائے کی تائید کرتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ یہی درست ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حشر کے میدان میں اپنی قوم کے سامنے ایک عظیم جلسہ میں یاد دلاتے ہیں کہ میں نے تم پر یہ یہ انعامات کئے۔

(اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (۵:۱۱۲)) "یہ واقعہ بھی یاد رہے کہ جب حواریوں نے کہا "اے عیسیٰ ابن مریم' کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتار سکتا ہے۔ حواری حضرت عیسیٰ کے تلامذہ تھے' غریب لوگ تھے اور آپ کے بارے میں زیادہ جانتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آپ انسان ہیں۔ جانتے تھے کہ آپ ابن مریم ہیں اور آپ کے بارے میں جو کچھ جانتے تھے وہی کہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ حضرت عیسیٰ رب نہیں ہیں بلکہ وہ رب کے پروردہ بندہ ہیں۔ یہ کہ وہ ابن اللہ نہیں ہیں' بلکہ ابن مریم اور اللہ کے بندے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ رب وہی ہے جو حضرت عیسیٰ کے ہاتھ پر ان معجزات کا صدور کر رہا ہے۔ وہ ان معجزات میں سے کوئی بات از خود صادر نہیں کر سکتے۔ اپنی ذاتی قدرت کے ساتھ۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے ان سے یہ مطالبہ کیا کہ آپ ان پر آسمان سے خوان اتاریں تو انہوں نے یہ مطالبہ حضرت عیسیٰ سے نہ کیا۔ اس لئے کہ وہ بذات خود قدرت نہ رکھتے تھے بلکہ انہوں نے مطالبہ ان الفاظ میں کیا۔

(يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ

السَّمَآءِ (۵: ۱۱۲) "اے عیسیٰ ابن مریم کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے خوان اتار سکتا ہے۔ اب لفظ (هَلْ يَسْتَطِيعُ) ؟ میں مختلف تاویلات سامنے آتی ہیں۔ سوال یہ تھا کہ ایمان اور کلمہ شہادت کے بعد وہ یہ سوال کیسے کر سکتے ہیں جبکہ وہ اپنے اسلام پر خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شاہد ٹھہراتے ہیں۔ یستطیع کا مفہوم یہ بھی بتایا گیا ہے ھل یقدر ؟ لیکن مقصد وہ نتیجہ ہے جو اس قدرت اور استطاعت کے نتیجے میں آسکتا ہے یعنی آسمان سے خوان۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ سے یہ طلب کر رہے تھے کہ اگر وہ طلب کریں تو کیا اللہ ان کے مطالبے کو پورا کرے گا۔ ایک قرات (هَلْ تَسْتَطِيعُ رَبَّكَ) یعنی کیا آپ کو یہ سوال کرنے کا اختیار ہے کہ آپ نزول مائدہ کا سوال کریں۔ بہر حال مفہوم جو بھی ہو حضرت عیسیٰ نے جواب میں انہیں تنبیہ کی کہ وہ ایسے سوالات نہ کریں اور خدا سے ڈریں۔

(قَالَ اتَّقُوا اللهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۵: ۱۱۲) (تو عیسیٰ نے کہا اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔) لیکن حواریوں نے دوبارہ مطالبہ کیا۔ اور انہوں نے اپنے مطالبے کی غرض و غایت بھی بتا دی :

(قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ (۵: ۱۱۳) ) انہوں نے کہا "ہم بس یہ چاہتے ہیں کہ اس خوان سے کھانا کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپ نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ سچ ہے اور ہم اس پر گواہ ہوں۔"

وہ بہر حال یہ مائدہ کھانا چاہتے تھے جس کی کوئی نظیر زمین پر نہ ہو اس لئے کہ ان کے دل مطمئن ہو جائیں اور وہ اپنی آنکھوں کے سامنے یہ معجزہ ہوتے دیکھیں اور انہیں یقین ہو جائے کہ حضرت عیسیٰ نے ان سے سچ کہا۔ پھر وہ خود اپنی باقی ماندہ قوم کے لئے گواہ ہو جائیں کہ یہ عظیم معجزہ سرزد ہوا۔ یہ تمام امور اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کے حواریوں کا مقام و معیار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حواریوں سے ذرا کم تھا۔ اگر دونوں کرداروں کا باہم موازنہ کیا جائے تو صحابہ محمد کا مقام نہایت ہی ممتاز نظر آتا ہے۔

اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے سامنے دست بدعا ہوتے ہیں :

(قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۵: ۱۱۴) ) "اس پر عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی "خدایا! ہمارے رب، ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل کر جو ہمارے لئے اور ہمارے اگلوں پچھلوں کے لئے خوشی کا موقع قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو، ہم کو رزق دے اور تو بہترین رازق ہے۔"

جیسا کہ سیاق کلام میں بار بار اس بات کو دہرایا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا نہایت ہی مؤدبانہ ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ ایک مختار بندہ اپنے رب اور اپنے آقا کے ساتھ نہایت ہی رازدارانہ انداز میں بات کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام "اے اللہ" "اے ہمارے رب" کے الفاظ کے ساتھ دعا شروع کرتے ہیں۔ اے اللہ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ہمارے اوپر آسمان سے خوان نازل فرما۔ اور یہ خوان ایسا ہو کہ ہمارے لئے خوشی اور انبساط کا سبب بنے اور وہ

ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لئے سامان فرحت ہو۔ نیز یہ آپ کے خصوصی رزق سے ہو۔ اور آپ رزق دینے والوں میں سے حقیقی رازق ہیں۔ حضرت عیسیٰ جانتے ہیں کہ وہ بندے ہیں اور اللہ ہی رب العالمین ہے اور یہ اعتراف وہ ایک کھلی مجلس اور دربار میں کرتے ہیں۔ یہ کھلی مجلس دربار قیامت میں ہے اور حضرت کی قوم کے سامنے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ ابن مریم کی دعا کو قبول کر لیا۔ لیکن اس قبولیت دعا کو سنجیدگی کا عنصر بھی دے دیا جو حضرت عیسیٰ کے شایان شان تھا۔ انہوں نے ایک معجزے کا مطالبہ کیا۔ اللہ نے اسے قبولیت بخشی لیکن یہ شرط عائد کر دی کہ اگر اس کے بعد کسی نے کفران نعمت کیا تو اسے شدید عذاب کا سامنا کرنا ہو گا۔ اس قدر شدید جس کی کوئی مثال نہ ہو، اور ایسا عذاب کبھی کسی قوم پر نہ آیا ہو۔

(قَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّىْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (۵:۱۱۵)) اللہ نے جواب دیا "میں اس کو تم پر نازل کرنے والا ہوں، مگر اس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے گا اسے میں ایسی سزا دوں گا جو میں نے کسی کو نہ دی ہو گی۔" یہ سنجیدگی اللہ کی شان کے لائق ہے تاکہ معجزات کا مطالبہ ایک مذاق نہ بن جائے۔ اور یہ بھی نہ ہو کہ جن لوگوں کے سامنے بین اور معجز دلائل پیش ہوں اور پھر بھی وہ کفر کریں تو انہیں عذاب الہی کا سامنا کرنے کا خوف تو ہو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ جن اقوام نے معجزات طلب کئے ہیں اور پھر انہوں نے سچائی کو تسلیم نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ضرور ہلاک کیا ہے۔ رہی آیت زیر بحث تو ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد دنیا کا عذاب ہو اور اگر یہاں نہ ہو تو آخرت کا عذاب ہو۔

اب اس تنبیہ اور تخویف کے بعد یہاں سیاق کلام خاموش ہے کہ آیا یہ خوان اترا یا نہیں اور روئے سخن اپنے اصل موضوع کی طرف پھر جاتا ہے۔ یعنی الوہیت اور ربوبیت کے اصل موضوع کی طرف کیونکہ اس سبق کا اصل موضوع یہی ہے۔ یہ عظیم دربار ابھی تک جاری ہے اور لوگ اس کا تماشا کر رہے ہیں۔ چاہیے کہ ہم ذرا اس کی طرف لوٹیں اور براہ راست سوال و جواب سے لطف اندوز ہوں۔ اب اللہ تعالیٰ اس دربار میں حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ مریم کی الوہیت کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے وہ پیروکار بھی موجود ہیں جنہوں نے ان کو اور ان کی والدہ کو الٰہ سمجھا تھا تاکہ وہ سنیں اور ان کے سامنے حضرت ان کے لغو عقائد سے براءت کا اظہار کریں۔ یہ جواب نہایت ہی خوفناک فضا پیدا کرتا ہے۔ ذرا ملاحظہ ہو:

---

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ
اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ
اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ

وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۱۶﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿۱۱۷﴾ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۱۸﴾

”غرض جب (یہ احسانات یاد دلاکر) اللہ فرمائے گا کہ ”اے عیسیٰ ابن مریم‘ کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنالو؟“ تو وہ جواب میں عرض کرے گا کہ ”سبحان اللہ‘ میرا یہ کام نہ تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا‘ اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوتا‘ آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ آپ کے دل میں ہے‘ آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے عالم ہیں۔ میں نے ان سے اس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا‘ یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ میں اسی وقت تک ان کا نگران تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا۔ جب آپ نے مجھے واپس بلالیا تو آپ ان پر نگران تھے اور آپ تو ساری ہی چیزوں پر نگران ہیں۔ اب اگر آپ انہیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ غالب اور دانا ہیں۔“

اللہ تعالیٰ تو خوب جانتے تھے کہ حضرت عیسیٰ لوگوں کے سامنے کن عقائد کی تبلیغ کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس خوفناک دن میں یہ عظیم جواب طلبی اور پھر ایسے شخص سے جو ذمہ دار بھی نہیں ہے‘ اس لئے کی گئی کہ اس صالح بندے اور ان کی والدہ کو جو لوگ الہ تصور کرتے تھے‘ ان کا یہ پورا موقف اچھی طرح واضح ہو جائے اور وہ خوب شرمندہ ہوں۔

یہ اس قدر عظیم جسارت ہے کہ کوئی عام اور معقول انسان اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ خود الہ ہے۔ جبکہ وہ جانتا ہو کہ وہ بندہ ہے۔ ایک رسول اس قسم کا دعویٰ کب کر سکتا ہے اور پھر اولوالعزم رسولوں میں سے ایک رسول۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسا رسول۔ حالانکہ اللہ نے رسالت سے پہلے اور رسالت کے بعد اسے معجزات اور مقامات عطا کئے تھے اور ان پر عظیم انعامات کئے تھے اور اعزاز بخشے تھے۔ ایسے رسول کب ایسا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ ایک صالح اور راہ راست پر گامزن رسول۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت کی طرف سے نہایت ہی خشوع و خضوع کے ساتھ عاجزانہ جواب آتا ہے۔ نہایت ہی حمد و ثنا کے ساتھ (سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ (۵: ۱۱۶)) ”سبحان اللہ‘ میرا یہ کام نہ تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا۔“ اس طرح حضرت جلدی سے جواب دے دیتے ہیں کہ میں نے مطلقاً یہ بات نہیں کہی۔

حضرت عیسیٰ اپنی براءت پر اللہ کو گواہ ٹھہراتے ہیں اور اپنی عاجزی دکھاتے ہوئے اللہ کے خصائص الوہیت اور

بندے کے شایان عبودیت کے افعال بتاتے ہیں۔

(اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (۵:۱۱۶)) "اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوتا' آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ آپ کے دل میں ہے' آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے عالم ہیں۔"

اس قدر تسبیح اور پاکی بیان کرنے کے بعد اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ جرأت کرتے ہیں کہ وہ کوئی مثبت بات کریں اور یہ کہیں کہ انہوں نے ہرگز انہیں ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے۔بلکہ انہوں نے تو یہ کہا ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور تم بھی سب صرف اللہ ہی کی بندگی کرو۔

(مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِهٖ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ (۵:۱۱۷)) "میں نے ان سے اس کی سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا' یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔" اور آپ علیہ السلام یہ فرماتے ہیں کہ میں تو ان پر نگران صرف اس وقت تک کے لئے تھا جب میں ان کے سامنے تھا۔ لیکن اپنی وفات کے بعد میں نگران نہ تھا۔ قرآن کی ظاہری آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے حضرت عیسیٰ کو وفات دی اور پھر اپنی طرف اٹھا لیا جبکہ بعض آثار میں یہ آتا ہے کہ آپ اللہ کے ہاں زندہ ہیں۔ میرے خیال میں دونوں قسم کے نصوص میں کوئی تعارض نہیں ہے۔یہ بھی درست ہے کہ زمین کی زندگی سے ان کا قطع تعلق ہو گیا ہو اور انہیں اٹھا لیا گیا ہو اور یہ بھی درست ہے کہ انہیں زندہ حالت میں اٹھا لیا گیا ہو' کیونکہ شہداء بھی تو اللہ کے ہاں زندہ ہوتے ہیں اگرچہ دنیا سے ان کی زندگی کٹ جاتی ہے اگرچہ شہداء کی زندگی کی نوعیت کا ہمیں تفصیلی علم نہیں ہے۔ یہی صورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ میری وفات کے بعد مجھے علم نہ تھا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں؟

(وَكُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ (۵:۱۱۷)) "میں اسی وقت تک ان کا نگران تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا۔ جب آپ نے مجھے واپس بلا لیا تو آپ ان پر نگران تھے اور آپ تو ساری ہی چیزوں پر نگران ہیں۔" حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں' کہ آپ چاہیں تو سزا دیں اور اگر آپ ان کو بخش دیں تو بھی آپ قادر مطلق ہیں۔ بہرحال وہ ہیں تیرے ہی بندے اور آپ ہی جانتے ہیں کہ ان کے لئے سزا مقرر ہے یا مغفرت۔

(اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۵:۱۱۸)) (اب اگر آپ انہیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ غالب اور

دانا ہیں۔) ذرا ملاحظہ تو کیجئے کہ اللہ کے یہ صالح اور مقرب بندے بارگاہ الوہیت میں کس قدر خوفزدہ ہیں اور ان لوگوں کی جرأت کو دیکھئے جنہوں نے یہ افتراء باندھا، جس سے حضرت عیسیٰ ابن مریم صاف صاف براءت کا اظہار کرتے ہیں اور ان لوگوں کی اس افتراء کی وجہ سے یہ بندہ اللہ کے سامنے اس طرح گڑگڑاتے ہوئے کلام کرتا ہے۔

ان لوگوں کے موقف کو دیکھئے اور اس عظیم دربار کو دیکھئے۔ اس دربار میں اپنے اس غلط موقف کی وجہ سے اس قدر ذلیل و حقیر نظر آتے ہیں کہ اس پورے مکالمے میں ان کے ساتھ کوئی بات نہیں کی جاتی اور نہ ان کی طرف کوئی التفات کیا جاتا ہے۔ شاید اس منظر میں شرمندگی اور ندامت کی وجہ سے یہ لوگ پسینہ پسینہ ہو گئے ہوں گے۔ جس طرح اللہ نے انہیں نظر انداز کیا ہم بھی انہیں اسی طرح چھوڑتے ہیں اور آیئے ذرا اس دربار کے آخری منظر کو دیکھیں۔

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾

"تب اللہ فرمائے گا" یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی نفع دیتی ہے، ان کے لئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، یہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہو اور وہ اللہ سے، یہی بڑی کامیابی ہے۔"

"یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی نفع دیتی ہے" یہ اللہ کی بات ہے اور جھوٹوں کی اس شرمندگی پر یہ خوب تبصرہ ہے۔ انہوں نے یہ افتراء باندھا اور یہ افتراء بھی اولوالعزم رسولوں میں ایک معزز رسول پر باندھا۔ اور مسئلہ الوہیت اور بندگی میں یہ افتراء باندھا جس کی اساس پر یہ پوری کائنات قائم ہے اور جس کی اساس پر دنیا میں سچائی قائم ہے اور تمام مخلوقات قائم ہے۔

"یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کے لئے ان کی سچائی مفید ہوگی۔" اس عظیم منظر اور شاہی دربار کے سوال و جواب کے آخر میں یہ رب العالمین کا فیصلہ ہے۔ تمام جہان کے لوگوں کی موجودگی میں اس منظر کے مکالمے کے یہ آخری الفاظ ہیں اور کس قدر فیصلہ کن الفاظ ہیں اور اس کے بعد پھر سچوں کے انجام کی ایک جھلکی بھی دکھائی دیتی ہے۔

(لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۵:۱۱۹)) "ان کے لئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، یہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے، یہی بڑی کامیابی ہے۔"

درجوں کے بعد بلند درجے، جنتیں، پھر ان میں دائمی زندگی اور پھر اللہ کی رضامندی یقیناً یہ بڑی کامیابی ہے۔"

ہم نے یہ منظر دیکھا اور یہ منظر قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز اور اسلوب میں پیش کیا۔ اس منظر کا آخری مکالمہ بھی ہم نے سنا۔ ہم نے گویا اس منظر کو دیکھا اپنی آنکھوں کے ساتھ اور سنا اپنے کانوں کے ساتھ۔ قرآن کریم

کے انداز تصویر کشی کے مطابق بات کا طریقہ یہ نہیں اختیار کیا جاتا ہے کہ ایسا ہو گا بلکہ عملاً منظر پیش کر دیا جاتا ہے۔ انسان کو اس منظر موعودہ کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ قرآن کریم محض خشک عبارت ہی پیش نہیں کرتا جسے صرف پڑھا جائے بلکہ وہ متحرک اور مجسم اور مشخص مناظر پیش کرتا ہے جس میں انسان چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور مکالمے ہوتے ہوئے اس طرح نظر آتے ہیں جس طرح اسکرین پر۔

ہماری سوچ اور ہمارے تصور کے مطابق تو یہ ایک منظر ہو گا جو واقع ہو گا' البتہ اللہ کے علم کے مطابق تو وہ ہو چکا۔ اس لئے کہ اللہ کا علم زمان و مکان کے حدود و قیود سے آزاد ہے۔ زمان و مکان کا تصور تو انسان کے محدود علم کے لئے ہے۔ ہمارا علم محدود اور فانی ہے۔

اس سبق کے آخر میں اور اس عظیم افتراء کے بیان کے خاتمے پر جس سے بڑا افتراء کسی رسول کے کسی پیروکار نے نہیں باندھا۔ حضرت مسیح کے پیروکاروں کی اس عظیم غلط فہمی کے بیان کے آخر میں' جس میں انہوں نے اس افتراء سے لاتعلقی کا اظہار کیا اور ان افتراء پردازی کرنے والوں کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا۔ اس کے بارے میں اس سوال و جواب اور اس سوال و جواب کے لئے قائم کئے گئے اس عظیم دربار کے خاتمے پر اب یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قسم کے افتراؤں سے پاک ہے اور زمین و آسمانوں پر صرف اسی کی حکومت ہے اور اس کی حکومت بے حد و بے قید ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا فِيْهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ۝ع　۱۶ ع ۵ ۶

"زمین اور آسمانوں اور تمام موجودات کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

یہ ایک ایسا اختتامی تبصرہ ہے جو اس عظیم مسئلے کی بحث کے خاتمے کے لئے موزوں اور مناسب ہے۔ نیز اس عظیم منظر سے جو تاثر ملتا ہے اس کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے۔ یہاں اللہ وحدہ الٰہ ہے اور وہی قادر مطلق ہے۔ اس کے سامنے تمام رسول سر تسلیم خم کرتے ہیں اور سب رسول آخری فیصلہ اللہ کے سپرد کرتے ہیں اس میں حضرت عیسیٰ ابن مریم بھی اپنا فیصلہ اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں زمیں و آسماں کی حکومت ہے۔

اور یہ آخری تبصرہ اس پوری سورت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اس سورہ کا مرکزی موضوع "الدین" ہے اور دین اور دینداری کا اظہار اللہ کی شریعت کی اطاعت میں ہوتا ہے۔ صرف اللہ کے قوانین و ضوابط اخذ کرنا اور صرف اسی کے مطابق فیصلے کرنا اس لئے کہ وہی بادشاہ ہے جس کے سوا کوئی بادشاہ نہیں ہے۔ زمین و آسمان کے درمیان جس قدر چیزیں بھی ہیں وہ اس کی مملوک ہیں اور یہ مالک اور بادشاہ یہ آرڈیننس جاری فرماتا ہے (وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ) "اور جو شخص اس قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہ کافر ہے۔" یہی ایک مسئلہ ہے اور یہ اللہ کی حاکمیت کا مسئلہ ہے۔ یہ عقیدۂ توحید کا مسئلہ ہے۔ اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کا مسئلہ ہے' جس کے بعد ہی مکمل توحید وجود میں آتی ہے اور صرف اللہ اللہ و حاکم قرار پاتا ہے۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ----- ۷

## سورہ الانعام - ٦

## آیت نمبر ١ --- تا --- ١١٠

# سورہ انعام ایک نظر میں

یہ سورہ مکی سورتوں میں سے ہے اور یہ قرآن کا وہ حصہ ہے جو مکہ میں نازل ہوا۔ قرآن مجید کا جو حصہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوا' اس کا زمانہ نزول تیرہ سال ہے۔ اس پورے عرصے میں وحی کا محور اور مرکزی مضمون ایک ہی رہا اور کسی وقت اس میں تبدیلی نہ ہوئی' البتہ اسلوب بیان میں تبدیلی برابر ہوتی رہی۔ مضامین کو بار بار دہرایا گیا لیکن ہر مرتبہ نئے نئے اسلوب سے بات کی گئی اور سامعین کو یوں محسوس ہوا کہ گویا یہ بات آج ہی پہلی مرتبہ بیان ہو رہی ہے۔

یہ وہ دور تھا جب قرآن کریم ایک نہایت ہی اہم اور اساسی مسئلے کو حل کر رہا تھا۔ اس مسئلے پر اس نئے دین کی نیو اٹھنے والی تھی اور اس کا اظہار اس کے اساسی نظریات میں ہونے والا تھا۔ یعنی ''حقیقت الوہیت' حقیقت عبودیت اور ان کا باہمی تعلق''۔ اس قضیہ کا حل بھی خالص انسانی نقطہ نظر سے مطلوب تھا۔ یہ کوئی وقتی حل نہ تھا بلکہ اس وقت کے عرب اور آج کے عرب یا اس وقت کے انسان اور آج کے انسان سب کے سب' اس کی رو سے ایک ہی حقیقت اور حیثیت کے حامل ہیں۔ چونکہ اس بحث کا محور اساسی سوالات یہ تھے کہ اس کائنات میں وجود انسانی کی کیا حقیقت ہے۔ اس کائنات کی کیا اصلیت ہے اور انسان اور کائنات اور انسان اور موجودات کے درمیان روابط کی کیا نوعیت ہے؟ اور پھر ان دونوں یعنی انسان اور موجودات اور ان کے خالق کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اس لئے نہ تو یہ مسائل وقتی نوعیت کے حامل تھے اور نہ ہی ان کا یہ حل وقتی نوعیت کا حامل ہو سکتا تھا بلکہ یہ خالص انسانی مسائل تھے اور یہ ان کا دائمی حل تھا۔

نزول قرآن کے مکی دور میں' جن سوالات کو چھیڑا گیا ان کا تعلق انسان اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی پوری کائنات سے تھا۔ یہ تفصیلات کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیوں آیا ہے؟ آخر کار اسے کہاں جانا ہے؟ کون ہے جو اسے ایک نامعلوم عدم سے لایا؟ کون ہے جو اسے یہاں سے لے چلے گا؟ پھر اس کا انجام کیا ہو گا؟ اس دور میں قرآن نے انسان کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ اس کائنات کی حقیقت پر غور کرے جسے وہ دیکھ رہا ہے اور محسوس کر رہا ہے۔ اس کے سامنے ایک مستور غیب ہے۔ وہ کائنات کو دیکھ بھی رہا ہے لیکن وہ اس کی کوئی معقول تعبیر نہیں کر سکتا کہ اس پراسرار کائنات کا خالق کون ہے؟ کون اس حیرت انگیز نظم کو چلا رہا ہے؟ اس کا مدبر کون ہے؟ اور اس میں جو تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں ان کے پیچھے کس طاقت کا ہاتھ کام کر رہا ہے؟ مکہ مکرمہ میں قرآنی تعلیمات نے انسان کو بالتفصیل بتایا کہ اس کا تعلق اپنے رب سے کیا ہے؟ اس کا تعلق اس مخلوقات سے کیا ہے؟ اور یہ کہ انسانوں کے باہمی تعلقات کا مدار کس پہ رکھنا ہے؟ یہ مسئلہ چونکہ نہایت اہم' اساسی اور انسان کی پوری تاریخ اور حیات سے لے کر موت تک کی پوری زندگی سے تعلق رکھتا تھا' اس لئے' اس کی وضاحت اور بیان و تشریح میں قرآن کریم نے پورے تیرہ سال صرف کئے' کیونکہ یہ ایک ایسا اہم قضیہ تھا جس کے حل ہونے کے بعد' انسانی زندگی میں کوئی ایسا مسئلہ ہی نہیں رہتا جو حل طلب ہو۔

اس تیرہ سالہ دور میں قرآن نے کبھی بھی ان بنیادی مسائل کو چھوڑ کر اسلامی نظام حیات کی تفصیلات بیان نہیں

کیں ۔ جب یہ بالکل واضح ہو گیا کہ تحریک اسلامی کے کارکنوں کے دل و دماغ میں اسلامی نظام کے اساسی تصورات اچھی طرح جاگزیں ہو گئے ہیں ' تو اس کے بعد تفصیلی تعلیمات شروع ہوئیں اور اس سے قبل ' اس پورے عرصے میں صرف اس ممتاز گروہ یعنی صحابہ کرام کی تربیت ہوتی رہی جس نے آگے جاکر اقامت دین کا کام سنبھالنا تھا ۔

## اقامت دین کا طریق کار

ہمارے اس دور میں ' جو لوگ اسلامی نظام حیات کے قیام اور احیاء کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں ' میں ان کی توجہ قرآن کریم کے اس خاص اسلوب کی طرف مبذول کراؤں گا ۔ انہیں غور کرنا چاہئے کہ قرآن کریم نے پورے تیرہ سال تک کیوں صرف عقائد و نظریات اور دین کے صرف اساسی مسائل سے بحث کی اور اس پورے عرصے میں کبھی بھی اسلامی نظام حیات کی تفصیلات کو نہ چھیڑا گیا ' نہ ہی وہ احکام اور قوانین بیان کئے گئے جنہیں آگے جاکر اسلامی معاشرے میں نافذ ہونا تھا ۔ اس طریق کار کی تہ میں یہ حکمت کار فرما تھی کہ اللہ تعالیٰ ' حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخالفین کے درمیان سب سے پہلے نظریاتی جنگ کا فیصلہ کرانا چاہتے تھے ۔ چنانچہ آپ نے اپنی دعوت کا آغاز (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) سے کیا جس کے مفہوم کو عرب اچھی طرح جانتے تھے ۔ اس کا اعلان ہوتے ہی ایک نظریاتی جنگ چھڑ گئی اور حضور نے لوگوں کے سامنے یہ دعوت پیش کرنا شروع کر دی کہ وہ تمام الٰہوں ' ارباب اور دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف ایک ہی رب کی عبادت کریں ۔

عرب اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی زبان میں (اِلٰهَ) کے کیا معنی ہیں ؟ اور (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کے کیا معنی ہوتے ہیں ۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ الٰہ تو وہ ہوتا ہے جو انسان کی تکوینی زندگی پر بھی حاکم ہو اور تشریعی زندگی بھی اسی کے زیر نگیں ہو ۔ اگر ہم اس کا اقرار کر لیتے ہیں تو اس کا اولین اثر یہ ہو گا کہ ہمارے ہاتھ سے امارتیں اور سیادتیں سب چلی جائیں گی اور اس کے بعد قلب و ضمیر ' دل و دماغ ' احساس و شعور ' عدالت و امارت ' تجارت و معیشت غرض روح و بدن سب پر صرف ایک خدا اور حاکم مطلق کی فرمان روائی ہو گی ۔ چنانچہ کلمہ طیبہ کو سنتے ہی وہ تاڑ گئے کہ یہ کلمہ نہ صرف یہ کہ ان کے اختیارات حاکمیت کے خلاف اعلان جنگ ہے بلکہ وہ مستقبل قریب میں ان کی عادات و اطوار اور رسم و رواج کو بھی یکسر بدل کر رکھ دے گا ۔ بہرحال وہ عرب تھے اور اہل لسان ہونے کی حیثیت سے یہ اچھی طرح محسوس کر رہے تھے کہ (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) ان کے لئے کیا کیا مشکلات پیدا کرنے والا ہے ۔ انہوں نے اس کلمہ کو سنتے ہی اس کا سخت ترین نوٹس لیا ' جس سے تاریخ کا ہر طالب علم خوب واقف ہے ۔ یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ کفر و اسلام کی اس جنگ کا آغاز اس قدر پیچیدہ نظریاتی جنگ سے کیوں کیا گیا جب کہ بظاہر یہ بات ذہن میں نہیں آتی تھی کہ یہ نظریات عربوں کو اپیل کریں گے ۔

## قومی تحریک کا راستہ

یہ سوال اور بھی قابل توجہ ہو جاتا ہے ' جب ہم غور کریں کہ دعوت اسلامی کے آغاز کے وقت جزیرۂ عرب کے

مخصوص سیاسی حالات کیا تھے؟ جس وقت حضور نے دعوت اسلامی کا آغاز کیا تو سرزمین عرب کے سب سے آباد اور شاداب علاقے 'عربوں کے بجائے دوسری اقوام کے قبضے میں تھے۔ شمال میں شام سے متصل علاقوں پر رومیوں کا قبضہ تھا اور ان کی جانب سے ان پر عرب حکمران حکومت کر رہے تھے۔ جنوب میں یمن پر ایرانیوں کی حکومت تھی اور عربوں کے پاس صرف حجاز' تہامہ اور نجد کے علاقے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے پاس فقط صحرائے عرب کی چند منتشر سرسبز پٹیاں تھیں۔

ان حالات کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے مقبول اور قابل اعتماد شخص کے لئے مناسب یہ تھا کہ وہ ان حالات میں عربی قومیت کا نعرہ بلند کرتے' عرب کے منتشر قبائل کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرتے' ان کی خانہ جنگیاں ختم کرتے' جنہوں نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا تھا۔ اس طرح آپ کے لئے بسہولت یہ ممکن تھا کہ آپ شمال کی جانب رومی اور جنوب کی طرف سے ایرانی استعمار کے خلاف صف آراء ہو جاتے' عرب کے خونی رشتوں سے اپیل کرتے اور پورے جزیرۃ العرب کو ایک قومی وحدت میں جمع کر دیتے۔ یہ کام حضور کے لئے اس وجہ سے بھی آسان تھا کہ آپ قریش جیسے معزز قبیلے کے چشم و چراغ تھا۔ آپ کے پورے قبیلے نے حجراسود کے جھگڑے میں آپ کو فیصل بھی مقرر کر دیا تھا اور پندرہ سال تک آپ کو ثالث بھی مان چکے تھے۔

اگر آپ اپنی تحریک کا آغاز اس طرح کرتے تو تمام عرب فی الفور آپ کی دعوت پر لبیک کہہ دیتے' اور اس طرح آپ کو پورے تیرہ سال تک خود غرض حکمرانوں اور شیوخ و امراء کا جانکاہ مقابلہ نہ کرنا پڑتا اور جس وقت پورا جزیرۃ العرب آپ کے زیرنگیں ہو جاتا اور اقتدار اعلیٰ آپ کے ہاتھوں میں آجاتا تو آپ اپنی پوری طاقت سے لوگوں کو وہ تعلیم دینا شروع کر دیتے' جس کے ساتھ باری تعالیٰ نے آپ کو ہدایت بشریت کے لیے بھیجا تھا' اور آپ بسہولت لوگوں کو بتا سکتے کہ لوگو! انسانوں کی اطاعت اور بندگی کے بجائے صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو اور شرک سے باز آجاؤ۔

لیکن اللہ تعالیٰ علیم و خبیر تھا' اس کا منصوبہ کچھ اور ہی تھا' اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) کا اعلان کر دیں' اسلامی تاریخ ہمارے سامنے ہے کہ حضور اور آپ کے ساتھیوں نے کس طرح باطل کے خلاف واضح نظریاتی جنگ کا اعلان کیا اور اس کے نتیجے میں' بے حد و حساب مصائب برداشت کئے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب نہ تھا کہ خواہ مخواہ' حضور اور آپ کے مٹھی بھر ساتھیوں کو مصیبت میں مبتلا کریں بلکہ یہی ایک صحیح مستقیم اور متین طریق کار تھا جسے اپنانا ضروری تھا۔ نیز اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب نہ تھا کہ انسانیت کو رومی طاغوت یا فارسی طاغوت کے چنگل سے چھڑا کر عربی طاغوت کے زیرنگیں کر دیا جائے۔ طاغوت خواہ جس قوم و نسل سے بھی تعلق رکھتا ہو وہ بہرحال طاغوت ہے۔ مقصود یہ سمجھانا تھا کہ کائنات کا مالک صرف اللہ ہے اور اس پر اسی کی حکمرانی ہونا چاہئے۔ اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہونا چاہئے اور یہ کام صرف اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب اس سرزمین پر صرف (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) کا علم بلند کیا جائے اور خداوند کریم کی بادشاہت کے مقابلے میں قائم ہونے والی تمام ایرانی' رومی اور عربی بادشاہتوں کو ختم کر دیا جائے۔ اس کلمے کی بنیاد پر جو اجتماعیت اور جو قومیت وجود میں آتی ہے وہ ایک نظریاتی قومیت ہوتی ہے اور اسے عربی' رومی اور ایرانی قومیت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ تھا وہ راز جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی قومیت کا نعرہ بلند کرنے کے بجائے نظریاتی کشمکش کے طریق کار کو اختیار کرنے کا حکم ہوا۔ یاد رکھئے! آج بھی ہمارے لئے بہترین طریق کار یہی ہے۔

---ooo---

# معاشی مساوات کا راستہ

جس دور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اس وقت معاشی لحاظ سے دنیا کی حالت ناگفتہ بہ تھی ۔ دولت کی مساوی تقسیم اور عدل و انصاف کا نام و نشان تک نہ تھا۔ دولت اور تجارت پر ایک چھوٹی سی اقلیت نے قبضہ کر رکھا تھا اور یہ اقلیت اپنا پورا کاروبار سودی نظام کے مطابق چلا رہی تھی ' اس لئے اس کی دولت میں بڑی تیز رفتاری سے اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس ایک عظیم اکثریت تھی جو فقر و فاقہ اور غربت و افلاس کا شکار تھی ۔ جو لوگ دولت و ثروت پر قبضہ جمائے ہوئے تھے ' وہی سوسائٹی میں اونچے مناصب پر بھی براجمان تھے اور عام لوگوں کی حالت یہ تھی کہ نہ مایہ اور نہ سرمایہ۔

ان حالات کے پیش نظر یہ ممکن تھا کہ حضور معاشی مساوات کا نعرہ بلند فرماتے ۔ مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان طبقاتی کشمکش قائم ہو جاتی اور ایک عوامی تحریک برپا ہو جاتی۔ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جاتا اور لوگ موجودہ معاشی ناہمواریوں کو حل کرنے کے لئے ' آپ کے ساتھ ہو جاتے تاکہ امراء کی دولت فقراء میں بانٹ دی جائے ۔ یہ راستہ دوسرے راستوں سے نسبتاً سہل بھی ہوتا کیونکہ اس نعرے سے پورا معاشرہ فی الفور دو گروہوں میں بٹ جاتا۔ ایک طرف دولت ' شرف اور اقتدار کی دست درازیوں سے نالاں ایک عظیم اکثریت ہوتی اور دوسری جانب ان برائیوں کی حامل ایک حقیر سی اقلیت ۔ پھر وہ صورت حال پیش نہ آتی جو نظریاتی اعلان جنگ کی صورت میں پیش آئی کہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کرنے والی ایک کمتر سی اقلیت کے مقابلے میں پورا معاشرہ صف آرا ہو گیا۔ نیز یہ معاشی انقلاب برپا کرنے کے بعد جب اقتدار اعلیٰ آپ کے ہاتھ میں آ جاتا اور آپ اکثریت کے بل بوتے پر حکمران ہو جاتے تو آپ اقتدار اور اکثریت کے زور سے پوری آبادی سے اپنے وہ عقائد منوالیتے ' جو بحیثیت رسول خدا آپ لے کر آئے تھے اور اس طرح لوگ انسانوں کی غلامی سے نکل کر ایک خدا کی بندگی میں داخل ہو جاتے ۔

لیکن آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انقلاب کے لئے یہ راہ اختیار کرنے کی ہدایت نہیں کی 'کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تحریک اسلامی کے انقلابی کام کا طریق کار یہ نہ تھا اور اللہ تعالیٰ کو اس بات کا خوب علم تھا کہ صحیح معاشی نظام وہی ہوتا ہے جس کی کونپلیں صحیح نظریات سے پھوٹتی ہیں ۔ صحیح نظریہ حیات صرف یہی ہے کہ ہر قسم کی حاکمیت کو صرف اللہ کے لئے مخصوص کر دیا جائے ۔ اس نظریے کے مطابق ایک معاشرہ وجود میں آئے اور اس کا ہر رکن رضاکارانہ اور اطاعت گذارانہ طور پر اللہ جل شانہ کے ان احکام کی پابندی کرے جو اس نے اجتماعی انصاف ' معاشی کفالت اور دولت کی منصفانہ تقسیم کے بارے میں دیئے ہیں اور اس معاشرے میں کاروبار کرنے والے دونوں فریق یہ خیال کرتے ہوں کہ اس لین دین میں وہ اللہ کے احکامات نافذ کر رہے ہیں اور پھر یہ کہ ان احکامات کی اطاعت کر کے وہ دنیا و آخرت کی سرخروئی حاصل کر رہے ہیں ۔ یہی ایک ایسی صورت ہے جس میں سے کوئی بھی حرص و آز کا شکار نہ ہو گا ' نہ کسی کے دل میں کسی کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوں گے ۔ ایسے معاشرے میں ہر کام کے لئے قوت اور طاقت استعمال کرنے کی ضرورت نہ ہو گی اور لوگ اس معاشرے میں وہ گھٹن محسوس نہ کریں گے جو ہر اس معاشرے میں پائی جاتی ہے جس کی اساس (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) پر نہ رکھی گئی ہو۔

---OOO---

## اخلاقی اصلاح کا راستہ

جب حضور اکرم ؐ تشریف لائے ' تو عرب سوسائٹی ' اخلاقی لحاظ سے قعر مذلت میں گری ہوئی تھی ۔ چند بدویانہ فضائل اخلاق کو چھوڑ کر وہ کسی ضابطے کے پابند نہ تھے ' زہیر بن ابی سلمی اخلاقی صورت حال کی عکاسی یوں کرتے ہیں ۔

ومن لم یذو عن حوضه بسلاحه

یهدم ومن لا یظلم الناس یظلم

(اور جو اپنے حوض کی حفاظت ' اپنے اسلحہ کے ذریعے نہیں کریں گے ' ان کے حوض کو منہدم کر دیا جائے گا اور جو لوگوں پر ظلم نہیں کرے گا ' مظلوم بنے گا) "جاہلیت کا یہ متعارف قول تھا کہ "اپنے بھائی کی مدد کرو ' خواہ ظالم ہو یا مظلوم ہو ۔"

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ' عربوں کی زندگی میں جو انقلاب برپا کیا ' وہ اخلاق و عادات اور قواعد و قوانین تک ہی محدود نہ تھا بلکہ آپ نے عربوں کے ادب کی اصلاح بھی فرمائی ۔ اس جملے کا مفہوم آپ نے یوں بدل دیا کہ مظلوم کی حمایت کرنا تو واضح ہے 'لیکن ظالم بھائی کی مدد یوں ہو سکتی کہ اسے ظلم سے باز رکھا جائے ۔ چنانچہ اس قول کو اس معنوی ترمیم کے ساتھ حضور نے ادا فرمایا اور دور جاہلیت کا یہ قول ذخیرہ احادیث کا جزو بن گیا)۔

یہ شعر اس معاشرے کی اخلاقی صورت حال کی صحیح تعبیر تھا ۔ شراب نوشی اور قمار بازی دونوں ان کی زندگی کا لازمہ تھیں اور یہ لوگ ان پر فخر کیا کرتے تھے ۔ جاہلیت کی پوری شاعری عربوں کے ان اخلاق کی عکاسی کرتی ہے ۔ بطور مثال طرفہ بن العبد کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

فلولا ثلاث هن من عيشه الفتي

وجدك لم احفل متي قام عودی

(اگر تین چیزیں نہ ہوتیں جو ایک نوجوان کے لئے سامان عیش ہیں تو تیرے سر کی قسم میں اپنی پوری زندگی میں کسی محفل میں شریک نہ ہوتا ۔)

فمنهن سبقي العاذلات بشربه

كميت متي ما تعل بالماء تزبد

ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں شرمسار کنندہ عورتوں سے بھی آگے بڑھ کر کلیجی رنگ کی شراب کا جام اٹھا لیتا ہوں ' جس میں اگر پانی ڈالا جائے تو کف آ جائے ۔

فما زال تشرابي الخمور ولذتي

وبذلي و انفاقي طريفي وتالدي

میں ہمیشہ شراب نوشی اور لذت کوشی کا عادی ہوں اور مسلسل اپنی جدی دولت اور تازہ جمع کردہ دولت کو خرچ کرتا رہتا ہوں۔

الا ان تحامتني العشيرة كلها

و افودت افراد البعيد النمعبد

یہاں تک کہ میرا قبیلہ میری دشمنی پر اتر آیا اور میں اس طرح اکیلا ہو گیا جس طرح خارش زدہ اونٹ علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔

فسق و فجور' اپنی مختلف شکلوں کے ساتھ اس معاشرے میں وبا کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ عرب کیا بلکہ ہر قدیم و جدید جاہلی معاشرے کی یہ امتیازی خصوصیت رہی ہے کہ اخلاقی لحاظ سے وہ ایک فاجر اور فاسد معاشرہ ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث سے اچھی طرح ہوتا ہے جس میں آپ جاہلیت کی عائلی زندگی کی تفصیلات بتاتی ہیں۔ جاہلیت میں نکاح چار قسم کا ہوا کرتا تھا۔

(۱) ایک تو وہ نکاح جو آج ہمارے اندر رائج ہے۔ ایک آدمی کسی کی بیٹی یا اس کی زیر دست کا پیغام دیتا تھا اس کا مہر دے کر وہ اس سے نکاح کر لیتا تھا۔

(۲) دوسرا یہ کہ مرد اپنی بیوی سے کہتا تھا' جب وہ ایام ماہواری سے پاک ہو جاتی' کہ تو فلاں کے پاس چلی جا اور اس سے ہم بستری کر۔ مرد عورت سے علیحدہ رہتا تھا اور اسے چھوتا بھی نہ تھا یہاں تک کہ اس مرد سے اس کا حمل ٹھہر جاتا۔ جب حمل واضح ہو جاتا تو پھر یہ اس کے پاس جاتا جب چاہتا۔ یہ حرکت اس لئے کی جاتی تھی کہ نجیب النسب اولاد حاصل کی جائے۔ اس نکاح کو "نکاح استبضاع" کہتے تھے۔

(۳) اس کے علاوہ ایک تیسرا نکاح بھی ہوتا تھا۔ دس آدمیوں سے کم آدمی جمع ہو جاتے تھے اور وہ سب ایک ہی عورت کے پاس جاتے اور سب کے سب اس سے جماع کرتے۔ جب اس کا حمل ٹھہرتا اور وہ بچہ جن دیتی تو چند دن گزرنے کے بعد وہ سب کو بلا لیتی۔ قانون کے مطابق ہر ایک کو حاضر ہونا پڑتا۔ جب سب آ جاتے تو وہ انہیں کہتی "تم جانتے ہی ہو میرے ساتھ جو تمہارا معاملہ تھا۔ اب چونکہ میں نے بچہ جن دیا ہے تو اے فلاں! یہ تیرا بیٹا ہے۔" تو یہ جسے چاہتی اس کا نام لے لیتی اور بچہ اس کی نسل سے ملحق ہو جاتا۔ کسی شخص کو اختیار نہ ہوتا تھا کہ وہ انکار کر سکے۔

(۴) چوتھا نکاح اس طرح ہوتا کہ بے شمار لوگ جمع ہو جاتے وہ سب ایک ہی عورت کے پاس جاتے۔ یہ فاحشہ عورتیں ہوا کرتی تھیں اور کسی کو ہم بستری سے نہ روکتی تھیں۔ اپنے دروازوں پر خاص قسم کے جھنڈے نصب کر دیتی تھیں جو ان کی خاص علامت ہوتے تھے۔ جو چاہتا وہاں جاتا۔ جب ان میں سے کوئی حاملہ ہو جاتی تو سب لوگ وہاں جمع ہوتے اور قیافہ دان کو بلایا جاتا۔ قیافہ دان بچے کو جس سے ملا دیتے وہ اسے اٹھا لیتا اور اسے اپنا بیٹا پکارتا۔"

۱۔ بخاری کتاب النکاح

عربوں کی اس اخلاقی صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر

اپنی دعوت کا آغاز اصلاح معاشرہ اور تزکیہ نفس کے پروگرام سے کرتے تو زیادہ مناسب تھا۔ اس صورت میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد بسہولت آپ کی تحریک میں شامل ہو جاتی۔ ہر معاشرے میں ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہوتی ہے جو اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی برائیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور جو بھی ان کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اسے اپنی تائید میں' ایسے لوگوں کی ایک کثیر تعداد مل جاتی ہے۔ اس طریق کار کا اثر یہ ہوتا کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد حضور کے ساتھ ہو جاتی' ان کے اخلاق درست ہو جاتے' ان کی روحیں پاکیزہ ہو جاتیں اور وہ اس قابل ہو جاتے کہ بسہولت صحیح عقیدہ اپنا لیں اور یہ صورت حال پیش نہ آتی جو ابتداء ہی سے (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کی نظریاتی جنگ چھیڑ دینے کی صورت میں پیش آئی کہ تمام عالم عرب کلمہ حق کے سامنے سینہ سپر ہو گیا۔

لیکن میں یہی کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جاننے والا تھا کہ انقلابی عمل کا صحیح راستہ کون سا ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی کہ صحیح اخلاق اور ٹھوس کردار کی تعمیر صرف عقیدہ اور نظریے ہی کی اساس پر ہو سکتی ہے۔ یہ نظریہ ہی ہوتا ہے جو انسانوں کے لئے اخلاقی پیمانے وضع کرتا ہے۔ عقیدہ ہی انسان کو اس ذات سے متعارف کراتا ہے جو اخلاقی قدروں اور اخلاقی اصول کا ماخذ و مصدر ہوتی ہے اور اس کی طرف سے جزاو سزا کا تعین بھی ہوتا ہے جو ان اصولوں کی نافرمانی کی صورت میں دی جائے گی۔ اگر اس عقیدے کا تعین نہ ہو اور نظریات واضح نہ ہوں تو اس صورت میں جو اصلاحی کام بھی ہو گا' جو اخلاق بھی تعمیر ہوں گے وہ خام ہوں گے۔ ان کا کوئی ضابطہ نہ ہو گا' کوئی قوت نافذہ نہ ہو گی اور نہ ہی خلاف ورزی کی صورت میں جزاو سزا کا کوئی معقول انتظام ہو گا۔

اس کے برعکس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریق کار اختیار کیا وہ کس قدر کامیاب ثابت ہوا؟ اس کا اندازہ تحریک اسلامی کی تاریخ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ آپ نے نظریات کا اعلان فرمایا' ان کے لئے ان تھک جدوجہد کی' لوگوں کے دل و دماغ میں اسلامی نظریات بیٹھ گئے۔ ان نظریات کے خطوط پر ایک ریاست تشکیل پائی اور اس کا اقتدار مضبوط ہو گیا۔ لوگوں نے اپنے رب کو پہچان لیا اور صرف اسی کی بندگی کرنے لگے۔ انسان' انسان کی بندگی سے آزاد ہو گیا اور ہر طرف (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کی حکمرانی شروع ہو گئی۔ اس نظریے کے قائلین کی وہ پوری تربیت ہو گئی جو اللہ کو مطلوب تھی تو اس طریق کار کے عظیم الشان نتائج سامنے آگئے۔ اس زمین کو رومیوں اور فارسیوں کے ناپاک نظاموں سے پاک کر دیا گیا اور یہ کام اس لئے نہ کیا گیا تھا کہ وہاں رومیوں اور فارسیوں کی جگہ عربوں کی سلطنت قائم ہو جائے بلکہ صرف اس لئے کہ پورے کرۂ ارض پر صرف اللہ تعالیٰ کی حکمرانی ہو اور اسے ان تمام طاقتوں سے' علی السواء پاک کر دیا جائے خواہ یہ رومی ہوں' فارسی ہوں یا عربی ہوں۔

اس طریق کار کے مطابق جو انقلاب رونما ہوا اس کے اثرات یہ ہوئے کہ معاشرے کو ہر قسم کے ظلم و ستم سے پاک کر دیا گیا۔ ایک خالص اسلامی نظام زندگی قائم ہوا جس کی اساس عدل و انصاف اور کلی مساوات پر تھی۔ اس میں تمام انسانوں کے ساتھ یکساں سلوک ہونے لگا۔ اجتماعی انصاف کا جھنڈا صرف خدائے واحد و برتر کے نام کا بلند ہوا اور اس میں اس کے ساتھ کوئی دوسرا نعرہ شریک نہ تھا۔ اسلامی نظام کے علم پر صرف (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) لکھا ہوا تھا۔

لوگوں کے اخلاق درست ہو گئے' نفوس پاک ہو گئے' ان کے دل اور روح آئینہ بن گئے۔ وہ یوں پاک ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود و تعزیرات کے نفاذ کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ کیونکہ خود ہر فرد کے دل و دماغ میں کچھ

چوکیدار بیٹھ گئے تھے - یعنی اللہ کی رحمت کی امیدواری' اس کی رضاجوئی اور عذاب آخرت کا ڈر - یہ تھے وہ محافظ جو ہروقت اس گروہ کے ہر فرد کے ساتھ لگے رہتے تھے - اسلامی نظام کا اثر صرف عرب اور مسلم معاشرے تک ہی محدود نہ رہا بلکہ اس سے پوری انسانیت کو فائدہ پہنچا - اس کی تنظیم اور اس کے اجتماعی نظم و نسق کو ترقی نصیب ہوئی اور اس نے وہ کمال حاصل کیا جو اس سے پہلے کبھی حاصل نہ کیا تھا -

یہ انقلاب 'اس خوش اسلوبی سے محض اس لئے وقوع پذیر ہوا کہ جن لوگوں نے اسلامی نظام حیات کو ایک ریاست' ایک نظام' ایک قانون اور ایک حکومت کی شکل میں قائم کرنے سے قبل اسے خود اپنی زندگیوں میں نافذ کر دیا تھا' یہ دین ان کی زندگیوں میں رچ بس گیا تھا - یہی ان کا عقیدہ تھا' یہی ان کا اخلاق تھا' یہی ان کی عبادت اور عام طرز عمل تھا -

پھر ان لوگوں نے یہ کام کسی دنیاوی غرض کے لئے نہ کیا تھا بلکہ ان کے پیش نظر صرف فلاح اخروی اور جنت الماوئ تھی - یہ تک مطلوب نہ تھا کہ انہیں یہاں غلبہ نصیب ہو یا انہی کے ہاتھوں سے نظام اسلامی کا قیام عمل میں آجائے بلکہ ان تمام کوششوں' ان تمام ناقابل برداشت ابتلاؤں اور حق و باطل اور اسلام و جاہلیت کی اس طویل کشمکش کے صلے میں ان کی صرف ایک تمنا تھی ...... یعنی رضائے الٰہی اور فلاح اخروی اور ان سب حقائق کے بالمقابل انہوں نے یہ کام اس عنوان سے کیا جو تاریخ انسانی کا معروف عنوان تھا یعنی (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) — ہمیشہ اس نعرے کو خطرناک قرار دیا گیا خصوصاً ان لوگوں کی طرف سے جو مناصب حکومت پر براجمان ہوتے تھے -

## اقتدار کب ملتا ہے ؟

قرن اول کے ان لوگوں کو جب اللہ نے آزمایا - تو وہ اس میں پورے اترے - ان کے نفوس ہر قسم کی نفسیاتی آلائشوں سے پاک ہوگئے اور جب اللہ نے دیکھ لیا کہ وہ اس دنیائے دنی کے کسی ذلیل و حقیر مقصد کے لئے نہیں لڑ رہے' یہاں تک کہ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ صرف انہی کے ہاتھوں اس دعوت کو کامیابی حاصل ہو اور اسلامی نظام حیات کا قیام عمل میں آجائے - نیز ان کے دل قومیت اور وطنیت اور نسل پرستی' کنبہ پروری اور قبائلی عصبیت جیسے فروتر جذبات سے پاک ہوگئے اور انہیں ان روابط سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رہا - ان میں وہ تمام مطلوب خوبیاں اور کمالات پیدا ہوگئے جو اللہ کو مطلوب تھے تو پھر خود اللہ نے فیصلہ کر لیا کہ یہ لوگ اب اس امانت کو سنبھالنے کے قابل ہوگئے ہیں - یہ اس عقیدے اور نظریہ حیات کے امین ہو سکتے ہیں جس میں حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ صرف اللہ وحدہ لاشریک کا ہو کیونکہ یہ عقیدہ ان کے دل و جان میں جاگزیں ہو چکا ہے - ان کے شعور و عمل کا جزو بن چکا ہے اور ان کے جان و مال پر حاکم ہے - وہ اس قابل ہوگئے ہیں کہ اقتدار اعلیٰ ان کے سپرد کر دیا جائے' جس کے ذریعے وہ اللہ کی شریعت کو اس دنیا میں چلائیں اور خالص خدائی عدل و انصاف جاری کریں - جو کچھ کریں وہ رضائے الٰہی کے حصول کے لئے کریں کیونکہ اسی نے یہ امانت ان کے سپرد کی ہے اور ان کے پیش نظر اپنی ذات' اپنا خاندان اور اپنی قوم یا اپنا قبیلہ ہرگز نہ ہو -

غرض اسلامی نظام حیات کا قیام اور اس کی سربلندی صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ہم اس کے قیام کے لئے وہی طریق کار اختیار کریں جو حضور نبی اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی راہنمائی میں اختیار فرمایا یعنی (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) کا علم بلند کرنا اور اس کلمے کے ساتھ کسی اور کلمے' نعرے اور نظریئے کو شریک نہ کرنا - اگرچہ بظاہر یہ طریق کار نہایت مشکل اور

پر خطر تھا' لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہی حقیقت پسندانہ اور مناسب تھا اس لئے اسی کو اختیار کیا گیا۔

اگر دعوت اسلامی کو ایک قومی تحریک ' وطنی تحریک یا کسی اجتماعی تحریک یا اخلاقی اور اصلاح معاشرہ کی تحریک کی شکل میں اٹھایا جاتا تو اس کے نتیجے میں برپا ہونے والا نظام حیات خالص خدائی نظام حیات نہ ہوتا اور اس تحریک کا علم وہ نہ ہوتا جو تحریک اسلامی کا تھا یعنی (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ)۔

## یہ طریق کار کیوں ؟

پورے مکی دور میں قرآن کریم نے اسلام کی نظریاتی اساس ' (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کو دل و دماغ میں بٹھانے کی کوشش کی اور اس کے لئے وہ پر آشوب طریق کار اختیار کیا گیا جس کا ذکر اوپر ہوا اور کسی وقت بھی اسے چھوڑ کر کوئی دوسرا طریق کار اختیار نہ کیا گیا بلکہ ہمیشہ اسی پر اصرار کیا گیا۔ نیز قرآن مجید نے دعوت کے آغاز میں اور مکی دور میں صرف عقائد و نظریات ہی پر زور دیا اور نظام اسلامی کی فقہی اور شرعی تفصیلات کو نہ چھیڑا۔ یہ طریق کار محض اتفاقی طور پر نہیں اختیار کیا گیا بلکہ اس میں گہری حکمت کارفرما تھی۔ دعوت اسلامی کے ہر کارکن کا یہ فرض ہے کہ وہ گہری سوچ بچار کر کے معلوم کرے کہ وہ حکمت کیا تھی ؟

وقت یہ ہے کہ اس نظام حیات کے مزاج کا تقاضا ہی یہی تھا۔ کیونکہ پورے نظام کی تشکیل اور تمام تر فقہی اور تشریعی ضوابط کی تعمیر و تدوین صرف اسی ایک اساس پر ہوئی تھی یعنی عقیدہ توحید اسلامی نظام حیات کا اساسی نظریہ۔ یوں سمجھئے کہ یہ دین گویا ایک تناور درخت ہے جو دور تک پھیلا ہوا ہے جس کی شاخیں لمبی اور گھنی ہیں۔ اس کے بے شمار سایہ دار پتے ہیں اور وہ دور تک فضاء میں بلند ہو گیا ہے' لیکن اس کے باوجود اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس تناوری اور طول و عرض اور بلندی و ضخامت کے لحاظ سے زمین کے اندر دور تک اس کی جڑیں گہری ہوں اور دور تک پھیلی ہوئی ہوں۔ یہی مثال اسلامی نظام حیات کی بھی ہے۔ وہ زندگی کا جو نظم پیش کرتا ہے وہ جامع و شامل ہے۔ زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ ہر چھوٹے اور بڑے امر کے بارے میں فیصلے کرتا ہے۔ یہ زندگی کے صرف دنیاوی دائرے تک محدود نہیں ہے بلکہ فلاح اخروی کا بھی ضامن ہے۔ صرف دنیائے بنی و گوش ہی سے سروکار نہیں رکھتا بلکہ پردہائے غیب کے اندر مستور ایک "بڑے جہاں" سے بھی گہری دلچسپی رکھتا ہے پھر اسے انسان کے صرف ظاہری اور مادی معاملات ہی سے دلچسپی نہیں بلکہ اس کا تعلق انسانی ضمیر کی گہرائیوں سے بھی ہے اور وہ انسان کے "راز ہائے سینہ" اور "دنیائے نیات" سے بھی گہرا ربط رکھتا ہے۔ ہاں تو جب وہ ایک عظیم درخت ہے جس کی شاخیں حیات انسانی کے ایک وسیع تر خطے میں پھیلی ہوئی ہیں تو یہ امر نہایت ضروری ہو جاتا ہے کہ اس وسعت ' اس ضخامت اور اس عمق اور پھیلاؤ کے مطابق ' اس کی جڑیں بھی کشت زار دل و دماغ میں نہایت ہی گہری ہوں۔

(اَصْلُهَا ثَابِتٌ فِي الْاَرْضِ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ) اسلامی نظام حیات کے مزاج اور اس کی تعمیری باریکیوں کا یہ ایک خاص پہلو ہے کہ وہ اپنی تعمیر اور پھیلاؤ میں ایک خاص طریق کار اختیار کرتا ہے۔ وہ اس بات کو حد درجہ اہمیت دیتا ہے کہ اس کی نشو و نما اور تعمیر جن عقائد و نظریات پر ہو رہی ہے وہ دل و دماغ میں غایت درجہ متمکن ہو جائیں۔ نفس

انسانی اور انسانی فکر و عمل کو پورے طور پر اپنے رنگ میں رنگ دیں' اس کی جڑوں اور تناور شاخوں کے درمیان ایک خاص تناسب ہو اور جڑیں اس قدر مضبوط اور طاقتور ہوں کہ فضا میں پھیلی ہوئی بلند شاخوں اور بھاری تنوں کا بوجھ بسہولت سہار سکیں۔

اس طریق کار کے مطابق جب کسی فرد اور گروہ کے دل و دماغ کی گہرائیوں تک (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) اتر جاتا ہے تو اس کی زندگی میں اس نظام حیات کی بنیاد پڑ جاتی ہے جسے اس کلمہ پر تعمیر ہونا ہوتا ہے اور اس کی جھلک اس میں نظر آتی ہے۔جوں جوں اس نظام کی تفصیلات سامنے آتی جاتی ہیں لوگ برضا و رغبت انہیں اپناتے جاتے ہیں کیونکہ ان کی جڑیں پہلے سے ان کے دل میں ہوتی ہیں۔یہی معاملہ صحابہ کرام ؓ کا تھا کہ مکی دور کی اس فکری تطہیر اور صالح عقائد کی وجہ سے ان کے ذہن نہ صرف یہ کہ اسلامی احکام کے لئے آمادہ تھے بلکہ طالب تھے حالانکہ احکام کی تفصیلات ابھی تک پردۂ اخفا میں تھیں۔

دور اول میں ہمیں جو معجزانہ تسلیم و انقیاد نظر آتا ہے وہ فقط ایمان راسخ اور صالح نظریات کی تشکیل کا رہین منت ہے۔اس ایمان کے بعد حالت یہ تھی کہ شرعی احکامات آرہے ہیں' نظم و نسق کے بارے میں ہدایات آرہی ہیں اور ان پر بے چون وچرا اور کامل تسلیم و رضا کے ساتھ عمل ہو رہا ہے۔وہ موجودہ احکامات کے متنفر ہو جاتے ہیں اور جو حکم آجاتا ہے اس کی تعمیل میں پل بھر کی دیر نہیں کرتے۔یہی وجوہات تھیں جس کی وجہ سے شراب نوشی ختم ہوئی' سودی کاروبار کا نام و نشان تک نہ رہا۔قماربازی کا وجود ناپید ہو گیا اور تمام جاہلی عادات اور اوضاع و اطواریوں مٹے کہ گویا کبھی تھے ہی نہیں' اور سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ یہ تمام کام چند احکام خداوندی نازل ہوتے ہی سرانجام پا گئے' بس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے احکامات سننے کی دیر تھی۔

اس کے برعکس ان نظاموں کا حال دیکھ لیجئے جن کی تعمیر اس طریق کار کے برعکس متعارف دنیاوی طریقوں کے مطابق ہوتی ہے۔آج کل اگر کوئی حکومت ان منکرات کو بند کرنا چاہتی ہے تو وہ قانون سازی کے ساتھ مقننہ' انتظامیہ کے تمام محکمہ جات' پولیس اور فوج اور نشرواشاعت کے تمام ذرائع کو پوری جدوجہد کے ساتھ کام میں لاتی ہے' لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ پھر بھی اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ چند ظاہری اور خلاف قانون چیزوں پر ہی کنٹرول کر سکتی ہیں جب کہ معاشرے کی اندرونی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ منہیات اور منکرات سے اٹا پڑا ہوتا ہے۔

(تحریم شراب کے سلسلے میں ملاحظہ ہو میری تفسیر فی ظلال القرآن جلد ۵ از ص ۸۷ تا ص ۸۰۔ہنقح ایڈیشن - نیز ملاحظہ ہو الاستاذ المودودی کی کتاب "تنقیحات" بحوالہ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین - از ابوالحسن علی الندوی)

## نظریہ اور تحریک ساتھ ساتھ

اس مضبوط طریق کار کو سمجھ لینے سے' اس دین کے مزاج اور خصوصیات کا ایک اور پہلو بھی روشن ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ دین درحقیقت ایک بہترین عملی اور متحرک پروگرام ہے اور یہ آیا ہی اس لئے ہے کہ زندگی کے تمام واقعات و حقائق پر حکمران ہو۔یہ زندگی کے حقائق کا سامنا اس حیثیت سے کرتا ہے کہ ان پر اپنے اوامر نافذ کرے۔انہیں برقرار رکھے' یا بدل دے یا سرے سے منسوخ کر دے۔یہی وجہ ہے کہ اس دین میں قانون سازی صرف انہی امور کے

متعلق ہوتی ہے جو واقع ہو چکے ہوتے ہیں اور یہ بھی ایک ایسے معاشرے میں جس نے ابتدائی طور پر صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا اقرار کر لیا ہو۔

یہ دین کوئی ایسا "نظریہ" نہیں ہے جو محض مفروضات سے دلچسپی رکھتا ہو' بلکہ یہ ایک ایسا نصب العین اور پروگرام ہے جس کا معاملہ تمام تر واقعات حیات سے ہے۔ لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ پہلے ایک ایسا معاشرہ موجود ہو جو (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کا اقرار کرے۔ یعنی کہ حاکمیت اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے اور اس کے ساتھ اللہ کے سوا تمام دوسرے لوگوں کی حاکمیت کا انکار کرے۔ ایسے تمام طور طریقوں کو ترک کر دے جو اس قاعدے کے خلاف ہوں اور نہ ہی انہیں جائز سمجھے۔

جب ایسے معاشرے کا قیام فعلاً ہو جائے تو اس وقت محض ایک خیالی معاشرے کے بجائے وہ ایک حقیقی اور زندہ معاشرہ ہو گا جسے تنظیم اور قانون سازی کی ضرورت پڑے گی۔ ایسے حالات میں پھر یہ دین اس معاشرے کی اجتماعی زندگی کی تنظیم شروع کر دیتا ہے اور قانون سازی کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ یہ قانون سازی اس قوم کے لئے ہوتی ہے جو دل و جان سے نظم و قانون کی مطیع ہو چکی ہے اور جس نے تمام غیر دینی نظاموں اور قوانین کو سرے سے ترک کر دیا ہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر ضروری ہو جاتا ہے کہ جو لوگ ایسے نظریات و عقائد کے حامل ہوں' انہیں خود اپنے آپ اور اپنے معاشرے پر خود مختاری حاصل ہو' جو اس معاشرے میں اس نظام حیات کے نافذ کرنے کی ضامن ہو' تاکہ لوگوں کے دل میں اس نظام کا احترام ہو۔ لوگوں کو معلوم ہو کہ یہ شریعت ایک حقیقت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشرے میں ایسے حالات بھی موجود ہوں جو فوری نظم و نسق اور قانون سازی کے متقاضی ہوں۔

---ooo---

## اقامت دین کے لئے حکومت کی ضرورت

جب مسلمان مکے میں تھے تو انہیں اپنے امور میں خود مختاری حاصل نہ تھی۔ نہ معاشرے پر انہیں کوئی اختیار حاصل تھا اور نہ ہی ان کی زندگی اس طرح مستقل اور آزاد تھی کہ وہ خود ہی اسے اللہ کی شریعت کے مطابق چلا سکتے ہوں.....
اس لئے زندگی کے اس دور میں صرف عقائد نازل ہوئے۔ عقائد کی مضبوطی اور پختگی کے بعد ایسے اخلاقی احکامات آئے جو ان عقائد پر مبنی تھے' لیکن جس وقت مدینہ طیبہ میں انہوں نے اپنی ایک مستقل حکومت قائم کر لی جس میں وہ بالکل خود مختار تھے' تو اس وقت اسلامی معاشرتی قوانین کا نزول شروع ہوا' مسلم معاشرے کے لئے ایک ایسا نظام متعین ہوا جو اس کی تمام حقیقی ضروریات کا متکفل تھا۔ یہ ایسا نظام تھا جس کی پشت پر ایک حکومت اور ایک قوت نافذہ بھی تھی۔

اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ نہ تھی کہ وہ مکہ مکرمہ ہی میں قوانین اتار دیں تاکہ وہ خزانہ قوانین میں تیار رکھے ہوں اور مدینہ طیبہ میں حکومت بنتے ہی نافذ کر دیئے جائیں۔

یہ طریق کار اس دین کے مزاج کے خلاف ہے۔ یہ دین ایک نہایت ہی حقیقت پسندانہ اور واقعیت جویانہ دین ہے..... وہ ازخود مشکلات فرض کر کے ان کے لئے حل تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ وہ صرف ان امور کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو حقائق ہوں۔ ایسے حقیقی مسلم معاشرے کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس نے اللہ کی شریعت کے سامنے

سر تسلیم خم کر دیا ہو اور اس کے سوا تمام دینوں سے منہ پھیر لیا ہو۔ اس کا سلوک بعینہٖ اس معاشرے کی وسعت ' اس کی نوعیت اور اس کے ظروف و احوال کے مطابق ہوتا ہے تاکہ قوانین ' معاشرے کی نوعیت' وسعت اور حالات و ضروریات کے مطابق ہوں۔

لوگ اس وقت اسلام سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ نظریات وضع کرے ' مجوزہ نظام حیات کے طور طریقے اور شکلیں متعین کرے اور زندگی کے لئے مفصل قوانین وضع کرے ' جب کہ صورت حال یہ ہے کہ اس وقت کرۂ ارض پر کوئی ایسا معاشرہ موجود نہیں ہے جس نے عملاً اس بات کا اقرار کر لیا ہو کہ اس میں صرف خدا کی شریعت کی حکمرانی ہو گی اور اس نے تمام غیر اسلامی شرائع و قوانین کو ترک کر دیا ہو یا اس کے پاس اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے قوت نافذہ بھی ہو۔ جو لوگ اسلام سے ایسی توقعات رکھتے ہیں انہوں نے درحقیقت اس دین کے مزاج ہی کو نہیں پایا۔ بدقسمتی سے وہ نہیں جانتے کہ یہ دین اللہ کے پسندیدہ طریق کار کے مطابق کس طرح عملی شکل اختیار کیا کرتا ہے۔

اس طرز پر سوچنے والے لوگوں کا اصل منشاء درحقیقت یہ ہوتا ہے کہ وہ اس دین کے مزاج ' اس کے طریق کار اور اس کی تاریخ کو بدل دیں تاکہ وہ انسانی نظریات اور انسانی طریق ہائے حیات کے مطابق ہو جائے۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ یہ دین ' اپنے طریق کار اور اقدامات کو چھوڑ کر ان کی وقتی خواہشات اور نفسانی تقاضوں کو پورا کرے۔ یہ ایسی خواہشات ہیں جو انسان کے وضع کردہ چھوٹے بڑے نظامہائے حیات کے مقابلے میں ان کی روحانی اور اندرونی شکست خوردگی کی آئینہ دار ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ یہ دین اپنے آپ کو جدید نظریات اور مفروضات کی شکل میں ڈھال لے اور ایسے مستقبل کی طرف متوجہ ہو جو سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ لیکن اللہ نے اس دین کے لئے وہی طریق کار مقرر فرمایا ہے جو اسے پسند ہے یعنی یہ کہ وہ ایک عقیدہ ہو جو دل دماغ پر چھا جائے۔ انسانی ضمیر پر اس کی حکومت ہو۔ اس عقیدے کا لازمی تقاضا یہ ہو کہ اس کا ماننے والا اللہ کے سوا کسی کے آگے نہ جھکے اور یہی عقیدہ قانون و شریعت کا ماخذ بھی ہو اور اس کے سوا کوئی دوسرا ماخذ نہ ہو۔ جب اس عقیدے کے حاملین موجود ہوں اور انہیں اپنے معاشرے پر اقتدار بھی حاصل ہو تو پھر ان کی واقعی ضروریات کے لئے قانون سازی کا کام شروع ہو اور اس کے مطابق ان کی واقعی زندگی کی تنظیم و تشکیل کی جائے۔

یہ ہے وہ طریق کار جسے اللہ نے اس دین کی اقامت کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ آپ یقین کریں کہ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے ' رہیں لوگوں کی نفسانی خواہشات سو جو ہوتی ہیں ہوا کریں۔

دعوت اسلامی کے حاملین کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس طریق کار کے مطابق جب بھی وہ لوگوں کو دین کی طرف بلائیں ' انہیں سب سے پہلے اسلامی نظریہ حیات سے روشناس کرائیں۔

یہ بات صرف غیر مسلموں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلم کہلاتے ہیں اور مردم شماری کا ریکارڈ بھی گواہ ہے کہ وہ مسلمان ہیں ' ان کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کا نئے سرے سے اقرار کریں ' اس کے مفہوم اور مراد کو سمجھیں۔ حاکمیت کو خاصہ خدا سمجھیں اور اس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور یہ بھی زندگی کے ایک محدود دائرے میں نہیں بلکہ پوری زندگی میں اس کے ساتھ ساتھ وہ ان لوگوں کی حاکمیت کا بھی صاف صاف انکار کر دیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حق حاکمیت کو اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ یہ اقرار دل کی

گہرائیوں سے ' پورے شعور کے ساتھ ہو اور اس کا اظہار انسانی زندگی کے عملی طور طریقوں اور حقائق میں بھی ہو رہا ہو۔

## پہلے فکری اصلاح اور پھر قانونی اصلاح

لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینے کی اساس یہی نظریاتی اقرار ہونا چاہئے ۔ یہی اقرار اول روز سے دعوت اسلامی کی بنیاد رہا ہے ۔ مکہ مکرمہ میں پورے تیرہ سال تک قرآن مجید اسی کی طرف بلاتا رہا ۔ جب (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) کا یہ مفہوم سامنے رکھتے ہوئے ایک اچھی خاصی جمعیت دین اسلام میں داخل ہو گئی ' تو اس گروہ پر اسلامی معاشرے کا اطلاق ہونے لگا ' یعنی وہ معاشرہ جس میں اسلامی نظام حیات ' انسانوں کی اجتماعی زندگی میں قائم ہو سکتا ہو کیونکہ اپنے عقیدے اور اقرار کی رو سے اس معاشرے نے فیصلہ کر لیا ہوتا ہے کہ آئندہ اس کی پوری زندگی کا ارتقاء اس عقیدے کی بنیاد پر ہو گا اور یہ کہ وہ اپنی پوری زندگی میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حکمران تسلیم کرے گا ۔

جب اسلامی نظام حیات کی اساس مستحکم ہو جاتی ہے تو اس کے بعد اسلامی نظام کے تفصیلی منصوبے کا نفاذ شروع ہو جاتا ہے ۔ معاشرے کی فعال طاقتیں خود بخود ایسے اسلامی قوانین کا اجراء شروع کر دیتی ہیں ' جن کا تعلق معاشرتی زندگی کی حقیقی ضروریات سے ہوتا ہے ۔ نظریاتی اساس کی پختگی کے بعد جو تفصیلی قوانین وضع ہوتے ہیں وہ اسلامی نظام کے نظریاتی اصولوں کی روشنی میں ہوتے ہیں ۔ غرض اسلامی نظام کے نفاذ اور قیام کا یہی صحیح اور متوازن طریق کار ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے طریق کار کے ذریعے ان زریں ' عملی اور واقعیت پسند اصولوں کا نفاذ ممکن نہیں ہے ۔

تحریک اسلامی کے بعض مخلص لیکن جلد باز کارکنوں کا خیال یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے نظام اسلامی کے بنیادی تصورات ہی نہیں بلکہ تفصیلی تشریعات تک کو پیش کر دینا نہایت ضروری ہے ۔ اس سے ایک طرف تو لوگ دین اسلام میں دلچسپی لیں گے اور دوسری جانب یہ فائدہ بھی ہو گا کہ دعوت دین کا کام بہت آسان ہو جائے گا ۔ اس طرز پر سوچنے والے لوگوں نے دراصل اس دین کی حقیقت اور مزاج پر غور ہی نہیں کیا اور نہ ہی رب العالمین کے مضبوط "منہاج کار" کو سامنے رکھا ہے ' جو اس ذات علیم و حکیم کی حکمت خاص پر مبنی ہے ۔ ظاہر ہے کہ وہی انسانی طبائع اور زندگی کی حقیقی ضروریات کو صحیح معنوں میں جانتا ہے ۔

یہ خیال دراصل جلد بازی کے باعث پیدا ہوتا ہے اور اس کی مثال اس طرح ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ سہولت کار کی خاطر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت کو ایک قومی نصب العین کے عنوان سے یا کسی اجتماعی نصب العین کے رنگ میں یا کسی اخلاقی اصلاح کے نام سے شروع کرتے ۔ اس صورت میں آپ کو وہ مشکلات پیش نہ آتیں جو آئیں ۔ لیکن یہ انداز فکر درست نہیں ہے ۔ سب سے پہلے ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ کی طرف یکسو ہو جائیں ' اس کی مکمل اطاعت کا اعلان کر دیں ' اس کی شریعت کو غیر مشروط طور پر تسلیم کر لیں اور اس کے علاوہ تمام دوسرے شرائع کا انکار کر دیں ۔ یہ وہ کام ہے جو سب سے پہلے ہونا ضروری ہے اور اسے نظام اسلامی کی تفصیلات پیش کرنے سے پہلے سرانجام پا جانا چاہئے ۔ اس کے بعد اسلامی نظام کی تفصیلات پیش کی جائیں جو انسانوں کے لئے افادیت رکھتی ہیں اور مرغوب ہیں ' تاکہ شریعت کی جانب میلان اور رغبت کی اساس خالص اطاعت الٰہی ہو اور شریعت پر عمل کرنے والوں کے پیش نظر یہ ہو کہ وہ غیر اللہ کی غلامی سے آزاد ہو کر صرف اللہ کی غلامی چاہتے ہیں ۔ ان کی پیش نظر صرف یہ جذبہ نہ ہونا چاہئے کہ اسلامی نظام حیات کو وہ

اس لئے قبول کر رہے ہیں کہ وہ اپنی تفصیلات کے لحاظ سے دوسرے تمام نظام ہائے زندگی سے بہتر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نظام اسلامی اپنی جگہ ایک بہترین اور افضل ترین نظام ہے کیونکہ وہ اللہ کے تجویز کردہ قانون کی شکل میں آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی انسانی قانون کبھی الٰہی قانون کا ہمسر نہیں ہو سکتا لیکن یہ چیز اصول دعوت میں سے نہیں ہے۔ دعوت دین کا اصل الاصول یہ ہے کہ اللہ کی شریعت جیسی بھی ہو اسے قبول کیا جائے اور غیر اللہ کی شریعت کو رد کیا جائے ' خواہ وہ خوشنما کیوں نہ ہو...... یہی ہے حقیقت اسلام۔ اس کے سوا اسلام کا کوئی اور مفہوم نہیں ہے۔ جو شخص ابتدائی طور پر اسلام کی طرف مائل ہو گیا اس نے گویا معاملے کا فیصلہ کر دیا۔ اب اسے اس نظام کی خوبصورتی اور افضلیت سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ایمان کی بدیہات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

(مصنف یہاں تسلیم و رضا کے اعلیٰ مدارج بیان کر رہا ہے۔ جس کے بعد کسی کو شریعت محمدیہ کی فضیلت بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی لیکن ظروف و احوال کی تبدیلی سے دعوت دین کے طریق کار میں تبدیلی ضروری ہوتی ہے۔

ایک وقت تھا کہ پوری انسانیت نظام اسلامی اور اسلامی تہذیب کو افضل ترین تہذیب کی حیثیت سے مانتی تھی۔ مسلمان دنیا میں مہذب ترین مخلوق تھے۔ لیکن اس وقت صورت حال یہ ہے کہ نہ صرف غیر مسلم بلکہ اکثر مسلمان بھی اسلام کی فضیلت کے قائل نہیں رہے حتیٰ کہ وہ اسے قابل عمل بھی نہیں سمجھتے۔ اس لئے ان حالات میں ہمیں نہ صرف یہ کہ اسلام کی افضلیت کو اجاگر کرنا ہے بلکہ دنیا پر یہ ثابت کرنا ہے ' کہ اسلام قابل عمل بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس میدان میں گراں قدر تصنیف پیش کی۔ آپ سے پہلے امام غزالی نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ خود قرآن اور حدیث سے یہ ثابت ہے کہ خدا اور رسول نے اسلام کی افضلیت اور افادیت کو بطور ترغیب پیش فرمایا۔ ایک موقع پر حضور نے قریش کے رؤسا کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں تمہیں ایسے کلمے کی طرف دعوت دیتا ہوں کہ اگر تم اسے تسلیم کر لو تو عرب و عجم تمہارے زیر نگیں ہو جائیں۔ (مترجم))

## نظریاتی اصلاح کا انداز

اس موقع پر ہمارے سامنے قدرتی طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ قرآن مجید نے پورے تیرہ سالہ مکی دور میں عقائد کے مسئلہ کو کس طرح حل کیا؟ دراصل قرآن مجید نے عقائد کو نہ تو محض نظریہ کے طور پر پیش کیا ہے اور نہ ہی مسائل ''لاہوت'' کی شکل میں بیان کیا ہے۔ نیز اس نے علم کلام کی متداول اصطلاحات کا وہ انداز بھی اختیار نہ کیا' جو ''علم التوحید'' کے عنوان سے کلامی کتابوں میں موجود ہیں۔

قرآن مجید نے براہ راست فطرت انسانی سے خطاب کیا' جو اس کے وجود کے اندر ودیعت تھی۔ نیز اس نے استدلال کا سادہ طریقہ اختیار کرتے ہوئے انہی فطری دلائل و شواہد سے استدلال کیا جنہیں ہر انسان اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات میں دیکھ رہا تھا۔ اسلام کا انسانیت پر یہ عظیم احسان ہے کہ اس نے فطرت انسانی کو جاہلیت کی دبیز تہوں کے نیچے سے نکالا اور اس کے دل و دماغ کو اوہام و اساطیر کے زنگ سے صاف کیا' جس نے اسے سوچنے سمجھنے اور قبولیت حق کی استعداد سے محروم کر دیا تھا۔ قرآن نے ان کے دل و دماغ کے دروازے قبولیت حق کے لئے کھول دیئے اور انسان اس قابل ہو گئے کہ صالح افکار و خیالات کو اخذ کر سکیں۔

یہ کام قرآن کریم نے عمومی انداز میں کیا' لیکن اس کے لئے قرآن کریم کے حاملین کو ایک زبردست نظریاتی جنگ بھی لڑنا پڑی' کیونکہ لوگوں کی فطرت سلیمہ تعطل کا شکار تھی اور غیر صالح افکار کے تہ بہ تہ پردوں میں مستور تھی۔ اسے

اس حالت سے نکالنے کے لئے' اسلام کو زبردست جدوجہد کرنی پڑی۔جب ہم قرن اول کے اسلامی نظریاتی انقلاب اور زمانہ حال کے نظریات کا مقابلہ کرتے ہیں تو ان میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔اسلام محض نظریہ ہی نہ تھا بلکہ ایک تحریک بھی تھا اور اس تحریک کو' اپنے راستے سے رکاوٹوں' بندشوں اور مشکلات کو دور کرنے کے لئے' خونریز معرکوں سے دوچار ہونا پڑا۔یہ نظریاتی انقلاب محض ذہنی اور جدلی معرکہ نہ تھا جس کی بنیاد منطق پر ہو اور جس کے نتیجے میں کوئی علم الکلام مدون ہو جائے۔(اگرچہ یہ چیزیں بھی اپنی جگہ ایک اہمیت رکھتی ہیں)بلکہ اس نظریاتی اقدام کا مقابلہ ایک زندہ معاشرے سے تھا' جو اپنے طور پر ہر قسم کے ہتھیاروں سے مسلح تھا' چنانچہ قرآن نے اس صورت حال سے نمٹنے اور اس معاشرے کو توڑنے کے لئے پوری انسانیت سے اپیل کی۔اسلام کے نظریات کے لئے لاہوتی (Divinity) شکل بھی مناسب نہ تھی کیونکہ اسلامی نظریہ حیات اگرچہ درحقیقت ایک عقیدہ ہی ہے لیکن عقیدے کے ساتھ ساتھ وہ ایک مکمل نظام حیات بھی پیش کرتا ہے اور اسے عملاً نافذ کرنے کا بھی مطالبہ کرتا ہے' اس لئے وہ اپنے آپ کو لاہوتی ابحاث کی طرح ایک محدود دائرے کے اندر محدود نہیں کرتا۔

## اندرونی اور بیرونی کشمکش

قرآن نے جماعت مسلمہ کے دل و دماغ میں پاک اور صالح عقائد و نظریات بٹھانے کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی کیا کہ اس جماعت کو لے کر' اپنے اردگرد پھیلی ہوئی جاہلیت کے ساتھ چومکھی لڑائی کا اعلان کر دیا یہ جنگ اس قدر ہمہ گیر و ہمہ پہلو ہو گئی کہ اس بیرونی جنگ کے ساتھ ساتھ جماعت مسلمہ کو اپنے ضمیر' اپنے اخلاق اور اپنے معاشرے کے اندر جمے ہوئے جاہلی اثرات کے خلاف بھی لڑنا پڑا۔یہ تھے وہ خاص حالات جن کی وجہ سے اسلامی نظریہ حیات کی نشوونما' ایک خالص نظریے (Theory) کی شکل میں یا لاہوت (Divinity) کی شکل میں یا علم کلام کے لاحاصل جدلیات کی شکل میں نہیں ہوئی بلکہ یہ نشوونما ایک مجسم اور زندہ اجتماعیت کی شکل میں ہوئی' ایک ایسی تنظیم کی شکل میں' جس کا عملی زندگی سے گہرا تعلق تھا۔یہ اجتماعیت اور یہ تنظیم' جماعت مسلمہ کی اجتماعی زندگی میں عملاً موجود تھی اور کام کر رہی تھی۔اس تصور حیات کے مطابق امت مسلمہ کے اعتقادی تصورات اور ان عقائد و تصورات کے مطابق ان کی زندگی کی تعمیر ہوتی رہی اور جاہلیت کے ساتھ عملی ٹکراؤ کی وجہ سے' ایک منظم محارب قوت کی حیثیت سے' اس کی عملی تربیت بھی ہوتی رہی۔جماعت کی یہ خارجی نشوونما ہی درحقیقت اس کی نظریاتی تعمیر و ترقی کی آئینہ دار تھی اور یہ عملی جدوجہد جماعت کے عقائد کی زندہ ترجمانی تھی۔

تحریک اسلامی کے ہر داعی کا یہ فرض ہے کہ وہ اس دین کے مزاج اور تحریک اسلامی میں اس کے پروگرام کو انہی خطوط پر سمجھنے کی کوشش کرے جن پر ہم نے سمجھنے کی کوشش کی ہے تاکہ انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اس پروگرام کے مطابق تعمیر افکار کا یہ طویل کی دور' عملی تعمیر سے خالی نہ تھا بلکہ اس میں مسلسل تحریک اسلامی کی عملی تشکیل و تعمیر بھی ہوتی رہی اور کارکنوں کی ایک ٹھوس جماعت وجود میں آگئی۔یہ مرحلہ محض علمی اور نظریاتی درس و تدریس کا نہ تھا بلکہ اس مرحلے میں تحریک اسلامی کی بنیادیں اٹھائی جا رہی تھیں۔یہ بنیادیں افکار و عقائد اور تحریک جماعت کے عملی وجود پر مشتمل تھیں اور سب کی تعمیر ساتھ ساتھ ہو رہی تھی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جہاں اور جب بھی کام شروع کیا جائے اسے انہی

خطوط پر کیا جانا چاہئے۔

(مصنف نے بڑی خوبی سے اسلام کی تحریکت کو واضح کیا ہے۔ اگر اسے غور سے پڑھا جائے اور حضور اکرم ؐ کی سیرت طیبہ سامنے ہو تو وہ تمام اختلافات ازخود ختم ہو جاتے ہیں جو احیائے اسلام کی مختلف تحاریک کے پروگراموں میں موجود ہیں۔ بعض لوگ اس وقت اس کوشش میں ہیں کہ مسلمانوں کے دل میں ایمان بٹھا دیا جائے۔ عملی خرابیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ جاہلیت کے ساتھ الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جاہلیت چونکہ حکومت و اقتدار کی شکل میں ہوتی ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ اسلام کو حکومت و اقتدار سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور یہ کہ حضور نے مکی دور میں محض ایمان و عقائد کی تبلیغ کی ہے۔ سید صاحب کا مقصد یہ ہے کہ مکی دور میں عقائد کی تعمیر اس طرز پر ہوئی تھی کہ اصلاح حکومت اور جاہلیت سے عملی ٹکراؤ اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ ان عقائد کی ذہن نشینی کا لازمی تقاضا اور پہلا نتیجہ عملی تحریک کی شکل میں ظاہر ہوا تھا اور جس حد تک ممکن تھا اندرونی اور بیرونی جاہلیت سے تصادم کا سلسلہ اول روز سے ہی جاری تھا۔ اگر ایسا نہ تھا تو بیت ارقم میں خفیہ کام کی ضرورت کیا تھی۔ مخالفین کے ساتھ ٹکراؤ اور نام لے کر ان کے بتوں کی مذمت کی ضرورت کیا تھی۔

غیر متحرک اور جامد ایمان کی تبلیغ درحقیقت جاہلیت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے سے گریز ہے۔ حضور ؐ صرف یہ تبلیغ نہ کرتے کہ لوگو بتوں کی پوجا چھوڑ دو بلکہ وہ بتوں کی تذلیل بھی کرتے تھے اور جاہلیت کو مٹانے کا اعلان بھی کرتے تھے۔ لہٰذا صرف یہ دعوت اور مطالبہ کافی نہیں ہے کہ اسلامی قانون جاری کیجئے بلکہ اس کے ساتھ یہ اعلان بھی ضروری ہے کہ ہم غیر اسلامی قوانین کو ختم کر کے دم لیں گے۔ (مترجم)

تعمیر افکار کا طویل دور اسی طریق کار کے مطابق ہونا چاہئے اور یہ تعمیر بتدریج 'عمیق اور مضبوط بنیادوں پر ہونی چاہئے۔ نیز یہ تعمیر محض عقائد کی فلسفیانہ تدریس تک ہی محدود نہ ہو بلکہ اس فکری تعمیر کے مرحلے کو ان عقائد کا زندہ ترجمان بھی ہونا چاہئے۔ حالت یہ ہو کہ عقیدہ زندہ شکل میں چلتا پھرتا نظر آئے 'اس کا کیف و سرور انسانوں کے دلوں میں جاگزیں ہو اور وہ ایک اجتماعی اور متحرک معاشرے میں متشکل نظر آئے 'جس کی تعمیر و ترقی اندرونی طور پر بھی اور بیرونی لحاظ سے بھی اسی عقیدے کی تعمیر و ترقی کی زندہ تعبیر ہو۔ نیز اس کے ساتھ وہ معاشرہ نظریات کے میدان میں بھی اور خارجی زندگی کے عملی میدان میں بھی جاہلیت سے برسرپیکار ہو۔ وہ ایک زندہ عقیدے کا مظہر ہو اور معرکہ حق و باطل کے طوفانوں میں اس کی نشوونما ہو رہی ہو۔

اسلامی نقطہ نظر سے 'یہ خیال حد درجہ غلط ہے کہ عقیدے کو محض نظریے (Theory) یا محض علمی درس و تدریس یا محض ادب و ثقافت کے طور پر پڑھایا پڑھایا جائے ...... یہ طریق فکر نہایت خطرناک ہے۔

قرآن مجید نے عقائد و نظریات کی تعمیر و تطہیر میں تیرہ سال اس طرح نہیں گزار دیئے کہ اس نے کچھ عقائد بیان کر دیئے اور لوگوں کو بیان عقائد کے بعد اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہو۔ تاریخ اس کے خلاف شاہد ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ پورے قرآن مجید ہی کو ایک دفعہ نازل فرما کر چھوڑ دیتے اور مسلمان تیرہ سال تک اسے پڑھتے پڑھاتے رہتے یہاں تک کہ وہ پورے نظریہ اسلامی سے واقف ہو جاتے۔

لیکن ' اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تحریک اسلامی کے لئے ایک خاص اور منفرد طریق کار مطلوب تھا۔ عقیدہ 'تحریک اور جماعت کی تعمیر و تشکیل بیک وقت مطلوب تھی۔ یوں کہ عقیدہ ایک فعال و متحرک جماعت کا اوڑھنا بچھونا بن جائے اور اس کی تعمیر جماعت اور تحریک کی شکل میں ہو۔ ایک فعال جماعت اور ایک منظم تحریک اس عقیدے کا ظاہری قالب ہو۔ اس ذات علیم و خبیر کو خوب معلوم تھا کہ کسی نفس کی اصلاح اور کسی جماعت کی تشکیل دنوں اور ہفتوں کا کام نہیں ہے۔ تربیت اخلاق اور تنظیم جماعت کے لئے جس قدر وقت درکار ہوتا ہے' اتنا ہی وقت تطہیر افکار اور عقائد کی پختگی کے لئے بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس طریق کے مطابق جب عقائد راسخ اور کردار پختہ ہو گیا تو پوری امت مسلمہ اسلام کا مظہر بن گئی۔

یہ اس دین کی اہم خصوصیت ہے اور یہی اس کا مزاج ہے۔کی دور کی روشنی میں 'اس خصوصیت کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ ہمارے لئے سخت مضر ہے کہ ہم زمانہ حاضرہ کے نظریات سے متاثر ہو کر یا اپنی مخصوص خواہشات کی خاطر اس دین کو بدلنے کی کوشش کریں۔اس دین نے اپنی انہی خصوصیات اور اسی مزاج کی وجہ سے تاریخ انسانی میں 'امت مسلمہ جیسی عظیم امت کو جنم دیا تھا۔ آئندہ بھی احیاء امت کی کوئی کوشش اگر کامیاب ہوسکتی ہے تو وہ اسی طریق کار کو اختیار کرنے سے ہو سکتی ہے 'جس کے مطابق پہلی بار اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو برپا کیا تھا۔

اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف حلقوں کی طرف سے اسلام کے ان زندہ 'متحرک اور واقعیت پسندانہ افکار و نظریات کو 'محض ایک ثقافتی اور تدریسی نظریہ (Theory) بنانے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں انہیں سمجھیں اور کامیاب نہ ہونے دیں کیونکہ اسلام دراصل ایک فعال اور زندہ معاشرے میں منعکس ہونا چاہتا ہے۔اس تصور کے مطابق اگر کام کیا گیا تو وہ اپنی اس خصوصیت اور اس مزاج کو کھو دے گا اور ہم اسلامی نظریہ حیات کو لے کر دوسرے نظریات کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔

تحریک احیائے اسلام میں اس بات کو بے حد اہمیت حاصل ہے کہ اسلامی نظریہ حیات کا ظہور انسان کی عملی زندگی میں ہو۔ ایک حقیقی تنظیم کی شکل میں 'ایک زندہ و فعال معاشرے کی صورت میں اور ایک ایسی تحریک کے کردار میں جو ہر جانب سے جاہلیت کے ساتھ نبرد آزما ہو۔یہ تحریک مسلسل 'یہ کوشش کر رہی ہو کہ خود اس کے اندر سے بھی جاہلی افکار و خیالات اور اطوار و عادات ختم ہو جائیں کیونکہ تحریک میں جو لوگ آتے ہیں بہرحال وہ جاہلیت کی صفوں میں سے چھٹ کر آتے ہیں اور اسلامی نظریہ حیات کو اختیار کرنے سے پہلے وہ جاہلی افکار کے حامل ہوا کرتے ہیں۔جب اسلامی نظریہ حیات 'انہیں جاہلی طبقات میں سے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے تو وہ جاہلی افکار سے چشم زدن میں پاک و صاف نہیں ہو جاتے کیونکہ جاہلیت انسان کے دل و دماغ 'اس کی ذہنیت 'بلکہ اس کی عملی زندگی کے اتنے وسیع حصے پر چھائی ہوئی ہوتی ہے جو محض "نظریہ" کے محدود دائرہ اثر تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس سے باہر بھی ہوتا ہے۔اس میں شک نہیں کہ جاہلیت نظریات اور نظریات کے عناصر ترکیبی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے تاہم اس کا دائرہ اثر 'نظریہ محض (Theory) سے کہیں وسیع تر ہوتا ہے۔

## کائنات کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر

الوہیت 'کائنات کے وجود 'زندگی اور انسان کے بارے میں اسلامی نظریہ ایک کامل اور وسیع نظریہ ہے 'لیکن ایک نظریہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ واقعیت پسند اور مثبت فکر بھی ہے۔

اسلامی نظریہ حیات 'اپنے مزاج کے اعتبار سے اس بات سے ابا کرتا ہے کہ وہ محض ایک تصور یا ذہنی فلسفہ یا تدریسی نظریہ ہو کیونکہ یہ اس کے طبعی مزاج اور اس کی اصل غرض و غایت ہی کے خلاف ہے۔اس کا مزاج یہ ہے کہ وہ کچھ لوگوں کی زندگیوں میں 'ایک زندہ تنظیم کی شکل میں اور ایک ٹھوس تحریک کی شکل میں ظاہر ہو اور اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ کچھ لوگوں کی زندگیوں میں سے پھوٹ کر نکلے 'اسے ایک تنظیم ملے 'اس کے پیچھے ایک ٹھوس تحریک ہو اور اس کی تعمیر نظریاتی طور پر اور عملی پہلو سے بیک وقت مکمل ہو۔یہاں نظریت اور عملیت میں دوئی اور فرق نہیں ہے بلکہ اسلامی نظریہ حیات ایک چلتا پھرتا نظریہ ہوتا ہے اور ایک فعال تحریک ہوتا ہے۔رہی اسلام کی ایسی نظریاتی تعبیر جس کے پیچھے کوئی تحریک نہ

ہو اور اس کے ساتھ ساتھ کسی قسم کی عملی حرکت نہ ہو' تو یہ ایک نہایت ہی خطرناک تعبیر ہے۔ایک غلط رجحان ہے اور اسلامی نظریہ حیات کی فطرت' اس کی غرض و غایت اور ایک فرد کے تزکیہ نفس کے بلند تر مقصد کے سراسر خلاف ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو متفرق طور پر نازل فرمایا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

(وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ)------(عَلَى مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا)

اور قرآن جسے ہم نے متفرق اور ٹکڑے ٹکڑے بنایا تاکہ آپ اسے لوگوں تک وقفہ وقفہ کے بعد پہنچائیں اور ہم نے اسے بتدریج نازل کیا ہے۔" (اسراء :۱۰۶)

یعنی قرآن کریم کو مجملا" مجملا" اور وقفوں کے بعد نازل کیا گیا اور مطلوب یہ تھا کہ اسلامی نظریہ حیات کی بنا اور تعمیر ایک زندہ تنظیم کی شکل میں ہو محض "نظریہ" (Theory) کی صورت میں نہیں۔

نیز ہمیں اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ جس طرح یہ دین اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ رسول نازل کیا گیا اسی طرح اس کا طریق کار بھی اللہ تعالیٰ نے سنت رسول کے ذریعے مقرر فرما دیا۔یہ مسنون طریق کار ہی اس دین کے مزاج کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور اس دین اور اس کے فطری طریق کار کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہمارے پیش نظر رہے کہ جس طرح اسلام نظریاتی اصلاح کے ذریعہ انسان کے کردار میں اصلاح اور تبدیلی چاہتا ہے' بعینہٖ اسی طرح وہ اس طریق کار کو بھی بدل دینا چاہتا ہے جس کے مطابق فکری اور نظریاتی اصلاح درکار ہے۔مثلاً یہ کہ وہ محض فکری تعمیر' فلسفیانہ طور پر نہیں چاہتا بلکہ وہ فکری اصلاح اور راہنمائی کے ساتھ ساتھ ایک تحریک بھی برپا کرنا چاہتا ہے' تاکہ ایک ایسی امت (Great Nation) کی تعمیر ہو جس کے طرز فکر میں اعتقادی تصورات اور ایک زندہ و فعال معاشرے کا وجود ساتھ ساتھ موجود ہوں۔غرض اسلامی نظریہ حیات کی رو سے اس کے طرز فکر' اور اس فکر کے مطابق اساسی تصورات اور ان تصورات کے مطابق وجود میں آنے والے معاشرے کے درمیان ایسی کوئی حد فاصل نہیں ہے کہ جب ایک پر کام ہو رہا ہو تو دوسرے کو ہاتھ نہ لگایا جائے' احیائے دین کے اسلامی طریق کار کے مطابق سب پر بیک وقت کام ہو گا۔

## اس طریق کار کی اہمیت

احیائے دین کے اس طریق کار کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں اس بات کو اپنے ذہن میں رکھنا چاہئے کہ یہ طریق نہایت اہم اور نہایت بنیادی ہے۔یہ کسی خاص مرحلے' کسی خاص خاندان اور کسی خاص معاشرے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اور نہ ہی یہ طریق پہلی تحریک اسلامی کے ظروف و احوال کے ساتھ مخصوص تھا۔یہ ایسا طریق کار ہے جس کو اختیار کیے بغیر احیائے دین کا کام کسی جگہ اور کسی زمانے میں بھی نہیں ہو سکتا۔

اسلام کے پیش نظر صرف یہ نہ تھا کہ لوگوں کے کچھ عقائد میں تبدیلی کر کے اور معاشرتی حالات میں کچھ اصلاحات کر کے بیٹھ جائے۔وہ لوگوں کے فکر و نظر میں ہمہ گیر تبدیلی چاہتا تھا اور یہی وہ مہم تھی جس کا بیڑا اس نے اٹھایا۔اس نے انہیں نظریہ بھی دیا اور واقعیت بھی دی اور اس کے لئے ایک خاص طریق کار بھی دیا اور چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ طریق کار

ہے اس لئے وہ اپنے مزاج کے اعتبار ہی سے انسانوں کے وضع کردہ ناقص طریق ہائے کار سے' سراسر مختلف ہے۔

اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام زندگی کا حصول اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہم اپنے اندر اسلامی طرز فکر (Islamic Way of Thinking) پیدا نہ کرلیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی طرز فکر پر لوگوں کے افکار و تصورات کی تعمیر کی اور ان کے تمام عقائد درست ہوگئے اور ان کی عملی زندگی کی تشکیل اور تعمیر بھی صحیح خطوط پر ہوئی۔ جدید افکار سے متاثر ہو کر جب ہم اسلامی نظریہ حیات کو محض تعلیمی اور تدریسی نظریہ بنا دیں گے تو وہ اپنا مخصوص مزاج کھو دے گا اور ہم اس ذہنی شکست کا شکار ہوں گے کہ گویا اسلامی طریق کار اور الٰہی نقطہ نظر انسانی نظریوں اور نظاموں سے فروتر ہے یا یہ کہ وہ ان سے ناقص ہے اور ہم یہ تبدیلی کر کے اس کے نقص کو دور کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ انسانی طریق کار اور معیار کے مطابق ہو جائے ........ یہ ایک عظیم شکست ہوگی اور تباہ کن بھی۔

اسلامی نظام حیات کی خصوصیت یہ ہو کہ وہ تحریک اسلامی کے کارکنوں کو ایک خاص طرز فکر عطا کرے اور انہیں جاہلی طرز فکر کے بندھنوں سے آزاد کر دے' جو اس وقت ہر طرف چھائے ہوئے ہیں اور جن سے ہماری تنظیمیں اور ہماری پوری ثقافت متاثر ہے۔ اگر ہم اسلامی نظام حیات کو اسی نقطہ نظر سے دیکھیں' جو کسی دنیاوی جاہلی نظام کے بارے میں رکھا جاتا ہے تو یہ اسلامی نظام حیات کے مزاج کے سراسر خلاف ہو گا اس طرح اس دین کا وہ اصلی مقصد ہی فوت ہو جائے گا جو مقصد وہ فلاح انسانیت کے سلسلے میں پیش نظر رکھتا ہے۔ اس نقطہ نظر کو اختیار کرنے کے بعد ہمارے لئے یہ بے حد مشکل ہو گا کہ ہم جاہلی نظام حیات سے نجات پا سکیں۔ جب کہ یہ نظام اس وقت ہر طرف سے غلبہ پا رہا ہے۔ اس طرح ہم ایک زریں موقع کھو دیں گے اور ہماری اجتماعی زندگی جاہلی نظریات اور غیر اسلامی افکار کے نیچے دب جائے گی اور اس کے نتائج دوررس اور تباہ کن ہوں گے۔

## نقطہ نظر کا توازن

تحریک احیائے اسلام میں طرز فکر اور طریق کار' تصور حیات اور نظام حیات کے درمیان اہمیت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ طرز فکر اور طریق کار کسی وقت بھی مفصل نظام حیات اور تصور حیات سے منفصل نہیں ہوتے اور اس تصور حیات اور نظام حیات کو اگر محض تعبیری شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتیجے میں قطعاً کوئی تحریک وجود میں نہ آئے گی اور اسلامی نظریہ حیات محض ذہنی نظریہ بن کر رہ جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اگر ہم اسلام کے تصور حیات کو پیش کرنے کے لئے محض تعبیری طریق کار کو اختیار بھی کرلیں تو پھر بھی اس سے وہی لوگ مستفید ہو سکیں گے جو عملاً اس تحریک کو اپنائے ہوئے ہوں اور یہ بھی اس صورت میں کہ جس منزل پر یہ کارکن ہوں اس میں وہ اسلامی نظام حیات کے احکامات پر پوری طرح عمل پیرا ہوں۔ یعنی اس نظریہ حیات سے استفادہ مقدار عمل کے مطابق اٹھایا جاسکتا ہے' مقدار علم کے مطابق نہیں۔ غرض میری ان معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تصور حیات فی الفور ایک تحریک کی شکل میں ظاہر ہونا چاہئے اور یہ تحریک اس تصور حیات کی صحیح تمثیل اور ترجمہ ہو۔ یہی اسلامی نظام حیات کے قیام کا فطری طریق کار ہے اور تمام دوسرے طریقوں سے اعلیٰ' ارفع اور ٹھوس بھی ہے۔ انسانی فطرت کے ساتھ زیادہ مطابق بھی ہے اور اس میں زیادہ تحریکیت اور فعالیت پائی جاتی ہے۔ محض جامد شکل میں ایک مستقل اور مکمل نظریہ

حیات پیش کر دینے سے یہ طریق کار زیادہ مفید ہے کیونکہ اس میں فعال اور متحرک لوگوں کے سامنے لائحہ عمل پیش ہوتا ہے اور غیر متحرک لوگوں سے واسطہ نہیں پڑتا بلکہ لوگ ذہنی تصورات اور نظریہ حیات کی جیتی جاگتی تصویر ہوتے ہیں۔

## تحریک اسلامی اور علمی تحقیقات

اگر میری یہ رائے اصل اسلامی نظریہ حیات کے بارے میں درست ہے تو اسے اسلامی نظریہ حیات کے اساسی تصورات کے بارے میں بھی درست ہونا چاہئے۔ نیز اسلامی نظام حیات کے مفصل قوانین پیش کرنے کے مسئلے میں بھی یہی طریق کار 'یعنی تدوین و نفاذ کا اتحاد ہی درست ہونا چاہئے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہمارے اردگرد جاہلیت کا گھٹاٹوپ اندھیرا ہے۔ وہ تحریک اسلامی کے کارکنوں پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ جوں جوں وہ احیائے دین کے لئے 'اسلامی نظام حیات کے مقررہ طریق کار کے مطابق قدم آگے بڑھاتے ہیں وہ ان سے بڑے معصوم لہجے میں سوال کرتی ہے کہ جس نظام حیات کی طرف تم لوگوں کو بلا رہے ہو اس کی تفصیلات کیا ہیں۔ اس کے نفاذ کے لئے تم نے کیا کیا علمی تحقیقات کی ہیں' اس کی علمی اور نظری بنیادیں کہاں تک تیار ہو چکی ہیں اور جدید خطوط پر اسلامی فقہ کی تدوین کہاں تک ہوگئی ہے؟ ان معصومانہ سوالات کو سن کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا اسلامی نظام حیات کے نفاذ کی راہ میں 'اب صرف یہی رکاوٹیں حائل ہیں کہ صرف فقہی احکامات کی تدوین اور بعض فقہی موضوعات پر تحقیق کی ضرورت پوری ہو جائے۔ رہی جاہلیت تو وہ تو اللہ کی حاکمیت کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے اور تمام لوگ اس کے لئے آمادہ ہو چکے ہیں کہ اسلامی قوانین کو نافذ کیا جائے۔ مشکل صرف یہ درپیش ہے کہ کوئی ایسا فقیہ' مجتہد اور مقنن نہیں مل رہا جو جدید قانونی خطوط پر اسلامی شریعت کو مدون کر سکے۔ یہ دراصل ایک گہری سازش اور ایک کھلا مزاح ہے جو شریعت اسلامیہ کے ساتھ کیا جا رہا ہے اور ہر حساس دل کو اس کی طرف خاطر خواہ توجہ دینا چاہئے۔

جاہلیت کے پیروکار ایسے سوالات اٹھا کر' دراصل شریعت اسلامی کے نفاذ سے پہلوتہی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو بدستور غیر اسلامی اور انسانی قوانین کے تابع رکھا جائے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ تحریک اسلامی کو اقامت دین کے اسلامی طریق کار سے ہٹا دیا جائے 'تعمیر افکار اور احیائے تحریک کے ضروری مرحلے کو نظرانداز کر دیا جائے اور اس سے پہلے ہی قانون کی تدوین شروع کر دی جائے' حالانکہ اقامت دین کا صحیح طریق کار یہ ہے کہ سب سے پہلے اسلامی نظریہ حیات تحریک اسلامی کی فعال شکل میں ظہور پذیر ہو اور اقامت دین کا جو مرحلہ درپیش ہو اس کی حقیقی ضرورت کے مطابق ہی تفصیلی قوانین کو سامنے لایا جائے اور تدوین قانون اس وقت ہو جب اس کی ضرورت درپیش ہو۔

تحریک اسلامی کے کارکنوں کا یہ فرض اولین ہے کہ وہ اسی طریق کار کو پیش نظر رکھیں۔ سازشوں اور فوجی انقلابات کے طریق کار سے باز رہیں اور اس اسلامی طریق کار کے مقابلے میں 'اپنی طرف سے کوئی طریق کار املاء نہ کرائیں۔ جو لوگ سرے سے خدا اور رسول پر یقین ہی نہیں رکھتے ان کی باتوں پر توجہ نہ دیں۔ یہ لوگ دراصل ہمارے تحریک اسلامی کے کارکنوں کو گمراہ کر کے جلد باز بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہمیں بے حد سنجیدہ ہونا چاہئے۔

اسلام پسند عناصر میں مختلف طریقوں سے جو تنگ دلی پھیلائی جا رہی ہے اس کا مقابلہ بے حد ضروری ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس سازش کو بھی ناکام بنائیں اور اس پست ذہنیت کو نظرانداز کر دیں جو "فقہ اسلامی کے ارتقاء" کے نام

سے ایک ایسے ملک میں پھیلائی جا رہی ہے جو سرے سے شریعت کی اطاعت اور نفاذ کا قائل ہی نہیں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس بے فائدہ مزاح کو نظرانداز کرتے ہوئے صحیح اسلامی طریق کار کے مطابق اپنے حقیقی نصب العین کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہوا میں تخم ریزی کا فائدہ کچھ نہ ہو گا۔ اسلامی تحقیقات اور فقہی ارتقاء کا یہ خوش آئند کھیل دراصل ایک گہری سازش ہے اور ہمارا فرض یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں احیائے دین کے صحیح اور فطری طریق کار ہی پر ڈٹ جائیں۔ اسی میں اس دین کی قوت کا راز مضمر ہے اور وہی ہمارے کارکنوں کی معنوی قوت کا مصدر ہے۔

(اس وقت مصر میں پاکستان کے ادارۂ ثقافت اسلامیہ اور مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی کی طرز پر کئی ادارے اسلام پر تحقیقات کر رہے ہیں۔ یہ تحقیقات ایسی ہی ہیں جیسے کوئی مشتاق فن ریگستانوں میں اثری اکتشافات میں مصروف ہوتا ہے۔ سید قطب کا مقصد یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو اسلام کے احیاء سے کوئی سروکار ہے نہ وہ لوگ جو ان اداروں میں کام کرتے ہیں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور نہ ان کی حکومتوں کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ ان تحقیقات کو نافذ کیا جائے بلکہ محض علمی اور فنی عیاشی کے طور پر یہ کام کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی کوئی تدبیر اسلام کو مطلوب نہیں ہے۔

البتہ یہ بات اپنی جگہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام کے ہر موضوع پر اٹھائے ہوئے جدید سوالات اور جدید حالات کی روشنی میں تحقیقات کی اشد ضرورت ہے، خصوصاً دفاعی تحقیقات۔ نیز یہ بھی پیش نظر رہے کہ عربوں کے سامنے اسلامی نظام پہلی مرتبہ پیش ہوا اور ساتھ ساتھ بتدریج اس پر عمل بھی ہوتا رہا ہے۔ لہٰذا قدرتی طور پر تعمیر افکار، اس کا طریق کار اور تحریک اسلامی اور تشکیل نظام حیات کے کام ساتھ ساتھ ہی ہوتے رہے۔ لیکن اب ہم جس صورت حال سے دوچار ہیں اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک طرف عوام الناس ہیں جو اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے آمادہ ہیں یا کم از کم اس کے مخالف نہیں ہیں کہ ان پر یہ نظام نافذ کیا جائے اور دوسری طرف ایک محدود اقلیت ہے جو اسلامی نظام کے نفاذ کی امکانیت کی قائل نہیں اور یہ اقلیت محض طاقت اور اقتدار کے بل بوتے پر اسلامی نظام حیات کے راستے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے، لہٰذا اس صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے بعینہٖ وہ طریق کار جس میں تمام لوگوں کو غیر مسلم فرض کر کے اختیار کیا جاتا ہے، نہیں اپنایا جا سکتا۔

ایک دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ دور اول میں اسلامی قوانین کی تفصیلات پر وہ غیب میں مستور تھیں اور جاہلیت کے حامل صرف انہی قوانین اور احکامات پر اعتراض کر سکتے تھے جو نازل ہو جاتے تھے۔ لیکن اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اسلامی نظام حیات مفصل طور پر قرآن و سنت میں موجود ہے۔ اسلامی تاریخ مدون ہے اور جاہلیت کو یہ موقع مل رہا ہے کہ وہ اسلامی ثقافت کے بارے میں قسم قسم کے اعتراضات اٹھائے۔ لہٰذا اسلامی نظام حیات کے احیاء کے ابتدائی طریق کار کے ہر مرحلے میں یہ ضروری ہو گا کہ جاہلیت کے اعتراضات کا دفعیہ کیا جائے اور اسلامی قوانین کے مختلف گوشوں کی وضاحت کی جائے۔ نیز اس وقت ساری دنیا کو زندگی کے اساسی مسائل کا سامنا ہے اور مختلف نظام ہائے حیات کی باہمی آویزش میں صرف وہی نظام حیات کامیاب ہو سکتا ہے جو عالمی مسائل کا بہترین حل پیش کرتا ہو۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ تحریک اسلامی اس میدان میں بھی اسلامی نظام حیات کی برتری کو ذہن نشین کرائے۔ اس طرح صحیح خطوط پر اسلامی تحقیقات کا کام بھی اشد ضروری ہو جاتا ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر سید قطب کا یہ فرمان کہ اسلامی قانون کی تفصیلات کو بالکل نہ چھیڑا جائے خالی از مبالغہ نہیں ہے)۔

احیائے دین کا اسلامی طریق کار اور خود اسلامی نظام حیات آپس میں عین ہیں۔ ان کے درمیان کوئی فرق اور جدائی نہیں ہے۔ اس طریق کار کے سوا کوئی دوسرا طریق کار اسلامی نظام حیات کو جنم نہیں دے سکتا۔ کسی دوسرے طریق کار کے نتیجے میں کوئی انسانی اور جاہلی نظام حیات ہی جنم لے سکتا ہے۔ اسلامی نظام حیات کا احیاء اس کے مطابق ہرگز نہیں ہو سکتا۔ غرض اس پوری بحث کا نچوڑ یہ ہے کہ احیائے دین کی ہر تحریک اور ہر کوشش میں، احیائے دین کے اسلامی طریق کار کا التزام اس قدر ضروری ہے جس طرح اسلامی نظریہ حیات اور خود اسلامی نظام حیات کا التزام ضروری ہے۔

---ooo---

یہ میری آخری بات ہے اور مجھے یہ یقین ہے کہ اس طویل نوٹ کے ذریعے میں نے مکی سورتوں اور ان کے اندر

طے کردہ منہاج کی پوری پوری وضاحت کر دی ہے۔اب ان تمام قائدین کو چاہیے کہ وہ اپنی تحریکوں کے لئے اسلامی منہاج کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیں جو اسلام کا کام کرنا چاہتے ہیں۔پھر اطمینان کر لیں اور امید رکھیں کہ وہ جس منہاج کو پا چکے ہیں وہ خیر اور بھلائی ہے اور یہ کہ وہی بلند ترین لوگ ہیں اور یہ کہ قرآن کریم جو راہ دکھاتا ہے وہ اقوم اور مضبوط ہے۔(اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ)

---ooo---

اب ہم کچھ بات اس سورہ کے بارے میں کرتے ہیں۔ظلال القرآن میں یہ پہلی مکی سورہ ہے جس پر ہمیں کلام کرنے کا موقعہ مل رہا ہے اور یہ سورہ مکی قرآن اور مکی انداز کلام اور مضامین کی ایک مکمل تصویر ہے 'جس کے خصائص ' جس کے مزاج اور مضامین کے بارے میں ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں۔اس سورہ میں قرآن کریم کے خصائص 'اس کے منہاج کلام 'اس کے موضوع اساسی 'اور طرز ادا کے زاویے سے ایک مثالی بحث موجود ہے۔اس عمومی اسلوب کو اپناتے ہوئے سورہ کے اپنے مزاج کو بھی قائم رکھا گیا ہے۔جس طرح قرآن کریم کی تمام سورتوں کی یہ خصوصیت ہے کہ ان میں قرآن کریم کے عمومی اسلوب اور اخذ کے ساتھ ساتھ سورہ کا ایک خاص مزاج اور اسلوب بھی قائم رکھا گیا ہے۔اور ہر سورہ کا مخصوص ماحول دوسری سورتوں میں نہیں پایا جاتا۔چنانچہ قرآن کریم کی ہر سورہ کی اپنی ذاتی شخصیت بھی ہوتی ہے 'اس کا ایک علیحدہ محور ہوتا ہے ' ہر سورہ کے مخصوص خدوخال ہوتے ہیں اور اس کا ایک بڑا موضوع ہوتا ہے جس کے گرد تمام مباحث گھومتے ہیں۔پھر اس موضوع کی مناسبت اور دوسرے اسباب جو ادائے مطلب کو نہایت ہی موثر بناتے ہیں۔مخصوص منظرکشی 'مخصوص سائے اور مخصوص فضا ہر سورہ میں ممیز و ممتاز نظر آتی ہے۔

ہر سورہ میں مخصوص اسلوب کے جملے بار بار تکرار کے ساتھ آتے ہیں۔موضوعات بعض اوقات ملتے جلتے بھی ہوتے ہیں' سورہ کی شخصیت کا تعین موضوع سے نہیں ہوتا بلکہ کچھ دوسرے خدوخال ہوتے ہیں جو اس سورہ کی شخصیت کے لئے سیٹ کا کام دیتے ہیں جو اس سورہ کے ساتھ خاص ہوتے ہیں اور دوسری سورتوں میں نہیں ہوتے۔

رہی سورہ زیر بحث تو اس کا ایک ہی مرکزی موضوع ہے اور یہ موضوع ہر لمحہ ' ہر وقت' ہر منظر میں نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ایسی خوبصورتی کے ساتھ جس کو دیکھ کر آنکھیں چندھیا جائیں۔ انسان انگشت بدنداں رہ جائے اور اس کی سانس رک جائے۔اس وقت جبکہ کوئی اس کے مناظر پر غور کرے 'اس کے زیروبم کو دیکھے اور اس کے اثرات کو محسوس کرے۔

ہاں یہ ایک حقیقت بہت اہم ہے 'میں اپنے نفس کے اندر اس حقیقت کو پاتا ہوں' جب بھی میں اس سورہ کے سیاق کلام کے ساتھ چلتا ہوں' اس کے مناظر کی سیر کرتا ہوں اور اس کے اثرات کو محسوس کرتا ہوں۔میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص بھی ایک حساس دل رکھتا ہے 'وہ ضرور ان احساسات میں سے کچھ نہ کچھ پائے گا جو میں محسوس کرتا ہوں۔یہ حقیقت ہے کہ اس سورہ کی خوبصورتی انسان کو مبہوت کر دیتی ہے اور دل و دماغ مسحور ہو کر اس کے ساتھ چلتے ہیں۔

یہ سورہ مجموعی لحاظ سے اللہ کی حاکمیت سے بحث کرتی ہے۔اس پوری کائنات کے دائرے میں بھی اور انسانی زندگی کے دائرے میں بھی۔انسانی نفس اور ضمیر کے دائرے میں بھی اور اس دکھائی دینے والی کائنات کے نامعلوم رازوں کے دائرے میں بھی۔نیز عالم الغیب کے نامعلوم رازوں کے دائرے میں بھی۔یہ سورہ اس کائنات کی تخلیق 'اس کرہ ارض

کے اوپر زندگی کی تخلیق' پھر حیوانات کے اوپر انسان کی تخلیق کے باب میں تصور حاکمیت اللہ کو پیش کرتی ہے۔ پھر تاریخی زاویے سے یہ سورہ گزرنے والوں کی باہمی کشمکش اور پھر ان کی جگہ لینے والوں کی جانشینی میں بھی حاکمیت الٰہیہ کے کچھ رنگ دکھاتی ہے۔ غرض اس کائنات کے اوپر نظر ڈالتے ہوئے مظاہر فطرت پر اللہ کی حاکمیت ' دنیا میں رونما ہونے والے بڑے بڑے واقعات میں اللہ کی حاکمیت ' اور دنیا میں خوشحالی اور بدحالی میں اللہ کی حاکمیت اس سورہ کا موضوع ہے۔ قدرت الٰہیہ کے مختلف مظاہر و مشاہد میں اللہ حاکمیت ' انسانی زندگی کے اوپر اللہ کی ظاہری اور باطنی گرفت میں اللہ کی حاکمیت ' اس کرۂ ارض پر رونما ہونے والے واقعات و حوادث میں اللہ کی حاکمیت اور سب سے آخر میں مشاہد قیامت اور لوگوں کے بارگاہ الٰہی میں کھڑے ہونے میں اللہ کی حاکمیت۔

وہ موضوع جو اس سورہ میں آغاز سے انتہا تک چلتا ہے وہ نظریے کا موضوع ہے۔ اس موضوع کے تمام عناصر ترکیبی نظریاتی ہیں اور اس کے تمام پوشیدہ معانی بھی نظریاتی ہیں۔ یہ سورہ انسانی معاشروں کا ہاتھ پکڑتی ہے اور انہیں لے کر اس پوری کائنات کی سیر کراتی ہے۔ یہ انہیں اس کائنات کے نظریاتی سرچشموں اور ان کے ظاہری اور خفیہ اشارات کی سیر کراتی ہے۔ نفس انسانی کو لے کر یہ زمین و آسمانوں کی بادشاہت میں چلتی ہے۔ جہاں یہ نفس عالم ظلمات اور عالم نور کی سیر کرتا ہے' سورج چاند اور ستاروں کے جھرمٹ دیکھتا ہے۔ یہ اس زمین کے باغات میں سیر کرتا ہے جس میں قسم قسم کے پھل ہیں۔ ان پر بارشیں ہو رہی ہیں اور ان کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں۔ پھر یہ سورہ نفس انسانی کو ایسے معرکہ کارزار میں لاکر کھڑا کر دیتی ہے جس میں گذشتہ اقوام مرتی مٹتی نظر آتی ہیں اور ان کے آثار قدیمہ نظر آتے ہیں۔ پھر بحر و بر کے اندھیروں کی سیر کرائی جاتی ہے۔ کچھ غیبی راز بتائے جاتے ہیں۔ انسانی نفسیات کے راز آشکارا ہوتے ہیں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ زندہ مردے سے نکلتا ہے اور مردہ زندے سے نکلتا ہے۔ ایک بیج ہے جو زمین کے پیٹ کی تاریکیوں میں پوشیدہ' ایک نطفہ ہے جو رحم کے اندھیروں میں پرورش پا رہا ہے۔ پھر اس سورہ کی اسکرین پر جن و انس کے غول آتے ہیں' پھر پرندوں اور دوسرے وحوش کے گلے آتے ہیں۔ پھر اولین اور آخرین آتے ہیں۔ زندہ لوگ اور مرے ہوئے لوگ بھی نظر آتے ہیں اور رات و دن کے وقت محافظین الٰہی بھی نظر آتے ہیں۔

یہ بے شمار کائناتی مشاہد و مناظر انسانی حس اور انسانی نفس پر ہر جانب سے حملہ آور ہوتے ہیں۔ انسان بالکل ایک نیا نیچ محسوس کرتا ہے۔ نہایت ہی زندہ احساس نفس کے اندر پیدا ہوتا ہے اور یہ مناظر اور یہ معانی پردہ خیال پر زندہ دوڑتے نظر آتے ہیں۔ حالت یہ ہو جاتی ہے کہ مکرر اور دیکھے ہوئے مناظر اور احساسات بھی بالکل نئے اور انوکھے نظر آتے ہیں' بالکل جدید اور بالکل متحرک اور زندہ۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ احساس اور یہ شعور بالکل پہلی مرتبہ حاصل ہوا ہے۔ گویا اس سے قبل کوئی انسانی ضمیر اور شعور ان احساسات سے کبھی دوچار نہ ہوا تھا۔

یہ سورہ اپنے ان شاہدات و مواقف' اپنے اشارات و اثرات اور اپنی تصاویر و شیڈز کے ساتھ اس طرح جاری و ساری ہے جس طرح کوئی دریا اپنی امواج کے ساتھ جاری و ساری رہتا ہے۔ ایک موج ساحل سے نہیں ٹکراتی کہ دوسری اٹھتی ہے۔ امواج کے اس نشیب و فراز میں اس سورہ کا دریا مسلسل آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

یہ سورہ اپنی امواج کے اس مسلسل طلاطم کے ساتھ اور اپنی امواج کے باہم ٹکراؤ کے ساتھ اس قدر خوبصورت نظر آتی ہے کہ انسان مسحور ہو جاتا ہے۔ اس خوبصورتی کے ساتھ ساتھ مضامین اور مفاہیم کو بھی نہایت ہی ہم آہنگی اور خوش

اسلوبی کے ساتھ ادا کیا گیا ہے اور اس قدر اثرانگیز طریقے سے مضامین پیش کئے گئے ہیں کہ انسان کے احساسات دنگ رہ جاتے ہیں۔ نہایت ہی زندہ' متحرک' ہم آہنگ اور مؤثر صوتی اثرات والے الفاظ ہیں جو نفس انسانی پر ہر جہت اور ہر سمت سے اثرانداز ہو کر اسے مسحور کر دیتے ہیں۔ زندگی سے بھرپور فقرے' مؤثر صوتی اثرات اور تصویری انداز تعبیر نفس انسانی کے ہر پہلو پر اپنے اثرات چھوڑتا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ ہم اس سورہ میں وہ اثرات جو دل و دماغ پر مرتب ہوتے ہیں' ان کا اظہار ہم اپنے الفاظ میں نہیں کر سکتے۔ بہتر تو یہ ہے کہ پڑھنے والا اسے خود پڑھے اور خود براہ راست اس کے اثرات اور کرشمے محسوس کرے۔ اس سورہ کے ادبی اور اشاراتی اوصاف ہم اپنے انسانی الفاظ اور فقروں میں بیان ہی نہیں کر سکتے۔ البتہ ہم ان لوگوں کو اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے ذریعے ایک راہ دکھلاتے ہیں جنہوں نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔ ان کی زندگی اور قرآن کے درمیان خلیج واقعہ ہو گئی ہے اور وہ قرآن کی فضا سے متضاد فضاؤں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

قرآنی فضا میں زندگی گزارنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم قرآن مجید کی تعلیم حاصل کریں۔ اس کو قرأت کے ساتھ پڑھیں اور اس کے علوم و فنون سے آگاہ ہوں اور اس کی ادبی خوبیاں ہمیں معلوم ہوں۔ یہ قرآنی فضا نہیں ہے۔ قرآن کی فضا میں زندگی گزارنے کے معنی ہمارے نزدیک یہ ہیں کہ انسان ایسے حالات میں' ایسی فضا میں' ایسی کشمکش میں' ایسی مشکلات میں اور ایسی اقدار میں زندگی بسر کرے جس طرح دور اول میں نزول قرآن کے وقت تھی۔ اس طرح کہ گویا یہ قرآن ابھی نازل ہو رہا ہے۔ انسان اس جاہلیت کے بالمقابل زندگی بسر کرے جو اس وقت پورے کرۂ ارض پر چھائی ہوئی ہے۔ انسان اپنے دل میں' اپنے ارادوں میں' اپنی حرکات میں' جاہلیت کا مقابلہ کر رہا ہو' اپنے نفس اور لوگوں کے نفس کے اندر اسلام کو پیدا کر رہا ہو' اپنی زندگی میں اور لوگوں کی زندگیوں میں' جاہلیت کا مقابلہ کرتے ہوئے از سرنو اسلام کو پیدا کر رہا ہو۔ وہ جاہلیت کے تمام تصورات' جاہلیت کی تمام ترجیحات' جاہلیت کی تمام رسومات اور جاہلیت کی تمام عملی صورت حال کا از سرنو مقابلہ کرے۔ جاہلیت کے تمام پریشرز' جاہلیت کی ہر قسم کی معرکہ آرائی' ہر قسم کے مقابلے اور اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام حیات پر ہر قسم کے حملے کے سامنے صف آراء ہو جائے۔ اسلامی نظام اور اسلامی نظریہ حیات کے تمام تقاضے پورے کرے' اسلام کی راہ میں جہاد کرے اور اس پر مصر رہے۔ یہ ہے قرآنی فضا کا مفہوم۔

یہ ہے وہ قرآنی فضا جس میں رہنے کا تقاضا یہ قرآن کرتا ہے' صرف اسی صورت میں کوئی صاحب ذوق فہم قرآن کو پا سکتا ہے۔ اس لئے کہ ایسے ہی حالات میں یہ قرآن نازل ہوا' ایسے ہی بحر مشکلات میں قرآن نے اپنا کام کیا۔ جو مسلمان ایسی فضاؤں سے ناآشنا ہیں وہ قرآن سے محروم ہیں۔ اگرچہ وہ اسلامی مدارس میں پڑھتے ہوں' قاری ہوں اور قرآنی علوم و فنون کے ماہر ہوں۔

قرآن کی دنیا میں داخل ہونے کے لئے' مخلصین کے استعمال کے لئے ہم جو فہم قرآن کا پل تعمیر کر رہے ہیں' اس کا فائدہ ان مخلصین کو تب ہی ہو گا کہ وہ اس پل کو عبور کر کے قرآن کی دنیا میں داخل ہو جائیں' وہ اس جہان اور منطقہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے علاقے میں داخل ہو جائیں' اور اپنے عمل اور اپنی جدوجہد کے ذریعے وہ قرآن کی فضا میں داخل ہو جائیں' اور یہ فضا وہ خود پیدا کریں' صرف اس وقت ان کو قرآن کا ذائقہ محسوس ہو گا اور صرف اس وقت ہی وہ محسوس کریں گے کہ اللہ نے انہیں ایک عظیم نعمت سے نوازا ہے۔

یہ سورہ اسلامی نظریہ حیات سے بحث کرتی ہے۔اس کا موضوع اللہ کی الوہیت اور بندے کی بندگی ہے۔یہ سورہ اللہ کے بندوں کے سامنے اللہ کا تعارف پیش کرتی ہے کہ اللہ کیا ہے؟ اس کائنات کی اصلیت کیا ہے؟ اس کی پشت پر کیا راز ہائے دروں ہیں؟ یہ انسان کون ہیں؟ انہیں کون وجود میں لایا ہے؟ انہیں کس نے پیدا کیا؟ انہیں رزق کون فراہم کرتا ہے؟ ان کی کفالت کون کرتا ہے؟ ان کے معاملات کی تدبیر کون کرتا ہے؟ ان کے دلوں اور ان کے نقطہ نظر میں تبدیلی کون لاتا ہے؟ ان کے شب و روز کو کون بدلتا ہے؟ کون ان کو پیدا کرتا ہے اور کون ہے جو انہیں قیامت میں دوبارہ پیدا کرے گا؟ ان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ ان کی زندگی کو یہاں محدود کیوں رکھا گیا ہے؟ ان کا انجام کیا ہو گا؟ یہ زندگی کیا ہے اور اس کی بوقلمونیاں کیا ہیں؟ اس کرۂ ارض پر اسے کس نے پھیلایا؟ یہ پانی کیا ہے؟ یہ چشمے 'یہ پھل اوپر نیچے' یہ شہاب ثاقب' یہ صبح کی نمو داری' یہ رات کی تاریکی' یہ آسمانوں کی گردش 'ان کے پیچھے کون ہے؟ اور ان کے پیچھے کیا راز ہیں؟ کیا اطلاعات ہیں؟ یہ اقوام' یہ صدیاں' لوگ آتے ہیں اور جاتے ہیں' اقوام ہلاک ہوتی ہیں اور دوسری نمودار ہوتی ہیں۔یہ کون ہے جو زوال دیتا ہے اور عروج بخشتا ہے؟ یہ اقوام ہلاکت سے کیوں دوچار ہوتی ہیں؟ اور پھر نئے لوگوں کو اوپر لاکر جس آزمائش میں ڈالا جاتا ہے ان کا انجام' آزمائش اور جزاء و سزا کس طرح وقوع پذیر ہوتی ہے عمل اور مکافات عمل کا یہ کیا چکر ہے؟

اس طرح یہ سورہ قلب انسانی کو لے کر ان تمام ابعاد و آفاق تک لے جاتی ہے اور ان تمام نشیب و فراز کی سیر کراتی ہے 'لیکن پوری سورہ میں قرآن کریم کا مکی انداز برقرار ہے جس کے اسلوب کے بارے میں ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں۔مکی اسلوب کے ساتھ ساتھ پورے قرآن کا انداز کلام بھی اس سورہ میں اپنے اعلیٰ معیار پر ہے۔انداز بحث صرف نظریاتی نہیں ہے اور نہ ہی لاہوتی جدلیات پر مشتمل ہے کہ قارئین کے افکار اور ان کے ذہنوں کو مشغول کیے رکھے 'بلکہ سیدھے سادے انداز میں' یہ سورہ رب العالمین کا تعارف لوگوں سے کراتی ہے تاکہ لوگ اپنے سچے رب کی بندگی اور غلامی اختیار کریں۔ان کا ضمیر اور ان کی روح اللہ کی غلام ہو جائے۔ان کی جدوجہد اور ان کی تمام مساعی اللہ کی تابعداری میں ہوں' ان کے رسوم اور رواج اللہ کی اطاعت میں ہوں اور ان کی زندگی کی پوری عملی صورت حال اللہ وحدہ کی حاکمیت کے تحت ہو جس کے سوا زمین و آسماں کے اندر کسی کی حاکمیت نہیں ہے۔

یوں نظر آتا ہے کہ یہ سورہ اول سے آخر تک ایک متعین نصب العین کی طرف بڑھ رہی ہے' یہ کہ اللہ ہی خالق ہے' وہی مالک ہے' وہی قدرتوں والا ہے اور وہی بادشاہ اور قہار ہے۔وہی پوشیدہ چیزوں اور غیب کا جاننے والا ہے۔وہ جس طرح رات اور دن کو گردش دے رہا ہے اسی طرح وہ دلوں اور دماغوں کا بھی پھیرنے والا ہے اس لئے اسی کو تمام لوگوں کی زندگیوں پر حاکم ہونا چاہئے اور لوگوں کی زندگیوں میں امر اور نہی کا اختیار صرف اسے ہونا چاہئے۔کوئی حکم کوئی قانون اس سے سوا نہ ہو گا۔حلال و حرام کے تعین کا اختیار بھی صرف اسی کو ہے۔اس لئے کہ یہ تمام امور اللہ کی الوہیت کے عناصر ترکیبی ہیں۔لہٰذا لوگوں کی زندگیوں میں ان کے بارے میں تصرف صرف اللہ کر سکتا ہے۔اس کے سوا نہ کوئی خالق ہے' نہ کوئی رازق ہے' نہ زندہ کرنے والا ہے' نہ مارنے والا ہے' نہ نفع دینے والا ہے' نہ نقصان دینے والا ہے' نہ کوئی داتا ہے اور نہ کوئی مانع ہے۔غرض نہ اللہ کے سوا کوئی بھی کسی کے لئے یا اپنے لئے نفع و نقصان کا مالک ہو سکتا ہے' نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔اس سورہ میں اول سے آخر تک اس مقصد کے لئے دلائل و شواہد پیش کئے گئے

ہیں۔ اور یہ دلائل ان مشاہدات' مؤثرات اور قدرتی مواقف کے ذریعے پیش کیے گئے ہیں جو اس کائنات میں موجود ہیں اور فکر و نظر کو مسحور کرنے والے ہیں۔ ان مناظر فطرت کے اس مطالعے سے دل پر ہر طرف سے اشارات و مؤثرات ہر دروازے اور ہر پہلو سے ہوتے ہیں۔

وہ سب سے بڑا مسئلہ جس پر یہ سورہ زور دے رہی ہے' وہ زمین و آسمانوں کے اندر اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کا مسئلہ ہے۔ زمین و آسمان کے وسیع دائرے میں اور اس کائنات کے وسیع و عریض میدان میں تصور حاکمیت الٰہیہ کا مسئلہ۔ یہ سورہ اسی مسئلے کو پیش کرتی ہے لیکن اخلاقی انداز اور بات کی مناسبت یہ ہے کہ جاہیت کے پیروکار بعض ذبیحوں اور بعض کھانوں کے معاملے میں حلال و حرام کے اختیارات اللہ کے سوا دوسروں کو دیتے تھے۔ اسی طرح نذر بعض قربانیوں' بعض پھلوں اور بعض بچوں کے سلسلے میں جاہلیت کے پرستار اللہ کے سوا دوسرے الٰہوں کو اختیارات دیتے تھے۔ اس مناسبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس پوری کائنات کے اندر نظریہ حاکمیت الٰہیہ یہاں تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور اس مناسبت کی طرف سورہ کی آخری آیات کے اندر اشارے کیے گئے ہیں۔

(پھر اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو' تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو' اس کا گوشت کھاؤ۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو' حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالت اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے ان کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے۔ بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بنا پر گمراہ کن باتیں کرتے ہیں' ان حد سے گزرنے والوں کو تمہارا رب خوب جانتا ہے۔ تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی۔ جو لوگ گناہ کا اکتساب کرتے ہیں وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے۔ اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو' اس کا گوشت نہ کھاؤ' ایسا کرنا فسق ہے۔ شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔ لیکن اگر تم نے ان کی اطاعت قبول کر لی تو یقیناً تم مشرک ہو گے۔ (۶: ۱۱۸ تا ۱۲۱)

(اور ان لوگوں نے اللہ کے لئے خود اس کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے' اور کہتے ہیں یہ اللہ کے لئے ہے بزعم خود' اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لئے ہے۔ پھر جو حصہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لئے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لئے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے۔ کیسے برے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ۔ اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لئے ان کے شریکوں نے اولاد کے قتل کو خوشنما بنایا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے' لہٰذا انہیں چھوڑ دو کہ یہ اپنی افترا پردازیوں میں لگے رہیں۔ کہتے ہیں یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں۔ انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھلانا چاہیں حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے۔ پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے اور یہ سب کچھ انہوں نے اللہ پر افتراء کیا ہے۔ عنقریب اللہ انہیں ان کی افتراء پردازیوں کا بدلہ دے گا۔ اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے یہ ہمارے مردوں کے لئے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں پر حرام' لیکن اگر وہ مردہ ہوں تو دونوں اس کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ باتیں جو انہوں نے گھڑ لی ہیں ان کا بدلہ اللہ انہیں دے کر رہے گا۔ یقیناً وہ حکیم ہے اور سب باتوں کی اسے خبر ہے۔ یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ

لوگ جنھوں نے اپنی اولاد کو جہالت اور نادانی کی وجہ سے قتل کیا اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو اللہ پر افتراء پردازی کر کے حرام ٹھہرالیا۔ یقیناً وہ بھٹک گئے اور ہرگز وہ راہ راست پانے والوں میں سے نہ تھے۔ (۶: ۱۳۶ تا ۱۴۰)

امت مسلمہ کی زندگی میں یہ ایک عملی پہلو تھا' جس کی مناسبت سے اس سورہ میں اس عظیم مسئلہ کو لیا گیا۔ اس دور میں امت مسلمہ کے ماحول پر بھی جاہلیت چھائی ہوئی تھی جس میں قانون سازی اور حلال و حرام کے تعین کے معاملے میں یہ شرکیہ عقائد موجود تھے۔ ان کی اصلاح کے حوالے سے یہاں اللہ کی الوہیت ' اللہ کی حاکمیت اور تمام انسانوں کی بندگی اور عبودیت کے مسائل کو لیا گیا۔ چنانچہ جس طرح تمام کی قرآن میں اس مسئلے کو لیا گیا ہے' اسی طرح اس سورہ میں بھی اس مسئلے کو بڑی تفصیل سے لیا گیا ہے۔ مدنی آیات میں جہاں بھی حلال و حرام اور حق قانون سازی کا بیان آتا ہے وہاں بھی مسئلہ حاکمیت الٰہیہ کو لیا جاتا ہے۔

اس سیاق کلام میں جن مؤثر ہدایات اور فیصلوں اور قراردادوں کا سیلاب امنڈتا چلا آ رہا ہے اور ان جانوروں' نذروں اور ذبیحوں کے بارے میں اہل شرک کی جو تردید کی جا رہی ہے' اسی حوالے سے یہاں اللہ کے مسئلہ الوہیت اور اللہ کے حق قانون سازی کو بھی بیان کیا جا رہا ہے۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ حلال و حرام کی اس قانون سازی کا تعلق اسلامی عقائد اور اسلامی نظریات کے ساتھ ہے۔ وہ نظریہ اسلام کا نظریہ حاکمیت الٰہیہ اور انسانوں کی بندگی اور غلامی کا ہے اور یہ مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے' اسلام اور کفر اور اسلام اور جاہلیت کا مسئلہ ہے۔ ہدایات کے اس سیلاب میں سے ہم یہاں اس سورہ کے تعارف میں صرف چند نمونے پیش کریں گے لیکن ان کی مکمل تفصیلات اس وقت آئیں گی جب ہم اس سورہ کی آیات پر تفصیلی بحث کریں گے۔ لیکن اپنے اثرات کے اعتبار سے یہ سیلاب نفس انسانی کے اندر اس دین کے مزاج کی حقیقی ماہیت بٹھا دیتا ہے۔ وہ یہ کہ انسانی زندگی کا چھوٹا مسئلہ ہو یا بڑا' ــــــــ اللہ کے حق حاکمیت کے تحت حل ہونا چاہئے اور اللہ کی حاکمیت اسلامی شریعت کی صورت میں ریکارڈ شدہ ہے۔ اگر اس طرح نہ ہو گا تو پھر یہ تصور ہو گا کہ ایسے لوگ یا معاشرہ دین سے خارج ہے۔ ایک جزوی مسئلے یا معمولی مسئلے کی حد تک انسان دین سے نکل گیا ہے۔

ہدایات کا یہ کثیر مجموعہ اس بات کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ یہ دین انسانی زندگی کے تمام مظاہر سے اور زندگی کے تمام معاملات میں سے انسانوں کی حاکمیت کو ختم کرتا ہے۔ یہ معاملات اہم ہوں یا غیر اہم' بڑے ہوں یا چھوٹے' ان معاملات کو اس عظیم اصول کے دائرے کے اندر لاتا ہے یعنی یہ کہ اللہ کی الوہیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پورے کرۂ ارض پر حاکم مطلق ہے اور وہ بلا شرکت غیرے اس کائنات کے اوپر متصرف ہے۔ یہ اصول دین اسلام کے اندر پوری طرح ظاہر اور مجسم ہے۔

اس سورہ میں مویشیوں' پھلوں' نذر و نیاز اور اولاد کے بارے میں دور جاہلیت کی رسومات اور شعائر کے ذکر کے بعد مختلف قسم کے تبصرے بھی کیے گئے ہیں' جن سے اس بات کا اظہار مطلوب ہے کہ یہ رسومات اور شعائر نہایت ہی احمقانہ' نہایت ہی متضاد ہیں۔ بعض میں یہ کہا گیا ہے کہ انسان کا یہ حق نہیں ہے کہ حلال و حرام کا تعین خود کرے بلکہ یہ کام تو ایک عظیم نظریاتی کام ہے اور حلال و حرام کے تعین میں اللہ کے احکام کی اطاعت ہی درست راستہ اور صحیح طرز عمل ہے۔ اگر کوئی شخص حلال و حرام کے تعین میں اللہ کے احکام کی اطاعت نہیں کرتا تو وہ دین سے خارج ہے' سابقہ آیات کے بعد ملاحظہ ہو ذرا طرز ادا اور پھر تبصرے :

”وہ اللہ ہی ہے جس نے طرح طرح کے باغ اور تاکستان اور نخلستان پیدا کئے۔ کھیتیاں اگائیں جن سے قسم قسم کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں' زیتون اور انار کے درخت پیدا کئے جن کے پھل صورت میں مشابہ اور مزے میں مختلف ہوتے ہیں۔ کھاؤ اس کی پیداوار جب کہ یہ پھلیں اور اللہ کا حق ادا کرو' جب ان کی فصل کاٹو' اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر وہی ہے جس نے مویشیوں میں سے وہ جانور بھی پیدا کئے جن سے سواری و بار برداری کا کام لیا جاتا ہے اور وہ بھی جو کھانے اور بچھانے کے کام آتے ہیں۔ کھاؤ ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں بخشی ہیں اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ یہ آٹھ نر و مادہ ہیں' دو بھیڑ کی قسم سے' دو بکری کی قسم سے' اے محمدؐ ان سے پوچھو کہ اللہ نے ان کے نر حرام کئے ہیں یا مادہ' یا وہ بچے جو بھیڑوں اور بکریوں کے پیٹ میں ہوں؟ ٹھیک ٹھیک علم کے ساتھ مجھے بتاؤ اگر تم سچے ہو اور اسی طرح دو اونٹ کی قسم سے ہیں اور دو گائے کی قسم سے۔ پوچھو' ان کے نر حرام کئے ہیں یا مادہ' یا وہ بچے جو اونٹنی اور گائے کے پیٹ میں ہوں۔ کیا تم اس وقت حاضر تھے جب اللہ نے ان کے حرام ہونے کا حکم دیا تھا؟“ پھر اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ کی طرف منسوب کر کے جھوٹی بات کہے تاکہ علم کے بغیر لوگوں کی راہنمائی کرے یقیناً اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھاتا۔ اے محمدؐ ان سے کہو کہ جو وحی میرے پاس آئی ہے اس میں تو میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر حرام ہو' الا یہ کہ وہ مردار ہو' یا بہایا ہوا خون ہو یا سور کا گوشت ہو' کہ وہ ناپاک ہے' یا فسق ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ پھر جو شخص مجبوری کی حالت میں بغیر اس کے کہ وہ نافرمانی کا ارادہ رکھتا ہو اور بغیر اس کے کہ وہ حد ضرورت سے تجاوز کرے' یقیناً تمہارا رب درگزر سے کام لینے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے اور گائے اور بکری کی چربی بھی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا آنتوں سے لگی ہوئی ہو' یا ہڈی سے لگی رہ جائے۔ یہ ہم نے ان کی سرکشی کی سزا انہیں دی تھی' اور یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ اب اگر وہ تمہیں جھٹلائیں تو ان سے کہہ دو کہ تمہارے رب کا دامن رحمت وسیع ہے اور مجرموں سے اس کے عذاب کو پھیرا نہیں جا سکتا۔ یہ مشرک لوگ ضرور کہیں گے کہ ”اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔“ ایسی ہی باتیں بنا کر ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا یہاں تک کہ آخر کار ہمارے عذاب کا مزہ انہوں نے چکھ لیا۔ ان سے کہو ”کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو۔“ پھر کہو ”حقیقت رس حجت تو اللہ کے پاس ہے' بے شک اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔“ ان سے کہو ”کہ لاؤ اپنے وہ گواہ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ ہی نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے۔“ پھر اگر وہ شہادت دے دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دینا اور ہرگز ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے اور جو آخرت کے منکر ہیں اور جو دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں۔ اے محمدؐ ان سے کہو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تم پر کیا کیا پابندیاں عائد کی ہیں؟

(۱) یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

(۲) اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

(۳) اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو' ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے اور بے شرمی

کی باتوں کے قریب نہ جاؤ۔ خواہ وہ کھلی' یا چھپی ہوں۔

(۴) اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ...... یہ باتیں ہیں جس کی ہدایت تمہیں اس نے کی ہے شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔

(۵) اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو' یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے۔

(۶) اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو' ہم ہر شخص پر ذمہ داریوں کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے۔

(۷) اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنی رشتہ داری کا کیوں نہ ہو۔

(۸) اور اللہ کے عہد کو پورا کرو...... ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم نصیحت قبول کرو۔

(۹) نیز اللہ کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے' لہٰذا اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے۔ یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم کج روی سے بچو۔"

یہاں یہ بات نظر آتی ہے کہ مویشیوں' جانوروں اور پھلوں اور بچوں کی نذر و نیاز کی جو رسوم جاہلیت میں مروج تھیں' ان کے جواز اور عدم جواز کے ایک بالکل جزوی مسئلے کو بھی عظیم نظریاتی اور فکری مسائل کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ اس جواز و عدم جواز کو ہدایت اور گمراہی' اسلامی نظام کے اتباع اور شیطانی نظام کے اتباع اور اللہ کی رحمت اور اللہ کی پکڑ کے مسائل کے ساتھ جوڑ دیا گیا جو زندگی کے اہم ترین مسائل ہیں۔ یہ قرار دیا گیا کہ ان مسائل سے عقیدۂ توحید اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو برابر کرنے کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ قرار دیا گیا کہ جو لوگ غیر اللہ کی نذر و نیاز دیتے ہیں وہ اللہ کے صراط مستقیم سے ہٹ گئے ہیں۔ اس لئے ان مسائل کی اہمیت کے پیش نظر وہی تعبیرات اختیار کی گئی ہیں جو ان بلند نظریاتی مسائل کے اظہار کے لئے اختیار کی گئی تھیں۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں اشارات و دلائل کا وہی رنگ اختیار کیا گیا ہے جو قرآن کریم ان مسائل عالیہ کے لئے اختیار کرتا ہے۔ مسئلہ تخلیق اور مختلف زندہ چیزوں کی اقسام' باغات اور تاکستان' نخلستان اور کھیت' مختلف رنگ اور ذائقے' زیتون' انار' ایک سے ذائقے اور مختلف ذائقے وغیرہ۔ وہ حقائق بھی لائے گئے جو عقیدہ توحید کے لیے لائے جاتے ہیں اور یہاں مشرکین کے لئے اللہ کے عذاب اور پکڑ کو بھی لایا گیا ہے۔

یہ تمام مشاہد و مناظر اس سے پہلے بھی اس سورہ میں پیش کئے گئے' جب موضوع عقیدۂ توحید تھا۔ اس وقت نذر و نیاز کا مسئلہ زیر بحث نہ تھا۔ اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ جہاں بات عقیدۂ توحید کی ہو اور اللہ کی حاکمیت کا مسئلہ زیر بحث ہو تو قرآن کا انداز ایسا ہی ہوتا ہے چاہے کوئی جزوی مسئلہ ہی کیوں نہ ہو۔

---ooo---

اس سے پہلے جب ہم نے اس سورہ کے موضوع اور مضمون کے بارے میں مجموعی بات کی' اس سے ہمارا مقصد یہ نہ تھا کہ یہ زوردار انداز کلام اور یہ اہم فیصلے محض مسئلہ الوہیت اور حاکمیت الٰہیہ کے موضوع کے ساتھ مخصوص ہیں بلکہ یہ مسئلہ پوری سورہ کا مرکزی مضمون اور محور تھا اور یہ کہ اس دین کا مزاج یہ ہے کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی

سے بڑی بات مسئلہ حاکمیت الٰہیہ اور اللہ کے حق قانون سازی کے ساتھ مربوط ہے۔

اب ہم یہاں اس سورہ کے تعارف اور اس کی خصوصیات کی طرف کچھ اشارہ کریں گے جس طرح ظلال القرآن میں ہم نے تمام سورتوں کا تعارف کرایا ہے۔ حضرت ابن عباس' حضرت اسماء بنت یزید' حضرت جابر' حضرت انس ابن مالک اور حضرت عبداللہ ابن مسعود کی روایات میں یہ بات آتی ہے کہ یہ مکی سورہ ہے اور یہ سورہ مکہ میں ایک ہی دفعہ مکمل نازل ہوئی ہے۔ ان روایات میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جن سے اس سورہ کے زمانہ نزول پر روشنی پڑتی ہو کہ مکی عہد میں یہ کس زمانے میں نازل ہوئی۔ رائج ترتیب کے مطابق یہ سورہ الحجر کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اس طرح ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس کا نمبر ۵۵ بنتا ہے۔ لیکن جس طرح ہم نے سورہ البقرہ کے آغاز میں کہا کہ اس قسم کی معلومات کے ذریعے ہم کوئی بات یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ کون سی سورہ کس دور میں نازل ہوئی۔ اصل بات یہ ہے کہ مفسرین و مؤرخین نے صرف یہ دیکھا ہے کہ سورہ کا ابتدائی حصہ کس دور میں نازل ہوا ہے۔ ترتیب نزولی میں ان کی مراد پوری سورہ نہیں ہوتی۔ بعض اوقات کسی سورہ کے بعض حصے اس کے ابتدائی حصے کے بعد میں نازل ہوتے رہے ہیں۔ لہٰذا کسی سورہ کے زمانہ نزول کے تعین میں اصل دارومدار اس کے آغاز میں مذکور حصے کے تعین سے ہوتا ہے۔ رہی سورہ انعام تو یہ سب کی سب یکبارگی نازل ہوئی ہے' البتہ اس کی تاریخ نزول کے بارے میں ہمیں کوئی متعین بات معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ رسالت کے ابتدائی دنوں کے بعد نازل ہوئی ہے۔ پانچویں یا چھٹے سال میں اور یہ بات بھی ہم صرف اس درجے کی بناپر کہہ رہے ہیں جو اس کو ترتیب نزول کے مطابق شمار کرنے والوں نے دیا ہے۔ مزید یہ کہ اس سورہ میں بہت سے موضوعات کو لیا گیا ہے اور بات بڑی تفصیل سے کی گئی ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کے ساتھ بات چیت اور بحث و مباحثہ پر عرصہ گزر گیا تھا اور اب بڑی تفصیل کے ساتھ مدلل گفتگو کی ضرورت تھی۔ جس طرح اس سورہ میں اصول و نظریات پر بات کی گئی ہے اس کے بعد ایسی ہی فیصلہ کن' اور مدلل گفتگو کی ضرورت تھی۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ایک طویل عرصے سے کام کر رہے تھے اور کام کرتے کرتے تھک گئے تھے انہیں بھی تسلی دینے کی ضرورت تھی۔

حضرت ابن عباس ؓ سے ایک روایت ہے کہ یہ سورہ مکی ہے صرف دو آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں یعنی آیت نمبر۹۱ (وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ ........) اور ۱۴۱ (وَهُوَ الَّذِیْ ........) آیت ۹۱ مالک ابن سیف اور کعب ابن الاشرف یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی اور آیت ۱۴۱ ثابت ابن قیس ابن شماس الانصاری کے حق میں نازل ہوئی۔ ابن جریج اور الماوردی کہتے ہیں یہ معاذ ابن جبل کے بارے میں نازل ہوئی۔

پہلی آیت میں تو دونوں احتمالات ہیں کیونکہ اس میں اس کتاب کا ذکر ہے جو موسیٰ پر نازل ہوئی تھی' جو نور اور ہدایت تھی اور یہودیوں کو جس لفظ سے خطاب نظر آتا ہے وہ یہ ہے۔ (تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا) "تم پارہ پارہ کر کے رکھتے ہو' کچھ دکھاتے ہو ـــــ)" اس لئے کہ اس کے بارے میں حضرت ابن عباس اور مجاہد سے روایات ہیں کہ (مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ) کا عقیدہ اہل مکہ کا تھا۔ پھر آیت زیر بحث میں ایک قراۃ تَجْعَلُوْنَ کی جگہ یَجْعَلُوْنَ بھی ہے۔ پھر معنی یہ ہو جاتا ہے "پوچھو' پھر وہ کتاب جسے موسیٰ لایا تھا' جو تمام انسانوں کے لئے روشنی اور ہدایت تھی' جسے وہ پارہ پارہ کر کے رکھتے ہیں' کچھ دکھاتے ہیں اور بہت کچھ چھپاتے ہیں۔" یعنی تُبْدُوْنَ کی جگہ

یُبْدُوْنَ اور تُخْفُوْنَ کی جگہ یُخْفُوْنَ کی بھی ایک قراءت ہے۔اس قرأت کے مطابق آیت مکی بن جاتی ہے۔اور اس سورہ میں اہل کتاب کو خطاب نہیں رہتا اور سیاق کلام ہم آہنگ ہو کر مشرکین مکہ کے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے۔ابن جریر نے اس روایت اور اس قراءت کو ترجیح دی ہے اور اس طرح یہ آیت بھی مکی بن جاتی ہے۔رہی دوسری آیت تو اس کا سیاق و سباق بھی اس کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ آیت مدنی ہو' اس لئے کہ اگر اس آیت کو مدنی کہا جائے تو اس سے پہلے اور بعد کی عبارت لفظاً اور معناً منتشر ہو جاتی ہے حالانکہ قرآن میں سیاق و سباق بالکل جڑا ہوا ہے۔اللہ نے باغات اور جانوروں کی بات کی ہے جو سواری اور فرش کے لئے کام آتے ہیں۔آیت ہے۔

(وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (٦ : ١٤٢) (پھر وہی ہے جس نے مویشیوں میں سے وہ جانور بھی پیدا کئے جن سے سواری و بار برداری کا کام لیا جاتا ہے اور وہ بھی جو کھانے اور بچھانے کے کام آتے ہیں۔کھاؤ ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں بخشی ہیں اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔) اس کے بعد مویشیوں کے بارے میں بات مکمل کی جاتی ہے اور اس سے قبل پھلوں کے تذکرے کے بعد اس کا آغاز ہوا تھا۔بات سب کی سب ایک ہی موضوع سے متعلق ہے۔سابقہ پیراگراف میں ہم نے اس کے بارے میں مفصل بات کی ہے جس کا تعلق حلت اور حرمت کے اختیارات کے بارے میں تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ جس وجہ سے اس آیت کو مدنی کہا گیا ہے وہ یہ الفاظ ہیں:

(كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (٦ : ١٤١)) (کھاؤ ان کی پیداوار جب کہ یہ پھلیں اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو۔) ان لوگوں نے حقہ سے زکات مراد لی ہے اور زکات کا نصاب اور مقدار مدینہ میں متعین ہوئے تھے فصلوں میں بھی اور پھلوں میں بھی۔لیکن آیت میں یہ مفہوم صریح نہیں ہے اس لئے کہ اس آیت کے بارے میں علماء کے یہ اقوال نقل ہیں کہ اس سے مراد صدقات ہیں یا حق خدا۔ مراد یہ ہے کہ فصل کاٹتے وقت اور باغ کو اتارتے وقت جو بھی آئے انہیں کچھ نہ کچھ دینا چاہئے۔

نیز یہ مفہوم بھی مراد ہو سکتا ہے کہ رشتہ داروں کو بھی دو۔زکات جب مقرر ہوئی تو عشر اور نصف عشر زکات لازم کر دی گئی۔اس تفصیل کے بعد کوئی شک نہیں رہتا کہ یہ آیت مکی ہے۔

ثعلبی نے کہا ہے کہ سورہ انعام سب کی سب مکی ہے۔صرف چھ آیات مدینہ میں نازل ہوئیں یعنی (وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (٦ : ٩١)) کے بعد تین آیات اور (قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ (٦ : ١٥١)) کے بعد تین آیات۔پہلی تین آیات کے مکی ہونے کا بیان تو ہم نے کر دیا ہے۔اس لئے کہ ان میں سے پہلی آیت کا جو مضمون ہے وہی دوسری اور تیسری کا بھی ہے۔

رہی دوسری تین آیات تو ان کے بارے میں' میری اطلاع کے مطابق کسی صحابی اور تابعی سے کوئی روایت نہیں ہے کہ وہ مدنی ہیں۔نہ ان کے موضوع میں ایسی کوئی بات ہے کہ یہ مدنی ہیں۔ان میں بعض جاہلی تصورات سے بحث کی گئی

ہے اور ذبیحوں اور نذروں کے بارے میں جو بات چلی آتی ہے ان کے اندر بھی وہی بات مذکور ہے' لہٰذا درست یہی ہے کہ یہ آیات بھی مکی ہیں۔

مصحف امیری میں ہے کہ آیات ۲۰، ۲۳، ۹۱، ۹۲، ۱۱۴، ۱۴۱، ۱۵۱، ۱۵۲ اور ۱۵۳ مدنی ہیں۔ آیات ۹۱، ۹۲، ۱۴۱، ۱۵۱، ۱۵۲ کے بارے میں تو ہم بات کر آئے ہیں۔ آیات ۲۰، ۲۳، ۱۱۴ میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ ان پر مدنی ہونے کا شبہ کیا جائے ماسوائے اس بات کے کہ ان میں اہل کتاب کا ذکر ہے لیکن یہ مدنی ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اہل کتاب کا ذکر مکی آیات میں بھی آیا ہے۔

لہٰذا میری رائے اس طرف مائل ہے کہ جو مطلق روایات ہیں کہ یہ پوری سورہ یکبارگی مکہ میں نازل ہوئی وہی درست ہیں۔ حضرت ابن عباس' اسماء بنت یزید کی روایات میں اس کی صراحت ہے اور اسماء بنت یزید کی روایت میں ایک خاص واقعے کا بھی ذکر ہے۔ سفیان ثوری' لیث' شہر ابن حوشب کے ذریعے اسماء بنت یزید سے روایت ہے' فرماتی ہیں: "سورہ انعام حضور پر یکبارگی نازل ہوئی۔ اس وقت میں نے آپ کی ناقہ کی زمام تھامی ہوئی تھی اور اس وقت ناقہ پر اس قدر بوجھ تھا کہ قریب تھا کہ اس کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں۔

طبرانی نے حضرت ابن عباس سے جو روایت نقل کی ہے وہ یہ ہے۔ عبدالعزیز' حجاج ابن منہال' حماد ابن سلمہ' علی ابن زید' یوسف ابن مہران اور ابن عباس سے۔ انہوں نے کہا "انعام مکہ میں نازل ہوئی' یکبارگی اس کے اردگرد ستر ہزار فرشتے تھے اور وہ تسبیح پڑھ رہے تھے۔"

یہ دونوں روایات ان تمام اقوال سے زیادہ مضبوط ہیں جن میں یہ آیا ہے کہ بعض آیات مدنی ہیں۔ مزید یہ کہ موضوع و مضمون کے زاویے سے ہم نے جو تجزیہ کیا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سورہ انعام میں بات کی روانی' اس کا باہم اتصال اور ربط ایسی خصوصیات ہیں جن سے یہ سورہ ایک ایسی نہر کی طرح نظر آتی ہے جس کا پانی نہایت ہی ترتیب اور روانی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے' جس طرح ایک سیلاب آگے بڑھتا ہے۔ اس میں کوئی کٹاؤ اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اس سورہ کی بناوٹ (Construction) سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ ایک ہی بار نازل ہوئی ہے۔

---ooo---

اس سورہ کے بنیادی موضوع اور اس کی شخصیت کے بارے میں اجمالی بات اس سے قبل ہم کر چکے ہیں یعنی اس مقدمے کے آغاز میں لیکن اس بارے میں کچھ تفصیلات بھی ضروری ہیں۔

ابوبکر ابن مردویہ نے حضرت انس ابن مالک کی یہ روایت نقل کی ہے۔ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب سورہ انعام نازل ہوئی تو اس کے ساتھ فرشتوں کا جلوس تھا۔ اس جلوس نے شرق و غرب کے درمیان پوری جگہ کو روک دیا۔ وہ تسبیح کے ساتھ گنگنا رہے تھے اور ان کی وجہ سے زمین کانپ رہی تھی۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے جاتے تھے۔ سبحان اللہ العظیم' سبحان اللہ العظیم۔"

یہ جلوس اور یہ فرشتوں کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی فوج اس پوری سورہ پہ سایہ فگن ہے۔ یہ پوری سورہ ایک جلوس ہے جس سے مرعوب ہو کر نفس انسانی پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ پرسکون حالت ایک زلزلے میں بدل جاتی ہے۔ اس

میں مختلف مواقف 'مختلف مناظر' مختلف اشارات اور مختلف مؤثرات کا اژدہام ہے - یوں نظر آتا ہے کہ معانی و تصورات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا ہے جو بڑھتا ہی چلا جاتا ہے' لہر پر لہر اٹھتی ہے - ایک لہر ساحل تک پہنچتی نہیں کہ دوسری نمودار ہو جاتی ہے اور یہ تمام لہریں گتھم گتھا ہوتی ہیں اور مسلسل آگے ہی بڑھتی ہیں -

اس تلاطم معانی میں سورہ کا اصل موضوع ساتھ ساتھ چلتا ہے - اس لئے یہ ممکن ہی نظر نہیں آتا کہ اس سورہ کو مختلف حصوں اور ٹکڑوں میں تقسیم کیا جا سکے اور ہر ٹکڑے کا الگ موضوع ہو' یا وہ موضوع کے کسی خاص حصے سے بات کر رہا ہو - یہ پے در پے موجوں کی شکل میں ہے اور ہر موج کا تعلق اس سے پہلی موج کے ساتھ قائم ہے - ہر موج دوسری کے لئے تکملہ ہے -

یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس سورہ کے اس دیباچے میں موضوعات کا ذکر نہیں کیا - ہماری کوشش یہ ہوگی کہ مختلف اسباق کے تعین کے بجائے مختلف موجوں اور لہروں کے بارے میں بات کریں اور یہ بتائیں کہ اس نئی لہر کی غرض و غایت کیا ہے -

سورہ کا آغاز اس مضمون سے ہوتا ہے کہ مشرکین جو اللہ کے ساتھ الٰہ ٹھہراتے ہیں ان کا موقف نہایت ہی بودا ہے' حالانکہ توحید کے دلائل ان کے سامنے ہیں' ہر طرف سے انہیں گھیرے ہوئے ہیں اور وہ اپنے نفوس میں اور آفاق میں انہیں دیکھ سکتے ہیں - یہ سورہ ہمارا استقبال ایک واضح حقیقت الوہیت کے ساتھ کرتی ہے اور چند جھلکیوں کے ذریعے اس پوری کائنات کے اوراق الٹ دیتی ہے - صرف تین جھلکیوں میں ہم اس پوری کائنات کی تہ تک اتر جاتے ہیں اور اس کی وسعت کو اپنے دائرے میں لے لیتے ہیں -

(اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ (۱) هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ (۲) وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَفِی الْاَرْضِ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ (۳))

"تعریف ہے اللہ کے لئے جس نے زمین و آسمان بنائے' روشنیاں اور تاریکیاں پیدا کیں - پھر بھی وہ لوگ جنہوں نے دعوت حق کو ماننے سے انکار کر دیا ہے دوسروں کو اپنے رب کے ہمسر ٹھہراتے ہیں - وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا' پھر تمہارے لئے زندگی کی ایک مدت مقرر کر دی' اور ایک دوسری مدت اور بھی ہے جو اس کے ہاں طے شدہ ہے - مگر تم لوگ ہو جو شک میں پڑے ہوئے ہو - وہی ایک خدا آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی' تمہارے کھلے اور چھپے سب حال جانتا ہے - اور جو برائی یا بھلائی تم کماتے ہو اس سے خوب واقف ہے -"

یہ تین جھلکیاں ہیں - ایک جھلکی میں اس پوری کائنات کی تخلیق دکھائی جاتی ہے' دوسری میں پوری انسانیت کی تخلیق دکھائی جاتی ہے اور تیسری میں ان دونوں وجودوں کو ذات باری گھیرے ہوئے ہے - کیا اعجاز ہے یہ! کلام کی شوکت اور

زور کو تو دیکھئے ' کس قدر جامع اور مانع بات ہے!

اس کائنات کے ہوتے ہوئے جو وحدت خالق پر دال ہے ' وجود انسانی کے ہوتے ہوئے جو ایک ذات مدبر پر شاہد عادل ہے اور اس کرۂ ارض اور کرات سماوی اور ان کے اندر اللہ کی جاری و ساری حاکیت کے ہوتے ہوئے بھی کیا کوئی ذات باری میں شک کر سکتا ہے؟ کیا کوئی ذات باری کا انکار کر سکتا ہے؟ ان شواہد کے ہوتے ہوئے مشرکین کے شرک اور شک کرنے والوں کے شک کی کوئی گنجائش ازروئے عقل نہیں ہونا چاہئے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کا یہ رویہ نظام کائنات ' انسان کے نفس اور اس کی فطرت اور ایک صحت مند انسان کے دل اور اس کی عقل کی روشنی میں تعجب انگیز ہے۔

اس لمحے میں اس سورہ کے دریا میں ایک دوسری لہر نمودار ہوتی ہے۔ اس میں جھٹلانے والوں کا موقف پیش کیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ ایسی نشانیوں اور ایسے دلائل کو جھٹلاتے ہیں جو اس پوری کائنات اور خود انسان کے نفس کے اندر بکھرے پڑے ہیں اور موجود ہیں۔ ان منکرین کے عجیب و غریب موقف کو پیش کر کے انہیں سخت تنبیہ بھی کی جاتی ہے۔ ان کے سامنے ان منکرین کے نقشے پیش کئے جاتے ہیں جن کے لاشے انسانی تاریخ کی اسکرین پر بکھرے نظر آتے ہیں۔ اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی قوت قاہرہ کے مقابلے میں ان کی کوئی پوزیشن نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ وہ اللہ کی ایسی ہی کسی پکڑ سے بالکل نہیں ڈرتے۔ وہ حق مبین کو دیکھتے ہوئے بھی ' اپنی سرکشی پر قائم ہیں۔ اس لہر سے ظاہر ہوتا ہے کہ منکرین دلائل کی کمی کی وجہ سے انکار نہیں کرتے بلکہ ان کی نیت درست نہیں ہے اور ان کے دل قبولیت حق کے لئے ابھی نہیں کھلے ' ان کے دلوں کے دروازے بند ہیں۔ ذرا قرآن کے الفاظ دیکھیں۔

"لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ایسی نہیں ہے جو ان کے سامنے آئی ہو ' اور انہوں نے اس سے منہ نہ موڑ لیا ہو۔ چنانچہ اب جو حق ان کے پاس آیا تو اسے بھی انہوں نے جھٹلا دیا۔ اچھا ' جس چیز کا وہ اب تک مذاق اڑاتے رہے ہیں عنقریب اس کے متعلق کچھ چیزیں انہیں پہنچیں گی۔ کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے زمانے میں دور دورہ رہا ہے؟ ان کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا جو تمہیں نہیں بخشا ' ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہا دیں (مگر انہوں نے کفران نعمت کیا) تو آخر کار ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دوسرے دور کی قوموں کو اٹھایا۔ اے پیغمبرؐ اگر ہم تمہارے اوپر کوئی کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب بھی اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنہوں نے حق کا انکار کیا وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ اگر کہیں ہم نے فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ' پھر انہیں کوئی مہلت نہ دی جاتی۔ اور اگر ہم فرشتہ اتارتے تب بھی اسے انسانی شکل میں اتارتے اور اس طرح انہیں اسی شبہ میں مبتلا کر دیتے جس میں اب یہ مبتلا ہیں۔ اے محمدؐ ' تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے ' مگر ان مذاق اڑانے والوں پر آخر کار وہی حقیقت مسلط ہو کر رہی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ ان سے کہو ' ذرا زمین پر چل پھر کر دیکھو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے "

اس مقام پر اب ایک تیسری موج اٹھتی ہے۔ اس لہر میں شان الوہیت کا حقیقی تعارف ہے اور اس کا اظہار یوں کر گیا ہے کہ زمین و آسمانوں اور مافیہا کا مالک ذات باری ہے۔ رات کے اندھیروں میں اور دن کے اجالوں میں جو کچھ ٹھہرا ہوا ہے وہ اسی کا ہے۔ وہ ایسا رازق ہے جو سب کو کھلا رہا ہے اور اسے کسی جانب سے جوابی کھلانے کی کوئی ضرورت

ہی نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ صرف وہی ولی ہے اور اس کے سوا کوئی اور ولی نہیں ہے۔بندوں کو چاہئے کہ اپنے آپ کو صرف اس کے حوالے کر دیں۔یہ وہی تو ہے جو آخرت میں نافرمانوں کو سزا دے گا۔وہی ہے جو بندوں کی بھلائی اور مصیبت کا مالک ہے' اور وہ ہرچیز پر قادر ہے۔اپنے بندوں پر اسے مکمل کنٹرول حاصل ہے۔وہ حکیم و خبیر ہے۔

اس پوری تمہید کے بعد اب یہ لہر اپنی بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے۔رسول اور اس کی قوم کے درمیان ثبوت واثبات کے بعد مکمل فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔قوم کو ڈرایا جاتا ہے کہ وہ شرک سے دور رہیں اور یہ کہ رسول ان کے شرک کے ذمہ دار نہیں ہیں۔یہ اعلان نہایت ہی بلند آہنگی اور نہایت ہی فیصلہ کن انداز میں ہوتا ہے۔ذرا قرآن کے الفاظ دیکھیں،

"ان سے پوچھو' آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ کہو سب کچھ اللہ کا ہے' اس نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔قیامت کے روز وہ تم سب کو ضرور جمع کرے گا' یہ بالکل ایک غیر مشتبہ حقیقت ہے۔مگر جن لوگوں نے اپنے آپ کو خود تباہی کے خطرے میں مبتلا کر لیا ہے وہ اسے نہیں مانتے۔رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں جو کچھ ٹھہرا ہوا ہے' سب اللہ کا ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔کہو' اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنالوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمانوں کا خالق ہے اور جو روزی دیتا ہے اور روزی لیتا نہیں؟ کہو' مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سر تسلیم خم کروں اور "تو بہرحال مشرکوں میں شامل نہ ہو" کہو' اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی۔اس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے۔اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے' اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہرچیز پر قادر ہے۔وہ اپنے بندوں پر کامل اختیار رکھتا ہے اور وہ دانا اور باخبر ہے۔ان سے پوچھو کس کی گواہی بڑھ کر ہے؟ کہو میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے۔یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے' سب کو متنبہ کر دوں۔کیا تم لوگ واقعی یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی شریک ہیں؟ کہو' میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں دے سکتا۔کہو خدا تو وہی ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔"

اب ایک چوتھی لہر اٹھتی ہے۔اس میں اس نئی کتاب کے بارے میں اہل کتاب کے رویے کا ذکر ہے' جسے مشرکین نے جھٹلایا ہے۔اس لہر میں یہ بتایا گیا ہے کہ شرک ایک عظیم ظلم ہے اور یہ تمام مظالم سے بدتر ہے۔اس لہر میں مشرکین کے سامنے قیامت میں ان کو پیش آنے والے واقعات کے منظر کو پیش کیا جاتا ہے۔اس منظر میں اہل شرک ان لوگوں سے دریافت کرتے ہیں جنہیں وہ شریک ٹھہراتے تھے' یہ لوگ ان کے اس شرک کا صاف صاف انکار کرتے ہیں۔اس لئے ان کی اس افتراء پردازی کے تار و پود بکھر جاتے ہیں۔اس لہر میں اہل شرک کے حالات کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔نظر آتا ہے کہ ان کی قبولیت حق کی فطری قوتیں معطل ہیں۔وہ ایمان کے اشارات سے استفادہ کرنے سے قاصر ہیں اس لئے وہ ایمان نہیں لاتے۔وہ دلائل نہیں پاتے' اس لئے کہ ان کے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں' کیونکہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن محض پرانے قصوں پر مشتمل ہے۔اس لہر میں ان کو کہا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی ہدایت قبول کرنے سے روکتے ہیں اور خود بھی قرآن سے دور بھاگتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں۔ان کے حالات کی تصویر کشی یوں کی جاتی ہے'

اس وقت کے حالات کی جب وہ آگ پر کھڑے ہوں گے' اس وقت ان کی سوچ کی کیفیت یہ ہو گی کہ کاش ہمیں دوبارہ دنیا میں لوٹا دیا جاتا اور ہم اپنے رب کی آیات کو نہ جھٹلائیں اور اہل ایمان میں شامل ہو جائیں لیکن اگر وہ لوٹا بھی دیئے جائیں تو پھر معاد اور آخرت کا انکار کر دیں۔ تصویر کا ایک دوسرا رخ جب وہ اپنے رب کے سامنے پیش ہوتے ہیں' ان سے ان کے اس جحود انکار کے بارے میں بازپرس ہوتی ہے۔ حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے گناہوں کو مشخص طور پر اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اس لہر کے آخر میں ان کی حسرت اور پشیمانی کا ذکر ہے۔ اس ملاقات میں ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حیات دنیا محض لہو و لعب تھی اور آخرت ہی زندگی جاوداں ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ دیکھیں۔

"جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس بات کو اس طرح غیر مشتبہ طور پر پہچانتے ہیں جیسے ان کو اپنے بیٹوں کے پہچاننے میں کوئی اشتباہ پیش نہیں آتا۔ مگر جنہوں نے اپنے آپ کو خود خسارے میں ڈال دیا ہے وہ اسے نہیں مانتے۔ اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگائے' یا اللہ کی نشانیوں کو جھٹلائے؟ یقیناً ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ جس روز ہم ان کو اکٹھا کریں گے اور مشرکین سے پوچھیں گے کہ اب وہ تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریک کہاں ہیں جن کو تم خدا سمجھتے تھے تو وہ اس کے سوا کوئی فتنہ نہ اٹھا سکیں گے کہ لے، ہمارے آقا! تیری قسم ہم ہرگز مشرک نہ تھے۔ دیکھو' اس وقت یہ کس طرح اپنے اوپر آپ جھوٹ گھڑیں گے اور وہاں ان کے سارے بناوٹی معبود گم ہو جائیں گے۔ ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمہاری بات سنتے ہیں مگر حال یہ ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس کو کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے۔ وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں' اس پر ایمان لا کر نہ دیں گے۔ حد یہ ہے کہ جب وہ تمہارے پاس آکر تم سے جھگڑتے ہیں تو ان میں سے جن لوگوں نے انکار کا فیصلہ کر لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک داستان پارینہ کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اس امر حق کو قبول کرنے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور بھاگتے ہیں حالانکہ دراصل وہ خود اپنی ہی تباہی کا سامان کر رہے ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ کاش تم اس وقت ان کی حالت دیکھ سکتے کہ جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کئے جائیں گے۔ اس وقت وہ کہیں گے کہ کاش کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں پھر واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔ درحقیقت یہ بات وہ محض اس وجہ سے کہیں گے کہ جس حقیقت پر انہوں نے پردہ ڈال رکھا تھا وہ اس وقت بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آچکی ہو گی' ورنہ اگر انہیں سابق زندگی کی طرف واپس بھیجا جائے تو پھر وہی سب کچھ کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے۔

وہ تو ہیں ہی جھوٹے۔ آج یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے۔ کاش وہ منظر تم دیکھ سکو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے۔ اس وقت ان کا رب ان سے پوچھے گا "کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟" یہ کہیں گے "ہاں ہمارے رب! یہ حقیقت ہی ہے۔" وہ فرمائے گا "اچھا تو اپنے انکار کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو۔" ........ نقصان میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے اپنی ملاقات کی اطلاع کو جھوٹ قرار دیا۔ جب اچانک وہ گھڑی آ جائے گی تو یہی لوگ کہیں گے "افسوس! ہم سے اس معاملے میں کیسی تقصیر ہوئی۔" اور ان کا حال یہ ہو گا کہ اپنی پیٹھوں پر اپنے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے ہوں گے۔ دیکھو

کیسا برا بوجھ ہے جو یہ اٹھا رہے ہیں۔ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور تماشا ہے' حقیقت میں آخرت کا مقام ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو زیاں کاری سے بچنا چاہتے ہیں۔ پھر کیا تم لوگ عقل سے کام نہ لوگے؟"

اب اس سورہ کے دریا میں پانچویں موج اٹھتی ہے۔ اس میں روئے سخن رسول اللہ کی طرف مڑ جاتا ہے۔ آپ کو تسلی دی جاتی ہے اور آپ کے حزن و ملال کو دور کیا جاتا ہے۔ آپ کی پریشانی یہ تھی کہ لوگ آپ کو اور آپ پر نازل ہونے والے کلام کی تکذیب کرتے تھے۔ آپ کو تلقین کی جاتی ہے کہ آپ انبیائے سابقین کے اسوہ حسنہ کو اپنائیں جن کی تکذیب کی گئی جن کو جھٹلایا گیا اور جن کو اذیت دی گئی۔ یہاں تک کہ اللہ کی نصرت آپہنچی۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ اللہ کی سنت ہے اور اس میں تبدیلی نہیں ہوتی لیکن اللہ کی سنت اپنے وقت سے پہلے بھی نہیں آتی۔ اگر آپ ان کے جود و انکار پر صبر نہیں کرتے تو آپ خود اپنی طرف سے کوئی معجزہ لے آئیں اور یہ سوچیں کہ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو اللہ ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ اللہ وحدہ صاحب حکم و تصرف ہے اور اس کی مشیت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ لوگ دعوت حق کو قبول کریں جن کی فطری قوتیں قبولیت حق کے لئے نااہل نہیں ہو چکیں۔ رہے وہ لوگ جو روحانی طور پر مر چکے ہیں اور ان کے اندر زندگی کی رمق باقی نہیں ہے تو وہ اشارات ہدایت کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور سچائی کو قبول نہیں کرتے۔ ایک دن آنے والا بہرحال ہے اور وہ سب اٹھ کر اس کے سامنے پیش ہوں گے۔

"اے محمد ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے' لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔ تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر جو انہیں پہنچائی گئیں انہوں نے صبر کیا' یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں تمہیں پہنچ چکی ہیں۔ تاہم اگر ان لوگوں کی بے رخی تم سے برداشت نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو۔ اگر اللہ چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا لہذا نادان مت بنو۔ دعوت حق پر لبیک وہی کہتے ہیں جو سننے والے ہیں' رہے مردے تو انہیں تو بس اللہ قبروں سے اٹھائے گا اور پھر وہ واپس لائے جائیں گے۔"

یوں اس سورہ میں کلام کی روانی موج در موج کی صورت میں چلتی ہے اور اس انداز میں جس کے نمونے ہم نے قارئین کے سامنے رکھے۔ ان نمونوں سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اس سورہ کا مزاج کیسا ہے نیز اس سے سورہ کے موضوع کے بارے میں بھی اچھی طرح روشنی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کی بعض لہریں ان سے بھی اونچی ہیں جن کو ہم نے بطور نمونہ درج کیا۔ بعض مقامات میں ان کا بہاؤ اور ٹکراؤ زیادہ پرجوش اور شدید ہے۔ ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ اس پوری سورت کا تنقیدی جائزہ اور تعارف ان مختصر الفاظ میں کر سکیں۔ بہرحال اس کا ایک دوسرا پہلو اگلے پیراگراف میں دیکھیں۔

---O:O---

اس سے پہلے ہم یہ بات کہہ آئے ہیں کہ یہ سورہ اپنے مرکزی موضوع کو نہایت ہی منفرد انداز میں پیش کرتی ہے' اس لیے کہ یہ سورہ ہر لمحہ میں' ہر موقف میں اور ہر منظر میں آنکھوں میں چکا چوند کرنے والا حسن لیے ہوئے ہے۔ جب انسان اس کے مناظر' اس کے اثرات' اور اس کے اشارات کو پے در پے دیکھتا ہے تو نفس انسانی انہیں اپنا حصہ بنا لیتا

ہے'اس کے تمام اثرات کو پلے باندھ لیتا ہے اور ہدایت کی روشنی حاصل کر لیتا ہے۔

اب ہم قارئین کے سامنے بعض ایسی آیات رکھتے ہیں جن سے یہ حقائق براہ راست قرآنی اسلوب میں نظر آئیں اس لیے کہ تبصرے کے ذریعے ہم جس قدر تعریف بھی کریں وہ براہ راست قرآنی آیات کے مطالعے کے مقابلے میں کم ہی مفید ہوتی ہے۔ آیات کا براہ راست اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

مقام الوہیت کا بیان 'لوگوں کو اپنے سچے رب سے متعارف کرانا اور لوگوں کو صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کے دائرے میں لانا اس سورہ کا مرکزی موضوع اور محور ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجئے مختلف مواقع اور مواقف پر قرآن کریم اس موضوع کو کس طرح لیتا ہے۔

شہادت اور فیصلہ کن موقف کے وقت' جہاں ضمیر مومن میں مقام الوہیت اچھی طرح بیٹھ جاتا ہے' جہاں مخالفین کے سامنے صاف صاف یہ موقف واضح کر دیا جاتا ہے نہایت ہی قوت اور نہایت ہی یقین کے ساتھ تو قرآن کا اسلوب یہ ہوتا ہے:

(قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ قُلْ اِنِّيْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (١٤) قُلْ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (١٥) مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ (١٦) وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (١٧) وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ (١٨) قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (١٩)

"کہو' اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنالوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین اور آسمان کا خالق ہے' اور جو روزی دیتا ہے اور روزی لیتا نہیں ہے؟ کہو' مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سر تسلیم خم کر دوں۔" "اور تم مشرکین میں شامل نہ ہو۔" کہو' اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی۔ اس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے۔ اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے

تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔وہ اپنے بندوں پر کامل اختیارات رکھتا ہے اور دانا و باخبر ہے۔ان سے پوچھو 'کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے؟ کہو میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے سب کو متنبہ کر دوں۔کیا واقعی تم لوگ یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں؟کہو 'میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں دے سکتا۔کہو 'خدا تو وہی ایک ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔"

جب اللہ کی حاکمیت اور سلطنت تمام بندوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور انسانی فطرت واشگاف ہو جاتی ہے' اس پر سے جاہلیت کے زنگ اتر جاتے ہیں' انسان اپنے رب واحد کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے' وہ جھوٹے خداؤں کا انکار کر دیتا ہے اور انسان جھٹلانے والوں کے خوفناک انجام کو دیکھتا ہے تو اس خوفناک صورت حالات میں اسے ان الفاظ میں متنبہ کیا جاتا ہے۔

(قُلْ اَرَئَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (٤٠) بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ (٤١) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ (٤٢) فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (٤٣) فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ (٤٤) فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (٤٥) قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ (٤٦) قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ (٤٧))

"ان سے کہو 'ذرا غور کر کے بتاؤ 'اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے کوئی بڑی مصیبت آ جاتی یا آخری گھڑی آ پہنچتی ہے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم سچے ہو۔اس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے ہو۔پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے۔ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو بھول جاتے ہو۔تم سے

پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور ان قوموں کو مصائب و آلام میں مبتلا کیا تاکہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جھک جائیں۔پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انہوں نے عاجزی اختیار کی؟ مگر ان کے دل تو اور سخت ہوگئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو، جو انہیں کی گئی تھی، بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے، یہاں تک کہ جب ان بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں وہ خوب مگن ہوگئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر چیز سے مایوس تھے۔اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا۔اور تعریف اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔اے محمدؐ ان سے کہو، کبھی تم نے یہ سوچا کہ اگر اللہ تمہاری بینائی اور سماعت تم سے چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا اور کون سا خدا ہے جو یہ قوتیں تمہیں واپس دلا سکتا ہے۔دیکھو کس طرح ہم بار بار اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر یہ کس طرح ان سے نظر چراتے ہیں۔کہو پھر کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ کی طرف سے اچانک یا اعلانیہ تم پر عذاب آجائے تو کیا ظالم لوگوں کے سوا کوئی اور ہلاک ہوگا؟"

جب مضمون یہ ہوتا ہے کہ اللہ تمام غیب اور تمام رازوں کا جاننے والا ہے، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کون کتنی بار سانس لے گا اور کس کی کیا عمر ہوگی۔وہ بحر و بر کو گھیرے ہوئے ہے، رات دن کا نگہبان ہے، دنیا و آخرت کا حکمران ہے اور زندگی اور موت اسی کے اختیار اور قدرت میں ہے تو ان مضامین کو یوں ادا کیا جاتا ہے۔

(وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۵۹) وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰى اَجَلٌ مُّسَمًّى ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۶۰) وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتّٰى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ (۶۱) ثُمَّ رُدُّوْا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحَاسِبِيْنَ (۶۲)

"اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔بحر و بر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے، درخت سے گرنے والا کوئی پتا ایسا نہیں ہے جس کا اسے علم نہ ہو، زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں ہے جس سے وہ باخبر نہ ہو، خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔وہی ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہے۔پھر دوسرے روز وہ تمہیں اسی کاروبار کے عالم میں واپس بھیج دیتا ہے تاکہ زندگی کی مقرر مدت پوری ہو، آخر کار اسی کی طرف تمہاری واپسی ہے، پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔اپنے بندوں پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے اور تم پر نگرانی کرنے والے مقرر کر کے

بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو اس کے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی جان نکال لیتے ہیں اور اپنا فرض انجام دیتے ہیں اور ذرا کوتاہی نہیں کرتے 'پھر سب کے سب اللہ ' اپنے حقیقی آقا کی طرف واپس جاتے ہیں ۔ خبردار ہو جاؤ کہ سارے اختیارات اس کو حاصل ہیں اور وہ حساب لینے میں بہت تیز ہے"۔

جب یہ مضمون آتا ہے کہ فطرت انسانی خود رب جلیل کی طرف سے ہادی اور رہبر ہے 'بشرطیکہ انسان اپنی فطرت کے دروازے ہدایت اور اشارات کائنات کے لئے کھول دے اور انسان قبولیت ہدایت کے لئے تیار ہو اس لیے کہ یہ کائنات اپنی زبان میں نہایت ہی موثرانداز میں بات کرتی ہے 'تو یہ سورہ یوں گویا ہوتی ہے ۔

(وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً اِنِّيْۤ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (٧٤) وَ كَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (٧٥) فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (٧٦) فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ (٧٧) فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَاۤ اَكْبَرُ فَلَمَّاۤ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (٧٨) اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (٧٩) وَ حَآجَّهٗ قَوْمُهٗ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنِ وَ لَاۤ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ (٨٠) وَ كَيْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ وَ لَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (٨١) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْۤا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ (٨٢) "اور ابراہیم کا واقعہ یاد کرو جب اس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا: "کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے؟ میں تو تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں ۔" ابراہیم کو ہم اسی طرح زمین و آسمان کا نظام سلطنت دکھاتے تھے اور اس لئے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے ۔ چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا ۔ کہا یہ میرا رب ہے؟ مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا ڈوب جانے

والوں کا میں گرویدہ نہیں ہوں۔ پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ میرا رب ہے' مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری راہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیم پکار اٹھا "اے برادران قوم! میں ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔" اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے کہا "کیا تم لوگ اللہ کے معاملے میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے راہ راست دکھا دی ہے اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا۔ ہاں اگر میرا رب کچھ چاہے تو ضرور ہو سکتا ہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے' پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟ اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جبکہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لئے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی؟ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی اور اطمینان کا مستحق ہے؟ بتاؤ اگر تم علم رکھتے ہو۔ حقیقت میں تو امن انہی کے لئے ہے اور راہ راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔"

اب گردش لیل و نہار کا منظر آتا ہے۔ اس میں زندہ اور متحرک مخلوق رواں دواں ہے' رات کی تاریکی میں چمکتے ہوئے ستارے' بحری ظلمات میں سمندری طوفانی لہریں' اور خشکی پر بڑھتے ہوئے فصل' میوہ جات اور زرعی کھیت' لہلہاتے ہوئے زیر بحث آتے ہیں۔ ان سب میں معرفت کردگار کا سامان ہے۔ کون ہے وہ ذات جس نے ان مناظر کو بغیر سابقہ مثال کے پیدا کیا؟ کیا کوئی عقل' اگر وہ درست و سلیم ہو' ایسے مبدع کے ساتھ شریک ٹھہرا سکتی ہے؟ سورہ کے الفاظ ہیں :

( اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَ النَّوٰى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۹۵) فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَ جَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۹۶) وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۹۷) وَهُوَ الَّذِيْ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (۹۸) وَ هُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَ مِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ الزَّيْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْا اِلٰى ثَمَرِهٖ اِذَآ

اَثْمَرَ وَ یَنْعِه اِنَّ فِیْ ذٰلِکُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۹۹) وَ جَعَلُوْا لِلّٰه شُرَکَآءَ الْجِنَّ
وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَه بَنِیْنَ وَ بَنٰتٍ بِغَیْرِ عِلْمٍ سُبْحٰنَه وَ تَعٰلٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ (۱۰۰)
بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنّٰی یَکُوْنُ لَه وَلَدٌ وَّلَمْ تَکُنْ لَّه صَاحِبَةٌ وَ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ
وَ هُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (۱۰۱) ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ
فَاعْبُدُوْهُ وَ هُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ (۱۰۲) لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ یُدْرِکُ
الْاَبْصَارَ وَ هُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (۱۰۳) "دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے۔ وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی مردہ کو زندہ سے خارج کرتا ہے۔ یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ ہے' پھر تم کدھر بہکے چلے جا رہے ہو؟ شب کو چاک کر کے وہی صبح نکالتا ہے۔ اسی نے رات کو سکون کا وقت بنایا ہے۔ اسی نے چاند اور سورج کے طلوع و غروب کا حساب مقرر کیا ہے۔ یہ سب اسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھہرائے ہوئے اندازے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا۔ دیکھو ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں' ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں اور وہی ہے جس نے ایک تنفس سے تم کو پیدا کیا۔ پھر ہر ایک کے لئے ایک جائے قرار ہے اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ۔ یہ نشانیاں ہم نے واضح کر دی ہیں ان لوگوں کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر اس کے ذریعے سے ہر قسم کی نباتات اگائیں۔ پھر اس سے ہرے بھرے کھیت اور درخت پیدا کئے' پھر ان سے تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھولوں کے گچھے پیدا کئے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں اور انگور' زیتون اور انار کے باغ لگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور پھر ہر ایک کی خصوصیت جدا جدا بھی ہے۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو' ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔ اس پر بھی لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا دیا حالانکہ وہ خالق ہے اور بے جانے بوجھے اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں تصنیف کر دیں' حالانکہ وہ پاک اور بالاتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ وہ تو آسمان اور زمین کا موجد ہے' اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اس کی کوئی شریک زندگی ہی نہیں ہے۔ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ یہ ہے اللہ تمہارا رب' کوئی خدا' اس کے سوا نہیں ہے' ہر چیز کا خالق' لہٰذا تم اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے۔ نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے وہ نہایت باریک بین اور باخبر ہے۔"

اب اللہ کی طرف نہایت ہی خشوع کے ساتھ رجوع کا منظر آتا ہے۔ اللہ واحد کی طرف سے نماز اور روزہ' زندگی اور موت صرف اسی کے لئے اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک کرنے کا انکار اور نفی۔ تمام امور' دنیاوی اور اخروی' دنیا میں خلافت اور نظام خلافت اور آزمائش اور آخرت میں حساب و کتاب اور جزاو سزا سب اسی کے لئے ثابت کئے جاتے ہیں اور یہ اس سورہ کا آخری منظر ہے۔

(قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَ مَا كَانَ
مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (١٦١) قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ
الْعٰلَمِیْنَ (١٦٢) لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (١٦٣)
قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا وَلَا تَزِرُ
وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ
(١٦٤) وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ
لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (١٦٥)

”اے محمدؐ کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھایا ہے' بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں' ابراہیم کا طریقہ جسے یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔کہو' میری نماز' میرے تمام مراسم عبودیت' میرا جینا اور مرنا' سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔اس کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا ہوں۔کہو' کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے؟ ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے' کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا' پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے' اس وقت وہ تمہارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا' اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں بلند درجے دیئے' تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔“

یہ تھے نمونے جو ہم نے اوپر پیش کئے' اس سورہ کے حسن بے بہا کو صرف یہی ظاہر نہیں کرتے' بلکہ اس سورہ کا ہر منظر اور ہر موقف حسن اثر اور حسن اظہار کا بہترین نمونہ ہے۔

---ooo---

اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں کہ اس سورہ کا سیاق کلام ہر مرحلے اور ہر منظر پر نہایت ہی دلکش پیرائے میں ہے' جبکہ ہر مرحلے اور ہر منظر میں بات متوازن بھی ہے۔کلام کے توازن اور دلکشی پر بات کرنے کا ہم نے وعدہ کیا تھا۔یہاں مناسب یہی ہے کہ ہم چند ہی نمونے پیش کریں اور تفصیلی بات چیت کو ایک بار پھر تشریح اور تفسیر کے موقع کے لئے چھوڑ دیں۔اس سورہ میں کلام کی شوکت اور دلکشی کے صرف تین رنگ ملاحظہ کریں۔یہ رنگ بہت ہی نمایاں ہیں۔

واقعات اور مناظر کے بیان میں ایک اہم خصوصیت یہ ہے اور یہ خصوصیت پوری سورہ میں پائی جاتی ہے کہ سامعین کو ایک زندہ اور متحرک منظر اور موقف کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔انسان کی نظروں کے سامنے ایک بھرپور منظر

ہوتا ہے اور وہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ مناظر اور مقاصد ایسے الفاظ میں پیش کئے جاتے ہیں کہ وہ تمام افراد اور واقعات کو مجسم طور پر پیش کر دیتے ہیں۔ گویا ان مناظر میں لوگ زندہ کھڑے ہیں' سامع انہیں دیکھ رہا ہے اور واقعات اس کی نظروں کے سامنے رونما ہو رہے ہیں۔ قیامت کے مناظر میں یوں نظر آتا ہے کہ گویا قیامت برپا ہے۔

(وَلَوْ تَرٰى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (٦: ٢٧) کاش تم اس وقت کی حالت دیکھ سکتے جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کئے جائیں گے۔ اس وقت وہ کہیں گے کہ کاش کوئی ایسی صورت ہو کہ دنیا میں پھر واپس جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔

(وَلَوْ تَرٰى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (٦: ٣٠) کاش وہ منظر تم دیکھ سکو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے۔ اس وت ان کا رب ان سے پوچھے گا "کیا یہ حقیقت نہیں ہے" یہ کہیں گے "ہاں اے ہمارے رب! یہ حقیقت ہی ہے" وہ فرمائے گا "اچھا تو اب اپنے انکار کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو۔"

(وَلَوْ تَرٰى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ (٩٣) وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ

(٩٤) کاش تم ظالموں کو اس حالت میں دیکھ سکو جب کہ وہ سکرات موت میں ڈبکیاں کھا رہے ہوتے ہیں اور فرشتے ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ "لاؤ' نکالو اپنی جان' آج تمہیں ان باتوں کی پاداش میں ذلت کا عذاب دیا جائے گا جو تم اللہ پر تہمت رکھ کر ناحق بکا کرتے تھے اور اس کی آیات کے مقابلے میں سرکشی دکھاتے تھے" (اور اللہ فرمائے گا) "لو اب تم ایسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا۔ جو کچھ ہم نے تمہیں دنیا میں دیا تھا' وہ سب تم پیچھے چھوڑ آئے ہو' اور اب ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمہارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے۔ تمہارے آپس کے سب رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے گم ہو گئے جن کا تم زعم رکھتے تھے۔"

(وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ (۲۲) ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ (۲۳) انْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ (۲٤)

"جس روز ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے اور مشرکین سے پوچھیں گے کہ اب وہ تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریک کہاں ہیں جن کو تم اپنا خدا سمجھتے تھے تو وہ اس کے سوا کوئی فتنہ نہ اٹھا سکیں گے کہ اے ہمارے آقا" تیری قسم ہم ہرگز مشرک نہ تھے۔" دیکھو اس وقت یہ کس طرح اپنے اوپر آپ جھوٹ گھڑیں گے اور وہاں ان کے سارے بناوٹی معبود گم ہو جائیں گے۔

اور جب یہ موقعہ آتا ہے کہ مکذبین کو اللہ کی پکڑ سے ڈرایا جائے اور یہ سمجھایا جائے کہ اللہ کی حاکمیت کی گرفت سے کوئی بچ نہیں سکتا تو لوگوں کو اللہ کی پکڑ کے مناظر کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

(قُلْ أَرَءَيْتَكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ اللَّهِ تَدْعُونَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (٤٠) بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ (٤١)) "ان سے کہو، ذرا غور کر کے بتاؤ، اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے مصیبت آ جاتی ہے یا آخری گھڑی آ پہنچتی ہے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم سچے ہو۔ اس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے ہو، پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو بھول جاتے ہو۔

(قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَأَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلَى قُلُوبِكُمْ مَنْ إِلَهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِهِ انْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُونَ (٤٦) قُلْ أَرَءَيْتَكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ بَغْتَةً أَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الظَّالِمُونَ (٤٧))

"اے محمدؐ ان سے کہو کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ تمہاری بینائیاں اور سماعت تم سے چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا اور کون خدا ہے جو یہ قوتیں تمہیں واپس دلا سکتا ہے؟ دیکھو کس طرح ہم بار بار اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر یہ کس طرح ان سے نظر چراتے جاتے ہیں۔ کہو کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ کی طرف سے اچانک یا اعلانیہ تم پر عذاب آ جائے تو ظالم لوگوں کے سوا کوئی اور ہلاک ہو گا؟"

ہدایت کے بعد ضلالت کی تمثیل پیش کرتے ہوئے اور ہدایت کے بعد حق سے رجوع اور روگردانی کرنے کی حالت

کے منظر کو یوں پیش کیا کہ ایک مجسم صورت حال نظروں کے سامنے ہوتی ہے' اگرچہ الفاظ میں اس طرف نہ اشارہ ہوتا ہے اور نہ کوئی حکم ہوتا ہے کہ اس کی طرف توجہ کرو' لیکن انسان منظر کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔

(قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (٦: ٧١)

اے محمدؐ ان سے پوچھو کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں' نہ نقصان؟ اور جب اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا چکا ہے تو کیا اب ہم الٹے پاؤں پھر جائیں؟ کیا ہم اپنا حال اس شخص کا سا کر لیں جسے شیطانوں نے صحرا میں بھٹکا دیا ہو اور وہ حیراں و سرگرداں پھر رہا ہو' درآں حالیکہ اس کے ساتھی اسے پکار رہے ہوں کہ ادھر آؤ' سیدھی راہ موجود ہے۔"

اب ہمارے سامنے پختہ پھلوں کا منظر آتا ہے' اور جنت کی زندگی کا نقشہ کھینچا جاتا ہے اور دست قدرت کے نتیجے میں قسم قسم کے پھل سامنے آتے ہیں اور قارئین کو اس منظر کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَىْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ اِنَّ فِىْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (٩٩)

"اور وہی ہے جس نے آسمانوں سے پانی برسایا' پھر اس کے ذریعے ہر قسم کی نباتات اگائی' پھر اس سے ہرے بھرے کھیت اور درخت پیدا کیے' پھر ان سے تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے۔ اور پھر کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے مہیا کیے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں اور انگور' زیتون اور انار کے باغ لگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور پھر ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا بھی ہیں۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو' ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔"

یہ ہیں' اس سورہ کے مقامات اور مناظر جن میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور یہ رنگ اس پوری سورہ میں برابر نظر آتا ہے۔ ان تمام رنگوں کے اندر ایک بات مشترک نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ان مناظر کی تصویر کشی اس انداز میں کی گئی ہے کہ مجرمین اور جھٹلانے والوں کے خلاف ہر قسم کی شہادت اور ثبوت جرم خود بخود ذہن نشین ہو جاتا ہے اور ان مناظر

میں ان مجرمین کی تصویر خود بخود نظروں میں آجاتی ہے۔ ان مناظر کے نمونے ہم نے اس سے قبل بھی پیش ہیں کئے جو لفظ (وَلَوْ تَرٰی) سے شروع ہوتے ہیں۔ ان مناظر میں اسلامی نظریہ حیات پر بھی دلائل دیئے جاتے ہیں اور اسلامی شریعت پر بھی۔ اس سورہ کے آغاز میں جب اسلامی عقائد اور نظریات سے بحث کی جاتی ہے تو ان جامع و مانع الفاظ میں کی جاتی ہے:

( قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ شَهِیْدٌ بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ اَءِنَّکُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی قُلْ لَّآ اَشْهَدُ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِیْ بَرِیْءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ (۱۹)

”ان سے پوچھو کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے؟ کہو' میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے' اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے سب کو متنبہ کر دوں' کیا واقعی تم لوگ یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں؟ کہو' میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں دے سکتا۔ کہو خدا تو وہی ایک ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔“

اور بات جب اس مضمون تک پہنچتی ہے جو حلال و حرام کے تعین سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا نظریاتی پہلو زیر بحث آتا ہے تو ایک نیا منظر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس جزوی مسئلے پر بھی ایسا ہی ثبوت طلب کیا جاتا ہے جس طرح اسلامی نظریات کے خلاف دوسرے موضوعات پر۔ مثلاً شرک وغیرہ پر ثبوت طلب کیا جاتا ہے اور قرآن کریم کا یہ عمومی انداز ہے۔

(قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَکُمُ الَّذِیْنَ یَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ (۱۵۰) ”ان سے کہو کہ لاؤ اپنے وہ گواہ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ ہی نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے۔“ پھر اگر وہ شہادت دے دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دینا' اور ہرگز ان کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور جو آخرت کے منکر ہیں اور جو دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں۔

قرآن کریم میں کلام کی ہم آہنگی کا ایک تیسرا رنگ یوں نظر آتا ہے کہ کسی موضوع پر مختلف مقامات پر جو بھی بات ہوتی ہے اس کا رنگ ڈھنگ ایک جیسا ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی عبارت مختلف ہو تو گویا ایک ہی حقیقت کو مختلف رنگوں میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ رنگ ڈھنگ چاہے جس قدر بھی مختلف ہوں حقیقت وہی رہتی ہے۔ مثلاً سورہ کے آغاز میں کہا گیا کہ جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ رب کے ساتھ دوسروں کو ہمسر بناتے ہیں۔ اسی طرح اس سورہ میں یہ کہا گیا کہ حلال و حرام جو لوگ از خود مقرر کریں وہ بھی دوسروں کو اللہ کا ہمسر بناتے ہیں دونوں جگہ (یَعْدِلُوْنَ) کا لفظ لایا جاتا ہے۔

(اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِیْنَ

كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ (۱) ”تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے زمین و آسمان بنائے ' روشنیاں اور تاریکیاں پیدا کیں ۔پھر بھی وہ لوگ جنہوں نے دعوت حق کو ماننے سے انکار کیا ہے دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھہراتے ہیں۔

(قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ (۱۵۰) ”ان سے کہو لاؤ اپنے گواہ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ ہی نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ' پھر اگر وہ شہادت دے دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دینا اور ہرگز ان کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور جو آخرت کے منکر ہیں اور جو دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں۔“

پہلی آیت میں اپنے رب کے ساتھ لوگوں کو ہمسر بنانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں اور دوسری آیت میں بھی وہ اللہ کے ساتھ ہمسر بناتے ہیں اس لئے کہ وہ حق قانون سازی میں دوسروں کو اللہ کا شریک اور ہمسر ٹھہراتے ہیں....... ان دونوں جگہ لفظ يَعْدِلُوْنَ اپنے مضمون کو بھی اچھی طرح ادا کرتا ہے اور اس کے اندر حسن تعبیر بھی ہے۔

اسی طرح قرآن کریم میں لفظ صراط سے پورا اسلام بھی مراد ہوتا ہے اور اس سے اسلام میں حق قانون سازی کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔

(فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۲۵) وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (۱۲٦) ”پس جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے ۔ اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے ۔ اور ایسا بھینچتا ہے کہ اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے ' اس طرح اللہ ناپاکی ان لوگوں پر مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے ' حالانکہ یہ راستہ تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے اور اس کے نشانات ان لوگوں کے لئے واضح کر دیئے گئے ہیں جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔“

اور جب سورہ کے آخر میں مویشیوں اور کھیتوں اور حلال و حرام کی بحث آتی ہے تو وہاں بھی لفظ صراط استعمال کیا جاتا ہے۔

(وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ

ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۵۳) "یہ کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے۔ یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں دی ہے شاید کہ تم کج روی سے بچو۔"

صرف ایک لفظ کے انتخاب سے ایک جزوی مسئلے کو ایمان اور نظریہ کے زمرے میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ دونوں معاملات میں اللہ کی ہدایت پر عمل صراط مستقیم پر چلنا ہے اور دونوں میں انحراف سیدھی راہ سے انحراف ہے۔ دونوں معاملات میں مسئلہ کفر و ایمان کا مسئلہ قرار پاتا ہے۔ یا کوئی شخص اسلام پر عمل پیرا ہوتا ہے یا رسم جاہلیت کا پیروکار ہوتا ہے جس طرح آغاز کلام میں ہم اس نکتے پر مفصل بحث کر آئے ہیں۔

مناسب ہے کہ اس سورہ کی اجمالی تعریف اور تبصرہ یہاں ختم ہو جائے اور اب اس کی آیات کو تفصیلاً لیا جائے۔ جس طرح اس سورہ میں ایک لہر کے بعد دوسری لہر اٹھتی ہے اس طرح ہم بھی تفصیلات میں جائیں گے اور اس میں ہمارا انداز کلام درس (سبق) کا نہ ہو گا جس طرح دوسری مدنی سورتوں میں ہم نے اختیار کیا' اس لئے کہ یہ انداز اس سورہ کے مزاج کے زیادہ مناسب ہے۔ واللہ ہو الموفق۔

---OOO---

# درس نمبر ۵۵ ایک نظر میں

سورہ کے آغاز میں یہ وسیع لہر انسان کے دل و دماغ کو تخلیق کائنات اور اس کے اندر تخلیق پر غور و خوض کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہ دونوں حقائق بیک وقت آفاق اور انفس میں نقطہ استدلال ہیں لیکن قرآن کریم ادراک انسانی کو اس طرف محض جدلیاتی انداز میں متوجہ نہیں کرتا اور نہ ہی لاہوتی اور کلامی انداز بحث اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا خطاب ہے جو زندگی سے بھرپور ہے اور خفتہ فطرت انسانی کو جگاتا ہے۔ انسانی فطرت کے سامنے تخلیق کائنات اور تخلیق حیات کو پیش کیا جاتا ہے۔ فیصلہ کن انداز میں تدبیر کائنات اور اس پر مکمل کنٹرول اور ضابطے کے پابند نظام کو پیش کیا جاتا ہے۔ محض جدلیاتی انداز میں نہیں۔ اس فیصلہ کن انداز کی تہ میں یقین کی قوت ہے جو کلام الٰہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس پر فطرت انسانی گواہ ہے اور فطرت انسانی شاہد عادل ہوتی ہے۔

زمین و آسمان کا وجود ' ان کا ایک مخصوص نظام کے مطابق چلنا ' ان کے اندر زندگی کا پیدا ہونا اور اس زندگی میں سے انسان کا اشرف الخلوق ہونا اور ان تمام امور کا ایک ضابطے کے مطابق جاری و ساری رہنا ' ایسے حقائق ہیں جو انسانی فطرت کے سامنے اصل سچائی کو روشن کرتے ہیں۔ فطرت انسانی کے اندر اللہ کی وحدانیت پر اس کا یقین پیدا کرتے ہیں اور وحدانیت اس سورہ کا اصل موضوع بھی ہے۔ نہ صرف اس پوری سورہ بلکہ پورے قرآن کا اصل موضوع ہی اللہ کی مکمل وحدانیت ہے۔ پورا قرآن ثبوت توحید کے لئے کوشاں ہے۔ قرآن مجید کے پیش نظر اصل مسئلہ یہ تھا ہی نہیں کہ اللہ موجود ہے یا نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اللہ جو موجود ہے اس کی صحیح معرفت کیا ہے۔ اس کی سچی صفات کیا ہیں؟ مسئلہ یہ کبھی نہیں رہا ہے کہ آیا اس کائنات کا کوئی الٰہ ہے یا نہیں ہے۔

مشرکین عرب جن کو یہ سورہ مخاطب کرتی تھی ' وہ وجود باری کے منکر تو تھے ہی نہیں۔ وہ اللہ کے وجود کا اقرار کرتے تھے اور مانتے تھے کہ اللہ خالق ہے ' رازق ہے ' مالک ہے ' زندہ کرنے والا اور مارنے والا ہے وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم میں ان کے جو افکار نقل کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان صفات باری کے قائل تھے۔ ان لوگوں کو اس اعتراف کے باوجود مشرک قرار دیا گیا تھا اس لئے کہ وہ اللہ وحدہ کے اس اعتراف کے مطابق اللہ وحدہ کو حاکم مطلق نہ قرار دیتے تھے اور اپنے تمام امور میں ذات باری کو حکم تسلیم نہ کرتے تھے۔ اپنی زندگی کے تمام معاملات سے دوسرے شرکاء کے عمل دخل کو خارج نہ کرتے تھے اور صرف اللہ کی شریعت کو قانون حیات تسلیم نہ کرتے تھے۔ اور وہ اس اصول کو تسلیم نہ کرتے تھے کہ زندگی کے معاملات میں سے کسی بھی معاملے میں غیر اللہ کو قانون سازی کا کوئی حق نہ ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ان لوگوں کو مشرک اور کافر کہا ' حالانکہ وہ وجود باری کا اقرار کرتے تھے اور مذکورہ بالا صفات باری کے بھی قائل تھے ' جن کا تقاضا یہ تھا کہ ان کے تمام امور میں حاکمیت کا حق صرف اللہ کو ہے اس لئے کہ جب خالق ' رازق اور مالک وہی ہے تو حاکم بھی اللہ ہی کو ہونا چاہئے۔ اس سورہ کے آغاز میں اسی لئے ان کے سامنے یہ

حقیقت رکھی گئی کہ اللہ انسانوں کا بھی خالق و مدبر ہے اور اس کائنات کا بھی خالق و مدبر ہے۔ اس کائنات اور انسانوں کی تدبیر میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ کائنات اور انسانوں کے تمام امور سے واقف ہے۔ ظاہری اور باطنی چیزوں سے خبردار ہے' انسانوں کے اعمال اور کردار سے بھی واقف ہے۔ یہ تمام امور ایسے ہیں کہ ان کے لازمی تقاضے کے طور پر تسلیم کیا جانا چاہئے کہ حاکم اور شارع بھی صرف اللہ ہی ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جس کی وضاحت ہم نے اس سورہ کے اجمالی تبصرے میں کر دی ہے۔

تخلیق اور روئیدگی حیات جس طرح مشرکین کے مقابلے میں عقیدۂ توحید کے حق میں مضبوط دلائل و شواہد تھے اور ان کا تقاضا تھا کہ اللہ ہی حاکم ہو' یہ دونوں باتیں جدید جاہلی تہذیب کے خلاف بھی نہایت ہی مضبوط دلائل ہیں جس کی بنیاد انکار خدا پر رکھی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جاہلیت جدیدہ کے ملحد پیروکار تو شاید اس بارے میں بھی شک میں مبتلا ہیں کہ آیا وہ خود اپنی ذات کے وجود کے بھی قائل ہیں یا نہیں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جاہلیت جدید کینسہ کے ردعمل کے طور پر ابھری۔ اس تحریک کو یہودیوں نے ہائی جیک کر لیا اور اسے اپنے اس منصوبے کے لئے استعمال کیا کہ دنیا میں اصول دین کی بنیاد پر ان کی تہذیب کے سوا کوئی دوسری تہذیب استوار نہ ہو اور تمام انسانیت کو الحاد و زندقہ میں پھنسا کر تاخت و تاراج کر دیا جائے۔ حکمائے یہود کے مشہور مکالمات میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت پوری انسانیت ان یہودیوں کے چنگل میں گرفتار ہے اور یہ محض اس لئے کہ اس وقت صرف یہودی ہی وہ لوگ ہیں جو قوت کے حقیقی سرچشمے یعنی عقیدۂ توحید اور دین کو پختگی کے ساتھ پکڑے ہوئے ہیں اور دوسری اقوام کو انہوں نے بے دین بنا دیا ہے۔

یہودیوں کے مکر و فریب کا یہ جال چاہے جس قدر بھی وسیع ہو وہ انسانی فطرت کو اس میں نہیں پھنسا سکتے۔ اس لئے کہ ذات باری پر ایمان انسان کی فطرت کی آواز ہے۔ اس سلسلے میں اگر انسان کبھی کوئی بڑی ٹھوکر کھاتا ہے تو وہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ذات باری کی صفات میں افراط و تفریط کرتا ہے۔ مزید یہ کہ انسان اللہ کو تو مانتا ہے لیکن اللہ کے حق حاکمیت کو تسلیم کرنے میں وہ متامل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ایسے لوگوں کو مشرک اور کافر کہتا ہے۔ بعض لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کی فطرت فساد و بگاڑ کا شکار ہوتی ہے اور وہ فطرت کی آواز کو نہیں سن سکتے اور ایسی بگاڑ کا شکار لوگ بسہولت یہودیوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور وجود باری کا انکار کر دیتے ہیں' البتہ یہ حقیقت ہے کہ اس کرۂ ارض کی عظیم آبادی میں ایسے بگڑے ہوئے نفوس شاذ کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کی تعداد ہر دور میں کم ہی رہی ہے۔ اس وقت پورے کرۂ ارض پر روس میں چند ملین ملحد ہوں گے اور چند ملین چین میں ہوں گے جن پر نہایت ہی قلیل تعداد میں پائے جانے والے حکمران آگ اور خون کے بل بوتے پر حکومت کرتے ہیں' اس کے باوجود کہ ان ملحد ممالک نے اربوں روپے خرچ کر کے اور تمام تعلیمی وسائل کو کام میں لاکر ان کے ذہن میں الحاد کا عقیدہ بٹھانے کی سعی کی ہے جس کے لئے انہوں نے نشرواشاعت کے تمام جدید ذرائع بھی استعمال کئے۔

ایک دوسرے میدان میں یہودی بہت کامیاب ہیں' وہ یہ کہ انہوں نے دین کو محض وجدان اور چند رسوم تک محدود کر دیا ہے اور اسے عملی زندگی سے نکال دیا ہے۔ انہوں نے لوگوں کو اس وہم میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ اس کے باوجود مومنین میں شمار ہو سکتے ہیں کہ اللہ ان کا قانون ساز نہ ہو اور انہوں نے قانون سازی کا حق کچھ اور ارباب کو دے

رکھا ہو۔ اپنی اس کامیاب پالیسی کی وجہ سے انہوں نے تمام انسانیت کو تباہ کر دیا ہے۔ لوگ کافر ہو گئے ہیں لیکن وہ سمجھتے یہی ہیں کہ وہ پکے مومن ہیں۔

یہودیوں کی دین دشمنی کا رخ سب سے زیادہ اسلام کی طرف ہے اس لئے کہ انہیں اپنی تاریخ کا پوری طرح علم ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ جب دین اسلام انسان کی پوری زندگی پر حکمران تھا تو اس نے ان یہودیوں پر بھی غلبہ پالیا تھا اور یہ کہ جب مسلمانوں نے اپنی عملی زندگی سے دین اسلام کو باہر نکالا تو یہودیوں کو مسلمانوں پر غلبہ نصیب ہو گیا۔ مسلمان اس زعم میں مبتلا رہے کہ وہ پکے مسلمان اور پکے مومن ہیں۔ دین کی موجودگی کے معاملے میں یہ بے فکری اور خوش فہمی جبکہ دین سرے سے موجود ہی نہ ہو' یہودی سازش کی کامیابی کے لئے نہایت ہی ضروری ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اللہ لوگوں کو اس بے فکری اور بے حسی سے اپنے حکم سے نکال دے۔

میں سمجھتا ہوں کہ صہیونی یہودی اور عیسائی صلیبی' دین اسلام کے حوالے سے مایوس نظر آتے ہیں۔ وہ اس وسیع اسلامی خطے کے بارے میں سخت مایوسی کا شکار ہیں جو یورپ' افریقہ اور ایشیا کے وسیع حصے پر مشتمل ہے۔ وہ اس بارے میں مایوس ہو گئے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو ملحد بنا سکیں گے یا یہ کہ جدید مادی نظریات سے مسلمانوں کو متاثر کیا جا سکے گا۔ اسی طرح وہ اس امر سے بھی مایوس ہو چکے ہیں کہ وہ مسیحی واعظین کے ذریعے مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کر سکیں گے اس لئے وہ اہل اسلام کے خلاف نہایت ہی مکروہ وسائل استعمال کر رہے ہیں اور گہری سازش تیار کر رہے ہیں۔ انہوں نے ان ممالک میں ایسی تنظیمیں تیار کر لی ہیں جو اپنے آپ کو اسلامی رنگ میں ظاہر کرتی ہیں۔ یہ تنظیمیں نظریات کے اندر بڑی رواداری کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ اگرچہ یہ تنظیمیں پورے دین کا انکار نہیں کرتیں لیکن اپنے اسلامی لباس میں یہ تنظیمیں وہ تمام منصوبے عالم اسلام میں روبکار لاتی ہیں جن کا حکم انہیں عیسائی اور یہودی استاد دیتے ہیں۔ یہ لوگ وہ کام بھی کر گزرتے ہیں جن کو سرانجام دینے میں صدیوں تک یہودی اور عیسائی ایجنٹ ناکام رہے۔

یہ تنظیمیں اسلام کے جھنڈے بلند کرتی ہیں اور زبان سے یہ اعلان کرتی ہیں کہ ہم دین کا احترام کریں گے لیکن اپنی حکومتوں میں یہ پوری طرح غیر اسلامی قوانین جاری کئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے خدا کی شریعت کو اپنی زندگیوں سے پوری طرح نکالا ہوا ہے۔ حرام کو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ حلال کیا جا رہا ہے۔ وہ اپنے ہاں تصورات اور اقدار کے میدان میں ایسے تصورات اور اخلاق کو رواج دے رہی ہیں جن سے اسلامی اخلاق اور اسلامی تصورات ختم ہو رہے ہیں۔ ان کی نشرواشاعت اور تعلیم و تربیت کے تمام وسائل اس طرح کام کر رہے ہیں کہ جن کے نتیجے میں تمام اسلامی تصورات اور اسلامی اخلاق کی نفی ہوتی ہے۔ اور جن کی وجہ سے تمام دینی اقدار مٹ رہی ہیں۔ یہ لوگ وہ تمام قوانین اور قراردادیں نافذ کرتے ہیں جن کو عیسائی مجالس اور یہودی پروٹوکول پاس کر دیں۔ مثلاً مسلمان عورت کو بازاروں اور سڑکوں میں نکالنا' عورت کو معاشرے کے لئے فتنہ بنانا' اور یہ بتانا کہ کثرت پیداوار اور ترقی کے لئے عورت کا گھر سے باہر آ جانا ضروری ہے جبکہ ہزاروں مرد گھروں میں بیکار اور بے روزگار بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اخلاقی بے راہ روی کو مختلف طریقوں سے عام کرتے ہیں اور لوگوں کو عملاً بے راہ روی میں مبتلا ہونے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ سب کام کرتے ہوئے یہ تنظیمیں یہ دعویٰ بھی کرتی چلی جاتی ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور اسلام کا احترام کرتی ہیں۔ عام لوگ بھی اس وہم میں مبتلا ہیں کہ وہ ایک مسلم معاشرے میں زندہ رہ رہے ہیں۔ وہ مسلمان ہیں اور ان میں سے کچھ اچھے لوگ نماز بھی پڑھتے ہیں اور

روزے بھی رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حق حاکمیت یا تو صرف اللہ کے لئے ہو گا یا ارباب متفرقون کے لئے ہو گا۔ بس یہی نقطہ حکمرانی ہے جس کے بارے میں صلیبی عیسائیوں اور صیہونی یہودیوں نے اہل اسلام کو مکمل طور پر دھوکے میں ڈال دیا ہے اور ان کے تمام نشرواشاعت کے ذرائع اور تعلیم و تربیت کے وسائل پورے طور پر اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ مغربی استعمار کے ایجنٹ' مستشرقین اور مغربی علماء اور مفکرین رات اور دن اس کام میں لگے ہوئے ہیں کہ حکومت اور حکمرانی کے ساتھ دین کا کوئی واسطہ اور تعلق نہیں ہے۔ اسلامی حکومت کے بغیر بھی وہ مسلمان رہ سکتے ہیں۔ وہ دین اسلام میں داخل شمار ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ ان کی پوری زندگی ایسی اقدار پر استوار اور ایسے تصورات پر اٹھی ہو جن کا تعلق نہ اسلام سے ہو اور نہ شریعت میں ان کی کوئی گنجائش ہو۔

اس سازش کو مزید گہری اور گمراہ کن بنانے کے لئے یہ عالمی صیہونیت اور عالمی صلیبیت' عالم اسلام میں مقرر کردہ اپنے ایجنٹوں کے ساتھ مصنوعی معرکہ آرائی بھی شروع کر دیتی ہیں۔ بعض جگہ یہ معرکہ آرائی سرد جنگ کی صورت میں ہوتی ہے جبکہ بعض اوقات عملی جنگ ہوتی ہے اور مختلف شکلوں میں لوگوں کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ ان مغربی ایجنٹوں کے سخت مخالف ہیں حالانکہ یہ ایجنٹ درحقیقت خود انہوں نے مقرر کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ان کو ہر قسم کی مالی' ادبی' ثقافتی امداد دیتے ہیں اور اپنی ظاہری اور خفیہ قوتوں کی وجہ سے ان کی حفاظت کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کی خفیہ ایجنسیاں رات دن ان گماشتوں کی خدمت اور حفاظت میں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔

یہ ظاہری اور مصنوعی عداوت اس لئے پیدا کی جاتی ہے کہ یہ صیہونی اور صلیبی سازش نہایت ہی گہری ہو اور کسی کے ذہن میں یہ خیال تک نہ گزرے کہ عالم اسلام کے حکمران مغرب کے گماشتے ہیں اور یہ اہالیان مغرب کے لئے وہ کام کر رہے ہیں جو اہل مغرب اپنے استعمار کی تین صدیوں تک نہ کر سکے تھے۔ یہ لوگ عالم اسلام کے اخلاق کو تباہ کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی اقدار کو ختم کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے تصورات اور نظریات کو برباد کر رہے ہیں اور وہ مسلمانوں کو ان کی قوت کے اصل سرچشمے سے محروم کر رہے ہیں۔ کہ کہیں وہ اپنی زندگیوں کو اسلامی شریعت کے اوپر استوار نہ کر لیں تاکہ یہ ایجنٹ صیہونیوں کے پاس کردہ پروٹوکولز عالم اسلام میں نافذ کریں اور عالمی صلیبیوں کے پاس کردہ فیصلوں کے مطابق حکومت کریں اور کوئی آنکھ انہیں دیکھ نہ رہی ہو اور عالم اسلام کا کوئی بیدار شخص انہیں نوٹ نہ کر سکے۔

لیکن ان تدابیر کے باوجود بھی اگر عالم اسلام میں کوئی شخص ایسا پایا جائے جو اس گہری سازش کے پھندے میں نہ آئے اور جعلی اسلام پر مطمئن ہو کر بے حس ہونے کے لئے تیار نہ ہو' ان دینی تنظیموں کے پھندے میں نہ آئے جو دین اسلام کی تحریف کے لئے وجود میں لائی گئی ہیں جو کفر کو اسلام ثابت کرتی ہیں۔ فسق' فجور اور اخلاقی بے راہ روی کو ترقی پسندی سے تعبیر کرتی ہیں۔ اگر اس قسم کا کوئی صاحب بصیرت ان گماشتوں کو نظر آئے تو یہ فوراً اس کے خلاف تباہ کن جنگ شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر جھوٹی تہمتیں لگاتے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ تمام ایسے بیدار لوگوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے اور ان پر ناقابل برداشت مظالم ڈھائے جائیں' لیکن مغربی عالمی خبر رساں ادارے اور خبر رساں ایجنسیاں اس طرح مہر بلب ہوتی ہیں کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ ان کا کردار گونگے 'شیطان کا کردار ہوتا ہے اور اس وقت انہیں بنیادی حقوق بالکل یاد نہیں ہوتے۔

عالم اسلام کے سادہ لوح اور نیک مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ ان غیر ملکی ایجنٹوں اور عالم اسلام کی بیدار لیڈر شپ کے

درمیان شاید کوئی شخصی تنازعہ ہے اور اس جنگ کا دین اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بدستور اپنی سادہ لوحی میں روز و شب بسر کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے دینی معاملات میں تو بڑی دینی حمیت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے مسائل پر سینہ تان کر سامنے آ جاتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے منکرات کے خلاف ضرور اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے ان مکروہات اور منکرات کے خلاف زبانی آواز اٹھا کر بس دینی فریضہ ادا کر دیا ہے لیکن وہ دیکھ رہے ہیں کہ دین کی بنیادوں کو اکھاڑا جا رہا ہے' اس کی اساسوں پر کلہاڑا چلایا جا رہا ہے' اللہ کے حق حاکمیت اور حق قانون سازی کو غصب کیا جا رہا ہے اور اللہ کے مقابلے میں طاغوت کی شریعت نافذ ہے' حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ شریعت طاغوت کا انکار کر دیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ طاغوت حکمران ہے اور لوگوں کی پوری زندگی پر حکمران ہے لیکن وہ اسے انگیز کیے جا رہے ہیں۔

عالمی یہودیت اور عالمی صلیبیت جب یہ دیکھتی ہے کہ اس کی یہ سازش نہایت کامیابی سے آگے بڑھ رہی ہے تو وہ خوشی سے پھولی نہیں سماتی حالانکہ وہ اعلانیہ الحاد کے ذریعہ دین اسلام کا مقابلہ کر کے عاجز آگئی تھی' نیز صدیوں تک کوشش کرنے کے باوجود وہ مسلمانوں کو دین اسلام سے پھیر کر عیسائی نہ بنا سکی تھی۔

لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ غبار جلد ہی چھٹ جائے گا اور یہ دین ایک دن ضرور غالب ہو کے رہے گا۔ بے شک یہ لوگ گہری چال چلتے ہیں لیکن اللہ خیر الماکرین ہے۔ اس کا فرمان ہے:

(وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ (٤٦) فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ

(١٤ : ٤٦ - ٤٧)) "انہوں نے اپنی ساری چالیں چل دیکھیں' مگر ان کی ہر چال کا توڑ اللہ کے پاس تھا' اگرچہ ان کی چال ایسی غضب کی تھی کہ پہاڑ اس سے ٹل جائیں۔ اے نبی تم ہرگز گمان نہ کرو کہ اللہ کبھی اپنے رسولوں سے کیے ہوئے وعدوں کے خلاف کرے گا۔ اللہ زبردست ہے' اور انتقام لینے والا ہے۔"

الحاد کے جنون کے علاج کے لئے تخلیق اور حیات کے دلائل نہایت مفید نسخہ ہے۔ یہ اس قدر قوی دلیل ہے کہ ملحدین اس کے مقابلے میں محض شف شف اور بودی تاویلیں ہی کر سکتے ہیں۔

اس کائنات کا اس کے مخصوص نظام کے ساتھ وجود میں لانا' فطرت کے بدیہی استدلال کے مطابق اور نفس انسانی کے عقلی تقاضے کے مطابق' اس بات کو مستلزم ہے کہ اس کا کوئی موجد' خالق اور مدبر ہو اس لئے کہ وجود اور عدم کے درمیان جو فاصلے اور گیپ ہیں ان کو محض انسانی ادراک عبور نہیں کر سکتا۔ یہ گیپ صرف اس عقیدے اور نظریے کے ذریعہ ہی بھرا جا سکتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق' موجد اور الٰہ ہو۔

جو لوگ عقیدۂ الحاد کے قائل ہیں وہ اس گیپ کو محض مکابرہ کے ذریعہ بھرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بات ضروری نہیں ہے کہ ہم وجود سے قبل عدم کے قائل ہوں۔ ان میں سے ایک برگسان یہودی فلسفی ہیں' جو روحانیت کے فلسفی مشہور ہیں' وہ مادیت کے مقابلے میں روحانیت کا دفاع کرتے ہیں اور اس پہلو سے بعض مسلمان بھی ان سے متاثر

نظر آتے ہیں۔انہوں نے ان کے بعض اقوال سے اپنے دین کے حق میں استدلال بھی کیا ہے۔گویا یہ لوگ اللہ کے دین کو بندوں کے اقوال کے ذریعے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔برگسان کے فلسفے کا نچوڑ یہ ہے کہ اس کائنات سے پہلے عدم تھا ہی نہیں۔اور یہ مفروضہ کہ یہ کائنات عدم سے وجود میں آئی محض انسانی عقل کا مفروضہ ہے اور انسانی عقل کی کمزوری یہ ہے کہ وہ صرف اسی نہج پر سوچ سکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ برگسان کس منطق سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وجود سے پہلے عدم نہ تھا۔

کیا عقل اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ وجود سے پہلے عدم نہ تھا؟ نہیں' وہ خود اس نتیجے تک پہنچا ہے کہ عقل تو صرف عدم کے بعد وجود کا تصور کر سکتی ہے۔پھر کیا اس نے اللہ کی جانب سے کسی وحی کے بل بوتے پر یہ نتیجہ اخذ کیا؟ نہیں وہ اس کا بھی مدعی نہیں رہا ہے۔اگرچہ وہ اس کا قائل ہے کہ روحانی صوفیوں کا وجدان ہمیشہ الٰہ العالمین کا قائل رہا ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس مسلسل وجدان کی تصدیق نہ کریں۔(ہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ جس الٰہ کو برگسان کے مطابق صوفی وجدان نے ہمیشہ پایا ہے وہ زندگی ہے)۔اب سوال یہ ہے کہ وہ تیسرا ذریعہ کیا ہے جس سے وہ اپنے اس فلسفے کو ثابت کرتا ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کائناتی وجود سے قبل کوئی عدم ہو......کوئی عقلی نقلی دلیل اس کے ہاں نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر ذی شعور اس بات پر مجبور نظر آتا ہے کہ وہ اس کائنات کے لئے ایک خالق کا قائل ہو اور وہ مجبور اس لئے ہے کہ وہ اس کائنات کے وجود کی کوئی علت سمجھ سکے۔ ہمارے سامنے مجرد اور فقط وجود ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے سامنے ایک کائناتی نظام ہے۔ یہ نظام ایسے ضابطوں کا پابند ہے جس کی ذرہ برابر خلاف ورزی نہیں ہو رہی ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز حساب وہندسہ کے مطابق معیاری ہے اور ہماری چھوٹی عقلیں صدیوں کے غور و خوض کے بعد بھی اس کائنات کے نہایت ہی قلیل ضابطوں کو سمجھ سکی ہیں۔

(انکار خدا کا اصل سبب یہ ہے کہ اہل کینسہ اللہ کے نام سے عوام الناس کی گردنوں پر صدیوں سے سوار تھے۔ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں کلیسا سے فرار کی راہ یوں اختیار کی گئی کہ لوگوں نے سرے سے خدا کا انکار کر دیا۔کینسہ سے فرار حاصل کرنے والوں میں جو لوگ زیادہ سمجھدار تھے انہوں نے انکار خدا کے بجائے عقل کو وہ صفات دے دیں جو اللہ کی تھیں اور ان میں سے جو لوگ مادہ پرست تھے۔انہوں نے صرف مادہ کو صفات باری عطا کر دیں' اس لئے کہ ان سب کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا کہ یہ لوگ اپنے وجود اور تمام موجودات کے اوپر کسی قوت کے قائل ہوں' جس کی روشنی میں اس کائنات کو بامعنی بنایا جاسکے اور اس کے اندر جو واقعات اور تغیرات ہوتے ہیں ان کو سمجھا جاسکے۔یہ لوگ محض انکار خدا چاہتے تھے اور اس سے بھی ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ اہل کینسہ کے کنٹرول سے نکل آئیں۔)

اسی طرح اس کرۂ ارض کے اوپر زندگی کا نمودار ہونا بھی ایک بہت ہی بڑا راز ہے۔زندگی اور مادے کے درمیان بہت ہی بڑا فرق ہے اگرچہ مادے کی اصلیت ہم روشنی کو قرار دیں۔بہرحال کسی ایسی ذات کا تصور ضروری ہے جو الٰہ ہو' مدبر ہو' خالق ہو' جس نے اس کائنات کی تخلیق اس انداز میں فرمائی جس کے اندر زندگی کے نشوونما پانے کے لئے سازگار حالات پیدا ہوئے۔ایسے اسباب فراہم کئے جس کے نتیجے میں زندگی کو جاری رکھا جا سکتا ہے۔پھر اس کائنات کے اوپر پائی جانے والی تمام زندہ مخلوقات کے سرخیل ''انسان'' کی زندگی تو اپنے مخصوص خدوخال رکھتی ہے۔انسان کی

اصل ساخت مٹی سے ہے اور مٹی اس زمین کا اصل مادہ ہے لہٰذا اس مٹی سے اوپر کوئی ارادہ ضرور ہونا چاہیے جس نے انسان کو حیات عطا فرمائی اور اسے خصائص انسانیت عطا کرتے ہوئے صاحب ارادہ اور صاحب اختیار مخلوق قرار دیا۔

اب ذرا ملحدین کی سوچ پر نگاہ ڈالیں۔ آج تک انہوں نے "زندگی" کی جو تفسیر اور تشریح بھی کرنے کی سعی کی ہے ' اس میں وہ ناکام رہے ہیں۔یعنی زندگی کی وہ تشریح جو انسانی عقل کے ذریعے کرنے کی کوشش کی گئی۔اس سلسلے میں جو آخری بات میں نے پڑھی ہے وہ سٹرڈیورانٹ کی تحریر ہے ' جو نام نہاد امریکی فلسفی ہیں۔انہوں نے ایٹم کے اندر پائے جانے والی حرکت اور اس کرۂ ارض پر پائے جانے والی زندگی کے درمیاں مماثلت ثابت کرنے کی سعی کی ہے۔وہ ایٹم کے اندر پائے جانے والی حرکت کو زندگی قرار دیتا ہے۔یہ ایک بھونڈی کوشش ہے جو یہ ملحد فلسفی اس گیپ کو بھرنے کے لئے کر رہے ہیں جو مردہ مادے اور متحرک اور دوڑتی ہوئی زندگی کے درمیان موجود ہے۔اور یہ تفسیریں اور تعبیریں یہ ملحد فلسفی اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں کائنات کی حقیقی تشریح کے لئے کسی اللہ کا قائل ہونا نہ پڑے جو زندگی بھی دینے والا ہے اور موت بھی دینے والا ہے۔

لیکن سٹرڈیورانٹ کی یہ بھونڈی کوشش نہ اس کے لئے مفید ہے اور نہ ان ملحدین کے لیے مفید مطلب ہے ' جو خدا کے منکر ہیں۔اس لئے کہ اگر زندگی کو ایک ایسی خصوصیت قرار دیا جائے جو مادے کے اندر موجود ہے اور اس مادے کے اوپر کسی صاحب عزم و ارادہ قوت کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہو گا کہ اس مادے کے اندر موجود زندگی کی خصوصیات مختلف زندہ چیزوں میں مختلف کیوں ہیں؟ بعض اشیاء کی زندگی نہایت ہی پیچیدہ ہے اور مادہ ترقی یافتہ ہے۔مثلاً ایٹم کے اندر جو حرکت ہے اس کے اندر فہم و ادراک نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔یہ زندگی اور حرکت نباتات کے اندر ایک عضو کی حرکت کی صورت میں آتی ہے۔اس کے بعد زندہ چیزوں کے اندر ان کی عضویاتی تشکیل زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ مادہ جس کے اندر حرکت یا زندگی ایک ہی معیار کی ہے ' اس کا ظہور بعض چیزوں کے اندر بمقابلہ بعض دوسری چیزوں کے کیوں زیادہ معیاری اور مکمل ہوتا ہے اور بعض میں غیر مکمل ہوتا ہے۔کیا اس تغیر کے پیچھے کوئی قوت مدبرہ آپ مانتے ہیں یا نہیں؟ آخر مختلف چیزوں کے اندر یہ مادی حرکت ہے یا بقول شما زندگی مختلف کیوں ہے؟

ہم تو اس کی تعبیر یہ کرتے ہیں کہ ایک قوت مدبرہ ہے جو اپنے ارادے سے ایسا کرتی ہے اور وہ اللہ العٰلمین ہے ' اور یہ تعبیر دل لگتی ہے ' لیکن اگر آپ مادے سے وراء کوئی قوت نہیں مانتے تو عقل انسانی کے لئے زندگی کے ان تغیرات اور بوقلمونیوں کو سمجھنا کس قدر مشکل ہے۔

ہم تو بسہولت اس کائنات کو سمجھ لیتے ہیں جب ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ اس کائنات کے اوپر ایک قوت مدبرہ حاکم ہے۔لیکن اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ایٹم زندہ ہے (چلو ہم فرض کر لیتے ہیں) اور اس زندہ ایٹم کے اوپر کوئی اور قوت مدبر نہیں ہے تو اس صورت میں عقل انسانی کے لئے زندگی کی ان بوقلمونیوں کو سمجھنا مشکل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے ان متنوع مظاہر کو صرف اس انداز میں حل کیا جاسکتا ہے جس میں انہیں اسلامی تصور حیات حل کرتا ہے اور اس حل اور تصور کے علاوہ جس قدر مادی تصورات بھی پیش کئے گئے ہیں وہ بری طرح ناکام رہے۔

تفسیر ظلال القرآن میں ہم نے چونکہ صرف قرآنی انداز تفسیر اپنایا ہے اس لئے اس موضوع پر ہم اس سے زیادہ کوئی بات کرنا مناسب نہیں سمجھتے ' اس لئے الحاد کے خلاف ہم یہی دو دلائل دے کر اپنی بات کو ختم کرتے ہیں جو قرآن نے دیئے

یعنی تخلیق اور حیات - قرآن نے وجود باری کے ثبوت کو اپنے ذمے نہیں لیا ہے - وجود باری کا اقرار تقاضائے فطرت ہے اور الحاد کی گندگی کو فطرت کبھی قبول ہی نہیں کرتی - قرآن جس مسئلے پر بہت زور دیتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کو وحدہ لاشریک تسلیم کیا جائے اور انسانوں کی زندگی میں اللہ کی سلطنت کو قائم کیا جائے - یہی وہ مسئلہ ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اس پہلی موج میں، اشارہ فرمایا ہے -

---ooo---

# درس نمبر ۵۵ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۳

اس سورہ کے آغاز میں اس حقیقت کی کچھ جھلکیاں دکھائی گئی ہیں جو اس میں زیر بحث ہے۔ سورہ کا آغاز ہی طویل زیر و بم سے کیا گیا ہے۔ ابتدائی آیات ہی میں اسلامی نظریہ حیات کی حقیقت اور سورہ کے موضوع کا کلیہ بیان کر دیا گیا ہے۔ آغاز یوں ہوتا ہے۔

سُورَةُ الْأَنْعَامِ (۶) مَكِّيَّةٌ (۵۵)
آيَاتُهَا ۱۶۵ رُكُوعَاتُهَا ۲۰
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ؕ۬ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ۝۱

تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے زمین اور آسمان بنائے' روشنی اور تاریکیاں پیدا کیں۔ پھر بھی وہ لوگ جنہوں نے دعوت حق کو ماننے سے انکار کر دیا ہے دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھہرا رہے ہیں۔"

یہ ابتدائی جھلکیاں' الحمد للہ سے شروع ہوتی ہیں' اللہ کی تعریف کی جاتی ہے اور اس کی پاکی کا بیان ہوتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ حمد و ثنا کا مستحق اور سزاوار وہی ہے اور یہ اس لئے کہ اس کی الوہیت اور بادشاہی اس کی تخلیق اور مخلوقات سے واضح طور پر عیاں ہے۔ اس طرح تعریف کے سزاوار اللہ اور اس کی اہم خصوصیت یعنی تخلیق کائنات کو یہاں مربوط کیا جاتا ہے اور اس کائنات کے وسیع حصے کی تخلیق کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ یعنی آسمان و زمین کو۔ نیز تخلیق کے اس وسیع حصے کے اہم مظہر یعنی ظلمت و نور کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو گردش ارض و سما کے نتیجے میں سامنے آتا ہے۔ ایک جھلکی میں اس نظر آنے والی کائنات کے وسیع حصے کو ہمارے فکر و نظر کے لئے پیش کر دیا جاتا ہے' حالانکہ اس کائنات کے اجرام فلکی جو ظلمت و نور کا سبب ہیں ان کے درمیان وسیع مسافتیں ہیں' لیکن کائنات کی ان وسعتوں میں ان کی گردش کے نتائج کو یہاں لایا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ ان لوگوں کی حالت پر حیرت کا اظہار کیا جائے جو اس عظیم کائنات کے ان

کھلے صفحات کو دیکھ رہے ہیں جن کے اندر ایک عظیم حکمت و تدبیر صاف نظر آتی ہے۔ لیکن عقل و خرد کے مالک ہونے کے باوجود وہ ایمان نہیں لاتے' اللہ کو وحدہ لاشریک نہیں سمجھتے اور اس کی حمد و ثنا نہیں کرتے بلکہ وہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں اور اللہ کے مساوی درجہ دیتے ہیں۔

(ثُمَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ (٦ : ١)) پھر بھی وہ لوگ جنہوں نے دعوت حق کو ماننے سے انکار کر دیا ہے' دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھہرا رہے ہیں۔" تعجب ہے اس بات پر کہ اس کائنات میں عقیدۂ توحید پر عظیم دلائل موجود ہیں جو پکار پکار کر دعوت غور و فکر دے رہے ہیں لیکن ان تمام دلائل کے آثار نفس انسانی پر اثر نہیں کرتے۔ ایک کفر کرنے والے نفس پر۔ انسان کا نقطہ نظر کس قدر حقیقت سے دور ہے کہ وہ ان اجرام فلکی اور ان کے درمیان پائے جانے والے فاصلوں اور ان کے دوران گردش کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مظاہر پر نہ صرف یہ کہ غور نہیں کرتا بلکہ وہ حقیقت سے بہت ہی دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

ایک دوسری جھلکی :

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا ۖ وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِندَهُ ۖ ثُمَّ أَنتُمْ تَمْتَرُونَ ﴿٢﴾

"وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا' تمہارے لئے زندگی کی ایک مدت مقرر کر دی' اور ایک دوسری مدت اور بھی ہے جو اس کے ہاں طے شدہ ہے' مگر تم لوگ ہو کہ شک میں پڑے ہوئے ہو۔"

کائنات کے بعد اب اس کائنات کے اندر وجود انسانی کی جھلکی دکھائی جاتی ہے۔ پہلے اس کائنات اور اس میں پیدا ہونے والے بڑے مظاہر روز و شب کو غور و فکر کے لئے پیش کیا گیا تھا۔ اس بے جان کائنات کے اندر ایک جاندار اور شاندار مخلوق انسانی کو غور فکر کے لئے پیش کیا جاتا ہے کہ ایک بے جان اور تاریک مٹی کے اندر انقلاب برپا کر کے اللہ نے اس سے ایک زندہ اور تر و تازہ مخلوق کو پیدا کیا۔ دونوں جھلکیوں کے اندر تناسب اور ہم آہنگی دیکھئے کہ ظلمت و نور اور مردہ و زندہ کے اندر کس قدر خوبصورت فنی تقابل ہے۔ ان دونوں جھلکیوں کے اندر دو اور جھلکیاں بھی ہیں' ایک یہ کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ اس زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا اور دوسرے یہ کہ بیک وقت یہ تمام مردہ لوگ میدان حشر میں جمع ہوں گے۔ تمام مردہ اور ساکن لوگ بیک وقت جنبش میں آ جائیں گے اور میدان حشر برپا ہو گا جس میں ہر طرف حرکت ہی حرکت ہو گی جس طرح مٹی ساکن اور ہر جاندار متحرک ہوتا ہے۔ ان مردوں اور زندوں کے درمیان اپنی حقیقت کے اعتبار سے بہت بڑا فرق اور فاصلہ ہے۔ ان تمام مناظر و مظاہر کا تقاضا تو یہ تھا کہ ایک سلیم الفطرت انسان کا کاسہ دل ایمان سے لبریز ہو جاتا اور وہ اللہ کے سامنے ایک دن پیش ہونے کا یقین کر لیتا لیکن اس سورہ کے مخاطب اہل کفر اس کے باوجود اس میں شک کرتے ہیں۔ (ثُمَّ أَنتُمْ تَمْتَرُونَ (٢ : ٢)) "مگر تم لوگ ہو کہ شک میں پڑے ہوئے ہو۔" تیسری جھلکی کی نوعیت یہ ہے کہ وہ ان تمام سابقہ مظاہر کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ یہ

پوری کائنات 'یہ پوری زندگی اور پھر خصوصاً پورا عالم انسانیت اللہ کے دائرہ حکومت میں داخل ہے۔

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۚ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ﴿۳﴾

"وہی ایک حاکم آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی' تمہارے کھلے اور چھپے سب حال جانتا ہے اور جو برائی یا بھلائی تم کماتے ہو اس سے خوب واقف ہے۔"

وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا' وہی آسمانوں اور زمین کی حاکم مطلق ہے۔ اس حق حاکیت میں وہ منفرد ہے۔ زمین و آسمان دونوں پر اس کی حکومت کو تسلیم کیا جانا چاہئے۔ اللہ کی شان حاکیت' زمین و آسمان میں پوری طرح جاری و ساری ہے۔ یوں کہ زمین و آسمان میں اللہ کا جاری کردہ ناموس کائنات ان پر پوری طرح حاوی ہے اور وہ اس سے سرتابی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اللہ کی منشا یہ ہے کہ انسانوں کی زندگی کے اندر بھی اللہ کا حکم' قانون اور شریعت جاری ہو' اس لئے کہ جس طرح اللہ نے زمین و آسمان کی تخلیق فرمائی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو بھی پیدا کیا ہے۔ انسان اپنی ابتدائی تخلیق کے وقت اس زمین کی مٹی سے پیدا کیا گیا۔ اس کے اندر وہ خصائص رکھے گئے جن کی وجہ سے وہ انسان بنا اور اس زمین ہی سے اس کے رزق کا بھی بندوبست کیا گیا۔ یہ انسان اپنی جسمانی تخلیق کے زاویہ سے بھی اسی قانون قدرت کا تابع ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے جاری کیا ہے' چاہے وہ راضی ہو یا نہ ہو۔ اس کی ابتدائی تخلیق صرف اللہ کی مرضی سے ہوتی ہے۔ انسان کی ذات کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا' نہ اس کی ماں اور باپ کی مشیت اور ارادے کا اس میں کوئی دخل ہوتا ہے۔ وہ دونوں باہم ملتے ضرور ہیں لیکن وہ بچے میں روح نہیں ڈال سکتے نہ جنین کو وجود بخش سکتے ہیں۔ یہ بچہ ان تمام قوانین قدرت کے مطابق مدت حمل پوری کر کے اس ناموس فطرت کے مطابق بطن مادر سے باہر آتا ہے جو اس کے لئے رب ذوالجلال نے تجویز کیا ہے۔ وہ اس ہوا میں سانس لیتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیمانوں کے مطابق بنایا ہے اور وہ اسی قدر اور اسی کیفیت کے مطابق سانس لیتا ہے جو اللہ کے قانون قدرت نے وضع فرمائے۔ اس کا احساس رنج والم' اس کا بھوک اور پیاس کا احساس' اس کا کھانا اور پینا اور عام طور پر زندہ رہنا عین ناموس فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں اس کے ارادے کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اپنے فطری وجود کے اعتبار سے انسان اور زمین و آسمان کی فطرت اور ناموس کے اندر کوئی فرق نہیں ہے۔

اللہ وہ ذات ہے کہ انسان کے بھیدوں سے بھی واقف ہے۔ اور اس کی ظاہری باتوں سے بھی واقف ہے۔ وہ جو اعمال بھی کرتا ہے چاہے وہ ظاہری ہوں یا خفیہ ہوں ان سب سے اللہ اچھی طرح باخبر ہے اس لئے حق تو یہ ہے کہ وہ اللہ کے اس ناموس اور قانون کا بھی اتباع کرے جو اللہ نے اس کی اختیاری زندگی کے لئے تجویز کیا ہے۔ وہ اپنے نظریات و عقائد بھی اللہ سے لے۔ وہ اقدار حیات بھی اللہ سے لے اور زندگی کے طور طریقے بھی اللہ سے اخذ کرے تاکہ اس کی وہ زندگی جو ناموس تکوینی کے اندر جکڑی ہوئی ہے اور وہ زندگی جو اختیاری ہے دونوں میں وہ اللہ کی شریعت کے تابع ہو'

دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں۔ ان دونوں زندگیوں کے اندر کوئی تضاد اور کشمکش نہ ہو 'کوئی عملی تصادم نہ ہو اور یہ دونوں ناموس باہم ٹکرا کر پاش پاش نہ ہو جائیں کہ اس کائنات اور زندگی میں الہی ناموس ہو اور اختیاری اور قانونی اور شرعی زندگی طاغوتی اور غیر اسلامی بنیادوں پر استوار نہ ہو۔

---ooo---

# درس نمبر ۵۶ ایک نظر میں

افتتاح سورہ کے بعد یہ ایک دوسری لہر ہے۔ پہلی لہر کے اثرات نہایت ہی دور رس تھے۔ اس نے اس پوری کائنات کو حقیقت وجود باری سے بھر دیا تھا۔ صرف زمین و آسمان کی تخلیق اور نور و ظلمت کے ظہور سے اس میں اس حقیقت پر استدلال کیا گیا۔ پھر یہ بتایا گیا کہ اس تاریک مادے سے اللہ نے انسان جیسی مخلوق کو پیدا کیا۔ اس کی زندگی کے خاتمے کے لئے ایک مقررہ وقت دیا اور بتایا گیا کہ بعث بعد الموت کے لئے بھی ایک وقت مقرر ہے جس کا سوائے اللہ کے کسی کو علم نہیں ہے۔ یہ بھی واضح کیا گیا کہ ذات باری لوگوں کے تمام افعال و اقوال کو جانتی ہے۔ وہ چھپے اور ظاہر سے بھی واقف ہے اور ان کے پورے اعمال سے باخبر ہے۔

وجود باری جو انفس اور آفاق میں تاباں ہے' وہ منفرد اور واحد وجود ہے۔ اس جیسا کوئی دوسرا وجود نہیں ہے۔ اللہ کے سوا کوئی اور خالق نہیں ہے۔ وہ بھرپور' روشن اور نہایت ہی چھایا ہوا وجود حق ہے۔ ان آیات و دلائل کی روشنی میں اس کی تکذیب نہایت ہی مکروہ فعل ہے جس کی کوئی سند نہیں ہے اور نہ یہ منکر معذور تصور ہو گا۔

اس لئے اس لہر میں مشرکین کے موقف کو اس وجود برحق کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے کہ یہ لوگ دعوت اسلامی کا انکار ایسے حالات میں کر رہے ہیں کہ ذات باری پر روشن دلائل ان کے انفس و آفاق میں واضح طور پر موجود ہیں' اس لئے ان کا یہ موقف نہایت ہی مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔ ان منکرین کا یہ طرز عمل خود ان کے اپنے احساس و شعور کی رو سے بھی مکروہ ہے اس لئے کہ قرآن ان کے سامنے یہ دلائل پیش کر رہا تھا۔ چنانچہ پہلے ہی معرکے میں قرآن کریم انہیں شکست دے دیتا ہے اور لوگوں کی فطرت کی گہرائیوں کے اندر اس سچائی کو اتار دیتا ہے اگرچہ بظاہر وہ مکابرہ میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن دراصل عناد کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم اس عہد میں ان کے عناد اور غرور اور مکابرہ کی ایک تصویر کبھی تو نہایت ہی تہدید آمیز لہجے میں اور تلخ نوائی کے ساتھ پیش کرتا ہے اور کبھی ان کو یوں دعوت دیتا ہے کہ ذرا اس سے پہلے کے جھٹلانے والوں کے انجام کی تاریخ پر غور کرو۔ جس میں بے شمار سامان عبرت و بصیرت ہے۔ بعض اوقات ان جھٹلانے والوں کا انجام بھی سامنے رکھ دیتا ہے اور بے شمار ہدایات و اشارات فراہم کر دیتا ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۵٦ تشریح آیات

## ۴ ـــــ تا ـــــ ۱۱

وَ مَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ﴿۴﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ؕ فَسَوْفَ یَاْتِیْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۵﴾ اَلَمْ یَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَیْهِمْ مِّدْرَارًا ۪ وَّ جَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ ﴿۶﴾

”لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ایسی نہیں جو ان کے سامنے آئی ہو اور انہوں نے اس سے منہ نہ موڑ لیا ہو۔ چنانچہ اب جو حق ان کے پاس آیا تو اسے بھی انہوں نے جھٹلا دیا۔ اچھا ' جس چیز کا وہ اب تک مذاق اڑاتے رہے ہیں عنقریب اس کے متعلق کچھ خبریں انہیں پہنچیں گی۔ کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے اپنے زمانے میں دور دورہ رہا ہے؟ ان کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا تھا جو تمہیں نہیں بخشا ہے ' ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہا دیں ' (مگر جب انہوں نے کفران نعمت کیا تو) آخر کار ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دوسرے دور کی قوموں کو اٹھایا۔

ان لوگوں نے عناد اور باطل پہ اصرار کرنے کے موقف کو اپنایا ' حالانکہ ایسے دلائل اور نشانیوں کی کمی نہ تھی جن کو دیکھ کر وہ ایمان لاتے اور نہ ایسے دلائل اور نشانات کی کمی تھی جن سے معلوم ہوتا کہ پیغمبروں کی دعوت نہایت ہی سچی دعوت ہے ' نہ یہ بات تھی کہ اس دعوت اور داعی کی سچائی پہ دلائل کی کوئی کمی تھی۔ وجود باری پر دلائل و براہین بھی

موجود تھے ۔ غرض ان چیزوں کی ان کے ہاں کوئی کمی نہ تھی بلکہ جس چیز کی کمی تھی وہ یہ تھی کہ وہ مان کر نہ دیتے تھے ۔ وہ باطل پہ مصر تھے ' تحریک سے عناد رکھتے تھے اور اس روگردانی کی وجہ ان کے لئے اس دین اور تحریک میں غور و فکر کرنے کے مواقع جاتے رہے ۔

(وَمَا تَأْتِيهِمْ مِّنْ ءَايَةٍ مِّنْ ءَايَٰتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا۟ عَنْهَا مُعْرِضِينَ (٦ : ٤) " لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ایسی نہیں جو ان کے سامنے آئی ہو اور انہوں نے اس سے منہ نہ موڑ لیا ہو ۔" جب صورت حالات یہ ہو جائے کہ لوگ جان بوجھ کر حق سے روگردانی اختیار کریں ' جبکہ ان کے پاس آیات و دلائل موجود ہوں ' حقائق ان پر روز روشن کی طرح واضح ہو چکے ہوں تو پھر بعض اوقات ڈراوا اور تہدید ان کی آنکھیں کھول دیتی ہے ۔ ایک جھٹکے سے آنکھ کھل جاتی ہے اور فطرت کے دریچے کھل جاتے ہیں ' بشرطیکہ غرور اور عناد کے پردے حائل نہ ہوں ۔

(فَقَدْ كَذَّبُوا۟ بِٱلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۖ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنۢبَٰٓؤُا۟ مَا كَانُوا۟ بِهِۦ يَسْتَهْزِءُونَ

(٦ : ٥ ) ) " چنانچہ اب جو حق ان کے پاس آیا تو اسے بھی انہوں نے جھٹلا دیا ۔ اچھا ' جس چیز کا وہ اب تک مذاق اڑاتے رہے ہیں عنقریب اس کے متعلق کچھ خبریں انہیں پہنچیں گی ۔"

زمین و آسمانوں کے خالق کی طرف سے جو ہدایت آئی وہ سچائی تھی ۔ روشنی اور تاریکی پیدا کرنے والے کی طرف سے سچائی تھی ' جس نے انسان کو کیچڑ سے پیدا کیا ۔ جو آسمانوں کا بھی حاکم ہے اور زمین کا بھی حاکم ہے ' جو ان کے کھلے اور پوشیدہ سب امور سے واقف ہے ۔ وہ جو کچھ بھی کماتے ہیں ان سے واقف ہے ۔ وہ سچائی ہے اور انہوں نے سچائی کو جھٹلایا ہے ۔ اب وہ اس تکذیب پر اصرار کر رہے ہیں ' آیات الہی سے روگردانی کرتے ہیں ' دعوت اسلامی کے ساتھ مذاق کرتے ہیں ۔ لہٰذا انہیں چاہئے کہ وہ اب اس بات کے انجام اور آخری خبر کا انتظار کریں ۔

اب یہ ایک نہایت ہی اجمالی تہدید اور ڈراوا ہے جس کی نہ تفصیلات دی گئی ہیں اور نہ اس انجام بد کا کوئی وقت مقرر کیا گیا ہے ۔ انہیں صرف یہ تاثر دیا گیا ہے کہ وہ ہر وقت اس انجام کا انتظار کریں ۔ ان پر عذاب الہی کسی بھی وقت آ سکتا ہے ۔ ان پر سچائی کھل جائے گی اور وہ اپنی آنکھوں سے عذاب کو دیکھ لیں گے ۔

اس تہدید اور ڈراوے کے مقام پر انہیں یاد دلایا جاتا ہے ' انہیں متوجہ کیا جاتا ہے کہ ذرا پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھیں اور ذرا نگاہ ڈالیں کہ انسانی تاریخ میں جھٹلانے والوں کا انجام کیا رہا ہے ؟ ان میں سے بعض لوگوں کے انجام سے وہ واقف بھی تھے ۔ احقاف میں قوم عاد کا جو انجام ہوا اور حجر میں قوم ثمود کا جو انجام ہوا ' اس کی داستانیں ان کے ہاں مشہور تھیں ۔ جب عرب گرمیوں میں شمال کی طرف جاتے اور سردیوں میں جنوب کی طرف سفر کرتے تو ان اقوام کے کھنڈرات کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ۔ قوم لوط پر جہاں تباہی آئی وہ مقامات بھی انہیں معلوم تھے اور ان کے اردگرد رہنے والے لوگ ان مقامات سے واقف تھے لہٰذا یہاں ان کی توجہ ان حقائق کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے ۔

(أَلَمْ يَرَوْا۟ كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّن قَرْنٍ مَّكَّنَّٰهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّن لَّكُمْ

وَأَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِم مِّدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْأَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنٰهُمْ

بِذُنُوْبِهِمْ وَأَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ (٦:٦) ''کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے اپنے زمانے میں دور دورہ رہا ہے؟ ان کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا تھا جو تمہیں نہیں بخشا ہے' ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہا دیں' (مگر جب انہوں نے کفران نعمت کیا تو) آخر کار ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دوسرے دور کی قوموں کو اٹھایا۔''

کیا یہ لوگ گزری ہوئی اقوام کے انجام بد سے عبرت نہیں لیتے؟ اللہ تعالیٰ نے ان اقوام کو اس کرۂ ارض پر بہت ہی بڑا اقتدار عطا کیا تھا۔ انہیں قوت اور سلطنت کے اسباب فراہم کئے تھے۔ اور وہ اس قدر ترقی یافتہ اور قوی تھی کہ قرآن کے مخاطبین اہل قریش اور ان کے درمیان کوئی مماثلت ہی نہ تھی۔ ان پر پے درپے بارشیں ہوتی تھیں' ان کی سرزمین تروتازہ تھی اور ہر قسم کی پیداوار کی فراوانی تھی۔ پھر کیا ہوا؟ انہوں نے اپنے رب کی نافرمانی شروع کر دی۔ اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑا۔ ان کو تباہ کر کے ان کی جگہ دوسری اقوام کو منصہ شہود پر لایا گیا اور زمین کا اقتدار ان کے حوالے کر دیا گیا۔ اس زمین نے جانے والوں پر کوئی ماتم نہ کیا اس لئے کہ زمین کے وارث اب دوسرے لوگ تھے۔ ذرا دیکھئے کہ ان مکذبین اور روگردانی کرنے والوں کی حیثیت ہی کیا رہی ہے۔ اللہ کے ہاں وہ کس قدر ہلکے ہیں اور اس زمین پر وہ کس قدر ہلکے ہیں۔ وہ ہلاک کر دیئے گئے' نیست و نابود ہوگئے اور اس زمین کو کوئی احساس ہی نہ ہوا۔ اور نہ یہ زمین خالی رہ گئی' اس خلا کو دوسری اقوام نے پر کر دیا اور یہ زمیں اس طرح گردش کرتی رہی کہ گویا یہ مٹنے والی اقوام کبھی اس پر بسی ہی نہ تھیں۔ اور زندگی اس طرح چلتی رہی کہ گویا سابقہ لوگ کبھی زندہ ہی نہ تھے۔

جب اللہ کسی کو اس کرۂ ارض پر تمکن عطا کرتا ہے تو صاحبان اقتدار سب سے پہلے اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ یہ اقتدار انہیں اللہ کی مرضی سے نصیب ہوا ہے اور یہ ان کے لئے ایک بڑی آزمائش ہے۔ آزمائش یہ کہ آیا وہ اس اقتدار کو اللہ کے عہد اور شرط کے مطابق استعمال کرتے ہیں اور اس میں وہ صرف اللہ کی بندگی کرتے ہیں اور صرف اسی سے ہدایات لیتے ہیں اس لئے کہ وہی تو اس اقتدار کا اصل مالک ہے اور انسان تو اس کا خلیفہ ہے' یا وہ اپنے آپ کو طاغوت کا منصب دیتے ہیں اور اپنے لئے اللہ کے اختیارات حاصل کرتے ہیں اور وہ ان اختیارات کو بطور خلیفہ استعمال نہیں کرتے بلکہ بطور مالک خود مختار استعمال کرتے ہیں۔

یہ وہ حقیقت ہے جسے انسان بھول جاتے ہیں' الا یہ کہ کوئی اللہ کی جانب سے محفوظ کر دیا گیا ہو۔ جب انسان اس حقیقت کو بھول جائیں تو وہ اللہ کے عہد اور ان کے خلیفہ فی الارض ہونے کی شرائط سے صرف نظر کرنے لگتے ہیں اور سنت الٰہیہ کے خلاف جاتے ہیں۔ پہلے پہل انہیں احساس نہیں ہوتا کہ اس انحراف کے نتائج کیا ہوں گے' چنانچہ ان کے اندر آہستہ آہستہ فساد رونما ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ انہیں اس کا شعور بالکل نہیں ہوتا' یہاں تک کہ وقت مقررہ تک وہ پہنچ جاتے ہیں اور اللہ کا وعدہ آ جاتا ہے۔ ان کے انجام پھر مختلف ہوتے ہیں' بعض اوقات ان پر ایسا عذاب آتا ہے کہ انہیں بیخ وبن سے اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ عذاب کبھی آسمان سے آتا ہے اور کبھی نیچے زمیں سے آتا ہے۔ دنیا کی کئی

اقوام کو اس عذاب کے ذریعے تباہ کیا گیا اور بعض اوقات یہ عذاب قحط سالی اور خشک سالی کی صورت میں آتا ہے' پھل اور پیداوار ختم ہو جاتے ہیں اور لوگ بھوکے مرنے لگتے ہیں۔کئی اقوام عالم اس عذاب سے دوچار ہوئیں ۔بعض اوقات وہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے ہیں اور ہر ایک دوسرے کے لئے عذاب بن جاتا ہے۔بعض دوسروں کو مبتلائے عذاب کرتے ہیں 'بعض اقوام دوسروں کو نیست و نابود کر دیتی ہیں ۔بعض دوسروں کو اذیت دیتی ہیں اور کئی دوسروں کو امن نہیں دیتے ۔اس طرح ان کی قوت اور شوکت ختم ہو جاتی ہے 'اور اللہ ان پر پھر اپنے دوسرے بندوں کو مسلط کر دیتا ہے جو یا تو اللہ کے فرمانبردار ہوتے ہیں اور یا نافرمان ہوتے ہیں ۔وہ ان کی قوت کو توڑ کر انہیں اس اقتدار اعلیٰ سے محروم کر دیتے ہیں جس پر ان کو متمکن کیا گیا تھا۔اس کے بعد اللہ کچھ نئے لوگوں کو تمکین فی الارض عطا کرتا ہے تاکہ اب ان کی آزمائش کا دور شروع ہو ۔یوں سنت الٰہیہ کا دور چلتا ہے اور دنیا میں نیک بخت اقوام وہ ہوتی ہیں جو سنت الٰہیہ کا ادراک رکھتی ہیں ۔ جو یہ سمجھتی ہیں کہ یہ ایک آزمائش ہے ۔وہ اللہ کے عہد کا پاس رکھتی ہیں ۔ بدبخت اقوام وہ ہوتی جو اس حقیقت سے غافل ہوتی ہیں اور یہ گمان کرنے لگتی ہیں کہ یہ اقتدار انہیں خود ان کے علم و کمال کی وجہ سے ملا ہے یا کسی حیلے اور تدبیر سے ملا ہے یا اتفاقاً بغیر کسی منصوبے کے انہیں مل گیا ہے۔

لوگوں کو یہ امر دھوکے میں ڈالتا ہے کہ وہ ایک باغی و سرکش 'ایک بدکار اور مفسد اور ایک ملحد اور کافر کو دیکھتے ہیں کہ وہ اس کرۂ ارض پر مقتدر اعلیٰ ہے اور اس پر اللہ کی جانب سے کوئی مواخذہ نہیں ہو رہا ہے ۔وہ مایوس ہو جاتے ہیں ' لیکن ایسے لوگ جلدبازی سے کام لیتے ہیں ۔وہ راستہ کا ابتدائی حصہ دیکھتے ہیں ' درمیانی حصہ بھی دیکھتے ہیں لیکن ان کی نظر منزل مقصود پر نہیں ہوتی ۔راستے کی انتہا منزل مقصود اس وقت نظر آتی ہے 'جب کوئی شخص اس تک پہنچ جاتا ہے۔ جب ایسے سرکشوں پر اللہ کا عذاب آتا ہے تو وہ نیست و نابود ہو جاتے ہیں اور ان کے بارے میں محض قصے' اور کہانیاں ہی رہ جاتی ہیں 'تب حقیقت نظر آتی ہے ۔قرآن کریم ایسے لوگوں کے ہونے والے انجام کے کچھ مظاہر پیش کرتا ہے تاکہ ایسے غافل سرکشوں کو ہوش آ جائے 'کیونکہ ایسے لوگ اپنے انفرادی حالات میں اس قدر مست ہوتے ہیں کہ انہیں منزل مقصود اور اپنا آخری انجام نظر نہیں آتا۔یہ لوگ بس اس مختصر زندگی کو دیکھ سکتے ہیں اور اسے ہی آخری منزل سمجھتے ہیں۔

قرآن کریم کی یہ آیت ( فَأَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ (٦: ٦ )) اور اس جیسی دوسری آیات بار بار دہرائی گئی ہیں۔ ایسی آیات میں اللہ کی ایک ناقابل تبدیل سنت کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور ان میں اسلام کے نظریہ تاریخ کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے ۔

ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ سنت الٰہیہ یہ ہے کہ بدکار لوگوں کو آخرکار ان کی اس بدکاری کی وجہ سے ہلاک اور برباد کر دیا جاتا ہے ۔ان پر یہ ہلاکت اور بربادی اللہ کی جانب سے آتی ہے اور یہ سنت اس کائنات میں ہمیشہ کے لئے جاری و ساری ہے ۔اگرچہ ایک فرد اپنی مختصر زندگی میں اسے نہ سمجھ سکے ۔یا ایک محدود اور متعین نسل کی زندگی میں یہ ہلاکت نہ آئے ۔لیکن یہ ایک ایسی سنت الٰہیہ ہے کہ جب کسی قوم میں جرائم اور بدکاریاں بہت زیادہ ہو جاتی ہیں اور پوری زندگی کا نظام بدکاری اور جرائم پر قائم ہو 'تو پھر اللہ کی جانب سے عذاب ضرور آتا ہے۔ اسلام کا نظریہ تاریخ یہ ہے کہ اقوام کے عروج و زوال میں اصل اور موثر عامل (Factor) یہ ہوتا ہے کہ ان کے جسم میں جب بدکاری اور جرائم سرایت کر جاتی ہیں تو یہ تباہی اور بربادی کا شکار ہو جاتی ہیں ۔یہ تباہی یا تو آفات سماویہ کے ذریعے سے ہوتی ہے جیسا کہ قدیم

تاریخ میں یہ واقعات رونما ہوئے یا نہایت ہی تدریجی تباہی کے ذریعے طبعی طور پر' جس طرح کسی جسم پر عارضی طور پر زوال آتا ہے جب وہ بدکاری اور جرائم میں کانوں تک ڈوب جاتے ۔

انسان کی جدید تاریخ میں ہمارے سامنے اس زوال کی کئی مثالیں موجود ہیں جن میں اقوام پر اخلاقی بے راہ روی' بدکرداری اور فحاشی' عیاشی اور اسراف اور لہو ولعب کی وجہ سے تباہی آئی۔ مثلاً یونان کی تباہی کے یہی عوامل تھے۔ اس کے بعد رومیوں کی تباہی اور زوال کے یہی اسباب تھے۔ یہ اقوام اپنے عروج کے باوجود اس طرح مٹ گئیں کہ اب ان کے صرف قصے کہانیاں ہی رہ گئیں۔ جدید ترقی یافتہ اقوام کے اندر بھی اس عظیم تباہی اور زوال کے اسباب نمودار ہونا شروع ہوگئے ہیں مثلاً فرانس اور برطانیہ کا زوال شروع ہو چکا ہے حالانکہ مادی' جنگی اور تکنیکی قوت کے اعتبار سے وہ عروج پر ہیں اور نہایت ہی ترقی یافتہ اور دولتمند ہیں۔

تاریخ کی مادی تفسیر لکھنے والوں اور اقوام کے عروج و زوال کی داستانیں لکھنے والوں کی نظر سے تاریخ کا یہ اخلاقی پہلو غائب ہے' اس لئے کہ مادی نقطہ نظر رکھنے والے کی نگاہوں سے شروع ہی سے اخلاقی عناصر اوجھل رہتے ہیں۔ اصل الاصول یعنی سنت الہیہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوتی ہے۔ جو لوگ تاریخ کی تفسیر اور اس پر تبصرہ صرف مادی نقطہ نظر سے کرتے ہیں وہ اقوام کے عروج و زوال کے سلسلے میں نہایت ہی مضحکہ خیز باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ اقوام کے عروج و زوال کے بعض واقعات کی معقول تفسیر صرف اعتقادی اور اخلاقی زاویے ہی سے کی جاسکتی ہے۔

اسلام کا تاریخی نقطہ نظر نہایت جامع' حقیقت پسندانہ اور سچا ہے اور وہ اپنی اس جامعیت کی وجہ سے مادی عنصر کو بالکل نظرانداز نہیں کرتا۔ لیکن مادی نقطہ نظر رکھنے والے مورخین اسے صرف مادی زاویے ہی سے دیکھتے ہیں۔ جہاں تک اسلامی نقطہ نظر کا تعلق ہے' وہ زوال اقوام میں مادی زوال کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ تاہم اسلام دوسرے عوامل کو بھی لیتا ہے جن کا انکار صرف معاندین ہی کرتے ہیں۔ اسلام نے سب سے پہلے اللہ کی سنت اور اللہ کی تقدیر کو اصل عامل قرار دیتا ہے۔ پھر انسان کے داخلی شعور' جذبات اور تصورات اور نظریات کو اس کا سبب قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد اسلام لوگوں کی عام اخلاقی اور عملی زندگی کو بھی اس میں اہمیت دیتا ہے اور وہ ان اسباب و علل میں سے کسی ایک کو بھی نظرانداز نہیں کرتا جو کسی قوم کے عروج و زوال کا سبب بنتی ہیں۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے الاسلام ومشکلات الحضارۃ - التطور والثبات فی حیات البریہ - خصائص التصور الاسلامی وھو ماتہ التصویر الفنی فی القرآن)

اب اگلی آیات میں ان لوگوں کے اس عناد کی تصویر کشی کی جاتی ہے' جس کی وجہ سے یہ بیماری لاحق ہوتی ہے۔ اس تصویر کشی میں انسانوں کی ایک عجیب قسم پیش کی جاتی ہے۔ انسانوں کی یہ قسم صرف ماضی یا کسی ایک زمانے تک محدود نہیں ہے' اس قسم کے لوگ تاریخ میں بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ ہر زمانے میں ہر جگہ ایسے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ہر نسل اور ہر خاندان میں یہ نمونے موجود ہوتے ہیں۔ یہ ہٹ دھرم قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ سچائی ان کی آنکھوں کو پھاڑتی ہے لیکن یہ اسے دیکھ نہیں پاتے۔ یہ لوگ ایسے امور کا بھی بڑی ڈھٹائی کے ساتھ انکار کرتے ہیں جن کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے امور جو اس قدر واضح ہوتے ہیں کہ ان کے انکار کی وجہ سے منکر کو کم ازکم شرم آتی ہے۔ قرآن کریم اس قسم کے نمونے کا بڑی وضاحت سے ذکر کرتا ہے۔ مختصر کلمات میں عجیب انداز میں جو انوکھا بھی ہے اور معجزانہ بھی ہے۔ جس طرح قرآن کریم کا انداز تعبیر بالعموم اعجاز کا حامل ہوتا ہے۔

وَلَوۡ نَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ كِتَٰبٗا فِي قِرۡطَاسٖ فَلَمَسُوهُ بِأَيۡدِيهِمۡ لَقَالَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوٓاْ إِنۡ هَٰذَآ إِلَّا سِحۡرٞ مُّبِينٞ ۝٧

"اے پیغمبر" اگر ہم تمہارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنہوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔"

یہ لوگ آیات الٰہی کا انکار اس لئے نہیں کرتے کہ ان آیات کی صداقت کی دلیل میں کوئی کمزوری ہے یا اس کے ادراک میں کوئی پیچیدگی ہے یا یہ کہ مختلف دماغ اس کے بارے میں ایک طرح نہیں سوچتے بلکہ وہ ہٹ دھرمی اور مکابرہ کی وجہ سے اور کھلے عناد کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔ انہوں نے دلیل و برہاں پر غور کرنے سے پہلے ہی اس حقیقت کے انکار کی ٹھان لی ہے۔ اگر نزول قرآن کی صورت یہ ہوتی کہ وہ آسمان سے پرچوں کی شکل میں اترتا اور وہ اپنے ہاتھوں سے اسے چھوتے اور آنکھوں سے دیکھتے اور یہ نہ ہوتا کہ بذریعہ وحی حضور ؐ پر آتا اور آپ اسے سناتے تو اس صورت میں بھی وہ اس محسوس اور مشاہد حقیقت کے بارے میں یوں کہتے : (اِنۡ هٰذَآ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ (٦: ٧)) "یہ تو صریح جادو ہے۔" یہ ان لوگوں کی ایسی مکروہ تصویر ہے کہ انسانی فطرت کو اس سے گھن آتی ہے۔ یہ ایک ایسی تصویر ہے جسے دیکھتے ہی ہر انسان ان کے منانے کے لئے آگے بڑھتا ہے' اس لئے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ بحث و تکرار اور دلیل و استدلال کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس انداز میں اس تصویر کشی کے دو فائدے ہیں بلکہ کئی فائدے ہیں (تصویر کشی کا یہ انداز اس طرح ہے کہ قرآن کریم عام طور پر دیکھے جانے والے نمونے کو سامنے لاتا ہے۔)

ایک تو یہ فائدہ ہے کہ قرآن کریم خود ان لوگوں کے سامنے ان کا یہ کریہہ اور ناپسندیدہ موقف پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ دیکھیں تو سہی ان کی تصویر کس قدر بھدی ہے۔ مثلاً کوئی کسی کریہہ المنظر شخص کے ہاتھ میں آئینہ پکڑا دے اور کہہ دے کہ دیکھو یہ ہو تم۔ اور وہ شخص اپنی شکل دیکھ کر شرمندہ ہو جائے۔

اس کے ساتھ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس تصویر کشی کے ذریعہ اہل ایمان کے دلوں میں جوش پیدا ہو جاتا ہے' اور وہ مشرکین کے مقاصد کو ناکام بنا دیتے ہیں وہ منکرین کے انکار کا مقابلہ کرتے ہیں اور خود ان کے دل حق پر جم جاتے ہیں۔ وہ اس فضا سے متاثر نہیں ہوتے جس میں ہر طرف سے انکار' استہزاء' فتنہ اور ایذا ہوتی ہے۔ اس سے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نہایت حلیم ہے اور وہ ان جھٹلانے والوں اور تکذیب کرنے والوں کو جلدی نہیں پکڑتا' حالانکہ وہ بہت قابل نفرت انداز میں انکار کرتے ہیں اور کھلے عناد میں مبتلا ہیں۔ یہ تمام امور جماعت مسلمہ اور مشرکین کے درمیان برپا کشمکش میں مسلمانوں کے لئے اسلحہ اور زاد راہ ہیں۔

---ooo---

اس کے بعد قرآن مجید اہل شرک کی جانب سے آنے والی بعض تجاویز کو ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بغض و عناد میں کس قدر عیار ہیں اور ان کی سوچ کس قدر پوچ ہے۔ تجویز یہ لاتے ہیں کہ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق ہیں تو آپ کے ساتھ تبلیغ کے وقت ایک فرشتہ ہو جو ساتھ ساتھ آپ کی تصدیق

کرتا جائے ۔ اس تجویز کے ذکر کے بعد اس پر تنقید بھی کی جاتی ہے کہ اس میں کیا نقص ہے؟ ایک تو یہ کہ یہ لوگ ملائکہ کی ماہیت سے بھی واقف نہیں ہیں ۔ دوسرے یہ کہ فرشتوں کو بھیجنے کے سلسلے میں اللہ کی جو سنت ہے اس سے بھی یہ لوگ واقف نہیں ہیں ۔ پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ اللہ کی بہت بڑی مہربانی ہے کہ وہ فرشتے نہیں بھیج رہا ہے اور ان کی تجویز کو تسلیم نہیں کرتا ۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ مَلَكٌ ؕ وَ لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِیَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا یُنْظَرُوْنَ ۝۸ وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَیْهِمْ مَّا یَلْبِسُوْنَ ۝۹

"کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ اگر کہیں ہم نے فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا' پھر انہیں کوئی مہلت نہ دی جاتی ۔ اور اگر ہم فرشتے کو اتارتے تب بھی اسے انسانی شکل ہی میں اتارتے اور اس طرح انہیں اسی شبہ میں مبتلا کر دیتے جس میں اب یہ مبتلا ہیں ۔"

یہ تجویز مشرکین کی طرف سے تھی اور ان مشرکین سے پہلے بھی کئی اقوام نے یہ تجویز پیش کی ۔ ہر قوم نے اپنے رسول سے نزول فرشتگاں کا مطالبہ کیا ۔ دوسری جگہ قرآن کریم نے ایسے مطالبے پیش کئے ہیں اور یہاں اس تجویز کو دلائل کے ساتھ رد کر دیا جاتا ہے ۔ اس تجویز کے بارے میں' مناسب ہے کہ ہم تمام حقائق یہاں پیش کر دیں حتی الامکان ۔

اس کے متعلق پہلی حقیقت یہ ہے کہ مشرکین عرب اللہ کا انکار نہ کرتے تھے بلکہ وہ اس بارے میں ایک بین دلیل طلب کرتے تھے جس سے معلوم ہو جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی مرسل ہیں اور آپ جو کتاب ان کے سامنے پڑھتے ہیں وہ اللہ کی طرف سے نازل کر رہا ہے ۔ اس سلسلے میں وہ جو متعین دلیل طلب کرتے تھے وہ یہ تھی کہ ایک فرشتہ حضور کے اوپر نازل ہو جو آپ کے ساتھ ساتھ پھرے اور آپ کی دعوت کی تصدیق کرے ۔ ان کی یہ تجویز ایسی ہی تھی جس طرح وہ اس سلسلے میں دوسری تجاویز دیتے تھے ۔ یہ تجاویز قرآن کریم نے متعدد مقامات پر ذکر فرمائی ہیں ۔ مثلاً سورہ اسرائیل میں یہ تجاویز مذکور ہیں ۔ اس میں اس تجویز کے ساتھ ساتھ دوسری تجاویز بھی دی گئی ہیں جن سے ان لوگوں کی ہٹ دھرمی اور عناد کا اظہار ہوتا ہے ۔ عناد کے علاوہ ان کی کج فہمی پر بھی خود ان کی تجویز دلیل بین ہے ۔ اس لئے کہ یہ لوگ نہ اس نظام کائنات کو اچھی طرح سمجھے ہیں اور نہ حقیقی اقدار کو سمجھتے ہیں ۔ سورہ اسرائیل میں آتا ہے ۔

(وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا (۹۰) اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا (۹۱) اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (۹۲) اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ

مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰی فِی السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّكَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (۹۳) وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰی اِلَّا اَنْ قَالُوْا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (۹۴) قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (۹۵)

(اور انہوں نے کہا "ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لئے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے ۔ یا تیرے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے ۔ یا تو آسمانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے یا خدا اور فرشتوں کو رو در رو ہمارے سامنے لے آئے ۔ یا تیرے لئے سونے کا ایک گھر بن جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں .... اے نبی ان سے کہو "پاک ہے میرا پروردگار 'کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟" ..... لوگوں کے سامنے جب کبھی ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے ان کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر ان کے اسی قول نے کہ "کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا ۔ ان سے کہو اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہیں تو ہم ضرور آسمان سے کسی فرشتے ہی کو ان کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجتے ۔)

یہ تجاویز اور مطالبے ایسے ہیں کہ ان سے ایک طرف ان کی ہٹ دھرمی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری جانب ان کی جہالت کا ۔ اس لئے کہ ان کے سامنے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب اخلاق کھلی تھی' وہ طویل ترین تجربے سے آپ کو اچھی طرح جانتے تھے اور آپ کے اخلاق سے ان کو معلوم تھا کہ آپ سچے اور امین ہیں اور ان ہی لوگوں نے ان کو امین کا لقب دیا ہوا تھا ۔ آپ کے ساتھ ان کے شدید نظریاتی اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی یہ لوگ اپنی امانتیں حضور ؐ کے پاس رکھتے تھے ۔ جب آپ نے ہجرت فرمائی تو آپ نے اپنے چچازاد بھائی حضرت علی ؓ کو امانتوں کی ادائیگی کے لئے اپنے پیچھے چھوڑا تھا کہ وہ اہل قریش کی وہ امانتیں ادا کر دیں جو ابھی تک آپ کی تحویل میں تھیں ۔ لیکن ان کو ان کے ساتھ اس قدر اختلاف تھا کہ وہ لوگ آپ ؐ کے قتل کی تدابیر کر رہے تھے ۔ آپ کی امانت و دیانت جس طرح مسلم تھی اسی طرح آپ کی سچائی بھی مسلم تھی' اس لئے کہ جب آپ نے سب سے پہلے کوہ صفا پر انہیں علی الاعلان دعوت دی ۔ یہ اس وقت ہوا جب اللہ کا حکم آ گیا کہ آپ علی الاعلان دعوت کا آغاز کر دیں ۔ اس موقعہ پر آپ نے ان سے سوال کیا کہ اگر میں آپ لوگوں کو کوئی اہم خبر دوں تو آپ لوگ تصدیق کر دیں گے ؟ تو سب نے مل کر جواب دیا کہ آپ تو نہایت ہی سچے آدمی ہیں ۔ اگر یہ لوگ صرف یہ جاننا چاہتے کہ آپ سچے ہیں یا نہیں تو آپ کے ماضی میں ان کے لئے دلیل و برہان تھی ۔ وہ جانتے تھے کہ آپ تو نہایت ہی سچے آدمی ہیں ۔ اسی سورہ میں یہ مضمون آنے والا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ یہ لوگ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ اللہ کو جھٹلاتے ہیں ۔

(قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَیَحْزُنُكَ الَّذِیْ یَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا یُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ

اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (٣٣)) ”ہم جانتے ہیں کہ آپ کو ان لوگوں کی باتیں بہت پریشان کرتی ہیں ' دراصل یہ لوگ آپ کی تکذیب نہیں کرتے لیکن یہ ظالم اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔“ ان لوگوں کا مقصد یہ تھا کہ وہ انکار کر دیں۔ یہ انکار محض عناد اور کبر کی وجہ سے تھا۔ جہاں تک حضور ؐ کی سچائی کا تعلق ہے تو اس میں کسی کو شک نہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ عربوں کے لئے خود قرآن کریم کے اندر ایک عظیم شہادت موجود تھی۔ یہ شہادت ان شہادتوں سے زیادہ وقیع تھی جو وہ طلب کرتے تھے۔ قرآن بذات خود شاہد تھا۔ قرآن کا طرز تعبیر اور اس کے مضامین بھی اس بات پر شاہد تھے کہ وہ من جانب اللہ ہے۔ یہ لوگ ذات باری کے تو منکر نہ تھے اور قرآن کی اندرونی شہادت کا انہیں بھی احساس تھا۔ وہ جس قدر ادبی اور لسانی ذوق رکھتے تھے اس کے ذریعے وہ جانتے تھے کہ انسانوں کی ادبی اور لسانی صلاحیت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ قرآن کریم انسانی حدود سے ماوراء ہے۔ جو لوگ فنی اور ادبی ذوق رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ جانتے ہیں جو ادبی ذوق نہیں رکھتے۔ دنیا میں جو لوگ اسالیب کلام کے اندر کچھ بھی ذوق رکھتے ہیں (چاہے مسلم ہوں یا غیر مسلم) وہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم کا اسلوب انسان کی قدرت سے بہت ہی اونچا ہے۔ انسان اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس حقیقت کا انکار صرف ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جو معاند ہو' جو ایک حقیقت کو پا رہا ہو لیکن اسے اپنے عناد کی وجہ سے دل میں چھپا رہا ہو۔ نیز اس بہترین اسلوب کے اندر قرآن کریم نے جو تصورات پیش کئے ہیں' ان تصورات اور اعتقادات کو جس اسلوب میں نفس انسانی کے اندر بٹھانے کی کوشش کی' جس انداز میں قرآن' نفس انسانی اور ادراک انسانی پر اثر انداز ہوتا ہے اور اسے جو اشارات اور احساسات دیتا ہے' یہ تمام امور ایسے ہیں کہ انسانی اسلوب ادا اور انسانی افکار و عقائد کے اندر وہ چیز ناپید ہے۔ انسانی طرز ادا اور انسانی نفسیاتی اسلوب اظہار سے قرآن کا اسلوب نہایت ہی مختلف اور معجز ہے۔ عربوں کے گہرے شعور اور ان کی نفسیات کی اندرونی حالت یہ تھی کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے۔ ان کے حالات اور ان کے اقوال سے بھی یہ بات اچھی طرح عیاں ہے کہ وہ اس بات میں کسی شک میں مبتلا نہ تھے کہ یہ قرآن اللہ کی جانب سے ہے۔

یہ بھی اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حضور ؐ سے جو مطالبے کئے تھے' وہ اس لئے نہ تھے کہ وہ تسلیم کے لئے کسی دلیل و برہان کے طالب تھے بلکہ یہ ان کی ہٹ دھرمی تھی۔ یہ ایک ایسا انداز تھا جس کے ذریعے وہ یہ جتلانا چاہتے تھے کہ وہ ہٹ کے پکے ہیں اور یہ مطالبے تو وہ محض عناد اور نہ ماننے کی وجہ سے کر رہے تھے۔ اللہ نے فرمایا:

(وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (٦ : ٧)) ”اے پیغمبر ؐ اگر ہم تمہارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی اتار دیتے اور وہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنہوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔“

دوسری حقیقت یہ ہے کہ عرب ملائکہ کو تو مانتے تھے اور مطالبہ یہ کرتے تھے کہ حضور ؐ پر ایک فرشتہ نازل ہو اور جب آپ تبلیغ کریں تو وہ ساتھ ساتھ آپ کی تصدیق و تائید کرے۔ لیکن ان کے ذہن میں یہ بات نہ تھی کہ ملائکہ کی حقیقت اور ماہیت کیا ہے؟ وہ اس مخلوق کے بارے میں اپنے عقیدے اور تصور میں نہایت ہی مخبوط الحواس تھے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ ملائکہ کا اپنے رب کے ساتھ تعلق کیا ہوتا ہے۔ اس زمین اور اس کے باسیوں کے ساتھ ان کا تعلق کیا

ہوتا ہے؟ قرآن کریم نے عربوں کی فکری ژولیدگی کی کئی مثالیں بیان کی ہیں اور ملائکہ کے بارے میں ان کے جو بت پرستانہ خیالات تھے وہ بھی قرآن نے بیان کئے ہیں۔ قرآن کریم نے ان تمام فکری غلطیوں کی اصلاح کی ہے تاکہ یہ لوگ پاک و صاف عقیدے کے حامل بن جائیں اور صحیح راہ پر گامزن ہوں۔ کائنات اور اس میں بسنے والی مخلوق کے بارے میں بھی قرآن نے صحیح فکر دی ہے۔ اس زاویے سے اسلام نے جس طرح عقل و شعور کو غذا فراہم کی اسی طرح دل اور ضمیر کو بھی صحیح سوچ دی اور اس درست فکری اساس پر لوگوں کے اعمال و اطوار کو بھی درست کیا۔

قرآن کریم نے عربوں کی توہم پرستیوں اور باطل نظریات کے کئی پہلوؤں پر بحث کی ہے کہ وہ کس قدر باطل نظریات کے حامل تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ سمجھتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں حالانکہ اللہ اس تصور سے پاک اور برتر ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ان فرشتوں کو ناقابل استرداد سفارش کے اختیارات بھی حاصل ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ عربوں کے اندر مروج بتوں میں اکثر ان فرشتوں کے تصور پر بنائے گئے تھے اور ان کے اس تصور اور مطالبے سے کہ حضورؐ پر ایک مؤید اور مصدق فرشتہ اترے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

قرآن کریم نے سورہ نجم میں ان کی اس کج فکری کی اصلاح اس طرح کی ہے۔

(اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى (١٩) وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى (٢٠) اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى (٢١) تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى (٢٢) اِنْ هِىَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (٢٣) اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى (٢٤) فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى (٢٥)) وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِى السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِىْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى (٢٦) اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى (٢٧) وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا (٢٨)) (٥٣ : ١٩ تا ٢٨) "اب ذرا بتاؤ تم نے کبھی اس لات' اور عزیٰ اور تیسری ایک دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور کیا ہے؟ کیا بیٹے تمہارے لئے ہیں اور بیٹیاں خدا کے لئے؟ یہ تو پھر بڑی دھاندلی کی تقسیم ہوئی' دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ محض وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشات نفس کے مرید بنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔ کیا انسان جو کچھ چاہے اس کے لئے وہی حق ہے۔ دنیا و آخرت کا مالک تو اللہ ہی ہے۔ آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے موجود ہیں۔ ان کی شفاعت کچھ

بھی کام نہیں آ سکتی جب تک کہ اللہ کسی شخص کے حق میں اس کی اجازت نہ دے دے جس کے لئے وہ کوئی عرضداشت سننا چاہے اور اس کو پسند کرے ۔ مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ فرشتوں کو دیویوں کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں، حالانکہ اس معاملے کا علم بھی انہیں حاصل نہیں ہے ۔ وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا ۔"

مزید یہ کہ ان دو آیات میں قرآن کریم نے فرشتوں کی ماہیت کے بارے میں ان کی دوسری کج فکری کی اصلاح بھی کر دی ہے ۔ اس سورہ کے علاوہ دوسری سورتوں کے اندر بھی ان کی فکری اصلاح کی گئی :

(وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ (٦ : ٨)) "کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا ہے؟ اگر کہیں فرشتہ اتار دیا گیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا، پھر انہیں کوئی مہلت نہ دی جاتی ۔" اللہ کی مخلوقات میں سے جن لوگوں کی یہ سوچ ہے، یہاں ان کے بارے میں وضاحت کر دی گئی ۔ یہ لوگ یہ تجویز کرتے ہیں کہ اللہ قرآن کے ساتھ فرشتہ بھی اتارے ۔ لیکن فرشتوں کے اترنے کے بارے میں اللہ کی سنت یہ ہے کہ جب وہ اترتے ہیں تو وہ اس قوم کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں جس نے کسی نبی کی تکذیب کی ہوتی ہے اور وہ پھر تباہی و بربادی کے بارے میں اللہ کے احکامات پر عمل کرتے ہیں ۔ اگر اللہ تعالیٰ مشرکین عرب کی اس تجویز اور مطالبے کو تسلیم کر لیتے تو بات کا فیصلہ ہو جاتا اور وہ تباہ کر دیئے گئے ہوتے ۔ اس کے بعد انہیں کوئی مہلت نہ دی جاتی ۔ کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے اور کیا انہیں اس قدر شعور بھی نہیں ہے کہ ان کی بات نہ مان کر اللہ تعالیٰ انہیں ایک عظیم تباہی اور عذاب سے بچا رہا ہے ۔ یوں سیاق کلام میں ان کو یہ بات براہ راست جتا دی جاتی ہے کہ اللہ انہیں مہلت دے کر ان کے ساتھ نہایت ہی رحمت اور درگزر سے کام لے رہا ہے ۔ یہ اس لئے کہ وہ خود اپنی مصلحت کو بھی نہیں سمجھتے اور سنت الہیہ سے بالکل بے خبر ہیں ۔ وہ اس جہالت میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ اس طرح ان کی زندگی ہی تباہ ہو جائے ۔ اس جہالت کی وجہ سے وہ بدستور اللہ کی رحمت سے انکار کر رہے ہیں، ہدایت سے دور بھاگے جا رہے ہیں، دلائل و معجزات اور فرشتے اترنے کے مطالبے کر رہے ہیں ۔ ان کی کج فہمی کو درست کرنے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے :

(وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ (٦ : ٩)) "اگر ہم فرشتے کو اتارتے تب بھی اسے انسانی شکل ہی میں اتارتے اور اس طرح انہیں اسی شبہ میں مبتلا کر دیتے جس میں اب وہ مبتلا ہیں ۔" ان کا مطالبہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول پر ایک فرشتہ نازل کریں اور یہ فرشتہ حضور ؐ کے دعوائے نبوت کی تصدیق کرے ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ فرشتے تو انسانوں سے بالکل جدا مخلوق ہیں ۔ ان کا اپنا ایک خاص مزاج اور ماہیت ہے جس کے بارے میں صرف اللہ تعالیٰ کو علم ہے ۔ یہ فرشتے (جس طرح ان کے بارے میں ان کا خالق ہمیں معلومات فراہم کرتا ہے) اپنی موجودہ ہیئت کے ساتھ اس زمین پر نہیں چل سکتے کیونکہ وہ اس کرہ ارض کے باشندے نہیں ہیں ۔ تاہم اگر وہ اس کرہ ارض پر انسانوں کے حوالے سے کوئی ڈیوٹی سرانجام دیں تو وہ انسانوں کی شکل اختیار کر کے یہاں آتے ہیں

مثلاً تبلیغ رسالت اور مکذبین کو ہلاک کرنے کی ڈیوٹی وغیرہ۔یا مسلمانوں کی تسلی اور حوصلہ افزائی کی ڈیوٹی یا مسلمانوں کے دشمنوں کو قتل کرنے کی ڈیوٹی یا اس قسم کی دوسری ڈیوٹیاں جن کی بابت انہیں اللہ ہدایت کر دے۔وہ ان کے سرانجام دینے میں اللہ کی ہدایت کی ذرہ برابر نافرمانی نہیں کرتے۔

اگر اللہ تعالیٰ رسول کی تصدیق کے لئے کوئی فرشتہ بھیج بھی دے تو وہ لوگوں کے سامنے ایک انسان کی شکل اختیار کر کے ہی ظاہر ہو گا۔وہ فرشتوں کی اصل صورت میں ہرگز نہ آئے گا۔اور جب فرشتہ انسان کی شکل میں آئے گا تو وہ پھر بھی اسی شبہے کا شکار ہوں گے اور انہیں وہی تردد لاحق ہو گا۔وہ پہلے بھی اس تردد کا شکار ہیں حالانکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ جو بات کرتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ”میں محمد ہوں' تم مجھے خوب جانتے ہو۔مجھے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے تاکہ میں تمہیں برے انجام سے خبردار کروں اور اچھے انجام کی خوشخبری دوں۔“ لیکن اگر کوئی فرشتہ آئے اور وہ ایک ایسے انسان کی شکل میں آئے جسے وہ نہیں جانتے اور وہ یوں گویا ہو: ”میں فرشتہ ہوں اور مجھے اللہ نے بھیجا ہے کہ میں رسول خدا حضرت محمد ؐ کی تصدیق کروں۔“ تو وہ دیکھیں گے کہ یہ شخص تو ان ہی جیسا ایک آدمی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھی انہیں ویسا ہی شبہ لاحق ہو گا۔غرض اگر کوئی فرشتہ آدمی کی شکل میں آتا تو بھی وہ اسی شبہے کا شکار ہوتے جس کا وہ پہلے سے شکار تھے اور کوئی یقینی بات نہ کر سکتے۔

اس طرح ان آیات میں اللہ تعالیٰ یہ بتاتے ہیں کہ یہ لوگ حقائق کائنات کے بارے میں کس قدر جاہل ہیں اور سنت الہیہ سے کس قدر ناواقف ہیں جبکہ اپنی جگہ نہایت ہی معاند اور بغیر علم و جواز کے ہٹ دھرمی میں مبتلا ہیں۔بالکل بلا دلیل۔تیسری حقیقت جو یہ آیات انسانی سوچ کے اندر پیدا کرتی ہیں' وہ یہ ہے کہ اسلامی تصور حیات اور اس کے اساسی عناصر ترکیبی کیا ہیں؟ ان عناصر میں وہ تمام مظاہر فطرت شامل ہیں جن کے بارے میں اسلام ایک مسلمان کو ہدایت دیتا ہے کہ وہ ان کا ادراک کرے اور اپنی زندگی کو ان مظاہر فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کر لے۔ نیز عالم غیب بھی ان اساسی عناصر میں شامل ہے جس میں ملائکہ بھی شامل ہیں۔اسلام نے ایمان کے بنیادی عناصر میں اس بات کو شامل کیا ہے کہ تم فرشتوں پر بھی ایمان لاؤ گے۔ فرشتوں پر ایمان کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔اللہ پر ایمان' ملائکہ پر ایمان' کتابوں پر ایمان' رسولوں پر ایمان' یوم آخرت پر ایمان اور اچھی اور بری تقدیر پر ایمان۔

ظلال القرآن کی جلد اول میں جب ہم نے سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات کی تشریح کی تھی تو اس میں ہم نے اس موضوع پر بات کی تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان بالغیب کی وجہ سے انسانی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہو جاتا ہے۔انسان محض عالم محسوسات کے محدود دائرے سے نکل جاتا ہے اور وہ اس بات پر ایمان لاتا ہے کہ ایک عالم اور بھی ہے جو ہمیں معلوم نہیں ہے۔ہم اگرچہ اس کا تصور نہیں کر سکتے لیکن وہ بلاشک اور لاریب آنے والا ہے۔یہ تصور انسان کو حیوانات کے محسوس دائرے سے نکال کر انسانی ادراک کے دائرے میں داخل کر دیتا ہے اور جو لوگ انسان کے لئے محسوسات سے اوپر جانے کا دروازہ بند کرتے ہیں وہ انسان کو مقام انسانیت سے گرا کر اسے پیچھے حیوانی دائرے میں لے جاتے ہیں اور اس کا نام ترقی پسندی رکھتے ہیں۔اس سورہ میں جب ہم عالم غیب کے بارے میں بات کریں گے تو اس نکتے کی مزید وضاحت کریں گے۔آیت عندہ مفاتح الغیب کے ذیل میں۔ان شاء اللہ۔

عالم غیب کے بارے میں جو اسلامی تصور ہے اس میں یہ بات موجود ہے کہ عالم غیب میں ایک مخلوق ایسی ہے جو نظر

نہیں آتی اور وہ فرشتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس مخلوق کی بعض صفات کا تذکرہ کیا ہے' جو ان کے بارے میں ایک مجمل تصور کے لئے کافی ہے اور انسان اپنے حدود کے اندر فرشتوں کے ساتھ جو برتاؤ کرے گا اس کی بنیاد اسی بات پر ہونی چاہئے۔

فرشتے اللہ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہیں۔ وہ ہروقت اللہ کی اطاعت اور بندگی پر کمربستہ ہیں۔ مطلق مطیع ہیں۔ وہ اللہ کے قریب رہتے ہیں۔ وہ اللہ کے کس طرح مقرب ہیں اس کی کیفیت کا ہمیں پوری طرح علم نہیں ہے۔

(وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ (۲۶) لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ (۲۷) يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ (۲۸)(۲۱ : ۲۶ تا ۲۸) (یہ کہتے ہیں رحمٰن اولاد رکھتا ہے' سبحان اللہ' وہ تو بندے ہیں جنہیں عزت دی گئی ہے۔ اس کے حضور بڑھ کر نہیں بولتے اور بس اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ جو کچھ ان کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے وہ باخبر ہے' وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اس کے کہ جس کے حق میں سفارش سننے پر اللہ راضی ہو' اور وہ اس کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں)۔

(وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ) (اور جو فرشتے اس کے پاس ہیں وہ نہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اس کی بندگی سے سرتابی کرتے ہیں اور نہ ملول ہوتے ہیں۔ شب و روز اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں دم نہیں لیتے) یہ فرشتے اللہ کے تخت کو بھی اٹھائے ہوئے ہیں اور قیامت کے دن بھی اسے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اس کی کیفیت کا ادراک انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس غیبی حقیقت کے بارے میں ہمارا ادراک اسی حد تک محدود ہے جس حد تک اللہ تعالیٰ نے انکشاف فرمایا ہے۔

(اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (۴۰ : ۷)) "عرش الٰہی کے حامل فرشتے اور وہ جو عرش الٰہی کے گرد و پیش حاضر رہتے ہیں' پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں اور وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔"

(وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۳۹ : ۷۵)) "اور تم دیکھو گے کہ فرشتے عرش کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنے رب کی حمد و تسبیح کر رہے ہوں گے اور لوگوں کے درمیان ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ چکا دیا جائے گا اور پکار دیا جائے گا کہ حمد ہے اللہ رب العالمین کے لئے۔"

وہ اللہ کے خزانوں کے بھی نگراں ہیں اور آگ اور جہنم کے داروغے بھی وہی ہوں گے۔ اہل جنت کو سلام اور دعاء کے ساتھ استقبال کریں گے اور اہل جہنم کو وہ سخت عذاب کی دھمکی دیتے ہوئے لیں گے۔"

(وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا حَتّٰى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۷۱) قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ (۷۲) وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتّٰى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ (۷۳) (۳۹: ۷۱ تا ۷۳) "اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا، جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے کارندے ان سے کہیں گے "کیا تمہارے پاس تمہارے اپنے لوگوں میں سے ایسے رسول نہیں آئے تھے جنہوں نے تم کو تمہارے رب کی آیات سنائی ہوں اور تمہیں اس بات سے ڈرایا ہو کہ ایک وقت تمہیں یہ دن بھی دیکھنا ہو گا۔" وہ جواب دیں گے "ہاں آئے تھے مگر عذاب کا فیصلہ کافروں پر چپک گیا۔" کہا جائے گا داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں، یہاں اب تمہیں ہمیشہ رہنا ہے، بڑا ہی برا ٹھکانا ہے یہ متکبروں کے لئے...... اور جو لوگ اپنے رب کی نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے انہیں گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہوں گے تو اس کے منتظمین ان سے کہیں گے "سلام ہو تم پر، بہت اچھے رہے، داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ کے لئے۔" اور دوسری جگہ آتا ہے:

(وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً) "اور ہم نے آگ کا نگران بھی صرف ملائکہ کو بنایا ہے۔" ایک اہم سوال یہ ہے کہ یہ فرشتے اہل زمین کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اہل زمین کے ساتھ ان کا معاملہ مختلف شکلوں میں ہوتا ہے۔ وہ خدا کے حکم سے اہل زمین کی حفاظت بھی کرتے ہیں اور ان کے اعمال کا مکمل ریکارڈ بھی تیار کرتے ہیں اور جب ان کا مقررہ وقت پورا ہوتا ہے تو وہ ان کی روح قبض کر لیتے ہیں۔

(وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتّٰىٓ اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ (۶: ۶۱)) "اور اپنے بندوں پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے اور تم پر نگرانی کرنے والے مقرر کر کے بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آتا ہے تو اس کے

بھیجے ہوئے فرشتے اس کی جان نکال لیتے ہیں اور اپنا فرض انجام دینے میں ذرا کوتاہی نہیں کرتے۔"

(لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ (۱۳ : ۱۱)) "ہر شخص کے آگے پیچھے اس کے مقرر کئے ہوئے نگران لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔"

(مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (۵۰ : ۱۸)) "کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا ہے جسے محفوظ کرنے کے لئے ایک حاضر باش نگران نہ ہو۔"

ان فرشتوں کے فرائض میں یہ بات بھی شامل ہے کہ یہ رسولوں کے اوپر وحی لے کر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتا دیا ہے کہ ان میں سے حضرت جبرائیل یہ کام سرانجام دیتے ہیں۔

(يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ أَنْ أَنذِرُوا أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاتَّقُونِ (۱۶ : ۲)) "وہ اس روح کو اپنے جس بندے پر چاہتا ہے اپنے حکم سے ملائکہ کے ذریعے نازل فرما دیتا ہے (اس ہدایت کے ساتھ کہ) لوگوں کو آگاہ کر دو، میرے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ہے لہٰذا تم مجھ ہی سے ڈرو۔"

(قُلْ مَن كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ (۲ : ۹۷)) "ان سے کہو کہ جو کوئی جبرائیل سے عداوت رکھتا ہو، اسے معلوم ہونا چاہئے کہ جبرائیل نے اللہ ہی کے اذن سے یہ قرآن تمہارے قلب پر نازل کیا ہے۔"

(وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ (۱) مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ (۲) وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ (۳) إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (۴) عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ (۵) ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ (۶) وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ (۷) ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ (۸) فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ (۹) فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ (۱۰) مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ (۱۱) أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ (۱۲) وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ (۱۳) عِندَ سِدْرَةِ الْمُنتَهَىٰ (۱۴) عِندَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَىٰ (۱۵) إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَىٰ (۱۶) مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ (۱۷) لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ (۱۸) (۵۳ : ۱ تا ۱۸)) "قسم ہے تارے کی جب وہ غروب ہوا، تمہارا رفیق نہ بھٹکا ہے، نہ بہکا ہے۔ وہ اپنی

خواہش نفس سے نہیں بولتا، یہ تو ایک وحی ہے، جو اس پر نازل کی جاتی ہے، اسے زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے، جو بڑا صاحب حکمت ہے۔ اور وہ سامنے آکھڑا ہوا جبکہ وہ بالائی افق پر تھا، پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہو گیا۔ یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔ تب اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو اس نے پہنچانی تھی۔ نظر نے جو کچھ دیکھا دل نے اس میں جھوٹ نہ ملایا۔ اب کیا تم اس چیز پر اس سے جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے۔" اور ایک دفعہ پھر اس نے سدرة المنتہیٰ کے پاس اترتے دیکھا، جہاں پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ چندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی اور اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

اور جب مسلمانوں کی طاغوت کے ساتھ نہایت ہی اہم اور بڑی جنگ ہوتی ہے تو اس معرکے میں وہ بطور تائید اور امداد ثابت قدمی پیدا کرنے کے لئے اترتے ہیں :

(اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۳۰) (۴۱ : ۳۰)) "جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے، اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں "نہ ڈرو، نہ غم کرو، اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔"

(اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ (۱۲۴) بَلٰۤى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ (۱۲۵) وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۱۲۶) (۳ : ۱۲۴ تا ۱۲۶)) "اے نبی یاد کرو جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے "کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ اللہ تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کرے؟" بے شک اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ آئیں گے، اسی آن تمہارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ یہ بات اللہ نے تمہیں اس لئے بتا دی ہے تاکہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہارے دل مطمئن ہو جائیں۔ فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے جو بڑی قوت والا اور دانا اور بینا ہے۔"

(اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ کُلَّ بَنَانٍ (٨ : ١٢) (اور وہ وقت جبکہ تمہارا رب فرشتوں کو اشارہ کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو، میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیتا ہوں، پس تم ان کی گردنوں پر ضرب لگاؤ اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ۔) یہ فرشتے اہل ایمان کے کاموں میں بھی مصروف رہتے ہیں، وہ اللہ کی تسبیح کرتے ہیں اور ان لوگوں کے لئے ہروقت مغفرت کی دعا کرتے ہیں جو اہل ایمان ہیں اور وہ ان مومنین کے لئے اس قدر شغف کے ساتھ دعا کرتے ہیں کہ جس طرح ایک نہایت ہی محبت کرنے والا شخص اپنے محبوب کے لئے دعا کرتا ہے۔

(اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ کُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ (٧) رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ نِ الَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (٨) وَقِهِمُ السَّیِّاٰتِ وَمَنْ تَقِ السَّیِّاٰتِ یَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (٩) (٤٠ : ٧ تا ٩) "عرش الٰہی کے حامل فرشتے، اور وہ جو عرش کے گرد و پیش رہتے ہیں، سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "اے ہمارے رب، تو اپنی رحمت اور علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے، پس معاف کر دے اور عذاب دوزخ سے بچالے ان لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ اے ہمارے رب، اور داخل کر ان کو ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کے والدین، اور بیویوں اور اولاد میں سے جو صالح ہوں (ان کو بھی وہاں ان کے ساتھ ہی پہنچا دے)۔ تو بلاشبہ قادر مطلق ہے اور حکیم ہے، اور بچا دے ان کو برائیوں سے، جس کو تو نے قیامت کے دن برائیوں سے بچا دیا اس پر تو نے رحم کیا، یہی بڑی کامیابی ہے۔"

جب فرشتے روح قبض کرتے ہیں تو اس وقت اہل ایمان کو جنت کی خوشخبری دیتے ہیں اور ان کا استقبال خوشخبری سے کرتے ہیں اور آخرت میں وہ ان کی سلام و آداب سے عزت افزائی کریں گے۔

(اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ طَیِّبِیْنَ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْکُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (١٦ : ٣٢)) "ان متقیوں کو جن کی روحیں پاکیزگی کی حالت میں جب ملائکہ قبض کرتے ہیں تو کہتے ہیں "سلام ہو تم پر، جاؤ جنت میں اپنے اعمال کے بدلے۔"

(جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ وَالْمَلٰىِٕكَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ (۲۳) سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (۲۴) (۱۳: ۲۳-۲۴) ایسے باغ جو ان کی ابدی قیام گاہ ہوں گے۔ وہ خود بھی ان میں داخل ہوں گے اور ان کے آباواجداد اور ان کی بیویاں اور ان کی اولاد میں سے جو صالح ہیں وہ بھی ان کے ساتھ وہاں جائیں گے۔ ملائکہ ہر طرف سے ان کے استقبال کے لئے آئیں گے اور کہیں گے تم پر سلامتی ہے' تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اس کی بدولت آج تم اس کے مستحق ہو۔ پس کیا ہی خوب ہے یہ آخرت کا گھر۔

ان کے فرائض میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ اہل کفر کا استقبال آخرت میں توہین آمیز رویے کے ساتھ کریں گے اور دنیا میں کفر و اسلام کے معرکے میں وہ کفار کے مقابلے میں لڑتے ہیں اور جب کفار کی روح قبض کرتے ہیں تو وہ سختی' اذیت اور توہین آمیز انداز میں قبض کرتے ہیں۔

(وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰىِٕكَةُ بَاسِطُوْٓا اَیْدِیْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ (۶: ۹۳) "کاش تم ظالموں کو اس حالت میں دیکھ سکو جبکہ وہ سکرات موت میں ڈبکیاں کھا رہے ہوتے ہیں اور فرشتے ہاتھ بڑھا کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ "لاؤ' نکالو اپنی جان' آج تمہیں ان باتوں کی پاداش میں ذلت کا عذاب دیا جائے گا جو تم اللہ پر تہمت رکھ کر ناحق بکارتے تھے اور اس کی آیات کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرتے تھے۔"

(فَكَیْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰىِٕكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ (۴۷: ۲۷) "پھر اس وقت کیا حال ہو گا جب فرشتے ان کی روحیں قبض کریں گے اور ان کے منہ اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے انہیں لے جائیں گے۔"

جب سے اللہ تعالی نے انسانوں کے باوا آدم کو پیدا کیا اس وقت سے فرشتوں کا انسانوں کے ساتھ ایک خاص تعلق رہا ہے اور یہ سلسلہ طول حیات تک دنیا میں جاری رہا ہے اور قیامت تک جاری رہے گا جیسا کہ مذکورہ بالا قرآنی آیات کے اقتباسات سے اچھی طرح معلوم ہوا ہے۔ فرشتوں اور عالم بشریت کے باہم تعلق پر بھی قرآن کریم کے متعدد مقامات پر بحث کی گئی ہے اور سورہ بقرہ میں اس کی پوری تفصیل دی گئی ہے۔

(وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰىِٕكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا

تَعْلَمُوْنَ (۳۰) وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ
بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۳۱) قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ
اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ (۳۲) قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ
قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ
تَكْتُمُوْنَ (۳۳) وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ اَبٰى
وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ (۳۴ (۲: ۳۰ تا ۳۴))

”پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ ”میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔“ انہوں نے عرض کیا ”کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے نظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔“ فرمایا: ”میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔“ اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔ پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: ”اگر تمہارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے نظام بگڑ جائے گا) تو بتاؤ ان چیزوں کے نام کیا ہیں؟“ انہوں نے عرض کیا ”نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے۔ ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں' جتنا آپ نے ہم کو دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے والا اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔“ پھر اللہ نے آدم سے کہا: ”تم انہیں ان چیزوں کے نام بتاؤ۔“ جب اس نے ان کو ان سب کے نام بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا: ”میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں' جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو' وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اسے بھی میں جانتا ہوں۔“ پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ' تو سب جھک گئے مگر ابلیس نے انکار کیا۔ وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔)

یہ ایک وسیع میدان ہے جس میں انسانی زندگی اور عالم بالا کی زندگی کا باہم اتصال ہوتا ہے اور اس اتصال کی وجہ سے انسانی سوچ میں ایک وسعت سی پیدا ہو جاتی ہے اور انسان اس کائنات کے حقائق کا ادراک ایک وسیع زاویے سے کر سکتا ہے۔ اس کا نفسیاتی شعور وسیع اور اس کے ذہن کی جولانی کا دائرہ کھل جاتا ہے اور فکر ونظر کی یہ وسعت ایک مسلمان کو ایک ہمہ گیر اسلامی تصور عطا کرتی ہے۔ قرآن کریم انسان کے سامنے اس وسیع اور مشہود کائنات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کا آخری اتصال عالم غیب کے اس وسیع میدان سے ہوتا ہے۔

عالم غیب کا ایک وسیع عالم اور ایک کھلا میدان ہے۔ جو لوگ انسان پر عالم غیب کے دروازے بند کرنا چاہتے ہیں وہ انسان کے ساتھ نہایت ہی قبیح عداوت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ وہ انسان کی دنیا کو اس کے نہایت ہی محدود تصور بلکہ عالم محسوسات کے اندر محدود کر دینا چاہتے ہیں اور اسے عالم حیوانات میں داخل کرنا چاہتے ہیں حالانکہ اللہ نے انسان کو عزت

اور شرافت اس طرح بخشی کہ اسے غور و فکر کی قوت عطا کی۔ اس غور و فکر کی قوت سے انسان ان چیزوں کا ادراک کر سکتا ہے جس سے جانور اور بہائم محروم ہیں۔ انسان اپنی اس صلاحیت کی وجہ سے علم و معرفت کی فراوانی پاتا ہے اور اس کا شعور نہایت ہی وسیع ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی عقل اور اپنے دل کی وجہ سے عالم بالا کی وسعتوں تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ اخلاق پاکیزہ حاصل کرتا ہے اور اپنے وجود کے ساتھ نورانی عالم بالا کی سیر کرتا ہے۔

عرب اپنی اس جاہلیت کے باوجود جس میں وہ غرق تھے اور جس میں ان کا تصور حیات نہایت ہی غلط اصولوں پر قائم تھا' دور جدید کی سائنسی جاہلیت کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ یہ جدید جاہلیت کے پیروکار عالم غیب کے ساتھ مذاق کرتے ہیں اور ایسے غیبی امور پر ایمان لانے کو غیر علمی اور غیر سائنسی تصور سمجھتے ہیں۔ وہ عالم غیب کو ترازو کے ایک پلڑے میں ڈالتے ہیں اور عالم سائنس کو دوسرے میں جو ایک نہایت ہی غلط تقابل ہے۔ اس تصور کی تردید میں آیت (عندہ مفاتح الغیب) کے ضمن میں کروں گا اس لئے کہ جاہلیت جدیدہ کا یہ وہ دعویٰ ہے جس کے اوپر سائنس کے اصولوں کے مطابق کوئی دلیل نہیں لائی جا سکتی نہ دین میں اس کے اوپر کوئی دلیل پیش کی جا سکتی ہے۔ یہاں ہم صرف فرشتوں کے وجود کے بارے میں ایک مختصر بات کریں گے۔

سائنس دانوں سے ہم صرف یہ بات پوچھتے ہیں کہ وہ جو فرشتوں کا انکار کرتے ہیں اس پر ان کے پاس سائنسی اصولوں کے مطابق کیا دلیل ہے؟ وہ فرشتوں کے وجود کو تصور اور تصدیق کے دائرے سے کیوں نکالتے ہیں؟ زرا وہ کوئی سائنسی فارمولا بتائیں جس کی رو سے وہ ایسا عقیدہ رکھنے پر مجبور ہوں کہ فرشتوں کا وجود نہیں ہے۔

ان کی سائنس کی حالت تو یہ ہے کہ وہ دوسرے کرات سماوی کے اندر ایسی موجودات کے اقرار اور انکار سے بھی عاجز ہے جو اس کرۂ ارض پر موجود ہیں۔ کجا کہ وہ کرات جن کی فضا اور جن کی کیمیاوی اور طبیعیاتی ترکیب اور مسافت زمین سے مختلف ہے اور جن کی فضائیں مختلف ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ ان دوسرے جہانوں کا انکار کس اصول پر کرتے ہیں جبکہ ان کے پاس فرشتوں کے وجود کی نفی پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

ہم ان سے اپنے عقائد کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں چاہتے اور نہ ہم اللہ کے کلام کے بارے میں ان سے کوئی استدلال چاہتے ہیں۔ ہم ان سے خود ان کے اس علم اور سائنس کے بارے میں محاکمہ چاہتے ہیں جس کو انہوں نے الہ بنا لیا ہے۔ اس سوال کے جواب میں ان کے پاس مکابرہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اب ان کی یہ سائنس جو انہیں عالم غیب اور ملائکہ کے انکار پر آمادہ کرتی ہے' اس سوال سے لاجواب ہو جاتی ہے۔ انکار محض اس لئے کہ یہ جہان پردۂ غیب میں مستور ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جس سائنس کی وجہ سے وہ عالم غیب اور فرشتوں کا انکار کرتے ہیں وہی بالجزم عالم غیب کو ثابت کرتی ہے۔ بلکہ اس سائنس نے عالم غیب کو ایک طرح سے عالم شہادت میں بدل دیا ہے اور کئی ایسے انکشاف کر دیئے ہیں جو پہلے عالم مغیبات میں تھے۔ ان مغیبات کو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

اس موج کا اختتام اس انجام کے تذکرے سے ہوتا' جس سے انسانی تاریخ میں وہ تمام لوگ دوچار ہوئے جنہوں نے رسولوں کا مذاق اڑایا۔ پھر جھٹلانے والوں کو دعوت دی گئی کہ ذرا وہ انسانی تاریخ میں ان مقتل گاہوں کا مطالعہ کریں جن میں ان کے اسلاف پر عذاب آئے۔ ذرا اس کرۂ ارض پر چل پھر کر جھٹلانے والوں کے انجام کو دیکھیں۔ یہ واقعات

زبان حال سے گویا ہیں کہ جھٹلانے والوں اور مذاق کرنے والوں کا انجام کیا ہوا ہے؟

---ooo---

وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۰﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾

"اے نبیؐ" تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے مگر ان مذاق اڑانے والوں پر آخر کار وہی حقیقت مسلط ہو کر رہی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ ان سے کہو' ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے۔" یہ ایک جھلکی ہے' جو ان لوگوں کی روگردانی اور ہٹ دھرمی کے بعد اور ان کی جاہلانہ اور احمقانہ مطالبات کے بعد آتی ہے۔ اور اس کے بعد کہ ان کے اس چیلنج اور ان کے ان مطالبات کو اللہ تعالیٰ نے نہایت مہربانی اور نہایت ہی بردباری کر کے قبول نہ کیا ورنہ وہ ہلاک ہو جاتے' تو اس موقعہ پر اس جھلکی سے دو مقاصد مطلوب ہیں۔

پہلا مقصد تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جائے اور ان کے دل سے غبار غم چھٹ جائے کیونکہ روگردانی کرنے والوں اور مذاق اڑانے والوں کے رویے کی وجہ سے اور مسلسل ہٹ دھرمی کی وجہ سے آپ بہت ہی پریشان ہو جاتے تھے۔ اس طرح حضورؐ کا دل مطمئن ہو جاتا کہ جھٹلانے والوں اور مذاق اڑانے والوں کا انجام آخر کار خراب ہی ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سمجھایا جاتا ہے کہ تاریخ دعوت و تاریخ رسل میں یہ رویہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ آپ سے پہلے بھی رسولوں کے ساتھ یہی رویہ اختیار کیا گیا۔ مذاق اڑانے والوں کا یہی انجام رہا ہے اور وہ جس چیز سے مذاق کرتے تھے آخر کار اسی چیز نے انہیں گھیر لیا اور جس کو دھمکی سمجھتے تھے وہ عذاب ان پر آکر رہا اور حق کو باطل پر آخر کار غلبہ نصیب ہوا۔

دوسرا مقصد یہ تھا کہ ان جھٹلانے والوں اور مذاق کرنے والوں کے دلوں کو بھی ذرا جھنجوڑا جائے اور انہیں اس طرف متوجہ کیا جائے کہ وہ ذرا اپنے اسلاف کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں جنہوں نے نبیوں کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑایا اور اس کی وجہ سے اللہ کے عذاب نے انہیں گھیرا۔ یہ لوگ قوت اور شوکت کے اعتبار سے تم سے زیادہ قوی اور پر شوکت تھے۔ وہ زیادہ آسودہ حال اور ترقی یافتہ تھے۔ اس طرح انہیں اس طرف متوجہ کیا۔ شاید کہ وہ ہدایت قبول کر لیں جس طرح سورہ کے آغاز میں بھی انہیں واقعات تاریخ سے عبرت حاصل کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ قرآن کریم کے درج ذیل الفاظ قابل غور ہیں:

(قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۶:۱۱)

"ان سے کہو' ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو' جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے؟" زمین میں سیر و سیاحت کے مقاصد یہ

ہیں کہ پھرنے والے کو علم حاصل ہو' وہ حالات پر غور کرے اور ان سے عبرت حاصل کرے۔ اور پھر تدبر کے بعد پھرنے والا یہ معلوم کرے کہ سنن الہیہ حوادث و واقعات میں کس طرح کارفرما ہوتی ہیں۔ سنن الہیہ آثار قدیمہ سے بھی معلوم ہو سکتی ہیں جو نظر آتے ہیں اور ابھی تک کھڑے ہیں۔ ان تاریخی واقعات کے اندر بھی معلوم کی جاسکتی ہیں جو ہر خطے اور ہر قوم کی روایتی تاریخ کے اندر منضبط ہوتے ہیں۔ زمین کے اندر اس غرض کے لئے اور اس نہج پر سیاحت کرنا عربوں کے لئے ایک انوکھی بات تھی۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں جیسی بدوی اور سادہ قوم میں قرآن مجید فکر و نظر کا کس قدر عظیم انقلاب لا رہا ہے۔ وہ ایک جاہل اور ان پڑھ قوم کو فلسفہ تاریخ پڑھا رہا ہے۔

وہ زمین میں پھرتے تھے' سیاحت کے عادی تھے۔ وہ زندگی گزارنے اور تجارت کے لئے قافلوں کی صورت میں پھرنے کے عادی تھے لیکن ان کے پیش نظر صرف وہ امور تھے جن کا تعلق صرف تجارت اور شکار وغیرہ سے تھا۔ تربیتی مقاصد کے لئے سیر و سیاحت کبھی ان کا مقصود نہیں رہی تھی۔ یہ سفر ان کے لئے بالکل جدید تھا۔ یہ جدید نظام حیات انہیں سچ کی یہ نئی لائن دے رہا تھا اور بچوں کی طرح انہیں ہاتھ سے پکڑ کر جاہلیت کی گہرائیوں اور تاریکیوں سے نکال رہا تھا۔ انہیں ایک بلند اور کھلی شاہراہ پر ڈال کر مقام سربلندی تک لے جا رہا تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ قرآن پر عمل کر کے ہی وہ اس بلند مقام تک پہنچے۔

مطالعہ تاریخ کا یہ منہاج جو قرآن کریم عربوں کو سکھا رہا تھا' اپنے اول اور آخر سے یہ انسانی تاریخ کے مطالعے کا بالکل ایک نیا منہاج تھا جس کے مطابق اس دور میں اسلامی نظام زندگی نے انسانی عقل کے سامنے انسانی تاریخ کو پیش کیا۔ اس طرز مطالعہ سے صاف صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ جب کچھ اسباب اللہ کی مشیت کے مطابق جمع ہو جاتے ہیں تو ان کے نتائج لازماً ظہور پذیر ہوتے ہیں اور انسان کھلی آنکھوں سے تاریخ میں واقعات و احداث کو سنن الہیہ کے مطابق ظاہر ہوتا دیکھتا ہے۔ اسلامی نظام سے پہلے انسان اور ان کی روایات میں سے محض چند واقعات گنوائے گئے تھے اور کچھ مشاہدات اور لوگوں کے کچھ رسوم اور رواجات کو قلم بند کیا گیا تھا۔ کہیں بھی واقعات کے اسباب اور وجوہات کے بارے میں کوئی بحث اور تبصرہ نہیں ہوا تھا اور نہ ان کا تجزیہ کیا گیا تھا کہ یہ اسباب اور یہ ان کے نتائج نکلے۔ یہ تھے تاریخ کے مراحل اور انقلابات۔ یہ اسلامی نظام اور قرآن تھا جس نے انسان کو فلسفہ تاریخ دیا اور اسے یہ سکھایا کہ تاریخی واقعات کے اندر اسباب و نتائج کا مطالعہ کرو۔ قرآن نے فلسفہ تاریخ کا کوئی مرحلہ پیش نہیں کیا اور نہ کسی پرانی فکر کو آگے بڑھایا ہے بلکہ قرآن نے انسان کو تاریخی تجزیہ کا ایک منہاج دیا ہے اور صرف اس منہاج کے مطابق ہی انسانی تاریخ کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔

بعض لوگ اس امر پر تعجب کرتے ہیں کہ اسلامی نظام نے اور رسالت محمدیہ نے صرف ربع صدی کے ایک مختصر عرصے میں عربوں کی زندگی میں ایک عظیم اور بے مثال ثقافتی اور اقتصادی انقلاب برپا کر دیا۔ یہ عرصہ بظاہر اس قدر عظیم اور ہمہ گیر انقلاب کے لئے نہایت ہی قلیل ہے۔ اگر وہ اقتصادی انقلاب کے اصل عوامل کا مطالعہ کریں تو وہ ہرگز یہ تعجب نہ کریں گے۔ انہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ عوامل کیا تھے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدائے علیم و خبیر کی طرف سے لے کر آئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اقتصادی انقلاب بھی اسلامی نظام زندگی کا دکھایا ہوا معجزہ تھا اور اس کا راز اسی نظام میں پنہاں ہے۔ جو لوگ دور جدید کے جدید اقتصادی نظریات اور کھوئے ہوئے اقتصادی اصولوں کے اندر جو چیز تلاش کر رہے ہیں اور اس کے لئے تاریخ کی مادی تعبیر کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ یہ راز اسلامی نظام کے اندر تلاش کریں۔

اگر وہ اس کے اسباب اسلامی نظام زندگی کے اندر تلاش نہیں کرتے تو رسالت محمدیہ کے نتیجے میں پسماندہ اور بدوی عربوں میں جو اقتصادی انقلاب برپا ہوا' اس کے نتیجے میں لوگوں کو ایک نظریہ اور تصور حیات ملا' ایک نظام حکومت ملا' فکر و نظر کا نیا انداز ملا' اخلاق ملا' اقدار ملیں' اجتماعی اوضاع و اطوار ملے اور نہایت ہی مختصر عرصے یعنی ربع صدی میں ملے ۔ ان کے وہ کیا اسباب اور عوامل بتا سکیں گے ؟ (هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ)

اس جھلکی پر ذرا دوبارہ غور کیجئے ۔

(قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (٦ : ١١))

"ان سے کہو کہ ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا؟" ....... اور اس لہر کے ابتدائی حصہ میں آنے والے ریمارک کو ذرا دوبارہ ذہن میں تازہ کریں ۔

(اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ مَالَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ (٦ : ٦)) "کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے اپنے زمانے میں دور دورہ رہا ہے؟ ان کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا تھا جو تمہیں نہیں بخشا ہے' ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہا دیں ۔ آخر کار ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دوسرے دور کی قوموں کو اٹھایا ۔"

یہ آیات اور ایسی ہی آیات اس سورہ میں اور پورے قرآن میں پائی جاتی ہیں اور انسانیت کو فکر و نظر کا ایک جدید منہاج عطا کرتی ہیں ۔ یہ زندہ رہنے والا منہاج ہے اور یہ بے مثال اور لاثانی نظام زندگی ہے ۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے میری کتاب خصائص التصور الاسلامی ومقوماتہ کی "فصل" اسلام کا فلسفہ تاریخ)۔

---ooo---

# درس نمبر ۵۷ ایک نظر میں

یہ لہر نہایت ہی اونچی ہے اور اس کا ٹکراؤ بھی بہت خوفناک ہے۔ جھٹلانے ' روگردانی کرنے ' مذاق اڑانے اور دعوت اسلامی کے ساتھ استہزاء کرنے کی بحث کے بعد متصلاً یہ لہر اٹھتی ہے۔ روگردانی اور استہزاء کی گزشتہ بحث کے درمیان لوگوں کے لئے ڈراوا اور انجام بد سے ان کے دلوں میں خوف پیدا کیا گیا تھا اور لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا گیا تھا کہ وہ جھٹلانے والوں اور مذاق اڑانے والوں کے اس تاریخی انجام پر بھی غور کریں ' جس سے وہ دوچار ہوئے۔ مکذبین کے متعلق لہر نمبر ۲ سے پہلے اس سورت کی افتتاحی لہر میں اس پوری کائنات میں حقیقت الٰہی اور اس کی شان حاکمیت سے بحث کی گئی تھی۔ یہ شان پوری کائنات کے ساتھ ساتھ خود نفس انسانی کی اندر بھی دکھائی گئی تھی۔ اب اس لہر میں بھی ذات باری کے اقتدار اعلیٰ اور اس کے تصرفات کے کچھ اور پہلو دکھائے گئے ہیں۔ ایک نئے زیروبم اور کچھ نئے فیکٹرز کے ساتھ۔ گویا افتتاحی لہر اور اس لہر کا مضمون ایک ہی ہے ' فرق صرف یہ ہے ان دونوں کے درمیان مکذبین اور مذاق اڑانے والوں کے لئے ایک سخت تنبیہ آگئی ہے اور جس نے یہ بتانا مقصود ہے کہ معترضین کا یہ فعل نہایت ہی شنیع فعل ہے۔ جو لوگ دعوت سے منہ موڑتے ہیں وہ بہت ہی بری حرکت کر رہے ہیں۔

پہلی لہر میں شان الٰہی کو زمین و آسمان کی تخلیق میں دکھایا گیا ' کہ کس طرح یہاں ظلمت و نور کا نظام پیدا کیا گیا اور پھر اس کائنات کے اندر کیچڑ سے انسان کو کس طرح پیدا کیا گیا۔ پہلا مرحلہ اس کی عمر کا طے کیا گیا اور دوسرا مرحلہ اس کی قیامت اور بعث کے لئے مقرر کیا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ خدا کی خدائی زمیں و آسمانوں سب پر حاوی ہے۔ زمین پر اس مخلوق یعنی حضرت انسان کی تمام سرگرمیوں پر بھی حاوی ہے چاہے وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ ' بلند آواز سے ہوں یا خفیہ ' ان کے افعال کھلے بندوں ہوں یا پوشیدگی کے ساتھ۔ یہ سب امور اس لئے نہ لائے گئے کہ قرآن کے پیش نظر کوئی لاہوتی یا نظریاتی بحث نہ تھی بلکہ اس لئے کہ ان حقائق کے تقاضے انسانی زندگی میں عملاً نمودار ہوں۔ انسان کی پوری کی پوری زندگی اللہ واحد کے سامنے سرنگوں ہو اور انسان اللہ العالمین کے سوا کسی اور کے آگے نہ جھکے اور توحید میں کوئی شک و شبہ نہ رہے۔ وہ یہ سمجھے اور اقرار کرے کہ اللہ کی حاکمیت اس پوری کائنات اور انسان کی ظاہری و باطنی زندگی پر حاوی ہے اور یوں انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی پوری زندگی کو حاکمیت الٰہیہ کے تابع کر دے۔ جس طرح کہ اس کی تکوینی زندگی حاکمیت الٰہیہ کے تابع ہے۔

اس جدید بلند لہر کا مقصد بھی حقیقت الوہیت اور حاکمیت الٰہیہ کا اظہار ہے وہ اس طرح کہ اس پوری کائنات کا مالک اللہ ہی ہے۔ فعال بھی وہی ہے۔ رزق بھی وہی دیتا ہے اور کفالت بھی وہی کرتا ہے۔ وہ قادر اور قہار ہے ' وہ نافع اور ضار ہے ' لیکن یہ عقائد محض سلبی اور نظریاتی نہیں ہیں بلکہ ضروری ہے کہ ان عقائد کی روشنی میں اللہ وحدہ کو ولی تسلیم کیا جائے اور اس کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس کی مکمل بندگی کی جائے اور اس کا مطیع فرمان رہا جائے۔ ان تمام امور کا

اظہار اس طرح ہو گا کہ اللہ ہی کو اپنا دوست اور حاکم تسلیم کیا جائے' اس لئے کہ وہی تو ہے جو ہمارا رب اور مطعم ہے جبکہ ہماری جانب سے اسے کچھ نہیں دیا جاتا۔ دوسرے یہ کہ خود اس نے اس بات سے منع کیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو ولی حاکم اور دوست بنایا جائے یا ان امور میں اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کیا جائے۔

اس مقصد کے لئے اور اس شکل میں 'حقیقت الوہیت کے بیان کے ساتھ ساتھ ان مؤثرات اور فیکٹرز کو بھی بیان کر دیا گیا ہے جو دل کو پریشان کرتے ہیں۔ آغاز اس سے کیا جاتا ہے۔ اللہ تمام چیزوں کا مالک ہے' پھر وہی رب ہے لیکن اس طرح کہ وہ تمام لوگوں کو کھلاتا ہے اور اسے کوئی بھی نہیں کھلاتا اور نہ وہ محتاج ہے۔ پھر اللہ کے اس عذاب کا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ اگر کسی سے وہ عذاب ٹل جائے تو گویا اس نے عظیم کامیابی حاصل کر لی۔ پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ خیر و شر پر قادر ہیں اور یہ کہ وہ ہر فعل پر قادر ہیں اور قہار ہیں' وہ حکیم اور تجربہ کار ہیں۔ ان تمام امور کو ایک مؤثر انداز بیان کے ساتھ لایا جاتا ہے اور نہایت ہی بلند شان سے کہا جاتا ہے۔ کہہ دو' کہہ دو' کہہ دو۔

حقیقت حاکمیت الٰہیہ کے اس گہرے اور مؤثر بیان کا خاتمہ نہایت ہی بلند آہنگی کے ساتھ ہوتا ہے اور عقیدۂ توحید اور رد شرک اور ان کے درمیان فرق و امتیاز کو نہایت ہی پر زور انداز میں بیان کر کے اس کی شہادت دی جاتی ہے اور یہ شہادت بھی نہایت ہی شاہانہ انداز میں دی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے۔

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً سب سے بڑی شہادت کیا ہے؟ قُلِ اللّٰهُ کہو اللہ' کہو میں تو شرک پر شہادت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ اللہ تو صرف ایک ہی ذات ہے جو الٰہ واحد ہے۔ ان فقروں اور تنبیہ آمیز سوال و جواب کی وجہ سے ایک پر خطر اور خوفناک فضا پیدا ہو جاتی ہے اور ماحول یکلخت سنجیدہ ہو جاتا ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۵۷ تشریح آیات

## ۱۲--- تا--- ۱۹

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰہِ ؕ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ ؕ لَیَجْمَعَنَّکُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ لَا رَیْبَ فِیْہِ ؕ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَہُمْ فَہُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ لَہٗ مَا سَکَنَ فِی الَّیْلِ وَ النَّہَارِ ؕ وَ ہُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۳﴾

"ان سے پوچھو' آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے' وہ کس کا ہے؟ ........ کہو سب کچھ اللہ ہی کا ہے' اس نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے' (اسی لئے وہ نافرمانیوں اور اور سرکشیوں پر تمہیں جلدی سے نہیں پکڑ لیتا)' قیامت کے روز وہ تم سب کو ضرور جمع کرے گا' یہ بالکل ایک غیر مشتبہ حقیقت ہے' مگر جن لوگوں نے اپنے آپ کو خود تباہی کے خطرے میں مبتلا کر لیا ہے' وہ اسے نہیں مانتے۔ رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں جو کچھ ٹھہرا ہوا ہے' سب اللہ کا ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

یہاں خطاب بیان اور فیصلے کے لئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ ان مشرکین سے مخاطب ہوں جو اچھی طرح جانتے ہیں اللہ ہی خالق ہے لیکن یہ جانتے ہوئے بھی خالق کا ہمسر ان لوگوں کو بناتے ہیں جو بذات خود مخلوق ہیں۔ اور پھر بزعم خود اپنی زندگی کے تصرفات میں ان شرکاء کو بھی دخیل کرتے ہیں۔ سوال یہ کیا جاتا ہے کہ تم مانتے ہو کہ اللہ خالق ہے تو یہ بتاؤ کہ تخلیق کے بعد پھر مالک کون ہے؟ یعنی اس پوری کائنات اور زمین و آسمان کا خالق کون ہے؟ (مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ) کا مالک کون ہے؟ اور پھر اس سوال کا جواب خود ہی دے دیا جاتا ہے اس لئے کہ وہ اس کا انکار نہ کرتے تھے۔ (قُلْ لِّلّٰہِ) عربوں سے اگر پوچھا جاتا کہ (لِمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ) ؟ تو وہ جواب دیتے (اللہ) تو معلوم ہوا کہ جاہلیت کے اندھیروں میں ہوتے ہوئے اور فکری اور نظری گمراہی کا شکار ہوتے ہوئے بھی وہ دور جدید کی جاہلیت سے بہرحال زیادہ بہتر تھے۔ دور جدید کی جاہلیت کو علمی جاہلیت کہا جا سکتا ہے اس لئے کہ وہ اس سادہ حقیقت کی بھی منکر ہے' کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے۔

اس نے اپنی فطرت کو اندھا کر دیا ہے اور وہ اس بدیہی حقیقت کو بھی دیکھ نہیں رہی ہے۔ عرب جاہلیت کے پیروکار اگرچہ اس بدیہی حقیقت کا ادراک کرتے تھے اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے لیکن وہ اس حقیقت اور اقرار پر پھر اس کے منطقی نتیجے مرتب نہ کرتے تھے۔ یوں وہ اللہ کو اس کی مملوکات کے اندر بھی حاکم مطلق اور مقتدر اعلیٰ نہ سمجھتے تھے۔ وہ دنیا میں اپنے تمام تصرفات اور تمام حرکات و سکنات کو اذن اللہ کے دائرے کے اندر محدود نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مشرک قرار پاتے تھے اور انہیں اہل جاہلیت کہا گیا۔ رہے وہ لوگ جو اپنے تمام امور کو اللہ تعالیٰ کے دائرہ حاکمیت سے نکال دیں اور اپنی زندگی کے خود حاکم بن جائیں تو اب یہ سوال ان سے کیا جا سکتا ہے کہ ہم انہیں کیا کہیں اور ان کی زندگی پر کیا فیصلہ دیں۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو مشرکین کے سوا کوئی اور لقب نہیں دیا جا سکتا اور نہ ان کی زندگی کو شرکیہ زندگی کے سوا کچھ اور کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ خود اللہ کے فیصلے کے مطابق ان کی یہ زندگی فاسقانہ' ظالمانہ اور کافرانہ ہے۔ چاہے وہ جس قدر بھی اسلام کا دعویٰ کریں (ان کے برتھ سرٹیفکیٹ چاہے ان کا مذہب جو بھی بتائیں کیونکہ وہ تو پیدائش کے وقت خانہ پری ہوتی ہے)۔

اب ذرا آیت پر بھرپور نظر ڈالیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ یہ قرار دینے کے بعد کہ زمین اور آسمان کا مالک وہ ہے' ساتھ ساتھ یہ بھی اضافہ فرماتے ہیں (كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ) "اس نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔" اللہ وحدہ خالق و مالک ہے اور اس میں اس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں ہے جو نزاع کر سکے۔ لیکن اس نے اپنے فضل و کرم سے اپنے اوپر یہ بات لازم کر لی ہے کہ وہ رؤف و رحیم ہے۔ اپنے ارادے اور اپنی مشیت اور مرضی سے اس نے یہ رویہ لازم کر لیا ہے کوئی اور نہیں ہے جس نے اللہ پر اس رویے کو لازم کر دیا ہو' نہ کسی اور نے اللہ سے اس کا مطالبہ کیا ہے۔ اپنے ارادۂ مطلق اور اپنی کریمانہ شان ربوبیت کی وجہ سے اس نے یہ رحیمانہ رویہ اپنایا ہوا ہے۔ اور یہ اصول اللہ تعالیٰ نے اپنے فیصلوں' اپنے اخلاق اور اپنے معاملات میں' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اپنے لئے ایک مسلمہ قاعدہ قرار دیا ہے۔ اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظریات کی بنیادوں کے اندر بھی یہ اصول کارفرما ہے۔ اصل اصول یہ ہے کہ اللہ بندوں پر رحم کرتا ہے یہاں تک کہ اگر اللہ کسی بندے کو مشکلات اور مصائب سے دوچار کرتا ہے تو بھی دراصل اس پر شفقت مطلوب ہوتی ہے۔ وہ بندوں کو مشکلات میں اس لئے ڈالتا ہے تاکہ ان میں سے ایک ایسا عنصر ہر وقت تیار رہے جو اللہ کی امانت کا بار اٹھانے کا اہل ہو اور یہ امانت کبریٰ ان کو تب سپرد کی جاتی ہے جب یہ گروہ اپنے خلوص' اپنی بے لوثی اور اپنی فہم و ادراک' اور اپنی تیاری اور تجربات کے اعتبار سے اس بوجھ کے اٹھانے کے لئے تیار ہو جائے۔ خبیث قوتیں پاک اور صاف لوگوں کی صفوں سے نکال کر باہر پھینک دی جائیں اور یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ کون صحیح طرح مطیع رسول ہے اور کون بھاگنے والا ہے۔ جو ہلاک ہوتا ہے وہ سمجھ کر ہلاک ہو اور جو زندہ رہتا ہے تو اصولوں پر زندہ رہے۔ یہ تمام امور اللہ کے دائرہ رحمت کے اندر ہیں۔

اللہ کی رحمت کے مواقع سے تو ہماری زندگی بھری پڑی ہے۔ ہر لمحہ اور ہر لحظہ اس کی شفقت اور رحمت کی نئی شان ہے۔ ہم نے ابتلاء اور مشکلات کے زمانے کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ بعض اوقات لوگوں کی فکر و نظر اس میں دھوکہ کھا جاتی ہے۔

ہماری یہاں یہ کوشش نہیں ہے کہ ہم اللہ کی رحمت کے معاملات اور مظاہر گنوائیں' بعض مظاہر آنے والے صفحات میں آپ دیکھیں گے۔ یہاں ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اس آیت پر قدرے غور کریں۔ اور دیکھیں (كَتَبَ

عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ) سے دراصل کیا مراد ہے۔ اسی سورہ میں دوسری جگہ اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے (كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ) اس آیت میں جو بات جاذب نظر ہے وہ یہی فضل و کرم ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔یعنی ایک ذات عالی جو خالق ہے' مالک ہے اور قوت قاہرہ کی مالک ہے وہ اپنی قوت قاہرہ کے استعمال کے بجائے فضل و کرم کا مظاہرہ فرما رہی ہے اور پھر اس صورت میں کہ اس نے اس فعل کو اپنے اوپر لکھ لیا ہے' فرض قرار دے لیا ہے۔ازخود اس نے اس عہد پر دستخط کر لئے ہیں۔محض اپنے ارادہ مطلقہ اور اپنی مشیت کی رو سے وہ ہم پر فضل کر رہا ہے۔ یہ وہ عظیم حقیقت ہے کہ جب انسان اسے پیش نظر رکھے اس پر غور کرے اور اس کے عجیب انداز کا ملاحظہ کرے تو اس کا انسان کی شخصیت' اس کی فکر اور اس کے ذوق نظر پر اچھا اثر مرتب ہونا ضروری ہے۔

پھر یہ امر بھی جاذب نظر ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں کو اپنی اس شان رحیمی کی اطلاع بھی دیتا ہے کہ میں نے یہ اصول اپنے اوپر لکھ لیا ہے' اپنے لئے اسے فرض قرار دے لیا ہے کہ میں فضل و کرم ضرور کروں گا۔اب وہ بندے ہیں کون جن کے بارے میں عالم بالا میں یہ فیصلہ ہوا ہے اور اس کا حکم ان تک تحریری شکل میں آپہنچا ہے کہ ان کے بارے میں یہ فیصلہ ہو گیا ہے اور رسول اللہ کی زبانی ان تک اس کی اطلاع ہو رہی ہے۔یہ لوگ کون ہیں؟ یہ کوئی خاص لوگ نہیں ہیں 'بلکہ یہ لوگ عام لوگ ہیں اور اللہ کا یہ فضل و کرم تمام لوگوں کے لئے ہے۔

اس انداز میں 'اس حقیقت پر غور کرنے سے دل میں عجیب و غریب خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔انسان حیران ہو جاتا ہے۔اس کے دل میں انس اور اس کے اندر اس قدر روحانی سرور پیدا ہوتا ہے جس کا اظہار الفاظ کے اندر ممکن نہیں ہے۔ یہ حقائق قلب و نظر پر جو اثرات چھوڑتے ہیں انسان اسے چکھ تو سکتا ہے' اسے محسوس تو کر سکتا ہے لیکن انسانی اسلوب کلام میں ان کا اظہار ممکن نہیں ہے اور نہ پوری طرح اسے بیان کیا جاسکتا ہے۔

اس حقیقت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی تصور حیات میں شان رحیمی حقیقت الٰہیہ کا اساسی پہلو ہے۔اسی کی اساس پر بندے اور اللہ کا تعلق بندگی استوار ہوتا ہے اور یہ تصور نہایت ہی خوبصورت ' پر کیف ہے اور محبت اور مودت سے سرشار ہے۔اس اساسی تصور کے ہوتے ہوئے ہر منصف مزاج شخص کو ان بدمزاج لوگوں کی ذہنیت اور ان کی بہتان تراشیوں پر سخت تعجب ہو گا کہ وہ جو اسلام کے تصور الٰہ کے خلاف ایسی باتیں کرتے ہیں جو خلاف حقیقت ہیں ' یہ الزامات وہ اس لئے عائد کرتے ہیں کہ اسلام عقیدۂ ابنیت کا قائل نہیں ہے۔ اسلام اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ اللہ کے بندوں میں سے بھی کوئی اس کا بیٹا ہو سکتا ہے جب کہ کینسہ نے انجیل میں انحراف کر کے یہ عقیدہ گھڑا۔اسلامی تصور حیات اللہ کی شان کریمی کے بارے میں بہت ہی اعلیٰ و ارفع ہے اور وہ کنیسہ کہ کینسہ بیگانہ تصورات سے بہت ہی بلند ہے۔اللہ اور بندے کے درمیان جو شفقت اور محبت کا تعلق ہے وہ انسانی الفاظ سے ماوراء ہے۔اللہ کی شان جلالت کے ساتھ ساتھ اسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن بیان نہیں کیا جاسکتا۔

اللہ کی رحمت کا فیضان اس کے تمام بندوں پر ہوتا ہے۔یہ رحمت سب کو اپنے جوار میں لیتی ہے۔یہ اس کی رحمت ہی ہے جس کے ذریعے ذات انسان زندہ ہے۔اس کے جسم اور جان کا رشتہ استوار ہے۔انسانی وجود میں اور اس پوری کائنات کے وجود میں اللہ کی رحمت اور اس کی شان کریمی ہروقت جاری و ساری ہے۔جہاں تک انسانی زندگی اور انسانی جسم کا تعلق ہے' اس کے اندر اللہ کی رحمت کے مواقع کو تو ہم گن ہی نہیں سکتے۔البتہ ان میں سے چند ممتاز پہلوؤں اور

مظاہر کا ذکر ضروری ہے۔

سب سے پہلے انسان کی ذات میں اللہ کی شان رحیمی نظر آتی ہے۔انسان کو اللہ تعالیٰ اس طرح پیدا کرتا ہے کہ خود انسان کو اس کا کوئی علم نہیں ہوتا۔خود انہیں اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ کس طرح انہیں یہ وجود عطا ہوا۔پھر اس کے اندر ایسے خصائص رکھ دیئے گئے جن کی وجہ سے انسان کو تمام موجودات پر فضیلت حاصل ہوگئی۔

پھر اس کی شان کریمی ان قوتوں کے اندر نظر آتی ہے جن کو آج تک انسان مسخر کر سکا ہے۔یہ کائنات اور اس کی قوتیں' اور یہ ہے اللہ کا رزق اپنے وسیع تر مفہوم میں' یوں سمجھیں کہ کائنات جس کے وسیع میدانوں میں ہر وقت انسان جولانیاں دکھاتا ہے۔

پھر اس شان کریمی کا اظہار اس حقیقت سے بھی ہوتا ہے کہ اللہ نے انسان کو علم عطا فرمایا۔پہلے اسے حصول علم کی استعداد عطا کی اور اس کی صلاحیتوں اور اس کائنات کی قوتوں کے اندر ہم آہنگی پیدا کی۔یہ علم جس کی وجہ سے بعض بدفطرت اور بدمزاج انسان خود ذات باری پر دست درازی شروع کر دیتے ہیں حالانکہ یہ وہی تو ہے جس نے ان بدمزاجوں کو یہ علم عطا فرمایا اور یہ علم اللہ کے ارزاق میں سے ایک رزق ہے۔

پھر اس شان رحیمی کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے کہ اللہ نے انسان کو اس جہان میں اپنا خلیفہ بنا کر اس کی نگہداشت اور تربیت کا انتظام یوں کیا کہ اس کی ہدایت کیلئے مسلسل رسول بھیجے۔جب بھی انسان بھٹکا' اللہ نے اسے ہدایت سے نوازا اور بڑی محبت اور صبر کے ساتھ اسے دوبارہ راہ مستقیم پر ڈال دیا۔حالانکہ بعض اوقات انسان نے ان ڈرانے والوں اور نصیحت کرنے والے رسولوں کی آواز پر کان بھی نہ دھرا۔اللہ کے لئے اس کا ہلاک کر دینا مشکل نہ تھا لیکن اللہ کی صفت رحمت نے ہمیشہ اس کو مہلت دی اور ہمیشہ اللہ کے حلم نے انسان کو ڈھانپ لیا۔

پھر اللہ کی اس شان کریمی کا اظہار اس حقیقت سے بھی ہوتا ہے کہ جب ایک بندہ اپنی جہالت کی وجہ سے گناہ کرتا ہے اور پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دیتے ہیں اور یہ اس وجہ سے کہ اللہ نے اپنے اوپر رحمت کرنا لازم کر لیا ہے۔

اور یہ بھی اس کی شان کریمی کا ایک پہلو ہے کہ وہ برائی کی جگہ ایک ہی برائی شمار کرتا ہے۔ایک ہی برائی کی سزا دیتا ہے لیکن ایک نیکی کے بدلے وہ دس نیکیوں کا ثواب اور اجر عطا کرتا ہے اور اس کے بعد بھی وہ جس کے اعمال نامے میں جو چاہے اضافہ کر دے۔پھر مزید یہ کہ اللہ نیکی کے بدلے کو محو بھی کرتا جاتا ہے اور یہ سب اس کا کرم ہے۔پھر یہ کہ کوئی شخص محض اپنے اعمال کے بل بوتے پر جنت حاصل نہیں کر سکتا جب تک اس کا کرم شامل حال نہ ہو۔یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں بھی یہی کہا ہے کہ وہ بھی اللہ کے فضل سے جنت میں جائیں گے۔اگر اللہ کا فضل و کرم شامل حال نہ ہو تو انسان بہت ہی عاجز ہے۔

غرض اللہ کے رحم و کرم اور جود و سخا کے مواقع اور مظاہر کی تفصیلات دینے کے بجائے ہمارے لئے بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے قصور فہم کا اعلان کر دیں اور یہ کہہ دیں کہ ہمارے لئے اس کی شان کریمی کو پوری طرح سمجھنا ہی مشکل ہے اور ہمارے لئے یہی مناسب رویہ ہے۔اس لئے کہ اگر ہم ایسا نہ کریں اور یہ اعلان نہ کر دیں کہ ہم فیل ہو گئے تو ہم اس میدان میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔وہ لمحہ جس میں کسی بندے پر اللہ کی رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں' اسے اللہ تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔وہ معرفت کردگار سے سرشار ہوتا ہے' اسے سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔اس کے سایہ

عاطفت میں پناہ لیتا ہے۔ اس کی بارگاہ میں پناہ لیتا ہے' ایسا ایک مختصر لمحہ بھی اس قدر وسعت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی انسان کے لئے اس کا بیان کرنا اور اس کی وضاحت کرنا ممکن نہیں ہے' یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان اللہ کی شان کریمی کو پوری طرح بیان کر سکے۔

ذرا غور کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جوامع الکلم کے ذریعے' خوبصورت تمثیلات کے ذریعے کس طرح اللہ کی شان کریمی کو ہماری فہم اور ہماری عقل کے قریب کرنے کی سعی کی ہے: شیخین نے اپنی سندوں کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت فرمائی ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ نے مخلوقات کا فیصلہ کر دیا (امام مسلم نے کہا جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کر دیا) تو اللہ نے ایک ایسی کتاب میں جو ذات باری کے پاس عرش پر ہے لکھا کہ "میری رحمت میرے غضب سے پہلے ہو گئی۔" امام بخاری نے ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ دیئے ہیں "میری رحمت' میرے غضب پر غالب آگئی ہے۔"

شیخین نے اسی سند سے حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ رسول خدا ؐ نے فرمایا "اللہ نے رحمت کے سو حصے کئے ہیں جن میں سے ۹۹ اللہ نے اپنے ہاں روک لئے ہیں اور زمین پر اللہ نے صرف ایک حصہ اتارا ہے۔ اس ایک حصے کو استعمال کر کے مخلوقات ایک دوسرے کے ساتھ رحیمانہ سلوک کرتی ہیں۔" یہاں تک کہ ایک جانور اپنے کھروں کو اٹھاتا ہے مبادا کہ اس کا پاؤں اس کے بچے پر پڑ جائے۔"

امام مسلم نے اپنی سند کے ذریعے حضرت سلمان فارسی سے روایت فرمائی ہے۔ انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کے پاس سو رحمتیں ہیں' ان میں سے ایک رحمت کو استعمال کر کے مخلوق خدا باہم شفیقانہ سلوک کرتی ہے اور ۹۹ رحمتیں اللہ نے قیامت کے لئے محفوظ کی ہوئی ہیں۔"

انہی سے ایک دوسری روایت میں ہے "جس دن اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا تو اس نے سو رحمتیں پیدا کیں۔ اللہ کی ہر رحمت زمین و آسمان سے بڑی ہے۔ ان میں صرف ایک رحمت کو اللہ تعالیٰ نے زمین کے اوپر استعمال کے لئے دیا۔ اسی رحمت سے والدہ اپنے بچے پر شفقت کرتی ہے اور وحشی جانور اور پرندے ایک دوسرے پر رحمت کرتے ہیں۔ جب قیامت کا دن ہو گا تو اس کے باقی ۹۹ % کے ذریعے اللہ تعالیٰ اس رحمت کو مکمل کر دے گا۔"

حضور اکرم ؐ نے جس تمثیلی انداز میں رحمت کی مقدار کو بیان کیا ہے یہ محض تقریب الی الافہام کے لئے ہے۔ انسان جب زندہ جانوروں میں یہ دیکھتا ہے کہ مائیں اپنے بچوں کے ساتھ کس قدر رحمت و شفقت سے پیش آتی ہیں' لوگ بچوں پر کس قدر شفقت کرتے ہیں' اسی طرح بوڑھوں' ضعفاء' مریضوں' اقرباء' دوستوں اور اولاد پر' نیز پرندے اور وحشی جانور ایک دوسرے کے ساتھ' تو انسان ورطہ حیرت میں غرق ہو جاتا ہے۔ بعض مناظر تو ایسے ہوتے ہیں کہ انسان پر دہشت طاری ہو جاتی ہے اور اس کے بعد جب انسان یہ تصور کرتا ہے کہ اللہ کی شان کریمی کے سو حصوں میں سے یہ صرف ایک حصہ ہے تو انسان مزید حیران ہوتا ہے۔ یہ انداز تفہیم ایسا ہے کہ بات لوگوں کے ذہن کے قریب آجاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اپنے ساتھیوں کو اس عظیم رحمت کے بارے میں آگاہ کرتے رہتے تھے۔

حضرت عمر ابن خطاب ؓ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ جنگی قیدی عورتیں لائی گئیں۔ ان میں سے ایک عورت دوڑی پھرتی تھی' اس کے پستانوں سے دودھ بہہ رہا تھا۔ اسے گرفتار عورتوں کے کیمپ میں جو بچہ

بھی ملتا وہ اسے پکڑتی' اسے پیٹ سے لگاتی اور دودھ پلاتی۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا تم اس بات پر یقین کرو گے کہ یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں پھینک دے گی۔" ہم نے کہا خدا کی قسم اگر وہ ایسا نہ کرنے کی قدرت رکھتی ہو (یعنی مجبور نہ ہو) تو وہ ہرگز ایسا نہ کرے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جان لو کہ اس عورت کو اپنے بچے سے جس قدر محبت ہے' اللہ کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے زیادہ محبت ہے۔" (بخاری ۔ مسلم)

کس طرح نہ ہو گی؟ یہ عورت اپنے بچے کے ساتھ جو رحم اور شفقت رکھتی ہے تو یہ اس رحمت کی برکت ہے جو اللہ نے اپنی وسیع رحمت سے اہل زمین کو عطا کی ہے۔

حضور اکرم ؐ نے اپنے ساتھیوں کو اس قسم کی جو تعلیم دی تھی' یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے ایک قدم مزید آگے بڑھ کر اپنے ساتھیوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اس سلسلے میں اللہ کے اخلاق کو اپنائیں۔ آپس میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ رحمت اور مودت سے پیش آئیں۔ اس جہان کے تمام زندہ جانوروں کے ساتھ رحم کریں۔ ان کے دلوں کے اندر محبت اور شفقت کا ذوق پیدا ہو اور وہ اپنے تمام معاملات میں اس ذوق کو برتیں جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے معاملات میں اپنی مخلوقات کے ساتھ رحمت برتتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا یہ پہلو نہایت ہی زندہ اور تابندہ ہے۔ کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت عمرو ابن العاص ؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "رحم کرنے والوں پر اللہ کا رحم ہو گا۔ تم لوگ اہل زمین پر رحم کرو تم پر وہ رحم کرے گا جو آسمانوں میں ہے۔" (ابو داؤد' ترمذی)۔

ابن جریر ؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ اس شخص پر رحم نہیں فرماتے جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔" (بخاری' مسلم اور ترمذی)

ابو داؤد اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرۃ ؓ سے ایک روایت میں یہ کہا ہے حضور ؐ نے فرمایا "رحمت صرف اس شخص سے چھین لی جاتی ہے جو شقی القلب ہو۔"

اور اسی طرح حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن ابن علی کو بوسہ دیا اور اس وقت آپ کے پاس اقرع ابن حابس بیٹھے ہوئے تھے۔ اقرع نے کہا میرے تو دس بیٹے ہیں میں نے کبھی ان میں سے ایک کو بھی بوسہ نہیں دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا: "جس نے شفقت نہ کی اس پر شفقت نہ ہو گی۔" (مسلم و بخاری)

حضور اکرم ؐ نے اپنے ساتھیوں کو صرف یہ تعلیم نہ دی تھی کہ وہ فقط انسانوں کے ساتھ مشفقانہ سلوک رکھیں' اس لئے کہ آپ کو علم تھا کہ اللہ کی رحمت بہت ہی وسیع ہے اور مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اندر خدائی اخلاق پیدا کریں۔ انسان اس وقت تک مکمل انسان نہیں بن سکتا جب تک وہ تمام مخلوقات کے ساتھ رحمت کا برتاؤ نہ کرے۔ اس سلسلے میں آپ کی تعلیمات نہایت ہی مؤثر تھیں جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یوں ہوا کہ ایک شخص کسی سفر کے دوران کسی راستے پر جا رہا تھا کہ اسے شدید پیاس لگ گئی۔ اسے ایک کنواں ملا۔ وہ اس میں اترا اور پانی پیا اور باہر نکل آیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک کتا پیاس کی وجہ سے ہانپ رہا ہے اور پیاس کی شدت کی وجہ سے مٹی کھا رہا

ہے۔ اس شخص نے کہا' اس کا حال بھی پیاس نے ایسا کر دیا جس طرح میرا کر دیا تھا۔ وہ کنویں میں اترا' اپنے جوتے کو پانی سے بھرا اور اسے اپنے منہ میں پکڑا یہاں تک کہ نکل آیا۔ اس نے کتے کو پانی پلایا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اس کا اجر دیا اور اس کی مغفرت فرما دی۔" اس پر صحابہ کرام نے کہا : رسول اللہ کیا ہمارے لئے بہائم میں بھی اجر ہے؟ تو آپ ؐ نے فرمایا ہر تر کلیجے والی چیز کی ساتھ رحم پر اجر ہے۔" (بخاری' مسلم' موطاء)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک بدکار عورت نے ایک بار دیکھا کہ شدید گرمی میں ایک کتا ایک کنویں کے ارد گرد چکر لگا رہا ہے۔ اس نے پیاس کی وجہ سے زبان نکالی ہوئی ہے۔ اس نے اس کے لئے اپنے جوتے کو ڈول بنا کر اور دوپٹے کو رسی بنا کر پانی نکال کر پلایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی۔"

حضرت عبدالرحمٰن ابن عبداللہ ؓ نے اپنے باپ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ ہم نے ایک (حُمَّرہ) (پرندہ) کو دیکھا جس کے ساتھ اس کے دو بچے تھے۔ ہم نے اس کے بچے پکڑ لئے۔ (حُمَّرہ) آئی اور وہ زمین پر بچھی جا رہی تھی (یعنی پر ڈھیلے کر کے پھیلا کر زمین کے قریب ہو رہی تھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ نے فرمایا: "کس نے اسے اس کے بچوں کی وجہ سے تکلیف دی۔ اس کے بچوں کو لوٹا کر اسے دے دو۔" حضور ؐ نے دیکھا کہ ہم نے چیونٹیوں کے گھر کو جلا دیا تھا تو آپ ؐ نے پوچھا یہ کس نے جلایا ہے؟ ہم نے کہا یہ تو ہم نے جلایا ہے تو آپ ؐ نے فرمایا کہ آگ کے ساتھ صرف آگ کا مالک سزا دے سکتا ہے۔ (ابو داؤد)

حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے۔ حضور ؐ نے فرمایا کسی نبی کو چیونٹی نے کاٹا۔ آپ نے حکم دیا کہ ان کے گھر کو جلایا جائے اللہ تعالیٰ نے اس پر وحی بھیجی "اگر آپ کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا تو کیا آپ اس کی پوری نوع کو جلا ڈالیں گے جو تسبیح کرتی ہے۔ (مسلم بخاری)

یوں حضور ؐ نے اپنے ساتھیوں کو قرآن کریم کی اس تعلیم کے مطابق تربیت دی کہ وہ اللہ کی رحمت کا مزہ اس طرح چکھیں کہ اسے لوگوں کے ساتھ برتیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مخلوقات ایک دوسرے کے ساتھ جو رحم اور شفقت کرتی ہے وہ اللہ کی بے بہا اور بے شمار رحمتوں میں سے ایک رحمت ہے۔

اب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایک مسلمان کے تصور حیات کے اندر رحمت کی حقیقت بیٹھ جانے سے اس کے احساسات' اس کی زندگی اور اس کے اخلاق پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور انہیں کسی صورت میں بھی مٹایا نہیں جا سکتا۔ مذکور بالا تعلیم کے جو اثرات ایک مسلم کی زندگی پر پڑتے ہیں' یہاں ہم ظلال القرآن کے مختصر اسلوب کے مطابق اس کی طرف بھی کچھ اشارہ کئے دیتے ہیں۔

اس حقیقت کے شعور کے نتیجے میں' دل مومن اطمینان کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے اور وہ اپنے رب کی جانب سے پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب کہ وہ مشکلات اور شدید لمحات سے گزر رہا ہو کیونکہ مصائب و شدائد میں انسان کے قلب و نظر دھوکہ کھا سکتے ہیں۔ اس طرح مشکلات میں گھرا ہوا مومن ہر وقت رحمت خداوندی کا امیدوار ہوتے ہوئے یہ یقین رکھتا ہے کہ کسی بھی لمحہ حالات میں تبدیلی آ سکتی ہے اور ہر صورت حال کے بعد نئی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔ اللہ اپنے بندوں کو مشکلات میں مبتلا کر کے چھوڑ نہیں دیتا' یا اسے اپنی رحمت سے محروم

نہیں کر دیتا۔اس لئے کہ جو شخص بھی رحمت خداوندی کا طلبگار ہو گا اسے اللہ محروم نہ کرے گا۔لوگ تو خود اپنے آپ کو رحمت خداوندی سے محروم کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی ناشکری کرتے ہیں' رحمت کے سایہ میں آنے سے انکار کرتے ہیں اور اس سے دور بھاگتے ہیں۔پھر اللہ کی رحمت کی امیدواری پر پختہ اطمینان کے نتیجے میں انسان کے اندر صبر و ثبات پیدا ہوتا ہے' امید کی کرن روشن ہوتی ہے' وہ اطمینان اور آرام محسوس کرتا ہے'کیونکہ وہ بارگاہ رحمت و محبت میں ہوتا ہے' جس کا سایہ گھنا ہوتا ہے جب تک وہ خود اپنے آپ کو اس سے دور نہ کرلے۔

جب ایک مسلم یہ شعور پاتا ہے تو اس کے احساسات میں باری تعالیٰ کی نسبت سے ایک حیا پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ مغفرت کی امیدواری اور رحمت باری کی خواہش کے باوجود کوئی شخص یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ اللہ کی نافرمانی کرے۔ بعض لوگوں کا یہ وہم درست نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کا کوئی امیدوار ہوتا ہے تو وہ پھر نافرمانی کرتا ہے حالانکہ اس امید کے نتیجے میں اللہ غفور و رحیم کی نافرمانی کرنے سے شرم آتی ہے۔جن لوگوں کے اندر رحمت خداوندی اور مغفرت خداوندی کے نتیجے میں مزید معصیت کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے انہوں نے درحقیقت ایمان کی حقیقی مٹھاس کو پایا ہی نہیں ہے۔اس لئے نہ یہ بات میری سمجھ میں آتی ہے اور نہ میں اسے تسلیم کرتا ہوں جو بعض صوفی کہتے ہیں کہ وہ گناہوں کا ارتکاب اس لئے کرتے ہیں تاکہ وہ اللہ کے صبر اور حلم کا مزہ چکھیں یا اس کی مغفرت اور رحمت سے فائدہ اٹھائیں۔یہ سلیم الفطرت لوگوں کی سوچ نہیں ہے' رحمت الٰہیہ کے لئے یہ ایک منفی ردعمل ہے۔

اس حقیقت کو اس انداز میں پالینے کے بعد ایک مسلم کے ذہن میں بہت ہی اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔وہ جانتا ہے کہ اسے اپنے اندر خدائی اخلاق پیدا کرنے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس پر ہر طرف سے اللہ کی رحمتوں کی بارش ہو رہی ہے اس کے باوجود کہ وہ پر از تقصیرات ہے اور اس سے گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں۔اس طرح وہ خود بھی رحم اور شفقت کے انداز سیکھ لیتا ہے' وہ معاف کرنا جانتا ہے۔وہ گناہوں اور غلطیوں سے درگزر کرتا ہے اور یہ بات ہمیں ان تعلیمات میں صاف صاف نظر آتی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو دیں اور یہ تعلیم آپ نے بذریعہ "تخلق باخلاق اللہ" دی۔اللہ کی رحمت کے مقامات میں سے ایک مقام یہ ہے کہ اللہ نے اپنے اوپر یہ لکھ دیا ہے کہ وہ تمام انسانوں کو ایک دن میدان حشر میں اٹھائے گا۔یہ آیت اس کا بھی فیصلہ کرتی ہے :

(قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلْ لِّلّٰهِ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ (٦: ١٢)) ان سے پوچھو' آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے' وہ کس کا ہے؟........ کہو سب کچھ اللہ ہی کا ہے' اس نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے (اسی لئے وہ نافرمانیوں اور سرکشیوں پر تمہیں جلدی سے نہیں پکڑ لیتا) قیامت کے روز وہ تم سب کو ضرور جمع کرے گا' یہ بالکل ایک غیر مشتبہ حقیقت ہے۔

اللہ کی اس تحریری رحمت کے دعوے میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ ایک دن انہیں دوبارہ جمع کرے گا اور یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔اور اس جمع کے بعد اللہ کی عنایات کا دور ہو گا اور یہ عنایات اللہ کی ان لوگوں پر ہونگی جو اس کی بندگی کریں گے۔ اس لئے کہ اللہ نے انہیں پیدا ہی اس لئے کیا تھا کہ وہ اپنی پوری زندگی میں اللہ کی بندگی کی راہ اپنائیں۔انہیں اس زمین پر منصب خلافت صرف اسی مقصد کے لئے دیا گیا تھا۔انہیں بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا اور نہ وہ یونہی چھوڑ دیئے

گئے - ایک دن ایسا آنے والا ہے جس میں یہ سب لوگ جمع ہوں گے - یہ وہ آخری ٹھکانا ہے جس کی طرح یہ لوگ اس طرح لوٹیں گے جس طرح ایک سواری اور قافلہ اپنی منزل مقصود کی طرف مسلسل بڑھتا ہے - وہاں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جزاء دے گا جنہوں نے اللہ کی طرف جانے کی صحیح راہ اختیار کی اور زندگی کے اس طویل سفر میں تکلیفات اٹھائیں - دنیا میں انہوں نے جو اچھے اعمال کئے اور اب وہاں انہیں اس کا اجر ملے گا تاکہ ان کی مشقتیں اور تکالیف ضائع نہ جائیں بلکہ یوم آخرت میں انہیں ان کا اجر پورا پورا دیا جائے گا - یوں اللہ کی رحمتوں کے مظاہر میں سے ایک مظہر کا اظہار ہو گا - قیامت میں اللہ کا جو فضل ہو گا کہ برائی کا بدلہ صرف برائی جیسا ہو گا جبکہ نیکی کے بدلے دس گناہ اجر ہو گا بلکہ اللہ چاہے تو اضعاف مضاعفہ ہو گا تو یہ بھی اللہ کی رحمت اور شفقت کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہو گا -

اللہ نے عربوں پر دین اسلام کے ذریعے جو فضل و کرم کیا اور انہیں اس دین کے ذریعے جو باعزت مقام دیا وہ ان پر اللہ کا احسان عظیم ہے - اس سے قبل عرب قیام قیامت کا انکار کرتے تھے - وہ بعینہٖ اسی طرح کے تصورات رکھتے تھے جس طرح دور جدید کی مہذب جاہلیت کے افکار ہیں' یعنی سائنسی جاہلیت - یہی وجہ ہے کہ قیام قیامت کا ذکر اس قدر تاکیدی الفاظ میں کیا گیا اور اس تکذیب کے مقابلے میں اس قدر حروف تاکید لائے گئے -

(لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ (۶:۱۲)) تمہیں قیامت کے دن اٹھایا اور جمع کیا جائے گا جس میں کوئی شک نہیں ہے -"

قیامت کے دن خسارہ صرف ان لوگوں کو ہو گا' جو اس دنیا میں ایمان سے محروم رہیں گے - اہل ایمان کو کوئی خسارہ نہ ہو گا - جبکہ اہل کفر کو پورا پورا خسارہ ہو گا - اس لئے کہ انہوں نے اپنی ذات ہی کو ہار دیا تو وہ کمائیں گے کیا - انسان تو اپنی جان اور اپنے نفس کے لئے کماتا ہے - اگر اس کا نفس اور اس کی زبان ہی چلی جائے تو وہ کمائی کس کے لئے کرے گا - کس کے لئے کمائے گا - (اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۶:۱۲)) مگر جن لوگوں نے اپنے آپ کو خود تباہی کے خطرے میں مبتلا کر دیا ہے وہ اسے نہیں مانتے -"

انہوں نے اپنی ذات ہی کو خسارے میں ہار دیا - ان کی ذات اور شخصیت ہی چلی گئی' چونکہ ان کے پاس کوئی شخصیت ہی نہ رہی لہٰذا ایمان کون لائے - اہل کفر کی حالت کی یہ نہایت ہی لطیف اور حقیقت پسندانہ تعبیر ہے - اس تعبیر کے اندر ایک نہایت ہی گہری فطری پکار ہے کہ ایمان لاؤ - ایمان کی برکات میں سے ایک بڑی برکت یہ ہے کہ وہ تمہیں ایک ذات اور شخصیت عطا کرتا ہے - یہ لوگ جو ایمان سے قبل اپنی شخصیت گم کر بیٹھے تھے' ان کی فطرت مسخ ہو چکی تھی - ان کی وہ صلاحیتیں جو حق کو قبول کرتی ہیں' ختم ہو گئی تھیں یا معطل ہو گئی تھیں' یا ان پر پردے پڑ گئے تھے اس لئے وہ قبولیت حق کی صلاحیت کھو کر اپنی شخصیت اور شناخت گم کر گئے تھے - یہی وجہ ہے کہ وہ ایمان نہ لائے تھے اس لئے کہ ان کے پاس ان کی ذات اور شخصیت ہی نہ رہی تھی - یہ ان کے عدم اطمینان اور کفر کی ایک نہایت ہی لطیف اور گہری تعبیر ہے - حالانکہ دلائل ایمان موجود تھے اور ایسے اشارات موجود تھے کہ جن کی وجہ سے انسان حق کو قبول کرتا ہے اس امر نے ان کے معاملے میں فیصلہ کن حیثیت اختیار کی - یوں گویا وہ اپنی شخصیت سے ہاتھ دھو کر ایک عظیم خسارے سے دوچار ہوئے -

اب اگلی آیت میں بتایا جاتا ہے کہ لیل و نہار میں جو لوگ اور جو مخلوق ہے یعنی زمان میں' وہ بھی اسی کی ملکیت ہے -

جس طرح پہلی آیات میں بتایا گیا تھا کہ جہاں اور جس جگہ بھی جو متنفس ہے' وہ اللہ کا مملوک ہے - یوں یہ ملکیت زمان و مکان دونوں پر مشتمل ہو گئی - اللہ کا علم تمام مخلوقات کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔

(وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۶:۱۳)) رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں جو کچھ ٹھہرا ہوا ہے' سب اللہ کا ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

(مَا سَكَنَ) کی زیادہ قریب الفہم تفسیر یہ ہے کہ یہ لفظ سکنیہ سے ہے' جیسا کہ زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے یعنی وہ تمام اشیاء جو لیل و نہار میں پناہ لیتی ہیں یعنی تمام مخلوقات - یہ سب مخلوق اللہ کی ملکیت میں ہے - اس سے پہلی آیت میں بھی یہ قرار دیا گیا - (قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلْ لِّلّٰهِ (۶: ۱۲)) اس آیت میں تمام مخلوقات کی حصر بلحاظ مکان تھی اب اس آیت میں (وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ (۶: ۱۳) آیا ہے جس میں حصر بلحاظ زمان ہے - قرآن کریم کا یہ معروف انداز بیان ہے - ان آیات کی تفسیر میں بہت کچھ لکھا گیا ہے - میرے خیال میں یہ تاویل سب سے بہتر ہے کہ ایک آیت میں حصر زمانی اور دوسری میں حصر مکانی ہے۔

اس کے بعد ایک تبصرہ یہ آتا ہے کہ اللہ سمیع و علیم ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کے اعتبار سے بھی اللہ تمام مخلوقات کا احاطہ کئے ہوئے ہے - اس آیت کے جواب میں مشرکین جو بھی کہتے ہیں وہ اللہ کے علم میں ہے یعنی وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ اللہ وحدہ ہی مالک ہے' اس کے باوجود وہ بعض مویشیوں' ان کے بچوں اور بعض پھلوں کو شرکاء کے لئے مخصوص کرتے تھے - اس سورہ کے آخر میں یہ بحث آ رہی ہے - یہاں اللہ تعالیٰ انسانوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ تمام مخلوقات پر اللہ کا حق ملکیت تسلیم کریں تاکہ بعد میں انہیں یہ سمجھایا جائے کہ اللہ کی مخلوقات میں سے بعض چیزیں تم شرکاء کے کھاتے میں کس کی اجازت سے ڈالتے ہو - جبکہ اسی فقرے میں آنے والی یہ بات بھی اس سے ثابت کرنا مطلوب ہے کہ جب مالک وہ ہے تو ولی اور حاکم بھی وہی ہے - اور وہ اس لئے حاکم ہے کہ وہی مالک ہے ہر اس چیز کا جو زمان و مکان کے اندر ہے اور جو اللہ کے علم کے اندر ہے۔

---ooo---

اب جبکہ یہ بات تسلیم ہو گئی کہ وہی خالق ہے اور وہی مالک ہے تو ان لوگوں پر سخت نکیر و تنقید کی جاتی ہے جو اللہ کے سوا کسی اور سے امداد طلب کرتے ہیں - جو اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرتے ہیں اور کسی اور کو ولی اور حاکم بناتے ہیں - چنانچہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ صورت حال اسلام سے متضاد ہے - یہ صریح شرک ہے اور اسلام کے ساتھ اس کا یکجا جمع ہونا ممکن نہیں ہے - یہاں اللہ کی صفات میں سے اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے فاطر السموت والارض' رازق و مطعم' نافع و ضار اور قاہر و قادر کے الفاظ لائے جاتے ہیں' جبکہ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ خوفناک سزا بھی دیتا ہے - اس سے فضا پر ایک دم جلال باری تعالیٰ کے سائے پڑ جاتے ہیں اور یہ انسان ڈر جاتا ہے اور یہ نہایت ہی زوردار انداز میں کہا جاتا ہے :

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ
يُطْعِمُ وَ لَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَ لَا
تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ
يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ
الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ؕ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ
بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾ وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ
الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۸﴾

"کہو اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنالوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا خالق ہے اور جو روزی دیتا ہے۔ روزی لیتا نہیں ہے؟ کہو مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سر تسلیم خم کروں اور (تاکید کی گئی ہے کہ کوئی شرک کرتا ہے تو کرے) تو بہرحال مشرکوں میں شامل نہ ہو۔ کہو 'اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے (خوفناک) دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی۔ اس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے۔ اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے' اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنے بندوں پر کامل اختیارات رکھتا ہے اور دانا اور باخبر ہے۔"

یہ مسئلہ کہ اللہ وحدہ ولی ہے لفظ ولی کے تمام معنوں میں ہے۔ یعنی وہ وحدہ رب ہے۔ وہ وحدہ معبود ہے۔ تمام لوگ اسی کی بندگی کرتے ہیں اور تمام اس کے اقتدار اعلیٰ کے تابع ہیں۔ وہ عبادت بھی اس کی کرتے ہیں اور عبادت کے مراسم بھی اس کے سامنے ادا کرتے ہیں۔ صرف اسی کو ناصر اور مددگار سمجھتے ہیں' اسی پر اعتماد کرتے ہیں' مصائب میں اسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ اسلام کا اساسی عقیدہ ہے۔ انسان اگر صرف اللہ کو اپنا ولی سمجھے گا' ان تمام مفہومات کے ساتھ تو پھر وہ مسلمان ہو گا اور اگر اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی ولی بنائے گا تو پھر وہ مشرک ہو گا۔ شرک اور اللہ وحدہ کی ولایت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

اس آیت میں اس حقیقت کو نہایت ہی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ ذرا دوبارہ غور کریں۔

(قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ قُلْ اِنِّيْ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۶ : ۱۴)) "کہو اللہ کو چھوڑ کر

کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنالوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا خالق ہے اور جو روزی دیتا ہے۔ روزی لیتا نہیں ہے؟ کہو، مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سرتسلیم خم کروں (اور تاکید کی گئی ہے کہ کوئی شرک کرتا ہے تو کرے) تو بہرحال مشرکوں میں شامل نہ ہو۔"

یہ ایک نہایت ہی گہری، فطری اور منطقی سوچ ہے۔ کون ولی ہو گا اور ولایت کس کے لئے خالص ہو گی؟ اگر ہم زمین و آسمانوں کے بنانے والے اور ان کو وجود میں لانے والے کو اپنا ولی نہ بنائیں گے تو پھر کس کو بنائیں گے۔ زمین و آسمان میں رہنے والی تمام مخلوقات کو رزق دینے والا ولی نہ ہو گا تو اور کون ہو گا۔ جو تمام مخلوقات کو رزق دیتا ہے اور خود کسی کا محتاج نہیں ہے۔

کہو کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو ولی بنالوں، جبکہ اللہ کی ذات ان صفات کی مالک ہے جن کا ذکر ہوا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیا دلیل اور منطق ہے، جس کی وجہ سے کوئی انسان مجبور ہو کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کو ولی بنائے۔ انسان کسی کو ولی اور سرپرست اس لئے بناتا ہے کہ وہ اس کی مدد کرتا ہے۔ اللہ جب زمین و آسمانوں کا بنانے والا ہے وہ زمین و آسمان دونوں پر صاحب اقتدار ہے، اگر ولایت اور سرپرستی کا مقصد یہ ہے کہ سرپرست رزق اور طعام دے تو ذات باری تو تمام جہان والوں کی رازق اور مطعم ہے، خواہ زمین میں ہوں یا آسمانوں میں۔ اب اللہ کے سوا کسی اور کو ولی اور سرپرست بنانے کا فائدہ کیا ہو گا؟

پھر یہ کہ "کہو، مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سرتسلیم خم کروں اور مجھے تاکید کی گئی ہے کہ تو بہرحال مشرکین میں شامل نہ ہو۔" معلوم ہوا کہ سرتسلیم خم کرنے اور شرک سے باز رہنے کے لازمی معنی یہ ہیں کہ اللہ کے سوا کسی اور کو سرپرست نہ بنایا جائے۔ دوسرے زاویے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو سرپرست بنانے کا مقصد یہ ہے کہ گویا ہم شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں اور شرک ہرگز اسلام نہیں ہو سکتا۔

یہ ایک واضح اور متعین مسئلہ ہے۔ اس کے بارے میں کوئی دو رنگی اور نرمی نہیں ہو سکتی۔ اس معاملے میں ہم صرف دو موقف اختیار کر سکتے ہیں یا تو اللہ کو وحدہ لاشریک سمجھیں گے، صرف اسی کی طرف متوجہ ہوں گے، اسی کی اطاعت کریں گے، اسی سے ڈریں گے، خشوع و خضوع کے ساتھ اسی کی عبادت کریں گے، صرف اسی سے امداد طلب کریں گے، صرف اسی کو اپنا حاکم اور مقتدر اعلیٰ اور قانون ساز سمجھیں گے۔ اپنی زندگی کے پورے امور میں اس کی اطاعت کریں گے، اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کریں گے، اپنے دل اور اپنے عمل میں، اپنے قانون اور طرز عمل میں اسی کو اپنا ولی اور سرپرست سمجھیں گے اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کریں گے تو ہمارا یہ رویہ عین اسلام ہو گا یا پھر ہم اس کے بندوں میں سے کسی کو ان معاملات میں اس کے ساتھ شریک کریں گے تو یہ رویہ مشرکانہ ہو گا اور شرک وہ بیماری اور وہ حقیقت ہے جو اسلام کے ساتھ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی۔

اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ مشرکین کے سامنے اپنی اس ناپسندیدگی کا اظہار برملا کر دیں کیونکہ وہ آپ کو اس بات پر آمادہ کر رہے تھے کہ آپ ان کے ساتھ اس نظریاتی مسئلے میں نرمی اور مداہنت کریں اور ان کے الہوں کو بھی اپنے اس جدید دین میں کوئی نہ کوئی حیثیت دے دیں۔ اس کے بدلے میں وہ اس دین میں داخل ہو جائیں گے۔ یوں کہ آپ ان کے الہوں کو الوہیت کے بعض خصائص عطا کر دیں تاکہ مشرکین کی حیثیت اور مرتبہ اور ان

کے مفادات اپنی جگہ پر قائم رہیں۔ وہ سب سے پہلے اور سرفہرست یہ چاہتے تھے کہ ان کے الٰہوں کو حرام کرنے اور حلال کرنے کا حق دیا جائے اور اس کے عوض وہ حضورؐ کی مخالفت ترک کر دیں گے، آپ کو رئیس مکہ بھی تسلیم کریں گے، آپ کو مالی واجبات بھی ادا کریں گے اور اپنی خوبصورت ترین لڑکیاں بھی آپ کے نکاح میں دے دیں گے۔

مشرکین مکہ ایک طرف تو آپؐ کو اذیت دیتے تھے، مسلمانوں پر مظالم ڈھاتے تھے اور دوسری جانب نرمی اور مصالحت کا ہاتھ بڑھا کر آپ کو پھسلانا بھی چاہتے تھے۔ ان کی اس پالیسی کی وجہ ہی سے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپؐ ان کے سامنے ان باتوں سے اپنی شدید ترین نفرت کا اظہار کریں اور فیصلہ کن انداز میں اور دو ٹوک الفاظ میں اعلان کر دیں کہ آپ اس نظریاتی معاملے میں کوئی نرمی نہیں کر سکتے۔

(قُلْ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (١٥) مَنْ يُصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ (١٦) (٦: ١٥، ١٦)) "کہو، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے خوفناک دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی۔ اس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے۔"

آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس معاملے کی اہمیت اور سنجیدگی کا اعلان کر دیں اور یہ کہہ دیں کہ اگر وہ سرمو انحراف بھی کریں تو خود ان پر عذاب الٰہی نازل ہو سکتا ہے۔ خصوصاً اسلام اور توحید کے معاملے میں اس طرح خود اہل شرک کے دلوں میں خوف اور رعب پیدا ہو گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے احکام کے بارے میں جس قدر حساس تھے یہ اس کی بہترین تصویر کشی ہے۔ نظر آتا ہے کہ حضورؐ عذاب الٰہی سے بہت ہی ڈرتے تھے۔ اللہ کا عذاب اس قدر خوفناک ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی سے ٹل جائے تو اس کا محض ٹلنا ہی فوز عظیم تصور ہوتا ہے۔ اس تصویری احساس کے علاوہ اس میں اہل شرک کے لئے دلوں کو ہلا دینے والی ایک تنبیہ بھی ہے۔ اس دور کے مشرکین کے لئے بھی اور بعد کے ادوار کے مشرکین کے لئے بھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا عذاب کس قدر ہولناک ہو گا۔ یہ عذاب اپنے شکار کو بسہولت تلاش کرے گا۔ اسے گھیر لے گا اور اس کو جھپٹ کر اپنے قبضے میں لے لے گا۔ صرف قادر مطلق ہی اسے بچا سکتا ہے۔ چونکہ عذاب الٰہی کی باگیں اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہیں، اسے صرف وہی پھیر سکتا ہے۔ انسان جب اس تصویر کشی پر غور کرتا ہے تو اس کی سانس رکنے لگتی ہے۔ یہ آخری گھڑی کس قدر ہوش ربا ہے۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی میں طریقہ قرآن)۔

سوال یہ ہے کہ کوئی شخص غیر اللہ کو ولی اور سرپرست کیوں بنائے؟ اپنے آپ کو اس شرک میں مبتلا کیوں کرے اور اس کے نتیجے میں اپنے آپ کو کیوں اس قدر ہولناک عذاب میں مبتلا کرے؟ کیا وہ اپنے آپ کو کوئی نفع پہنچانے کے لئے ایسا کرے، یا کسی دنیاوی مضرت سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ایسا کرے۔ یا اس لئے کرے کہ مشکلات میں لوگ امداد کریں یا بدحالی میں کوئی نفع دیں۔ حالانکہ نفع و نقصان تو صرف اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ عالم اسباب میں وہ اللہ کی ذات ہی ہے جو قدرتوں والی ہے۔ تمام انسان اس کے قبضہ قدرت اور کنٹرول میں ہیں۔ عطا کرنے اور روکنے میں صرف اس کی حکیمانہ پالیسی ہی کارفرما ہوتی ہے۔

(وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۷) وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ (۱۸)) (۶: ۱۷، ۱۸) "اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنے بندوں پر کامل اختیارات رکھتا ہے اور دانا اور باخبر ہے۔"

وہ نفس انسانی کے ہر خیال اور اس کے سینے کے ہر وسوسے کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ دلی خواہشات اور اندرونی اندیشوں سے بھی باخبر ہے۔ وہ شکوک و شبہات کی تمام شکلوں کو جانتا ہے اور ان تمام باتوں کو نظریاتی روشنی سے حل کرتا ہے۔ برہان و دلیل سے انسانی تصور کو واضح کرتا ہے اور اپنی خدائی کی صحیح معرفت عطا کرتا ہے۔ چونکہ یہ ایک اہم مسئلہ ہے اس لئے قرآن کریم دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔

اب یہ لہر اپنے عروج پر ہے اور اس سے نہایت ہی گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ بات شہادت، ثبوت اور سرزنش تک آ پہنچتی ہے۔ اب جدائی اور براءت کا اعلان کر دیا جاتا ہے کہ بس ہم تمہارے ساتھ شرکیہ امور میں شریک نہیں ہو سکتے۔ نہایت ہی بلند آواز میں اور نہایت ہی رعب دار اور فیصلہ کن اعلان میں :

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۭ قُلِ اللّٰهُ ڐ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۣ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۭ اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰي ۭ قُلْ لَّآ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ؑ۹

"ان سے پوچھو، کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے؟..... کہو میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے، اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے، سب کو متنبہ کر دوں۔ کیا واقعی تم لوگ یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں؟ کہو، میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں دے سکتا۔ کہو، خدا تو وہی ایک ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔"

بات کا جگہ جگہ رکنا، اور پھر مؤثر آغاز اور ایک ہی آیت میں یہ زیر و بم ایک عجیب انداز کلام ہے۔ ایک لفظ میں ایک موقف بیان ہو جاتا ہے، ایک ایک لفظ ایک منظر کو پیش کرتا ہے جس سے شبہات و خلجانات اور ان کی نوعیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

بذات خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا جاتا ہے اور احکام دیئے جاتے ہیں۔ پھر حضور ؐ ان احکامات کے تحت ان مشرکین سے مخاطب ہوتے ہیں جنہوں نے اللہ کے سوا اور لوگوں کو اپنا سرپرست بنا رکھا ہے۔ وہ اللہ کے مخصوص حقوق میں بعض حقوق غیر اللہ کو دیتے ہیں اور ان سرپرستوں کو اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ پھر یہ لوگ حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ آپ ؐ ان کو ان کی اس حالت پر برقرار رکھیں تاکہ وہ اس کے بدلے حضور ؐ کے دین میں شریک ہو جائیں ۔ ان کے خیال میں ایسا ممکن تھا ۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اسلام اور شرک ایک ہی دل میں جمع ہو سکتے ہیں ۔ انہوں نے اس سلسلے میں ایک سوچ دل میں بٹھالی تھی ۔ آج کے دور جدید میں بھی لوگوں کے دلوں میں اس قسم کی سوچ بیٹھی ہوئی ہے ۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ کے حوالے سے مسلمان بھی ہو سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے معاملات میں غیراللہ سے ہدایات بھی لے سکتے ہیں ۔ وہ غیراللہ کے مطیع فرمان بھی ہو سکتے ہیں اور غیراللہ سے غیبی امداد بھی لے سکتے ہیں اور غیراللہ کو ولی اور سرپرست بھی بنا سکتے ہیں ۔

حضور اب یہاں مشرکین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ یہاں آکر آپ ؐ کے دین اور ان کے ادیان کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں ۔ آپ کی توحید اور ان کا شرک اب اکٹھے نہیں رہ سکتے ۔ آپ ؐ کا اسلام اور ان کی جاہلیت ایک جگہ زندہ نہیں رہ سکتے ۔ اب آپ ان کے ساتھ فیصلہ کر دیتے ہیں :" اب میرے اور تمہارے درمیان اتحاد و اتصال ممکن نہیں ہے ۔ اتحاد صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ تم لوگ اپنا دین چھوڑ کر میرے دین میں شامل ہو جاؤ ورنہ ۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ اتحاد ہو سکے کیونکہ آغاز ہی سے دونوں کی راہیں جدا ہو چکی ہیں ۔"

حضور ؐ ان کے ساتھ یوں ہمکلام ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ کون سی سند اور شہادت ہے ؟ ذرا لائیں میدان میں کوئی شہادت اور کوئی ثبوت اپنے موقف پر ۔

(قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً (٦ : ١٩)) ان سے پوچھو ' کس چیز کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے ۔"

اس پوری کائنات میں سب سے بڑی شہادت کیا ہے ؟ وہ کون سی شہادت ہے جسے درجہ تصدیق حاصل ہے ؟ مقدمے میں کون سا ثبوت فائنل ہے جس کے بعد کسی ثبوت کی ضرورت نہ ہو ؟

یہ نہایت ہی عمومی سوال ہے ۔ شَیْءٍ کے لفظ سے سوال کیا گیا ہے یعنی پوری کائنات کی کوئی شے ثبوت میں لاؤ ۔ جو سب سے بڑی شہادت ہو ۔

حضور ؐ کو جس طرح حکم دیا جاتا ہے کہ ان سے پوچھو ' اسی طرح آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان کو جواب بھی دے دو ۔ اس لئے کہ خود مخالفین اس بات کے معترف تھے کہ دراصل جواب وہی ہے جو حضور ؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ یہ جواب دے دیں ۔ (قُلِ اللّٰهُ (٦ : ١٩)) "کہو اللہ" ہاں! اللہ بے شک سب سے بڑا گواہ ہے ۔ وہی تو ہے جو اس سچائی کو بیان کر رہا ہے ۔ وہی تو ہے جو سب سے بھلے فیصلے کرتا ہے اور اس کی گواہی کے بعد کوئی گواہی نہیں ہے ۔ اس کی بات کے بعد کسی بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ جب اللہ بات کر دے تو تمام باتیں ختم ہو جاتی ہیں اور معاملے کا فیصلہ ہو جاتا ہے ۔

جب اس حقیقت کا اعلان کر دیا گیا کہ اللہ کی شہادت سب سے برتر شہادت ہے تو اب اس بات کا اعلان کیا جاتا ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان بس اللہ گواہ ہے اور اللہ ہی اس مسئلے کا فیصلہ کرے گا ۔

(شَهِیْدٌ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ (٦ : ١٩)) "میرے اور تمہارے درمیان وہ گواہ ہے ۔" مطلب یہ ہوا (هُوَ شَهِیْدٌ) ۔ میرے اور تمہارے درمیان وہ گواہ ہے ۔ اس مقام پر لفظ اللہ کے بعد وقف مناسب ہے ۔ کیونکہ یہاں مختصر مختصر فقروں میں بات ہو رہی ہے ۔ یعنی لفظ اللہ کے بعد وقف وصل کے مقابلے میں زیادہ مناسب ہے ۔ اگر وصل ہو تو اللہ

(شَهِيدٌ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ (۶: ۱۹)) ہو گا۔

جب یہ اصول متعین ہو گیا کہ اس معاملے میں فیصلہ صرف اللہ کا فیصلہ ہے تو یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کی شہادت قرآن کی شکل میں آگئی ہے۔ اللہ نے یہ قرآن کریم محض اس لئے نازل کیا ہے کہ میں تمہیں اور ان تمام دوسرے لوگوں کو ڈراؤں جن تک وہ پہنچے۔ آپ کی زندگی میں یا آپ کی وفات کے بعد۔ لہذا قرآن کریم ان لوگوں پر بھی حجت ہو گا جن تک حضور ﷺ کی موجودگی میں پہنچا یا آپ ﷺ کے بعد جن تک پہنچا۔ اس لئے کہ انسانی سوچ کے اس اساسی مسئلے میں قرآن ہی فیصلہ کن شہادت ہے اور اسی سوچ پر دنیا اور آخرت کی نجات کا مدار ہے اس پر انسانی وجود قائم ہے۔

وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ (۶: ۱۹)) "اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے، سب کو متنبہ کر دوں۔" ہر وہ شخص جس تک قرآن کی تعلیمات پہنچ جائیں، کسی ایسی زبان میں جسے وہ سمجھتا ہو اور اس سے وہ دعوت قرآن اخذ کر سکتا ہو تو اس پر حجت قائم ہو گئی۔ حضور ﷺ کا فریضہ انذار ادا ہو گیا، اور اگر وہ نافرمانی کرے اور تکذیب کرے تو اس کے لئے عذاب لازم ہو گیا۔ (ہاں جو شخص عربی زبان نہیں جانتا اور اس کی زبان میں قرآن کی دعوت بھی موجود نہیں ہے تو اس پر حجت قائم نہ ہو گی اور اس بات کا مؤاخذہ اہل اسلام سے ہو گا کیونکہ انہوں نے اس زبان میں قرآن کے مفہوم کو منتقل نہ کیا جسے وہ سمجھتا ہے۔ اگر اس کی زبان میں قرآن کا ترجمہ کر دیا گیا ہو تو اس پر حجت تمام ہو گی)۔

جب یہ اعلان کر دیا گیا کہ اللہ کی شہادت قرآن کریم کے اندر درج ہے تو اس شہادت کا مضمون بھی بتا دیا گیا۔ اور یہ چیلنج کی صورت میں اور سخت تنبیہ کے انداز میں بتا دیا گیا وہ لوگ جو شہادت دیتے تھے اس پر ان کی سرزنش کی گئی کہ کیا تم اللہ کے مقابلے میں خود اپنی شہادت پیش کرتے ہو؟ بتا دیا گیا کہ ہم تمہاری اس شہادت کو مسترد کرتے ہیں۔ آپ اس کے مخالف موقف کا اعلان فرما دیتے ہیں اور اعلان کر دیتے ہیں کہ اللہ کی ذات وحدہ لاشریک ہے۔ صرف اللہ ہی الہ ہے اور اس معاملے میں ہمارے اور تمہارے درمیان مکمل جدائی ہے، ہماری راہیں مختلف ہیں۔ نہایت ہی تاکید کی اور فیصلہ کن الفاظ میں اپنی براءت کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔

(أَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ آلِهَةً أُخْرَىٰ قُل لَّا أَشْهَدُ قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَإِنَّنِي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ (۶: ۱۹)) "کیا واقعی تم لوگ یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں؟ کہو، میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں دے سکتا۔ کہو، خدا تو وہی ایک ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔" قرآن کی یہ آیات، ان آیات کے یہ مقطعے اور ان کی یہ ضربات انسانی دل کو اس قدر جھنجوڑتی ہیں کہ الفاظ میں ان کے اثرات کو بیان کرنا ہی محال ہے اس لئے میں مناسب نہیں سمجھتا کہ اپنے الفاظ کے ذریعے ان کے اثرات اور ان کی خوبصورتی کو محدود کر دوں کیونکہ کوئی تبصرہ ان کے حسن کو بیان نہیں کر سکتا۔

---ooo---

آیات کے اس مجموعے یا اس لہر میں جس مسئلے کو لیا گیا ہے اس پر قدرے بحث ضروری ہے۔ یہ مسئلہ سرپرستی،

توحید اور مشرکین کے ساتھ مکمل جدائی کا مسئلہ ہے۔یہ اسلامی نظریہ حیات کا اساسی مسئلہ ہے اور اس دین میں یہ ایک عظیم اور اہم حقیقت ہے۔ آج کے اسلامی گروہ اور اسلامی جماعت کو چاہئے کہ وہ اس مسئلے پر غور کرے' اس سبق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ذرا طویل وقفہ کرے اور تامل وتدبر کرے۔

اس وقت تحریک اسلامی کا مقابلہ پورے کرۂ ارض پر چھائے ہوئے نظام جاہلیت کے ساتھ ہے۔جس طرح نزول قرآن کے وقت برپا ہونے والی تحریک اسلامی کا مقابلہ اس وقت کی جاہلیت سے تھا۔اس لئے آج کی تحریک اسلامی کو چاہئے کہ وہ اپنا موقف نزول قرآن کے وقت کی تحریک اسلامی کے موقف کی روشنی میں متعین کرے تاکہ وہ اس روشنی کی مدد سے اپنی راہ کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ چنانچہ تحریک اسلامی کی یہ ضرورت ہے کہ وہ ان آیات پر خوب اچھی طرح طویل غور و فکر کرے اور پہلی تحریک اسلامی کے نقوش پا سے راہنمائی حاصل کرے۔

زمانہ لوٹ کر اسی مقام پر آگیا ہے جہاں پہلی تحریک اسلامی کے وقت تھا۔انسانیت اسی مقام پر آگئی ہے جس پر وہ نزول قرآن کے وقت تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ و موجود تھے۔ان پر اسلام نازل ہوا تھا اور اس کی اساس اس بات کی شہادت پر تھی کہ اللہ ایک ہے' اور اس کے سوا کوئی اور الہٰ نہیں ہے۔یہ شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں ہے' اسی طرح ہم نے ادا کرنی ہے جس طرح اسے حضرت ربعی ابن عامر نے ادا کیا تھا' جب وہ مسلمانوں کے کمانڈر انچیف کے ایلچی کے طور پر ایرانیوں کے کمانڈر انچیف رستم کے ہاں گئے تھے اور جنہوں نے حضرت ربعی سے پوچھا تھا "تم نے کیوں ہم لوگوں پر لشکرکشی کی ہے؟" ان کا جواب یہ تھا:"اللہ نے ہمیں اس لئے اٹھایا ہے کہ وہ اپنے جن بندوں کو انسانوں کی غلامی سے نکالنا چاہتا ہے انہیں اس غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی بندگی میں داخل کر دے۔پھر انہیں دنیا اور آخرت کی وسعتوں کے اندر لے جائے اور دوسرے ادیان کے مظالم سے نکال کر اسلام کے نظام عدل میں داخل کر دے۔" حضرت ربعی ؓ نے یہ شہادت یہ جانتے ہوئے دی کہ رستم اور اس کے ساتھی کسی کی پوجا یہ جانتے ہوئے نہ کرتے تھے کہ وہ اللہ ہے اور ان کا خالق ہے یا اس کائنات کا خالق ہے اور نہ یہ لوگ کسریٰ کے سامنے معروف مراسم عبودیت بجالاتے تھے۔بلکہ وہ قانون اور شریعت کسریٰ سے اخذ کرتے تھے۔اس طرح وہ کسریٰ کی بندگی کرتے تھے جو اسلام کے منافی تھی۔ربعی ؓ نے ان کو بتایا کہ وہ لوگوں کو انسانی نظاموں سے نکال کر اللہ کے نظام حاکمیت میں داخل کرنا چاہتے ہیں جس میں اطاعت اور بندگی صرف اللہ وحدہ کے لئے مخصوص ہے اور اس کے مقابلے میں اسلامی نظام زندگی ہے جس کے اندر حاکمیت' اطاعت اور بندگی صرف اللہ وحدہ کے لئے ہے۔

آج کل زمانہ اس مقام پر لوٹ آیا ہے جس پر کبھی اسلام نے لوگوں کے سامنے (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کی شہادت پیش کی تھی۔ آج انسانیت لوٹ کر بندوں کی غلامی میں داخل ہوگئی ہے' وہ دوسرے ادیان کے مظالم سہ رہی ہے اور اس عظیم شہادت سے اس نے روگردانی اختیار کر لی ہے۔اگرچہ انسانیت کی آبادی کا ایک حصہ مسجدوں سے اذانوں کے ذریعے سے روز و شب (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کی شہادت نشر کر رہا ہے لیکن اسے معلوم نہیں ہے کہ اس شہادت اور کلمہ شہادت کا مدلول اور مفہوم کیا ہے؟ نہ یہ شہادت دیتے وقت یہ لوگ اس مفہوم کو ذہن میں لاتے ہیں۔نہ یہ لوگ اس حاکمیت کا انکار کرتے ہیں جو کچھ لوگوں نے اپنے لئے مخصوص کر لی ہے حالانکہ ان کا یہ موقف اعلان خدائی کے برابر ہے چاہے وہ اپنے اس موقف کا اعلان کریں یا نہ کریں۔مثلاً دنیا میں مروج مجالس قانون ساز کا جو حال ہے یا کچھ اقوام کا حال

ہے۔ اس معاملے میں افراد و مجالس کا حکم ایک ہی ہے۔ افراد اور اقوام کی حیثیت ایک ہی ہے۔ یہ افراد اور یہ مجالس اور یہ اقوام چونکہ اللہ نہیں ہیں اس لئے انہیں انسانوں کے لئے قانون سازی کا کوئی حق نہیں ہے الا یہ کہ انسانیت مرتد ہو کر (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) سے انکار کر دے اور وہ یہ اختیارات اللہ کے سوا کسی اور کو دے دے تو اس صورت میں وہ عقیدۂ توحید کی منکر ہوگی اور صرف اللہ اس کا والی اور سرپرست نہ ہو گا۔

اس وقت صورت حالات یہ ہے کہ پوری انسانیت' جس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو رات اور دن مساجد سے اذانوں کے ذریعے سے (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کا مفہوم نہ سمجھتے ہوئے اس کا اعلان کرتے ہیں۔ یہ لوگ قیامت کے دن سب سے بڑے گناہگار اور زیادہ عذاب کے مستحق ہوں گے' اس لئے کہ انہوں نے مسلمان ہونے کے بعد لوٹ کر انسانوں کی بندگی اختیار کر لی ہے۔ اس کے بعد کہ ان پر یہ سچائی اتری اور ان تک پہنچ گئی اور اس کے بعد کہ وہ دین اسلام میں داخل تھے' لہٰذا اس دور میں تحریک اسلامی اس بات کی زیادہ محتاج ہے کہ وہ ان آیات پر اچھی طرح غور کرے :

(قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (٦: ١٤))

"کہو اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنالوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین اور آسمان کا خالق ہے اور جو روزی دیتا ہے' روزی لیتا نہیں ہے؟ کہو مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سر تسلیم خم کر دوں (مجھے کہا گیا) تو بہرحال مشرکین میں شامل نہ ہو۔" ضرورت اس امر کی ہے کہ تحریک اسلامی کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو ولی اور سرپرست بنانا' چاہے اس کا جو مفہوم بھی لیا جائے' اس کا مطلب ہو گا اس کے سامنے عاجزی کرنا' اس کی اطاعت کرنا' اس سے نصرت طلب کرنا اور اس سے استعانت طلب کرنا۔ یہ سب امور اسلام کے ساتھ متضاد ہیں اس لئے کہ یہ امور شرکیہ ہیں اور اسلام آیا ہی اس لئے ہے کہ لوگوں کو ان شرکیہ امور سے نکالا جائے۔ تحریک اسلامی کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ولایت کا اظہار سب سے پہلے جس بات میں ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی اپنے نظریہ یا اپنی زندگی کے نظام میں غیر اللہ کی حاکمیت کو قبول کر لے۔ یہ وہ بات ہے جس میں اس وقت کرۂ ارض پر بننے والی پوری انسانیت مبتلا ہے۔ بلا استثناء۔ اور تاکہ تحریک اسلامی کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اس کے سامنے جو ہدف ہے وہ یہ ہے کہ اس نے عوام الناس کو لوگوں کی بندگی سے نکال کر صرف اللہ وحدہ کی بندگی میں داخل کرنا ہے اور یہ کہ اسے اسی قسم کی جاہلیت سے واسطہ درپیش ہے جس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلی تحریک اسلامی کو سابقہ درپیش تھا جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں۔

نیز تحریک اسلامی کو اس شراب ایمانی کی بھی اشد ضرورت ہے جو یہ آیات قلب مومن میں انڈیل رہی ہیں جبکہ دل مومن کسی جاہلیت کے سامنے صف آرا ہو:

(قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (١٥) مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ

يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ (١٦) وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ

اِلَّا هُوَ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (١٧) وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ

عِبَادِهٖ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ (١٨) (٦: ١٥ تا ١٨))

وہ کہو' اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی ۔ اس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے ۔ اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے ' اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہرچیز پر قادر ہے ۔ وہ اپنے بندوں پر کامل اختیار رکھتا ہے اور دانا و باخبر ہے ۔" جو تحریک بھی جاہلیت اور اس کی طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کر رہی ہو' جو جاہلیت کے جبر و قہر اور عناد و سرکشی کا مقابلہ کر رہی ہو اور جو جاہلیت کی سازشوں اور کینہ پروریوں کے سامنے صف آرا ہو اور اس کے پھیلائے ہوئے فساد اور فسق و فجور کا دفعیہ چاہتی ہو اس کے لئے اس تمام شر کے مقابلے کے لئے ان حقائق کا ادراک ضروری ہے اور اس تحریک کے اندر یہ جذبات اور یہ شعور موجود ہونا چاہئے ۔ ورنہ اس بات کا خطرہ ہے کہ وہ غیراللہ کو اپنا سرپرست بنالے اور یہ نہ ہو کہ اس نافرمانی کے نتیجے میں وہ عذاب اخروی کی سزاوار ہو جائے ۔ تحریک اسلامی کو یہ یقین کر لینا چاہئے کہ نفع و نقصان صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور یہ کہ اللہ کو اپنے بندوں پر پورا پورا کنٹرول حاصل ہے ۔ اس کے فیصلے کے بعد کوئی فیصلہ نہیں ہے اور نہ اس کے حکم اور فیصلے کو کوئی رد کر سکتا ہے ۔ جس دل میں یہ یقین اور یہ شعور نہ ہو وہ احیائے اسلام کی مشکلات کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا جبکہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ جاہلیت کے قائم نظام کے مقابلے میں ہو رہی ہو اس لئے کہ احیائے اسلام کی تحریک کو جاہلیت کبھی بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتی ۔ اس کی راہ میں ہمیشہ پہاڑ جیسی مشکلات حائل کی جاتی رہی ہیں ۔

یہ یقین کر لینے کے بعد کہ آج کرۂ ارض پر تحریک اسلامی کا نصب العین کس قدر اہم اور مشکل ہے ' اپنے نظریے اور عقیدے کے صحیح ادراک کے بعد اور اس کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کہ اللہ سبحانہ وحدہ لاشریک ہے اور اس توحید کے کئی پہلو ہیں اور ان تمام امور کے ساتھ ساتھ یہ شعور کہ اس راہ میں کیا کیا مشکلات ہیں ۔ آج کی تحریک اسلامی کو اللہ کی جانب سے شہادت اور جاہلیت کے ساتھ مکمل بائیکاٹ اور فیصلہ کن علیحدگی کی ضرورت ہے کیونکہ جاہلیت بعینہ اسی شرک میں مبتلا ہے جس میں قرون اولیٰ کی جاہلیت مبتلا تھی ۔ اس لئے تحریک اسلامی کو چاہئے کہ وہ ویسا ہی اعلان کر دے جس اعلان کے کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا ۔ جس طرح رسول ؐ نے اس وقت کی جاہلیت کے منہ پر اس کے نظریات مار دیئے تھے آج بھی تحریک کو چاہئے کہ وہ دور جدید کی جاہلیت کے غلط افکار اس کے منہ پر دے مارے اور اللہ رب العالمین کے ان احکام کو نافذ کر دے ۔

(قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ شَهِيْدٌ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ

لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى قُلْ لَّا اَشْهَدُ قُلْ اِنَّمَا

هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (۶: ۱۹) ''ان سے پوچھو کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے؟ کہو اللہ..... میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے۔ اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے سب کو متنبہ کر دوں کیا واقعی تم لوگ یہ شہادت دے سکتے ہو؟ کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں؟ کہو میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں دے سکتا۔ کہو خدا تو وہی ایک خدا ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔'' تحریک اسلامی کا یہ فرض ہے کہ وہ اس وقت کرۂ ارض پر چھائی ہوئی جاہلیت کے مقابلے میں یہ موقف اختیار کرے۔ اسے چاہئے کہ وہ اس کے مقابلے میں اپنے سچے نظریات کا اعلان ببانگ دہل کرنے اور فیصلہ دل دہلانے دینے والی رعب دار آواز میں کرے۔ اس کے بعد نتائج اللہ پر چھوڑ دے جو ہر چیز پر قادر ہے۔ اسے اپنے بندوں کے معاملات پر پورا پورا کنٹرول ہے۔ اللہ کے بندے جس میں یہ جابر طاغوتی طاقتیں بھی شامل ہیں اللہ کے مقابلے میں ایک مکھی جتنی طاقت بھی نہیں رکھتے۔ اگر ان سے مھی بھی کوئی چیز لے بھاگے تو یہ اس سے نہیں چھڑا سکتے۔ یہ جابر قوتیں اللہ کے اذن کے بغیر کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں نہ یہ قوتیں کسی کو کوئی نفع پہنچا سکتی ہیں۔ اللہ تمام امور کائنات پر پوری طرح غالب ہے لیکن لوگوں کو اللہ کا غلبہ نظر نہیں آتا۔

تحریک اسلامی کو اچھی طرح یقین کر لینا چاہئے کہ اسے حسب وعدہ الٰہی تمکن فی الارض اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک وہ جاہلیت کے مقابلے میں اپنی زندگی کی راہیں بالکل الگ نہیں کر لیتی اس کے ساتھ مکمل طور پر قطع تعلق نہیں کر لیتی جب تک طاغوتی قوتوں کے مقابلے میں تحریک اسلامی اعلان حق نہیں کر دیتی اور جب تک وہ جاہلیت کے مقابلے میں اس اسلوب پر شہادت حق نہیں دے دیتی جس طرح ان آیات میں اسے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جب تک وہ جاہلیت کو اسی انداز میں چیلنج نہیں کرتی اور اس کے ساتھ مکمل بائیکاٹ نہیں کر دیتی اور اس سے اعلان برأت نہیں کر دیتی۔

قرآن کریم تاریخ کے ایک مخصوص دور کی اصلاح کے لئے مخصوص نہ تھا۔ قرآنی ہدایات مکان و زمان کی قیود سے آزاد ہیں۔ قرآن تو ایک منہاج انقلاب ہے اور جب بھی کوئی تحریک اس منہاج کو اپنائے گی اسے اسی طرح کام کرنا پڑے گا جس طرح پہلی تحریک اسلامی کو کرنا پڑا۔ آج ہمیں ویسے ہی حالات درپیش ہیں جیسے نزول قرآن کے وقت درپیش تھے۔ زمانہ اسی مقام پر لوٹ کر آگیا ہے جس پر وہ حضور ؐ کے وقت تھا۔ جبکہ دنیا میں اسلام متعارف ہو رہا تھا۔ ہمیں اس دین کی حقیقت پر پورا بھروسہ ہونا چاہئے۔ ہمیں اللہ کی قدرت اور اس کے غلبے پر پورا پورا بھروسہ ہونا چاہئے۔ جماعت اسلامی کو اسی انداز میں تیاری کرنا چاہئے۔ اللہ سب سے اچھا محافظ ہے اور وہ ارحم الراحمین ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۵۸ ایک نظر میں

"یہ ایک نئی لہر ہے - روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جو قرآن کریم کی تکذیب کرتے ہیں اور خصوصاً قرآن کے نظریہ بعث بعد الموت کو جھٹلاتے ہیں - البتہ اس لہر میں نہ تو ان کی ہٹ دھرمی اور عناد کی تصویر کشی کی گئی ہے اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے وہ اسلاف جو قرآن اور بعث بعد الموت کے منکر تھے' ان کا انجام کیا ہوا؟ بلکہ ان کے سامنے یوم البعث کے کچھ مناظر اور جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں اور ان کے اخروی انجام بد کی تصویر کشی کی جاتی ہے اور یہ انجام بد نہایت متحرک اور زندہ مناظر و مشاہد کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے - یہ لوگ میدان حشر میں ہیں اور نہایت ہی شرمسار کنندہ سوالات سے دوچار ہیں جس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے' سرعام رسوا ہو رہے ہیں - کوئی جواب بن نہیں پڑتا -

(اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (۶ : ۲۲)) "کہاں ہیں تمہارے وہ شریک جنہیں تم خدا کے ساتھ برابر سمجھتے تھے؟" یہ سوال اس قدر شان جلالت کے ساتھ ہوتا ہے کہ ان پر جزع و فزع کا عالم طاری ہو جاتا ہے - اب وہ نہایت ہی خاکساری اور نہایت ہی بھولے پن سے قسمیں اٹھاتے ہیں اور اللہ کی ربوبیت کا اعتراف کرتے ہیں -

(وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (۶ : ۲۳)) اللہ ہمارے رب کی قسم ہم تو مشرک تھے ہی نہیں -" لیکن جب وہ آگ کے کنارے پہنچتے ہیں' ہتھکڑیاں لگی ہوئی' حسرت و ندامت میں ڈوبے ہوئے ڈرے اور سہمے ہوئے تو یوں گویا ہوتے ہیں -

(يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۶ : ۲۷)) "اے کاش! کہ ہم لوٹائے جائیں' اور اللہ کی آیات کی تکذیب نہ کریں اور مومنین میں شامل ہو جائیں -" اب خود اللہ جل جلالہ ان سے ایک سوال کرتے ہیں اور ان کی حالت یہ ہے کہ وہ شرم و ندامت کی وجہ سے پگھلے جا رہے ہیں اور خوف و ہراس کی وجہ سے ان کی جان نکلی جا رہی ہے -

(اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ (۶ : ۳۰)) "کیا یہ سچائی نہیں ہے؟" اب وہ نہایت ہی خاکساری اور شرمندگی کے ساتھ جواب دیتے ہیں (بَلٰى وَرَبِّنَا (۶ : ۳۰)) "ہمارے رب کی قسم' ہاں"........ اب یہ اعتراف ان کے لئے مفید نہیں ہے - حکم ہوتا ہے -

(فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (۶ : ۳۰)) پس چکھو تم اس عذاب کو اس لئے کہ تم انکار پر مصر تھے -" وہ ایسے حالات میں اس صورت حالات سے دوچار ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ہار چکے ہیں - سب کچھ ہار چکے ہیں - اب انہوں نے اپنے کاندھوں پر اپنے تمام برے اعمال اٹھائے ہوئے ہیں اور آخرت کے بارے میں

اپنے برے موقف کی وجہ سے اور اس گھاٹے کے سودے پر سخت نالاں ہیں اور غم سے نڈھال ہو چکے ہیں۔

• ایک منظر کے بعد دوسرا منظر اسکرین پر آتا ہے۔ ہر منظر ایسا ہے کہ دل دہل جاتا ہے' پورا بدن ٹوٹ رہا ہے' پورا وجود ریزہ ریزہ ہوا چاہتا ہے۔ دل و دماغ کے دریچے اب تو بالکل کھلے ہیں۔ اب وہ سچائی انہیں صاف صاف نظر آتی ہے جو حضور ؐ پیش فرما رہے تھے۔ لیکن ان مناظر کو بھی دیکھ کر قبولیت حق کی توفیق صرف ان لوگوں کو ہوئی جن کے بارے میں مشیت الٰہی نے فیصلہ کیا کہ وہ حق کو قبول کریں گے' لیکن وہ لوگ جن کو قرآن کریم سے پہلے کتابیں دی گئی تھیں وہ تو اس سچائی کو اس طرح پہچان رہے تھے جس طرح وہ اپنے بچوں کو پہچانتے تھے' لیکن اس کے باوجود اس سچائی کو قبول نہ کرتے تھے۔

---o0o---

# درس نمبر ۵۸ تشریح آیات

## ۲۰ --- تا --- ۳۲

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ
اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ؏ ۲۰ ۱۰ ۸

(”جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس بات کو اس طرح غیر مشتبہ طور پر پہچانتے ہیں جیسے ان کو اپنے بیٹوں کے پہچاننے میں کوئی اشتباہ پیش نہیں آتا۔ مگر انہوں نے اپنے آپ کو خود خسارے میں ڈال دیا ہے وہ اسے نہیں مانتے۔) قرآن کریم میں اس بات کا ذکر بار بار آتا ہے کہ اہل کتاب ' یہود و نصاریٰ' قرآن کریم کو بعینہٖ اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق ہیں اور یہ قرآن کریم ان پر اللہ کی جانب سے نازل ہو رہا ہے۔ یہ حقیقت اہل کتاب کے ساتھ کلام کرتے ہوئے بھی بیان کی گئی ہے اور مشرکین عرب کے مقابلے میں بھی یہ دلیل دی گئی۔ اہل کتاب بالعموم مدینہ میں تحریک اسلامی کے خلاف دشمنی' عناد اور مقابلے کا موقف اختیار کئے ہوئے تھے اور اہل شرک ہر جگہ پر تھے۔ یہ حقیقت اس لئے لائی گئی کہ مشرکین عرب مانتے تھے کہ اہل کتاب ان کے مقابلے میں زیادہ اہل علم ہیں اور وہ کتب سماویہ اور وحی کے مزاج سے زیادہ باخبر ہیں۔ لہٰذا یہ بات لائی گئی کہ اہل کتاب قرآن کریم کو اچھی طرح بغیر کسی اشتباہ کے پہچانتے ہیں اور یہ کہ حضورؐ پر بھی اسی رب کی وحی آ رہی ہے جس نے پہلے رسولوں پر وحی بھیجی تھی۔

جس طرح ہم نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ آیت مکی ہے' اور اس میں اس انداز سے اہل کتاب کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں خطاب مشرکین مکہ سے تھا کہ جس کتاب کا تم انکار کر رہے ہو اہل کتاب اسے اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں اور اگر اہل کتاب کی ایک بڑی اکثریت ایمان نہیں لائی تو اس نے درحقیقت اپنے آپ کو ایک بہت ہی بڑے خسارے میں ڈال لیا ہے۔ اس معاملے میں علم کے باوجود وہ مشرکین کے ہم پلہ ہو گئے ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالتے ہوئے ایمان کی دولت سے محروم کر لیا ہے۔ اس آیت سے قبل اور بعد کی بات بہرحال مشرکین مکہ کی بابت ہے۔ اس لئے 'جس طرح ہم نے اس سورہ کے تعارف کے وقت بتایا' ہم ترجیح اس بات کو دیتے ہیں کہ یہ آیات بھی مکی ہیں۔ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں' (اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (۶: ۲۰)) ”جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس بات کو اس طرح غیر مشتبہ طور پر پہچانتے

ہیں جیسے ان کو اپنے بیٹوں کے پہچاننے میں کوئی اشتباہ نہیں آتا۔" کا حوالہ دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ وہ مانتے ہیں کہ یہ کلام منزل من اللہ اور سچا ہے یا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے نبی ہیں اور ان پر بذریعہ وحی یہ قرآن نازل ہو رہا ہے۔ یہ تفسیر بھی بہرحال اس آیت کے مدلول اور مفہوم میں داخل ہے لیکن تاریخی واقعات کی روشنی میں اور اہل کتاب کے رویے کو پیش نظر رکھتے ہوئے' جو انہوں نے دین اسلام کے مقابلے میں اختیار کیا' ہم یہ کہتے ہیں کہ اس آیت کے مفہوم کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ اللہ کا منشا یہ تھا کہ جماعت مسلمہ کے ذہن میں یہ پہلو بھی آ جائے تاکہ وہ آئندہ کے ادوار میں اہل کتاب کے حوالے سے اپنا اپنا رویہ متعین کر لے اور یہ جان لے کہ ان کا رویہ اسلام کی بابت کیا ہو گا۔

اہل کتاب اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ کتاب از جانب اللہ برحق ہے' اس لئے کہ وہ اس کتاب کی قوت تاثیر سے واقف تھے۔ اس میں جو بھلائی اور اصلاح تھی اس سے بھی وہ واقف تھے۔ وہ اس بات سے بھی اچھی طرح باخبر تھے کہ اس کتاب کے اندر پائے جانے والے نظریات کو جو قوم سینے سے لگاتی ہے اس کے اندر پھیلاؤ کی کس قدر عظیم قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کے نتیجے میں کسی قوم کے اندر جو اخلاقی قوت پیدا ہوتی ہے اس کے اثرات کس قدر دور رس ہوتے ہیں۔ یہ کتاب جو نظام حیات پیش کرتی ہے وہ کس قدر مستحکم نظام ہے۔ اہل کتاب اس کتاب اور اس کے ماننے والوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اس کتاب میں ان کے لئے نہ کوئی گنجائش ہے اور نہ کسی دوسرے دین کے لئے کوئی گنجائش ہے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اس کتاب میں کس قدر عظیم سچائی ہے اور وہ خود کس عظیم باطل کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اس نظام جاہلیت سے بھی واقف تھے جس تک وہ آپہنچے اور جس تک ان کی قوم' ان کے اوضاع و اطوار اور ان کے اخلاق اور ان کا اجتماعی نظم پہنچ گئے ہیں۔ اب صورت یہ ہو گئی کہ یہ دین برحق ان کے ساتھ کوئی مصالحت نہیں کر سکتا۔ نہ ان کے درمیان بقائے باہمی ممکن ہے۔ اس لئے جو معرکہ درپیش ہے وہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اس کرۂ ارض کے اوپر سے جاہلیت ختم نہیں ہو جاتی' جب تک ہر جگہ یہ دین غالب نہیں ہو جاتا اور پوری دنیا کا دین خدا پرستی پر قائم نہیں ہو جاتا اور اس کرۂ ارض پر اللہ کی بادشاہت قائم نہیں ہو جاتی۔ جب تک اللہ کے حقوق سلطنت اور حقوق اقتدار اعلیٰ پر دست درازی کرنے والوں کو اس کرۂ ارض کے اوپر سے بھگا نہیں دیا جاتا اس وقت تک دونوں گروہوں کے درمیان مصالحت نہیں ہو سکتی اس لئے کہ صرف اسی طریقے سے خدا کی بادشاہت قائم ہو سکتی ہے۔

اہل کتاب اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ اس دین میں یہ حقیقت موجود ہے اور اس حقیقت کو وہ بعینہٖ اس طرح بغیر کسی اشتباہ کے جانتے تھے جس طرح وہ اپنے بچوں کو جانتے تھے۔ اہل کتاب نسلاً بعد نسل اس دین کا مطالعہ کرتے چلے آئے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ اس دین کے اندر قوت اور شوکت کے سرچشمے پنہاں ہیں اور یہ کہ یہ دین نفس انسانی کے اندر کن کن راہوں پر اپنے اثرات چھوڑتا ہے۔ اسی لئے وہ ہر وقت ان تحقیقات میں لگے رہتے ہیں کہ وہ اس دین کی ان قوتوں کے اثرات کو کس طرح زائل کر دیں۔ کس طرح وہ اہل اسلام کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر سکتے ہیں؟ کس طرح وہ دین اسلام کے نصوص میں لفظی اور معنوی تحریف کر سکتے ہیں؟ کس طرح وہ اس دین کو باطل اور جاہلیت کے مقابلے میں تحریک نفاذ اسلام اور تحریک قیام حکومت الٰہیہ کے مقام سے گرا کر ایک مجرد ثقافتی اور علمی تحریک میں بدل سکتے ہیں اور اس کی زندہ نصوص کو محض الٰہیاتی نظریاتی مباحث میں بدل کر انہیں بے جان کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کی

یہی سعی رہی کہ اس دین کو محض لاہوتی، فقہی اور فرقہ وارانہ اختلافات کا اکھاڑہ بنا کر رکھ دیا جائے۔ وہ دین اسلام کے مطالب اور مفہومات کو ایسے تصورات اور ایسی اشکال میں ڈھالتے ہیں جن کا اس دین سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ اس دین کے لئے مہلک ہیں۔ لیکن ان سازشوں کے باوجود وہ اہل اسلام کو یہ باور کراتے ہیں کہ تمہارا عقیدہ محفوظ ہے اور قابل احترام ہے۔ اس طرح جو خلا وہ پیدا کرتے ہیں اس کی جگہ وہ نئے تصورات، نئے طور طریقے اور نئی ترجیحات سامنے لاتے ہیں اور اس طرح وہ اسلامی سوچ کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں۔

اہل کتاب دین اسلام کا بہت ہی گہرا مطالعہ کرتے ہیں اور نہایت ہی سنجیدگی اور گہرائی سے اسلام کو سمجھنے کی سعی کرتے ہیں۔ لیکن اس سے وہ کسی حقیقت کی تلاش میں نہیں ہیں۔ ہمارے بعض سادہ لوح لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید انہیں حقیقت کی تلاش ہے یا وہ اس دین کے ساتھ کوئی انصاف کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ ہمارے بعض سادہ لوح لوگ ایسا سمجھتے ہیں جب مستشرقین میں سے کوئی اسلام کے بعض پہلوؤں کے بارے میں اچھے تاثرات کا اظہار کرے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے کہ یہ لوگ سچائی کی تلاش میں ہیں یا یہ کہ وہ دین اسلام پر کوئی منصفانہ تبصرہ کرنا چاہتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی ان تحقیقات سے اس امر کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کس مقام سے وہ دین اسلام پر حملہ آور ہوں۔ یہ لوگ دین اسلام کے ان تمام سرچشموں کو بند کرنا چاہتے ہیں جن کی وجہ سے انسانی فطرت کو سیرابی حاصل ہو سکتی ہے یا فطرت انسانی ان پہلوؤں سے متاثر ہو سکتی ہے۔ وہ ایسے تمام سرچشموں کو بند کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس دین کی قوتوں کے راز معلوم کرتے ہیں تاکہ وہ ان قوتوں کا اچھی طرح دفاع کر سکیں۔ یہ لوگ یہ جاننا چاہتے کہ یہ دین اپنے آپ کو انسانی نفسیات کے اندر کس طرح نشوونما دیتا ہے تاکہ یہ لوگ اہل اسلام کو غافل پا کر کچھ اپنے تصورات اس کے اندر داخل کر دیں اور لوگوں کے نفوس کے اندر جو بھی خلا باقی ہو اسے وہ دین کے ساتھ متضاد تصورات کے ذریعے بھر دیں۔

چنانچہ ان مقاصد کے حصول کے لئے یہ لوگ دین اسلام کو اسی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بچوں کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ ہمیں ان حقائق کے بارے میں علم ہونا چاہئے۔ ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ ہمیں اپنے دین کے بارے میں بھی پورا پورا علم ہونا چاہئے اور ہمیں بھی چاہئے کہ ہمیں اپنے دین کے بارے میں اسی طرح پہچان ہو جس طرح ہمیں اپنی اولاد کے بارے میں پہچان ہوتی ہے۔

گزشتہ چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ کی عملی صورت حال اس بات کی تصدیق کرتی ہے جس کے بارے میں قرآن کریم نے پہلے سے بتا دیا تھا

(اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (٦ : ٢٠)) "وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے، وہ اسے اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔" ماضی قریب کے تاریخی دور میں یہ صورت حال بہت ہی اچھی طرح واضح ہوگئی ہے۔ آج اسلام کے بارے میں جو بحثیں ہو رہی ہیں وہ اس قدر وسیع ہیں کہ ہر ہفتے کی تحریروں کو جمع کر کے ایک کتاب شائع کی جا سکتی ہے۔ یہ صورت تمام غیر ملکی زبانوں کی ہے۔ ان مباحث سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب اس دین کی ہر چھوٹی بڑی بات سے واقف ہیں۔ وہ اس کے مزاج اور اس کی تاریخ سے پوری طرح باخبر ہیں۔ انہیں اس دین کی قوت کے سرچشمے بھی معلوم ہیں اور اس کی قوت مدافعت سے بھی وہ پوری

طرح باخبر ہیں۔انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس دین کے بگاڑنے کے طریقے کیا ہیں' لیکن اہل کتاب کی اکثریت اپنی اس نیت کو چھپائے رکھتی ہے۔ وہ اپنے مقاصد کو اس لئے خفیہ رکھتے ہیں کہ اگر دین اسلام پر براہ راست حملہ کیا جائے تو لوگ اس کی مدافعت کے لئے اٹھتے ہیں اور طرفداری کرتے ہیں۔وہ تحریکات جو اس دین پر مسلح حملوں کے دفاع کے لئے برپا کی گئیں' مثلاً استعماری قوتوں کے خلاف تو یہ تحریکات ایک دینی فہم اور دینی جذبے کے اوپر قائم تھیں۔انہوں نے اپنے وقت میں دین کے دفاع کا فریضہ سرانجام دیا'لیکن آج دین کے خلاف فکری جنگ شروع ہے۔اس فکری و نظریاتی جنگ کی مدافعت کے لئے بھی اسلامی تحریکات اٹھتی رہی ہیں اور اہل کتاب کو اس کا اندیشہ ہمیشہ رہتا ہے۔اس لئے وہ نہایت ہی مذموم طریقے اختیار کرتے ہیں اور وہ یوں کہ وہ پہلے دین اسلام کی کسی قدر تعریف کرتے ہیں اور اسلام کی مدافعت اور حمایت کے جذبات کو سلا دیتے ہیں تاکہ اسلام کی حمایت کا جذبہ بے حس کر دیا جائے' اور پڑھنے والے کے دل میں اطمینان پیدا ہو جائے اور اس طرح ایسے مصنفین پیالے میں زہر ڈالتے جائیں اور پڑھنے والا ایک ایک گھونٹ پیتا رہے۔اب ایسے لوگوں کی بات کچھ اس طرح کی ہوتی ہے۔"بے شک اسلام ایک عظیم دین ہے لیکن اس کے معانی اور تصورات کو ترقی یافتہ شکل میں جدید تہذیب کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا ضروری ہے تاکہ وہ جدید دور کی ضروریات کو پورا کرے۔دور جدید میں معاشروں کے اندر جو جدت اور ترقی کا عمل جاری ہے' مناسب نہیں ہے کہ یہ دین اس کی راہ میں رکاوٹ بنے بلکہ مناسب یہ ہے کہ یہ دین جدید اخلاقی قدریں اپنا لے اور جدید نظامہائے حکومت اور اجتماعی امور کو نہ چھیڑے۔اس طرح کہ جو چاہے اسلامی عقائد کو اپنے دلوں میں بٹھائے رکھے لیکن انسان کی عملی زندگی میں جدید نظریات اور تہذیب مغرب کے رنگ ڈھنگ اس کے دائرے سے باہر نکل آئیں۔ وہ اپنے اجتماعی معاملات بھی ان لوگوں کے حوالے کر دے جو اس کرۂ ارض پر الٰہ اور رب بنے ہوئے ہیں اور خود اپنا دین چلا رہے ہیں' اس طرح اسلام ایک ہمہ گیر دین قرار پائے گا"۔

اس انداز گفتگو کے دوران یہ مصنفین اپنی اقوام کو یہ راز سمجھاتے ہیں کہ دین اسلام کی قوت اور صلابت کا راز کیا ہے؟ بظاہر یہ تعریف کر رہے ہوتے ہیں لیکن بباطن اپنی اقوام کو تاثر دیتے ہیں کہ یہ دین نہایت ہی خطرناک ہے۔یوں تعریف کے لباس میں یہ اپنی اقوام کو اس دین کی قوت کے راز سے آگاہ کرتے ہیں تاکہ ان انکشافات کے ذریعے تخریبی قوتیں دین کے نازک مقامات پر حملہ آور ہوں اور ان کے وار اور بمباری ٹھیک ٹھیک نشانے پر لگے اور ان کو اس بارے میں اس قدر علم و معرفت حاصل ہوتی رہے جس طرح وہ اپنے بچوں کے بارے میں جانتے ہیں۔

قرآن کریم کے اسرار و رموز اس کے جاننے والوں پر کھلتے ہی رہیں گے۔یہ کتاب ہمیشہ جدید اور نئی رہے گی۔گزشتہ چودہ سو سال میں یہ ہمیشہ جدید رہی ہے۔مسلمان اس کی روشنی میں معرکے لڑتے رہے ہیں اور اپنی تاریخ پر اس کی روشنی میں غور کرتے رہے ہیں۔وہ اپنے ماضی اور حال کا جائزہ اس کی روشنی میں لیتے رہے ہیں اور اپنے معاملات کو اللہ کے نور میں دیکھتے رہے ہیں جس کے ذریعے سچائی کے راستے واضح ہو جاتے ہیں۔

---ooo---

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

”اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگائے' یا اللہ کی نشانیوں کو جھٹلائے؟ یقیناً ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ جس روز ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے اور مشرکوں سے پوچھیں گے کہ اب وہ تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریک کہاں ہیں جن کو تم اپنا خدا سمجھتے تھے تو وہ اس فتنے سے نکل آئیں گے اور کہیں گے اے ہمارے آقا' تیری قسم ہم ہرگز مشرک نہ تھے۔ دیکھو' انہوں نے کس طرح اپنے اوپر جھوٹ گھڑا اور وہاں ان کے سارے بناوٹی معبود گم ہو گئے۔“

بات کی مناسبت سے اب مشرکین کے سامنے وہ حقیقت رکھی جاتی ہے جس پر وہ دنیا میں قائم تھے۔ اس کی روشنی میں ان کے موقف اور عمل کو خدا تعالیٰ کے پیمانوں سے ناپا جاتا ہے۔ سب سے پہلے ان سے پوچھا جاتا ہے کہ ذرا وہ اپنے رویے پر غور کریں کہ وہ اللہ پر افتراء پردازی کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ وہ اس دین پر ہیں جس کے ساتھ حضرت ابراہیم مبعوث ہوئے تھے۔ اور ان کے مزعومات میں سے یہ بھی تھا کہ وہ خود جن چیزوں کو حلال اور حرام قرار دیتے تھے ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے جیسا کہ اس سورہ کے آخر میں لفظ بزعمہم سے اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ حالانکہ اللہ نے اس چیز کی حلت یا حرمت کا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ جس طرح آج ہمارے زمانے میں بے شمار لوگ دعوائے اسلام کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں' حالانکہ ان کا یہ دعویٰ سراسر جھوٹا ہے اور اللہ پر افتراء ہے۔ وہ خود اپنی جانب سے قوانین اور فرامین جاری کرتے ہیں' خود اپنی جانب سے زندگی کے اوضاع و اطوار اور رسومات پیدا کرتے ہیں اور اپنی جانب سے نئی نئی چیزیں جاری کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ان معاملات میں اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو غصب کر لیتے ہیں اور خود مقتدر اعلیٰ بن بیٹھتے ہیں۔ پھر بھی ان کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ دین اسلام پر ہیں جو سراسر جھوٹ ہے۔ ان میں سے تعلیم یافتہ لوگ جنہوں نے اپنا دین فروخت کر دیا ہے اور اپنے لئے جہنم کے بدترین درجے کو الاٹ کرا لیا ہے وہ ایسے لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ وہ پھر بھی مسلمان ہیں۔ ان آیات میں ان کی جانب سے پیش کی جانے والی آیات کو جھٹلانے پر بھی ان کے خلاف نکیر کی جاتی ہے۔ انہوں نے آیات الٰہیہ کو مسترد کیا' ان کا مقابلہ اور انکار کیا' انہوں نے یہ الزام بھی لگایا کہ یہ آیات از جانب اللہ نہیں ہیں اور جس جاہلیت پر وہ عمل پیرا ہیں وہ از جانب اللہ ہیں۔ یہ موقف بعینہ ویسا ہی ہے جس طرح آج کے دور میں اہل جاہلیت جدید اس کے مدعی ہیں۔ ان دونوں کا موقف بالکل یکساں ہے۔

(وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ (۶:۲۱)) ”اور اس شخص

سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگائے 'یا اللہ کی نشانیوں کو جھٹلائے ۔" یہاں ظلم سے مراد شرک ہے شرک کو ظلم اس لئے کہا گیا ہے کہ لفظ "ظلم" سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے اس کے گھناؤنے پن اور قباحت کا اظہار اچھی طرح ہو جائے ۔ قرآن کریم میں بیشتر شرک کی تعبیر ظلم سے کی جاتی ہے اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ اسے ایک نہایت ہی برا فعل سمجھ کر اس سے متنفر ہو جائیں اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ شرک سچائی کے ساتھ ظلم ہے ۔ نفس انسانی کے ساتھ ظلم ہے اور عوام الناس پر ظلم ہے ۔ اس لئے کہ کبریائی صرف اللہ کا حق ہے اور وہ اس بات کا مستحق ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے کیونکہ اس سے اللہ کی حق تلفی ہوگی ۔ نفس انسانی پر یہ اس لئے ظلم ہے کہ اس کی وجہ سے یہ دائمی ہلاکت میں پڑ جائے گا ۔ اور لوگوں پر ظلم یہ ہے کہ وہ معرفت حق سے محروم ہوں گے اور ان کی زندگی ایسے اصولوں کے تحت چلتی رہے گی جو ظالمانہ ہوں گے ' غرض شرک ہر پہلو سے ظلم عظیم ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے آخر میں رب العالمین خود فرماتے ہیں ۔ (اِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (٦: ٢١)) یقیناً ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے ۔"

یہاں اللہ تعالیٰ ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیتے ہیں اور حکم آ جاتا ہے کہ مشرک یا ظلم اور ظالموں کا انجام کیا ہو گا ۔ انسانوں کی کوتاہ نظر آنکھیں جو کچھ دیکھ سکتی ہیں وہ قابل اعتبار حقیقت نہیں ہوتی ۔ انسان کی نظر نہایت ہی قریبی فاصلے تک ہوتی ہے ۔ انسان صرف دنیوی فلاح اور نجات کو دیکھ سکتا ہے ۔ یہ ہے وہ تدبیر جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو انجام بد تک پہنچاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ صادق القول اور کوئی نہیں ہو سکتا ۔

اس موقعہ پر قرآن ان کی ناکامی اور عدم فلاح اور ان کے غلط موقف کی ایک تصویر کشی نہایت ہی زندہ ' متحرک اور دلکش الفاظ میں فرماتے ہیں :

(وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (٢٢) ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَ اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (٢٣) اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (٢٤)) (٦: ٢٢ تا ٢٤)) "جس روز ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے اور مشرکوں سے پوچھیں گے کہ اب وہ تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریک کہاں ہیں جن کو تم اپنا خدا سمجھتے تھے تو وہ اس فتنے سے نکل آئیں گے اور کہیں گے اے ہمارے آقا ' تیری قسم ہم ہرگز مشرک نہ تھے ۔ دیکھو ' انہوں نے کس طرح اپنے اوپر جھوٹ گھڑا اور وہاں ان کے سارے بناوٹی معبود گم ہو گئے ۔" حقیقت یہ ہے کہ مشرک کی کئی قسمیں ہیں ۔ اللہ کے ساتھ ٹھہرائے ہوئے شرکاء کی بھی کئی اقسام ہیں اور صورت حال وہ نہیں ہے جو عام طور پر کلمہ شرک اور شرکاء اور مشرکین کے اطلاق سے آج کل عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ کچھ لوگ بتوں اور پتھروں کی پوجا کرتے ہیں یا پتھروں ' درختوں اور آگ وغیرہ کے مظاہر کی پرستش کرتے ہیں ۔ بس یہی ہے شرک کا مفہوم ۔

درحقیقت شرک تو یہ ہے کہ کوئی اللہ کے سوا کسی اور کے بارے میں یہ اعتراف کرے کہ ذات باری کے خصائص میں سے کچھ خصائص اس میں بھی پائے جاتے ہیں۔ چاہے وہ نظریاتی امور ہوں جن میں کا اس کائنات کے تصرفات میں سے کوئی امر اللہ کے سوا کسی اور سے منسوب کیا جائے 'یا مراسم عبودیت ہوں کہ اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے بجا لائے جائیں مثلاً عبادت اور نذر و نیاز وغیرہ یا زندگی کے نظام کو درست کرنے کے لئے اصول اور ضابطے اللہ کے سوا کسی اور سے لیے جائیں۔ یہ سب کے سب شرک کے الوان و اقسام ہیں۔ اس شرک کا ارتکاب یوں ہوتا ہے کہ بعض لوگ ایک قسم کا شرک کرتے ہیں اور بعض دوسری قسم کے شرک میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھر مختلف قسم کے مشرکین کے شرکاء اور معبود بھی مختلف ہوتے ہیں۔

قرآن کریم نے ان تمام اقسام پر کلمہ شرک کا اطلاق کیا ہے اور شاید قیامت کے منظر کے اندر ان مشرکین اور شرکاء کے زندہ مناظر پیش کر کے اہل ایمان کو حقیقت سمجھانے کی سعی کی ہے۔ قرآن کریم نے لفظ شرک کو کسی ایک مفہوم تک محدود نہیں رکھا ہے اور نہ ان میں سے کسی ایک مفہوم سے متصف کسی شخص کو مشرک کہا ہے اور نہ دنیا اور آخرت میں ان تمام اقسام کے مشرکین کے انجام اور سزا اور ان کے ساتھ تعلق میں کوئی فرق کیا ہے۔

عربوں کے اندر شرک کی یہ تمام اقسام پائی جاتی تھیں۔ عربوں میں یہ اعتقاد موجود تھا کہ اللہ کی مخلوقات میں سے بعض اللہ کے ساتھ شریک ہیں۔ یہ شرکت اس طرح ہے کہ اللہ کے ہاں جو بات وہ کہتے ہیں وہ لازماً منظور ہوتی ہے۔ لوگوں کی قسمتوں کے فیصلوں اور واقعات کی رونمائی میں ان کا بھی دخل ہوتا ہے۔ مثلاً فرشتے شریک ہوتے ہیں یا یوں کہ یہ مخلوقات انسان کو اذیت دینے پر قادر ہے۔ مثلاً جنات کے بارے میں یہ عمومی عقیدہ ہوتا ہے کہ وہ نقصان دیتے ہیں یا کاہنوں اور جادوگروں کے واسطے سے جنات نقصان دیتے ہیں۔ یا دونوں طریقوں سے یہ انسان کو اذیت دے سکتے ہیں۔ مثلاً آباؤ اجداد کی روحیں بھی نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ ان جنات' کاہنوں اور اجداد کی ارواح کی طرف اشارات کے طور پر یہ لوگ ان کی طرف منسوب بت بناتے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ ہوتا تھا کہ ان بتوں کے اندر ان خدا رسیدہ مخلوقات کی روح آجاتی ہے۔ کاہن پھر ان روحوں اور بتوں کے ساتھ ہم کلام بھی ہوتے تھے۔ یوں ان کے لئے یہ کاہن اس اسلوب اور انکل سے بعض چیزوں کو حرام کرتے تھے اور بعض کو حلال کرتے تھے۔ اس طرح درحقیقت یہ کاہن ہی تھے جو یہ کام کرتے تھے اور وہی شریک کا درجہ رکھتے تھے۔

مزید برآں شرک کا ارتکاب وہ اس طرح بھی کرتے تھے کہ ان بتوں کے سامنے مراسم بندگی ادا کرتے تھے۔ ان کے استھانوں پر قربانیاں کرتے اور ان کی نذریں مانتے تھے۔ یہ قربانیاں اور نذریں اور عبادات بھی دراصل وہ ان کاہنوں کی کرتے تھے۔ بعض عرب ایرانیوں کے زیر اثر یہ بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ کواکب کو بھی واقعات عالم میں اثر و دخل حاصل ہے' اور اس طرح گویا یہ ستارے بھی خدا کے شریک ہیں۔ چنانچہ عربوں کے اندر ستارہ پرستی داخل ہو گئی۔ اس سورہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو قصہ لایا گیا ہے وہ بھی اسی نقطہ نظر سے لایا گیا ہے اور اس سورہ کے موضوع سے یہی بات اس قصے کو مربوط کر دیتی ہے۔ (جیسا کہ آگے ہم بتائیں گے انشاء اللہ)۔

شرک کی تیسری صورت بھی ان عربوں کے اندر رائج تھی۔ یہ لوگ کاہنوں کی مدد سے اپنے لئے دستور اور قانون خود بناتے تھے اور زندگی کے طور طریقے اور رسم و رواج اپنے لئے خود وضع کرتے تھے۔ اگرچہ اس کے اندر قانون

سازی کی اجازت اللہ نے نہ دی تھی لیکن خود قانون بنا کر وہ دعویٰ یہ کرتے تھے کہ یہ اللہ کا قانون اور شریعت ہے جس طرح آج کے بعض سیاسی مفکر ایسا دعویٰ کرتے ہیں۔

پس اس منظر میں، یعنی قیامت کے دن، اللہ تعالیٰ تمام قسم کے شرکاء کے بارے میں لوگوں کو بلا کر یہ سوال کریں گے کہ لاؤ ان کو اب جن کو تم میرا شریک ٹھہراتے تھے؟ آج تو ان کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ آج تو وہ اپنے متبعین کی کوئی امداد نہیں کر سکتے۔ نہ ان کو اس ہولناک صورت حال سے بچا سکتے ہیں۔

(وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ (۶:۲۲)) "جس روز ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے اور مشرکوں سے پوچھیں گے کہ اب وہ تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریک کہاں ہیں جن کو تم اپنا خدا سمجھتے تھے۔" یہ منظر بالکل آنکھوں کے سامنے ہے۔ گو میدان حشر برپا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ مشرکوں سے یہ باز پرس ہو رہی ہے اور ان کے لئے یہ باز پرس نہایت ہی المناک ہے۔ "وہ تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریک کہاں ہیں؟"

یہ ہولناک باز پرس انہیں حواس باختہ کر دیتی ہے۔ اب ان کی فطرت پر جو پردے پڑ گئے تھے وہ پردے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کی فطرت اور ان کی یادداشت سے وہ عارضی حالات محو ہو جاتے ہیں اس لئے کہ ان حالات کی بنیاد فطرت پر تھی ہی نہیں۔ یہ غیر فطری اور محض سراب کی طرح عارضی حالات تھے۔ ان کا شعور اب یہ بتاتا ہے کہ وہ کس طرح شریک ٹھہر سکتے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ نہ تو شرکاء موجود تھے اور نہ ہی ہم نے کسی کو شریک بنایا۔ اب یہ منظر ان کے لئے ایک نئے فتنے کا سبب بنے گا۔ اس حقیقی دربار میں اب خبیث اور بے اصل افکار ان کے ذہن سے محو ہو جاتے ہیں جس طرح بھٹی میں تپ کر چیزوں سے غلط عناصر جھاگ کی شکل میں خارج ہو جاتے ہیں۔

(ثُمَّ لَمْ تَكُن فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ (۶:۲۳)) "تو ان کا فتنہ نہ رہے گا اور وہ یہ کہیں گے کہ اے ہمارے آقا تیری قسم ہم ہرگز مشرک نہ تھے۔" وہ حقیقت سامنے آ گئی جس کی وجہ سے فتنہ چھٹ گیا یا اس کی روشنی میں فتنہ واضح ہو گیا۔ ان لوگوں نے اپنے ماضی سے مکمل طور پر کٹ کر اللہ وحدہ کی ربوبیت کا اقرار کر لیا لیکن انہوں نے یہ کام اس وقت کیا جب ان کے لئے اقرار مفید نہ تھا۔ اس اقرار باطل سے علیحدگی ان کے لئے مفید نہ رہے گی۔ بلکہ یہ ان کے لئے ایک مصیبت ہو گی اور ان کا یہ اقرار ان کے لئے اب موجب نجات نہ ہو گا۔ وقت جا چکا ہو گا۔ آج تو جزائے اعمال کا دن ہے۔ آج تو آخری فیصلوں کا دن ہے۔ یہ ریمانڈ کا دن نہ ہو گا۔

ان کی اس حالت پر اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ تبصرہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے جب شرک کا ارتکاب کیا اور ان لوگوں کو اللہ کا شریک ٹھہرایا تو انہوں نے اپنے نفوس کے ساتھ جھوٹ اور فریب کا ارتکاب کیا اس لئے کہ اللہ کے ساتھ کسی شریک کا تو دراصل کوئی وجود ہی نہ تھا۔ نہ ان شرکاء کی کوئی حقیقت تھی۔ آج ان سے وہ افتراء غائب ہے۔ انہوں نے حق کا اعتراف اس وقت کیا جب ان کا جھوٹا طلسم غائب ہو گیا۔

(اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (٦: ٢٤))

"دیکھو' انہوں نے کس طرح اپنے اوپر جھوٹ گھڑا' لیکن یہاں ان کے تمام بناوٹی معبود ناپید ہوگئے -" انہوں نے اپنے اوپر جھوٹ بولا ہے - جب انہوں نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو انہوں نے اسی وقت اپنے اوپر جھوٹ بولا اور اپنے آپ کو فریب میں ڈال دیا - اللہ پر افتراء باندھا اور اب ان کے تمام معبود ناپید اور گمشدہ ہیں اور اب تو حشر اور حساب کا دن ہے -

میرے خیال میں اس آیت کی یہی اطمینان بخش تفسیر ہے' کیونکہ منظر قیامت کا ہے اور وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہیں اور ذات باری کی قسم اٹھا کر کہتے ہیں کہ وہ مشرک نہ تھے اس لئے کہ قیامت کے دن ان کا جھوٹ ان کے خلاف ہو گا اس مفہوم میں - کیونکہ قیامت کے دن وہ اللہ پر جھوٹ نہ باندھ سکیں گے اور نہ ارادۃً جھوٹی قسم اٹھا سکیں گے - جن لوگوں نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے کہ وہ عمداً جھوٹ بولیں گے تو وہ اس لئے درست نہیں ہے کہ لا یکتمون اللہ حدیثا کے بموجب وہ قیامت میں اللہ سے تو کوئی بات چھپا نہ سکیں گے - بلکہ قیامت کے اس ہولناک منظر میں ان کی فطرت پاک و صاف ہو جائے گی اور اس سے شرک کی آلائشیں دور ہو جائیں گی - ان کی فطرت سے شرک اور باطل افکار اسی طرح محو ہو جائیں گے کہ وہ اس دن ماضی کا احساس بھی نہ کر سکیں گے - لیکن اللہ ان پر تعجب فرماتا ہے کہ دیکھو انہوں نے دنیا میں اپنی زندگی کس جھوٹ میں بسر کی اور آج آخرت میں ان کے پردۂ خیال میں اس جھوٹ کا کوئی اثر نہیں ہے - (و اللہ اعلم بالمراد - -) بہرحال یہ بھی احتمالات میں سے ایک احتمال ہے -

اگلی آیات میں مشرکین کا ایک دوسرا گروہ اسکرین پر آتا ہے اور اب ان کے کیس کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے - یہ مناظر قیامت میں سے ایک دوسرا منظر ہے - یہ لوگ قرآن کریم کو سنتے ہیں لیکن انہوں نے اپنی قوت مدرکہ کو معطل کر دیا ہے' ان کی فطرت مسخ ہو چکی ہے - یہ لوگ تحریک اسلامی کے معاند ہیں اور اپنے آپ کو بہت ہی بڑی شے سمجھتے ہیں - یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مجادلہ کر رہے ہیں - چنانچہ اس صورت میں وہ آنکھیں بند کرنے اور نفرت کرنے کی وجہ سے اس قرآن کریم پر یہ تبصرہ کرتے ہیں "یہ تو ایک داستان پارینہ کے سوا کچھ نہیں ہے -" اور پھر وہ دوسروں کو بھی اس حقیقت کو سننے اور قبول کرنے سے منع کرتے ہیں اور خود بھی اس سے دور بھاگتے ہیں - ان کے حالات کی یہ تصویر صفحہ کی ایک طرف ہے اور اس صفحے کے دوسری جانب ان کی نہایت ہی مکروہ اور دردناک حالت کو منقش کیا گیا ہے - وہ آگ کے کنارے کھڑے ہیں گرفتار ہیں اور انہیں اس خوفناک انجام کے دھانے پر کھڑا کر دیا جاتا ہے - وہ نہایت ہی ذلت میں چیخ و پکار کرتے ہیں اور نہایت ہی حسرت آمیز انداز میں یہ تمنا کرتے ہیں کہ اگر انہیں دنیا کی طرف لوٹایا جائے تو وہ اپنے موقف میں تبدیلی کر لیں گے جس کی وجہ سے ان کو یہ روز بد دیکھنا پڑا - چنانچہ نہایت ہی حقارت آمیز انداز میں ان کی اس تمنا اور خواہش کو رد کیا جاتا ہے -

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ حَتّٰٓى

إِذَا جَآءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوٓا إِنْ هَٰذَآ إِلَّآ أَسَٰطِيرُ
الْأَوَّلِينَ ﴿٢٥﴾ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۖ وَإِن يُهْلِكُونَ إِلَّآ
أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذْ وُقِفُوا عَلَى النَّارِ فَقَالُوا يَٰلَيْتَنَا
نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِـَٔايَٰتِ رَبِّنَا وَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٧﴾ بَلْ بَدَا لَهُم
مَّا كَانُوا يُخْفُونَ مِن قَبْلُ ۖ وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَإِنَّهُمْ
لَكَٰذِبُونَ ﴿٢٨﴾

"ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمہاری بات سنتے ہیں مگر حال یہ ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس کو کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے (کہ سب کچھ سننے پر بھی کچھ نہیں سنتے)۔ وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں' اس پر ایمان لا کر نہ دیں گے۔ حد یہ ہے کہ جب وہ تمہارے پاس آکر تم سے جھگڑتے ہیں تو ان میں سے جن لوگوں نے انکار کا فیصلہ کر لیا ہے وہ (ساری باتیں سننے کے بعد) یہی کہتے ہیں کہ یہ ایک داستان پارینہ کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اس امر حق کو قبول کرنے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور بھاگتے ہیں۔ (وہ سمجھتے ہیں کہ اس حرکت سے وہ تمہارا کچھ بگاڑ رہے ہیں) حالانکہ دراصل وہ خود اپنی ہی تباہی کا سامان کر رہے ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ کاش تم اس وقت کی حالت دیکھ سکتے جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کئے جائیں گے۔ اس وقت وہ کہیں گے کاش کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں پھر واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔ درحقیقت یہ بات وہ محض اس وجہ سے کہیں گے کہ جس حقیقت پر انہوں نے پردہ ڈال رکھا تھا وہ اس وقت بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آچکی ہو گی' ورنہ اگر انہیں سابق زندگی کی طرف واپس بھیجا جائے تو پھر بھی وہ وہی سب کچھ کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے' وہ تو ہیں ہی جھوٹے۔"

ان کی تصویر کے یہ دو رخ ہیں۔ ایک رخ دنیا سے متعلق ہے جس میں عناد' بغض اور سرکشی کے رنگ بھرے ہوئے ہیں' اور دوسرا رخ آخرت سے متعلق ہے اور اس میں حسرت اور ندامت کے رنگ ہیں۔ قرآن کریم ان دونوں حالتوں کی تصویر کشی نہایت ہی مؤثر اور اشاراتی انداز میں کرتا ہے۔ جامد فطرت پگھل جاتی ہے اور اس میں حرکت اور جوش پیدا ہو جاتا ہے' شاید کہ اس کے اوپر جہالت کی جو تہیں چڑھی ہوئی ہیں وہ دور ہو جائیں اور فطرت کے بند دریچے وا ہو جائیں اور قبل اس کے کہ وقت ختم ہو' وہ راہ راست پر آ جائے۔

(وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِىٓ ءَاذَانِهِمْ وَقْرًا وَإِن يَرَوْا كُلَّ ءَايَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا (٦: ٢٥)) "ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر

تمہاری بات سنتے ہیں مگر حال یہ ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس کو کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے (کہ سب کچھ سننے پر بھی کچھ نہیں سنتے)۔ وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں ' اس پر ایمان لا کر نہ دیں گے ۔"

انسانیت کے یہ ایسے نمونے ہیں کہ بظاہر سنتے ہیں لیکن ان کے دلوں پر پردے ہیں ۔اکنہ کے معنی ہیں غلاف ۔اور یہ غلاف قوت مدرکہ کو بند کر دیتے ہیں ۔الوقر کا مفہوم ہے بوجھ یعنی ان کے کان بھاری ہیں ' اس لئے اس بھارے پن کی وجہ سے وہ سننے کا فریضہ ادا نہیں کر سکتے ۔اس قسم کے لوگ انسانیت کا حصہ ہیں اور ہر دور میں اور ہر جگہ موجود رہتے ہیں ۔ ہر قوم اور ہر قبیلے میں ایسے لوگ ہوتے ہی ہیں ۔ یہ ٹھیک ٹھیک انسان ہوتے ہیں ۔ بظاہر وہ بات سنتے ہیں لیکن سنی ان سنی کر دیتے ہیں ۔ان کے کان گویا بہرے ہیں ۔اپنا فریضہ منصب فطری ادا نہیں کرتے ۔ان کی قوت مدرکہ گویا غلافوں میں لپٹی ہوئی ہے اور اس تک قرآنی مدلولات نہیں پہنچے ۔

(حَتّٰى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (٦ : ٢٥)) "حد یہ ہے کہ جب وہ تمہارے پاس آکر تم سے جھگڑتے ہیں تو ان میں سے جن لوگوں نے انکار کا فیصلہ کر لیا ہے وہ (ساری باتیں سننے کے بعد) یہی کہتے ہیں کہ یہ ایک داستان پارینہ کے سوا کچھ نہیں ۔" ان کی آنکھیں بھی دیکھ رہی ہوتی ہیں لیکن درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی ہوتیں ۔ جو منظر وہ دیکھتی ہیں اس کا ان کے دل و دماغ پر کوئی اثر نہیں ہوتا ۔

سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ اور کیا بات ہے جو انہیں سمجھنے اور قبول کرنے سے روک رہی ہے؟ حالانکہ وہ سننے والے کان ' بینا آنکھیں اور تیز عقل کے مالک ہیں ' تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "مگر ان کا حال یہ ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں جن کی وجہ سے وہ کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی ہے ۔وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں اس پر ایمان لا کر نہ دیں گے ۔"

یوں ان کے بارے میں اللہ کے فیصلے کو بیان کیا جاتا ہے کہ ان کا ادراک اس حقیقت تک نہ پہنچ سکے گا اور نہ ہی اسے سمجھ سکے گا ان کی قوت شنوائی کام چھوڑ دے گی ۔وہ ان کی قوت مدرکہ تک ان کی رہنمائی ہی نہ کرے گی کہ وہ اسے سمجھ سکیں اور قبول کریں چاہے وہ اپنی آنکھوں سے حقائق کو دیکھ رہے ہوں اور دلائل ایمان ان کے سامنے ہوں ۔ ہاں ' ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس فیصلے میں سنت الہیہ کو پڑھنے کی سعی کریں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

(وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا) "جو لوگ ہمارے بارے میں سعی کریں گے ہم انہیں ضرور اپنی راہوں کی طرف لے جائیں گے ۔" اور دوسری جگہ ہے ۔

(وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا (٧) فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (٨) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (٩) وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (١٠) (٩١ : ٧ تا ١٠)) "اور نفس انسانی کی اور اس

ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا' پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیز گاری اس پر الہام کر دی' یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔" (الشمس)

اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ ہر اس شخص کو ہدایت دیتا ہے جو ہدایت پانے کی جدوجہد کر رہا ہو اور ہر اس شخص کو کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے جو اپنے نفس کو پاک اور مطہر کر لے۔ مذکورہ بالا لوگوں کا رویہ یہ رہا کہ انہوں نے قبول ہدایت کے لئے کوئی سعی نہ کی اور انہوں نے قبولیت حق کی فطری قوتوں کو اس طرف متوجہ ہی نہ کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کو قبولیت حق کی توفیق دے دیتا۔ انہوں نے دراصل اپنی فطری قوتوں کو معطل کر دیا اور یوں اللہ تعالیٰ نے ان کے اور سچائی کے درمیان حجاب ڈال دیا۔ ان کے بارے میں سنت الٰہیہ کے مطابق فیصلہ یہ ہوا کہ انہیں ان کے پہلے فعل اور ان کی نیت اور ارادے پر چھوڑ دیا جائے۔ ہر کام اللہ کے حکم اور امر الٰہی سے ہوتا ہے اور اللہ کا امر اور حکم یہ ہے کہ جو بھی جدوجہد کرے اسے راہنمائی فراہم کی جائے اور جو بھی تزکیہ نفس کرے کامیاب ہو۔ اللہ کا حکم یہ ہے کہ اعراض کرنے والوں کے دلوں پر پردے ڈال دے اور وہ سمجھ ہی نہ سکیں۔ ان کے کان بہرے ہو جائیں اور وہ سن ہی نہ سکیں۔ اپنی آنکھوں سے آیات و دلائل دیکھیں اور ہدایت نہ پا سکیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی گمراہی' ان کی جانب سے شرک کا ارتکاب اور ان کی تمام خطا کاریاں اللہ کے ارادے کے نتیجے میں ہیں اور یہ کہ ان کے بارے میں تو اللہ نے پہلے ہی فیصلے کر دیئے ہیں۔ وہ اپنی اس سوچ میں مغالطہ کا شکار ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے سامنے حقیقت پیش فرماتے ہیں۔ ان کے یہ اقوال نقل کر کے ان کا سقم ظاہر فرماتے ہیں۔ ذرا اس آیت پر غور کریں:

(وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۳۵) وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۳۶) (۱۶: ۳۵-۳۶)) (یہ مشرکین کہتے ہیں "اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اس کے سوا کسی اور کی عبادت کرتے۔ اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔" ایسے ہی بہانے ان سے پہلے کے لوگ بھی بناتے رہے ہیں۔ تو کیا رسولوں پر صاف صاف بات پہنچا دینے کے سوا اور بھی کوئی ذمہ داری ہے؟ ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا' اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ "اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔" اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کسی پر ضلالت مسلط ہو گئی۔ پھر ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہو چکا ہے؟) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول پر ناراضگی کا اظہار کیا اور یہ کہ ان کی گمراہی کا فیصلہ اس لئے کر دیا گیا کہ ان پر فریضہ تبلیغ ادا ہو گیا۔ اس کے بعد ان کے طرز عمل کی وجہ سے ان کے ساتھ یہ سلوک ہوا۔

جو لوگ قضا و قدر اور صبر اور اختیار کے مسائل میں اور بندے کے ارادے اور اس کے عمل کے بارے میں فضول مباحث کرتے ہیں اور ان سادہ سے مسائل کو پیچیدہ لاہوتی مباحث بنا دیتے ہیں وہ ان باتوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں جو ان کی عقل میں آتی ہیں - یہ لوگ فرضی و تقدیر کے انداز میں بحثیں کرتے چلے جاتے ہیں 'مگر قرآن کریم کے مثبت' سادہ اور حقیقت پسندانہ طرز فکر کو چھوڑ دیتے ہیں - وہ سادہ حقیقت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ تقدیر الہی کے مطابق ہوتا ہے اور یہ کہ انسان کا ایک طرف مائل ہونا یا دوسری طرف مائل ہونا اس کی اس فطرت میں داخل ہے 'جس پر اللہ نے اسے پیدا کیا ہے - یہ فطرت بھی تقدیر الہی کے مطابق ہے' اور وہ اسی طرح ہے جس طرح تقدیر الہی ہے - انسان کا کسی طرف مائل ہونا اور اس پر دنیا اور آخرت کے نتائج کا مرتب ہونا بھی تقدیر الہی کے حدود کے اندر ہے - تمام امور اللہ کی تقدیر کی طرف لوٹتے ہیں لیکن یہ تمام نتائج انسان کے ارادے پر مرتب ہوتے ہیں اور انسان کا یہ ارادہ بھی تقدیر الہی کا پیدا کردہ ہے - یہ ہے اصل حقیقت اور اس سے آگے اگر کوئی بحث کرتا ہے تو ماسوائے اس کے کہ وہ مزید پیچیدگیوں میں مبتلا ہو اور کچھ حاصل نہ ہو گا -

مشرکین کی صورت حال یہ تھی کہ ان کے سامنے ہدایت کی علامات پیش کر دی گئی تھیں - سچائی کے دلائل واضح کر دیئے گئے تھے اور ایمان کے اشارات ان پر واضح کر دیئے گئے تھے - قرآن کریم میں ان پر انفس و آفاق میں بکھرے ہوئے دلائل جمع کر دیئے گئے تھے - اگر ان کے دل اس طرف متوجہ ہوتے تو صرف قرآنی دلائل ہی اس بات کے لئے کافی و شافی تھے کہ وہ مشرکین کے قلوب کی تاروں کو زمزمہ خیز بنا دیتے اور ان کے خفیہ گوشہائے ادراک کو جگاتے' ان کو زندگی بخشتے اور اس طرح ان کے دل ہدایت کو قبول کر کے لبیک کہتے - لیکن انہوں نے اس مقصد کے حصول کے لئے کوئی زحمت گوارا نہ کی جس سے وہ راہ ہدایت پا لیتے بلکہ انہوں نے اپنی فطرت اور اس کے صحیح رجحانات کو معطل کر دیا - اس طرح ان کے اور اشارات ہدایت کے درمیان پردے حائل ہو گئے - جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تو وہ کھلی آنکھوں کے ساتھ نہ آتے - ان کے کان بھی سننے کے لئے تیار نہ ہوتے - ان کے دل سمجھنے کے لئے تیار نہ ہوتے اور وہ قرآن پر اس طرح تدبر نہ کرتے جس طرح حق اور سچائی کے متلاشی اس پر غور کرتے ہیں بلکہ وہ قرآن کا مطالعہ ہی اس لئے کرتے کہ مجادلہ کریں اور اس کی تکذیب اور اس کے رد کے مواقع تلاش کریں -

(حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (٦: ٢٥)) "حدیہ ہے کہ جب وہ تمہارے پاس آکر تم سے جھگڑتے ہیں تو ان میں سے جن لوگوں نے انکار کا فیصلہ کر لیا ہے وہ یہی کہتے ہیں کہ یہ ایک داستان پارینہ کے سوا کچھ نہیں -" اساطیر' اسطورہ کی جمع ہے - اور اسطورہ کا اطلاق ان کہانیوں پر ہوتا تھا' جن میں خداؤں کے بارے میں خارق عادت کہانیوں کا ذکر ہوتا تھا یا بڑے بڑے لیڈروں' بہادروں اور بت پرستی کے واقعات کا تذکرہ ہوتا تھا عربوں میں زیادہ تر ایرانی بت پرستی کے قصے مشہور تھے کیونکہ وہ عربوں کے قریب تھے -

حقیقت یہ ہے کہ مشرکین اچھی طرح جانتے تھے کہ قرآن کریم کا ان پرانی داستانوں کے ساتھ تعلق ہی نہیں ہے - یہ محض ان کی جانب سے مجادلہ تھا اور وہ قرآن کریم کو رد کرنے اور اس کو جھٹلانے کے لئے حیلے بہانے تلاش کر رہے تھے

اور قرآن سے دور دراز کی باتیں تلاش کر کے ان کے ذریعے قرآن کو رد کرتے تھے ۔ قرآن کریم میں چونکہ رسولوں اور ان کی اقوام کے واقعات و قصص مذکور تھے' نیز اس میں ان اقوام کا بھی ذکر تھا جن کو اللہ نے ہلاک فرمایا تھا تو محض فریب کاری اور نہایت ہی بودے اعتراض اور دور کی کوڑی ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ لاتے تھے ۔ چنانچہ ان نصوص بلکہ پورے قرآن کے بارے میں وہ یہ تبصرہ کرتے "کہ یہ ایک داستان پارینہ کے سوا کچھ نہیں ہے ۔"

لوگوں کو اس قرآن کریم سے دور رکھنے کی سازش کو مزید گہرا کرنے کے لئے اور اسے نہایت ہی پختہ بنیادوں پر استوار کرنے کی غرض سے اور عوام کے ذہنوں میں یہ بٹھانے کی خاطر کہ قرآن کریم ایک داستان پارینہ ہے' مکہ کا ایک دانشور نضر بن حارث اہل فارس کے رستم و اسفندیار کی داستانیں حفظ کرتا اور اس طرح اہل فارس کے دوسرے لیڈروں اور بہادروں کے قصے اور کہانیاں جمع کرتا ۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہی اپنی مجلس قائم کرتا جبکہ حضور ؐ لوگوں کے سامنے قرآن مجید پڑھتے ۔ وہ لوگوں سے کہتا اگر محمد تم پر پرانے لوگوں کے افسانے پڑھتا ہے تو میرے پاس اس کے مقابلے میں زیادہ ادبی مواد ہے ۔ اس کے بعد وہ رستم و اسفندیار کے قصے شروع کر دیتا اور یہ تدبیر وہ اس لئے کرتا تھا کہ لوگ قرآن کو نہ سنیں ۔

یہ لوگ عوام الناس کو قرآن سننے سے بھی منع کرتے تھے' اس لئے کہ اس وقت کی سوسائٹی کے وہ لوگ لیڈر تھے ۔ وہ لوگوں کو ایسے مواقع سے دور رکھتے تھے اس ڈر سے کہ کہیں وہ قرآن کریم کی تلاوت سن کر اس سے متاثر نہ ہو جائیں ۔

(وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْئَوْنَ عَنْهُ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (٦ : ٢٦)) "وہ اس امر حق کو قبول کرنے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور بھاگتے ہیں ۔ (وہ سمجھتے ہیں کہ اس حرکت سے وہ تمہارا کچھ بگاڑ رہے ہیں) حالانکہ دراصل وہ خود اپنی ہی تباہی کا سامان کر رہے ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے ۔" وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ قرآن کریم محض پرانے لوگوں کے قصوں پر مشتمل نہیں ہے اور اس کا پرانے قصوں کے ساتھ مقابلہ کوئی فائدہ نہ دے گا ۔ اگر لوگ قرآن کو سنتے رہے تو اس سے متاثر ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا ۔ قریش کے بڑے بڑے دانشور تو خود اپنے بارے میں یہ خوف رکھتے تھے کہ تلاوت قرآن خود ان کو بھی متاثر کر سکتی ہے ۔ اپنے متبعین کے بارے میں تو انہیں شدید خوف لاحق تھا ۔ اس لئے اس زوردار' پھیلنے والی اور زبردست تحریک اور اہل مکہ کی کمزور اور باطل سوسائٹی کے درمیاں برپا کشمکش میں صرف یہ امر کافی نہ تھا کہ نضر ابن حارث حضور ؐ کے بالمقابل مجلس لگائے اور اس میں اہل فارس کے ادبی شہ پارے پیش کرے ۔ لہٰذا احتیاطی تدابیر کے طور پر وہ اپنے متبعین کو قرآن سننے سے منع کرتے تھے اور خود بھی اپنے آپ کو ایسے مواقع سے دور رکھتے تھے جہاں وہ قرآن کریم سنیں ۔ محض اس خوف سے کہ کہیں وہ خود ہی متاثر نہ ہو جائیں اور اسے قبول ہی نہ کر لیں ۔ اخنس ابن شریق' ابوسفیان ابن حرب اور عمرو ابن ہشام کا قصہ تو بہت ہی مشہور ہے ۔ یہ لوگ قرآن کریم کی اس جاذبیت کا مقابلہ کرتے تھے لیکن قرآن پھر بھی انہیں اپنی طرف کھینچ لاتا تھا ۔ (دیکھئے ابن ہشام جزء اول اور ظلال القرآن پارۂ ششم) ۔

یہ تمام پاپڑ وہ اس لئے بیلتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے متبعین کو قرآن سننے سے بچا سکیں تاکہ وہ اس سے متاثر نہ ہو جائیں اور اسے قبول نہ کر لیں اور یہ کام درحقیقت خود ان کے لئے باعث ہلاکت تھا ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وہ

درحقیقت خود اپنی تباہی کا سامان کرتے ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔"

جو شخص اپنے آپ کو اور دوسروں کو راہ ہدایت' راہ حق اور راہ نجات سے روکے رکھتا ہے وہ دنیا و آخرت دونوں میں خود اپنے آپ کو خسارے اور ہلاکت میں ڈالتا ہے۔ وہ لوگ جو خود اپنے آپ کو اور اپنے متبعین کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں' دراصل وہ مساکین ہیں۔ اگرچہ بظاہر وہ بڑے قہار و جبار اور بڑے بڑے طاغوت نظر آتے ہیں۔ وہ تو دنیا و آخرت میں صرف اپنے اوپر اختیار رکھتے ہیں۔ اگرچہ انہیں اور ان کے متبعین کو دنیا میں بعض اوقات ایک مختصر عرصے کے لئے یہ نظر آتا ہے کہ وہ بہت ہی فائدے میں ہیں اور کامیاب ہیں' لیکن دراصل وہ مفلس ہوتے ہیں۔ اور ان کا آخری انجام کیا ہونے والا ہے تو پھر ذرا تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیں :

(وَلَوْ تَرٰٓی اِذْ وُقِفُوْا عَلَی النَّارِ فَقَالُوْا یٰلَیْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُکَذِّبَ بِاٰیٰتِ رَبِّنَا وَنَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۶:۲۷)) "کاش تم اس وقت کی حالت دیکھ سکتے جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کئے جائیں گے۔ اس وقت وہ کہیں گے کاش کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں پھر واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔" اس دنیا کے مختصر منظر کے بالمقابل دنیائے اخروی کا یہ منظر ہے۔ نہایت ہی رسواکن' شرمساری اور یاس و حسرت کا منظر۔ دنیا میں تو وہ سرکشی کرتے' جھگڑتے اور اسلام کے قریب آنے سے لوگوں کو روکتے اور لمبے چوڑے وعدے کرتے لیکن یہاں ان کے ارمان یہ ہیں جبکہ وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے۔ یہ منظر دیکھنے کے لائق ہو گا۔ یہ آگ پر گرفتار کر کے پیش کئے جائیں گے۔ اب انہیں یہ طاقت ہی نہ ہو گی کہ وہ اعراض اور سرکشی کر سکیں۔ اب نہ وہ جھگڑ سکیں گے اور نہ مغالطہ آرائی کر سکیں گے۔ اس قابل دید منظر میں ان کی جانب سے اس تمنا کا اظہار ہو گا اور اگر آپ اس وقت ہوتے تو وہ یوں گویا ہوں گے "اس وقت وہ کہیں گے کاش کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں پھر واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔"

اب تو وہ جانتے ہیں کہ یہ آیات الٰہیہ تھیں۔ اب وہ تمنا کرتے ہیں کہ وہ دنیا کی طرف لوٹا دیئے جائیں۔ اب تو وہ ان آیات کی تکذیب نہیں کر سکتے لہٰذا اب تو وہ پکے مومن بن جائیں گے لیکن اب کیا ہو سکتا ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

اب یہ لوگ اپنی جبلت کو بھول گئے۔ وہ ایسی جبلت کے مالک ہیں جو مان کر نہیں دیتی اور ان کی یہ بات کہ کاش وہ اگر لوٹا دیئے جائیں تو وہ تکذیب نہ کریں گے اور لازماً ایمان لائیں گے۔ یہ تمنا بھی جھوٹی تمنا ہے یہ وہ تمنا ہے جو ان کی جبلت و حقیقت کے ساتھ لگا نہیں کھاتی۔ اگر ان کی یہ تمنا پوری بھی کر دی جاتی تو بھی وہ ایسا نہ کرتے۔ اور پھر ان کی بات یہ نہ ہوتی اور یہ لوگ یہ بات اس لئے کہیں گے کہ ان کے سامنے ان کے اعمال اور ان کا برا انجام واضح ہو جائے گا جبکہ اس سے قبل وہ اپنے متبعین سے اپنے یہ اعمال اور یہ برا انجام چھپاتے تھے تاکہ ان کو اس فریب میں ڈالے رکھیں کہ یہ حق پرست ہیں اور آخرت میں وہ کامیاب ہونے والے ہیں اور فلاح پانے والے ہیں۔

(بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۶:۲۸)) "درحقیقت یہ بات وہ محض اس وجہ سے کہیں گے کہ جس حقیقت پر انہوں نے پردہ ڈال

رکھا تھا وہ اس وقت بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آچکی ہو گی' ورنہ اگر انہیں سابق زندگی کی طرف واپس بھیجا جائے تو پھر وہی سب کچھ کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے' وہ تو ہیں ہی جھوٹے۔" یہاں اب ان کے بارے میں بات ختم ہو جاتی ہے اور وہ اس بری حالت میں ایک جھوٹے انسان کے طور پر حقارت کے ساتھ پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔

اب ایسے لوگوں کے بارے میں ان کے کچھ مزید رخ سامنے آتے ہیں اور ان کے اس اخروی منظر کے مقابلے میں دو مزید منظر پیش کیے جاتے ہیں۔ایک تو دنیا کا منظر ہے جس میں وہ عزم بالجزم کے ساتھ اس بات کا اظہار کرتے تھے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے اور اللہ کسی کو دوبارہ نہ اٹھائے گا اور کوئی حساب و کتاب نہیں ہے۔اور دوسرا منظر آخرت سے متعلق ہے۔ایک جھلکی جس میں وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے دکھائے جاتے ہیں اور اللہ رب العالمین ان سے باز پرس فرماتے ہیں (اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ (٦: ٣٠)) کیا یہ قیامت حق نہ تھی اور حقیقت نہیں ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس سے وہ ٹوٹ جاتے ہیں بلکہ پگھل جاتے ہیں اور ایک نہایت ہی بدحال اور ذلیل آدمی کی طرح جواب دیتے ہیں (بَلٰى وَ رَبِّنَا (٦: ٣٠)) "ہمارے رب تیری قسم یہ حقیقت ہے۔" اور اب وہ اپنے اعمال کی وجہ سے عذاب الیم سے دوچار ہوتے ہیں۔ایک دوسری جھلکی بھی سامنے آتی ہے۔اچانک وہ گھڑی آ پہنچتی ہے جس کے بارے میں وہ اللہ کے اس "آمنے سامنے" سے بالکل منکر تھے۔اب یہ یاس و حسرت میں ڈوب جاتے ہیں۔اپنے کاندھوں پر اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں اور آخر میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے ترازو میں دنیا کی حقیقت کیا ہے اور آخرت کا مقام کیا ہے؟

وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿٢٩﴾ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۭ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ۭ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿٣٠﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰي مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰي ظُهُوْرِهِمْ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿٣١﴾ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٣٢﴾

"آج یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے۔کاش وہ منظر تم دیکھ سکو جب وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے۔اس وقت ان کا رب ان سے پوچھے گا "کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟" یہ کہیں گے "ہاں اے ہمارے رب' یہ حقیقت ہی ہے۔" وہ فرمائے گا "اچھا' تو

اب اپنے انکار حقیقت کی پاداش میں عذاب کا مزا چکھو۔" نقصان میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے اپنی ملاقات کی اطلاع کو جھوٹ قرار دیا۔جب اچانک وہ گھڑی آجائے گی تو یہی لوگ کہیں گے "افسوس !ہم سے اس معاملے میں کیسی تقصیر ہوئی۔" اور ان کا حال یہ ہو گا کہ اپنی پیٹھوں پر اپنے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے ہوں گے ۔ دیکھو !کیسا برا بوجھ ہے جو یہ اٹھا رہے ہیں۔ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور ایک تماشا ہے۔حقیقت میں آخرت ہی کا مقام ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو زیاں کاری سے بچنا چاہتے ہیں' پھر کیا تم لوگ عقل سے کام نہ لوگے؟ قیامت کی جزاو سزا اور دار آخرت کا عقیدہ اسلامی عقائد و نظریات کی اساس ہے اور ہمیشہ یہ عقیدہ صرف اسلام نے پیش کیا ہے اور عقیدۂ توحید کے بعد اسلامی نظام کا ڈھانچہ اسی پر استوار ہے۔ دین اسلام کے عقائد و نظریات 'اخلاق و طرز عمل' قانون و دستور صرف اسی صورت میں قائم اور استوار ہو سکتے ہیں جب لوگوں کے اندر آخرت کی جوابدہی کا احساس پیدا ہو جائے۔

یہ دین جسے اللہ نے مکمل فرمایا ہے' اور اس دین کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر اپنی نعمتوں کو مکمل کر دیا ہے اسے اللہ نے مسلمانوں کے نظام حیات کے طور پر پسند کر لیا ہے۔جیسا کہ قرآن خود یہ کہتا ہے کہ یہ دین درحقیقت زندگی کا ایک مکمل نظام ہے اور اپنی ساخت میں وہ باہم مربوط اور باہم متعلق ہے۔اس کے اخلاقی اصولوں اور عقائد و نظریات کے درمیان ایک گہرا ربط و تعلق ہے۔اور پھر عقائد و اخلاقیات دونوں کا قانون' دستور اور انتظام ملک سے تعلق ہے۔یہ تمام امور اللہ کے عقیدۂ حاکمیت اور آخرت کی جوابدہی کی اساس پر قائم ہیں۔

اسلامی نظریہ حیات کے مطابق زندگی وہ مختصر عرصہ نہیں ہے جو ایک فرد اس جہان میں بسر کرتا ہے اور نہ زندگی وہ مختصر عرصہ ہے جس میں کوئی قوم زندہ رہتی ہے۔اور نہ زندگی وہ عرصہ معلوم ہے جو اس دنیا میں انسانیت کو دیا گیا ہے اور جسے ہم دیکھ رہے ہیں۔اسلامی تصور حیات کے مطابق زندگی ایک طویل اور نہ ختم ہونے والا عرصہ ہے۔یہ آفاق کائنات میں وسعت پذیر ہے اور تمام جہانوں میں گہرائی تک چلا گیا ہے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے متنوع اور رنگا رنگ ہے اور یہ اس زندگی سے بالکل مختلف ہے جسے آخرت کے منکر یا اس سے غافل لوگ زندگی سمجھتے ہیں' اسے بسر کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بس یہی زندگی ہے اور اس جہان کے بعد کوئی اور جہان نہیں ہے۔اس طرح وہ آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔

اسلامی تصور حیات کے مطابق زندگی بہت ہی وسیع ہے۔اس میں یہ زمانہ بھی شامل ہے جسے ہم دیکھ رہے ہیں'یعنی دنیا۔وہ اخروی زمانہ بھی اس میں شامل ہے جسے اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔اس طویل اخروی زندگی کے مقابلے میں یہ زندگی اس قدر قصیر ہے کہ یہ ساعۃ من نہار ہی کہی جا سکتی ہے۔یعنی دن کا ایک حصہ۔

مکانیت کے اعتبار سے یہ تصور اس قدر وسیع ہے کہ وہ اس جہان اور اس کرۂ ارض کے مقابلے میں مزید کروں اور جہانوں کا قائل ہے۔وہ ایک ایسی جنت کا قائل ہے جو آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ وسیع ہے۔جہنم بھی اس قدر وسیع ہے کہ اس کے پیٹ کو ان تمام انس و جن سے نہیں بھرا جا سکتا جو آغاز انسانیت سے اس دنیا میں آباد ہیں اور یہ آبادی لاکھوں سالوں پر مشتمل ہے۔

پھر یہ تصور نامعلوم جہانوں تک وسیع ہو جاتا ہے۔اس جہان سے آگے کئی جہان ہیں جن کے بارے میں صرف ذات باری کو علم ہے اور ہم اس کے بارے میں وہی کچھ اور صرف اسی قدر جانتے ہیں جس قدر اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے۔اور یہ اخروی زندگی موت سے شروع ہو کر دار آخرت تک جا پہنچتی ہے۔عالم موت اور عالم آخرت دونوں غیبی جہان ہیں اور

ان میں انسانی وجود اس صورت میں آگے بڑھتا ہے جس کی صحیح کیفیت صرف اللہ کے علم میں ہے۔

یہ زندگی بھی وسعت اختیار کرتی ہے' یہ جہان جسے ہم دیکھ رہے ہیں اس سے آگے بڑھتی ہے اور آخرت میں جنت و دوزخ میں بھی رواں دواں نظر آتی ہے۔ یہ اس زندگی کے مختلف رنگ ہیں اور اس دنیا کی زندگی میں اس کی صورتیں اور ذائقے مختلف ہیں۔ آخرت میں بھی اس کے رنگ ڈھنگ ہیں لیکن دنیا کی یہ پوری زندگی اخروی زندگی کے مقابلے میں اس قدر بے قیمت ہے جس طرح دنیا کے مقابلے میں مچھر کا ایک پر بے قیمت ہے۔

یہ ہے اسلامی تصور حیات کے مطابق انسانی شخصیت 'جس کا وجود زمانے کی حدود سے باہر پھیلا ہوا ہے۔ جس کا عمل دخل مکان سے آگے آفاق کائنات میں وسعت رکھتا ہے اور جس کا مرتبہ اس کائنات میں پائے جانے والے عالمین سے زیادہ گہرا ہے۔ اس کا تصور اس پوری کائنات تک وسیع ہے اور پورے انسانی وجود کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اس کا ذوق حیات بہت ہی وسیع ہے۔ اس میں انسانیت کی اہمیت ہے۔ انسانی روابط کی اہمیت ہے اور انسانی اقدار کی اہمیت ہے۔ جس طرح یہ تصور وسیع ہے جو زمان و مکان کے حدود و قیود سے ماوراء ہے' لیکن جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کی سوچ خود اس کائنات کے بارے میں نہایت ہی محدود اور کمزور ہے۔ انسانی تصور حیات کے بارے میں ان کی سوچ بہت ہی محدود ہے۔ وہ اپنے آپ کو 'اپنی اقدار حیات کو اور اپنے تصورات کو اس محدود دنیا کی تنگنائی تک محدود کرتے ہیں۔

اس نظریاتی اختلاف کی وجہ سے پھر اقدار حیات ' زندگی کے تفصیلی نظام اور عملی شکل میں اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی کس قدر جامع اور مکمل نظام زندگی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نظام کی تشکیل میں عقیدہ آخرت کا کس قدر دخل ہے۔ نظریات و تصورات کے اعتبار سے 'اخلاق اور طرز عمل کے اعتبار سے اور نظام قانون اور نظام دستور کے اعتبار سے۔

وہ انسان جو اس طویل زمانے 'اس وسیع و عریض کائنات اور اس کے اندر پائے جانے والی تمام مخلوقات کے ساتھ بس رہا ہے' یقیناً اس انسان سے مختلف ہے جو اس تنگ دنیا کے غار میں بند ہے اور وہ اس تنگ غار میں بھی دوسرے انسانوں کے ساتھ برسرپیکار ہے۔ اس کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ اگر اس دنیا میں وہ کسی چیز سے محروم رہ گیا تو عالم آخرت میں وہ اس سے بہتر پائے گا اور اگر اس دنیا میں اسے کسی عمل کا اجر نہ ملا تو اسے آخرت میں یقیناً بہتر اجر ملے گا اگر اس کے اندر یہ یقین پیدا ہو جائے تو یہ شخص اس دنیا کے لوگوں اور مفادات کے بارے میں بہت ہی سخت رویہ اختیار کرے گا۔

جس قدر انسان کی سوچ وسیع ہوتی ہے اور حقائق کا گہرا ادراک اسے حاصل ہوتا ہے' اسی قدر اس کی شخصیت بڑی ہوتی ہے۔ اس کی ترجیحات بلند ہوتی ہیں' اس کا شعور بلند ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کے اخلاق اور اس کا طرز عمل بھی بہت ہی پاکیزہ بن جاتا ہے اور ایسے شخص کا طرز عمل ان لوگوں کے مقابلے میں بہت ہی بلند ہوتا ہے جو سوراخوں میں بند ہوتے ہیں۔ جب ایسے وسیع سوچ رکھنے والے کسی فرد کی سوچ میں عقیدۂ آخرت اور اخروی جزاء و سزا کی سوچ داخل ہو جاتی ہے تو اس کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ اس کی سوچ میں نفاست اور پاکیزگی آ جاتی ہے۔ اس کا دل بھلائی اور جزائے اخروی کے راستے میں خرچ کے لئے تیار ہو جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور اس پر اخروی جزاء مرتب ہو گی۔ یوں اس کا اخلاق اور اس کا طرز عمل صالح ہو جاتا ہے اور وہ پختہ کردار کا مالک بن جاتا ہے۔ یہ پختگی اس وقت تک رہتی ہے جب تک اس کے دل و دماغ پر یہ عقیدہ چھایا رہتا ہے۔ ایسے لوگ ہر وقت اصلاح اور بھلائی کے لئے کوشاں رہتے ہیں

کیونکہ وہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر وہ خاموش رہے تو نہ صرف یہ کہ ان کی دنیا فساد کا شکار ہوگی بلکہ آخرت میں بھی وہ خسران کا شکار ہو جائیں گے۔

جو لوگ حیات اخروی کے بارے میں افتراء باندھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کو اخروی زندگی کی طرف بلانا اس جہاں کے سلسلے میں ایک منفی رویہ ہے۔اس کے نتیجے میں لوگ اس دنیا سے لاتعلق ہو جاتے ہیں اور پھر وہ اس دنیا کو خوبصورت بنانے اور اس کی اصلاح کے لئے جدوجہد نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے اقتدار پر مفسدوں کا قبضہ ہو جاتا ہے کیونکہ ان نیک لوگوں کی نظریں صرف آخرت ہی پر لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ جو لوگ اسلام پر یہ الزام دھرتے ہیں وہ جہالت میں مبتلا ہیں۔ یہ لوگ اسلام کے نظریہ آخرت اور اہل کنیسہ کے نظام رہبانیت اور ترک دنیا کے اندر فرق نہیں کرتے۔ اسلامی تصور حیات کے مطابق آخرت کا تصور یہ ہے کہ دنیا آخرت کے لئے ایک مزرعہ ہے اور دنیا میں ہم اس کھیت میں جو بوئیں گے وہی آخرت میں کاٹیں گے۔ اسلام کا نظریہ جہاد بھی تو اس دنیا کی اصلاح کے لئے ہے۔ یہ اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ اس دنیا سے شر و فساد کو بالکلیہ مٹا دیا جائے اور اس جہان میں جو لوگ اللہ کے حق حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ پر دست درازی کرتے ہیں ان کا ہاتھ پکڑا جائے۔ یہاں تمام ظالم طاغوتوں کی حکومت کو ختم کر کے کرۂ ارض پر عادلانہ نظام قائم کیا جائے جس میں تمام انسانوں کی بھلائی اور خیر ہو' اور یہ تمام کام فلاح اخروی کے لئے کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے مجاہدین فی سبیل اللہ کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے ہیں اور باطل کے ساتھ اس کشمکش میں وہ جو کھوتے ہیں وہاں اللہ انہیں اس کا عوض ادا کرتا ہے۔ انہوں نے اس کی راہ میں جو اذیت اٹھائی اس کے بدلے انہیں راحت دیتا ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ایسا نظریہ حیات جس کی سوچ یہ ہو' وہ انسانی زندگی معطل کر کے اسے متعفن بنا دے؟ یا یہ زندگی فساد زدہ اور خلفشار میں مبتلا ہو' یا اس میں ظلم اور سرکشی کا دور دورہ ہو اور کوئی نہ ہو کہ ظالم کا ہاتھ روکے۔ یا وہ زندگی کو پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ حالت میں چھوڑ دے جبکہ ایسے نظریے کے حامل لوگوں کی نظریں آخرت پر لگی ہوں اور وہ آخرت میں جزاء کے طالب ہوں۔

یہ درست ہے کہ تاریخ کے بعض ادوار میں لوگ منفی سوچ کے حامل رہے ہیں۔ وہ شر و فساد' ظلم و سرکشی کے داعی رہے ہیں۔ پسماندگی اور جہالت ان کی زندگی پر چھائی رہی ہے اور یہ لوگ اپنے ان حالات کے ساتھ ... اسلام کے مدعی بھی رہے ہیں۔ لیکن ان کے یہ حالات اسلام کی وجہ سے نہ تھے بلکہ اسلام کے بارے میں ان کی سوچ صحت مند نہ تھی۔ ان کا تصور اسلام بگڑا ہوا تھا۔ وہ جادہ مستقیم منحرف ہو گئے تھے اور آخرت پر انہیں کوئی یقین نہ رہا تھا۔ ان کا ایمان متزلزل تھا۔ ان کے یہ حالات اس لئے نہ تھے کہ وہ حقیقتاً دین پر چل رہے تھے اور انہیں پورا یقین تھا کہ انہوں نے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ہرگز ایسے حالات میں زندگی بسر نہ کرتے جن میں انہوں نے پوری زندگی گزار دی کیونکہ جو شخص حقیقت دین کو پالیتا ہے وہ ان لوگوں کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ یعنی منفی سوچ کا حامل پسماندہ اور شر و فساد پر راضی۔

ایک مسلمان اس دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو اس دنیا سے بہت ہی اونچا تصور کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس حقیر دنیا سے بہت ہی عظیم سمجھتا ہے۔ وہ اس دنیا کی پاکیزہ چیزوں کو کام میں لاتا ہے یا وہ جائز اور حلال چیزوں سے بھی دامن پاک رکھتا ہے محض اپنی اخروی فلاح کے لئے۔ وہ دنیا کی قوتوں کی تسخیر اور دنیاوی زندگی کی ترقی اور نشوونما کے لئے پوری کوشش کرتا ہے لیکن اس نقطہ نظر سے کہ یہ جدوجہد اس پر اس کے منصب خلافت کی رو سے بطور

فریضہ عائد ہوتی ہے اور یہ کہ اس کا فرض ہے کہ وہ اس جہان میں شر و فساد اور ظلم و سرکشی کے خلاف جہاد کرے اور اس جہاد کی راہ میں جان و مال کی قربانی دے تاکہ اسے فلاح اخروی حاصل ہو۔ اس کا دین اسے یہ تعلیم دیتا ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور آخرت تک پہنچنے کا واحد راستہ یہ دنیا ہے۔ اس دنیا سے ہو کر ہر شخص کو آخرت تک پہنچنا ہے۔ لیکن آخرت کے مقابلے میں دنیا نہایت ہی حقیر اور کم ہے۔ بہرحال دنیا بھی ایک محدود نعمت ہے۔ اور اس محدود نعمت کو انسان عبور کر کے لامحدود نعمتوں میں داخل ہوتا ہے۔

اسلامی نظام کا ہر جزء اخروی زندگی کے لئے ایک سیڑھی کا کام دیتا ہے۔ اسلامی نظام کی اس سوچ کی وجہ سے انسان کے تصور میں وسعت، حسن اور بلندی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سوچ کے نتیجے میں رفعت، پاکیزگی اور رواداری پیدا ہوتی ہے اور انسان اس راہ کے لئے پرجوش ہو جاتا ہے۔ وہ محتاط اور متقی بن جاتا ہے اور انسانی جدوجہد اور زندگی میں خوشی، پختگی اور اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی زندگی صرف تصور آخرت پر استوار ہو سکتی ہے اور اسی لئے قرآن کریم نے اول سے آخر تک جگہ جگہ خوف آخرت اور یقین قیامت پر زور دیا ہے اور حقیقت آخرت کے مضامین و مناظر کو پیش کیا ہے۔

عرب ایک گھمبیر جاہلیت میں ڈوبے ہوئے تھے اور اسی جاہلیت کی وجہ سے ان کی سوچ اور ان کے شعور کی تنگ حدود میں عالم آخرت کا تصور نہیں سماتا تھا اور وہ اس دنیا کے علاوہ کوئی اور بات نہ سوچ سکتے تھے۔ وہ صرف اسی دنیا کو دیکھ سکتے تھے جو ان کی نظروں کے سامنے تھی۔ وہ اپنی شخصیت اور اپنی فکر کو اس محدود دنیا کی حدود کے آگے نہ بڑھا سکتے تھے اور نہ ہی کائنات کی مزید وسعتوں کے بارے میں کوئی تصور کر سکتے تھے۔ ان کی سوچ اور ان کا شعور بالکل حیوانی سطح تک تھا اور وہ بعینہٖ اس طرح سوچتے تھے جس طرح جدید جاہلیت سوچتی ہے حالانکہ دور جدید کے لوگ اپنے آپ کو علمی اور سائنسی اعتبار سے ترقی یافتہ کہتے ہیں۔ چنانچہ عربوں کی سوچ یہ تھی۔

(وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ (۶ : ۲۹)) "آج یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے۔"

یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی کہ مذکورہ بالا نظریہ حیات اور اعتقادات کے نتیجے میں ایک پاکیزہ، شریفانہ اور بلند مرتبہ زندگی وجود میں نہیں لائی جا سکتی۔ شعور اور تصور کے یہ محدود دائرے انسان کو گرا کر اسے مٹی میں ملا دیتے ہیں اور اس کی سوچ کو جانوروں کی طرح محسوسات تک محدود کر دیتے ہیں۔ جب انسان اس محدود دنیا کے اندر بند ہو جاتا ہے تو اس کے نفس کے اندر دنیا کی بھوک پیدا ہو جاتی ہے اور دنیاوی وسائل کے بارے میں حرص اور آز پیدا ہو جاتی ہے اور انسان دنیا کی اس مال و متاع کا بندہ بن جاتا ہے۔ جس طرح شہوت پرستیاں جب بے لگام ہو جائیں تو خرمستیاں کرتی ہیں اور بے روک ٹوک اور بغیر ٹھہراؤ کے اور بغیر کسی حدود کے زیادہ ہی ہوتی رہتی ہیں۔ پھر اگر یہ خواہشات اور شہوات پوری نہیں ہوتیں تو انسان اپنے آپ کو محروم تصور کرتا ہے کیونکہ اسے کسی اخروی اجر کی بھی امید نہیں ہوتی، اگرچہ وہ نہایت ہی گری ہوئی کیوں نہ ہوں اور وہ نہایت ہی چھوٹی خواہشات کیوں نہ ہوں اور ان کی نوعیت محض حیوانی خواہشات کی ہی کیوں نہ ہو۔

آج دنیا کی جو صورت حال ہے اور اس کے ردعمل میں آج لوگوں کا جو طرز عمل ہے صرف دنیا کے اس محدود دائرے کو پیش نظر رکھ کر تشکیل پاتا ہے' جس میں لوگوں کے پیش نظر صرف زمان و مکان کا محدود دائرہ ہوتا ہے جس میں عدل و انصاف اور ہمدردی اور رحم دلی کا کوئی نام و نشان نہیں ہے' جس میں ہر انسان دوسرے انسان کے ساتھ بر سر جنگ ہے' جس میں ہر طبقہ دوسرے طبقے سے بر سرپیکار ہے' جس میں ایک نسل دوسری نسل کی بیخ کنی میں مصروف ہے اور سب انسان جنگل کے جانوروں کی طرح اس دنیا کے جنگل میں آزاد پھر رہے ہیں۔ وحشیوں کی طرح جس کے جی میں جو آتا ہے کرنے پر آمادہ ہے۔ یہ مناظر آج کی مہذب دنیا میں رات اور دن ہم دیکھتے ہیں اور ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ یہ سب کے سب دنیا کے اس محدود تصور کی وجہ سے ہیں۔

ذات باری کو ان سب حالات کا علم تھا کہ وہ امت جسے پوری انسانیت کی نگرانی کا فریضہ سپرد کیا جانا تھا' اور جس کے فرائض میں یہ بات بھی شامل تھی کہ پوری انسانیت کو وہ مقام بلند تک پہنچا دے اور اسے اس طرح ترقی دے کہ اس میں انسان کا انسانی پہلو اپنی حقیقی شکل میں نمودار ہو جائے۔ اپنے یہ فرائض اس وقت تک سرانجام نہیں دے سکتی جب تک وہ دنیا کے اس محدود دائرے سے باہر نہیں آ جاتی۔ جب تک اس کے تصورات اور اس کی اقدار اس محدود غار سے نکل کر آفاقی نہیں بن جاتے اور جب تک خود یہ امت دنیا کی تنگ نائیوں سے نکل کر آخرت کی وسعتوں کی سیر نہیں کرتی۔ یہ وہ سبب ہے جس کی وجہ سے قرآن نے عقیدۂ آخرت پر بہت ہی زور دیا ہے۔ ایک تو اس لئے کہ یہ ایک حقیقت ہے جو آنے والی ہے' اور قرآن کریم کا نزول اس لئے ہوا ہے کہ وہ حقائق بیان کرے۔ دوسرے اس لئے کہ اس عقیدے کے سوا کوئی انسان مکمل انسان ہی نہیں بن سکتا۔ نہ تصورات و عقائد کے اعتبار سے' نہ اخلاق اور طرز عمل کے اعتبار سے اور نہ اپنے نظام قانون اور نظام دستور کے اعتبار سے۔

یہی وجہ ہے کہ اس لہر میں اس قدر شدید اتار چڑھاؤ ہے۔ اور اس میں ایک ایسی خوفناک فضا پائی جاتی ہے جس سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان خوفناک مناظر کی بابت اللہ کو علم تھا کہ وہ انسان پر بہت ہی اثرانداز ہوتے ہیں اور اس سے انسان کے دل و دماغ کے دریچے وا ہو جاتے ہیں۔ انسان کے اندر قبولیت حق کی جو فطری استعداد ودیعت کی گئی ہے وہ جاگ اٹھتی ہے۔ اس کے اندر حرکت پیدا ہو جاتی ہے' وہ زندہ انسان نظر آتا ہے اور ہر وقت سچائی کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک عظیم سچائی کا اظہار ہے۔

(وَ لَوْ تَرٰى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (۶ : ۳۰) "کاش وہ منظر تم دیکھ سکو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے۔ اس وقت ان کا رب ان سے پوچھے گا "کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟" یہ کہیں گے "ہاں اے ہمارے رب' یہ حقیقت ہی ہے۔" وہ فرمائے گا "اچھا' تو اب اپنے انکار حقیقت کی پاداش میں عذاب کا مزا چکھو۔" یہ ہے ان لوگوں کا انجام جو کہتے تھے :۔

"جو کچھ ہے بس ہماری دنیا کی زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے۔" یہ ایک نہایت ہی برا' توہین آمیز اور شرمسار کنندہ منظر ہے۔ یہ لوگ بارگاہ الٰہی میں کھڑے ہیں' وہ یہاں پیش ہونے کی تکذیب کرتے

تھے - اب وہ اس موقف سے ہل بھی نہیں سکتے - یوں کھڑے ہیں جس طرح باندھے ہوئے ہیں اور سامنے خوفناک انجام ہے - ان سے پوچھا جاتا ہے - "کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟"

یہ سوال ہی نہایت شرمسار کرنے والا ہے - سوال سنتے ہی مارے شرم کے انسان پسینے سے شرابور ہو جاتا ہے - اب وہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں؟ "ہاں ہمارے رب یہ حقیقت ہے -" اس حقیقت کو وہ ایسے وقت تسلیم کرتے ہیں جبکہ وہ باری تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہیں اور ایک ایسی جگہ کھڑے ہیں جس کا وہ بڑی سختی سے انکار کرتے تھے - اب نہایت ہی شاہانہ انداز میں اور نہایت ہی مختصر فیصلے میں اور نہایت ہی خوفناک انداز میں ان کا انجام بتا دیا جاتا ہے - عالم بالا سے نہایت ہی سری فیصلہ آجاتا ہے لیکن فائنل ! "اچھا تو اب اپنے انکار حقیقت کی پاداش میں عذاب کا مزا چکھو -" یہ انجام ان لوگوں کا بالکل مناسب انجام ہے جنہوں نے اپنے اوپر اسلام کے وسیع تصور حیات کے دروازے بند کر لیے ہیں اور اس تصور کی وسعتوں کو چھوڑ کر وہ محسوسات کے تنگ دائرے میں بند ہو چکے ہیں' جو گوشت و پوست کی دنیا سے بلند ہو کر انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنا نہیں چاہتے اور زمین اور مادے کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں - انہوں نے اپنی پوری زندگی کے نظام کو ایک گرے پڑے اور کمزور تصور پر استوار کر لیا ہے - یہ لوگ اس قدر گر گئے ہیں کہ انہوں نے خود اپنے آپ کو اس عذاب کا مستحق بنا لیا ہے' جو ان لوگوں کی طبیعت اور مزاج سے زیادہ مناسب ہے جو قیام قیامت کے منکر ہیں' جنہوں نے اس قدر گھٹیا زندگی کو اختیار کر لیا ہے اور جو اس قدر گرے ہوئے خیالات کے حامل ہیں - اس فیصلے پر جس منظر کا خاتمہ ہوتا ہے اس کی تکمیل ان خوفناک ریمارکس کے ساتھ ہوتی ہے' جو رعب و داب میں شان باری کے شایان شان ہیں - فرماتے ہیں :

(قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا

عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا (٦: ٣١)) "نقصان میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے اپنی ملاقات کی اطلاع کو جھوٹ قرار دیا - جب اچانک وہ گھڑی آجائے گی تو یہی لوگ کہیں گے "افسوس ! ہم سے اس معاملے میں کیسی تقصیر ہوئی -" یقیناً یہ عظیم خسارہ ہو گا' دنیا میں بھی انہوں نے گھٹیا اور نچلے درجے کی زندگی گزاری اور آخرت میں تو حال وہ ہو گا جس کا تذکرہ ہوا - اب اچانک وہ گھڑی آپہنچی جس کی توقع ان غفلت شعاروں کو نہ تھی اور جو اسے شمار ہی میں نہ لاتے تھے - لیکن "جب وہ گھڑی آجائے گی تو یہی لوگ کہیں گے "افسوس کہ اس معاملے میں ہم سے کیسی تقصیر ہوئی -"

اب ان لوگوں کا اگلا منظر ملاحظہ فرمائیں - یہ لوگ یوں نظر آتے ہیں جس طرح بار برداری کے ایسے جانور جن پر بھاری بوجھ لدا ہو - (وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ (٦: ٣١) "اور ان کا حال یہ ہو گا کہ اپنی پیٹھوں پر اپنے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے ہوں گے -" بلکہ جانور تو ان کے مقابلے میں بہتر ہیں کیونکہ یہ بار برداری سے متعلق ہیں اور بوجھ اٹھاتے ہیں لیکن یہ لوگ جرائم کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں گے - جانور اپنے بوجھ کو منزل تک پہنچا کر آرام کرتے ہیں اور یہ لوگ گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے وارد جہنم ہوں گے اور ان کو تو مجرم قرار دے کر وہاں بھیجا جائے گا -

(اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ (٦: ٣١)) دیکھو ! کیسا برا بوجھ ہے جو یہ اٹھا رہے ہیں -" اب اس پیراگراف کا

آخری بند آتا ہے 'خسارے اور ہلاکت کے اس منظر میں اور خوف و ہراس کے ان حالات میں بات ختم ہوتی ہے۔ اللہ کے ترازو میں ایک طرف دنیا کا وزن ہے اور دوسری جانب آخرت کی قدروقیمت رکھی جاتی ہے اور اقدار کو یوں تولا جاتا ہے :

(وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (٦ : ٣٢)) "دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور ایک تماشا ہے۔ حقیقت میں آخرت ہی کا مقام ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو زیاں کاری سے بچنا چاہتے ہیں۔ پھر کیا تم لوگ عقل سے کام نہ لوگے؟) اللہ کے پیمانے کے مطابق حیات دنیا اور حیات اخروی کا یہ وزن ہے اور یہ حقیقی وزن ہے۔ اس چھوٹے سے کرے پر جس کا نام زمین ہے۔ ایک گھنٹے کی زندگی کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے۔ یہ لہو و لعب ہی ہو سکتا ہے۔ خصوصاً جب اس کا موازنہ عالم آخرت کی طویل اور ابدی زندگی سے کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ عالم آخرت کے مقابلے میں اسے لہو و لعب ہی کہا جا سکتا ہے اس لئے کہ وہ ابدی اور دوامی زندگی ہے اور جنت بہت ہی کشادہ ہے۔

یہ تو ہے اس دنیا کی حقیقی قدروقیمت بمقابلہ آخرت لیکن اسلامی تصور حیات نے اس مختصر دنیا کو بھی مہمل نہیں چھوڑا اور نہ ہی اس کے ساتھ منفی رویہ اختیار کیا ہے اور نہ ہی ترک دنیا کی تعلیم دی ہے۔ تصوف اور زاہدانہ زندگی کے بعض مناظر میں جو ترک دنیا اور رہبانیت نظر آتی ہے اس کا سرچشمہ اسلامی تصور حیات نہیں ہے۔ یہ چیزیں اسلامی تصور حیات میں کنیسہ اور رہبانیت کے راستے داخل ہوئی ہیں یا اہل فارس کے بعض اداروں سے در آئی ہیں یا بعض ہندوانہ اور یونانی تصورات کی وجہ سے آئی ہیں۔ اس وقت جب دوسرے معاشروں کی ثقافتوں کو اسلامی معاشرے میں منتقل کیا گیا۔

اسلامی تصور حیات کے مطابق عملی زندگی کا مکمل نمونہ صحابہ کرام تھے۔ انہوں نے دنیا کے حوالے سے کوئی منفی رویہ اختیار نہیں کیا اور نہ ہی ترک دنیا کا راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے اپنے نفوس کے اندر پائے جانے والے شیطانی نفس پر قابو پایا۔ انہوں نے کرۂ ارض پر غالب نظام جاہلیت کو مغلوب کیا۔ ان نظاموں میں حق حاکمیت خدا کے بجائے دوسرے سرداروں اور بادشاہوں کو حاصل تھا۔ صحابہ کرام میزان الٰہی کے مطابق اس دنیاوی زندگی کی اصل قدروقیمت بھی سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی میں آخرت کے لئے کام کیا اور اس دنیا کے حوالے سے بھی مثبت رویہ کا اختیار کیا۔ انہوں نے معاملات حیات میں سرگرمی سے حصہ لیا اور جوش و خروش کے ساتھ معاملات دنیا طے کئے اور دنیاوی زندگی کے ہر پہلو پر انہوں نے کام کیا۔ لیکن صحابہ کرام کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے دنیا کی حقیقت کی تعلیم نے بہت ہی فائدہ دیا۔ اس لئے وہ دنیا ہی کے بندے نہ بنے بلکہ انہوں نے آخرت کے لئے بھی کام کیا۔ وہ دنیا پر سوار تھے ' دنیا ان کے اوپر سوار نہ تھی۔ انہوں نے دنیا کو اپنا غلام بنا کر اسے ذلیل کیا اور خود دنیا کے غلام بن کر انہوں نے دنیا کی سلطنت کی ماتحتی اختیار نہ کی۔ وہ اس دنیا پر اللہ کی جانب سے نائب اور خلیفہ رہے۔ انہوں نے حق خلافت خوب ادا کیا اور اس دنیا کی خوب تعمیر کی۔ اس کی خوب اصلاح کی لیکن انہوں نے یہ سب رضائے الٰہی کے لئے کیا اور اجر اخروی کی امید پر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دنیا کے میدان میں بھی اہل دنیا اور دنیا پرستوں سے آگے بڑھ گئے اور آخرت کے میدان میں تو وہ تھے ہی ان سے آگے۔

آخرت بے شک پردۂ غیب میں مستور ہے اس لئے جو شخص آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کی سوچ وسیع اور اس

کا ادراک بلند ہوتا ہے اور جو لوگ عقل رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ اچھا راستہ ہے۔ ’’حقیقت میں آخرت ہی کا مقام ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو زیاں کاری سے بچنا چاہتے ہیں۔ پھر کیا تم عقل سے کام نہ لو گے؟‘‘

جو لوگ آج کے دور میں آخرت کے منکر ہیں اور اس لئے منکر ہیں کہ وہ پردۂ غیب میں مستور ہے' وہ دراصل پرلے درجے کے جاہل ہیں حالانکہ وہ دعویٰ علم کا کرتے ہیں اور یہ لوگ جس علم کا دعویٰ کرتے ہیں وہ انسانی علم ہے اور انسانی علم میں آج تک کوئی ایسی حقیقت سامنے نہیں آئی ہے کہ اسے آخری حقیقت کہا جا سکے۔ اگر کوئی حقیقت سامنے آئی ہے تو وہ یہ ہے کہ ہمیں غیب کا کوئی علم نہیں ہے اور غیب ہم سے مخفی ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۵۹ ایک نظر میں

اس سورہ کی پر تلاطم موجوں میں سے اس موج میں روئے سخن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دلجوئی فرماتے ہیں کہ آپ ؐ اس رویے سے پریشان نہ ہوں جو آپ ؐ کی جانب آپ ؐ کی قوم نے اختیار کر رکھا ہے۔ آپ ؐ کی قوم آپ ؐ کو صادق و امین مانتی ہے' اس لئے یہ لوگ آپ ؐ کو جھوٹا نہیں سمجھتے بلکہ وہ اصرار اس بات پر کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی آیات کو نہ مانیں گے اور ایمان نہ لائیں گے۔ اس لئے نہیں کہ وہ حضور ؐ کو جھوٹا سمجھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ کچھ دوسری وجوہات سے وہ اسلامی نظریہ حیات کا انکار کرتے ہیں۔ آپ کی تسلی کے لئے آپ کے سابق بھائیوں اور رسولوں کے قصے اور واقعات کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا ہے کہ ان کو آپ سے زیادہ اذیت دی گئی لیکن انہوں نے صبر سے کام لیا اور مشکلات کو انگیز کیا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح و کامرانی عطا فرمائی اور یہ سب کچھ سنت الٰہیہ کے اصولوں کے مطابق ہوا جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور اطمینان دلایا جاچکا تو پھر آپ کے سامنے اللہ تعالیٰ دعوت اسلامی کے بارے میں ایک اہم حقیقت برائے غور رکھتے ہیں۔ وہ یہ کہ دعوت اسلامی کا کام سنت الٰہیہ کے مطابق اس جہاں میں چلتا رہتا ہے اور داعی کا کردار اس میں صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ دعوت کو مخاطبین تک پہنچائے اور بات کرتا چلا جائے۔ تمام امور کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے' وہ اس جہان کو جس طرف چاہے موڑ دے۔ داعی کا کام بس صرف یہ ہے کہ وہ احکام الٰہی کے مطابق اپنی جدوجہد جاری رکھے اور ایک قدم بھی اپنی راہ سے ادھر ادھر نہ ہو اور خود اللہ کو تجاویز دینا نہ شروع کر دے۔ اگر داعی بذات خود حضور اکرم ؐ ہوں تو انہیں بھی اس کی اجازت نہیں ہے۔ نہ داعی کا یہ کام ہے کہ وہ مخالفین اور مکذبین کی تجاویز پر غور کرے نہ عوام الناس کے کام پر غور کرے کہ دعوت کا منہاج یہ ہونا چاہئے اور نہ ہی وہ ان کی جانب سے دلائل و معجزات کا مطالبہ مانے۔ اس لئے کہ زندہ دل لوگ تو اس کی بات سنیں گے اور قبول کریں گے' لیکن جن لوگوں کے دل مرچکے ہیں وہ ہرگز اس کی بات قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ لوگوں کو اسی طرح مردہ رہنے دیتا ہے یا انہیں زندگی بخشتا ہے۔ قیامت اور حشر تک اللہ کی یہ سنت جاری رہے گی۔

یہ لوگ اقوام سابقہ کی طرح آیات و معجزات طلب کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اگرچہ ہر قسم کے معجزات کے صدور پر قادر ہے' لیکن وہ حکیم ہے' اور وہ ان معجزات کا صدور اپنی حکمت کی بناء پر نہیں کرتا۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جاتا ہے کہ اگر آپ پر یہ صورت حال شاق گزر رہی ہے تو پھر اگر آپ کے اندر کوئی طاقت ہے تو آپ خود کسی معجزے کا بندوبست کریں۔ اللہ تو تمام مخلوقات کا خالق ہے۔ وہ تمام مخلوق کے بھیدوں کا جاننے والا ہے' ان کے مزاج اور صلاحیتوں کو خوب جانتا ہے۔ وہ اپنی حکمت کے تحت جھٹلانے والوں کو اندھیروں میں چھوڑتا ہے جس طرح گونگے اور بہرے ہوتے ہیں۔ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ضلالت میں چھوڑ دیتا ہے۔ یہ سب امور اس کی حکمت کے تحت چلتے ہیں۔

# درس نمبر۵۹ تشریح آیات

## ۳۳ ---- تا ---- ۳۹

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۝۳۳

”اے نبی ؐ ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے، لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔

مشرکین عرب عموماً اور قریش کا وہ طبقہ خصوصاً جو دعوت اسلامی کے مقابلے میں ڈٹا ہوا تھا اور جاہلیت میں گرفتار تھا' وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت میں شک نہ کرتا تھا۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ آپ صادق اور امین ہیں۔ ان کے علم میں کوئی ایک چھوٹا سا واقعہ بھی نہ تھا جس میں آپ نے جھوٹ بولا ہو کیونکہ آپ رسالت سے قبل ان میں ایک طویل زمانہ رہ چکے تھے۔ اسی طرح جو طبقات آپ کی دعوت کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے تھے انہیں اس بات میں بھی شک نہ تھا کہ آپ بالکل سچے رسول ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ قرآن انسانی کلام نہیں ہے اور یہ کہ انسان اس قسم کا کلام پیش نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے باوجود اپنے اس علم اور یقین کے اظہار سے انکار کر رہے تھے اور اس دین جدید میں داخل ہونے سے مسلسل انکار کرتے چلے جاتے تھے۔ وہ یہ انکار اس لئے نہ کرتے تھے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرتے تھے بلکہ وہ اس لئے یہ انکار کرتے تھے کہ اس طرح ان کے اپنے اثر و رسوخ اور ان کی معاشرتی پوزیشن پر زد پڑتی تھی۔ یہ تھی وہ اصل بات جس کی وجہ سے انہوں نے انکار اور کفر کی راہ کو اپنا لیا تھا اور اپنے باطل شرکیہ انکار پر جمے ہوئے تھے۔

اسلامی تاریخ اور ذخیرہ احادیث میں متعدد ایسی روایات موجود ہیں جن سے قریش اور دوسرے عربوں کی اس پالیسی کا اچھی طرح اظہار ہوتا ہے۔ وہ لوگ قرآن کے بارے میں اپنی حقیقی رائے کو چھپاتے تھے۔

ابن اسحٰق نے ابن شہاب زہری سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ابوسفیان ابن حرب' ابوجہل ابن ہشام اور بنی زہرہ کے حلیف اخنس ابن شریق ابن عمر ابن وہب ثقفی ایک رات خفیہ طور پر نکلے تاکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنیں۔ آپ رات کو اپنے گھر میں نماز میں قرآن کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ ہر ایک کسی خفیہ جگہ بیٹھ گیا اور تلاوت سنتا رہا۔ ان تین افراد میں سے کوئی شخص دوسرے کے بارے میں نہ جانتا تھا۔ یہ لوگ ساری رات قرآن کریم سنتے رہے جب صبح ہوئی تو بکھر گئے۔ راستے میں اتفاقاً ایک دوسرے کو انہوں نے دیکھ لیا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو ملامت کی اور ایک دوسرے سے کہا

کہ دوبارہ کوئی یہ حرکت نہ کرے کیونکہ اگر ہمیں عام نادان لوگوں نے دیکھ لیا تو ان کے دل میں تم اچھا تاثر نہ چھوڑو گے۔ اس قرارداد کے بعد یہ لوگ چلے گئے۔ جب دوسری رات آئی تو ان میں سے ہر ایک پھر آکر اپنی جگہ چھپ گیا۔ ساری رات سنتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو یہ لوگ پھر بکھر گئے۔ اتفاقاً راستے میں پھر ان کی ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے پھر پہلی رات کی طرح ایک دوسرے کو سخت وست کہا اور چلے گئے۔ جب تیسری رات ہوئی تو یہ پھر اپنی اپنی جگہ آکر بیٹھ گئے اور ساری رات کلام الہی سنتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو پھر جانے لگے اور راستے میں انہوں نے پھر ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔ انہوں نے کہا ' ہم ایک دوسرے کو نہ چھوڑیں گے جب تک کہ ہم پختہ عہد نہ کر لیں کہ پھر اس طرف نہ آئیں گے۔ چنانچہ انہوں نے پھر نہ آنے کا باقاعدہ معاہدہ کر لیا اور چلے گئے دوسرے دن صبح ہوتے ہی اخنس ابن شریق نے اپنا عصا لیا اور ابوسفیان ابن حرب سے ان کے گھر آکر ملا۔ اس نے ابوسفیان سے کہا: بتاؤ ابو حنظلہ رات کو تم نے محمد سے جو کلام سنا اس کے بارے میں تمہاری حقیقی رائے کیا ہے؟ اس نے کہا: "ابو ثعلبہ! خدا کی قسم میں نے اس سے بعض ایسی باتیں سنیں جنہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں اور ان کا مطلب بھی اچھی طرح سمجھتا ہوں اور بعض باتیں میں نے ایسی بھی سنی ہیں کہ جن کے معنی و مراد کو میں نہیں سمجھا ہوں۔" اخنس نے کہا: "اس خدا کی قسم جس کے نام پر میں نے حلف لیا۔ میرا بھی یہی حال ہے۔ اب اخنس ان کے ہاں سے نکلا اور ابوجہل کے پاس آیا' اس کے گھر گیا۔ اور اسے کہا ابوالحکم! تم بتاؤ محمد سے تم نے جو کلام سنا اس کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے؟ ابوجہل نے کہا: "میں نے کیا سنا؟" اور پھر کہا: "ہمارا اور عبد مناف کا ہمیشہ مقابلہ رہا۔ انہوں نے لوگوں کو کھانا کھلانا شروع کیا۔ ہم نے بھی لوگوں کو مقابلے میں خوب کھلایا' انہوں نے لوگوں کو سواریاں دیں تو ہم نے بھی سواریاں دینا شروع کر دیں۔ انہوں نے عطیے دیئے تو ہم نے بھی عطایا کی بارش کر دی یہاں تک کہ ہم گھوڑوں کے اوپر بیٹھ کر بھی گھٹنے سے گھٹنا ملا کر چلے اور ہم ایک دوسرے سے اس طرح آگے بڑھے جس طرح مقابلے کے دو گھوڑے ایک دوسرے سے آگے بڑھتے ہیں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ ہم میں ایک نبی پیدا ہو گیا ہے اور اس پر آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے۔ ہم ان کے مقابلے میں نبی کہاں سے لائیں گے؟ خدا کی قسم ہم کبھی بھی اس پر ایمان نہ لائیں گے۔ اور کبھی بھی اس کی تصدیق نہ کریں گے۔ راوی کہتے ہیں کہ اخنس اسے چھوڑ کر اٹھ گیا۔

ابن جریر نے آیت (قَدْ نَعْلَمُ ...... (۶: ۳۳) الخ کے بارے میں سدی سے بواسطہ اسباط یہ روایت نقل کی ہے کہ بدر کے موقعہ پر اخنس ابن شریق نے بنی زہرہ سے کہا: اے بنی زہرہ' محمد تمہارا بھانجا ہے' تمہارا حق تو یہ ہے کہ تم اپنے بھانجے کی مدافعت کرو۔ اگر وہ فی الحقیقت نبی ہے تو تم ایک نبی کے ساتھ مقاتلہ کرنے کے گناہ سے بچ جاؤ گے۔ اگر وہ جھوٹا ہوا تو تمہارا حق تو یہ ہے کہ تم اپنے بھانجے پر دست درازی نہ کرو۔ تم رک جاؤ حتیٰ کہ اس کی مڈبھیڑ ابوجہل سے ہو جائے۔ اگر محمد غالب ہوا تو تم صحیح و سلامت واپس ہو جاؤ گے اور اگر محمد مغلوب ہو گیا تو بھی تمہاری قوم تم سے کوئی مؤاخذہ نہ کرے گی۔ چنانچہ بدر کے واقعہ کے بعد اس کا نام اخنس (علیحدہ ہونے والا' چھپنے والا) پڑ گیا حالانکہ پہلے اس کا نام ابی تھا۔ اس کے بعد اخنس نے ابوجہل سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات تنہائی میں ہوئی۔ اخنس نے کہا: "ابو الحکم' مجھے محمد کے بارے میں بتاؤ کہ وہ سچے ہیں یا جھوٹے؟ یہاں قریش کا میرے اور تمہارے سوا کوئی نہیں ہے جو ہماری بات سنتا ہو' ابوجہل نے کہا: "تم برباد ہو جاؤ' وہ تو سچے ہیں خدا کی قسم۔" محمد نے تو کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ لیکن بات یہ ہے کہ اگر قصی کی اولاد لواء' سقایہ اور حجابہ کے مناصب کے ساتھ ساتھ نبوت کا مرتبہ بھی لے جائے تو قریش کے باقی قبائل کے پاس کیا رہ جائے

گا۔“یہی مفہوم ہے اس آیت کا”یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔“

یہاں یہ بات نوٹ کر لی جائے کہ یہ سورہ مکی ہے اور یہ آیت بھی بے شک مکی ہے لیکن بدر کا واقعہ مدینہ میں پیش آیا' لیکن جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ صحابہ کرام کسی آیت میں یہ کہتے (ذلك قوله) اور اس کے بعد کسی واقعہ کا ذکر کرتے تو مطلب یہ نہ ہوتا تھا کہ اس واقعہ کی بابت یہ آیت نازل ہوئی تھی بلکہ مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس واقعہ پر یہ آیت صادق آتی ہے اور اس واقعہ پر اس سے راہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ چاہے یہ آیت اس واقعہ سے پہلے نازل ہوئی ہو یا بعد میں نازل ہوئی ہو لہٰذا یہ روایت اس لحاظ سے غریب نہ ہوگی۔

ابن اسحاق نے یزید ابن زیادہ سے روایت کی ہے' انہوں نے محمد ابن کعب قرظی سے روایت کی ہے۔ محمد نے کہا کہ مجھے یہ بتایا گیا ہے عتبہ ابن ربیعہ سرداران قریش سے تھا' ایک دن قریش کی ایک محفل میں بیٹھا ہوا تھا۔ حضور اکرم ؐ بھی مسجد حرام میں اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔ عتبہ نے قریش سے کہا' کیا یہ مناسب ہے کہ میں محمد ؐ کے پاس جاکر ان کے سامنے کچھ تجاویز پیش کروں؟ اور وہ جو مطالبے کرے ہم انہیں پورا کر دیں اور وہ ہم پر تنقید بند کر دے' شاید کہ وہ مان جائے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب حضرت حمزہ مسلمان ہوگئے تھے اور آپ کے ساتھی روز بروز بڑھ رہے تھے۔ مجلس نے بالاتفاق کہا کہ تجویز بالکل درست ہے۔ ابو الولید اٹھو اور ان سے بات کرو۔ عتبہ اٹھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ ؐ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور بولا :”بھتیجے! تم جانتے ہو کہ ہم میں تمہارا بلند مقام ہے' افراد قبیلہ بھی کافی ہیں اور آپ کا نسب بھی بلند مرتبت ہے لیکن تم نے اپنی قوم کو ایک عظیم مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ قوم کا اتحاد و اتفاق ختم ہوگیا ہے' تم نے قوم کے افکار و عقائد کی تضحیک کی۔ ان کے دین اور الٰہوں کو برا بھلا کہا اور قوم کے آباؤ اجداد جو فوت ہو گئے ہیں ان کو تم کافر اور جہنمی قرار دیتے ہو۔ میں تمہارے سامنے کچھ تجاویز پیش کرتا ہوں تم انہیں ذرا غور سے سنو۔ ممکن ہے کہ یہ تمہارے لئے قابل قبول ہوں۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا :”ابوالولید کہو' میں سنتا ہوں۔“ اس پر عتبہ نے کہا :”بھتیجے! تم نے جو تحریک برپا کر رکھی ہے اگر اس سے تمہاری غرض یہ ہو کہ تم مال و دولت جمع کر لو تو ہم تمہارے لئے اس قدر مال جمع کر دیتے ہیں کہ ہم میں تم سب سے زیادہ مالدار بن جاؤ گے۔ اگر تم لیڈر شپ چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا اتنا بڑا لیڈر بنا دیتے ہیں کہ تمہارے بغیر ہم کوئی فیصلہ نہ کریں گے۔ اگر تم بادشاہت چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں اور اگر صورت حال یہ ہے کہ جو خیالات تم پر نازل ہوتے ہیں یہ کوئی ایسی نفسیاتی بیماری ہے جس میں تم مجبور ہو اور تم ان خیالات کو ترک نہیں کر سکتے تو ہم تمہارے لئے بڑے بڑے اطباء کا انتظام کرتے ہیں اور اس قدر خرچ کرتے ہیں کہ تم صحیح اور تندرست ہو جاؤ اس لئے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کا تابع اس پر غالب آجاتا ہے اور اس کا علاج کرنا پڑتا ہے۔ (یہ تھے تقریباً اس کے الفاظ) عتبہ نے یہ بات کی اور فارغ ہوگیا۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی باتوں کو اچھی طرح سنتے رہے۔ اس کے بعد آپ ؐ نے اس سے پوچھا ابوالولید تمہاری بات ختم ہوگئی۔“ تو اس نے کہا' ہاں۔ حضور ؐ نے ان سے کہا”اب تم میری بات توجہ سے سنو' تو عتبہ نے کہا فرمایئے! آپ نے پڑھنا شروع کیا۔

حٰمٓ (١) تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (٢) كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (٣) بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (٤) (٤١: ١ تا

٤ ))  آپ نے سورہ حم السجدہ کی یہ آیات ' آیت سجدہ تک تلاوت کیں اور پھر سجدہ فرمایا۔ عتبہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اپنے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے زمین پر رکھے اور ان پر ٹیک لگائی۔ حضور ؐ نے فرمایا: "ابوالولید تم نے سن لیا' یہ ہے میرا جواب۔" عتبہ اٹھا اور اپنی محفل میں گیا۔ انہوں نے جب عتبہ کو آتے دیکھا تو ایک دوسرے سے کہا: "خدا کی قسم ابوالولید جو چہرہ لے کر گیا تھا اب اس کا وہ چہرہ نہیں ہے۔" لیکن جب وہ ان کے پاس بیٹھا تو انہوں نے پوچھا ابوالولید تم کیا لے کر آئے ہو؟ اس نے کہا کہ میرے پاس یہ بات ہے کہ میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے کہ خدا کی قسم میں نے پہلے کبھی ایسا کلام نہیں سنا۔ خدا کی قسم نہ وہ جادو ہے' نہ شعر ہے' نہ کہانت ہے۔ اے اہل قریش! تمہیں میرا مشورہ یہ ہے کہ تم میری بات مانو اور اس معاملے کو مجھ پر چھوڑ دو۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اس شخص سے تعرض نہ کرو اور اس کی راہ نہ روکو' اسے اس کے حال پر چھوڑ دو' خدا کی قسم میں نے اس کی جو بات سنی ہے اس کے بارے میں ایک دن تم کوئی عظیم خبر سنو گے۔ اگر اس کو عربوں نے ختم کر دیا تو وہ تمہارا یہ مسئلہ حل کر دیں گے۔ اور اگر یہ شخص عربوں پر غالب آگیا تو اس کی حکومت تمہاری حکومت ہوگی۔ اس کی عزت تمہاری عزت ہوگی اور تم اس کی وجہ سے نہایت ہی خوشحال قوم بن جاؤ گے۔" اس پر اہل محفل نے یک زبان ہو کر کہا: "ابوالولید خدا کی قسم اس نے اپنی باتوں سے تم پر جادو کر دیا ہے۔" اس پر ابوالولید نے کہا "یہ تمہاری رائے ہے لہٰذا جو تمہاری سمجھ میں آئے کرو۔"

علامہ بغوی نے اپنی تفسیر میں حضرت جابر ؓ کی روایت نقل فرمائی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ حم السجدہ پڑھتے پڑھتے اس آیت تک پہنچے (فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ( ٤١: ١٣ )) تو عتبہ نے حضور ؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور آپ ؐ کو صلہ رحمی کا واسطہ دیا کہ ایسا نہ کہیں' اس کے بعد عتبہ اپنے خاندان کے پاس چلا گیا اور قریش کی طرف نہ آیا اور اس نے اپنے آپ کو بند کر لیا۔

اس کے بعد جب عتبہ سے اس بارے میں گفتگو کی جاتی تو وہ کہتا: "میں نے حضور ؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور آپ ؐ کو صلہ رحمی کا واسطہ دیا کہ وہ آگے نہ بڑھیں اور کیا تمہیں علم نہیں ہے جب محمد کوئی بات کہتا ہے تو وہ ہو کر رہتی ہے' اس لئے میں ڈر گیا تھا کہ کہیں تم پر بھی عذاب نازل نہ ہو جائے۔

ابن اسحاق نے یہ روایت کی ہے کہ ولید ابن مغیرہ کے پاس قریش کے کچھ زعماء جمع ہوئے۔ ولید ابن مغیرہ ان میں ایک معمر دانشور تھا۔ زمانہ حج کا تھا۔ اس نے ان زعماء سے کہا' اہل قریش موسم حج آرہا ہے اور تمام عرب وفود کی شکل میں آئیں گے اور انہوں نے تمہارے ساتھی کے بارے میں سن رکھا ہے' لہٰذا اس کے بارے میں تم ایک رائے پر متفق ہو جاؤ اور اگر تم مختلف باتیں کرو گے تو اس طرح تم خود ایک دوسرے کی تکذیب کرو گے۔ خود تمہاری اپنی باتیں تمہاری تردید کر دیں گی۔ انہوں نے کہا' ابو شمس! تم ہی کچھ کہو اور ہمارے لئے ایک پختہ بات متعین کر دو تاکہ ہم سب وہی ایک بات کہیں۔ اس نے کہا مناسب تو یہ ہے کہ پہلے تم خود تجاویز دو' میں سنتا ہوں۔ انہوں نے کہا: "ہم اسے کاہن کہیں گے۔" اس نے کہا: "یہ بات بالکل غلط ہے' اس لئے کہ وہ ہرگز کاہن نہیں ہے۔ ہم نے کاہن بہت دیکھے ہیں' نہ وہ کاہنوں کی طرح گاتا گنگناتا ہے اور نہ سجع ملاتا ہے۔" پھر انہوں نے یہ تجویز دی کہ ہم اسے مجنون کہیں گے' اس پر اس نے کہا: کہ وہ مجنوں بھی نہیں ہے۔ ہم نے بہت سے پاگل دیکھے ہیں اور پاگلوں کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں نہ اس کا گلا گھونٹا ہوا ہے' نہ اس کے دل میں وسوسے آتے ہیں' نہ اس کے دل میں شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ پھر انہوں نے تجویز کیا کہ

اسے شاعر کہنا چاہئے تو اس نے کہا: کہ آپ "شاعر بھی نہیں ہیں۔ ہم اشعار کو اچھی جانتے ہیں، رجز، ہزج، قریضہ، مقبوضہ اور مبسوطہ اس کی اقسام ہیں لہٰذا قرآن شعر کے زمرے میں نہیں آتا۔ تو پھر انہوں نے کہا کہ ہمیں انہیں ساحر کہنا چاہیے۔ ان پر اس نے کہا: کہ حضور " ساحر بھی نہیں ہیں۔ ہم نے جادوگروں اور ان کے جادوگرانہ کرتبوں کو دیکھا ہے۔ وہ نہ پھونک جھاڑ کا کام کرتا ہے اور نہ تعویذ گنڈوں کا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ابوشمس پھر تم ہی بتاؤ کہ ہم کیا کہیں۔ انہوں نے کہا: خدا کی قسم' ان کی باتوں میں بڑی مٹھاس ہے اس کا اصل پھل دار ہے اور اس کی شاخیں بار آور ہیں اور ان باتوں میں سے جس کا بھی تم اظہار کرو گے لوگ انہیں غلط سمجھیں گے۔ میرے خیال میں اگر اس کلام کے بارے میں کوئی معقول بات کہی جا سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ تم محمد پر ساحر ہونے کا الزام عائد کرو کہ وہ ایسی جادو بھری باتیں کرتا ہے جن کی وجہ سے باپ اور بیٹے کے درمیان تفرقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بھائی اور بھائی کے درمیان دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ میاں اور بیوی کے درمیان اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور ایک شخص اپنے خاندان سے کٹ جاتا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ یہ بات لے کر پھیل گئے اور موسم حج میں تمام راستوں پر بیٹھ گئے' جو شخص بھی آتا یہ لوگ اسے ڈراتے اور خبردار کرتے اور حضور " کے کام سے لوگوں کو باخبر کرتے۔

ابن جریر نے عبدالاعلیٰ' محمد ابن ثورہ' معمر' عبادہ ابن منصور کے واسطوں سے عکرمہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ولید ابن مغیرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ نے اسے قرآن کریم سنایا۔ اس پر قرآن کریم کا بہت ہی اثر ہوا۔ اس واقعہ سے جب ابوجہل ابن ہشام خبردار ہوا تو وہ ولید کے پاس آیا اور اسے کہا کہ تمہاری قوم یہ چاہتی ہے کہ وہ تمہارے لئے دولت جمع کرے تو ولید نے کہا یہ کیوں؟ تو اس نے کہا کہ آپ کے لئے بطور چندہ وہ جمع کر رہے ہیں اس لئے کہ تم محمد کے پاس گئے تھے اور اس کی جانب سے عطیے کے خواہاں تھے۔ (یہ خبیث اس کی عزت نفس پر چوٹ لگانا چاہتا تھا کیونکہ یہ شخص اپنے آپ کو مالدار سمجھتا تھا اور اپنے مال پر فخر کرتا تھا) اس نے کہا کہ آیا قریش کو معلوم نہیں ہے کہ میں ان میں سب سے زیادہ مالدار ہوں؟ تو اس پر ابوجہل نے کہا' پھر آپ کے لئے مناسب ہے کہ محمد کے بارے میں کوئی ایسی بات کہیں جس سے معلوم ہو کہ تم اسے سخت ناپسند کرتے ہو اور اس کے خلاف ہو۔ تو ولید نے کہا: کہ "تم بتاؤ میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ خدا کی قسم تم میں کوئی ایک بھی میرے مقابلے میں اصناف شعر سے زیادہ واقف نہیں ہے' نہ مجھ سے زیادہ رجزیہ اشعار کو جانتا ہے' نہ قصائد کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ نہ کوئی جنات کے اشعار کا مجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ خدا کی قسم محمد کی کوئی بات شعر کے زمرے میں نہیں آتی۔ خدا کی قسم وہ جو بات کرتا ہے وہ بہت ہی میٹھی بات ہے' اس کی ظاہری شکل نہایت ہی پالش شدہ ہے۔ اس کے سامنے جو چیز آتی ہے وہ اسے توڑ دیتی ہے۔ الغرض اس کی بات برتر اور بلند رہتی ہے اور اس پر کوئی بات بلندی حاصل نہیں کر سکتی۔ ابوجہل نے کہا' خدا کی قسم لوگ تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے۔ تمہیں بہرحال کچھ کہنا ہی پڑے گا۔

اس نے کہا "پھر مجھے سوچنے دیجئے۔" جب اس نے اچھی طرح سوچا تو پھر کہا: "یہ ایک جادو ہے جو پر اثر ہے اور کسی اور ذریعے سے آتا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ..... تا ..... عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ) ایک دوسری روایت میں ہے کہ قریش نے کہا کہ اگر ولید صابی بن گیا تو تمام قریش صابی بن جائیں گے۔ ابوجہل نے کہا: "اس کا بندوبست میں کر لوں گا۔ فکر مت کرو۔" اس کے بعد وہ اس سے ملا اور اس نے بڑے غور و فکر

کے بعد یہ بات کہی کہ "یہ جادو بھرا کلام ہے - کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اس کے نتیجے میں ایک شخص اور اس کی اولاد اور اس کے ملازمین کے درمیان تفرقہ پیدا ہو جاتا ہے -"

ان تمام باتوں سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضور ؐ کے مخالفین کا یہ عقیدہ نہ تھا کہ آپ ان تک جو پیغام پہنچا رہے ہیں اس میں آپ ؐ ان سے کوئی جھوٹ بول رہے ہیں بلکہ وہ ان روایات کے مطابق بعض دوسری وجوہات و اسباب کی وجہ سے آپ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے تھے - ان اسباب میں سے سب سے بڑا سبب یہ کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس دعوت و تحریک کے نتیجے میں ان سے ان کی موجودہ سیادت و قیادت چھن جائے گی' جس پر وہ غاصبانہ طور پر فائز تھے - حالانکہ سیادت و قیادت اور حاکمیت کا مقام خاصہ خدا تھا اور یہی مفہوم ہے (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کا جو دعوت اسلامی کی اساس ہے - یہ لوگ بہرحال عربی زبان اور اس کے مفہومات سے اچھی طرح واقف تھے اور وہ کلمہ شہادت کے اس مفہوم کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے - اس لئے کہ کلمہ شہادت تمام حاکمیتوں اور قیادتوں کے خلاف ایک انقلابی دعوت تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ انسانوں کی زندگی سے غیر اللہ کی بندگی کا قلع قمع کر دیا جائے -

(قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۳۳) وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا (۳٤) (٦: ۳۳ - ۳٤) "اے نبی ؐ ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے' لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں - تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں' مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر انہوں نے صبر کیا -

یہاں الظالمون سے مراد المشرکون ہے اور قرآن کریم کے بیشتر مقامات میں الظالمون سے مراد المشرکون ہی ہوتا ہے حضور اکرم ؐ کے طیب خاطر کے لئے بات آگے بڑھتی ہے اور وہ حقیقی اسباب بیان کر دیئے جاتے ہیں جن کی بناء پر جھٹلانے والے حضور ؐ کی دعوت کو جھٹلاتے ہیں اور اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں - حالانکہ آیات الہیہ کی صداقت اور سچائی بالکل بدیہی ہے - پھر اس سے آگے یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ کے ہم منصب رسولوں کے ساتھ پوری انسانی تاریخ میں مکذبین نے یہی رویہ اختیار کیا ہے' جن کے کچھ حالات قرآن نے بھی بیان کیے ہیں کہ رسولوں نے کن کن مشکل حالات میں اپنا کام جاری رکھا - انہوں نے مشکلات پر صبر کیا یہاں تک کہ اللہ کی مدد آ پہنچی - یہ اشارہ اس لئے کیا گیا کہ سنت الٰہیہ کی یہی شان ہے - سنت الٰہیہ کبھی نہیں بدلتی اور کسی کی تجاویز اور کسی کی خواہشات کے بدلے اللہ کی سنت نہیں بدلتی - نیز کسی کے جھٹلانے کی وجہ سے' کسی کی تکالیف کی وجہ سے اور کسی کی ذاتی مشکلات کی وجہ سے سنت الٰہیہ میں کبھی فیصلے قبل از وقت نہیں کیے جاتے -

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا
وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ

مِن نَّبَإِى الْمُرْسَلِينَ ﴿۳۴﴾

"تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں' مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر جو انہیں پہنچائی گئیں' انہوں نے صبر کیا' یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے۔ اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں تمہیں پہنچ ہی چکی ہیں۔"

خدا پرستی کی دعوت ایک قدیم دعوت ہے۔ تاریخ قدیم کی دور دراز وادیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ راہ بالکل سیدھی ہے اور بالکل واضح ہے۔ اس کے خطوط بالکل سیدھے ہیں۔ اس پر چلنے والے پاؤں ہمیشہ ثابت قدم رہے ہیں۔ مختلف قسم کے جرائم پیشہ لوگوں نے اس راہ کو روکنے کی کوشش کی ہے۔ نیز گمراہوں اور ان کے شدید ترین پیروکاروں نے اس دعوت کی راہ ہمیشہ روکی ہے۔ اس راہ میں کئی داعیوں کو سخت مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ خون دینا پڑا اور جان دینی پڑی لیکن قافلہ داعیان حق نے ہمیشہ اپنا سفر بالکل سیدھی سمت میں جاری رکھا۔ یہ قافلہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس سیدھی راہ سے ادھر ادھر نہ ہوا۔ نہ اس نے اس راہ کو چھوڑ کر روگردانی اختیار کی۔ لیکن انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے اور آخر کار اللہ کی نصرت صرف اللہ کے اصولوں اور فیصلوں کے مطابق آتی ہے۔

"تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں' مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر جو انہیں پہنچائی گئیں' انہوں نے صبر کیا' یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں تمہیں پہنچ ہی چکی ہیں۔"

یہ وہ الفاظ ہیں جو اللہ کی جانب سے اپنے رسول کو کہے جا رہے ہیں۔ یہ ایک یاد دہانی ہے اور ایک گونہ تسلی ہے۔ ہمدردی اور تسلی کا ہاتھ آپ کے سر پر پھیرا جا رہا ہے اور ان الفاظ کے اندر حضور اکرم ؐ کے بعد آنے والے داعیوں کے بھی نقوش راہ واضح ہیں۔ ایک واضح راستہ انہیں دکھایا جاتا ہے' ان کا کردار بھی ان کے لئے متعین کر دیا جاتا ہے اور آگاہ کر دیا جاتا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کہنے سے مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ سکتے ہیں اور جو مشکلات پہلے لوگوں کو پیش آئیں وہ ہر داعی حق کی راہ میں آتی ہیں۔

یہ الفاظ داعیان حق کو بتاتے ہیں کہ دعوت حق کے لئے سنت الٰہیہ ایک ہی ہے اور دعوت حق بھی ایک ہی ہے۔ اس میں تعدد ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی دعوت ہے کہ اکثر لوگ اس کی تکذیب کرتے ہیں اور مکذبین کی روش ہمیشہ ایسی ہی رہی ہے' اس دعوت کے حاملین کو ہمیشہ اذیت دی جاتی رہی ہے اور اس تکذیب اور ایذا رسانی پر داعیوں کو صبر کرنا پڑتا ہے اور پھر صبر کے مرحلے کے بعد آخر کار داعیوں کو فتح و کامرانی نصیب ہوتی ہے۔ لیکن نصرت اللہ کے طے کردہ اصولوں کے مطابق اور اپنے وقت پر آتی ہے۔ یہ نصرت محض اس لئے قبل از وقت نہیں آجاتی کہ کچھ پاک طینت اور بے گناہ داعیوں کو جھٹلایا جاتا ہے اور انہیں اذیت دی جاتی ہے۔ یا یہ کہ گمراہ لوگ اور گمراہی کے لیڈر ان پاک طینت لوگوں کو اذیت دینے پر قادر ہیں۔ نیز یہ امر بھی سنت الٰہیہ کی رفتار کو تیز نہیں کر سکتا کہ ایک مخلص' ذاتی خواہشات سے پاک و صاف' نہایت ہی پاک طینت کارکن اور داعی اپنے دل کے اندر شدید خواہش رکھتا ہے کہ اس کی قوم راہ راست پر آجائے اور وہ اس حقیقت پر بہت ہی فکر مند اور دل گرفتہ ہے کہ اس کی قوم ضلالت میں گری ہوئی ہے اور یہ کہ اس کی قوم دنیا کی تباہی اور آخرت کے عذاب کی راہ پر چل پڑی ہے۔ یہ تمام امور سنت الٰہیہ کو قبل از وقت ظاہر نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کی جلد بازی کی

وجہ سے اپنے کسی کام میں جلد بازی نہیں کرتا۔ اور اللہ کے کلمات میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ چاہے ان کلمات کا تعلق عباد صالحین کی آخری فتح سے ہو یا ان کے متعلق کسی طے شدہ تقدیر سے ہو۔

یہ ایک فیصلہ کن دو ٹوک اور سنجیدہ فیصلہ ہے۔ اس کا مقصد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور اطمینان دلانا ہے اور مشکلات راہ پر آپ کے ساتھ ہمدردی اور یک جہتی کا اظہار ہے۔

اب یہ سنجیدہ فیصلہ اپنے اثرات کو اپنی آخری ممکن حدوں تک پہنچاتا ہے۔ ان خدشات کی راہ بھی روک دی جاتی ہے جو ممکن تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں پیدا ہو جائیں۔ اس لئے کہ فطری طور پر ایک انسان' یہ چاہتا ہے کہ اس کی قوم سدھر جائے اور ایک رسول تو پوری بشریت کی ہدایت کا مشتاق ہوتا ہے۔ وہ خواہش مند ہوتا ہے اور انتظار میں ہوتا ہے کہ کب اس کی قوم اس کی دعوت پر لبیک کہتی ہے اور کب ہدایت پذیر ہو جاتی ہے؟ اس قسم کی خواہشات نزول قرآن کے وقت بعض مسلمانوں کے دل میں بھی جوش مارتی تھیں جن کی طرف اسی سورہ کی دوسری آیات میں اشارات موجود ہیں۔ اس قسم کی خواہشات انسانوں کے اندر نہایت ہی قدرتی اور فطری ہوتی ہیں لیکن اس دعوت اسلامی کے فیصلہ کن انداز' اس کے حقیقی مزاج' اس کے بارے میں رسولوں کے کردار اور پھر عوام الناس کے کردار کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن کریم ذرا سخت لہجے میں یوں مخاطب ہوتا ہے :-

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؕ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾

النصف

"تاہم اگر ان لوگوں کی بے رخی تم سے برداشت نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو۔ اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا' لہذا نادان مت بنو۔ دعوت حق پر لبیک وہی لوگ کہتے ہیں جو سننے والے ہیں۔ رہے مردے' تو انہیں تو اللہ بس قبروں ہی سے اٹھائے گا اور پھر وہ (اس کی عدالت میں پیش ہونے کے لئے) واپس لائے جائیں گے۔" نہایت ہی شاہانہ انداز کے درمیان سے خوف کے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ کوئی ان الفاظ کی ہولناکی اور اس معاملے کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ اس حقیقت کو اپنے ذہن میں تازہ نہ رکھے کہ یہ الفاظ رب العالمین کی طرف سے ہیں اور ان کے ساتھ اللہ رب العالمین نے اپنے نبی کو مخاطب کیا ہے جن کی صفات میں صابر ہونا اور اولوالعزم رسولوں میں سے ہونا اہم صفات ہیں۔ جنہوں نے نہایت ہی صبر اور خلوص کے ساتھ اپنی قوم کی جانب سے پہنچنے والی ایذاؤں کو برداشت کیا۔ آپ نے حضرت نوح علیہ السلام کی طرح ان کو بددعا نہ دی حالانکہ ایک زمانہ آپ ان کی تمسخر زنیاں سہتے رہے۔ اور نہایت ہی صبر اور حلم کا مظاہرہ فرماتے رہے۔

اے محمد! یہ تو ہماری سنت ہے۔ اگر ان لوگوں کی بے رخی اور ان کی جانب سے مسلسل تکذیب آپ برداشت نہیں کر سکتے اور آپ بہرحال انہیں کوئی معجزہ ہی دکھانا چاہتے ہیں تو پھر اگر آپ کے اندر استطاعت ہے تو آپ زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈلیں یا آسمان تک پہنچنے کے لئے کوئی سیڑھی لگالیں اور اس طرح ان لوگوں کے سامنے کوئی حیران کن معجزہ پیش کر دیں۔

ان کی ہدایت 'حقیقت یہ ہے کہ اس لئے موقوف نہیں ہے کہ تم ان کے سامنے کوئی معجزہ پیش کر دو۔ صرف یہ کمی نہیں رہ گئی کہ بس کوئی معجزہ صادر ہو اور وہ ہدایت کو قبول کرلیں۔ جیسے وہ بالکل تیار بیٹھے ہوں۔ اس طرح تو اللہ تعالیٰ اگر چاہتا تو انہیں ہدایت پر جمع کر دیتا۔ یا تو اللہ اس طرح کرتا کہ ابتداء ہی سے انہیں اس طرح پیدا کرتا کہ وہ ہدایت کے سوا کوئی اور راستہ قبول ہی نہ کرتے مثلاً ملائکہ اور یا یوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو اپنی قدرت کے ذریعے راہ ہدایت کی طرف موڑ دیتا اور وہ ہدایت کی قبولیت کے لئے آمادہ ہو جاتے اور یا اللہ تعالیٰ کوئی ایسا معجزہ صادر کر دے جس کی وجہ سے ان کی گردنیں جھک جائیں اور کسی وجہ سے یا بغیر کسی وسیلہ کے اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دے دے کیونکہ وہ قادر مطلق ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے 'اپنی اس حکمت کی وجہ سے جو اس پوری کائنات میں جاری و ساری ہے' اس مخلوق مکرم حضرت انسان کو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا۔ اس آسمانی منصوبے کے مطابق اس مقصد کی خاطر اس بات کی ضرورت تھی کہ اس مخلوق کو کچھ متعین صلاحیتیں دی جائیں اور یہ صلاحیتیں ان صلاحیتوں سے جدا ہوں جو فرشتوں کو دی گئی تھیں۔ ان خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ انسانوں کی صلاحیتوں کے درمیان تفاوت رکھی جائے۔ یہ کہ لوگوں کے اندر ہدایت اور ایمان کی قبولیت کی استعداد بھی مختلف ہو اور لوگوں کے اندر قبولیت حق کے مادے کی مقدار بھی مختلف ہو۔ یہ کام اللہ کے دائرہ قدرت کے مطابق' اللہ کے قانون عدل کے مطابق اور اس کے قانون جزاء وسزا کے عین مطابق ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی تکوینی جبر کے ذریعے لوگوں کو راہ ہدایت پر جمع نہیں فرمایا۔ اللہ نے انہیں حکم دیا کہ وہ ہدایت کی راہ لیں اور ماننے نہ ماننے کا اختیار انہیں دے دیا اور آخرت میں اس پر عادلانہ جزاء و سزا کا اجراء فرمایا۔ اس حقیقت کو جاننا چاہئے اور اس سے غافل نہ ہونا چاہئے۔

(وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (٦: ٣٥)) "اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا' لہٰذا نادان مت بنو۔" شوکت کلام دیکھنے کے قابل ہے اور فیصلہ ہدایت بھی قابل دید ہے' لیکن بات کا موقع و محل ہی ایسا تھا جس کے اندر اس زور داریات اور دو ٹوک ہدایت کی ضرورت تھی۔

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ نے انسانوں کو کس مزاج اور کس فطرت پر پیدا کیا ہے اور یہ کہ وہ ہدایت کے مقابلے میں کیا موقف اختیار کرتے ہیں حالانکہ دعوت حق کے پاس ثبوت دلیل کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔

(اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ

(٦: ٣٦)) "دعوت حق پر لبیک وہی لوگ کہتے ہیں جو سننے والے ہیں۔ رہے مردے تو انہیں تو اللہ بس قبروں ہی سے اٹھائے گا اور پھر وہ (اس کی عدالت میں پیش ہونے کے لئے) واپس لائے جائیں گے۔" جب کوئی رسول دعوت حق لے کر لوگوں کے پاس آتا ہے تو اس دعوت کے مقابلے میں لوگ دو گروہ بن جاتے ہیں۔ ایک فریق تو زندہ اور بیدار

لوگوں کا ہوتا ہے' جن کے اندر قبولیت حق کی استعداد ہوتی ہے' یہ استعداد کام کر رہی ہوتی ہے اور ان لوگوں کے دل کے دریچے کھلے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ ہدایت قبول کر لیتے ہیں اس لئے کہ ہدایت اور سچائی کے اندر ذاتی قوت' نکھار اور فطرت کے ساتھ ہم آہنگی ہوتی ہے اور ایسے لوگ اسے پاتے ہی قبول کر لیتے ہیں۔ (اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ (٦ : ٣٦)) یعنی جن لوگوں کی قوت شنوائی کام کر رہی ہوتی ہے وہ حق کو قبول کر لیتے ہیں۔ ایک دوسرا فریق وہ ہوتا ہے جو دراصل مردہ ہوتا ہے۔ اس کی فطرت معطل ہو جاتی ہے۔ وہ نہ سنتا ہے اور نہ قبول کرتا ہے۔ وہ نہ متاثر ہوتا ہے اور نہ ہی لبیک کہتا ہے۔ یہ بات نہیں ہوتی کہ اس سچائی کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہوتی کیونکہ سچائی تو خود دلیل ہوتی ہے' آفتاب آمد دلیل آفتاب' اور جب بصیرت رکھنے والی فطرت اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو وہ اس کے اندر سچائی دیکھ لیتی ہے۔ فوراً وہ آخری فیصلہ کر کے تسلیم کر لیتی ہے۔ دوسری قسم کے لوگوں کے اندر جو کمی ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان کی فطرت مرچکی ہوتی ہے اور ان کی استعداد قبولیت حق جاتی رہتی ہے لہٰذا ان کے اندر محض دعوت سنتے ہی قبولیت حق کی استعداد پیدا نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کا کوئی علاج خود رسول وقت کے پاس بھی نہیں ہوتا۔ ان پر کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی۔ ان کا معاملہ اللہ کی مشیت کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ اگر اللہ چاہے تو ایسے لوگوں کو زندہ کر دیتا ہے اور اگر نہ چاہے تو یہ لوگ زندہ ہوں یا مردہ قیامت تک مردہ رہیں گے۔ اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انہیں اٹھائے گا۔

(وَالْمَوْتٰی یَبْعَثُھُمُ اللّٰہُ ثُمَّ اِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ (٦ : ٣٦)) مردوں کو تو اللہ قبروں ہی سے اٹھائے گا اور وہ اس کی عدالت میں پیش ہوں گے۔ یہ ہے کہانی قبولیت حق اور محرومیت کی۔ اس سے ہدایت و ضلالت کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ رسول کے فرائض متعین ہو جاتے ہیں اور تمام امور کا آخری فیصلہ اللہ کے سپرد ہوتا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے' کرتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس حقیقت کو آشکارا کرنے کے بعد' اب روئے سخن اہل کفار اور مشرکین کے اس غلط مطالبے کی طرف پھر جاتا ہے جس میں وہ خوارق و معجزات کے مطالبے کرتے تھے۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کا یہ مطالبہ جہالت پر مبنی ہے اور یہ لوگ اس معاملے میں سنت الہیہ سے بالکل بے خبر ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی معجزہ صادر ہوتا ہے تو اس کے بعد نہ ماننے والوں بلکہ ماننے والوں کو بھی ایک عظیم بربادی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ جو ان لوگوں کے مطالبے کو تسلیم نہیں کرتا تو اس لئے نہیں کرتا کہ وہ ان پر رحم کر کے انہیں اس عظیم تباہی سے بچانا چاہتا ہے۔ اس موقعہ پر تمام زندہ مخلوقات کے بارے میں اللہ کی حکیمانہ تدابیر کو بھی بیان کر دیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ سنت تمام زندہ مخلوقات تک وسعت پذیر ہے۔ یہاں وہ حکمت بتائی جاتی ہے جو ہدایت و ضلالت کے فیصلوں کے پیچھے کام کرتی ہے اور جس میں اللہ تعالیٰ کی بے قید مشیت کام کرتی ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنْ یُّنَزِّلَ اٰیَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَ

لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتٰبِ مِنْ شَىْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝۳۸ وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكْمٌ فِى الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَ مَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۳۹

”یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی؟ کہو ' اللہ تعالیٰ نشانی اتارنے کی پوری قدرت رکھتا ہے 'مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی میں مبتلا ہیں۔ زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو ' یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں ' ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے ' پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں مگر جو لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے اور گونگے ہیں ' تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے رستے پر لگا دیتا ہے۔“ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ لوگ ایسے خوارق عادت معجزات کے طلبگار تھے ' جو آپ سے قبل آنے والے رسولوں کو دیئے گئے تھے۔ یہ لوگ قرآن کریم جیسے زندہ معجزے پر اکتفا کرنے والے نہ تھے ' جو قیامت تک کے لئے باقی ہے ' جو انسانی فہم و ادراک کو اپیل کرتا ہے اور یہ اعلان کرتا ہے کہ اب انسان فکری اعتبار سے بلوغ تک پہنچ گیا ہے۔ اس لئے انسان کو ایسے فلسفیانہ اور بلند کلام کے ذریعے مخاطب کیا جاتا ہے اور یہ کلام ایسا لازوال اور ابدی کلام ہے کہ کسی نسل کے ساتھ اس کا خاتمہ نہیں ہو جاتا 'بلکہ دائم و باقی ہے اور قیامت تک انسانی شعور اور ادراک سے مخاطب ہے۔

یہ لوگ خارق عادت معجزے کے تو طلبگار تھے لیکن ایسے معجزات کے صدور کے بعد سنت الٰہی کے مطابق جو عذاب آتا ہے اسے سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ اس عذاب کی لپیٹ میں سب لوگ آجایا کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو دنیا میں ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ نیز یہ لوگ اس حکمت کو بھی نہ پا رہے تھے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ایسے معجزے کا صدور نہ فرمایا۔ اس لئے کہ اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ اگر معجزہ صادر بھی ہو جائے تو بھی یہ لوگ ماننے والے نہ تھے۔ حضور ؐ سے قبل کئی اقوام نے یہ حرکت کی تھی ' اور وہ ہلاکت کی مستحق ہو گئی تھیں جبکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ ان لوگوں کو مہلت دی جائے اور ان لوگوں میں سے کئی ایسے تھے جن کی قسمت میں ایمان لانا لکھا تھا۔ اگر کوئی شخص ان میں سے ایمان نہ بھی لایا تو اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ اس کی پشت سے امت مومنہ پیدا ہونے والی ہے۔ لیکن یہ لوگ اس مہلت پر خدا کا شکر ادا نہیں کرتے کہ اللہ نے خود ان کے مطالبے کے باوجود انہیں اس ابتلاء سے بچایا جبکہ وہ اس مطالبے کے عواقب سے بے خبر تھے۔

قرآن کریم ان کے اس مطالبے کے تذکرے کے بعد یہ فیصلہ کرتا ہے کہ یہ لوگ بے علم ہیں اور یہ لوگ ان نتائج سے بے خبر ہیں جو ان کے مطالبے کے پورے ہو جانے کے بعد ظہور پذیر ہونے والے تھے۔ حکم ہوتا ہے کہ اللہ کی قدرت میں ہے ہر قسم کے معجزات کا صدور 'لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ان لوگوں کو مطالبے کے باوجود ان مشکلات اور ہلاکتوں سے دوچار نہ کیا جائے۔ یہ اس کی رحمت کا بھی تقاضا ہے کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کرنا فرض کر لیا ہے۔

(وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَن يُنَزِّلَ آيَةً وَلَٰكِنَّ

أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (٦: ٣٧)) "یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی؟ کہو' اللہ نشانی اتارنے کی پوری قدرت رکھتا ہے' مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی میں مبتلا ہیں۔" اس انتباہ کے بعد اب سیاق کلام قرآن کریم کو ایک نہایت ہی لطیف راستے سے مخاطب کے دل میں اتارنے کی راہ تلاش کرتا ہے۔ انسان کی قوت مشاہدہ اور قوت تدبر کو جگایا جاتا ہے کہ ذرا وہ اس کائنات پر غور و فکر کر کے اس کے اندر پائے جانے والے دلائل ایمان پر غور کرے۔ اگر وہ غور و فکر کرے تو اسے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔

(وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُم مَّا فَرَّطْنَا فِي

الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ (٦: ٣٨)) "زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو' یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں' ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے' پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔" اس کائنات میں صرف انسان ہی نہیں بستے تاکہ ہم یہ کہیں کہ بس اتفاقاً وہ وجود میں آگئے اور اب ان کی زندگی بھی جس طرح وہ چاہیں بسر ہو اور لغو جائے۔ بلکہ انسان کے ارد گرد دوسری جاندار مخلوقات بھی ہوتی ہیں اور ان تمام جانداروں کی زندگی ایک خاص منظم طریقے سے بسر ہو رہی ہے۔ ان کی زندگی کے مطالعے سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زندگی بامقصد' ایک اسکیم کے مطابق اور حکیمانہ انداز میں بسر ہو رہی ہے اور تمام مخلوقات کی زندگی کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ یہ سب مخلوق ایک ہی خالق کی پیدا کردہ ہے ایک ہی قوت مدبرہ ہے جو ان تمام مخلوقات کے پیچھے عمل پیرا ہے اور کائنات پر پوری طرح حاوی ہے۔

جو جانور زمین پر چلتے ہیں (وَمَا مِن دَابَّةٍ (٦: ٣٨)) اس لفظ میں تمام جاندار حشرات الارض تک شامل ہیں۔ کیڑے مکوڑے یہاں تک کہ تمام جراثیم' تمام پرندے جو ہواؤں میں اڑتے ہیں اور تمام مخلوق جو اس کائنات پر زندہ ہے' وہ ایک امت ہے۔ اس میں ایک جیسے خصائص ہیں۔ وہ ایک طرح زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کی زندگی کے امور بعینہٖ اسی طرح ہیں جس طرح یہاں امم انسانی کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سے کوئی چیز بغیر اسکیم اور تدبیر کے نہیں چھوڑی اور نہ کوئی چیز اپنے مخصوص علم کے دائرے سے باہر رکھی ہے۔ آخرت میں یہ تمام مخلوقات اپنے رب کے سامنے حاضر ہوں گی اور ان کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ آخری فیصلے کرے گا' جو وہ چاہے گا۔

یہ آیت نہایت ہی مختصر ہونے کے باوجود زندہ مخلوقات کے بارے میں ایک فیصلہ کن بات ہمارے سامنے رکھتی ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ اللہ کی جانب سے پوری مخلوقات کی مکمل نگرانی ہو رہی ہے۔ پوری مخلوق اس کی فعال تدبیر کے تحت زندہ ہے' وہ اس پوری مخلوق کے بارے میں خوب جانتا ہے اور ہر چیز اس کے دائرہ قدرت میں ہے جو رب ذوالجلال ہے۔

یہاں ظلال القرآن میں ہمارا جو انداز ہے' اس کے پیش نظر ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم یہاں کائنات کے اندر پائے جانے والی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کر سکیں۔ (البتہ میری کتاب خصائص التصور الاسلامی میں'

حقیقت الوہیت 'حقیقت انسانی اور حقیقت مادہ کے عنوانات قابل ملاحظہ ہیں) یہاں اس بحث کے دوران اس حقیقت کو اس لئے لایا گیا ہے کہ انسان کے دل و دماغ کو اس طرف متوجہ کیا جائے کہ یہ تمام مخلوقات اور اس مخلوق کا یہ نظام حیات جس کے مطابق زندگی رواں دواں ہے اور پھر اس کے بارے میں اللہ کی جانب سے مکمل تدبیر اور علم اور آخرت میں ان تمام مخلوقات کا اللہ کے سامنے اٹھنا یہ سب ایسے امور ہیں کہ ان میں کسی معجزے سے زیادہ حیرت انگیز دلائل اور اشارات ہیں۔ اگر کوئی معجزہ صادر ہو جائے تو اسے انسانوں کی ایک وقت میں موجود نسل ہی ملاحظہ کرے گی لیکن ان مخلوقات کے اندر موجود آیات الٰہی پر اگر غور کیا جائے تو ہر وقت زندہ معجزات نظر آئیں گے اور ہر دور کے لوگ انہیں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

اب اس لہر کا خاتمہ اس حقیقت پر ہوتا ہے کہ ہدایت و ضلالت کی پشت پر سنت الٰہی کے مطابق مشیت الٰہی کام کر رہی ہے اور یہ کہ اللہ کی مشیت اور سنت انسانی فطرت پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں اور راہنمائی کرتی ہیں۔

(وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (٦ : ٣٩)) "مگر جو لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے اور گونگے ہیں' تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے' بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے رستے پر لگا دیتا ہے۔" یہ اسی حقیقت کا اعادہ ہے کہ کون لوگ ہیں جو سنتے ہیں اور کون ہیں جو مردہ ہیں اور سن ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا وہ قبول حق سے محروم ہیں لیکن یہاں بات کو ایک دوسرے تناظر میں پیش کیا جاتا ہے۔ جو لوگ آیات الٰہی کی تکذیب کرتے اور ان دلائل و بینات پر غور نہیں کرتے جو اس کائنات میں ہر طرف بکھری پڑی ہیں۔ پھر قرآن کریم میں پائی جانے والی آیات و نشانیوں پر بھی وہ غور نہیں کرتے یہ کیوں؟ اس لئے کہ انہوں نے اپنی شخصیات میں پائے جانے والے قبولیت حق کے مادے اور صلاحیت ہی کو معطل کر دیا ہے۔ یہ بہرے ہیں سنتے ہی نہیں گونگے ہیں اور کوئی بات ہی نہیں کرتے۔ گمراہی کے اندھیروں میں غرق ہیں۔ کچھ دیکھتے ہی نہیں۔ صرف مادی اعتبار سے ہی نہیں حقیقی اعتبار سے بھی یہ بہرے' گونگے اور اندھے ہیں اس طرح کہ ان کے قوت مدرکہ معطل ہے۔ ان کے حواس کام ہی نہیں کرتے اور نہ ان کے حواس کوئی اچھی بات ان کے دماغوں تک منتقل کرتے ہیں۔ اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ قرآن کی آیات بذات خود اثرانگیز' محرک اور جھنجوڑنے والی ہیں لیکن ان پر ان آیات کا کچھ اثر ہی نہیں ہو رہا ہے۔ وہ بات کو پاتے ہی نہیں۔ لہٰذا ان آیات بینات سے جو شخص روگردانی کرتا ہے اس کی فطرت میں فساد پیدا ہو گیا ہے' لہٰذا وہ اس قابل نہیں رہی ہے کہ ہدایت قبول کرے اور ایک ترقی یافتہ زندگی بسر کرنے کا اہل بن جائے۔

اور یہ سب صورت حالات اللہ کی مشیت کے دائرے کے اندر رونما ہو رہی ہے۔ اس مشیت کا تقاضا ہی یہ تھا کہ حضرت انسان کے اندر ہدایت قبول کرنے اور گمراہی اختیار کرنے کی دونوں صلاحیتیں موجود ہوں اور وہ دونوں راستوں میں سے کوئی ایک راہ اختیار کرنے میں آزاد ہو اور اس پر کوئی جبر نہ ہو اور نہ کوئی قضائے مبرم ہو۔ اس طرح اللہ جسے چاہتا ہے راہ ہدایت پر ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اور یہ ہے اللہ کی مشیت کا مفہوم۔ اللہ کی مشیت اس شخص کی مددگار ہوتی ہے جو اس کی راہ میں جدوجہد کرتا ہے اور جو شخص عناد کی راہ اختیار کرتا ہے خود گمراہ ہوتا ہے۔

اللہ کسی بندے پر ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

راہ ہدایت کی طرف انسان کا رجحان اور میلان یا راہ ضلالت کی طرف انسان کا رجحان اور میلان ' دونوں اس مخلوق کے اندر اللہ کی پیدا کردہ صلاحیت سے پیدا ہوتے اور اس کی مشیت کے مطابق ہی کام کرتے ہیں۔ابتداء " تو یہ رجحان اللہ کا پیدا کردہ ہے اور اس ابتدائی تخلیق کردہ مادے کے نتائج کے طور پر جو ہدایت وگمراہی آتی ہے یہ بھی دائرہ مشیت الہیہ کے اندر ہوتی ہے۔اور یہ مشیت بے قید ہے۔سوال یہ ہے کہ پھر باز پرس اور سزاو جزاء کیوں ہے؟ تو وہ اس وجہ سے ہے کہ انسان کا رجحان بہرحال آزادی کی طرف ہوتا ہے۔میلان میں وہ آزاد ہے۔اگرچہ اس کی یہ صلاحیت اس کے اندر اللہ کی تخلیق کردہ ہے اور اللہ کی مشیت کے ماتحت ہے۔( دیکھئے "خصائص تصور اسلامی" کا عنوان "التوازن" )

اس لہر کی آیات کی تشریح کے بعد اب ذرا رکیے تاکہ ہم اس مطالعے سے ان لوگوں کے لئے سرمہ بصیرت حاصل کر لیں جو کسی بھی دور میں اور کسی بھی امت میں دعوت اسلامی کا کام کرتے ہیں۔ان آیات میں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ زمان و مکان کی حدود سے باہر ہیں۔ان کا اطلاق تمام حالات اور تمام تحریکوں پر ہوتا ہے اور ان میں دعوت دین کے ایسے نقوش وضع کئے گئے ہیں جو ہر دور کے لئے کار آمد ہیں۔یہاں ہم اس نکتے کے پورے پہلوؤں کو زیر بحث نہیں لاسکتے البتہ ہم یہاں نشانات راہ معلوم کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دعوت اسلامی کی راہ نہایت ہی پرخطر ہے۔اس میں جگہ جگہ کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ہر قدم پر ایک ناپسندیدہ صورت حال کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود سچائی کو فتح اور کامرانی کی گارنٹی دی گئی ہے۔ہاں یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ فتح کا وقت پس پردہ تقدیر ہوتا ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے۔اس کی حکمت کے مطابق ظاہر ہوتا ہے۔اس کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے اور اس کے سوا کوئی اور اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔یہاں تک کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس غیب کا علم نہیں دیا گیا۔اس راہ میں جو مشکلات سامنے آتی ہیں وہ دو اہم اساسی فیکٹرز کا نتیجہ ہوتی ہیں۔پہلا فیکٹر یہ ہے کہ جب دعوت اسلامی کا آغاز ہوتا ہے تو پہلے لوگ اس سے روگردانی اختیار کرتے ہیں۔اس کے بعد دوسری مشقت یہ ہوتی ہے کہ داعی کے دل میں اس بات کی شدید خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ لوگ دعوت اسلامی کو قبول کر کے راہ حق پر آجائیں اور اس ذوق و شوق میں وہ بھی ڈوب جائیں جس سے داعی سرشار ہوتا ہے۔اس کے لئے وہ پرجوش ہوتا ہے اور اپنی دعوت کے کلمے کی سربلندی چاہتا ہے۔یہ خواہش بھی اسی قدر تکلیف دہ ہوتی ہے جس قدر مخالفین کی طرف سے اعراض اور تکذیب تکلیف دہ ہوتی ہے۔یہ دونوں فیکٹرز داعی کے لئے سوہان روح بن جاتے ہیں۔

یہاں ' اس لہر میں قرآن کریم جو ہدایات دیتا ہے وہ اس مشقت کے دونوں پہلوؤں کے سلسلے میں ہیں۔قرآن کریم کہتا ہے کہ جو لوگ قرآن کی دعوت سے اعراض کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلاتے ہیں وہ حق الیقین رکھتے ہیں کہ صرف حضور ؐ اور آپ کی دعوت عین سچائی ہیں۔اور حضور ؐ سچے ہیں اور وہ یہ پیغام اللہ کی جانب سے لے کر آئے ہیں۔لیکن اپنے اس علم کے باوجود وہ اس دعوت کو قبول نہیں کرتے۔وہ محض ذاتی خواہشات اور ہوائے نفس کی وجہ سے تکذیب کرتے ہیں حالانکہ یہ دعوت ایسی ہے کہ وہ بذات خود دلیل حق ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب کا مصداق ہے اور انسان کے فطری تقاضوں کے عین مطابق ہے۔بشرطیکہ فطرت زندہ ہو

اور سچائی کو قبول کرنے کا مادہ اپنے اندر رکھتی ہو۔ کیونکہ (اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ (۶: ۳۶)) بے شک دعوت حق تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو تکذیب پر اصرار کرتے ہیں تو ان کے دل و دماغ مردہ ہیں۔ وہ خود بھی مردہ ہیں۔ گونگے 'بہرے اور اندھے ہیں اور تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ رسول کے اندر یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ مردوں کو سنوائے اور نہ مردے سنتے ہیں۔ اگرچہ کوئی پکارتا ہے۔ ایک داعی کی ڈیوٹی یہ نہیں ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کرے۔ کیونکہ یہ تو اللہ کی شان ہے اور یہ اللہ کا کام ہے۔ یہ تو ہے معاملے کا ایک پہلو اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ کی نصرت بہرحال حق کے ساتھ ہوتی ہے۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ دستور الٰہی ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے مقرر شدہ وقت پر آتی ہے۔ جس طرح سنت الٰہیہ قبل از وقت ظاہر نہیں ہوتی اور جس طرح اللہ کے کلمات بدلتے نہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی اٹل ہے کہ آخر کار نصرت آتی ضرور ہے اور یہ بات بھی اپنی جگہ پر ہے کہ وہ قبل از وقت نہیں آتی۔ اپنے وقت پر ہی ظاہر ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس معاملے میں کوئی جلدبازی نہیں فرماتے۔ اس لئے کہ اذیت اور تکالیف تو داعیوں پر آتی ہی رہتی ہیں اگرچہ داعی رسول ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ داعیوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ بغیر عجلت اور شتابی اور بے صبری کے مشکلات کو انگیز کریں اور قبل از وقت نصرت کا مطالبہ نہ کریں۔

دین اسلام میں ایک داعی اور رسول کا کردار کیا ہوتا ہے' ان قرآنی ہدایات میں اس کا تعین بھی کر دیا گیا ہے۔ تمام ادوار کے لئے اور تمام معاملات کے لئے۔ وہ کردار یہ ہے کہ انہوں نے پیغام پہنچانا ہے اور اپنی راہ پر آگے بڑھنا ہے اور اس راہ کی مشکلات کو برداشت کرنا ہے۔ رہی یہ بات کہ لوگ راہ ہدایت پر آتے ہیں یا نہیں تو یہ جس طرح داعی اور رسول کی طاقت کے حدود سے باہر ہے اسی طرح ان کے فرائض میں بھی شامل نہیں ہے۔ ہدایت و ضلالت سنت الٰہیہ کے مطابق کام کرتی ہیں اور سنت الٰہیہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اگر رسول اپنے کسی محبوب کے بارے میں لاکھ چاہے کہ وہ ہدایت پر آجائے تو اگر سنت الٰہیہ اس کے حق میں نہیں ہے تو وہ راہ ہدایت نہیں پا سکتا۔ جبکہ رسول کے دشمنوں اور مبغوض لوگوں کو بھی ہدایت نصیب ہو سکتی ہے۔ اس معاملے میں داعی اور رسول کی شخصیت اور ذات کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ رسول کے ساتھ یہ حساب نہ ہو گا کہ اس کی دعوت کے نتیجے میں کتنے لوگ راہ راست پر آئے ہیں۔ اس سے صرف یہ پوچھا جائے گا کہ اس نے دعوت کا حق کس قدر ادا کیا' کس قدر مشکلات کو برداشت کیا اور کس قدر اپنی راہ روش پر جمے رہے۔ اور کس قدر ثابت قدمی اختیار کی۔ رہی یہ بات کہ لوگ ہدایت قبول کرتے ہیں یا نہیں' تو یہ معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

(مَنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یُضْلِلْهُ وَمَنْ یَّشَاْ یَجْعَلْهُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۶: ۳۹)) جسے اللہ چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے صراط مستقیم پر ڈال دیتا ہے۔" (وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَی الْهُدٰی (۶: ۳۵)) اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔" (اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ (۶: ۳۶)) دعوت حق پر لبیک وہی لوگ کہتے ہیں جو سنتے ہیں۔ اس سے قبل ہم یہ بیان کر آئے ہیں کہ اللہ کی مشیت ہدایت و ضلالت کے بارے میں بے قید ہے اور اس کا رابطہ لوگوں کے رجحان اور جدوجہد کے ساتھ ہے۔ وہ بیان کافی و شافی ہے۔

چنانچہ داعی حق کا رویہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ جن لوگوں کو دعوت دیتا ہے' ان کی جانب سے پیش کردہ تجاویز پر کان نہ دھرے۔ خصوصاً جبکہ ان تجاویز کا تعلق اساس دین اور منہاج دعوت سے ہو۔ نہ کسی داعی کے لئے مناسب ہے کہ وہ دین کے اصولوں کو لوگوں کی وقتی خواہشات و رغبات کے مطابق بنا سجا کے پیش کرے۔ مشرکین کا مطالبہ یہ تھا کہ حضورؐ کچھ خارق عادت معجزات پیش کریں جو ان کے زمانے کے تصورات اور مالوفات کے مطابق ہوں اور جنہیں وہ سمجھ سکیں جس کے بارے میں قرآن کریم نے کئی مقامات پر ذکر کیا ہے۔ اس سورہ میں بھی ان کا یہ قول مذکور ہے۔

(لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ (۲۵ : ۷) وہ کہتے ہیں کہ اس پر فرشتہ کیوں نہیں نازل ہوتا؟ (وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ) اور وہ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں نازل ہوتی اس پر کوئی نشانی اس کے رب کی جانب سے؟" (وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا (۶ : ۱۰۹) اور وہ پختہ قسمیں اٹھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئی تو وہ اس پر ضرور ایمان لائیں گے۔" ایک دوسری سورہ میں ان کا یہ مطالبہ نہایت ہی تعجب خیز انداز میں سامنے آتا ہے۔ سورہ اسراء میں اللہ نے ان کے اس مطالبے اور تجویز کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

(وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا (۹۰) اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا (۹۱) اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (۹۲) اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ (۹۳) (۱۷ : ۹۰ تا ۹۳)) "اور انہوں نے کہا ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لئے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے۔ یا تیرے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے۔ یا تو آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے یا خدا اور فرشتوں کو رو در رو ہمارے سامنے لے آئے۔ یا تیرے لئے سونے کا ایک گھر بن جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں۔" اور سورہ الفرقان میں اسے یوں بیان کیا گیا ہے۔

(وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا (۷) اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا (۸)

(۲۵ : ۷-۸) کہتے ہیں یہ کیسا رسول ہے' جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ کیوں نہ اس کے پاس

کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو) دھمکاتا یا اور نہیں تو اس کے لئے کوئی خزانہ ہی اتار دیا جاتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ روزی حاصل کرتا۔" اس لہر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو براہ راست اس بات کی ممانعت کی گئی ہے کہ وہ اہل کفر کے مطالبے سے متاثر ہو کر کہیں اس خواہش کا اظہار نہ کریں کہ کوئی معجزہ صادر ہو ہی جائے۔ چنانچہ حضور ؐ سے ان الفاظ میں خطاب ہوا۔

(وَاِنْ کَانَ کَبُرَ عَلَیْکَ اِعْرَاضُھُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِیَھُمْ بِاٰیَۃٍ وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَمَعَھُمْ عَلَی الْھُدٰی فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ (۳۵) اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ وَالْمَوْتٰی یَبْعَثُھُمُ اللّٰہُ ثُمَّ اِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ (۳٦) (٦ : ۳۵ - ۳٦) "اگر ان لوگوں کی بے رخی تم سے برداشت نہیں ہوتی' تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کچھ سرنگ ڈھونڈو' یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو' اگر اللہ چاہتا تو ان لوگوں کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا' لہٰذا نادان مت بنو۔ دعوت حق پر لبیک وہی لوگ کہتے ہیں جو سننے والے ہیں۔ رہے مردے تو انہیں اللہ بس قبروں سے اٹھائے گا اور پھر وہ واپس لائے جائیں گے (اس کی عدالت میں پیش ہونے کے لئے)۔

بعض مسلمانوں کے دلوں میں یہ رغبت پائی جاتی تھی کہ مشرکین صدور معجزات کے بارے میں جو مطالبے کرتے ہیں ان کا مطالبہ پورا کر دیا جائے۔ اس لئے کہ وہ پختہ قسمیں کھاتے تھے کہ اگر کوئی معجزہ صادر ہو گیا تو وہ ضرور ایمان لائیں گے۔ ایسے لوگوں کو کہا گیا :-

(قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ وَمَا یُشْعِرُکُمْ اَنَّھَآ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۱۰۹) وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَھُمْ وَاَبْصَارَھُمْ کَمَا لَمْ یُؤْمِنُوْا بِہٖٓ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّنَذَرُھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ (۱۱۰) (٦ : ۱۰۹ - ۱۱۰)) (اے نبی ؐ' ان سے کہو نشانیاں تو اللہ کے اختیار میں ہیں اور تمہیں کیسے سمجھایا جائے کہ اگر نشانیاں آ بھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں۔ ہم اسی طرح ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر رہے ہیں جس طرح یہ پہلی مرتبہ اس پر ایمان نہیں لائے تھے۔ ہم انہیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑے دیتے ہیں۔) تاکہ اہل ایمان یہ جان لیں کہ اہل کفر کے ہاں اس بات کی کمی نہیں ہے کہ ان کے سامنے کوئی معجزہ نہیں ہے یا ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے جو انہیں سچائی تک لے جائے 'بلکہ ان کے ہاں جو کمی ہے وہ یہ ہے کہ وہ سنتے ہی نہیں۔ وہ اس طرح ہیں جس طرح مردے۔ ان کی قسمت میں ہدایت نہیں ہے۔ وہ سنت الٰہی کے مطابق اپنے آپ کو ہدایت سے محروم کر چکے ہیں۔ لہٰذا تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ دین اللہ کی سنت کے مطابق چلتا ہے۔ اور اس کا مقام

اس سے بلند ہے کہ وہ لوگوں کی خواہشات اور عوام کی تجاویز کے مطابق کوئی روش اختیار کرے ۔ اب ہم قرآنی آیات کے ایک وسیع دائرے میں آجاتے ہیں۔ اب ایسی ہدایات سامنے آتی ہیں جو زمان و مکان کی قید سے وراء ہیں' جن کا تعلق کسی ایک واقعہ سے نہیں ہے۔ نہ کسی مخصوص تجویز سے ان کا تعلق ہے۔ زمانہ تو بدلتا رہتا ہے۔ لوگوں کی خواہشات اور ان کے مطالبات بھی بدلتے رہتے ہیں اس لئے داعیان حق کو چاہئے کہ انہیں لوگوں کی خواہشات صراط مستقیم سے ادھر ادھر نہ کر دیں۔ یہ لوگوں کی خواہشات اور ان کے مطالبات ہی ہیں جن کا لحاظ کرتے ہوئے بعض داعیان حق اسلامی نظریہ حیات کو ایک مذہب کے طور پر تسلیم کر کے اسے دوسرے مذہب کی طرح ایک کاغذی مذہب قرار دیتے ہیں اور اسے انفرادی زندگی کے معاملات تک محدود کر دیتے ہیں۔ جس طرح اس کرۂ ارض پر متعدد دوسرے مذاہب موجود ہیں جو کسی وقت ایک محدود مقصد کے لئے وجود میں آجاتے ہیں۔ جب ان مذاہب پر کچھ وقت گزر جاتا ہے تو وہ بکواس ثابت ہوتے ہیں اور ان کے تضادات کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ پھر اسی جذبے کے تحت بعض داعی اسلامی نظام کو ایک کاغذی منصوبے یا ایک مفصل کاغذی قانونی نظام کی صورت میں پیش کرتے ہیں اور اس منصوبے کے ذریعے وہ دور جدید کی جاہلیت کے واقعی حالات کا مقابلہ کرتے ہیں حالانکہ اہل جاہلیت کی جو عملی صورت حال ہے اس کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے کہ دور جدید کے اہل جاہلیت تو ہبانگ دہل یہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک پرائیویٹ عقیدہ ہے اور اس کا زندگی کے واقعی اور عملی نظام کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ یہ داعی لوگوں کے لئے اس عملی جاہلی صورت حال کو اسلامی رنگ میں مرتب کرتے ہیں۔ اس کے مطابق لوگ بدستور جاہلیت پر قائم رہتے ہیں' اپنے فیصلے طاغوت کی عدالت سے کراتے ہیں۔ نہ وہ شریعت کے مطابق فیصلے کرتے ہیں اور نہ کراتے ہیں۔ اس قسم کی تمام کوششیں نہایت ہی گھٹیا اور ذلیل حرکات ہیں۔ ایک سچے مسلمان کو چاہئے کہ وہ ان جدید فکری رنگوں میں رنگے ہوئے ان خیالات کو پرے پھینک دیں' اس لئے کہ یہ خیالات ناپختہ ہیں اور کسی حال میں بھی اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتے۔ اگرچہ ان کو دعوت اسلامی کے جدید رنگ اور جدید تکنیک کا نام دیا جائے۔

اور اس سے بھی زیادہ ذلیل اور گھٹیا حرکت ان لوگوں کی ہے جو اسلام کو جدید لباس پہناتے ہیں اور اسلام پر ایسی صفات اور اصطلاحات کا اطلاق کرتے ہیں جو تاریخی ادوار میں کسی دور میں خود انسانوں نے ایجاد کیں۔ مثلاً اشتراکیت اور جمہوریت وغیرہ۔ ایسے لوگوں کی اس سعی نامشکور کا مقصد یہ رہا ہے کہ وہ اسلام کی ترقی یافتہ تعبیر کر کے اس طرح اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے اشتراکیت ایک اجتماعی اور اشتراکی نظام ہے اور یہ خالص انسانوں کا بنایا ہوا ہے۔ اس کے اندر کچھ چیزیں درست بھی ہو سکتی ہیں اور کچھ غلط بھی ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح جمہوریت بھی ایک نظام حکومت اور نظام زندگی ہے۔ یہ جمہوری نظام خود انسانوں کی سوچ اور فکر کے نتیجے میں بنایا گیا ہے۔ اس میں بعض چیزیں درست بھی ہو سکتی ہیں اور غلط بھی ہو سکتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور یہ نظریاتی افکار ایک اجتماعی سوشل نظام' ایک علیحدہ اقتصادی نظام اور ایک ممتاز عملی اور انتظامی ڈھانچے پر مشتمل ہے اور یہ نظام اللہ کا بنایا ہوا نظام ہے۔ اس کے اندر نہ کوئی نقص پایا جاتا ہے اور نہ کوئی عیب ہے۔ لہذا جو شخص اسلامی نظام حیات کے لئے وہ خصوصیات اور صفات تلاش کرتا ہے جو انسانوں کی بنائی ہوئی ہیں اور ان کی سفارش کرتا ہے تو وہ شخص اسلام کے حوالے سے درست موقف کا حامل نہیں ہے۔ یا اس پر ایسے اقوال منطبق کرتا ہے جو انسانوں کے اعمال ہیں۔

اہل جاہلیت مشرک صرف اس لئے قرار پاتے تھے کہ وہ اللہ کی مخلوقات میں سے بعض لوگوں کو اللہ کے ہاں سفارشی بناتے تھے اور ان کو دوست بناتے تھے۔

(وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی

(۳۹:۳)) "وہ لوگ جنہوں نے اس کے سوا دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں۔ (اور اپنے اس فعل کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ) ہم تو ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کر دیں" یہی تو شرک ہے' سوال یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے دربار میں کچھ لوگوں کی سفارش کے مرحلے سے بھی آگے بڑھ کر کچھ دوسرے لوگوں کے بنائے ہوئے نظام حیات کے ذریعے تقرب حاصل کرتے ہیں ان کا یہ فعل' مشرکین عرب کے فعل سے کس قدر زیادہ مکروہ ہے۔ مشرکین عرب دین بہرحال خدا ہی کا مانتے تھے البتہ کچھ اشخاص کو شریک بناتے تھے۔ یہ لوگ تو نظام حیات غیراللہ کا اپناتے ہیں اور قرب اللہ کا چاہتے ہیں۔

خوب غور کیجئے اور سمجھیے کہ اسلام اسلام ہے' سوشلزم سوشلزم ہے اور جمہوریت جمہوریت ہے۔ اسلام کا صرف وہی نام اور وہی عنوان ہو گا جو اس کے لئے اللہ نے رکھا ہے اور تجویز کیا ہے۔ یہ دوسرے نام اور عنوان لوگوں کے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ تمام دوسرے نظام لوگوں نے اپنے تجربوں سے بنائے ہوئے ہیں' اگر کوئی شخص ان نظاموں کو اپناتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ انہیں اپنے نام اور عنوان سے اپنائے۔ کسی داعی دین کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ لوگوں کے اپنائے ہوئے کسی رنگ کو اپنائے اور دعویٰ یہ کرے کہ وہ اللہ کے دین پر کوئی احسان کر رہا ہے۔

بہرحال ہم ایسے لوگوں سے ایک بات پوچھتے ہیں' آخر تمہاری نظروں میں اللہ کا دین اس قدر بے وقعت کیوں ہو گیا ہے' اور تم کیوں اللہ کی عظمت کو اپنے دل میں اس طرح نہیں بٹھاتے جس طرح اس کا حق ہے۔ تم لوگ آج کے دور میں اسلام کو کیوں اشتراکیت اور جمہوریت کے رنگ میں پیش کرتے ہو' کیونکہ یہ تو دور حاضر کے فتنے اور دور حاضر کے بدلتے ہوئے رنگ ہیں۔ تم دیکھتے نہیں ہو کہ ماضی قریب ہی میں سرمایہ داری کس قدر محبوب نظام تھا۔ یہ اس لئے محبوب تھا کہ لوگ جاگیرداری سے گلوخلاصی چاہتے تھے جبکہ جاگیرداری سے بھی پہلے ڈکٹیٹرشپ ایک محبوب نظام تھا اور اس کے ذریعے لوگ چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور بکھری ہوئی ظالم ریاستوں سے نجات چاہتے تھے مثلاً جرمنی اور اٹلی کے ممالک اس دور سے بھی گزرے ہیں۔ کل مذکورہ بالا نظاموں کے مقابلے میں دنیا میں کوئی نیا نظام بھی رائج ہو سکتا ہے جو اہل دنیا کا کوئی تجربہ یا نیا رنگ ہو گا اور جس میں ایک نئی شکل میں انسان' انسان کا غلام ہو گا تو تم پھر کل اسلام پر اس نئے نظام اور رنگ کا لیبل چسپاں کرو گے تاکہ تم اسلام کو ایک ایسے رنگ میں پیش کر سکو جسے لوگ چاہتے ہیں؟

آیات کے زیر بحث حصے بالعموم اور قرآن کریم کے دوسرے مقامات پر یہ ہدایات دی گئی ہیں کہ داعی دین کا رویہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنی دعوت و نظریہ کو لے کر اور مستغنی ہو کر آگے بڑھے اور جو لوگ دعوت اسلامی کے سلسلے میں ترمیمی تجاویز دیتے ہیں ان کی باتوں اور تجویزوں پر سرے سے کان ہی نہ دھرے۔ نیز دین اسلام کو اس کے اصل نام اور عنوان کے ساتھ ہی پیش کرے اور اسے دوسرے مروجہ ناموں اور عنوانوں کے ساتھ معنون کرنے کی سعی نہ کرے۔ وہ لوگوں کو اسلامی منہاج اور اسلامی ذرائع ہی کے ذریعے بیدار کرنے کی سعی کرے۔ اللہ تمام جہانوں

سے بے نیاز ہے۔ اگر کوئی اس دعوت کو اس طرح قبول نہیں کرتا جس میں وہ صرف اللہ کی بندگی کرے اور اس کے سوا تمام غلامیوں سے نکل آئے تو دین اسلام کو کسی ایسے شخص کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کو کسی سرکش اور کسی مطیع فرمان کی طرف کوئی احتیاج ہے۔

دین اسلام اپنے بنیادی عناصر اور اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اپنی ایک خاص اصلیت (Orignality) رکھتا ہے۔ اللہ کا منشا یہ ہے کہ یہ خصائص اور یہ اساسی اقدار غالب ہو جائیں۔ دنیا کے عملی نظام کے معاملے میں یہ دین اصلیت (Orignality) کا مالک ہے اور وہ جس انداز میں انسان کو دعوت فکر دیتا ہے وہ بھی اور جنیل ہے۔ جس خدا نے اس دین کو اپنی خصوصیات اور اپنے عناصر ترکیبی کے ساتھ اتارا ہے' وہی خدا تو ہے جو اس حضرت انسان کا خالق ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ انسان کیا کیا سوچتا رہتا ہے اور اس کے دل میں خواہشات کی کیا کیا لہریں اٹھتی ہیں؟

اس لہر میں قرآن کریم کے اس انداز خطاب کا بھی ایک نمونہ موجود ہے جس کے ساتھ وہ فطرت انسانی کو مخاطب کرتا ہے۔ اس کے اسلوب خطاب میں سے یہ بھی ایک اساسی نمونہ ہے۔ قرآن انسانی فطرت اور اس کائنات کے طبیعی عمل کے درمیان ایک رابطہ اور تعلق پیدا کرتا ہے۔ وہ کائناتی اثرات و اشارات کا رخ فطرت انسانی کی طرف موڑتا ہے۔ اس اثناء میں قرآن انسان کی فطری ساخت کو اس پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ ان فطری اشارات کو قبول کرے۔ قرآن جانتا ہے کہ جب اس کائنات کے تکوینی اشارات انسانی فطرت کی گہرائیوں تک پہنچ جائیں تو انسان فوراً لبیک کہتا ہے۔

(اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ (٦ : ٣٦) "بے شک وہ لوگ قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں۔" وہ نمونہ طرز ادا کیا ہے جو اس لہر میں ہم سے مخاطب ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں۔

(وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (٦ : ٣٧)) "یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی؟ کہو 'اللہ نشانی اتارنے کی پوری قدرت رکھتا ہے' مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی میں مبتلا ہیں۔"

اس آیت میں ان لوگوں کی بات نقل کی گئی ہے جو دین اسلام کو جھٹلاتے تھے' حضور ؐ کا مقابلہ کرتے تھے' اور ایسے خارق عادت معجزات کے طلبگار تھے جنہیں ان کی آبادی بچشم سر دیکھے۔ یہاں ان کا مطالبہ نقل کرنے کے بعد ان کے دلوں میں یہ بات بٹھائی جاتی ہے کہ اگر ان کا یہ مطالبہ مان لیا جائے تو اس کے نتائج کیا نکلیں گے۔ یہ کہ وہ خدا کی شدید پکڑ میں آ جائیں گے اور ہلاک و برباد کر دیئے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اللہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ کوئی معجزہ نازل فرمائے۔ لیکن اللہ کی رحمت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ نازل نہ کرے اور اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کے اس مطالبے کو مسترد کر دے۔

سیاق کلام اب اس محدود موضوع سے نکل کر کائنات کی وسعتوں میں داخل ہو جاتا ہے اور لوگوں کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ تم اپنے اردگرد پھیلی ہوئی اس کائنات پر ذرا نگاہ ڈالو' وہ آیات و معجزات خود کتاب کائنات کے اندر موجود ہیں جن کے مقابلے میں وہ خوارق کچھ خوارق نہیں جن کا وہ مطالبہ کرتے ہیں۔ اور یہ معجزات اور نشانات اس کائنات کے

دل میں ابد الاباد تک قائم ہیں تاکہ صرف ایک موجودہ نسل ہی نہیں سب نسلیں انہیں دیکھتی رہیں۔

(وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طٰئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ (٦ : ٣٨)) "زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمہاری ہی طرح کے انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جا رہے ہیں۔" یہ بے شک ایک ہولناک حقیقت ہے۔ یہ وہ عظیم حقیقت ہے جسے اس وقت ان کی قوت مشاہدہ دیکھ سکتی تھی، اس لئے کہ اس وقت تک وہ سائنس میں کوئی منظم علم نہ رکھتے تھے۔ وہ یہ کہ تمہارے اردگرد موجود تمام مخلوقات کے اصناف و اجناس اپنی جگہ اقوام و امم ہیں۔ ہر ایک کی اپنی خصوصیت ہے اور اپنا نظام ہے، لیکن یہ مشاہدہ اس قدر عظیم حقیقت ہے کہ جس قدر اس کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کی عظمت کا یقین ہوتا جاتا ہے، اس سے انسانی علم میں اضافہ ہوتا ہے ہاں انسانی علوم اس کائنات کے علوم میں اضافہ تو کر سکتے ہیں لیکن ان کی وجہ سے اس کائنات کی کسی بھی حقیقت میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی علوم کے متوازی اللہ کے علوم غیبی ہیں جو اپنا کام کرتے ہیں اور ہر معاملے پر الہی علم و ارادہ اپنا تدبیری عمل جاری رکھے ہوئے ہے اور اس کائنات میں ہمارا مشاہدہ جس قدر آگے جاتا ہے، یہ حقیقت اور واضح ہوتی جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس کائنات کے اندر جو الہی قوتیں کارفرما ہیں اور جو نہایت ہی معجزانہ انداز میں کام کر رہی ہیں ان کے مقابلے میں ان لوگوں کے مطلوبہ معجزات کی حیثیت ہی کیا ہے؟ یہ کائناتی آیات و معجزات تو وہ حقائق ہیں کہ انسان کی بصارت اور بصیرت جس قدر آگے بڑھتی ہے وہ ان کے نئے نئے پہلو دیکھتے ہیں اور قیامت تک دیکھتے رہیں گے۔

اس انتخاب اور نمونے میں قرآنی منہاج کلام یہ ہے کہ قرآن کریم فطرت انسانی اور اس کائنات کے درمیان ایک ربط اور جوڑ پیدا کر دیتا ہے۔ وہ فطرت کے دریچے کائنات کے رازوں کے لئے وا کر دیتا ہے اور اس طرح قرآن کریم اس عظیم کائنات کے رازوں کے ذریعے انسان کی شخصیت اور اس کی سوچ پر گہرے اثرات چھوڑتا ہے۔

قرآن کریم انسان کی فطرت کے سامنے محض جدلیاتی لاہوتی مباحث پیش نہیں کرتا۔ نہ ان کے سامنے محض جدلیاتی علم الکلام اور توحیدی مباحث پیش کرتا ہے۔ نہ عقلی اور حسی فلسفے پیش کرتا ہے۔ یہ امور اسلامی اور قرآنی منہاج کے خلاف ہیں۔ قرآن لوگوں کے سامنے عالم موجودات اور عالم غیب کے واقعی مشاہد و حقائق پیش کرتا ہے۔ عقل انسانی کو آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ وہ غور و فکر کرے، ان سے نتائج اخذ کرے اور قدرت کی کارفرمائیوں کے ساتھ ہمقدم ہو کر چلے اور حقائق کو قبول کرے لیکن قرآن کریم انسان پر یہ ایک خاص ضابطے اور اسلوب کے ساتھ پیش کرتا ہے اور اسے اسی طرح نہیں چھوڑ دیتا کہ وہ عالم شہادت کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر صراط مستقیم کھو دے۔ اب سب سے آخر میں ان لوگوں کا انجام بتلایا جاتا ہے جو اس عظیم معجزے کے منکر ہیں :-

(وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَمَنْ يَّشَاْ

يَجْعَلْهُ عَلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۶ : ۳۹)) ”مگر جو لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں' وہ بہرے اور گونگے ہیں' تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے رستے پر لگا دیتا ہے۔“ قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ جو لوگ آیات الہی کو جھٹلاتے ہیں وہ گونگے اور بہرے ہیں اور اندھیروں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور پھر بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے نزدیک ہدایت و ضلالت کے بارے میں کیا اصول رائج ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہدایت و ضلالت اللہ کی مشیت کے دائرے میں آتی ہے اور یہ اس قانون فطرت کے مطابق ہے جس پر اللہ نے بندوں کو پیدا کیا ہے۔

یوں اس معاملے میں اسلامی تصور حیات کے تمام پہلو جڑ جاتے ہیں اور اسلامی منہاج دعوت کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے۔ ایک داعی کے موقف کو متعین کر دیا جاتا ہے' جو اپنے نظریات و عقائد کے مطابق جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ ہر دور اور ہر حال میں وہ لوگوں کے سامنے دعوت پیش کرتا رہتا ہے۔ امید ہے کہ اس قدر کلمات کے ساتھ ہم اپنا مدعا واضح کر چکے ہیں اور اس کے ساتھ وہ مزید بحث بھی قابل ملاحظہ ہے جو ہم نے دعوت اسلامی کے منہاج کے سلسلے میں اس سورہ کے مقدمے میں کی ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۶۰ ایک نظر میں

یہاں سے سیاق کلام کا رخ اب اس موضوع کی طرف پھر جاتا ہے کہ جب اللہ کا عذاب آتا ہے تو اس کا مشرکین کی فطرت پر کیا ردعمل ہوتا ہے بلکہ مشرکین کے سامنے ان کے فطری ردعمل کا نمونہ پیش کر دیا جاتا ہے کہ جس سے وہ عذاب الہی کے وقت دوچار ہوتے ہیں۔ جب انسان اور ان مشرکین کی فطرت کے اوپر سے تہ بہ تہ جمے ہوئے مادی پردے ہٹ جاتے ہیں اور جب وہ خوفناک حالات سے جھنجوڑے جاتے ہیں تو فطرت کے اوپر جمی ہوئی گردو غبار چھٹ جاتی ہے۔ ایسے حالات میں یہ مشرکین اپنے جھوٹے خداؤں کی تمام کہانیاں بھول جاتے ہیں۔ وہ رب واحد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جس کی معرفت ان کی فطرت کی گہرائیوں میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ اب وہ صرف اللہ کے سامنے نجات اور فلاح کے لئے دست بدعا ہوتے ہیں۔

اس کے بعد سیاق کلام ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک دوسرے منظر کے سامنے لے جاتا ہے اور اس منظر میں انہیں بتایا جاتا ہے کہ ان کے اسلاف پر کیا کیا عذاب نازل ہوئے اور کس کس میدان میں وہ مارے گئے۔ سنت الہیہ نے تاریخ میں کیا کیا کردار ادا کیا اور قضائے الہی کس طرح ان کے ساتھ عمل کرتی رہی۔ ان کی بصارت اور بصیرت کو روشن کرنے کے لئے انہیں وہ واقعات بتائے گئے کہ اللہ نے انہیں کہاں کہاں مہلت دی جس کے اندر وہ رسولوں کو جھٹلاتے رہے۔ اور نتیجۃً کس طرح ایک ابتلاء کے بعد ان پر دوسری ابتلاء آتی رہی۔ انہیں مصائب و مشکلات سے دوچار کیا گیا۔ پھر نعمت و دولت کے ذریعے انہیں آزمائش میں ڈالا گیا اور انہیں مہلت کے بعد مہلت دی جاتی رہی تاکہ وہ غفلت کی نیند سے بیدار ہو جائیں یہاں تک کہ انہوں نے فرصت کے تمام مواقع ضائع کر دیئے۔ مشکلات اور مصائب نے ان کے اندر جو احساس پیدا کر دیا تھا' دولت و نعمت نے انہیں اس احساس سے محروم کر دیا۔ اللہ کی سنت کے مطابق ان پر پھر عذاب الہی آیا اور اس نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ یہ تھا:۔

(فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (٦: ٤٥) "اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی ہے جنہوں نے ظلم کیا تھا اور تعریف ہے اللہ رب العالمین کے لئے۔"

یہ منظر جو دلوں کو دہلانے والا ہے' ابھی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا کہ سامنے سے دوسرا منظر نمودار ہو جاتا ہے۔ اس نئے منظر میں یہ لوگ اللہ کے عذاب میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اللہ کے عذاب نے ان کی قوت سماعت اور ان کی قوت بصارت کو ختم کر دیا ہے۔ ان کے دلوں پر مہریں لگ چکی ہیں اور اب اللہ کے سوا' اس منظر میں' کوئی دوسری قوت انہیں نظر نہیں آتی جو ان کی کھوئی ہوئی بصارت' سماعت اور قوت مدرکہ انہیں دوبارہ دے سکے۔ ان نمایاں اور خوفناک مناظر کی موجودگی میں بتایا جاتا ہے کہ کسی رسول کے فرائض کیا ہیں؟ یہ کہ وہ بشیر و نذیر ہوتا ہے اور اس کے سوا نہ کوئی

اس کی ڈیوٹی ہے اور نہ اختیار۔ رسول کے پاس یہ طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی جانب سے کوئی معجزہ پیش کرے۔ نہ رسولوں کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ لوگوں سے تجاویز لیں اور ان کے مطابق کام کریں۔ وہ تو مبلغ ہوتے ہیں اور بشیر و نذیر ہوتے ہیں۔ اب صورت حالات یہ ہو جاتی ہے کہ بعض لوگ ان پر ایمان لا کر عمل صالح شروع کر دیتے ہیں۔ وہ خوف سے اور پریشانی سے نجات پا جاتے ہیں اور بعض لوگ ان کی تکذیب کرتے ہیں' اس لئے انہیں عذاب سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور یہ عذاب ان پر اس روگردانی اور تکذیب کی وجہ سے آتا ہے۔ اس لئے جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کا رویہ اختیار کرے' اس کا انجام یہ ہو گا' جس کا اس لہر میں ذکر ہوا ہے۔

-----ooo-----

# درس نمبر ۶۰ تشریح آیات

## ۴۰ ---- تا ---- ۴۹

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَ تَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ۝۴۱

"ان سے کہو، ذرا غور کر کے بتاؤ، اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے کوئی بڑی مصیبت آ جاتی ہے یا آخری گھڑی آپہنچتی ہے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم سچے ہو۔ اس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے ہو، پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو بھول جاتے ہو۔" اللہ تعالیٰ فطرت انسانی کے خطاب کے لئے جو وسائل استعمال فرماتے ہیں یہ اس کا ایک نمونہ ہے۔ یہ نمونے اس سے پہلے کی لہروں میں بھی بیان کئے جا چکے ہیں اور اس کے بعد جو فقرات آرہے ہیں ان میں بھی اس کے نمونے آئیں گے۔ اس پوری سورہ میں انسانی فطرت کو مخاطب کیا گیا ہے۔

اس سے قبل یہ بات کہی گئی تھی کہ زندہ مخلوقات کے جہان تمہاری نظروں کے سامنے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مدبرانہ قدرت نے ان کے اندر کس قدر تنظیم پیدا کر رکھی ہے۔ پھر ذرا دیکھو کہ اللہ کا علم کس قدر وسیع اور شامل ہے۔ اس زیر بحث مجموعہ آیات میں اللہ کے عذاب اور آفات ناگہانی کا ذکر ہے۔ جب یہ ناگہانی آفات و بلیات انسانی فطرت پر آتی ہیں تو ان کے مقابلے میں انسان کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب یہ آفات ایک ہولناک صورت میں ہوتی ہیں جس سے انسان کا دل دہل جاتا ہے۔ ایسے حالات میں انسان کے دل و دماغ سے شرک کے گرد و غبار کی تہیں چھٹ جاتی ہیں اور انسانی فطرت صاف ہو کر سامنے آجاتی ہے اور عقیدۂ توحید جو انسانی فطرت کی گہرائیوں میں موجود رہتا ہے وہ سامنے آتا ہے اور انسانی فطرت صرف رب واحد کو پکارتی ہے۔

(قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ اِنْ كُنْتُمْ

صٰدِقِیْنَ (۶ : ۴۰) ''ان سے کہو' ذرا غور کر کے بتاؤ اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے کوئی بڑی مصیبت آ جاتی ہے یا آخری گھڑی آ پہنچتی ہے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم سچے ہو۔'' یہاں ایک خوفناک صورت حال کا تصور پیش کیا جاتا ہے اور دنیا میں تباہی و بربادی کے بعض مناظر نظروں کے سامنے لائے جاتے ہیں یا یہ تصور کہ اچانک قیامت برپا ہو جائے۔ جب انسانی فطرت کے سامنے یہ مناظر آتے ہیں تو فطری احساس چٹکیاں لینے لگتا ہے۔ ان مناظر کی ہولناکی کا تصور ذہن میں خوبی کے ساتھ آ جاتا ہے اور اللہ خوب جانتا ہے جو خالق فطرت ہے کہ اس اسلوب کے ساتھ فطرت ان مناظر کا اچھی طرح ادراک کر لیتی ہے اور بسہولت حقیقت تک رسائی حاصل کر لیتی ہے۔ اس کی تمام قوتیں ان مناظر کی وجہ سے حرکت میں آ جاتی ہیں اس لئے کہ ان ہولناک مناظر میں جو حقیقت ہوتی ہے وہ فطرت انسانی کے اندر موجود ہوتی ہے۔ خالق فطرت کو تو اچھی طرح علم ہے کہ یہ حقیقت فطرت کے اندر موجود ہوتی ہے اس لئے باری تعالیٰ اس اسلوب میں فطرت سے مخاطب ہوتے ہیں اور فطرت اس تصور کو قبول کر لیتی ہے' کانپ اٹھتی ہے اور غفلت اور سرکشی پردوں اور غبار کی تہوں کے نیچے سے صاف صاف نمودار ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتے ہیں یا جواب طلب فرماتے ہیں اور خود ان کی زبان سے جواب چاہتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ یہ جواب ان کی فطرت کا حقیقی اظہار ہے۔ (اَغَیْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ) کیا تم اللہ کے سوا دوسروں کو پکارتے ہو' اگر تم سچے ہو تو جواب دو۔''

ان کی جانب سے جواب کا انتظار کئے بغیر سچا اور حقیقی جواب آ جاتا ہے جو عملاً ان کی فطرت کے مطابق ہے' اگرچہ وہ جواب نہ دیں لیکن ایسے مواقع پر ان کا عمل کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ (بَلْ اِیَّاهُ تَدْعُوْنَ فَیَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ (۶ : ۴۱) اس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے ہو' پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو بھول جاتے ہو۔'' بلکہ تم صرف اللہ وحدہ ہی کو پکارو گے اور ایسے حالات میں تم اپنے شرکیہ تصورات کو یکسر بھول جاؤ گے۔ یہ خوفناک صورت حال تمہاری اصل فطرت کو سطح تک لے آئے گی اور اب یہ فطرت صرف اللہ وحدہ کو پکارے گی۔ اسے یہ بات یاد بھی نہ رہے گی کہ کوئی شخص شرک کرتے ہوئے غیر اللہ کو بھی پکارتا رہا ہے۔ سرے سے حقیقت شرک بھی ان کے ذہن سے محو ہو جائے گی۔ اس لئے کہ معرفت کردگار ہی وہ اصل حقیقت ہے جو انسانی فطرت کے اندر موجود ہوتی ہے۔ رہے شرکیہ تصورات تو یہ چھلکے کی طرح عارضی چیز ہوتی ہے۔ بعض عارضی عوامل اور حالات کی وجہ سے یہ شرکیہ تصورات جنم لیتے ہیں۔ انسانی فطرت پر یہ عارضی پردے پڑ کر اصل حقیقت کو نیچے چھپا دیتے ہیں۔ جب کوئی خوفناک صورت حالات انسان کو جھنجوڑتی ہے تو اوپر کے پردے اور غبار چھٹ جاتے ہیں اور نیچے سے اصل حقیقت نمودار ہو جاتی ہے۔ اب یہ فطرت رب ذوالجلال کے سامنے اپنا ردعمل ظاہر کرتی ہے اور امید کرتی ہے کہ ان خوفناک حالات میں صرف اللہ تعالیٰ ہی انسان کی مدد کر سکتے ہیں اور ایسے حالات میں انسان کے لئے کوئی اور چارہ کار نہیں رہتا۔

یہ ہے انسان کی حقیقی فطری روش۔ اللہ تعالیٰ مشرکین کے سامنے انسان کے اس فطری ردعمل کو برائے غور پیش فرماتے ہیں لیکن ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ کی شان بے نیازی کیا روش اختیار فرماتی ہے؟ یہ کہ اگر اللہ چاہے کہ ان پر سے ان مشکلات کو دور فرما دے تو اس کی مشیت بے قید ہے۔ اس کے ارادے کو رد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر چاہے تو ان کی دعاؤں کو قبول کر لے' تکالیف پوری طرح دور ہو جائیں یا جزوی طور پر دور ہو جائیں۔ اور اگر اس کی مشیت کا تقاضا یہ

ہو کہ ان کی پکار کو رد کر دے تو کر دیتا ہے ۔ یہ فیصلہ 'اس کی تقدیر' اس کے علم اور اس کی حکمت پر موقوف ہے ۔

اگرچہ شرک انسانی فطرت کے خلاف ہے لیکن بعض اوقات انسان شرکیہ تصورات اختیار کر لیتا ہے ۔ یہ وہ اس وقت اختیار کرتا ہے جب وہ راہ فطرت سے انحراف اختیار کر لیتا ہے اور یہ انحراف مختلف عوامل کی وجہ سے واقع ہوتا ہے اور یہ عوامل انسان کے اندر جو صاف ستھری فطرت موجود ہے اسے دبا دیتے ہیں اور ان عوامل کے نیچے رب واحد کی حقیقی معرفت انسان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے ۔ اس لئے کہ انسان کبھی بھی وجود باری کا منکر نہیں رہا ہے اور نہ یہ اس کا فطری موقف رہا ہے کہ وہ وجود باری سے انکار کر دے ۔

جیسا کہ ہم بارہا دیکھ چکے ہیں کہ جو لوگ بظاہر اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ ملحد ہیں اور وہ وجود خالق کے منکر ہیں' درحقیقت وہ خدا کے منکر نہیں ہوتے ۔ ہم یہ یقین نہیں کر سکتے کہ جن لوگوں کو دست قدرت نے بنایا ہے اور جن کے وجود کے ہر ذرے اور ہر خلیے میں دست قدرت کی چھاپ موجود ہے' پھر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے خالق کو بالکل بھول جائیں اور حقیقی ملحد ہو جائیں ۔ ان کے وجود کا تو ہر ذرہ ذات باری پر گواہ ہے ۔

انسانیت پر اس خوفناک عذاب کے نزول کی ایک طویل داستان ہے ۔ کنیسہ اور فطرت کے درمیان ایک طویل عرصے تک کشمکش جاری رہی ۔ کنیسہ اس جدوجہد میں رہا کہ فطری عوامل اور دواعی کا قلع قمع کر دے ۔ اہل کنیسہ انسان کی فطری خواہشات اور میلانات کی قانونی حیثیت کا انکار کرتے تھے ۔ جبکہ درحقیقت وہ نہایت ہی مکروہ زندگی بسر کرتے تھے جو عیاشیوں سے پر تھی ۔ اس طرح فطرت کے ساتھ مخاصمت اور کشمکش یورپ میں صدیوں تک برپا رہی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل یورپ نے یہ سمجھا کہ خدا پرستی کا مطلب فطرت کا انکار ہے ۔ یوں وہ کفر اور الحاد کے صحرا میں گم گشتہ راہ ہو گئے اور کنیسہ کی رہبانی زندگی سے بھی مکروہ تر زندگی اور سراب کے پیچھے بھاگتے رہے ۔ (دیکھئے میری کتاب المستقبل لھذا الدین کی فصل غیر فطری افتراق)

اس صورت حال سے یہودیوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور نصاریٰ کو اپنے صحیح دین سے برگشتہ کر دیا تاکہ ان کی نکیل ان کے ہاتھ آ جائے اور وہ خوب اچھی طرح سے ان کے اندر فسق و فجور اور اخلاقی بے راہ روی پھیلا سکیں اور ان کو اپنے مقاصد کے لئے اس طرح استعمال کریں جس طرح گدھے کو استعمال کیا جاتا ہے' جس کا اظہار انہوں نے تلمود اور یہودی زعما کے پروٹوکولز میں بڑی صراحت سے کیا ہے ۔ یہودی یہ کام اس وقت تک نہ کر سکتے جب تک انہوں نے یورپ کی اس غیر فطری تاریخ کنیسہ پر تنقید کر کے لوگوں کو گمراہ نہ کر دیا اور لوگوں کو کنیسہ سے متنفر کر کے ملحد نہ بنا دیا ۔

اس صریح اور ان تھک مکارانہ جدوجہد کا آخری اظہار عالمی کیمونزم کی صورت میں ہوا ۔ یہ بات یاد رہے کہ عالمی کیمونزم لوگوں کو ملحد اور گمراہ کرنے کی ایک عظیم یہودی سازش تھی ۔ یہ لوگ گزشتہ نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے سے تمام حکومتی ذرائع ابلاغ کے ذریعے لوگوں کو ملحد بنانے میں مصروف رہے لیکن دوسری اقوام کے دلوں کی گہرائی کے اندر اب بھی عقیدہ خدا پرستی موجود ہے ۔ سٹالن جیسے وحشی انسان کو بھی بالآخر کنیسہ کے ساتھ مصالحت کرنی پڑی اور دوسری عالم گیر جنگ کے دوران اس نے کنیسہ کے مشائخ کو رہا کر دیا ۔ دوسری عالم گیر جنگ نے اس پر اس قدر بوجھ ڈالا کہ اس کی گردن بھی تصور خدا کے سامنے آخر جھک ہی گئی اس لئے کہ لوگوں کی فطرت کے اندر تصور خدا موجود تھا ۔ اگرچہ سٹالن اور اس کے مٹھی بھر ساتھی ملحد تھے جن کے ہاتھوں میں زمام حکومت تھی ۔

یہودیوں نے اپنے صلیبی خرکاروں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان اقوام کے اندر بھی کفر و الحاد کا مصنوعی سیلاب لانے کی بے حد سعی کی۔ اگرچہ مسلم اقوام کے دل و دماغ میں عقیدہ خدا پرستی نہایت ہی کمزور ہو گیا تھا لیکن انہوں نے ترکی کے نام نہاد لیڈر اتاترک کے ذریعے عالم اسلام کے اندر کفر و الحاد کی جو تحریک شروع کی تھی وہ تحریک خود ترکی کے اندر بری طرح ناکام ہو گئی' حالانکہ یہودیوں اور ان کے خرکاروں نے اس نام نہاد لیڈر کی عظمت اور برتری کے ڈھنڈورے پیٹے اور ہر طرف سے مالی امداد کے دروازے کھول دیئے۔ ترکی کی تحریک الحاد پر انہوں نے بے شمار کتابیں بھی لکھیں اور ان میں اس کے الحادی تجربے کو بے حد سراہا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ عالم اسلام میں ترکی کے تجربے کے بعد جو دوسرے تجربے کر رہے ہیں ان کو وہ الحاد و زندقہ کا عنوان نہیں دیتے بلکہ یہاں وہ اسلام کے نام سے الحاد پھیلاتے ہیں تاکہ ان کی تحریک کا ٹکراؤ انسان کے فطری میلانات سے نہ ہو' جس طرح اتاترک کے تجرباتی کے انسان کے فطری رجحان کے ساتھ ٹکراؤ ہوا اور وہ اپنی جگہ پاش پاش ہو گیا۔ اب یہ لوگ اسلامی جھنڈوں کے سائے تلے گندگی' غلاظت اور اخلاقی بے راہ روی پھیلاتے ہیں۔ اس طرح خام انسانی عقول کو تباہ و برباد کرتے ہیں اور یہودی اور ان کے خرکار صلیبی یہ کام عالم اسلام میں بڑے اہتمام سے کرتے ہیں۔

لیکن ان تمام تجربات کے بعد جو حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ انسانی فطرت اپنے رب کو اچھی طرح جانتی ہے۔ وہ رب کو وحدہ لاشریک بھی تسلیم کرتی ہے۔ اگر کسی وقت انسانی فطرت پر فسق و فجور کی گرد پڑ جائے اور وہ اس آلودگی کے نیچے دب جائے تو جونہی کوئی اچانک خطرہ درپیش ہو اور انسان جھنجوڑا جائے تو یہ گرد و غبار چھٹ جاتا ہے اور اصل انسانی فطرت واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے اور انسان اپنے رب کو یوں پکارتا ہے جس طرح اس وقت انسان نے پکارا تھا جب اسے اللہ نے پیدا کیا تھا۔ اچانک وہ مطیع فرمان مومن اور خشوع و خضوع کرنے والا انسان بن جاتا ہے۔ یہودیوں اوران کے خرکاروں کی اس عالمی سازش کا تار و پود فطرت کی ایک کڑکے دار چیخ ہی سے پاش پاش ہو جاتا ہے اور فطرت دوبارہ باری تعالیٰ کے آستانے پر آگرتی ہے۔ جس خطے میں یہ فطری آواز بلند ہو وہاں سے یہ سازش نابود ہو جاتی ہے اور یہودی اور ان کے خرکار جس قدر جدوجہد بھی کریں' زمین پر یہ آواز حق بلند ہوتی رہے گی۔

---○ ○ ○---

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ

ظَلَمُوا ۚ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾

"تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور ان قوموں کو مصائب و آلام میں مبتلا کیا تاکہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جھک جائیں۔ پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انہوں نے عاجزی اختیار کی؟ مگر ان کے دل تو اور سخت ہوگئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔ پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو جو انہیں کی گئی تھی 'بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے' یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہوگئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔ اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا اور تعریف ہے اللہ رب العالمین کے لئے (کہ اس نے ان کی جڑ کاٹ دی)۔

یہ لہر عذاب الٰہی کی ایک جھلکی ہے اور انسان کی تاریخ کی واقعی صورت حال کی طرف اشارہ ہے لیکن اس میں کسی واقعہ کے بجائے یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ عذاب الٰہی کی زد میں کس طرح آتے ہیں۔ اور ان کا انجام کیا ہوتا ہے۔ عذاب سے پہلے اللہ تعالیٰ کس طرح انہیں مہلت کے بعد مہلت دیتا چلا جاتا ہے اور کس طرح ان کو تنبیہ کے بعد تنبیہ کی جاتی رہتی ہے۔ لیکن وہ بھلاتے ہی چلے جاتے ہیں اور بعض اوقات شدید سے شدید عذاب بھی انہیں خواب غفلت سے نہیں جگا سکتا۔ اور جب ان پر انعامات و اکرامات کی بارش کر دی جاتی ہے تو وہ شکر ادا نہیں کرتے یا زوال نعمت اور فتنوں سے نہیں ڈرتے۔ ان کی فطرت اس قدر بگڑ جاتی ہے کہ اب وہ لاعلاج ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں اس قدر عمل بگاڑ رونما ہو جاتا ہے کہ اب اصلاح احوال ممکن ہی نہیں رہتی۔ ایسے لوگوں پر حجت تمام ہو جاتی ہے اور ان پر اللہ کا ایسا عذاب آتا ہے کہ پھر ان میں کا کوئی متنفس زندہ نہیں رہتا۔

( وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ

( ٤٢ ) فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ( ٤٣ ) ( ٦ : ٤٢ - ٤٣ ) ) "تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور ان قوموں کو مصائب و آلام میں مبتلا کیا تاکہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جھک جائیں۔ پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انہوں نے عاجزی اختیار کی؟ مگر ان کے دل تو اور سخت ہوگئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔" انسانی تاریخ میں ایسی اقوام بکثرت موجود ہیں اور ان میں سے بے شمار قرآن کریم نے انسانوں کو گنوا کر ان کے حالات بتائے ہیں۔ قرآن نے یہ حالات اس وقت بتائے جب انسانی تاریخ ابھی مدون ہی نہ ہوئی تھی۔ تاریخ کی جن کتابوں کو انسانوں نے مرتب کیا ہے وہ تو بہت ہی قریبی ادوار سے متعلق ہیں وہ حدیث السن اور نو مولود ہے۔ ہماری تاریخ انسان کی طویل ترین تاریخ کو سمجھنے سمجھانے کی اہل نہیں ہے کیونکہ کرۂ ارض پر انسان کے بسنے کی تاریخ بہت ہی طویل ہے اور انسان نے جو تاریخ مرتب کی ہے یہ تو جھوٹ کا پلندہ ہے۔ وہ ہے بھی بہت ہی مختصر اور اس کے

اندر تاریخ کے اصل عوامل اور اسباب کا احاطہ ہی نہیں کیا جا سکا۔ ان تاریخی عوامل میں سے بعض تو نفس انسانی کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہیں اور بعض ایسے اسباب ہیں جو پردۂ غیب میں مستور ہیں اور ان میں سے نہایت ہی قلیل حصہ انسان پر ظاہر ہوا ہے۔ پھر جو بعض انسانوں پر ظاہر بھی ہوئے ہیں انسانوں نے ان کے جمع و تدوین میں غلطی کی۔ ٹھیک طور پر واقعات جمع کر بھی لئے گئے تو ان کے سمجھنے میں غلطیاں کی گئیں اور ان میں سے سچے اور جھوٹے واقعات و اسباب کو ایک دوسرے سے جدا نہ کیا جا سکا۔ صرف چند واقعات کا درست تجزیہ ہو سکا۔ لہٰذا کسی انسان کی جانب سے یہ دعویٰ کرنا کہ اس نے پوری انسانی تاریخ کے واقعات و اسباب کا احاطہ کر لیا ہے اور یہ کہ وہ ان واقعات کی سائنٹیفک تفسیر کر سکتا ہے اور یہ کہ وہ تاریخ کے مستقبل کے رخ کو بھی صحیح طرح متعین کر سکتا ہے اور نتائج اخذ کر سکتا ہے تو یہ بہت ہی بڑا جھوٹ ہے جو کوئی بول سکتا ہے۔ ایک نہایت ہی تعجب انگیز بات یہ ہے کہ بعض لوگ ایسے جھوٹ کا دعویٰ کرتے نہیں شرماتے۔ اگر ایسے لوگ یہ کہتے کہ مستقبل میں یہ واقعات ظاہر ہونے کی توقع ہے تو ان کی بات معقول ہوتی لیکن اگر کسی جھوٹے شخص کو ایسے افراد مل رہے ہوں جو اس کے جھوٹ کی تصدیق کے لئے ہر وقت تیار ہوں تو اسے جھوٹ سے باز رہنے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ بہرحال سچائی بیان کرتا ہے اور صادق القول ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ دنیا میں کیا واقعات ہو گزرے ہیں۔ اور اپنی مہربانی اور فضل کی وجہ سے وہ بندوں کے سامنے ان حقائق کو بیان کرتا ہے۔ کلام الٰہی اللہ کی تقدیر، اس کے فیصلوں اور اس کائنات میں اس کی سنت پر مشتمل ہوتا ہے تاکہ لوگ احتیاط کریں اور واقعات سے عبرت حاصل کریں۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ سکیں کہ ان واقعات کے پیچھے کیا اسباب و عوامل کارفرما تھے اور ظاہری اسباب کیا نظر آتے تھے تاکہ وہ ان تاریخی واقعات کو صحیح طرح سمجھ سکیں اور ان کی تشریح تجزیہ اور تحلیل کر سکیں۔ پھر آئندہ تاریخ پر پڑنے والے اثرات اور نکلنے والے نتائج کو سمجھ سکیں اور ان کا استدلال سنت الٰہیہ کی روشنی میں ہو جس کے اصول یہاں اللہ نے اپنی کتاب میں بیان کئے ہیں۔

آیات زیر بحث میں ایسے واقعات کی صورت گری کی گئی ہے جو مختلف اقوام میں بار بار پیش آتے رہے ہیں۔ ان اقوام کے پاس اللہ کی طرف سے بھیجے گئے رسول آئے، لیکن انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں مشکلات اور تکالیف کے ذریعے ابتلاء میں ڈالا گیا۔ یہ مشکلات مالی بھی تھیں اور جانی بھی۔ ان کو مشکل حالات اور مشکل مسائل میں مبتلا کر دیا گیا لیکن یہ مشکلات ابھی عذاب الٰہی کی حد تک نہ پہنچی تھیں، جن کا ذکر اس سے قبل کی آیات میں آ گیا ہے۔ یعنی یہ مشکلات تباہی اور بربادی کی حد تک نہ تھیں۔

قرآن کریم نے ان اقوام کے بعض نمونے پیش کئے ہیں اور ان مشکلات اور مصائب کا ذکر بھی کیا ہے جو ان پر ڈالے گئے۔ ان میں سے فرعون اور اس کے ساتھیوں کا قصہ بہت ہی مشہور ہے۔

(وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ

(۱۳۰) فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى

وَمَنْ مَّعَهٗ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۳۱) وَقَالُوْا مَهْمَا

تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۱۳۲) فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (۱۳۳)(۷: ۱۳۰ تا ۱۳۳)) (ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ شاید ان کو ہوش آجائے۔ مگر ان کا حال یہ تھا کہ جب اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اسی کے مستحق ہیں' اور جب برا زمانہ آتا تو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کو اپنے لئے فال بد ٹھہراتے' حالانکہ درحقیقت ان کی فال بد تو اللہ کے پاس تھی' مگر ان میں سے اکثر بے علم تھے۔ انہوں نے موسیٰ سے کہا: "تو ہمیں مسحور کرنے کے لئے خواہ کوئی نشانی لے آئے ہم تو تیری بات ماننے والے نہیں ہیں۔" آخر کار ہم نے ان پر طوفان بھیجا' ٹڈی دل چھوڑے' سرسریاں پھیلائیں' مینڈک نکالے اور خون برسایا۔ یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں مگر وہ سرکشی کئے چلے گئے) یہ ہے ایک نمونہ ان واقعات کا' جس کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو مشکلات و مصائب سے محض اس لئے دوچار کیا کہ وہ ذرا ہوش میں آجائیں' وہ ذرا اپنے ضمیر میں جھانکیں اور اپنے حالات پر غور و فکر کریں' محض اس لئے کہ ان شدائد کی وجہ سے شاید وہ اللہ کے سامنے عاجزی کرنے لگیں اور اپنے آپ کو اللہ کے سامنے ذلیل و جھکنے والے بنا دیں۔ وہ اپنے کبر و غرور کو چھوڑ کر سنجیدہ رویہ اختیار کریں اور اخلاص سے دعا کریں کہ اللہ ان پر سے یہ مشکلات دور کر دے۔ ان کے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے' لیکن ان کے لئے جو مناسب تھا وہ انہوں نے نہ کیا۔ انہوں نے اللہ کی پناہ میں داخل ہونے سے انکار کر دیا اور اپنے عناد اور سرکشی کو جاری رکھا اور ان مشکلات کی وجہ سے بھی ان کی سوچ اس طرف نہ لوٹی۔ ان کی چشم بصیرت وا نہ ہوئی اور ان کے دل نرم نہ ہوئے۔ شیطان ان کے پیچھے خوب لگا ہوا تھا۔ وہ ان کے لئے ان کی ضلالت اور سرکشی کو مزین کر رہا تھا۔ "مگر ان کے دل تو اور سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلا دیا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔"

وہ دل جو شدائد اور مصائب کے باوجود رجوع الی اللہ اختیار نہیں کرتا وہ دل اس طرح خشک ہو گیا ہے جس طرح پتھر خشک ہوتا ہے اور اس کے اندر رس کا ایک قطرہ بھی نہیں ہوتا جسے شدائد اور مصائب نچوڑ سکیں۔ یہ دل مر گیا ہے اور اس پر جس قدر دباؤ آئے اسے احساس نہ ہو گا۔ اس دل کے اندر سے قبولیت حق کا تمام مواد خارج ہو چکا ہے۔ وہ پوری طرح مر چکا ہے اس لئے اس کو احساس دلانے کے لئے چاہے جس قدر چٹکیاں بھریں اسے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ حالانکہ زندہ دل ایسے جھٹکوں کے نتیجے میں بیدار ہو جاتے ہیں اور اللہ کی جانب سے اس قسم کے مصائب آتے ہی حق کو قبول کر لیتے ہیں۔ وہ جاگ اٹھتے ہیں اور ان کے دریچے کھل جاتے ہیں اور یوں ان کو رجوع الی اللہ نصیب ہو جاتا ہے۔ وہ اس رحمت اور رافت اور جود و کرم کے مستحق ہو جاتے ہیں جسے اللہ نے اپنے اوپر فرض کر لیا ہے۔ جو شخص مر چکا ہو یہ مشکلات اس کے لئے محاسبہ اور سزا ہوتے ہیں اور ان سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ الٹا اس شخص کے تمام عذرات ختم ہو جاتے ہیں اور تمام دلائل بیکار جاتے ہیں۔ وہ انجام بد اور شقاوت کا مستحق قرار پاتا ہے لہٰذا اللہ کا عذاب اس کے لئے طے ہو جاتا ہے۔

یہ امم سابقہ جن کی خبریں اللہ تعالیٰ رسول اللہ پر نازل کرتے ہیں اور آپ کے واسطے سے ہمیں پہنچاتے ہیں' انہوں نے ان مصائب و شدائد سے کوئی عبرت نہ پکڑی۔ انہوں نے رجوع الی اللہ اختیار نہ کیا اور نہ اللہ کے سامنے بدست بدعا

ہوئے - شیطان نے ان کے لئے روگردانی اور عناد کو مزین کر دیا ہے وہ اسے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے - ایسی اقوام کو اللہ تعالیٰ مہلت دیتے ہیں اور انہیں آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور وہ حدوں سے گزر جاتے ہیں -

(فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ (٤٤) فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (٤٥)(٦ : ٤٤ — ٤٥)) ''پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو جو انہیں کی گئی تھی، بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے، یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے - اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا اور تعریف ہے اللہ رب العالمین کے لئے (کہ اس نے ان کی جڑ کاٹ دی)''۔ خوشحالی بھی دراصل ابتلاء ہے جس طرح مصائب اور شدائد ابتلاء ہیں لیکن خوشحالی غربت اور بدحالی کے مقابلے میں شدید ہے - اللہ تعالیٰ انسانوں کو جس طرح بدحالی سے آزماتا ہے اسی طرح خوشحالی سے بھی آزماتا ہے - جب کسی مومن پر بدحالی آ جائے اور وہ آزمائش میں مبتلا ہو جائے تو وہ صبر کرتا ہے اور اگر مومن پر خوشحالی آ جائے تو وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اس لئے وہ ہر حالت میں اچھا رہتا ہے - حدیث شریف میں آتا ہے: ''مومن بھی عجیب ہے کہ اس کے تمام حالات خیر ہی خیر ہوتے ہیں اور یہ خصوصیت صرف مومن کو حاصل ہے - اگر اسے خوشحالی نصیب ہو اور وہ اس کا شکر ادا کرے تو یہ اس کے لئے خیر ہے اور اگر وہ بدحال ہو اور صبر کرے تو بھی اس کے لئے خیر ہے -'' (روایت مسلم)

رہیں وہ اقوام جنہوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی اور جن کی کہانیاں اللہ نے یہاں بیان کیں تو انہوں نے اس ہدایت کو بھلا دیا جو انہیں دی گئی تھی - اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم تھا کہ اب وہ ہلاکت سے دوچار ہونے ہی والے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو شدائد و مصائب میں ڈالا تو بھی انہیں ہوش نہ آیا - اور ان میں سے بعض پر انعامات کے دروازے کھول دیئے اور ہر چیز کی فراوانی کر دی اور ان کے لئے میدان کھلا چھوڑ دیا تاکہ وہ سرکشی میں خوب آگے بڑھ جائیں - یہاں قرآن کا انداز تعبیر بھی نہایت ہی خوبصورت ہے -

(فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ (٦ : ٤٤)) (ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے) اس کے اندر ہر قسم کی بھلائیاں، ہر قسم کی ضروریات، سازوسامان اور عزت و شان کی بڑی فراوانی کے ساتھ شامل ہیں - یعنی ہر چیز سیلاب کی طرح بہتات میں، بغیر رکاوٹ اور پابندی کے ان کے لئے عام کر دی یہ نعمت انہیں بسہولت ارزاں ملتی رہی بغیر کسی محنت و مشقت کے - فی الحقیقت یہ ایک نہایت ہی مؤثر منظر ہے - قرآن کریم کے فنی انداز تعبیر کا یہ ایک نادر نمونہ ہے - (دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی میں باب طریقۃ القرآن)

(حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا (٦ : ٤٤ — ٤٥)) (یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو

انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہوگئے ) ہر قسم کی بھلائیوں اور سازوسامان کی بہتات میں وہ غرق ہوگئے اور عیش و عشرت میں مگن ہوگئے ۔ انہوں نے ایسے حالات میں نہ خدا کو یاد کیا اور نہ اس کا شکر ادا کیا اور ان کے دلوں سے منعم حقیقی کا تصور محو ہوگیا اور خشیت الہی سے انکے دل خالی ہوگئے ۔ وہ عیش کوشی اور کام و دہن کی لذت کوشی میں مکمل طور پر گھر گئے اور اپنے آپ کو مکمل طور پر ان چیزوں کے حوالے کر دیا ۔ ان کی زندگی میں اعلیٰ اقدام کی کوئی اہمیت نہ رہی اور یہ لہو و لعب اور عیش طرب میں غرق لوگوں کی عام عادت ہوتی ہے کہ ان میں سے اعلیٰ قدریں غائب ہو جاتی ہیں ۔ اس کے بعد ان کی سوسائٹی سے نظم اور اچھی عادات غائب ہو جاتی ہیں اور وہ اخلاقی اعتبار سے مکمل طور پر تباہ ہو جاتے ہیں ۔ یوں ان کے یہ حالات اس پر منتج ہوتے ہیں کہ ان کی پوری زندگی تباہ ہو جاتی ہے اور اب یہ تباہی بالکل قدرتی ہوتی ہے ۔ یہ عین سنت الہیہ ہے ۔

(اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ (۶ : ۴۴)) (تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے ) اب یہ پکڑ بالکل ناگہانی تھی ۔ یہ لوگ مدہوشی کی حالت میں تھے اور عیش و عشرت میں مست تھے اور جب اچانک اللہ کی پکڑ میں آتے ہیں تو حیرت زدہ ہو جاتے ہیں ۔ اب کچھ سوجھتا ہی نہیں کہ کدھر جائیں ۔ ایسے ہی حالات میں سب کے سب تباہ کر دیئے جاتے ہیں ۔

(فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (۶ : ۴۵)) (اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا) کسی قوم کا دابر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو سب سے پیچھے آتا ہے یعنی ان کا آخری آدمی ۔ جب آخری آدمی ہی کٹ گیا تو اس سے پہلے کے بدرجہ اولیٰ کٹ گئے ۔

(الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (۶ : ۴۵)) سے یہاں وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے شرک کیا اس لئے کہ قرآن کریم بیشتر مقامات پر مشرکین کو ظالمین سے تعبیر کرتا ہے اور شرک پر ظلم کے لفظ کا اطلاق کرتا ہے ۔

(وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ) (اور تعریف ہے اللہ رب العالمین کے لئے ) یہ تبصرہ ہے اس بات پر کہ اللہ نے مشرکین کی جڑ کاٹ دی اور یوں انہیں مہلت دیتے دیتے اچانک پکڑ لیا ۔ سوال یہ ہے کہ اللہ کی حمد تو اللہ کے انعام و اکرام پر ہوتی ہے؟ ہاں، لیکن اللہ کی زمین کا تو ظالموں سے پاک ہونا بھی ایک گونہ نعمت ہے ۔ نیز اللہ کی حمد اس کی رحمت پر ہوتی ہے تو زمین کو پاک کر دینا بھی سب سے بڑی رحمت ہے ۔

اللہ نے نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام، صالح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی اقوام کو پکڑا ۔ فرعون اور اہل یونان اور اہل روما کو پکڑا اور اسی سنت کے مطابق اس نے دوسری اقوام کو بھی عروج کے بعد پکڑا ۔ پہلے ان کی تہذیب و تمدن کو خوب ترقی دی اور پھر انہیں تباہ و برباد کر دیا ۔ یہ بہرحال اللہ کی تقدیروں کے راز ہیں لیکن سنت الہیہ عروج و زوال کی اس داستان میں ظاہر ہے اور اللہ اسی کی داستاں یہاں اس اصولی انداز میں ثبت فرماتے ہیں ۔

ان اقوام کی اپنی اپنی تہذیبیں تھیں اور اپنے وقت میں ان کو بڑا عروج حاصل تھا ۔ ان کو بڑی فراوانی اور دولتمندی حاصل تھی ۔ بعض پہلوؤں سے وہ آج کے ترقی یافتہ دور سے بھی زیادہ خوشحال تھے ۔ انہیں شان و شوکت اور سازو

سامان اور فراوانی حاصل تھی اور وہ اس دھوکے میں تھے کہ وہ یوں ہی رہیں گے۔ یہ اقوام ان دوسری اقوام کو بھی دھوکہ دے رہی تھیں جو خوشحالی اور ترقی کے بارے میں سنت الٰہیہ سے واقف نہ تھیں۔

یہ اقوام اس بات کو نہ سمجھ سکیں کہ اس کائنات میں سنت الٰہیہ کام کرتی ہے۔ وہ یہ بات بھی نہ سمجھ سکیں کہ انہیں ڈھیل دی جا رہی ہے' اس سنت کی پالیسی کے عین مطابق۔ جو لوگ سنت الٰہیہ کے آسمان میں گردش کر رہے تھے اللہ کی نعمتوں کی بارش نے ان کی آنکھیں چندھیا دی تھیں۔ شوکت و قوت نے ان کے اندر بہت ہی زیادہ اعتماد پیدا کر دیا تھا اور ان خوشحال اقوام کو جو مہلت اور ڈھیل دی گئی تھی اس کی وجہ سے وہ دھوکے میں پڑ گئے تھے۔ یہ لوگ نہ اللہ کی عبادت کرتے تھے اور نہ انہیں اللہ کی معرفت حاصل تھی۔ یہ لوگ اللہ کی حاکمیت کے خلاف باغی ہو گئے تھے بلکہ انہوں نے حق حاکمیت کا دعویٰ خود کیا تھا حالانکہ حاکمیت الوہیت کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت ہے۔ یہ لوگ زمین میں فساد پھیلاتے تھے' لوگوں پر مظالم ڈھاتے تھے اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے مقابلے میں حاکمیت کا دعویٰ خود کر لیا تھا۔ جب میں امریکہ میں تھا تو میں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا وہ اس آیت کا مصداق تھا۔

(فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ (۶:۴۴)) (پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو بھلا دیا جو انہیں کی گئی تھی' تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے) یہ منظر جس کی تصویر کشی اس آیت میں کی گئی ہے' یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان لوگوں پر رزق کی فراوانی تھی اور ہر جانب سے بلاحساب سہولیات کا سیلاب تھا جو امڈتا چلا آ رہا تھا۔ یہ منظر امریکہ میں پوری طرح عروج پر تھا۔

میں نے دیکھا کہ یہ قوم اس خوشحالی پر بے حد مغرور بھی ہے اور ان کے شعور میں یہ بات پوری طرح بیٹھی ہوئی نظر آتی تھی کہ سہولتوں کی یہ بہتات صرف سفید رنگ کے لوگوں کے لئے مخصوص ہے۔ رنگ دار لوگوں کے ساتھ ان کا طرز عمل نہایت متکبرانہ اور وحشیانہ ہوتا ہے۔ امریکی پورے کرۂ ارض کے لوگوں کو اس قدر کم وقعت سمجھتے ہیں جس کے مقابلے میں یہودیوں کا نازی ازم بھی کچھ وقعت نہیں رکھتا حالانکہ یہودی اس کے بارے میں بہت مشہور ہیں اور قومی اور نسلی افتخار ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ سفید رنگ امریکیوں کا رویہ رنگ دار امریکیوں کی نسبت یہودیوں سے بھی زیادہ برا اور زیادہ سخت ہے۔ یہ سختی خصوصاً اور زیادہ ہو جاتی ہے جب رنگ دار لوگ مسلمان ہوں۔

امریکہ میں' میں یہ سب کچھ دیکھتا رہا اور یہ توقع کرتا رہا کہ سنت الٰہیہ ایک دن ضرور اپنا کام کرے گی۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ سنت الٰہیہ امریکی سوسائٹی کی طرف دھیمی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔

(حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ (۴۴) فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۵) (۶:۴۴-۴۵)) "یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر چیز سے مایوس تھے۔ اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا اور تعریف ہے' اللہ رب العالمین کے لئے۔" حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ نے اقوام عالم پر یہ رحم فرمایا کہ اب ان کو مسخ

نہ کیا جائے گا اور نہ انہیں بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا۔ لیکن اللہ کے عذابوں کی کئی اقسام اب بھی آتی رہتی ہیں خصوصاً ان اقوام پر جنہیں خوشحالی اور فراوانی دی گئی ہے۔ ان پر انواع و اقسام کے عذاب آئے دن آتے رہتے ہیں' اس کے باوجود کہ ان کے ہاں ضروریات زندگی کی پیداوار حد سے زیادہ ہو چکی ہے اور انہیں رزق اور سہولیات کی بہتات سے نوازا گیا ہے۔

نفسیاتی عذاب' روحانی بے چینی' جنسی بے راہ روی اور اخلاقی بگاڑ جیسے عذابوں نے انہیں تباہ کر دیا ہے اور ان کی اس خوشحالی اور مادی پیداوار اور سازو سامان میں بھی ان کے لئے کوئی ذریعہ اطمینان نہیں ہے اور قریب ہے کہ ان کی پوری زندگی بدبختی' قلق و پریشانی میں ڈوب جائے۔ (دیکھئے میری کتاب اسلام اور مشکلات تہذیب کا باب خبط و اضطراب) اس خوشحالی کے باوجود ان لوگوں کی اخلاقی حالت یہ ہے کہ بڑے بڑے سیاسی راز چند ٹکوں میں بیچ دیئے جاتے ہیں اور پوری قوم کے خلاف جرم خیانت کا ارتکاب کیا جاتا ہے اور حاصل کیا ہوتا ہے چند لمحوں کی عیاشی' جنسی لذت اور چند ٹکے اور یہ ایسی علامات ہیں کہ مستقبل قریب میں ایسی اقوام کے لئے شدید خطرے کی نشان دہی کرتی ہیں۔

اقوام مغرب کی تباہی کے یہ بالکل ابتدائی آثار ہیں۔ حضور اکرم ؐ نے بالکل سچ فرمایا: "جب تم دیکھو کہ جب اللہ کسی کو اس کی بدکرداری کے باوجود سب کچھ دے جو وہ چاہتا ہو' تو سمجھ لو کہ یہ اسے ڈھیل دی جا رہی ہے۔" اس کے بعد حضور ؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں' جو انہیں عطا کی گئیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر چیز سے مایوس ہو گئے' اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا اور تعریف ہے' اللہ رب العالمین کے لئے۔" (ابن جریر' ابن ابی حاتم)

لیکن یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اہل باطل کو ہلاک کرنے کا اصول اور سنت الٰہیہ کی اسکیم میں صرف یہ نہیں ہوتا کہ اہل باطل کو نیست و نابود کر دیا جائے بلکہ یہ امر بھی اس کا حصہ ہوتا ہے کہ اہل حق کو قائم اور غالب کر دیا جائے اور یہ اہل حق ایک امت کی شکل میں نمودار ہوں۔ اصل اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سچائی کے ذریعے اور اہل حق کے ذریعے باطل پر وار کرتا ہے اور باطل کا سرپھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ باطل نابود ہو جاتا ہے لہٰذا اہل حق کو ڈھیلے ہو کر بیٹھ نہ جانا چاہیے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر صرف سنت الٰہیہ کا انتظار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ سنت الٰہیہ بھی اسلامی جدوجہد کے نتیجے میں روبعمل ہوتی ہے۔ اگر اہل حق بے عمل ہو کر بیٹھ جائیں تو وہ اہل حق نہ رہیں گے اور وہ غلبہ اور باطل کا سرپھوڑنے کے قابل ہی نہ رہیں گے۔ خصوصاً جبکہ وہ ست اور بے عمل ہو کر بیٹھ جائیں۔ حق تو ایسی امت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جو کرۂ ارض پر اللہ کی حاکمیت کے مقام کے لئے جدوجہد کر رہی ہوتی ہے اور ان لوگوں کے مقابلے میں دفاع کر رہی ہوتی ہے جنہوں نے اللہ کے مقابلے میں اپنی حاکمیت قائم کی ہوئی ہوتی ہے جبکہ حاکمیت الٰہیہ خصائص الوہیت میں سے ایک خاصہ ہے۔ یہ ہے اصلی اور بنیادی سچائی۔

(وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ) (اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض دوسروں کے ذریعے نہ روکتا تو زمین میں فساد برپا ہو جاتا)۔

---ooo---

اب سیاق کلام مشرکین کو عذاب الہٰی کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتا ہے اور عذاب کی یہ مجوزہ شکل ان کی ذات اوران کے نفوس کے ساتھ متعلق ہے۔اس کا تعلق ان کی قوت باصرہ' قوت سامعہ اور قوت ادراک کے ساتھ ہے۔ تجویز یہ ہے کہ اگر اللہ ان قوتوں کو سلب کرے تو کون ہے جو تمہیں یہ قوتیں لوٹا کر دے دے 'کوئی نہیں ہے۔اب سوچنے کے بعد وہ بھی یقین کر لیتے ہیں کہ کوئی نہ ہو گا جو انہیں 'قوت ساعت 'قوت باصرہ اور قوت ادراک دے سکے اگر اللہ ان قوتوں کو چھین لے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝

"اے نبی " ان سے کہو'کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ تمہاری بینائی اور ساعت تم سے چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا اور کون سا خدا ہے جو یہ قوتیں تمہیں واپس دلا سکتا ہے ؟ دیکھو 'کس طرح ہم بار بار اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر یہ کس طرح ان سے نظر چرا جاتے ہیں۔"

یہ ایک ایسے منظر کی تصویر کشی ہے جس میں وہ خود اپنے عقائد کے مطابق اللہ کے اس مجوزہ عذاب سے بچنے کی کوئی سبیل نہیں پاتے جبکہ ضمناً یہ بات بھی آجاتی ہے کہ یہ لوگ اللہ کے سواجن دوسرے لوگوں کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں وہ بھی نہایت ہی عاجز ہیں۔البتہ اس منظر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اس مجوزہ عذاب کی تجویز نے ان لوگوں کو خوب جھنجوڑا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فطرت انسانی کا خالق ہے۔اسے خوب علم ہے کہ اس فطرت کے اندر اوراک حقیقت کی حقیقی قوت بھی موجود ہے اور فطرت انسانی سچائی سے دور نہیں ہے۔فطرت انسانی کو اس بات کا ادراک ہے اور علی وجہ البصیرت ہے کہ یہ کام صرف اللہ کر سکتا ہے اور کوئی نہیں۔وہ قوت باصرہ' قوت سامعہ اور قوت مدرکہ کو سلب بھی کر سکتا ہے اور لوٹا بھی سکتا ہے اور اس کے سوا کوئی اور یہ کام نہیں کر سکتا۔

دل کو دہلا دینے والے اور اعضائے جسم پر کپکپی طاری کر دینے والے اس منظر کے ذریعے اور عقیدہ شرک اور اللہ کے شرکاء کی زبوں حالی کا منظر پیش کرنے کے بعد اب سیاق کلام میں اس تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے کہ جن لوگوں کے سامنے یہ مناظر اور یہ دلائل رکھے جا رہے ہیں وہ پھر بھی بیمار اونٹ کی طرح ایک طرف جھکتے ہیں اور سیدھی راہ پر بھی ٹیڑھے چلتے ہیں۔

(اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ( ٦ : ٤٦ )) دیکھو'کس طرح ہم بار بار اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر یہ کس طرح ان سے نظر چرا جاتے ہیں۔" یہ تعجب ان کی جانب سے جادۂ حق سے ایک طرف چلنے کے منظر پر کیا جا رہا ہے۔ (يَصْدِفُوْنَ ( ٦: ٤٦ )) کا مفہوم عربوں میں مشہور ہے۔فعل

صدف کا صدور بیمار اونٹ سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان لوگوں کے بارے میں ایک قسم کا بیمانہ اور قابل نفرت تصور دیا جاتا ہے جو ان کے لئے ایک لطیف توہین ہے۔

---ooo---

ابھی اس متوقع مجوزہ تصوراتی منظر کے اثرات زائل نہ ہوئے تھے کہ ان کے سامنے اب ایک دوسرا متوقع منظر پیش کر دیا جاتا ہے۔ وہ خود بھی یقین رکھتے ہیں کہ اس مجوزہ منظر کو عملی شکل دینا اللہ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس منظر میں انہیں یہ دکھایا جاتا ہے کہ اگر اللہ کا عذاب اچانک آگیا تو تم سوچو کہ اس کی زد میں ظالموں کے سوا اور کون آئے گا؟ مشرکین ہی تو سب سے پہلے تباہ ہوں گے۔ ایک جھلکی دکھائی جاتی ہے کہ جب اچانک عذاب آتا ہے تو ظالم اور مشرک نابود کر دیئے جاتے ہیں' چاہے یہ عذاب اچانک آئے یا اطلاع کے بعد کھلے بندوں آئے۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾

"کہو' کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ کی طرف سے اچانک یا علانیہ تم پر عذاب آ جائے تو کیا ظالم لوگوں کے سوا کوئی اور ہلاک ہو گا؟" ظالموں کو عذاب الہیٰ ہر صورت میں پکڑتا ہے۔ یہ اچانک بھی آتا ہے جبکہ وہ غفلت میں ہوتے ہیں اور انہیں کوئی توقع نہیں ہوتی اور کبھی ان پر یہ عذاب اعلانیہ آتا ہے اور وہ اس کے لئے پوری طرح تیار بھی ہوتے ہیں' لیکن ظالم اقوام پر تباہی آکر رہتی ہے۔ (یہ بات یاد رہے کہ قرآن کریم کی تعبیرات کے مطابق ظالمین سے مراد مشرکین ہیں) جب یہ عذاب آتا ہے چاہے اچانک آئے یا اعلانیہ تو پھر اس کے مقابلے میں وہ کوئی بچاؤ نہیں کر سکتے اس لئے کہ عذاب الہیٰ کے مقابلے میں وہ اس قدر ضعیف ہیں کہ وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ نہ ان کے بنائے ہوئے شریک اس عذاب کو روک سکتے ہیں اس لئے کہ جن لوگوں کو یہ لوگ شریک بناتے ہیں وہ تو اللہ کے ضعیف بندے ہیں۔

یہ ایک متوقع صورت حالات ہے' جو قرآن کریم ان کے سامنے اس مؤثر انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ یہ لوگ اس صورت حال سے ڈر جائیں اور اپنا بچاؤ کر لیں اور اس صورت حالات کے وقوع کے اسباب فراہم کرنے سے باز رہیں۔ یہ متوقع صورت حال اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے سامنے اس لئے پیش فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ خود انسانی فطرت کے اندر تقویٰ موجود ہے اور ایسی صورت حالات کے تصور ہی سے انسان کانپ اٹھتا ہے۔

---ooo---

اب جب یہ لہر ساحل کے قریب پہنچ جاتی ہے اور اس کے اندر ایک دوسرے کے بعد اٹھنے والے مناظر دکھائے جا چکے ہیں اور موثر ہدایات دی جا چکی ہیں اور ان ہدایات کے تاثرات سامعین اور ناظرین کے قلوب کی تہہ تک اتر جاتے ہیں تو اب حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے رسولوں کے فرائض نبوت کا تعین کر دیا جاتا ہے۔ یہ تعین اس لئے کیا جاتا ہے کہ رسولوں سے ان کی اقوام کے لوگ خارق عادت معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ رسول تو صرف مبلغ

ہوتے ہیں' خوشخبری دیتے ہیں اور انجام بد سے ڈراتے ہیں۔اس فریضہ کی ادائیگی کے بعد اب لوگ خود مختار ہوتے ہیں کہ وہ جو راہ چاہیں اختیار کریں۔ان کے اس اختیار تمیزی کے اوپر پھر سزا و جزاء مرتب ہوگی۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۖ فَمَنْ آمَنَ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٤٨﴾ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿٤٩﴾

"ہم جو رسول بھیجتے ہیں اسی لئے تو بھیجتے ہیں کہ وہ نیک کردار لوگوں کے لئے خوشخبری دینے والے اور بدکرداروں کے لئے ڈرانے والے ہوں۔پھر جو لوگ ان کی بات مان لیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔اور جو ہماری آیات کو جھٹلائیں وہ اپنی نافرمانیوں کی پاداش میں سزا بھگت کر رہیں گے۔"

دین اسلام کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو ذہنی اور عقلی بلوغ تک پہنچائے اور انہیں اس قابل بنائے کہ وہ اس عظیم قوت کو کام میں لاکر فائدہ اٹھائیں جو اللہ نے صرف انسان کو دی ہے اور اسے پوری طرح اس سچائی کے سمجھنے میں استعمال کریں جو اس کائنات کے صفحات میں موجود ہے۔خود زندگی کے طور طریقوں کے اندر موجود ہے اور انسان کی تخلیق کے رازوں میں پوشیدہ ہے۔یہ راز قرآن مجید نے سب سے پہلے انسانوں پر کھولے اور انسان کی قوت مدرکہ کو ان کی طرف متوجہ کیا۔

یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو حسی خارق عادت معجزات سے نکال کر عقلی میدان میں داخل کیا گیا۔ حسی معجزات کے نتیجے میں انسان یقین کرنے پر مجبور تو ہو جاتا ہے لیکن اصل حقیقت اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔انسان کی گردن ظاہری خارق عادت واقعہ کے سامنے جھک جاتی ہے۔اس کے مقابلے میں دین اسلام نے عقل انسانی کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی کاریگریوں کا مطالعہ کرے اور انہیں سمجھنے کی سعی کرے۔اس لئے کہ اس کائنات کی راز بذات خود معجزات ہیں۔یہ اور بات ہے کہ یہ معجزات ہروقت ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں اور ان کے صدور پر یہ کائنات قائم ہے اور اس کے عناصر ترکیبی' انہی قدرتی بوقلمونیوں پر مشتمل ہیں۔اسلام نے انسان کو یہ قوت مدرکہ اور یہ ملکہ بذریعہ کتاب الٰہی عطا کیا۔اپنے انداز بیاں اور طرز تعبیر کے اعتبار سے یہ کتاب معجز ہے' اس کا اسلوب بھی معجزے اور اس کی اجتماعی ساخت اور متحرک انداز بیاں اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ اس کی ساخت بے مثال ہے اور قرآن کے نزول کے بعد آج تک اس کی کوئی مثال نہیں لائی جا سکی۔

انسان کو عقلی بلوغ کے مقام تک پہنچانے کے لئے طویل تربیت اور مسلسل ہدایت کی ضرورت تھی تاکہ انسان کی قوت مدرکہ کے اندر یہ مطلوب عظیم انقلاب روبہ عمل لایا جا سکے' اور انسانیت ترقی کے مقام بلند تک پہنچ سکے اور انسان خود اپنی قوت مدرکہ کے ساتھ اس کائنات اور موجودات کے اس مسلسل سفر کو سمجھ سکے۔لیکن قرآنی ہدایات کی روشنی میں' قرآنی ضابطوں کے اندر رہتے ہوئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی روشنی میں انسان سفر کائنات کو مثبت' واقعیت اور اچانک ایک مختصر عرصے میں سمجھ سکے اور اس کی یہ سمجھ اور اس کا یہ ادراک ان فلسفوں کے تصور اور ادراک سے بالکل مختلف

ہو جو اس وقت رائج تھے ۔ مثلاً یونانی اور مسیحی لاہوتی فلسفے یا محض حسی اور مادی تصور کائنات جو اس دور میں ہندی 'مصری' مجوسی اور بودھ فلسفوں کی شکل میں رائج تھے اور انسانوں کو رنگ و بو کے اس محدود دائرے سے بھی نکال دے جو نزول قرآن کے وقت عربوں میں عام تھے ۔

یہ ہدایت و تربیت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں سے تھی اور جس طرح ان دو آیات کے اندر اس کی وضاحت کی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل کردار یہ تھا۔ اس کی مزید تشریح اگلی لہر میں بھی آپ دیکھیں گے ۔ خلاصہ یہ کہ رسول انسان ہوتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ دنیا والوں کی طرف اس لئے بھیجتے ہیں کہ وہ انہیں اچھے انجام کی خوشخبری دے اور برے انجام سے ڈرائے ۔ ان امور پر اس کا فریضہ رسالت ختم ہو جاتا ہے ۔ اب آگے لوگوں کا فریضہ شروع ہو جاتا ہے کہ وہ رسول کی دعوت کو قبول کریں ۔ لوگوں کی جانب سے قبولیت اللہ کی مشیت کے دائرے کے اندر ہوتی ہے اور اس دعوت کے مقابلے میں جو شخص جو رویہ بھی اختیار کرے گا اس پر جزا ملے گی یا سزا ہوگی ۔ لہذا جو ایمان لے آئے اور ایسے نیک کام کرے جن سے اس کے ایمان کا اظہار ہو تو اس کا انجام اطمینان بخش ہو گا اور وہ کسی خوف سے دوچار نہ ہو گا نہ اسے بے اطمینانی ہوگی ۔ اس کی تمام سابقہ کوتاہیاں معاف کر دی جائیں گی اور جو نیکی کے کام اس نے کئے ہوں گے ان پر اسے ثواب ملے گا ۔ جن لوگوں نے ان آیات کو جھٹلایا جو رسول لے کر آتا ہے اور جن کے اشارات کتاب کائنات کے اندر موجود ہوتے ہیں تو وہ لوگ عذاب سے دوچار ہوں گے ۔ اور یہ عذاب اور سزا ان کو ان کی اس تکذیب کی وجہ سے دی جائے گی اور اس کی تعبیر یوں کی گئی بما کانوا یفسقون (اس وجہ سے کہ انہوں نے فسق اختیار کیا تھا جس سے مراد کفر ہے ) ۔ قرآن کریم میں اکثر مقامات پر شرک پر ظلم کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے اور کفر پر فسق کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے ۔

یہ ایک نہایت ہی واضح اور سیدھا سادا تصور ہے جس کے اندر کوئی پیچیدگی نہیں ہے ۔ رسول کے مقام اور اس کے فرائض کے بارے میں یہ ایک واضح نشاندہی ہے کہ دین میں رسول کا کیا مقام و حیثیت ہے اور اس کے فرائض کیا ہیں؟ یہ ایک ایسا تصور ہے کہ جس کے مطابق مقام الوہیت صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے 'اپنے تمام خصائص کے ساتھ اور تمام کاموں کو اللہ کی تقدیر اور فیصلوں پر موقوف کر دیا جاتا ہے ۔ اللہ کی تقدیر اور مشیت کے دائرے کے اندر انسان کو سوچ اور فیصلے کی آزادی بھی دی گئی ہے ۔ اس وجہ سے انسان مسئول ہو جاتا ہے اور جزاء و سزا کے نتائج اس کے اعمال پر مرتب ہوتے ہیں ۔ اس واضح تصور سے ان پیچیدہ تصورات کی مکمل نفی ہو جاتی ہے جو بعض لوگوں میں رسولوں کی شخصیت اور طبیعت کے بارے میں غلط فلسفوں کے نتیجے میں رائج ہیں یا دور جاہلیت میں رائج تھے جو یہ توقع کرتے تھے کہ اگر رسول برحق ہے تو معجزے کیوں نہیں لاتا؟ اور لوگ اس کے مطیع فرمان کیوں نہیں ہوتے ؟ یوں اسلام نے انسان کو عقلی بلوغ کے دور میں داخل کیا اور نہایت ہی سادہ انداز میں ' بغیر اس کے کہ وہ پیچیدہ ذہنی اور فلسفیانہ تصورات میں گم ہو ' یا لاہوتی جدلیات و مباحث میں پڑ کر اپنی قوت مدرکہ کو ضائع کرے جس طرح قرون مظلمہ میں ہوتا رہا ہے ۔

---ooo---

# درس نمبر ۶۱ ایک نظر میں

اس لہر میں حقیقت رسالت کے بیان کا باقی حصہ دیا گیا ہے۔ مشرکین عرب کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ رسالت کی حقیقت کیا ہوتی ہے اور رسول کا مزاج کیا ہوتا ہے اور یہ حقیقت ان کو سمجھانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ یہ لوگ رسول اکرم ؐ سے خارق عادت معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ سابقہ لہر میں ان کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ یہاں رسالت کے بارے میں ان کے جو جاہلانہ تصورات تھے ان کی مزید درستی کی جا رہی ہے۔ خصوصاً یہ وضاحت کر دی جاتی ہے کہ رسول بشر ہوتے ہیں اور تمام رسول بشر ہی گزرے ہیں اس لئے کہ عربوں اور ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی جاہلیتوں کے اندر حقیقت رسالت کے بارے میں بہت کچھ غلط فہمیاں پائی جاتی تھیں۔ ان تصورات کی وجہ سے یہ لوگ حقیقت رسالت 'حقیقت وحی اور حقیقت نبوت اور ذات رسل کے بارے میں جادۂ حق سے بہت دور نکل چکے تھے اور تمام لوگ خرافات اور قصے کہانیوں کی دنیا میں داخل ہو کر گمراہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے نبوت اور رسالت کو سحر اور جادوگری سے ملا دیا تھا۔ وحی کو وہ جنون سے بھی تعبیر کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ ہوتا تھا کہ رسول غیب کی خبریں دیا کرتا ہے۔ رسول وہ ہوتا ہے جس کے ہاتھ سے خوارق اور معجزات صادر ہوتے ہیں اور اسے وہ کام کرنے چاہئیں جو جنات کے عامل اور جادوگر کیا کرتے ہیں۔
جب اسلامی نظریہ حیات آیا تو اس نے باطل عقائد پر بمباری کر کے باطل کا سر پھوڑ کر رکھ دیا اور ایمان کو اس کی سادگی' واقعیت' سچائی اور اس کی وضاحت لوٹا کر دے دی۔ یوں ایک نبی کی سچی تصویر سامنے آئی اور نبوت کا واضح تصور دنیا نے پایا اور تمام خرافات اور قصے کہانیوں اور وہمی دیو مالائی تصورات سے انسان نے نجات پائی جو اس وقت دنیا پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔ مشرکین کے ہاں رائج تصورات وہ تھے جو ان کے قرب و جوار میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اندر بالعموم پائے جاتے تھے۔ ان دونوں ملتوں کے اندر بھی بہت سی شاخیں اور فرقے تھے۔ لیکن تمام فرقوں کے اندر حقیقت نبوت کو بگاڑنا قدر مشترک تھی۔

اس لہر میں حقیقت رسالت اور حقیقت رسول ؐ کو باطل اوہام و خرافات سے پاک و صاف کر کے پیش کرنے کے بعد اب اسلامی نظریہ حیات کو بھی نہایت ہی سادہ انداز میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ اسے بغیر کسی مبالغہ اور بغیر کسی بناوٹ کے اپنے سادہ اور حقیقی خد و خال کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اس نظریہ کے پیش کرنے والے ہیں وہ بھی تو انسان ہیں۔ ان کے پاس دنیا کے خزانے نہیں ہیں۔ وہ غیب کا علم نہیں رکھتے 'نہ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ فرشتے ہیں۔ وہ تو صرف اپنے رب کی طرف سے ہدایات اخذ کرتے ہیں اور صرف اسی کے حکم کا متبع ہیں۔ ان کے پاس سارا علم بذریعہ وحی رب کی طرف سے ان کے پاس آ جاتا ہے۔ جو لوگ آپ کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں وہ لوگوں کے نزدیک نہایت ہی مکرم ہیں۔ اس لئے رسول کا بھی فرض ہے کہ وہ انہیں اپنے ساتھ جوڑے رکھے اور ان کا خیر مقدم کرے۔ انہیں یہ خوشخبری دے کہ اللہ نے اپنے اوپر یہ فرض کر لیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ نہایت ہی

رحیمانہ سلوک کرے گا۔ نیز رسول کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ان لوگوں کو ڈرائے جن کے دلوں کے اندر خوف خدا موجود ہے اور جو آخرت کی جوابدہی کے قائل ہیں تاکہ وہ خدا خوفی کے اعلیٰ مقام تک پہنچ جائیں۔ بس یہی ہے رسول کا فریضہ اور اس کی ڈیوٹی اور اس کی حقیقت دو لفظوں کے اندر منحصر ہے۔ "بشریت" اور "اخذ وحی"۔ ان دو لفظوں کے اندر رسول کی حقیقت بھی بیان کر دی گئی اور رسول کے فرائض منصبی کے حدود کا بھی تعین کر دیا گیا۔ فکر کی اس درستی اور انجام بد کی نشاندہی کے ساتھ ہی مجرمین کی راہ بھی متعین ہو جاتی ہے اور مومنین اور مجرمین کی راہیں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہیں۔ حق و باطل ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور حقیقت رسول اور منصب رسالت کے بارے میں تمام اوہام و خرافات کا رد ہو جاتا ہے۔ نہایت ہی واضح طور پر مومنین اور غیر مومنین کے درمیاں لکیر کھنچ جاتی ہے 'کھلے طور پر۔

ان حقائق کی وضاحت کے ساتھ ساتھ مقام الوہیت کے بعض پہلو بھی لوگوں کے سامنے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ رسول خدا اور خدا کے درمیان تعلق کی نوعیت بھی بتا دی جاتی ہے۔ نیز رسول اور اس کے متبعین اور اس کے مخالفین کے ساتھ اس کے تعلق کی حدود اور نوعیت کا بھی تعین کر دیا جاتا ہے۔ یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ متبعین کا رنگ ڈھنگ کیا ہوتا ہے اور گمراہوں کے طور طریقے کیا ہوتے ہیں۔ جو لوگ ہدایت پانے والے ہیں وہ آنکھوں والے ہوتے ہیں اور جو گمراہ ہیں وہ اندھے ہوتے ہیں۔ اللہ نے اپنے اوپر اپنے مومن بندوں کے لئے رحمت فرض کر دی ہے اور اگر ان میں سے کوئی تائب ہو جائے تو اللہ اسے ضرور معاف فرماتے ہیں 'اگرچہ انہوں نے معاصی کا ارتکاب کیا ہو' بشرطیکہ یہ ارتکاب انہوں نے جہالت کی وجہ سے کیا ہو اور توبہ کے بعد وہ اصلاح کی راہ اپنائیں۔ نیز اللہ مجرموں کی روش کو اچھی طرح واضح کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا جو بھی ایمان لاتا ہے وہ علی وجہ البصیرت ایمان لائے اور جو گمراہ ہوتا ہے وہ بھی علی وجہ البصیرت گمراہ ہو۔ ہر شخص جو موقف بھی اختیار کرے سوچ کر کرے۔ کسی غلط فہمی اور کسی گمان و تخمین کی بنیاد نہ ہو۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۶ تشریح آیات

# ۵۰ ---تا--- ۵۵

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَالْبَصِیْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۠﴿۵۰﴾

"اے نبی ؐ' ان سے کہو' میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں' اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔" پھر ان سے پوچھو "کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟"

اہل مکہ میں سے معاندین اور مخالفین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ آپ ؐ ان کے سامنے کوئی خارق عادت معجزہ پیش کر دیں تو وہ آپ کی دعوت کو قبول کر لیں گے۔ لیکن جیسا کہ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ اہل مکہ کو آپ کی صداقت میں ذرہ برابر شک نہ تھا۔ یہ محض بہانہ سازی تھی۔ کبھی وہ اس مطالبے کا مخصوص طور پر ذکر کرتے تھے اور وہ یہ کہ آپ صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کو سونے میں تبدیل کر دیں۔ کبھی وہ یہ مطالبہ کرتے تھے کہ ان پہاڑیوں کو مکہ سے غائب کر دیا جائے' ان کی جگہ سرسبز و شاداب زمین بن جائے اور اس میں فصل اور پھل اگ آئے۔ کبھی وہ یہ مطالبہ کرتے تھے کہ آپ انہیں کچھ غیبی امور کی اطلاع کر دیں۔ کبھی وہ یہ مطالبہ کرتے کہ ان کے سامنے فرشتہ آ جائے۔ کبھی وہ یہ مطالبہ کرتے کہ قرآن کریم کتابی صورت میں لکھا ہوا ان کے سامنے آپ پر نازل ہو جائے' وہ اسے پڑھ لیں اور نازل ہوتے ہوئے دیکھ بھی لیں۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے مطالبات دراصل وہ اس لئے کرتے تھے کہ ان کے نیچے وہ اپنے بغض و عناد کو چھپا لیں جس کی وجہ سے وہ مان کر نہ دیتے تھے۔

یہ مطالبات ان کے ذہن میں ان تصورات کی وجہ سے پیدا ہوتے تھے' جو عربوں کے ارد گرد پھیلی ہوئی جاہلیتوں نے' حقیقت رسالت اور شخصیت رسول کے ساتھ غلط طور پر وابستہ کر رکھے تھے۔ ان تمام وہمی تصورات کو اہل کتاب نے اپنے ہاں تصور نبوت میں جگہ دے رکھی تھی' اور انہوں نے ان ہدایات کو ترک کر دیا تھا جو اہل کتاب کے پاس ان کے رسول

لے کر آتے رہے تھے۔

دنیا میں رائج مختلف جاہلیتوں میں بہت سے لوگوں نے اپنے آپ کو خود نبی بناکر پیش کیا تھا اور بعض سادہ لوح اقوام نے ان کو نبی تسلیم بھی کر لیا تھا۔ ان لوگوں پر جادوگروں' کاہنوں' اہل نجوم اور جنات والوں کے دعوے شامل تھے جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اس قسم کے تمام نبیوں نے ہمیشہ عالم الغیب ہونے کا دعویٰ کیا' مزید یہ کہ انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ روحیں ان کے قبضے میں ہیں اور جنات کے ساتھ ان کے رابطے ہیں اور یہ کہ وہ تعویذوں اور گنڈوں کے ذریعے نظام قدرت کو تبدیل کر سکتے ہیں یا یہ کہ وہ عبادات اور دعاؤں کے ذریعہ کارسازی کر سکتے ہیں یا دوسرے خفیہ ذرائع سے مقصد برآری کر سکتے ہیں۔ یہ تمام مذاہب جس امر پر متفق ہیں وہ یہ ہے کہ یہ لوگ متبعین کو وہم میں مبتلا کرتے ہیں اور راہ حق سے انہیں گمراہ کرتے ہیں۔ ہاں اس وہم پرستی اور ضلالت کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں۔

جادوگروں کی نبوت کا تعلق ہمیشہ ارواح خبیثہ کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ یہ جادوگر ان خبیث روحوں کے ساتھ تعلقات استوار کرتے تاکہ نامعلوم امور کو معلوم کر سکیں یا یہ کہ وہ واقعات و حالات پر اثرانداز ہو سکیں۔ کاہنوں کی نبوت کی شکل یہ ہوتی کہ اس کا تعلق بعض خداؤں سے ہوتا۔ یہ خدا کاہن کے ماتحت نہیں ہوتے نہ اس کے قبضے میں ہوتے ہیں لیکن وہ اس کی درخواست اور عبادت کو قبول کرتے ہیں اور کاہن کو جو مسائل درپیش ہوتے ہیں انہیں وہ سوتے میں یا حالت بیداری میں حل کر دیتے ہیں اور اسے بعض اشارات یا خوابوں کے ذریعہ ہدایات دیتے ہیں۔ لیکن کاہن کی تمام درخواستیں اور دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ یہ دونوں قسم کی نبوتیں جذب و جنون کی نبوت سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ ساحر اور کاہن دونوں جو طلب کرتے ہیں وہ اسے خود سمجھتے ہیں۔ وہ بالارادہ دعا کرتے ہیں جو بھی کرتے ہیں یا وہ جو عزم و ارادہ کرتے ہیں وہ سوچ سمجھ کر کرتے ہیں لیکن جذب و جنون کا نبی جذب و جنون کے ہاتھوں بے بس ہوتا ہے۔ اس کی زبان سے مبہم قسم کی باتیں نکلتی ہیں۔ وہ بالارادہ یہ باتیں نہیں کرتا۔ بعض اوقات شاید وہ سمجھتا بھی نہیں کہ وہ کیا کہتا ہے۔ اکثر اقوام میں یوں ہوتا ہے کہ جذب و جنون میں سرشار نبی کے ساتھ ایک مفسر ہوتا ہے جو اس مجذوب کے کلام کو سمجھنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ یونانی زبان میں ایسے نبی کو مانتی (Manti) اور اس کے شارح کو پرافٹ (Prophet) کہا جاتا ہے۔ لغوی مفہوم یہ ہے "وہ جو دوسرے کی جانب سے بطور نائب بات کرتا ہے۔" اسی لفظ کو اہل یورپ نے نبوت کے مختلف معنوں میں اپنے ہاں رائج کیا۔ کاہن اور مجذوب کبھی بھی ایک دوسرے کے ساتھ متفق نہیں ہوئے۔ ہاں ایک صورت ایسی ہے کہ کاہن اور مجذوب باہم متفق ہو جاتے ہیں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب مجذوب کا شارح کلام' کاہن ہو اور اس کی ڈیوٹی یہ ہو کہ وہ مجذوب کے اشارات و مضامین کی تشریح کرے گا۔ اکثر اوقات ان کے درمیان اختلاف ہو جاتا ہے اور ان کے درمیان تنازعات برپا ہو جاتے ہیں کیونکہ ان دونوں کی معاشرتی ذمہ داریاں جدا ہوتی ہیں اور ان کی تربیت مختلف حالات میں ہوئی ہوتی ہے۔ مجذوب ایک انقلابی مزاج رکھتا ہے اور وہ عادات اور سوشل مراسم کا پابند نہیں ہوتا جبکہ کاہن سوشل مراسم کا پابند اور محافظ ہوتا ہے کیونکہ اکثر اوقات یہ کہانت اسے ورثے میں ملتی ہے۔ اس کے آباؤاجداد بھی کاہن ہوتے ہیں۔ کہانت ایسے معاشرے میں چلتی ہے جو کسی علاقے میں قریب و بعید کے معبد یا ہیکل سے متاثر ہو جبکہ جذب کسی معاشرے اور رسم کا پابند نہیں ہوتا کیونکہ صاحب جذب بعض اوقات پوری دنیا سے کٹ جاتا ہے اور اس کی موجودہ صورت حالات اسے اپنے ارد گرد سوسائٹی سے کاٹ دیتی ہے۔"

"بنی اسرائیل کے قبائل میں انبیاء کی بڑی کثرت رہی ہے اور بنی اسرائیل کی طویل تاریخ میں ان کی مثال اسی طرح ہے

جس طرح جدید دور میں اہل ذکر کے سلسلے ہیں یا صوفیاء کے طریقے ہیں۔ کیونکہ بعض زمانوں میں ان کی تعداد سینکڑوں میں رہی ہے اور انہوں نے اپنے متبعین میں ریاضت اور تربیت کے وہی طریقے جاری کئے جو آج بھی صوفیاء کے ہاں جاری ہیں' مثلاً جسمانی ریاضت کے ذریعے سے جذب حاصل کرنا یا سماع اور طرب و نشاط کے آلات کے ذریعے جذب حاصل کرنا۔"

(اسلام کے حقائق اور اس کے دشمنوں کی گمراہیاں۔ مصنفہ استاد عقاد صفحہ ۲۲٦)

یہ بات یاد رہے کہ ہم نے عقاد کی کتاب سے محض غلط تصورات کا حوالہ دیا ہے۔ البتہ انہوں نے تصور خدا اور تصور رسالت میں جو ارتقائی بحث کی ہے بلکہ ادیان سماوی کے اندر بھی ارتقاء ثابت کیا ہے اور اسے اسلام میں تصور خدا اور رسالت تک پہنچایا ہے' اس منہاج سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ دراصل تمام ادیان سماوی میں خدا کا وہی تصور تھا جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ ہاں ملل انبیائے سابقین اگر گمراہ ہو کر جاہلیت میں داخل ہو گئیں تو اس کی ذمہ داری ادیان پر نہیں ہے کیونکہ بعد کے ادوار میں ملتوں نے انبیاء کی صحیح تعلیمات کے اندر تحریفات کر دیں اور اسلامی تصور کو اپنے جاہلی تصورات کے تابع کر دیا۔ قرآن کریم ہماری اس بات کی تائید کرتا ہے۔ اہل مغرب کے اہل علم جو ادیان کے بارے میں بحث کرتے ہیں خصوصاً ارتقائی نظریے سے تو یہ محض مفروضے اور شبہات ہیں۔ (سید قطب)

"سموئیل اول کی کتاب میں ہے کہ :

"ساؤل نے داؤد کو گرفتار کرنے کے لئے کچھ ایلچی بھیجے .... سو انہوں نے نبیوں کی جماعت کو نبوت کرتے دیکھا اور ساؤل ان کے درمیان بطور رئیس کھڑا تھا۔ پھر اللہ کی روح ساؤل کے ایلچیوں پر اتری اور انہوں نے بھی نبوت کی۔ پھر اس نے اوروں کو بھیجا تو انہوں نے نبوت کی .... پس اس نے اپنے کپڑے اتار دیئے۔ اور اس نے بھی سموئیل کے آگے نبوت کی اور وہ دن بھر اور رات بھر ننگا رہا۔

اسی طرح کتاب سموئیل میں یہ بھی آیا ہے کہ : تو نبیوں کے ایک گروہ سے ملے گا جو ٹیلے سے اترتے ہوں گے۔ ان کے آگے رباب' دف' بانسری اور عود بجتے ہوں گے۔ اور وہ نبوت کرتے ہوں گے۔ پس ان پر رب کی روح اترے گی اور ان کے ساتھ نبوت کرے گی اور ایک اور آدمی کی طرف منتقل ہو گی۔

گزشتہ بیان سے ثابت ہوا کہ نبوت ایک فن تھا۔ جس کا تعلق ماوراء کے ساتھ تھا۔ بیٹے اسے آباؤ اجداد سے سیکھتے تھے۔ جس طرح کہ کتاب سلاطین دوم میں آیا ہے : جب کہ نبیوں کے بیٹوں نے کہا اے الیسع یہ وہ جگہ ہے جہاں پر ہم تیرے آگے مقیم ہیں۔ یہ جگہ ہم پر تنگ ہے سو اب ہم کو اردن جانا چاہیے۔

بعض مواضع میں ان کی خدمات لشکر کے سپرد ہوتی تھیں۔ جیسے کہ ایام کے سفر اول میں ہے : داؤد اور لشکروں کے سرداروں نے بنی اساف وغیرہ کے نبی کہلانے والوں کو عود' رباب اور سارنگیوں سے سرفراز کیا"۔ یہ تھا قدیم جاہلیتوں کا حال اور ان میں وہ جاہلیتیں بھی شامل ہیں جو آسمانی رسالتوں پر ایمان لانے والی امتوں میں فکری انحراف کی وجہ سے رائج ہو گئی تھیں اور اس فکری انحراف کی وجہ سے ان کے ہاں حقیقت نبوت اور مزاج نبی کے بارے میں غلط افکار نے راہ پالی تھی۔ ان غلط افکار کی وجہ سے عوام الناس ہر مدعی نبوت سے یہ توقع رکھتے تھے کہ اس سے مطلوبہ واقعات صادر ہوں۔ کبھی تو وہ یہ توقع کرتے تھے کہ وہ انہیں غیب کی خبریں دے۔ کبھی وہ یہ مطالبہ کرتے تھے کہ وہ سحر اور کہانت کے ذریعے کائنات کے طبیعی قوانین کو بدل دے۔ یہی تصور تھا جس کی وجہ سے مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کے مطالبات کرتے تھے۔ اور ان غلط افکار کی درستی کے لئے قرآن کریم نے حقیقت رسالت اور طبیعت رسول کے بارے میں بار بار وضاحت کی ہے۔ اور ان وضاحتوں میں سے ایک یہ ہے :

(قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّىْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَىَّ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ

(٦ : ٥٠)) اے نبی ؐ ' ان سے کہو "میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں' اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔" پھر ان سے پوچھو "کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟" حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے رب کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو صرف بطور انسان پیش کریں اور اپنے ساتھ جاہلیت کے اوہام اور دیومالائی قصے وابستہ نہ کریں جو اہالیان جاہلیت نے نبوت کی حقیقت اور نبی کی ذات میں داخل کر دیئے تھے۔ نیز حضور ؐ ان کے سامنے اسلامی نظریہ حیات کو بغیر کسی لاگ ولپیٹ کے پیش کریں 'جس میں کوئی زیادتی نہ ہو اور نہ ادعا ہو۔ بس یہ ایک عقیدہ ہے جسے رسول لے کر آیا ہے اور اس سے فائدہ وہی شخص اٹھا سکتا ہے جسے اللہ ہدایت دے ' بذات خود رسول کسی کو ہدایت بھی نہیں دے سکتا۔ راہ دکھانے والا صرف اللہ ہے۔

رسول کی حقیقت اس نظریہ حیات کے مطابق صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے آمدہ وحی کی پیروی کرتا ہے۔ اللہ اسے ان باتوں کی تعلیم دیتا ہے جنہیں وہ پہلے نہ جانتا تھا۔ رسول اللہ کے خزانوں کا مختار نہیں بن جاتا کہ وہ ان خزانوں کے دروازے ان لوگوں پر کھول دے جو اس کے متبعین ہیں۔ نہ اس کے پاس غیب کی کنجیاں آجاتی ہیں کہ وہ اپنے پیروکاروں کو آنے والے واقعات بتاتا جائے۔ نہ وہ فرشتہ ہوتا ہے کہ اس کی پاس فرشتے آیا کریں اور ساتھ رہیں۔ وہ بشر اور رسول ہوتا ہے۔ یہ ہے اسلامی نظریہ حیات پاک وصاف اور بالکل واضح اور سیدھا سادا۔

یہ عقیدہ فطرت کی آواز ہے۔ یہ زندگی کا بنیادی عنصر ہے اور اللہ اور آخرت کے راستے کے لئے چراغ راہ ہے۔ اسے اس کی اصل شکل کے سوا کسی اور سجاوٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص صرف اس عقیدے کو چاہتا ہے تو وہی اس کا مستحق ہے اور یہ عقیدہ اس کے لئے سب سے اونچی قدر ہوگی۔ اگر کوئی شخص اس عقیدے کو بطور سامان' دنیا اپنائے تو وہ اس کی حقیقت کا ادراک نہ کر سکے گا۔ نہ اس کی قدر وقیمت کو سمجھ سکے گا' لہذا یہ عقیدہ بھی ایسے شخص کو کچھ نہ دے سکے گا۔ ایسا شخص محتاج ہی رہے گا۔

ان وجوہات کی بنا پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اسے اس انداز میں پیش کریں کہ اس میں کوئی بناوٹ اور تصنع نہ ہو 'کیونکہ اسے کسی بناؤ سنگھار کی ضرورت نہیں ہے تاکہ معلوم ہو کہ جو لوگ اس نظریے کے سایہ عاطفت میں آتے ہیں وہ کسی غرض اور دولت کے لئے نہیں آتے 'کسی جاہ وجلال کے لئے نہیں آتے اور ماسوائے تقویٰ کے کسی فضیلت کے طلبگار نہیں ہیں۔ وہ محض اللہ کی راہنمائی حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں جو اللہ کا بڑا کرم اور سب سے بڑی دولت ہے۔ ذرا دوبارہ غور کیجئے :

(قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّىْ مَلَكٌ

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰی اِلَیَّ (۶:۵۰)) اے نبی "ان سے کہو "میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں - نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں' اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں - میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے -" نیز انہیں معلوم ہو کہ وہ ہدایت الہٰی ہیں اگر درحقیقت نور و بصیرت کے دائرے میں آ جاتے ہیں اور جہالت اور ظلمت سے نکل آتے ہیں - (قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ اَفَلَا تَتَفَکَّرُوْنَ (۶:۵۰)) "پھر ان سے پوچھو 'کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟" ایک اہم سوال یہ ہے کہ صرف وحی کی پیروی کرنا ہی ہدایت اور بصیرت ہے اور جو شخص وحی سے محروم ہو گیا وہ نابینا اور اندھا تصور ہو گا - اس آیت نے نہایت ہی دو ٹوک الفاظ میں اس سوال کو حل کر دیا - سوال یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں عقل انسانی کا کیا کردار ہے؟

اسلامی نظام حیات نے اس سوال کا نہایت ہی واضح اور دو ٹوک جواب دیا ہے - عقل جو خود اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے 'بذات خود دین الہٰی ہے - اس کے اندر یہ قوت تو ہے کہ وہ وحی الہٰی کو اخذ کر سکے 'اور اس کے مفہومات کو سمجھ سکے - یہ اس کا فریضہ بھی ہے اور یہ اس کا دائرہ اختیار بھی ہے کہ وہ نور ہدایت کو اپنائے اور اپنے آپ کو اس مضبوط ضابطے کا پابند کر لے جس کے اندر کسی جانب سے کوئی جھول یا غلطی نہیں ہے -

لیکن اگر عقل انسانی اپنے آپ کو ضابطہ وحی الہٰی سے آزاد کر لے تو وہ ہمیشہ گمراہی اور انحراف کا شکار ہو جاتی ہے - اس کا مطالعہ غلط ہوتا ہے 'اس کے اندازے بہت ہی غلط ہو جاتے ہیں اور اس کی تمام تدابیر ناکارہ رہ جاتی ہیں -

عقل انسانی اس حادثے سے دوچار اس لئے ہوتی ہے کہ اپنی ساخت کی وجہ سے عقل انسانی اس کائنات کے اجزاء کا ادراک تو کر سکتی ہے لیکن اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کائنات کو بحیثیت کل واحد یا مجموعی طور پر مطالعہ کر سکے - انفرادی اور جزئی ادراک کی وجہ سے عقل بار بار تجربہ کرتی ہے 'حادثے کے بعد حادثہ رونما ہوتا ہے 'ایک تصویر بنتی ہے اور دوسری بگڑتی ہے - لیکن عقل چوبیں پا کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ پوری کائنات کو مجموعی حیثیت سے دیکھ سکے اور اس مجموعی اور کلی مطالعے کے نتیجے میں احکام صادر کر سکے - اس کلی ادراک کے نتیجے میں کوئی نظام تشکیل دے سکے ' جس کے اندر مکمل جامعیت اور توازن موجود ہو - یہی وجہ ہے کہ جب عقل ہدایت الہٰیہ اور وحی الہٰی سے آزاد ہو کر فیصلے کرتی ہے تو اسے بار بار تجربے کرنے پڑتے ہیں اور بار بار احکام تبدیل کرنے پڑتے ہیں - بار بار نظام بدلنا پڑتا ہے 'ایک اقدام کرنا پڑتا ہے جس کا کوئی الٹا ردعمل سامنے آتا ہے - کبھی تو عقل نہایت بائیں طرف جھک کر دور چلی جاتی ہے اور کبھی دائیں طرف جھک کر بہت دور نکل جاتی ہے - یوں وہ اس عزیز ترین مخلوق خدا یعنی انسان کو ضائع کرتی رہتی ہے اور معزز انسانی ڈھانچے کو تباہ و برباد کر دیتی ہے - اگر عقل اپنے دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے وحی کی مطیع فرمان ہو جاتی تو پوری انسانیت اس تباہی سے بچ جاتی - تجربات اور رسم و رواج کے لئے ہم مادی میدان کا انتخاب کر لیتے ' نیز صنعتی اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ہم عقل کو چھوڑ دیتے 'کیونکہ یہ وہ میدان ہے جس میں عقل "مستقلاً" کام کر سکتی ہے - اگر اس میں اس کا کوئی تجربہ غلط نکلے تو انسان کو مادی نقصان تو ہو سکتا ہے لیکن انسانی اور روحانی نقصان سے وہ دوچار نہ ہو گا -

لیکن اس کی کیا وجوہات ہیں کہ انسان عقل کی وجہ سے ان مشکلات سے دوچار ہو جاتا ہے؟ اس کی عقل کی فطری ساخت کے علاوہ اس کی کچھ اور وجوہات بھی ہیں - اس کے اندر کچھ فطری میلانات ' خواہشات اور جذبات بھی ہیں اور

انسان کے ان فطری میلانات ' جذبات اور خواہشات کے لئے کسی ضابطے کی بھی ضرورت ہے تاکہ وہ ان ضابطوں کے اندر رہتے ہوئے سلسلہ زندگی کو جاری رکھ سکے - اسے ترقی دے سکے اور اپنے فطری فرائض کو ادا کر سکے اور فطری ضابطوں کے محفوظ حدود سے آگے نہ بڑھ جائے ' جس کی وجہ سے اس کی پوری زندگی تباہی اور بربادی کا شکار ہو جائے - یہ ضابطہ بندی کون کرے گا؟ کیا صرف عقل انسانی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ بذات خود کوئی اصول طے کر دے ؟ عقل چونکہ یا تو بذات خود جذبات اور میلانات اور جسمانی خواہشات کے زیر اثر کام کرتی ہے جن کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے ' لہٰذا اس کے لئے کسی اور مصدر کی طرف سے ضابطہ بندی ضروری ہے - یہ مصدر اس ضابطہ بندی کے بعد اس کا محافظ بھی ہو سکتا ہے اور عقل انسانی ہر وقت اس کی طرف رجوع کر سکے گی - انسانی زندگی کے ہر حکم پر ' ہر تجربے کی ضابطہ بندی اس مصدر و منبع کی سمت میں ہوگی اور انسان کی حرکت اور جدوجہد کا قبلہ درست رہے گا -

جو لوگ عقل انسانی کو وحی الٰہی کی طرح فیصلہ کن اور حقیقی سمجھتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ جس طرح وحی الٰہی خدا کی جانب سے ہوتی ہے ' اسی طرح عقل انسانی بھی خدا ہی کی دین ہے اور انسان کو خدا ہی نے عقل عطا کی ہے لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وحی الٰہی اور عقل انسانی کے اندر کوئی تضاد ہو - یہ وہ لوگ ہیں جو عقل انسانی کو وہ درجہ دیتے ہیں جو اسے انسانی فلاسفروں نے دیا ہے - اللہ تعالیٰ نے عقل انسانی کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کی ہے -

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ صرف کسی ایک انسان کی عقل انسان کو وحی الٰہی سے بے نیاز کر دیتی ہے ' اگر وہ بہت ہی بڑا انسان ہو - وہ اس معاملے میں ایسی بات کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمائی - اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے خلاف وحی اور رسالت کو حجت قرار دیا ہے - محض انسانی عقل پر نظام مسئولیت نہیں موقوف کیا - نہ صرف اس بات کا انسان کو مکلف بنایا ہے کہ وہ اپنی فطری قوتوں کے بل بوتے ہی پر راہ ہدایت حاصل کرے اور معرفت کردگار حاصل کرے - اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ صرف عقل کے لئے منزل مقصود تک پہنچنا مشکل ہے - صرف فطرت پر ہی اعتماد نہیں کیا جا سکتا - کیونکہ فطرت کے اندر انحراف ممکن ہے جب وحی راہنما نہ بنے کیونکہ یہی قابل اعتماد راہنما ہے اور صاحب بصیرت لیڈر - ( دیکھئے فی ظلال القرآن پارۂ ششم آیت ---- کی تفسیر )

جو لوگ یہ یقین رکھتے ہیں کہ عقل انسان کو دین سے مستغنی کر دیتی ہے یا یہ کہ سائنس جو عقل کی پیداوار ہے ' انسان کو اللہ کی جانب سے راہنمائی کی ضرورت سے بے نیاز کر دیتی ہے ' یہ لوگ ایسی بات کرتے ہیں جو نہ حقیقی ہے اور نہ امر واقعہ اس طرح ہے - اس لئے کہ عملی صورت حال بتاتی ہے کہ جن لوگوں کی زندگی کسی فلسفیانہ تصور پر استوار ہے یا سائنسی نظریات پر استوار ہے وہ نہایت ہی تکلیف دہ زندگی گزار رہے ہیں اور اس میں انسان سخت ترین مصائب کا شکار ہے - اگرچہ ان کی زندگی پر ہر طرف سے سہولیات کی بارش ہو ' ان کی پیداوار اور آمدن بہت زیادہ ہو اور اس میں وسائل زندگی اور اسباب عیش و طرب حد سے زیادہ ہوں - ( دیکھئے ' اسلام اور مشکلات تہذیب کا باب خبط اور اضطراب ) اس کے برعکس یہ بات بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی کہ حیات دنیا محض جہالت اور اتفاق پر مبنی ہے - جو لوگ اس کائنات کی تعبیر اس انداز سے کرتے ہیں کہ یہ خود بخود وجود میں آگئی ہے وہ مطلب پرست اور خود غرض ہیں -

اسلام ایک ایسا نظام زندگی ہے جس میں عقل انسانی کو ایسی ضمانتیں دی گئی ہیں جن کی وجہ سے انسان اپنی ذاتی ساخت میں پائی جانے والی کمزوریوں سے بھی پاک ہو جاتا ہے ' نیز ان کمزوریوں سے بھی بچ جاتا ہے جن میں وہ ذاتی خواہشات اور

میلانات کی وجہ سے مبتلا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اسلام عقل کے لئے اصول و ضوابط وضع کرتا ہے جن کی وجہ سے وہ سائنس اور تجربات اور علم و معرفت کے میدان میں محفوظ طریقے سے کام کرتی ہے۔ ان قواعد کے نتیجے میں عقل کی سرگرمیاں عملی زندگی میں بھی خوب پھیلتی ہیں۔ یہ سب امور اسلامی شریعت کے مطابق طے پاتے ہیں اور عملی زندگی میں عقل پر کوئی پابندی بھی نہیں ہوتی تاکہ وہ برے راستوں پر پڑ کر سیدھے راستے سے منحرف نہ ہو جائے۔

جب عقل کو وحی الہی کی راہنمائی حاصل ہوتی ہے تو وہ صاحب بصارت ہو جاتی ہے۔ اگر وہ وحی الہی کی راہنمائی سے آزاد ہو کر چلے تو وہ اندھی ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ ذکر کہ حضور صرف وحی سے ہدایت اخذ کرتے ہیں اور اس کے بعد یہ کہنا کہ اندھے اور آنکھوں والے برابر نہیں ہوتے اور سوالیہ انداز میں یہ کہنا اور اس کے بعد بات پر زور دینا کہ غور و فکر سے کام لو' معنی خیز ہے۔

(اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰی اِلَیَّ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ اَفَلَا تَتَفَکَّرُوْنَ

( ٦ : ٥٠ ) ) (میں تو صرف وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل ہوتی ہے' پھر ان سے پوچھو کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟) یہاں آگے پیچھے ایسے اشارات کا ذکر اور یہ انداز' قرآن کریم کا مخصوص انداز تعبیر ہے۔ اسلام میں غور و فکر مطلوب ہے اور قرآن کریم اس پر بار بار زور دیتا ہے لیکن اسلامی غور و فکر کو وحی کے ضوابط کے اندر منضبط کر دیا گیا ہے۔ وحی عقل کے لئے بطور بصارت کام کرتی ہے۔ اگر وحی نہ ہو تو عقل چوبیں یا اندھی بھی ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ اندھیروں میں لڑکھڑاتی پھرتی ہے۔ بغیر دلیل و بغیر ہدایت کے اور بغیر کسی کتاب منیر کے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر عقل کو ضابطہ ہی کے اندر منضبط کر دیا جائے تو کیا اس کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے؟ نہیں وحی اسے ایک وسیع جولانگاہ فراہم کرتی ہے۔ عقل کے میدان کار میں یہ پوری کائنات بھی آتی ہے اور اس سے آگے عالم غیب بھی اس کی فکری جولانگاہ میں آ جاتا ہے جبکہ عالم غیب کا میدان عالم شہادت سے بہت وسیع ہے۔ نفس انسانی کی گہرائی 'انسانی زندگی اور زندگی کے واقعات یہ سب انسانی غور و فکر کا موضوع ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ وحی الہی کسی موڑ پر بھی عقل انسانی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ اگر کسی جگہ وہ رکاوٹ بنتی ہے تو اس مقام پر جب عقل بے راہ روی اختیار کرتی ہے۔ غلط منہاج سے سوچتی ہے اور خواہشات اور اغراض کے پیچھے بھاگتی ہے۔ ورنہ وحی الہی تو عقل سے کام لینے کی ہدایت کرتی ہے اور اس کی سرگرمیوں کے لئے میدان کا تعین کرتی ہے' اس لئے کہ عقل وہ عظیم قوت ہے جو خود اللہ نے انسان کو عطا کی ہے۔ لیکن یہ قوت انسان کو اس لئے دی گئی ہے کہ انسان اس کے ذریعے ربانی ہدایت اور ربانی نظام کی حفاظت کرے نہ اس لئے کہ اس کے ذریعے وہ تخریب کاری کر کے گمراہ اور سرکش بن جائے۔

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْٓا اِلٰی رَبِّهِمْ لَیْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ
حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ
فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا
اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝ وَ اِذَا
جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى
نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ
مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

"اور اے نبی ؐ، تم اس (علم وحی) کے ذریعے سے ان لوگوں کو نصیحت کرو جو اس کا خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے سامنے کبھی اس حال میں پیش کیے جائیں گے کہ اس کے سوا وہاں کوئی (ایسا ذی اقتدار) نہ ہو گا جو ان کا حامی و مددگار ہو، یا ان کی سفارش کرے، شاید کہ (اس نصیحت سے متنبہ ہو کر) وہ خدا ترسی کی روش اختیار کر لیں اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں انہیں اپنے سے دور نہ پھینکو۔ ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں ہے اور تمہارے حساب میں سے کسی چیز کا بار ان پر نہیں۔ اس پر بھی اگر تم انہیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گے۔ دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے آزمائش میں ڈالا ہے۔ تاکہ وہ انہیں دیکھ کر کہیں "کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے؟" .............
ہاں! کیا خدا اپنے شکر گزار بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا ہے؟ جب تمہارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان کو کہو "تم پر سلامتی ہے۔ تمہارے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ (یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ) اگر تم میں سے کوئی نادانی کے ساتھ کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھا ہو پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کر لے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے۔"

یہ اسلامی نظریہ حیات کی برتری اور عزت کی علامت ہے کہ اس میں اس دنیا کے عارضی کروفر کو کوئی وقعت نہیں دی گئی۔ اس میں پیش نظر اعلیٰ اقدار ہوتی ہیں اور دنیا کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ اس دعوت کو صاف اور ستھرے انداز میں بغیر کسی بناوٹ کے اصل شکل میں پیش فرما دیں اور اس دعوت کے عوض میں لوگوں کو کسی دنیاوی غرض کا لالچ نہ دیں۔ یہ حکم بھی دیا گیا کہ آپ صرف ان لوگوں ہی کو پیش نظر رکھیں جو اس دعوت سے کوئی دنیاوی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے ہیں نہ آپ اس سے نفع لینا چاہتے ہیں۔ اور اپنے ارد گرد ان لوگوں کو جمع کریں جو اس دعوت کو قبول کرتے ہیں اور مخلص ہیں۔ جو لوگ دل

و جان سے اللہ کی طرف متوجہ ہیں اور صرف رضائے الٰہی کے لئے کام کرنے والے ہیں۔ آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ جاہلی معاشرے کے رسوم و رواجات اور جاہلی اقدار کو دعوت اسلامی کے نظام میں کوئی وزن نہ دیں اور دنیاوی اعتبارات اور علامات میں سے کسی علامت کو اہمیت دیں۔

(وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (٦ : ٥١)) "اور اے نبی ؐ، تم اس (علم وحی) کے ذریعے سے ان لوگوں کو نصیحت کرو جو اس کا خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے سامنے کبھی اس حال میں پیش کیے جائیں گے کہ اس کے سوا وہاں کوئی (ایسا ذی اقتدار) نہ ہو گا جو ان کا حامی و مددگار ہو' یا ان کی سفارش کرے' شاید کہ (اس نصیحت سے متنبہ ہو کر) وہ خدا ترسی کی روش اختیار کر لیں۔" یعنی دعوت اسلامی ان لوگوں کے سامنے سب سے پہلے پیش کی جائے جو لوگ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن انہیں اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ وہاں ان کی حالت یہ ہو گی کہ نہ کوئی ولی ہو گا جو مدد کر سکے اور نہ کوئی سفارشی ہو گا جو چھڑا سکے۔ اس لئے کہ قیامت کے دن اللہ کے ہاں' اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی بھی سفارش نہیں کر سکتا۔ اگر کسی کو سفارش کی اجازت بھی مل جائے تو بھی وہ ان لوگوں کے حق میں اللہ کی جناب میں سفارش نہ کرے گا۔ کیونکہ سفارش کے منصب پر فائز ہونے والے لوگ تو خود اس دن خوف کا شدید شعور رکھتے ہوں گے کیونکہ اس دن کوئی اللہ کے سوا شفیع و مددگار نہ ہو گا۔ اس لئے کہ ان خدا رسیدہ اور خدا سے ڈرنے والے لوگوں سے اس بات کی توقع زیادہ ہو گی' وہ زیادہ خوف محسوس کریں گے اور زیادہ مطیع فرمان ہوں گے اور ہدایت الٰہی سے اور لوگوں کے مقابلے میں زیادہ نفع اندوز ہوں گے۔ ایسے لوگوں سے زیادہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی اس دنیاوی زندگی میں ایسے امور سے بچیں جن کی وجہ آخرت میں عذاب الٰہی میں مبتلا ہوں۔ لہٰذا ڈراوا ایک ایسا بیان ہوتا ہے جو واضح ہوتا ہے اور اس کا بہت اثر ہوتا ہے۔ یوں انذار کی وجہ سے ان پر وہ امور واضح ہو جائیں گے جن سے وہ پہلے ہی خائف ہیں' لہٰذا ان امور کے بیان اور انذار کی وجہ سے وہ مزید متقی بنیں گے اور حدود اللہ پامال کرنے سے ڈریں گے اور ان امور میں مبتلا نہ ہوں گے جن سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اس کے بعد ہو گا جبکہ ان کے سامنے ممنوع باتوں کا بیان ہو جائے۔

(وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (٦ : ٥٢))

"اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں' انہیں اپنے سے دور نہ پھینکو۔" جن لوگوں نے اپنے آپ کو اللہ کے لئے خالص کر دیا ہے انہیں اپنے آپ سے دور نہ پھینکو۔ ایسے لوگ جو صبح و شام اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اسے پکارتے ہیں اور یہ کام وہ محض رضائے الٰہی کے لئے کرتے ہیں۔ یہ خلوص اور محبت کا مقام ہے اور ادب اور احترام کی فضا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نہایت خضوع اور خشوع کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور عبادت میں مشغول ہیں۔ رضائے الٰہی کا حصول صرف اس وقت ہوتا ہے جب انسان نہایت ہی خلوص کے ساتھ رب کی طرف متوجہ ہو' پوری طرح اللہ کے ساتھ محبت کرتا ہو اور دربار الٰہی میں نہایت ادب اور خشوع کے ساتھ کھڑا ہوتا ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے ربانی کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے یعنی للہ فی اللہ والے۔

سوال یہ ہے کہ حضور ؐ کو یہ حکم کیوں دیا گیا؟ اصل بات کیا ہے ۔ واقعہ یوں ہوا کہ اشراف عرب میں سے بعض لوگ دعوت اسلامی کو اس لئے قبول نہ کرتے تھے کہ حضور اکرم ؐ کے ارد گرد فقراء اور کمزور لوگ جمع تھے مثلاً صہیب ' بلال ' عمار ' خباب ' سلمان اور ابن مسعود وغیرہ اور ان لوگوں نے ایسے جبے پہنے ہوئے ہوتے تھے جن سے بدبو آتی تھی ' کیونکہ غربت کی وجہ سے وہ بار بار دھو نہیں سکتے تھے ۔ ان لوگوں کی معاشرتی حیثیت یہ تھی کہ وہ قریش کے بڑے لوگوں کی مجلس میں بیٹھنے کے اہل نہ سمجھے جاتے تھے ۔ ان وجوہات کی بنا پر قریش کے ان اکابرین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ ان لوگوں کو اپنی مجلس سے دور کر دیں ۔ حضور اکرم ؐ نے اس بات کا انکار کر دیا ۔ اس پر ان لوگوں نے یہ مطالبہ کیا کہ حضور ؐ ان کے لئے علیحدہ مجلس بنا دیں اور صاحب حیثیت لوگوں کے لئے ایک مجلس بنا دیں جس میں ان فقراء میں سے کوئی بھی نہ ہو ۔ یہ مطالبہ وہ اس لئے کرتے تھے کہ جاہلیت میں دور جاہلیت کی مجالس میں اکابرین قریش کو یہ امتیازات حاصل تھے جن کی وجہ سے وہ عوام پر اپنا رعب بٹھاتے تھے ۔ اس دوسری تجویز کے بارے میں حضور ؐ نے غور کرنا شروع کر دیا محض اس لئے کہ شاید اس طرح ان کے دل میں دعوت اسلامی اتر جائے ۔ اس پر حکم صادر ہوا ۔

(وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (۶:۵۲)

"اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں ' انہیں اپنے سے دور نہ پھینکو ۔" امام مسلم نے سعد ابن ابی وقاص سے روایت نقل کی ہے ' وہ فرماتے ہیں ہم چھ افراد حضور ؐ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ۔ مشرکین نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائش کی ' ذرا آپ ان لوگوں کو اپنے ہاں سے ہٹا دیں تاکہ یہ لوگ بے تکلف ہو کر ہمارے خلاف حوصلے نہ پالیں ۔ وہ کہتے ہیں ان چھ میں ' ایک میں تھا ' ابن مسعود تھے ' ایک شخص ہذیل کا تھا ' بلال تھے اور دو افراد اور تھے جن کے نام یاد نہیں ۔ قریش کی بات کا اثر رسول ؐ اللہ کے دل پر ہوا جو اللہ نے چاہا ۔ آپ نے ان کی فرمائش پر سوچنا شروع کیا ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔

(وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (۶:۵۲)

"اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں ' انہیں اپنے سے دور نہ پھینکو ۔" یہ کبراء ان بیچاروں کے بارے میں بہت کچھ کہتے تھے ۔ ادھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ان پر بے حد عنایات تھیں اور آپ کی مجلس میں ان کا خصوصی مقام تھا ۔ کبراء ان پر الزام لگاتے اور انہیں برا بھلا کہتے اور ان کی غربت اور ضعف پر تنقید کرتے ۔ ان لوگوں کو ان کا حضور ؐ کی مجلس میں بیٹھنا گوارا نہ تھا اس لئے یہ کبراء اسلام سے نفرت کرتے تھے اور اسلام قبول کرنا نہ چاہتے تھے ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس امر کے بارے میں ایک فیصلہ کن حکم دے دیا ۔ ان کی اس تجویز کو بنیادی طور پر رد کر دیا گیا اور اسے کالعدم قرار دے دیا گیا ۔

(مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۶:۵۲) "ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں ہے اور تمہارے حساب

میں سے کسی چیز کا بار ان پر نہیں ۔ اس پر بھی اگر تم انہیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گے ۔" وہ خود اپنا بوجھ اٹھائیں گے اور حساب دیں گے اور تم اپنا بوجھ اٹھاؤ گے اور حساب دو گے ۔ یہ کہ وہ غریب ہیں تو ان کی قسمت میں یہ اللہ نے لکھا ہے ۔ اس میں تمہارا کوئی دخل نہیں ہے ۔ اسی طرح اے پیغمبر خود تمہاری امارت یا فقر کے بارے میں ان سے بھی نہ پوچھا جائے گا ۔ ایمان اور کفر کے معاملے میں امارت اور غربت کا کوئی اعتبار نہیں ہے ۔ اگر آپ کسی کو اپنی مجلس میں جگہ دیں یا نکال دیں 'ان کی امارت اور غربت کا لحاظ رکھتے ہوئے تو یہ فعل اللہ کے ترازو میں کوئی وزن اور قیمت نہ رکھے گا ۔ اس طرح آپ ظالموں میں سے ہوں گے اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی رسول ظالموں میں سے ہو جائے ۔

وہ لوگ جو دل کے تونگر تھے اور جیب کے لحاظ سے غریب تھے ۔ وہ مجلس رسول کے مستقل ممبر رہے ۔ جو لوگ دنیاوی لحاظ سے کمزور تھے مگر ایمانی اور نظریاتی اعتبار سے طاقتور تھے وہ اسی مقام پر برقرار رہے جو ان کے ایمان نے ان کے لئے مقرر کر دیا تھا ۔ اس مقام کے وہ اس لئے مستحق ہو گئے تھے کہ وہ صرف اللہ کو پکارتے تھے اور صرف اللہ کی رضامندی کے طالب تھے ۔ یوں اسلامی اقدار نے اس طرح روایات کی شکل اختیار کی جس طرح اللہ تعالیٰ پسند فرماتے تھے ۔

اہل کبر و غرور تحریک اسلامی سے متنفر ہو گئے ۔ ان کا تاثر یہ تھا کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے ایسے لوگ اللہ کے فضل و کرم کے مالک بن جائیں ۔ یہ ٹٹ پونجیے! اگر محمد کی برپا کی ہوئی تحریک اور آپ جو پیغام لے کر آئے ہیں اس میں کوئی بھلائی ہوتی تو اس کے قبول کرنے میں یہ لوگ ہم سے آگے نہ ہوتے ۔ اللہ ہمیں ان سے پہلے اس کی جانب راہنمائی فرماتا ۔ یہ کوئی معقول بات نظر نہیں آتی کہ اہل عرب میں سے اللہ تعالیٰ ان ضعفاء اور ناداروں کو اپنے فضل و کرم کے لئے منتخب فرمائیں جبکہ ہم صاحب جاہ و مرتبہ ہیں ۔

نسب اور مال پر غرور کرنے والے ان لوگوں کو اللہ نے دراصل فتنے میں ڈال دیا تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے دین اسلام کو سمجھا ہی نہ تھا ۔ نیز یہ دین انسانیت کو جس نئی دنیا میں لے جانا چاہتا تھا اسے بھی یہ لوگ نہ سمجھ سکے تھے جس کے آفاق نہایت ہی وسیع تھے ۔ یہ دین انسانوں کو اس جدید دنیا میں نہایت ہی بلندیوں تک لے جانا چاہتا تھا ۔ اس جدید اسلامی دنیا کا علم اس وقت نہ عربوں کو تھا اور نہ دوسرے لوگوں کو تھا ۔ آج جو لوگ جمہوریت اور دوسرے ناموں سے ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں وہ بھی اسلامی نظام کی دنیا سے بے خبر ہیں ۔

(وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا (٦ : ٥٣))
"دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالا ہے تاکہ وہ انہیں دیکھ کر کہیں "کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن کریم یوں دیتا ہے یعنی طبقہ کبراء کے استفہام انکاری کو یوں رد کیا جاتا ہے ۔

(اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ (٦ : ٥٣)) ہاں! کیا خدا اپنے شکر گزار بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا ہے ۔ اس تردید میں بہت کچھ ہدایات اور اشارات دیئے گئے ۔ پہلی ہدایت یہ دی گئی کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم ان لوگوں پر کرتا ہے جن کے بارے میں اللہ کے علم میں یہ بات ہوتی ہے کہ وہ شکر نعمت بجا لائیں گے ۔ اگرچہ کوئی بندہ اللہ کے انعام کا حق ادا نہیں کر سکتا لیکن بندہ شکر نعمت کے میدان میں جو حقیری کوشش بھی کرے اللہ اسے قبول کرتا ہے اور

اس حقیر سے شکر پر اسے وہ انعام دیتا ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا کہ نعمت ایمان کا تعلق ان حقیر اقدار سے نہیں ہے جو اس دنیا پر چھائے ہوئے جاہلی نظاموں میں اہمیت رکھتی ہیں۔ ایمان کی دولت اللہ ان لوگوں کو نصیب کرتا ہے جن کے بارے میں اللہ کو علم ہے کہ وہ شکر بجا لائیں گے 'اگرچہ وہ غلام 'ضعیف اور نادار ہوں کیونکہ اللہ کے ترازو میں دنیا کی دولت اور مال کا کوئی وزن نہیں ہے۔ انہیں صرف جاہلیت ہی اہمیت دیتی ہے حالانکہ اللہ کے نزدیک ان میں کوئی وزن نہیں ہوتا ہے۔

اس جواب میں یہ فیصلہ بھی کر دیا جاتا ہے کہ دراصل یہ اعتراض وہ لوگ کرتے ہیں جو چیزوں کی حقیقت سے واقف نہیں ہوتے۔ اللہ دولت ایمان کو جب تقسیم فرماتے ہیں تو وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کا مستحق کون ہے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی اعتراض کرے گا تو ایک تو وہ جاہل ہو گا اور اس کے ساتھ ساتھ نہایت گستاخ بھی ہو گا۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی جاتی ہے کہ آپ آغاز دعوت ان لوگوں سے کریں جن پر اللہ نے فضل فرمایا' سب سے پہلے انہیں نعمت ایمان سے نوازا' ان کو سابقون الاولون کی فضیلت دی گئی اور جن سے یہ کبراء اور اشراف نفرت کرتے ہیں۔ حکم دیا جاتا ہے کہ آپ سب سے پہلے انہیں سلام کریں اور اس کے بعد انہیں خوشخبری دیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر ان کے لئے رحمت فرض کر لی ہے اور اگر ان میں سے کسی سے دور جاہلیت میں کوئی غلطی صادر ہوئی ہے تو وہ معاف ہے بشرطیکہ وہ توبہ کرے اور اصلاح کر لے۔

(وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۶ : ۵۴)) "جب تمہارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے کہو "تم پر سلامتی ہے۔ تمہارے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ (یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ) اگر تم میں سے کوئی نادانی کے ساتھ کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھا ہو پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کر لے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے۔" نعمت ایمان کے بعد یہ ان کے لئے ایک بڑا اعزاز ہے۔ اس سے حساب و کتاب میں بہت ہی نرمی ہوگی اور جزاء میں نہایت ہی فیاضی اور فراوانی ہوگی۔ اس قدر عظیم رحمت اور یقینی رحمت کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر اس فعل کو فرض کر لیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ؐ بعد سلام ایسے مومنین آیات الہی کو خوشخبری بھی دے دیں کہ ان کے ساتھ عفو و درگزر کا سلوک ہو گا بشرطیکہ وہ توبہ اختیار کریں اور صالحانہ روش اپنائیں۔ اسی لئے بعض مفسرین نے جہالت کی تعریف یہ کی ہے کہ کوئی ارتکاب ذنوب پر جما ہوا ہو ورنہ جو شخص بھی ارتکاب جرم کرتا ہے وہ جہالت ہی کی وجہ سے کرتا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق اس نص میں ہر وہ گناہ شامل ہو گا جو کسی سے صادر ہو اور جب وہ توبہ کرے اور نیک ہو جائے تو گناہ معاف ہو جائے گا۔ اس رائے کی تائید ان آیات و نصوص سے بھی ہوتی ہے جن میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ توبہ اور اس کے بعد اصلاح حال سے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ وہ رحمت الہی ہے جسے اللہ نے اپنے اوپر فرض کر لیا ہے۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ بعض اہم احادیث کا یہاں تذکرہ کر دیا جائے' جو ان واقعات و حالات کے بارے میں ہیں جن میں یہ آیات نازل ہوئیں ۔ ان آثار و احادیث اور اس آیت کو اگر ملا کر پڑھا جائے تو معلوم ہو گا کہ دین اسلام اس وقت انسانیت کے اندر کس قدر عظیم انقلاب لا رہا تھا۔ اس وقت معاشرتی اعتبار سے اسلام نے انسانیت کو جس مقام بلند تک پہنچا دیا تھا' انسانیت آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکی ہے۔

طبری نے ضاد' ابو زید' اشعث' کردوس اور حضرت ابن مسعود کے سلسلہ روایت سے نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ قریش کے کچھ کبراء حضور کے پاس سے گزرے' اس وقت آپ ؐ کے پاس صہیب' عمار' بلال' خباب اور ان جیسے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ ہم تمام مسلمانوں میں زیر دست لوگ تھے۔ ان کبراء نے کہا: "اے محمد ؐ کیا تم نے اپنی قوم سے ان لوگوں کو منتخب کیا ہے؟ کیا ہم میں سے اللہ نے صرف ان لوگوں پر احسان کیا ہے؟ کیا ہم ان لوگوں کے زیر اطاعت آجائیں؟ آپ ان لوگوں کو اپنے پاس سے بھگا دیں' اگر آپ نے ایسا کیا تو ممکن ہے کہ ہم تمہارے مطیع ہو جائیں' اس واقعہ پر یہ آیات نازل ہوئیں

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۵۲) وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ --- (۵۳) (۶: ۵۲-۵۳) تک۔

طبری نے حسین ابن عمرو ابن محمد عنقزی' انہوں نے اپنے والد' انہوں نے بعض دوسرے لوگوں اور انہوں نے سدی اور ابو سعید ازدی سے نقل کیا ہے۔ یہ ازد قبیلہ کے قاری تھے۔ انہوں نے خباب سے اس آیت

(وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ

(۶: ۵۲)) کے بارے میں کہا کہ اقرع ابن حابس تمیمی اور عیینہ ابن حصن فزاری آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بلال' صہیب' عمار' خباب اور دوسرے ضعیف اور کمزور اہل ایمان کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے جب ان ضعفاء کو دیکھا تو انہیں حقیر سمجھا۔ یہ دونوں حضور ؐ کے پاس آئے اور انہوں نے کہا' ہم چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے ہمراہ ایک جگہ بیٹھیں جس کی وجہ سے عربوں کے اندر ہماری عزت ہو' کیونکہ آپ کے پاس عربوں کے وفود آتے جاتے ہیں لیکن ہم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ہمیں عرب آپ کے پاس ان دوسرے درجے کے لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے پائیں۔ جب ہم آپ لوگوں کے پاس آئیں تو آپ ذرا ان لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دیا کریں۔ جب ہم چلے جائیں تو پھر آپ آزاد ہیں ان کے پاس بیٹھیں یا نہ بیٹھیں۔ آپ نے فرمایا" درست" اس پر ان لوگوں نے یہ مطالبہ کیا کہ اس سلسلے میں آپ ایک پروٹوکول پر دستخط فرما دیں۔ راوی کہتا ہے آپ نے کاغذ منگوایا اور حضرت علی ؓ کو بلایا کہ انہیں یہ

بات لکھ دیں۔ راوی کہتا ہے ہم ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے کہ جبرئیل علیہ السلام آئے اور یہ آیت نازل ہوئی۔

(وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ (٦ : ٥٢)) "اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں انہیں اپنے سے دور نہ پھینکو"۔ ان کے حساب میں کسی چیز کا بار تم پر نہیں ہے۔ اور تمہارے حساب میں سے کسی چیز کا بار ان پر نہیں۔ اس پر بھی اگر انہیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہوگے) اس کے بعد آپ ؐ نے پڑھا۔

(وَكَذَٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوا أَهَٰؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ (٦ : ٥٣)) (دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈال دیا ہے تاکہ وہ انہیں دیکھ کر کہیں : کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے؟ ہاں کیا اللہ اپنے شکرگزار بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا) اور اس کے بعد پڑھا

(وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (٦ : ٥٤)) تک

(جب تمہارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے کہو : تم پر سلامتی ہے۔ تمہارے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر دیا ہے) اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے کاغذ پھینک دیا۔ اور ہمیں بلایا اور آپ یہ آیت پڑھ رہے تھے۔ (سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (٦ : ٥٤))

اس کے بعد ہم آپ کے پاس بیٹھا کرتے اور جب آپ جانا چاہتے تو خود اٹھ کر چلے جاتے اور ہم اپنی جگہ پر ہوتے۔ اس کے بعد سورۂ کہف کی یہ آیت نازل ہوئی۔

(وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (١٨ : ٢٨)) "اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو"۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ بیٹھے رہتے اور جب وقت ہو جاتا تو ہم خود اٹھ جاتے اور آپ ؐ کو اکیلا چھوڑتے کہ آپ ؐ اٹھ کر چلے جائیں۔

(ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس حدیث پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ "یہ حدیث غریب ہے۔ یہ آیت مکی ہے' اور اقرع ابن حابس اور عیینہ ہجرت کے بہت بعد میں مسلمان ہوئے ہیں۔" لیکن اس تنقید کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ان کی اس روایت کا تعلق ان کے

اسلام کے پہلے کے واقعہ سے ہے۔ انہوں نے یہ تو نہیں کہا کہ اس واقعے کے وقت وہ مسلمان ہو چکے تھے۔ لہذا ان کے اسلام اور اس روایت کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ جب حضور ؐ نے ان کی بات تسلیم نہ کی تو انہوں نے اس وقت اسلام سے اعراض کر دیا۔ (سید قطب ))

اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو دیکھتے ان کو سلام کرنے میں پہل فرماتے اور فرماتے "خدا کا شکر ہے کہ میری امت میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جن کے بارے میں اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں انہیں پہلے سلام کروں۔"

صحیح مسلم میں عائذ ابن عمر کی روایت ہے کہ ابو سفیان آیا اور مجلس میں سلمان 'صہیب' بلال اور دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ ان لوگوں نے کہا: "خدا کی قسم اللہ کی تلواروں نے خدا کے دشمنوں میں سے جس مقام تک پہنچنا چاہئے تھا نہ پہنچ سکیں۔" اس پر حضرت ابوبکر نے فرمایا: تم لوگ یہ ریمارکس شیخ قریش اور ان کے سردار کے بارے میں پاس کر رہے ہو؟ ابوبکر ؓ حضور ؐ کے پاس آئے اور انہوں نے اس واقعہ کی اطلاع آپ ؐ کو دی تو حضور ؐ نے فرمایا: "تم نے ان کو ناراض تو نہیں کر دیا؟ اگر تم نے ان لوگوں کو ناراض کر دیا ہے تو' تو نے رب کو ناراض کر دیا ہے۔" ابوبکر ؓ فوراً ان کے پاس آئے اور ان سے پوچھا "بھائیو! کیا تم میری بات سے ناراض تو نہیں ہو گئے ہو؟ تو انہوں نے کہا: "نہیں تو' بھائی تمہیں اللہ معاف کر دے۔

---ooo---

ذرا ٹھہرو' یہ غور کا مقام ہے اور اس پر ذرا طویل وقفہ کرو۔ ان آیات پر غور کرو' بلکہ تمام انسانیت کا یہ حق ہے کہ وہ اس مقام پر رکے اور دیر تک غور کرے۔ ان آیات میں انسان کے خالی خولی حقوق اور چمکدار اصولوں اور اقدار ہی کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ ان آیات میں جو بات کہی گئی ہے وہ انسانی حقوق سے بھی بہت بلند اور اہم ہے۔ یہاں ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو عملاً لوگوں کی زندگیوں میں موجود ہے اور یہ وہ عظیم انقلاب ہے جو اسلامی نظام حیات نے پوری انسانیت کی زندگی میں عملاً برپا کیا۔ ذرا آسمان انسانیت کے افق پر نگاہ ڈالو' وہ ہے بلند اور باریک لکیر جس تک کبھی یہ انسانیت پہنچی تھی اور کاغذوں پر نہیں عملاً وہاں تک پہنچی تھی آج ذرا غور کرو کہ وہی انسانیت اس ریکارڈ مقام سے کس قدر نیچے گر گئی ہے اس لئے کہ انسانیت دین اسلام کی قیادت سے محروم ہو گئی ہے۔ انسانیت جس قدر بھی گر جائے اس ریکارڈ کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ اس انقلاب کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے کیونکہ تاریخ کے ایک دور میں انسانیت اس مقام تک پہنچی ہے۔ یہ ریکارڈ عملاً قائم ہوا ہے اور انسان نے یہ خط ایک دن اپنے عمل سے افق انسانیت پر رقم کیا ہے۔ انسانیت کو چاہئے کہ اس مقام بلند تک دوبارہ پہنچنے کی سعی کرے اس لئے کہ اسلامی انقلاب نے اس چوٹی کو ایک بار سر کیا ہے۔ دوبارہ اس مقام تک پہنچا جا سکتا ہے۔ وہ دیکھو افق انسانیت پر مسلمانوں کے نقوش پا موجود ہیں۔ اب بھی انسان وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ اب بھی دین اسلام موجود ہے۔ صرف عزم' یقین اور اعتماد کی ضرورت ہے۔

ان آیات کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں انسانیت کے اس عظیم سفر کے نقوش پا کو دائماً مرتسم کر دیا گیا ہے۔ ان آیات میں اس تاریخی عمل کو ریکارڈ کر دیا گیا جس کے ذریعے اسلام نے عربوں کو جاہلیت کی گراوٹوں اور گندگیوں سے اٹھا کر اس مقام بلند تک پہنچا دیا تھا اور پھر ان کے ہاتھ میں پوری انسانیت کی قیادت دے دی تھی۔ انہوں نے اطراف عالم میں پوری

انسانیت کو ہاتھ سے پکڑا اور افق انسانیت میں اس ریکارڈ لکیر تک اٹھا دیا جسے کوئی اور نظام آج تک عبور نہیں کر سکا۔

انسانیت عموماً اور عرب خصوصاً جس قعر مذلت میں گرے ہوئے تھے ' ان آیات میں اس کا تصور سردار قریش کے ان الفاظ کے اندر بالکل واضح ہے۔ کہتے ہیں :"محمد ' تم نے اپنی قوم میں سے صرف ان لوگوں کو چن لیا ہے؟ کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ نے ' ہم سب کو چھوڑ کر ' احسان کیا ہے؟ اور کیا اب ہم ان لوگوں کے مطیع فرمان ہو جائیں؟ ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو اپنی مجلس سے بھگا دیں۔ اگر آپ نے انہیں اپنی مجلس سے رخصت کر دیا تو امید ہے کہ ہم آپ کی اطاعت کر لیں گے۔"...... اقرع ابن حابس اور عیینہ ابن حصن فزاری نے جو الفاظ کہے ان میں بھی صاف نظر آتا ہے کہ اس وقت دنیا کس قعر مذلت میں گری ہوئی تھی۔ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سابقین اولین کے بارے میں اس حقارت آمیز انداز میں کلام کرتے ہیں کہ بلال ' صہیب ' عمار اور خباب جیسے لوگ دوسرے درجے کے لوگ ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ملاقات کرنا چاہتے ہیں لیکن ہمیں یہ پسند نہیں ہے کہ اہل عرب ہمیں ان جیسے ضعفاء اور غلاموں کے ساتھ ایک ہی مجلس میں بیٹھے ہوئے دیکھیں کیونکہ حضور ؐ کے پاس تو ہر وقت عالم عرب سے وفود آتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کا موقف یہ تھا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ ان کا بیٹھنا ان کے لئے باعث ننگ ہے۔

اس جگہ جاہلیت کا سیاہ چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے اور اس کی حقیر رسمیں اور کمزور اقدار کھل کر سامنے آ جاتی ہیں۔ قوم ' نسب اور مال و دولت کی بنیاد پر قائم ہونے والی عصبیت واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ ان فقراء میں سے بعض لوگ سرے سے عرب ہی نہ تھے۔ بعض دوسرے ایسے تھے کہ ان کا تعلق وقت کے نام نہاد شرفاء میں سے نہ تھا اور بعض ایسے تھے جو مالدار نہ تھے۔ یہی وہ اقدار ہیں جن کو دنیا کی ہر جاہلیت نشوونما دیتی ہے۔ دور جدید کی جاہلیتیں بھی آج تک اس قسم کے تصور قومیت ' تصور نسل اور مالی لحاظ سے اٹھنے والے طبقاتی تصور سے بلند نہیں ہو سکیں۔

یہ ہیں جاہلیت کی گراوٹیں اور پستیاں اور یہ ہے اسلام کی سربلندی اور علوشان۔ اسلام کی نظر میں ان قومی ' نسلی اور طبقاتی نعروں کا کوئی وزن نہیں ہے اور نہ ان پست اور سطحی تصورات کا کوئی اعتبار ہے۔ اسلام وہ نظام ہے جو آسمان سے نازل ہوا ' یہ کوئی ایسا نظام نہیں ہے جو زمین سے اگا ہو۔ اس لئے کہ زمین کے اندر تو پستیاں موجود ہیں اور یہ پستیاں ایسی شور زدہ ہیں کہ ان کے اندر ایسے خیالات کے پودے اگ ہی نہیں سکتے کیونکہ اسلامی پودا نہایت ہی پاکیزہ درخت ہوتا ہے۔ اسلام کی اطاعت سب سے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے ہیں جو اللہ کے نبی اور رسول ہیں اور جن پر آسمانوں سے وحی آتی ہے۔ وہ قریش کی ایک سرکردہ شاخ بنی ہاشم کے فرد ہیں۔ پھر اسلام کی اطاعت حضرت ابوبکر کرتے ہیں ' جو حضور اکرم ؐ کے ساتھی ہیں۔ یہ حضرات سب سے پہلے ان غلاموں کے بارے میں ' ان زیردستوں کے بارے میں اسلامی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ یہ غلام اور زیردست وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کے سوا تمام غلامیوں کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا ہے۔ صرف اللہ کے غلام بن گئے ہیں اور صرف اللہ کے غلام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں مذکورہ بالا انقلابی ہدایات آئیں۔

جس طرح قریش کے ان سرداروں کی باتوں میں جاہلیت کی پستیاں عیاں ہیں اور اقرع اور عیینہ کی ذہنیت میں یہ گراوٹیں نمایاں ہیں اس طرح کلام الٰہی کے اس حصے میں بھی علوشان عیاں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ میں ہدایات دی جاتی ہیں۔ ذرا دوبارہ غور کیجئے۔

(وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِم مِّن شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظّٰلِمِينَ (۵۲) وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوا أَهٰؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَعْلَمَ بِالشّٰكِرِينَ (۵۳) وَإِذَا جَآءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنكُمْ سُوٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنۢ بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۵۴)) (۶: ۵۲ تا ۵۴) ”اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں انہیں اپنے سے دور نہ پھینکو۔ ان کے حساب میں سے کسی کا بار تم پر نہیں ہے اور تمہارے حساب میں سے کسی چیز کا بار ان پر نہیں ہے۔ اس پر بھی اگر تم انہیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گے۔ دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالا ہے تاکہ وہ انہیں دیکھ کر کہیں ”کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے۔“ ہاں! کیا خدا اپنے شکرگزار بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا ہے؟ جب تمہارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے کہو ”تم پر سلامتی ہے۔ تمہارے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے (یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ) اگر تم میں سے کوئی نادانی کے ساتھ کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھا ہو پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے تو وہ معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے“۔ اسلام کی یہ سربلندی اس رویے سے عیاں ہوتی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان غلاموں کے ساتھ اختیار کیا جن کے بارے میں اللہ نے نبی کو حکم دیا کہ آپ ان کو سلام کرنے میں پہل کریں اور جب وہ مجلس میں بیٹھے ہوئے ہوں تو اس وقت تک انتظار کریں جب تک وہ خود اٹھ نہیں جاتے حالانکہ حضور محمد ابن عبداللہ ابن ہاشم تھے، اس کے سوا آپ پیغمبر خدا تھے اور خیر الخلائق تھے اور ان لوگوں کے سرخیل تھے جن کی وجہ سے انسانیت اور زندگی کو شرف نصیب ہوا۔

ان غلاموں کی ذہنیت سے بھی اسلامی نظریہ حیات کی سربلندی عیاں ہے۔ وہ اللہ کے ہاں اپنے مرتبے کا احساس رکھتے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں چلنے والی تلواروں کے کام اور فرائض کے بارے میں بھی احساس رکھتے ہیں کہ یہ اللہ کی تلواریں ہیں۔ ابوسفیان قریش کا شیخ اور سردار ہے اور وہ اسلامی صفوں میں اس لئے پیچھے رہ گیا کہ وہ فتح مکہ کے بعد عام معافی کے نتیجے میں ایمان لایا۔ یہ غلام اس لئے پہلی صفوں میں چلے گئے کہ انہوں نے مشکل دور میں دعوت اسلامی پر لبیک کہا اور شدید ابتلا میں ڈالے گئے۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے انہیں ابوسفیان کے معاملے میں ڈانٹا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سخت متنبہ کیا اور کہا کہ تم نے ان لوگوں کو غصہ تو نہیں دلایا۔ اگر تم نے انہیں ناراض کیا ہے تو گویا تم نے اللہ کو ناراض کر دیا ہے۔ آج کے دور میں ہمارا کوئی تبصرہ یہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ ہم تو صرف سادہ الفاظ میں اس واقعہ کو نقل کر سکتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ فوراً اٹھ کر ان کے پاس واپس جاتے اور پوچھتے ہیں ”بھائیو! تم ناراض تو نہیں ہو گئے

ہو۔" وہ جواب دیتے ہیں "نہیں بھائی' اللہ تمہاری مغفرت کرے۔"

یہ کس قدر حیران کن واقعہ ہے جو انسانی تاریخ میں رونما ہوا؟ یہ کس قدر عظیم انقلاب تھا جو انسانی زندگی میں رونما ہوا؟ جس کے اندر اقدار بدل گئیں' طور طریقے بدل گئے۔ لوگوں کا شعور بدل گیا اور ان کے خیالات بدل گئے اور یہ تمام تغیرات آناً فاناً واقع ہوئے جبکہ علاقے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لوگ بدل نہیں گئے تھے اور اقتصادی نظام جوں کا توں تھا۔ نظریات کے سوا تمام حالات زندگی جوں کے توں تھے۔ بس آسمان سے ایک پیغام آیا' وہ ایک بشر پر آیا' یہ صرف اللہ کی حاکمیت کا پیغام تھا۔ انسانی فطرت تہ بہ تہ آلودگیوں میں ڈوبی ہوئی تھی' لوگ جاہلیت کی پستیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس پیغام لانے والے نے انہیں پکارا' اس پکار کی وجہ سے ان کی قوتوں نے جوش مارا اور اس جوش میں وہ پستیوں سے اٹھ کر بلند ترین چوٹیوں پر چڑھ گئے۔ یہ برتری انہیں صرف اسلام کی برکت سے نصیب ہوئی۔

پھر تاریخ نے دیکھا کہ یہ لوگ ان بلندیوں سے پستیوں میں جا جا کر گرنے لگے۔ اور آخرکار دوبارہ پستیوں تک پہنچ گئے۔ آج نام نہاد تہذیب کے مراکز واشنگٹن' نیویارک' شکاگو اور جوہانسبرگ وغیرہ میں یہ گندی عصبیتیں دوبارہ عروج پر ہیں۔ رنگ اور نسل کی اساس پر آج پھر لوگوں نے عصبیتوں کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ کہیں وطنیت کا فتنہ ہے' کہیں قومیت کا چرچا ہے' کہیں طبقاتی جنگ برپا ہے اور ان جاہلیتوں کی گندگی جاہلیت عربیہ سے کچھ کم بدبودار نہیں ہے۔

لیکن اسلامی نظام حیات آج بھی سرفراز ہے۔ اس کے عروج کا خط آج بھی افق انسانیت پر ریکارڈ ہے۔ آج بھی انسانیت کے لئے یہ نظام رحمت ہے اور امید کی کرن ہے کہ شاید دوبارہ انسانیت اس مقام تک اس کی قیادت میں پہنچ جائے اور اس گندے اور بدبودار تجیز سے نکل آئے۔ اس کی آنکھیں اور نظریں اوپر کو اٹھیں۔ وہ دوبارہ اس ریکارڈ خط تک پہنچنے کی سعی کرے۔ شاید وہ دوبارہ یہ میٹھی آواز سن سکے اور داعی اسلام کی حدی خوانی سے وجد میں آ جائے اور اسلامی نقوش راہ پر چل کر دوبارہ اس بلند ترین ٹارگٹ تک جا پہنچے۔

اس تفسیر میں ہم نے جو انداز اختیار کیا ہے اس کی وجہ سے ان اجمالی اشارات سے آگے ہم نہیں جا سکتے۔ جس قدر وقفہ ہم نے کر لیا اب اس سے زیادہ نہیں رک سکتے تاکہ ہم تمام انسانیت کو دعوت دے سکیں کہ وہ ان آیات پر غور کرے اور دیکھے کہ پوری انسانی تاریخ کے اندر یہ واقعہ کس قدر روشن اور چمکدار ہے۔ اس کے اندر انسانیت نے نہایت ہی پستیوں سے اسلامی نقوش راہ پر چلتے ہوئے بلندی حاصل کی اور وہ بلندیوں میں بہت دور تک جا نکلی۔ کس طرح آج کی مادی اور بے دین تہذیب کی قیادت میں وہ دوبارہ گری اور اب اس کی حالت یہ ہے کہ انسانیت ایک ایسا جسم ہے جس میں کوئی روحانیت نہیں ہے۔ انسان ہیں مگر وہ نظریہ حیات سے محروم ہیں۔ یہ بھی معلوم کر لیں اسلام میں کس قدر صلاحیت ہے کہ وہ دوبارہ قائدانہ مقام حاصل کر سکتا ہے۔ خصوصاً تاریخ کے ایسے موڑ پر جبکہ تمام تجربے' تمام مکاتب فکر' تمام طرز ہائے حیات' تمام نظامہائے زندگی' تمام تصورات حیات اور تمام افکار' جو انسانوں کے خود ساختہ تھے اور جن میں دین اسلام سے ہدایت نہ اخذ کی گئی تھی وہ زندگی کے مسائل حل کرنے میں بری طرح ناکام ہو گئے ہیں۔ یہ تمام افکار انسانی زندگی کو اس سربلندی تک نہ پہنچا سکے جس تک اسلامی نظام نے اسے پہنچایا تھا۔ یہ تمام تصورات انسانیت کو عزت و احترام کا وہ مقام نہ دلا سکے جو اسے اسلام کے زیر سایہ نصیب ہوا۔ انسانوں کو وہ اطمینان نہ دلا سکے جو اسلام نے انہیں عطا کیا۔ خصوصاً وہ انقلاب جو اسلامی نظام نے عربوں میں رونما کیا' بغیر اس کے کہ لاکھوں انسانوں کو ذبح کیا جائے' بغیر اس

کے کہ کروڑوں پر تشدد کیا جائے ' بغیر اس کے کہ لوگوں کو بغیر مقدمہ چلائے کیمپوں میں بند رکھا جائے ' بغیر تشدد ' بغیر بے چینی ' بغیر ایذا رسانی ' بغیر بھوک اور بغیر فقر اور بغیر ان انقلابات کے جن کی زد میں انسانیت آتی رہتی ہے اور جس میں کچھ لوگ دوسروں کو جسمانی یا روحانی طور پر غلام بنالیتے ہیں ۔ اللہ کی غلامی کے سوا اور غلامیاں راسخ ہو جاتی ہیں ۔

میں سمجھتا ہوں یہاں اسی قدر کلام کافی ہے اور یہ آیات بذات خود جو گہرے اثرات نفس انسانی پر چھوڑتی ہیں وہ کسی تشریح کے محتاج نہیں ہیں ۔ (مزید تشریح کے لئے پارہ ۳۰ میں سورہ عبس کی تشریح ملاحظہ فرمائیں)

٦ ٥٥ ع ١٢

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٥٥﴾

"اور اس طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں تاکہ مجرموں کی راہ بالکل نمایاں ہو جائے ۔"

یہ اس لہر کا خاتمہ ہے ۔ اس میں حقیقت رسالت اور مزاج رسول کی بڑی خوبی سے وضاحت کی گئی ہے اور اسلامی نظریہ حیات کو بھی کسی بغیر لاگ و لپیٹ کے بتایا گیا ہے ۔ ان اقدار حیات کو بھی واضح کیا گیا ہے جن کے غلبے کے لئے اسلام اس جہان میں آیا اور ان کو بھی جدا کر دیا گیا جن کی بیخ کنی کے لئے اسلام اٹھا ۔

(وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ (٦ : ٥٥)) (اس طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں) کیوں اس لئے کہ (لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ (٦ : ٥٥)) (تاکہ مجرموں کی راہ بالکل نمایاں ہو جائے) یعنی اس انداز ' اس منہاج اور اس طرز کلام کے ساتھ ہم بیان مدعا کرتے ہیں ۔ بڑی تفصیلات کے ساتھ جن کے بعد سچائی کی پہچان میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی ۔ بات میں کوئی اجمال یا پیچیدگی نہیں رہتی اور اس فصاحت کے بعد سچائی کو تسلیم کرنے کے لئے کسی معجزے کی ضرورت نہیں رہتی ۔ سچائی واضح ہو جاتی ہے ' بات کھل جاتی ہے اور قرآنی انداز کلام کے مطابق ۔ اس پوری سورہ کے اندر بیان ہونے والے شواہد و دلائل کے مطابق حقائق و واقعات کی روشنی میں یہ امور تفصیل آیات کے مفہوم میں شامل ہیں ۔

مقصد مجرموں کی راہوں کو جدا کرنا ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ اسلامی نظریہ حیات اور اس کی اساس پر تحریک برپا کرنے کے لئے قرآن کا منہاج کیا ہے ؟ (لِتَسْتَبِيْنَ) قرآن کا منہاج و انداز یہ نہیں ہے کہ وہ فقط مومنین و صالحین کی راہوں کی نشاندہی کر دے ' بلکہ قرآن کا منہاج تحریک یہ ہے کہ قرآن کریم گمراہوں اور مجرموں کے طور طریقوں کی وضاحت بھی کرتا ہے ۔ مجرموں کی راہوں کی وضاحت بذریعہ تنقید باطل بے حد ضروری ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل حق کے راستے کی وضاحت ہو ۔ یہ دعوت اسلامی کے واضح خطوط ہیں جن پر ہمیں چلنا ہے ۔ حق و باطل کا طریقہ کار یہاں سے جدا ہو جاتا ہے ۔

اسلام کا منہاج عمل اللہ نے متعین کیا ہے اور یہ اس لئے متعین کیا گیا ہے کہ اس منہاج کے مطابق نفوس انسانی کا علاج کیا جائے ۔ اللہ کو اس بات کا خوب علم تھا کہ سچائی و بھلائی پر پختہ یقین اس وقت حاصل ہوتا ہے کہ جب بھلائی کے مقابلے میں شر اور سچائی کے مقابلے میں جھوٹ پر بھی نظر رکھی جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ یہ باطل خالص جھوٹ اور شر محض ہے جس کے مقابلے میں حق خالص سچائی اور خیر محض ہے ۔ نیز حق و صداقت کی حمایت پر انسان اس وقت آمادہ ہوتا ہے جب وہ یہ یقین کر لے کہ اس سچائی کا مقابلہ جو قوت کر رہی ہے وہ باطل ہے ۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ قوت

باطلہ مجرموں کی راہوں کی مسافر ہے اور مجرمین وہ قوت ہیں جن کے بارے میں ایک دوسری جگہ قرآن کریم یہ تصریح کرتا ہے کہ ہر نبی کا کوئی دشمن ہوتا ہے ۔ (وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ) (اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے مجرموں میں سے ایک دشمن پیدا کیا) یہ اس لئے تاکہ نبی اور مومنین کے دلوں میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ جائے کہ ان کا دشمن مجرم ہے اور ان کا یہ عقیدہ پختہ یقین 'اعتماد اور شرح صدر پر مبنی ہو۔

کفر' شر اور مجرمانہ حرکات کی وضاحت 'ایمان' بھلائی اور اصلاح کے لئے نہایت ضروری ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ مجرمین کے راستوں کی وضاحت آیات الٰہیہ کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے 'مجرمین کے موقف اور ان کے طرز عمل کے بارے میں کوئی بھی شعبہ یا معمولی التباس خود مومنین کے موقف' ان کے طرز عمل اور ان کی راہ میں شبہات پیدا کر دیتا ہے 'اس لئے کہ دونوں تصویر کے دو رخ ہیں 'کتاب کے صفحات متقابل ہیں اور دو جدا جدا راستے ہیں ۔ دونوں کے الگ الگ رنگ ہیں جن کے درمیان امتیاز ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تحریک اسلامی کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کے کارکنوں کے فکر و نظر مومنین اور مجرمین کا راستہ ممتاز ہو ۔ ہر تحریک کو چاہئے کہ وہ سب سے پہلے اپنے راستے کو متعارف کرائے اور اس کے بالمقابل مجرمین کے جو راستے ہیں ان پر تنقید کر کے ان کی کمزوریاں واضح کرے اور دونوں کے درمیان جو فرق و امتیاز ہے اسے کھول کر بیان کرے ۔ یہ فرق و امتیاز عالم واقعہ میں بھی ہو 'حقیقی ہو 'محض نظریاتی نہ ہو' اس لئے کہ داعیوں اور ان کے کارکنوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ جس ماحول میں وہ کام کر رہے ہیں ان میں مومنین کون ہیں اور مجرمین کون ہیں؟ نیز ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان مجرمین کا طریق کار کیا ہے' ان کا منہاج کار کیا ہے اور ان کی علامات کیا کیا ہیں ۔ تاکہ ان کے ذہن میں دونوں راستوں اور منہاج کے اندر کوئی شبہ و التباس نہ ہو ۔ نہ عنوان ایک ہو اور نہ صفات اور خدوخال ایک ہوں ۔ مومنین اور مجرمین ان کے تصور میں ایک دوسرے سے اچھی طرح ممتاز ہوں۔

جس وقت جزیرۃ العرب میں سب سے پہلے اسلام اور شرک کی مڈبھیڑ ہوئی' اہل ایمان اور مجرمین کے درمیان یہ فرق و امتیاز بالکل واضح تھا ۔ دونوں کے راستے اچھی طرح ممتاز اور جدا تھے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ مومنین کا راستہ تھا اور یہی آپ کے ساتھیوں کا راستہ تھا اور مجرمین کا راستہ ان لوگوں کا راستہ تھا جو تحریک اسلامی میں آپ کے ساتھ شامل نہ ہوئے تھے اور ایمان نہ لائے تھے ۔ اس حدبندی اور اس وضاحت کے ساتھ قرآن کریم نازل ہو رہا تھا اور آیات الٰہیہ تفصیلات دے رہی تھیں ۔ جس کے نمونے اس سورہ میں آپ نے دیکھے ۔ یہ آخری نمونہ توسبیل المجرمین کی اچھی طرح نشاندہی کر رہا ہے۔

جب اسلام نے شرک 'بت پرستی' الحاد اور ان ادیان کا سامنا کیا جو اپنی اصل کے اعتبار سے ادیان سماوی تھے لیکن ان کے اندر بعد میں آنے والے انسانوں نے اپنی خواہشات کے مطابق تحریفات کر دی تھیں' تو اسلام نے ان ادیان و نظریات کے مقابلے میں مومنین کو ایک واضح موقف اور ایک صاف و سیدھا راستہ دیا ۔ جس طرح ان کافروں اور مشرکوں کی راہ واضح اور متعین تھی' اور ان کے اندر کوئی تلبیس اور شک نہ تھا۔

لیکن آج عالم اسلام میں چلنے والی تحریکات اور ان کے مخالفین کے درمیان راستے کی صفائی اور اس کا تعین نہیں ہے ۔ اور یہی بہت بڑی مشکل ہے ۔ یہ اسلامی تحریکات ایسے لوگوں کے درمیان چل رہی ہیں جو نسلی اعتبار سے مسلمان ہیں

اور ایسے علاقوں میں چل رہی ہیں جو کسی وقت دارالاسلام میں شامل تھے۔ کسی وقت ان علاقوں پر دین اسلام کی حکمرانی تھی اور شریعت ان علاقوں کا بنیادی قانون تھی۔ پھر ان علاقوں نے اور ان اقوام نے حقیقی اعتبار سے اسلام کو چھوڑ دیا' صرف نام کے مسلمان رہ گئے اور انہوں نے اسلام کے بنیادی عناصر کو عملاً اور اعتقاداً ترک کر دیا۔ اگر چہ وہ اس زعم میں مبتلا رہے کہ انہوں نے عقیدے کے اعتبار سے اسلام کو اپنایا ہوا ہے۔ حالانکہ اسلام کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی اس بات کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ اور حاکم نہیں ہے۔ اس شہادت کے اندر یہ مفہوم شامل ہیں کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے' وہ اس کائنات کا خالق اور اس میں متصرف ہے۔ انسان صرف اسی کی عبادت کریں گے اور اسی کے احکام کے مطابق پوری زندگی بسر کریں گے۔ انسانوں کا یہ فرض ہو گا کہ صرف اللہ سے اپنے قوانین اخذ کریں اور اپنی پوری زندگی میں اللہ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔ جو شخص اس مفہوم کے ساتھ اللہ کی وحدانیت کا اقرار نہیں کرتا تو اس نے نہ کلمہ شہادت پڑھا اور نہ وہ اسلام میں داخل ہوا۔ چاہے اس کا نام اور اس کا لقب اور اس کی نسل اور نسب جو بھی ہو۔ جس سرزمین پر بھی کلمہ شہادت اپنے اس مدلول کے ساتھ جاری نہ ہو تو اس سرزمین کو ہم دارالاسلام نہیں کہہ سکتے اور نہ وہ سرزمین ' سرزمین اسلام ہے۔

اس کرۂ ارض پر لوگوں کی بڑی بڑی قومیں آباد ہیں جن کے نام مسلمانوں کے ناموں جیسے ہیں اور یہ لوگ ہیں بھی مسلمانوں کی نسلوں سے۔ ان لوگوں کے علاقے بھی کسی وقت دارالاسلام تھے لیکن ان میں سے آج کوئی قوم بھی لا الہ الا اللہ کی شہادت اس مفہوم کے مطابق نہیں دیتی اور نہ کسی ملک میں لوگ اس مفہوم کے مطابق نظام حکومت چلاتے ہیں۔

یہ ایک نہایت ہی تکلیف دہ صورت حال ہے' جس کا مقابلہ آج ان ملکوں میں اسلامی تحریکات کر رہی ہیں۔ ایسے لوگوں سے ان کا رابطہ ہے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ ان تحریکات کو یہ مشکل درپیش ہے کہ نام نہاد مسلمانوں کے اندر لا الہ الا اللہ کا مفہوم نہیں سمجھا جاتا۔ اور نہ لوگ لفظ اسلام کو اس کے صحیح معنوں میں سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ نہ تو جاہلیت کے مفہوم سے آگاہ ہیں اور نہ ہی شرک کی حقیقت سے۔

اس کے علاوہ اسلامی تحریکات کو یہ مشکل بھی درپیش ہے کہ خود صالح مسلمانوں کے سامنے صحیح راستہ متعین نہیں ہے۔ ان کا راستہ مجرموں اور مشرکوں کے راستے سے جدا نہیں ہے۔ دونوں کے نشانات و عنوانات ایک ہیں۔ دونوں کے نام اور اوصاف ایک جیسے ہیں اور دونوں ایک ناپید اکنار صحرا میں گم گشتہ راہ ہیں۔

اسلامی تحریکات ' اس کمزوری کو اچھی طرح جانتی ہیں' لیکن وہ اس عظیم کوتاہی کے بارے میں خاموش ہیں۔ یہ خاموشی محض وسعت قلبی' بے راہ روی' منافقت اور حق و باطل کے درمیان ملاوٹ کی وجہ سے اختیار کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس پوائنٹ پر جو شخص سچی اور فیصلہ کن بات کرتا ہے وہی الٹا مجرم بن جاتا ہے۔ اس کی پکڑ دھکڑ شروع ہو جاتی ہے اور اس پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ یہ شخص مسلمانوں کی تکفیر کرتا ہے۔ اس طرح ان لوگوں کے نزدیک مسلمان وہ نہیں جو اقوال خدا اور اقوال رسول کے مطابق مسلمان ہو بلکہ مسلمان وہ ہوتا ہے جو ان کی اپنی اصطلاحات اور ان کے رسم و رواج کے مطابق مسلمان ہو۔ یہ ہے وہ عظیم مشکل جو اسلامی تحریکات کی راہ میں مائل ہے۔ لیکن تمام اہل دعوت کے لئے لازم ہے کہ وہ اس مشکل مسئلے کو حل کر کے آگے بڑھیں' وہ جہاں بھی ہوں اور جس دور میں بھی ہوں۔

مناسب یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کی تحریک کا آغاز یوں کیا جائے کہ ابتداء ہی سے مومنین اور مجرمین کی راہیں بالکل

علیحدہ اور متعین ہو جائیں - اہل دعوت جب کام کا آغاز کریں تو حق اور صداقت کا اظہار بغیر کسی مداہنت کے دو ٹوک الفاظ میں کریں - وہ بغیر کسی خوف اور لاگ لپیٹ کے بات کریں - ان کی بات میں کوئی پیچیدگی نہ ہو اور وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں - ان کے دل میں کوئی خوف اور ڈر نہ ہو - نہ وہ اپنے دل میں اس بات کا خوف پیدا ہونے دیں کہ ان کے خلاف کوئی مخالفانہ آواز اٹھے گی اور یہ کہا جائے گا "دیکھو یہ لوگ تو مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں -

اسلام کا موقف یہ نہیں ہے جو ان بے راہ رو لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے - اسلام کا راستہ واضح ہے 'جس طرح کفر کی راہ بالکل واضح ہے - اسلام یہ ہے کہ کلمہ طیبہ کا اقرار درج بالا مفہوم کے ساتھ کیا جائے - جو شخص اس مفہوم کے ساتھ کلمہ طیبہ کا اقرار نہیں کرتا اور جو شخص اپنی زندگی میں کلمہ طیبہ کو اس مفہوم کے اندر قائم نہیں کرتا تو اس کے بارے میں اللہ اور رسول اللہ کا حکم یہ ہے کہ وہ ظالم 'فاسق اور کافر ہے اور مجرم ہے -

ذرا پھر پڑھیے (وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ (٦: ٥٥)) (اور اس طرح ہم نشانیاں کھول کر پیش کرتے ہیں تاکہ مجرموں کی راہ بالکل نمایاں ہو جائے) یاد رکھیے دعوت الی اللہ کا کام کرنے والوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے اس گھاٹی کو سر کریں - اپنی راہ سے اس رکاوٹ کو ہٹائیں - وہ اپنے نظریات کے اندر خلوص اور للہیت پیدا کریں تاکہ وہ اپنی پوری قوتوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں اٹھ کھڑے ہوں - کوئی شبہ ان کی راہ نہ روک سکے 'کوئی التباس 'کوئی مداہنت اور کوئی بے راہ روی ان کی راہ میں حائل نہ ہو 'اس لئے کہ ان کی قوتیں اس وقت تک کھل کر کام نہ کر سکیں گی جب تک انہیں یہ یقین نہ ہو کہ وہ سچے مسلمان ہیں اور یہ کہ جو لوگ ان کی راہ روکے کھڑے ہیں اور ان کو اور تمام دوسرے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکے ہوئے ہیں وہ مجرمین ہیں - یہ بات بھی تحریک اسلامی کے حاملین کے پیش نظر رہے کہ اقامت دین کے مسئلے کو جب تک کفر و ایمان کا مسئلہ نہ تصور کیا جائے گا اس وقت تک کوئی بھی اس راہ کی مشکلات کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو گا - جب تک ایک مسلمان یہ یقین نہ کر لے کہ اس کی راہ اور اس کی قوم کی راہ بالکل جدا ہے 'یہ کہ اس کی ملت اور اس کی قوم کی ملت جدا ہے اور یہ کہ ان کا دین اور ان کی قوم کا دین جدا ہے - ذرا پھر دہرائیے -

(وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ (٦: ٥٥)) (اور اس طرح ہم نشانیاں کھول کر پیش کرتے ہیں تاکہ مجرموں کی راہ بالکل نمایاں ہو جائے) صدق اللہ العظیم -

---ooo---

# درس نمبر ۶۲ ایک نظر میں

حقیقت رسول ؐ اور حقیقت رسالت کے بیان کے بعد اب روئے سخن دوبارہ حقیقت الوہیت کی طرف پھر گیا ہے۔ ان حقائق پر سابقہ لہر میں بحث کی گئی تھی۔ ان تمام لہروں کا باہم گہرا ربط ہے۔ حقیقت رسول اور حقیقت رسالت کے بعد یہ بھی واضح کیا گیا کہ رسول کا راستہ مومنین کا راستہ ہے اور اس کے مقابلے میں تمام راستے مجرمین کے راستے ہیں۔

اس لہر میں شان کبریائی کا اظہار کئی رنگوں اور کئی میدانوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تفصیلات تو ہم تشریح آیات کے ضمن میں دیں گے البتہ یہاں ہم ان کی طرف اجمالی اشارات کریں گے۔

حقیقت الوہیت کا چراغ قلب رسول میں روشن ہے۔ رسول کا دل اعتماد اور یقین کی شراب طہور سے بھرپور ہوتا ہے۔ اگر پوری دنیا بھی اس حقیقت کو جھٹلا دے تو رسول ثابت قدم رہتا ہے اس کے پائے یقین میں کوئی لغزش نہیں آتی۔ اس لئے رسول اللہ اعلان کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے ہوگئے ہیں اور وہ اس معاملے میں ان لوگوں سے مکمل علیحدہ راہ اپنا لیتے ہیں جو اس بارے میں متزلزل ہوتے ہیں اور یہ جدائی رسول کے پختہ یقین اور عزم کی وجہ سے ہے۔

(قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ (٥٦) قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ

(٥٧) (٦:٥٦-٥٧)) (اے نبی ؐ، ان سے کہو "تم لوگ اللہ کے سوا جن دوسروں کو پکارتے ہو ان کی بندگی کرنے سے مجھے منع کیا گیا ہے۔" کہو: "میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا، اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو گیا، راہ راست پانے والوں میں سے نہ رہا۔" کہو: "میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر قائم ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے۔ اب میرے اختیار میں وہ چیز ہے نہیں جس کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو، فیصلے کا سارا اختیار اللہ کو ہے، وہی امر حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے)۔ شان کبریائی کا اظہار اس حلم اور برداشت سے بھی ہوتا جس کا برتاؤ اللہ تعالیٰ ان مکذبین کے ساتھ فرماتے ہیں۔ وہ تو مطالبہ کرتے ہیں کہ ان پر خارق عادت معجزے کا وقوع ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ ان کے اس مطالبے کے جواب میں نہایت ہی بردباری کا عمل اختیار فرماتے ہیں اور یہ اس لئے کہ اگر کسی خارق عادت معجزے کا ظہور ہو جائے اور پھر وہ تکذیب کریں تو سنت الہیہ کے مطابق پھر ان پر نزول عذاب لازم ہو جائے گا اور ہر قسم کا عذاب نازل کرنا اللہ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں

ہے۔ اگر نزول عذاب کو خود حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں دے دیا جاتا تو ان لوگوں نے جو رویہ اختیار کیا اس کے پیش نظر یہ خطرہ تھا کہ حضور ؐ ان پر یہ عذاب نازل ہی کر دیتے کیونکہ انہوں نے بار بار ناحق جھٹلا کر آپ کو دل تنگ کر دیا تھا اور آپ کی قوت برداشت سے یہ صورت حال باہر ہو گئی تھی۔ لہٰذا ایسے حالات میں بھی ان کو مہلت دے دینا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نہایت ہی حلیم و حکیم ہے اور اس سے شان کبریائی کا ظہور بھی ہوتا ہے۔

(قُلْ لَوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ

(۶ : ۵۸)) (کہو : "اگر کہیں وہ چیز میرے اختیار میں ہوتی جس کی تم جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ مگر اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ ظالموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جانا چاہئے؟") شان کبریائی کا ظہور اس حقیقت سے بھی ہوتا ہے کہ وہ عالم الغیب ہے اور اس کائنات کے اندر جو واقعہ بھی ہوتا ہے، اس کا علم اسے احاطے میں لئے ہوئے ہے اور یہ علم اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں ہے۔ اس غیب کا یہ نقش اور یہ صورت صرف اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔

(وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ

(۶ : ۵۹)) (اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے۔ درخت سے گرنے والا کوئی پتہ ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو۔ زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔ خشک و ترسب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے)۔ اس کا اظہار اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ اللہ کو اپنے بندوں پر مکمل گرفت حاصل ہے۔ وہ ہر حال میں اللہ کے کنٹرول میں ہیں، سوتے ہوں یا جاگتے، زندہ ہوں یا مردہ اور دنیا میں ہو یا آخرت میں ہوں۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۶۰) وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَیُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةً حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ (۶۱) ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ

(۶۲)(۶ : ۶۰ تا ۶۲)) (وہی ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہے، پھر دوسرے روز تمہیں اسی کاروبار کے عالم میں واپس بھیج دیتا ہے تاکہ زندگی کی مقررہ مدت پوری

ہو۔ آخر کار اسی کی طرف تمہاری واپسی ہے' پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو؟ اپنے بندوں پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے اور تم پر نگرانی کرنے والے مقرر کر کے بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو اس کے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی جان نکال لیتے ہیں اور اپنا فرض انجام دینے میں ذرا کوتاہی نہیں کرتے' پھر سب کے سب اللہ' اپنے حقیقی آقا کی طرف واپس لائے جاتے ہیں' خبردار ہو جاؤ فیصلہ کے سارے اختیارات اسی کو حاصل ہیں اور وہ حساب لینے میں بہت تیز ہے۔)

یہ شان کبریائی خود ان لوگوں کے اس فطری ردعمل کے وقت بھی ظاہر ہوتی ہے جب یہ جھٹلانے والے کسی خطرے سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ لوگ دوسرے شرکاء کو چھوڑ کر صرف اللہ کو پکارتے ہیں کہ وہ اس خطرے کو ٹال دے لیکن اس کے باوجود پھر شرک کرنے لگتے ہیں اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس خطرے کو ٹالنے کے لئے وہ جس خدا کو پکارتے تھے وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ انہیں کسی دوسرے ایسے عذاب سے دوچار کر دے جس کے بعد ان میں سے کوئی زندہ نہ بچے۔

(قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ (٦٣) قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ (٦٤) قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ (٦٥) (٦:٦٣ تا ٦٥)) (اے نبی " ان سے پوچھو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں کون تمہیں خطرات سے بچاتا ہے' کون ہے جس سے تم (مصیبت کے وقت) گڑگڑا گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعائیں مانگتے ہو؟ کس سے کہتے ہو کہ اگر اس بلا سے اس نے ہم کو بچالیا تو ہم ضرور شکر گزار ہوں گے؟ کہو' اللہ تمہیں اس سے اور ہر تکلیف سے نجات دیتا ہے۔ پھر تم دوسروں کو اس کا شریک ٹھہراتے ہو۔ کہو "وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب اوپر سے نازل کر دے' یا تمہارے قدموں کے نیچے سے برپا کر دے' یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزہ چکھوا دے۔" دیکھو ہم کس طرح بار بار مختلف طریقوں سے اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں شاید کہ یہ حقیقت کو سمجھ لیں)۔

---ooo---

# درس نمبر ٦٢ تشریح آیات

## ٥٦ ---- تا ---- ٦٥

---

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ۝٥٦ قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَ هُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ۝٥٧ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝٥٨

(اے نبی ﷺ' ان سے کہو کہ "تم لوگ اللہ کے سوا جن دوسروں کو پکارتے ہو ان کی بندگی کرنے سے مجھے منع کیا گیا ہے۔" کہو "میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا' اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو گیا' راہ راست پانے والوں میں سے نہ رہا۔ "کہو' میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر قائم ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے۔ اب میرے اختیار میں وہ چیز ہے نہیں جس کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو' فیصلہ کا سارا اختیار اللہ کو ہے' وہی امر حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔" کہو' "اگر کہیں وہ چیز میرے اختیار میں ہوتی جس کی تم جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ اور اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ ظالموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جانا چاہئے)۔

یہ لہر ہدایات اور اشارات سے بھری پڑی ہے۔ اس میں قلب انسانی پر اثر انداز ہونے والے مختلف عوامل کے ذریعے حقیقت الوہیت کو نظروں کے سامنے لایا گیا ہے۔ ان مؤثرات اور ضربات میں سے اہم اور گہرا مؤثر اس میں لفظ قل کا تکرار ہے' کہہ دو' کہہ دو' کہہ دو' اس میں خطاب رسول اللہ ﷺ کو کیا گیا ہے کہ آپ اپنے رب کی طرف سے آنے والے ہر پیغام کو پہنچا دیں۔ یہ وہ پیغام ہے جو کسی اور گروہ کے پاس نہیں ہے' کوئی اور اس پیغام کا حامل نہیں ہے

اور نہ یہ پیغام کسی اور پر القا ہوتا ہے۔

قُلْ اِنِّی نُهِیتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِینَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَ کُمْ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِینَ (٥٦)(٦:٥٥-٥٦)) "اے نبی" ان سے کہو کہ "تم لوگ اللہ کے سوا جن دوسروں کو پکارتے ہو ان کی بندگی کرنے سے مجھے منع کیا گیا ہے۔" کہو "میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا' اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو گیا' راہ راست پانے والوں میں سے نہ رہا۔" حضور کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اعلان فرما دیں کہ آپ کو ان لوگوں کی بندگی کرنے اور ان کی پیروی کرنے سے خدا نے منع کر دیا ہے جن کی بندگی اور پیروی تم مشرکین کرتے ہو۔ میں تمہارے معبودوں کو کسی صورت میں اپنے رب کا ہمسر نہیں بنا سکتا۔ اس لئے کہ مجھے اس بات سے روک دیا گیا کہ میں لوگوں کی خواہشات کی پیروی کروں اور جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی کرتے ہیں وہ محض اپنی خواہشات نفس کی وجہ سے ان لوگوں کی پیروی کرتے ہیں اور انہیں اللہ کا ہمسر بناتے ہیں۔ وہ کسی علم یا دلیل کی وجہ سے ایسا نہیں کر رہے۔ اور نہ اس وجہ سے کر رہے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ کوئی حق بات ہے۔ نیز یہ کہ اگر میں ان لوگوں کی پیروی کروں تو میں گمراہ ہو جاؤں گا اور ہدایت یافتہ نہ رہوں گا کیونکہ جن لوگوں پر ان کی خواہشات مسلط ہوتی ہیں وہ لازماً گمراہی کا شکار ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیتے ہیں کہ آپ مشرکین کے ساتھ اس انداز میں ہمکلام ہوں۔ ان کے ساتھ اس انداز میں دو ٹوک بات کریں۔ اس سورہ میں اس سے پہلے بھی حضور کو حکم دیا جا چکا ہے۔

(اَئِنَّکُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی قُلْ لَّآ اَشْهَدُ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِی بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ (٦:١٩)) "کیا واقعی تم لوگ یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرا خدا بھی ہے؟ کہو' میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں دے سکتا۔ خدا تو وہی ایک ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔" مشرکین مکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پیشکش کرتے رہے تھے کہ آپ ان کے دین کو مان لیں اور وہ آپ کے دین کو تسلیم کریں گے۔ آپ ان کے خداؤں کے سامنے سجدہ ریز ہوں اور وہ آپ کے الٰہ واحد کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ شاید اس قسم کی مصالحت و مسالمت کا امکان ہے اور یہ کہ ایک ہی دل میں شرک اور توحید جمع ہو سکتے ہیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ غیر اللہ کی بندگی اور پیروی کے ساتھ ساتھ اللہ کی بندگی اور پیروی بھی ممکن ہے حالانکہ یہ اجتماع ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ اللہ کو کیا پڑی ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسرے شریکوں کو تسلیم کرے۔ وہ تو یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اس کے بندے صرف اور صرف اس کی بندگی کریں۔ اللہ کو وہ بندگی سرے سے قبول ہی نہیں ہے جس میں شرک کا کوئی شائبہ تک موجود ہو' چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔

آیت کا مقصد تو یہ ہے کہ حضور ان سے یوں مخاطب ہوں کہ آپ کو ان کی بندگی سے منع کر دیا گیا ہے جن کی یہ لوگ بندگی کرتے ہیں یا جنہیں وہ الٰہ کہتے ہیں۔ لیکن یہاں انداز تعبیر یوں ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے "الذین" کا لفظ

استعمال کیا گیا ہے جو قابل غور ہے اس لئے کہ الذین کا لفظ ذوالعقول کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اگر مراد صرف بتوں سے ہوتی یا دوسرے بے جان معبود مراد ہوتے تو یہاں لفظ (ما) استعمال ہوتا (الذین) استعمال نہ ہوتا۔ لہٰذا یہاں بتوں اور دوسرے حجر و شجر سے کوئی اور مخلوق مراد ہے جن کے لئے لفظ الذین استعمال ہوا ہے۔ ان معبودوں کے لئے الذین کی ضمیر استعمال بتاتا ہے کہ معبود ذوالعقول تھے۔ اس تعبیر کی تائید دو باتوں سے ہوتی ہے ایک تو واقعی تاریخی حقائق سے اور دوسری اسلامی اصطلاحات سے۔

تاریخی واقعہ یہ ہے کہ مشرک صرف پتھر کے بتوں اور درختوں کی پوجا نہ کرتے تھے بلکہ ان کے ساتھ وہ جنوں' فرشتوں اور انسانوں کو بھی پوجتے تھے۔ انسانوں کی پوجا اس طرح کرتے تھے کہ وہ انسانوں کو قانون سازی اور افراد کے لئے راہنمائی کا حق دیتے تھے یہ انسان ان کے لئے رسم و رواج قوانین اور ضابطے بناتے تھے جن کے مطابق ان کے ہاں اجتماعی عمل ہوتا اور تنازعات کے فیصلے ہوتے۔ ان انسانوں کی رائے اور دوسرے انسانوں کے رواج کے مطابق۔

اب ہم اسلامی اصطلاحات کی طرف آتے ہیں۔ اسلام اسے شرک تصور کرتا ہے۔ اسلام کا تصور یہ ہے کہ انسانوں کے امور زندگی میں کچھ دوسرے انسانوں کو حاکم بنانا اس طرح ہے جس طرح انہیں کوئی اپنا الٰہ بنا لے اور انہیں اللہ کا شریک اور ہمسر بنا دے۔ اسلام اس حرکت سے اسی طرح منع کرتا ہے جس طرح اسلام بتوں اور پتھروں کی پوجا سے منع کرتا ہے۔ یہ دونوں کام اسلام کے عرف میں برابر اور مساوی درجے کے منکرات ہیں۔ یہ صریح شرک ہے اور اللہ کے ساتھ دوسروں کو ہمسر بنانا ہے۔ اب پہلی چوٹ کے ساتھ متصلاً دوسری چوٹ لگتی ہے۔ یہ دوسری ضرب پہلی ضرب کی تکمیل ہے اور اس سے متصل ہے۔

(قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ (۶:۵۷)) "کہو' "میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر قائم ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے' اب میرے اختیار میں وہ چیز ہے نہیں جس کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو' فیصلہ کا سارا اختیار اللہ کو ہے' وہی امر حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔"

یہ ضرب اللہ کی جانب سے ہے۔ اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتے ہیں کہ آپ کفار اور جھٹلانے والوں کے سامنے واضح الفاظ میں اس بات کا اعلان کر دیں کہ آپ کے دل میں اپنے پیغام کے بارے میں پختہ یقین ہے اور آپ کو اس سلسلے میں مکمل یکسوئی حاصل ہے۔ آپ کے شعور میں اس پیغام کی سچائی پر بین دلائل موجود ہیں اور آپ کی ذات میں اس امر کا گہرا وجدانی احساس موجود ہے کہ آپ ؐ جو پیغام دے رہے ہیں وہ حق ہے۔ یہ ایک ایسا شعور ہے' جو تمام نبیوں کے اندر پوری طرح پایا جاتا ہے اور تمام نبیوں نے اس احساس و شعور اور وجدانی راہنمائی کا اظہار ایسے ہی الفاظ میں کیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا:

(قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰىنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّیَتْ عَلَیْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ (۱۱:۲۸)) "نوح نے کہا اے برادران قوم' ذرا سوچو تو

سمی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا' اور پھر اس نے مجھ کو اپنی خاص رحمت سے بھی نواز دیا مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو تمہارے سر پر چپکا دیں ۔" اور حضرت صالح علیہ السلام نے کہا :

(قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ (۱۱ : ۶۳) "صالح نے کہا اے برادران قوم' تم نے کچھ اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا اور پھر اس نے مجھے اپنی رحمت سے بھی نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھے کون بچائے گا اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ تم میرے کس کام آسکتے ہو؟ سوائے اس کے کہ مجھے اور خسارہ میں ڈال دو۔" اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا :

(وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ (۶ : ۸۰) "اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے قوم سے کہا :"کیا تم لوگ اللہ کے معاملے میں مجھ سے جھگڑتے ہو حالانکہ اس نے مجھے راہ راست دکھا دی ہے ۔" اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا :

(فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۲ : ۹۶)) "پھر جب خوشخبری لانے والا آیا تو اس نے یوسف کا قمیص یعقوب کے منہ پر ڈال دیا اور یکایک اس کی بینائی عود کر آئی ۔ تب اس نے کہا :"میں تم سے کہتا نہ تھا؟ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۔"

یہ ہے حقیقت خدائی' جو اللہ والوں کے دل میں روشن چراغ کی طرح نمایاں ہوتی ہے ۔ لیکن صرف ان لوگوں کے دلوں میں یہ چراغ روشن ہوتا ہے جن کے دلوں میں اللہ روشن کرنا چاہے ۔ ایسے لوگ اللہ کو اپنے دل میں موجود پاتے ہیں اور ان کی شخصیت کی گہرائیوں میں یہ حقیقت بیٹھ جاتی ہے اور ان کے دلوں کو یقین سے بھر دیتی ہے ۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے بارے میں اللہ اپنے نبی کو حکم دیتا ہے کہ وہ مشرکین کے سامنے اس کا اعلان ببانگ دہل کر دیں ۔ مشرکین دراصل دعوت الی اللہ کی تکذیب کرنا چاہتے ہیں اور وہ حیلے بہانے بناکر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ اس حقیقت کو تسلیم کرانے کے لئے معجزات پیش کریں حالانکہ یہ حقیقت تو قلب رسول میں روشن چراغ کی طرح موجود ہے ۔

(قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ((۶ : ۵۷)) (کہو' میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر قائم ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے ) وہ ہمیشہ یہ مطالبہ کرتے رہتے تھے کہ یا تو ان پر کوئی خارق عادت معجزہ نازل ہو جائے یا ان پر عذاب الہی نازل ہو جائے تاکہ وہ اس بات کو تسلیم کر لیں ۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم دیا جاتا تھا کہ اس سوال کے جواب میں آپ ان کے سامنے رسول اور رسالت کی حقیقت کا اعلان کریں اور رسول اور رسالت اور اللہ اور اس کی الوہیت و حاکمیت کے درمیان مکمل فرق بیان کریں ۔ نیز یہ بھی اعلان کر دیں کہ جس عذاب اور

معجزے کی آمد میں کے لئے وہ عجلت کا اظہار کر رہے ہیں اس کے صدور میں ان کو بالکل اختیارات نہیں ہیں۔ یہ کام تو صرف اللہ کے دست قدرت میں ہے۔وہ تو الٰہ نہیں وہ تو فقط پیغام بر ہیں۔

(مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ

(۶:۵۷)) "میرے اختیار میں وہ چیز نہیں ہے جس کی تم جلدی مچا رہے ہو' فیصلے کا سارا اختیار اللہ کو ہے۔وہی حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔" کسی معجزے کا آنا اور اس کے بعد نہ ماننے کی صورت میں ان پر عذاب الٰہی کا نزول ایک ایسا معاملہ ہے جس کا تعلق اللہ کے فیصلے اور حکم سے ہے اور اس معاملے میں جج اور فیصلہ کرنے والا صرف اللہ ہی ہے۔اللہ ہی حق بیان کرنے والا ہے اور اطلاع دینے والا ہے۔اللہ ہی ہے جو کسی پیغمبر اور اس کی امت دعوت کے درمیان فیصلے کا اختیار رکھتا ہے۔کسی انسان کو اس باب میں کوئی اختیار اور حق مداخلت نہیں دیا گیا ہے۔

اس طرح رسول اللہ اعلان کر دیتے ہیں کہ ایسا کوئی فیصلہ کرنے کا انہیں کوئی اختیار نہیں ہے اور نہ وہ قضا و قدر کے ان امور میں مداخلت کر سکتے ہیں۔یہ اللہ کے نظام الوہیت کے ساتھ مخصوص ہے اور خصائص الوہیت میں سے ہے جبکہ وہ خود ایک بشر ہیں۔ہاں امتیاز یہ ہے کہ ان کی طرف وحی آتی ہے۔ان کا فرض یہ ہے کہ وہ اسے لوگوں تک پہنچا دیں اور انہیں انجام بد سے ڈرائیں۔ان کا یہ منصب نہیں ہے کہ فیصلے کریں اور ان کے مطابق لوگوں کو سزا دیں۔جس طرح اللہ تعالیٰ حق بیان کرتا ہے اور ہمیں اس کی اطلاع دیتا ہے اسی طرح فیصلوں کا اختیار بھی اللہ کو ہے۔یہ وہ انداز ہے جس کے سوا ایک بشر اور ذات باری کے درمیان فرق و امتیاز کی کوئی اور سبیل نہیں ہے۔

اس کے بعد حضرت کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ان کے قلب و نظر سے اپیل کریں اور ان کی توجہ ان قوی دلائل و اشارات کی طرف مبذول کرائیں جو اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ پیغام اللہ کی جانب سے ہے اور اس کا فیصلہ بھی مشیت الٰہی پر موقوف ہے۔اگر معجزات کا صدور اور عذاب الٰہی کا نزول آپ کے قبضہ قدرت میں ہوتا تو تقاضائے انسانیت کے نتیجے میں آپ فوراً ہی یہ چیلنج قبول کر لیتے اور اس معاملے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے کیونکہ وہ تو اس امر کا بار بار باصرار مطالبہ کرتے تھے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ معاملہ اللہ کے اختیار میں تھا اور اللہ وہ ذات ہے جو اپنے بندوں کے مقابلے میں نہایت ہی حلیم ہے۔اسی لئے اللہ تعالیٰ کوئی خارق عادت معجزہ نہیں صادر فرماتے کیونکہ اس کے بعد ان پر عذاب آتا ہے۔وہ تو تکذیب پر تلے ہوئے تھے اور یہ وہ بات ہے جو تاریخ میں اس سے قبل اقوام و ملل کو پیش آتی رہی ہے۔

(قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

بِالظّٰلِمِیْنَ (۶:۵۸)) "کہو' اگر وہ چیز میرے اختیار میں ہوتی جس کی تم جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ اور اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ ظالموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جانا چاہئے۔" جہاں تک انسان کا تعلق ہے 'صبر' حلم' بردباری اور مہلت دینے میں اس کی صلاحیت محدود ہے۔جب انسان' انسان کے خلاف بغاوت اور سرکشی اختیار کرتا ہے تو انسان کی قوت برداشت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ انسان دوسرے زیر دست انسان کی

جانب سے سرکشی کو برداشت ہی نہیں کرتا لیکن اللہ حلیم ' بردبار اور قوی ہے ' وہ عظمت والا ہے۔

ذرا کلام الٰہی پر غور کرو۔ بارہا ایسا ہوتا ہے انسان بعض دوسرے انسانوں سے ایسے امور دیکھتا ہے کہ اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا ہے اور اس کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں دیکھو کہ انسان اللہ کی نافرمانی کرتا چلا جاتا ہے لیکن وہ پھر بھی اللہ کی زمین پر رہتے ہیں ' وہ اللہ کھاتا و پیتا فراہم کرتا ہے ' ان پر بارش برساتا ہے ' ان کے لئے ہر طرف سے فراوانی کے دروازے کھول دیتا ہے اور اس کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہیں رہتا کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی بات کو دہرائے۔ ایک بار وہ معرکہ جنگ میں تھے۔ معرکہ اس قدر گرم تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا اور کفار نے فیصلہ کن حملہ کیا ہوا تھا۔ ہر طرف سے بزن کا عالم تھا۔ آپ نے فرمایا: "اے اللہ آپ کس قدر حلیم اور بردبار ہیں! اے اللہ آپ کس قدر حلیم و بردبار ہیں۔ غرض یہ اللہ کا حلم اور بردباری ہی ہے کہ نافرمانوں کو مہلت دیئے جا رہی ہے۔

(وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ (٦: ٥٨)) "اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ ظالموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جانا چاہئے۔" وہ جانتے ہوئے مہلت دیتا ہے۔ وہ حکمت کے ساتھ انہیں ڈھیل دیتا ہے۔ وہ علیم بھی ہے اور قدرت بھی رکھتا ہے کہ ان کے مطالبے کو بھی پورا کر دے اور انہیں سخت عذاب سے بھی دوچار کر دے۔"

---ooo---

* بات یہ ہو رہی تھی کہ اللہ ظالموں کے بارے میں خوب جانتے ہیں ' اور یہ کہ حقیقت الوہیت اور شان کبریائی کیا ہے ' اس مناسبت سے یہاں شان کبریائی کے ایک وسیع ترمیدان کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور یہ وسیع ترمیدان عالم غیب ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کا علم تمام خفیہ باتوں پر محیط ہے۔ یہاں اللہ کے علم کی وسعت کی عجیب اور منفرد تصویر کشی کی جاتی ہے اور اس میدان میں اللہ کے علم کی وسعتوں کی طرف دور تک راہوار خیال کو گامزن کیا جاتا ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾

"اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے 'سب سے وہ واقف ہے۔ درخت سے گرنے والا کوئی پتہ ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو۔ زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔ خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

اللہ کے کامل اور محیط علم کی یہ نہایت خوبصورت تصویر ہے۔ یہ علم اس قدر محیط ہے کہ زمان و مکان کا ایک ذرہ بھی

اس سے باہر نہیں ہے۔ زمین و آسمان کی ہر چیز اس کے علم میں ہے۔ بر و بحر کے تمام موجودات اس کے علم کے دائرے کے اندر ہیں۔ فضاؤں اور زمین کی گہرائیوں میں پائے جانے والے تمام ذرات بھی اس کے دائرۂ علم کے اندر ہیں۔ خشک و تر اور زندہ و مردہ ہر چیز اس کے علم میں ہے۔

ہمارے اس بیان اور آیت زیر بحث کے اسلوب بیان میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قرآن کا انداز نہایت ہی منفرد، شامل و کامل، گہرا عمیق اور نہایت ہی مؤثر اور معنی آفریں ہے۔

ہمارا راہوار خیال اس مختصر آیت کے پیچھے سرپٹ بھاگتا ہے۔ ہمارا خیال عالم معلومات اور عالم مجہولات میں گھوڑے دوڑاتا ہے۔ انسان عالم غیب و عالم شہادت پر غور و فکر کرتا ہے تو اس کا وجدان اور مشاہدہ کانپ اٹھتا ہے کہ ہر وادی میں اور ہر طرف اسے مشاہدات و مظاہر کی نئی نئی شکلیں نظر آتی ہیں۔ انسان کی جدوجہد بڑی تیزی سے اپنی تلاش نامعلوم کے لئے جاری ہے۔ وہ غیب کے پردوں کو پھاڑ کر سب کچھ عیاں کرنا چاہتا ہے۔ وہ ماضی اور مستقبل کے تمام پردے ہٹانا چاہتا ہے۔ زمان و مکان کے آفاق اور گہرائیوں میں وہ دور تک جھانکنا چاہتا ہے لیکن وہ جس سمت سے آگے بڑھتا ہے اسے نظر آتا ہے کہ غیب کی چابیاں تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ ایک حد پر جاکر اس کو علم و انکشافات کے دروازے مقفل نظر آتے ہیں اور آگے کی چابیاں اللہ کے پاس ہیں۔ غرض انسان کا وجدان کائنات کی تاریک وادیوں اور سمندر کی گہرائیوں میں دوڑتا ہے۔ یہ سب جگہیں اللہ کے علم کے زاویے سے عیاں ہیں۔ پھر ہمارا شعور دنیا کے ہر خزاں میں گرنے والے پتوں کی طرف جاتا ہے، جن کی تعداد سے انسان بے خبر ہیں لیکن اللہ کی آنکھ ایک ایک کو دیکھ رہی ہے کہ کس طرح وہ امر ربی سے گرتا ہے اور اس پوری کائنات میں یہ علم ان پتوں تک وسیع ہے۔ اس کائنات میں اگنے والے بے شمار پودوں سے نکلنے والے چھوٹے چھوٹے بیج اور ان کا ایک ایک دانہ جو ظلمات ارض میں کہیں پڑا ہے وہ بھی اللہ کی نظر میں ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات کا ہر خشک و تر اللہ کی نظروں میں ہے اور کوئی بھی چیز علم الٰہی سے باہر نہیں ہے۔

غرض یہ تصور سر کو چکرا دیتا ہے اور اس سے عقل مبہوت ہو جاتی ہے۔ یہ تصور اور شعور ہمیں تاریخ اور زمانوں کی طوالتوں میں لے جاتا ہے۔ یہ آفاق کائنات کی دوریوں کا تصور دلاتا ہے۔ عالم معلوم اور مشاہد اور عالم غیب اور مجہول کا تصور انسان کرتا ہے تو اس میں ہر طرف وسعت ہی وسعت نظر آتی ہے۔ راہوار خیال تھک کر چور چور ہو جاتا ہے لیکن قرآن کریم کے چند کلمات ان وسعتوں اور دوریوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ یہ ہے قرآن کا اعجاز، اعجاز عبارت اور اعجاز خیال۔ جس پہلو سے بھی ہم اس مختصر آیت پر نگاہ ڈالیں یہ معجز ہے اور یہ اعجاز ہمیں واضح طور پر اس طرف لے جاتا ہے کہ اس عظیم کلام کا مصدر اور منبع کیا ہے؟

قرآن کریم جو اسلامی تصور حیات کا مصدر اور سرچشمہ ہے اور جس سے اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی ہے، وہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ اس کائنات کے دو جہان ہیں، ایک عالم غیب ہے اور دوسرا عالم مشاہدہ یا عالم شہادت۔ لہٰذا انسان جس جہان میں رہتا ہے اس کے تمام حقائق غیبی نہیں ہیں اور نہ اس کا واسطہ عالم مجہولات سے ہے بلکہ یہاں عالم شہادت بھی ہے۔

اس کائنات کے اندر بعض ناقابل تغیر قوانین اور سنن ہیں اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ سنن کائنات میں سے ضروری کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ اپنی اس صلاحیت اور ضرورت کے مطابق۔ اسے یہ صلاحیت اس لئے دی گئی ہے کہ وہ یہاں خلافت ارضی کے منصب سے وابستہ فرائض ادا کر سکے اور اپنی زندگی کو سنن کائنات کے ساتھ ہم

آہنگ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس قدر صلاحیت دی ہے جس قدر اسے منصب خلافت کے تقاضے پورے کرنے کے لئے درکار ہے۔ تاکہ انسان کائناتی قوتوں کو مسخر کر کے اس زمین کو آباد کر سکے' یہاں زندگی کو ترقی دے سکے اور انسانی زندگی کی بہتری کے لئے اللہ نے اس کائنات کے اندر جو ذخائر ودیعت کئے ہیں انہیں کام میں لا سکے۔

لیکن ان قوانین قدرت کے ساتھ ساتھ مشیت الٰہی بھی بطور ایک حقیقت کے موجود ہے۔ اگرچہ یہ تمام قوانین قدرت مشیت ازدی کا نتیجہ ہیں لیکن یہ قوانین قدرت مشیت الٰہیہ کے بجائے تقدیر الٰہی کے مطابق کام کرتے ہیں۔ یہ تمام قوانین قدرت الٰہیہ کے تحت چلتے ہیں۔ یہ کوئی خودمختار یا کنٹرول سے باہر مشینری نہیں ہے۔ اللہ کی قدرت اور اس کی تقدیر ان قوانین پر پوری طرح محیط ہے۔ اس کائنات کی ہر حرکت اس کے دائرہ قدرت میں ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ کائنات ایک ناموس کے مطابق رواں دواں ہے لیکن یہ ناموس اللہ کا پیدا کردہ ہے۔ اللہ کا نظام قضا و قدر ان قوانین قدرت کو نافذ کرتا ہے۔ نظام قضا و قدر عالم غیب کا حصہ ہے اور اس کے بارے میں علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ لوگوں نے جو سائنسی اصول وضع کر رکھے ہیں وہ بھی ظنی اور احتمالی ہوتے ہیں اور آج تک انسان نے اس کائنات کے جو راز معلوم کئے ہیں ان کے اندر بھی یہ اعتراف موجود ہے۔

ذرا انسان کے اس مختصر وجود پر غور کیجئے۔ اس کے اندر ہر لحظہ لاکھوں ذرات سرگرداں ہیں۔ یہ سب تصرفات انسانی نقطہ نظر سے غیب ہیں۔ اگرچہ یہ تمام حرکات اور مؤثرات خود اس کے وجود کے اندر روبعمل رہتے ہیں۔ پھر اس عظیم کائنات کے اندر جو مؤثرات کام کر رہے ہیں وہ تو لاتعد دولاتحصی ہیں۔ انسان ان میں سے کچھ بھی نہیں جانتا۔

عالم غیب انسان کے ماضی پر بھی محیط ہے اور اس کائنات کے ماضی پر بھی محیط ہے۔ انسان اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی اس کائنات اور اس کی موجودہ حالت پر بھی عالم غیب محیط ہے۔ نیز ان کے مستقبل پر بھی عالم غیب محیط ہے۔ یہ سب امور سنن الٰہیہ کے مطابق روبعمل ہیں جن میں سے نہایت ہی قلیل مقدار کا علم ابھی تک انسان کو ہو سکا ہے۔ انسان ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور انہیں منظم اور مربوط طریقے سے فریضہ خلافت کی ادائیگی میں استعمال کر رہا ہے۔

انسان اس کائنات میں اپنی خواہش کے مطابق نہیں آتا۔ نہ اسے یہ علم ہوتا ہے کہ اب وہ اس جہان میں وارد ہو گا۔ جب وہ اس جہان سے رخصت ہوتا ہے تب بھی اس رخصتی میں اس کی خواہش شامل نہیں ہوتی اور نہ اسے علم ہوتا ہے کہ کب اسے جانا ہے۔ یہی صورت حال ہر زندہ مخلوق کی ہے۔ انسان جس قدر علم بھی حاصل کر لے اور اس کی معرفت اور آگاہی کا دائرہ کتنا ہی وسیع تر کیوں نہ ہو جائے وہ اس صورت حالات میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا۔

اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر اپنی ماہیت کے اعتبار سے "غیبی علمی" نوعیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ غیب اور عدم علم سائنسی اعتبار سے بھی حقیقی علم ہے۔ جو لوگ غیب کا انکار کرتے ہیں وہ جاہل ہیں حالانکہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ بہت کچھ جاننے والے ہیں۔

اسلامی فکر کی اساس یہ ہے کہ ایک مسلمان ایسے غیبی حقائق کے وجود کا اقرار کرتا ہے جس کا حقیقی علم صرف اللہ کو ہے۔ اس علم کی کنجیاں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ پھر اسلامی فکر یہ بھی یقین رکھتی ہے کہ یہ کائنات سنن الٰہیہ کے مطابق چل رہی ہے۔ اور ان سنن الٰہیہ میں سے بعض ایسے ہیں جن کا علم فریضہ خلافت فی الارض کے لئے ضروری ہے۔ ان اصولوں کے ساتھ مضبوط اساسوں پر ہم آہنگی اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر کی وجہ سے انسان نہ علم و معرفت سے محروم ہوتا ہے اور نہ حقیقت واقعیہ کے ادراک سے محروم ہوتا ہے۔ اس عالم شہادت سے آگے ایک عالم غیب ہے اور

اس عالم مغیبات کا علم صرف اللہ کو ہے اور اپنے بندوں میں سے اگر اللہ چاہے تو کسی قدر علم کسی کو عطا کر دے۔

ایمان بالغیب وہ دشوار گزار گھاٹی ہے جس کو انسان نے ضرور عبور کرنا ہے۔ جب تک وہ اس مقام پر فائز نہیں ہوتا وہ حیوانی مقام سے بلند ہو کر انسانی مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ حیوان صرف ان امور کا ادراک کر سکتا ہے جو اس کے حواس کے دائرے میں آتے ہیں۔ اس حقیقت کا ادراک صرف انسان ہی کر سکتا ہے کہ یہ کائنات صرف اسی قدر محدود نہیں ہے جو اس کے حواس میں آتی ہے یہ بہت ہی وسیع ہے بلکہ اس سے بھی وسیع تر ہے جو بذریعہ آلات اس کے ترقی دادہ حواس خمسہ کے دائرہ ادراک میں آرہی ہے۔ یہ اسلامی تصور اس کائنات کے تصور سے کہیں وسیع تر تصور ہے بلکہ اس کائنات کے بارے میں انسانی سوچ کے اندر یہ ایک دور رس تبدیلی ہے۔ یہ انسانی شخصیت کے بارے میں بھی انسانی سوچ میں ایک دور رس تبدیلی ہے۔ انسانی شخصیت کے اندر جو قوتیں کارفرما ہیں ان کے بارے میں بھی یہ ایک انقلابی سوچ ہے۔ اس سوچ کے تحت ایک انسان کے اندر اس کائنات کے بارے میں اور اس کے پیچھے کام کرنے والی قوتوں کے بارے میں ایک نیا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس تصور کے اثرات اس کرۂ ارض پر انسان کی عملی زندگی پر بھی پڑتے ہیں اس لئے کہ وہ انسان جو صرف اپنے ماحول کا اپنے حواس کے ساتھ ایک محدود مشاہدہ کرتا ہے اس انسان کے مساوی نہیں ہو سکتا جو اپنی بصیرت اور اپنے نظریات کی وجہ سے اس کائنات کے بارے میں وسیع تر سوچ رکھتا ہے۔ یہ عقلمند انسان فطرت کائنات کی آواز کو اپنی شخصیت کے نہاں خانے سے سنتا ہے اور اپنے دل کی گہرائیوں سے اشارات پاتا ہے۔ وہ یہ شعور رکھتا ہے کہ اس کا دائرہ کار زمان و مکان کی قید سے زیادہ وسیع ہے۔ اور اس کی شخصیت اس سے کہیں وسیع ہے جو وہ سمجھتا ہے یا اپنی عمر کے ایک مختصر عرصے میں وہ سمجھ سکتا ہے۔ وہ اس بات کا شعور رکھتا ہے کہ اس ظاہری اور پوشیدہ کائنات کے پس پشت ایک عظیم حقیقت ہے اور یہ حقیقت اس کائنات سے بڑی اور اس کی خالق ہے۔ اس عظیم حقیقت کے وجود ہی سے تمام کائنات کا وجود مستفاد ہے۔ یہ ہے حقیقت باری تعالیٰ جسے آنکھیں نہیں پاسکتیں اور جو انسان کی عقل کے احاطے میں نہیں آسکتی۔

ایمان بالغیب وہ پوٹ ہے جہاں سے انسان اور حیوان کے راستے جدا ہوتے ہیں اور انسان عالم حیوانیت سے بلند ہوتا ہے۔ لیکن ہر زمانے کی طرح ہمارے دور کے مادہ پرست بھی یہ چاہتے ہیں کہ انسان کو انسانیت کے مقام بلند سے گرا کر عالم حیوانیت کی طرف لوٹا کر لے آئیں جہاں وہی چیز حقیقت سمجھی جاتی ہے جو حواس کے دائرے میں آتی ہے۔ یہ مادیت پسند اس بات کو ترقی پسندی کہتے ہیں حالانکہ یہ دراصل رجعت پسندی اور ناکامی ہے جس سے اللہ نے مسلمانوں کو ابھی تک بچایا ہے۔ لہٰذا ان کی امتیازی صفت ہی یہ قرار دی گئی کہ یومنون بالغیب (جو غیب پر ایمان لاتے ہیں) اور یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے جس پر ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ یہ نکتہ گرنے والوں اور منہ موڑنے والوں کے لئے ہلاکت اور تباہی کا مقام ہے۔

جو لوگ غیب اور سائنس کا باہم تقابل کر کے بحث کرتے ہیں وہ تاریخی واقعات کی فیصلہ کن تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک گویا مستقبل ان کے سامنے یقینی صورت میں موجود ہے حالانکہ جدید ترین سائنسی انکشافات یہ ہیں کہ مستقبل کا دارومدار محض احتمالات پر ہے۔ مستقبل کے بارے میں انسان کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا۔

مارکس کی یہ عادت تھی کہ وہ تاریخی اسباب کی روشنی میں مستقبل کے لئے قطعی فیصلے کرتا تھا۔ لیکن آج کا انسان بچشم سر دیکھ سکتا ہے کہ مارکس کی ان تمام پیشین گوئیوں کا حشر کیا ہوا؟

مارکس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ سب سے پہلے انگلستان میں کیمونزم نافذ ہوگا کیونکہ انگلستان صنعتی اعتبار سے چوٹی پر پہنچ

چکا ہے - وہاں ایک طرف سرمایہ دار عروج پر ہے اور دوسری جانب مزدور فقر و فاقے کے اعتبار سے اپنی آخری منزل تک پہنچ چکا ہے - لیکن بعد کے ادوار میں ہم نے دیکھا کہ نہایت ہی پسماندہ اقوام کے اندر کیمونزم کامیاب ہوا' مثلاً روس اور چین میں - اور صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ممالک میں سے کسی ایک میں بھی کیمونسٹ انقلاب برپا نہ ہوا۔

لینن اور اسٹالن نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ سوشلسٹ دنیا اور سرمایہ دار دنیا کے درمیان کسی وقت بھی عالمگیر جنگ ہوگی' لیکن ان دونوں کے خلیفہ خروشیف باہم سلامتی اور دیانت کے جھنڈے اٹھائے ہوئے ہیں.......... میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کی پیشین گوئیوں پر مزید بحث کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ان لوگوں کی یہ یقینی پیشین گوئیاں اس لائق نہیں کہ ان پر کوئی سنجیدہ بحث کی جائے۔

یقینی حقیقت اگر کوئی ہے تو یہی غیبی حقیقت ہے اور اس کے سوا تمام باتیں محض احتمالات ہیں - اگر کوئی حتمی بات ہے تو وہی ہے جس کا فیصلہ اللہ کی قضا و قدر نے کر دیا ہے اور مستقبل کے بارے میں اللہ نے کیا فیصلہ کیا ہے' اس کا کسی کو علم نہیں ہے سوائے اللہ کے - ہاں تقدیر الٰہی کے اٹل حقیقت ہونے کے باوجود اس کائنات کے بارے میں کچھ سنن الہیہ ایسی بھی ہیں جو اٹل ہیں اور جو تقدیر الٰہیہ کا حصہ ہیں - ان میں سے بعض سنن الہیہ تک انسان کی رسائی بھی ممکن ہے اور ان تک رسائی حاصل کر کے انسان اپنے منصب خلافت الٰہیہ کے فرائض کو بہت ہی اچھی طرح ادا کر سکتا ہے - لیکن ان وسائل کے باوجود اللہ کا فیصلہ اور اس کی تقدیر سپریم ہے اور تقدیر الٰہی نامعلوم ہے - یہ اس کائنات کی اصل حقیقت ہے اور (اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (۱۷ : ۹)) یہ قرآن کریم اس بات کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو نہایت ہی سیدھی ہے -

---ooo---

اب روئے سخن غیب کے علوم کی کنجیوں سے اس کائنات کے ایک خاص پہلو کی طرف مڑ جاتا ہے - یعنی ذات انسانی کی طرف جو اس کائنات ہی کا ایک حصہ ہے اور اللہ کی قدرت کے کرشموں میں سے اہم کرشمہ ہے جس سے اللہ کے علم محیط کا بہت ہی اچھی طرح اظہار ہوتا ہے -

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ

ع ۵ ۱۴ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۰﴾

"وہی ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہے' پھر دوسرے روز وہ تمہیں اسی کاروبار کے عالم میں واپس بھیج دیتا ہے تاکہ زندگی کی مقرر مدت پوری ہو - آخر کار اسی کی طرف تمہاری واپسی ہے' پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو -"

یہ چند مزید الفاظ ہیں' اس سے پہلے چند کلمات میں عالم غیب کے طویل و عریض آفاق کے خطوط کھینچ دیے گئے تھے

اور سابق آیت کے محدود کلمات نے یہ واضح کر دیا تھا کہ باری تعالیٰ کا علم کس قدر کامل اور شامل ہے۔ اب ان زیر بحث چند کلمات اور محدود فقروں سے یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ انسان کی پوری زندگی مکمل طور پر اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ تمام امور اللہ کے علم' اللہ کی تقدیر اور اللہ کی تدبیر کے مطابق طے پا رہے ہیں۔ انسان کا جاگنا اور سونا' اس کا مرنا اور پیدا ہونا' اس کا دوبارہ اٹھنا اور حساب و کتاب سب کے سب امرالٰہی کے مطابق طے ہو رہے ہیں اور آئندہ بھی اس کے مطابق ہی طے ہوں گے۔ یہ حقیقت قرآن کے مخصوص طرز ادا اور نہایت ہی ایجاز اور نہایت ہی مؤثر پیرائے میں بیان کی جاتی ہے۔ طرز ادا نہایت ہی محسوس' متحرک اور ایسے انداز میں ہے کہ پورا منظر اسکرین پر چلتا پھرتا نظر آتا ہے اور انسانی شعور اور جذبات کو ساتھ لئے ہوئے ہے' نہایت ہی تعجب خیز طرز تعبیر میں۔

(وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّكُمْ بِالَّيْلِ (٦: ٦٠)) وہی ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے۔ جب انسان نیند کی آغوش میں ڈوب جاتا ہے تو گویا وہ مرجاتا ہے۔ حالت نوم بھی دراصل موت کی ایک قسم ہے۔ جس طرح حالت موت میں انسان کے حواس معطل ہو جاتے ہیں اسی طرح حالت خواب میں بھی حواس معطل ہو جاتے ہیں اور انسان غافل ہوتا ہے۔ حواس مردہ ہو جاتے ہیں' عقل رک جاتی ہے اور انسان کا فہم و ادراک بھی ختم جاتا ہے۔ یہ ایک راز ہے جو ابھی تک انسانی فہم سے باہر ہے کہ انسانی قوتیں حالت خواب میں کس طرح رک جاتی ہیں۔ اگرچہ ہم حالت خواب کے آثار کو جانتے ہیں لیکن اس کی حقیقت تک انسان نہیں پہنچ سکا کہ یہ حالت کس طرح طاری ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ایک حالت غیبی ہے جس طرح دوسرے غیبی حالات انسان کے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن جب انسان اس حالت میں پہنچتا ہے تو اس کی تمام قوتیں اس سے سلب ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ فہم و ادراک کی قوت سے بھی انسان محروم ہو جاتا ہے۔ ایک مخصوص وقت تک کے لئے انسان آثار حیات سے محروم ہو جاتا ہے اور اللہ کے قبضہ قدرت میں جا پہنچتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جب انسان خواب میں چلا جائے تو صرف اور صرف ارادۂ الٰہی اسے حالت بیداری میں لاتا ہے۔ ذرا غور کیجئے! کہ انسان جب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہو تو وہ کس قدر کمزور و ناتواں ہے۔

(وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ (٦: ٦٠)) "اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو' اسے جانتا ہے۔" انسانوں کے اعضاء حالت بیداری میں پورا دن جو حرکات کرتے ہیں جو پکڑتے ہیں اور جو چھوڑتے ہیں' جو اچھے کام کرتے ہیں اور جو برے کام کرتے ہیں' سب کے سب اللہ کے علم میں ہیں۔ تمام کے تمام انسانوں کی حرکات و سکنات اللہ کی نگرانی میں ہوتی ہیں اور ان کی حرکات و سکنات میں سے کوئی چیز اللہ کے علم سے باہر نہیں جاتی۔

(ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُسَمًّى (٦: ٦٠)) "پھر دوسرے روز وہ تمہیں اسی کاروبار کے عالم میں واپس بھیج دیتا ہے تاکہ زندگی کی مقرر مدت پوری ہو۔" یعنی جب تم رات سوتے میں گزارتے ہو تو وہ اس ٹھہراؤ اور انقطاع کی حالت سے تمہیں جگاتا ہے تاکہ تم حقیقی موت تک اپنی مقررہ مدت حیات پوری کر سکو۔ تو گویا یہ سب انسان ان تمام حالات میں اللہ کی قدرت اور تقدیر میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ تقدیر الٰہی سے باہر نکل نہیں سکتے۔ نہ یہ تقدیر کہیں جا کر رکتی ہے۔

(ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُکُمْ (٦: ٦٠)) آخرکار اسی کی طرف تمہاری واپسی ہے۔" جس طرح ایک ریوڑ چرنے چگنے کے بعد واپس اپنی جائے قیام اور اپنے مالک کی طرف لوٹتا ہے اسی طرح انسان واپس اپنے مالک حقیقی کی طرف لوٹتا ہے۔

(ثُمَّ یُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (٦: ٦٠)) پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو؟" اس وقت ان کا وہ اعمال نامہ پیش ہو گا جس کے اندر ان کا ہر فعل درج ہو گا۔ اور اس پر اس قدر حقیقی انصاف ہو گا جس میں ظلم کا شائبہ تک نہ ہو گا۔

غرض یہ آیت چند کلمات پر مشتمل ہے لیکن ان کلمات کے اندر ایک طویل ریل لپٹی ہوئی ہے۔ اس کے اندر مختلف تصاویر اور مناظر پنہاں ہیں۔ مختلف فیصلے 'مختلف اشارات اور ہدایات ثبت ہیں۔ مختلف شیڈ اور رنگ ہیں 'کون ہے جو اس قدر مختلف کلمات میں یہ رنگ بھر سکتا ہے۔ اگر یہ آیات معجز نہیں ہیں تو پھر کون سا کلام معجز ہو سکتا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ تکذیب کرنے والے اور کفر کا رویہ اپنانے والے ان سے غافل ہیں اور مادی معجزات اور خوارق کے طلبگار ہیں اور اللہ کے عذاب الیم کو دعوت دے رہے ہیں۔

---

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿٦١﴾ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۫ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿٦٢﴾

"اپنے بندوں پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے اور تم پر نگرانی کرنے والے مقرر کر کے بھیجتا ہے' یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو اس کے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی جان نکال لیتے ہیں اور اپنا فرض انجام دینے میں زرا کوتاہی نہیں کرتے۔ پھر سب کے سب اللہ' اپنے حقیقی آقا کی طرف واپس لائے جاتے ہیں۔ خبردار ہو جاؤ' فیصلہ کے سارے اختیارات اسی کو حاصل ہیں اور وہ حساب لینے میں بہت تیز ہے۔"

(وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (٦: ٦١)) اپنے بندوں پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے۔" یعنی وہ صاحب قوت بادشاہ ہے اور تمام انسان اس کی ایسی رعایا ہیں جو اس کے مکمل کنٹرول میں ہیں۔ اس بادشاہ کی حقیقی قوت اور لوگوں کی قوت کے درمیان کوئی نسبت نہیں ہے۔ اس کے بالمقابل نہ صرف یہ کہ ان کی کوئی قوت نہیں ہے بلکہ ان کے لئے کوئی معاون و مددگار بھی نہیں ہے سب پوری طرح اس کے غلام ہیں اور پوری طرح اس کے تابع اور زیر قبضہ ہیں۔

یہ ہے انسان کی جانب سے ایک قاہر اور مکمل طور پر حاوی خدا کی مکمل غلامی اور یہی وہ حقیقی تصور ہے جو لوگوں کی

عملی زندگی میں حقیقی تبدیلی پیدا کرتا ہے چاہے اللہ لوگوں کو مکمل آزادی اور اختیارات عطا کر دے ' ان کو وافر مقدار میں علم و معرفت دے دے اور ان کو وافر مقدار میں قوت دے دے تاکہ وہ اس کرۂ ارض پر فریضہ خلافت ارضی کے تقاضے پورے کر سکیں ۔ لیکن ان باتوں کے باوجود انسانی زندگی کے تمام سانس اللہ کے ہاں مقرر ہیں اور انسان کی تمام حرکات و سکنات اللہ کے اس قانون قدرت کے مطابق ہیں جو اس نے خود انسانوں کے وجود میں جاری اور ساری کر دیئے ہیں اور انسان خود اپنے وجود کے ان قوانین کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا ۔ اور یہ قوانین بھی نفس انسانی اور حرکات انسانی کے اندر متعین اور مقرر ہیں ۔

( وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ( ٦ : ٦١ ) ) اور تم پر نگرانی کرنے والے مقرر کر کے بھیجتا ہے ۔" یہاں آیت میں ان نگرانوں کی نوعیت کو متعین نہیں کیا گیا ۔ دوسرے مقامات پر بتایا گیا ہے کہ یہ نگرانی کرنے والے فرشتے ہیں جو انسانوں کے ساتھ لگے ہوئے ہیں اور وہ تمام اعمال ریکارڈ کر رہے ہیں جو انسانوں سے صادر ہوتے ہیں ۔ یہاں صرف اس امر پر روشنی ڈالنا مقصود ہے کہ ہر انسان براہ راست اللہ کی نگرانی میں ہے اور انسانی سوچ میں یہ شعور ڈالنا ہے کہ نفس انسانی کو ایک لحظہ کے لئے بھی آزاد نہیں چھوڑا جاتا اور نہ ہی وہ کسی وقت تنہا ہوتا ہے ۔ ہر وقت اس کے ساتھ ایسے افراد موجود ہوتے ہیں جو اس کی تمام حرکات و سکنات کو ریکارڈ کرتے رہتے ہیں اور اس قدر مکمل اور جامع ریکارڈ تیار کرتے ہیں کہ ان کی نظروں سے کوئی بات بچ کر نہیں رہتی ۔ یہ ایک ایسا تصور اور ایسی سوچ ہے جس کے نتیجے میں مکمل انسانی شخصیت بیدار ہو جاتی ہے اور وہ ہر بات کو محسوس کرتی ہے ۔

(حَتَّى إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُونَ (٦ : ٦١))

"یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو اس کے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی جان نکال لیتے ہیں اور اپنا فرض انجام دینے میں ذرا کوتاہی نہیں کرتے ۔" یہ اسی ربانی نگرانی کا رنگ ہے ' لیکن مختلف شیڈز میں ' یعنی ہر انسان کے لئے اس دنیا میں سانس لینے کی تعداد مقرر ہے ۔ اس کے ان سانسوں کے رک جانے کا بھی ایک وقت مقرر ہے لیکن اس کو وہ جانتا نہیں ہے ۔ انسانی زاویے سے اجل مقرر ہے جو اس کے لئے غیب ہے اور اس کا علم اسے کسی ذریعے سے بھی نہیں ہو سکتا ۔ لیکن اللہ کے علم میں وہ پہلے سے تحریری طور پر ثبت ہے اور ایک سیکنڈ آگے پیچھے نہیں ہو سکتی ۔ ہر شخص زندگی کے سانس پورے کر رہا ہے ۔ اس دنیا سے اس کے جانے کا وقت دور نہیں ہے بلکہ بالکل قریب ہے ' اس کے اندر کوئی تغیر ممکن نہیں ہے ۔ نہ اس میں بھول چوک ممکن ہے ۔ اللہ کے نمائندے تیار کھڑے ہوتے ہیں ' یہ فرشتے ہوتے ہیں اور ان کا نظام نہایت ہی محفوظ ہوتا ہے ۔ ہر شخص کی موت کا وقت تحریری طور پر ثبت ہے لیکن انسان سخت غفلت میں ہوتا ہے ۔ یہ نمائندے اپنا فرض نہایت ہی باریک بینی سے ادا کرتے ہیں ۔ وہ اپنا پیغام وقت پر پہنچاتے ہیں ۔ یہ سوچ اور یہ عقیدہ ہی ایک غافل انسان کو جھنجوڑنے کے لئے کافی اور شافی ہے ۔ اس عقیدے کا حامل انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اللہ کے فیصلے اسے پوری طرح گھیرے ہوئے ہیں ۔ ہر وقت وہ یہ یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ اگلے ہی لمحے میں اس کی روح قبض ہو سکتی ہے اور اگلے ہی سانس میں اس کی حرکت قلب رک سکتی ہے ۔

(ثُمَّ رُدُّوْا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ (٦ : ٦٢) پھر سب کے سب اللہ ' اپنے حقیقی آقا کی طرف واپس لائے جاتے ہیں -" حقیقی آقا وہی ہے اور اس کے سوا جن آقاؤں کو لوگ پکارتے ہیں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے - وہی آقا ہے جس نے انہیں پیدا کیا ہے - وہی ہے جس نے انہیں یہاں اس کرہ ارض پر زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کیے اور ان پر یہاں ان کی پوری زندگی کا ریکارڈ تیار کرنے کے لئے اپنے نگران مقرر کیے جو بالکل کوئی کمی بیشی نہیں کرتے - اس کے بعد وہی آقا ہے کہ جب چاہتا ہے ان انسانوں کو اپنے پاس بلالیتا ہے تاکہ وہ ان کے بارے میں اپنی مرضی سے فیصلہ کرے اور اس کے فیصلے پر کوئی اپیل نہیں ہو سکتی -

(اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ (٦ : ٦٢)) خبردار ہو جاؤ' فیصلہ کے سارے اختیارات اسی کو حاصل ہیں اور وہ حساب لینے میں بہت تیز ہے -" صرف وہی فیصلہ کرتا ہے ' وہ خود ہی حساب لیتا ہے - وہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں کرتا - اور نہ جزا و سزا میں تاخیر کرتا ہے - جلدی فیصلہ کرنے کے اثرات بھی انسانی زندگی پر نہایت ہی گہرے ہوتے ہیں - انسان سوچتا ہے کہ اللہ کے ہاں نہ حساب میں دیر لگتی ہے اور نہ فیصلہ کرنے میں -

ایک مسلمان کی یہ سوچ کہ اللہ اس کا خالق ہے اور ایک دن اسے مرنا ہے اور اللہ کے سامنے اپنی پوری زندگی کا حساب و کتاب پیش کرنا ہے اسے ایک لمحہ کے لئے غافل نہیں ہونے دیتی - اس سوچ کے مطابق اس کے عقائد کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ وہ صرف اللہ وحدہ کو حقیقی حاکم سمجھنے لگتا ہے اور اس کا یہ منطقی عقیدہ ہو جاتا ہے کہ اس کرہ ارض پر بندوں کے تمام امور اللہ کے حکم کے مطابق طے ہونے چاہئیں -

آخرت کا حساب و کتاب اور آخرت میں سزا و جزاء کے فیصلے بہرحال اس دنیا میں کیے گئے اعمال پر مرتب ہوتے ہیں اور لوگ اس دنیا میں اس وقت تک صحیح طرز عمل اختیار نہیں کر سکتے جب تک ان کے لئے کسی شریعت کی شکل میں مربوط ضابطہ عمل موجود نہ ہو جس میں ان کے لئے حلال و حرام کی حدبندی کر دی گئی ہو اور جس کے اوپر ان کا اخروی حساب و کتاب ہو - اس طرح اس تصور حیات کے مطابق یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ اس دنیا میں بھی حاکم اللہ ہے اور آخرت میں بھی حاکم اللہ ہے -

اگر طے یہ کر دیا جائے کہ دنیا میں اللہ کی شریعت کے سوا کوئی اور قانون رائج ہو گا تو پھر آخرت میں ان سے مؤاخذہ اور حساب و کتاب کس ضابطہ عمل پر ہو گا؟ کیا ان کے اعمال کا موازنہ قیامت کے روز ان قوانین کے مطابق ہو گا جو دنیا میں کچھ انسانوں نے یا سب انسانوں نے مل کر بنائے اور نافذ کیے تھے اور جن کے مطابق وہ اپنے تنازعات حل کرتے تھے یا قیامت میں لوگوں کا حساب و کتاب اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق ہو گا جو دنیا میں عملاً نافذ نہ تھی اور نہ یہ لوگ اپنے فیصلے اس شریعت کے مطابق کراتے تھے؟ یہ صورت حال ہرگز ممکن نہیں ہے -

لوگوں کو چاہئے کہ وہ اچھی طرح سمجھ لیں اور اس بات کا یقین کر لیں کہ اللہ ان سے حساب و کتاب خود اپنی شریعت کے مطابق لے گا - اگر انہوں نے اپنی پوری زندگی کو اور اپنے تمام معاملات کو اللہ کی شریعت کے مطابق نہ ڈھالا ' جس طرح وہ اپنے مراسم عبودیت شریعت کے مطابق بجالاتے ہیں تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان سے حساب لیتے وقت سب

سے پہلے اس بات کا حساب لیا جائے گا کہ انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا اور یہ کہ کیوں انہوں نے اللہ کے سوائی دوسرے الہوں کو حاکم اور شارع مقرر کیا اور تسلیم کیا۔ صرف اللہ وحدہ لاشریک ہی کو حاکم اور رب قرار کیوں نہ دیا؟ حقیقت یہ ہے کہ ان سے پہلا حساب یہ لیا جائے گا کہ انہوں نے اللہ کے حق حاکیت کا انکار کیوں کیا یا انہوں نے اللہ کی شریعت کے ساتھ ساتھ دوسرے شرائع کا اتباع کر کے اور اللہ کی بندگی کے ساتھ دوسروں کی بندگی کر کے شرک کا ارتکاب کیوں کیا؟ انہوں نے اپنی اجتماعی زندگی میں اپنے اقتصادی اور سیاسی نظام میں' اپنے معاملات اور سوشل روابط میں اللہ کے سوا دوسروں کی پیروی کر کے شرک کا ارتکاب کیوں کیا جو ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ شرک کو معاف نہیں کرتا اور شرک کے سوا سب کوتاہیوں سے درگزر کرتا ہے' اگر چاہے۔

---ooo---

اب اللہ تعالیٰ انہیں عدالت فطرت میں پیش فرماتے ہیں' کیونکہ خود فطرت انسانی کو حقیقت الہیہ کا شعور ہوتا ہے۔ فطرت انسانی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ مشکل لحات میں بارگاہ الہیہ میں پناہ لیتی ہے۔ قرآن ایسے بعض شدید لحات کی تصویرکشی بھی کرتا ہے جہاں انسان ہولناک اور کربناک صورت حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ پھر قرآن کریم یہ بھی بتا دیتا ہے کہ جونہی وہ حالت دور ہوتی ہے انسان اپنی فطری راہ سے ہٹ جاتا ہے۔ یہ سب تصویرکشی بڑی سرعت سے ہوتی ہے اور یہ منظر اسکرین پر آکر چلا جاتا ہے۔ لیکن یہ منظر نہایت ہی دوٹوک' فیصلہ کن' مؤثر اور حیران کن ہوتا ہے۔

یہ ہولناک اور کربناک صورت حال ہمیشہ قیامت کے لئے مؤخر نہیں کر دی جاتی' کبھی کبھار اس دنیا میں بھی انسان ایسے حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ مثلاً بحری سفر میں انسان کو جو مشکلات پیش آتی ہیں تو ان میں مشرکین بھی ہمیشہ اللہ جل شانہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ ہی پھر لوگوں کو نجات دیتے ہیں۔ لیکن جب وہ اس مشکل اور خوفناک صورت حالات سے بخیریت نکل آتے ہیں اور نارمل زندگی میں داخل ہوتے ہیں تو پھر شرک کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾

"اے نبی ؐ" ان سے پوچھو' صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں کون تمہیں خطرات سے بچاتا ہے؟ کون ہے جس سے تم (مصیبت کے وقت) گڑگڑا گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعائیں مانگتے ہو؟ کس سے کہتے ہو کہ اگر اس بلا سے اس نے ہم کو بچا لیا تو ہم ضرور شکرگزار ہوں گے؟ ........ کہو' اللہ تمہیں اس سے اور ہر تکلیف سے نجات دیتا ہے پھر تم دوسروں کو اس کا شریک ٹھہراتے ہو۔"

خطرات کا تصور اور ہولناک لمحات کی یاد بعض اوقات خود سرانسانوں کو بھی راہ راست پر لے آتی ہے۔اس سے پتھر دل بھی موم ہو جاتے ہیں۔اس سے انسان کو یہ شعور دیا جاتا ہے کہ انسان بہت ہی ضعیف ہے اور اسے ہروقت اللہ کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے' جس کے نتیجے میں اس کی مشکلات دور ہو جاتی ہیں اور اسے نعمت الٰہیہ بشکل نجات دستیاب ہوتی ہے۔

(قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ (٦٣:٦)) "اے نبی" ان سے پوچھو' صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں کون تمہیں خطرات سے بچاتا ہے؟ کون ہے جس سے تم (مصیبت کے وقت) گڑگڑا گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعائیں مانگتے ہو؟ کس سے کہتے ہو کہ اگر اس بلا سے اس نے ہم کو بچا لیا تو ہم ضرور شکرگزار ہوں گے؟ یہ وہ نفسیاتی تجربہ ہے جو ہر اس شخص کو درپیش ہوا ہے جو کبھی مشکلات میں گھرا ہے یا جس نے مشکلات کے اندر گھرے ہوئے لوگوں کو دیکھا ہے' کیونکہ خشکی اور سمندر دونوں میں انسان اس قسم کی مشکلات سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ضروری نہیں کہ اندھیروں کا تحقق رات ہی میں ہو' اس لئے کہ لاچاری بھی ایک اندھیرا ہے۔خطرہ بھی اندھیرا ہے۔خشکی اور سمندر کے غیبی واقعات جن کے انتظار میں پوری دنیا کی نظریں لگی ہوتی ہیں یہ بھی ظلمات ہوتے ہیں۔جب بھی انسان خشکی اور سمندر کی ان ظلمتوں میں گھرتا ہے تو اس کائنات میں انہیں صرف اللہ ہی حقیقی متصرف نظر آتا ہے۔ایسے حالات میں انسان بڑی عاجزی' یکسوئی اور نہایت ہی رازدارانہ طور پر صرف اللہ ہی کے سامنے دست بدعاء ہوتا ہے۔ایسے حالات میں فطرت انسانی اپنی اصل شکل میں تمام پردوں سے باہر آکر عیاں ہوتی ہے۔اس وقت فطرت کی گہرائیوں میں جو حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے وہ سامنے آتی ہے اور وہ حقیقت ہوتی ہے اللہ وحدہ لاشریک کی حاکمیت۔انسان حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اب اس کے ساتھ کسی کو شریک بھی نہیں ٹھہراتا۔ اس وقت انسان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ شرکیہ تصورات کس قدر بودے ہوتے ہیں۔اب شرک کا نام و نشان نہیں ہوتا اور جو لوگ اس کرب و الم میں مبتلا ہوتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے: "اگر اس بلا سے اس نے ہم کو بچا لیا تو ہم ضرور شکرگزار ہوں گے؟" اللہ تعالیٰ اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کو اصل حقیقت کی طرف متوجہ کریں:

(قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ (٦٤:٦)) کہو' اللہ تمہیں اس سے اور ہر تکلیف سے نجات دیتا ہے پھر تم دوسروں کو اس کا شریک ٹھہراتے ہو۔" اس کے اندر ہی انہیں یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ وہ پھر بھی شرک جیسے منکر کا ارتکاب کرتے ہیں اور تعجب خیز انداز میں الٹے پھرتے ہیں۔

---ooo---

یہاں انسانوں کو یہ صورت حال یاد دلائی جاتی ہے کہ اس نجات کے بعد بھی دوبارہ وہ ایسے ہی مشکل حالات میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔یہ بات نہیں ہے کہ یہ مشکلات صرف ایک بار ہی آنے والی تھیں۔یہ باری ان پر سے گزر گئی اور اب گویا وہ اللہ کے قبضہ قدرت سے نکل گئے ہیں۔اگر وہ ایسا سمجھتے ہیں تو یہ ان کی بھول ہے۔اس سلسلے میں ذیل کی آیت ملاحظہ ہو:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ

أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ۗ انْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝

"کہو' وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب اوپر سے نازل کر دے' یا تمہارے قدموں کے نیچے سے برپا کر دے' یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزہ چکھوا دے۔" دیکھو' ہم کس طرح بار بار مختلف طریقوں سے اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں شاید کہ یہ حقیقت کو سمجھ لیں"۔

اگر کوئی مصیبت سر کے اوپر آکر پڑتی ہے یا پاؤں کے نیچے سے کوئی مصیبت پھوٹتی ہے تو اس کا تصور دائیں بائیں سے آنے والی مصیبتوں سے زیادہ خوفناک ہوتا ہے اس لئے کہ انسان کی قوت واہمہ یہ سمجھتی ہے کہ وہ دائیں بائیں سے آنے والی مصیبت کا مقابلہ کر سکتا ہے لیکن جو عذاب سر کے اوپر سے نازل ہو یا جو عذاب پاؤں کے نیچے سے ابل پڑے وہ انسان کو ڈھانپ لیتا ہے' اسے متزلزل کر دیتا ہے' اور انسان کی محدود قوت پر غالب آ جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ٹھہرنا اور اس کا مقابلہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ انداز بیان ایسا ہے جو انسان کے شعور و احساس میں اس قوی فیکٹر کو اجاگر کرتا ہے اور انسان یہ یقین کر لیتا ہے کہ اللہ کا عذاب جب چاہے اور جس طرح چاہے انسان کو اپنے گھیرے میں لے سکتا ہے۔ اللہ کسی بھی وقت بندوں کو پکڑنے کی قدرت رکھتا ہے۔

اس آیت میں عذاب کی ان قسموں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد' عذاب کی ان اقسام کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے جو نہایت ہی دھیمی رفتار سے اور طویل زمانے کے بعد انسان پر آتی ہیں۔ ان اقسام کا عمل لمحہ بھر یا مختصر عرصے میں پورا نہیں ہو جاتا۔ یہ اقسام انسان کی ساتھی بن جاتی ہیں' انسان کی آبادی اور اس کی پوری زندگی میں رچ بس جاتی ہیں اور رات دن انسان کی رفیق سفر رہتی ہیں۔

(اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ (٦ : ٦٥)) "یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزہ چکھوا دے۔" اللہ کے دائمی اور طویل المدت عذاب کی یہ ایک اور شکل ہے۔ یہ عذاب انسانوں پر خود اپنے ہاتھوں آتا ہے اور وہ خود اسے گھونٹ گھونٹ پیتے ہیں' وہ یوں کہ اللہ انہیں گروہوں اور پارٹیوں میں تقسیم کر دیتا ہے' یہ گروہ اور احزاب ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں ہو جاتے ہیں' وہ ایک قسم کی پارٹیاں ہوتی ہیں' عوام ان فرقوں کے اندر فرق و امتیاز بھی نہیں کر سکتے۔ ان فرقوں کے درمیان جدل و جدال قائم رہتا ہے۔ ایک طویل دشمنی قائم ہو جاتی ہے اور ان میں سے ایک فرقہ دوسرے کے لئے بلائے جان ہوتا ہے۔

انسانیت نے اپنی تاریخ کے مختلف وقفوں میں اس قسم کے عذاب کو محسوس کیا ہے۔ جب بھی انسان نے اپنی اجتماعی زندگی سے اسلامی نظام حیات کو بدر کیا ہے' انسان اس عذاب میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ جب بھی اسلام کو ترک کر کے انسانوں نے اپنی خواہشات اور میلانات کی پیروی شروع کی ہے اور اپنی کوتاہیوں' کمزوریوں اور جہالتوں کو اپنا اصول بنایا ہے وہ اس قسم کے عذاب سے دوچار ہوئے ہیں۔ جب بھی لوگ راہ گم کر دیتے ہیں اور اپنے لئے خود نظام زندگی بنانے

لگتے ہیں' اپنے لئے رسم و رواج اور اجتماعی قوانین خود بنانے لگتے ہیں اور حسن و قبح کے پیمانے خود تجویز کرنے لگتے ہیں تو اس کے نتیجے میں انسانوں میں سے بعض لوگ بعض دوسرے انسانوں کے غلام بن جاتے ہیں۔ بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کے تجویز کردہ نظام زندگی کی اطاعت کریں۔ اور یوں وہ دوسروں کے غلام بن جائیں اور اس کے مقابلے میں بعض دوسرے لوگ اس نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یوں فریق اول ان مخالفین پر حتی المقدور مظالم ڈھانے لگتا ہے۔ اب دو فریق میدان میں ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی خواہشات' میلانات اور مقاصد و مفادات کے درمیان ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں وہ ایک دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھتے ہیں۔ بعض لوگ بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں' ایک دوسرے پر غصہ ہوتے ہیں اور ان سب تضادات کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ یہ دونوں فریق کسی ایک پیمانے پر متفق نہیں ہوتے۔ وہ پیمانہ معبود نے سب کے لئے تجویز کیا ہے جس کے مطابق تمام لوگ رب ذوالجلال کے بندے ہوتے ہیں۔ اس رب کے سامنے کوئی بھی جھکنے سے نہیں کتراتا نہ وہ اس عبادت اور جھکنے میں اپنے لئے کوئی سبکی محسوس کرتا ہے۔

اس کرۂ ارض پر سب سے بڑا فتنہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ یہ مطالبہ لے کر اٹھیں کہ دوسرے لوگ انہیں الٰہ سمجھتے ہوئے ان کی بندگی کریں اور ان کے حق حاکمیت کو تسلیم کریں۔ یہ وہ فتنہ ہے جس کی وجہ سے انسان گروہوں میں بٹ کر باہم دست و گریباں ہو جاتے ہیں اس لئے کہ بظاہر تو وہ ایک ہی قوم اور ایک امت نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ایک دوسرے کے غلام اور بندے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگوں کی ہاتھ میں اقتدار ہوتا ہے اور وہ اس اقتدار کے ساتھ چمٹے ہوئے ہوتے ہیں' اس لئے کہ اس اقتدار میں وہ اللہ کی شریعت کے پابند نہیں ہوتے۔ بعض دوسرے جن کے ہاتھ میں اقتدار نہیں ہوتا ان کے دل میں اہل اقتدار کے لئے نفرت اور بغض ہوتا ہے۔ یہ صاحبان اقتدار' دران سے اقتدار چھیننے کی فکر کرنے والے متربصین (گھات میں بیٹھنے والے) ایک دوسرے کی طاقت اور دشمنی کا مزہ چکھتے ہیں۔ یہ سب لوگ پارٹیوں میں بٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے نہ علیحدہ ہوتے اور نہ ہی ان کے درمیان کوئی فاصلہ ہوتا ہے۔ وہ ایک ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں------ آج اس کرۂ ارض پر تمام انسانیت اللہ کے اس عذاب میں مبتلا ہے اور یہ اللہ کا وہ عذاب ہے جو نہایت ہی دھیمی رفتار سے اپنا کام کرتا ہے۔

اس وقت اس کرۂ ارض پر اسلامی تحریک کا جو موقف ہے وہ قابل التفات ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس اسلامی تحریک کے موقف کو دنیا پر چھائی ہوئی جاہلیت سے بالکل علیحدہ اور ممتاز کر دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ جاہلیت ہے کیا؟ ہر صورت حال' ہر حکومت اور ہر معاشرہ جس پر اسلامی شریعت کی حکمرانی نہ ہو' وہ جاہلیت ہے۔ ہر وہ صورت حال جس میں اللہ وحدہ کی حاکمیت کو تسلیم نہ کیا جاتا ہو جاہلیت ہے۔ اس جاہلیت اور اسلامی تحریک کے موقف کے درمیان مکمل جدائی ضروری ہے۔ تحریک اسلامی کو ہر قوم اور ہر معاشرے کے اندر جو جاہلیت میں رہتی ہو اور جاہلی قوانین اور اقدار نافذ کرنا چاہتی ہو خود اپنا ایک مستقل اور جداوجود اور تشخص قائم کرنا چاہئے اور اسے جدا نظر آنا چاہئے۔

اسلامی تحریک عذاب الٰہی کی اس دھمکی کی زد سے صرف اس صورت میں نجات پا سکتی ہے کہ وہ شعوری 'نظریاتی' اور اپنے نظام زندگی کے اعتبار سے اہل جاہلیت سے مکمل طور پر علیحدہ ہو جائے۔ آیت کے یہ الفاظ "یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزہ چکھوا دے اس بات کا تقاضا کرتے ہیں۔" اور یہ مکمل جدائی

اور علیحدہ تشخص اس وقت تک قائم رہے جب تک اللہ ہمیں دارالاسلام قائم کرنے کی توفیق نہیں دے دیتا۔ اسلامی تحریک کے اندر یہ شعور زندہ رہنا چاہئے کہ وہی حقیقی امت مسلمہ ہے اور اس کے ارد گرد جو معاشرہ عملاً موجود ہے وہ ابھی تک اسلامی امت کا حصہ نہیں بنا ہے۔ یہ لوگ حاملین جاہلیت ہیں۔ اس نظریے اور اس منہاج پر تحریک اسلامی کو دوسرے لوگوں سے جدا ہونا چاہئے۔ اس کے بعد اسے بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہونا چاہئے کہ لے اللہ ہمارے اور ہماری اس قوم اور اس معاشرے کے اندر حق کے اوپر فیصلہ کر دے تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

اگر تحریک اسلامی یہ امتیاز اور جدائی اختیار نہیں کرتی تو مذکورہ بالا وعید اور دھمکی کی مستوجب ہوگی۔ وہ کسی مخصوص معاشرے میں ایک گروہ اور فرقہ بن جائے گی، اور یہ فرقہ بھی دوسرے فرقوں کے ساتھ خلط ملط ہو گا۔ اس کا کوئی علیحدہ تشخص نہ ہو گا اور نہ اپنے ماحول کے اندر ان کی کوئی امتیازی شان ہوگی۔ اس پر بھی وہ عذاب نازل ہو گا جو دوسرے لوگوں پر ہو گا اور یہ ایک دائم اور طویل عذاب ہو گا۔ اور یہ امید تک نہ رہے گی کہ اسے کوئی فتح اور نصرت نصیب ہوگی جس کا اللہ نے وعدہ کیا ہوا ہے۔

اپنے معاشرے سے مکمل جدائی اور امتیاز کی وجہ سے بعض اوقات بہت بڑی قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں اور مصائب کے پہاڑ بھی ٹوٹتے ہیں۔ لیکن یہ مصائب اور نقصانات ان مصائب اور نقصانات سے کہیں کم ہوتے ہیں جو اس صورت میں کسی اسلامی تحریک پر آتے جب وہ جاہلی معاشرے میں خلط ملط ہو اور اس کا موقف واضح اور ممتاز نہ ہو اور وہ جاہلی معاشرے میں مدغم اور پیوستہ رہے اور آخر کار ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد ہو جائے۔

اس نکتے کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم انبیاء و رسل کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔ رسولوں کی تاریخ سے یہ بات نظر آتی ہے کہ جب تک رسولوں کے متبعین نے اس وقت کے موجود جاہلی معاشرے سے اپنے آپ کو مکمل طور پر علیحدہ نہیں کر لیا، اس وقت تک انہیں وہ فتح اور نصرت حاصل نہیں ہوئی جس کا اللہ نے تمام رسولوں کے ساتھ وعدہ کیا ہوا ہوتا ہے کہ اہل ایمان اور رسول آخر کار غالب ہوں گے۔ کسی امت کو بھی غلبہ اور کامیابی اس وقت تک نصیب نہیں ہوئی جب تک وہ اس وقت کے جاہلی معاشرے سے کٹ کر علیحدہ نہیں ہوگئی۔ اور انہوں نے دوسرے لوگوں سے اپنا نظریہ اور نظم زندگی علیحدہ اور ممتاز نہیں کر لیا۔ اس علیحدگی اور امتیاز سے مراد یہ نہیں ہے کہ اسلامی تحریک لوگوں سے معاشرتی بائیکاٹ کر دے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اپنے نظریہ حیات اور اپنے دین اور نظام کے اعتبار سے ممتاز ہو۔ یہ وہ پوائنٹ ہے جس سے اسلامی تحریکوں اور دوسرے لوگوں کی راہ جدا ہو جاتی ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ دعوت اسلامی کا منہاج وہی ہو گا جس کے مطابق رسولوں نے دعوت دی۔ اس راہ میں وہی مقامات ہیں جو رسولوں کو پیش آئے۔

" (أُنظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ (٦:٦٥)) دیکھو، ہم کس طرح بار بار مختلف طریقوں سے اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں شاید کہ یہ حقیقت کو سمجھ لیں۔"

---ooo---

# درس نمبر ۶۳ ایک نظر میں

سابق لہر میں اہل حق و باطل کے درمیاں مکمل جدائی کے مضمون پر خاتمہ ہوا تھا۔ اس لہر میں اس کی مزید تفصیل دی گئی ہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم ہی تھی جس نے اس کتاب کو جھٹلایا جو آپ پر نازل ہوئی تھی اور وہ کتاب برحق تھی۔ اسی نکتے پر حضور ؐ اور آپ کی قوم کی راہیں جدا ہوگئیں اور آپ ؐ نے ان سے علیحدہ ہو کر اپنی راہ لی۔ آپ ؐ کو اللہ نے حکم دیا کہ آپ ان سے علیحدہ ہو جائیں اور اعلانیہ کہہ دیں کہ میں تمہارا حوالہ دار نہیں ہوں اور یہ کہ اب میں تمہیں تمہاری تقدیر کے حوالے کرتا ہوں اور تم برے انجام تک پہنچنے والے ہو' وہ عنقریب آنے والا ہے۔

رسول ؐ کو یہ بھی حکم دیا جاتا ہے کہ جب وہ اسلام پر نکتہ چینیاں کر رہے ہوں تو آپ ان کی مجلس میں نہ بیٹھیں' اس وقت جبکہ وہ دین اسلام کے ساتھ مذاق کر رہے ہوں اور دین اسلام کا شایان شان احترام نہ کر رہے ہوں۔ لیکن اس جدائی اور امتیاز کے ساتھ ساتھ حکم یہ ہے کہ انہیں انجام بد سے ڈرایا جاتا رہے اور وعظ و تبلیغ کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ یہ صورتحال بہرحال موجود رہنی چاہئے کہ اہل دعوت اور اہل جاہلیت ایک قوم ہونے کے ساتھ ساتھ دو الگ فرقے ہوں' دو علیحدہ امتیں ہوں۔ اس لئے کہ اسلام میں رنگ و نسل اور خاندان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہاں تو اتحاد و افتراق کا مدار نظریے' دین اور عقیدے کی اساس پر ہے۔ یہ نظریہ اور عقیدہ ہی ہوتا ہے جو نکتہ اتفاق یا مقام افتراق ہوتا ہے۔ جب دینی اساس پائی جائے تو لوگ متحد ہو جاتے ہیں اور جب دینی عنصر مفقود ہو تو تمام دوسرے روابط کٹ جاتے ہیں............ بس یہی اس لہر کا مختصر مضمون ہے۔

---○○○---

# درس نمبر ٦٣ تشریح آیات

## ٦٦ --- تا --- ٧٠

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿٦٦﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ؗ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٧﴾

"اور تمہاری قوم نے اس کا انکار کر دیا ہے حالانکہ وہ حقیقت ہے۔ ان سے کہہ دو کہ میں تم پر حوالہ دار نہیں بنایا گیا ہوں ہر خبر کے ظہور میں آنے کا ایک وقت مقرر ہے، عنقریب تم کو خود انجام معلوم ہو جائے گا"۔

یہاں روئے سخن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ اس خطاب کے ذریعے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آنے والے اہل ایمان کے کاسہ دل کو ایمان و یقین سے بھر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ ایک داعی کی پوری قوم اور پورا معاشرہ حق کو جھٹلا دے تب بھی اسے یقین ہوتا ہے کہ حق غالب رہے گا اس لئے کہ سچائی کے بارے میں فیصلہ کرنا اہل جاہلیت کا کام نہیں ہے، یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ حق اور باطل کا فیصلہ کرے۔ اللہ ہی ہے جو یہ اعلان کر سکتا ہے کہ فلاں چیز حق ہے اور فلاں چیز باطل۔ لہذا جھٹلانے والوں کے کسی فیصلے کی کوئی حقیقت اور حیثیت نہیں ہے۔

اس کے بعد حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی قوم سے دامن جھاڑ دیں اور اعلان کر دیں کہ وہ ان سے بری الذمہ ہیں اور یہ کہ اب ان کی اور ان کی قوم کی راہیں جدا ہو گئی ہیں اور یہ بھی اعلان کر دیں کہ وہ ان کے معاملے میں کسی چیز کے مختار و حوالہ دار نہیں ہیں اور نہ ان کی نگہبانی کے ذمہ دار ہیں۔ ان کا فریضہ اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب وہ پیغام پہنچا دیں اور سمجھا دیں کیونکہ ذمہ داری اور نگہبانی رسولوں کی ڈیوٹی میں شامل نہیں ہے۔ جب کوئی رسول پیغام پہنچا دے اور سمجھا دے تو اس کا فریضہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد رسول اقوام کو چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اپنے فطری انجام تک پہنچ جائیں، کیونکہ ہر بات اپنے مقررہ وقت پر ظاہر ہو جاتی ہے اور جب بات سامنے آجاتی ہے تو سب اسے جان لیتے ہیں۔

(لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (٦:٦٧)) ہر خبر کے ظہور میں آنے کا ایک وقت مقرر ہے، عنقریب تم کو خود انجام معلوم ہو جائے گا"۔ یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ کیا بات ہے جو ظاہر

ہونے والی ہے۔ ایسے مقامات پر بات کو مجمل رکھنا زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔ مارے ڈر کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔

آیات میں حق پر ثابت قدمی کی تلقین ہے۔یقین دلایا گیا ہے کہ باطل کا ظاہری غلغلہ جس قدر بھی ہو اس کا انجام بہرحال برا ہو گا اور ایک مقررہ وقت پر اللہ کی جانب سے اہل باطل کو پکڑا جاتا ہے اور یہ کہ ہربات کے ظہور کا وقت مقرر ہے اور ہرحاضر صورت حال کا ایک انجام سامنے آنے والا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ داعیان حق کو اپنی قوم کی جانب سے جس تکذیب اور سردمہری کا سامنا کرنا پڑتا ہے' ان پر اپنے خاندان کی جانب سے جو مظالم ہوتے ہیں'جس طرح وہ اپنے اہل و عیال میں بیگانے بن جاتے ہیں' انہیں جن اعصاب شکن حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے' ایسے حالات میں فی الواقعہ وہ ایسی ہی تسلی کے محتاج ہوتے ہیں' اس طرح ان کا کاسہ دل اطمینان اور یقین سے بھرجاتا ہے اور یہ اطمینان اور سکینت قرآن ہی ان کے دلوں میں پیدا کر سکتا ہے۔

جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تک یہ پیغام پہنچا دیا اور ان کی جانب سے ناروا تکذیب و انکار کا جواب ان کے ساتھ قطع تعلق کے ذریعے دے دیا گیا تو اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ان کی ہمنشینی اختیار نہ کریں' یہاں تک کہ تبلیغی مقاصد کے لئے بھی ان کے پاس نہ جائیں اگر حالات ایسے ہوں کہ وہ اسلام پر تنقید اور نکتہ چینیاں کر رہے ہوں اور عزت و احترام اور سنجیدگی سے اسلامی موضوعات پر بحث نہ کر رہے ہوں۔اسلام جس سنجیدہ عزت و وقار اور رعب و داب کا تقاضا کرتا ہے وہ اس کا لحاظ نہ کر رہے ہوں بلکہ الٹا دین کے ساتھ مذاق کر رہے ہوں اور ہنسی مزاح کے ساتھ ریمارکس پاس کر رہے ہوں چاہے اپنی زبان سے وہ ایسا کر رہے ہوں یا عمل کے ساتھ۔ایسے حالات میں حکم دیا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ ہم نشینی اختیار نہ کی جائے کیونکہ اس طرح معنوی اعتبار سے ہم نشینی کرنے والا ان باتوں کا تائید کنندہ تصور ہو گا یا کم ازکم یہ تصور ہو گا کہ ایسے شخص کے اندر کوئی دینی غیرت نہیں ہے۔اگر شیطان کسی مسلمان کو بھلاوے میں ڈال دے اور وہ ایسی محفل میں بیٹھ جائے تو یاد آتے ہی اس کا فرض ہے کہ وہ وہاں سے اٹھ کھڑا ہو۔

وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖ ؕ وَاِمَّا یُنْسِیَنَّکَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّکْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۶۸﴾

''اور اے نبی ؐ' جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ' یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں لگ جائیں۔اور اگر کبھی شیطان تمہیں بھلاوے میں ڈال دے تو جس وقت تمہیں اس غلطی کا احساس ہو جائے اس کے بعد پھر ایسے ظالم لوگوں کے پاس نہ بیٹھو''۔

یہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھا۔یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے بعد آنے والے مسلمان بھی اس میں شامل ہوں۔یہ حکم مکی دور کے لئے تھا۔اس وقت آپ کا کام صرف دعوت و تبلیغ تک محدود تھا اور اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ آپ جہاد و قتال سے باز رہیں۔آپ کو یہ ہدایت تھی کہ آپ مشرکین کے ساتھ تصادم سے باز رہیں۔چنانچہ اس

دور میں آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ آپ جب دیکھیں کہ مشرکین کی کسی مجلس میں دین اسلام کے خلاف بدتمیزی ہو رہی ہے تو آپ ایسی مجالس میں بیٹھنے سے اجتناب فرمائیں اور اگر کبھی ایسا ہو کہ شیطان آپ کو بہلاوے میں ڈال دے اور آپ کسی ایسی مجلس میں پہنچ جائیں اور وہاں اسلام کے بارے میں گستاخانہ باتیں ہو رہی ہوں تو آپ یاد آتے ہی وہاں سے اٹھ کھڑے ہوں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ اہل اسلام سب کو یہی حکم تھا۔ یہاں ظالمون سے مراد مشرکون ہے جیسا کہ اس سے پہلے ہم کہہ چکے ہیں۔ قرآن کریم کا یہ عام انداز گفتگو ہے۔

لیکن جب مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو اس وقت مشرکین کے مقابلے میں حضور ؐ کی پوزیشن مختلف تھی۔ اب پوزیشن یہ تھی کہ حضور ؐ ان کے مقابلے میں اس وقت تک جہاد و قتال جاری رکھے ہوئے تھے جب تک تمام فتنوں کا استیصال نہیں کر دیا جاتا اور کسی کو یہ جرأت ہی نہیں رہتی کہ وہ آیات الہیہ کے خلاف کوئی ہرزہ سرائی کرے۔

اس کے بعد سیاق کلام مومنین اور مشرکین کے درمیان مکمل فرق و امتیاز کی بات کو پھر دہراتا ہے جس طرح اس سے قبل رسول ؐ اللہ اور مشرکین کے درمیان جدائی کا فیصلہ ہوا تھا۔ یہاں فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ دونوں کے انجام اور ذمہ داریوں میں بھی فرق ہے۔

وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَلَٰكِن ذِكْرَىٰ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿٦٩﴾

"ان کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمہ داری پرہیزگار لوگوں پر نہیں ہے، البتہ نصیحت کرنا ان کا فرض ہے شاید کہ وہ غلط روی سے بچ جائیں"۔ اسلامی نظام میں متقین اور مشرکین کے درمیان کوئی مشترکہ ذمہ داری نہیں ہے کیونکہ متقین اور مشرکین دو علیحدہ علیحدہ امتیں ہیں۔ اگرچہ رنگ و نسل اور قوم و حکومت میں وہ ایک ہوں۔ کیونکہ اسلامی پیمانے کے مطابق رنگ، نسل اور قوم کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اہل تقویٰ ایک امت ہیں اور ظالم اور مشرک بالکل ایک دوسری امت ہیں۔ ظالموں کے حساب و کتاب میں سے کسی چیز کی ذمہ داری اہل تقویٰ پر نہیں ہے۔ ہاں ان کی ذمہ داری اس حد تک ضرور ہے کہ وہ ظالموں کی اصلاح کے لئے سعی کرتے رہیں تاکہ وہ بھی ان کی طرح اہل تقویٰ بن جائیں اور ان کی امت کا حصہ بن جائیں۔ اگر اہل تقویٰ اور اہل ظلم کے درمیان نظریاتی اتحاد نہیں ہو جاتا تو پھر ان کے درمیان کسی اور بات پر اشتراک نہیں ہو سکتا۔

یہ ہے دین اسلام اور یہ ہے اللہ کا کلام۔ اگر کوئی اس کے سوا کوئی اور بات کرتا ہے یا کوئی اور طرز عمل اختیار کرتا ہے تو یہ فعل اس کا اپنا ہوگا لیکن اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اپنے اس طرز عمل کے سبب دین اسلام سے خارج بھی ہو سکتا ہے۔ ذرا مزید مطالعہ کیجئے، قرآن کریم کچھ مزید ہدایات دیتا ہے، اہل حق و اہل باطل کے درمیان مکمل جدائی کی کچھ مزید حدود و قیود بیان کی جاتی ہیں۔

وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ

الدُّنْيَا وَ ذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا
ع ۸ ۱۴ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

”چھوڑو ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے اور جنہیں دنیا کی زندگی فریب میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔ہاں مگر یہ قرآن سنا کر نصیحت اور تنبیہ کرتے رہو کہ کہیں کوئی شخص اپنے کئے ہوئے کرتوتوں کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے' اور اگر گرفتار بھی اس حال میں ہو کہ اللہ سے بچانے والا کوئی حامی و مددگار اور کوئی سفارشی اس کے لئے نہ ہو' اور اگر وہ ہر ممکن چیز فدیہ میں دے کر چھوٹنا چاہے تو وہ بھی اس سے قبول نہ کی جائے۔کیونکہ ایسے لوگ تو خود اپنی کمائی کے نتیجے میں پکڑے جائیں گے' ان کو تو اپنے انکار حق کے معاوضہ میں کھولتا ہوا پانی پینے کو اور دردناک عذاب بھگتنے کو ملے گا“۔اس میں ہم درج ذیل حقائق کے سامنے کھڑے ہیں :

ایک یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ان لوگوں سے قطع تعلق کر لیں جو آپ کے دین اور اسلامی نظام کے ساتھ ٹھٹھا مذاق کرتے ہیں اور آپ کے بعد اہل ایمان کے لئے بھی یہی ہدایت آتی ہے اور یہ قطع تعلق اور جدائی بات چیت میں بھی ہوتی ہے اور عمل میں بھی۔جو لوگ دین اسلام کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنا کر' اپنے لئے ماخذ نظریات قرار دے کر' اپنے لئے نظام عمل بنا کر' اپنے لئے نظام اخلاق اور اپنے لئے نظام قانون قرار دے کر اس کا صحیح مقام نہیں دیتے اور اسے پروقار نہیں بناتے وہ بھی دراصل اس دین کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔جو لوگ اس دین کے موضوعات پر بحث کرتے ہیں' اسلامی شریعت پر کلام کرتے ہیں اور اس دین کی طرف قابل تضحیک اوصاف کی نسبت کرتے ہیں وہ بھی دین کے ساتھ مذاق کرنے والوں میں شامل ہیں۔مثلاً وہ لوگ جو غیب کے بارے میں باتیں کرتے ہیں اور عالم غیب کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں حالانکہ ایمان بالغیب اصول عقائد میں سے ہے اور جو لوگ زکوٰۃ کے ساتھ مزاح کرتے ہیں حالانکہ وہ دین کی بنیادوں میں سے ہے۔اور جو لوگ شرم و حیاء اور عفت و پاکیزگی کے ساتھ مزاح کرتے ہیں حالانکہ یہ اصول دین میں سے ہیں۔یہ لوگ اپنی تقریروں اور تحریروں میں انہیں قرون اولیٰ کے زرعی اور جاگیردارانہ اخلاق میں سے قرار دیتے ہیں یا انہیں بورژوا اخلاق قرار دیتے ہیں اور جو لوگ حقوق الزوجین کے بارے میں تحقیر آمیز ریمارکس پاس کرتے ہیں اور جو لوگ عورت کے لئے مقرر اصول عفت و پاکیزگی کو عورت کی پسماندگی اور اس کا استحصال قرار دیتے ہیں اور سب سے آخر میں اور تمام باتوں سے پہلے وہ انسانوں کی پوری زندگی میں اللہ کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتے اور انسان کی سیاسی' اجتماعی' اقتصادی اور قانونی زندگی میں اللہ کی حاکمیت کے قائل نہیں ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ ان شعبوں میں لوگ اللہ کی شریعت سے بغاوت کرتے ہوئے اپنے اختیارات استعمال کر سکتے ہیں۔یہ سب

لوگ اس آیت کے مفہوم میں داخل ہیں اور اللہ کے دین کے ساتھ ٹھٹھا مذاق کرنے والے سمجھے جائیں گے۔ اس لئے ہر مسلمان کو حکم ہے کہ وہ ماسوائے تبلیغی مقاصد کے ان لوگوں سے دور رہے اس لئے کہ یہ لوگ ظالم اور مشرک ہیں اور ان کافروں میں سے ہیں جو اپنے کفریہ اعمال میں گرفتار ہونے والے ہیں اور قیامت میں ان کی تواضع کھولتے ہوئے پانی سے کی جائے گی اور وہ دردناک عذاب میں رہیں گے' اس لئے کہ یہ لوگ مذکورہ کفریہ روش میں مبتلا تھے۔

دوسری حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ ایسے لوگوں کو ایک طرف چھوڑ دیں اور یہی حکم آپ کے بعد آنے والے اہل ایمان کے لئے بھی باقی ہے۔ لیکن حضور کو اس مقاطعہ کے ساتھ ساتھ یہ ہدایت بھی دی گئی کہ وہ لوگ جنہوں نے اس دین کے ساتھ ہنسی مذاق کو اپنا شیوہ بنا رکھا ہے اور انہیں دنیا کی اس عارضی زندگی نے فریب میں ڈال دیا ہے انہیں نظرانداز کرتے ہوئے بھی' انہیں یاد دہانی کراتے جائیں۔ انہیں ڈراتے رہیں کہ وہ جو کچھ برائیاں سمیٹ رہے ہیں ان کا وبال ان کی جان پر ہو گا اور ایک وقت آنے والا ہے جس میں وہ اللہ سے ملیں گے اور اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار نہ ہو گا جو کچھ بھی تعاون کر سکے۔ نہ کوئی ان کا سفارشی ہو گا' نہ ان سے کوئی مالی تاوان قابل قبول ہو گا جس کے ذریعے وہ اپنی جان کو ان باتوں سے چھڑا سکیں جن کا انہوں نے دنیا میں ارتکاب کیا۔ یہ مفہوم قرآن کریم نے جن الفاظ میں ادا کیا ہے' ان کی خوبصورتی اور معنوی گہرائی قابل غور ہے۔ ذرا دوبارہ تلاوت کیجئے۔

(وَذَكِّرْ بِهِ أَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ وَإِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَا يُؤْخَذْ مِنْهَا (۶ : ۷۰)) ہاں مگر یہ قرآن سنا کر نصیحت اور تنبیہ کرتے رہو کہ کہیں کوئی شخص اپنے کیے کرتوتوں کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے۔ اور گرفتار بھی اس حال میں ہو کہ اللہ سے بچانے والا کوئی حامی و مددگار اور کوئی سفارشی اس کے لئے نہ ہو اور اگر وہ ہر ممکن چیز فدیہ میں دے کر چھوٹنا چاہے تو وہ بھی اس سے قبول نہ کی جائے"۔ ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت میں ماخوذ ہو گا' ذمہ داری انفرادی ہو گی اور اپنے اعمال کی بنیاد پر ہو گی اور ایسے حالات میں ہو گی کہ جہاں اللہ کے سوا کوئی ولی اور سفارش کرنے والا نہ ہو گا اور اگر کوئی ممکن حد تک زیادہ معاوضہ و تاوان دینا چاہے تو بھی قبول نہ ہو گا اور یوں وہ کسی صورت میں بھی گردن نہ چھڑا سکے گا۔

رہے وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین کو مذاق کا نشانہ بنایا اور دنیا کی چند روزہ حیات سے دھوکہ کھا گئے تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی کو گروی رکھ دیا اپنی بداعمالیوں کے ہاتھ' اور اس وجہ سے ان پر وہ عذاب ثابت ہو گیا جس کا تذکرہ اس آیت میں ہوا اور ان کا انجام یہ قرار پایا:

أُولَئِكَ الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ (۶ : ۷۰)) کیونکہ ایسے لوگ تو خود اپنی کمائی کے نتیجے میں پکڑے جائیں گے' ان کو تو اپنے انکار حق کے معاوضے میں کھولتا ہوا پانی پینے کو اور دردناک عذاب بھگتنے کو ملے گا"۔ گویا وہ اپنے افعال بد کی وجہ سے پکڑے گئے اور یہ

ان کے لئے مناسب سزا تھی، کیسی جزاء؟ ایسا گرم پانی جو ان کے حلق اور پیٹ کو بھون ڈالے گا۔ ان کے کفریہ اعمال کی وجہ سے یہ ان کے لئے ایک دردناک عذاب ہو گا اور یہ عذاب اس بات کی دلیل ہو گا کہ وہ دین کے ساتھ مذاق کرتے رہے۔

تیسری بات اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اللہ کا سچا دین فی الحقیقت ان کا دین ہے۔ (دینھم) سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین میں داخل ہو گئے ہیں اور داخل ہونے کے بعد انہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے۔ مدینہ طیبہ میں اس قسم کے لوگ موجود تھے اور عرف عام میں انہیں منافقین کہا جاتا تھا۔ مدینہ طیبہ میں تو بات ایسی ہی تھی۔

سوال یہ ہے کہ آیا اس آیت کا اطلاق ان لوگوں پر بھی ہو گا مثلاً مشرکین جو دین اسلام میں داخل نہیں ہوئے۔ ہاں ان پر بھی ہو گا اس لئے کہ حقیقی دین' دین اسلام ہی ہے۔ یہ پوری بشریت کا دین ہے چاہے کوئی اس پر ایمان لائے یا نہ لائے۔ اس لئے کہ جو شخص اس دین کا انکار کرتا ہے اسے چھوڑ دیتا ہے تو وہ درحقیقت خود اپنے دین کو چھوڑتا ہے۔ اس لئے کہ یہی تو دین ہے جو اللہ کے نزدیک دین ہے اور خاتم النبین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اللہ کی جانب سے صرف یہی دین مقبول ہے۔

یہی مفہوم ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دین کی نسبت ان کی طرف کی ہے کہ یہ ان کا دین ہے۔

(وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا(۷:۷۰))

"چھوڑو ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے اور جنہیں دنیا کی زندگی فریب میں مبتلا کئے ہوئے ہے"۔ جیسا کہ ہم نے وضاحت کی اس آیت میں اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے کہ دین اسلام تمام انسانوں کا دین ہے۔ لہٰذا جو شخص دین اسلام کو کھیل اور تماشا بناتا ہے گویا وہ خود اپنے دین کے ساتھ مذاق کرتا ہے۔ اگرچہ ایسا کرنے والا شخص مشرک ہو۔

چہارم یہ کہ ظالموں اور مشرکوں کی ہم نشینی کس قدر جائز ہے؟ اور جو لوگ دین اسلام کو کھیل تماشا بناتے ہیں ان کے ساتھ مجالست کی حدود کیا ہیں؟ یہ مجالست صرف وعظ و نصیحت کی خاطر جائز ہے اور اس کے سوا ایسے لوگوں کے ساتھ کسی قسم کا تعلق جائز نہیں ہے۔ یعنی ایسے حالات میں جب وہ آیات الٰہی کے ساتھ مذاق کر رہے ہیں اور نکتہ چینی کر رہے ہوں اور یہ نکتہ چینی اور مذاق مختلف انداز میں ہو سکتا ہے۔

امام قرطبی نے اپنی تفسیر جامع الاحکام میں اس سلسلے میں لکھا ہے کہ "اس آیت میں بصراحت اس نظریے کی تردید آجاتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ راہنمایان دین اور ان کے متبعین بطور تقیہ فاسقین کے ساتھ ہم نشینی اختیار کر سکتے ہیں اور ان کی غلط آراکی تصدیق بطور تقیہ کر سکتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ فاسقین اور مفسدین کی مجالس میں وعظ و تذکیر کی خاطر بھی ان حدود و قیود کے ساتھ ہم بیٹھ سکتے ہیں جن کا تذکرہ اس آیت میں ہو چکا ہے۔ رہی یہ بات کہ فساق و فجار کی مجالس میں بیٹھنا اور ان کی بری اور مفسدانہ باتوں پر سکوت اختیار کرنا اور بطور تقیہ ایسا کرنا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے کیونکہ یہ تو کھلے طور پر باطل کا اقرار ہے اور حق کے خلاف شہادت ہے اور لوگوں کو دھوکے میں ڈالنا ہے۔ نیز اس طرز عمل میں دین کی بھی توہین ہے اور جو لوگ دین

کا کام کرتے ہیں ان کی بھی توہین ہے۔ لہٰذا ایسے حالات میں بیٹھنا منع ہو گا اور ایسی مجالس کو چھوڑنا فرض ہو گا۔

امام قرطبی نے بعض دوسرے اقوال بھی نقل کئے ہیں: "ابن خویز مقداد کہتے ہیں کہ جو شخص آیات الٰہی کے بارے میں گستاخانہ کلام کرے اس کی مجلس سے فوراً واک آؤٹ کرنا چاہئے خواہ یہ شخص مومن ہو یا کافر۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ائمہ نے دشمن کی سرزمین میں جانے سے منع کیا ہے۔ اسی طرح گرجوں اور مندروں میں جانے سے بھی منع کیا گیا ہے اور کفار اور بدعتیوں کے ساتھ ہم نشینی کی بھی ممانعت کی گئی ہے۔ نیز یہ بات بھی منع ہے کہ کوئی ان سے محبت و دوستی کرے' ان کی باتیں سنے اور ان کے ساتھ مناظرے کرے۔ روایات میں آیا ہے کہ بعض بدعتی لوگوں نے ابو عمران نخعی سے کہا کہ میری بات سنو تو انہوں نے ان سے منہ پھیر لیا اور کہا میں تمہاری آدھی بات سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں"۔ اسی قسم کی بات ایوب سختیانی سے بھی منقول ہے اور فضیل ابن عباس نے کہا ہے: جو شخص کسی صاحب بدعت کے ساتھ دوستی رکھے گا' اس کے اعمال تباہ ہو جائیں گے اور یوں اس کے دل سے اسلام خارج ہو جائے گا۔ جس شخص نے کسی مبتدع شخص کو رشتہ دیا تو اس نے قطع رحم کیا اور جو شخص بدعتی لوگوں کے ساتھ بیٹھے گا وہ دانشمندی سے محروم کر دیا جائے گا۔ اگر اللہ کو معلوم ہوا کہ فلاں بندہ بدعتی کو بری نظروں سے دیکھتا ہے تو مجھے امید ہے کہ ایسے شخص کو اللہ بخش دے گا۔ ابو عبداللہ حاکم نے حضرت عائشہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس شخص نے بدعتی کی عزت افزائی کی اس نے اسلام کو منہدم کرنے کے کام میں معاونت کی"۔

یہ باتیں تو اس شخص کے بارے میں ہیں جو بدعتی ہو' البتہ دین اسلام کا پیروکار ہو' رہا وہ شخص جو اپنے لئے اللہ کی خصوصیات میں سے ایک صفت کا دعویٰ کرتا ہو' مثلاً صفت حاکیت تو وہ بدعتی سے بھی بڑا مجرم ہے اور جو شخص ایسے شخص کو اس صفت کے ساتھ متصف کرتے ہیں وہ اس سے بھی بڑے مجرم ہیں۔ یہ جرم محض ارتکاب بدعت جیسا جرم نہیں ہے بلکہ کفر اور شرک جیسا بڑا جرم ہے۔ کسی شخص کو صفت حاکیت سے متصف کرنا سلف صالحین کے دور میں نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے اس نکتے پر بحث نہیں کی۔ تاریخ اسلام میں کسی وقت بھی کسی نے اپنے آپ کو اللہ کے بالمقابل حاکم نہیں سمجھا اور نہ حاکیت خود یا حاکیت عوام کا دعویٰ کیا ہے اور ساتھ ہی وہ مسلمان ہونے کا بھی مدعی ہو۔ شرق اوسط پر فرانسیسی حملے سے پہلے عالم اسلام میں اللہ کی حاکیت کا نظام قائم تھا۔ فرانسیسی حملے کے بعد ہی لوگ اللہ کی حاکیت کے دائرے سے خارج ہوئے ہیں۔ ہاں بعض لوگ ایسے تھے جو اس سے بچے رہے۔ لہٰذا اقوال سلف میں سے ایسے اقوال کم ملتے ہیں جن کا انطباق ہم اس جدید صورت حالات پر کر سکیں اس لئے کہ یہ جدید صورت حال ایسی ہے کہ اس میں مسلمان شرعی حدود کو دور پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۶۴ ایک نظر میں

یہ لہر حقیقت الوہیت اور خصوصیات ذات کبریائی کے بیان میں ایک نہایت ہی موزوں زمزمہ ہے۔اس میں ایسے شخص کے بارے میں بڑی شدت کے ساتھ سمجھایا گیا ہے جو راہ ہدایت پانے کے بعد دوبارہ شرک کے اندھیروں میں داخل ہو جائے اور آگے بڑھنے کے بعد رجعت قہقری اختیار کر لے یا دین اسلام کو ترک کر کے مرتد ہو جائے۔ایسے شخص کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے جیسے وہ ایک صحرا میں کھڑا ہے اور اسے اپنی منزل مقصود کی طرف جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔اس فیصلے اور قرار داد پر کہ ہدایت وہی ہے جو اللہ کی راہنمائی پر مبنی ہو' اس لہر کا میٹھا نغمہ اپنے طویل ترنم کے ساتھ اس بات پر ختم ہو جاتا ہے کہ تخلیق اور نظام حکومت (امر) کے بارے صرف اللہ وحدہ کو تمام اختیارات حاصل ہیں۔اس اختیار کلی کا اظہار اس وقت ہو گا جب نفخ صور کے دن مومن و کافر سب کو اپنی اپنی قبر سے اٹھایا جائے گا سب کے سب اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے تو اس وقت جس کا عقیدہ نہیں تھا وہ بھی یقین سے جان لے گا کہ اب تو تمام اختیارات اللہ وحدہ کے ہاتھ میں ہیں اور اب تمام معاملات اسی کی طرف لوٹ آئے ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۶۴ تشریح آیات

## ۷۱ --- تا --- ۷۳

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُنَا وَ لَا یَضُرُّنَا وَ نُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّیٰطِیْنُ فِى الْاَرْضِ حَیْرَانَ ۪ لَهٗۤ اَصْحٰبٌ یَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۱﴾ وَ اَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ

"اے نبی" ان سے پوچھو کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان؟ اور جب کہ اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا چکا ہے تو کیا اب ہم الٹے پاؤں پھر جائیں؟ کیا ہم اپنا حال اس شخص کا سا کر لیں جسے شیطانوں نے صحرا میں بھٹکا دیا ہو اور وہ حیران و سرگرداں پھر رہا ہو درآں حالیکہ اس کے ساتھی اسے پکار رہے ہوں کہ ادھر آ یہ سیدھی راہ موجود ہے؟ کہو "حقیقت میں صحیح راہنمائی تو صرف اللہ ہی کی رہنمائی ہے اور اس کی طرف سے ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ مالک کائنات کے آگے سراطاعت خم کر دو' نماز قائم کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو۔"

اس سورہ میں بار بار مضراب قل سے ضربات لگائی جا رہی ہیں۔ یہ نہایت ہی پر تاثیر طرز خطاب ہے جس سے یہ تاثر دیا جانا مطلوب ہے کہ حلال و حرام کے حدود و قیود کے تعین کا اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو محض مبلغ اور انجام بد سے ڈرانے والے ہیں۔ اس انداز کلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ نہایت ہی اہم' بڑا اور خوفناک ہے۔ یہ تصورات جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پیش فرما رہے ہیں یہ ان کی ڈیوٹی ہے اور انہیں خدا کی جانب سے امر ہے کہ وہ ایسا کریں۔

(قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا یَنْفَعُنَا وَلَا یَضُرُّنَا (٦ : ٧١)) اے نبی" ان سے پوچھو کیا

ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان؟" لوگ اللہ کے سوا اوروں کو پکارتے تھے اور ان سے امداد طلب کرتے تھے۔ ان کی اس حرکت کو برا سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے نبی "ان سے صاف صاف کہہ دو کہ تم نے جو ان لوگوں کی اطاعت اختیار کر رکھی ہے وہ تمہارے نفع و نقصان کے مالک ہی نہیں۔ تم ان لوگوں کو کیوں پکارتے ہو؟ غیراللہ سے مراد یہاں 'بت' آستانے بھی ہیں' درخت و پتھر بھی ہیں' روحانی مخلوق اور فرشتے بھی ہیں اور انسان و شیاطین بھی ہیں۔ یہ سب کے سب اس لحاظ سے برابر ہیں کہ ان کے قبضے میں کسی کا نفع و نقصان نہیں ہے۔ وہ اس پوزیشن سے بہت دور ہیں کہ کسی کو نفع و نقصان پہنچا سکیں۔ اس دنیا میں تمام حرکات و سکنات اور سب کا نفع و نقصان اللہ کی تقدیر کے مطابق ظاہر ہوتا ہے۔ اللہ کا اذن نہ ہو تو کوئی واقعہ نہیں ہو سکتا اور جو کچھ واقعہ ہو جاتا ہے وہ اللہ کی تقدیر اور رضا کے مطابق ہوتا ہے' اللہ کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

غیراللہ کو پکارنا' غیراللہ کی بندگی کرنا اور غیراللہ سے استعانت طلب کرنا قابل نفرت کام ہے۔ غیراللہ کے سامنے عاجزی کرنا اور اللہ کے سوا دوسروں کے لئے تمام ایسے نظریات اور اعمال کھوٹے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تردید و نکیر ان باتوں کو دیکھ کر ہو جس پر مشرکین عمل پیرا تھے یا یہ تردید ان کی اس تجویز کی تردید کرتے ہوئے آئی ہو جس میں وہ لوگ تجویز کرتے تھے کہ ہم حضور ؐ کے خدا کی عبادت شروع کر دیں گے بشرطیکہ حضور ؐ ہمارے الہوں کی عبادت میں شریک ہوں۔ بہرحال یہ از خود تردید ہو یا ان کی کسی تجویز کا رد ہو دونوں صورتوں میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مشرکین کے ساتھ مکمل نظریاتی قطع تعلق کر لیں۔ مشرکین کے نظریات اور عمل دونوں عقل انسانی کی رو سے نہایت کمزور اور بودے ہیں بشرطیکہ روشن فکری کے ماحول میں عقل کو دعوت فکر دی جائے اور رسم و رواج اور موروثی روایات کی تہوں کے نیچے عقل دبی ہوئی نہ ہو جیسا کہ حضور ؐ کے دور میں لوگوں کا شعور ماحول میں دبا ہوا تھا۔

ان مشرکانہ معتقدات اور اعمال کو یہاں ان ہدایات کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دیں تاکہ اسلامی ہدایات کے بالمقابل ان کا کھوٹ اور ان کا قابل نفرت ہونا اچھی طرح واضح ہو جائے' کیونکہ اللہ نے یہ ہدایت دی ہے کہ صرف اللہ وحدہ کی عبادت کی جائے صرف اسے ہی الٰہ اور حاکم تسلیم کیا جائے اور بلاشرکت غیرے اس کے تجویز کردہ نظام زندگی کو قبول کیا جائے۔ ذرا انداز کلام ملاحظہ ہو۔ "اے نبی " ان سے پوچھو کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان۔" اگر ہم ایسا کریں تو یہ صحیح معنوں میں ارتداد ہو گا' الٹے پاؤں پھرنا ہو گا' رجعت پسندی ہو گی۔ ترقی پسندی اور آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے لوٹنا ہو گا' کیونکہ اسلام نام ہی ترقی پسندی کا ہے۔

(وَنُرَدُّ عَلٰٓی اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ (٦ : ٧١)) "اور جب کہ اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا چکا ہے تو کیا اب ہم الٹے پاؤں پھر جائیں؟" اس کے بعد ایک اور متحرک اور مشخص منظر اسکرین پر آتا ہے۔

(كَالَّذِی اسْتَهْوَتْهُ الشَّیٰطِیْنُ فِی الْاَرْضِ حَیْرَانَ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ یَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَی الْهُدَی ائْتِنَا (٦ : ٧١)) کیا ہم اپنا حال اس شخص کا سا کر لیں جسے شیطانوں نے صحرا میں بھٹکا دیا ہو اور وہ حیران و سرگرداں پھر رہا ہو درآں حالیکہ اس کے ساتھی اسے پکار رہے ہوں کہ ادھر آ' یہ سیدھی راہ موجود ہے؟" ضلالت و

گمراہی اور حیرانی و پریشانی کا یہ ایک متحرک اور جیتا جاگتا منظر ہے جو شخص عقیدۂ توحید کے بعد شرک اختیار کرتا ہے۔جس کا ضمیر رب واحد اور ارباب متفرقہ کے درمیان گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے' وہ عموماً ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے اور فیصلہ نہیں کر پاتا کہ کون سی راہ اختیار کرے۔ غرض یہ ایک ایسی بدبخت مخلوق خدا کا منظر ہے "جسے شیطان نے صحرا میں بھٹکا دیا ہو۔لفظ استہوتہ اپنے مفہوم کی تصویرکشی خود ہی کر دیتا ہے۔اگر وہ ایک راہ لیتا تو کوئی بات نہ تھی۔کسی ایک راہ پر پڑ جاتا چاہے وہ گمراہی کی راہ ہوتی' لیکن یہاں وہ جس صورت حال سے دوچار ہے وہ یہ ہے کہ دوسری جانب سے اس کے کچھ ساتھی ہدایت یافتہ ہیں اور وہ اسے راہ راست کی طرف بلاتے ہیں اور بار بار پکارتے ہیں کہ آؤ بھائی ادھر آؤ۔وہ اس شیطانی بے راہ روی اور دوستوں کی پکار کے درمیاں حیران و پریشان کھڑا ہے۔ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کدھر جائے اور دونوں پکارنے والوں میں سے کس کی راہ کا انتخاب کرے۔وہ اس نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہے اور قرآن کے الفاظ کے درمیان سے اس شخص کی ذہنی اذیت واضح طور پر نظر آتی ہے۔

میں جب بھی اس آیت کی تلاوت کرتا تو سوچتا رہتا کہ اس ذہنی کھینچاتانی' کشمکش اور تذبذب کی وجہ سے انسان کس عذاب میں مبتلا ہوتا ہوگا۔ایسے افراد کا ایک ذہنی نقشہ سامنے آجاتا ہے لیکن یہ صرف ذہنی تصور ہی ہوتا ہے جبکہ عملی زندگی میں' ہمارے سامنے بعض لوگوں کے حقیقی حالات بھی آئے ہیں جن پہ یہ منظر پوری طرح چسپاں ہوتا ہے اور وہ لوگ اس عذاب میں مبتلا نظر آتے ہیں۔یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلامی نظریہ حیات کو تو پالیا تھا اور اس میں اپنی ذہنی و عملی بساط کے مطابق معرفت بھی حاصل کی مگر اس کے بعد وہ الٹے پاؤں پھرے اور کھوٹے اور جھوٹے الٰہوں کی پرستش اور اطاعت کرنے لگے۔یہ اطاعت انہوں نے خوف اور لالچ کی وجہ سے کی۔میں نے دیکھا کہ وہ ایسی ہی کربناک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ایسے لوگوں کے عملی حالات کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ اس آیت کا حقیقی مفہوم کیا ہے اور قرآن کریم کا یہ انداز بیاں کس قدر جامع اور مؤثر ہے۔

ابھی یہ خوفناک منظر آنکھوں کے سامنے تھا اور اس برے انجام کو دیکھ کر دل مومن کانپ ہی رہا تھا کہ صراط مستقیم دکھا دیا جاتا ہے اور فیصلہ کن حکم دیا جاتا ہے۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (٧١) وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ (٦: ٧٢ - ٧١) "کہو' حقیقت میں صحیح رہنمائی تو صرف اللہ ہی کی رہنمائی ہے اور اس کی طرف سے ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ مالک کائنات کے آگے سر اطاعت خم کر دو' نماز قائم کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو۔" نہایت ہی مناسب نفسیاتی حالات میں یہ فیصلہ کن بات ہے۔اس لئے کہ جب انسان یہ مشاہدہ کرتا ہے کہ اس کے سامنے حیرانی اور کشمکش کی ایک تصویر چل رہی ہے' اسے کوئی سکون و قرار حاصل نہیں ہے اور وہ سخت ترین اذیت کا شکار ہے تو ایسے حالات کو دیکھ کر کوئی بھی قاری اس بات کے لئے آمادہ ہوتا ہے کہ وہ فیصلہ کن اور مطمئن کر دینے والی بات کو قبول کرے اور راحت و سکون کی تلاش کرے۔یہ فیصلہ کن بات کیا ہے؟ یہ ہے سچائی۔"راہنمائی تو صرف اللہ کی راہنمائی ہے۔" هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى کی ترکیب سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ بات فیصلہ کن ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ اللہ کی راہنمائی ہی حقیقی راہنمائی ہے۔

انسان نے جب بھی اللہ کی ہدایت سے منہ موڑا وہ آوارۂ صحرا ہوا۔ نیز اگر انسان اللہ کی راہنمائی کا کچھ حصہ تبدیل کر کے اس کی جگہ اپنے تصورات نافذ کرے ' اپنے فارمولے آزمائے ' اپنی جانب سے قوانین وضع کرے ' اپنے طور طریقے اپنائے ' خود ساختہ پیمانے رائج کرے اور یہ سب کام علم الٰہی ' ہدایت الٰہیہ اور اللہ کی روشن کتاب کی راہنمائی کے دائرے سے باہر نکل کر کرے تو وہ کبھی بھی راہ راست نہ پائے گا اور بے کنار صحراؤں میں پھرتا رہے گا۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت انسان کو اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی قوتیں عطا کی ہیں جن کے ذریعے وہ اس کائنات کے بعض نوامیس فطرت تک رسائی حاصل کر چکا ہے ' کائنات کی بعض قوتوں کو اس نے مسخر کر لیا ہے ' اس کرۂ ارض کا نظام چلانے کے لئے وہ ان قوتوں سے استفادہ کر رہا ہے اور اس دنیا کی زندگی کو ترقی دے رہا ہے لیکن اس کو اللہ نے اس قدر وسیع علم اور قوت نہیں دی ہے کہ وہ اس کائنات کی تمام قوتوں اور تمام حقیقتوں کی تہہ تک پہنچ سکے ' نہ یہ حضرت انسان اس عالم غیب کی وسعتوں کے اندر داخل ہو سکتا ہے جو اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ خود انسان کی عقل ' انسان کی سوچ ' اس کے جسم کے مختلف اعضاء کا کام کرنا اور ان کے اسباب اور ان اعضاء کا اس طرح مربوط طریقے پر کام کرنا ' یہ سب امور ایسے ہیں جو انسان کے لئے ابھی تک عالم غیب کے حصے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ خود اپنی ذات کے بارے میں بھی انسان خدائی ہدایت اور راہنمائی کا محتاج ہے۔ انسان کی زندگی ' اس کے نظریات ' اس کی تخلیق و نشوونما ' زندگی کی اقدار اور پیمانے ' زندگی کا نظام اور طور طریقے ' زندگی کے ضوابط اور قوانین ایسے امور ہیں جن میں انسان کو اللہ کی راہنمائی درکار ہے تاکہ ان چیزوں کو اس کی زندگی میں نافذ کیا جا سکے اور اس کی عملی زندگی پر ان خدائی ہدایات کا نفاذ ہو۔

یہ انسان جب اللہ کی ہدایت کی طرف لوٹ آتا ہے اور ہدایت کو قبول کر لیتا ہے تو وہ صحیح معنوں میں ہدایت یافتہ انسان قرار پاتا ہے کیونکہ اللہ کی ہدایت ہی صحیح ہدایت ہے جب بھی وہ اللہ کی ہدایت سے دور ہوتا ہے یا اللہ کی راہنمائی میں سے بعض اجزاء سے انحراف کرتا ہے یا اس میں سے بعض اجزاء کو تبدیل کر کے اس کے اندر خود ساختہ اجزاء پیوست کر دیتا ہے تو وہ گمراہ ہو جاتا ہے اس لئے کہ جو بات اللہ کی راہنمائی پر مبنی نہ ہو تو وہ ضلالت ہے کیونکہ کوئی تیسرا اور درمیانی راستہ موجود نہیں ہے۔ (فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِ اِلَّا الضَّلَال) "سچائی کے بعد گمراہی کے سوا اور ہے کیا؟" انسان نے اپنی طویل تاریخ میں اس گمراہی کا مزہ خوب چکھا ہے اس کی وجہ سے اس نے بے حد مصائب جھیلے ہیں اور آج تک انسانیت ان مصائب میں مبتلا ہے۔ انسانی تاریخ نے اپنا یہ حتمی فیصلہ دے دیا ہے کہ اس کا یہی انجام ہو گا ' جب بھی وہ اللہ کی راہنمائی سے انحراف کرے گی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نیز اللہ کا حکم بھی یہی ہے اور اللہ کی جانب سے اطلاع بھی یہی ہے۔ اس حقیقت کی سوا اور کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگرچہ دعویٰ بہت سے حقائق کا کیا جاتا ہے لیکن تاریخ نے کسی کی تصدیق نہیں کی۔ جو لوگ خدائی راہنمائی سے انحراف کی وجہ سے انسانی مصائب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں انہیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے معاشروں کا مطالعہ کریں۔ ایک عقلمند سب کچھ چشم بینا سے دیکھ سکتا ہے۔ وہ ان مصائب کو ہاتھ سے چھو سکتا ہے۔ یہ محسوس ہیں اور اس پوری دنیا کے عقلمند لوگ ان کی بابت چیخ و پکار کر رہے ہیں۔

چنانچہ سیاق کلام میں مکرر حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دو صرف اللہ کے سامنے۔ اسی سے ذرو

اور اسی کی بندگی اور عبادت کرو - وامرنا...... اور اس کی طرف سے ہمیں حکم ملا ہے کہ مالک کائنات کے آگے سر اطاعت خم کر دو اور نماز قائم کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو -"

یعنی اے محمد اعلان کر دو کہ راہنمائی اور ہدایت تو صرف اللہ کی راہنمائی اور ہدایت ہے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ اللہ رب العالمین ہی کے آگے سر تسلیم خم کر دو' اس لئے کہ عالمین اسی کے آگے جھکتے ہیں - یہ پوری کائنات اس کے آگے پابند حکم ہے' پس کوئی جواز نہیں ہے کہ اس پوری کائنات کے اندر انسان جیسی عقلمند مخلوق اللہ رب العالمین کے آگے نہ جھکے اور اللہ کی ملکیت اور ربوبیت کا انکار کر دے اور آسمان و زمین اور پوری کائنات سے مختلف روش اختیار کرے -

یہاں پورے جہان اور اس کی ربوبیت کا ذکر بے محل نہیں ہے - یہ وہ حقیقت ہے جسے تسلیم کئے بغیر بات بنتی ہی نہیں - اس کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا یہ کہ پوری دنیا میں مشہود اور غائب دونوں شامل ہیں اور وہ قوانین قدرت جن کے مطابق یہ رواں دواں ہے ان سے یہ کائنات شمہ بھر انحراف بھی نہیں کر سکتی - اس لئے کہ اللہ رب العالمین ہے - جہاں تک انسان کا تعلق ہے اپنی طبیعی زندگی کے اندر وہ بھی ان نوامیس فطرت کا پابند ہے - انسان کی جسمانی زندگی ان ضوابط کے اندر جکڑی ہوئی ہے اور وہ ان ضوابط کا مطیع ہے - ان کے دائرے سے خارج نہیں ہو سکتا - لہذا انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی اس محدود اختیاری زندگی کے اندر بھی اللہ کے ضوابط کی پابندی کرے اور یہ اس کے لئے سخت آزمائش ہے - اس آزمائش میں دیکھا جائے گا کہ وہ راہ ہدایت پالیتا ہے یا صحرائے ضلالت کی طرف جانکلتا ہے - اگر وہ خدائی ضوابط کی اس طرح پابندی کرے جس طرح وہ اپنی طبیعی زندگی کے اندر مطیع نوامیس الہی ہے تو اس کی زندگی خوش اسلوبی سے گزرے گی اور اس کا طرز عمل اور اس کی طبیعی زندگی باہم متناسق ہوں گے - اس کا جسم اس کی روح کا ساتھی ہو گا اور اس کی دنیا آخرت کے ساتھ جڑی ہوئی ہوگی - تفصیلات کے لئے دیکھئے (امیر جماعت اسلامی پاکستان کی کتاب رسالہ دینیات) -

یہ کہنا کہ مجھے اور تمام مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مالک حقیقی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں' اس لئے انہوں نے سر تسلیم خم کر دینے کی روش اختیار کی ہے' ایک نہایت ہی مؤثر اور مفرح انداز گفتگو ہے اور تاقیامت جو لوگ بھی راہ تسلیم و رضا کو اختیار کریں گے وہ اپنے آپ کو براہ راست امرالہی کا تعمیل کنندہ سمجھیں گے -

اب وہ مامورات آتے ہیں جو اعلان تسلیم و رضا کے بعد کا لائحہ عمل ہیں -

(وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ (٦: ٧٢)) یہ کہ نماز قائم کرو اور اس کی نافرمانی سے ڈرو -"

اصل فریضہ یہ ہے کہ اللہ کی ربوبیت کو تسلیم کیا جائے - اس کی حاکمیت کو تسلیم کیا جائے اور اس کی رضا کے مطابق اپنے آپ کو درست کیا جائے - اس کے بعد پھر عبادات کا درجہ آتا ہے اور نفسیاتی اصلاح کا کام شروع ہوتا ہے تاکہ تسلیم و رضا کی اساس پر عملی زندگی کا نقشہ قائم ہو سکے اور عملی زندگی اور تفصیلی نظام زندگی اس وقت تک استحکام حاصل نہیں کر سکتا جب تک اس کی تعمیر مستحکم بنیادوں پر نہ ہو -

اس لہر کی آخری ضرب اسلامی نظریہ حیات کے اساسی حقائق کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے - یہ حقائق اسلامی نظریہ حیات کے اصلی اور بنیادی عوامل ہیں - مثلاً حشر و نشر' تخلیق کائنات' حاکمیت الہیہ' علم غیب اور علم شہادت اور یہ کہ

اللہ حکیم و خبیر ہے۔

---

وَ هُوَ الَّذِیۡۤ اِلَیۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۷۲﴾ وَ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ وَ یَوۡمَ یَقُوۡلُ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ۬ؕ قَوۡلُهُ الۡحَقُّ ؕ وَ لَهُ الۡمُلۡکُ یَوۡمَ یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ ؕ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَ الشَّهَادَۃِ ؕ وَ هُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۷۳﴾

---

"اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔ اور جس دن وہ کہے گا کہ حشر ہو جائے اسی دن وہ ہو جائے گا۔ اس کا ارشاد عین حق ہے۔ اور جس روز صور پھونکا جائے گا اس روز بادشاہی اسی کی ہوگی، وہ غیب اور شہادت ہر چیز کا عالم ہے اور دانا اور باخبر ہے۔"

(وَهُوَ الَّذِیْ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ (٦: ٧٢)) اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔" اسی لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ تم صرف اس کے سامنے سرتسلیم خم کرو کیونکہ تم کو آخر کار اسی کی طرف جانا ہے۔ لہذا انسانوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ یوم الحشر کے لئے کچھ چیزیں ساتھ لے کر جائیں جس کی وجہ سے ان کی نجات ہو، کیا وہ اس کے سامنے نہیں جھکتے جس کے سامنے حشر کے دن عالمین سرنگوں ہوں گے۔ مناسب ہے کہ اس دن کے آنے سے پہلے ہی وہ جھکیں۔ حشر کا تصور دے کر یہاں انسان کو اس بات پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ آج ہی سے اس کے سامنے سرنگوں ہونا شروع کر دو جبکہ حشر کے روز کوئی بچ کر نہیں نکل سکے گا۔

(وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (٦: ٧٣)) "وہی ہے جس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔" یہ ایک دوسری حقیقت ہے جو اصلاح احوال کا ایک دوسرا بہترین مؤثر ہے۔ وہ اللہ جس کے سامنے سرنگوں ہونے کا یہاں حکم دیا جا رہا ہے، وہ وہی ہے جس نے زمین و آسمان کو برحق پیدا کیا ہے۔ وہ ذات وہی ہے جو پیدا کرتا ہے، جو مالک ہے، جو حاکم ہے اور جو تمام امور میں متصرف ہے اور اس نے زمین و آسمان کو پیدا بھی حق پر کیا ہے۔ تخلیقات کائنات میں سچائی ایک بنیادی عنصر ہے اور یہ ایک حقیقت ہے۔ اس فقرے میں ایک جانب تو اس کائنات کے بارے میں افلاطون کے مثالی نظریے کی تردید کر دی جس میں کہا گیا تھا کہ یہ کائنات ایک وہم ہے اور اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دوسری جانب اس میں یہ قرار دیا گیا کہ سچائی اپنے اندر اصلیت رکھتی ہے اور وہ اس کائنات کا بنیادی عنصر ہے۔ جو لوگ سچائی کا سہارا لیتے ہیں فطرت کائنات کے اندر موجود سچائی بھی اسی طرف لوٹتی ہے۔ اس طرح اس

کائنات کی طبیعی سچائی اور اسلامی نظریہ حیات کی سچائی باہم مل کر ایک خوفناک اور عظیم قوت بن جاتی ہیں۔پھر اس عظیم قوت کے سامنے باطل اپنے پائے چوبیں پر کھڑا ہی نہیں ہو سکتا' اس لئے کہ باطل کی جڑیں اس کائنات کے اندر نہیں ہوتیں۔اس کی مثال تو ایک خبیث درخت جیسی ہوتی ہے جسے زمین کے اوپر سے باسانی اکھاڑ لیا جاتا ہے اور وہ زمین پر ٹھہر نہیں سکتا یا اس کی مثال اس جھاگ کی طرح ہوتی جس کے اندر جسمانی حقیقت نہیں ہوتی اور وہ جلد ہی خود بخود بیٹھ جاتی ہے۔اس لئے باطل پر اس کائنات کی بنیاد نہیں رکھی گئی۔یہ ایک عظیم اور مؤثر نظریاتی حقیقت ہے۔

وہ مومن جس کے شعور میں یہ بات ہو کہ وہ حق کا حامل ہے وہ شخصی اور ذاتی طور پر اس سچائی کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے جو اس کائنات کے اندر موجود ہے۔(ایک دوسری آیت میں ہے کہ ان اللہ ھو الحق یعنی اللہ سچائی ہے) یہ دونوں سچائیاں پھر ذات باری تعالیٰ سے اتصال حاصل کر لیتی ہیں جو بذات خود عظیم سچائی ہے۔جب ایک مرد مومن اپنے اندر یہ شعور پیدا کر لیتا ہے کہ وہ واصل بالحق ہے تو اس کے سامنے پھر باطل کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہتی۔اگرچہ یہ باطل طاقت بظاہر بہت عظیم و ضخیم نظر آتی ہو' جابر و قاہر ہو اور اسے اذیت رسانی کی بڑی قوت ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ایسا مرد مومن یہ سمجھتا ہے کہ یہ صورت حال نہایت ہی عارضی اور حقیر ہے۔اس کی جڑیں اس کائنات کے اندر نہیں ہیں اور نہ اسے ثبات و قرار حاصل ہو گا۔جلد ہی یہ عارضی حالت ختم ہو گی اور صورت حال اس طرح بدل جائے گی کہ گویا وہ یہاں تھی ہی نہیں............... اور جب ایک منکر اور غیر مومن اس حقیقت پر غور کرتا ہے تو بعض اوقات وہ راہ راست پر آ جاتا ہے اور اللہ کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے۔

(وَيَوْمَ يَقُولُ كُنْ فَيَكُونُ (٦ : ٧٣)) اور جس دن وہ کہے گا کہ حشر ہو جائے اسی دن وہ ہو جائے گا۔" وہ قادر مطلق بادشاہ ہے' اور اس کی مشیت بے قید ہے۔از سر نو تخلیق' اپنی تخلیق میں تغیر و تبدل کرنے میں اسے کچھ دیر نہیں لگتی۔اللہ کی اس قدرت کا یہاں ذکر کرنے کے دو مقاصد ہیں۔ایک طرف تو اس سے اسلامی نظریہ حیات کو قلب مومن میں جاگزیں کیا جا رہا ہے۔دوسری جانب ان لوگوں کے لئے جنہیں دعوت دی جا رہی ہے یہ امر ایک مؤثر ذریعہ ہے کہ وہ دعوت کو قبول کریں اور اللہ رب العالمین کے سامنے سرنگوں ہو جائیں کیونکہ کن فیکون کہنے والا وہی قادر مطلق ہے۔

(قَوْلُهُ الْحَقُّ (٦ : ٧٣)) اس کا ارشاد عین حق ہے۔" اس کا وہ قول بھی حق ہے جس کے ذریعے اس نے پوری کائنات کی تخلیق کی اور کن فیکون کہا۔اس کا وہ فرمان بھی برحق ہے جس کے ذریعے اس نے بندوں کو حکم دیا کہ وہ صرف اس کی اطاعت کریں اور صرف اس کے سامنے سرنگوں ہوں۔اس کے وہ احکام بھی برحق ہیں جن کے ذریعے اس نے لوگوں کے لئے قانون سازی کی۔اور وہ اقوال بھی برحق ہیں جن میں ماضی' حال اور مستقبل کے بارے میں اطلاعات دی گئی ہیں یعنی خلق' نشاۃ اور حشر و نشر کی بابت اور سزا و جزاء سے متعلق۔

(وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ (٦ : ٧٣)) اور جس روز صور پھونکا جائے گا اس روز بادشاہی اسی کی ہو گی۔" اور جب صور میں پھونکا جائے گا (صور ڈھول کی طرح اندر سے خالی سینگ کو کہتے ہیں) یہ وہ دن ہو گا جس میں لوگ اپنی قبروں سے اٹھ کر پھیلیں گے' یہ کیونکر ہو گا؟ انسان کے علم میں یہ کیفیت نہیں آ سکتی۔یہ ان غیبی

امور میں سے ہے جس کا علم اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔ صور کی ماہیت اور حقیقت کیا ہوگی' یہ بھی غیبی امور میں سے ہے۔ کس طرح تمام مردے اٹھ کھڑے ہونگے اس کا تصور بھی ہم نہیں کر سکتے۔ روایات میں آتا ہے کہ صور ایک نورانی بگل ہے جس میں فرشتہ پھونکے گا۔ تمام اہل قبور اسے سنیں گے اور وہ جہاں بھی ہوں گے اٹھنے کی تیاری کریں گے اور یہ دوسری آواز ہوگی۔ رہا پہلا صور تو اس کے نتیجے میں تمام لوگ مرکر گر جائیں گے یعنی زمین و آسمان کی تمام مخلوق جان دے دیگی۔ الا ماشاء اللہ۔ سورہ زمر میں ہے "اور اس روز صور پھونکا جائے گا اور وہ سب مرکر گر جائیں گے جو آسمان و زمین میں ہیں سوائے ان کے جنہیں اللہ زندہ رکھنا چاہے۔ پھر ایک دوسرا صور پھونکا جائے گا اور یکایک سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے۔" (۳۹:۶۸) صور اور اس کے پھونکنے کے جو آثار یہاں دیئے گئے وہ ایسے ہیں کہ انسان جس صورت حال کے عام طور پر عادی ہیں ان میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے' ایک عام انسان ایسے حالات کا تصور نہیں کر سکتا اس لئے کہ یہ اللہ کے ان غیبی حقائق میں سے ایک ہے جس کا علم ہمیں نہیں دیا گیا۔ ہمارا علم وہاں تک محدود ہے جو اللہ نے ہمیں دیا۔ اس لئے ہم اس کے بارے میں اس سے آگے نہیں بڑھتے جس قدر اس آیت میں دے دیا گیا ہے۔ نہ آگے جانے میں کوئی فائدہ ہے۔ اگر اس کی کیفیات پر کوئی کلام کرے گا تو وہ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے مترادف ہوگا محض ظن و تخمین ہوگا۔

ہاں جس دن صور میں پھونکا جائے گا اس دن اصل حقیقت منکرین پر بھی ظاہر ہوگی اور اندھے بھی اسے دیکھ لیں گے کہ اس دن صرف اللہ کی بادشاہی ہوگی اور صرف اللہ ہی بادشاہ ہوگا۔ صرف اللہ ہی فیصلے کرے گا۔ لہذا اس دنیا میں جو لوگ سرکش ہیں انہیں چاہئے کہ وہ ابھی سے اپنا طرز عمل درست کر لیں۔ قبل اس کے کہ وہ جبار و قہار کے سامنے کھڑے ہو کر اطاعت کریں یعنی نفخ صور کے دن۔

(عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (٦:٧٣)) "وہ غیب اور شہادت ہر چیز کا عالم ہے۔" یعنی ان باتوں کی کیفیات کا علم اسے ہے جنہیں ہم نہیں سمجھتے۔ وہ ان باتوں کو اس طرح جانتا ہے جس طرح ہم عالم شہادت کو جانتے ہیں اور بندوں کی پوشیدہ چیزوں سے کوئی چیز بھی اس پر مخفی نہیں ہے۔ نہ کوئی چیز اس سے چھوٹ سکتی ہے۔ لہذا لوگوں کو چاہئے کہ وہ اللہ کی اطاعت کریں اور اس سے ڈریں۔ اپنی جگہ حقیقت اور جزو عقیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ دھمکی مخالفین اور جھٹلانے والوں کے لئے مفید ہے۔

(وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ (٦:٧٣)) اور وہ دانا اور باخبر ہے۔" وہ اپنی حکمت کے مطابق اس پوری کائنات کو چلاتا ہے۔ وہ دنیا و آخرت دونوں میں اپنے بندوں کے معاملات کو نہایت خبرداری اور حکمت سے چلاتا ہے۔ لہذا لوگوں کو چاہئے کہ وہ اللہ کی ہدایت اور اس کی شریعت کی پیروی کریں اور اللہ کے علم و حکمت سے استفادہ کریں۔ اس کی ہدایت و رحمت کے سائے میں لوٹ آئیں۔ حیرانی و پریشانی سے نکل کر اس کے سایہ عاطفت اور حکمت و دانائی میں داخل ہو جائیں جہاں انہیں صراط مستقیم ملے گا اور علم و بصیرت ملے گی۔

یوں اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو لوگوں کی عقل و بصیرت کے لئے مؤثر بناتے ہیں۔

---ooo---

پارہ نمبر ۷

# درس نمبر ۶۵ ایک نظر میں

یہ درس 'طوالت کے باوجود' ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا موضوع بھی ایک ہے جس کے تمام پیراگراف باہم پیوستہ ہیں۔ یہ اس سورہ کے مرکزی مضمون سے متعلق ہے۔ سورہ کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ اسلامی نظریہ حیات کی تعبیر مقام الوہیت کی صحیح تعریف اور توضیح کے رنگ میں کی جائے۔ اس کے مقابلے میں بندے کی حقیقت اور اس کے آداب زندگی کی وضاحت اور عبد و معبود کے درمیان تعلق کی صحیح نوعیت کا بیان۔ لیکن اس سبق میں ان حقائق اور موضوعات پر بات کرنے کا ایک نیا انداز اختیار کیا گیا ہے جو اس سے قبل اس سورہ میں اختیار کیے جانے والے انداز سے بالکل جدا ہے۔

یہاں اس موضوع اور مضمون کو قصے کے انداز میں لیا گیا ہے۔ لیکن اس قصے میں وہ تمام اثر آفریں باتیں آگئی ہیں جو اس سے قبل اس سورہ میں آنے والی تمام لہروں میں مذکور ہیں جیسا کہ ہم نے اس سورہ پر تبصرہ کرتے وقت بیان کیا تھا۔ مثلاً ایک یہ ہے کہ مختلف لہروں کے درمیانی وقفے میں قیامت کے دن اللہ کے سامنے پیشی کے مناظر بار بار دہرائے گئے ہیں اور نہایت مرتب انداز میں۔

اس سبق میں اس مسلسل قافلہ دعوت اسلامی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جو حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک طویل انسانی تاریخ کی شاہ راہ پر پھیلا ہوا ہے۔ اس قافلے کی طرف اشارہ کرنے سے پہلے مقام کبریائی کی توضیح کر دی گئی ہے اور یہ توضیح ایک مومن کامل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فطری تاثرات کی شکل میں کی گئی ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ فطرت سلیمہ اس طرح کی ہوتی ہے اور یہ فطرت سلیمہ جب سچائی کی متلاشی ہوتی ہے تو اس کا انداز اس طرح کا ہوتا ہے۔ اللہ کی کبریائی کا صحیح تصور تو خود فطرت سلیمہ کے اندر موجود ہوتا ہے' رہے خارجی مظاہر تو ان میں تو قدم قدم پر جاہلیت کو تصادم کے بعد ہی صحیح تصورات عطا کیے جا سکتے ہیں۔ یہ تصورات حق تعالیٰ کے بارے میں فطرت انسانی کے اپنے تصور کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ ان تصورات کی بنیاد ان داخلی شواہد پر ہوتی ہے جو فطرت انسانی کے اندر ہوتے ہیں اور جو محسوس شواہد سے زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنے داخلی فطری شواہد کی وجہ سے حق تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لیتے ہیں اور انہیں ان داخلی فطری شواہد کی وجہ سے اطمینان حاصل ہو جاتا ہے تو قرآن کریم اس داخلی واردات کی حکایت ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ قَالَ اَتُحَاجُّوْنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ (۸۰) وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا

فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (٨١) (٦: ٨٠ تا ٨١))

"اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے قوم سے کہا: کیا تم لوگ اللہ کے معاملے میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے راہ راست دکھا دی ہے۔ اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا' ہاں اگر میرا رب کچھ چاہے تو وہ ضرور ہو سکتا ہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے۔ اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لئے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی؟ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی اور اطمینان کا مستحق ہے؟ بتاؤ اگر تم علم رکھتے ہو۔" اب سیاق کلام قافلہ ایمان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اس قافلے کی قیادت اللہ کے رسولوں کے ہاتھ میں ہے۔ شاہراہ تاریخ پر یہ رواں دواں ہے۔ اس طویل شاہراہ پر مشرکین کا شرک اور مکذبین کی تکذیب بے وزن نظر آتے ہیں۔ اور اس قافلے نے ان چیزوں کو ٹھوکریں مار کر اس شاہراہ سے ایک طرف پھینک دیا ہے۔ یہ قافلہ رواں دواں ہے۔ اس قافلے کی آخری کڑی اس کی ابتدائی کڑی سے جڑی ہوئی ہے۔ یوں ایک متحدہ امت تشکیل پاتی ہے۔ اس امت مسلمہ کا آخری حصہ اسی ہدایت کی پیروی کر رہا ہے جس کی پیروی اس کے ابتدائی حصے نے کی۔ اس امت کی تشکیل میں زمان و مکان کا کوئی لحاظ نہیں ہے۔ قوم اور نسل کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ رنگ و نسب کا کوئی لحاظ نہیں ہے۔ اس امت کے درمیاں واحد رابطہ اور واحد رسی دین اسلام ہے اور اس رسی اور حبل اللہ کو سب نے پکڑ رکھا ہے۔

یہ ایک حیران کن منظر ہے۔ اللہ تعالیٰ قافلہ رسل، کا نام لے کر گنواتے ہیں اور اس کے بعد فرماتے ہیں:

(ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (٨٨) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ (٨٩) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۗ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۗ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (٩٠) (٦: ٨٨ تا ٩٠)) "یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے راہنمائی کرتا ہے' لیکن اگر کہیں ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا سب کا کیا کرایا غارت ہو جاتا۔ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی تھی۔ اب اگر یہ لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو (پرواہ نہیں) ہم نے کچھ اور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے جو اس سے منکر نہیں ہیں۔ اے نبی وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے۔ انہی کے راستہ پر تم چلو اور کہہ دو میں اس (تبلیغ و ہدایت کے) کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لئے۔" اس موقف کو پیش کرنے کے بعد ان لوگوں پر سخت تنقید کی جاتی ہے جو یہ زعم لئے ہوئے تھے کہ اللہ

تعالیٰ نے کوئی رسول نہیں بھیجا اور نہ اللہ نے کسی انسان پر کوئی کتاب اتاری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کے لوگ درحقیقت کوتاہ بین ہیں اور انہوں نے ذات باری کی صحیح معرفت حاصل نہیں کی۔ ان کے اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے لوگوں کو پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ دیا' ان کی لگام ان کے نفس اور ان کی عقل کے ہاتھ میں دے دی' ان کی خواہشات اور ان کی ناقص فہم اور ان کا سرکش نفس انہیں جو چاہے حکم دے۔ اللہ کی شان کبریائی اور اس کی الوہیت و ربوبیت سے یہ نظریہ فروتر ہے۔ اس کا علم' اس کی حکمت اور اس کی عدالت اور پھر سب سے بڑھ کر اس کی شان رحیمی ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔ اس کے علم' اس کی رحمت اور اس کے عدل کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اپنے بندوں میں سے بعض برگزیدہ ہستیوں کو رسول بنا کر بھیجے اور ان میں سے بعض رسولوں پر کتاب نازل کرے تاکہ یہ سب لوگ عوام الناس کا ہاتھ تھام کر انہیں اللہ کی طرف لے جائیں اور ان کی فطرت سلیمہ پر جو تہ بہ تہ پردے پڑ جائیں انہیں اتاریں۔ ان کے قلب و نظر کے جو دریچے بند ہو چکے ہیں انہیں از سر نو کھولیں اور وہ ان کی دعوت پر لبیک کہیں۔ اس سلسلے میں یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی کتاب کی مثال دی گئی اور پھر قرآن ایک شاہد عادل ہے' جو ماقبل کی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔

اس طویل سبق کا خاتمہ ان لوگوں کو دھمکی دینے پر ہوتا ہے جو اللہ پر افتراء باندھتے ہیں اور جو یہ غلط دعویٰ کرتے ہیں کہ ان پر وحی نازل ہوئی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جس قسم کا کلام اللہ نازل کرتا ہے ویسا ہی کلام یہ لوگ بھی نازل کر سکتے ہیں اور یہ دعوے ایسے ہیں جو ہر پیغمبر کے مقابلے میں غلط مدعیان نبوت نے ہمیشہ کیے ہیں۔ بعض نے وحی کا دعویٰ کیا اور بعض نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ آخر میں مشرکین کا ایک کربناک منظر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اس منظر کی ایک جھلک ہے جو آخر میں انہیں درپیش ہو گا۔

(وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ (۹۳) وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (۹۴) (٦: ۹۳ - ۹٤))

"کاش تم ظالموں کو اس حالت میں دیکھ سکو جبکہ وہ سکرات الموت میں ڈبکیاں کھا رہے ہوتے ہیں اور فرشتے ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ "لاؤ' نکالو اپنی جان' آج تمہیں ان باتوں کی پاداش میں ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔ جو تم اللہ پر تہمت رکھ کر ناحق بکا کرتے تھے اور اس کی آیات کے مقابلے میں سرکشی دکھاتے تھے۔" "لو اب تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا' جو کچھ ہم نے تمہیں دنیا میں دیا تھا وہ سب کچھ تم

پیچھے چھوڑ آئے ہو' اور اب ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمہارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے۔ تمہارے آپس کے تمام رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے گم ہو گئے جن کا تم زعم رکھتے تھے۔'' یہ نہایت ہی اعصاب شکن منظر ہے۔ انسان دیکھتے ہی خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ اس منظر میں ان لوگوں کی حالت زار صاف صاف نظر آتی ہے جس میں وہ حیران و پریشان نظر آتے ہیں اور ان کی پشیمانی اور ان کی گوشمالی ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ ہے جزاء ان کی سرکشی' روگردانی اور تکذیب و افتراء کی۔

---ooo---

# درس نمبر ٦۵ تشریح آیات

## ۷۴ ---- تا ---- ۷۹

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً ۖ إِنِّي أَرَاكَ وَ
قَوْمَكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٧٤﴾ وَكَذَٰلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَ
الْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَىٰ كَوْكَبًا ۖ
قَالَ هَٰذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ ﴿٧٦﴾ فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ
بَازِغًا قَالَ هَٰذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ
مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ ﴿٧٧﴾ فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَٰذَا رَبِّي هَٰذَا
أَكْبَرُ ۖ فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ﴿٧٨﴾ إِنِّي وَجَّهْتُ
وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا ۖ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٧٩﴾

”ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ یاد کرو جب کہ اس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا ”کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے؟ میں تو تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں ۔“ ابراہیم علیہ السلام کو ہم اسی طرح زمین اور آسمانوں کا نظام سلطنت دکھاتے تھے اور اس لئے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے ۔ چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا 'کہا' یہ میرا رب ہے مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں ۔ پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا' یہ ہے میرا رب ۔ مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا ۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب' یہ سب سے بڑا ہے ۔ مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیم علیہ السلام پکار اٹھے ”اے برادران قوم' میں ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو ۔ میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں ۔“

ان آیات میں قرآن کریم نے جس منظر کی تصویر کشی کی ہے وہ ایک عجیب منظر ہے - یہ فطرت انسانی کا مظاہرہ ہے - فطرت انسانی دیکھتے ہی تمام جاہلی تصورات اور شرکیہ بت پرستانہ عقائد کو رد کر دیتی ہے - ان غلط تصورات کو دیکھتے ہی فطرت دامن جھاڑتی ہے اور تلاش الٰہ حق کی راہ میں نکل کھڑی ہوتی ہے - یہ حقیقی سچائی خود اس کے ضمیر میں موجود ہے لیکن انسان کو اس کا ادراک نہیں ہے اور فطرت اس پر متنبہ نہیں ہے - لیکن یہ فطرت تلاش حق میں ہر اس چیز سے ربط قائم کرتی ہے جو بظاہر الٰہ ہو سکتی ہو' لیکن جب ملاحظہ عمیق کرتی ہے تو وہ کھوٹے خداؤں کو رد کر دیتی ہے کیونکہ فطرت کے اندر حقیقی الٰہ کی جو ذات و صفات ودیعت ہیں وہ چیز اس کے ساتھ ٹیلی نہیں کرتی - جب تلاش کرتے کرتے یہ فطرت اللہ کی ذات تک جا پہنچتی ہے تو وہ حقیقت اسے واضح نظر آ رہی ہوتی ہے جس سے اسے بے حد خوشی ہوتی ہے - اس کے اندر جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے' اس لئے کہ وہ اس منزل تک بدلائل پہنچ جاتی ہے وہ خود اس کے اندر پنہاں ہوتی ہے - یہ ہے وہ فطری منظر جو قلب ابراہیم علیہ السلام کو دکھایا جاتا ہے - وہ جس تجربے سے گزرے اسے ان مختصر آیات میں بیان کر دیا جاتا ہے - حق و باطل کے بارے میں فطری سوچ کی یہ عجیب کہانی ہے جسے یہاں اس اسلوب میں لایا گیا ہے - یہ ایک نظریہ حیات کا معاملہ ہے جس کا اظہار ایک مومن ببانگ دہل کرتا ہے اور اس معاملے میں وہ کوئی رکھ رکھاؤ نہیں کرتا - اس راہ میں وہ باپ' خاندان اور قوم کسی کے ساتھ کوئی نرمی نہیں کرتا جیسا کہ ایسا ہی رویہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے معاملے میں اختیار کیا - انہوں نے ناقابل تغیر اور بالکل غیر لیک دار موقف اختیار کیا اور اپنے موقف کو بالکل واضح کر کے بیان کیا -

(وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً اِنِّیْۤ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (٦ : ٧٤) یہ وہ فطری پکار ہے جو حضرت ابراہیم کی زبانی ظاہر ہوتی ہے - اگرچہ اپنی فہم و فراست کے ذریعے حضرت ابراہیم ؑ کو الٰہ حقیقی تک رسائی حاصل نہ ہوئی تھی لیکن آپ کی فطرت سلیمہ ابتداً ہی سے اس بات کا انکار کر رہی تھی کہ اس کی قوم جن بتوں کی پوجا کرتی ہے وہ حقیقی الٰہ ہو سکتے ہیں - حضرت ابراہیم کی قوم عراق کے کلدانی تھے - وہ بتوں' ستاروں اور سیاروں کے پجاری تھے لیکن حضرت ابراہیم کی فطرت یہ جانتی تھی کہ وہ رب' معبود اور وہ ذات باری جس کی طرف لوگ خوشحالی اور بدحالی میں متوجہ ہوتے ہیں اور جس نے تمام لوگوں اور تمام زندہ مخلوق کو پیدا کیا ہے - وہ ذات یہ بت نہیں ہیں - بتوں کی ظاہری حالت ہی بتا رہی تھی کہ نہ وہ خالق ہیں' نہ رازق ہیں' نہ سنتے ہیں اور نہ جواب دیتے ہیں لہٰذا یہ حقیقی الٰہ نہیں ہو سکتے - اس لئے ان کی فطرت تلاش حق کی راہ پر نکل پڑی اور فیصلہ دے دیا کہ یہ الٰہ جن کی تم پوجا کرتے ہو نہ یہ الٰہ حقیقی ہیں اور نہ ہی وہ اس قابل ہیں کہ انہیں الٰہ حقیقی تک رسائی کا واسطہ اور ذریعہ بنایا جائے -

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فطرت اس صورت حال کو واضح طور پر گمراہی کی صورت حال پاتی ہے اور انہیں صحیح فیصلے تک پہنچنے میں کوئی دیر نہیں لگتی - یہ ہے اس فطرت کا نمونہ کامل جس پر اللہ نے اپنی تمام مخلوق کو پیدا کیا ہے - پھر یہ وہ ردعمل ہے فطرت سلیمہ کا جب اس کا مقابلہ کسی واضح گمراہی کے ساتھ ہوتا ہے - وہ فوراً اس کا انکار کر دیتی ہے اور اسے اس سے نفرت ہو جاتی ہے - اس باطل بین کے معاملے میں پھر فطرت سلیمہ اعلان حق کرنے میں ذرہ بھر دیر نہیں کرتی' خصوصاً جب معاملہ عقیدے اور نظریات کا ہو -

''کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے؟ میں تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں -'' یہ بات حضرت ابراہیم ؑ اپنے

باپ کے سامنے کرتے ہیں' حالانکہ حضرت ابراہیم اپنے مزاج کے اعتبار سے نہایت ہی نرم مزاج' بردبار اور حلیم الطبع تھے اور پھر وہ تھے بھی ایک بیٹے کی پوزیشن میں لیکن نظریہ حیات کی قدر وقیمت باپ بیٹے کے تعلق اور صبر اور برداشت کی صفات کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ نشان راہ تھے جس کے بارے میں ان کی اولاد کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اس کی پیروی کریں اور یہ قصہ بھی بطور مثال اور نمونہ پیش کیا جارہا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی فطرت کی صفائی اور اپنے خلوص نیت کی بنا پر اس بات کے مستحق ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی بادشاہت کے کچھ مخصوص راز منکشف فرمائیں اور ان کو وہ دلائل عطا کریں جو زمین و آسمان کے اندر ۔ ہد کی بادشاہت کے دلائل ہیں۔

( وَكَذٰلِكَ نُرِىٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ

(۶ : ۷۵) ) ابراہیم علیہ السلام کو ہم اسی طرح زمین اور آسمانوں کا نظام سلطنت دکھاتے تھے اور اس لئے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔'' اس فطرت سلیمہ کے ساتھ' اس کھلی بصیرت کے ساتھ اور طلب حق کی راہ میں اس خلوص کی وجہ سے اور اس قوت اور صراحت کے ساتھ باطل کے انکار کی وجہ سے اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زمین و آسمان کی بادشاہت کے کچھ راز بتائے' جن میں زمین اور آسمانوں میں مملکت الٰہیہ کے کچھ اصول تھے۔ اس کائنات کے کچھ خفیہ راز جن پر یہ نظام استوار ہے' پھر اللہ نے انہیں وہ دلائل و شواہد دیئے جو اس کائنات میں موجود تھے۔ خود ان کی فطرت اور ان کے دل کے اندر بھی ان ہی جیسے دلائل و شواہد موجود تھے جو راہ ہدایت دکھا رہے تھے تاکہ حضرت ابراہیم باطل کے انکار کے مقام سے آگے بڑھ کر حصول حق اور معرفت حق کے درجے تک پہنچ جائیں اور انہیں پوری طرح یقین آجائے۔

یہ ہے فطرت کا گہرا طریق کار۔ اس کے مطابق جو فراست دی جاتی ہے وہ کبھی بھی زنگ آلود نہیں ہو سکتی اور انسان کے اندر ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جو اپنی آنکھوں سے اس کائنات میں قدرت کے عجائبات کو دیکھتی ہے۔ انسان کے اندر ایسا تدبر پیدا ہوتا ہے جو ان مشاہدات عجیبہ کا تتبع کرتا ہے اور آخر کار راز کائنات تک جا پہنچتا ہے۔ جب اس کے ساتھ انسان اللہ کی راہ میں جدوجہد کرتا ہے تو اس کے عوض اللہ تعالیٰ اس انسان کی راہنمائی کرتا ہے۔

یوں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کائنات کی سیر شروع کی اور اس راہ سے انہیں اللہ کے ساتھ وصل نصیب ہوا۔ پہلے تو وہ اپنی فطرت سلیمہ کے ذریعے حق تعالیٰ کو پکار رہے تھے لیکن اب تو آپ کی قوت مدرکہ اور آپ کے علم میں ذات باری موجود تھی۔ پہلے تو حقیقت الوہیت کا شعور ان کے ضمیر اور ان کی فطرت سلیمہ میں تھا مگر اب یہ حقیقت ان کے فہم و ادراک میں آچکی تھی۔

حضرت ابراہیم کی فطرت صادقہ اور فطرت سلیمہ کا یہ سفر نہایت ہی دلچسپ ہے۔ اس کا مطالعہ جاری رہنا چاہئے۔ یہ ایک عظیم سفر تھا اگرچہ چشم ظاہر بین کو یہ سفر ایک معمولی سفر نظر آتا ہے۔ یہ سفر درحقیقت فطری ایمان سے آگے بڑھ کر ایمان مدرک اور ایمان مفہومہ کی طرف انتقال تھا۔ ایمان مدرک اور ایمان مفہوم کے اوپر ہی شرعی فرائض اور واجبات کا دارومدار ہوتا ہے اور پھر انسان پر شریعت کا اتباع فرض ہو جاتا ہے۔ یہ ایمان اور اتباع شریعت' وہ مقام ہے جسے صرف

لوگوں کے عقلی سفر پر ہی نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ اللہ نے اس کے بیان اور تشریح کے لئے نبوت کو جاری کیا اور سلسلہ رسل کو جاری فرمایا تاکہ لوگ ایمان و شریعت کو صرف اپنی عقل ہی سے معلوم نہ کریں بلکہ رسول اس کی تبلیغ اور تبیین کریں۔ لوگوں پر عقلی ایمان کے بجائے شرعی ایمان اور شرعی دلائل حجت قرار پائیں ۔ آخرت میں بھی جزاو سزا کا مدار ان احکام شرعی پر ہو گا جو رسولوں کی زبانی نازل نہیں ہوئے اور یہ سلسلہ اس لئے جاری کیا کہ اللہ تعالٰی کو معلوم تھا کہ انسان صرف اپنی عقل سے ایمان و شریعت کی تفصیلات طے نہیں کر سکتا۔

رہے ابراہیم علیہ السلام تو وہ ابراہیم علیہ السلام تھے ۔ وہ ایک عام انسان نہ تھے ۔ وہ اللہ کے دوست تھے اور مسلمانوں کے ابو الاباء تھے ۔

(فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ

( ٦ : ٧٦ ) ) "چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا' کہا یہ میرا رب ہے مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں ۔" یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نفس کی تصویر کشی ہے ۔ ان پر معبودان خاندانی کے سلسلے میں شک بلکہ فیصلہ کن انکار پوری طرح حاوی ہو چکا ہے ۔ ان کے والد اور ان کی قوم جن معبودان باطل اور بتوں کی پوجا کر رہے تھے ان کے ذہن نے اس سے ابا کر دیا ہے ۔ اور وہ صحیح نظریہ حیات اور صحیح عقیدے کے متلاشی ہیں اور یہ ان کے لئے عظیم مسئلہ بن گیا ہے ۔ اس مسئلے کی تصویر کشی ان الفاظ سے اچھی طرح ہوتی (فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ) "جب رات ان پر طاری ہوئی ۔" گویا رات نے صرف حضرت ابراہیم ہی کو گھیر لیا ہے اور یہ رات ان کو دوسرے لوگوں سے علیحدہ کر رہی ہے' تاکہ وہ رات کی تاریکی میں سکون کے ساتھ اپنے دل میں اس مسئلے پر سوچ بچار کر سکیں اور اسے حل کر سکیں جو انہیں پریشان کر رہا ہے اور بار بار حملہ آور ہوتا ہے ۔ "چنانچہ جب رات طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا' کہا یہ میرا رب ہے ۔" ان کی قوم ستاروں کی بھی پوجا کرتی تھے جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں ۔

جب حضرت ابراہیم اس بات سے مایوس ہو گئے کہ ان کی فطرت کے اندر الٰہ برحق کی جو تصویر ہے اس کے ساتھ تو یہ بت مطابقت نہیں رکھتے تو انہوں نے شاید یہ امید رکھی کہ وہ الٰہ برحق بتوں کے علاوہ دوسرے سیاروں اور ستاروں کی صورت میں مل جائے ۔

صورت حال یہ نہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ اور اپنی قوم کو کہیں پہلی مرتبہ ستاروں اور سیاروں کی پوجا کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے ۔ نہ صورت حال یہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان ستاروں سیاروں کو پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے لیکن آج کی رات یہ ستارے حضرت ابراہیم کو جو بات بتا رہے تھے وہ بات انہوں نے اس سے پہلے نہ کی تھی ۔ آج وہ حضرت ابراہیم کو وہ حقیقت بتا رہے تھے' جو آپ کی فطرت کے عین مطابق تھی' جس کے لئے آپ پریشان و سنوسنی تھے اور اس کے بارے میں ان پر خیالات و تصورات کا ہجوم رہتا تھا۔

(قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ( ٦ : ٧٦ ) ) یہ میرا رب ہے ۔" اپنے نور اور اپنی چمک اور اپنے مقام بلند کی وجہ سے شاید بتوں کے مقابلے میں اس کا رب ہونا زیادہ ممکن ہے ۔ لیکن نہیں نہیں یہ امکان بھی بعید ہے' ایسا نہیں ہو سکتا۔

(فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ (۶:۷۶)) جب ڈوب گیا تو بولا میں ڈوب جانے والوں کا گرویدہ نہیں ہوں ۔" یہ ستارہ یا سیارہ تو لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے؟ مخلوقات سے دور ہو جاتا ہے' غائب ہو جاتا ہے ۔اگر خدا ڈوب گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا تو پھر کون ہے جو اس عالم کی تدبیر کرتا ہے ۔رب ہو اور غائب ہو' نہیں' یہ ستارہ رب نہیں ہوسکتا ۔رب تو اوجھل نہیں ہو سکتا ۔

یہ ہے فطری اور بدیہی استدلال ۔یہ منطقی اور جدلیاتی فلسفیانہ استدلال نہیں ہے ۔یہ وجدانی استدلال ہے جو براہ راست سامنے آتا ہے اور بڑی سہولت سے یقین پیدا کر دیتا ہے ۔پوری انسانیت اور پوری انسانی فکر اسے قبول کر لیتی ہے ۔اور اسے گہرا یقین حاصل ہو جاتا ہے

(لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ (۶:۷۶)) (میں ڈوب جانے والوں کو پسند نہیں کرتا) انسانی فطرت اور الٰہ العالمین کے درمیاں حقیقی تعلق محبت کا تعلق ہے اور محبت کا یہ ربط قلبی ربط ہے ۔اسی لئے فطرت ابراہیم ڈوب جانے والوں کے ساتھ محبت نہیں رکھتی ۔لہٰذا انہیں الٰہ تسلیم نہیں کرتی ۔اور فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ جو اللہ ہے وہ ہر وقت حاضر و محبوب ہو گا ۔

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ (۶:۷۷) پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ ہے میرا رب ۔مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا" سابقہ تجربہ بھی سامنے آتا ہے ۔نظر یوں آتا ہے کہ گویا حضرت ابراہیم نے اس سے قبل چاند کو دیکھا تک نہ تھا ۔گویا آپ کو پتہ تک نہ تھا کہ آپ کا خاندان اور آپ کی قوم چاند کی پرستش کرتی ہے ۔اور یہ کہ آج کی رات بالکل ایک نئی رات تھی (غور و فکر کی رات)۔

(قَالَ هٰذَا رَبِّیْ (۶:۷۷)) انہوں نے کہا یہ میرا رب ہے ۔" یہ پوری کائنات پر اپنا نور نچھاور کر رہا ہے' آسمانوں میں اکیلا نظر آتا ہے اور اس کی روشنی بھی پسندیدہ ہے لیکن دیکھو یہ بھی غائب ہو رہا ہے لیکن رب کائنات جس سے فطرت ابراہیمی خوب واقف تھی' وہ تو غائب نہیں ہوتا' وہ تو حضرت ابراہیم کے دل میں جاگزیں تھا ۔

اس مقام پر آکر حضرت ابراہیم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس حل طلب مسئلے کو وہ ذاتی غور و فکر ہی سے حل نہیں کر سکتے اور انہیں اس رب ذوالجلال کی جانب سے معاونت کی ضرورت ہے جسے ان کی فطرت پا رہی ہے اور جو ان کے ضمیر میں بیٹھا ہے ۔وہ رب جسے وہ محبوب رکھتے ہیں لیکن وہ آپ کے ادراک اور آپ کی فہم میں نہیں اتر رہا ۔آپ یہ اعلان کرتے ہیں کہ اس مقام پر اگر ان کا رب انہیں ہدایت نہ کرے گا تو وہ صحیح راہ نہ پا سکیں گے ۔اب اس رب کی جانب سے دست گیری کی ضرورت ہے ۔اس کی جانب سے براہ راست راہنمائی کی ضرورت ہے ۔

(قَالَ لَئِنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ (۶:۷۷)) کہا' اگر میرے رب نے میری راہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاتا ۔"

(فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (۷۸) اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۷۹)) (۶:۷۸–۷۹) پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب' یہ سب سے بڑا ہے۔مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیم ﷺ پکار اٹھے "اے برادران قوم' میں ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

یہ تیسرا تجربہ ہے اور یہ تجربہ اس کائنات کے سب سے بڑے کرے کے ساتھ ہوا' جسے دیکھا جا سکتا ہے۔جس کی ضو پاشیاں عیاں ہیں اور جس کی گرمی محسوس ہوتی ہے۔یہ سورج تو روز طلوع و غروب ہوتا رہتا ہے لیکن وہ آج حضرت ابراہیم کی نظروں میں بالکل ایک نئی چیز ہے۔(وہ نئے زاویئے سے اسے دیکھ رہے ہیں) آج تو ابراہیم ان تمام چیزوں کو اس زاویئے سے جانچ رہے ہیں کہ آیا ان میں سے کوئی چیز اس قابل ہے کہ اسے اللہ تسلیم کیا جائے اس پر دل مطمئن بھی ہو جائے اور اس پریشانی اور حیرت انگیز مسئلے کے حل کی طویل جدوجہد میں یہ امر فیصلہ کن ہو۔

(قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ (۶:۷۸)) کہا یہ میرا رب ہے! یہ سب سے بڑا ہے۔" لیکن تعجب ہے کہ یہ بھی غائب ہو رہا ہے۔اس مقام پر دونوں حقائق آپس میں جڑتے ہیں۔اس اتصال و التباس سے ایک چنگاری نکلتی ہے۔یہاں فطرت صادقہ اور ذات کبریا کے درمیان اتصال ہو جاتا ہے۔قلب سلیم روشنی سے معمور ہو جاتا ہے اور پھر یہ روشنی پوری کائنات کو منور کر دیتی ہے۔اس کے ذریعے انسان کی عقل و فکر بھی روشن ہو جاتی ہے۔حضرت ابراہیم کو مطلوب الٰہی مل جاتا ہے جس طرح ان کی فطرت اور ان کے شعور میں وہ موجود تھا۔اس کا تصور ان کے فہم و ادراک میں بھی آجاتا ہے اور فطرت کے شعور احساس اور عقلی ادراک کے درمیان اتحاد و توافق ہو جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم کو اپنا رب واللہ مل جاتا ہے' لیکن یہ اللہ کسی چمکدار ستارے کی شکل میں بھی نہیں۔کسی طلوع ہونے والے چاند کی شکل میں نہیں' بلند ہونے والے سورج کی شکل میں نہیں' کسی ایسی شکل میں نہیں جسے آنکھ دیکھ سکے' کسی ایسی صورت میں بھی نہیں جسے انسان چھو سکے' بلکہ یہ اللہ ان کے شعور اور فطرت میں ہے' ان کی عقل اور فہم میں ہے' اس پوری کائنات میں ہر جگہ موجود ہے۔وہ ان تمام مخلوقات کا خالق ہے جسے آنکھ دیکھ سکتی ہے' جسے محسوس کیا جا سکتا ہے یا جس کا انسانی عقل ادراک کر سکتی ہے۔

اب وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی اور ان کی قوم کے درمیان اب مکمل جدائی کا وقت آگیا ہے۔وقت آگیا ہے کہ آپ ان تمام معبودات باطلہ سے اپنی اعلانیہ براءت کا اظہار کر دیں اور دو ٹوک انداز میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے ان کے نقطہ نظر اور ان کے منہاج حیات اور مشرکانہ عقائد و خیالات کو یکسر رد کر دیں۔یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ یہ لوگ ذات کبریائی کے بالکل منکر نہ تھے لیکن صورت حال ایسی تھی کہ وہ لوگ حقیقی اللہ کے ساتھ ان جھوٹے خداؤں کو شریک کرتے تھے اور حضرت ابراہیم اللہ العالمین کی طرف اس طرح متوجہ ہوئے تھے کہ وہ اللہ

کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے تھے۔

"تو ابراہیم پکار اٹھا" اے برادران قوم' میں ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔میں نے تو یکسو ہوکر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا ہے' جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

اب گویا ان کا رخ آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے والے کی طرف مڑ گیا اور اس قدر یکسوئی کے ساتھ مڑا کہ اس میں شرک کا شائبہ تک نہ رہا۔انہوں نے فیصلہ کن بات کر دی' یقین محکم کا اظہار کر دیا اور آخری طور پر اپنا رخ متعین کر لیا۔اب نہ تو کوئی تردد ہے' نہ الجھن ۔عقل و ادراک اس طرح روشن ہوگئے جس طرح ان کا شعور اور ضمیر روشن تھے۔

ایک بار پھر ہم آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا خوش کن منظر دیکھ رہے ہیں۔یہ ایک نظریہ حیات کا منظر ہے جو نفس انسانی کے اندر نمودار ہو گیا ہو' جو کسی دل پر غالب اور حاوی ہو گیا ہو' جو پوری طرح واضح اور نمایاں ہو گیا ہو اور اس سے ہر قسم کا غبار چھٹ گیا ہو۔یہ منظر ہمارے سامنے آتا ہے اور اس کی حالت یہ ہے کہ ایک انسان کی شخصیت پر وہ چھایا ہوا ہے اور اس نے اس شخصیت کے ہر پہلو کو ڈھانپ لیا ہے۔اس شخصیت کے کاسہ دل کو شراب اطمینان سے بھر دیا ہے۔اب اسے اپنے اس رب پر پورا اعتماد ہے جسے اس نے عقلی طور پر پالیا ہے اور وہ اس کے اردگرد کے وجود پر چھایا ہوا ہے۔یہ ایک ایسا منظر ہے جو سیاق کلام کے آنے والے جملوں کے اندر اچھی طرح نمایاں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اب اپنے ضمیر' اپنی عقل اور اپنے اردگرد پھیلے ہوئے وجود کے اندر اپنے رب کو دیکھ رہے ہیں۔ان کی مشکل حل ہوگئی ہے اور ان کا دل مطمئن ہے۔اب وہ محسوس کر رہے ہیں کہ دست قدرت اس راہ میں ان کی راہنمائی کر رہا ہے اب تو ان کی قوم سامنے آتی ہے اور یہ قوم ان نتائج کو چیلنج کر رہی ہے جن تک وہ جا پہنچے ہیں اور انہیں ان کا یقین حاصل ہو گیا ہے۔ان کے دل میں عقیدہ توحید بیٹھ گیا ہے۔یہ قوم اب حضرت ابراہیم کو اپنے خداؤں سے ڈراتی ہے کہ یہ الہ انہیں نقصان پہنچائیں گے اور آپ ان کو نہایت ہی اعتماد ایک راسخ العقیدہ مسلم کی طرح جواب دیتے ہیں اور یہ جواب وہ ظاہری اور باطنی دونوں طرح اپنے رب پر اپنے عقیدے کو پیش نظر رکھتے ہوئے دیتے ہیں۔

---

وَحَآجَّهُ قَوْمُهُ ۚ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْــٴًـا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَكَیْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾

"اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے قوم سے کہا: "کیا تم لوگ اللہ کے معاملے میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے راہ راست دکھا دی ہے اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا' ہاں اگر میرا رب کچھ چاہے تو وہ ضرور ہو سکتا ہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے' پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟ اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں' جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لئے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی و اطمینان کا مستحق ہے؟ بتاؤ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔"

جب انسان کی فطرت راہ سلامتی سے ہٹ جاتی ہے تو وہ گمراہ ہو کر غلط راستوں پر پڑ جاتی ہے۔ وہ ان راستوں پر بہت دور نکل جاتی ہے۔ اب زاویہ کشادہ ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کے بازو ایک دوسرے سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ جس نقطے سے یہ فطرت راہ مستقیم سے ہٹ جاتی ہے وہ دور رہ جاتا ہے۔ خود انسان اس راہ مستقیم سے اتنا دور نکل جاتا ہے کہ اس کے لئے لوٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم کی اس قوم کو دیکھو' یہ بتوں' ستاروں اور سیاروں کی پرستش کر رہے ہیں لیکن وہ اس تبدیلی اور تغیر کو محسوس کرنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جو حضرت ابراہیم کی زندگی میں نمودار ہوئی۔ اگر وہ معمولی غور و فکر بھی کرتے تو وہ اسے محسوس کرنے لگتے۔ اس کے بجائے انہوں نے الٹا حضرت ابراہیم سے مجادلہ شروع کر دیا اور احتجاج شروع کر دیا' حالانکہ وہ خود نہایت ہی بودے تصورات کے حامل تھے اور واضح طور پر گمراہ تھے۔

لیکن حضرت ابراہیم پکے مومن تھے' اپنے دل و دماغ میں اور پوری کائنات میں اللہ کو پا رہے ہیں اور وہ پورے قلبی اطمینان کے ساتھ ان کو جواب دیتے ہیں۔

(وَحَآجَّهُ قَوْمُهُ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ (٦: ٨٠)) تم مجھ سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو' میں نے تو محسوس کیا ہے کہ وہ ہاتھ پکڑ کے مجھے راہ راست پر لا رہا ہے' میری چشم بصیرت کھول رہا ہے' وہ اپنی طرف مجھے بلا رہا ہے۔ مجھے اپنی معرفت نصیب کر کے اپنا مقرب بنا رہا ہے۔ جب اس نے میرے ہاتھ پکڑ کر مجھے ہدایت دی تو وہ موجود ہے' یہ میرے لئے نفسیاتی اور وجدانی دلیل ہے۔ میں اپنے ضمیر میں اسے پاتا ہوں' میں اپنے فہم کے مطابق اس کے بارے میں سوچتا ہوں اور میں اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات میں اسے دیکھتا ہوں۔ ایک بات جو میری نفسیات اور میرے ضمیر و شعور میں موجود ہے کیا اس کے بارے میں تم مجھ سے الجھتے ہو؟ میں نے کب تم سے دلیل طلب کی ہے؟ اس نے خود مجھے اپنی طرف راہنمائی دی ہے اور یہی میری دلیل ہے۔

(وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖ (٦: ٨٠)) اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا۔" وہ شخص جس نے اللہ کو پا لیا ہو' وہ شریکوں سے کیسے ڈر سکتا ہے۔ وہ کس سے ڈرے اور کیوں ڈرے؟ اللہ کے سوا تمام قوتیں ہیچ ہیں اور اللہ کی بادشاہت کے سوا تمام بادشاہتیں اس قابل ہی نہیں کہ ان سے خوف کھایا جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے پختہ ایمان اور اللہ کے مطیع فرمان ہونے کے باوجود کسی بات کو ماسوائے مشیت الہی دو ٹوک انداز میں نہ کہتے تھے۔ وہ ہر معاملے میں الا ماشاء اللہ کہتے تھے اور ہر بات کو اللہ کے علم کی طرف لوٹاتے تھے۔

(اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْئًا وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا (۶ : ۸۰)) حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کی جانب سے حمایت و رعایت کو اللہ کی مشیت پر چھوڑتے ہیں اور اعلان فرماتے ہیں کہ وہ مشرکین کے الہوں سے ذرہ بھر خوف نہیں کھاتے کیونکہ ان کا تکیہ اللہ کی حفاظت و حمایت پر ہے۔ انہیں پورا یقین ہے کہ انہیں اس وقت تک کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی جب تک اللہ نہ چاہے اور اللہ علیم ہے اور اس کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔

(وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۶ : ۸۱)) "اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لئے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی و اطمینان کا مستحق ہے؟ بتاؤ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔" یہ اس شخص کا استدلال ہے جس نے اس دنیا کے حقائق کا ادراک کر لیا ہے۔ اگر کوئی ڈرتا ہے تو ڈرے، ابراہیم نہیں ڈرتا کیونکہ ابراہیم تو وہ مومن ہے جس نے اپنا ہاتھ اللہ کے ہاتھ میں دے دیا ہے اور اپنے راستے پر چل رہا ہے۔ پھر وہ موجودہ عاجز ولاچار الہوں سے کیوں ڈرے، چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں؟ اس لئے کہ الٰہ قہار و جبار حکمرانوں کی شکل میں سامنے آتے ہیں جن کی گرفت بظاہر بہت ہی سخت ہوتی ہے۔ لیکن اللہ کی قدرت کے سامنے ان کی کچھ حیثیت نہیں ہوتی۔ وہاں یہ بھی عاجز ہوتے ہیں اس لئے حضرت ابراہیم جیسے موحد ایسے ضعیف اور جھوٹے خداؤں سے کس طرح ڈر سکتے ہیں حالانکہ ڈرنا مشرکین کو چاہئے کہ انہوں نے بغیر ثبوت و برہان کے اللہ کے ساتھ ان ضعیف خداؤں کو شریک بنالیا ہے اور یہ اس قدر ضعیف ہیں کہ ان کے اندر کوئی قوت نہیں ہے۔ یہ نہایت ہی اہم سوال ہے کہ ہم دونوں فریقوں میں سے کون سا فریق زیادہ مامون اور بے خوف ہے؟ اللہ پر ایمان رکھنے والا یا ان ضعیف بتوں کو الٰہ ماننے والا، جن کو وہ اللہ جل شانہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہے اور آنکھوں سے دیکھ بھی رہے ہیں کہ ان کو کوئی اقتدار اور قوت حاصل نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے پاس فہم و ادراک کی کوئی بصیرت نہیں ہے۔

اس سوال کے جواب میں وحی آتی ہے اور اس قضیے کا فیصلہ یوں ہوتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ
۹ ع۱۲ ۱۵ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾

"حقیقت میں تو امن انہی کے لئے ہے اور راہ راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔"

وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے لئے خالص کر لیا اور اس ایمان میں انہوں نے کسی قسم کے شرک کو نہ ملایا۔ نہ غیر اللہ کی اطاعت کی اور نہ اسلام کے سوا کوئی اور رخ اختیار کیا تو ایسے ہی لوگ مطمئن اور مامون رہیں گے اور صرف ایسے ہی لوگ راہ ہدایت پا سکتے ہیں۔

یہی وہ محبت تھی جس کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ توفیق دی گئی کہ انہوں نے اپنے ساتھ مجادلہ کرنے والوں کے تمام دلائل کو رد کر دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے سامنے یہ انکشاف کیا کہ ان کے تمام دلائل بودے ہیں' الہوں کے بارے میں ان کے تمام تصورات غلط ہیں اور ان کا یہ وہم بھی فرضی ہے کہ ان کے الٰہ حضرت ابراہیم کو کوئی گزند پہنچا سکتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم تھی کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے وجود کے منکر نہ تھے اور نہ اس بات کے منکر تھے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات میں قوت اور حکومت اور اقتدار کا مالک ہے۔ غلطی صرف یہ تھی کہ وہ لوگ اپنے ان الہوں کو اللہ کے ساتھ شریک کرتے تھے۔ جب حضرت ابراہیم ﷺ نے ان کے سامنے یہ بات رکھی کہ جو شخص صرف اللہ وحدہ پر یقین رکھتا ہے وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ اللہ کے سوا اوروں سے تو اس شخص کو ڈرنا چاہئے جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتا ہے۔ جب حضرت ابراہیم نے ان کے سامنے یہ حقیقت رکھی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ڈال دی تھی تو ان کے تمام دلائل خاک میں مل گئے' حضرت ابراہیم کی بات بلند ہوئی اور اپنے عقائد و نظریات کے اعتبار سے حضرت ابراہیم اپنی قوم کے مقابلے میں برتر و سربلند ہو گئے۔ یوں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا مقام اور درجہ بلند کر دیتا ہے اور یہ اللہ کے تصرفات ہیں اس کی حکمتوں کے تقاضوں کے مطابق۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝۸۳

"یہ تھی ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی۔ ہم جسے چاہتے ہیں بلند مرتبے عطا کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ تمہارا رب نہایت دانا اور علیم ہے۔"

قبل اس کے کہ ہم آیات زیر بحث کو چھوڑ کر آگے بڑھیں' میں مناسب سمجھتا ہوں کہ صحابہ کرام کی زندگی کے کچھ خوشگوار واقعات ناظرین کے سامنے رکھوں۔ ان پر قرآن کریم باران رحمت کی طرح اثر کر رہا تھا اور ان کے نفوس اس سے خوب سیراب ہو رہے تھے۔ وہ اس قرآن کے ساتھ زندہ تھے اور قرآن کے لئے زندہ تھے۔ وہ اپنی زندگی کو قرآن کریم کے اشاروں' اس کے مفہومات و مدلولات کے ساتھ بدلتے اور ہم آہنگ کرتے چلے جاتے تھے۔ اس کے تقاضوں کو پورے کرتے چلے جاتے تھے اور وہ نہایت ہی سنجیدگی' نہایت ہی فہم و فراست اور نہایت ہی سختی کے ساتھ اسے لیتے تھے۔ قرآن کریم کی خوبصورتی' اثر آفرینی' عملیت اور سنجیدگی کو دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ یہ امر حیران کن ہے کہ قرآن نے گروہ صحابہ کے اندر کس قدر خارق العادت تبدیلی پیدا کی کہ صرف ۲۵ سال کے اندر اندر یہ معجزہ رونما ہوا جس کی کوئی مثال تاریخ میں نہیں۔ یہ اس لئے ہوا کہ گروہ صحابہ نہایت ہی محیر العقول لوگ تھے۔ ابن جریر نے' اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ ابن ادریس سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری

(اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ نہ ملایا۔" تو یہ بات صحابہ کرام پر بہت ہی گراں گزری۔ انہوں نے کہا کہ ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے نفس

پر ظلم نہ کیا ہو۔ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس طرح نہیں جس طرح تم لوگ گمان کرتے ہو، یہ تو اس طرح ہے جس طرح حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا تھا

(لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ) بیٹے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ بے شک شرک ظلم عظیم ہے۔" انہوں نے اپنی سند کے ساتھ ابوالاشعری عبدی اور اس کے باپ سے نقل کیا ہے کہ زید ابن ہومان نے سلمان سے پوچھا: اے ابو عبداللہ، اللہ کی کتاب میں سے ایک آیت نے میرا برا حال بنا دیا ہے۔

(اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کو نہ ملایا۔" تو سلمان نے کہا کہ یہ تو اللہ کے ساتھ شرک ہے اور اس کا ذکر اللہ نے کیا ہے۔ زید نے کہا کہ آپ سے یہ سن کر مجھے اس قدر خوشی ہوئی کہ کل رات میری جس قدر دولت تھی اگر اسی قدر مجھے اور بھی مل جائے تو اتنی خوشی نہ ہوتی۔

ان تین روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحابہ کا معزز گروہ قرآن کریم کے بارے میں کس قدر حساس تھا اور ان کی زندگی پر قرآن کس قدر عملاً اثرانداز ہوتا تھا اور کس طرح وہ قرآن کریم کو لیتے تھے؟" اس طرح کہ یہ ایسے احکام ہیں جن کا فی الفور نافذ کرنا ضروری ہے۔ اور یہ ایسی ہدایات اور ایسے فیصلے ہیں جن کی اطاعت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ آخری احکام اور فیصلے ہیں اور جب وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی وسعت و طاقت اور مطلوبہ احکام کے درمیان فرق ہے اور ان کے لئے ان احکام کا نفاذ ممکن نہ رہے گا تو وہ بے چین ہو جاتے تھے اور اللہ اور رسول ان احکام میں رعایت اور نرمی فرما دیتے تھے۔ یہ وہ مناظر ہیں جو آنکھوں کو خیرہ کر دیتے ہیں۔ یہ ہیں ان لوگوں کے حالات جو اس دین کے حاملین تھے۔ وہ ایسا پر وہ تقدیر الٰہی تھے اور وہ دستہ تھے جو مشیت الٰہی کے نفاذ کے لئے منتخب کیا گیا تھا اور یہ مشیت سب سے پہلے انہوں نے اپنی زندگی میں نافذ کی تھی۔

---ooo---

اب سیاق کلام میں اس عظیم قافلہ ایمان کا ذکر آتا ہے جس کے قائدین انبیاء و رسل تھے۔ حضرت نوح ؑ سے خاتم النبیین تک ان سب پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔ یہ طویل قافلہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہے۔ خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ان حضرات کے تذکرے میں تاریخی تسلسل کا خیال نہیں رکھا گیا۔ جیسا کہ دوسرے مقامات پر نظر آتا ہے کیونکہ یہاں مقصد یہ نہیں ہے کہ ان کی تاریخی ترتیب کو بیان کیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ تمام انبیاء کا مشن ایک ہی تھا یعنی عقیدۂ توحید:

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَ نُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ

عِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ يُوْنُسَ
وَ لُوْطًا ؕ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ
اِخْوَانِهِمْ ۚ وَ اجْتَبَيْنٰهُمْ وَ هَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾ ذٰلِكَ هُدَى
اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ
مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ
يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ١٠
ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾ ع ٨
١٦

پھر ہم نے ابراہیم ؑ کو اسحاق ؑ اور یعقوب ؑ جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو راہ راست دکھائی (وہی راہ راست جو) اس سے پہلے نوح ؑ کو دکھائی تھی۔ اور اس کی نسل سے ہم نے داؤد ؑ ' سلیمان ؑ ' ایوب ؑ ' یوسف ؑ ' موسیٰ ؑ ' اور ہارون ؑ کو (ہدایت بخشی)۔ اسی طرح ہم نیکوکاروں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں۔ (اسی کی اولاد سے) زکریا ؑ ' یحییٰ ؑ ' عیسیٰ ؑ ' اور الیاس ؑ کو (راہ یاب کیا) ہر ایک ان میں سے صالح تھا۔ (اسی کے خاندان سے) اسماعیل ؑ ' الیسع ؑ ' اور یونس ؑ اور لوط ؑ کو (راستہ دکھایا)۔ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کی۔ نیز ان کے آباؤاجداد اور ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بہتوں کو ہم نے نوازا۔ انہیں اپنی خدمت کے لئے چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی راہنمائی کی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اگر کہیں ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی تھی۔ اب اگر یہ لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو (پرواہ نہیں) ہم نے کچھ اور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے جو اس سے منکر نہیں ہیں۔ اے نبی ' وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے ' انہی کے راستہ پر تم چلو اور کہہ دو کہ میں (اس تبلیغ و ہدایت کے) کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں ' یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لئے۔

ان آیات میں ۱۷ رسولوں اور نبیوں کا ذکر ہے یعنی حضرت نوح ؑ اور حضرت ابراہیم ؑ کے علاوہ اور دوسروں کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

(وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ (۶:۸۷)) اور ان کے آباء ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے۔" اور اس قافلہ ایمان پر جو تبصرے کئے گئے ہیں۔

(وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِينَ (٦: ٨٤)) "اور ہم نیک کام کرنے والوں کو اسی طرح جزاء دیتے ہیں۔

(وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِينَ (٦: ٨٦)) اور ان سب کو ہم نے تمام جہان والوں پر فضیلت دی۔" اور

(وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (٦: ٨٧)) اور ہم نے انہیں منتخب کیا اور انہیں سیدھی راہ کی طرف ہدایت کی۔" ان تمام تبصروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قافلہ رسل کس قدر قابل قدر اور کس قدر منتخب لوگوں پر مشتمل تھا اور یہ کہ یہ صحیح راہ کی طرف ہدایت یافتہ تھا۔ اس گروہ کو اس انداز میں پیش کرنا اور اس کو اس شکل و صورت میں اجاگر کرنا دراصل ایک اہم بات کہنے کے لئے تمہید کے طور پر تھا۔ بات یہ تھی:

(ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (٦: ٨٨)) یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اگر کہیں ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا۔" یہ فیصلہ ہے اس امر کا کہ اس کرۂ ارض پر ہدایت کے سرچشمے کون سے ہیں؟ تو انسانوں کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ کی وہ تعلیمات ہیں جو رسولوں کے ذریعے بھیجی گئیں اور ان ہدایات الٰہیہ میں سے جو ہدایات یقینی طور پر ثابت اور محفوظ ہیں وہ اسی منبع اور سرچشمہ قرآن میں ہیں جس کے بارے میں اللہ کا فیصلہ ہے کہ یہی اس کی ہدایت ہے۔ اور یہ کہ یہ ہدایت اپنے مختار بندوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ہی بھیجتا ہے۔ اگر یہ مختار بندے بھی اس راہ کو چھوڑ دیں اور ہدایت کے اس سرچشمے کو ترک کر دیں جس سے وہ ہدایات لیتے ہیں اور نظریات و اعمال اور عقیدہ و عبادت میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کر دیں تو ان کا انجام بھی یہ ہو گا کہ ان کے تمام اعمال اکارت جائیں گے، ضائع ہو جائیں گے اور وہ اس طرح ہلاک ہو جائیں گے جس طرح کوئی جانور زہریلی گھاس کھا کر پھول جاتا ہے اور اس کی موت واقعہ ہو جاتی ہے۔ "حبط" کے لغوی معنی یہی ہیں۔

(اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ (٦: ٨٩)) "یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی تھی۔ اب اگر یہ لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو (پرواہ نہیں) ہم نے کچھ اور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے جو اس سے منکر نہیں ہیں۔ یہ دوسرا نتیجہ ہے۔ پہلی تعقیب میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مصدر ہدایت اللہ ہے۔ اللہ کی ہدایت وہ ہے جو رسولوں کے ذریعے سے انسانوں تک پہنچی ہو۔ دوسری میں یہ کہا گیا کہ جن رسولوں کا ذکر کیا گیا اور جن کی طرف مجمل اشارہ کیا گیا یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے کتاب، حکمت، حکومت اور نبوت عطا کی۔ اس آیت "حکم" اپنے دونوں مفاہیم میں استعمال ہوا ہے۔ بمعنی حکومت بھی استعمال ہوتا ہے اور حکم بمعنی حکمت سلطنت اور اقتدار بھی استعمال ہوتا ہے اور اس آیت میں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ ان رسولوں میں سے بعض پر تو کتاب نازل کی گئی مثلاً تورات حضرت موسیٰ پر، زبور حضرت داؤد پر، انجیل حضرت عیسیٰ پر اور بعض کو اقتدار دیا گیا۔ مثلاً داؤد اور سلیمان علیہ السلام کو اور

ہرایک کو اس معنی میں اقتدار اعلیٰ دیا گیا کہ اس کے پاس جو ہدایت ہے وہ اللہ کی جانب سے ہے اور جو دین وہ لے کر آئے ہیں لوگوں پر اسی کی حکمرانی ہوگی - اللہ نے جو رسول بھی بھیجے ہیں وہ اس لئے بھیجے ہیں کہ ان کی اطاعت کی جائے اور اللہ نے جو کتاب بھی بھیجی ہے وہ اس لئے بھیجی ہے کہ لوگوں کے درمیان اس کتاب کے مطابق فیصلے کئے جائیں جیسا کہ دوسری آیات میں آتا ہے کہ تمام نبیوں کو حکم اور نبوت دیا گیا - اللہ نے اپنا دین ان ہی کے حوالے کیا تاکہ وہ لوگوں تک اسے پہنچائیں - خود اس دین پر قائم رہیں' ایمان لائیں اور اس کی حفاظت کریں - اگر مشرکین عرب اللہ کی کتاب' اس کی حکومت اور نبوت کا انکار کر دیں تو اللہ کا دین ان کا محتاج نہیں - اللہ کے نبی اور ان کے ساتھی اس دین کے لئے کافی ہیں - یہ دین ایک پرانی حقیقت ہے اور اس درخت کی جڑیں دور تک تاریخ کے اندر پھیلی ہوئی ہیں - رسولوں کی کڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں' ایک کے بعد دوسرا آیا ہے اور وہی دعوت لے کر آیا ہے - جس کی قسمت میں اللہ نے ہدایت یافتہ ہونا لکھ دیا تھا اس نے ان سے ہدایت لی کیونکہ یہ اللہ ہی جانتا تھا کہ کون ہدایت کا مستحق ہے - یہ وہ تبصرہ ہے جس کے ذریعے مومنوں کے دلوں کو یقین و اطمینان کے ساتھ بھر دیا جاتا ہے' ہر دور کا گروہ مومن ان ہدایات سے اطمینان حاصل کر سکتا ہے - چاہے تعداد میں وہ کم ہو یا زیادہ ہو' کیونکہ تحریک اسلامی کے ساتھی چاہے کم ہوں اکیلے نہیں ہوتے - پوری تاریخ اسلامی ان کی پشت پر ہے - یہ ایک ایسا پودا ہے جس کی جڑیں زمین کے اندر دور تک گئی ہوئی ہیں اور اس کی شاخیں فضا میں دور تک بلند ہیں - یہ تحریک ایک عظیم تاریخی تحریک اسلامی کی ایک کڑی ہے جس کا آخری سرا اللہ تک پہنچا ہوا ہے - ایک منفرد مومن' اس کرۂ ارض پر جہاں بھی ہو' جس قوم میں بھی ہو' وہ نہایت ہی طاقتور ہے اور ایک عظیم الشان حقیقت ہے - وہ اس عظیم درخت کی ایک شاخ ہے جس کی جڑیں دور تک ہیں اور انسانی فطرت کی زمین کے اندر گہرائی تک چلی گئی ہیں - انسانیت کے اندر دور تک پھیلی ہوئی ہیں' انسانی تاریخ کے اندر گہرائی تک گئی ہوئی ہیں اور وہ واحد مومن فرد بھی قافلہ اہل ایمان کا ایک حصہ ہے اور اس کی تاریخ زمانوں تک پھیلی ہوئی ہے -

(أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ (٦ : ٩٠)) اے نبی ؐ' وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے' انہی کے راستہ پر تم چلو' اور کہہ دو کہ میں (اس تبلیغ و ہدایت کے) کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں' یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لئے -"

یہ ایک تیسری قرارداد ہے - یہ قافلہ رسل جو اہل ایمان کی جماعت کے قائد ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے راہ ہدایت دکھائی - ان کے پاس اللہ کی جانب سے جو ہدایات آتی رہیں وہ نبی آخرالزمان کے لئے بھی مشعل راہ ہیں - ان افراد کے لئے بھی مشعل راہ ہیں جو آپ ؐ پر ایمان لائے ہیں - لہٰذا حضور ؐ انہی ہدایات پر چلیں گے اور اپنی زندگی کے تمام امور میں فیصلے انہی ہدایات سے لیں گے - انہی ہدایات کی طرف پوری انسانیت کو دعوت دیں گے اور آپ امت دعوت کے سامنے یوں گویا ہوں گے -

(قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا (٦ : ٩٠)) "میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا مطالبہ نہیں کرتا" -

هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (٦ : ٩٠) "یہ تو تمام جہان والوں کے لئے صرف ایک نصیحت ہے۔" یہ نصیحت تمام لوگوں کے لئے ہے یہ کسی ایک نسل یا کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اور نہ قریب و بعید کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ تو پوری انسانیت کے لئے ایک یاد دہانی ہے اس لئے وہ اس پر کسی اجر کا تقاضا نہیں کر رہے۔ رسول کا اجر تو اللہ پر ہے۔

اب آگے یہ مضمون آتا ہے کہ جو لوگ سرے سے نبوت اور رسالت کے منکر ہیں ان کا موقف درست نہیں ہے۔ ان کی غلطی یہ ہے کہ وہ مقام الوہیت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے۔ نہ اللہ کی حکمت 'اس کی رحمت اور اس کے انصاف کے بارے میں ان کا تصور درست ہے۔ لہٰذا یہ بات جان لو کہ یہ آخری نبوت بھی سابقہ نبوتوں اور رسالتوں کے طریق پر ہے اور یہ کتاب بھی تمام کتب سابقہ کی تصدیق و تائید کر رہی ہے۔ تمام انبیائے سابق کی تعلیمات بھی اسی کتاب کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿٩١﴾ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿٩٢﴾

"ان لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے۔ ان سے پوچھو 'پھر وہ کتاب جسے موسیٰ لایا تھا' جو تمام انسانوں کے لئے روشنی اور ہدایت تھی' جسے تم پارہ پارہ کر کے رکھتے ہو 'کچھ دکھاتے ہو اور بہت کچھ چھپا جاتے ہو' اور جس کے ذریعے سے تم کو وہ علم دیا گیا جو نہ تمہیں حاصل تھا اور نہ تمہارے باپ دادا کو' آخر اس کا نازل کرنے والا کون تھا؟......... بس اتنا کہہ دو کہ اللہ 'پھر انہیں اپنی دلیل بازیوں سے کھیلنے کے لئے چھوڑ دو۔ (اسی کتاب کی طرح) یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔ بڑی خیر و برکت والی ہے۔ اس چیز کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آئی تھی۔ اور اس لئے نازل کی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ سے تم بستیوں کے اس مرکز (یعنی مکہ) اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو متنبہ کرو۔ جو لوگ آخرت کو مانتے ہیں وہ اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔"

مشرکین اپنی کج بحثی اور عناد کی وجہ سے یہ کہتے تھے کہ اللہ نے تو انسانوں میں سے کسی فرد کو رسول بنا کر بھیجا ہی نہیں ہے۔ نہ اللہ تعالیٰ نے کوئی کتاب بھیجی ہے جو اللہ کی وحی پر مبنی ہو حالانکہ مشرکین کے پڑوس ہی میں یہودی اہل کتاب رہتے تھے اور ان مشرکین نے کبھی اس امر کا انکار نہ کیا تھا کہ وہ اہل کتاب ہیں۔ نہ انہوں نے اس بات کا انکار کیا تھا کہ تورات اللہ کی جانب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اتری۔ یہ بات وہ عناد اور محض کٹ حجتی کی خاطر کرتے تھے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اس بہانے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر سکیں۔ اسی لئے قرآن مجید یہاں ان پر تنقید کرتا ہے کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ اللہ نے کوئی کتاب کسی انسان پر نہیں اتاری تو پھر حضرت موسیٰ کے بارے میں یہ بات تم کیوں نہ کہتے تھے۔

(وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ (٦: ٩١))

ان لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا' جب کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے۔" یہ نظریہ مشرکین مکہ دور جاہلیت میں رکھتے تھے۔ ہر دور میں اس قسم کے لوگ ہمیشہ رہے ہیں۔ آج دور جدید میں بھی بعض لوگوں کا یہی نظریہ ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ تمام ادیان سماوی انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں اور ان ادیان نے بھی درجہ بدرجہ ترقی کی جس طرح انسان نے بتدریج ترقی کی۔ یہ لوگ اس معاملے میں ان ادیان کے درمیان جو خود لوگوں نے بنائے مثلاً قدیم و جدیدیت پرستیاں اور ان ادیان کے درمیان فرق نہیں کرتے جو اللہ کے فرستادہ رسول لے کر آئے اور جو اب تک اپنے حقیقی اصولوں پر قائم ہیں۔ تمام رسول پے درپے انہی ادیان پر قائم رہے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے ان ادیان کو قبول کیا اور بعض نے انکار کیا۔ بعد کے زمانوں میں ان کے اصول و فروع کے درمیان تحریف واقع ہو گئی اور لوگ اس تحریف کی وجہ سے دوبارہ جاہلیت کی طرف لوٹ گئے۔ اس کے بعد اللہ نے ان قوموں کے اندر رسول بھیجنے کی ضرورت محسوس کی۔ آخرکار دین اسلام آیا۔ ان لوگوں کا نظریہ فقط یہ ہے کہ جس طرح انسان نے ترقی کی اسی طرح ادیان نے بھی ساتھ ساتھ ترقی کی۔

یہ بات قدیم لوگوں نے کی یا جدید لوگوں نے 'ان لوگوں نے فی الحقیقت اللہ کی ذات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کے فضل' اس کی رحمت اور اس کے عدل کو صحیح طرح نہیں پہچانا۔ ان لوگوں کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو رسول بنا کر نہیں بھیجتا۔ اگر اللہ کوئی رسول بھیجنا چاہتا تو کسی فرشتے کو بھیج دیتا جس طرح بعض عرب یہ کہتے تھے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس عظیم کائنات کے عظیم خالق کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اپنی مخلوقات میں سے ایک چھوٹے سے ذرے جس کا نام کرۂ ارض ہے' کے اوپر بسنے والی اس حقیر مخلوق کی اس قدر فکر کرے جس طرح اہل ادیان کہتے ہیں کہ اس نے رسول بھیجے' رسولوں پر کتابیں بھیجیں تاکہ ان کے ذریعے ان حقیر اہل ارض کو صحیح راستے پر لایا جائے یا جس طرح بعض قدیم اور جدید فلاسفر یہ کہتے آئے ہیں کہ نہ کوئی الٰہ ہے' نہ کوئی وحی ہے اور نہ رسول ہیں۔ یہ لوگوں کے اوہام ہیں اور دین کے نام پر بعض لوگ بعض دوسرے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں جس طرح آج کے جدید ملحد اور مادہ پرست لوگ کہتے ہیں۔

یہ تمام لوگ دراصل اللہ کی ذات کے بارے میں اندازہ لگانے میں غلطی کرتے ہیں۔ ایک عظیم و کریم ذات' ایک

رحیم اور عادل پروردگار اور ایک علیم و حکیم خالق کس طرح انسان کو بلاہدایت اور بلاحکمت و بصیرت چھوڑ سکتا ہے حالانکہ اللہ نے اس انسان کو پیدا کیا۔ وہ اس کی خفیہ اور ظاہر ہر جبلت سے واقف ہے۔ اس کی قوتوں اور صلاحیتوں سے باخبر ہے۔ وہ اس کی کمزوریوں اور کوتاہیوں سے بھی واقف ہے' وہ اس کی ضروریات اور اقدار کے بارے میں بھی خوب جانتا ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ اللہ اس کے لئے کچھ اصول اور پیمانے وضع نہ کرے جس کے مطابق اس کے اعمال و افعال کو جانچا جائے اور اس کی اچھائیوں اور برائیوں کی نشاندہی کی جائے۔ اللہ کو یہ بھی علم تھا کہ اس انسان کو جو عقل دی گئی ہے وہ محدود القوت ہے اور اس پر کئی فیکٹر اثر انداز ہوجاتے ہیں۔ خواہشات نفس اور ذاتی میلانات کے وہ تابع ہوتی ہے۔' وہ لالچ اور مفادات سے بھی متاثر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ عقل کے ذمہ از جانب اللہ یہ فریضہ بھی عائد ہے کہ وہ اس کائنات کی قوتوں کو مسخر کر کے کام میں لائے لیکن اس کے ذمہ یہ فریضہ عائد نہیں کیا گیا کہ وہ اس کائنات کے بارے میں کوئی مطلق تصور پیش کرے۔ نہ اس پر یہ فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ اس زندگی کے لئے کوئی مستحکم نظام اور اصول تجویز کرے اس لئے کہ زندگی کا نظام تجویز کرنا اس کا کام نہیں ہے' یہ نظام اس کے لئے منجانب اللہ آئے گا۔ اللہ نے زندگی کا نظام تجویز کرنے کا کام صرف عقل انسانی پر نہیں چھوڑا ہے اور نہ یہ امر اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس فطری قوت کے حوالے کیا ہے جس کی رو سے اس پر یہ بات لازم ہے کہ وہ اللہ کی ذات کے سلسلے میں اجمالی معرفت حاصل کرے۔ مصیبت کے وقت وہ اس رب ہی کو پکارتا ہے اس لئے کہ انسان کی اس فطرت سلیمہ پر بھی بعض فیکٹر دباؤ ڈال کر اسے فساد میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہ فیکٹر داخلی بھی اور خارجی بھی ہو سکتے ہیں۔ نیز انسان کو بدی کی طرف انسانوں اور جنوں کے تمام شیاطین ہروقت مائل کرتے رہتے ہیں اور وہ اس سلسلے میں انسان کو متاثر کرنے کے لئے تمام توجیہات اور تمام ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نظام زندگی کے بارے میں انسان کو صرف وحی اور رسالت کے حوالے کرتے ہیں۔ اس کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اس کی ان ہدایات کی پیروی کرے جو اس نے کتابوں میں اتاری ہیں تاکہ اس کی فطرت درست اور صاف رہ سکے۔ ان کی عقل اور سوچ صحیح سمت میں کام کر سکے۔ اور ان پر وہ عوامل نہ اندر سے اثر انداز ہو سکیں اور نہ باہر سے جو انسان کو گمراہ کرتے ہیں۔ یہی پالیسی اللہ کی شان اور اس کے فضل و کرم اور اس کی رحمت اور عدالت اور اس کی حکمت اور علم کے شایان شان ہے۔ اللہ کے لئے یہ بات کیسے مناسب ہو سکتی ہے کہ وہ انسان کو پیدا کر کے یونہی چھوڑ دے۔ قیامت کے دن ان سے حساب و کتاب تولے لیکن ان کی ہدایات کے لئے کوئی رسول نہ بھیجے حالانکہ اللہ کا اعلان ہے:

(وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا) اور ہم کسی قوم کو اس وقت تک عذاب دینے والے نہیں جب تک ان کے لئے رسول نہ بھیجیں۔" اس لئے اللہ کی الوہیت کا صحیح اندازہ لگانے اور اس کی قدر و قیمت کا اقرار کرنے کے لئے لازم ہے کہ یہ اعتراف کیا جائے کہ اس نے اپنے بندوں کے لئے رسول بھیجے ہیں۔ ان رسولوں کا مقصد یہ رہا ہے کہ وہ لوگوں کی فطرت کو تمام آلودگیوں سے پاک کر کے' اور ان کی عقل و ادراک کو تمام مؤثرات سے نکال کر خالص اور آزادانہ غور و فکر کرنے کے لئے آزاد کر دیں۔ اللہ نے ان رسولوں کو دعوت کا منہاج اور طریقہ کار بھی سکھایا اور ان میں سے بعض کو کتابیں بھی دیں جو آج تک موجود ہیں جیسا کہ داؤد اور موسیٰ علیہ السلام۔ نبی آخر الزمان کو

قرآن کریم دیا گیا جو آج تک تمام تحریفات سے پاک ہے۔

چونکہ ساکنان جزیرۂ عرب کے ہاں حضرت موسیٰ کی رسالت معروف و مشہور تھی اور عرب اہل کتاب کو بھی جانتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے رسول کو حکم دیا کہ وہ ان کے سامنے اہل کتاب اور کتاب موسیٰ کو بطور مثال پیش کریں کہ اس کا تو کبھی تم نے انکار نہیں کیا۔

(قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰی نُوْرًا وَّهُدًی لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِیْرًا وَعُلِّمْتُمْ مَّالَمْ تَعْلَمُوْا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ (٦: ٩١)) "ان سے پوچھو' پھر وہ کتاب جسے موسیٰ علیہ السلام لائے تھے' جو تمام انسانوں کے لئے روشنی اور ہدایت تھی' جسے تم پارہ پارہ کر کے رکھتے ہو کچھ دکھاتے ہو اور بہت کچھ چھپا جاتے ہو' اور جس کے ذریعے سے تم کو وہ علم دیا گیا جو نہ تمہیں حاصل تھا اور نہ تمہارے باپ دادا کو' آخر اس کا نازل کرنے والا کون تھا؟" اس سورہ پر تبصرے کے وقت ہم نے بتایا تھا کہ ان لوگوں کا قول درست نہیں ہے کہ یہ آیت مدنی ہے۔ انہوں نے یہ قول اس لئے اختیار کیا کہ اس میں یہ الفاظ ہیں: "جسے تم پارہ پارہ کر کے رکھتے ہو' کچھ دکھاتے ہو اور کچھ چھپاتے ہو۔" ہم نے اس موقعہ پر بتایا تھا کہ ابن جریر کی رائے یہ ہے کہ یہ آیت مکی ہے اور اس میں ایک قرات یجعلونہ یبدونھا اور یخفون بھی ہے اس صورت میں ضمیر غائب اہل کتاب کی طرف راجع ہے۔ اگرچہ مخاطب مشرکین مکہ ہیں لیکن بات اہل کتاب کے متعلق ہے۔ جس طرح انہوں نے عملاً کر رکھا تھا کہ تورات کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بعض حصوں کو چھپاتے تھے اور بعض کو اپنے منصوبے اور مقاصد کے مطابق ظاہر کرتے تھے۔ یوں وہ عوام کو دھوکہ دیتے تھے اور احکام و فرائض کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔ یہودیوں کے ان کارناموں سے بعض عرب بھی واقف تھے' جس طرح قرآن کریم بھی ان کا انکشاف کر رہا ہے۔ تو گویا یہ آیت اخبار عن الیھود ہے جو مشرکین مکہ سے ہونے والی بات چیت کے اندر بطور جملہ معترضہ آگئی ہے۔ اس طرح یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ آیت بھی مکی ہے' مدنی نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں ابن جریر کی رائے درست ہے۔

اب مضمون و مفہوم یہ ہو گا: "اے محمد ﷺ ان سے کہو وہ کتاب جو موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے جس میں نئی روشنی انسان کو دی گئی تاکہ لوگ راہ ہدایت پائیں جبکہ یہود نے اسے پارہ پارہ کیا' جس میں سے بعض حصوں کو وہ چھپاتے تھے اور بعض کو ظاہر کرتے تھے اور کتاب الٰہی کے ساتھ یہ مذاق وہ اپنے ذاتی مقاصد کے لئے کرتے تھے۔" ذرا غور تو کرو کہ اللہ تمہیں وہ حقائق بتا رہا ہے جن کے بارے میں تم نہ جانتے تھے' اس لئے تم پر یہ فرض ہے کہ اللہ کے اس فضل و کرم کا شکر ادا کرو اور سرے سے تم اس بات کے منکر نہ بن جاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے نہ وحی بھیجی ہے اور نہ کوئی کتاب نازل کی ہے۔

یہ سوال کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں موقعہ ہی نہ دیا کہ وہ جواب دیں۔ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ خود ہی جواب دے دیں اور فیصلہ کن اور دو ٹوک بات کر دیں تاکہ کوئی تنازعہ ہی نہ رہے اور نہ ہی مزید قیل و قال کرنے کی ضرورت رہے۔

(قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ (۶:۹۱)) بس اتنا کہہ دو کہ اللہ' پھر انہیں اپنی دلیل بازیوں سے کھیلنے کے لئے چھوڑ دو۔" اللہ نے اسے نازل کیا ہے۔بس یہ کہہ دیں اور اس کے بعد ان کے ساتھ مزید بات چیت کی ضرورت نہیں ہے۔ان کی کٹ حجتی اور لجاجت اور ظاہرداری کو خاطر میں نہ لائیں اور پھر ان کو چھوڑ دیں کہ وہ اپنی کٹ حجتی میں مگن رہیں۔یہ انداز کلام نہایت ہی تہدید آمیز ہے اور اس میں ان کے لئے ایک قسم کی توہین بھی ہے۔اس سے حق پرستی اور سنجیدگی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔جب لوگوں کی غیر سنجیدگی کا عالم یہ ہو جائے اور وہ ایسی باتیں کرنے لگیں تو مناسب یہی ہے کہ دوٹوک انداز میں کہہ دیا جائے کہ ہماری تو یہ راہ ہے تمہاری جو مرضی ہے 'کرو۔

آگے اس کتاب جدید کے بارے میں ایک مختصر تبصرہ آتا ہے'جس کے بارے میں منکرین یہ کہتے تھے کہ اللہ سرے سے کتاب نازل ہی نہیں کرتا۔بتایا یہ جاتا ہے کہ یہ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے'یہ تو کتاب سماوی کا آخری حلقہ ہے۔اللہ اس سے قبل بھی رسول بھیجتا رہا ہے۔اور ان میں سے جسے چاہتا ہے کتاب عطا کرتا رہا ہے۔

(وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ

(۶:۹۲)) " (اس کتاب کی طرح) یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔بڑی خیر و برکت والی ہے۔اس چیز کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آئی تھی۔اور اس لئے نازل کی گئی ہے کہ اس کے ذریعے سے تم بستیوں کے اس مرکز (یعنی مکہ) اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو متنبہ کرو جو لوگ آخرت کو مانتے ہیں وہ اس کتاب پر بھی ایمان لاتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔

سنن الہیہ میں سے یہ بھی ایک سنت ہے کہ اللہ رسول بھیجا کرتا ہے۔یہ جدید کتاب جس کے نزول کے بارے میں یہ لوگ شک کرتے ہیں یہ ایک کتاب مبارک ہے اور خدا کی قسم فی الواقعہ یہ ایک مبارک کتاب ہے............. یہ ہر معنی کے اعتبار سے مبارک ہے اور حقیقت کے اعتبار سے مبارک ہے۔اس میں اللہ نے اس وقت برکت ڈالی جب اسے نازل کیا۔اس اعتبار سے بھی مبارک ہے کہ جس محل اور رسول پر اسے اتارا گیا وہ بھی مبارک ہے۔یعنی قلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کریم اور عظیم ہیں۔یہ اپنے حجم اور مضامین کے اعتبار سے بھی مبارک ہے۔یہ انسانوں کی لکھی ہوئی طویل کتابوں کے مقابلے میں چند صفحات ہیں۔لیکن مفہوم' ہدایات' تعلیمات اور اثرات کے اعتبار سے وہ اس قدر عظیم ہے کہ انسانوں کی لکھی ہوئی دسیوں کتابیں ان کی تشریح نہیں کر سکتیں اگرچہ وہ حجم اور صفحات کے اعتبار سے قرآن کریم سے کئی گناہ زیادہ کیوں نہ ہوں۔وہ لوگ جو اسالیب کلام' خود اپنے کلام یا دوسروں کے کلام پر تبصرے اور غور و فکر کرتے ہیں اور الفاظ کے ذریعے معانی کی طرز ہائے تعبیر پر تنقیدی نگاہ رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ متن قرآن اظہار معانی کے اعتبار سے نہایت ہی مبارک کلام ہے اور یہ بات ناممکن ہے کہ کوئی انسان اس طرز پر بات کر سکے۔کوئی شخص طویل ترین عبارات کے اندر بھی وہ معانی ادا نہیں کر سکتا جو قرآن نے مختصر ترین جملوں میں ادا کئے ہیں۔ان میں معانی کا دریا ہے' اشارات اور معانی کا سیلاب ہے' اور پھر نہایت ہی اثر آفریں بھی۔ایک پوری آیت تو اس قدر معانی ادا کرتی ہے

اور اس قدر حقائق اس کے اندر سمو دیئے گئے ہوتے ہیں کہ اسے تقریر و تحریر کے بہترین نمونے اور ایک منفرد ٹکڑے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے 'جس کی نظیر بلیغ سے بلیغ انسانی کلام میں نہیں ملتی - پھر یہ کتاب اپنے اثرات کے اعتبار سے بھی بہت ہی مبارک ہے - یہ انسانی فطرت اور انسانی شخصیت کو جامعیت کے ساتھ خطاب کرتی ہے اور یہ خطاب نہایت ہی لطیف پیرائے میں اور براہ راست ہوتا ہے - یہ خطاب نہایت ہی لطیف انداز میں فطرت کے اندر اتر جاتا ہے - یوں یہ کلام فطرت انسانی کو اس کے ہر پہلو اور ہر راستے سے متاثر کرتا ہے اور اس پر یوں اثرانداز ہوتا ہے کہ کوئی اور کلام اس پر اس طرح اثرانداز نہیں ہو سکتا - اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کلام میں اللہ کی جانب سے ایک قوت ودیعت کر دی گئی ہے اور اس کے سوا دوسرے لوگوں کے کلام کے اندر اس قسم کی کوئی قوت نہیں ہوتی -

کتاب اللہ کی برکات کے بارے میں یہاں مزید کہنا ہمارے لئے ممکن نہیں اور اگر ہم اس موضوع پر کلام جاری بھی رکھیں تو اس کا حق ادا کرنا کسی انسان کے لئے ممکن ہی نہیں ہے - بس اللہ کی یہ بات کافی و شافی ہے کہ یہ کلام مبارک ہے اور فصل الخطاب پر مشتمل ہے -

(مُصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ (٦ : ٩٢)) یہ سابقہ کتب کی تصدیق کرنے والی ہے -" یعنی یہ ان تمام کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو کبھی بھی اللہ کی جانب سے اتری ہیں لیکن یہ کتاب ان کتابوں کی تصدیق ان کی اصلی شکل میں کرتی ہے 'اس شکل میں نہیں جن میں ان کتابوں کو ان کے ماننے والوں کی مختلف کانفرنسوں نے پیش کیا اور کہا کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہے - یہ کتاب کتب سابقہ کی تصدیق اس لئے کرتی ہے کہ اصول و عقائد کے اندر یہ کتاب جو سچائی پیش کرتی ہے 'وہ ان کتب سابقہ کے اندر بھی موجود ہے - رہی شریعت اور قوانین تو اللہ کی سنت یہ ہے کہ اللہ ہر امت کے لئے علیحدہ شریعت اور علیحدہ منہاج وضع کیا کرتا ہے لیکن یہ منہاج اور یہ شریعت دین کے عظیم اصولوں کی روشنی میں طے ہوتے ہیں -

جو لوگ اسلام کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ یہ پہلا دین ہے جس نے مکمل توحید کا نظریہ پیش کیا اور یہ کہ رسالت اور رسولوں کے بارے میں اس دین نے سب سے پہلے مکمل تصور پیش کیا - آخرت اور حساب و کتاب کے بارے میں سب سے پہلے مکمل نظریہ پیش کیا - ایسے لوگوں کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی تعریف کریں - ایسے لوگوں نے دراصل قرآن کریم کا مطالعہ نہیں کیا ہوتا - اگر انہوں نے قرآن کریم کا مطالعہ کیا ہوتا تو وہ لوگ بسہولت معلوم کر لیتے کہ قرآن کے مطابق تمام رسولوں نے مکمل اور خالص توحید کا نظریہ اور عقیدہ پیش کیا جس کے اندر شرک کا شائبہ تک نہ تھا 'اور یہ کہ تمام رسولوں نے رسالت کی حقیقت بیان کی اور سب نے یہی کہا کہ وہ کسی کے نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں - وہ غیب نہیں جانتے اور یہ کہ وہ کسی کے رزق میں نہ کمی کر سکتے ہیں اور نہ زیادتی - تمام رسولوں نے اپنی اپنی قوم اور امت کو آخرت کی جوابدہی کا احساس دلایا اور کہا کہ تم کو وہاں حساب و کتاب سے سابقہ پیش ہو گا - تمام رسولوں نے ایک ہی قسم کے اساسی عقائد و نظریات پیش کئے - قرآن کریم جو آخری کتاب ہے اس نے ان تمام سابقہ کتب کی تصدیق کی - اسلام کے بارے میں یہ تعریفی جملے جن کا ذکر ہوا یورپین تصورات کا چربہ ہیں اور یورپین تصور یہ ہے کہ تمام آسمانی مذاہب ترقی پذیر ہیں اور وہ ترقی کے مختلف مراحل سے گزرے ہیں - جوں جوں قوموں نے ترقی

کی 'ان مذاہب کے تصورات میں بھی ترقی ہوتی رہی ۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے کسی اصول کو منہدم کر کے اسلام کی تعریف و توصیف نہیں کی جا سکتی لہٰذا تمام لکھنے والوں اور تمام پڑھنے والوں کو چاہئے کہ وہ ایسی باتیں نہ لکھیں اور نہ ایسی باتیں پڑھیں ۔ اور یہ آخری کتاب کیوں نازل کی گئی ؟ تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل مکہ اور اس کے ارد گرد جو لوگ بستے ہیں ان کو ڈرائیں ۔

(لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (۶ : ۹۲)) تاکہ تم ام القری اور اس کے ارد گرد بسنے والوں کو ڈراؤ ۔" مکہ مکرمہ کو ام القری اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں وہ گھر ہے جسے سب سے پہلے اللہ وحدہ کی عبادت کے لئے تعمیر کیا گیا اور اسے امن اور لوگوں کے آنے جانے کی جگہ قرار دیا گیا ۔ فقط انسانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ہر زندہ چیز کے لئے اسے جائے امن قرار دیا گیا اور مکہ مکرمہ ہی سے تمام روئے زمین کے باشندوں کے لئے دعوت اٹھی ۔ اس سے قبل تمام انبیاء کی دعوت کبھی دعوت عامہ نہیں رہی اور یہ ام القری اس لئے بھی ہے کہ یہاں تمام اہل ایمان حج کے لئے آتے ہیں تاکہ یہاں سے دعوت اسلامی کو لے کر دنیا میں پھیل جائیں ۔

اس آیت سے وہ مراد نہیں جو مغربی مستشرقین نے نکالی ہے کہ دعوت اسلامی صرف اہل مکہ اور اس کے ارد گرد بسنے والے لوگوں کے لئے ہے ۔ مستشرقین اس آیت کا یہ مفہوم اس طرح نکالتے ہیں کہ اسے دوسرے قرآن مجید سے کاٹ کر پڑھتے ہیں اور یہ اخذ کرتے ہیں کہ پہلے پہل حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد صرف یہ تھا کہ اہل مکہ اور چند دوسرے شہروں کے لوگوں تک اپنی دعوت کو محدود رکھیں مگر بعد میں آپ نے اپنی دعوت کو پورے جزیرۃ العرب تک وسعت دے دی حالانکہ پہلے آپ کے خیال میں یہ بات نہ تھی کہ آپ وسیع علاقے تک دعوت کو پھیلائیں ۔ اس کے بعد آپ نے یہ ارادہ کیا کہ اسے اور آگے بڑھایا جائے ۔ آپ کے ذہن میں یہ خیال بعض اتفاقات کی وجہ سے پیدا ہوا یعنی مدینہ کی طرف ہجرت کرنے اور وہاں حکومت قائم ہو جانے کی وجہ سے 'لیکن ان لوگوں نے اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ عظیم افتراء باندھا ہے اس لئے کہ دعوت کے ابتدائی دنوں ہی میں اللہ نے حضور ؐ کو کہہ دیا تھا

(وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱ : ۱۰۷)) اور ہم نے تو تجھے پورے جہان والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے ۔"

(وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (۳۴ : ۲۸)) اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے ۔" یہ اس دور کی بات ہے جب دعوت اسلامی مکہ میں شعب ابو طالب میں محصور تھی اور اسے سخت مشکلات کا سامنا تھا ۔

(وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (۶ : ۹۲)) اور وہ لوگ جو آخرت پر ایمان لاتے ہیں وہ اس کتاب پر بھی ایمان لاتے ہیں اور وہ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں ۔" وہ لوگ جو اس حقیقت پر ایمان لاتے ہیں کہ ایک دن ہم نے اپنی زندگی کا حساب و کتاب دینا ہے ' وہ اس بات

پر بھی ایمان لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لازماً رسول بھیجتا ہے اور وہ رسولوں کی طرف وحی کرتا ہے۔ ایسے لوگ قرآن مجید کی تصدیق کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے بلکہ یہ ایمان انہیں اس تصدیق پر آمادہ کرتا ہے اور پھر وہ اپنے اس ایمان بالآخرت اور ایمان بالکتاب کی وجہ سے اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں تاکہ ان کا تعلق ذات باری سے قائم و دائم ہے اور وہ نماز کی شکل میں اطاعت باری تعالیٰ کا اظہار کر سکیں۔ یہ انسانی نفسیات کی کیفیت ہے کہ جب کسی کے دل میں خوف آخرت پیدا ہو جائے اور اس کو قیام قیامت کا یقین ہو جائے تو ایسے نفوس اللہ کی جانب سے کتاب ہدایت کے نزول کو خود بخود مان لیتے ہیں اور اس کے بعد وہ نماز کی صورت میں اللہ کے ساتھ اپنا تعلق قائم کر لیتے ہیں۔ قرآن کریم کے اندر جا بجا جن انسانی نفسیات و کیفیات کو قلم بند کیا گیا ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رب العالمین کا سچا کلام ہے۔

---ooo---

اب آگے اس لہر اور سبق کا آخری حصہ ہے۔ یہ حصہ ایک خوفناک اور متحرک منظر پیش کرتا ہے۔ یہ منظر الفاظ کی تصویر کے ذریعے نظروں کے سامنے اسکرین پر ہے۔ اس منظر کے کردار وہ لوگ ہیں جو مشرک ہیں اور ظالم ہیں اور جن کا وطیرہ یہ ہے کہ یہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ یہ جعلی مدعیان نبوت ہیں جن کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کی طرف وحی آتی ہے۔ حالانکہ ان کی طرف کوئی وحی نہیں آتی۔ یا وہ لوگ جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ بھی قرآن مجید جیسا کلام پیش کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ حالت نزع میں ہیں اور ان کا ظلم اس قدر عظیم ہے کہ اس کے بارے میں انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ موت کے وقت فرشتے ہاتھوں میں ذرائع عذاب لے کر ان کی جان نکالنے کے لئے حاضر ہوں گے۔ اس وقت ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہوں گی اور یہ لوگ اس دنیا کی ہر چیز کو پیچھے چھوڑتے ہوئے جان دیں گے اور رخصت ہوں گے۔

---

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ
اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ
وَلَوْ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ ۚ
اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی
اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی كَمَا
خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰی مَعَكُمْ
شُفَعَآءَكُمُ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِیْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَیْنَكُمْ وَضَلَّ
عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾ ع ۱۱ ع ۴ ۱۷

اور اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑے ' کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے در آں حالیکہ اس پر کوئی وحی نازل نہ کی گئی ہو' یا جو اللہ کی نازل کردہ چیز کے مقابلے میں کہے کہ میں بھی ایسی چیز نازل کر کے دکھا دوں گا؟ کاش تم ظالموں کو اس حالت میں دیکھ سکو جب کہ وہ سکرات موت میں ڈبکیاں کھا رہے ہوتے ہیں اور فرشتے ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ "لاؤ' نکالو اپنی جان' آج تمہیں ان باتوں کی پاداش میں ذلت کا عذاب دیا جائے گا جو تم اللہ پر تہمت رکھ کر ناحق بکا کرتے تھے اور اس کی آیات کے مقابلے میں سرکشی دکھاتے تھے۔" (اور اللہ فرمائے گا) "لو اب تم ایسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا' جو کچھ ہم نے تمہیں دنیا میں دیا تھا وہ سب تم پیچھے چھوڑ آئے ہو' اور اب ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمہارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے' تمہارے آپس کے سب رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے گم ہو گئے جن کا تم زعم رکھتے تھے۔"

حضرت قتادہ اور حضرت ابن عباس سے یہ روایت ہے کہ یہ آیت مسیلمہ کذاب اور اس کی بیوی سجاح بنت حارث کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اسود عنسی کے بارے میں بھی۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل کی ہے۔ رہی یہ بات کہ (سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (٦: ٩٣)) یا جس نے کہا کہ "میری طرف بھی وحی آئی ہے۔" تو حضرت ابن عباس کی ایک روایت میں ہے کہ اس سے مراد عبداللہ ابن سعد ابن ابی سرح ہیں۔ یہ ایمان لائے تھے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی تھے۔ جب سورہ المومنون کی یہ آیت نازل ہوئی

(لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (٢٣: ١٢)) تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور اسے لکھوانا شروع کیا اور جب یہ آیات یہاں تک پہنچیں۔

(ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (٢٣: ١٤)) تو عبداللہ کو تخلیق کی ان تفصیلات پر تعجب ہوا۔ تو اس نے کہا

(فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (٢٣: ١٤)) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اسی طرح آیت نازل ہوئی ہے۔ اس مقام پر عبداللہ نے شک کر لیا کہ اگر محمد سچا ہو تو پھر مجھ پر بھی ویسے ہی وحی نازل ہو گئی جس طرح ان پر نازل ہوئی اور اگر جھوٹے ہوں تو جس طرح انہوں نے کہا ویسا ہی میں نے بھی کہا۔ اسی طرح وہ اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو گیا اور مشرکین سے دوبارہ مل گیا۔ یہ ہے مصداق اس آیت کا۔

(سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (٦: ٩٣)) (روایت کلبی عن ابن عباس)۔

یہاں سیاق کلام میں' ان مشرک ظالموں کے جس انجام کا ذکر ہوا ہے وہ نہایت خوفناک 'کربناک اور ہراساں کنندہ ہے۔ نظر آتا ہے کہ یہ ظالم سکرات الموت کی حالت میں ہیں اور اس حالت کے لئے لفظ غمرات کا استعمال بتاتا ہے کہ ان کی حالت نہایت دردناک ہو گی۔ فرشتے ان کی جان لینے کے لئے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے اور فرشتوں کی یہ گرفت بھی سزا

دہی کے طور پر ہوگی - یہ فرشتے ان کی روح نکال لیں گے اور پھر عذاب الہٰی ان کے لئے حاضر ہوگا۔

(وَلَوْ تَرٰى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ (۹۳) کاش تم ظالموں کو اس حالت میں دیکھ سکو جب کہ وہ سکرات الموت میں ڈبکیاں کھا رہے ہوتے ہیں اور فرشتے ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ "لاؤ' نکالو اپنی جان' آج تمہیں ان باتوں کی پاداش میں ذلت کا عذاب دیا جائے گا جو تم اللہ پر تہمت رکھ کر ناحق بکا کرتے تھے اور اس کی آیات کے مقابلے میں سرکشی دکھاتے تھے۔"

ان کے استکبار اور سرکشی کی وجہ سے انہیں عذاب عظیم میں مبتلا ہونا ہوگا۔ یہ توہین آمیز سزا انہیں اس لئے دی جا رہی ہے کہ انہوں نے اللہ پر افتراء باندھا۔ ان تمام امور کے تذکرے سے اس منظر پر ایک خوفناک فضا طاری ہو جاتی ہے اور اس کو دیکھ کر انسان مارے خوف کے دہشت زدہ ہو جاتا ہے اور اس کا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

آخر میں یہ توبیخ اور جھڑک اس وقت ہوتی ہے جب وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور اللہ تعالیٰ کا خطاب ان سے ایسے حالات میں یوں ہوتا ہے۔

(وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۶:۹۴)) (اور اللہ فرمائے گا) "لو اب تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہوگئے ہو جیسا ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا۔" اب تمہارے پاس فقط تمہاری ذات ہے۔ تم بالکل اکیلے ہو' تم اپنے رب کے سامنے گروہ کی شکل میں نہ ہوگے بلکہ فرداً فرداً جس طرح تم ماں کے پیٹ سے اکیلے اس جہان میں آئے تھے' ننگا جسم اور بے یار و مددگار۔

اب تم سے تمہارے تمام یار و مددگار دور ہو چکے ہیں۔ ہر سہارا اور وسیلہ تم سے دور ہو چکا ہے۔ اب تمہیں ان چیزوں پر بھی اختیارات حاصل نہیں ہیں جنہیں اللہ نے تمہاری ملکیت میں دیا تھا۔

(وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ (۶:۹۴)) جو کچھ ہم نے تمہیں دنیا میں دیا تھا وہ سب تم پیچھے چھوڑ آئے ہو۔" وہ مال و زینت جس کے تم دنیا میں مالک تھے' وہ تم سے پیچھے رہ گیا ہے۔ اولاد اور مرتبہ تم سے پیچھے رہ گیا ہے۔ قوت اور اختیارات سب کے سب ختم ہوگئے۔ یہ سب چیزیں دنیا میں رہ گئیں اور اب تمہارے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے اور نہ کسی دنیاوی امر پر اب تمہیں کوئی اختیار حاصل ہے۔

(وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا (۶:۹۴)) اور اب ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمہارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے۔"

یہ لوگ جن کے بارے میں تم سمجھتے تھے کہ یہ لوگ مشکلات میں تمہاری سفارش کریں گے اور تم انہیں اپنی زندگی اور اپنے مال میں شریک ٹھہراتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کے ہاں یہ تمہارے سفارشی ہوں گے ۔ دوسری جگہ میں آتا ہے ۔

(مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى) ہم تو ان کی بندگی صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں ۔" چاہے یہ شریک لوگ ہوں' کاہن ہوں یا وقت کے حکمران ہوں' یا پتھر ہوں یا حجر و شجر کے بت ہوں' جنات ہوں یا ملائکہ ہوں' ستارے ہوں یا سیارے ہوں یا اولیاء فقراء ہوں بتاؤ وہ کہاں ہیں؟ بتوں کی نسبت یا ستاروں کی نسبت وہ اپنے جھوٹے خداؤں کی طرف کرتے تھے اور اپنے مال اور اپنی زندگی میں یہ لوگ انہیں شریک بناتے تھے ۔ اللہ میاں سوال کریں گے' بتاؤ وہ کہاں گئے؟

(لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ (٦ : ٩٤)) تمہارے آپس کے سب رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے گم ہو گئے جن کا تم زعم رکھتے تھے ۔" تمام رابطے ٹوٹ گئے' تمام تعلقات ختم ہو گئے اور تمام اسباب اور وسیلے ختم ہو گئے ۔ اب وہ تمہارے تمام مزعومہ خدا اور الٰہ غائب ہو گئے ہیں' جس طرح شرکاء غائب ہیں اسی طرح تمہارے مزعومہ عقائد بھی کافور ہو گئے ہیں ۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میرے ہاں اب ان کا نہ کوئی اثر ہے' نہ کوئی سفارش ہے اور نہ اثر و رسوخ ہے ۔

غرض یہ ایک ایسا منظر ہے جو انسان کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے ۔ یہ منظر نہایت ہی مجسم شکل میں اور متحرک طور پر سامنے نظر آتا ہے ۔ نفس انسانی پر اس کی چھاؤں پڑتی ہے ۔ دل مومن معرفت سے بھر جاتا ہے ۔ یہ سائے نہایت ہی خوفناک اور دہشتناک ہیں ۔ بے شک یہ قرآن ہی کا انداز بیان ہے اور قرآن ہی کا حصہ ہے ۔

---ooo---

# درس نمبر ٦٦ ایک نظر میں

مناسب ہے کہ یہاں وہ تبصرہ ہمارے پیش نظر رہے جو ہم نے اس سورہ پر کیا تھا' اور یہ بات بھی ہمارے سامنے رہے کہ اس سورہ کے مضامین دریا کی لہروں کی طرح ٹھاٹھیں مارتے ہوئے آرہے ہیں اور لہر کے پیچھے لہر چلی آرہی ہے۔ اس کا انداز بیان اس حد تک خوبصورت اور اس قدر فصیح و بلیغ ہے کہ حسن تعبیر کے بارے میں انسان جس حد تک سوچ سکتا ہے۔اثر آفریں کلام کی جو آخری حد ہو سکتی ہے یہ سورہ اس سے بھی آگے بڑھ رہی ہے۔ہم نے کہا تھا:

"یہ سورہ اپنے اساسی موضوع کو ایک منفرد طریقے پر لے رہی ہے۔ ہر لمحے' ہر موقف اور ہر منظر میں اس کا انداز بیان خیرہ کن ہے۔جب انسان اس پر غور کرتا ہے اور اس کے مناظر کی سیر کرتا ہے تو احساس اس کے مناظر کا گرفتار ہو جاتا ہے اور ایک لمحہ کے لئے سانس رک سا جاتا ہے خصوصاً جب انسان اس کے مناظر پر غور کرے۔اس کے زیر و بم کو سمجھنے کی کوشش کرے اور اس کے اثرات کو محسوس کرے۔"

"یہ سورہ اپنے مشاہد و مواقف' اپنے اشارات و اثرات اور اپنی تقاریر و شیڈز کے ساتھ اس طرح جاری و ساری ہے جس طرح کوئی لہر اور دریا اپنی امواج اور لہروں کے ساتھ جاری و ساری رہتا ہے۔ایک لہر ساحل سے نہیں ٹکراتی کہ دوسری اٹھ رہی ہوتی ہے۔امواج کے اس تلاطم میں اس سورہ کا دریا اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔"

"یہ سورہ اپنی امواج کے اس تلاطم کے ساتھ اور اپنی لہروں کے باہم ٹکراؤ کی روشنی میں اس قدر خوبصورت نظر آتی ہے کہ انسان مسحور ہو جاتا ہے۔اس خوبصورتی کے ساتھ ساتھ مضامین اور مفہومات کو نہایت ہی ہم آہنگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کیا گیا ہے اور اس قدر اثر انگیز طریقے سے مضامین پیش کئے گئے ہیں کہ انسان کے احساسات دنگ رہ جاتے ہیں۔نہایت ہی زندہ' متحرک' ہم آہنگ اور مؤثر صوتی اثرات کے ذریعے الفاظ نفس انسانی پر ہر جہت اور ہر سمت سے اثرانداز ہو کر اسے مسحور کر دیتے ہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔

یہ تمام خصوصیات جن کا اوپر اس سورہ کے بارے میں ذکر ہوا' اس سبق میں پوری طرح عیاں اور نمایاں ہیں۔ قاری یوں محسوس کرتا ہے کہ یہ مناظر اسکرین پر یکے بعد دیگرے چل رہے ہیں۔چمک دمک کے ساتھ سامنے آرہے ہیں۔جس طرح الفاظ کا سیل رواں سامنے آتا ہے' اسی طرح معانی کا بھی ایک سیلاب ہے جو امڈتا چلا آرہا ہے اور دونوں کے درمیان ہم آہنگی ہے۔جس طرح یہ مناظر سب کچھ دکھا رہے ہیں' اسی طرح لفظی تعبیر بھی پورے مفہوم و مراد کو واضح کرتی چلی جاتی ہے اور دونوں اپنے ہدف کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

ان مناظر و مشاہد میں سے ہر منظر کسی نامعلوم خزانہ سے نہایت ہی چمک دمک اور نہایت ہی دل کشی ساتھ لے کر سامنے آتا ہے اور دل و دماغ اور قلب و نظر کو روشن کر کے غائب ہو جاتا ہے۔

پھر الفاظ و عبارات اس طرح ہیں جس طرح ایک قدرتی چشمہ سے پانی پھوٹتا ہے۔ عبارت یوں چلتی ہے جس طرح کہ

گویا کسی منظر پر رننگ کنٹری ہو رہی ہو اور الفاظ اور ان سے مراد مناظر دونوں نہایت تابانی کے ساتھ ہم قدم ہو کر چلتے ہیں ۔

یہ مناظر اور یہ تصورات اور یہ الفاظ و نعرے یوں چلتے ہیں جس طرح لہریں اور موجیں یکے بعد دیگرے ایک توازن کے ساتھ چلتی ہیں ۔ انسان کی نظریں ان کا تعاقب کرتی ہیں اور یوں کہ جس طرح چندھیا جائیں' خیالات و تصورات کی ایک لہر ابھی ساحل کے ساتھ ٹکرا کر ختم نہیں ہوتی کہ تصورات کی اور بہت سی لہریں اٹھتی ہیں ۔ اس سبق یا اس لہر میں وہ تمام خواص نمایاں ہیں جن کا ہم نے سورہ کے آغاز میں ذکر کیا ہے ۔

خوبصورتی اس لہر کی نمایاں خصوصیت ہے' اس قدر خوبصورتی کہ انسان حیران رہ جاتا ہے ۔ اس سبق میں جو مناظر ہیں وہ بالکل صاف ہیں اور خوبصورتی کے اعتبار سے منتخب ہیں ۔ الفاظ' عبارتیں اپنے مفہوم و مدلول کے اعتبار سے اور اپنے لفظی حسن کے اعتبار سے اور اپنے تصورات اور حقائق کے اعتبار سے نہایت ہی اعلیٰ معیار کی اور حسین و جمیل ہیں ۔ غرض مفہوم اور حقائق موتیوں کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں ۔

اس سبق کی خوبصورتی اور تر و تازہ حسن کا اظہار اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ خود اللہ جل شانہ نے ایک منظر کے حسن و خوبی کی طرف متوجہ کیا ہے ۔ باغات کے اندر پھلوں کی تازگی اور حسن کے سلسلے میں دعوت نظارہ دی گئی ہے ۔ فرمایا گیا ہے ۔

(اُنْظُرُوْا اِلٰی ثَمَرِہٖ اِذَآ اَثْمَرَ وَ یَنْعِہٖ (۶:۹۹)) " یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت زرا غور کی نظر سے دیکھو ۔" یہ براہ راست دعوت نظارہ ہے کہ اس قدرتی جمال کو دیکھو' اس پر غور کرو اور لطف اندوز ہوتے رہو ۔

اب ایک ایسا مقام آتا ہے کہ یہ خوبصورتی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے ۔ انسان نہایت ہی تعجب میں پڑ جاتا ہے اور اس کے دل و دماغ روشن ہو جاتے ہیں ۔ اب یہ بہار اس کائنات کے دائرے سے نکل کر ماوراء کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے ۔ اور اب یہ بہار' تر و تازگی اور خوبصورت بیان بدیع السماوات والارض ذات کبریا کی طرف لوٹ جاتا ہے ۔ ذات کبریا کے بارے میں یہاں جو بات کی جاتی ہے بتائی جاتی ہے اس میں معیار فصاحت و بلاغت بدستور ہے ۔ زرا قرآن ہی کے الفاظ میں پڑھئے

(لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (۶:۱۰۳))
نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے ۔ وہ نہایت ہی باریک بین اور باخبر ہے ۔"

اب میں ایک دوسرے پہلو کو لیتا ہوں ۔ اس سبق میں ہم اس کائنات کی کھلی کتاب کو پڑھتے ہیں ۔ اس کتاب کو غافل لوگ ہر لحظہ دیکھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں مگر وہ کتاب کائنات کے عجائبات اور معجزات کو گہری نظر سے نہیں دیکھتے ۔ جو صاف اندھے ہیں انہیں تو کچھ نظر ہی نہیں آتا ۔ وہ کیا دیکھیں کہ اس میں کیا کیا اعجوبے ہیں لیکن قرآن کریم کی یہ آیات ہمیں ایک ایک اعجوبے کے سامنے لا کھڑا کرتی ہیں ۔ یوں نظر آتا ہے کہ شاید ان سے پہلے ہم اس دنیا میں نہ تھے اور اب اس میں اتر رہے ہیں ۔ یہ آیات ہمیں اس کتاب کے عجیب و غریب نشانات کے سامنے کھڑا کر دیتی ہیں ۔ اور ہمارے تجسس کو ان عجائبات کی طرف ابھارتی ہیں جن پر سے دنیا کے غافل انسان یونہی گزر جاتے ہیں ۔

اب ہم ایک ایسے خارق العادت اعجوبے کے سامنے ہیں جو رات کے ہر لحظہ میں رونما ہوتا رہتا ہے' یہ کہ اس دنیا

میں مردہ چیزوں سے زندہ اشیاء رات اور دن نمودار ہو رہی ہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ مردہ زمین سے یہ روئیدگی کس طرح نمودار ہو رہی ہے؟ ہم اس کرۂ ارض پر زندگی کے مختلف نمونے پاتے ہیں اور ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اور تعبیر نہیں ہے کہ اللہ کے حکم اور فیصلے کے مطابق سب کچھ ہو رہا ہے۔ انسان نہ تو یہ عمل کر سکتا ہے کہ کسی مردہ چیز سے زندہ چیز کو نکالے اور نہ ہی وہ اس کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔

اب ہم زمین و آسمان کے نظام کی گردش بلکہ گردشوں کے سامنے ہیں۔ یہ گردشیں بھی عجیب ہیں۔ زمین کی گردش جو رات دن ہو رہی ہے' نہایت ہی تعجب خیز ہے اور ہر لمحہ اور ہر سیکنڈ میں اس کی تکمیل ہو رہی ہے۔ اب ہم خود تخلیق انسان کے سامنے ہیں۔ ایک ہی نفس سے انسان پیدا ہوتا ہے اور اپنی نسل کشی کے نظام سے بڑھتا جاتا ہے۔

اب ہم نباتات کی اگائی کے نظام کے سامنے ہیں۔ نباتات کو زندگی مل رہی ہے۔ بارشیں ہو رہی ہیں' پھل پھول اگ رہے ہیں' کیا ہی خوبصورت ہیں اور کیا ہی خوش ذائقہ ہیں۔ ان میں قسم قسم کے حیوانات ہیں اور عجیب و غریب مناظر ہیں' اگر ہم زندہ احساس اور روشن آنکھوں سے انہیں دیکھیں تو ہر ایک میں سامان عبرت ہے۔

اب ہم اس پوری کائنات کے سامنے ہیں۔ اب یہ ہمیں اس طرح نظر آ رہی ہے گویا ہم اسے پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ یہ ایک زندہ کائنات ہے۔ وہ ہم سے پیار کرتی ہے اور ہم اس سے پیار کرتے ہیں۔ یہ رواں دواں ہے' اس کی رگ رگ میں حرکت اور دوڑ ہے۔ یہ ہمارے احساس و شعور کا دامن پکڑتی ہے اور اپنے خالق کی بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنی انفرادی اور انوکھی حیثیت میں اللہ کی قدرت اور اس کی ذات کے لئے دلیل و برہان ہے۔

یہاں آکر اچانک بات کا رخ شرک باللہ کی طرف پھر جاتا ہے اور شرک اور مشرکین کی مذمت کی جاتی ہے۔ یہ اس کائنات کی فطرت اور اس کے وجود کے مزاج ہی کے خلاف تصور ہے' یہ فطرت کائنات کے خلاف ہے۔ جو شخص دلائل و شواہد کی اس بھری کائنات کا مطالعہ کرتا ہے اس کے آئینہ فطرت پر یہ ایک بدنما داغ نظر آتا ہے۔ شرک اور اللہ کے ساتھ! اس کائنات کا گہرا مطالعہ اسے یکسر رد کر دیتا ہے اور یوں غور کرنے والے کا دل گہرے ایمان سے بھر جاتا ہے۔

قرآن کریم جب شخصیت انسانی کو ذات باری کے بارے میں خطاب کرتا ہے تو اس کا انداز بحث یہ ہوتا ہے۔ دیکھو وہ تمہارا اور پوری کائنات کا خالق ہے' اس نے اس کرۂ ارض پر سب سے پہلے زندگی اور روئیدگی پیدا کی۔ پھر اس نے تمام جانداروں اور نباتات کی زندگی کی نشوونما کا انتظام کیا اور ان کے لئے اپنی پوری کائنات کی قوتوں کو ممد و معاون بنایا۔ اللہ وہ ذات ہے کہ عالم اسباب اور اس کائنات کے اندر ہونے والے تمام تغیرات اور تصرفات صرف اس کی مرضی اور ارادے سے ہوتے ہیں۔ اس دنیا کے تمام ظاہری اسباب کو اللہ ہی نے تاثیر بخشی ہوئی ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ تم صرف اللہ کی بندگی کرو۔ کیا تم اشارات فطرت کو نہیں پاتے؟ کیا اس دنیا کی رنگا رنگ بوقلمونیاں انسان کے لئے برہان ناطق نہیں ہیں کہ وہ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کرے' صرف اللہ ہی کے سامنے مراسم عبودیت بجا لائے اور اسی کے سامنے عاجزی اور خشوع کرے اور اس کی اطاعت کرے؟ اس کائنات کی کھلی کتاب کو برائے مطالعہ پیش کر کے قرآن کریم یہ دعوت دیتا ہے کہ چونکہ تخلیق اس کی ہے' رزق اس کا ہے' کفالت اس کی ہے تو سلطنت اور بندگی بھی اس کی ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم خدائی اور خدائی کے حقوق میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اسی کے لیے مراسم عبودیت بجا لائیں' وہی حاکم ہو اور زندگی کے تمام امور میں وہی متصرف ہو' اور اس کے سوا جو بھی ان حقوق و خصائص کا

مدعی ہو اس کا انکار کیا جائے۔اس سبق میں آتا ہے۔

(ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (٦ : ١٠٢)) یہ سب کام تمہارے رب کے ہیں۔اس کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے۔وہ ہر چیز کا خالق ہے، پس اس کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔" یہ ہے قرآن کریم کا منہاج استدلال کہ چونکہ اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر چیز کا نگہبان ہے اس لئے بندگی اسی کی چاہئے وہی اس کا مستحق ہے۔

اس سبق کے آخر میں کتاب کائنات کو کھولنے اور اس کے اندر سے خوارق و معجزات دکھانے کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کائنات کے ہوتے ہوئے بھی جو لوگ مزید معجزات اور خوارق عادت امور کے طالب ہیں وہ نہایت ہی کم عقل ہیں۔بتایا جاتا ہے کہ جو لوگ اب بھی منکر ہیں وہ دلائل و معجزات کی کمی کی وجہ سے منکر نہیں ہیں بلکہ ان کی چشم بصیرت میں بینائی نہیں ہے ورنہ اس کائنات میں تو ہر طرف وجود باری اور خصائص الوہیت پر دلائل و معجزات کے انبار لگے ہوئے ہیں اور دعوت نظارہ دیتے ہیں۔

---ooo---

# درس ۶۶ تشریح آیات

## ۹۵ --- تا --- ۱۱۰

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ﴿٩٥﴾

"دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے۔ وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی مردہ کو زندہ سے خارج کرنے والا ہے۔ یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ ہے' پھر تم کدھر بہکے چلے جا رہے ہو؟"

یہ وہ معجزہ ہے جس کے راز تک کوئی نہیں پہنچ سکا یہ تو بڑی بات ہو گی کہ کوئی یہ معجزہ کر دکھائے۔ کیا معجزہ؟ یعنی زندگی کی تخلیق اور اس کی نشوونما اور اس کی حرکت' ہر وقت ایک زندہ اور بڑھنے والے درخت سے مردہ بیج نکالتا ہے اور ایک بے جان گٹھلی ایک بڑھنے والے درخت سے نکلتی ہے۔ پھر اس بیج اور اس گٹھلی کے اندر پوشیدہ زندگی ایک پودے اور ایک درخت کی شکل اختیار کرتی ہے۔ یہ ایک خفیہ راز ہے جس کی حقیقت کا علم صرف اللہ کی ذات کریم کو ہے۔ اس زندگی کا اصل مصدر اور منبع کیا ہے' اس بات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ انسان نے جو بھی عملی ترقی کی ہے' جس قدر زندگی کے ظاہری امور کا مطالعہ کیا ہے اور جس قدر خصائص بھی متعین کئے ہیں اس کی انتہا پر ایک راز ہے جو غائب ہے۔ اس سلسلے میں جس طرح پہلے انسان کا علم محدود تھا اسی طرح اس آخری دور کے ترقی یافتہ انسان کا علم بھی محدود ہے۔ انسان صرف مظاہر اور خواص حیات سے واقف ہے لیکن اسے زندگی کے اصل منبع اور اس کی اصل ماہیت کا علم نہیں ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ زندگی ہماری آنکھوں کے سامنے رواں دواں ہے اور یہ معجزہ ہر لحظہ واقعہ ہوتا رہتا ہے۔

اللہ وہ ذات ہے جس نے روز اول سے ایک مردہ حالت سے انسان کو زندگی بخشی۔ یہ کائنات تو تھی مگر انسان نہ تھا۔ یہ زمین تھی مگر اس پر زندگی نہ تھی۔ پھر یہ زندگی اذن الٰہی سے نمودار ہوئی۔ یہ کیسے نمودار ہوئی؟ اس کا ہمیں علم نہیں ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک یہ زندگی مردے سے نمودار ہو رہی ہے اور مردہ ذرات زندگی کے ذریعے زندگی پاتے ہیں۔ یہ بے جان مواد زندہ عضوی شکل اختیار کرتا ہے' اور پھر یہ زندہ خلیہ انسان کے جسم میں اور تمام جانداروں کے جسم میں داخل ہوتا ہے۔ یہ زندہ ذرات اب مزید تغیر پذیری کے ذریعے زندہ خلیے بن جاتے ہیں اور اس کے بعد یہ زندہ خلیے پھر مر جاتے ہیں۔ کیونکہ زندہ خلیے ہر وقت مردہ خلیوں کی شکل اختیار کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ یہ زندہ شخص یا جانور ایک دن مردہ ذرات کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ ہے مفہوم اس جملے کا۔

(يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ (٦: ٩٥)) وہ زندہ کو مردے سے خارج کرنے والا ہے اور مردے کو زندہ سے خارج کرنے والا ہے۔" اللہ کے سوا کوئی بھی یہ کام نہیں کر سکتا اور یہ بھی ناممکن ہے کہ آغاز حیات کے وقت اللہ کے سوا کوئی اور حیات پیدا کر سکے اور نہ کوئی یہ قدرت رکھتا ہے کہ وہ مردہ ذروں کو زندہ ذروں کی شکل دے دے۔ یہ اللہ ہی ہے جو ان زندہ ذروں کو پھر مردہ ذروں کی شکل دیتا ہے اور یہ سرکل ایک ایسا سرکل ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ اس کا آغاز کب ہوا اور کب یہ سرکل ختم ہو گا۔ سائنس دان جو قیافے لگاتے رہتے ہیں وہ محض احتمالات ہیں۔

اس کرۂ ارض پر ظہور حیات کے خصائص کے بارے میں آج تک سائنس دانوں نے جو نظریات بیان کئے ہیں ان میں سے کوئی نظریہ بھی تشفی بخش نہیں ہے۔ صرف یہ نظریہ تشفی بخش ہے کہ اس دنیا پر تخلیق کائنات ذات باری کا کارنامہ ہے اور یورپ میں جب قرون وسطیٰ میں عوام کنیسہ سے بھاگ کھڑے ہوئے جس طرح بدکے ہوئے گدھے ہوں یا جس طرح شیر کے ڈر سے جانور بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ مذہب سے فرار اختیار کرنے والوں نے جب اس کرۂ ارض پر تخلیق حیات کے راز کے عقدے کو حل کرنا چاہا' پھر جب انہوں نے خود اس کائنات کی تخلیق کے رازوں سے پردہ اٹھانا چاہا' اور یہ کام انہوں نے خدا کے نظریے کو اپناتے ہوئے کیا تو ان کی تمام مساعی ناکام رہیں اور بیسویں صدی میں اس موضوع پر جو کچھ بھی لکھا گیا وہ ایک مذاق کے سوا کچھ نہ تھا اور یہ تمام تحریریں عناد اور انکار مذہب پر مبنی تھیں اور کوئی مخلصانہ مساعی نہ تھیں۔

ان سائنس دانوں میں سے بعض صحیح الفکر لوگوں نے اپنے عجز اور ناتوانی کا اعتراف کیا ہے۔ ایسے لوگوں کی باتوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس موضوع پر انسان کا علم کس قدر محدود ہے۔ ہمارے ہاں بعض ایسے لوگ اب بھی موجود ہیں جو سترہویں یا انیسویں صدی کے مغربی افکار کو نقل کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ سائنس دان ہیں اور صرف مشاہدے کے قائل' جبکہ اہل مذہب عالم غیب کو ماننے والے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سمجھانے کے لیے میں یہاں بعض بڑے سائنس دانوں کے اقوال نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں مثلاً بعض امریکی علماء یہاں تک پہنچے ہیں۔

ڈاکٹر فرانک ایلن' کورنل یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں اور کینیڈا کی مانٹویا یونیورسٹی میں طبیعیات کے استاد ہیں۔ اپنے ایک مقالے میں جس کا عنوان ہے "یہ دنیا یا اتفاقاً وجود میں آئی یا منصوبے کے تحت"۔ یہ مقالہ اللہ یتجلی فی عصر العلم کتاب ترجمہ ڈاکٹر مرداش عبدالحمید سرفان سے نقل کیا گیا ہے۔

"اگر یہ زندگی کسی سابقہ متعین منصوبے اور اسکیم کے تحت وجود میں نہیں لائی گئی تو پھر یہ اتفاقاً وجود میں آگئی ہو گی۔ وہ "اتفاق" کیا ہے؟ معلوم ہونا چاہئے تاکہ ہم اس پر غور کریں اور دیکھیں کہ اس "اتفاق" کے ذریعے زندگی کا ظہور کس طرح ہوتا ہے۔"

"اتفاق اور احتمال (بخت و اتفاق) کے جو نظریات اس وقت پائے جاتے ہیں پہلے کی طرح نہیں ہیں۔ دور جدید میں اب ان کے لئے ریاضی کے کچھ ٹھوس اصول اور قواعد مرتب ہو چکے ہیں اور اگر کسی موضوع پر یقینی فیصلہ نہ کیا جا سکتا ہو تو ان اصولوں کے مطابق بخت و اتفاق کے اصولوں کو کام میں لایا جاتا ہے اور ان اصولوں کے مطابق جو نتائج سامنے آتے ہیں وہ اقرب الی الصواب ہوتے ہیں اگرچہ ان نتائج کے غلط ہونے کے امکان کو بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حقیقت

ہے کہ ریاضی کے زاویہ سے نظریہ بخت و اتفاق نے کافی ترقی کر لی ہے۔ان قواعد اور اصولوں کے مطابق انسان کے لئے ممکن ہو گیا ہے کہ وہ بعض واقعات کے بارے میں بات کر سکے ' جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ واقعات اتفاقاً ہو گئے ہیں اور جن کے ظہور کے اسباب و عوامل دوسرے ذرائع سے معلوم نہیں ہو سکتے۔(مثلاً تاش کے کھیل میں پھول کا پھینکنا) ان تحقیقات کی وجہ سے انسان اس بات پر قادر ہو گیا ہے کہ وہ یہ بتا سکے کہ کیا چیز اتفاقاً وجود میں آ جاتی ہے اور کیا امر ہے جو اتفاقاً وجود میں نہیں آ سکتا۔

(اسلامی تصور حیات کے مطابق اس دنیا میں بخت واتفاق نہیں ہے۔ ہر چیز کی تخلیق تقدیر الہی کے مطابق ہوتی ہے۔ انا خلقنا کل شیء بقدر

(ہم نے ہر چیز کو اندازے کے مطابق تخلیق کیا) اللہ نے تخلیق کائنات کے لئے اٹل قوانین وضع کئے ہیں۔جو واقعات ہوتے ہیں ان میں ہر بار سنت الہیہ کے مطابق تقدیر الہی تصرف کرتی ہے۔اسی طرح یہ قوانین قدرت بھی کبھی کبھی ٹال دیئے جاتے ہیں اور ایک خارق عادت معجزہ صادر ہو جاتا ہے۔یہ بھی ایک خاص حکمت الہیہ کے مطابق ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ نوامیس فطرت اور خارق عادت بظاہر دونوں اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوتے ہیں۔ہم نے جو سائنس دانوں کے حوالے دیئے ہیں تو ضروری نہیں ہے کہ ہم مولہ بالا عبارت سے پوری طرح متفق بھی ہوں۔) اور یہ بھی بتایا جا سکتا ہے کہ کون سا واقعہ کس قدر عرصے کے بعد اتفاقاً نمودار ہو سکتا ہے۔اس تمہید کے بعد اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس کرہ ارض پر زندگی کا ظہور بطور اتفاق ہو سکتا ہے۔"

تمام زندہ خلیوں میں پروٹین بنیادی عناصر ترکیبی ہیں۔ یہ پروٹین پانچ عناصر سے مرکب ہوتے ہیں۔ کاربن ' ہائیڈروجن ' نائٹروجن ' آکسیجن اور گندھک۔ایک پروٹین میں چالیس ہزار ایٹم ہوتے ہیں۔کیمیاوی عناصر کی تعداد ۹۲ ہے اور یہ سب غیر منظم اور نامعلوم مقداروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

( عقل انتہائی بھی فلسفیانہ اصطلاحات میں سے ایک ہے۔ایک مسلمان اللہ پر صرف اس کے اسمائے حسنیٰ ہی کا اطلاق کر سکتا ہے اس لئے اللہ پر اس لفظ کا اطلاق مناسب نہیں ہے۔)

ان پانچ عناصر کے آپس میں ملنے کے احتمال کے تعین کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس مادے کی مقدار اور زمانے کا تعین ہو اور وہ مادہ مسلسل ان عناصر پر مشتمل مخلوطہ میں رہے اور پھر اس قدر طویل عرصے تک وہ مادہ یونہی رہے تاکہ اس عرصے میں "اتفاقاً" واقعہ ہو جائے اور یوں ایک عدد پروٹین حاصل ہو جائے۔" غرض یہ تعین ضروری ہے کہ کتنا مادہ کتنے عرصے کے لئے ضروری ہے۔"

" سوئٹزر لینڈ کے ایک ریاضی دان نے کچھ حساب لگایا ہے (چارلز یوجین سچ) اس نے اس کا حساب لگا کر کہا ہے کہ احتمال کے طور پر ایک پروٹین کی تشکیل پر ایک نسبت : دس کی قیمت ۱۶۰ مرتبہ لگائی جائے ( $1 : 10^{160}$ ) یہ اس قدر بڑی رقم بنتی ہے کہ زبان سے اس کا ادا کرنا بھی مشکل ہے نہ الفاظ کے ذریعے اسے بیان کیا جا سکتا ہے اور بطور اتفاق اس عمل کی تکمیل کے لئے یعنی ایک پروٹین کی تشکیل کے لئے اس قدر مادے کی ضرورت ہے جس کے ساتھ اس پوری کائنات کو کئی ملین بار بھرا جا سکتا ہو اور اگر صرف روئے زمین پر اتفاقاً ایک پروٹین کو پیدا کرنا ہو تو اس کے لئے کئی بلین سالوں کی ضرورت ہو گی اور یعنی ۱۰ کی "۲۴۳" بار سال ( $10^{243}$ )۔یہ زمانہ مذکور ماہر طبیعیات نے تجویز کیا ہے۔

"پروٹین اینو ایسڈ کے طویل سلسلوں سے تشکیل پاتے ہیں' تو سوال یہ ہے کہ ان جزئیات کے ذرات کی باہم تالیف

کس طرح ہوتی ہے؟ جس طرح ان کی تشکیل طبعی ہوتی ہے اگر اس کے سوا کسی اور طریق سے ان کی تالیف ہو تو وہ زندگی کے اہل ہی نہیں رہتے اور بعض اوقات ایسے پروٹین زہر بن جاتے ہیں۔ ایک برطانوی سکالر ج۔ب سیتھر (J.B.Seather) نے حساب لگایا ہے کہ ان سلسلوں میں پروٹینی ایٹم کس تعداد میں ہوتے ہیں ان کے نزدیک ان کی تعداد ( ۱۰<sup>۴۸</sup> ) ہوتی ہے۔ اس لئے عقلاً یہ بات محال ہے کہ احماض امینہ کا یہ پورا سلسلہ محض اتفاقی طور پر تالیف پا جائے اور دنیا میں ایک پروٹین بن جائے۔"

"لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بات پیش نظر رہے کہ پروٹین ایک کیمیاوی مادہ ہے جس کے اندر کوئی زندگی نہیں ہوتی اور اس کے اندر زندگی اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک اس کے اندر وہ خفیہ عمل نہیں ہو جاتا جو آج تک ایک عجیب راز ہے اور جس کی حقیقت کا ہمیں کوئی علم نہیں ہے اور اس بات کو صرف "عقل لا انتہائی" ۲۔ جانتا ہے اور یہ صرف اللہ ہے جس کی حکمت بالغہ کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے کہ یہ پروٹینی جزء مقر حیات بنتا ہے۔ یہ حیات کی منزل ہے جسے اللہ نے بنایا۔ اس کو ایک بہترین شکل دی ہے اور اس کو راز حیات بخشا ہے۔"

نباتات کی موروثی صفات کے ایک ماہر مسٹر ارفنگ ولیم 'استاد طبیعیات جامعہ ایوی مچگن مقالے بعنوان "صرف مادیت کافی نہیں ہے" میں لکھتے ہیں:

سائنس اس بات پر قادر نہیں ہے کہ نہایت ہی چھوٹے ایٹم لاتعداد صورت میں کس طرح وجود میں آ جاتے ہیں' جن سے دنیا کے تمام مادے مرکب ہوتے ہیں اور اس طرح سائنس کوئی قابل اعتماد توجیہ نہیں کر سکتی کہ ان چھوٹے چھوٹے جثوں سے ذی حیات جاندار کس طرح اتفاقاً بن جاتے ہیں اور یہ نظریہ کہ تمام جاندار اپنی موجودہ ترقی یافتہ صورت میں بسبب حدوث طفرات عشوریہ اور حجائن کے تجمعات کی وجہ سے پہلے پہنچے ایک ایسا نظریہ ہے جو کسی ایسی دلیل و منطق کی اساس پر قائم نہیں ہے جس پر اطمینان ہوتا ہو' یہ بات محض تسلیم کر لینے کی وجہ سے ہی ممکن ہے۔"

( یہ بھی سائنس دانوں کا خبط ہے کہ عناصر کی مقدار معلوم نہیں ہے۔ ان عناصر کی مقدار بھی مقرر ہے۔)

باہلر یونیورسٹی کے پروفیسر طبیعیات ڈاکٹر البرٹ میکومب ونسٹر اپنے ایک مقالے کا عنوان یہ دیتے ہیں "سائنس نے میرے ایمان باللہ کو مضبوط کر دیا"۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں نے حیاتیات کے مطالعہ میں اپنے آپ کو مصروف رکھا۔ حیاتیات وہ علم ہے جس کا موضوع زندگی ہے جس کا میدان مطالعہ بہت ہی وسیع ہے اور اللہ کی تمام مخلوقات میں سے زیادہ دلکش چیز اس دنیا کی زندہ مخلوق ہے۔"

"ذرا پودے کو دیکھئے' یہ نہایت ہی چھوٹا پودا ہے۔ یہ راستے کے ایک کنارے پر اگا ہوا ہے۔ کیا آپ بے شمار انسانی مصنوعات و آلات میں سے کسی چیز کو اس کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ یہ ایک زندہ آلہ ہے اور مسلسل رات دن چلتا رہتا ہے۔ اس کے اندر ہزاروں کیمیاوی عمل اور ردعمل واقعہ ہوتے رہتے ہیں' طبعی تغیرات ہوتے ہیں اور پروٹو پلازم کے تحت ہوتے ہیں۔ یہ وہ مادہ ہے جو تمام زندہ کائنات کی ترکیب میں داخل ہوتا ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ یہ زندہ اور پیچیدہ آلہ کہاں سے آگیا؟ اسے اللہ نے صرف اس کو اس شکل میں نہیں بنایا' بلکہ اللہ نے پوری زندگی کو بھی تخلیق کیا ہے اور اسے اپنے تحفظ کی قوت بھی دی ہے۔ وہ اس زندگی کو تسلسل بھی بخشا ہے اور اس نے اس کے اندر وہ تمام خواص رکھے ہیں اور تمام خصوصی صفات اس کے اندر ودیعت کیں ہیں جن کی وجہ سے ہم ایک

پودے اور دوسرے پودے کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ زندہ اشیاء میں اس عظیم کثرت کا مطالعہ بھی ایک عظیم اور دلچسپ موضوع ہے اور اس سے قدرت کی طاقت کی بوقلمونیوں کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ خلیہ جس کے ذریعے نسل کشی ہوتی ہے اور ایک نیا پودا وجود میں آتا ہے اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ صرف مائیکروسکوپ سے نظر آتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس پودے کے خواص ' ہر رگ ' ہر ریشہ ' ہر شاخ اور ہر تنا ' ہر جڑ اور ہر چھوٹا ریشہ ' ایسے انجینئروں کی زیر نگرانی سرانجام پاتا ہے کہ یہ تمام نقوش اس چھوٹے سے خلیہ کے اندر موجود ہوتے ہیں اور اس کے اندر موجود رہتے ہیں۔ یہ انجینئر کون ہوتے ہیں؟ یہ کرو موسوم ہوتے ہیں۔"

میں سمجھتا ہوں کہ اس قدر حوالے کافی ہیں اب پھر ہم دوبارہ اس حسن ادا کی طرف لوٹتے ہیں جو قرآن کریم کی عبارت میں موجود ہے۔

( ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ (٦ : ١٠٢ ) ) یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ تمہارا رب ہے۔" جو اس معجزۂ حیات کا موجد ہے اور اس معجزے کا ظہور تسلسل سے ہو رہا ہے لیکن راز حیات کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔ یہ ہے اللہ تمہارا رب اور وہی اس بات کا مستحق ہے کہ تم لوگ اس کے حلقہ بگوش بنو۔ اس کے ساتھ خشوع و خضوع کرو اور اس کے احکام کا اتباع کرو۔

(فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (٦ : ٩٥ ) ) پھر تم کدھر بہکے چلے جا رہے ہو؟" تم اس سچائی سے صرف نظر کر کے دوسری راہوں پر چل رہے ہو حالانکہ یہ راہ حق ہے ' عقلی طور پر واضح ہے ' دل لگتی بات ہے اور چشم بصیرت کے لئے تشفی ہے۔

یہ معجزہ یعنی مردے سے زندہ کو نکالنا ' قرآن نے اس کا ذکر بار بار کیا ہے اور اس حقیقت کو بھی قرآن نے بار بار دہرایا ہے کہ اللہ نے اس کائنات کو سب سے پہلے پیدا کیا ہے۔ ان حقائق کا ذکر اس ضمن میں کیا گیا جہاں مقام الوہیت کی حقیقت کا ذکر آیا ہے اور جہاں ان آثار کا ذکر کیا گیا ہے جو بتلاتے ہیں کہ خالق کائنات وحدہ لاشریک ہے۔ یہ اس لئے کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ خالق کائنات ایک ہے اور اسی وحدہ لاشریک کی بندگی کی ضرورت ہے۔ عقیدہ و نظریہ میں بھی وحدہ لاشریک کو مانا جائے اور ربوبیت بھی اسی وحدہ لاشریک کی تسلیم کی جائے۔ مراسم عبودیت بھی اسی کے سامنے بجا لائے جائیں اور زندگی کے قوانین اور ضوابط بھی اسی کے احکام سے اخذ کئے جائیں۔ صرف اسی کے نافذ کردہ قانونی نظام یعنی شریعت کی پابندی کی جائے۔

( اس مصنف نے اس مقالے میں برٹرینڈ رسل کے اس نظریے کی تردید کی ہے کہ زندگی اتفاق کے طور پر وجود میں آتی ہے اور اتفاقاً چلی جاتی ہے۔)

قرآن کریم میں ان باتوں کا ذکر محض لاہوتی فلسفیانہ انداز میں نہیں کیا جاتا۔ یہ دین تو بہت ہی معقول اور سنجیدہ دین ہے اور لوگوں کا وقت لاہوتی مباحث اور فلسفیانہ موشگافیوں میں ضائع نہیں کرتا۔ دین اسلام کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں کے تصور حیات کو درست کیا جائے اور انہیں صحیح افکار اور صحیح عقائد دیئے جائیں تاکہ ان کی ظاہری اور باطنی زندگی درست ہو سکے۔ لوگوں کی زندگی کی اصلاح صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ وہ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کی طرف لوٹ

جائیں اور اپنے جیسے انسانوں کی غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکیں۔ جب تک کہ وہ اپنی پوری زندگی میں اللہ کی اطاعت اختیار نہ کرلیں اور روز مرہ کی زندگی میں اللہ وحدہ کی شریعت کو نہ اپنالیں۔حیات کے بارے میں ان کا عقیدہ اور نظریہ درست نہیں ہو سکتا۔ان کی زندگی میں ایسے لوگوں کا اقتدار نہ ہو جو زبردستی ان پر مسلط ہو گئے ہوں' جو بالفاظ دیگر حق الوہیت کے دعویدار ہیں اور لوگوں کی زندگیوں پر اللہ کے حق حاکیت کے بجائے وہ خود اپنا حق استعمال کرتے ہیں۔یوں وہ اس دنیا کے جھوٹے خداؤں میں شامل ہو گئے ہیں انہوں نے لوگوں کی حیات دنیوی میں بگاڑ پیدا کر دیا ہے اور یہ فساد محض اس لئے ہے کہ لوگ اللہ کے سوا کسی اور کی اطاعت کرنے لگتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان باتوں پر تعقیب یہ آتی ہے۔

(ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۶:۹۵)) یہ سارے کام تو اللہ تمہارے رب کے ہیں پھر تم کدھر بہکے جا رہے ہو؟" تمہاری زندگی میں ربوبیت یعنی مکمل اطاعت کا مستحق تو وہی ہے۔رب کا مفہوم ہے مربی' جس کی طرف انسان متوجہ ہو' جو سردار اور حاکم ہو' اپنے ان مفہومات کے ساتھ اللہ کے سوا کوئی اور رب نہیں ہے۔

(لفظ رب کی توضیح کے لئے دیکھئے امیر جماعت اسلامی پاکستان کی کتاب المصطلحات الاربعہ فی القرآن)

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۹۶﴾

"پردۂ شب کو چاک کر کے وہی صبح نکالتا ہے۔اسی نے رات کو سکون کا وقت بنایا ہے۔اسی نے چاند اور سورج کے طلوع و غروب کا حساب مقرر کیا ہے۔یہ سب اسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھہرائے ہوئے اندازے ہیں۔"

دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے۔پردۂ شب کو چاک کر کے وہی صبح کو نکالتا ہے' وہی ہے جس نے سکون کے لئے رات بنائی ہے' اور وہی ہے جس نے چاند ستاروں کی گردش کے لئے صحیح اوقات مقرر کئے ہیں۔ان کی گردش کے لئے ایک مقرر نظام تجویز کیا ہے اور اس نظام کو اس قدر مؤثر اور کنٹرول میں رکھا ہے جس سے اس کے مکمل قبضے کا ثبوت ملتا ہے اور جس سے اس کے وسیع اور محیط علم کا ثبوت ملتا ہے۔

رات کی تاریکیوں سے سپیدۂ صبح نکالنا ایک ایسا ہی عمل ہے جس طرح گٹھلی اور دانے کو پھاڑ کر اس سے پودا اور درخت نکالا جاتا ہے۔ایک حرکت میں صبح کی روشنی نمودار ہوتی ہے۔اور دوسری حرکت میں پودے کی سوئی برآمد ہوتی ہے۔ان دونوں مثالوں میں وجہ تشبیہ یہ ہے کہ دونوں میں حرکت' زندگی خوبصورتی اور جمال ہے جبکہ دونوں حقیقتیں اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک جیسی بھی ہیں۔

گٹھلی اور دانے کو پھاڑ کر اس سے پودوں کا اخراج جبکہ پہلے یہ جامد تھے اور رات کی تاریکیوں سے اور سکون سے صبح کی روشنی نکالنا یہ بھی وجہ مماثلت ہے۔گٹھلی اور رات دونوں کے اندر سکون موجود ہے۔اس کائنات میں صبح و شام اور وقت و سکون کا موجودہ نظام زندگی اور ہر چیز کے اگنے اور بڑھنے سے خاص تعلق رکھتا ہے۔

زمین کا اپنے محور کے گرد گھومنا' اور سورج کے سامنے ایک فاصلے اور متعین فاصلے پر رہنا' چاند کا موجودہ حجم اور

موجودہ فاصلے پر رہنا اور سورج کا موجودہ حجم' موجودہ فاصلہ اور موجودہ درجہ حرارت' یہ وہ اندازے اور تقدیرات ہیں جن کی وجہ سے اس کرہ ارض پر زندگی ممکن ہو سکی ہے اور انہی اندازوں اور تدابیر تکوینی کی وجہ سے انسانی اور نباتاتی زندگی ممکن ہو سکی ہے۔ انہی کی وجہ سے گٹھلی اور دانے کو پھاڑ کر نباتات اگ سکے ہیں۔

یہ ایک کائنات ہے جسے دقیق حسابی اور ریاضی اصولوں پر استوار کیا گیا ہے۔ اس کے اندر ہر قسم کے ذی حیات کی زندگی کا بھی پہلے سے حساب موجود ہے۔ اس زندگی کا مقام اور اس کی نوعیت ایک ایسی کائنات ہے جس کے اندر بخت و اتفاق کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ نیز یہاں اس نظریے کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ یہاں وجود بخت و اتفاق سے ہے لیکن اس بخت و اتفاق کے لئے حساب و کتاب اور ضابطہ مقرر ہے۔

جو لوگ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ زندگی اس کائنات میں جاری ہے لیکن اس کائنات کو زندگی کے ساتھ کوئی ہم آہنگی نہیں ہے بلکہ کائنات زندگی کی مخالف اور دشمن ہے۔ یہ چھوٹا سا سیارہ یعنی کرہ ارض جس کے اوپر یہ زندگی موجود ہے' بتا رہا ہے کہ وہ اس زندگی کا مخالف ہے۔ ایسے لوگوں میں بعض تو یہ کہتے ہیں کہ اگر اس کائنات کا کوئی اللہ ہوتا تو وہ اس چھوٹے سے کرہ ارض اور اس پر موجود زندگی کے جھمیلوں میں نہ پڑتا اور اس قسم کے دوسرے خرافات یہ لوگ بکتے ہیں۔ کبھی اسے علم اور سائنس کا نام دیتے ہیں' کبھی اسے فلسفہ کہتے ہیں اور یہ خرافات ایسے ہیں کہ ان کی طرف کسی سنجیدہ نگاہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

یہ لوگ اپنی ان خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں جو ان کے نفوس پر حاوی ہیں اور ان سائنسی نتائج کو بھی تسلیم نہیں کرتے جن کا استخراج خود انہوں نے کیا ہے۔ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے دین میں جو فیصلے کر لئے وہ ان کے خلاف کسی واضح ترین حقیقت کا سامنا کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ وہ اپنے فیصلوں کو سینے سے لگا کر بھاگ رہے ہیں۔ وہ لوگ ذات باری سے بھاگ رہے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی وحدانیت کے دلائل ان کے سامنے منکشف کرتے چلے جاتے ہیں اور اس کی قدرت کے نظارے ہر طرف عام ہیں اور دعوت نظارہ دے رہے ہیں' وہ ذات باری سے فرار کرتے ہوئے جو راہ بھی لیتے ہیں اس کے آخری سرے پر ذات باری پھر کھڑی ہوتی ہے۔ یوں وہ پریشان ہو کر دوسری گلی سے بھاگتے ہیں لیکن وہاں بھی انہیں ذات باری کی حقیقت کبریٰ نظر آتی ہے۔

یہ علمی اور عقلی دونوں لحاظ سے یتیم ہیں' علمی لحاظ سے تہی دامن ہیں اور نہایت ہی بدبخت ہیں۔ یہ لوگ کینسہ اور اس کے اللہ سے بہت پہلے بھاگے تھے' اس لئے کہ کینسہ نے انہیں اپنا غلام بنا لیا تھا۔ وہ اس طرح بھاگے تھے جس طرح کسی شیر کی آمد پر گدھے بدکتے ہیں اور وہ آج تک بھاگ ہی رہے ہیں۔ اس صدی کے اوائل تک وہ بھاگتے رہے اور آج تک سرپٹ بھاگ رہے ہیں لیکن پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھتے کہ آیا کلیسا اب بھی ان کا پیچھا کر رہا ہے یا نہیں۔ یا خود کلیسا نے اپنا غلط موقف ترک کر دیا ہے یا ابھی تک اسی موقف پر قائم ہے۔ ان لوگوں کا سانس ابھی تک پھولا ہوا ہے لیکن بھاگ رہے ہیں۔

یہ بدبخت خستہ حال لوگ ہیں اور ان کی بدقسمتی یہ ہے کہ انہوں نے سائنس کے میدان میں جو دریافتیں کی ہیں ان کے نتائج ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کہاں تک بھاگتے رہیں گے۔ فرانک ایلن جس کی تحریروں سے اس سے قبل ہم اقتباسات دیکھ آئے ہیں دنیا میں زندگی کی نمود کے بارے میں کہتے ہیں :

"زندگی کے لئے زمین کی سازگاری نے' یہاں زندگی کو مختلف شکلوں میں ترقی دی ہے۔ زندگی کی ان بوقلمونیوں کی

توجیہ سے ہم محض "اتفاق" نہیں کر سکتے اور نہ لاادریت سے اس کی کوئی تعبیر کر سکتے ہیں اس لئے کہ یہ زمین ایک کرہ ہے جو ہوا میں معلق ہے۔ یہ اپنے ارد گرد چکر لگا رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں رات اور دن پیدا ہوتے ہیں اور فضاؤں میں یہ زمین سال میں ایک بار سورج کے ارد گرد بھی گھومتی ہے۔ اس کے نتیجے میں مختلف موسم آگے پیچھے آتے ہیں اور اس کی وجہ سے ہمارے اس کرے کا زیادہ سے زیادہ حصہ قابل رہائش بن جاتا ہے۔ مختلف قسم کے نباتات اگ آتے ہیں۔ اگر یہ زمین ایک ہی جگہ رہتی تو اس قدر اقسام کے نباتات نہ ہوتے۔ اس کرۂ ارض کے ارد گرد ایک گیس اوزون کا پردہ ہے جس میں ایسی قسم کی گیسیں پائی جاتی ہیں جو زندگی کے لئے اہم ہیں۔ ان گیسوں کا یہ خول بہت بلندی تک گیا ہوا ہے۔"

"یہ گیس اس قدر کثیف ہے کہ آسمانوں سے ہزاروں شہاب جو زمین کی طرف آتے ہیں وہ اس سے ٹکرا کر ٹوٹ جاتے ہیں اور یہ تیس میل ایک سیکنڈ کے حساب سے ٹوٹتے ہیں۔ ان گیسوں کا خول اس کرۂ ارض کے درجہ حرارت کو بھی کنٹرول کرتا ہے اور اسے زندگی کے لئے مناسب حدود میں رکھتا ہے۔ ان گیسوں کی وجہ سے آبی بخارات فضاؤں میں دور تک چلے جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بارش میں بدل کر زمین کو موت کے بعد دوبارہ زندہ کر دیتے ہیں۔ بارش کی وجہ سے ہمیں میٹھا پانی ملتا ہے' اور اگر بارشیں نہ ہوتیں تو یہ زمین ایک چٹیل میدان ہوتی اور اس میں کوئی اگنے والی چیز یا دوسری حیوانی زندگی کا کوئی نام و نشان نہ ہوتا۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فضا اور سطح زمین کے گرد دوسرے خول نظام طبیعی کے اندر ایک توازن پیدا کرتے ہیں۔"

غرض اب ایسے علمی اور سائنسی دلائل کا انبار لگ گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر آثار حیات اور اقسام حیات کی کوئی تعبیر دل لگتی تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ اس زندگی کے آغاز' نشوونما اور اس کے قیام دوام کے لئے جو عوامل کارفرما ہیں وہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ کائنات ایک منصوبے کے تحت وجود میں آئی ہے۔ ان دلائل میں سے بعض وہ ہیں جن کا ذکر علم طبیعیات کے مذکورہ بالا ماہرین نے کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار آثار و دلائل ہیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ اور یہ اللہ ہی کی ذات ہے۔

(اَلَّذِیْ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی) جس نے زندگی دی اور پھر ہدایت دی اور جس نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا لیکن اندازے اور منصوبے کے ساتھ۔"

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۟﴿۹۷﴾

اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا۔ دیکھو ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔"

یہ نظام فلکی کے منظر کا تتمہ ہے' جس کے اندر سورج' چاند اور ستارے سرگرداں ہیں اور یہ پوری کائنات کے منظر کا حصہ ہے جو نہایت ہی وسیع' نہایت ہی حیران کن ہے اور جس کی تمام حرکات و سکنات انسانی زندگی اور اس کے مفادات اور

ضروریات کے ساتھ وابستہ ہیں۔

(لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ( ٦: ٩٧ )) تاکہ تم ان کے ذریعے صحرا اور سمندروں کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرو۔" صحراؤں اور سمندروں کی دوریوں میں انسان ہمیشہ ستاروں کے ذریعے راستہ معلوم کرتا آیا ہے اور آج بھی وہی نظام ہے۔ اصول وہی ہیں اگرچہ دور جدید کے انکشافات کی وجہ سے وسائل بدل گئے ہیں۔ سمندری سفر کے لئے جدید آلات تیار ہو گئے ہیں لیکن اصل الاصول یہی ہے ان سفروں میں قطب شمالی اور ستاروں سے ہدایت لی جاتی ہے۔ ظلمات البر والبحر میں حسی اور حقیقی اندھیرا بھی شامل ہے اور فکری اور تصوراتی اندھیرا بھی۔ لہٰذا نص قرآن جس طرح آج سے صدیوں پہلے بامقصد تھی اسی طرح آج بھی بامقصد اور بامصداق ہے۔ آج کی بحری زندگی بھی اسی اصول کے مطابق ہے۔ آج بھی قرآن انسانوں سے اسی طرح مخاطب ہے جس طرح آج سے پہلے تھا حالانکہ آج کے دور میں انسانی انفس اور آفاق میں اللہ نے انسان کو وسیع علم سے نوازا ہے لیکن آج بھی ہماری بحری سفری زندگی اسی آیت کی مصداق ہے۔

قرآن آج بھی فطری انداز میں انسانوں کو خطاب کرتا ہے اور تکوینی حقائق ان کے سامنے رکھتا ہے۔ محض نظریاتی بنیادوں پر خطاب نہیں کرتا بلکہ "واقعی" صورت انسان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو آج تک قائم ہے۔ اس صورت میں خطاب کے نتیجے میں صانع کائنات کی کارفرمائی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اللہ کی تقدیر اس کی تدبیر اور اس کی شان رحیمی عقل و نظر سے بالکل روشن نظر آتی ہے۔ انسان بصیرت حاصل کرتا ہے' اس کے ادراک کو جلا ملتی ہے اور وہ کائنات پر تدبر بھی کرتا ہے۔ اس سے نصیحت بھی حاصل کرتا ہے اور اپنے علم' اپنی معرفت اور ترقی کو اس کائنات میں کارفرما حقیقت کبریٰ کے ادراک کے لئے استعمال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حقیقت انسان کے سامنے رکھنے کے بعد کہ اللہ بحر و بر کے اندھیروں میں ان کی راہنمائی کا انتظام کرتا ہے یہ تعقیب آتی ہے۔

(قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ( ٦: ٩٧ )) دیکھو ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں' ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔" اس لئے کہ صحرا کی پہنائیوں اور سمندر کی تاریکیوں میں ستاروں سے ہدایت تب ہی لی جا سکتی ہے جب انسان کو ستاروں کے مداروں' ان کے دوروں اور مختلف اوقات میں ان کے مواقع کے بارے میں علم حاصل ہو اور معنوی اندھیروں میں ہدایت وہ لوگ لے سکتے ہیں جنہیں علم ہو کہ یہ کائنات صانع حکیم کی بنائی ہوئی ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا یہاں ہدایت سے مراد دونوں قسم کی ہدایات ہیں' حسی اور بحری سفر کی ہدایات بھی اور معنوی اور گمراہی قلب و نظر کی ہدایات بھی۔ وہ لوگ جو ستاروں کو حسی رہبری کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس رہبری سے اپنے خالق تک پہنچنے کی ہدایت و بصیرت اخذ نہیں کرتے وہ گویا علم سے محروم ہیں کیونکہ انہوں نے ان چیزوں سے جھوٹی اور حقیر ہدایت تو لی لیکن ہدایت کبریٰ اخذ نہ کی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس کائنات کا تعلق رب کائنات سے کاٹنا چاہتے ہیں اور اس کائنات کے ان دلائل سے وہ ہدایت اخذ نہیں کرتے جو مبدع عظیم پر دال ہیں۔ صدق اللہ العظیم۔

وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾

"اور وہی ہے جس نے ایک جان سے تم کو پیدا کیا۔ پھر ہر ایک کے لئے ایک جائے قرار ہے اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ - یہ نشانیاں ہم نے واضح کر دی ہیں ان لوگوں کے لئے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں -"

اب یہ چٹکی براہ راست ہے' اور یہ مجھ نفس انسانی اور ذلت انسانی کو دیا جاتا ہے - اپنی حقیقت کے اعتبار سے انسان ایک ہی نفس سے پیدا کئے گئے ہیں کیونکہ مرد اور عورت اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی ہیں - لہذا پوری بشریت ایک حقیقت واحدہ ہے - مرد و عورت کے درمیان زندگی کا آغاز تناسل کے خلیہ سے شروع ہوتا ہے - مثلاً خلیہ جب صلب پدر میں ہوتا ہے تو وہ جائے قرار میں ہوتا ہے - جب وہی خلیہ رحم مادر میں جاتا ہے تو وہ اس کے لئے سپردگی کی جگہ ہے اس کے بعد زندگی بڑھتی ہے اور پھیل جاتی ہے اور مختلف نسلوں اور رنگوں میں تقسیم ہو جاتی ہے - مختلف گروہوں اور زبانوں میں بٹ جاتی ہے - مختلف اقوام و قبائل میں تقسیم ہو جاتی ہے اور اس زندگی کے اس قدر نمونے بن جاتے ہیں جن کا گننا مشکل ہو جاتا ہے - پھر زندگی کے اس قدر کلچر وجود میں آجاتے ہیں کہ جب تک زندگی موجود رہے گی آتے رہیں گے -

( نفس واحدہ سے مراد میں نے نفس انسانیت لیا ہے اس لئے کہ مجھے اس بارے میں قابل اعتماد حدیث نہیں ملی کہ حوا کو آدم سے پیدا کیا گیا -)

(قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (۶:۹۸)) یہ نشانیاں ہم نے واضح کر دی ہیں ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں -" یہاں فقیہ وہ شخص ہو گا' جو اس نفس انسانی کی تخلیق کے بارے میں اللہ کی کاریگری کا ادراک رکھتا ہو اور پھر اس بات میں مہارت رکھتا ہو کہ ایک انسان آگے جا کر کن کن کلچروں اور نمونوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور یوں انسان ایک نفس کو بذریعہ نسل آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے - اس عمل سے بے شمار مرد اور عورتیں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور انسانی آبادی بڑھتی رہتی ہے - یہ تمام کام اللہ کی اس حکمت کے نتیجے میں پورا ہوتا ہے جسے اس نے نظام زوجیت کے ذریعے فرض قرار دیا - جس کے ذریعے آبادی بڑھتی ہے' بچوں کی نشوونما دائرہ انسانیت کے اندر ہوتی ہے اور وہ آئندہ زندگی میں وظیفہ انسانیت ادا کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں -

ہم یہاں ظلال القرآن میں اس موضوع کی پوری تفصیلات نہیں دے سکتے جس سے انسانیت کے دونوں اصناف کے درمیان تمام تعلقات کو زیر بحث لا سکیں - اس کے لئے تو علیحدہ ایک کتاب کی ضرورت ہے -

( دیکھئے کتاب خصائص التصور الاسلامی میں بحث حقیقۃ الحیاۃ)

لیکن یہاں اس قدر تذکرے کی بہرحال ضرورت ہے کہ نطفے سے مرد اور عورت کس طرح پیدا ہو جاتے ہیں اور کس طرح ایک غیبانی قوت اور قدرت الہی مرد اور عورتوں کی تعداد کو برابر رکھتی ہے تاکہ آئندہ نسل کشی کے لئے اور سلسلہ توالد و تکاثر کو جاری رکھنے کے لئے مناسب انتظام ہو - اس سے قبل ہم نے آیت -

(وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ (۶:۵۹)) کی تفسیر میں کہا تھا کہ مرد کے مادہ منویہ کے اندر جو کروموسوم ہوتے ہیں اور جب ان کا التقاء عورت کے انڈے کے ساتھ ہوتا ہے تو اس وقت صرف تقدیر الہی ہوتی ہے جو مذکر کروموسوم کو مؤنث کروموسوم پر ترجیح دیتی ہے یا اس کے برعکس فیصلہ کرتی ہے اور یہ ترجیح از جانب تقدیر الہی غیب الہی ہے - اس معاملے میں کسی انسان کو کوئی اختیار نہیں ہے -

یہ تقدیر فیصلہ کرتی ہے اور کسی کو لڑکا عطا ہوتا ہے اور کسی کو لڑکی - یہ تقدیر تمام روئے زمین پر مردوں اور عورتوں کی تعداد کے اندر مطلوب توازن کو برقرار رکھتی ہے کہ کس قدر مرد درکار ہیں اور کس قدر عورتیں - چنانچہ آج تک پوری انسانیت کی سطح پر اس توازن کے اندر کوئی فرق نہیں پڑا اور اس توازن کے ذریعے سلسلہ توالد و تکاثر آج تک جاری و ساری ہے - یہ درست ہے کہ اگر مرد کم ہوں تو بھی توالد و تکاثر کا سلسلہ جاری رہ سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اسکیم کا مطلب فقط یہ تھا کہ انسانوں کے درمیان نہ صرف نسل کشی کا انتظام کر دیا جائے بلکہ ساتھ یہ بھی مطلوب تھا کہ حیوانی سطح سے اوپر جاکر انسان کی ازدواجی زندگی میں توازن اور استحکام پیدا ہو' کیونکہ اس استحکام کے بغیر مقاصد انسانیت کی تکمیل ممکن نہ ہوتی - ان میں سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ ماں باپ کی پرورش کے بغیر بچوں کی تربیت اسلامی خطوط پر ممکن نہ تھی یعنی ایک خاندان کی خوشگوار فضا کے اندر' تاکہ یہ بچے آئندہ زندگی میں اپنا انسانی کردار ادا کر سکیں - صرف یہ نہ ہو کہ بچے ایک حیوان کی طرح مادی زندگی کے لحاظ سے بلوغ تک پہنچ جائیں - انسانی کردار یہ بچے تب ہی ادا کر سکتے ہیں جب یہ ایک پرسکون خاندانی زندگی میں ماں اور باپ دونوں کی پرورش میں ایک طویل عرصے تک رہیں کیونکہ انسانی بچہ حیوانات کے مقابلے میں ایک طویل عرصے تک بچپن میں ہوتا ہے اور محتاج ہوتا ہے -

مرد اور عورتوں کی تعداد کے درمیان یہ توازن اس بات پر کافی وشافی دلیل ہے کہ اس کائنات میں خالق کائنات کی تدبیر' حکمت اور اس کی تقدیر کس طرح ہروقت کارفرما ہے لیکن یہ دلیل اور نشانی صرف ان لوگوں کیلئے ہے جو فقیہ ہیں (لقوم یفقهون) - رہے وہ لوگ جو اندھے ہیں اور حقیقت ان کی نظروں سے اوجھل ہے تو ان کی نابینائی کا کوئی علاج نہیں ہے - ان کے سرخیل وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو سائنس دان کہتے ہیں اور کسی غیبی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں بلکہ وہ عالم الغیب تسلیم کرنے والوں کے ساتھ مذاق کرتے ہیں تو ایسے لوگ ان آیات الہیہ کو اس طرح پڑھ کر گزر جاتے ہیں جس طرح اندھے گزر جاتے ہیں - ان لوگوں کی نظروں سے حقیقت اوجھل رہتی ہے اور ان کی حالت یہ ہوتی ہے -

(وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا) وہ جو نشانی بھی دیکھیں 'اس پر ایمان نہیں لاتے -

---ooo---

اب اگلی آیت میں اس زندگی کا منظر سامنے لایا جاتا ہے جو اس کرۂ ارض پر ہر طرف نظر آتی ہے اور آنکھیں ہر روز اسے دیکھتی ہیں - حواس کے دائرے کے اندر سے اور اس کو دیکھ کر دل و دماغ اس کے بارے میں سوچتے بھی ہیں - ہمارے ادراک کو اس میں اللہ کی تخلیق اور کاریگری صاف صاف نظر بھی آتی ہے - کلام الٰہی ات اسی طرح پیش کرتا ہے جس طرح یہ چیزیں نظر آتی ہیں اور ان کے مختلف رنگ اور مختلف مناظر پیش کر کے ذرا نظروں کو ان کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے 'مختلف شکلیں اور مختلف قسمیں سامنے لائی جاتی ہیں ' انسانی وجدان کو بتایا جاتا ہے کہ زندگی کی نشوونما کو دیکھے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ قدرت نے کیسی کیسی چیزیں پیدا کی ہیں - قلب انسانی کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ اس نظام کی خوبصورتی کو بھی ذرا دیکھے اور لطف اندوز ہو -

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۤءِ مَاۤءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا

مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِن طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَجَنَّاتٍ مِّنْ أَعْنَابٍ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۗ انظُرُوا إِلَىٰ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَيَنْعِهِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكُمْ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٩٩﴾

''اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا' پھر اس کے ذریعے سے ہر قسم کی نباتات اگائی' پھر اس سے ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کئے' پھر ان سے تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کئے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں' اور انگور' زیتون اور انار کے باغ اگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور پھر ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا بھی ہیں۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو' ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔''

قرآن کریم میں جب بھی حیاتیات اور نباتات کا ذکر ہوتا ہے اس دوران پانی کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے۔

(وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ (٦ : ٩٩)) اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا' پھر اس کے ذریعے سے ہر قسم کی نباتات اگائی۔'' ہر چیز کی پیدائش میں پانی کا جو کردار ہے وہ بالکل ظاہر ہے اور اس کے بارے میں ایک پسماندہ اور ترقی یافتہ انسان دونوں یکساں طور پر جانتے ہیں۔ عالم اور جاہل دونوں جانتے ہیں لیکن قرآن کریم نے ظاہری طور پر عوام کے لئے جو کچھ کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کی تخلیق میں پانی کا کردار کہیں زیادہ ہے۔ مثلاً سطح زمین پر مٹی کی فراہمی پانیوں کی مرہون منت ہے۔ یہ بات میں ان نظریات کی اساس پر کہہ رہا ہوں جو اس وقت سطح زمین کے بارے میں معروف ہیں۔ (اگر وہ درست ہوں) مثلاً یہ کہ ابتداء میں سطح زمین آگ کا گولہ تھی' اس کے بعد وہ سخت ہوگئی' اس قدر سخت کہ سطح زمین پر نباتات اگنے کے لئے کوئی مٹی نہ تھی' اس کے بعد فضائی عوامل اور پانی کی وجہ سے سطح زمین پر مٹی جمع ہونا شروع ہوئی اور اس کے بعد اس زمین کو تروتازہ اور سرسبز رکھنے کے لئے پانی اہم کردار ادا کرتا رہا۔ اس کے بعد آسمانوں میں بجلیوں کی چمک کی وجہ سے برف اور بارشوں کے ساتھ ایسی نائٹروجن گرتی رہی جو پانیوں میں تحلیل ہو سکتی تھی اور اس طرح زمین کے اندر روئیدگی شروع ہوگئی۔ یہ وہ کھاد ہے' جسے آج انسان انہیں قوانین قدرت کے اصول کو اپنا کر بنا رہے ہیں اور یہ وہ مادہ ہے کہ اگر روئے زمین اس سے خالی ہو جائے تو زمین کے اوپر کوئی تروتازگی نہ رہے گی۔

(فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِن طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَجَنَّاتٍ مِّنْ أَعْنَابٍ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ (٦ : ٩٩)) پھر اس سے ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کئے' پھر ان سے تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے

پھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کئے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں' اور انگور' زیتون اور انار کے باغ اگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور پھر ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا بھی ہیں۔" ہر پودا جب اگتا ہے تو وہ سبز ہوتا ہے اور خضر کا لفظ اخضر سے زیادہ لطیف ہے اور زیادہ پسندیدہ ہے۔ یہ ہرا پودا تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے دیتا ہے۔ مثلاً خوشے وغیرہ۔ اور کھجور کے درخت کے اوپر چھوٹی چھوٹی شاخیں نکلتی ہیں۔ (قنو۔ جمع قنوان) یعنی وہ شاخ جس پر کھجوریں لگتی ہیں۔ پھر (قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ (٦: ٩٩)) شاخیں جھکی ہوئی بھی ایک نہایت ہی دل پسند اور لطیف ترکیب ہے۔ یہ پورا منظر یوں نظر آتا ہے کہ گویا ہرے بھرے کھیتوں اور باغ کی گھنی چھاؤں کے درمیان انسان سیر کر رہا ہو جس میں انگوروں کے باغ اور زیتون کے باغات ہیں۔ یہ نباتات اپنی مختلف اقسام اور خاندانوں کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ ملتے جلتے بھی ہیں اور علیحدہ خصوصیات کے بھی مالک ہے۔

(اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ (٦: ٩٩)) یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو"۔

تیز احساس اور بیدار دل کے ساتھ ان کی طرف دیکھو' یہ کس قدر تر و تازہ ہیں اور جس وقت یہ پکتے ہیں تو کس قدر خوبصورت نظر آتے ہیں۔ دیکھو اور ان خوبصورت مناظر کو دیکھ کر لطف حاصل کرو۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ تم ان کے پھلوں کو کھاؤ جب وہ پھل دے دیں بلکہ یہ کہا کہ تم غور کی نظر سے دیکھو کہ کس طرح پھل لگتا ہے اور کس خوبصورتی کے ساتھ پکتا ہے اس لئے کہ یہاں خوبصورتی کے اظہار کا اور دعوت نظارہ کا مقام ہے۔ پھر ان مناظر کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے اللہ کی نشانیوں پر غور کرنے کا مقام ہے۔ نیز اللہ کی کاریگری اور اس کی صنعت کاریوں پر فکر و تدبر کا مقام ہے۔

(اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (٦: ٩٩)) ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔" ایمان ہی وہ نعمت ہے جس سے دل کھل جاتا ہے اور جس کے ذریعے بصیرت روشن ہوتی ہے اور فطرت میں کسی حقیقت کو قبولیت اور تسلیم کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ اجاگر ہو جاتی ہے۔ ذات انسانی کا ربط اس کائنات کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے اور انسان کا وجدان اس پوری کائنات کے خالق اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے ورنہ بعض دل ایسے ہوتے ہیں جو بند ہوتے ہیں اور بعض لوگوں کی بصیرت تاریک ہو جاتی ہے۔ ان کی فطرت کا رخ الٹے پاؤں کی طرف ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی ان کاری گریوں اور صنعت کاریوں کو دیکھتے ہیں۔ ان تمام آیات و دلائل کو دیکھتے ہیں لیکن انہیں کوئی احساس نہیں ہوتا اور نہ وہ سچائی کو قبول کرتے ہیں۔

(اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ) قبول تو وہ لوگ کرتے ہیں جو سنتے ہیں۔" اور ان آیات و نشانات کو صرف وہ لوگ پاتے ہیں جو صاحب ایمان ہوں۔

---ooo---

جب بات یہاں تک پہنچتی ہے تو انسان کے قلب و نظر کے سامنے اس پوری کائنات کی کتاب کو پیش کر دیا جاتا ہے جو اللہ کے وجود کے دلائل' اس کی وحدانیت' اس کی قدرت اور اس کی تدبیر کے مختلف مظاہر سے بھری پڑی ہے اور

انسانی وجدان کو اس کائنات کے پر تو نے اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ انسانی ضمیر نے انسانی زندگی کو بدل کر رکھ دیا اور انسانی ضمیر اللہ کی حکیمانہ صنعت و خلاقی کا اعتراف کرنے لگا۔ جب بات اس مقام پر پہنچ گئی تو اب مشرکین کے افعال شرکیہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں کہ شرک انسان کو غیر مانوس اور انوکھا لگتا ہے اور معرفت کردگار کی اس فضا میں اور اعتراف مبدع خلائق کے ان تصورات میں جب مشرکین کے افکار و ہمیہ کو پیش کیا جاتا ہے تو وہ بالکل پوچ اور بے بنیاد نظر آتے ہیں اور ایک سلیم الفطرت انسان کا مزاج ان سے ابا کرتا ہے۔ انسانی فہم و ادراک اور انسانی عقل اسے مسترد کر دیتی ہے اور فوراً ان شرکیہ تصورات پر تنقید کی جاتی ہے اور اس انکار اور تنبیہ کے لئے فضا بالکل تیار ہے۔

---

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ
۱۲ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ ع ۶
۱۸ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

"اس پر بھی لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرالیا، حالانکہ وہ ان کا خالق ہے، اور بے جانے بوجھے اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں تصنیف کر دیں، حالانکہ وہ پاک اور بالا تر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے۔ جب کہ کوئی اس کی شریک زندگی ہی نہیں ہے۔ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔"

عرب کے بعض مشرکین جنوں کی عبادت کرتے تھے، لیکن ان کو علم نہیں تھا کہ جن ہیں کیا۔ البتہ یہ انہیں ایک وہمی سی مخلوق سمجھتے تھے اور یہ بتوں کے پیچھے کوئی مخلوق تھی۔ انسان جب ایک بالشت کے برابر بھی عقیدۂ توحید سے ہٹ جائے تو وہ اس قدر ہٹتا چلا جاتا ہے کہ راہ حق سے کوسوں دور ہو جاتا ہے لیکن آخر کار انسان دیکھتا ہے کہ نقطہ آغاز کا انحراف اگرچہ تھوڑا سا اور ناقابل لحاظ تھا لیکن آگے جاکر دونوں راہوں کے درمیان بہت بڑی خلیج واقع ہو جاتی ہے۔ یہ مشرکین مکہ آغاز میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دین پر تھے اور حضرت اسماعیل کا دین وہی دین توحید تھا جسے اس علاقے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیا تھا۔ لیکن یہ لوگ اس عقیدۂ توحید سے انکار کر بیٹھے۔ اگرچہ یہ انحراف آغاز کار میں بہت ہی معمولی ہوگا لیکن وہ بت پرستی کے فعل شنیع پر منتج ہوا اور وہ یہاں تک آپہنچے کہ جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرانے لگے حالانکہ جن اللہ کی مخلوق ہیں۔

(وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ (۶: ۱۰۰)) اس پر بھی لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا دیا، حالانکہ وہ ان کا خالق ہے۔" دنیا میں جس قدر بت پرست مذاہب گزرے ہیں اور جن کی نوعیت مختلف

جاہلیتوں میں مختلف رہی ہے ان سب میں ایک شریر مخلوق کا تصور رہا ہے اور اس شریر مخلوق کا تصور ایسا ہی رہا ہے جس طرح شیطان کا تصور ہے۔ تمام بت پرست ہمیشہ اس شریر مخلوق سے ڈرتے رہے ہیں۔ چاہے یہ شریر مخلوق ارواح شریرہ ہوں یا اشخاص شریرہ۔ ان بت پرست مذاہب میں یہ رواج رہا ہے کہ وہ اس شریر مخلوق کے شر سے بچنے کے لئے کچھ قربانیاں دیں۔ ہوتے ہوتے یہ شرکیہ مذاہب ان کی پوجا کرنے لگے۔

عرب بت پرستی میں بھی ایسے ہی تصورات پائے جاتے تھے مثلاً وہ جنوں کی پوجا کرتے تھے۔ ان کو اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے حالانکہ اللہ کی ذات ان چیزوں سے پاک ہے۔ قرآن کریم یہاں ان کے ان عقائد کی کمزوری ان کو بتاتا ہے اور بالکل ایک لفظ میں بات کو ختم کر دیتا ہے۔ (خلقهم)۔ اللہ نے تو ان کو خود پیدا کیا۔ یہ ہے تو صرف ایک لفظ لیکن ان کے عقائد کو مذاق بنا دینے کے لئے یہ ایک لفظ ہی کافی ہے۔ جب پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے اور اس نے ان کی تخلیق کی ہے تو اللہ کی مخلوق اس کے ساتھ شریک کیسے ہو جائے گی اور اس مخلوق کو الوہیت اور ربوبیت کے حقوق کیسے حاصل ہو جائیں گے۔

ان لوگوں نے صرف اس دعوے پر ہی اکتفا نہ کیا' کیونکہ بت پرستانہ اوہام جب شروع ہوتے ہیں تو پھر کسی حد پر جا کر نہیں رکتے اور یہ انحراف آگے ہی بڑھتا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اس سے بھی آگے بڑھے اور یہ عقیدہ اختیار کر لیا کہ اللہ کے بیٹے اور بیٹیاں بھی ہیں۔

(وَ خَرَقُوْا لَهُ بَنِيْنَ وَ بَنٰتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ (٦ : ١٠٠)) اور بے جانے بوجھے اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں تصنیف کر دیں۔" خَرَقُوا کا مفہوم ہے کہ انہوں نے جعلی طور پر یہ عقیدہ تصنیف کر لیا۔ خرقوا کے معنے ہوتے ہیں اپنی جانب سے جھوٹ گھڑنا۔ خرق کے اصل معنی پھاڑنے کے ہیں مثلاً کوئی جھوٹی خبر لے کر آتا ہے۔ یہودیوں کے نزدیک حضرت عزیر ابن اللہ تھے۔ نصاریٰ حضرت مسیح کو ابن اللہ کہتے تھے۔ مشرکین مکہ کے نزدیک ملائکہ اللہ کی بیٹیاں تھیں۔ وہ فرشتوں کو مادہ تصور کرتے تھے لیکن وہ کوئی معقول بات نہ کرتے تھے کہ وہ کیوں مؤنث ہیں۔ کیونکہ جھوٹے دعوے ہمیشہ بغیر علم کے ہوا کرتے ہیں لہٰذا ان لوگوں کے دعوے بھی بغیر علم کے ہیں۔

(سُبْحٰنَهُ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ (٦ : ١٠٠)) حالانکہ وہ پاک اور بالا تر ہے' ان باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔" اس کے بعد اب اللہ تعالیٰ ان کے ان افتراؤں کے جواب میں اصل حقیقت سامنے لاتے ہیں۔ ان کے غلط تصورات کی تردید فرماتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ ان میں کیا کیا جھول ہے۔

(بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهُ صَاحِبَةٌ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (٦ : ١٠١)) وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کوئی اس کی شریک زندگی ہی نہیں ہے۔ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔ اللہ تو وہ ہے جو اس پوری کائنات کو عدم مطلق سے وجود میں لایا لہٰذا اسے کیا ضرورت ہے کہ وہ کسی کو اپنا خلف تجویز

کرے۔ خلف اور پسماندگان تو اس ذات کے لئے ہوتے ہیں جو فانی ہو۔ اور یا جو کمزور ہو اور اسے امداد کی ضرورت ہو' یا جنہیں دیکھ کر وہ خوش ہو سکے۔

پھر ان لوگوں کو معلوم ہے کہ توالد و تکاثر کا ضابطہ کیا ہوتا ہے۔ کسی شخص کے لئے اس ہی کی جنس سے ایک مادہ جوڑ ہوتا ہے۔ جب اللہ کی بیوی ہی نہیں ہے تو بیٹا کیسے ہو گا اور وہ ان چیزوں سے پاک بھی ہے۔ اس جیسی تو کوئی چیز ہی نہیں ہے لہذا کس طرح ممکن ہے کہ بغیر شادی کے نسل چلے........... یہ تو حقیقت ہے لیکن قرآن کریم اس حقیقت کو ان کے لئے قریب الفہم بنا دیتا ہے اور ان کے ساتھ خطاب میں ان کی فہم کو ملحوظ رکھتا ہے تاکہ وہ اپنے مشاہدات کے رنگ میں بات کو سمجھ سکیں۔

یہاں قرآن کریم ان کی تردید میں صرف حقیقت تخلیق کو پیش کرتا ہے تاکہ شرک کا کوئی سایہ تک باقی نہ رہے۔ یوں کہ کسی صورت میں بھی مخلوق خالق کے ساتھ شریک نہیں بن سکتی۔ کیونکہ خالق اور مخلوق کی حقیقت ہی جدا ہوتی ہے اور دوسری دلیل اللہ یہ دیتے ہیں کہ اللہ ہی حقائق کا علم رکھتا ہے اور ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے۔

(خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (٦ : ١٠١)) یعنی خلق بھی اس کا ہے اور علم بھی وہی رکھتا ہے۔

---ooo---

جس طرح اس سے قبل قرآن کریم نے مشرکین مکہ کی تردید کرتے ہوئے یہ کہا کہ "اللہ نے ہر چیز کی تخلیق کی ہے۔" اور اس سے ان کے ان تصورات کی تردید کر دی گئی اور بتا دیا گیا کہ اللہ کے بیٹے بیٹیاں کیسے ہو سکتی ہیں جبکہ اللہ کی کوئی شریک زندگی ہی نہیں ہے یا اللہ کا کوئی شریک خود اس کی مخلوق سے کیسے بن سکتا ہے' تو یہاں دوبارہ اللہ کی صفت تخلیق کو لایا جاتا ہے تاکہ یہ بات ثابت کی جاسکے کہ چونکہ وہ خالق ہے' اس لئے وہی معبود ہو گا اور ہمیں چاہئے کہ ہم صرف اسی کی بندگی کریں اور اپنی زندگی میں پورا دین صرف اس کا نافذ کریں اسی لئے کہ خالق وہی ہے۔ اس کے سوا کوئی اللہ اور حاکم نہیں ہو سکتا اور نہ ان کا اس کے سوا کوئی رب ہو سکتا ہے.....

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿١٠٢﴾

"یہ ہے اللہ تمہارا رب کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے' ہر چیز کا خالق' لہذا تم اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے۔"

جب یہ بات تسلیم ہو جائے کہ اللہ تعالی وحدہ ہی خالق ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ وہی بادشاہ اور مالک ہے۔ اور جب اللہ ہی خالق اور مالک ہے تو لازماً وہی رازق ہے اس لئے کہ جب وہ خالق ہے اور مالک ہے تو رزق اسی کی ذمہ داری ہے اور یہ رزق وہ اپنی مملکت سے دیتا ہے جس میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ اللہ کی مملکت میں جو کچھ بھی ہے یا جس چیز سے بھی انسان فائدہ اٹھاتے ہیں وہ تمام چیزیں اللہ کی مملوکہ ہیں اور جب تخلیق' ملکیت اور رزق

اللہ کا ہے تو یہ بات حتماً ثابت ہو جاتی ہے کہ رب بھی وہی ہے۔ لہذا یہ ہر انسان کا فرض ہو گا کہ وہ خصائص ربوبیت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔ ربوبیت کی اہم خصوصیات یہ ہیں' مختار و منتظم ہونا' ہدایت دینا' بادشاہ ہونا اور ایسی پوزیشن میں ہونا کہ اس کی اطاعت کی جائے اور وہ ایک ایسا نظام اور دین دے جس پر لوگ اجتماعی طور پر عمل کریں۔ (دیکھئے المصطلحات الاربعہ فی القرآن مولانا مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان' مباحث الوہیت' ربوبیت اور عبادت) لہذا ہر قسم کی عبادت و بندگی اور اطاعت اس کی ہوگی جن میں سے اہم خضوع اور سر تسلیم خم کرنا ہے۔

عرب لوگ اپنے دور جاہلیت میں اس بات کے منکر نہ تھے کہ اللہ اس کائنات کا خالق ہے۔ وہ لوگوں کا خالق اور رازق ہے اور تمام لوگوں کو اللہ کی ملکیت سے تمام ضروریات زندگی فراہم ہو رہی ہیں۔ اس کی ملکیت میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ عربوں کے علاوہ تمام دوسری جاہلیتیں بھی ان حقائق کا انکار نہ کرتی تھیں (ماسوائے یونانی فلاسفہ کی ایک قلیل تعداد کے) اور اس زمانے میں ہمارے دور جدید کے مادی مذاہب نہ تھے جن کی تشہیر و تشریح یونانی دور کے مقابلے میں زیادہ وسیع طور پر ہو رہی ہے۔ لہذا اسلام کے آغاز کے دور میں اللہ کے ساتھ جن الہوں کو شریک کیا جاتا تھا ان کی عبادت اس لئے کی جاتی تھی کہ یہ الہ' اللہ حقیقی کے قرب کا سبب اور ذریعہ ہیں۔ یہ ایک انحراف تھا اور دوسرا انحراف یہ تھا کہ لوگوں کی زندگیوں پر اسلامی نظام حیات کی حکمرانی نہ تھی۔ اور نہ اس دور میں تحریک اسلامی کو ایسے لوگوں سے سابقہ تھا جو ہمارے دور میں پائے جاتے ہیں جو سرے سے وجود باری کے منکر ہیں اور یہ انکار وہ بغیر علم' بغیر ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج بھی جو لوگ وجود باری کے منکر ہیں یا انکار خدا پر اصرار کرتے ہیں وہ بہت ہی تھوڑے ہیں اور ایسے لوگ ہمیشہ ایک حقیر اقلیت ہی میں رہیں گے۔ حقیقی گمراہی یہ تھی جس طرح آج ہے کہ لوگ اللہ کے سوا کسی اور سے نظام زندگی اخذ کرتے تھے اور یہی وہ روایاتی شرک تھا جس پر جاہلیت عربیہ قائم تھی اور تمام دوسری جاہلیتیں قائم رہی ہیں۔

اب جو حقیر اقلیت انکار خدا پر مصر ہے کیا اس کے پاس کوئی علمی دلیل ہے؟ کیا اس کا انکار سائنس پر مبنی ہے؟ اگرچہ اس کا دعویٰ تو ہے لیکن سائنس ان کے اس عقیدے کی تصدیق نہیں کرتی ہے؟ نہ کوئی سائنسی دلیل ہے اور نہ اس کائنات کی طبیعیات میں اس بات پر کوئی دلیل ہے۔ یہ دراصل وہ انحراف اور بغاوت ہے جو لوگوں نے اہل کلیسا اور ان کے خداؤں کے خلاف اختیار کی۔ کلیسا کے خدا اس بات پر مصر تھے کہ لوگ کلیسا کے پاس غلام ہوں حالانکہ اصول دین میں سے کوئی اصل ایسا نہ تھا کہ لوگوں کو غلام رکھا جائے۔ پھر ان مذہبی پیشواؤں کی شخصیت کی فطری نشوونما بھی غلط تھی۔ وہ انسان کے انسانی وظائف کو معطل کر رہے تھے مثلاً وہ لوگ جنہیں بپتسمہ دے دیا جاتا تھا۔ (دیکھئے کتاب الخصائص التصور الاسلامی' باب الوہیت اور بندگی)۔

یہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید میں تخلیق کائنات اور تقدیر نظام کائنات کا ذکر اس لئے نہیں کیا جاتا کہ ان امور سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے وجود پر دلائل قائم کیے جائیں' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے منکرین کا موقف اس قدر بودا تھا کہ قرآن کریم جیسی سنجیدہ کتاب میں اس پر بحث مناسب ہی نہ تھی۔ خلق اور تقدیر کے حقائق تو قرآن مجید میں اس لئے لائے گئے ہیں کہ لوگ راہ راست پر آجائیں' وہ اپنے عقائد و اعمال میں اللہ کی الوہیت' اس کی حاکمیت اور اس کی مکمل بندگی کو نافذ کریں اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ یہی صورت حال حقیقت حیات کی ہے۔

تعین سائنسی اعتبار سے تخلیق اور دنیا کو ایک نہایت ہی حکیمانہ اندازے کے مطابق پیدا کرنا' اور اس کائنات کے اندر زندگی کی مختلف شکلوں کو پیدا کرنا' ایسے حقائق ہیں جو ان لوگوں کے دلائل کے قلع قمع کرنے کے لئے نہایت ہی کافی و شافی ہیں۔ جو لوگ ذات باری کے وجود کے بارے میں کج بحثی کرتے ہیں وہ ان حقائق کے ہوتے ہوئے وجود باری کے خلاف کوئی قوی دلیل نہیں لاسکتے' ماسوائے اس کے کہ وہ ہٹ دھرمی کریں اور اپنے آپ کو شرمندہ کریں۔

جولیان ہاکسلے نے دو کتابیں لکھی ہیں "انسان اکیلا کھڑا ہے" اور "انسان جدید دنیا میں"۔ یہ شخص ایسے ہی لوگوں میں سے ہے جو اس سلسلے میں نہایت ہی دریدہ دہنی سے کام لیتے ہیں اور ہٹ دھرمی کرتے ہیں۔ یہ شخص ایسی باتیں کرتا ہے جو صرف اس کے دل کی خواہشات ہیں اور ان باتوں پر کوئی علمی اور سائنسی دلیل اس کے پاس نہیں ہے۔ یہ اپنی کتاب "انسان جدید دنیا میں" میں دین کے موضوع پر یہ کلام کرتا ہے :

"ہمیں سائنس کی ترقی' منطق کی ترقی اور علم النفس کی ترقی نے اس مقام تک پہنچا دیا ہے کہ ایسے حالات میں اب اس کائنات کے کسی خدا کو فرض کرنے کا فائدہ نہیں ہے۔ طبیعی علوم نے ہماری عقل سے خدا کو نکال دیا ہے۔ چنانچہ اب وہ اس کائنات کا حاکم اور مدبر نہیں رہا ہے۔ اب یہ خدا اگر ہے تو وہ پہلا سبب (cause) ہے اور ایک مجمل یا ناقابل فہم بنیاد ہے"۔ ول ڈیورانٹ اپنی کتاب "مناہج فلاسفہ" میں لکھتے ہیں :

"فلسفہ بھی خدا کی ذات سے بحث کرتا ہے لیکن فلسفے کا خدا لاہوتی خدا نہیں ہے جسے وہ لوگ عالم طبیعی سے خارج وجود سمجھتے ہیں بلکہ فلاسفہ کا الہ "قانون عالم' اس کا ہیکل' اس کی زندگی اور اس کی مشیت ہے"۔ ہمارے قارئین ایسی باتیں برداشت نہیں کر سکتے لیکن بہرحال یہ باتیں کہی گئی ہیں۔

ہم اپنے مسائل کا فیصلہ نہ قرآن سے کرتے ہیں اور نہ ہی اپنی عقل سے ان کے ان غلط اقوال پر کوئی فیصلہ کرتے ہیں کیونکہ ہماری عقل بھی قرآنی ہدایت سے فیض یاب ہے۔ ہم ان لوگوں کا فیصلہ انہی جیسے سائنس دانوں کی عدالت میں پیش کر دیتے ہیں جنہوں نے اس مسئلے پر ذرا سنجیدگی سے غور کیا ہے۔

جان کلیفلانڈ کوتران' مشہور ریاضی دان اور ماہر طبیعیات ہیں۔ انہوں نے جامعہ کورنل سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی اور ایک دوسری یونیورسٹی میں طبیعیات کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ہیں۔ یہ شخص اپنے ایک مقالے میں جو "حتمی نتیجہ" کے عنوان سے کتاب "اللہ سائنس کے دور میں روز روشن کی طرح ہیں" میں شائع ہوا لکھتے ہیں :

"کیا کوئی سمجھ دار آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ مادہ جو عقل اور حکمت سے عاری ہے' وہ خود اپنے آپ کو پیدا کر سکتا ہے اور یہ بھی محض اتفاق سے۔ کون عقلمند ہے جو ایسا عقیدہ رکھ سکتا ہے یا کوئی یہ سوچ سکتا ہے کہ اس بے جان بے عقل مادے نے یہ پورا نظام اور یہ قوانین طبیعی ایجاد کئے اور پھر یہ قوانین اس نے اپنے اوپر لاگو کر لیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر معقول انسان اس سوال کا جواب نفی میں دے گا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب مادہ قوت میں بدلتا ہے یا قوت مادے میں بدلتی ہے تو یہ عمل بھی متعین قوانین کے تحت ہوتا ہے۔ وہ مادہ جو یہ نتائج پیدا کرتا ہے وہ بھی ان قوانین طبیعی کا پابند ہے جن کا وہ مادہ پابند ہے جو اس سے پہلے تھا"۔

"کیمیائی تجربے بتاتے ہیں کہ مادے میں سے بعض چیزیں زوال اور فنا کی طرف جا رہی ہیں۔ ان میں سے بعض فنا کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ بعض دوسری ایسی ہیں جو سست رفتاری سے فنا کی طرف جا رہی ہیں۔ اس کے باوجود یہ

بات مسلمہ ہے کہ مادہ ابدی نہیں ہے اور جب وہ ابدی نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ وہ ازلی بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ایک دن ایسا تھا جس میں مادے کی ابتدا ہوئی۔ کیمیائی شواہد اور دوسرے سائنسی حقائق یہ بتاتے ہیں کہ مادے کا آغاز اس طرح نہیں ہوا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ پیدا ہوا ہو یا وہ تدریج کے ساتھ آگے بڑھا ہو بلکہ دلائل یہ بتاتے ہیں کہ مادہ اچانک نمودار ہوا ہے۔ آج سائنس نے وہ وقت بھی متعین کر دیا ہے جس میں مادہ وجود میں آیا۔ ان حقائق سے معلوم ہو گیا کہ یہ جہان مخلوق ہے اور جب سے یہ پیدا ہوا ہے وہ متعین قوانین قدرت کا پابند ہے۔ لہٰذا اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے اور نہ گنجائش ہے کہ یہاں معاملات اتفاقات سے طے ہوتے ہیں۔"

"جب یہ مادی دنیا' اس بات کی اہل نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو خود پیدا کر سکے' یا وہ قوانین اور ضابطے متعین کر سکے جس کے تحت دنیا کو چلنا ہے تو یہ بات متعین ہو گئی اور ثابت ہو گئی کہ یہ مادی مخلوقات کسی غیر مادی ذات کی پیدا کردہ ہے۔ تمام قرائن اور شواہد اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اس ذات خالق کو عقل و حکمت کا حامل ہونا چاہئے۔ عقل عالم مادی میں کوئی کام بغیر اس کے اس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک اس کے ساتھ ارادہ نہ ہو۔ مثلاً طب اور نفسیاتی علاج کا نظام اس بات کو ثابت کرتا ہے اور جو ذات صاحب ارادہ ہو گی وہ لازماً اپنا ذاتی وجود رکھتی ہو گی لہٰذا خود ہماری عقل جو حتمی اور لازمی نتیجہ نکالتی ہے وہ یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس عالم کا ایک خالق ہے بلکہ وہ خالق علیم و حکیم بھی ہے اور ہر چیز پر قادر بھی۔ وہ اس عالم کی تخلیق کی بھی قدرت رکھتا ہے اور اس کا انتظام اور تدبیر بھی کرتا ہے' اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خالق دائم الوجود ہو۔ اس کی آیات و علامات ہر جگہ پائی جاتی ہوں لہٰذا کوئی معقول شخص اس عالم کے مسئلہ کو اس وقت تک حل نہیں کر سکتا جب تک وہ وجود باری تعالیٰ پر ایمان نہ رکھتا ہو' جو اس عالم کا خالق ہو اور اس کی طرف متوجہ ہو جس طرح ہم نے اس مقالے کے آغاز میں کہا"۔

لارڈ کلیفن کے زمانے کے بعد سائنسی علوم نے جس قدر ترقی کی ہے' اس کے بعد ہمارے لئے یہ دلیل بے مثال انداز میں مؤکد ہو گئی ہے۔ اس سے پہلے اس قسم کا کوئی تاکیدی استدلال نہ تھا کہ جس قدر بھی ہم گہرے غور و فکر سے کام لیں تو بہت جلد سائنس ہمیں مجبور کر دے گی کہ ہم خدا پر ایمان لائیں۔

ایک دوسرے ماہر علوم جدید اور بیالوجی کے ماہر فرانک ایلن ایک مقالے میں جس کا عنوان یہ ہے "تخلیق کائنات اتفاق ہے یا بالارادہ ہے" اور یہ مقالہ بھی مذکورہ بالا کتاب میں ہے۔ لکھتے ہیں:

"اکثر اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مادی کائنات کسی بھی خالق کی محتاج نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم تسلیم کریں کہ یہ جہان موجود ہے تو سوال یہ ہو گا کہ یہ کس طرح موجود ہوا۔ اس سوال کے صرف چار جواب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ محض وہم اور خیال ہے' تو یہ احتمال اس لئے غلط ہو گا کہ ہم نے اس کا وجود تسلیم کر کے گفتگو شروع کی ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ کائنات از خود وجود میں آئی ہے اور عدم سے وجود میں آئی ہے اور پھر تیسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ازلی ہو اور اس کا کوئی آغاز نہ ہو اور چوتھا یہ ہے کہ اس کا کوئی خالق ہو۔

جہاں تک پہلے احتمال کا تعلق ہے تو اسے تسلیم کرنے میں اور کوئی مشکل نہیں ہے ماسوائے اس کے کہ ہمارا شعور و احساس اس احتمال کو کبھی تسلیم نہیں کرے گا کہ یہ عالم محض وہم ہے اور اس میں حقیقت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ ماضی قریب میں یہ رائے سر جیمس جینز نے اختیار کی۔ انہوں نے طبیعیات میں اس رائے کا اظہار کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس جہان

کا کوئی عملی وجود نہیں ہے بلکہ ہمارے ذہن کے اندر یہ محض ایک تصویر ہے۔اس رائے کے نتیجے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم محض اوہام کی دنیا میں رہتے ہیں۔ مثلاً یہ ریل گاڑی جس میں ہم سوار ہو کر جاتے ہیں اور جسے ہم چھوتے ہیں یہ محض وہم ہے۔ان گاڑیوں میں جو لوگ بیٹھے ہوتے ہیں وہ بھی محض اوہام ہیں اور یہ ریلیں جن صحراؤں اور دریاؤں کو عبور کرتی چلی جا رہی ہیں ان کا بھی کوئی وجود نہیں ہے۔وہ جن پلوں کے اوپر سے گزرتی ہیں وہ بھی محض وہم ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس رائے اور نظریے سے بڑھ کر اور کوئی وہمی بات نہ ہوگی۔

رہی دوسری رائے کہ یہ جہان اور یہ پوری مادی دنیا خود بخود وجود میں آگئی تو یہ بات اور احتمال سابقہ احتمال سے بھی زیادہ بودا ہے' زیادہ احمقانہ ہے اور اس کے بارے میں بھی بحث وجدال کرنا یا اس پر سوچنا تک حماقت ہے۔

تیسری رائے یہ کہ یہ جہان ازلی ابدی ہے اور اس کا کوئی آغاز نہیں ہے۔تو یہ رائے چوتھی رائے کے ساتھ ازلیت میں مشترک ہے کیونکہ وہاں اللہ ازلی ہے یہاں مادہ ازلی ہے۔اب سوال یہ ہے کہ ہم صفت ازلیت کو کسی مردہ جہان کی طرف راجع کرتے ہیں یا ہم صفت ازلیت کو کسی زندہ حی و قیوم اور خالق کی طرف منسوب کرتے ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں احتمالات کو مان لینے میں اس قدر شبہات و مشکلات نہیں ہیں جس قدر پہلے دو احتمالات کو قبول کرنے میں ہیں۔ لیکن ڈائنامک حرارت کے قوانین یہ بتاتے ہیں کہ اس جہان کی ضرورت تدریجاً ختم ہو رہی ہے اور آخر جا کر اس نے ختم ہونا ہے اور ایک دن ایسا آئے گا کہ دنیا کا درجہ حرارت نہایت کم ہو جائے گا مثلاً مطلق صفر تک۔اس دن قوت ختم ہو جائے گی' زندگی محال ہو جائے گی۔ ایسا ایک دن ضرور آئے گا جب تمام اجسام کا درجہ حرارت صفر مطلق تک پہنچ جائے گا ۔ یہ حالت طویل زمانے کے بعد ہوگی۔جلنے والا سورج' بھڑکتے ہوئے ستارے اور یہ زمین اپنی زندگی کے مختلف انواع کے ساتھ یہ بتا رہی ہے کہ اس کا آغاز ایک وقت سے ہوا' اور اس متعین وقت میں یہ وجود میں آئی۔لہذا اس بات کو تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اس جہان کا ایک خالق ہے جو ازلی اور ابدی ہے' اس کا کوئی آغاز نہیں ہے اور نہ خاتمہ ہے' وہ ہر چیز کو جانتا ہے' وہ نہایت ہی قوی اور اس کی قوت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔لہذا حقیقی بات یہی ہے کہ اس کے دست قدرت نے اس جہان کو بنایا ہے''۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور اس کے سوا کوئی اور اللہ نہیں ہے۔یہاں قرآن کریم تخلیق کی اساس پر یہ اصول قائم کرتا ہے کہ چونکہ وہ خالق ہے لہذا یہ امر واجب ہے کہ صرف اسی کی بندگی کی جائے اور صرف وہی رب ہے' اپنے تمام مفاہیم اور معانی کے ساتھ یعنی حاکم بھی وہی ہے۔ مربی اور تربیت کنندہ بھی وہی ہے' ہادی و رہبر بھی وہی ہے اور قیوم بھی وہی ہے۔

(ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (٦:١٠٢)) یہ ہے اللہ تمہارا رب' کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے' ہر چیز کا خالق' لہذا تم اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے''۔اللہ قیوم اور نگران ہے' صرف انسانوں پر ہی نہیں بلکہ تمام کائنات کا قیوم اور منتظم اعلیٰ ہے اس لئے کہ وہ سب کا خالق ہے۔اس اصول تخلیق کے یہاں ذکر کا مقصد ہی یہ ہے اور اس بات کا انکار مشرکین مکہ دور جاہلیت میں بھی نہ کرتے تھے کہ اللہ خالق ہے' لیکن وہ لوگ خالق کائنات کی تخلیق کا حق نہ ادا کرتے تھے۔یعنی اللہ

کی حاکمیت کو تسلیم کرنا اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور اس کے تجویز کردہ نظام حیات کو اپنی پوری زندگی میں اپنانا۔ یہ صاحب نہایت یقین سے یہ باتیں کرتے ہیں لیکن خود انسانی علم بھی اسے تسلیم نہیں کرتا۔ پھر حرارت کے ڈائنامک قوانین بھی حتمی نہیں۔ البتہ تشریح کائنات کے دوسرے نظریات میں سے یہ بھی ایک نظریہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں ترمیم ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نظریہ سرے سے اڑ جائے۔ ہماری عادت یہ نہیں ہے کہ ہم سائنس کے اصولوں سے اسلام کی صحت پر استدلال کریں۔ نہ ہم سائنس کو اسلام کا تصدیق کنندہ سمجھتے ہیں۔ ہم ان لوگوں کے لئے یہ سائنسی شواہد پیش کرتے ہیں جو صرف سائنس کو الٰہ سمجھتے ہیں۔ گویا یہ اقوال ان خداؤں کے ہیں جن پر جولیان ہاکسلے یقین رکھتے ہیں۔

---ooo---

اس کے بعد اللہ کی صفات کی یہاں ایک تعبیر پیش کی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی تعبیر ہے جو موضوع کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی انسانی زبان اللہ کی ایسی توصیف کر سکتی ہے' لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ہم قرآن کو اسی طرح بلا تشریح دیکھیں کہ وہ نہایت صاف و شفاف انداز میں ذات باری کے بارے میں روشنی ڈالے اور اس مشہد کی تصویر کشی کرے جس کے اندر ایک نہایت ہی عظیم اور ہولناک حقیقت پوشیدہ ہے تاکہ صفات باری کے معاملے میں انسان کو پوری تشفی ہو اور اس کا ضمیر روشن ہو۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝

"نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے' وہ نہایت باریک بیں اور باخبر ہے"۔ وہ لوگ جو اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ وہ اللہ کو دیکھ لیں' وہ ایسے ہی ہیں جس طرح بعض دوسرے لوگ اپنی قبیح فطرت کی وجہ سے وجود باری پر مادی دلیل پیش کرتے ہیں۔ یہ دونوں قسم کے لوگ درحقیقت سمجھتے ہی نہیں کہ وہ کہتے کیا ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی نظر' انسان کے حواس' اور انسان کا ذہنی ادراک یہ سب قوتیں اسے صرف اس لئے دی گئی ہیں کہ وہ اس کائنات سے ساتھ تعلق کی نسبت سے اپنے معاملات طے کر سکے اور اس کرۂ ارض پر منصب خلافت کی ذمہ داریاں ادا کر سکے اور اس مخلوق کائنات کے صفحات میں وجود باری پر دلالت کرنے والے آثار کی تلاش کر سکے۔ رہی ذات باری کی حقیقت تو وہ اس طاقت ہی سے محروم ہیں جس کے ذریعے وہ اس کا ادراک کر سکیں۔ اس لئے کہ ایک حادث اور فانی وجود کے اندر وہ قدرت ہی نہیں ہے کہ وہ ازلی اور ابدی ذات کا ادراک کر سکے۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اس کرۂ ارض پر انسان کی جو ذمہ داریاں ہیں ان کی ادائیگی کے لئے اس کے لئے رویت باری کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جہاں تک یہاں انسانی فرائض کا تعلق ہے ان کی ادائیگی کے لئے انسان کو مناسب طاقت دی گئی ہے۔

انسان کے لئے یہ تو ممکن ہے کہ وہ سابقہ لوگوں کی سادگی کو سمجھ لے مگر وہ آخری دور میں آنے والوں کی قبیح فطرت کو سمجھنے میں غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہے' یہ لوگ ایٹم اور برق کی بات کرتے ہیں۔ پروٹون اور نیوٹرون کی بات کرتے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے اپنی زندگی کے اندر کوئی ایٹم' کوئی برق' کوئی نیوٹرون اور کوئی پروٹون نہ دیکھا' اس لئے کہ زندگی کی ماہیت کو دیکھنے کی دوربین ابھی تک وجود میں نہیں آ سکی۔ ان سائنس دانوں کے نزدیک یہ امور بہرحال

مسلم ہیں اور وہ ان کے وجود کو فرض کرتے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے ان چیزوں کے کچھ آثار متعین کر لئے ہیں۔ جب وہ آثار پائے جاتے ہیں تو ان لوگوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ موجود ہیں اور کائنات بھی موجود ہے حالانکہ یہ صرف احتمال ہے کہ جس طرح انہوں نے فرض کیا ہے کائنات اسی طرح ہو۔ تاہم جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ موجود ہے اس لئے کہ اس کے آثار موجود ہیں اور یہ آثار اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اللہ موجود ہے تو پھر یہ لوگ وجود باری کے بارے میں جدل و جدال اور مناقشہ شروع کر دیتے ہیں بغیر علم' بغیر ہدایت' بغیر ادراک اور بغیر کسی کتاب منیر کے۔ اس کے برعکس اللہ کے وجود کے لئے وہ ایسی دلیل طلب کرتے ہیں کہ آنکھیں اللہ کو دیکھ سکیں۔ اس کرۂ ارض پر زندگی کے عجائب گویا ان کے لئے کافی نہیں ہیں حالانکہ وہ وجود باری پر کافی ثبوت ہیں۔

---ooo---

دلائل تکوینی جو اس کائنات کی کھلی کتاب کے صفحات میں بکھرے ہوئے ہیں اور انسانی نفوس کے اندر بھی موجود ہیں ان کے بیان کے بعد اور یہ کہنے کے بعد کہ۔

(لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (٦:١٠٣))

نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے' وہ نہایت باریک بیں اور باخبر ہے۔" اب اس خوبصورت انداز میں صفات الہی کے بیان کے بعد بات یوں آگے بڑھتی ہے۔

قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ﴿١٠٤﴾

"دیکھو' تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں' اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا اور میں تم پر کوئی پاسبان نہیں ہوں"۔ یہ جو کچھ اللہ کی طرف سے آ رہا ہے بصیرت کی روشنی ہے۔ بصیرت انسان کو ہدایت دیتی ہے اور راہنمائی کرتی ہے۔ یہ بذات خود عین روشنی ہے۔ اس لئے جو شخص اسے دیکھے گا وہ روشن دیکھے گا اور اگر کوئی آنکھیں بند کرے گا تو وہ اندھا ہو گا۔ ان بصیرتوں اور روشنیوں کے آجانے کے بعد صرف اندھا ہی محروم رہ سکتا ہے۔ وہ جس کے حواس کام نہ کر رہے ہوں اور جس کے شعور کا دروازہ بند ہو جس کا ضمیر اندھا ہو۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اپنی برأت کا اعلان یوں کر دیں کہ میں تم پر نگہبان اور پاسبان مقرر نہیں کیا گیا ہوں۔ (مَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ (٦:١٠٤)) "میں تمہارے لئے پاسباں مقرر نہیں ہوا ہوں"۔ یہاں عبارت میں ایک عجیب تناسق ہے۔ اللہ کی صفت بیان کرتے ہوئے کہا گیا تھا۔

(لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (٦:١٠٣))

نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے' وہ نہایت باریک بین اور باخبر ہے ۔" اور دوسری آیت میں کہا گیا ہے :

(قَدْ جَآءَ كُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِه وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا (٦: ١٠٤)) "دیکھو تمہارے پاس' تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں' اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا" ۔ ایک جگہ ابصار اور مقابل میں بصائر ہے ۔ ایک جگہ بصیر ہے اور مقابلے میں عمی ہے' یہ عربی اسلوب میں الفاظ کا بہترین انتخاب ہے ۔

---ooo---

اس کے بعد روئے سخن حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مڑ جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ قرآن کریم کے اندر جو اسلوب کلام اختیار کیا گیا ہے وہ ایسا نہیں ہے جو کسی امی شخص کی طرف سے بنایا جاسکتا ہو اور جس سے مالکان بصیرت خود بخود یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہ یقیناً کلام الٰہی ہے ۔ لیکن مشرکین انکار اس لئے نہ کرتے تھے کہ ان کے سامنے تشفی بخش دلائل نہ تھے' بلکہ وہ بہانہ سازی کرتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ عظیم علمی کام اور فصیح و بلیغ کلام بعض اہل کتاب سے سیکھ کر بتا رہے ہیں حالانکہ وہ جانتے تھے کہ اس وقت جو اہل کتاب تھے ان کے پاس نہ یہ پیغام تھا اور نہ یہ اعلیٰ کلام ۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کر دی جاتی ہے کہ آپ مشرکین سے اعراض کریں اور اللہ کی ہدایات پر عمل کرتے چلے جائیں ۔

---

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿١٠٥﴾ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٦﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۗ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿١٠٧﴾

"اس طرح ہم اپنی آیات کو بار بار مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور اس لئے کرتے ہیں کہ یہ لوگ کہیں "تم کسی سے پڑھ آئے ہو" ' اور جو لوگ علم رکھتے ہیں ان پر ہم حقیقت کو روشن کر دیں ۔ اے نبی "اس وحی کی پیروی کیے جاؤ' جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے کیونکہ اس ایک رب کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے ۔ اور ان مشرکین کے پیچھے نہ پڑو ۔ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو (وہ خود ایسا بندوبست کر سکتا تھا کہ) یہ لوگ شرک نہ کرتے ۔ تم کو ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم ان پر حوالہ دار ہو" ۔

اللہ اپنی آیات اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ عربوں کے اندر نہ یہ اسلوب تھا اور نہ وہ اس پر قادر تھے کیونکہ یہ ان کے

معاشرے سے ماخوذ نہ تھا۔ یہ پیغام اور یہ کلام پوری انسانیت کے پاس بھی اس وقت نہ تھا' اس لئے اس کلام کے دو نتائج برآمد ہوئے۔

جو لوگ ہدایت چاہتے ہی نہ تھے' جن کو اس پیغام اور علم سے دلچسپی ہی نہ تھی وہ حقیقت تک پہنچنے کی سعی ہی نہ کرتے تھے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس بلند مقام سے ان سے ہمکلام ہوتے تھے اسے وہ اس انکار اور عدم دلچسپی کا جواز بنا کر پیش کرتے تھے اس لئے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ خوب جانتے تھے' یہ بات ان کے بھی سامنے تھی کہ محمد جو اونچا کلام پیش کرتے تھے وہ ان کا ذاتی نہ تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہے تھے اس کے بارے میں سمجھتے تھے کہ یہ بہانہ بناوٹی ہے کیونکہ وہ حضور ؐ سے خوب واقف تھے۔ رسالت سے قبل بھی اور بعد میں بھی۔ اسی لئے انہوں نے یہ کہا کہ اے محمد تو نے یہ کلام اہل کتاب سے سیکھا ہے۔ حالانکہ خود اہل کتاب کے ہاں نہ یہ پیغام تھا اور نہ ایسا اسلوب کلام تھا۔ اہل کتب کی کتابیں تو وہ پڑھتے تھے اور ان کے پاس موجود تھیں اور اب بھی وہ کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں۔ ان کتابوں کے پیغام اور کلام میں اور قرآن کے پیغام و کلام میں کوسوں اور میلوں فاصلے ہیں۔ ان کے ہاں جو کلام ہے وہ تو تاریخ انبیاء کی بے ترتیب تاریخی روایات ہیں۔ سابقہ بادشاہوں کی تاریخ اور قصے کہانیاں ہیں اور ان کو نامعلوم افراد نے تصنیف کیا ہے۔ یہ تو عہد قدیم کی بات ہے۔ رہیں عہد جدید کی کتب یعنی اناجیل تو ان میں حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں کی روایات کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پھر یہ بھی آپ کے جانے کے کئی سال بعد جمع کی گئی کتابیں ہیں۔ بعد میں عیسائیوں کی مختلف کانفرنسوں نے ان میں کئی تبدیلیاں کیں اور سالہا سال تک یہ تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ اخلاقی تعلیمات اور روحانی ہدایات بھی اس تحریف اور تعدیل سے نہ بچ سکیں۔ یہ چیزیں تھیں اس وقت اہل کتاب کے پاس۔ ان کا قرآن کریم کے ساتھ تقابلی مطالعہ بھی کیا گیا ہے لیکن جاہلیت کے دور میں مشرکین کے پاس اس کے سوا اور کوئی بہانہ تھا کہاں؟ تعجب کی بات یہ ہے کہ ہمارے دور کے مستشرقین اور نام نہاد مسلمان بھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ وہ اسے علمی تحقیقات کا نام دیتے ہیں اور ان بے بنیاد تحقیقات تک صرف نام نہاد ماہرین علوم شرقیہ ہی پہنچتے ہیں۔

رہے وہ لوگ جو حقیقی علم رکھتے ہیں تو اس انداز میں کلام عالی سنتے ہی وہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ حق ہے اور ان کے بارے میں اللہ فرماتے ہیں۔

(وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (٦:١٠٥)) اور جو لوگ علم رکھتے ہیں ان پر ہم حقیقت کھول دیں"۔
اس کے بعد یہ حکم آتا ہے کہ وہ جو چشم بینا رکھتے ہیں اور جانتے ہیں اور وہ جو اندھے ہیں اور کورے ہیں ان کے درمیان مکمل جدائی ہونا چاہئے۔

اللہ کی جانب سے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ اب جبکہ اللہ نے اپنی آیات کو ایک اعلیٰ اسلوب میں کھول کر بیان کر دیا ہے اور لوگ اس کے نتیجے میں دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں تو آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ آنے والی وحی کی پیروی کریں اور مشرکین کو ایک طرف چھوڑ دیں۔ آپ اب ان سے ہمکلام ہی نہ ہوں اور وہ جو گھٹیا گفتگو کرتے ہیں اس کی طرف توجہ ہی نہ کریں۔ وہ جو کج بحثی کرتے ہیں' آپ کی تکذیب کرتے ہیں اور آپ کے ساتھ بغض رکھتے ہیں' اس کی کوئی پرواہ نہ کریں۔ آپ کے لئے اب راہ صرف ایک ہے کہ آپ اللہ کے راستے پر چل پڑیں۔ اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالیں' اپنے ساتھیوں کی زندگیوں کو اس کے مطابق درست کریں۔ آپ مشرکین

کے ذمہ دار نہیں ہیں اور جب آپ اپنے رب کی وحی کی اطاعت کریں گے تو بندوں کی ذمہ داری آپ پر نہ ہوگی ۔

(اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ

(٦: ١٠٦)) اے نبی "اس وحی کی پیروی کیے جاؤ' جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے کیونکہ اس ایک رب کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے ۔ اور ان مشرکین کے پیچھے نہ پڑو"۔ اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی کہ ان پر ہدایت لازم کر دے تو اللہ نے لازم کر دی ہوتی ۔ اگر اللہ یہ چاہتا کہ ان کو آغاز ہی سے فرشتوں کی طرح ہدایت پر پیدا کرتا تو وہ ایسا کر دیتا' لیکن اللہ نے انسان کو اس طرح پیدا کیا اور اس کے اندر ہدایت و ضلالت دونوں کی طاقت ودیعت کر دی اور اسے آزاد چھوڑ دیا کہ وہ ہدایت اختیار کرتا ہے یا ضلالت ۔ پھر جو راستہ بھی وہ اختیار کرے اس کی سزا و جزا اسے دی جائے اور یہ تمام کام اللہ کی مشیت کے دائرے کے اندر ہو جس سے کوئی بات بھی باہر نہیں ہو سکتی ۔ البتہ اللہ کسی انسان کو ہدایت یا گمراہی پر مجبور نہیں کرتا اور یہ کام اللہ نے اپنی اس حکمت کی وجہ سے کیا ہے جس کا علم صرف اسے ہے تاکہ انسان اس کائنات میں اپنا مقررہ کردار ادا کر سکے' اپنی صلاحیتوں اور اپنے تصرفات کے مطابق ۔

(وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا (٦: ١٠٧)) اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو (وہ خود ایسا بندوبست کر سکتا تھا کہ) یہ لوگ شرک نہ کرتے"۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اعمال کے بارے میں مسئول نہیں ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو لوگوں کے اعمال کا مختار اور پاسبان مقرر نہیں کیا ۔ یہ کام تو اللہ کا ہے ۔

یہ ہدایت حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے کرام اور ان کے بعد ان تمام لوگوں کے لئے حدود کار متعین کر دیتی ہے جو آپ کے بعد آئیں گے ۔ ہر دور میں اور ہر قوم میں اور ہر معاشرے میں ۔

کسی داعی کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنی دعوت 'اپنے دل' اور اپنی سرگرمیوں کو صرف منحرفین اور معاندین کے لئے وقف کر دے حالانکہ ان کے دل اور دماغ قبول دعوت اور دلائل قبول دعوت اور شواہد حقیقت کے لئے کھلے ہی نہیں ۔ داعی کو چاہئے کہ وہ دل کھلا رکھے اور اپنی امیدیں اور اپنی سرگرمیاں ان لوگوں تک محدود رکھے جو قبول دعوت کے لئے آمادہ ہوں ۔ یہ لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی سیرت کی تعمیر اصول دین کی روشنی میں کی جائے ۔ یعنی اسلامی نظریہ حیات کی روشنی میں ۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کے دلوں میں اس کائنات اور اس دنیاوی زندگی کے بارے میں اسلامی نظریہ حیات کی روشنی میں ایک گہرا تصور بٹھایا جائے ۔ نیز ایسے ہی لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے اخلاق اور ان کے طرز عمل کو صحیح طرح استوار کیا جائے اور پھر ایسے افراد کی ایک ایسی سوسائٹی تشکیل دی جائے جس کی بنیاد اس عقیدے اور نظریہ حیات پر ہو ۔ یہ کام اس قدر بھاری ہے کہ اس کے لئے زبردست جدوجہد کی ضرورت ہے اور یہ کام مسلسل جدوجہد کا مستحق بھی ہے ۔ رہے وہ لوگ جو دعوت کی مخالفت میں صف آرا ہیں تو وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ دعوت دے کر انہیں ایک طرف چھوڑ دیا جائے ۔ جب سچائی قوت پکڑتی ہے اور غالب ہو جاتی ہے تو پھر اللہ کی سنت یہ ہے کہ سچائی برائی پر حملہ آور ہوتی ہے اور باطل مٹ جاتا ہے ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سچائی موجود رہے ۔ جب سچائی مکمل شکل میں موجود ہوتی ہے تو اس کے مقابلے میں باطل نرم پڑ جاتا ہے اور اس کے دن گنے جاتے ہیں ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دینے کے بعد کہ آپ مشرکین سے اعراض کریں' حضور کو اور اہل اسلام کو

حکم دیا گیا کہ یہ اعراض اور صرف نظر نہایت ہی شائستہ انداز میں اور پر وقار طریقے سے ہو مثلاً یہ کہ وہ مشرکین کے الٰہوں کو برا بھلا نہ کہیں کیونکہ اس کے جواب میں وہ لوگ اللہ کی شان میں گستاخی کر سکتے ہیں اس لئے کہ انہیں اللہ جل شانہ کی جلالت قدر کا کوئی علم نہیں ہے۔ چنانچہ مسلمان تو ان کے الٰہوں کو برا کہیں گے جو حقیر ہیں اور اس کے مقابلے میں وہ لوگ ان کے جلیل القدر اللہ کو برا بھلا کہیں گے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٠٨﴾

"اور (اے مسلمانو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔ ہم نے تو اسی طرح ہر گروہ کے لئے اس کے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے' پھر انہیں اپنے رب ہی کی طرف پلٹ کر آنا ہے' اس وقت وہ انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ ان میں سے جو شخص بھی کوئی عمل کرتا ہے وہ اسے اچھا سمجھ کر کرتا ہے اور وہ اپنے طرز عمل کی مدافعت کرتا ہے۔ اگر وہ اچھے اعمال پر عمل پیرا ہے تو بھی وہ انہیں اچھا سمجھتا ہے۔ اگر وہ برے اعمال پر عمل پیرا ہے تو بھی وہ انہیں اچھا سمجھتا ہے اور ان کی مدافعت کرتا ہے۔ اگر وہ صحیح راہ پر ہو تو بھی اسے اچھا سمجھتا ہے اور اگر وہ ضلالت کی راہ پر گامزن ہو تو بھی وہ اسے اچھا سمجھتا ہے۔ یہ ہے انسان کی فطرت اور اس کا مزاج۔ مشرکین مکہ اللہ کے ساتھ کچھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے تھے حالانکہ وہ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ صرف اللہ ہی خالق اور رازق ہے۔ اگر ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو مسلمانوں نے برا بھلا کہا تو وہ اپنے بتوں کے دفاع میں نکل آئیں گے اور اللہ رب العزت کو برا بھلا کہیں گے۔ لہٰذا مسلمانوں کو ہدایت ہوئی کہ وہ انہیں ان کے حال ہی پر چھوڑ دیں۔

(ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (٦: ١٠٨)) "پھر انہیں اپنے رب ہی کی طرف پلٹ کر آنا ہے' اس وقت وہ انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں۔" ایک مومن جس کو اسلامی دین پر اطمینان قلب حاصل ہو اور اسے یہ یقین ہو کہ وہ جس دین پر ہے وہ برحق ہے۔ اس کا قلب مطمئن ہے اور وہ ایسے امور کے پیچھے نہیں پڑتا جس میں کوئی فائدہ نہ ہو کیونکہ بتوں کو گالیاں دینے سے ان کے ایمان و یقین میں کوئی اضافہ ہو نہیں سکتا۔ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ مخالفین کے دلوں میں عناد بڑھ جائے۔ اس لیے اہل ایمان کو اس بے فائدہ مشغلے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ خطرہ ہو سکتا ہے کہ جواب میں اہل ایمان مخالفین کی جانب سے ایسی باتیں سنیں جن کو وہ پسند نہیں کرتے یعنی رب ذوالجلال کی شان میں گستاخی۔

اب اس سبق کا خاتمہ ہو رہا ہے' اس پورے سبق میں اللہ تعالیٰ نے ایسے دلائل و شواہد پیش کئے ہیں جو رات و دن کے ہر لمحے میں چشم بینا کے لئے وافر مقدار میں موجود ہیں سبق کا خاتمہ اس بات پر ہوتا ہے کہ یہ مخالفین اللہ کی قسمیں کھا

کر کہتے ہیں کہ اگر ہمارے سامنے بھی رسولان سابقہ کی طرح کوئی خارق العادۃ مادی معجزہ آجائے تو وہ ضرور ایمان لائیں گے اور ان کے اس حلفیہ بیان کو سن کر بعض مخلصین اہل ایمان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تجویز پیش کی کہ آپ ؐ اللہ سے کسی ایسے معجزے کے صدور کے لئے دست بدعا ہوں۔ اس تجویز کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ دو ٹوک جواب یوں دیتے ہیں کہ دیکھو تمہیں ان مکذبین اور ان کی تکذیب کی حقیقت ہی کا علم نہیں ہے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ
بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا
١٣ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ
ع١٠ وَّنَذَرُهُمْ فِیْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ ع
١٩

"یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی (یعنی معجزہ) ہمارے سامنے آجائے تو ہم اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اے نبی ؐ! ان سے کہو کہ "نشانیاں تو اللہ کے اختیار میں ہیں۔" اور تمہیں کیسے سمجھایا جائے کہ اگر نشانیاں آ بھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں۔ ہم اسی طرح ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر رہے ہیں جس طرح یہ پہلی مرتبہ اس (کتاب) پر ایمان نہیں لائے تھے۔ ہم انہیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑے دیتے ہیں۔"

وہ دل جو اس کائنات میں بکھرے ہوئے شواہد و دلائل کو تسلیم نہیں کرتا، خصوصاً اس تبلیغ و بیان کے بعد جو اس کتاب نے بے مثال پیرائے میں پیش کیا اور اس کائنات اور خود انسان کے نفس کے اندر موجود آیات الٰہیہ اسے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتیں اور وہ اپنے رب کی طرف دوڑ کر نہیں آتا تو ایسا دل یقیناً لاعلاج دل ہے۔ ان لوگوں نے ابتداء ہی سے ایمان کا انکار کر دیا ہے تو جو مسلمان حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواستیں کرتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ سے ایسے معجزات کے صدور کی دعا کریں تو ان کے پاس کیا گارنٹی ہے کہ وہ صدور معجزہ کے بعد دوبارہ انکار نہ کریں گے۔ اللہ ہی ان کے دلوں کا حال جانتا ہے اور خوب جانتا ہے۔ اللہ کی مشیت یہ ہے کہ یہ لوگ یونہی اپنی سرکشی میں غرق رہیں کیونکہ اللہ جانتا ہے کہ ان کی تکذیب کا صلہ یہی ہے اور اللہ کو یہ بھی علم ہے کہ صدور معجزہ کے بعد بھی یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اگر فرشتے بھی اتر آئیں تب بھی وہ مان کر دینے والے نہیں ہیں۔ اگر مردے اٹھ کر قبروں سے بات چیت شروع کر دیں تب بھی نہیں مانیں گے۔ اگر تمام مخلوق کو اٹھا کر ان کے سامنے حشر برپا کر دیا جائے اور یہ تمام مخلوق ان کو دعوت ایمان دے تب بھی یہ مان کر دینے والے نہیں ہیں۔ یہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک اللہ کی مشیت انہیں مجبور ایمان نہ کر دے۔ اور اللہ کی مشیت کسی کو مجبور نہیں کرتی کیونکہ لوگ اس طرف آنا ہی نہیں چاہتے۔ یہ وہ نفسیاتی حقیقت ہے جسے اکثر داعی بھول جاتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ اہل ضلال کے سامنے دلائل و براہین کی کوئی کمی ہے، بلکہ وہ دل کے بیمار ہیں۔ ان کی فطرت معطل ہو چکی ہے اور ان کا ضمیر فاسد ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہدایت ان لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو اس کی طرف متوجہ ہوں اور اس کے حصول کے لئے سعی کریں۔ ہنگرام ۱۲ دسمبر ۱۹۹۰-۹-۴ : ۱۲ بجے دن

# فی ظلال القرآن

## پارہ ----------- ۸

## سورۃ الانعام ------- ۱۱۱ تا ۱۶۵

## سورۃ الاعراف ------- ۱ تا ۸۷

# پارہ نمبر ۸ ایک نظر میں

اس پارے کے دو حصے ہیں۔پہلے حصے میں سورہ الانعام کا باقی حصہ ہے 'جس کا پہلا حصہ ساتویں پارے میں تھا۔ دوسرا حصہ سورہ اعراف پر مشتمل ہے۔سورہ انعام کا تعارف ہم نے ساتویں پارے میں کرا دیا تھا۔ہم چاہتے ہیں کہ اس تعارف کا ایک حصہ قارئین کی یاد تازہ کرنے کے لئے یہاں بھی ذکر کریں۔رہی سورہ اعراف تو اس کے آغاز میں اس کا مکمل تعارف دے دیا جائے گا' انشاء اللہ تعالیٰ!

سورہ انعام کا یہ حصہ بھی اسی پیٹرن (Pattern) پر آگے بڑھتا ہے جس کی وضاحت ہم نے سورہ انعام کے آغاز میں کر دی تھی 'یعنی ساتویں پارے میں۔یہاں چند فقروں میں مختصر اشارات کافی ہوں گے۔اس سورہ کے تعارف میں ساتویں پارے میں یہ فقرے اس قابل ہیں کہ انہیں ذہن میں تازہ کیا جائے۔

"یہ سورہ مجموعی لحاظ سے حقیقت الوہیت سے بحث کرتی ہے۔اس پوری کائنات کے دائرے میں بھی اور انسانی زندگی کے دائرے میں بھی۔انسانی نفس اور ضمیر کے دائرے میں بھی اور اس دکھائی دینے والی کائنات کے نامعلوم رازوں کے دائرے میں بھی اور عالم غیب کے نامعلوم رازوں کے دائرے میں بھی۔یہ سورہ اس کائنات کی تخلیق 'اس کے اوپر زندگی کی تخلیق اور پھر حیوانات کے اوپر انسانی تخلیق کے دائرے کے اندر بھی تصور حاکمیت الٰہیہ کو پیش کرتی ہے اور گزرنے والوں کی باہمی کشمکش اور ان کی جگہ لینے والوں کی جانشینی میں بھی حاکمیت الٰہیہ کے کچھ رنگ دکھاتی ہے۔غرض اس کائنات پر نظر ڈالتے ہوئے مشاہد فطرت میں اللہ کی حاکمیت ' دنیا میں ہونے والے بڑے بڑے واقعات میں اللہ کی حاکمیت ' دنیا کی خوشحالی اور بدحالی میں اللہ کی حاکمیت اس سورہ کا موضوع ہے۔قدرت الٰہیہ کے مختلف مظاہر و مشاہد میں اللہ کی حاکمیت ' انسان کی زندگی کے اوپر اللہ کی ظاہری اور باطنی گرفت میں اللہ کی حاکمیت دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اور متوقع حوادث میں اور سب سے آخر میں قیامت کے مناظر اور خصوصاً اس منظر میں اللہ کی حاکمیت جس میں سب لوگ بارگاہ الٰہی میں کھڑے ہونگے۔"

"اس طرح یہ سورہ قلب انسانی کو لے کر مختلف ابعاد و آفاق تک لے جاتی ہے اور ان کے نشیب و فراز کی سیر کراتی ہے 'لیکن پوری سورہ میں قرآن کریم کا مکی انداز برقرار ہے جس کے اسلوب کے بارے میں ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں۔مکی اسلوب کے ساتھ ساتھ پورے قرآن کا انداز کلام بھی اس سورہ میں اپنے اعلیٰ معیار پر ہے۔انداز صرف نظریاتی نہیں ہے 'نہ ہی لاہوتی جدلیات پر مشتمل ہے کہ قارئین کے افکار اور ان کے ذہنوں کو مشغول رکھنے کے لئے کوئی بحث مطلوب ہو۔بلکہ سیدھے سادے انداز میں یہ سورہ رب العالمین کا تعارف لوگوں سے کراتی ہے 'تاکہ لوگ اپنے سچے رب کی بندگی اور غلامی کریں۔ان کا ضمیر اور ان کی روح اللہ کی غلام ہو جائے 'ان کی جدوجہد اور ان کی تمام مساعی اللہ کی تابعداری میں ہوں 'ان کے رسوم و رواج اللہ کے رنگ میں ہوں 'اور ان کی زندگی کی پوری صورت حال اللہ وحدہ کی

حاکمیت کے تحت ہو جس کے سوا زمین و آسمان میں کسی اور کی حاکمیت نہیں ہے۔"

"یوں نظر آتا ہے کہ یہ سورہ اول سے آخر تک ایک متعین نصب العین کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہ کہ اللہ ہی خالق ہے' وہی مالک ہے' وہی قدرتوں والا ہے' اور وہی بادشاہ اور قہار ہے۔ وہی پوشیدہ چیزوں اور غیب کا جاننے والا ہے۔ وہ جس طرح رات و دن کو گردش دے رہا ہے' اسی طرح وہ دلوں اور دماغوں کا بھی پھیرنے والا ہے اس لئے اس کو تمام لوگوں کی زندگیوں پر حاکم ہونا چاہئے۔ لوگوں کی زندگیوں میں امر و نہی کا اختیار صرف اسی کو ہونا چاہئے۔ کوئی حکم اور کوئی قانون اس کے حکم اور قانون کے سوا نہ ہو گا۔ حلال و حرام کے تعین کا اختیار بھی صرف اسی کو ہے' اس لئے کہ یہ تمام امور اللہ کی الوہیت کے عناصر ترکیبی ہیں' لہٰذا لوگوں کی زندگیوں میں ان کے بارے میں تصرف صرف اللہ کر سکتا ہے۔ اس کے سوا نہ کوئی خالق ہے' نہ کوئی رازق ہے' نہ زندہ کرنے والا ہے اور نہ مارنے والا ہے' نہ نفع دینے والا ہے اور نہ نقصان دینے والا ہے' نہ کوئی داتا ہے اور نہ کوئی مانع ہے۔ غرض نہ اللہ کے سوا کوئی بھی کسی کے لئے یا اپنے لئے نفع و نقصان کا مالک ہو سکتا ہے' نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ اس سورہ میں اول سے آخر تک اس مقصد کے لئے دلائل و شواہد پیش کئے گئے ہیں اور یہ دلائل ان مشاہدات' مؤثرات اور قدرتی مواقف کے ذریعے فراہم ہوئے ہیں جو اس کائنات میں موجود ہیں اور فکر و نظر کو مسحور کرنے والے ہیں۔ اور ان مناظر فطرت کے اس مطالعے سے دل پر ہر طرف سے اشارات و مؤثرات ہر دروازے اور ہر پہلو سے متوجہ ہوتے ہیں اور اثرانداز ہوتے ہیں۔

وہ سب سے بڑا مسئلہ جس پر یہ سورہ زور دے رہی ہے' وہ زمین و آسمانوں کے اندر اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کا مسئلہ ہے' زمین و آسمان کے وسیع دائرے میں اور کائنات کے وسیع و عریض میدان میں تصور حاکمیت الٰہیہ کا مسئلہ۔ یہ سورہ اسی مسئلے کو پیش کرتی ہے لیکن اطلاقی انداز اور بات کی مناسبت یہ ہے کہ جاہلیت کے پیرو کار بعض ذبیحوں اور بعض کھانوں کے معاملے میں حلال و حرام کے اختیارات اللہ کے سوا دوسروں کو دیتے تھے۔ اسی طرح نذر کے معاملے میں بعض قربانیوں' بعض پھلوں اور بعض بچوں کے ملنے میں جاہلیت کے پرستار اللہ کے سوا دوسرے الٰہوں کو اختیارات دیتے تھے۔ اس مناسبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس پوری کائنات کے اندر نظریہ حاکمیت الٰہیہ یہاں تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور اسی مناسبت کی طرف سورہ کی آخری آیات کے اندر اشارے کئے گئے ہیں۔

(پھر اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو' تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو' اس کا گوشت کھاؤ' آخر کیا وجہ ہے کہ وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو' حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالت اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے' ان کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے۔ بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بناء پر گمراہ کن باتیں کرتے ہیں' ان حد سے گزرنے والوں کو تمہارا رب خوب جانتا ہے۔ تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی۔ جو لوگ گناہ کا اکتساب کرتے ہیں وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو' اس کا گوشت نہ کھاؤ' ایسا کرنا فسق ہے۔ شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات القاء کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں لیکن اگر تم نے ان کی اطاعت قبول کر لی تو یقیناً تم مشرک ہو گے۔ (٦: ١١٨ تا ١٢١)

(اور ان لوگوں نے اللہ کے لئے خود اس کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے' اور

کہتے ہیں یہ اللہ کے لئے بزعم خود' اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لئے ہے۔ پھر جو حصہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لئے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لئے ہے وہ ان شریکوں کو پہنچ جاتا ہے۔ کیسے برے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ۔ اور اس طرح بہت سے مشرکوں کے لئے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنایا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے' للذا انہیں چھوڑ دو کہ اپنی افتراء پردازیوں میں لگے رہیں۔ کہتے ہیں یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں' انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھلانا چاہیں حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے' پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور باربرداری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے اور یہ سب کچھ انہوں نے اللہ پر افتراء کیا ہے۔ عنقریب اللہ انہیں ان کی افتراء پردازیوں کا بدلہ دے گا۔ اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے یہ ہمارے مردوں کے لئے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں پر حرام' لیکن اگر وہ مردہ ہوں تو وہ دونوں اس کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ باتیں جو انہوں نے گھڑی ہیں ان کا بدلہ اللہ انہیں دے کر رہے گا۔ یقیناً وہ حکیم ہے اور سب باتوں کی اسے خبر ہے۔ یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت اور نادانی کی وجہ سے قتل کیا اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو اللہ پر افتراء پردازی کر کے حرام ٹھہرالیا۔ یقیناً وہ بھٹک گئے اور ہرگز وہ راہ راست پانے والوں میں سے نہ تھے۔ (٦ : ١٣٦ تا ١٤٠)

"امت مسلمہ کی زندگی میں یہ ایک عملی پہلو تھا' جس کی مناسبت سے اس سورہ میں اس عظیم مسئلہ کو لیا گیا۔ اس دور میں امت مسلمہ کے ماحول پر بھی جاہلیت چھائی ہوئی تھی۔ قانون سازی اور حلال و حرام کے تعین کے معاملے میں جو شرکیہ عقائد موجود تھے ان کی اصلاح کے حوالے سے یہاں اللہ کی الوہیت' اللہ کی حاکمیت اور تمام انسانوں کی بندگی اور عبودیت کے مسائل کو لیا گیا۔ چنانچہ جس طرح تمام مکی قرآن میں اس مسئلے کو لیا گیا ہے' اسی طرح اس سورہ میں بھی اس مسئلے کو بڑی تفصیل سے لیا گیا ہے اور مدنی آیات میں جہاں بھی حلال و حرام اور حق قانون سازی کا بیان آتا ہے وہاں بھی مسئلہ حاکمیت الٰہیہ کو لیا جاتا ہے۔"

"اس سیاق کلام میں جن مؤثر ہدایات اور فیصلوں اور قراردادوں کا سیلاب امنڈتا چلا آرہا ہے اور جن جانوروں' نذروں اور ذبیحوں کے بارے میں مشرکین کی جو تردید کی جارہی ہے' اسی حوالے سے یہاں اللہ کے مسئلہ الوہیت اور اللہ کے حق قانون سازی کو بھی بیان کیا جارہا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ حلال و حرام کی اس قانون سازی کا تعلق اسلامی عقائد اور اسلامی نظریات کے ساتھ ہے' اور وہ نظریہ' حاکمیت الٰہیہ اور انسانوں کی بندگی اور غلامی کا ہے۔ یہ مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے' یہ اسلام اور کفر اور اسلام اور جاہلیت کا مسئلہ ہے۔ ہدایات کے اس سیلاب میں سے ہم یہاں اس سورہ کے تعارف میں صرف چند نمونے پیش کریں گے لیکن ان کی مکمل تفصیلات اس وقت آئیں گی جب ہم سورہ کی آیات پر تفصیلی بحث کریں گے۔ اپنے اثرات کے اعتبار سے یہ سیلاب نفس انسانی کے اندر اس دین کے مزاج کی حقیقی ماہیت بٹھا دیتا ہے۔ وہ یہ کہ انسانی زندگی کا چھوٹا مسئلہ ہو یا بڑا' اللہ کے حق حاکمیت کے تحت حل ہونا چاہئے اور اللہ کی حاکمیت اسلامی شریعت کی صورت میں ریکارڈ شدہ ہے۔ اگر اس طرح نہ ہوگا تو پھر یہ تصور ہو گا کہ ایسے لوگ یا معاشرہ دین سے خارج ہے' یا ایک جزوی مسئلے یا اس معمولی مسئلے کی حد تک انسان دین سے نکل گیا ہے۔

"اور یہ کثرت ہدایات اس بات کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ دین انسانی زندگی کے تمام مظاہر سے اور زندگی کے تمام

معاملات سے انسانوں کی حاکمیت کو ختم کرتا ہے۔یہ معاملات اہم ہوں یا غیراہم' بڑے ہوں یا چھوٹے ان کو اس عظیم اصول کے دائرے کے اندر لاتا ہے۔یعنی یہ کہ اللہ کی الوہیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پورے کرۂ ارض پر حاکم مطلق ہے' بلاشرکت غیرے اس کائنات کے اوپر متصرف ہے اور یہ اصول دین اسلام کے اندر پوری طرح ظاہراور مجسم ہے۔"

---ooo---

درج بالا اقتباسات میں جس صورت حالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ امت مسلمہ کی زندگی میں موجود تھی اور امت کے اردگرد جاہلیت بھی موجود تھی جس کی اصلاح یہ سورہ مذکورہ بالا انداز میں کر رہی تھی۔اس پارے میں سورہ انعام کے جس حصے کی بابت ہم بات کریں گے یہ حصہ اسی صورت حالات سے متعلق ہے جبکہ سورہ انعام کا جو حصہ گزشتہ پارے میں گزر گیا ہے اس کا موضوع بھی مسئلہ الوہیت' حاکمیت اور انسانوں کی بندگی تھا' لیکن یہ مسئلہ وہاں عمومی طور پر لیا گیا تھا۔اب سیاق کلام یہاں مخصوص جاہلی رسوم کی شکل میں اسی مسئلہ الوہیت اور عبودیت کو لے رہا ہے اور دونوں کے درمیان ربط واضح ہے' ایک جگہ اصول عام ہے اور دوسری جگہ اس کی مثال ہے۔

اس پارے میں اب متعدد اور بے شمار مثالوں کو لے کر بعض جاہلی رسوم کو لیا گیا ہے' کہ اہل جاہلیت نے بعض کھانوں کو حرام قرار دیا تھا اور بعض کو جائز قرار دے دیا تھا۔جن کا تعلق نذر و نیاز' بعض پھلوں اور بعض بچوں سے تھا۔ اس حوالے سے نہایت ہی مؤثر اور متعدد فیصلے کیے گئے۔ان فیصلوں کا ربط بعض حقائق اور اصولوں کے ساتھ ہے جو اس دین کی اساس ہیں۔ان قواعد اور اصولوں کے بڑے بڑے اختلافات اور نتائج کو بھی پیش کیا گیا ہے' ان تمام باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ دین اسلام اس بات کو نہایت ہی زیادہ اہمیت دیتا ہے کہ انسان کی زندگی جاہلیت سے مکمل طور پر خالی ہو' اور پوری کی پوری اسلام میں داخل ہو یعنی اللہ کی حاکمیت کے نیچے آجائے۔

اس پارے کا آغاز بطور تمہید اس بات سے کیا جاتا ہے کہ اللہ کی مشیت تمام بندوں کو گھیرے ہوئے ہے' جنوں کو بھی اور انسانوں کو بھی اور تمام جہانوں کے واقعات اللہ کی تقدیر اور مشیت کے مطابق رونما ہوتے ہیں۔انسانوں اور جنوں میں سے جو لوگ شیطان ہیں' رسولوں کے دشمن ہیں۔انہیں اللہ تعالیٰ مہلت دیتا ہے' ڈھیل دیتا ہے' تاکہ وہ جن برائیوں کا ارتکاب کرنا چاہتے ہیں' کرلیں۔اگر اللہ چاہتا تو انہیں مجبور کر کے ہدایت دے دیتا اور انہیں گمراہی سے روک دیتا' یا انہیں ہدایت دے دیتا اور راہ حق پر انہیں شرح صدر حاصل ہو جاتی یا انہیں اس بات سے روک دیتا کہ وہ رسولوں کو اذیت دیں' مومنین کو تنگ کریں اور ان کے ہاتھ ہی رسولوں اور مومنین تک نہ پہنچ سکتے۔اس لئے کہ وہ جن برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور رسولوں کو اذیت دیتے ہیں تو یہ اللہ کی مشیت کے دائرے سے باہر نکل کر نہیں کرتے' اللہ کی مشیت اور سلطنت کے اندر رہ کر وہ یہ کام کرتے ہیں۔یہ اللہ کی مشیت ہی ہے جس نے ان کو یہ سب کچھ کرنے کا اختیار دیا ہے کہ وہ چاہیں تو ہدایت کی راہ لیں اور چاہیں تو ضلالت کی راہ لیں۔وہ تو بہرحال اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں: "اور ہم نے تو اسی طرح شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القاکرتے رہتے ہیں' اگر تمہارے رب کی مشیت یہ ہوتی کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کرتے' پس تم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ اپنی افتراء پردازیاں کرتے رہیں اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے' ان کے دل اس دھوکے کی طرف مائل ہوں اور اس سے راضی ہو جائیں اور ان برائیوں کا اکتساب کریں جن کا اکتساب وہ کرنا چاہتے ہیں۔"

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ انسانوں میں سے شیطان اور جنوں میں سے شیطان' سنت الٰہی کے مطابق انبیاء رسل کے دشمن ہوں گے اور یہ کہ یہ شیاطین اپنی تمام کارستانیوں کے باوجود اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کو بہت ہی برا سمجھا کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کو حکم کیسے بنا سکتا ہوں۔ یعنی تمام معاملات میں مطلقاً یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کو حکم بناؤں چاہے معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو' اس لئے کھانے پینے کی ان چیزوں میں اللہ کے سوا کسی اور کے فیصلے کو ماننے کے معنی یہ ہیں کہ ہم تمام معاملات میں غیراللہ کو حکم بنا رہے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ سے کے سوا میں کسی اور کی ربوبیت کا اقرار کیسے کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب اور اس شریعت کی صورت میں فیصلہ کن بات آگئی ہے اس لئے اللہ کی بات کے بعد کسی کی بات کا کیا موقعہ ہے اور اللہ کے حکم کے بعد کسی حکم کی ضرورت ہی کیا ہے؟ حضور اکرم ؐ کو متنبہ کر دیا گیا کہ آپ اللہ کے دین کے معاملے میں کسی انسان کی اطاعت نہ کریں۔ اس لئے کہ لوگ تو محض ظن و تخمین سے کام چلاتے ہیں اور ان کے پاس کوئی یقینی علم نہیں ہے۔ اگر کسی نے ان کی اطاعت کی تو وہ اسے گمراہ کر دیں گے۔ اس بات کا علم صرف اللہ کو ہے کہ اس کے بندوں میں سے ہدایت یافتہ کون ہے اور گمراہ کون ہے؟ یہ بات بطور تمہید یہ حکم دینے کے لئے کہی گئی کہ اگر تم مومن ہو تو ان جانوروں کو خوب کھاؤ جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہو' اور ان جانوروں کو نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو' اور اس بات سے ڈرایا گیا کہ تم حلال و حرام کے تعین میں شیطان کے دوستوں کی بات ہرگز نہ مانو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تم بھی انہی کی طرح مشرکین میں سے ہو جاؤ گے۔ آخر میں پھر ان احکامات کا خاتمہ اس وضاحت پر ہوتا ہے کہ کفر کی حقیقت کیا ہے اور ایمان کی ماہیت کیا ہے۔ اور وہ اسباب کیا ہیں جو ان کفار کو برائیوں کے ارتکاب پر مجبور کرتے ہیں۔ ذرا قرآن کے ان الفاظ پر غور کریں :

"پھر جب حال یہ ہے تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں' حالانکہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کر دی ہے' اور جن لوگوں کو ہم نے تم سے پہلے کتاب دی تھی وہ جانتے تھے کہ یہ کتاب تمہارے رب ہی کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے لہٰذا تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔ تمہارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے' کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے اور اے محمد اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو بس گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ درحقیقت تمہارا رب بہتر جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے ہٹا ہوا ہے اور کون سیدھی راہ پر ہے۔ پھر اگر تم لوگ اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اس کا گوشت کھاؤ۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو' حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالت اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے ان کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے۔ بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بناء پر گمراہ کن باتیں کرتے ہیں' ان حد سے گزرنے والوں کو تمہارا رب خوب جانتا ہے۔ تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی' جو لوگ گناہ کا اکتساب کرتے ہیں وہ اپنی کمائی کا بدلہ پاکر رہیں گے اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو اس کا گوشت نہ کھاؤ' ایسا کرنا فسق ہے۔ شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات القاء کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔ لیکن اگر تم نے ان کی اطاعت

قبول کر لی تو یقیناً تم مشرک ہو۔ کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح اس سے نہ نکلتا ہو۔ کافروں کے لئے تو اسی طرح ان کے اعمال خوشنما بنا دیئے گئے ہیں اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکر و فریب کا جال پھیلائیں۔ دراصل وہ اپنے فریب کے جال میں خود پھنسے ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ جب ان کے سامنے کوئی آیت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم نہ مانیں گے جب تک کہ وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے۔ اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغامبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔ قریب ہے وہ وقت کہ یہ مجرم اپنی مکاریوں کی پاداش میں اللہ کے ہاں ذلت اور سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔"

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ ہدایت پانے والوں کی ہدایت اور ضلالت کی راہ لینے والوں کی گمراہی دونوں کی تکمیل تب ہی ہو سکتی ہے کہ جب قدرت الہیہ کا منشا ہو۔ دونوں قسم کے لوگ اللہ کے قبضہ قدرت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کے تحت ہیں اور یہ دونوں اللہ کی قدرت اور مشیت کے دائرے کے اندر رہتے ہیں۔ فرمایا جا رہا ہے :

"پس حقیقت یہ ہے کہ اللہ جسے ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا کہ اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے۔ اس طرح اللہ ناپاکی ان لوگوں پر مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔"

آیات کا یہ حصہ اس بات پر اختتام پذیر ہوتا ہے کہ اس سے قبل جو امر و نہی وارد ہوئے' جو اعتقادات اور تصورات بیان کئے گئے یہ سب کے سب صراط مستقیم ہیں۔ اللہ کی مشیت اور قدرت کے تعین کے اصول اور ان اوامر و نواہی کے درمیان ربط پیدا کر کے انہیں ایک پیکج قرار دیا جاتا ہے جسے صراط مستقیم قرار دے کر حکم دیا جاتا ہے کہ اس راہ کو اپنائیں تاکہ اپنے رب کے ہاں امن و سلامتی کی منزل کو پالیں اور اللہ بہرحال ان کا ولی اور ناصر ہے۔ "حالانکہ یہ راستہ تمہارے رب کا سیدھا راستہ ہے اور اس کے نشانات ان لوگوں کے لئے واضح کر دیئے گئے ہیں جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔ ان کے لئے ان کے رب کے پاس سلامتی کا گھر ہے اور وہ ان کا سرپرست ہے' اس صحیح طرز عمل کی وجہ سے جو انہوں نے اختیار کیا۔"

ذبیحوں کی بحث اور ان کے کھانے کے مسائل ختم ہونے سے پہلے یہاں قرآن کریم ان لوگوں کے انجام کا ذکر بھی کر دیتا ہے جو شیاطین ہیں اور جن و انس دونوں میں سے ہیں اور جو اس وقت اہل ایمان کے ساتھ ان ذبیحوں کے مسائل پر سخت الجھ رہے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ آخری انجام اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ قادر مطلق اور حاکم ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو جسے چاہے اس زمین کی خلافت عطا کرتا ہے۔ جس کے بارے میں چاہے اسے اس جہان سے حرف غلط کی طرح مٹا دے۔ اس بات پر سخت تنبیہ کی جاتی ہے کہ کوئی شخص خودسری اختیار نہ کرے اس لئے کہ اسے جو آزادی اور اختیار دیا گیا ہے وہ خودسری کے لئے نہیں دیا گیا بلکہ اسے آزمانے کے لئے دیا گیا ہے اور مہلت دی گئی ہے کہ وہ کس راہ پر چلتا ہے اور آخر کار جب مہلت ختم ہو گی تو اس سے مواخذہ ہو گا اور جو کچھ اس نے کمایا اس کی سزا بھگتے گا۔ "اور جس روز اللہ ان سب لوگوں کو گھیر کر جمع کرے گا' اس روز جنوں سے خطاب کر کے فرمائے گا "اے گروہ جن! تم نے نوع

انسانی پر خوب ہاتھ صاف کیا۔" انسانوں میں سے جو ان کے رفیق تھے وہ عرض کریں گے پروردگار! ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے کو خوب استعمال کیا ہے' اور اب ہم اس وقت پر آپہنچے ہیں جو تو نے ہمارے لئے مقرر کر دیا ہے۔ اللہ فرمائے گا "اچھا اب آگ تمہارا ٹھکانا ہے' اس میں تم ہمیشہ رہو گے۔" اس سے بچیں گے صرف وہی جنہیں اللہ بچانا چاہے گا' بے شک تمہارا رب دانا اور علیم ہے۔ دیکھو اس طرح ہم ظالموں کو ایک دوسرے کا ساتھی بنائیں گے۔ اس کمائی کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے ....... "اے گروہ جن و انس! کیا تمہارے پاس خود تم ہی میں سے وہ پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم کو میری آیات سناتے اور اس دن کے انجام سے ڈراتے تھے۔" وہ کہیں گے "ہاں! ہم اپنے خلاف خود گواہی دیتے ہیں۔" آج دنیا کی زندگی نے ان لوگوں کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ مگر اس وقت وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔ تمہارا رب بستیوں کو ظلم کے ساتھ تباہ کرنے والا نہ تھا بلکہ ان کے باشندے حقیقت سے ناواقف تھے۔ ہر شخص کا درجہ اس کے عمل کے لحاظ سے ہے اور تمہارا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ تمہارا رب بے نیاز ہے اور مہربانی اس کا شیوہ ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے اور تمہاری جگہ دوسرے جن لوگوں کو چاہے لے آئے' جس طرح اس نے تمہیں کچھ اور لوگوں کی نسل سے اٹھایا ہے۔ تم سے جس چیز کا وعدہ کیا جا رہا ہے وہ یقیناً آنے والی ہے اور تم خدا کو عاجز کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اے محمدؐ! کہہ دو کہ لوگو تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو اور میں بھی اپنی جگہ عمل کر رہا ہوں' عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ انجام کار کس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔"

اب ذرا غور کیجئے کہ کھانے یا نہ کھانے کا ایک جزئی مسئلہ ہے کہ کون سے ذبیحے کا کھانا جائز ہے اور کس کا ناجائز ہے؟ لیکن اس جاہلی رسم و رواج کے مقابلے میں قرآن اسلامی نظریہ حیات کا اساسی تصور پیش کرتا ہے۔ نہایت ہی مؤثر اشارات اور مختلف قسم کے مشاہدات سے اللہ کی مشیت کے بعض حقائق پر روشنی ڈالی جاتی ہے' اللہ کے بعض تکوینی تصرفات کو پیش کیا جاتا ہے' انسانی نفسیات کے بعض اصولوں سے پردہ اٹھایا جاتا ہے' انسانی زندگی کے بعض ظاہری اور بعض خفیہ میلانات کو ظاہر کیا جاتا ہے' زمین و آسمان پر اللہ کی حاکمیت کے بارے میں بعض حقائق پیش کئے جاتے ہیں' دنیا و آخرت میں اور ان سب امور کو محض ایک جزوی مسئلہ حلت و حرمت کے ضمن میں۔ سوال یہ ہے کہ اس مسئلے کو اس قدر اہمیت کیوں دی گئی؟ اس لئے کہ یہ اس دین کا اساسی مسئلہ ہے۔ یہ اس کرۂ ارض پر اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت کا مسئلہ ہے کہ یہ حق کس کو حاصل ہے؟ بالفاظ دیگر یہ الوہیت اور ربوبیت کا مسئلہ ہے اور فیصلہ یہ کرنا ہے کہ الٰہ اور رب کون ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اس جزوی مسئلے کے بیان کے ضمن میں اس قدر اساسی نظریاتی مباحث کو یہاں لایا گیا ہے۔

یہی تمام امور مسئلہ نذر و نیاز کے بیان کے ضمن میں بیان ہوئے ہیں یعنی پھلوں' مویشیوں اور اولاد کے بارے میں جاہلیت میں مروج نذر و نیاز کے بارے میں ....... وجہ یہ ہے کہ عرب جاہلیت ذات باری کی منکر نہ تھی۔ اسی طرح دور جاہلیت کے عرب اللہ کے ساتھ مساوی طور پر کسی اور کو الٰہ بناتے تھے۔ ان کی کج فکری یہ تھی کہ وہ اللہ کے ساتھ کچھ اور الٰہ قرار دیتے تھے اور مقام و مرتبہ کے اعتبار سے ان کے الٰہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کم مرتبہ ہوتے تھے اور وہ کہتے یہ تھے کہ ان دوسری شخصیات کو ہم الٰہ اس لئے قرار دیتے ہیں کہ ان کے ذریعے ہم اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں اور یہی وہ شرک تھا جس کا وہ ارتکاب کرتے تھے اور اسی وجہ سے قرآن انہیں مشرکین کا لقب دیتا ہے۔

نیز ان کے شرک میں سے ایک شرک یہ تھا کہ اپنے کاہنوں اور اپنے مشائخ کے ذریعے انہوں نے اپنے لئے کچھ قوانین اور کچھ رسم و رواج گھڑ لئے تھے جو ان کے لئے شریعت کا درجہ رکھتے تھے۔ اور ان کا زعم یہ تھا کہ یہ قوانین اور رسوم ان کے لئے اللہ نے تجویز کئے ہیں اور اللہ نے انہیں حکم دیا ہے کہ وہ ان کی پابندی کریں۔ وہ اس قدر شدید مشرک نہ تھے کہ وہ ان قوانین اور رسوم کو اپنی طرف منسوب کرتے اور یہ دعویٰ کرتے کہ اقتدار اعلیٰ کا حق خود انہیں حاصل ہے اور انہیں حق ہے کہ اپنے لئے جو چاہیں قانون سازی کریں۔ یہ خود سری تو دور حاضر کے مشرکین نے سیکھی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے سوا از خود اپنے لئے قانون سازی کر سکتے ہیں۔ یہی ان کا شرک تھا اور اسی وجہ سے وہ مشرکین کہلائے۔

یہ قوانین اور رسومات جو انہوں نے خود اپنے لئے گھڑ لئے تھے اور زعم یہ تھا کہ وہ خدا کی طرف سے ہیں ان میں ان کے قوانین نذر و نیاز بھی تھے جو انہوں نے اپنے پھلوں اور مویشیوں کے بارے میں وضع کئے تھے۔ یہ قوانین انہوں نے خود بنائے تھے یا ان کے کاہنوں اور شیوخ نے بنائے تھے۔ بہرحال وہ ایسے تھے کہ "جو ان کے شرکاء کے لئے ہوتا وہ اللہ کے حصے کے ساتھ نہ مل سکتا اور جو اللہ کے لئے ہوتا وہ ان کے شرکاء کے حصص کے ساتھ مل سکتا۔" مثلاً وہ اپنی اولاد میں سے بعض کی منت مانتے اور اس طرح وہ اپنے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق اپنی بیٹیوں کو قتل کرتے۔

ان قوانین میں سے ایک قانون یہ تھا کہ وہ بعض فصلوں، پھلوں اور مویشیوں کو بند کر دیتے اور یہ کہتے کہ ان کا استعمال صرف ان کے لئے جائز ہوگا جنہیں اللہ اجازت دے حالانکہ ان چیزوں کو حرام بھی وہ خود قرار دیتے اور جن لوگوں کے لئے ان کا استعمال جائز تھا ان کا تعین بھی وہ خود کرتے۔ بعض قوانین ایسے تھے کہ وہ بعض مویشیوں پر سواری حرام قرار دیتے مثلاً بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام۔ (دیکھئے سورہ مائدہ)

ایک قانون یہ بھی تھا کہ وہ مویشیوں کے بعض حمل کو مردوں کے لئے خاص کر دیتے اور عورتوں پر حرام کر دیتے الا یہ کہ مویشیوں کا بچہ مردہ پیدا ہو تو اس صورت میں دونوں شریک ہوتے۔ یہ لوگ ایک چیز کو حرام قرار دیتے اور دوسری کو حلال قرار دیتے۔ ایک قانون یہ بھی تھا کہ وہ مردار کو حلال قرار دیتے اور یہ کہتے کہ اسے خود اللہ نے ذبح کیا ہے۔

اسلام ان تمام باتوں پر ایک کھلا حملہ کرتا ہے۔ اس تنقیدی حملے میں بنیادی نظریاتی فیصلے کئے جاتے ہیں۔ ان جزوی قوانین اور مسائل کے بارے میں قرآن کریم نہایت ہی مؤثر حقائق اور شواہد پیش کرتا ہے۔ وہ شواہد و حقائق جو قرآن اس پوری مدت میں ایمان و شرک کے موضوع پر لاتا ہے۔ اس لئے کہ ان جزوی مسائل کا تعلق بھی شرک اور ایمان کے اصولی مسائل کے ساتھ ہے۔ یہ جزوی مسائل وہ ہیں جن پر ایمان اور شرک کے اصولوں کی تطبیق اور اطلاق ہوتا ہے۔

اس تنقیدی حملے کا مطالعہ کر کے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسائل جزئی مسائل نہیں بلکہ اس دین کے اساسی مسائل ہیں۔ ان کا تعلق نظریات کے ساتھ ہے۔ یہ قوانین اور یہ رسوم ان مشرکین کے لئے ان لوگوں نے مزین کر کے تجویز کئے ہیں جن کو یہ لوگ اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ یہ شرکاء ان مشرکین کی زندگی کو تباہ کرتے ہیں اور ان پر دین کو مشتبہ بناتے ہیں۔ یہ دینی تلبیس اور زندگی کی تباہ کاریاں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں یا تو لوگ شریعت کے پیروکار ہوں گے اور اس صورت میں ان کی زندگی صحیح و سلامت ہوگی اور یا وہ اسلامی شریعت سے متضاد شریعت پر چلتے ہوں گے تو اس صورت میں وہ کوئی سیدھی راہ نہ پا سکیں گے اور ان کی زندگی خطرے میں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

(وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ (٦ : ١٣٧)) "اور اسی طرح بہت سے مشرکین کے لئے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔"

اس تنقیدی مہم کے دوران یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ شریعت خداوندی سے سرتابی کی پشت پر ہمیشہ شیطانی سازش ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی قوم شریعت کو چھوڑتی ہے تو وہ جن لوگوں کی بھی اطاعت کرے گی وہ اللہ کے شرکاء ہوں گے۔ اس مہم کا اہم عنصر یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اور جب اس کی یہ سازش کامیاب ہوتی ہے تو وہ ایسے مشرکین کی قیادت ہلاکت اور تباہ کن گھاٹے کی طرف کرتا ہے۔

(كُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ (٦ : ١٤٢)) "کھاؤ ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں بخشی ہیں اور شیطان کی پیروی نہ کرو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔" اس مہم سے معلوم ہوتا ہے کہ حلال و حرام کا شریعت اسلامیہ کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے تعین کرنا کھلا شرک ہے اور یہ شرک جلی کے برابر ہے۔ لیکن تمام زمانوں میں مشرکین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ شرک کرنے پر مجبور ہیں ورنہ وہ اللہ کی قوت قاہرہ کے خلاف کیونکر جا سکتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کی مشیت تو یہ تھی کہ اس نے ہر انسان کو ایک حد تک مختار بنایا ہے اور اسی اختیار کے نتیجے میں اس کے لئے آزمائش لازمی کی ہے لہذا اللہ تعالیٰ نے کسی کو بھی اس بات پر مجبور نہیں کیا کہ وہ شرک کرے بہرحال وہ آزمائش میں ہیں اور اللہ کے دائرہ قدرت کے اندر ان کی آزمائش ہو رہی ہے۔

(سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ (١٤٨) قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ (١٤٩)) "یہ مشرک لوگ ضرور کہیں گے کہ "اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔" ایسی ہی باتیں بنا کر ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا تھا یہاں تک کہ آخر کار ہمارے عذاب کا مزہ انہوں نے چکھ لیا۔ ان سے کہو "کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو۔" پھر کہو، تمہاری (اس محبت کے مقابلے میں) حقیقت تک پہنچنے والی محبت تو اللہ کے پاس ہے، بے شک اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔"

اب اس کے بعد ہمارے سامنے طلب ثبوت اور شہادت کا ایک منظر آتا ہے۔ ان سے یہ ثبوت مانگا جاتا ہے کہ اپنے مزعومات کے بارے میں وہ دعویٰ کرتے کہ ان کو اللہ نے حرام کیا ہے تو اس پر وہ گواہ لائیں۔ اس سے ذہن اس طرف

منتقل ہو جاتا ہے کہ اس سورہ کے آغاز میں بھی اللہ کی حاکمیت کے مسئلے پر ان سے ثبوت اور شہادت طلب کی گئی تھی۔ اس لئے کہ اللہ کی حاکمیت اور حلال و حرام کے تعین کے اختیارات کا آپس میں چولی دامن کا تعلق ہے۔ اور یہ کہ حلال و حرام کے تعین کا اختیار اللہ کی حاکمیت کے مخصوص ترین خصائص میں سے ایک ہے۔ اور یہی حقیقی سوال ہے۔

(قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَ كُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ (٦ : ١٥٠)) "ان سے کہو "لاؤ اپنے وہ گواہ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ ہی نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے۔" پھر اگر وہ شہادت دے دیں تو ان کے ساتھ شہادت نہ دینا اور ہرگز ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے اور جو آخرت کے منکر ہیں اور جو دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں۔" یہاں لفظ (يَعْدِلُوْنَ) ذہن کو اس سورہ کے آغاز میں 'عقیدۂ توحید کے ذکر کے وقت اسی لفظ کے استعمال کی طرف متوجہ کرتا ہے' وہاں بھی مشرکین کو یہ کہا گیا کہ وہ دوسروں کو اللہ کا ہمسر بناتے ہیں۔ (يَعْدِلُوْنَ) دیکھئے سورہ انعام آیت (۱)

اس کے بعد یہ مہم اس آخری فیصلے پر ختم ہوتی ہے کہ قانون سازی اور مویشیوں اور ان کے بچوں اور پھلوں کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کیا ہے وہی صراط مستقیم ہے۔ یہی انداز گفتگو اس سے پہلے ذبیحوں کی حلت اور حرمت کے مضامین کے وقت اختیار کیا گیا تھا اور یہی انداز اس سورہ کے آغاز میں مسئلہ الوہیت کے بیان کے وقت اختیار کیا گیا تھا۔

(وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (٦ : ١٥٣)) "نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے۔ یہ ہے وہ ہدایت جو رب نے تمہیں کی ہے 'شاید کہ تم کج روی سے بچو۔"

بات ان اقتباسات پر ختم نہیں ہو جاتی جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا' بلکہ اس سے آگے یہ بتایا جاتا ہے کہ اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اپنی قوم کے لئے ایک کتاب لے کر آئے تھے جس کے اندر تمام امور کی تفصیلات تھیں۔ وہ ہدایت اور رحمت تھی اور اس کتاب کا مقصد بھی یہ تھا کہ لوگ قیامت کی جوابدہی پر ایمان لے آئیں۔ اس کتاب کا مقصد بھی یہ ہے کہ مسلمان اس کی اطاعت کریں اور خدا ترسی کا رویہ اختیار کریں تاکہ ان پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں اور وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ اللہ نے یہود و نصاریٰ کے لئے تو مفصل کتابیں بھیجیں مگر ہمارے لئے کوئی کتاب نہ بھیجی جس میں ہمارے لئے تفصیلی ہدایات ہوں اور انہیں معلوم ہو کہ شریعت کے احکام کیا ہیں اور یہ کہ انہیں جو باتیں شریعت کی بتائی جاتی ہیں وہ شریعت نہیں ہے اور محض افتراء ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کو تہدید آمیز تنبیہ کی جاتی ہے جو حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے اور اس

جاہلی نظام پر قائم رہتے ہیں جسے وہ من جانب اللہ کہتے ہیں اور ان کا یہ دعویٰ صریح افتراء ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ایسے خارق العادت معجزات کا بھی مطالبہ کرتے ہیں جن کے نتیجے میں وہ تصدیق اور اتباع پر مجبور ہو جائیں - ان لوگوں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ جس دن ایسے معجزات آگئے تو وہ دن ان کا آخری دن ہو گا اور اس کے بعد وہ ہلاک اور نیست و نابود کر دیئے جائیں گے -

(هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ (۶:۱۵۸)) "کیا اب یہ لوگ اس کے منتظر ہیں کہ ان کے سامنے فرشتے کھڑے ہوں یا تمہارا رب خود آ جائے ' یا تمہارے رب کی صریح نشانیاں نمودار ہو جائیں؟ جس روز تمہارے رب کی بعض مخصوص نشانیاں نمودار ہو جائیں گی پھر کسی ایسے شخص کو اس کا ایمان کچھ فائدہ نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو' جس نے اپنے ایمان میں کوئی بھلائی نہ کمائی ہو - اے محمد ؐ! ان سے کہہ دو کہ اچھا' تم انتظار کرو' ہم بھی انتظار کرتے ہیں -" اس کے بعد یہ فیصلہ آتا ہے کہ حضرت محمد ؐ' امت مسلمہ اور دین اسلام اور ان لوگوں کے درمیان اتحاد ممکن ہی نہیں ہے جو اللہ کی شریعت کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے لئے حلال و حرام اور جائز و ناجائز مقرر کرتے ہیں اور اپنے لئے شریعت خود بناتے ہیں اور اس پر یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ یہ شریعت الٰہیہ ہے -

(اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۶:۱۵۹)) "جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں - ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے' وہی ان کو بتائے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے -" اللہ کا فیصلہ بہت ہی واضح ہے - لست منهم فی شیء "ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں ہے -" اب یہ سورہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور قانون سازی اور اللہ کی حاکمیت کو نہایت ہی مفصل اور واضح انداز میں بیان کر دیا جاتا ہے' بظاہر تو یہ موضوع ایک جزئی موضوع نظر آتا ہے' لیکن یہاں اس نظریاتی مسئلے کو نہایت ہی اصولی انداز میں پیش کیا جاتا ہے اور پورے دین کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ مسائل دین اسلام کے مقاصد و نظریات ہیں - ان کے بارے میں اہل اسلام کا قلب و نظر صاف اور یکسو ہونا چاہئے اور پھر اس نظریے' اس عقیدے اور یکسوئی کو ایک مفصل نظام حیات کی شکل میں ظاہر ہونا چاہئے -

(قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۶۱) قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ

الْعٰلَمِيْنَ (١٦٢) لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (١٦٣) قُلْ
اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ
وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ
(١٦٤) وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ
لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (١٦٥))

"اے محمدؐ! کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھایا ہے' بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں' ابراہیم کا طریقہ جسے یکسو ہوکر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو' میری نماز میرے تمام مراسم عبودیت' میرا جینا' میرا مرنا' سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔ کہو 'کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے؟ ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے 'کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا' پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے' اس وقت وہ تمہارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیئے 'تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے۔ اور بہت درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔"

یہ وہ مسائل ہیں جو اسلامی نظریہ حیات اور دین اسلام کے اساسی مسائل ہیں۔ دنیا و آخرت کے بارے میں ہدایات' زندگی اور موت کے مسائل' عمل اور مکافات عمل کے مسائل' عبادت اور احسان کے مسائل اور ان تمام مسائل کو زبانی اسلوب بیان اس سورہ کے اس رعب دار اختتامیہ میں نہایت ہی پرشوکت اور خوفناک انداز میں جمع کر دیتا ہے۔ اللہ کی حاکمیت اور سلطنت اور اس کی قانون سازی کے حق کے اعلیٰ ترین مسئلے کو نہایت ہی سادہ اور روزمرہ کے مسائل یعنی کھانے و پینے کے عام مسائل کے ضمن میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ کی حاکمیت اور ربوبیت بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے معاملات میں اپنا فیصلہ کرتی ہے......... یہ ہے اسلام جس کی تشریح خود قرآن مجید کر رہا ہے جو کلام اللہ العالمین ہے۔

---ooo---

# درس ۶۷ تشریح آیات

## ۱۱۱ --- تا --- ۱۱۳

یہ پارۂ ہشتم کی ابتدائی آیات ہیں۔ ان میں سے پہلا پیراگراف پارۂ ہفتم کی آخری آیات سے متعلق ہے۔ پارۂ ہفتم کی آخری آیات میں مشرکین عرب کی اس تجویز کا ذکر تھا کہ حضور ؐ ان کے سامنے ' خود ان کے تجویز کردہ معجزات پیش کریں۔ اور وہ اپنی اس بات پر قسمیں کھاتے تھے کہ اگر ان کے طلب کردہ معجزات پیش کر دیے جائیں تو وہ آپ کی تصدیق کریں گے اور آپ پر ایمان لائیں گے۔ ان لوگوں کی ان قسموں کی وجہ سے بعض اہل اسلام بھی دل ہی دل میں یہ خواہش رکھتے تھے کہ اگر اللہ ان لوگوں کی اس خواہش کو پورا کر دے تو بہتر ہو' اور یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ مطالبہ کرتے تھے کہ آپ بھی اللہ تعالیٰ سے یہ مطالبہ فرمائیں کہ اللہ ان لوگوں کی خواہشات کو پورا کر دے۔ پارۂ ہفتم اور پارۂ ہشتم کے ان حصوں کا پورا مضمون یوں ہے۔

(وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰۹) وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۱۱۰) وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ (۱۱۱) (٦: ۱۰۹ تا ۱۱۱)) "یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی (یعنی معجزہ) ہمارے سامنے آجائے تو ہم اس پر ایمان لائیں گے۔ اے نبی ؐ! ان سے کہو کہ نشانیاں تو اللہ کے اختیار میں ہیں" اور تمہیں کیسے سمجھایا جائے کہ اگر نشانیاں آبھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں۔ ہم اسی طرح ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر رہے ہیں جس طرح یہ پہلی مرتبہ اس کتاب پر ایمان نہیں لائے تھے۔ ہم انہیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر ہم فرشتے بھی ان پر نازل کر دیتے اور مردے ان سے باتیں کرتے اور دنیا بھر کی چیزوں کو ہم ان کی آنکھوں کے سامنے جمع کر دیتے تب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے الا یہ کہ مشیت الٰہی یہی ہو (کہ یہ ایمان لائیں) مگر اکثر لوگ نادانی کی باتیں کرتے ہیں۔"

ان آیات کی تفسیر ہم پارۂ ہفتم میں کر آئے ہیں۔ یہاں ہم وہ عمومی حقائق بیان کریں گے جو ان آیات میں دیئے گئے ہیں اور جن کے بارے میں وہاں بات نہ ہوئی تھی۔

۱۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ ایمان وکفر' اور ہدایت و ضلالت کا دار و مدار صرف دلائل پر نہیں ہوتا کہ اگر کسی سچائی پر دلائل نہ دیئے گئے تھے تو لوگ اسے تسلیم نہ کریں گے۔ بلکہ سچائی تو بذات خود ایک دلیل ہوتی ہے۔ سچائی کے اندر بذات خود اس قدر قوت ہوتی ہے کہ وہ قلب انسانی پر چھا جاتی ہے' ہر انسان کا دل اس پر مطمئن ہو جاتا ہے اور اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے لیکن کچھ دوسرے داخلی اور خارجی اسباب ایسے ہوتے ہیں جو کسی انسان اور قبولیت حق کے درمیان رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ ایسی ہی رکاوٹوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَمَا يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَآ إِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُونَ (۱۰۹) وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ (۱۱۰) "اور تمہیں کیسے سمجھایا جائے کہ اگر نشانیاں آبھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں۔ ہم اسی طرح ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر رہے ہیں جس طرح یہ پہلی مرتبہ اس کتاب پر ایمان نہیں لائے تھے۔ ہم انہیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑے دیتے ہیں۔"

سوال یہ ہے کہ پہلی بار جب ان کے سامنے دعوت اسلامی پیش ہوئی تو انہوں نے کیوں نہ اسے قبول کیا؟ اور اگر معجزات آبھی جائیں تب بھی کیا گارنٹی ہے کہ وہ دوبارہ انکار نہ کریں گے اور ان نامعلوم اسباب کی وجہ سے کیوں وہ دوبارہ انکار نہ کر دیں گے؟

یہ حقیقت ہے کہ ایمان کے دواعی دلوں کے اندر ہوتے ہیں' نیز سچائی کے اندر بھی وہ دواعی موجود ہوتے ہیں۔ قبولیت حق کا تعلق خارجی عوامل سے ہرگز نہیں ہوتا لہٰذا ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے اس دل کا علاج کریں اور دل کو ان بیماریوں سے بچائیں جو قبولیت حق کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔

۲۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کا دار و مدار مشیت الٰہیہ پر ہے۔ اللہ کی مشیت کا تقاضا یہ ہوا کہ انسان کو اس قدر آزادی اور اختیار دیا جائے کہ وہ آزادی کے ساتھ کسی بھی راستے کی طرف متوجہ ہو جائے اور انسان کو جو آزادی دی گئی ہے یہی اس کی مسئولیت اور اس کی آزمائش کا سبب ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اپنی اس آزادی کو کس طرح استعمال کرتا ہے؟ اگر اسے کوئی قبولیت حق کی طرف رغبت اور توجہ کے لئے استعمال کرتا ہے اور راہ ہدایت پانے کی سعی کرتا ہے' اگرچہ اسے معلوم نہ ہو کہ ہدایت کہاں ہے تو اس صورت میں مشیت الٰہی اس کی دست گیری کرتی ہے' اس کے ساتھ اللہ کی توفیق شامل ہو جاتی ہے اور وہ صحیح راستے پر آجاتا ہے اور جو شخص اس آزادی کو ہدایت کے ساتھ نفرت کرنے اور راہ ہدایت پانے کے ذرائع سے منہ موڑنے کے لئے استعمال کرتا ہے تو اللہ کی مشیت اسے راہ حق سے دور پھینک دیتی ہے اور وہ اندھیروں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں انسان اور اس کے حالات اللہ کے ارادے اور اللہ کی قدرت کے دائرے کے اندر ہوتے ہیں اور مآل امر تمام کا تمام اللہ کی ذات کی طرف ہوتا ہے۔ اس حقیقت کی طرف درج ذیل آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (١١٠) "اور ہم اسی طرح ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر رہے ہیں جس طرح یہ پہلی مرتبہ اس کتاب پر ایمان نہیں لائے تھے ۔ہم انہیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں ۔" اور دوسری آیت میں ہے :

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿١١١﴾

"اگر ہم فرشتے بھی ان پر نازل کر دیتے اور مردے ان سے باتیں کرتے اور دنیا بھر کی چیزوں کو ہم ان کی آنکھوں کے سامنے جمع کر دیتے تب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے' الا یہ کہ مشیت الٰہی یہی ہو کہ (یہ ایمان لائیں) مگر اکثر لوگ نادانی کی باتیں کرتے ہیں ۔" اور اسی پیراگراف میں ایک سابقہ آیت بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے :

(اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (٦: ١٠٦)) وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (١٠٧)) "اے نبی" اس وحی کی پیروی کیے جاؤ جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے کیونکہ اس ایک رب کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے ۔ اور مشرکین کے پیچھے نہ پڑو ۔ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو (وہ ایسا بندوبست کر سکتا تھا کہ) یہ لوگ شرک نہ کرتے ۔ تم کو ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا اور نہ تم ان پر حوالہ دار ہو ۔"

(وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ (٦: ١١٢)) "اور ہم نے تو اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القاکرتے رہے ہیں ۔ اگر تمہارے رب کی مشیت یہ ہوتی کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کرتے ۔ پس تم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ اپنی افتراپردازیاں کرتے رہیں ۔"

لہٰذا بات پوری کی پوری مشیت الٰہیہ پر موقوف ہے ۔ یہ اللہ ہی تو ہے جس نے یہ چاہا کہ یہ لوگ ہدایت نہ پائیں اس لئے کہ ان کو جو قوت تمیزی دی گئی تھی اور جو دائرۂ اختیار دیا گیا تھا اس میں انہوں نے ان اسباب کو نہ اپنایا جو

اسباب ہدایت تھے ۔ یہ اختیار اللہ نے ان لوگوں کو اس لئے دیا تھا کہ وہ ان کو آزمائے ۔ ہاں جب وہ اسباب ہدایت اپنائیں اور سعی کریں تو ہدایت دینے والا وہی ہے اور جب وہ ضلالت کے اسباب اپنائیں تب بھی گمراہ کرنے والا بھی اللہ ہے ۔ اور اس اسلامی تصور حیات میں کوئی تعارض اور تضاد نہیں ہے ۔ اللہ کی مشیت مطلقہ اور انسان کی محدود مقدار آزادی کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے ۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے 'خصائص التصور الاسلامی حصہ اول)

۳۔ تیسری حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کرنے والے اور گمراہی کا راستہ اختیار کرنے والے دونوں اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں ۔ دونوں اللہ کے سامنے مغلوب اور محکوم ہیں ۔ یہ دونوں مل کر بھی اتنی قوت نہیں رکھتے کہ کوئی چیز اللہ کی تقدیر اور توفیق کے بغیر سامنے لا سکیں ۔ تمام معاملات یہاں سنن الہیہ کے مطابق طے پاتے ہیں اور انہی کے مطابق اللہ یہاں معاملات کو چلاتے ہیں ۔ مومنین کو جو محدود اختیار دیا گیا ہے وہ اسے بھی اللہ کی مشیت اور تقدیر کے مطابق استعمال کرتے ہیں ۔ وہ اپنے اجسام کے اندر جاری و ساری قانون قدرت ' اپنے مزاج ' اپنے خلیوں اور اپنی عضویاتی اور نفسیاتی ساخت اور اپنے دائرہ اختیار کے اندر ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں اور اس اختیاری حصے میں وہ پابندی اللہ کی ہدایت کی وجہ سے کرتے ہیں ۔ یوں وہ خود اپنی ذات کے ساتھ بھی ہم نشینی اور مطابقت پیدا کر لیتے ہیں 'کیونکہ اس صورت میں انسان کی ذات کے اندر جاری و ساری ناموس اور ان کی اختیاری زندگی کے اندر جاری ناموس ایک ہی ناموس ہوتا ہے اور تکوینی زندگی اور اختیاری زندگی کے اندر ایک ہی حکومت چلتی رہتی ہے ۔ رہے اہل کفر تو وہ تکوینی زندگی میں تو ناموس الہیہ کی اطاعت پر مجبور ہوتے ہیں اور کسی صورت میں بھی اس سے نکل نہیں سکتے ۔ وہ اسی ناموس کے مطابق اپنی جسمانی ضروریات پوری کرتے ہیں ۔ رہی ان کی اختیاری زندگی تو اس میں وہ اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں اور اس زندگی میں وہ اللہ کے ضابطہ حکمرانی یعنی نظام شریعت کے خلاف جاتے ہیں ۔ اس تضاد کی وجہ سے ان کی پوری زندگی بے چینی سے گزرتی ہے ' اس لئے کہ وہ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہوتے ہیں اور اس سے کسی بھی وقت میں خارج نہیں ہو سکتے اور وہ اس تقدیر الہیہ کے مطابق ہی چل سکتے ہیں ۔

اس سورہ کا بقیہ حصہ اسی تیسری حقیقت سے بحث کرتا ہے ۔ متعدد مقامات میں اور بار بار تکرار کے ساتھ اس حقیقت کو اس میں بیان کیا گیا ہے ۔ جیسا کہ اس سے قبل ہم اس نکتے کو بیان کر کے آئے ہیں اس سورہ میں اللہ کی حاکمیت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کی بحث ہو گی کہ اللہ کی حاکمیت کس طرح لوگوں کی زندگی اور ان کے شرعی عمل میں کارفرما ہو گی ۔ یہی وجہ ہے کہ اس حصے میں انداز کلام یوں ہو گا کہ اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کے لئے ہو گا ۔ یہاں تک کہ جو لوگ اللہ کے نافرمان اور باغی ہیں وہ بھی اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں ۔ یہ باغی بھی اللہ کے دوستوں کو کوئی تکلیف نہیں دے سکتے ' الا ماشاء اللہ ' اس لئے کہ وہ اس قدر عاجز ہیں کہ وہ خود اپنی ذاتوں پر قادر نہیں ہیں ۔ وہ اہل ایمان پر قدرت کس طرح رکھیں گے ۔ یہ صرف ذات باری کی مشیت ہے جو بیک وقت اہل ایمان اور اہل کفر پر حکمران ہے ۔

ابو جعفر محمد ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں :

"اللہ تعالیٰ اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہیں : اے محمد ان لوگوں کی نجات اور فلاح سے آپ اپنے آپ کو مایوس کر دیں کیونکہ یہ لوگ بتوں اور مورتیوں کو اللہ کے برابر ٹھہراتے ہیں ۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی معجزہ یا نشانی آجائے تو وہ ایمان لائیں گے ۔ اگر ہم ملائکہ بھی بھیج دیں اور یہ لوگ انہیں اپنی آنکھوں سے

دیکھ لیں اور مردے اٹھ کر ان کے ساتھ بات کرنا شروع کر دیں' مثلاً اگر ہم ان کو معجزانہ طور پر زندہ کر دیں اور بطور ثبوت آپ کی نبوت پر پیش کر دیں اور وہ مردے کہہ دیں کہ آپ برحق ہیں اور یہ کلام' کلام الہی ہے اور ہم ان پر تمام مخلوق کو اٹھا کر ان کے سامنے پیش کر دیں تو بھی یہ نہ تو ایمان لائیں گے اور نہ آپ کی تصدیق کریں گے - الا ماشاء اللہ جن کے بارے میں اللہ چاہے' لیکن ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں - یعنی وہ نہیں جانتے کہ معاملات کس نہج پر جارہے ہیں - وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایمان وکفران کے دائرۂ اختیار میں ہے جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر اختیار کرے حالانکہ بات اس طرح نہیں ہے - یہ تمام امور تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں - ان میں سے کوئی اس وقت تک ایمان نہیں لاسکتا جب تک اللہ کی ہدایت و توفیق شامل حال نہ ہو - اور کفر بھی فقط وہی اختیار کرے گا جسے اللہ شرمندہ کر کے گمراہ کر دے -"

یہاں ابن جریر جس اصول کا ذکر کر رہے ہیں وہ صحیح ہے لیکن اس امر اور نکتے کی مزید وضاحت کی ضرورت ہے - اور یہی تو وہ منہج ہے جس کی تشریح ہم نے گزشتہ صفحات میں کی اور یہ نکتہ ہم نے ہدایت و ضلالت کے بارے میں آنے والی تمام نصوص پر غور کرنے کے بعد سمجھا ہے - اس لئے کہ ایمان وکفر دونوں حادث ہیں اور کوئی حادث اللہ کی مشیت کے بغیر حادث ہو ہی نہیں سکتا - کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں -

(اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ) ہم نے ہر چیز کو ایک مقدار کے ساتھ پیدا کیا ہے -" رہی وہ سنت الہیہ جس کی اساس پر کوئی گمراہ بن جاتا ہے اور کوئی راہ ہدایت پاتا ہے تو اس کا بیان ان ہی نصوص میں ہوا ہے - انسان اپنے مقدار اختیار کے مطابق آزمائش میں ہے - جب وہ راہ ہدایت کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اللہ اسے ہدایت دیتا ہے اور یہ سہولت بھی اسے تقدیر الہی کے مطابق ملتی ہے اور جب کوئی شخص راہ راست کو ناپسند کرنے لگے اور غلط راہ کو اختیار کرے تو اللہ اسے گمراہ کر دیتا ہے اور یہ ضلالت بھی تقدیر الہی کے مطابق ہوا کرتی ہے - دونوں قسم کے حالات میں انسان اللہ کے قبضہ قدرت میں اور اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے تحت ہوتا ہے - اس کی زندگی اللہ کی تقدیر کے مطابق ہی چل رہی ہوتی ہے یعنی سنت الہیہ کے مطابق - اور اللہ کی تقدیر اور اس کی مشیت بے قید ہے -

---ooo---

اس کے بعد سیاق کلام میں دو آیات آتی ہیں اور ان آیات میں وہی مفہوم بیان ہوئے ہیں جن کے بارے میں اوپر ہم تفصیلاً بات کر آئے ہیں - دوسری جانب یہ دو آیات اللہ کی حاکمیت' اس کے اقتدار اعلیٰ اور نظام شریعت کے بارے میں آنے والی تصریحات کے لئے تمہیدی آیات ہیں کیونکہ اس سورہ کے بقیہ حصے میں یہی مضامین ہیں - وہ دو آیتیں یہ ہیں :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا

يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوا مَا هُمْ مُقْتَرِفُونَ﴿۱۱۳﴾

"اور ہم نے تو اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے رہے ہیں۔ اگر تمہارے رب کی مشیت یہ ہوتی کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کرتے۔ پس تم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ اپنی افترا پردازیاں کرتے رہیں۔ (یہ سب کچھ ہم انہیں اسی لئے کرنے دے رہے ہیں کہ) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل اس خوشنما دھوکے کی طرف مائل ہوں اور وہ اس سے راضی ہو جائیں اور ان برائیوں کا اکتساب کریں جن کا اکتساب وہ کرنا چاہتے ہیں۔

یوں ہم نے انسان کے لئے مقدر کر دیا ہے کہ جو مشرکین اپنے ایمان کو ایسی باتوں پر موقوف کرتے ہیں جو خوارق عادت ہیں اور اپنے انفس اور اپنے آفاق و ماحول میں اس پھیلی ہوئی کائنات کے اندر دلائل ہدایت اور نشانات راہ پر غور نہیں کرتے تو اگر ان کے پاس ہزار معجزات اور خوارق عادت واقعات آجائیں وہ ایمان نہ لائیں گے۔

ان لوگوں کی تقدیر کو ہم نے اسی طرح بنا دیا ہے۔ ہم نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ہر نبی کے بالمقابل انسانوں اور جنوں میں سے کچھ شیاطین اٹھ کھڑے ہوں گے اور ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان میں سے بعض، بعض دوسروں پر خوش آئند باتیں القا کرتے ہیں۔ اور یہ عوام الناس کو دھوکہ اور فریب دیتے ہیں اور یوں وہ رسولوں کے ساتھ دشمنی کر کے لوگوں کو فریب دیتے ہیں حالانکہ درحقیقت وہ ہدایت کے ساتھ برسرپیکار ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہماری سنت اور ہماری اسکیم ہے کہ ان شیطانوں کی باتوں کی طرف وہ لوگ بڑے شوق سے کان رکھتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اپنی اس روش پر راضی ہیں اور گناہ کماتے ہیں جس میں وہ مصروف ہیں یعنی رسولوں کی عداوت اور اس کرۂ ارض پر فساد اور گمراہی کو پھیلانا۔

یہ سب واقعات تقدیر الٰہی کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اس کی مشیت کے مطابق واقع ہوتے ہیں اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو یہ لوگ ایسا رویہ اختیار نہ کرتے اور واقعات کا رخ بالکل الٹی سمت ہوتا اور اللہ کی تقدیر بالکل دوسری سمت پر چلتی۔ اس لئے کہ یہ واقعات محض اتفاق کے طور پر واقع نہیں ہوتے اور نہ دنیا میں رونما ہونے والے واقعات خود حضرت انسان کی اپنی طاقت اور قوت سے رونما ہوتے ہیں۔

جب یہ بات طے ہوگئی کہ اس جہاں میں حق و باطل کا جو معرکہ برپا ہے اور جس کے فریق ایک جانب سے رسول اور ان کے ساتھ کی سچائی ہے اور دوسرا فریق انسانوں اور جنوں کے شیاطین ہیں جن کے ساتھ باطل، فریب اور دھوکہ ہے اور جب یہ بات بھی طے ہوگئی کہ یہ پوری کشاکش، حق و باطل کی کشمکش، اللہ کی مشیت اور اس کی تقدیر کی اسکیم کے تحت جاری ہے تو ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس حکمت اور تدبیر پر غور کرے جو اس کشاکش کی تہ میں کارفرما ہے اور اس سے قبل بندۂ مومن کو چاہیے کہ وہ ان واقعات کی تہ تک پہنچنے کی سعی کرے۔

(وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (٦: ١١٢) "اور ہم نے تو اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان

جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القاکرتے رہے ہیں۔"
یعنی اپنے ارادے اور تقدیر کے مطابق ہم نے ایسا کیا ہے۔ ہر نبی کا ہم نے ایک دشمن پیدا کیا ہے۔ یہ دشمن انسانوں اور جنوں میں سے وہ لوگ ہوتے رہے ہیں جو شیطان تھے۔ شیطنت کے معنی نافرمانی اور حکم عدولی کے ہیں۔ شیطنت کا مفہوم ہے مجسمہ شر ہونا۔ یہ ایسی صفت ہے جس سے انسان بھی متصف ہوتے ہیں اور جن بھی۔ اگر کوئی مجسمہ شر ہو تو اگر جن ہو تو وہ جن شیطان ہے اور اگر انسان ہو تو وہ انسان شیطان ہے۔ بعض اوقات اس صفت کے ساتھ ایک حیوان بھی متصف ہوتا ہے جبکہ وہ نافرمان' سرکش اور حملہ آور ہو' اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے کہ سیاہ کتا شیطان ہوتا ہے۔"

یہ جنی اور انسی شیاطین جن کے بارے میں فیصلہ الٰہیہ ہے کہ وہ ہر نبی کے دشمن ہوں گے' یہ ایک دوسرے کو چکنی چپڑی باتوں سے دھوکہ دیتے ہیں اور یہ باتیں وہ ایک دوسرے پر القاکرتے ہیں۔ وحی کے مفہومات میں سے ایک مفہوم یہ ہے کہ کسی ایک جان سے دوسری جان کی طرف ایک خفیہ اور داخلی اثر منتقل ہو۔ یا کوئی ایک شخص دوسرے کو دھوکہ دے اور لوگ ایک دوسرے کو سرکشی' نافرمانی اور شرو معصیت کے لئے ابھاریں۔

ان شیاطین میں سے جو انسان ہیں ان کی سرگرمیاں معروف و مشہور ہیں اور اس کرۂ ارض پر ہم ان کو رات و دن دیکھتے ہیں۔ ان کے نمونے اور ماڈل اور انبیاء کے مقابلے میں ان کی سرگرمیاں معلوم و معروف ہیں۔ ہر دور کے انسانوں نے اسے دیکھا ہے اور اب بھی دیکھ رہے ہیں۔

رہے وہ شیطان جن کا تعلق جنات سے ہے تو وہ اللہ کے غیبی امور میں سے ایک امر ہے۔ ان کے بارے میں ہم صرف اسی قدر جانتے ہیں جس قدر اللہ اور رسول نے ہمیں بتایا ہے۔ اس لئے کہ مفاتیح غیب صرف اللہ کے پاس ہیں اور ان کے بارے میں اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ بات کہ اس کرۂ ارض پر معروف و مشہور ذی روح اشیاء کے علاوہ بھی کوئی مخلوق ہے' تو اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں اطلاع دی ہے۔ اور اس مخلوق کے بارے میں اللہ نے جو اطلاع دی ہے اس کے حدود کے اندر ہم ایمان لاتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو سائنس کو ڈھال بنا کر اللہ کی ایسی کسی مخلوق کا انکار کرتے ہیں تو ہمیں معلوم نہیں ہے کہ وہ کن دلائل پر انحصار کرتے ہوئے ایسا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ انسانی علم نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ انسان نے تمام قسم کی ذی روح اشیاء کو معلوم کر لیا ہے۔ خصوصاً اس چھوٹے سے ستارے کرۂ ارض کے اندر بھی جبکہ دوسرے بے شمار اجرام فلکی کے بارے میں سائنس کے پاس ابھی تک ابتدائی معلومات ہی ہیں' صرف یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر جس قسم کی مخلوق ہے وہ بعض دوسرے ستاروں میں ممکن ہے یا نہیں ہے۔ اس سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ زندگی کی ایک مختلف قسم اور زندہ اور ذی روح مخلوقات کی کوئی دوسری جنس و صنف ممکن نہیں ہے جس کا علم سائنس کو نہ ہو۔ اس لئے کہ سائنس کے عنوان سے کوئی جاہل ہی ہوگا جو اس جہان سے آگے دوسرے جہانوں کا انکار کرتا ہو۔ ہوسکتا ہے بے شمار ایسی مخلوقات ہوں۔

اس اصولی عقیدے کے بعد اب یہ بات کہ اس مخلوقات کا مزاج کیا ہوتا ہے اور اس کی طبعی زندگی کیسی ہوتی ہے تو اس کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔ اس بارے میں ہم اسی قدر جانتے ہیں جس قدر مخبر صادق حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا ہے۔

ہم اس قدر جانتے ہیں کہ یہ مخلوق ناری مخلوق ہے۔ یہ مخلوق زمین کے اوپر' زمین کے اندر اور اس سے خارج میں

بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ یہ مخلوق نہایت ہی سریع الحرکت ہے۔اس مخلوق میں سے بعض لوگ صالح اور مومن ہیں' بعض شیاطین اور سرکش ہیں۔وہ انسانوں کو دیکھ سکتے ہیں اور انسان ان کو نہیں دیکھ سکتے۔یعنی ان کی اصلی شکل میں۔ اور کتنی ہی مخلوق ہے جسے انسان نظر آتا ہے لیکن انسانوں کو وہ نظر نہیں آتی۔بعض شیاطین ایسے ہیں جو انسانوں پر مسلط کر دیئے گئے ہیں اور وہ انسانوں کو دھوکہ و فریب دے کر گمراہ کرتے ہیں لیکن ان کو اللہ کے خاص بندوں پر کوئی قدرت حاصل نہیں ہوتی جو اللہ کو یاد کرنے والے اور پختہ ایمان کے مالک ہوتے ہیں۔شیطان ہر وقت مومن کے ساتھ لگا ہوا ہوتا ہے۔ جب مومن اللہ کو یاد کرتا ہے تو وہ چھپ جاتا ہے اور بھاگ جاتا ہے اور جب وہ غافل ہوتا ہے تو پھر وسوسے ڈالتا ہے۔ مومن جب یاد الہی سے سرشار ہوتا ہے تو اس کے مقابلے میں شیطان کا مکر کمزور ہو جاتا ہے۔جنوں کا حشر و نشر بھی اس طرح ہو گا جس طرح انسانوں کا حشر و نشر ہو گا۔اسی طرح ان کا بھی حساب و کتاب ہو گا۔اسی طرح جنت کی جزاء اور دوزخ کی سزا کے وہ بھی مستوجب ہوں گے۔جنات کا جب فرشتوں سے سامنا ہوتا ہے تو وہ بہت ہی ضعیف نظر آتے ہیں اور ان کے پاس کوئی قوت نہیں ہوتی۔اس آیت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کے مقابلے میں جنوں اور انسانوں میں سے اپوزیشن کو کھڑا کیا ہے۔

اللہ کی ذات تو اس بات پر قادر تھی کہ اگر اس کی مشیت کا تقاضا ہوتا تو جن یہ طرز عمل اختیار نہ کرتے۔وہ سرکشی نہ کرتے اور مجسمہ شر ہرگز نہ بنتے۔وہ انبیاء کے دشمن نہ ہوتے' اہل ایمان کو اذیت نہ دیتے اور عوام الناس کو اللہ کی راہ سے برگشتہ نہ کرتے۔اللہ تو اس بات پر قادر تھا کہ انہیں مجبور کر کے ہدایت کی راہ پر ڈال دیتا اور ان کو ہدایت دے دیتا بشرطیکہ وہ ہدایت کی طرف متوجہ ہوتے اور یوں وہ انبیاء کی دشمنی' حق کی مخالفت اور مومنین سے عداوت نہ کرتے۔لیکن اللہ نے ان کو ایک حد تک اختیار اور آزادی دے دی اور ان کو یہ اذن دے دیا کہ وہ اللہ کے دوستوں پر دست درازیاں کرتے پھریں۔اللہ کی مشیت اور اس کی اسکیم تقدیر کے مطابق تاکہ اس کے دوستوں کی آزمائش ہو سکے اور یہ آزمائش اس کے دشمنوں کے ذریعے ایذا رسانی سے ہو۔جس طرح اللہ اپنے دشمنوں کو قوت' اختیار اور آزادی کی ایک محدود مقدار عطا کر کے آزماتا ہے۔دشمن بھی اللہ کے دوستوں کو اسی حد تک اذیت دے سکتے ہیں جس حد کو اللہ نے مقرر کیا ہے۔

(وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ (۶ : ۱۱۲) اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا کر ہی نہ سکتے۔" سوال یہ ہے کہ اس ہدایت سے ہمارے لئے کیا نتائج نکلتے ہیں؟

۱۔ یہ کہ جو لوگ انبیاء کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور انبیاء کے متبعین کو اذیت دیتے ہیں وہ شیطان ہوتے ہیں۔یہ شیطان انسانوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور جنات سے بھی۔جنوں کے شیطان اور انسانوں کے شیطان دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں اور دونوں کے کام کی نوعیت بھی ایک جیسی ہوتی ہے۔وہ ایک دوسرے کو دھوکہ اور فریب دیتے ہیں اور گمراہ کرتے ہیں جبکہ سب کی مشترکہ خاصیت یہ ہے کہ وہ سرکش' گمراہ اور اللہ کے دشمن ہوتے ہیں۔

۲۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ شیاطین جو انبیاء کے دشمن ہوتے ہیں اور انبیاء کے متبعین کو اذیت دیتے ہیں' یہ اپنی کسی ذاتی قوت یا صلاحیت کی بنیاد پر ایسا نہیں کرتے۔یہ تو سب کے سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کے ذریعے اللہ اپنے بندوں اور دوستوں کو آزماتا ہے اور یہ آزمائش بھی گہری حکمت پر مبنی ہوتی

ہے۔ تاکہ لوگوں کو چھان پھٹک کر دیکھ لیا جائے' ان کے دلوں کو صاف کیا جائے۔ ان کے صبر کا امتحان لیا جائے' ان کی قوت برداشت اور امانت و دیانت کو آزمایا جائے۔ جب بھی وہ اس آزمائش میں کامیاب ہوگئے یہ آزمائش اور امتحان ختم ہو جاتا ہے اور مخالفین کی مخالفت ختم ہو جاتی ہے۔ اب دشمن دست درازی کرنے پر قدرت نہیں رکھتے۔ اس لئے کہ اللہ کی اسکیم تقدیر ختم ہو جاتی ہے اور اب ان کے دشمن کمزور اور ناکام ہو جاتے ہیں۔ ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے کرتوتوں کا بوجھ اٹھائے اللہ کی طرف لوٹ رہے ہوتے ہیں۔

(وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ) اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔"

۳۔ یہ کہ یہ اللہ کی حکمت کا تقاضا تھا کہ وہ شیاطین جن اور شیاطین انس کو یہ مہلت عطا کرے کہ وہ شیطنت کرتے پھریں اس لئے کہ اللہ نے ان شیطانوں کو جو مہلت اور طاقت دی ہوئی ہے اس میں ان کو آزمائے' تاکہ وہ ایک وقت تک اللہ کے دوستوں کو اذیت دیتے رہیں۔ اس طرح اللہ اپنے دوستوں کو بھی آزماتا ہے تاکہ دیکھا جائے کہ وہ صبر کرتے ہیں؟ کیا ان کے پاس جو سچائی ہے اس پر وہ ثابت قدم رہتے ہیں جبکہ باطل ان پر زور آور ہو رہا ہے اور دست درازی کر رہا ہو۔ کیا وہ اپنے نفوس کو اللہ کے ہاں پوری طرح فروخت کرتے ہیں اور خوشی اور دکھ دونوں حالتوں میں' تنگی و ترشی میں اور فراوانی اور خوشحالی دونوں میں اللہ کے عہد پر پختہ رہتے ہیں؟ ورنہ یہ تو اللہ کے دائرۂ قدرت میں تھا کہ وہ اس تمام کھیل کو شروع ہی نہ کرتا۔

۴۔ یہ کہ جن و انس کے تمام شیاطین کی مکاری کی کوئی بھی حقیقت نہیں ہے' یہ تو بہت ہی کمزور مخلوقات ہیں۔ ان کے پاس ان کی کوئی ذاتی قوت اور طاقت نہیں ہے۔ وہ تو ان حدود و قیود کے اندر کام کر سکتے ہیں جو انکے لئے اللہ نے مقرر فرمائی ہیں۔ وہ مومن جو اس بات کو جانتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ قادر مطلق تو . ہے' وہی ہے جس نے ان لوگوں کو اجازت دے رکھی ہے' تو اس کی نظروں میں یہ شیاطین ضعیف ہوتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر وہ قہار و جبار نظر آئیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضور کو متوجہ کر دیا جاتا ہے۔ (فذرھم وما یفترون) چھوڑ دیجئے ان کو اور ان کی افتراء پردازی کو۔ میں قادر مطلق ہوں اور ان کے جرائم کی سزا ان کے لئے تیار ہے۔

۵۔ ان اہل ایمان اور شیاطین کے ابتلاء کے علاوہ ایک اور حکمت بھی ہے۔ یہ عداوت اور یہ گمراہی پھیلانا اور قول و فعل سے یہ وسیع فریب کاری' اللہ نے اس کا اذن اس لئے بھی دے رکھا ہے :

(وَلِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْئِدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ (٦ : ١١٣)" (یہ سب کچھ ہم انہیں اس لئے کرنے دے رہے ہیں) کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل اس طرف مائل ہوں اور وہ اس سے راضی ہو جائیں اور ان برائیوں کا اکتساب کریں جن کا اکتساب وہ کرنا چاہتے ہیں۔"

یعنی جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ ان ہدایات پر کان نہیں دھریں گے اور ان شیطانوں کی وسوسہ اندازی پر توجہ دیں گے۔ اس لئے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کی تمام صلاحیتیں دنیاوی کاموں میں صرف ہوتی

ہیں۔ایسے لوگ جب دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر موڑ پر یہ شیاطین بیٹھے ہوئے ہیں اور نبی کے مخالف ہیں 'نبیوں کے متبعین کو رات اور دن اذیت دیتے ہیں اور یہ شیاطین ایک دوسرے کے مددگار ہیں' ایک دوسرے کی باتوں کو مزین بناتے ہیں اور ایک دوسرے کی قولی اور فعلی تائید کرتے ہیں۔اس لئے یہ دنیا پرست لوگ شیاطین کے تابع ہو جاتے ہیں اور ان کے اس باطل رعب و داب اور شان و شوکت سے مرعوب ہو جاتے ہیں حالانکہ ان کا یہ اقتدار اور قوت نہایت ہی کمزور ہوتی ہے۔ چنانچہ یوں وہ بھی برائی اور گناہ کماتے ہیں اور شر' معصیت اور فساد کے پھیلانے میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اس توجہ اور اصغاء کی وجہ سے یہ دنیا پرست شیطانی ہدایات لیتے رہتے ہیں۔

یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ اس کا یونہی چلنا منصوبہ تقدیر الٰہیہ کے مطابق تھا۔کیونکہ اس عمل کے ذریعے اپنے بندوں کی آزمائش کرکے اللہ ان میں سے کھرے اور کھوٹے کو سامنے لانا چاہتے تھے۔نیز اس اسکیم کے مطابق اللہ ہر شخص کو آزادی کے ساتھ ایک راہ پر چلانا چاہتے تھے تاکہ وہ قیامت کے دن اپنے عمل کے ساتھ بالکل مناسب جزا کا مستحق بن جائے۔

نیز یہ مقصد بھی تھا کہ اس کشمکش حق و باطل کے ذریعے دنیا میں اصلاحی کام جاری رہ سکے۔حق باطل سے علیحدہ ہوکر ممتاز ہو جائے اور صبر کے صیقل کے ذریعے خیر صاف ستھری ہوکر سامنے آجائے۔شیاطین قیامت کے دن اپنے کئے کا پورا پورا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں اور یہ تمام اسکیم اللہ کی مشیت کے مطابق جاری و ساری رہے۔اسی اسکیم کے مطابق معاملہ اللہ کے دوستوں کا بھی طے ہو اور اسی کے مطابق معاملہ اللہ کے دشمنوں کا بھی طے ہو۔یہ ہے اللہ کی اسکیم مشیت اور اللہ جو چاہتا ہے' وہ کرتا ہے۔

اب ذرا اس منظر پر غور کریں' اس میدان معرکہ میں ایک جانب جن و انس کے تمام شیطان اور ان کے دوست و مددگار کھڑے ہیں اور دوسری جانب انبیائے کرام اور ان کے تمام متبعین کھڑے ہیں اور اس کشمکش میں ایک تیسری اور فیصلہ کن قوت اللہ کی مشیت' اس کا غلبہ اور اس کا اقتدار اعلیٰ ہے۔اس منظر کے یہ تین پہلو ہیں اور ہمیں چاہیے کہ ہم ذرا توقف کر کے اس پر گہری نگاہ ڈالیں۔

یہ ایک ایسا معرکہ ہے کہ اس میں اس کائنات میں شر کی تمام قوتیں جمع ہو رہی ہیں۔جن شیطان اور انسان شیطان شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔یہ اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر رہے ہیں اور نہایت ہی تعاون اور ہم آہنگی سے کام کر رہے ہیں۔ان لوگوں کا مشترکہ منصوبہ یہ ہے کہ یہ تمام انبیاء' ان کی دعوت اور ان کے حامیوں کے دشمن ہیں۔اور ان کا ہدف اور منصوبہ متعین ہے۔"یہ ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القاکر رہے ہیں۔یہ ایک دوسرے کی مدد تمام وسائل کے ساتھ کرتے ہیں جن میں فریب کاری اور دھوکہ بازی کے تمام ذرائع شامل ہیں اور یہ خود آپس میں بھی ایک دوسرے کو گمراہ کرتے ہیں اور جب بھی حق اور سچائی کے مطابق کوئی مجمع جمع ہوتا ہے تو اس مجمع کی اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ ایک دوسرے کو بھی فریب دیتے ہیں۔وہ باہم تعاون کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو گمراہ کرتے ہیں اور اس گمراہی میں ایک دوسرے کے معاون بنتے ہیں۔یہ لوگ ایک دوسرے کو حق کی کوئی بات نہیں بتاتے۔بلکہ وہ ایک دوسرے کے سامنے سچائی کی دشمنی کو ایک بڑا جہاد کہہ کر پیش کرتے ہیں اور یہ عزم کرتے ہیں کہ وہ اس سچائی کے ساتھ طویل عرصے تک لڑیں گے۔

ان قوتوں کی یہ مکاری مکمل طور پر آزاد اور بے قید بھی نہیں ہے۔اس کے ارد گرد مشیت الٰہیہ کا ایک وسیع دائرہ

ہے - یہ شیاطین جو سرگرمیاں بھی دکھاتے ہیں وہ اللہ کی مشیت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے دکھاتے ہیں - یہ مشیت کا دائرہ اللہ کی تقسیم کا دائرہ ہے - یہیں سے اللہ کے بندوں کی نظروں میں شرکی قوتوں کا یہ اکٹھ اور ان کی پشت پر عالمی تائید پر کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی - یہ مقید اور پابزنجیر ہے - یہ اکٹھ اور گٹھ جوڑ بے قید اور آزاد نہیں ہے - اللہ جس طرح چاہتا ہے 'کرتا ہے اور یوں نہیں کرتا کہ ہرکوئی ان کے اس جال میں بغیر کسی مدافعت اور مقاومت کے پھنس جائے جس طرح ہمیشہ تمام سرکش شیاطین چاہتے ہیں کہ انہیں بے قید حاکمیت حاصل ہو اور لوگ ان کی غیر مشروط اطاعت کریں اور ان کی مرضی اور خواہش کے اوپر عمل پیرا ہوں - ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ان سرکشوں کی تمام سرگرمیاں اللہ کی مشیت اور اس کی تقدیر اور ضوابط کے اندر محدود ہیں - یہی وجہ ہے کہ یہ شیطانی قوتیں اللہ کے دوستوں کو کوئی اذیت اور نقصان نہیں پہنچاسکتیں - ہاں اس قدر اذیت یہ ضرور پہنچا دیتے ہیں جس قدر اللہ میاں اپنے دوستوں کی آزمائش کے طورپر اجازت دیں - آخر کار تمام معاملات اللہ کی طرف لوٹ جاتے ہیں -

لیکن شرکی قوتوں کا یہ اکٹھ اور ان کا باہم تعاون اہل حق کے لئے بھی ایک نکتہ تفکیر ہے - ان کو غور و فکر کر کے شر کی قوتوں کے اس منصوبے کو سمجھنا چاہیے اور شر کے وسائل کو بھی زیر نظر رکھنا چاہیے - اسی طرح یہ منظر کہ اللہ کی مشیت اور تقدیر ان لوگوں کی تمام سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے ہے یہ بھی اہل حق کے لئے ایک بشارت ہے - اس سے بھی اہل حق کو یقین اور اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ آخر کار وہ کامیاب رہیں گے - اس لئے ان کی نظریں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی قوت قاہرہ پر مرکوز رہنی چاہئیں جو ہمیشہ نافذ اور کارگر رہتی ہے - اور آخر کار اللہ کا اقتدار اعلیٰ قائم ہوتا ہے اور حق کو غلبہ نصیب ہوتا ہے' اس لئے اہل حق کو چاہیے کہ وہ اپنے یقین اور عقیدے کو اللہ کی ذات کبریا کے ساتھ وابستہ رکھیں خواہ شیطان چاہے یا نہ چاہے - اور وہ اپنی راہ پر اس طرح گامزن ہوں کہ ان کے اخلاق و اعمال میں سچائی رچی بسی ہو' ان کے دل و دماغ حق سے سرشار ہوں - رہی شیطانوں کی دشمنی اور ان کی مکاری تو اہل حق کو چاہیے کہ ان کو اللہ کی مشیت اور قدرت کے حوالے کر دیں جو ہر صورت میں کامیاب اور غالب رہتی ہے - اس لئے کہ یہ سب امور اللہ کی مشیت کے مطابق چلتے ہیں اور "اگر تمہارے رب کی مشیت ہوتی تو وہ ایسا نہ کرتے پس انہیں چھوڑ دیں جو چاہیں افتراپردازیاں کرتے پھریں -"

---ooo---

# درس ٦٨ ایک نظر میں

اب یہاں سے وہ موضوع شروع ہوتا ہے جو اس پوری سورہ کا موضوع ہے اور اس موضوع کے بارے میں تمہیدی باتیں اس سورہ میں جگہ جگہ آتی رہی ہیں۔ ان میں سے آخری تمہیدی بات وہ عظیم نظریاتی مسئلہ ہے جو سابقہ دو آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ نیز وہ نظریاتی کشمکش ہے جو حق و باطل کے درمیان برپا رہی ہے اور اس کشمکش کے درمیان شیاطین جن اور شیاطین انس اور دوسری جانب سے انبیاء اور ان کے متبعین کے درمیان دشمنی رہی ہے اور اس پر آخرکار اللہ کی مشیت غالب رہی ہے اور پھر یہ بیان کہ ہدایت و ضلالت سنت الہیہ کے مطابق اور مشیت الہیہ کے تحت ہوتی ہے۔ یعنی درس سابق کے آخر میں آنے والے تمام مباحث جن پر تفصیلی بحث کی گئی ہے بطور تمہید آئے ہیں۔

اب روئے سخن اس اصل موضوع کی طرف آتا ہے جس کے لئے یہ تمام باتیں بطور تمہید تھیں۔ یہ موضوع تھا مسئلہ ما اهل به لغير الله یعنی ان چیزوں کی حلت اور حرمت کا مسئلہ جن پر ذبح کے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ اس مسئلہ کی اہمیت اسلام کے اس اولین اصول کی وجہ سے ہے کہ اسلام میں حق حاکمیت صرف اللہ کو حاصل ہے' اور اقتدار اعلیٰ کا مستحق صرف اللہ ہے۔ کسی انسان کو اللہ کے حق حاکمیت کو کسی صورت میں بھی استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اور اگر مسئلہ اصولی اور نظریاتی ہو تو اس میں چھوٹی سی بات بھی ایک نہایت ہی عظیم معاملے کی طرح اہم ہو جاتی ہے۔ یہ بات اہم نہیں ہے کہ یہ ایک ذبیحہ کا مسئلہ ہے یا یہ کہ یہ اس قدر معمولی مسئلہ ہے کہ ایک متعین جانور کا گوشت کھانا جائز ہے یا ناجائز ہے یا یہ معاملہ ہے کہ ایک مملکت کا اقتدار اعلیٰ کس کو حاصل ہو یا کسی معاشرے میں اقتدار اعلیٰ کس کا ہو گا۔ اصولوں کے اس معاملے میں دونوں باتوں کی اہمیت برابر ہے کیونکہ دونوں میں ایک شخص اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ حاکمیت کس کو حاصل ہے اللہ کو یا کسی اور کو۔ یا یہ کہ اقرار حاکمیت الہیہ ہے یا اس کا انکار ہے۔

اسلامی نظام حیات اور قرآن اس اصول پر ہر جگہ زور دیتا ہے اور چاہے معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا' ہر جگہ اس اصول کو بتکرار اور بتاکید مزید پیش کیا جاتا ہے' اس لئے کہ یہ اصول نہایت ہی اہم نظریاتی اصول ہے۔ یہ اصول اسلام ہے اور یہی دین ہے۔ اس اصول کے علاوہ جو مسائل بھی ہیں وہ اس اصول کی عملی تطبیق اور تشریح ہیں اور تفصیلی نتائج ہیں۔

سورہ کے زیر بحث حصے میں یا سورہ کی تمام دوسری آیات میں ہم اس حقیقت کو پالیں گے کہ قرآن میں اس اصول کو بتکرار دہرایا گیا ہے اور مختلف شکلوں میں اسے لایا گیا ہے۔ جب دور جاہلیت کے قانون' نظام اور رسم و رواج پر بحث ہوتی ہے تو بھی اس اصول کو دہرایا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قوانین اور رسوم و رواج شرک ہیں اور اسلام سے سرکشی کے مترادف ہیں۔ اور یہ قوانین و ضوابط اس نظریہ سے پیدا ہوئے کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام ایسے قوانین اور ایسے رسوم و رواج پر سخت ترین تنقید کرتا ہے۔ اور یہ تنقید مختلف اسالیب اور مختلف طرز ادا میں کی گئی ہے۔ لیکن اس تنقید کا اصل محور یہی اسلام کا اصول اعظم ہے کہ اس کائنات پر مقتدر اعلیٰ صرف اللہ ہے۔ یہی اصل اسلام اور اصل ایمان ہے۔

# درس ٦٨ تشریح آیات

## ۱۱۴ --- تا --- ۱۲۷

آغاز کلام اس سوال سے ہوتا ہے کہ لوگوں کے معاملات میں حاکم اعلیٰ کون ہے؟ اور یہ بات اس لئے لائی گئی ہے کہ آگے جاکر یہ بتایا جائے کہ ذبیحوں میں بھی حلال قرار دینے اور حرام قرار دینے کے اختیارات صرف اللہ جل شانہ کے ہاتھ میں ہیں۔ ذبائح کے معاملے میں مشرکین حق حاکیت الٰہیہ پر دست درازی کرتے تھے اور یہ کام وہ خود ذات باری پر افتراء پردازی کرتے ہوئے کرتے تھے۔ چنانچہ اس بارے میں ایک طویل تمہیدی بات اس طرح شروع کی جاتی ہے۔

أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ
مُفَصَّلًا ۚ وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِّن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ ۖ
فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿١١٤﴾ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ لَّا مُبَدِّلَ
لِكَلِمَاتِهِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١١٥﴾ وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ
يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ
﴿١١٦﴾ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ مَن يَضِلُّ عَن سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿١١٧﴾

"پھر جب حال یہ ہے تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں' حالانکہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کر دی ہے؟ اور جن لوگوں کو ہم نے (تم سے پہلے) کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمہارے رب ہی کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے لہذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو۔ تمہارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے' کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور

وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے ۔

اور اے نبی ؐ، اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو گے جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے ۔ وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں ۔ درحقیقت تمہارا رب زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے ہٹا ہوا ہے اور کون سیدھی راہ پر ہے ۔

یہ اہم تمہیدی امور یہاں اس لئے لائے گئے ہیں کہ اصل موضوع پر کلام کیا جا سکے ۔ اس کے بعد اس تمہید اور موضوع دونوں کو مسئلہ کفر و ایمان کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہے ۔

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ ﴿١١٨﴾ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ۗ

”پھر اگر تم لوگ اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اس کا گوشت کھاؤ ۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو؟ حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالت اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے ان کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے ۔“

اس سے قبل کہ اس تمہید کے بعد حلال و حرام کا آخری فیصلہ دے دیا جائے بعض دوسری ہدایات اور نتائج دیئے جاتے ہیں جو امر و نہی کے بیان اور وعید اخروی اور ضروری تنبیہ پر مشتمل ہیں :

وَإِنَّ كَثِيرًا لَيُضِلُّونَ بِأَهْوَائِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ ﴿١١٩﴾ وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ ﴿١٢٠﴾

”بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بنا پر گمراہ کن باتیں کرتے ہیں ، ان حد سے گزرنے والوں کو تمہارا رب خوب جانتا ہے ۔ تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی ، جو لوگ گناہ کا اکتساب کرتے ہیں وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے ۔“ اور اس کے بعد تحلیل و تحریم کے مسئلے کو لیا جاتا ہے اور اسے اسلام اور شرک کا مسئلہ قرار دیا جاتا ہے ۔

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ۗ

وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰۗـِٕــهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ ۱۴
ااع لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾
ا

"اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو اس کا گوشت نہ کھاؤ' ایسا کرنا فسق ہے۔ شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔ لیکن اگر تم نے ان کی اطاعت قبول کر لی تو یقیناً تم مشرک ہو۔" اس کے بعد ایک بار پھر کفر و ایمان کی اصل حقیقت پر بات کی جاتی ہے اور دوبارہ تکرار کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں حلال و حرام قرار دینے کا تعلق کفر و اسلام سے ہے۔

یہ بار بار کی تاکید' یہ بار بار کے ربط اور بات کو دہرانے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں قانون سازی اور اقتدار اعلیٰ انسان کی روز مرہ زندگی کے اندر کس قدر اہمیت رکھتے ہیں۔

(اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۭ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (٦:١١٤))

"پھر جب حال یہ ہے تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں' حالانکہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کر دی ہے؟ اور جن لوگوں کو ہم نے (تم سے پہلے) کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمہارے رب ہی کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے' لہٰذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو۔"

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ایک سوال ہے اور یہ استفہام انکاری ہے۔ یہ تنبیہ اس بات پر کی گئی ہے کہ کسی کے لئے یہ کوئی درست رویہ نہیں ہے کہ وہ اپنی زندگی کے معاملات میں سے کسی معاملے میں بھی اللہ کے سوا کسی اور کو حاکم اور فیصلہ کنندہ تسلیم کرے۔ چنانچہ اس طرح اس بات کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ اسلامی نظام میں زندگی کے تمام معاملات میں فیصلہ صرف اللہ کے اختیار میں ہو گا اور یہ ایک غیر متنازعہ بات ہے اور اس بات کی ممانعت کر دی جاتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو انسانوں کی زندگیوں میں فیصلے کرنے کا مجاز ہو اور اپنی مرضی کے مطابق وہ ایسا کرتا رہے۔

(اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا) کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں؟" اس کے بعد اس ناگوار احساس کی تفصیل آتی ہے' ان حالات کی تفصیل بھی بیان کر دی جاتی ہے جن کی وجہ سے اللہ کے سوا دوسروں کا اقتدار اعلیٰ ایک قابل سرزنش فعل قرار پاتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کی تفصیلات دے دی ہیں اور بندوں کو اس بات کا محتاج نہیں چھوڑا کہ وہ اپنے لئے خود راہ ہدایت تلاش کرتے پھریں' یا اللہ کے سوا کسی دوسری جگہ سے اپنی زندگی کے مسائل کے فیصلے لیں۔ اور مشکلات حیات کو حل کریں۔

(وَهُوَ الَّذِیٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا) ”حالانکہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کر دی ہے۔“ یہ کتاب اس لئے نازل کی گئی ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان ان معاملات کے فیصلے کرے جن کے بارے میں ان کے درمیان اختلاف ہو اور یوں اللہ کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کا ظہور ہو۔ پھر اللہ نے یہ کتاب نہایت ہی مفصل طور پر نازل کی ہے۔ اس میں وہ تمام اصول منضبط کر دیئے گئے ہیں جن کے اوپر پورا نظام زندگی استوار ہو گا۔ اس میں بعض فروعی اور جزئی مسائل بھی بیان کر دیئے گئے ہیں جن کے بارے میں اللہ کی مرضی یہ تھی کہ وہ انسانی معاشرے کے لئے دائمی احکام ہوں چاہے وہ معاشرہ جس قدر بھی ترقی یافتہ ہو اور علمی لحاظ سے وہ بہت ہی آگے کیوں نہ بڑھ گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے ہوتے ہوئے پھر کسی دوسرے پلیٹ فارم سے فیصلہ لینے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یہ ہے وہ فیصلہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب کے مقام کے بارے میں کیا ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہتا ہے :”کہ دنیا ترقی کر چکی ہے اور اب اسے اس کتاب کی طرف رجوع کی ضرورت نہیں ہے تو ہزار بار کہتا پھرے لیکن اسے اس قول کے ساتھ ایک اور بات بھی صاف صاف کہہ دینا چاہیے وہ یہ کہ میں (نعوذ باللہ) کافر ہوں' اس دین اسلام کا منکر ہوں اور اللہ رب العالمین کے اقوال کی تکذیب کرتا ہوں۔

یہاں ان لوگوں کے ارد گرد ایک مخصوص صورت حالات بھی موجود ہے' جس کے اندر زندگی کے حالات میں سے کسی حال میں بھی اللہ کے سوا کسی اور مصدر سے فیصلہ طلب کرنا نہایت ہی مکروہ عمل قرار پاتا ہے' اور نہایت ہی عجیب سا لگتا ہے۔ وہ یہ کہ جن لوگوں کو اس سے قبل آسمانی کتابیں دی گئیں وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن بھی منزل من اللہ ہے' اس لئے کہ وہ کتب سماوی کے بارے میں زیادہ معرفت رکھنے والے ہیں۔

(وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّہٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّکَ بِالْحَقِّ (٦:١١٣) ”اور جن لوگوں کو ہم نے (تم سے پہلے) کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب ہمارے رب ہی کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔“ یہ صورت حالات مکہ مکرمہ اور جزیرۃ العرب میں موجود تھی اس لئے اللہ تعالیٰ مشرکین کو اس طرف متوجہ فرماتے ہیں۔ چاہے اہل کتاب اس حقیقت کو مان کر اعلان کر دیں جس طرح بعض لوگوں نے کیا بھی جن کے دل اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیئے تھے' یا وہ اسے چھپا دیں اور اس کا اظہار نہ کریں۔ اکثر اہل کتاب نے یہی رویہ اختیار کیا' لیکن دونوں صورتوں میں یہ حقیقت اپنی جگہ موجود تھی کہ اہل کتاب حقیقت سے باخبر تھے۔ خود اللہ تعالیٰ ان کے علم کے بارے میں شہادت دیتے ہیں اور اللہ کی شہادت سچی ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ واضح الفاظ میں فرماتے ہیں کہ یہ لوگ (یَعْلَمُوْنَ) جانتے ہیں کہ قرآن اللہ کی جانب سے سچائی لے کر نازل ہوا ہے اور اس میں صرف سچائی ہی سچائی ہے اور یہ سچائی منزل من اللہ ہے۔

آج بھی اہل کتاب اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اس دین کی قوت کا راز صرف یہ ہے کہ اس کی پشت پر عظیم سچائی ہے اور قرآن کریم اسی عظیم سچائی پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اس علم کی وجہ سے اس دین کے خلاف اس بے جگری سے مسلسل لڑ رہے ہیں۔ وہ اس کتاب سے بھی لڑتے ہیں اور ان کی یہ لڑائی اس دین کے آغاز سے آج تک جاری ہے۔ یہ

نہایت ہی شدید اور تکلیف دہ جنگ ہے۔ یہ جنگ اہل کتاب محض اس مقصد کے لئے لڑ رہے ہیں کہ مسلمانوں کی زندگی کے اوپر سے اس کتاب کی حاکمیت ختم کر دیں اور مسلمانوں کی زندگی کچھ دوسری کتابوں اور کچھ دوسرے وضعی قوانین کی حکمرانی میں آ جائے۔ وہ اللہ کے سوا کسی اور کو جج اور حاکم بنا لیں تاکہ یہ کتاب زندہ نہ رہے اور اللہ کے دین کا کوئی حقیقی وجود نہ رہے۔ ان کی کوشش ہے وہ ان اسلامی ممالک میں جہاں کبھی اللہ کی حاکمیت قائم تھی کچھ دوسری حاکمیتیں اور اقتدار قائم کر دیں حالانکہ کبھی ان ممالک میں وہ نظام اور قانون نافذ تھا جو اس کتاب میں تھا۔ صرف یہی قانون نافذ تھا اور اس میں اس کے ساتھ کوئی دوسرے قوانین شریک عمل نہ تھے۔ نہ اللہ کی کتاب کے ساتھ کچھ دوسری کتابیں بھی رائج تھیں جن سے لوگ اصول قانون اور زندگی کی دوسری اقدار اخذ کرتے ہوں اور ان کی دفعات اور آیات کو کتاب اللہ کی طرح بطور اتھارٹی پیش کرتے ہوں۔ ایسے تمام منصوبوں کے پیچھے اہل کتاب یعنی صلیبی اور صہیونی عزائم کام کر رہے ہوتے ہیں۔ اس قسم کی تمام سرگرمیاں آج بھی ان اہل کتاب ہی کی ریشہ دوانیوں سے ہوتی ہیں۔

یہاں کہا گیا کہ اللہ نے اس کتاب کو نہایت مفصل انداز میں نازل کیا ہے اور یہ کہ اہل کتاب اس بات کو اچھی طرح جانتے بھی ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے سچائی کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ اب روئے سخن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے اور آپ کے واسطہ سے تمام اہل ایمان کو یہ حقیقت بتلائی جاتی ہے اور یہ تسلی دی جاتی ہے کہ آپ اہل کتاب کے جدل وجدال اور تکذیب اور روگردانی سے دل تنگ نہ ہوں۔ وہ جو حق کو چھپا رہے ہیں جانتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے۔ یہ بات آپ کے لئے گرانبار نہ ہو۔

(فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (٦ : ١١٤)) لہذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کبھی شک اور شبہ نہیں کیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب آپ پر سورہ یونس کی یہ آیت نازل ہوئی:

(فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (١٠ : ٩٤)) "اب اگر تجھے اس ہدایت کی طرف سے کچھ شک ہو جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو پہلے سے کتاب پڑھ رہے ہیں۔ فی الواقع یہ تیرے پاس حق ہی آیا ہے' تیرے رب کی طرف سے لہذا تو شک کرنے والوں میں نہ ہو۔" اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں نہ شک کرتا ہوں اور نہ مجھے ان سے پوچھنے کی ضرورت ہے۔"

لیکن ان ہدایات اور اس قسم کی دوسری مثالوں سے جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس دور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور امت مسلمہ کو نہایت ہی گہری ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ مخالفین سخت عناد اور انکار کا مظاہرہ کر رہے تھے اور اللہ کی رحمت کا یہ تقاضا تھا کہ آپ کو ایسی سخت ہدایات دے کر آپ اور امت مسلمہ کو سخت موقف اختیار کرنے کی تلقین کی جائے۔

آگے مزید کہا جاتا ہے کہ اللہ کی دو ٹوک بات اب ختم ہو گئی ہے' مکمل ہو گئی ہے۔ اللہ کی اتھارٹی کے اوپر کوئی اور اتھارٹی نہیں ہے جو اس فیصلہ کن بات کو بدل دے کیونکہ یہ برحق ہے اور یہ حق ان کی تمام سازشوں تک رسائی رکھتا ہے۔

(وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

(٦: ١١٥) "تمہارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے' کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔" اللہ تعالیٰ نے جو کہنا تھا اور جو فیصلے کرنے تھے وہ سچائی کے ساتھ کر دیئے' اور جو قانون سازی کرنی تھی وہ عادلانہ طور پر کر دی۔ اللہ کی بات کے بعد اب نہ کسی کی بات ہے' نہ کوئی نظریہ و عقیدہ ہے' نہ کوئی اصول و قانون ہے اور نہ کوئی قدر اور میزان ہے۔ اب نہ کوئی قانون اور شریعت کے بارے میں اس کے خلاف کوئی بات کہہ سکتا ہے' نہ کوئی رسم و رواج اس کے مقابلے میں رہ سکتے ہیں۔ نہ اللہ کی اتھارٹی کے اوپر کوئی اتھارٹی ہے کہ وہ اللہ کی بات کو بدلنے کی مجاز ہو۔

(وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (٦: ١١٥)) وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔" اس کے بندے جو کچھ کہتے ہیں وہ سنتا ہے اور ان کے اقوال کے پس منظر کو بھی جانتا ہے اور ان کے مصالح و مفادات کو بھی اچھی طرح جانتا ہے۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ سچائی وہی ہے جو کتاب اللہ میں ہے اور جو اللہ نے نازل کی ہے' یہ بھی فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ کتاب اللہ کی سوچ کے مقابلے میں انسان جو سوچ پیش کرتا ہے وہ محض ظن و تخمین کے پائے چوبیں پر قائم ہوتی ہے۔ جو لوگ انسانی سوچ کی پیروی کرتے ہیں وہ محض ظن و تخمین کی پیروی کرتے ہیں اور ان کا انجام صرف یہی ہو گا کہ وہ سیدھے راستے سے بھٹک جائیں گے۔ انسانوں کی سوچ صرف اسی وقت درست اور ہدایت یافتہ ہو سکتی ہے جب وہ کتاب اللہ سے ماخوذ ہو جو ایک یقینی مصدر ہدایت ہے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی متنبہ فرماتے ہیں کہ وہ لوگوں کی ان باتوں پر دھیان نہ دیں جو وہ محض انسانی سوچ کی بنیاد پر کرتے ہیں اگرچہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس سوچ کی ماننے والی ہو' اس لئے کہ جاہلیت بہرحال جاہلیت ہوتی ہے' چاہے اس کے ماننے والے زیادہ ہوں یا کم' بہرحال وہ گمراہ ہوتے ہیں۔

(وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ

وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (٦: ١١٦)) "اور اے نبی" اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو گے جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ کے راستہ سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔"

زمین پر بسنے والے لوگوں کی اکثریت' نزول قرآن کے وقت اہل جاہلیت پر مشتمل تھی' جس طرح آج ہمارے دور میں لوگوں کی اکثریت نے جاہلیت کو اپنا لیا ہے۔ اس وقت لوگوں کی اکثریت الٰہی قانون کے مطابق اپنے فیصلے نہ کرتی تھی' نہ انہوں نے اللہ کی کتابوں میں موجود شریعت کو لاء آف دی لینڈ قرار دیا تھا۔ وہ اپنے تصورات و افکار' اپنی طرز فکر اور طرز زندگی اللہ کی ہدایات اور راہنمائی سے اخذ نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثریت نزول قرآن کے وقت جاہلیت میں مبتلا تھی جس طرح آج لوگوں کی اکثریت جاہلیت میں مبتلا ہے۔ وہ لوگ کوئی فکر' کوئی رائے اور کوئی فیصلہ اس "حق" سے اخذ نہ کرتے تھے اور نہ وہ اس سچائی پر مبنی ہوتا تھا۔ نیز اس دور کے قائدین اپنے متبع لوگوں کو ہدایت کی طرف نہیں بلکہ

ضلالت کی طرف لے جاتے تھے۔ جس طرح آج کی صورت حال ہے کہ لوگ یقینی علم کتاب و سنت کو چھوڑ کر ظن اور تخمین کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ظن و تخمین صرف گمراہی پر منتج ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو متنبہ کر دیا گیا کہ آپ ؐ نے اگر لوگوں کی اطاعت شروع کر دی تو وہ آپ کو گمراہ کر دیں گے۔ اللہ نے حضور ؐ کو عمومی ہدایات اگرچہ شان نزول کے اعتبار سے دی ہیں تاہم یہ ہدایت ایک مخصوص مسئلے یعنی ذبیحوں کے ضمن میں آئی جیسا کہ آگے تفصیلات آ رہی ہیں۔

اس کے بعد یہ قرارداد آتی ہے کہ بندوں کے بارے میں ہدایت یافتہ ہونے یا گمراہ ہونے کا فیصلہ کرنے کا مجاز بھی اللہ ہی ہے' کیونکہ یہ اللہ ہی ہے جو بندوں کی حقیقت سے باخبر ہے۔ کسی کے راہ راست پر ہونے اور گمراہ ہونے کا فیصلہ بھی وہی کر سکتا ہے۔

(اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (۱۱۷:۶)) "اور حقیقت تمہارا رب زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے ہٹا ہوا ہے اور کون سیدھی راہ پر ہے۔" لوگوں کے تصورات و افکار' ان کی اقدار اور پیمانوں' ان کے طرز عمل اور سرگرمیوں کے بارے میں حسن و قبح کا فیصلہ کرنے کے لئے لازماً کوئی معیار ہونا چاہیے جس کے مطابق یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ یہ معیار لوگوں کی خواہشات نفسانیہ اور ان کی بدلتی ہوئی اصطلاحات اور رسم و رواج کو نہیں ہونا چاہیے اس لئے کہ یہ دونوں امور متغیر ہیں۔ اس لئے ایک ایسے منبع اور ماخذ کا تعین ہونا چاہیے جہاں سے لوگ اپنے پیمانوں اور خود لوگوں کے بارے میں فیصلے کر سکیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ یہ قرار دیتے ہیں کہ یہ فیصلہ اللہ نے کرنا ہے کہ یہاں اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے' اور یہ حق صرف اللہ ہی کو ہے۔ وہی فیصلہ کر سکتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیا ہے' ہادی کون ہے اور ضال کون ہے؟

ہم کسی سوسائٹی کو یہ اختیار نہیں دے سکتے کہ وہ اپنے بدلتے ہوئے حالات اور اصطلاحات کے مطابق حسن و قبح کا فیصلہ کرے اس لئے کہ ہر سوسائٹی کے عناصر ترکیبی' اس کی شکل و صورت اور اس کی مادی ضروریات بدلتی رہتی ہیں۔ اگر یہ حق سوسائٹی کو دے دیا جائے تو حسن و قبح کے پیمانے بھی مستقل نہ رہیں گے۔ پھر ایک زرعی معاشرے کی اخلاقی اقدار اور ہوں گی اور ایک صنعتی معاشرے کی اقدار اور ہوں گی۔ سرمایہ دارانہ بورژوا معاشرے کی اقدار اور ہوں گی اور اشتراکی اور کمیونسٹ معاشرے کی اقدار اور ہوں گی اور پھر ان معاشروں کی اقدار کے مطابق لوگوں کے حسن و قبح کے اصول مختلف ہوں گے۔

اسلام اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے' اس لئے ایسی مستقل ذاتی اقدار وضع کرتا ہے جو اللہ کی طرف سے مستقلاً دی گئی ہیں۔ معاشرے اور سوسائٹیاں جس قدر بدل جائیں' ترقی یافتہ ہوں یا پسماندہ۔ جو سوسائٹیاں ان اصولوں کو ترک کر دیں اسلامی نظام ان کے لئے ایک مخصوص اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ اسلام انہیں جاہلی معاشرے کے نام سے پکارتا ہے۔ یہ مشرک معاشرہ ہوتا ہے' اس لئے کہ یہ معاشرہ اللہ کے سوا دوسرے خداؤں کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ ان کے لئے حسن و قبح کے پیمانے مقرر کریں۔ ان کو تصور حیات' اصول اخلاق اور نظام حیات دیں۔ اسلامی نظام صرف ایک ہی تقسیم روا رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک ایک معاشرہ یا تو اسلامی معاشرہ ہے یا جاہلی معاشرہ۔ کوئی تیسری قسم اس کے

نزدیک نہیں ہے۔ آگے جاہلی معاشرے کی اشکال اور صورتیں پھر مختلف ہو سکتی ہیں۔

اس طویل تمہید کے بعد اب اسلامی نظام میں ذبیحوں کے اصولی مسئلے کو لیا جاتا ہے۔ اس مسئلے کو اسی اساسی اصول کے مطابق لیا جاتا ہے کہ اسلام میں حسن و قبح اور حلال و حرام کے تعین کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سابقہ آیات میں اس اصول پر تفصیلی گفتگو ہوئی :

(فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ (١١٨) وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ وَإِنَّ كَثِيرًا لَيُضِلُّونَ بِأَهْوَائِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ (١١٩) وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ (١٢٠) وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ (١٢١) "پھر اگر تم لوگ اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اس کا گوشت کھاؤ۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو؟ حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالت اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے۔ ان کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے۔ بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بنا پر گمراہ کن باتیں کرتے ہیں، ان حد سے گزرنے والوں کو تمہارا رب خوب جانتا ہے۔ تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی، جو لوگ گناہ کا اکتساب کرتے ہیں وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پاکر رہیں گے اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو اس کا گوشت نہ کھاؤ، ایسا کرنا فسق ہے۔ شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات القاکرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔ لیکن اگر تم نے ان کی اطاعت قبول کر لی تو یقیناً تم مشرک ہو۔"

حکم یہ ہے کہ جس ذبیحہ پر اللہ کا نام لے لیا جائے اسے کھاؤ۔ اللہ کا نام لینا اس لئے ضروری قرار دیا گیا کہ لوگوں کے نظریے اور ان کے عقیدے کی سمت کا تعین کر دیا جائے، تاکہ ان کا ایمان اور ان کی اطاعت ان احکام کے لئے مخصوص ہو جو اللہ کی طرف سے صادر ہوتے ہیں۔

(فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ (٦:١١٨)) "پھر اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اس کا گوشت کھاؤ۔" اور اس کے بعد ان سے پوچھا جاتا ہے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو تمہارے لئے ایسے جانوروں کے گوشت کو کھانے سے روک رہی ہے جبکہ ان پر اللہ کا نام لیا گیا ہے، اور ان کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے۔ حالانکہ اللہ نے اضطراری حالت میں استثناء کی گنجائش رکھتے ہوئے ان چیزوں کی تفصیلات دے دی ہیں جو حرام ہیں۔ یوں اللہ تعالیٰ نے حلت اور حرمت کے معاملے میں کسی کو بات کرنے کا کوئی اختیار

نہیں دیا ہے۔ اس لئے کوئی شخص یہ نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی مرضی سے بعض چیزوں کو حلال سمجھتے ہوئے کھائے اور بعض کو حرام سمجھتے ہوئے ترک کر دے۔

(وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ (۶:۱۱۹)) "آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو؟ حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالت اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے۔ ان کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے۔"

اس مسئلے کا وقتی تعلق اس وقت کے معاشرے میں پائے جانے والے ایک معاملے سے ہے۔ مشرکین مکہ بعض ایسے جانوروں کا گوشت کھاتے تھے جنہیں اللہ نے حرام قرار دے دیا تھا اور بعض ایسے جانور کے گوشت کو حرام قرار دیتے ہوئے نہ کھاتے ہیں جو عنداللہ حلال تھے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ اللہ کی شریعت ہے۔ چنانچہ یہاں قرآن مجید اس قصے کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ قرار دیتا ہے کہ یہ لوگ اپنی خواہشات سے متاثر ہو کر اور بغیر علم کے قانون سازی کرتے ہیں اور یوں وہ اللہ تعالیٰ کے حق حاکمیت پر دست درازی کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ان حدود کار میں داخل ہوتے ہیں جو اللہ کے لئے مخصوص ہیں حالانکہ وہ اللہ کے بندے اور غلام ہیں۔

(وَإِنَّ كَثِيرًا لَّيُضِلُّونَ بِأَهْوَائِهِم بِغَيْرِ عِلْمٍ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ (۶:۱۱۹)) "بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بنا پر گمراہ کن باتیں کرتے ہیں۔ ان حد سے گزرنے والوں کو تمہارا رب خوب جانتا ہے۔" اس لئے اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ تم ہر قسم کے گناہوں کو ترک کر دو، چاہے ظاہری ہوں یا باطنی۔ یہ بات بھی ان گناہوں ہی میں سے ہے کہ کوئی بغیر علم کے لوگوں کو گمراہ کرنے کا سبب بنے۔ اور یہ کام وہ محض اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے کرے اور پھر اپنی اس سرگرمی کو دینی اور شرعی رنگ بھی دے اگرچہ شریعت کے ساتھ اسے کوئی نسبت بھی نہ ہو بلکہ یہ اسلامی شریعت پر محض افترا ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ انہیں اس قسم کی افتراء پردازی کے انجام بد سے ڈراتا ہے۔

(وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ (۶:۱۲۰)) "تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی بچو، جو لوگ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے۔" اس کے بعد حکم دیا جاتا ہے کہ جن جانوروں پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، ان کا گوشت کھانے سے باز رہو۔ یہ لوگ بعض جانوروں کو ذبح کرتے وقت ان پر اللہ کے سوا اور الہوں کے نام لیتے تھے۔ یا وہ انہیں قمار بازی کے لئے ذبح کرتے تھے اور پھر پانسوں کے ذریعے انہیں تقسیم کرتے تھے۔ بعض مردار جانوروں کے گوشت کے استعمال کے معاملے میں وہ مسلمانوں سے جھگڑتے تھے۔ وہ کہتے تھے 'اگرچہ ایسے مردہ جانوروں پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا لیکن اللہ نے خود انہیں ذبح کر دیا ہے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ مسلمان اپنے ہاتھ سے ذبح کئے

ہوئے جانوروں کا گوشت تو کھاتے ہیں لیکن اللہ کے ذبح کئے ہوئے جانوروں کا گوشت وہ نہیں کھاتے۔ یہ وہ تصور اور استدلال ہے جس کی کمزوری بالکل واضح ہے اور یہ تصور تمام جاہلیتوں کے اندر پایا جاتا رہا ہے۔ یہ تصور مشرکین کو ان کے وہ شیاطین دیتے تھے جو جنوں اور انسانوں میں سے ان کے ساتھ لگے ہوئے تھے تاکہ وہ ان کے بودے تصورات اور دلائل کے ذریعے مسلمانوں کے ساتھ مجادلہ کریں۔ ان باتوں کی تفصیلات ان آیات میں دی گئی ہیں۔

(وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰى اَوْلِيٰٓـِٕهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ (٦: ١٢١)) ’’اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو، اس کا گوشت کھاؤ، ایسا کرنا فسق ہے، شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔ لیکن اگر تم نے ان کی اطاعت قبول کر لی تو یقیناً تم مشرک ہو۔‘‘ اس آخری فیصلے کے سامنے کھڑے ہو کر ذرا غور کیجئے۔ یہ فیصلہ کس قدر دو ٹوک اور صریح ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حاکم صرف اللہ ہے، اس لئے مطاع بھی وہی ہو گا اور یہ اس دین کا بنیادی اصول ہے۔ یہ آیت فیصلہ کر دیتی ہے کہ زندگی کے مسائل کے کسی ایک جزئیہ میں بھی اللہ کے سوا کسی اور کی اطاعت کرنا جبکہ یہ اطاعت اللہ کی شریعت اور اس کے اصولوں کی طرف منسوب نہ ہو، کھلا شرک ہے اور اس کی وجہ سے ایک مسلمان دائرہ اسلام سے خارج ہو کر دائرہ کفر میں داخل ہو جاتا ہے۔ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں: ’’اللہ تعالیٰ کا یہ کہنا کہ

وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ (٦: ١٢١)) اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو تم مشرکین میں سے ہو گے۔‘‘ یعنی جہاں تم نے امرالٰہی اور شریعت الٰہیہ کو ترک کر دیا اور دوسروں کے اوامر اور احکام کو ان پر ترجیح دے دی تو یہ صریح شرک ہو گا۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ) انہوں نے اپنے احبار اور رہبان کو اللہ کے سوا رب بنایا ہے۔‘‘ اس آیت کی تفسیر میں ترمذی نے ایک روایت نقل کی ہے۔ وہ حضرت عدی ؓ ابن حاتم سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے پوچھا رسول ؐ اللہ! انہوں نے تو احبار و رہبان کی بندگی نہیں کی ہے۔ رسول ؐ اللہ نے فرمایا: ’’ہاں‘‘ بالکل انہوں نے کی ہے۔ انہوں نے ان کے لئے حرام کو حلال کر دیا اور حلال کو حرام اور یہ لوگ ان کی اطاعت کرتے ہیں تو یہ ان لوگوں کی جانب سے احبار و رہبان کی عبادت ہے۔ اسی طرح علامہ ابن کثیر نے حضرت عدی ؓ سے روایت کی ہے کہ اس آیت

(اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ) کا مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے لوگوں سے نصیحت و ہدایت طلب کی اور اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا۔

(وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا) ’’ان کو حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ صرف اللہ واحد کی بندگی کریں۔‘‘ یعنی اس کی بندگی کریں جس نے اگر کسی چیز کو حرام قرار دے دیا تو وہ حرام ہو جاتی ہے اور کسی چیز کو حلال قرار

دے دیا تو وہ حرام ہو جاتی ہے ۔ جو قانون بنایا وہ قابل اتباع ہوتا ہے جو فیصلہ وہ کرتا ہے وہ نافذ ہوتا ہے ۔

یہ ہیں اقوال حضرت ابن کثیر اور سدی کے ۔ یہ دونوں حضرات نہایت ہی دو ٹوک الفاظ میں فیصلہ کرتے ہیں اور بات کو بالکل کھول کر بیان کرتے ہیں اور یہ اس لئے کہ اس معاملے میں قرآن کی بات بھی نہایت ہی واضح اور دوٹوک ہے ۔ پھر اس بات کو حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تشریح کر کے واضح کر دیا ہے کہ جو شخص بھی معاملات زندگی کے کسی بھی جزئیہ میں اللہ کی بنائی ہوئی شریعت کے مقابلے میں لوگوں کی بنائی ہوئی شریعت پر چلتا ہے وہ مشرک ہے اگرچہ ایسا شخص اپنی اصلیت کے اعتبار سے مسلم ہو کیونکہ اس فعل کی وجہ سے وہ اسلام سے خارج ہو کر مشرکوں کی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے ۔ اگرچہ زبان کے ساتھ وہ بار بار "اشھد" پڑھتا رہے جبکہ عملاً وہ غیراللہ کا مطیع فرمان اور شاگرد رہو ۔

آج جب ہم اس کرۂ ارض پر اس زاویے سے نظر ڈالتے ہیں اور پھر اسے ہم ان آیات کی ان تصریحات کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پر شرک اور جاہلیت کا مکمل کنٹرول ہے ۔ الا ماشاء اللہ تو ہم اس کرۂ ارض کے مالکان اقتدار کے اس عمل پر اعتراض کرتے ہیں جنہوں نے خدائی خصوصیات کا دعویٰ کر دیا ہے کہ ان کا کوئی قانون اور کوئی حکم قابل قبول نہیں ہے ۔ الا یہ کہ کوئی نہایت ہی مجبور ہو ۔

آیت زیر بحث (وَلَا تَاْكُلُوْا) میں ذبیحوں کے بارے میں جو ہدایات دی گئی ہیں ان میں سے فقہی اعتبار سے حلال و حرام کی تفصیلات علامہ ابن کثیر نے اس طرح دی ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں ائمہ فقہ کے تین اقوال ہیں ۔

بعض فقہاء کہتے ہیں کہ ایسے ذبیحے کا گوشت کھانا حرام ہے چاہے ذبیحے پر اللہ کا نام عمداً نہ لیا گیا ہو یا سہواً ۔ حضرت ابن عمر ' نافع ' عامر شعبی اور محمد ابن سیرین سے بھی ایسے ہی مروی ہے ' امام مالک سے بھی ایک روایت ایسی ہی ہے ' امام احمد ابن حنبل سے بھی ایک روایت ایسی ہی ہے اور متقدمین و متاخرین میں سے ایک گروہ نے اس کی تائید کی ہے ۔

ابو ثور ' داؤد ظاہری اور ابو الفتوح محمد ابن محمد ابن علی طائی جو متاخرین شافعیہ میں ہیں ' انہوں نے اپنی کتاب اربعین میں بھی یہی رائے اختیار کی ہے اور انہوں نے اپنے مذہب پر اسی آیت سے استدلال کیا ہے ۔ نیز اس گروہ نے شکار کے بارے میں وارد دوسری آیت سے بھی استدلال کیا ہے ۔

(وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ) پس اس شکار سے کھاؤ جسے وہ (کتے) پکڑ کر تمہارے لئے روک لیں ' اور اس پر اللہ کا نام لو ۔" ان کا استدلال یہ بھی ہے کہ اس آیت میں اس کے لئے انه لفسق کا تاکیدی لفظ آیا ہے ۔ انه کی ضمیر کا مرجع اکل ہے ۔ بعض مفسرین نے غیراللہ کے نام پر ذبح کرنے کی طرف عائد کیا ہے ۔ نیز یہ رائے رکھنے والے حضرات ان احادیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جو شکار اور ذبیحوں پر اللہ کا نام لینے کے بارے میں وارد ہیں مثلاً عدی ابن حاتم اور ابو ثعلبہ کی احادیث ۔ "جب تم نے اپنے سدھائے ہوئے کتے کو چھوڑا اور اس پر تم نے اللہ کا نام لیا تو جب تک وہ کتا تمہارے لئے روکے رکھے تم کھاؤ ۔" یہ دونوں احادیث صحیحین نے روایت کی ہیں ۔ نیز رافع ابن خدیج کی حدیث سے بھی یہ گروہ استدلال کرتا ہے ۔ "جس سے خون نکلا اور اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو تو اسے کھاؤ ۔" یہ حدیث بھی صحیحین نے روایت کی ہے ۔ اس مسئلے میں دوسرا مذہب یہ ہے کہ ذبیحوں پر اللہ کا نام لینا شرط اور واجب نہیں ہے ۔ بلکہ یہ مستحب ہے ۔ اگر کوئی عمداً یا نسیان کی وجہ سے ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ یہ امام شافعی کا مذہب ہے ۔ اور آپ کے تمام رفقاء بھی اسی طرف گئے ہیں ۔ امام احمد ابن حنبل سے بھی

ایک روایت اسی مضمون کی ہے۔ امام مالک سے بھی ایک روایت اس کے مطابق ہے۔ آپ کے رفقاء میں سے اشہب ابن عبد العزیز نے اس کی تصریح کی ہے اور انہوں نے حضرت ابن عباس ' ابو ہریرہ' عطاء ابن ابو رباح سے بھی ایسی ہی روایات نقل کی ہیں' واللہ اعلم۔ اب رہیں وہ آیات و احادیث تو ان کی تاویل امام شافعی نے یوں کی ہے کہ آیت

(وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ) ان ذبیحوں کے بارے میں ہے جن پر بتوں کا نام لیا گیا ہو۔ مثلاً

(اَوْفِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ) میں اس کی تصریح ہے۔ اسی طرح ابن جریج کہتے ہیں کہ آیت (وَلَا تَاْكُلُوْا ---------) میں ممانعت ان ذبیحوں سے ہے جو قریش بتوں کے اوپر ذبح کرتے تھے۔ نیز ان ذبیحوں کے بارے میں جو مجوسی ذبح کرتے تھے۔ امام شافعی نے جو مسلک اختیار کیا ہے یہ قوی تر ہے۔

ابن ابو حاتم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس ؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ

(وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ) مردار کے بارے میں ہے۔ اس کی تائید میں امام ابو داؤد نے اپنی مرسل احادیث میں ثور ابن یزید کی حدیث نقل کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مسلم کا ذبیحہ حلال ہے' اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو۔ اس لئے کہ اگر وہ نام لیتا تو صرف اللہ ہی کا لیتا۔" اور اس مرسل روایت کی تائید دارقطنی کی روایت سے ہوتی ہے کہ جب ایک مسلمان ذبح کرے اور اس ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لے تو چاہیے کہ اس کا گوشت کھایا جائے' اس لئے کہ مسلمان کے اندر اللہ کے ناموں میں سے کوئی نام ہوتا ہی ہے۔"

تیسرا مذہب یہ ہے کہ اگر کوئی بھول کر اللہ کا نام نہ لے تو کوئی حرج نہیں ہے اور اگر عمداً ایسا کرے تو کھانا جائز نہ ہو گا۔ امام مالک اور امام احمد ابن حنبل کا یہ مشہور مذہب ہے۔ اور امام ابو حنیفہ اور ان کے ساتھی بھی اسی طرف گئے ہیں۔ اسحاق ابن راہویہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ حضرت علی' ابن عباس' سعید ابن مسیب ' عطاء' طاؤس' حسن بصری' ابو مالک' عبد الرحمٰن ابن ابولیلیٰ' جعفر ابن محمد اور ربیعہ ابن عبد الرحمٰن سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔

ابن جریر کہتے ہیں اہل علم نے اس آیت کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ اس آیت کا کوئی حکم منسوخ ہوا ہے یا نہیں۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ اپنے مفہوم میں محکم آیت ہے اور اس کا کوئی حصہ منسوخ نہیں ہے۔ مجاہد اسی کے قائل ہیں۔ حسن بصری' عکرمہ کا یہ قول ہے کہ

(فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ (۱۱۸))

دوسری جگہ اللہ فرماتے ہیں۔

(وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ) اس طرح اس آیت نے پہلی کو منسوخ کر دیا۔ پھر اس سے اہل کتاب کا کھانا مستثنیٰ کیا گیا۔

(وَطَعَامُ الَّذِينَ اُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ) ابن ابو حاتم کہتے ہیں کہ عباس ابن الولید کے سامنے مکحول کی یہ روایت پڑھی گئی کہ اللہ نے پہلے یہ آیت نازل فرمائی۔

(وَلَا تَاْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ) اور اس کے بعد اللہ نے اسے منسوخ کر دیا۔ یوں اس نے اہل اسلام پر رحم فرمایا اور یہ آیت نازل ہوئی۔

(اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِينَ اُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ) یوں اس دوسری آیت نے پہلی کو منسوخ کر دیا اور اہل کتاب کا ذبیحہ حلال قرار دیا گیا۔ اس کے بعد ابن جریر نے کہا: "حقیقت یہ ہے کہ جن چیزوں پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ ان کی حرمت اور اہل کتاب کے ذبیحوں کی حلت کے احکام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابن جریر کی بات درست ہے۔ سلف میں سے جن لوگوں نے نسخ کا لفظ استعمال کیا ان کی مراد تخصیص ہے' واللہ اعلم۔

---ooo---

اس کے بعد اسلام اور کفر کے درمیان ایک مکمل معرکہ سامنے آتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر گاؤں میں بڑے بڑے مجرمین پیدا کئے ہیں اور ان کے دلوں میں کبر و غرور کی ایک بڑی مقدار پائی جاتی ہے۔ یہ اس گاؤں کے بڑے مجرم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ پورے علاقے میں لوگوں کو راہ راست پر آنے سے روکتے ہیں۔ اس بیانیہ میں واضح طور پر یہ دکھایا جاتا ہے کہ جن لوگوں کے دل ایمان کے لئے کھل جاتے ہیں ان کے حالات کیسے ہوتے ہیں۔ وہ حالات کس طرح کے ہوتے ہیں جن میں لوگوں کا دل اسلام اور قبولیت حق کے لئے تنگ ہو جاتا ہے اور اسلام کا تصور کرتے ہی وہ لوگ تنگی محسوس کرتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ گویا ان کی سانس رک گئی ہے۔ یوں یہ بیانیہ موضوع سخن یعنی اسلام میں حلال و حرام کے موضوع کے ساتھ اصولی طور پر منسلک ہو جاتا ہے' یعنی اصول اور فروع کی نسبت قائم ہو جاتی ہے اور یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ ذبیحوں کی حلت اور حرمت کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ نہایت ہی اصولی مسئلہ ہے۔

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؕۘ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ

عَذَابٌ شَدِيدٌۢ بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ ﴿١٢٤﴾ فَمَن يُرِدِ اللّٰهُ أَن يَهْدِيَهُۥ يَشْرَحْ
صَدْرَهُۥ لِلْإِسْلَامِ ۖ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُۥ يَجْعَلْ صَدْرَهُۥ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا
يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٢٥﴾

"کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح ان سے نہ نکلتا ہو؟ کافروں کے لئے تو اسی طرح ان کے اعمال خوشنما بنا دیئے گئے ہیں' اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکروفریب کا جال پھیلائیں۔ دراصل وہ اپنے فریب کے جال میں آپ پھنستے ہیں 'مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔

جب ان کے سامنے کوئی آیت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں "ہم نہ مانیں گے جب تک کہ وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے۔" اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغامبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔ قریب ہے وہ وقت جب یہ مجرم اپنی مکاریوں کی پاداش میں اللہ کے ہاں ذلت اور سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔

پس (یہ حقیقت ہے کہ) جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ (اسلام کا تصور کرتے ہی) اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے۔ اس طرح اللہ (حق سے فرار اور نفرت کی) ناپاکی ان لوگوں پر مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔"

ان آیات میں ہدایت و ضلالت کی ماہیت کی تصویرکشی کی گئی ہے اور حقیقت ہدایت و ضلالت پر حقیقت ضلالت کی نہایت ہی حقیقت پسندانہ تعبیر کی گئی ہے۔ اس کے اندر جو تشبیہات اور جو مجاز استعمال کیا گیا ہے وہ اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ تصویر پرتاثیر بن جائے۔ تشبیہات اور مجاز بھی نہایت ہی واقعیت پسندانہ ہیں۔

ہدایت و ضلالت کے حقائق اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسے ہیں جن کو سمجھانے کے لئے اس قسم کی تصویرکشی اور مؤثر انداز بیاں نہایت ہی ضروری ہے۔ اگرچہ بلاشبہ ہدایت و ضلالت حقائق ہیں لیکن یہ روحانی اور نظریاتی حقائق ہیں اور ایسے حقائق میں جنہیں تجربات اور عمل کے ذریعے چکھا جا سکتا ہے۔ رہی کسی روحانی حقیقت کی تعبیر یا حسن تعبیر تو اس سے لطف اندوز صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے ان حقائق کو عملاً برتا ہو۔

یہ ایسے حقائق ہیں جو مردہ دلوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو تاریک قلب و نظر کو روشن کرتے ہیں۔ یہ حقائق انسان کو ایسی زندگی دیتے ہیں جس کے ذریعے انسان ہر چیز کا مزہ لیتا ہے۔ ہر چیز کے بارے میں درست نقطہ نظر اپناتا ہے' ہر چیز کی

صحیح قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ انسان کا احساس تمام محسوسات کے بارے میں یکسر بدل جاتا ہے اور اس کے دل و دماغ میں اس قدر روشنی پیدا ہو جاتی ہے جس میں انسان ایک نئے جہاں کو دریافت کر لیتا ہے 'جس کے بارے میں پہلے اسے کچھ احساس بھی نہیں ہوتا۔

یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو عام انسان کے حس و ادراک میں نہیں آسکتا۔ نہ انسان اسے الفاظ کا جامہ پہنا سکتا ہے۔اس کا ادراک صرف وہ شخص کر سکتا ہے جس نے اس حقیقت کو چکھا ہو۔ قرآن کریم کا اسلوب بیان اس قدر زور دار ہے کہ صرف وہی اسے ہمارے ادراک کے قریب تر کر سکتا ہے۔کیونکہ یہ قرآن کا کمال ہے کہ وہ ہر حقیقت کے لئے حسب حال الفاظ لے کر آتا ہے جو مفہوم کی حقیقت کے ساتھ ہم رنگ ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کفر انسان کو ازلی اور ابدی حقیقت سے دور کر دیتا ہے۔یہ ازلی اور ابدی حقیقت ایسی ہوتی ہے جس کے لئے فنا نہیں ہے۔جو اوجھل نہیں ہوتی اور نہ گہرائی تک اترتی ہے۔ ابدی اور ازلی حقیقت سے قطع تعلق ہی درحقیقت موت ہے 'کسی انسان کے لئے۔ ایسا انسان کبھی بھی فعال نہیں ہو سکتا' مؤثر نہیں ہو سکتا اور اس کائنات پر اسے کنٹرول نہیں حاصل ہو سکتا۔چنانچہ ایسا شخص مردہ شخص ہے۔اس کی قوتیں اور صلاحیتیں مرجاتی ہیں اور وہ فطرتاً مردہ انسان ہوتا ہے۔یہی ہے موت کی حقیقت۔

اس کے مقابلے میں ایمان نام ہے اس ابدی قوت کے ساتھ اتحاد و اتصال کا۔ ایمان اس قوت سے مدد لیتا ہے اور یہ قوت اس کی دعا کو قبول کرتی ہے لہٰذا ایمان حیات ہے اور کفر موت ہے۔

پھر کفر کی حالت میں روح انسانی شرف اور علم سے محروم ہوتی ہے۔وہ تاریکی میں گھر جاتی ہے۔ انسان کے اعضاء اور اس کے شعور پر تالے پڑ جاتے ہیں۔ انسان تاریکی میں کھو جاتا ہے اور گمراہ ہو جاتا ہے۔ ایمان ہی درحقیقت آنکھیں کھول دیتا ہے۔وہ ادراک کا بہترین وسیلہ ہے۔اس سے استقامت نصیب ہوتی ہے۔ وہ ایک نور ہے' نور کے ہر مفہوم کے اعتبار سے۔

کفر سے انسان سکڑ جاتا ہے' اور بالآخر پتھر بن جاتا ہے' اس کی سوچ تنگ ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے انسان فطری راستے سے بے راہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کفر ایک قسم کی تنگی ہے جس میں ہر شخص اطمینان سے محروم ہوجاتا ہے اور ہر وقت دل تنگ رہتا ہے جبکہ ایمان سے شرح صدر' خوشی' سہولت حاصل ہوتی ہے اور اس کے خوشگوار سایے میں اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

کافر کی حیثیت اس طرح ہوتی ہے جس طرح کوئی خودرو گھاس اور پودا ہوتا ہے۔جس کا اس کرۂ ارض پر کوئی مضبوط وجود نہیں ہوتا اور نہ اس کی پختہ جڑیں ہوتی ہیں' وہ ایک ایسا فرد ہوتا ہے جو اپنے خالق سے منقطع ہوتا ہے اور تنہا تنہا نظر آتا ہے۔ اس کائنات سے بھی وہ مربوط نہیں ہوتا' اس کائنات کے ساتھ اس کا روحانی ربط نہیں ہوتا۔ فقط مادی ربط ہوتا ہے جو نہایت ہی محدود تعلق ہے اور یہ اسی طرح ہے جس طرح کسی بھی حیوان کا اس کائنات کے ساتھ فطری ربط ہوتا ہے۔ محض محسوس ربط اور دائرہ۔

اس کے مقابلے میں للہ فی اللہ جو تعلق ہوتا ہے وہ انسان فانی کو حقیقت ابدیہ اور حقیقت ازلیہ کے ساتھ مربوط کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے اس کائنات ظاہری کے ساتھ بھی موصول اور مربوط کر دیتا ہے۔

اس کے بعد ایک مومن کا گہرا تعلق اس قافلہ ایمان کے ساتھ اور ایک ایسی امت کے ساتھ ہوتا ہے جس کی جڑیں انسانی تاریخ میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ لہٰذا مومن روابط کے ایک بڑے خزانے کا مالک ہوتا ہے۔ وہ تعلقات کا ایک عظیم اور وسیع سرمایہ رکھتا ہے۔ وہ ایک نہایت ہی بھرپور اور وسیع شخصیت رکھتا ہے۔ اس کا وجود اور اس کی شخصیت اس کی عمر کے اختتام کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔

جب انسان ایمان لاتا ہے تو وہ اپنے دل میں ایک روشنی پاتا ہے اور اس روشنی کے ذریعے پھر اسے دین کے حقائق معلوم ہوتے ہیں اور اسے اس دین کے منہاج عمل اور طرز تحریک کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ اس کے قلب پر عجیب انکشافات ہوتے ہیں۔ جب ایک مومن اپنے دل میں یہ نور پاتا ہے تو اسے عجیب و غریب مناظر و مقامات نظر آتے ہیں۔ اسے نظر آتا ہے کہ اس دین کے تمام اجزاء کے اندر ایک گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ اسے حقائق واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ اسے نظر آتا ہے کہ اس دین کا منہاج عمل نہایت ہی گہرا اور نہایت ہی خوبصورت ہے۔ یہ دین متفرق عقائد اور متفرق عبادات کا کوئی بے ربط مجموعہ نہیں ہے جس میں کچھ قوانین بھی ہوں اور کچھ ہدایات بھی' بلکہ یہ دین ایک مکمل منصوبہ ہے' اس کے تمام اجزاء ایک دوسرے میں داخل اور ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ ہیں' ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ نہایت ہی گہرا عشق رکھتے ہیں۔ یہ تمام اجزاء ایک جسم کی طرح زندہ اور اس کائنات کی فطرت کے ساتھ ہم سفر ہیں اور یہ سفر نہایت ہی دوستانہ' باہم محبت اور گہری الفت کے ساتھ جاری و ساری ہے' نہایت ہی جوش و محبت کے ساتھ۔

انسان اپنے دل میں یہ نور پاتا ہے' اس کے ذریعے اس پر اپنی ذات کے حقائق' اپنی حیات کے حقائق' کرۂ ارض پر رونما ہونے والے حقائق' لوگوں کے حقائق اور لوگوں کے احوال کے حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ ان کی نظروں کے سامنے نہایت ہی روشن اور خیرہ کن مناظر آتے ہیں۔ وہ اس کائنات کے اندر جاری و ساری سنت الٰہیہ اور اس کے ضوابط کو بھی پالیتا ہے' جو نہایت ہی محکم اور فطری اور خوشگوار انداز میں جاری ہیں۔ پھر وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ ان سنن و ضوابط کے پیچھے اللہ کی مشیت بھی کام کر رہی ہے اور یہ اللہ کی مشیت ہی ہے جس نے اس کائنات میں سنن الٰہیہ کو آزادی کے ساتھ جاری و ساری کیا ہے اور کام کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ ایسا شخص پھر اس کائنات کے انسانوں کو دیکھتا ہے کہ یہ لوگ کس طرح سنن الٰہیہ کے مطابق چلتے پھرتے ہیں لیکن سنن الٰہیہ کے حدود کے اندر۔

جب کسی انسان کے دل میں یہ نور ایمانی پیدا ہو جاتا ہے تو وہ ہر معاملے' ہر واقعہ اور ہر مسئلے میں سچائی کی راہ واضح طور پر پالیتا ہے۔ اب وہ اپنے اردگرد جاری سنن الٰہیہ اور واقعات کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہے۔ خواہ وہ اس کے نفس سے متعلق ہوں' اس کے خیالات سے متعلق ہوں یا اس کے اردگرد مختلف لوگوں کی طرف سے جاری منصوبوں سے متعلق ہوں۔ وہ اپنے ماحول کے ارادوں کو بھی معلوم کر لیتا ہے چاہے یہ ارادے ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔ واقعات کی تعبیر و توضیح وہ اپنی عقل اور اپنے نفس کے اندر واضح طور پر پاتا ہے۔ وہ رونما ہونے والے تمام واقعات کی تعبیر اچھی طرح کر سکتا ہے گویا وہ ہر معاملے کا جواب کتاب اللہ سے اخذ کر رہا ہے۔

جسے یہ نور حاصل ہوتا ہے اس کے خیالات' اس کا شعور اور اس کے خدوخال بھی روشن نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے دل میں مسرور' اپنے حالات پر خوش اور اپنے انجام سے مطمئن ہوتا ہے۔ وہ حکم دیتے وقت نرم اور خوشگوار رویہ اپناتا

ہے ۔ وہ واقعات و حالات کا سامنا بھی نہایت ہی سنجیدگی سے کرتا ہے اور ہر حال میں مطمئن ' پرامید اور پریقین ہوتا ہے ۔
یہ ہے وہ حقیقت جس کی تصویر کشی قرآن کریم ان الفاظ میں کرتا ہے اور کتنی خوبصورتی سے اور کس پیارے انداز میں ۔

(اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (٦: ١٢٢)) "کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا' پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح ان سے نہ نکلتا ہو؟

اس دین سے قبل مسلمان ایسے ہی تھے ' وہ مردہ تھے ' یہ اسلام ہی ہے جس نے ان کی روح کو وسعت دی اور انہیں زندگی بخشی ۔ ان کو ترقی جستجو ' حرکت اور حیات جاوداں عطا کی جبکہ اس سے پہلے ان کے دل بجھے بجھے تھے ۔ ان کی روح تاریک تھی 'لیکن جب ان کے دلوں کے اوپر ایمان کی بارش ہوئی تو وہ سرسبز اور لہلاتے ہوئے کھیت کی طرح ہو گئے ۔ ان کی روح سے نور کے چشمے پھوٹنے لگے ' روشنی اور نور کی لہریں اٹھنے لگیں ۔ وہ گمراہوں کو راہ بتلانے لگے ۔ وہ حیران و پریشان لوگوں کو راہ دکھاتے ' خوفزدہ انسانیت کو اطمینان دلاتے ' غلاموں کو رہائی دلاتے ' وہ لوگوں کے لئے زندگی کے سفر کی سمت متعین کرنے لگے اور یہ اعلان کرنے لگے کہ انسان کو از سرنو زندگی عطا ہو گئی ہے ۔ اب وہ صرف اللہ کا غلام ہے اور دنیا کی تمام غلامیوں سے اس نے رہائی پالی ہے ۔

سوال یہ ہے کہ جس کی روح میں اللہ نے زندگی بھر دی ہو 'کیا وہ شخص اس آدمی کی طرح ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں گھرا ہوا ہے اور ان سے اس کے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں ہے ۔ یقیناً ان دونوں افراد کے حالات ایک دوسرے سے بہت ہی مختلف ہیں اور ان کے درمیان بہت بڑا فرق ہے ۔ لہٰذا کون ہے جو اس ظلمت کدے میں دھرنا مار کر بیٹھ جائے جبکہ اس کے اردگرد نور کا فیضان ہو رہا ہو؟

(كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (٦: ١٢٢)) "کافروں کے لئے تو اسی طرح ان کے اعمال خوشنما بنا دیئے گئے ہیں ۔" یہ ہے حقیقی راز ۔ یہاں کفر کی تعبیر تاریکی اور موت سے کی گئی ہے اور کفر کے اندر یہ صفات مشیت الٰہی نے ودیعت کی ہیں ۔ پھر اللہ نے انسانوں کے اندر ایسی اقسام پیدا کی ہیں کہ ان میں سے بعض لوگ نور کو پسند کرتے ہیں اور بعض لوگ ظلمت کو پسند کرتے ہیں ۔ جب کوئی ظلمت کو پسند کرنے لگتا ہے تو اس کے لئے ظلمت محبوب کر دی جاتی ہے اور وہ گمراہی میں دور تک نکل جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے لئے واپس آنے کا کوئی راستہ ہی نہیں رہتا ۔ اس کے بعد جنوں اور انسانوں میں سے شیاطین کا ایک لشکر سامنے آتا ہے جو ایک دوسرے کے سامنے بدنما اور گمراہ کن باتوں کو اچھا بنا کر پیش کرتا ہے ۔ اور پھر وہ کافروں کے لئے ان کے اعمال کو مزید خوشنما بنا دیتے ہیں ۔ جس دل میں نور ایمان نہیں ہوتا وہ ان شیاطین کی باتوں پر توجہ سے کان دھرتا ہے ۔ وہ ان کے وسوسوں کے جال میں پھنس جاتا ہے ۔ اب وہ ہدایت و ضلالت کی بھی کوئی تمیز نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اندھیروں میں گھرا ہوتا ہے ۔ یوں اللہ کافروں کے لئے ان کے اعمال کو خوشنما بنا دیتا ہے ۔

اس اصول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہر گاؤں میں کچھ وڈیرے مجرم بنا دیے ہیں اور وہ ان بستیوں میں اپنی مکاریوں کے جال پھیلاتے ہیں۔ یوں اللہ کی جانب سے انسانوں کے ابتلاء کی یہ اسکیم مکمل ہوتی ہے اور اللہ کی تقدیر اپنا کام کرتی ہے۔ اس کی حکمت کے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور ہر شخص اس دنیا میں وہی راستہ اختیار کرتا ہے جو اس کے لئے سازگار بنا دیا گیا ہوتا ہے اور آخر کار ہر شخص اپنے مقرر انجام تک جا پہنچتا ہے۔

(وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِىْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۶:۱۲۳)) "اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکر و فریب کا جال پھیلائیں۔ دراصل وہ اپنے فریب کے جال میں آپ پھنستے ہیں، مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔" یہ اللہ کی سنت ہے کہ وہ ہر بستی 'شہر یا دار الخلافہ میں بڑے بڑے مجرمین میں کچھ لوگوں کو مقتدر بنا دیتا ہے۔ یہ جرائم پیشہ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دین کے دشمن ہوتے ہیں اور یہ دین کے دشمن اس لئے ہوتے ہیں کہ بستیوں کے اوپر اقتدار حاصل کر کے اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ دین ان سے اس اقتدار کو چھین کر اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ یوں دین ان سے ربوبیت اور حاکمیت کی حیثیت چھین لیتا ہے اور لوگوں کو آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ یوں دین تمام لوگوں کو اللہ کی غلامی میں دے دیتا ہے اور اللہ ہی رب الناس اور ملک الناس قرار پاتا ہے۔

یہ سنت الٰہیہ ہے کہ اللہ سچائی کے ساتھ رسولوں کو بھیجے اور یہ سچائی تمام مدعیان ربوبیت سے ان کی ربوبیت چھین لے اور تمام مدعیان حاکمیت سے ان کا حق اقتدار چھین لے۔ چنانچہ سچائی کے باوجود یہ اکابر مجرمین رسولوں اور سچائی کے دشمن ہو جاتے ہیں اور بستیوں اور دارالحکومتوں میں اپنی مکاری کے جال پھیلاتے ہیں۔ تمام لوگ اپنے اپنے دارالخلافوں سے ایک دوسرے کو ہدایات اور رپورٹیں دیتے ہیں جو فریب پر مبنی ہوتی ہیں اور یہ لوگ معرکہ حق و باطل میں شیاطین کے معاون بنتے ہیں۔ باطل اور گمراہی کو پھیلانے کی سعی کرتے رہتے ہیں اور اپنی اس ظاہری اور خفیہ سازش کی وجہ سے لوگوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔

یہ سنت جاریہ اور ہمہ گیر معرکہ ہے۔ اس لئے کہ دونوں قوتوں کے درمیان اصل اول ہی کی بنا پر تضاد وجود میں آ گیا ہے۔ اصل اول یہ ہے کہ حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ صرف اللہ جل شانہ کے ساتھ مخصوص ہے جبکہ کسی بھی بستی کے مجرمین کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس بستی میں ان کی بات کی چلت ہو اس کے علاوہ اہل حق اور ان اکابر مجرمین کے درمیان ذاتی تضاد بھی ہوتا ہے۔

ہر نبی کو اس معرکے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کوئی نبی اس سے بچ نہیں سکتا۔ نبی اور اہل ایمان کے لئے لازمی ہے کہ وہ اس معرکے میں کودیں اور آخر کار اس میں سے سرخروئی کے ساتھ نکلیں۔ اللہ اپنے دوستوں کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ان مجرمین کا مکر و فریب کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو اور ان کا جال طویل سے طویل تر کیوں نہ ہو؟ آخر کار یہ مکر خود ان پر آ کر پڑے گا۔ اس لئے کہ اہل ایمان صرف تنہا اس معرکے میں نہیں کودتے اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ ان کے لئے کافی مددگار ہے۔ وہ کافرین کی سازش کو خود ان پر لوٹاتا ہے۔ "دراصل وہ خود اپنے فریب کے جال میں پھنستے

ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں۔

(وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۶: ۱۲۳)) "لہٰذا اہل ایمان کو پوری طرح مطمئن رہنا چاہیے۔" اب قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ اللہ کے رسولوں اور اللہ کے دین کے دشمنوں کے مزاج میں کبرو غرور کا مادہ بھرا ہوتا ہے۔ اور یہی کبر اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ اسلام سے دور رہیں اور یہ اس لئے اس نظریہ سے دور بھاگتے ہیں کہ اس میں جس طرح یہ اکابر اللہ کے بندے ہوتے ہیں اس طرح تمام عوام بھی اللہ کے بندے ہوتے ہیں' کوئی طبقاتی فرق باقی نہیں رہتا۔ چونکہ یہ لوگ اپنے اس طبقاتی فرق و امتیاز کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اس لئے ایسے لوگوں کے لئے یہ ایک بڑا کڑوا گھونٹ ہے کہ یہ ایمان لے آئیں اور نبی کے سامنے اطاعت کریں حالانکہ وہ اس بات کے عادی ہیں کہ وہ خود مطاع بنیں اور الوہیت اور ربوبیت کے مقام پر فائز ہوں' قانون سازی کریں اور ان کے قوانین کو تسلیم کیا جائے۔ وہ احکام دیں اور لوگ ان کے احکام کی اطاعت کریں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جو کرنے کی نہیں ہیں۔ نہایت ہی بے بنیاد بات کرتے ہیں کہ ہم اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمیں وہ تعلیم نہ دی جائے جو نبیوں کو دی گئی :

(وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ (۶: ۱۲۴))
"جب ان کے سامنے کوئی آیت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں "ہم نہ مانیں گے جب تک کہ وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے۔" ولید ابن مغیرہ نے ایک بار کہا: "کہ اگر نبوت حق بات ہوتی تو میں زیادہ مستحق تھا کہ میں نبی ہوتا' کیونکہ میں عمر میں 'اے محمد' تم سے بڑا ہوں۔ مال میں تم سے زیادہ ہوں۔" اور ابو جہل نے کہا "خدا کی قسم ہم اس تحریک پر راضی نہ ہوں گے اور نہ ہی اس کی اطاعت کریں گے الا یہ کہ ہم پر بھی اسی طرح جبرئیل وحی لے کر آئیں جس طرح اس پر لاتے ہیں۔

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ کبر نفس اور اس قسم کے لوگ جس طرح کے عادی ہوتے ہیں کہ یہ احکام صادر کرتے ہیں اور دوسرے لوگ اطاعت کرتے ہیں ایسے امور ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کے لئے ضلالت کو مزین کر دیا جاتا ہے اور یوں یہ لوگ دین اور داعیان دین (رسل) کے مقابلے میں دشمنی پر اتر آتے ہیں۔

چنانچہ اللہ ایسے لوگوں کے ان اقوال کی تردید فرماتے ہیں۔ اول یہ کہ کسی کو رسول مقرر کرنا یہ اللہ کے علم محیط پر موقوف ہے کہ کون اس لائق ہے کیونکہ نبوت ایک نہایت ہی اہم کائناتی منصب ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ یہاں اللہ تعالیٰ ان کی تردید سخت تحقیر اور دھمکی سے کرتے ہیں کہ تمہارا انجام بہت ہی برا ہونے والا ہے۔

(اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ (۶: ۱۲۴)) "اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغامبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔ قریب ہے وہ وقت جب یہ مجرم اپنی مکاریوں کی پاداش میں اللہ کے ہاں ذلت اور سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔" رسالت ایک نہایت ہی عظیم اور مہتم بالشان منصب ہے۔ یہ ایک کائناتی معاملہ ہے

جس میں ازلی اور ابدی ارادۂ الٰہیہ ایک بندے کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ عالم بالا اور انسان کی محدود دنیا کے درمیان اتصال ہو جاتا ہے۔ آسمان اور زمین آپس میں مل جاتے ہیں' دنیا اور آخرت ایک ہو جاتے ہیں۔ اس میں سچائی کے کلیات انسانی دلوں' انسانی واقعات' انسانی تاریخ اور عملی دنیا پر منطبق ہوتے ہیں۔ اس میں ایک انسان اپنی ذات سے الگ ہو جاتا ہے اور خالص اور کامل اللہ کا ہو جاتا ہے۔ محض نیت اور عمل کا خلوص ہی نہیں بلکہ اس مخصوص انسان کا ظرف بھی اس عظیم کام کے لئے خالی ہو جاتا ہے۔ ذات رسول ذات باری کے ساتھ مربوط ہو جاتی ہے۔ رسول اور خدا کے درمیان براہ راست رابطہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ اتصال صرف اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے کہ رسول کی ذات اپنی ماہیت کے اعتبار سے اس رابطے کے لئے صالح اور قابل ہو جائے۔ اس کے اندر ایسی صلاحیت پیدا کر دی جائے کہ وہ اس پیغام کو وصول کر سکے۔

اس لئے یہ بات اللہ ہی جانتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے کہ امانت رسالت وہ کہاں لا کر رکھ دے۔ اس مقصد کے لئے کس ذات کا انتخاب کرے کیونکہ اللہ کے اربوں بندے اس زمین پر آتے جاتے اور موجود رہتے ہیں۔ یہ اللہ ہی ہے کہ ان اربوں میں سے کسی ایک کا انتخاب فرما لیتا ہے۔

جو لوگ مقام رسالت تک پہنچنا چاہتے ہیں یا وہ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کو دینی تعلیمات عطا کی جائیں جو رسولوں کو دی گئی ہیں' لیکن یہ لوگ ایسا مزاج رکھتے ہیں جو مسلمان کے لئے موزوں ہی نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ خود اپنی ذات کو محور کائنات سمجھتے ہیں جبکہ رسولوں کا مزاج بالکل دوسرا ہوتا ہے۔ رسول کا مزاج تو یہ ہوتا ہے کہ وہ نہایت ہی عاجزی سے رسالت کو قبول کرتا ہے اور پھر اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ وہ اپنی ذات کو اس پیغام میں نشوونما دیتا ہے اور پھر رسول کو یہ منصب ایسے حالات میں دیا جاتا ہے کہ وہ نہ اس کے بارے میں کوئی خبر رکھتا ہے اور نہ ہی وہ اس کا امیدوار ہوتا ہے۔

(وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ) تم اس بات کی امید نہ رکھتے تھے کہ تمہارے طرف کتاب کا القاء ہو گا' یہ تو تمہارے رب کی ایک رحمت تھی۔" دوسری بات یہ ہے کہ یہ اکابر جاہل ہیں اور اس منصب کی اہمیت سے واقف ہی نہیں ہیں۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ ہی نہیں پا رہے کہ یہ منصب کسی کو عطا کرنا صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔

یہی وجوہات ہیں جن کی بنا پر قرآن ان کی بات کا دو ٹوک الفاظ میں جواب دیتا ہے۔

(اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (۶ : ۱۲۴)) "اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغامبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔" چونکہ اللہ جانتا تھا' اس لئے اس نے یہ منصب موزوں شخص کو دے دیا۔ نہایت ہی مکرم اور مخلص شخص کے سپرد ہوا۔ پوری تاریخ میں اس نے رسولوں کے معزز سلسلے کو جاری کیا اور اسے خاتم النبیینؐ پر ختم کیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان مجرمین کو یہ دھمکی دیتے ہیں کہ ان کا انجام توہین آمیز ہو گا اور انہیں شدید عذاب سے دوچار ہونا ہو گا۔

(سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ (٦: ١٢٤)) قریب ہے وہ وقت جب مجرم اپنی مکاریوں کی پاداش میں اللہ کے ہاں ذلت اور سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔" اللہ کے ہاں ان کو ذلت اس لئے نصیب ہوگی کہ انہوں نے اپنے متبعین کے ہاں اپنے آپ کو سربلند کیا ہوا تھا اور وہ بوجہ کبر و غرور قبول حق سے انکار کرتے تھے اور ان برائیوں کے ساتھ ساتھ مقام رسالت کی تمنا بھی کرتے تھے۔ اور چونکہ انہوں نے اسلامی تحریک کے مقابلے میں سازش کا جال پھیلایا' رسولوں کی دشمنی اختیار کی اور مومنین کو اذیت دی' اس لئے انہیں سخت عذاب دیا جائے گا۔

اب یہ بیان اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ انسانوں کے دل و دماغ میں ایمان ہو تو کیا صورت حال ہوتی ہے اور ہدایت سے انسان کے شب و روز کس طرح بدل جاتے ہیں۔

(فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ (٦: ١٢٥)) "پس (یہ حقیقت ہے کہ) جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ (اسلام کا تصور کرتے ہی) اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے۔ اس طرح اللہ (حق سے فرار اور نفرت کی) ناپاکی ان لوگوں پر مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔"

اللہ تعالیٰ نے اس جہاں میں ہر شخص کو اختیار تمیزی اور آزادی دی ہے کہ وہ ضلالت اختیار کرے یا ہدایت۔ اب جو شخص اللہ تعالیٰ کی اس سنت جاریہ کے مطابق جو اس نے اس کائنات میں ہدایت کے سلسلے میں وضع فرمائی ہے راہ ہدایت کے حصول میں دلچسپی رکھتا ہے اور اسے آزمانے کے لئے اسے جو اختیار دیا گیا ہے اور وہ اس کو استعمال کر کے ہدایت کے لئے سعی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سینہ کو اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔ اس کے دل کے دریچے کھل جاتے ہیں اور وہ بسہولت اسلام کو قبول کرتا ہے اور اس میں دلچسپی لیتا ہے' اس پر مطمئن ہو جاتا ہے اور وہ اسلام کے ساتھ گھل مل جاتا ہے۔

اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے جس کے لئے گمراہی مقدر کر دی ہے' اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی اسی سنت جاریہ کے مطابق اسی شخص کو مقدر کر دی جاتی ہے جسے اسلام اور ہدایت سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ اس کے دل کے دریچے بند ہو جاتے ہیں اور اس کا سینہ اسلام کے لئے تنگ ہو جاتا ہے۔ اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ گویا اس کی روح آسمان پر پرواز کرنے والی ہے۔ چنانچہ اس کا دل و دماغ اس کے لئے بند ہو جاتا ہے اور وہ راہ ہدایت کو اختیار کرنے میں نہایت ہی مشکل محسوس کرتا ہے۔

(كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ) کے الفاظ میں ایک نفسیاتی صورت حال کا نقشہ حسی انداز بیان میں کھینچا گیا

ہے۔ ایسے حالات جس میں انسان کی سانس پھول جاتی ہے اور سینہ تنگی محسوس کرتا ہے' جس طرح بلندی پر چڑھتے وقت انسان محسوس کرتا ہے۔ مفہوم کے ساتھ ساتھ قراۃ حفص کے مطابق لفظ ( یَصَّعَّدُ ) کے اندر بذات خود ایک قسم کی سختی اور مشکل پائی جاتی ہے اور بڑی محنت سے یہ لفظ ادا ہوا ہے۔ اس لفظ کی آواز ہی سے اس کے مفہوم کی مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے۔ یوں انسان کی نفسیاتی حالت' اس کی حسی حالت اور انداز تعبیر سب کے سب یہاں یکجا اور یک رنگ ہو جاتے ہیں۔ (تفصیلات دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی میں بحث حسی تخیل)۔

یہ منظر اس اختتامیہ پر ختم ہوتا ہے :

(كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۶:۱۲۵)) "اور اسی طرح اللہ تعالیٰ ناپاکی ان لوگوں پر مسلط کر دیتا ہے' جو ایمان نہیں لاتے۔" اسی طرح کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنا نظام قضاو قدر جاری کیا ہے۔ اس کے مطابق اور اللہ کی جاری و ساری سنت کے مطابق جو شخص راہ ہدایت تلاش کرتا ہے اللہ اس کا سینہ کھول دیتا ہے اور جو شخص ہدایت کو پسند نہیں کرتا' اللہ اسے گمراہی کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔ اللہ اس طرح ایمان نہ لانے والوں کو گندگی میں ڈال دیتا ہے۔ (الرِّجْسَ ) کے مفہومات میں سے ایک مفہوم عذاب بھی ہے اور اس کے مفہوم میں گندگی اور ناپاکی بھی ہے اور گراوٹ بھی ہے۔ یعنی جو شخص اس ناپاکی اور گندگی کے دلدل میں پھنس جاتا ہے وہ اسی میں پڑا رہتا ہے اور رجس کے لفظ کے استعمال سے یہی اشارہ دینا مطلوب ہے۔

اب ہم اس آیت پر دوبارہ غور کرتے ہیں :

(فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۶:۱۲۵)) "پس (یہ حقیقت ہے کہ) جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ (اسلام کا تصور کرتے ہی) اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے۔ اس طرح اللہ (حق سے فرار اور نفرت کی) ناپاکی ان لوگوں پر مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔"

اس آیت میں جس عظیم حقیقت کو بیان کیا گیا ہے یعنی مشیت الٰہیہ اور اس کے ساتھ وہ تمام دوسری آیات و نصوص جن کا تعلق اللہ کی مشیت اور انسانی اعمال اور رجحانات سے ہے' اور جن میں انسانی اعمال پر جزاو سزا کو مرتب کیا گیا ہے یا جن میں انسان کی ہدایت اور ضلالت کے احکام مرتب ہوئے ہیں' ان تمام آیات کو صحیح طرح سمجھنے کے لئے عقلی اور فلسفیانہ منطق کے سوا ایک دوسری منطق اور قوت ادراک کی ضرورت ہے۔ یہ منطق اور قوت ادراک' ہماری ظاہری عقل اور منطق سے وراء ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی افکار کی تاریخ میں جو بحثیں معتزلہ اور اہل سنت کے درمیان ہوئی ہیں اور اہل سنت اور مرجئہ کے درمیان اور اس سے قبل عیسائیوں کے فلسفہ لاہوت کے اندر جو بحث و جدال رہی ہے اور اس سلسلے میں جو منطق صغریٰ و کبریٰ متعین ہوئے ان سب سے وہ قوت مدرکہ وراء ہے۔

اس نازک بحث کو سمجھنے کے لئے ہمیں انسان کی عقلی اور منطقی دنیا سے ذرا آگے جانا ہو گا اور اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہمیں عقلی اور فلسفیانہ دنیا سے ذرا باہر آکر انسان کی عملی زندگی میں آنا ہو گا۔ قرآن کریم جس صورت حال کی تصویر کشی کر رہا ہے اس کا تعلق انسان کی عملی صورت حالات سے ہے۔ اس کا تعلق محض عقلی اور فلسفیانہ مباحث سے نہیں ہے۔ انسان کے واقعی حالات اور اس کے عملی شب و روز جس طرح ہوتے ہیں اور اس کائنات میں جس طرح عملی طور پر چلتے ہیں ان آیات میں ان کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جب ہم انسان کی عملی دنیا کو دیکھتے ہیں تو اس میں اللہ کی قدرت اور مشیت اور انسان کا ارادہ اور سعی و عمل ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں اور ان کا عملی میدان اس طرح باہم ملا ہوا ہے کہ محض فلسفیانہ منطق اس گتھی کو سلجھا نہیں سکتی۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ کا ارادہ اور تقدیر انسان کو ہدایت یا ضلالت کی طرف دھکیل دیتی ہے تو یہ صورت بھی عملی نہیں ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ بس انسان کا ارادہ اور عمل ہی اس کے انجام کو متعین کرتا ہے تو عملاً ایسا بھی نہیں ہے۔ حقیقت کا تعلق ان دونوں امور کے ساتھ ہے اور وہ اس قدر لطیف اور نظروں سے اوجھل ہے اور اسی طرح بین بین ہے کہ ایک طرف اللہ کی مشیت مطلقہ ہے اور دوسری جانب انسان کا ارادہ اور رجحان ہے' دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان کے درمیان عملاً تصادم بھی نہیں ہوتا۔

لیکن جبر و اکراہ اور قدرت واختیار کے اس حسین امتزاج کی اصل نوعیت کو ہم محض استدلال یا عقلی سوچ کے ذریعے متعین نہیں کرپاتے۔ نہ ہم اس کی واضح تعبیر انسانی الفاظ و عبارات میں کرسکتے ہیں۔ اس لئے کہ انسانی عبارات کسی حقیقت کی حقیقی نوعیت سے عبارت ہوتی ہیں اور جب اصل حقیقت ہی منطقی استدلال اور عقلی فکر کی رینج سے باہر ہو تو عبارات اور اسلوب اظہار کیا کر سکتا ہے۔

اس عظیم عملی حقیقت کے صحیح تصور کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان کو بیک وقت عقلی اور روحانی دنیا کا تجربہ ہو۔ عملاً یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کا فطری میلان اسلام کی طرف ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔ یہ بات قطعی طور پر اللہ کا فعل ہوتی ہے اس لئے کہ یہ شرح صدر ایک وقوعہ ہے اور کوئی وقوعہ اللہ کی تخلیق کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔ اور جس کی فطرت ضلالت کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو وہ اپنے دل میں تنگی اور گھٹن محسوس کرتا ہے اور اسلام و ہدایت کا تصور کرتے ہی وہ مشکل محسوس کرتا ہے۔ یہ بھی اللہ کا کام ہے کیونکہ یہ بھی ایک وقوعہ ہے اور اس کا ظہور بھی اللہ کی تخلیق اور عملاً اس کی مشیت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں امور اس ارادے کے تابع ہیں جو اللہ کی ذات انسانوں کے بارے میں فرماتی ہے۔ لیکن اللہ کے اس ارادے کو جبری ارادہ نہیں کہہ سکتے۔ یہ ارادہ اللہ کی سنت جاریہ کے مطابق ہے۔ وہ سنت یہ ہے کہ اللہ نے حضرت انسان کو ایک مخصوص مقدار میں آزادی عطا کر کے اسے آزمائش میں ڈال دیا ہے اور اللہ کی یہ سنت اور یہ تقدیر انسان کی جانب سے اس آزادی کے استعمال کے نتیجے میں اپنا کام کرتی ہے۔ رہی ہدایت و ضلالت تو یہ انسان کے خود اپنے رجحان اور صلاحیت پر مبنی ہے۔

اگر ہم ایک عقلی صغریٰ کے مقابلے میں ایک عقلی کبریٰ لائیں اور ان صغریٰ اور کبریٰ کے قضیوں کے ساتھ روحانی اور باطنی علم کو نہ ملائیں اور نہ ہی اس کے ساتھ انسان کے عملی اور نفسیاتی تجربات کو شامل کریں تو ہم اس عظیم حقیقت کو اپنے ادراک کے دائرے میں نہیں لا سکتے۔ پوری اسلامی تاریخ میں اس مسئلے پر جو بحث و جدال رہا اس کا یہی نتیجہ نکلا ہے۔

اسی طرح اسلام کے علاوہ دوسرے فلسفوں کا نتیجہ بھی ایسا ہی رہا ہے۔ لہٰذا اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے ہمیں عملی اور روحانی ذوق کو بھی استعمال کرنا ہوگا۔ ایسا ذوق جو اس حقیقت کو منطقی صغریٰ و کبریٰ سے نکل کر براہ راست پا سکے۔

اب ہم دوبارہ سیاق قرآن کی طرف لوٹتے ہیں۔ اس سبق کی یہ لہر سابق بیان پر بطور تبصرہ وارد ہوئی۔ سابق بیان ذبیحوں کی حلت اور حرمت کے بارے میں تھا لیکن یہ تمام امور دراصل ایک ہی پیکیج کے مختلف حصے ہیں۔ انسان کے اندر دینی شعور کی تعمیر' انسان کے لئے قانون اور اقتدار کی تجویز' انسان پر اللہ کی حاکمیت کا تصور اور ان سب کو دائرہ ایمان کے اندر لاکر ایک ہی پیکیج بنا دینا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ایمان اور کفر اور ہدایت و ضلالت کے مضمون کو بھی بیچ میں بیان کر دیا گیا۔ اب آخر میں ایک دوسرا تبصرہ آتا ہے جس کے نتیجے میں یہ تمام امور باہم مربوط ہو جاتے ہیں۔ ان امور کا مجموعہ صراط مستقیم کہلاتا ہے۔ اگر ان امور میں سے کوئی ایک بھی ترک کر دیا گیا تو گویا انسان نے صراط مستقیم کو ترک کر دیا۔ یعنی عقیدۂ توحید و شعور بھی اس کا حصہ ہے اور اس راستے پر جاکر انسان دارالسلام تک پہنچتا ہے۔ اور دارالسلام میں اللہ اہل ایمان کا دوست و ولی ہوتا ہے۔

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿126﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿127﴾

"حالانکہ یہ راستہ تمہارے رب کا سیدھا راستہ ہے اور اس کے نشانات ان لوگوں کے لئے واضح کر دیئے گئے ہیں جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔ ان کے رب کے پاس ان کے لئے سلامتی کا گھر ہے اور وہ ان کا سرپرست ہے اس صحیح طرز عمل کی وجہ سے جو انہوں نے اختیار کیا۔" یہ ہے صحیح راستہ' اور تیرے رب کا راستہ۔ "تیرے رب" کا لفظ نہایت ہی اطمینان بخش اور تشفی بخش ہے۔ دل مومن کو اعتماد اور یقین سے بھر دینے والا ہے اور ایک اچھے انجام کے لئے خوشخبری ہے۔ یعنی یہ ہے ہدایت و ضلالت کے بارے میں سنت الٰہیہ اور یہ ہے اسلام کا قانون حلال و حرام اور یہ دونوں دین اسلام کا حصہ ہیں اور سیاق قرآن میں اسی لئے انہیں یکجا اور ایک ٹکڑا بنایا گیا ہے۔

ہم نے تو ان آیات الٰہیہ کو نہایت ہی واضح کر کے بیان کر دیا ہے۔ لیکن ان سے استفادہ وہی لوگ کر سکیں گے جو ان کو بھلائیں گے نہیں بلکہ یاد رکھیں گے۔ اس لئے کہ دل مومن تو یاد کرنے والا ہے' بھولنے والا نہیں ہے۔ نیز دل مومن ہمیشہ ہدایت کے لئے کھلا رہتا ہے۔ وہ زندہ ہوتا ہے اور بات سنتا ہے' مردوں کی طرح نہیں ہوتا۔

پھر جو لوگ یاد کرتے ہیں اور نصیحت پکڑتے ہیں ان کے لئے ان کے رب کے نزدیک دارالسلام ہے جہاں وہ تسلی اور تشفی سے رہیں گے۔ اس امن و طمانیت کی ضمانت اللہ دیتا ہے جو کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ وہ ان کا ولی اور مددگار ہے اس لئے کہ وہ صحیح راستے پر عمل کرتے ہیں اور آزمائش دنیا میں ان کی کامیابی پر یہ ان کے لئے انعام ہے۔

یہاں آکر ہم ایک بار پھر اپنے آپ کو ایک عظیم حقیقت کے سامنے کھڑا پاتے ہیں۔ اس حقیقت کا تعلق اس دین کے نظریاتی پہلو سے ہے اور یہ حقیقت اسلام کے ان نظریات اور اللہ کے حق حاکمیت پر مشتمل ہے جن کے اوپر اللہ کا سیدھا راستہ استوار ہوتا ہے۔ یہ اس دین کا حقیقی مزاج ہے اور اسی پر اسے اللہ رب العالمین نے استوار کیا ہے۔

# درس ٦٩ ایک نظر میں

یہ پورا مضمون درس سابق ہی کے ساتھ ملحق ہے 'بلکہ یہ اسی کا تسلسل ہے - اور یہ اسی طرح ہے جس طرح سمندر میں لہر کے بعد لہر اٹھتی ہے - اس میں شیاطین جن اور شیاطین انس کے انجام کا بیان کیا گیا ہے اور یہ انجام اس اچھے انجام کے بالمقابل بیان ہوا ہے جو ان لوگوں کا ہو گا جو صراط مستقیم پر قائم ہوں گے - اس جگہ اس کا ذکر اس مناسبت سے ہوا ہے کہ یہاں اللہ کی حاکمیت اور اس کے حق قانون سازی کا مضمون چل رہا تھا اور یہ مسائل وہ ہیں جن کا تعلق دین اسلام کے بنیادی اور ایمانی تصورات کے ساتھ ہے - مقصد یہ بتلانا ہے کہ یہ مسائل محض سیاسی اور دنیاوی مسائل نہیں ہیں بلکہ یہ ایمانیات کے ساتھ متعلق ہیں اور ان پر اخروی جزاو سزا بھی مرتب ہوتی ہے یعنی دنیا میں تبلیغ اور دعوت اور ڈراوے کے بعد انسان جو بھی کمائے گا اس پر تمام لوگوں کا انجام ہو گا - اگر لوگوں کے کسب و عمل کو دخل نہ ہوتا تو اللہ تو اس بات پر پوری پوری قدرت رکھتا ہے کہ شیاطین اور ان کی دوست اقوام کو صفحہ ہستی سے مٹا دے اور ان کی جگہ دوسری فرمانبردار اقوام کو لے آئے کیونکہ پوری دنیا کی آبادی اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی - یہ تمام امور نظریاتی عقائد کے ساتھ متعلق ہیں - اور ان کو ذبیحوں کے حلال و حرام کی بحث کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے - اس بحث سے قبل بھی اور بعد میں بھی - ذبیحوں کے بیان کے بعد پھلوں اور مویشیوں اور اولاد کی نذر کے مسئلے کو بھی یہاں لیا گیا ہے' اس کا بھی یہاں نظریاتی پہلو ہے اور جاہلیت کے مختلف ادوار میں یہ رسوم کچھ نظریات پر مبنی تھیں - اس طرح یہ تمام مباحث ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ اور پیوستہ نظر آتے ہیں - اور یہ مسئلہ اسلامی نظام میں اس کی حقیقی حیثیت اور مقام میں نظر آتا ہے - ان سب کے اندر مشترکہ صفت یہ ہے کہ ان تمام مسائل کا ایک نظریاتی پہلو ہے اور وہ یہ کہ اسلامی نظریہ حیات کے مطابق حلال و حرام کے تعین کا اختیار صرف اللہ کو ہے -

---ooo---

# درس نمبر ۶۹ تشریح آیات

## ۱۲۸--- تا--- ۱۳۵

اس سے پہلے سبق میں یہ بات گزری ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے دلوں کو اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔ایسے لوگوں کے دل بیدار ہوتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔یہ لوگ دارالسلام میں داخل ہوتے ہیں اور اپنے رب کی ولایت اور کفالت میں رہتے بستے ہیں۔اب یہاں ایسے لوگوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو ان کے نقیض ہیں۔قیامت کے مناظر بیان کرتے ہوئے قرآن کریم کا یہی انداز ہوتا ہے کہ وہ تصویر کے دونوں رخ انسان کے سامنے پیش کرتا ہے۔اب یہاں انسانوں اور جنوں میں سے جو لوگ شیطانی کام کرتے ہیں ان کے شب و روز کا ذکر کیا جاتا ہے' یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا میں ایسی زندگی گزاری ہے کہ یہ ایک دوسرے کو کھوٹی باتیں بتاتے رہے ہیں۔ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے رہے ہیں اور یہ کام وہ اس لئے کرتے رہے ہیں کہ لوگ گمراہ ہوں۔ان لوگوں کا رویہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ یہ لوگ نبیوں کے مقابلے میں ایک دوسرے کے پشتیبان بنیں اور یہ لوگ ایک دوسرے کو مشورے دیتے رہے ہیں تاکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ان معاملات میں بحث و مباحثہ کریں جن میں اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے حلال و حرام کا تعین کیا ہے۔ان لوگوں کو قرآن کریم نے اس طرح پیش کیا ہے جس طرح ایک زندہ اور متحرک منظر میں کوئی چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔یہ لوگ اس منظر میں ایک دوسرے پر الزام لگاتے ہوئے' نہایت ہی منافق نظر آئے۔غرض اس آیت میں وہ مناظر بھرپور انداز میں آگئے جس طرح کہ قرآن کریم ہر جگہ مناظر قیامت کے بیان کے وقت یہ انداز عموماً اختیار کرتا ہے۔

---

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ۚ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِنَ الْإِنْسِ ۖ وَقَالَ أَوْلِيَاؤُهُمْ مِنَ الْإِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتَ لَنَا ۚ قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۱۲۸﴾ وَكَذَٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظَّالِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۱۲۹﴾

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَ يُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓي اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝۱۳۰

''جس روز اللہ سب لوگوں کو گھیر کر جمع کرے گا' اس روز وہ جنوں (یعنی شیاطین جن) سے خطاب کر کے فرمائے گا کہ ''اے گروہ جن' تم نے تو نوع انسانی پر خوب ہاتھ صاف کیا۔'' انسانوں میں سے جو ان کے رفیق تھے' وہ عرض کریں گے ''پروردگار! ہم میں سے ہرایک نے دوسرے کو استعمال کیا ہے' اور اب ہم اس وقت پر آ پہنچے ہیں جو تو نے ہمارے لئے مقرر کر دیا تھا۔'' اللہ فرمائے گا ''اچھا اب آگ تمہارا ٹھکانا ہے' اس میں تم ہمیشہ رہو گے۔'' اس سے بچیں گے صرف وہی جنہیں اللہ بچانا چاہے گا' بے شک تمہارا رب دانا اور علیم ہے۔ دیکھو' اس طرح ہم (آخرت میں) ظالموں کو ایک دوسرے کا ساتھی بنائیں گے۔ اس کمائی کی وجہ سے جو وہ (دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر) کرتے تھے۔ (اس موقع پر اللہ ان سے یہ بھی پوچھے گا کہ) ''اے گروہ جن و انس' کیا تمہارے پاس خود تم میں سے ایسے رسول نہیں آئے تھے جو تم کو میری آیات سناتے اور اس دن کے انجام سے ڈراتے ''؟ وہ کہیں گے ''ہاں' ہم اپنے خلاف خود گواہی دیتے ہیں۔'' آج دنیا کی زندگی نے ان لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا ہے' مگر اس وقت وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔

یہ منظر براہ راست مستقبل کے واقعات سے شروع ہوتا ہے' جب اللہ تعالیٰ سب کو گھیر کر میدان حشر میں جمع کرے گا' لیکن سننے والے کے لئے یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے اور وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو اور یہ تخیل اور تصور صرف ایک لفظ (اور کہے گا) کے حذف سے سامنے آتا ہے یعنی ''اور جس روز اللہ ان سب کو گھیر کر جمع کرلے گا (اور یہ کہے گا) اے گروہ جن''۔ صرف لفظ کہے گا کے حذف سے مفہوم ایک منظر کی شکل میں نظروں کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ منظر جو مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والا تھا فی الواقع سامنے آجاتا ہے اور یہ اندازبیان قرآن کریم کے ساتھ مخصوص ہے۔ اب ذرا اس منظر کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیں۔

(يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ (۶:۱۲۸)) ''اے گروہ جن' تم نے تو نوع انسانی پر خوب ہاتھ صاف کیا۔'' یعنی تم نے انسانوں کی اکثریت کو اپنا تابع بنا لیا۔ وہ تمہاری ہدایات و اشارات پر چلتے رہے اور تمہاری وسوسہ اندازیوں پر خوب یقین کرتے رہے۔ تمہارے منصوبوں پر چلتے رہے۔ یہ صورت واقعہ کا ایسا بیان ہے کہ جس سے مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ صرف واقعہ بیان کرنا مطلوب ہے اس لئے کہ جن اس بات کو خوب جانتے تھے کہ انہوں نے انسانوں کی ایک بڑی اکثریت کو گمراہ کر دیا ہے بلکہ اس واقعی صورت حال کے بیان سے مقصد یہ ہے کہ یہ تمہارا بہت ہی بڑا جرم ہے کہ تم نے انسانوں کی اتنی بڑی اکثریت کو گمراہ کر دیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے اس جرم کو دیکھ کر

پشیمان ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں جنات کی جانب سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ البتہ وہ لوگ جواب دیتے ہیں جنہیں دھوکہ دیا گیا اور جو بسہولت ان شیاطین کے وسوسوں کا شکار ہو جاتے تھے۔ یہ لوگ یوں جواب دیتے ہیں۔

(وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا (۶:۱۲۸)) انسانوں میں سے جو ان کے رفیق تھے وہ عرض کریں گے "پروردگار' ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے کو خوب استعمال کیا ہے' اور اب ہم اس وقت پر آپہنچے ہیں جو تو نے ہمارے لئے مقرر کر دیا تھا۔"

اس جواب سے ان غافلوں کی غفلت اور ان کے ہلکے پن کا اندازہ ہوتا ہے اور اس دنیا میں شیطان انسانوں کو جس راہ پر گمراہ کرتا ہے اس کا اندازہ بھی خوب ہو جاتا ہے۔ یعنی جب جنات ان لوگوں کو دھوکہ دے رہے تھے تو یہ دھوکہ کھانے والے بھی انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے۔ یوں یہ جنات ان افکار و تصورات کو ان لوگوں کے لئے خوشنما بناتے تھے۔ اس طرح یہ لوگ ظاہری اور باطنی بدکاریوں میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ گویا شیطان عیاشیوں کے راستے سے انسان کو گمراہ کرتا ہے۔ اس طرح اس دھوکے اور گمراہ سازی کے ذریعے یہ شیاطین بھی خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ یوں شیطان ان کو اپنی ہوس کا شکار بناتا اور ان سے کھیلتا اور ان کو اس جہان میں ابلیسی مقاصد کے لئے استعمال کرتا۔ جبکہ یہ دھوکہ کھانے والے یہ سمجھتے کہ ہم نے شیطان کو گمراہ کر دیا ہے۔ اس طرح یہ خود بھی اس کھیل میں مشغول ہوتے' دلچسپی لیتے اور لطف اندوز ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتے تھے۔

(اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ) (ہم ایک دوسرے سے خوب لطف اندوز ہوتے۔) چنانچہ مرنے تک ہماری یہی عیاشی جاری رہی اور پھر اچانک موت آگئی۔ اور اب وہ جان رہے ہیں کہ یہ مہلت تو اللہ تعالیٰ نے دی تھی اور یہ جو عیاشیاں کرتے تھے' اس وقت بھی دراصل وہ پوری طرح اللہ کے قبضہ قدرت میں تھے۔ (اور اب ہم اس وقت پر آپہنچے ہیں جو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا ہے)۔ اب اس مقام پر اللہ کی جانب سے فیصلہ کن جواب آتا ہے:

(قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۶:۱۲۸)) "اللہ فرمائے گا "اچھا اب آگ تمہارا ٹھکانا ہے' اس میں تم ہمیشہ رہو گے۔" اس سے بچیں گے صرف وہی جنہیں اللہ بچانا چاہے گا' بیشک تمہارا رب دانا اور علیم ہے۔"

یعنی تمہارا ٹھکانا جہنم ہے۔ یہاں تمہارا قیام ہو گا اور یہ قیام دائمی ہو گا' (اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ (۶:۱۲۸)) اور یہ لفظ (اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ (۶:۱۲۸)) یہاں اس لئے استعمال ہوا ہے کہ اللہ کی مشیت مطلق ہے' بے قید ہے۔ اسلامی تصورات و عقائد میں اللہ کی مشیت کا بے قید ہونا ایک اساسی اصول ہے۔ نہ اس پر کوئی چیک ہے اور نہ اس میں کوئی نقص ہے کیونکہ اللہ دانا اور علیم ہے اور وہ اپنی مشیت اور تقدیر کو پورے علم کے ساتھ چلاتا ہے۔ اس کے علم کے ساتھ حکمت بھی موجود ہے۔ اس منظر کے خاتمے سے پہلے اس منظر پر ایک تبصرہ سامنے آتا ہے اور یوں ایک حکمت ہمارے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے۔

(وَكَذٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظّٰلِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ "دیکھو' اس طرح ہم (آخرت میں) ظالموں کو ایک دوسرے کا ساتھی بنائیں گے اس کمائی کی وجہ سے جو وہ (دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کرتے تھے)۔" یعنی یہ بات قابل عبرت ہے کہ جنوں اور انسانوں کے درمیان اس طرح دوستی قائم ہو جاتی ہے اور اس دوستی کا یہ انجام ہوتا ہے۔ اس طرح اللہ انہیں ایک دوسرے کے لئے سازگار بنا دیتا ہے۔ خود ان کی اپنی کمائی کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں' اس لئے کہ ان کے مزاج اور ان کی خواہشات ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتی ہیں۔ ان کے رجحانات اور اہداف ایک ہوتے ہیں اور پھر ان کا انجام بھی ایک جیسا ہوتا ہے۔

یہ تعقیب اور اس میں بیان کردہ حقیقت اس وقت کے موجودہ حالات کے مقابلے میں زیادہ دور رس نتائج کی حامل ہے۔ اس میں جنی اور انسی شیطانوں کے درمیان پائے جانے والے رابطے اور دوستی کی اصل حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے اس لئے کہ وہ لوگ جو ظالم ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں شرک کرتے ہیں' وہ سچائی اور ہدایت کے مقابلے میں اکٹھ کر لیتے ہیں اور ان لوگوں کا وطیرہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ نبی اور اس کے ساتھیوں کے مقابلے میں آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جس طرح ان لوگوں کی فطرت اور مزاج ایک ہے' اگرچہ شکلیں مختلف ہوں' اسی طرح ان کے اغراض و مقاصد بھی ایک ہوتے ہیں اور ان کے اغراض و اہداف یہ ہوتے ہیں یعنی اللہ کے مقابلے میں اپنا حق حاکمیت چلاتے ہیں اور خواہشات نفسانیہ اور عیاشی کے معاملے میں کوئی حد اور قید قبول نہیں کرتے 'یعنی اللہ کے جانب سے حدود و قیود۔

یہ لوگ ہر دور میں ایک گروہ اور ایک بلاک ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں حالانکہ خود ان کے درمیان باہم مقاصد و مفادات کے اختلافات بھی ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کا مزاج اور رجحان ایک ہوتا ہے' ان کے مقاصد ایک ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کے درمیان باہم محبت ہوتی ہے اس لئے جس طرح گزشتہ منظر میں بتایا گیا ان کا انجام بھی ایک ہی ہوتا ہے۔

آج کے دور میں' ایک طویل عرصے سے ہم اس بات کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ انسانی شیطان مثلاً صلیبی' صہیونی' بت پرست اور اشتراکی' مختلف مفادات اور مختلف بلاکوں کے ممبر ہوتے ہوئے بھی باہم دوست ہیں اور باہم معاون و مددگار ہیں۔ ان کا یہ اتحاد و اتفاق اسلام اور اسلامی تحریکات کے دستوں کے خلاف ہے اور یہ پوری دنیا پر موجود ہے۔

عملاً یہ ایک خوفناک گٹھ جوڑ ہے۔ یہ گٹھ جوڑ کرنے والے وہ لوگ ہیں جن کو صدیوں تک اسلام کے مقابلے میں محاربت کا تجربہ ہے۔ یہ لوگ مادی اور علمی معاشرتی قوتوں اور تمام دوسرے سازوسامان کے ساتھ اسلام کے مقابلے میں معرکہ آراء ہیں اور اپنی مکارانہ شیطانی چالوں کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔ اس گٹھ جوڑ پر اللہ کا یہ فرمان آج اچھی طرح چسپاں ہوتا ہے۔ "اور ہم ظالموں کو اسی طرح ایک دوسرے کا دلی بناتے ہیں اس کمائی کی وجہ سے جو وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کرتے ہیں۔" اس گٹھ جوڑ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے آنے والی یہ آیت صادق آتی ہے۔

(وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ) "اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے 'پس آپ ان کو چھوڑ دیجئے جو چاہیں افتراء باندھیں) لیکن اس تسلی کے تقاضے تب ہی پورے ہوں گے کہ دنیا میں حضور ؐ کے نقش قدم پر چلنے والا ایک گروہ موجود ہو اور یہ معلوم ہو کہ یہ گروہ حضور کے ساتھیوں کا قائم مقام ہے۔ دین پر دشمنوں کے

حملوں کی راہ میں کھڑا ہے۔اب ذرا دوبارہ آیات قرآنیہ کی طرف آیئے۔

(یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِیْ وَیُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓی اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِیْنَ (٦ : ١٣٠)) "(اس موقع پر اللہ ان سے یہ بھی پوچھے گا کہ) "اے گروہ جن و انس 'کیا تمہارے پاس خود تم میں سے ایسے رسول نہیں آئے تھے جو تم کو میری آیات سناتے اور اس دن کے انجام سے ڈراتے"؟ وہ کہیں گے "ہاں' ہم اپنے خلاف خود گواہی دیتے ہیں۔" آج دنیا کی زندگی نے ان لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا ہے 'مگر اس وقت وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔"

یہ استفہام تقریری ہے۔یہ اس لئے نہیں ہے کہ اللہ ان لوگوں سے معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے کہ آیا رسول آئے تھے یا نہیں۔ اللہ تو خوب جانتے تھے کہ کیا ہو چکا ہے۔ان کی جانب سے اقرار اور استشہاد درحقیقت ان کی سزا کے لئے وجہ جواز ہے۔یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ سزا ان کے لئے عادلانہ سزا ہے۔وہ اس کے مستحق ہیں۔

خطاب جس طرح جنوں سے ہے اسی طرح انسانوں سے ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا جنوں کے پاس بھی خود ان کے ہم جنس رسول بھیجے گئے تھے؟ جس طرح انسانوں کے پاس انسان آئے تھے۔جن انسانوں سے پوشیدہ مخلوق ہے اور ان کے اصل حالات سے تو صرف اللہ خبر رکھتا ہے۔رہی یہ آیت 'تو اس کی تفسیر میں کہا جا سکتا ہے کہ جنات بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والے کلام کو سنتے تھے۔پھر جا کر اپنی قوم کو ڈراتے تھے اور خوشخبری بھی سناتے تھے۔اس کی تفصیلات سورہ احقاف میں قرآن نے دی ہیں :۔

"اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ وہ قرآن سنیں۔ جب وہ اس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو انہوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ' پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔انہوں نے جا کر کہا :"اے ہماری قوم کے لوگو' ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے' تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی' راہنمائی کرتی ہے حق اور راہ راست کی طرف' اے ہماری قوم کے لوگو' اللہ کی طرف بلانے والی دعوت قبول کر لو' اور اس پر ایمان لے آؤ اور اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں عذاب الیم سے بچا لے گا۔" اور جو کوئی اللہ کے داعی کی بات نہ مانے وہ نہ زمین میں خود کوئی بل بوتا رکھتا ہے کہ اللہ کو زچ کر دے اور نہ اس کے کوئی ایسے حامی و سرپرست ہیں کہ اللہ سے اس کو بچائیں۔ایسے لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہیں۔" (۴۶ :۲۹ تا ۳۲)

ہو سکتا ہے کہ یہ سوال و جواب ان انسانوں اور جنوں سے ہو رہا ہو جو اس طرح کھڑے تھے۔بہرحال اصل علم اللہ ہی کو ہے۔یہاں ہم اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتے۔اس سے زیادہ اس مسئلے پر بحث کرنے کا کچھ فائدہ بھی نہیں ہے۔

بہرحال جن و انس میں سے جن لوگوں سے یہ سوال کیا گیا تھا' وہ جانتے تھے کہ یہ محض استفسار کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ فرد قرارداد جرم ہے۔ان کے جرم کا ریکارڈ تیار ہو رہا ہے اور یہ سوال و جواب محض زجر و توبیخ کے لئے ہیں۔

چنانچہ انہوں نے پورا پورا اعتراف کر لیا اور اس بات کا اقرار کر لیا جس کے وہ مستحق تھے۔

(قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰى اَنْفُسِنَا (٦ : ١٣٠)) انہوں نے کہا ہم خود اپنے اوپر گواہی دیتے ہیں۔" اب یہاں اس منظر پر ایک مبصر سامنے آتا ہے اور کہتا ہے۔

(وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا

كٰفِرِيْنَ (٦ : ١٣٠)) "آج دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ مگر اس وقت وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔" یہ تبصرہ دنیا میں ان کے حالات پر خوب منطبق ہوتا ہے۔ دراصل اس دنیاوی زندگی کی بوقلمونیوں نے انہیں دھوکہ دے رکھا ہے اور اس دھوکے کی وجہ سے وہ کفر میں مبتلا ہیں۔ اب وہ قیامت کے دن سب کچھ دیکھ لینے کی بعد مجبور ہیں کہ اپنے اوپر شہادت دیں کیونکہ یہاں انکار اور مکابرہ کرنے سے کچھ حاصل ہونے کی امید نہیں ہے۔ اس سے بڑی مایوس کن صورت حالات اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان اپنے آپ کو ایسے حالات میں گھرا ہوا پائے کہ خود اپنا دفاع بھی نہ کر سکتا ہو۔ نہ انکار کی تاب ہو۔ اور نہ کوئی عذر و معذرت اس کے پاس ہو۔

اب ذرا ملاحظہ ہو قرآن کریم کا انداز بیان۔ مشاہدہ قیامت کا جو تصویری نقشہ قرآن پیش کرتا ہے اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا نقشہ یوں کھینچ دیا جاتا ہے کہ انسان منظر کو اسکرین پر دوڑتا محسوس کرتا ہے۔ مستقبل کے بجائے قرآن کریم ان مناظر کے لئے ماضی کا صیغہ استعمال کرتا ہے، گویا یہ مناظر دکھلائے جا چکے ہیں۔

یہ قرآن ہم اس دنیا میں پڑھ رہے ہیں، بلکہ آج پڑھ رہے ہیں، ابھی قیامت تو واقعہ ہی نہیں ہوئی۔ ابھی تو ہم اس کرۂ ارض پر ہیں لیکن یوں نظر آتا ہے کہ یہ منظر نظروں کے سامنے ہے بلکہ یہ منظر ہم دیکھ چکے ہیں۔ ایک دیکھے ہوئے منظر کی حکایت ہو رہی ہے اور ہم اپنے حافظہ سے یاد تازہ کر رہے ہیں۔ انسان یہ بات بھول جاتا ہے کہ اس منظر کو تو ابھی آنا ہے۔ لیکن بات یوں ہو رہی ہے کہ شاید کوئی تاریخی واقعہ دہرایا جا رہا ہے۔

( وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ

(٦ : ١٣٠)) آج دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ مگر اس وقت وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔" یہ انداز تخیل کے عجائبات میں سے ہے۔

---ooo---

اب اس منظر کا خاتمہ ہوتا ہے اور روئے سخن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے۔ آپ کو خطاب کر کے اہل ایمان کو سمجھایا جاتا ہے اور اہل ایمان کے بعد قیامت تک آنے والے مومنین کو بتایا جاتا ہے کہ جن و انس کے اس انجام میں تمہارے لئے یہ سبق ہے۔ یہ عظیم مخلوق جو جہنم کی طرف جا رہی ہے اور تم اس منظر میں دیکھ رہے ہو کہ وہ خود اپنے خلاف اقرار جرم کر رہے ہیں کہ بے شک رسول آئے تھے، انہوں نے اللہ کی پوری پوری ہدایات ہمیں سنائی

تھیں۔ اس برے انجام سے ہمیں پہلے ہی خبردار کر دیا گیا تھا۔ مومنین کو خبردار کیا جاتا ہے کہ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ تو ان پر حجت تمام کرتا ہے' ان کو بذریعہ رسل خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کرتا ہے۔ خوشخبری بھی دیتا ہے اور انجام بد سے ڈراتا بھی ہے۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾

یہ شہادت ان سے اس لئے لی جائے گی کہ یہ ثابت ہو جائے کہ تمہارا رب بستیوں کو ظلم کے ساتھ تباہ کرنے والا نہ تھا جب کہ ان کے باشندے حقیقت سے ناواقف ہوں۔"

اللہ کی رحمت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ لوگوں کو شرک 'کفر اور نافرمانی پر اس وقت تک سزا نہ دے جب تک ان تک رسولوں کے ذریعے اپنا پیغام پہنچا نہ دے حالانکہ اللہ نے لوگوں کی فطرت کے اندر یہ صلاحیت ودیعت کر دی تھی کہ وہ از خود اپنے رب کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی تلاش کریں۔ یہ انتظام اس لئے کیا گیا کہ انسانی فطرت بعض اوقات صحیح راہ کو گم کر دیتی ہے۔ انسان کے فطری رجحانات کے علاوہ اللہ نے انسان کو عقلی قوت دے کر بھی ایک امتیاز بخشا لیکن اللہ نے اس عقلی قوت کے باوجود رسول بھیجے اس لئے کہ عقلی قوت بھی نفسانی خواہشات کے نتیجے میں بسا اوقات دب جاتی ہے۔ نیز اس کائنات کے مشاہد و مناظر کے اندر بے شمار دلائل ایسے موجود تھے جو انسان کو دعوت فکر دیتے تھے لیکن انسان کی عقلی اور ادراکی قوتیں بسا اوقات معطل ہو جاتی ہیں۔

ان وجوہات کی بنا پر اللہ نے انسانی فطرت' انسانی عقل اور انسانی مشاہدے کو رسولوں کی دعوت کے ساتھ منسلک کر دیا تاکہ انسان کی ان قوتوں کو فساد سے بچایا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تب ہی لوگوں کو عذاب دیتا ہے جب رسولوں کی دعوت کسی تک پہنچ جائے اور ان پر حجت تمام ہو جائے۔

اس حقیقت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے ساتھ کس قدر رحیمانہ اور کریمانہ سلوک کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان صرف اپنی قوت ادراک اور عقلی قوتوں کے بل بوتے پر راہ ہدایت نہیں پا سکتا۔ نہ وہ یقین حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی عقل اور ادراک کے ذریعے اپنی شہوانی قوتوں کو ضابطے کا پابند کر سکتا ہے۔ یہ قوتیں تب ہی کام کر سکتی ہیں جب ان کی پشت پر دین اور عقیدے کی قوت موجود ہو۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ جزا و سزا کے بارے میں ایک دوسرے اہم اصول کا ذکر فرماتا ہے اور یہ اصول اہل ایمان اور جن و شیاطین سب کے لئے ہے۔

وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

"ہر شخص کا درجہ اس کے عمل کے لحاظ سے ہے اور تمہارا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔" اہل ایمان کے بھی درجے ہیں۔ ایک سے ایک بڑا ہے۔ شیاطین کے بھی درجے ہیں۔ ایک سے ایک بڑا ہے۔ اور سب لوگوں کے اعمال ریکارڈ شدہ ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے بے خبر نہیں ہے۔ (وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ (۶: ۱۳۲))

اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے رسول بھیجے' یہ محض اس کا کرم ہے کہ اس نے ایسا کیا' اس لئے کہ وہ غنی بادشاہ ہے' اسے ان کے ایمان کی کوئی ضرورت لاحق نہیں ہے۔ نہ اسے ان کی جانب سے عبادت اور بندگی کی کوئی احتیاج ہے۔ اگر وہ نیک بنتے ہیں تو وہ دنیا اور آخرت میں اپنی بھلائی کے لئے نیک بنیں گے۔ اسی طرح اللہ رحمت کا اظہار اس وقت بھی علی وجہ الاتم ہوتا ہے کہ اللہ اس دنیا میں نافرمانوں کو بھی مہلت دیتا ہے ورنہ وہ اس بات کی پوری پوری قدرت رکھتا ہے کہ وہ سب کو ہلاک کر دے اور ان کی جگہ کوئی دوسری قوم اور نسل لے آئے۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ﴿١٣٣﴾

"تمہارا رب بے نیاز ہے اور مہربانی اس کا شیوہ ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے اور تمہاری جگہ دوسرے جن لوگوں کو چاہے لے آئے جس طرح اس نے تمہیں کچھ اور لوگوں کی نسل سے اٹھایا ہے۔"

لوگوں کو یہ بات نہ بھولنا چاہیے کہ وہ اس دنیا میں محض اللہ کی مہربانی کی وجہ سے زندہ ہیں۔ ان کا یہاں رہنا اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ ان کے پاس جو قوت اور حکمت ہے یہ انہیں اللہ کی عطا کی ہوئی ہے۔ یہ اصل قوت نہیں ہے بلکہ عطائی ہے۔ وہ خود مختار نہیں ہیں اس لئے کہ کوئی شخص اپنی پیدائش اپنے وجود اور اس جہان میں اپنی بقا میں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ انسان کو جو بھی قوت دی گئی ہے اس میں اس کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ان کو یہاں سے ہٹانا اور ان کی جگہ دوسری اقوام کو لانا اللہ کے لئے بہت ہی آسان ہے۔ کیا وہ دیکھتے نہیں کہ خود اللہ نے دوسری اقوام کی جگہ انہیں یہاں وجود بخشا اور اپنی قدرت کے ذریعے ان دوسری اقوام کی جگہ یہاں انہیں اقتدار اور قوت دی۔

یہ نہایت ہی شدید تنبیہات ہیں اور نہایت ہی سختی کے ساتھ انسانوں کے دل و دماغ کو جھنجوڑا جا رہا ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کو جو ظالم اور مشرک ہیں اور وہ جنات جو مکر و فریب کا جال بچھاتے ہیں' لوگوں پر دست درازیاں کرتے ہیں' اقتدار کا تخت بچھاتے ہیں۔ خود حلال و حرام قرار دیتے ہیں اور اللہ کی شریعت پر دست درازی کرتے اور خود قانون بناتے ہیں۔ یہ سب لوگ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں جب تک وہ چاہے وہ رہیں گے اور جب چاہے ان کو اس دنیا سے رخصت کر کے ان کی جگہ دوسری اقوام کو لے آئے۔ ان تنبیہات کے ذریعے اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو تسلی بھی دیتا ہے کہ اگرچہ ان پر مظالم ہوتے ہیں' ان کے خلاف سازشیں ہوتی ہیں اور انہیں اذیت دی جاتی ہے لیکن ان کے دشمن اللہ پر غالب نہیں ہیں۔ یہ امتحان ہے اور اللہ کسی بھی وقت ان کو اور ان کی مکاریوں کو صفحہ ہستی سے مٹا سکتا ہے۔ اور یہ آخری ضرب ہے۔

إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ ۖ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿١٣٤﴾

"تم سے جس چیز کا وعدہ کیا جا رہا ہے' وہ یقیناً آنے والی ہے اور تم خدا کو عاجز کر دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔"

تم اللہ کے قبضہ قدرت میں ہو' اور تم اس کی مشیت کے مرہون منت ہو۔ تم اللہ کی مشیت کے دائرے سے نہ باہر

نکل سکتے ہو اور نہ اللہ کے مقابلے میں سرکشی کر سکتے ہو۔ اس سے قبل مناظر قیامت جن کی ایک جھلک تم دیکھ چکے ہو' تمہارے انتظار میں ہیں۔ یہ مناظر عملاً تمہارے سامنے آنے والے ہیں۔ تم ان سے بچ کر نہیں نکل سکو گے کیونکہ اللہ کا نظام نہایت ہی قوی اور متین ہے۔

اب یہ تبصرے اور نتائج ایک نہایت ہی سخت تہدید پر ختم ہوتے ہیں جس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

"اے نبی ؐ' کہہ دو کہ لوگو' تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو اور میں بھی اپنی جگہ عمل کر رہا ہوں' عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ انجام کار کس کے حق میں بہتر ہوتا ہے' بہرحال یہ حقیقت ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔"

یہ نہایت ہی پختہ تہدید ہے' حق پر مشتمل ہے اور اس کی پشت پر سچائی کی قوت ہے۔ یہ تہدید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ہے کہ وہ ان کے معاملات سے ہاتھ نکال رہے ہیں' انہیں یقین ہے کہ وہ سچائی پر ہیں' انہیں یقین ہے کہ ان کا طریق کار اور نظام سچائی پر مشتمل ہے اور انہیں پختہ یقین ہے کہ ان کے مخالفین گمراہی پر ہیں اور ان کا انجام برا ہونے والا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ

(اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶ : ۱۳۵)) کہ ظالم فلاح نہیں پا سکتے۔" اس لئے کہ یہ غیر متبدل اصول ہے' کہ مشرکین جو اللہ کے سوا کسی اور کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں اور انہیں اپنا دوست بناتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے اس لئے کہ اللہ کے سوا کوئی اور کسی کا مددگار نہیں ہو سکتا' نہ اس کے سوا کوئی اور نصرت کر سکتا ہے۔ جو لوگ اللہ کی ہدایات سے منہ موڑتے ہیں' وہ نہایت اعلیٰ درجے کی گمراہی میں بہت دور تک چلے گئے ہیں اور وہ گھاٹے ہی گھاٹے میں ہیں۔

---ooo---

اب اس سورہ کے دوسرے حلقے میں کلام کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ اس سبق پر قدرے غور کیا جائے۔ اس سبق سے پہلے ان ذبیحوں پر کلام تھا جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا تھا اور اس سبق کے بعد پھلوں' مویشیوں اور اولاد کے بارے میں نذر و نیاز کی بحث ہے۔ ان دو جزوی مسائل کے درمیان یہ سبق خالص نظریاتی اور عقائد کے مباحث پر مشتمل ہے اور اس میں ایمان و کفر کے مسائل اور مناظر بیان کئے گئے۔ اس درمیانی سبق میں انسانوں اور جنوں' انبیاء اور ان کے دشمنوں کے درمیان چلنے والی کشمکش کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ تمام بڑے بڑے نظریاتی مسائل چھیڑے گئے ہیں جو اس سورہ میں بالعموم بیان ہوئے ہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم زندگی کے ان جزوی مسائل کو کس طرح شریعت کے مطابق اسلام کی نظریاتی اساس پر منطبق کرتا ہے اور اس بات کو اہمیت دیتا ہے کہ ہر مسئلے کا نظریاتی پس منظر نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ وہ نظریاتی اساس یہ ہے کہ اس کائنات کا رب اور حاکم صرف اللہ ہے اور وہی ہے جو حلال و حرام کی حدود کا تعین کرتا ہے۔ سوال

یہ ہے کہ قرآن کریم جگہ جگہ اپنے نظریہ اساسی کو کیوں بار بار دہراتا ہے۔اس لئے کہ قرآن کریم اصولاً اس بات کو اسلام کا اساسی نظریہ قرار دیتا ہے۔اسلام کا نظریہ اساسی کلمہ شہادت (لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ) پر قائم ہے۔اسی کلمے کے ذریعے اسلام مسلمانوں کے دلوں سے تمام دوسری خدائیاں نکال کر ان کے دلوں میں صرف اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کا عقیدہ جاگزیں کرتا ہے۔چنانچہ اسلام تمام لوگوں سے حق حاکمیت چھین کر صرف اللہ کی حاکمیت قائم کرتا ہے۔قانون سازی ایک ایسا معاملہ ہے کہ کوئی چھوٹا قانون ہو یا بڑا' دونوں میں اللہ کا حق حاکمیت استعمال ہوتا ہے۔یہی وہ حق ہے جسے ایک مسلمان صرف اللہ کے لئے مخصوص کر دیتا ہے اور تمام دوسرے لوگوں کے لیے اس حق کی نفی کر دیتا ہے۔اسلام میں دین کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں' چاہے وہ عقائد و نظریات سے متعلق ہوں مثلاً الوہیت و حاکمیت یا عملی معاملات ہوں سب میں صرف اللہ کی اطاعت اور بندگی کی جائے اور قانون سازی کا حق صرف اللہ کو ہو۔اس طرح قانون کا حق بھی صرف اللہ کے قانون کو حاصل ہو۔چنانچہ ایک مسلمان کا دین یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام اطاعتوں اور قیادتوں کا انکار کر کے صرف اللہ کی اطاعت اور قیادت کو قبول کر لے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ان اعتقادی امور کو بار بار دہراتا اور ان کو بہت ہی اہمیت دیتا ہے اور تمام امور کو ان نظریات پر مرتب کرتا ہے جس طرح اس مکمل سورہ میں صاف نظر آتا ہے جیسا کہ آغاز سورہ میں ہم نے کہا کہ یہ سورہ پوری کی پوری مکی ہے اور مکی سورتوں میں امت مسلمہ کے سامنے قانون سازی کا کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا۔اس کے باوجود اس سورہ میں نظریاتی اور اعتقادی طور پر اس بات کی صاف صاف نشاندہی کر دی گئی ہے کہ قانون سازی کا حق صرف اللہ کو ہے اور یہ اسلام اور دین اسلام کا ایک عظیم اور اساسی نظریاتی اصول ہے جس پر یہ دین قائم ہے۔ (۱)

---ooo---

(۱) (دیکھیے خصائص التصور الاسلامی کا فصل الوہیت اور عبودیت)۔

# درس نمبر ۷۰ ایک نظر میں

یہ سبق جو قدرے طویل ہے اور اس سے پہلے کا سبق اور اس پر آنے والے تبصرے اسلام کے نظریہ حاکمیت سے متعلق ہیں ۔ یہ ایک ایسی سورہ میں ہیں جو مکہ میں نازل ہوئی' جبکہ یہ بات معلوم ہے کہ مکی سورتوں کا موضوع بالعموم نظریات اور عقائد سے متعلق ہوتا ہے ۔ مکی سورتوں میں قانون سازی کو نہیں چھیڑا گیا تھا' قانون سازی کے بارے میں صرف وہ باتیں ان سورتوں میں ہوتی تھیں جن کا تعلق اصول قانون سے تھا ۔ مکہ مکرمہ میں کوئی اسلامی حکومت موجود نہ تھی جسے قانون سازی کی ضرورت پڑتی اور اللہ تعالیٰ شریعت کو محض داستان یا تاریخ کے طور پر ذکر کرنا نہ چاہتا تھا ۔ نہ اس وقت اسلامی شریعت بحث و تحقیق کا محض کوئی تدریسی موضوع تھا ۔ اسلام تو ایک ایسا معاشرہ چاہتا تھا جو عملاً پورے کا پورا اسلام میں داخل ہو سکے' جس کے اندر لوگ اپنے آپ کو' اپنی پوری زندگی کو اللہ کی بندگی اور شریعت کی قیادت میں دینے کے لئے تیار ہوں ۔ لہٰذا اسلام میں قانون سازی اس وقت تک نہ ہو سکتی تھی جب تک اسلامی حکومت قائم نہ ہو جائے اور وہ لوگوں کے درمیان اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے کرنا نہ شروع کر دے ۔ صورت یہ نہ ہو کہ ادھر سے حکم آ رہا ہو اور ادھر انسانوں پر نافذ ہو رہا ہو' اس لئے کہ اسلام کا مزاج ہی ایسا ہے کہ وہ ایک عملی نظام ہے اور اپنے قانونی نظام کا نفاذ بھی سنجیدگی' وقار اور متانت کے ساتھ کرتا ہے ۔

لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ یہ سبق ایک مکی سورہ میں ہونے کے باوجود قانون سازی کے مسئلے کے ساتھ متعلق ہے ۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلام قانون سازی کو بہت ہی اہمیت دیتا ہے اور قانون سازی کو اس دین کے اساسی مسائل میں سے تصور کرتا ہے ۔

اس سے قبل کہ ہم اس سبق کی تفصیلات میں جائیں مناسب ہو گا کہ ظلال القرآن کی طرز پر ہم اس پورے سبق پر ایک اجمالی نگاہ دوڑائیں اور دیکھیں کہ اس سبق کی مراد کیا ہے اور اس میں کیا ہدایات دی گئی ہیں؟

اس کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ مشرکین مکہ پھلوں' مویشیوں اور اولاد کے بارے میں کچھ تصورات اور اوہام رکھتے تھے ۔ ان کے کچھ مالی اور کچھ اجتماعی تصورات تھے جو دور جاہلیت میں عقیدے اور قانون کا درجہ رکھتے تھے ۔ یہ تصورات اور اوہام درج ذیل امور پر مشتمل تھے ۔

۱۔ اللہ نے انہیں فصلوں اور مویشیوں کی صورت میں جو رزق عطا کیا تھا وہ انہوں نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا ۔ ایک حصہ اللہ کے لئے تھا' اور وہ یہ زعم رکھتے تھے کہ اللہ نے یہ حصہ اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے ۔ ایک دوسرا حصہ انہوں نے اپنے شرکاء کے ساتھ مخصوص کر دیا تھا ۔ یہ شرکاء وہ الٰہ تھے جن کو وہ پکارتے تھے اور ان کو وہ اللہ کے ساتھ اپنے نفس کے معاملات' اموال اور اولاد کے معاملات میں شریک کرتے تھے ۔

(وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا (۶ : ۱۳۶) "انہوں نے اللہ کے لئے خود اس کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ کے لئے ہے 'بزعم خود' اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لئے ہے۔"

۲۔ اس کے بعد وہ خود بزعم خود مقرر کردہ حصہ خدا پر دست درازی کرتے تھے' اس حصے سے کچھ وہ لے لیتے تھے اور اسے اپنے شریکوں کے حصے کے ساتھ ملا دیتے تھے لیکن وہ اپنے شرکاء کے حصے کے ساتھ یہ سلوک نہ کرتے تھے۔

(فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ (۶ : ۱۳۶) "پھر جو حصہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کا ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لئے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے۔"

۳۔ ان کے ان شرکاء نے ان کے لئے قتل اولاد کو خوشنما بنا دیا تھا۔ یہ کام ان کے معاشرے میں پائے جانے والے کاہنوں کا تھا جو ان کے قوانین بناتے تھے جو ان کے لئے از خود ایسی رسومات گھڑتے تھے کہ ان پر لوگ عمل کرنے پر مجبور ہوتے۔ ان پر ایک طرف سے اجتماعی دباؤ ہوتا تھا اور دوسری جانب سے وہ دینی رسومات کے زاویہ سے از خود ایسا کرنا چاہتے تھے مثلاً وہ فقر اور عار کی وجہ سے لڑکیوں کو قتل کرتے تھے اور بعض اوقات وہ بطور نذر بھی اولاد کو قتل کرتے تھے جس طرح عبدالمطلب نے نذر مانی تھی کہ اگر اس کے دس بچے ہوئے اور جوان ہوئے تو وہ ایک کو الٰہوں کے نام پر قربان کرے گا۔

(وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ (۶ : ۱۳۷)) "اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لئے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔"

۴۔ یہ لوگ بعض جانوروں اور بعض فصلوں پر پابندی عائد کر دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ان کا کھانا محض اللہ کے اذن پر موقوف ہے اور یہ ان کا زعم تھا۔ بعض سواری کے جانوروں کی پشت کا گوشت نہ کھاتے تھے۔ بعض پر وہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا جائز نہ سمجھتے تھے یا حج کے موسم میں اگر ان پر سوار ہوتے تو اللہ کا نام نہ لیتے اس لئے کہ وہ کہتے تھے کہ یہ حج کی سواریاں ہیں اور ان کے اندر اللہ کا ذکر موجود ہے۔ وہ کہتے یہ تھے کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔

(وَقَالُوْا هٰذِهٖ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ (۶ : ۱۳۸)) "وہ کہتے ہیں کہ یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں' انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھلانا چاہیں حالانکہ یہ پابندی ان کی

خود ساختہ ہے - پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور باربرداری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے' اور یہ سب کچھ انہوں نے اللہ پر افتراء کیا ہے -"

۵- وہ یہ کہتے تھے کہ بعض جانوروں کا جو حمل ہے وہ صرف مردوں کے لئے ہے اور عورتوں پر وہ حرام ہے - ہاں اگر وہ بچہ مردہ پیدا ہو تو مرد اور عورت دونوں مساویانہ طور پر حقدار ہوں گے اور اس مضحکہ خیز قانون کو بھی وہ منجانب اللہ سمجھتے تھے -

(وَقَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۶: ۱۳۹)) "اور کہتے ہیں جو کچھ جانوروں کے پیٹ میں ہے یہ ہمارے مردوں کے لئے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے - لیکن اگر وہ مردہ ہو تو دونوں اس کے کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں - یہ باتیں جو انہوں نے گھڑ لی ہیں ان کا بدلہ اللہ انہیں دے کر رہے گا - یقیناً وہ حکیم ہے اور سب باتوں کی اسے خبر ہے -"

عربی سوسائٹی کے اسلام سے پہلے جو رنگ ڈھنگ تھے مذکور بالا تصورات' مزعومات اور رسم و رواج سے ان کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے اور مکہ مکرمہ کے اندر اس سورہ کی اصلاحات کے ذریعے قرآن کریم ان کا قلع قمع کرنے کے درپے ہے - عربوں کے دل و دماغ کو ان غلط مزعومات سے پاک کر رہا ہے اور عرب کی جاہلی سوسائٹی سے ان کو محو کر رہا ہے - قرآن کریم نہایت ہی دھیمی رفتار سے اپنے مخصوص منہاج اصلاح کے ذریعے غلط تصورات کے اس جنگل کو صاف کر رہا ہے -

- سب سے پہلے اس نے لوگوں کو یہ بتایا کہ جو لوگ اپنی اولاد کو مختلف وجوہات کی بنا پر قتل کر رہے ہیں وہ بے وقوف ہیں - وہ علم و معرفت سے محروم ہیں اور اپنے آپ کو نعمت اولاد سے محروم کر رہے ہیں - پھر یہ کام وہ یوں کرتے ہیں کہ اسے اللہ کی طرف منسوب کر کے اس کی ذات بے عیب پر افتراء باندھنے کے جرم کا ارتکاب بھی کرتے ہیں - قرآن نے اعلان کیا کہ یہ مطلق گمراہی ہے اور یہ مزعومات سب کے سب غلط ہیں -
- اس کے بعد قرآن نے انہیں یہ سمجھایا کہ ان کے یہ تمام اموال جن میں وہ تصرف کرتے ہیں یہ دراصل اللہ کے پیدا کردہ ہیں - اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے طرح طرح کے باغ' تاکستان اور نخلستان پیدا کئے - وہی ہے جس نے تمہارے تمام جانور پیدا کئے اور وہی ہے جو سب کو رزق دیتا ہے - غرض وہی مالک ہے اور صرف وہی لوگوں کے لئے قانون بنانے کا حق رکھتا ہے' ان تمام چیزوں میں جو اس نے اس دنیا میں بطور رزق پیدا کیں - اس بیان کے دوران قرآن کریم ان مناظر کو کام میں لاتا ہے جو انسان پر اثرانداز ہوتے ہیں - پھلوں کے باغ اور لہلہاتے کھیت اور نخلستان اور تاکستان وغیرہ اور حیوانات جو بہترین اور خوبصورت سواری کا کام کرتے ہیں اور ان کی فرسے فرش کا کام لیا جاتا ہے' ان کا گوشت کھایا جاتا ہے' ان کی کھالوں سے متعدد مفادات لئے جاتے ہیں بلکہ اون اور بال بھی کام میں لائے جاتے ہیں - اس مقام پر یہ تاثر بھی واضح طور پر دیا جاتا ہے کہ انسان اور شیطان کے درمیان روز اول سے دشمنی ہے لہٰذا انہیں ہرگز اپنے دشمنوں کے قدموں پر نہیں چلنا چاہیے اس لئے کہ وہ کھلا دشمن ہے -
- اس کے بعد بعض حیوانات کے بارے میں ان کے بودے تصورات کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ تصورات اور

عقائد ادنیٰ منطق سے بھی خالی ہیں۔ان تصورات کو ایسے انداز میں سامنے لایا گیا ہے کہ وہ بادی النظر میں حقیر' بودے اور بے وقعت نظر آتے ہیں۔اس وضاحت کے بعد ان سے پوچھا جاتا ہے کہ ان بے دلیل قوانین و رواجات پر وہ کیوں عمل پیرا ہیں؟ وہ کس دلیل سے کہتے ہیں کہ یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں' انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھلانا چاہیں' حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے' پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے۔کچھ جانور ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے اور یہ سب کچھ انہوں نے اللہ پر افتراء کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سوال کرتے ہیں کیا تم اس وقت موجود تھے جب اللہ تعالیٰ نے یہ قوانین بنائے؟ یا یہ کوئی راز کی بات تھی جو اللہ نے صرف تمہیں بتائی تھی یا یہ حکم صرف تمہارے لئے تھا۔فرماتے ہیں یہ سب کچھ افتراء ہے اور لوگوں کو ناحق گمراہ کرنا ہے اور اس افتراء اور گمراہی کے نتیجے میں اللہ ان سے مؤاخذہ کرے گا۔

○ اس مقام پر اللہ تعالیٰ واضح فرماتے ہیں کہ حرام کیا ہے اور حلال کیا ہے اور یہ کہ یہودیوں کے لئے کیا حرام کیا گیا تھا اور کیوں' اور مسلمانوں کے لئے کیا حرام ہے اور وہ کیا چیزیں ہیں جو اگرچہ یہودیوں کے لئے قبلاً حرام تھیں مگر اب حلال کر دی گئی ہیں۔

○ اس کے بعد ان کے اس استدلال کی تردید کی جاتی ہے کہ وہ جو کہتے ہیں کہ اگر اللہ نہ چاہتا تو وہ اس جاہلیت میں مبتلا نہ ہوتے اور یوں اپنے لئے خود حلال و حرام کے اصول طے کر کے شرک کا ارتکاب نہ کرتے۔

(وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ (٦:١٤٨)) "اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے' نہ ہمارے آباء شرک کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام قرار دیتے۔" چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ بات اور یہ استدلال تمام کافر ہمیشہ سے پیش کرتے چلے آئے ہیں لیکن تاریخ میں جن اقوام نے یہ استدلال کیا ہے وہ ہمارے عذاب سے بچ کر نہیں نکل سکیں۔

(كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا (٦:١٤٨)) "اسی طرح ان سے پہلے جو لوگ تھے انہوں نے تکذیب کی یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کو چکھا۔"

ان آیات سے ثابت ہوا کہ شریعت کے بغیر از خود کسی چیز کو حرام سمجھنا شرک باللہ کے مترادف ہے۔جن لوگوں نے ہمیشہ آیات الٰہی کی تکذیب کی ہے وہ ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔چنانچہ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتے ہیں کہ وہ اس قسم کے فیصلے اور استدلال کس منطق کی رو سے کرتے ہیں۔

(قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ۔ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ (٦:١٤٨)) "ان سے کہو کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کر رہے ہو۔"

☆ اس کے بعد ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے موقف پر کوئی علمی ثبوت پیش کریں لیکن اگر وہ کوئی جھوٹے

دلائل دیں تو ان کو یکسر رد کر دیں۔ اس سورہ کے آغاز میں بھی اصل عقائد کے مضمون میں یہی حکم دیا گیا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ رابطہ ہی ختم کر دیا جائے۔ دونوں مواقع پر مضمون کے الفاظ میں بہت کم تغیر پایا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک باللہ (ذات میں) اور شرک باللہ (حاکمیت میں) ایک ہی درجہ رکھتا ہے۔ جو شخص اللہ کے سوا قانون سازی کرتا ہے یا کسی کو قانون ساز تسلیم کرتا ہے وہ بھی شرک کرتا ہے۔

(قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَ كُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ (٦ : ١٥٠)) "ان سے کہو لاؤ اپنے گواہ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ ہی نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے۔ پھر اگر وہ شہادت دیں تو ان کے ساتھ شہادت نہ دینا اور ہرگز ان لوگوں کی شہادت کے پیچھے نہ چلنا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور جو آخرت کے منکر ہیں اور جو دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں۔"

ان آیات اور سابقہ آیات کے مناظر' عبارات اور الفاظ تک ایک ہیں۔ جو لوگ قانون سازی از خود کرتے ہیں وہ ہوائے نفس کے تبع ہیں اور یہ وہی لوگ ہیں جو آیات الٰہی کو جھٹلاتے ہیں اور یہ وہی لوگ ہیں جو آخرت پر ایمان و یقین نہیں رکھتے۔ اگر وہ اللہ کی آیات کو سچا مانتے اور آخرت پر ایمان لاتے اور اللہ کی ہدایت کو تسلیم کرتے تو وہ اپنے لئے اور لوگوں کے لئے خود قانون نہ بناتے اور اللہ کے احکام کے سوا کسی چیز کو حرام قرار نہ دیتے۔

☆ اور آخر میں اللہ تعالیٰ ان چیزوں کے بارے میں بتاتے ہیں جو اس نے فی الحقیقت حرام کر دی ہیں۔ اس میں اجتماعی زندگی کے تمام اصول بتلا دیئے گئے ہیں یعنی اللہ کی توحید' اللہ کے احکام اور حدود و فرائض لیکن زیادہ تر وہ چیزیں گنوائی گئی ہیں جو حرام ہیں ............ چنانچہ اللہ نے شرک کی ممانعت کی' والدین کے ساتھ احسان کا حکم دیا اور فقر و فاقہ کے ڈر سے اولاد کے قتل کی ممانعت اور یہ کہ اللہ رازق ہے اور یہ کہ ممانعت کی ظاہری اور خفیہ خواہش کے قریب مت جاؤ اور کسی جان کو ناحق قتل کر دینے کی ممانعت اور یتیم کے مال کو کھانے کی ممانعت الا یہ کہ جائز طور پر اسے استعمال کیا جائے اور ناپ اور تول کے پیمانوں کو درست رکھنے کا حکم۔ بات اور معاملات میں عدل سے کام لیا جائے اگرچہ معاملہ رشتہ داروں کا ہو اور اللہ کے عہد سے وفا کی جائے اور ان سب امور کو منجانب اللہ وصیت قرار دیا گیا اور ان امور کے بارے وصیت کو بار بار دہرایا گیا ہے۔

یہ تمام امور اسلامی نظریہ حیات کے اساسی اصول اور شریعت کے مبادی ہیں۔ ان کو ایک ہی سلسلہ کلام میں جمع کیا گیا ہے اور بالکل ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر اور منظم کر کے بیان کیا گیا ہے۔ یہ سب احکام ایک ہی جملے' ایک ہی گروپ' اور ایک ہی اجتماعی شکل میں لائے گئے ہیں۔ اس سے قرآن کریم کی اجتماعی سوچ اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے اور اسلام کا منہاج بھی واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سبق کے آخر میں کہا جاتا ہے۔

(وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ

سَبِيْلِه ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِه لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۶:۱۵۳)) "اور یہ کہ یہ میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے - یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم کج روی سے بچو۔"

یہ آخری جملہ اس لئے کہا گیا تاکہ اس پورے سبق سے جو مقصود اصلی ہے وہ بالکل سامنے آجائے اور بات کھل کر ایک ہی فقرے میں سمیٹ لی جائے اور اس طرح دو ٹوک بن جائے - دین اسلام میں عقائد اور قانون دونوں کا تعلق توحید اور شرک سے ہے - بلکہ اسلامی قانون سازی میں بھی شرک کا ارتکاب ہو سکتا ہے جس طرح عقیدے میں شرک ہو سکتا ہے کیونکہ اسلام میں قانون سازی عین عقیدہ ہے اس لئے کہ قانون اسلامی دراصل عقیدہ توحید کی تفصیل و تشریح ہوتا ہے - یہ حقیقت قرآن کریم کے متعدد نصوص سے بالکل واضح ہے - اور اسلام کے اسلوب بیان کے مطابق اسے جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے -

یہ وہ حقیقی مقام ہے جس سے دین کا مفہوم طویل تاریخی عوامل کی وجہ سے دور ہو گیا اور یہ عمل طویل زمانے میں مکمل ہوا - اس مقصد کے حصول کے لئے خبیث اور اوچھے ہتھکنڈے استعمال کئے گئے - آج حال یہ ہے کہ دین کے دشمن تو ہیں ہی دشمن 'خود دین کے لئے کام کرنے والوں اور اس کے پرجوش کارکنوں کے ذہنوں سے یہ حقیقت اوجھل ہو گئی - خود حامیان دین بھی عقیدۂ حاکمیت الٰہیہ کو اسلامی عقائد سے علیحدہ سمجھتے ہیں اور حامیان دین بھی مسئلہ حاکمیت الٰہیہ میں اس طرح پرجوش نہیں رہے جس طرح وہ معروف دینی عقائد کے لئے پرجوش ہیں - وہ لوگ عقیدہ حاکمیت الٰہیہ کے انکار کو دین کا انکار نہیں سمجھتے جس طرح وہ عقیدۂ توحید کے انکار اور اللہ کی عبادات کے انکار کو دین کا انکار سمجھتے ہیں حالانکہ دین اسلام نے کسی جگہ بھی عقیدے ' بندگی اور شریعت کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا ہے - اسلامی نظریہ حیات کے تصور سے حاکمیت الٰہیہ کے تصور کو طویل تاریخی اور تدریجی سازشوں کے تحت نکالا گیا ہے اور نہایت ہی ہوشیاری اور تجربہ کاری کے ساتھ یہ کام کیا گیا ہے - یہاں تک کہ حاکمیت الٰہیہ کے عقیدے نے موجودہ شکل اختیار کر لی - اسلام کے پرجوش حامی بھی اس کے حامی نہ رہے ' حالانکہ یہ حقیقت اس سورہ میں واضح طور پر بیان ہوئی ہے ' باوجود اس کے کہ یہ سورہ مکی سورہ ہے اور اس کا موضوع دستور و قانون نہیں ہے بلکہ اس کا موضوع عقیدۂ توحید اور اسلامی نظریہ حیات ہے لیکن اس کے باوجود اس نکتے کے تمام پہلو لئے گئے ہیں اور تمام تفصیلات دی گئی ہیں اور یہ بھی اس حوالے سے کہ بات اجتماعی زندگی کے اس جزوی مسئلے پر ہو رہی تھی لیکن اس جزوی مسئلے کا تعلق چونکہ ایک اصول سے تھا' نظریاتی اور دستوری مسئلے سے تھا - یہ اصول بھی ایسا تھا جو اساس دین ہے اس لئے یہاں اس پر زور دیا گیا -

لوگ بتوں کی پوجا کرنے والے پر تو شرک کا فتویٰ لگاتے ہیں لیکن ان لوگوں پر شرک کا فتویٰ نہیں لگاتے جو اپنے فیصلے طاغوتی عدالتوں سے کراتے ہیں - وہ بت پرستی سے تو اجتناب کرتے ہیں لیکن طاغوتی حکام کی اطاعت سے اجتناب نہیں کرتے - یہ لوگ قرآن کریم کی تلاوت تو کرتے ہیں لیکن اس دین کے مزاج کو نہیں سمجھتے - انہیں چاہیے کہ قرآن کو اس طرح پڑھیں جس طرح وہ نازل ہوا ہے - انہیں اس آیت پر غور کرنا چاہیے -

(وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ) "اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو تم مشرک بن جاؤ گے -"

اسلام کے یہ پرجوش حامی اپنے آپ کو اور دوسرے لوگوں کو صرف بعض جزوی امور کو زیر بحث لا کر مطمئن کرنے کی

سعی کرتے ہیں کہ فلاں فلاں قانون ' اسلام کے خلاف ہے یا فلاں فلاں قانون کا فلاں جزء اسلام کے خلاف ہے ۔ ان کا جوش بعض جزوی اصلاحات تک موقوف ہے یا وہ بعض بدعملیوں کی اصلاح تک اپنے آپ محدود رکھتے ہیں اور ان کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ گو اسلام تو پورے کا پورا قائم ہے لیکن بعض جزوی امور میں نقص رہ گیا ہے بس صرف ان امور کی اصلاح ہی سے اس کی تکمیل ہو جائے گی ۔

دین اسلام کے بارے میں غیرت رکھنے والے اور اس کے پرجوش حامی درحقیقت اس دین کے لئے باعث اذیت ہیں لیکن سمجھتے نہیں بلکہ اس قسم کی جزوی اور غیر اہم باتوں کو اہمیت دے کر یہ لوگ دین کی پیٹھ میں چھرا گھونپتے ہیں ۔ امت مسلمہ کے اندر اس وقت جو نظریاتی قوت اور جوش پایا جاتا ہے یہ لوگ اسے اس قسم کی غیر اہم باتوں پر صرف کرتے ہیں اور ضمناً وہ موجودہ دور کے جاہلی اجتماعی نظام اور جاہلی سوسائٹی کی تائید کرتے ہیں ۔ وہ عملاً یہ شہادت دیتے ہیں کہ دین قائم ہے اور اگر کوئی کمی ہے تو وہ صرف یہ جزوی نقائص ہیں جنہیں وہ ختم کرنا چاہتے ہیں حالانکہ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ دین مکمل طور پر معطل ہے اور اس وقت موجودہ سوسائٹی پوری طرح جاہلی سوسائٹی ہے ۔ اس میں اللہ کی حاکمیت جاری نہیں ہے ' ایسی حاکمیت جس میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو ۔

دین اسلام تب قائم ہو گا جب زمین پر اللہ کی حاکمیت جاری ہو گی ۔ جب تک اللہ کی حاکمیت قائم نہ ہو گی دین پوری طرح قائم نہیں ہو سکتا ۔ آج اس کرۂ ارض پر مسئلہ ہی یہ ہے کہ یہاں ایسے طاغوتی نظام قائم ہیں جنہوں نے دست درازی کر کے اللہ کی حاکمیت کو چھین لیا ہے ۔ یہ اختیار خود انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے کر لوگوں کے لئے حلال و حرام متعین کرنا شروع کر دیا ہے اور وہ لوگوں کے مال اور اولاد کے بارے میں قوانین بناتے ہیں ۔

زیر بحث آیات اور بیانات میں اسی مشکل مسئلے کو نہایت ہی مؤثر انداز میں نہایت ہی تفصیل کے ساتھ لیا گیا ہے ۔ تمام باتوں کو اللہ کی حاکمیت اور بندگی کے نظریات کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے اور انہیں مسئلہ کفر و اسلام اور مسئلہ اسلام و جاہلیت قرار دیا گیا ہے ۔

اسلام نے جس عظیم معرکے کے بعد اس دنیا میں اپنا وجود قائم کیا تھا وہ محض الحاد کے خلاف معرکہ نہ تھا ' کہ ایک شخص خدا کو مان لے اور چند دینی رسومات کا پابند ہو کر حامی دین بن جائے ۔ یہ معرکہ اجتماعی فساد اور اخلاقی فساد کے خلاف محض کوئی اصلاحی تحریک بھی نہ تھا ' یہ باتیں بھی اگرچہ اس معرکہ میں شامل تھیں لیکن یہ تحریکات دین کے قیام کے بعد بھی جاری رہیں ۔ اسلام نے اپنے وجود کے لئے جو معرکہ سر کیا وہ اس کرۂ ارض پر حاکمیت الہیہ کے قیام کا معرکہ تھا ۔ مکہ میں لوگ سمجھتے تھے کہ لا الہ الا اللہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے ۔ اس وقت مکہ میں قرآن نے اس نظریہ کو مسلمانوں کے ذہن میں اچھی طرح بٹھا دیا تھا ۔ قرآن نے مسلمانوں کے ضمیر کے اندر اور ان کے دل و دماغ کے اندر یہ نظریہ اچھی طرح مرتسم کر دیا تھا کہ حاکم صرف اللہ ہے اگرچہ مکہ میں نظام حاکمیت الہیہ اور نظام قانون اسلامی کا کوئی موقعہ نہ تھا ۔ کسی مسلمان کے ذہن میں یہ بات تھی ہی نہیں کہ اللہ کے سوا کوئی اور حاکم ہو سکتا ہے اور اگر کوئی یہ تصور کرتا تھا تو وہ مومن نہ ہو سکتا تھا ۔ جب یہ نظریہ مکہ میں مسلمانوں کے دل و دماغ میں اچھی طرح بیٹھ گیا تو مدینہ میں اس نظریہ کی بنیاد پر حاکمیت الہیہ قائم ہوئی ۔ اگر ہمارے دور کے دین کے پرجوش حامیوں کے ذہن میں یہ بات سما جائے تو انہیں اپنے طرز عمل پر غور کرنا چاہیے کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور انہیں کرنا کیا چاہیے؟ ............ میں سمجھتا ہوں اس سبق پر یہ تبصرہ کافی ہے ۔ اب آیات کی تشریح ملاحظہ فرمائیں ۔

# درس نمبر ۷۰ تشریح آیات

## ۱۳۶ ---- تا ---- ۱۵۳

وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَٰذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَٰذَا لِشُرَكَائِنَا ۖ فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَىٰ شُرَكَائِهِمْ ۗ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿١٣٦﴾

"انہوں نے اللہ کے لئے خود اس کی پیدا کی ہوئی کھیتوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ کے لئے ہے' بزعم خود' اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لئے ہے۔ پھر جو حصہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لئے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لئے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے۔ کیسے برے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ!"

فصلوں اور مویشیوں کے بارے میں جاہلی سوسائٹی کے رسم و رواج کے بیان کے بعد یہاں بتایا جاتا ہے کہ ان فصلوں اور مویشیوں کی خالق اللہ کی ذات ہے اور وہی ہے جو زمین و آسمان سے لوگوں کے لیے وسائل رزق فراہم کرتا ہے۔ لیکن ان حقائق کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کے بعد ذرا سوچیں کہ تم لوگ اللہ کے عطا کردہ رزق کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو' یہ کہ وہ اس کا ایک حصہ تو اللہ کے لئے قرار دیتے ہیں اور دوسرا حصہ اپنے بتوں کے نام منسوب کرتے ہیں۔ (ظاہر ہے کہ بتون کے مجاور ہی وہ لوگ ہیں جو بتوں کے حصے کو حاصل کرنے کے حقدار ہوتے ہیں)۔ اب اللہ کے حصے کے ساتھ وہ یہ توہین آمیز سلوک کرتے ہیں جس کی تفصیلات آیت کے اندر دی گئی ہیں۔

حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ جب وہ غلہ لے آتے تو اسے ڈھیر بنالیتے۔ اس میں سے ایک حصہ اللہ کے لئے نکالتے اور ایک بتوں کے لئے۔ اب جب تیز ہوا چلتی اور غلے کے دانے بتوں کے حصے سے اڑ کر اللہ کے حصے میں شامل ہو جاتے تو یہ اس حصے سے ان کو جدا کرکے پھر بتوں کے حصے میں ملا دیتے' اور اگر اللہ کے حصے کی جانب سے ہوا آئے اور اللہ کے حصے سے دانے بتوں کے حصے میں مل جاتے تو وہ انہیں اسی طرح چھوڑ دیتے۔ اسی کے بارے میں یہ آیت آئی ہے۔

(سَآءَ مَا يَحْكُمُونَ (۶: ۱۳۶)) یہ لوگ بہت برے فیصلے کرتے ہیں۔" مجاہد سے روایت ہے کہ وہ کھیت کے ایک حصے کو اللہ کے نام کر دیتے اور ایک حصے کو اپنے بتوں کے لئے مخصوص کر دیتے۔ اب اللہ کے حصے سے ہوا اگر کسی چیز کو اڑا کر بتوں والے حصے میں ملا دے تو یہ اسے اسی طرح چھوڑ دیتے تھے اور اگر بتوں کے حصے سے کوئی چیز اللہ کے حصے میں مل جائے تو یہ اسے واپس کر دیتے تھے۔ اور کہتے۔

(اَللّٰهُ عَنْ هٰذَا غَنِيٌّ) اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اور مویشیوں میں سے انہوں نے سائبہ اور بحیرہ نام رکھے ہوئے تھے۔ حضرت قتادہ سے روایت ہے۔ اہل ضلالت نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے مویشیوں اور فصلوں کے ایک حصے کو اللہ کا حق قرار دے دیا اور ایک حصے کو بتوں کا حق قرار دیا۔ اب اگر اللہ کے حصے کی کوئی چیز بتوں کے حصے میں خلط ملط ہو جاتی تو یہ اسے چھوڑ دیتے اور اگر بتوں کے حصے سے کوئی چیز اللہ کے حصے میں جا پڑتی تو یہ اسے لوٹا دیتے۔ اور اگر کبھی خشک سالی ہوتی تو وہ اللہ کے حصے کو موقوف کر کے خود استعمال کرتے لیکن بتوں کے حصے کو ہر حال میں قائم رکھتے۔ اس کے بارے میں اللہ نے کہا (سَآءَ مَا يَحْكُمُونَ (۶: ۱۳۶)) (یہ برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔")

حضرت سدی کہتے ہیں کہ یہ اپنے مالوں کے حصے بناتے تھے اور فصلوں میں سے بھی اللہ کا حصہ مقرر کرتے تھے۔ اسی طرح بتوں کے لئے بھی حصہ مقرر تھا۔ بتوں کے حصے کو بتوں پر صرف کرتے اور اللہ کے حصے کو صدقہ کر دیتے۔ اب وہ مویشی جو بتوں کا حصہ ہوتے اگر اتفاقاً مر جاتے اور اللہ کا حصہ زیادہ ہو جاتا تو وہ کہتے کہ ہمارے خداؤں کے لئے بھی تو اخراجات درکار ہیں تو وہ اللہ کے حصے میں سے لے کر اللہ کے ساتھ ٹھہرائے ہوئے شریکوں پر خرچ کرتے۔ اور اگر اللہ کے حصے کی فصل خراب ہو جاتی اور بتوں والے حصے میں فصل زیادہ ہو جاتی تو کہتے کہ اگر اللہ چاہتا تو وہ اپنے حصے کو اچھا بناتا۔ یوں وہ بتوں کے حصے سے لے کر اللہ کے حصے کو پورا نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "اگر یہ سچے ہوتے تو ہرگز ایسا نہ کرتے کیونکہ یہ لوگ میرے حصے سے تو لیتے ہیں لیکن میرے حصے میں شامل نہیں کرتے۔ اور یہی مطلب ہے۔ (سَآءَ مَا يَحْكُمُونَ (۶: ۱۳۶)) کا۔

ابن جریر (سَآءَ مَا يَحْكُمُونَ (۶: ۱۳۶)) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان لوگوں کے بارے میں اطلاع ہے کہ وہ برے فیصلے کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انہوں نے جو فیصلہ کیا وہ نہایت ہی غلط فیصلہ تھا کہ انہوں نے میرا حصہ ان لوگوں کو دے دیا جو انہوں نے بزعم خود میرے شریک ٹھہرائے ہوئے ہیں اور مزید یہ کہ ان مزعومہ شریکوں کے حصے میں سے وہ مجھے کچھ نہیں دیتے۔ یہی بات اس امر کے لئے کافی ثبوت ہے کہ یہ لوگ گمراہ بھی ہیں اور جاہل بھی۔ انہوں نے سچائی کی راہ کو ایک طرف چھوڑ دیا کیونکہ وہ جب اپنے خالق اور رازق کے ساتھ انصاف نہیں کرتے تو اور کس کے ساتھ کریں گے جبکہ اس نے ان پر لاتعداد احسانات بھی کر رکھے ہیں۔ وہ اللہ کو ان بتوں کے برابر کرتے ہیں جو نفع و نقصان نہیں دے سکتے۔ بلکہ انہوں نے ان بتوں کو اللہ پر فضیلت دے دی کہ ان کے حصے کو اللہ کے حصے سے بڑا قرار دیا۔

یہ تھی وہ بات جو انسانوں اور جنوں میں سے شیطان لوگ اپنے دوستوں کو سجھاتے تھے تاکہ وہ مویشیوں اور فصلوں کے بارے میں اہل ایمان کے ساتھ الجھتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شیاطین انسانوں کو جو زاویہ نظر دیتے ہیں' اس میں ان

شیاطین کا کوئی نہ کوئی مفاد ضرور ہوتا ہے۔ انسانی شیطانوں کا مفاد یہ ہے (یہ کاہنوں' مجاوروں اور رئیسوں میں سے ہوتے ہیں) کہ پہلے تو وہ ان انسانوں کے دل ودماغ پر چھا جاتے ہیں اور اس اثر کو قائم کر لینے کے بعد وہ ان کو اپنی مطلوبہ سمت کی طرف حرکت دیتے ہیں۔ اپنے دیئے ہوئے زاویہ نظر کے عین مطابق جو باطل تصورات اور فاسد عقائد پر مشتمل ہوتا ہے۔ یوں وہ ان عوام الناس کو گمراہ کر کے خود اپنے مادی مفاد بھی حاصل کرتے ہیں مثلاً یہ بر خود غلط عوام بتوں کے لئے جو حصے تجویز کرتے ہیں وہ عملاً انہی لوگوں کو ملتے ہیں جو ان کو یہ تصور دیتے ہیں۔ جنوں کے شیاطین کا مفاد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال کر ان کو گمراہ کرتے ہیں اور ان کی قیادت کر کے ان کی دنیا بھی خراب کرتے ہیں اور آخرت بھی۔

یہ تصورات جو عرب جاہلیت میں پائے جاتے تھے' ان کی مثالیں دنیا میں پائی جانے والی دوسری جاہلیتوں کے اندر بھی موجود ہیں۔ مثلاً یونانی' فارسی' رومی اور افریقہ وایشیا کی دوسری جاہلیتوں میں۔ یہ تصورات تمام جاہلیتوں میں مالی تصرفات کرتے ہیں اور یہ ہر جاہلیت میں موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً دور جدید کی جاہلیت بھی ایسے مالی تصرفات کو روا رکھتی ہے جس کی اجازت اللہ نے نہیں دی۔ چنانچہ اس شرک میں دور جدید کی جاہلیت بھی ازمنہ سابقہ کی جاہلیتوں کے بالکل برابر ہے۔ دونوں ایک ہی اصول پر قائم ہیں۔ مثلاً جاہلیت کی تعریف ہے ہروہ تصرف جو عوام الناس کی زندگیوں میں کیا جائے جبکہ اس کی اجازت اللہ نے نہ دی ہو۔ اب یہ اور بات ہے کہ قدیم زمانوں میں اس قسم کے تصرفات کی شکل و نوعیت اور ہوتی تھی اور آج ذرا مختلف ہے۔ اصول ایک ہے اور شکلیں مختلف۔

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

"اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لئے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کر دیں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے' لہٰذا انہیں چھوڑ دو کہ اپنی افتراء پردازیوں میں لگے رہیں۔"

جس طرح ان لوگوں کے لئے ان کے شرکاء اور ان کے شیاطین نے اپنے مالوں اور فصلوں میں یہ تصرفات خوبصورت بنا دیئے ہیں' اسی طرح انہوں نے ان کے لئے قتل اولاد کو بھی مزین بنا دیا ہے۔ یوں کہ وہ لوگ اپنی بیٹیوں کو تنگدستی کے خوف سے زندہ درگور کر دیتے تھے' یا اس لئے کہ وہ جنگی قیدی بن جائیں گی اور ان کے لئے موجب عار ہوں گی۔ بعض اوقات وہ اولاد کو بطور نذر بھی قتل کرتے تھے۔ جس طرح حضرت عبدالمطلب سے روایت ہے کہ انہوں نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر اللہ نے ان کو دس ایسے بیٹے بخشے جو ان کے لئے دست و بازو ہوں تو وہ ان میں سے ایک کو قربان کریں گے۔

یہ تمام باتیں ان کے دل و دماغ میں ان کی جاہلی رسومات نے پختہ طور پر بٹھا دی تھیں - یہ رسومات جاہلیت وہ تھیں جو لوگوں نے خود ہی اپنے لئے وضع کی تھیں - اس آیت میں جن شرکاء کا ذکر ہے اس سے مراد شیاطین جن وانس ہیں - انسانوں میں سے جو شیاطین تھے وہ کاہن' مجاور اور سردار تھے - جنوں میں سے وہ لوگ تھے جو بعض انسانوں کے دوست بن جاتے تھے اور وہ ان انسانوں کی مدد کرتے تھے - اس آیت میں ان شیاطین کا جو واضح ہدف بتایا گیا ہے وہ یہ ہے -

(لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ (٦ : ١٣٧)) تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں -" یعنی وہ ان کو ہلاک کر دیں' ان پر ان کے دین کو گنجلک اور مشتبہ بنا دیں - اس طرح کہ وہ اسے واضح طور پر سمجھ نہ سکیں - ہلاک کرنے کا مصداق ایک تو یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کرتے ہیں - دوسرا مصداق یہ ہے کہ ان کی اجتماعی زندگی اسلام کے خلاف ہو جاتی ہے اور وہ اپنے معاشرے میں ان مویشیوں کی طرح بن جاتے ہیں جن کو وہ شیاطین جس طرف چاہیں ہانک کر لے جائیں' یعنی اپنے مقاصد اور مفادات کے مطابق یہاں تک کہ وہ لوگ ان حیوانوں کے اموال' اولاد اور خود ان کی جان کے بارے میں قتل کرنے اور ہلاک کرنے کے اختیارات کے بھی مالک ہو جاتے ہیں - ان حیوانوں کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ پوری اطاعت کریں - اس لئے کہ دین اور عقیدے کے ساتھ جو زائد تصورات وابستہ کر دیئے گئے اور جو درحقیقت دین سے نہیں ہیں' وہ نہایت ہی گہرے ہو گئے اور اب دیندار لوگوں پر ان کا بھاری دباؤ ہے - یہ تصورات چونکہ سوسائٹی کے اندر موجود رسم و رواج کی وجہ سے دین سے وابستہ ہوئے ہیں اس لئے یہ عرف بھی ان کی پشت پر ہوتا ہے اور ان رسومات کا دباؤ معاشرے پر اس قدر زیادہ ہو جاتا ہے کہ عوام کالانعام اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے - الا یہ کہ ان میں سے کوئی حقیقی دین کی بنیادوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہو اور قرآن وسنت پر اس کی گرفت مضبوط ہو -

یہ دینی رنگ کے مبہم اور پیچیدہ تصورات جن کو لوگ دین سمجھتے ہیں' یہ اجتماعی رسومات جن سے یہ تصورات پروان چڑھتے ہیں اور جو عوام الناس پر کمر توڑ بوجھ بنے ہوئے ہیں' یہ ان صورتوں تک محدود نہیں ہیں جو قدیم زمانوں کی جاہلیتوں کے اندر پائی جاتی تھیں' دور جدید کی تازہ ترین جاہلیت میں بھی یہ تصورات واضح طور پر موجود ہیں - یہ رسم و رواج جو دور جدید میں بھی عوام الناس پر بارگراں بنے ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے عوام کی زندگی اجیرن بنی ہوئی ہے' لوگوں کے لئے لابدی بن گئے ہیں اور اب لوگوں کے لئے کوئی راہ نہیں رہی ہے کہ وہ ان کے چنگل سے نکل بھاگیں - لوگوں نے اپنے اوپر مخصوص لباس فرض کر لئے ہیں اور بعض اوقات ان پر اس قدر روپیہ خرچ کرتے ہیں جو ان کے پاس نہیں ہوتا - یہ رسم و رواج لوگوں کی زندگی کو چاٹ جاتے ہیں - ان کی تمام آرزوئیں خاک میں مل جاتی ہیں' ان کے اخلاق ختم ہو جاتے ہیں لیکن وہ ہر حال میں ان کی پابندی کرتے ہیں - صبح کا لباس' دوپہر کا لباس' شام کا لباس' منی اسکرٹ' ٹیڈی لباس اور مضحکہ خیز لباس' قسم قسم کا میک اپ اور بناؤ سنگھار - بعض لوگ یہ کام کرتے ہیں بعض ان سے کراتے ہیں - کرانے والوں میں لباس کے بڑے بڑے تاجر' بڑی بڑی کمپنیاں اور بینکوں اور مالی اداروں کے سود خوار کارندے اور وہ تاجر شامل ہیں جو لوگوں سے یہ حرکات اس لئے کراتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں جو نفع ملے اسے وہ مزے لے لے کر کھائیں - اس تمام صورت حال کی پشت پر یہودی سازش ہے اور یہودیوں نے یہ صورت حال اس لئے

چلا رکھی ہے کہ اس طرح وہ لوگوں پر معاشی اور سیاسی حکمرانی کریں۔ لیکن یہودی یہ کام اسلحہ اور فوج کے ذریعے نہیں کرتے بلکہ یہ کام وہ افکار و خیالات' تصورات و نظریات کے ہتھیاروں کے ذریعے کرتے ہیں اور یہ حکومت وہ عرف عام کے دباؤ سے کرتے ہیں اور یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ نظریات کا اثر اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک یہ نظریات نظام حکومت کا روپ نہ دھاریں اور اجتماعی شکل اختیار نہ کرلیں اور سوسائٹی کے ڈھانچے کے اندر نہ گھس جائیں۔ چنانچہ سوسائٹی کے اندر ان جاہلی نظریات اور تصورات کو یہ یہودی بڑی اسکیم کے ساتھ پھیلاتے اور جاری کرتے ہیں۔

یہ کام معاشرے کے تمام شیاطین کرتے ہیں' یہ شیاطین جنوں میں بھی ہیں اور انسانوں میں بھی۔ یہ تمام کام جاہلیت ہیں جس کی اشکال اور صورتیں مختلف ہیں۔ لیکن اس کے اصول اور جڑیں اور بنیادیں ایک ہی ہوتی ہیں۔ اگر ہم یہ سمجھیں کہ قرآن نے بعض ازمنہ قدیمہ کی جاہلیتوں ہی پر بحث و تنقید کی ہے اور جدید دور کی جاہلیتوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں تو ہم قرآن کریم کی شان کو گھٹا رہے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم تمام قدیم و جدید جاہلیتوں پر بحث کرتا ہے۔ وہ ہر دور میں انحراف کرنے والے معاشرے کا مقابلہ کرتا ہے اور اسے واپس لاکر جادۂ مستقیم پر ڈالتا ہے۔

باوجود اس کے کہ یہ ایک عظیم عمرانی بوجھ اور سازش ہے قرآن کریم مسئلہ جاہلیت کے حل کو آسان کرنے کے لئے اس حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ یہ تمام شیاطین اور ان کے دوست اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور وہ جو کچھ کر رہے ہیں اپنی قوت اور قدرت سے نہیں کر رہے۔ وہ یہ کام اس لئے کر رہے ہیں کہ اللہ نے ان کو مہلت دے رکھی ہے' اس دنیا کی مختصر زندگی کے لئے۔ یہاں یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ کے دائرہ قدرت کے اندر اور اللہ کی مشیت کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اگر اللہ کی مشیت نہ ہوتی تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتے۔ لہٰذا کوئی پرواہ نہیں ہے' انہیں اپنی روش پر چلنے دیجئے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ (۶:۱۳۷) اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے' لہٰذا انہیں چھوڑ دو کہ اپنی افتراء پردازیوں میں لگے رہیں"۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ لوگ اس قدر بے باک ہوگئے تھے کہ وہ یہ بات تسلیم نہ کرتے تھے کہ وہ یہ بات اپنی جانب سے کر رہے ہیں بلکہ وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ یہ تمام تصورات اور تصرفات من جانب اللہ ہیں اور ان کے لئے یہ شریعت ہیں۔ اپنے زعم کے مطابق وہ کہتے تھے کہ یہ تصورات و تصرفات حضرت اسماعیل ؑ اور حضرت ابراہیم ؑ کی شریعت ہیں۔

آج جاہلیت جدیدہ کے دور میں بھی شیاطین کا یہی رویہ ہے۔ ان کی اکثریت میں اس قدر جرأت تو نہیں ہے کہ وہ کمیونسٹوں کی طرح سرے سے وجود باری کا انکار ہی کر دیں لیکن وہ دین کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو دور جاہلیت قدیمہ کے لوگ کرتے تھے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو دین اور مذہب کا سخت احترام کرتے ہیں اور وہ جو قانون بناتے ہیں اس کی اساس بھی دین اسلام پر ہی ہے۔ لیکن ان لوگوں کا طریقہ واردات خالص منکرین خدا اور کمیونسٹوں کے مقابلے میں زیادہ مکارانہ اور اذیت دہ ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے اس سوئے ہوئے جذبہ دین سے بہت ڈرتے ہیں جو ان کی رگ و روح میں جاری و ساری ہے۔ اگرچہ وہ جذبہ اسلام کا حقیقی جذبہ نہ ہو' کیونکہ مکمل اسلام تو پورا نظام حیات ہے۔ وہ محض خفیہ جذبہ نہیں ہے اور نہ بجھی ہوئی چنگاری ہے۔ اس طرح یہ لوگ مسلمانوں کے غیض و غضب سے بچنا چاہتے

ہیں - یہ نہایت ہی مکارانہ چال ہے اور اسلام کے خلاف ایک نہایت ہی تکلیف دہ صورت حالات ہے -

اب ذرا دین کے ان نادان حامیوں کے حالات کو دیکھئے - یہ اسلامی نظام حیات کے اساسی مقاصد کو چھوڑ کر ادھر ادھر کی باتوں پر اپنی قوتیں کھپاتے ہیں - انہیں اس جاہلی صورت حالات کے اندر یہ بات نظر ہی نہیں آتی کہ اللہ کی حاکمیت پر دست درازی کر کے شرک کا ارتکاب کیا جارہا ہے اور اپنے اس بے دانش جوش کی وجہ سے وہ موجودہ مشرکانہ نظام کو ایک اسلامی صورت حالات بناتے ہیں - اپنی اس روش کی وجہ سے یہ تاثر دیتے ہیں کہ موجودہ حالات گویا اسلامی حالات ہیں اور ان حالات اور عالم اسلام کی صورت حال میں صرف چند جزئیات کا اختلاف ہے -

اپنے اس رویے کی وجہ سے اسلام کے یہ نادان دوست ' مذہبی طبقے اور بظاہر اسلام کے پرجوش حامی اس غیر اسلامی صورت حالات کو طول دے رہے جو سراسر غیر اسلامی ہے اور اسلامی دنیا پر چھائی ہوئی ہے حالانکہ اس طرز عمل کی وجہ سے ان لوگوں کے مقاصد پورے ہو رہے ہیں جو اسلام کے دشمن ہیں - یہ خدمات وہ لوگ انجام دیتے ہیں جنہوں نے اسلام کا مخصوص مذہبی لباس پہن رکھا ہے حالانکہ اسلامی نظام نے کوئی ایسا مخصوص مذہبی طبقہ نہیں رکھا کہ اسلام کے بارے میں وہی بات کر سکے - اسلام کا نہ کوئی کاہن ہے اور نہ اس میں کسی پادری کی گنجائش ہے کہ ان کے سوا کوئی اور اسلام کی بات ہی نہ کر سکے -

وَ قَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّ حَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا یَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَ اَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَ اَنْعَامٌ لَّا یَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا افْتِرَآءً عَلَیْهِ ؕ سَیَجْزِیْهِمْ بِمَا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

"کہتے ہیں یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں' انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھلانا چاہیں' حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے - پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن پر یہ اللہ کا نام نہیں لیتے اور یہ سب کچھ انہوں نے اللہ پر افتراء کیا ہے' عنقریب اللہ انہیں ان افتراء پردازیوں کا بدلہ دے گا" -

ابن جریر طبری کہتے ہیں ان جاہلوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ اطلاع دیتے ہیں کہ یہ لوگ از خود بعض چیزوں کو حلال قرار دیتے تھے اور بعض کو حرام قرار دیتے تھے' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو قانون سازی کے اختیارات نہیں دیئے تھے -

آیت میں لفظ حجر کے معنی حرام کے ہیں - یہ لوگ جو اللہ کے حق قانون سازی اور حق حاکمیت پر دست درازی کرتے تھے' یہ دعویٰ بھی کرتے تھے کہ یہ اللہ کی شریعت ہے جو ایک جرم ہے - انہوں نے اپنی فصلوں کے ایک حصے کو اور بعض قسم کے مویشیوں کو اپنے الہوں کے لئے مختص کر رکھا تھا جیسا کہ اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں - وہ کہتے تھے کہ یہ پھل اور مویشی ان کے لئے حرام ہیں اور ان کو وہی شخص کھا سکتا ہے جس کو اللہ کی طرف سے اجازت ہو - یہ سب اقوال ان کا زعم تھا اور ظاہر ہے کہ ان کے مذہب میں پھر اجازت صرف کاہنوں' گدی نشینوں اور بعض رئیسوں کو تھی - پھر انہوں نے مویشیوں میں سے بعض کو اسی طرح اپنے اوپر بھی حرام کر دیا تھا جن کا ذکر سورت مائدہ میں ہو چکا ہے - "اللہ

نے کسی جانور کو بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام قرار نہیں دیا"۔ یہ انہوں نے از خود قرار دیا کہ ان جانوروں پر سواری حرام ہے۔ اسی طرح انہوں نے یہ قرار دیا کہ بعض جانوروں کے اوپر اللہ کا نام نہ لیا جائے گا یعنی سواری کے وقت' دودھ نکالنے کے وقت اور نہ ان کے ذبح کے وقت بلکہ ان پر الٰہوں کا نام لیا جائے گا جن کے نام وہ مختص ہو چکے تھے۔

ابن جریر افتراء علی اللہ کی تفسیر میں یہ کہتے ہیں کہ "ان لوگوں نے بعض چیزوں کو حرام قرار دے کر اور پھر یہ کہہ کر کہ یہ اللہ کی نازل کردہ شریعت ہے' اللہ پر افتراء باندھا ہے' اللہ پر جھوٹ بولا ہے کیونکہ انہوں نے ازخود بعض چیزوں کو حرام قرار دے کر اس کی نسبت اللہ کی طرف کر دی تھی۔ اس آیت میں اللہ نے اس بات کی تردید کر دی کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے انہیں جھوٹا قرار دیا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو یہ اطلاع کر دی کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں"۔

یہاں ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ جاہلیت کے وہ خدوخال کون سے ہیں' جو اکثر جاہلیتوں میں مشترک ہوتے ہیں۔ ان تمام جاہلیتوں میں یہ بات مشترک ہوتی ہے کہ بعض لوگ دیدہ دلیری سے کام لے کر اس دنیا کو محض مادہ قرار دیتے ہیں اور بعض اگرچہ بے حیائی میں اس حد تک آگے نہیں جاتے اور خدا کا سرے سے انکار نہیں کرتے مگر وہ کہتے ہیں کہ دین تو صرف عقیدے کا نام ہے۔ یہ کوئی نظام زندگی یا اجتماعی ڈھانچہ' یا سیاسی اور اقتصادی نظام نہیں ہے جو پوری زندگی کو اپنے دائرہ اختیار میں لے سکتا ہو۔

جاہلیت کی دوسری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ہر جاہلیت ایک مخصوص دنیاوی نظام قائم کرتی ہے جس میں حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ اللہ کے سوا کسی اور کے لئے ہوتا ہے' البتہ ہر جاہلیت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ مذہب کا احترام کرتی ہے اور وہ اپنے خدوخال دین ہی سے لیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی جاہلیت کا یہ انداز نہایت ہی خطرناک اور گہری عیاری اور چالاکی پر مبنی ہوتا ہے۔ عالمی عیسائیت اور عالمی صہیونیت نے اس علاقے میں جو کبھی دارالسلام تھا' اور جہاں شریعت الٰہی قانون کی حیثیت رکھتی تھی' یہی پالیسی اپنا رکھی ہے۔ یہ پالیسی انہوں نے ترکی میں عظیم لیڈر کے تجربے کی ناکامی کے بعد اپنائی ہے۔ یاد رہے کہ ترکی کا یہ عظیم لیڈر خود انہوں نے مصنوعی طور پر پیدا کیا تھا' اس نے انہی کی ہدایت پر ترکی سے خلافت اسلامیہ کو ختم کیا۔ اس لئے کہ ترکی کی خلافت اسلامیہ اس کرہ ارض پر عظمت اسلام کی آخری نشانی تھی' لیکن ترکی میں ان کی اعلانیہ ملحدانہ پالیسی بری طرح ناکام رہی اور اس نے اس علاقے میں کوئی اہم کردار ادا نہ کیا۔ اس ملحدانہ پالیسی نے اعلانیہ دین سے علیحدگی اختیار کر لی۔ چنانچہ یہ پالیسی وہاں کے اجتماعی نظام سے بالکل نامانوس رہی کیونکہ اہالیان ترکیہ کے دلوں میں ابھی تک محبت اسلام کی آگ سلگ رہی تھی۔ چنانچہ اس تجربے کے بعد عالمی صلیبیت اور صہیونیت نے نئے تجربے شروع کیے' جن کے مقاصد تو وہی ہیں البتہ ان نئے تجربات میں کمالی غلطیوں کو نہیں دہرایا جاتا۔ چنانچہ وہ اب جو سازشیں کرتے ہیں وہ دین کے پردے میں رہ کر کرتے ہیں۔ وہ دینی تنظیمیں قائم کرتے ہیں جو یا تو اعلانیہ ان مقاصد کے لئے کام کرتی ہیں اور یا ان کا مقصد یہ ہوتا ہے۔ وہ ان تنظیموں کے بعض جزوی مسائل کو لے کر بیٹھ جاتی ہیں اور یہ تاثر دیتی ہیں کہ ان جزوی خرابیوں کے علاوہ جو کچھ ہے وہ درست ہے۔ میں سمجھتا ہوں اسلام کے خلاف یہ نہایت ہی گہری سازش ہے جو دین اسلام کے خلاف شیاطین جن وانس نے تیار کی ہے۔

صلیبی اور صہیونی اس عرصے میں پوری طرح اپنے مقاصد کے لئے کام کرتے رہے۔ باوجود مذہبی اختلافات کے وہ

باہم دگر متحد و متفق رہے اور باہم تجربات اور مہارتوں کا تبادلہ کرتے رہے۔ بظاہر وہ اس ترکی تجربے کے بھی خلاف رہے اور یہ تاثر دیتے رہے کہ ترکوں کی تحریک بھی دراصل احیائے اسلام کی تحریک ہے اور یہ کہ ترکی حکومت محض زبانی طور پر اپنے آپ کو لادینی حکومت ظاہر کر رہی ہے۔

مستشرقین صلیبی اور صیہونی استعمار کو فکری غذا مہیا کرتے ہیں۔ انہوں نے اس بات پر بڑی محنت کی ہے کہ ترکی تجربہ فی الواقعہ ملحدانہ تجربہ نہ تھا اور یہ محنت وہ اس لئے کرتے ہیں کہ ترکی تجربے کے ملحدانہ خدوخال کی وجہ سے اس کے اثرو رسوخ اور فعالیت میں کمی واقع ہوگئی تھی۔ مستشرقین کی جانب سے اسلامی تحریک کے خلاف یہ تباہ کن حملہ تھا لیکن ترکی کی تحریک الحاد اب اس قابل نہ رہی تھی کہ وہ دوبارہ فعال ہو سکے۔ دور جدید میں مستشرقین کی جانب سے اسلام کے خلاف کارروائی خود اسلام کے عنوان سے کی جا رہی ہے۔ یہ لوگ اسلامی نظریات کے مفہوم بدل رہے ہیں۔ اسلام کے لئے لوگوں کے جوش و خروش کو کم کر رہے ہیں اور اس کو جاہلی رنگ دے رہے ہیں۔ دین کے نام سے دینی نظریات کو بدلنے کی سعی کرتے ہیں۔ اسلامی اخلاق اور انسان کی نہایت ہی فطری عادات کو دین کے نام سے بے راہ روی پر ڈال رہے ہیں۔ پھر وہ جاہلیت کے ہر نشان کو ایسا ثابت کر رہے ہیں کہ یہ عین اسلام ہے اور اس کو ان ممالک میں رواج دے رہے ہیں جہاں اسلام کے بارے میں لوگوں کے جذبات حساس نہیں۔ یوں وہ عالم اسلام کو صلیبیت اور صیہونیت کے دام تذویر میں پھنساتے ہیں اور ان کی یہ تحریک ان صلیبی اور صیہونی جنگوں سے زیادہ کامیاب ہے جو وہ اسلام کے خلاف گزشتہ تیرہ سو سال سے لڑ رہے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے۔

(سَيَجْزِيهِمْ بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ (٦:١٣٨)) ”عنقریب اللہ انہیں ان افتراء پردازیوں کا بدلہ دے گا“۔

وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَٰذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا ۖ وَإِنْ يَكُنْ مَيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ ۚ سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿١٣٩﴾

”اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے یہ ہمارے مردوں کے لئے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں پر حرام، لیکن اگر وہ مردہ ہو تو دونوں اس کے کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ باتیں جو انہوں نے گھڑ لی ہیں ان کا بدلہ اللہ انہیں دے کر رہے گا۔ یقیناً وہ حکیم ہے اور سب باتوں کی اسے خبر ہے“۔

اس شرک اور بت پرستی سے جو اوہام پیدا ہوئے تھے، ان کے اندر یہ لوگ اس قدر آگے بڑھ گئے تھے کہ انہوں نے حلال و حرام کے تعین کا کام بھی اللہ کے بجائے انسانوں کے سپرد کر دیا تھا اور دعویٰ یہ کرتے تھے کہ یہ انسان جو قانون سازی کر رہے ہیں وہی اللہ کی شریعت ہے۔ چنانچہ خرافات کی دنیا میں وہ اس مقام تک آپہنچے کہ کہنے لگے کہ ان جانوروں

کے پیٹ میں جو کچھ ہے وہ مردوں کے لئے ہے یا شاید یہ بات وہ مذکورہ بالا بحیرہ' سائبہ اور وصیلہ وغیرہ کے حق میں کہتے تھے کہ عورتوں کے لئے اس کا کھانا حرام ہے۔ہاں ایک صورت ہے کہ اگر یہ جانور مردہ حالت میں پیدا ہو تو عورتیں بھی ان سے کھا سکتی ہیں اور یہ کیوں؟ اس کا کوئی منطقی جواز ان کے پاس نہ تھا۔ہاں جواز صرف یہ تھا کہ انہوں نے قانون سازی کا کام جن لوگوں کے سپرد کر دیا تھا ان کی منشا یہ ہوگی یا ان کا مفاد اس میں ہو گا۔یہ خالص بے معنی قانون سازی تھی۔یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے آخر میں قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ یہ نہایت ہی مکروہ قانون ہے۔جن لوگوں نے یہ بنایا ہے انہوں نے اللہ پر افتراء پردازی کی ہے' خصوصاً یہ بات جو وہ کہتے ہیں کہ یہ بھی من عنداللہ شریعت ہے۔

(سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ (٦: ١٣٩)) "ان کا بدلہ اللہ انہیں دے کر رہے گا۔ یقیناً وہ حکیم ہے اور سب باتوں کی اسے خبر ہے"۔اللہ تمام حالات سے باخبر ہے' وہ تمام امور میں بڑی حکمت کے ساتھ تصرفات کرتا ہے اور اس کے فیصلے اور قانون ایسے نہیں ہوتے جیسے ان جاہلوں کے ہوتے ہیں۔

جب انسان کلام الٰہی کو پڑھتے ہوئے ان گمراہیوں پر نظر ڈالتا ہے اور ان گمراہیوں کے حاملین جن خساروں' نقصانات اور مشکلات میں مبتلا ہوتے ہیں ان پر غور کرتا ہے تو وہ یہ دیکھ کر نہایت ہی تعجب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ لوگ اسلامی شریعت اور اسلامی نظام سے انحراف کر کے کس قدر نقصانات اٹھا رہے ہیں اور کن ناقابل برداشت ذمہ داریوں میں گھر گئے ہیں۔ان ذمہ داریوں کو لے کر وہ کس قدر فضول اور مجمل ناقابل فہم امور میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ان کے عقائد غلط ہیں اور ان پر فرائض ایسے عائد کر دیئے گئے ہیں کہ ناقابل برداشت ہیں۔ان کی زندگی پیچیدہ اور اضطراب انگیز ہے۔زندگی کا کوئی اصول نہیں ہے۔ ہر طرف وہم و خرافات اور تقلید اور نقل ہے۔ان سب حالات کے مقابلے میں اسلام کا عقیدہ توحید ہے جو بالکل صاف ستھرا اور واضح ہے۔یہ عقیدہ انسانی ذہن سے اوہام اور خرافات کو کھرچ کر رکھ دیتا ہے اور انسانی عقل کو اندھی تقلید کی پیروی اور جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیتا ہے۔یہ عقیدہ انسانیت کو جاہلیت اور اس کی رسومات سے رہائی دلاتا ہے۔ پھر یہ عقیدہ بندوں کو بندوں کی غلامی سے آزاد کرتا ہے' چاہے یہ غلامی قانون سازی کے معاملے میں ہو' یا رسومات اور طرز عمل میں ہو یا حسن و قبح کے پیمانوں کے میدان میں ہو۔اس جنگل سے نکال کر عقیدۂ توحید انسان کو ایک واضح نظریہ دیتا ہے۔ایک واضح معنی دیتا ہے۔اس کے تصورات واضح اور آسان ہیں۔ان تصورات کی روشنی میں انسان کو ہمہ گیر آزادی نصیب ہو جاتی ہے اور انسان صرف اللہ کی بندگی اور غلامی کے اعلیٰ و ارفع مقام تک پہنچ جاتا ہے۔لوگ نبی کی اتباع سے وہاں پہنچ سکتے ہیں۔

آہ! یہ ایک عظیم خسارہ ہے اور یہ خسارہ دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی' بلکہ آخرت کا خسارہ تو بہت ہی زیادہ ہے اور یہ اس لئے ہے کہ انسانیت نے اللہ کی سیدھی راہ سے انحراف کر لیا ہے اور جاہلیت کی گندگی میں ڈوب گئی ہے۔ اس نے انسانوں کی غلامی میں اپنے آپ کو دے دیا ہے۔

---ooo---

قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ حَرَّمُوْا مَا

رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝

"یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت و نادانی کی بنا پر قتل کیا اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو اللہ پر افتراء پردازی کر کے حرام ٹھہرا لیا۔ یقیناً وہ بھٹک گئے اور ہرگز وہ راہ راست پانے والوں میں سے نہ تھے"۔

یہ ایک عام اور مطلق خسارہ ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ ہے۔ ان کا اپنا بھی خسارہ ہے اور آنے والی نسلوں کا بھی خسارہ ہے۔ ان کا فکری خسارہ ہے اور روحانی خسارہ ہے اور ان کی آزادی کا خسارہ ہے کہ اللہ نے تو انہیں انسانوں کی غلامی سے چھڑایا اور انہیں رب کی غلامی میں داخل کیا لیکن انہوں نے اپنے آپ کو اپنے جیسے بندوں کی غلامی میں دوبارہ داخل کر دیا۔ اور ان انسانوں کو اپنا حاکم بنا لیا۔ ان تمام امور سے صرف نظر بھی کیا جائے تو انہوں نے ضلالت اختیار کر لی ہے اور ہدایت کی راہ کو ترک کر دیا ہے۔

(قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (٦:١٤٠)) "یقیناً وہ بھٹک گئے اور ہرگز راہ راست پانے والوں میں سے نہ تھے"۔

---ooo---

اس کے بعد قرآن کریم انہیں اس کائنات کی پہلی حقیقت کی طرف لاتا ہے جسے انہوں نے بھلا دیا تھا اور آغاز کلام میں آیت

(وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ (٦:١٣٦)) میں اشارہ بھی کر دیا تھا۔ انہیں اس حقیقت کی طرف لایا جاتا ہے کہ جن فصلوں اور مویشیوں کے متعلق وہ ایسے نامعقول قواعد وضع کرتے ہیں، ان کی ماہیت کیا ہے اور ان کا اصل اور مصدر کیا ہے۔ وہ ان کے بارے میں جنوں اور انسانوں کے شیاطین کی ہدایات لیتے ہیں جبکہ ان کو ان جنوں اور شیطانوں نے پیدا نہیں کیا۔ اللہ وہ ذات ہے جس نے ان فصلوں اور مویشیوں کو پیدا کیا۔ ان چیزوں کو تمہارے سازوسامان کے طور پر پیدا کیا گیا اور تم انہیں استعمال کر رہے ہو۔ تمہارا فرض تو یہ ہے کہ تم شکر خداوندی بجا لاؤ اور صرف اللہ کی عبادت کرو، حالانکہ اللہ کو تمہارے شکر اور تمہاری بندگی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو غنی اور رحمتوں والا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ حقائق و عقائد تو خود انسانوں کی دنیا و آخرت کو سدھارنے کے لئے بتلائے جاتے ہیں جو ان میں سے کسی ایک چیز کے مالک و خالق نہیں ہیں۔ یہ تو اللہ کے پیدا کردہ فصل اور مویشی ہیں لیکن انسان اللہ کی مخلوق کو تقسیم کر کے کچھ بتوں کو دے دیتے ہیں اور کچھ اللہ کے لئے مخصوص کرتے ہیں۔ پھر اللہ کے حصے کے ساتھ توہین آمیز سلوک کرتے ہیں اور یوں شیطانوں کو خوش کرتے ہیں۔

حالانکہ اللہ ہی خالق، مالک اور رازق و رب ہے، اور ان مالوں میں کوئی تصرف اس کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس کا اذن اسلامی شریعت کی صورت میں موجود ہے۔ اور یہ شریعت اللہ کی جانب سے رسول اللہ لائے ہیں۔ اللہ کا اذن ان غاصبوں کے جاری کردہ قوانین کو حاصل نہیں ہے۔ جنہوں نے اللہ کے حق حاکمیت کو غصب کر لیا ہے۔

وَ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَيْرَ
مَعْرُوْشٰتٍ وَّ النَّخْلَ وَ الزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَ الزَّيْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ
مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ
يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ ؗ وَ لَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ وَ مِنَ الْاَنْعَامِ
حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ
اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۴۲﴾

"وہ اللہ ہی ہے جس نے طرح طرح کے باغ اور تاکستان اور نخلستان پیدا کیے' کھیتیاں اگائیں جن سے قسم قسم کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں' زیتون اور انار کے درخت پیدا کیے جن کے پھل صورت میں مشابہ اور مزے میں مختلف ہوتے ہیں۔ کھاؤ ان کی پیداوار جب کہ یہ پھلیں' اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر وہی ہے جس نے مویشیوں میں سے وہ جانور بھی پیدا کیے جن سے سواری و باربرداری کا کام لیا جاتا ہے اور وہ بھی جو کھانے اور بچھانے کے کام آتے ہیں۔ کھاؤ ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں بخشی ہیں اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"۔

اللہ وہ زات ہے جس نے ابتداء ان باغات کو پیدا کیا۔ لہٰذا وہی ہے جو ایک مردہ سے زندہ چیز کو نکالتا ہے۔ ان باغوں میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو تاکستان کی شکل کے ہیں اور انسان انہیں اگاتا ہے۔ اور ان کے ارد گرد باڑ لگاتا ہے اور کچھ نخلستان کی شکل کے ہیں۔ جو خود ہی پیدا ہوتے ہیں اور ان کو انسان کی جانب سے کسی قسم کی اعانت کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ اور فصلیں اس نے اگائیں۔ زیتون اور انار اس نے پیدا کیے اور قسم قسم کے پھل ہیں جو ملتے جلتے بھی ہیں اور جدا جدا بھی ہیں۔ پھر حیوانات بھی اس نے پیدا کیے جن میں سے بعض اونچے قد کے ہیں اور کچھ چھوٹے جسم کے ہیں اور وہ تمہارے کھانے کے لئے اور لباس کے لئے ہیں اور جن کے بالوں سے تم فرش و قالین بناتے ہو۔

اور یہ اللہ ہی ہے جس نے اس کرۂ ارض پر رنگا رنگ زندہ مخلوقات کو پھیلایا اور اس مخلوقات کی رنگا رنگی حیرت انگیز ہے۔ اور پھر اس مخلوق کو ان فرائض کے لئے نہایت ہی سازگار ماحول دیا جو انسان کو اس کرۂ ارض پر ادا کرتے ہیں۔ ان کو ان ضروریات کے لئے بھی موافق بنایا جو انسان کی زندگی کے لئے لابدی ہیں۔ ان آیات و دلائل اور ان رنگا رنگ مخلوقات کو دیکھ کر ایک انسان کس طرح کچھ اثر لئے بغیر گزر سکتا ہے۔ پھر بھی وہ اس مخلوق اور ان زرعی اجناس میں اللہ کے سوا کسی اور کی حاکیت و اختیارات کو تسلیم کرتا ہے۔

قرآن کریم بار بار اس رزق کا ذکر کرتا ہے جو انسان کے لئے اللہ نے اس کرۂ ارض پر بکھیر دیا ہے۔ اس متنوع رزق کو اس بات پر دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے کہ اگر رازق وہ ہے تو حاکم بھی وہی ہے۔ انسانوں پر اس کی حکومت چلنی چاہئے۔ اس لئے کہ جو خالق ہے' رازق ہے' رب ہے اور پوری زندگی میں کفیل ہے' صرف وہی اس بات کا مستحق ہے کہ لوگ زرعی اجناس اور مویشیوں اور پوری زندگی کے معاملات میں اسے اپنا حاکم' مختار اور قانون ساز سمجھیں ۔ اور اس میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے باغات اور پھلوں کے کئی مناظر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مختلف قسم کے جانوروں کا ذکر کیا ہے اور بتلایا ہے کہ یہ تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں۔ اس سے پہلے ان مناظر سے اللہ کی الوہیت اور خدائی پر استدلال کیا گیا ہے۔ اور یہاں اللہ تعالیٰ ان چیزوں کے ذکر سے اپنے حق حکمرانی پر استدلال کرتا ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ الوہیت اور حاکمیت دراصل ایک ہی حقیقت ہے۔ وہی حاکم ہے اور یہ اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔

(لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لَا حَاكِمَ اِلَّا اللّٰهُ) اب فصلوں اور پھلوں کے ذکر کے بعد یہ حکم ہے۔ ایک قانون کی طرف اشارہ ۔

( كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ( ٦ : ١٤١ ) ) "کھاؤ ان کی پیداوار جب کہ یہ پھلیں' اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ جب تم اس کی فصل کاٹو تو اللہ کا حق دو' اس فقرے کی وجہ سے بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ آیت مدنی ہے۔ لیکن ہم نے اس سورہ کے مقدمہ میں اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ یہ آیت مکی ہے۔ اور اگر اس سورہ سے اس آیت کو علیحدہ کر دیا جائے تو بات مکمل نہیں ہوتی۔ اس آیت سے قبل کا کلام اور بعد کا کلام ایک دوسرے سے اس وقت تک کٹ جاتا ہے جب تک یہ آیت مدینہ میں نازل نہیں ہو جاتی' لہٰذا یہ بات درست نہیں ہے۔ پھر ضروری نہیں ہے کہ اللہ کا حق جس کا اس سورہ میں ذکر ہے وہ زکوٰۃ ہی ہو۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ اس سے مراد مقدمہ ہے۔ رہی زکوٰۃ' تو اپنی متعین شرح کے ساتھ تو وہ ہجرت کے بعد دوسرے سال میں فرض ہوئی۔

(وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ( ٦ : ١٤١ ) ) "اور حد سے نہ گزرو بے شک اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" یہ آیت کھانے پر بھی مناسب حد بندی ہے اور عطا پر بھی مناسب حد بندی عائد کرتی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ مسلمان جب دینے لگے تو حد سے گزر گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی "کہ حد سے نہ گزرو بے شک اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" اسلام ہر بات میں اعتدال کو پسند کرتا ہے۔

(وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ( ٦ : ١٤٢ ) ) "پھر وہی ہے جس نے مویشیوں میں سے وہ جانور بھی پیدا کئے جن سے

سواری و باربرداری کا کام لیا جاتا ہے۔ اور وہ بھی جو کھانے اور بچھانے کے کام آتے ہیں۔ کھاؤ ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں بخشی ہیں اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

مویشیوں کے ذکر میں یہ کہا گیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ انسان کو یہ یاد دلانا مطلوب ہے کہ یہ تمام مخلوق اللہ کی پیدا کردہ ہے۔ شیطان کسی چیز کا خالق نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب شیطان کا کچھ ہے ہی نہیں تو پھر یہ کیا ہے کہ نعمتیں اللہ کی اور پیروی شیطان کی؟ جبکہ معلوم ہے کہ شیطان ہے بھی کھلا دشمن۔ کیا سوچتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چیزیں استعمال کر کے شیطان کی پیروی کرتے ہو اور وہ تو کھلا دشمن ہے۔

اب قرآن کریم نہایت ہی گہرائی میں جاکر اوہام جاہلیت کو تلاش کرتا ہے۔ نہایت ہی خفیہ گوشوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور ایک ایک خفیہ گوشے کو روشنی میں لایا جاتا ہے۔ ایسے ایسے گوشے واضح کرتا ہے جو بادی النظر میں بھی نامعقول ہیں اور ان کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی' اور بعض اوقات تو ان اوہام میں مبتلا لوگوں کو بہت زیادہ شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب ان کی یہ حرکات کھلے میدان میں آشکارا ہو جاتی ہیں اور جب وہ دیکھ لیتے ہیں کہ ان کے ان اوہام کی پشت پر نہ کوئی سند ہے' نہ کوئی کتاب منیر ہے اور نہ کوئی عقلی دلیل ہے۔

---

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

"یہ آٹھ نر و مادہ ہیں' دو بھیڑ کی قسم سے اور دو بکری کی قسم سے۔ اے نبی" ان سے پوچھو کہ اللہ نے ان کے نر حرام کئے ہیں یا مادہ' یا وہ بچے جو بھیڑوں اور بکریوں کے پیٹ میں ہوں؟ ٹھیک ٹھیک علم کے ساتھ مجھے بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ اور اسی طرح دو اونٹ کی قسم سے ہیں اور دو گائے کی قسم سے۔ پوچھو' ان کے نر اللہ نے حرام کئے ہیں یا مادہ' یا وہ بچے جو اونٹنی اور گائے کے پیٹ میں ہوں؟ کیا تم اس وقت حاضر تھے جب اللہ نے ان کے حرام ہونے کا حکم تمہیں دیا تھا؟ پھر

اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ کی طرف منسوب کر کے جھوٹی بات کہے تاکہ علم کے بغیر لوگوں کی غلط راہنمائی کرے۔ یقیناً اللہ ایسے ظالموں کو راہ راست نہیں دکھاتا۔

یہ مویشی جن کے بارے میں تنازعہ چل رہا ہے اور جن کے بارے میں آیت سابقہ میں یہ کہا گیا کہ یہ صرف اللہ کی مخلوق ہے ان کے آٹھ سیٹ ہیں لفظ "ازواج" اس وقت بولا جاتا ہے جب نر اور مادہ دونوں ہوں' زوج کے معنے جوڑا' ایک جوڑا بھیڑوں کا اور ایک بکریوں کا۔ سوال یہ ہے کہ ان کو اللہ نے کن لوگوں پر حرام قرار دیا ہے؟ یا ان کے پیٹ میں جو جنین ہیں ان کے بارے میں حرمت کا حکم کہاں ہے؟ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ۔

(نَبِّئُوْنِیْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (٦:١٤٣)) اس لئے کہ حلال و حرام کے فیصلے محض ظن و تخمین سے تو نہیں ہو سکتے' نہ ہی انکل پچو سے اس معاملے میں کوئی فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔ نہ اس بارے میں معلوم اور مسلم سند کے بغیر کوئی قانون بنایا جا سکتا ہے۔

باقی جوڑے نر اونٹ اور مادہ اونٹ' بیل اور گائے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان کے بارے میں حلال و حرام کا حکم کہاں ہے؟ یا ان کے جنین کے بارے میں حکم کہاں ہے اور کس نے دیا ہے؟

(اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا (٦:١٤٤)) کیا تم اس وقت حاضر تھے جب اللہ نے ان کے حرام ہونے کا حکم تمہیں دیا تھا۔" یعنی تم حاضر تھے اور تم اس بات کے گواہ ہو کہ اللہ نے اس کا حکم تمہیں دیا ہے۔ اس لئے کہ کوئی چیز حلال و حرام تو صرف اللہ کے حکم سے ہو سکتی ہے اور حکم بھی یقینی ہو۔ محض ظن و تخمین سے اس معاملے میں بات نہیں ہو سکتی۔

اس آیت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قانون ساز صرف اللہ ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ جو قانون بناتے ہیں وہ قانون الٰہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ فوراً ان کو متنبہ کرتے ہیں۔

(فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (٦:١٤٤)) "پھر اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ کی طرف منسوب کر کے جھوٹی بات کہے تاکہ علم کے بغیر لوگوں کی غلط راہنمائی کرے۔ یقیناً اللہ ایسے ظالموں کو راہ راست نہیں دکھاتا۔" اس شخص سے بڑا ظالم اور کوئی نہیں ہے جو از خود قانون بنا کر اسے اللہ کا قانون بتلاتا ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ شریعت ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ عوام کالانعام کو گمراہ کرے۔ ایسا شخص لوگوں کو محض ظن کی طرف بلاتا ہے جبکہ ایسے لوگوں کے لئے ہدایت کی راہ مسدود ہو چکی ہے۔ انہوں نے غلط راہ کو اپنا لیا ہے اور اللہ کے ساتھ شرک کا ارتکاب کر کے ظلم کا ارتکاب کیا ہے اور کسی ظالم کو اللہ راہ ہدایت نہیں دیتا۔

اب جبکہ ان کے معتقدات' تصورات اور ان کی عملی رسومات کے بودے پن کو ظاہر کر دیا گیا اور یہ ثابت کر دیا گیا کہ یہ سب کچھ محض وہمی ہے اور بے اصل ہے' اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ ان کے تصورات اور عقائد کسی علم و دلیل پر مبنی

نہیں ہیں اور یہ کہ مویشیوں اور فصلوں کے بارے میں جو تصورات اور رسومات وہ رکھتے ہیں وہ یا تو انہوں نے از خود گھڑ لئے ہیں اور یا ان کے شیاطین نے ان پر القاء کئے ہیں حالانکہ یہ مویشی اور یہ فصل اور پھول پھل ان کے پیدا کردہ نہیں ہیں - یہ تو اللہ کی تخلیق کے کمالات ہیں' لہٰذا حاکمیت اور عبادت سب کی سب اللہ کے لئے مخصوص ہونی چاہیے - اس لئے کہ مخلوق اس کی ہے' رزق اس کا ہے اور لوگوں کو ہر قسم کے مال اس نے دیئے ہیں -

اب اس تمہید کے بعد اللہ تعالیٰ بتلاتے ہیں کہ وہ کیا چیزیں ہیں جو اللہ نے حرام کی ہیں - اور وہ چیزیں اللہ نے سچائی اور دلیل کی اساس پر حرام کی ہیں' محض وہم و گمان کی بنا پر نہیں - کیونکہ اللہ وہی ذات ہے جس کو حاکمیت کا حق حاصل ہے' جسے قانون سازی کا حق ہے - یہ اللہ ہی کا منصب اور مقام ہے کہ وہ جس چیز کو حلال کرے وہ حلال ہے اور جس کو حرام کرے تو وہ حرام ہے - اس کام میں کوئی انسان نہ شریک ہے اور نہ کوئی اس میں کسی قسم کی مداخلت کر سکتا ہے - اللہ کی حاکمیت اور اس کی قانون سازی پر کوئی نظر ثانی کرنے والا نہیں ہے - موقعہ کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے یہاں وہ چیزیں بھی گنوا دیں جو یہودیوں پر حرام تھیں اور مسلمانوں کے لئے حلال کر دی گئیں' اس لئے کہ وہ یہودیوں پر بطور سزا حرام کی گئی تھیں کیونکہ وہ ظلم و شرک میں مبتلا ہو گئے تھے اور اللہ کی شریعت سے دور ہو گئے تھے -

---

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَعَلَی الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ شُحُوْمَهُمَاۤ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَاۤ اَوِ الْحَوَایَاۤ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَیْنٰهُمْ بِبَغْیِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

"اے نبی " ان سے کہو کہ جو وحی میرے پاس آئی ہے اس میں تو میں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر حرام ہو' الا یہ کہ وہ مردار ہو' یا بہایا ہوا خون ہو' یا سور کا گوشت ہو کہ وہ ناپاک ہے' یا فسق ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو - پھر جو شخص مجبوری کی حالت میں (کوئی چیز ان میں سے کھا لے) بغیر اس کے کہ وہ نافرمانی کا ارادہ رکھتا ہو اور بغیر اس کے کہ وہ حد ضرورت سے تجاوز کرے' تو یقیناً تمہارا رب درگزر سے کام لینے والا اور رحم

فرمانے والا ہے۔ اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے' اور گائے اور بکری کی چربی بھی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا ان کی آنتوں سے لگی ہوئی ہو یا ہڈی سے لگی رہ جائے' یہ ہم نے ان کی سرکشی کی سزا انہیں دی تھی۔ اور یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔"

"ابن جریر طبری لکھتے ہیں "اللہ اپنے نبی سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں اے محمد! ان لوگوں سے یہ کہہ دیں جنہوں نے اللہ کی پیدا کردہ فصلوں اور مویشیوں میں ایک حصہ اللہ کے لے مخصوص کر دیا ہے اور ایک حصہ اپنے ان معبودوں کے لئے مخصوص کر دیا ہے جو خود انہوں نے اللہ کے شریک قرار دیئے ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ مویشی اور یہ فصل اور لوگوں کے لئے ممنوع ہے اور اسے صرف وہی لوگ استعمال کر سکتے ہیں جن کے بارے میں ہم چاہیں یہ قانون وہ بزعم خود بناتے ہیں جو بعض جانوروں پر بار برداری کو حرام کرتے ہیں اور بعض جانور ایسے ہیں جن پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا جائز نہیں سمجھتے۔ وہ بعض جانوروں کے پیٹ میں جنین کو اپنی عورتوں اور بیویوں کے لئے حرام قرار دیتے ہیں اور مردوں کے لئے حلال قرار دیتے ہیں۔ وہ اللہ کے پیدا کردہ بعض دوسرے ارزاق کو حرام قرار دیتے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ یہ قوانین و ضوابط اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان کے یہ کام شرک کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان سے پوچھو! کہ آیا اللہ کی جانب سے کوئی رسول آیا تھا جس نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا تو بتاؤ وہ کون سا رسول تھا یا اللہ نے جب ان چیزوں کو حرام قرار دیا تو تم خود اس مجلس میں موجود تھے۔ تم نے خود اللہ سے سنا ہے کہ یہ چیزیں حرام ہیں۔ اگر تم ایسا دعویٰ کرو تو بادی النظر میں یہ جھوٹا ہو گا اور تم عقلاً ایسا دعویٰ کر ہی نہیں سکتے۔ اگر تم ایسا دعویٰ کرو تو تمام جہان تمہاری تکذیب کر دے گا۔ رہا یہ میرا معاملہ' تو میرے اوپر جو کتاب قرآن نازل ہو رہی ہے اس میں کسی شخص پر کوئی ایسی چیز حرام نہیں ہے جس کو تم حرام قرار دیتے ہو اور بزعم خود "تم" حرام قرار دیتے ہو۔ میرے اوپر اللہ نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ یہ ہیں کہ کوئی جانور مردار ہو گیا ہو' بغیر ذبح کے مر گیا ہو' یا بہایا ہوا خون ہو' یا خنزیر کا گوشت حرام ہے اس لئے کہ یہ ناپاک ہے' یا وہ گوشت جو فسق کا ہو' مثلاً وہ ذبیحہ جو مشرکین بتوں پر ذبح کرتے ہیں' اپنے بتوں اور آستانوں پر اور ان پر بتوں کا نام لیا گیا ہو' یہ ذبح اسلام میں فسق تصور ہوتا ہے' اسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے اور ایسا کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے۔ یہ مردار تصور ہوتا ہے اور اس کا کھانا حرام ہے۔"

یہ اللہ کی جانب سے اعلان ہے ان مشرکین کے لئے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ مردار کی حلت و حرمت کے مسئلے میں مجادلہ کرتے تھے کہ وہ جن چیزوں میں مجادلہ کرتے ہیں ان میں سے بعض اشیاء تو حرام ہیں جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہے اور بعض اشیاء حلال ہیں جنہیں اللہ نے حلال قرار دیا ہے۔ ان حلال چیزوں کی حرمت کی نسبت جو وہ اللہ کی طرف کرتے ہیں اس میں وہ جھوٹے ہیں۔ ابن جریر آیت (فَمَنِ اضْطُرَّ ..........) کی تفسیر میں کہتے ہیں: "اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے مردار' خون' لحم خنزیر یا بتوں کے نام پر ذبح ہونے والے جانوروں کو حرام قرار دیا لیکن اگر کوئی اس کے کھانے پر مجبور ہو جائے' بطور حکم عدولی نہ کھا رہا ہو اور یہ نہ ہو کہ حالت اضطرار میں نہ ہو اور اسی طرح وہ جان بوجھ کر حدود سے تجاوز نہ کر رہا ہو اور حد ضرورت کے اندر کھا رہا ہو مثلاً صرف اس قدر کھا رہا ہو کہ اس کی زندگی بچ جائے' اس سے زیادہ نہ کھا رہا ہو تو اس قدر کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے' بے شک اللہ غفور و رحیم ہے اور وہ اس کی پردہ پوشی کرنے والا ہے۔ اس پر اس کو کوئی سزا نہ ہوگی اور

گناہ بخش دیا جائے گا' یہ ہے مفہوم غفور کا۔ اور رحیم اس لئے ہے کہ اس نے لوگوں پر رحم کر کے بوقت مجبوری جواز کا حکم دیا۔ ورنہ اگر وہ چاہتا تو وہ ان چیزوں کے استعمال کو ہر حال میں حرام کر دیتا۔"

رہی وہ مقدار جو ان چیزوں سے کھائی جا سکتی ہے تو اس بارے میں فقہاء کے درمیان اختلافات ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ وہ صرف اسی قدر کھائے گا جس سے جان بچ جائے' دوسری رائے یہ ہے کہ بقدر کفایت اور سیر ہو جانے تک کھا سکتا ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ ایک بار کھانے کے علاوہ دوسرے اوقات مجبوری کے لئے ذخیرہ بھی کر سکتا ہے۔ اگر اسے یہ ڈر ہو کہ آئندہ بھی رزق حلال نہ ملے گا' میں ان اختلافات کی تفصیلات میں نہیں جاتا۔ اس موضوع پر اسی قدر کافی ہے۔

رہے یہودی تو ان پر وہ تمام جانور حرام کر دیئے گئے تھے جن کے ناخن تھے۔ یعنی وہ تمام حیوانات جن کے پاؤں پھاڑے ہوئے نہیں ہیں مثلاً اونٹ' شتر مرغ' مرغابی اور بطخ۔ ان پر گائے اور بکریوں کی چربی بھی حرام کر دی گئی تھی' صرف پیٹھ کی چربی جائز تھی یا وہ چربی جو آنتوں کے ساتھ لگی ہوئی تھی یا جو ہڈیوں سے ملی ہوئی تھی۔ یہ چیزیں ان پر بطور سزا حرام کی گئیں اور یہ سزا ان کو اس بغاوت کے نتیجے میں دی گئی جو وہ اللہ کے احکام اور قوانین سے کرتے تھے۔

(وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ (٦:١٤٦)) "اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے' اور گائے اور بکری کی چربی بھی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا ان کی آنتوں سے لگی ہوئی ہو یا ہڈی سے لگی رہ جائے۔ یہ ہم نے ان کی سرکشی کی سزا انہیں دی تھی اور یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔" قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ وہ سبب بتا دیا جس کی وجہ سے ان پر یہ چیزیں حرام کر دی گئی تھیں اور یہ حرمت یہودیوں کے ساتھ مخصوص تھی اور یہی حقیقی سبب تھا۔ وہ سبب نہ تھا جو وہ کہتے ہیں کہ اسرائیل یعنی حضرت یعقوب نے خود اپنے اوپر یہ چیزیں حرام کر لی تھیں اور اسرائیل کی اطاعت میں یہ لوگ بھی بدستور ان چیزوں کو اپنے اوپر حرام کئے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اشیاء حضرت یعقوب کے لئے مباح اور حلال تھیں یعنی ان کے بعد جب انہوں نے سرکشی اختیار کی تو ان پر اللہ نے ان چیزوں کو حرام کر دیا اور یوں انہیں سزا دی۔

فَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٤٧﴾

"اب اگر وہ تمہیں جھٹلائیں تو ان سے کہہ دو کہ تمہارے رب کا دامن رحمت وسیع ہے اور مجرموں سے اس کے عذاب کو پھیرا نہیں جا سکتا۔"

اس کا دامن رحمت بہت وسیع ہے اور یہ رحمت ہمارے لئے بھی وسیع ہے اور اس سے پہلے کے مومنین کے

لئے بھی وسیع تھی اور مومنین کے علاوہ تمام مخلوقات کے لئے بھی اس میں وسعت ہے کیونکہ وہ تو محسن ہے۔ دوست کے لئے بھی رحیم ہے اور دشمن کے لئے بھی رحیم ہے۔ اگر مجرم عذاب کے مستحق ہوں تو بھی وہ نفاذ عذاب میں جلدی نہیں کرتا اور یہ اس کی شان کریمی ہے اور اس ڈھیل کے عرصہ میں کئی لوگ توبہ کر لیتے ہیں اور اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن اس کا عذاب نہایت ہی سخت ہے۔ صرف اس کا حلم ہی اسے اہل ایمان سے رد کر سکتا ہے۔ اللہ کے نظام قضا و قدر میں جو وقت متعین ہے اس وقت تک ہی وہ مؤخر ہو سکتا ہے۔

اس آیت میں اگرچہ شمع امید کو بھی روشن رکھا گیا ہے اور انسان کو مایوس نہیں کیا گیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں تنبیہ بھی موجود ہے کہ وہ حد سے نہ گزرے اور اللہ وہ ذات ہے جس نے لوگوں کے دل و دماغ کو پیدا کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ ان کے لئے یہ دونوں باتیں ضروری ہیں تاکہ وہ ڈر جائیں ' اپنے رویے پر غور کریں اور دعوت اسلامی کو قبول کر لیں۔

---ooo---

جب بات یہاں تک پہنچتی ہے اور اہل ضلالت کے لئے کوئی مفر نہیں رہتا۔ جب ان کے پاس کوئی استدلال نہیں رہتا اور تمام بھاگنے کے راستے بند ہو جاتے ہیں تو قرآن کریم ان کے فرار کے آخری راستے کو بھی بند کر دیتا ہے۔ ان کے گمراہانہ تصورات ' شرکیہ عقائد اور بے معنی اعمال کے لئے ایک راہ موجود تھی۔ وہ کہتے تھے کہ وہ اپنا کوئی اختیار نہیں رکھتے ' وہ تو مجبور ہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو وہ نہ ایسے تصورات رکھتے ' نہ غلط عقائد ان کے ہوتے اور نہ وہ بداعمالیوں میں مبتلا ہوتے۔ اگر اللہ چاہتا تو وہ ہمیں ان باتوں سے روک دیتا۔ وہ تو قادر مطلق ہے اور اس کی قدرت پر کوئی قید نہیں ہے۔

---

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ﴿١٤٨﴾ قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۖ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٤٩﴾

"یہ مشرک لوگ (تمہاری ان باتوں کے جواب میں) ضرور کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا ' اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔" ایسی ہی باتیں بنا بنا کر ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا تھا یہاں تک کہ آخر کار ہمارے عذاب کا مزا انہوں نے چکھ لیا۔ ان سے کہو "کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو۔" پھر کہو (تمہاری اس حجت کے

مقابلے میں) حقیقت رس حجت تو اللہ کے پاس ہے' بے شک اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔

افکار اسلامی کی تاریخ میں مسئلہ جبر و قدر پر طویل مباحث رہے ہیں۔ اہل سنت اور معتزلہ اور مرجیئہ اس میں باہم دست و گریباں رہے ہیں۔ یونانی فلسفہ اور یونانی منطق جب عالم اسلام میں آئی تو اس نے بھی ان مباحث کو متاثر کیا۔ پھر عیسائیوں کے فلسفہ لاہوت نے بھی اثرات ڈالے۔ اور اس کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا کہ یہ اسلام کے واضح اور حقیقت پسندانہ تصور کے لئے ناقابل فہم بن گیا۔ اگر اس مسئلے پر قرآن کے سنجیدہ' حقیقت پسندانہ اور ڈائرکٹ انداز میں غور کیا جاتا تو یہ جدل و جدال نہ ہوتا اور یہ بحث وہ رخ اختیار نہ کرتی جو اس نے اختیار کیا۔

جب ہم مشرکین کے قول کو پڑھتے ہیں اور اس کو قرآن کریم نے جس سادہ اور واضح انداز میں رد کیا اسے دیکھتے ہیں تو یہ بہت ہی سادہ اور قابل فہم نظر آتا ہے۔

(سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ(٦:١٤٨)) یہ مشرک لوگ (تمہاری ان باتوں کے جواب میں) ضرور کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا' اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔

ان کا مقصد یہ تھا کہ انہوں نے جو شرک کیا' ان کے آبا نے جو شرک کیا یا انہوں نے از خود جن چیزوں کو حرام قرار دیا اللہ نے انہیں حرام قرار دیا تھا' اور ان کا یہ دعویٰ کرنا کہ یہ اللہ کی جانب سے مقرر کردہ شریعت ہے اور بلا دلیل یہ دعویٰ کرنا کہ یہ سب امور اللہ کی مشیت کے مطابق چل رہے ہیں۔ اگر اللہ نہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔ اور نہ ان چیزوں کو حرام قرار دیتے۔ یہ سب بیکار باتیں ہیں۔

اب دیکھئے کہ قرآن کریم ان کے اس فلسفے کی تردید کس طرح کرتا ہے۔ قرآن کریم صرف یہ کہتا ہے کہ یہ لوگ بعینہٖ اسی طرح جھوٹ بول رہے ہیں جس طرح ان سے پہلے لوگوں نے جھوٹ بولا۔ اور اس سے پہلے جن لوگوں نے جھوٹ بولا انہوں نے تو اپنے جھوٹ کا مزہ چکھ لیا ہے اور اب یہ نئے مکذبین آگئے ہیں اور اللہ کا عذاب ان کے انتظار اور استقبال میں ہے۔

(كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا(٦:١٤٨)) ایسی ہی باتیں بنا بنا کر ان سے پہلے لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا تھا یہاں تک کہ آخر کار ہمارے عذاب کا مزا انہوں نے چکھ لیا۔" یہ وہ تنبیہ ہے جو سوچنے والے کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ غافل سے غافل انسان بھی ہوش میں آجاتا ہے اور انجام کو سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اب ایک دوسری تنبیہ ہے جس کے ذریعے ان کی فکری اصلاح مطلوب ہے۔ یہ کہ اللہ نے کچھ احکامات و اوامر دیئے ہیں اور بعض چیزوں سے منع کیا ہے اور انہیں حرام قرار دیا ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں وہ یقینی اور ناقابل شک علم حاصل کر سکتے ہیں۔ رہی اللہ کی مشیت اور اس کا نظام تو وہ ایک پوشیدہ نظام ہے اور اس کی اصل حقیقت تک پہنچنا انسان کی قوت مدرکہ کے لئے کوئی آسان کام نہیں ہے۔ وہ کس طرح جان سکتے ہیں کہ اللہ کی مشیت

کیا ہے ۔ اور جب انسان اللہ کے نظام قضا و قدر کا ادراک ہی نہیں کر سکتا تو وہ کسی کے فعل کو کس طرح نظام قضا و قدر کی طرف منسوب کر سکتا ہے۔

(قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ (۶:۱۴۸)) ان سے کہو "کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو۔" اللہ نے جو احکام دیئے یا اس کی جانب سے جو منہیات ہیں' وہ معلوم ہیں اور ان کے بارے میں قطعی علم ہمارے پاس قرآن میں موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ ان قطعی معلومات کو چھوڑ کر محض ظن و تخمین کے سراب کے پیچھے کیوں دوڑتے ہیں اور اس وادی میں کیوں قدم رکھتے ہیں جس کے نشیب و فراز سے وہ واقف نہیں ہیں۔

میں سمجھتا ہوں مسئلہ جبر و قدر میں یہ ایک فیصلہ کن بات ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس بات کا مکلف نہیں بناتا کہ وہ اللہ کے نظام قضا و قدر کا علم حاصل کریں اور اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالیں۔ اللہ کی جانب سے لوگوں پر صرف یہ فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے اوامر اور منہیات کا علم حاصل کریں اور اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالیں۔ جب وہ اس سلسلے میں سعی شروع کریں گے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اللہ انہیں راہ ہدایت پر ڈال دیں گے اور ان کے دل اسلام کے لئے کھل جائیں گے۔ مسئلہ قضا و قدر میں یہ ایک حقیقت پسندانہ اور عملی سوچ ہے اور انسان کے مسائل کے حل کے لئے کافی ہے' یہ آسان بھی ہے' واضح بھی ہے اور اس میں کوئی بحث و مباحثہ اور جدل و جدال نہیں ہے۔ نہ تحکم اور سینہ زوری ہے۔

اگر اللہ چاہتا تو آغاز ہی سے انسان کو اس طرح پیدا کرتا کہ وہ ہدایت کی راہ کے سوا کسی دوسری راہ پر چل ہی نہ سکتا یا اللہ انہیں مجبور کر دیتا کہ وہ ہدایت اختیار کریں یا اللہ ان کے دلوں میں از خود ہدایت ڈال دیتا اور ان پر ہدایت کے لئے جبری ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی لیکن اللہ جل شانہ یہ نہیں چاہتے تھے۔ اللہ کی مشیت یہ تھی کہ آدم کو قدرت و اختیار دے کر اسے آزمائے اور یہ اختیار اس قدر ہو کہ وہ ہدایت و ضلالت میں سے جس راہ کو چاہے اختیار کرے۔ انسان جب کسی راہ کا آزادانہ ارادہ کرے تو اللہ پھر اس کی مدد کرے' ہدایت کی طرف یا ضلالت کی طرف' یعنی جو ضلالت کی طرف اشارہ کرے اس کے لئے وہ راہ بھی آسان ہو۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے مطابق اس کی سنت جاری رہتی ہے۔

(قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۶:۱۴۹)) پھر کہو (تمہاری اس حجت کے مقابلے میں) حقیقت رس حجت تو اللہ کے پاس ہے' بے شک اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔" اب یہ مشکل مسئلہ واضح ہو جاتا ہے اور قرآن اسے اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ ہر انسان اسے بسہولت سمجھ سکتا ہے۔ رہی وہ علمی کشتیاں جو اس مسئلے پر ہوتی رہیں اور وہ طویل جدل و جدال جو ہماری تاریخ کا حصہ ہے تو وہ اسلامی احساس اور اسلامی منہاج کے ساتھ لگا نہیں کھاتا۔ نہ صرف یہ کہ اسلامی سوچ اسے قبول نہیں کرتی بلکہ یونانی فلسفے اور عیسائیوں کے ہاں لاہوتی مباحث بھی آج تک کسی نتیجے تک نہیں پہنچ پائے۔ اس لئے کہ یہ مباحث جس انداز سے چلے

وہ اس مسئلے کے مزاج کے خلاف تھا۔

ہر حقیقت کی جو نوعیت ہوتی ہے اس کے مطابق ہی اسے لیا جاتا ہے اور اس پر بحث کے لئے اس کے حسب حال اسلوب اپنایا جاتا ہے۔ جہاں تک مادی حقائق کا تعلق ہے ان کو بذریعہ تجربہ معلوم کیا جاسکتا ہے اور ریاضی حقائق کو ذہنی معروضات کے ذریعے معلوم کیا جاتا ہے لیکن جو حقائق مادی دنیا سے ورأ ہیں ان کا اپنا منہاج بحث ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر کہا کہ یہ حقائق عملی نوعیت رکھتے ہیں اور انہیں عملی انداز میں اور حقیقت پسندانہ منہاج بحث کے ساتھ لینا چاہئے۔ ان کو محض ذہنی مفروضوں کے انداز میں نہیں لینا چاہیے جس طرح ان کو پہلے بھی لیا گیا اور آج بھی لیا جارہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام اس دنیا میں اس لئے آیا تھا کہ یہاں ایک عملی صورت حالات پیدا کر دے۔ وہ احکام اور منہیات پر مشتمل ہے اور یہ احکام اور منہیات واضح ہیں۔ ان کے بارے میں نامعلوم مشیت الٰہیہ کو زیر بحث لانے کا مقصد یہ ہوگا کہ ہم کسی بے کنار صحرا میں بلا دلیل پڑ جائیں اور اپنی قوتوں کو لاحاصل جدل و جدال اور بادیہ پیمائی میں صرف کر دیں۔

---OOO---

اب اللہ تعالیٰ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کرتے ہیں کہ آپ اس قانون سازی میں اللہ کو بطور گواہ پیش فرمائیں۔ اس طرح جس طرح اس سے پہلے حضور کو ہدایت ہوئی تھی کہ آپ اللہ کے اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت کے مسئلے میں بھی اللہ کی ذات کو بطور شہادت پیش فرمائیں۔ اس سورہ کے آغاز میں یہ فرمایا گیا تھا۔

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَھَادَةً قُلِ اللّٰہُ شَھِیْدٌ بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْ بَلَغَ اَئِنَّکُمْ لَتَشْھَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِھَةً اُخْرٰی قُلْ لَّآ اَشْھَدُ قُلْ اِنَّمَا ھُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ (۶:۱۹) ”ان سے پوچھو، کس کی شہادت بڑھ کر ہے؟ کہو میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے، اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے سب کو متنبہ کر دوں۔ کیا واقعی تم یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں؟ کہو میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں دے سکتا۔ کہو خدا تو وہی ایک ہے اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔ اور یہاں اللہ نے یوں فرمایا!

قُلْ ھَلُمَّ شُھَدَآءَکُمُ الَّذِیْنَ یَشْھَدُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ ھٰذَا ۚ فَاِنْ شَھِدُوْا فَلَا تَشْھَدْ مَعَھُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَھُمْ بِرَبِّھِمْ یَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

"ان سے کہو "لاؤ اپنے وہ گواہ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ ہی نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے -" پھر اگر وہ شہادت دے دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دینا اور ہرگز ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے' اور جو آخرت کے منکر ہیں اور جو دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں -"

یہ ایک عظیم مقابلہ ہے' اور یہ بھی فیصلہ کن اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام کا مزاج کیا ہے؟ دین اسلام میں اللہ کی ذات میں کسی اور کو شریک ٹھہرانا شرک ہے - اسی طرح اللہ کے حق حاکیت اور قانون سازی میں کسی اور کو عملاً شریک کرنا بھی شرک ہے جو عملی شرک ہے - الا یہ کہ کوئی ایسا قانون بنائے جس کی قرآن و سنت نے اجازت دی ہو - قانون سازی میں اگر کوئی زبانی طور پر یہ اعلان کر دے کہ یہ قانون از جانب اللہ ہے تو اس کا دعویٰ مسترد ہو گا الا یہ کہ درحقیقت وہ منجانب اللہ ہو - یہاں اللہ تعالیٰ اس قسم کے لوگوں کو جو خود قانون بناتے ہیں یا کوئی قانون بنا کر اسے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں' اللہ جھوٹا قرار دیتا ہے اور یہ اعلان بھی کر دیا جاتا ہے کہ ایسے لوگوں کے دل میں نہ خوف آخرت ہے اور نہ ایمان آخرت اس لئے کہ یہ لوگ اگر منکر آخرت نہ ہوتے تو اللہ کے ساتھ دوسروں کو ہمسر بنانے کی جرأت ہی نہ کرتے - نہ کسی کو اللہ کا شریک ٹھہراتے - ایسی ہی تعبیر اس سورہ کے آغاز میں بھی آئی تھی -

(اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ (٦: ١)) "تعریف ہے اللہ کے لئے جس نے زمین و آسمان بنائے' روشنیاں اور تاریکیاں پیدا کیں - پھر بھی وہ لوگ جنہوں نے دعوت حق کو ماننے سے انکار کر دیا دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھہرا رہے ہیں -" یہ ہے حکم ان لوگوں کے بارے میں جو اللہ سے اس کا حق حاکیت چھینتے ہیں اور اسے ان لوگوں کے سپرد کرتے ہیں جو خود ان ہی کی طرح انسان ہیں - یہاں ان لوگوں کے اس دعویٰ کو بھی مسترد کر دیا جاتا ہے کہ ایسی کوئی قانون سازی اسلامی قانون سازی ہو سکتی ہے - اب اللہ کے اس حکم کے بعد کسی اور انسانی رائے کی کیا وقعت ہو سکتی ہے -

اگر ہم یہ بات سمجھنا چاہیں کہ اللہ نے اس مسئلے کا فیصلہ اس انداز میں کیوں کیا؟ اور ایسے لوگوں کو آیات الٰہیہ کو جھٹلانے والا کیوں کہا - ان کے بارے میں یہ فیصلہ کیوں دے دیا کہ وہ آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور یہ کہ وہ مشرک ہیں اور اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو ہمسر بنانے والے ہیں' تو ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم سمجھنے کی سعی ضرور کریں کیونکہ اللہ کی شریعت' اس کے احکام اور فیصلوں پر تدبر کرنا اور ان کی حکمت معلوم کرنا ایک مطلوبہ امر ہے -

اللہ نے ان لوگوں کے بارے میں جو اپنی جانب سے عوام کے لئے قانون بنائیں یہاں یہ حکم لگایا ہے کہ وہ آیات الٰہیہ کی تکذیب کرتے ہیں اگرچہ وہ اسے اللہ کی شریعت کا عنوان دیں' کیونکہ آیات الٰہیہ سے یہاں دو مفہوم لئے جا سکتے ہیں - ایک یہ کہ ان سے مراد آیات کونیہ ہیں' تو یہ آیات بھی اس بات پر گواہ ہیں کہ خالق اور رازق اللہ وحدہ ہے' اور جو خالق اور رازق ہو گا وہی مالک ہو گا لہٰذا وہی متصرف اور حاکم ہو گا - اس لئے جو شخص صرف اللہ کو حاکم نہ سمجھے تو وہ گویا آیات الٰہیہ کونیہ کی تکذیب کرتا ہے اور اگر ان آیات سے مراد قرآنی آیات ہوں تو قرآن کی بے شمار آیات واضح اور دو ٹوک انداز میں یہ قرار دیتی ہیں کہ حاکیت اور قانون سازی کے معاملے میں اللہ وحدہ لاشریک ہے - صرف اللہ کی شریعت ہی کو قانونی درجہ حاصل ہے - اور لوگوں کو صرف اللہ کی شریعت کی پابندی کرنی اور کرانی چاہیے -

ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ نے بھی یہ قرار دیا ہے کہ یہ لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے اس لئے کہ جو شخص آخرت پر یقین و ایمان رکھتا ہے کہ وہ ایک دن قیامت کے روز اپنے رب کو ملنے والا ہے تو ایسا شخص ہرگز اللہ کے حق حاکمیت پر دست درازی نہیں کرے گا اور نہ وہ اپنے لئے کسی ایسے حق کا مطالبہ کرے گا۔ اللہ انسانوں کا حاکم مطلق ہے اس کا نظام قضا و قدر بھی انسان پر جاری ہے اور اس طرح اس کی شریعت بھی ان پر جاری ہونا چاہیے۔

ان لوگوں کے بارے میں اللہ کی تیسری قرار داد یہ ہے کہ یہ لوگ دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں۔ یعنی وہ اسی طرح شرک ہیں جس طرح بت پرست مشرک ہیں۔ اگر یہ اہل توحید میں سے ہوتے تو وہ دوسروں کو اللہ کا ہمسر نہ بناتے نہ اس کے حق حاکمیت میں اور نہ اس کے حق الوہیت میں کیونکہ وہ ان میں منفرد ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا ان حقوق کو استعمال کر رہا ہو تو اس کی مخالفت کرتے اور ہرگز اس پر راضی نہ ہوتے۔

جیسا کہ معلوم ہوتا ہے' یہ بات ان تمام احکام کی علت ہے کہ جو لوگ قرآن و سنت کے بالمقابل قانون سازی کرتے ہیں ان کے اس فعل کی وجہ سے اللہ نے ان پر یہ احکام صادر کئے کہ وہ مشرک ہیں' اللہ کی آیات کو جھٹلانے والے ہیں اور یہ کہ دراصل وہ آخرت کی جوابدہی پر یقین نہیں رکھتے کہ ایک دن انہوں نے اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ یہ ہے علت اور اس کے نتیجے میں یہ ہے حکم۔ رہا یہ کہ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ کا یہ حکم کیوں ہے تو یہ تو نص قطعی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور اس کے مطابق تو ایسے لوگ مشرک ہی سمجھے جائیں گے۔ تو اب یہ ہر مسلمان کے سوچنے کی بات ہے کہ وہ اس سلسلے میں کیا طرز عمل اختیار کرتا ہے۔

اس شہادت اور گواہی کے بعد اور ان کی جانب سے قرار دادہ محرمات کو رد کر دینے کے بعد اب وہ فہرست دی جاتی ہے کہ فی الواقعہ اللہ نے کن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ یہاں محرمات کے ذکر کے ساتھ ساتھ بعض مثبت احکام کی یاد دہانی بھی کی گئی ہے جس کے مخالف طرز عمل کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ ان محرمات کا آغاز ارتکاب شرک سے ہوتا ہے کیونکہ یہ اسلام کا اصول اولیں ہے اور سب سے پہلے اس کو ذہن نشین کرانا ضروری ہے۔ شرک سے مراد عام ہے۔ شرک فی الاعتقاد اور شرک فی الحکم۔ یہاں شرک سے دونوں قسم کے شرک مراد ہیں۔ اس بنیادی اصول کے بعد تمام اوامر اور نواہی اسی پر مرتب ہوتے ہیں یعنی اسلام قبول کر لے اور پھر سر تسلیم خم کر دے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ
شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ
نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ ۚ
وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ

حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا
اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ
اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ
مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ
وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

"اے نبی" ان سے کہو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں : یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو ' اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو ' ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے ' اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ ' خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی ' اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ - یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو - اور مال یتیم کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو ' یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے - اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو ' ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے - اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو - ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم نصیحت قبول کرو - نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے - یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم کج روی سے بچو -

اللہ تعالیٰ نے آیات کے اس حصے میں جو وصیتیں فرمائی ہیں اور جو قوانین بتلائے ہیں مثلاً مویشیوں اور پیداوار کے متعلق اور اوہام جاہلیت اور رسوم جاہلیت کی تردید وغیرہ تو ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوانین و ہدایات اس دین کی اساسی باتوں پر مشتمل ہیں - ان کی وجہ سے انسان کے ضمیر کو توحید کی روشنی اور زندگی ملتی ہے اور صدیوں پر مشتمل تاریخ میں انسانی خاندان کو تقویت ملتی ہے - باہم تکافل اور باہم نصرت کی وجہ سے اجتماعی روابط مضبوط ہوتے ہیں اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جس میں حقوق کی ضمانت ہوتی ہے اور فرائض ادا کئے جاتے ہیں - یہ سب کام اللہ کی ہدایات کے مطابق چلتے ہیں مگر ان کا آغاز عقیدہ توحید سے ہوتا ہے -

اور جب یہ ہدایات ختم ہوتی ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہی اللہ کا جاری کردہ صراط مستقیم ہے اور اس کے علاوہ جس قدر بھی راستے ہیں وہ ٹیڑھے راستے ہیں یعنی راہ توحید سے ہٹے ہوئے -

غرض ان تین آیات میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ نہایت ہی اہم امور سے متعلق ہیں - یہ امور اس مسئلے کے بعد

ذکر ہوئے جو بظاہر جاہلیت کا جزوی مسئلہ معلوم ہوتا ہے لیکن یہ مسئلہ اس دین کا نہایت ہی اساسی مسئلہ ہے کیونکہ یہ ان اہم وصیتوں کے ساتھ مربوط ہے۔

(قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ (٦: ١٥١)) اے نبی "ان سے کہو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں۔"

آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ اللہ نے کیا حرام کیا ہے؟ تم خود جن بعض چیزوں کو حرام قرار دیتے وہ دراصل حرام نہیں ہیں۔ اس نے تم پر بعض چیزیں حرام قرار دی ہیں اس لئے کہ اسے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے کہ وہی تمہارا رب ہے۔ رب کا مفہوم ہے' قیم' مربی' ہادی اور حاکم۔ لہذا حلال و حرام مقرر کرنا اس کا کام ہے۔ یہ اس کا مقام اور منصب ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اگر اللہ کے سوا کوئی اور حلال و حرام مقرر کرے گا تو وہی رب کہلائے گا۔ فی الحقیقت رب ہوتا ہی وہ ہے جو حلال و حرام مقرر کرے۔

(اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا (٦: ١٥١)) یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔" یہ وہ بنیادی اصول ہے جس پر اسلامی تصور حیات کی پوری عمارت اٹھائی گئی ہے۔ تمام واجبات و فرائض اسی کی جانب لوٹتے ہیں اور اسی سے حقوق و واجبات متعین ہوتے ہیں۔ یہ وہ اصول ہے کہ اس کے تسلیم کرنے کے بعد ہی کسی پر دوسرے احکام اور منہیات فرض ہوتے ہیں۔ فرائض و تکالیف اور اسلامی نظام کی تفصیلات اور اسلامی دستور و قوانین کی پیروی کی تب عائد ہوتی ہے جب کوئی انسان یا معاشرہ عقیدہ توحید کو قبول کر کے اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اللہ وحدہ اس کا رب ہے اور وہی الٰہ اور حاکم ہے۔ اس کی الوہیت' اس کے اقتدار اعلیٰ اور اس کی ربوبیت میں وہ کسی کو شریک نہیں سمجھتا۔ وہ اعتراف کر لیتا ہے کہ اللہ ہی اس پوری کائنات کے تمام طبیعی امور میں متصرف ہے۔ عالم اسباب اور نظام تضا و قدر اسی کی مرضی سے چلتا ہے۔ وہ یہ عقیدہ بھی اپنا لیتے ہیں کہ آخرت میں انہوں نے اپنی پوری زندگی کی کارکردگی کا جواب دینا ہے۔ وہ یہ بھی اعتراف کر لیتے ہیں کہ نظام حکومت میں بھی وہ اللہ کے احکام کے پابند ہیں۔ غرض انسانی دل و دماغ کے لئے یہ عقیدہ ایک مکمل تطہیر ہے اور انسانی فکر اور عقلیت کو وہم و گمان کی بیماریوں سے مکمل طور پر صاف کر دیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے ہی کسی معاشرے کو جاہلیت کی آلودگیوں سے پاک کیا جا سکتا ہے اور انسان انسانوں کی غلامی اور بندگی سے رہا ہو سکتا ہے۔

شرک اپنی ہر شکل و صورت کے اعتبار سے حرام ہے اس لئے کہ اس کی وجہ سے انسان ہر حرام چیز میں پڑ سکتا ہے۔ یہ پہلا منکر ہے جس کے خلاف جہاد کا آغاز ہوتا ہے اور اس کے ہر پہلو کا انکار ضروری ہے۔ یہاں تک کہ لوگ اعتراف کر لیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اللہ کے سوا کوئی رب نہیں' اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے' اللہ کے سوا کوئی قانون ساز نہیں ہے اور پھر لوگ اس بات کا اعتراف بھی کر لیں کہ وہ ان معاملات میں صرف اللہ کے سوا کسی طرف رجوع نہ کریں گے۔

توحید اپنے تمام معانی کے ساتھ' اسلام کا وہ اساسی اصول ہے کہ جسے کسی صورت میں بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ نہ اسلام میں توحید کی کمی کو پورا کیا جا سکتا ہے' نہ یہ کمی عبادت سے پر کی جا سکتی ہے' نہ حسن اخلاق سے اور نہ فضائل اعمال سے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں جو وصیتیں کی جا رہی ہیں ان کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے

(اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا (۶ : ۱۵۱)) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔" ہمیں چاہیے کہ یہاں ایک نظر ان آیات پر ڈالیں جو ان وصیتوں سے پہلے وارد ہوئی ہیں تاکہ ہمیں اس شرک کے تعین میں دشواری نہ ہو' جس سے یہاں منع کیا گیا ہے۔ ان وصیتوں سے پہلے ایک متعین موضوع پر بحث تھی۔ وہ موضوع تھا حق قانون سازی' اقتدار اعلیٰ کا استعمال اور احکام و نواہی کا صدور۔ ایک آیت قبل ہی یہ کہا گیا:

(قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ (۶ : ۱۵۰)) "ان سے کہو" لاؤ اپنے وہ گواہ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ ہی نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے۔" پھر اگر وہ شہادت دے دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دینا اور ہرگز ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے' اور جو آخرت کے منکر ہیں اور جو دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں۔"

ہم اس لگاتار یاددہانی کے اس لئے محتاج ہیں کہ اسلامی تاریخ میں شیاطین نے دین اسلام کی اساسی اصطلاحات کے معانی اور مفاہیم کو بدلنے کی جو جدوجہد کی ہے' اس کے آثار اب ظاہر ہو رہے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں حاکمیت کے مسئلے کو اسلام کے بنیادی عقیدے کے مفہوم سے نکال دیا گیا ہے اور اس کو اسلامی فکر کا شعور اور احساس ہی نہیں رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جو لوگ اسلام کے نہایت ہی مخلص اور پرجوش حامی ہیں وہ ایک پرستش کے شعار' عبادات کے طریقے اور ایک اخلاقی قدر کے قیام اور قوانین کی معمولی خلاف ورزی کے جزوی مسائل پر تو بات کرتے ہیں مگر اصل مسئلہ یعنی اقتدار اعلیٰ اور اس کے نظریاتی مقام پر بات نہیں کرتے۔ وہ منکرات کے خلاف تو مہم چلاتے ہیں لیکن وہ اس عظیم منکر کے خلاف نہیں اٹھتے یعنی یہ کہ زندگی کو عقیدۂ توحید کی اساس پر قائم کرنے کے لئے نہیں اٹھتے' ایسا نظام قائم کرنے کے لئے سعی نہیں کرتے جس میں حاکمیت صرف اللہ کی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ تمام دوسری وصیتوں سے پہلے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو یہ وصیت کی کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور یہ وصیت ایسے سیاق میں کی جا رہی ہے کہ شرک کا مفہوم ان تمام وصیتوں کے اصول کی روشنی میں متعین ہوتا ہے۔

توحید اور نفی شرک وہ اصول ہے جس کی اساس پر ایک انسان علی وجہ البصیرت اپنے رب کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے اور جماعت مسلمہ کے افراد بھی باہم ان اصولوں کی اساس پر جڑ جاتے ہیں جو عقیدۂ توحید اور نفی شرک کے نتیجے میں متعین ہوتے ہیں اور وہ اقدار ان لوگوں کے درمیان قدر مشترک بن جاتی ہیں جو عقیدۂ توحید کے بعد وجود میں آتی ہیں۔

اور یہ اصول و اقدار اس قدر مستحکم ہوتے ہیں کہ جن کو خواہشات نفسانیہ اور جذبات سفلیہ کے طوفان اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے اور نہ ان پر ان اصطلاحات کا اثر ہوتا ہے جو انسان نے اپنی خواہشات اور میلانات کے تحت وضع کر رکھی ہیں۔

(وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶ : ۱۵۱)) اور والدین

کے ساتھ نیک سلوک کرو، اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔" صدیوں سے یہ خاندانی نظام قائم ہے اور اللہ نے یہ نظام عقیدۂ توحید کی اساس پر قائم کیا ہے۔ اللہ لوگوں پر والدین اور اولاد سے بھی زیادہ رحیم وکریم ہے اس لئے اللہ نے اولاد کو والدین کے بارے میں حسن سلوک کی وصیت فرمائی اور والدین کو ان کی اولاد کے بارے میں وصیت فرمائی۔ اس وصیت کی پشت پر وہ نظریاتی رابطہ ہے جو اللہ کی حاکمیت اور ربوبیت کی صورت میں قائم ہے۔ اللہ نے ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ وہی خالق ہے اور وہی رازق ہے۔ لہٰذا تم والدین کے بارے میں ان کی کبر سنی کے دور میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرو، اور اولاد جب ضعیف و ناتواں ہو تو تم ان کے بارے میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرو اور فقر اور مجبوری سے نہ ڈرو کیونکہ اللہ تعالیٰ سب کا رازق ہے۔

(وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (٦: ١٥١)) اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی۔" اللہ تعالیٰ نے سابقہ فقرے میں وصیت فرمائی کہ خاندانی نظام کو مضبوط بناؤ تو اس کے بعد حکم دیا گیا کہ خاندان اور معاشرے کو پاک و صاف رکھو کیونکہ معاشرہ بھی خاندانوں سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ معاشرے کی اخلاقی تطہیر کا خیال رکھو۔ اسلام معاشرے میں فحاشی کو برداشت نہیں کرتا، چاہے یہ فحاشی ظاہری ہو یا پوشیدہ، لہٰذا اس وصیت اور سابقہ وصیت کے درمیان گہرا ربط ہے۔

یہ حکم اس لئے دیا گیا کہ فحاشی کے کیچڑ میں کوئی پاکیزہ خاندان اور پاکیزہ معاشرہ پروان نہیں چڑھ سکتا۔ فحاشی ظاہری ہو یا خفیہ اور باطنی ہو اس لئے کہ اسلام عفت اور پاکیزگی کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ جو طبقات بھی فحاشی پھیلاتے ہیں ان کا مقصد دراصل یہ ہوتا ہے کہ خاندانی نظام اور معاشرہ کمزور ہو جائیں، ان کی بنیادیں ہل جائیں اور آخر کار وہ معاشرہ دم توڑ دے۔

فواحش کیا ہوتے ہیں؟ ہر وہ بات فواحش میں آتی ہے جو حد سے متجاوز ہو۔ لفظ فحش بعض اوقات خصوصاً صرف زنا پر بھی بولا جاتا ہے۔ اس آیت میں بھی غالب گمان یہ ہے کہ اس لفظ سے زنا مراد ہے۔ کیونکہ یہاں اللہ تعالیٰ ان حرام امور کا ذکر فرمارہے ہیں جن کا ارتکاب ممنوع ہے خواہ کم ہو یا زیادہ، لہٰذا یہاں مراد زنا ہوگا۔ ورنہ قتل نفس بھی فاحشہ ہے اور مال یتیم کھانا بھی فاحشہ ہے۔ اور اللہ کے ساتھ شرک بھی فاحشہ ہے۔ لہٰذا یہاں لفظ فاحشہ سے مراد مخصوص طور پر زنا ہوگا اور زنا کے لئے "فواحش" یعنی جمع کا لفظ اس لئے استعمال ہوا ہے کہ زنا کے ساتھ اور مقدمات اور لوازم بھی لازماً ہوتے ہیں جو سب کے سب فواحش ہیں مثلاً نمائش حسن، بے پردگی، اختلاط، الفاظ و مکالمات، حرکات و اشارات، ہنسی اور مذاق، میک اپ اور لوگوں کو آمادہ کرنا، یہ سب افعال فواحش میں آتے ہیں۔ ان میں سے بعض خفیہ ہیں اور بعض ظاہری ہیں۔ بعض دل میں ہوتے ہیں اور بعض اعضاء سے ہوتے ہیں۔ یہ تمام فواحش کسی بھی معاشرے کے لئے سم قاتل ہوتے ہیں اور کسی سوسائٹی کا اجتماعی وجود ان کے ذریعے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ افراد معاشرہ کے دل گندے ہوتے ہیں اور ان کی ترجیحات حقیر ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کے بعد یہ وصیت ذکر ہوئی۔

زنا کے ساتھ متعلق فواحش چونکہ اپنے اندر جاذبیت رکھتے ہیں، اس لئے حکم دیا گیا کہ ان کے قریب مت جاؤ، تاکہ اس برائی میں مبتلا ہونے کے ذرائع ہی بند ہو جائیں اور دور رہنے کی وجہ سے ان فواحش کی کشش کے اثرات کم ہو

جائیں - اور وہ انسان کی قوت ارادی پر غالب نہ آ جائیں - یہی وجہ ہے کہ اسلام نے یہ بات حرام قرار دی ہے کہ اگر کسی عورت پر ایک دفعہ نظر پڑ جائے تو دوسری بار اسے دیکھنے کی کوشش نہ کی جائے اور مرد و زن کے درمیان اختلاط کو بھی ممنوع کیا گیا اور جاہلانہ آرائش و زیبائش کو ممنوع کیا گیا ہے - یہاں تک کہ عطر لگا کر باہر نکلنے سے بھی منع کیا گیا ہے - اسی طرح تمام ایسی حرکات ہنسی مذاق اور اشارات کو اسلام کے پاک معاشرے میں منع کیا گیا ہے - اسلام لوگوں کو ایسی مشکل صورت حال سے دوچار نہیں کرتا کہ اس میں انہیں اپنے اعصاب کے اوپر کنٹرول نہ رہے اور وہ ترغیبات کا مقابلہ نہ کر سکیں - اسلام ایک ایسا دین ہے جو حدود نافذ کرنے اور سزائیں دینے سے پہلے ہی لوگوں کو بچاتا بھی ہے - اسلام لوگوں کے ضمیر، شعور، حواس اور اعضاء تک کو بچانے کی سعی کرتا ہے اس لئے کہ رب تعالیٰ اپنی مخلوق کی کمزوریوں سے خوب واقف ہے - وہ لطیف و خبیر ہے -

ہم اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو لوگ دوسروں کے لئے عیاشیاں پیدا کرتے ہیں، ان کے سفلی جذبات کو آزاد کرتے ہیں، اور اس مقصد کے لیے تصاویر، فلمیں، افسانے، میلے اور دوسرے تمام ذرائع فراہم کرتے ہیں وہ دین اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کیا ارادے رکھتے ہیں -

(وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ (۶ : ۱۵۱)) "اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ -" قرآن کریم میں ان تین منکرات کا ذکر بارہا ایک جگہ آیا ہے - یعنی شرک زنا اور قتل نفس کا ذکر بارہا ایک ساتھ کیا گیا ہے اس لئے کہ یہ تمام جرائم دراصل قتل کے جرائم ہیں - پہلا جرم شرک دراصل فطرت کا قتل ہے - دوسرا جرم معاشرے کا قتل ہے، اور تیسرا جرم نفس انسانی کا قتل ہے - اس لئے کہ جو فطرت توحید پر قائم نہیں ہے وہ دراصل مردہ فطرت ہے اور جس سوسائٹی میں فحاشی پھیل گئی ہے وہ سوسائٹی بھی مردہ سوسائٹی ہے اور اس نے آخر کار ہلاک و برباد ہونا ہے - یونانی تہذیب، رومی تہذیب اور فارسی تہذیب کی تباہی اسی بیماری یعنی فحاشی کی بیماری کی وجہ سے وقوع پذیر ہوئی - یہ تاریخی تباہیاں بتاتی ہیں کہ کسی تہذیب کی بربادی اور ہلاکت کی پہلی علامت فحاشی ہوتی ہے - آج مغربی تہذیب کے اندر جس تیزی سے فحاشی پھیلی ہے، ماہرین اب انتظار کر رہے ہیں کہ کب اس پر ہمہ گیر تباہی آتی ہے - اسی طرح وہ معاشرہ جس میں امن و امان نہ ہو وہ بھی لازماً اپنے انجام تک پہنچتا ہے - یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ان جرائم کے لئے سخت سزائیں مقرر کی ہیں کیونکہ اسلام اپنے معاشرے کو ہمہ گیر تباہی سے بچانا چاہتا ہے -

اس سے پہلے یہ بات آ گئی ہے کہ اپنی اولاد کو بھوک و افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو، یہاں مطلق نفس کے قتل کی ممانعت کی گئی ہے - یہاں اشارہ یہ مطلوب ہے کہ ایک فرد کے خلاف بھی اگر جرم قتل کا ارتکاب کیا جائے تو یہ جرم پورے معاشرے کے خلاف جرم تصور ہو گا - دوسری جگہ اس کی تصریح یوں کی گئی ہے -

(أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا

وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا (۵ : ۳۲)) جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی

بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخشی۔"

اس لئے کہ ارتکاب قتل کا وقوع زندگی پر ہوتا ہے اور زندگی نفس بشر میں ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس اصول کے تحت نفس انسانی کی بقا کی ضمانت دی ہے تاکہ دارالاسلام میں جماعت مسلمہ کے تمام افراد کو امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع ملے اور اسلامی معاشرے کا ہر فرد بڑی آزادی کے ساتھ ترقی کی جدوجہد میں حصہ لے سکے۔ اور اسے ماسوائے حق کے کسی اور وجہ سے نہ ستایا جائے۔ وہ سچائی جس کی اساس پر کسی کو ستایا جا سکتا ہے وہ اسلامی شریعت میں بیان کر دی گئی ہے اور اس بارے میں کسی تاویل یا اندازے کی اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں اس کی تفصیلات نہیں دی گئیں اس لئے کہ یہ کام مدینہ میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد کیا جانا تھا تاکہ وہاں اسلامی شریعت کے نفاذ کے لئے ایک حکومت بھی موجود ہو۔ اس نکتے کی بڑی اہمیت ہے' اور اس سے اسلامی نظام اور دین اسلام کے عملی مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ اسلامی نظام کی نشوونما اور اس کی حرکیت میں عملیت ایک اہم پہلو ہے کہ ان اساسی اصولوں کی تفصیلات بھی نہیں دی گئیں کیونکہ ابھی ان کے نفاذ کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ یہ اصول و قواعد اور اوامر و نواہی اللہ کی جانب سے ایک وصیت ہے اور اس پر تمہیں عمل کرنا ہے۔

(ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (٦ : ١٥١)) یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔" اس قسم کی تعقیبات قرآن کریم کے ہر حکم' ہر امر و نہی کے بعد آتی ہیں اور یہ قرآن کا خاص اسلوب ہے جس کے ذریعے وہ قانونی امور کو بھی اللہ کی ذات سے وابستہ کر دیتا ہے اور یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ امر و نہی کے صدور اور قانون سازی کا کام صرف اللہ وحدہ کے اختیار میں ہے۔ یوں اسلامی نظام مملکت میں قانون کے لئے بے حد احترام پایا جاتا ہے۔

اس بات میں ایک یہ اشارہ بھی ہے کہ یہی بات قابل فہم ہے۔ اس لئے کہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی حکومت کی اطاعت کی جائے' جیسا کہ اوپر کہا گیا۔ اسلامی تصور یہ ہے کہ اللہ خالق' رازق اور متصرف فی الکون ہے لہٰذا لوگوں کی زندگی میں تصرفات بھی اللہ کے چلنے چاہئیں۔

اس تعقیب اور وصیت سے پہلے جو آیت ہے اس میں پائے جانے والے احکام باہم متناسب ہیں اور بعد کی آنے والی آیت میں پائے جانے والے امور بھی باہم ہم رنگ ہیں اور درمیان میں یہ تبصرہ ہے۔

(وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ (٦ : ١٥٢)) اور یہ کہ مال یتیم کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو' یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے۔" کسی سوسائٹی میں یتیم ایک کمزور شخصیت ہوتی ہے' اس کا حامی اور مربی کوئی نہیں ہوتا اور اس کے سر پر والدین کا سایہ نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی ذمہ داری اسلامی سوسائٹی پر ڈال دی گئی ہے کیونکہ سوشل سیکورٹی اسلامی نظام کی اساس ہے۔ دور جاہلیت میں یتیم ہمیشہ کسمپرسی کی حالت میں ہوتے تھے۔ یتیم کے بارے میں قرآن کریم بار بار ہدایات دیتا ہے اور مختلف پہلوؤں سے اس مسئلے کو لیا گیا ہے۔ اس سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دور جاہلیت میں یتامیٰ کی بے حد حق تلفی ہوا کرتی

تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبری کے لئے بھی ایک یتیم شخص کا انتخاب کیا اور اسے یہ عظیم اعزاز بخشا کہ اسے تمام جہان والوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا پھر فرمایا کہ ان کا خیال اس طرح رکھا جائے کہ ان کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے۔"

حکم یہ ہے کہ یتیم کے متولی اور گارڈین کو یتیم کے مال میں صرف اتنا تصرف کرنا ہے جو اس کے لئے احسن ہو۔ اس کا فرض ہو گا کہ وہ اسے بچائے اور اسے ترقی دے۔ جب وہ سن رشد تک پہنچ جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے پورا پورا دے دے اور ترقی یافتہ شکل میں دے۔ سن رشد اس وقت حاصل ہوتا ہے کہ جب یتیم کی جسمانی اور عقلی قوت کمال کو پہنچ جائے، اس طرح کہ وہ مال کو بچا بھی سکے اور اس کی حفاظت بھی کر سکے اور اسے ترقی بھی دے سکے۔ اور وہ جب سوسائٹی میں ایک مختار شخص کی صورت میں آئے تو وہ اس کا ایک صحت مند فرد ہو اور سوسائٹی کے لئے مفید ہو۔

سن رشد اور بلوغ کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلافات ہیں۔ عبدالرحمٰن ابن زید اور امام مالک کے نزدیک عقلی بلوغ ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک پندرہ سال کی عمر ہے۔ سدی تیس سال کی عمر مقرر کرتے ہیں اور اہل مدینہ بلوغ اور عقلمندی دونوں کے حصول کے بعد سن رشد مانتے ہیں اور کسی عمر کی تحدید نہیں کرتے۔

(وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ لَانُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (٦:١٥٢)) اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو، ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے۔"

یہ حکم تجارتی معاملات کے بارے میں ہے کہ تجارتی معاملات میں حتی المقدور کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔ ان احکام کو اسلامی عقائد و نظریات سے وابستہ کیا گیا ہے حالانکہ یہ محض تجارتی معاملات ہیں۔ یہ اس لئے کہ اسلامی نظام میں تمام معاملات دین و ایمان سے وابستہ ہیں اور ان کے بارے میں جو احکام ہیں وہ منجانب اللہ ہیں۔ اس طرح یہ احکام اللہ اور اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے مسئلہ سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان احکام کو ایک ایسے منظر میں لایا جاتا ہے جس میں اسلامی نظریہ حیات کا ربط زندگی کے تمام معاملات میں عیاں کیا گیا ہے۔

تمام جاہلی نظاموں میں جس میں دور جدید کی جاہلیت بھی شامل ہے، طریقہ یہ رہا ہے کہ عقائد و عبادات سے قانون اور معاملات کو بالکل علیحدہ رکھا جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے حضرت شعیب علیہ السلام کے قصے میں اچھی طرح واضح کیا ہے۔

(قَالُوا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (١١:٨٦)) انہوں نے جواب دیا: اے شعیب کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشا کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟" یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں باہم مالی اور تجارتی معاملات، بیع و شرا کے مسائل اور اسلامی نظریہ حیات کے نظریاتی پہلوؤں کو ایک ساتھ لایا جاتا ہے تاکہ یہ بتایا جا سکے کہ اس دین کا مزاج کیا ہے؟ اور اس میں عقائد و قانون کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ عبادت اور معاملات دونوں میں اللہ کی بندگی ضروری ہے کیونکہ یہ

سب امور دین ہی کا حصہ ہیں اور اس کے اصل الاصول سے مربوط ہیں۔

(وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (٦ : ١٥٢)) اور جب بات کہو انصاف کی کہو، خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو۔" سب سے پہلے اسلام قلب مومن کا رابطہ اللہ کے ساتھ قائم کرتا ہے اور اس طرح انسان کو نہایت ہی بلند مقام تک پہنچاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لائے اور ہروقت اس سے ڈرتا رہے۔ اس راستے میں کئی ایسے مقامات آتے ہیں جہاں قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ انسانی کمزوری اثر کر جاتی ہے اور انسان قرابت، رشتہ داری اور قرابت کے حقوق کا لحاظ کر جاتا ہے۔ کیونکہ انسان نہایت ہی کمزور، ضعیف ہے اور دور اندیش نہیں ہے اور رشتہ داری کی قوت اس سے کمزوری کا ارتکاب کراتی ہے۔ رشتہ داری کے ماحول میں وہ پروان چڑھتا ہے۔ اس ماحول میں وہ زندہ رہتا ہے اور جب وہ رشتہ دار کے مقابلے میں شہادت کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اس سے کمزوری کا ارتکاب ہوتا ہے۔ اگر بھائی کے لئے شہادت دے تو مبالغہ ہو گا اور اگر خلاف دے تو کمی کرے گا یا بھائی اور دوسرے شخص کے درمیان فیصلہ کرے تو جانب داری کرے گا۔ اس خطرناک مقام پر اسلام ہی مدد کو آتا ہے۔ وہ انسانی ضمیر کو ہدایت دیتا ہے کہ وہ کلمہ حق کہے اور انصاف کرے۔ اور صرف اللہ وحدہ پر بھروسہ کرے۔ صرف اس سے ڈرے اور بھائی کی دوستی و دشمنی کے معاملے صرف اللہ کی نصرت طلب کرے۔ اللہ سے ڈرے اور یہ نہ کرے کہ رشتہ داری کا حق ادا کرتے ہوئے اللہ کے حقوق کو تلف کر دے۔ اللہ انسان کا خالق ہے اور اس کی شہ رگ سے زیادہ اس کے قریب ہے۔ چنانچہ اللہ یہاں اپنی وصیتوں کے بعد اپنے ساتھ کئے ہوئے عہد کو یاد دلاتے ہیں۔

(وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا (٦ : ١٥٢)) "اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔" اللہ کے عہد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سچ کہو اگرچہ اس کی زد تمہارے کسی قرابت دار پر پڑتی ہو۔ اس کے عہد میں سے یہ بھی ہے کہ ناپ اور تول کے پیمانے پورے رکھو۔ اس کے عہد میں سے یہ بھی ہے کہ یتیم کے مال میں اس طرح تصرف کرو کہ وہ اس کے لئے احسن ہو۔ اس کے عہد میں یہ امر بھی داخل ہے کہ بے گناہ جان کا احترام کرو، اور ان سب عہدوں سے بڑا عہد یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ الوہیت اور حاکمیت میں کسی کو شریک نہ کرو، اور یہ عہد عہد اکبر ہے۔ یہی انسانی فطرت کا تقاضا ہے، اس لئے کہ مخلوق کو خالق کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے اور اسے ان نوامیس قدرت کا شعور ہونا چاہیے جو انسان کے اندر اور اس کے اردگرد کائنات میں جاری و ساری ہیں۔ اور آخر میں وہی تبصرہ۔

(ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (٦ : ١٥٢)) ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم نصیحت قبول کرو۔" ذکر کا مفہوم غفلت کے بالمقابل ہے۔ لہٰذا یاد رکھنے والا دل غافل دل کے متضاد ہو گا اور ذاکر وہ ہو گا جو اللہ کے عہد کو یاد رکھے اور ان عہود کے بارے میں اللہ کی وصیتوں کا خیال رکھے اور ان کو کسی حالت میں نہ بھولے۔

یہ اصول جن کا آغاز عقیدۂ توحید کے ساتھ ہوا، جس میں اسلامی عقائد اور اسلامی قانون اور اسلام کے اجتماعی نظام کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں اور جن سے پہلے کے سبق میں اللہ کے اقتدار اعلیٰ اور اس کے حق حاکمیت کے مضامین

تھے' جس میں حق قانون سازی نمایاں ہے' یہ سب اصول اللہ کا صراط مستقیم ہیں - یہ وہ راستہ ہے جس کے مقابلے میں دوسرے تمام راستے غلط' دشوار گزار ہیں' یہی مستقیم راستہ ہے -

(وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِه ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِه لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۶:۱۵۳)) "نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹاکر تمہیں پراگندہ کر دیں گے - یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم کج روی سے بچو -" یہ سبق یہاں ختم ہوتا ہے جس کا آغاز اس آیت سے ہوا تھا :

(اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ اِلَیْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا) کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو حکم تلاش کرو' حالانکہ وہی ہے جس نے تمہاری طرف کتاب مفصل طور پر نازل کر دی ہے -" اور اس طویل سبق کا خاتمہ اس فقرے سے ہوا - اس آغاز اور انجام اور درمیان میں مسئلہ حاکمیت الٰہیہ' مسئلہ قانون سازی' پھلوں اور مویشیوں کی حلت و حرمت' ذبحوں اور نذروں کے مسائل اور دوسرے اساسی اور اصولی مسائل تھے - یہ مسائل اس آغاز و انجام کے درمیان بیان ہوئے - مقصد یہ بتانا تھا کہ یہ ہے وہ وسیع دائرہ جس کے اندر یہ سب چیزیں آتی ہیں اور ان سب کا تعلق ان عقائد اور نظریات کے ساتھ ہے جو اس سورہ کا اساسی مضمون ہے جس کا اہم نکتہ یہ ہے کہ اللہ حاکم و معبود ہے اور اس معاملے میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے -

یہ واحد راستہ ہی اللہ کا راستہ ہے اور اس راہ سے ہم اللہ تک پہنچ سکتے ہیں - وہ یہ ہے کہ لوگ اللہ وحدہ کو رب تسلیم کریں' اسی کی عبادت کریں' اسی کی اطاعت کریں' صرف اسی کو اپنا حاکم و قانون ساز تسلیم کریں اور پوری زندگی اسی کے رنگ میں رنگ دیں -

یہی راہ ہے جو اللہ کی راہ ہے - اس کے سوا جس قدر بھی راستے ہیں وہ اللہ کی راہ سے جدا ہو جاتے ہیں اور وہ راستے کسی انجام تک نہیں پہنچتے - اللہ نے تمہیں اسی راستے پر چلنے کی ہدایت فرمائی ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ - لہذا معلوم ہوا کہ تقویٰ کا مدار صحیح عقیدے اور صحیح عمل پر ہے - یہ تقویٰ ہی ہے جو انسان کو اللہ کے راستے کی طرف لے جاتا ہے -

---OOO---

# درس نمبر ۷۱ ایک نظر میں

اس سورہ کے اس آخری حصے میں جو موضوع درس سابق میں تھا وہی ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی طرح آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ کہ اللہ ہی حاکم اور قانون ساز ہے اور یہ بات اسلام کے اساسی عقائد و نظریات کا حصہ ہے۔ یہ سبق بھی اسی موضوع کا حصہ ہے اور اس میں کچھ مزید پہلو سامنے آتے ہیں تاکہ یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

اس سورہ کے آغاز میں دین اسلام کے اساسی نظریات اور عقائد موضوع بحث ہیں اور آخری حصے میں یہ موضوع آیا تھا کہ اسلام کے اساسی نظریات میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اللہ وحدہ حاکم اور قانون ساز ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اللہ کا اقتدار جس کا ظہور قانون سازی کی صورت میں ہوتا ہے اس دین کے اساسی قضایا میں سے ہے اور اسی طریقے اور اسی سطح پر قرآن اسے رکھتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن کریم اس دوسرے مسئلے پر وہی دلائل و براہین پیش کرتا ہے جو اس نے اس سورہ کے حصہ اول میں عقائد و نظریات کے بارے میں پیش کئے۔

- یہاں بھی رسولوں 'کتابوں' وحی اور معجزات کی بات ہے۔
- یہاں بھی اس بات کا ذکر ہے کہ اگر معجزات پیش ہوئے اور مان کر نہ دیئے گئے تو پھر اللہ کا عذاب لازماً آئے گا۔
- مناظر قیامت اور حساب و کتاب۔
- یہ کہ رسول اور اس کی قوم کے درمیان کوئی تعلق و رابطہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ قوم رسول کے نظریات کو رد کر کے متفرق ارباب کے تابع ہوگئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اپنے نظریات کو واضح ' دوٹوک اور فیصلہ کن انداز میں پیش کریں۔
- یہ کہ دو جہانوں کا رب اور حاکم صرف اللہ ہے اور اس کے سوا کوئی اور رب تلاش نہ کرو۔
- اللہ تمام مخلوقات کا رب اور خالق ہے اور انسانوں کو اس جہان میں اسی رب نے بسایا اور بٹھایا ہے اور وہ اس بات پر قادر ہے کہ موجودہ لوگوں کو بے دخل کر کے کسی اور مخلوق کو یہاں لا بٹھائے۔

یہ ہیں وہ مسائل جو اس سبق میں لیے گئے ہیں جبکہ یہی مسائل سورہ کے آغاز اور اس کے پہلے حصے میں موضوع بحث تھے۔ لیکن وہاں نظریاتی پہلو نمایاں تھا اور یہاں مسئلہ حاکمیت اور قانون سازی عیاں ہے۔ یہ قرآن کریم کا ایک خاص اسلوب اور انداز ہے اور اسے صرف وہی شخص جان سکتا ہے جو قرآن کے اسلوب کلام سے واقف ہو اور اس کی ممارست رکھتا ہو۔

اس سبق کے آغاز میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کی بات ہے اور سابقہ بات کا تکملہ ہے جس میں کہا گیا تھا کہ یہی صراط مستقیم ہے۔ کہ یہی ہمارا سیدھا راستہ ہے 'اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے۔" یہاں کتاب موسیٰ کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ یہ راستہ ایک طویل شاہراہ ہے جس پر انسانی تاریخ کے

تمام انبیاء چلتے رہے ہیں۔ تمام رسولوں کی شریعتیں اسی راہ کی کڑیاں ہیں اور ان میں سے قریب ترین شریعت، شریعت موسوی ہے۔ اللہ نے حضرت موسیٰ کو بھی ایک کتاب دی تھی جس میں ہر چیز کی تفصیلات تھیں اور یہ شریعت ان کی امت کے لئے ہدایت و رحمت تھی۔ صرف ان لوگوں کے لئے جو خوف آخرت اور قیام قیامت پر یقین رکھتے تھے۔

(ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ (۶:۱۵۴)) پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی تھی، جو بھلائی کی روش اختیار کرنے والے انسان پر نعمت کی تکمیل اور ہر ضروری چیز کی تفصیل اور سراسر ہدایت اور رحمت تھی۔ شاید کہ لوگ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لے آئیں۔"

پھر دوبارہ کتاب جدید، قرآن کا ذکر آتا ہے، جو کتاب موسیٰ کی صف میں ہے اور اس میں بھی نظریہ حیات اور نظام زندگی موجود ہے۔ اس کا اتباع ضروری ہے تاکہ لوگوں کی دنیا اور آخرت دونوں سدھر جائیں۔

(وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۶:۱۵۵)) اور اسی طرح یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے۔ ایک برکت والی کتاب، پس تم اس کی پیروی کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو، بعید نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے۔" قرآن کریم عربوں پر بطور حجت نازل ہوا ہے، تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم پر ایسی کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی ہے جس طرح یہود و نصاریٰ پر کتابیں نازل ہوئی۔ اگر ہم پر کوئی ایسی کتاب نازل ہوتی جس طرح ان پر نازل ہوئی ہے تو ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے ....... چنانچہ عربوں پر حجت تمام کرنے کے لئے کہا گیا، لیجئے یہ ہے کتاب جو تم پر نازل کی گئی۔ اور اس کے بعد بھی اگر وہ اس کتاب کو جھٹلاتے ہیں تو وہ دردناک عذاب کے مستحق ہوں گے۔

(اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ (۶:۱۵۷)) "اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتاب تو ہم سے پہلے دو گروہوں کو دی گئی تھی اور ہم کو کوئی خبر نہیں کہ وہ کیا پڑھتے پڑھاتے تھے۔ اب تم یہ بہانہ بھی نہیں کر سکتے کہ اگر ہم پر کتاب نازل کی گئی ہوتی تو ہم ان سے زیادہ راست رو ثابت ہوتے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن اور ہدایت و رحمت (قرآن کی صورت میں) آگئی ہے۔ اب اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا، جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے اور ان سے منہ موڑے۔ جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑتے ہیں انہیں اس روگردانی کی پاداش میں ہم بدترین سزا دے کر رہیں گے۔"

یقیناً قرآن کے نزول سے عربوں پر حجت تمام ہوگئی لیکن وہ اب بھی شرک کر رہے ہیں۔ وہ اب بھی خود قانون

بناتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ خدائی شریعت ہے حالانکہ خدا کی کتاب آگئی ہے۔ اس میں وہ باتیں نہیں ہیں جو وہ ازخود گھڑتے ہیں اور ماننے کے بجائے وہ مزید خوارق عادت معجزات طلب کرتے ہیں تاکہ وہ کتاب کی تصدیق کریں اور پھر اس پر عمل کریں۔ لیکن یہ سمجھتے نہیں کہ اگر کوئی خارق عادت معجزہ آجائے یا بعض حصہ اس کا آجائے تو پھر یہ آخری فیصلے کا وقت ہو گا۔

(هَلْ يَنظُرُونَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ (۶:۱۵۸)) اب لوگ اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے سامنے فرشتے آکھڑے ہوں یا تمہارا رب خود آجائے' یا تمہارے رب کی بعض صریح نشانیاں نمودار ہو جائیں؟ جس روز تمہارے رب کی بعض مخصوص نشانیاں نمودار ہو جائیں گی پھر کسی ایسے شخص کو اس کا ایمان کچھ فائدہ نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو' یا جس نے اپنے ایمان میں کوئی بھلائی نہ کمائی ہو' اے نبی ؐ ان سے کہہ دو کہ اچھا تم انتظار کرو ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔"

یہاں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین اور ان تمام ادیان کے اندر فرق کر دیتے ہیں جو عقیدۂ توحید اور اس پر مبنی قانونی نظام پر قائم نہیں ہیں اور یہ کہ ان کا معاملہ اللہ کے ہاں ہے اور وہ اپنے نظام عدل اور رحمت کے مطابق ان کا فیصلہ کرے گا۔

(اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۱۵۹) مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۱۶۰)(۶:۱۵۹-۱۶۰)) "جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے یقیناً ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں ہے' ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے' وہی ان کو بتائے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے جو اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اس کے لئے دس گنا اجر ہے اور جو بدی لے کر آئے گا اس کو اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا جتنا اس نے قصور کیا اور کسی پر ظلم نہ کیا جائے گا۔"

اب اس سبق کی آخری ضرب آتی ہے اور اس پر اس سورہ کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ تسبیح کا آخری دانہ گرا' نہایت ہی تروتازگی' نہایت ہی نرمی کے ساتھ' نہایت حکیمانہ اور نہایت دوٹوک انداز میں۔ اس دین کے انتہائی گہرے حقائق کا خلاصہ پیش کر دیا جاتا ہے یعنی بے قید اور ہمہ جہت توحید' خالص بندگی اور اطاعت' سنجیدگی کے ساتھ آخرت کا اقرار و جوابدہی کا تصور۔ دنیا میں ہر شخص کے لئے اپنے اور صرف اپنے اعمال کی جوابدہی۔ ہر چیز میں نظام ربوبیت کا مشاہدہ' اور یہ کہ یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ اپنی اس سرزمین پر اقتدار کی کنجیاں کس کے حوالے کرتا ہے۔ اللہ کے اس اختیار

میں اس کے ساتھ نہ کوئی شریک ہے اور نہ ہی اس سے کوئی باز پرس کرنے کا مجاز ہے۔ اس آخری حصے میں مقام الوہیت کو تفصیل سے واضح کیا جاتا ہے۔ نہایت ہی مخلص 'پاک و صاف دل یعنی قلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ربانی تجلیات پھوٹتی ہیں اور انداز تعبیر قرآنی ہے جو کسی بھی مفہوم کی تصویر کشی میں لاثانی ہے۔

(قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰنِیْ رَبِّیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (۱٦۱) قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱٦۲) لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (۱٦۳) قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (۱٦٤) وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۱٦٥) (٦:۱٦۱ تا ۱٦٥))

"اے نبی ؐ! کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے' بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں' ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ جسے یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو میری نماز' میرے تمام مراسم عبودیت' میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔ کہو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے؟ ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے' کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا' پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ اس وقت وہ تمہارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلہ میں زیادہ بلند درجے دیئے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے' اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔"

---ooo---

# درس نمبر ۷۱ تشریح آیات

## ۱۵۴--- تا --- ۱۶۵

ثُمَّ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ تَمَامًا عَلَی الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ وَ تَفۡصِیۡلًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ وَّ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃً لَّعَلَّہُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّہِمۡ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۵۴﴾

”پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی تھی جو بھلائی کی روش اختیار کرنے والے انسان پر نعمت کی تکمیل اور ہر ضروری چیز کی تفصیل اور سراسر ہدایت و رحمت تھی ۔ (اور اس لئے بنی اسرائیل کو دی گئی تھی کہ) شاید لوگ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لائیں ۔“

یہ کلام لفظ ثم کے ذریعہ کلام ماقبل پر عطف ہے ۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ پہلے یہ آیت آئی تھی ۔

(قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمۡ عَلَیۡکُمۡ اَلَّا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا (۶ : ۱۵۱)) جہاں یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ تمہارا حرام کردہ حرام نہیں بلکہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام کیا ۔ پھر کہا ( وَاَنَّ ہٰذَا صِرَاطِیۡ مُسۡتَقِیۡمًا (۶ : ۱۵۳)) کہ یہی میرا سیدھا راستہ اور دین ہے ۔ اس جملے کا عطف پہلے پر ہوا تھا ۔ یعنی (اَلَّا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ) پر ۔ اس کے بعد یہ آیت آئی (ثُمَّ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ (۶ : ۱۵۴)) جس کا عطف مذکورہ بالا دونوں جملوں پر ہوا ۔ اس طرح یہ پورا کلام مسلسل ایک دوسرے سے مربوط ہے ۔ (تَمَامًا عَلَی الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ (۶ : ۱۵۴)) کا مفہوم یہ ہے ' جیسا کہ ابن جریر نے لکھا ہے ”پھر ہم نے موسیٰ کو تورات دی اور یہ ان پر ہماری جانب سے تکمیل نعمت تھی ۔ ہماری جانب سے ان کے لئے اعزاز و شرف تھا اس وجہ سے کہ انہوں نے احسان کا رویہ اختیار کیا اور اپنے رب کی اطاعت کی ۔ رب کی جانب سے جو فرائض بھی عائد کئے گئے ہیں اس پر وہ عمل پیرا ہوئے اور اس کتاب میں وہ تمام امور درج ہیں جن کی حضرت موسیٰ کی قوم کو ضرورت تھی ۔

(وَتَفۡصِیۡلًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ (۶ : ۱۵۴)) ”قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد حلال و حرام ہیں ۔ (وَّہُدًی وَّرَحۡمَۃً ۶ : ۱۵۴)) کے معنی یہ ہیں کہ ان کی قوم ہدایت پائے اور آخرت کی جوابدہی پر ایمان لے آئے اور اس طرح اللہ کی رحمت کی مستحق ہو کر اللہ کے عذاب سے بچ جائے ۔

یہ تھے مقاصد جن کے لئے ہم نے حضرت موسیٰ کو کتاب دی تھی' انہی مقاصد کی خاطر اللہ نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم بھی ہدایت پاؤ اور پھر رحمت کے مستحق قرار پاؤ۔

---

وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾

"اور اسی طرح یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے۔ایک برکت والی کتاب ۔پس تم اس کی پیروی کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو' بعید نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے۔"

بے شک یہ ایک مبارک کتاب ہے اور اس کی تشریح ہم نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس آیت کی تفسیر میں کر دی ہے جہاں یہ لفظ پہلے آیا تھا :

(وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُصَدِّقُ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ

(٦ : ٩٢)) "یہ کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے' بڑی خیر و برکت والی ہے' اس چیز کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آئی تھی اور اس لئے نازل کی گئی ہے کہ اس کے ذریعے سے تم بستیوں کے اس مرکز اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو متنبہ کرو' جو لوگ آخرت کو مانتے ہیں' وہ اس کتاب کو مانتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔" یہاں لفظ مبارک اسلامی نظریہ حیات اور اس کی شمولیت اور ہمہ گیری کی بحث کے ضمن میں آیا ہے' یعنی یہ کتاب ایک شرعی نظام پر مشتمل ہے۔ حکم یہ دیا جا رہا ہے کہ تم اس شرعی نظام کی اطاعت کرو اور تم پر اللہ کی رحمت صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ تم اس کتاب کا اتباع کرو' کیونکہ یہاں کلام شرعی نظام کے بارے میں ہے جبکہ سورہ کے آغاز میں بات اسلامی عقائد و نظریات کی تھی۔

یعنی اب تمہارے لئے کوئی وجہ معذرت باقی نہیں ہے اور نہ کوئی حجت باقی ہے ۔یہ کتاب نازل ہو گئی اور اس نے تمام دلائل اور حجتوں کو منسوخ و باطل کر دیا ہے۔ اس کتاب میں زندگی کے تمام امور کی تفصیلات موجود ہیں۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں اس میں ہدایات موجود نہ ہوں کہ تم خود اپنے لئے قانون بنانے کے لئے محتاج رہ جاؤ۔

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ

هُدًى وَّ رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ؕ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

"اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتاب تو ہم سے پہلے کے دو گروہوں کو دی گئی تھی' اور ہم کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کیا پڑھتے پڑھاتے تھے۔ اور اب تم یہ بہانہ بھی نہیں کر سکتے کہ اگر ہم پر کتاب نازل کی گئی ہوتی تو ہم ان سے زیادہ راست رو ثابت ہوتے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن اور ہدایت اور رحمت آگئی ہے' اب اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے اور ان سے منہ موڑے۔ جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑتے ہیں انہیں اس روگردانی کی پاداش میں ہم بدترین سزا دے کر رہیں گے۔"

اللہ تعالیٰ کی اسکیم یہ تھی کہ ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان میں پیغام دے کر بھیجا گیا اور جب آخری رسالت دنیا میں آئی تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اقوام عالم کی طرف بھیجا گیا۔ لہٰذا حضور ؐ تمام انسانوں کے لئے آخری رسول ہیں' کیونکہ ان کو تمام انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا ہے۔

عربوں پر اللہ نے حجت اس طرح تمام کر دی کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اپنی قوموں کی طرف بھیجے گئے اور عرب کہتے تھے کہ ہم ان کی کتابوں کو نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ہم عالم نہ تھے' نہ ہم تک اس دعوت کو پہنچانے کا کوئی اہتمام کیا گیا۔ اگر ہمارے پاس ہماری زبان میں کوئی کتاب آئی ہوتی تو ہم ضرور ایمان لاتے اور ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ چنانچہ ان کے پاس یہ کتاب آگئی اور رسول بھی آگئے' بلکہ یہ رسول تمام جہان والوں کے لئے آگئے۔ اس رسول کو ایسی کتاب دی گئی جو خود اپنی سچائی کی دلیل ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ پھر اس کتاب میں جو حقائق بیان ہوئے ان میں کوئی التباس یا پیچیدگی نہیں ہے۔ لوگ جس گمراہی میں ڈوبے ہوئے ہیں ان کے لئے چراغ روشن ہے اور جن مصیبتوں میں وہ مبتلا ہیں ان کے مقابلے میں رحمت ہے' دنیا کے لئے بھی اور آخرت کے لئے بھی۔

اگر صورت حال یہ ہے تو پھر اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو ایسی کتاب کی آیات کی تکذیب کرتا ہو یا ان سے منہ موڑتا ہو حالانکہ یہ کتاب صحیح راہ' اصلاح حال اور دنیا و آخرت کی فلاح کی طرف بلاتی ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو اور عوام الناس کو اس کتاب کی برکتوں سے محروم کرتا ہے' اس سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے۔ وہی شخص ظالم ہے جو جاہلی تصورات اور خلاف اسلام قانون بنا کر اس زمین پر فساد پھیلاتا ہے۔ جو لوگ اس کتاب سے روگردانی کرتے ہیں درحقیقت ان کے مزاج میں فساد پوشیدہ ہے جو انہیں اس چشمہ خیر سے دور رکھتا ہے۔ مثلاً اونٹ کے پاؤں میں جب نقص ہو یا بیماری ہو تو وہ ایک طرف جھکتا ہے اور سیدھا نہیں چلتا۔ (صَدَفَ کا یہی مفہوم ہے) یعنی یہ لوگ سچائی سے ایک طرف چلے جاتے ہیں جس طرح ایک بیمار اونٹ ایک طرف جھکا ہوا ہوتا ہے اور سیدھا نہیں چل سکتا۔ اپنے اس میلان کی وجہ سے وہ برے عذاب کے مستحق ہوں گے۔

(سَنَجْزِی الَّذِیْنَ یَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰیٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا کَانُوْا یَصْدِفُوْنَ (٦ : ١٥٧))
"جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑتے ہیں' انہیں اس روگردانی کی پاداش میں ہم بدترین سزا دے کر رہیں گے۔"
قرآنی انداز بیان کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ عربی زبان کے ایک ایک لفظ کو حسی مفہوم سے بلند کر کے معنوی مدلول کے لئے استعمال کرتا ہے' لیکن یہ استعمال معنوی مفہوم پر اس طرح منطبق ہوتا ہے کہ اصل حسی مفہوم بھی اپنی جگہ درست نظر آتا ہے۔ اسی طرح (یَصْدِفُوْنَ) کا استعمال ہوا ہے۔ (صَدَفَ) کے معنی یہ ہیں کہ اونٹ اپنے پاؤں کی بیماری کی وجہ سے ایک طرف جھک کر چلے۔ اس کی دوسری مثال ہے (اَلصَّعَرْ) صعر عربی زبان میں ایک ایسی بیماری کو کہا جاتا ہے جس میں اونٹ کا منہ ایک طرف ٹیڑھا ہو جاتا ہے اور گردن سیدھی نہیں ہو سکتی۔ یہ بیماری انسانوں کو بھی لاحق ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اسے بطور تکبر منہ ٹیڑھا کرنے کے لئے استعمال کیا (وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ (٣١ : ١٨)) منہ کو ٹیڑھا نہ کرو' تکبر نہ کرو' اس کی تیسری مثال خبط کی ہے۔ خبط کے معنی ہیں کسی جانور کا زہریلی گھاس کھا کر پھول جانا۔ خطبت النافۃ اس وقت بولتے ہیں جب اونٹنی زہریلی گھاس چر کر پھول جائے۔ قرآن نے یہ لفظ بے مقصد اور بغیر ایمان کے اعمال کے لئے استعمال کیا ہے۔ جس میں بظاہر اعمال بڑے نظر آئیں۔ اس قسم کے استعمال کی بے شمار مثالیں قرآن میں ہیں۔

اب بات ذرا آگے بڑھتی ہے اور اس کتاب کے آجانے کے بعد اب یہ لوگ مزید خوارق عادت واقعات اور معجزات طلب کرتے ہیں تاکہ وہ اسے تسلیم کرلیں۔ اس قسم کی تہدید سورہ کے آغاز میں بھی تھی جہاں اسلامی نظریہ توحید اور عقائد کو تسلیم نہ کرنے پر تہدید دی گئی تھی اور یہاں یہ تہدید اسلامی نظام حیات اور اسلامی شریعت کو تسلیم نہ کرنے کی مناسبت سے دوبارہ دہرائی گئی ہے۔ ابتداء میں یہ کہا گیا تھا :

(وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ (٦ : ٨)) "کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ اگر کہیں ہم نے فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ پھر انہیں کوئی مہلت نہ دی جاتی۔ یہاں اسی مضمون کو دہرایا گیا :

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ۭ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ١٥٨

"کیا اب لوگ اس کے منتظر ہیں کہ ان کے سامنے فرشتے آکھڑے ہوں' یا تمہارا رب خود آجائے' یا تمہارے رب کی بعض صریح نشانیاں نمودار ہو جائیں؟ جس روز تمہارے رب کی بعض مخصوص نشانیاں نمودار ہو جائیں گی پھر کسی ایسے

شخص کو اس کا ایمان کچھ فائدہ نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو یا جس نے اپنے ایمان میں کوئی بھلائی نہ کمائی ہو۔ اے نبی ؐ ان سے کہہ دو کہ اچھا' تم انتظار کرو' ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔"

یہ ایک دو ٹوک اور واضح تہدید ہے' کیونکہ یہ اللہ کی ناقابل تبدیل سنت ہے کہ جب کوئی معجزہ آتا ہے اور لوگ پھر بھی تکذیب کرتے ہیں تو انہیں ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جن خوارق عادت واقعات کا مطالبہ کرتے ہیں اگر ان میں سے کوئی واقعہ لایا جاتا تو ان کا فیصلہ کب کا ہو چکا ہوتا کیونکہ جب اس قسم کا کوئی معجزہ آتا ہے تو مدت عمل اور مہلت ختم ہو جاتی ہے اور پھر ایمان و عمل مفید نہیں ہوتے۔ جو لوگ پہلے سے مومن اور اسلامی نظام پر عمل پیرا نہ تھے ان کے لئے پھر کوئی وقت نہیں ہوتا۔ قرآن کریم میں ایمان کے ساتھ عمل کا ذکر ہمیشہ کیا جاتا ہے' کیونکہ اسلامی پیمانے کے مطابق وہی ایمان مقبول ہے جو عمل کے ساتھ ہو۔ متعدد روایات میں آتا ہے کہ اس آیت (يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيٰتِ رَبِّكَ (٦: ١٥٨)) سے علامات قیامت مراد ہیں کیونکہ علامات قیامت آنے کے بعد پھر ایمان و عمل مفید نہیں رہتے اور بعض روایات میں اشراط الساعہ کو گنوایا بھی گیا ہے۔ لیکن اس آیت کی تفسیر اس مفہوم میں زیادہ بہتر ہے کہ اس سے مراد اس دنیا میں اللہ کی سنت جاریہ ہے۔ اس کی مثال اسی سورہ کے آغاز میں موجود ہے۔

(وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ (٦: ٨)) "کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ اگر کہیں ہم نے فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ پھر انہیں کوئی مہلت نہ دی جاتی۔" یہ بات ذہن میں رہے کہ آغاز سورہ میں یہی باتیں ایمان لانے اور اسلامی نظریات قبول کرنے کے موضوع پر کہی گئی تھیں اور یہاں یہی باتیں اسلامی نظام کے نفاذ اور شریعت کے اجراء کے موضوع پر کہی جا رہی ہیں۔ یہ نہایت ہی اہم اور یاد رکھنے کے قابل بات ہے تاکہ اسلامی شریعت اور اللہ کی حاکمیت کے قیام کی حقیقت ذہن میں رہے۔ جس طرح آغاز سورہ کی یہ بات سنت جاریہ پر محمول ہے' اسی طرح یہاں بھی اس کی تاویل اشراط قیامت کے مقابلے میں سنت جاریہ کے ساتھ مناسب ہے۔ یہ مناسب تاویل و تفسیر ہوگی اور یہاں اسے قیامت پر محمول کرنے کی ضرورت نہ ہوگی جس کے وقوع کا علم عالم الغیب کو ہے۔

---ooo---

اب بات کا رخ رسول اللہ کی طرف مڑ جاتا ہے کہ آپ کی شریعت اور آپ کی ملت دنیا میں تمام قائم ملتوں سے علیحدہ ہے۔ تمام فرقے اور مذاہب جن میں مشرکین مکہ کا مذہب بھی شامل ہے' سب باطل ہیں اور آپ کے دین و شریعت سے متضاد ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۭ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿١٥٩﴾

"جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے یقیناً ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں ' ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے ' وہی ان کو بتائے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے -"

یہاں آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین ' آپ کی شریعت اور نظام حیات کے بارے میں یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ دنیا میں قائم تمام ادیان ' تمام نظام ہائے قانونی کا آپ کے دین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے - نہ آپ کا تعلق مشرکین عرب سے ہے جنہیں اوہام جاہلیت ' جاہلی اعتقادات اور عادات و رسومات نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور وہ باہم جنگ و جدال میں مصروف ہیں 'گروہ ' فرقے اور شاخ در شاخ بٹے ہوئے ہیں - نہ آپ کے دین و نظام کا تعلق اہل کتاب اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ ہے جن کو مذہبی اختلافات نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور ان کے اندر کئی کئی فرقے اور گروہ بن گئے ہیں اور نہ آپ کا تعلق آئندہ آنے والے فرقوں اور مسلکوں سے ہو گا جو قیامت تک وجود میں آتے رہیں گے -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان فرق و مذاہب سے کوئی تعلق نہیں ہے - آپ کا دین ' دین اسلام ہے اور آپ کی شریعت وہ ہے جو اس کتاب میں ہے - اور آپ کا لایا ہوا نظام ایک منفرد نظام ہے جو سب سے جدا ہے - اس دین کے تصورات اور اعتقادات دوسرے ادیان کے ساتھ خلط ملط نہیں ہو سکتے - نہ آپ کی شریعت دوسرے قانونی نظاموں اور رسومات کے ساتھ خلط ملط ہو سکتی ہے - کسی صورت حالات اور کسی نظام قانون پر بیک وقت اسلامی اور غیر اسلامی کا اطلاق نہیں ہو سکتا - اسلام فقط اسلام ہے اور اسلامی شریعت ہی اصل شریعت ہے - اسلام کا اپنا سیاسی ' اجتماعی ' اقتصادی نظام ہی اسلامی نظام ہے - اور قیامت تک رسول خدا اور ان کے لائے ہوئے نظام زندگی کا کوئی تعلق دوسرے لوگوں اور نظاموں سے نہیں ہو سکتا -

ان تمام ادیان اور تصورات کو جب کسی مسلم سے واسطہ پڑتا ہے تو اس کا پہلا ردعمل مکمل انکار اور جدائی اور قطع تعلق کا ہونا چاہئے - اسی طرح وہ تمام اجتماعی و سیاسی نظام جن میں اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت بالفاظ دیگر الوہیت و ربوبیت اللہ کی نہیں ہے ' ایک مسلمان کا پہلا فرض یہ ہے کہ سابقہ پیش آتے ہی انہیں رد کر دے اور ان سے اپنی برأت کا اعلان کر دے - نہ اسے ان نظاموں اور اسلام کے درمیان قدر مشترک ڈھونڈنا چاہئے اور نہ ان کے بارے میں موافقت اور مخالفت کی بحث میں شریک ہونا چاہئے -

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے اور جن لوگوں نے دین اسلام کو قبول نہیں کیا اور اسے اپنی زندگیوں پر جاری نہیں کیا ' ان لوگوں کے ساتھ رسول اللہ کا کوئی تعلق نہیں ہے -

اللہ کے نزدیک دین اسلام ایک سیاسی قانونی نظام ہے اور جو لوگ اسے نہیں اپناتے ان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی تعلق نہیں ہے - یہی حقیقت ہے اور اس پر کسی بحث و مباحثے کی گنجائش نہیں ہے اور نہ کسی قیل و قال کی ضرورت ہے -

جن لوگوں نے دوسرے نظامہائے زندگی کو عمداً اپنا رکھا ہے ان کا بھی رسول خدا سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ان کے بارے میں یہ فیصلہ اللہ نے کیا ہے اور قیامت میں بھی ان کے بارے میں فیصلہ اللہ کرے گا اور اللہ ہی ان سے حساب لینے والا ہے ' ان تمام امور کا جو وہ کرتے ہیں -

(اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (٦: ١٥٩)) "ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے وہی انہیں بتائے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے۔" ایسے لوگوں کے حساب و کتاب کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے حساب و کتاب میں اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ بندوں سے حساب لیتے وقت وہ رحیم و کریم ہو گا۔ اس لئے جو شخص مومن ہے اور وہ کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اسے دس گناہ اجر ملے گا۔ یاد رہے کہ اچھے کام کے لئے ایمان شرط ہے کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی کام اچھا نہیں ہو سکتا' ہاں اگر ایمان ہو تو اچھے کام کا بدلہ دس گنا ملے گا اور اگر برائی کی ہے تو صرف اس کے برابر کا بدلہ ہو گا۔ اللہ کسی پر کوئی ظلم نہیں کرتا۔

(مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (٦: ١٦٠)) "جو اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اس کے لئے دس گنا اجر ہے' اور جو بدی لے کر آئے گا اس کو اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا جتنا اس نے قصور کیا ہے اور کسی پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ اس سورہ کے خاتمے اور اسلام کے نظریہ حاکمیت اور قانون سازی پر اس طویل بحث کے خاتمے پر نہایت ہی تروتازہ عبارت' نہایت ہی نرم اور حسین الفاظ میں' نہایت ہی خوشگوار آواز میں' لیکن نہایت ہی دوٹوک اور فیصلہ کن انداز میں آتی ہے۔ بات کو اس طرح ختم کیا جاتا ہے کہ یہ مضمون دل کی گہرائیوں تک اتر جاتا ہے۔ ہر بات کو لفظ (قُلْ، قُلْ) اور (قُلْ) سے دہرایا جاتا ہے اور ہمہ جہت نظریہ توحید ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ رستے اور ملت کی وحدت' سمت اور حرکت کی وحدت' الٰہ اور رب کی وحدت' بندگی اور اطاعت کی وحدت' پوری کائنات اور اس کے اندر جاری و ساری نوامیس قدرت کی وحدت اور ان کے اندر پائے جانے والے عناصر ترکیبی کی وحدت۔

---

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ
فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾
قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۭ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ
نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ

فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿١٦٤﴾ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ
الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ
إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٦٥﴾ ۲۰ ۱۱ع

"جو اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اس کے لئے دس گنا اجر ہے' اور جو بدی لے کر آئے گا اس کو اتنا ہی بدلا دیا جائے گا جتنا اس نے قصور کیا ہے اور کسی پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ اے نبی ؐ 'کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے' بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں' ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ جسے یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو میری نماز' میرے تمام مراسم عبودیت' میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔ کہو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے؟ ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے' کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا' پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ اس وقت وہ تمہارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیئے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے' اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔"

یہ تعقیب اور خاتمہ کلام اس سورہ کے شروع کے مضامین کو مدنظر رکھتے ہوئے' ایک نہایت ہی خوبصورت زمزمہ ہے' نہایت موزوں اور خیرہ کن۔ اس زمزمے کے ساتھ ذبیحوں اور نذر و نیاز' پھلوں اور فصلوں سے نیاز' اور اس سلسلے میں جاہلیت کے اوہام و رسومات اور پھر یہ دعوے کہ یہ شریعت من جانب اللہ ہے' کا موضوع یہاں اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ یہ تعقیب اور آخری زمزمہ اس مضمون میں کیا اضافہ کرتا ہے؟ میں سمجھتا ہوں ان موضوعات پر ہم نے جو بات کی ہے اس کے بعد اس پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (٦: ١٦١)) "اے نبی ؐ 'کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے' بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں' ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ جسے یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔" یہ سپاس گزاری پر مشتمل اعلان ہے' جس سے یقین محکم اور بھرپور بھروسے کا اظہار ہوتا ہے۔ اس میں عبارت کی لفظی تعبیر اور اس کے حقیقی مفہوم کو سمو دیا گیا ہے۔ اس سے رب کے ساتھ ہدایت کا ربط' ربوبیت کا تعلق اور اس کی جانب سے مسلسل نگہبانی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس میں اس بات کا شکر ادا کیا گیا ہے کہ اس نے ہمیں صراط مستقیم کی طرف

ہدایت بخشی' جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے۔ وہ دین قیم ہے اور یہ دین ہماری قدیم میراث بھی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے یہی دین اسلام ہے' حضرت ابراہیم اس امت کے ابو الاباء ہیں اور اس وقت سے امت مسلمہ مبارک امت ہے۔ اس میں دو ٹوک اعلان ہے کہ حضرت ابراہیم مشرکین میں سے نہ تھے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (١٦٢) لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (١٦٣) (٦: ١٦٢-١٦٣) "کہو میری نماز' میرے تمام مراسم عبودیت' میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔" یہ توحید کا نغمہ ہے۔ مطلق توحید اور ہمہ گیر بندگی کا اظہار جس میں نماز' اعتکاف' زندگی اور موت سب امور اللہ کے لئے مختص کر دیئے گئے ہیں جو رب العالمین ہے۔ جو سنبھالنے والا وحدہ متصرف اور نگہبان ہے۔ مربی اور عالمین کا حاکم اور رب ہے۔ اس میں مکمل اسلام کا اعلان ہے نفس زندگی کے تمام امور بلکہ موت تک میں' ضمیر میں اور عمل میں سب میں مکمل اسلام۔ (وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ) میں یہ کہا گیا کہ یہ مکمل اسلام امر الہی ہے' محض رضاکارانہ فعل نہیں ہے۔ اس لئے سب سے پہلے مسلم حضور اکرم ؐ ہیں۔

(قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ

(٦: ١٦٤)) "کہو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے؟ ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے' کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا' پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ اس وقت وہ تمہارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔" یہ ایک لفظ ہے جو پوری کائنات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ زمین و آسمان اور مافیہا۔ وہ تمام مخلوق اس میں آتی ہے جو معلوم ہے یا نامعلوم ہے۔ ہر واقعہ اور ہر حادثہ اس میں آتا ہے جو ظاہری ہو یا باطنی۔ یہ سب اللہ کی ربوبیت کے سائے میں ہیں۔ اور یہ عظیم کائنات اللہ کی ربوبیت کے دائرے میں ہے۔ اس پر اللہ کی حاکمیت حاوی ہے اور یہ اس کی مطیع فرمان ہے۔ عقائد میں' عبادت میں اور قانونی نظام میں۔ (وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ) ذرا انداز کلام ملاحظہ' استفہام انکاری۔ کیا میں اللہ کے سوا کسی اور رب کو تلاش کروں؟ (وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ) یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ میں غیر اللہ کو رب تسلیم کروں' وہ میرا حاکم ہو' وہ میرے امور میں متصرف ہو' وہ مجھ پر نگہبان ہو' وہ میرا مصلح اور راہنما ہو' حالانکہ میری نیت اور عمل کے بارے میں مجھ سے باز پرس صرف اللہ کرے گا' صرف وہی ہے جو حساب لے گا' اطاعت کا اور معصیت کا۔ پس یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ میں غیر اللہ کو رب تسلیم کروں جبکہ یہ پوری کائنات اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے اور میں اور تم سب اس کے نظام ربوبیت کا حصہ ہیں۔

میں غیر اللہ کو کس طرح رب بنا سکتا ہوں' کیونکہ آخرت میں جب ہر شخص کو اس کے کئے ہوئے جرائم کی سزا ملے گی

تو یہ غیر کیا'۔ سکے گا' وہاں تو ہر شخص اپنے کیے کا خود ذمہ دار ہو گا اور کوئی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھا سکے گا۔

میں غیر اللہ کو رب کس طرح بنا سکتا ہوں' انہی میں انسانوں کو تو اللہ نے لا کر بسایا ہے اور اس میں ان کی تنظیم کر کر کے کسی کو بلند رتبے دیئے ہیں اور کسی کو ماتحت بنایا ہے۔ کسی کو عقل مند اور کسی کو نادان' کسی کو تنومند اور کسی کو ناتواں' کسی کو مالدار اور کسی کو غریب تاکہ سب کی آزمائش ہو' کسی غیر کو کس طرح رب بناؤں جب غفور و رحیم تو صرف اللہ رب العالمین ہے۔

(وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٦: ١٦٥))

"وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیئے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے' اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔" کیا میں غیر اللہ کو رب بناؤں اور اس کی شریعت کو اپنے لئے شریعت بناؤں اور اس کے امر کو امر سمجھوں' اس کے حکم کو حکم مانوں یہ سب دلائل میرے سامنے موجود ہیں' سب شواہد موجود ہیں اور یہ سب دلائل بتلاتے ہیں کہ ہمیں صرف اللہ وحدہ کو رب بنانا چاہیے۔

یہ توحید کا نغمہ ہے' نہایت نرم اور خوشگوار۔ اس نغمے کے اندر ایمان کی حقیقت اور اس کے مظاہر و مشاہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کی اسکرین پر صاف صاف نظر آتے ہیں۔ اسے ایسے انداز اور ایسے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جو قرآن کا واضح اعجاز ہے اور منفرد انداز بیان ۔

شعور کی تاروں پر یہ آخری ضرب ہے جس کا مقصد اللہ کی حاکمیت اور اس کے قانونی نظام کی اطاعت کا اعلان ہے بعینہ اس طرح ہے جس طرح سورہ کے آغاز میں' اللہ کی حاکمیت کے بارے میں نظریاتی اظہار کے وقت کیا گیا تھا۔ سورہ کے آغاز میں سے اس آیت اور اس جیسی دوسری آیات کو ذرا دوبارہ ملاحظہ فرمائیں ۔

(قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (١٤) قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّیْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (١٥) مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ (١٦) (٦: ١٤ تا ١٦)) "کہو' اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنا لوں' اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا مالک ہے اور جو روزی دیتا ہے' روزی لیتا نہیں ہے۔ کہو مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سر تسلیم خم کروں (اور یہ کہ) تو بہرحال مشرکوں میں شامل نہ ہو۔ کہو' اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے دن سزا بھگتنی پڑے گی۔ اس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے

بڑا کرم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے ۔"

---ooo---

اب اس بارے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس سورہ کے آغاز میں جن امور کا تذکرہ ہوا تھا اسے اختتام پر دوبارہ دہرایا گیا تھا۔ابتداء کے معانی اور اختتام کے معانی ایک جیسے ہیں' ابتداء میں ان معانی اور حقائق کے نظریاتی پہلو کو لیا گیا تھا اور اختتام پر ان کو عملی اور نظام حیات کی شکل میں لیا گیا ہے ۔ دونوں جگہ اس دین کی ایک ہی حقیقت کے دو پہلوؤں کو لیا گیا ہے ۔

اب یہ سورہ ختم ہوگئی ہے' ذرا پیچھے مڑکر نظر ڈالئے' ہم نے ایک طویل ذہنی سفر کیا' معانی کے وسیع صحراؤں اور دریاؤں کو عبور کیا' طویل اور گہری وادیوں کا سفر کیا۔اس سورہ کا کچھ حصہ سابقہ پارے میں تھا اور کچھ حصہ زیر نظر پارے میں آیا۔ معانی و حقائق کا یہ کس قدر عظیم سفر تھا۔اگر اس سورہ کے حجم کو دیکھا جائے تو یہ گنے چنے صفحات ہی ہیں ۔ محدود آیات و عبارات ہیں ۔ اگر یہ انسانی کلام ہوتا تو وہ ان لامحدود حقائق کو اس قدر مختصر سورہ میں ادا نہ کر سکتا۔ حقائق' مشاہدات' ہدایات واشارات کا ایک عظیم ذخیرہ ہے جو ان آیات میں سمو دیا گیا ہے ۔اور کلام کا انداز نہایت ہی معجز اور مترنم ہے اور تعبیر نہایت ہی مختصر اور بے مثال ۔

اس سورہ کے مضامین کی دنیا میں ہم نے جو سفر کیا یہ نہایت ہی طویل' وسیع اور نشیب و فراز پر مشتمل تھا۔ اس میں اس کائنات کے حقائق سے بھی ہم دوچار ہوئے اور اسلامی تصور حیات کے حدود کی پیمائش بھی ہم نے کی ۔ اس سفر میں ہم حقیقت الوہیت' اس کی خوبصورتی اور اس کے جلال و جمال سے بھی آگاہ ہوئے ۔ اس سفر میں ہم نے اس کائنات اور اس کے اندر پائے جانے والے حقائق' اس کے اندر زندگی اور اس کی بوقلمونیوں کا بھی مشاہدہ کیا اور اس کے پس منظر میں جو غیبی حقائق موجود ہیں یا آنے والے ہیں ان کے مناظر بھی ہم نے دیکھے ۔ اللہ کے نظام مشیت کے بارے میں بھی ہمیں علم ہوا کہ کس طرح وہ ثبات دیتی ہے اور کس طرح مٹا دیتی ہے' کس طرح پیدا کرتی ہے اور کس طرح معدوم کر دیتی ہے' کس طرح زندگی بخشتی ہے اور کس طرح موت طاری کرتی ہے ۔اس پوری کائنات کو اس نے کس طرح متحرک کر دیا ہے' تمام زندہ اور مردہ مخلوق کس طرح رواں اور دواں ہے ۔

اس سفر میں ہم نفس انسانی کی گہرائیوں تک بھی گئے' اس کے نشیب و فراز میں بھی ہم نے سفر کیا' اس کی ظاہری تصویر اور باطنی حقیقت سے بھی آگاہ ہوئے' اس کی خواہشات اور میلانات سے بھی دوچار ہوئے' اس کی ہدایت یابی اور گمراہی کو بھی دیکھا' اس نفس انسانی کے اندر شیاطین جن و انس کی کارستانیاں بھی ملاحظہ کیں اور ان کے اقدامات و منصوبے دیکھے' ہدایت دینے والوں اور گمراہ کرنے والوں کو باہم دست و گریباں ہوتے بھی دیکھا۔

اس طویل سیر میں مشاہد قیامت' حشر و نشر کے مناظر' کرب و ابتلا کے اوقات' خوشی اور فلاح کے لمحات' اس کرۂ ارض پر انسانیت کی آبادی اور اس کی تاریخ کے بعض باب اور اس کائنات کی تاریخ کی بعض جھلکیاں بھی نظر آئیں ۔ غرض اس سورہ میں ہم نے وہ کچھ دیکھا جس کی پوری تلخیص یہاں ممکن نہیں ہے ۔ پوری حقیقت تو اس سورہ کے مطالعہ اور اس کے پیارے اسلوب ہی سے اخذ ہو سکتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ قرآن فی الواقعہ ایک کتاب مبارک ہے اور یہ سورہ اس کی برکات میں سے ایک حصہ ہے ۔

(وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ)

# فی ظلال القرآن

## پارہ نمبر ـ ۸

## سورۃ الاعراف

## آیات ۱ ـــ تا ـــ ۹۳

# سورہ اعراف ایک نظر میں

سورہ انعام کی طرح یہ بھی مکی سورہ ہے اور اس کے اندر بنیادی موضوعات وہی ہیں جو عموماً مکی آیات میں بیان ہوتے ہیں' یعنی نظریاتی مباحث۔ لیکن یہ دونوں سورتیں اس عظیم مسئلے کے بیان میں جو طرز عمل اور اسلوب بیان اختیار کرتی ہیں اور جس طرح میدان کار میں حرکت پذیر ہوتی ہیں' ان کے درمیان بہت بڑا فرق و امتیاز ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی ہر سورہ ایک علیحدہ شخصیت کی مالک ہے۔ ہر سورہ کے اپنے خدوخال ہیں' ہر ایک کا ایک متعین اسلوب ہے' ہر ایک کا ایک میدان کار ہے'جس میں یہ سورہ اپنے اسی عظیم نظریاتی ہدف کی طرف بڑھتی ہے جو ایک ہے۔

ہر سورہ کا ایک موضوع اور ہدف ہوتا ہے۔ یہ موضوع اور ہدف لے کر یہ سورہ اپنے مخصوص میدان میں آگے بڑھتی ہے اور اپنی مخصوص راہوں پر چلتی ہے۔ اپنے اس مضمون کو آگے بڑھاتی ہے اور اپنے ہدف اور مقصد تک پہنچتی ہے اور قارئین کو بھی پہنچاتی ہے۔

قرآن کریم کی تمام سورتوں کا حال بعینہٖ انسانوں کی طرح ہے۔ تمام انسان انسان ہیں لیکن ہر انسان کے خدوخال دوسرے سے جدا ہیں' ہر ایک کے انسانی خصائص مختلف ہیں۔ ہر ایک کی عضویاتی ساخت اور بناوٹ مختلف ہے۔ پھر شخصیت کے اعتبار سے انسانوں کے مختلف نمونے ہیں اور یہ اختلاف بھی بین اختلاف ہے۔ بعض کے درمیان معمولی اختلاف ہوتا ہے اور بعض ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ بنیادی اور عام انسانی خصوصیات کے سوا ان کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں ہوتی۔

میں قرآن کو اسی انداز میں سمجھنے کا عادی ہوں' قرآن کے بارے میں یہی میرا احساس ہے۔ اس کے ساتھ اسی احساس کے مطابق میں معاملہ کرتا ہوں۔ قرآن کے ساتھ طویل صحبت' طویل الفت اور طویل ترین ممارست اور اس کی تمام سورتوں میں غور و فکر کرنے کے بعد میں نے ہر سورہ کا مزاج' اس کا رجحان اور اس کے خدوخال کو بالکل علیحدہ متعین کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مجھے قرآن کی سورتوں کی شکل میں مختلف نمونے نظر آتے ہیں اور میں نے ہر سورہ کے ساتھ ذاتی تعلق کی وجہ سے ایک خاص لگاؤ پیدا کر لیا ہے اور ہر سورہ کے ساتھ اس ذاتی لگاؤ اور ممارست کی وجہ سے مجھے نظر آتا ہے کہ اس کے خدوخال دوسری سورتوں سے مختلف ہیں اور اس کے رجحانات بھی دوسری سورتوں کے مقابلے میں مختلف ہیں۔

قرآن کی سورتوں کے ساتھ میرا تعلق بعینہٖ اسی طرح ہے جس طرح کسی انسان کا مختلف دوستوں کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک دوست ہوتا ہے۔ سب کے ساتھ الفت اور محبت ہوتی ہے سب محبوب ہوتے ہیں' سب قیمتی

متاع کا درجہ رکھتے ہیں لیکن ہر ایک کے ساتھ انسان کا دل عجیب رنگ ڈھنگ اختیار کرتا ہے' ہر ایک کے اندر وہ ایک جدا خوشی پاتا ہے' ہر ایک کے ساتھ علیحدہ اثرات اور مؤثرات ہوتے ہیں اور ہر ایک کے ساتھ برتاؤ اور مذاق علیحدہ ہوتا ہے۔

جب انسان ایک سورہ کے اندر داخل ہوتا ہے تو اس کے اول سے آخر تک ایک سفر ہوتا ہے۔اس سورہ کی دنیا اور اس کے مناظر دوسری سورتوں سے الگ ہوتے ہیں۔تصورات اور حقائق مختلف ہوتے ہیں۔ اشارات اور قرار دادیں مختلف ہوتی ہیں' ہر سورہ نفس انسانی میں غوطے لگا کر موتی نکال لاتی ہے' ہر سورہ میں نئے نئے مناظر پیش کئے جاتے ہیں حتیٰ کہ ہر سورہ کا سفر ایک نئی دنیا کا سفر ہوتا ہے اور اس سفر کی منزل اور نشانات منزل متعین ہوتے ہیں۔

سورہ انعام کا موضوع بھی نظریہ حیات تھا اور اعراف کا موضوع بھی اسلامی عقائد و نظریات ہیں ۔لیکن سورہ انعام میں اسلامی عقائد سے براہ راست ذاتی طور پر بات کی گئی تھی ۔عقائد اور ان کی حقیقت سے بحث کی گئی تھی اور ان عقائد کے حوالے سے عرب جاہلیت پر بھرپور تنقید کی گئی تھی ۔جاہلیت عربیہ کو خطاب کر کے دوسری جاہلیتوں کو بھی بالواسطہ رد کیا گیا تھا اور اس میں سچائی کے حامل پیغمبر کو اس روپ میں دکھایا گیا تھا کہ وہ ببانگ دہل سچائی کا اعلان کر رہے ہیں۔ اس اعلان حق کے ساتھ ساتھ فطرت کے گہرے اور بے شمار اور عظیم اشارات بھی پیش کئے گئے تھے جو اس سچائی کے لئے بطور دلیل اور مشیر موجود تھے اور جن اشارات فطرت کے بارے میں ہم نے سورہ انعام کے آغاز میں' ساتویں پارے میں اور اس پارے میں مختصر اور مفصل کلام کیا ہے اور اس سورہ پر غور و فکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ سورہ انعام کا رنگ ڈھنگ اور اسلوب اور طریق کیا ہے۔اب ہم دیکھتے ہیں کہ سورہ اعراف کا موضوع بھی وہی اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقائد ہیں لیکن اس کا طریقہ کار بالکل مختلف ہے۔یہ ایک بالکل نئے میدان میں اس موضوع کو لے جاتی ہے۔اس سورہ میں اسی موضوع کو انسانی تاریخی زاویہ سے لیا گیا ہے۔انسان جب اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے تو وہ جنت میں ملاء اعلیٰ کا باشندہ ہوتا ہے۔یہ سورہ اس نقطہ آغاز سے انسان کو لے کر آگے بڑھتی ہے۔انسانی سفر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد تک ہمارے سامنے آتا ہے اور انسانیت کی اس طویل شاہراہ پر قافلہ ایمان مختلف مقامات و منازل سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا ہے یہ قافلہ اس نظریہ اور عقائد کے جھنڈے اٹھائے ہوئے ہے۔ نسلاً بعد نسلٍ اقوام کے بعد اقوام آتی ہیں اور اس سورہ میں ان قافلوں کے سفر کو ریکارڈ کیا جاتا ہے۔پھر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ہر دور میں انسانوں نے اس قافلہ ایمان کا استقبال کس انداز میں کیا۔اس نے ان ہدایات کو پاکر کیا رد عمل ظاہر کیا۔اس قافلہ ایمان نے دعوت کس انداز میں پیش کی۔ اور لوگوں نے کیا جواب دیا۔کس طرح بعض لوگوں نے اس قافلے کی راہ کو روکنے کی کوشش کی اور اس قافلے نے کس طرح مشکلات کے باوجود اپنی راہ نکالی اور اپنی منزل کی طرف یہ قافلہ آگے ہی بڑھتا رہا۔راہ روکنے والوں اور جھٹلانے والوں کا انجام کیا رہا اور قافلہ ایمان کس انجام سے دوچار ہوا۔دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

یہ نہایت ہی طویل ترین سفر ہے'لیکن یہ سورہ اسے مرحلہ بمرحلہ طے کرتی چلی جاتی ہے۔یہ قافلہ بعض نہایت ہی اہم مقامات اور منازل میں ٹھہرتا بھی ہے'لیکن اپنے مقررہ راستے پر چل بھی پڑتا ہے۔اس قافلے کے نشانات اور خدوخال بالکل واضح ہیں۔اس کے سنگ ہائے میل قائم ہیں۔اس کے سفر کا نقطہ آغاز بھی معلوم ہے اور منزل بھی متعین ہے۔انسانیت اپنی بڑی بڑی جمعیتوں کو لے کر اس منزل کی طرف رواں دواں ہے۔اور آخر کار یہ سورہ انسانیت کو اس کے نقطہ آغاز یعنی عالم بالا تک پہنچا دیتی ہے۔

انسانیت کا آغاز حضرت آدم و حوا کی شکل میں دو افراد سے ہوا۔ آدم ابو البشر اور حوا ام البشر ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ ساتھ شیطان بھی اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے اور اسے اللہ کی جانب سے یہ اجازت مل جاتی ہے کہ وہ جس حیلے سے چاہے انسان کو گمراہ کر سکتا ہے۔ حضرت آدم و حوا کو بھی گمراہ کر سکتا ہے اور ان کی اولاد کو بھی۔ اللہ ان دونوں سے اور دونوں کی اولاد سے عہد لیتے ہیں کہ وہ اس سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ اولاد آدم کو بھی اس کرۂ ارض پر یہ اختیار دیا گیا کہ وہ جو راہ چاہے اختیار کرے لیکن اس اختیار تمیزی کے استعمال پر اس سے باز پرس ضرور ہوگی۔ ذریت آدم کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے اس عہد کو مضبوطی سے تھامیں اور شیطان کے آگے نہ جھکیں جو خود ان کا اور ان کے ابو الآباء آدم علیہ السلام کا دشمن ہے اور یہ شیطان ہی ہے جس نے آدم و حوا کو جنت سے نکالنے کا سامان کیا اور یہ کہ گردش ایام میں جس جس مرحلے پر بھی رسول آئیں انسانوں کا فرض یہ ہے کہ وہ ان رسولوں کی ہدایات کو قبول کریں۔ اگر وہ انبیاء کی بات نہ سنیں گے تو وہ شیطان کے بہکاوے میں آجائیں گے جس کی فوجیں ہر وقت ان کی آگے اور پیچھے لگی ہوتی ہیں اور دائیں اور بائیں ہر طرف سے ایک انسان پر حملہ آور ہوتی ہیں۔

انسانیت کا آغاز جنت سے' اپنے رب کے ہاں سے ہوتا ہے۔ وہاں سے انسانیت کا نزول زمین کی طرف ہوتا ہے۔ یہاں عمل اور مکافات عمل' سعی و مشقت' اصلاح و فساد' تعمیر و تخریب' منافست اور مقابلے کا بازار گرم ہوتا ہے اور اس مقابلے میں ہر نیک و بد شریک ہے۔ کسی کے لئے اس سے باہر نکل بھاگنا ممکن نہیں ہے۔ اب یہ انسانیت لوٹ رہی ہے' اپنے رب کی طرف' جس نے اسے کھلا چھوڑ کر اس جہان میں اختیار تمیزی دیا اور اس لمبے سفر میں انسانیت نے جو کچھ کمایا اسے وہ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ اس نے جو کچھ جمع کیا ہے اس میں کانٹے بھی ہیں اور پھول بھی ہیں۔ اس میں قیمتی متاع بھی ہے اور کھوٹے سکے بھی ہیں۔ خیر بھی ہے اور شر بھی ہے' اچھائیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی ہیں۔ سونا بھی ہے اور پیتل۔ اس نے صبح انسانیت میں آغاز کیا اب شام ہونے کو ہے اور اس کا انجام ہے اور ہم اس سورہ کی عبارات اور آیات کے آئینے میں اس سفر کو اور اس کے آغاز و انجام کو دیکھ رہے ہیں۔ لوگ اپنے اپنے بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں اور اپنے رب کی طرف لوٹ رہے ہیں' کسی کا بوجھ کم ہے اور کسی کا زیادہ ہے' کسی کا اچھا ہے اور کسی کا برا۔ ہر ایک افتاں و خیزاں اسے اٹھائے ہوئے ہے۔ یہ سب لوگ مشقت میں ہیں اور تھکے ماندے جا رہے ہیں۔ ہر ایک دوبارہ نقطہ آغاز تک پہنچ جاتا ہے اور اللہ کی میزان کے سامنے اپنا بوجھ رکھ دیتا ہے اور نہایت ہی خوف و ہراس میں اپنے نتیجے کا منتظر ہے۔ ہر شخص اپنی کمائی کو فرداً فرداً لے کر آ رہا ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا اسے دعوت دے کہ وہ اس سے کوئی بوجھ ہٹالے تو کوئی اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ اگرچہ بلائے جانے والا رشتہ دار و تعلق دار ہو۔ ہر شخص اپنا حساب علیحدہ چکا رہا ہے۔ اور جزا و سزا سے دوچار ہو رہا ہے۔ اس سورہ میں لوگ فوج در فوج چلتے نظر آتے ہیں' کوئی جنت کی طرف رواں ہے اور کوئی جہنم کی طرف ہانکا جا رہا ہے اور جب سب لوگ واپس ہو کر اپنی اپنی جگہ داخل ہو جاتے ہیں تو پھر دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ گویا لوگ اس جہان میں غریب اور مسافر تھے۔

(كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ (۲۹) فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۳۰) (۷:۲۹-۳۰)) "جس

طرح اس نے تمہیں اب پیدا کیا اسی طرح تم پھر پیدا کئے جاؤ گے۔ایک گروہ کو تو اس نے سیدھا راستہ دکھایا ہے' مگر دوسرے گروہ پر گمراہی چسپاں ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ انہوں نے خدا کے بجائے شیاطین کو اپنا سرپرست بنا لیا ہے اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم سیدھی راہ پر ہیں۔" گردش لیل و نہار اور مناظر صبح و شام میں حق و باطل کے معرکوں کی جھلکیاں بھی پیش کی جاتی ہیں' ہدایت اور ضلالت کی معرکہ آرائی کے مناظر دکھائے جاتے ہیں' رسولوں اور مخلص مومنین کے قافلوں کو متکبرین اور ذلیل لوگوں کے پیروکاروں کے ساتھ لڑتے دکھایا گیا ہے۔یہ ٹکراؤ تاریخ میں بار بار دکھایا جاتا ہے اور اس تاریخی تبصرے میں ایک جیسے نتائج سامنے آتے ہیں۔ایمانی صحیفے روشن اور پر ایمان اور واضح اور جلی نظر آتے ہیں اور کفر کے صحیفے بجھے بجھے نظر آتے ہیں' کبھی کبھی جھٹلانے والوں کے مقتل کے مناظر بھی دکھائے جاتے ہیں اور کلام کا بہاؤ رک جاتا ہے اور درمیان میں ایک نہایت ہی پر مغز تبصرہ کیا جاتا ہے۔یاد دہانی اور ڈراوا آ جاتا ہے اور یہ وقفے سورہ کے اندر ایک خاص انتظام کے تحت ہوتے ہیں۔تاریخی واقعات کے ہر مرحلے کے بعد بات رک جاتی ہے اور بیچ میں تبصرہ ہوتا ہے اور ایک مختصر کلمہ نصیحت کہہ دیا جاتا ہے۔یاد دہانی اور ڈراوے کے لئے اور پھر سلسلہ کلام آگے چلتا ہے۔

غرض یہ سورہ انسانیت کی ایک کہانی ہے کہ یہ جنت اور ملاء اعلیٰ سے نکلی اور پھر لوٹی اور دنیا کے اس سفر میں اس کی نظریاتی صورت حال کا نقشہ اس میں کھینچا گیا ہے۔تاریخ کے طویل سفر میں اس کی حرکات و سکنات کو ریکارڈ کیا گیا ہے اور انسانیت کا آغاز جہاں سے ہوا یہ سورہ انجام کار انسانیت کو نقطہ آغاز تک پہنچاتی ہے۔بشریت کی نظریاتی کشمکش کا یہ ایک دوسرا انداز بیان ہے اور یہ انداز سورہ انعام سے بالکل مختلف ہے۔اگرچہ دونوں سورتوں میں بعض اوقات جھٹلانے والوں کے جو انجام دکھائے گئے ہیں وہ یکساں نظر آتے ہیں' دونوں میں شاید مناظر قیامت بھی یکساں ہیں اور اس کائنات پر جو تبصرے کئے گئے ہیں اور اس کے جو مناظر دکھائے گئے ہیں وہ بھی یکساں ہیں' لیکن اس سورہ کا انداز اور میدان کار سورہ انعام سے بالکل جدا ہے اور حدود بھی علیحدہ ہیں۔

یہ اختلاف اس وجہ سے ہے کہ دونوں سورتوں کا انداز تعبیر مختلف ہے۔ہر سورہ میں تعبیر کا وہ انداز اختیار کیا گیا جو اس کے موضوع کو پیش کرنے کے لئے مناسب سمجھا گیا۔انعام کی حالت یہ تھی کہ وہ انداز بیان لہروں کی شکل میں تھا اور ایک لہر کے بعد دوسری لہر اٹھتی۔اس میں مناظر نہایت ہی بھڑکیلے اور چمکدار تھے اور اس میں الفاظ کی سرموسیقی کی حد تک پہنچ رہی تھی' سورہ کے اندر سیاق کلام نہایت ہی تیز' بڑھنے والا اور بمباری جیسا تھا جبکہ سورہ اعراف میں بات نہایت ہی نرمی سے اور دھیرے دھیرے آگے بڑھتی ہے' الفاظ کی سر نہایت ہی نرم اور اسلوب بیان دھیما ہے۔گویا ایک قافلہ نہایت ہی سنجیدہ رفتار سے جا رہا ہے اور اس پر رنگ کنٹری ہو رہی ہے اور قافلہ قدم بقدم آگے بڑھ رہا ہے اور آخر کار اپنے نقطہ آغاز کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ہاں اس سورہ میں جب تذکیر و تہدید کا مرحلہ آتا ہے تو انداز کلام سخت ہو جاتا ہے لیکن جونہی تہدید اور ڈراوے کا موضوع ختم ہوتا ہے بات دوبارہ سنجیدگی اختیار کر لیتی ہے اور نہایت ہی مرتب انداز میں آگے بڑھتی ہے۔

---ooo---

یہاں مناسب ہے کہ انسانی تاریخ کے بہاؤ میں یہ سورہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقیدے کو جس طرح ایک متحرک شکل میں پیش کرتی ہے' اس کے کچھ نمونے پیش کریں۔

یہ سورہ اسلامی نظریہ حیات کی تاریخ اس طرح بیان نہیں کرتی جس طرح نظریات کی تاریخ عموماً بیان کی جاتی ہے۔ یعنی اسلامی نظریہ حیات کو آدم سے لے کر انتہا تک ایک حصے کی شکل میں بیان کر دے۔بلکہ وہ اسلامی نظریہ حیات کی وہ جھلکیاں دکھاتی ہے جس میں کسی دور میں اس نظریہ اور اس کے مقابل جاہلیت کے درمیان کشمکش برپا رہی ہے۔چنانچہ اس سورہ میں بعض تاریخی مناظر اور معرکے لئے گئے ہیں اور یہ مناظر اور معرکے وہ ان لوگوں کے سامنے پیش کرتی ہے جو اس قرآن کے مخاطب تھے۔ قرآن ان لوگوں کے سامنے اس طویل قصے کو پیش کرتے ہوئے اس کے نتائج اور نصائح کو بھی ان کے سامنے پیش کرتا ہے اور ساتھ ساتھ ان کو یاد دہانی بھی کراتا جاتا ہے۔اس طرح قرآن کریم ان زندہ مخاطبین کو لے کر ایک معرکے میں داخل ہوتا ہے اور یہ معرکہ حقیقتاً برپا ہوتا ہے اور جب قصص کے اہم مراحل آتے ہیں تو پھر قرآن کریم ان پر مختصراً تبصرہ بھی کرتا ہے اور اس تبصرے کے مخاطب وہ زندہ لوگ ہوتے ہیں جو قرآن کو سنتے ہیں اور جو تحریک اسلامی کے معرکے کے اندر حصہ دار ہوتے ہیں جس طرح اس وقت صحابہ کرام عملاً تحریک اسلامی کے معرکے میں شامل تھے۔قرآن کریم جو قصہ بھی بیان کرتا ہے اس کو کسی متعین صورت حال پر چسپاں کرتا ہے۔وہ جس حقیقت کا اظہار کرتا ہے اس کے بالمقابل کسی قائم باطل کو ختم کرنا مطلوب ہوتا ہے۔ اس کے قصص محض فنی اور تاریخی پہلو سے بیان نہیں ہوئے۔

---ooo---

جب کسی قصے کے آخر میں یا درمیان میں قرآن کریم ان واقعات پر تبصرہ کرتا ہے تو اس میں وہ مسلمانوں کو نصائح اور ڈراوے کے اسباق پڑھاتا ہے، جبکہ کلام کا نقطہ آغاز اور انجام اس کے پیش نظر ہوتا ہے۔اس سورہ میں اگر قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح، قوم لوط ور قوم شعیب کے قصص کو سرسری طور پر لیا گیا ہے تو حضرت موسیٰ کے قصے کو بڑی تفصیل سے لیا گیا ہے۔یہاں اس سورہ کے اجمالی تعارف میں تو ہم صرف چند نمونے ہی پیش کر سکتے ہیں کہ یہ سورہ کن اہم نکات پر اپنی توجہ مرکوز کئے ہوئے ہے۔سورہ کا آغاز یوں ہوتا ہے :

الۤمّۤصۤ (۱) كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِىْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۲) اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۳) (۷: ۱ تا ۳) "ا'ل'م'ص - یہ ایک کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے' پس اے محمد ؐ تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو۔اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے سے ڈراؤ اور ایمان والوں کو یاد دہانی کراؤ۔لوگو' جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو مگر تم نصیحت کم ہی پاتے ہو۔" یہ سورہ اپنے آغاز ہی سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کو خطاب کر رہی ہے' جو اس قرآن کو لے کر جہاد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔اس کے بعد جو قصص بھی اس میں لائے گئے ہیں اور انسانیت کے طویل ترین سفر پر جو کمنٹری کی گئی ہے' اس کے بعد قافلہ انسانیت کو جو رب ذوالجلال کے سامنے پہنچایا گیا ہے اور اس کے اندر جو مناظر اور جو مشاہدات پیش کئے گئے ہیں دنیا میں

اور قیامت میں وہ بھی بالواسطہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کو خطاب کا درجہ رکھتے ہیں اور ایسا محض ڈراوے اور یاد دہانی کی خاطر کیا گیا ہے۔ اس امر کی طرف وہ مختصر فقرات اشارہ کر رہے ہیں' جن میں اللہ تعالیٰ رسول اکرم ؐ سے فرماتے ہیں "یہ ایک کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے' پس اے محمد تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو۔"

یہ ایسی صورت حال ہے جسے صرف وہ شخص سمجھ سکتا ہے جو جاہلیت کے نظام میں زندگی بسر کر رہا ہو اور اس جاہلی ماحول میں وہ لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دے رہا ہو وہ جانتا ہو کہ اس کا ہدف ایک عظیم انقلاب ہے اور اس کے حصول کی راہ میں بہت ہی بڑی دشواریاں حائل ہیں۔ اس کا ہدف یہ ہو کہ وہ دنیا کو ایک نیا نظریہ حیات دے' ایک نیا تصور حیات دے' نئی اقدار اور نئے پیمانے دے' نئے حالات اور نئے طور طریقے پیدا کرے اور یہ سب کے سب اس وقت کی قائم صورت حالات اور اقدار سے بالکل مختلف اور متضاد ہوں۔ وہ شخص سمجھتا ہو کہ جاہلیت کی آلودگیاں نفوس انسانی کے اندر رچی بسی ہیں۔ لوگوں کے دماغوں پر جاہلیت کے تصورات چھائے ہوئے ہیں۔ زندگی میں جاہلی اقدار کی حکمرانی ہے اور انسان کی عادات اور اس کے اعصاب پر ان کا مکمل دباؤ ہے اور اسے یہ احساس ہو رہا ہو کہ ایسے حالات میں وہ جو بات کرتا ہے وہ عجیب و غریب لگ رہی ہے۔ لوگوں کے لئے وہ بات نہایت ہی ثقیل ہے اور ان کے دل اس بات کو ناپسند کرتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے جس کی کچھ ذمہ داریاں ہیں' اس لئے کہ یہ بات لوگوں کے افکار' ان کے تصورات' ان کی اقدار' ان کے پیمانوں' ان کے قوانین' ان کی عادات اور ان کے اوضاع و اطوار کے اندر مکمل تبدیلی کی بات ہے۔ اس کے نتیجے میں ان کے تمام جاہلی روابط کٹ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس عظیم بات کے نتائج کے بارے میں ممکن ہے کہ آپ کے دل میں خلجان پیدا ہو جائے کہ لوگ اس عظیم بات سے ردعمل کا اظہار کس طرح کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیتے ہیں کہ آپ کوئی جھجک محسوس نہ کریں اور یاد دہانی اور ڈراوے کا کام جاری رکھیں۔ اس سچی بات کے مقابلے میں کوئی جس قدر شدید ردعمل بھی ظاہر کرے' برا سمجھے یا تشدد کرے آپ اس کی پرواہ نہ کریں۔ کوئی مقابلے میں اتر آئے' جنگ کے لئے تیار ہو جائے اور دشمنی پر اتر آئے تو آئے۔

اس سے پہلے کہ بات تفصیلی قصص میں داخل ہو' قرآن اپنے مخاطبوں کو فیصلہ کن انداز میں متنبہ کرتا ہے اور یہ بات ان کے علم میں لاتا ہے کہ ان سے پہلے جھٹلانے والوں کا جو انجام ہوا ہے وہ ذرا اس پر غور کر لیں یہ تنبیہ انہیں اس لئے کی جاتی ہے کہ اسلامی انقلاب کی بات نہایت ہی دور رس ہے' انوکھی ہے' لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں اور اس کے مقابلے میں اتر آتے ہیں۔ اس لئے بھی کہ یہ بات مکمل انقلاب کی بات ہے اس سے ان کے عقائد' تصورات اور طرز عمل سب کے سب بدلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

(وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ (٤) فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (٥) فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ (٦) فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ (٧)

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۸) وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ

(۹) (۷ : ٤ تا ۹)) "کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ ان پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت ٹوٹ پڑا' یا دن دہاڑے ایسے وقت آیا جبکہ وہ آرام کر رہے تھے اور جب ہمارا عذاب ان پر آگیا تو ان کی زبان پر اس کے سوا کوئی صدا نہ تھی کہ واقعی ہم ظالم تھے۔ پس یہ ضرور ہو کر رہتا ہے کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں۔ پھر ہم خود پورے علم کے ساتھ ساری سرگزشت ان کے آگے پیش کر دیں' آخر ہم کہیں غائب تو نہیں تھے اور وزن اس روز عین حق ہو گا جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے رہیں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں گے کیونکہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے رہے تھے۔" اس تمہید کے بعد اب قصہ انسانیت کا آغاز ہوتا ہے۔ اور یہ کہانی بتائی جاتی ہے کہ انسان کو اس کرۂ ارض پر کس طرح بسایا گیا۔ اس کرۂ ارض کے اندر ایسی خصوصیات اور ایسی صلاحیتیں ودیعت کی گئی تھیں کہ اس پر انسان کا بسایا جانا آسان تھا۔ پھر انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے ایسی صلاحیتیں دی تھیں کہ اس کرۂ ارض کو اس کے حوالے کرنا موزوں تھا۔ ان کی صلاحیتیں اس کائنات کے خزانوں کے ساتھ ہم آہنگ تھیں۔ وہ اس کائنات کے اصولوں اور نوامیس کا ادراک کر سکتا تھا۔ اس کائنات کے اندر پوشیدہ قوتوں کو کام میں لا سکتا تھا اور اس سے بھرپور استفادے کی قوت اپنے اندر رکھتا تھا۔

(وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ

(۷ : ۱۰)) "ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لئے یہاں سامان زیست فراہم کیا' مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔" یہ بات بطور تمہید لائی گئی۔ اس کے بعد وہ قصہ تفصیلاً آتا ہے کہ اس جہان میں انسانیت کی تخلیق کس طرح ہوئی اور اس دنیا میں انسانیت نے اپنے اس مقررہ سفر کا آغاز کس طرح کیا۔ اس سورہ کے سیاق کلام میں انسانیت کے نقطہ آغاز پر بات کو مرکوز کیا گیا ہے۔ انسانیت کی تخلیق کی کہانی پر بھی زور اور یاد دہانی کرائی جاتی ہے۔ اور انسانوں کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ ذرا عمل تخلیق کے واقعات پر غور تو کریں' اس میں کیا کیا سامان عبرت ہے۔

(وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ (۱۱) قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (۱۲) قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ

لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ (۱۳) قَالَ اَنْظِرْنِىْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ
(۱۴) قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ (۱۵) قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ
الْمُسْتَقِيْمَ (۱۶) ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ
شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (۱۷) قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا لَمَنْ
تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۱۸) وَيٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ
الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۱۹)
فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِىَ لَهُمَا مَا وٗرِىَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا
رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ (۲۰)
وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّىْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ (۲۱) فَدَلّٰهُمَا بِغُرُوْرٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ
بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَنَادٰهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ
اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۲۲) قَالَا
رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۲۳) قَالَ
اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (۲۴)
قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ (۲۵) (۷:۱۱ تا ۲۵)) ”بے

شک ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتداء کی‘ پھر تمہاری صورت بنائی‘ پھر فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو‘ اس حکم پر سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ پوچھا ”تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب میں نے تجھ کو حکم دیا تھا۔“ بولا: ”میں اس سے بہتر ہوں‘ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔“ فرمایا: ”تو یہاں سے نیچے اتر تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے۔ نکل جا کہ درحقیقت تو ان لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں۔“ بولا: ”مجھے اس دن تک مہلت دے جبکہ یہ سب دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔“ فرمایا: ”تجھے مہلت ہے۔“ بولا: ”اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا‘ آگے اور پیچھے‘ دائیں اور بائیں‘ ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔“ فرمایا: ”نکل

جا یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا'یقین رکھ کہ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے تجھ سمیت ان سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔اور اے آدم'تو اور تیری بیوی دونوں اس جنت میں رہو جہاں جس چیز کو تمہارا جی چاہے کھاؤ مگر اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔" پھر شیطان نے ان کو بہکایا تاکہ ان کی شرمگاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں ان کے سامنے کھول دے۔اس نے ان سے کہا "تمہارے رب نے تمہیں جو اس درخت سے روکا ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمہیں ہیشگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے۔اور اس نے قسم کھاکر ان سے کہا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔اس طرح دھوکہ دے کر وہ ان دونوں کو رفتہ رفتہ اپنے ڈھب پر لے آیا۔آخر کار جب انہوں نے اس درخت کا مزہ چکھا تو ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔تب ان کے رب نے انہیں پکارا "کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہ روکا تھا' اور نہ کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔" دونوں بول اٹھے "اے ہمارے رب ہم نے اپنے اوپر ستم کیا' اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔" فرمایا: "اتر جاؤ' تم ایک دوسرے کے دشمن ہو' اور تمہارے لئے ایک خاص مدت تک زمین ہی میں جائے قرار اور سامان زیست ہے۔" اور فرمایا" وہیں تم کو جینا اور وہیں مرنا ہے اور اسی میں سے تم کو آخر کار نکالا جائے گا۔"

اس منظر میں'جس میں انسانیت کا آغاز دکھایا گیا ہے'یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے اور سفر انسانیت کے مسافران کی آخری منزل کون سی ہے۔جب انسانیت اس طویل سفر کا آغاز کرتی ہے تو اس سفر میں معرکہ خیروشر شروع ہو جاتا ہے اور دوران سفر یہ ہروقت برپا ہے۔یہ معرکہ شیطان' حزب الشیطان اور انسانوں کے درمیان برپا ہے۔اس پورے سفر میں ہمیں وہ مقامات بھی نظر آتے ہیں جہاں بنی آدم کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاکر یہ شیطان حملہ آور ہوتا ہے۔ان مقامات پر سورہ میں انسانوں کو یاد دہانی اور ڈراوے کے لئے وقفہ کیا جاتا ہے۔لوگوں کو ڈرایا جاتا ہے کہ ذرا غور تو کرو کہ اس شیطان مردود نے تمہارے باپ آدم کے ساتھ کیا سلوک کیا۔اس منظر میں آدم و شیطان آمنے سامنے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اس معرکہ آدم و ابلیس میں جب ابلیس اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتا ہے اور آدم و حوا جنت سے نکل جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انسانوں کو یاد دلاتے ہیں اور ڈراتے ہیں۔

(يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِىْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (٢٦) يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ

(٢٧) (٧: ٢٦ - ٢٧)) اے اولاد آدم'ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے لئے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو' اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔یہ اللہ

کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے' شاید کہ لوگ اس سے سبق لیں ـ اے بنی آدم ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے جس نے اس سے پہلے تمہارے والدین کو اس نے جنت سے نکلوایا اور ان کے لباس ان پر سے اتروا دیئے تھے تاکہ ان کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے ـ وہ اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے ـ ان شیاطین کو ہم نے ان لوگوں کا سرپرست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے ـ"

(يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۳۵) وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۳۶)(۷:۳۵ ـ ۳۶)) "اے بنی آدم' یاد رکھو! اگر تمہارے پاس خود تم میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سنا رہے ہوں' تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویے کی اصلاح کرے گا اس کے لئے کسی خوف و رنج کا موقع نہیں ہے' اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلے میں سرکشی برتیں گے وہی اہل دوزخ ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے ـ" یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ ممنوع کے ارتکاب کے بعد آدم و حوا کے ننگے ہو جانے کا جو منظر سامنے آتا ہے اور اس میں وہ جنت کے پتوں کے ذریعے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اس واقعہ پر قرآن مجید کا محولہ بالا تبصرہ کہ لباس انسان کے لئے اللہ نے اتارا ہے اور ستر کی پوشیدگی اور وہ لباس جس کے ذریعہ وہ زینت اختیار کرتے ہیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے ـ یہ لباس اللہ کے نازل کردہ ہیں ـ پھر انہیں شیطان کے فتنے سے آگاہ کیا جاتا ہے کہ شیطان کی سعی یہ ہے کہ وہ انہیں بھی اس طرح ننگا کر دے جس طرح ان کے باپ کو اس نے ننگا کر کے جنت سے نکال دیا ـ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ قصہ تخلیق آدم کی اس کڑی کا یہاں خاص طور پر ذکر کرنا اور پھر اس پر یہ تبصرہ کرنا اس بات کا مظہر ہے کہ اس وقت عربوں کے مشرک جاہلی معاشرے میں ایسی ہی عملی صورت حال موجود تھی کیونکہ اس معاشرے میں لوگ اپنے جاہلی رسم و رواج اور اپنے جاہلی تصورات کے نتیجے میں اور اپنی سابقہ دیو مالائی روایات کے مطابق بیت اللہ کے گرد ننگے ہو کر طواف کرتے تھے ـ نیز انہی تصورات کے تحت وہ خاص قسم کے لباسوں کو حرام قرار دیتے تھے' بعض کھانوں کو بھی حرام قرار دیتے تھے خصوصاً حج کے دنوں میں' اور یہ خیال کرتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی شریعت ہے ـ نیز انہوں نے اپنے اوپر جو کچھ حرام قرار دیا ہے وہ دراصل اللہ نے حرام قرار دیا ہے ـ یہی وجہ ہے کہ انسانیت کی تخلیق کی کہانی کی اس کڑی کے بعد ایسا تبصرہ آتا ہے جو اس وقت کے موجود حالات کے ساتھ نہایت ہی مناسبت رکھتا ہے ـ یہ واقعی صورت حال صرف عرب جاہلیت کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ تمام جاہلیتوں میں حالات ایسے ہی ہوتے ہیں ـ آپ دیکھتے نہیں کہ تمام جاہلیتوں میں عریانی اور بے حیائی اور خدا خوفی کو نظرانداز کرنا ایک قدر مشترک ہے ـ

اس سے ہمیں قرآن کریم کی ایک نہایت ہی اہم خصوصیت کا پتہ چلتا ہے اور اس کا ذکر یہاں نہایت ضروری ہے ـ وہ یہ کہ قرآن کریم جو بات بھی کرتا ہے یا جو قصہ بھی بیان کرتا ہے' وہ ایک واقعی اور موجود صورت حالات کے لئے ہوتا ہے اور قرآن اپنے آپ کو عملی حالات تک محدود رکھتا ہے ـ جس قدر واقعات ہوتے ہیں اور ان میں جس قدر ہدایات کی

ضرورت ہوتی ہے ' قرآن اسی قدر بات کرتا ہے - صرف حسب ضرورت - سورہ انعام کے تعارف میں ہم نے اس اہم قاعدے کی طرف اشارہ کیا تھا کہ قرآن کریم کوئی ایسی بات نہیں کرتا جس کی فی الواقعہ ضرورت نہ ہو - قرآن کریم کا طریق کار یہ نہیں ہے کہ وہ معلومات یا احکام کے فرضی مجموعے تیار کرے یہاں تک کہ قرآن کریم قصص کے معاملے میں بھی وہ تمام حلقے چھوڑ دیتا ہے جن کی موضوع زیر بحث میں ضرورت نہ ہو - قرآن معلومات و احکام کا خزانہ تیار نہیں کرتا تاکہ جب ضرورت ہو تو اس سے احکام لئے جائیں - یہ قرآن کا طریق کار نہیں ہے -

اب اس سے پہلے کہ قافلہ انسانیت اپنی راہ پر روانہ ہو اور اس سے پہلے کہ رسول آکر انسانیت کے سامنے ہدایت پیش کریں اور اس سے پہلے کہ قرآن کریم کا سیاق کلام اس بات کو پیش کرے کہ نظریاتی تحریک کس طرح قافلہ انسانیت کے ساتھ ساتھ چلتی رہی اور آدم علیہ السلام اور بی بی حوا کے پہلے تجربے کے ساتھ ساتھ سلسلہ انبیاء و رسل کس طرح چلا؟ ان تمام امور کے بیان سے پہلے قرآن کریم قافلہ انسانیت کے آخری منظر کو پیش کرتا ہے - اس عظیم مرحلے کے آخری حصے کو یہاں پہلے لایا جاتا ہے اور قرآن کریم کا یہ عمومی طریقہ ہے کہ وہ ابتلاء اور جزا و سزا کے مناظر کو پہلے لے لیتا ہے - اس طرح گویا یہ سب مناظر ایک ہی سفر کی جھلکیاں ہیں -

یہاں مشاہد قیامت میں سے ایک طویل ترین منظر پیش کیا جاتا ہے - اس میں بہت سی تفصیلات دی گئی ہیں ' پے درپے کئی مناظر پیش کئے گئے ہیں اور کئی قسم کے ڈائیلاگ دیئے گئے ہیں - سورہ میں یہ منظر اس موقعہ و مناسبت میں دیا گیا کہ قصہ آدم و ابلیس میں ابلیس آدم اور ان کی بیوی کو ورغلاتا ہے اور ان کو جنت سے نکال دیا جاتا ہے اور یہاں لوگوں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ خبردار شیطان تمہیں اس طرح نہ ورغلائے جس طرح تمہارے ماں باپ کو ورغلایا اور جنت سے نکلوا دیا - اب اللہ کی جانب سے تمہارے پاس رسول آتے رہیں گے جو تم پر اللہ کی آیات پڑھیں گے اور یہ منظر اس لئے بھی یہاں پیش کیا جاتا ہے کہ جب رسول آئیں گے تو لوگ ان کی تصدیق سے جنت میں دوبارہ داخل ہوں گے اور جن لوگوں نے شیطان کی اطاعت کی وہ جنت میں داخل نہ ہو سکیں گے - گویا وہ آدم کی طرح شیطان کے بہکاوے میں آجائیں گے اور جن لوگوں نے شیطان کی مخالفت کی ' وہ لوٹیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے - ان پر یہ آواز ہوگی "یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث ہوگئے ہو ' جس کے بارے میں تم بھی جانتے تھے -" اب یہ مسافر اس پرمشقت سفر کو ختم کریں گے اور نعمتوں کی جگہ جنت میں داخل ہوں گے -

یہ منظر نہایت ہی طویل ہے اور اس مختصر تبصرے میں ہم اسے پیش نہیں کر سکتے - جب تفسیر کا موقعہ آئے گا تو تفصیلی بحث ہوگی - البتہ اس منظر کو پیش کر کے قرآن کریم یاد دہانی اور ڈراوے کے لئے موقعہ نکالتا ہے - ان لوگوں کو خبردار کیا جاتا ہے جو قرآن کریم کا مقابلہ تکذیب سے کرتے ہیں اور معجزات اور خوارق طلب کرتے ہیں - ان لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ تمہارا انجام اچھا نہ ہوگا -

(وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۵۲) هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ

رَبِّنَا بِالْحَقِّ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِىْ كُنَّا نَعْمَلُ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۵۳) (۷:۵۲-۵۳) "اور ہم ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس کو ہم نے علم کی بنا پر مفصل بنایا ہے اور جو ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت و رحمت ہے۔ اب کیا یہ لوگ اس کے سوا کسی اور بات کے منتظر ہیں کہ وہ انجام سامنے آ جائے جس کی یہ کتاب خبر دے رہی ہے؟ جس روز انجام سامنے آ گیا تو وہی لوگ جنہوں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا کہیں گے کہ "واقعی ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے، پھر کیا اب ہمیں کچھ سفارشی ملیں گے جو ہمارے حق میں سفارش کریں؟ یا ہمیں دوبارہ واپس ہی بھیج دیا جائے تاکہ جو کچھ ہم پہلے کرتے تھے اس کے بجائے اب دوسرے طریقے پر کام کر کے دکھائیں۔" انہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا اور سارے جھوٹ جو انہوں نے تصنیف کر رکھے تھے آج ان سے گم ہوئے۔"

اس دور دراز اور طویل سفر میں آغاز تخلیق اور انتہائے خلقت کے بیان کے بعد بات میں ایک وقفہ آتا ہے۔ اب سابقہ کلام پر ایک تبصرہ سامنے آتا ہے۔ اس تبصرے میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ خدا کی خدائی کی حقیقت کیا ہے۔ اللہ کی ربوبیت اس کائنات کے مناظر میں اپنا کام کس طرح کرتی ہے۔ اللہ کی ربوبیت اس حقیقت پر کس طرح شاہد عادل ہے۔ جس طرح قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ وہ کائنات کے اندر نظر آنے والے عجیب و غریب مشاہدات اور کائنات کے آثار کے ذریعہ اس حقیقت کبریٰ پر استدلال کرتا ہے جس کے انسانی احساسات پر نہایت ہی گہرے اثرات پڑتے ہیں بشرطیکہ انسانی دل اور اس کی بصیرت ان اشارات فطرت کے اخذ کے لئے تیار ہو۔ قرآن کریم کے اس تاریخی سفر کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ بتائے کہ انسانیت کے پاس نظریاتی پیغام ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور وہ یہ کہ اس پوری کائنات میں اللہ کی بندگی اور اس کی ربوبیت کا نظام جاری و ساری ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو اس پوری کائنات کا حاکم اور رب ہے لہٰذا انسان کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ نافرمان نہ ہو اور اس رب کائنات کی بندگی سے سرتابی نہ کرے جو اس کائنات کا خالق بھی ہے اور اس کا حکمران مطلق بھی، اور وہی ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ پروردگار ہے۔

(اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۵۴) اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (۵۵) وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۵۶) وَهُوَ الَّذِىْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ

بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۵۷) وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ (۵۸)(۷:۵٤ تا ۵۸)) "درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمان و زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا' پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے جس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کئے۔ سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار رہو اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ' سارے جہانوں کا مالک و پروردگار۔ اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے' یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو' جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔ اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت سے آگے آگے خوشخبری لئے ہوئے بھیجتا ہے۔ پھر جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھالیتی ہیں تو انہیں کسی مردہ سرزمین کی طرف حرکت دیتا ہے اور وہاں مینہ برسا کر طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے۔ دیکھو اس طرح ہم مردوں کو حالت موت سے نکالتے ہیں' شاید کہ تم اس مشاہدے سے سبق لو۔ جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ اس طرح ہم اپنی نشانیوں کو بار بار پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو شکر گزار ہونے والے ہیں۔"

اب یہ سفر شروع ہوتا ہے اور انسانیت کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ پردہ عدم کے پیچھے قافلہ ایمان نمودار ہوتا ہے۔ یہ قافلہ گم گشتہ راہ انسانیت کو پکارتا ہے' اسے یاد دہانی کراتا ہے اور برے انجام سے ڈراتا ہے لیکن یہ گمراہ انسانیت روگردانی کرتی ہے اور قافلہ ایمان کی دشمنی پر اتر آتی ہے۔ وہ اس اصلاحی تحریک کا مقابلہ عناد اور سرکشی کے ساتھ کرتی ہے۔ پھر ظلم و زیادتی شروع کر دیتی ہے اور اس قافلے کی راہ روکتی ہے۔ جب رسول یاد دہانی اور ڈراوے کا فریضہ ادا کر چکتے ہیں تو اللہ تعالیٰ خیر و شر کے اس معرکے کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب رسولوں کی قوم انہیں جھٹلاتی ہے اور وہ نافرمانی کر کے منہ موڑ لیتے ہیں۔ ظلم اور پکڑ دھکڑ کا آغاز کر دیتے ہیں۔ اس وقت صالح لوگ اسی نظریاتی بنیاد پر قوم سے جدا ہو جاتے ہیں اور صرف اللہ کو پکارتے ہوئے تمام اختیارات اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔

قرآن کریم اس سورہ میں حضرت نوح' حضرت ہود' حضرت صالح' حضرت لوط' حضرت شعیب اور ان کی اقوام کے قصے' نقل کرتا ہے۔ یہ تمام رسول ایک ہی حقیقت اپنی قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں' صرف اللہ کی بندگی کرو۔ "اے قوم صرف اللہ کی بندگی کرو اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی اور حاکم و الہ نہیں ہے۔" ان تمام رسولوں کی اقوام نے ان کے ساتھ اللہ کے حق حاکمیت کے سلسلے میں جھگڑا کیا۔ ان سب قوموں کو اعتراض بھی رہا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم ربوبیت کے اختیارات سب کے سب اللہ کو دے دیں۔ نیز ان لوگوں نے اس بات پر بھی اعتراض کیا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ ہم جیسے انسان کو ہمارے پاس رسول بنا کر بھیج دے۔ بعض اقوام نے یہ اعتراض کیا کہ ہم مذہب کا یہ حق تسلیم

نہیں کرتے کہ وہ لوگوں کی زندگی کے معاملات میں دخل دے اور مالی اور تجارتی معاملات میں فیصلے کرے - آج صدیوں کے بعد' جاہلیت جدیدہ کے متبعین میں سے بعض لوگ بعینہٖ یہی اعتراض کرتے ہیں اور اپنے اس قدیم جاہلی فعل کو وہ ترقی اور آزادی کا نام دیتے ہیں - ہر قصے کے آخر میں ان تمام اقوام کا انجام بھی نقل کر دیا جاتا ہے -

جو شخص ان قصص کا بغور مطالعہ کرے گا وہ دیکھے گا کہ ان میں ہر رسول اپنی قوم کے سامنے ایک ہی بات رکھتا ہے - "اے قوم اللہ ہی کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا اور کوئی حاکم و الٰہ نہیں ہے -" ہر ایک رسول لوگوں کے سامنے وہ حقیقت پیش کرتا رہا ہے جس کا محافظ اور مبلغ اسے اللہ نے مقرر کیا تھا - وہ نہایت ہی اخلاص اور شفقت کے ساتھ اپنی قوم کو خطاب کرتا رہا - وہ نہایت ہی درد کے ساتھ انہیں اس انجام سے آگاہ کرتا جس سے وہ دوچار ہونے والے تھے لیکن وہ اس سے غافل تھے ۔ ان کی نظروں میں ان رسولوں کی نصیحت کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی - وہ اپنی بات کے انجام پر کوئی غور نہ کرتے تھے - وہ اس گہرے اخلاص کو نہ سمجھ سکے جو ان کے رسول کے دل میں پنہاں تھا - وہ اس بات کو بھی نہ سمجھتے تھے کہ یہ رسول نہایت ہی مخلص اور بے لوث تھے اور ان کو اچھی طرح احساس تھا کہ ان کا انجام کیا ہونے والا ہے -

یہاں بطور مثال حضرت نوح علیہ السلام کے قصے کا ایک حصہ نقل کرنا نامناسب نہ ہو گا - یہ پہلا قصہ ہے - نیز حضرت شعیب علیہ السلام کے قصے کا بھی ایک حصہ یہاں بیان کرنا مناسب ہے - یہ ان قصوں کے آخری فقرے ہیں - اس کے بعد ان قصوں پر تبصرے آتے ہیں -

(لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنِّيْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۵۹) قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖ اِنَّا لَنَرٰكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۶۰) قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶۱) اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۶۲) اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۶۳) فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ (۶۴)) (۷: ۵۹ تا ۶۴) "اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا - اس نے کہا: "اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے - میں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں -" اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا: "ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو -" نوح نے کہا: "اے برادران قوم! میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں تمہیں اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں' تمہارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں ہے - کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ

تمہیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے؟" مگر انہوں نے اس کو جھٹلایا۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں نجات دی اور ان لوگوں کو ڈبو دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا' یقیناً وہ اندھے لوگ تھے۔"

(وَإِلَى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ قَدْ جَاءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ (٨٥) وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا وَاذْكُرُوا إِذْ كُنْتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ وَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ (٨٦) وَإِنْ كَانَ طَائِفَةٌ مِّنْكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَائِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا فَاصْبِرُوا حَتَّى يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا وَهُوَ خَيْرُ الْحَكِمِينَ (٨٧) قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَشُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَرِهِينَ (٨٨) قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ نَجَّنَا اللَّهُ مِنْهَا وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَّعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَتِحِينَ (٨٩) وَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَسِرُونَ (٩٠) فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَثِمِينَ (٩١) الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَأَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَانُوا هُمُ الْخَسِرِينَ (٩٢) فَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَقَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَلَتِ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَيْفَ آسَى عَلَى قَوْمٍ كَفِرِينَ (٩٣) (٧: ٨٥ تا ٩٣))

"اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا' اس نے کہا: "اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی صاف راہنمائی آگئی ہے۔ لہٰذا وزن اور پیمانے پورے کرو' لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو' اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے۔ اس میں تمہاری بھلائی ہے۔ اگر تم واقعی مومن ہو' اور ہر راستے پر رہزن بن کر نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوفزدہ

کرنے اور ایمان لانے والوں کو خدا کے راستے سے روکنے لگو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔یاد کرو وہ زمانہ جبکہ تم تھوڑے تھے پھر اللہ نے تمہیں بہت کر دیا اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ دنیا میں مفسدوں کاکیاانجام ہوا ہے اگر تم میں ایک گروہ اس تعلیم پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں' ایمان لاتا ہے اور دوسرا ایمان نہیں لاتا تو صبر کے ساتھ دیکھتے رہو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔"

اس کی قوم کے سرداروں نے 'جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے 'اس سے کہا "اے شعیب 'ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہو گا۔"شعیب نے جواب دیا "کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں۔ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے اگر تمہاری ملت میں پلٹ آئیں جبکہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے۔ہمارے لئے تو اس طرف پلٹنا اب کسی طرح ممکن نہیں الا یہ کہ ہمارا رب ہی ایسا چاہے ہمارے رب کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔اس پر ہم نے اعتماد کر لیا۔اے رب' ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔" اس کی قوم کے سرداروں نے 'جو اس کی بات ماننے سے انکار کر چکے تھے 'آپس میں کہا "اگر تم نے شعیب کی پیروی قبول کر لی تو برباد ہو جاؤ گے۔" مگر ہوا یہ ایک دہلا دینے والی آفت نے ان کو آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ ایسے مٹے کہ گویا کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے۔شعیب کے جھٹلانے والے ہی آخر کار برباد ہو کر رہے اور شعیب یہ کہہ کر ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ "اے برادران قوم میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔اب میں اس قوم پر کیسے افسوس کروں جو قبول حق سے انکار کرتی ہے۔"

ان دو نمونوں کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ ان دو قصوں کے علاوہ جو اور قصے لائے گئے تھے ان کا حال کیا ہے۔ ان تمام قصوں میں ایک ہی نظریہ حیات کو پیش کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام اولاد آدم کے لئے بھیجا۔ ہر قوم کے پاس ایک رسول بھیجا اور تمام اقوام کے منکر مستکبرین نے رسولوں کے ماننے والے متبعین اور مستضعفین کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا۔یہ بات بھی تمام قصوں میں یکساں ہے کہ رسولوں اور ان کے ——— قلوب اور اذہان میں یہ نظریہ کس قدر واضح تھا اور یہ کہ ان رسولوں اور اہل ایمان کے دلوں کے اندر یہ خواہش کس طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ ان کی پوری قوم راہ ہدایت کو اختیار کرے اور جب رسولوں کی اقوام نے مکمل سرکشی اور عناد اور انکار کا مظاہرہ کر دیا تو رسولوں نے اور ان کے متبعین نے ان اقوام کے ساتھ پورا پورا بائیکاٹ کر دیا اور رسولوں نے یاد دہانی اور ڈراوے کا فریضہ ترک کر دیا۔اس لئے کہ جھٹلانے والوں نے انکار پر مکمل اصرار کیا اور کسی طرح بھی مان کر نہ دیا۔

اس مقام پر آکر اس سورہ میں تمام رسولوں کے قصص کا بیان رک جاتا ہے۔ایک مختصر تبصرہ آتا ہے اور اس تبصرے میں اللہ کی اس سنت کا تذکرہ ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے رسول آتے ہیں اور کوئی قوم ان کے پیغام اور دعوت کو مکمل طور پر رد کر دیتی ہے تو اللہ کی سنت اپنا کام کس طرح کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی اقوام کو مصائب و مشکلات سے دوچار کرتا ہے۔اس لئے کہ شاید ان کے دلوں کے اندر نرمی پیدا ہو جائے۔وہ خواب غفلت سے جاگ اٹھیں اور دعوت کو قبول کر لیں۔اور جب ان مصائب اور مشکلات کی وجہ سے وہ مائل بحق نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ انہیں چھٹی دے کر ان پر اچھے دن لے آتے ہیں۔ مشکلات کے مقابلے میں خوشحالی بہت ہی خطرناک فتنہ ہوتی ہے۔ اچھے

دنوں میں وہ سنت الٰہیہ کو پوری طرح بھول جاتے ہیں۔ اور پھر اللہ کا ایک سخت عذاب انہیں اچانک آلیتا ہے درآں حالیکہ انہیں کوئی شعور و احساس نہیں ہوتا۔

جب اللہ اپنی اس سنت کی وضاحت فرماتے ہیں تو پھر انہیں اللہ کے اس عذاب سے خبردار کیا جاتا ہے جو انہیں اچانک آلے گا۔ اور وہ غفلت میں سو رہے ہوں گے۔ کیونکہ سنت الٰہیہ ان کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ یہ سورہ لوگوں کو اس طرح متوجہ کرتی ہے کہ کیا ان لوگوں کی تباہی کا نقشہ ان لوگوں کے لئے کافی نہیں کہ لوگ اپنے گھروں کے اندر پڑے کے پڑے رہ گئے۔

(وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ (۹۴) ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰی عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (۹۵) وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ (۹۶) اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤی اَنْ یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا بَیَاتًا وَّهُمْ نَآىِٕمُوْنَ (۹۷) اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤی اَنْ یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًی وَّهُمْ یَلْعَبُوْنَ (۹۸) اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ فَلَا یَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ (۹۹) اَوَلَمْ یَهْدِ لِلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ اَهْلِهَاۤ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَنَطْبَعُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ (۱۰۰) تِلْكَ الْقُرٰی نَقُصُّ عَلَیْكَ مِنْ اَنْۢبَآىِٕهَا وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِ الْكٰفِرِیْنَ (۱۰۱) وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ وَاِنْ وَّجَدْنَاۤ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِیْنَ (۱۰۲) (۷: ۹۴ تا ۱۰۲))

"اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں نبی بھیجا ہو اور اس بستی کے لوگوں کو تنگی اور سختی میں مبتلا نہ کیا ہو' اس خیال سے کہ شاید وہ عاجزی پر اتر آئیں۔ پھر ہم نے ان کی بدحالی کو خوشحالی سے بدل دیا یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پھولے اور کہنے لگے: "ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور برے دن آتے رہے ہیں۔" آخر کار ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا اور انہیں خبر تک نہ ہوئی۔ اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش

اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے مگر انہوں نے تو جھٹلایا' لہٰذا ہم نے اس بری کمائی کے حساب میں انہیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔پھر کیا بستیوں کے لوگ اب اس سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ ہماری گرفت کبھی اچانک ان پر رات کے وقت نہ آجائے گی جبکہ وہ سوئے پڑے ہوں ؟ یا انہیں اطمینان ہوگیا ہے کہ ہمارا مضبوط ہاتھ کبھی یکایک ان پر دن کے وقت نہ پڑے گا کہ وہ کھیل رہے ہوں؟ کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں؟ حالانکہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو۔اور کیا ان لوگوں کو جو سابق اہل زمین کے بعد زمین کے وارث ہوئے ہیں اس امرواقعی نے کچھ سبق نہیں دیا کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے قصوروں پر انہیں پکڑ سکتے ہیں اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں پھر وہ کچھ نہیں سنتے۔یہ قومیں جن کے قصے ہم تمہیں سنا رہے ہیں ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے' مگر جس چیز کو وہ ایک دفعہ جھٹلا چکے تھے اسے وہ ماننے والے نہ تھے۔دیکھو اس طرح ہم منکرین حق کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔ہم نے ان میں سے اکثر میں کوئی پاس عہد نہ پایا بلکہ اکثر کو فاسق ہی پایا۔

اس کے بعد قرآن کریم فرعون اور اس کے مددگاروں کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معرکے کی داستان کو لیتا ہے اور بنی اسرائیل کی کہانی شروع ہوتی ہے۔اس قصے کی اس سورہ میں تمام قرآن کریم کے مقابلے میں زیادہ تفصیلات دی گئی ہیں اور اس کے کئی حلقے یہاں تفصیل کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔بعض حلقے دینے کے بعد سیاق کلام میں ایک وقفہ دیا جاتا ہے اور اس میں اس پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔جب یہ قصہ ختم ہو جاتا ہے تو سورہ کے آخر تک اس پر طویل تبصرہ ہوتا ہے۔

اس سے قبل جو سورتیں نازل ہوگئی تھیں' ترتیب نزولی کے مطابق' سورہ مزمل' الفجر' ق اور القمر میں قصہ موسیٰ و فرعون کے مختصر اشارات دیئے گئے تھے۔یہ پہلی سورہ ہے جس میں اس قصے کی طویل کڑیاں لائی گئی ہیں اور وسیع حصوں کو لیا گیا ہے۔اس میں پہلے تو یہ کڑی لائی گئی ہے کہ فرعون نے دعوت اسلامی کا مقابلہ کس طرح کیا۔پھر جادوگروں کے چیلنج کو لایا گیا ہے۔یہ دونوں حصے دوسری سورتوں میں بھی مذکور تھے۔ایک نئی بات جو یہاں لائی گئی وہ یہ تھی کہ قوم فرعون پر برے دن آئے' آفات و بلیات 'طوفان' ٹڈی دل کے حملے' خون' مینڈکوں اور سرسریوں کی کثرت وغیرہ عذاب ان پر آئے۔یہ تفصیلات صرف اسی سورہ میں دی گئیں' یہاں فرعون اور اس کی فوج کی غرقابی کا ذکر ہے۔اس کے بعد یہ عجیب بات کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ ان کے لئے ایک ایسا الٰہ بنائیں جو دوسری قوموں کے الٰہوں کی طرح ہو یعنی بت جس طرح سینائی میں انہوں نے بعض بت پرست اقوام کے ہاں دیکھا۔پھر حضرت موسیٰ کی مناجات کو بھی یہاں لایا گیا ہے جس میں آپ نے رویت باری کا مطالبہ کیا اور جب انوار الٰہی پہاڑ پر اترے تو وہ ریزہ ریزہ ہوگیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوگئے۔پھر تختیوں کا نزول اور بنی اسرائیل کی جانب سے بچھڑے کی پوجا۔پھر ستر افراد کے ساتھ موسیٰ کا طور پر جانا اور ان کا بے ہوش ہو جانا۔انہوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ وہ اللہ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔اس کے بعد ان کا ایک گاؤں میں آباد ہونا اور سبت کے دن شکار کرنا۔پھر ان کے اوپر پہاڑ کا سایہ فگن ہونا اور تمام تفصیلات جن کی وجہ سے یہ قصہ قرآن کریم کے ایک بہت بڑے حصے پر منتقل ہوگیا ہے۔

ایک موقعہ پر اس قصے میں سیاق کلام نبی آخرالزماں کی طرف پھر جاتا ہے اور آخری نبوت کی حقیقت اور اس کی

دعوت کے بنیادی عناصر سے بحث کی جاتی ہے۔ یہ اس وقت جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں کے بارے میں دعا کی جو بے ہوش ہوگئے تھے۔ اس کے بعد اللہ کی رحمت آئی۔ اس موقعے پر قرآن نے نبوت آخرہ کے بارے میں ایک جھلک دکھا دی کیونکہ ان قصص سے مراد اور غرض و غایت یہی تھی کہ لوگوں کو آخری نبوت کے بارے میں آگاہ کیا جائے۔ ملاحظہ کیجئے:

(وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ (۱۵۵) وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۵۶) اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۵۷) (۷:۱۵۵ تا ۱۵۷)) "اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو منتخب کیا تاکہ وہ ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر حاضر ہوں۔ جب ان لوگوں کو ایک سخت زلزلے نے آ پکڑا تو موسیٰ نے عرض کیا "اے میرے سرکار! آپ چاہتے تو پہلے ہی ان کو اور مجھے ہلاک کر سکتے تھے۔ کیا آپ اس قصور میں جو ہم میں سے چند نادانوں نے کیا تھا' ہم سب کو ہلاک کر دیں گے؟ یہ تو آپ کی ڈالی ہوئی ایک آزمائش تھی جس کے ذریعے آپ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت بخش دیتے ہیں۔ ہمارے سرپرست تو آپ ہی ہیں۔ پس ہمیں معاف کر دیجئے اور ہم پر رحم فرمایئے' آپ سب سے بڑھ کر معاف فرمانے والے ہیں۔ اور ہمارے لئے اس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجئے اور آخرت کی بھی' ہم نے آپ کی طرف رجوع کر لیا۔" جواب میں ارشاد ہوا: "سزا تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے' اور اسے میں ان لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے' زکوٰۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے جو اس پیغمبر' نبی امی کی پیروی اختیار کریں گے جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے' بدی سے

روکتا ہے ' ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے ' جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے ۔ لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے ' وہی فلاح پانے والے ہیں ۔"

اس سچی خبر کی روشنی میں اور اس سابقہ عہد کے نتیجے میں ' اللہ تعالیٰ نبی آخر الزماں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنی نبوت کے اساسی عناصر ترکیبی کا اعلان کر دیں اور یہ بتا دیں کہ آپ کی نبوت کے اہداف کیا ہیں اور اس رب ذوالجلال کی حقیقت کا اعلان کر دیں جس نے آپ کو بھیجا ہے اور اس نظریاتی اصل الاصول کا اعلان کر دیں جو تمام رسولوں کی دعوت کی اساس تھا ۔

(قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۷ : ۱۵۸)) "اے محمد کہو "اے انسانو ' میں تم سب کی طرف خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے ۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے ۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے ' پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امی پر جو اللہ اور اس کے ارشاد کو مانتا ہے اور پیروی اختیار کرو اس کی ' امید ہے کہ تم راہ راست پالو گے ۔"

اس واقعے کے بعد قصہ موسیٰ و فرعون آگے بڑھتا ہے ۔ بنی اسرائیل کے ساتھ عہد ' پہاڑ کا سایہ اور اس کے نتیجے میں ان کے ساتھ پختہ معاہدہ اور بنی اسرائیل کے اس عہد و پیمان ہی کی مناسبت سے اس عہد کا تذکرہ بھی کر دیا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی فطرت سے لیا تھا ۔

(وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ (۱۷۲) اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ (۱۷۳) (۷ : ۱۷۲ - ۱۷۳)) "اور اے نبی" لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا: "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" انہوں نے کہا: "ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں 'ہم اس پر گواہی دیتے ہیں ۔" یہ ہم نے اس لئے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ یہ تو اس بات سے بے خبر تھے ۔" یا یہ نہ کہنے لگو کہ "شرک کی ابتداء تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے ' پھر کیا آپ ہمیں اس تصور میں

پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا۔

اس کے بعد اس قصے پر کئی تبصرے سامنے آتے ہیں - ایک تبصرہ فطری عہد کے بعد آتا ہے - اس میں اس شخص کی صورت حال کا نقشہ کھینچا گیا ہے جسے اللہ نے اپنی نشانیاں عطا کیں اور وہ اس سے نکل گیا - مثلاً بنی اسرائیل اور وہ تمام دوسری اقوام جنہیں اللہ نے اپنی نشانیاں عطا کیں لیکن انہوں نے ان کی پابندی نہ کی - یہ ایک ایسا تبصرہ ہے جس میں تمام اشکال اور تمام حرکات اور اشارات ہماری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں اور سورہ انعام جیسے مناظر اور مشاہد سامنے آتے ہیں -

(وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ (۱۷۵) وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۱۷۶) سَآءَ مَثَلَا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ (۱۷۷) مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۷۸) وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۱۷۹) (۷:۱۷۵ تا ۱۷۹)) "اور اے محمدؐ ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا - مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا - آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا - یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا - اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعے سے بلندی عطا کرتے 'مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا' لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے - یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں - تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو' شاید کہ یہ غور و فکر کریں - بڑی ہی بری مثال ہے ایسے لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا' اور وہ آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرتے رہے ہیں جسے اللہ ہدایت بخشے بس وہی راہ راست پاتا ہے - اور جسے اللہ اپنی راہنمائی سے محروم کر دے وہی ناکام و نامراد ہو کر رہتا ہے - اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لئے پیدا کیا ہے - ان کے پاس دل ہیں مگر ان سے سوچتے نہیں' ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں - ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے ہیں - وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے اور یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں -

اب براہ راست نظریاتی مباحث آتے ہیں - نظریاتی مباحث کے ساتھ بعض کائناتی شواہد و مؤثرات بھی پیش کیے

جاتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کے عذاب اور اس کی سخت پکڑ سے ڈرایا جاتا ہے۔ ان کے دلوں کو ٹٹولا جاتا ہے کہ وہ غور و فکر کریں' اللہ کی آیات میں تدبر کریں اور اس رسول اور اس کی رسالت کے بارے میں سوچ سے کام لیں۔

(وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِىْ اَسْمَآئِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۸۰) وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (۱۸۱) وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۸۲) وَاُمْلِىْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِىْ مَتِيْنٌ (۱۸۳) اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۱۸۴) اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِىْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَىْءٍ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ فَبِاَىِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ (۱۸۵) مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ وَيَذَرُهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۱۸۶)) (۷ : ۱۸۰ تا ۱۸۶)) "اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے' اس کو اچھے ناموں ہی سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے نام رکھنے ہیں' وہ راستی سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں اس کا بدلہ وہ پاکر رہیں گے۔ ہماری مخلوق میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ہدایت اور حق ہی کے مطابق انصاف کرتا ہے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے' تو انہیں ہم بتدریج ایسے طریقے سے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انہیں خبر تک نہ ہو گی۔ میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں' میری چال کا کوئی توڑ نہیں۔ اور کیا ان لوگوں نے کبھی سوچا نہیں؟ ان کے رفیق پر جنون کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ تو ایک خبردار کرنے والا ہے جو صاف صاف متنبہ کر رہا ہے۔ کیا ان لوگوں نے آسمان و زمین کے انتظام پر کبھی غور نہیں کیا اور کسی چیز کو بھی جو خدا نے پیدا کی ہے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا؟ اور کیا یہ بھی انہوں نے نہیں سوچا کہ شاید ان کی مہلت زندگی پوری ہونے کا وقت قریب آلگا ہو؟ پھر آخر پیغمبر کی اس تنبیہ کے بعد اور کون سی بات ایسی ہو سکتی ہے جس پر یہ ایمان لائیں؟ جس کو اللہ راہنمائی سے محروم کر دے اس کے لئے پھر کوئی راہنمائی نہیں ہے اور اللہ انہیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔

اس کے بعد اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو اپنی دعوت کی نوعیت سے آگاہ کریں اور اس نظریہ حیات میں رسول کے حدود کار سے آگاہ کریں۔ یہ بات ان کے اس سوال کے جواب میں آتی ہے جس میں انہوں نے رسول سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ اس قیامت کے وقت کا تعین کر دیں جس سے وہ انہیں ہر وقت ڈراتے رہتے ہیں۔

(یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً یَسْئَلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِیٌّ عَنْهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۱۸۷) قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۱۸۸) (۷ : ۱۸۷ – ۱۸۸)) ”یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر وہ قیامت کی گھڑی کب نازل ہو گی؟ کہو اس کا علم میرے رب ہی کے پاس ہے۔ اسے اپنے وقت پر وہی ظاہر کرے گا۔ آسمانوں اور زمین میں وہ بڑا سخت وقت ہو گا۔ وہ تم پر اچانک آ جائے گا۔“ یہ لوگ اس کے متعلق تم سے اس طرح پوچھتے ہیں گویا کہ تم اس کی کھوج میں لگے ہوئے ہو۔ کہو ”اس کا علم تو صرف اللہ کو ہے مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔“ اے محمدؐ، ان سے کہو کہ ”میں اپنی ذات کے لئے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے، وہ ہوتا ہے۔ اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لئے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں ایک محض خبردار کرنے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں ان لوگوں کے لئے جو میری بات مانیں۔

---ooo---

اس کے بعد قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ نفس انسانی جس سے اللہ نے عہد لیا تھا کہ وہ راہ ہدایت پر قائم رہے گا کس طرح اس عقیدۂ توحید کو ترک کر دیتا ہے جس کا اقرار اس کی فطرت نے کیا تھا۔ یہاں شرک کی کراہت اور شریک معبودوں کی کمزوری کو بیان کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ان معبودوں کی تحدی کریں کہ وہ کس قدر عاجز ہیں۔

(قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِیْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ (۱۹۵) اِنَّ وَلِیِّ َ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ وَهُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ (۱۹۶) وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ (۱۹۷) وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَسْمَعُوْا وَتَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ وَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (۱۹۸))(۷: ۱۹۵ تا ۱۹۸)) ”اے محمد ان سے کہو کہ ”بلا لو اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو، پھر تم سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو، میرا حامی و ناصر وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت کرتا ہے، بخلاف اس کے تم جنہیں، خدا کو چھوڑ کر، پکارتے ہو وہ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد ہی کرنے کے قابل ہیں بلکہ اگر تم انہیں

سیدھی راہ پر آنے کے لئے کہو تو وہ تمہاری بات سن بھی نہیں سکتے ۔ بظاہر تم کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر فی الواقعہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے ۔"

اب آگے خطاب صرف حضور ؐ سے کیا جاتا ہے اور یہ آخر تک چلتا ہے ۔ یاد رہے کہ سورہ کا آغاز بھی براہ راست حضور ؐ کے خطاب کے ساتھ ہوا تھا ۔ یہاں حضور ؐ کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کریں گے ۔ دعوت کو لے کر کس طرح بڑھیں گے ۔ راستے کی مشکلات پر کس طرح قابو پائیں گے 'لوگوں کی سازشوں اور ایذا رسانیوں پر کس طرح قابو پائیں گے ۔ وہ اور اہل ایمان قرآن پر کس طرح کان دھریں گے ۔ وہ اللہ کو ہر وقت کس طرح یاد کریں گے اور اس کے ساتھ ایک تعلق کس طرح قائم رکھیں گے ۔ نیز یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے ہاں ملائکہ کس طرح اللہ کو یاد کرتے ہیں ۔

(خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (۱۹۹) وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۰۰) اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (۲۰۱) وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِى الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ (۲۰۲) وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۲۰۳) وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۲۰۴) وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ (۲۰۵) اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ (۲۰۶) (۷ : ۱۹۹ تا ۲۰۶)) "اے نبی ' نرمی اور درگزر کا طریقہ اختیار کرو ' معروف کی تلقین کئے جاؤ ' اور جاہلوں سے نہ الجھو ۔ اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو ۔ وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے ۔ حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگ جاتا ہے کہ ان کے لئے صحیح طریق کار کیا ہے ۔ رہے ان کے (شیطانوں کے) بھائی بند ' تو وہ انہیں کج روی میں کھینچے لئے چلے جاتے ہیں اور انہیں بھٹکانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے ۔ اے نبی ' جب تم ان لوگوں کے سامنے کوئی نشانی پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے ان کے لئے کوئی نشانی کیوں نہ انتخاب کر لی؟ ان سے کہو "میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں ۔ جو

میرے رب نے میری طرف بھیجی ہے۔ یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اسے قبول کریں۔ جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو' شاید کہ تم پر بھی رحمت کی جائے۔" اے نبی اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو۔ دل ہی دل میں زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ۔ تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ جو فرشتے تمہارے رب کے حضور تقرب کا مقام رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آکر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کے آگے جھکتے ہیں۔"

امید ہے کہ اس خلاصے اور ان اقتباسات سے سورہ اعراف کے خدوخال واضح ہو گئے ہوں گے۔ اور اس میں اور سورہ انعام میں فرق و امتیاز بھی واضح ہو گیا ہو گا کہ دونوں سورتیں ایک ہی موضوع کو کس طرح مختلف انداز میں بیان کرتی ہیں۔ دونوں کا موضوع اسلامی عقیدہ اور نظریہ حیات ہے۔ جہاں تک ہر موضوع پر تفصیلی بات کا تعلق ہے وہ نصوص پر تفصیلی بحث کے وقت آئے گی۔ ان شاء اللہ' اللہ کے فضل و کرم سے!

---ooo---

سورۃ الاعراف مکیۃ (۳۹)
آیاتھا ۲۰۶ رکوعاتھا ۲۴
بسم اللہ الرحمن الرحیم

# درس نمبر ۲۷ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۹

(المص) الف لام میم صاد' سورہ کا آغاز ان حروف مقطعات سے کیا گیا ہے۔سورہ بقرہ کے آغاز میں ہم ان پر بحث کر آئے ہیں۔اسی طرح سورہ آل عمران کے آغاز میں بھی۔ان کی تفسیر کے سلسلے میں ہم نے اس رائے کو ترجیح دی ہے کہ ان سے مراد یہ ہے کہ یہ سورہ ایسے ہی حروف سے بنی ہوئی ہے اور عربی زبان کے ان حروف تہجی کو تمام لوگ استعمال کرتے ہیں لیکن کوئی شخص اس میٹریل سے قرآن جیسا کلام نہیں بنا سکتا اور یہ بذات خود اس بات کے لئے شاہد عادل ہے کہ قرآن انسان کا بنایا ہوا کلام نہیں ہے کیونکہ یہ حروف اور عربی زبان کے الفاظ ان کے سامنے موجود ہیں۔لیکن وہ ان سے قرآن نہیں بنا سکتے۔ہم نے یہ رائے بطور ترجیح اختیار کی ہے۔ہم جزم سے کوئی بات نہیں کہہ سکتے واللہ اعلم۔

اس لحاظ سے پھر ترکیب یوں ہوگی کہ المص مبتدا ہے اور کتاب انزل الیک اس کی خبر ہے۔یعنی ان حروف اور کلمات سے مرکب یہ کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے۔اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ (المص) صرف اشارہ ہے جس سے یہ مفہوم اخذ ہوتا ہے اور کتاب خبر ہے اور مبتدا محذوف ہے یعنی (ھٰذا کتٰبٌ)

الٓمّٓصٓ ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾

"ا' ل' م' ص۔یہ ایک کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے' پس اے نبی ؐ تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو۔اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے (منکرین کو) ڈراؤ اور ایمان لانے والوں کو نصیحت ہو۔"

یہ کتاب تمہاری جانب اتاری گئی ہے تاکہ تم لوگوں کو بھلایا ہوا سبق یاد دلاؤ اور انجام بد سے ڈراؤ۔اس میں جو سچائی ہے اسے صاف صاف لوگوں کے سامنے بیان کر دیں اور اس بات کا خیال نہ کریں کہ لوگ اسے پسند کرتے ہیں یا نہیں۔یہ کتاب آئی ہی اس لئے ہے کہ لوگوں کے سامنے وہ حقائق پیش کرے جسے وہ پسند نہیں کرتے' یہ آئی ہی اس لئے ہے کہ غلط عقائد' رسومات اور غلط تعلقات کو ختم کرے اور باطل نظامہائے حکومت' باطل قوانین اور باطل معاشروں کا مقابلہ کرے۔لہٰذا اس کتاب کی راہ میں مشکلات بہت ہیں' اس کتاب کا پیغام لے کر جو بھی آئے گا' اسے مشکلات کو انگیز کرنا ہوگا۔اس کتاب کے اس پہلو کا ادراک وہی شخص کر سکتا ہے' جیسا کہ ہم نے سورہ پر

تبصرے کے وقت کہا' جو اس کے پیغام کو لے کر اٹھے ۔ اس کتاب کے نظریات کا اعلان بانگ دہل کر دے اور اس راہ میں جو مشکلات پیش ہوں انہیں برداشت کرے ۔ اس حقیقت کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو اس کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے لئے اہداف طے کرے اور وہ جاہلی معاشرے کو جڑوں سے' اس کے تنے اور شاخوں سمیت اکھاڑ پھینکنے اور اس کی جگہ مکمل تغیر اور انقلاب لانے کا داعیہ اپنے اندر رکھتا ہو' جس طرح اس کتاب کے حامل اول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لے کر دنیا میں انقلاب برپا کیا تھا اور طاغوت اور جاہلیت کا مقابلہ کیا اور پہلے جزیرۃ العرب میں اور پھر پوری دنیا کی کایا پلٹ دی تھی ۔

اس کتاب کے ساتھ یہ طرز عمل اس وقت جزیرۃ العرب اور اس کے ارد گرد کے ماحول میں لائے جانے والے انقلاب تک ہی موقوف و مخصوص نہ تھا' کیونکہ اسلام کوئی حادثہ یا تاریخ نہیں ہے کہ ایک وقفہ تاریخ میں واقعہ ہو گیا اور اس کے بعد لوگوں نے اسے تاریخ میں لکھنا شروع کر دیا ۔ اسلام تو انسانیت کے بالمقابل ایک دائمی تحریک ہے اور یہ تحریک قیامت تک رہے گی ۔ اسلام لوگوں کے لئے وہی پیغام ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے تھا ۔ جب بھی انسانیت صراط مستقیم سے انحراف کرے' اسلام اسے روکتا ہے اور واپس اسے جادہ مستقیم پر ڈال دیتا ہے اس لئے کہ تاریخی عوامل کے تحت انسانیت بار بار جاہلیت کی طرف لوٹ جاتی ہے ۔ یہ اس کی پسماندگی اور رجعت ہوتی ہے لیکن اسلامی تحریک اس مرحلے پر آگے بڑھتی ہے ۔ دوبارہ اسلام کی تجدید ہو جاتی ہے اور اس کمزوری کے بعد اسلام دوبارہ ایک قوت بن کر اٹھتا ہے اور دوبارہ انسانیت کو ترقی اور تہذیب و تمدن کی راہ پر ڈال دیتا ہے ۔ ہر دور میں اس تحریک کے قائدین کو وہ مشکلات پیش آتی ہیں جو داعی اول کو پیش آئیں' اس لئے کہ جب انسانیت جاہلیت کے گندے کیچڑ میں لت پت ہوتی ہے تو انہیں اس پوری انسانیت کو کھینچ کر واپس لانا ہوتا ہے' کیونکہ جاہلیت میں انسانیت فکری گمراہی میں مبتلا ہوتی ہے ۔ اس کے تصورات تاریک ہو جاتے ہیں' وہ نفسیاتی خواہشات کی تاریکیوں میں گرفتار ہوتی ہے' وہ ظلم اور ذلت' غلامی اور ذاتی خواہشات' مفادات و اغراض کا شکار ہوتی ہے اور جو شخص انسانیت کو اس جاہلیت اور گندگی سے نکالنا چاہتا ہے' اسے اس قسم کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ اس لئے کہ وہ اس جہان کو ان گندگیوں سے پاک کرنے کے لئے تحریک چلاتا ہے اور اس تحریک میں وہ اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کو خوب سمجھ سکتا ہے ۔

(الٓمٓصٓ (۱) كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۲) (۷ : ۱ ـ ۲)) "ا' ل' م' ص ۔ یہ ایک کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے' پس اے نبی تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو ۔ اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے (منکرین کو) ڈراؤ اور ایمان لانے والوں کو نصیحت ہو ۔"

ایک مومن اپنے معاشرے کے حالات سے یہ اندازہ کر لیتا ہے کہ مومن کون ہیں جنہیں نصیحت کی جاتی ہے اور غیر مومن کون ہیں جن کے لئے انذار کا حکم ہے ۔ اس تحریکی کارکن کے لئے یہ قرآن ایک زندہ کتاب ہوتی ہے' جسے پڑھتے ہوئے وہ محسوس کرتا ہے کہ گویا یہ کتاب ابھی نازل ہو رہی ہے ۔ یہ کتاب اس شخص کے لئے تازہ پیغام ہوتی ہے جب وہ اسے بطور پیغام لے کر پوری دنیا کے خلاف جدوجہد شروع کر دے ۔

اس وقت پوری انسانیت کی حالت ویسی ہی ہے جس طرح اس وقت تھی جب یہ کتاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ اس وقت حضور ؐ کو حکم تھا کہ آپ تذکیر اور انذار کا فریضہ سرانجام دیں اور جب آپ جاہلیت کے مقابلے میں اٹھیں تو آپ کے دل میں کوئی جھجک نہیں ہونا چاہئے۔ آپ کے اندر یہ داعیہ ہونا چاہئے کہ آپ نے جاہلیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔

آج گردش دوراں نے حالات کو اسی مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جس طرح آج سے چودہ سو سال پہلے نزول قرآن کے وقت تھے۔ اس وقت دنیا مکمل طور پر جاہلیت کی طرف لوٹ گئی ہے۔ اس نے اصول و فروع دونوں میں جاہلیت کو اپنا لیا ہے' اس کا ظاہر و باطن اور اس کی سطح اور گہرائی سب کی سب جاہلیت میں ہے۔

اس وقت انسانیت کے تمام تصورات و نظریات جاہلی ہیں۔ یہاں تک کہ جن کے آباؤ اجداد مومن تھے اور مومنین مخلصین تھے انہوں نے بھی پوری طرح جاہلی افکار کو اپنا لیا ہے۔ ان کے تصورات و خیالات میں دین اسلام کا وہ مفہوم باقی نہیں رہا جو حقیقت میں ہے۔ انہوں نے اسلامی نظام کا مفہوم ہی بدل دیا ہے۔

یہ دین تو اس دنیا میں اس لئے آیا تھا کہ وہ اس کرۂ ارض کے خدوخال ہی بدل دے اور اس کی جگہ اسے ایک نیا روپ دے۔ یہاں صرف اللہ کا اقتدار اعلیٰ قائم کرے اور طاغوت کے اقتدار کا خاتمہ کر دے۔ یہ دنیا ایسی دنیا ہو جس میں صرف اللہ کی مکمل بندگی ہو' اور اللہ کے علاوہ انسانوں میں سے کوئی اپنی بندگی نہ کرائے۔ ایک ایسی دنیا ہو جس میں لوگ آزادی کے ساتھ انسانوں کی بندگی سے باہر نکل آئیں۔ اس دنیا میں آزاد' شریف اور پاکدامن انسان پیدا ہوں' وہ خود اپنی شہوات سفلیہ سے بھی آزاد ہوں اور دوسرے لوگوں کی غلامی سے بھی آزاد ہوں۔

یہ دین اس لئے آیا تھا کہ دنیا میں یہ اصول قائم کرے (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) 'یعنی اللہ کے سوا کوئی حاکم اور مقتدر اعلیٰ نہیں ہے۔ انسانی تاریخ میں تمام انبیاء یہی دعوت لے کر آتے ہیں۔ یہ سورہ اور قرآن کریم کی دوسری نصوص و آیات اس بات کی صراحت کرتی ہیں کہ (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) کا مفہوم صرف یہی ہے کہ اقتدار اعلیٰ اللہ کے سوا کسی اور کا نہیں ہے اور جس طرح اللہ اس کائنات کے اوپر حاکم ہے' اسی طرح وہ انسان کی زندگی کے اوپر بھی حاکم ہے۔ وہ اپنے نظام قضا و قدر کے ذریعے اس کائنات اور خود انسان کی طبیعی زندگی پر حکمران ہے لہٰذا وہ انسانوں کے قانونی اور ذاتی نظام کے متعلق امور پر بھی حاکم ہے۔ اس اصول کے تحت جس طرح ایک مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ اس جہاں کی تکوینی زندگی میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ صرف وہی متصرف ہے اور ایک مسلمان بندگی کے مراسم جس طرح صرف اللہ کے سامنے بجا لاتا ہے اسی طرح دستور و قانون میں بھی وہ صرف اسی اللہ کا مطیع ہے۔ وہ اپنی اقدار اور حسن و قبح کے پیمانے بھی اسی سے اخذ کرتا ہے۔ عقائد و نظریات بھی اللہ سے اخذ کرتا ہے اور وہ ہرگز کسی طاغوت کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اللہ کے اس اقتدار اعلیٰ کا کوئی حصہ اپنے لئے مختص کر لے یا اللہ کے ساتھ شریک ہو جائے۔

غرض اعتقاد و نظریے کے اعتبار سے یہ اس دین کا بنیادی اصول ہے۔ اس اصول کی روشنی میں اگر ہم آج دنیا پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا نے اس اساسی اصول کو ترک کر دیا ہے۔ اس دنیا میں فرقے فرقے ہیں اور یہ سب فرقے جاہلیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

ایک گروہ ملحدین کا گروہ ہے اور یہ لوگ سرے سے وجود باری تعالیٰ کے منکر ہیں' ان پر کسی تبصرے کی کوئی

ضرورت نہیں ہے۔ ایک گروہ بت پرستوں کا ہے' جو ایک اللہ کے وجود کے تو قائل ہیں لیکن وہ اس خدا کے ساتھ دوسرے خداؤں کو شریک کرتے ہیں اور انہوں نے کئی رب بنا رکھے ہیں مثلاً ہند اور وسطی افریقہ اور بعض دوسرے علاقوں میں بھی ایسے لوگ ہیں۔

ایک گروہ اہل کتاب کا ہے یعنی یہود و نصاریٰ کا۔ یہ لوگ اللہ کے بیٹے کے قائل ہیں اور بیٹے کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں اور اپنے احبار اور رہبان کو ایسا سمجھتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے احبار و رہبان کی حاکمیت اعلیٰ اور حق قانون سازی کو تسلیم کر لیا ہے اگرچہ یہ ان کی نماز نہیں پڑھتے اور ان کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوتے اور نہ ان کے سامنے جھکتے ہیں۔ آج کے دور میں عیسائیوں نے اپنی زندگی سے اللہ کے اقتدار کو خارج کر دیا ہے اور انہوں نے اپنے لئے نظامہائے زندگی تجویز کر لئے ہیں جنہیں وہ سرمایہ داری' اشتراکیت اور دوسرے ناموں سے پکارتے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے نظامہائے حکومت بھی تجویز کر لئے ہیں جسے وہ جمہوریت اور ڈکٹیٹرشپ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے اللہ کے اصول و دستور کو کلیتاً ترک کر دیا ہے۔ جیسا کہ یونانی اور رومی جاہلیت نے اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو ترک کر کے اپنا نظام زندگی اور نظام حکومت خود گھڑ لیا تھا۔

ایک گروہ وہ ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے لیکن اپنی زندگی میں وہ اہل کتاب کے نظام کا مطیع ہے۔ وہ پوری طرح اہل مغرب کے عیسائیوں کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ فرقہ اللہ کے نظام کو ترک کر کے اہل مغرب کے نظام کو اپنا چکا ہے۔ اللہ کا دین قرآن و سنت اور اسلامی شریعت ہے اور یہی اسلامی نظام قانون و دستور ہے اور انسانوں کا دین انسانوں کا بنایا ہوا دستور اور قانون ہے۔

لہٰذا بات یہی ہے کہ زمانہ گردش کر کے اسی مقام پر آگیا ہے جس پر اس وقت تھا جب پہلے پہل دین اسلام انسانوں کی ہدایت کے لئے آیا۔ لوگ دین اسلام کو ترک کر کے جاہلیت کی طرف لوٹ گئے ہیں اور فرقے فرقے بن گئے ہیں لیکن کوئی فرقہ دین اسلام کا مطیع نہیں ہے۔ آج قرآن پوری انسانیت کے لئے اسی طرح دعوت فکر و عمل ہے جس طرح اپنے نزول کے وقت تھا۔ اس دین کا آج بھی ہدف یہ ہے کہ انسان کو سب سے پہلے عقیدے اور نظریات کے زاویے سے اسلام میں داخل کرے' پھر نظام زندگی اور میدان عمل کو اسلام کے مطابق ڈھالا جائے۔ چنانچہ آج جو شخص بھی قرآنی دعوت کو لے کر اٹھتا ہے وہ ویسی ہی مشکلات سے دوچار ہو گا جس طرح کی مشکلات سے رسول اللہ دوچار ہے تھے۔ کیونکہ آپ نے جب انسانیت کو خطاب فرمایا تو وہ جاہلیت کی گندگی میں آلودہ تھی۔ جاہلیت کے صحرا میں گم کردہ راہ تھی۔ اس نے شیطان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا اور بھٹک رہی تھی۔ لہٰذا آج پہلا ہدف یہ ہونا چاہئے کہ لوگوں کے دل میں کلمہ شہادت کے مطابق اسلامی تصور حیات اور اسلامی سوچ پیدا کی جائے اور دنیا میں ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں صرف اللہ کی عبادت ہو' اور اللہ کے سوا کوئی اور حاکم اور مقتدر اعلیٰ نہ ہو۔ یوں انسان کو ایک نئی اسلامی زندگی عطا کی جائے جس میں انسان انسانوں کی زندگی سے آزاد ہو کر اور اپنی خواہشات سے آزاد ہو کر صرف اللہ کی بندگی میں داخل ہو جائے۔

اسلام کوئی تاریخی حادثہ نہیں ہے کہ وہ ایک دفعہ پیش آگیا اور پھر جس طرح اس سے پہلے کا دور ایک تاریخ ہے اور بعد کا دور بھی ایک تاریخ ہے۔ اسے آج بھی وہی کردار ادا کرنا ہے جو اس نے ایک بار پہلے ادا کیا تھا۔ وہ اس طرح کام کرے گا جیسے حالات اور واقعات میں' جیسے نظام اور معاشرے میں' جیسے عقائد و تصورات میں' جیسی اقدار اور پیمانوں میں اس نے

پہلے کام کیا تھا اور نظام باطل کا مقابلہ کیا تھا۔

یاد رہے کہ جاہلیت ایک صورت حال ہوتی ہے۔ جاہلیت تاریخ کے کسی مخصوص دور کا نام نہیں ہے۔ اس وقت اطراف عالم میں یہ جاہلیت چھائی ہوئی ہے۔ تمام فرقوں، تمام تصورات، تمام مذاہب اور تمام نظامہائے زندگی میں جاہلیت قائم و دائم ہے۔ اس کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان انسانوں کے غلام ہوں اور اس میں اللہ کی ہمہ گیر حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کا انکار ہو۔ اس کا دوسرا اصول یہ ہے کہ وہ انسانی خواہشات پر قائم ہوتی ہے، چاہے ان کی شکل و صورت جو بھی ہو۔ اس کی اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں اللہ کی شریعت کو بطور نظام حکومت تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس کے بعد اس کی شکل و صورت، اس کے خدوخال، اس کے جھنڈے اور شعائر، اس کے نام و القاب، اس کے گروہ اور مذاہب اور اس کے ملل و نحل اگرچہ مختلف ہوتے ہیں لیکن ان تمام میں مذکورہ بالا اساسی ضابطے اور اصول موجود ہوتے ہیں۔

ان اصولوں کی روشنی میں، آج اگر دنیا پر نظر ڈالی جائے تو اس میں ہر طرف جاہلیت چھائی ہوئی ہے۔ بلکہ اس وقت پوری دنیا پر جاہلیت حکمران ہے۔ اس وقت دنیا میں اسلامی نظام زندگی معطل ہے اور جو لوگ اس وقت دنیا میں اسلامی نظام زندگی کی طرف دعوت دے رہے ہیں، انہیں ویسی ہی مشکلات درپیش ہیں جیسی حضور اکرم ﷺ کو درپیش تھیں۔ ان کا ہدف وہی ہے جو رسول اللہ کا تھا اور آج یہ آیت ان سے اسی طرح مخاطب ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب تھی۔

(كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ

(۷ : ۲)) "یہ ایک کتاب ہے جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے، پس اے نبی تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو۔" اس وقت دنیا میں جس قدر معاشرے موجود ہیں، وہ جاہلی معاشرے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ پسماندہ، رجعت پسند معاشرے ہیں کیونکہ وہ دوبارہ جاہلیت کی طرف لوٹ گئے ہیں حالانکہ اسلام نے انہیں اس جاہلیت سے نجات دی تھی۔ آج بھی اسلام کا یہ فرض ہے کہ وہ ان جاہلی معاشروں کو رجعت پسندی اور پسماندگی سے نجات دے۔ اور ترقی اور ربانی ہدایات کے مطابق تہذیب و تمدن کے حصول کے لئے ان کی قیادت کے فرائض سرانجام دے۔

جب اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کے لئے مخصوص ہو جائے اور یہ اقتدار ایک معاشرے کی صورت میں روبعمل آجائے جس میں اسلامی شریعت نافذ ہو، تو یہی ایک صورت حالات ہوگی جس میں انسانیت انسانوں کی غلامی سے پوری طرح آزاد ہوگی۔ وہ ہوائے نفس اور مطلب پرستی کی غلامی سے آزاد ہوگی اور صرف یہی صورت حالات اسلامی اور متمدن صورت حالات ہوگی، اسلامی اقدار کے مطابق، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جس تہذیب و تمدن کو انسان کے لئے پسند فرماتے ہیں وہ ہر فرد کی مکمل آزادی اور شرف کے اصول پر مبنی ہے۔ اس طرح کا کوئی تمدن اللہ کو پسند نہیں ہے جس میں انسان کو ایسی آزادی حاصل ہو جس میں وہ دوسرے انسانوں کا غلام ہو اور جس میں انسان انسانوں کے رب اور خدا ہوں اور ان کے حاکم اور قانون ساز ہوں۔ بعض تابع ہوں اور بعض متبوع اور حاکم ہوں۔ قانون سازی سے مراد محض رسمی قوانین ہی نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد حسن و قبح کے پیمانے، اخلاق اور رسم و رواج بھی ہیں۔ یہ سب قوانین و ضوابط ہیں اور لوگ ان کے تابع ہوتے ہیں چاہے لوگ شعوری طور پر ان کے پابند ہوں یا غیر شعوری طور پر۔ اس قسم کے معاشروں کو

رجعت پسند اور پسماندہ معاشرے تصور کیا جاتا ہے اور اسلامی اصطلاح کے مطابق انہیں جاہلی معاشرے کہا جاتا ہے۔

جب کسی معاشرے میں اجتماعیت کی اساس نظریہ حیات پر ہو' اس کی اساس پر ایک نظام حیات بھی ہو اور یہ تصور اور نظام دونوں کا مصدر ذات باری تعالیٰ ہو' کسی ایک فرد کی خواہش نہ ہو' کسی ایک بندے کا ارادہ نہ ہو' تو یہ معاشرہ ترقی یافتہ مہذب معاشرہ ہو گا۔ اسلامی اصطلاح کے مطابق اسے ربانی اور مسلم معاشرہ کہا جائے گا۔ کیونکہ اس معاشرے میں اجتماعیت انسانی خواص پر نہ ہو گی بلکہ روحانی اور فکری تصورات پر ہو گی۔ لیکن اگر کسی اجتماعی نظام اور معاشرے کی اساس قوم' نسل وغیرہ اور زمین کی اساس پر ہو تو ایسا معاشرہ رجعت پسند اور پسماندہ معاشرہ کہلائے گا یا اسلامی اصطلاحات کے مطابق اسے جاہلی اور مشرک معاشرہ کہا جائے گا۔ اس لئے کہ قوم و نسل اور زمین و رنگ کوئی اعلیٰ انسانی اقدار نہیں ہیں کیونکہ انسان کسی نسل' کسی قوم' کسی زمین' کسی رنگ میں بھی ہو وہ بہرحال انسان رہتا ہے۔ اور اس کے اندر اگر کوئی فرق ہوتا ہے تو روح اور فکر کے ذریعے ہوتا ہے۔

انسان اپنے آزادانہ اختیار اور ارادے سے اور یہ اختیار ارادہ وہ عظیم شرف ہے جو انسان کو عطا ہوا ہے' اپنے عقائد و اپنے تصورات کو بدل سکتا ہے' بشرطیکہ اپنے فہم کے ادراک کے ذریعے وہ کسی سمت میں مائل ہو جائے اور اسے اطمینان ہو جائے' اس صورت میں گمراہی کو ترک کر کے ہدایت اپنا سکتا ہے' اور کوئی اچھا نظام حیات اپنا سکتا ہے' لیکن کوئی انسان اپنی نسل' اپنا رنگ' اپنی قوم اور اپنے اس ملک کو نہیں بدل سکتا اور زمین کا تعین نہیں کر سکتا۔ اس لئے وہ معاشرہ اور وہ اجتماعی نظام جسے لوگوں نے خود اپنے آزادانہ ارادہ سے اپنایا ہو وہ بہتر ہے یا وہ نظام جس کے اندر کوئی شخص مقہور و مجبور ہو۔ اور اس میں اس کی آزادی اور ارادے کا کوئی دخل نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت حالات شرف انسانیت کے لئے اعلیٰ و ارفع ہے اور اسے زیادہ ترقی پسندانہ کہا جا سکتا ہے۔

اگر کسی معاشرے میں انسان کی انسانیت ہی اعلیٰ قدر قرار پائے انسان کے انسانی خصائص اہمیت اور رعایت کے مستحق قرار پائیں تو وہ معاشرہ ترقی پسند اور مہذب معاشرہ قرار پائے گا اور اسلامی اصطلاح میں وہ ربانی اور مسلم معاشرہ ہو گا۔ لیکن اگر کسی معاشرے کی اساس مادے پر ہو' چاہے جس شکل و صورت میں بھی وہ ہو' اور مادہ ہی اعلیٰ قدر ہو' وہ مارکسی نظریات کے مطابق ہو' یا مادی پیداوار کے نظریہ کے مطابق ہو۔ مثلاً یورپ و امریکہ کے تمام معاشرے جہاں اعلیٰ قدر و قیمت مادی پیداوار ہے جس کے لئے انہوں نے تمام اعلیٰ انسانی اقدار اور انسانی خصوصیات کو قربان کر دیا ہے۔ اس کے لئے ان معاشروں نے تمام اخلاقی اقدار کو ثانوی حیثیت دے دی ہے تو یہ معاشرہ پسماندہ اور رجعت پسند معاشرہ تصور ہو گا اور اسلامی اصطلاح میں اسے جاہلی اور مشرکانہ معاشرہ کہا جائے گا۔

اسلام کا ربانی معاشرہ بھی مادے کو حقارت کی نظروں سے نہیں دیکھتا' نہ اس نقطہ نظر سے کہ اس پوری کائنات کی تشکیل اسی مادے سے ہوئی ہے اور نہ اس اعتبار سے کہ اس سے پیداوار حاصل کر کے انسان کو اس سے استفادہ کرنا چاہئے' کیونکہ مادہ اور مادی پیداوار اس کرۂ ارض پر انسان کے لئے اپنے فرائض خلافت ادا کرنے کے لئے ازحد ضروری ہیں۔ دنیا کی حلال چیزوں سے فائدہ اٹھانا اسلام جائز سمجھتا ہے بلکہ اس کی دعوت دیتا ہے جیسا کہ آگے ہم اس سورہ میں بتائیں گے لیکن اسلام مادے اور مادی پیداوار کو اس کائنات کی اعلیٰ قدر قرار نہیں دیتا جس کے حصول کے لے اعلیٰ انسانی اقدار کو قربان کر دیا جائے جیسا کہ تمام جاہلی اور مادی معاشرے کرتے ہیں۔

انسانی اقدار اور انسانی اخلاق ہی اگر کسی معاشرے میں سربلند ہوں' اس طرح جس طرح انہیں اللہ تعالیٰ نے وضع کیا ہے تو یہ معاشرہ مہذب اور ربانی معاشرہ ہو گا۔ اب سوال یہ ہے کہ انسانی اخلاق کیا ہیں اور انسانی اقدار کیا ہیں؟ تو یہ کوئی پوشیدہ اور ناقابل فہم مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی اخلاق و اقدار تغیر پذیر ہوتے ہیں یا ایک حالت پر نہیں رہتے جیسا کہ وہ لوگ رائے رکھتے ہیں جو اسلام کے اخلاقی نظام میں طوائف الملوکی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اعلیٰ اقدار اور اعلیٰ اخلاقی معیار انسان کی ان خصوصیات کو اجاگر کرتے ہیں جن میں وہ دوسرے حیوانات کے مقابلے میں منفرد ہے۔ انسان کے انسانی پہلو کو اس کے حیوانی پہلو پر غالب کرتے ہیں۔ اخلاقی قدریں انسان اور حیوان کے درمیان مشترکہ خصوصیات کو پروان نہیں چڑھاتیں۔ اگر اس مسئلے کو اس انداز سے لیا جائے تو اعلیٰ اقدار اور اخلاق اور محض حیوانیت کے درمیان ایک حد فاصل قائم ہو جائے گی اور اعلیٰ قدروں کو اچھی طرح سمجھا جا سکے گا۔ چنانچہ اس طرح ترقی پسندوں کے تمام فلسفے ڈھیر ہو جاتے ہیں اور سرمایہ دارانہ اخلاق' اشتراکی اخلاق' غرباء کے اخلاق اور مالداروں کے اخلاق جیسی کوئی تقسیم نہیں باقی رہتی' صرف انسانی اخلاق اور حیوانی اخلاق رہ جاتے ہیں۔ اس طرح معاشرتی اخلاق اور معاشی اخلاق کی تقسیم کوئی مستقل تقسیم نہ رہے گی۔ یہ چیزیں تعمیر اخلاق میں مستقل عوامل شمار نہیں ہوں گی اور تعمیر اخلاق میں ان کا اثر حتمی تصور ہو گا۔ اس زاویہ سے ایک طرف انسانی اخلاق اور انسانی اقدار ہوں گی اور یہ اسلامی معاشرے کے اخلاق ہوں گے اور دوسری جانب حیوانی اخلاق اور اقدار ہوں گی اور اسے پسماندہ کہا جائے گا۔ اسلامی اصطلاحات میں اس تقسیم کو اسلامی اور ربانی اخلاق و اقدار اور رجعت پسندانہ جاہلی اخلاق و اقدار کہا جاتا ہے۔

وہ معاشرے جن پر حیوانی خواہشات اور میلانات چھائے ہوئے ہوتے ہیں' وہ کبھی مہذب معاشرے نہیں بن سکتے۔ اگرچہ وہ صنعتی اور اقتصادی اعتبار سے بہت ہی ترقی یافتہ ہوں۔ انسان کی ترقی میں یہ معیار کبھی غلط ثابت نہیں ہوا ہے۔

دور جدید کے جاہلی معاشروں نے اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ اقدار کو ان تمام شعبوں سے نکال دیا ہے جن کا تعلق انسان کے حیوانی پہلو سے ہے۔ ان معاشروں میں فری سیکس کا اصول کار فرما ہے۔ ان لوگوں کے ہاں نہایت ہی سوقیانہ جنسی حرکات کو بھی جائز سمجھا جاتا ہے۔ ان کے ہاں اگر ان کا کوئی قومی مفاد تقاضا کرتا ہو تو وہ شخصی معاملات' اقتصادی روابط اور سیاست میں اخلاق کے قائل ہیں' اپنی قومی مصلحتوں کے دائرے کے اندر اندر۔ ان ممالک کے صحافی' ادیب اور میڈیا کے تمام شعبے نوجوانوں کو جنسی بے راہ روی کی تعلیم دیتے ہیں اور ان میں جنسی اتصال کو اخلاق رذیلہ میں شمار نہیں کیا جاتا۔

اس قسم کے معاشرے اسلامی نقطہ نظر سے پسماندہ معاشرے ہیں اور انسانی زاویہ سے بہت ہی گرے ہوئے ہیں۔ اسلامی لحاظ سے تو یہ اس لئے قابل رد ہیں کہ اسلام انسان کی حیوانی خواہشات کو ضبط میں لاتا ہے اور اس کے انسانی پہلوؤں کو ترقی دیتا ہے اور انسانی پہلو کو حیوانی پہلو پر غالب کرتا ہے۔

آج کے انسانی معاشروں پر یہاں ہم اس سے زیادہ بحث نہیں کر سکتے۔ یہ معاشرے درحقیقت جاہلیت میں غرق ہیں۔ نظریات سے لے کر اخلاق تک میں اور تصورات سے لے کر طرز عمل تک میں۔ ان معاشروں کے خدوخال کی وضاحت کے لئے یہ اشارات' میں سمجھتا ہوں یہاں کفایت کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں ان کا تعارف ان اشارات سے ہو جاتا ہے۔ ہمارے دور میں تحریک اسلامی کا اپنے اہداف' دعوت اسلامی اور احیائے دین کے لئے اس قدر تعارف کافی

ہے۔ آج کی دعوت دین اور تحریک اسلامی کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسانیت کو از سرنو اسلام کی طرف دعوت دی جائے ' نظریات کے اعتبار سے بھی' اخلاق کے اعتبار سے بھی اور نظام زندگی کے اعتبار سے بھی ۔ یہ وہی جدوجہد ہے جس کا آغاز حضور اکرم ؐ نے فرمایا تھا۔ ہماری دعوت کا آغاز بھی اسی مقام سے ہونا چاہئے جہاں سے داعی اول نے کیا تھا۔ جس طرح داعی اول نے اس کتاب کے ساتھ رویہ اختیار کیا تھا وہی ہمارا بھی ہونا چاہئے اور دوبارہ اس آیت پر غور کرنا چاہئے ۔

(یہ کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے ۔ پس تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو)۔

---ooo---

اللہ نے اس کتاب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نازل فرمایا اور حضور ؐ نے سب سے پہلے کتاب کو لوگوں کے سامنے پیش فرمایا۔ قیامت تک جب بھی کوئی شخص اس کتاب کو کسی قوم کے سامنے پیش کرے گا تو وہ ان لوگوں کو سب سے پہلے یہی حکم دے گا کہ تم ان احکام کی پیروی کرو جو اس کتاب میں ہیں۔ اللہ کے سوا کسی اور کو ولی اور کارساز نہ بناؤ۔ کیونکہ دعوت اسلامی کا اصل محور ہی یہ ہے کہ اسلامی احکامات کا اتباع کیا جائے بجائے اس کے کہ دوسرے لوگوں کا اتباع کیا جائے۔ جو لوگ اس کتاب کا اتباع کرتے ہیں وہ مسلمان ہیں اور اگر وہ دوسروں کا اتباع کرتے ہیں تو مشرک ہیں۔ اہل کتاب کے مقابلے میں صرف یہی دو موقف ہیں یا مسلم یا مشرک ۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳

"لوگو' جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو ۔۔۔ مگر تم نصیحت کم ہی ملنتے ہو۔"

یہ اس دین کا اساسی مسئلہ ہے' یہ کہ یا تو اس وحی کی پیروی ہو گی تو یہ اسلام ہو گا اور اس میں اللہ کی ربوبیت کا اعتراف ہو گا۔ اس میں اللہ وحدہ کی حاکمیت کا اعتراف ہو گا' اللہ حکم دے گا اور لوگ اطاعت کریں گے ۔ اللہ نہی کرے گا اور لوگ رک جائیں گے ۔ یا اگر لوگ اپنے لئے کچھ اور لوگوں کو سرپرست بنالیں گے تو یہ شرک ہو گا اور شرک کے معنی یہ ہوں گے کہ لوگ صرف اللہ کو رب تسلیم نہیں کرتے اس لئے کہ ربوبیت اور اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کا ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے وقت یہ فرمایا گیا کہ (كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ) (۷: ۲)) یعنی نزول آپ کی ذات پر ہوا ہے اور جب لوگوں کو خطاب ہوا تو فرمایا گیا (اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ) (۷: ۳)) رسول کی طرف تو کتاب نازل ہوئی کہ آپ اس پر ایمان لائیں اور اسے لوگوں تک پہنچائیں اور انہیں انجام بد سے ڈرائیں اور لوگوں کی طرف کتاب کے نزول کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں اور عمل کریں اور اس کے علاوہ کسی اور کی اطاعت نہ کریں ۔ دونوں صورتوں میں الیک اور الیکم کے ذریعے حضور ؐ اور آپ کی امت کی عزت افزائی کی گئی ہے اور ان کے حوصلے بڑھائے گئے ہیں اس لئے کہ جس کی طرف اللہ کتاب بھیج دے اور اسے اس عظیم کام کے لئے چن لے اور اس پر یہ کرم کر دے کہ وہ اس بات کا مستحق ہے کہ وہ اس کا شکر بھی بجالائے ۔ اس فریضے کو اچھی طرح سرانجام دے اور اس

میں سستی نہ کرے ۔

چونکہ یہ ایک عظیم جدوجہد ہے ' اس میں پیش نظر یہ ہے کہ جاہلیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا ہے ۔ اس کے تصورات ' اس کے افکار ' اس کی اقدار ' اس کی عادات ' اس کی رسومات ' اس کے انتظامات ' اور اس کی اجتماعی عادات و اطوار ' اقتصادی نظام کو اور اس کائنات اور انسانوں کے ساتھ اس کے روابط کو یکسر ختم کرنا ہے ...... یہ ایک عظیم جدوجہد ہے اس لئے یہاں انسانوں کے ضمیر کو خوب جھنجوڑا جاتا ہے اور انسانی اعصاب کو حساس بنایا جاتا ہے ۔ انہیں ہلا مارنا اور ان کی سوئی ہوئی فطرت کو جگانا ' جو زمانہ جاہلیت میں جاہلی تصورات اور اطوار میں ڈوبی ہوئی تھی ' مقصود ہے ۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے لوگوں کے سامنے ازمنہ ماضی کے مکذبین کے انجام کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے اور یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ آج دنیا کی خواری کے بعد آخرت میں وہ زیادہ برباد ہوں گے ۔

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ﴿۴﴾ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵﴾ فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶﴾ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ﴿۷﴾ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ﴿۹﴾

"کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا ۔ ان پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت ٹوٹ پڑا ' یا دن دیہاڑے ایسے وقت آیا جب کہ وہ آرام کر رہے تھے ۔ اور جب ہمارا عذاب ان پر آگیا تو ان کی زبان پر اس کے سوا کوئی صدا نہ تھی کہ واقعی ہم ظالم تھے ۔

پس یہ ضرور ہو کر رہنا ہے کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں (کہ انہوں نے پیغام رسانی کا فرض کہاں تک انجام دیا اور انہیں اس کا کیا جواب ملا) پھر ہم خود پورے علم کے ساتھ ساری سرگزشت ان کے آگے پیش کر دیں گے ' آخر ہم کہیں غائب تو نہیں تھے ۔ اور وزن اس روز عین حق ہو گا جن کے پلڑے بھاری ہوں گے ' وہی فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں گے کیونکہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے رہے تھے ۔"

اقوام سابقہ کا انجام سبق آموز ہوتا ہے۔ وہ نہایت ہی اونچا ذراوا ہوتا ہے۔ قرآن کریم اقوام سابقہ کے عبرت آموز حصوں کو نہایت ہی مؤثر انداز میں لاتا ہے جس سے انسان خواب غفلت سے جاگ اٹھتا ہے۔ اور دل پر سے غفلت کے پردے ہٹ جاتے ہیں۔

بے شمار ایسی بستیاں ہیں جو غفلت کی وجہ سے اللہ کے عذاب کی مستحق ٹھہریں۔ ان پر جب ہلاکت آئی تو وہ خواب غفلت میں مدہوش تھیں۔ یہ عذاب ان پر رات کے وقت آیا یا دن کے وقت وہ سوتے میں مارے گئے۔ بالعموم لوگ دوپہر کے وقت آرام کرتے ہیں اور اس وقت ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ امن و امان سے رہیں۔

(وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْهُمْ قَآئِلُوْنَ (۷ : ۴)) ''کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ ان پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت ٹوٹ پڑا' یا دن دیہاڑے ایسے وقت آیا جب کہ وہ آرام کر رہے تھے۔''

یہ دونوں حالتیں' یعنی قیلولہ کی حالت اور رات کے وقت سونے کی حالت ایسی حالت ہوتی ہے جس میں انسان بے پرواہ' پرامن اور غفلت کی حالت میں ہوتا ہے اور ایسی حالت میں کسی کا پکڑا جانا اور عذاب میں مبتلا ہونا نہایت ہی خوفناک اور زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں' ذر' نصیحت آموزی' احتیاط وتقویٰ' زیادہ سہولت کے ساتھ حاصل ہو سکتا ہے۔

ایسے حالات میں جب یہ مجرمین پکڑے گئے اور ان پر عذاب آیا تو ان کا ردعمل کیا تھا' اعتراف اور مطلق اعتراف جرم۔ ماسوائے اقرار کے ان کے پاس اور کوئی بہانہ نہ رہا۔

(فَمَا كَانَ دَعْوٰهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۵) (۷ : ۵)) ''اور جب ہمارا عذاب ان پر آگیا تو ان کی زبان پر اس کے سوا کوئی صدا نہ تھی کہ واقعی ہم ظالم تھے۔''

انسان ہر قسم کے بہانے تلاش کرتا ہے لیکن اعتراف اس کے لئے مشکل کام ہوتا ہے۔ وہ آخری وقت تک اقرار نہیں کرتا۔ لیکن ان لوگوں کو عذاب الہٰی نے اس قدر اچانک آلیا تھا کہ ماسوائے اقرار کے ان میں اور کوئی حجت نہ رہی تھی۔ اس لئے کہ وہ نہایت ہی خوفناک اور مرعوب کن پوزیشن میں ڈال دیئے گئے تھے ایسی پوزیشن میں جہاں اقرار و اعتراف آخری کوشش ہوتی ہے۔ یہاں انہوں نے ظلم یعنی شرک کا اقرار کیا۔

یہاں ظلم سے مراد وہ شرک لیتے ہیں۔ قرآن کریم کی تعبیرات میں سے بیشتر میں ظلم سے مراد شرک ہی ہے۔ ظاہر ہے شرک ظلم ہے اور ظلم شرک ہے اس لئے کہ جو شخص اپنے خالق کے ساتھ کسی کو شریک کرے۔ اس سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے؟

اب ذرا دیکھئے کہ دنیا کے عذاب کا منظر نظروں کے سامنے ہے' جھٹلانے والے عذاب الہٰی کی گرفت میں ہیں اور وہ اعتراف کر رہے ہیں کہ بے شک وہ ظالم تھے' حق ان کے سامنے واضح ہو جاتا ہے اور وہ حق کا اعتراف بھی کر لیتے ہیں لیکن اب یہ اعتراف ان کے لیے مفید مطلب نہیں ہے۔ یہ عذاب اب ندامت اور اعتراف کی وجہ سے نہیں ٹل سکتا' نہ

اب توبہ مفید ہے اس لئے کہ توبہ و ندامت کا وقت چلا گیا ہے اور توبہ کا دروازہ بند ہے۔

یہ منظر ابھی چل رہا ہے اور دنیا کی سطح پر وہ عذاب الٰہی سے کچلے جا رہے ہیں' کہ اچانک دیکھنے والے اپنے آپ کو میدان حشر میں پاتے ہیں' کوئی وقفہ درمیان میں نہیں ہے۔سیاق کلام ایک ریل پر چل رہا ہے جو جڑی ہوئی ہے اور منظر کے بعد منظر سامنے آتا ہے۔زمان و مکان کی طنابیں کھنچ جاتی ہیں اور دنیا و آخرت باہم مل جاتے ہیں۔عذاب دنیا ابھی ختم نہیں ہوا کہ آخرت کا عذاب شروع ہو جاتا ہے۔اچانک دوسرا منظر سامنے ہے۔

(فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ (٦) فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ (٧) وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (٨) وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ (٩) (٧ : ٦ تا ٩))

"پس یہ ضرور ہو کر رہنا ہے کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں (کہ انہوں نے پیغام رسانی کا فرض کہاں تک انجام دیا اور انہیں اس کا کیا جواب ملا) پھر ہم خود پورے علم کے ساتھ ساری سرگزشت ان کے آگے پیش کر دیں گے' آخر ہم کہیں غائب تو نہیں تھے۔اور وزن اس روز عین حق ہو گا' جن کے پلڑے بھاری ہوں گے' وہی فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں گے کیونکہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے رہے تھے۔"

یہ تصویر کشی کا انداز بیان قرآنی تعبیرات کا خاصہ ہے۔طرز تعبیر ہمیں لحظہ بھر میں پوری دنیا کی سیر کرا دیتا ہے۔پھر قرآن کی ایک سطر میں دنیا اور آخرت مل جاتے ہیں اور آغاز و انجام ایک ہو جاتے ہیں۔

اس جہان میں تو یہ لوگ عذاب الٰہی سے دوچار ہیں اور اس جہان میں ان سے باز پرس ہو رہی ہے اور جب عذاب آگیا تھا اور وہ غفلت میں تھے تو پھر اچانک انہوں نے اعتراف کرنا شروع کر دیا اور کہا (اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ) (بے شک ہم ظالم تھے) لیکن اس جہان میں

(فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ (٦) "پس یہ ضرور ہو کر رہنا ہے کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں گے جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے۔

یہ سوال نہایت ہی جامع و مانع ہے۔یہ رسولوں سے بھی ہو گا اور ان کی امتوں سے بھی ہو گا۔یہ سوال و جواب کھلی مجلس میں ہو گا' ایک بڑے اجتماع میں اور اس میں تمام راز کھل جائیں گے۔امت دعوت سے سوال ہو گا اور ان کی جانب سے اعتراف ہو گا' رسولوں سے بھی باز پرس ہو گی اور وہ جواب دیں گے۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ لوگوں کے اعمال کا ریکارڈ پوری تفصیلات کے ساتھ پیش کریں گے اس لئے کہ اللہ تو ہر چیز کے پاس تھا' اس سے کوئی چیز غائب نہ تھی۔یہ نہایت ہی مؤثر ٹچ ہے۔

(وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ (۷: ۸)) "وزن اس روز حق ہو گا۔" اس دن وزن کے اندر کوئی غلطی کا امکان نہ ہو گا اور نہ فیصلے میں کوئی غلطی ہو گی ۔ دنیا میں فیصلوں پر جو جدل و جدال اور واقعات ہوتے ہیں وہ نہ ہوں گے ۔

(فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهُ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۷: ۸)) جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پانے والے ہوں گے ۔" اللہ کا ترازو سچا ہے ۔ اب وہ بھاری ہو گیا ہے لہذا آگ سے بچاؤ ہو گیا۔ جنت کی طرف سفر شروع ہو گیا اور یہ اس طویل سفر کا آخری ٹھکانا ہے ۔

(وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ فَاُولٰئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ

(۷: ۹)) "اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں گے کیونکہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے رہے ہیں۔

اللہ کے ترازو میں غلطی کا امکان ہی نہیں ہے ۔ یہ لوگ گھاٹا کھا گئے ہیں ۔ اب تو کمائی کا وقت ختم ہے ۔ انسان اپنے لئے کماتا ہے 'جب خسارہ ہی ہو گیا کاروبار میں تو کیا کمائے گا اور کیا رہے گا۔ انہوں نے کفر کیا' اپنی جان ہی کو گنوا دیا۔ کیونکہ آیات الہیہ کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے تھے 'جیسا کہ کہا گیا ظلم سے مراد شرک ہے کیونکہ شرک ظلم عظیم ہے ۔ (اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ) یہاں ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ وزن اور میزان کی شکل کیا ہو گی ۔ اسلامی عقائد کی تاریخ میں اس پر بحثیں ہو چکی ہیں 'کیونکہ اللہ کے افعال کی شکل و صورت اور کیف و کم کی کوئی مثال نہیں ہے ۔ خود اللہ تعالیٰ کی کوئی مثال نہیں ۔ (لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ) اس لئے ہم قرآن کے فرمان ہی پر اکتفا کرتے ہیں کہ اس دن حساب برحق ہو گا کہ انسان کے کسی بھی نیک عمل میں نہ کمی ہو گی' نہ وہ شمار سے رہ جائے گا اور نہ ہی ضائع ہو گا۔

---ooo---

# درس نمبر ۷۳ تشریح آیات

## ۱۰ --- تا --- ۲۵

یہاں سے انسانیت کے عظیم سفر کا آغاز ہوتا ہے اور نسل انسانی کو کرۂ ارض کا چارج دیا جاتا ہے ۔ یہ فقرہ قصہ انسانیت کے لئے ایک تمہید ہے ۔ تفصیلات آگے آرہی ہیں ۔

۱ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا
ع ۱۰ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۰ۧ
۸

ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لئے یہاں سامان زیست فراہم کیا، مگر تم لوگ کم ہی شکرگزار ہوتے ہو۔"

اس زمین اور انسانوں کے خالق ہی نے یہاں انسانوں کو بسایا اور اسی نے زمین کے اندر وہ وسائل و خصائص پیدا کئے جو انسانی زندگی کے لئے سازگار ہیں جو انسانوں کے لئے قوت و ضروریات مہیا کرتے ہیں اور اس کی نگہداشت کرتے ہیں جن میں وسائل رزق و معاش شامل ہیں۔

یہ اللہ ہی ہے کہ جس نے کرۂ ارض کو ایک ایسے مقام پر رکھا جو انسانوں کی نشوونما کے لئے سازگار ہے ۔ زمین اپنی ترکیب، حجم اور سورج و چاند سے اپنے متعین فاصلے اور سورج کے گرد اپنی گردش، اور اپنے طور پر ایک طرف جھکاؤ اور اپنی گردش کی رفتار وغیرہ کے اعتبار سے انسانی زندگی کے لئے مفید ہے ۔ پھر یہ اللہ ہی ہے جس نے زمین کے اندر بے حد و حساب خزانے ودیعت کئے ہیں اور اس میں اکثر چیزیں انسان کی خوراک اور استعمال کے لئے فراوانی سے پیدا کی، جو اس انسان کے لئے یہاں نشوونما پانے اور ترقی کرنے کا سبب ہیں ۔ پھر وہ اللہ ہی ہے جس نے جنس انسانی کو اس زمین کا سردار بنایا ہے ۔ وہ اس قابل ہوا ہے کہ ان قوتوں کو تسخیر کرے اور انہیں اپنی آسائش کے لئے استعمال کرے پھر اللہ نے انسانوں کو ایسی عقلی قوت دی ہے جس کے ذریعے انہوں نے اس کائنات کے بعض پوشیدہ رازوں تک رسائی حاصل کر لی ہے ۔ اور اس علم کو پھر وہ اپنی ضروریات کے لئے استعمال کر رہا ہے ۔

اگر اللہ تعالیٰ انسانوں کو یہ قوت نہ دیتا تو یہ ضعیف انسان ان کائناتی قوتوں کو "تسخیر" نہ کر سکتا (جس طرح قدیم و جدید جاہلیت کے علمبردار اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں) اور اس عظیم کائنات اور طویل و عریض دنیا کی قوتوں کا

مقابلہ نہ کر سکتا۔

دور جدید کی تہذیب پر رومی اور یونانی جاہلی افکار کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ یہ جاہلی تصورات کائناتی قوتوں کو انسان کی دشمن قوتیں سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ قوتیں انسان کے وجود اور اس کی سرگرمیوں کی دشمن ہیں۔ ان تصورات کے مطابق انسان اور کائناتی قوتوں کے درمیان مسلسل جنگ ہے۔ اس لئے انسان جب اس کائنات کے بھیدوں میں سے کسی بھید کو جان لیتا ہے تو یہ لوگ اسے "تسخیر فطرت" کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں لیکن یہ تصورات غلط ہیں اور پھر ان کے پس منظر میں خباثت بھی چھپی ہوئی ہے۔

اگر یہ کائناتی قوتیں انسان کی دشمن ہوتیں' اس کی زندگی کا نقیض ہوتیں' اس کے خلاف مورچہ زن ہوتیں' اس کی مخالفت کرتیں' اور ان کے پس منظر میں کسی مدبر ذات کا ارادہ کام نہ کر رہا ہوتا' جس طرح ان لوگوں کا خیال ہے تو انسان سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا۔ اگر پیدا ہوتا تو وہ اس کائنات کے اندر کسی طرح نشوونما نہ پا سکتا تھا۔ کیونکہ ان تصورات کے مطابق یہ پورا جہان انسان کا دشمن ہے محض اس لئے کہ وہ وجود میں آگیا ہے۔ لہذا وہ یہاں زندگی بسر کر رہا ہے' یہ کوئی معقول توجیہ نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ پوری کائنات ہی انسان کی دشمن ہے تو وہ کس طرح یہاں چل سکتا ہے۔ ان لوگوں کا تصور یہ تھا کہ یہ کائنات خود مختار ہے اور اس کے اوپر کوئی مقتدر اعلیٰ نہیں ہے۔

ان تصورات کے مقابلے میں اسلامی تصور کائنات ہی وہ حقیقی تصور ہے جو یہاں اس کائنات کے تمام اجزاء کی پوری پوری تشریح کر دیتا ہے۔ وہ یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا۔ وہی ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور یہ وہی اللہ ہے جس نے اس کائنات کے مزاج کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ اپنی ساخت کے اعتبار ہی سے انسان کے لئے مدد و معاون ہے۔ انسان کے اندر اسی اللہ نے ایسی قوتیں ودیعت کی ہیں جن کی وجہ سے وہ اس کائنات کی قوتوں کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کر پاتا ہے۔ یہ موافقت اور یہ ہم آہنگی ہی وہ قابل لحاظ راز ہے جس کی وجہ سے اللہ نے ہر چیز کی تخلیق کو بہترین بنایا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ کائنات کی یہ قوتیں باہمدگر بر سر جنگ ہیں۔

اس اسلامی تصور کے مطابق انسان اس کائنات کے ساتھ باہم دوست کی طرح زندگی گزار رہا ہے۔ ایک قوت مدبرہ یعنی باری تعالیٰ کی نگرانی میں۔ اس کا قلب مطمئن ہے۔ اس کا نفس خوش ہے۔ اس کے قدم مضبوط ہیں اور وہ پورے اعتماد کے ساتھ اس کرۂ ارض پر اپنے فرائض خلافت انسانی کو سرانجام دے رہا ہے۔ وہ کائنات کا انیس و ہم نشیں ہے اور اللہ کا شکرگزار ہے کہ اس نے اسے اس کائنات کا راز بخشا ہے۔ جونہی وہ اس کائنات کے رازہائے نہفتہ میں سے کوئی راز دریافت کرتا ہے' جو اس کے فرائض کے لئے معاون ہوتا ہے تو اس کی ترقی' آرام اور خوشحالی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اس کائنات کے بارے میں یہ تصور جو اسلام دیتا ہے' انسان کو اس بات سے نہیں روکتا کہ وہ اس کائنات کے مزید راز معلوم کرے۔ یہ تصور اس کی اس بات کے لئے حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اسے نہایت ہی اطمینان اور خود اعتمادی کی کیفیت دیتا ہے کیونکہ اس کی حرکت' ایک ایسے دوست کی ہمرکابی میں ہوتی ہے جو بخیل نہیں ہے جو اسے اپنے راز نہ بتاتا ہو۔ وہ اپنے تعاون اور امداد سے بھی ہاتھ نہیں کھینچتا۔ اس کی وجہ سے انسان کا کسی ایسے دشمن سے رابطہ نہیں ہوتا جو ہر وقت مخالفت کرتا ہے اور راستے میں روڑے اٹکاتا ہے اور اس کی آرزوؤں اور امیدوں پر پانی پھیرتا ہے۔

فلسفہ وجودیت کا یہ عظیم المیہ ہے کہ اس کائنات کے بارے میں ایک برا اور خبیث تصور رکھتا ہے۔ اس فلسفے کا تصور کائنات یہ ہے کہ یہ پوری کائنات اور اس کے اندر انسان کا اجتماعی نظام انسان کے انفرادی وجود کا دشمن ہے اور اس کائنات کا بوجھ اور پھر انسان کی اجتماعیت کا بوجھ انسان کے لئے تباہ کن ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے کہ اس پر یقین رکھنے والا انسان رجعت پسندی' عزلت نسبتی بلکہ عدم کے دامن میں لوٹ جاتا ہے یا پھر اس کے نتیجے میں انفرادیت اور خود سری اور سرکشی جنم لیتی ہے۔ دونوں حالتوں میں ایک انسان بے چینی اور قلق میں مبتلا ہوتا ہے جس کا بوجھ وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ عقل و خرد انسان کے لئے وبال جان بن جاتے ہیں۔ وہ عملی اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے اور یا وہ سرکشی کی راہ اختیار کر لیتا ہے یا عدم کے صحرا میں گم گشتہ راہ ہو جاتا ہے اور یہ دونوں حالتیں ایک ہی طرح کی مصیبت ہیں۔

یورپی افکار کے شعبہ وجودیت ہی کا یہ المیہ نہیں ہے بلکہ پوری دنیا کے پورے فلسفے کا بھی یہی المیہ ہے۔ یورپ کے تمام مکاتب فکر اور رجحانات اسی المیہ میں گرفتار ہیں بلکہ ہر قسم کا جاہلی نظام ہر دور میں اور ہر معاشرے میں اس المیے سے دوچار ہوتا ہے۔ اس المیے کا مقابلہ صرف اسلامی نظام فکر و عمل ہی کرتا ہے کیونکہ اسلام ہی انسان کو اس کائنات کے بارے میں ایک درست زاویہ فکر دیتا ہے۔ بلکہ وہ ورائے کائنات بھی ایک معقول تصور دیتا ہے۔

انسان اس زمین کا بیٹا ہے' وہ اس کائنات کی پیداوار ہے۔ وہ اس زمین سے پیدا کیا گیا' اسی میں پروان چڑھا۔ اس کی بود و باش اور نشو و نما کا انتظام اسی زمین میں ہے اور اسے یہاں ایسی عقلی قوت دی گئی ہے جس کے ذریعے وہ اس جہان کے پوشیدہ رازوں تک رسائی حاصل کرتا ہے اور یہ راز اور قوتیں انسانی وجود کے لئے سازگار ہیں۔ جب ان رازوں تک انسان رسائی حاصل کر لیتا ہے تو یہ انسان کے معاون ہوتے ہیں اور اس کی زندگی کی تفسیر و تعبیر کرتے ہیں۔

لیکن انسان! انسان کی اکثریت ناشکری ہے اس لئے کہ وہ اپنی جہالت اور جاہلیت میں گم گشتہ راہ ہے۔ جو لوگ اس کائنات کے رازہائے نہفتہ سے واقف ہو گئے ہیں وہ بھی حق شکر ادا نہیں کرتے۔ وہ شکر و ثنا کر بھی کیسے سکتے ہیں جب اللہ کو ان کی جانب سے یہ اعزاز قبول ہی نہیں۔ (وہ انسانیت کے بجائے اپنی حیوانیت ثابت کرتے ہیں) ۔

(وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ

(۷ : ۱۰)) "ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لئے یہاں سامان زیست فراہم کیا' مگر تم لوگ کم ہی شکرگزار ہوتے ہو۔"

---ooo---

اب قصہ انسانیت کے دلچسپ واقعات بیان ہوتے ہیں۔ ایک عظیم محفل میں انسانیت کی ولادت کی تقریب منعقد ہوتی ہے۔ یہ ملاء اعلیٰ میں ایک عظیم الشان تقریب ہے۔ اللہ تعالیٰ جو ایک عظیم اور جلیل القدر بادشاہ ہے' اس کی جانب سے تخلیق آدم کا اعلان ہوتا ہے' خود بادشاہ کائنات اعلان کرتے ہیں۔ یہ اس بندہ انسان کے لئے ایک بڑا اعزاز ہے۔ اس محفل میں تمام ملائکہ حاضر ہیں۔ ان میں حضرت ابلیس بھی موجود ہیں۔ اگرچہ یہ دراصل فرشتہ نہیں تھا لیکن اس تقریب میں پوری کائنات اور اس کی مخلوقات موجود ہیں' اس لئے کہ یہ نہایت ہی اہم واقعہ ہے اور عظیم الشان معاملہ

ہے جس کی اہمیت پوری کائنات کی اسکیم میں مرکزیت کی حامل ہے۔

---

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا
لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ مَا مَنَعَكَ
اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ
طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ
مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ
الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۱۵﴾ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ
لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ
شَمَاۗىِٕلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا
مَّدْحُوْرًا ۭ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾

"ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتداء کی' پھر تمہاری صورت بنائی' پھر فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو۔ اس حکم پر سب نے سجدہ کیا' مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ پوچھا "تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا؟" بولا "میں اس سے بہتر ہوں' تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے۔" فرمایا "اچھا' تو یہاں سے نیچے اتر۔ تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے۔ نکل جا کہ درحقیقت تو ان لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں۔" بولا "مجھے اس دن تک مہلت دے جب کہ یہ سب دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔" فرمایا "تجھے مہلت ہے۔" بولا "اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا' آگے اور پیچھے' دائیں اور بائیں' ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکرگزار نہ پائے گا۔" فرمایا "نکل جا یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ یقین رکھ کہ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے' تجھ سمیت ان سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔"

یہ پہلا منظر ہے اس قصے کا۔ نہایت ہی دلچسپ' نہایت ہی اہم۔ ہم اس قصے کے مناظر اس کی تفسیر سے پہلے پیش

کریں گے - ان مناظر سے فارغ ہونے کے بعد ہم اس قصے کے اشارات و اثرات پیش کریں گے -

(وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ (۷ : ۱۱)) "ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتداء کی 'پھر تمہاری صورت بنائی' پھر فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو - اس حکم پر سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا -

لفظ خلق کبھی تو محض وجود میں لانے کے لئے آتا ہے - اسی طرح تصویر کا مفہوم کبھی یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کو شکل و صورت اور خصائص دینا - اس اعتبار سے خلق و تصویر کی تخلیق کے دو مرحلے نہیں ہوتے بلکہ بیک وقت کسی تخلیق میں پیدا ہوتے ہیں - اس لئے کہ یہ لازمی نہیں ہے کہ ثم کا لفظ ہمیشہ ترتیب زمانی کے لئے استعمال ہو - یہ معنوی ترقی کے مفہوم میں بھی آتا ہے - معنوی اعتبار سے محض وجود کے مقابلے میں مصور ہونا زیادہ ترقی یافتہ شکل ہوتی ہے - اس لئے کہ محض مادے پر بھی وجود کا اطلاق ہوتا ہے - البتہ تصویر کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں مجرد وجود ہی نہیں بخشا گیا بلکہ ایک ترقی یافتہ مصور اور صاحب خصائص و کمالات وجود دیا گیا ہے - دوسری جگہ (اَلَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی) جس نے ہر چیز کو اس کا وجود بخشا اور پھر ہدایت دی -" ........ اس لئے کہ اللہ نے ہر چیز کو اس کے خصائص اور اس کے مقاصد و فرائض اسی وقت دے دیئے تھے جس وقت انہیں پیدا کیا تھا اور تخلیق کے وقت ہی ہدایت کر دی تھی کہ اپنے ان وظائف و فرائض کے لئے کام کرو ' اور تخلیق اور ہدایت کے درمیان کوئی زمانی فاصلہ نہ تھا - اگر ہدایت سے مراد رب کی طرف ہدایت لی جائے تب بھی مفہوم میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ تخلیق کرتے ہی اللہ نے انسان کو ہدایت کر دی تھی - اسی طرح آدم کو بھی خصائص انسانیت تخلیق کے وقت ہی دے دیئے گئے تھے - اور ثم کا لفظ یہاں ترقی اور مرتبہ کی بڑائی کے معنوں میں ہے - زمانہ ماقبل یا مابعد کے معنی میں نہیں ہے - ہمارے خیال میں یہی مفہوم درست ہے -

بہرحال خلق آدم کے بارے میں جس قدر نصوص وارد ہیں اور اس کرۂ ارض کے اوپر نسل انسانی کے بارے میں جس قدر آیات آئی ہیں ان سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ انسان کو اس کی تخلیق کے ساتھ ہی اس کے انسانی خصائص اور فرائض منصبی دے دیئے گئے تھے اور انسانی تاریخ میں جو ترقی نظر آتی ہے وہ صرف ان صلاحیتوں کے ظہور میں ہوئی ہے - انسان کے تجربے اور اس کی مہارت میں اضافہ بہرحال ہوتا رہا ہے - یہ ترقی انسان کے وجود اور اس کی ذہنی صلاحیت میں نہیں ہوئی لہٰذا یہ فلسفہ بالکل غلط ہے جو ڈارون نے گھڑا ہے کہ انسان کی ساخت میں ترقی ہوتی رہی ہے -

ڈارون کا یہ نظریہ کہ حیوانات کے انواع میں ترقی ہوتی رہی - آثار قدیمہ اور پتھروں کی کھدائی پر مبنی ہے اور محض ظن و تخمین ہے - طبقات الارض کے لحاظ سے بھی پتھروں اور پہاڑوں کی عمر کا تعین کوئی یقینی امر نہیں ہے - یہ محض ظنی اور تخمینی فیصلے ہیں - مثلاً شعاعوں کے ذریعے ستاروں کی عمر معلوم کرنا - یہ علوم جو محض ظن و تخمین اور مفروضوں پر مبنی ہیں - ان کے مقابلے میں دوسرے مفروضے بھی ہو سکتے ہیں جو ان سے زیادہ معقول ہو سکتے ہیں -

اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ پتھروں اور چٹانوں کی عمر یقینی طور پر متعین ہو گئی ہے تب بھی یہ ممکن ہے کہ قدیم زمانوں سے حیوانات کی مختلف اقسام اپنی موجودہ شکل میں تھیں - ان ادوار میں ان کے لئے حالات سازگار تھے لیکن بعد میں ان کے لئے حالات سازگار نہ رہے اور ان کی نوع دنیا سے ختم ہو گئی - لیکن اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ان

میں سے ایک نوع دوسری نوع کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ہم دونوں کو مستقل انواع مان سکتے ہیں۔ ڈارون کی کھدائیاں اور اس کے بعد دریافت ہونے والے انواع اس سے زیادہ کچھ ثابت نہیں کر سکتے۔ ان چٹانی تصاویر سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کسی ایک نوع سے زیادہ ترقی یافتہ نوع فلاں وقت میں موجود تھی اور اس بات کی تاویل کی جاسکتی ہے کہ اس وقت اس نوع کے وجود کے لئے حالات سازگار تھے اور بعد میں حالات ناسازگار ہونے کے باعث وہ نوع ختم ہو گئی اور اس کی جگہ دوسری قسم کے حیوانات وجود میں آگئے اور ترقی کر گئے

اس لئے ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ نوع انسانی روز اول سے ایسی ہی ہے جس طرح کہ آج ہے اور اسے اللہ تعالیٰ زمین پر اس وقت وجود میں لائے جب یہاں کے حالات انسان کے لئے سازگار بنا دیئے گئے۔ تمام قرآنی نصوص اسی بات کی تائید کرتے ہیں۔

مزید یہ کہ انسان طبیعیاتی عضویاتی اور عقلی و روحانی اعتبار سے اس قدر منفرد ہے کہ دور جدید کے ڈارونی بھی اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہوگئے ہیں کہ انسان کسی دوسری نوع کی ترقی پذیر نوع نہیں ہے اور وہ کسی دوسری نوع کے ساتھ عضویاتی مماثلت نہیں رکھتا۔ حالانکہ ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو سرے سے ذات باری کے قائل ہی نہیں ہیں اور ان کی جانب سے یہ ایک قسم کا اعتراف ہے کہ انسان کا وجود اور اس کی نشوونما بالکل منفرد ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا اعلان فرشتوں کے اجتماع میں کیا اور یہ اجتماع عالم بالا میں منعقد ہوا۔

ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ

(۷ : ۱۱) ”پھر ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو۔ اس حکم پر سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔“

ملائکہ اللہ کی مخلوقات میں سے ایک مستقل مخلوق ہے اور ان کے اپنے خصائص و فرائض ہیں۔ہم ان کے بارے میں اسی قدر جانتے ہیں جس قدر اللہ نے ہمیں بتایا ہے۔ظلال القرآن میں ہم اس سے قبل فرشتوں کے بارے میں ایک نوٹ دے آئے ہیں۔ اسی طرح ابلیس بھی ایک مستقل نوع کی مخلوق سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے کان من الجن ففسق عن امر ربہ ”یہ جنوں میں سے تھا' اس نے اپنے رب کی حکم عدولی کی۔“ جنات فرشتوں سے الگ ایک مخلوق ہیں۔ ان کے بارے میں بھی ہم اسی قدر جانتے ہیں جس قدر ہمیں اللہ نے بتایا ہے۔ ان کے بارے میں بھی ہم نے ایک مجمل حاشیہ اسی پارے میں دے دیا ہے۔ اس سورہ میں آگے جاکر یہ بات آئے گی کہ ابلیس آگ سے پیدا ہوا اس لئے وہ ملائکہ سے الگ ایک مخلوق سے وابستہ ہے۔ ابلیس کو بھی حضرت آدم کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا گیا تھا اس لئے کہ یہ زمرۂ ملائکہ میں شامل تھا اور اس وقت وہ عالم بالا کی اس محفل میں موجود تھا' جہاں تخلیق آدم کی تقریب ہوئی۔

رہے فرشتے تو وہ تو ایسی مخلوق ہیں جو اللہ کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرتے اور انہیں جو حکم بھی دیا جائے اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں اس لئے انہوں نے مطیع فرمان ہو کر سجدہ کر دیا اور اللہ کے حکم کی تعمیل کر دی۔ کیونکہ وہ کسی معاملے میں نہ تردد کرتے ہیں نہ تکبر کرتے ہیں اور نہ وہ اللہ کی نافرمانی کے بارے میں سوچ سکتے ہیں' چاہے کوئی سبب اور کوئی جواز ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ان کا مزاج ہے۔ یہ اطاعت شعاری ان کی خصوصیت ہے اور یہ ان کے فرائض منصبی میں شامل

ہے۔ اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت انسان کی ذات کس قدر مکرم ہے اور یہ بھی عیاں ہو جاتا ہے کہ فرشتے اللہ کے مطیع مطلق ہیں۔

رہا ابلیس تو اس نے امتثال امر نہ کیا اور نافرمانی کر دی۔ یہ بات آگے آ رہی ہے کہ کس وجہ سے اس کے دل میں خلجان پیدا ہوا۔ اس پر کیا خیالات چھا گئے جس کی وجہ سے اس نے نافرمانی کی جرأت کی؟ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اللہ رب العالمین ہے اور خود اس کا بھی خالق ہے۔ وہ اس کے امور اور خود اس کے وجود کا بھی مالک ہے' اسے ان معاملات میں کوئی شک نہیں تھا۔

اس منظر میں اللہ کی مخلوقات کے تین نمونے پائے جاتے ہیں۔ ایک نمونہ وہ ہے جو ہر لحاظ سے مطیع فرمان ہے اور اس کی فطرت میں تعمیل امر ہے۔ دوسرا نمونہ ہے جو مکمل طور پر نافرمان ہے اور اس کی فطرت میں استکبار اور نافرمانی ہے۔ تیسری مخلوق انسانی مخلوق ہے۔ اس کی صفات' اس کی کمزوریوں اور کمالات پر بھی عنقریب بات ہوگی۔ پہلی قسم کی مخلوق خالص الٰہی مخلوق ہے اور انہوں نے اپنا فرض اس محفل ہی میں پوری طرح ادا کر دیا۔ دوسری دو قسم کی مخلوقات کے بارے میں عنقریب تفصیلات آئیں گی کہ ان کے رجحانات کیا ہیں؟

(قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (۷: ۱۲)) "پوچھا' تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا؟" بولا "میں اس سے بہتر ہوں' تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے۔"

ابلیس کا قصور یہ تھا کہ نص صریح کے ہوتے ہوئے بھی اس نے یہ سوچا کہ وہ اپنی رائے پر عمل کر سکتا ہے اور اگر حکم کے باوجود کوئی سبب اور علت ہو تو اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ جب نص صریح آ جائے تو پھر فکر و نظر کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اب صرف یہ صورت رہتی ہے کہ اطاعت کی جائے اور حکم کو نافذ کیا جائے۔ اب حضرت ابلیس ملعون کو دیکھئے کہ باوجود اس بات کے علم کے کہ اللہ خالق و مالک ہے' وہی رازق اور مدبر ہے اور اس دنیا میں کوئی بات اس کے علم اور اذن کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس کے حکم کی اطاعت نہیں کرتا جو اس کے پاس پہنچ گیا ہے۔ وہ اپنی منطق سامنے لاتا ہے۔ "میں اس سے زیادہ بہتر ہوں کہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔" اس کی اس حجت سازی پر اس کو فوراً سزا ملتی ہے۔

(قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ (۷: ۱۳)) فرمایا' "اچھا' تو یہاں سے نیچے اتر' تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے۔ نکل جا کہ درحقیقت تو ان لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں۔"

یہاں اب اس کا علم اس کے لئے نفع بخش نہیں رہا' وہ اللہ کی ذات و صفات سے خوب واقف ہے لیکن یہ علم اس کے لئے نفع بخش نہیں ہے۔ یہی حال ہر اس شخص کا ہو گا جس تک اللہ کا حکم پہنچ جاتا ہے اور اس کے بعد وہ پھر اپنی فکر و

نظر کے گھوڑے دوڑاتا ہے اور خود فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اسے قبول کرے یا نہ کرے ۔ایک مسئلہ اس کے سامنے ہے جس کا فیصلہ اللہ کی عدالت سے ہو گیا ہے لیکن وہ اسے نہیں مانتا' وہ اپنا فیصلہ خود کرتا ہے اور اس کے ذریعہ اللہ کے فیصلے کو رد کرتا ہے ۔پس یہ جان بوجھ کر اور اچھی طرح سمجھ کر کفر کا ارتکاب ہے ۔ابلیس کے پاس علم و معرفت کی کمی نہ تھی' اس کا اعتقاد متزلزل نہ تھا۔

چنانچہ وہ جنت سے بھگایا گیا' اللہ کی رحمت سے محروم ہو گیا اور اس پر لعنت لکھ دی گئی ۔اس کے اوپر ذلت مسلط کر دی گئی ۔لیکن یہ شدید فطرت اس بات کو سمجھنے کی سعی ہی نہیں کرتی کہ اس آدم کی وجہ سے وہ راندۂ درگاہ ہوا۔ چنانچہ اب وہ توبہ کرنے کے بجائے انتقام پر اتر آتا ہے ۔اب وہ اپنے سر پر وہ ذمہ داریاں لیتا ہے جو اس شر کے ساتھ مناسب ہیں جس میں وہ مبتلا ہو گیا ہے ۔

(قَالَ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (۱۴) قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ (۱۵) قَالَ فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ (۱۶) ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ (۱۷))(۷:۱۴ تا ۱۷) ''بولا'' مجھے اس دن تک مہلت دے جب کہ یہ سب دوبارہ اٹھائے جائیں گے ۔'' فرمایا'' تجھے مہلت ہے ۔'' بولا'' اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا' آگے اور پیچھے' دائیں اور بائیں' ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا ۔''

معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنی اس شرپسندی پر اصرار کرنے پر تلا ہوا ہے ۔ اس نے پوری طرح عزم کر لیا ہے کہ وہ گمراہ ہو گا اور مزید لوگوں کو گمراہ کرے گا ۔اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیطانی مخلوق کی فطرت میں گمراہی رچی بسی ہے اور یہ اس کی خصوصیت اولی ہے ۔یہ شر عارضی اور وقتی نہیں ہے' یہ اصلی' بامقصد اور عمداً ہے اور نہایت ہی گہری دشمنی پر مبنی ہے ۔

یہ آیت عقلی' معنوی اور نفسیاتی حرکات کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے اور اس میں زندہ مناظر نظر آتے ہیں ۔

ابلیس یہ درخواست کرتا ہے کہ اسے قیامت تک مہلت دی جائے' اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے اللہ کی مشیت و ارادے کے بغیر اس تک نہیں پہنچ سکتا ۔اللہ تعالیٰ انتظار اور مہلت کے بارے میں اس کی درخواست منظور فرماتے ہیں لیکن ایک معلوم میعاد تک جیسا کہ دوسری سورتوں میں وضاحت کر دی گئی ہے ۔روایات میں آتا ہے کہ یہ مہلت نفخۂ اولی کے دن تک ہے جس دن تمام مخلوق جان دے دے گی ۔یوم البعث تک نہیں ہے ۔

اب مہلت کے بارے میں فیصلہ لے لینے کے بعد ابلیس نہایت ہی ڈھٹائی اور خبث باطن کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ وہ اپنی گمراہی اور راندگی کا بدلہ اللہ کی مخلوق سے یوں لے گا کہ وہ اللہ کی اس مکرم مخلوق کو گمراہ کر کے چھوڑے گا اور وہ اپنے اس پروگرام کا اعلان ایسے فیصلہ کن انداز میں کرتا ہے ۔

(لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ (١٦) ثُمَّ لَآتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ (١٧)(٧: ١٦ - ١٧)) "میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا' آگے اور پیچھے اور دائیں اور بائیں ہر طرف سے ان کو گھیروں گا۔"

یعنی تو نے ان کے لئے جو سیدھا راستہ تجویز کیا ہے میں اس میں اپنے مورچے لگاؤں گا۔ ان کو اس راہ سے روکنے کی سعی کروں گا۔ اللہ کی طرف جانے والا راستہ ظاہر ہے کہ کوئی محسوس راستہ نہیں ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ اللہ ایک ہی جگہ میں ہے اور اس کی طرف یہ راستہ جا رہا ہے۔ اللہ کا راستہ تو ایمان اور اطاعت کا راستہ ہے جس کے نتیجے میں اللہ کی رضا کا حصول ہوتا ہے۔ لہٰذا شیطان انسانوں پر ہر جانب سے حملہ آور ہوتا ہے' آگے سے' پیچھے سے' دائیں سے اور بائیں سے۔ اس طرح وہ انسانوں کو ان کے ایمان و عمل کی راہ میں روکے گا۔ یہ گویا ایک ایسا منظر ہے جو زندہ اور رواں دواں ہے۔ ابلیس ہر طرف سے انسانوں پر حملہ آور ہوتا ہے 'مسلسل انہیں بدراہ کر رہا ہے اور لوگ اس کے دام فریب میں گرفتار ہو کر اللہ کی معرفت اور اس کے شکر سے محروم ہوتے ہیں۔ ہاں ایک قلیل تعداد ایسی ہے جو اس کے دام سے بچ نکلتی ہے اور وہ اللہ کے احکام پر چلتی ہے۔

(وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شٰكِرِينَ (٧: ١٧)) "تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔" یہاں شکر کا تذکرہ آغاز سورہ میں تذکرہ شکر سے بطور ہم آہنگی کیا گیا ہے۔ آغاز میں کہا گیا (قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (٧: ١٠)) "تم کم ہی شکرگزار رہتے ہو۔" مقصد یہاں یہ بتانا ہے کہ وہ کیا سبب ہے کہ انسان شکرگزار نہیں رہتا۔ اس لئے کہ ابلیس خفیہ طور پر شکرگزاری کے خلاف کام کرتا ہے۔ وہ ہر راستہ پر مورچہ زن ہے اس لئے انسانوں کو چاہئے کہ وہ پوری طرح چوکنے ہو جائیں' دشمن گھات لگائے بیٹھا ہے۔ وہ ہر طریقے سے انہیں ہدایت سے روکتا ہے اور انہیں اس امر کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جبکہ انہیں معلوم ہے کہ ان پر یہ مصیبت کس راستے سے آرہی ہے۔

ابلیس کی درخواست اس لئے منظور کی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تقاضا بھی یہ تھا کہ انسان خود مختاری سے اپنا راستہ خود بنائے' کیونکہ اس کی فطرت میں خیر و شر دونوں کی استعداد موجود ہے۔ اسے عقلی قوت بھی دی گئی ہے جو شر کے مقابلے میں خیر کو ترجیح دیتی ہے۔ پھر رسولوں کے ہاتھ پیغام بھیج کر اسے شر کے انجام بد سے خبردار بھی کر دیا اور پھر اسے دین اسلام کا ضابطہ دے کر اسے درست راہ پر گامزن بھی کر دیا گیا۔ اسے بتایا گیا کہ مشیت الٰہی کا یہ تقاضا تھا کہ وہ ہدایت اختیار کرے یا گمراہی اور اس کی شخصیت میں خیر و شر کی کشمکش رہے اور وہ دو انجاموں میں سے کسی ایک تک پہنچ جائے اور اللہ کی مشیت کے مطابق اس پر سنت الٰہیہ جاری ہو۔ چاہے وہ ہدایت کی راہ لے یا ضلالت کا فیصلہ ہو۔

لیکن یہاں سیاق کلام میں ابلیس ملعون کو بصراحت یہ اجازت نہیں دی گئی کہ جاؤ تمہیں اجازت ہے کہ تم لوگوں کو گمراہ کرو' جس طرح اس کے پہلے سوال کو منظور کرتے ہوئے قیامت تک اسے مہلت دے دی گئی تھی' یہاں اس کی کارستانیوں پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جاتا اور اعلان کر دیا جاتا ہے کہ تم ذلیل و خوار کر کے یہاں سے نکالے جاتے ہو اور اسے یہ دھمکی دی جاتی ہے کہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔

(قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَّدْحُورًا لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ أَجْمَعِينَ (۱۸:۷)) فرمایا! ''نکل جا یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ یقین رکھ کہ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے، تجھ سمیت ان سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔''

انسانوں میں سے بعض لوگ تو اللہ کو جانتے ہوئے شیطان کی پیروی کرتے ہیں اور ان کا یہ عقیدہ بھی ہوتا ہے کہ اللہ ہمارا اللہ ہے لیکن اس معرفت اور عقیدے کے ساتھ ساتھ وہ اللہ کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ اور اللہ کے قوانین کے مطابق فیصلے کرنے سے انکار کرتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے احکام پر نظرثانی کر سکتے ہیں اور اللہ کے احکام کو نافذ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ یا پھر شیطان ان کو اس قدر گمراہ کر دیتا ہے کہ وہ سرے سے خدا کو مانتے ہی نہیں۔ یہ دونوں قسم کے لوگ شیطان کے پیروکار ہیں اور جہنم کے مستحق ہوں گے۔

اللہ نے ابلیس اور اس کی جماعت کو یہ موقع دے دیا ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرنے کی آزادانہ سعی کرے اور آدم اور اس کی اولاد کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ اپنے اختیار سے جو راہ چاہے اختیار کرے۔ دونوں کے لئے آزمائش کے مواقع ہیں اور یہ اللہ کی مشیت کا تقاضا تھا کہ وہ اس طرح انسان کو آزمائے۔ اس طرح اسے اس کائنات کی ایک منفرد اور مکرم مخلوق کا مقام دے تاکہ یہ انسان نہ فرشتہ ہو اور نہ شیطان، بلکہ وہ اپنا ہی کردار ادا کرے نہ شیطانی کردار اور نہ ہی فرشتوں کا کردار۔

---○○○---

اب یہ منظر ختم ہوتا ہے اور اس کے بعد دوسرا منظر سامنے آتا ہے۔ ابلیس کو جنت سے دھتکارنے کے بعد اللہ تعالیٰ حضرت آدم اور ان کی بیوی سے مخاطب ہوتے ہیں۔ یہاں ہمیں صرف اس قدر بتایا جاتا ہے کہ آدم کی بیوی بھی تھی اور وہ اس کی ہم جنس تھی، لیکن یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کی تخلیق کس طرح ہوئی۔ آیت زیربحث اور اس جیسی دوسری آیات جو قرآن کریم میں وارد ہیں، اس معاملے میں کوئی بات نہیں بتاتیں اور تخلیق حوا کے بارے میں جو روایات ہیں ان کے اندر اسرائیلیات کے اثرات ضرور ہیں اس لئے ہم اس بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہہ سکتے کہ حوا کی تخلیق کیسے ہوئی؟ یہ بات یقینی ہے کہ اللہ نے آدم کی ہم جنس اس کی بیوی پیدا کی اور اس طرح وہ جوڑا ہو گئے۔ اللہ نے اپنی تمام مخلوق میں جوڑے پیدا کئے ہیں۔

(وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ) ''اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے ہیں تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔'' چنانچہ یہ اللہ کی سنت جاریہ اور اس کائنات کا بنیادی اصول ہے۔ جب ہم اس اصول کے مطابق رائے اختیار کریں تو پھر ہمیں یہ رائے اختیار کرنی ہوگی کہ خلق آدم کے بعد حوا کی تخلیق بھی جلد ہی کی گئی اور حضرت حوا کی تخلیق بھی حضرت آدم کی طرح ہوئی۔

بہرحال اب خطاب حضرت آدم اور آپ کی بیوی حضرت حوا سے ہے تاکہ سب سے پہلے ان کی زندگی کے بارے میں اللہ ان کو احکام دے۔ ان کی تربیت کی جائے اور زمین پر انہوں نے جو بنیادی کردار ادا کرنا ہے اس کے لئے انہیں تیار کیا جائے کیونکہ آدم کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ اس کرۂ ارض پر فریضہ خلافت الٰہیہ انجام دے جب کہ سورہ بقرہ کی

آیت میں واضح طور پر کہا گیا ہے۔

(اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً) "جب اللہ نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔"

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾

"اور اے آدم، تو اور تیری بیوی، دونوں اس جنت میں رہو، جہاں جس چیز کو تمہارا جی چاہے کھاؤ، مگر اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔"

قرآن کریم نے اس درخت کا نام نہیں لیا کیونکہ درخت کا نام لینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل بات یہ تھی کہ انہیں صرف منع کرنا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمام حلال چیزوں کے استعمال کی اجازت دے دی تھی اور ممنوعات کے استعمال سے روک دیا تھا۔ ممنوعات کی حد اس لئے ضروری تھی تاکہ انسان کو معلوم ہو جائے کہ وہ اس سے آگے نہیں جا سکتا اور اس کو ارادہ و اختیار کی جو آزادی دی گئی ہے اس کو استعمال کر کے وہ اپنی خواہشات اور میلانات پر کنٹرول کرنا سیکھے اور خواہشات اور میلانات پر برتری حاصل کرے۔ وہ حیوانات کی طرح خواہشات کا غلام نہ ہو بلکہ خواہشات کا حاکم ہو۔ کیونکہ ایک انسان اور حیوان میں فرق ہی یہ ہے کہ انسان خواہشات پر قابو رکھتا ہے اور حیوان خواہشات پر کوئی کنٹرول نہیں رکھتا۔

اب ابلیس اپنا وہ کام شروع کرتا ہے جس کے لئے اس نے اپنے آپ کو وقف کر لیا ہے۔ یہ انسان جسے اللہ نے یہ اعزاز دیا اور جس کی تخلیق کا اعلان عالم بالا کی اس عظیم تقریب میں کیا گیا، جسے تمام فرشتوں نے سجدہ ریز ہو کر سلامی دی، اور جس کے سامنے سجدہ ریز نہ ہونے کی بنا پر ابلیس کو عالم بالا سے خارج البلد کیا گیا۔ یہ مخلوق اپنے اندر دو صلاحیتیں رکھتی ہے۔ یہ دونوں جانب جا سکتی ہے اور اس مخلوق میں بعض کمزور پوئنٹ بھی ہیں جن سے اسے پکڑا جا سکتا ہے۔ الا یہ کہ وہ امر الٰہی پر کاربند ہو جائے۔ ان کمزور مقامات سے اس پر حملہ کیا جا سکتا ہے اور اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ ان کمزور نکات میں سے ایک ہے شہوات نفسانیہ ........ ذرا دیکھئے شیطان ان نکات سے کس طرح انسان پر قابو پاتا ہے۔

---

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ

تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَ قَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾

"پھر شیطان نے ان کو بہکایا تاکہ ان کی شرمگاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں ان کے سامنے کھول دے۔ اس نے ان سے کہا "تمہارے رب نے تمہیں جو اس درخت سے روکا ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ، یا تمہیں ہیشگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے۔" اور اس نے قسم کھا کر ان سے کہا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔"

معلوم نہیں کہ شیطانی وسوسہ کس طرح عمل پیرا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہم شیطان کی حقیقت سے واقف نہیں جس سے ہم اس کے اعمال کی نوعیت سے خبردار ہو جائیں یا یہ معلوم کر سکیں کہ وہ انسان تک رسائی کیونکر حاصل کرتا ہے اور اس کو کس طرح گمراہ کرتا ہے۔ لیکن ہمیں مخبر صادق کے ذریعے یہ علم حاصل ہے کہ شیطان کسی نہ کسی طرح انسان کو گمراہ کرتا ہے اور ان غیبی حقائق کے بارے میں مخبر صادق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی سچا اور یقینی ذریعہ علم ہیں۔ شیطان انسان کو مختلف طریقوں سے گمراہ کرتا ہے اور یہ تمام طریقے انسانی شخصیت میں کمزور مقامات کے ذریعے سے سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ انسانی شخصیت میں جو فطری کمزوریاں ہیں ان سے انسان صرف پختہ ایمان اور یاد الہٰی کے ذریعے سے بچ سکتا ہے اور ایمان اور ذکر کے بعد صورت یہ ہو جاتی ہے کہ شیطان کا انسان پر کوئی کنٹرول نہیں رہتا۔ اس کی سازشیں کمزور پڑ جاتی ہیں اور انسان پر ان کا اثر نہیں ہوتا۔ اس طرح شیطان نے ان کو بہکایا اور ان کی شرمگاہیں جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھیں ان کو ان پر ظاہر کر دیا گیا اور یہ تھا اس کا اصل مقصد۔ ان کی شرمگاہیں تھیں لیکن وہ ان کی نظروں سے اوجھل تھیں۔ وہ دیکھ نہ سکتے تھے۔ آگے تفصیلات آئیں گی کہ یہ جسمانی شرمگاہیں تھیں اور ان کو کسی دوسری مادی چیز سے چھپانے کی ضرورت تھی۔ شیطان نے ان پر اپنی اسکیم ظاہر نہ کی تھی البتہ وہ ان کی خواہشات کی راہ سے داخل ہو گیا۔ اس نے کہا "تمہارے رب نے تمہیں جو اس درخت سے روکا ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمہیں ہیشگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے۔"

یوں شیطان انسانی خواہشات کے ساتھ کھیلا۔ ہر انسان یہ خواہش رکھتا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے یا طویل عرصے تک عمر پائے اور اسے خلود نصیب ہو۔ اور اس کو ایسی سلطنت ملے جو محدود زندگی سے آگے ہو۔

بعض قراءتوں میں (مَلَكَيْنِ) لفظ ل کی زیر کے ساتھ آیا ہے۔ (مَلِكَيْنِ) جس کے معنی دو بادشاہ کے ہوتے ہیں۔ سورہ طٰہٰ کی آیت (هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (۲۰: ۱۲۰)) "کیا میں خلود کا درخت نہ بتاؤں اور ایسی بادشاہت جو ختم ہونے والی نہ ہو۔" اس صورت میں شیطان نے انہیں دائمی عمر اور دائمی حکومت کا لالچ دیا۔ یہ دونوں چیزیں انسان کی خواہشات میں سرفہرست ہیں۔ جنسی خواہش کی اصل حقیقت بھی یہ ہے کہ جنسی تعلق و اتصال کے ذریعے ایک انسان خلود ہی چاہتا ہے یعنی اس کی اولاد ہو اور نسلاً بعد نسلٍ وہ زندہ رہے اور اگر ملکین پڑھیں تو مراد یہ ہو گی کہ دونوں فرشتے بن جاؤ گے اور انسان کی جسمانی ضروریات سے فارغ ہو جاؤ گے اور ملائکہ کی طرح زندگی بھی دائمی ہو گی لیکن پہلی قرأت اگرچہ مشہور قرأت نہیں ہے، سورہ طٰہٰ کی آیت سے زیادہ موافق ہے اور اس سورہ میں شیطان کا دھوکہ بھی انسانی خواہشات کی حدود کے اندر رہتا ہے۔

شیطان لعین چونکہ جانتا تھا کہ اللہ نے ان کو بصراحت اس درخت سے منع کر دیا ہے اور یہ کہ اللہ کی جانب سے ممانعت کی وجہ سے ان کے دل میں کھٹکا موجود ہے اور قوت مدافعت ان کے اندر پائی جاتی ہے اس لئے اس وسوسہ اندازی میں وہ انسانی خواہشات اور کمزوریوں سے استفادے کے ساتھ ساتھ ناصح مشفق بن کر اور قسمیں اٹھا کر کہتا ہے (وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ (۷: ۲۱)) "اور اس نے قسم کھا کر ان سے کہا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔"

آدم اور ان کی بیوی اللہ کی اس تنبیہ کو بھول جاتے ہیں کہ شیطان ان کا دشمن ہے۔ یہ بھول ان کی شخصی خواہش اور شیطان کی قسموں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا تھا کہ تم احکام الٰہیہ کی اطاعت کرو چاہے کسی حکم کی علت سمجھو یا نہ سمجھو۔ یہ دونوں یہ بھی بھول گئے کہ اللہ کی تقدیر اور حکم کے سوا کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر اللہ نے ان کے لئے خلود نہیں لکھا اور دائمی حکومت نہیں لکھی تو یہ مقصد کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۗ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾

"پس دھوکا دے کر وہ ان دونوں کو رفتہ رفتہ اپنے ڈھب پر لے آیا۔ آخرکار جب انہوں نے اس درخت کا مزا چکھا تو ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔ تب ان کے رب نے انہیں پکارا "کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہ روکا تھا اور تم دونوں سے نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

اب یہ دھوکہ تمام ہوا اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے آگیا۔ شیطان نے ان کو اللہ کی اطاعت سے پھیر کر اللہ کی معصیت میں مبتلا کر دیا اور یہ سب کچھ اس نے گہری سازش اور دھوکے سے کیا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس جوڑے کو دنیا میں اتار دیا۔ (فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ (۷: ۲۲)) "اس نے دھوکہ دے کر یہ مقصد حاصل کیا۔"

اب انہیں اس بات کا شعور ہوا کہ ان کے جسم میں شرمگاہیں بھی ہیں۔ یہ شرمگاہیں پہلے ان کی نظروں سے اوجھل تھیں۔ چنانچہ انہوں نے جنت کے درختوں کے پتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر ان کو اپنی شرمگاہوں پر رکھنا شروع کر دیا۔ ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان شرمگاہوں سے مراد وہ جسمانی حصے ہیں جن کے ظاہر ہونے سے انسان فطرتاً شرمندہ ہوتا ہے اور ان مقامات کو صرف وہی شخص ننگا اور ظاہر کر سکتا ہے جس کی فطرت کسی جاہلی سوسائٹی کی وجہ سے فساد پذیر ہو چکی ہو۔

(وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ

لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ (۷: ۲۲)) "تب ان کے رب نے انہیں پکارا" کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہ روکا تھا اور نہ کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔"
ان دونوں نے اللہ کی جانب سے آنے والی یہ جواب طلبی سنی کیونکہ انہوں نے نصیحت کو بھلا دیا اور نافرمانی کی۔ سوال یہ ہے کہ اللہ کی جانب سے آنے والی اس ندا کی کیفیت کیا تھی؟ ویسی ہی جس طرح پہلی مرتبہ اللہ نے انہیں خطاب کیا تھا' جس طرح فرشتوں کو خطاب کیا تھا۔ جس طرح ابلیس کو خطاب کیا تھا۔ یہ سب امور غیبی امور ہیں اور ان کے بارے میں ہم صرف گمان رکھتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا ہو گا اور اللہ جو چاہتا ہے' کرتا ہے۔
اس پکار کے مقابلے میں' معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کی اس منفرد مخلوق انسان کی شخصیت کا ایک دوسرا اہم پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ وہ بھول بھی جاتا ہے اور اس سے غلطی بھی سرزد ہو جاتی ہے اور یہ کہ اس میں ایسی کمزوریاں بھی ہیں جن کے راستے سے شیطان اس پر اثرانداز ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ یہ انسان نہ ہمیشہ غلطی پر ہوتا ہے اور نہ ہمیشہ صحیح راستے پر ہوتا ہے۔ البتہ یہ ہے کہ وہ اپنی غلطی اور لغزش کا ادراک کر لیتا ہے اور اس ادراک کے بعد وہ طلب مغفرت کرتا ہے اور نادم ہو جاتا ہے۔ وہ واپس ہو کر توبہ کرتا ہے اور شیطان کی طرح معصیت پر اصرار نہیں کرتا۔ وہ اپنے رب سے معصیت پر معاونت طلب نہیں کرتا۔

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۲۳﴾

دونوں بول اٹھے "اے رب' ہم نے اپنے اوپر ستم کیا' اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔"
یہ انسان کی وہ خصوصیت ہے جو اسے اپنے رب سے ملائے رکھتی ہے' اور رب تک رسائی کے دروازے کھلے رکھتی ہے۔ اعتراف جرم اور ندامت و استغفار۔ اپنی کمزوری کا شعور اور اللہ سے طلب استعانت اور طلب رحمت' اور یہ یقین کہ اللہ کے سوا کوئی اور قوت کا سرچشمہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی معاونت کر سکتا ہے۔ اگر اللہ کی رحمت و معاونت نہ ہو تو انسان عظیم خسارے سے دوچار ہوتا ہے۔
یہاں انسان کا پہلا تجربہ پورا ہو جاتا ہے اور اس کی شخصیت کے بڑے بڑے خدوخال واضح ہو جاتے ہیں۔ خود انسان اپنی کمزوریوں اور اپنے کمالات و صلاحیتوں سے واقف ہو جاتا ہے' وہ صلاحیتیں جو اسے کرۂ ارض پر فریضہ خلافت کی ادائیگی کے لئے دی گئی ہیں۔ اس فریضے کا اہم حصہ یہ ہے کہ اس زمین پر انسان نے اپنے دشمن شیطان کے ساتھ ایک دائمی معرکہ سر کرنا ہے۔

---

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ

مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ﴿۲۴﴾ قَالَ فِیْهَا تَحْیَوْنَ وَ فِیْهَا تَمُوْتُوْنَ وَ مِنْهَا
۲ ع ۱۵
تُخْرَجُوْنَ﴿۲۵﴾
۹

فرمایا "اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اور تمہارے لئے ایک خاص مدت تک زمین ہی میں جائے قرار اور سامان زیست ہے، اور فرمایا "وہیں تم کو جینا اور وہیں مرنا ہے اور اسی میں سے تم کو آخر کار نکالا جائے گا۔"

سب کے سب اتر جاؤ، اس کرۂ ارض پر جا بسو، سوال یہ ہے کہ اس وقت یہ لوگ کہاں تھے؟ جنت کہاں ہے؟ یہ غیبی امور سے متعلق باتیں ہیں اور اس بارے میں ہم اسی قدر جانتے ہیں جس قدر ہمیں وہ ذات باری بتا دے جس کے ہاتھ میں غیب کی کنجیاں ہیں۔ اب جب کہ وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے تو کسی انسان کی جانب سے ان غیبی امور و مقامات کی تلاش ایک فضول کوشش ہو گی۔ اسی طرح جو لوگ ان امور کا انکار کرتے ہیں اور اپنی سائنسی اور غیر یقینی معلومات کی اساس پر کرتے ہیں وہ بھی اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں اور ان کا یہ موقف محض خود سری اور مکابرہ ہے۔ اس لئے کہ وہ اس عالم غیب کی بات کرتے ہیں جہاں تک انہیں رسائی حاصل نہیں ہے لیکن ان لوگوں کی خود سری کا عالم یہ ہے کہ یہ سرے سے عالم غیب کا انکار کرتے ہیں حالانکہ اس غیب نے ابھی تک انسان کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ ان لوگوں کے علم کا موضوع مادہ ہے اور مادے کی دنیا میں بھی اب تک کے معلوم سے مجہول زیادہ ہے۔

بہرحال یہ سب لوگ اترے۔ زمین پر آ گئے۔ آدم، حوا، ابلیس اور اس کے حواری و موالی اور یہاں وہ اس لئے اترے کہ اس میدان میں معرکہ آدم و ابلیس شروع ہو، وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں اور دو مزاجوں کے درمیان معرکہ شروع ہو جائے۔ ایک مزاج سو فیصد شر پسند ہے اور دوسرا خیر و شر دونوں کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اللہ کی مشیت نے ابتلاء کی جو اسکیم تیار کی ہے اسے پورا کیا جا سکے اور اللہ کا منصوبہ قضا و قدر آخر تک پہنچے۔

اللہ نے آدم اور ان کی اولاد کے لئے زمین پر رہنا مقرر کر دیا کہ وہ یہاں بسیں۔ دنیا کی پیداوار سے فائدہ اٹھائیں۔ ایک وقت مقررہ تک۔ یہاں زندہ رہیں اور مریں اور وقت آنے پر انہیں اٹھایا جائے گا تاکہ وہ اپنے رب کے سامنے جوابدہی کریں۔ اہل جنت، جنت میں اور اہل النار دوزخ میں جائیں۔ یہ ہو گا انجام اس عظیم سفر انسانیت کا۔

اب یہ پہلا راؤنڈ ختم ہوا۔ اس کے بعد معرکہ آدم و ابلیس کے نئے راؤنڈ ہوں گے۔ ان میں انسان صرف اس صورت میں کامیاب ہو گا کہ اس نے اپنے رب کی پناہ لی ہو گی اور اگر اس نے اپنے دشمن کو دوست بنا لیا تو ظاہر ہے کہ وہ شکست کھائے گا۔

---ooo---

یہاں یہ بات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ کوئی قصہ یا کہانی نہیں ہے بلکہ ان آیات میں انسان کی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے تاکہ اس کے مزاج، اس کی نشو و نما، اس کے ماحول، نظام قضا و قدر جو اس کی زندگی کو متاثر کرتا ہے اور وہ نظام جو اللہ نے اس کے لئے پسند کیا، وہ ابتلاء جس سے اس نے دوچار ہونا ہے اور وہ انجام جس تک اس نے پہنچنا ہے، کے بارے میں حقائق سامنے آ سکیں اور یہ وہ باتیں ہیں جو اسلامی تصور حیات کی بنیادوں میں شامل ہیں۔

جہاں تک ہمیں فی ظلال القرآن کا منہاج اجازت دے گا' ہم اس کے بنیادی نکات یہاں نوٹ کریں گے۔ تفصیلات ہم اپنی کتاب "خصائص التصور الاسلامی" کے لئے چھوڑتے ہیں جو اس موضوع پر تفصیلی بحث کرتی ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں' قصہ تخلیق انسانیت سے ہمیں جو پہلی حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق اور انسان کی تخلیق کے درمیان ایک فطری ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یہ دونوں اللہ کے نظام قضا و قدر کے اندر کام کرتے ہیں۔ اس حقیقت کے ادراک سے ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ انسان کی تخلیق جو ایک تقدیر اور منصوبے کے مطابق ہوئی محض اتفاقی بات نہ تھی اور اس کائنات' انسان اور نظام قضا و قدر کے درمیان مکمل توافق ہے۔

جو لوگ اللہ کی معرفت سے محروم ہیں وہ ذات باری کی قدر نہیں کر سکتے جس طرح کہ اس کا حق ہے۔ یہ لوگ اللہ کے کاموں اور اس کے نظام قضا و قدر کو ان پیمانوں سے ناپتے ہیں جو انسان کے چھوٹے چھوٹے کاموں اور منصوبوں کے لئے وضع ہوئے ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں تو ان کی سمجھ میں صرف یہ بات آتی ہے کہ انسان بھی اس دنیا کی دوسری مخلوقات کی طرح کی ایک مخلوق ہے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ اس عظیم کائنات میں یہ زمین ایک ذرہ کے برابر ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ کوئی معقول بات نہیں ہے کہ انسان کی پیدائش کے پیچھے کوئی مقصد تلاش کیا جائے' لہٰذا اس انسان کی اس کائنات میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ انسان کا وجود یہاں محض اتفاق سے ہو گیا اور اس انسان کے اردگرد جو کائنات ہے وہ اس کے وجود اور نشوونما کے سخت خلاف ہے۔ یہ محض تیر تکے ہیں جو یہ لوگ اللہ کے افعال اور اس کے نظام قضا و قدر کے بارے میں چلاتے ہیں۔ اور وہ بھی محض اپنی محدود انسانی معیار عقل و دانش کے مطابق۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ پوری کائنات انسان کی ملکیت ہوتی تو وہ اس چھوٹے سے کرۂ ارض کو خاطر ہی میں نہ لاتا اور نہ اس چھوٹی سی مخلوق کی پرواہ کرتا جو اس پر چلتی ہے۔ کیونکہ انسان اس پوری کائنات کی عظیم مملکت کا اہتمام نہیں کر سکتا۔ نہ وہ اس کی ہر چیز کی تدبیر کر سکتا ہے' نہ ہر چیز کا اندازہ کر سکتا ہے اور نہ وہ اس جہان کی تمام اشیاء کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جہان کا بادشاہ اللہ ہے اور آسمانوں اور زمینوں میں سے کوئی ایک ذرہ بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہے۔ اللہ اس عظیم کائنات کا تھامنے والا ہے اور اس کائنات کی کوئی چیز اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتی اگر اللہ کا حکم نہ ہو۔ یہاں کوئی چیز بھی اللہ کی مشیت کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی۔ انسان جب اللہ کی ہدایت کو ترک کر دے اور اپنی خواہشات نفسانیہ کی پیروی شروع کر دے تو وہ مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر اس مصیبت کو وہ علم کا نام دیتا ہے تو یہ اس کی مرضی ہے۔ وہ اللہ کو اپنے اوپر قیاس کرتا ہے اور اللہ کے افعال و اعمال کو اپنے افعال پر قیاس کرتا ہے حالانکہ اللہ کے افعال و اقدار انسان کے قیاس سے باہر ہیں۔ یہ انسان کی غلط فہمی ہے کہ وہ اپنی خواہش کو اپنی کم ظرفی کی وجہ سے حقیقت سمجھتا ہے۔

سر جیمس جینز اپنی کتاب "کائنات جو ایک راز ہے" انسان کے گمراہانہ تصورات کے بارے میں کہتا ہے۔

"ہم جب اس زمین پر کھڑے ہوتے ہیں' جو ریت کا ایک چھوٹا سا دانہ ہے تو ہم یہ کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس پوری کائنات کی طبیعت اور ماہیت کو معلوم کریں جو ہمارے اردگرد اور زمان و مکان کی ناقابل تصور وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہم یہ بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس کو وجود میں لانے کی غرض و غایت کیا ہے؟ جب ہم اس کائنات کو دیکھتے ہیں تو سب سے پہلے تو ہم حیرانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ہماری نظریں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ

کائنات کس طرح ہمیں خوف میں مبتلا نہ کرے جبکہ اس کی وسعتیں اس قدر بڑی ہیں کہ ہماری عقل ان کا ادراک نہیں کر سکتی ۔ پھر اسی کائنات پر ایک طویل عرصہ گزر گیا ہے اور ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور اس کے مقابلے میں انسان کے ذخیرہ علم میں جو تاریخ ہے وہ ان زمانوں کے مقابلے میں ایک لمحہ ہے ۔ پھر یہ اس اعتبار سے بھی خوفناک ہے کہ اس کے اندر ایک خوفناک وحدت پائی جاتی ہے ۔ پھر یہ اس لئے بھی خوفناک ہے کہ اس کائنات کے اندر ہمارا وطن' یہ زمین اس قدر چھوٹی ہے کہ دنیا کے سمندروں کے ایک چھوٹے سے ریت کے کنکر کو اگر ایک ملین ٹکڑے کیا جائے تو اس سے بھی کم ہے ۔ لیکن اس کائنات کی سب سے زیادہ خوفناکی اس پہلو سے ہے کہ یہ ایک بے مطلب چیز ہے ۔ جس طرح ہماری زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بے مطلب ہے ۔ ہمارے جذبات' ہمارے مقاصد' ہمارے اعمال' ہمارے فنون اور ہمارے ادیان سب کے سب اس کائنات کے نظام کے ساتھ غیرمانوس ہیں اور اس کے نظام کے ساتھ بے میل ہیں ۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اس کائنات اور ہماری زندگی کے درمیان مستقل دشمنی اور تضاد ہے تو یہ بات غلط نہ ہوگی اس لئے کہ اس کائنات کی فضا کی اکثریت اس قدر ٹھنڈی ہے کہ جہاں زندگی ممکن نہیں ہے ۔ تمام انواع حیات وہاں منجمد ہو جاتے ہیں اور اکثر مادی اجزاء اس قدر گرم ہیں کہ ان میں زندہ رہنا محال ہے ۔ اس فضائے کائنات میں ایسی شعاعیں ہر وقت باہم متصادم ہوتی رہتی ہیں کہ اجرام فلکی باہم متصادم رہتے ہیں اور یہ شعاعیں بسااوقات زندگی کی دشمن ہو سکتی ہیں بلکہ کسی بھی وقت زندگی ختم کر سکتی ہیں ۔"

"یہ کائنات جس میں حالات نے ہمیں لا کر پھینک دیا ہے' اگر یہ بات سچ نہیں ہے کہ ہم یہاں اس کائنات کی کسی غلطی کی وجہ سے زندہ ہیں تو یہ بات بہرحال قرین قیاس ہے کہ انسان کا وجود یہاں محض اتفاق اور مصادفت سے ہو گیا ہے ۔"

یہ ہیں ان لوگوں کے خیالات ۔ یاد رہے کہ اس سے قبل ہم اس نکتے پر بحث کر آئے ہیں کہ اس کائنات کا دشمن حیات ہونا اور یہ فرض کر لینا کہ یہ کائنات کسی مدبر اور کنٹرول کرنے والے کے بغیر ہے' اور یہ کہ اس کے اوپر انسان جیسی مخلوق اور مطلق زندگی کا وجود میں آ جانا محض اتفاق کے طور پر ہے کسی عام آدمی کی عقل میں آنے والی بات نہیں ہے چہ جائیکہ کوئی بڑا عالم یا سائنس دان ایسی باتیں کرے ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ کائنات اس کے اندر پائے جانے والی ہر قسم کی زندگی کی قاتل ہے اور کوئی اس کے اوپر قوت مدبرہ بھی نہیں ہے تو یہ زندگی کس طرح وجود میں آ گئی؟ سوال یہ ہے کہ یہ زندگی کائنات سے زیادہ طاقتور ہے کہ یہ کائنات کے علی الرغم وجود میں آ گئی اور باوجود اس کے وجود میں آ گئی کہ کائنات اس کے وجود میں آنے کے خلاف تھی ۔ کیا انسان وجود میں آنے سے قبل اس عظیم کائنات سے زیادہ قوی تھا' اور اس طرح وہ زبردستی یہاں آکر کھڑا ہو گیا ۔

میں کہتا ہوں یہ ایک ایسی سوچ ہے جس پر توجہ ہی نہ دینا چاہئے ۔ اگر یہ نام نہاد علماء فقط یہ کہنے پر اکتفا کرتے کہ ہمارے ذرائع علم اس کائنات کی تفسیر و توضیح نہیں کر سکتے اور یہ خرافات نہ بکتے جو وہ میٹا فزکس کے بارے میں بکتے ہیں' جن پر کوئی سند ان کے پاس نہیں ہے تو وہ اپنا فرض ادا کر جاتے اگرچہ یہ فرض بھی ناقص ہوتا ۔ البتہ وہ کہہ دیتے کہ ہمارے اردگرد جو کائنات ہے یہ ایک معمہ ہے لیکن وہ اپنے دائرہ علم سے بہت آگے بڑھ جاتے ہیں اور مفروضوں' بلا دلیل تصورات اور انسانی خواہشات کے پیدا کردہ فنی مزعومات کی دلدل میں جا پھنستے ہیں جو غیر محفوظ علاقے ہیں ۔

ہم مسلمان الحمدللہ جب اس کائنات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں نہ خوف دامن گیر ہوتا ہے اور نہ ہم اس حیرت میں

پڑتے ہیں، جس کا اظہار سرجیس جینز نے کیا ہے بلکہ ہم تو اس کائنات کے خالق کے بارے میں ڈر جاتے ہیں اور ہمیں وہ جمال و جلال نظر آتا ہے جو اس کائنات کے اندر ودیعت کر دیا گیا ہے۔ ہمیں بے حد اطمینان اور انس کا احساس ہوتا ہے اور یہ کائنات ہماری دوست بن جاتی ہے اس لئے کہ اس کو بھی خالق نے پیدا کیا ہے اور ہمیں بھی۔ دونوں کے اندر پورا توافق اور ہم آہنگی ہے۔ ہم اس کی ضخامت اور اس کی باریکی سے حیرت زدہ ضرور ہوتے ہیں لیکن خوفزدہ نہیں ہوتے اور ہمیں یہ شعور اور احساس آکر نہیں پکڑتا کہ اب ہم آج یا کل برباد ہو رہے ہیں اس لئے کہ ہمارا اور اس کائنات کا رب ایک ہے۔ ہم اس کے ساتھ نہایت ہی انس و محبت اور اعتماد اور یقین کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ ہمارا رزق اور ضروریات اور ہماری معاش اور معیشت کے ذخائر اسی میں ہیں اور ہمیں اس کائنات کے خالق کا شکرگزار ہونا چاہئے۔

(وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۷: ۱۰)) "ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لئے یہاں سامان زیست فراہم کیا۔ مگر تم لوگ کم ہی شکرگزار ہوتے ہو۔"

قصہ تخلیق آدم سے ہمیں جو دوسری حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی جملہ زندہ مخلوق کے مقابلے میں انسان ایک معزز، برتر اور مکرم مخلوق ہے۔ اس نے اس جہان میں نہایت ہی اہم رول ادا کرنا ہے۔ اس نے نہایت ہی وسیع میدان میں تگ و دو کرنی ہے اور اس کے ساتھ یہاں کئی جہانوں کا معاملہ ہے۔ لیکن یہ تمام امور اللہ وحدہ کی بندگی اور غلامی کی حدود میں ہیں۔ اس انسان کی یہاں وہ پوزیشن نہیں جو اسے وہ مکاتب فکر دیتے ہیں جو حواس خمسہ اور مادیت کے اندر محدود ہیں۔ یہ مکاتب فکر انسان کو اس کائنات کا ایک مؤثر عامل نہیں سمجھتے۔ ان مذاہب و تصورات میں تمام اہمیت مادے اور اس کے اثرات کو دی جاتی ہے۔ اسی طرح نظریات ارتقاء کے قائلین اسے اس سے بھی گھٹیا مقام دیتے ہیں یعنی حیوانات میں سے ایک حیوان۔ ان لوگوں کو انسان کی انسانی خصوصیات سے کوئی غرض اور واسطہ نہیں ہے۔ یا وہ اسے فرائیڈ کے نظریہ جنسیت کے زاویہ سے دیکھتے ہیں جو انسان کو محض جنس کے گندے تالاب کا ایک کیڑا سمجھتا ہے اور وہ اسی گندے تالاب کے ذریعے ہی ترقی کرتا ہے۔ لیکن اسلام اس منفرد مخلوق یعنی انسان کو جو عزت و کرامت عطا کرتا ہے وہ اس مقام تک نہیں پہنچتی کہ وہ الٰہ بن جائے جیسا کہ جدید روشن خیالی کے دور میں پیدا ہونے والے تصورات حیات نے اسے الٰہ بنا دیا ہے۔ اسلامی تصور حیات اسے سچائی اور اعتدال کا درجہ دیتا ہے جو درست اور صحت مند ہے۔

پھر اس منفرد مخلوق حضرت انسان کی تخلیق کا اعلان عالم بالا کی ایک نہایت ہی پروقار تقریب میں کیا گیا، اور جیسا کہ ہم نے قرآنی نصوص کی روشنی میں کہا اس تقریب میں ایک مکمل انسان پیش کیا گیا۔ اس میں یہ اعلان بھی کیا گیا کہ وہ اس زمین کا خلیفہ ہے۔ جنت میں اس پر جو ابتلا آئی وہ بھی اسی غرض کے لئے تھی کہ وہ فرائض خلافت کی ادائیگی کے لئے تیار ہو جائے، جیسا کہ دوسری آیات میں آتا ہے کہ یہ پوری کائنات، صرف زمین نہیں، انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ وہ اس کے لئے مفید و معاون ہے اور زمین و آسمان میں جس قدر چیزیں ہیں، انسان کے لئے مسخر کر دی گئیں۔

پھر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے اس دنیا میں انسان کو جو کردار سپرد کیا ہے وہ بھی بہت ہی عظیم ہے۔ اس

پورے کرۂ ارض کو ترقی دینا اور اس کے اوپر اللہ کا نظام خلافت قائم کرنا چاہے اس زمین کا حجم بڑا ہو یا چھوٹا' بہرحال یہ ایک عظیم ڈیوٹی ہے جو انسان کے سپرد کی گئی۔

اس قصے اور قرآن کریم کی دوسری آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک منفرد مخلوق ہے اور یہ صرف اس کرۂ ارض پر ہی منفرد نہیں ہے بلکہ یہ پوری کائنات میں منفرد مخلوق ہے۔ دوسرے ستاروں میں ملائکہ' جنات اور وہ تمام مخلوقات ہیں جن کے بارے میں صرف اللہ جانتا ہے۔ ان مخلوقات کے دوسرے فرائض ہیں' یہ تمام مخلوقات اپنا علیحدہ مزاج اور طبیعت رکھتی ہیں۔ ان کی طبیعت ان کے فرائض کے ساتھ مناسب ہے۔ البتہ انسان ایک منفرد مخلوق ہے جس کے فرائض اور وظائف بھی منفرد ہیں اور اس پر قرآن کی یہ آیت دلالت کرتی ہے۔

(اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۳۳ : ۷۲)) ”ہم نے اس امانت کو آسمانوں' زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے' لیکن انسان نے اسے اٹھالیا' بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔“

گویا انسان اس پوری کائنات میں اپنی خصوصیات کے اعتبار سے منفرد ہے۔ ان خصوصیات میں ظلم اور جہل دونوں شامل ہیں۔ اس ظلم اور جہل کے ساتھ اسے ذاتی خود مختاری دی گئی ہے اور علم و معرفت کی استعداد دی گئی ہے۔ ذاتی ارادہ دیا گیا ہے اور جس قدر وہ جہل و ظلم پر قادر ہے اسی قدر وہ عدل اور علم پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ غرض انسانی صلاحیتوں کی یہ رنگارنگی ہی اس کی اہم خصوصیت ہے۔

ان تمام خصوصیات کے ساتھ' اب یہ بات اہم نہیں رہتی کہ انسان جس کرے پر زندہ ہے وہ اپنے حجم اور اس پوری کائنات کی وسعت کے اعتبار سے بہت ہی چھوٹا ہے۔ اس لئے کہ ہر معاملے میں حجم کی اہمیت نہیں ہوتی۔ مثلاً قوت عقلی جو اشیاء کا ادراک کرتی ہے اور انسان کا متحرک بالارادہ ہونا اور اپنی ذاتی ترجیح کے مطابق کام کرنا' اگرچہ اللہ کی بندگی کے وسیع تر دائرے کے اندر ہو' یہ سب چیزیں بہرحال انسان کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتی ہیں اور اسے ایک منفرد مخلوق بنا دیتی ہیں۔ محض اس زمین کے حجم کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے سر جیمس جینز جیسے لوگ انسان کی قدر و قیمت کو گھٹاتے ہیں۔ یہ بات درست نہیں ہے۔

یہ آیات اور یہ قصص انسان کو جو اعزاز عطا کرتے ہیں وہ اس کے فریضہ خلافت الٰہیہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس منفرد مخلوق کا اعزاز اور اس کی اہمیت مزید واضح ہوتی ہے جب ہم ان آفاق اور کائنات کی ان پہنائیوں پر نظر ڈالتے ہیں جن میں یہ کام کرتا ہے۔

اب ذرا دیکھئے کہ اس منفرد مخلوق کا معاملہ اپنے رب کے ساتھ براہ راست ہے۔ اس نے اسے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا ہے۔ پھر عالم بالا کی پروقار تقریب میں اس کا اعلان کیا ہے اور اسے گویائی عطا کی۔ پھر اسے جنت میں داخل کیا اور کہا کہ کھاؤ جہاں سے چاہو ماسوائے ممنوعہ درخت کے۔ اس کے بعد اسے خلافت کا مقام عطا کیا' خود اپنے کلام کے ساتھ۔ پھر اللہ نے اسے تعلیم دی جیسا کہ آیت سورۂ بقرہ میں ہم نے اس کی تشریح کر دی ہے کہ اسماء سے مراد الفاظ کے معانی ہیں یعنی لفظ اور

مدلول وہ چیز ہے جس پر علم و معرفت کا تبادلہ ممکن ہوا ہے۔ان ہی کے ذریعے سے تمام انسانوں کے علم میں اضافہ ہوا ہے۔
اور آدم کو جنت میں بھی اور اس کے بعد بھی اللہ نے وصیت کی اور اسے ایسی خصوصی صلاحیتیں دیں جو صرف انسان میں ہیں اور کسی اور مخلوق کو نہیں دی گئیں اور پھر اپنی مزید ہدایت دے کر رسولوں کو بھیجا۔پھر اللہ نے اپنے اوپر اپنی مخلوق کے ساتھ رحمت کرنا فرض کر لیا کہ اگر وہ توبہ کر لیں اور معافی کے خواستگار ہوں تو انہیں معاف کر دیا جائے اور یہ اس منفرد مخلوق پر اللہ کا آخری کرم ہے۔

یہ انسان عالم بالا کے ساتھ بھی باہم ہم سفر ہے۔فرشتے اس کی تکریم میں سجدہ کرتے ہیں۔پھر اس کی حفاظت کے لئے بھی فرشتے مقرر ہیں۔ان میں سے بعض وحی لانے کے فرائض سرانجام دیتے ہیں اور اللہ کے جو بندے یہ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر ثابت قدمی اختیار کرتے ہیں تو ان پر اللہ فرشتے نازل کرتا ہے' جو اسے خوشخبری دیتے ہیں۔اس طرح جو لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں ان کی بھی یہ فرشتے نصرت کرتے ہیں اور انہیں فتح کی خوشخبری دیتے ہیں۔پھر یہ فرشتے کفار پر مسلط کئے جاتے ہیں جو انہیں قتل بھی کرتے ہیں اور ان کی ارواح کو بھی عذاب دیتے ہیں۔غرض یہ اور دوسرے معاملات ایسے ہیں جن میں انسان کا فرشتوں کی دنیا سے بھی ربط و معاملہ ہے۔

پھر انسان کا جنات کے ساتھ بھی معاملہ ہے۔ان کے صالحین کے ساتھ بھی اور ان کے شرپسندوں کے ساتھ بھی۔
انسان اور شیطان اعظم کے درمیان جو معرکہ ہوا اس کے بارے میں تو قارئین جان چکے ہیں۔یہ عظیم معرکہ اب بھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔لیکن نیک جنوں کے ساتھ انسان کا باہم ربط بھی بعض آیات میں مذکور ہے اور جنات کی تسخیر بھی قرآن سے ثابت ہے جس طرح حضرت سلیمان کے قصے میں مذکور ہے کہ انہوں نے جنات کو مسخر کر لیا تھا۔

اسی طرح یہ انسان اس پوری مادی کائنات کے ساتھ بھی مربوط ہے۔خصوصاً زمین اور اس کے اردگرد ستاروں اور سیاروں کے ساتھ۔اس زمین پر تو انسان اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے۔انسان کے لئے اس کی تمام قوتیں مسخر کر دی گئی ہیں' اس کے خزانے اور پیداوار انسان کے لئے وقف ہے۔اور انسان کے اندر وہ قوت اور استعداد ودیعت کر دی گئی ہے جو اس کی کنہ تک مسلسل پہنچ رہا ہے اور اس کے طبیعی قوانین کا انکشاف کرتا چلا جاتا ہے اور اس طرح وہ اس زمین پر عظیم کردار ادا کر رہا ہے۔یوں اس کا اس کائنات کی تمام زندہ مخلوق کے ساتھ ربط ہے۔پھر اپنی طبیعت کی بوقلمونیوں کی وجہ سے وہ خود اپنے نفس کے اندر بہت دور تک معرفت کے گھوڑے دوڑاتا ہے۔یہ آسمانوں تک معراج حاصل کرتا ہے اور فرشتوں کے مقامات سے بھی آگے چلا جاتا ہے۔لیکن اس وقت جب وہ اللہ کا بندۂ خاص ہوتا ہے۔لیکن اگر وہ گر جائے تو محض ایک حیوان کی سطح تک بھی اتر آتا ہے۔جب وہ اپنی خواہشات کو اپنا الٰہ بنالے۔اس وقت اس کی انسانیت گندے حیوانی تالاب میں لت پت ہو جاتی ہے۔ان دو انتہاؤں کے درمیان ایک وسیع و عریض میدان درجات ہے جو عالم حس کے اندر اور اس کے آگے ورائے حس کی حدود تک پھیلا ہوا ہے اور اس کا اس میں معاملہ ہے........یاد رہے کہ انسان کے سوا کسی اور مخلوق کے لئے یہ مقامات نہیں ہیں' جیسا کہ اس قصے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ یہ منفرد مخلوق' اپنی اس انفرادیت کے باوجود بعض پہلوؤں سے کمزور بھی ہے اور اپنی ان کمزوریوں کی وجہ سے اس بات کا امکان ہے کہ اسے شر کی طرف کھینچا جاسکتا ہے وہ ذاتی اور سفلی خواہشات کے پیچھے درجہ اسفل تک بھی گر سکتا ہے۔اس کی ایک کمزوری تو یہ ہے کہ وہ یہاں باقی رہنا چاہتا ہے۔پھر وہ اقتدار کا بھی بھوکا ہے اور اس

کے اندر اقتدار کی سخت خواہش ہے۔ جب وہ اللہ کی ہدایات کو پس پشت ڈال دیتا ہے تو اس کی کمزوریوں میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ خالص خواہشات نفسانیہ کا بندہ بن جاتا ہے یا وہ ایسے دشمن شیطان کا پیروکار بن جاتا ہے' جس نے یہ ڈیوٹی اپنے ذمے لے رکھی ہے کہ وہ اسے گمراہ کرے گا' اس مقصد کے لئے انتھک کوشش جاری رکھے گا اور اس مقصد کے حصول کے لئے وہ تمام ذرائع و وسائل کام میں لائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کی وجہ سے اسے پوری طرح اس کی فطرت کے سپرد نہیں کر دیا۔ نہ اسے اپنی عقل اور سوچ کے حوالے کر دیا ہے۔ بلکہ اس کی ہدایت کے لئے اور اسے انجام بد سے ڈرانے کے لئے رسولوں کا سلسلہ بھیجا ہے۔ چنانچہ اس قصے پر بطور تبصرہ اگلی آیات کی تفسیر میں آ رہا ہے۔ اور یہ انسان کی کامیابی کا پہلا زینہ ہے۔ اس طرح وہ اپنی خواہشات کے جنگل سے آزاد ہو کر اللہ کی جانب چلا آتا ہے اور اس طرح اپنے خفیہ دشمن سے نجات پا جاتا ہے۔ یہ نجات اسے اللہ کے ذکر' اس کی یاد' اس کی رحمت اور اس کے اجر کے حصول کے داعیہ اور اس کی سرزنش سے ڈر کی وجہ سے ملتی ہے۔

یہ تمام باتیں اسے قوت بخشتی ہیں اور ان کے ذریعے وہ اپنی کمزوریوں اور شہوات پر قابو پا لیتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کی پہلی ٹریننگ یہ تھی کہ جنت میں اس کے لئے ایک درخت کو حرام کر دیا گیا تاکہ وہ اس سے بچ کر اپنے ارادے کو قوت بخشے اور کمزوریوں اور نافرمانیوں کی کشش کا مقابلہ کرے۔ اگرچہ وہ اس پہلے تجربے اور پہلی آزمائش میں کامیاب نہیں رہا لیکن بعد میں یہ ناکامی اس کے لئے سبق آموز ثابت ہوئی۔

اس کی ان کمزوریوں کی وجہ سے اللہ نے رحم فرمایا اور اس کے لئے توبہ کے دروازے کو کھلا رکھا۔ جب وہ بھول جائے اور پھر اسے یاد آ جائے اور وہ پشیمان ہو۔ جب وہ گر جائے اور پھر اٹھے' جب وہ راہ راست سے ہٹ جائے اور توبہ کر لے اور مڑ کر سیدھی راہ اختیار کر لے تو اس کے لئے توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے' اس کی غلطی کو معاف کرتا ہے اور یہ نہیں کہ اگر کسی سے غلطی ہو جائے تو ضرور اسے پکڑے۔ یا اس کے لئے لعنت ہو اور اس کی اولاد بھی اس تہمت سے متہم ہو' کیونکہ کوئی گناہ ابدی نہیں ہوتا۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ کس طرح اٹھائے گا؟

اسلامی نظام حیات کا یہ تصور اس کہانی کو رد کر دیتا ہے جو انسانیت پر کینسہ کے غلط تصورات نے مسلط کی تھی اور جس کے نتیجے میں عیسائی مذہب پر کئی غیر فطری عقائد اور رسومات مسلط ہو گئے اور یہ مذہب درست عقائد کے بجائے خرافات میں گم ہو گیا۔ یہ عجیب تصور ہے کہ آدم کی لغزش اب پوری انسانیت کی گردن میں لٹکی ہوئی ہے' اور ایک دائمی لعنت ہے' یہاں تک کہ وہ ان کے خود ساختہ خدا مسیح کے ساتھ بھی لگی ہوئی ہے۔ ان کی جان بھی اس سے تب چھوٹتی ہے اور انسانیت کا دامن بھی تب صاف ہوتا ہے جب یہ انسانی خدا سولی پر چڑھ جاتا ہے اور پھر کیا ہوتا ہے؟ جو لوگ قیامت تک عیسائیت کو قبول کرتے ہیں ان کے گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ بہت خوب!

اس کے مقابلے میں اسلامی تصور حیات میں یہ معاملہ کس قدر آسان اور قابل فہم ہے کہ حضرت آدم بھول گئے اور ان سے لغزش کا صدور ہو گیا۔ انہوں نے توبہ کی اور اللہ نے بخش دیا اور یوں اس پہلی لغزش کا معاملہ ختم ہو گیا اور یہ لغزش انسان کے لیے ایک سبق آموز تجربے کے طور پر تاریخ میں محفوظ ہو گئی اور بس تاکہ انسان اس سے سبق حاصل کرے۔ ذرا دیکھئے یہ تصور کس قدر سادہ ہے۔ کس قدر واضح ہے اور اس تصور کا اپنانا کس قدر سادہ ہے اور آسان ہے۔

چوتھی حقیقت یہ ہے کہ یہاں انسان اور شیطان کی کشمکش ایک حقیقی کشمکش ہے۔ یہ مسلسل اور سخت ترین کشمکش ہے۔ اس قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دشمن انسان نے ہر حالت میں انسان کے خلاف اپنی کاروائی جاری رکھنے کا اعلان کر دیا ہے اور اس نے برملا کہہ دیا ہے کہ وہ ہر طرف اور ہر جہت سے انسان پر حملہ آور ہو گا اور اپنے حملوں کو مسلسل جاری رکھے گا۔ وہ ان الفاظ میں اعلان جنگ کرتا ہے۔

"اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کے گھات میں لگا رہوں گا' آگے اور پیچھے' دائیں اور بائیں' ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔"

شیطان ملعون نے یہ راہ اپنائی کہ وہ انسانوں کے خلاف اپنی اس فریب کاری کو جاری رکھے گا۔ اسے اس کاروائی کے لئے مہلت ملنی چاہئے۔ اس کے مقابلے میں اس کے سامنے جو سیدھی راہ تھی اسے اس نے ترک کر دیا۔ سیدھی راہ یہ تھی کہ اس نے ذات باری کے سامنے' اللہ کے احکام کو درست طرح سن کر جو معصیت کی اس پر وہ نادم ہوتا اور اللہ سے بخشش طلب کرتا۔ اس کے برعکس اس نے یہ اعلان کیا کہ وہ ہر راہ گزر پر بیٹھ کر ان کو گمراہ کرے گا اور ہر جہت اور ہر طرف سے ان پر حملہ آور ہو گا اور ان کو گمراہ کر کے چھوڑے گا۔

شیطان انسانوں پر ان مقامات سے حملہ کرتا ہے جو دفاعی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں۔ یہ کمزور مقامات جنسی خواہشات اور مرتبے کے حصول کی خواہشات ہیں۔ ان کمزور مقامات کو انسان صرف خدا خوفی اور ذکر الٰہی کے ذریعے درست کر سکتا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی ذاتی خواہشات کو دبائے اور اپنی خواہشات کو اللہ کی ہدایت کے تابع کر دے۔

انسان اور شیطان کی جنگ ایک اہم جنگ ہے۔ یہ ہماری مادی خواہشات کے خلاف جنگ ہے اور اللہ کی جانب سے آئی ہوئی ہدایت کا اتباع ہے۔ اور مادی خواہشات پر قابو پاکر صرف وہ لوگ بلندی حاصل کر سکتے جو بلند نظریات اور بلند ارادے رکھتے ہوں اس لئے کہ یہاں شیطان اپنے لاؤ لشکر سمیت ایک طرف میدان میں ہے اور اس کا مقابلہ تب ہی کیا جا سکتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر شریعت کو نافذ کر دیا جائے۔ پس یہ معرکہ نظریات اور ضمیر کے میدان میں بھی جاری ہے اور زندگی کے عملی میدان میں بھی جاری ہے۔ دونوں میدانوں میں یکبارگی یہ کشمکش ضروری ہے۔

وہ شیاطین جو دنیا میں براجمان ہیں وہ لوگوں کو اپنی شریعت' اپنی وضع کردہ اقدار کے مطابق چلاتے ہیں۔ انہوں نے یہاں حسن و قبح کے اپنے پیمانے بنا رکھے ہیں جو اللہ کی حاکیت' اس کے اقتدار اعلیٰ اور اس کی شریعت کی نفی کرتے ہیں اور ان اقدار کے خلاف چلتے ہیں جو دین اسلام سے نکلتی ہیں۔ یہ انسانی شیاطین ہیں اور ان کو جنی شیاطین ہدایات دیتے ہیں۔ ان انسانی شیاطین کے ساتھ یہ سیاسی معرکہ بھی خود شیطان اصلی کے خلاف معرکہ ہے۔ یہ اس سے کوئی علیحدہ بات نہیں ہے۔

اس طرح اس دنیا میں برپا یہ عظیم کشمکش دراصل شیطان کے ساتھ ایک عظیم معرکہ ہے۔ شیطان کے دوستوں کے ساتھ معرکہ ہے۔ جب ایک صحیح الفکر مسلمان اس معرکے میں کودتا ہے تو وہ فی الحقیقت اپنی مادی خواہشات کے ساتھ برسر جنگ ہوتا ہے۔ پھر وہ شیطان کے ان دوستوں کے خلاف برسر جنگ ہوتا ہے جنہوں نے اس کرۂ ارض پر خود اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کر رکھا ہے۔ وہ ان تمام شرارتوں کے ساتھ برسر جنگ ہوتا ہے جو ان شیاطین اور ان کے دوستوں نے دنیا میں برپا کر رکھی ہیں اور جب ایک مومن اس ہمہ جہت جنگ میں مصروف ہوتا ہے تو وہ پوری طرح یہ شعور رکھتا ہے کہ وہ یہ ہمہ جہت جنگ شیطان کے ساتھ لڑ رہا ہے جو اس کا حقیقی دشمن ہے اور جس نے اس کے خلاف مسلسل جنگ کرنے کا اعلان کر رکھا

ہے۔ یہ جنگ قیامت تک ہوگی اور یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ (اَلْجِهَادُ مَاضٍ اِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (حديث)) کہ "جہاد قیامت تک جاری رہے گا اور ہر صورت اور ہر میدان میں جاری رہے گا۔"

آخری بات اس قصے سے یہ معلوم ہوتی ہے 'جیسا کہ تفصیلات آگے آرہی ہیں' کہ خود انسان کی فطرت 'طبیعت اور مزاج میں ایک چیز موجود ہے اور وہ ہے شرم و حیاء۔ انسان عریانی کو فطرتاً ناپسند کرتا ہے خصوصاً شرمگاہ کی عریانی کو۔

(فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوُرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا (۷: ۲۰))

"شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ وہ ننگا کر دے ان کی ان شرمگاہوں کو جو پوشیدہ تھیں۔"

(فَدَلّٰهُمَا بِغُرُوْرٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ (۷: ۲۲)) "اس طرح دھوکا دے کر وہ ان دونوں کو رفتہ رفتہ اپنے ڈھب پر لے آیا۔ آخر کار جب انہوں نے اس درخت کا مزا چکھا تو ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو جنت کے پتوں سے ڈھانپنے لگے۔"

(يٰبَنِيْ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ (۷: ۲۶)) "اے اولاد آدم 'ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے لئے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔"

(يٰبَنِيْ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا (۷: ۲۷)) "اے بنی آدم 'ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اسی فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس ان سے اتروا لئے تھے تاکہ ان کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے۔"

یہ تمام ہدایات و تبصرے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ مسئلہ بہت ہی اہم اور نہایت ہی فطری مسئلہ ہے اور یہ داعیہ انسانی فطرت کی انتہائی گہرائیوں میں ہے کہ وہ لباس پہنے اور اپنی شرمگاہ کو چھپائے 'لباس انسان کے لئے زینت اور پردہ ہے جبکہ لباس تقویٰ انسان کی روحانی شرمگاہوں کے لئے ستر ہے۔

فطرت سلیمہ نے ہمیشہ اپنی جسمانی اور روحانی شرمگاہوں کو چھپانے کی سعی کی ہے اور وہ ہمیشہ ان کمزوریوں کو چھپانے پر حریص رہی ہے۔ جو لوگ انسانی جسم کو لباس سے عاری کرنا چاہتے ہیں 'نفس انسانی کو لباس تقویٰ سے محروم کر کے ننگا کرنا چاہتے ہیں 'اللہ اور انسانوں سے شرم و حیاء کو ختم کرنا چاہتے ہیں 'جن لوگوں کی زبانیں 'جن کے قلم ' اور جن کے ذرائع ابلاغ

اور میڈیا اس بات میں رات اور دن مصروف ہو کہ مختلف طریقوں سے اور مختلف خبیث اور شیطانی ذرائع سے ان کو اپنے ان فطری دواعی سے عاری کر دیں' وہ درحقیقت انسان سے وہ فطری خواص چھین لینا چاہتے ہیں جن کی وجہ سے انسان' انسان ہے۔ یہ لوگ انسان کو اس شیطان کے سامنے جھکانا چاہتے ہیں جو ان کا دشمن ہے جس نے سب سے پہلے انسان کی شرمگاہ کو ننگا کرنے سے اپنی شیطنت کا آغاز کیا تھا۔ پھر یہ لوگ ان صہیونی منصوبوں کو مکمل کرنا چاہتے ہیں جو یہودیوں نے انسانیت کی بربادی کے لئے تیار کر رکھے ہیں اور ان کے مطابق وہ پوری انسانیت کو اس قدر مضمحل کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے مقابلے میں اٹھ نہ سکے اور اس کی حالت یہ ہو جائے کہ اس کے اندر کوئی انسانی خصوصیت نہ رہے۔

عریانی فطرتاً ایک حیوانی خاصہ ہے۔ اس کی طرف انسان صرف اس وقت آمادہ ہو سکتا ہے جب وہ مقام انسانیت سے گر کر حیوانی مرتبے میں آ جائے۔ نیز عریانیت کو خوبصورتی صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں' جن کا ذوق انسانی ختم ہو چکا ہو۔ چنانچہ وسطی افریقہ کے نہایت ہی پسماندہ لوگ مادر زاد ننگے ہوتے ہیں اور جب اسلام ان میں داخل ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ انہیں کپڑے پہناتا ہے۔ آج مغرب کے نام نہاد ترقی پسند دانشور انسان کو عریانی کے اس گڑھے میں گرا رہے ہیں جہاں سے اسلام نے انہیں نکالا تھا اور نکالنے کے بعد ان کو نہایت ہی متمدن بنا دیا تھا اور ان کو اسلامی مفہوم اور اہداف کے مطابق متمدن بنایا تھا۔ اسلام میں تمدن اور ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے اندر انسانی خصائص کو ترقی دی جائے اور ان کو زیادہ سے زیادہ ظاہر کیا جائے۔

نفس کی عریانی یہ ہے کہ انسان شرم و حیاء کو خیرباد کہہ دے اور یہ وہ مقصد ہے جس کے لئے یورپ کا میڈیا' قلم' آواز اور اسکرین کام کر رہی ہے۔ یہ اس قدر پسماندگی اور جاہلیت کی طرف رجعت قہقہری ہے جو کبھی تھی' اسے کسی مفہوم میں بھی ترقی' حضارت اور تمدن نہیں کہا جا سکتا جیسا کہ آج مغرب کا شیطانی میڈیا مسلمانوں کو باور کرا رہا ہے۔

تخلیق انسانیت کا قصہ ان تمام اقدار اور پیمانوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مسلمانوں کو اس طرف ہدایت کی اور تمام شیطانی وساوس سے نجات دی اور جاہلیت کے گندے تالاب سے مسلمانوں کو نکالا۔ قرآن نے یہ قصہ انہی مقاصد کے لئے پیش کیا ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۷۴ ایک نظر میں

زیر نظر سبق اس سورہ کے وقفوں میں سے ایک وقفہ ہے۔ پہلے منظر کے بعد یہ ایک طویل وقفہ ہے جس میں تخلیق انسانیت کی ایک عظیم روئیداد بیان کی گئی ہے۔ اس سورہ میں جگہ جگہ ایسے وقفے آتے ہیں۔ گویا سامعین سے کہا جاتا ہے ' ذرا رکیں ' کہ یہاں تک جو کچھ آپ نے دیکھا اس پر غور کریں اور آگے بڑھنے سے پہلے یہ جان لیں کہ اس منظر میں انسانیت کے لئے کیا کیا نصائح ہیں اور کیا کیا عبرت آموزیاں ہے۔

یہ وقفہ ان دستوں کی موجودگی میں ہے جو ایک طرف انسانیت کی جانب سے اور دوسری جانب شیطان کی جانب سے باہم معرکہ آرائی کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ اس وقفے میں بتایا جاتا ہے کہ شیطان کس اسلوب سے اور کس گزرگاہ سے داخل ہوتا ہے اور یہ کہ اس کا منصوبہ کیا ہے اور کس شکل و صورت میں ہے۔

قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ صرف اس صورت میں ہدایت دیتا ہے جب کوئی صورت عملاً قائم ہو' موجود ہو اور مسئلہ پیدا ہو گیا ہو۔ وہ جو قصص بھی بیان کرتا ہے' اس لئے بیان کرتا ہے کہ تحریک اسلامی کے اندر کچھ واقعی حالات موجود ہوتے ہیں جن پر وہ قصہ منطبق ہوتا ہے۔ قرآن کے قصص جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں محض فنی اور ادبی مقاصد کے لئے نہیں ہوتے اور نہ قرآن کسی مسئلے پر محض نظریاتی زاویے سے بحث کرتا ہے۔ اسلام کی حقیقت پسندی اور اس کی سنجیدگی اس بات کی متقاضی تھی کہ اس کی ہدایات ایسے مسائل کے بارے میں ہوں جو عملاً تحریک اسلامی کو اس وقت درپیش تھے۔

قصہ آدمیت کے اس پہلے مرحلے کے بعد آنے والے اس وقفے کا تعلق عرب جاہلیت کی واقعی صورت حال کے ساتھ ہے۔ قریش نے دوسرے عربوں کے مقابلے میں اپنے لئے کچھ حقوق مختص کئے ہوئے تھے۔ لوگ باہر سے حج بیت اللہ کے لئے آتے تھے جسے قریش نے بت خانہ بنا دیا تھا اور یہ حقوق وہ اپنے لئے بعض جعلی تصورات کی اساس پر مختص کرتے تھے اور اسے اللہ کی شریعت قرار دیتے تھے۔ ان تصورات کو انہوں نے قانونی شکل دے رکھی تھی اور اسے شریعت کہتے تھے تاکہ دوسرے مشرکین ان قوانین کی پیروی کریں۔ ہر جاہلیت میں کاہن' سردار' گدی نشین لوگ عوام الناس کے لئے ایسے ہی اصول گھڑ لیتے ہیں۔ قریش نے اپنے لئے ایک خاص لقب اختیار کیا ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو "حمس" کہتے تھے۔ اور اپنے لئے انہوں نے بعض حقوق مختص کر رکھے تھے جو دوسرے عربوں کو حاصل نہ تھے۔ ان حقوق میں سے بعض طواف بیت اللہ کے بارے میں تھے۔ صرف ان کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے زیر استعمال کپڑوں میں طواف کر سکتے تھے' رہے دوسرے عرب تو وہ ان کپڑوں میں حج نہ کر سکتے تھے جو کبھی کسی نے پہنے ہوں۔ اب ان لوگوں کے لئے دو صورتیں تھیں یا تو وہ قریش سے کپڑے مستعار لیتے تھے تاکہ وہ طواف کر لیں اور یا اپنے لئے نئے کپڑے بنواتے تھے اور اگر وہ ان دونوں صورتوں پر عمل نہ کر سکتے تو پھر وہ ننگے طواف کرتے اور ان میں عورتیں بھی شامل ہوتیں۔

علامہ ابن کثیر کہتے ہیں "ماسوائے قریش کے دوسرے عرب ان کپڑوں میں طواف نہ کر سکتے تھے جو انہوں نے اس سے پہلے پہن لئے ہوتے تھے۔ اس بات کے پیچھے ان کا یہ نظریہ تھا کہ چونکہ ان کپڑوں میں وہ اللہ کی نافرمانی کرتے رہے ہیں اس لئے ان میں ہمارے لئے طواف کرنا درست نہیں ہے۔ قریش جو حمس کہلاتے تھے' ان کا یہ حق تھا کہ وہ اپنے زیر استعمال کپڑوں ہی میں طواف کریں۔ اگر قریش میں سے کوئی دوسرے عربوں کو عاریتاً کپڑے دے دیتا تو وہ بھی طواف کر لیتا' کسی کے پاس جدید کپڑے ہوتے تو بھی وہ طواف کر لیتا' لیکن طواف کے بعد اسے پھینک دیتا اور وہ کسی کی ملکیت نہ ہوتا۔ اگر کسی کو نہ نیا کپڑا ملتا اور نہ عاریتاً اہل قریش میں سے دستیاب ہوتا تو وہ ننگا طواف کرتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک عورت ننگی حالت میں طواف کر رہی ہے' اس صورت میں وہ اندام نہانی کو ڈھانپ لیتی۔ لیکن جن عورتوں کو ایسی حالت میں طواف کرنا پڑتا وہ اکثر اوقات رات کے وقت طواف کرتیں۔ یہ رسوم انہوں نے اپنی جانب سے گھڑ لی تھیں اور آباؤ اجداد کے وقت سے وہ ان پر عمل پیرا تھے۔ وہ عقیدہ یہ رکھتے تھے کہ ان کا یہ جدی فعل شریعت الٰہیہ پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بات پر حرف گیری فرمائی۔

(وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا (۷:۲۸)) "اور جب وہ کوئی فحش کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے آباء کو ایسا ہی کرتے پایا ہے اور یہ کہ اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔" (قُلْ اَیْ) "اے پیغمبر کہہ دے (اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ (۷:۲۸)) "بے شک اللہ فاشی کا حکم نہیں دیتا۔" یعنی تم جو کچھ کر رہے ہو یہ ایک فحش کام ہے اور قابل نفرت ہے اور اللہ ایسے قابل نفرت کاموں کا بھی حکم نہیں دیتا۔ (اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۷:۲۸)) "کیا تم اللہ پر وہ افتراء باندھتے ہو جو تمہارے علم میں نہیں ہے۔" یعنی تم اللہ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہو جن کی صحت کا خود تمہیں بھی یقین نہیں ہے۔ (قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ (۷:۲۹)) "کہہ دے کہ مجھے میرے رب نے عدل و انصاف کا حکم دیا ہے۔"

(وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (۷:۲۹))
"اس کا حکم یہ ہے کہ ہر عبادت میں اپنا رخ ٹھیک رکھو اور اسی کو پکارو اپنے دین کو اس کے لئے خالص رکھ کر۔" یعنی اس نے جو حکم دیا ہے وہ یہ ہے کہ عبادت اور عبادت کے مقامات کو درست رکھو اور ان رسولوں کی اطاعت کرو جو معجزات لے کر آئے ہیں اور عبادت صرف اللہ کی کرو' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ان دو بنیادی ارکان کے سوا کسی کی عبادت کو قبول نہیں کرتا یعنی یہ کہ وہ عمل شریعت کے مطابق ہو اور دوسرے یہ کہ وہ شرک سے خالص ہو۔

عبادت' طواف اور لباس کے بارے میں شرعی قوانین اور خوراک کے معاملات میں عربوں کی جاہلی سوسائٹی میں جو عملی صورت حال اس وقت موجود تھی اور جسے وہ شریعت منجانب اللہ سمجھتے تھے' اس عملی صورت حال کے بارے میں یہ تبصرہ آیا ہے یہ تبصرہ انسانیت کی تخلیق کی عظیم کہانی کے ضمن میں آیا ہے۔ کھانے کا ذکر شجر ممنوعہ کے ضمن میں اور لباس کا ذکر واقعہ نزع لباس میں تھا جو شیطان کی سازش سے حضرت آدم اور حوا سے اتار دیا گیا۔ اس سازش کا شکار ہو کر وہ اس ممنوعہ درخت کے پھل کو کھا گئے تھے اور انسان کی فطری حیا کا ذکر بھی اس میں آ گیا تھا کہ جب ان سے لباس جنت

اتار دیا گیا تو پھر وہ جنت کے درختوں کے پتے اپنے اوپر لپیٹنے لگے اور یوں وہ ستر پوشی کرنے لگے۔

غرض اس قصے میں جو واقعات آئے اور اس کے بعد ان پر جو تبصرہ ہوا' وہ عربوں کے اندر موجود جاہلی صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔یہ قصہ قرآن کی دوسری سورتوں میں بھی آئے گا۔لیکن اس وقت اس کے لانے کے مقاصد اور ہوں گے اور اس پر پھر تبصرے اور نتائج بھی اور ہوں گے۔قرآن کریم ہر جگہ جو قصہ بھی لاتا ہے وہ انسانوں کی کسی عملی صورت حال پر ہی پیش کرتا ہے اور اس پر پھر تبصرے بھی ان مقاصد اور صورت حالات کے مطابق کرتا ہے۔چنانچہ قرآن کریم ہر مقام کے حالات کے مطابق قصے کی متعلقہ کڑی پیش کرتا ہے اور ہر مقام کے مزاج کے مطابق اس کی تفصیلات دیتا ہے۔

(تفصیلات کے لئے دیکھئے فصل قصص ' میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن میں)۔

---ooo---

# درس نمبر ۷۴ تشریح آیات

## ۲۶ --- تا --- ۳۴

يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ قَدۡ أَنزَلۡنَا عَلَيۡكُمۡ لِبَاسٗا يُوَٰرِي سَوۡءَٰتِكُمۡ وَرِيشٗاۖ وَلِبَاسُ ٱلتَّقۡوَىٰ ذَٰلِكَ خَيۡرٞۚ ذَٰلِكَ مِنۡ ءَايَٰتِ ٱللَّهِ لَعَلَّهُمۡ يَذَّكَّرُونَ ﴿۲۶﴾

"اے اولاد آدم' ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے لئے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو' اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے - یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے' شاید کہ لوگ اس سے سبق لیں -"

یہ اللہ کی جانب سے انسانوں کے نام ایک دردانگیز پکار ہے اور یہ پکار تخلیق انسانیت کی کہانی کے منظر کے بعد آئی ہے - خصوصاً اس کے اس حصے کے بعد جس میں شیطان کی سازش سے حضرت آدم اور حوا کے جسموں سے جنت کا لباس اتار دیا گیا اور جس میں دونوں اس طرح دکھائی دیتے تھے کہ وہ اپنے جسموں کے اوپر جنت کے پتوں کو چسپاں کر رہے تھے - یہ دن انہیں اللہ کی حکم عدولی کرنے کی وجہ سے دیکھنے پڑے تھے کیونکہ انہیں ایک خاص درخت کا پھل کھانے کی صریح ممانعت کی گئی تھی - یہ ایک لغزش تھی اور اس کی نوعیت ایسی نہ تھی جس کی تفصیلات اہل کتاب کی منحرف کتابوں تورات و انجیل کے اندر موجود ہیں اور جن کا پرتو آج مغرب کے تمام علوم و فنون پر صاف صاف نظر آتا ہے - دور جدید میں فرائڈ کے افکار اس پر مستزاد ہیں - ان اساطیر اور فضول قصوں میں یہ کہا گیا ہے کہ شجر ممنوعہ شجر علم تھا اور شجر حیات تھا اور اگر آدم و حوا اس کا پھل کھا لیتے تو اللہ کو یہ ڈر تھا کہ وہ بھی خدا کی طرح الٰہ بن جاتے - نہ یہ ممانعت جنسی ملاپ کی ممانعت تھی جس طرح فرائڈ اور مغربی علوم و فنون اور مغربی ارٹ اس بات کا انعکاس کرتے ہیں اور انہوں نے ان کہانیوں کی اساس پر جنسی بے راہ روی کا فلسفہ فرائڈ کے خیالات کی شکل میں اپنا رکھا ہے -

غرض حضرت آدم کی لغزش کے نتیجے میں ان کے لباس کے اتر جانے کے منظر اور پھر دور جاہلیت میں عریانی کی حالت میں طواف کرنے کی صورت حال کے پیش نظر یہ پکار آتی ہے کہ اے انسان اللہ نے تم پر کس قدر رحمت اور شفقت کی ہے کہ تمہاری زینت اور شرمگاہوں کو چھپانے کے لئے لباس کا انتظام کیا اور اسے تمہارے ستر کے لئے ایک لازمی قانون کی شکل دی - اگر لباس نہ ہوتا تو تم برہنگی کی حالت میں نہایت ہی مکروہ نظر آتے - (اَنْزَلْنَا) کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ لباس بطور قانون لازمی ہے - لباس کا اطلاق کبھی تو ستر پر ہوتا ہے یعنی داخلی ستر اور ریاش کا اطلاق

اس لباس پر ہوتا ہے جو زیب و زینت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔یعنی ظاہری لباس ۔لفظ ریاش کے معنی ہیں عیش و عشرت اور مال و دولت ہے۔ان سب معانی کا ایک دوسرے سے تعلق ہے اور یہ لازم و ملزوم ہیں۔

(یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا (۷:۲٦)) "اے اولاد آدم، ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے لئے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو۔"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ تقویٰ کے لباس کا ذکر فرماتے ہیں اور ساتھ یہ اضافہ بھی کر دیتے ہیں کہ لباس تقویٰ زیادہ بہتر ہے۔

(وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ ذٰلِکَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ (۷:۲٦)) "اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

عبدالرحمٰن ابن اسلم نے یہ کہا ہے کہ "جو اللہ سے ڈرے اور اپنی شرمگاہ کو چھپائے تو یہ لباس تقویٰ ہے۔" لباس ستر اور لباس تقویٰ شریعت میں لازم و ملزوم ہیں۔لباس ستر جسم کو چھپانے اور زینت کے لئے ہے اور لباس تقویٰ دل کے قابل شرم حالات کو چھپاتا ہے اور قلب کی زیب و زینت بنتا ہے۔دونوں لازم و ملزوم ہیں اس لئے کہ خدا کے خوف اور خدا سے حیاء کرنے کے شعور کے نتیجے ہی میں انسان جسم کے قابل شرم حصوں کو کھلا رکھنا قبیح سمجھتا ہے اور جو شخص اللہ سے حیا نہیں کرتا اور اس نہیں ڈرتا، اس کے لئے جسمانی عریانی کوئی قابل ملامت بات نہیں ہوتی۔چنانچہ اسلام کی نظر میں تقویٰ اور حیا سے عاری ہونا اور لباس کو اتار دینا ایک ہی جیسا قبیح فعل ہے۔

جسم کا چھپانا فطری حیاء ہے اور اس کا تعلق محض کسی خاندان اور سوسائٹی کے رواج کے ساتھ نہیں ہے۔جیسا کہ بعض وہ لوگ اس کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں جو اسلامی معاشرے سے حیاء کو ختم کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ مسلمانوں کی انسانیت کو ختم کر دیں اور یہ عین اس منصوبے کے مطابق ہے جو صہیونی لیڈروں نے انسانیت کی تباہی کے لئے بنایا تھا۔بلکہ یہ ایک فطری داعیہ ہے جسے اللہ نے انسان کے اندر ودیعت کر رکھا ہے۔پھر یہ ایک شرعی اور قانونی تقاضا ہے جو اللہ نے نازل کیا ہے۔اللہ نے انسانوں کو یہ توفیق دی ہے کہ وہ دنیا میں اس قانون کو نافذ کریں کیونکہ یہ زمین اللہ نے انسانوں کے اختیار میں دی ہے اور اسے ان کے لئے جائے رزق بنا دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ انسان کو یاد دلاتے ہیں کہ اس لباس اور ستر پوشی کا قانون دے کر تم پر عظیم رحمت کی گئی ہے۔اس طرح اللہ نے ان کی قیمتی متاع انسانیت کو اس انجام سے بچایا ہے کہ وہ حیوانات کی سطح تک نیچے چلی جائے۔پھر اللہ تعالیٰ انہیں وہ تمام مسائل یاد دلا کر ان سے توقع کرتے ہیں کہ (لَعَلَّهُمْ یَذَّکَّرُوْنَ (۷:۲٦)) "شاید کہ لوگ اس سے سبق لیں۔" اس مقام پر آکر ایک مسلمان اچھی طرح معلوم کر سکتا ہے کہ زیب و زینت 'فیشن' ترقی پسندی اور محبت کے نام پر انسانوں کے اخلاق کو بگاڑنے اور انہیں جسمانی طور پر ننگا کرنے کے لئے جو عظیم کوشش ہو رہی ہے وہ امر، یہودی سازش کے عین مطابق ہے جو انہوں نے انسانیت کی تباہی کے لئے تیار کر رکھی ہے۔یہ سازش یہودیوں نے اس لئے تیار کی ہے کہ مسلمانوں کی قوت جلدی سے تباہ ہو جائے اور انہیں جلدی سے غلام بنایا جا سکے۔نیز دین اسلام کے ساتھ لوگوں کے

دلوں کی گہرائیوں میں جو محبت ابھی تک باقی ہے یہ منصوبہ اس کی مکمل بیخ کنی کے لئے بھی بنایا گیا ہے اور اس مقصد کے لئے یہ یہودیوں اور ان کے ایجنٹوں کی قلمیں' فلمیں 'تمام تعلیمی ادارے اور میڈیا مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں حالانکہ انسان کے لئے زینت عریانی میں نہیں ستر میں پوشیدہ ہے۔یہ حیوانات کی زینت ہے کہ وہ ننگے رہیں'لیکن آج کا انسان جاہلیت اور پسماندگی کی طرف لوٹ رہا ہے اور انسان کے بجائے حیوان بن رہا ہے۔کیا انسان اس نعمت کو یاد نہیں کر رہا ہے جو اللہ نے اسے انسان بنانے کے حوالے سے کی ہے۔

---

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَاۗءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۣ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڛ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ۝ فَرِيْقًا هَدٰي وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ۭ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

اے بنی آدم' ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا۔اور ان کے لباس ان پر سے اتروا دیئے تھے تاکہ ان کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے۔ وہ اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ان شیاطین کو ہم نے ان لوگوں کا سرپرست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔

یہ لوگ جب کوئی شرمناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقے پر پایا ہے اور اللہ ہی نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ان سے کہو اللہ بے حیائی کا حکم کبھی نہیں دیا کرتا۔کیا تم اللہ کا نام لے کر وہ باتیں کہتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہیں؟ اے نبی "ان سے کہو! میرے رب نے تو راستی و انصاف کا حکم دیا ہے' اور اس کا حکم تو یہ ہے کہ ہر عبادت میں اپنا رخ ٹھیک رکھو اور اسی کو پکارو۔اس کے دین کو اس کے لئے

خالص رکھ کر۔ جس طرح اس نے تمہیں اب پیدا کیا ہے ' اسی طرح تم پھر پیدا کئے جاؤ گے ۔ ایک گروہ کو تو اس نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے ' مگر دوسرے گروہ پر گمراہی چسپاں ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ انہوں نے خدا کے بجائے شیاطین کو اپنا سرپرست بنالیا ہے اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم سیدھی راہ پر ہیں ۔"

یہ اللہ کی جانب سے انسان کے نام دوسری پکار ہے ۔ یہ غور و فکر کے اس وقفے میں ہے جو ان کے والدین حضرت آدم و حوا کے قصے کے دوران کیا گیا ہے ۔ اور خصوصاً اس منظر پر بطور تبصرہ کیا گیا ہے جس میں شیطان نے اپنی گہری سازش کے ذریعے انہیں بے لباس کر دیا کہ انہوں نے اس سازش کا شکار ہو کر اللہ کے صریح حکم کو بھلا دیا اور شیطان کی وسوسہ اندازی کے نتیجے میں ان سے لغزش سرزد ہو گئی ۔ نیز ہم نے جاہلیت عربیہ کے دور میں برہنہ طواف کے بارے میں جو کچھ کہا اس کی روشنی میں بھی یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ اللہ نے کیوں اس انداز میں بنی نوع انسان کو پکارا کیونکہ وہ اس عریانی کو منجانب اللہ شریعت سمجھتے تھے ۔

پہلی ندا میں تو بنی آدم کو یہ یاد دلایا گیا کہ ان کے ابوالآباء کے ساتھ کیا پیش آیا اور کس طرح اللہ نے ان کی شرمگاہوں کے چھپانے اور پھر ان کی زیب و زینت کا انتظام فرمایا ۔ رہی یہ دوسری پکار تو یہ بنی آدم کو عموماً اور مشرکین مکہ کو خصوصاً یہ یاد دہانی ہے جن سے اسلام سب سے پہلے خطاب کر رہا تھا کہ وہ شیطان کی پیروی نہ کریں اور اپنے لئے خود نظام زندگی اور رسم و رواج اور شریعت تصنیف نہ کریں اور اس طرح شیطان کے فتنے کا شکار نہ ہوں کیونکہ اس نے تمہارے باپ کے خلاف یہی سازش کی تھی ' اس کو سازش کے ذریعے جنت سے نکلوایا تھا ' اور انہیں جنت کے لباس سے محروم کر کے ان کی شرمگاہوں کو ان کے سامنے ننگا کر دیا تھا ۔ لہذا ہر وہ تحریک جو عریانی کی دعوت دیتی ہے وہ شیطانی تحریک ہے اور جاہلی تحریک ہے خواہ یہ زمانہ قدیم کی ہو یا دور جدید کی ۔ یہ تحریک تمہارے دشمن کی تحریک ہے ۔ شیطان تو تمہارا کھلا دشمن تھا اور وہ آدم اور اس کی اولاد کا دائمی دشمن ہے ۔ عریانی کی تحریک بھی انسان اور شیطان کی دشمنی کی ہمہ گیر تحریک کا ایک پہلو ہے ۔ لہذا بنی آدم کو اپنے دشمن کو یہ موقع نہ دینا چاہئے کہ وہ اس معرکہ میں کامیاب ہو اور اس طرح انسانوں اور جنوں سے جہنم کو بھر دیئے جانے کا باعث بن سکے ۔

(يَٰبَنِىٓ ءَادَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ ٱلشَّيْطَٰنُ كَمَآ أَخْرَجَ أَبَوَيْكُم مِّنَ ٱلْجَنَّةِ يَنزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْءَٰتِهِمَآ (۷: ۲۷)) "اے بنی آدم ' ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس ان پر سے اتروا دیئے تھے تاکہ ان کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے ۔"

انسانوں کو زیادہ ڈرانے کے لئے اللہ تعالیٰ انہیں یہ اطلاع بھی دیتے ہیں کہ شیطان اور اس کا قبیلہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے اور تم اسے نہیں دیکھ سکتے ' لہذا وہ اپنے پوشیدہ وسائل کے ذریعے تمہارے بدراہ کرنے پر زیادہ قدرت رکھتا ہے ' لہذا انہیں ڈرنا چاہئے اور شدید احتیاط کرنا چاہئے ۔ ہر وقت چوکنا رہنا چاہئے اور حد درجہ محتاط رہنا چاہئے ۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں آلے اور تمہیں پتہ ہی نہ ہو ۔

(اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (۷:۲۷)) "وہ اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔"

اور اب اس فقرے کا آخری بند آتا ہے جو نہایت ہی مؤثر ہے اور اس طرف ہدایت کرتا ہے کہ تم احتیاط کرو کیونکہ تقدیر الٰہی کے نظام نے ان لوگوں کے ساتھ شیطان کو بطور دوست لگا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے' اور اس شخص کی بربادی کی کیا انتہا ہوگی جس کا دوست شیطان ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ ان پر قبضہ کر لے گا گمراہ کرے گا اور ان کی تکمیل تمام کر جدھر چاہے گا' لے جائے گا اور ان کا کوئی مددگار اور معاون نہ ہو گا۔ اور نہ اللہ ان کا دوست ہو گا۔

(اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۷:۲۷)) "ان شیاطین کو ہم نے ان لوگوں کا سرپرست بنایا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔"

یہ ایک عظیم حقیقت ہے جو لوگ ایمان نہیں لاتے' شیطان ان کا یار اور مددگار ہوتا ہے۔ اور اس کے بالمقابل حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں اللہ ان کا ولی اور ناصر ہوتا ہے۔ یہ ایک خوفناک حقیقت ہے اور اس کے نتائج بھی خوفناک ہیں اور اس حقیقت کو یہاں ایک کلیہ کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد اس کلیہ کی ایک مثال بھی پیش کر دی جاتی ہے جو عملاً مشرکین کی زندگیوں میں موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شیطان کس طرح ولی اور مددگار ہوتا ہے۔ اور اس کی ولایت لوگوں کے تصورات اور عملی زندگی میں کس طرح کام کرتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

(وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَیْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا (۷:۲۸)) "یہ لوگ جب کوئی شرمناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقہ پر پایا ہے اور اللہ ہی نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔"

مشرکین عرب اس کے قائل تھے اور اس پر عمل پیرا بھی تھے وہ برہنگی کی حالت میں طواف کر کے بیت الحرام میں اس فحاشی کا ارتکاب کرتے تھے اور اس میں ان کی عورتیں بھی شامل ہوتی تھیں لیکن وہ زعم یہ رکھتے تھے کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ اس طرح کہ اللہ نے ہمارے آباء کو اس کا حکم دیا تھا اس لئے وہ ایسا ہی کرتے چلے آئے تھے اور ہم کو یہ رسم وراثت میں ملی ہے اس لئے ہم بھی ایسا کرتے ہیں۔

باوجود اس کے کہ وہ مشرک تھے' لیکن وہ دور جدید کی جاہلیت کی طرح مغرور اور سرکش نہ تھے۔ آج کے لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ مذہب کا معاملات زندگی کے ساتھ تعلق ہی کیا ہے' یہ تو عوام کا حق ہے کہ وہ اپنے لئے جو قوانین' جو اقدار اور جو رسومات چاہیں وضع کر لیں۔ اس میں اللہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ پرانی جاہلیت کے پیروکار تو فقط یہ جرم کرتے تھے کہ اپنے لئے خود قوانین اور دستور حیات وضع کرتے اور پھر کہتے کہ یہ امر الٰہی ہے۔ یہ غلطی زیادہ بھیانک تو ہو سکتی ہے اور زیادہ قابل ملامت بھی ہو سکتی ہے کیونکہ یہ دین کے نام پر دھوکہ اور فریب ہے اور لوگوں کے جذبہ دین سے بھی غلط فائدہ اٹھاتا ہے لیکن خودسری اور غرور کے اعتبار سے یہ ان لوگوں سے کم تھے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ لوگوں کے لئے قانون سازی کا حق صرف ان کو حاصل ہے اور وہی یہ فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں کہ لوگوں کے لئے کیا مفید ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرماتے ہیں کہ وہ ان سے یوں مخاطب ہوں کہ یہ تم اللہ پر خالص

افترا باندھتے ہو اور یہ کہ اللہ کی شریعت اور اس کا قانونی نظام اپنے مزاج کے اعتبار سے فحاشی کو پسند نہیں کرتا' لہذا اللہ تعالیٰ کس طرح تمہیں یہ حکم دے سکتا ہے کہ تم فحاشی و عریانی کا ارتکاب کرو۔

(قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ (۷:۲۸)) "ان سے کہو اللہ بے حیائی کا حکم کبھی نہیں دیا کرتا۔ کیا تم اللہ کا نام لے کر وہ باتیں کہتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ مطلقاً فحاشی کے خلاف ہیں اور فحاشی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کسی بھی معاملے میں مقررہ حد سے گزر جائے۔ عریانی بھی اسی کی تعریف میں آتی ہے اس لئے اللہ اس کا حکم کیسے دے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حدود مقرر کیے ہیں اور وہ یہ حکم نہیں دیتا کہ اس کے مقرر کردہ حدود توڑے جائیں۔ اس نے شرم' حیاء اور تقویٰ کا حکم دیا ہے تو پھر عریانی کا حکم کیسے صادر ہو سکتا ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ ان کو اللہ کے اس حکم کی اطلاع کس نے دی ہے۔ کیونکہ اللہ کے احکام اور قوانین محض دعویٰ سے تو ثابت نہیں ہوتے۔ اللہ کے احکام اور قوانین تو اس کی کتابوں اور رسولوں کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے اللہ کے احکام معلوم ہوں۔ کوئی انسان کسی بات کے اللہ اور رسول کی جانب سے آنے کا دعویٰ اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ثابت نہ ہو۔ اس لئے اللہ کے دین میں سند کے بغیر کوئی قول نہیں کیا جا سکتا' ورنہ اس فکری انتشار کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکے گا کہ لوگ بات تو خود کریں مگر اسے اللہ کی طرف منسوب کر دیں۔

جاہلیت بہرحال جاہلیت ہوتی ہے اور اس کے جو بنیادی عناصر ہوتے ہیں وہ ہر جاہلیت میں موجود ہوتے ہیں۔ جب بھی لوگ جاہلیت کی طرف لوٹتے ہیں وہ ایک ہی طرح کی بات کرتے ہیں اور ان کی سوچ ایک ہی طرح کی ہوتی ہے۔ باوجود اس کے کہ قدیم اور جدید دونوں جاہلیتوں کے درمیان ایک طویل زمانہ حائل ہے اور وہ مکان کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے بہت ہی دور ہیں۔ آج ہم جس جاہلیت میں زندگی بسر کر رہے ہیں' اس میں کوئی ایک جھوٹا اٹھتا ہے اور وہ باتیں کہنا شروع کر دیتا جو اس کی خواہشات نفسانیہ ڈکٹیٹ کرتی ہیں اور پھر کہتا ہے کہ یہ ہے اللہ کی شریعت۔ پھر ایک اور خود سر اور سرکش اٹھتا ہے اور اللہ کے دین کے صریح اور بدیہی امور کا انکار کرتا ہے۔ وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ کا دین اس قسم کے احکام پر مشتمل نہیں ہو سکتا۔ دین کس طرح یہ احکام دے سکتا ہے' دین ان امور سے کس طرح منع کر سکتا ہے اور ایسے لوگوں سے اگر دلیل پوچھی جائے تو ان کی خواہش نفس کے سوا اور کوئی دلیل ان کے پاس نہیں ہوتی۔ ہم کہتے ہیں (اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ (۷:۲۸))

ان کے اس دعویٰ کی تردید کے بعد کہ اللہ نے اس قسم کی فحاشی کا حکم نہیں دیا' اب اللہ کے احکام تو اس کے بالکل متضاد اور برعکس ہیں۔ اللہ تو عدل' اعتدال کا حکم دیتا ہے اور حد سے تجاوز کرنے سے روکتا ہے۔ وہ حدود سے تجاوز اور فحاشی کا حکم ہرگز نہیں دیتا۔ اللہ کا حکم یہ ہے کہ عبادت یا شعائر زندگی اور پکارنے کے معاملے میں صرف اللہ کی بندگی کرو جیسا کہ اللہ نے اپنی نازل کردہ کتاب میں صریح ہدایات دی ہیں۔ اللہ نے اس مسئلے کو یوں نہیں چھوڑ دیا کہ اس کے بارے میں ہر انسان جو چاہے رائے رکھے اور پھر یہ دعویٰ کرے کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔ بلکہ اللہ نے یہ حکم دے دیا

ہے کہ دین خالص اللہ کے لئے ہو گا اور صرف اللہ کی مکمل بندگی ہوگی۔ نہ کوئی کسی کا غلام اور مطیع ہو گا اور نہ کوئی کسی کے ذاتی احکام کا پابند ہو گا۔

(قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْھَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (۷:۲۹)) "اے نبیؐ، ان سے کہو، میرے رب نے تو راستی و انصاف کا حکم دیا ہے، اور اس کا حکم تو یہ ہے کہ ہر عبادت میں اپنا رخ ٹھیک رکھوں اور اسی کو پکاروں۔ اپنے دین کو اس کے لئے خالص رکھ کر۔"

یہ تو ہیں اللہ کی جانب سے ماموراات اور یہ اس صورت حال کے برعکس ہے جس پر وہ قائم ہیں۔ یہ اس کے بھی خلاف ہیں کہ وہ اپنے آباء کی اطاعت کریں اور آباء کے قوانین کی اطاعت کریں کیونکہ یہ بھی تو ہماری طرح کے بندے تھے اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ اسے سمجھتے بھی منجانب اللہ ہیں۔ نیز یہ احکام اس عریانی اور ننگے پن کے بھی خلاف ہیں، جبکہ اللہ نے آدم و حوا پر یہ احسان کیا تھا کہ انہیں لباس دے کر اور زیب و زینت کا سامان دے کر ان کو حکم دیا تھا کہ اپنے آپ کو ڈھانپ لو اور اپنی شکل و صورت اچھی بناؤ۔ پھر یہ احکام اس صورت حال کے بھی خلاف تھے جس میں انہوں نے اپنے عقائد اور نظام زندگی میں شرک کو داخل کر دیا ہے۔

یہاں آکر اب لہجہ ذرا سخت ہو جاتا ہے اور سخت الفاظ میں سبق یاد دلایا جاتا ہے۔ انجام بد سے بھی ڈرایا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس چند روزہ زندگی کے خاتمے پر تمہیں اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ ان کی پیشی کا منظر یہ ہو گا کہ وہ دو فریق بن جائیں گے۔ ایک وہ فریق جو اللہ کی راہ پر ہو گا اور امر الٰہی کا پابند ہو گا اور دوسرا فریق وہ ہو گا جو شیطان کے احکام کا پیروکار ہو گا۔

(کَمَا بَدَاَکُمْ تَعُوْدُوْنَ (۲۹) فَرِیْقًا ھَدٰی وَفَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْھِمُ الضَّلٰلَةُ اِنَّھُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ مُّھْتَدُوْنَ (۳۰) (۷:۲۹ - ۳۰)) جس طرح اس نے تمہیں اب پیدا کیا ہے اسی طرح تم پھر پیدا کئے جاؤ گے۔ ایک گروہ کو تو اس نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، مگر دوسرے گروہ پر گمراہی چسپاں ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ انہوں نے خدا کے بجائے شیاطین کو اپنا سرپرست بنا لیا ہے اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم سیدھی راہ پر ہیں۔"

یہ آیت ایک خوشنما خوشے کی طرح ہے جس کے اندر اس عظیم سفر انسانیت کا نقطہ آغاز اور نقطہ اختتام دونوں آگئے ہیں۔ (کَمَا بَدَاَکُمْ تَعُوْدُوْنَ (۷:۲۹)) "جس طرح اس نے تمہیں پیدا کیا، اسی طرح تم دوبارہ پیدا کئے جاؤ گے۔" تمہاری زندگی کا آغاز جوڑے کی شکل میں ہوا، آدم اور حوا، شیطان اور اس کے حواری، اسی طرح دوبارہ تمہیں پیدا کیا جائے گا۔ ایک فریق مسلم اور مطیع ہو گا اور یہ آدم اور حوا کے زمرے میں ہو گا اور مومن ہو گا۔ دوسرا گروہ ابلیس کے حواریوں اور متبعین کا ہو گا اور اللہ ان کے ساتھ جہنم کو بھرے گا۔ یہ ابلیس کے دوست ہوں گے اور ابلیس ان کا دوست ہو گا اور اسی وجہ سے وہ جہنم میں جائیں گے اگرچہ ان کا خیال یہ ہو گا کہ وہ ہدایت پر ہیں۔

جس شخص کا دوست اللہ ہو وہ ہدایت پر ہو گا اور جس شخص کا دوست شیطان ہو وہ گمراہ ہو گا اور اس طرح یہ دونوں فریق لوٹ کر آئیں گے ۔ (فریقًا ھدٰی ---------) ''ایک گروہ کو تو اس نے سیدھا راستہ دکھایا ہے مگر دوسرے گروہ پر گمراہی چسپاں ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ انہوں نے خدا کے بجائے شیاطین کو اپنا سرپرست بنا لیا ہے ۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ سیدھی راہ پر ہیں ۔'' اسی طرح وہ واپس آ رہے ہوں گے ۔ غرض ایک ہی لمحے میں سفر کا آغاز ہوا اور دوسرے میں انجام کی منظرکشی کر دی گئی ۔ یہ ہے قرآن کریم کا معجزانہ انداز بیان اور قرآن کے علاوہ آج تک کسی عبارت میں یہ اسلوب نہیں پایا گیا۔

---ooo---

اب بنی آدم کو دوبارہ پکارا جاتا ہے اور یہ تیسری پکار بھی اسی وقفے میں ہے ۔ آگے انسانیت کا عظیم سفر دوبارہ شروع ہونے والا ہے جو اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق جاری رہے گا۔

---

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ
۳ لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ
ع ۲
۱۰ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾
قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ
الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ
تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾

''اے بنی آدم ، ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو ، اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

''اے نبی ''، ان سے کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لئے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں ؟ کہو ، یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لئے ہیں ، اور قیامت کے روز تو خالصتاً انہی کے لئے ہوں گی ۔ اس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو علم رکھنے والے ہیں۔

اے نبی " ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں : بے شرمی کے کام ---- خواہ کھلے ہوں یا چھپے ---- اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی اور یہ کہ اللہ کے ساتھ تم کسی ایسے کو شریک کرو جس کے لئے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی' اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلق تمہیں علم نہ ہو (کہ وہ حقیقت میں اسی نے فرمائی ہے)۔

یہ اسلامی نظریہ حیات کے اساسی عقائد پر تاکید مزید ہے۔ زور اس بات پر دیا جا رہا ہے کہ عرب جاہلیت کے مقابلے میں اسلام کی اساس ان امور پر ہے۔ یہ نظریہ پوری انسانیت کے لئے تجویز کیا گیا ہے اور اسے اس بحث کے ضمن میں لایا گیا ہے جو اس کرۂ ارض پر پوری انسانیت کی تخلیق کے قصے سے متعلق ہے۔

ان حقائق میں سے اہم ترین حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس مخلوق' انسان کے لئے جن چیزوں کو پیدا کیا ہے' اس میں سے بعض چیزوں کو خود بعض انسان حرام قرار دیتے ہیں اور یہ کام بھی وہ اذن الہیٰ کے بغیر کرتے ہیں اور اللہ کے قانون میں سے کسی سند کے بغیر' جبکہ ان کا یہ فعل یعنی یہ تحریم و تحلیل ایک شرکیہ فعل ہے۔ پھر یہ اللہ تعالیٰ پر ایک افتراء بھی ہے اور ان کا ذاتی زعم بھی۔

چنانچہ اللہ ان کو پکارتے ہیں کہ اللہ نے تمہاری زیب و زینت کے لئے جو سامان پیدا کیا ہے اس سے آراستہ رہو۔ عربی میں اسے "ریش" کہتے ہیں خصوصاً عبادت کے وقت اور عبادات میں طواف بھی شامل ہے' جسے وہ برہنہ حالت میں ادا کرتے تھے۔ وہ ایسے لباسوں کو حرام قرار دیتے تھے جنہیں اللہ نے حرام قرار نہیں دیا بلکہ وہ بندوں کے لئے انعام و اکرام تھا۔ لہٰذا ان کے لئے بہتر ہے کہ وہ اللہ کے فراہم کردہ زیب و زینت میں اس کی عبادت کریں' نہ کہ ننگے ہو کر اور نہ ہی فحاشی کرتے ہوئے۔

(يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (۷ : ۳۱)) "اے بنی آدم' ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو۔"

اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ پوری انسانیت کو یہ بھی حکم دیتے ہیں کہ یہاں پاکیزہ چیزوں کو استعمال کرو اور کھانے پینے کی قسم کی تمام چیزوں کو کام میں لاؤ۔ لیکن اسراف نہ کرو' اور دوسرے یہ کہ پاکیزہ چیزیں استعمال میں لاؤ۔

(وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (۷ : ۳۱)) "اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو' اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

احادیث میں وارد ہے کہ جس طرح وہ لوگ بعض اوقات لباس کو حرام قرار دیتے تھے' اسی طرح وہ بعض کپڑوں کو پہننا بھی حرام سمجھتے تھے۔ اور یہ باتیں قریش نے اپنی طرف سے گھڑ لی تھیں۔

صحیح مسلم میں ہشام ابن عروہ کی روایت ہے کہ عرب بیت اللہ کا طواف عریانی کی حالت میں کرتے تھے ماسوائے قریش اور ان کی اولاد کے۔ یہ لوگ ننگے ہو کر طواف کرتے تھے' الا یہ کہ قریش انہیں کپڑے دیں۔ چنانچہ قریش کے مرد مردوں کو کپڑے دیتے تھے اور عورتیں عورتوں کو' نیز قریش مزدلفہ سے آگے نہیں جاتے تھے جبکہ دوسرے لوگ عرفات تک جاتے تھے۔ قریش یہ کہتے تھے کہ ہم حرم والے ہیں اس لئے کسی عرب کو یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ہمارے کپڑوں کے

سوا کسی اور کپڑے میں طواف کرے۔اسی طرح جب کوئی عرب حرم میں داخل ہو تو وہ صرف اہل قریش کا کھانا کھا سکتا ہے اس لئے کہ اگر کسی عرب کا مکہ میں دوست نہ ہوتا جو اسے کپڑے عاریتاً دے سکتا' اور یا اگر اسے یہ سہولت حاصل نہ ہوتی کہ وہ کرایہ کے کپڑے خرید سکتا تو اس کے لئے دو راستے کھلے ہوئے تھے' ایک یہ کہ وہ عریانی کی حالت میں طواف کرے اور یا کپڑوں میں طواف کر کے کپڑے پھینک دے۔ایسے کپڑوں کو لقی کہا جاتا تھا اور پھر انہیں کوئی بھی ہاتھ نہ لگاتا۔"

قرطبی' احکام القرآن میں لکھتے ہیں :کہا جاتا ہے کہ عرب ایام حج میں مرغن غذا نہ کھاتے تھے اور تھوڑا بہت کھاتے تھے اور برہنہ حالت میں طواف کرتے تھے۔انہیں کہا گیا" ہر عبادت کے وقت اپنے آپ کو زینت سے آراستہ کرو اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔" یعنی جو چیزیں تم پر حرام نہیں قرار دی گئی ہیں ان کو حرام کرنے میں اسراف نہ کرو۔ اس لئے کہ اسراف کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا اور حد سے تجاوز یہ بھی ہے کہ حلال چیزوں کو حرام قرار دیا جائے۔ جائز کرنے میں حدود توڑنا اور حرام کرنے میں حدود سے آگے بڑھنا دونوں تجاوزات میں آتے ہیں۔

یہاں قرآن کریم صرف اس بات پر اکتفاء نہیں کرتا کہ ہر عبادت گاہ میں صرف لباس زیب تن کر کے جاؤ' اور اللہ کے پیدا کردہ پاکیزہ رزق سے فائدہ اٹھاؤ اور کھاؤ پیو' بلکہ بطور استکار ان لوگوں سے پوچھتا ہے کہ اللہ نے لوگوں کے لئے زیب و زینت کی جو چیزیں پیدا کی ہیں انہیں کس نے حرام قرار دیا ہے اور جو پاکیزہ خوراک پیدا کی ہے اسے کس نے حرام قرار دیا ہے۔اس لئے کہ لوگوں کی جانب سے از خود رزق کو حلال قرار دینا اور اپنے اوپر زیب و زینت کو حرام قرار دینا کس کے اذن سے ہے' کیونکہ حلال و حرام کا تعین من جانب شارع ہوتا ہے۔

(قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷:۳۲))
"اے نبی ؐ' ان سے کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لئے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں۔"

اس تنبیہ آمیز سوال کے بعد یہ قرار دیا جاتا ہے کہ یہ لباس اور یہ پاکیزہ رزق اہل ایمان کا حق ہے' اس لئے کہ وہ مومن ہیں اور وہ اس رب پر ایمان لانے والے ہیں جس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے' اگرچہ ان چیزوں میں غیر مومن اس دنیا کی حد تک ان کے ساتھ شریک ہیں لیکن قیامت میں اور اگلے جہان میں تو یہ چیزیں خالصتاً مومنین کے لئے ہیں اور وہاں کفار کا کوئی حصہ نہیں ہو گا۔ (قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ (۷:۳۲)) "کہو' یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لئے ہیں' اور قیامت کے روز تو خالصتاً انہی کے لئے ہوں گی۔" اس لئے اگر صورت حال یہ ہے تو یہ حرام کیسے ہو سکتی ہیں؟ ایک چیز قیامت میں تو مسلمانوں کے لئے خاص ہو اور یہاں ان پر حرام ہو۔

(كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۷:۳۲)) "اس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو علم رکھنے والے ہیں۔" اور جو لوگ اس دین کی حقیقت کو سمجھتے ہیں وہی اس بیان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

رہی وہ چیز جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے تو اگر اس کا تعلق لباس سے ہے تو بھی وہ صحت مند لباس نہیں ہے۔ اگر اس کا تعلق خوراک و اسکاک سے ہے تو وہ طیب نہیں ہے ماسوائے اسراف اور کبرو غرور کے۔ حرام تو وہ چیزیں ہیں جن کا ارتکاب وہ رات دن کر رہے ہیں۔

(قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَالَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ (۷:۳۳)) "اے نبی ؐ ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے شرمی کے کام ----- خواہ کھلے ہوں یا چھپے ----- اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی اور یہ کہ اللہ کے ساتھ تم کسی ایسے کو شریک کرو جس کے لئے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی' اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلق تمہیں علم نہ ہو (کہ وہ حقیقت میں اسی نے فرمائی ہے)۔"

یہ ہیں وہ چیزیں جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ وہ فحش افعال جو حدود الٰہیہ سے متجاوز ہوں۔ چاہے وہ ظاہر ہوں یا خفیہ ہوں' (اِثْم) ہر معصیت کو کہتے ہیں۔ (بَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ) وہ ظلم جو حق و انصاف کے خلاف ہو' اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا جبکہ شرک کی پشت پر کوئی قوت دلیل نہیں ہوتی۔ اس شرک میں وہ بھی شامل ہے جو عرب جاہلیت میں بھی تھی اور اس کے علاوہ بھی تمام جاہلیتوں میں تھی کہ قانون سازی میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کیا جائے حالانکہ قانون سازی اور شریعت سازی اللہ کی اہم خصوصیات میں سے ایک ہے۔ اللہ کی طرف ایسی باتوں کی نسبت کرنا جو خود نسبت کرنے والے کے علم میں بھی نہ ہوں' مثلاً وہ جن چیزوں کو حلال و حرام قرار دیتے تھے وہ ان کے علم میں نہ تھیں اور وہ بغیر علم و یقین کے ان کی نسبت اللہ کی طرف کرتے تھے۔ یہ بجائے خود شرک ہے۔

اس سلسلے میں کلبی نے ایک عجیب روایت نقل کی ہے کہ جب مشرکین کو یہ خطاب کیا گیا اور ان پر یہ گرفت کی گئی تو اس وقت ان کی حالت یہ تھی کہ "جب مسلمانوں نے لباس پہن کر بیت اللہ کا طواف کیا تو مشرکین نے ان کو غیرت دلائی اور انہیں شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جاہلیت اپنے پیروکاروں کو کس حد تک پہنچا دیتی ہے۔ بعض لوگ ننگے بیت اللہ کا طواف کرتے تھے۔ ان کی فطرت نے اپنی حالت بدل دی تھی اور ان کی فطرت اس حقیقی شرم و حیا سے محروم ہو چکی تھی جس کے بارے میں قصہ آدم و ابلیس میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ یہ شرم و حیا آدم و حوا میں موجود تھا کیونکہ "جب انہوں نے درخت کو چکھا تو ان کی شرمگاہیں ظاہر ہو گئیں اور وہ اپنے اوپر جنت کے درختوں کے پتے لپیٹنے لگے۔ جب کفار نے دیکھا کہ مسلمان تو لباس پہن کر بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں اور زیب و زینت کے ساتھ طواف کر رہے ہیں اور ستر و شرافت کے ساتھ کر رہے ہیں تاکہ ان میں فطرت کے عین مطابق انسانی خصوصیات پروان چڑھیں اور وہ حیوانوں کی طرح عریانی سے محفوظ رہیں۔ جب مسلمانوں نے یہ فطری حالت اختیار کی تو انہوں نے اس پر نکتہ چینی شروع کر دی۔

یہ ہے جاہلیت کا کارنامہ۔ وہ لوگوں کی فطرت' ان کی روح' ان کے تصورات اور ان کی اقدار اور پیمانوں کو مسخ کر

دیتی ہے - آج دور جدید کی جاہلیت لوگوں کے ساتھ وہی کچھ کر رہی ہے جو ان کے ساتھ جاہلیت عربیہ کر رہی تھی یا اس سے پہلے یونانی جاہلیت کر رہی تھی یا رومی جاہلیت کر رہی تھی یا فارس کی مشرک جاہلیت کر رہی تھی غرض ہر خطے اور ہر دور میں جاہلیت کے یہی خدوخال رہے ہیں -

دور جدید کی جاہلیت کیا کر رہی ہے' صرف یہ کہ وہ لوگوں کو ننگا کر رہی ہے - ان کے جسم سے شرم و حیا اور تقویٰ کے لباس کو اتار رہی ہے - اس کام کو وہ ترقی اور تہذیب و تمدن کا نام دیتی ہے - اس کے بعد وہ شریف زادوں اور شریف زادیوں کو طعنہ دیتی ہے کہ وہ رجعت پسند' مقلد' روایت پسند اور دیہاتی ہیں -

مسخ فطرت کو مسخ کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے - فطرت سے روگردانی کرنے کو فطرت کا فساد ہی کہا جاسکتا ہے - حسن و قبح کے پیمانے بدل جانے کو ضمیر کا بدلنا ہی کہا جاسکتا ہے اور اس پر اگر کوئی فخر بھی کرتا ہے تو وہ اس کا احمقانہ غرور ہی ہو گا بلکہ صریح سرکشی ہو گی - کیونکہ اس بیماری' اس حیوانیت اور اس سرکشی کا تعلق شرک کے ساتھ ہے' یہ دراصل ارباباً من دون اللّٰہ کی طرف سے ان کے لئے قانون سازی اور ضابطہ بندی ہے اور انہوں نے مل کر ایک دوسرے کو اس کی وصیت کی ہے -

عرب مشرکین اس قسم کی ہدایات اپنے علاقے کے حاکموں سے اخذ کرتے تھے اور یہ حکام ان کا استحصال کرتے تھے' محض ان کی جہالت کی وجہ سے اور ان سے اس قسم کے غیر معقول کام کروا کر ان پر اپنی قیادت و سیادت مسلط کرتے تھے - اسی طرح قدیم جاہلیتوں کا حال تھا' بعض چالاک اور عیار لوگ لوگوں کو اس قسم کے اوہام میں مبتلا کر کے ان پر اپنی سیادت مسلط کرتے جن میں کاہن سردار اور امراء سب شامل تھے - آج بھی لوگ اپنی دنیاوی قیادتوں سے ایسی ہی ہدایات اخذ کرتے ہیں اور ان کی ہدایات کی تعمیل خدائی احکام کی طرح فرض ہوتی ہے - کوئی انہیں رد نہیں کر سکتا -

آج آرائش کی دکانیں اور ان کی منصوبہ بندی کرنے والے' اسی طرح فیشن کی منصوبہ بندی کرنے والے وہ ارباب ہیں جن کے جال میں دور جدید کی جاہلیت میں بسنے والی تمام عورتیں اور مرد پھنسے ہوئے ہیں - یہ ارباب اپنے احکام صادر کرتے ہیں اور ان کی تعمیل وہ تمام لوگ کرتے ہیں جو پوری دنیا میں ننگی ٹکڑیوں کی شکل میں موجود ہیں اور یہ لوگ ان منصوبہ سازوں کے احکام کی تعمیل نہایت ہی بے بسی کی حالت میں کرتے ہیں - یہ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کے لئے نئے سال کے لئے جو فیشن تیار کر لیا گیا ہے وہ ان کے حالات اور ضروریات کے لیے مناسب بھی ہے یا نہیں - یہ لوگ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ یہ لباس ان کے لئے مفید ہے یا نہیں بلکہ نہایت ہی عاجزی سے یہ لوگ ان کے اشاروں پر چلتے ہیں - اگر یہ نہ چلیں تو ان پر دوسرے مویشی اور حیوانات حرف گیری کرتے ہیں اور طعنے دیتے ہیں -

سوال یہ ہے کہ آرائش و زیبائش اور فیشن ہاؤس کے پیچھے کون سی قوتیں کام کر رہی ہیں؟ اور یہ کون سی قوتیں ہیں جو لوگوں کو ننگا کر رہی ہیں - ناولوں اور فلموں کے پیچھے کیا مقاصد کام کر رہے ہیں؟ رسالوں اور اخباروں کی پشت پر کون سی قوتیں کار فرما ہیں - بعض اخبارات تو مسلسل اخلاقی پستی اور اخلاقی فساد پھیلا رہے ہیں - سوال یہ ہے کہ ان چیزوں کی پشت پر وہ کون سی خفیہ قوت ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس تمام عالمی فساد کی پشت پر یہودیوں کی قوت ہے - یہ یہودی ہی ہیں جو دراصل ان لوگوں کے خدا بنے ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی نکیل ان کے ہاتھ میں دے دی ہے - وہ اپنے مقاصد دنیا میں اس قسم کی لہریں پیدا کر کے حاصل کرتے ہیں اور پوری دنیا ان مقاصد کے لئے بھاری قیمت ادا کر کے کام کر رہی

ہے۔ان مقاصد کے لئے وہ لوگوں کے اندر نفسیاتی بے چینی پھیلاتے ہیں' انسانی فطرت کو بدلتے ہیں اور انسان کو فیشن اور جنسی بے راہ روی کے ہاتھ میں ایک کھلونا بنا دیا گیا ہے۔ اس اسراف و تبذیر اور اخلاقی فساد کے ذریعے یہ یہودی قوت اپنے معاشی مقاصد پورے کرتی ہے۔کیونکہ فیشن اور میک اپ اور سامان تعیش کے کارخانے عالمی یہودیت نے لگا رکھے ہیں اور یہ لوگوں کے اندر مانگ پیدا کر کے پھر ان اشیاء کو ان پر ہی فروخت کرتے ہیں۔

لباس اور فیشن کا معاملہ اسلامی شریعت سے جدا نہیں ہے۔اسلامی نظام حیات میں اس کے لئے بھی ضابطہ مقرر ہے۔ اور اسی لئے اسے ایمان اور توحید و شرک کے اساسی مسئلے کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے۔ مختلف اسباب کی بنأ پر یہ مسئلہ نظریات اور شریعت کے ساتھ مربوط ہے۔

- لباس کا تعلق اللہ کے اقتدار اعلیٰ سے ہے کیونکہ اللہ ہی وہ ذات ہے جس کی طرف ہمیں اس معاملے میں رجوع کرنا ہے کیونکہ لباس ایک ایسی چیز ہے جس کے اثرات اخلاق' معیشت اور زندگی کے دوسرے اہم معاملات پر پڑتے ہیں۔
- لباس ہی کے ذریعے انسان کی انسانی خصوصیات کا ظہور ہوتا ہے اور انسانی شخصیت کے حیوانی پہلو کو دبا کر انسانی پہلو کو نمایاں کیا جاتا ہے۔

ہر جاہلیت کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ وہ عوام الناس کے ذوق' ان کے اخلاق اور ان کے حسن و قبح کے پیمانے بدل دیتی ہے اور عریانی اور حیوانیت کو ترقی کا نام دیتی ہے۔اور ستر اور حیا چشمی کو رجعت پسندی اور پسماندگی کہتی ہے۔ایسی صورت میں انسانی فطرت کو مسخ کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

ہمارے ہاں آج اس قسم کے جاہل موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ لباس کا دین اور مذہب کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ دین کا عورتوں کے لباس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ دین و مذہب اور آرائش و زیبائش کا آپس میں تعلق ہی کیا ہے؟ یہ ہے وہ فکری بگاڑ جو جاہلیت ہر دور میں اور ہر جگہ پیدا کرتی ہے۔

بظاہر تو لباس کا مسئلہ ایک جزئی مسئلہ نظر آتا ہے لیکن اسلام اور رب تعالیٰ کے ہاں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ ایک تو اس کا تعلق توحید و شرک کے مسئلے سے ہے' دوسرے اس کا تعلق انسان کے اخلاق و معاشرے کی اصلاح و فساد کے ساتھ ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہاں اس پر ایک نہایت ہی مؤثر اور پر زور تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ تبصرہ عموماً قرآن کریم میں بڑے بڑے اور اہم مسائل پر بحث کے بعد کیا گیا ہے۔اس تبصرے میں بنی آدم کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ انہیں اپنی اصل حقیقت پر بھی غور کرنا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ یہاں ان کا رہنا اور سہنا بہرحال ایک محدود مدت تک کے لئے ہے اور ایک دن انہیں یہاں سے جانا ہے جس کا وقت مقرر ہے جب وہ وقت آجاتا ہے تو ایک منٹ کی تاخیر و تقدیم نہیں ہو سکتی۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٣٤﴾

" ہر قوم کے لئے مہلت کی ایک مدت مقرر ہے' پھر جب کسی قوم کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی

تاخیر و تقدیم بھی نہیں ہوتی۔"

اسلامی تصور حیات کا یہ ایک اساسی عقیدہ ہے۔ اور قرآن کریم بار بار غافل اور ناشکرے دلوں کے اندر اس کو جگاتا رہتا ہے تاکہ وہ اپنی اس زندگی اور اس کی محدود مہلت کو دائمی نہ سمجھ لیں اور سرکشی اختیار نہ کریں۔

یہاں اس مہلت سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آج کی نسل انسانی کے لئے طبیعی زندگی کی ایک حد ہے اور اس سے مراد ملت اور تہذیب کی عمر طبیعی بھی ہو سکتی ہے جس میں اس کے اقتدار اعلیٰ اور دنیا میں اس کی برتری کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔ مراد کسی نسل کی عمر طبیعی ہو یا کسی ملت کی عمر طبیعی ہو' بہرحال جب مہلت ختم ہو تو اس کے بعد ان کا زندہ رہنا یا مقتدر اعلیٰ رہنا ممکن نہیں ہوتا۔

---ooo---

یہاں بحث کے خاتمہ سے پہلے ایک عجیب نکتے پر اظہار خیال ضروری ہے۔ سورہ انعام اور سورہ اعراف میں' جاہلیت کے زاویے سے نذر و نیاز' حلال و حرام کے تعین کے مسائل پر قرآن نے جو منہاج بحث اختیار کیا اور مسائل لباس اور خوراک اور کھانوں کے مسائل پر جو بحث کی گئی اس میں ایک عجیب مماثلت پائی جاتی ہے۔

وہاں ذبحوں' نذر و نیاز' مویشیوں اور کھانوں پر بحث کا آغاز اس طرح کیا گیا کہ سب سے پہلے اس صورت حالات کو سامنے لایا گیا جو عملاً موجود تھی اور کہا گیا کہ یہ اللہ پر افتراء ہے کہ اس صورت حالات کو منجانب اللہ شریعت سے تعبیر کیا جائے۔ اس کے بعد کہا گیا کہ تم اس پر کوئی دلیل پیش کرو اگر تمہارے پاس کوئی سند ہے تو۔ کہا گیا (اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا) کہ جب اللہ نے یہ شریعت بنائی اور تمہیں تلقین کی کہ اس پر عمل کرو کیا تم خود اس وقت موجود تھے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے کہ وہ جھوٹ بولے اور جھوٹ اس لئے بولے کہ لوگوں کو بغیر علم کے وہ گمراہ کرے' ایسا شخص ظالم ہے اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ اس کے بعد بیان یوں آگے بڑھا کہ کفار نے کہا کہ وہ جو شرک کر رہے ہیں وہ امرالٰہی کے نتیجے میں ہے' اگر اللہ نہ چاہتا تو ایسا نہ ہوتا (سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ......) وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا ہے وہ یہ کہیں گے کہ اگر اللہ نہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے آباء کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کرتے۔ اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی جھٹلایا یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے کہ تم اسے ہمارے لئے نکال لاؤ' تم تو ماسوائے ظن و تخمین کے کسی اور چیز کی پیروی نہیں کر رہے ہو' بلکہ تم اپنی جانب سے باتیں گھڑتے ہو' کہہ دو اللہ ہی کے پاس حجت بالغہ ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔ کہہ دو' لاؤ اپنے گواہوں کو جو یہ شہادت دیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ اے پیغمبر اگر کوئی گواہ یہ شہادت دے بھی تو تم اس کے ساتھ شہادت نہ دو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے اور جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو برابر قرار دیتے ہیں۔

اس کے بعد وہاں ان کے ان مزعومات اور مفتریات کو مضحکہ خیز بتایا گیا اور کہا گیا کہ آؤ' ہم تمہیں بتائیں کہ اللہ کی جانب سے کیا حرام ہے' کیونکہ حلال و حرام کا اختیار اللہ کے پاس ہے۔ اور وہی کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دے سکتا

ہے۔ فرمایا (قُلْ تَعَالَوْا ........) کہہ دو آؤ' میں تمہیں سناؤں کہ تمہارے رب نے تم پر کیا حرام کیا ہے؟ یہ کہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔"

یہاں بھی اسی منہاج بحث کو اختیار کیا گیا ہے۔ وہی مدارج بیان یہاں بھی ہیں۔ پہلے ان کی صورت حالات کو پیش کیا گیا کہ وہ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور ازخود حلال و حرام کے حدود مقرر کرتے ہیں' خصوصاً لباس اور کھانوں کے معاملات میں۔ پھر انہیں تنبیہ کی گئی کہ وہ فحاشی اور شرک جیسے خطرناک گناہوں میں مبتلا ہیں اور ان کے سامنے یہ حقیقت رکھی گئی کہ شیطان نے جنت میں کس طرح تمہارے باپ کو بے لباس کیا اور پھر یہ کہا گیا کہ لباس ستر اور لباس زینت تمہارے لئے اتارا گیا ہے اور یہ رب کی نعمت ہے۔ اس کے بعد ان کو یہ تنبیہ کی گئی کہ تمہارا یہ دعویٰ غلط ہے کہ یہ حلال و حرام جس پر تم عمل پیرا ہو یہ اللہ نے مقرر کئے ہوئے ہیں اور اللہ کی شریعت ہیں۔ (قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ) "کہہ دیجئے کہ اللہ نے اپنے بندوں کے لئے جو زینت پیدا کی ہے اسے کس نے حرام قرار دیا ہے؟ اور پھر پاکیزہ رزق ...... کہہ دیجئے یہ دنیا کی زندگی میں ان لوگوں کے لئے ہیں جو ایمان لائے ہیں اور قیامت میں تو خالصتاً ان کے لئے ہیں۔ ہم آیات کو مفصل ان لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں جو ایمان لائیں۔" تفصیل آیات میں یقینی علم کی طرف اشارہ ہے اور ان کی پیروی ضروری ہے۔ لوگ عبادات و شریعت کے بارے میں جس ظن و تخمین کی پیروی کرتے ہیں وہ درست نہیں ہے اور اس سلسلے میں ان کے تمام دعوے غلط ہیں۔ اس کے بعد آخر میں بتایا جاتا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں اللہ نے کن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ (قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ) "کہہ دیجئے' میرے رب نے تو صرف ظاہری اور باطنی فواحش کو حرام قرار دیا ہے 'مطلق گناہ' بغیر حق کے دست درازی' اور یہ کہ تم بے دلیل شرک کرو' اور اللہ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرو جن کے بارے میں تمہارے پاس علم نہیں ہے۔"

اور جس طرح اللہ نے لباس و طعام کے بارے میں احکام دیئے اسی طرح اس نے عبادت اور اکل و شرب کے بارے میں بھی دیئے ہیں۔ (قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ (۷: ۲۹)) "کہہ دیجئے میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے' اور عبادت کے وقت اپنے چہروں کو درست رکھو' کھاؤ' پیو اور اسراف نہ کرو' اللہ اسراف کرنے والوں کو محبوب نہیں رکھتا۔"

ان دونوں مباحث میں مسائل حلال و حرام کا تعلق ایمان اور شرک کے ساتھ جوڑا گیا ہے کیونکہ تحلیل و تحریم کا تعلق مسئلہ اقتدار اعلیٰ سے ہے اور انسانوں میں سے کوئی مقتدر اعلیٰ نہیں ہو سکتا۔ نیز ان مسائل کا تعلق اس معاملے سے ہے کہ یہاں لوگ کس کی بندگی کریں گے؟ غرض دونوں مقامات پر مسئلہ بھی ایک ہے اور منہاج بحث بھی ایک ہے اور اس بحث کے لئے جو درجے (steps) رکھے گئے ہیں وہ بھی وہی ہیں۔ (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْم) اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ قرآن اگر اللہ کی جانب سے نہ ہوتا تو دیکھنے والا دیکھتا کہ اس میں اختلافات ہیں۔ وحدت منہاج کی اہمیت اس وقت دوچند ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ سورہ انعام اور سورہ اعراف کے موضوعات بحث مختلف ہیں لیکن جاہلیت کے ساتھ جب اسلامی نظام کا مقابلہ ہوتا ہے تو منہاج بحث ایک جیسا ہو جاتا ہے' خصوصاً جبکہ بات اساسی موضوعات و تصورات پر ہو۔

# درس نمبر ۵۷ تشریح آیات

## ۳۵ --- تا --- ۵۳

قصہ تخلیق انسانیت پر تبصرہ کرنے کے لئے یہ ایک طویل وقفہ تھا۔ اس تبصرے میں کہا گیا تھا کہ اس وقت انسانیت کس قسم کی جاہلیت میں ڈوبی ہوئی ہے اور اس کے مقابلے میں عرب جاہلیت کس مقام پر ہے۔ جاہلیت کا موازنہ چند اساسی مسائل کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ یعنی جسم کی ستر پوشی اور روح کی ستر پوشی لباس تقویٰ کے ساتھ۔ جسم و روح کی ستر پوشی کا تعلق اسلامی نظریہ حیات کے اساسی عقیدے 'عقیدۂ توحید و شرک کے ساتھ ہے جو اسلامی نظریہ حیات کا بنیادی عقیدہ ہے۔

اب یہاں سے انسانیت کے نام ایک دوسری پکار شروع ہوتی ہے۔ اس ندا اور پکار کا تعلق مسئلہ لباس کے ساتھ بھی ہے اور انسانوں کے لئے زندگی کے تمام معاملات میں ہدایات لینے اور ان کا اتباع کرنے کے معاملے سے بھی ہے۔ قانون سازی کے مسئلے سے بھی ہے اور دنیا میں اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے قیام کے مسئلے سے بھی ہے تاکہ لوگوں کو اچھی طرح از سر نو یہ بات معلوم ہو جائے کہ انہوں نے ان موضوعات پر ہدایات کہاں سے لینی ہیں۔ تو بتایا جاتا ہے کہ ہدایات لینے کا قوام رسالت کا قوام ہے۔ اور زندگی کے موجودہ مرحلے کے اختتام پر قیامت کے دن حساب و کتاب اسی نقطہ نظر سے ہو گا کہ کس نے رسولوں سے ہدایات لے کر ان کی پیروی کی اور کس نے ان کی نافرمانی کی؟

---

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٦﴾

(اور یہ بات اللہ نے آغاز تخلیق ہی میں صاف فرما دی تھی کہ) "اے بنی آدم' یاد رکھو' اگر تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سنا رہے ہوں' تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویے کی اصلاح کرلے گا اس کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے' اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلے

میں سرکشی برتیں گے وہی اہل دوزخ ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے ۔"

اللہ کی جانب سے بنی آدم کو آغاز تخلیق ہی میں یہ صاف ہدایت تھی اور یہ اس کرۂ ارض پر بنی آدم کے اقتدار اور خلافت کے لئے لازمی شرط بھی تھی 'کیونکہ یہ زمین اللہ نے پیدا کی ہے ۔اس میں انسانوں کی زندگی کی ضروریات اس نے پیدا کی ہیں اور اس کے اوپر اقتدار و اختیار اللہ ہی نے انسان کو عطا کیا ہے تاکہ انسان یہاں مناسب رول ادا کر سکے ' ورنہ انسان کا ہر قسم کا عمل مردود ہو گا اور اسے کوئی مسلمان قبول نہ کرے گا۔ آخرت میں بھی وہ گناہ ہو گا اور موجب جہنم ہو گا اور کوئی بدلہ اس عذاب سے چھڑا نہ سکے گا۔

(فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ (۷: ۳۵)) "تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویے کی اصلاح کرلے گا اس کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے ۔"

اس لئے کہ تقویٰ ہی انہیں گناہوں اور فواحش سے دور رکھ سکتا ہے ۔ سب سے بڑی فحاشی اللہ کے ساتھ شرک کا ارتکاب ہے ' پھر اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے حق پر ہاتھ ڈالنا ہے اور خدائی خصوصیات کا دعویٰ کرنا ہے ۔تقویٰ ہی انسان کو خدا کی اطاعت اور نیک کاموں پر آمادہ کرتا ہے اور خوف سے نجات دے کر دارالامان میں داخل کرتا ہے اور اسی کے ذریعے حصول رضائے الٰہی ممکن ہے ۔

(وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

(۷: ۳۶)) "اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلے میں سرکشی برتیں گے وہی اہل دوزخ ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے ۔"

کیونکہ اللہ کے عہد و نصیحت کو فراموش کرنے اور استکبار اور تکذیب کی وجہ سے یہ لوگ اپنے دوست شیطان سے مل چکے ہیں اور ان پر اللہ کا یہ فیصلہ نافذ ہو گیا ہے کہ "جو لوگ تم میں سے اس کی اطاعت کریں گے تو ان سب سے میں جہنم کو بھر دوں گا۔"

---○○○---

اب یہاں سے اللہ کے سامنے پیشی کا منظر شروع ہوتا ہے 'جس کی طرف سابقہ سبق کے آخر میں اشارہ کیا گیا تھا۔

(وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا

يَسْتَقْدِمُوْنَ (۷: ۳۴)) "ہر قوم کے لئے مہلت کی ایک مدت مقرر ہے 'پھر جب کسی قوم کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی تاخیر و تقدیم بھی نہیں ہوتی ۔" اس کے بعد یوم و حساب کا منظر شروع ہوتا ہے 'فیصلے اور سزا و جزاء کے مناظر آتے ہیں۔گویا یہ متقین اور مستکبرین کے انجام کی تفصیل ہے۔ یہ منظر اسی طرح ہے جس طرح قرآن کریم مناظر قیامت کو پیش کرتا ہے ۔ قارئین کو یوں نظر آتا ہے کہ واقعات عملاً رونما ہو رہے ہیں۔

قرآن کریم نے مناظر قیامت کے بیان میں ایک خاص اسلوب اپنایا ہے ۔ حشر و نشر' حساب و کتاب ' انعام و اکرام

اور عذاب اور سزا کے بیان میں نہایت ہی موثر اسلوب اپنایا ہے ۔ یہاں صرف یہ نہیں ہے کہ قرآن نے موجودہ دنیا کے بعد آنے والے جہان کے کچھ اوصاف گنوا دیئے ہیں بلکہ اس کے مناظر کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ وہ مناظر محسوس اور مجسم نظر آتے ہیں ۔ ان کے اندر افراد چلتے پھرتے اور زندہ نظر آتے ہیں اور نہایت ہی واضح شکل و صورت میں ۔ قرآن کریم کی دنیا میں جب ایک مسلم زندگی بسر کرتا ہے تو وہ ان مشاہدات و مناظر کو اپنی آنکھوں سے جگہ جگہ دیکھتا ہے ۔ وہ ان سے متاثر ہوتا ہے ۔کبھی اس کا دل دھڑکتا ہے 'کبھی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں 'کبھی وہ بری طرح خوفزدہ ہو جاتا ہے ۔کبھی وہ پوری طرح مطمئن اور ہشاش وبشاش ہو جاتا ہے ۔کبھی اسے آگ کے شعلہ ہائے جوالہ نظر آتے ہیں اور کبھی اسے جنت کی باد نسیم محسوس ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں زندہ رہنے والا مومن اس دن سے پوری طرح واقف ہوتا ہے اور جو لوگ ان مناظر کے بارے میں آیات کو غور سے پڑھتے ہیں 'وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اس دنیا کے مقابلے میں درحقیقت میدان حشر میں زندہ رہ رہے ہیں ۔وہ قرآن کی دنیا میں اس طرح گم ہو جاتے ہیں جس طرح کوئی انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے ۔ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں چلا جاتا ہے اور یہ انتقال محسوس طور پر ہوتا ہے ۔ غرض اس کے احساس و شعور میں عالم آخرت آنے والا مستقبل نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسا حال ہوتا ہے جس کا وہ مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے ۔

یہاں جن مناظر کو پیش کیا گیا ہے وہ طویل ترین مناظر میں سے ہیں اور ان میں زندگی بھرپور نظر آتی ہے ۔یہ مسلسل مناظر ہیں اور ان میں لوگوں کے ڈائیلاگ بھی موجود ہیں اور زندہ اور بھرپور مکالمات کو حیرت انگیز الفاظ میں منتقل کیا گیا ہے ۔اس طرح مکمل طور پر جس طرح آنکھوں سے دیکھ کر کوئی کسی منظر کو محفوظ کر لیتا ہے ۔

جیسا کہ ہم نے اس سے قبل کہا یہ مناظر قصہ آدم پر تبصرے کے بعد آئے ہیں جبکہ آدم جنت سے نکال دیئے گئے تھے ۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی کا اخراج بھی ہو گیا تھا اور یہ اخراج شیطان کی وسوسہ اندازی کے نتیجے میں عمل میں آیا تھا ۔ اس کے بعد بنی آدم کو یہ تنبیہ بھی کر دی گئی تھی کہ شیطان کے فتنوں سے بچو وہ تمہیں اس طرح نقصان نہ پہنچا دے جس طرح تمہارے باپ کو اپنی دسیسہ کاریوں سے جنت سے نکلوایا ۔اس تنبیہ کے ساتھ کہ اگر انہوں نے آنے والے رسولوں کو چھوڑ کر شیطان کا اتباع اختیار کیا تو وہ جہنم کی سزا کے مستحق ہوں گے ۔ان باتوں کے بعد قیامت کے دن اللہ کے سامنے حضوری کے شاہد پیش کئے گئے ۔یہ شاہد اس طرح پیش کئے گئے کہ گویا یہ قصہ آدم کے متصلاً پیش آ رہے ہیں ۔اچانک رسولوں کی بعثت اور ان کے مقاصد سامنے آ جاتے ہیں 'اچانک ان لوگوں کا منظر سامنے آ جاتا ہے جو شیطان کے پیروکار ہیں 'اچانک وہ لوگ سامنے آ جاتے ہیں جو شیطان کے مخالف ہیں اور جنت کے وارث ہیں ۔وہ عالم بالا سے یہ پکار سنتے ہیں "کہ یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث ہو 'اس لئے کہ تمہارے عمل اچھے تھے ۔" (اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ الَّتِىْ ) یوں نظر آتا ہے کہ مسافر گھروں کو واپس آ رہے ہیں 'مہاجر اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں اور اب انہوں نے اس دارالنعیم میں ہمیشہ رہنا ہے ۔

اس قصے اور اس پر تبصرے کے اندر جو ہم آہنگی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے قصہ آتا ہے اور اس کے مناظر عالم بالا میں پیش کئے جاتے ہیں ۔اس کے بعد اس پر تبصرہ اور شاید قیامت آئے ۔ اس ہم آہنگی میں جو خوبصورتی ہے وہ ناقابل بیان ہے ۔ یہ کہانی عالم بالا میں فرشتوں کے سامنے شروع ہوتی ہے ۔اس وقت آدم و حوا کی تخلیق کی تقریب سعید تھی ۔ آدم

اور حوا کو جنت میں رکھا گیا تھا' اور شیطان کی وسوسہ اندازی سے جنت سے ان کے اخراج کے واقعات پیش آئے۔ اخراج اس لئے ہوا کہ انہوں نے مکمل اطاعت اور بندگی نہ کی اور عالم بالا ہی میں یہ مناظر آغاز و انجام یکجا ہو جاتے ہیں اور ان کے درمیان انسانی زندگی کے طویل مناظر پیوست ہیں۔ گویا ایک ہی اسٹیج پر یہ تمام مناظر آغاز' درمیان اور انجام پیش ہو گئے۔ نہایت ہی ہم آہنگی اور مناسب انداز و پیرائے میں۔

---○○○---

اب ہم میدان حشر میں آگئے ہیں اور اس میں اللہ کے سامنے ان لوگوں کو پیش کیا گیا ہے جو اللہ پر بہتان باندھتے ہیں۔ ان لوگوں کا افتراء اور بہتان یہ ہے کہ انہوں نے آباؤ اجداد سے کچھ رسومات اور ضابطے ورثے میں پائے ہیں اور کچھ ضابطے اور قوانین خود انہوں نے اپنی جانب سے وضع کئے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ من جانب اللہ ہیں۔ ان لوگوں کی بھی پیشی ہے جن لوگوں نے اللہ کے بھیجے ہوئے رسولوں کو جھٹلایا حالانکہ وہ یقینی شریعت لے کر آئے تھے۔ اس کے مقابلے میں انہوں نے ظن و تخمین سے کام لے کر علم و یقین کو رد کر دیا' یہ لوگ دنیا میں عیش و عشرت کرتے رہے اور زمانہ ابتلاء خوب مستی سے گزارا اور رسولوں نے ان کے سامنے جو پیغام پیش کیا وہ بھی ان تک پہنچا جسے قبول کرنا ان کی قسمت میں نہ تھا۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

”آخر اس سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جو بالکل جھوٹی باتیں گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی سچی آیات کو جھٹلائے؟ ایسے لوگ اپنے نوشتہ تقدیر کے مطابق اپنا حصہ پاتے رہیں گے' یہاں تک کہ وہ گھڑی آجائے گی جب ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے کے لئے پہنچیں گے۔ اس وقت وہ ان سے پوچھیں گے کہ ”بتاؤ' اب کہاں ہیں تمہارے معبود جن کو تم خدا کے بجائے پکارتے تھے؟“ وہ کہیں گے کہ ”سب ہم سے گم ہو گئے۔“ اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ ہم واقعی منکر حق تھے۔

دیکھئے اب ہم ان لوگوں کو دیکھ رہے ہیں جنہوں نے اللہ پر بہتان باندھا اور اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔ حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کے رسول آچکے تھے۔ اس منظر میں پہلے تو ان کی روح قبض کی جاتی ہے گویا ملزم گرفتار ہوتے ہیں۔ پھر ان کے درمیان یہ مکالمہ ہو گا: فرشتے کہیں گے ”بتاؤ اب کہاں ہیں تمہارے وہ معبود جن کو تم خدا کے بجائے پکارتے تھے؟“ وہ کہیں گے کہ ”وہ سب ہم سے گم ہو گئے۔“

اب تمہارے وہ دعوے کہاں ہیں جن کے ذریعے تم اللہ پر افتراء باندھتے تھے ' اور وہ الٰہ کہاں ہیں جن کو تم نے دنیا میں دوست بنا رکھا تھا ' جن کی وجہ سے تم فتنے میں پڑ گئے اور رسولوں کی لائی ہوئی دعوت کو چھوڑ دیا ۔ یہ تو تیں اس آڑے وقت میں تمہاری مدد کو یوں نہیں آ رہی ہیں کہ اب تمہاری جان لی جا رہی ہے اور تمہیں کوئی ایسا مددگار نہیں مل رہا جو اس مقررہ وقت سے لمحہ بھر کے لئے موت کو مؤخر کر دے ۔ ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ ان کا یہی جواب ہو سکتا ہے ۔ (قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا (۷: ۳۷)) "وہ سب ہم سے گم ہو گئے ۔"

وہ ہم سے اس طرح گم ہو گئے اور اس طرح غائب ہو گئے کہ ہمیں ان کا کوئی اتا پتا نہیں مل رہا ۔ اب وہ ہماری طرف نہیں آ رہے ۔ غرض وہ لوگ اس قدر بدحال ہوں گے کہ ان کے خدا بھی ان کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں گے اور نہ وہ ایسے برے حالات میں ان کی کوئی مدد کر سکیں گے اور ایسے خداؤں سے زیادہ گھاٹے میں اور کون ہو گا جو اپنے بندوں تک نہ پہنچ سکتے ہوں اور ایسے مشکل حالات میں ۔

(وَشَهِدُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ (۷: ۳۷)) "وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ ہم واقعی منکر حق تھے ۔" اس سے قبل جب ان پر دنیا میں عذاب آیا تھا تو بھی انہوں نے یہی اعتراف کیا تھا ۔ (فَمَا كَانَ دَعْوٰهُمْ) "جب ہمارا عذاب آیا تو ان کی پکار صرف یہی تھی کہ حقیقت میں ہم ظالم تھے ۔"

---ooo---

اب حاضری دربار الٰہی کا منظر ختم ہے اور اس کے بعد دوسرا منظر سامنے آتا ہے ۔ یہ مجرم اب جہنم کی آگ میں ہیں ۔ ان دونوں مناظر کی درمیانی کڑیاں غائب ہیں ۔ موت کے واقعات ' نشر و حشر کے واقعات درمیان میں سے غائب ہیں گویا ان کو پکڑ کر سیدھا جہنم میں ڈال دیا گیا ۔

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ
الْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا
جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا
ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَالَتْ
اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا ۴
كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع ۸
۱۱

"اللہ فرمائے گا جاؤ ' تم بھی اسی جہنم میں چلے جاؤ جس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے گروہ جن و انس جا چکے ہیں ۔ ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہو گا تو اپنے پیش رو گروہ پر لعنت کرتا ہوا داخل ہو گا ' حتیٰ کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں

گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے رب' یہ لوگ تھے جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا' لہٰذا انہیں آگ کا دوہرا عذاب دے۔ جواب میں ارشاد ہو گا۔ ہر ایک کے لئے دوہرا عذاب ہی ہے مگر تم جانتے نہیں ہو۔ اور پہلا گروہ دوسرے گروہ سے کہے گا کہ (اگر ہم قابل الزام تھے تو) تمی کو ہم پر کون سی فضیلت حاصل تھی' اب اپنی کمائی کے نتیجے میں عذاب کا مزا چکھو۔"--- ذرا ان الفاظ پر غور کیجئے۔

(قَالَ ادْخُلُوْا فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِی النَّارِ (۷:۳۸)) "اللہ فرمائے گا جاؤ' تم بھی اسی جہنم میں چلے جاؤ جس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے گروہ جن و انس جا چکے ہیں۔"

یعنی اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا ملو' انسانوں اور جنوں میں سے تمہارے جو دوست ہیں ان میں شامل ہو جاؤ' لیکن جہنم میں۔ کیا تمہیں معلوم نہ تھا کہ ابلیس نے اپنے رب کی نافرمانی کی تھی؟ کیا اس نے آدم اور ان کی بیوی کو جنت سے نہ نکلوایا تھا؟ کیا شیطان نے اولاد آدم کو گمراہ نہ کیا تھا؟ کیا اللہ نے اسی شیطان کو دھمکی نہ دی تھی کہ وہ اور اس کے تمام متبعین جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے؟ لہٰذا اب تم سب جہنم میں خوشی سے داخل ہو جاؤ' کچھ پہلے جاؤ اور کچھ ان کے پیچھے ان کا اتباع کرو' تم سب ایک دوسرے کے دوست ہو اور سب کے سب برابری کی بنیاد پر اس کے مستحق ہو۔

یہ تمام امتیں اور یہ تمام اقوام اور جماعتیں باہم دگر اس طرح دوست' حلیف اور پیوست تھیں کہ ان میں سے آخری قوم سب سے پہلی قوم کی تبع تھی اور ان میں سے تابع جماعت اپنی متبوع جماعت سے ہدایات لیتی تھی لیکن آج صورت حالات یہ ہے کہ ان کے درمیان دشمنی ہو گئی ہے اور وہ ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ رہی ہیں۔

(كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا (۷:۳۸)) "ہر گروہ جہنم میں داخل ہو گا تو اپنے پیش رو گروہ پر لعنت کرتا ہوا داخل ہو گا۔" ملاحظہ کیجئے کہ بیٹا باپ پر لعنت بھیج رہا ہو گا' کس قدر برا ہے یہ انجام۔ دوست دوست کو کوس رہا ہو گا۔ پچھلے لوگ اگلوں سے مل جائیں گے اور دور اور قریب والے سب ایک جگہ ہوں گے تو ان کے درمیان اب جدل و جدال یوں شروع ہو گا۔

(حَتّٰٓی اِذَا ادَّارَكُوْا فِیْهَا جَمِیْعًا قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ (۷:۳۸)) "حتیٰ کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے رب' یہ لوگ تھے جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا' لہٰذا انہیں آگ کا دوہرا عذاب دے۔"

یوں ان لوگوں کے مصائب کا آغاز ہوتا ہے۔ اس منظر میں دوست اور یار بھی سامنے آتے ہیں' یہ لوگ ایک دوسرے کو کوستے ہیں' اب یہ ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ہیں۔ ایک دوسرے پہ لعن طعن کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ایک دوسرے کے خلاف یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ انہیں سخت عذاب دیا جائے۔ حالانکہ وہ "رب" پر دنیا میں افتراء باندھتے تھے اور اس کی آیات کو جھٹلاتے تھے۔ اب اسی کو "ربنا" کہتے ہیں۔ اب تو وہ صرف اسی کی طرف لوٹ رہے ہیں

اور صرف اسی کی طرف رخ کئے ہوئے ہیں لیکن اللہ کی جانب سے ان کو جو جواب دیا جاتا ہے اور ان کی دعا جس طرح قبول ہوتی ہے وہ یہ ہے۔

(قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ (۷:۳۸)) "جواب میں ارشاد ہو گا' ہر ایک کے لئے دوہرا عذاب ہی ہے مگر تم جانتے نہیں ہو۔" تمہارے اور ان سب کے لئے دوگنا عذاب ہے۔

جب ان لوگوں نے یہ فیصلہ سنا تو جن کے خلاف یہ شکایت کی گئی تھی انہوں نے دعا کرنے والوں کا خوب مذاق اڑایا اور ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ ہم سب برابر کے مجرم ہیں۔

(وَقَالَتْ اُوْلٰهُمْ لِاُخْرٰهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ (۷:۳۹)) "اور پہلا گروہ دوسرے گروہ سے کہے گا (اگر ہم قابل الزام تھے تو) تمہی کو ہم پر کون سی فضیلت حاصل تھی' اب اپنی کمائی کے نتیجے میں عذاب کا مزا چکھو۔"

اب یہاں یہ المناک منظر ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد ان لوگوں کے اس انجام کو ایک منطقی انجام ثابت کرنے کے لئے تبصرہ آتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ تبصرہ اس منظر سے پہلے آتا ہے جو مومنین صادقین کا منظر ہے اور اس المناک منظر کے بالکل برعکس ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

"وہ یقین جانو' جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے اور ان کے مقابلے میں سرکش رہے ان کے لئے آسمان کے دروازے ہرگز نہ کھولے جائیں گے۔ ان کا جنت میں جانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا۔ مجرموں کو ہمارے ہاں ایسا ہی بدلا ملا کرتا ہے۔ ان کے لئے تو جہنم کا بچھونا ہو گا اور جہنم ہی کا اوڑھنا ہے۔ یہ ہے وہ جزا جو ہم ظالموں کو دیا کرتے ہیں۔

اب ذرا اپنے تصورات کو لے کر کیجئے۔ یہ ایک عجیب منظر ہے۔ ایک اونٹ ہے اور اسے سوئی کے ناکے میں داخل کرانے کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ انتظار کرو کہ یہ ناکہ اس قدر کھل جائے کہ اس سے اونٹ پار ہو جائے تب ہی ان کفار کے لئے جنت کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ تب ہی ان کی توبہ قبول ہو سکتی ہے' لیکن وقت تو گزر

چکا ہے - اب یہ جنت میں اسی طرح داخل نہیں ہو سکتے جس طرح سوئی کے ناکے سے ایک اونٹ پار نہیں ہو سکتا' لہذا یہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور اس میں یہ لوگ پے درپے جمع ہوں گے - اسی میں یہ لوگ ایک دوسرے کو ملامت کرتے رہیں گے - ایک دوسرے پر لعنت بھیجتے رہیں گے - ایک دوسرے کے لئے سزا کا مطالبہ کرتے رہیں گے لیکن سب کے سب اسی عذاب میں مبتلا رہیں گے - (وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ (۷: ۴۰)) "اسی طرح ہم مجرموں کو سزا دیتے ہیں -" اور وہاں ان کی حالت یہ ہوگی -

(لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ (۷: ۴۱)) "ان کے لئے تو جہنم کا بچھونا ہو گا اور جہنم ہی کا اوڑھنا -" یعنی ان کے لئے فرش بھی جہنم کی آگ کا ہو گا اور مہاد کا اطلاق اس پر بطور مذاق کیا گیا ہے - بچھونا ایسا ہو گا جس میں نہ نرمی ہوگی اور نہ ہی وہ فرحت بخش ہو گا اور آگ ہی کا اوڑھنا ہو گا - یعنی ہر طرف سے آگ میں گھرے ہوں گے -

(وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِينَ (۷: ۴۱)) "یہ ہے وہ جزا جو ہم ظالموں کو دیا کرتے ہیں -" ظالم ہی مجرم ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو مشرک ہیں اور آیات الہی کی تکذیب کرتے ہیں - قرآن کی تعبیر کی رو سے یہ اوصاف مترادف ہیں - اب اس منظر کے بالمقابل دوسرا منظر دیکھئے -

---

وَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۖ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۭ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

"بخلاف اس کے جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا ہے اور اچھے کام کئے ہیں ----- اور اس باب میں ہم ہر ایک کو اس کی استطاعت ہی کے مطابق ذمہ دار ٹھہراتے ہیں ---- وہ اہل جنت ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے - ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ کدورت ہوگی اسے ہم نکال دیں گے - ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ کہیں گے کہ "تعریف خدا ہی کے لئے ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا' ہم خود راہ نہ پا سکتے تھے اگر خدا ہماری رہنمائی نہ کرتا' ہمارے رب کے بھیجے ہوئے رسول واقعی حق ہی لے کر آئے تھے -" اس وقت ندا آئے گی کہ "یہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو تمہیں ان اعمال کے بدلے میں ملی ہے جو تم کرتے رہے تھے -"

یہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنی استطاعت کے مطابق عمل کیا (کیونکہ اللہ کی جانب سے صرف وہی فرائض عائد کئے جاتے ہیں جن پر عمل ممکن ہوتا ہے) تو یہ لوگ ان باغوں کی طرف لوٹیں گے جو ان کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے فضل و کرم کی وجہ سے ان جنتوں کے مالک ہوں گے اور اس نے ان لوگوں کو ان جنتوں کا وارث و مالک بنا دیا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ انہوں نے ایمان کے بعد عمل صالح کو اپنایا اور یہ باغات اس بات کا صلہ ہیں کہ انہوں نے رسولوں کا اتباع کیا اور شیطان کے مخالف چلے۔ انہوں نے اللہ رحیم و کریم کے احکام مانے اور شیطان رجیم کی معصیت کی لیکن یہ سب کچھ اللہ کی رحمت سے ممکن ہوا۔ اگر اللہ کی رحمت نہ ہوتی تو ان کے لئے یہ سب کچھ ممکن نہ تھا۔ اور اس مضمون کو حضور نے ایک حدیث میں یوں بیان کیا ہے کہ "تم میں سے کوئی ایک بھی صرف اپنے عمل کی وجہ سے جنت کو نہ جائے گا۔" کہا کہ حضور ؐ آپ بھی نہ جائیں گے؟ "نہیں 'میں بھی نہیں الا یہ کہ مجھے اللہ کی رحمت اور فضل ڈھانپ لے۔"...... یاد رہے کہ اس آیت اور حضور ؐ کے قول مبارک کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اس لئے کہ حضور ؐ کے اقوال بھی وحی پر مبنی ہوتے ہیں اور اسلامی فرقوں نے اس موضوع پر جو اختلافی مباحث کیے ہیں وہ غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ یہ اختلافات محض ذاتی خواہشات پر مبنی تھے۔ اللہ کے علم میں تھا کہ انسان ضعیف 'کمزور اور عاجز مخلوق ہے۔ وہ صرف اپنے اعمال کے بل بوتے پر جنت کے استحقاق کے مقام تک نہیں پہنچ سکتی اور نہ وہ دنیا میں کسی ایک نعمت کے استحقاق پر جنت میں داخل ہو سکتی ہے 'اس لئے اللہ نے اپنے اوپر یہ فرض کر لیا کہ وہ رحیم و کریم ہو گا اور انسانوں کی جانب سے تھوڑے بہت اچھے اعمال بھی قبول کر لے گا۔ اور ان تھوڑے بہت اعمال ہی کی بناء پر ان کے نام جنت لکھ دے گا مگر یہ محض اس کا فضل و کرم ہو گا۔ پس وہ اپنے عمل ہی کی وجہ سے جنت کے مستحق قرار پائیں گے لیکن ان تھوڑے اعمال پر استحقاق کی عطاء محض رحمت الٰہی کی وجہ سے ہو گی۔

ایک طرف یہ مفتری 'جھوٹے 'مجرم 'ظالم 'کافر اور مشرک اہل جہنم ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے 'باہم جھگڑیں گے 'ان کے دل کینہ پروری اور دشمنی سے جوش ماریں گے 'حالانکہ دنیا میں وہ ہم نشین اور دوست تھے۔ دوسری جانب وہ لوگ جو ایمان لائے تھے 'نیک عمل والے تھے وہ جنت میں بھائی بھائی 'محبت کرنے والے دوست 'اولیائے باصفا اور ہم نشینان دلسوز ہوں گے اور ان پر محبت و سلامتی کا سایہ ہو گا۔

(وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِھِمْ مِّنْ غِلٍّ (۷ : ۴۳)) "ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ کدورت ہو گی اسے ہم نکال دیں گے۔" بہرحال ایمان والے انسان ہی تو تھے 'انسانوں کی حیثیت سے انہوں نے زندگی بسر کی۔ بارہا ایسا ہوا کہ وہ ایک دوسرے پر دنیا میں خفا ہوئے مگر انہوں نے اس خفگی کو چھپایا اور ان کے دل میں ایک دوسرے کے خلاف کدورت پیدا ہوئی مگر انہوں نے اس کدورت پر غلبہ پایا۔ البتہ کچھ اثرات آخر تک ان کے دلوں میں موجود رہے۔

قرطبی اپنی تفسیر احکام القرآن میں کہتے ہیں: "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غل (کدورت) جنت کے دروازوں کے باہر پڑی ہو گی جس طرح اونٹوں کی مینگنیاں۔ اللہ نے مومنین کے دلوں سے اس کو نکال پھینکا ہو گا۔" اور حضرت علی ؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا: "میں امید کرتا ہوں کہ میں 'عثمان' طلحہ اور زبیر ان لوگوں میں سے ہوں

گے جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا (وَنَزَعْنَا) "ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو کدورت ہوگی اسے ہم نکال دیں گے ۔"

اہل جہنم جب ہر طرف سے آگ میں گھرے ہوئے ہوں گے تو دوسری جانب اہل جنت جن باغات میں ہوں گے ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور ان کی وجہ سے پوری فضا پر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جاری ہوگی ۔

(تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ (۷:۴۳)) ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ۔" ایک طرف اہل جہنم ایک دوسرے کو کوس رہے ہوں گے اور دست وگریباں ہوں گے اور دوسری جانب اہل جنت اللہ کی تعریف اور اس کے احسانات کا اعتراف کر رہے ہوں گے ۔

(وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِىَ لَوْلَا اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ (۷:۴۳)) "اور وہ کہیں گے کہ "تعریف خدا ہی کے لئے ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا' ہم خود راہ نہ پا سکتے تھے ' اگر خدا ہماری راہنمائی نہ کرتا' ہمارے رب کے بھیجے ہوئے رسول واقعی حق ہی لے کر آئے تھے ۔"

ایک طرف اہل جہنم کو بطور تحقیر و طنز اور برائے شرمساری یہ کہا جائے گا ۔

(قَالَ ادْخُلُوْا فِىْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِى النَّارِ (۷:۳۸)) "تم بھی اسی جہنم میں چلے جاؤ جس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے گروہ جن و انس جا چکے ہیں ۔" دوسری جانب اہل جنت کو اہلاً وسہلاً کہا جا رہا ہوگا ۔

(وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۷:۴۳)) "اس وقت ندا آئے گی کہ "یہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو تمہیں ان اعمال کے بدلے میں ملی ہے جو تم کرتے رہے تھے ۔"

اسی طرح اہل جنت اور اہل جہنم کے درمیان مکمل تقابل ان آیات میں دے دیا گیا ہے ۔ غرض یہ مناظر مزید آگے بڑھتے ہیں ۔ اب ہمارے سامنے ایک نیا منظر ہے ۔ اہل جنت جنت میں اتر چکے ہیں اور مطمئن ہیں اور اہل جہنم کو بھی یقین ہو چکا ہے کہ اب یہی ان کا دائمی انجام ہے ۔ چنانچہ اہل جنت اب ان پر یہ آوازہ کستے ہیں اور وہ بھی بے بسی میں یہ جواب دیتے ہیں :

---

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۗ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ

اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۴﴾ الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾

”پھر یہ جنت کے لوگ دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے ”ہم نے ان سارے وعدوں کو ٹھیک پایا جو ہمارے رب نے ہم سے کئے تھے ‘کیا تم نے بھی ان وعدوں کو ٹھیک پایا جو تمہارے رب نے کئے تھے؟“ وہ جواب دیں گے ”ہاں۔“ تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکارے گا کہ ”خدا کی لعنت ان ظالموں پر جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکتے رہے اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے تھے اور آخرت کے منکر تھے۔“

یہ آواز کس قدر توہین آمیز اور کس قدر تلخ ہے؟ اہل زبان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اہل ایمان کو تو اچھی طرح یقین ہے کہ اللہ کا وعدہ بھی سچا ہے اور اس کی وعید بھی اٹل ہے لیکن وہ پھر بھی اہل جہنم سے سوال کرتے ہیں اور جواب میں وہ صرف لفظ ”ہاں“ منہ سے نکال سکتے ہیں۔ صرف ایک ہاں پر جواب ختم اور بات کٹ جاتی ہے اور آواز آتی ہے :

(فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌ بَیْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ (۴۴) الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ (۴۵) (۷ : ۴۴ - ۴۵)) ”تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکارے گا کہ ”خدا کی لعنت ان ظالموں پر جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکتے رہے اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے تھے اور آخرت کے منکر تھے۔“ اس آیت سے معلوم ہو جاتا ہے ظالمون کا مفہوم کافرون کے مترادف ہے۔ کیونکہ یہی لوگ ہیں جو لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کو سیدھی راہ سے ہٹا کر ٹیڑھی راہ پر ڈال دیں اور یہی لوگ منکر قیامت ہیں۔

یہ صفت کہ وہ اللہ کے راستے کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں بتاتی ہے کہ جو لوگ عوام کو اللہ کے راستے سے روکنا چاہتے ہیں ان کا منصوبہ کیا ہے ‘ ان کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ وہ ٹیڑھا راستہ تجویز کرتے ہیں ‘ لوگوں کو سیدھے راستے پر نہیں ڈالتے۔ وہ ٹیڑھ چاہتے ہیں اور ”سیدھ“ سے بھاگتے ہیں۔ استقامت کی صورت ایک ہی ہے۔ وہ یہ کہ انسان اللہ کے منہاج اور شریعت کو اپنا لے۔ اس کے سوا تمام راستے ٹیڑھے ہیں اور جو کوئی دوسری راہ کا ارادہ کرے گا وہ آخر کار دار کفر میں پہنچ جائے گا۔ کفر یہ ہے کہ انسان آخرت کی جواب دہی کا منکر ہو جائے اس لئے کہ اگر کسی کو آخرت میں ملاقات رب کا یقین ہو تو وہ ہرگز کسی کو اللہ کی راہ سے نہیں روکتا اور نہ وہ خود اللہ کے منہاج اور شریعت سے ایک طرف جاتا ہے۔ غرض اللہ کی راہ سے روکنے والوں کی تصویر کشی اس آیت میں نہایت ہی صحیح اور جامع و مانع کی گئی ہے اور ہر دور میں دشمنان دین کی نفسیات یہی ہوتی ہیں۔

---ooo---

اب منظر پر ایک نیا خطہ آتا ہے ‘ یہ جنت و جہنم کے درمیان حد فاصل ہے۔ اس حد فاصل کے اوپر بھی کچھ مخلوق خدا بیٹھی ہے ‘ یہ لوگ اہل جنت کو بھی ان کی علامات سے پہچانتے ہیں اور اہل جہنم کو بھی ان کی علامات سے پہچان لیتے ہیں۔

دیکھیے! یہ اہل جنت اور اہل جہنم کے بارے میں کیا تاثرات پیش کرتے ہیں۔

---

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ
كُلًّا بِسِيمَاهُمْ ۚ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۚ لَمْ
يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ﴿٤٦﴾ وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ
۸ ع ۵ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٤٧﴾ وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ
۱۲ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ قَالُوا مَا أَغْنَىٰ عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ
تَسْتَكْبِرُونَ ﴿٤٨﴾ أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللَّهُ بِرَحْمَةٍ ۚ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ
لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ﴿٤٩﴾

"ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک اوٹ حائل ہو گی جس کی بلندیوں (اعراف) پر کچھ اور لوگ ہوں گے۔ یہ ہر ایک کو اس کے قیافہ سے پہچانیں گے اور جنت والوں سے پکار کر کہیں گے کہ "سلامتی ہو تم پر"۔ یہ لوگ جنت میں داخل تو نہیں ہوئے مگر اس کے امیدوار ہوں گے اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف پھریں گی تو کہیں گے "اے رب، ہمیں ان ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجیو۔" پھر یہ اعراف کے لوگ دوزخ کی چند بڑی بڑی شخصیتوں کو ان کی علامتوں سے پہچان کر پکاریں گے کہ "دیکھ لیا تم نے 'آج نہ تمہارے جتھے تمہارے کسی کام آئے اور نہ وہ ساز و سامان جن کو تم بڑی چیز سمجھتے تھے۔ اور کیا یہ اہل جنت وہی لوگ نہیں ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ان کو تو خدا اپنی رحمت میں سے کچھ نہ دے گا؟ آج انہی سے کہا گیا کہ داخل ہو جاؤ جنت میں 'تمہارے لئے نہ خوف ہے نہ رنج۔"

روایات میں آتا ہے کہ اعراف پر جو لوگ کھڑے ہوں گے۔ یہ انسانوں ہی کا ایک گروہ ہو گا' یاد رہے کہ اعراف جنت اور دوزخ کے درمیان حائل جگہ ہو گی' یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور برائیاں وزن میں برابر ہوں گی۔ نہ نیکی انہیں جنت میں اہل جنت کے ساتھ لے جا سکے گی اور نہ برائی انہیں اہل جہنم کے ساتھ جہنم میں لے جا سکے گی۔ یہ لوگ بین بین ہوں گے اور اللہ کے فضل اور رحمت کے انتظار میں ہوں گے۔ یہ لوگ اہل جنت کو ان کی علامات کی وجہ سے پہچان سکیں گے 'کیونکہ اہل جنت کے چہرے ہشاش بشاش اور سفید ہوں گے' ان کے آگے ایک نور جاری و ساری ہو گا اور ان کا ایمان محسوس ہو گا۔ یہ لوگ اہل جہنم کو بھی ان کی علامات سے پہچان سکیں گے کیونکہ ان کے چہرے سیاہ ہوں

گے اور ہوائیاں اڑ رہی ہوں گی یا وہ ان لوگوں کو اس داغ کی وجہ سے پہچان لیں گے جو ان کی ناک پر لگایا جائے گا۔جس طرح سورہ قلم میں ہے۔ (سَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرْطُومِ (۶۸: ۱۶)) "ہم عنقریب ان کی ناک پر داغ لگائیں گے۔" تو یہ اہل اعراف اہل جنت کو سلام کریں گے۔"اور سلام اس انداز کا ہو گا کہ وہ امید کریں گے کہ جلد ہی وہ بھی داخلہ جنت کے مستحق قرار پائیں گے اور جب وہ اہل جہنم کو دیکھیں گے تو ان کی یہ نظر اچٹتی ہو گی' بالارادہ وہ ان پر نگاہ ڈالنا پسند نہ کریں گے۔وہ انہیں دیکھتے ہی اللہ کی پناہ مانگنے لگیں کہ بارالہا! ہمیں ان کا ساتھی نہ بنا۔

(وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ (٤٦) وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ

(٤٧)(٧: ٤٦ - ٤٧)) "ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک اوٹ حائل ہو گی جس کی بلندیوں (اعراف) پر کچھ اور لوگ ہوں گے۔یہ ہر ایک کو اس کے قیافہ سے پہچانیں گے اور جنت والوں سے پکار کر کہیں گے کہ "سلامتی ہو تم پر" یہ لوگ جنت میں داخل تو نہیں ہوئے مگر اس کے امیدوار ہوں گے اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف پھریں گی تو کہیں گے "اے رب' ہمیں ان ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجیو۔"

اس کے بعد اصحاب اعراف بڑے بڑے مجرموں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔یہ لوگ معروف قسم کے لوگ تھے اور ان پر بھی علامات جہنم عیاں تھیں۔ان پر وہ یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ دنیا میں تمہاری جو جمعیت اور شوکت تھی اب وہ کہاں گئی؟ ان کو یوں شرمندہ کرتے ہیں۔

(وَنَادَى أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ قَالُوا مَا أَغْنَى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ (٧: ٤٨)) "پھر یہ اعراف کے لوگ دوزخ کی چند بڑی بڑی شخصیتوں کو ان کی علامتوں سے پہچان کر پکاریں گے کہ "دیکھ لیا تم نے' آج نہ تمہارے جتھے تمہارے کسی کام آئے اور نہ وہ سازوسامان جن کو تم بڑی چیز سمجھتے تھے۔"

اب ذرا اپنی حالت کو دیکھو کہ کہاں پڑے ہو' تمہاری جمعیت نے تمہیں کیا فائدہ دیا اور تمہارے استکبار نے تمہیں کیا تحفظ دیا؟ اب یہ لوگ ان اکابر مجرمین کو یاد دلاتے ہیں کہ تم تو اہل ایمان کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ یہ گمراہ ہو گئے ہیں اور یہ کہ یہ لوگ اللہ کی رحمت سے محروم ہیں۔

(أَهَؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللَّهُ بِرَحْمَةٍ (٧: ٤٩)) "اور کیا یہ اہل جنت وہی لوگ نہیں ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ان کو تو خدا اپنی رحمت میں سے کچھ نہ دے گا۔اب دیکھو کہ تم کہاں کھڑے ہو اور یہ بھی دیکھو کہ ان کے بارے میں اللہ کے احکام کیا ہیں؟ یہ ہیں :

(اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ (۷:۴۹)) "آج انہی سے کہا گیا کہ داخل ہو جاؤ جنت میں، تمہارے لئے نہ خوف ہے نہ رنج۔"

---○○○---

ہاں، ایک آواز اہل جہنم کی طرف سے بھی سنائی دیتی ہے۔ یہ پر امید بھی ہے اور رحم طلب بھی۔ دوسری جانب سے اس کا جو جواب دیا جاتا ہے وہ نہایت ہی تلخ، دردناک اور عبرت آموز ہے۔ ذرا غور کیجئے۔

وَنَادَىٰ أَصْحَابُ النَّارِ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ أَفِيضُوا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاءِ
أَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ ۚ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٥٠﴾ الَّذِينَ اتَّخَذُوا
دِينَهُمْ لَهْوًا وَلَعِبًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۚ

"اور دوزخ کے لوگ جنت والوں کو پکاریں گے کہ کچھ تھوڑا سا پانی ہم پر ڈال دو یا جو رزق اللہ نے تمہیں دیا ہے اسی میں سے کچھ پھینک دو۔ وہ جواب دیں گے کہ "اللہ نے یہ دونوں چیزیں ان منکرین حق پر حرام کر دی ہیں جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تفریح بنا لیا تھا اور جنہیں دنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا۔

اب انسانوں کا باہم مکالمہ ختم ہو جاتا ہے اور اللہ رب العزت اور صاحب اقتدار اور صاحب ملک کی بات سنی جاتی ہے۔

---

فَالْيَوْمَ نَنْسَاهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هَٰذَا ۙ وَمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ﴿٥١﴾
وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٥٢﴾
هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ ۚ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِنْ
قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَنَا مِنْ شُفَعَاءَ فَيَشْفَعُوا لَنَا أَوْ
نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۚ قَدْ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا ٦
كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٥٣﴾ ع ١١
١٣

اللہ فرماتا ہے کہ "آج ہم بھی انہیں اسی طرح بھلا دیں گے جس طرح وہ اس دن کی ملاقات کو بھولے رہے اور

ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔"

ہم ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس کو ہم نے علم کی بناء پر مفصل بنایا ہے اور جو ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔اب کیا یہ لوگ اس کے سوا کسی اور بات کے منتظر ہیں کہ وہ انجام سامنے آجائے جس کی یہ کتاب خبر دے رہی ہے؟جس روز وہ انجام سامنے آگیا تو وہی لوگ جنہوں نے پہلے اسے نظرانداز کر دیا تھا کہیں گے کہ "واقعی ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے' پھر کیا اب ہمیں کچھ سفارشی ملیں گے جو ہمارے حق میں سفارش کریں؟ یا ہمیں دوبارہ واپس ہی بھیج دیا جائے تاکہ جو کچھ ہم پہلے کرتے تھے اس کے بجائے اب دوسرے طریقے پر کام کر کے دکھائیں۔" ............ انہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا اور وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے تصنیف کر رکھے تھے آج ان سے گم ہو گئے۔

اس طرح اس طویل منظر کی جھلکیاں سامنے آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ ابھی آخرت کی جھلکی ہے اور ساتھ ہی دنیا کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے۔ایک لمحہ ہم ان لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں جو آگ میں جل رہے ہیں' جن کا خیال تھا کہ وہ اللہ کے حضور پیش نہ ہوں گے اور جنہوں نے آیات الٰہی کا انکار کر دیا تھا حالانکہ ان کے پاس کتاب مفصل آچکی تھی جو بالکل واضح تھی اور اس کی تفصیلات اللہ کے علم پر مبنی تھیں۔انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا اور اپنی پسند کے اوہام اور شکوک کو اختیار کر لیا۔ دوسرے ہی لمحہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہی لوگ دنیا میں اس کتاب کے انجام کا انتظار کر رہے ہیں اور اس میں جو ڈراوے درج ہیں ان کے ظہور کے منتظر ہیں۔انہیں اس انجام بد سے ڈرایا جاتا ہے مگر اس منظر میں وہ واقع ہو چکا ہے۔

یہ عجیب مناظر ہیں جو اس کتاب کے صفحات میں پیش کئے گئے اور انہیں اس انداز میں یہی کتاب معجز بیان پیش کر سکتی تھی۔اس طرح یہ طویل منظر کشی یہاں ختم ہو جاتی ہے اور اس پر اللہ کی جانب سے یہ آخری تبصرہ آتا ہے 'جس میں لوگوں کو ان مناظر قیامت کی روشن یاد دہانی کرائی جاتی ہے اور لوگوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ اللہ کے رسول اور اللہ کی آیات کی تکذیب کا انجام کیا ہو گا؟

کہا جاتا ہے کہ لوگ اس کتاب میں دیئے گئے انجام کے بارے میں انتظار کرتے ہیں تو یہ ہے اس کا انجام۔ اور اس انجام کے دن توبہ کی کوئی گنجائش نہ ہو گی۔مشکلات میں کوئی سفارش نہ چلے گی اور یہ بھی ممکن نہ ہو گا کہ آزمائش کے لئے دوبارہ چانس دیا جائے۔

یوں یہ منظر ختم ہوتا ہے اور انسان اس منظر میں گم رہتا ہے۔ جب یہ منظر ختم ہوتا ہے تو دیکھنے والا یہ محسوس کرتا ہے گویا وہ قیامت کے میدان سے پھر لوٹ کر دنیا میں آگیا ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ پلک جھپکتے ہی ہم آخرت میں چلے گئے اور واپس آگئے۔

یہ پورے مناظر زندگی کے سفر پر مشتمل ہیں۔ زندگی کا طویل سفر' حشر و نشر اور حساب و کتاب اور جزاء و سزاء جبکہ اس سے قبل کے سبق میں انسانیت نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا جبکہ انسان کے جد امجد جنت میں تھے۔ان کی لغزش کی وجہ سے انسان جنت سے اترا تھا۔

یوں قرآن کریم انسان کو اور اس کے تصورات کو کہاں سے کہاں لے جاتا ہے' زمان و مکان کے دفتر لپیٹ دیئے

جاتے ہیں' فاصلے مٹ جاتے ہیں اور انسان کو ملکوت السماوات کی سیر کرائی جاتی ہے اور یہ سیر چند لمحات میں کرا دی جاتی ہے تاکہ وہ نصیحت پکڑے اور ڈرانے والوں کی باتوں کی طرف توجہ کرے اور سورہ اعراف کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے کیا خوب کہا۔

(كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۲) اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۳) (۷: ۲ - ۳)) "یہ کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے 'پس اے نبی تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو' اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے سے ڈراؤ اور ایمان لانے والے لوگوں کو نصیحت ہو۔"

---ooo---

# درس نمبر ۶۷ ایک نظر میں

پہلے دو اسباق میں ہم نے قصہ آغاز انسانیت ' جنت سے اس کے نزول اور پھر حشر و نشر کے میدان اور جنت و دوزخ کے مناظر کی سیر کی ۔ اب اگلے سبق میں ملکوت السموات والارض کی سیر ہے ۔ اس پھیلی ہوئی کائنات کے ضمیر کی سیر مطلوب ہے ۔ انسان کی تخلیق سے ذرا پیچھے جاکر اس پوری کائنات کی تخلیق کی روئیداد بھی سن لیجئے ۔ متوجہ کیا جاتا ہے کہ ذرا اس کائنات کے اسرار و رموز پر بھی غور کرو اور یہ سمجھو کہ اس کا قصہ تخلیق کیا ہے؟ ذرا اس کے مناظر و مظاہر پر بھی غور کرو ۔ گردش افلاک میں مناظر لیل و نہار کی دوڑ پر غور کرو ۔ سورج اور چاند کو دیکھو اور فضا کی وسعتوں میں سیاروں اور ستاروں کی بندش کو ملاحظہ کرو ۔ فضا میں ہواؤں کی گردش اور ان کے اثرات ' بادل اور بارش اور پھر مردہ زمین اور باران رحمت کے بعد اس کی تازگی اور روئیدگی ' ایک لمحہ مردہ اور ایک لمحہ فصلوں اور پھلوں سے بھرپور ۔

اللہ کی بادشاہت کی وادیوں سے قبل قصہ تخلیق انسانیت بیان ہو چکا ہے ۔ اس کے بعد انسانیت کے اس طویل سفر کا آغاز و انجام بیان ہو چکا ہے اور اس سے قبل یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ اتباع شیطان اور اللہ کی آیات اور احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے استکبار کا انجام کیا ہو گا ۔ نیز یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ جاہلی تصورات و رسومات کیا ہیں اور انسان کی جانب سے اپنے لئے شریعت سازی اللہ کی نظر میں کیا حیثیت رکھتی ہے ۔ ان موضوعات کے بعد انسان کو کائنات کی وسعتوں میں لے جایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے اس رب کی طرف لوٹ سکے جو ان وسعتوں کا خالق ہے اور پھر ان کو مسخر کرنے والا ہے ' جو اس وسیع و عریض کائنات کو اپنے نظام قضا و قدر سے چلاتا ہے ' اس کے لئے اس نے ایک ناموس تجویز کر رکھا ہے لہذا وہی ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا اور وہی ہے جو سیاسی اقتدار اعلیٰ کا مالک ہے ۔

ملکوت السموات کی اس سیر کے ذریعے یہ گہرا تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ پوری کائنات رب کائنات کی مطیع ہے ' لہذا اس ناقابل تصور طویل و عریض کائنات کے اندر اس چھوٹے سے انسان کی سرکشی اور استکبار فطرت کائنات سے نافرمانی ہے ۔ اس طرز عمل سے انسان ناموس فطرت اور ناموس شریعت سے بیک وقت سرکشی اختیار کرتا ہے لہذا انسان کو اس کائنات کے اندر رہتے ہوئے یہ رویہ اختیار نہ کرنا چاہئے ۔

(اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (٥٥) وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ

الْمُحْسِنِيْنَ (٥٦) (٧: ٥٥ - ٥٦)) "اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے' یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں کے قریب ہے۔"

دین کو اللہ کے لئے خالص کر دینا' اور تمام انسانوں کی جانب سے اللہ کی بندگی اختیار کرنا اس عظیم بندگی اور سرنگونی کا ایک معمولی سا جزء اور ایک چھوٹی سی شاخ ہے جو اس عظیم اور بیکراں کائنات کی طرف سے رب ذوالجلال کے حضور کی جا رہی ہے۔ یہ ہے وہ سوچ اور وہ تصور جسے پورا قرآن کریم انسان کے دل و دماغ اور اس کے نظریات و تصورات میں نہایت ہی عمدگی سے بٹھانا چاہتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو دل و دماغ بھی سوچ اور ادراک کے دروازے کھول کر اس پوری کائنات اور اس کے ان نوامیس کی طرف متوجہ ہو گا جو اس کائنات میں پوشیدہ ہیں یا بالکل ظاہر ہیں تو لابدی ہے کہ وہ نہایت ہی پختہ انداز میں اور نہایت ہی گہرائی کے ساتھ اس سے متاثر ہو گا اور دل کی گہرائیوں سے یہ شعور پائے گا کہ وہ ذات نہایت ہی عظیم ہے جس نے اس کائنات اور اس کے نوامیس کو بنایا ہے اور وہی بنانے والی ذات سیاسی اقتدار اعلیٰ کی بھی سزاوار ہے۔ یہ غور و فکر وہ پہلا قدم ہے جو انبیاء کی دعوت کی قبولیت کی طرف انسان کو لے جاتا ہے اور پھر انسان پوری طرح اللہ رب العالمین کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے جس طرح سے پوری کائنات سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے اور پھر انسان کائنات کا ہم قدم ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم حقیقت الوہیت کو سمجھانے کے لئے حقیقت کائنات کے ادراک کو پہلا زینہ قرار دیتا ہے اور اس طرح پوری انسانیت کو اللہ وحدہ کی غلامی کے لئے تیار کرتا ہے۔ اس طرح انسانی شعور اور انسانی شخصیت کو حقیقت عبودیت سے روشناس کراتا ہے۔ انسان بڑے اطمینان سے ذوق بندگی پاتا ہے اور وہ یقین کر لیتا ہے کہ وہ اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی یہ کائنات دونوں ہم قدم ہو کر بندگی رب کی راہ پر چل رہے ہیں۔

پوری کائنات کی جانب سے اللہ کی بندگی کے ثبوت کا مقصد قرآن کے پیش نظر محض عقلی استدلال ہی نہیں ہے کہ چونکہ کائنات اللہ کے ہاتھ میں مسخر ہے' وہ پوری طرح مطیع فرمان ہے' اور نہایت ہی فرمانبرداری سے' نہایت ہی گہرائی اور مکمل طور پر اللہ کے حکم اور امر کی پابند ہے لہٰذا انسان کو بھی ایسا ہونا چاہئے۔ صرف عقلی استدلال ہی پیش نظر نہیں بلکہ اس سے ایک دوسرا ذوق بھی انسان کے اندر پیدا کرنا مطلوب ہے۔ وہ یہ ذوق و احساس ہے کہ انسان اور یہ پوری کائنات اس بندگی اور غلامی میں باہم شریک و رفیق ہیں اور نہایت ہی اطمینان کے ساتھ انسان یہ بندگی کر سکتا ہے گویا اس طرح انسان اس قافلہ کائنات کا ایک فرد ہو گا جو مطیع رب ہو گا۔

گویا ہر انسان راضی برضا بندگی کر رہا ہے۔ کوئی امر اسے مجبور نہیں کر رہا ہے' وہ جبر کے تحت نہیں بلکہ محبت اور اطمینان کی وجہ سے بندگی کر رہا ہے۔ اس بندگی کی وجہ سے وہ اس پوری کائنات سے ہم آہنگ ہو رہا ہے۔ لہٰذا ایسا انسان بندگی سے فرار کی راہیں تلاش نہیں کرتا' نہ اس جبر سے اپنے آپ کو آزاد کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس تصور سے بندگی' اس کی فطرت قرار پاتی ہے اور اس کے لئے خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ یہ ایسی بندگی ہوتی ہے جس کی وجہ سے انسان تمام غیر اللہ کی بندگیوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور رب رفیع و ذوالجلال ہی کا بندہ بن جاتا ہے جو رب العالمین ہے۔

یہی بندگی ایمان کی تمثیل ہوتی ہے اور اسے پر ذائقہ بناتی ہے۔اسی بندگی سے اسلام کا مفہوم ظہور پذیر ہوتا ہے اور اسلام کے اندر روح اور زندگی اور تروتازگی پیدا ہوتی ہے۔یہ وہ اساس ہے جس پر اسلام کو قائم ہونا چاہئے اس اساس کو اچھی طرح پختہ کرنا چاہئے اور اس کے بعد کسی بندے کو احکام و شریعت دینا چاہئے۔اس کے بعد ہی قوانین و ضوابط کا اقرار ہونا چاہئے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کا منہاج اور اسلوب سب سے پہلے انسان کے اندر یہ شعور اور ذوق پیدا کرتا ہے۔اسے پختہ کرتا ہے اور یہ نہایت ہی متین اور پختہ منہاج ہے۔

---()()()---

# درس نمبر ۶۷ تشریح آیات

## ۵۴ --- تا --- ۵۸

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٥٤﴾

" درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا' پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے۔ جس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کئے سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار رہو! اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ ' سارے جہانوں کا مالک و پروردگار۔

اسلام کا نظریہ توحید ایسا عقیدہ ہے جو اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں ہر قسم کے انسانی تصورات کا قلع قمع کر دیتا ہے۔ اللہ کے افعال کی کیفیات کی بھی وہ نفی کرتا ہے' کیونکہ اللہ ایسا ہے جیسا کوئی بھی نہیں ہے۔ چنانچہ انسانی تصور اللہ کی کوئی تصویر نہیں کھینچ سکتا' کیونکہ انسانی تصور اور انسانی عقل وہی تصاویر اللہ پر چسپاں کرے گا جو وہ اپنے ماحول سے اخذ کرے گا اور اس میں ان اشکال کا دخل ہو گا جو انسان دیکھتا ہے اور اللہ کی ذات ایسی ہے جیسا کوئی اور ذات نہیں ہے لہذا انسانی تصور اللہ کی کوئی تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ اور جب ذات باری انسانی تصور کے دائرہ تصویر کشی سے باہر ہے تو اللہ کے افعال کی کیفیات بھی دائرہ عقل سے وراء ہیں۔ انسان صرف یہی کر سکتا ہے کہ ذات باری اور افعال باری کے آثار ہی ہمارے فہم و ادراک کا موضوع ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ ایسے سوالات کہ اللہ نے آسمان و زمین کو کس طرح پیدا کیا؟ اللہ پھر عرش پر کیسے متمکن ہوا؟ اور وہ عرش کیسا ہے جس پر باری تعالیٰ متمکن ہوا؟ یہ تمام سوالات لغو سوالات ہیں اور اسلامی تصورات و عقائد کے اصول کے خلاف ہیں۔ ایسے سوالات کے جواب دینا ان سوالات سے بھی لغو بات ہے اور کوئی شخص جو اسلامی تصورات و عقائد کے ان

اصولوں سے واقف ہے 'وہ کبھی ان سوالات کا جواب دینے کی سعی نہیں کرے گا۔ اسلامی فرقوں میں سے بعض لوگوں نے ان سوالات کے جوابات دینے کی سعی کی ہے' جو نہایت ہی افسوسناک مشغلہ تھا۔ اسلامی افکار کی تاریخ ایسے مباحث سے بھری پڑی ہے اور یہ مباحث اس وقت پیدا ہوئے جب اسلامی فکر کو یونان کی افکار کی بیماری لاحق ہوئی۔

رہے وہ چھ دن جن میں اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا تو یہ بھی ایک غیبی حقیقت ہے جس کا صحیح علم صرف اللہ کو ہے۔ اس وقت انسان موجود نہ تھا کہ وہ اس تخلیق اور زمانہ تخلیق کے بارے میں کچھ کہہ سکتا ہو۔ نہ اللہ کی دوسری مخلوق کے بارے میں انسان کچھ کہہ سکتا ہے۔ (مَا اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ) تم نے تخلیق سماوات اور زمین اور خود اپنے نفوس کی تخلیق کا مشاہدہ نہیں کیا۔" اس کے بعد ان موضوعات پر کوئی شخص جو بھی کہے گا وہ کسی یقینی اصول پر مبنی نہ ہو گا۔

یہ چھ مراحل بھی ہو سکتے ہیں' چھ طریقے بھی ہو سکتے ہیں۔ اور اللہ کے ایام میں سے چھ یوم بھی ہو سکتے ہیں۔ ایام الٰہی ان ایام جیسے نہیں ہوتے جو اجرام سماوی کی حرکات کے نتیجے میں ہم لوگ دیکھتے ہیں کیونکہ تخلیق کائنات سے قبل یہ اجرام فلکی تو موجود ہی نہ تھے جن سے ہم وقت کا تعین کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ یہ ایام اور کوئی چیز بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا کوئی انسان متعین طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ چھ ایام کے عدد سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں انسانوں نے جو کچھ کہا ہے وہ بہرحال انسانی مفروضے ہیں جو ظن وتخمین پر مبنی ہیں اور تعجب ہے کہ بعض لوگ ان اندازوں کو علم اور سائنس قرار دیتے ہیں جو کھلا تحکم ہے اور ذہنی و روحانی شکست پر مبنی ہے۔ یہ سائنس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے برابر ہے جو بذات خود غیر یقینی چیز ہے اور اکثر اوقات مفروضات پر مبنی ہوتی ہے۔

ہم اس آیت کو ان مفروضوں سے آلودہ نہیں کرتے 'کیونکہ ان مفروضوں کی وجہ سے اس کے مفہوم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ آیئے ہم اس وسیع وعریض کائنات کی سیر شروع کرتے ہیں۔ آیت پر دوبارہ نگاہ ڈالیں۔

(اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۷:۵٤)) "درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا' پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے۔ جس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کئے 'سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار رہو! اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ 'سارے جہانوں کا مالک و پروردگار۔

یہ عظیم کائنات جو ہمیں نظر آتی ہے اور جو نہایت ہی وسیع ہے' یہ اللہ کی پیدا کردہ ہے اور اللہ اس پر حاوی اور سربلند ہے۔ وہ اپنی قدرت اور تدبیر کے ساتھ اسے چلاتا ہے' جو رات کو دن پر ڈھانپ دیتا ہے اور پھر رات کو دن کے پیچھے دوڑاتا ہے۔ یہ سلسلہ مسلسل دوران کی شکل میں چلتا ہی رہتا ہے لیل و نہار آگے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ جس نے سورج' چاند اور ستاروں کو اپنے قبضے میں رکھا ہوا ہے۔ وہ نگہبان' متصرف اور مدبر ہے' وہی تمہارا رب ہے۔ وہی اس بات کا

مستحق ہے کہ وہ رب ہو' وہ اپنے طبیعی نظام کے ذریعے تمہاری تربیت کرتا ہے' تم اس کے نظام کے مطابق اٹھتے ہو' وہ اپنے حکم سے تمہارے لئے قانون بناتا ہے' وہ اپنے قانون کے مطابق تمہارے درمیان فیصلے کرتا ہے' وہی خالق ہے اور وہی حاکم ہے۔جس طرح اس کے ساتھ خلق میں کوئی شریک نہیں اسی طرح اس کے ساتھ سیاسی حاکمیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔یہی وہ اصل مسئلہ ہے جو اس سبق کی روح ہے۔الوہیت' ربوبیت' سیاسی حاکمیت' اور اقتدار اعلیٰ میں اللہ کو وحدہ لاشریک سمجھنا وغیرہ۔اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی میں اللہ کی شریعت کا پابند ہو اور اس پوری سورۃ کا اصلی موضوع یہی ہے' کبھی تو اسے لباس اور خوراک کے مسائل کے ضمن میں لیا جاتا ہے اور کبھی دوسری شکل میں' جس طرح سورہ انعام میں مویشیوں اور فصلوں اور نذر و نیاز کے موضوع کے ضمن میں اسے بیان کیا گیا۔

قرآن کریم کے پیش نظر جو ہدف ہے اسے سمجھتے ہوئے ہمیں اس بات کو بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا چاہئے کہ ان مناظر کی خوبصورتی کا معیار کس قدر اونچا ہے۔یہ مناظر زندگی اور حرکت سے کس قدر بھرپور ہیں اور ان کے اندر کس قدر اشاریت اور راہنمائی پائی جاتی ہے۔اس عظیم ہدف کے حصول کے لئے قرآن کریم نے کس قدر اچھا اسلوب اختیار کیا ہے۔

گردش لیل و نہار کے ساتھ ساتھ گردش افکار و تصورات اور اس کائنات میں فکر کی جولانی' دن کے پیچھے رات کا تعاقب اور اس کے پکڑنے میں اس کی ناکامی ایک ایسی تگ و دو ہے کہ انسانی وجدان اس پر سے غفلت اور لاپرواہی کے ساتھ نہیں گزر سکتا' اس گردش پیہم سے انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔بلکہ انسان ہر وقت انتظار اور امید میں رہتا ہے۔

اس کائنات میں گردش اور زندگی قدرتی طور پر حسین لگتی ہے' پھر گردش لیل و نہار کو ایک زندہ اور صاحب ارادہ ذات انسان کے ملاحظہ کے لئے پیش کرنا' ایک نہایت ہی خوبصورت طرز تعبیر ہے۔کوئی انسانی طرز تعبیرات اس حسن کے ساتھ پیش نہیں کر سکتا یہ قرآن کا مطلق اعجاز ہے۔

جب انسان کسی منظر کا عادی ہو جاتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے حسن اور خوبصورتی کے اثرات ختم ہو جاتے ہیں۔انسان ان مناظر سے یونہی ایک بلید الطبع شخص کی طرح متاثر ہوئے بغیر ہی گزر جاتا ہے۔قرآن کریم عادی مناظر و مشاہد کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ وہ عادی اور روٹین کے مناظر نہیں رہتے' وہ انہیں ایسے نئے انداز میں پیش کرتا ہے اور اس انداز تعبیر کے اثرات اس طرح مرتب ہوتے ہیں کہ گویا یہ منظر انسان نے بالکل پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔زیر نظر گردش لیل و نہار کے مناظر کو دیکھئے' یہ عام' عادی اور پیش پاافتادہ مناظر نہیں ہیں بلکہ لیل و نہار زندہ انسانوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے نظر آتے ہیں اور ارادہ اور روح کے حامل حقائق و اشخاص نظر آتے ہیں۔اپنی اس حرکت اور دوڑ میں لیل و نہار انسان کے ساتھ شریک اور مانوس ہیں اور ان کی حرکت کو ایسی حرکت سے تعبیر کیا گیا ہے جس میں لوگ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہیں۔

اسی طرح سورج' چاند اور ستارے بھی اس منظر میں اس طرح پیش ہوئے ہیں گویا زندہ ارواح ہیں اور اللہ کے احکام ان پر آتے ہیں وہ ان احکام کے مطابق حرکت کرتے ہیں اور پوری اطاعت اور وفاکیشی کے ساتھ حرکت پذیر ہیں۔وہ اس طرح ڈسپلن میں ہیں کہ احکام لیتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں' جہاں ان کو حکم دیا جاتا ہے وہاں جاتے ہیں' جس طرح زندہ باوردی فوجیوں کو احکام ملتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس انداز تعبیر سے انسان جھوم اٹھتا ہے' فوراً احکام الٰہی کی تعمیل کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے اور انسان اپنے

آپ کو قافلہ وفا کیشاں کائنات کا فرد سمجھتا ہے اور انسان پر قرآن کی گرفت اس طرح نظر آتی ہے جس طرح کوئی کسی بادشاہ کی قید میں ہوتا ہے۔ یاد رکھئے کہ قرآن انسانی فطرت سے مخاطب ہوتا ہے۔ یہ فطرت اس خالق نے پیدا کی ہے' جو قرآن کی شکل میں انسان سے ہمکلام ہے اور اللہ انسان کی فطرت کے اسرار و رموز سے خوب واقف ہے۔

---OOO---

جب بات اس مقام تک پہنچی ہے' جب انسانوں کے اندر شعور و وجدان پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ اس کائنات کے زندۂ جاوید مناظر کے ہمرکاب ہو جاتے ہیں۔ اس سے قبل وہ ایک غافل اور بلید الطبع انسان کی طرح ان حسین مناظر سے متاثر ہوئے بغیر گزر جاتے تھے۔ اور جب انسان کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ مناظر اللہ کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ اس کے مطیع فرمان ہیں اور اپنے خالق کے احکام و نوامیس سے ذرہ برابر سرتابی نہیں کرتے تو اس مقام پر قرآن انسان کو اپنے رب کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ اپنے رب کو نہایت ہی خضوع و خشوع کے ساتھ پکارو' چونکہ وہ تمہارا رب ہے' لہٰذا اس کے ساتھ جڑ جاؤ اور اللہ کی حدود و قیود کی پابندی کرو۔ اللہ کے سیاسی اقتدار اعلیٰ پر دست درازی نہ کرو۔ اور اس زمین اپنی پر اللہ کی شریعت کو چھوڑ کر اپنی ہوائے نفس کی پیروی نہ کرو خصوصاً جبکہ اللہ نے اپنے نظام کے ذریعے انسانی مصالح کا انتظام فرما دیا ہے۔

ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿٥٥﴾ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۚ إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾

"اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے' یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ' یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔"

یہ ہدایات ایسے وقت میں دی جا رہی ہیں جبکہ مطالعہ کرنے والا نفسیاتی طور پر ان کو قبول کرنے کے لئے پوری طرح آمادہ ہو جاتا ہے۔ وہ دعاء اور رجوع الی اللہ کی حالت میں ہوتا ہے اور اس عظیم کارخانہ قدرت کے مطالعہ کے بعد اللہ کے سامنے عاجزی اور فروتنی کی حالت میں ہوتا ہے۔ خفیہ سے مراد یہ ہے کہ چیخ و پکار نہ کرو' دھیمی آواز سے پکارو کیونکہ اللہ کی جلالت شان کے لائق یہ ہے کہ انسان اسے نہایت ہی نرم اور دھیمی آواز میں پکارے اور اس انداز میں جس سے معلوم ہو کہ اللہ قریب ہے اور سن رہا ہے۔

مسلم کی روایت ہے۔ حضرت ابوموسیٰ روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ ایک روایت میں آتا ہے ایک غزوہ میں تھے' لوگوں نے زور زور سے اللہ اکبر کہنا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' لوگو ذرا نرمی کے ساتھ اور اپنے دل میں پکارو' تم کسی بہرے کو نہیں پکار رہے اور نہ کسی ایسے

شخص کو پکار رہے ہو جو غائب ہے 'تم تو سننے والی قریب ذات کو پکار رہے ہو جو تمہارے ساتھ ہے۔

یہاں قرآن کریم کا یہ اسلوب لوگوں کے اندر یہ احساس پیدا کر رہا ہے کہ اللہ کی ذات جلیل القدر ہے اور قریب ہے اور دعا اور پکارنے کے وقت قرآن کریم عمداً ایسی ہیئت اور شکل پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ پکارنے والا ذات باری کی برتری کی وجہ سے چیخنے اور چلانے سے حیا کرتا ہے۔ جن لوگوں کے دل میں اللہ کی جلالت قدر بیٹھی ہوئی ہے وہ اللہ کی جناب میں شور و شغب سے دور رہتے ہیں۔

غرض اس عاجزانہ دعا اور انکساری اور خشوع و خضوع کی فضا میں ' اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس بات کی ممانعت کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے لئے اس حاکمیت کا دعویٰ کریں جو وہ ایام جاہلیت میں کیا کرتے تھے کیونکہ حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کا حق صرف اللہ کو ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ممانعت بھی آ جاتی ہے کہ فساد فی الارض سے باز رہو' جبکہ اسلامی شریعت کے نظام کے ذریعے اللہ نے اس کی اصلاح کر دی ہے۔ جو شخص عاجزی' تضرع اور نہایت ہی خفیہ طریقے سے اللہ کو پکارتا ہے جو قریب بھی ہے اور سننے والا بھی ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا شخص زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہیں پھیلاتا کیونکہ ان دونوں تاثرات کے درمیان ایک گہرا داخلی اور نفسیاتی ربط ہے۔ قرآن کا منہاج اصلاح یہ ہے کہ وہ دلوں کی گہری سوچوں اور نفسیاتی میلانات کو لے کر چلتا ہے اور یہ منہاج وہی ذات اختیار کر سکتی ہے جو لطیف و خبیر ہے۔

(اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (٥٥) وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ

(٥٦) (٧: ٥٥ - ٥٦)) "اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے' یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں کے قریب ہے۔"

خوف اس لئے کہ تم اس کے غضب سے بچ جاؤ اور طمع اس لئے کرو کہ وہ تم سے راضی ہو گا اور اجر دے گا۔ جو لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اس طرح کرتے ہیں کہ گویا اللہ کو دیکھ رہے ہیں اور اگر وہ اسے دیکھ نہیں رہے تو ان کی حالت ایسی ہو کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ انہیں دیکھ رہا ہے۔ جیسا کہ حدیث کے مضمون میں آتا ہے تو یہ ہے احسان۔ حضور کی تعریف کے مطابق۔

---ooo---

ایک بار پھر قرآن کریم اس کھلی کائنات کا ایک دوسرا ورق انسان کے مطالعے کیلئے الٹتا ہے۔ یہ ورق تو ہمارے سامنے ہروقت کھلا رہتا ہے لیکن ہم غفلت میں اس کے پاس سے گزر جاتے ہیں۔ ہم اس سے کوئی تاثر نہیں لیتے' ہم اس کی پکار کو نہیں سنتے۔ یہ وہ صفحہ ہے کہ آیت سابقہ میں رحمت الٰہیہ کے ضمن میں اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ یہاں رحمت الٰہیہ کے ایک نمونے کے طور پر اسی صفحے کو کھولا جا رہا ہے۔ آسمانوں سے پانی گر رہا ہے' زمین سے مختلف قسم کی فصلیں اگ رہی ہیں اور زمین مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھتی ہے یعنی سرسبز ہو جاتی ہے۔

وَهُوَ الَّذِیۡ یُرۡسِلُ الرِّیٰحَ بُشۡرًۢا بَیۡنَ یَدَیۡ رَحۡمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتۡ سَحَابًا ثِقَالًا سُقۡنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنۡزَلۡنَا بِهِ الۡمَآءَ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخۡرِجُ الۡمَوۡتٰی لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۵۷﴾

"اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوشخبری لئے ہوئے بھیجتا ہے ' پھر جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھالیتی ہیں تو انہیں کسی مردہ سرزمین کی طرف حرکت دیتا ہے اور وہاں مینہ برسا کر (اسی مری ہوئی زمین سے) طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے۔ دیکھو 'اسی طرح ہم مردوں کو حالت موت سے نکالتے ہیں' شاید کہ تم اس مشاہدے سے سبق لو۔"

یہاں اس کائنات میں شان ربوبیت کے آثار کو قلم بند کیا گیا ہے ' مثلاً کائنات میں فعالیت 'اس پر کنٹرول' اس کا مدبرانہ نظام اور اس کی قوتوں کی تحدید و تقدیر۔ یہ سب امور اللہ کی عظیم کارفرمائیوں کے مظہر ہیں اور ایسے امور ہیں جو بتاتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی رب نہیں ہو سکتا۔ وہی خالق اور رازق ہے ' مسبب الاسباب ہے اور یہ اسباب اس نے اپنی مخلوق کے لئے تیار کئے ہیں۔

ہوا ہروقت چلتی رہتی ہے ' ہروقت وہ اس کائنات میں بادلوں کو اٹھاتی اور دوڑاتی ہے۔ ہروقت بادلوں سے بارش برستی رہتی ہے۔ لیکن یہ سب امور اللہ کے فضل و کرم کے مظہر ہیں جیسا کہ یہ حقیقت ہے۔ یہ بات ہمارے مشاہدے سے وراء ہے اور نئی ہے جسے سیاق کلام میں سمو دیا گیا ہے اور نہایت ہی مؤثر ' متحرک اور مشخص انداز میں اسے یہاں پیش کیا جارہا ہے ' یوں کہ گویا منظر آنکھوں کے سامنے ہے۔

یہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو چلاتا ہے اور وہ اللہ کی رحمت لئے ہوئے ہوتی ہیں۔ لوگوں کے لئے سامان مسرت فراہم کرتی ہیں۔ یہ ہوائیں ان نوامیس فطرت کے مطابق چلتی ہیں جو اللہ نے اس کائنات پر حاوی کر دیئے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے عقل کی کسی بڑی مقدار کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ کائنات اپنے آپ کو وجود میں خود نہیں لائی اور نہ اس نے اپنے لئے یہ نوامیس فطرت خود وضع کئے ہیں' جبکہ اسلام کے معقول تصور حیات میں ہے کہ اس کائنات میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں وہ ان قوانین تکوینی کے مطابق ہوتے ہیں جو اللہ نے اس کائنات کے لئے وضع کئے ہیں اور مقدر کر دیئے ہیں۔ تمام حادثات کا ظہور ان قوانین کے مطابق ہوتا ہے ' تمام انفرادی حوادث کا ظہور بھی اسی ناموس کے مطابق ہوتا ہے ' لہٰذا ہواؤں کا کسی معین وقت اور معین خطے میں چلنا بھی اسی قاعدہ کلیہ اور اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوتا ہے۔

چنانچہ یہ ہوائیں بھی سنت الہیہ اور ناموس الٰہی کے مطابق چلتی ہیں لیکن ایک خاص مقدار کے مطابق ' ان ہواؤں کو مردہ علاقے اور صحراؤں کی طرف چلایا جاتا ہے اور یہ سب کچھ امر الٰہی کے مطابق ہوتا ہے۔ کسی جگہ جو بارش برستی ہے وہ مقررہ مقدار کے مطابق برستی ہے۔ اس سے جو روئیدگی اور پیداوار حاصل ہوتی ہے ' وہ بھی تقدیر الٰہی کے مطابق بطور خاص ہوتی ہے اور یہ تمام عمل اس کائنات کے نظام کے مطابق ہوتا ہے۔

غرض اسلامی تصور حیات کے مطابق یہاں کوئی واقعہ آزادانہ یا بطور اتفاق وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ تخلیق سے لے کر ظہور واقعات تک ہر حرکت' ہر تغیر اور ہر تبدیلی بر وقت' مقررہ تقدیر اور سنت کے مطابق ہوتی ہے۔ اسی طرح یہاں اسلامی نقطہ نظر سے یہ تصور بھی غلط ہے کہ یہ کائنات مجبور محض ہے اور اللہ نے اسے پیدا کر کے اپنے طور پر اسے چھوڑ دیا ہے۔ اس نے اس کی حرکت کے قوانین وضع کر دیئے ہیں' اب وہ اس کی حرکت کے قوانین میں جکڑی ہوئی ہے اور اس حرکت کے پیچھے کوئی ارادہ اب نہیں ہے۔

اسلامی تصور یہ ہے کہ تخلیق اللہ کی مشیت اور ارادے سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد مخلوقات میں اللہ کی سنت جاریہ کا نفاذ ہوتا ہے لیکن اس کائنات کی ہر حرکت تقدیر الٰہی کے مطابق ہوتی ہے۔ اور ہر دفعہ کی حرکت میں سنت الٰہیہ جاری و ساری نظر آتی ہے اور ہر حرکت کی مقدار مقرر ہے۔ یہ سب کچھ اس مشیت الٰہیہ کے مطابق ہوتا ہے جس کو نوامیس الٰہیہ پر بھی بالادستی حاصل ہوتی ہے۔

یہ ایک زندہ اور روشن دل و دماغ کا حامل تصور ہے اور اس کے مطابق ۔۔۔۔۔ یہ کائنات مجبور محض اور مردہ نہیں ہیں۔ یہ کائنات سوتی نہیں' جاگتی ہے اور خود سر نہیں بلکہ اس کا قیم اور نگران ہر وقت اس کی طرف متوجہ ہے۔ یہاں جو کچھ واقعہ ہوتا ہے وہ ارادۂ مدبرہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہر حرکت ناموس کے مطابق ہوتی ہے' اور ہر حرکت سے قلب مومن جاگ اٹھتا ہے۔ وہ اللہ کی تقدیر اور سنت کو دیکھتا ہے کہ وہ اپنا کام کر رہی ہے۔ چنانچہ قلب مومن اللہ کی حمد میں رطب اللسان ہوتا ہے' اللہ کو یاد کرتا ہے۔ وہ مردہ آلات کی طرح غافل ہو کر حرکت نہیں کرتا' اندھا اور بہرا ہو کر۔

یہ تصور حیات مومن کے دل میں حیاء اور دماغ میں جوش ادراک پیدا کرتا ہے۔ وہ تمام حرکات و واقعات میں دست قدرت کی کار فرمائیاں دیکھتا ہے اور ہر حرکت' ہر حادثے میں رات اور دن اللہ کی تسبیح و تہلیل کرتا ہے۔

اب اس مقام پر قرآن کریم' اس رواں دواں زندگی کا ربط حیات اخروی کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ یہاں کی تخلیق اور آخرت میں دوبارہ اٹھانا' ایک ہی عمل نظر آتا ہے۔ اللہ کی مشیت کے مطابق یہ اسی طرح ممکن ہے جس طرح اس جہان میں یہ زندگی رواں دواں ہوئی۔

(كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۷:۵۷)) "دیکھو' اسی طرح ہم مردوں کو حالت موت سے نکالتے ہیں' شاید کہ تم اس مشاہدے سے سبق لو۔"

اس کرۂ ارض پر زندگی کے رنگ ڈھنگ مختلف ہیں لیکن زندگی کی اس بوقلمونی کے باوجود اس کائنات پر وجود حیات کا معجزہ ایک ہی جیسا ہے۔ اس تبصرے میں اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جس طرح یہاں مردے سے زندہ اجسام نکلتے ہیں اسی طرح آخرت میں مردوں کو زندہ کر دیا جائے گا' جس اللہ نے اس کرۂ ارض پر زندگی کے یہ مختلف رنگ ڈھنگ پیدا کئے وہ اس بات پر قادر ہے کہ آخرت میں انسان کو دوبارہ زندہ کر دے۔ جو قوت اور جو قدرت یہاں مردے سے زندہ کو وجود میں لا سکتی ہے' وہ ذات آخرت میں مردے کو دوبارہ زندگی کیوں نہیں بخش سکتی۔ (لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۷:۵۷)) "شاید کہ اس مشاہدے سے تم سبق لو۔"

یہ ایک پیش پا افتادہ اور عظیم حقیقت ہے' لیکن لوگ دیکھتے ہوئے بھی اسے دیکھنا نہیں چاہتے اور لایعنی اوہام و

خرافات کو حقیقت بتانے کے درپے ہیں۔

اس کائنات کی وسعتوں کے اس سفراور اسرار کائنات کے اس غور و فکر کو قرآن کریم ایک مثال پر ختم کرتا ہے۔ یہ تمثیل ایک صالح اور پاک اور غیر صالح اور ناپاک دل کے بارے میں ہے۔ اور یہ تمثیل بھی اس کائنات کے مشاہدے اور اس مطالعاتی سفر سے اخذ کی گئی ہے تاکہ یہ تمثیل اس مطالعاتی سفر سے ہم آہنگ نظر آئے اور انسانی طبیعت اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا ۷
نَكِدًا ۚ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿٥٨﴾ ۵ ع
۱۴

''جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ اسی طرح ہم اپنی نشانیوں کو بار بار پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو شکرگزار ہونے والے ہیں۔''

اچھے دل کو قرآن و سنت میں زرخیز مٹی اور صالح زمین سے مشابہت دی جاتی ہے' اور برے دلوں کو بیکار مٹی اور بنجر زمین سے۔ اس لئے کہ اچھی زمین میں اچھی فصل پیدا ہوتی ہے اور وہ پھل پھول لاتی ہے اور اسی طرح اچھے دل میں صالح خیالات اور اچھے تصورات پیدا ہوتے ہیں اور وہ ایک پاکیزہ شعور و تصورات کا مسکن ہوتا ہے۔ اس کے اندر انسانی رجحانات میلانات اور ارادے اور عزائم جاگزیں ہوتے ہیں جو بعد میں عملی شکل اختیار کرتے ہیں بعینہٖ اس طرح جس طرح زمین سے ہر قسم کی پیداوار حاصل ہوتی ہے اور مختلف رنگوں اور مختلف ذائقوں کے پھل نمودار ہوتے ہیں۔

( وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا (۷: ۵۸) ) ''جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔''

اچھی زمین وہ ہوتی ہے جو نرم اور آسان ہوتی ہے اور جو بری ہوتی ہے وہ اذیت دہ' سخت مشقت خیز اور تنگ ہوتی ہے۔ ایک اچھے دل پر ہدایت' نصیحت اور یاد دہانی کی بارش نازل ہوتی ہے' جس طرح اچھی زمین پر بادلوں سے بارش برستی ہے۔ اگر دل پاکیزہ ہو' ایک اچھی اور زرخیز زمین کی طرح تو وہ کھل جاتا ہے۔ وہ ہدایت اور نصیحت کو قبول کرتا ہے اور مزید پاکیزہ ہو کر کامیاب ہو جاتا ہے۔ اگر دل فاسد ہو' جس طرح خبیث اور بنجر زمین ہوتی ہے تو اس دل کے دریچے بند ہو جاتے ہیں' وہ سخت ہو جاتا ہے اور شر و فساد کی راہ لیتا ہے۔ یقین کے بجائے اس دل میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں جس طرح بنجر زمین میں جھاڑیاں پیدا ہوتی ہیں۔

( كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ (۷: ۵۸) ) ''اسی طرح ہم اپنی نشانیوں کو بار بار

پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو شکر گزار ہونے والے ہیں۔"

شکر کا پودا پاکیزہ دل ہی میں اگ سکتا ہے' اور اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ دل پر نصیحت کا اثر ہو گیا ہے اور وہ قبولیت کی راہ لے رہا ہے۔ ایسے ہی دل رکھنے والے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ اپنی آیات اور دلائل بار بار اور مختلف انداز میں بیان کرتا ہے' کیونکہ صرف ایسے ہی لوگ ان بیانات سے نفع اٹھاتے ہیں اور اپنے شب و روز کو درست کرتے ہیں۔

شکر الٰہی' اس سورہ کا خاص مضمون ہے۔ اس سورہ میں انذار و تذکیر کے ساتھ ساتھ اس کا خصوصاً ذکر ہوا ہے۔ اس سے پہلے بھی ہم اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں اور آئندہ بھی اس سورہ کی دوسری خصوصیات یعنی انذار و تذکیر کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کریں گے۔

---ooo---

# درس نمبر ۷ ایک نظر میں

اس سبق میں ہم قافلہ ایمان کے ہمرکاب ہیں - یہ ہیں اس کے لیڈر اور یہ ہیں اس کے جھنڈے اور یہ ہیں ان کے نشانات راہ - یہ قافلہ اس کرۂ ارض کی تاریخ کے طویل میدانوں میں رواں دواں ہے - اور پوری انسانیت کے ساتھ ہمکلام ہے - اس طویل سفر میں انسانیت جب بھی بے راہ روی اختیار کرتی ہے' یہ قافلہ لئل حق اس کی راہ روکتا ہے اور اسے صراط مستقیم پر ڈال دیتا ہے - انسانیت راہ مستقیم سے اس وقت ہٹ جاتی ہے کہ جب اس پر شیطانی خواہشات کا غلبہ ہو جائے - شیطان ہر وقت اس تاک میں لگا رہتا ہے کہ انسانیت کو بدراہ کر کے اپنے جذبہ انتقام کو ٹھنڈا کرتا رہے اور انسانیت کے منہ میں شہوت نفسانیہ کی لگام ڈال کر اسے جہنم رسید کر دے - جب بھی شیطان یہ اسکیم شروع کرتا ہے پیغمبروں کا قافلہ ایمان نمودار ہو جاتا ہے پیغمبر اور ان کے پیروکار انسانیت کے سامنے روشنی کے مینار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور انسانیت کے لئے جنت کی باد نسیم کے جھونکے کھل جاتے ہیں - یہ پروقار قافلہ جہنم کی گرم لو سے انہیں ڈرانے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے - اور شیطان رجیم کے وسوسوں سے اسے نجات دیتا ہے کیونکہ وہ انسانوں کا ازلی دشمن ہے -

یہ نہایت ہی خوبصورت منظر ہے - ایک طویل شاہراہ حیات پر حق و باطل کی گھمسان کی جنگ جاری ہے - حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ نہایت ہی پیچیدہ انداز میں گزر رہی ہے' اس لئے کہ انسان تو تاریخ بناتا ہے جو بذات خود ایک پیچیدہ مخلوق ہے - یہ دو عناصر سے بنا ہے ایک تو وہ خاکی مادہ ہے جس سے اس کا خمیر تیار ہوا اور دوسرا عنصر وہ روح ہے جو اس جسد خاکی کے اندر پھونکی گئی اور اس نفخ روح کی وجہ سے انسان' انسان کہلایا - اس طرح دو متضاد عناصر کا یہ اتحاد و ازدواج اللہ کے دست قدرت کے ذریعے تکمیل کو پہنچا - اس لئے حضرت انسان تاریخ میں بڑی پیچیدگی سے آگے بڑھتا ہے - اس کی ذات اور اس کے اعمال و نظریات بھی پیچیدہ ہیں - انسان اپنی اس مخصوص طبیعت اور مزاج کے ساتھ اس وسیع کائنات اور اس کے آفاق کے ساتھ تعلق کا ایک خاص زاویہ رکھتا ہے جس کی تفصیلات ہم نے قصہ آدم و ابلیس میں دے دی ہیں - یہ ایک طرح حقیقت الہیہ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اللہ کی تقدیر' اس کی مشیت' اللہ کی قدرت اس کی طاقت اور اس کے رحم و کرم کا موضوع بنتا ہے - وہ عالم بالا اور ملائکہ کے ساتھ بھی مربوط ہے - پھر وہ ابلیس اور شیطان اعظم کے ساتھ بھی معاملہ کرتا ہے - وہ اس قابل مشاہدہ کائنات اور اس کے قوانین فطرت کے ساتھ بھی ملحق ہے - وہ اس کرۂ ارض کی تمام چیزوں کے ساتھ بھی طرز عمل اختیار کرتا ہے اور دوسرے ہم جنس انسانوں کے ساتھ بھی اس کے روابط قائم ہوتے ہیں اور یوں وہ اپنی اس طبیعت کے ساتھ پورے عالم مشہود کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے - اس کائنات کی ہم آہنگ قوتوں کے ساتھ بھی اس کا واسطہ ہے اور اس کی مخالف اور متضاد قوتوں کے ساتھ بھی اس کا معاملہ ہے -

غرض تاریخ کے اس باہم متلاطم اور پیچیدہ سمندر میں انسانی تاریخ دنیا کا سفر طے کرتی ہے - کبھی اس کی ذات قوی نظر آتی ہے اور کبھی گم کردہ راہ - کبھی وہ متقی اور ہدایت یافتہ ہوتا ہے اور کبھی ضعیف ہوتا ہے کبھی وہ عالم غیب سے جڑ جاتا ہے

اور کبھی عالم مشاہدہ میں ہی گم رہتا ہے 'کبھی وہ عالم مادیات میں سرگرم رہتا ہے' اور کبھی عالم روح اور دل کی دنیا میں پھرتا ہے لیکن آخر کار وہ اللہ کی تقدیر کے سامنے بے بس نظر آتا ہے۔ یہ سب رنگ اس کی تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ لہذا انسانی تاریخ کی تشریح صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ اس کے یہ متضاد عناصر ترکیبی پیش نظر رہیں۔

آج کل بعض لوگ انسانی تاریخ کی تشریح محض اقتصادی زاویہ سے کرتے ہیں۔ بعض اس کی تاریخ محض سیاسی زاویہ سے لکھتے ہیں 'بعض لوگ اس کی تاریخ بیالوجی اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے لکھتے ہیں۔ بعض لوگ محض روح اور بعض دوسرے محض نفس اور بعض دوسرے محض عقل کے اعتبار سے تاریخ لکھتے ہیں۔ جو لوگ انسان کا مطالعہ محض ایک ہی زاویہ سے کرتے ہیں وہ انسان کے دوسرے متعدد پہلوؤں کو نظرانداز کر جاتے ہیں' یوں یہ مطالعہ نہایت ہی سطحی ہوتا ہے حالانکہ انسان کا ہمہ گیر مطالعہ ضروری ہے۔ اسی طرح اس کی تاریخ کی تشریح بھی ہمہ پہلو اور ہمہ جہت ہونا چاہئے۔ انسانیت کی تاریخ کی اسلامی تشریح ہی وہ ہمہ جہت تشریح ہے جس کا مؤرخ انسانیت کے وسیع سمندر میں گہرائی تک غوطے لگاتا ہے اور ہر حقیقت نکال لاتا ہے۔ اسلامی مؤرخ اس ہمہ گیر اور گہرے مطالعے کے بعد اس کے واقعات پر نظر ڈالتا ہے۔ (دیکھئے اسلامی تصور حیات کے بنیادی عناصر کی فصل حقیقت انسان)۔

یہاں ہم اب ایک عظیم تاریخی سمندر کے سامنے کھڑے ہیں۔ اس سے قبل ہم تخلیق انسانیت کے مناظر دیکھ چکے ہیں۔ اس منظر میں تمام جہانوں کا اکٹھ تھا۔ وہ تمام مخلوقات جمع تھی جس کے ساتھ انسان کا واسطہ پڑنا مقرر تھا۔ تمام آفاق اور تمام مخلوق و عناصر ظاہر تھے یا خفیہ' سب کے ساتھ حاضر مجلس تھے۔ اس محفل میں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ اس نئی مخلوق کی صلاحیت کیا ہے اور اس کی اساسی خصوصیات کیا ہیں۔ عالم بالا کی یہ مجلس اس کے اعزاز میں منعقد ہوئی ہے اور اس میں اسے آخری اعزاز ملا یعنی ملائکہ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اسے سجدہ کریں۔ اس وقت اللہ نے اعلان کیا کہ یہ ہے جدید مخلوق۔ پھر ہم نے اس منظر کی ایک دوسری جھلک بھی دیکھی جس میں اس کی کمزوری سامنے آئی اور وہ دشمن کے ہتھے چڑھ گیا۔ پھر کیا ہوا؟ وہ جو ہونا تھا کہ اسے زمین پر اتار دیا گیا اور اسے آزاد چھوڑ دیا گیا کہ وہ اس کرۂ ارض کے تمام عناصر کے ساتھ اپنے تعلقات کی نوعیت متعین کرے۔

ہم نے دیکھا کہ حضرت انسان اس کرۂ ارض پر بطور مومن اتر رہا ہے۔ وہ اپنی کوتاہی اور لغزش پر اللہ سے مغفرت طلب کر رہا ہے۔ اس سے عہد لیا جاتا ہے کہ وہ فرائض خلافت فی الارض پورے کرے گا اور اللہ کی جانب سے جو احکام آئیں گے ان کی پیروی کرے گا۔ شیطان یا نفسانی خواہشات کے تابع نہ ہو گا اور اس سلسلے میں اسے جنت سے نکلنے کا جو تجربہ ہوا اسے زاد راہ بنائے گا۔

اب صدیاں گزر گئی ہیں اور تاریخ کے ناپید اکنار سمندر کی متلاطم امواج کے تھپیڑوں نے اسے اچھا خاصا تجربہ کار بنا دیا ہے۔ اس پوری کائنات 'اس کے ماحول اور اس میں باہم بر سرپیکار متضاد عوامل میں رہتے ہوئے اسے ایک عرصہ گزر گیا ہے۔ وہ اپنے ضمیر اور اپنے میلانات کے ساتھ بھی کشمکش میں رہا ہے۔ چنانچہ اس سبق میں حضرت انسان کی طویل تاریخ کی بعض جھلکیاں دکھائی جاتی ہیں کہ وہ کس طرح اس کرۂ ارض کے متضاد میلانات کی کشاکش میں زندگی بسر کرتا رہا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان بھول جاتا ہے۔ بارہا وہ اپنا سبق بھول گیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے بارہا کمزوریاں سرزد ہوتی رہیں اور ہوئیں۔ شیطان اس پر غالب آجاتا ہے اور بارہا ایسا ہوتا ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ بار بار اس کی راہنمائی کی جائے

اور اسے مصیبتوں سے نجات دلائی جائے۔

جب وہ اس کرۂ ارض پر اترا تو وہ توبہ کر چکا تھا' ہدایت یافتہ تھا اور عقیدۂ توحید پر قائم تھا۔ لیکن اگلے ہی منظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پھر گمراہ ہو گیا ہے' مشرک بن گیا ہے اور اللہ پر افتراء باندھ رہا ہے۔ لیکن تاریخی امواج کے اس تلاطم میں اس کے لئے ایک نشان راہ اور ادارۂ رسالت کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ اسے بار بار اپنے رب کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے اور یہ اللہ کا عظیم رحم و کرم ہے کہ اس نے اسے بے سہارا نہیں چھوڑا۔

اس سورہ میں ہم قافلہ ایمان کے طویل سفر کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اس قافلے کی ہدایت کے لئے انبیاء و رسل نے ہدایت کے جھنڈے بلند کر رکھے ہیں۔ حضرت نوحؑ' حضرت ہودؑ' حضرت صالحؑ' حضرت لوطؑ' حضرت شعیبؑ' حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسان کی ہدایت کے لئے تشریف لائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ حضرات اللہ کی ہدایات کے مطابق ہاتھ پکڑ پکڑ کر انسان کو اس راہ سے روکتے ہیں جس راہ پر چلا کر شیطان انہیں وارد جہنم کرنا چاہتا ہے۔ شیطان کے ساتھ اس کے مددگار بھی اس کام میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ وہ مستکبرین ہیں جو ہر زمانے میں اپنے آپ کو حق سے بالا سمجھتے رہے ہیں۔ پھر ہم ہدایت و ضلالت کے درمیان جو مسلسل کشمکش برپا ہے' اس کی جھلکیاں بھی ان مناظر میں دیکھتے ہیں۔ ایک طرف حق ہے اور دوسری جانب باطل' حق کے لیڈر انبیاء رسل ہیں اور باطل کے لیڈر شیاطین جن و انس ہیں۔ اس سفر کے آخری مرحلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ جھٹلانے والے کس طرح مار کھاتے ہیں' ان کے لاشے ہر طرف بکھرے نظر آتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اہل ایمان کامیاب اور پرمسرت ہیں۔ یاد دہانی اور تذکیر کا یہ ایک طویل سلسلہ ہے جو اس سبق میں نظر آتا ہے۔

قرآن میں قصص کا بیان لازماً تاریخی ترتیب کے مطابق نہیں ہوتا' لیکن اس سورہ میں قصص کی تاریخی ترتیب کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے' اس لئے کہ اس سورہ میں انسانیت کے طویل سفر کو بھی پیش نظر رکھنا مطلوب ہے۔ یہ بھی مطلوب ہے کہ نظر آئے کہ کس طرح اس طویل انسانی سفر میں انبیاء و رسل بار بار انسان کو ہدایت فراہم کرتے ہیں۔ جب بھی وہ راہ راست سے بھٹک جاتا ہے یہ لوگ اس کا ہاتھ پکڑتے ہیں۔ جب بھی شیطان نے انسانیت کی قیادت سنبھالی ہے اور اسے جہنم کی طرف لے چلنے کا حکم دیا ہے انبیاء و رسل نے اسے روکنے کی سعی کی ہے۔

اس سبق میں جو نشانات راہ دکھائے گئے ہیں ان کا خلاصہ ہم یوں پیش کرتے ہیں:

یہ کہ انسانیت کا آغاز ایک مومن ہدایت یافتہ اور عقیدۂ توحید پر ایمان رکھنے والے انسان کے ساتھ ہوا۔ بعد کے ادوار میں انسان بھٹک کر مشرکانہ عقائد کا حامل بن گیا۔ انسان کے بھٹکنے کا سبب وہ عوامل اور رجحانات و میلانات بنے جو اس کی ذات کے اندر اللہ نے ودیعت کئے تھے یا وہ عناصر اور اسباب اس کی گمراہی کا سبب بنے جو اس جہان میں پنہاں تھے۔ جب بھی انسان گمراہی میں مبتلا ہوا ایک رسول دنیا کی اسٹیج پر نمودار ہوا اور وہ وہی دعوت اس کے سامنے پیش کرنے لگا جس کا یہ گمراہ انسان اپنی گمراہی سے قبل ماننے والا اور اس کا حامل تھا۔ رسول کی دعوت آنے کے بعد لوگ ہمیشہ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ نے ہلاکت کی راہ لی اور دوسرا گروہ از سر نو زندہ ہو گیا۔ زندہ وہ لوگ ہوئے جو راہ ہدایت کی طرف لوٹ آئے اور انہوں نے جان لیا کہ ان کا الٰہ' الٰہ واحد ہے اور وہ پوری طرح اس الٰہ واحد کے سامنے سر تسلیم خم کرنے لگے۔ انہوں نے اس رسول کی پکار کو سنا جو انہیں کہہ رہا تھا "اے میری قوم صرف اللہ کی بندگی کرو' حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا

تمہارا کوئی اور حاکم نہیں ہے ۔" پس یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس پر اللہ کا پورا دین قائم ہے اور انسان کی طویل تاریخ میں تمام رسولوں نے صرف اسی عقیدے کی طرف دعوت دی ہے ۔ جو رسول بھی آیا' اس نے قوم کے سامنے یہی کلمہ پیش کیا۔ ایسے حالات میں جب اس کی قوم کو شیطان نے گمراہی کے جال میں پھنسا لیا تھا۔ وہ اصل عقیدے کو بھول گئے تھے اور گمراہ ہو چکے تھے ۔ انہوں نے اللہ کے ساتھ بے شمار شریک ٹھہرائے ہوئے تھے ۔ مختلف جاہلیتوں کے اندر یہ شریک مختلف نوعیت کے تھے ۔ ان بت پرستیوں کی اساس پر انسانی تاریخ میں حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی قائم رہی ہے اور اسی معرکہ آرائی کی اساس پر اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ جھٹلانے والوں کو پکڑا ہے اور ایمان لانے والوں کو نجات دی ہے ۔ قرآن نے ان دعوتوں کو ایک ہی جیسے الفاظ میں منضبط کیا ہے حالانکہ انبیاء مختلف زبانوں میں دعوت دیتے چلے آئے تھے ۔ انہوں نے مختلف ادوار اور مختلف زبانوں میں جو دعوت دی' قرآن نے اس کی تعبیر ان الفاظ میں کی ہے ۔ "اے قوم' صرف اللہ کی بندگی کرو' تمہارا اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے ۔" اس سے اس حقیقت کا اظہار مقصود تھا کہ پوری انسانی تاریخ میں دعوت اسلامی ایک ہی رہی ہے بلکہ اسے ایک جیسے الفاظ ہی میں پیش کیا گیا ہے ۔ یہ عبارت اور یہ الفاظ اس عقیدے کو پوری طرح اور جامع و مانع انداز میں پیش کرتے ہیں ۔ جس طرح سیاق کلام سے بھی اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ایک کے بعد ایک رسول اسٹیج پر آتا ہے اور وہی الفاظ دہراتا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے اسلامی نظریہ حیات کے بیان کے لئے کیا منہاج اختیار کیا ہے؟

اس بات سے یہ حقیقت خود بخود سامنے آجاتی ہے کہ جدید دور میں ادیان کا تقابلی مطالعہ کرنے والے مفکرین اور قرآن کے منہاج کے درمیان بہت بڑا فرق ہے ۔ قرآنی منہاج یہ ہے کہ رسول جو عقائد لے کر آئے ان کے اندر کوئی ترقی یا تغیر و تبدیلی نہیں ہوئی ہے نہ ان عقائد کے اندر غور و فکر کے کوئی ابتدائی یا انتہائی مدارج رہے ہیں ۔ جو لوگ ادیان کے بنیادی عقائد کی ارتقائی اور تدریجی ارتقائی سوچ بیان کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اسلامی نظریات کو بھی ارتقائی شکل میں پڑھتے ہیں وہ ایسی بات کرتے ہیں جو اللہ نے قرآن کے اندر نہیں کی ہے ۔ جس طرح قرآن کریم واضح طور پر اظہار کرتا ہے کہ انبیاء نے ہمیشہ ایک ہی دعوت دی ہے ۔ قرآن اس دعوت کو ایک ہی عبارت میں بیان کرتا ہے یعنی "اے قوم صرف اللہ کی بندگی کرو' حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا تمہارا کوئی اور حاکم نہیں ہے ۔"

(اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷: ۶۰)) اور یہ الٰہ جس کی طرف تمام رسول دعوت دیتے رہے' وہ رب العالمین ہے اور لوگوں سے ایک عظیم دن حساب و کتاب لے گا ۔ رسولوں میں سے کوئی ایک رسول بھی ایسا نہیں گزرا جس نے لوگوں کو اپنے قبیلے کی طرف دعوت دی ہو' یا کسی قوم یا کسی نسل کے رب کی طرف لوگوں کو بلایا ہو ۔ نہ رسولوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا گزرا ہے جس نے دو الٰہوں کی طرف دعوت دی ہو یا متعدد الٰہوں کا پرچار کیا ۔ رسولوں میں سے کسی رسول نے بھی سورج' چاند' ستاروں' ارواح یا بتوں کی پوجا اور غلامی کی طرف نہیں بلایا ۔ اسی طرح اللہ کی جانب سے کوئی ایسا نظام وضع نہیں ہوا جس میں آخرت کا تصور نہ ہو' جس طرح بعض وہ لوگ کہتے ہیں جو اپنے آپ کو ماہرین ادیان کہتے ہیں اور جو دنیا کی مختلف جاہلیتوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ جن نتائج تک پہنچے ہیں وہی اس دنیا کے معروف ادیان تھے اور اس کے علاوہ کوئی اور دین ان ادوار میں نہ تھا ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کرہ ارض پر پے درپے رسول آتے رہے اور انہوں نے صرف اور صرف عقیدہ توحید اور

خالص توحید کا عقیدہ پیش کیا۔ انہوں نے یہ نظریہ دیا کہ صرف اللہ رب العالمین ہے' اور وہ لازماً قیامت کے دن سب سے حساب لے گا۔ لیکن ہر رسالت کے خاتمے کے بعد جاہلیت دوبارہ دنیا پر چھا گئی اور اس کے چھانے کے اسباب کچھ تو انسانوں کے اندر تھے اور کچھ وہ عوامل و دواعی تھے جو انسان کو فراہم کردہ ماحول میں نہایت ہی پیچیدہ شکل میں موجود تھے۔ یہ انحرافات مختلف تصورات، عقائد کی صورت میں سامنے آئے اور آج کل کے ماہرین ادیان درحقیقت اصل دین کو چھوڑ کر ان ہی منحرف ادیان کا مطالعہ کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے اخذ کردہ خطوط پر دنیا میں دین اور مذہب نے بتدریج ارتقائی سفر کے ذریعے موجودہ شکل اختیار کی ہے۔

بہرحال اللہ کا فرمان زیادہ قابل تقلید ہے' خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو دین کے موضوع پر لکھتے ہیں جو اسلام کے حق میں لکھتے ہیں اور اس کی جانب سے دفاع کرتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو سرے سے قرآن پر ایمان ہی نہیں لاتے تو ہم ان سے مخاطب ہی نہیں ہیں' اللہ بہرحال سچائی بیان کرتا ہے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

تمام رسول جب بھی وہ آئے تو انہوں نے سب سے پہلے اپنی قوم کو دعوت دی ہے۔ انہوں نے قوم میں دعوت اسلامی کا کام اس وقت شروع کیا ہے جب قوم صراط مستقیم اور اس عقیدے سے منحرف ہو گئی' جس پر سابقہ رسول نے انہیں چھوڑا تھا۔ چنانچہ پہلے انسان اہل توحید تھے اور وہ رب العالمین کو تسلیم کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ وہی تھا جو آدم ؑ اور ان کی بیوی کا تھا۔ اس کے بعد مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اور ان اسباب کی وجہ سے جن کا تذکرہ ہم نے کیا وہ اس عقیدے سے منحرف ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام تشریف لائے۔ انہوں نے لوگوں کو دوبارہ رب العالمین کے عقیدۂ توحید پر قائم ہونے کی دعوت دی۔ ان کی دعوت کے اختتام پر ایک عظیم طوفان آیا' اہل ایمان نے نجات پائی' اہل تکذیب کو طوفان میں غرق کر دیا گیا۔ اس کرۂ ارض پر اہل توحید نے قبضہ کیا اور اسے آباد کر دیا۔ دنیا کی اس تعمیر نو کی تعلیم ان کو حضرت نوحؑ نے اپنی اولاد کے واسطے سے دی تھی۔ جب مزید وقت گزرا تو یہ لوگ پھر گمراہ ہو گئے اور اس کے بعد حضرت ہود تشریف لائے اور ان کی دعوت کے اختتام پر انہیں ایک سخت ہوائی طوفان نے آلیا۔ یوں یہ قصہ اسی طرح آگے بڑھتا رہا اور تاریخ کا سفر جاری رہا۔

ان رسولوں میں سے ہر رسول اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا۔ اس نے یوں خطاب کیا "اے برادران قوم' صرف اللہ کی بندگی کرو' تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے۔" اور ہر رسول نے اپنی قوم سے کہا (اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ (۷: ۶۸) "میں تمہارے لئے ناصح امین ہوں۔"

ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کو اپنی عظیم ذمہ داریوں کا کس قدر شدید احساس تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کی قوم کے لوگ جس صورت حالات میں پھنسے ہوئے ہیں دنیا اور آخرت میں اس کا انجام کس قدر برا ہونے والا ہے۔ رسولوں کے دلوں میں شدید خواہش تھی کہ ان کی قوم ہدایت پائے اس لئے کہ وہ قوم میں سے تھے اور قوم ان سے تھی۔ مگر اس وقت قوم کے سرداروں نے ان کی راہ روکی اور حکم حق کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اللہ رب العالمین کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان سرداروں نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ نظام زندگی صرف اللہ کا جاری ہو اور اس نظام میں صرف اللہ کی بندگی ہو۔ یہی وہ اساس ہے جس کے اوپر تمام رسالتوں کا مدار رہا اور اسی کے اوپر اللہ کے ہاں سے تمام ادیان استوار ہوئے۔ لیکن رسولوں نے تمام طاغوتی طاقتوں اور تمام سرداروں کے منہ پر کلمہ حق نہایت

ہی وضاحت اور صاف گوئی کے ساتھ بلند کیا اور ہر بار ان کی قوم دو نظریاتی دھڑوں میں تقسیم ہوئی۔ لوگوں کے درمیان قومیت اور رشتہ داری کے روابط کٹ گئے اور ان کی جگہ ایک نظریہ کی اساس پر اخوت استوار ہو گئی۔ جو لوگ ایک قوم کے افراد تھے وہ دو امتوں کی شکل اختیار کر گئے اور یوں نظر آنے لگے کہ ان کے درمیان نہ تو کوئی قرابت ہے اور نہ ہی متحدہ قومیت کا کوئی تعلق ہے۔ اس کشاکش کے بعد فتح آتی ہے اور اس کے ذریعے دونوں امتوں کے درمیان فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ امت ہدایت اور امت ضلالت کے درمیان جدائی کر دیتا ہے۔ اب جھٹلانے والے مستکبرین اور سردار پکڑے جاتے ہیں اور مطیع فرمان اور سرتسلیم خم کرنے والے نجات پاتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی قوم نظریاتی اعتبار سے بٹی نہ ہو اور اللہ کی جانب سے فتح آگئی ہو۔ ہمیشہ یہی ہوا کہ کوئی قوم نظریاتی اعتبار سے بٹ جاتی ہے اور پھر دونوں میں سے اہل حق فتح پاتے ہیں اہل اللہ 'اللہ کی بندگی اور غلامی میں خالص ہو جاتے ہیں۔ وہ طاغوتی طاقتوں کے مقابلے میں صف آرا ہو جاتے ہیں اور خود اپنی قوم سے علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ وہ مشاہدہ ہے جو دعوت انبیاء کی تاریخ کے مطالعے کے دوران واضح طور پر نظر آتا ہے۔

ان تمام رسالتوں میں ایک بات پر فوکس کیا گیا ہے۔ یہ کہ تمام لوگ رب واحد کی بندگی اور غلامی اختیار کریں اس لئے کہ صرف اللہ رب العالمین ہی بندگی کا مستحق ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم بندگی اور اقتدار اعلیٰ کا حق دوسری تمام مخلوق سے لے کر رب العالمین کو دے دیں۔ انسانی زندگی کا کوئی پہلو بھی اس کے عقیدے کے بغیر اصلاح پذیر نہیں ہو سکتا۔ تمام رسالتوں کے اس مشترکہ اصول کے بیان کے بعد قرآن کریم نے ان رسالتوں کی دعوت کی تفصیلات نہیں دی ہیں اس لئے کہ تمام رسولوں کے ادیان کی تفصیلات اسی مرکزی اصول پر مبنی تھیں۔ کوئی بات اس عقیدے سے خارج نہ تھی۔ یہ اصول چونکہ نہایت ہی اہم اور اساسی تھا اس لئے قرآن کریم نے اس پر اس قدر زور دیا ہے کہ اسے علیحدہ بیان کیا ہے۔ جس طرح ہم نے سورہ انعام پر تبصرے میں کہا کہ تمام کی قرآن کا اصل مبحث ہی یہی ہے 'لیکن مدنی حصے میں بھی جہاں جہاں موقع آیا ہے اس کی مناسبت سے اس موضوع پر بات ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام ایک ٹھوس حقیقت ہے 'ایک نظام ہے اور اس حقیقت کو پیش کرنے کے لئے ایک منہاج اور طریقہ کار ہے۔ اور منہاج اسلام دین اسلام جیسے ہی اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہئے کہ وہ عظیم حقیقت کیا ہے جسے یہ دین لے کر دنیا میں آیا ہے؟ اسی طرح ہمیں دین اسلام کو سمجھنے کے لئے اور اس کے قیام کے لئے وہی منہاج اپنانا چاہئے جس میں اس حقیقت کو پیش کیا گیا ہے۔ اور اس منہاج کا خلاصہ یہ ہے کہ عقیدۂ توحید کو مکرر 'مؤکد اور منفرد انداز میں پیش کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورہ میں اس منہاج کو بار بار 'مؤکد سے مؤکد الفاظ میں اور نہایت ہی واضح اور سادہ اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ منہاج اس سورہ کے تمام قصص میں واضح ہے۔

اس سورہ میں جو قصص بیان ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کا مزاج کیا ہوتا ہے اور کفر کا مزاج کیا ہوتا ہے اور نفس انسانی پر دونوں کے اثرات کیا مرتب ہوتے ہیں۔ یہاں بتکرار بتایا جاتا ہے کہ جو قلوب ایمان کے لئے مستعد ہوتے ہیں وہ کس قسم کے ہوتے ہیں اور جو دل کفر اور انکار پر آمادہ ہوتے ہیں وہ کس قسم کے ہوتے ہیں؟ جن لوگوں نے رسولوں کی دعوت کو قبول کیا ان کے دلوں میں کبر و غرور نہ تھا اور وہ رسولوں کی دعوت کو قبول کرنے اور اس کے سامنے سرتسلیم خم کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ کرتے تھے۔ ان کو یہ بات انوکھی نہ لگتی تھی کہ اللہ ان میں سے ایک شخص کو

رسول بنا کر بھیج دے جو ان تک اس کا پیغام پہنچائے اور انہیں انجام بد سے خبردار کرے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے کسی بھی رسول کو ماننے سے انکار کیا' وہ ہمیشہ اس قسم کے لوگ رہے ہیں جنہوں نے گناہ کی راہ اس لئے اختیار کی کہ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے تھے اور صاحب مرتبہ لوگ تھے۔ انہوں نے اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے قیام کے بجائے خود اپنا اقتدار لوگوں پر مسلط کر دیا تھا اور کسی صورت میں بھی اس غاصبانہ اقتدار سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ نہ اس کے لئے تیار تھے کہ وہ خود اپنے ایک عام آدمی کی سمع و اطاعت کریں۔ یہی لوگ تھے جن کے لئے قرآن کریم "مَلَأٌ" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یہ حکام' بڑے لوگ' صاحب قوت و اقتدار لوگ تھے اور یہیں سے اس دین کا اصل راز معلوم ہوتا ہے۔ یہ راز اللہ کا اقتدار اعلیٰ اور اللہ کی حاکمیت کے قیام کا مسئلہ ہے۔ یہ بڑے لوگ رسول کے ان الفاظ کے نتائج کو اچھی طرح سمجھتے تھے "اے برادران قوم! صرف اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا اور کوئی حاکم نہیں ہے۔" اور "میں تو رب العالمین کا فرستادہ ہوں۔" وہ سمجھتے تھے کہ اقتدار اور حاکمیت اللہ کی ہو جائے اور اللہ کا رسول یہ شخص ہو تو ظاہر ہے کہ ان کی تمام بڑائی ختم اور ان کے تمام اختیارات ازخود اس شخص کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں جو رب العالمین کا نمائندہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس دعوت کے لئے سد راہ بن گئے تھے اور نتیجۃً" ان لوگوں میں شامل ہو گئے تھے جو ہلاک ہونے والے تھے۔ یہ لوگ اس اقتدار اعلیٰ کے شیدائی ہو گئے تھے کہ ان کی آنے والی نسلیں بھی انہی کی راہ پر چلتی تھیں اور انہی کی طرح جہنم کی راہ پر پڑ گئی تھیں جس کا انجام ہلاکت کے سوا کچھ نہ تھا۔ غرض جھٹلانے والوں کی مقتل گاہوں کے جو نقشے ان قصص میں کھینچے گئے ہیں وہ اللہ رب العالمین کی اس سنت کے مطابق ہیں جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ لوگ اللہ کی آیات کو یکسر بھلا دیتے تھے اور اللہ کی راہ سے انحراف کر لیتے تھے۔ اللہ کی جانب سے رسولوں کے ذریعے ڈراوا آتا تھا اور وہ اللہ کی بندگی کے اقرار کو اپنے لئے ہتک سمجھتے تھے۔ وہ اپنی خوشحالی پر فخر کرتے اور مطالبہ کرتے کہ جلدی عذاب لاؤ۔ اس کے برعکس وہ رسول اور اہل ایمان کو دھمکیاں دیتے اور ایذا پہنچاتے' جس کے مقابلے میں اہل ایمان ثابت قدم رہتے اور اپنے نظریات پر جم جاتے۔ اس کے بعد پھر عذاب الٰہی آ جاتا۔ یہ ہے تاریخ انسانیت۔

سب سے آخری بات یہ ہے کہ باطل کی سرکش قوت کا مزاج ہی یہی ہے کہ وہ سچائی کے وجود ہی کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ سچائی اگر باطل کے مقابلے میں گوشہ نشین ہو کر حق و باطل کا فیصلہ اللہ پر چھوڑ دے تو بھی باطل اسے برداشت نہ کرے گا۔ بلکہ باطل اس کا پیچھا کرے گا اور اسے آخری حدوں تک بھگانے کی سعی کرے گا۔ اسے شکست دینے کی کوشش کرے گا۔ حضرت شعیب نے اپنی قوم سے کہا: "تم میں سے اگر ایک گروہ اس دعوت پر ایمان لایا ہے جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا ہے تو تم صبر کرو کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے' وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔" لیکن انہوں نے حضرت شعیب کی اس پیشکش کو قبول نہیں کیا اور وہ اس بات کو برداشت نہ کر سکے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے سچائی موجود ہو اور وہ پھلے پھولے۔ نہ کوئی باطل یہ برداشت کر سکتا ہے کہ کوئی ایسی جماعت میدان میں موجود رہے جو صرف اللہ کی بندگی کرتی ہو اور تمام طاغوتی طاقتوں کے اقتدار اعلیٰ کی منکر ہو۔" شعیب کی قوم سے ان لوگوں نے جو مستکبرین تھے' انہیں یہ کہا "اے شعیب ہمیں تو تم کو اور ان لوگوں کو جو تم پر ایمان لے آئے ہیں اپنے اس گاؤں سے نکالنا پڑے گا۔ یا تمہیں ہمارے نظام و ملت میں واپس آنا ہو گا۔" لیکن حضرت شعیب بھی ان کی اس تجویز کو صاف صاف رد کر دیتے ہیں۔ "انہوں نے کہا' تب بھی کہ ہم ایسا نہ چاہ رہے ہوں۔ اگر ہم تمہارے نظام اور ملت میں

واپس لوٹ آئیں گے تو ہم تو اللہ پر افتراء پردازی کر رہے ہوں گے جبکہ اس سے اللہ نے ہمیں نجات دے دی ہے۔"

یہ مکالمہ بتاتا ہے کہ اہل دعوت پر طاغوتی طاقتوں کے ساتھ یہ معرکہ آرائی فرض ہے اور انہیں اس کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ کوئی اٹکل اور کوئی حکمت حاملین دعوت اسلامی کو اس معرکے سے بچا نہیں سکتی اس لئے کہ طاغوتی طاقتیں تب آرام کریں گی جب وہ دعوت اسلامی کو اپنے نظریات سے منحرف کر لیں گی یہ قوتیں تب دم لیں گی جب تک داعیان حق واپس ان کی گمراہ ملت کی طرف لوٹ نہ آئیں گے حالانکہ اللہ نے ان کے دل سے یہ منحرف ملی نظریات نکال کر ان کے دل میں صرف اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے نظریات بٹھا دیئے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں قوتوں کے درمیان معرکہ آرائی لابدی ہے اور اس سے نہیں بچا جا سکتا۔ جب معرکہ لابدی ہے تو پھر اس کی مشکلات کو برداشت کرنا بھی لابدی ہے۔ اور یہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک فتح نصیب نہیں ہو جاتی اور جب تک وہ کشتیاں جلا کر شعیب علیہ السلام کا یہ نغمہ نہیں الاپتے۔ "ہم نے اللہ پر بھروسہ کر لیا ہے۔ اے اللہ اب تو ہی ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ فرما کیونکہ تو بہترین فیصلے کرنے والا ہے۔" (عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا (۷: ۸۹)) اب اللہ کی سنت چلتی ہے اور پوری انسانی تاریخ میں یہ چلتی رہی ہے۔ ان قصص پر یہ تبصرہ کافی ہے۔ اب آیات قرآن تفصیلات کے ساتھ۔

---O O O---

# درس نمبر ۷۷ تشریح آیات

## ۵۹ --- تا --- ۹۳

انسانی تاریخ میں قافلہ انسانیت کے اس سفر کے بیان سے پہلے 'ایسے ہی ایک کائناتی مومن قافلے کا ذکر تھا' جو اس کائنات میں رواں دواں نظر آتا ہے۔ اس سے پہلے سبق کے آخر میں ایسے مومنین کا ذکر جو امر الہی سے ذرا بھی سرتابی نہیں کرتے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے۔

(اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۷: ۵٤)) "درحقیقت تمہارا رب ہی ہے جس نے آسمان و زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا۔ جو رات کو دن پر ڈھانپ دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑتا چلا جاتا ہے۔ جس نے سورج چاند اور تارے پیدا کئے ۔ سب اس کے فرمان کے تابع ہیں 'خبردار رہو اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ رب العالمین۔" قرآن کریم میں بسااوقات اس حقیقت کو کہ یہ پوری کائنات اللہ کی مطیع فرمان ہے اور یہ حقیقت کہ تمام انسانوں پر اللہ کا امر جاری ہونا چاہئے ایک ساتھ لایا جاتا ہے۔ یعنی جس طرح وہ کائنات مطیع فرمان ہے جس میں انسان بستے ہیں اسی طرح انہیں بھی اللہ کا مطیع فرمان ہونا چاہیے۔ تمہارا اسلام اس طرح ہونا چاہئے جس طرح کا اس پوری کائنات کا ہے۔ اور جس کے قوانین میں وہ جکڑی ہوئی ہے۔ اس طرح اس پوری کائنات کے مسلم ہونے کے اثرات قلب مومن پر پڑتے ہیں' اسے خوب جھنجوڑتے ہیں اور اسے آمادہ کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی اطاعت کے لئے آمادہ ہو جائے اور یہ کہ اس کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کے اردگرد یہ پھیلی ہوئی کائنات تو اللہ کی مطیع فرمان ہو اور اس کائنات میں وہ اللہ وحدہ کے مقابلے میں سرکشی کرے۔

غرض رسولوں کی دعوت کوئی ایسی دعوت نہیں ہے جو انوکھی ہو' بلکہ وہ تو اس حقیقت کی طرف بلاتے ہیں جو اس پوری کائنات میں جاری و ساری ہے' اس پوری کائنات کے ضمیر میں رچی بسی ہے اور یہی حقیقت خود انسان کی فطرت کے اندر بھی موجود ہے۔ جب بھی انسان کی فطرت پر شہوات اور خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے یہ فطرت ضمیر کے اندر اسے پکارتی ہے اور اس طرح شیطان انسان کو گمراہ کر کے اس کی نکیل اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو اس سبق کے تمام قصوں میں مختلف پیرائیوں میں بیان کی گئی ہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ
إِلَٰهٍ غَيْرُهُ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٥٩﴾ قَالَ الْمَلَأُ مِن
قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٦٠﴾ قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي ضَلَالَةٌ
وَلَٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٦١﴾ أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنصَحُ لَكُمْ
وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦٢﴾ أَوَعَجِبْتُمْ أَن جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن
رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٦٣﴾ فَكَذَّبُوهُ
فَأَنجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۚ
إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا عَمِينَ ﴿٦٤﴾ ع ۸ ۶ ۱۵

”ہم نے نوح ؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا ”اے برادران قوم ' اللہ کی بندگی کرو ' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ میں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔“ اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا: ”ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔“ نوح ؑ نے کہا ”اے برادران قوم ' میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں ' تمہارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں ہے۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمہیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے؟“ مگر انہوں نے اس کو جھٹلایا۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں نجات دی اور ان لوگوں کو ڈبو دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا ' یقیناً وہ اندھے لوگ تھے۔“

یہاں اس قصے کو نہایت ہی اختصار کے ساتھ لیا گیا ہے ' جبکہ دوسرے مقامات پر جہاں تفصیلات کی ضرورت تھی اس کی تفصیلات بھی دی گئی ہیں۔ مثلاً سورہ ہود اور سورہ نوح میں ' اس لئے کہ یہاں صرف ان نشانات راہ کی طرف اشارہ کرنا مطلوب تھا جن کے بارے میں ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ یعنی اسلامی نظریہ حیات کا مزاج کیا ہے اور اس کے پھیلانے اور دعوت اسلامی کا طریقہ تفہیم کیا ہے اور اس دعوت کے آغاز کے بعد لوگوں کا رد عمل کیا ہوتا ہے؟ اس کے داعی کے جذبات کیا ہوتے ہیں۔ یہاں ہم صرف انہی نشانات راہ کی طرف اشارہ کریں گے جن کے لئے اس قصے کو یہاں لایا گیا ہے۔

(لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِه (۷: ۵۹)) "ہم نے نوح ﷺ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔" یہ اللہ کی سنت ہے کہ اللہ ہر قوم کی طرف رسول اس کی قوم سے بھیجتے ہیں۔ وہ ان سے ان کی زبان میں بات کرتا ہے۔ یہ رعایت اللہ نے ہر قوم کی تالیف قلب کے لئے دی ہے اور اس لئے دی ہے کہ ان کے لئے پیغام کو سمجھنا آسان ہو اور ان کا باہم تعارف ہو لیکن یہ سہولتیں بھی ان لوگوں کے لئے مفید ہوتی ہیں جن کی فطرت بگڑ نہ چکی ہو۔ رہے وہ لوگ جن کی فطرت بگڑی ہوئی ہوتی ہے انہیں یہ انتظام بھی عجیب لگتا ہے۔ وہ دعوت کو قبول نہیں کرتے اور اپنے آپ کو اس مقام سے اونچا سمجھتے ہیں کہ وہ ایمان لائیں اور اطاعت کریں' اس لئے وہ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ملائکہ اور فرشتے آکر انہیں تبلیغ کریں۔ یہ بات محض بہانہ سازی ہے۔ اگر فرشتے بھی آتے تب بھی یہ لوگ مان کر نہ دیتے۔ چاہے جو بھی طریقہ اختیار کیا جاتا وہ ماننے والے نہ تھے۔

حضرت نوح ﷺ کو جب رسول بنا کر بھیجا گیا تو انہوں نے دعوت کا آغاز انہی کلمات سے کیا جن کے ساتھ بعد میں آنے والے تمام رسولوں نے کیا۔ (فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُه (۷: ۵۹)) "اس نے کہا" اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔" یہ کلمات آخر تک نہیں بدلتے۔ یہ وہ اصولی قاعدہ ہے جس کے سوا اسلام متحقق نہیں ہو سکتا۔ یہ انسانی زندگی کا بنیادی پتھر ہے اور اس کے بغیر انسانیت کی عمارت کھڑی ہی نہیں ہو سکتی۔ یہی قاعدہ کلیہ اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ لوگوں کا نقطہ نظر ایک ہو' ان کے مقاصد ایک ہوں اور ان کے درمیان رابطہ ایک طرح کا ہو' یہی اصول ہے جس کے ذریعے کوئی انسان ہوا و ہوس کی غلامی سے آزاد ہو سکتا ہے اور خود اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے بھی آزاد ہو سکتا ہے۔ اسی کے ذریعے انسان بے پناہ انسانی خواہشات کو کنٹرول کر سکتا ہے اور انعام و سزا کو منضبط کر سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ اس کا اساسی قاعدہ یہ ہے کہ انسانوں کی پوری زندگی کے اندر اللہ کی حاکمیت اور بادشاہت کو قائم کیا جائے۔ یہی ہے مفہوم اس بات کا کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور یہی مفہوم ہے اس فقرے کا کہ اللہ کے سوا کوئی الہ (حاکم) نہیں ہے۔ اللہ کی بادشاہت جس طرح کائنات کی تخلیق میں ہے' اس کی ربوبیت تدبیر اور تقدیر میں ہے اور جس طرح یہ بادشاہت انسان کی تخلیق ربوبیت اور اس کی تقدیر اس کے عناصر ترکیبی میں ہے اسی طرح یہ بادشاہت انسان کی عملی زندگی میں بھی قائم ہونا چاہیے اور اس کی عملی زندگی کو اللہ کی شریعت کے مطابق استوار ہونا چاہئے۔ مثلاً مراسم عبودیت میں' اور زندگی کے تمام دوسرے معاملات میں بطور یکجا اللہ کی بندگی ہونا چاہئے۔ اگر ایسا نہ ہو گا تو پھر انسان شرک کا مرتکب ہو گا اور عملاً وہ اس بات کا قائل ہو گا کہ اللہ کے سوا کوئی اور حاکم بھی ہیں۔

حضرت نوح ﷺ نے اپنی قوم کے لوگوں سے یہ مختصر بات کی اور انہیں ان کے انجام بد سے ڈرایا۔ انہوں نے اس طرح نصیحت کی جس طرح ایک مشفق بھائی' بھائی کو کرتا ہے' اور جس طرح ایک مشفق سربراہ اپنی قوم اور خاندان کو کرتا ہے کہ اگر تم نے تکذیب کی تو انجام بہت ہی بھیانک ہو گا۔

(اِنِّیْ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۷: ۵۹)) "میں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔" اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ترین دین' دین نوح میں بھی تصور آخرت اپنی مکمل شکل

میں موجود ہے - وہ فرماتے ہیں کہ میں یوم الحساب میں تمہارے برے انجام سے کانپ رہا ہوں - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی اور دینی عقائد کے بارے میں قرآن کا تصور کیا ہے اور ان نام نہاد ماہرین ادیان کا کیا تصور ہے جو تاریخ ادیان کو بھی ارتقائی انداز میں مرتب کرتے ہیں - یہ لوگ قرآنی منہاج سے بے خبر ہیں -

(قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرٰكَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ (۷: ۶۰)) "قوم کے سرداروں نے جواب دیا "ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔" یہی بات مشرکین عرب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہی تھی - انہ صباء "یہ کہ آپ بے دین ہوگئے ہیں۔" اور آپ نے دین ابراہیم سے روگردانی اختیار کر لی ہے - جب کوئی شخص گمراہی کی حدیں پار کر لیتا ہے تو وہ ان لوگوں کو گمراہ سمجھتا ہے جو اسے راہ ہدایت کی طرف بلاتے ہیں اور جب کسی کی فطرت مسخ ہو جاتی ہے تو وہ بھی خود سری کے اس مقام تک جا پہنچتا ہے - یوں اقدار بدل جاتی ہیں اور حق و باطل کے پرکھنے کا معیار بدل جاتا ہے - انسان نفسانی خواہشات کے تابع ہو جاتا ہے - الا یہ کہ انسان اللہ کی اقدار اور پیمانوں کو نہیں اپنا لیتا اس لئے کہ یہ اقدار اور پیمانے غیر متبدل ہوتے ہیں اور ان کے اندر کبھی انحراف نہیں ہوتا -

جو لوگ آج کے دور میں ہدایات اللہ سے لیتے ہیں' ان کو دور جدید کی جاہلیت گمراہ کہتی ہے اور جو شخص جاہلیت جدید سے ہدایت اخذ کرے ' مغربی تہذیب کے گندے نالے میں گر جائے اور اس کریہہ ماحول میں اتر آئے اسے وہ ہدایت یافتہ اور ترقی یافتہ کہتے ہیں -

آج جو عورت اپنے گوشت کو ننگا نہیں کرتی ' اپنے جسم کو عریاں نہیں کرتی ' اور جو اس پست حالت کو قبول نہیں کرتی اس کے بارے میں جدید جاہلیت کیا کہتی ہے ؟ یہ دنیا جدید دور کی اس پاک و صاف اور صالح عورت کو رجعت پسند کہتی ہے اسے پسماندگی اور دیہاتی پن کا طعنہ دیا جاتا ہے اور جاہلیت جدید نے اپنے پورے ذرائع ابلاغ اور میڈیا کو اس مقصد کے لئے مصروف کر رکھا ہے کہ وہ ہماری عورت کی اس پاکیزگی ' نظافت اور سربلندی کو ختم کر کے اسے جنسیت کے اس گندے تالاب میں گرا دے جو نہایت ہی کریہہ المنظر ہے -

جن لوگوں کی ترجیحات کھیل کود سے بلند ہیں ' جو فلموں ' سینماؤں اور ٹیلی ویژن کے جنون سے سربلند ہیں اور جو لوگ رقص و سرود اور جام وسبو کی فحاشیوں اور عیاشیوں سے اپنے آپ کو دور رکھنا چاہتے ہیں ' یہ جاہلیت ان کے بارے میں کیا کہتی ہے ؟ یہ کہتی ہے کہ یہ لوگ جامد اور کوڑمغز ہیں ' اپنے آپ میں گم ' غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ ہیں - یہ جاہلیت ہر وقت اسی کام میں لگی ہوئی ہے کہ وہ تمام لوگوں کو اس گندگی میں ڈال دے اور لوگ سب کے سب عیاشی اور فحاشی میں زندگی بسر کریں - غرض جاہلیت ہر دور میں جاہلیت ہوتی ہے - وہ اشکال و ظروف تو بدلتی ہے مگر اس کی ماہیت وہی رہتی ہے -

حضرت نوح علیہ السلام ان کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ گمراہ نہیں ہیں - وہ ان کے سامنے اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی دعوت کیا ہے اور اس دعوت کا سرچشمہ کیا ہے ؟ یہ کہ انہوں نے اپنی سوچ اور فکر سے اس دعوت کو نہیں شروع کیا نہ ان کی یہ ذاتی خواہش ہے - وہ تو رب العالمین کے رسول ہیں اور حامل رسالت ہیں - وہ نہایت ہی امانت و دیانت سے اللہ کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق نصیحت کرتے ہیں اور وہ جو تعلیمات دیتے ہیں وہ بھی رب العالمین کی طرف سے ہیں - یہ تعلیمات ان کے قلب پر اترتی ہیں اور یہ کہ ان کا رب العالمین کے ساتھ مسلسل رابطہ ہے جبکہ تم

لوگ اللہ کے ساتھ رابطہ نہیں رکھتے۔

(قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِىْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (٦١) اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّىْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (٦٢) (٧: ٦١-٦٢))

"نوح ؑ نے کہا "اے برادران قوم، میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں، تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، تمہارا خیرخواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں ہے۔"

یہاں سیاق قصہ میں ایک کڑی غائب ہے، رسول کی اس دعوت پر انہوں نے گویا اس تعجب کا اظہار کر دیا کہ اللہ نے انسانوں میں سے ایک شخص کو رسول بنا کر کس طرح بھیج دیا؟ اور یہ کہ کس طرح اللہ کا پیغام ایک شخص تک پہنچ جاتا ہے اور دوسرے لوگ اس پیغام کے آنے سے خبردار ہی نہیں ہوتے۔ واقعات کی اس کڑی کا اظہار آنے والی آیات سے ہوتا ہے۔

(اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (٧: ٦٣)) "کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمہیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ، اور تم پر رحم کیا جائے؟" اللہ کی جانب سے کسی ایک شخص کو پیغامبری کے لئے چن لینا اگرچہ تعجب خیز ہے لیکن حضرت انسان کی پوری شان ہی نرالی ہے۔ یہ تو جہانوں کے ساتھ معاملات کرتا ہے، ان سے مربوط ہے۔ دوسری جانب یہ اللہ کے ساتھ بھی جڑا ہوا ہے، کیونکہ اللہ نے خود اس کے جسم میں روح اور زندگی پھونکی ہے، لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی انسان کو رسول بناتا ہے اور اس کام کو اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کس کو اس منصب کے لئے منتخب کرے تو یہ انسان پھر اللہ سے براہ راست ہدایت اخذ کرتا ہے، اس لئے کہ اللہ نے اس کے جسم کے اندر یہ استعداد اور قابلیت رکھ دی ہوتی ہے۔ یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے انسان، انسان ہے اور اسی وجہ سے وہ خالق کائنات کے ہاں معزز اور مکرم ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح فرماتے ہیں "تاکہ وہ تمہیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور پھر تم پر رحم کیا جائے۔" رسول کا مشن یہ ہے کہ لوگوں کو ڈرایا جائے اور ان کے دل دہل جائیں اور وہ تقویٰ کے لئے آمادہ ہوں اور آخر کار رحمت خداوندی سے بہرہ ور ہوں۔ اس سے زیادہ حضرت نوح ؑ کا کوئی اور مقصد نہ تھا۔ یہی وہ بلند اور اعلیٰ نصب العین ہے جس کے لئے حضرت نوح ؑ کام کر رہے تھے۔

لیکن انسان کی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ جب وہ ایک معین حد سے گزر جائے تو وہ پھر غور و فکر اور سوچ سے کام نہیں لیتی اور اس کے لئے انذار اور نصیحت آموزی نفع بخش نہیں رہتی۔

(فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِى الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ (٧: ٦٤)) "مگر انہوں نے اس کو جھٹلا دیا۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو

ایک کشتی میں نجات دی اور ان لوگوں کو ڈبو دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا' یقیناً وہ اندھے لوگ تھے ۔"

ہم نے دیکھا کہ انہوں نے مخلصانہ نصیحت اور حقیقی خطرے سے ڈراوے کو قبول نہ کیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں ۔ اسی وجہ سے انہوں نے تکذیب کی اور اسی وجہ سے وہ اس انجام تک پہنچے جس کا ذکر قرآن کر رہا ہے ۔

---ooo---

اب تاریخ کی گاڑی ذرا اور آگے بڑھتی ہے اور قرآن اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے ۔ ہم اب حضرت ہود کی قوم عاد کے سامنے ہیں۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا
اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۚ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٦٥﴾ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ
كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ
الْكَاذِبِينَ ﴿٦٦﴾ قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ
الْعَالَمِينَ ﴿٦٧﴾ أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ ﴿٦٨﴾ أَوَعَجِبْتُمْ أَن
جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ ۚ وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ
خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً ۖ فَاذْكُرُوا آلَاءَ
اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ وَنَذَرَ مَا كَانَ
يَعْبُدُ آبَاؤُنَا ۖ فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٧٠﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ
عَلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ ۖ أَتُجَادِلُونَنِي فِي أَسْمَاءٍ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ
وَآبَاؤُكُم مَّا نَزَّلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ ۚ فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ ﴿٧١﴾
فَأَنجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا
۹
۸ ع وَمَا كَانُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٧٢﴾
16

"اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا

تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز کرو گے؟" اس کی قوم کے سرداروں نے' جو اس کی بات ماننے سے انکار کر رہے تھے' جواب میں کہا "ہم تو تمہیں بے عقلی میں مبتلا سمجھتے تھے اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو۔" اس نے کہا "اے برادران قوم' میں بے عقلی میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں' تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں' اور تمہارا ایسا خیر خواہ ہوں جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ وہ تمہیں خبردار کرے؟ بھول نہ جاؤ کہ تمہارے رب نے نوح ﷺ کی قوم کے بعد تم کو اس کا جانشین بنایا اور تمہیں خوب تنومند کیا' پس اللہ کی قدرت کے کرشموں کو یاد رکھو' امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔" انہوں نے جواب دیا "کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ ہی کی عبادت کریں اور انہیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں؟ اچھا تو لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو سچا ہے۔" اس نے کہا "تمہارے رب کی پھٹکار تم پر پڑ گئی اور اس کا غضب ٹوٹ پڑا۔ کیا تم مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں' جن کے لئے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ اچھا تو تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔" آخر کار ہم نے اپنی مہربانی سے ہود اور اس کے ساتھیوں کو بچا لیا اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جو ہماری آیات کو جھٹلا چکے تھے اور ایمان لانے والے نہ تھے۔"

یہ وہی رسالت اور وہی پیغام بری ہے۔ وہی معاملہ اور وہی انجام ہے۔ وہی سنت الٰہیہ ہے جو جاری و ساری ہے اور وہی قانون الہی ہے جس کے مطابق یہ کائنات قائم ہے۔ ایک ہی قانون ہے اور ایک ہی ضابطہ ہے۔

قوم عاد حضرت نوح کی اولاد میں سے ہے' یا ان لوگوں کی اولاد میں سے ہے جو آپ کے ساتھ کشتی میں سوار تھے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ ان کی تعداد تیرہ تھی' ظاہر ہے کہ یہ سب لوگ دین نوح علیہ السلام کے پیرو تھے اور نوح علیہ السلام کا دین' دین اسلام تھا۔ یہ صرف اللہ وحدہ کو پکارتے تھے اور وہ اللہ کے سوا اپنے لئے کسی اور کو الٰہ نہ بناتے تھے' ان کا عقیدہ یہی تھا کہ اللہ ہی رب العالمین ہے' اور حضرت نوح نے انہیں یہی تعلیم دی تھی۔ وَلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۷: ۶۷) "میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں۔" لیکن جب طویل زمانہ گزر گیا اور یہ لوگ زمین کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے تو شیطان نے انہیں اچھی طرح گمراہ کر دیا اور انہیں اپنی خواہشات اور شہوات کے مطیع بنا دیا اور انسان کی سب سے بڑی خواہش ملکیت اور ساز و سامان کی خواہش ہوتی ہے۔ اور یہ مال و دولت اور ساز و سامان وہ شریعت کے قانون کے علی الرغم جمع کرتے ہیں' تو اس وجہ سے حضرت ہود کی قوم عاد نے اس دعوت کو بہت ہی ناپسندیدہ سمجھا کہ وہ اب صرف اللہ کی بندگی اور اطاعت کریں۔

(وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ

(۷: ۶۵)) "اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کرو گے۔"

اور یہ وہی بات ہے جو اس سے قبل حضرت نوح نے کہی تھی' اور جس پر قوم نوح نے ان کی تکذیب کی تھی اور اس کے نتیجے میں ان پر جو عذاب آیا وہ معلوم ہے۔ حضرت نوح کے بعد اللہ تعالیٰ نے قوم عاد کو زمین پر خلیفہ بنایا تھا۔ یہاں

قرآن کریم نے قوم عاد کے مسکن کی نشاندہی نہیں فرمائی لیکن دوسری سورتوں میں یہ تصریح آئی ہے کہ یہ احقاف میں تھے۔ یہ یمامہ اور حضرموت کے درمیان بڑے بڑے ٹیلے ہیں۔ غرض یہ لوگ اسی راہ پر چل نکلے جس پر اس سے قبل قوم نوح چل رہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے نہ تو نصیحت پر کان دھرا اور نہ ہی واقعات نوح سے عبرت پکڑی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ہود اپنے خطاب میں مزید یہ بھی کہتے ہیں کیا تمہیں اللہ کا خوف نہیں ہے؟ یہ ان کے رویے پر نکیر ہے' اور انہیں اس خوفناک انجام بد سے ڈرایا جا رہا ہے۔

غرض اس قوم کے سرداروں کو یہ بات بہت ہی ناگوار گزری کہ ان میں سے ایک عام آدمی اٹھ کر انہیں ڈرائے اور یہ بتائے کہ وہ خدا سے نہیں ڈرتے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ یہ شخص نہایت ہی احمق اور سفیہ ہے' اپنی حدود سے آگے بڑھ رہا ہے اور ہمارے مقام و منصب کا صحیح خیال نہیں رکھ رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے نبی کی طرف یہ باتیں منسوب کیں کہ وہ احمق اور جھوٹے ہیں اور اس قسم کے الزام لگانے میں انہوں نے ذرہ بھر شرم محسوس نہ کی۔

(قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ

(۷ : ٦٦)) "اس کی قوم کے سرداروں نے' جو اس کی بات ماننے سے انکار کر رہے تھے' جواب میں کہا "ہم تو تمہیں بے عقلی میں مبتلا سمجھتے ہیں اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو۔" یہ تھا ان اکابرین کا جواب جو محض ایک مذاق تھا اور تدبر اور دلیل سے خالی تھا۔ حضرت کا جواب یہ تھا :

(قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۶۷) اُبَلِّغُكُمْ

رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ (٦٨) (۷ : ٦٧ - ٦٨)) "اس نے کہا "اے برادران قوم' میں بے عقلی میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں' تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں' اور تمہارا ایسا خیر خواہ ہوں جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔" آپ نے بڑی سچائی اور سنجیدگی سے اس بات کی نفی کی کہ وہ بے وقوف یا سفیہ ہیں۔ اسی طرح آپ نے اس بات کی نفی بھی کی کہ آپ گمراہ ہیں' اس لئے کہ حضرت نوح کی طرح آپ نے بھی انہیں بتا دیا تھا کہ ان کے پیغام کا سرچشمہ کیا ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟ یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ ناصح امین ہیں اور یہ بات انہوں نے نہایت ہی درد بھرے لہجے میں ان سے کہی' نہایت ہی سچائی اور صفائی کے ساتھ۔

یہاں یہ بات لازمی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ حضرت ہود ؑ کی قوم نے آپ کے نظریات پر تعجب کیا' جس طرح اس سے قبل حضرت نوح ؑ کی قوم نے تعجب کیا تھا کہ کس طرح اللہ عام انسانوں میں سے کسی کو نبی چن سکتا ہے اور رسول بنا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت ہود ؑ بھی وہی بات دہراتے ہیں جو حضرت نوح ؑ نے کی تھی۔ یوں نظر آتا ہے کہ ان دونوں شخصیتوں کی روح ایک ہے' صرف اجسام میں اختلاف ہے۔

(اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِیُنْذِرَكُمْ (۷ : ٦٩))

"کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ وہ تمہیں خبردار کرے؟" اس کے بعد وہ ان کو اس صورت حال کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو ان کی واقعی صورت حال سے واضح تھی کہ اللہ نے قوم نوح کے بعد ان کو خلافت فی الارض کا منصب عطا فرمایا تھا' ان کو جسمانی قوت دی تھی اور پہاڑوں میں بسنے والوں کی طرح وہ جسمانی توانائی رکھتے تھے نیز سیاسی اور سماجی اعتبار سے بھی ان کو زمین میں اقتدار دیا گیا تھا۔

(وَاذْكُرُوْا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً

فَاذْكُرُوْا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۷ : ۶۹)) "بھول نہ جاؤ کہ تمہارے رب نے نوح کی قوم کے بعد تم کو اس کا جانشین بنایا اور تمہیں خوب تنومند کیا' پس اللہ کی قدرت کے کرشموں کو یاد رکھو' امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔" انہیں زمین میں جو اقتدار اعلیٰ عطا کیا گیا تھا اور جو جسمانی توانائی عطا ہوئی تھی اس کی وجہ سے ان کا فرض یہ تھا کہ وہ ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے اور اللہ کی پکڑ سے ڈرتے اور اس برے انجام سے خوف کھاتے جو ان سے پہلے آنے والی اقوام کا ہوا۔ اس لئے کہ انہوں نے اللہ سے ایسا کوئی عہد تو نہیں کیا تھا کہ اللہ کی سنت کا اجراء ان پر نہ ہو گا۔ کیونکہ اللہ کی ناقابل تغیر سنت میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی ہے اور وہ اس کائنات میں اللہ کے جاری کردہ ضابطے کے مطابق چلتی رہتی ہے۔ نعمتوں کے ذکر سے یہ اشارہ کرنا مطلوب ہے کہ ان پر اللہ کا شکر ادا کیا جائے اور شکر ادا کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان نعمتوں کے اسباب کو قائم و دائم رکھا جائے کیونکہ دنیا و آخرت کی کامیابی اسی میں ہوتی ہے۔

لیکن جب انسان کی فطرت میں فساد اور انحراف پیدا ہو جاتا ہے تو پھر وہ غور و فکر اور تدبر سے کام نہیں لیتا' چنانچہ یہ دعوت سن کر وہ آمادہ انکار و سرکشی ہو گئے اور برے طرز عمل کو اپنانے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے اب بات کو کاٹ کر مکالمہ ہی بند کر دیا اور جلد ہی نزول عذاب چاہنے لگے' ان کے لئے نصیحت بوجھل بن گئی اور ڈراوے کے ساتھ وہ مذاق کرنے لگے۔

(قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ

مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۷ : ۷۰)) "انہوں نے جواب دیا "کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ ہی کی عبادت کریں اور انہیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں؟ اچھا تو لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے۔ اگر تو سچا ہے۔" یہ روایات اور ان کے موجودہ حالات کی ذلت آمیز غلامی کی ایک تصویر ہے۔ انسان کے دل و دماغ حالات کے اسیر ہیں۔ یہ ایسی غلامی اور قید ہے جس میں انسان سے اس کے اعلیٰ ترین خصائص گم ہو جاتے ہیں۔ وہ آزادانہ غور و فکر سے محروم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ لوگ بھی آزادی رائے اور آزادی اعتقاد کے حق سے محروم ہو گئے۔ نظر آتا ہے کہ یہ لوگ اپنی عادات و رسومات کے غلام ہیں۔ تقلید آباء ان پر حکمران ہے اور ذاتی خواہشات اور شہوات نفسانیہ کے وہ اسیر ہیں اور ان لوگوں نے اپنے اوپر علم و معرفت اور روشنی کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں۔

ان کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ وہ سچائی سے فرار اختیار کرنے کے لئے خودکشی پر آمادہ ہیں اور عذاب کو جلدی سے دیکھنا

چاہتے ہیں۔ وہ یہ سوچنا ہی نہیں چاہتے کہ وہ کس قدر حماقت میں مبتلا ہیں اور جہالت کے اسیر ہیں۔ چنانچہ اپنے ناصح اور امین نبی کو کہتے ہیں "اگر تم سچے ہو تو وہ عذاب لے آؤ جس سے ہمیں ڈراتے ہو؟" اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت ہی جلد انہیں اپنے رسول کی طرف سے دوٹوک جواب دلواتے ہیں۔:

(قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (۷ : ۷۱)) "اس نے کہا "تمہارے رب کی پھٹکار تم پر پڑ گئی اور اس کا غضب ٹوٹ پڑا۔ کیا تم مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں' جن کے لئے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ اچھا تو تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔" حضرت ہودؑ نے انہیں اس انجام بد سے خبردار کر دیا جس کی اطلاع انہیں ان کے رب نے دی تھی اور جس کا فیصلہ ان کے بارے میں ہو چکا تھا اور اب وہ عذاب ٹلنے والا نہ تھا۔ یہ اللہ کا غضب تھا اور اللہ کا غضب جس پر آجائے وہ کبھی ٹلتا نہیں۔ پھر کہا کہ تم تو جلدی عذاب چاہتے ہو لیکن اپنے معتقدات پر غور نہیں کرتے کہ وہ کس قدر بودے تصورات ہیں لیکن عذاب جلدی چاہتے ہو۔ "کیا تم مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں جن کے لئے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔"

تم نے اللہ کے ساتھ جو شریک ٹھہرائے ہوئے ہیں وہ تو محض نام ہی نام ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور یہ نام تم نے اور تمہارے باپ دادا نے از خود گھڑ لئے ہیں۔ محض اپنی طرف سے' اللہ کی طرف سے اس پر تو کوئی سند نازل نہیں ہوئی۔ نہ اللہ نے اس کی اجازت دی اور نہ تمہارے پاس کوئی دلیل و برہان ہے۔

قرآن کریم اس ضمن میں بار بار یہ کہتا ہے کہ "جس کے لئے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے"۔ یہ تعبیر ایک عظیم حقیقت کا اظہار کر رہی ہے۔ یعنی ہر وہ بات' ہر وہ قانون' ہر وہ رواج غرض ہر وہ فکر و تصور جس کی پشت پر اللہ کی جانب سے کوئی برہان نہ ہو' وہ بے حقیقت' ہلکا' بے اثر' زائل ہونے والا اور کالعدم ہے اور انسانی فطرت ایسی چیز کو ہلکا تصور کرتی ہے۔ لیکن جب کوئی بات منجانب اللہ ہوتی ہے تو وہ بھاری' نافذ العمل اور گہری ہوتی ہے اس لئے کہ اس کی پشت پر اللہ کی دلیل ہوتی ہے۔

دنیا میں ہم نہایت ہی زرق و برق الفاظ سنتے ہیں' بے شمار مذاہب و نظریات پڑھتے ہیں' بے شمار کھوٹے اور بے حقیقت تصورات دیکھتے ہیں اور بے شمار رسومات اور عادات کو دیکھتے ہیں۔ جنہیں دنیا والوں کے لئے مزید مستحکم کیا جاتا ہے لیکن جب اللہ کا کلمہ آتا ہے تو یہ تمام چیزیں برف کی طرح پگھل جاتی ہیں اس لئے کہ اللہ کے کلمے کے اندر ایسی قوت و حرارت ہوتی ہے کہ اس کی تپش تو یہ چیزیں برداشت ہی نہیں کر سکتیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ہود نہایت ہی اہتمام' وثوق' اطمینان اور چیلنج کے انداز میں جواب دیتے ہیں۔ "اچھا تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔"

جو لوگ بھی اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں' ان کے اندر یہ اطمینان اور قوت ہوتی ہے' انہیں یقین ہوتا ہے کہ باطل

کمزور ' ہلکا اور بے وزن ہوتا ہے - اگرچہ بظاہر وہ پھولا ہوا نظر آئے ' اگرچہ بہت عظیم نظر آئے - داعی کو یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کی پشت پر سچائی کی قوت ہے اور اس کو تائید ایزدی حاصل ہے - چنانچہ مزید انتظار کئے بغیر کہا جاتا ہے -

(فَاَنْجَیْنٰهُ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ (۷ : ۷۲)) "آخر کار ہم نے اپنی مہربانی سے ہود اور اس کے ساتھیوں کو بچا لیا اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جو ہماری آیات کو جھٹلا چکے تھے اور ایمان لانے والے نہ تھے -" یہ ہے وہ حقیقت جس سے کوئی بھی بھاگ نہیں سکتا - کہا گیا کہ ہم نے ان کی جڑ کاٹ دی - (دابر) عربی میں اس آخری شخص کو کہا جاتا ہے جو قافلے کے آخری سرے میں ہوتا ہے - غرض جھٹلانے والوں کی تاریخ کا یہ دوسرا صفحہ بھی اب الٹ دیا جاتا ہے اور ایک بار پھر تاریخ دیکھتی ہے کہ جن لوگوں نے نصیحت سے استفادہ نہ کیا ان کا انجام کیا ہوتا ہے - ان لوگوں کی ہلاکت کی وہ تفصیلات یہاں نہیں دی گئیں جو قرآن کریم نے دوسرے مقامات پر دی ہیں ' لہٰذا ہم بھی اس سرسری نظر میں قرآن کے انداز کا اتباع کرتے ہوئے یہاں ہی رک جاتے ہیں اور مزید تفصیلات وہیں دیں گے جہاں اس قصے کی دوسری تفصیلات دی گئی ہیں -

---

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِی الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُیُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۝ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِیْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَ

قَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾

""اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا ""اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی کھلی دلیل آگئی ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے ایک نشانی کے طور پر ہے' لہٰذا اسے چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں چرتی پھرے۔ اس کو کسی برے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ ایک دردناک عذاب تمہیں آلے گا۔ یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اس کے ہموار میدانوں میں عالیشان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو۔ پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔""

اس کی قوم کے سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے' کمزور طبقہ کے ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے' کہا ""کیا واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح علیہ السلام اپنے رب کا پیغمبر ہے؟"" انہوں نے جواب دیا ""بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے اسے ہم مانتے ہیں۔"" ان بڑائی کے مدعیوں نے کہا ""جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اس کے منکر ہیں۔""

پھر انہوں نے اونٹنی کو مار ڈالا اور پورے تمرد کے ساتھ اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کر گزرے' اور صالح سے کہہ دیا کہ ""لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو واقعی پیغمبروں میں سے ہے۔"" آخر کار ایک دہلا دینے والی آفت نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔ اور صالح یہ کہتا ہوا ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ ""اے میری قوم' میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں نے تیری بہت خیر خواہی کی مگر میں کیا کروں کہ تجھے اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں ہیں۔""

قصہ انسانیت کی کتاب کا اب ایک اور صفحہ الٹا جاتا ہے۔ اس صفحہ میں تاریخ کے ناپیدا کنار سمندر کی گہرائیوں کی ایک عظیم لہر اٹھی ہے۔ انسانیت کی کشتی ایک بار پھر منحرف ہو کر پیچھے چلی گئی ہے اور اب وہ مکمل جاہلیت کے چنگل میں ہے۔ حق و باطل کے درمیان کشمکش کا ایک نیا منظر سامنے ہے اور مکذبین اور جھٹلانے والوں کی ایک نئی قتل گاہ منظر پر آنے والی ہے۔

(وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ

(۷۳:۷)) ""اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا ""اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔"" یہ وہی کلمہ ہے جس سے اس جہان کا آغاز ہوا اور اسی پر اس کا اختتام ہو گا۔ اعتقاد' طرز عمل اور نقطہ نظر کی وہی سمت ہے جو دعوت و تبلیغ میں اختیار کی جا رہی ہے۔ وہی انداز کلام و گفتگو ہے جو روز اول سے جاری ہے۔ تمام انبیاء کے ہاں یہی طرز تبلیغ ہے۔

ہاں یہاں ایک عنصر کا اضافہ ہے ۔ حضرت صالح کی دعوت کی پشت پر اب استدلال کے ساتھ ساتھ ایک معجزہ بھی نظر آتا ہے اور یہ معجزہ خود قوم ثمود کے مطالبے کے نتیجے میں اللہ کی قدرت کاملہ کا مظہر ہے اور حضرت صالح کی دعوت کی تصدیق و تائید کے لئے ہے ۔

(قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً (۷:۷۳)) ”تمہارے پاس تمہارے رب کی کھلی دلیل آگئی ہے ۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے ایک نشانی کے طور پر ہے ۔“ یہاں سیاق کلام سے اصل مطلوب یہ ہے کہ دعوت اسلامی اپنے اصولوں کے اعتبار سے ایک ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس پر جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا انجام کیا ہوتا ہے اور جو لوگ انکار کرتے ہیں اور اس دعوت کو جھٹلاتے ہیں ان کا حشر کیا ہوتا ہے ۔ اس لئے قصوں کی اہم اہم جھلکیاں دی گئی ہیں ۔ یہاں یہ تفصیل اس لئے نہیں دی گئی کہ انہوں نے اس طرح معجزے کا مطالبہ کیا اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے انہیں معجزہ دکھایا بلکہ صرف یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ان کو دعوت دی گئی اور اس کے بعد معجزہ دکھایا گیا ۔ ناقہ کے بارے میں بھی صرف اسی قدر کہا گیا کہ وہ اللہ کی جانب سے ایک نشانی تھی ۔ یہ اللہ کی ناقہ تھی اور ایک معجزہ تھی ۔ اس انداز کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک غیر معمولی ناقہ تھی یا اس ناقے کی پیدائش معجزانہ انداز میں ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ اللہ کی نشانی کہلائی ۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ”اللہ کی اونٹنی“ کے الفاظ سے پکارا گیا اور وہ نشانی تھی اس بات کی کہ حضرت صالح کی نبوت برحق ہے ۔ اس ناقہ کے بارے میں بس ہم اتنی ہی معلومات پر اکتفا کرتے ہیں جو یقینی ہیں اور اس قدر اشارات ہی ان روایات سے بہتر ہیں جو یقینی نہیں ہیں ۔ چنانچہ کہا جاتا ہے ۔

(فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۷:۷۳)) ”لہٰذا اسے چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں چرتی پھرے ۔ اس کو کسی برے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ ایک دردناک عذاب تمہیں آلے گا ۔“ یہ اللہ کی ناقہ ہے اور اسے اللہ کی زمین میں آزادانہ چرنے دو اور اگر تم نے اسے برے ارادے سے چھوا بھی تو تم پر عذاب الٰہی نازل ہو گا ۔

یہ معجزہ پیش کرنے اور اس نشانی کے بارے میں خبردار کرنے کے بعد حضرت صالح قوم کو نصیحت اور یاد دہانی شروع کر دیتے ہیں اور انہیں مشورہ دیتے ہیں کہ ان کی دعوت پر غور کرو اور ذرا انسانی تاریخ پر بھی نگاہ ڈالو ۔ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے دوسری اقوام کو ہلاک کر کے تمہیں مواقع دیئے ہیں ۔

(وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِی الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (۷:۷۴)) ”یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اس کے ہموار میدانوں میں عالیشان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں

تراشتے ہو۔ پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔" یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ قوم ثمود کا مسکن کہاں تھا؟ لیکن دوسری سورہ میں ہے کہ یہ الحجر میں رہتے تھے' جو حجاز اور شام کے درمیان کا علاقہ ہے' حضرت صالح ان کو یاد دلاتے ہیں کہ ذرا دیکھو کہ اللہ نے تم پر کس قدر انعام کیا ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین پر نہایت ہی ترقی یافتہ اور سیاسی اعتبار سے ایک قوت تھے۔ ان کے جغرافیہ کی طرف جو اشارہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں پہاڑ بھی تھے اور ہموار علاقے بھی تھے۔ وہ ہموار علاقوں میں عالیشان محل بناتے تھے اور پہاڑوں کو بھی تراش کر مکانات بناتے تھے۔ گویا اس مختصر آیت میں ان کی تہذیب اور ان کے تمدن کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ حضرت صالح یہ بھی بتاتے ہیں کہ عاد کے بعد قوم ثمود کو عروج حاصل ہوا۔ اگرچہ یہ لوگ قوم عاد کی سرزمین میں نہ رہتے تھے۔ ہاں یہ حقیقت واضح ہے کہ وہ عاد کی تہذیب کے بعد نمودار ہونے والی تہذیب کے حامل تھے اور حجر سے باہر بھی دور دراز علاقوں تک ان کی مملکت پھیلی ہوئی تھی۔ اس طرح وہ خلیفۃ اللہ فی الارض کے منصب پر فائز تھے اس لئے حضرت صالح ان کو نصیحت کرتے ہیں کہ تمہارا کام فساد فی الارض نہیں ہے اور تمہیں اپنی شان و شوکت پر غرور نہیں کرنا چاہئے۔ تمہیں چاہیے کہ ذرا پچھلی اقوام کے انجام کو نگاہ میں رکھو۔

یہاں سیاق قصہ میں ایک دوسرا خلا بھی ہے جس کا ذکر نہیں ہوا' یہ کہ حضرت صالح کی دعوت کو بعض لوگوں نے قبول کر لیا اور یہ مطیع فرمان لوگ تھے اور بعض لوگوں نے تکبر کر کے اسے رد کر دیا۔ کسی علاقے کے بااثر لوگ ہمیشہ دعوت اسلامی کو سب سے آخر میں قبول کرتے ہیں کیونکہ اس دعوت کا منشا یہ ہوتا ہے کہ تمام لوگ اپنی بڑائیاں اور خدائیاں چھوڑ کر صرف اللہ واحد کو بڑا اور بادشاہ تسلیم کر لیں جو رب العالمین ہے۔ اس سے قبل یہ بڑے لوگ ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ جن ضعفاء نے اپنی گردنوں سے طاغوت کی غلامی کا جوا اتار پھینکا ہے اور اللہ کے سوا تمام غلامیوں سے آزاد ہو گئے ہیں ان پر تشدد کریں ...... چنانچہ حضرت صالح کی قوم کے بڑے اور بااثر لوگ ان ضعفاء پر تشدد کرتے ہیں جو ایمان لائے ہیں اور ان کے نئے قسم قسم کا فتنہ و فساد پیدا کرتے ہیں۔

(قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (۷: ۷۵)) "اس کی قوم کے سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے' کمزور طبقہ کے ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے' کہا "کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کا پیغمبر ہے۔" بااثر لوگوں کی طرف سے یہ سوال تہدید اور ڈرانے کے لئے کیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے اس بات کو بہت ہی برا سمجھا کہ یہ غریب لوگ بھی صالح کے جنبہ دار بن گئے ہیں اور یہ حضرت صالح کی تصدیق کر رہے ہیں؟

لیکن حقیقت یہ ہوتی ہے کہ ضعیف لوگ جب ایمان لے آتے ہیں تو وہ ضعیف نہیں رہتے۔ ایمان ان کے دلوں کو قوت اور جرأت سے بھر دیتا ہے۔ ان کے دلوں کے اندر اطمینان اور یقین پیدا ہو جاتا ہے' انہیں اپنے نظریات پر اعتماد ہوتا ہے' لہٰذا اب دنیا والوں کی تہدید و تخویف اور ڈراوے دھمکاوے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ نہ مذاق اور استہزاء کا ان پر اثر ہوتا ہے۔ اب وہ متکبرین کو خاطر میں نہیں لاتے اور ایمان کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اور جواب میں یہ متکبرین بھی تہدید آمیز لہجے میں یہ بتا دیتے ہیں کہ اچھا' ہم تو اس دعوت کا صاف صاف انکار کر رہے ہیں۔

(قَالُوْا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (۷۵) قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا اِنَّا بِالَّذِیْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ کٰفِرُوْنَ (۷۶)(۷:۷۵-۷۶)) "انہوں نے جواب دیا" بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے اسے ہم مانتے ہیں۔" ان بڑائی کے مدعیوں نے کہا "جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اس کے منکر ہیں۔" حالانکہ صالح علیہ السلام واضح دلائل لے کر آئے تھے' ان دلائل و معجزات کے بعد پھر شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ اکابرین قوم اس لئے انکار نہ کر رہے تھے کہ ان کے سامنے دلائل و معجزات کی کوئی کمی تھی بلکہ وہ اس لئے منکر تھے کہ وہ ایک ایسے نظام مملکت کو تسلیم نہ کرنا چاہتے تھے جس میں صرف رب العالمین کی اطاعت ہوتی ہو۔ مسئلہ حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے دل میں حاکمیت و اقتدار کی ایک اعلیٰ اور گہری خواہش پائی جاتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے شیطان انسان پر حملہ آور ہوتا ہے۔

چنانچہ انہوں نے قولی انکار کے بعد کافرانہ کاروائی کی اور اللہ کی اس ناقہ پر دست درازی کی جو درحقیقت نبی وقت کی تائید کے لئے بطور معجزہ لائی گئی تھی اور جس کے بارے میں نبی وقت نے' قبل از وقت ان کو متنبہ کر دیا تھا کہ وہ اس پر دست درازی سے باز رہیں ورنہ وہ ایک دردناک عذاب سے دوچار ہوں گے۔

(فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا یٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ کُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (۷:۷۷)) "پھر انہوں نے اس اونٹنی کو مار ڈالا اور پورے تمرد کے ساتھ اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کر گزرے اور صالح سے کہہ دیا کہ "لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے' اگر تو واقعی پیغمبروں میں سے ہے۔" معصیت اور نافرمانی کے بعد یہاں ان کی خودسری بھی عیاں ہے۔ یہاں ان کی معصیت اور خودسری کے لئے لفظ "عتو" استعمال ہوا ہے تاکہ ان کی نفسیاتی حالت کی تصویر بھی اچھی طرح سامنے آجائے جس کی وجہ سے وہ عذاب کے نزول کا مطالبہ کرتے ہیں اور پیغمبر کو حقیر جانتے ہیں۔ بغیر کسی تاخیر کے اب ان کے خاتمے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔

(فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ (۷:۷۸)) "آخرکار ایک دہلا دینے والی آفت نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔" چنانچہ دہلا دینے والی مصیبت آگئی اور اس کے نتیجے میں ان کو اوندھا اس لئے گرایا گیا تاکہ ان کی اکڑ اور سرکشی کے لئے مناسب سزا ان کو دے دی جائے' کیونکہ کڑک اور جھنجوڑنے کے نتیجے میں وہ خوفزدہ ہوئے اور بے حس و حرکت اوندھے منہ گرے۔ ان کی یہ حالت ان کی سرکشی اور اکڑ کے لئے مناسب سزا تھی۔ الفاظ کی نفسیاتی تصویرکشی قابل دید ہے۔

اب ان کو اسی طرح اوندھے پڑے چھوڑ کر بات کا رخ حضرت صالح کی طرف مڑ گیا' جس کی انہوں نے تکذیب کی تھی اور چیلنج دیا تھا۔ آپ کا تبصرہ یہ رہا۔

(فَتَوَلّٰی عَنْهُمْ وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ وَلٰکِنْ لَّا

تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ (۷: ۷۹)) اور صالح یہ کہتا ہوا ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ "اے میری قوم' میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں نے تیری بہت خیر خواہی کی' مگر میں کیا کروں کہ تجھے اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں ہیں۔" یہ شہادت دے دی گئی کہ حضرت صالح نے پیغام پوری طرح پہنچا دیا تھا اور سرکشی اور نافرمانی کر کے انہوں نے خود اپنے آپ کو اس انجام کا مستحق بنایا تھا۔ یہاں مکذبین کی تاریخ کا ایک دوسرا صفحہ لپیٹ دیا جاتا ہے اور کسی ڈرانے والے کی توہین و تکذیب کرنے والے برے انجام کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

---○○○---

اب تاریخ کی گاڑی آگے بڑھتی ہے اور ہم عہد ابراہیم علیہ السلام میں پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن یہاں حضرت ابراہیم کا قصہ بیان نہیں کیا جاتا کیونکہ یہاں ان سرکش نافرمانوں کا ذکر مطلوب ہے جنہیں ہلاک کر دیا گیا۔ یہ اس آیت اور موضوع کی تفصیل ہے جسے آغاز سورت میں لایا گیا تھا۔

(وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا) "کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کیا)۔ یہ قصص گویا اس موضوع کی تفصیلات کے طور پر آ رہے ہیں جبکہ قوم ابراہیم کو ہلاک نہ کیا گیا چونکہ حضرت ابراہیم نے اللہ سے ان کی ہلاکت کے لئے کوئی مطالبہ نہ کیا تھا بلکہ حضرت ابراہیم نے ان کو اور ان کی بت پرستی کو چھوڑ کر ان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ اس لئے یہاں قصہ لوط کو لایا جاتا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم کے بھتیجے تھے اور آپ کے معاصر تھے۔ اس قصے میں بھی ڈراوا ہے' اور لوگوں کی طرف سے تکذیب ہے اور انجام میں قوم کی ہلاکت ہے اور یہ اس سلسلہ قصص اور موضوع سے مناسبت رکھتا ہے۔

وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۝ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ۝ وَ مَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ۝ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖؗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ۝ وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ۝

"اور لوط کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا' پھر یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا "کیا تم ایسے بے حیا ہو گئے کہ وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔" مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ "نکالو ان لوگوں کو

اپنی بستیوں سے ’ بڑے پاکباز بنتے ہیں۔‘‘ آخر کار ہم نے لوط اور اس کے گھر والوں کو نجات دی بجز اس کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی ....... بچا کر نکال دیا اور اس قوم پر برسائی ایک بارش ‘پھر دیکھو کہ ان مجرموں کا کیا انجام ہوا؟

قصہ لوط میں انسانی فطرت کے ایک ایسے بگاڑ کا ذکر ہے جس کی مخصوص نوعیت ہے۔ سابقہ قصص میں تو اقوام کی ہلاکت نہایت ہی اساسی نظریہ حیات یعنی عقیدۂ توحید اور وحدت حاکمیت اللہ کے مسئلے پر ہوتی تھی۔ لیکن فطرت کا یہ بگاڑ بھی نہایت ہی اساسی مسئلہ تھا اور یہ عقیدہ توحید اور مسئلہ حاکمیت سے متعلق تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ربوبیت اور عبودیت کے اقرار کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ قرآن و سنت کی مکمل اطاعت کی جائے۔ سنت الہیہ یہ ہے کہ اللہ نے مرد اور عورت کو علیحدہ اصناف میں پیدا کیا اور مرد اور عورت کے اتصال کو ایسا ذریعہ بنایا جس کے نتیجے میں وہ ایک دوسرے کے لئے ذریعہ تکمیل ثابت ہوئے اور اس طرح نسل انسانی کے اجراً و امتداد کا سامان فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے دونوں اصناف کے وظائف مقرر کر کے انہیں ایک دوسرے کے لئے مناسب جسمانی اور نفسیاتی اہلیت دی اور باہم ملاپ سے نسل انسانی کی بقا کا انتظام فرمایا۔ پھر اس ملاپ کے اندر دونوں کے لئے گہری لذت ودیعت کی اور اسے ایک فطری لذت قرار دیا تاکہ وہ دلکشی اور کشش کے ساتھ باہم ملیں اور بقائے نسل انسانی کی ذمہ داریاں قبول کریں اور اس راہ میں آنے والی تمام مشکلات کو بھی برداشت کریں۔ حمل ‘وضع حمل اور بچوں کی پرورش اور رضاعت ‘نفقہ اولاد و اہلیہ اور تربیت اولاد کی ذمہ داریاں اور کفالت اور اس کے بعد پورے خاندان کے افراد کی باہم ذمہ داریاں۔ باوجود اس کے کہ دوسرے حیوانات کے مقابلے میں انسانی بچوں کی نشوونما اور تربیت کا عمل نہایت ہی طویل اور صبر آزما ہوتا ہے۔

یہ فریضہ چونکہ نہایت ہی اساسی اور بنیادی فریضہ ہے اور اس کے سوا نسل انسانی کی بقا ممکن نہیں۔ اس لئے اس فریضے کے اندر انحراف کو بھی ایک اساسی جرم قرار دیا گیا جس طرح عقیدۂ توحید کے اندر ذرا بھر انحراف ناقابل برداشت ہے۔ اس لئے نظریہ حیات اور عقیدۂ توحید کے اندر انحراف اور ہم جنس پرستی کے انحراف کو ایک درجے کا جرم قرار دیا گیا۔

قوم لوط کے قصے میں انحراف واضح طور پر نظر آتا ہے۔ یہ فطرت سے انحراف ہے اور حضرت لوط ان سے کہتے ہیں کہ یہ ایک نئی اخلاقی بے راہ روی انہوں نے شروع کی ہے اور ان سے پہلے کسی قوم میں یہ اخلاقی فساد نہ تھا۔

(وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ
(۸۰) اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ

(۸۱) (۷: ۸۰ ـ ۸۱)) اور لوط ﷺ کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا‘ پھر یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا ‘‘کیا تم ایسے بے حیا ہو گئے کہ وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔‘‘

حضرت لوط ﷺ ان پر حد سے گزرنے کا جو الزام لگاتے ہیں اور اس پر ان کی سرزنش کرتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطرت سلیمہ کا جو نظام انسانوں کے لئے وضع کیا ہے اس سے آگے گزر جانا اسراف ہے۔ پھر اللہ نے انہیں توالد و تناسل کے لئے جو قوتیں دی ہوئی ہیں ان کا صحیح مصرف یہ ہے کہ ان کو یہاں زندگی کی نشوونما کے لئے صرف کیا جائے

جبکہ وہ ان قوتوں کو بنجر زمین میں ضائع کر رہے ہیں اور محض عارضی لذت اور شہوت رانی کے لئے کام میں لاتے ہیں' حالانکہ شہوت اور لذت کا حصول بھی طبعی راہ سے ہونا چاہئے۔ اگر کوئی سنت الہیہ کے خلاف لذت کوشی کی سعی کرتا ہے تو اسے بے راہ روی' اور خلاف فطرت عمل تصور کیا جائے گا۔ مزید یہ کہ یہ عمل خلاف اخلاق بھی ہو گا' اس لئے کہ اسلامی اخلاق بھی فطری اخلاق ہوتے ہیں اور ان کے اندر کوئی فساد اور انحراف نہیں ہوتا۔

عورت کی نفسیاتی اور عضویاتی ساخت ایسی ہوتی ہے جس سے مرد کو حقیقی لذت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے بھی مقصد صرف حصول لذت نہیں ہوتا بلکہ اس ملاپ کے نتیجے میں رحمت اور نعمت بھی حاصل ہوتی ہے' اس طرح کہ اس ملاپ کے نتیجے میں سنت الہیہ کے مطابق سلسلہ حیات کی بقا کا انتظام ہو رہا ہے۔ رہا یہ کہ مرد اور مرد کے درمیان جو عضویاتی یکسانیت ہوتی ہے تو اس سے کوئی صحت مند لذت حاصل نہیں ہوتی بلکہ انسان کو اس میں گندگی کا احساس ہوتا ہے اس لئے فطرت سلیمہ اس ملاپ کو قبول نہیں کرتی۔

اس سلسلے میں انسان کے اعتقادات اور تصورات کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ آج کے دور میں یورپ میں جو جاہلیت مروج ہے' وہ اس جنسی بے راہ روی کو بڑی بے حیائی کے ساتھ پھیلاتی ہے اور یہ بے راہ روی محض نظریاتی بے راہ روی کے نتیجے میں ہے۔

ہمارے دور میں یہودی تمام غیر یہودی اقوام کو اخلاقی اعتبار سے برباد کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کے نشر و اشاعت کے ادارے رات اور دن کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ نظریاتی اور اخلاقی طور پر غیر یہودی اقوام کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ دعویٰ کرتے رہے کہ یہ جنسی انتشار اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ عورت پردہ کرتی ہے' لیکن واقعات اس کے برعکس بتاتے ہیں' اس لئے کہ یورپ و امریکہ کے اندر کسی مرد اور عورت کے ملاپ کے لئے کوئی ضابطہ یا کوئی قید نہیں ہے' بعینہٖ اسی طرح جس طرح بہائم بوقت ضرورت ملتے ہیں۔ لیکن ان کھلے معاشروں میں خلاف وضع فطرت فعل بھی دوسرے معاشروں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے بلکہ ہم جنس پرستی صرف مردوں کے اندر ہی نہیں عورتوں کے درمیان بھی یہ فعل رائج ہے۔ اگر کسی کو شبہ ہے تو وہ مسٹر کنزی کی کتابیں پڑھیں۔ "مردوں کے درمیان جنسی تعلقات" اور "عورتوں کے درمیان جنسی تعلقات"۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود یہ جھوٹے ذرائع ابلاغ اپنی اس جھوٹی بات کو دہراتے چلے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ فعل بد عورتوں کے پردے کی وجہ سے کسی سوسائٹی میں پھیلتا ہے۔ یہ پروپیگنڈہ وہ ان مقاصد کے لئے کرتے ہیں جن کا اظہار انہوں نے اکابرین یہود کے پروٹوکول میں کیا ہے۔ اب ذرا دوبارہ قرآنی قصے کی طرف آیئے اور سنئے کہ وہ اپنے نبی کو کیا جواب دیتے ہیں۔

(وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُم مِّن قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ (۷: ۸۲)) "مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ "نکالو ان لوگوں کو اپنی بستیوں سے' بڑے پاکباز بنتے ہیں یہ۔" عجیب بات ہے! جو پاکباز ہے اسے گاؤں سے نکالا جا رہا ہے اور گندے' غلیظ اور ناپاک لوگ بستیوں کے اندر رہنے کے مستحق بنتے ہیں لیکن یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ دور جدید کی جاہلیت یہی تو کر رہی ہے کیا یہ ان لوگوں کو مسترد نہیں کر رہی ہے جو پاکبازی اختیار کرتے ہیں اور ان گندگیوں میں اپنے آپ کو آلودہ نہیں کرتے۔ اس بات کو

وہ ترقی پسندی کہتے ہیں اور اسے عورت اور مرد کی آزادی کا نام دیتے ہیں۔ یہ جاہلیت آج کے دور میں ایسے پاکباز لوگوں پر رزق کے دروازے بند کر رہی ہے۔ ان کا زندہ رہنا اس نے مشکل کر دیا ہے۔ ان کی دولت کے ذرائع سکیڑ دیئے گئے ہیں' ان کے افکار و تصورات کو دبایا جاتا ہے۔ جاہلیت اس بات کو دیکھ ہی نہیں سکتی کہ کوئی پاکبازی اختیار کرے۔ کیونکہ اس جاہلیت کو صرف وہی لوگ قبول ہیں جو گندے' ناپاک اور برائیوں میں ملوث ہوں' پاک لوگوں کے لئے اس کا دل تنگ ہے۔ ہر دور میں جاہلیت کی ذہنیت یہی رہی ہے۔

چنانچہ ان کو جلدی اپنے انجام سے دوچار کر دیا جاتا ہے اور تمام دوسری تفصیلات کو یہاں چھوڑ دیا جاتا ہے۔

(فَاَنْجَیْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ (۸۳) وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِیْنَ (۸٤)(۷:۸۳-۸٤)) "آخر کار ہم نے لوط اور اس کے گھر والوں کو...... بجز اس کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی ..... بچاکر نکال دیا اور اس قوم پر برسائی ایک بارش 'پھر دیکھو کہ ان مجرموں کا کیا انجام ہوا۔" اللہ کے نافرمان اللہ کے بندوں کے لئے خطرہ بن گئے تھے 'تو اللہ نے اپنے بندوں کو نجات دی اور نافرمان طبقات اور فرمان برداروں کے درمیان نظریاتی تفریق کر دی گئی۔ حضرت لوط کی بیوی اگرچہ ان کی بیوی تھی لیکن وہ ہلاکت سے نہ بچ سکی کیونکہ اس کا نظریاتی اتحاد ان لوگوں کے ساتھ تھا جو ہلاک ہونے والے تھے۔

ان لوگوں کو سخت بارشوں نے آلیا اور ان بارشوں میں زبردست طوفان تھے 'یوں نظر آتا تھا کہ سب لوگ بارش میں غرق ہوگئے اور پانی اس طرح امڈ رہا تھا جس طرح موجیں اور یوں اس سرزمین کو ان ناپاک لوگوں سے پاک کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ روحانی طور پر ناپاک ہوگئے تھے اور گندگیوں میں آلودہ ہوگئے تھے۔ چنانچہ وہ گندگی میں زندہ رہے اور گندگی کے اندر ہی ان کو موت نے آلیا۔

----ooo----

اب تکذیب کرنے والی اقوام کی تاریخ کا آخری صفحہ الٹا جاتا ہے۔ یہ صفحہ اس دور کی اقوام میں سے قوم شعیب یعنی اہل مدین سے متعلق ہے۔

---

وَاِلٰى مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَیْلَ وَ الْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝۸۵ وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ

وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا
اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۠ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٨٦﴾ وَ
اِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا
فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿٨٧﴾

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿٨٨﴾
قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ۭ
وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ۭ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ
شَيْءٍ عِلْمًا ۭ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۭ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ
اَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿٨٩﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ
شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿٩٠﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ
جٰثِمِيْنَ ﴿٩١﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٩٢﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ
اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰي قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿٩٣﴾

"اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی صاف راہنمائی آگئی ہے، لہٰذا وزن اور پیمانے پورے کرو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو، اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے، اسی میں تمہاری بھلائی ہے اگر تم واقعی مومن ہو۔ اور (زندگی کے) ہر راستے پر رہزن بن کر نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوفزدہ کرنے اور ایمان لانے والوں کو خدا کے راستے سے روکنے لگو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔ یاد کرو وہ زمانہ جب کہ تم تھوڑے

تھے پھر اللہ نے تمہیں بہت کر دیا اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ دنیا میں مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے۔ اگر تم میں سے ایک گروہ اس تعلیم پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں' ایمان لاتا ہے اور دوسرا ایمان نہیں لاتا تو صبر کے ساتھ دیکھتے رہو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے' اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

اس کی قوم کے سرداروں نے جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے' اس سے کہا کہ "اے شعیب' ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں' اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہو گا۔" شعیب نے جواب دیا"کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں؟ ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے' اگر تمہاری ملت میں پلٹ آئیں جب کہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے۔ ہمارے لئے تو اس کی طرف پلٹنا اب کسی طرح ممکن نہیں الا یہ کہ خدا ہمارا رب ہی ایسا چاہے۔ ہمارے رب کا علم ہر چیز پر حاوی ہے' اسی پر ہم نے اعتماد کر لیا۔ اے رب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔"

اس کی قوم کے سرداروں نے' جو اس کی بات ماننے سے انکار کر چکے تھے آپس میں کہا"اگر تم نے شعیب کی پیروی قبول کر لی تو برباد ہو جاؤ گے۔" مگر ہوا یہ کہ ایک دہلا دینے والی آفت نے ان کو آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔ جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ ایسے مٹے کہ گویا کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے۔ شعیب کے جھٹلانے والے ہی آخر کار برباد ہو کر رہے اور شعیب یہ کہہ کر ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ "اے برادران قوم' میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اب میں اس قوم پر کیسے افسوس کروں جو قبول حق سے انکار کرتی ہے۔"

یہ قصہ دوسروں کے مقابلے میں قدرے طویل ہے' دوسرے قصص کی نسبت کیونکہ اس میں اسلامی نظریہ حیات کے علاوہ بعض دوسرے معاملات بھی موجود ہیں۔ اگرچہ اس میں بھی وہی طرز ادا اختیار کی گئی ہے جس طرح اس سے قبل دوسرے قصوں میں اختیار کی گئی ہے۔

(وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوْا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ

(۷: ۸۵)) "اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا"اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔" یہ دعوت اسلامی کا بنیادی عقیدہ ہے اور یہ ہر پیغمبر کی دعوت کا اساسی کلمہ اور شعار رہا ہے۔ ہر پیغمبر اس سے دعوت کا آغاز کر کے پھر دوسری تفصیلات میں جاتا ہے۔

(قَدْ جَآءَتْکُمْ بَیِّنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ (۷: ۸۵)) "تمہارے پاس تمہارے رب کی صاف رہنمائی آگئی ہے۔" سیاق کلام میں اس طرح شہادت اور راہنمائی کا ذکر نہیں ہے' جس طرح قصہ صالح میں شہادت کا ذکر موجود ہے۔ قرآن کی دوسری سورتوں میں بھی حضرت شعیب کی جانب سے کوئی معجزہ پیش کرنے کا ذکر نہیں ہوا لیکن یہاں اس آیت میں معجزے کی طرف اشارہ موجود ہے کہ حضرت شعیب نے بھی دوسرے انبیاء کی طرح کوئی معجزہ پیش کیا تھا۔ اس معجزے کے نتیجے میں اپنی قوم سے آپ کا مطالبہ یہ تھا کہ آپ ناپ اور تول میں کمی بیشی نہ کریں اور فساد فی الارض کے

تمام طریقوں سے بچیں نیز راہ زنی اور ڈاکہ زنی جیسے برے افعال سے باز رہیں۔ اور اہل دین کو محض ان کی دین داری کی وجہ سے فتنے میں نہ ڈالیں۔

(فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاۤءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۸۵) وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَاذْكُرُوْا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (۸۶)

(۷: ۸۵–۸۶)) ”لہٰذا وزن اور پیمانے پورے کرو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو، اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے، اسی میں تمہاری بھلائی ہے اگر تم واقعی مومن ہو۔ اور (زندگی کے) ہر راستے پر رہزن بن کر نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوفزدہ کرنے اور ایمان لانے والوں کو خدا کے راستے سے روکنے لگو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔ یاد کرو وہ زمانہ جب کہ تم تھوڑے تھے پھر اللہ نے تمہیں بہت کر دیا اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ دنیا میں مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے۔“ اس نہی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب کی قوم مشرک قوم تھی۔ وہ صرف اللہ وحدہ کی عبادت نہ کرتی تھی، وہ اللہ کے اقتدار اعلیٰ میں اللہ کے بندوں کو شریک کرتی تھی۔ یہ لوگ اپنے معاملات میں اللہ کے عادلانہ قانون کی پیروی نہ کرتے تھے بلکہ انہوں نے باہم معاملات طے کرنے کے لئے خود اپنی جانب سے قواعد گھڑ رکھے تھے۔ شاید اسی معاملے میں وہ شرک کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ بیع و شریٰ کے معاملات میں وہ بدمعاملہ تھے اور اس کے علاوہ فساد فی الارض، رہزنی اور ڈاکہ زنی کے معاملات بھی ان میں عام تھے۔ علاوہ ازیں جو لوگ دین دار اور پاکباز تھے ان کو بھی وہ ستاتے تھے اور اللہ کی سیدھی راہ سے انہیں روکتے تھے۔ اللہ کی راہ میں ہر قسم کی استقامت کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ غلط راہوں پر چلیں جس میں ان کے مالی مفادات تھے اور اسلامی نظام کو ترک کر دیں جس میں ان کا نقصان تھا۔

حضرت شعیب دعوت کا آغاز ہی اس کلمہ سے کرتے ہیں کہ صرف اللہ وحدہ کی بندگی اور غلامی کرو، اس کے اقتدار اعلیٰ کو دنیا میں قائم کرو اور زندگی کے تمام امور میں اس کے دین اور حکم کو نافذ کرو۔

حضرت شعیب اس اصولی اور بنیادی بات سے اپنی دعوت کا آغاز کرتے ہیں اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ زندگی کے تمام معاملات کا دارومدار اسی اصول پر ہے اور انسان کے اخلاق اور اس کا باہمی طرز عمل اسی قاعدے اور سرچشمے سے پھوٹتے ہیں اور جب تک یہ اصول قائم و استوار نہ ہو، انسان کا کوئی عمل قائم و استوار نہیں رہ سکتا۔

اللہ وحدہ کی بندگی کی دعوت اور اپنی پوری زندگی کو توحید کے جادۂ مستقیم پر قائم کرنے کی دعوت اور شریعت الٰہیہ کے نفاذ اور فساد فی الارض کو چھوڑنے کی دعوت کے ساتھ ساتھ ان کو حضرت شعیب اس طرف بھی متوجہ فرماتے ہیں کہ تم پر اللہ کا جو فضل و کرم ہے اور اس نے جو انعامات تم پر کیے ہیں ان پر اللہ کا شکر بجا لاؤ۔ ”یاد کرو وہ زمانہ جب تم تھوڑے تھے پھر اللہ

نے تمہیں بہت کر دیا۔" ...... اگر تم ان انعامات پر شکر ادا نہیں کرتے اور بدستور آمادۂ فساد رہنے پر مصر ہو تو پھر ........ "ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو کہ دنیا میں مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے۔"

حضرت شعیب چاہتے ہیں کہ ان کی قوم عدل و انصاف اور وسعت قلبی کا رویہ اختیار کرے۔ ان لوگوں کو فتنے میں نہ ڈالے جو ایمان لا کر اللہ کی ہدایت کے پیرو کار بن گئے ہیں اور جن کو اللہ نے اپنے دین کی طرف ہدایت کر دی ہے۔ یہ لوگ ہر طرف سے ان لوگوں کی راہ روکنے کی کوشش نہ کریں۔ نہ ان پر زندگی کے دروازے بند کریں اور نہ ان کو ڈرائیں دھمکائیں۔ اگر وہ ایمان نہیں لاتے تو اہل ایمان اور اہل کفر کی اس کشمکش میں کم از کم غیر جانبدار ہو کر نتائج کا انتظار کریں۔

(وَإِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِیْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ یُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى یَحْكُمَ اللّٰهُ بَیْنَنَا وَهُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ (۸۷:۷)) "اگر تم میں سے ایک گروہ اس تعلیم پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں' ایمان لاتا ہے اور دوسرا ایمان نہیں لاتا تو صبر کے ساتھ دیکھتے رہو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔" حضرت شعیب نے ان کو منصفانہ منصوبے کو اپنانے کا مشورہ دیا اور یہ آخری حد تھی جہاں تک وہ ان کو رعایت دے سکتے تھے' اس سے پیچھے وہ ایک قدم بھی نہ ہٹ سکتے تھے۔ وہ یہ کہ ان کی قوم کفر و اسلام کی اس کشمکش میں غیر جانبدار ہو کر انتظار کرے اور مسلمانوں کو اذیت نہ دے۔ قوم جس دین کو چاہے اختیار کرے یہاں تک کہ اللہ خود کوئی فیصلہ کر دے۔

لیکن طاغوتی قوتیں اس بات کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتیں کہ اس کرۂ ارض پر ایمان کا معمولی وجود بھی ہو اور وہ ایسی جماعت کی شکل میں ہو جو طاغوت کی اطاعت نہ کرتی ہو۔ اس کرۂ ارض پر ایسی جماعت مسلمہ' جو صرف اللہ کی غلام ہو' جو اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے سوا کسی اور اقتدار کو نہ تسلیم کرتی ہو' اپنی زندگی میں اللہ کے قانون کے سوا کسی اور کا قانون نہ مانتی ہو' اپنی اجتماعی زندگی میں اللہ کے نظام کے سوا کسی اور نظام کی قائل نہ ہو۔ ایسی جماعت کا مجرد پایا جانا ہی طاغوت کے وجود کے لئے خطرہ ہوتا ہے۔ اگرچہ اس قسم کی جماعت خود اپنے دائرے کے اندر ہی محدود کیوں نہ ہو' طاغوتی قوتوں کو فی الحال نہ بھی چھیڑتی ہو اور طاغوت کو وہ اپنے طبعی انجام تک پہنچنے کے لئے انتظار کر رہی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ طاغوتی قوتوں نے اپنے اوپر از خود یہ بات لازم کر لی ہے کہ وہ اسلامی قوتوں کے خلاف بر سر جنگ رہیں گی اگرچہ اسلامی قوتیں جنگ سے بچنا چاہیں کیونکہ حق کا وجود ہی ان قوتوں کے لئے خوفناک ہوتا ہے اور طاغوت ہر وقت حق سے کانپتا رہتا ہے۔ حق کا وجود ہی اس کشمکش کے آغاز کا باعث ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی سنت ہے۔ اگر کوئی سمجھے کہ حق ہے اور باطل اس کے خلاف نہ اٹھ رہا ہو' تو ایسے اہل حق کو غور کرنا چاہئے کہ وہ حق پر ہیں بھی کہ نہیں؟

(قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا (۸۸:۷)) اس کی قوم کے سرداروں نے' جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے' اس سے کہا کہ "اے شعیب' ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ تم

لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہو گا۔" یہ ہے طاغوت کی تنگی خود سری۔اسے اصرار ہے کہ وہ حق کے ساتھ یہ معرکہ جاری رکھے گا اور یہ بات ممکن ہی نہیں ہے کہ حق اور باطل باہم زندہ رہ سکیں یا ان کے درمیان فائر بندی ہو سکے۔

لیکن نظریاتی قوتوں پر باطل کی دھمکیوں کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔حق کے پاؤں میں کوئی لغزش نہیں آتی اور وہ بات کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتا۔حضرت شعیب علیہ السلام اس مقام سے پیچھے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ان کی جانب سے یہ آخری رعایت تھی کہ لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ جو عقیدہ چاہیں اختیار کریں' جس کے اقتدار میں چاہیں اپنے آپ کو داخل کر دیں اور دونوں حریف اللہ کے فیصلے کا انتظار کریں۔یہ وہ مقام ہے جس سے مزید پیچھے کوئی حامل حق داعی نہیں ہٹ سکتا۔چاہے طاغوتی قوتوں کی طرف سے شدید دباؤ کیوں نہ ہو۔اگر کوئی داعی اس مقام سے پیچھے ہٹ جاتا ہے تو وہ گویا اس سچائی کو خیرباد کہہ دیتا ہے جس کا وہ نمائندہ ہے بلکہ اس سے خیانت کرتا ہے۔

جب حضرت شعیب کو ان متکبرین کی طرف سے یہ دھمکی ملتی ہے کہ وہ یا تو اپنے نظریات کو ترک کر کے واپس ہماری ملت میں آجائیں ورنہ پھر ہمارے حلقے سے نکلنے کے لئے تیار ہو جائیں تو حضرت شعیب صاف اعلان فرما دیتے ہیں کہ وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ نے انہیں جس برے دین سے نجات دی وہ پھر اسی میں داخل ہو جائیں۔اب وہ اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دست بدعا ہوتے ہیں کہ اے اللہ ہمارے اور ہمارے دشمنوں کے درمیان اب تو ہی فیصلہ کر دے۔اور ہماری مدد فرما۔کیونکہ تو ہی مدد کرنے والا ہے۔

(قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ (۸۸) قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ

(۸۹) (۷:۸۸-۸۹)) "شعیب نے جواب دیا"کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں؟ ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے' اگر تمہاری ملت میں پلٹ آئیں جب کہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے۔ ہمارے لئے تو اس کی طرف پلٹنا اب کسی طرح ممکن نہیں الا یہ کہ خدا ہمارا رب ہی ایسا چاہے۔ہمارے رب کا علم ہر چیز پر حاوی ہے' اسی پر ہم نے اعتماد کر لیا۔اے رب' ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔" یہ مختصر ترین چند کلمات ہیں' لیکن ان میں ایمان کی تجلیات واضح طور پر نظر آتی ہیں اور اہل ایمان کا ذوق و شوق ان سے عیاں ہے۔اسی طرح ان کلمات سے جاہلیت کا مزاج اور اس کی بدذوقی کا اظہار بھی خوب ہوتا ہے۔ رسول وقت کے دل کے خوبصورت مناظر بھی چمکتے نظر آتے ہیں اور ان میں ربانی حقائق صاف نظر آتے ہیں۔

(قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ (۷:۸۸)) "شعیب نے کہا کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں؟" حضرت شعیب ان کی اس دھمکی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس میں انہوں نے کہا تھا"شعیب ہم تمہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے یا تمہیں ہمارے دین میں واپس آنا ہو گا۔" حضرت شعیب کا مطلب یہ ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم اس

صورت حال میں پھر داخل ہو جائیں جس سے اللہ نے ہمیں نجات دی ہے ۔وہ تو ایک مکروہ اور ناپسندیدہ صورت حال ہے ۔
"وہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے 'اگر تمہاری ملت میں پلٹ آئیں جبکہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے ۔
جو شخص اس طاغوتی ملت کی طرف دوبارہ لوٹ جاتا ہے جس میں دین اللہ کے لئے خالص نہیں ہوتا'جس میں اطاعت صرف اللہ کی نہیں ہوتی'جس میں لوگ اللہ کے سوا کچھ دوسری شخصیات کو رب بنالیتے ہیں اور ان کے اقتدار اعلیٰ کا اقرار کرتے ہیں وہ صراط مستقیم سے ہٹ جاتا ہے حالانکہ ایسے شخص کو اللہ نے ان تمام ملتوں سے نجات دے دی تھی ۔وہ اللہ کی غلامی کے سوا تمام غلامیوں سے نکل آئے تھے اور اللہ نے انہیں راہ ہدایت بتا دی تھی ۔ایسا شخص اگر پھر اسی ملت میں داخل ہوتا ہے تو وہ کلمہ شہادت جھوٹ موٹ پڑھ رہا ہے کیونکہ اس نے ملت ابراہیم کو ترک کر کے دوبارہ طاغوتی ملت میں داخلہ لے لیا ہے ۔
ایسی ملت میں دوبارہ جانے کا مدعا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ طاغوتی ملت کو حق سمجھتا ہے اور ایسے لوگوں کے اقتدار اعلیٰ کو جائز اور قانونی سمجھتا ہے ۔ایسا شخص کلمہ شہادت ادا کرنے کے ساتھ ساتھ طاغوتی ملت کا بھی فرد بن جاتا ہے ۔وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ طاغوتی نظام کا بھی یہ حق ہے کہ وہ اس دنیا میں قائم رہے 'اور اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کر دے اور یہ کہ اس کا وجود ایمان کے منافی نہیں ہے ۔ایسا شخص طاغوتی ملت میں داخل ہو کر اسے تسلیم کرتا ہے ۔ایسے شخص کا یہ طرز عمل اس شخص سے زیادہ خطرناک ہے جو سرے سے ہدایت قبول ہی نہیں کرتا اور اسلام کے جھنڈے کو بلند ہی نہیں کرتا کیونکہ اس طرز عمل سے یہ شخص طاغوت کے اقتدار اعلیٰ کے جھنڈے کو بلند کرتا ہے اور طاغوت کا اقتدار اللہ کے اقتدار اعلیٰ پر دست درازی کے مترادف ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔ حضرت شعیب فرماتے ہیں۔

(وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ (۷: ۸۹)) "ہمارے لئے یہ سزاوار ہی نہیں ہے کہ ہم طاغوتی ملت کی طرف لوٹ آئیں ۔" یہ دینی شان ہی کے متضاد ہے اور حضرت شعیب اس بات کا اعلان اس وقت کرتے ہیں جب کہ ان کو کھلی دھمکی دی جا رہی ہے کہ تمہیں ایسا کرنا ہو گا ۔ایسی دھمکی طاغوتی قوتیں ہر دور اور ہر زمانے میں ہر اسلامی جماعت کو دیتی چلی آئی ہیں ۔ان تمام جماعتوں کو جو اپنے آپ کو طاغوتی نظام سے نکالنا چاہتی ہیں اور صرف اللہ کے دین اور نظام میں داخل ہونا چاہتی ہیں ہمیشہ ایسی دھمکیاں ملتی رہتی ہیں۔
طاغوتی نظام اور اس کی اطاعت سے نکلنے کی مشکلات اگرچہ بہت ہی زیادہ نظر آئیں ان مشکلات اور مصائب کے مقابلے میں بہت کم ہیں جو انسانوں پر طاغوت کی غلامی کی صورت میں پڑتی ہیں ۔طاغوتی نظام کی جانب سے آنے والی مشکلات نہایت ہی رسواکن ہوتی ہیں اگرچہ بظاہر طاغوتی نظام میں امن و سلامتی 'اور اطمینان و سکون اور ہر چیز کی فراوانی نظر آئے ۔طاغوتی نظام کی مشکلات نہایت ہی گہری اور دور رس ہوتی ہیں ۔ان میں انسان کی انسانیت ختم ہو جاتی ہے ۔جب انسان انسان کا غلام ہو تو اس کی انسانیت ختم ہو جاتی ہے ۔اس سے بڑی اور کوئی غلامی نہیں ہو سکتی کہ کسی جگہ انسان 'انسان کے لئے قانون بنائے اور دوسرا اس کا مطیع فرمان ہو ۔اس سے بڑی غلامی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک انسان کا ارادہ اسی جیسے ایک دوسرے انسان کے تابع ہو اور وہ اس کی مرضی اور حکم کا پابند ہو یا اس سے اور بڑی غلامی اور معصیت کیا ہو سکتی ہے کہ انسان بعض انسانوں کی خواہشات اور رجحانات کے غلام ہوں اور ایک انسان کی لگام دوسرے انسانوں کے ہاتھ میں ہو ۔وہ انہیں جس طرح چاہے چلائے اور جس طرف چاہے لے جائے ۔

لیکن طاغوتی نظام میں صرف اس قسم کی معنوی اور فلسفیانہ اعلیٰ اقدار ہی کو پامال نہیں کیا جاتا بلکہ لوگوں کے اموال اور اولاد بھی طاغوتی نظام کے اختیار میں چلے جاتے ہیں۔ وہ جس طرح چاہتا ہے لوگوں کے اموال میں تصرفات کرتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے ان کی اولاد کو بری یا اچھی تربیت دیتا ہے۔ انہیں اپنی مرضی کے تصورات و افکار اور مفہوم و اقدار عطا کرتا ہے۔ نیز ان کے اندر اخلاق اور عادات بھی اپنی مرضی کے مطابق رواج دیتا ہے۔ اس کے علاوہ طاغوت لوگوں کی روح اور ان کی زندگی پر بھی اثرانداز ہوتا ہے۔ وہ ارواح کو ذبح کرتا ہے' وہ لوگوں کے جسموں کو ذبح کر کے ان کی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرتا ہے۔ پھر ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کا بھی وہ سودا کرتا ہے اور حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ایک باپ اپنی بیٹی کو بھی بے راہ روی سے باز نہیں رکھ سکتا کیونکہ یہ بے راہ روی طاغوتی نظام کے اہلکاروں کے مفاد میں ہوتی ہے۔ طاغوتی نظام لوگوں کی عزت و آبرو کے ساتھ یا تو بطور ظلم کھیلتا ہے اور لوگوں کے ضمیر کو بدل کر خوشی خوشی ان سے ان کی عزتیں لٹاتا ہے۔ وہ تہذیب کے عنوان سے ان سے بے تہذیبی کراتا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ طاغوتی نظام میں رہتے ہوئے اپنا مال اور اپنی آبرو بچا لے جائیں اور ان کا ایمان و نظریہ بھی محفوظ رہے وہ درحقیقت ایک بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں یا انہیں حقیقی صورت حال کا احساس ہی نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ طاغوت کی غلامی نفس انسانی' دولت انسانی اور عزت انسانی کو گہری مصیبت میں مبتلا کرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اللہ کی غلامی کے فرائض خواہ کتنے ہی زیادہ نظر آئیں' وہ بہرحال اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی کے لئے بہت ہی مفید ہے جبکہ آخرت میں اللہ کے ہاں اجر عظیم ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنے ایک مقالے "تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں" میں فرماتے ہیں :۔

"انسانی زندگی کے مسائل میں جس کو تھوڑی سی بصیرت بھی حاصل ہو وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا کہ انسانی معاملات کے بناؤ اور بگاڑ کا آخری فیصلہ جس مسئلے پر منحصر ہے وہ یہ سوال ہے کہ معاملات انسانی کی زمام کار کس کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرح گاڑی ہمیشہ اسی سمت چلا کرتی ہے جس سمت پر ڈرائیور اس کو لے جانا چاہتا ہے اور دوسرے لوگ جو گاڑی میں بیٹھے ہوں خواستہ و ناخواستہ اسی سمت پر سفر کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں' اسی طرح انسانی تمدن کی گاڑی بھی اسی سمت پر سفر کیا کرتی ہے جس سمت پر وہ لوگ جانا چاہتے ہیں جن کے ہاتھ میں تمدن کی باگیں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ زمین کے سارے ذرائع جن کے قابو میں ہوں' قوت و اقتدار کی باگیں جن کے ہاتھ میں ہوں' عام انسانوں کی زندگی جن کے دامن سے وابستہ ہو' خیالات و افکار اور نظریات کو بنانے اور ڈھالنے کے وسائل جن کے قبضے میں ہوں' انفرادی سیرتوں کی تعمیر اور اجتماعی نظام کی تشکیل اور اخلاقی قدروں کی تعیین جن کے اختیار میں ہو' ان کی رہنمائی و فرماں روائی کے تحت رہتے ہوئے انسانیت بحیثیت مجموعی اس راہ پر چلنے سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتی جس پر وہ اسے چلانا چاہتے ہوں۔ یہ رہنما و فرمانروا اگر خدا پرست اور صالح لوگ ہوں تو لامحالہ زندگی کا سارا نظام خدا پرستی اور خیر و صلاح پر چلے گا۔ برے لوگ بھی اچھے بننے پر مجبور ہوں گے' بھلائیوں کو نشوونما نصیب ہو گا اور برائیاں اگر مٹیں گی نہیں تو کم از کم پروان بھی نہ چڑھ سکیں گی۔ لیکن اگر رہنمائی و قیادت اور فرمانروائی کا یہ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو خدا سے برگشتہ اور فسق و فجور میں سرگشتہ ہوں تو آپ سے آپ سارا نظام زندگی خدا سے بغاوت اور ظلم و بداخلاقی پر چلے گا۔ خیالات و نظریات' علوم و آداب' سیاست و معیشت' تہذیب و معاشرت' اخلاق و معاملات' عدل و قانون' سب کے سب بحیثیت مجموعی بگڑ

جائیں گے - برائیاں خوب نشو و نما پائیں گی -"
"اس تشریح کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ دین میں اس مسئلے کی کیا اہمیت ہے - ظاہر بات ہے کہ اللہ کا دین اول تو یہ چاہتا ہے کہ لوگ بالکلیہ بندۂ حق بن کر رہیں اور ان کی گردن میں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کا حلقہ نہ ہو - پھر وہ چاہتا ہے کہ اللہ ہی کا قانون لوگوں کی زندگی کا قانون بن کر رہے - پھر اس کا مطالبہ یہ ہے کہ زمین سے فساد مٹے - ان منکرات کا استیصال کیا جائے جو اہل زمین پر اللہ کے غضب کے موجب ہوتے ہیں اور ان خیرات و حسنات کو فروغ دیا جائے جو اللہ کو پسند ہیں - ان تمام مقاصد میں سے کوئی مقصد بھی اس طرح پورا نہیں ہو سکتا کہ نوع انسانی کی رہنمائی و قیادت اور معاملات انسانی کی سربراہ کاری ائمہ کفر و ضلال کے ہاتھوں میں ہو اور دین حق کے پیرو محض ان کے ماتحت رہ کر ان کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یاد خدا کرتے رہیں - یہ مقاصد تو لازمی طور پر اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ تمام اہل خیر و صلاح جو اللہ کی رضا کے طالب ہوں' اجتماعی قوت پیدا کریں اور سر دھڑ کی بازی لگا کر ایک ایسا نظام حق قائم کرنے کی سعی کریں جس میں امامت و راہنمائی اور قیادت و فرماں روائی کا منصب مومنین و صالحین کے ہاتھوں میں ہو - اس چیز کے بغیر وہ مدعا حاصل ہی نہیں ہو سکتا جو دین کا اصل مدعا ہے -

اسی لئے دین میں امامت صالحہ کے قیام اور نظام حق کی اقامت کو مقصدی اہمیت حاصل ہے اور اس چیز سے غفلت برتنے کے بعد کوئی عمل ایسا نہیں ہو سکتا جس سے انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کو پہنچ سکے - غور کیجئے' آخر قرآن و حدیث میں التزام جماعت اور سمع و اطاعت پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص جماعت سے خروج اختیار کرلے تو اس سے قتال واجب ہے خواہ وہ کلمہ توحید کا قائل اور نماز روزے کا پابند ہی کیوں نہ ہو - کیا اس کی وجہ یہ اور صرف یہی نہیں ہے کہ امامت صالحہ اور نظام حق کا قیام و بقا دین کا حقیقی مقصود ہے' اور اس مقصد کا حصول اجتماعی طاقت پر موقوف ہے' لہٰذا جو شخص اجتماعی طاقت کو نقصان پہنچاتا ہے وہ اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کرتا ہے جس کی تلافی نہ نماز سے ہو سکتی ہے اور نہ اقرار توحید سے؟ پھر دیکھئے کہ آخر اس دین میں جہاد کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے کہ اس سے جی چرانے اور منہ موڑنے والوں پر قرآن مجید نفاق کا حکم لگاتا ہے؟ جہاد' نظام حق کی سعی کا ہی تو دوسرا نام ہے اور قرآن اسی جہاد کو وہ کسوٹی قرار دیتا ہے جس پر آدمی کا ایمان پرکھا جاتا ہے - بالفاظ دیگر جس کے دل میں ایمان ہو گا وہ نہ تو نظام باطل کے تسلط سے راضی ہو سکتا ہے اور نہ نظام حق کے قیام کی جدوجہد میں جان و مال سے دریغ کر سکتا ہے - اس معاملے میں جو شخص کمزوری دکھائے گا اس کا ایمان ہی مشتبہ ہے' پھر بھلا کوئی دوسرا عمل اسے کیا نفع پہنچا سکتا ہے؟"

"اس وقت اتنا موقع نہیں ہے کہ میں آپ کے سامنے اس مسئلے کی پوری تفصیل بیان کروں مگر جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لئے بالکل کافی ہے کہ اسلام کے نقطہ نظر سے امامت صالحہ کا قیام مرکزی اور مقصدی اہمیت رکھتا ہے - جو شخص اس دین پر ایمان لایا ہو اس کا کام صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا کہ اپنی زندگی کو حتی الامکان اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے بلکہ عین اس کے ایمان ہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی تمام سعی و جہد کو اس ایک مقصد پر مرکوز کر دے کہ زمام کار کفار و فساق کے ہاتھ سے نکل کر صالحین کے ہاتھ میں آئے اور وہ نظام حق قائم ہو جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق دنیا کے انتظام کو درست کرے اور درست رکھے -

اسلام جب یہ دعوت دیتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ ان غاصبوں سے چھین لیا جائے اور اسے دوبارہ اللہ کے لئے مخصوص کر دیا جائے

تو اس دعوت کی اصل غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ انسانیت کو آزاد کیا جائے اور تمام انسانوں کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ وحدہ کی غلامی میں داخل کیا جائے۔ اسی طرح اسلام کی اس دعوت کا مقصد یہ بھی ہے کہ لوگوں کی روحانی و نظریاتی دنیا اور مالی اور مادی دنیا کو بھی ان طاغوتی طاقتوں کے عمل و دخل سے آزاد کیا جائے۔ اسی لئے اسلام اپنے جھنڈے کے نیچے لوگوں کے لئے فرض کرتا ہے کہ وہ ان طاغوتی قوتوں کے خلاف جدوجہد اور جہاد و قتال کریں اور ہر قسم کی قربانیاں دیں۔ لیکن اس راہ میں قربانیاں دے کر دراصل وہ مسلسل لمبی قربانیاں دینے سے نجات پاتے ہیں جو ان کے مقابلے میں ذلیل اور حقیر ہیں۔ اسلام تو لوگوں کو عزت اور شرف کے مقام کے لئے جدوجہد کرنے کی دعوت دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انہیں حضرت شعیب نے فرمایا:

(قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ ------ (۷: ۸۹)) "ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے' اگر تمہاری ملت میں پلٹ آئیں جبکہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے۔ ہمارے لئے تو اس کی طرف پلٹنا اب کسی طرح ممکن نہیں۔" لیکن حضرت شعیب جس قدر باطل کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں' اپنی پوری قوت سے آواز حق بلند کر رہے ہیں اور اپنی سوسائٹی کے کبراء کو چیلنج کر رہے ہیں' اسی قدر وہ اللہ کی مشیت اور رضا کے سامنے سرنگوں ہو رہے ہیں اور اللہ کی تقدیر کے سامنے راضی برضا ہو رہے ہیں اس لئے کہ اللہ کا علم وسیع اور حاوی ہے اور انسان کا علم محدود ہے۔ اللہ کے علم کے سامنے کوئی انسان عزم اور جزم اختیار نہیں کر سکتا۔ جہاں تک باری تعالیٰ کا تعلق ہے ایک مسلمان کے لئے اچھا رویہ یہی ہے کہ اس کے سامنے مکمل طور پر سرتسلیم خم کر دے۔ (إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ (۷: ۸۹)) "الا یہ کہ ہمارا رب ہی ایسا چاہے۔ ہمارے رب کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔" حضرت شعیب تمام امور کو اللہ کے سپرد فرماتے ہیں۔ مستقبل میں ان کے حالات جس رخ پر چلنے والے ہیں اور اہل ایمان کو جو کچھ پیش آنے والا ہے۔ وہ سب کے سب اللہ کے سپرد ہیں۔ وہ تو صرف یہ کر سکتے ہیں کہ تمام طاغوتی نظریات اور طاغوتی پیشکشوں کا انکار کر دیں' ملت طاغوتی میں واپس چلے جانے سے صاف صاف انکار کر دیں اور مسلمانوں کی جانب سے بھی عزم صمیم ظاہر کر دیں۔ اور اس بات کا اصولی طور پر قطعی انکار کر دیں' لیکن وہ مشیت الہیہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتے' کیونکہ معاملات کا دارومدار تو مشیت الہیہ پر ہے حضرت شعیب اور اہل ایمان کا علم محدود ہے اور رب ذوالجلال کا علم لامحدود ہے' لہذا وہ اللہ کے وسیع اور محیط علم اور اس کی مشیت کی طرف اپنے معاملات کو سپرد کرتے ہیں۔

یہ ہے اللہ کے ایک دوست کا طرز عمل' اللہ کے ساتھ۔ ان آداب کے ساتھ وہ اللہ کے اوامر و نواہی کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اللہ کی مشیت اور تقدیر پر کوئی احسان نہیں جتلاتے۔ نہ وہ اللہ کے ارادے اور مشیت میں سے کسی چیز کا انکار کرتے ہیں۔ دوست کی جانب سے جو پیش آئے منظور ہے۔

یہاں حضرت شعیب اپنی قوم کے طاغوتوں اور ان کے وعدو وعید اور دھمکیوں کو ایک طرف چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں نہایت ہی توکل اور نہایت ہی اعتماد کے ساتھ' اور دعا کرتے ہیں کہ اے رب' ہمارے اور ہماری اس طاغوتی قوم کے درمیان فیصلہ فرما دے' تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

(عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا (۷: ۸۹) "اللہ پر ہی ہم نے اعتماد کیا ہے۔ اے رب' ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان

ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ۔'' یہاں ہم ایک خیرہ کن منظر دیکھتے ہیں ۔ ایک نبی اور خدا کے ایک دوست کے قلب میں حقیقت الٰہیہ کی تجلیات صاف نظر آتی ہیں ۔ نبی جانتے ہیں کہ قوت کا منبع کہاں ہے اور ایک مومن کے لئے آخری پناہ گاہ کونسی ہے ۔ وہ یہ بھی جانتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ آخری فیصلے اور فتح و شکست کا اختیار صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔ اس لئے وہ رب واحد پر توکل کرتا ہے اور اس معرکے میں کود پڑتا ہے جو نبی اور اہل ایمان پر مسلط کر دیا گیا ہے اور جو حالات نے لابدی کر دیا ہے ۔ اب رب ذوالجلال کی جانب سے عطا کردہ فتح کے سوا یہ معرکہ سر نہیں کیا جاسکتا۔

یہ ہیں وہ حالات جن میں کفار اہل ایمان کو ڈراتے دھمکاتے ہیں اور ان کو اپنے دین سے دور کرنے کی سعی کرتے ہیں ۔

(وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَیْبًا اِنَّکُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ

(۷ : ۹۰)) ''اس کی قوم کے سرداروں نے ' جو اس کی بات ماننے سے انکار کر چکے تھے ' آپس میں کہا ''اگر تم نے شعیب کی پیروی قبول کر لی تو برباد ہو جاؤ گے ۔'' یہ ہیں خدوخال اس معرکے کے جو انسانی تاریخ میں بار بار دہرایا جاتا ہے اگرچہ اس کی نوعیت کبھی نہیں بدلتی ۔ طاغوتی قوتیں سب سے پہلے داعی کی طرف متوجہ ہوتی ہیں کہ وہ دعوت کو بند کر دے لیکن جب وہ اپنی ایمانی قوت پر اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے ڈٹ جاتا ہے ' دعوت کو جاری رکھتا ہے ' اس راہ میں ہر قسم کی مشکلات کو انگیز کرتا ہے اور دھمکیوں اور طاغوتی قوتوں کے حجم سے مرعوب نہیں ہوتا ' تو یہ قوتیں داعی کے متبعین کو اذیت دینا شروع کر دیتی ہے ۔ ان پر یہ مصائب محض ان کے دین کی وجہ سے توڑے جاتے ہیں ۔ ان ظالموں کے پاس اپنے ظلم کے لئے کوئی جواز نہیں ہوتا لیکن ان کے پاس مار دھاڑ اور پکڑ دھکڑ کی ظاہری قوتیں ہوتی ہیں ۔ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی جس سے وہ اپنی جاہلیت پر عوام کو مطمئن کر سکیں ۔ خصوصاً ان لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتے جنہوں نے حق کو پہچان لیا اور جن کی نظروں میں باطل خفیف و حقیر ٹھہرا کیونکہ ان لوگوں نے اپنا دین اللہ کے لئے خالص کر دیا اور ہر قسم کا اقتدار اللہ کے حوالے کر دیا ۔ ان کی نظروں میں اس کے سوا کوئی مقتدر اعلیٰ ہوتا ہی نہیں ہے ۔

یہ اللہ کی سنت جاریہ ہے کہ جب حق و باطل علیحدہ علیحدہ متمیز ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے بالمقابل آجاتے ہیں تو پھر ان کے درمیان فیصلہ کن معرکہ ہوتا ہے اور اللہ خود فیصلہ کر دیتا ہے ۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔

(فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ (۷ : ۹۱)) ''مگر ہوا یہ کہ ایک دہلا دینے والی آفت نے ان کو آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے ۔'' رجفہ ' ایسی آفت جو دہلا دیتی ہے اور اوندھا گرا دیتی ہے ' اس لئے کہ انہیں اپنی دھمکیاں اور دست درازیاں یاد آجائیں کہ وہی تو تھے جو اہل ایمان کو اذیتیں دیتے تھے ۔ اب اللہ تعالیٰ ان کے اس دعوے کا جواب انہی کے الفاظ میں دیتے ہیں ۔ وہ کہتے تھے (لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ ------ (۷ : ۹۱)) ''اگر تم نے شعیب کا اتباع کیا تو تم برباد ہو جاؤ گے ۔'' یہ بات وہ مومنین کو بطور تہدید کہتے تھے ۔ اس پر اللہ تعالیٰ ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہیں کہ جن لوگوں نے شعیب کی اطاعت کی وہ نہیں بلکہ وہ لوگ برباد ہوئے جنہوں نے مخالفت کی ۔

(اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا شُعَیْبًا کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا شُعَیْبًا کَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِیْنَ

(۷:۹۲)) "جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ ایسے مٹے کہ گویا کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے۔ شعیب کے جھٹلانے والے ہی آخر کار برباد ہو کر رہے۔" آنکھ جھپکتے ہی ہم نے دیکھا کہ وہ اپنے ہی گھروں میں اوندھے پڑے ہیں' بے حس و حرکت گویا انہوں نے ان گھروں کو تعمیر نہیں کیا اور گویا اب ان گھروں میں ان کے کچھ آثار بھی باقی نہیں ہیں۔

اب ان کی تاریخ کے ان صفحات کو اس طرح پست کر کے رکھ دیا جاتا ہے اور ان کو ذلیل و خوار کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وہ رسول جو ان کا بھائی ہے ان سے جدا ہو جاتا ہے' اس لئے کہ ان کی راہیں جدا ہیں' اور ان کے نظریات جدا ہیں۔ اب اس منظر میں نظر آتا ہے کہ ان کے انجام بھی جدا ہیں اور اب ان کے اس انجام بد پر ان کے حقیقی بھائی کو بھی کوئی تاسف نہیں ہوتا کہ کس طرح انہیں نیست و نابود کر دیا گیا ہے۔

(فَتَوَلّٰی عَنْهُمْ وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ فَکَیْفَ اٰسٰی عَلٰی

قَوْمٍ کٰفِرِیْنَ (۷:۹۳)) "اور شعیب یہ کہہ کر ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ "اے برادران قوم' میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اب میں اس قوم پر کیسے افسوس کروں جو قبول حق سے انکار کرتی ہے۔" اس لئے کہ وہ ایک ملت ہے اور یہ لوگ دوسری ملت ہیں۔ اہل ایمان ایک قوم ہیں اور وہ دوسری قوم ہیں۔ رہا سلسلہ نسب اور قوم تو اس دین میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں اس کا کوئی وزن نہیں ہے۔ یہاں فلاں ابن فلاں کوئی چیز نہیں ہے۔ اس دین میں واحد رابطہ عقیدہ و نظریہ ہے اور اسی پر اتحاد و انفعال کا مدار ہے۔

صدق اللہ العظیم

---ooo---

# فی ظلال القرآن

پارہ ۹ تا ۱۲

جلد سوم


سید قطب شہید

ترجمہ

سید معروف شاہ شیرازی



ادارہ منشورات اسلامی

بالمقابل منصورہ ملتان روڈ لاہور

| | | |
|---|---|---|
| تفسیر | ------------ | فی ظلال القرآن |
| مصنف | ------------ | سید قطب شہیدؒ |
| مترجم | ------------ | سید معروف شاہ شیرازی |
| ناشر | ------------ | سید عارف شاہ شیرازی |
| جلد سوم | ------------ | پارہ ۹ تا ۱۲ |
| اشاعت دوم | ------------ | ستمبر ۱۹۹۷ء |
| تعداد | ------------ | ۱۱۰۰ |
| مطبع | ------------ | عید محمد پریس |
| ہدیہ | ------------ | ۲۵۰ روپے |


---ooo---

# عرض ناشر

**شہید اسلام سید قطب** ؒ۔ سید قطب کا شمار امت مسلمہ کی ان چند برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریک دور میں روشنی کے چراغ جلائے اور اسلامی نظام زندگی کی کھیتی کو اپنے خون سے سینچا۔

سید قطب ۱۹۰۳ء میں مصر کے ایک صوبہ ''اسیوط'' کے ایک گاؤں ''موشاء'' میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ دونوں عربی النسل تھے۔ سید قطب اپنے والدین کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔

آپ نے ثانوی تعلیم ''تجہیزیہ دارالعلوم'' نامی ایک اسکول میں حاصل کی۔ اس اسکول میں طلباء کو دارالعلوم میں داخلہ کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہوکر آپ ۱۹۲۹ء میں قاہرہ کے دارالعلوم میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں آپ نے بی۔ اے کی ڈگری اور ڈپلومہ ان ایجوکیشن حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے محکمہ تعلیم میں بحیثیت انسپکٹر تعلیم ملازمت اختیار کرلی اور ۱۹۵۲ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران ۱۹۵۴ء میں آپ اخوان المسلمون سے متعارف ہوئے۔ اور ۲ جولائی ۱۹۵۴ء میں آپ کو اخوان کے شعبہ نشرواشاعت نے اخبار ''الاخوان المسلمون'' کا ایڈیٹر مقرر کیا۔

شہید اسلام سید قطب ؒ ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک جیل میں رہے اور اگست ۱۹۶۴ء میں مرحوم عبدالسلام عارف صدر عراق کی کوشش سے رہا ہوئے۔ رہا ہوتے ہی پوری دنیا کے نوجوانوں نے آپ کی طرف رجوع کیا، اور آپ کا لٹریچر جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیلنے لگا۔ چنانچہ لادین مغرب پرست کیمونسٹ اور سوشلسٹ عناصر چیخ اٹھے اور بیک وقت ماسکو اور واشنگٹن سے ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ چنانچہ آپ کو ایک سال بعد اگست ۱۹۶۵ء میں دوبارہ گرفتار کرلیا گیا اور ایک سال بعد ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء میں آپ کو شہید کردیا گیا۔

سید قطب اخوان المسلمون میں آنے سے پہلے خالص ادبی کام کرتے رہے۔ لیکن تحریک اخوان المسلمون میں شامل ہونے کے بعد اسلامی انقلاب، اور تحریک اسلامی، ان کا خاص موضوع رہا۔

**تفسیر فی ظلال القرآن** ۔ مصنف نے فی ظلال القرآن میں قرآن پاک کی اثر انگیزی، جس نے عرب کی کایا پلٹ دی تھی، کی راہ میں حائل پردوں کو چاک کردیا ہے۔ اس کے ذریعے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والا اس تحریک کے ساتھ جا کھڑا ہوتا ہے جو ہبوط آدم علیہ السلام کے وقت سے روئے زمین پر برپا ہوئی اور انبیاعلیہم السلام کی قیادت میں چلتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک آپہنچی۔ آپ ؐ کے بعد بھی یہ تحریک زندہ ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ قاری توحید و رسالت اور آخرت کے عقیدے کو قافلے کے ایک رفیق اور تحریک کے ایک کارکن کی حیثیت سے سنتا اور سمجھتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان کو امت کے ایک فرد کی حیثیت سے پڑھ کر اس سے سبق لیتا ہے۔

فی ظلال القرآن میں علمی موشگافیوں اور فقہی باریکیوں سے ہٹ کر قرآن پاک کے اصل مقصد اور دعوتی رنگ کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے لئے جو زبان استعمال کی گئی ہے۔ وہ سید کا ہی حصہ ہے اور اسے بلاشبہ الہامی زبان کہا جاسکتا ہے۔ اپنے اس رنگ میں یقیناً یہ متاثر ترین تفسیر ہے۔ تفسیر کیا ہے ایک دعوت عمل اور دعوت انقلاب ہے، الفاظ اور معنی کا دریا ہے۔ جس میں تحقیق، علمی، وجدانی، اور ادبی نکات جابجا موجود ہیں۔ پورے ذخیرہ تفاسیر میں یہ پہلی تفسیر ہے۔ جو خود قرآن کے اسلوب بیان میں لکھی گئی ہے۔ دوسری تفاسیر بالعموم منطقی انداز بیان میں لکھی گئی ہیں اور فی ظلال القرآن قرآنی اور انقلابی انداز بیاں میں ہے۔ اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ یہ اختلافی مسائل اور اسرائیلیات سے خالی ہے۔ اسلام کا جامع تصور لئے ہوئے، اس کے احیاء کا طریقہ کار نمایاں کرتی ہے۔ غرض اخلاص، روح ایمان، عمل صالح اور دعوت انقلاب اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ پندرہ پارے جیل سے باہر اور بقیہ جیل میں لکھے گئے ہیں۔ عربی میں اب تک کئی ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

**مترجم سید معروف شاہ شیرازی** ـ سید معروف شاہ شیرازی ۱۸ اپریل ۱۹۳۲ء کو ضلع مانسہرہ کے ایک گاؤں ہروڑی میں پیدا ہوئے' ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ ہی میں حاصل کی حصول علم کا شوق بچپن ہی سے انتہائی زیادہ تھا جس کی وجہ سے سرحد اور پنجاب کے مختلف دینی مدارس اور معروف علماء کرام سے تعلیم حاصل کرتے رہے' پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۵۲ء میں منشی فاضل اور ۱۹۵۳ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور اگلے ہی سال مشہور دینی درس گاہ جامعہ اشرفیہ لاہور سے دورہ حدیث کر کے سند فراغت حاصل کی' بعد ۱۹۶۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایف اے عربی کا امتحان پاس کیا اور بعد میں ۱۹۶۰ء میں پشاور یونیورسٹی سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔

درس نظامی پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۵ تا ۱۹۶۵ گورنمنٹ ہائی سکول بفہ میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے لیکن بعد میں اس پیشہ کو ترک کر کے تصنیف و تالیف اور صحافت کے شعبہ سے منسلک ہو گئے ـ ایک سال تک ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی کے ایڈیٹر رہنے کے بعد اپنا رسالہ "اسوہ" راولپنڈی سے نکالنا شروع کیا لیکن بعد میں کراچی منتقل ہونے کی وجہ سے کراچی سے "اسوہ ڈائجسٹ" کے نام سے یہی رسالہ شائع کرتے رہے ـ

اس دوران ادارہ معارف اسلامی کراچی میں ریسرچ اسکالر کے طور پر کام کرتے ہوئے مختلف عربی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا جو "اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو" "اسلام میں جرم و سزا" (دو حصے) "حسن البناء شہید کی یادداشتیں" اور "نشانات راہ" کے ناموں سے شائع ہوئیں ـ

لیکن ۱۹۷۰ میں ناسازی طبع کی بناء پر کراچی سے آبائی علاقہ میں منتقل ہو گئے اور وہاں ضلع مانسہرہ کی تحصیل بٹگرام میں وکالت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے اور ۱۹۹۲ء تک اسی پیشہ سے منسلک رہے ـ پیشہ وکالت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا ـ اس دوران "سیرت القرآن" حصہ اول دوم "اسلامی انقلاب کا منہاج" "اسلام اور جمہوریت ججوں اور جرنیلوں کے زیر سایہ" "مدارس عربیہ اور اسلامی انقلاب" "سید مودودی کے فکری کام کا ایک جائزہ" "جماعت اسلامی انصاف کے دروازے پر" اور انگریزی کی کتاب "The Shape Of Basic Organs in Islamic State" ادارہ منشورات اسلامی منصورہ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئیں ـ

گزشتہ ۲۹ سال میں دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ سید قطب شہید کی تفسیر فی ظلال القرآن کے اردو ترجمہ کا کام بھی جاری رہا جو اکتوبر ۱۹۹۵ء میں مکمل ہوا۔

سید معروف شاہ شیرازی دوران تعلیم ہی سید مودودی" سے متعارف ہوئے اور اکثر عصری مجالس میں حاضر رہتے تھے' تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ مولانا مودودی" کے ساتھ بھی رہے' جبکہ مولانا مودودی" اکثر انہیں مسکین شاہ صاحب کے نام سے یاد فرماتے تھے' ۱۹۶۲ میں جماعت اسلامی کے رکن بنے اور ہمیشہ تحریکی سرگرمیوں میں مصروف رہے' قومی اتحاد کی تحریک کے دوران ہری پور جیل میں بھی رہے ـ موصوف آجکل امیر جماعت اسلامی ضلع مانسہرہ کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں اور جماعت اسلامی صوبہ سرحد کی صوبائی شوریٰ کے بھی منتخب رکن ہیں ـ

فی ظلال القرآن کے ترجمہ کے بعد موصوف اپنی زیر تکمیل کتب "حرمت سود" "تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل" "کتاب نکاح" "تحریکات اسلامیہ" "غربت اسلام کی نظر میں" "مغلیہ دور حکومت میں سرحد کے صوفیاء کرام کا کردار" کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

اب فی ظلال القرآن کی تیسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس سلسلہ کی مزید ۳ جلدیں جلد شائع کرنے کی توفیق نصیب فرمائے آمین ثم آمین (سید عارف شیرازی)

# جلد سوم

| | | |
|---|---|---|
| سورۃ الاعراف ۔ ۷ | آیات | ۹۴ -- تا -- ۲۰۶ |
| سورۃ الانفال ۔ ۸ | آیات | ۱ -- تا -- ۷۵ |
| سورۃ التوبہ ۔ ۹ | آیات | ۱ -- تا -- ۱۲۹ |
| سورۃ یونس ۔ ۱۰ | آیات | ۱ -- تا -- ۱۰۹ |
| سورۃ ھود ۔ ۱۱ | آیات | ۱ -- تا -- ۱۲۳ |
| سورۃ یوسف ۔ ۱۲ | آیات | ۱ -- تا -- ۵۳ |

---m m m---

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

# فہرست جلد سوم

## پارہ نمبر- ۹------- سورۃ الاعراف - ۷



## سورۃ الانفال - ۸

## پارہ نمبر- ۱۰



## سورۃ التوبہ- ۹



## پارہ نمبر- ۱۱

## سورۃ یونس -- ۱۰



## پارہ -- ۱۲.........سورۃ ھود -- ۱۱

## سورۃ یوسف – ۱۲



---m m m---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ـــــ ۹

### سورۃ الاعراف ـ ۷

### ۹۴ ـــ تا ـــ ۲۰۶

# درس نمبر ۸۷ ایک نظر میں

اس سورہ میں اب تک کے مضمون میں یہ سبق گویا ایک وقفہ ہے۔ اس سے قبل قوم حضرت نوح' قوم ہود' قوم صالح' قوم لوط' اور قوم شعیب علیہم السلام کے جو قصے بیان کئے گئے۔ اس وقفے میں ان پر مجموعی تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور یہ وقفہ اس لئے کیا گیا تاکہ اس میں اس سنت الہیہ کا بیان کیا جائے جو اس کرۂ ارض پر جاری و ساری ہے اور اس دنیا کی ہر بستی کے مکذبین پر تقدیر الہی نے اسے نافذ کیا ہے' یہاں لفظ ''قریہ'' استعمال کیا گیا جس سے مراد کوئی بڑا شہر ہے' یا کوئی موجود مرکزی تہذیب ہے۔ یہ سنت الہیہ کا واحد اور اٹل قانون ہے اور اس کا نفاذ اللہ کی جانب سے تمام مکذبین پر ہوتا ہے۔ اور اسی سنت الہیہ سے انسانی تاریخ بنتی ہے 'بلکہ انسانی تاریخ کا اصلی پہلو ہی سنت الہیہ ہے۔ اور سنت الہیہ کا یہ کام اور غرض و غایت ہے کہ وہ جھٹلانے والوں کو رنج و الم میں مبتلا کرتی ہے۔ شاید کہ ان کے دل پسیج جائیں اور نرم ہو کر اللہ کی طرف مائل ہو جائیں اور اللہ کی حقیقت الوہیت اور اپنی حقیقت عبودیت کو اچھی طرح معلوم کر لیں۔ اور اگر وہ پھر بھی متوجہ نہ ہوں اور انہیں ہوش نہ آئے تو پھر اللہ ان مکذبین پر اپنی نعمتوں کی فراوانی کر دیتا ہے۔ اور ان پر ہر طرف سے سہولیات اور نعمتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں اور ان کو ڈھیل دی جاتی ہے اور پھر ان کی آبادی بڑھ جاتی ہے۔ وہ ناز و نعمت میں گھر کر عیاشیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ ان کے لئے آزمائش ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں وہ جن مشکلات میں مبتلا ہوئے ہیں ایسی ہی مشکلات ان سے قبل ان کے آباؤ اجداد پر بھی نازل ہوئی تھیں اور دنیا کے حالات ایسی ہی ڈگر پر نشیب و فراز کے ساتھ چلتے رہتے ہیں وَقَالُوا قَدْ مَسَّ آبَاءَنَا الضَّرَّاءُ وَالسَّرَّاءُ (اور وہ کہتے ہیں کہ ایسی ہی مشکلات میں ہمارے آباء بھی مبتلا ہوئے تھے اور ایسی ہی خوشحالی بھی ان پر آئی تھی۔) وہ ایسی ہی سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور غفلت کی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں کہ ان کو اللہ کی پکڑ آلیتی ہے اور ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ فراخیوں اور فراوانیوں اور مشکلات و مصائب میں اللہ کی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس آزمائش میں اللہ کی جو حکمت ہوتی ہے وہ اس کا ادراک نہیں کر پاتے اور اللہ کے غضب میں جو لوگ مبتلا ہوتے ہیں اور جو غافل اور لاپرواہ ہوتے ہیں ان کے انجام سے وہ نہیں ڈرتے اور وہ اسی طرح عیش و عشرت میں زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح حیوان زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ اسی مدہوشی کی حالت میں ہوتے ہیں کہ ان پر عذاب الہی کا نزول ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ایمان لاتے اور خدا خوفی کا رویہ اختیار کرتے تو ان کا یہ حال نہ ہو گا بلکہ ان پر آسمانوں سے مزید برکات نازل ہوتیں اور زمین سے اور آسمانوں سے ان پر رزق نازل ہوتا اور ان پر اللہ اپنی طمانیت کی وہ حالت نازل کرتا جس سے ان کی زندگی نہایت اطمینان سے بسر ہوتی اور اس اطمینان اور فراخی کے بعد ان پر زوال اور بربادی کی کوئی حالت نہ آتی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ڈراتے ہیں جو ان ہلاک کئے جانے والوں کے بعد زمین کے وارث اور اہل اقتدار بنائے گئے۔ ان کو بتایا جاتا ہے کہ غفلت اور غرور سے اپنے آپ کو بچاؤ اور ہر وقت بیدار رہو اور خدا تعالیٰ سے

ڈرتے رہو۔ ان کو اس تاریخی حقیقت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں اللہ نے کئی اقوام کو پے در پے ہلاک کیا اور ان کی جگہ دوسری اقوام کو مواقع فراہم کئے مگر انہوں نے ہلاک ہونے والوں کے انجام سے نصیحت نہ پکڑی لہذا بستیوں والوں کا انتظار اللہ کا قانون مکافات کر رہا ہے اور انسانی تاریخ میں اس کی واضح مثالیں موجود ہیں۔

یہ وقفہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب پر ختم ہوتا ہے۔ آپ کو کہا جاتا ہے تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا (یہ قومیں جن کے قصے ہم تمہیں سنا رہے ہیں) تاکہ آپ کو ان لوگوں کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ ان کا یہ انجام سنت الہیہ کے مطابق ہوا۔ فرمایا جاتا ہے وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ (ہم نے ان میں سے اکثر میں کوئی پاس عہد نہ پایا بلکہ اکثر کو فاسق ہی پایا) یہ آخری رسول اور اس آخری رسول کی امت تمام رسولوں کی اخلاقی دولت کے وارث ہیں اور صرف یہ رسول اور ان کی امت ہی ان تاریخی واقعات و اطلاعات سے فائدہ اور نصیحت لیتے حاصل کرتے ہیں۔

---0:0 0---

# درس نمبر ۸۷ تشریح آیات

## ۹۴ --- تا --- ۱۰۲

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں نبی بھیجا ہو اور اس بستی کے لوگوں کو پہلے تنگی اور سختی میں مبتلا نہ کیا ہو' اس خیال سے کہ شاید وہ عاجزی پر اتر آئیں۔ پھر ہم نے ان کی بدحالی کو خوش حالی سے بدل دیا یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ "ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور برے دن آتے ہی رہے ہیں۔" آخر کار ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا اور انہیں خبر تک نہ ہوئی۔ اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے مگر انہوں نے تو جھٹلایا' لہٰذا ہم نے اس بری کمائی کے حساب میں انہیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔"

یہاں سیاق کلام سے غرض و غایت یہ نہیں ہے کہ کسی متعین حادثے کو بیان کیا جائے بلکہ یہاں مقصد نوعی سنت الہیہ کا بیان ہے۔ یہاں کسی خاص قوم کے خدوخال بیان کرنا مطلوب نہیں ہیں' بلکہ اللہ کے نظام قضا و قدر کے اقدامات کا بیان مقصود ہے۔ چنانچہ یہاں اللہ کے اس ناموس کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جس کے مطابق یہ پورا نظام کائنات چل رہا ہے اور تمام واقعات اس کے مطابق رونما ہوتے ہیں اور اس ناموس کی وجہ سے اس جہان میں انسانی تاریخ اپنا سفر کرتی ہے اور "رسالت" بھی اس کرۂ ارض پر ناموس الٰہی کا ایک حصہ ہے کیونکہ ناموس الٰہی بھی دراصل ایک وسیع تر اور عظیم تر رسالت ہے۔ یہ کہ اس جہان میں واقعات بغیر کسی پروگرام کے وقوع پذیر ہوتا ہے وہ تقدیر الٰہی کے مطابق

ہوتے ہیں' اس کی حکمت کے عین مطابق ہوتا ہے اور اس کے مقرر کردہ مقاصد و اہداف کے مطابق ہوتا ہے اور آخری نتائج مشیت الہیہ کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں اور یہ مشیت سنت الہیہ کے مطابق کام کرتی ہے اور یہ ناموس اور سنت دونوں مشیت الہیہ کے وضع کردہ ہیں۔

ماضی کی ان بستیوں کو جو واقعات پیش آئے وہ اللہ کی بے قید مشیت کی وضع کردہ سنت کے مطابق پیش آئے اور اسی طرح بعد میں آنے والی اقوام کو بھی اسی عالمی ناموس کے مطابق چلایا جائے گا۔

اسلامی تصور حیات کے مطابق انسان کا ارادہ اور اس کی جدوجہد' اس کی تاریخ کی تشکیل میں ایک اہم عنصر ہے' لیکن انسانی جدوجہد اور انسانی ارادے اللہ کی بے قید مشیت کے وسیع دائرے کے اندر رہتے ہیں اور اللہ کا نظام قضا و قدر ان کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ "اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے" انسان کا یہ ارادہ اور اس کی یہ جدوجہد اللہ کے نظام مشیت اور نظام قضا و قدر کے اندر رہتے ہوئے اس پوری کائنات کی حرکت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ یہ انسان اور اس کی جدوجہد اس کائنات سے متاثر بھی ہوتے ہیں اور متاثر کرتے بھی ہیں' گویا عوامل اور مناظر کا ایک بڑا مجموعہ ہے جس سے انسانی تاریخ تشکیل پاتی ہے اور یہ دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کے مقابلے میں انسانی تاریخ کی اقتصادی تعبیر اور انسانی تاریخ کی طبیعاتی تعبیر اور انسانی تاریخ کی جغرافیائی تعبیر نہایت ہی محدود اور چھوٹے دائرے نظر آتے ہیں جبکہ اسلامی تصور تاریخ کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے اور اس کے مقابلے میں یہ محدود دائرے انسان کے بنائے ہوئے کھیل نظر آتے ہیں اور بے ڈھب لکیریں دکھائی دیتی ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ (۹٤) "کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں نبی بھیجا ہو اور اس بستی کے لوگوں کو پہلے تنگی اور سختی میں مبتلا نہ کیا ہو' اس خیال سے کہ شاید وہ عاجزی پر اتر آئیں۔"

یہ بات محض کھیل تماشے کے طور پر نہیں ہوتی' کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات سے بہت ہی بلند ہے کہ وہ لوگوں کو تنگی اور سختی میں محض کھیل تماشے کی غرض سے مبتلا کرے اور ان پر جسمانی اور مالی پریشانیاں آئیں۔ اللہ کی شان سے یہ تصور مطابقت ہی نہیں رکھتا کہ لوگوں کو رنج و محن میں اس لئے مبتلا کیا جائے کہ اللہ ان سے انتقام لیتا ہے اور کینہ کی تسکین کرتا ہے۔ جیسا کہ تمام بت پرستانہ مذاہب میں الہوں کی طرف اس قسم کے قصے مشہور ہیں۔ اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان الہوں کا کام یہ ہے کہ وہ عبث مشغلوں اور انتقامی کارروائیوں میں ہر وقت لگے رہتے ہیں۔ اور انسانوں کے معمولی جرائم پر سخت سے سخت انتقامی کارروائی کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اللہ کی جانب سے پھر لوگوں کو سختیوں اور مشکلات سے کیوں دوچار کیا جاتا ہے؟ صرف اس لئے کہ جن لوگوں کی فطرت بالکل مسخ نہ ہو چکی ہو اور اس میں بھلائی کی کچھ نہ کچھ رمق موجود ہو' وہ فطرت جاگ اٹھے۔ اور وہ دل نرم ہو جائیں جن میں کچھ بھی لچک موجود ہے اور جو بالکل ہی پتھر نہ بن گئے ہوں اور یہ کہ یہ ضعیف انسان اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے جو قہار و جبار ہے۔ اور وہ عاجزی اور تضرع سے اللہ کی طرف متوجہ ہوں' اور اس کی رحمت کے طلبگار ہوں۔ اور اس عاجزی اور تضرع کے اظہار کے ذریعے اس بات کا اعلان کر دیں کہ وہ اللہ کے بندے ہیں' کیونکہ

اللہ کی بندگی کرنا انسانی وجود کی اصل غرض و غایت ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انسانوں کی جانب سے عاجزی کرنے اور بندگی کے اظہار کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ یہ انسان کی ضرورت اور اس کا مقصد وجود ہے ۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (٥٦) مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ (٥٧) اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ”میں نے جن و انس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں ۔ میں ان سے رزق نہیں چاہتا اور نہ ان سے کھانے کا طلبگار ہوں ۔ حقیقت یہ ہے کہ رزاق اور پختہ قوت کا مالک تو صرف اللہ ہی ہے ۔“ اور حدیث قدسی میں آتا ہے کہ ”اگر تمام انسان اور جن ' ایک شخص کے دل کی طرح اللہ کی عبادت اور بندگی پر جمع ہو جائیں تو یہ مکمل اجتماع اللہ کی حکومت میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کر سکتا اور اگر تمام جن و انس ایک شخص کے دل کی طرح اللہ کی معصیت پر جمع ہو جائیں تو بھی اللہ کی حکومت سے کسی چیز کو کم نہیں کر سکتے ۔“ لیکن لوگوں کی جانب سے اعلان بندگی اور اللہ کے سامنے عجز و نیاز مندی کا اظہار خود ان کے لئے مفید ہے ۔ انسان کی زندگی اور انسان کا معاشی نظام بھی اس سے اصلاح پذیر ہوتا ہے جب لوگ صرف اللہ کی بندگی کا اظہار کرتے ہیں تو وہ اللہ کی بندگی اور غلامی کے سوا تمام بندگیوں اور غلامیوں سے نجات پا لیتے ہیں ' وہ شیطان کی غلامی سے بھی بچ جاتے ہیں جو انسان کو گمراہ کرنے کے درپے ہے ' اور اس سورہ کے آغاز ہی میں بتا دیا گیا تھا کہ شیطان کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ انسانوں کو گمراہ کر دے ۔ اسی طرح اللہ کی غلامی اختیار کر کے انسان اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے بھی نجات پاتے ہیں اور وہ شیطان کی پیروی کرنے سے حیا کرتے ہیں اور اس طرح ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے کسی قول و عمل سے اللہ کے غضب کے مستحق نہیں ہوتے ۔ وہ مشکل حالات میں بھی اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور عاجزی کرتے ہیں اور اس راہ پر استقامت کے ساتھ گامزن ہوتے ہیں جو انہیں آزادی کی طرف لے جاتی ہے 'جس میں ان کی اخلاقی تطہیر ہوتی ہے اور وہ ہوا و ہوس کے غلام بھی نہیں ہوتے اور دوسرے افراد کی غلامی سے بھی بالا ہو جاتے ہیں ۔

چنانچہ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ ہر بستی کے باشندوں کے لئے ایک نبی بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ اسے جھٹلائیں اور پھر انہیں پکڑا جائے اور اس پکڑ کا آغاز اس طرح ہو کہ ان کو نفسیاتی اور روحانی مصائب میں مبتلا کر دیا جائے اور ان کو بدنی اور مالی تاوان کی اذیت کا مزہ چکھایا جائے تاکہ یہ اذیتیں سہ کر ان کے دل دوبارہ زندہ ہوں ۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب انسان رنج و الم میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کی شخصیت کے اندر سے کمزوریاں دور ہو جاتی ہیں اور اس کے اندر تہذیب آ جاتی ہے اور اندر سے خیر و برکت کے خشک سوتے تازہ ہو کر پھوٹ نکلتے ہیں ۔ زندہ دلوں کے اندر احساس تیز ہو جاتا ہے اور انسان اللہ کی رحمتوں کے سائے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور پھر جب اندوہناک لمحات میں گھرے ہوئے ضعیف آدمی پر اللہ کی رحمت کی ہواؤں کے خوشگوار جھونکے چلنے لگتے ہیں تو ایسا انسان نہایت ہی اطمینان اور سکینت محسوس کرتا ہے ۔ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ”شاید کہ وہ عاجزی پر اتر آئیں ۔“

ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ ”اس کے بعد ہم نے ان کی بدحالی کو خوشحالی سے بدل دیا ۔“ سختی کی

جگہ نرمی آگئی' تنگی کی جگہ فراوانی آگئی' غربت کی جگہ انعامات آگئے' بیماری کی جگہ صحت آگئی' اولاد کی کمی کی جگہ کثرت اولاد آگئی' ہر چیز میں کمی کی جگہ کثرت نے لے لی اور خوف کی جگہ امن آگیا۔ چنانچہ عیش و آرام کے تمام ساز و سامان مہیا ہوگئے' ناز و نعمت اور کھانے پینے کے لئے سامان فراہم ہوگئے' لیکن اللہ کے اس اصول کے مطابق دراصل یہ سب کچھ ایک قسم کی آزمائش تھی۔

اگر کسی کو مصائب میں مبتلا کر کے آزمائش میں ڈالا جائے تو بعض اوقات اس پر لوگ صبر کرتے ہیں اور اکثر لوگ اس کو برداشت کرتے ہیں۔ کیونکہ شدت سے فریق مخالف میں دفاعی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ ظلم اور شدت کا شکار شخص بعض اوقات اللہ کو یاد کر کے قوت حاصل کرتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں بھلائی کی کوئی رمق ابھی باقی ہو۔ ایسا شخص اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے عاجزی اور زاری کرتا ہے اور ذکر الہی کے سایہ میں وہ اطمینان و سکون حاصل کر لیتا ہے۔ یاد رہے کہ ذکر الہی کے آفاق وسیع ہیں اور اس کے میدان طویل و عریض ہیں اور اللہ کی جانب سے ذاکرین کے لئے جو وعدے ہوتے ہیں' ان میں ان کے لئے خوشخبری ہوتی ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی کو مال و دولت کی فراوانی کے ذریعے آزماتا ہے تو یہ آزمائش غربت و افلاس کے مقابلے میں بہت سخت ہوتی ہے۔ دولت مندی کی وجہ سے انسان غفلت کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر وہ سرکشی اختیار کر لیتا ہے اور بہت ہی کم لوگ ایسے حالات میں صبر کر سکتے ہیں اور ایسے کم لوگ ہی پھر اللہ کے صحیح بندے ہوتے ہیں۔

ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ

وَالسَّرَّآءُ "پھر ہم نے ان کی بدحالی کو خوش حالی سے بدل دیا یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ "ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور برے دن آتے ہی رہے ہیں۔"

یعنی یہ لوگ پھلے پھولے' اور زمین میں پھیل گئے' عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگے' ان کو زندگی کی تمام سہولیات فراہم ہوگئیں اور انہوں نے سب کچھ کرنا شروع کر دیا۔ کسی معاملے میں احتیاط یا ڈر ان کی راہ میں حائل نہ رہا۔ عَفَوْا کے لفظ سے جہاں کسی چیز کی کثرت کا اظہار ہوتا ہے وہاں اس سے لاپرواہی کی نفسیات کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کو خفیف اور ہلکی سمجھنے لگے۔ ہر معاملے میں خواہ وہ شعوری دنیا سے متعلق ہو یا طرز عمل کے ساتھ متعلق ہو' اس میں وہ سہل انگار ہوگئے تھے۔ یہ نفسیاتی اور عملی صورت حالات ان تمام لوگوں کے اندر پائی جاتی ہے جن لوگوں کو مال و دولت کی فراوانی حاصل ہو اور وہ بڑے آرام کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ خصوصاً جبکہ عیش کوشی میں وہ ایک طویل عرصے تک غرق رہے ہوں' خواہ افراد ہوں یا اقوام ہوں۔ گویا ان کے دل و دماغ سے سنجیدگی اور احساس جاتا رہتا ہے اور وہ بڑے بڑے معاملات میں بھی سنجیدہ ہونا پسند نہیں کرتے۔ وہ کھلے ہاتھوں خرچ کرتے ہیں' وسیع پیمانے پر داد عیش دیتے ہیں' عیش و عشرت میں ہروقت گم رہتے ہیں اور نہایت ہی لاپرواہی سے معاملات کو لیتے ہیں اور ایسے ایسے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں جس کے بارے میں سن کر بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ لوگ ایسے افعال کا ارتکاب بڑی بے باکی سے کرتے ہیں وہ اللہ کے غضب سے نہیں ڈرتے۔ وہ عوام سے شرم محسوس نہیں کرتے۔ ان سے ہر قسم کی ذات کا صدور بڑی لاپرواہی سے ہوتا ہے۔ وہ اس کائنات میں جاری سنت الہیہ کو نہیں پاتے۔ ان آزمائشوں کو نہیں سمجھتے' اور یہ

سمجھتے ہیں کہ یہ معاملات یہاں یونہی چلتے رہتے ہیں' ان کا کوئی معلوم سبب نہیں ہے اور نہ یہ کائنات کسی منصوبے کے ساتھ چل رہی ہے اور یہ کہ (ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور برے دن آتے رہے ہیں) قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ ہم نے مشکلات کا دور گزار لیا ہے' اب ہمارے اچھے دن آئے ہیں اور یہ دن بہت ہی اچھی طرح بسر ہو رہے ہیں اور یہ بغیر کسی منصوبے کے گزر رہے ہیں۔

یہ وہ آخری حد ہے کہ جب یہ لوگ غفلت میں ڈوب جاتے ہیں' ہر نصیحت کو بھول کر لہو ولعب اور سرکشی میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو اس حد پر انجام بد ان کو آ لیتا ہے اور یہ سنت الٰہیہ کے مطابق ہوتا ہے۔فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۹۵) ''آخر کار ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا اور انہیں خبر تک نہ ہوئی۔''

ان کی غفلت' غرور اور اللہ سے ان کی دوری پر ان کو یہ سزا دی گئی۔انہوں نے اپنی خواہشات کو کھلی چھٹی دے دی تھی۔وہ کسی بھی برے کام کے ارتکاب میں کوئی باک نہ کرتے تھے۔اور ان کے دلوں کے پیمانے سے خدا خوفی کا آخری قطرہ بھی ختم ہو گیا تھا۔

یہی ہے اللہ کی سنت' اس کائنات میں اور وہ اسی ڈگر پر چلتی رہتی ہے۔یہ سنت اللہ کی مخلوق میں اس کی مشیت کے مطابق کام کرتی ہے۔انسانی تاریخ کا قافلہ انسان کے ارادے اور عمل کے ساتھ' اللہ کی قدرت اور مشیت کے وسیع دائرے میں آگے بڑھتا رہتا ہے۔اور قرآن کریم اس سنت الٰہیہ کو لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان کرتا ہے اور بار بار انہیں اس سے ڈراتا اور متنبہ کرتا ہے۔یہ فتنہ عذاب الٰہی کا فتنہ ہے اور اس میں انسان کو مصائب و مشکلات میں مبتلا کر کے آزمایا جاتا ہے اور اس میں انسان کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ہروقت چوکنا رہے اور برے انجام سے بچتا رہے' کیونکہ یہاں مکافات عمل کا قانون جاری و ساری ہے اور مکافات عمل کا قانون اٹل ہے۔اس لئے جو شخص چوکنا نہ رہے' جس نے خدا خوفی کا راستہ نہ اپنایا' اور احتیاط نہ کی وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا۔اور وہ اپنے آپ کو ایسے عذاب سے دوچار کرے گا جو ٹلنے والا نہ ہو گا۔اور اللہ کسی نفس پر کوئی ظلم نہیں کرتا۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ''اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے مگر انہوں نے تو جھٹلایا' لہٰذا ہم نے اس بری کمائی کے حساب میں انہیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔''

یہ اللہ کی سنت جاریہ کا ایک دوسرا پہلو ہے' اگر بستیوں کے لوگ جھٹلانے کے بجائے مان لیتے اور بدکرداری کے بجائے تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو اللہ ان پر آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتا۔(بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ) اور بلاحساب ان کو دیتا رہتا' آسمانوں سے اور زمین سے ان پر برکات کی بارش ہوتی۔قرآن نے جو انداز تعبیر اختیار کیا ہے' اس کے پیش نظر ہم اسے ہر طرح کی فراوانی سے تعبیر کر سکتے جو کسی ایک جنس ضرورت کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ہر قسم اور ہر نوع کی فراوانی۔

اس آیت اور اس سے قبل کی آیت میں ہم ایک عظیم حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کا تعلق بیک وقت انسانی نظریات اور انسانی زندگی کے حقائق سے بھی ہے اور اس پوری کائنات کے حقائق سے بھی ہے۔ اور ان کے اندر انسانی تاریخ کا اہم عنصر اور عامل بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس اہم فیکٹر کو دنیا کے انسانوں کے وضع کردہ نظامہائے حیات نے پوری طرح نظرانداز کیا ہے بلکہ اس کا انکار کیا ہے۔

وہ فیکٹر ہے ایمان و عقیدہ اور خدا خوفی کا۔ ایمان و عقیدے اور خدا خوفی کا مسئلہ انسانی زندگی کے حقائق سے جدا چیز نہیں ہے اور نہ وہ انسانی تاریخ سے کوئی الگ چیز ہے بلکہ ایمان باللہ اور خدا خوفی وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کی برکات نازل فرماتے ہیں۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ سے زیادہ ایفائے عہد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

ہم لوگ جو اللہ پر ایمان لانے والے ہیں' ہمارا شیوہ تو یہ ہے کہ اللہ کے اس عہد کو مومنانہ دل سے لیتے ہیں۔ اس کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کے علل و اسباب کو سمجھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے' اور اس آیت کے مدلول و مفہوم کی تصدیق میں لحہ بھر تردد بھی نہیں کرتے۔ اس لئے کہ ہمارا ایمان تو ہے ہی ایمان بالغیب اور اس ایمان کے تقاضے کے طور پر ہم اللہ کے اس عہد کی تصدیق کرتے ہیں۔

اس کے بعد' ہم پھر اللہ کے اس عہد پر غور و فکر کرتے ہیں کیونکہ اللہ نے خود حکم دیا ہے کہ تم قرآن میں غور و فکر کرو اور غور و فکر کے بعد ہمیں اس بات کی ماہیت و حقیقت کا علم بھی ہو جاتا ہے۔

اللہ پر ایمان لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کی فطرت زندہ ہے اور فطری حقائق کے ادراک اور قبول کرنے کی اہلیت اس میں موجود ہے۔ ایسے شخص کا ادراک سچا ہے اور اس کی انسانی بنیاد صحیح و سالم ہے۔ اور اس شخص کے دماغ میں اس قدر وسعت ہے کہ وہ اس کائنات کے حقائق کا ادراک کر سکے۔ یہ تمام امور ایسے ہیں جو عملی زندگی میں انسان کی کامیابی کے ضامن ہیں۔

اللہ پر ایمان ایک ایسی قوت ہے جو انسان کو آگے بڑھاتی ہے' یہ انسانی شخصیت کی منتشر قوتوں کو جمع کر کے انہیں ایک جہت اور رخ پر ڈال دیتی ہے اور اس جہت میں انسانی شخصیت اللہ کی قوت کی مدد سے آگے بڑھتی ہے اور اس زمین پر اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے قیام کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔ اس کرۂ ارض کی تعمیر میں لگ جاتی ہے۔ نتیجتہ اس کرۂ ارض سے فتنہ و فساد کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے اور انسان اس زمین کی ترقی اور تعمیر میں لگ جاتا ہے اور اس طرح انسان عملی زندگی میں کامیاب رہتا ہے۔

اللہ پر پختہ ایمان انسان کو خود اپنی خواہشات کی غلامی اور دوسرے انسانوں کی غلامی سے نجات دیتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ صرف اللہ کا غلام اور دوسری تمام غلامیوں سے آزاد انسان ہی اس کرۂ ارض پر خلافت راشدہ کا صحیح نظام قائم کر سکتا ہے۔ ایسا شخص ان لوگوں سے قوی تر ہو گا جو ایک دوسرے کے غلام ہیں یا اپنی خواہشات کے غلام ہیں۔

خدا کا خوف ایک دانشمندانہ بیداری ہے۔ اس سے انسان سرکشی' غرور' بے راہ روی جیسے اخلاقی عیوب سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس کی سرگرمیاں اعتدال اختیار کر لیتی ہیں اور اس کی زندگی کا اسلوب سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ انسان کی پوری جدوجہد محتاط ہو جاتی ہے۔ اور وہ سرکشی کا ارتکاب کر کے اپنی حدود سے آگے نہیں بڑھتا اور اپنی زندگی کو صالحانہ حدود میں رکھتا ہے۔

ایک صالح انسان کی زندگی کا نقشہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی متوازن اور اعتدال پر مبنی ہوتی ہے۔ وہ آگے بڑھنے

اور رکاوٹوں کے درمیان توازن پیدا کر لیتا ہے۔ وہ زمین پر محنت کرتا ہے اور آسمان کی طرف نظریں اٹھائے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ ہوائے نفس ' سرکشی اور تجاوز سے آزاد ہوتا ہے اور اس کے دل میں ہروقت خوف خدا ہوتا ہے۔ ایسا شخص ایک صالح' نتیجہ خیز اور مفید کردار کا مالک ہوتا ہے اور ایسا ہی شخص اللہ کی امداد کا مستحق ہوتا ہے اور اس کے دل میں خدا کا خوف ہوتا ہے۔ ایسے شخص کے اوپر برکات الہی کے سائے نزول کرتے ہیں۔ ان کے کام میں خیر و برکت عام ہوتی ہے اور اس کی زندگی پر فلاح سایہ فگن ہوتی ہے۔ اس کی زندگی بظاہر اسباب کے مطابق چل رہی ہوتی ہے لیکن درحقیقت ایک غیبی قوت اس کی مددگار ہوتی ہے۔

وہ برکات جو مومنین اور اہل تقویٰ پر سایہ فگن ہوتی ہیں وہ مختلف النوع ہوتی ہیں اور اس آیت میں ان کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں لیکن وہ یقیناً موجود ہوتی ہیں۔ اس آیت میں جو اشارات ہیں ان سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان پر ہر جانب سے برکات کا نزول ہو رہا ہوتا ہے۔ ہر طرف سے برکت کے چشمے پھوٹتے ہیں جن کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں۔ لہٰذا اس سے مراد ہر قسم و نوع کی برکات ہیں' ہر شکل و صورت میں ان کا نزول ہوتا ہے' بعض ایسی ہیں جو لوگوں کے وہم و خیال میں بھی نہیں ہوتیں اور بعض ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو وہ سمجھتے ہیں۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ پر ایمان لانا اور اللہ سے خوف کھانا محض پرائیویٹ عبادت کا مسئلہ ہے اور اس کا انسان کی عملی اور اجتماعی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسے لوگوں نے دراصل حقیقت ایمان کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ دیکھیں کہ اللہ کے نزدیک تو ایمان کا عملی اور اجتماعی زندگی کے ساتھ تعلق موجود ہے۔ اور اس پر اللہ عزوجل گواہی دے رہا ہے اور اللہ کی شہادت کافی شہادت ہے۔ اور اللہ ات ان باتوں سے متعلق کرتا ہے جن کے بارے میں لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ عملی اور اجتماعی زندگی کے معاملات ہیں۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ''اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے مگر انہوں نے تو جھٹلایا' لہٰذا ہم نے اس بری کمائی کے حساب میں انہیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔''

بعض لوگ دیکھتے ہیں کہ بعض اقوام کا نقطہ نظر اس معاملے میں یوں ہے: ''ہم مسلمان ہیں اور ہمارے اوپر رزق کے دروازے بند ہیں اور ہمارے حصے میں خشک سالی اور تباہی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ اقوام ایسی ہیں جو نہ مومن باللہ ہیں اور نہ اہل تقویٰ میں سے ہیں لیکن ان پر ہر طرف سے رزق کی بارش ہو رہی ہے۔ ان کے پاس بے پناہ قوت ہے اور وہ دنیا میں بااثر ہیں۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں جس سنت الہیہ کا ذکر ہوا ہے وہ ہم پر صادق کیوں نہیں آتی؟''

دراصل ایسے لوگوں نے اس مسئلے کے صرف ظاہری اور سطحی پہلو کو لیا ہے۔ یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں' وہ مومن اور متقی ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ نہ ان لوگوں نے خالصتاً'' اللہ کی بندگی اور غلامی کا رویہ اپنایا ہے۔ ان کی عملی زندگی میں لا الہ الا اللہ کی شہادت موجود نہیں ہے بلکہ یہ لوگ اپنے میں سے بعض غلاموں کی غلامی کر رہے

ہیں۔"یہ" غلام ان کے الٰہ بنے ہوئے ہیں اور ان کے لئے قانون بناتے ہیں۔نہ صرف قوانین بلکہ ان کے لئے حسن و قبح کی اقدار بھی تجویز کرتے ہیں۔میں کہتا ہوں کہ ایسے لوگ کہاں مومن ہیں۔مومن کا تو فریضہ ہی یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو ختم کر دے جو ان پر مقتدر اعلیٰ بنے ہوئے ہیں۔مومن کا تو پہلا عمل یہ ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی کو بھی الٰہ و رب نہ بنائے جو ان پر اپنے قوانین اور اپنا نظام نافذ کرے۔جب ایسے مدعیان کے اسلاف حقیقی مومن اور مسلم تھے تو ان کے سامنے پوری دنیا سرنگوں تھی اور ان پر آسمان اور زمین کی برکات کی بارش ہوتی تھی اور ان کے ساتھ ان کے رب کا وعدہ سچا تھا کیونکہ وہ خود سچے تھے۔

رہے وہ لوگ جن پر رزق کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں تو یہ بھی سنت الہیہ کا ایک حصہ ہے۔ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتَّى عَفَوا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ س"پھر ہم نے ان کی بدحالی کو خوش حالی سے بدل دیا یہاں تک کہ خوب پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور برے دن آتے رہے ہیں (۷:۹۸) ان لوگوں پر جو انعامات ہوتے ہیں وہ دراصل ان کے لئے ابتلاء و آزمائش ہے اور یہ ابتلاء مصیبت کی ابتلاء سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔کفار پر جو انعامات ہوتے ہیں اور اہل ایمان پر جو انعامات ہوتے ہیں ان کے درمیان بہت بڑا فرق ہے' برکت الٰہی بعض اوقات ایک قلیل چیز میں بھی اپنے رنگ دکھاتی ہے۔جب انسان ایک تھوڑی چیز سے اچھی طرح فائدہ اٹھاتا ہے اور امن و سکون کے ساتھ خوشی اور اطمینان محسوس کرتا ہے' دوسری جانب بڑی بڑی ترقی یافتہ اور مالدار اقوام ایسی ہیں جو پریشانی اور عدم اطمینان کی زندگی بسر کرتی ہیں حالانکہ بظاہر وہ نہایت ہی امن و امان سے زندگی بسر کرتی ہیں اور ان کے افراد کے درمیان کوئی تعلق باقی نہیں ہے۔افراد معاشرہ کے درمیان بے چینی کا دور دورہ ہے۔اور قریب ہے کہ یہ اقوام مکمل طور پر تباہ ہو جائیں۔ساز و سامان بسیار مگر اطمینان مفقود ہے' ہر چیز کی فراوانی ہے' لیکن لوگ بدکردار ہیں' ان کی خوشحالی ہی ان کے لئے برے مستقبل کا پتہ دے رہی ہے اور یہ خوشحالی ان کے لئے انتقام الٰہی کا سبب ہے۔

اہل ایمان کو جو برکات ملتی ہیں' ان کے کئی رنگ ہیں' ان کی ضروریات کی چیزوں میں برکت ہوتی ہے' ذات انسانی میں برکت ہوتی ہے' انسانی شعور میں برکت ہوتی ہے' پاکیزہ زندگیوں میں برکت ہوتی ہے اور ان برکات کے نتیجے میں زندگی بڑھتی ہے اور اس کے اندر سکون و اطمینان پیدا ہوتا ہے' یہ نہیں کہ ہر طرف سہولیات تو وافر ہوں اور انسان جہنم میں ہو جسمانی اور نفسیاتی انحلال میں مبتلا ہو۔(۱)

سنت جاریہ جس پر تاریخ انسانی بھی ایک گواہ ہے اور جس کے بیان کے متصل بعد اب روئے سخن اہل غفلت کی طرف مڑتا ہے۔ان حالات کے جاننے اور دیکھنے کے بعد جن میں مکذبین کو تباہ و برباد کیا گیا اور ان پر عذاب نازل ہوا جن کی وجہ سے پڑھنے والے کے شعور اور وجدان کے اندر ایک ہمہ گیر ارتعاش پیدا ہو گیا کیونکہ ان لوگوں نے اپنی نرمی اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے آزمائش انعامات اور زندگی کے ساز و سامان میں غفلت کا مظاہرہ کیا اور حکمت الہیہ کو نہ سمجھ سکے کہ یہ تو دراصل ان کی آزمائش ہے۔ایسے حالات میں اب سیاق کلام ان اہل غفلت کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو اپنے حال

(۱) دیکھئے میری کتاب الاسلامی و مشکلات الحضارۃ کی فصل تخبط و اضطراب اور فصل شہادۃ القرن العشرین۔ از کتاب التصور و الشبہات از محمد قطب۔

میں مست ہیں ۔ ایسے لوگوں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ رات اور دن کے کسی بھی وقت میں ان کو عذاب الٰہی اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے ' ایسے حالات میں کہ لہو ولعب اور خواب غفلت میں ڈرے ہوئے ہوں ۔

أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا بَيَاتًا وَهُمْ نَائِمُونَ ﴿٩٧﴾
أَوَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا ضُحًى وَهُمْ يَلْعَبُونَ ﴿٩٨﴾ أَفَأَمِنُوا ۱۲
مَكْرَ اللَّهِ ۚ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٩٩﴾ أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ ع ۱
يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِن بَعْدِ أَهْلِهَا أَن لَّوْ نَشَاءُ أَصَبْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَ ۲
نَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿١٠٠﴾

"پھر کیا بستیوں کے لوگ اب اس سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ ہماری گرفت کبھی اچانک ان پر رات کے وقت نہ آجائے گی جب کہ وہ سوئے پڑے ہوں؟ یا انہیں اطمینان ہو گیا ہے کہ ہمارا مضبوط ہاتھ کبھی یکایک ان پر دن کے وقت نہ آپڑے گا جب کہ وہ کھیل رہے ہوں؟ کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں؟ حالانکہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو۔

اور کیا ان لوگوں کو جو سابق اہل زمین کے بعد زمین کے وارث ہوتے ہیں ' اس امر واقعی نے کچھ سبق نہیں دیا کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے قصوروں پر انہیں پکڑ سکتے ہیں؟ (مگر وہ سبق آموز حقائق سے تغافل برتتے ہیں) اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں ' پھر وہ کچھ نہیں سنتے ۔"

کیا لوگ سنت الٰہیہ کو دیکھتے ہوئے بھی اس قدر بے خوف ہوگئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو خوشحالی اور فراوانی دے کر اور شدائد و مصائب میں مبتلا کر کے آزماتا ہے ۔ اس کے بعد ناشکروں اور نافرمانوں اور جھٹلانے والوں کو تباہ و برباد کرتا ہے اور ان کی تباہی اور ہلاکت کے میدان تمہاری نظروں کے سامنے ہیں جو تباہ ہوئے اور جنہوں نے ان بستیوں کو خوب آباد کیا اور تباہی کے بعد پیچھے آنے والوں کے لئے چھوڑ دیا ' کیا وہ اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر بھی اچانک عذاب الٰہی آجائے اور وہ غفلت اور بے خبری میں مبتلا ہوں اور تباہ و برباد ہو جائیں ۔ عذاب دن کے کسی وقت میں آئے یا رات کو کسی ایسے وقت میں آئے کہ وہ غافل ہوں ۔ یاد رہے کہ نیند میں انسان اس طرح غرق ہوتا ہے کہ اس کے اندر کوئی شعور اور ارادہ نہیں رہتا اور نہ کوئی کام کرنے کی قوت ہوتی ہے ۔ نہ وہ احتیاطی تدابیر اختیار کر سکتا ہے ۔ نہ کسی معمولی کیڑے مکوڑے کے خلاف مدافعت کر سکتا ہے ۔ اللہ جیسی عظیم قوت کے مقابلے میں تو وہ کیا کرے گا؟ جس کے مقابلے میں کوئی انسان نہایت بیداری اور قوت و حکمت کے ساتھ بھی کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا ۔

غرض ان پر یہ عذاب دن کو بھی آسکتا ہے جب یہ کھیل رہے ہوں ' کھیل کے وقت انسان کو کوئی ہوش نہیں ہوتا ۔ وہ کھیل میں غرق ہوتا ہے اور اس کی توجہ صرف مد مقابل کی طرف ہوتی ہے ۔ رہا وہ حملہ جو اللہ کی جانب سے ہو تو اس کا مقابلہ تو وہ پوری تیاری اور پوری بیداری کے ساتھ بھی نہیں کر سکتا اور جب وہ غافل ہو تو کیا کرے گا؟

اللہ کا عذاب اس قدر شدید ہوتا ہے کہ وہ جاگ رہے ہوں یا سو رہے ہوں کسی حالت میں بھی وہ اس کے آگے ٹک نہیں سکتے ۔ وہ کھیل میں ہوں یا سنجیدہ حالت میں ہوں ' اس کا مقابلہ تو وہ نہیں کر سکتے 'لیکن قرآنی سیاق انسان کے سامنے اس کی زندگی کے وہ لمحات پیش کرتا ہے تاکہ انسانی شعور میں پوری طرح انسان کے ضعف اور کمزوری کا احساس پیدا کر دیا جائے اور وہ محتاط ہو جائے اور اپنے بچاؤ کی فکر کرے جب تباہ کن حملہ ہو اور ایسے حالات میں ہو کہ انسان پوری طرح غفلت اور لاپرواہی میں ہو اور مکمل بے خبری میں اسے آلیا جائے تو ایسے حالات میں اس کا دفاع نہایت ہی کمزور ہوتا ہے ۔رہا عذاب الہی تو انسان باخبر ہو یا بے خبر ہو' اس کے مقابلے میں اس کی بے بسی یکساں ہوگی ۔

اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ (۹۹) "کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں؟ حالانکہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو ۔"

اللہ کے مکر سے مراد وہ خفیہ تدبیر ہے جس سے وہ بے خبر ہوں تاکہ انسان اللہ سے ڈرتے رہیں اور اللہ کے احکام میں محتاط رہیں ۔ اور جو لوگ نہ ڈریں گے وہ خسارے میں رہیں کیونکہ عافیت کوشی 'غفلت اور حد سے گزر جانے اور لاپرواہی کا نتیجہ خسران مبین ہی ہو سکتا ہے ۔

کیا یہ لوگ اللہ کی چال اور تدبیر سے بے خوف ہو گئے ہیں؟ حالانکہ یہ وہی لوگ ہیں جن کے آباؤ اجداد کو ہلاک کر دیا گیا اور ان کے بعد یہ لوگ اس دنیا کے وارث بنائے گئے اور جنہیں ان کی غفلت ہی کی وجہ سے برباد کیا گیا کہ ان کی بربادی میں ان کے لئے کوئی ہدایت اور عبرت نہیں ہے؟

اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (۱۰۰) "اور کیا ان لوگوں کو جو سابق اہل زمین کے بعد زمین کے وارث ہوتے ہیں 'اس امر واقعی نے کچھ سبق نہیں دیا کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے قصوروں پر انہیں پکڑ سکتے ہیں؟ (مگر وہ سبق آموز حقائق سے تغافل برتتے ہیں) اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں 'پھر وہ کچھ نہیں سنتے ۔"

بے شک اللہ کی سنت اٹل ہوتی ہے اور اللہ کی مشیت جاری رہتی ہے ۔ اگر اللہ ان لوگوں کے گناہوں کے سبب انہیں اسی طرح پکڑے جس طرح ان کے آباؤ اجداد پکڑے گئے تھے تو انہیں کون بچا سکتا ہے؟ یا اگر اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دے اور ان سے ہدایت کی توفیق ہی سلب کر لے اور وہ ہدایت سے ہمیشہ ہی کے لئے محروم ہو جائیں اور دلائل ہدایت کی طرف سے ان کا رخ ہی پھر جائے اور ان کی دنیا و آخرت دونوں تباہ ہو جائیں تو کون ان کی مدد کو پہنچ سکے گا۔ سابقہ لوگوں کی ہلاکت اور ان کے بعد ان موجودہ لوگوں کی جانشینی اور اس بارے میں اللہ کی سنت کی کارفرمائیاں یہ سب امور ان کے لئے غور و فکر و ہدایت و تقویٰ کا وافر سامان مہیا کرتے تھے اور ان سے یہ توقع تھی کہ وہ اللہ سے ڈرتے اور اس عارضی مصنوعی عافیت کو چھوڑ دیتے ہیں جس میں وہ اپنے آپ کو سمجھتے تھے ۔ اس لاپرواہی کو ایک طرف چھوڑ دیتے تو وہ اصلاح پذیر ہو جاتے اور ان واقعات سے عبرت لیتے ۔ کاش کہ وہ ایسے کرتے ۔

اس آیت میں جو تنبیہ کی گئی ہے' اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگ ہر وقت نامعلوم عذاب اور مستقبل کی اچانک

تباہی اور بربادی کے خوف سے کانپتے ہی رہیں اور وہ ہروقت غیر یقینی صورت حالات سے دوچار رہیں کہ کسی بھی وقت ان پر کوئی عذاب نازل ہوسکتا ہے۔کیونکہ ہروقت کا جزع و فزع 'کسی بھی وقت آجانے والے عذاب کا ڈر' اور ہروقت یہ خطرہ کہ کسی بھی وقت کوئی آفت نازل ہوسکتی ہے' ایسے امور ہیں جن کی وجہ سے انسانی قوتیں شل ہو جاتی ہیں اور انسان علم و عمل کی خوبی سے محروم ہوسکتا ہے۔اور اس طرح مایوس ہوکر انسان اس کرۂ ارض کی تعمیر اور ترقی کے مسلسل عمل سے دستکش ہوسکتا ہے۔اس تنبیہ کی غرض و غایت انسان کو شل کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان بیدار ہو' اس کے اندر ہروقت خدا خوفی کا احساس ہو' وہ ہروقت اپنے نفس کے اوپر نگران رہے اور دنیا میں گزرے ہوئے واقعات سے سبق لے وہ انسانی تاریخ کے محرکات کو معلوم کرلے۔اور اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہر وقت قائم رہے اور عیش و عشرت کی زندگی اسے غافل اور مغرور نہ کردے۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے لوگوں کے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ وہ انہیں آخرت میں امن' اطمینان' اپنی رضامندی' دنیا و آخرت کی رضامندی عطا کرے گا لیکن یہ اس وقت ہوگا جب انہوں نے اللہ کے بارے میں اپنے احساس کو تیز رکھا۔اور انہوں نے تقویٰ اور خدا خوفی کی وجہ سے اپنے آپ کو آلودگیوں میں ملوث نہ کیا۔انہوں نے اپنی مادی قوت کے مقابلے میں اللہ پر اعتماد کیا۔انہوں نے اپنے محدود و مادی وسائل کے مقابلے میں ان وسائل پر بھروسہ کیا جو اللہ کے ہاں موجود ہیں۔

اس دنیا میں ایسے لوگ پختہ مومن اور اللہ سے ڈرنے والے تھے جو اللہ کے اس عذاب کی خفیہ تدابیر سے محفوظ تھے اور جو اللہ کے سوا کسی پر بھروسہ نہ کرتے تھے' ان کے دل دولت ایمان سے بھرے ہوئے تھے۔وہ اللہ کے ذکر پر مطمئن تھے' وہ اپنی خواہشات اور شیطانی حرکات پر کنٹرول کئے ہوئے تھے۔وہ اس کرۂ ارض پر مصلح کے طور پر اللہ کی ہدایات کے مطابق زندگی بسر کر رہے تھے۔وہ لوگوں سے نہ ڈرتے تھے اور صرف اللہ سے ڈرتے تھے اور اللہ ہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔

اس انداز میں ہم اللہ کے عذاب سے اس دائمی ڈراوے کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں' ایسا عذاب جو اٹل ہوتا ہے اور وہ اللہ کی ان تدابیر کے مطابق ہوتا ہے جس کا ادراک انسان کو نہیں ہوتا۔اس طرح ہم سمجھ سکتے ہیں کہ قرآن کی ان آیات کا مطلب محض خوف و ہراس پھیلانا نہیں ہے بلکہ لوگوں کے اندر بیداری پیدا کرنا ہے' لوگوں کے اندر بے چینی پیدا کرنا نہیں بلکہ ان کے اندر احساس زیاں پیدا کرنا مطلوب ہے۔زندگی کو معطل کرنا مطلوب نہیں ہے' بلکہ اسے لاپرواہی اور سرکشی سے بچانا مطلوب ہے۔

اسلامی اور قرآنی منہاج تربیت کا یہ طریقہ کار ہے کہ وہ انسانی نفسیات کے بدلتے ہوئے طور طریقوں کی اصلاح بھی کرتا ہے' اقوام اور سوسائٹیوں کے مسائل و اطوار کو بھی درست کرتا ہے۔اور ہر ایک کا علاج اس کے حالات کے مطابق کرتا ہے۔کسی کو امن' اطمینان اور اللہ پر بھروسے کی امید کی دولت دیتا ہے۔اور کسی کے لئے خوف' بیداری اور سٹینڈ ٹو کا نسخہ تجویز کرتا ہے کہ وہ اپنی بداعمالیوں سے باز آجائے اور اللہ کے عذاب سے ڈرے جو کسی بھی وقت انہیں گھیر سکتا ہے۔خصوصاً اس وقت جب وہ مادی زندگی پر بھروسہ کرکے غرے میں مبتلا ہو جائے۔اللہ بہرحال اپنی مخلوق سے اچھی طرح باخبر ہے اللہ لطیف و خبیر ہے۔

---ooo---

یہاں سنت جاریہ کا بیان ختم ہو جاتا ہے۔ انسانی وجدان کو اس سنت کے شعور کا مچ دیا گیا اور نہایت ہی اچھے اشارات دیئے گئے۔ اب روئے سخن حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پلٹ جاتا ہے اور آپ کو بتایا جاتا ہے کہ ان بستیوں کے باشندوں کا مجموعی طور پر کیا انجام ہوا اور اس انجام سے کفر کا کیا مزاج سامنے آتا ہے اور ایمان کا مزاج کس رنگ میں سامنے آتا ہے اور اقوام عالم کی تاریخ سے ان دو قسم کے انسانوں کی عمومی روش کیا معلوم ہوتی ہے؟

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَاۤ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

"یہ قومیں جن کے قصے ہم تمہیں سنا رہے ہیں (تمہارے سامنے مثال کے طور پر موجود ہیں) ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے مگر جس چیز کو وہ ایک دفعہ جھٹلا رہے چکے تھے پھر اسے وہ ماننے والے نہ تھے۔ دیکھو اس طرح ہم منکرین حق کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔ ہم نے ان میں سے اکثر میں کوئی پاس عہد نہ پایا بلکہ اکثر کو فاسق ہی پایا۔"

یہ قصے اللہ کی جانب سے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا کوئی علم نہ تھا۔ آپ کو یہ قصے بذریعہ وحی تعلیم کئے گئے۔

(لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ) "ان کے رسول ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے۔" لیکن ان نشانیوں کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ بدستور رسولوں کو جھٹلاتے رہے جس طرح وہ ان نشانیوں سے پہلے بھی جھٹلاتے تھے۔ یہ نشانیاں اور معجزات بھی ان کو ایمان تک نہ پہنچا سکے۔ یہ نہ تھا کہ ان کے سامنے دلائل کی کمی تھی بلکہ حقیقی صورت حالات یہ تھی کہ ان کے دلوں کو تالے لگے ہوئے تھے' ان کا احساس مردہ ہو گیا تھا' اور ہدایت کی طرف وہ متوجہ ہی نہ تھے۔ جس چیز کی کمی تھی وہ یہ تھی کہ ان کی فطرت مرچکی تھی' وہ متاثر ہی نہ ہوتے تھے' لہٰذا وہ دعوت کو قبول ہی نہ کرتے تھے۔ جب ان کے دل دلائل ایمان کی طرف متوجہ ہی نہ تھے اور ہدایت کے اشارات ان تک پہنچ ہی نہ پا رہے تھے تو اللہ نے بھی انہیں اس حال پر چھوڑ کر ان کے دلوں پر مہر لگا دی اور ان کے لئے قبولیت حق کے تمام راستے بند ہو گئے۔

(كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ) "دیکھو اس طرح اللہ تعالیٰ منکرین حق کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔" یہ مزاج ان میں سے اکثریت کا تھا۔

(وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ وَاِنْ وَّجَدْنَاۤ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ) "ان میں سے اکثر میں کوئی پاس عہد نہ پایا بلکہ اکثر کو فاسق ہی پایا۔"

یہاں جس عہد کا ذکر ہے وہ فطرت انسانی کا عہد بھی ہو سکتا ہے جس کا ذکر اس سورہ کے آخر میں ہوا ہے۔ (وَاِذْ

اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا) "اے نبی" لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا: "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" انہوں نے کہا: "ضرور آپ ہمارے رب ہیں۔" ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔ (۷:۱۷۲)

اس عہد سے وہ عہد بھی مراد ہو سکتا ہے جو ان لوگوں کے اسلاف نے اپنے رسولوں سے کیا تھا کہ وہ ایمان لائیں گے مگر بعد میں آنے والے لوگ اس سے منحرف ہو گئے جیسا کہ ہر جاہلیت میں یہی ہوتا رہا ہے کہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اہل ایمان جاہلیت کی طرف بڑھتے رہتے ہیں اور آخرکار پوری طرح جاہلیت میں داخل ہو جاتے ہیں۔

بہرحال عہد سے مراد جو بھی ہو، لیکن ہلاک ہونے والوں کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ کسی عہد و پیمان کے پابند نہ تھے، نہ وہ کسی بات پر قائم رہتے تھے۔ یہ لوگ اپنی ذاتی خواہشات کے ساتھ بدلتے رہتے تھے۔ ان کا مزاج بھی ایسا ہو گیا تھا کہ وہ اپنی بات پر جمتے نہ تھے اور نہ سچا طرز عمل اختیار کرتے تھے۔ بلکہ اکثر کو فاسق پایا گیا یعنی اپنے دین سے منحرف پایا گیا۔ اور یہ اس لئے کہ وہ ہر وقت بدلتے رہتے تھے اور کسی عہد کا پاس نہ رکھتے تھے بلکہ وہ اغراض کے بندے ہو گئے تھے جو قوم اللہ کے ساتھ اپنے وعدے پر قائم نہیں رہتی اور اپنے دین اور راہ ہدایت پر قائم نہیں رہتی اور اللہ سے ہدایت اخذ نہیں کرتی تو ظاہر ہے کہ ایسی قوم تتر بتر ہو جاتی ہے۔ راہ حق سے منحرف ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ فاسق بن جاتی ہے چنانچہ ان بستیوں والوں کی یہی حالت ہو گئی تھی اس لئے ان کا یہ انجام ہوا۔

---ooo---

# درس نمبر ۷۹ ایک نظر میں

اس سبق میں فرعون اور اس کے درباریوں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات و واقعات بیان کئے گئے ہیں' ان واقعات کی وہ کڑیاں جو اس کے دعوائے ربوبیت اور اس کے لشکر سمیت اس کی غرق یابی کے واقعات پر مشتمل ہیں۔ ان کڑیوں کی درمیانی کڑیاں مثلاً جادوگروں کے ساتھ مقابلہ اور حق کا باطل پر غالب آنا' جادوگروں کا ایمان لانا' اور ان کے الفاظ کے ساتھ کہ ہم رب موسیٰ اور رب ہارون پر ایمان لاتے ہیں' پھر فرعون کی جانب سے انہیں سخت عذاب کی دھمکی' اور ان کے دل و دماغ میں ایمان و اسلام کی سربلندی کا مظاہرہ اور ان کی جانب سے اپنی زندگی کے مقابلے میں ایمان و اسلام کو ترجیح دینا' اس کے بعد بنی اسرائیل پر فرعون کی جانب سے مظالم کا ذکر' پھر اللہ کی جانب سے آل فرعون اور اہل مصر پر خشک سالی وغیرہ کے عذاب کا نزول اور ہر قسم کی پیداوار کی تباہی' پھر طوفان' پسوؤں اور مینڈکوں کے حملے اور خون کی بارش اور ہربار ان کی جانب سے حضرت موسیٰ کی روحانی قوت کے سامنے جھکنا کہ وہ رب العالمین سے سوال کریں تاکہ انہیں اس عذاب سے نجات ملے۔ لیکن جب ان پر سے یہ مصیبت دور کی جاتی تو جلد ہی وہ لوگ دوبارہ اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ جاتے اور اعلان کر دیتے کہ جس قدر آیات و معجزات بھی وہ دکھائیں ہم اسے ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ ان بار بار کی بدعملیوں کی وجہ سے ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے اور وہ غرق کر دیئے جاتے ہیں کیونکہ وہ معجزات کو جھٹلاتے ہیں اور اس آزمائش میں غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یہ تمام امور سنت جاریہ کے مطابق انجام پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان پر سختی کر کے اور مصائب میں مبتلا کر کے بھی آزماتے ہیں اور ان کو خوشحال اور فراوانی عطا کر کے بھی آزماتے ہیں۔ اس کے بعد وہ واقعات آتے ہیں کہ جب قوم موسیٰ ان آزمائشوں میں پوری اترتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو خلافت فی الارض عطا فرماتے ہیں اور غلامی کی اس شدت اور مصیبت کے بعد خلافت فی الارض عطا کر کے پھر ان کو آزمایا جاتا ہے اور فراوانی عطا کی جاتی ہے۔

ہم نے مذکورہ بالا واقعات پر مشتمل ایک سبق تجویز کیا ہے اور اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم کی جانب سے جو واقعات درپیش ہوئے اسے دوسرا درس بنایا ہے کیونکہ دونوں کا موضوع مختلف ہے۔

یہ قصہ یہاں جس انداز سے شروع کیا جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس قصے کو لانے کے مقاصد کیا ہیں؟ اس کا آغاز ان الفاظ سے کیا جاتا ہے۔

(ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ) "پھر ان قوموں کے بعد (جن کا ذکر اوپر کیا گیا) ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی

نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس بھیجا۔ مگر انہوں نے ہماری نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا' بس دیکھو کہ ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا؟"

یہ تصریح کی جاتی ہے کہ یہاں اس قصے کو لانے کی غرض و غایت کیا ہے۔ یعنی یہ کہ اس دنیا میں ہمیشہ مفسدین کا انجام ایک ہی جیسا ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ قصے کی غرض و غایت کے اظہار کے بعد اس کے ضروری مضمون و موضوع کے ساتھ مناسب حلقے پے درپے لائے جاتے ہیں۔

اس قصے میں زندہ اور متحرک مناظر بھی دکھائے گئے ہیں۔ ان میں حرکت بھی ہے اور مکالمات بھی ہیں۔ تاثرات بھی ہیں اور مختلف لوگوں اور کرداروں کے خدوخال اور ان کی شناخت بھی ہے۔ اس کے درمیان جگہ جگہ ہدایات و اشارات بھی ہیں اور عبرت آموزی بھی ہے اور اس بات کی صفائی بھی ہے کہ دعوت الی اللہ کے خدوخال کیا ہوتے ہیں اور دعوت الی الطاغوت کا مزاج کیا ہوتا ہے اور یہ کہ تمام طاغوتی قوتیں دراصل ربوبیت اور حاکمیت کی مدعی ہوتی ہیں اور دعوت الی رب العالمین کی تڑپ جس نفس میں گہرائی تک بیٹھ جاتی ہے' اس نفس سے طاغوتی قوتوں کا خوف یکسر غائب ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اس راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں اور کسی وعدہ و وعید کو خاطر میں نہیں لاتے۔

---0 0 0---

# درس نمبر ۹۷ تشریح آیات

# ۱۰۳ ---تا--- ۱۲۷

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

"پھر ان قوموں کے بعد (جن کا ذکر اوپر کیا گیا) ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس بھیجا۔ مگر انہوں نے ہماری نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا' پس دیکھو کہ ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا؟"

اس سے پہلے اس سورت میں جن بستیوں کا ذکر ہوا تھا' ان کے اہالیان نے دعوت حق کی تکذیب کی تھی اور ان کو ہلاک کیا گیا تھا' ان کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ قصے کا آغاز اس مقام سے ہوتا ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون ایک دوسرے کے آمنے سامنے آتے ہیں اور خلاصہ یہاں دے دیا جاتا ہے کہ فرعون اور اس کا ٹولہ دعوت حق کا استقبال کس طرح کرتا ہے اور اس انجام کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے جس تک وہ پہنچے۔ انہوں نے ان آیات و معجزات کے ساتھ ظلم اس طرح کیا کہ ان کا انکار کر دیا۔ یعنی انہوں نے کفر و شرک کا ارتکاب کیا۔ قرآن کریم میں بارہاکفر کے لئے فسق کا لفظ اور شرک کے لئے ظلم کا لفظ استعمال ہوتا ہے کیونکہ کفر و شرک سے بڑا ظلم اور بڑا فسق اور نہیں ہے۔ جو لوگ کفر کرتے ہیں یا شرک کرتے ہیں وہ دراصل ایک عظیم سچائی کے ساتھ ظلم کرتے ہیں یعنی اللہ کی حاکمیت اور عقیدۂ توحید کے ساتھ۔ اور یہ لوگ دراصل خود اپنے آپ پر بھی ظلم کرتے ہیں کیونکہ اپنے آپ کو یہ لوگ ہلاکت و بربادی کا مستحق ٹھہراتے ہیں' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ پھر ایسے لوگ عوام الناس پر یہ ظلم کرتے ہیں کہ انہیں ایک اللہ وحدہ کی غلامی اور بندگی سے نکال کر مختلف طاغوتی طاقتوں کے بندے بناتے ہیں اور ان کو رب اور مقتدر اعلیٰ تسلیم کرتے ہیں اور اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے؟ چنانچہ کفر ظلم ہے اور کافرون ظالمون ہیں جیسا کہ قرآن کریم ایسا انداز بیان اختیار کرتا ہے نیز جو شخص کفر اور ظلم اختیار کرتا ہے وہ راہ مستقیم کو چھوڑ کر غلط راستوں پر چلتا ہے اور مختلف بے راہ رویوں میں پڑ کر فاسق اور بدکار بن جاتا ہے اور آخر کار جنت کے بجائے جہنم کا مستحق قرار پاتا ہے۔

فرعون اور اس کے ٹولے نے آیات الٰہی کے ساتھ ظلم کیا یعنی ان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لئے وہ برے

انجام تک پہنچے ۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (۷:۱۰۳) ”پس دیکھو کہ ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا؟“ اس انجام کا ذکر سیاق کلام میں عنقریب آنے والا ہے ۔ یہاں ہم چاہتے ہیں کہ لفظ مفسدین کی تشریح کر دیں ۔ یہ لفظ اس مقام پر کافرین اور ظالمین کے مترادفات میں سے ہے یعنی ان کا ہم معنی ہے ۔ انہوں نے آیات الٰہی کے ساتھ ظلم کیا یعنی ان کا انکار کر دیا اور اس لئے ان کا یہ انجام ہوا ۔

یہ لوگ مفسد کیوں ہیں؟ اس لئے کہ ظالم ہیں یعنی کافر اور منکر ہیں ۔ کیونکہ کفر شدید ترین فتنہ و فساد کا نام ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف ایمان و اسلام کی اساس ہی پر درست ہو سکتی ہے ۔ یعنی جب تک اللہ وحدہ کو الٰہ تسلیم نہیں کر لیا جاتا اور جب تک کسی سرزمین پر بندگی اور غلامی صرف اللہ کے لئے خالص نہیں کر دی جاتی اور صرف اللہ کی بندگی اور غلامی تب قائم ہوگی جب ہم اللہ کو حاکم اور فرمانروا تسلیم کر لیں ۔ ہم بندگی اور عبادت بھی اسی کی کریں ۔ ہم اپنی زندگی میں قوانین اور ضابطے بھی اسی کے جاری کریں اور اس معاملے میں اللہ کے ساتھ کسی اور ذات کو شریک نہ کریں ۔ فساد جس طرح لوگوں کی فکری دنیا میں برپا ہوتا ہے ' اسی طرح ان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں بھی سرایت کرتا ہے ۔ اجتماعی زندگی میں فساد اس وقت قائم ہوتا ہے کہ جب لوگ ارباب متفرقون کی غلامی اور اطاعت اختیار کر لیں ۔ اور اللہ کو چھوڑ دیں ۔ یہ بات پتے کی بات ہے کہ لوگوں کی زندگی اس وقت تک استوار نہیں ہو سکتی جب تک اپنے نظریات اور اپنی عملی زندگی کو نظریہ حاکمیت خدائے واحد کے اوپر استوار نہیں کرتے ۔ اور نہ اس وقت تک کوئی انسان صحیح معنوں میں آزاد تصور ہو سکتا ہے ۔ انہی وجوہات کی بناء پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (۷:۱۰۳) ”پس دیکھو کہ ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا؟“ ہر وہ طاغوتی نظام جس میں اللہ کی شریعت کو چھوڑ کر کسی دوسرے قانون کی اطاعت کی جاتی ہو وہ فسادی نظام ہے اور اسی کے بارے میں اللہ کا حکم ہے کہ ایسی طاغوتی قوتیں مصلحین میں نہیں ہو سکتیں بلکہ یہ فسادی قوتیں ہوتی ہیں ۔

---○○○---

اس انداز میں قصے کا آغاز کرنا قرآن کریم کا ایک مخصوص اسلوب ہے ۔ یہاں اس سورت میں جو موضوع اور مضمون چل رہا تھا اس کے لئے یہی انداز موزوں تھا ۔ کیونکہ اس انداز سے قاری ایک ہی لمحہ میں اس ہدف تک پہنچ جاتا ہے جس کے لئے اس طویل قصے کو لایا جا رہا ہے اور پھر وہ تفصیلات کو بڑے اطمینان کے ساتھ پڑھتا جاتا ہے ۔ اب دیکھئے کہ قصے کی اگلی کڑیاں کس طرح آتی ہیں اور کس طرح انجام تک لے جاتی ہیں ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان اس پہلی ملاقات میں جو مکالمات ہوئے اور واقعات پیش آئے تھے وہ اس طرح تھے ۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ

مَعِيَ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ
مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَّنَزَعَ
يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ۝ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ ۱۳ ۹ ع
هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۝ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۳
۝ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۝ يَاْتُوْكَ
بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝

موسیٰ نے کہا "اے فرعون' میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں' میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں' میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے صریح دلیل ماموریت لے کر آیا ہوں' لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے ۔" فرعون نے کہا "اگر تو کوئی نشانی لایا ہے اور اپنے دعوے میں سچا ہے تو اسے پیش کر ۔" موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک جیتا جاگتا اژدھا تھا اور اس نے اپنی جیب سے ہاتھ نکالا اور سب دیکھنے والوں کے سامنے وہ چمک رہا تھا ۔ اس پر فرعون کی قوم کے سرداروں نے آپس میں کہا کہ "یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے ۔ اب کہو کیا کہتے ہو؟" پھر ان سب نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اسے اور اس کے بھائی کو انتظار میں رکھیے اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دیجئے کہ ہر ماہر فن جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں ۔"

حق و باطل اور ایمان و کفر کے مابین یہ پہلا معرکہ ہے' اس منظر میں ایک جانب رب العالمین کی طرف سے دعوت دی جارہی ہے مد بالمقابل وہ طاغوتی طاقت ہے جس نے ربوبیت کے تمام حقوق اپنے لئے خاص کئے ہوئے ہیں اور زندگی کے ان معاملات میں رب العالمین کی اطاعت نہیں کی جاتی ۔

( وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ( ۱۰۴ ) حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ )

موسیٰ نے کہا "اے فرعون' میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں' میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں' میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے صریح دلیل ماموریت لے کر آیا ہوں' لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے ۔"

ذرا انداز خطاب ملاحظہ ہو= "اے فرعون' آپ نے اسے مائی لارڈ سے خطاب نہیں فرمایا ۔ جس طرح عموماً لوگ

اس لفظ کو غیراللہ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔اور انہیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ فی الحقیقت لارڈ اور مولیٰ کون ہے؟ ہاں آپ نے بادشاہ کو بڑی عزت سے اس کے لقب سے پکارا' اس لفظ کے استعمال کے ذریعہ آپ نے فرعون کو بتا دیا کہ آپ صرف فرعون ہیں اور دوسری یہ حقیقت بھی اس کے سامنے کھول دی کہ ( اِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۷: ۱۰۴ ) "میں اس کائنات کے مالک کا نمائندہ ہوں۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو حقیقت پیش کی یہی حقیقت آپ سے پہلے آنے والے تمام رسولوں نے بھی پیش کی تھی اور وہ یہ تھی کہ تمام جہانوں کا اب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ ایک ہی حاکم ہے اور پوری زندگی میں اس کی اطاعت ضروری ہے۔آج کل کے ماہرین ادیان جو کچھ کہتے ہیں کہ عقائد میں بھی تغیر اور ارتقاء کا عمل ہوتا رہا ہے اور وہ ساوی ادیان کو بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں کرتے تو ان حضرات کا یہ نظریہ باطل ہے 'کیونکہ آدم علیہ السلام سے نبی آخرالزماں تک تمام رسولوں کا عقیدہ ایک ہی رہا ہے' اس میں صرف اللہ حاکم اور مطاع رہا ہے' اور یہ نہیں رہا کہ پہلے متعدد الہوں کے نظریات تھے پھر تین خداؤں اور پھر ایک خدا کا عقیدہ جاری ہو گیا۔ یہ تو تھی صورت اسلام کی۔رہی جاہلیت تو اس کے اندر جو اختلاف و اضطراب رہا ہے اس کی کوئی حد نہیں ہے۔روح پرستی' متعدد الہوں کی پرستش' سورج کی پرستش' دو خداؤں کی پرستش' ایک خدا کی مشرکانہ پرستش اور بے خدا جاہلیت وغیرہ۔لہذا ساوی ادیان رسولوں کی تعلیمات اور جاہلی ادیان کے افکار کو ایک ہی اصول پر نہیں پرکھا جاسکتا۔

غرض حضرت موسیٰ اور فرعون اور اس کے ٹولے کے درمیان جو آمنا سامنا ہوا' یہی صورت ہر نبی کو اپنے اپنے دور میں پیش آئی۔حضرت موسیٰ سے پہلے آنے والوں کو بھی اور ان کے بعد آنے والوں کو بھی۔ ہر دور میں حکمرانوں نے یہ سمجھا کہ یہ دعوت ان کے اقتدار کے خلاف سازش ہے جس طرح فرعون نے یہ سمجھا کہ یہ درحقیقت ان کے اقتدار اعلیٰ کے خلاف ایک تحریک ہے۔جب کوئی یہ عقیدہ پیش کرتا ہے کہ اللہ وحدہ رب العالمین ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی حاکمیت کے سوا تمام دوسری حاکمیتیں باطل ہیں اور اللہ کے سوا وہ تمام لوگ جو عوام سے اپنا قانون منواتے ہیں وہ دراصل طاغوت ہیں۔اور اس اعلان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس دعوے کے ساتھ پیش فرمایا کہ وہ اللہ رب العالمین کی جانب سے رسول ہیں اور وہ جو بات کرتے ہیں وہ اللہ کی جانب سے کرتے ہیں اور ان کا اللہ کی جانب سے یہ فریضہ ہے کہ وہ لوگوں تک یہ دعوت پہنچائیں۔

(حَقِیْقٌ عَلٰٓی اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَی اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ) "میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں۔" اس لئے کہ جو رسول حقیقت الوہیت سے خبردار ہے وہ اللہ کے بارے میں سچ کے سوا اور کہہ بھی کیا سکتا ہے 'کیونکہ وہ مقام خدائی اور مرتبہ کبریائی سے خبردار ہوتا ہے۔

(قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ )"میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے صریح دلیل ماموریت لے کر آیا ہوں۔" اور یہ ایسی دلیل ہے جو میری بات کی صداقت پر بین دلیل ہے کہ میں رب العالمین کی طرف سے ہوں۔"

اب اس عظیم حقیقت کے عنوان سے اور اللہ کی ربوبیت عامہ اور حاکمیت شاملہ کے نظریہ کے تحت حضرت موسیٰ نے یہ مطالبہ کیا کہ فرعون بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ کے ساتھ واپس اپنے وطن جانے کی اجازت دے دے۔

بنی اسرائیل صرف اللہ کے بندے اور غلام تھے - لہٰذا فرعون کو یہ حق نہ پہنچتا تھا کہ وہ انہیں اپنا بندہ اور غلام بنائے کیونکہ کوئی بھی انسان دو آقاؤں کا غلام نہیں بن سکتا - نہ وہ دو الہوں کا معبود بن سکتا ہے ' جو شخص عبداللہ ہو وہ کسی اور کا عبد نہیں ہو سکتا - ایک طرف فرعون بنی اسرائیل کو اپنی خواہشات کا غلام بنا رہا تھا اور دوسری جانب حضرت موسیٰ یہ اعلان کر رہے تھے کہ صرف اللہ ہی رب العالمین ہے صرف ربوبیت الہیہ کے اعلان ہی سے اس بات کی نفی ہو جاتی ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کو جو غلام بنا رکھا ہے وہ کالعدم ہے -

یہ اعلان کہ صرف اللہ رب العالمین ہی ہمارا حاکم اور رب ہے ' بذات خود ہی انسان کی آزادی کا چارٹر ہے اور اس اعلان کے ساتھ ہی ایک انسان غیراللہ کی غلامی ' اطاعت اور قانون سے آزاد ہو جاتا ہے - وہ انسانی غلامی ' اپنی خواہشات کی غلامی ' انسانی رسومات کی غلامی اور انسانی قانون و حرکت کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے -

لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی اللہ کی رب العالمین کا اعلان بھی کرے اور پھر غیراللہ میں سے کسی کی غلامی کا دم بھی بھرے - اس اعلان کے ساتھ کسی غیراللہ کی حکومت و اقتدار جمع ہو سکتا اور نہ کسی اور کا قانون جمع ہو سکتا ہے - جو لوگ یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور اس کے بعد وہ اپنے ہاں وہ قوانین جاری کئے ہوئے ہیں جو انہی جیسے انسانوں نے بنائے ہیں یا خود انہوں نے بنائے ہیں اور ان کے ہاں اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت رہی ہے تو یہ لوگ ایک بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں اور وہ ایک لحظہ کے لئے بھی مسلمان نہیں ہو سکتے - یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ان پر حاکمیت غیراللہ کی ہو اور وہ دین اللہ میں داخل ہوں - ان کے ہاں رائج قانون ' قانون شریعت نہ ہو اور وہ مسلمان بھی ہوں - حقیقت یہ ہے کہ ایسے حالات میں وہ اپنے ملوک اور حکام کے دین پر تو ہوتے ہیں لیکن اللہ کے دین پر نہیں ہوتے -

یہی وہ نظریہ تھا جس کی بناء پر حضرت موسیٰ نے فرعون سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ ان کے ساتھ بنی اسرائیل کو واپس جانے دے - ذرا ان فقرات کو دوبارہ پڑھئے "اے فرعون میں رب العالمین کا رسول ہوں -" --- "لہٰذا میرے ساتھ بنی اسرائیل کو رخصت کیجئے -" بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ اس اساس پر ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور رسالت کا یہ منطقی نتیجہ ہے کہ لوگوں کو غلامی سے رہا کیا جائے - یہ لازم و ملزوم امور ہیں -

فرعون اور اس کے ٹولے نے بھی اس اعلان کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اللہ کی ربوبیت کے اعلان کا مفہوم کیا ہے ؟ یہ بات ان کی نظروں سے اوجھل نہ تھی - وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اس دعوت کے نتیجے میں ان کی حکومت کا خاتمہ یقینی ہے - اس دعوت سے ایک عظیم انقلاب برپا ہو جائے گا - اس کی حکومت کے قانونی جواز کے لئے یہ اعلان ایک چیلنج ہے اور یہ کھلی بغاوت اور مخالفت ہے - لیکن انہوں نے سوچا کہ وہ موسیٰ کو جھوٹا ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ رسول رب العالمین ہیں اس لئے انہوں نے فی الفور معجزات کا مطالبہ کر دیا -

(قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ) فرعون نے کہا "اگر تو کوئی نشانی لایا ہے اور اپنے دعوے میں سچا ہے تو اسے پیش کر -"

فرعون نے مطالبہ معجزات کا راستہ اس لئے اختیار کیا کہ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ حضرت موسیٰ رب العالمین کے رسول نہیں اور جھوٹا دعویٰ کر رہے ہیں تو آپ کی دعوت یہاں ہی ختم ہو جائے گی اور آپ کی ہوا اکھڑ جائے گی اور

جن لوگوں کو یقین ہی نہ رہے گا تو پھر جو چاہیں کہتے پھریں۔ وہ ایک بے دلیل دعویٰ کے مدعی ہوں گے اور اس کے لئے کوئی خطرہ نہ ہوں گے۔ حضرت موسیٰ کا جواب یہ تھا=

( فَأَلْقَى عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ (۱۰۷) وَنَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّاظِرِينَ (۱۰۸) ) "موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک جیتا جاگتا اژدھا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے ہاتھ نکالا اور سب دیکھنے والوں کے سامنے وہ چمک رہا تھا۔" حضرت موسیٰ کے ہاتھوں اچانک عظیم معجزات کے صدور سے وہ لوگ ششدر رہ گئے۔ عصا ایک سانپ بن گیا تھا اور اس کی حقیقت یوں بدل گئی تھی کہ اب اس کے سانپ ہونے میں شک ہی نہ رہا تھا

(مُبِينٌ) کے معنی واضح طور پر' جیتا جاگتا۔ دوسری صورت میں کہا گیا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَى "تو وہ اچانک چلنے پھرنے والا سانپ بن گیا۔" حضرت موسیٰ سرخ رنگ والے تھے۔ انہوں نے اپنا گندم گوں ہاتھ نکالا تو وہ بلب کی طرح چمکتا ہوا باہر آیا۔ لیکن یہ سفیدی بوجہ بیماری نہ تھی بلکہ معجزانہ سفیدی تھی۔ جب آپ نے ہاتھ دوبارہ اپنے کپڑوں میں چھپایا تو دوبارہ اپنی اصلی حالت میں چلا گیا یعنی گندم گوں رنگ کا ہو گیا۔

یہ تھی حضرت موسیٰ کے دعوائے نبوت پر دلیل۔ آپ کا دعویٰ یہ تھا کہ آپ رب العالمین کے نمائندے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ فرعون اور اس کے ٹولے نے ان معجزانہ دلائل کو تسلیم کیا؟ کیا انہوں نے رب العالمین کی ربوبیت اور اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کر لیا؟ اگر وہ ایسا کرتے تو پھر فرعون کی ربوبیت' اقتدار اور تاج و تخت کا جواز کیا رہ جاتا اور اس کے ٹولے کے لئے مراکز و مناصب پر مقتدر رہنے کا کیا جواز رہ جاتا جو ان کو فرعون نے عطا کئے تھے اور وہ فرعون کی حکومت کے کل پرزے تھے۔ اگر وہ اللہ کو رب العالمین تسلیم کرتا تو عملاً اس کا اقتدار ختم ہو جاتا۔

اگر اللہ کو رب العالمین تسلیم کیا جائے تو اس کا منطقی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ پھر ملک کے اندر اللہ کی شریعت اور قانون نافذ ہو' کیونکہ اسلامی نظریہ حیات کے مطابق اللہ کے سوا کسی اور کے حکام کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ اس لئے اس نظریہ کے مطابق فرعون کا قانون اور اس کے احکام بے اثر ہو جاتے ہیں۔ وہ احکام جو شریعت کے خلاف ہوں اور نہ شریعت پر مبنی ہوں۔ اگر لوگوں کے رب اللہ رب العالمین قرار پائیں تو پھر ان کا کوئی اور رب نہیں رہتا جس کے احکام اور قوانین کے وہ مطیع ہوں اور لوگ فرعون کے احکام اور شریعت کی جو اطاعت کرتے ہیں تو اس لئے کرتے ہیں کہ انہوں نے اسے اپنا رب تسلیم کر لیا ہے۔ لوگوں کا رب وہ شخص ہوتا ہے جس کے قوانین کی وہ اطاعت کرتے ہیں اور یہ لوگ اس رب کے دین میں ہوتے ہیں۔

لیکن یہ بات تو اس قدر جلدی سے نہیں مانی جا سکتی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ طاغوت ٹھنڈے پیٹوں اپنے اقتدار اعلیٰ سے دستبردار ہو جائے اور اس کا نظام باطل اور کالعدم قرار پا جائے؟

فرعون اور اس کا ٹولہ اس قدر بے وقوف نہ تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعلان اور مطالبے کے نتائج سے باخبر نہ ہو بلکہ وہ واضح طور پر موسیٰ علیہ السلام کے اعلان کو سمجھ جاتے ہیں اور اس کا اعلان کر دیتے ہیں۔ لیکن اس انداز میں کہ لوگوں کی نظریں حضرت موسیٰ کے معجزانہ دلائل سے پھر جائیں۔ چنانچہ فرعون اور اس کے ٹولے نے حضرت موسیٰ

پر یہ الزام لگایا کہ وہ ایک عظیم جادوگر ہیں۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ (۱۰۹) يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ

اَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ (۱۱۰) "اس پر فرعون کی قوم کے سرداروں نے آپس میں کہا کہ "یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے 'اب کہو کیا کہتے ہو؟" وہ چلا چلا کر کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے جو دعویٰ کیا ہے وہ کس قدر دوررس نتائج کا حامل ہے اور کس قدر خطرناک ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ ہمیں سرزمین مصر سے نکالنا چاہتا ہے 'حکومت چھیننا اس کا مطلب ہے۔ وہ ہمارے نظام حکومت کے خلاف سازش کر رہا ہے بلکہ وہ انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے۔ دور جدید میں اسے یہی کہا جاسکتا ہے۔

یہ زمین اللہ کی ہے 'عوام الناس اللہ کے پیدا کردہ ہیں 'اگر اللہ کی سرزمین پر اللہ کے بندوں پر حکومت بھی اللہ کی قائم ہو جائے تو وہ تمام طاغوتی حکمرانیاں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں جو اللہ کی شریعت کے برعکس قائم ہوں۔ اور ان لوگوں کا اقتدار خود بخود ختم ہو جاتا ہے جو از خود لوگوں کے خدا بنے ہوئے ہیں اور ان لوگوں کا اقتدار بھی خود بخود ختم ہو جاتا ہے جنہیں ان طاغوتی حکمرانوں نے صاحب منصب اور اہلکار بنا رکھا ہے۔

اس طرح فرعون اور اس کے ٹولے نے معلوم کر لیا کہ حضرت موسیٰ کی دعوت کس قدر خطرناک ہے۔ اور یہی بات تمام طاغوتی قوتیں ہر دور میں اچھی طرح جان لیتی ہیں۔

ایک عرب نے اپنے فطری فہم و ادراک کی اساس پر یہ کہا کہ حضور ؐ جو لوگوں کا (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ) کی دعوت دیتے ہیں یہ ایک ایسی دعوت ہے جسے بادشاہ پسند نہیں کرتے۔ اور ایک دوسرے عرب دانشور نے اپنی فطری معاملہ فہمی کی اساس پر یہ کہا اگر تم نے اس دعوت کو جاری رکھا تو عرب و عجم تمہارے ساتھ برسرپیکار ہو جائیں گے۔ یہ دونوں عرب دانشور دراصل عربی زبان کے مفاہم کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کا اعلان حکمرانوں کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ کیونکہ وہ عربی کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ایک دل میں یا ایک سرزمین پر کلمہ طیبہ کی شہادت اور پھر غیر اللہ کی اور خلاف شریعت حکمرانی قائم نہیں ہو سکتی۔ اس وقت کے عرب کلمہ شہادت کو اس طرح نہ سمجھتے تھے جس طرح آپ کے نام نہاد مسلمان اسے سمجھتے ہیں۔ آج کے لوگوں کا مفہوم کلمہ شہادت بہت ہی ناقص 'کم درجے کا اور کمزور درجے کا ہے۔

اب فرعون اور اس کے ٹولے کے درمیان مذاکرات اور مشورے شروع ہو گئے۔

قَالُوْا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ (۱۱۱) يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ

عَلِيْمٍ (۱۱۲) "پھر ان سب نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اسے اور اس کے بھائی کو انتظار میں رکھئے اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دیجئے کہ ہر ماہر فن جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں۔" اس وقت مصر میں کاہن اور جادوگر بڑی تعداد میں تھے۔ خود کاہن جادوگری کا کام بھی کرتے تھے۔ تمام بت پرستانہ مذاہب میں جادو دین کا ایک حصہ ہوتا ہے

چنانچہ ان ادیان کے کاہن اور مجاور جادوگری کا کام بھی کرتے تھے۔ آج کل ادیان کے جدید ماہرین اس صورت حالات کو دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ایک دور ایسا بھی رہا ہے کہ جادوگری سے دین کا آغاز ہوا۔ اور زیادہ پکے ملحد یہ یاوہ گوئی کرتے ہیں کہ جس طرح جادو بالکل دین قرار پا گیا ہے اسی طرح ہر ایک دین بھی ختم ہو جائے گا اور جس طرح سائنس نے جادوگری کے دور کو ختم کر دیا ہے اسی طرح ایک وقت ایسا آئے گا کہ مذہب بھی ختم ہو جائے گا۔ بہرحال یہ ان کا خبط ہے جس میں وہ سائنس کے عنوان سے مبتلا ہیں۔

فرعون کے مشیروں نے اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ حضرت موسیٰ اور آپ کے بھائی کو وقت دے دیں اور اپنی ریاست کے اطراف و اکناف سے بڑے بڑے جادوگروں کو طلب کریں تاکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جادوگری کا مقابلہ کریں۔ (نعوذ باللہ)

فرعون نے اپنی معروف و مشہور فرعونیت کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں سرکشی کا مظاہرہ نہ کیا اور اس کا رویہ بیسویں صدی کے بعد کے فرعونوں سے زیادہ معقول رہا۔ آج کل کے فرعون دعوت اسلامی کا مقابلہ تشدد اور قید و بند اور باطل طریقوں سے کرتے ہیں۔

---○○○---

قرآن کریم اب درمیانی تفصیلات چھوڑ کر ایک دوسرے منظر کو پیش کرتا ہے کہ کس طرح فرعون کے ٹولے نے لوگوں کو جمع کیا اور کن کن کو جمع کیا بلکہ پردہ اٹھتے ہی جادوگر سامنے آجاتے ہیں اور یہ قرآن کریم کا بیان کردہ قصص میں نہایت ہی موثر اور پیارا اسلوب ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ ایک منظر کو لپیٹ کر دوسرا منظر سامنے لایا جاتا ہے۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

"چنانچہ جادوگر فرعون کے پاس آگئے۔ انہوں نے کہا "اگر ہم غالب رہے تو ہمیں اس کا صلہ تو ضرور ملے گا؟" فرعون نے جواب دیا "ہاں، اور تم مقرب بارگاہ ہو گے۔"

یہ لوگ پیشہ ور جادوگر تھے اور اسی طرح پیشہ ور کاہن تھے اور دونوں کاموں سے ان کا مقصد پیسے کمانا تھا۔ دنیا میں ہمیشہ پیشہ ور علمائے دین نے طاغوتی طاقتوں اور ظالم بادشاہوں کی خدمت کو اپنا فرض سمجھا ہے۔ نیز دنیا میں جب بھی اللہ کی حاکمیت کا نظام معطل ہوا ہے اور اللہ وحدہ کی بندگی ختم ہوئی ہے اس کی جگہ طاغوتی نظام قائم ہو گیا ہے اور جب طاغوتی نظام قائم ہوا ہے تو ایسے حکمرانوں کو پیشہ ور اہل دین کی ضرورت پیش آئی ہے اور ان حکمرانوں نے ان اہل پیشہ کو ان کے پیشے پر اجر دیا ہے اور انہوں نے دینی اعتبار سے اس طاغوتی نظام کو قبول کیا ہے۔ یوں دونوں کے درمیان باہم معاہدہ رہا ہے اور طاغوتی حکمرانوں نے ان پیشہ ور اہل دین کو پیسہ بھی دیا ہے اور مقرب بھی بنایا ہے۔

فرعون نے یقین دہانی کرائی کہ وہ اس کام پر انہیں اجرت بھی دے گا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کے مقربین میں سے بھی ہوں گے۔ یوں فرعون نے ان کو آمادہ کیا کہ وہ صرف موسیٰ کا بے جگری سے مقابلہ کریں اور سخت جدوجہد

کریں۔ لیکن ان کو کیا پتہ تھا کہ معاملہ اس قدر آسان نہیں ہے کہ وہ چرب زبانی یا چالاکی سے حضرت موسیٰ کو شکست دے دیں گے۔ یہاں تو ان کا واسطہ خدا' خدا کے رسول' خدائی معجزات اور خوارق عادت' حقائق و واقعات سے تھا' محض شعبدہ بازی اور تخیلاتی جادوگری نہ تھی۔

---○○○---

جادوگر اجر کے بارے میں مطمئن ہو گئے اور فرعون کی ہمنشینی کی لالچ میں ان کی گردنیں بلند ہو گئیں اور مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ اب یہ حضرت موسیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور آپ کو چیلنج دیتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں وہ اس مقام بلند تک جا پہنچتے ہیں جو اللہ نے ان کے لئے مقرر کیا تھا اور جس کے بارے میں انہیں تصور بھی نہ تھا اور وہ اس اجر کے مستحق قرار پائے جس کی انہیں توقع ہی نہ تھی۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِیْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا ۚ

"پھر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا "تم پھینکتے ہو یا ہم پھینکیں؟" موسیٰ نے جواب دیا "تم ہی پھینکو۔"

انہوں نے اختیار حضرت موسیٰ کو دے دیا کہ چاہو تو تم اپنا عصا کو پھینکو یا ہم پھینکیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت اعتماد سے چیلنج کر رہے تھے۔ ان کو اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا اور اپنی فنکاری پر اعتماد تھا۔ اس کے مقابلے میں حضرت موسیٰ بھی نہایت ہی پر اعتماد تھے اور انہوں نے لاپرواہی سے جواب دیا "تم پھینکو" انہوں نے صرف ایک لفظ میں جواب دیا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ان کے کرتب کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔ حضرت موسیٰ کے نفس کے اندر پورا یقین و اطمینان تھا۔ یہ امور اور یہ معانی قرآن کریم کے طریقہ کلام کے مطابق الفاظ کے استعمال سے ظاہر ہوتے ہیں۔

جس طرح حضرت موسیٰ اچانک اس صورت حالات سے دوچار ہوئے' سیاق کلام اور انداز بیان ایسا ہے کہ ہر قاری اچانک ایک خوفناک صورت حال سے دوچار ہو جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑی لاپرواہی سے جواب دے رہے ہیں لیکن اچانک انہیں بھی ایک نہایت ہی خوفناک اور مرعوب کن صورت حال سے دوچار ہونا پڑا ہے جسے دیکھ کر انسان خائف ہو جاتے ہیں اور کانپ اٹھتے ہیں۔

فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا سَحَرُوْۤا اَعْیُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَ جَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۱۶﴾

"انہوں نے جو اپنے آنچھر پھینکے تو نگاہوں کو مسحور اور دلوں کو خوفزدہ کر دیا اور بڑا ہی زبردست جادو بنا لائے۔"

ہمارے لئے یہ بات کافی ہے کہ ان لوگوں کے فن کے بارے میں قرآن کریم نے بھی سحر عظیم کا لفظ استعمال کیا اور اس سے ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ان کا جادو کس قدر عظیم تھا۔ انہوں نے لوگوں کی نگاہوں کو مسحور کر دیا اور لوگوں کے

دلوں کو رعب سے بھر دیا اور ماحول پر خوف کی فضا طاری ہو گئی۔

لفظ استرھب کے استعمال سے ماحول کا ایک نقشہ سامنے آجاتا ہے یعنی انہوں نے لوگوں کے اندر خائف ہونے کا تاثر پیدا کر دیا۔ اس طرح کہ وہ ڈرنے پر مجبور ہو گئے۔ اور سورت طٰہٰ میں تو یہ بھی بتایا گیا کہ حضرت موسیٰ بھی دل ہی دل میں خائف ہو گئے تھے۔ ان تمام الفاظ سے ان لوگوں کی خوفناک جادوگری کے بارے میں یقین آجاتا ہے۔

لیکن اب ایک دوسری سرپرائز سامنے آتی ہے۔ ایک عظیم واقعہ پیش آتا ہے۔ فرعون اور اس کا ٹولہ اور جادوگر سب کے سب ششدر رہ جاتے ہیں۔ تمام لوگ دم بخود رہ جاتے ہیں اور اس عظیم میدان کے بے شمار اور عظیم مجمع پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے جنہوں نے جادوگری کے اس عظیم عمل کو دیکھا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

"ہم نے موسیٰ کو اشارہ کیا کہ پھینک اپنا عصا۔ اس کا پھینکنا تھا کہ آن کی آن میں وہ ان کے اس جھوٹے طلسم کو نگلتا چلا گیا۔ اس طرح جو حق تھا وہ حق ثابت ہوا اور جو کچھ انہوں نے بنا رکھا تھا وہ باطل ہو کر رہ گیا۔ فرعون اور اس کے ساتھی میدان مقابلہ میں مغلوب ہوئے اور (فتح مند ہونے کے بجائے) الٹے ذلیل ہو گئے۔"

باطل ہمیشہ پھول جاتا ہے اور آنکھوں کو چکا چوند کر دیتا ہے' دلوں کو مرعوب کر دیتا ہے اور اکثر لوگ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ باطل غالب ہی رہے گا۔ یہ سیلاب کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ اور تمام چیزوں کو نیست و نابود کر دے گا لیکن جونہی اس کا واسطہ ایک سنجیدہ' پرعزم اور مضبوط سچائی سے ہوتا ہے تو اس سے غبارے کی طرح ہوا نکل جاتی ہے اور وہ بلبلے کی طرح بیٹھ جاتا ہے' خارپشت کی طرح سکڑ جاتا ہے اور محض گھاس کے شعلے کی طرح ہوتا ہے جو ایک منٹ میں بجھ جاتا ہے۔ اب سچائی کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔ اس کی بنیادیں مضبوط ہو جاتی ہیں اور جڑیں گہری ہو جاتی ہیں۔ قرآن کریم نے یہاں جو انداز تعبیر اختیار کیا ہے' اس میں اس مفہوم کا پرتو موجود ہے۔ یہ تاثر ملتا ہے کہ حق ایک عظیم اور بھاری وجود کا مالک ہے اور اس کی زد بڑے زور سے پڑتی ہے اور وہ مستقلاً ثابت ہو جاتا ہے اور حق کے سوا تمام دوسرے امور ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور باطل کے تار و پود بکھر جاتے ہیں۔ سچائی باطل اور اس کے پیروکاروں پر غالب آجاتی ہے اور نہایت پھلنے پھولنے اور آنکھوں کو چندھیانے کے بعد یہ باطل بڑی تیزی سے سکڑ جاتا ہے۔

(فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ) "فرعون اور اس کے ساتھی میدان مقابلہ میں مغلوب ہوئے اور فتح مند ہونے کے بجائے الٹا ذلیل ہوئے۔" لیکن ابھی تک یہ سرپرائز ختم نہیں ہوئی' اس منظر میں ایک کے بعد خلاف توقع دوسرے مناظر آتے ہیں۔ اب ایک عظیم منظر اچانک نظروں کے سامنے ہے۔

وَ أُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

''اور جادوگروں کا حال یہ ہوا کہ گویا کسی چیز نے اندر سے انہیں سجدے میں گرا دیا۔کہنے لگے ''ہم نے مان لیا رب العالمین کو' اس رب کو جسے موسیٰ اور ہارون مانتے ہیں۔''

یہ ہے انسانی ضمیر میں سچائی کا رعب اور دبدبہ۔ انسانی شعور اچانک روشن ہو جاتا ہے اور جب کوئی دل قبولیت حق کے لئے تیار ہو جاتا ہے تو اس کے اندر اچانک سچائی کا چراغ روشن ہو جاتا ہے اور وہ یقین سے بھر جاتا ہے۔یہ جادوگر اپنے فن کی حدود سے اور اس کی ماہیت سے اچھی طرح باخبر تھے اور اگر حضرت موسیٰ جادوگر ہوتے تو وہ اور لوگوں کے مقابلے میں انہیں بہت جلد پہچان لیتے۔حضرت موسیٰ کے ہاتھوں جس معجزے کا ظہور ہوا وہ انسانی قدرت اور جادو کے دائرے سے ورا تھا۔ایک ماہر فنکار اپنے فن کے بارے میں حقیقت کو بہت جلد تسلیم کر لیتا ہے' بشرطیکہ حقیقت اس پر منکشف ہو جائے۔اس لئے کہ صاحب فن حقیقت کے قریب ہوتا ہے' اور اس کا علم ان لوگوں سے زیادہ ہوتا ہے جو صرف سطحی معلومات رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جادوگر چیلنج اور تحدی کے موقف کو چھوڑ کر تسلیم و رضا کا پیکر بن گئے کیونکہ وہ اپنے دلوں کے اندر یقین پا رہے تھے اور یہ حقیقت ان کے شعور کا حصہ بن گئی تھی۔

لیکن کوئی بھی طاغوتی طاقت اس بات کو نہیں سمجھ سکتی کہ انسان کا دل کس طرح نور سے بھر جاتا ہے یا یہ کہ انسان کو ایمان کی یہ شرح صدر کس طرح ہو جاتی ہے اور انسان کے دل میں یقین کی گرمی کس طرح پیدا ہو جاتی ہے۔یہ طاغوتی قوتیں چونکہ طویل عرصے تک لوگوں کو غلام بنائے رکھتی ہیں اس لئے انہیں یہ زعم ہو جاتا ہے کہ وہ معاملات کو اپنے ڈھب پر ڈالنے کی قوت رکھتی ہیں اور لوگوں کے دل و دماغ کو پھیر بدل سکتی ہیں۔حالانکہ انسان کا دل تو رحمٰن کی انگلیوں میں ہوتا ہے' وہ جس طرح چاہے اسے پھیر دے۔جادوگروں کی جانب سے اعلان شکست اور اعلان ایمان فرعون کے لئے ناقابل تصور اور تعجب خیز تھا۔کیونکہ ان لوگوں کے دلوں میں تو ایمان کا شائبہ تک نہ تھا اور نہ ان کے ضمیر میں ایمان کا کوئی دخل و عمل اس کے علم میں تھا۔پھر اس کے لئے یہ اچانک اعلان ایمان اس قدر خطرناک تھا کہ اس سے اس کی حکومت خطرے میں پڑ گئی۔اس کے قدم ڈگمگانے لگے تھے۔جادوگر صرف جادوگر ہی نہ تھے بلکہ وہ اس وقت کی عبادت گاہوں کے کاہن اور علماء و خطباء تھے' جب کسی ملک کے تمام مذہبی راہنما ایمان لے آئیں تو پھر حکومت کے لئے اپنی جگہ پر ٹھہرنا ممکن نہیں رہتا۔خصوصاً ایسے حالات مبارزت میں کہ وہ مقابلے کے لئے میدان میں آئے ہوں۔ایسے حالات میں کہ جب طاغوتی نظام بذات خود خطرے میں ہو تو اہل طاغوت سب کچھ کر گزرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔

---

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

لَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِیْنَ﴿۱۲۴﴾

فرعون نے کہا "تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں' یقیناً یہ کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اس دارالسلطنت میں کی تاکہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کرو۔ اچھا تو اس کا نتیجہ اب تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا دوں گا اور اس کے بعد تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔"

ذرا انداز ملاحظہ ہو "تم اس پر ایمان لائے ہو قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں۔" گویا یہ ان کا قانونی فرض تھا کہ وہ اس سے اجازت لیں کہ وہ ایمان قبول کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ خود مختار نہیں ہیں۔ یا مطلب یہ ہے کہ ان کے شعور و وجدان کو کوئی حرکت نہیں کرنا چاہئے اور وہ اپنے شعور کے معاملے میں بھی خود مختار نہیں ہیں۔ اگر ان کے قلب و نظر پر کوئی روشنی پڑتی ہے تو انہیں حجاب کرنا چاہئے اور اس معاملے میں بھی فرعون سے پوچھنا چاہئے۔ اگر ان کے دلوں میں کوئی عقیدہ یا یقین بیٹھتا ہے تو انہیں اس کی اجازت نہیں ہے کہ فرعون کے اذن کے بغیر ایسا کریں غرض ان کا فرض ہے کہ ہر قسم کی نئی روشنی سے اپنے آپ کو دور رکھیں۔

لیکن ہر طاغوتی طاقت جاہل اور غبی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہر طاغوتی طاقت متکبر' مغرور اور انتہا پسند ہوتی ہے۔ نیز ہر طاغوتی طاقت اپنے اقتدار کے بارے میں نہایت حساس ہوتی ہے اور اسے ایسی باتوں سے اپنا اقتدار خطرے میں نظر آتا ہے اور طاغوتی تخت اور اقتدار متزلزل نظر آتا ہے۔

(اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِی الْمَدِیْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا (۱۲۳)) "یقیناً کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اس دارالسلطنت میں کی تاکہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کر دو۔ اچھا تو اس کا نتیجہ اب تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے۔"

اور ایک دوسری آیت میں ہے (اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ) "یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔" بہرحال یہ مسئلہ بالکل واضح ہے۔ حضرت موسیٰ کی دعوت رب العالمین کی طرف تھی اور ہر وہ دعوت جو رب العالمین کی طرف ہوتی ہے وہ نہایت خوفناک ہوتی ہے۔ جہاں بھی رب العالمین کی طرف دعوت پھیل جائے وہاں طاغوتی نظام باقی ہی نہیں رہتا۔ اس لئے کہ طاغوتی نظام قائم ہی اس بات پر ہوتا ہے کہ اس میں رب العالمین کے اقتدار اور قانون کے بجائے دوسرے انسانوں کا اقتدار اور قانون نافذ ہوتا ہے اور انسان زمین پر بطور رب کام کرتے ہیں۔ انسانوں کو اپنا غلام بناتے ہیں اور ان کے لئے جو چاہتے ہیں قوانین بناتے ہیں۔ دراصل یہ دو مستقل نظام حیات ہوتے ہیں جو ایک جگہ جمع ہو ہی نہیں ہو سکتے۔ بلکہ یہ دو الگ الگ دین ہوتے ہیں اور ان کے دو الگ الگ رب ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو فرعون اچھی طرح جانتا تھا' اس کی جماعت بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی دعوت کے نتیجے میں فرعون کا اقتدار متزلزل ہو گیا تھا اور اب جبکہ جادوگر سب کے سب سجدے میں گر گئے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ انہوں نے رب العالمین کی دعوت تسلیم کر لی ہے اور وہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے رب پر ایمان لائے ہیں۔ یہ جادوگر اس وقت کے مذہبی لیڈر اور کاہن تھے اور انہوں نے دینی اعتبار سے فرعون کو رب الناس کا مقام دیا ہوا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ فرعون نے ان کو اس قدر وحشیانہ اور عبرت آموز سزا کی دھمکی دی۔

(لَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّکُمْ اَجْمَعِیْنَ (۱۲۴)) "میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا دوں گا اور اس کے بعد تم سب کو سولی چڑھاؤں گا۔"

تشدد، تعذیب اور سخت اور عبرت آموز سزا۔ یہ ہیں وہ وسائل جو ہر طاغوتی نظام، حق کے مقابلے میں لاتا ہے۔ اس لئے کہ حق کا مقابلہ کبھی بھی حجت اور استدلال سے نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ تشدد کے ہتھیار ہمیشہ سچائی کے خلاف استعمال ہوتے ہیں۔

...... لیکن جب نفس انسانی کو ایمانی سربلندی حاصل ہو جاتی ہے اور اس کے اندر ایمان کی حقیقت جاگزیں ہو جاتی ہے تو وہ اس کرۂ ارض کی عظیم قوتوں کے مقابلے میں آکھڑا ہوتا ہے اور اسے سرکشوں اور طاغوتوں کے انتقام کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ اور ایسے افراد کی زندگی میں نظریہ حیات کو دنیاوی زندگی پر برتری حاصل ہو جاتی ہے اور یہ فانی زندگی آنے والی دائمی زندگی کے مقابلے میں ہیچ نظر آتی ہے۔ جب نفس انسانی اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ وہ کیا ہے اور کیا چھوڑے یا کیا ہے یا وہ کیا پائے گا اور کیا کھوئے گا اور اس کو اس راہ میں کیا کیا مشکلات انگیز کرنی ہوں گی؟ اور کیا کیا مشقتیں اٹھانی ہوں گی؟ کیونکہ اس کا نصب العین دور افق پر روشن نظر آتا ہے اور اس کی نظر بلند ہو جاتی ہے اور وہ پھر نیچے راستے کے کانٹوں کی طرف دیکھتا ہی نہیں ہے۔

۱۴ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا
بِاٰیٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ ﴿۱۲۶﴾ ۱۸ع
۴

انہوں نے جواب دیا "بہرحال ہمیں پلٹنا اپنے رب ہی کی طرف ہے۔ تو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم نے انہیں مان لیا۔ اے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اٹھا تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرمان بردار ہوں۔"

یہ ہے وہ ایمان حقیقی کا حامل انسان، جو نہ خائف ہوتا ہے اور نہ اس کے پاؤں ڈگمگاتے ہیں۔ نہ وہ جھکتا ہے اور نہ غلام ہے۔ جو اپنے انجام کے بارے میں مطمئن ہے اور اس راہ پر راضی ہوگیا ہے۔ اسے یقین ہے کہ وہ رب العالمین کی طرف لوٹنے والا ہے اور وہ اس راہ کو اب نہیں چھوڑ سکتا۔

(قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ (۱۲۵)) انہوں نے جواب دیا "بہرحال ہمیں پلٹنا اپنے رب ہی کی طرف ہے۔" جو شخص یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کے اور طاغوتی نظام کے درمیان برپا معرکے کی نوعیت کیا ہے؟ اور یہ کہ یہ معرکہ ایک نظریاتی معرکہ ہے، وہ پھر مداہنت نہیں کرتا اور نہ جنگی داؤ پیچ سے کام لیتا ہے نہ درگزر اور عفو سے کام لیتا ہے۔ خصوصاً ایسے دشمن کے مقابلے میں جس کا مقصد یہ ہو کہ اہل ایمان اپنے ایمان اور نظریے سے دستبردار ہو جائیں۔

(وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا) "تو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم نے انہیں مان لیا۔"

جو شخص یہ جانتا ہو کہ وہ کس کے خلاف صف آرا ہے' اور وہ کس کے مقابلے میں آگے بڑھ رہا ہے' پھر وہ اپنے دشمن سے امن و عافیت کا سوال نہیں کیا کرتا۔ وہ صرف اپنے رب سے سوال کرتا ہے اور وہ بھی اس بات کا کہ اسے اس فتنے میں صبر و استقامت عطا کی جائے اور یہ کہ وہ اسلام کا وفادار ہے۔

(رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ) "اے رب' ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اٹھا تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرمان بردار ہوں۔"

اب سرکشی ایمان کے مقابلے میں بے بس ہو جاتی ہے' اسے ایک فہم سے اور اطمینان کے ایک پہاڑ سے واسطہ پڑتا ہے۔ سرکشی اور طغیان کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ اسے اختیار کرنے والے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح اسے انسان کے جسم پر غلبہ اور کنٹرول حاصل ہے' اس طرح اسے لوگوں کے دل و دماغ پر بھی تسلط حاصل ہے۔ اور جس طرح وہ لوگوں کے جسموں پر حکم چلاتے ہیں اسی طرح وہ لوگوں کے دماغوں کو بھی کنٹرول کرتے ہیں' لیکن یہ بات ان کے لئے انہونی ہوتی ہے کہ کوئی دل ان کی نافرمانی کرے حالانکہ ایسا ہوتا ہے' اس لئے کہ دل تو اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور جب کسی دل کا رابطہ اللہ سے ہو جائے اور وہ سرکشی کے مقابلے میں ڈٹ جائے تو یہ سرکشی بے بس ہو جاتی ہے۔ جب دل اللہ کے ہو جائیں اور ان کا ربط اللہ سے ہو جائے تو بڑی سے بڑی طاقت بھی بے بس ہو جاتی ہے۔ ایمانی قوت کے مقابلے میں بڑے بڑے سلطان اور جبار عاجز آ جاتے ہیں۔

یہ انسانی تاریخ کا ایک فیصلہ کن موقف ہے۔ ایک طرف فرعون' اس کا طاغوتی نظام اور اس کے پیروکار ہیں اور دوسری جانب بے بس مومن جادوگر ہیں جو کبھی جادوگر تھے۔ اب وہ ایک تاریخی موقف کے حامل ہیں۔ ان کا نظریہ حیات زندگی پر فاتح ہو کر برتری حاصل کر چکا ہے۔ انسانی عزیمت نے جسمانی رنج و الم پر برتری حاصل کر لی ہے۔ انسان شیطان پر غالب آگیا ہے۔

بے شک یہ انسانی تاریخ کا ایک دو ٹوک موقف ہے۔ اس موقف کے ذریعے ایک حقیقی آزادی کا اعلان کیا گیا ہے۔ آزادی کی ماہیت کیا ہے؟ آزادی یہ ہے کہ ایک انسان اپنے عقیدے اور نظریات کو لے کر سرفراز ہو جائے اور جباروں اور سرکشوں کے مقابلے میں ڈٹ جائے۔ اور اس مادی قوت کو ہیچ سمجھ لے جو انسانی جسموں پر تو کنٹرول کرتی ہے لیکن جسے انسان کی روح اور نظریات تک رسائی نہیں ہوتی' اور جب مادی قوتیں دلوں کو مسخر کرنے سے عاجز آ جائیں تو اس مقام سے حقیقی حریت اور آزادی کا جنم شروع ہوتا ہے اور یاد رہے کہ یہ جنم آزاد دلوں میں ہوتا ہے۔

یہ ایک دو ٹوک موقف ہے اور پوری انسانی تاریخ میں یہ موقف واضح طور پر بتاتا ہے کہ مادی قوت بے کس و بے بس ہے۔ ذرا دیکھئے کہ یہ جادوگر ابھی تو فرعون سے معمولی اجرت کے طلبگار تھے اور پھر یہ تمنا رکھتے تھے کہ اس کے دربار میں کرسی نشین ہو جائیں اور بادشاہ کے ساتھ انہیں قرب نصیب ہو۔ یہ حقیر گروہ' ایمان کے بعد' اب فرعون کے مقابلے میں سرفرازی کا مظاہرہ کر رہا ہے اور دار و رسن کے مقابلے میں تیار کھڑا ہے۔ حالانکہ مادی اعتبار سے ان کے ماحول میں

ہر چیز اسی حالت میں ہے جو تغیر ہوا ہے ۔ وہ صرف یہ ہے کہ ایک حقیر ستارے کو خفیہ اجالا مل گیا ہے' اور اب یہ حقیر ستارہ نہیں بلکہ حقیر ذرہ ایک مستحکم برج میں داخل ہو گیا ہے اور ایک فانی فرد ازلی اور ابدی قوت تک رسائی حاصل کر چکا ہے ۔ قلب مومن پر ایک سوئی رکھ دی گئی' اب دل مومن قدرت کے اثرات قبول کر رہا ہے' اس کے ضمیر میں سے قدرتی آوازیں آ رہی ہیں' اور انسانی بصیرت پر انوار پڑتے ہیں' یہ سوئی قلب مومن کو احساس دلاتی ہے جبکہ عالم مادیت میں کچھ بھی تغیر پذیر نہیں ہوتا ۔ لیکن انسان عالم مادیت سے سربلند ہو کر ایسے جہان نو میں چلا جاتا ہے جن کے بارے میں پہلے وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا ۔

اب دھمکی اپنا راہ لیتی ہے اور ڈراوا تلاش میں رہتا ہے لیکن ایمان اپنی راہ پر دور نکل چکا ہوتا ہے ۔ وہ پیچھے کی طرف دیکھا ہی نہیں' اسے کوئی تردد نہیں ہوتا اور نہ وہ بے راہ ہوتا ہے ۔

اس حد تک جب منظر چلتا ہے تو پردہ گر جاتا ہے اور مزید تفصیلات نہیں دی جاتیں کیونکہ یہاں اس منظر کی خوبصورتی اپنے عروج کو پہنچ کر ایک بات بھی مکمل ہو جاتی ہے اور ایک فنی خوبصورتی بھی اپنے کمال تک پہنچ جاتی ہے ۔ قرآن کا فنی کمال یہاں پر بھی اپنی انتہاؤں کو چھو رہا ہے اور قاری کا وجدان بھی قصے کے نفسیاتی مقاصد کو پا لیتا ہے ۔ نہایت ہم آہنگی کے ساتھ اور قرآن کریم کے مخصوص اسلوب اظہار میں ۔ (دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی)

---ooo---

قرآن کے سائے میں' اس دلچسپ منظر کے سامنے کھڑے ہو کر ہمیں چاہئے کہ قدرے غور و فکر کریں ۔

☆ فرعون اور اس کے ساتھیوں نے جادوگروں کی جانب سے ایمان اور رب موسیٰ اور ہارون کو تسلیم کر لینے کے فعل کو اپنے نظام حکومت کے خلاف ایک سازش سمجھا اور اس بات کا اظہار کیا کہ ان کی حکومت اور اقتدار خطرے میں ہے ۔ اس لئے کہ جس اصول پر ایمان کا نظام قائم ہوتا ہے وہ اصول فرعونی نظام کے اساسی اصول سے متضاد ہے ۔ اس بات کی تشریح اس سے قبل ہم کر چکے ہیں ۔ یہاں بطور تکرار و تاکید دوبارہ یہ بات لائی جاتی ہے' کسی ایک دل' کسی ایک ملک' کسی ایک نظام میں یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ بھی رب العالمین ہو اور اس کے ساتھ ساتھ کوئی انسان بھی رب الناس ہو' اور اس کے قوانین لوگوں میں رائج اور نافذ ہوں اس لئے کہ اللہ کا دین بھی ایک مکمل نظام ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فرعونی دین بھی ایک مکمل دین ہے ۔

☆ جب جادوگروں کے دلوں میں شمع ایمان روشن ہو گئی اور انہوں نے ایمان وکفر کی حقیقت کو پا لیا تو انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ ان کے اور فرعون کے درمیان ایسا نظریاتی اور اصولی اختلاف ہے' اور یہ کہ فرعون جو انتقامی کارروائی کی دھمکی دے رہا ہے وہ محض اس لئے دے رہا ہے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ہم نے اللہ کو رب العالمین تسلیم کر لیا ہے ۔ اور اس انداز میں ایمان لانا فرعون کے نظام حکومت کے لئے چیلنج ہے ۔ اسی طرح فرعون کی حکومت کے اعلیٰ ڈھانچے اور دستوری نظام کے لئے بھی یہ ایک چیلنج ہے ۔ یعنی فرعون کا نظام ربوبیت جس بت پرستانہ تصورات پر قائم تھا وہ جڑ سے اکھڑ گئے تھے ۔ جو شخص بھی رب العالمین وحدہ لاشریک کی طرف دعوت دیتا ہے اسے چاہئے کہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لے ۔ اس لئے کہ اس ادراک ہی کی وجہ سے اہل ایمان کے لئے تمام مصائب و شدائد قابل برداشت بن گئے ۔ اب وہ دار و رسن کے لئے تیار ہو گئے اس

لئے کہ انہوں نے ایمان کا دعویٰ کر دیا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ ان کا اور فرعون کا دین ان سے جدا ہے اس لئے کہ فرعون نے لوگوں کو غلام بنا کر اور اپنا قانون جاری کر کے اللہ کی رب العالمینی کا انکار کر دیا ہے لہٰذا فرعون کافر ہے۔ اس طرح ہر داعی کو یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ایمان کی طرف دعوت دے رہا ہے اور اس کی راہ میں روڑے اٹکانے والے کافر ہیں اور فرعونی نظام کے داعی ہیں۔ اور یہ دشمنی محض (اَلْبُغْضُ فِی اللّٰہِ) ہے۔ اس کی تہ میں کوئی اور داعیہ' داعیہ ایمان کے سوا نہیں ہے۔

☆ اس کے بعد اس منظر میں ہمیں نظر آتا ہے کہ ایمان کے سامنے پوری زندگی اور اس کی آسائشوں کی کوئی قیمت نہیں رہتی۔ عزم و ارادے کے سامنے رنج و الم کے پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ انسانی قوت شیطانی قوت پر فتح یاب ہوتی ہے۔ یہ ایک نہایت ہی فرحت بخش اور حیران کن منظر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس منظر کی خوبصورتی کا بیان ممکن نہیں ہے۔ خود نصوص قرآن ہی کو پڑھئے۔۔

---○○○---

اب اس قصے کا مزید مطالعہ کیجئے۔ پردہ اٹھتا ہے اور ایک جدید اور دوسرا خوبصورت منظر ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس میں کفر کی پارلیمنٹ نظر آتی ہے۔ مشورہ اور نجوہ ہوتا ہے اور کسی سخت اقدام کے لئے ایک دوسرے کو جوش دلایا جاتا ہے۔ پہلے اور کھلے میدان کے معرکے میں کھلی کھلی شکست میں خفت اٹھائے ہوئے اعیان دولت بپھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے لئے یہ صورت حالات ناقابل برداشت ہے کہ موسیٰ اور ہارون اس طرح کامیاب و کامران ہو جائیں۔ اور یہ ایمان لانے والے لوگ بھی مزے مزے سے ان کے ہم رکاب ہوں۔ حالانکہ حضرت موسیٰ پر ایمان لانے والوں میں چند کمزور لوگ شامل تھے اور وہ فرعون سے ہر وقت ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں فرعون ان کو فتنے میں نہ ڈال دے۔ جیسا کہ دوسرے مقامات پر قرآن نے تصریح کی ہے۔ یہ پارلیمنٹ سختی کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ یہ لوگ حضرت موسیٰ کے خلاف فرعون کو برانگیختہ کر رہے ہیں اور اسے ڈراتے ہیں کہ اگر اس کے خلاف سخت ایکشن نہ لیا گیا تو نتائج خطرناک ہوں گے۔ حکومت کا رعب جاتا رہے گا۔ جدید خطرناک نظریات پھیل جائیں گے۔ لوگ فرعون کے بجائے اللہ کو رب العالمین سمجھیں گے۔ چنانچہ وہ تیار ہو جاتا ہے اور اس کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ وہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ ان لوگوں کے خلاف شدید ایکشن لے اور قوت کا استعمال کرے اور اخلاقی شکست کے بعد پوری مادی قوت استعمال کرے۔ مادی قوت کے مالکان ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں۔

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَقَوْمَهٗ لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَیَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

”فرعون سے اس کی قوم کے سرداروں نے کہا ”کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دے گا کہ ملک میں فساد

پھیلائیں اور وہ تیری اور تیرے معبودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھیں؟" فرعون نے جواب دیا "میں ان کے بیٹوں کو قتل کراؤں گا اور ان کی عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا۔ ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے۔"

فرعون کا دعویٰ یہ نہ تھا کہ وہ اس کائنات کا الٰہ اور خالق ہے اور اس کائنات کو وہ چلاتا ہے یا یہ کہ اسے اس کائنات کے طبیعی نظام پر قدرت حاصل ہے بلکہ وہ اپنے آپ کو اپنی کمزور پبلک پر الٰہ اور رب سمجھتا تھا۔ اس معنی میں کہ وہ حاکم اور مقنن ہے اور یہ کہ اس کا حکم اور ارادہ قانون ہیں اور ان پر عمل ہوتا ہے اور ہونا چاہئے اور تمام حکام اور بادشاہوں کا بھی یہی دعویٰ ہوتا ہے کہ ان کا قانون چلتا ہے اور ان کے حکم سے امور طے ہوتے رہیں اور یہی مفہوم ہے ربوبیت کا ازروئے لغت۔ مصر میں لوگ فرعون کی بندگی اس معنی میں نہ کرتے تھے کہ وہ فرعون کی نمازیں پڑھتے تھے یا فرعون کے روزے رکھتے تھے بلکہ ان کے اپنے الٰہ تھے جس طرح فرعون نے اپنے لئے الٰہ بنا رکھے تھے اور یہ لوگ ان الہوں کی بندگی بجالاتے تھے اور اس حقیقت کا اظہار درباریوں کے اس قول سے بھی ہوتا ہے

(وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ) "تیری اور تیرے معبودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھے ہیں۔" اور یہ حقیقت مصر کی فرعونی تاریخ سے بھی ثابت ہے کہ فرعون کا الٰہ تھا۔ لہٰذا فرعون اس معنی میں ان کا رب اور الٰہ تھا کہ یہ لوگ اس کے اوامر و نواہی کے پابند تھے اور اس کے کسی حکم کی نافرمانی نہ کر سکتے تھے اور نہ اس کے کسی قانون کی خلاف ورزی کر سکتے تھے اور عبادت کا یہی لغوی، حقیقی اور اصطلاحی مفہوم ہے بلکہ یہی واقعی مفہوم ہے جو شخص کسی انسان کے وضع کردہ قانون کی اطاعت کرے وہ گویا اس کی عبادت کر رہا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی تشریح فرمائی ہے۔ اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی تشریح کے بارے میں ایک صحابی عدی ابن حاتم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا کہ یہ لوگ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت تو نہ کرتے تھے؟ تو حضورؐ نے فرمایا کہ یہ احبار و رہبان ان کے لئے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرتے تھے اور یہ لوگ اس میں ان کی اطاعت کرتے تھے، یہی تو ان کی جانب سے ان کی عبادت ہے۔ (ترمذی)

رہی یہ بات جو اس نے کہا مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ "میرے علم میں تمہارے لئے میرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے؟" تو اس کی تفسیر خود قرآن نے کر دی ہے۔ قرآن نے فرعون کی زبانی یہ بات نقل کر دی

(اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱) اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ (۵۲) فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ (۵۳) "لوگو، کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے؟ اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا کہ میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل و حقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا؟ کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی (معیت) میں نہ آیا۔" (۴۳: ۵۱، ۵۳) ظاہر ہے کہ وہ اس میں اپنا اور حضرت موسیٰ کا موازنہ پیش کر رہا تھا۔ اس کے پاس کنگن نہیں

ہیں اور میں نے کنگن پہنے ہوئے ہیں یعنی میں بادشاہ ہوں اور زیب و زینت کا مالک ہوں اور موسیٰ کے پاس یہ خوبی نہیں۔ لہٰذا اس کے اس قول سے مراد یہ ہے کہ میرے سوا تمہارا کوئی حاکم نہیں ہے۔ میں ہی حاکم ہوں اور جس طرح چاہتا ہوں اس مملکت کو چلاتا ہوں اور لوگ میری بات سے سرتابی نہیں کر سکتے اور اس مفہوم میں حاکمیت الوہیت کے مترادف ہے۔ اور فی الحقیقت الوہیت کا مفہوم ہی یہی ہے۔ الہ ہوتا ہی وہ ہے جو لوگوں کے لئے قانون بناتا ہے۔ چاہے وہ الوہیت کا دعویٰ کرے یا نہ کرے۔ (۱)

اس تفسیر کے مطابق ہم فرعون کے امراء کے اس قول کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جس میں وہ کہتے ہیں۔

(وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ) ”فرعون سے اس کی قوم کے سرداروں نے کہا ”کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دے گا کہ ملک میں فساد پھیلائیں اور وہ تیری اور تیرے معبودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھیں۔“

ان لوگوں کے نقطہ نظر سے فساد فی الارض یہ ہے کہ انسان اللہ وحدہ کی ربوبیت اور حاکمیت کی طرف لوگوں کو بلائے کیونکہ جب کوئی اللہ رب العالمین کو الہ اور حاکم تسلیم کرتا ہے تو اس سے ازخود تمام دوسرے نظاموں اور حاکموں کی نفی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ فرعونی نظام حاکمیت غیراللہ کے اصول پر قائم ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ نظام فرعون کی ربوبیت کے اصول پر قائم ہوتا ہے اور یہ شخص اللہ کی ربوبیت کا داعی ہوتا ہے۔ لہٰذا اب ہر شخص فرعونیوں کی نظروں میں مفسد فی الارض ہوتا ہے۔ وہ باغی اور انقلابی ہوتا ہے اور ملک کے موجودہ قائم حالات کے اندر اکھاڑ پچھاڑ چاہتا ہے۔ اور موجود مستحکم حالات کی جگہ نئے حالات پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جن میں ربوبیت اور حاکمیت صرف اللہ کے لئے ہو کسی انسان کو یہ حقوق حاصل نہ ہوں۔ لہٰذا ان پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ یہ مفسدین فی الارض ہیں اور فرعون اور اس کے الہوں کی بندگی کو ترک کرنا چاہتے ہیں۔

دراصل فرعون نے اپنے تمام حقوق اس دین سے اخذ کئے تھے جس کا وہ پیروکار تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ وہ ان الہوں کا محبوب بیٹا ہے اور باپ بیٹے کے جس تعلق کا وہ داعی تھا وہ کوئی حسی اور طبعی تعلق نہ تھا کیونکہ لوگوں کو معلوم تھا کہ فرعون جس ماں باپ سے پیدا ہوا تھا وہ مصری باشندے تھے اور انسان تھے۔ یہ ایک اشاراتی اور رمزی ابنیت تھی جس کے ذریعے وہ اپنے لئے وہ تمام حقوق حاصل کرتا تھا، جو اس نے اپنے لئے مخصوص کر رکھے تھے۔ جب موسیٰ اور آپ کی قوم نے رب العالمین کی براہ راست بندگی شروع کر دی اور فرعونی الہوں کو ترک کر دیا جن کی عبادت مصری لوگ کرتے تھے، تو اس فعل سے وہ نظریاتی اساس ہی ختم ہو جاتی تھی جس پر فرعون کی مملکت کی تعمیر ہوئی تھی۔ پھر وہ اپنے نظام مملکت میں اپنی قوم کو کچھ حیثیت بھی نہ دیتا تھا اور وہ لوگ بھی اس کی اطاعت کرتے تھے وہ اللہ کے دین سے خارج تھے اور فاسق تھے۔ دوسری جگہ میں ہے (فاستخف قومه فاطاعوه ...... انهم قوم فاسقين) ”اس نے اپنی

(۱) اس مسئلے کی تفصیلات کے لئے دیکھئے کتاب المصطلحات الاربعہ فی القرآن مصنفہ مسلم صادق سید ابو الاعلیٰ مودودی ﷺ امیر جماعت اسلامی پاکستان (سید قطب)

قوم کو ہلکا کر دیا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی..... بے شک یہ لوگ فاسق تھے۔" یہ تاریخ کی صحیح تفسیر ہے۔ اگر فرعون کی قوم ہلکے لوگوں پر مشتمل نہ ہوتی اور فسق و فجور کی عادی نہ ہوتی تو ہرگز فرعون کی اطاعت نہ کرتی۔ اللہ پر جو شخص ایمان لے آتا ہے طاغوت اسے ہلکا نہیں سمجھ سکتا۔ اور نہ کوئی مومن طاغوت کی اطاعت کر سکتا ہے بشرطیکہ مومن یہ جانتا ہو کہ یہ معاملہ شریعت کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے فرعون اور تمام لوگوں کو رب العالمین کی طرف دعوت دینا' پھر میدان مبارزت میں جادوگروں کو شکست دینا اور ان کا ایمان لے آنا اور اس کے بعد قوم موسیٰ کی طرف سے رب العالمین پر ایمان لانا اور رب واحد کی عبادت کرنا یہ سب امور ایسے تھے جو فرعون کے نظام حکومت کے لئے نہایت ہی خطرناک تھے اور جہاں بھی کوئی ایسا نظام قائم ہو جس میں انسان انسان کا غلام اور مطیع ہو اور ایسے نظام کے اندر کوئی صرف رب العالمین کی بندگی اور اطاعت کی دعوت شروع کر دے تو یہ اس نظام کے لئے چیلنج ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شہادت لا الٰہ الا اللہ کی طرف دعوت دے اور یہ دعوت اس کلمہ کے حقیقی مفہوم کی طرف ہو کہ لوگ پورے پورے اسلام میں داخل ہو جائیں اور یہ مفہوم نہ لیا جائے کہ جزوی طور پر مراسم عبودیت اللہ کے سامنے بجالائیں تو یہ دعوت کسی بھی موجود نظام کفر کے لئے چیلنج ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فرعون نے اس صورت حالات میں سخت الفاظ میں اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے سخت اقدامات کرنے کا اعلان کر دیا کیونکہ اس کا پورا نظام مملکت خطرے میں تھا۔

(قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيِ نِسَآءَهُمْ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ (۱۲۷)) فرعون نے جواب دیا "میں ان کے بیٹوں کو قتل کراؤں گا اور ان کی عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا۔ ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے۔"

حضرت موسیٰ کی پیدائش کے دور میں بھی بنی اسرائیل کے خلاف نسل کشی کی یہ پالیسی اختیار کی گئی تھی۔ فرعون اور اس کا نظام مملکت ان کے لڑکوں کو قتل کر رہا تھا۔ سورہ قصص میں اس کی تفصیلات یوں دی گئی ہیں:-

(اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيِ نِسَآءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۸ : ۴)) "واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا' اس کے لڑکوں کو قتل کرتا تھا' اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا۔ فی الواقعہ وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔"

یہ سرکشی ہر دور میں رہتی ہے اور ہر جگہ رہتی ہے۔ آج بھی وہ یہی ذرائع و وسائل اختیار کرتی ہے اور صدیاں پہلے بھی اس کے یہی ذرائع تھے۔

---ooo---

اب پھر پردہ گرتا ہے' فرعون اور اس کے حوالی و موالی کو سازش اور دھمکیوں اور سخت تندی کی حالت میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور اب اس قصے کا ایک دوسرا خاص منظر سامنے آتا ہے' معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے تشدد کی کارروائیاں شروع

کر دی ہیں ۔اس منظر میں حضرت موسیٰ اپنی قوم میں نظر آتے ہیں' آپ اپنی قوم کے ساتھ ایک نبی کے قلب کے ساتھ اور ایک نبی کی زبان میں بات کر رہے ہیں' آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے رب کی پوری پوری معرفت حاصل ہے ۔ آپ رب تعالیٰ کی سنت جاریہ کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں' آپ کو علم ہے کہ اللہ کے منصوبے اور اس کی تقدیر کے فیصلوں پر کوئی اثر انداز نہیں ہو سکتا ۔ آپ ان کو نصیحت کرتے ہیں کہ آپ یہ مشکلات انگیز کریں ۔صبر سے کام لیں اور اللہ سے ان مشکلات کی برداشت کے لئے مدد اور معاونت طلب کریں ۔ آپ انہیں اس کائنات کی اصل صورت حال سے آگاہ کرتے ہیں ۔وہ یہ کہ زمین اللہ کی ملکیت ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے اور آخری انجام ان لوگوں کا اچھا ہوتا ہے جو اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے' صرف اللہ سے ڈرتے ہیں ۔اور جب وہ لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ اے موسیٰ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم پر یہ مصائب تھے اور آپ کے آنے کے بعد بھی ہم ان مشکلات سے دوچار ہیں اور یہ مشکلات ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں تو آپ ان کو ان الفاظ میں تسلی دیتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اللہ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور اس کرۂ ارض کی خلافت تمہیں دے دے لیکن پھر تمہاری بھی آزمائش کا دور شروع ہو گا ۔

---

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ
لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا
مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ
15
ع ۳ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

۵ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا "اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو' زمین اللہ کی ہے' اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے' اور آخری کامیابی انہی کے لئے ہے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں ۔" اس کی قوم کے لوگوں نے کہا "تیرے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جاتے تھے اور اب تیرے آنے پر بھی ستائے جا رہے ہیں ۔" اس نے جواب دیا "قریب ہے وہ وقت کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تم کو زمین میں خلیفہ بنائے' پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو ۔"

نبی کی بصیرت دیکھ رہی ہے کہ اللہ کی قوتیں اس کائنات میں کس طرح متصرف ہیں ۔ اور اللہ کی حقیقت اور قوت کس قدر عظیم ہے ۔ اور اس کائنات میں سنت الٰہیہ کس طرح جاری و ساری ہے اور اللہ کی راہ میں مشکلات برداشت کرنے والے لوگوں کے لئے اس میں کیا کیا مراعات ہیں؟

جو لوگ رب العالمین کی طرف دعوت دیتے ہیں' ان کے لئے جائے پناہ صرف ایک ہے اور وہ مامون محفوظ اور

قابل بھروسہ جائے پناہ ہے۔ان کا صرف ایک ہی ولی اور آقا ہوتا ہے جو بڑی قوت والا اور ناقابل شکست ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو اس وقت تک صبر اور مصابرت کا مظاہرہ کرنا چاہئے جب تک ان کا آقا ان کے لئے فتح و کامرانی کے احکام صادر نہیں کرتا' انہیں اس معاملے میں جلد بازی نہیں کرنی چاہئے کیونکہ انسان کو معلوم نہیں ہے کہ غیب میں اس کے لئے کیا کیا پوشیدہ ہے اور اس کی بھلائی کس چیز میں ہے؟

یہ زمین اللہ کی ہے۔فرعون اور اس کی قوم یہاں مسافرین ہیں اور ان کے چلے جانے کے بعد یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ یہاں کس قوم کو لاتا ہے اور اسے اس زمین کا وارث بناتا ہے۔یہ کام اللہ اپنے سنن جاریہ کے مطابق کرتا ہے' لہٰذا جو لوگ رب العالمین کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ اس بات کو خاطر میں نہیں لاتے کہ ان کا جس طاغوتی طاقت سے مقابلہ ہے' وہ اس سرزمین پر بظاہر بڑی مستحکم نظر آتی ہے اور اس کی بنیادوں میں کوئی تزلزل نہیں ہے۔اس لئے کہ اس زمین کا مالک اللہ ہے اور وہ کسی مناسب وقت میں کسی سے اقتدار چھین کر کسی دوسرے بندے کے حوالے کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آخری اچھا انجام بہرحال متقین کا ہوتا ہے' چاہے طویل عرصے کے بعد یہ انجام ظاہر ہو یا جلدی ظاہر ہو۔لہٰذا رب العالمین کی طرف دعوت دینے والوں کو چاہئے کہ وہ اپنے دلوں سے اپنے انجام کے بارے میں ہر خلجان کو نکال دیں اور یہ گمان نہ کریں کہ آج جن اہل باطل کی زمین پر چلت پھرت ہے وہ ہمیشہ ہی اسی طرح رہیں گے۔

یہ تو نبی کی چشم بصیرت تھی جو اس کائنات میں ہونے والے واقعات کو دور تک دیکھ رہی تھی لیکن بنی اسرائیل بھی تو بنی اسرائیل تھے۔

(قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا) "اس کی قوم کے لوگوں نے کہا "تیرے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جاتے تھے اور اب تیرے آنے پر بھی ستائے جارہے ہیں۔"

ان الفاظ کے پیچھے ایک خاص ذہنیت ہے' ان کے اندر قطعیت کے ساتھ ان کی مایوسی کا اظہار ہے۔کہتے ہیں کہ تیرے آنے سے پہلے بھی ہم پر مظالم ہوتے رہے اور آپ کے آنے کے بعد بھی جاری ہیں۔ان کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آرہا ہے۔یہ ختم ہوتے نظر نہیں آتے۔

لیکن نبی اپنی نہج اور ڈگر پر جاری رہتا ہے۔وہ انہیں مشورہ دیتا ہے کہ ذکر الٰہی میں مشغول ہوں' پر امید رہیں' نبی انہیں اشارہ بھی دیتے ہیں کہ دشمن ضرور ہلاک ہو گا اور تمہیں مقام خلافت فی الارض ضرور نصیب ہو گا لیکن جسے یہ مقام ملتا ہے وہ دراصل بڑی آزمائش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

(قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۲۹)) "اس نے جواب دیا "قریب ہے وہ وقت کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تم کو زمین میں خلیفہ بنائے' پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔"

حضرت موسیٰ نبوت کے دل و دماغ اور بصیرت کے ساتھ دیکھ رہے ہیں' آپ سنت الٰہیہ کو مٹا مٹا دیکھ رہے ہیں۔یہ سنت حسب وعدہ صابرین کے حق میں فیصلہ کرتی ہے' اسی طرح منکرین حق کے لئے بھی اس کے فیصلے وقت پر ہوتے ہیں۔آپ

کو صاف صاف نظر آتا ہے کہ طاغوتی طاقتوں نے تباہ و برباد ہونا ہے اور ان کی جگہ صابرین و مجاہدین نے لینی ہے ' لہذا آپ اپنی قوم کو راہ مصابرت پر آگے بڑھاتے ہیں تاکہ سنت الہیہ ان کے حق میں فیصلے کر دے۔ آپ کو تو آغاز ہی سے معلوم ہے کی بنی اسرائیل کو زمین کا وارث بنانا ان کے لئے آزمائش ہے۔ یہ نہیں کہ وہ اللہ کے چہیتے ہیں اور محبوب ہیں' جیسا کہ بعض بنی اسرائیل اپنے بارے میں زعم رکھتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے ان کے گناہوں کی وجہ سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا' اس لئے کہ یہ دنیا یونہی بے مقصد بھی نہیں بنائی گئی اور نہ یہ ازلی اور ابدی ہے بلکہ یہاں ہر قوم کا عروج انسان کے لئے ہے۔ فَيَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ "تاکہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو؟" اللہ تو کسی چیز کے واقعہ ہونے سے بھی پہلے جانتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی جانب سے ارتکاب جرم سے پہلے سزا نہیں دیتا۔ جب تک کہ وہ بات ان سے واقعہ نہیں ہو جاتی جس کا اللہ کو پہلے سے عالم الغیب ہونے کی حیثیت سے علم ہوتا ہے۔

---

اب سیاق کلام موسیٰ اور ان کی قوم کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس منظر پر پردہ گر جاتا ہے۔ اب ایک دوسرا منظر سامنے آ جاتا ہے۔ اس منظر میں فرعون اور اس کی قوم نظر آتے ہیں۔ فرعون اپنی قوم پر انتہائی ظلم کرتے ہوئے نظر آتا ہے اور حضرت موسیٰ کا وہ وعدہ سچ ہو جاتا ہے جو اس نے اپنی قوم سے کیا تھا اور جس کی انہیں امید تھی۔ اب رسول کی تمام باتوں کی تصدیق ہو جاتی ہے اس لئے کہ یہ قصہ یہاں اسی مقصد کے لئے لایا گیا ہے۔

یہ منظر نہایت ہی معمول کے حالات میں شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد دھیرے دھیرے فضا میں تندی اور تیزی آتی جاتی ہے اور پردہ گرنے سے پہلے ہم فضا میں ایک خوفناک طوفان دیکھتے ہیں۔ ہر چیز تباہ و برباد کر دی جاتی ہے۔ روئے زمین کو صاف کر دیا جاتا ہے۔ اب یہاں کوئی طاغوت و سرکش نہیں رہتا۔ اور نہ طاغوت کے اہالی و موالی کا کوئی اتہ پتہ نظر آتا ہے اور ہمیں یہ بات معلوم ہو گئی کہ بنی اسرائیل نے مشکلات پر صبر کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جزائے خیر دے دی۔ فرعون اور اس کی پارٹی نے فسق و فجور کی راہ لی اور ظلم کیا اور وہ بھی اپنے کئے پر مناسب انجام تک پہنچ گئے۔ اللہ کا وعدہ بھی پورا ہوا اور اس کی وعید نے بھی رنگ دکھایا۔ اور ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے حق کو جھٹلایا۔ سنت الہیہ کے مطابق سلوک ہوا۔ اللہ نے انہیں نہایت ہی مشکل حالات میں مبتلا کیا۔ ذرا تفصیلا مطالعہ کریں۔

---

وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتِ
لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿١٣٠﴾ فَإِذَا جَاءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَٰذِهِ ۖ وَإِن
تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسَىٰ وَمَن مَّعَهُ ۗ أَلَا إِنَّمَا طَائِرُهُمْ عِندَ اللَّهِ
وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٣١﴾ وَقَالُوا مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِنْ آيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا
بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ﴿١٣٢﴾ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَ

الْقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ وَ الدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا
مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَ لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا
عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَ لَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا
هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا
وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ
مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ
الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ
فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ الربع

”ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ شاید ان کو ہوش آئے ۔ مگر ان کا حال یہ تھا کہ جب اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اسی کے مستحق ہیں ' اور جب برا زمانہ آتا تو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کو اپنے لئے فال بد ٹھہراتے ' حالانکہ درحقیقت ان کی فال بد تو اللہ کے پاس تھی ' مگر ان میں سے اکثر بے علم تھے ۔ انہوں نے موسیٰ سے کہا کہ ”تو ہمیں مسحور کرنے کے لئے خواہ کوئی نشانی لے آئے ' ہم تو تیری بات ماننے والے نہیں ہیں ۔“ آخر کار ہم نے ان پر طوفان بھیجا ' ٹڈی دل چھوڑے ' سرسریاں پھیلائیں ' مینڈک نکالے اور خون برسایا ۔ یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں مگر وہ سرکشی کئے چلے گئے ۔ اور وہ بڑے ہی مجرم لوگ تھے ۔ جب کبھی ان پر بلا نازل ہو جاتی تو کہتے ”اے موسیٰ ' تجھے اپنے رب کی طرف سے جو منصب حاصل ہے اس کی بناء پر ہمارے حق میں دعا کر ' اگر اب کے تو ہم پر سے یہ بلا ٹلوا دے تو ہم تیری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے ۔“ مگر جب ہم ان پر سے اپنا عذاب ایک وقت مقرر تک کے لئے ' جس کو وہ بہرحال پہنچنے والے تھے ' ہٹا لیتے تھے تو وہ یکلخت اپنے عہد سے پھر جاتے ۔ تب ہم نے ان سے انتقام لیا اور انہیں سمندر میں غرق کر دیا کیونکہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پرواہ ہو گئے تھے ۔ اور ان کی جگہ ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے ' اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا ۔ اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدۂ خیر پورا ہوا کیونکہ انہوں نے صبر

سے کام لیا تھا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ برباد کر دیا جو وہ بناتے اور چڑھاتے تھے ۔"

فرعون اور اس کے ساتھی اپنے جبروت میں اور تشدد میں آگے ہی بڑھتے گئے ۔ فرعون نے اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا ۔ اس نے مردوں کو قتل کرنا اور عورتوں کو زندہ رکھنا شروع کر دیا ۔ حضرت موسیٰ اور آپ کی قوم ان مشکلات کو برداشت کرتے اور یہ امید کرتے رہے کہ ایک دن ضرور ان کی مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا ۔ انہوں نے نہایت ہی صبر و تحمل سے ان مشکلات کو برداشت کیا اور جب دونوں جماعتوں کا موقف بالکل واضح ہو گیا ایمان اور کفر آمنے سامنے آگئے ' ایک طرف سے مظالم ہوتے رہے اور دوسری جانب سے صبر ہوتا رہا ۔ اللہ کی زمین پر اٹھنے والی قوت اللہ ہی کو چیلنج کرنے لگی ۔ اب وقت آگیا کہ اللہ کی جانب سے مداخلت ہو اور اللہ تعالیٰ مجرمین اور صابرین کے درمیان فیصلہ کر دیں ۔

( وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ) "ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ شاید ان کو ہوش آئے ۔

یہ اللہ کی طرف سے ان کے لئے ابتدائی تنبیہ تھی ۔ ملک کو خشک سالی نے آلیا اور ہر قسم کی فصلیں ضائع ہو گئیں اور پیداوار ختم ہو گئی ۔ سنین عربی اصطلاح میں خشک سالوں اور قحط اور شدت کے لئے بولا جاتا ہے ۔ قحط سالی مصر جیسے سرسبز اور گل گزار ملک میں عذاب الٰہی تصور ہوتی ہے ۔ لوگوں کے اندر اس سے خوف و ہراس پیدا ہو جاتا تھا اور وہ پریشان ہو کر عالم بالا کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے ۔ لیکن چونکہ طاغوتی قوتیں اور ان کے اہلکار لوگوں کو غافل کرتے ہیں ' دین سے دور کرتے ہیں اور لوگ ان کی اطاعت کرتے ہیں ' اس لئے وہ اس لائن پر نہیں سوچتے کہ یہ عذاب الٰہی ہے جو ان پر بصورت خشک سالی وغیرہ آیا ہے ۔ طاغوتی قوتوں کی وجہ سے لوگوں کے اندر اس قدر غفلت اور لاپرواہی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اللہ کی تنبیہات کو بھول جاتے ہیں اور یہ اعتراف نہیں کرتے کہ ایمان اور روحانی اقدار اور طبیعی حالات کے درمیان گہرا تعلق ہوتا ہے ۔ اور عالم الغیب کی نظر لوگوں کی اخلاقی زندگی اور ان کے طبیعی حالات دونوں پر ہوتی ہے ۔ طاغوتی نظام کے تحت لوگوں کا دماغ اس قدر موٹا ہو جاتا ہے کہ وہ محسوسات کے علاوہ کچھ دیکھ ہی نہیں سکتے اور وہ بہائم کی سطح تک اتر آتے ہیں کیونکہ بہائم بھی صرف محسوسات کو دیکھ سکتے ہیں ۔ اگر اس قسم کے لوگ کچھ ایسے واقعات دیکھیں بھی جن کی وہ طبیعی تعبیر نہیں کر سکتے تو بھی ان اہم واقعات کو وہ اتفاقات اور مصادفات کے حوالے کر دیتے ہیں ۔ اور ان واقعات کے پیچھے کام کرنے والی سنت الہیہ اور ناموس قدرت کو وہ نہیں سمجھ پاتے ' جو اس کائنات میں جاری و ساری ہے ۔ (۱)

غرض قوم فرعون کو اللہ نے متنبہ کرنے کی کوشش کی حالانکہ وہ کافر اور فاسق و فاجر تھے ۔ بت پرستی کے خرافات نے

---

(۱) جب خروچیف کے دور میں روس خشک سالی کا شکار ہوا اور ہر قسم کی زرعی پیداوار ختم ہو گئی تو اس نے کہا کہ قدرت ہمارے خلاف جا رہی ہے ۔ حالانکہ وہ لامذہب کیمونزم کا قائل تھا اور کسی غیبی طاقت کو تسلیم نہ کرتا تھا ۔ غرض یہ لوگ زبردستی اپنے آپ کو اندھا کرتے ہیں اور دست قدرت کو دیکھنا نہیں چاہتے ۔ سوال یہ ہے کہ وہ قدرت کیا ہے جو ان کے خلاف جا رہی ہے؟ یہی تو رب تعالیٰ ہے ۔

ان کی فطرت کو تبدیل کر دیا تھا اور اس کائنات میں جو ناموس قدرت جاری ہے اور جس کے مطابق خود انسانوں کی زندگی بھی رواں دواں ہے اس کے ساتھ ان کا کوئی ربط و تعلق نہ تھا۔کیونکہ اس ناموس قدرت کا صحیح ادراک صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جنہیں صحیح ایمان اور نور ایمان نصیب ہوا ہو۔اہل ایمان ہی یہ ادراک کر سکتے ہیں کہ یہ کائنات یونہی پیدا نہیں کی گئی اور نہ ہمیشہ کے لئے یونہی بے مقصد رہے گی بلکہ اس کے اوپر اللہ کے سچے قوانین حاوی ہیں۔یہ ہے حقیقی علمی سوچ۔یہ سوچ اللہ کے عالم مغیبات کا انکار نہیں کرتی۔اس لئے کہ حقیقی علم و سائنس اور علم غیب کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔کیونکہ کائنات اور انسانی زندگی دونوں کے پیچھے اللہ کی ذات کام کرتی ہے جو (فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ) ہے اور ذات الٰہی کا مطالبہ یہ ہے کہ بندے ایمان لائیں اور اللہ خلافت فی الارض کا منصب ان کے سپرد کر دے۔اور جس نے ہمیشہ انسانوں کے لئے ایسی شریعتیں تجویز کی ہیں جو ان قوانین فطرت اور نوامیس قدرت سے ہم آہنگ رہی ہیں اور انہوں نے اس کائنات میں انسانی زندگی اور اخلاقی زندگی کے درمیان توازن پیدا کیا ہے۔

فرعون اور اس کے اہالی و موالی یہ نہ سمجھ سکے کہ ان کے کفر و فسق اور آل موسیٰ پر ان کے مظالم اور قحط سالی کے عذاب کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق ہے۔خصوصاً مصر میں جہاں ہمیشہ تازگی' سرسبزی اور بہار رہتی ہے اور ہر قسم کے پھلوں اور زرعی پیداوار کی کثرت اور فراوانی ہوتی ہے۔وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ مشکلات ان کے فسق و فجور کی وجہ سے ان پر نازل ہو رہی ہیں۔

غرض اہل فرعون مصر میں عظیم خشک سالی کے مہلک آثار کو دیکھ کر بھی متنبہ نہ ہوئے اور انہوں نے اپنی آنکھیں بند کیے رکھیں۔ان کی سوچ یہ تھی کہ جب کبھی ان پر اچھے دن آتے تو کہتے کہ یہ تو ان کا حق ہے اور وہ اس کے مستحق ہیں لیکن جب خشک سالی اور مشکلات درپیش ہوتیں تو یہ کہتے کہ یہ سب کچھ موسیٰ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔حضرت موسیٰ کے ساتھیوں کی وجہ سے یہ مشکلات ان پر آ رہی ہیں۔

(فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ) "مگر ان کا حال یہ تھا کہ جب اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اسی کے مستحق ہیں' اور جب برا زمانہ آتا تو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کو اپنے لئے فال بد ٹھہراتے۔"

جب انسانی فطرت جادۂ مستقیم سے منحرف ہو جاتی ہے تو اسے نظر نہیں آتا کہ اس کائنات کو دست قدرت چلا رہا ہے۔ان کو اللہ کا نظام قضا و قدر نظر نہیں آتا جس کے تحت تمام چیزیں پیدا ہو رہی ہیں اور تمام واقعات رونما ہو رہے ہیں۔جب یہ فطرت اس حد تک خراب ہو جائے تو پھر وہ اس کائنات میں پائے جانے والے نوامیس قدرت کا ادراک نہیں کر سکتی۔حالانکہ یہ قوانین قدرت مستقلاً یہاں رواں دواں ہیں۔ایسے لوگ پھر کائنات کے واقعات کی تفسیر اور تشریح انفرادی واقعہ کے طور پر کرتے ہیں۔وہ یہ نہیں خیال کرتے کہ اس واقعہ کا کسی کلی اصول کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ایسے لوگ دفتر خرافات لئے ہوئے بے آب و گیاہ وادیوں میں سرگرداں پھرتے رہتے ہیں۔کسی اصول پر متفق نہیں ہوتے اور یہ کسی ایک راہ و رسم کے قائل نہیں ہوتے' ان کی سوچ منطقی نہیں ہوتی۔خروشیف جیسے لوگ بھی یہ کہتے ہیں کہ "طبیعت" ہمارے خلاف جا رہی ہے۔سوال یہ ہے کہ مادہ کس طرح ان کے خلاف جا رہا ہے۔لیکن وہ (فَعَّالٌ لِّمَا

غیبیہ کا قائل ہی نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ بعض لوگ اصول الدین کا انکار کرتے ہوئے اور خدا اور خدا کی غیبی قدرت کا انکار کر کے بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔

فرعون اور اس کے ساتھی دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کی ایسی تشریح کرتے تھے کہ اگر دنیا کے حالات اچھے ہوں تو کہتے کہ بس یہ ہمارا حسن کارکردگی ہے اور ہم اس کے مستحق ہیں۔ اور اگر حالات خراب ہوں تو وہ کہتے کہ یہ حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی وجہ سے ہوئے ہیں' یعنی ان سے بدشگونی لیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ بدشگونی کیا چیز ہے۔ اس کے لئے یہاں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ طیر ہے۔ اس کے لغوی معنی پرندے کا اڑنا ہیں۔ اہل جاہلیت کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی تھی کہ اس کائنات میں سنت الٰہیہ جاری ہے اور قدرت کے بعض ضوابط کے مطابق یہاں واقعات رونما ہوتے ہیں' وہ ظاہری حالات کو دیکھ کر اور بت پرستی کے زیر اثر بعض عجیب توہمات پر یقین رکھتے تھے۔ اگر کوئی شخص کسی کام کا ارادہ کرتا تو کسی پرندے کے گھونسلے کے قریب جاتا اور گھونسلے سے پرندے کو اڑاتا۔ اگر پرندہ اس کے دائیں جانب سے اڑتا تو اسے "سانح" کہتے۔ اس سے وہ خوش ہوتے اور اس کام کو کر گزرتے۔ اگر پرندہ بائیں جانب سے اڑتا تو اسے وہ "بارح" کہتے اور اسے بدشگونی سمجھ کر اس کام سے باز آجاتے۔ تو اسلام نے اس خرافاتی سوچ کو کالعدم کر دیا۔ اور اس کی جگہ غور و فکر کا سائنٹیفک انداز دیا۔ اور نتائج کو اللہ کے سنن جاریہ پر چھوڑ دیا کہ نتائج جو بھی نکلیں گے وہ اللہ کے نظام قضا و قدر کے مطابق ظاہر ہوں گے۔ اسلام نے تمام معاملات کو سائنسی اور علمی انداز پر چھوڑ دیا جس میں اہمیت انسان کے ارادے اور اس کی نیت' اس کی حرکت اور اس کی جدوجہد کو دی گئی۔ اور اللہ کے دائرہ قضا و قدر پر اللہ کی مشیت محیط ہے۔

(أَلَآ إِنَّمَا طَٰٓئِرُهُمْ عِندَ ٱللَّهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ) "حالانکہ درحقیقت ان کی فال بد تو اللہ کے پاس تھی مگر ان میں سے اکثر بے علم تھے۔"

اس دنیا میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں۔ ان کا سبب واحد یہ ہے کہ یہ اللہ کے حکم سے واقع ہوتے ہیں اور اللہ ہی کے ہاں سے ان کو اچھی بات نصیب ہوتی ہے جس میں ان کے لئے آزمائش ہے اور اللہ ہی کی طرف سے ان پر مصائب آتے ہیں اور یہ بھی آزمائش کے لئے ہیں۔ ونبلوكم بالشر والخير فتنة والينا ترجعون "اور ہم خیر و شر میں مبتلا کر کے انہیں آزمائیں گے اور یہ آزمائش بڑا فتنہ ہے اور تم ہماری جانب لوٹو گے۔" انسان پر جو مشکلات آتی ہیں وہ اس کی شامت اعمال ہیں لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے اور اکثر تو ایسے ہیں جو سرے سے تقدیر الٰہی کے قائل ہی نہیں ہیں وہ اپنے نظریات کا اظہار سائنٹیفک سوچ کے لفظ سے کرتے ہیں اور بعض اسے "قدرت کا عدم تعاون" کہتے ہیں مثلاً اشتراکی لوگ لیکن یہ سب حضرات حقیقت سے جاہل اور ناعلم ہیں۔

ذرا آگے بڑھئے: فرعون اور اس کے حواری اپنی سرکشی میں آگے بڑھ رہے ہیں' عزت نفس کے مجروح ہو جانے کی وجہ سے بہت ہی طیش میں ہیں اور غصے اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ کہتے ہیں:

(وَقَالُوا۟ مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِۦ مِنْ ءَايَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ (۱۳۲))

"انہوں نے موسیٰ سے کہا کہ "تو ہمیں مسحور کرنے کے لئے خواہ کوئی نشانی لے آئے' ہم تو تیری بات ماننے والے نہیں ہیں۔"

یہ وہ حیوانی خود سری ہے جسے سدھایا نہیں جاسکتا' جس پر نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوتا' جسے کسی دلیل سے رد نہیں کیا جاسکتا' وہ نہ فکر و نظر جانتی ہے اور نہ غور و تدبر سے کام لیتی ہے' دلیل کا سامنا کرنے سے بھی پہلے وہ بات کو رد کر دیتی ہے' وہ دلیل کا راستہ ہی روک دیتی ہے۔ یہ وہ نفسیاتی حالت ہے جس میں ہر وہ شخص مبتلا ہو جاتا ہے جو جابرانہ انداز میں اور اپنی مصلحتوں کے لئے اقتدار میں ہوتا ہے اور جسے دلیل نے شکست دے دی ہوتی ہے بلکہ دلیل و برہان اس کا پیچھا کر رہے ہوتے ہیں لیکن اپنی مصلحتوں کی وجہ سے سچائی دلیل اور ثبوت کا سامنا نہیں کر سکتا۔ جب ایسے حالات ہوں تو پھر قادر مطلق اپنے خاص وسائل کام میں لاتا ہے۔

(فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ (۱۳۳)) "آخر کار ہم نے ان پر طوفان بھیجا' ٹڈی دل چھوڑے' سرسریاں پھیلائیں' مینڈک نکالے اور خون برسایا۔ یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں مگر وہ سرکشی کئے چلے گئے اور وہ بڑے ہی مجرم لوگ تھے۔"

یہ تھا ڈرامہ 'ابتلاء' آیات متصلات کا مفہوم یہ ہے کہ وہ نشانیاں واضح واضح طور پر بتا رہی تھیں' ایک کے بعد ایک ابتلا آ رہی تھی' اور پچھلی آنے والی اگلی کا منطقی نتیجہ تھی۔

قرآن کریم نے ان تمام آیات کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے حالانکہ یہ مصائب ان پر یکے بعد دیگرے آئے تھے۔ جب بھی کوئی مصیبت آتی تو مشکلات کے دباؤ کے تحت وہ حضرت موسیٰ کے آگے جھکتے اور وعدہ کرتے کہ اگر تمہاری دعا سے ہمیں اس سے نجات ملی تو بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ بھیج دیں گے۔ لیکن جب بھی عذاب ٹلتا تو ان کی روش وہی رہتی۔

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يَا مُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِندَكَ لَئِن كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِي إِسْرَائِيلَ (۱۳۴)) "جب کبھی ان پر بلا نازل ہو جاتی تو کہتے "اے موسیٰ! تجھے اپنے رب کی طرف سے جو منصب حاصل ہے' اس کی بناء پر ہمارے حق میں دعا کر' اگر اب کے تو ہم پر سے یہ بلا ٹلوا دے تو ہم تیری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے۔"

ہر بار وہ وعدہ خلافی کرتے' اور دوبارہ وہ اسی حالت میں چلے جاتے جو ان کے لئے ایک مہلت تھی اور ان کے لئے اللہ نے ایک وقت مقرر کر دیا تھا۔

(فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلَىٰ أَجَلٍ هُم بَالِغُوهُ إِذَا هُمْ يَنكُثُونَ (۱۳۵)) "مگر جب ہم ان پر سے اپنا عذاب ایک وقت مقرر تک کے لئے' جس کو وہ بہرحال پہنچنے والے تھے' ہٹا لیتے تو وہ یکلخت اپنے عہد سے پھر جاتے۔"

سیاق کلام میں ان تمام نشانیوں کو ایک جگہ لایا گیا' اس طرح کہ گویا بیک وقت ان سب کا ظہور ہوا' اور ان کے بعد جب اللہ نے ان مشکلات کو رفع فرمایا تو ایک ہی بار فرعونیوں نے بد عہدی کی' یہ انداز اس لئے اختیار کیا گیا کہ جب بھی کوئی

نشانی آئی اور دور ہوئی تو انہوں نے پھر عہد وفا نہ کیا۔ یہ انداز بیان قرآن کے اسالیب میں سے ایک ہے ' چونکہ واقعات ایک ہی جیسے تھے ' اس لئے ایک ہی جگہ ان کے آغاز کی طرف اشارہ کر دیا گیا گویا ایک ہی دل کے ساتھ یہ تمام تجربات پیش آئے اور وہ دل اس قدر سخت ہو چکا تھا کہ کسی تجربہ نے بھی اس کے اندر راہ نہ پایا۔ اور کسی نے عبرت نہ حاصل کی۔

یہ تمام نشانیاں جن تفصیلات کے ساتھ آتی رہیں ' قرآن کریم نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ احادیث مرفوع میں بھی ان کا تذکرہ نہیں آیا۔ ہم بھی فی ظلال القرآن میں اختیار کئے ہوئے اسلوب کے مطابق ان کو یونہی مجمل چھوڑتے ہیں اس لئے کہ قرآن کی تشریح یا قرآن سے ہوگی یا سنت ثابتہ سے۔

یہ اسلوب ہم نے اسرائیلیات سے بچنے کے لئے اپنایا ہے کیونکہ اسرائیلی روایات بے اصل روایات ہوتی ہیں۔ اس قسم کی اسرائیلی روایات تمام سابقہ تفاسیر کا حصہ بن گئی ہیں۔ کوئی ایسی تفسیر نہیں ہے جو ان سے خالی ہو۔ امام طبری کی تفسیر باوجود اس کے کہ وہ ایک نفیس تفسیر ہے اور نہایت ہی قیمتی تفسیر ہے ' ابن کثیر کی تفسیر باوجود اس کے کہ وہ قابل قدر تفسیر ہے ' دونوں اسرائیلیات سے خالی نہیں ہیں۔

اس بارے میں حضرت ابن عباس بہت سے بھی روایات منقول ہیں۔ ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ اور تفسیر دونوں میں ذکر کی ہیں اور ان میں سے ایک روایت یہ ہے =

سعید ابن جبیر سے روایت ہے کہ جب موسیٰ ؑ فرعون کے دربار میں آئے تو انہوں نے اس سے یہ مطالبہ کیا کہ میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دو۔ اس نے انکار کر دیا۔ تو اللہ نے ان پر طوفان بھیجا یعنی سخت بارش ہوئی۔ جب یہ بارش طویل عرصے تک برستی رہی تو یہ لوگ ڈر گئے کہ شاید یہ کوئی عذاب نہ ہو ' اہل فرعون نے حضرت موسیٰ سے عرض کی کہ آپ اپنے خدا کے سامنے سوال کریں کہ وہ اس بارش کو بند کر دے۔ اگر یہ بند ہو جائے تو ہم تم پر ایمان لائیں گے اور تمہارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے۔ آپ نے رب تعالیٰ سے دعا کی لیکن وہ ایمان نہ لائے اور نہ ہی بنی اسرائیل کو آپ کے ساتھ بھیجا۔ تو اس سال ان کے ہاں فصلیں ' پھل اور چارہ اس قدر ہوا کہ اس سے قبل نہ ہوا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہی تو ہماری تمنا تھی۔ تو اللہ نے ان پر ٹڈی دل بھیج دیئے۔ ٹڈی دلوں نے گھاس کو صاف کر دیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ٹڈی دل نے گھاس کو چاٹ لیا ہے تو اب ظاہر ہے کہ یہ فصل کو بھی نہ چھوڑے گی۔ اب پھر انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ آپ رب تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ ہمیں اس بلا سے نجات ملے۔ اگر نجات مل گئی تو ہم ایمان بھی لائیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے۔ اللہ نے ٹڈی دل کو بھی ختم کر دیا اور یہ لوگ پھر بھی ایمان نہ لائے اور نہ ہی بنی اسرائیل کو آپ کے ساتھ بھیجا۔ انہوں نے فصل کاٹی اور گھروں میں ڈال دی اور کہا اب تو ہم نے فصل گھروں تک پہنچا دی ہے۔ اس پر اللہ نے ان پر سرسریاں پھیلا دیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص دس پیمانے دانے لے کر پن چکی پر جاتا اور جب آتا واپس ہوتا تو وہ صرف تین پیمانے ہوتا۔ اب پھر انہوں نے حضرت موسیٰ سے درخواست کی کہ اے موسیٰ اللہ سے سوال کریں کہ اگر وہ سرسریوں کو دفع کر دیں تو ہم ایمان لائیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے۔ حضرت نے دعا کی اور ان سے یہ عذاب بھی دور ہو گیا۔ اب بھی وہ لوگ ایمان نہ لائے اور انہوں نے آپ کے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیجنے سے انکار کر دیا۔ یوں ہوا کہ حضرت موسیٰ فرعون کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے مینڈک کی آواز سنی۔ حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہا "تم اور تمہاری قوم کو اس سے تکلیف پہنچنے والی ہے۔" فرعون نے کہا کہ یہ مینڈک کیا سازش کر سکتے ہیں؟ شام ہونے سے پہلے اس قدر مینڈک امنڈ آئے کہ جب کوئی

بات کرتا تو منہ میں مینڈک سے گر جاتا۔ اب پھر انہوں نے حضرت موسیٰ سے عرض کی کہ آپ دعا کریں کہ اللہ ہم سے اس عذاب کو دور کرے ۔ ہم ایمان لائیں گے اور بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ بھیج دیں گے ۔ اللہ نے یہ عذاب بھی دور کر دیا۔ لیکن اہل فرعون نہ ایمان لائے اور نہ بنی اسرائیل کو بھیجا۔ اب اللہ نے ان پر خون بھیج دیا۔ اب ان کی نہروں میں کنوؤں میں ' برتنوں میں تازہ بہ تازہ خون تھا۔ لوگوں نے فرعون کے پاس شکایت کی کہ اب تو آزمائش کی حد ہو گئی ہے 'ہمارے پینے کے لئے بھی پانی نہیں رہا تو فرعون نے کہا کہ درحقیقت موسیٰ نے جادو کر دیا ہے ۔ انہوں نے کہا کہ ہم پر سحر کہاں سے ہوا' ہمارے برتنوں میں بھی جو پانی تھا وہ بھی تازہ خون ہے ۔ اب پھر وہ حضرت موسیٰ کے پاس آئے اور کہا اے موسیٰ اپنے رب کو پکارو 'اگر یہ عذاب ہم سے دور ہو جائے تو ہم ضرورت تم پر ایمان لائیں گے ۔ آپ نے رب تعالیٰ کو پکارا' اللہ تعالیٰ نے یہ عذاب بھی دور کر دیا۔ انہوں نے پھر بھی یہی کیا کہ نہ ایمان لائے اور نہ بنی اسرائیل کو بھیجا۔"

اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا واقعات ہوئے 'بہرحال اس حدیث میں جو واقعات ذکر ہوئے وہ قرآن سے متضاد نہیں ہیں ۔ یہ عذاب اللہ نے بے شک ان پر نازل کئے تاکہ ان کو آزمائے اور جھٹلانے والوں کے ساتھ اللہ کی روش یہی تو ہوتی ہے بار بار آزماتا ہے تاکہ وہ مان جائیں ۔

فرعون کی قوم 'اپنی بت پرستی اور جاہلیت کے باوجود اور فرعون کی جانب سے ان پر ظلم و تشدد اور ان کی ذلت و خواری کے باوجود 'حضرت موسیٰ کے دامن میں پناہ لیتی تھی کہ وہ اپنے رب سے سوال کرے 'کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے ساتھ یہ عہد کیا ہوا تھا کہ وہ دعا قبول کرے گا اور آپ یہ دعا کریں کہ ان سے یہ مصیبت دور ہو۔ اگرچہ 'مصر کے حکام وعدہ خلافی کرتے اور ایمان نہ لاتے کیونکہ اس وقت کا نظام حکومت اس نظریہ پہ قائم تھا کہ فرعون ان کا رب اور حاکم ہے ۔ یہ لوگ فرعون کی جگہ اللہ کی ربوبیت اور حاکمیت کے قیام سے خوف کھاتے تھے ۔ اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ موسیٰ پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ فرعون کا نظام حکومت ختم ہو جائے اور ملک کے اندر صرف اللہ کی حاکمیت قائم ہو جائے ۔ رہے وہ لوگ جو جاہلیت جدیدہ کے داعی ہیں تو اللہ تعالیٰ بار بار ان کے رزق پر آفات و بلیات نازل کرتا ہے لیکن وہ اپنی روش سے باز نہیں آتے ۔ اور جب زمیندار اور اہل دیہات اس بات کو محسوس کریں اور اللہ کے سامنے دست بدعا ہوں جس طرح کافروں کے تحت الشعور میں بھی اللہ کی جانب رجوع کا داعیہ ہوتا ہے تو آج کل کے جاہلیت زدہ اور اپنے آپ کو سائنٹیفک کہنے والے لوگ کہتے ہیں کہ یہ خرافات میں یقین رکھنا ہے اور جہالت ہے اور یہ کام اہل جاہلیت جدیدہ لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے کرتے ہیں ۔ میں سمجھتا ہوں ان لوگوں کی یہ حرکت قدیم بت پرستوں سے زیادہ بری ہے ۔

اب اللہ کی سنت کے مطابق قدرتی انجام سامنے آتا ہے ۔ ان لوگوں کو مشکلات میں مبتلا کر کے بھی آزمایا گیا' انہیں فراوانی دے کر بھی آزمایا گیا لیکن وہ باز نہ آئے ۔ اب وہ واقعہ پیش آتا ہے جو یقینی بنا۔ فرعون اور اس کے حاشیہ نشین ہلاک ہوتے ہیں ۔ اب ان کی مہلت ختم ہے اور جس انجام تک انہوں نے پہنچنا تھا' وہ قریب آگیا ہے ۔ اور ضعفاء اور صبر کرنے والوں کے ساتھ اللہ کا جو عہد ہوتا ہے اس کا وقت بھی آپہنچا ہے لہٰذا سرکشوں اور جابروں کو ہلاک کر دیا جاتا ہے ۔

(فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ (۱۳۶) وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا

بٰرَكْنَا فِيهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىٓ اِسْرَآءِيلَ بِمَا صَبَرُوْا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (۱۳۷)) "تب ہم نے ان سے انتقام لیا اور انہیں سمندر میں غرق کر دیا کیوں کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا اور ان سے بے پرواہو گئے تھے ۔ اور ان کی جگہ ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے 'اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا ۔ اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدۂ خیر پورا ہوا کیونکہ انہوں نے صبر سے کام لیا تھا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ برباد کر دیا جو وہ بناتے اور چڑھاتے تھے ۔"

یہاں سیاق کلام میں 'فرعون کی غرق یابی کے واقعہ کو مختصراً بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی وہ تفصیلات نہیں دی گئیں جو دوسرے مقامات میں دی گئی ہیں ۔ اس لئے کہ یہاں مضمون صرف یہ ہے کہ اللہ سرکشوں کو مہلت کے بعد پکڑتا ہے ۔ لہٰذا اس موضوع کو قصوں کی تفصیلات کی ضرورت نہیں تھی اور ایسے موقعے میں محض اشارات زیادہ اثر انگیز ہوتے ہیں اور احساس پر ایسے واقعات کا زیادہ اچھا اثر ہوتا ہے ۔

(فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ) "تب ہم نے ان سے انتقام لیا اور انہیں سمندر میں غرق کر دیا۔" ایک ہی وار میں ان کا کام تمام کر دیا ۔ وہ سرکش ' دست دراز اور متکبر تھے ۔ اللہ نے انہیں سمندر کی تہہ میں ڈال کر یہ دکھایا کہ تم اب پستیوں سے بھی پست ہو ۔ اور یہ تمہارے لئے مناسب جزا ہے ۔

یہ کیوں؟ اس لئے بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ "کیونکہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پرواہ ہو گئے تھے ۔"

اس فیصلہ کن انداز کی مناسبت سے تصویر کا دوسرا رخ بھی اختصار کے ساتھ فیصلہ کن انداز میں دے دیا جاتا ہے ۔ یہ نہیں کہ کوئی دوسرا جابر آ گیا بلکہ مستضعفین نے ملک میں اپنا اقتدار قائم کر دیا یعنی بنی اسرائیل حکمران بن گئے ۔ اس لئے کہ اس وقت وہ اصلاح کے معیار پر پورے اترے تھے ۔ لیکن اس کے بعد جلد ہی وہ بگڑ گئے اور اللہ نے ان پر ذلت اور جلاوطنی مسلط کر دی ۔ بنی اسرائیل کا یہ استخلاف مصر میں نہ تھا کہ وہ فرعون کے تخت پر بیٹھ گئے ' ان کا نظام حکومت شام میں برپا ہوا اور فرعون کی غرقابی کے بعد کئی سال کے بعد ۔ اس وقت حضرت موسیٰ فوت ہو چکے تھے اور بنی اسرائیل تیہ کے صحرا میں چالیس سال خانہ بدوشی کی زندگی بسر کر چکے تھے جیسا کہ قرآن نے دوسرے مقامات پر دیا ہے ۔ یہاں قصے کے بیان میں ان کڑیوں کو حذف کر دیا گیا ہے اور فرعون کی غرقابی کے بعد جلد ہی ' موقعہ و موضوع کی مناسبت سے بنی اسرائیل کے اقتدار کے قیام کا ذکر کر دیا گیا ۔

(وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىٓ اِسْرَآءِيلَ بِمَا صَبَرُوْا وَدَمَّرْنَا مَا

كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُوْنَ (۱۳۷)) "اور ان کی جگہ ہم نے ' ان لوگوں کو جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے ' اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا ' اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدہ خیر پورا ہوا کیونکہ انہوں نے صبر سے کام لیا تھا اور فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ برباد کر دیا جو وہ بناتے اور چڑھاتے تھے ۔"

یعرشون کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تعمیرات کرتے تھے ' اس سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ انگوروں کی بیلیں اپنی چھتوں پر چڑھاتے تھے ۔

ہم انسان صرف زمان و مکان کے حدود کے اندر ہی سوچ سکتے ہیں ۔ اور ہم کہتے ہیں کہ یہ واقعہ فلاں کے بعد یا اس سے پہلے ہوا کیونکہ ہم واقعات کو وقوع اور مرور کے بعد ہی سمجھ سکتے ہیں ۔ ہم کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کا عروج اور ان کا اقتدار فرعون کی غرقابی کے بعد پیش آیا ۔ لیکن اللہ علیم و خبیر ہے اور مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ اس کے سامنے کھلے صفحات میں ہے ۔ علم الٰہی مکان و زمان سے وراء ہے ۔ اس کا عالم مثال بھی بلند ہے اور عالم علم تو اس کے عالم مثال تک بھی ایسا نہیں ہے ۔

اب پردہ گرتا ہے ' ایک طرف ہلاکت و بربادی کے مناظر تھے ' دوسری جانب ضعفاء مسند اقتدار پر براجمان ہو رہے تھے ۔ ایک سرکش اور متکبر اور گردن فراز سمندر میں سرنگوں تھے ۔ ان سے وہ تمام برتریاں 'تعمیرات اور سہولیات حیات چھوٹ گئیں ' تمام باغ و راغ نظروں سے اوجھل ہو گئے ' چشم زدن میں سب کچھ ان کی نظروں میں نابود تھا ' اور اس منظر کشی میں قرآن نے چند الفاظ استعمال کیے اور اسے آڑیو کر دیا ۔

یہ مثال اللہ تعالیٰ مکہ کی ایک قلیل جماعت کے سامنے رکھتے ہیں ۔ اہل شرک ان پر مظالم ڈھا رہے ہیں ' شہر بدر کر رہے ہیں ۔ چنانچہ ان کے لئے شمع امید روشن کی جا رہی ہے ۔ آج دنیا میں جہاں جہاں بھی لوگ اسلامی انقلاب کے لئے کام کر رہے ہیں ان کے لئے یہ شمع امید ہے ۔ آج جو عواقب وہ جھیل رہے اور دار و رسن کو چوم رہے ہیں تو یقیناً اللہ اس دنیا کے مشرق و مغرب کو ان کے اقتدار میں دینے والا ہے کیونکہ انہوں نے صبر کیا ' مگر انعام کے طور پر نہیں آزمائش کے طور پر کہ دیکھا جائے کہ وہ کیا کرتے ہیں؟

---ooo---

# درس نمبر ۸ ایک نظر میں

اس سبق میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کی ایک دوسری کڑی چلتی ہے۔ اب آپ کا معاملہ اپنی قوم بنی اسرائیل سے ہے۔ یہ لوگ اب دشمن سے نجات پا چکے ہیں۔ اللہ نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ اور وہ تمام ترقی اور تعمیرجسے وہ سب کچھ سمجھتے تھے' تباہ و برباد کر دی گئی ہے۔ آج حضرت موسیٰ کو فرعون اور اس کے طاغوتی نظام سے واسطہ نہیں پڑا ہوا' طاغوت کے ساتھ جو معرکہ تھا وہ تو سرہو چکا ہے۔ آج آپ کو ایک نئے محاذ میں لڑنا ہے اور یہ معرکہ نہایت ہی شدید' طویل اور تکلیف دہ ہے۔ آج حضرت موسیٰ کو نفس انسانی کے ساتھ معرکہ درپیش ہے۔ انسانی شخصیت کے اندر جو جاہلیت رچی بسی ہوتی ہے۔ آج اس کے ساتھ معرکہ درپیش ہے۔ آج حضرت موسیٰ اس ذلت اور پستی سے بر سرپیکار ہیں جو بنی اسرائیل کی شخصیت میں' دور غلامی کے اندر تہ بہ تہ بیٹھی ہوئی ہے۔ ان کے مزاج میں کجی آگئی ہے' ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے ہیں اور میدان جنگ میں وہ سخت بزدل نظر آتے ہیں۔ زندگی اور بلند تر زندگی کی راہ میں جو مشکلات ہوتی ہیں ان کے انگیز کرنے میں وہ نہایت کی کمزور ہیں۔ اور وہ شخصی میلانات کے بندے ہو گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ذلت' غلامی اور مظلومیت انسان کی شخصیت کو تباہ کر دیتی ہیں۔ طویل عرصے تک خائف زندگی گزارنا' خفیہ سرگرمیاں' کج فطرتی' اور تشدد اور عذاب سے بچنے کے لئے مخفی رہنا اور رات کے اندھیرے میں کام کرنا ہروقت تشدد اور مصیبت میں ابتلاء کا ڈر ایک ایسا ماحول ہوتا ہے جس سے انسان کی فطرت میں سخت بگاڑ اور عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے۔

بنی اسرائیل ایک طویل عرصے تک سخت ترین تشدد کا شکار رہے تھے۔ طویل عرصے تک ان پر خوف' ڈر' بت پرستی اور فرعونیت کا سایہ رہا۔ فرعون ان کی بچیوں کو زندہ رکھتا اور لڑکوں کو ذبح کر دیتا۔ یہ سنگ دلانہ تشدد کبھی موقوف بھی ہوتا لیکن ذلت غلامی اور توہین آمیز زندگی تو مستقلا ان کی قسمت میں تھی۔

ان کی شخصیت میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا۔ ان کا مزاج غیرمعتدل ہو گیا تھا۔ فطرت میں کجی داخل ہو گئی تھی۔ خیالات بگڑ گئے تھے۔ ان کی نفسیات میں ذلت' بزدلی' کینہ پروری' نفرت رچی بسی تھی۔ جب بھی کوئی انسانی طبقہ اس اس قسم کے مظالم کا شکار ہو تو ان میں ایسی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے ربانی بصیرت عطا کی تھی۔ آپ انسانوں کی نفسیات سے اچھی طرح باخبر تھے۔ انہوں نے اپنے تمام حکام سے کہہ رکھا تھا اور یہ وصیت کر دی تھی "آپ لوگ لوگوں کے چہرے پر مار کر سزا مت دو' اس طرح تم لوگوں کو ذلیل کر دو گے۔" ان کو علم تھا کہ چہرے پر مار کی وجہ سے لوگ ذلیل ہو جاتے ہیں اور اسلام کی تو یہ بنیادی پالیسی ہے کہ رعیت کو ذلیل و خوار نہیں کرنا ہے' کیونکہ اسلامی مملکت میں لوگ باعزت تصور ہوتے ہیں۔ اسلام کی پالیسی اور خواہش یہ ہے کہ لوگ باعزت ہوں۔ اور حکام کو اس بات سے منع کیا گیا کہ وہ لوگوں کو مار مار کر ذلیل

کریں۔ اسلام نے یہ کہا کہ لوگ حکام کے غلام نہیں ہوتے ۔ وہ اللہ کے غلام اور معزز لوگ ہوتے ہیں ۔ وہ تمام غیراللہ سے محترم ہیں۔

فرعونیت کے طاغوتی نظام میں فرعونیوں نے بنی اسرائیل کو مار مار کر ذلیل کر دیا تھا۔بلکہ ان پر جو مظالم ڈھائے گئے ان کے مقابلے میں یہ مار بالکل معمولی بات نظر آتی تھی ۔ بنی اسرائیل کے بعد تمام مصری قوم کو بعد میں آنے والے حکمرانوں نے مار مار کر ذلیل کیا' فرعونی طاغوت کے بعد رومی طاغوت نے مصریوں کو اسی طرح مار مار کر ذلیل کیا۔ ان مصائب سے مصری قوم کو صرف اسلام نے نجات دی ۔جب اسلام آیا تو اس نے مصری قوم کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے نجات دی ۔ عمرو ابن العاص حاکم مصر اور فاتح مصر کے بیٹے نے جب ایک قبطی کی پشت پر ایک کوڑا مار دیا۔ غالباً اس وقت رومیوں کے کوڑوں کے آثار اس کی پشت پر موجود تھے ۔ اس قبطی کو صرف ایک کوڑا مارے جانے پر بہت ہی غصہ آیا اور وہ بھی فاتح مصر اور گورنر کے بیٹے کی طرف سے ۔ اس نے اونٹنی پر سوار ہو کر ایک ماہ تک سفر کیا اور یہ شکایت حضرت عمر ابن خطاب تک پہنچائی ۔ صرف ایک کوڑا مارنے کی شکایت ۔ حالانکہ فتح مصر سے پہلے رومیوں کی جانب سے مارے جانے والے کئی کوڑوں پر وہ صبر کرتا تھا۔ یہ تھا اسلامی انقلاب کا معجزہ ۔جس نے قبطیوں کے اندر بھی انقلاب پیدا کر دیا۔اگرچہ وہ مسلمان نہ ہوں۔ اسلام نے انسانیت کو ذلت و خواری کی جمی ہوئی تہوں کے نیچے سے نکالا اور آزادی دی ۔لوگ اس طرح اٹھے کہ ان کا جسم و روح آزاد ہو گیا اور انہوں نے اپنے آپ سے ذلت کے غبار کو ایک دم جھاڑ دیا۔کسی غیراسلامی نظام نے انسانیت کو اس قدر آزادی نہیں دی تھی ۔

اب حضرت موسیٰ کا واسطہ اس مہم سے تھا کہ انہوں نے اپنی قوم کی شخصیت سے صدیوں کی غلامی کی وجہ سے اور طاغوتی نظام کے تحت ذلت کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے پیدا ہونے والی کمزوریوں کو دور کرنا تھا۔ بنی اسرائیل مصر سے نکل چکے تھے اور انہوں نے سمندر کو عبور کر لیا تھا۔ قرآن کریم کے بیان کردہ قصص میں ان لوگوں کی شخصیات صاف صاف نظر آتی ہیں ۔ یہ غلامی کے گرد و غبار سے اٹی ہوئی ہیں ۔ دوسری جانب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آثار جاہلیت سے مقابلہ ہے ۔حضرت موسیٰ کا مقابلہ اب ان لوگوں کی کٹ حجتی' اخلاقی بے راہ روی' فکر و نظر کی جہالت سے ہے جو ان کی شخصیت میں' اس طویل عرصہ اسیری میں کوٹ کوٹ بھری ہوئی تھیں ۔

اس سلسلے میں ہمیں معلوم ہو گا کہ ان کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے حضرت موسیٰ کس قدر ان تھک مصائب برداشت کر رہے ہیں ۔ ان کو ایسے لوگوں سے واسطہ ہے جن کی فطرت صدیوں تک زمین بوس رہی ہے ۔ ان کی حالت یہ تھی جس طرح غلاظت کا کیڑا غلاظت سے نکلنا پسند نہیں کرتا اور ذلت اور غلاظت کو اپنے لئے معمول سمجھتا ہے ۔

موسیٰ علیہ السلام کی جدوجہد میں ہر صاحب دعوت کے لئے ایک سبق ہے ۔ خصوصاً ایسے صاحب دعوت کے لئے جسے ایسے لوگوں سے واسطہ ہو' جو صدیوں تک ذلت اور غلامی میں رہے ہوں اور جنہوں نے ایسے طاغوتی نظام میں زندگی بسر کی ہو جو ظالم بھی ہو اور متشدد بھی ۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ لوگ یہ بھی جانتے ہوں کہ داعی جس طرف بلا رہا ہے وہ راہ نجات ہے ۔بلکہ وہی راہ نجات ہے لیکن ایک طویل عرصہ عالم ہونے اور مومن ہونے کی وجہ سے ان کے لئے یہ دعوت ایک عادی دعوت بن گئی ہو اور ان کا دین ایک بے روح رسمی دین بن گیا ہو۔

ایسے حالات میں ایک داعی کے کاندھوں پر ذمہ داریوں کا بوجھ دگنا ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایسے داعی کے

لئے صبر کی بھی بڑی مقدار کی ضرورت ہوتی ہے۔ایسے داعی کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کی کج فہمی' ان کی بد اخلاقی' ان کے مزاج کی سہل انگاری اور ان کے اقدام کی سست رفتاری پر صبر کرے۔ ہر مرحلے پر ایسے لوگوں میں شکست اور دوبارہ جاہلیت کی طرف لوٹ جانے کی خواہشات پر نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ صبر کرے۔

قصہ بنی اسرائیل کو امت مسلمہ کے لئے قرآن کریم میں اسی لئے ثبت کر دیا گیا ہے کہ امت مسلمہ کے لئے اس میں بڑی عبرتیں ہیں اور اسی حکمت کے تحت اسے بار بار مختلف پہلوؤں سے لایا گیا ہے۔تاکہ امت مسلمہ اس تجربے سے فائدہ اٹھائے اور حضور اکرم ؐ کے بعد آنے والے تمام داعیوں کے لئے بھی اس قصے میں بڑی مقدار میں زادراہ موجود ہے۔

---OOO---

# درس نمبر ۸ تشریح آیات

## ۱۳۸ --- تا --- ۱۷۱

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓی
اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ
قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا
یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَی
الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَاِذْ اَنْجَیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ
الْعَذَابِ ۚ یُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ ۱۶
مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ﴿۱۴۱﴾ ۱۲ع
۶

”بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر سے گزار دیا‘ پھر وہ چلے اور راستے میں ایک ایسی قوم پر ان کا گزر ہوا جو اپنے چند بتوں کی گرویدہ بنی ہوئی تھی۔ کہنے لگے ”اے موسیٰ ﷺ‘ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا معبود بنا دے جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں۔“ موسیٰ ﷺ نے کہا ”تم لوگ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو۔ یہ لوگ جس طریقہ کی پیروی کر رہے ہیں وہ تو برباد ہونے والا ہے اور جو عمل وہ کر رہے ہیں وہ سراسر باطل ہے۔“ پھر موسیٰ نے کہا ”کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود تمہارے لئے تلاش کروں؟ حالانکہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں دنیا بھر کی قوموں پر فضیلت بخشی ہے۔ اور (اللہ فرماتا ہے) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرعون والوں سے تمہیں نجات دی‘ جن کا حال یہ تھا کہ تمہیں سخت عذاب میں مبتلا رکھتے تھے‘ تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔“

اس قصے کا یہ ساتواں منظر ہے۔ اس میں بنی اسرائیل اس وقت نظر آتے ہیں جب وہ نجات پاکر بحر قلزم سے اس پار چلے

گئے ہیں۔اب ہمیں فرعونی مناظر کے برعکس اس میں بنی اسرائیل کی سرکش ' معصیت کیش اور نہایت ہی کج مزاج شخصیت کا سامنا ہے ۔ اور یہ اخلاقی کمزوریاں ان کے مزاج میں تہ بہ تہ صدیوں کی تاریخ کے دوران جمی ہوئی ہیں ۔ اس پر کوئی طویل عرصہ نہ گزرا تھا کہ اللہ نے انہیں فرعون سے نجات دی تھی جس نے انہیں خوب ذلیل کر کے رکھا ہوا تھا۔ فرعون کی قوم بھی اس کام میں شریک تھی اور یہ نجات انہیں حضرت موسیٰ کی وجہ سے ملی تھی ' حضرت موسیٰ نے یہ تحریک اللہ رب العالمین کے نام سے چلائی تھی ۔ رب العالمین نے ان کے دشمن کو ہلاک کیا اور ان کی نجات کے لئے سمندر کے ٹکڑے کئے اور انہیں اس ذلت آموز زندگی سے نجات دی ۔ وہ تو مصر کی بت پرستی اور سرزمین ظلم سے ابھی رہا ہو کر آئے تھے ۔ لیکن سمندر کو پار کرتے ہی جب وہ ایک ایسی قوم کے پاس سے گزرتے ہیں جس کا ایک بت ہے اور وہ اس کی پوجا کرتی ہے اور ہر شخص اپنے بتوں کی پوجا پاٹ میں مشغول ہے تو وہ جھٹ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ ان کے لئے بھی ایسا ہی بت تجویز کر دیں تاکہ وہ بھی اسی طرح پوجا پاٹ شروع کر دیں حالانکہ حضرت موسیٰ اور فرعون کی کشمکش خالص نظریہ توحید پر مبنی تھی اور اسی نظریہ کے تحت فرعون کی ہلاکت ہوئی تھی اور ان کو نجات ملی تھی ۔

وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّھُمْ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ (۷:۱۳۸) ”بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر سے گزار دیا ' پھر وہ چلے اور راستے میں ایک ایسی قوم پر ان کا گزر ہوا جو اپنے چند بتوں کی گرویدہ بنی ہوئی تھی ۔ کہنے لگے ”اے موسیٰ “ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا معبود بنا دے جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں ۔“

متعدی بیماریاں جس طرح جسم کو آلیتی ہیں اسی طرح روحانی بیماریاں بھی متعدی ہوتی ہیں ' لیکن متعدی بیماریاں تب ہی پھیلتی ہیں جب لوگوں کے اندر ان کے پھیلاؤ کے لئے جراثیم موجود ہوں اور قرآن کریم نے جس طرح بنی اسرائیل کے مزاج کا نہایت ہی سچا 'گہرا اور ہمہ جہت نقشہ کھینچا ہے اس سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ اخلاقی اعتبار سے نہایت ہی بودے 'ضعیف الاعتقاد اور توہم پرست تھے ' وہ گمراہی کو اسی طرح قبول کرتے تھے جس طرح پٹرول کو آگ لگتی ہے ۔ وہ اٹھتے ہی گر جاتے تھے ' چند قدم ہی راہ مستقیم پر چلتے تھے کہ اچانک ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیتے تھے ' اس لئے کہ ان کے کلیجے میں گمراہی کے جراثیم داخل ہو چکے تھے ۔ وہ سچائی سے دور تھے ۔ ان کا احساس مر چکا تھا ' اور ان کا شعور بجھ چکا تھا ۔ اچانک جب وہ ایک بت پرست قوم کو بت پرستی میں مشغول دیکھتے ہیں تو وہ حضرت موسیٰ کی بیس یا تیس سالہ جدوجہد اور اپنی غلامی کی صدیاں بھول جاتے ہیں اور مطالبہ کر دیتے ہیں کہ ان کے لئے بھی بت تجویز کئے جائیں ۔ سابقہ معجزات کو تو چھوڑ دیں ایک طرف ' ابھی ابھی تو وہ سمندر پھٹا اور بڑے بڑے تودوں سے گزر کر آئے ہیں ۔ جس میں ان کی آنکھوں کے سامنے ان کا دشمن ہلاک کیا گیا ۔ فرعون اور اس کا ظالم عملہ سب بت پرست تھے اور وہ بنی اسرائیل کے خلاف فرعون کو اسی بت پرستی کے نام پر ابھارتے تھے ۔ وہ اہل فرعون کی یہ باتیں بھول گئے جو وہ کہتے تھے

اَتَذَرُ مُوْسٰی وَقَوْمَہٗ لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَیَذَرَکَ وَاٰلِھَتَکَ ”کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑ رہا ہے کہ وہ زمین میں فساد کریں اور وہ تمہیں اور تمہارے الہوں کو چھوڑ دیں ۔“ یہ سب کچھ بھول بھلا کر وہ اپنے

نبی اور رسول سے مطالبہ کرتے ہیں کہ جس طرح تمہارے کہنے پر دوسرے معجزات سرزد ہوئے اب اپنے رب سے ہمارے لئے بتوں کی منظوری بھی لے لے تاکہ ہم بھی بت پرستی شروع کر دیں۔ اگر یہ لوگ خود ہی بت پرستی شروع کر دیتے تو پھر بھی کوئی بات تھی مگر انہیں اس قدر حیا نہ آئی نبی اور رب العالمین سے بت پرستی کی اجازت چاہی لیکن یہ بنی اسرائیل ہیں' ان سے سب کچھ متوقع ہے۔

اس مطالبے پر حضرت موسیٰ کو بہت غصہ آتا ہے' جس طرح رب العالمین کے کسی رسول کو اپنے رب کے بارے میں آنا چاہئے۔ اس لیے کہ کوئی بھی رسول عقیدۂ توحید کے بارے میں سخت غیرت مند ہوتا ہے اور اس کے لئے شرک ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ ان کو ایسا جواب دیتے ہیں جو ان کے لئے مناسب ہے۔ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ (۷: ۱۳۸) موسیٰ نے کہا "تم لوگ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو۔" یہاں ان کی جہالت کو مخصوص نہیں کیا گیا' لہٰذا مفہوم یہ ہوا کہ تم غایت درجے کے جاہل ہو' اگر یہ علم کے مقابلے میں استعمال ہو تو مراد بے علمی ہوتی ہے اور اگر یہ لفظ عقل کے مقابلے میں آئے تو مراد حماقت ہوتی ہے یعنی تم غایت درجہ کے احمق اور غایت درجے کے کورے اور بے علم ہو۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ عقیدہ توحید سے جو لوگ منحرف ہوتے ہیں وہ جاہل بھی ہوتے ہیں اور احمق بھی ہوتے ہیں اور یہ کہ علم اور سائنس اور عقلمندی انسان کو عقیدۂ توحید پر پہنچاتی ہے۔ علم اور عقل کبھی بھی عقیدہ توحید کے سوا کسی اور عقیدہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

علم اور عقل تو اس پوری کائنات کا مشاہدہ کر کے یہ شہادت پاتے ہیں کہ اس کا ایک خالق اور مدبر ہے' یہ خالق اور مدبر ہے بھی وحدہ لاشریک۔ اس لئے کہ اس پوری کائنات کے ضوابط و قوانین اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ اس کا مدبر ایک ہے۔ اور جس قدر اس کائنات میں غور و فکر کیا جاتا ہے اور اس کے اندر جستجو کی جاتی ہے یہی بات سامنے آتی ہے کہ ضوابط و آثار کی یک رنگی دلیل ہے وحدت خالق کی۔ اس سے اعراض اور صرف نظر وہی لوگ کر سکتے ہیں جو پرلے درجے کے جاہل ہوں یا احمق ہوں۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو عالم اور سائنس دان کہتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو سمجھاتے ہیں کہ جس بت پرستی میں وہ پڑے ہوئے ہیں وہ نہایت ہی بری چیز ہے اور ان کی جانب سے یہ سراسر غیر معقول مطالبہ ہے' کیا تم ایسے لوگوں کی پیروی کرتے ہو جو خود ہلاک و برباد ہونے والے ہیں؟ اِنَّ هٰؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۷: ۱۳۹) "یہ لوگ جس طریقہ کی پیروی کر رہے ہیں وہ تو برباد ہونے والا ہے اور جو عمل وہ کر رہے ہیں وہ سراسر باطل ہے۔"

یہ شرک و بت پرستی' یہ بتوں کی پوجا پاٹ' یہ بت پرستانہ تہذیب و تمدن جس میں کئی رب ہوں اور ان ارباب کے نیچے پھر مسند نشتیں اور مذہبی لیڈر ہوں اور حاکم اور محکوم ہوں اور وہ بت پرستی سے اپنے حقوق کا تعین کرتے ہوں۔ یہ تمام خرافات اور توہمات زندگی کے فاسد تصور پر مبنی ہیں اور باطل اور بے اصل ہیں۔ اور ان تصورات اور اعمال نے دنیا سے ختم ہونا ہے اور آخرت میں بھی ان کے لئے ہلاکت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام میں اپنے نظریہ حیات اور اپنے رب کے بارے میں غیرت کی وجہ سے مزید جوش آجاتا ہے۔ ان کا لہجہ تیز تر ہو جاتا ہے اور وہ برہمی کے ساتھ ان کو یاد دلاتے ہیں کہ ابھی ابھی سمندر کے کنارے جو کچھ ہوا تم بھول گئے ہو' تم اپنے مرتبہ و مقام کا خیال بھی نہیں رکھتے۔

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۷: ۱۴۰) "پھر موسیٰ نے کہا "کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود تمہارے لئے تلاش کروں؟ حالانکہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں دنیا بھر کی قوموں پر فضیلت بخشی ہے۔"

اس دور میں تمام اقوام پر بنی اسرائیل کی فضیلت واضح ہے کہ تمام مشرک اقوام میں سے بنی اسرائیل کو منصب رسالت دیا گیا۔ اس سے بڑی فضیلت اور اس سے زیادہ احسان اور کیا ہو سکتا ہے۔ رسالت ایک عظیم فضل اور عظیم احسان ہے۔ نیز اس وقت بنی اسرائیل کو اس منصب کے لئے بھی چنا گیا کہ وہ اس زمین پر مقتدر اعلیٰ ہوں گے۔ خصوصاً ارض مقدس کو ان کے ہاتھوں واگزار کرنے کا فیصلہ بھی ہوا کیونکہ اس دور میں ارض مقدس پر غیر قوموں کا قبضہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ ان اعزازات کے بعد وہ کس منہ سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کے لئے کوئی الٰہ تجویز کیا جائے جیسا کہ دوسری اقوام نے اپنے لئے الٰہ تجویز کر رکھے ہیں، جبکہ ان پر اللہ کا بڑا فضل و کرم تھا۔

قرآن کا یہ انداز کلام ہے کہ انبیاء کے کلام کے ساتھ متصلاً اللہ کے کلام کو بھی ذکر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام کی حکایت کے ساتھ متصلاً اللہ کا کلام بھی آجاتا ہے۔

وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (۷: ۱۴۱) "اور (اللہ فرماتا ہے) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرعون والوں سے تمہیں نجات دی، جن کا حال یہ تھا کہ تمہیں سخت عذاب میں مبتلا رکھتے تھے، تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔"

اللہ کے کلام اور اللہ کے نبیوں کے کلام کو یکجا کرنے سے دراصل نبیوں کی تکریم مقصود ہے اور یہ دراصل اعزاز و تکریم کا یہ نہایت ہی بہترین انداز ہے۔

یہ احسان جو بنی اسرائیل پر کئے گئے اور یہاں جتلائے گئے وہ ان کے دل و دماغ میں موجود تھے۔ اور ان کا مشاہدہ تازہ تھا۔ محض ان احسانات کی یاد دہانی ہی اس بات کے لئے کافی تھی کہ وہ سجدہ شکر بجالاتے۔ اللہ تعالیٰ ان کو متوجہ کرتے ہیں کہ یہ عبرت کا مقام ہے اور انسانوں پر مشکلات اور اس کے بعد مشکلات سے نجات سب کچھ انسان کے لئے ایک آزمائش ہے۔ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (۷: ۱۴۱) "اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش ہے۔" اس لئے کہ ان میں سے کوئی واقعہ بھی اتفاقی نہ تھا۔ سب کچھ تقدیر الٰہی کے مطابق تھا اور آزمائش تھی اور آزمائش سے مقصد عبرت آموزی تھی اور مسلمانوں کو تجربات سے دوچار کر کے کھرے اور کھوٹے کو جدا کرنا مطلوب تھا اور یہ مقصد تھا کہ جب ان کو سزا دی جائے تو ان کے لئے گلے شکوے کا کوئی موقعہ نہ رہے، اس وقت جب یہ تمام آزمائشیں ان پر کارگر نہ ہوں۔

اب یہ منظر بھی ختم ہو جاتا ہے، اس سے بڑا دلچسپ دوسرا منظر سامنے آتا ہے۔ یہ آٹھواں منظر ہے۔ اس میں حضرت موسیٰ اور آپ کے رب العالمین کے درمیان ملاقات ہونے والی ہے۔ حضرت موسیٰ اس عظیم تقریب کے لئے بڑا اہتمام کرتے

ہیں۔حضرت ہارون کو وصیت کر کے اپنا قائم مقام بناتے ہیں اور اس کے بعد آپ اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھتے ہیں۔

وَ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰی ثَلٰثِیۡنَ لَیۡلَۃً وَّ اَتۡمَمۡنٰہَا بِعَشۡرٍ فَتَمَّ مِیۡقَاتُ رَبِّہٖۤ اَرۡبَعِیۡنَ لَیۡلَۃً ۚ وَ قَالَ مُوۡسٰی لِاَخِیۡہِ ہٰرُوۡنَ اخۡلُفۡنِیۡ فِیۡ قَوۡمِیۡ وَ اَصۡلِحۡ وَ لَا تَتَّبِعۡ سَبِیۡلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۱۴۲﴾

"ہم نے موسیٰ کو تیس شب و روز کے لئے (کوہ سینا پر) طلب کیا اور بعد میں دس دن کا اور اضافہ کر دیا' اس طرح اس کے رب کی مقرر کردہ مدت پورے چالیس دن ہوگئی۔موسیٰ نے چلتے ہوئے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ "میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرنا اور ٹھیک کام کرتے رہنا اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہ چلنا۔"

حضرت موسیٰ کی مہم کا پہلا مرحلہ اب مکمل ہوگیا ہے' اس مرحلے میں بنی اسرائیل کو ذلت اور زبردستی کی زندگی سے نکال دیا گیا ہے۔اب وہ قوم فرعون کی ایذا رسانیوں اور تشدد کے دائرے سے باہر نکل آتے ہیں۔ذلت اور غلامی کی شہری زندگی کو ترک کر کے اب وہ صحرا کی آزاد فضاؤں میں گھوم رہے ہیں۔اور ارض مقدس کی طرف آگے بڑھ رہے ہیں لیکن ابھی تک وہ ارض مقدس کی بازیابی کی عظیم اور اصلی مہم کے اہل ہی نہیں بنے۔یہ تو نہایت ہی عظیم اور کانٹوں سے پر راہ ہے کہ کوئی کرۂ ارض پر اقتدار کے مناصب حاصل کر کے فریضہ خلافت ارضی کا منصب سنبھال لے۔اس سے قبل کے منظر میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ ان کے دلوں میں بت پرستی اور شرک نے کس طرح گھر کر لیا ہے کہ ایک بت پرست قوم کو دوران سفر دیکھتے ہی اپنے لئے بتوں کا مطالبہ کر دیا۔ان کے اذہان و قلوب سے عقیدہ توحید متزلزل ہوگیا جس کے لئے حضرت موسیٰ کو خاص طور پر رسول بنا کر بھیجا گیا تھا اور اس پر کچھ زیادہ عرصہ بھی نہ گزرا تھا۔لہٰذا اس بات کی ضرورت تھی کہ حضرت موسیٰ کو تفصیلی ہدایات دے کر ان کے پاس واپس بھیجا جائے اور آپ نئی ہدایات کے تحت اس قوم کی تنظیم و تربیت کریں تاکہ وہ ارض مقدس کی آزادی کا عظیم فریضہ ادا کر سکیں۔اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک مقررہ وقت و مقام میں ملاقات کی دعوت دی تاکہ آپ اللہ تعالیٰ سے براہ راست کئی ہدایات لیں۔اور اس ملاقات میں خود حضرت موسیٰ کی بھی مزید تربیت مقصود تھی تاکہ آپ بھی آنے والے مشکل حالات اور مشکل مہمات کے لئے تیار ہو جائیں۔آپ کی تربیت کا کورس تیس دن مقرر ہوا تھا۔اس میں دس دن کا مزید اضافہ کر دیا گیا۔یوں چالیس دن تک یہ سلسلہ چلا۔حضرت موسیٰ نے اس عرصے میں ملاقات الٰہی کے لئے ریاض کیا۔آپ اس دنیا کی دلچسپیوں سے دور ہوگئے۔اور عالم بالا کی طرف قریب ہوگئے' لوگوں سے دوری اور رب العالمین سے قرب حاصل کیا۔آپ کی روح صاف ہوگئی اور آپ کا اندرون روشن ہوگیا اور یوں آپ کو براہ راست رب العالمین کی تربیت میں آنے والے فرائض منصب رسالت کے لئے تیار کر دیا گیا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی روانگی سے قبل اپنے بھائی اور جانشین حضرت ہارون کو ان الفاظ میں وصیت کی۔

وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ

(۷: ۱۴۲) "موسیٰ نے چلتے ہوئے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ "میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرنا اور ٹھیک کام کرتے رہنا اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہ چلنا۔"

حضرت موسیٰ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت ہارون بھی اللہ کی جانب سے نبی مرسل ہیں۔ لیکن ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کو نصیحت کرے بلکہ نصیحت ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر فرض ہے۔ پھر حضرت موسیٰ کو ان بھاری ذمہ داریوں کا اچھی طرح احساس تھا اور آپ اپنی قوم بنی اسرائیل کو بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ حضرت ہارون نے بھی کشادہ دلی سے نصیحت کو سنا اور قبول کیا۔ انہوں نے اس پر برا نہ منایا کیونکہ نصیحت برے لوگوں کو اچھی معلوم نہیں ہوتی کیونکہ یہ لوگ بھلائی سے چھٹکارا چاہنے والے ہوتے ہیں اور ان چھوٹے قد والوں پر بھی نصیحت گراں گزرتی ہے جو اپنے آپ کو بہت ہی بڑی چیز سمجھتے ہیں اور ان کو نصیحت کی جائے تو یہ چھوٹے قد کے لوگ اس میں اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ چھوٹے قد والے متکبر وہ ہوتے ہیں کہ تم ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہو کہ ان کی امداد کرو اور وہ تمہارے ہاتھ کو جھٹک دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے آپ کو بڑا دکھا سکیں۔

یہ تیس راتیں اور پھر ان میں دس دن کی مزید وسعت میں کیا حالات پیش آئے؟ ان کے بارے میں ابن کثیر کہتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے ساتھ تیس راتیں مقرر کی تھیں۔ مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے اس عرصے میں روزے رکھے اور کچھ نہ کھایا۔ اور جب میعاد پوری ہوگئی تو آپ نے درخت کے چھلکے سے مسواک کی۔ اس پر اللہ نے ان کو حکم دیا کہ آپ چالیس دن پورے کریں۔"

---ooo---

اب تو یہ منظر آپ کے سامنے ہے۔ یہ منظر ایک منفرد منظر ہے اور یہ حضرت موسیٰ کا خاصہ ہے۔ اس میں رب ذوالجلال اور رب العالمین براہ راست اپنے بندے سے مخاطب ہیں۔ اس منظر میں ایک ذرہ' ایک محدود ذرہ اور ایک فانی وجود ایک ازلی اور ابدی ذات کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر ایک بندہ اپنے خالق سے براہ راست ہدایت اخذ کرتا ہے جبکہ خالق ابدی و ازلی وراء الوراء ہے اور بندہ زمین پر ہے۔ لیکن اس التقاء کی کیفیت کیا تھی؟ اس کے ادراک سے ہم عاجز ہیں۔ اللہ کے ساتھ ہمکلام ہونے کی کیفیت کیا تھی' اس کے بارے میں ہم نہیں بتا سکتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کن ذرائع ادراک سے یہاں ہدایات اخذ کرتے تھے' کلمات کس طرح تھے؟ یہ سب تصورات ہم بندوں اور محدود قوت کے مالک انسان کے لئے ناقابل تصور ہیں۔ اس لئے کہ ہماری قوت مدرکہ محدود ہے۔ ہمارا سرمایہ ادراک محدود ہے۔ ہمارے تجربے واقعاتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اندر جو لطیف راز اور جو لطیف شعور ودیعت کر رکھا ہے اس کے ذریعے ہم معلوم کرتے ہیں کہ یہ ہمکلامی واقع ہوئی اور ہمیں اس کا یقین ہے اور شعوری یقین ہے لیکن کیفیت کے بارے میں سوال کرتے ہمیں اپنے یقین کو گدلا نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ تعلق' محدود اور لامحدود کا تعلق ہمارے محدود پیمانہ ادراک میں سما نہیں سکتا۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوسٰى لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيٓ
اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ
مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوسٰى
صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٤٣﴾
قَالَ يٰمُوسٰٓى اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ۖ فَخُذْ مَآ
اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٤٤﴾ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ
مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا
بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿١٤٥﴾ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ
يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ
وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ
يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿١٤٦﴾
وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ
١٧
٦ع اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٤٧﴾ ع

''جب وہ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر پہنچا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے التجا کی کہ ''اے رب! مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں۔'' فرمایا ''تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھ' اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا۔'' چنانچہ اس کے رب نے جب پہاڑ پر تجلی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو بولا ''پاک ہے تیری ذات' میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والا میں ہوں۔'' فرمایا ''اے موسیٰ' میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا کہ میری پیغمبری کرے اور مجھ سے ہم کلام ہو۔ پس جو کچھ میں تجھے دوں اسے لے اور شکر بجا لا۔''

اس کے بعد ہم نے موسیٰ ؑ کو ہر شعبہ زندگی کے متعلق نصیحت اور ہر پہلو کے متعلق واضح ہدایت تختیوں پر لکھ کر دے دی اور اس سے کہا ''ان ہدایات کو مضبوط ہاتھوں سے سنبھال اور اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کے بہتر مفہوم کی

پیروی کریں، عنقریب میں تمہیں فاسقوں کے گھر دکھاؤں گا۔ میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں، وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں کبھی اس پر ایمان نہ لائیں گے، اگر سیدھا راستہ ان کے سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں گے، اس لئے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پروائی کرتے رہے۔ ہماری نشانیوں کو جس کسی نے جھٹلایا اور آخرت کی پیشی کا انکار کیا اس کے سارے اعمال ضائع ہو گئے۔ کیا لوگ اس کے سوا کچھ اور جزا پا سکتے ہیں کہ جیسا کریں ویسا بھریں؟"

ہمیں چاہئے کہ اس منفرد منظر کو ہم اپنے خیال، اپنے اعصاب اور اپنے وجود میں پوری طرح مستحضر کر لیں۔ اپنی پوری قوتوں، فہم و ادراک کی پوری قوتوں کو مستحضر کر کے اور اس منظر کے تصورات کے قریب جانے کی کوشش کریں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جس حقیقت کا ادراک کرتے تھے اور اس کا شعور پاتے تھے، اس میں ہم بھی ان کے ساتھ شریک ہو سکیں۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ (۷: ۱۴۳)

"جب وہ ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر پہنچا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے التجا کی کہ "اے رب! مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں۔"

یہ ایک خوفناک منظر ہے۔ حضرت موسیٰ اللہ کی طرف سے کلمات سن رہے ہیں اور ان کو جس بات کا شوق ہے اور جس طرف وہ کھنچے چلے جا رہے ہیں اور ان کی روح جس سمت میں بلند ہو رہی ہے ایسے حالات میں حضرت موسیٰ بھول جاتے ہیں کہ ان کی بساط کیا ہے اور یہ کہ اللہ کی حالت شان کیا ہے، وہ مطالبہ کر دیتے ہیں، ایک ایسے امر کا جو اس کرہ کی بشریت کے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔ اور اگر اسے ممکن بنا دیا جائے تو کسی انسان کی طاقت ہی میں یہ نہیں ہے۔ یعنی آپ رویت ذات باری کا مطالبہ فرماتے ہیں۔ شوق و امید کے ان حالات میں اور محبت و وصال کے اس ماحول میں وہ عالم شہود میں ذات باری کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن جواب میں دو ٹوک بات آتی ہے۔ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ (۷: ۱۴۳) فرمایا "تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔" اور اس کے بعد اللہ کی شفقت سامنے آتی ہے۔ اور آپ کو یہ بات پڑھا دی جاتی ہے کہ لَنْ تَرٰىنِيْ (۷: ۱۴۳) کی وجہ کیا ہے یہ کہ آپ کے اندر اس کی طاقت ہی نہیں ہے۔ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ (۷: ۱۴۳) "ہاں ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھ، اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا۔" اس لئے کہ پہاڑ انسان کے مقابلے میں زیادہ جمنے والا ہے۔ پھر وہ متاثر ہونے والا بھی نہیں ہے اور وہ انسان کے مقابلے میں قبولیت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ لیکن اس کے باوجود جو واقعہ ہوا وہ یہ تھا۔ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا (۷: ۱۴۳) "چنانچہ اس کے رب نے جب پہاڑ پر تجلی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا۔"

سوال یہ ہے کہ یہ تجلی کیسی تھی، ہم اس پر قدرت نہیں رکھتے کہ اس کی کوئی صفت بیان کر سکیں۔ نہ ہم اس کا ادراک کر سکتے ہیں، نہ ہم اس تجلی کو دیکھ سکتے ہیں، ہم اسے صرف اس لطیف روحانی تعلق کے ذریعے دیکھ سکتے ہیں اور یہ روحانی رویت بھی اس وقت ممکن ہے جب انسان کی روح صاف و شفاف ہو جائے اور پوری طرح اپنے اس اصل اور

مصدر کی طرف متوجہ ہو جائے ۔ صرف الفاظ اور بے معنی الفاظ کے ذریعے ہم کسی کیفیت کو قارئین کے اذہان میں منتقل نہیں کر سکتے ۔ لہٰذا ہم کوشش نہیں کرتے کہ ہم اس کو الفاظ کے ذریعے سمجھائیں ۔ نیز اس موضوع پر جو روایات وارد ہیں ان کو بھی ہم ایک طرف رکھتے ہیں ۔ اس لئے کہ ان روایات میں سے کوئی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع نہیں ہے ۔ قرآن کریم نے اس بارے میں کوئی تفصیل نہیں دی ہے ۔

اس تجلی کے آثار کے بارے میں قرآن یہ کہتا ہے کہ وہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور زمین پر ہموار ۔ حضرت موسیٰ انسانی ضعیف کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے ۔ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۷: ۱٤۳) ''جب ہوش آیا تو بولا ''پاک ہے تیری ذات 'میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والا میں ہوں ۔''

جب انہیں ہوش آیا' انہیں معلوم ہوا کہ انسانی قوت ادراک کی حدود کیا ہیں اور انہیں عملاً معلوم ہو گیا کہ انہوں نے یہ سوال کر کے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہے تو اعتراف کیا کہ اے اللہ تیری ذات پاک ہے 'میں توبہ کرتا ہوں' میں نے حد سے تجاوز کیا' میں پہلا مسلمان ہوں اور رسول ہمیشہ پہلا مسلمان ہوا کرتا ہے' وہ اللہ کی عظمت پر سب سے پہلے ایمان لاتا ہے' سب سے پہلے وہ اپنی رسالت اور اپنے اوپر نازل ہونے والے کلام پر ایمان لاتا ہے 'پیغمبروں کو اللہ کا حکم ہوتا ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے ایمان کا اعلان کریں ۔ یہ مضمون قرآن کریم میں کافی مقامات پر آیا ہے ۔

حضرت موسیٰ نے دوسری بار رحمت الٰہیہ کا یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا' اب انہیں خوشخبری مل رہی ہے کہ وہ منتخب روزگار ہیں ۔ آپ میرے کلام اور پیغام کے حامل ہیں ۔ فرعون سے مطالبہ یہ تھا کہ میری قوم کو رہا کر دو' اب آپ نے اپنی قوم میں کام کرنا ہے ۔

قَالَ يٰمُوْسٰى اِنِّيْ اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَ بِكَلَامِيْ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ (۷: ۱٤٤) فرمایا ''اے موسیٰ ؑ میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا کہ میری پیغمبری کرے اور مجھ سے ہم کلام ہو ۔ پس جو کچھ میں تجھے دوں اسے لے اور شکر بجا لا ۔''

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ بتایا ''میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا ہے کہ میری پیغمبری کرے ۔'' اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے زمانے کے سب لوگوں میں سے آپ کو رسول بنانے کے لئے منتخب کیا ۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے بھی رسول گزرے ہیں اور بعد میں بھی ۔ لہٰذا انتخاب اور اصطفاء سے مراد ہے' قرآن کے مطابق اس دور کے لوگوں کے مقابلے میں ہے ۔ رہی صفت ہم کلامی باری تعالیٰ' تو اس صفت میں حضرت موسیٰ منفرد ہیں ۔ وہی یہ بات کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو یہ حکم دیا کہ آپ وہ ہدایات پکڑیں اور شکر ادا کریں تو یہ اللہ کی جانب سے ہدایت اور راہنمائی اور یہ تذکیر ہے کہ اللہ کے ان انعامات کا جواب ایک ہی ہے یعنی شکر ادا کرنا ۔ رسول چونکہ قائد ہوتے ہیں اور قائدین لوگوں کے لئے نمونہ ہوتے ہیں' اس لئے لوگوں کا بھی فرض بن جاتا ہے کہ وہ بھی اللہ کی ہدایات کو لیں اور اس پر اللہ کا شکر ادا کریں ۔ یوں ان پر اللہ کے مزید انعامات نازل ہوں گے' ان کی اصلاح ہو گی اور وہ اللہ سے جڑ کر سرکشی سے بچ جائیں گے ۔

اب چند الفاظ اس رسالت کے مضمون اور طریقہ کار کے بارے میں ہیں کہ یہ رسالت کس طرح دی گئی :

وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۴۵:) اس کے بعد ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو ہر شعبہ زندگی کے متعلق نصیحت اور ہر پہلو کے متعلق واضح ہدایت تختیوں پر لکھ کر دے دی۔"

روایات اور مفسرین کے درمیان ان تختیوں کے بارے میں اختلافات ہیں' بعض نے ان کے بارے میں تفصیلات دی ہیں۔ ان تفصیلات کا بیشتر حصہ ان اسرائیلی روایات پر مشتمل ہے جو اسلامی تفاسیر کے اندر داخل ہو گئی ہیں۔ ان روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات مرفوع نہیں ہے۔ چنانچہ ہم اس آیت کو پڑھ کر آگے جانے سے رک جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان روایات میں جو تفصیلات ہیں ان سے ان الواح کی حقیقت میں نہ اضافہ ہوتا ہے اور نہ کمی۔ یہ تختیاں کیسی تھیں' کس چیز کی بنی ہوئی تھیں۔ ان پر کس انداز کی تحریر درج تھی' اس کے بارے میں ہمارے پاس تفصیلات نہیں ہیں' نہ ان کی کوئی ضرورت ہے' کیونکہ اصل مقصد تو یہ تھا کہ ان تختیوں میں لکھا ہوا کیا ہے اور کیا تھا؟ ان میں وہ تمام تفصیلات تھیں جن کا تعلق حضرت موسیٰ کی رسالت سے تھا۔ مثلاً اللہ کا بیان' اللہ کی شریعت کے احکام' لوگوں کی اصلاح کے لئے مزید ہدایات' امت کے حالات اور جن امور کی وجہ سے ان کے اندر بگاڑ پیدا ہو گیا تھا' یعنی ان کی تاریخ وغیرہ۔

فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا (۱۴۵:) اور اس سے کہا "ان ہدایات کو مضبوط ہاتھوں سے سنبھال اور اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کے بہتر مفہوم کی پیروی کریں۔"

اللہ کی جانب سے اہم حکم یہ تھا کہ آپ نہایت ہی قوت اور عزم سے ان الواح و ہدایات کو لیں اور اپنی قوم کو سختی سے حکم دیں کہ وہ ان ہدایات پر عمل کریں۔ اگرچہ وہ مشکل ہوں اس لئے کہ وہ ان کی اصلاح حال کے لئے نہایت ہی موزوں تھیں اور احسن تھیں۔

حضرت موسیٰ کو اس انداز میں ہدایات لینے کا حکم دینے کے دو مقصد ہیں۔ ایک یہ' بنی اسرائیل نے ایک طویل عرصہ تک غلامی کی زندگی بسر کی تھی' ایک طویل عرصہ تک غلامی کی زندگی بسر کرتے کرتے ان کے اندر اخلاقی بگاڑ پیدا ہو گیا تھا' لہٰذا ان کے ساتھ معاملہ کرتے وقت سختی اور سنجیدگی کی اشد ضرورت تھی' تاکہ وہ ان کے اندر فرائض رسالت اچھی طرح ادا کر سکیں اور پھر فرائض منصب خلافت ادا کر سکیں اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ تمام وہ لوگ جو نظریہ حیات کی اساس پر کام کرتے ہوں ان کو اپنے نظریات پر صحیح طرح جم جانا چاہئے۔

اللہ کے نزدیک عقیدہ بہت ہی اہم ہوتا ہے۔ اس پوری کائنات کے نقطہ نظر سے بھی نظریہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یعنی اس کائنات کے تصرفات اور انسانی تاریخ کے بارے میں انسان کا صاف ستھرا نقطہ نظر ہونا چاہئے۔ اسی طرح اس دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی کے بارے میں انسان کے افکار صاف ہونے ضروری ہیں۔ یوں انسان کی بندگی صرف اللہ وحدہ کی الوہیت کے لئے مخصوص ہو۔ اس کے بعد اس نظریہ پر مبنی ایک ایسا نظام زندگی قائم ہو جو انسانی زندگی کو یکسر تبدیل کر دے اور زندگی کے لئے بالکل ایک نیا انداز مقرر کر دے۔ وہ نظام ایسا نہ ہو جس کے تحت جاہلیت چلتی ہے' جس

میں اللہ کے سوا کسی اور کی الوہیت قائم ہوتی ہو۔ غرض پوری زندگی کا ایک ایسا تفصیلی اور جامع نظام جو اس نظریہ حیات پر مبنی ہو۔ایسے نظام کا قیام ضروری ہے ۔اللہ کے نزدیک واضح عقیدہ اور اس پر مبنی نظام کی بڑی اہمیت ہے ۔اس پوری کائنات کی تخلیق 'اس کے اندر انسان کے وجود اور پھر اس انسان کی تاریخ کے بارے اسلامی نظریہ حیات پر انسان کو بڑی سختی سے جم جانا چاہئے ۔انسان کو اس کے بارے میں سنجیدہ ہونا چاہئے' واضح طور پر وہ اپنے نظریات کا اعلان کرے اور دو ٹوک الفاظ میں کرے ۔اس معاملے میں سہل انگاری سے کام نہ لے ۔ نرمی اختیار نہ کرے 'رخصتیں تلاش نہ کرے ۔ اس لئے کہ یہ بہت ہی اہم اور بنیادی معاملہ ہے ۔اس معاملے کے تقاضے بھی اس قدر مشکل ہیں کہ نرم مزاج' لچک والے اور رخصتیں تلاش کرنے والے لوگ ان کو پورے نہیں کر سکتے ۔

لیکن اسلامی نظریہ حیات پر جمنے اور اسے سختی سے پکڑنے کے معنی یہ بھی نہیں کہ انسان متشدد' پیچیدہ مزاج اور خشک مزاج ہو جائے ۔اس لئے کہ دین اسلام کی یہ نفسیات نہیں ہیں ۔دین صرف یہ تقاضا کرتا ہے کہ دین کے لئے ایک شخص سنجیدہ ہو' بات صاف کرتا ہو' دو ٹوک نظریات رکھتا ہو اور صاف گو ہو ۔یہ باتیں تشدد 'سختی' خشکی اور بد مزاجی سے الگ ہیں ۔نظریات پر جمنے اور بد مزاجی میں بہرحال فرق ہونا چاہئے ۔

حقیقت یہ ہے کہ مصر کی طویل غلامانہ زندگی نے بنی اسرائیل میں ایسی اخلاقی کمزوریاں پیدا کر دی تھیں' جن کے لئے سختی پر مبنی ہدایات ضروری تھیں ۔یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کو جس قدر ہدایات بھی دی گئیں ان میں نہایت ہی سختی پائی جاتی ہے ۔ تاکہ روایتی سہل انگاری' کمزور اخلاقی قوت اور بے راہ روی کا علاج کیا جا سکے اور وہ دین کے معاملے میں درست فکر' صریح آواز اور واضح انداز اختیار کریں۔

وہ تمام اقوام جو ایک طویل عرصے تک غلام رہی ہوں ان کے اندر ایسی ہی اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں ۔غلامی' ذلت' عاجزی' ڈر' طاغوت کی غلامی وغیرہ جن کی وجہ سے ایسے لوگ کج فہم' دھوکہ باز' سہل انگار اور محنت و مشقت سے بھاگنے والے ہوتے ہیں ۔ آج کل ہمارے دور میں جو اقوام بھی غلام رہی ہیں ان کے اندر یہ صفات موجود ہیں کیونکہ غلامی میں لوگوں کے ضمیر بدل جاتے ہیں ۔ایسے لوگ نظریات سے دور بھاگتے ہیں ۔اس لئے کہ یہ نظریات کے تقاضے پورے نہیں کر سکتے ۔جس طرف دنیا چلتی ہے' یہ لوگ اسی طرف چلتے ہیں اور جدھر کی ہوا ہو انسان اس طرف بڑی آسانی کے ساتھ چل سکتا ہے ۔

یہ ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ کو یہ بشارت بھی دیتے ہیں کہ اگر تم نے اپنے نظریہ حیات کو سختی سے تھامے رکھا تو تمہیں زمین کا اقتدار اعلیٰ نصیب ہو گا اور تم فاسقوں کے گھروں کے مالک بن جاؤ گے ۔سَأُورِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ (۱٤٥) "عنقریب میں تمہیں فاسقوں کے گھر دکھاؤں گا۔"

آیات کے اس ٹکڑے کا اقرب مفہوم یہ ہے کہ اس سے مراد ارض مقدس ہے جو اس دور میں بت پرستوں کے قبضے میں تھی ۔یہ حضرت موسیٰ کو بشارت تھی کہ تم اس پر قابض ہو گے ۔اگرچہ حضرت موسیٰ کے عہد میں بنی اسرائیل اس میں داخل نہ ہوئے کیونکہ آپ کے دور میں ابھی تک ان کی اخلاقی تربیت مکمل نہ ہوئی تھی ۔ان کے اخلاق ابھی تک درست نہ تھے کیونکہ وہ جب ارض مقدس کے سامنے آئے تو انہوں نے اپنے نبی سے کہہ دیا "اے موسیٰ! اس میں تو ایک جبار قوم بستی ہے اور ہم اس وقت تک اس میں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ اس سے نکل نہیں جاتے ۔ہاں اگر

وہ نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہوں گے۔"

ان میں ایک دو شخص سچے مومن تھے' انہوں نے اصرار کیا کہ شہر میں داخل ہو جاؤ اور حملہ کر دو' یہ دو شخص دراصل اللہ سے ڈرنے والے تھے۔ اس پر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ جواب دیا "ہم تو اس شہر میں ہرگز داخل نہ ہوں گے جب تک یہ قوم وہاں موجود ہے۔ تم اور تمہارا رب جاؤ' لڑو' ہم یہاں بیٹھے ہیں انتظار میں۔"

ان آیات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کا مزاج کس قدر بگڑا ہوا تھا۔ وہ کس قدر کج رو تھے اور حضرت موسیٰ' ان کی دعوت اور ان کی شریعت کن لوگوں کی اصلاح کے لئے تھی۔ ایسے حالات میں یہ نہایت ہی موزوں ہدایت تھی کہ تورات کی ہدایات کو قوت سے پکڑو اور اپنی قوم سے ان پر سختی سے عمل کراؤ۔

اب اس منظر کے آخر میں اور موسیٰ اور رب موسیٰ کے مکالمے کے اختتام پر ان لوگوں کے انجام کے بارے میں بتایا جاتا ہے جو متکبر ہیں' جو اللہ کے معجزات و ہدایات سے منہ موڑتے ہیں۔ اور بتایا جاتا ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی کیا خصوصیات ہوتی ہیں اور ان لوگوں کی تصویر کشی بڑے واضح رنگ اور قرآن کریم کے انداز تصویر کشی کے عین مطابق۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ (۱۴۶) وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَاۗءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۴۷)

(۷:۱۴۶ - ۱۴۷) "میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں' وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں کبھی اس پر ایمان نہ لائیں گے' اگر سیدھا راستہ ان کے سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں گے' اس لئے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پروائی کرتے رہے۔ ہماری نشانیوں کو جس کسی نے جھٹلایا اور آخرت کی پیشی کا انکار کیا اس کے سارے اعمال ضائع ہو گئے۔ کیا لوگ اس کے سوا کچھ اور جزا پا سکتے ہیں کہ جیسا کریں ویسا بھریں۔"

اللہ تعالیٰ یہاں ان لوگوں کے بارے میں اپنی مشیت کا اعلان فرماتے ہیں جو اس زمین میں بغیر جواز کے تکبر کرتے ہیں اور بڑے بنتے ہیں۔ یہ لوگ کس قسم کے ہوتے ہیں؟ ایسے کہ چاہے جو معجزانہ استدلال ان کے سامنے پیش کیا جائے وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ ان کو کسی اچھے کام کی دعوت دی جائے تو اس پر لبیک نہیں کہتے' اگر وہ برائی کا کوئی کام بھی دیکھیں اس کی طرف لپکیں لہٰذا ایسے لوگوں کا صحیح علاج یہ ہے کہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور ایسے لوگوں پر کام کیا جائے جو مانتے ہیں' یہ تو ماننے والے نہیں' آیات و دلائل جو اس کائنات میں ظاہر و باہر ہیں اور وہ آیات و دلائل جو اللہ کی کتابوں میں ہیں' اس لئے کہ انہوں نے پہلے سے تکذیب کا فیصلہ کر لیا ہے اور اعراض کا فیصلہ کر لیا ہے۔

قرآن کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ لوگ کیسے ہوں گے ان کی حرکات اور ان کی صفات یہ ہیں:

الَّذِیْنَ یَتَكَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ (۷: ۱۴٦) "جو بغیر کسی حق کے زمین پر بڑے بنتے ہیں۔" اس لئے کہ اللہ کے بندوں میں سے کسی بندے کا حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی زمین پر خود بڑا بنے۔ بڑائی تو اللہ کی صفت ہے' اور کبریائی میں اللہ کسی کو شریک نہیں کرتا کیونکہ یہ اللہ کی چادر ہے۔ لہٰذا کوئی انسان جو اس کرۂ ارض پر بڑا بنتا ہے وہ بغیر جواز کے تکبر کرتا ہے اور سب سے بڑا تکبر یہ ہے کہ کوئی اس سرزمین پر قانون سازی کا حق اپنے لئے مخصوص کر لے اور اللہ کے بندوں پر اللہ کے بجائے اپنا اقتدار اعلیٰ استعمال کرے۔ اور لوگوں سے اپنے قوانین پر عمل کرائے۔ اس تکبر اور بڑائی سے تمام دوسری برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ تمام شرارتوں کی بنیاد ہے اور ہر قسم کا فساد اس سے برپا ہوتا ہے اور اس کے بعد دوسری صفات ایسے لوگوں کی یہ آتی ہیں۔

وَاِنْ یَّرَوْا كُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا (اگر سیدھا راستہ سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں۔" ان کی یہ فطرت ہے کہ سیدھے راستے کو دیکھ کر ہی اس سے ایک طرف ہو جاتے ہیں اور ٹیڑھے راستے کو دیکھتے ہی اس پر روانہ ہو جاتے ہیں اور یہ ان کی فطرت کا حصہ ہے۔ اور اس کے خلاف وہ نہیں جا سکتے۔ یہ ہے ان کی صفت۔ قرآن کریم اس انداز میں اس کی تعبیر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اللہ کی مشیت نے ایسے لوگوں کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے اور وہ سزا یہ ہے کہ ہدایت کے دروازے ان کے لئے بند کر دیئے گئے ہمیشہ کے لئے۔

اس قسم کے لوگ ہمیں ہر معاشرے میں ملتے رہتے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ لوگ حق سے اجتناب کرتے ہیں اور باطل کی طرف سخت میلان رکھتے ہیں اور بغیر تدبیر اور بغیر سوچے باطل کی طرف لپکتے ہیں۔ سچائی کا مستقیم راستہ ان کو مشکل اور باطل کا ٹیڑھا راستہ ان کو آسان نظر آتا ہے اور ایسے لوگ اللہ کی آیات و دلائل اور معجزات سے دور بھاگتے ہیں' ان پر غور و فکر نہیں کرتے' ان کے ذرائع فہم و ادراک پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور نہ فطرت اور حق کے اشارات ان پر اثر کرتے ہیں۔

سبحان اللہ' اس عجیب قرآنی ہدایات کی ان جھلکیوں سے اس قسم کے لوگ ممتاز طور پر نظر آتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کو اپنے ماحول اور معاشرے میں دیکھتے ہی ایک قاری کہہ اٹھتا ہے۔ ہاں ہاں اس قسم کے لوگوں کو میں جانتا ہوں۔ فلاں فلاں شخص ان قرآنی کلمات کا مصداق ہے۔

اس قسم کے لوگوں کو ایسی ایسی تباہ کن اور مہلک سزا دے کر اللہ تعالیٰ ان پر کوئی ظلم نہیں کرتا۔ نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ یہ وہ سزا و جزا ہے جس کے وہ لوگ ٹھیک طور پر مستحق ہیں جو آیات الٰہیہ کی تکذیب کرتے ہیں۔ اور ان کے بارے میں غفلت برتتے ہیں اور زمین میں بغیر حق اپنی بڑائی جماتے ہیں۔ ان کی روش یہ ہے کہ ہر اس راستے سے ایک طرف ہو جاتے ہیں جو ہدایت کا راستہ ہو اور ہر اس راستے کی طرف لپکتے ہیں جو گمراہی کا راستہ ہو' ایسے لوگوں کو تو ان کے عمل کی سزا مل رہی ہے اور یہ لوگ اپنے طرز عمل کی وجہ سے ہلاکت کے دروازے تک آپہنچے ہیں۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ (۷: ۱۴٦) "اس لئے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پرواہی کرتے رہے۔" اور یہ کہ

وَ الَّذِينَ كَذَّبُوا ( ۷: ۱٤۷ ) "ہماری نشانیوں کو جس کسی نے جھٹلایا آخرت کی ہستی کا انکار کیا اور اس کے سارے اعمال ضائع ہوگئے 'کیا لوگ اس کے سوا کچھ اور جزا پا سکتے ہیں کہ جیسا کریں ویسا بھریں۔"

حبطت کا لفظ حبوط سے ہے۔کہتے ہیں حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ( ۷: ۱٤۷ ) جب وہ زہریلی گھاس چرے اور اس کا پیٹ پھول جائے اور پھر اس سے گیس نکل جائے 'اس لفظ کو باطل کی قوت کے لئے اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ باطل کے اعمال بظاہر بہت ہی پھلتے پھولتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی حقیقت کچھ نہیں ہوتی جب غبارے سے ہوا نکل جاتی ہے تو پھر کچھ نہیں رہتا۔

یہ تو مناسب سزا ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی اور آخرت کی جوابدہی سے انکار کیا لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے اعمال کس طرح ختم ہو جاتے ہیں اور برباد ہو جاتے ہیں؟

نظریاتی اور اعتقادی لحاظ سے تو ہمارا ایمان ہے کہ ان کے اعمال ضائع ہوں گے 'اگرچہ ظاہری حالات ایسے نظر آئیں کہ ان میں 'ان لوگوں کے اعمال کا یہ انجام متوقع نہ نظر آتا ہو۔لیکن جو کوئی بھی اللہ کی ایات کی تکذیب کرے اور آخرت کی جوابدہی کا یقین نہ رکھے اس کے اعمال آخر کار ضائع اور برباد ہوں گے اور ان کی حیثیت ایسی ہوگی جیسے کہ وہ کچھ نہیں ہیں۔

لیکن نظری پہلو سے بھی یہ بات واضح ہے کہ جو لوگ ان آیات و معجزات کی تکذیب کرتے ہیں جو اس پوری کائنات کے صفحات میں بکھرے پڑے ہیں اور ان کی تائید میں وہ آیات و دلائل بھی موجود ہیں جو اللہ کے پیغمبروں نے پیش کئے 'اور اس کے ساتھ ساتھ یہ لوگ آخرت کی جوابدہی کا بھی انکار کرتے ہیں 'ایسے لوگوں کی روح دراصل مسخ شدہ ہے اور ایسے لوگ اس کائنات کے مزاج اور اس کے قوانین سے سرکش ہیں۔اس کائنات سے ایسے شخص کا کوئی حقیقی رابطہ نہیں ہوتا اور نہ اس قسم کے لوگ اس کی جدوجہد کی راہ سے ہم آہنگ ہیں۔ایسے لوگوں کے اعمال چونکہ کائنات کے رخ 'اس کے مقاصد اور اللہ کے قوانین کے خلاف ہوتے ہیں۔اس لئے یہ اعمال اگرچہ بظاہر خیرہ کن ہوں 'بے حقیقت ہیں۔اگرچہ بظاہر وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہوں 'اس لئے کہ یہ اعمال ان دائمی مضبوط دواعی اور نظریات پر مبنی نہیں ہوتے جو اس پوری کائنات کی بنیاد ہیں۔ان اعمال کا ہدف اور نصب العین وہ نہیں ہوتا جو اس پوری کائنات کا ہدف اور نصب العین ہے۔ان کی مثال اس نہر جیسی ہے جو اپنے سرچشمے سے کٹ گئی ہو اور اس نے جلد یا بدیر لامحالہ خشک ہونا ہے۔

>جو لوگ ان ایمانی اقدار اور انسانی تاریخ کے درمیان گہرے رابطے کا ادراک نہیں کر سکتے اور جو لوگ تقدیر کے اس اٹل فیصلے کو نہیں پا سکتے جو ان لوگوں کے حق میں صادر ہو چکا ہے جو ان ایمانی اقدار کے منکر ہیں 'یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ غافل ہیں۔اور انہی کے بارے میں یہ سزا سنائی گئی ہے کہ وہ اللہ کی سنت جاریہ اور ناموس کلی کو نہ پا سکیں گے۔کیونکہ ان کا رخ پھر گیا ہے اور اب ان کے بارے میں آخری فیصلے کا ظہور باقی ہے۔

جن لوگوں کو اس دنیا کی عمر مختصر نے غرے میں ڈال دیا ہے اور وہ یہ دیکھتے ہیں کہ آخرت سے غافل لوگ بظاہر اس دنیا میں بڑی کامیابی سے زندگی بسر کر رہے ہیں 'ان کو یہ دھوکہ اس سوجن سے ہو گیا جو کسی جانور کو مسموم گھاس کھانے کی وجہ سے لاحق ہو جاتی ہے۔وہ سمجھتے ہیں کہ یہ جانور تازہ اور موٹا ہو گیا ہے اور وہ بہت ہی صحت مند ہے۔حالانکہ درحقیقت وہ مرنے والا ہوتا ہے۔

اس دنیا میں جو اقوام نابود ہو کر مٹ چکی ہیں 'اور ان کی جگہ جو دوسری اقوام آکر آباد ہو گئی ہیں۔وہ ان سابقہ اقوام

سے عبرت نہیں لیتیں۔ وہ اللہ کی اس سنت کو نہیں دیکھ رہی ہیں کہ وہ کس طرح اس کائنات میں کام کرتی ہے۔ اللہ کی یہ تقدیر اور اس کا نظام جاری وساری ہے۔ اس میں کسی وقت بھی ٹھہراؤ نہیں آتا۔ اللہ سب لوگوں پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔

---()()()---

جس دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے دربار میں تھے، یہ ایک منفرد ملاقات تھی اور ہماری محدود آنکھوں کے لئے ظاہر ہے کہ اس منظر کا احاطہ کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ نہ ہماری روح اس منظر کو دیکھ سکتی ہے اور ہماری فکر اور قوت مدرکہ اس کے بارے میں حیران ہے۔ حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی میں ان کی قوم نے گمراہی اختیار کر لی۔ وہ دوبارہ مصری بیماریوں میں مبتلا ہو گئے اور بت پرستی کے گڑھے میں گر گئے۔ انہوں نے ایک بولتے ہوئے بچھڑے کے بت کو اپنا الٰہ بنالیا اور اس کی عبادت شروع کر دی۔

ان حالات میں اب اس قصے کے نویں منظر سے ہم آگے بڑھتے ہیں اور ہمارے سامنے اس کا دسواں منظر آتا ہے۔ نواں منظر بلند عالم بالا میں ہے، جس کے مناظر میں خوشی اور روشنی کا ماحول ہے، محبتوں اور بہار کے مکالمات ہمارے سامنے تھے، لیکن اچانک ایک ایسا منظر نظر آتا ہے کہ لوگ سربلندیوں سے پستیوں میں گرتے ہیں، وہ صحت مندی کے بعد دوبارہ بیمار نظر آتے ہیں۔ واضح سوچ کے بجائے خرافات کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔

---

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِنۢ بَعْدِهِۦ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُۥ خُوَارٌ ۚ أَلَمْ يَرَوْا۟ أَنَّهُۥ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا ۘ ٱتَّخَذُوهُ وَكَانُوا۟ ظَٰلِمِينَ ﴿١٤٨﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِىٓ أَيْدِيهِمْ وَرَأَوْا۟ أَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوا۟ قَالُوا۟ لَئِن لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلْخَٰسِرِينَ ﴿١٤٩﴾

"موسیٰ کے پیچھے اس کی قوم کے لوگوں نے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑے کا پتلا بنایا جس میں بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ کیا انہیں نظر نہ آتا تھا کہ وہ نہ ان سے بولتا ہے نہ کسی معاملہ میں ان کی رہنمائی کرتا ہے؟ مگر پھر بھی انہوں نے اسے معبود بنالیا اور وہ سخت ظالم تھے۔ پھر جب ان کی فریب خوردگی کا طلسم ٹوٹ گیا اور انہوں نے دیکھ لیا کہ درحقیقت وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو کہنے لگے کہ "اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہم سے درگزر نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔"

یہ ہے بنی اسرائیل کا مزاج، وہ قدم قدم پر بے راہ روی اختیار کرتے ہیں۔ وہ ظاہری اور معنوی کسی بھی اعتبار سے بلندی کی طرف نہیں جاتے بلکہ ان کی فطرت میں پستی کی طرف گرنا ہی لکھا ہے۔ جونہی ہدایت و راہنمائی کا سلسلہ منقطع ہوتا ہے وہ غلط راہوں پر چل پڑتے ہیں۔

انہوں نے بحر قلزم کو معجزانہ طور پر پار کرتے ہی دیکھا کہ ایک قوم بت پرستی میں مشغول ہے تو انہوں نے پیغمبر سے مطالبہ کر دیا کہ ہمارے لئے بھی ایسا ہی الٰہ بنا دیا جائے۔ اس پر حضرت موسیٰ نے انہیں روکا اور ان کے اس خیال کو تنی

سے ردکر دیا۔ جب حضرت موسیٰ طور پر گئے اور انہوں نے دیکھا کہ ایک سنہری بچھڑا' آواز نکال رہا ہے اور اس میں زندگی کے آثار بھی نہیں محض ایک جسد ہے' یہ سامری کی مصنوعات میں سے ایک عجیب صنعت تھی۔ یہ شخص سامرہ کا رہنے والا تھا' اس کے بارے میں سورت طہٰ میں تفصیلات درج ہیں۔ اس نے اس بچھڑے کو اس طرح ڈیزائن کیا کہ اس سے بیلوں جیسی آواز نکل رہی تھی۔ جب انہوں نے اسے دیکھا تو ہر طرف سے امنڈ آئے اور جب سامری نے ازروئے شیطنت یہ کہا کہ یہ تمہارے موسیٰ اور تمہارا الہ ہے تو یہ اس پر ٹوٹ پڑے۔

اس نے کہا کہ موسیٰ جس الہ کی ملاقات کے لئے گئے ہیں وہ تو یہ رہا۔ موسیٰ نے مقام اور وقت کے تعین میں غلطی کی ہے۔ انہوں نے خصوصاً اس لئے بھی یقین کر لیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گزار لیا۔ جب حضرت موسیٰ تیس دنوں کے بعد بھی نہ لوٹے تو سامری نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام غلطی کر گئے ہیں الہ تو یہ رہا۔ حالانکہ حضرت موسیٰ نے ان کو ایک ایسے رب کی عبادت کی تعلیم دی تھی جو نظر نہیں آتا تھا' جو رب العالمین تھا۔ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ جسد تو ان میں سے ایک شخص سامری کی صنعت ہے۔ بنی اسرائیل اپنے کردار کا جو نقشہ پیش کر رہے تھے وہ انسانیت کی ایک نہایت ہی بھونڈی تصویر تھی' قرآن کریم اس تصویر پر تعجب کا اظہار کر کے مشرکین مکہ کو یہ تصور دیتا ہے کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ جن بتوں کی تم پوجا کرتے ہو ان کی حالت کیا ہے؟

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا اتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ (۷:۱۴۸)

"کیا انہیں نظر نہ آتا تھا کہ وہ نہ ان سے بولتا ہے نہ کسی معاملہ میں ان کی راہنمائی کرتا ہے؟ مگر پھر بھی انہوں نے اسے معبود بنالیا اور وہ سخت ظالم تھے۔"

اس سے بڑا ظالم کون ہے جو ایک ایسے جسد کی عبادت کرتا ہے جسے خود اس نے بنایا ہو' حالانکہ خود انسانوں کو اور ان کی مصنوعات کو اللہ بناتا ہے' حقیقی خالق اللہ ہے۔

ان میں حضرت ہارون موجود تھے' وہ اس بھونڈی گمراہی سے ان کو نہ روک سکے۔ ان میں بعض عقلاء اور مومنین بھی موجود تھے' لیکن وہ بھی بے عقل عوام کے اس ریلے کے آگے بند نہ باندھ سکے۔ خصوصاً جبکہ وہ سونے کا بنا ہوا تھا۔

آخر میں جب جوش و خروش ختم ہوا اور لوگوں کے حواس بحال ہوئے اور حقیقت سامنے آگئی اور انہوں نے جان لیا کہ وہ تو گمراہ ہو گئے اور انہوں نے کھلے شرک کا ارتکاب کر لیا ہے تو وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۷:۱۴۹)

"پھر جب ان کی فریب خوردگی کا طلسم ٹوٹ گیا اور انہوں نے دیکھ لیا کہ درحقیقت وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو کہنے لگے کہ "اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہم سے درگزر نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔""

سقط فی یدہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کسی کا حیلہ اور تدبیر اس کے سامنے فیل ہو جائے۔ جب بنی اسرائیل نے دیکھا کہ وہ جس گمراہی میں ملوث ہو گئے اب تو وہ اس سے صاف نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا' تو ایسے حالات میں بے بس ہو کر انہوں نے کہا "اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہم سے درگزر نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔"

اس بات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ان میں اصلاح پذیری کا مادہ بہرحال موجود تھا۔ اور ان کے دل

اس قدر سخت نہ ہو گئے تھے جس طرح بعد میں ہوئے کہ قرآن مجید کو کہنا پڑا کہ وہ پتھر بن گئے یا پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔ بہرحال اس وقت جب انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ غلطی پر ہیں اور اللہ کی رحمت اور مغفرت کے سوا ان کے لئے فلاح کا اور کوئی راستہ نہیں ہے تو انہوں نے اس طرح توبہ کی اور اس سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ اس دور میں یہ لوگ قابل اصلاح تھے۔

---o o o---

یہ واقعات اس وقت ہوئے جب حضرت موسیٰ رب ذوالجلال کے دربار میں کھڑے تھے' اور اللہ سے ہمکلام تھے۔ آپ کو معلوم نہ تھا کہ ان کے پیچھے ان کی قوم کیا کر رہی ہے۔ اگر اللہ ان کو بتاتے تو انہیں اس وقت علم ہو جاتا' بہرحال اب حضرت موسیٰ کی واپسی پر گیارہواں منظر سامنے آتا ہے۔

وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا
قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِي مِن بَعْدِي ۖ أَعَجِلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ ۖ وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ
وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ ۚ قَالَ ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي
وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْأَعْدَاءَ وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ
الظَّالِمِينَ ﴿١٥٠﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنتَ ۸
أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿١٥١﴾ ع۴
۸

"ادھر سے موسیٰ غصے اور رنج میں بھرا ہوا اپنی قوم کی طرف پلٹا۔ آتے ہی اس نے کہا "بہت بری جانشینی کی تم لوگوں نے میرے بعد! کیا تم سے اتنا صبر نہ ہوا کہ اپنے رب کے حکم کا انتظار کر لیتے؟" اور تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی (ہارون) کے سر کے بال پکڑ کر اسے کھینچا۔ ہارون نے کہا "اے میری ماں کے بیٹے' ان لوگوں نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالتے۔ پس تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور اس ظالم گروہ کے ساتھ مجھے نہ شامل کر۔" تب موسیٰ نے کہا "اے رب' مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما' تو سب سے بڑھ کر رحیم ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تو ان حالات کو دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے۔ آپ کے اقوال اور آپ کے اقدامات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سخت غصے میں تھے۔ اور آپ کے غصے کا اظہار ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِي مِن بَعْدِي أَعَجِلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ (۷ : ۱۵۰) آتے ہی اس نے کہا "بہت بری جانشینی کی تم لوگوں نے میرے بعد! کیا تم سے اتنا صبر نہ ہوا کہ اپنے رب کے حکم کا انتظار کر لیتے۔" اسی طرح آپ کے اقدامات سے بھی غصہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے بھائی کو داڑھی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔"

وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗ اِلَيْهِ (۷: ۱۵۰) (اور اپنے بھائی کے سر کے بال پکڑ کر اسے کھینچا) حضرت موسیٰ کا یہ غصہ بالکل برحق تھا' اس لئے کہ وہ اچانک ایسی صورت حال سے دوچار ہو گئے تھے جن کی انہیں توقع نہ تھی۔ یہ ایک انقلابی صورت حالات تھی۔ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ (۷: ۱۵۰) "بہت بری جانشینی کی تم لوگوں نے میرے بعد!" میں تمہیں ٹھیک راستے پر چھوڑ کر گیا تھا' تم نے اسے ضلالت سے بدل دیا۔ میں تمہیں اس حال میں چھوڑ کر گیا کہ تم خدا کی عبادت کر رہے تھے اور جب واپس ہوا تو تم بچھڑے کی عبادت کر رہے تھے حالانکہ وہ صرف ایک جسد تھا اور بیل جیسی آواز نکال رہا تھا۔ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ (۷: ۱۵۰) "کیا تم سے اس قدر صبر نہ ہوا کہ اپنے رب کے حکم کا انتظار کر لیتے۔" یعنی تم نے اپنے رب کے فیصلے کا انتظار نہ کیا' اس کے عذاب کا انتظار نہ کیا اور اس نے جس عرصے کے لئے مجمع بلایا تھا اس کا انتظار نہ کیا۔" وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗ اِلَيْهِ (۷: ۱۵۰) "اس نے تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی کے سر کے بال پکڑ کر اسے کھینچا۔" اس اقدام سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سخت مشتعل تھے۔ اس لئے کہ ان تختیوں میں اللہ کا کلام تھا' اور ان کے پاس ادب کا تقاضا یہ تھا کہ آپ ان کو زمین پر نہ پھینکتے لیکن اس وقت آپ سخت غصے میں تھے اور آپ ضبط نہ کر سکے۔ بھائی کو بھی بالوں سے پکڑ کر کھینچا حالانکہ ان کے بھائی عبد صالح اور پیغمبر تھے۔ حضرت ہارون نے برادرانہ جذبات سے اپیل کی تاکہ آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے اور آپ موافقانہ رویہ اختیار کریں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی صفائی پیش کی اور یہ بتایا کہ انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ (۷: ۱۵۰) ہارون نے کہا "اے میری ماں کے بیٹے' ان لوگوں نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالتے۔"

اے میری ماں کے بیٹے کے الفاظ استعمال کر کے حضرت ہارون ان کے جذبہ کی طرف نہایت ہی جوش و خروش سے لپک رہے تھے۔ اور ایسے حالات موجود تھے کہ اگر حضرت ہارون ان کی زیادہ مزاحمت کرتے تو وہ تشدد پر اتر آتے اور اس صورت حال کی تصویر وہ اس طرح کھینچتے ہیں "قریب تھا کہ وہ مجھے مار ڈالتے۔" اس لئے وہ بے قصور تھے۔

فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۷: ۱۵۰) "پس تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور اس ظالم گروہ کے ساتھ مجھے نہ شامل کر۔"

اس دوسرے فقرے سے بھی حضرت ہارون اپنے بھائی کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر دونوں بھائیوں کے مشترکہ دشمن ہوں تو بھائی ایک دوسرے کی پوزیشن کا خیال رکھتے ہیں۔ اور تیسری بات یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ آپ مجھے اور ظالموں کو ایک صف میں کھڑا نہ کریں۔ ظالم وہ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور میں نے تو ان کے ساتھ ظلم میں شرکت نہیں کی۔ میں تو بری الذمہ ہوں۔

اب حضرت موسیٰ کے جذبات ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اور آپ معذرت کو معقول سمجھ لیتے ہیں' اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور مغفرت اور شفقت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (۷: ۱۵۱) تب موسیٰ نے کہا "اے رب' مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما' تو سب سے بڑھ کر رحیم ہے۔"

اب فیصلہ کن بات سامنے آتی ہے اور آخری فیصلہ بہرحال اللہ سبحانہ کے ہاتھ میں ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی بات کو اپنے بندے حضرت موسیٰ کی بات سے متصلاً لاتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کی عزت افزائی کا ایک انداز ہے ۔

---

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿١٥٢﴾ وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٥٣﴾

(جواب میں ارشاد ہوا) "کہ جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا وہ ضرور اپنے رب کے غضب میں گرفتار ہو کر رہیں گے اور دنیا کی زندگی میں ذلیل ہوں گے ۔ جھوٹ گھڑنے والوں کو ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں اور جو لوگ برے عمل کریں پھر توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں تو یقیناً اس توبہ و ایمان کے بعد تیرا رب درگزر اور رحم فرمانے والا ہے ۔"

یہ حکم بھی ہے اور وعدہ بھی ہے ۔ بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کو الٰہ بنایا ۔ عنقریب ان پر غضب آنے والا ہے اور اس دنیا کی زندگی میں وہ ذلت سے رہیں گے ۔ اور یہ اللہ کا ایک دائمی اصول اور اس کی سنت ہے کہ جو لوگ برے کام کرتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں تو اللہ ان کی مغفرت کر دیتا ہے ' اللہ کو چونکہ علم تھا کہ بچھڑے کے پجاری توبہ نہ کریں گے ۔ اس لئے ان کے بارے میں فیصلہ کر دیا گیا کیونکہ اللہ کو علم تھا کہ وہ اپنی روش درست نہ کریں گے اور اس اصول سے استفادہ نہ کریں گے اور تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہی ہوا ۔ بنی اسرائیل ایک کے بعد ایک نافرمانی کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ انہیں بار بار معاف کرتے رہے یہاں تک کہ وہ دائمی غضب کے مستحق ہوئے ۔ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ (۷: ۱۵۲) "جھوٹ گھڑنے والوں کو ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں ۔" قیامت تک جو بھی افتراء باندھیں گے یہ ایک مسلسل سزا ہے جب بھی جرم ہو گا یہی سزا ہو گی ۔ چاہے افتراء بنی اسرائیل کی طرف سے ہو یا غیر بنی اسرائیل کی طرف سے ہو ۔

اللہ کا وعدہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے جن لوگوں نے بچھڑے کو الٰہ بنایا ' ان پر اللہ نے ذلت لکھ دی ہے اور وہ ہمیشہ مغضوب علیہ رہیں گے اور غضب کی شکل یہ ہے کہ قیامت تک ان پر ایسی اقوام کو مسلط کر دیا جائے گا جو ان کو بدترین عذاب دیتی رہیں گی ۔ جب بھی معلوم ہوا کہ یہ لوگ زمین میں سرکشی اختیار کئے ہوئے ہیں اور ان پڑھ اور پسماندہ لوگوں پر برتری حاصل کر رہے ہیں اور جیسا کہ تلمود کی زبان میں ایسے لوگوں کے لئے "گوئم" کا لفظ استعمال ہوا ہے ۔ یہ لوگ اپنی مالی اور پروپیگنڈے کی قوت سے غلط فائدہ لینے لگے یا انہوں نے ایسے نظامہائے حکومت قائم کئے اور ان کے ذریعے سے اپنے منصوبے جاری کرنا شروع کئے یا انہوں نے اللہ کے بندوں کو اپنے گھروں سے نکالنا شروع کر دیا اور ان پر مظالم شروع کر

دیئے اور جب کبھی گمراہ حکومتوں نے ان کے ہمرکاب چلنا شروع کر دیا جیسا کہ آج کے دور میں ان کی یہ پوزیشن بظاہر نظر آتی ہے۔گو یہ تمام امور ان کے خلاف اللہ کے مذکورہ فیصلے کے خلاف یا متضاد نہیں ہیں بلکہ ان لوگوں کے مذکورہ بالا خود اپنے اقدامات کی وجہ یہ دنیا کے لوگوں کے اندر قابل نفرت ہیں اور اس مواد کو جمع کر رہے ہیں جو آخر کار ان کی ہلاکت کا سبب بنے گا۔اہل فلسطین ان کے ان مظالم کا شکار اس لئے ہیں کہ اہل فلسطین کا کوئی دین نہیں ہے 'اور اہل فلسطین صحیح مسلمان نہیں ہیں۔یہ لوگ دین اسلام کے علاوہ بعض دوسرے جھنڈوں کے نیچے لڑتے ہیں 'جمع ہوتے ہیں اور متفرق ہوتے ہیں۔یہ لوگ اسلامی نظریہ حیات کے جھنڈے تلے جمع نہیں ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ناکام و نامراد ہیں اور اسرائیل کی چھوٹی سی جمعیت اگرچہ بظاہر ترقی پذیر نظر آتی ہے 'لیکن یہ حالات دائمانہ رہیں گے۔یہ ایک عارضی دور ہے 'اور اس میں مسلمانوں سے وہ قوت اور وہ اسلحہ گم ہو گیا ہے جو ان کا واحد ہتھیار ہے۔وہ واحد نظام ہے 'واحد جھنڈا ہے 'یعنی اسلامی جھنڈا جس کے تحت انہوں نے ہزار سال تک دنیا پر غلبہ حاصل کیا۔اسی جھنڈے تلے وہ غالب آئے اور اس کے سوا ہمیشہ مغلوب ہوں گے۔اس وقت امت مسلمہ سکڑنے اور غائب ہونے کے دور سے گزر رہی ہے۔اور یہ گمشدگی اس زہر کی وجہ سے ہے جو امت مسلمہ کے اندر عالمی یہودیت اور عالمی صلیبیت نے پھیلائی ہے۔اور یہ عالمی جمہوریت اور صیہونیت اور صلیبیت نے عالم اسلام پر کڑی نظر رکھی ہوئی ہے کہ یہاں کے حالات درست نہ ہوں لیکن یہ حالات ہمیشہ یونہی نہ رہیں گے۔اس گمشدگی کے بعد امت مسلمہ کو نمود اور ظہور ضرور نصیب ہو گا۔آخر کار آنے والے مسلمان اپنے اسلاف کے ہتھیار کو پائیں گے۔کون جانتا ہے کہ کب پوری دنیا ہوش کے ناخن لیتی ہے اور یہودی مظالم کے خلاف اٹھتی ہے تاکہ اللہ کا وعدہ پورا ہو اور وہ دنیا میں دوبارہ ذلت کے اس گڑھے میں جا گریں جو اللہ ان پر لکھ دیا ہے۔اگر پوری انسانیت یہودیوں کے خلاف بیدار نہیں ہوتی تو ہمارا یقین ہے کہ امت مسلمہ ضرور بیدار ہو گی۔

غرض یہ تو ایک وقفہ اور لمحہ فکریہ تھا تاکہ بچھڑے کو الہ بنانے والوں کے انجام پر قدرے غور کر لیا جائے۔اب سابقہ منظر ہی اختتام کو یوں پہنچتا ہے۔

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖ وَفِيْ نُسْخَتِهَا
هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ۝

"پھر جب موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے وہ تختیاں اٹھا لیں جن کی تحریر میں ہدایت اور رحمت تھی ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔"

قرآن کا ذرا انداز تعبیر ملاحظہ ہو گویا غضب اور غصہ ایک شخصی چیز ہے 'جس نے حضرت موسیٰ پر تسلط حاصل کر لیا ہے اور اپنی مرضی سے ان کو چلاتا ہے اور حرکت میں لاتا ہے۔اور جب یہ خاموش ہو گیا اور حضرت موسیٰ کو اس نے آزاد چھوڑ دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اپنے اختیار میں آگئے۔غصے کی وجہ سے جو تختیاں انہوں نے پھینک دی تھیں۔وہ دوبارہ ہاتھ میں لے لیں۔اب بتایا جاتا ہے کہ ان تختیوں میں اللہ کی ہدایات تھیں۔اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرنے والے تھے ان کے لئے یہ رحمت تھیں ان کے دل راہ راست پر آنے کے لئے کھل گئے تھے۔اور انہوں نے اللہ کی

رحمتوں سے دامن بھرلئے تھے ۔ اور ایک گمراہ اور بے راہ شخص سے اور کون بدبخت ہو گا جو اپنے سامنے کوئی راہ نہیں پاتا۔ اور اس روح سے اور کوئی بدبخت نہیں ہے جو ماری ماری پھرتی ہے اور جسے نہ کوئی صحیح راہ نظر آتی اور نہ اسے دولت یقین ملتی ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ اور خدا خوفی ہی وہ صفت ہے جس سے دل کھلتے ہیں اور جس سے غفلت دور ہوتی ہے اور انسان راہ راست پر آتا ہے اور حق کو قبول کرتا ہے ۔ اللہ ان ربوں کا خالق ہے ۔ اور وہی اس حقیقت کا فیصلہ اور اعلان کرنے والا ہے ۔ ظاہر ہے کہ دلوں کا حال رب العالمین سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا ۔

اب یہ قصہ ذرا آگے بڑھتا ہے ۔ ایک نیا منظر اسکرین پر آتا ہے ۔ اس قصے کا یہ بارہواں منظر ہے ۔ اس میں حضرت موسیٰ اپنے منتخب ستر افراد کے ساتھ رواں دواں ہیں ۔

---

وَ اخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا لِّمِیْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّاۤ اَخَذَتْهُمُ
الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِیَّایَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا
فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَ تَهْدِیْ
مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِیُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَیْرُ الْغٰفِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾
وَ اكْتُبْ لَنَا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَیْكَ ؕ قَالَ
عَذَابِیْۤ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا
لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾
اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا
عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ ؗ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰىهُمْ عَنِ
الْمُنْكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ
اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ
۱۹
نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾
ع ۶
۹

---

''اور اس نے اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو منتخب کیا تاکہ وہ (اس کے ساتھ) ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوں۔ جب ان لوگوں کو ایک سخت زلزلے نے آپکڑا تو موسیٰ نے عرض کیا ''اے میرے سرکار' آپ چاہتے تو پہلے ہی ان کو اور مجھے ہلاک کر سکتے تھے۔ کیا آپ اس قصور میں جو ہم میں سے چند نادانوں نے کیا تھا ہم سب کو ہلاک کر دیں گے؟ یہ تو آپ کی ڈالی ہوئی ایک آزمائش تھی جس کے ذریعہ سے آپ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت بخش دیتے ہیں۔ ہمارے سرپرست تو آپ ہی ہیں۔ پس ہمیں معاف کر دیجئے اور ہم پر رحم فرمائیے' آپ سب سے بڑھ کر معاف فرمانے والے ہیں۔ اور ہمارے لئے اس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجئے اور آخرت کی بھی' ہم نے آپ کی طرف رجوع کر لیا۔'' جواب میں ارشاد ہوا ''سزا تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں' مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اور اسے میں ان لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے' زکوۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے۔''

(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر' نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے' بدی سے روکتا ہے' ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے۔ اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے' وہی فلاح پانے والے ہیں۔''

اللہ کے ساتھ تعین وقت کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ شاید یہ وقت اس لئے متعین ہوا تھا کہ اس میں بنی اسرائیل توبہ کریں اور انہوں نے جس کفر اور شرک کا ارتکاب کیا تھا' اس پر اللہ سے معافی چاہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ اس جرم کے عوض بنی اسرائیل کے لئے بطور کفارہ جو سزا مقرر کی گئی تھی وہ یہ تھی کہ وہ خود اپنے لوگوں کو قتل کریں یعنی ان میں سے مطیع فرمان لوگ نافرمانوں کو قتل کریں' انہوں نے ایسا ہی کیا اور یہاں تک وہ قتل کرتے رہے کہ جب تک اللہ نے ان کو معاف کر کے یہ حکم نہیں دے دیا کہ اب بس کرو۔ یہ ستر آدمی ان کے زیرک اور سمجھدار لوگ تھے' یا ان کے نمائندے تھے ''یہ الفاظ کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے ستر آدمیوں کو منتخب کیا کہ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوں'' سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نائب یا نمائندے تھے۔

یہ سوال اپنی جگہ ہے کہ یہ لوگ کون تھے؟ انہیں سخت زلزلے نے آلیا اور یہ بے ہوش ہو گئے جیسا کہ دوسری سورتوں میں ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اللہ کو کھلا دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ ہم آپ پر اترنے والی ہدایات اور الواح کو تسلیم کر لیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا مزاج کیا تھا۔ ان کے منتخب لوگوں کا یہ حال تھا تو دوسرے عام لوگوں کا حال کیسا ہو گا اور اس سے زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ یہ لوگ گئے ہیں توبہ قبول کرانے کے لئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ آپ درخواست فرما رہے ہیں کہ آپ قصور معاف کر دیں اور رحمت فرمائیں۔ آپ عاجزی کر رہے ہیں اور قصور کا اعتراف کر رہے ہیں۔

فَلَمَّآ اَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ قَالَ رَبِّ لَوۡ شِئۡتَ اَهۡلَكۡتَهُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ وَاِيَّايَ اَتُهۡلِكُنَا بِمَا

فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا (۷: ۱۵۵) "جب ان لوگوں کو ایک سخت زلزلے نے آپکڑا تو موسیٰ نے عرض کیا "اے میرے سرکار' آپ چاہتے تو پہلے ہی ان کو اور مجھے ہلاک کر سکتے تھے ۔ کیا آپ اس قصور میں جو ہم میں سے چند نادانوں نے کیا' ہم سب کو ہلاک کر دیں گے؟"

اللہ کی قدرت کے سامنے یہ مکمل تسلیم و رضا کا اظہار ہے کہ پہلے بھی آپ چاہتے تو ہمیں ہلاک کر سکتے تھے ' اور یہ مکمل تسلیم و رضا کا اظہار وہ دعائے مغفرت سے پہلے بطور تمہید کرتے ہیں ۔ دعا یہ ہے کہ اے اللہ آپ کیا ہم میں سے چند نادانوں کی وجہ سے ہم سب کو ہلاک فرمارہے ہیں ۔ استفہام کا صیغہ استعمال کر کے حضرت موسیٰ یہ تاثر دیتے ہیں کہ اے اللہ تیری شان کریمی سے یہ مستبعد ہے کہ تو ایسا کرے ۔ گویا یہ دعا بشکل استفہام ہے ۔

اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ (۷: ۱۵۵) "یہ تو آپ کی ڈالی ہوئی ایک آزمائش تھی جس کے ذریعہ سے آپ جسے چاہتے ہیں 'گمراہی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت بخش دیتے ہیں ۔"

موسیٰ علیہ السلام یہ بتاتے ہیں کہ اس جہاں میں جو کچھ واقعہ ہوتا ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟ یہ کہ جو بھی پیش آئے وہ اللہ کی جانب سے ابتلا ہوتا ہے اور آپ بتاتے ہیں کہ وہ دوسروں کی طرح اللہ کی مشیت سے غافل نہیں ہیں ۔ تمام آزمائشوں کا یہی حال ہوتا ہے ' جو لوگ ان کی حقیقت کو جان لیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے ابتلاء ہے اور ایک امتحان ہے جس سے انہوں نے گزرنا ہے اچھی طرح جانتے ہوئے اور بہانگ دہل ۔ اور جو لوگ ان واقعات کی حقیقت سے غافل ہوتے ہیں ان کے لئے یہ واقعات و مشکلات گمراہی کا سبب بنتے ہیں ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس حقیقت کا اظہار اس مقصد کے لئے کرتے ہیں جو آگے آتا ہے یعنی اللہ کے سامنے یہ درخواست اور دعا کہ وہ اس امتحان میں انہیں کامیاب کرے ۔

اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ (۷: ۱۵۵) "ہمارے سرپرست تو آپ ہی ہیں ۔ پس ہمیں معاف کر دیجئے اور ہم پر رحم فرمایئے ' آپ سب سے بڑھ کر معاف فرمانے والے ہیں ۔"

آپ ہمارے سرپرست ہیں اس لئے ہماری مدد کیجئے ۔ اس آزمائش سے ہم آپ کی مدد اور معاونت کے بغیر کامیابی سے نہیں نکل سکتے ۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں آپ کی مغفرت اور آپ کی رحمت کی بھی ضرورت ہے ۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ (۷: ۱۵۶) "اور ہمارے لئے اس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجئے اور آخرت کی بھی' ہم نے آپ کی طرف رجوع کر لیا ۔"

ہم مکمل طور پر تیری طرف لوٹ گئے ہیں ' تیری رحمت میں پناہ لئے ہوئے ہیں اور تیری جانب سے نصرت کے امیدوار ہیں ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تسلیم و رضا اور حکمت ابتلاء کو سمجھتے ہوئے مغفرت اور رحمت کی درخواست پیش فرمائی اور یہ حتمی اعلان کر دیا کہ ہم اللہ کی پناہ گاہ کی طرف لوٹ گئے ہیں ۔ اس طرح حضرت موسیٰ کی یہ دعا ہر مسلمان کے لئے خضوع و خشوع اور مقام کبریائی کے آداب کے عین مطابق ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بندے کو اپنی

درخواست کس طرح شروع کرنا چاہئے اور کس طرح اس کا اختتام ہونا چاہئے ـ اور اس کے بعد جواب یہ آتا ہے۔ قَالَ عَذَابِیْ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ (۷: ۱۵۶) "جواب میں ارشاد ہوا" سزا تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں' مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے ـ"

یہ اللہ کی بے قید مشیت کی حکمرانی کا اعلان ہے جس نے اس کائنات کے لئے اپنے اختیار سے ایک قانون وضع کیا ہے اور اسے اپنی مرضی سے جاری کیا ہے اور اس نے اپنے اوپر لازم کیا ہے کہ وہ اسے عدل و انصاف کے ساتھ چلائے گا ـ اور سچائی پر وہ چلے گا ـ کیونکہ عدل اللہ کی صفات میں سے اہم صفت ہے اور اللہ کی مشیت نہایت عدل کے ساتھ جاری رہتی ہے ' اس لئے کہ اللہ نے اسی طرح کرنا چاہا ہے ـ لہٰذا عذاب اسی شخص پر آتا ہے جو اللہ کے نزدیک مستحق عذاب ہو' یہی اس کی مشیت کا تقاضا ہے ـ اس کی رحمت نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور رحمت بھی مستحق رحمت کو ملتی ہے ـ یہ بھی اسی کی مشیت ہے 'کسی کو سزا دینے میں یا کسی پر انعامات کی بارش کرنے میں اللہ کی مشیت یونہی بغیر کسی منصوبے اور اتفاقات کے نہیں چلتی ـ اللہ اس سے بہت برتر ہے ـ

اس اصول کے تعین کے بعد اب اللہ تعالیٰ اپنے نبی حضرت موسیٰ کو بعض آنے والے واقعات کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں ـ یہ امت مسلمہ اور آخری امت کے بارے میں ہے جن پر اللہ کی رحمت کی بارش ہوگی ' اس انداز تعبیر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کی رحمت اس پوری کائنات سے وسیع ہے ـ انسان اس کی انتہاؤں کو نہیں پا سکتا ـ اس کی وسعتوں سے اللہ ہی واقف ہے 'کیا ہی عظیم رحمت ہوگی یہ!

فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ (۱۵۶) اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۵۷)

"اور اسے میں ان لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے ' زکوٰۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے ـ"

(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر' نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کریں ـ جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے ـ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے' بدی سے روکتا ہے' ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے ـ لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے ' وہی فلاح پانے والے ہیں ـ"

یہ ایک عظیم خبر تھی' اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ نبی آخر الزمان کے بارے میں بنی اسرائیل کو پہلے ہی اطلاع دے دی گئی تھی۔ اور یہ اطلاع ان کے بڑے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی دی گئی تھی اور نبی آخر الزمان کے عملاً آنے سے بہت ہی پہلے یہ اطلاع کر دی گئی تھی۔ یہ یقینی خبر تھی کہ آپ مبعوث ہوں گے' آپ کی یہ صفات ہوں گی' آپ کی رسالت اس منہاج پہ ہوگی۔ آپ کی امت کی صفات یہ ہوں گی۔ وہ نبی امی ہوگا۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے گا۔ وہ تمام پاک چیزوں کو حلال کرے گا اور تمام ناپاک چیزوں کو حرام قرار دے گا۔ اور بنی اسرائیل پر ان کی معصیتوں کی وجہ سے جو بوجھ ڈال دیئے گئے' انہیں اتار دے گا اور جن پابندیوں میں انہوں نے اپنے آپ کو جکڑ لیا تھا وہ بھی کھول دے گا' بشرطیکہ وہ اس پر ایمان لے آئیں' اس نبی کے متبعین رب سے ڈرنے والے ہوں گے۔ وہ اپنے مالوں سے زکوۃ دیں گے اور اللہ کی آیات پر یقین رکھیں گے۔ اور اس نبی پر جو لوگ ایمان لائیں گے وہ اس کی نہایت درجے کی تعظیم کریں گے' اس کی عزت کریں گے۔ اس کی مدد کریں گے' ہر معاملے میں اس کی تائید کریں گے اور کتاب اللہ کی صورت میں جو نور اس پر نازل ہوگا وہ اس کے تبع ہوں گے اور یہی لوگ فلاح پانے والوں میں سے ہوں گے۔

بنی اسرائیل کو اس بڑے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے' نہایت ہی قبل از وقت اطلاع دے کر اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو بتا دیا تھا کہ اس کا آئندہ کا دین کیا ہوگا' آئندہ اس کا جھنڈا بلند کرنے والے کون لوگ ہوں گے' اس کے متبعین کون ہوں گے اور اس کی رحمت کن لوگوں پر ہوگی' لہٰذا تمام ادیان سماوی کے متبعین کے پاس اب کوئی عذر نہیں ہے کہ وہ اس یقینی اطلاع پر عمل نہ کریں۔

یہ خبر رب العالمین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے بھیجی ہے' اور ایسے اہم وقت میں اس کا اعلان کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ اپنے ستر منتخب لوگوں کے ساتھ اللہ کی ملاقات کے لئے مقررہ وقت پر گئے ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اس نبی کے ساتھ جو سلوک کیا وہ کس قدر گھناؤنا جرم تھا اور یہ کہ اگر وہ ایمان لے آتے تو اس میں خود ان کے لئے بہت سی بھلائیاں تھیں اور مومنین کے ساتھ شامل ہو کر وہ فلاح پاتے۔

علم اور دلیل کے باوجود اس جرم کا ارتکاب ہو رہا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ بنی اسرائیل وہ شرمناک لوگ ہیں جنہوں نے ہمیشہ نبی آخر الزمان اور آپ کے لائے ہوئے دین کی مخالفت کی۔ پہلے یہودی یہ دشمنی کرتے رہے اور ان کے بعد صلیبیوں نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور یہ نہایت ہی مکارانہ لڑائی ہے جس کا اعلان انہوں نے اس نبی اور اس کے دین کے خلاف کر رکھا ہے۔ وہ مسلسل اس جنگ میں مشغول ہیں اور انہوں نے اسے اپنا وطیرہ بنا رکھا ہے۔

جو شخص صرف ان نصوص کا مطالعہ کرے جو قرآن کریم میں اہل کتاب کے بارے میں اور ان کی اسلام دشمنی کے بارے میں آئے ہوئے ہیں جن کا تفصیلی تذکرہ سورہ بقرہ' سورہ آل عمران' سورہ نساء اور سورہ مائدہ میں ہوا ہے اسے معلوم ہو جائے گا کہ ان لوگوں نے اس دین کے خلاف کس قدر ہمہ گیر جنگ کی ہے اور کس قدر بے رحمی اور بے جگری کے ساتھ وہ اس دین کے خلاف لڑتے رہے ہیں۔

اور جو شخص قرآن کے بعد کی تاریخ کو غور سے پڑھے کہ جب مدینہ میں اسلام کے جھنڈے بلند ہوئے' اسلام کی ایک مملکت قائم ہوئی اور تب سے لے کر آج تک جو زمانہ بھی گزرا ہے' اس سے معلوم ہو گا کہ ان لوگوں نے اسلام کو مٹانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے اور وہ ہمیشہ اس بات پر مصر رہے ہیں۔

دور جدید کی عالمی صہیونیت اور صلیبیت نے اسلام کے خلاف وہ کارروائیاں کی ہیں جو کبھی وہ پوری اسلامی تاریخ میں نہ کر سکے تھے۔ اس دور میں انہوں نے ایسی سازشیں کی ہیں کہ اس دین کو سرے سے مٹا دیا جائے۔ ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ اسلام کے خلاف آخری فیصلہ کن معرکہ لڑیں گے۔ اور اس کے لئے وہ تمام وہ تدابیر اختیار کر رہے ہیں جس کا وہ اس سے قبل پوری تاریخ میں تجربہ کر چکے ہیں اور وہ تمام جدید طریقہ ہائے کار بھی اختیار کریں گے جو انہوں نے اب ایجاد کئے ہیں۔

آج بعض سادہ لوح انسان جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں' وہ یہ تجویز کرتے ہیں کہ دنیا کے ملحدین کے خلاف تمام اہل ادیان کو باہم مل کر تعاون کرنا چاہئے' حالانکہ یہ اہل ادیان ہر اس شخص کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہیں جو اپنے آپ کو صرف اسلام کی طرف منسوب کرتا ہے اور اہل اسلام کے خلاف وہ ایسی جنگیں لڑ رہے ہیں جن کے خدوخال صلیبی جنگوں اور اندلس کی تفتیشی عدالتوں جیسے ہیں مثلاً وہ دوسرے ممالک میں استعماری اور نو آبادیاتی نظام قائم کر کے ایسا کریں یا آزاد ممالک کے اندر ایسے حالات پیدا کر کے جن کے ذریعہ اسلامی تصورات کا قلع قمع کرنے کے لئے ہر وقت لگے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ہر قسم کے غیبی تصور کے منکر ہیں' سائنس اور تجربے کے سوا کسی چیز کو نہیں مانتے' ترقی کے نام پر اخلاقی بگاڑ پیدا کرتے ہیں' فقہ اسلامی میں تبدیلیوں کے لئے مستشرقین کی کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں' ربا کو حلال قرار دیتے ہیں اور اس کے علاوہ تمام محرمات کے سلسلے میں عالم اسلام کو غلط راہ پر ڈالنا چاہتے ہیں۔

یہ ایک وحشیانہ جنگ ہے جو یہ لوگ اسلام کے خلاف جاری کئے ہوئے ہیں حالانکہ انہیں اسلام اور نبی اسلام کے بارے میں بہت پہلے خوشخبری دی گئی تھی' لیکن انہوں نے اسے ماننے کے بجائے اسلام اور نبی اسلام کے خلاف یہ عناد اور کینہ شروع کر دیا۔

---ooo---

قبل اس کے کہ سیاق کلام اگلے منظر کی نقاب کشائی کرے' یہاں قدرے وقفہ کیا جاتا ہے اور اس وقفے میں روئے سخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مڑ جاتا ہے کہ آپ پوری انسانیت کو دعوت دیتے رہیں اور یہ اللہ کا وعدہ قدیم ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٨﴾

اے محمد ؐ' ان سے کہو کہ "اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے' اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے' وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے' پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے' اور پیروی اختیار کرو اس کی' امید ہے کہ تم راہ راست پالو گے۔"

یہ آخری رسالت ہے' یہ پوری دنیا کے لئے عام ہے' یہ کسی نوع یا کسی نسل کے ساتھ مخصوص نہیں ہے' اس

رسالت سے پہلے جو رسالتیں گزری ہیں وہ مقامی تھیں یا محدود اور ایک محدود زمانے کے لئے تھیں اور زمانہ وہی تھا جو کسی رسول کے بعد دوسرے رسول کے آنے کے درمیان ہوتا ہے۔ ان رسالتوں کے دور میں انسانیت نے ترقی کی طرف چند ہی قدم رکھے تھے' تاکہ انسانیت رفتہ رفتہ ترقی کرتی چلی جائے اور آخری رسالت تک یہ قافلہ پہنچ جائے۔ ہر رسالت میں شریعت کے بعض احکام کے اندر اضافے و ترمیم کا کام ہوتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ جب آخری رسالت کا دور آیا تو یہ آخری رسالت اپنے اصول اور فروع کے اعتبار سے ایک مکمل رسالت تھی اور یہ ایسی تھی کہ اس کے اصول نئے قوانین کی شکل میں دنیا میں نافذ ہو سکتے تھے اور یہ آخری رسالت ساری دنیا کے لئے آئی۔ اس لئے کہ اس آخری رسالت پر سلسلہ رسل ختم ہو گیا ہے۔ اب اور کوئی رسالت آنے والی نہیں ہے اور یہ بالکل انسانی فطرت کے مطابق ہے جس میں تمام انسان باہم مشترک بھی ہیں۔ اس آخری رسالت کے لئے نبی امی منتخب ہوا تاکہ اس کا پیغام فطری پیغام ہو اور اللہ کی جانب سے جو کچھ آئے وہ پہنچا دے اور اس کا معلم صرف اللہ ہو' اس لئے اس آخری رسالت کے اوپر کسی دنیاوی تعلیم کی چھاپ نہیں ہے' نہ وہ انسانی افکار سے متاثر ہے تاکہ فطری رسالت لوگوں کی فطرت تک پہنچے اور اپیل کرے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (۷:۱۵۸) اے محمد" ان سے کہو "اے انسانو' میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں۔"

یہ آیت مکی سورہ میں ایک مکی آیت ہے۔ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ پوری دنیا کے لئے اپنی رسالت کا اعلان کر دیں' یہ ان اہل کتاب اور مستشرقین کا مسکت جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں' اہل مکہ اور قریش سے آگے وسیع علاقے میں اپنی رسالت کے بارے میں نہ سوچتے تھے۔ یہ کہ قریش سے آگے اہل عرب اور پھر اہل عرب سے آگے اہل کتاب تک اپنی دعوت کو وسعت انہوں نے اس وقت دی اور جزیرۃ العرب سے بھی باہر پوری دنیا تک دعوت پھیلانے کا انہوں نے اس وقت سوچا جبکہ کامیاب حالات نے ان کو اس پر آمادہ کیا۔ یہ حقیقت میں ایک عظیم افتراء ہے اور اسلام کے خلاف ان کی ایک قدیم نظریاتی جنگ ہی کا ایک حصہ ہے۔ اور یہ نظریاتی جنگ وہ ہر وقت جاری رکھے ہوئے ہیں۔

پریشانی کی بات یہ نہیں ہے کہ اہل کتاب اس دین کے خلاف یہ سازشیں کیوں کرتے ہیں اور مستشرقین جو اہل کتاب کے سرخیل ہیں اور اسلام کے خلاف لڑنے والی ایک زبردست قوت ہیں وہ ایسا کیوں کرتے ہیں' پریشانی اور عظیم پریشانی کی بات یہ ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں وہ ان ملمع سازوں سے اپنا دین سیکھتے ہیں اور بڑے فخر سے ان کی شاگردی اختیار کرتے ہیں۔ اور ان لوگوں کو اپنا استاد سمجھتے ہیں۔ وہ ان کے لکھے ہوئے ان خرافات کے حوالے اپنی کتابوں میں دیتے ہیں۔ وہ اسلامی تاریخ بھی ایسے ملمع کاروں سے لیتے ہیں اور اس قسم کے دھوکہ کھائے ہوئے احمق پھر اپنے آپ کو تعلیم یافتہ اور مہذب بھی کہتے ہیں۔

اب ہم دوبارہ آیت کی تشریح کی طرف آتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دینے کے بعد کہ آپ اعلان کر دیں کہ آپ کی رسالت تمام انسانوں کے لئے ہے' یہ بتایا جاتا ہے کہ جس رب کی طرف دعوت دی جا رہی ہے اس کی پہچان کیا ہے؟

اَلَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ (۷:۱۵۸) ”جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے‘ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے‘ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں کے لئے رسول ہیں اور آپ اس رب کے فرستادہ ہیں جو تمام مخلوقات کا رب ہے۔ اور وہ بھی اسی کائنات کا ایک حصہ ہیں۔ اللہ وحدہ الٰہ اور حاکم ہے۔ تمام لوگ اس کے بندے ہیں۔ اور آپ کی بادشاہت اور قدرت کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ آپ واحد پیدا کرنے والے اور زندہ کرنے والے ہیں۔

اللہ تمام کائنات کا مالک ہے‘ وہ تمام موجودات پر حاکم ہے‘ وہ موت و حیات کا مالک ہے۔ لہٰذا وہی اس بات کا مستحق ہے کہ لوگ اس کے دین پر چلیں اور اس کے فرستادے سب کے سب اسی دین کو پھیلانے والے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم لوگوں کو ان کے رب کی شناخت کراتا ہے۔ تاکہ وہ اپنی زندگی کا نظام اس رسول کی اطاعت پر قائم کریں۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۷:۱۵۸) ”پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے‘ اور پیروی اختیار کرو اس کی‘ امید ہے کہ تم راہ راست پالو گے۔“

اس پکار اور دعوت کے اندر نہایت ہی لطیف اشارے ہیں چاہیے کہ ہم ذرا وقفہ کر کے ان پر غور کریں۔

☆ اس پکار اور دعوت میں سب سے پہلا امر یہ ہے کہ اللہ اور رسول اللہ پر ایمان لاؤ اور یہ ایمان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے کلمہ طیبہ میں منضبط کیا گیا ہے۔

☆ اور اس پر ایمان و اقرار کے بغیر اسلام اور ایمان کا تصور بھی ممکن نہیں ہے لیکن یہاں ایمان لانے کی دعوت سے پہلے اللہ کی تعریف کی گئی اور اس کی شناخت دی گئی کہ ایسے اللہ پر ایمان لاؤ۔ یعنی وہ ”جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے اس کے سوا کوئی الٰہ و حاکم نہیں ہے‘ وہ زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔“ لہٰذا یہاں جس خدا پر ایمان کی دعوت دی گئی ہے اس کی صفات پہلے بیان کر دی گئی ہیں۔ اسی طرح جس رسول پر ایمان کی دعوت دی گئی ہے کہ سب لوگ اس کو مانیں اور اطاعت کریں اس کی صفات بھی پہلے بیان کر دی گئیں۔

☆ دوسری بات یہ کہ نبی امی بھی اللہ پر اور اللہ کے کلام پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ بات واضح ہے لیکن اس کے اندر یہ اہم حقیقت بیان کی گئی ہے کہ کسی بھی دعوت سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ داعی کا خود اس پر یقین ہو‘ اس کے دین میں دعوت کا مفہوم واضح ہو‘ اسے اس پر پورا یقین ہو‘ یہی وجہ ہے کہ جس رسول کو تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے وہ ”اللہ پر بھی ایمان لاتا ہے اور اس کے کلمات پر بھی۔“ اور اسی کی طرف وہ لوگوں کو بھی دعوت دیتا ہے۔

☆ پھر یہاں ایمان کے تقاضے بھی دیئے گئے ہیں‘ کہ سب لوگ رسول کی اطاعت بھی کریں اور اس کی لائی ہوئی شریعت کو بھی اپنے ہاں جاری کریں۔ اس کی سنت کو مشعل راہ بنائیں۔ اور اس بات کی نشاندہی یوں کی گئی ہے ”لہٰذا اس کی پیروی اختیار کرو‘ اس کی امید ہے کہ شاید تم راہ راست پالو گے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ اگر لوگ رسول کی اطاعت نہیں کرتے تو ان کی فلاح کی کوئی امید نہیں ہے۔ یہ بات کافی نہیں ہے کہ لوگ دلوں میں ایمان

لے آئیں اور پھر رسول کا اتباع نہ کریں۔ عملی اتباع ہی دراصل اسلام ہے۔

دین اسلام اپنے مزاج اور اپنی ماہیت کی وضاحت ہر موقع و محل میں کرتا ہے۔ اس طرح کہ اسلام مجرد عقیدہ و نظریہ نہیں ہے' نہ اسلام صرف مراسم عبودیت کا نام ہے۔ اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکمل اتباع کا نام ہے' تمام ہدایات جو رسول پہ اترے' تمام شرعی قوانین جو رسول نے وضع کیے ان کا اتباع ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ حکم نہیں دیا کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو' اور نہ صرف یہ حکم دیا ہے کہ اس طرح مراسم عبودیت بجا لاؤ بلکہ اسلام نے ایک مکمل قانون اور نظام دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ جب تک تم پورے نظام شریعت اور اسلامی قانون اور نظام کو اپنی عملی زندگی میں واضح نہ کرو گے اس وقت تک تمہاری فلاح کی کوئی امید نہیں ہے۔

یہ ہے دین اسلام اور اس دین کی کوئی اور تصویر قابل قبول نہیں ہے' صرف اس کی یہی شکل قابل قبول ہے جس میں کہا گیا (واتبعوہ) اس کی اطاعت کرو' شاید کہ تم فلاح پاؤ۔ اگر صرف اعتقادی تصور ہی مطلوب ہوتا تو اللہ صرف یہ بات کہنے پر اکتفا کرتے۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (۷: ۱۵۸)

---OOO---

شدید زلزلے کے بعد کیا واقعات پیش آئے جس میں بنی اسرائیل کے ستر لیڈر ہلاک کر دیئے گئے؟ یہاں صرف یہ بات آتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی اس اچانک موت پر اللہ کے ہاں نہایت ہی عاجزی سے دعا کی' یہ نہیں بتایا کہ ان لوگوں کا کیا بنا لیکن دوسری سورتوں میں یہ قصہ جس طرح لایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی دعاء کی وجہ سے اللہ نے انہیں زندہ کر دیا اور یہ لوگ پکے مومن کی طرح اپنی قوم کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ لوٹے۔

لیکن قصے کی اگلی کڑیاں لانے سے قبل یہاں اس حقیقت کو بیان کر دیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی قوم میں سے کچھ لوگ اچھے بھی تھے' وہ حق کو قبول کرتے تھے۔

---

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

"موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو حق کے مطابق ہدایت کرتا اور حق ہی کے مطابق انصاف کرتا تھا۔"

حضرت موسیٰ کے دور میں ان میں اچھے لوگ بھی تھے۔ ان میں سے ایک طبقہ ایسا تھا جو حق بات کرتا تھا اور انصاف سے کام لیتا تھا۔ اور خود حضور کے دور میں بھی ان میں سے بعض حق پرستوں نے اسلام کو قبول کیا۔ خصوصاً ان لوگوں نے جو اپنے ہاں موجود تورات میں نبی امی کے بارے میں لکھا ہوا پاتے تھے۔ ان کے سرخیل آپ کے صحابی حضرت عبداللہ ابن سلام تھے اور یہ اس وقت کے یہودیوں کا مقابلہ ان پیشن گوئیوں سے کرتے تھے جو نبی آخر الزمان کے بارے میں تورات میں موجود تھیں۔ نیز ان کے ہاں جو شریعت کے نصوص تھے وہ بھی اسلامی نظام قانون کے ساتھ ہم رنگ تھے۔

اب اس اہم ضمنی بات کے بعد اصل قصے کا مضمون یوں آگے بڑھتا ہے۔

وَ قَطَّعۡنٰهُمُ اثۡنَتَیۡ عَشۡرَةَ اَسۡبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اِذِ اسۡتَسۡقٰىهُ قَوۡمُهٗۤ اَنِ اضۡرِبۡ بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ ۚ فَانۡۢبَجَسَتۡ مِنۡهُ اثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَیۡنًا ؕ قَدۡ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَهُمۡ ؕ وَ ظَلَّلۡنَا عَلَیۡهِمُ الۡغَمَامَ وَ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡهِمُ الۡمَنَّ وَ السَّلۡوٰی ؕ كُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ ؕ وَ مَا ظَلَمُوۡنَا وَ لٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۱۶۰﴾

”اور ہم نے اس قوم کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے انہیں مستقل گروہوں کی شکل دے دی تھی ۔ اور جب موسیٰ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے اس کو اشارہ کیا کہ فلاں چٹان پر اپنی لاٹھی مارو ۔ چنانچہ اس چٹان سے یکایک بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر گروہ نے اپنے پانی لینے کی جگہ متعین کر لی ۔ ہم نے ان پر بادل کا سایہ کیا اور ان پر من و سلویٰ اتارا ۔ ”کھاؤ وہ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو بخشی ہیں ۔“ مگر اس کے بعد انہوں نے جو کچھ کیا تو ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ آپ اپنے اوپر ظلم کرتے رہے ۔“

یہ اللہ کی خاص مہربانی تھی جس کا سایہ حضرت موسیٰ پر قائم و دائم رہا ۔ انہوں نے بچھڑے کی عبادت کر کے کفر کیا اور اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر کے غلطی معاف کروائی ۔ انہوں نے اللہ کو دیکھنے کا مطالبہ کیا اور زلزلے کی وجہ سے ان کی جان نکل گئی ۔ اور حضرت موسیٰ کی آہ و زاری کے بعد دوبارہ ان کو زندگی ملی ۔ اسی طرح ان کو ۱۲ گروہوں میں ان کی شاخوں کے اعتبار سے تقسیم کیا گیا ۔ ان کے ۱۲ گروہ تھے اور ہر گروہ حضرت یعقوب کے پوتوں میں سے کسی ایک کی شاخ تھا ۔ ان لوگوں نے قبائل کی طرح اپنے سلسلہ انساب کو اچھی طرح محفوظ کر رکھا تھا ۔

وَقَطَّعۡنٰهُمُ اثۡنَتَیۡ عَشۡرَةَ اَسۡبَاطًا اُمَمًا ”اور ہم نے اس قوم کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے انہیں مستقل گروہوں کی شکل دے دی تھی ۔“

معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ان بارہ فرقوں میں محض انتظامی اعتبار سے پانی کی تقسیم کے لئے بانٹا گیا تاکہ وہ ایک دوسرے کے حقوق پر دست درازی نہ کریں ۔

وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰی اِذِ اسۡتَسۡقٰىهُ قَوۡمُهٗۤ اَنِ اضۡرِبۡ بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ فَانۡۢبَجَسَتۡ مِنۡهُ اثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَیۡنًا قَدۡ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَهُمۡ (۷ : ۱۶۰) ”اور جب موسیٰ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے اس کو اشارہ کیا کہ فلاں چٹان پر اپنی لاٹھی مارو ۔ چنانچہ اس چٹان سے یکایک بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور

ہر گروہ نے اپنے پانی لینے کی جگہ متعین کر لی۔"

ان پر بادلوں کا سایہ اس لئے کیا گیا کہ صحرا کےاندر بے پناہ تپش تھی - من ایک قسم کا بری شہد ہے اور سلوی ایک چڑیہ پرندہ ہوتا ہے - اس طرح پانی فراہم کرنے کے بعد ان کے لئے زندگی کی تمام ضروریات فراہم ہو گئیں۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْآ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۷: ۱۶۰) "ہم نے ان پر بادل کا سایہ کیا اور ان پر من و سلویٰ اتارا۔۔ "کھاؤ وہ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو بخشی ہیں۔" مگر اس کے بعد انہوں نے جو کچھ کیا تو ہم پر ظلم نہیں کیا 'بلکہ آپ اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔"

یہاں ان کو حکم دیا گیا کہ تمام طیبات کو کھاؤ 'معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ان پر ' ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے بعض طیبات کو حرام نہ کیا گیا تھا۔

ان کے ساتھ یہ تمام مراعات بالکل واضح ہیں لیکن یہ لوگ بہرحال بدفطرت تھے اور ہر وقت معصیت اور نافرمانی کے لئے تیار رہتے تھے۔ اور اس آیت کے آخری حصے وَمَا ظَلَمُوْنَا (۷: ۱۶۰) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام انعامات و اکرامات ' ان کے لئے معجزانہ انداز میں چشمے نکالنے اور حضرت موسیٰ کے عصا مارنے کے نتیجے میں ۱۲ چشمے ابل پڑنے ' اور تپتے ہوئے صحرا میں ان پر بادلوں کے سائے اور پھر صحرا میں ان کے لئے اس قدر قابل فخر غذا فراہم کرنے کے باوجود انہوں نے "آپ اپنے اوپر ظلم کیا" یعنی وہ کفر و ظلم کر کے خود اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے اور خود اپنے آپ کو سزا و عذاب کا مستحق ٹھہرا رہے تھے۔

عنقریب سیاق کلام میں ان کے ظلم کے کچھ نمونے آئیں گے۔ مثلاً اللہ کے احکام کی نافرمانی کرنا' ان سے پہلوتہی کرنا' یہ سب کام وہ اپنے خلاف کرتے تھے 'اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے ' اللہ تو غنی بادشاہ ہے۔ اگر تمام مخلوقات اس کی نافرمانی کرے تو اس کی بادشاہت میں کچھ کمی نہیں آتی۔ اور اگر تمام مخلوقات مطیع فرمان ہو جائے تو اللہ کی بادشاہت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ معصیتوں کا ارتکاب کر کے دراصل وہ اپنا ہی گھاٹا کرتے ہیں - دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

---ooo---

اب ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ بنی اسرائیل اللہ کے انعامات و اکرامات کے جواب میں کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اور ان کے کج رو قدم کس طرح کی روش اختیار کرتے ہیں۔

وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ۭ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ

۳۰
ع۵ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ۝۱۶۲
۱۰

"یاد کرو وہ وقت جب ان سے کہا گیا کہ "اس بستی میں جاکر بس جاؤ اور اس کی پیداوار سے اپنے حسب منشا روزی حاصل کرو اور حِطَّةٌ حِطَّةٌ کہتے جاؤ اور شہر کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو 'ہم تمہاری خطائیں معاف کریں گے اور نیک رویہ رکھنے والوں کو مزید فضل سے نوازیں گے ـ"مگر جو لوگ ان میں سے ظالم تھے انہوں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی 'بدل ڈالا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کے ظلم کی پاداش میں ان پر آسمان سے عذاب بھیج دیا ـ

انہوں نے بچھڑے کی عبادت کی اور اللہ نے انہیں معاف کر دیا ـ انہوں نے اللہ کو دیکھنا چاہا اور زلزلے سے جان ہی چلی گئی ـ پھر اللہ نے انہیں معاف کر کے دوبارہ زندہ کیا ـ اللہ نے ان پر بہت بڑے انعامات کئے ـ لیکن دیکھئے ان کی کج رو طبیعت صراط مستقیم کی راہ پر جانے کے لئے تیار نہیں ہے ـ بغیر جواز کے انہوں نے نافرمانی شروع کر دی ـ بات کو بدلنے کی جسارت کی ـ انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ اس شہر میں داخل ہو جاؤ 'یہ شہر تمہارا ہے 'یہ کون سا شہر تھا 'اس کا یہاں نام نہیں لیا گیا 'کیونکہ سیاق کلام میں اس کی ضرورت نہیں ہے ـ شرط صرف یہ عائد کی گئی کہ اس شہر میں داخل ہوتے وقت ایک مخصوص دعا مخصوص کلمات کی صورت میں پڑھتے جاؤ 'اور اس شہر میں داخل ہوتے وقت سجدہ ریز ہوتے جاؤ اور تمہیں جو فتح و نصرت عطا ہوئی اس پر شکر ادا کرو 'بعینہ اسی طرح جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تھے اور آپ اپنی سواری کے اوپر سجدہ ریز تھے ـ ان لوگوں سے اللہ وعدہ کر رہے تھے کہ اگر تم اس حالت میں اس شہر میں داخل ہوگے تو اللہ تمہاری تمام غلطیاں معاف کر دے گا اور اگر تم میں سے کوئی مزید نیکی کا راستہ اختیار کرے گا تو اللہ مزید بارش کرے گا اپنے انعامات کی ـ لیکن ان لوگوں کی حالت یہ تھی کہ ان میں بعض نے گستاخانہ انداز میں دعا کے الفاظ ہی بدل دیئے اور بعض نے داخلے کے لئے مقرر شکل بدل دی ـ انہوں نے یہ نافرمانی کیوں کی؟ الفاظ بدلنے یا سجدہ ریز نہ ہونے سے انہیں کیا فائدہ مل رہا تھا؟ محض سرکشی اور کج مزاجی کی تسکین !

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ (۷ : ۱۶۲) "مگر جو لوگ ان میں سے ظالم تھے انہوں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی 'بدل ڈالا ـ

لہٰذا اب ان پر عالم بالا کی طرف سے عذاب آتا ہے 'وہ اللہ جو ان پر من و سلویٰ اتار رہا تھا 'اور ان پر اس کے بھیجے ہوئے بادل سایہ فگن تھے 'اب ان پر عذاب نازل فرما رہا ہے ـ

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ (۷ : ۱۶۲) "اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کے ظلم کی پاداش میں ان پر آسمان سے عذاب بھیج دیا ـ"

اس طرح ان میں جنہوں نے ظلم کیا یعنی کفر کیا انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا 'کیونکہ وہ عذاب الٰہی کے مستحق ٹھہرے ـ اس بار قرآن مجید نے اس عذاب کی تصریح نہیں کی جو انہیں دیا گیا ـ کیونکہ عذاب کے تعین کے بغیر ہی اس قصے کی غرض و غایت پوری ہو جاتی ہے ـ قصے سے اصل غرض و غایت یہ بتانا ہے کہ اللہ کی معصیت کرنے والے عذاب کے مستحق ہوتے ہیں اور اللہ کا ڈراوا حقیقت بن جاتا ہے اور کوئی نافرمان اللہ کے انصاف سے بچ کر نہیں نکل سکتا ـ

اب پھر بنی اسرائیل معصیت اور سرکشی کا شکار ہو جاتے ہیں۔اس بار وہ کھلے بندوں احکام الٰہی کی خلاف ورزی نہیں کر رہے بلکہ تاویل سے کام لے رہے اور احکام سے گلو خلاصی کر رہے ہیں۔جب ان کو آزمایا جاتا ہے تو صبر نہیں کرتے کیونکہ ابتلاء اور مشکلات پر وہ لوگ صبر کرتے ہیں جن کی طبیعت سنجیدہ ہو اور جو ذاتی خواہشات اور ہر قسم کی لالچ کے مقابلے میں ضبط رکھتے ہوں۔

وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ
فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ
لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ
مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ
قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا
بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْۗءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ
بَـِٔيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ
كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ
الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ښ وَ
اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾

"اور ذرا ان سے اس بستی کا حال بھی پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھی۔انہیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں کے لوگ سبت (ہفتہ) کے دن احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سبت ہی کے دن ابھر ابھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں۔یہ اس لئے ہوتا تھا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے۔اور انہیں یہ بھی یاد دلاؤ کہ جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا تھا کہ "تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت سزا دینے والا ہے۔" تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ "ہم یہ سب کچھ تمہارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کے لئے کرتے ہیں اور اس امید پر کرتے ہیں کہ شاید یہ لوگ اس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں۔" آخر کار جب وہ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جو انہیں یاد کرائی گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے' اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا۔پھر جب وہ پوری سرکشی کے ساتھ وہی کام کئے چلے گئے جس سے انہیں روکا گیا تھا'

تو ہم نے کہا بندر ہو جاؤ' ذلیل اور خوار۔

اور یاد کرو جب کہ تمہارے رب نے اعلان کر دیا کہ "وہ قیامت تک برابر ایسے لوگ بنی اسرائیل پر مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے۔" یقیناً تمہارا رب سزا دینے میں تیز دست ہے اور یقیناً وہ درگزر اور رحم سے بھی کام لینے والا ہے۔"

یہاں قرآن نے بنی اسرائیل کے احوال ماضی کے بیان کو چھوڑ کر' اب ان بنی اسرائیل کے بارے میں بیان شروع کیا ہے' جو سابقہ بنی اسرائیل کی اولاد تھے اور حضور ؐ کے دور میں موجود تھے۔ یہ لوگ مدینہ میں بھی تھے۔ یہ آیات تا آیت وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ (۷: ۱۷۱) تک مدنی آیات ہیں۔ یہ مدینہ میں یہودیوں کے ساتھ مکالمے کے طور پر نازل ہوئیں اور انہیں مضمون کے اعتبار سے اس مکی سورت میں رکھ دیا گیا تاکہ بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کا مضمون مکمل ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ رسول اللہ کو حکم دیتے ہیں کہ وہ ان سے اس واقعہ کے بارے میں دریافت کریں جو ان کے ہاں بہت ہی مشہور و معروف ہے اور ان کی تاریخ میں درج ہے۔ قرآن کریم اگلے اور پچھلے بنی اسرائیل کو ایک ہی امت سمجھتا ہے۔ ان کو وہ جرائم بھی یاد دلاتا ہے جو مختلف ادوار میں ان سے سرزد ہوئے اور اس کے بدلے میں اللہ نے انہیں بندر بنا دیا اور ان پر مسخ جیسا عذاب نازل ہوا۔ ان پر ذلت اور اللہ کا غضب مسلط ہو گئے۔ ہاں ان سب عذابوں سے وہ لوگ بہرحال محفوظ رہے ہوں گے جنہوں نے نبی آخر الزمان کی مطابقت اختیار کی اور اس کی وجہ سے ان کے کاندھوں سے بوجھ اتر گئے اور جو بیڑیاں انہیں لگی ہوئی تھیں' وہ کھل گئیں۔

سمندر کے کنارے والی بستی کون سی تھی۔ قرآن نے اس کا نام نہیں لیا کیونکہ نام لینے کی ضرورت ہی نہ تھی اور گاؤں کا نام مخاطبین کے ذہنوں میں تھا۔ اس واقعہ کے کردار بنی اسرائیل کے سرکردہ لوگ تھے اور یہ کسی ساحلی شہر میں آباد تھے۔ بنی اسرائیل نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہفتے میں ان کے لئے ایک چھٹی کا دن مقرر کیا جائے جو آرام اور عبادت کا دن ہو۔ اور اس میں ان کے لئے معاشی سرگرمیاں منع ہوں۔ ہفتے کا دن ان کے لئے ایسا دن مقرر کیا گیا۔ اب اللہ نے اس دن کے بارے میں انہیں آزمائش میں ڈال کر یہ سمجھانا چاہا کہ وہ زندگی کی دلکشیوں اور لالچوں سے کس طرح چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ اور بنی اسرائیل کے لئے یہ ضروری بھی تھا اس لئے کہ وہ ایک طویل عرصے تک غلامی کی زندگی بسر کرتے رہے تھے اور غلاموں کے ضمیر بدل جاتے ہیں اور ان کے اندر اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ذلت اور غلامی سے بدنی نجات کے بعد یہ ضروری ہے کہ انسان ذہناً اور اخلاقاً بھی غلامی سے نجات پا جائے تاکہ وہ صحیح اور صالح زندگی بسر کر سکے۔ خصوصاً وہ لوگ جو داعی کے مقام پر فائز ہوں۔ ان کے لئے تو ایسی اخلاقی تربیت فرض عین ہے۔ پھر خصوصاً ان لوگوں کے لئے جن کے ذمے خلافت فی الارض کی ذمہ داری بھی ہے اور وہ مناصب حکمرانی پر فائز ہوں۔ ارادے کی پختگی اور نفس پر ضبط کے معاملے میں پہلی آزمائش آدم و حوا کی ہوئی اور ان سے لغزش ہو گئی اور انہوں نے شیطان کے ورغلانے کی وجہ سے شجرۂ خلد کو چکھ لیا اور یہ لالچ کیا کہ ان کی حکمرانی دائمی ہو جائے اور ان کے بعد بھی ہر وہ جماعت جسے اللہ نے منصب خلافت فی الارض عطا کیا اسے آزمایا گیا۔ مختلف اقوام کو مختلف انداز اور مختلف حالات میں ضرور آزمایا گیا۔

لیکن اس آزمائش میں بنی اسرائیل پورے نہ اترے۔ اس لئے کہ وہ اس سے قبل بار بار وعدہ خلافی کر چکے تھے اور بار بار انہوں نے سرکشی اختیار کی تھی۔ آزمائش یوں ہوئی کہ ہفتے کے روز مچھلیاں ساحل کے قریب آ جاتیں' ان کا

شکار سہل ہو جاتا' لیکن وہ یہ مچھلیاں اس لئے نہ پکڑ سکتے تھے کہ ہفتے کو شکار کرنا حرام تھا۔ اور اس حرمت میں خود ان کی خواہش شامل تھی۔ جب ہفتہ نہ ہوتا اور وہ شکار کے لئے نکلتے تو مچھلیاں قریب نہ ہوتیں جیسا کہ ہفتے کو وہ دیکھا کرتے تھے۔ یہ وہ بات تھی جسے حضور اکرم ؐ کے ذریعے اللہ انہیں یاد دلانا چاہتے ہیں کہ ذرا یاد کریں کہ انہوں نے اس حرمت کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (۷:۱۶۳) "اور ذرا ان سے اس بستی کا حال بھی پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھی۔ انہیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں کے لوگ سبت (ہفتہ) کے دن احکام الہیٰ کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سبت ہی کے دن ابھر ابھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں۔ یہ اس لئے ہوتا تھا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے۔"

سوال یہ ہے کہ مچھلیوں کا یہ واقعہ کیسے پیش آگیا' تو اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ یہ خارق عادت اور ایک غیر معمولی واقعہ تھا کہ مچھلیاں ساحل کے قریب بڑی تعداد میں دوڑتی پھرتیں اور اگر کوئی پکڑتا تو بسہولت پکڑ سکتا۔ آج کل بعض لوگ خود اللہ کے جاری کئے ہوئے قوانین کو کونیہ کو قوانین طبعیہ کا نام دے کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے خلاف کوئی بات نہیں ہو سکتی تو یہ ان کا مجرد دعویٰ ہے۔ اسلامی تصور حیات کے مطابق بات ایسی نہیں ہے۔ اللہ جل شانہ نے خود اس کائنات کو بنایا ہے اور اس کے اندر جو طبعی قوانین جاری کئے ہیں وہ اس نے یہاں ودیعت کئے ہیں۔ یہ اللہ کی مشیت ہے۔ اللہ کی یہ مشیت خود اپنے بنائے ہوئے قوانین کی پابند نہیں ہے کہ وہ صرف اپنے بنائے ہوئے قوانین کے خلاف نہ جا سکتی ہو۔ ان قوانین کے بعد بھی مشیت الہیہ آزاد ہے۔ جن لوگوں کو اللہ نے حقیقی علم دیا ہے وہ اس نکتے سے غافل نہیں ہوتے۔ اگر اللہ کی حکمت اور مشیت کا تقاضا یہ تھا کہ انسانوں کی بھلائی اس میں ہے کہ یہ قوانین فطرت درست طور پر کام کرتے رہیں تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اللہ کی مشیت ان قوانین کے ہاتھ میں قید ہو گئی۔ جس وقت بھی اللہ کی مشیت یہ چاہے کہ کوئی واقعہ ان قوانین کے خلاف وقوع پذیر ہو جائے تو ایسا ہو سکتا ہے۔ خصوصاً ان قوانین کے مطابق جو جزئی واقعہ بھی ہوتا ہے۔ (اگر کوئی پتا بھی گرتا ہے) تو وہ اللہ کے نظام تقدیر کے مطابق واقع ہوتا ہے۔ یوں نہیں ہے کہ یہ اسباب و مسببات اب مشیت الہیہ سے آزاد ہو گئے ہیں۔ ہم کہتے ہیں نظام قوانین طبعی بھی مشیت کا پابند ہے لہٰذا جو جزئی واقعہ قوانین طبعیہ کے مطابق ہوتا ہے یا خلاف یہ اللہ کے علم و قدر کے مطابق ہوتا ہے۔ لہٰذا مطابق عادت واقعہ اور خارق عادت واقعہ اصل میں دونوں ایک ہیں۔ اس نظام کائنات میں خود کاری نہیں ہے جیسا کہ بعض سطح میں لوگوں کو نظر آتا ہے۔ بعض فلاسفہ نے اب اس بات کو سمجھنا شروع کر دیا ہے (دیکھئے فی ظلال القرآن ج ۷' ص ۵۲۰/ ۶۲۲)

بہرحال بنی اسرائیل کی ایک ساحلی آبادی پر یہ واقعہ پیش آیا۔ چنانچہ اس آزمائش میں بعض لوگ گر جاتے ہیں۔ ان کے عزائم شکست کھا جاتے ہیں۔ وہ اپنے رب کے ساتھ کئے ہوئے اپنے پختہ عہد کو بھول جاتے ہیں' یہ حیلہ سازی

شروع کر دیتے ہیں اور حیلے بہانے یہودیوں کا پرانا طریقہ ہے۔ جب دلوں میں کجی آ جائے اور خدا خوفی ختم ہو جائے تو انسان حیلے بہانے ہی تلاش کرتا ہے۔ پھر لوگ نصوص کی عبارات کے ساتھ کھیلتے ہیں اور مقصد اور معانی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی قانون کی حفاظت اس کے دفعات و عبارات کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔ قانون اور ضابطے کی پابندی دلوں کے ساتھ ہوتی ہے اور دل تب قانون کی پابندی کرتے جب ان کے اندر تقویٰ اور خشیت ہو۔ ایک متقی اور خدا سے ڈرنے والا دل ہی قانون کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اور جب کوئی قوم دل و جان سے کسی قانون کی حفاظت کرنا چاہے تو اس کے بارے میں لوگ حیلے بہانے نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر کسی قانون کی حفاظت صرف حکومتی ذرائع سے مغلوب ہو، محض خوف سزا سے پابندی کرائی جائے تو اس طرح کبھی نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی حکومت ہر فرد پر ایک نگراں مقرر کر دے۔ اور وہ نگراں تنہائی اور مجمع دونوں میں پوری پوری نگرانی کر سکتا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ وہ تمام قانونی اسکیمیں فیل ہو جاتی ہیں جن کی قوت نافذہ لوگوں کا دلی تقویٰ اور دلی میلان نہ ہو اور اسی طرح وہ تمام نظامہائے زندگی ناکام رہتے ہیں جو بعض انسانوں نے دوسرے انسانوں کے لئے بنائے ہیں اور جس میں قوت نافذہ خوف خدا پر مبنی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام ادارے ناکام ہو جاتے ہیں جن کے ذمے قوانین کا نفاذ ہوتا ہے۔ پھر ان اداروں پر نگران ادارے بھی ناکام ہو جاتے ہیں (کرپشن میں ترقی ہوتی ہے اور انٹی کرپشن ادارہ کرپٹ ہوتا ہے) اور ان کا کام اول سے آخر تک سطحی ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اس گاؤں کے باسیوں نے اس قانون کی خلاف ورزی کے سلسلے میں حیلہ سازیاں شروع کر دیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہفتے کے دن مچھلیوں کو گھیرنے کے لئے بند باندھ دیتے اور جب ہفتے کا دن نہ ہوتا تو یہ لوگ جلدی سے آکر مچھلیاں پکڑ لیتے۔ اب دل کو تسلی یوں دیتے کہ انہوں نے ہفتے کے دن بہرحال مچھلیوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مچھلیاں بہرحال بندوں کے اندر پانی میں ہوتیں۔ اور ان میں سے اچھے لوگوں کا ایک گروہ سامنے آیا۔ اس نے ان لوگوں پر تنقید کی جو یہ حیلہ سازی کرتے تھے' یہ لوگ انہیں تلقین کرتے تھے 'خدا سے ڈرو اور ایسا نہ کرو' اور ایک تیسرا گروہ ایسے نیک لوگوں کا بھی سامنے آگیا جو کہتا کہ یہ تنقید کرنے والے لوگ بے فائدہ کام کر رہے ہیں کیونکہ یہ لوگ جس کام میں پڑ گئے ہیں ان کے لئے نصیحت و تنقید سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اللہ نے ان کو سزا دینا اور ہلاک کرنا لکھ دیا ہے۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (۷: ۱۶۴) "اور انہیں یہ بھی یاد دلاؤ کہ جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا تھا کہ "تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت سزا دینے والا ہے۔" تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ "ہم یہ سب کچھ تمہارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کے لئے کرتے ہیں اور اس امید پر کرتے ہیں کہ شاید یہ لوگ اس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں۔"

ان لوگوں کے خیال کے مطابق ان حیلہ سازوں کو وعظ و نصیحت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ اس کا فائدہ ہے۔ کیونکہ اللہ نے ان کے لئے ہلاکت و بربادی کا فیصلہ کر لیا ہے اس لئے کہ انہوں نے احکام الہیٰ کو مذاق بنایا ہے۔

لیکن منع کرنے والے گروہ نے جواب دیا کہ یہ ان پر ایک فریضہ ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور لوگوں کو

انجام بد سے ڈرانا پیغمبروں کا فریضہ ہے اور اگر ہم نہ ادا کریں تو ہم قیامت میں معقول عذر پیش نہ کر سکیں گے ۔ ایک تو یہ ہو گا کہ اللہ کے ہاں ہم سرخرو ہوں گے ۔ دوسرے یہ امکان بھی ہے کہ شاید یہ لوگ راہ راست پر آجائیں اور ان کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہو جائے ۔

یوں اس ساحلی بستی کے لوگ تین گروہوں میں بٹ گئے یا تین جماعتیں بن گئیں ۔ اسلامی تصورات کے مطابق امت ''لوگوں کا وہ مجموعہ ہے جو ایک نظریہ رکھتا ہو' جس کی سوچ ایک جیسی ہو' جس کی قیادت ایک ہو۔'' امت سے مراد وہ قدیم جاہلی دور کی امت نہیں ہے اور نہ جدید جاہلی تصورات کے مطابق امت ہے ' جاہلی تصورات کے مطابق امت ''لوگوں کا وہ مجموعہ ہے ' جو کسی ایک علاقے میں رہتا ہو' اور اس پر ایک حکومت ہو۔'' یہ مفہوم امت کا اسلامی مفہوم نہیں ہے ۔ یہ قدیم یا جدید جاہلیت کی اصطلاح ہے ۔

امت کا لفظ عربی لغت میں محض آبادی یا لوگوں کے ایک گروہ کے لئے بھی آتا ہے ۔ مثلاً (وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ) ''جب وہ مدین کے پانی کے پاس آئے تو انہوں نے لوگوں کے ایک گروہ کو پانی پلاتے ہوئے پایا۔'' اور امت بمعنی قیادت اور امامت کے معنی میں بھی مستعمل ہے ۔ (اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم ایک علیحدہ امت تھے یعنی قائد تھے ۔ لیکن یہ لغوی مفہوم اس لفظ کے اصطلاحی مفہوم کے متضاد نہیں ہیں ''یعنی لوگوں کا وہ مجموعہ جس کا عقیدہ ایک ہو اور تصور ایک ہو۔''

غرض اس گاؤں کے لوگ تین جماعتوں میں بٹ گئے ' ایک جماعت سرکشی اختیار کرنے والی ' دوسری جماعت اس کا راہ روکنے والی جو اصلاح اور نصیحت کا فریضہ انجام دے رہی تھی ' تیسری جماعت غیر جانبدار تھی ' وہ نہ تو سرکشوں کا ساتھ دیتی تھی اور نہ ہی امر بالمعروف کرنے والوں کا ساتھ دیتی تھی ۔ خیالات و سرگرمیوں کے ان تین طریقوں کو یہاں تین امتوں سے تعبیر کیا گیا۔

جب نصیحت اور وعظ سے ان کو کوئی فائدہ نہ ہوا اور گمراہی کی راہ پر چلنے والے چلتے ہی رہے تو ان پر اللہ کا عذاب آنا ہی ٹھہرا ۔ اور اللہ نے جو ڈراوا ان تک پہنچایا تھا اس کا وقت آپہنچا۔ صرف وہ لوگ نجات پانے والوں میں شامل رہے جو يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْءِ (۷: ۱۶۵) برائیوں سے روکنے والے تھے ۔ اور جو سرکش تھے ان کو عذاب نے آلیا۔ تفصیلات آگے آ رہی ہیں ۔ رہی وہ تیسری جماعت جو غیر جانبدار تھی اس کے بارے میں قرآن نے کچھ نہیں کہا ۔ شاید ان غیر جانبداروں کو اس لئے یہاں نسیاً منسیاً کر دیا کہ ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے اور یہ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ ان کا یہاں ذکر کیا جائے ۔ اس لئے کہ انہوں نے مثبت رویہ اختیار نہ کیا۔ محض منفی انکار کا کمزور موقف اختیار کیا ۔ لہذا اللہ نے بھی ان کا تذکرہ نہ کیا ۔ اگرچہ وہ سزا سے بچ گئے ہوں ۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَـِٔيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (۱۶۵) فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ (۱۶۶) ''آخر کار جب وہ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جو انہیں یاد کرائی

گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے ' اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا۔ پھر جب وہ پوری سرکشی کے ساتھ وہی کام کئے چلے گئے جس سے انہیں روکا گیا تھا' تو ہم نے کہا بندر ہو جاؤ ذلیل اور خوار۔"

ان لوگوں کو یہ سخت سزا اس لئے دی گئی تھی کہ یہ لوگ معصیت اور نافرمانی میں ڈوب گئے تھے اور قرآن نے اسے کفر سے تعبیر کیا ہے۔ کبھی اسے ظلم کہا گیا' کبھی فسق کہا گیا اور قرآن کریم میں بارہا یہ انداز اختیار کیا جاتا ہے کہ کفر اور شرک کو ظلم اور فسق سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ انداز تعبیر اس فقہی اور قانونی انداز تعبیر سے مختلف ہے جو ازمنہ مابعد میں اختیار کیا گیا۔ لہٰذا قرآنی انداز تعبیر اس فقہی اصطلاح کا پابند نہیں ہے کیونکہ اصطلاحات کا تعین بعد میں ہوا اور یہ شدید عذاب کیا تھا؟ یہ کہ آدمیوں کی شکل کو بندروں کی شکل میں بدل دیا گیا' کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو مرتبہ انسانیت سے گرا دیا تھا' اس لئے کہ انسانیت کی مخصوص ترین خصوصیت یعنی قوت ارادی کا انسانی خواہشات پر غالب رہنا انہوں نے ترک کر دیا تھا اور وہ حیوانات کی طرح خواہشات کے پابند ہو گئے تھے ' لہٰذا ان سے کہا گیا کہ اچھا تو پھر حیوان ہی بن جاؤ' کیونکہ یہی وہ مقام ہے جو تم نے اپنے لئے پسند کیا ہے۔ یہ کہ وہ کس طرح بندر بن گئے ' ان کی شکل کس طرح بدل گئی۔ کیا وہ بذات خود بدل کر بندر بن گئے یا ان سے بندر پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ اس سلسلے میں تفاسیر میں متعدد روایات ہیں اور اس نکتے کے بارے میں قرآن خاموش ہے ' اور اس سلسلے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کوئی روایت منقول نہیں ہے۔ لہٰذا ہم اس معاملے میں زیادہ گہرائی میں نہیں جاتے۔

انسان کی تخلیق بھی لفظ (کن) سے ہوئی تھی اور اس کی خلق میں تبدیلی بھی لفظ كُونُوا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ (۷: ۱٦٦) سے ہوئی یعنی "ذلیل و خوار بندر بن جاؤ" چنانچہ وہ ذلیل و خوار بندر بن گئے' کیونکہ اللہ کے حکم کے مقابلے میں کوئی حکم نہیں۔ اور نہ اسے کوئی رد کر سکتا ہے۔

اس سزا کے بعد' سب پر اللہ تعالیٰ نے ابدی لعنت کا حکم فرمایا اور صرف ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا جو نبی آخر الزمان پر ایمان لائیں گے ' اس لئے کہ وہ ایک عرصے تک یہی نافرمانیاں کرتے رہے اور اب ان کا زمانہ معصیت ختم ہو گیا اور مشیت الٰہیہ نے ان کے حق میں یہ دائمی حکم صادر کر دیا جو اٹل ہے۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ښ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۷: ۱٦۷) "اور یاد کرو جب کہ تمہارے رب نے اعلان کر دیا کہ "وہ قیامت تک برابر ایسے لوگ بنی اسرائیل پر مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بد ترین عذاب دیں گے۔" یقیناً تمہارا رب سزا دینے میں تیز دست ہے اور یقیناً وہ درگذر اور رحم سے بھی کام لینے والا ہے۔"

یہ ایک دائمی اعلان (Standing Order) ہے اور جب سے یہ صادر ہوا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ وقفے وقفے سے یہودیوں کی سرکوبی کے لئے کسی نہ کسی طاقت کو بھیجتا رہا ہے۔ اور عمومی اعتبار سے یہ حکم آئندہ بھی روبعمل ہوتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ان پر ایسی قوتوں کو مسلط کرتے رہیں گے۔ اور یہ قوتیں ان کو ایسا ہی عذاب دیتی رہیں گی۔ جب بھی وہ پھلیں پھولیں گے اور سرکشی کا رویہ اختیار کریں گے۔ اللہ ان پر ایسی ہی قوتوں کو بھیجتے رہیں گے۔ اور وہ ان پر

اچھی ضرب لگاتے رہیں گے کیونکہ یہ ایک ایسا باغی اور سرکش گروہ ہے کہ جب یہ ایک نافرمانی سے نکلتا ہے تو دوسری میں داخل ہو جاتا ہے' ان کی ایک ٹیڑھ کو اگر درست کر دیا جائے تو ان کے اندر دوسری ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے۔

بعض اوقات اس طرح نظر آتا ہے کہ ان پر یہ مسلسل لعنت شاید ختم ہو گئی ہے اور شاید یہودی اب باعزت اور صاحب قوت ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تاریخ کے وقفوں میں سے بعض وقفے ہیں۔ اب معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر کس کو مسلط کرتا ہے اور سابقہ ادوار ذلت کے بعد ان پر کون سی قوم مسلط ہوتی ہے۔

اللہ نے تو ان کے لئے یہ آرڈر قیامت تک کے لئے نافذ کر دیا ہے اور قرآن میں اپنے نبی کو اور اس کی امت کو اس کی اطلاع بھی کر دی ہے لیکن اس دائمی فیصلے کے باوجود اللہ کی صفت رحمت اور عفو و درگذر اپنی جگہ قائم ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهُ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۷: ۱۶۷) اپنی صفت سرعت عذاب کی وجہ سے وہ ان لوگوں کو پکڑ لیتا ہے جن پر نزول عذاب برحق ہو چکا ہے۔ جیسا کہ ساحلی بستی والوں کو اس نے پکڑا۔ اور اپنی صفت رحمت و مغفرت کی وجہ سے وہ ہر اس شخص کو معاف کرتا ہے جو تائب ہو گیا مثلاً بنی اسرائیل میں سے وہ لوگ جو نبی آخر الزمان کو تسلیم کرتے ہوئے ایمان لائے کیونکہ ان کے ہاں تورات میں نبی آخر الزمان کے بارے میں لکھا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی سے انتقام نہیں لیا جاتا اور نہ اس دربار میں کسی کے ساتھ ظلم ہوتا ہے۔ وہاں تو سب کے ساتھ انصاف ہوتا ہے' بلکہ وہاں تو معافی اور رحمت کے لئے بہانہ درکار ہے۔

---()()()---

اس کے بعد یہ قصہ تاریخی خطوط پر آگے بڑھتا ہے۔ حضرت موسیٰ' آپ کے خلفاء انبیاء اور آپ کے بعد نسلاً بعد نسل آنے والے لوگوں سے آگے بڑھ کر اب اس نسل سے بات ہو رہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود ہے اور جماعت مسلمہ اور اس کے درمیان مقابلہ ہے۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ
وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۡ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾
فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا
الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ
اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا
مَا فِيْهِ ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَالَّذِيْنَ
يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾

"ہم نے ان کو زمین میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے بہت سی قوموں میں تقسیم کر دیا۔ کچھ لوگ ان میں نیک تھے اور کچھ اس سے مختلف۔ اور ہم ان کو اچھے اور برے حالات سے آزمائش میں مبتلا کرتے رہے کہ شاید یہ پلٹ آئیں۔ پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے جو کتاب الہٰی کے وارث ہو کر اسی دنیائے دنی کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ توقع ہے ہمیں معاف کر دیا جائے گا' اور اگر وہی متاع دنیا سامنے آتی ہے تو پھر لپک کر اسے لے لیتے ہیں۔ کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللہ کے نام پر وہی بات کہیں جو حق ہو؟ اور یہ خود پڑھ چکے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے۔ آخرت کی قیام گاہ تو خدا ترس لوگوں کے لئے ہی بہتر ہے' کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے ہو؟ جو لوگ کتاب کی پابندی کرتے ہیں اور جنہوں نے نماز قائم کر رکھی ہے' یقیناً ایسے نیک کردار لوگوں کا اجر ہم ضائع نہیں کریں گے۔"

یہ آیات بھی مدنی ہیں اور ان کو یہاں اس لئے رکھا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے قصے کو مکمل کر دیا جائے۔ یہ اس وقت کے حالات ہیں جب یہودی اس کرۂ ارض پر دور تک پھیل گئے تھے۔ ان کی مختلف جماعتیں بن گئی تھیں اور انہوں نے مختلف مذاہب اور عقائد اپنا لئے تھے۔ ان کے مسلک اور مشرب مختلف ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ نیک تھے اور کچھ عام لوگ تھے' کہیں ان کی آزمائشیں ہوتی رہیں' کبھی خوشحال بن کر انہیں آزمایا جاتا اور کبھی بدحال بنا کر ، تاکہ وہ راہ راست کی طرف لوٹ آئیں اور راہ ہدایت پالیں اور سیدھے راستے پر چلیں۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۷:۱۶۸) "ہم نے ان کو زمین میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے بہت سی قوموں میں تقسیم کر دیا۔ کچھ لوگ ان میں نیک تھے اور کچھ اس سے مختلف۔ اور ہم ان کو اچھے اور برے حالات سے آزمائش میں مبتلا کرتے رہے کہ شاید یہ پلٹ آئیں۔"

اللہ کی طرف سے آزمائش بھی ایک قسم کی رحمت ہوتی ہے اور ان آزمائشوں کی وجہ سے انسان مسلسل اللہ کو یاد کرتا رہتا ہے اور انسان غافل نہیں رہتا' کیونکہ غافل لوگ ہلاکت میں جا پڑتے ہیں۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ (۷:۱۶۹) "پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے جو کتاب الہٰی کے وارث ہو کر اسی دنیائے دنی کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ توقع ہے ہمیں معاف کر دیا جائے گا' اور اگر وہی متاع دنیا سامنے آتی ہے تو پھر لپک کر اسے لے لیتے ہیں۔"

بعد میں آنے والوں کی صفات یہاں یہ دی گئی ہیں کہ یہ لوگ کتاب کے وارث تھے' اسے پڑھتے تھے' لیکن وہ اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق نہ ڈھالتے تھے' اور ان کے دل اور ان کا طرز عمل اس کتاب سے متاثر نہ ہوتا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ ان کا ایمان ان کی ثقافت بن گیا تھا۔ ایک علم تھا جسے وہ پڑھتے تھے لیکن جب وہ مقاصد دنیاوی میں سے کوئی بھی مقصد دیکھتے تو اس کی طرف لپکتے چاہے جائز ہوتا یا ناجائز اور خوش فہمی یہ رکھتے تھے کہ

امید ہے کہ اللہ ہمیں معاف کر دے گا۔ لیکن عفو کی امیدواری کے بعد پھر اگر کوئی دنیاوی اغراض ان کے سامنے آئیں تو پھر ان کی طرف لپکتے۔

اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ

(۷:۱۶۹) "کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللہ کے نام پر وہی بات کہیں جو حق ہو؟ اور یہ خود پڑھ چکے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے۔"

کیا کتاب میں ان سے وعدہ نہ لیا گیا تھا کہ وہ کتاب اللہ میں بے جا دلیل اور حجت نہ کریں گے اور نصوص کے تقاضوں سے بچنے کے لئے حیلہ سازی نہ کریں گے اور اللہ کی جانب سے سوائے سچائی کے اور کوئی بات نہ کریں گے۔ اس کے برعکس ان کا طرز عمل تو یہ ہے کہ دنیاوی مفادات دیکھتے ہی ان کی طرف لپکتے ہیں اور امید یں یہ لگائے بیٹھے ہیں کہ شاید اللہ ہمیں بخش دے۔ اور وہ جو اللہ کی طرف غلط باتیں منسوب کرتے ہیں اس میں اپنے آپ کو حق بجانب اس لئے قرار دیتے ہیں کہ وہ مغفرت کے بے جا امیدوار ہیں حالانکہ ان کو اس بات کا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو بے شک معاف فرماتا ہے لیکن صرف ان لوگوں کو جو فی الحقیقت تائب ہوگئے ہوں اور انہوں نے عملاً معصیت کو چھوڑ دیا ہو جبکہ ان کا طرز عمل ایسا نہیں ہے۔ ان کا حال تو یہ ہے کہ کوئی ناجائز مفاد سامنے آتے ہی یہ لوگ بے چین ہو جاتے ہیں اور اس کی طرف لپکتے ہیں حالانکہ انہیں کتاب اللہ کے احکام اور تقاضوں کا اچھی طرح علم ہوتا ہے۔

ہاں! وہ پڑھتے ہیں لیکن پڑھنا صرف اس شخص کے لئے مفید ہوتا جس کے دل میں تعلیم اتر جائے 'کئی ایسے پڑھنے والے ہیں جن کے دلوں سے قرآن بہت دور ہے۔ یہ لوگ کتاب اللہ کی تدریس اس لئے کرتے ہیں کہ اس کی تاویل بھی کریں۔ اور اس کے مفہومات کو بدل دیں اور اپنے مطلب کے فتویٰ کے ذریعے دنیاوی مفادات حاصل کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ دین کو محض پڑھنے کی خاطر پڑھیں 'اسے اپنا نظریہ اور عقیدہ نہ بنائیں نہ وہ اللہ سے ڈریں اور اس کی سزا سے خائف ہوں۔

وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۷:۱۶۹) "آخرت کی قیام گاہ تو خدا ترس لوگوں کے لئے ہی بہتر ہے 'کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے؟"

ہاں یہ اصل بات دار آخرت کی ہے 'جو اللہ سے ڈرنے والے ہوتے ہیں۔ صرف ان کی روش میں آخرت کی بات ہوتی ہے اور یہی لوگ دنیاوی مفادات کی کشش کے دائرے سے باہر نکل سکتے ہیں۔ کوئی دل اور کوئی نظام زندگی اس کے سوا درست نہیں ہو سکتا۔ انسان کے نفس اور اس کی نفسیات اور اس کی عملی زندگی کی اصلاح بھی صرف فکر آخرت سے ہو سکتی ہے۔ ورنہ بتایا جائے کہ وہ کون سا جذبہ ہو سکتا ہے جو انسان کو وہ تمام اغراض گھیر لینے سے روک سکتا ہے۔ وہ کیا چیز ہو سکتی ہے جو انسان کو طمع اور لالچ سے روک دے اور دوسروں کے حقوق پر دست درازی سے روک دے۔ اور وہ کیا چیز ہے جو دل کو مرغوبات سے روکے اور نفس انسانی کی شہوتوں پر کنٹرول کرے۔ زندگی کی اس ہیجان خیز کشاکش میں انسان کو ایک اطمینان بخش سکے۔ صرف اجر اخروی کی امید ہے جس کی وجہ سے انسان اخروی مفاد کی خاطر دنیا کی محرومیاں برداشت کر سکتا

ہے ۔ مزید یہ کہ حق و باطل کے معرکے میں 'خیر و شر کی جنگ میں' دنیوی اغراض اور اخروی مفادات کے درمیان فیصلے میں انسان ثابت قدم رہ سکتا ہے ۔ جبکہ شر سرکشی میں مبتلا ہو اور باطل حد سے آگے بڑھ رہا ہو ۔

"حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی اس ہیجان خیز کشاکش میں صرف فکر آخرت اور عقیدۂ آخرت انسان کے لئے یقین اور سکون کا سبب بن سکتا ہے ۔ جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں ان کے لئے یہ نہایت ہی مفید ہے ۔ ایسے لوگ عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں' آلودگیوں سے بالا رہتے ہیں اور جادہ حق پر ثابت قدم رہتے ہیں' قدم پھسلا دینے والے اور جھنجھوڑنے والے فتنے صرف اس شخص پر اثر انداز نہیں ہوتے جو متقی اور آخرت پر ایمان لانے والا ہو ۔ ایسے لوگوں کے دل مطمئن اور ثابت قدم ہوتے ہیں اور یہ لوگ کامیابی کا پوری طرح یقین رکھتے ہیں ۔

آج کے دور میں اشتراکیت کے داعی اس غائبانہ حقیقت کو ہمارے دلوں کے پردے سے محو کرنا چاہتے ہیں ۔ ہمارے عقائد و نظریات سے آخرت کے تصور کو مٹانا چاہتے ہیں اور یہ ہمارے دلوں میں جنوں کی وہ آگ روشن کرنا چاہتے ہیں جو صرف یقین آخرت سے بجھ سکتی ہے ۔ فکر آخرت کے سوا رشوت' فساد' لالچ' ظلم اور لاپرواہی کی بیماریاں زیادہ ہی ہوتی ہیں اور ایسے لوگ جہاں بھی ہوں خائن اور چور ہوتے ہیں ۔

یہ بات کہ عالم غیب اور عالم مشاہدہ' یعنی سائنس اور عالم غیب کے درمیان مکمل تضاد ہے ۔ یہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کی جہالت کی وبا ہے جہاں تک حقیقی سائنس دانوں اور اہل علم کا تعلق ہے انہوں نے تو اس نظریے کو ایک عرصے سے رد کر دیا ہے ۔ صرف بیسویں صدی کے جاہل کبھی کبھار اس کا ورد کرتے ہیں ۔ یہ ایک ایسی جہالت ہے جو انسانی فطرت سے موڑ نہیں رکھتی ۔ یہی وجہ ہے کہ اس جہالت کے شکار لوگوں کی زندگی میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے ۔ اور یہ اب ہمہ گیر بگاڑ ہے جس کے نتیجے میں پوری انسانیت کی تباہی کا خطرہ ہے ۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ نہایت ہی عیارانہ صیہونی منصوبہ ہے ۔ صیہونی کے اس منصوبے کی پشت پر یہ غرض کارفرما ہے کہ تمام دنیا کے انسانوں سے وہ اصلی قوت سلب کر لی جائے جو انسانوں کی زندگی کی ریڑھ کی ہڈی ہے تاکہ یہ صیہونی پوری دنیا کو اپنے مقاصد کے مطیع بنا سکیں اور صیہونی منصوبہ سازوں کے اس منصوبے کو یہ لوگ جگہ جگہ اپنے ڈھنڈورچیوں کے ذریعے پھیلاتے ہیں ۔ پوری دنیا میں صیہونیوں نے جو صورت حال پیدا کر دی ہے اس میں تمام لوگ خود بخود اس منصوبے کو عملاً چلا رہے ہیں ۔

فکر آخرت اور خدا خوفی' انسانی زندگی کے دو نہایت ہی اہم مسئلے ہیں' جو لوگ دنیاوی مفادات کے پیچھے سرپٹ بھاگ رہے ہیں قرآن کریم ان کو یہ تصور دیتا ہے کہ وہ عقل کے ناخن لیں "آخرت کی قیام گاہ تو خدا ترس لوگوں کے لئے ہی بہتر ہے کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے ۔"

اگر فیصلہ کرنے کا موقعہ عقل کو دیا جائے اور خواہشات نفسانیہ کا اس میں دخل نہ ہو ۔ اگر علم اور سائنس کو حقیقی معنوں میں لیا جائے اور جہالت کا نام علم نہ رکھا جائے تو آخری فیصلہ حتمی ہو کہ اس دنیائے دنی کے مقابلے میں آخرت ہی بہتر ہے ۔ تقویٰ اور خدا خوفی مومنین کے لئے دنیا و آخرت کا توشہ بن جائے ۔

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ

(۷ : ۱۷۰) "جو لوگ کتاب کی پابندی کرتے ہیں اور جنہوں نے نماز قائم کر رکھی ہے' یقیناً ایسے نیک کردار

لوگوں کا اجر ہم ضائع نہیں کریں گے ۔"

یہ ان لوگوں پر ایک طنز ہے جن سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ وہ کتاب کو مضبوطی سے پکڑیں اور اسے پڑھیں اور انہوں نے عہد کے باوجود کتاب کو مضبوطی سے نہ پکڑا حالانکہ وہ اسے پکڑ تو لیتے ہیں لیکن عمل نہیں کرتے اور اپنے نظریہ و عمل میں اسے نافذ نہیں کرتے ' نہ اپنے نظام زندگی میں اسے جاری کرتے ہیں ۔ اگر چہ یہ ایک تعریض ہے لیکن آنے والی تمام نسلوں کے لئے اس میں طے کردہ اصول باقی ہے ۔

تمسک کے لفظ سے ایسے مفہوم کا اظہار ہوتا ہے جو ذہن کے سامنے ایک عملی نقشہ اسکرین پر پیش کر دیتا ہے ۔ ایک معنوی چیز کو قرآن نے تمسک کے ذریعے حسی بنا دیا ہے ۔ معنی یہ ہیں کہ قوت کے ساتھ اس کتاب کو پکڑ لو اور تختی اور سنجیدگی کے ساتھ اس کے اصولوں کو رائج کرو ۔ جس طرح اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اس کی کتاب کو لیا جائے ' بغیر ہٹ دھرمی کے ' بغیر شکن کے اور بغیر گھٹن کے ۔ اس لئے کہ سنجیدگی ' قوت اور پختگی اور چیز ہے اور ہٹ دھرمی اور گھٹن اور دل گرفتگی اور چیز ہے ۔ سنجیدگی ' قوت اور پختگی یسر کے متضاد نہیں ہے البتہ سہل انگاری اور کردار کے بودے پن سے متضاد ہے ۔ یہ صورت حال وسعت قلبی کے متضاد نہیں ہے ۔ البتہ بے دینی کے متضاد ہے ' حالات کی رعایت اور حکمت کے متضاد نہیں البتہ وہ حالات اور واقعات کی رو میں نہیں بہتی ۔ واقعات کو شریعت کے مطابق ہونا تو پالیسی ہے ۔ یہ پالیسی نہیں ہے کہ ہم شریعت کو واقعی صورت حالات کے مطابق بناتے چلے جائیں ۔

کتاب اللہ کو پختگی سے پکڑ لینا ' نماز اور دوسرے مراسم عبودیت کی پابندی کرنا یہ اسلامی نظام حیات کے دو اہم پہلو ہیں ۔ یہاں تمسک بالکتاب کو ایک خاص رنگ یعنی مراسم عبودیت کے ساتھ متعین کیا گیا یعنی پورے اسلامی نظام حیات کے ساتھ ساتھ مراسم عبودیت کو لوگوں کی اصلاح کے لئے لازم کیا گیا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کی اصلاح اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ اس میں تمسک بالکتاب ہو اور اس میں عبادات کی پابندی ہو ' اس کی طرف اشارہ ان الفاظ میں ہے ۔ لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ (۷: ۱۷۰) "ہم نیک اور مصلحین کا اجر ضائع نہیں کرتے ۔" یعنی کتاب کو مضبوطی سے پکڑنا پوری کتاب کو اور عبادات پر عمل پیرا ہونا ہی اصلاح معاشرہ کا ذریعہ ہے ۔

کسی معاشرے میں ان دو باتوں میں سے کوئی ایک مفقود ہو جائے تو وہ بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے ۔ یعنی اس میں کتاب اللہ کو مضبوطی سے نہ پکڑا جائے اور لوگ اپنے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق نہ کریں ۔ دوسرے یہ کہ اس سے عبادت الہی مفقود ہو جائے جو دلوں کی صفائی کا ذریعہ ہے ۔ اس لئے کہ اگر دل صاف نہ ہوں تو لوگ اللہ کے احکام کے ساتھ یہودیوں جیسی حیلہ سازی کریں گے ۔ اس لئے کہ ان کے دلوں میں تقویٰ اور خدا خوفی نہ ہوگی ۔

اسلامی نظام ایک مکمل نظام ہے ' وہ باہم مربوط ہے ۔ عبادات کے ذریعے دلوں کا زنگ صاف ہوتا ہے اور پھر انسانی جسم احکام کتاب کو درستگی سے مانتے ہیں یوں عملی اور روحانی اصلاح مکمل ہوتی ہے ۔ یہ اللہ کا طریقہ اصلاح ہے اور اس کے سوا ہم اصلاح کا کوئی اور طریقہ اختیار نہیں کر سکتے ۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو بدبختی اور عذاب اس کی قسمت میں ہو گا ۔

---○○○---

اس قصے کے آخر میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو کس طرح پکڑا ۔

وَاِذۡ نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ فَوۡقَهُمۡ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوۡۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمۡ‌ۚ ٢١
خُذُوۡا مَاۤ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ وَّاذۡكُرُوۡا مَا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ۝ ع ٩
١١

"انہیں وہ وقت بھی کچھ یاد ہے جب کہ ہم نے پہاڑ کو ہلا کر ان پر اس طرح چھا دیا تھا کہ گویا وہ چھتری ہے اور یہ گمان کر رہے تھے کہ وہ ان پر آپڑے گا اور اس وقت ہم نے ان سے کہا تھا کہ جو کتاب ہم تمہیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ تھامو اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اسے یاد رکھو' توقع ہے کہ تم غلط روی سے بچے رہو گے۔"

یہ ناقابل فراموش عہد تھا' کیونکہ یہ ایسے ظروف و احوال میں لیا گیا تھا جسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ یہ عہد اس وقت لیا گیا کہ جب پہاڑ ان پر اس طرح چھا گیا کہ گویا چھتری ہے۔ وہ یہی گمان کر رہے تھے کہ ابھی گرا۔ اس لئے کہ عہد لیتے ہی وہ سرکشی کرنے لگے تھے۔ اس لئے ان سے ایسی صورت میں عہد لیا گیا تھا کہ اس کے بعد وہ دوبارہ عہد شکنی کے بارے میں سوچ ہی نہ سکیں۔ ان غیر معمولی حالات میں ان سے کہا گیا کہ کتاب اللہ کو سنجیدگی سے لو۔ سختی سے اس پر عمل کرو' اس میثاق کے بعد بد عہدی' سست روی اور پسپائی اختیار نہ کرو' کتاب اللہ کی ہدایات کو یاد رکھو۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح تمہارے دل بیج جائیں اور تمہارا تعلق باللہ قائم رہے۔

لیکن بنی اسرائیل' بنی اسرائیل ہی رہے۔ ان پر اللہ کی بات سچ ثابت ہو گئی تھی' اللہ نے انہیں اپنے وقت کی سپر پاور بنا دیا تھا۔ ان پر نعمتوں کی بارش کر دی تھی لیکن انہوں نے اللہ کا شکر ادا نہ کیا۔ اللہ کے عہد کا کوئی پاس نہ رکھا' ان کو میثاق الٰہی یاد ہی نہ رہا اس لئے وہ اس انجام تک پہنچے ورنہ اللہ تو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

---ooo---

# درس نمبر ۸۱ ایک نظر میں

اس سبق کا موضوع عقیدہ توحید اور رد شرک ہے ۔ اس پوری سورہ میں لائے جانے والے قصوں کا موضوع بھی یہی عقیدہ توحید تھا' اس پہلو سے کہ تمام رسولوں نے اسی عقیدے کی طرف دعوت دی تھی اور تمام رسولوں نے لوگوں کو شرک کے انجام بد سے ڈرایا تھا ۔ لیکن یاد دہانی اور ڈراوے کے بعد وہ حالات پیش آئے جن سے ڈرایا گیا تھا ۔

لیکن اس سبق میں توحید کے مسئلے کو ایک نئے زاویئے سے لیا گیا ہے' گہرے رخ سے اس پر بات کی گئی ہے ۔ انسانی فطرت کے زاویہ سے جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے ۔ انسان جب عالم ذریت میں تھا تو اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات اور بشریت سے یہ عہد لیا تھا کہ آیا میں تمہارا رب ہوں یا نہیں ' اقرار ربوبیت کو فطرت انسانی میں ودیعت کر دیا گیا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ بشریت انسانی وجود کی گہرائیوں میں اپنے خالق اور رب کے وجود کا شعور رکھتی ہے ۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد رسول کیوں آئے ہیں تو رسولوں کی آمد محض تذکیر کے لئے ہوتی ہے اور ایک رسول بشیر و نذیر کی حیثیت سے آتا ہے ۔ ان لوگوں کی اصلاح کے لئے آتا ہے جو فطرت سے انحراف کر چکے ہوتے ہیں ۔ ایسے لوگوں کو یاد دہانی کی ضرورت ہوتی ہے ۔ عقیدہ توحید دراصل ایک میثاق ہے جو فطرت انسانی اور خالق فطرت کے درمیان انسان کے ابتدائی وجود کے وقت طے شدہ ہے ۔ لہذا اس عہد کے توڑنے کے لئے انسان کے پاس کوئی جواز نہیں ہے ۔ اگرچہ تذکیر اور یاد دہانی کے لئے ان کے پاس کوئی رسول نہ آیا ہو' لیکن یہ اللہ کی خالص رحمت اور احسان ہے کہ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے منحرفین کی اصلاح کے لئے رسولوں کو ارسال کیا اور لوگوں کو محض ان کے عقول پر نہیں چھوڑ دیا گیا' کیونکہ عقل غلطی کر سکتی ہے ۔ چنانچہ اللہ نے رسول بھیجے تاکہ لوگوں کے لئے کوئی حجت ہی نہ رہے کہ فطرت کے تقاضے کے علاوہ اب تو رسول بھی آگئے ۔

اس سبق میں مسئلہ توحید کو اس زاویہ سے لیا گیا ہے اور اس زاویہ سے کئی خطوط کھینچے گئے ہیں ۔

ایک تاریخی لکیر ہے ۔ اس میں ایک شخص کے تاریخی کردار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ اس کا تعلق بھی تاریخ بنی اسرائیل کے ساتھ ہے ۔ لیکن راجح بات یہ ہے کہ اس کا کسی خاص اور متعین واقعہ یا خاص زمان و مکان کے ساتھ تعلق نہیں ہے ۔ یہ دراصل ایک نفسیاتی حالت کی تصویر کشی ہے جو بار بار پیش آتی رہتی ہے ۔ مثلاً جس شخص کو اللہ نے علم دیا ہے تو اس علم کا تقاضا اور اس سے توقع یہی ہے ۔ یہ شخص ہدایت یافتہ ہو اور حق پر قائم ہونے والا ہو ۔ لیکن اچانک یہ غیر متوقع صورت حالات سامنے آتی ہے کہ وہ اپنے علم کے تقاضوں سے بھاگ نکلتا ہے ۔ وہ اپنے علم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا ۔ اور وہ راہ ضلالت پر اس شخص کے دوش بدوش چلتا ہے جو بالکل بے علم ہے ۔ بلکہ یہ عالم شخص اس بے علم سے بھی زیادہ شرپسند' گمراہ اور بدبخت ثابت ہوتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ علم کو ایمان کی چاشنی نہ دی گئی ہو ۔ کیونکہ ایمان کے رنگ سے ہی یہ علم چراغ روشن بن جاتا ہے ۔ اور مسافر کے لئے روشنی کا

مینار ہوتا ہے ۔

ایک دوسرا خط یا دوسری لکیر ملاحظہ ہو۔ اس میں انسانی فطرت کے انحراف کا ایک دوسرا قصہ یا نمونہ بتایا گیا ہے کہ انسان کس ڈھٹائی کے ساتھ توحید کو چھوڑ کر شرک اختیار کر لیتا ہے ۔ ایک شادی شدہ جوڑا ہے وہ اللہ کے سامنے دست بدعاء ہوتا ہے کہ اگر انہیں ایک صالح بچہ دیا گیا تو وہ صرف اللہ کا شکر ادا کریں گے ۔ یہاں تک تو فطرت کے تقاضوں کا ساتھ دے رہے ہیں ۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو یہ لوگ بھی خلاف توقع بچے کی پیدائش کے عمل میں دوسروں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں اور ان کی فطرت میں کجی آجاتی ہے ۔

ایک تیسری لائن خود انسانی وجود کے اندر پائے جانے والی ادراکی قوتوں کے بارے میں ہے کہ اگر ان قوتوں کو صحیح طرح کام میں نہ لایا جائے تو ایک معقول انسان انسانیت کے مرتبہ اور مقام سے گر کر حیوانی سطح پر اتر آتا ہے اور پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جہنم کا مستحق ہو کر اس کا ایندھن بن جاتا ہے ۔ ایسے لوگوں کی حالت یہ ہوتی کہ وہ دل رکھتے ہیں لیکن اس کے اندر جذبہ ادراک نہیں ہوتا ۔ وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن بینائی نہیں ہوتی' وہ کان رکھتے ہیں لیکن سنتے ہی نہیں ہیں ۔ ایسے لوگ ضلالت کے پیچھے اس طرح بھاگتے ہیں کہ نہ واپسی ہوتی ہے اور نہ واپسی کا موقع رہتا ہے ۔

ایک اشاراتی لائن ہے 'ہدایت کی جاتی کہ دل و دماغ کو بیدار رکھو اور ہر معاملے میں غور و فکر کرتے رہو' اس زمین و آسمان کے نظام مملکت کو دیکھو ۔ ان میں اللہ تعالیٰ نے کیا کیا پیدا کیا ہے اور پھر ہر چیز کے خاتمے کے لئے ایک وقت مقرر کر دیا ہے ۔ اس لئے تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر توجہ کرو اور غور کرو کہ اس دعوت کے حامل کو مجنون اور گمراہ کہا جاتا ہے ۔

ایک لائن میں ان پر سخت تنقید لی گئی ہے اور یہ تنقید ان الہوں کے بارے میں ہے جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں ۔ حالانکہ وہ جن کو پکارا جاتا ہے الہیت کی ابتدائی خصوصیات سے بھی عاری ہیں بلکہ ان میں تو زندگی کے معمولی آثار بھی ناپید ہیں ۔

یہ سبق اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ آپ کو ہدایت دی جاتی ہے کہ آپ انہیں اور ان کے خداؤں کو چیلنج دیں کہ وہ کچھ تو پکاریں ۔ کہا جاتا ہے کہ آپ ان سے مکمل بائیکاٹ کا اعلان فرما دیں اور ان کے معبودوں اور عبادت سے علیحدہ ہو جائیں اور اس مولیٰ کے ہاں پناہ لیں جس کے سوا کوئی مولیٰ نہیں ہے ۔ اَلَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ "میرا ناصروہ ہے جس نے کتاب نازل کی اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت کرتا ہے ۔"

اس سے پہلے سبق کے آخر میں بنی اسرائیل کے اوپر پہاڑ کو چھتری کر کے ان سے عہد لیا گیا تھا' اور اس سبق کا آغاز انسانیت کے ساتھ میثاق اکبر کے ذکر سے کیا گیا جو فطرت انسانی کے ساتھ طے پایا تھا ۔ یہ عہد بھی ایسے منظر کی شکل میں ہے کہ اپنی خوبصورتی اور حلالت کے اعتبار سے اس منظر سے کہیں زیادہ بلند ہے ۔

---ooo---

# درس نمبر ۸۱ تشریح آیات

## ۱۷۲---تا---۱۹۸

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْؕ قَالُوْا بَلٰىۛۚ شَهِدْنَاۛۚ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ﴿۱۷۲﴾ اَوْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ﴿۱۷۳﴾ وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ وَ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ﴿۱۷۴﴾

"اور اے نبی "، لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" انہوں نے کہا "ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں' ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔" یہ ہم نے اس لئے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ "ہم تو اس بات سے بے خبر تھے" یا یہ نہ کہنے لگو کہ "شرک کی ابتداء تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے' پھر کیا آپ ہمیں اس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا؟" دیکھو' اس طرح ہم نشانیاں واضح طور پر پیش کرتے ہیں۔ اور اس لئے کرتے ہیں کہ یہ لوگ پلٹ آئیں۔

یہ فطرت انسانی کا مسئلہ ہے لیکن قرآن کریم نے اسے ایک منظر میں پیش کیا ہے اور یہ قرآن کریم کا عمومی انداز ہے' بہرحال یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد منظر ہے۔ عالم غیب میں موجود انسانی نسل اس میں ایک کردار ہے' یہ نسل انسانوں کی پشتوں میں موجود تھی' قبل اس کے کہ وہ اس دنیا کے عالم شہود پر آئے' یہ نسل عالم بالا کے اسٹیج پر آتی ہے۔ اللہ کی جانب سے اس نسل کے سامنے ایک سوال رکھا جاتا ہے۔ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" یہ پوری نسل انسانی اللہ کی ربوبیت کا اقرار کرتی ہے۔ اللہ کو وحدہ لا شریک تسلیم کرتی ہے۔ یہ پوری نسل ذروں کی طرح موجود ہے اور اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔

یہ ایک حیران کن کائناتی منظر ہے۔ ہم تک تمام زبانوں کے اندر آج تک جو تصورات منتقل ہوئے ہیں اس تصور کی

کوئی مثال کہیں بھی نظر نہیں آتی - جب انسانی تصورات اور قوائے مدرکہ اس تصور کا صحیح طرح احاطہ کر لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ عجیب تصور ہے - انسانی خلیے تمام کائنات سے اخذ کر لئے گئے ہیں - اور ان سے اس طرح بات ہو رہی جس طرح ایک مکمل انسان سے بات ہوتی ہے اور وہ بھی ایک عقلمند انسان کی طرح بات کرتے ہیں 'کیونکہ ان میں بات کرنے کی صلاحیت تو موجود ہے - یہ خلیے اعتراف کرتے ہیں اور شہادت توحید دیتے ہیں اور اس عظیم میثاق پر دستخط کرتے ہیں اور ہیں وہ انسانوں کے صلب میں -

جب انسان اس خوبصورت 'حیران کن اور منفرد منظر کو دیکھتا ہے تو وہ اپنی شخصیت کی گہرائیوں سے متاثر ہوتا ہے - وہ باریک خلیوں کے اندر انسانی نسل کے ذرات کو دیکھ رہا ہے جو فضا میں تیر رہے ہیں - ہر ذرہ اس وقت زندہ ہے 'اور ہر ایک میں مکمل استعداد موجود ہے' ہر ذرے کے اندر مکمل انسانی صفات موجود ہیں صرف وہ نشو و نما کی اجازت کا منتظر ہے - اس کائنات کی نامعلوم وسعتوں سے وہ ظہور اور شہادت کا منتظر ہے - یہ ذری موجودات اس میثاق کو قبول کرتی ہے - اگرچہ ہماری نظروں میں آنے والے عالم معلوم ہیں یہ موجود ذرہ ابھی تک منصہ شہود پر نہیں آیا۔

قرآن کریم نے اس خوبصورت 'حیران کن اور منفرد منظر کو اس عظیم حقیقت کے ذہن نشین کرانے کے لئے پیش کیا جو اس کائنات کی حقیقت میں نہایت ہی گہرائی پر موجود اور مستحکم ہے - یہ منظر قرآن کریم نے آج سے ۱۴سو سال قبل پیش کیا - اس وقت انسانوں کو اس کائنات کی تخلیق کے بارے میں کچھ زیادہ سائنسی معلومات نہ تھیں - اس موضوع پر انسانی معلومات چند اوہام پر مشتمل تھیں - انسانی مزاج اور تخلیق انسانیت کے بارے میں زمانہ مابعد میں انسان نے کچھ حقائق دریافت کئے - چنانچہ ان سائنسی انکشافات نے کہ جین کے اندر وہ تمام خصوصیات موجود ہوتی ہیں جو کسی انسان میں بعد کے ادوار میں نمودار ہوتی ہیں اور ان میں ایک مکمل فرد کی خصوصیات بھی موجود ہوتی ہیں جو بعد میں فرد کی صورت میں سامنے آتا ہے حالانکہ یہ خلیے کی شکل میں ہوتا ہے - ان خلیوں میں تین ہزار ملین انسانوں کا ریکارڈ محفوظ ہوتا ہے جس میں ان کی تمام خصوصیات بھی ہوتی ہیں - ان خلیوں کا حجم ایک مکعب سینٹی میٹر سے زیادہ نہیں ہوتا یعنی سوئی کے ناکے کے برابر اور یہ وہ معلومات ہیں کہ اگر اس وقت لوگوں کو یہ بتائی جائیں تو لوگ کہتے کہ یہ شخص مجنوں ہے - لیکن اللہ تعالیٰ نے سچ کہا سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ "ہم عنقریب ان کو آفاق میں اور خود ان کے نفسوں میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ یہ حق ہے -"

ابن جریر نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے - "حضور ؐ نے فرمایا تمہارے رب نے آدم کی پشت کو چھوا 'اس سے وہ تمام جرثومے برآمد ہوئے جنہیں اللہ تعالیٰ قیامت تک پیدا کرنے والا تھا 'اب اللہ نے ان سے پختہ وعدہ لیا اور انہیں خود ان کے خلاف گواہ ٹھہرایا - اور سوال کیا 'کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو ان سب نے جواب دیا ہاں! یہ روایت حضرت ابن عباس سے مرفوعاً اور موقوفاً دونوں طرح سے مروی ہے - لیکن حضرت ابن عباس کی موقوف روایت زیادہ قوی ہے -

سوال یہ ہے کہ یہ منظر کیسے تھا 'اور اللہ نے کس طرح تمام پیدا ہونے والی مخلوقات کو نکال لیا اور ان کی گواہی خود ان کے خلاف ثبت کر لی - اور ان کو مخاطب کرنے کا انداز اور سوال و جواب کس طرح تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ افعال الٰہی کی کیفیت بھی غیوب میں سے ایک غیب ہے 'جب تک انسان کے اندر ذات باری کے ادراک ذہنی کی قوت پیدا نہیں ہوتی اس وقت تک انسان کے لئے افعال الٰہیہ کی کیفیت کا ادراک بھی ممکن نہیں ہے - کیونکہ جب کسی ماہیت کا

ادراک نہیں ہو سکتا تو اس کے فروعات یعنی کیفیات کا ادراک کیسے ممکن ہو سکتا ہے ۔ اور وہ تمام افعال جن کی نسبت اللہ کی طرف کی جاتی ہے مثلاً ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ وَھِیَ دُخَانٌ "پھر اللہ آسمانوں پر متمکن ہوا اور یہ ایک دھواں تھا۔" ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ "پھر عرش پر متمکن ہوا۔" یَمْحُوْا اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ "اللہ جسے چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ٹھہراتا ہے ۔" وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌ بِیَمِیْنِہٖ "اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے ۔" وَجَاءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّا "تمہارا رب آئے گا اور فرشتے صف در صف کھڑے ہوں گے ۔" وَمَا یَکُوْنُ مِنْ نَجْوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا وَھُوَ رَابِعُھُمْ "جو تین آدمیوں کا مشورہ ہو' ان کا چوتھا اللہ ہوتا ہے ۔" وغیرہ یہ سب آیات جو افعال الٰہیہ کے بارے میں وارد ہیں' یہ افعال تو لازماً صادر ہوئے اور ہوں گے لیکن ان کی کیفیت کا ادراک مشکل ہے ۔ اس لئے کہ کیفیت کا تصور بھی ماہیت کے تصور کا فرع ہوتا ہے ۔ اور اللہ کی ذات ایسی ہے کہ اس جیسی کوئی ذات نہیں ہے ۔ لہٰذا اللہ کی ماہیت اور اس کے افعال کی کیفیت کا ادراک ممکن نہیں ہے ۔ کیونکہ اس صورت میں تشبیہ لازم آتی ہے اور اس کے مشابہ کوئی نہیں ہے ۔ اللہ کے افعال کو انسانی افعال کے ذریعے سمجھنے کی جو کوشش بھی کی گئی وہ گمراہی پر منتج ہوئی ہے ۔ کیونکہ اللہ اور مخلوق اللہ کی ماہیت میں فرق ہے ۔ فلاسفہ اور سائنس دانوں نے انسانی افعال کے رنگ میں اللہ کے افعال کی کیفیات کو سمجھنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ نامراد ثابت ہوئی ہیں ۔

نیز اس آیت کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ اس سے مراد فطرت انسانی ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی کے اندر اعتراف ربوبیت الٰہی ودیعت کر دیا ہے اور فطرتاً ایک شخص اعتراف رب کرتا ہے' البتہ بعض خارجی عوامل اسے فطرت کی راہ مستقیم سے بدراہ کرتے ہیں ۔

ابن کثیر فرماتے ہیں "سلف اور خلف کے مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے لوگوں کو توحید کی فطرت پر پیدا کیا ہے جیسا کہ اس سے قبل حضرت ابوہریرہ اور عیاض ابن حمار المجاشعی کی حدیث میں منقول ہے ۔ ان سے حسن بصری نے روایت کی ہے ۔ جس نے اس آیت کی تفسیر اس کے مطابق کی ہے ۔ ان لوگوں نے یہ کہا کہ اللہ نے آدم کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ بنی آدم کا لفظ استعمال کیا ہے اور مِنْ ظَھْرِہٖ نہیں کیا بلکہ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ "ان کی پشتوں سے" کیا ہے ۔ (ذریتھم) کے لفظ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد لوگ ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ اس دنیا میں مختلف زمانوں میں پیدا ہوتے ہیں ۔ جیسا کہ دوسری آیت میں اللہ نے فرمایا وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خُلَفَاءَ الْاَرْضِ "اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہیں زمین کا خلیفہ بنایا جَعَلَکُمْ خُلَفَاءَ الْاَرْضِ "وہ تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے ۔" اور دوسری آیت میں ہے کَمَا اَنْشَاَکُمْ مِّنْ ذُرِّیَّۃِ قَوْمٍ اٰخَرِیْنَ "جیسا کہ تمہیں دوسری قوم کی پشت سے پیدا کیا۔

پھر اللہ نے فرمایا وَاَشْھَدَھُمْ عَلٰی اَنْفُسِھِمْ "انہیں اپنے اوپر گواہ بنا کر پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تو انہوں نے کہا ہاں! یعنی ان کو وجود میں لا کر ان سے پوچھا اور انہوں نے اسے تسلیم کیا یعنی پیدائش کے وقت ۔ علماء کہتے ہیں کہ شہادت کبھی تو قولی ہوتی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے قَالُوْا شَھِدْنَا عَلٰی اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْھُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وَشَھِدُوْا عَلٰی اَنْفُسِھِمْ اَنَّھُمْ کَانُوْا کٰفِرِیْنَ "انہوں نے کہا ہم اپنے اوپر شہادت دیتے ہیں اور ان کو دنیا کی زندگی نے غرے میں ڈال دیا ہے اور انہوں نے اپنے اوپر شہادت دی کہ وہ کافر تھے ۔" اور کبھی حالاتی شہادت ہوتی ہے مثلاً قَالُوْا شَھِدْنَا عَلٰی اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْھُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وَشَھِدُوْا عَلٰی اَنْفُسِھِمْ اَنَّھُمْ کَانُوْا کٰفِرِیْنَ

"مشرکین کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مساجد کو تعمیر کریں۔ درآں حالیکہ وہ اپنے اوپر کفر کی شہادت دے رہے ہیں۔ یعنی ان حالات کفر کی شہادت دے رہے ہیں۔ اگرچہ وہ زبان سے اپنے آپ کو کافر نہیں کہتے۔ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ "اور وہ اس پر گواہ ہے۔" اسی طرح سوال بھی کبھی تو قولی ہوتا ہے اور کبھی حالاتی ہوتا ہے۔ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ "اور تمہیں وہ سب کچھ دیا جس کا تم نے سوال کیا۔"

مفسرین کہتے ہیں کہ اگر لوگوں کو عملاً اٹھاکر ان سے اقرار لیا گیا تھا اور یہ اقرار ان کے خلاف باءنڈنگ تھا تو پھر چاہئے تھا کہ لوگوں کو وہ یاد بھی ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اس واقعہ کی اطلاع ہی کافی ہے تو جواب یہ ہے کہ مشرکین تو اس حدیث کے ساتھ حضور اکرم کے تمام اخبار کو جھٹلاتے ہیں اور یہ ان کے خلاف حجت کے طور پر پیش کیا گیا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اس سے مراد وہ فطرت ہے جس پر تمام انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے کہ وہ توحید کا اقرار کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد تمام انسانوں کو کہا اَنْ تَقُوْلُوْا "یہ نہ ہو کہ تم کہو" یعنی قیامت کے دن تم یہ کہہ سکو کہ ہم تو اس سے غافل تھے۔ یا یہ نہ کہو اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا "دراصل ہمارے آبا مشرک تھے۔"

بعض احادیث میں بھی اس فطرت کی طرف اشارہ موجود ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔" (بعض روایات میں ملت پر پیدا ہو رہا ہے۔) بعد میں اس کے باپ اسے یہودی بنا دیتے ہیں یا عیسائی یا مجوسی جیسا کہ تمام جانوروں کے بچے صحیح سالم پیدا ہوتے ہیں۔ کیا اس میں کوئی کان کٹا ہوتا ہے؟

صحیحین میں عیاض ابن حمار کی روایتؓ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بندوں کو سیدھا پیدا کیا' اس کے بعد شیاطین آئے اور انہوں نے بندوں کو ان کو دین سے پھیر دیا اور ان پر وہ باتیں حرام کر دیں جو حلال تھیں۔

ابن جریر نے اسود ابن سریع کی حدیث نقل کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ میں نے حضور اکرم کے ساتھ چار غزوات میں شرکت کی۔ انہوں نے کہا کہ لوگوں نے جنگ کے بعد بچوں کو بھی قتل کیا۔ یہ بات رسول اللہ تک پہنچی اور یہ ان پر بہت ہی گراں گزری۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کیا حال ان لوگوں کا' جو بچوں کو قتل کرتے ہیں۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ حضورؐ کیا یہ لوگ مشرکین کے بچے نہیں ہیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ تم میں سے بہتر لوگ بھی تو مشرکین کے بچے ہیں' جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے وہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور وہ اس فطرت پر ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ باتیں کرنے لگتا ہے۔ اس کے بعد اس کے والدین اسے یہودی بناتے ہیں یا نصرانی۔ حسن نے کہا "اللہ تعالیٰ کے فرمان کا یہی مطلب ہے وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (۷: ۱۷۲) "جب اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا۔" الی الی آخرہ۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس آیت کو اپنے حقیقی معنوں میں بھی مستبعد نہیں سمجھتا کیونکہ جس طرح اللہ نے فرمایا ہے اسی طرح اس کا وقوع ممکن ہے "اور لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا اور انہیں خود ان پر گواہ بنایا تھا۔" اور کوئی بات بھی اس میں خلاف عقل نہیں ہے لیکن اوپر جن مفسرین نے اسے حالات فطرت کے معنوں میں لیا ہے وہ تفسیر بھی مستبعد نہیں ہے۔ ابن کثیر' حسن بصری وغیرہ نے اسے اختیار کیا ہے۔ واللہ اعلم!

بہ حال یہ بات پیش نظر رہے کہ انسانی فطرت نے اللہ کے ساتھ یہ عہد کر رکھا ہے کہ وہ اللہ کو وحدہ لاشریک ٹھہرائے گی۔ حقیقت توحید انسانی فطرت میں ودیعت ہے۔ ہر بچہ جب زندگی پاتا ہے تو یہ عہد اس کی فطرت کے ساتھ آتا ہے وہ اس وقت تک اس فطرت پر قائم رہتا ہے جب تک کوئی خارجی عامل اسے اس فطرت سے پھیر نہیں دیتا۔ اور یہ خارجی عوامل انسان کی فطری استعداد کو استعمال کرتے ہیں کیونکہ اللہ نے جس طرح فطرت میں توحید و ودیعت کی ہے اسی طرح فطرت کو یہ صلاحیت بھی دی ہے کہ وہ ہدایت قبول کرے یا ضلالت۔ اور جن حالات میں بچہ پیدا ہوتا ہے وہ حالات اور ظروف احوال اس پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

حقیقت توحید صرف فطرت انسانی کے اندر ہی ودیعت نہیں کی گئی بلکہ نظریہ توحید اس پوری کائنات کے اندر بھی رکھا ہوا ہے کیونکہ انسانی فطرت بہرحال اس وسیع فطری نظام ہی کا ایک حصہ ہے۔ انسانی وجود اس کائنات کے وجود سے منقطع نہیں ہے۔ یہ بھی اسی قانون کے مطابق چل رہا ہے جس کے مطابق پوری کائنات چل رہی ہے۔ جس طرح یہ پوری کائنات اللہ کے احکام اور اشارات قبول کرتی ہے اسی طرح اس چھوٹے سے انسان کی فطرت بھی تکوینی اثرات قبول کرتی ہے۔

وہ ناموس توحید جو اس کائنات پر حکمران ہے وہ اس کائنات کی شکل و صورت میں بالکل نمایاں ہے۔ اس کائنات کی ہم آہنگی' اس کے اجزاء کا باہم ربط اور تناسب' اس پوری کائنات اور اس کے اجزاء کی حرکت کا نظام' اس کے قوانین کا تسلسل اور پوری کائنات کا ان قوانین کے مطابق مسلسل رواں دواں ہونا اور پھر ان قلیل معلومات کے مطابق جن تک انسان اب تک پہنچ سکا ہے کہ وہ ذرات جن سے یہ کائنات مرکب ہے اور ان ذرات کی توڑ پھوڑ کے نتیجے میں نکلنے والی شعاعیں یہ سب کچھ اس کائنات کے خالق کی وحدت پر دلیل ہیں۔

اس ہمہ گیر وحدت کے راز ہائے نہفتہ کو انسان رات دن کھول رہا ہے جن سے اس کائنات کے مزاج کی وحدت معلوم ہوتی ہے' اس کے قوانین کی یک رنگی معلوم ہوتی ہے اور یہ یک رنگی آٹومیٹک نہیں ہے بلکہ سب کچھ اللہ کی مشیت اور اس کے نظام تقدیر کے مطابق ہو رہا ہے۔ ہم بہرحال انسانی انکشافات پر بھی بھروسہ نہیں کرتے کیونکہ انسان کا علم بہرحال ظن و تخمین پر مبنی ہے۔ اور انسان کا علم یقینی علم نہیں ہے' اس لئے کہ انسان کو جو ذرائع ادراک دیئے گئے ہیں وہ بھی یقینی نہیں ہیں اور ہم یقیناً یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ ناموس الٰہی کیا ہے؟ جہاں تک انسانی علم اور ذرائع علم کا تعلق ہے انسان صرف حقیقت سے مانوس ہو سکتا ہے۔ ہمارے پاس اس کائنات کے ناموس اکبر کے بارے میں بھی حقیقی ذریعہ اطلاع اور ذریعہ علم صرف خالق کائنات کا پیغمبر ہے۔ قرآن کریم بہرحال یقینی طور پر یہ بتاتا ہے کہ اس کائنات کے اندر ایک قانون توحید جاری و ساری ہے۔ اور اس قانون توحید کو اللہ رب العزت نے جاری کیا ہے اور یہ کائنات اور اس کے اندر بسنے والی تمام مخلوقات صرف اسی رب واحد کی غلام ہے۔ اور اس کا فرض ہے کہ وہ رب کی بندگی کرے۔ جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے تو ہم صرف اس کائنات کے جاری و ساری نظام ہی کو دیکھ سکتے ہیں جو ایک قاعدے کے مطابق چل رہا ہے۔

یہ ناموس اکبر جو اس عظیم کائنات کے اندر اللہ کی مشیت اور تقدیر نے جاری کیا ہے' یہی خود انسان کے اس چھوٹے سے وجود میں بھی جاری ہے کیونکہ انسان بھی اس کائنات کا ایک کارکن ہے۔ یہ بھی اپنی فطرت میں جکڑا ہوا ہے جسے اپنی فطری حرکات کا عقلی احساس بھی ضروری نہیں ہے کہ ہو' اس لئے وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے ادراک رکھتا

ہے اور یہ ادراک حقیقت اس کی فطرت کی گہرائیوں میں ہے۔ اس کی ذات اس کا شعور بھی رکھتی ہے۔ وہ اس کے مطابق تصرف کرتا ہے۔ جب تک کہ خلل و فساد اس پر طاری نہ ہو جائے۔ اس خلل و فساد کی وجہ سے اس کا ذاتی ادراک ماند پڑ جاتا ہے اور انسان عارضی حالات کے تابع ہو جاتا ہے۔ اور اب وہ بیرونی عوامل کے مطابق چلتا ہے۔ اور اس کا اندرونی عامل اپنا کام چھوڑ دیتا ہے۔

یہ ناموس فطرت بذات خود اللہ اور بندے کے درمیان ایک عقد ہے اور یہ عقد انسان کے وجود کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ اپنی پیدائش کے وقت سے وہ ہر خلیے میں رکھ دیا جاتا ہے اور یہ عقد آدم علیہ السلام کے وقت سے آج تک جاری و ساری ہے۔ انسان کا ہر خلیہ ربوبیت کا اقرار کرتا ہے اور اسی اقرار اور عقد یعنی ناموس قدرت کے مطابق دنیا میں آتا ہے۔ لہٰذا اس فطری عقد کے بعد مزید کسی دلیل و حجت کی انسان کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چاہے یہ دلیل بلسان الحال ہو یا بلسان القول ہو۔ لہٰذا اب انسان کے لئے یہ بات مفید نہ ہوگی کہ وہ کہے کہ میں تو غفلت کا شکار ہو گیا تھا اور میں نے کتاب اللہ اور رسول اللہ کی تعلیمات سے لاپرواہی برتی تھی۔ یا کوئی شخص یہ بہانہ نہیں پیش کر سکتا کہ جب وہ کائنات میں وارد ہوا تو میرے آباء و اجداد اور ماحول میں شرک ہی شرک تھا اور عقیدۂ توحید کی قبولیت کے لئے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ لہٰذا وہ اپنے عقائد و اعمال کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اللہ نے صاف صاف وضاحت فرما دی۔

اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ (۷:۱۷۳) "یہ ہم نے اس لئے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ "ہم تو اس بات سے بے خبر تھے" یا یہ نہ کہنے لگو کہ "شرک کی ابتداء تو ہمارے باپ دادانے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے' پھر کیا آپ ہمیں اس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کاروں نے کیا تھا"

لیکن یہ اللہ کی نہایت ہی مہربانی ہے کہ اللہ کو معلوم تھا کہ انسان میں ہدایت اور ضلالت دونوں کی استعداد ہے۔ اور یہ کہ انسان اپنے اس فطری عہد کے باوجود انحراف اختیار کر سکتا ہے۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے صحیح راہ سے شیاطین جن و انس منحرف کرتے ہیں اور یہ جن و انس کے شیاطین بڑی ہوشیاری سے انسان کی کمزوریوں کو کام میں لاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے رحم یہ فرمایا کہ اس نے انسان کو محض اپنی فطری صلاحیت پر ہی ذمہ دار ہدایت نہیں ٹھہرایا۔ اور نہ اپنی عقلی اور فطری قوت ادراک اور تمیز پر اس سے جواب طلبی فرمائی۔ بلکہ اس کے باوجود اللہ نے رسول بھیجے جنہوں نے تفصیلات کے ساتھ آیات و دلائل پیش کئے تاکہ وہ فطرت کے اوپر چڑھے ہوئے زنگ کو اتاریں۔ اسے صیقل کریں اور انسان کو خواہشات اور شہوات کی بندگی سے چھڑائیں۔ اگرچہ اللہ کو معلوم تھا کہ رسولوں اور دعوتوں کے بغیر بھی انسان کی ہدایت کے لئے اس کی فطری استعداد اور عقلی قوت کافی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اللہ نے حساب و کتاب کا مدار رسالت اور دعوت پر رکھا ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۷:۱۷۴) "دیکھو اس طرح ہم نشانیاں واضح

طور پر پیش کرتے ہیں ۔ اور اس لئے کرتے ہیں کہ یہ لوگ پلٹ آئیں ۔"

یہ آیات و ہدایات اس لئے اتاری گئیں کہ انسان راہ فطرت پر واپس آ جائے اور اس صلاحیت کو کام میں لائے جو اس کی فطرت کے اندر موجود ہے ۔ یعنی ان فطری صلاحیتوں اور عقلی ادراک کی وجہ سے بھی وہ بجا طور پر حقیقت کا ادراک کر سکتا تھا لیکن اللہ نے رسول اور ہدایات اس لئے ارسال کیں کہ وہ راہ ہدایت پا لے ۔ اور یاد دہانی اور ذراوے سے استفادہ کرے ۔

---()()()---

اب ' فطرت کی راہ سے انحراف کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے ' جس میں ایک شخص اپنا عہد فطرت توڑتا ہے اور ہدایت کے بعد اللہ کی آیات اور نشانات سے پھر جاتا ہے ۔ اللہ نے اپنی آیات اور دلائل اس کے سامنے بکھیر دیئے ' وہ اپنی فکر و نظر سے انہیں دیکھ سکتا تھا اور ان میں غور کر سکتا تھا ۔ لیکن وہ اس سے نکل بھاگا اور وہ اس طرح نکل گیا جس طرح کوئی اپنے لباس سے نکل جائے اور زمین پر گر جائے اپنی نفسانی خواہشات کے تابع ہو جائے اس نے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے میثاق کو مضبوطی سے نہ پکڑا اور نہ ان آیات نے نے اس کے لئے ہدایت کا سامان فراہم کیا ۔ شیطان اس پر حاوی ہو گیا اور وہ اللہ کے دائرۂ امن سے نکل گیا ۔ گمراہ ' بے قرار ' اور ادھر ادھر بھاگتا رہا ۔

لیکن قرآن کریم نے اس شخص کی مثال نہایت ہی معجزانہ انداز میں دی ہے ۔ اس مثال میں ایک متحرک منظر ہے ۔ جس میں اس شخص کے خدوخال بالکل واضح نظر آتے ہیں ۔ اس منظر کے تاثرات نہایت حقیقی اور واقعات فطری اور عبارت نہایت ہی زندہ اور اشاریت سے بھرپور ہے ۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَاۗءَ مَثَلَا ۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

"اور اے نبی " ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا ۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا ۔ یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا ۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعے سے بلندی عطا کرتے ' مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا ' لہذا اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو

تب بھی زبان لٹکائے رہے - یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں -

تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو' شاید کہ یہ کچھ غور و فکر کریں- بڑی ہی بری مثال ہے ایسے لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرتے رہے ہیں -"

یہ ایک عجیب منظر ہے' جدید ترین فنی تصویر کشی - الفاظ کی تصویر کشی - ایک شخص کو آیات و نشانات دیئے جاتے ہیں' اسے فضل و کرم کی خلعت پہنائی جاتی ہے' اس کو علم کا لباس دیا جاتا ہے اور اسے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں کہ وہ راہ ہدایت لے' اللہ سے جڑے اور سربلندی اختیار کرے لیکن وہ اس صورت حالات سے اپنے آپ کو نکال دیتا ہے - لباس فاخرہ کو اتار کر ننگا ہو جاتا ہے اور سربلندی اور طہارت کے بجائے کیچڑ میں اپنے آپ کو لت پت کر دیتا ہے - خواہشات نفس کے پیچھے بھاگ رہا ہے - اس نے پہلا فطری عہد بھی توڑ دیا - پھر اس نے ان آیات و دلائل کو بھی ترک کر دیا جن میں اس کے لئے سامان ہدایت تھا - وہ آیات و ہدایات سے نکل رہا ہے یوں کہ یہ آیات و ہدایات اس کے لئے گویا گوشت پوست ہیں اور یہ زبردست جدوجہد نہایت مشقت کے ساتھ ان سے نکل رہا ہے - یوں جس طرح زندہ انسان سے چمڑا کھینچا جا رہا ہو - حقیقت یہ ہے کہ دلائل ایمان انسانی جسم کے ساتھ اس طرح چمٹے ہوئے ہیں جس طرح چمڑا جسم کے ساتھ پیوستہ ہوتا ہے - وہ آیات سے نکل رہا ہے - وہ گویا ننگا ہو رہا ہے' اپنے آپ کو بچانے والے گوشت و پوست سے نکل رہا ہے اور راہ ہدایت کو چھوڑ کر خواہشات نفسانیہ کے پیچھے بھاگ رہا ہے - گویا وہ آفاق کی سربلندیوں سے گر کر کیچڑ میں لت پت ہو رہا ہے - یوں شیطان اس پر حملہ آور ہوتا ہے اور اب اس کے بچانے والا کوئی ذریعہ نہیں ہے - چنانچہ شیطان اس کے پیچھے پڑتا ہے اور اسے اپنے قابو میں لے آتا ہے - اب ہم اچانک ایک نہایت ہی خوفناک منظر کے سامنے ہیں - یہ نہایت ہی برا اور پریشان کن منظر ہے - ہمارے سامنے اس قسم کی مخلوق ہے جو کیچڑ میں لت پت ہے - زمین پر گری پڑی ہے - اچانک یہ مخلوق مسخ ہو کر کتے کی شکل میں آ جاتی ہے' تم اسے دھتکارتے ہو تب بھی زبان لٹکائے ہوئے ہے اور اگر تم اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے ہوئے ہے - غرض یہ متحرک مناظر تسلسل کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں - ہماری قوت متخیلہ ان مناظر کے ساتھ ساتھ چلتی ہے نہایت روشن تاثرات لئے ہوئے چلتی ہے - اور جب ہماری متخیلہ اس آخری منظر پر پہنچتی ہے جس میں ایک کتا زبان لٹکائے ہوئے نظر آتا ہے تو اچانک اس پورے منظر پر درج ذیل تبصرہ سنا جاتا ہے -

ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۱۷۶) سَآءَ مَثَلَاِ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ

(۷:۱۷۷) "یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں - تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو' شاید کہ یہ کچھ غور و فکر کریں - بڑی ہی بری مثال ہے ایسے لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرتے رہے ہیں -"

یہ ہے ان کی مثال - حقیقت یہ ہے کہ ہدایت کے دلائل اور ایمان کے موجبات خود ان کی فطرت میں سے ہوتے

تھے اور یہ دلائل اور اشارات ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کے اندر بھی موجود تھے' لیکن یہ لوگ اپنے آپ کو کھینچ کر ان سے نکال لائے - اب یہ مسخ شدہ اجسام تھے' جو ننگے تھے اور مقام انسانیت سے گر کر یہ لوگ حیوانیت تک اتر آئے تھے - یہ اس کتے کی طرح تھے جو کیچڑ میں لت پت ہو - ان کے پاس تو ایمان اور دلائل ہدایت کے وہ پر تھے جن کے ذریعے یہ اعلیٰ علیین تک پرواز کر سکتے تھے - ان کی تخلیق بھی بہترین ڈیزائن میں ہوئی تھی لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے اعلیٰ علیین کے مقابلے میں اسفل سافلین کے مقام کو اپنے لئے پسند کیا - "بڑی ہی بری مثال ہے ایسے لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے -"

کیا اس مثال سے کوئی اور بری مثال ہو سکتی ہے کہ کوئی خود اپنی کھال سے کھینچ کر باہر نکل آئے اور ہدایت سے بالکل ننگا ہو جائے اور یہ کہ کوئی خواہشات نفسانیہ کی تسکین کے لئے کیچڑ میں لت پت ہو - ان لوگوں سے زیادہ اپنے اوپر ظلم کرنے والا اور کون ہو گا کہ وہ خود اپنی ہی کھال کھینچ کر اپنی ہڈیوں اور گوشت کو ننگا کر دے - اپنے حامی اور مددگار کو تباہ کر دے اور اپنے گوشت کو شیطانی درندوں کے نوچنے کے لئے ننگا اور آسان کر دے - اور پھر شیطان ایسے شخص کو مرتبہ انسانیت سے گرا کر مرتبہ حیوانیت تک لے آئے اور وہ اسی طرح حیران و پریشان ہو جائے جس طرح باؤلا کتا زبان لٹکائے ہوئے ہوتا ہے -

یہ قرآن کریم ہی کا حصہ ہے کہ اس نے ایسی صورت حالات کی تصویر کشی ایسے موثر الفاظ میں کی' اس طرح کہ اس کا اعجاز بالکل واضح ہے -

سوال یہ ہے کہ آیا ایسے لوگوں کی کوئی مخصوص مثال بھی اس وقت تھی یا ایک عمومی بات کو یہاں مثال کی شکل میں لایا گیا ہے؟ کیا ان مثالوں کے مصداق کے بارے میں ذخیرہ روایات میں کچھ ہے؟

بعض روایات میں آتا ہے کہ فلسطین میں ایک صالح شخص تھا - یہ اس سے قبل گزرا ہے جب بنی اسرائیل فلسطین میں داخل ہوئے تھے - اس شخص کے انحراف اور اس کی اخلاقی بربادی کا ایک طویل قصہ بیان کیا جاتا ہے - بہرحال وہ شخص بھی اس مثال کا مصداق بن سکتا ہے لیکن چونکہ یہ اسرائیلی روایات اسلامی تفاسیر میں داخل ہو گئی ہیں لہٰذا اس قصے کی تمام تفصیلات کو درست تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے - پھر ان اسرائیلی روایات کے اندر چونکہ بے حد اختلاف و اضطراب ہے' اس لئے بھی ان کے بارے میں محتاط رویہ اختیار کرنا ضروری ہے -

روایات میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص بلعام ابن باطور نامی تھا' یہ شخص فلسطین کے جابر حکمرانوں میں سے تھا - اور بعض نے کہا ہے کہ یہ عربوں کا امیہ ابن الصلت تھا - بعض روایات مین ابو عامر فاسق کو اس کا مصداق قرار دیا گیا ہے - بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ شخص حضرت موسیٰ کے معاصر تھا - بعض روایات میں ہے کہ یہ حضرت یوشع ابن نون کے دور میں تھا - اور حضرت یوشع ابن نون نے تیہ میں بنی اسرائیل کی چالیس سالہ سرگردانی کے بعد ان جابر حکمرانوں کے ساتھ معرکہ آرائی کی تھی - جبکہ موسیٰ علیہ السلام کے دور میں ان جباروں کے ساتھ معرکہ آرائی کرنے سے بنی اسرائیل نے معذرت کر دی تھی - انہوں نے حضرت موسیٰ سے کہہ دیا تھا کہ جاؤ تم اور تمہارے رب دونوں لڑو' ہم یہاں بیٹھے ہیں - بعض روایات میں آتا ہے کہ اس شخص کو جو آیات دی گئی تھیں وہ اسم اعظم تھا - جس کے ساتھ ہر دعا مستجاب ہوتی ہے - بعض روایات میں آتا ہے کہ اس شخص کو کتاب الٰہی دی گئی تھی - یہ نبی تھا اور اس کے بعد اس

کے بارے میں بڑی اختلافی بحثیں ہوئیں۔

یہاں ظلال القرآن میں اپنے منہاج کے مطابق ہم ان تفصیلات میں نہیں جاتے۔ اس لئے کہ قرآن کریم نے نص میں ان تفصیلات کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا' نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلے میں کوئی مرفوع حدیث منقول ہے۔ بہرحال قرآن کریم نے جس واقعی صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اس دنیا میں انسانی تاریخ میں بار بار دہرائی جاتی ہے کہ ایک شخص کے سامنے آیات دلائل پیش ہوئے ہیں۔ وہ ان کی حقانیت کو جانتے ہیں لیکن ان کو تسلیم کر کے اپنی زندگی کو ان کے مطابق درست نہیں کرتے۔ اکثر لوگ جنہیں دینی علم دیا جاتا ہے لیکن وہ خود اپنے علم سے ہدایت نہیں لیتے بلکہ وہ اپنے علم کو تحریف کتاب کا ذریعہ بناتے ہیں اور یہ لوگ ذاتی خواہشات کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ ان لوگوں کی خواہشات اور ان لوگوں کے اوپر تسلط حاصل کرنے والوں کی خواہشات یعنی اس عارضی دنیا کے مفادات کے ہاتھ ہی میں ان کی تکمیل ہوتی ہے۔

ہم نے کئی علمائے دین کو دیکھا ہے کہ وہ ایک حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن وہ لائن پر نہیں آتے۔ ادھر ادھر ہو جاتے ہیں بلکہ اپنی زبان سے ایسی باتوں کا اعلان کرتے ہیں جنہیں خود بھی سچا نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگ اپنے علم کو تحریف و انحراف کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اور اپنے فتاوی اہل اقتدار کے حق میں استعمال کرتے ہیں اور اس طرح وہ ایسے اہل اقتدار کو اور مضبوط کرتے ہیں جو اس زمین پر اللہ کے اقتدار کے لئے چیلنج ہوتے ہیں۔

ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قانون صرف اللہ کا حق ہے' اور جو شخص قانون سازی کا حق اپنے لئے مخصوص کرے وہ دراصل مدعی الوہیت ہے اور جو شخص بھی خدائی کا دعویٰ کرے وہ کافر ہے۔ جو شخص کسی انسان کے لئے اس حق کو تسلیم کرے وہ بھی کافر ہے۔ اس کے باوجود اور اس بات کو جانتے ہوئے وہ ان لوگوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتا جو اپنے آپ کو قانون ساز کہتے ہیں اور الوہیت اور خدائی کے مدعی ہیں اور جن کے بارے میں خود اس عالم دین نے فتویٰ دے رکھا ہے کہ وہ کافر ہیں بلکہ یہ عالم دین ایسے لوگوں کو مسلمان بھی کہتا ہے اور جو وہ کرتے ہیں اس کو اسلام کہتا ہے اور اس کے بعد وہ ایک سال جو کچھ لکھتا ہے تو سود کو حرام قرار دیتا ہے اور دوسرے سال اپنی تحریروں میں سود کو حرام قرار دیتا ہے۔ ان میں سے بعض لوگ فسق و فجور کو ایک مبارک امر قرار دیتے ہیں۔ فسق و فجور کو اسلامی نام اور عنوان دیتے ہیں اور اسے اسلامی لباس میں لاتے ہیں۔

اب یہ شخص کیا اس تبصرے کا مصداق نہ ہو گا کہ جسے اللہ نے ایسی آیات دیں اور علم دیا اور وہ اللہ کے دلائل و علم سے نکل بھاگا' شیطان نے اسی پر گرفت مضبوط کر لی اور یہ شخص گمراہیوں میں سے ہو گیا۔ قرآن کریم جس شخص کے بارے میں خبر دے رہا وہ شخص اسی کا مصداق ہو گا۔ اس کو اللہ نے علم دیا' سربلندی کے ذرائع دیئے لیکن وہ بلندیوں کی طرف سفر کرنے کے بجائے پستیوں کی طرف گرتا رہا۔ ذرا قرآن کریم کے اس تبصرے اور اس خبر کو پڑھئے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ (۱۷۵) وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ

الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ (۷: ۱۷۶) "اور اے نبی" ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا۔ یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔

جس شخص کی خبر قرآن دے رہا ہے یہی ہمارے دور کے ایسے لوگوں پر صادق آتی ہے۔ یہ مثال ہر اس شخص پر فٹ ہے جسے اللہ نے علم دیا تکال کے لیکن وہ اس علم کے تقاضوں پر نہ چلا۔ اس نے ایمان کی راہ اختیار نہ کی' اللہ کی نعمتوں سے کھینچ کر نکل گیا۔ اور شیطان کا تابع مہمل ہو گیا۔ اب وہ باؤلے کتے کی طرح زبان لٹکائے پھرتا رہے گا۔

جس طرح قرآن ہمارے احساس میں ڈالتا ہے۔ یہ شخص اغراض دنیا کے پیچھے زبان لٹکائے بھاگ رہا ہے اور اغراض دنیا ہی کی وجہ سے یہ انعامات الٰہیہ سے اپنے آپ کو کھینچ کر باہر لے آیا ہے۔ اور یہ کتے کی طرح زبان لٹکائے ہوئے ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ایسا شخص اغراض دنیا کی جانب سے کبھی بھی مطمئن نہ ہو گا۔ جس شخص کی نکیل اغراض دنیا کے ہاتھ میں چلی جائے وہ ان سے چھوٹ نہیں سکتا' چاہے تم انہیں ہزار وعظ و نصیحت کرو۔ وہ اس راہ پر زبان لٹکائے سرکاری دفاتر کا طواف کرے گا اور کرتا رہے گا۔

انسانی زندگی کا گہرا مطالعہ کیجئے۔ اس مثال کا مصداق تو ہر جگہ اور ہر زمانے میں موجود ہے۔ بلکہ زمانے گزر جاتے ہیں اور ایسے لوگ ہر طرف نظر آتے ہیں۔ ہر طرف سے بڑھے چلے آتے ہیں اور جن لوگوں کو اللہ بچا لیتا ہے وہ قدرت نادرہ ہوتے ہیں۔ جو آیات الٰہیہ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہوتے ہیں' جو زمین کی پستیوں کی طرف آنے کے بجائے بلندیوں کی طرف اٹھتے ہیں' جو خواہشات نفسانیہ کو دباتے ہیں جنہیں شیطان ذلیل نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ اپنی ناک میں ایسی نکیل نہیں ڈالتے سمت نہیں جاتے جس کا سرا اہل اقتدار کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ غرض یہ ایک ایسی تمثیل ہے جس کے مصداق کبھی ختم نہیں ہوتے۔ ہر وقت وارد اور موجود رہتے ہیں۔ تعجب ہے کہ آپ ایسے لوگوں کو بہت دور بنی اسرائیل کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں۔

حضور ؐ کو حکم دیا گیا کہ آپ اپنی قوم پر یہ آیات پڑھیں اور انہیں خبردار کریں کہ وہ ان آیات الٰہیہ سے اپنے آپ کو کھینچ کر باہر نہ کر دیں۔ لہٰذا حضور کے بعد ہمیں ان آیات کی تلاوت کر کے لوگوں کو سمجھانا چاہئے کہ وہ ان آیات کی مضبوط پناہ گاہ سے اپنے آپ کو باہر نہ نکالیں۔ اور ان کو اللہ کے علوم میں سے جو حصہ ملا ہے' اسے ترک کر کے وہ اس انجام تک اپنے آپ کو نہ پہنچائیں۔ نیز اپنے آپ کو اس صورت حال میں مبتلا نہ کریں کہ انسان کتوں کی طرح زبان لٹکائے خواہشات دنیا کے پیچھے بھاگتا پھرے' جن کی کوئی انتہا نہیں ہے اور اپنے آپ پر وہ ظلم نہ کریں جو ایک دشمن اپنے دشمن پر بھی نہیں کرتا کیونکہ اپنے آپ کو ایسی شکل میں ڈال کر وہ صرف اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔

ہم نے اپنے دور میں ایسے اہل علم کو دیکھا ہے کہ جو اپنے اوپر اس قسم کے ظلم کرنے میں بہت ہی حریص ہیں۔ ایسے لوگ ہیں جو جہنم کے ٹھکانے کے حصول کے لئے اپنی پوری قوت صرف کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ صبح سے شام تک اپنے لئے جہنم کے ٹھکانے کو مضبوط کر رہے ہیں اور رات دن زبان لٹکائے اس کے پیچھے پھر رہے ہیں نہ ان پر نصیحت کا اثر ہوتا

ہے اور نہ کسی کی دھتکار کا۔ ایسی ہی حالت میں یہ لوگ آخر کار اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔ اے اللہ ہمیں بچائیو! ہمارے قدم مضبوط کیجیو۔ اور ہم پر صبر کی بارش کیجیو اور ہمیں اہل اسلام کے ساتھ موت اور خیر نصیب کیجئے۔

---

قرآن کریم نے ایک شخص کے بارے جو خبر ایک تمثیل کی صورت میں دی ہے ہمیں چاہئے کہ ہم اس پر قدرے طویل اور دوبارہ غور کریں۔

یہ ایک ایسے صاحب علم کی تمثیل ہے 'جس پر خواہشات نفس اور لذات دنیاوی اس قدر بوجھ ڈال دیں کہ وہ اس بوجھ کو نہ سہار سکے اور زمین پر گر جائے اور ان شہوات کی جاذبیت کی وجہ سے وہ براہ راست ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے۔ وہ اپنی خواہشات نفس کے پیچھے پڑ جائے اور شیطان اس کے پیچھے پڑ جائے اور اسے اپنی گرفت میں لے کر اپنی مرضی سے چلانا شروع کر دے اور اس کے منہ میں خواہشات نفسانیہ کی لگام پڑی ہو۔

چونکہ صرف علم انسان کو نجات نہیں دے سکتا۔ اسی لئے قرآنی منہاج تربیت نفس انسانی کی تربیت اور اسلامی زندگی کی ترویج کے لئے ایک خاص منہاج وضع کرتا ہے۔ اسلام صرف علم پیش نہیں کرتا بلکہ علم کو ایک زندہ اور متحرک شکل دیتا ہے تاکہ اسلامی مقاصد ذہنی اور فکری دنیا میں بھی سامنے آئیں اور عملی زندگی میں بھی سامنے آئیں۔

اسلامی منہاج یہ نہیں ہے کہ اسلامی عقائد کو محض نظریات کی شکل میں پیش کرے۔ محض تحقیق و توفیق کے لئے۔ اور انسان کے فکر و نظر اور اس کے عمل اور تگ و دو پر اس کا کوئی اثر نہ ہو۔ اس قسم کی مجرد تحقیقات محض جامد علم ہوتی ہیں' ایسا علم انسان کو خواہشات نفسانیہ کی زد سے نہیں بچا سکتا۔ نہ دنیا میں اسے سربلند کر سکتا ہے' خصوصاً سفلی جذبات و خواہشات سے۔ ایسا علم شیطان کا مقابلہ نہیں کر سکتا بلکہ یہ شیطان کے لئے راہ ہموار کرتا ہے اور اس کی وجہ سے انسان شیطان کی غلامی اختیار کر لیتا ہے۔

اسلام دین کے بارے میں محض تحقیقات میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ مثلاً اسلامی نظام کے بارے میں "تحقیقات" اسلامی فقہ کے بارے میں "تحقیقات"' اسلام کے اقتصادی نظام کے بارے میں "تحقیقات" اسلام کے سائنسی نظریات کے بارے تحقیقات 'علوم نفس کے بارے میں اسلامی تحقیقات وغیرہ وغیرہ۔

اسلام عقائد اسلامی کو ایک متحرک' ترقی پذیر' زندہ اور بیدار اور غالب اور سربلند ہونے والے عقائد کی شکل میں لاتا ہے۔ عقل و نظریہ پر چھانے کے بعد یہ عقائد فوراً ایک مسلمان کو اسلامی مقاصد پورے کرنے کے لئے متحرک کر دیتے ہیں۔ جب کسی مردہ ضمیر آدمی کے قلب و نظر میں بھی یہ عقائد جاگزیں ہوتے ہیں تو اسے زندہ کر دیتے ہیں۔ اور یہ عقائد قبول کرنے والا اپنے آپ کو جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اسلام کی سربلندی کے لئے جدوجہد شروع کر دیتا ہے۔ اس کی فطرت فوراً پہلے فطری عہد کی طرف لوٹ جاتی ہے اور یہ شخص بلند مقاصد کے لئے متحرک ہو جاتا ہے اور اسے دنیا کی آلودگیاں اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتیں۔ یہ کبھی فسق و فجور کے کیچڑ میں لت پت نہیں ہوتا۔ قرآن اسلام کو ایک منہاج فکر و تدبر کی صورت میں پیش کرتا ہے اور یہ دنیا کے تمام مناہج سے ممتاز نظر آتا ہے۔ یہ آیا ہی اس لئے ہے کہ دنیا کے دوسرے نظاموں کو کوتاہیوں کی نشاندہی کرے' ان کی غلطیوں اور کج رویوں کی اصلاح کرے' ان پر سے جسمانی اور مادی بوجھ اتار دے اور انہیں شیطان کی گمراہیوں سے نجات دے۔

قرآن اسلام کو حق و باطل کے لئے ایک معیار اور میزان کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس معیار کے ذریعہ لوگوں کے ذرائع ادراک اور ان کی عقلوں کو پرکھا جاتا ہے' لوگوں کی حرکات' ان کے رجحانات اور ان کے تصورات کو اس کے مطابق جانچا جاتا ہے۔ اسلام سے قبل دنیا میں کوئی ایسا معیار نہ تھا کہ اسے کام میں لایا جاتا اور یہ میزان اور معیار جسے رد کر دے وہ ردی ہو گا اسے پھینک دیا جائے گا۔

اسلام انسانیت کو ترقی دے کر ایک نہایت ہی بلند مقام تک لے جانا چاہتا ہے لیکن شاہراہ ترقی پر اسلام اسے نہایت ہی دھیمی رفتار سے لے جانا چاہتا ہے۔ یہ کام وہ اپنے منصوبے اور اپنے اندازوں کے مطابق کرتا ہے' ترقی کی اس شاہراہ پر چلنے کے لئے اسلام لوگوں کو اپنا ایک مفصل نظام زندگی دیتا ہے۔ ان کو ایک مفصل نظام قانون دیتا ہے' ان کو ایک مستقل نظام اقتصاد دیتا ہے' ان کے لئے سوسائٹی کے اصول اور سیاست کے اصول متعین کرتا ہے' اس کے بعد وہ لوگوں کو وضع اصول کے بعد آزادی دیتا ہے کہ ان اصول کی روشنی میں وہ اپنے لئے تفصیلی نظام وضع کریں۔ کائناتی امور میں انسان انکشافات کرتے ہیں اور نفسیاتی دنیا کے لئے' قواعد بناتے ہیں اور اپنی عملی زندگی کو منضبط کرتے ہیں۔ یہ اس دنیا میں رات و دن ترقی کرتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں حرارت ایمان موجود رہتی ہے۔ وہ ایک حقیقی نظام قانون وضع کرتے ہیں اور اس سے وہ اپنی تمام ضروریات کا حل نکالتے ہیں۔

اس طرح اسلامی نظام حیات' اسلامی زندگی کی شکل میں نفس انسان کی قیادت کرتا ہے' رہی وہ تحقیقات جو محض نظری قیل و قال تک محدود ہوتی ہیں تو ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ نہ تو شیطان کے مقابلے میں ایک فرد کو فائدہ دے سکتا ہے اور نہ اسلامی خطوط پر انسانی زندگی کو عملاً منظم کر سکتا ہے' نہ انسانی زندگی کو ترقی کی راہ پر ڈال سکتا ہے۔ اس منظر میں جو مثال دی گئی ہے' اب اس پر یہاں ایک مختصر تبصرہ کیا جاتا ہے' اس شخص کی مثال جسے اللہ نے اپنی ہدایات دیں مگر وہ ان سے نکل گیا' تبصرہ یہ ہے کہ ہدایت دراصل وہی ہوتی ہے جو من جانب اللہ ہو' جسے اللہ ہدایت دینا چاہے وہی ہدایت پر ہے اور جسے اللہ گمراہ کر دے وہ ہمیشہ کے لئے خسارے میں پڑ جاتا ہے۔ اب وہ کسی معاملے میں بھی نفع نہیں کما سکتا۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

"جسے اللہ ہدایت بخشے بس وہی راہ راست پاتا ہے اور جس کو اللہ اپنی رہنمائی سے محروم کر دے' وہی ناکام و نامراد ہو کر رہتا ہے۔"

اور اللہ تعالیٰ صرف اسی شخص کو ہدایت دیتا جو ہدایت کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ دوسری سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا "جو لوگ ہمارے بارے میں جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کو ضرور اپنے راستوں کی طرف راہنمائی کریں گے۔" اور دوسری جگہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ "اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت بدلنے کی سعی نہ کرے اور دوسری جگہ ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ

مَنْ دَسّٰهَا ''اور وہ نفس کی اور یہ جو اسے برابر کیا اور اسے برائی اور خدا خوفی سے آگاہ کیا۔ وہ کامیاب ہوا جس نے اس نفس کو پاک کیا اور وہ ناکام ہوا جس نے اسے ناپاک کیا۔''

جو شخص دلائل ہدایت کو ترک کر کے اپنے لئے راہ ضلالت کو پسند کر لیتا ہے اللہ بھی اسے گمراہ کر دیتا ہے کیونکہ ایسا شخص اپنے دل' اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں کو ہدایت کے لئے بند کر دیتا ہے اور اسی سیاق و سباق میں درج ذیل آیت اسی مفہوم کو ظاہر کر رہی ہے۔

---

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

''اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے' یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔''

اور دوسری جگہ فرمایا گیا فِی قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ''ان کے دل میں بیماری ہے' پس اللہ نے بھی ان کی بیماری کو زیادہ کر دیا۔'' اور ایک دوسری آیت میں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ''وہ لوگ جنہوں نے کفر کو اختیار کیا اور اپنی جانوں پر ظلم کیا' اللہ بھی ان کو بخشنے والا نہیں ہے اور نہ انہیں صحیح راستے کی ہدایت دیتا ہے' ماسوائے جہنم کے راستے کے جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔''

ان تمام آیات پر غور و فکر کرنے کے بعد جن میں ہدایت و ضلالت کا ذکر ہے اور ان کے مفہوم کے اندر تطبیق اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے بعد صرف ایک ہی تشریح و تطبیق ممکن ہے جس میں دل کا اطمینان بھی ہے اور وہ ان لاہوتی جدلیات سے بھی پاک ہے جن میں اسلامی متکلمین' یہودی' عیسائی اور دوسرے مذاہب فلسفہ ہمیشہ باہم دست و گریبان رہے ہیں' وہ یہ کہ اس کائنات میں اللہ کا نظام قضا و قدر اللہ کی مشیت کے ایک وسیع دائرے کے اندر کام کرتا ہے۔ اس دائرے کے اندر انسان کی تخلیق ہوئی ہے اور اس نظام قدر کے مطابق انسان کے اندر ہدایت اور ضلالت کی دہری صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ انسان کی فطرت مخلوقہ کے اندر ہی یہ فطری عہد رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اللہ وحدہ کی معرفت حاصل کرے اور ربوبیت کا اعتراف کرے' پھر انسان کو ہدایت و ضلالت کی دہری صلاحیت کے ساتھ عقل کی قوت تمیز بھی دی گئی ہے جو ہدایت و ضلالت کو پہچانتی ہے۔ اس پر مستزادات رسولوں کے ذریعے دلائل و نشانات ہدایت بھی بھیجے گئے تاکہ انسان کی فطرت پر جو مٹی جم گئی ہو تو

اسے صاف کرتا جائے لیکن ان تمام انتظامات کے ساتھ ساتھ اس میں قبولیت ہدایت و ضلالت کی دہری صلاحیت قائم رہتی ہے اور یہ تمام انتظام اللہ کے دائرہ مشیت' وسیع تر دائرہ مشیت کے اندر ہے۔

اللہ کی مشیت کے اندر اللہ کا نظام قضا و قدر جاری رہتا ہے اور اپنا کام کرتا ہے لہٰذا اس دائرے کے اندر جو شخص ہدایت کا انتخاب کرتا ہے وہ ہدایت کی راہ لیتا ہے' تقدیر اسے ہدایت دیتی ہے اور اگر وہ دلائل ہدایت اور اشارات فطرت کے مطابق نہیں چلتا تو یہ تقدیر اسے راہ ضلالت پر ڈال دیتی ہے۔ اس لئے کہ اس شخص نے اس عقل سے کام نہ لیا جو اسے عطا ہوئی تھی۔ اپنی آنکھوں اور کانوں سے کام نہ لیا جو اس کائنات کے اندر بکھری ہوئی نشانیوں کو دیکھنے کے لئے اسے دی گئی تھی۔ پھر ان ہدایات میں بھی موجود تھیں جو رسولوں کے ذریعے بھیجی گئیں۔

لیکن کوئی شخص جو راہ بھی اختیار کر کے وہ اللہ کے دائرہ مشیت کے اندر رہتا ہے اور جو واقعہ بھی ہوتا ہے اللہ کے نظام قضا و قدر کے اندر رہتا ہے اور اللہ کی قوت کے برعکس نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ کسی انسان کا کسی طرح کا عمل بھی چلتا ہو اللہ کی مشیت کے دائرے کے اندر ہی رہتا ہے' کیونکہ جو کچھ ہوتا ہے تقدیر کے مطابق ہوتا ہے۔ کیونکہ کائنات میں صرف اللہ کی مشیت کام کرتی ہے اور تقدیر اس دائرے کے اندر ہے۔ کیونکہ اللہ کی قوت کے سوا کوئی اور قوت نہیں ہے جو اس قسم کے نظام و واقعات کو وجود میں لا سکتی ہو۔ غرض انسان اس وسیع دائرے کے اندر متحرک ہے اور اسی دائرے کے اندر وہ جو راہ چلتا رہتا ہے۔

یہ ہے وہ تصور جو ان تمام آیات کے مطالعے سے ذہن میں آتا ہے بشرطیکہ ان آیات کو ایک دوسرے کے بالمقابل بطور مناظرہ نہ پیش کیا جائے اور انہیں یکجا پڑھ کر ان کی تطبیق کر کے ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے کتاب الخصائص التصور الاسلامی) آخر میں یہ تبصرہ آتا ہے۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ "جسے اللہ ہدایت بخشے بس وہی راہ راست پر ہے اور جس کو اللہ اپنی رہنمائی سے محروم کر دے وہی ناکام و نامراد ہو کر رہتا ہے۔"

یعنی مذکور بالا تفسیر کے مطابق جو راہ ہدایت لیتا ہے تو اللہ اسے ہدایت دے دیتا ہے' وہ اپنے مطلوب تک پہنچ جاتا ہے۔ اسے راستہ بھی معلوم ہوتا ہے' وہ اسی راستے پر چلتا ہے۔ اور دنیا و آخرت میں فلاح پاتا ہے۔ اور جسے اللہ اپنی سنت کے اصولوں کے مطابق گمراہ کرتا ہے۔ وہ گمراہ ہوتا ہے۔ تو وہ ہمہ پہلو خسارے میں رہتا ہے اگرچہ وہ بظاہر مالدار نظر آئے۔ لیکن وہ خسارے میں ہوتا ہے' کیونکہ اس کی دولت بے حقیقت ہوتی ہے' محض ہوا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شخص نے اپنی ذات کو گنوا دیا ہے' اور جس کی شخصیت گم ہو جائے' اپنی ذات کو ہار جائے اسے کیا نفع ہو گا۔

---ooo---

مذکورہ بالا آیات کی تفسیر میں ہم نے جو کچھ کہا ہے۔ اس کی تائید درج ذیل آیت سے بھی ہوتی ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ

اُولٰئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷: ۱۷۹) ”اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ' یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔“

جن و انس میں سے اکثریت جہنم کے لئے پیدا کی گئی ہے 'اس کے لئے وہ تیار ہو رہے ہیں ' تو ان لوگوں کا یہ انجام کیوں ہے؟ اس اعلان کے دو پہلو ہیں 'ایک یہ کہ اللہ کو پیشگی علم تھا کہ وہ یہ مخلوق جہنم کی راہ لے گی اور جہنم تک پہنچے گی۔ ان لوگوں کا عملاً جہنم کی راہ لینا اللہ کے علم سے متاثر نہیں ہوتا۔ اللہ کا علم تو ہر شے پر محیط اور ازلی ہے۔ اللہ کو پیدائش انسان اور عمل انسان سے بھی بہت پہلے معلوم تھا کہ فلاں فلاں یہ راہ لے گا۔ اللہ کا علم وقوع واقعات پر موقوف نہیں ہے بلکہ پہلے سے ذات باری کا حصہ ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ اپنے علم ازلی سے جو ذات باری کے ساتھ ہے لوگوں کو عالم واقعہ میں اس امر پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ یہ کریں اور دوسری راہ اختیار نہ کریں بلکہ وہ خود اپنی صلاحیت اور ذات کی وجہ سے خود ایسا کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ فرماتے ہیں ”ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں ' ان کے پاس آنکھیں ہیں ' مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں ہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان کے ساتھ سنتے نہیں۔“

ان کو دل و دماغ اس لئے دیئے گئے تھے کہ وہ انہیں کھولیں اور بات کو سمجھنے کی کوشش کریں ' جبکہ پوری کائنات میں دلائل ایمان بکھیرے پڑے ہیں ' پھر رسولوں نے جو پیغام دیا اس میں بھی دلائل و معجزات موجود ہیں اگر دل بصیرت رکھتا ہو اور آنکھیں کھلی ہوں تو ہدایت پا سکتے تھے مگر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور آیات الٰہیہ کو نہ دیکھا۔ انہوں نے کان بند کر لیے اور پیغمبروں کی دعوت کو نہ سنا۔ انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو معطل کر لیا۔ حالانکہ وہ ان کے فائدے کے لئے دی گئی تھیں۔ وہ حیوانات کی طرح غافل رہے لہٰذا وہ جانوروں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے ہوئے ہیں۔“

وہ لوگ جو ان آیات و نشانات سے غفلت برتتے ہیں جو ان کے اردگرد کائنات میں بکھری پڑی ہیں ' جو لوگ اپنی آنکھوں سے ایسے واقعات اور عبرت آموز حادثات دیکھتے ہیں لیکن ان میں ان کو اللہ کا ہاتھ نظر نہیں آتا ' یہ لوگ بے شک جانوروں کی طرح ہیں بلکہ یہ لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ اس لئے کہ مویشیوں کے بھی کچھ فطری وظائف ہوتے ہیں اور ہر جانور انہیں پورا کرتا ہے۔ رہے جن و انس تو انہیں ایک سوچنے والا دل دیا گیا اور دیکھنے والی آنکھ دی گئی ' سننے والے کان دیئے گئے جب انہوں نے دلوں سے نہ سوچا ' آنکھوں سے نہ دیکھا ' اور کانوں سے نہ سنا اور اس پوری کائنات کی رفتار پر سے غافل ہو کر گزر گئے اور اس کے مقاصد و معانی نہ سمجھے ' ان کی آنکھوں نے ان اشارات کو نہ دیکھا جو یہاں ہیں ' ان کی سماعت پر اس پوری کائنات کی چیخ و پکار نے بھی اثر نہ کیا تو یقیناً یہ لوگ اور اس قسم کے دوسرے لوگ جانوروں سے بھی بدتر ٹھہرے جو کم از کم اپنے فطری وظائف تو سرانجام دیتے ہیں۔ اور یہ لوگ جہنم کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور اللہ کی مشیت کے وسیع دائرے میں اللہ کے نظام قضا و قدر کے مطابق پر جہنم کے مستحق ٹھہرے ہیں۔ انہیں مجبور نہیں کیا گیا کہ وہ یہ راہ اختیار کریں بلکہ اللہ کو اس کے علم قدیم کے ذریعے اس کا علم تھا کہ وہ ایسا کریں گے

اور بھریں گے اور جہنم کا ایندھن ہوں گے ۔

---○○○---

توحید کے فطری اور کائناتی میثاق کے منظر کو پیش کرنے کے بعد اور اس میثاق سے انحراف کرنے والوں کی تمثیل کے بعد جو ان لوگوں کے بارے میں ہے جنہیں آیات الہیہ دی جاتی ہیں اور وہ ان سے نکل بھاگتے ہیں ۔ اب یہ حکم دیا جاتا ہے کہ جو لوگ منحرف اور گمراہ ہیں اور جو دعوت اسلامی کا مقابلہ کرتے ہوئے شرک اور کفر کے نمائندے ہیں ' جو اللہ کے ناموں کو بگاڑ کر غلط استعمال کرتے ہیں اور ان سے اپنے بتوں کو موسوم کرتے ہیں ۔

---

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

"اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے اس کو اچھے ہی ناموں سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے نام رکھنے میں راستی سے منحرف ہو جاتے ہیں ۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں ' اس کا بدلہ وہ پاکر رہیں گے ۔"

الحاد کے معنی یہ ہیں کہ کوئی راستی سے منحرف ہو جائے ۔ جزیرۃ العرب میں منحرفین مشرکین نے اللہ کے ناموں میں انحراف اور تبدیلی کر دی تھی اور اللہ کے نام انہوں نے قدرے تغیر کے ساتھ اپنے الہوں اور بتوں کے رکھ دیئے تھے ۔ اَللّٰہُ کو اَللَّات کر کے بت کا نام رکھ دیا ۔ العزیز کو العزیٰ بنا کر ایک دوسرے بت کا نام رکھ دیا ۔ یہاں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے نام کسی اور کے لئے استعمال نہ کرو اور اہل ایمان کا فرض ہے کہ وہ ان ناموں کے ساتھ صرف اللہ کو پکاریں اور الفاظ میں بھی کوئی تحریف اور تبدیلی نہ کریں اور نہ امالہ کریں ۔ اور اگر منحرفین ان ناموں کو غلط استعمال کرتے ہیں تو ان کے ہم محفل نہ ہوں ۔ وہ جانیں اور ان کا خدا جانے ۔ عنقریب انہوں نے اللہ کے سامنے جانا ہے ۔ ان کے ساتھ اللہ حساب و کتاب کرلے گا ۔

یہ حکم کہ جو لوگ اللہ کے ناموں میں الحاد کرتے ہیں ان سے قطع تعلق کر لو صرف اس تاریخی صورت حال تک ہی محدود نہیں جس میں وہ لات اور عزیٰ کے لئے اللہ اور العزیز کو استعمال کرتے تھے ' یہ اسماء الہی کے تحریف لفظی تک محدود ہے ۔ یہ کہ اس کا اطلاق ہر قسم کی لفظی اور معنوی تحریف پر بدستور ہوتا ہے ۔ چاہے وہ تحریف کریں یا انحراف کریں ۔ وہ تصور الہ میں انحراف کریں مثلاً اللہ کے لئے اولاد کے قائل ہوں یا یہ معنوی انحراف کریں کہ اللہ کی مشیت قوانین فطرت میں مقید ہے یا وہ اللہ کے اعمال اور اعمال کی کیفیات کو انسانوں کے اعمال کی کیفیت سے مشابہ قرار دیتے ہیں ۔ یا وہ اللہ کو زمین و آسمان اور آخرت کا الہ تو قرار دیتے ہیں لیکن ان کے نزدیک زمین پر اللہ کی سیاسی اور قانونی حکمرانی نہیں ہے ۔ اللہ کا یہ حق ہے کہ وہ لوگوں کے لئے قانون سازی کرے ۔ لوگ بذات خود یہ حق رکھتے ہیں کہ اپنے لئے قانون سازی کریں اور یہ قانون سازی وہ اپنی عقل ' تجربے اور مفادات کے مطابق کریں ۔ لہٰذا سیاسی اعتبار سے ایسے لوگوں کے نزدیک انسان خود اپنے خدا اور معبود ہیں ۔ یا بعض لوگ بعض دوسرے لوگوں کے خدا اور الہٰ ہیں ۔ یہ تمام افکار اللہ کی ذات و صفات میں الحاد کے ضمن میں آتے ہیں ۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان امور سے اپنے آپ کو

بچائیں اور دور رکھیں - اور جو لوگ اس قسم کا الحاد کرتے ہیں ان کے لئے یہ وعید ہے کہ انہیں سخت سزا دی جائے گی بوجہ اس الحاد کے -

---

اس کے بعد اب ہدایت و ضلالت کے اعتبار سے لوگوں کی اقسام بیان کی جارہی ہیں ' اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ بعض لوگ پیدائشی طور پر جہنمی ہیں -" ان کے دل ہیں مگر ان کے ساتھ سوچتے نہیں - ان کی آنکھیں ہیں مگر ان کے ساتھ دیکھتے نہیں ' ان کے کان ہیں مگر ان کے ساتھ سنتے نہیں -"

ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ کے ناموں میں الحاد کرتے ہیں اور اللہ کے اسمائے حسنیٰ کو غلط جگہ استعمال کرتے ہیں - ان میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جس نے سچائی کو پختگی کے ساتھ پکڑا ہوا ہے اور وہ لوگوں کو بھی سچائی کی طرف بلاتے ہیں - وہ سچائی کے مطابق فیصلے صادر کرتے ہیں اور اس سے ذرہ بھر انحراف نہیں کرتے - ایک گروہ ایسا ہے جو ضد کی وجہ سے حق کا انکار کرتا ہے - اللہ کی آیات کو جھٹلاتا ہے - پہلا گروہ تو وہ ہے کہ ان کا وجود اس سرزمین پر مستحکم ہے - یہ لوگ جمے ہوئے ہیں اور یہ حق کے نگہبان ہیں - اور جو لوگ انحراف کرتے ہیں اور جو ٹیڑھی راہوں پر چلتے ہیں یہ ان کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور جب دوسرے لوگ حق کی تکذیب کرتے ہیں اور حق کو چھوڑ دیتے یہ لوگ حق کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں - رہے فریق مخالف تو ان کا انجام خوفناک ہو گا اور ان کے مقابلے میں اللہ کی تدبیر مستحکم ہو گی -

---

۲۲
وَ مِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ ع۱۰
۱۲
وَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾
وَ اُمْلِیْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ ﴿۱۸۳﴾

"ہماری مخلوق میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ ہدایت اور حق کے مطابق انصاف کرتا ہے - رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا ہے ' تو انہیں ہم بتدریج ایسے طریقہ سے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انہیں خبر تک نہ ہو گی - میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں ' میری چال کا کوئی توڑ نہیں ہے -"

یہ لوگ جو حاملین حق ہیں اگر انسانیت میں یہ نہ ہوں تو انسانیت عزت اور شرف کی مستحق ہی نہ ہو ' یہ گروہ جسے قرآن کریم اسلامی اصطلاح کے مطابق امت کہتا ہے اس دنیا میں ہر وقت کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتا ہے - یہ وہ جماعت ہوتی ہے جس کا ایک ہی نظریہ ہوتا ہے ' جو اس نظریہ اور عقیدے پر باہم منظم اور مربوط ہوتی ہے اور اس کی قیادت بھی ایک ہی ہوتی ہے - یہی امت ہے جو حق پر جمی ہوئی ہے - جو حق پر عمل پیرا ہوتی ہے ' اور یہ اس سچائی کی نگہبان ہوتی ہے - اور یہ اس نظریہ کی شہادت لوگوں پر دیتی ہے اور گمراہیوں کے خلاف اللہ اس امت کے ذریعے شہادت اور حجت قائم کرتے ہیں -

اور ذرا اس کی صفت پر غور کریں۔

يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ (۷: ۱۸۱) "یہ گروہ حق سے ہدایت لیتا ہے اور حق کی ہدایت دیتا ہے اور حق کے مطابق انصاف کرتا ہے۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کرۂ ارض پر سے اس امت کا وجود ختم نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس کے افراد کی تعداد کم ہو جائے۔ یہ لوگ سچائی کی ہدایات دیتے اور اس کے پیرو ہیں اور یہ لوگ کسی بھی وقت اس دعوت سے خاموش نہیں ہوتے۔ وہ اس حق پر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کی طرف بلاتے ہیں۔ وہ اس حق کو اپنے تک ہی محدود نہیں رکھتے بلکہ اسے دوسروں تک بھی پہنچاتے ہیں۔ ان کے اردگرد ایسی قیادت موجود ہوتی ہے اور اس قیادت نے حق کو ترک کر دیا ہوتا ہے اور انہوں نے اپنے اس فطری عہد کو بھی بھلا دیا ہوتا ہے جو انہوں نے اللہ سے کر رکھا تھا۔ غرض اس گروہ کا عمل مثبت ہوتا ہے اور وہ صرف اپنے آپ تک محدود نہیں ہوتے بلکہ وہ اس کے حامل ہوتے ہیں اور دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ اور وہ اس سچائی کے ساتھ قیادت کرتے ہیں۔

ان کی ڈیوٹی یہاں تک ہی ختم نہیں ہو جاتی کہ بس وہ حق کی دعوت دے دیں بلکہ ان کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ لوگوں کی زندگیوں میں اس حق کو قائم کریں۔ اس کے مطابق فیصلے کریں۔ دنیا میں نظام عدل قائم کریں اور ظاہر ہے کہ نظام عدل اس حق کے بغیر قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ حق اس لئے نہیں آیا کہ اسے صرف پڑھایا جائے اور ایک علمی مشغلہ ہو' یہ حق اس لئے بھی نہیں آیا کہ یہ محض وعظ اور نصیحت ہو' بلکہ یہ اس لئے آیا ہے کہ حق لوگوں کے درمیان فیصلے کر دے۔ پہلے وہ لوگوں کے اعتقادی تصورات اور نظریات کے فیصلے کرے کہ کیا عقیدہ درست ہے اور کیا نظریہ غلط ہے۔

چنانچہ حق سب سے پہلے تطہیر افکار کا کام کرتا ہے اور لوگوں کی فکری اساس کو درست کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ حق لوگوں کا ربط اللہ سے قائم کر کے اللہ کے سامنے جو مراسم عبودیت ادا کئے جاتے ہیں ان کو درست کرتا ہے۔ اور اس کے بعد لوگوں کی اجتماعی زندگی کو اس حق پر استوار کر کے اسے ایک نظام زندگی کی شکل میں قائم کرتا ہے۔ لوگوں کی اجتماعی زندگی اور ان کی سوسائٹی کو حق کے اصولوں پر قائم کر کے' اس اجتماعی نظام میں حق کے قوانین اور شریعت کو نافذ کرتا ہے۔ چنانچہ لوگوں کے اخلاق و عادات' ان کے رسم و رواج' ان کے طرز عمل اور سلوک کو سچائی پر منظم اور استوار کیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ درست تصورات اور عقائد کی اساس پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد لوگوں کے طرز فکر' ان کے علوم اور ان کی ثقافتی سرگرمیوں کو بھی اس نظام حق پر ترقی دی جاتی ہے۔ یہ ہے وہ ڈیوٹی جو اس امت کو دی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ امت ممتاز اور متعارف ہے اور یہ اس امت کی شناخت ہے۔

غرض اس دین کا مزاج بالکل واضح ہے اور اس کے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی یا التباس ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ ٹھوس مزاج ہے اور یہ بدل ہی نہیں سکتا' جو لوگ دین میں الحاد کی مساعی کرنا چاہتے ہیں وہ بسا سعی نامسعود کے ساتھ دین کے اس سخت مزاج کو بدل نہیں سکتے۔ یہ لوگ اس سلسلے میں ان تھک مساعی کرتے ہیں مسلسل اپنے تنے جاری رکھے ہوئے ہیں' یہ لوگ ہر قسم کے وسائل و ذرائع کام میں لا کر اس دین کے نقطہ نظر کو بدلنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں تمام تجربات سے استفادہ کرتے ہیں' اس پوری دنیا میں جو لوگ احیائے اسلام کا کام کرتے ہیں اور جو اس سچائی کو سینے سے لگا کر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ان کے خلاف اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ہر حربے کو استعمال کرتے

ہیں۔ ان کو مٹانے کی سعی کرتے ہیں اور انہوں نے تمام اسلامی علاقوں میں اپنے ایجنٹوں کی تنظیمیں اور حکومتیں قائم کر رکھی ہیں ' پھر یہ لوگ ان علاقوں پر دین فروش علماء کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور یہ علماء دین اسلام کی تحریف کا کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ حرام کو حلال کرتے ہیں اور حلال کو حرام کرتے ہیں ' اللہ کی شریعت کو نرم کرتے ہیں اور ہر قسم کے فسق و فجور کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ' اور فحاشی کو رواج دیتے ہیں ' اور فحاشی اور فسق و فجور کو اسلامی عنوانات دیتے ہیں۔ یہ لوگ ایسے لوگوں کو تلاش کرتے ہیں جو جدید مادی ترقیات سے متاثر ہوں ' اور جدید نظریات سے مرعوب ہوں اور انہیں اپنے جھولوں میں بٹھاکر ورغلاتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ اسلام کو اپنی ٹھوس اساس سے ہٹاکر جدید نظریات کا رنگ دیتے ہیں یوں اسلام کے اندر جدید نظریات ' تہذیب جدید کے شعارات اور جدید رسوم اور قوانین اسلام کے نام سے داخل کرتے ہیں۔ یہ لوگ یہ تاثر دیتے ہیں کہ اسلامی تہذیب ایک تاریخی حادثہ تھا اور اسے کسی صورت میں بھی دوبارہ زندہ نہیں کیا جاسکتا۔ نہ اس حادثے کا اعادہ ممکن ہے۔ یہ لوگ اسلام کی عظمت رفتہ کو رفت و گزشت سے تعبیر کر کے مسلمانوں کے جذبات کو سن کرنا چاہتے ہیں اور پھر ان کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ آج اسلام اگر زندہ رہنا چاہتا ہے تو وہ ایک عقیدے اور مراسم عبودیت تک محدود ہو کر زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کا سیاسی اور قانونی نظام نہیں چل سکتا۔ اسلام کے لئے عظمت رفتہ کے قصے کہانیاں ہی بہتر اور کافی و شافی ہیں۔ اگر یہ نہیں تو پھر یہ ممکن ہے کہ اسلام کے اندر اس قدر تغیرات پیدا کئے جائیں کہ وہ جدید دور کے حالات کے تابع ہو جائے اور وہ اپنے آپ کو لوگوں کی خواہشات اور ان کی واقعی صورت حالات کے مطابق ڈھال لے ' اور عالم اسلام میں یہ لوگ خود جو لادینی نظریات رائج کر رہے ہیں ان کو وہ اسلام قرار دینے کے درپے ہیں۔ یہ لوگ قرآن کی ایسی تعبیرات کرتے ہیں جو قدیم قرآن میں متعارف نہ تھیں بلکہ خدا اور جبریل اور مصطفیٰ ؐ کو بھی ان کا پتہ نہ تھا۔ یہ لوگ جس طرح قرآن کو بدلنا چاہتے ہیں اسی طرح اسلامی معاشروں کو بھی بدلنا چاہتے ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ دین اسلام کو ایسے افراد کار ہی نہ ملیں جو اس کے کام کے ہوں۔ عالم اسلام میں یہ لوگ ایسا معاشرہ وجود میں لانا چاہتے ہیں جو جنسی بے راہ روی گندے کے تالاب میں غرق ہو اور لوگ فحاشی اور بدکاری اور بد اخلاقی میں غرق ہوں اور جنہیں دنیاوی عیش و مستی کے سواکسی اور غرض سے سروکار نہ ہو اور وہ دنیا میں اس قدر غرق ہوں کہ انہیں حق و صلاحیت اور اصل قرآنی ہدایات سننے کے مواقع ہی نہ ہوں ' اس طرح کہ غلطی سے بھی ان کے کانوں تک اسلامی ہدایات نہ پہنچ سکیں۔

یہ وہ ہمہ گیر معرکہ ہے جو اس وقت اس امت کے خلاف اور اس دین کے خلاف چار دانگ عالم میں برپا ہے ' وہ امت جو اس دین سے ہدایت لیتی ہے اور اس کی داعی ہے اور جو اس کا نظام عدل دنیا میں قائم کرنا چاہتی ہے۔ یہ وہ ہمہ گیر معرکہ آرائی ہے جس میں دشمنان اسلام ہر قسم کا ہتھیار کام میں لا رہے ہیں۔ بے حد و حساب وسائل اس میں جھونک رہے ہیں۔ اس کے لئے دشمن اپنی تمام تر قوتوں کو منظم کر کے ' انہیں وسائل دے کر اور نشر و اشاعت کے تمام ذرائع اور جدید سے جدید ذرائع ابلاغ دے کر میدان میں لایا ہے۔ ان قوتوں کی پشت پر عالمی تنظیمیں اور ادارے ہیں اور یہ عالمی کفالت اور ضمانت نہ ہو تو دشمنان اسلام کے یہ ایجنٹ اور یہ ادارے اور حکومتیں اس امت کے داعیوں کے سامنے ایک دن بھی ٹک نہ سکیں۔

لیکن اس ہمہ گیر معرکہ آرائی اور وسیع و عریض مہمات کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین نہایت ہی سخت جان

دین ہے - یہ امت جو اس دین کے لئے کوشاں ہے ' نہایت ہی سخت جان ہے - اپنی قلت تعداد اور اپنے قلت وسائل کے باوجود اور اپنی کمزوریوں کے باوجود وہ اس وحشیانہ حملے کے مقابلے میں ڈٹی ہوئی ہے - ذرا دوبارہ غور کیجئے -

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۸۲) وَاُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ (۱۸۳) "ہماری مخلوق میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ہدایت کرتا ہے اور حق کے مطابق انصاف کرتا ہے - رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا ہے ' تو انہیں ہم بتدریج اپنے طریقہ سے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انہیں خبر تک نہ ہوگی - میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں ' میری چال کا کوئی توڑ نہیں ہے -"

یہ لوگ اس قوت ' اس الہٰی قوت کو خاطر میں نہیں لاتے ' اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مذکورہ بالامہم جاری رکھے ہوئے ہیں ' حالانکہ امت مسلمہ نے اسلام کو مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے وہ اسلام کی قوت پر مجتمع ہے - یہ وہ قوت ہے کہ آیات الہیہ کی تکذیب کرنے والے اس کو سمجھ نہیں پا رہے - وہ لوگ اس حقیقت کو سمجھ نہیں پا رہے کہ اللہ نے ان لوگوں کو ڈھیل دے رکھی ہے ' اور یہ ڈھیل ایک مقررہ وقت تک ہے ' اور ان کو یہ یقین ہی نہیں ہے کہ اللہ کی تدبیر نہایت ہی مستحکم ہوتی ہے - ان دشمنان اسلام نے ایک دوسرے کے ساتھ دوستیاں گانٹھ رکھی ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس زمین پر ان کا راج ہے - لیکن یہ لوگ خدا کی قوت کبریٰ کو دیکھ نہیں پا رہے - غرض جھٹلانے والوں کے ساتھ اللہ کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے - اللہ ان کو ڈھیل دیئے رکھتا ہے اور سرکشی اور نافرمانی کے لئے انہیں طویل مہلت دیتا ہے - چنانچہ یہ لوگ اللہ کی اسکیم میں پوری طرح پکڑے جاتے ہیں اور یہ تدبیر عام شخص کی نہیں ہوتی کہ اللہ جیسے جبار اور صاحب قوت متین کی تدبیر ہوتی ہے - لیکن دشمنان اسلام غافل ہیں اس بات سے کہ آخری انجام ان لوگوں کا ہی ہوگا جو متقین ہیں اور جو حق پر ہیں اور حق کے داعی ہیں اور حق کا نظام عدالت قائم کرنا چاہتے ہیں -

قرآن کریم ان آیات میں ان لوگوں کو تنبیہ کر رہا ہے جو اس وقت مکہ میں اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے - لیکن یہ آیت مکہ کے لوگوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے ' ازمنہ مابعد میں بھی امت مسلمہ کے ساتھ اس کے دشمنوں کا یہی سلوک ہے اور ہو گا ' اللہ ان مخالفوں کو مہلت دیتا ہے لیکن اس کی تدبیر مستحکم ہوتی ہے - اس لئے اللہ انہیں مشورہ دیتا ہے کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں آنکھیں کھول کر کریں - اپنے دل و دماغ سے کام لیں اور اپنے آپ کو جہنمی مخلوق میں شامل نہ کریں - اسلام اہل مکہ کو یہ مشورہ دے رہا تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے معاملے میں اپنے رویے پر اچھی طرح غور کریں ' کیا وہ دیکھتے نہیں کہ آپ حق کے حامل اور حق کے داعی ہیں - نیز اہل مکہ زمین و آسمان کی ساخت اور بادشاہت پر غور کریں - کیا اس میں سچائی تک پہنچانے والی آیات و معجزات بکھرے ہوئے نہیں ہیں - یہ مہلت جو انہیں دی جا رہی ہے یہ بہت ابدی اور طویل نہیں ہے - اللہ کی تدبیر کے وقوع کا وقت بہت ہی قریب ہے - وہ کیوں اس قدر غافل ہو گئے ہیں؟

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۜ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ

مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ
شَيْءٍ ۙ وَّ اَنْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ
يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

"اور کیا ان لوگوں نے کبھی سوچا نہیں؟ ان کے رفیق پر جنون کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ تو ایک خبردار کرنے والا ہے جو (برا انجام سامنے آنے سے پہلے) صاف صاف متنبہ کر رہا ہے۔ کیا ان لوگوں نے آسمان و زمین کے انتظام پر کبھی غور نہیں کیا اور کسی چیز کو بھی جو خدا نے پیدا کی ہے، آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا؟ اور کیا یہ بھی انہوں نے نہیں سوچا کہ شاید ان کی مہلت زندگی پوری ہونے کا وقت قریب آ لگا ہو؟ پھر آخر پیغمبر کی اس تنبیہ کے بعد اور کون سی بات ایسی ہو سکتی ہے جس پر یہ ایمان لائیں؟"

اسلام یہ کوشش کرتا ہے کہ انسانوں کو مدہوشی سے ہوش میں لائے، ان کو غفلت کے خواب گراں سے جگائے اور انسان کی فطرت کو ان تہوں کے نیچے سے نکال کر باہر لائے جو اس کے اوپر جمی ہوئی ہیں۔ انسانوں کے شعور کو تازہ کرے۔ قرآن انسان کی شخصیت اور انسانیت کو مخاطب کرتا ہے اور اس کی ان صلاحیتوں کو جگاتا ہے جن کے ذریعہ وہ دعوت اسلام کو قبول کر لیں۔ قرآن کریم محض جامد اور خشک قسم کا مناظرہ نہیں کرتا۔ وہ انسان کی حقیقی شخصیت کو گمراہی کی گہری تہوں کے نیچے سے نکالتا ہے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۷: ۱۸۴) "اور کیا ان لوگوں نے کبھی سوچا نہیں؟ ان کے رفیق پر جنون کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ تو ایک خبردار کرنے والا ہے جو (برا انجام سامنے آنے سے پہلے) صاف صاف متنبہ کر رہا ہے۔"

قریش کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈے کی جنگ میں سب سے بڑا ہتھیار یہ تھا کہ وہ آپ پر یہ الزام لگاتے کہ آپ کو جنون لاحق ہو گیا ہے اور اس پر دلیل یہ دیتے تھے کہ تم دیکھتے نہیں کہ وہ ایسا کلام پیش کر رہا ہے جو عربوں کے معروف اسالیب کلام سے بالکل مختلف ہے۔

قریش جو یہ پروپیگنڈہ کرتے تھے، اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ جھوٹ بک رہے ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضور جس دعوت کے حامل ہیں وہ دعوت حق ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ قرآن کریم کو سننے کے لئے بے تاب رہتے تھے اور اپنے آپ کو کنٹرول نہ کر سکتے تھے کہ اس کے سننے سے باز رہیں۔ اس سماع کے ان پر گہرے اثرات پڑتے تھے۔ اخنس ابن شریق، ابوسفیان ابن حرب اور عمرو ابن ہشام ابوجہل کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ سب سے چھپ چھپ کر قرآن سنتے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ یہ تینوں حضرات چھپ کر قرآن سننے کے لئے آئے۔ اس واقعہ کو **فی ظلال القرآن** میں ہم ذکر کر آئے ہیں۔ نیز عتبہ ابن ربیعہ کا واقعہ بھی مشہور ہے کہ اس نے خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سورہ فصلت کی آیات سنیں اور انہوں نے اسے متزلزل کر دیا۔ اور یہ واقعات بھی مشہور ہیں کہ یہ لوگ موسم حج میں لوگوں کو قرآن سے دور رکھنے کی تدابیر کرتے۔ ولید ابن مغیرہ لوگوں سے کہتے کہ یہ نہایت ہی موثر جادو ہے۔ ان سب روایات

سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام ' دعوت اسلام اور قرآن کی حقانیت میں شک نہ رکھتے تھے بلکہ یہ لوگ اپنے آپ کو اس دعوت سے مقابلے میں بڑا سمجھتے تھے ۔ پھر ان کو یہ خطرہ تھا کہ جب ہم لہ اللہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرلیں گے تو پھر محمد ہمارے حاکم اور مقتدر اعلیٰ ہوں گے ۔ کیونکہ اس کلمے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان انسانوں کی غلامی سے نکل کر اللہ کی غلامی میں آجائیں اور تمام طاغوتی طاقتوں کو ختم کر دیں ۔

قرآن مجید ایک عجیب اور منفرد کتاب ہے ' اور اس کا اسلوب بھی لوگوں کے اندر مروج اسالیب کلام سے زیادہ منفرد ہے اس لئے قریش اس سے غلط فائدہ اٹھاتے تھے ۔ نیز عربوں میں پیش گوئی کرنے والوں اور مجنونوں کے درمیان یک رنگی ہوتی تھی ' مثلاً مجذوب لوگ عربوں میں بھی اپنے آپ کو عالم بالا سے متعلق قرار دیتے تھے جو اس قسم کی باتیں کیا کرتے تھے جن کی تاویل وہ حسب منشا کر سکتے تھے ' ان روایات کی وجہ سے قریش حضرت نبی صلی اللہ کو بھی ایک مجذوب یا مجنون قرار دیتے تھے اور آپ ؐ کے کلام کو مجذوب یا مجنون کا کلام کہتے تھے ۔

قرآن کریم ان لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا تھا اور یہ مشورہ دیتا تھا کہ یہ لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں غور و فکر کریں جنہیں وہ خوب جانتے تھے اور ان کو معلوم تھا کہ انہوں نے اس سے قبل کبھی ایسی مجذوبانہ باتیں نہیں کی تھیں ۔ پھر وہ خود اس بات کے بھی گواہ تھے کہ آپ سچے اور امین ہیں جبکہ آپ کی حکمت اور دانائی اور سنجیدگی کے بھی وہ قائل تھے ۔ جب حجر اسود کے معاملے میں انہوں نے آپ کو حکم بنایا اور آپ نے جو فیصلہ کیا اس کی وجہ سے وہ ایک بہت ہی عظیم خانہ جنگی سے بچ گئے ۔ پھر آپ کے پاس سب لوگ اپنی امانتیں رکھتے اور یہ امانتیں اس وقت تک آپ کے پاس تھیں جب تک آپ ؐ مکہ میں تھے اور آپ ؐ کے چلے جانے کے بعد آپ ؐ کے ابن عم حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں تک پہنچائیں ۔

قرآن مجید ان لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کہ حضرت محمد کا ماضی کھلی کتاب ہے ' تم ' آپ ؐ کی زندگی کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو ' آخر وہ کیا بات ہے کہ جس کی وجہ سے تم ' آپ کو مجنون کہتے ہو ' آپ جس معیار کا کلام آپ پیش کر رہے ہیں کیا یہ مجنونوں اور پاگلوں کا کام ہو سکتا ہے ؟ ہرگز نہیں ۔

مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۷: ۱۸٤) "ان کے رفیق پر جنون کا کوئی اثر نہیں ' وہ ایک خبردار کرنے والا ہے جو صاف صاف متنبہ کر رہا ہے ۔"

آپ کی عقل میں کوئی خلل نہیں ہے ۔ وہ تو واضح واضح بات کرنے والا ہے ۔ آپ ؐ کا کلام مجنون کے کلام سے بالکل مختلف ہے ۔ اور آپ ؐ کے حالات زندگی مجنونوں کے حالات زندگی سے مختلف ہیں ۔

اَوَ لَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَلْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ (۷: ۱۸٥) "کیا ان لوگوں نے آسمان و زمین کے انتظام پر کبھی غور نہیں کیا اور کسی چیز کو بھی جو خدا نے پیدا کی ہے ' آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا ؟

اس عجیب کائنات کے بارے میں یہ ایک دوسری کھڑکی ہے اور اس عظیم اور وسیع و عریض کائنات کو کھلی آنکھوں اور

بیدار دل کے ساتھ دیکھنے کی دعوت ہے ۔ اگر غور سے اس عظیم کائنات ہی پر نظر ڈال لی جائے تو انسانی فطرت جہالت کے جن دبیز پردوں کے نیچے گم ہے وہ باہر نکل آئے اور انسانی شخصیت کے سامنے حق کی راہیں کھل سکتی ہیں ۔ اس کائنات میں تخلیق کی عجیب و غریب کار فرمائیاں اور ایسے کارنامے جو معجز ہیں اور جو قادر مطلق اور وحدہ لا شریک کی ذات پر دال ہیں ۔ کیا وہ کسی ایک چیز کی تخلیق پر غور نہیں کرتے ' جبکہ اس کائنات میں بے شمار قابل غور چیزیں ہیں جن پر غور کرنے سے انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے ' انسانی فکر عاجز رہ جاتی ہے اور عقل ان کاریگریوں کے صناع اور کاریگر کی تلاش میں نکل جاتی ہے ۔ اور پھر وہ اس ارادے کو جاننا چاہتی ہے جس نے اس خلق کو پیدا کیا اور اس کے لئے اس نظام کو جاری کیا ۔

یہ مخلوقات اس طرح کیوں ہے ؟ اس کے علاوہ اس کائنات کے لئے ہزاروں امکانیات تھے ۔ یہ کائنات دوسری طرح کیوں نہ بنی ۔ دوسرے طریقوں کو چھوڑ کر کیوں یہ کائنات اس موجودہ طریقے پر چل پڑی اور پھر وہ کون سی قوت ہے جو اسے اس نہج پر چلائے رکھتی ہے ۔ اس پوری کائنات میں ایک ہی نظام طبیعت جاری و ساری ہے ' یہ کیوں ؟ اگر اس کے پیچھے ایک ہی فعال لما یرید نہیں ہے تو اس پوری کائنات میں جاری و ساری اور اس کے پیچھے کیوں ایک ہی ارادہ اور ایک ہی ناموس نظر آتا ہے ۔ اور ایک ہی تقدیر اور اندازہ مسلسل چل رہا ہے ۔

ایک زندہ جسم ! نہیں بلکہ ایک خلیہ ایک عظیم معجزہ ہے جس کے عجائبات ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے ۔ اس کا وجود ' اس کی ترکیب اور اس کے تصرفات اور اس کے اندر پیدا ہونے والی مسلسل تبدیلیاں جو مسلسل اس کے وجود کا تحفظ کرتی ہیں اور اس کے اندر پھر کئی نسلوں تک تجدید نسل کا انتظام ۔ پھر تمام نسلوں میں اس کے فرائض کا تعین ' جو شخص اس ایک خلیے کا مطالعہ کرے تو اس کا ضمیر اور اس کی عقل کبھی بھی اس بات پر مطمئن نہیں ہو سکتی کہ یہ کائنات بغیر کسی الٰہ اور مدبر کے نہیں چل سکتی یا کوئی عقل کبھی بھی اس نتیجے تک نہیں پہنچ سکتی کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ بھی ہو سکتا ہے ۔

زندگی کا یہ تسلسل بذریعہ نظام نسل کشی بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کائنات ایک خالق اور مدبر کے قانون کے مطابق چل رہی ہے ورنہ کروڑوں سال کے عرصہ میں وہ کون سی طاقت ہے جو نسل کشی کے لئے مرد اور عورت کا ایک تناسب قائم رکھے ہوئے ہے ۔ ایسا دور کیوں نہیں آتا کہ مرد ہی مرد پیدا ہوں صرف عورتیں ہی پیدا ہوں ۔ اگر کبھی ایسا واقعہ ہو جائے تو اس دور میں نسل کشی کا خاتمہ ہی ہو جائے ۔ سوال یہ ہے کہ نسلاً بعد نسل اس تناسب اور توازن کو کس قوت نے قائم کر رکھا ہے ۔

یہ توازن زمین و آسمان کے نظام میں مکمل طور پر کارفرما ہے ۔ صرف اس زندہ مخلوق ہی کے اندر نہیں ہے ۔ ایک ایٹم کی ساخت اور کسی مرکب چیز کی ساخت میں مکمل توازن موجود ہے ۔ زندہ اور مردہ تمام مخلوقات کے اندر مکمل توازن موجود ہے ۔ اور اگر ایک لمحہ بھر کے لئے یہ توازن بگڑ جائے تو یہ کائنات ڈھیر ہو کر رہ جائے ۔ لہٰذا یہ بہت ہی اہم سوال ہے کہ وہ ذات کون سی ہے جس نے یہ توازن زمین و آسمان میں قائم کر رکھا ہے ۔

جزیرۃ العرب کے باشندے جن کو سب سے پہلے اس قرآن نے مخاطب کیا ' وہ علوم و فنون میں اس قدر زیادہ ترقی یافتہ نہ تھے کہ وہ زمین اور آسمانوں کے نظام میں پائے جانے والے نہایت ہی لطیف توازن پر غور کر سکتے یا اللہ کی پیدا کردہ کسی ایک ہی چیز کا سائنسی تجزیہ کر سکتے ۔ لیکن انسانی فطرت اس کائنات کے ساتھ اپنی گہرائیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔ انسانی فطرت اور کائنات کی فطرت کے درمیان قائم ربط سائنسی مکالمات کا محتاج نہیں ہے ۔ ان کے درمیان ایک

توازن پایا جاتا ہے۔ ہر انسان جس کا دل کھلا ہوا اور آنکھوں میں بصیرت ہو وہ اس ہم آہنگی کو محسوس کر سکتا ہے اور اس کے اشارات کو قبول کر کے راہ ہدایت لے سکتا ہے۔

جب انسان اپنی فطرت صافی کے ذریعے فطرت کائنات کے ان اشارات کو پاتا ہے تو وہ یقین کر لیتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی الٰہ ضرور ہے اور اس کے احساس پر یہ حقیقت اور یقین اسی طرح چسپاں ہو جاتا ہے کہ کبھی غائب نہیں ہوتا۔ انسان نے اگر کوئی غلطی کی ہے تو اس نے الٰہ کی صفات میں کی ہے۔ رسولوں کی بعثت کا مقصد زیادہ تر یہی رہا ہے کہ انہوں نے اس الٰہ کا تعارف کرایا ہے۔ اس کی صفات کا صحیح تصور دیا ہے۔ رہے جدید ملحد' یعنی سائنٹیفک اشتراکیت کے داعی تو یہ وہ مسخ شدہ لوگ ہیں جن کی فطرت بگڑ چکی ہے بلکہ دراصل وہ فطرت کے منکر ہیں اور ان کی اپنی فکر میں اگر کچھ اشارات پائے جاتے ہیں تو وہ ان کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص جب فضائے آسمان میں قدرے بلند ہوا اور وہاں سے اس نے یہ حیران کن منظر دیکھا کہ زمین اس عظیم فضا کے اندر ایک چھوٹی سی گیند نظر آتی ہے' اس کی فطرت نے اس وقت اسے آواز دی کہ ذرا سوچو تو سہی' اس فضا میں اسے کس چیز نے معلق کر رکھا ہے' لیکن جب وہ زمین پر اترا اور حکومت کی جانب سے تشدد کا خوف اسے لاحق ہوا تو اس نے یہ بیان دیا کہ اسے فضا آسمانی میں خدا نہیں ملا۔ اس شخص نے اپنی فطرت کی آواز اور فطرت کی جانب سے اصرار کو دبا دیا اور آسمان و زمین کے نظام میں اس کے لئے جو سامان عبرت تھا' اسے نظرانداز کر دیا۔

اللہ تعالیٰ انسان سے مخاطب ہے کیونکہ انسان کی تخلیق اسی نے کی ہے۔ وہ اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہے۔ آخر میں ان کو حادثہ موت سے ڈرایا جاتا ہے' جو مستقبل کے پردوں میں چھپا ہوا اور بہت قریب ہے اور عالم الغیب میں وہ وقت طے شدہ ہے اگرچہ یہ لوگ اس وقت سے غافل ہیں۔

اَوَ لَمْ يَنظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ وَّاَنْ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ (۷:۱۸۵) "اور کیا یہ بھی انہوں نے نہیں سوچا کہ شاید ان کی مہلت زندگی پوری ہونے کا وقت قریب آ لگا ہو؟ پھر آخر پیغمبرؑ کی اس تنبیہ کے بعد اور کون سی بات ایسی ہو سکتی ہے جس پر یہ ایمان لائیں؟

ان کو کیا پتہ ہے کہ ان کا وقت قریب ہے یا دور ہے' اور کیا وجہ ہے کہ وہ غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور ان کے کوچ کا وقت پردہ غیب میں مستور ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موت کی یاد دہانی' خصوصاً جب وہ کسی بھی وقت میں آ سکتی ہے' انسان کے دل کو جھنجوڑنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ اس کی یاد سے انسان کے دل کے دروازے ہدایت کے لئے کھل سکتے ہیں اور انسان معاملات کو حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھ سکتا ہے۔ اللہ اس قرآن کو نازل کرنے والا اور انسان کو پیدا کرنے والا ہے۔ اللہ کو معلوم ہے کہ موت کا تصور ہر انسان پر اپنا اثر ضرور کرتا ہے لیکن بعض لوگ اس قدر ضدی ہوتے ہیں کہ وہ یہ اثر قبول کرنے کے باوجود انکار کرتے ہیں اور مکابرے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ حدیث رحلت سے بھی متاثر نہیں ہوتے۔ آخر ان پر کیا چیز اثر کر سکتی ہے؟

یہی تو بات ہے جو دلوں کو پگھلا دیتی ہے اور وہ نرم ہو جاتے ہیں۔ تذکرہ موت کا یہ نچ جو انسانی شخصیت کو اس آیت میں دیا گیا' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم انسانی شخصیت کے خطاب میں کیا منہاج اختیار کرتا ہے۔ وہ انسانی شخصیت کے ہر پہلو کو مخاطب کرتا ہے۔ وہ ہر زاویہ اور ہر و تر سے اس پر اثرات چھوڑتا ہے۔ قرآن کریم انسانی عقل کو مخاطب نہیں کرتا مگر عقل کو مہمل بھی نہیں چھوڑتا بلکہ وہ انسانی شخصیت کو ہمہ پہلو خطاب کرتا ہے اور اس کے ہر گوشے کو روشن کرتا ہے۔ قرآن کریم خشک بحث و مباحثے کا طریقہ بھی اختیار نہیں کرتا۔ قرآن کریم عقل اور سوچ کو زندہ کرتا ہے تاکہ انسان فکر کرے' لیکن اس کی زندگی سرد اور جامد نہ ہو بلکہ حرارت سے پر ہو اور انسانی شخصیت بھرپور انداز میں آگے بڑھے۔ اسلام کی طرف دعوت دینے والوں کو یہی انداز اختیار کرنا چاہئے کیونکہ انسان بہرحال وہی انسان ہے اور اس کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوئی۔ قرآن بھی وہی قرآن ہے اور یہ قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔ انسان کو اللہ نے جو خطاب کیا ہے وہ اسی طرح قائم ہے' چاہے دنیا جس قدر بھی ترقی کرے اور حالات جس **قدر بھی بدل جائیں۔**

---ooo---

اب بات قدرے ایک مختصر وقفے کے لئے رک جاتی ہے اور اس وقفے میں اللہ کی اس سنت کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ جو اللہ نے ہدایت و ضلالت کے لئے اسی دنیا میں جاری کی ہوئی ہے۔ یعنی اس قانون کے مطابق کہ جو شخص ہدایت کے لئے جدوجہد کرے گا' وہ ہدایت پائے گا' طلب صادق کے ساتھ۔ اور جو شخص منہ موڑے گا اور دلائل ایمان اور اشارات ہدایت کو پکڑنے کی سعی نہ کرے گا گمراہ ہو جائے گا۔

یہاں یہ اشارہ ان لوگوں کے حالات کی مناسبت سے کیا جا رہا ہے' جن کو قرآن خطاب کر رہا تھا اور قرآن کا یہ انداز اور خاص طریق کار ہے کہ قرآن کریم ایک انفرادی واقعہ کے بیان کے بعد اس سے اصول عامہ اخذ کرتا ہے اور اسے بطور اٹل سنت الہیہ پیش کر دیتا ہے۔ وہ واقعہ تو انفرادی ہوتا ہے اور وقوع کے بعد حصہ تاریخ بن جاتا ہے لیکن اصول اپنی جگہ رہتا ہے اور بار بار سامنے آتا رہتا ہے۔

مَنْ يُضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۚ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

"جس کو اللہ رہنمائی سے محروم کر دے اس کے لئے پھر کوئی رہنما نہیں ہے' اور اللہ انہیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔"

جو لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں' وہ کیوں گمراہ ہوتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ نہ ہدایت کی فکر کرتے ہیں اور نہ واقعات و مسائل پر تدبر کرتے ہیں اور جو شخص آیات الہیہ سے غفلت کرتا ہے اور ان پر تدبر نہیں کرتا اسے اللہ گمراہ کر دیتا ہے اور جسے اللہ نے اپنی سنت کے مطابق گمراہ کر دیا پھر وہ ہدایت نہیں پا سکتا اور نہ اس کے لئے کوئی ہادی بن سکتا ہے۔

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ (۷: ۱۸۶) "جس کو اللہ رہنمائی سے محروم کر دے اس کے لئے پھر کوئی رہنما نہیں ہے۔" اور جس شخص پر اللہ ضلالت مسلط کر دے' اپنی سنت جاریہ کے مطابق تو وہ ہمیشہ کے لئے گمراہ ہو جاتا ہے اور وہ ہدایت کے معاملے میں مادر زاد اندھا ہو جاتا ہے اور پھر کیا ہوتا ہے؟

وَيَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ (۷: ۱۸۶) "اور اللہ انہیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔"

ان لوگوں کو اللہ نے اس تاریکی میں چھوڑ کر' ان پر کوئی ظلم نہیں کیا' کیونکہ ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے خود اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ انہوں نے اپنے دلوں کو معطل کر دیا تھا۔ اپنے اعضائے مدرکہ سے کام لینا بند کر دیا تھا۔ انہوں نے اس دنیا کی تخلیق کے عجائبات پر غور نہ کیا اس کائنات کے رازوں کو پانے کی سعی نہ کی۔ خصوصاً ہر ایک پیدا کردہ چیز کی حقیقت اور اس کے راز جس کی طرف سابقہ آیات میں اشارہ کیا گیا تھا' انہوں نے اس حقیقت کی شہادت کو قبول نہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی انسان نے اس کائنات میں نظر دوڑائی اسے اس کے عجائبات نظر آئے۔ جب بھی اس نے آنکھیں کھولیں اسے کوئی نہ کوئی دلیل نظر آئی۔ جب بھی انسان نے اپنی ذات اور اپنے ماحول کا مطالعہ کیا۔ اسے اپنی تخلیق کا اعجاز معلوم ہوا' اسے اپنے ماحول کی ہر مخلوق ایک اعجاز نظر آئی' لیکن جب انسان نے اپنے آپ کو اندھا کر لیا تو وہ اندھا ہو گیا اور اللہ نے بھی اسے اندھیرے میں چھوڑ دیا اور اس کے بعد جب اس نے سرکشی شروع کر دی تو اللہ نے اسے اس میں ڈھیل دی۔ یہاں تک کہ وہ ہلاکت تک پہنچ جاتا ہے۔ "اور اللہ انہیں ان کی سرکشی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔"

---O O O---

یہ لوگ جو اپنے ماحول سے غافل ہیں' اپنے ماحول سے انہوں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے ہیں کہ پردۂ غیب میں مستور قیامت کب برپا ہو گی۔ ان لوگوں کا سوال اسی طرح ہے کہ ایک شخص کی بینائی اس قدر کمزور ہو کہ وہ اپنے قدموں میں کچھ نہ دیکھ سکتا ہو مگر خواہش یہ رکھتا ہو کہ وہ دور افق اعلیٰ میں بھی کچھ دیکھے۔

---

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ
رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ؔ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ
اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ
اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ
اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۛ
۲۳ ع ۷ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۞

۱۳ "یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر وہ قیامت کی گھڑی کب نازل ہو گی؟ کہو "اس کا علم میرے رب ہی کے پاس ہے۔ اسے اپنے وقت پر وہی ظاہر کرے گا۔ آسمانوں اور زمین میں وہ بڑا سخت وقت ہو گا۔ وہ تم پر اچانک آ جائے گا۔" یہ لوگ اس کے متعلق تم سے اس طرح پوچھتے ہیں گویا کہ تم اس کی کھوج میں لگے ہوئے ہو۔ کہو "اس کا علم تو صرف اللہ کو ہے" مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔" اے نبی ؐ ان سے کہو کہ "میں اپنی ذات کے لئے کسی نفع اور

نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے۔ اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لئے حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں تو محض ایک خبردار کرنے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں ان لوگوں کے لئے جو میری بات مانیں۔"

عقیدہ آخرت اور اس میں میزان کا قیام اور سزا و جزا کا واقع ہونا یہ مشرکین مکہ کے لئے ایک انوکھا نظریہ تھا۔ حالانکہ یہ عقیدہ دین ابراہیمی کا اساسی عقیدہ تھا اور مشرکین مکہ کا شجرۂ نسب حضرت ابراہیم سے ملتا تھا۔ یہی عقیدہ حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کے دین میں بھی ایک اساسی نظریہ تھا۔ لیکن ابراہیم علیہ السلام کے بعد زمانے گزر گئے اور وہ اسلام کے ان اصولوں سے دور چلے گئے جو دین ابراہیم اور دین اسماعیل کے اساسی عقائد تھے۔ ایک ایسا دور بھی آیا کہ ان کے تصور ہی سے عقیدہ آخرت مٹ گیا۔ یہ عقیدہ انہیں اب عجیب و غریب نظر آنے لگا تھا اور ان کے شعور زندگی سے بالکل متضاد سا ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب وہ حضور ﷺ کی زبان سے دعوت سنتے اور اس میں آپ ان کو بعث و نشر کے بارے میں بتاتے اور حساب و کتاب کے حالات ان کے سامنے رکھتے تو انہیں یہ بات نہایت ہی عجیب و غریب اور بعید الوقوع نظر آتی۔ ایک دوسری جگہ قرآن کریم نے ان کے اس تعجب کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا ........ الْبَعِيدِ (سورہ سبا) "منکرین حق لوگ کہتے ہیں "ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ جب تمہارا جسم ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہو گا اس وقت تم نئے سرے پیدا کر دیئے جاؤ گے؟ نہ معلوم یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گھڑتا ہے یا اسے جنون لاحق ہو گیا ہے۔ نہیں بلکہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں اور وہی بری طرح بہکے ہوئے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ کو یہ معلوم تھا کہ کوئی امت پوری انسانی کی قیادت اس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک اس کے نظام فکر میں عقیدہ بعث بعد موت اچھی طرح پختہ نہ ہو چکا ہو' اور امت مسلمہ کا فریضہ بہرحال یہی ہے کہ وہ پوری دنیا کی قیادت کرے۔ لہٰذا اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس دنیا کی زندگی کو ایک محدود زندگی تصور کرے' جو اس محدود دنیا کے چھوٹے سے کرے پر ہے۔ عقیدہ آخرت کے بغیر اس قسم کی امت کا پیدا کرنا ممکن نہ تھا جس کے سامنے اس قدر عظیم نصب العین ہو۔"

عقیدہ آخرت انسانی تصور میں وسعت پیدا کرتا ہے' نفس انسانی میں کشادگی آجاتی ہے' زندگی جس کے تسلسل کے بارے میں انسان کی شخصیت کے اندر تمنا پائی جاتی ہے' وہ تمنا پوری ہوتی ہے اور پھر امت مسلمہ کے ذمہ جو فرائض ہیں ان کی ادائیگی کے لئے یہ عقیدہ ضروری ہے۔ پھر اس عقیدے کی وجہ سے انسان کے سفلی جذبات اور محدود دنیاوی خواہشات پر بھی کنٹرول ہوتا ہے۔ نیز اس سے انسان کا دائرہ حرکت وسیع ہو جاتا ہے اور انسان کو دنیا کے محدود نتائج مایوس نہیں کر سکتے اور نہ اسے دردناک قربانیاں اپنے مقصد کے حصول سے روک سکتی ہے نیکی کے کاموں اور دعوت اسلامی کے پھیلانے اور بھلائی کی طرف لوگوں کی قیادت کرنے میں وہ کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتا۔ اگرچہ اس کی جدوجہد کے فوری نتائج اس کی منشا کے خلاف ہوں اور اس کی راہ میں دردناک رکاوٹیں ہوں۔ یہ شعور اور یہ اوصاف ہر اس فرد اور جماعت کے لئے ضروری ہیں جس کے کاندھوں پر یہ عظیم ذمہ داری ڈالی گئی ہو۔

آخرت کا عقیدہ دو تصورات کے درمیان ایک دوراہا ہے۔ایک تصور حیوانی تصور ہے' جو احساس کے حدود کے اندر محدود ہے۔دوسرا تصور ایک انسانی تصور ہے جو اس دنیا کو ایک وسیع دائرے کے اندر دیکھتا ہے۔ظاہر ہے کہ جس جماعت نے پوری انسانیت کی قیادت کا فریضہ سرانجام دینا ہے' وہ حیوانی تصور کے ساتھ یہ فریضہ انجام نہیں دے سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ دین اسلام میں امت مسلمہ کے لئے عقیدہ آخرت کے یقین کو ایک اساسی عقیدہ قرار دیا گیا ہے۔دین اسلام نے عقیدہ آخرت کو نہایت ہی گہرا' نہایت ہی وسیع اور نہایت ہی واضح شکل میں پیش کیا ہے۔یہاں تک کہ ایک مسلمان کے شعور اور عمل میں عالم آخرت 'اس محدود دنیا کے مقابلے میں زیادہ گہرائی تک' زیادہ وسعت کے ساتھ اور زیادہ واضح طور پر بیٹھا ہوا ہے۔حالانکہ مسلمان بہرحال اس جہان میں رہ رہے ہیں' اور یہی وہ خوبی تھی جس کی وجہ سے امت مسلمہ نے انسانیت کی قیادت کا فریضہ سرانجام دیا اور یہ قیادت راشدہ تھی جسے اسلامی اور عالمی تاریخ نے خوب سمجھا۔

سورہ اعراف میں اس موضوع پر یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے اور یہ سوال نہایت ہی تعجب انگیزی کے ساتھ کیا گیا ہے۔مشرکین نے فی الواقعہ عقیدہ آخرت کو ایک انوکھی بات سمجھا۔ان کا سوال یہ بتاتا ہے کہ وہ وقوع قیامت کو مضحکہ خیز سمجھتے تھے اور اسے بالکل بعید از امکان سمجھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے یہ سوال کیا۔

يَسْئَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسٰهَا (۷:۱۸۷) "یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر وہ قیامت کی گھڑی کب نازل ہوگی؟"

قیامت یہ غیب ہے اور اس کا علم اللہ نے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے' اپنی مخلوق میں سے کسی کو اللہ نے قیام قیامت کی اطلاع نہیں دی کہ وہ کب ہوگی۔اس کے باوجود مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے تھے کہ قیامت کب ہوگی۔یہ سوال یا تو بطور امتحان تھا' یا تعجب کرنے والے شخص کا سوال تھا جو کسی بات کو عجیب و غریب سمجھتا ہو یا ایک ایسے شخص کا سوال تھا جو مسئول الیہ کی توہین کرنا چاہتا ہو اور حقارت کے ساتھ یہ سوال کر رہا ہوں۔

أَيَّانَ مُرْسٰهَا (۷:۱۸۷) کے معنی یہ ہیں کہ قیامت کی کشتی کب لنگر انداز ہوگی اور قیامت کب واقع ہو کر رک جائے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہرحال ایک بشر تھے۔آپ علم غیب کے مدعی نہ تھے۔آپ کو حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ غیبی امور عالم الغیب کے سپرد کر دیں۔اور لوگوں کو یہ بتا دیں کہ یہ موضوع الوہیت کے خصائص کے ساتھ متعلق ہے۔آپ ایک بشر ہیں اور آپ بشریت کے دائرے سے باہر کسی چیز کے مدعی نہیں ہیں۔نہ بشریت کے حدود سے باہر جانا چاہتے ہیں۔آپ کے پاس جو کچھ ہے وہ رب کی جانب سے سکھایا ہوا ہے اور اللہ کی مرضی ہے کہ وہ رسول کو کیا بتائے اور کیا نہ بتائے۔

قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ (۷:۱۸۷) کہو "اس کا علم میرے رب ہی کے پاس ہے۔اسے اپنے وقت پر وہی ظاہر کرے گا۔"

کیونکہ قیامت کا علم اللہ نے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے اور اس کا علم لوگوں کو تب ہوگا جب اس کے وقوع کا آغاز ہوگا' کسی دوسرے پر اس کا انکشاف نہیں کیا گیا۔

اس کے بعد لوگوں کی توجہ اس کے وقت وقوع کے بجائے اس کی حقیقت اور ماہیت کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے اور یہ شعور دیا جاتا ہے کہ وہ ایک عظیم اور ہولناک واقعہ ہو گا اور اس کا بوجھ نہایت ہی بھاری ہو گا' اس کا بوجھ زمین و آسمان کی موجودہ نظر آنے والی کائنات میں بہت ہی بھاری ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ اچانک واقعہ ہوگی اور اس سے غافل لوگ اپنی غفلت میں مارے جائیں گے۔

ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً (۷:۱۸۷) "آسمانوں اور زمین میں وہ بڑا سخت وقت ہو گا۔ وہ تم پر اچانک آ جائے گا۔" لہذا بہتر یہ ہے کہ تمہارا سب اہتمام اس پہلو سے ہو کہ تم اس کی تیاریاں کرو اور جب وہ اچانک آئے تو تم اس کے لئے تیار ہو۔ کیونکہ جب وہ اچانک آئے گی تو اس وقت کوئی احتیاط اور کوئی قوت کام نہ دے گی' اس وقت تم جو احتیاطی تدابیر کرو گے' وہی کام آسکیں گی' وہی قوت کام آئے جو تم نے اس وقت تیار کی ہو۔ اس وقت عمر کافی ہے اور فرصت کے کافی اوقات تمہارے پاس ہیں۔ لہٰذا ابھی سے اس کے لئے تیاریاں شروع کر دو اور ایک منٹ بھی ضائع نہ کرو ممکن ہے کہ اگلے ہی منٹ میں قیامت ہو۔

اس کے بعد ان لوگوں کے سوال پر تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کا سوال کرتے ہیں یہ لوگ رسالت کی نوعیت اور رسول کی حقیقت سے نابلد ہیں۔ نیز یہ لوگ اللہ عظیم کی بادشاہت کی حقیقت سے بھی لاعلم ہیں اور یہ بھی نہیں جانتے کہ رب عظیم کے سامنے اللہ کے پیغمبر کس قدر باادب ہوتے ہیں۔

یَسْئَلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِیٌّ عَنْهَا (۷:۱۸۷) "یہ لوگ اس کے متعلق تم سے اس طرح پوچھتے ہیں' گویا کہ تم اس کی کھوج میں لگے ہوئے ہو۔"

گویا حضور ؐ دائماً اسی کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں یا آپ کی ڈیوٹی یہ ہے کہ آپ قیامت کے وقوع کی گھڑی کا کھوج لگائیں۔ ظاہر ہے کہ حضور رب تعالیٰ سے ان موضوعات کے بارے میں پوچھتے ہی نہیں جو اللہ العالمین کا مخصوص دائرہ ہے۔

قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۷:۱۸۷) "کیونکہ اللہ نے اسے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے اور اس کی اطلاع کسی کو نہیں دی۔"

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ (۷:۱۸۷) "مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے" یہ صرف قیامت کے وقوع کی گھڑی کی بات نہیں ہے۔ یہ ہر غیبی امر کے متعلق اصولی بات ہے۔ علم غیب صرف اللہ کو ہے اور علم غیب میں سے کچھ بات اگر اللہ چاہے تو کسی کو بتا دیتا ہے اور جس قدر چاہے بتا دیتا ہے' جس وقت چاہتا ہے بتا دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنے نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں۔ بعض اوقات لوگ ایک کام کرتے ہیں اور ان کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ان کے لئے مفید ہو گا لیکن آخر کار وہ ان کے لئے مضر ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ ایک کام مضرت کے لئے کرتے ہیں لیکن انجام کار وہ ان کے لئے مفید ہوتا ہے۔ کبھی وہ کسی کام کو ناپسند کرتے ہوئے مجبوراً کرتے ہیں اور وہ ان کے لئے مفید ہوتا ہے اور کبھی وہ کسی کام کو بہت ہی دلچسپی سے محبوب رکھتے ہوئے کرتے ہیں لیکن وہ ان کے لئے مضر ہوتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے۔

وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ

"ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لئے خیر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو محبوب رکھو اور وہ تمہارے لئے شر ہو" جس شاعر نے یہ کہا ہے اس کی بھی یہی مراد ہے۔

الا من یرینی غایتی قبل مذهبی

ومن این والغایات بعد المذاهب

"کون ہے جو مجھے میرے مرنے سے پہلے میری منزل بتا سکے قبل اس کے کہ میں سفر کروں۔ ایسا کب ہو سکتا ہے؟ انجام تو سفر کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے۔" اس شعر میں غیب مستور کے بارے میں انسانی موقف کو بیان کیا گیا ہے' انسان کا علم جس قدر وسیع ہو اور وہ تعلیم کے میدان میں چاہے جس قدر ترقی بھی کر لے تو اس کے سامنے غیب کا دروازہ بند ہے اور عالم غیب کے سامنے پردے گرے ہوئے ہیں' اس کی انسانیت کی حدود اسے یہ بات یاد دلاتے رہیں گے کہ اس کی انسانیت کے سامنے غیب کی دنیا محجوب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا شان ہے اور آپ کو اللہ کے ساتھ جو قرب ہے وہ بھی اپنی جگہ پر ہے۔ آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اعلان کر دیں کہ عالم غیب کے دروازے پر آپ بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک بشر ہیں اور وہ خود اپنی ذات کے لئے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں ہیں کیونکہ آپ کو غیب کا علم نہیں ہے اور آپ کو راستوں پر چلنے سے پہلے منزل کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے' کوئی بھی اپنے افعال کے انجام سے باخبر نہیں ہے۔ اس طرح کہ اگر وہ کسی فعل کے انجام کو جانتا ہو کہ وہ اچھا ہو گا تو وہ اس کو کر گزرے اور یا وہ یہ جانتا ہو کہ اس فعل کا انجام برا ہو گا' تو اس سے رک جائے۔ انسان تو سوچ کر ایک کام کرتا ہے مگر اس کا انجام اسی طرح ہوتا ہے جس طرح اللہ کی تقدیر ہو۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَا لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۔ "اے نبی' ان سے کہو کہ "میں اپنی ذات کے لئے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا' اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لئے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔"

یہ ایک اہم اعلان ہے اور اس کے ساتھ ہی اسلام کا نظریہ توحید بالکل صاف و شفاف ہو کر سامنے آگیا ہے اور وہ ہر قسم کے شرک کے معمولی شائبے سے بھی پاک ہو گیا ہے۔ ذات باری اپنے خصائص میں منفرد ہو گئی ہے اور اس کے خصائص میں اس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں رہا ہے۔ اگرچہ وہ شریک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کیوں نہ ہوں۔ جو اللہ کے حبیب ہیں اور اللہ کے برگزیدہ ہیں۔ غیب کے دروازے پر آپ کا راستہ بھی بند ہے' پوری انسانیت کا علم اس دروازے پر رک جاتا ہے۔ جہاں دوسرے انسان یہاں آکر رک جاتے ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض بھی یہاں پہنچ کر محدود ہو جاتے ہیں۔

اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۷:۱۸۸) "میں تو محض ایک خبردار کرنے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں' ان لوگوں کے لئے جو میری بات مانیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو محض خبردار کرنے والے اور خوشخبری سنانے والے ہیں۔ لیکن آپ کی نذارت و بشارات سے وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو اپنے دلوں میں ایمان رکھتے ہوں' اہل ایمان ہی اس دعوت کی حقیقت کو سمجھتے ہیں جس کے آپ ؐ حامل ہیں۔ وہی سمجھتے ہیں کہ اس دعوت کے پیچھے کیا آنے والا ہے۔ اہل ایمان دراصل بشریت کا خلاصہ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل ایمان کا خلاصہ ہیں۔

یہ فقرہ اس شخص کے لئے مفید ہو سکتا ہے جس کا دل کھلا ہو' جس کا دماغ روشن ہو اور قبولیت حق کے لئے تیار ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے خزانوں کے دروازے اس شخص کے لئے کھلتے ہیں جو مومن ہو' اس کا پھل وہی شخص چکھ سکتا ہے' جو مومن ہو اور اس کے اسرار تک رسائی اہل ایمان ہی کی ہو سکتی ہے۔ بعض صحابہ کرامؓ سے مروی ہے کہ اللہ نے ہمیں قرآن دینے سے قبل ایمان دیتا تھا۔ یہ ایمان ہی تھا جس کے ذریعے ان کو قرآن کا وہ ذوق دیا گیا جس کی مثال نہیں ہے' اور وہ اس کے معانی اور مقاصد کا وہ ادراک رکھتے تھے جس سے تمام دوسرے لوگ محروم ہیں اور یہ قرآن ہی تھا جس کے ذریعے انہوں نے انسانی تاریخ میں معجزات اور حیران کن کارناموں کا ایک ذخیرہ چھوڑا اور یہ عظیم کارنامے انہوں نے تاریخ کے نہایت ہی مختصر دور میں سرانجام دیئے۔

یہ منفرد گروہ قرآن کریم کی مٹھاس کا صحیح ذوق رکھتا تھا۔ ان کی آنکھیں اس کی روشنی میں دیکھتی تھیں' وہ اس کے دلائل کو پاتے تھے او خارق العادہ پاتے تھے۔ لیکن مخاطبین محمد ؐ کے صرف وہی لوگ تھے جن کو حلاوت ایمان نصیب ہوتی تھی۔ یہ قرآن ہی تھا کہ جس کی کشش نے ان کی ارواح کو ایمان کی طرف کھینچا۔ لیکن اس ایمان ہی کی وجہ سے ان پر قرآن کے راز بھی کھلتے گئے۔

یہ لوگ قرآن میں زندہ رہے' قرآن کے لئے زندہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گروہ منفرد رہا اور کبھی ایسے لوگ دوبارہ پیدا نہ ہو سکے' یعنی اس قدر کثیر گروہ' اس قدر نئی جدت کے ساتھ پوری اسلامی بلکہ انسانی تاریخ میں کبھی پیدا نہ ہو سکا' ہاں چند افراد' منفرد لوگ کبھی کبھار اسلامی تاریخ میں ضرور پیدا ہوتے رہے۔

وہ ایک طویل عرصے تک قرآن کے لئے وقف ہو گئے تھے۔ وہ قرآن کے چشمہ صافی ہی سے سیراب ہوتے رہے اور اس میں انہوں نے کوئی انسانی کلام یا ہدایت شامل نہ کی۔ الا یہ کہ حضور اکرم ؐ کے اقوال و احادیث ان کے لئے ہادی ہے۔ آپ کے اقوال بھی بہرحال قرآن ہی کا حصہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کا یہ گروہ بے مثال رہا۔

جو لوگ وہی کام کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے کیا تو ان کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ وہی انداز اختیار کریں جو انہوں نے کیا۔ وہ اس قرآن میں زندہ رہیں اور ایک طویل عرصہ وہ اس میں گم ہو جائیں اور وہ تمام انسانی تحریروں کو چھوڑ کر صرف قرآن کا مطالعہ کریں۔ صرف اسی صورت میں وہ وہی بن سکتے ہیں جو وہ تھے۔ (دیکھئے نشانات راہ باب اول)

---ooo---

عقیدہ توحید کے بارے میں ایک بار پھر اس کا آغاز قصے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور اس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ توحید سے شرک کی طرف انتقال میں کیا کیا مراحل پیش آتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کے انحراف کے مراحل ہیں جو دین ابراہیم

سے پھر کر موجودہ مشرکانہ عقائد و اعمال کے پیرو بن گئے ہیں۔ اور آخر میں بتایا جاتا ہے کہ وہ جن الہوں کی عبادت کرتے ہیں' ان کی عبادت کس قدر بودا اور احمقانہ فعل ہے۔ پہلی نظر ہی میں اور معمولی غور و فکر کے بعد ہی نظر آ جاتا ہے کہ ان کی سوچ و عمل باطل ہیں۔ اس فقرے کے آخر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ان کو چیلنج دیں کہ یہ اللہ آپ کا جو بگاڑنا چاہیں بگاڑ لیں اور آپ یہ بھی اعلان کر دیں کہ میرا ولی اور مددگار اللہ رب العالمین ہے۔ وہ میری نصرت کے لئے کافی ہے۔ ذرا ایک نظر ملاحظہ ہو۔

---

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا
زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ
فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ
مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ
فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾
وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى
الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا
لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۫ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ
بِهَآ ۫ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۫ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ
ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾ اِنَّ وَلِیِّ‍ۧ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ
الْكِتٰبَ ۚ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا
يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى

لَا یَسْمَعُوْا ۭ وَتَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ وَ هُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾

"وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا جسے لئے لئے وہ چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اللہ 'اپنے رب سے دعا کی کہ اگر تو نے ہم کو اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے مگر جب اللہ نے ان کو ایک صحیح و سالم بچہ دے دیا تو وہ اس کی بخشش و عنایت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے۔ اللہ بہت بلند و برتر ہے۔ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں 'کیسے نادان ہیں یہ لوگ کہ ان کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں' جو نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد ہی پر قادر ہیں۔ اگر تم انہیں سیدھی راہ پر آنے کی دعوت دو تو وہ تمہارے پیچھے نہ آئیں۔ تم خواہ انہیں پکارو یا خاموش رہو' دونوں صورتوں میں تمہارے لئے یکساں ہی ہے۔ تم لوگ خدا کو چھوڑ کر جنہیں پکارتے ہو وہ تو محض بندے ہیں جیسے تم بندے ہو۔ ان سے دعائیں مانگ دیکھو' یہ تمہاری دعاؤں کا جواب دیں اگر ان کے بارے میں تمہارے خیالات صحیح ہیں۔ کیا یہ پاؤں رکھتے ہیں کہ ان سے چلیں؟ کیا یہ ہاتھ رکھتے ہیں کہ ان سے پکڑیں؟ کیا یہ آنکھیں رکھتے ہیں کہ ان سے دیکھیں؟ کیا یہ کان رکھتے ہیں کہ ان سے سنیں؟ اے نبیؐ ان سے کہو کہ "بلا لو اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو پھر تم سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو' میرا حامی و ناصر وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت کرتا ہے۔ بخلاف اس کے تم جنہیں خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد ہی کرنے کے قابل ہیں 'بلکہ اگر تم انہیں سیدھی راہ پر آنے کے لئے کہو تو وہ تمہاری بات سن بھی نہیں سکتے۔ بظاہر تم کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر فی الواقع وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔"

یہ جاہلیت اور اس کے تصورات کے ساتھ ایک ٹکر ہے' جاہلیت جب اللہ وحدہ کی غلامی اور بندگی سے منحرف ہو جاتی ہے تو وہ ضلالت اور گمراہی کی حدوں کو پار کر لیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ تدبر اور غور و فکر کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ اس ٹکڑے میں ان مراحل کی تصویر کشی کی گئی ہے جب ابتدائی طور پر انسان راہ انحراف اختیار کرتا ہے اور آخر کار مکمل گمراہی کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ (۷:۱۸۹) "وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا جسے لئے لئے وہ چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اللہ 'اپنے رب سے

دعا کی کہ اگر تو نے ہم کو اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے ۔"

یہ ہے فطرت جس کے مطابق اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے ' اس فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ کی طرف متوجہ ہو ' اور اللہ وحدہ کی ربوبیت کا اس طرح اعتراف کرے کہ اس میں کوئی اور شریک نہ ہو ' اور خوف اور رجا دونوں میں یہ اعتراف ہو ۔ یہاں اللہ نے اس فطرت کی جس مثال کو بیان کیا ہے ' وہ تخلیق انسان سے شروع ہوتی ہے اور نظام تخلیق میں خاوند اور بیوی کے تعلق کی نوعیت کو لیا ہے ۔

هُوَ الَّذِیْ ........ (۷: ۱۸۹) "وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس کی جنس سے اس کا جوڑ بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے ۔"

مرد اور عورت تخلیقی اعتبار سے ایک ہیں اس لئے انہیں نفس واحد کہا گیا ' اگرچہ مرد اور عورت کا فطری وظیفہ جدا جدا ہے ۔ فرائض طبعیہ کا یہ اختلاف اللہ نے اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ مرد عورت کے پاس سکون حاصل کرے اور وہ اس کے لئے راحت کا سبب ہو ۔ انسان کی حقیقت کے بارے میں اسلام کا یہ تصور ہے اور زوجین کے باہم تعلق اور فرائض کے بارے میں اسلام یہ تاثر دیتا ہے ۔ یہ ایک مکمل اور سچا تصور ہے ' جو صرف اسلام نے پیش کیا ہے ۔ اور آج سے چودہ سو سال قبل پیش کیا گیا ہے ۔ جبکہ تحریف شدہ ادیان سماوی میں تصور یہ تھا کہ تمام انسانی مصائب کی ذمہ دار عورت ہے ۔ اسے نجاست اور لعنت سمجھا جاتا تھا ۔ اور گمراہی کا ایک خطرناک پھندا اسے کہا جاتا تھا اور ہروقت یہ تلقین کی جاتی کہ اس سے ہروقت خطرہ محسوس کیا جائے ۔ جبکہ قدیم و جدیدیت پرست ادیان اور تہذیبوں میں اس کا مقام کنڈم مال کا سا تھا یا اگر کہیں اسے کوئی رتبہ دیا جاتا تو وہ صرف یہ ہوتا کہ وہ مرد کی خادمہ ہے اور اس کی کوئی ذاتی حیثیت نہیں ہے ۔

زوجین کے ملاپ کا اصل مقصد ' اسلام میں یہ ہے کہ وہ باہم ملیں ' سکون حاصل کریں اور امن و محبت کی فضا میں آرام کی زندگی بسر کریں ۔ تاکہ یہ کائنات اور گھر کے امن کی فضا میں بچے کے سر پر سایہ ہوں اور انسانیت کے قیمتی اثاثے کے لئے سہولت فراہم ہو ۔ اور نئی نسل انسانی تہذیب و تمدن کی حامل بن کر اس امانت کو اگلی پشتوں تک منتقل کرنے کی اہل ہو سکے ۔ اور اس میں مناسب اضافہ بھی کر سکے ۔ اسلام نے زوجین کے اس ملاپ کی غرض و غایت وقتی لذت اور عارضی جذبات کو قرار نہیں دیا ہے اور نہ اسے مرد اور عورت کے درمیان دشمنی اور نزاع تصور کیا ہے ۔ نہ مرد اور عورت کے فرائض میں سے کسی ایک کو اہم قرار دے کر دوسرے کے ساتھ متعارض قرار دیا ہے ۔ نہ عورت کو مرد کے فرائض کی دعویدار بنایا ہے اور نہ مرد کو عورت کے فرائض سپرد کئے ہیں جیسا کہ قدیم و جدید جاہلیت نے ان میں التباس کرنے کی سعی کی ہے ۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے الاسلام و مشکلات الحضارہ)

یہاں مرد اور عورت کی پہلی ملاقات کے لئے قرآن کریم نے نہایت ہی لطیف و دقیق انداز بیان اختیار کیا ہے ۔ تغشاھا "مرد نے عورت کو ڈھانک لیا ۔" اس لفظ سے مباشرت کی تصویر کے ساتھ ساتھ امن و سکون کی فضا کا بھی اظہار ہوتا ہے ۔ بات کو دو جنسوں کے درمیان ملاپ کا رنگ دیا گیا ہے ' صرف اجسام کے ملاپ کا تصور نہیں دیا گیا تاکہ انسانی جنسی ملاپ اور حیوانی جنسی ملاپ میں فرق و امتیاز بتایا جا سکے ۔ اسی طرح حمل کی تصویر کشی بھی نہایت ہی اچھے پیرائے میں دی گئی ہے ۔ ابتداء میں وہ نہایت ہی خفیف شکل میں ہوتا ہے اور بعد میں بوجھ بنتا ہے ۔

حمل کا دوسرا درجہ بوجھل ہوتا ہے

فَلَمَّآ اَثۡقَلَتۡ دَّعَوَا اللّٰہَ　　رَبَّھُمَا لَئِنۡ اٰتَیۡتَنَا صَالِحًا لَّنَکُوۡنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیۡنَ

(۷:۱۸۹) "پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اللہ، اپنے رب سے دعا کی کہ اگر تو نے ہم کو اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔"

اب اس دوسرے مرحلے میں حمل واضح ہوگیا ہے اور زوجین کے دل اس کے ساتھ اٹک گئے ہیں اور ان امیدوں کا وقت آگیا ہے کہ بچہ صحیح و سالم اور خوبصورت اور صالح ہو اور یہی وہ چیزیں ہیں جن کی تمنا سب والدین، اولاد کے بارے میں کرتے ہیں جبکہ وہ ماں کے پیٹ کی تاریکیوں میں جنین ہوتی ہے اور وہ عالم غیب میں ہوتی ہے۔ امید کے اس عالم میں انسانی فطرت جاگ اٹھتی ہے۔ اور والدین اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، وہ اللہ کی ربوبیت کا اعتراف کرتے ہیں اور اللہ وحدہ کے فضل و کرم کے امیدوار ہوتے ہیں کیونکہ انسانی فطرت کو ذاتی طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کائنات میں قوت، نعمت اور فضل و کرم کا واحد سرچشمہ ذات باری ہے۔ چنانچہ دَّعَوَا اللّٰہَ (۷:۱۸۹)

"دونوں نے اپنے رب کو پکارا کہ اگر اس نے ہمیں صالح بچہ دیا تو ہم شکر ادا کرنے والوں میں سے ہوں گے۔"

فَلَمَّآ اٰتٰھُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَہٗ شُرَکَآءَ فِیۡمَآ اٰتٰھُمَا　(۷:۱۹۰) "مگر جب اللہ نے ان کو ایک صحیح و سالم بچہ دے دیا تو وہ اس کی بخشش و عنایت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے۔"

بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ ایک حقیقی واقعہ تھا۔ یہ واقعہ حضرت آدم اور حوا کو پیش آیا، کیونکہ ان کے جو بچے پیدا ہو رہے تھے وہ بدشکل اور بگڑی ہوئی صورت کے ہوتے تھے۔ شیطان نے حضرت حوا کو اس طرح ورغلایا کہ اس کے پیٹ میں جو کچھ ہے اس کا نام عبدالحارث رکھ دے۔ حارث ابلیس کا نام تھا۔ اس طرح یہ بچہ صحیح و سالم پیدا ہوگا۔ اس نے حضرت آدم کو بھی ورغلا کر ایسا ہی کہا۔" بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت اسرائیلی طرز کی ہے۔ کیونکہ اسرائیلی اور یہودی تصور کے مطابق وہ آدم کے ورغلانے میں حوا کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ جب کہ اسلام اس تصور کو جڑ سے اکھاڑتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہودی اور عیسائی ادیان میں حقیقت سے انحراف کیا گیا ہے۔

ہمیں اس آیت کی تشریح میں ایسی اسرائیلی روایات کی طرف کوئی احتیاج نہیں ہے۔ اس آیت میں دراصل ان انحرافات کی طرف اشارہ ہے جو نفس انسانی میں بتدریج راہ پاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اور آپ سے پہلے ادوار میں بھی یہ رواج تھا کہ مشرکین اپنے بچوں کی بتوں کے نام پر نذر مانتے تھے یا گرجوں اور عبادت گاہوں کی خدمت کے لئے وقف کرتے تھے۔ یہ کام وہ بطور تقرب الی اللہ کرتے تھے۔ اس معاملے میں پہلے تو ان کی توجہ کا مرکز ذات باری ہوتی تھی کیونکہ توحید کے بلند مقام سے گرنے اور بت پرستی کے گڑھے میں نیچے چلے جانے کے بعد وہ اس قسم کی نذر و نیاز مختلف آستانوں پر گزارتے تھے تاکہ ان کے بچے زندہ رہیں اور صحیح و سالم ہوں اور وہ خطرات سے دوچار نہ ہوں، جس طرح آج بھی لوگ اپنے بچوں میں سے بعض کو اولیاء اور مذہبی شخصیات کے لئے وقف کرتے ہیں۔ مثلاً وہ بچوں کے بال اس وقت تک نہیں منڈواتے جب تک پہلی مرتبہ کسی ولی اور پاکباز شخص کی درگاہ پر نہ لے جائیں۔ بعض

اوقات اس کا ختنہ بھی نہیں کرتے اور یہ ختنہ بھی کسی گدی اور درگاہ پر لے جا کر کرتے ہیں ۔ حالانکہ یہ لوگ کلمہ پڑھ کر اللہ وحدہ لاشریک کو تسلیم کرتے ہیں اور اس اقرار اور اعتراف کے باوجود یہ مشرکانہ رجحانات رکھتے ہیں ۔ غرض وہی لوگ اور وہی ان کے خیالات مشرکانہ :

فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۷: ۱۹۰) "اللہ بہت بلند و برتر ہے ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں ۔" یعنی وہ پاک ہے ان تصورات سے جو وہ اس کے بارے میں رکھتے اور ان باتوں سے جو اس کے حوالے سے وہ کرتے ہیں ۔

لیکن ہم اپنے دور جدید میں بھی دیکھتے ہیں کہ لوگ انواع و اقسام کے شرک میں مبتلا ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا زعم یہ ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور موحد ہیں اور ان لوگوں کے یہ جدید شرک اور بت پرستیاں بھی اسی شکل و صورت جیسی ہیں جن کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے ۔

آج لوگ اپنے لئے نئے نئے بت گھڑتے ہیں ' بعض اسے "قوم" کا نام دیتے ہیں ' بعض اسے "وطن" کا نام دیتے ہیں بعض اسے "شعب" کا نام دیتے ہیں وغیرہ ۔ یہ بھی بت ہیں لیکن یہ غیر مجسم بت ہیں ' یہ سابقہ بت پرستوں کی طرح سادہ اور مجسم بت نہیں ۔ یہ بھی دراصل ان لوگوں کے خدا ہیں جو ان کو پوجتے ہیں ۔ یہ ان بتوں کو اللہ کی تخلیق اور نذر و نیاز میں اسی طرح شریک کرتے ہیں جس طرح اس سے قبل قدیم الہوں کی پوجا کی جاتی تھی ۔ یہ ان بتوں کی چوکھٹ پر اسی طرح قربانیاں دیتے ہیں جس طرح قدیم بتوں اور بت خانوں پر خون بہایا جاتا تھا ۔ اور وسیع پیمانے پر بہایا جاتا تھا ۔

لوگ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اللہ ان کا رب ہے ' لیکن وہ اللہ کے اوامر و احکام اور شریعت کو پس پشت ڈالے ہوئے ہیں جبکہ ان جدید غیر مجسم بتوں کے احکام اور قوانین کی وہ پوری طرح پابندی کرتے ہیں اور انہیں مقدس سمجھتے ہیں اور ان کے مقابلے میں اللہ کے احکام و شرائع کو مکمل طور پر ترک کر دیتے ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ الٰہ نہیں ہیں ' اگر یہ شرک نہیں ہے ' اور لوگوں کی اولاد میں یہ لوگ شریک نہیں ہیں تو اور کیا ہیں ۔ آخر جاہلیت جدیدہ کی اس بت پرستی کو ہم کن الفاظ سے تعبیر کریں ۔ ظاہر ہے کہ یہ بت پرستی ہی ہے ۔

میں سمجھتا ہوں کہ جاہلیت قدیم اللہ کے معاملے میں زیادہ باادب تھی ۔ اس کا کہنا تو یہ تھا کہ ہم اپنی اولاد ' اپنی پیداوار اور اپنے مویشیوں میں ان الہوں کا حصہ اس لئے مقرر کرتے ہیں تاکہ ان ذرائع سے ہم اللہ کا قرب اور نزدیکی حاصل کر لیں ۔ ان کے احساس و شعور میں ان بتوں اور الہوں سے اللہ بلند تھا ۔ رہی جاہلیت جدیدہ تو اس کے احساس و شعور میں یہ غیر مجسم بت اللہ سے اعلیٰ و ارفع ہیں ' اس طرح کہ جاہلیت جدید اللہ کے احکام و شرائع کو ترک کر رہی ہے اور ان بتوں کے احکام و شرائع کو سینے سے لگا رہی ہے ۔

ہم بت پرستی کے بارے میں یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ اس سے مراد وہ ساری بت پرستی ہے جو قدیم زمانے کی طرح کوئی کسی بت کی طرف اشارہ کرے یا وہ مراسم ادا کرے جو بتوں کے حوالے سے قدیم زمانے کے لوگ کرتے تھے ۔ دور جدید کی بت پرستی میں بتوں کی شکل و صورت اور ان کے سامنے مراسم ادا کرنے کی شکل اگرچہ بدل گئی ہے لیکن ان کی تہ میں جو شرک ہے وہ ہرگز نہیں بدلا اور وہ علیٰ حالہ قائم ہے ۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اس حقیقت کو نوٹ کریں اور اس

معاملے میں دھوکے کا شکار نہ ہوں۔

مثلاً اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ عورت عفت و وقار اور شرافت کو اپنا زیور بنائے اور "وطن" کا حکم یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے عورت گھر سے نکل آئے اور جاہلیت کی زیب و زینت اختیار کرے۔ وہ عریاں ہو، ہوٹلوں میں خادمہ کا کام کرے، جس طرح بت پرست جاپان میں "جیشا" عورتیں کرتی ہیں لہٰذا کون الہ ہے جس کے احکام مانے جاتے ہیں، اللہ کے احکام مانے جاتے ہیں یا الہ وطن اور الہ پیداوار کے۔

اللہ کا حکم تو یہ ہے کہ اجتماع کا مدار عقیدے پر ہونا چاہئے، سوسائٹی کا مدار لا الہ پر ہو لیکن قومیت اور وطن کا حکم یہ ہے کہ اجتماعی زندگی سے اسلامی عقائد و تصورات کی نفی کی جائے اور سوسائٹی کا مدار قوم پرستی یا نسل پرستی پر ہو۔ یہاں بھی یہی سوال ہے کہ الہ کون ہے اللہ یا وطن اور نسل۔

اللہ کا حکم یہ ہے کہ اس کی شریعت کی پابندی ہوگی لیکن انسانوں میں سے ایک انسان ڈکٹیٹر اٹھتا ہے یا لوگوں کا ایک گروپ اٹھتا ہے (اسمبلی) کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ قانون تو اسمبلی کا چلے گا۔ اب آپ بتائیں کہ اسمبلی الہ ہے یا اللہ جل شانہ الہ ہے۔

یہی وہ مثالیں ہیں جن کے مطابق پوری دنیا چل رہی ہے اور پوری انسانیت ان مثالوں سے متعارف ہے اور گمراہ ہو چکی ہے اور یہ ہے اس وقت کی مروج اور چلتی ہوئی بت پرستی اور یہ ہیں آج کے بت۔ قدیم بتوں کے مقابلے میں یہ جدید بت سامنے آگئے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ بت نظر نہیں آتے اور وہ سابقہ بت مجسم تھے، نظر آتے تھے لیکن دونوں کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

قرآن کریم کا خطاب اس سادہ بت پرستی سے تھا۔ قدیم جاہلیت سے جو بالکل واضح تھی۔ قرآن انہیں اس کم عقلی سے جگا رہا تھا۔ وہ انسان جیسی مخلوق کے شایان شان نہ تھی۔ چنانچہ قرآن کریم نے ان کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے لئے ایسی مثال دی جس میں ان کی ذہنی کیفیات کو آشکارا کر دیا۔

اَیُشْرِکُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْئًا وَّھُمْ یُخْلَقُوْنَ (۱۹۱) وَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَھُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَھُمْ یَنْصُرُوْنَ (۷: ۱۹۲) "کیسے نادان ہیں یہ لوگ کہ ان کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں، جو نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد ہی پر قادر ہیں۔"

قرآن انہیں یہ سمجھاتا ہے کہ جو خالق ہے وہ اس بات کا مستحق ہوتا ہے کہ اس کی بندگی کی جائے اور جن الہوں کی وہ بندگی کرتے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس جہاں کا خالق نہیں ہے بلکہ وہ خود مخلوق ہیں تو آخر کیا جواز ہے کہ یہ لوگ ان بتوں کی بندگی کرتے ہیں۔ کس لئے وہ اپنے نفوس اور اپنی اولاد میں ان بتوں کو کیوں شریک کرتے ہیں۔

پرستش اور عبادت تو اس کی کی جاتی ہے جو اپنے بندوں کی حفاظت کرتا ہے اور وہ اپنی قوت سے ان کی مدد کرتا ہے۔ قوت، غلبہ اور بادشاہت تو صرف اللہ کے پاس ہے۔ وہ جن بتوں کو پکارتے ہیں وہ کوئی مدد نہیں کر سکتے، بلکہ وہ بت خود اپنی امداد بھی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اپنی جانوں اور اپنی اولاد اور اموال میں وہ کس جواز کی بنیاد پر ان بتوں کو شریک کرتے ہیں۔

تخلیق کی دلیل اور حجت جس طرح جاہلیت قدیمہ کے خلاف حجت تھی، اسی طرح یہ جاہلیت جدیدہ کے خلاف بھی

حجت ہے۔ جاہلیت جدید نے جو نئے بت تراشے ہیں ان میں سے کس بت نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے کہ وہ لوگ انہیں اپنی جان' اپنی اولاد اور اپنے اموال میں شریک کرتے ہیں۔ پھر ان جدید بتوں میں سے کون بت ایسا ہے جو نفع و نقصان کا مالک بن سکتا ہے۔

اگر انسانی عقل اور سوچ کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ اس صورت حالات کو یکسر رد کر دے اور کبھی اسے قبول نہ کرے۔ یہ تو لوگوں کی خواہشات اور میلانات اور خارجی گمراہی اور فریب کاری ہے کہ لوگ ان جدید بتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ خارجی اثرات اور سازشیں ہیں کہ وہ لوگوں کو مرتد کر کے اس جدید جاہلیت کی طرف لوٹا رہی ہیں اور اس جدید شکل میں اسے شرک و بت پرستی میں مبتلا کر رہی ہیں۔ اس لئے لوگ ان بتوں کو پوجتے ہیں جو انہوں نے خود گھڑے ہیں (قوم' نسل' وطن) اور یہ بت لوگوں کے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں ہیں۔

دور جدید کی انسانیت اس بات کی محتاج ہے کہ اسے قرآن کی تعلیمات سے مخاطب کیا جائے۔ جس طرح قدیم ادوار میں اس تک قرآنی تعلیمات پہنچائی گئی تھیں۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ جاہلیت کی قیادت کر کے اسے اسلام کی طرف لایا جائے۔ اسے اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لایا جائے' اور اس کے عقل و شعور کو اس جدید جاہلیت سے نجات دی جائے۔ اسے اس جدید فکری گندگی سے اسی طرح نجات دی جائے جس طرح آج سے صدیوں قبل اسلام نے انسانیت کو نجات دی تھی۔ قرآن کریم نے قدیم جاہلیت کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ان میں یہ اشارہ بھی ہے کہ انسانوں میں سے بھی کسی کو الٰہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ذرا دوبارہ غور کریں۔

"کیسے نادان ہیں یہ لوگ کہ ان کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں۔ جو نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں' نہ آپ اپنی مدد پر ہی قادر ہیں۔"

ان آیات کے صیغوں میں جمع مذکر کے صیغے اور ہم کی ضمیر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان بتوں میں سے کچھ عقلا بھی تھے۔ یہ بات ہم نہیں کہہ سکتے کہ عرب کچھ انسانوں کو بھی اپنا الٰہ اس معنی میں تسلیم کرتے تھے کہ وہ ان کی بندگی کرتے ہوں اور ان کے سامنے مراسم عبودیت بجا لاتے ہوں' انسانوں کو وہ الٰہ اس معنی میں بناتے تھے کہ وہ اجتماعی امور میں ان کے رسم و رواج اور ہدایات کی اطاعت کرتے تھے اور اپنے نزاعات میں ان کے قوانین کے مطابق فیصلے کرتے تھے یعنی زمینی حاکمیت کے اعتبار سے قرآن کریم اسی عمل کو شرک کہتا ہے اور وہ اس معنوی بت پرستی اور ان کی مجسم بت پرستی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا۔ اسلامی نقطہ نظر سے یہ دونوں شرک ہیں اور اسی معنی میں یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے مذہبی لیڈروں کو رب بنا رکھا تھا کہ وہ ان کے احکام و قوانین کو خدا کے احکام و قوانین کی طرح مانتے اور جانتے تھے جبکہ ان میں سے کوئی بھی خدا کی طرح ان کے سامنے مراسم عبودیت بجا نہ لاتا تھا لیکن قرآن نے ان کے اس فعل کو شرک اور خروج عن التوحید سے تعبیر کیا۔ اس توحید سے خروج جس کا ذکر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے کیا گیا ہے اور یہ تعبیر اس نکتے کے عین مطابق ہے جو ہم نے جاہلیت جدیدہ کے بارے میں اوپر بیان کیا۔ احادیث کے مطابق حضور نے آیات اتخذوا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی یہی تعبیر فرمائی ہے۔

زوجین کے قصے کی شکل میں اوپر جس شرک کا ذکر کیا گیا تھا' وہ دراصل ہر شرک کی بات تھی۔ ان لوگوں کو بت پرستی کے خلاف منظم کرنا مطلوب تھا' جن کو قرآن مخاطب کر رہا تھا۔ اور ان کو یہ بتلانا مقصود تھا کہ وہ جس بت پرستی میں

مبتلا ہیں وہ نہایت ہی کمزور اور احمقانہ ہے کہ وہ ایسی چیزوں کو الہ بنا رہے ہیں جو کسی چیز کی تخلیق نہیں کر سکتے بلکہ خود مخلوق ہیں' نہ صرف یہ کہ وہ چیزیں تمہیں نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتیں بلکہ وہ خود اپنے نفع و نقصان کی مالک ہی نہیں ہیں۔ خواہ یہ چیزیں زندہ انسان ہوں یا مردہ بت ہوں' یہ سب کی سب نہ تخلیق کر سکتی ہیں اور نہ کسی کی نصرت پر قادر ہیں۔ چونکہ قرآن کا مقصد اس تمثیل سے صرف یہی تھا' اس لئے تمثیل کے بعد روئے سخن براہ راست مشرکین مکہ کی طرف مڑ جاتا ہے اور حکایت کے اسلوب کو ترک کر کے اچانک خطاب شروع کر دیا جاتا ہے۔ بات وہی سابقہ ہے' پہلے تمثیل و قصہ تھا اور اب براہ راست خطاب ہے۔ ان الہوں کی حقیقت کے بارے میں۔

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ (۱۹۳) اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۹۴) اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا (۷:۱۹۵)

"اگر تم انہیں سیدھی راہ پر آنے کی دعوت دو تو وہ تمہارے پیچھے نہ آئیں۔ تم خواہ انہیں پکارو یا خاموش رہو' دونوں صورتوں میں تمہارے لئے یکساں ہی رہے۔ تم لوگ خدا کو چھوڑ کر جنہیں پکارتے ہو وہ تو محض بندے ہیں جیسے تم بندے ہو۔ ان سے دعائیں مانگ دیکھو' یہ تمہاری دعاؤں کا جواب دیں اگر ان کے بارے میں تمہارے خیالات صحیح ہیں۔ کیا یہ پاؤں رکھتے ہیں کہ ان سے چلیں؟ کیا یہ ہاتھ رکھتے ہیں کہ ان سے پکڑیں؟ کیا یہ آنکھیں رکھتے ہیں کہ ان سے دیکھیں؟ کیا یہ کان رکھتے ہیں کہ ان سے سنیں؟"

جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بیان کیا۔ مشرکین عرب کی بت پرستی ایک سادہ بت پرستی تھی' انسانی عقل کے ترازو میں بالکل بے وزن تھی' اگر چہ یہ عقل نہایت ہی ابتدائی اور پتھر کے دور کی کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بارے میں قرآن کریم عقل کو متوجہ کرتا ہے کہ وہ ان بتوں کے بارے میں جن شرکیہ خیالات کو سچا سمجھتے ہیں یہ نہایت ہی کم عقلی کی دلیل ہے۔

ذرا اپنے بتوں کے بارے میں غور تو کرو' بظاہر ان کے پاؤں چلنے کے قابل نہیں ہیں' ان کے ہاتھ پکڑنے والے نہیں ہیں۔ ان کی آنکھوں میں نظر نہیں ہے۔ ان کے کانوں میں قوت سماعت نہیں ہے جبکہ تمہارے پاس جو اعضاء ہیں ان میں یہ قوتیں موجود ہیں' تو پھر تم ایسے بے جان اعضاء والے بتوں کی کیوں پوجا کرتے ہو؟

بعض اوقات بت پرست یہ کہتے ہیں کہ ان بتوں سے ان کا اصل مدعاء اشارہ ہے بعض رشتوں کی عزت یا آباء و اجداد کی طرح تو قرآن کہتا ہے کہ وہ بھی تو تمہاری طرح کے بندے ہیں اور اللہ کی مخلوق ہیں اور وہ خود کوئی چیز پیدا کرنے والے نہ تھے اور نہ ہیں اور نہ نفع و نقصان کے مالک ہیں اور نہ خود اپنے نفع و نقصان کے مالک ہیں۔

چونکہ عرب بت پرستی میں ظاہری بت پرستی بھی تھی اور سابقہ انسانوں کی طرف اشارہ بھی تھا۔ اس لئے قرآن کریم

نے ان کے لئے ذوی العقول کے صیغے استعمال کئے اور یوں آدمیوں کی طرف خطاب کیا۔ ذوی العقول کی ضمیر میں اشارہ ان شخصیات کی طرف ہے جن کی طرف بتوں میں رمز تھا۔ کبھی تو براہ راست بتوں کی بات کی گئی اور کبھی عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (۷: ۱۹٤) کیا گیا۔ بہرحال دونوں طرز کا شرک اسلامی نظر میں باطل ہے۔ اور قرآن انسانیت کو اس ذلت سے نکالنے کے درپے ہے۔ اور اسے انسانیت کے شایان شان عقیدۂ توحید کی بلندیوں تک لے جاتا ہے۔

---ooo---

اس مباحثے اور نقد و جرح کے آخر میں اللہ تعالیٰ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرماتے ہیں کہ آپ ان کو چیلنج کریں۔ ان لاچار خداؤں کو بھی چیلنج کریں اور ان کے سامنے واشگاف الفاظ میں اپنے صاف اور ستھرے نظریات رکھیں۔

قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ (۱۹۵) اِنَّ وَلِيِّ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ (۱۹٦) وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ (۱۹۷) وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (۷: ۱۹۸) "اے نبی ؐ ان سے کہو کہ "بلا لو اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو پھر تم سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو، میرا حامی و ناصر وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت کرتا ہے، بخلاف اس کے تم جنہیں خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد ہی کرنے کے قابل ہیں، بلکہ اگر تم انہیں سیدھی راہ پر آنے کے لئے کہو تو وہ تمہاری بات سن بھی نہیں سکتے۔ بظاہر تم کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر فی الواقع وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔"

یہ ہے وہ بات جو ہر داعی کو کسی بھی جاہلیت کے سامنے کرنی چاہئے۔ اور یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کی جس طرح ان کے رب نے ان کو حکم دیا۔ اور اپنے دور میں آپ نے بت پرستوں اور ان کے بتوں کو اسی انداز میں چیلنج کیا۔

قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ (۷: ۱۹۵) "اے نبی ؐ ان سے کہو کہ "بلا لو اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو پھر تم سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔"

آپ ؐ نے اس تحدی کو ان کے اور ان کے بتوں کے منہ پر دے مارا اور فرمایا کہ میرے خلاف جو تدابیر تم کر سکتے ہو، وہ کرو۔ جس قدر کر سکتے ہو، کوئی کمی نہ چھوڑو۔ مجھے کوئی مہلت نہ دو، اور یہ تحدی آپ نے اس شخص کی طرح دی جسے اپنے مقصد پر یقین ہوتا ہے اور اپنے خالق اور اللہ پر پورا بھروسہ ہوتا ہے اور مخالفین کی سازشوں اور قوتوں کے مقابلے میں وہ اپنے خدا پر بھروسہ کرتا ہے۔

اِنَّ وَلِیِّ اللّٰہُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ (۷:۱۹۶) ”میرا حامی و ناصر وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت کرتا ہے۔“

آپ ؐ نے اعلان کر دیا کہ وہ کس پر بھروسہ کرتے ہیں' صرف اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں جس نے کتاب نازل فرمائی۔ اس کتاب کے نزول سے معلوم ہوا کہ آپ کا ارادہ کیا ہے' یہ کہ سچائی پر مشتمل اس کتاب کو رسول لوگوں کے سامنے پیش کریں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ نے یہ بات طے کر دی ہے کہ وہ اس سچائی کو ہر باطل اور اہل باطل پر بلند اور غالب کر دیں گے اور اس دعوت کے حاملین بندگان کی حفاظت اور ولایت وہ خود کریں گے جو اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں۔

رسول اللہ کے بعد ہر دور اور ہر علاقے میں دعوت کے حاملین کا یہی نعرہ اور یہ نصب العین ہو گا: ”اے نبی ان سے کہو ”بلا لو اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو پھر تم سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو' میرا حامی و ناصر وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت کرتا ہے۔“ ہر صاحب دعوت کا یہ فرض ہے کہ وہ دنیا کے تکیوں اور بھروسوں پر اعتماد نہ کرے اور وہ دنیا کے بھروسوں کو کوئی اہمیت نہ دے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے سہاروں کی کوئی اہمیت نہیں ہے' وہ بہت ہی کچے سہارے ہوتے ہیں۔ اگرچہ دنیاوی سہارے نہایت ہی قوی ہوں اور بظاہر نہایت ہی طاقتور نظر آئیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَہٗ وَاِنْ یَّسْلُبْھُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْہُ مِنْہُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (۲۲:۷۳) ”لوگو' ایک مثال دی جاتی ہے' غور سے سنو۔ جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو' وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے بلکہ مکھی اگر ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔“

مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْلِیَآءَ کَمَثَلِ الْعَنْکَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَیْتًا وَاِنَّ اَوْھَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْکَبُوْتِ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (۲۹:۴۱) ”جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لئے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے' جو اپنا گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے' کاش کہ یہ لوگ علم رکھتے۔“

غرض جو شخص اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے' وہ بھروسہ بھی اللہ پر کرتا ہے۔ لہٰذا اللہ کے سوا دوسرے سرپرستوں اور سہاروں کی حیثیت ہی کیا رہتی ہے۔ اور ایسے شخص کے شعور میں ان کی گنجائش کیا رہتی ہے۔ اگرچہ دوسرے لوگ داعی کو اذیت دینے پر بھی قدرت رکھتے ہوں۔ داعی کو اگر کوئی اذیت دیتا ہے تو یہ بھی اذن الٰہی سے ہوتا ہے' جو داعی کا والی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ داعی کی حمایت سے عاجز و لاچار ہوتا ہے اور نہ اس لئے کہ داعی کی حمایت سے اللہ تعالیٰ دست کش ہو گیا ہے۔ نہ یہ صورت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کی مدد نہیں کر سکتا۔ آخر اللہ تعالیٰ داعیوں کے مخالفین

کو یہ مہلت اور اجازت کیوں دیتا ہے کہ وہ اللہ کے دوستوں کو اذیت دیں؟ ان کی تربیت کے لئے کھرے اور کھوٹے کو جدا کرنے کے لئے اور ان کو مجرب بنانے کے لئے۔ نیز اللہ کے دشمنوں کی رسی دراز کرنے کے لئے انہیں مہلت دینے کے لئے اور ان کے خلاف سخت ترین اقدامات اور تدابیر اختیار کرنے کے لئے اللہ ان کو ڈھیل دیتا ہے۔

ایک موقع ایسا بھی آیا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مشرکین مکہ اذیت دے رہے تھے اور آپ کو جوتوں کے تلووں کے ساتھ مار رہے تھے۔ آپ کے چہرے پر انہوں نے اس قدر ضربات لگائیں کہ آپ کے چہرۂ مبارک پر آنکھیں نظر ہی نہ آتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس کرۂ ارض پر اس عظیم ترین ہستی پر اس قدر بے رحمانہ تشدد ہو رہا تھا لیکن اس پورے تشدد کے دوران آپ یہی کہتے رہے: "اے اللہ' آپ کس قدر حلیم ہیں! اے اللہ آپ کس قدر حلیم ہیں!" وہ دل و جان سے اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ اس اذیت کے پیچھے رب کا حلم کام کرتا ہے۔ ان کو پورا یقین تھا کہ رب تعالیٰ عاجز نہ تھا کہ وہ اپنے ان دشمنوں کو تہس نہس کر دے۔ نیز ان کو یہ یقین بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو بھی بے سہارا نہیں چھوڑتا۔

جب مشرکین نے حضرت عبداللہ ابن مسعود پر تشدد کیا اور یہ تشدد انہوں نے محض اس لئے کیا کہ انہوں نے کعبہ کے سائے میں' مشرکین کی ایک محفل کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت شروع کر دی تھی۔ انہوں نے اسے اس قدر مارا کہ ان کا سر چکرانے لگا اور ان کے لئے کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ اس سنگدلانہ تشدد کے بعد وہ کہتے "خدا کی قسم کہ یہ لوگ میرے لئے اس وقت سے زیادہ کبھی بھی قابل برداشت اور آسان نہ تھے۔" آپ کو علم تھا کہ یہ اللہ کے دشمن تھے اور ان کو یہ بھی یقین تھا کہ اللہ کا دشمن ایک مومن کے لئے بہت ہی آسان اور خفیف ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ کے دوستوں کو چاہئے کہ وہ اللہ کے دشمنوں کو خاطر ہی میں نہ لائیں۔

حضرت عبداللہ ابن مظعون عتبہ ابن ربیعہ مشرک کی پناہ میں تھے' انہوں نے اپنے آپ کو عتبہ کی پناہ سے نکال دیا۔ کیونکہ وہ یہ پسند نہ کرتے تھے کہ وہ عتبہ کی مشرکی پناہ میں مزے سے رہیں اور دوسرے مسلمانوں پر تشدد جاری ہو' جب انہوں نے عتبہ کی پناہ کو حقارت سے پھینک دیا تو مشرکین ان پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے ان پر اس قدر تشدد کیا کہ وہ ایک آنکھ سے محروم ہو گئے۔ عتبہ دیکھتے تھے کہ ان پر یہ تشدد ہو رہا ہے اور ان کو دعوت دیتے تھے کہ وہ دوبارہ اس کی پناہ میں آ جائیں۔ انہوں نے کہا: "میں ایک ایسی ذات کی پناہ میں ہوں جو تم سے زیادہ طاقتور ہے۔" عتبہ کہتا: "اے بھائی تمہاری آنکھ اس سے مستغنی اور محفوظ تھی جو اذیت اسے پہنچی۔" تو وہ جواب دیتے: "ہرگز نہیں خدا کی قسم! میری دوسری آنکھ بھی اس بات کی متمنی کہ اسے بھی اللہ کے راستے میں وہ کچھ پہنچے جو اس کے لئے بہتر ہو۔" وہ جانتے تھے کہ اللہ کی پناہ بندوں کی پناہ سے زیادہ طاقتور ہے۔ ان کو یقین تھا کہ رب تعالیٰ ہرگز انہیں بے سہارا نہ چھوڑیں گے۔ اگرچہ وہ نفس کو سربلند کرنے اور آزمانے کے لئے ان مشکلات سے دوچار کرتا ہے۔ کیا خوب کہا "خدا کی قسم میری دوسری آنکھ بھی اس صورت حال کی مستحق ہے جو اس کے لئے اللہ کے راستے میں بہتر ہو۔"

یہ ہیں مثالیں اس گروہ کی جنہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مدرسہ میں تربیت پائی اور اللہ کی ان ہدایات کے سائے میں پلے۔ "اے نبی ان سے کہہ دو کہ "بلا لو اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو' پھر تم سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو' اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو' میرا حامی اور ناصر وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں

کی حمایت کرتا ہے۔"

اس تشدد کا نتیجہ کیا تھا؟ انہوں نے مشرکین کی جانب سے یہ تشدد برداشت کیا۔ انہوں نے اللہ پر بھروسہ کیا' جس نے کتاب نازل کی تھی اور جو نیک بندوں کا حامی تھا۔ تاریخ اس نتیجے سے اچھی طرح واقف ہے۔ مسلمانوں کو غلبہ' عزت اور شوکت نصیب ہوئی کیونکہ وہ اللہ کے دوست تھے۔ ہزیمت' شکست اور ہلاکت و بربادی ان لوگوں کے حصے میں آئی جو نیک لوگوں کے دشمن تھے اور طاغوت تھے اور ان میں سے جن لوگوں کے نصیب میں ایمان لانا مقدر تھا' وہ ایمان لے آئے اور ان سابقین اولین کے تابع ہو گئے۔ جنہوں نے خود ان کے ہاتھوں تکالیف اٹھائی تھیں۔ لیکن ان کے عزم و استقلال میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔

اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ان کو چیلنج کریں تو آپ نے ان کو چیلنج دے دیا۔ اور حکم دیا کہ آپ ان کے الہوں کی کمزوری اور عاجزی کو ان الفاظ میں بیان کریں اور آپ نے اس کی تعمیل فرمائی۔

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ (۱۹۷) وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (۷:۱۹۸) اگر یہ موقف عربوں کی سادہ جاہلیت پر پوری طرح منطبق تھا' تو آج کی جدید اور نظریاتی جاہلیت پر بھی اسی اعلان اور اس موقف کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ جدید مشرکین بھی دراصل اللہ کے سوا دوسرے لوگوں کو اپنا ولی سمجھتے ہیں' اس لئے کہ ان کے ہاتھوں میں دنیا کا اقتدار ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے ان سرکشوں اور فرعونوں کے اندر اس قدر قوت نہیں ہوتی کہ وہ ان کی کوئی امداد کر سکیں۔ اور اللہ کی تقدیر اور اس کی سنت اپنے بندوں کے بارے میں اپنے مقررہ طریقے پر چلتی رہتی ہے۔

عربوں کے مصنوعی الٰہ اپنی سادہ شکل میں سنتے نہ تھے حالانکہ ان کی دھاتوں یا موتیوں کی بنی ہوئی آنکھیں تھیں' تو دور جدید کے بعض الٰہ بھی نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں۔ الٰہ وطن بھی اندھا ہے اور الٰہ القوم بھی بہرا ہے۔ اور الٰہ پیداوار بھی گونگا بہرا ہے۔ اور ان کے بارے میں بھی تاریخ کا فیصلہ اٹل ہو گا۔ جدید دور کے الہوں میں سے صرف وہ الٰہ سنتے اور سمجھتے ہیں جو انسانوں میں سے ہیں' جنہیں اقتدار دیا گیا ہے اور جو الٰہ حقیقی کے مقابلے میں قانون سازی بھی کرتے ہیں اور اس کے احکام کے برعکس احکام بھی صادر کرتے ہیں' تو یہ الٰہ بھی درحقیقت نہ دیکھتے ہیں اور نہ سنتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید نے کہہ دیا ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷:۱۷۹) "اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم

ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان کے ساتھ سوچتے نہیں۔ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے ہیں۔ان کے پاس کان ہیں مگر ان سے سنتے ہیں۔وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔"

ہر داعی کو ہی ایک صورت حال پیش آتی ہے۔تمام جاہلیتوں کے مقابلے میں اسے ایک ہی جیسے حالات سے سابقہ پڑتا ہے اور اسے چاہئے کہ وہ ہر جاہلیت کو وہی چیلنج دے جو اللہ نے نبی آخر الزمان کو بتایا۔

قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ (۱۹۵) اِنَّ وَلِيِّيَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ (۱۹۶) وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ (۱۹۷) وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (۷:۱۹۸) "اے نبی ؐ ان سے کہو کہ "بلا لو اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو پھر تم سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو' میرا حامی و ناصر وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت کرتا ہے' بخلاف اس کے تم جنہیں خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو' وہ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد ہی کرنے کے قابل ہیں' بلکہ اگر تم انہیں سیدھی راہ پر آنے کے لئے کہو تو وہ تمہاری بات سن بھی نہیں سکتے۔بظاہر تم کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر فی الواقع وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔"

غرض یہ الٰہ اب بھی وہی ہیں جو مکہ میں تھے' ہر دور اور ہر مقام پر دراصل یہ وہی کچھ ہیں اور ان کو اسی قسم کا چیلنج درکار ہے جو حضور ؐ نے بحکم خدا دیا۔

---ooo---

# درس نمبر ۸۲ ایک نظر میں

اس سورہ کے آخر میں یہ ربانی ہدایات ہیں ' اللہ کی جانب سے خاص اپنے دوستوں کو یہ نصیحت کی جا رہی ہے ۔ ان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں سے خطاب ہے ' اس وقت یہ لوگ ابھی مکہ ہی میں تھے ۔ یہ ہدایات انہیں اس ہمہ گیر جاہلیت کے مقابلے کے لئے دی جا رہی ہیں جو مکہ اور اس کے ارد گرد پوری دنیا پر چھائی ہوئی تھی ۔ یہ ہدایات اس ہمہ گیر جاہلیت کے مقابلے کے لئے خاص طور پر جاری ہوئی ہیں اور گمراہ انسانیت کو راہ ہدایت دکھانے کے لئے ہیں ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت قائد دعوت یہ حکم دیا جاتا ہے کہ لوگوں کے لئے نہایت ہی یسر اور نرمی کے ساتھ پیش آئیں اور ایسی باتوں کا حکم دیں جنہیں سلیم فطرت انسانی افعال خیر سمجھتی ہو ۔ تمہارے احکام و ہدایات میں تعقید اور تشدید نہ ہو ' اور جہاں جاہلیت اصلاح پذیر نہ ہوں وہاں اس کے ساتھ الجھنے کے بجائے اس سے پہلوتہی کیا جائے ' لوگوں سے مجادلہ نہ کیا جائے ' ان کی فضول محفلوں میں شریک نہ ہوں اور اگر اہل جاہلیت آپ ؐ کو غصہ دلائیں اور حدود پار کریں اور ضد و عناد کا مظاہرہ کریں اور شیطان کی وسوسہ اندازیوں کے نتیجے میں آپ کو طیش آ جائے تو آپ شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کریں اور تعوذ کے ذریعے اطمینان حاصل کر کے صبر کریں ۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِينَ (۱۹۹) وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۲۰۰) إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُونَ (۷ : ۲۰۱) " اے نبی ؐ ' نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو ' معروف کی تلقین کئے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو ۔ اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو ' وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے ۔ حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لئے صحیح طریق کار کیا ہے ۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان جاہلوں کے مزاج سے متعارف کرایا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ وہ کس قوت کی وسوسہ اندازی ہے جو ان لوگوں کو سرکشی اور گمراہی پر ابھار رہی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ جو سلوک کر رہے ہیں اس کا ایک حصہ بھی یہاں بتایا جاتا ہے کہ وہ آپ سے خوارق عادت امور طلب کرتے ہیں چنانچہ حضور ؐ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ان کے اس سلوک اور مطالبوں کا یہ جواب دیا جائے تاکہ ان کو معلوم ہو کہ رسالت کی حقیقت کیا ہے ؟ رسول کا مقام کیا ہے ؟ تاکہ رسالت اور رسول کے مقام و ماہیت کے بارے میں ان کے تصورات کی اصلاح کر دی جائے

اور یہ بتایا جائے کہ رسول اور رب العالمین کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ (٢٠٢) وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (٧: ٢٠٣) "رہے ان کے (یعنی شیاطین کے) بھائی بند، تو وہ انہیں ان کی کج روی میں کھینچے لئے چلے جاتے ہیں اور انہیں بھٹکانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

اے نبی ؐ "جب تم ان لوگوں کے سامنے کوئی نشانی (یعنی معجزہ) پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے اپنے لئے کوئی نشانی کیوں نہ انتخاب کر لی؟ ان سے کہو "میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب نے میری طرف بھیجی ہے - یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اسے قبول کریں۔"

بذریعہ وحی قرآن کے نزول کی طرف آیت سابقہ میں اشارہ کیا گیا تھا۔ اس مناسبت سے یہاں مسلمانوں کو وہ آداب سکھائے جاتے ہیں جو تلاوت قرآن کے وقت ملحوظ رکھے جائیں گے۔ اللہ کے ذکر کے آداب اور یاد الٰہی پر دوام اور اسے عادت بنا لینے کی ہدایت اور کسی بھی وقت یاد الٰہی سے غافل نہ ہونے کی ہدایت 'بعینہٖ اسی طرح ہے جس طرح ملائکہ ہر وقت اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں' تسبیح کرتے ہیں اور سجدہ ریز ہوتے ہیں لہٰذا انسانوں کے لئے یہ ضروری اور بہتر ہے کہ وہ غفلت نہ کریں اور تسبیح و تہلیل اور رکوع و سجود میں مشغول رہیں۔

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (٢٠٤) وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ (٢٠٥) اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ (٧: ٢٠٦) "جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو' شاید کہ تم پر بھی رحمت ہو جائے۔"

اے نبی ؐ اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو' دل ہی دل میں زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ۔ تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں' جو فرشتے تمہارے رب کے حضور تقرب کا مقام رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آکر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے' اور اس کی تسبیح کرتے ہیں' اور اس کے آگے جھکے رہتے ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۸۲ تشریح آیات

## ۱۹۹ ـــ تا ـــ ۲۰۶

خُذِ الْعَفْوَ وَ أْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَ
اِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۰۰﴾
اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ
مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾

"اے نبی " نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو' معروف کی تلقین کئے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو۔ اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو' وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لئے صحیح طریق کار کیا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ ممکن حد تک لوگوں کے ساتھ نرمی کرو۔ معاشرت' باہم میل جول میں لوگوں سے اخلاق عالیہ کا بدرجہ کمال توقع نہ کرو۔ اور ایسے اخلاق بھی ان پر مسلط نہ کرو جو ان پر شاق گزریں اور ان کے لئے ان کا مظاہرہ ممکن نہ ہو۔ ان کے اندر جو غلطیاں پائی جاتی ہوں' ان میں جو کمزوریاں اور جو نقائص پائے جاتے ہوں' ان کے بارے میں عفو و درگذر سے کام لو۔ لیکن یہ عفو و درگزر کی پالیسی ذاتی اور شخصی معاملات کے اندر ہے۔ شرعی فرائض و واجبات میں عفو و درگذر کی پالیسی اختیار نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ اسلامی عقائد میں سے کوئی عقیدہ ایسا نہیں ہے جس سے چشم پوشی کی جا سکتی ہو۔ اور اسلامی شریعت میں کوئی قانون ایسا نہیں ہے جس سے چھوٹ دی جا سکتی ہو۔ ہاں لوگ لین دین کے معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ میل و جول اور معاشرت میں نرمی اور تسامح کر سکتے ہیں۔ باہم معاشرت میں نرمی سے لوگوں کی زندگی بہت ہی اچھے اسلوب میں گزر سکتی ہے' خصوصاً بڑے لوگوں کی جانب سے چھوٹے لوگوں کی غلطیوں سے چشم پوشی کرنا' انسانی کمزوریوں سے درگزر کرنا اور ان پر رحم کرنا اور ان کے ساتھ دریا دلی کا رویہ اختیار کرنا' ان کے فرائض میں شامل ہے اور ان کے شایان شان تصور ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ معلم' مربی اور مصلح بھی ہیں۔ اس لئے ان کے لئے ان اوصاف حمیدہ کی رعایت کرنا ان کے شایان شان ہی نہیں ان کے فرائض میں سے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ذاتی معاملات میں سے کسی معاملے میں کبھی بھی کسی شخص پر

طیش میں نہیں آئے 'لیکن اگر معاملہ دین کا ہوتا تو آپ کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔

یہی حکم ان تمام افراد کے لئے ہے جو دعوت دین کا کام کرتے ہیں 'ان کے لئے بھی وہی حکم ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے۔اس لئے انسانی نفوس کو راہ ہدایت پر لانے کے لئے ان کے ساتھ وسعت قلبی کا سلوب ہو' چاہئے۔ان کے ساتھ اچھا رویہ خوش اخلاقی اور نرمی کا برتاؤ ہونا چاہئے 'مگر شرط یہ ہے کہ دین کے معاملے میں کوئی نرمی نہیں کی جا سکتی' نہ اللہ کے دین میں افراط و تفریط سے کام لیا جاسکتا ہے۔

وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ (۷: ۱۹۹) "معروف کی تلقین کر" معروف سے مراد وہ کام ہے جو اچھا ہونا جس کی بھلائی میں کوئی شبہ نہ ہو' اور اس میں کسی کا اختلاف اور جھگڑا نہ ہو اور جس میں تمام سلیم الفطرت اور درست فکر و نظر رکھنے والے لوگوں کا اختلاف نہ ہو۔جب نفس انسانی ان معروف امور کا عادی بن جائے تو پھر اس کی قیادت اور راہنمائی آسان ہو جاتی ہے اور وہ بغیر کسی مشقت کے اچھے کاموں کی طرف آگے بڑھتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جب آغاز ہی میں نفس انسانی کو مشقت 'مشکلات اور شدت اور سختی سے دوچار کر دیا جائے تو اس اچانک سخت صورت حالات سے نفس انسانی بدک جاتا ہے اور اس کی اصلاح کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔نفس انسانی کی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ آغاز کار میں اسے آسان کام دیئے جائیں جو معروف اور مشہور ہوں تاکہ وہ خود مشکل کاموں کی طرف بڑھنے کا حوصلہ کرے اور بڑی سہولت سے وہ کام کر گزرے۔

وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِينَ (۷: ۱۹۹) "اور جاہلوں سے نہ الجھو" جہالت رشد و ہدایت کے مقابلے میں ہے' جہالت علم کے بالمقابل بھی ہے۔گمراہی اور بے علمی گویا ہمسائے میں۔اعراض کس طرح کریں 'یعنی جاہلوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیں۔نیز جو باتیں وہ کرتے اور جو برے اعمال وہ کرتے ہیں ان کو اہمیت نہ دیں اور اگر ایسے حالات سامنے آجائیں تو شریفانہ انداز اختیار کر کے گزر جائیں۔ان کے ساتھ بحث و تکرار نہ کریں جس کا نتیجہ ماسوائے کشیدگی کے اور کچھ نہیں ہوتا اور جس میں محض وقت اور قوت ضائع ہوتی ہے۔بعض اوقات سکوت اور اعراض کی وجہ سے ان کا نفسیاتی علاج بھی ہو جاتا ہے۔یوں ان کے سرکش نفوس کی اصلاح ہو جاتی ہے اور یہ اصلاح بدکلامی اور بحث و مناظرے کے مقابلے میں زیادہ موثر ہوتی ہے۔جس کے نتیجے میں عناد اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔مزید یہ کہ الجھاؤ کے نتیجے میں مخاطبین کی اصلاح ہوگی یا نہ ہوگی یہ بات مشکوک ہے البتہ الجھنے والا داعی بہرحال ان لوگوں سے دور ہو جاتا ہے جن میں اصلاح احوال اور قبولیت حق کا مادہ ہوتا ہے۔اور جب داعی لغو اور بدکلام لوگوں سے اعراض کر دے۔تو وہ پروقار نظر آتا ہے اور لوگ دیکھتے ہیں کہ داعی کے مخالف لوگ جہالت میں مبتلا ہیں' احمقانہ کام کرتے ہیں تو اس وجہ سے وہ عوام الناس کی نظروں میں گر جاتے ہیں۔

ہر صاحب دعوت کو چاہئے کہ وہ اللہ کی ان ہدایات پر اچھی طرح غور و فکر کرے کیونکہ رب العالمین انسانی نفسیات کی داخلیات سے بھی اچھی طرح واقف ہے اسی لئے اس نے یہ ہدایات دی ہیں۔

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہرحال بشر تھے۔بارہا ایسا ہوتا تھا کہ جاہلوں کی جہالت کی وجہ سے آپ غصہ ہو جاتے تھے۔بعض احمق اور سفیہ اس قسم کے افعال کا ارتکاب کرتے تھے کہ وہ آپ کے لئے ناقابل برداشت ہوتے تھے' اور

اگرچہ آپ ان کو برداشت بھی کر لیتے لیکن آپ کے بعد آنے والے اصحاب دعوت ہو سکتا ہے کہ اس قدر برداشت کا مادہ نہ رکھتے ہوں' ایسے حالات میں شیطان اکساتا اور ورغلاتا ہے۔ اور نفس انسانی جوش میں آکر بے قابو ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد تمام داعیوں کو یہ حکم دیتے ہیں کہ اعوذ باللہ کے ذریعے اپنے غضب اور جوش پر قابو پانے کی سعی کریں تاکہ شیطان اپنی راہ لے۔

وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۷: ۲۰۰) "اور اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو' وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔" اس آیت پر یہ تبصرہ کہ اللہ سمیع و علیم ہے' نہایت ہی بامعنی اور برمحل ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ جاہلوں کے جہل اور ان کی حماقت کو سن رہا ہے اور ان کی جہالتوں اور حماقتوں کی وجہ سے تمہیں جو تکلیف ہو رہی ہے اس سے بھی اللہ واقف ہے۔ لہٰذا تم تسلی رکھو۔ تمہارے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے یا جو حالات تم کو پیش آ رہے ہیں اللہ انہیں جانتا ہے اس سے بڑی اور تسلی کیا ہو گی کہ ایک شخص لوگوں کو اللہ کی طرف بلا رہا ہو اور وہ داعی الی اللہ ہو اور اس کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہو اور اللہ کہہ دے کہ بہرحال ہم جانتے ہیں جو کچھ ہو رہا ہے تسلی رکھو۔

قرآن کریم ایک داعی کی نفسیاتی تسلی کے لئے ایک دوسرا تاثر بھی دیتا ہے کہ داعی کی مشکلات اس کے حق میں اللہ کے نزدیک سامان قبولیت ہیں اور شیطان کے وسوسوں اور اکساہٹوں کے دفعیے کے لئے اہم ہتھیار تقویٰ اور ذکر الٰہی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ

(۷: ۲۰۱) "حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لئے صحیح طریق کار کیا ہے۔"

اس مختصر آیت میں عجیب تاثرات دیئے گئے ہیں۔ جو گہرے حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور یہ تاثرات قرآن کریم کے خوبصورت انداز کلام سے معلوم ہوتے ہیں۔ آیت کے آخر کو ذرا ملاحظہ فرمائیں۔ فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (۷: ۲۰۱) "انہیں اچانک نظر آنے لگتا ہے کہ صحیح طریق کار کیا ہے۔"

یہ آخری فقرہ پوری آیت کو بے شمار معانی عطا کرتا ہے حالانکہ سابقہ آیات کے الفاظ میں ان معانی کے لئے کوئی لفظ اشارہ تک نہیں کرتا۔ اس آخری فقرے نے یہ بات بتائی کہ جب انسان کے احساس کو شیطانی خیال چھوتا ہے تو انسان کی فکر و نظر ایک مختصر وقت کے لئے معطل ہو جاتی ہے۔ لیکن تقویٰ' خدا خوفی اور اللہ کی یاد اور خشیت الٰہی وہ گہرا رابطہ ہے جو دلوں کو اللہ سے جوڑے رکھتا ہے اور انہیں بار بار غفلت سے جگاتا ہے اور ہدایت دیتا رہتا ہے۔ اہل تقویٰ کو جب حقیقت یاد آجاتی ہے تو ان کی فکر و نظر اور شعور سے پردے اٹھ جاتے ہیں اور وہ اچانک وہ راہ دیکھ لیتے ہیں جن پر انہیں چلنا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان کا مس انسان کو اندھا کر دیتا ہے اور اللہ کی یاد انسان کی آنکھیں کھول دیتی ہے۔ مس شیطان ظلمت اور تاریکی ہے اور اللہ کی طرف رجحان نور اور روشنی ہے۔ مس شیطان کا علاج صرف تقویٰ اور یاد الٰہی سے ہو سکتا ہے اور جن لوگوں میں تقویٰ اور ذکر الٰہی ہو ان پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا۔

---○○○---

متقین کی شان یہ ہوتی ہے کہ جب شیطان کے اثر سے برا خیال انہیں چھو بھی لے تو وہ چوکنے ہو جاتے ہیں اور صحیح راہ دیکھنے لگتے ہیں۔

وَ اِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ وَ اِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

"رہے ان کے (یعنی شیاطین کے) بھائی بند' تو وہ انہیں ان کی کج روی میں کھینچے لئے چلے جاتے ہیں اور انہیں بھٹکانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

اے نبی ؐ' جب تم ان لوگوں کے سامنے کوئی نشانی (یعنی معجزہ) پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے اپنے لئے کوئی نشانی کیوں نہ انتخاب کر لی؟ ان سے کہو "میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب نے میری طرف بھیجی ہے۔ یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اسے قبول کریں۔"

یعنی شیاطین کے بھائی ان کو ان کی کج روی میں کھینچے لیے چلے جاتے ہیں' اور بعض اوقات ان کے بھائی شیاطین انس بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ ان کی گمراہی میں ان کو ترقی ہی دیتے ہیں' نہ تھکتے ہیں' نہ آرام کرتے ہیں اور نہ خاموش ہوتے ہیں اور یہ لوگ حماقت اور جہالت اور کج روی میں مسلسل آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

مشرکین مکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزات کا مطالبہ ہر وقت کرتے رہتے تھے۔ یہاں ان کے بعض اقوال کو نقل کر کے دکھایا جاتا ہے کہ وہ کس قدر جاہل تھے اور رسالت کی حقیقت سے کس قدر بے خبر تھے۔

وَ اِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا (۷:۲۰۳) "اے نبی ؐ' جب تم ان لوگوں کے سامنے کوئی نشانی پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے اپنے لئے کوئی نشانی کیوں نہ انتخاب کر لی۔" یعنی تم نے یہ اصرار' رب العالمین کے سامنے کیوں نہ کیا کہ مجھے یہ نشانی اور معجزہ دیا جائے یا یہ مطلب تھا کہ تم نے ازخود معجزے کا صدور کیوں نہ کیا۔ کیا تم نبی نہیں ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ رسالت کی ماہیت اور رسول کے فرائض منصبی سے واقف ہی نہ تھے۔ اسی طرح وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ رب العالمین کے دربار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر باادب تھے اور آپ کا طریقہ یہ تھا کہ اللہ کی جانب سے جو کچھ ملتا آپ اسے لے لیتے اور اگر کچھ نہ ملتا تو آپ ازخود مطالبہ نہ کرتے نہ کوئی تجویز دیتے۔ نہ آپ میں اس قدر طاقت تھی کہ کسی معجزے کا صدور وہ اپنی طرف ہی سے کر لیتے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کے سامنے یہ اعلان کر دیا جائے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ (۷: ۲۰۳) "ان سے کہو میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب نے میری طرف بھیجی ہے۔" میں نہ تو رب العالمین کے سامنے کوئی تجویز دیتا ہوں' نہ اپنی طرف سے **کوئی معجزہ** ایجاد کرتا ہوں۔ میرے بس میں وہی کچھ ہے جو اللہ وحی کرتا ہے اور میں وہی کچھ کرتا ہوں جس کا امر ہوتا ہے۔

دور جاہلیت میں جعلی نبیوں نے عوام کے سامنے اچھے لوگوں کی جو تصویر پیش کی تھی وہ لوگوں کی نظروں کے سامنے تھی۔ حقیقی رسالت اور رسول کے اصل منصب کی ماہیت کے ادراک کے لئے ان کے پاس کوئی علم نہ تھا۔

چنانچہ حضور کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ان لوگوں کے سامنے وہ علمی حقائق پیش کریں جو ان کے لئے چشمہ بصیرت ہوں اور جن کو قرآن میں نازل کیا گیا ہے اور وہ ان سے جاہل ہیں۔ ان حقائق پر غور کرنے کے بجائے وہ معجزات طلب کرتے ہیں حالانکہ وہ قرآن کو پڑھ کر ان حقائق کو پا سکتے ہیں۔

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۷: ۲۰۳) "یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اسے قبول کریں۔" بے شک قرآن بصیرت کی روشنی ہے' اور رحمت الہی ہے لیکن ان لوگوں کے لئے جو اسے تسلیم کر لیں اور ایمان لائیں اور اس مال غنیمت کو لوٹ لیں کیونکہ یہ تو ہے ہی عامۃ الناس کی بھلائی کے لئے۔

وہ عرب جو جاہلیت میں ڈوبے ہوئے تھے وہ اس قرآن سے روگردانی کر کے اس کے بجائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خارق عادت معجزات طلب کرتے تھے جس طرح اس وقت لوگ نبیوں سے معجزات طلب کرتے تھے جب انسانیت دور طفولیت میں تھی اور اس وقت لوگ اپنے اپنے علاقوں میں محدود تھے اور عالمی سطح پر لوگوں کے درمیان علم و حکمت کا تبادلہ نہ ہوا تھا۔ اس وقت کی رسالتیں بھی علاقوں اور مختصر زمانوں کے لئے ہوا کرتی تھیں اور ان کا خطاب بھی ان ہی لوگوں تک محدود تھا جو اس وقت موجود تھے۔ بعد کے آنے والوں پر ان رسالتوں کا اطلاق نہ ہوتا تھا جنہوں نے ان معجزات کو نہ دیکھا تھا۔ وہ معجزات صرف ان لوگوں ہی کے لئے مفید تھے' بعد میں آنے والوں کے لئے مفید نہ تھے جنہوں نے ان کو نہ دیکھا تھا اور شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

قرآن کریم اس قدر معجز ہے کہ کوئی مادی معجزہ اس کے مقابلے میں معجزہ نہیں ہے۔ جس دور کو لیا جائے اور جس پہلو سے لیا جائے قرآن مجید حیران کن ہے۔ یہ کسی وقت یا کسی دور کے لوگوں کے لئے ہی معجز نہیں ہے بلکہ تاقیامت معجزہ ہے۔ لفظاً و معناً معجز ہے۔

ذرا اس کا لفظی اور اس تعبیری پہلو ملاحظہ کیجئے۔ جاہلیت کے دور میں عربوں کے اندر جو فصاحت و بلاغت پائی جاتی تھی وہ ان کے اعتبار سے بالکل واضح معجزہ تھا وہ جس طرز ادا کے عادی تھے اور جس طرح وہ اپنے بازاروں اور تہواروں میں اس پر باہم فخر کیا کرتے تھے۔ ذرا دیکھئے کہ اس پہلو سے جس طرح وہ اس وقت معجز رہا تھا' آج بھی ہے اور کوئی انسان آج تک ان بلندیوں کو نہیں چھو سکا حالانکہ قرآن نے ان کو اس وقت بھی چیلنج دیا تھا اور آج بھی دے رہا ہے۔ انسانوں میں سے جو لوگ تعبیرات کلامی سے واقف ہیں اور جن کو ادراک ہے کہ انسان کس قدر فصاحت و بلاغت تک پہنچ سکتا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اپنی طرز ادا کے اعتبار سے قرآن معجز ہے اور معجز رہے گا۔ اور یہ ماہرین اسلوب چاہے قرآن مجید پر ایمان لائے ہوں۔ چاہے نہ لائے ہوں وہ اس کے اعجاز کو مانتے ہیں کیونکہ یہ چیلنج جن اصولوں پر قائم ہے ان کے سامنے مومن اور کافر دونوں

برابر ہیں ۔کبرائے قریش قرآن کریم کے ان چیلنجوں کو رات دن پڑھتے تھے 'لیکن ان کے پاس ان کے جواب کی کوئی سبیل نہ تھی حالانکہ وہ قرآن کریم کے منکر تھے اور اسے بالکل پسند نہ کرتے تھے ۔ آج بھی ہر جاہل قرآن کریم کے ان چیلنجوں کو پاتا ہے مگر اس کے پاس جواب کی کوئی سبیل نہیں ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہو گا ۔

اس لفظی اور اسلوبی اعجاز کے ساتھ ساتھ اس کتاب کے فطرت انسانی پر معجزانہ اثرات ہیں ۔بشرطیکہ انسانی فطرت اور اس کتاب کے درمیان رکاوٹیں ایک لمحے کے لئے بھی دور ہو جائیں ۔ وہ لوگ جن کے دل سیاہ ہو چکے ہیں اور جن کے دلوں پر تہ بہ تہ جاہلیت کی گرد پڑی ہوئی ہو' ان کے دل بھی بعض اوقات گرد جھاڑ کر اٹھ جاتے ہیں اور جب وہ قرآن کو سنتے ہیں تو ان کے دل بھی تلملا اٹھتے ہیں اور ان کے دل قرآن کریم کے مسحور کن اثرات میں گھر جاتے ہیں ۔

بہت سے لوگ بات کرتے ہیں اور بعض لوگوں کے کلام میں اصول و مذاہب اور مختلف افکار اور رجحانات ہوتے ہیں ۔ لیکن انسانی فطرت پر قرآن مجید کا جو اثر ہوتا ہے وہ ایک منفرد اثر ہوتا ہے ۔ انسانی دلوں پر اس کی تلاوت کے مخصوص اثرات پڑتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم پڑھنے والوں کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے ۔ قریش اپنے زیر دست متبعین کو یہ مشورہ دیتے تھے اور دراصل وہ خود اپنے آپ کو بھی یہی مشورہ دیتے تھے ۔

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ "اس قرآن کی طرف کان نہ دھرو' بلکہ اس میں شور مچاؤ شاید کہ تم غلبہ پالو ۔"

وہ قرآن کریم کے اثرات خود اپنے نفوس کے اندر محسوس کرتے تھے 'وہ سمجھتے تھے کہ وہ ان اثرات کا مقابلہ نہ کر سکیں گے ۔ آج ہمارے دور جدید کے کبراء بھی یہ چاہتے ہیں کہ وہ لوگوں کی توجہ قرآن کریم سے ہٹائیں لیکن قران کریم آج بھی غالب اور موثر ہے اور انسانی کلام کے اندر اگر قرآن کریم کی ایک یا دو آیات کو رکھ دیا جائے تو وہ واضح طور پر منفرد نظر آتی ہیں ۔ ان کا اثر دوسرے کلام سے علیحدہ ہوتا ہے ۔انسانی احساس پر ان کا اثر گہرائیوں تک ہوتا ہے اور اس سے انسانی کلام بالکل جدا اور علیحدہ نظر آتا ہے ۔حالانکہ انسانی کلام بڑے تکلف اور نقش و نگار سے مزین کیا گیا ہوتا ہے ۔

اب ذرا اس کتاب کے موضوع اور مواد پر غور کریں ۔ قرآن کے مواد اور موضوعات پر کلام کے لئے ظلال القرآن کے مختصر صفحات میں کلام کی گنجائش نہیں ہے ۔کیونکہ موضوع اور مفہوم کے اعتبار سے تو وہ بحر ناپیدا کنار ہے ۔ اس قدر مختصر صفحات میں کہاں کہا جاسکتا ہے ۔

بہرحال انسان اور انسانی شخصیت کے ہر پہلو کو قرآن نے موضوع بحث بنایا ہے ۔انسانی شخصیت کو قرآن نے ہر جہت سے لیا ہے ۔ ایک ہی رو میں انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بات کی ہے ۔انسانی شخصیت کے ہر دروازے سے یہ کتاب اندر داخل ہوتی ہے ۔انسانی تفکرات میں سے ہر فکر اور انسانی جذبات میں سے ہر جذبے کو موضوع بنایا گیا ہے ۔

قرآن کریم جب ذات انسان کے مسائل پر بحث کرتا ہے تو اس کا منہاج بحث بڑا انوکھا ہوتا ہے ۔ انسان کا دل و دماغ اور اس کی فطرت جس بات کو محسوس کرتی ہے ' قرآن اسے لیتا ہے ۔ اس کی واضح شکل سامنے لاتا ہے اور اس موضوع پر انسان کی فطری ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا فیصلہ دیتا ہے ۔انسان کی پوشیدہ قوتوں کو یہ کتاب جگاتی ہے اور ان کو صحت مند راستے پر ڈالتی ہے ۔

پھر قران کا منہاج ایسا حکیمانہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کو لے کر قدم بقدم' مرحلہ وار' نہایت ہی تدریج کے ساتھ'

نرمی اور سہولت کے ساتھ بلندی پر چڑھاتا جاتا ہے۔ انسان اس راستے پر نہایت ہی خوشی اور پر جوش طریقے سے آگے بڑھتا ہے' اسے اپنی راہ بالکل واضح اور صاف نظر آتی ہے اور وہ یوں ترقی کرتا ہے جس طرح ایک انسان بلندی پر ایک ایک سیڑھی عبور کر کے چڑھتا ہے اور بلندیوں کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے اور اسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ اور اس راہ پر بڑھتے ہوئے وہ علم و نظر' جوش و خروش' استقامت اور یقین' اعتماد اور امید اور آرام اور اطمینان کے ساتھ' اس کائنات کے پورے حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے' خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے' آگے بڑھتا جاتا ہے۔

قرآن کا عجیب منہاج و انداز یہ ہے کہ وہ فطرت انسانی کو ایک ایسے مقام سے بیدار کرتا ہے جس کے بارے میں کوئی شخص یہ اندازہ ہی نہیں کر سکتا کہ یہ کس قدر بیدار اور حساس مقام ہے۔ یا یہ کہ اس زاویہ سے فطرت انسانی زیادہ قبولیت کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی فطرت اپنے اسی پہلو سے بیدار ہوتی ہے اور پر جوش انداز میں قرآنی ہدایات پر لبیک کہتی ہے' اس لئے کہ جس ذات نے یہ قرآن نازل کیا ہے۔ وہی تو اس فطرت کی خالق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے ساتھ اس قدر رکھتا ہے جو قربت انسان کی شہ رگ نہیں رکھتی۔

یہ منہاج یا یہ مواد جسے قرآن کریم اس اسلوب و منہاج میں پیش کرتا ہے' اس کے اس قدر وسیع پہلو ہیں جن پر قول و کلام حاوی نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے کہا گیا ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّیْ

وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا "کہو کہ اگر اللہ کے کلمات کے لئے سمندروں کو سیاہی بنا دیا جائے' تو یہ سمندر ختم ہو جائیں اور اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں' اگرچہ ہم ان جیسے مزید سمندر ہی سے سیاہی بنائیں۔" اور دوسری آیت میں کہا گیا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ "اور سمندر سے سیاہی بنانے میں مزید سات سمندر استعمال کئے جائیں تو بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں۔"

راقم الحروف' اللہ کے فضل و کرم سے' ۲۵ سال تک قرآن کریم کا نہایت ہی گہرا مطالعہ کرتا رہا ہے۔ اس عرصے میں وہ اس کتاب کے موضوعات کے مختلف پہلوؤں پر نگاہ دوڑاتا رہا ہے۔ انسان کے حاصل کردہ علوم کے مختلف میدانوں میں جہاں انسانی ذہن کی رسائی ہوئی ہے اور جہاں انسانی اذہان ابھی تک نہیں پہنچ سکے۔ میں نے ان علوم کے بارے میں ان چیزوں کا مطالعہ بھی کیا جو انسانوں نے ان موضوعات کے بعض پہلوؤں کے بارے میں بطور انسانی کاوش پیش کی ہیں' لیکن میں نے اس حقیقت کو پایا ہے کہ قرآن کریم کا فیض بہت ہی عام وسیع اور کھلا ہے۔ اس کے مقابلے میں انسانی علم ایک چھوٹا سا بحیرہ ہے' بلکہ ایک چھوٹا سا کنواں یا سوراخ ہے بلکہ وہ ایک ایسا تالاب ہے جو مسلسل ٹھہراؤ کی وجہ سے بدبودار ہو گیا ہے۔

میں نے اس کائنات پر قرآن کی روشنی میں ایک کلی نگاہ ڈالی۔ اس کائنات کے مزاج' اس کی ماہیت' اس کی پیدائش و تخلیق اور اس کی ترقی اور اس کی پشت پر رازہائے نہفتہ کو خوب پڑھا۔ اس کائنات کی خفیہ اور پوشیدہ صفات اور خصوصاً اس کی زندہ مخلوق پر غور کیا' خصوصاً وہ تحریریں بھی مطالعہ کیں جو اس کائنات کے بارے میں انسان نے اپنے

علم و تجربے سے تحریر کیں ۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے کتاب خصائص التصور الاسلامی وغیرہ)

پھر انسان کے وجود' اس کی نفسیات' اس کی اصلیت' اس کی نشوونما' اس کی پوشیدہ صلاحیتوں' اس کی سرگرمیوں کے دائروں' اس کے وجود کی ساخت' اس کے تاثرات' اس کے میلانات اور دوسرے حالات اور راز جن کے بارے میں انسانوں نے بھی کچھ معلومات فراہم کی ہیں' مثلاً علوم الحساب اور حیاتیات کے مختلف موضوع' انسانی عقائد و ادیان اور ان کے اجتماعی فلسفے' ان موضوعات کا بھی میں نے بغور مطالعہ کیا۔ (دیکھئے الاسلام و مشکلات الحضارہ وغیرہ)

پھر میں نے انسانی نظام ہائے حیات کا بھی مطالعہ کیا۔ ان نظاموں میں انسان کی سرگرمیوں کا بھی مطالعہ کیا' اس میں انسانوں کے باہم روابط اور اختلافات کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ انسانی روابط کی تجدید و اصلاح کی اسکیموں پر بھی غور کیا۔ اور ان کے بارے میں ان موضوعات پر مطالعہ کیا جن کے بارے میں بہت سے مکاتیب فکر میں اور جن پر انسانوں نے کام کیا ہے مثلاً سیاسی' اقتصادی اور اجتماعی مسائل (تفصیلات کے لئے دیکھئے میری کتاب نحو مجتمع اسلامی)

ان تمام شعبوں میں اور ان تمام موضوعات پر انسانی علوم و فنون کے مطالعے کے بعد جب میں نے قرآن مجید کو غور سے پڑھا تو معلوم ہوا کہ ان موضوعات کے بارے میں بڑی کثرت سے آیات موجود ہیں جن میں تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں اور جو علم کا خزانہ قرآن میں ہے وہ نہایت ہی حقیقی' ٹھوس اور وسیع ہے۔

ان موضوعات پر سالہا سال تک غور کرتے ہوئے میں نے کبھی بھی یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ قرآن سے باہر' کسی حوالہ سے مدد لی جائے۔ ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و احادیث کی ضرورت بہرحال پڑتی ہے کیونکہ وہ کلام بھی آثار کلام الہی میں سے ہے۔ قرآن و سنت کے سوا ان موضوعات پر انسانوں نے جو کہا ہے وہ نہایت ہی کمزور اور ناقص ہے۔ اگر صحیح بھی ہو تب بھی تشفی بخش نہیں ہے۔ راقم الحروف نے ہر انسانی تحریر کے مقابلے میں قرآن کو مفصل اور تشفی بخش پایا۔

میں جو بات کہہ رہا ہوں' ایک طویل عرصہ تک قرآن پر غور و فکر کرنے اور انسانی مسائل کے حل قرآن و سنت کی روشنی میں تلاش کرنے کی ضرورت کے تحت عملاً قرآن کے سائے میں رہنے کے بعد کہہ رہا ہوں۔ میں قرآن کی خوبیاں بیان کر کے قرآن کے بارے میں آپ کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کر رہا' نہ تمام انسان قرآن کی تعریفیں کر کے اس کے کمالات میں کوئی اضافہ کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کا ایک نہایت ہی منفرد گروہ اور نسل گراں قدر ہے' یعنی صحابہ کرام۔' ان کی تربیت' ان کے علم اور ان کی راہنمائی کا سرچشمہ یہی کتاب تھی۔ اسی کتاب نے ان کو بنایا تھا۔ اس کے بعد انسانوں میں کوئی گروہ اس معیار کا تیار نہیں ہو سکا' نہ اس سے قبل انسانی تاریخ میں صحابہ کی ٹکر کا کوئی گروہ ہمارے علم میں ہے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے انسانی تاریخ میں ایک گہرا اور وسیع انقلاب برپا کیا۔ لیکن اس عظیم انقلاب اور اس عظیم واقعہ کا انسانوں نے فی الحقیقت گہرا مطالعہ نہیں کیا۔

انسانی تاریخ میں گروہ صحابہ کے ذریعے جو انقلاب برپا کیا گیا اور جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ہے' درحقیقت وہ اسی کتاب یعنی قرآن کے سرچشمے سے پھوٹا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام رسولوں کے ہاتھوں جن معجزات کا صدور ہوا' یہ معجزہ یعنی انسانیت کے انقلاب عظیم کا معجزہ' ان تمام معجزات سے برتر اور ان پر بھاری ہے۔ کیونکہ یہ ایک حقیقی' قابل ملاحظہ اور زیر مشاہدہ معجزہ ہے۔ غرض گروہ صحابہ انسانی تاریخ کا

ایک منفرد معجزہ تھے۔

اسلامی معاشرے کی پہلی ترکیب اس منفرد گروہ سے تھی' اس کے بعد ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے تک اسلامی معاشرہ زندہ و تابندہ رہا اور اس میں اسلامی شریعت کے قوانین نافذ رہے۔ یہ معاشرہ اسلامی اقدار' اسلامی حسن و قبح کے پیمانوں اور اسلامی ہدایات اور اشارات کا پابند رہا۔ یہ ہزار سالہ اسلامی معاشرہ بھی درحقیقت ایک دوسرا تاریخی معجزہ تھا خصوصاً جبکہ کوئی تاریخی مبصر اس اسلامی معاشرے اور دوسرے انسانی معاشروں کے درمیان تاریخی موازنہ کرے۔ یہ دوسرے جاہلی معاشرے مادی ترقی میں تو اسلامی معاشرے سے برتری کا دعویٰ کر سکتے ہیں لیکن انسانی تہذیب و تمدن میں وہ برتری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ آج جدید جاہلیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی نفسیاتی ضروریات' اپنی اجتماعی ضروریات اور اپنی زندگی کی بہبود قرآن کے بجائے کسی اور سرچشمے سے اخذ کرتے ہیں۔ بعینہ اسی طرح جس طرح عرب جاہلیت کے پیروکار قرآن کریم کے علاوہ خوارق و معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ عرب کے سادہ جاہلوں کو تو قرآن مجید کا یہ عظیم معجزہ اس لئے نظر نہ آتا تھا کہ وہ نہایت ہی گہری جاہلیت اور جہالت میں مبتلا تھے اور ان کے ذاتی مفادات بھی قرآنی تعلیمات سے متضاد تھے۔ لہٰذا وہ قرآنی عجائبات کو پانے سے محروم رہے۔

رہی جدید جاہلیت تو وہ جہالت کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے تعلیمی معیار کے غرور کی وجہ سے قرآنی عجائبات کے دیکھنے سے محروم ہے' حالانکہ علم کے یہ دروازے' ان پر اللہ ہی نے کھولے ہیں لیکن انہوں نے علم کو مادی دنیا کے اندر محدود کر دیا۔ نیز انسانی ضروریات کے تحت آج دنیا کو جو ضروریات لاحق ہیں ان ضروریات کے حصول کے لئے انسانی زندگی بہت زیادہ منظم ہو چکی ہے اور تنظیم و تشکیل کے زاویہ سے جدید جاہلیت کے پرستار نہایت ہی غرور میں مبتلا ہیں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ زیادہ تجربات کی وجہ سے دور جدید کی زندگی نہایت ہی منظم اور پختہ ہو چکی ہے اور مختلف ضروریات کی وجہ سے پیچیدہ بھی ہو چکی ہے۔ اور اس جدید زندگی کے دلدادہ لوگ غرور میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ نیز چودہ سو سال سے یہودی اور صیہونی لابی اسلام دشمنی میں مبتلا ہے اور اس نے ان چودہ سو سالوں میں اسلام اور قرآن کے خلاف اپنی سازشوں کو لمحہ بھر کے لئے بھی موقوف نہیں کیا۔ یہودیوں کی پالیسی یہ رہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کی اس کتاب سے غافل کر دیں۔ وہ اس کتاب سے ہدایات نہ لیں' کیونکہ یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنے طویل تجربات کے ذریعے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ مسلمان جب تک قرآنی ہدایات کی پیروی کرتے رہیں گے یہ لوگ ان پر قابو نہیں پا سکتے۔ لیکن اس بات کے لئے ایک شرط ہے کہ مسلمان کتاب اللہ کو اس طرح پکڑیں جس طرح دور اول کی لاثانی جماعت' جماعت صحابہ نے اسے پختہ طریقے سے پکڑا تھا۔ یہ نہ ہو کہ وہ اس کی آیات کو تو اچھی طرح گاتے ہوں اور خوش الحانی سے پڑھتے ہوں لیکن ان کی عملی زندگی سو فیصد اس کی تعلیمات کے برعکس ہو۔ یہ یہودیوں کی نہایت ہی خبیث اور مذموم سازش ہے یہ مسلسل مسلمانوں کے خلاف بروئے کار لائی جا رہی ہے۔ اس سازش ہی کا آخری نتیجہ وہ حالات ہیں جن میں وہ اقوام مبتلا ہیں جو اپنے نام مسلمانوں جیسے رکھتی ہیں' حالانکہ وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں شریعت الٰہیہ کو نافذ نہ کر دیں۔ غرض اسی سازش کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر جگہ اس دین کے آثار کو مٹایا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے لئے یہ مواقع فراہم نہیں ہوتے کہ وہ اپنی زندگیوں کو قرآن کی ہدایات کے مطابق منظم کریں اور اپنے تمام اختلافات و نزاعات میں بھی قرآن کو اس طرح حکم بنائیں جس طرح قرون اول کے مسلمان قرآن کی ہدایت کے

مطابق عمل کرتے تھے اور اپنے لئے قوانین و اصول قرآن کی روشنی میں بناتے تھے۔

آج حالت یہ ہے کہ اہل قرآن نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ ماسوائے حسن قراءت، ترتیل کے اس کا مطالعہ نہیں کرتے، اوہام اور تعویذوں کے سوا اس کا استعمال نہیں کرتے۔ یہ حالت گہری اور مذموم صہیونی اور صلیبی سازش کی وجہ سے ہے، مسلمانوں کی جہالت اور غرور علم کی وجہ سے ہے اور مسلمانوں کے فکر و نظر کے عمومی فساد کی وجہ سے ہے۔

دور قدیم میں جاہلیت کے پرستار لوگوں کو اس سے اسی طرح غافل کرتے تھے کہ وہ اسے سننے اور اس پر غور کرنے کے بجائے خوارق عادت واقعات کے صدور کا مطالبہ کرتے تھے۔ دور جدید کے جاہل اس قرآن سے مسلمانوں کو دور رکھتے ہیں اور ان کے ہاتھ میں اپنے بنائے ہوئے قرآن دیتے ہیں اور ابلاغ اور میڈیا کے جدید وسائل کے ذریعے وہ اپنے بنائے ہوئے نظریات کو لوگوں کے ذہنوں پر مسلط کرتے ہیں اس قرآن کے بارے علیم و خبیر کا فیصلہ یہ ہے۔

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۷:۲۰۳) "یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں، تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اسے قبول کریں۔"

---○○○---

اور قرآن کا مقام چونکہ یہی ہے، اس لئے خود ہدایت دی جاتی ہے کہ تمہارا قرآن کے ساتھ رویہ یہ ہونا چاہئے۔

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو، شاید کہ تم پر بھی رحمت ہو جائے۔" اس آیت پر یہ سورہ ختم ہو جاتی ہے اور سورہ کا آغاز اس طرح ہوا تھا کہ اسی کتاب والاصفات کی طرف اشارہ تھا:

كِتَابٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِىْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ "یہ کتاب ہے، جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے، پس اے نبی، تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو۔ اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے سے ڈراؤ اور ایمان لانے والے لوگوں کو نصیحت ہو۔"

جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو اس وقت خاموش رہنے کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ قرآن مجید ہے جو نماز میں پڑھا جاتا ہے کہ امام جہراً قراءت کرتا ہے، تو مقتدی پر فرض ہے کہ وہ خاموش رہے۔ جب وہ جہری نماز میں امام کو سن رہا ہو تو اس کے لئے پڑھنا منع ہے۔ لا ینازع الامام القرآن "امام کے ساتھ قرآن میں تنازعہ نہ ہو۔" یہ روایت امام احمد اور اہل سنن نے نقل کی ہے۔ اور امام ترمذی نے اسے حدیث حسن کہا ہے اور ابو حاتم الرازی نے اسے حدیث صحیح کہا ہے۔ انہوں نے زہری، ابو اکثمہ لیثی کے واسطہ سے ابو ہریرہ سے نقل کیا کہ حضور ؐ جب ایک جہری نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں کو مخاطب کر کے سوال کیا کہ ابھی میرے پیچھے تم میں سے کسی نے میرے ساتھ قراءت کی؟ ایک شخص نے کہا "ہاں" رسول خدا ؐ میں نے پڑھا۔ حضور ؐ نے فرمایا "میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا کہ میں قرآن کے ساتھ تنازعہ کر رہا ہوں۔" اس کے بعد لوگ حضور ؐ کے ساتھ جہری نمازوں میں قراءت کرنے سے باز آ گئے۔ کیونکہ انہوں نے حضور ؐ کی یہ ہدایت سن لی۔ اسی طرح ابن جریر نے بھی اپنی

تفسیر میں ابو داؤد ابن ابو الہند' بشیر ابن جابر کی روایت سے حضرت ابن مسعود کی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے سنا کہ بعض لوگ امام کے ساتھ پڑھتے ہیں' تو جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا :"کیا اب وقت نہیں آگیا کہ تم سمجھو' کیا وقت نہیں آگیا کہ تم عقل سے کام لو' اللہ کا حکم مانو' اللہ فرماتے ہیں۔" جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو۔"

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اس آیت میں دراصل مسلمانوں کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ مشرکین کی طرح رویہ نہ اختیار کریں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں قرآن کریم کی تلاوت فرماتے تو مشرکین اگر سنتے۔ اس لئے ان میں سے بعض لوگوں نے دوسروں سے کہا تم لوگ قرآن نہ سنو بلکہ جب تلاوت ہو رہی ہو تو اس میں خلل ڈالو شاید کہ اس طرح تم غالب آجاؤ۔ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ "اس قرآن کی طرف کان نہ دھرو' بلکہ اس میں شور مچاؤ شاید کہ تم غلبہ پالو۔" اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا (۷: ۲۰۴) "جب قرآن مجید پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔ امام قرطبی کہتے ہیں کہ یہ نماز کے بارے میں نازل ہوئی۔ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ' ابن مسعود' جابر' زہری' عبید اللہ ابن عمیر' عطاء اور سعید ابن مسیب سے اس سلسلے میں روایات نقل کی ہیں۔

علامہ ابن جریر نے بھی اس کی شان نزول نقل کی ہے۔ اس نے ابو کریب' ابوبکر ابن عیاش عاصم' مسیب ابن رافع کے سلسلے کے ذریعے حضرت ابن مسعود سے روایت کی ہے "ہم میں سے بعض لوگ ایک دوسرے کو نماز میں سلام کرتے' اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۷: ۲۰۴) "جب قرآن مجید پڑھا جا رہا ہو' غور سے سنو اور خاموش ہو جاؤ۔ شاید کہ تم پر رحم کیا جائے۔"

اس کی تفسیر میں امام قرطبی کہتے ہیں کہ محمد ابن کعب قرظی نے یہ کیا ہے کہ جب حضور قرآن مجید پڑھتے تھے تو لوگ اسے دہراتے تھے۔ جب آپ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتے تو لوگ بھی اسی طرح کہتے۔ پوری فاتحہ اور سورت کی تلاوت میں لوگ ایسا ہی کرتے۔ ایک عرصہ تک یہی معمول رہا۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۷: ۲۰۴) "جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔" اس سے معلوم ہوا کہ خاموشی کا مطلب یہ ہے کہ جہراً نہ پڑھا جائے جس طرح کہ وہ لوگ رسول اللہ کی اطاعت میں پڑھتے تھے۔

یہ تو تھی امام قرطبی کی رائے۔ اس آیت کے بارے میں۔ قتادہ کہتے ہیں کہ جب نماز ہو رہی ہوتی تھی تو ایک شخص آتا اور نمازیوں سے پوچھتا تم نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں اور کتنی باقی ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۷: ۲۰۴) ایسی ہی روایت مجاہد سے منقول ہے کہ مسلمان نماز میں حسب ضرورت بات کر لیا کرتے تھے' اس لئے یہ آیت اتری' لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۷: ۲۰۴) جن لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حکم صرف اس تلاوت پر موقوف ہے' جو نماز میں ہوتی ہے تو ان کا استدلال ابن جریر کی روایت سے ہے۔ انہوں نے حمید ابن مسعدہ' بشر ابن جریری' طلحہ ابن عبید اللہ ابن عمیرؓ سے روایت کی ہے۔ یہ صاحب کہتے ہیں کہ

میں نے عبید اللہ ابن عمیر اور عطا ابن ابی رباح کو دیکھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مباحثہ کر رہے تھے اور قاری قراءت کے ساتھ تلاوت کر رہا تھا۔ کیا تم کان نہیں دھرتے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ کیا ہے' اس کے مستحق نہیں بنتے یعنی لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۷: ۲۰۴) کے۔ اس پر انہوں نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنی بات میں مشغول ہو گئے۔ کہتے ہیں' میں نے دوبارہ اپنی بات کا اعادہ کیا' انہوں نے پھر میری طرف دیکھا اور پھر اپنی بات میں مشغول ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ میں نے تیسری بار اپنی بات کا اعادہ کیا تو انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا "یہ تو نماز کے بارے میں ہے۔" وَاِذَا قُرِیءَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا (۷: ۲۰۴) علامہ ابن کثیر اس روایت کو نقل کر کے کہتے ہیں کہ سفیان ثوری ابو ہاشم اسماعیل ابن کثیر نے' انہوں نے مجاہد سے یہی روایت کی ہے کہ آیت وَاِذَا قُرِیءَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ (۷: ۲۰۴) نماز کے بارے میں ہے۔ کئی لوگوں نے مجاہد سے یہی روایت نقل کی ہے۔ عبدالرزاق نے ثوری سے یہ نقل کیا ہے کہ اگر نماز کے علاوہ قراءت ہو رہی ہو اور کوئی بات کر رہا ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ جس طرح نماز میں یہ حکم ہے اسی طرح خطبہ جمعہ اور عیدین میں بھی یہی حکم ہے۔ یہ سعید ابن ابوجبیر' مجاہد عطاء' عمرو ابن دینار' یزید ابن اسلم' قاسم ابن مخیرہ' سلمہ ابن بسار' شہر بن حوشب اور عبداللہ ابن مبارک بھی اسی طرف گئے ہیں لیکن قرطبی کہتے ہیں "یہ مذہب ضعیف ہے۔ اس لئے کہ خطبات میں قرآن مجید کا حصہ کم ہوتا ہے۔ اور خاموشی سب میں واجب ہے۔ علامہ ابن عربی اور نقاش نے کہا ہے کہ یہ آیت مکی ہے اور مکہ میں نہ کوئی خطبہ تھا اور نہ جمعہ واجب تھا۔

امام قرطبی کہتے ہیں کہ اہل تفسیر کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن کو کان لگا کر سننا اور خاموش رہنا جس طرح فرض نماز میں ہے' اسی طرح غیر فرض میں بھی ہے۔ لغوی مفہوم کے اعتبار سے ہر معاملے میں قرآن کو سننا اور خاموش رہنا فرض ہے' الا یہ کہ کوئی مخصوص دلیل ہو۔

اسباب نزول کے بارے میں اس سے قبل جو روایات دی گئی ہیں' ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو یہ بتاتی ہو کہ یہ آیت صرف نماز کے ساتھ مخصوص ہے یا فرض اور غیر فرض نماز میں فرق ہے۔ کیونکہ حکم تو آیت کے الفاظ کی عمومیت پر ہوتا ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ آیت کس خصوصی موقعہ پر نازل ہوئی۔ اقرب بات یہ ہے کہ یہ آیت عام تصور ہو' اور اس کے لئے کسی نص کو مخصوص نہ سمجھا جائے' قرآن کی عظمت اور احترام کے قرین قیاس اور قرین مرتبہ یہ ہے کہ جہاں بھی تلاوت قرآن ہو' خاموشی اختیار کی جائے۔ اور چونکہ اللہ کا کلام ہے' اس لئے اللہ کا ادب بھی اسی میں ہے۔ جب خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب قرآن مجید پڑھا جا رہا ہو تو خاموشی اختیار کرو اور سنو اور اسی میں تمہارے لئے رحمت کی امید ہے۔ لہٰذا کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ اس عمل کو نماز کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے بلکہ جہاں بھی قرآن پڑھا جائے وہاں اس کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہئے۔ نفس انسان کو ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہونا چاہئے اور یہ ادب اور احترام اس بات کا ضامن ہے کہ انسان پر دنیا و آخرت میں رحم ہو۔

حقیقت ہے کہ قرآن کریم سے اعراض اور روگردانی کر کے لوگ عظیم خسارے میں جا پڑے ہیں۔ بعض اوقات انسان ایک آیت کو غور سے سنتا ہے اور اس کے نتیجے میں عجیب و غریب تاثرات اس کے دل و دماغ پر نقش ہو جاتے ہیں اور اس پر علم و ادراک کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ انسان کو اطمینان قلبی' خوشی اور روحانی کیفیات نصیب ہوتی

ہیں اور اس کی سوچ اور عمل میں بڑی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ تاثرات اور یہ خصوصیت صرف اس شخص کی سمجھ میں آسکتی ہیں، جس نے انہیں کبھی چکھا ہو۔

قرآن کریم کا مسلسل مطالعہ، اس پر غور و فکر اور تدبر، صرف ترنم کے ساتھ قراءت ہی نہیں، بلکہ یہ انسان کے قلب و نظر پر گہرا غور و فکر اور تدبر پیدا کر دیتا ہے۔ اور انسان کو نہایت ہی دور رس قوت مدرکہ عطا ہو جاتی اور اس پر نہایت ہی یقینی علوم کا القا ہوتے ہیں۔ انسان کے اندر زندگی کی حرارت اور اقدامی قوت پیدا ہو جاتی ہے، وہ پرعزم، مثبت سوچ اور مصمم ارادے کا مالک بن جاتا ہے۔ یہ علوم انسان کو تدبر قرآن کے علاوہ کسی اور مشق یا اور ذریعہ علم سے حاصل نہیں ہوتے۔

قرآنی تصورات کے نتیجے میں سے انسان اس کائنات کے حقائق معلوم کر لیتا ہے۔ انسان زندگی کے بارے میں نئے حقائق کا ادراک و انکشاف ہوتا ہے۔ انسان کو انسانی زندگی کے حقائق، انسانی ضروریات، انسان کے مزاج اور اس کی فطرت و طبیعت کا نہایت ہی واضح گہرا اور دقیق و عمیق شعور حاصل ہو جاتا ہے اور یہ شعور خالص قرآنی عبادات اور احکام کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اس کائنات اور انسانی زندگی کے ساتھ وہ انسان جس نے قرآن کا مطالعہ کیا ہو نہایت ہی مختلف روح کے ساتھ معاملہ کرتا ہے اور اب انسان کا طرز عمل اس کائنات اور انسان کے ساتھ وہ نہیں ہوتا جو اس انسان کا ہوتا ہے جس کی تربیت محض انسانی علم و معرفت کی فضا میں ہوئی ہو۔

یہ فضا اللہ کی رحمت کی امیدواری کی فضا ہے اور یہ نماز اور غیر نماز میں برابر ہے۔ لہٰذا اللہ کی رحمت کی فضا کو ہم نماز کے ساتھ کسی وجہ سے بھی مخصوص نہیں کر سکتے اور وہی رائے درست ہے جو قرطبی نے نقل کی ہے۔

---ooo---

اس سورت کا خاتمہ اس ہدایت پر ہوتا ہے کہ ذکر الٰہی کی طرف منہ موڑ لو۔ خواہ یہ ذکر نماز میں ہو یا نماز کے علاوہ عام حالات میں ہو۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ
الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ اِنَّ
۲۴
۱۸ ع الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ السجدۃ
۱۴

"اے نبی ؐ، اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو دل ہی دل میں زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ۔ تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ جو فرشتے تمہارے رب کے حضور تقرب کا مقام رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آکر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں، اور اس کے آگے جھکے رہتے ہیں۔"

ابن کثیر فرماتے ہیں "اللہ حکم دیتے ہیں کہ اسے دن کے شروع میں یاد کیا جائے، دن کے آخر میں یاد کیا جائے اور

بڑی کثرت سے یاد کیا جائے ۔ اور دوسری جگہ حکم دیا ہے کہ ان اوقات میں اللہ کی تسبیح اور بندگی کرو۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ "پس اللہ کی تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح کرو' سورج نکلنے سے پہلے اور سورج غروب ہونے سے پہلے ۔" یہ حکم اس وقت تھا جبکہ اسراء کی رات میں ابھی پانچ نمازیں فرض نہ ہوئی تھیں ۔ یاد رہے کہ یہ آیت مکی ہے لیکن اس آیت میں لفظ غدو اور اصال استعمال ہوا ہے ۔ غدو کے معنی دن کا اول حصہ ہے' اصال اصل کی جمع ہے جس طرح ایمان جمع یمین ہے ۔ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً (۷: ۲۰۵) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کو اپنے دل میں نہایت ہی عاجزی اور خوف و رجا کی حالت میں یاد کرو۔ زبان سے بھی ذکر الٰہی کرو مگر جہراً نہ کرو۔ اس لئے دون الجہر من القول کہا گیا۔ یعنی ہلکی آواز میں۔ ذکر الٰہی کا مستحب طریقہ یہی ہے کہ یہ چیخ و پکار کی صورت میں نہ ہو اور جب صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا "کیا ہمارے رب قریب ہیں تاکہ ہم اس کو ہلکی آواز میں پکاریں یا دور ہیں تاکہ ہم اسے بلند آواز سے پکاریں' تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ "جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو کہہ دیجئے کہ میں قریب ہوں اور پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارے ۔"

صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت موجود ہے ۔ کہتے ہیں کہ سفروں میں سے کسی سفر میں لوگوں نے خدا تعالیٰ کو بلند آواز سے پکارنا شروع کر دیا۔ ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا "اے لوگو' ذرا اپنی آواز کو اپنے تک محدود رکھو' تم نہ کسی غائب ذات کو پکار رہے ہو اور نہ کسی گونگی بہری ذات کو۔ جسے تم پکار رہے وہ سمیع بھی ہے اور قریب بھی ہے' وہ تم میں سے ہر شخص کی سواری کی گردن سے زیادہ قریب ہے ۔

ابن کثیر اس بارے میں ابن جریر اور عبدالرحمن ابن زید ابن اسلم کی رائے کو قبول نہیں کرتے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص قرآن کریم کو سن رہا ہوں وہ ہلکی آواز سے اللہ کو یاد کرے ۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے اس قول پر کوئی دلیل انہوں نے پیش نہیں کی ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے مراد بندوں کی طرف سے صبح و شام مطلق ذکر الٰہی ہے تاکہ وہ غافل نہ ہو جائیں ۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کے آخر میں فرشتوں کے ذکر میں کہا گیا ہے کہ وہ رات اور دن ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں ۔ اور وہ اپنی بندگی اور ذکر میں تھکتے ہیں ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ (۷: ۲۰۶) اس کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ مسلمان ان کی تقلید کریں اور اللہ کی اطاعت کریں اور کثرت سے اسے یاد کریں اور بندگی بجا لائیں ۔

امام ابن کثیر نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اور جو احادیث نقل کی ہیں ۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم دور اول کے مسلمانوں کی تربیت کس طرح کر رہا تھا۔ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی عربوں کی نفسیاتی تربیت اور رب تعالیٰ کی معرفت میں انہیں نہایت ہی لطیف حقائق سے آگاہ کرتے رہے تھے نیز ان کو بتایا جاتا تھا کہ ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کی حقیقت کیا ہے ۔ ان لوگوں کے سوالات اور اللہ کی جانب سے اور رسول اللہ کی جانب سے جوابات کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے فکر و عمل میں کس قدر عظیم اور دور رس انقلاب برپا کر دیا گیا تھا اور یہ کتاب

اللہ اور سنت رسول کا حیرت انگیز کارنامہ تھا۔ یہ ایک عظیم اور دور رس انقلاب تھا جو ان لوگوں کے لئے باعث رحمت تھا لیکن اے کاش کہ لوگ جانتے۔

یہ بات نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ ان نصوص میں جس ذکر کے بارے میں کہا گیا ہے وہ صرف زبانی ذکر نہیں ہے' بلکہ اس سے مراد قلبی ذکر ہے' اس لئے کہ جس ذکر سے مومن اور ذاکر کا دل مرتعش نہ ہو' جس سے اس کا وجدان اور شعور متاثر نہ ہو' جس ذکر کا اثر انسان کی ذات اور اعمال پر نہ ہو' اور وہ ذکر عاجزی' تضرع اور خوف کے ساتھ نہ کیا جائے تو اسے ذکر نہ سمجھا جائے گا بلکہ بعض حالات میں تو وہ اللہ کی شان میں گستاخی تصور ہوگا' ذکر کا مفہوم تو یہ ہے کہ انسان نہایت ادب' نہایت عاجزی اور نہایت ہی خوف و رجا کی حالت میں اللہ کو یاد کرے۔ اور اللہ کی یاد کے ساتھ ساتھ اللہ کی عظمت اور جلالت شان کا تصور بھی کیا جائے اور دعا کی جائے کہ انسان اللہ کے غضب سے محفوظ ہوں' صرف اس ذکر سے انسان کو روحانی جلا نصیب ہو سکتی ہے۔

جب زبان ضمیر اور قلب کے ساتھ حرکت کرتی ہو' اور ہونٹ جب روح کے ہم رکاب ہوں' تو یہ اس صورت میں ہوں کہ خشوع اور خضوع میں فرق نہ آئے' نہایت ہی دھیمی آواز میں ہو اور چیخ و پکار اور شور و شغب کی صورت میں نہ ہو اور نہ ترنم اور غنا کی صورت مناسب ہے۔ اور نہ پریڈ میں اور طربیہ انداز میں۔

ذرا آیت پر دوبارہ نگاہ ڈالیں وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ (۷: ۲۰۵) "اے نبی اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو' دل ہی دل میں' زاری اور خوف کے ساتھ' اور زبان سے بھی ہلکی آواز میں۔"

بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (۷: ۲۰۵) "صبح و شام" یعنی دن طلوع ہوتے وقت اور دن کے آخری وقت ہیں' اس طرح کہ دن کے دونوں حصوں میں۔ انسان کا قلب اللہ کے ساتھ جڑا ہوا ہو' ذکر الہی ان اوقات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے' اللہ کی یاد تو ہروقت قلب و نظر میں ہونا چاہئے' ہروقت دل پر اللہ کی نگرانی قائم رہنا چاہئے' ان اوقات کا خصوصاً ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ ان میں کائنات کے صفحات پر ایک نمایاں تغیر رونما ہوتا ہے' رات سے دن اور دن سے رات نمودار ہوتی ہے۔ اور ایک حساس انسان کا دل اپنے ماحول میں اللہ کے عظیم کارناموں میں تغیرات اور انقلابات دیکھتا ہے۔ اس کائنات کے ظاہری احوال بدلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ ان اوقات میں انسان کا دل اور اس کا نفس قبولیت کے قریب تر ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں بکثرت ایسے اوقات میں ذکر الہی کی ہدایت کی گئی ہے جن میں انسان کے قلب و نظر پر یہ کائنات بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اور اس طرح انسان کا دل نرم ہوتا ہے۔ اور وہ باری تعالیٰ کی ذات سے تعلق قائم کرنے کے لئے خوب تیار ہوتا ہے۔ مثلاً مشکلات کے وقت فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ "جو باتیں یہ لوگ کرتے ہیں ان پر صبر کرو' اور اپنے رب کی تعریف کرو' اس کی تسبیح کرو طلوع شمس اور غروب سے پہلے۔" رات کو بھی اللہ کی تسبیح کرو اور سجدوں کے بعد بھی۔" وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى "اور رات کے حصے میں تسبیح کرو' دن کے اطراف کے وقت بھی' شاید کہ تم راضی ہو جاؤ۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا "اور

اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو' رات کے ایک حصے میں اس کے سامنے سجدہ ریز ہوا کرو اور طویل رات میں اس کی تسبیح کرو۔" یہاں کوئی ایسی وجہ نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ان اوقات میں ذکر الٰہی کا حکم فرضیت صلوٰۃ سے پہلے نازل ہوا تھا' جس کے اوقات معلوم ہیں اور اب ان اوقات میں ذکر الٰہی کی ضرورت یا حکم نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہاں جس ذکر کا بیان ہو رہا ہے یہ نماز سے عام ہے اور اس ذکر کے اوقات فرض نمازوں کے اوقات کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ یہ ذکر نماز کی شکل کے علاوہ بھی ہو سکتا ہے' یہ قلبی ذکر ہے' یا قلب اور زبان دونوں کے ساتھ ہو سکتا ہے' بلکہ یہ ان صورتوں سے بھی زیادہ عام ہے' ہروقت اللہ کا مستحضر رہنا اور ہروقت اللہ کی جلالت کا قلب و نظر پر جاری رہنا اور خفیہ اور اعلانیہ ہر حالت میں' چھوٹے معاملے میں یا بڑے معاملے میں حرکت میں اور سکون میں' نیت میں اور اعمال میں' غرض ہر حال میں اللہ کو یاد کرنا ان آیات کا ماحصل ہے۔ صبح و شام کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا گیا ہے کہ ان اوقات میں انسان کا قلب اور نظر قبولیت کے لئے تیار ہوتی ہے۔ اور اللہ جانتا ہے کہ اس وقت انسان پر کائناتی اثرات ہوتے ہیں۔

وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ (۷: ۲۰۵) "ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت کا شکار ہیں۔" یعنی ایسے لوگوں میں سے نہ بنو جو اللہ کی یاد سے غافل ہیں۔ جن ہونٹوں پر اور جن کی زبان پر اللہ کا نام نہیں آتا' نہ ان کے قلب و نظر میں تصور خدا ہوتا ہے۔ جو اب ذکر نہیں کرتے جس کے ساتھ دل کی دھڑکن وابستہ ہو' اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان راہوں پر نہیں چلتے جن پر اللہ تعالیٰ چلنے کو پسند نہیں کرتے جسے اللہ دیکھے تو انہیں شرمندہ ہونا پڑے۔ وہ چھوٹی اور بڑی ہر بات میں اللہ کا لحاظ رکھتے ہیں۔ ایسا ہی ذکر ان آیات کا مفہوم ہے۔ اگر کسی ذکر کا اثر انسان کے اعمال اور اس کے طرز عمل پر نہیں ہوتا اور وہ اللہ کا اتباع نہیں کرتا تو وہ ذکر' ذکر بھی نہیں ہے اور نہ اس آیت کا مطلوبہ ذکر ہے۔

یعنی اللہ کو یاد کرو' اور اس سے غفلت نہ کرو۔ تمہارا دل اس بات سے غافل نہ ہو کہ وہ مسلسل نگرانی کر رہا ہے۔ انسان اس بات کا سخت محتاج ہے کہ ہروقت اس کا جوڑ اللہ کے ساتھ رہے۔ صرف اس صورت میں وہ شیطانی وساوس سے بچ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ فَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ "اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو' وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔" (اعراف ۲۰۰) اس سورہ کے آغاز میں آدم و ابلیس کے معرکے کا تفصیلی بیان آیا تھا۔ پھر اس پوری سورہ میں قافلہ ایمان کی کہانی بیان ہوتی رہی ہے۔ اور اس قافلے کی راہ میں جنوں اور انسانوں کے شیاطین جو رکاوٹیں ڈالتے رہے ہیں' مثلاً اس شخص کی مثال کا بھی تفصیلی ذکر ہوا جسے اللہ نے اپنی نشانیاں دی تھیں لیکن وہ ان سے نکل بھاگا۔ شیطان نے اس کا پیچھا کیا اور اسے گمراہوں کے ٹولے میں شامل کر کے چھوڑا۔ سورت کے آخر میں شیطان کے اکسانے کا ذکر ہوا اور حکم دیا گیا کہ ایسی حالت میں مداوا یہ ہے کہ تم اللہ کی پناہ میں چلے جاؤ۔ وہ جاننے اور سننے والا ہے۔ غرض قرآن مسلسل اور مربوط کلام ہے اور اس کے آخر میں حکم دیا جاتا ہے کہ ہروقت نہایت ہی عاجزی کے ساتھ اللہ کو یاد کیا کرو۔ اور غفلت سے بچو۔ یہ حکم اس بات کے دوران آتا ہے جس میں اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتے ہیں کہ عفو و درگزر کو اپنا شعار بناؤ' معروف باتوں کا حکم دو اور جاہلوں سے پہلو تہی کرو' لہٰذا یاد الٰہی درحقیقت اسلامی انقلاب کے نشانات منزل کا تکملہ اور آخری منزل ہے۔ اور یہ راہ رو منزل کے لئے وہ توشہ ہے جس کے ذریعے وہ مشکل ترین منازل طے کر سکتا ہے۔

اب اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے سامنے ملائکہ مقربین کی مثال پیش کرتے ہیں ۔ وہ جن پر شیطان کی اکساہٹ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ان کے اندر تخلیقی اعتبار سے کوئی کمی نہیں ہوتی نہ ان کے اندر شہوات ہوتی ہیں اور نہ میلانات ہوتے ہیں ۔ وہ رات دن ذکر الٰہی میں مشغول ہوتے ہیں ۔ وہ اللہ کی بندگی میں نہ کوئی تقصیر کرتے ہیں اور نہ غرور کرتے ہیں حالانکہ اللہ کی بندگی اور تسبیح کرنے کے معاملے میں انسان ان سے زیادہ محتاج ہے ۔ انسان کی راہ میں زیادہ مشکلات ہیں اور اس پر شیطان کی اکساہٹ کا اثر بھی جلد ہوتا ہے ۔ انسان تباہ کن غفلت کا ارتکاب بھی کر سکتا ہے ۔ انسان کی سعی بھی محدود ہے 'اگر ذکر الٰہی کا توشہ نہ ہو تو اس کے لئے منزل تک پہنچنا ہی دشوار ہے ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ

(۷ : ۲۰۶) "جو فرشتے تمہارے رب کے حضور تقرب کا قیام رکھتے ہیں وہ کبھی بڑائی کے گھمنڈ میں آکر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کے آگے جھکے رہتے ہیں ۔"

عبادت اور ذکر الٰہی دین اسلام کے اساسی طریقوں میں شامل ہیں ۔ یہ محض علم و معرفت کا طریق کار نہیں ہیں ۔ نہ لاہوتی جدلیات سے ان کا تعلق ہے بلکہ ان کا تعلق سلوک و عمل اور عملی حرکت کے ساتھ ہے ۔ اور اس کے ذریعے انسان کی عملی دنیا کو بدلنا مطلوب ہوتا ہے ۔ انسان کی عملی زندگی کی جڑیں لوگوں کے نفس کے اندر ہوتی ہیں 'عمل کی اساس کے خزانے انسان کے اندر ہوتے ہیں 'لوگوں کو عملاً جاہلیت سے نکالنا اور اسلامی منہاج میں داخل کرنا ایک مشکل کام ہے ۔ اور اس کے لئے نہایت ہی مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے ۔ اس راہ کی مشکلات پر صبر ایوبی کی ضرورت ہے جبکہ داعی کی طاقت محدود ہوتی ہے ۔ اس لئے داعی کے لئے اس محدود قوت کے ساتھ اضافی قوت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ یہ قوت محض علم و معرفت اور دلیل و برہان سے حاصل نہیں ہوتی ہے ۔ اس کا سرچشمہ عبادت 'تعلق باللہ اور اللہ کی نصرت میں ہوتا ہے ۔ یہی وہ توشہ ہے جو ختم نہیں ہوتا۔ اور یہی سرچشمہ نصرت ہے جو اس طویل اور خطرناک راہ میں درکار ہوتا ہے ۔

اس سورت کا آغاز ان الفاظ سے ہوا۔ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ "یہ کتاب ہے جو تمہاری جانب نازل کی گئی ہے ۔ پس اے نبی تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو ۔ اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے منکرین کو ڈراؤ اور ایمان لانے والوں کو نصیحت ہو ۔"

پوری سورہ میں قافلہ اہل حق کی کہانیاں بیان ہوئیں اور اس قافلے کی قیادت رسل کرام اپنے اپنے اوقات میں کرتے رہے ۔ راستے پر شیطان رجیم ان کی راہ بار بار روکتا رہا۔ جنوں اور انسانوں کے شیاطین ان کو اذیت دیتے رہے ' اس دنیا کے جبار و قہار ان پر مظالم ڈھاتے رہے اور طاغوتی نظاموں کے ہرکارے ان کے آڑے آتے رہے ۔ یہ وہ لوگ تھے جو لوگوں کی گردنوں پر سوار ہو کر ان کو غلام بنا رہے تھے ۔

بے شک یہی ہے اس راستے کا توشہ اور یہی ہے اس راستے کے معزز مسافروں کا سازوسامان ۔

# فی ظلال القرآن

## پارہ ---- ۹

## سورۃ الانفال - ۸

## ۱ --- تا --- ۴۰

# سورۃ الانفال ایک نظر میں

ایک بار پھر ہم مدنی قرآن کا مطالعہ کر رہے ہیں ۔کیونکہ گذشتہ دونوں سورتیں' انعام اور اعراف مکی تھیں ۔ اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں کہ فی ظلال القرآن میں ہمارا طریقہ مصحف کے مطابق ہو گا' نزولی ترتیب کے مطابق نہ ہو گا مثلاً بقرہ' آل عمران' نساء اور مائدہ ۔ یہ اس لئے کہ سورتوں کی ترتیب نزولی کے بارے میں آج کے دور میں ہم کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکتے ۔ ہم اب اجمالاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سورتیں مکی ہیں اور یہ مدنی ہیں اور اس کے بارے میں تھوڑے بہت اختلافات موجود ہیں ۔ رہی یہ بات کہ کون سی سورہ کس سورہ سے پہلے اور کس کے بعد نازل ہوئی ہے تو اس کے بارے میں آج کے دور میں ہم کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکتے ۔ یا یہ کہ فلاں آیت کس دور میں نازل ہوئی ہے یا آیات کا کوئی گروپ کس دور میں نازل ہوا ۔ یہ تعین اب قریب قریب ناممکن ہے ۔ آج کے دور میں کوئی قطعی بات نہیں کی جا سکتی ۔ ہاں بعض آیات کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ فلاں وقت اتریں جن کے بارے میں تواتر کے ساتھ روایات وارد ہیں یا ایک ہی قطعی روایت ایسی آ گئی ہے جس کے ذریعہ کسی آیت کے بارے میں قطعی طور پر معلوم ہو سکتا ہے ۔ اس کے باوجود کہ آیات اور سورتوں کی ترتیب زمانی اور ان کے زمانہ نزول کا علم نہایت ہی اہم ہے ۔ اور اسی ذریعے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تحریک اسلامی کو کن مراحل میں کیا اقدامات کرنے پڑے لیکن اس باب میں تعین کے ساتھ کوئی بات کہنا نہایت ہی مشکل کام ہے ۔ جن لوگوں نے بھی اس سلسلے میں کچھ نتائج اخذ کئے ہیں وہ تخمینی اور ظنی ہیں ۔ کسی نتیجے کو قطعی اور یقینی نہیں کہا جا سکتا ۔ اس کے باوجود کہ سورتوں کے زمانہ نزول کے تعین کے یقینی اسباب و ذرائع نہیں ہیں لیکن اس میدان میں ظنی نتائج پر بھی بہت ہی اہم نتائج مرتب ہوئے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ظلال القرآن میں اگرچہ مصحف عثمانی کے مطابق تفسیر لکھی ہے تاہم ہر سورہ کے زمانہ نزول کی اہمیت کے پیش نظر اس کے زمانہ نزول کا تعین بھی کیا ہے ۔ ہر سورہ کے تاریخی حالات کو ہم نے بطور اجمال ہی لیا ہے اور زمانہ نزول کے تعین میں ترجیحات قائم کی ہیں' تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ آیات کن حالات میں نازل ہوئیں ۔ جس طرح ہم نے اس سے قبل مختصراً تمام سورتوں کے زمانہ نزول کے بارے میں بحث کی ۔ اس سورہ میں بھی انشاء اللہ ہم اس اسلوب کے مطابق بات کریں گے ۔ ( میں نے اپنی کتاب شاہد القیامت فی القرآن میں مشاہد ترتیب نزول کے مطابق ہی دیئے ہیں **لیکن فی ظلال القرآن میں** ہم نے مروج طریق کار ہی استعمال کیا ہے ۔

سورہ انفال سورہ بقرہ کے بعد نازل ہوئی ۔ یہ بدر الکبریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ۔ یہ جنگ رمضان المبارک سن دو ہجری میں ہوئی یعنی راجح روایات کے مطابق ہجرت کے بعد انیسویں مہینے میں ۔ لیکن یہ بات بھی قطعی نہیں ہے کہ یہ سورہ' سورہ بقرہ کے بعد نازل ہوئی ۔ اس لئے کہ سورہ بقرہ یکبارگی نازل نہیں ہوئی ۔ اس کے بعض حصے تو مدینہ میں آمد کے ابتدائی ایام میں نازل ہوئے اور بعض آیات ایسی بھی ہیں جو مدینہ کے آخری دور میں نازل ہوئیں ۔ اس کی ابتدائی

آیات اور آخری آیات کے درمیان ۹ سال کا فاصلہ زمانی ہے ۔ لہذا یقینی بات یہی ہے کہ سورہ انفال ان دو زمانوں کے درمیان نازل ہوئی جبکہ سورہ بقرہ اس سے پہلے اور بعد میں بھی نازل ہوتی رہی اور حضور کی ہدایات کے مطابق آیات کو اپنے مقامات نشاندہی پر رکھ دیا جاتا ۔ اب رہی یہ بات کہ فلاں سورہ فلاں سے پہلے اور بعد میں نازل ہوئی تو اس کا دار و مدار صرف سورتوں کے ابتدائی حصے پر رہا ہے ۔ اس سلسلے میں تفصیلات ہم سورہ بقرہ کے آغاز میں بیان کر آئے ہیں ۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ سورہ انفال کی درج ذیل آیات ۳۰ تا ۳۶ مکی ہیں ۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ (۳۰) وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۳۱) وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳۲) وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (۳۳) وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْآ اَوْلِيَآءَهٗ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۴) وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (۳۵) اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ (۳۶) (۸ : ۳۰ – ۳۶)

”اور اے پیغمبر، وہ وقت یاد کرو، جب کافر تمہارے خلاف خفیہ تدبیریں کر رہے تھے تاکہ تمہیں قید کریں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں، وہ اپنی چال چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا، اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے اور جب ہماری آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی تھیں تو کہتے تھے کہ ہم نے سن لیا، اگر ہم چاہیں تو اسی طرح کی باتیں ہم بھی کر لیں ۔ یہ تو کچھ بھی نہیں مگر اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں اور جب انہوں نے کہا تھا کہ اے اللہ اگر یہ واقعی تیری طرف سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا دے یا کوئی اور دردناک عذاب ہم پر لے آ ۔ اور اللہ ایسا کرنے والا نہ تھا کہ تم ان کے درمیان موجود ہو اور وہ تمہارے رہتے ان کو عذاب دے ۔ اللہ ایسا بھی کرنے والا نہیں کہ لوگ استغفار کر رہے ہوں اور وہ ان پر عذاب نازل کرے اور اب ان کا کیا استحقاق رہا ہے کہ وہ مسجد حرام سے مسلمانوں کو روکیں اور

اللہ ان کو عذاب نہ دے حالانکہ وہ اس کے متولی نہیں ہیں۔ اس کے جائز متولی تو متقی لوگ ہی ہو سکتے ہیں لیکن ان کافروں میں سے اکثروں کو معلوم نہیں۔ اور ان کی نماز خانہ کعبہ میں کیا ہے سوائے سیٹیاں بجانے اور تالیاں پیٹنے کے۔ پس جیسے کفر تم کرتے رہے ہو اب اس کی پاداش میں مزا چکھو۔ جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے وہ اپنے مال اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں۔ سو یہ لوگ آئندہ بھی خرچ کرتے رہیں گے اور پھر یہ ان کے لئے موجب حسرت ہو گا اور پھر وہ مغلوب ہوں گے اور کافر جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے۔

شاید ان لوگوں نے ان آیات کو مکی اس لئے کہا ہے کہ ان میں جن امور کا ذکر کیا گیا ہے وہ مکہ میں واقع ہوئے تھے اور ہجرت سے پہلے در پیش ہوئے تھے لیکن یہ کوئی حقیقی سبب نہیں جو ان آیت کو مکی قرار دے۔ اس لئے کہ کئی مدنی آیات اور سورتیں ایسی ہیں جن میں مکی واقعات پر تبصرے کئے گئے ہیں۔ اسی سورہ میں ان آیات سے پہلے کی آیت ۲۶ بھی مکی حالت سے بات کرتی ہے۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۸: ۲۶)

"وہ وقت یاد کرو، جب تم تھوڑے تھے اور کمزور سمجھے جاتے تھے، تم ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں اچک نہ لے جائیں پھر اللہ نے تمہیں ٹھکانا دیا اور اپنی مدد سے تمہیں قوت بخشی اور تمہیں رزق کا بہترین سامان دیا تاکہ تم شکر کرو۔"

جبکہ اس سورہ کی آیت ۳۶، جو آیات کے اس گروپ کی آخری آیت ہے جس کے بارے میں مکی ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے، یہ واقعہ بدر کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ بدر کے بعد مشرکین غزوہ احد کی تیاری کے لئے بہت بڑی دولت خرچ کر رہے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ (۸: ۳۶) "جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے وہ اپنے مال اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں، سو یہ لوگ آئندہ بھی خرچ کرتے رہیں گے اور پھر یہ ان کے لئے موجب حسرت ہو گا۔ اور پھر وہ مغلوب ہوں گے اور کافر جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے۔"

جن روایات میں ان آیات کے مکی ہونے کا ذکر آیا ہے، ان میں ان کے سبب نزول میں ایک ایسی بات کہی گئی ہے جو قابل اعتراض ہے۔ ان روایات میں آیا ہے کہ ابو طالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ تمہارے خلاف تمہاری قوم کیا کیا سازشیں کر رہی ہے؟ تو آپ ؐ نے فرمایا ان کا ارادہ ہے کہ مجھ پر جادو کریں، مجھے قتل کر دیں اور مجھے مکہ سے نکال دیں۔ ابو طالب نے کہا کہ تمہیں اس کی اطلاع کس نے دی۔ تو حضور ؐ نے فرمایا مجھے میرے رب نے اس کی اطلاع دی ہے تو انہوں نے کہا بالکل درست ہے، رب تمہارا ہی رب ہے۔ اس لئے آپ اپنے رب کے بارے میں

بھلائی کی وصیت کریں۔ حضور نے فرمایا کیا میں اپنے رب کے بارے میں بھلائی کی وصیت کروں بلکہ میرا رب میرے بارے میں بھلائی کا ارادہ کرے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَاِذْ یَمْکُرُبِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ (۸: ۳۰) ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کر کے اس پر یہ تنقید کی ہے۔ "اس روایت میں ابو طالب کا تذکرہ بالکل نامانوس ہے بلکہ منکر ہے کیونکہ یہ آیت مدنی آیت ہے' پھر یہ کہ یہ قصہ اور اس سلسلے میں قریش کا اجتماع اور مشورہ' آپ کی گرفتاری یا ملک بدری یا قتل کا فیصلہ انہوں نے اس رات کیا تھا جس میں آپ نے ہجرت فرمائی اور اس وقت ابوطالب فوت ہو چکے تھے اور ان کی وفات پر تین سال بھی گزر گئے تھے۔ صرف ان کی موت ہی کی وجہ سے ان کو جرات ہوگئی تھی کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یہ فیصلے کریں اس لئے کہ وہی تھے جو آپ کو گھیرے میں رکھ کر آپ کی امداد کرتے تھے اور آپ کی پوری ذمہ داریاں اپنے کاندھوں پر لئے ہوئے تھے۔"

ابن اسحاق نے عبداللہ ابن نجیح' مجاہد نے 'ابن عباس کی سند سے ایک طویل روایت نقل کی ہے جس میں قریش کی اس آخری رات کی سازش کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اس روایت کے آخر میں یہ الفاظ ہیں: "اس وقت اللہ نے آپ کو اجازت دے دی کہ اب آپ نکل جائیں اور جب آپ مدینہ چلے گئے تو آپ پر یہ سورہ انفال نازل ہوئی جس میں اللہ نے اپنے ان انعامات کا ذکر کیا جو آپ پر کئے گئے اور جن آزمائشوں سے آپ گزرے۔

وَاِذْ یَمْکُرُبِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ (۸: ۳۰) یہ روایت حضرت ابن عباس سے منقول ہے اور قرآن کریم کے سیاق کلام کے ساتھ بھی یہ لگا کھاتی ہے۔ اور ان آیات کا ربط بھی اپنے ماقبل اور مابعد سے درست ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو یاد دلاتے ہیں اور اہل ایمان کو یاد دہانی کراتے ہیں کہ ذرا ان واقعات کو تو یاد کرو کہ اللہ تعالیٰ کے کیا کیا کرم تم پر ہوئے' اس لئے تمہارا فرض ہے کہ تم جہاد کے لئے تیار ہو جاؤ اور جب تم معرکہ کارزار میں پہنچو تو ثابت قدم رہو وغیرہ۔ تمام مضامین جن سے یہ سورہ بحث کرتی ہے۔ لہٰذا یہ بات ہی درست ہے کہ یہ آیات بھی اسی طرح مدنی ہیں جس طرح یہ سورہ مدنی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ محض ایسے ہی غیر یقینی حالات کی وجہ سے اور اسباب نزول کی ایسی ہی روایات کی وجہ سے جو ہم نے یہ موقف اپنایا کہ قرآن کی تفسیر مصحف عثمانی کے مطابق لکھی جائے اور قرآن مجید کی ترتیب نزولی کے مطابق تفسیر نہ لکھی جائے۔ اس لئے کہ ترتیب نزول کے سلسلے میں آج بھی ہم کسی یقینی نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے۔ البتہ ہم نے اسباب نزول قرآن اور ہر سورہ کے حالات نزول کے بارے میں بقدر استطاعت بحث کی ہے اور اللہ ہی ہے جو توفیق دینے والا ہے۔

---()()()---

یہ سورہ بدر کبریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ غزوہ بدر تحریک اسلامی کی تاریخ میں بلکہ خود انسانی واقعات کی تاریخ میں ایک اہم موڑ تھا۔ یہ غزوہ تحریک اسلامی کے لئے ایک بہترین معلم ثابت ہوا' اپنے حالات اور ان پر مرتب ہونے والے نتائج کے زاویہ سے۔

اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن کو جمعیتوں کی مڈبھیڑ کا دن اور یوم الفرقان کے الفاظ سے تعبیر کیا۔ بلکہ نہ صرف یہ کہ اسے اس دنیا میں تحریک اسلامی کے راستے کا اہم موڑ قرار دیا بلکہ اسے آخرت کی کامیابی کے لئے بھی سنگ میل قرار دیا۔

یہ دن صرف دنیا کے لوگوں کے لئے ہی فیصلہ کن نہ تھا بلکہ آخرت کا فیصلہ یہ دن اس طرح کرتا ہے :

فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ
(۱۹) يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ (۲۰) وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ (۲۱)
كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ
(۲۲) اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ (۲۳) وَ
هُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوْا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ (۲۴) (۲۲:۱۹ –
۲۴) "یہ دو فریق ہیں ' ایک دوسرے کے مخالف ' جو اپنے رب کے بارے میں آپس میں جھگڑتے ہیں تو جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے ان کے لئے آگ کے لباس کاٹے جا چکے ہیں اور ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا ' اس سے جو کچھ ان کے پیٹ میں ہے گل جائے گا اور ان کی کھالیں گل جائیں گی اور ان کے مارنے کے لئے لوہے کے گرز ہوں گے جب کبھی وہ گھٹن کے سبب نکلنا چاہیں گے تو اس میں پھر دھکیل دیئے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا - اب جلنے کا عذاب چکھو۔ دوسری طرف جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے ان کو اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی - وہاں انہیں سونے کے کنگن اور ہار پہنائے جائیں گے اور لباس ان کا ریشمی ہو گا اور یہ سب انعام انہیں اس لئے ملے گا کہ دنیا میں انہیں پاکیزہ بات کی ہدایت کی گئی اور انہیں خدائے ستودہ صفات کی راہ بتائی گئی -"

روایات میں آتا ہے کہ یہ آیات ان دو فریقوں کے بارے میں نازل ہوئیں جنہوں نے بدر میں ایک دوسرے کا مقابلہ کیا ' یعنی یوم الفرقان میں - صرف دنیا ہی میں نہیں انسانی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ آخرت میں بھی بلکہ نہایت ہی دور رس طور پر فیصلہ کرنے والے دن میں - اللہ جل شانہ کی طرف سے یہ شہادت کافی ہے کہ بدر کا دن یوم الفرقان تھا اور یہ فیصلہ کن دن تھا - جب ہم بدر کے واقعات پر تبصرہ کریں گے تو اس دن کے فیصلہ کن اثرات سے بحث کریں گے اور اس سے نکلنے والے نتائج بھی قارئین کے سامنے رکھیں گے - ان شاء اللہ -

لیکن اس دن کی عظمتوں کے باوجود میں یہ بات کہوں گا کہ اس دن کے معرکے کی حقیقی قدر و قیمت اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتی جب تک ہم اسے تحریک جہاد اسلامی کی کڑیوں میں سے ایک کڑی تسلیم نہ کریں اور جب تک ہم لوگوں کو اس جہاد کے اسباب ' محرکات اور مقاصد کا ادراک نہ کر لیں اور جب تک ہم اسلام کے نظریہ جہاد کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں کہ اس کے مقاصد کیا ہیں اور یہ نہ سمجھ لیں کہ اسلامی نظام حیات اور دین اسلام کے تقاضے کیا ہیں؟

## اسلام کا نظریہ جہاد

امام ابن قیم جوزی نے 'اپنی مشہور کتاب' زاد المعاد میں 'حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجاہدانہ زندگی کے بارے میں ایک عنوان قائم کیا ہے۔"بعثت سے لے کر وفات تک کفار اور منافقین کے ساتھ آپ کا طرز عمل" اس عنوان کے تحت وہ رقم طراز ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آپ کی طرف یہ وحی نازل کی کہ "آپ اپنے رب کے نام سے پڑھیں' یوں ہوا آپ کی نبوت کا آغاز' اس وقت جو حکم دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ آپ اپنے دل میں پڑھیں۔ ابھی آپ کو تبلیغ کا حکم نہ ملا تھا' کچھ عرصہ بعد یہ آیت نازل ہوئی یَاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ یعنی اقراء سے آپ کو نبوت ملی اور یاایھا المدثر سے آپ کو منصب رسالت عطا ہوا اور حکم دیا گیا کہ آپ اپنے رشتہ داروں کو ڈرائیں' رشتہ داروں کے بعد آپ نے اپنی قوم کو انجام بد سے ڈرایا۔قوم کے بعد مکہ مکرمہ کے ارد گرد پھیلے ہوئے قبائل کو تبلیغ کی۔ اس کے بعد یہ پیغام پوری عرب دنیا تک عام کر دیا گیا اور بالآخر اس دعوت کو بین الاقوامی دعوت بنا دیا گیا۔

دعوت اسلامی کا کام شروع کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کئی سال تک صرف وعظ اور تبلیغ کرتے رہے اور طاقت کا استعمال نہ کیا' بلکہ آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ صبر اور درگزر سے کام لیں اور لڑنے کا جواب پتھر سے نہ دیں۔ ایک عرصہ بعد آپ کو ہجرت کی اجازت دی گئی اور ساتھ ہی دشمنوں سے لڑنے کی بھی اجازت دی گئی تاہم یہ اجازت اس حد تک تھی کہ صرف ان لوگوں سے جنگ کی جائے جو لڑنے کے لئے میدان میں اتر آئیں اور دوسروں سے نہ لڑا جائے۔سب سے آخر میں یہ حکم دیا گیا کہ کفار اور مشرکین سے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جائے جب تک دین اللہ کے لئے خالص نہیں ہو جاتا۔ (لِیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهُ لِلّٰهِ) جس وقت آپ کو جہاد کا حکم دیا گیا' اس وقت حضورؐ اور کفار کے درمیان تعلقات کی صرف تین شکلیں تھیں' اہل صلح' اہل حرب اور اہل ذمہ' اہل صلح یعنی جن کے ساتھ امن کے معاہدات ہوئے تھے' ان کے بارے میں حکم ہوا کہ عہد کو آخر تک نبھایا جائے' لیکن صرف اس صورت میں کہ جانب مخالف اپنے معاہدے کا پابند ہو اور اگر وہ عہد شکنی اور غداری کریں تو آپ بھی معاہدہ ان کے منہ پر دے ماریں' البتہ ایسے لوگوں کے ساتھ عملاً جنگ اس وقت تک نہ چھیڑی جائے جب تک انہیں باقاعدہ اطلاع نہ دی جائے کہ معاہدہ ختم ہو چکا ہے۔جب سورۂ براءت نازل ہوئی تو ان تمام اقسام کے احکام علیحدہ علیحدہ بیان ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے 'نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے اس وقت تک لڑیں کہ یا وہ جزیہ قبول کریں اور یا اسلام میں داخل ہو جائیں اور مشرکین اور منافقین سے بھی جہاد کا حکم دیا گیا۔ نیز منافقین سے مزید سختی برتنے کا حکم دیا گیا۔کفار کے ساتھ آپ کا جہاد مسلح جنگ کی شکل میں تھا اور منافقین کے ساتھ زبان اور دلیل سے۔

سورہ براءۃ میں یہ حکم بھی دیا گیا کہ کفار کے ساتھ کئے ہوئے تمام معاہدات کو ختم کر دیا جائے اور علی الاعلان ان سے براءت کا اظہار کر دیا جائے۔اس اعلان کے بعد اہل عہد کی تین اقسام قرار پائیں' وہ جن کے ساتھ جنگ کا حکم دیا گیا۔یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے عہد شکنی کی تھی اور اپنے عہد پر قائم نہیں رہے تھے' ان لوگوں کے ساتھ حضورؐ نے جنگ کی اور ان پر فتح پائی۔دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جن کے ساتھ عہد تھا اور وہ اسے نبھاتے بھی رہے۔ آپ کو حکم دیا گیا کہ ان کے ساتھ جو معاہدہ ہے اسے مقررہ مدت تک برقرار رکھا جائے اور شرائط کی پابندی کی جائے۔تیسری قسم ایسے لوگوں کی تھی کہ جن کے

ساتھ اگر چہ معاہدہ تو نہ تھا لیکن یہ لوگ آپ کے خلاف کسی جنگ میں بھی شریک نہ ہوئے تھے یا ان کے ساتھ تعین مدت کے بغیر معاہدہ طے پا گیا تھا' ایسے لوگوں کے بارے میں حکم ہوا کہ انہیں چار ماہ کی مہلت دی جائے اور ان سے کہہ دیا جائے کہ اس کے بعد کوئی معاہدہ نہیں کیا جائے گا۔ یا مسلمان ہو جاؤ ورنہ لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

چنانچہ انہی ہدایات کے مطابق آپ نے عہد شکنوں کے ساتھ جنگ کی' اور جن کے ساتھ کوئی عہد نہ تھا انہیں چار ماہ کی مہلت دی اور راست باز معاہدین کے ساتھ اپنا عہد پورا کیا اور ایسے تمام لوگ معاہدہ کی مدت پوری ہونے سے پہلے ہی اہل ایمان اور مسلمانوں کا جزو بن گئے اور اہل ذمہ پر جزیہ عائد ہوا۔

جیسا کہ کہا گیا سورۂ برات کے نزول کے بعد کفار کے ساتھ آپ کے تعلقات تین قسم کے رہ گئے تھے یعنی محارب' اہل ذمہ اور اہل عہد اور چونکہ اہل عہد سب کے سب اسلام میں داخل ہو گئے تھے' اس طرح صرف اہل ذمہ اور اہل حرب ہی باقی رہ گئے۔ اہل حرب کی حالت یہ رہتی تھی کہ آپ کے دور میں وہ ہمیشہ آپ سے خائف رہتے تھے۔(۱)

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے آخری دور میں حضورؐ اور تمام انسانوں کے تعلقات کی نوعیت صرف یہ رہ گئی تھی کہ ان میں سے بعض مسلم اور مومن تھے' بعض آمن اور مسالم تھے اور بعض آپؐ سے خائف اور محارب تھے۔

منافقین کے ساتھ آپ کا طرز عمل یہ تھا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ آپ ان کے اعلان اسلام کو قبول فرمائیں اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کر دیں اور ان کے مقابلے میں علم و استدلال کے ہتھیار ہی استعمال کریں اور ان کے ساتھ سرد مہری کا رویہ اختیار کریں اور ان سے سختی برتیں اور ان کی نفسی کیفیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے ارشادات عالیہ سے ان کی اصلاح کی سعی کریں' ان کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کریں اور نہ حضورؐ ان کی قبر پر کھڑے ہو کر دعا کریں اور یہ کہ اگر آپ ان کے لئے دعائے مغفرت مانگ بھی لیں تو بھی اللہ انہیں ہرگز نہ بخشے گا۔ یہ تھا مختصر بیان حضورؐ کے طرز عمل کا اپنے کفار اور منافق دشمنوں کے ساتھ۔"

## اقامت دین کی جدوجہد اور اس کی خصوصیات

علامہ ابن قیم نے اسلامی جہاد کے مختلف مراحل کی یہ بہترین تلخیص پیش کی ہے اور اس سے دین حق کے تحریکی پہلو کی مستقل اور گہری بنیادیں واضح ہو جاتی ہیں جو اس لائق ہیں کہ خاصی دیر ٹھہر کر ان پر اچھی طرح غور کر لیا جائے۔ اس مختصر سی بحث میں ہم صرف چند اشارات پر ہی اکتفاء کریں گے۔

(۱) یہ حکم صرف مشرکین عرب کے لئے ہے انہیں جزیہ دے کر اسلامی ریاست کے زیر سایہ ذمی کی حیثیت سے زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ اس لئے کہ حق کے پورے انکشاف کے بعد ان کے انحراف کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ نبی ہیں اور قرآن ان کی اپنی زبان میں نازل ہونے کی وجہ سے انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ محض ہٹ دھرمی کی بناء پر یہ انکار کئے جا رہے تھے اس لئے یہ کسی رعایت کے مستحق نہیں تھے۔ عرب اہل کتاب اور غیر عرب مشرکین اور اہل کتاب کے ساتھ یہ رعایت رکھی گئی کہ اگر وہ چاہیں تو حفاظت جان و مال کا معاوضہ یا جزیہ دے کر اسلامی حکومت کے زیر سایہ باعزت شہری کے طور پر رہیں۔

۱- ابن قیم کے اس "سیرت پارہ" سے "اسلامی جہاد کی جو پہلی بنیاد سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ دین حق اپنے طریق کار میں بھرپور واقعیت پسند ہے' یہ طریق کار دراصل اس حرکت کا نام ہے' جو زمین پر موجود کسی انسانی سوسائٹی کا سامنا کرتی ہے اور ایسے سب ذرائع سے اس کا سامنا کرتی ہے' جو سوسائٹی کے واقعی وجود کے مقابلہ میں کام آسکیں۔

وہ جاہلیت کے اس فکری دائرہ پر یلغار کرتی ہے جس پر عملاً زندگی کا چلتا پھرتا ایک نظام قائم ہے جسے وقت کا اقتدار مادی قوت کے ذریعہ سہارا دیئے چلا جاتا ہے۔

اسلامی تحریک عالم واقع میں اس واقعی صورت حال کا مقابلہ کرتی ہے۔ان تمام ذرائع و وسائل کو کام لاکر جن سے کہ یہ جاہلیت کام لیتی ہے۔وہ اس جاہلیت کا سامنا بیان و تقریر سے بھی کرتی ہے' تاکہ سوسائٹی کے افکار و عقائد کی اصلاح ہو سکے اور وہ غایت درجہ سعی کے ساتھ طاقت بھی استعمال کرتی ہے' تاکہ جاہلیت کے نظام و اقتدار کو ملیامیٹ کیا جاسکے۔

وہی اقتدار جو عوام اور تعمیر افکار کی اصلاح کے کام میں روگ بن کر کھڑا ہے اور جو جبراً ان پر مسلط ہے اور انہیں اندھیرے میں رکھے ہوئے ہے اور جو انہیں رب اکبر کے مقابلہ میں دوسروں کا بندہ بنائے ہوئے ہے۔یہ ایک ایسی تحریک ہے جو صرف بیان و اظہار پر اکتفاء کر کے ختم نہیں ہو جاتی جس طرح کہ اس تحریک میں یہ بھی نہیں ہے کہ مادی غلبہ حاصل کر کے لوگوں سے جبراً اپنی بات منوالے --- یہ رد و قبول میں جبر کی قائل ہی نہیں لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ دین حق کے طریق کار میں یہ دونوں ہی باتیں نہیں ہیں وہ تو ایک تحریک ہے۔اس لئے برپا کی گئی ہے کہ لوگوں کو بندوں کی غلامی سے نجات دلاکر اللہ وحدہ لاشریک کی بندگی میں داخل کر دے۔تفصیل آگے آتی ہے۔

۲- اس دین کی دوسری خصوصیت (علامہ ابن قیم کے سیرت پارہ کی روشنی میں) یہ ہے کہ اس کے اصلاحی طریق کار میں واقعیت پسندانہ تحریکیت پائی جاتی ہے۔وہ ایک ایسی تگ و دو سے عبارت ہے جس کے کئی مراحل ہیں' ہر مرحلے میں اس کے مناسب ذرائع اور وسائل کو کام میں لایا جاتا ہے' جو اس مرحلے کے واقعی تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں اور اس مرحلے سے یہ تحریک بتدریج آگے بڑھتی ہے۔اس تحریک کا طریق کار یہ ہے کہ یہ واقعی حالات کا مقابلہ مجرد نظریات سے نہیں کرتی اور نہ ہی اس کے وسائل و ذرائع جمود کا شکار ہیں۔ہمارے دور میں جو لوگ اسلام کے نظریہ جہاد کے بارے میں لکھنے بیٹھتے ہیں اور قرآن کی آیات پر بحث کرتے ہیں' ان کے پیش نظر پہلی تحریک اسلامی کے مختلف مراحل نہیں ہوتے' نہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان مراحل میں سے کس مرحلے سے متعلق آیات کا شان نزول (پس منظر) کیا تھا' یہ لوگ' خلط مبحث کرتے ہیں اور دین کے نظریہ جہاد کے بارے میں گمراہ کن التباس و اشتباہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور قرآنی آیات کو ایسے معنی پہناتے ہیں جن کی وہ متحمل نہیں ہوتیں' بعض آیات کا تعلق تحریک کے ابتدائی مراحل سے ہے' یہ لوگ انہیں آخری مراحل کے لئے اصول قرار دیتے ہیں۔یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ بے شمار غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے اور ابتدائی ہدایات کو آخری فیصلے سمجھ بیٹھے۔حد یہ ہے کہ یہ اس بات کے قائل ہو گئے کہ اسلام میں صرف دفاعی جنگ کا جواز ہے' دراصل یہ لوگ فکری و ذہنی طور پر شکست خوردہ ہو گئے اور یہ رائے انہوں نے اس لئے قائم کی کہ اس مادی دور کے حالات کی سنگینی سے "فرزندان اسلام" عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔جن کے ہاں اسلام کا صرف نام ہی رہ گیا ہے اس پر مستزاد یہ کہ دین حق پر ڈھائے ہوئے اپنے ظلم کو اسلام کی خدمت قرار دیتے ہیں' اسلام کا اصل موقف تو یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر سے طاغوت کا اقتدار ختم کر دیا جائے اور تمام لوگوں کو غیراللہ کی غلامی سے نجات دی جائے۔

اس معاملہ میں اسلام کا اصل رول یہ ہے کہ جاہلیت نے دنیا میں دین حق کے پھیلنے کی راہ میں جو جو رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں انہیں ہٹا دیا جائے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ حق کے مقابلہ میں باطل سرنگوں ہو جائے یا مٹ جائے اور یا اتنا مغلوب ہو جائے کہ اسلام کی بالادستی کو تسلیم کر کے اس کے سایہ عاطفت میں تحفظ جان و مال کا معاوضہ (جزیہ) ادا کر کے پرامن شہری کی حیثیت سے رہائش پذیر ہو اور اسلام اور عوام الناس کے درمیان حائل نہ ہو تاکہ لوگ اس بارے میں بالکل آزاد ہوں کہ وہ اسلام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں۔

۳۔ ابن قیم کے "سیرت پارہ" کی روشنی میں) اس دین کی تیسری خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وسعت پذیر تحریکیت اور نئے نئے وسائل 'اسے اپنے بنیادی اصولوں سے منحرف نہیں کر سکتے اور نہ اس نصب العین ہی میں کوئی فرق واقع ہوتا ہے جو شروع سے ایک ہی رہا ہے۔ یہ دین ہمیشہ اپنے اصولوں پر سختی سے جما رہا ہے۔ دعوت رشتہ داروں کو دی جا رہی ہو' قریش کو دی جا رہی ہو' تمام عرب کو بلایا جا رہا ہو' یا تمام کرۂ ارض کو خطاب کیا جا رہا ہو' اس کی دعوت ہر وقت یہی رہی ہے کہ صرف ایک اللہ کی غلامی اختیار کرو اور اللہ کے سوا تمام غلامیوں کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکو' مصلحت کی خاطر اصول کو چھوڑا جا سکتا ہے' نہ نرمی برتی جا سکتی ہے اور نصب العین کے حصول کے لئے متعین طریق کار ہے' جس کی حدود متعین ہیں۔ پھر اس کے لئے جدوجہد کے مراحل بھی متعین ہیں اور ہر مرحلہ کے لئے وسائل و ذرائع میں سے نوبہ نو ذرائع اختیار کئے جا سکتے ہیں (یہاں بھی حدود اللہ کا لحاظ رکھنا لازم ہے) اس سلسلہ میں اوپر بھی "اشارہ" گزر اہے۔

۴۔ (ابن قیم کے مطابق) دین حق کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ بین الاقوامی علائق کے لئے اس کا اپنا ایک ضابطہ ہے اور اس ضابطہ و قانون کی اساس و بنیاد اس امر پر ہے کہ اسلام کا اپنا ایک موقف (Stand) ہے اور وہ یہ ہے کہ :۔

"تمام بنی آدم اللہ وحدہ' لا شریک کی اطاعت کریں یہ ان پر فرض ہے اور انہیں زندگی میں اللہ کی اطاعت ہی کی روش اختیار کرنی چاہئے۔ یہ نہیں تو کم از کم تمام بنی آدم کو "الٰہی طاعت" کے اس نظام (اسلام) کو برداشت کرنا چاہئے اور مصالحانہ روش اختیار کرنا چاہئے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ بنی آدم میں سے کوئی بھی اس کی دعوت کی راہ میں حائل ہو--- کوئی سیاسی نظام ہو یا مادی قوت --- وہ تمام بنی آدم کے لئے یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ دنیا کے عوام اور اس کے درمیان آڑے نہ آئیں تاکہ لوگ اپنے آزاد ارادے کے ساتھ اسلام کو اختیار کریں یا اسے رد کر دیں۔ اسلام بطور خود بھی رد و قبول میں جبر و طاقت کے استعمال کو جائز نہیں سمجھتا۔ اگر کوئی شخص 'کوئی گروہ (خواہ وہ کوئی بھی ہو' کہیں بھی ہو' کیسا ہی ہو---) اسلام اور عوام کے درمیان حائل ہوتا ہے' تو اسلام اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔ تا اینکہ اسے ملیامیٹ کر دیا جائے یا وہ اسلام کے آگے گھٹنے ٹیک دے۔"

## کیا جہاد دفاعی جنگ کا نام ہے؟

ذہنی اور فکری شکست خوردگی میں مبتلا حضرات جب اسلامی جہاد پر قلم اٹھاتے ہیں--- اور ان کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ "جہاد" کے نام سے اسلام پر لگائی گئی "تہمت" کے سلسلہ میں اپنی صفائی پیش کریں تو انہیں بظاہر دین حق کی اشاعت اور قیام کے سلسلہ میں تضاد نظر آتا ہے ایک طرف ارشاد ہے کہ :

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ "دین میں جبر و اکراہ نہیں ہے۔" اور دوسری طرف اسلام کا نظریہ جہاد یہ ہے کہ ان تمام

سیاسی اور مادی قوتوں کے مقابلہ کے لئے ہر طرح کی سعی و جہد فرض ہے جو اسلام اور دنیا کے عوام کے راستہ میں حائل ہیں اور جو لوگوں کو انہی جیسے دوسرے لوگوں کا بندہ بنائے ہوئے ہیں اور جو انہیں اللہ کی بندگی کے اختیار کرنے سے روکتی ہیں، چنانچہ یہ قلم کار غلط مبحث کا شکار ہو جاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ذہنی مرعوبیت میں مبتلا ہیں اور جہاد کو صرف دفاعی جنگ ثابت کرنے کی سعی ناتمام کرتے ہیں حالانکہ اسلام کے ان دونوں احکام میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کا الگ موضوع ہے اور جہاد فی سبیل اللہ ایک دوسرا عنوان ہے۔

اسلامی جہاد کا کوئی تعلق ان جنگوں سے سرے سے ہے ہی نہیں جو اس دور میں لڑی جاتی ہیں۔ آج کل کی یہ لڑائیاں اور اسلامی جہاد ایک دوسرے سے اغراض و مقاصد میں مختلف ہیں۔ کیفیت اور نوعیت میں مختلف ہیں، جن اغراض و مقاصد کے تحت اسلام جہاد کو فرض قرار دیتا ہے، ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اسلام کے مزاج، طبیعت اور زمین پر اس کی حکمرانی کی روشنی میں انہیں تلاش کریں۔ یہ وہی مقاصد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے خود ہی بیان فرمائے ہیں اور اسی نے یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا ہے اور آپ کی ذات پر نبوت ختم فرما دی ہے اور آپ کی رسالت کو اپنا آخری پیغام قرار دیا ہے۔

دین حق دراصل انسانی آزادی اور حریت کے لئے ایک عمومی چارٹر اور منشور ہے، یہ انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کرانے کا اعلان کرتا ہے۔ یہ اسے اپنے نفس کی بندگی سے بھی آزاد کراتا ہے، یہ بھی بندوں کی غلامی کی ایک صورت ہے۔

دین حق کا یہ اعلان دراصل اللہ وحدہ لاشریک کی الوہیت کا اعلان ہے اور اس امر کا اعلان ہے کہ وہ تمام جہانوں کا رب ہے، آپ جانتے ہیں کہ تمام جہانوں کے رب ہونے کے معنے کیا ہیں؟

یہ انسانی حاکمیت کے خلاف ایک انقلابی نعرہ ہے۔ اس انسانی حاکمیت کی کوئی صورت ہو، کوئی سی ہیئت ہو اس کا جو بھی نظام ہو اور جو بھی طریقہ ہو، اللہ کی ربوبیت کے یہ معنے ہیں زمین کے ہر ایک گوشہ میں انسانی حاکمیت کو چیلنج کر دینے کے جس صورت میں کہ یہ موجود ہو۔ یا یوں کہئے کہ اللہ کی ربوبیت کے معنے ہیں کہ انسان کی خدائی کو چیلنج کیا جائے جس صورت میں کہ یہ موجود ہو، اور اس کا سبب یہ ہے کہ جس حکم کا سرچشمہ انسان کی اپنی رضا ہو اور جس حکم میں اقتدار اعلیٰ انسان ہی کو تسلیم کیا گیا ہو، اس کے معنے یہ ہیں کہ اس حکم میں انسان کو الہ بنا لیا گیا ہے، بعض نے بعض کو اللہ کے مقابلہ میں رب ٹھہرا لیا۔

تو اس صورت میں اللہ کی ربوبیت کے اعلان کے معنے یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے غصب کردہ اقتدار اعلیٰ کو ان کے ہاتھوں سے چھین کر اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دینا اور ان غاصبوں کو اقتدار اعلیٰ کے اس منصب سے اتار دینا، یہ غاصب جو لوگوں کو اپنے بنائے ہوئے قانون کا پابند بناتے ہیں خود ان کے سامنے رب بن کر بیٹھتے ہیں اور انہیں غلاموں کا درجہ دیتے ہیں۔

اس کا مطلب ہے :۔ ”بشری حاکمیت کے مقابلہ میں حکومت الٰہیہ کا قیام“ قرآن مجید کے اپنے الفاظ میں اس کی تعبیر یہ ہے: هُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ”اللہ کی حاکمیت جس طرح آسمانوں پر ہے اسی طرح زمین پر بھی ہے۔

اَنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ - اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ ..... ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (یوسف ۔ ۴) "خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے۔ اس نے ارشاد فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی غلامی نہ کرو..... یہی ہے دین مستقیم۔

قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ - فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (۳ : ٦٤) "کہہ دو اے اہل کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے اس کی طرف آؤ وہ یہ کہ خدا کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے۔ اگر یہ لوگ نہ مانیں تو تم کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔"

زمین پر حکومت الہیہ کے قیام کی یہ صورت نہیں ہے کہ اقتدار اعلیٰ کے اونچے مقام پر کسی مذہبی طبقہ کو فائز کر دیا جائے۔ جس طرح کلیسا کے اقتدار کے دور میں ہوا۔ اسی طرح حکومت الہیہ کے قیام کی یہ شکل بھی نہیں ہے کہ تھیاکریسی کے نام سے مذہبی طبقہ کو اللہ بنالیا جائے۔ اس کی تو ایک ہی صورت ہے کہ اللہ کی شریعت کا نفاذ عمل میں لایا جائے اور حاکمیت کے معاملہ کو اللہ کی طرف لوٹا دیا جائے اور اسی کے حکم کے مطابق فیصلے کئے جائیں جس طرح کہ اس نے اپنی نازل کردہ شریعت میں بیان فرما دیا ہے۔

## اسلامی نظام کے قیام کا صحیح طریق کار

اسلامی نظام حکومت کا قیام اور انسانی نظام مملکت کا خاتمہ' انسانی ہاتھوں سے اقتدار اعلیٰ (Soverignity) کا لینا اور اسے دوبارہ اللہ کی ذات کے لئے مخصوص کر دینا' انسانی قوانین کی تنسیخ اور شریعت اسلامی کا قیام اور اس قسم کے تمام دوسرے انقلابی کام 'محض وعظ و تقریر اور تبلیغ و بیان سے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو لوگ عوام الناس کی گردنوں پر سوار ہیں اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کو اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے' وہ اس کے لئے ہرگز تیار نہیں ہو سکتے کہ محض وعظ اور نصیحت سے' اپنی اس برتری سے دست بردار ہو جائیں۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو انبیاء علیہم السلام بسہولت لوگوں سے ایک خدا کی الوہیت کا اقرار کرا لیتے۔ انبیاء علیہم السلام کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یہ کام کس قدر کٹھن تھا' نیز اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت بھی اس پر گواہ ہے کہ یہ کام کس قدر کٹھن تھا' نیز اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت بھی اس پر گواہ ہے کہ اسلامی نظام حیات کے قیام کا کام محض وعظ اور تبلیغ سے ممکن نہیں رہا ہے۔

زمین پر انسان کی آزادی کا یہ اعلان عام --- (دین حق) --- کہ کوئی انسان اپنے جیسے دوسرے انسان کا بندہ نہیں' اللہ وحدہ لاشریک ہی سب کا الہ اور معبود ہے۔ وہی تمام جہانوں کا رب ہے' نہ یہ فلسفیانہ تخیل تھا اور نہ منفی قسم کے منتشر خیالات تھے بلکہ یہ تحریک کی شکل میں ایک ایجابی نظریہ تھا۔ یہ ایک ایسا اعلان تھا جس کے لئے چاہا گیا تھا کہ اس کی پشت پر ایک نظم حکومت ہونا چاہئے جو لوگوں سے اللہ تعالیٰ کی شریعت کی تعمیل کرائے اور انہیں اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کر دے۔ چنانچہ یہ ضروری تھا کہ بیان اور تبلیغ کے ساتھ ساتھ تحریک

کی شکل بھی اختیار کر لی جائے تاکہ انسانی سوسائٹی میں ہر جہتی تبدیلی کے لئے تمام ممکنہ وسائل سے کام لینے میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔

دعوت اسلامی کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ آج اور کل انسانی سوسائٹی کی واقعی حالت دین حق کے خلاف رہی ہے اور آئندہ بھی ایسی ہی رہے گی۔ جاہلی سوسائٹی نے اپنے پورے وسائل سے کام لے کر بے پناہ رکاوٹیں اسلامی نظام حیات کے قیام کی کوششوں کی راہ میں لاکر کھڑی کر دی ہیں 'کیونکہ اسلام انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دینے کا اعلان عام کرتا ہے۔ اس طرح جن جاہلی معاشروں کے مفاد پر زد پڑتی ہے وہ اپنے تمام اعتقادی 'تصوراتی' مادی 'سیاسی' معاشرتی' معاشی 'قومی اور طبقاتی وسائل کو لے کر میدان میں اتر آتے ہیں۔ یہ تمام وسائل جب مجتمع ہو جاتے ہیں تو دین حق کے مقابلہ میں ان کی شدت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور اس طرح دین حق کو ان شدید رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس سورت کے پیش نظر ایک طرف تو تحریک اسلامی کو غلط تصورات اور باطل عقائد کو ختم کرنے کے لئے وعظ و تبلیغ سے کام لینا پڑتا ہے اور دوسری طرف ان تمام مادی رکاوٹوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تنظیم اور جتھہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان مادی رکاوٹوں میں سرفہرست جاہلی نظام زندگی اور اس میں قائم شدہ جاہلی سیاسی نظام ہوتا ہے اور یہ نظام اس دور کی موجودہ اعتقادی 'فکری' قومی' اقتصادی اور اجتماعی حالت پر نہایت پیچیدگی اور باہمی گہرے ربط سے قائم ہوتا ہے۔ اس طرح وعظ و تلقین کی تحریک اور اجتماعی تنظیم دونوں مل کر اس موجود اجتماعی نظام کے خلاف صف آرا ہوتی ہیں اور اپنے پورے وسائل کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتی ہیں۔ لہٰذا انسانی آزادی اور پورے کرۂ ارض پر تمام انسانوں کی آزادی کے لئے تبلیغ و بیان اور تنظیم و تحریک دونوں کی اشد ضرورت ہے۔ یہ نکتہ اس قدر اہم ہے کہ اسے بار بار واضح کرنے کی ضرورت ہے۔

---()()()---

## ایک عالمی نظام حیات (۱)

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اسلامی نظام حیات صرف اس لئے نہیں آیا تھا کہ وہ صرف اہل عرب کو آزادی کی نعمت سے نوازے بلکہ یہ نظام حیات پوری انسانیت کے لئے ہے' اس کا میدان کار پورا کرۂ ارض ہے' پورے کا

(۱) سید قطب شہید نے 'اپنے مدعا کی وضاحت بڑے بسط سے کر دی ہے' دراصل عرب ممالک کی نسبت ہند و پاک میں اسے سمجھنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ یہاں ایک عظیم تحریک کی تمام طاقتیں محض اس مفروضے پر ضائع ہو رہی ہیں کہ ایک ایک شخص کو تبلیغ و بیان کے زور سے درست کر دو' تمام جہان درست ہو جائے گا' اور انقلاب خود بخود آ جائے گا۔ یہ ایک ایسا مفروضہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے بعد آج تک 'تحریک اسلامی کی اس طویل تاریخ میں 'عملاً ایسا نہیں ہوا' بلکہ وہی کچھ ہوتا رہا ہے جس کی وضاحت سید قطب صاحب کر رہے ہیں۔ (مترجم)

پورا۔ اس نظام زندگی کی رو سے اللہ تعالیٰ صرف عربوں کا اللہ ہی نہیں ہے' کہ وہی اسلامی نظام زندگی قبول کریں بلکہ وہ رب العالمین ہے اور اسلامی نظام زندگی کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ عالمین کو ان کے رب اور خالق تک پہنچائے اور انہیں غیراللہ کی بندگی سے چھڑا کر صرف ایک خدا کی بندگی میں داخل کر دے۔ اسلامی نظریہ حیات کی رو سے بندگی اور اطاعت کا اعلیٰ مقام قوانین اسلام اور شریعت کی اطاعت میں ہے اور یہی وہ اطاعت ہے جسے اللہ جل شانہ صرف اپنی ذات کے لئے خاص کرنا چاہتے ہیں اور اللہ کی شریعت اور قانون کے سوا' کوئی اگر کسی اور کی اطاعت کرتا ہے تو وہ اللہ کی غلامی سے خارج ہو جاتا ہے۔

زبانی طور پر خواہ وہ کچھ بھی دعویٰ کرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی تصریح فرما دی ہے کہ شریعت اور قانون کی اطاعت ہی دراصل بندگی ہے۔ غیراسلامی قانون کی اطاعت ہی کی وجہ سے یہود و نصاریٰ مشرک قرار پائے تھے' اسی وجہ سے قرآن کریم نے انہیں دعوت دی کہ وہ اللہ کے سوا تمام دوسرے ارباب کی غلامی ترک کر دیں۔

امام ترمذی نے اپنی سند سے حضرت عدی بن حاتم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب آپ کو دعوت اسلامی کے آغاز کا علم ہوا تو وہ شام کی طرف نکل کھڑے ہوئے' یہ جاہلیت کے زمانہ میں عیسائی ہو گئے تھے' ایک غزوہ میں آپ کی بہن اور قبیلے کے دوسرے لوگ گرفتار ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے ساتھ نہایت ہی اچھا سلوک کیا اور ان کی بہن کو گراں قدر عطیہ بھی دیا۔ بہن رہا ہو کر عدی سے ملی اور انہیں ترغیب دی کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ لوگوں کو معلوم ہوا کہ عدی' حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں' جب یہ مدینہ پہنچے تو ان کی گردن میں چاندی کی صلیب لٹک رہی تھی اور حضورؐ اس آیت کی تلاوت فرما رہے تھے اتَّخَذُوْا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ "ان لوگوں نے اپنے اللہ کو چھوڑ کر عالموں اور درویشوں کو رب بنا رکھا ہے۔"

حضرت عدی نے یہ عرض کی کہ یہود و نصاریٰ تو احبار و رھبان کی عبادت نہیں کرتے' آپ نے فرمایا کہ احبار و رھبان ان کے لئے حرام کو حلال ٹھہراتے رہے اور حلال کو حرام کرتے رہے اور وہ ان کی پیروی کرتے رہے۔ یہی تو دراصل احبار اور رھبان کی "عبادت" کرنا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی یہ جو تفسیر بیان فرمائی ہے' یہ اس امر میں نص قطعی ہے کہ آئین و قانون میں ماسوی اللہ کی اطاعت وہ عبادت ہے جس کے ارتکاب کے بعد آدمی کا مقام دین کے اندر نہیں رہتا اور یہ اطاعت اور یہ عبادت ایک اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا رب بنانا ہے' ماسوی اللہ کی یہی بندگی ہی تو ہے جس کے بندھنوں سے انسان کو آزاد کرانے کے لئے یہ دین آیا ہے تاکہ وہ یہ اعلان کر دے کہ پورے کرۂ ارض پر انسان ماسوی اللہ کی بندگی سے آزاد ہے۔

ماسوی اللہ کی بندگی سے آزادی کے اس اعلان کے سلسلہ میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ جاہلیت کے مقابلہ میں ایک طرف تقریر و تحریر کے ذریعہ دعوت دی جائے اور دوسری طرف عملاً ایک تحریک برپا کی جائے اور ان سیاسی طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے جو لوگوں کو اپنا غلام بنائے ہوئے ہیں۔ اللہ کے قانون کو چھوڑ کر اپنے بنائے ہوئے قانون و دستور کی ان سے پیروی کراتے ہیں۔ لوگوں کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں اور انہیں آزاد ارادہ سے عقیدہ و مسلک اختیار کرنے نہیں دیتے اور اپنی قوت اقتدار سے ان کی آزادی رائے کے حق کو سلب کئے ہوئے ہیں' اس تحریک کا

برپا رہنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس کے نتیجہ میں اسلام کا اجتماعی' سیاسی اور اقتصادی نظام قائم ہو گا جو باطل کے غیر نمائندہ اقتدار --- یہ محض سیاسی اقتدار ہو یا قومی اقتدار یا ایک ہی قومیت کے دائرے میں طبقاتی اقتدار ہو' کسی نوعیت کا ہو یہ اقتدار ظلم کے استیصال کے بعد انسانی آزادی کی اس تحریک کو زندہ اور برپا رکھنے کا ضامن ہو گا۔

## مذہبی آزادی اور اقتدار اعلیٰ

اس بات میں شک نہیں ہے کہ اسلام کسی ایک فرد کو بھی بہ جبر دائرہ اسلام میں داخل کرنا نہیں چاہتا' لیکن جیسا کہ اس سے قبل ہم لکھ آئے ہیں' اسلام اس بات کا اعلان عام کرتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر کسی انسان کو دوسرے انسان کی غلامی میں رکھے جانے کی اجازت نہ ہوگی اس لئے دین حق سب سے پہلے ہم سے یہ اقدام کراتا ہے کہ ہم زمین پر سے ان تمام تنظیمات اور حکومتوں کے اقتدار کو ہٹانے کی کوشش کریں جن کی بنیاد انسانی حاکمیت پر ہے اور جن میں ایک انسان اپنے جیسے انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت کرتا ہے۔ اس طرح دراصل اسلام بنی آدم کے لئے آزادی اور حریت کی ایسی فضا قائم کرتا ہے جس میں وہ ہر قسم کی سیاسی گرفت سے آزاد ہو کر اپنے آزاد ارادہ سے جو چاہیں عقیدہ اختیار کریں۔ اس سلسلے میں' اسلام صرف یہ کام کرتا ہے کہ وہ تحریر و تقریر کے ذریعہ لوگوں کے سامنے اسلامی نظریہ حیات کی وضاحت کر دیتا ہے (اور وہ جبراً لوگوں پر اپنا نظریہ نہیں ٹھونستا)' لیکن آزادی کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ لوگ اپنی خواہشات ہی کو اپنا الٰہ بنالیں گے اور اپنے آزاد ارادہ سے یہ فیصلہ کرلیں کہ وہ اپنے جیسے دوسرے بندوں کے غلام بن کر رہیں گے یا اللہ کو چھوڑ کر ان میں سے بعض کو اپنا رب بنالیں' اسلام ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتا' اس کی پالیسی یہ ہے کہ روئے زمین پر اقتدار اعلیٰ بہرحال اللہ کے لئے مخصوص ہونا چاہئے۔ (دوسرے الفاظ میں اسلام کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ ملکی قانون اور سیاسی نظام بہرحال بندگی رب پر مبنی ہونا چاہئے۔ اس کے بعد کوئی شخص' جو بھی مذہبی عقیدہ رکھنا چاہے رکھ سکتا ہے۔ اسلام اپنے دائرہ اقتدار میں زمام کار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں دینے کا قائل نہیں ہے جو اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ یہ معقول بات ہے اور کوئی بھی نظریاتی ریاست اس کے بغیر دو دن بھی نہیں چل سکتی۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس میں دین مکمل طور پر اللہ کے لئے خالص ہو سکتا ہے یعنی اطاعت۔ خود سپردگی اور پیروی اور بندگی صرف اللہ کے لئے ہو۔ اسلامی نظریہ حیات میں دین کا مفہوم مذہب کے مقابلہ میں وسیع تر ہے۔ درحقیقت وہ طریق زندگی کا نام ہے' جو پوری زندگی کو بالفعل کنٹرول کرتا ہے۔ اسلام میں دین کی بنیاد عقیدہ ہی پر رکھی گئی ہے تاہم دین عقیدہ کے مقابلہ میں عام اور وسیع تر ہے۔ مثلاً اسلامی نظام حیات کے دائرہ اقتدار میں ایسے لوگ بھی رہ سکتے ہیں جو اسلامی عقائد پر سرے سے ایمان ہی نہ لائے ہوں اور صرف سیاسی لحاظ سے وہ اس کے مطیع ہوں۔ (آخر ذمی' اسلامی ریاست کے پرامن شہری ہوتے ہیں اور ملکی قانون ان پر ویسا ہی لاگو ہوتا ہے جیسا مسلمانوں پر۔)

جو لوگ اس دین کو اپنے اسی مفہوم کے اعتبار سے اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں ان کے لئے اس بات کا سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ اسلامی نظام حیات کے قیام کے لئے صرف وعظ و ارشاد اور بیان و تبلیغ ہی کافی نہیں' اس کے لئے عملی جدوجہد اور جہاد بالسیف کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ پھر یہ لوگ بسہولت سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام کے نظریہ جہاد کا بھی وہ محدود مفہوم نہیں ہے جو "دفاعی جنگ" کا ہے' آج کل بعض مسلمان مستشرقین کے پرفریب پروپیگنڈے کے سامنے ہتھیار ڈال کر

ذہنی طور پر شکست کھا چکے ہیں اور اسلامی جہاد کو ''دفاعی جنگ'' قرار دیتے ہیں' ٹھیک ہے اسے دفاع ہی کے نام سے پکاریں لیکن یہ روئے زمین پر پھیلی ہوئی سسکتی ہوئی انسانیت کا دفاع ہے' اس اعتبار سے یہ انسانی حریت کے لئے ایک اقدامی جدوجہد ہے' تقریر و تحریر کے میدان میں بھی اور سیف و سنان کے ساتھ بھی۔ سوسائٹی کی واقعی صورت حال کو سامنے رکھ کر یہ ایک اقدام ہے' مرحلہ بمرحلہ اور پھر ہر مرحلہ میں تو بہ تو ذرائع اور وسائل کے ساتھ' اس طرح اسلامی جہاد دراصل ایک ''اقدامی تحریک'' ہے۔

## حریت انسانی کا دفاع

اگر یہ ضروری بھی ہو' کہ ہم اسلام کے نظریہ جہاد کی تعبیر دفاعی جنگ سے کریں' تو پھر ہمیں دفاع کا مفہوم ہی بدل دینا ہو گا۔ پھر دفاع کا مفہوم یہ ہو گا کہ اسلام پوری انسانیت کی حریت اور آزادی اور دفاع کے لئے' ان تمام عناصر کے مقابلے میں آتا ہے' جو انسانیت کی آزادی اور حریت فکر پر قدغن لگاتے ہیں۔ یہ عوامل خواہ کسی عقیدے کی شکل میں ہوں' یا کسی سیاسی نظام کی شکل میں ہوں' ان کی بنیاد معاشی امتیاز پر ہو' طبقاتی تقسیم پر ہو یا نسلی امتیاز پر ہو' عوامل کل بھی موجود اور غالب تھے اور آج بھی مختلف شکلوں میں دنیا کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں اور ایک غالب نظام کی حیثیت سے موجود ہیں۔

لفظ دفاع کے لئے اس مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے ہی' ہم اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ کن اسباب کی بناء پر اسلام' اس کرۂ ارض پر جہاد بالسیف کے ذریعہ متحرک رہا اور آگے بڑھتا گیا۔ اس سے ہمیں اسلام کے مزاج کا بھی پتہ چلتا ہے۔ دراصل اسلام حریت انسانی کا اعلان عام ہے اور اس کا مقصد اول ہی یہ ہے کہ ماسوی اللہ کی غلامی کے تمام آثار کو پورے کرۂ ارض پر سے نیست و نابود کر دیا جائے' اس کی جگہ صرف ایک خدا کی غلامی اور الوہیت قائم کی جائے اور اللہ کی اس زمین پر انسانی خواہشات کے بجائے صرف شریعت الٰہی کی حکمرانی ہو۔

بعض لوگ اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ اسلام کے نظریہ جہاد کو (آج کے مفہوم میں) دفاعی جنگ تک محدود کر دیں۔ یہ لوگ اسلامی تاریخ اور ذخیرۂ احادیث سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی روایات نکال لاتے ہیں' جن سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام کے دور اول میں جتنی بھی جنگیں ہوئی ہیں' وہ اس لئے ہوئیں کہ اسلامی ریاست کو ہمسایہ ممالک سے خطرہ لاحق تھا۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ بعض کے نزدیک اسلامی ریاست صرف عرب تک محدود ہے۔ دراصل یہ لوگ اس دین کے مزاج اور طبیعت ہی سے بے خبر ہیں نہ ہی یہ اس دور سے کوئی واقفیت رکھتے ہیں جس میں کہ اسلام اس لئے آیا ہے کہ وہ روئے زمین کا نظام بن کر رہے گا جس طرح کہ ان کی اس سعی نامشکور سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آج کی جاہلی سوسائٹی کی گرفت اور مستشرقین کے پروپیگنڈے کی وجہ سے شکست خوردگی میں مبتلا ہو گئے ہیں

## دفاعی جنگ 'تبلیغی انقلاب اور تاریخی حقائق

تمہارا کیا خیال ہے؟ اگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو روم اور فارس سے خطرہ درپیش نہ ہوتا تو کیا وہ زمین کی

آخری حدوں تک اسلام کے پہنچانے اور پھیلانے سے رک جاتے۔ ان کے لئے یہ کوئی آسان کام نہیں تھا کہ وہ اس دعوت کو پھیلا سکتے کیونکہ دعوت حق کے راستہ میں ہر طرح کی مادی رکاوٹیں کھڑی تھیں' منظم حکومتیں اور سوسائٹی کی نسلی' طبقاتی اور معاشی تنظیمات سدراہ تھیں اور انہیں مادی تفوق حاصل تھا اور حکومت ان کی پشت پناہی کرتی تھی۔ ان حالات میں یہ ممکن نہ تھا کہ یہ حضرات طاقت استعمال کئے بغیر دعوت اسلامی کو دوسروں تک پہنچا سکتے اور دین حق بغیر کسی روک ٹوک کے پھیلتا چلا جاتا ہے۔(۱)

یہ خیال محض بچگانہ خام خیالی ہے کہ کوئی تحریک یہ نصب العین لے کر اٹھے کہ وہ پورے کرۂ ارض پر تمام انسانوں کو دوسرے انسانوں کی غلامی سے نجات دلا کر رہے گی اور پھر اس کے سامنے بڑے بڑے نظاموں اور حکومتوں کی صورت میں رکاوٹیں بھی موجود ہیں اور ان باطل قوتوں سے اس کا ٹکراؤ نہ ہو اور یہ کام وہ محض وعظ و ارشاد ہی سے کرتی چلی جائے۔ یہ کام اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ تحریک اسلامی اور لوگوں تک اسلامی نظریہ حیات پہنچانے کے راستے میں کوئی مادی یا سیاسی رکاوٹ نہ ہو اور لوگ اس پوزیشن میں ہوں کہ وہ اس دعوت کے رد و قبول میں آزادانہ فیصلہ کر سکتے ہوں۔ ایسے حالات میں بے شک لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کا اصول چلتا ہے' لیکن اگر مادی' سیاسی اور معاشی قوتیں سدراہ ہو رہی ہوں تو پہلے طاقت استعمال کر کے ان کو دور کرنا ضروری ہے۔

جس تحریک کا بھی یہ مقصد ہو کہ اسے پورے کرۂ ارض پر سے تمام انسانوں کو انسانی غلامی سے نجات دلانا ہے' اس کے لئے جہاد ضروری ہو جاتا ہے' کیونکہ ہر معاشرہ میں ہمیشہ ایسی تحریک کو چیلنج کیا جاتا ہے' بشرطیکہ آزادی انسانیت کی یہ دعوت محض فلسفیانہ وعظ و تبلیغ ہی نہ ہو' جہاد ہر حال میں ضروری ہے خواہ دارالاسلام کے پڑوسی ملک میں حالات پرامن ہوں یا پرامن نہ ہوں' کیونکہ اسلام ایسے امن کا قائل نہیں جو صرف دارالاسلام تک محدود ہو' بلکہ ایسا امن چاہتا ہے جس میں صرف اللہ کا حکم چلتا ہو اور لوگ صرف ایک خدا کی بندگی کر رہے ہوں۔ ان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ ہو' جو خود خدا بن گیا ہو۔ اس معاملے میں ہمارے لئے معیار وہ آخری مرحلہ ہے جس تک اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق تحریک اسلامی پہنچی ہو۔ اس مرحلہ کی تفصیل امام ابن القیم جوزی کے بیان کے مطابق یہ ہے :-

"سورۂ توبہ کے نزول کے بعد کفار کے ساتھ آپ کا تعلق صرف تین قسم کا رہ گیا تھا۔ محارب' اہل عہد اور اہل ذمہ۔ اس کے بعد اہل عہد اور اہل صلح اسلام میں داخل ہو گئے۔ لہٰذا اب ان تعلقات کی صرف دو قسمیں رہ گئیں۔ محارب اور اہل ذمہ۔ محاربین کی حالت یہ تھی کہ وہ ہر وقت آپ سے ڈرتے رہتے تھے۔ اس طرح پوری انسانیت کے ساتھ آپ کے تعلقات صرف تین قسم کے رہ گئے۔ اہل ایمان' اہل صلح یعنی ذمی اور محارب یعنی بر سرپیکار ڈرنے والے۔"

تعلقات کی یہی قسمیں ایسی ہیں جو دین اسلام کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو زمانہ حاضرہ کے حالات کے سامنے ہتھیار ڈال چکے ہیں اور مستشرقین کے پرفریب پروپیگنڈے کا شکار ہیں اور دور از کار تاویلات کرتے

(۱) اسلام کے نظریہ جہاد کے لئے دیکھئے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب الجہاد فی الاسلام۔ سید مودودی نے پہلی مرتبہ اسلام کے نظریہ جہاد کو صحیح اور مثبت انداز میں پیش کیا ہے اور انہوں نے اس انداز کار د کیا جس کی شکایت سید قطب کر رہے ہیں۔ (مترجم)

ہیں تو وہ اس دین کے مزاج اور اس کے مقاصد کے خلاف جا رہے ہیں۔

## جہاد کے مراحل

اللہ تعالیٰ نے مکہ میں مسلمانوں کو قتال اور مسلح جھڑپوں سے روکا اور مدینہ میں بھی ابتداءً یہی حکم رہا۔ فرمایا گیا۔

كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ "ہاتھ روک لو' نماز قائم کرو اور زکوۃ دو۔"
اس کے بعد مسلمانوں کو قتال اجازت دی گئی :

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ (۳۹) الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ - وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۴۰) اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲: ۳۹ تا ۴۱) "اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے' کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔" "اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے' صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے" اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں' جس میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے' سب مسمار کر ڈالی جائیں۔ اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے' اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے' زکوۃ دیں گے' معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم سے جو لوگ لڑتے ہیں صرف انہی سے لڑو

وَقَاتِلُوْا الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ "ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں" اور اس کے بعد تمام مشرکین کے خلاف لڑنے کا حکم دیا گیا۔

وَقَاتِلُوْا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً "اور تمام مشرکین سے لڑو جیسا کہ تمام مشرکین تم سے لڑتے ہیں۔" --- چنانچہ اس سلسلے میں اصولی حکم ان الفاظ میں دیا جاتا ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ (۹ : ۲۹) ''جو لوگ اہل کتاب میں سے خدا پر ایمان نہیں لاتے اور نہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو خدا اور رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں' ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں ۔''

لہذا ابن قیم رحمہ اللہ کے قول کے مطابق' جہاد و قتال کے مراحل یہ تھے ۔''حرام' پھر اجازت' پھر ان لوگوں سے لڑنے کا حکم جو لڑنے کا آغاز کریں' یا پھر آخری مرحلے میں تمام مشرکین سے قتال کا حکم ۔''

تمام قرآنی آیات جو اس بارے میں وارد ہیں اور وہ تمام احادیث نبوی جن میں جہاد کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے اور وہ تمام واقعات جہاد جو تاریخ اسلامی کے اس طویل عرصے میں وقوع پذیر ہوتے رہے ہیں ۔سب کے سب اس بات کے شاہد ہیں کہ اسلام کے نظریہ جہاد کا وہ محدود مفہوم نہیں لیا جا سکتا جو شکست خوردہ ذہنیت رکھنے والے یہ حضرات پیش کرتے ہیں ۔ درحقیقت یہ حضرات مستشرقین کے زہریلے پروپیگنڈے کا شکار ہو چکے ہیں ورنہ کوئی ذی ہوش ایسا نہ ہو گا جو قرآن کریم کی ان آیتوں اور اقوال رسول کے اس ذخیرے کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد اور جہاد اسلامی کی تاریخ کے سامنے رکھتے ہوئے یہ خیال بھی کر سکتا ہو کہ یہ محض ایک عارضی واقعہ تھا' جو مخصوص حالات میں پیش آیا اور اب تو صرف دفاعی جنگ ہی لڑی جا سکتی ہے ۔

جب پہلے پہل مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی اجازت ملی تو اسی وقت اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر یہ بیان کر دیا کہ اس دنیا کی زندگی کا فطری تقاضا اور تکوینی فلسفہ ہی یہ ہے کہ بعض لوگ بعض دوسروں کے بالمقابل سینہ سپر ہوں اور اس طرح طاقت کا توازن قائم رہ کر دنیا سے فساد ختم ہو چنانچہ آیت اذن قتال کے بعد فرمایا جاتا ہے ۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ (۳۹) الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ - وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ----- (۲۲ : ۴۰) ''جن مسلمانوں کے خلاف لڑائی ہوئی ہے ان کو اجازت ہے کہ وہ بھی لڑیں کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے ۔یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے ۔ الا یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار خدا ہے اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو صومعے اور گرجے اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں خدا کا بہت ذکر کیا جاتا ہے 'گرائی جا چکی ہوتیں ۔

اسلامی نظریہ جہاد اور قتال ایک دائمی حالت ہے 'محض عارضی حالت نہیں ہے ' اس لئے اسلامی نظام زندگی اور

باطل نظاموں کے درمیان مصالحت ہرگز نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہ اس زمین پر باہم مل کر اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ جب بھی اسلام یہ مقصد لے کر اٹھا کہ زمین پر اللہ کی ربوبیت اور خدائی قائم ہو اور انسان کو انسانی غلامی سے چھڑا کر صرف اللہ وحدہ کی غلامی میں داخل کیا جائے' تو اس پر ان طاقتوں نے فی الفور حملہ کیا ہے' جنہوں نے خداوند قدوس کے حق خدائی کو غصب کر رکھا ہوتا تھا۔ ان طاقتوں نے کبھی بھی اسلام کو برداشت نہیں کیا اور اسلام بھی ہمیشہ ان طاقتوں پر حملہ آور ہوتا رہا ہے اور انہیں ختم کر کے' ان کے از خود قائم کردہ اقتدار کو ختم کر کے' انسانوں کو اس کی غلامی سے نجات دیتا رہا ہے اور یہ حالت اس وقت تک قائم رہی جب تک اسلام پورے کرۂ ارض پر غالب اور برتر طاقت نہیں بن گیا اور و يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ کا مقصد پورا نہیں ہو گیا۔

مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کو جہاد و قتال سے روکنا درحقیقت ایک طویل منصوبے کا ایک مختصر مرحلہ تھا' اسی طرح ہجرت کے بعد ابتدائی دور میں جہاد سے روکنا بھی ایک خاص مقصد کے لئے تھا' اور جہاد کا آغاز بھی صرف اس لئے نہ تھا کہ مدینہ طیبہ کو کوئی فوری خطرہ درپیش تھا اور اس کا دفعیہ ضروری تھا' اگرچہ یہ بھی ابتدائی اور ضروری مقصد تھا لیکن محض مدینہ کا بچاؤ ہی آخری اور بڑا مقصد نہ تھا بلکہ تحریک جہاد کے آغاز کے لئے ایک وسیلہ تھا کیونکہ تحریک کے مرکز کو مامون اور محفوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے جہاں سے تحریک کا آغاز کئی دوسرے مقامات پر بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کی راہ سے تمام رکاوٹیں دور کی جا سکتی ہیں۔

نیز مکہ مکرمہ میں جہاد و قتال سے اس لئے بھی روکا گیا تھا کہ وہاں مسلمانوں کو دعوت اسلامی اور تبلیغ و تلقین کی آزادی بہرحال حاصل تھی' حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنی ہاشم کی قوت کے بل بوتے پر کھلے بندوں اپنی دعوت پیش کرتے تھے' آپ کی دعوت لوگوں کے کانوں تک بڑی آزادی سے پہنچ رہی تھی اور ان کے دل و دماغ کو متاثر کر رہی تھی۔ آپ اس معاشرے کے ایک ایک فرد کو دعوت دیتے تھے اور وہاں کوئی ایسی منظم سیاسی قوت موجود نہ تھی جو آپ کو اپنے افکار کی نشرو اشاعت سے روک سکتی' یا وہ لوگوں کو اس بات سے منع کر سکتی کہ وہ آپ کے ارشادات نہ سنیں۔ اس لئے ایسے حالات میں قوت کے استعمال کی ضرورت بھی نہ تھی' نیز مکی دور میں قتال سے روکنے کے کچھ اور اسباب بھی تھے' جو اس وقت موجود تھے ان کا خلاصہ میں نے' اپنی تفسیر فی ظلال القرآن میں' سورۂ نساء کی آیت کف قتال (۴ : ۷۷) کے ضمن میں بیان کیا ہے' اور ان میں سے بعض اسباب یہ ہیں۔

(ا) وہ مکی دور میں قتال پر پابندی اس لئے بھی لگائی گئی کہ یہ دور دراصل ٹریننگ کا دور تھا۔ مخصوص حالات' ایک خاص قوم' ایک منفرد معاشرے کے درمیان یہ حکم دیا گیا' ایسے معاشرہ میں جو اپنے وقت میں بالفعل قائم تھا' ایک عرب انسان کو اس بات پر آمادہ کرنا مطلوب تھا کہ وہ ناموافق اور ناپسندیدہ صورت حال دیکھ کر اس پر صبر کرے' جب کہ عام طور پر صورت حال یہ تھی' ایسے عربوں کو یا ان کے متعلقین کو ایسے حالات پیش آتے تو وہ صبر نہ کرتے تھے' یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ ان لوگوں کے دل و دماغ سے شخصیت اور انفرادیت کے بت کو نکالا جائے اور ان کی زندگی کا محور اور محرک محض ان کی ذات یا شخصیت نہ ہو' نیز وہ اپنے اعصاب پر کنٹرول کرنا سیکھیں اور پہلی ناخوشگواری ہی انہیں آپے سے باہر نہ کر دے اور ان کی طبیعت میں اعتدال پیدا ہو جائے۔ کیونکہ عربوں کی حالت یہ تھی کہ وہ بات بات پر مشتعل ہو جاتے تھے اور اسلام یہ چاہتا تھا کہ ایک مسلم کی ہر حرکت معتدل ہو۔ اس کی ایسی تربیت ہو جائے کہ

وہ ایک ایسے منظم معاشرے کے تقاضے پورے کرنے کا عادی ہو جائے' جس کی ایک مستقل قیادت ہو۔ زندگی کے تمام امور میں وہی قیادت اس کا مرجع ہو' صرف اسی قیادت کے اوامر کے مطابق وہ عمل پیرا ہو' اور اس کے اندر اطاعت کا جذبہ اس قدر پختہ ہو کہ اگر قیادت کے احکامات اس کی عادات اور طرز زندگی کے خلاف بھی ہوں تو بھی وہ اطاعت کرے۔ یہ وہ مقصد تھا جو ایک عربی شخصیت کی تربیت کے لئے اشد ضروری تھا' جس سے آئندہ جا کر ایک مسلم معاشرہ کی تعمیر مطلوب تھی اور جسے ایک بااختیار قیادت کے زیر نگیں ہونا تھا اور جسے ایک ترقی پذیر' مہذب اور قبائلی طوائف الملوکی سے پاک معاشرہ کی صورت میں منظم ہونا تھا۔

۲۔ نیز مکی زندگی میں جہاد کی عدم مشروعیت کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قریش جیسے نخوت پسند اور صاحب مرتبہ خاندان کے اندر پرامن دعوت ہی زیادہ موثر ہو سکتی تھی' اگر ایسے مرحلے میں قریش کے ساتھ جنگ چھیڑ دی جاتی تو تمام کی تمام قوت بے حد' بغض و عناد میں مبتلا ہو جاتی اور اس سے خانہ جنگی کا ایک غیر منقطع سلسلہ شروع ہو جاتا' جو اس سے پہلے جنگ "داحس و غبراء" اور جنگ "بسوس" کی صورت میں کئی سالوں تک ہوتا رہا تھا اور جس کی لپیٹ میں آکر' قبیلوں کے قبیلے فنا ہو گئے تھے۔ اس طرح یہ جدید خون خرابے بھی اس نئی تحریک کے حساب میں جمع ہو جاتے اور تحریک اسلامی ہونے کے بجائے یہ' جنگ و جدال کی ایک تحریک بن کر رہ جاتی اور اس کا مقصد اصلی نظروں ہی سے اوجھل ہو جاتا اور آئندہ کبھی اس کا نام نہ لیا جاتا۔

۳۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت یہ مناسب نہ تھا کہ تحریک اسلامی گھر گھر میں اختلافات اور فتنہ و فساد برپا کر دے' کیونکہ مکہ میں معروف معنوں میں کوئی منظم سلطنت موجود نہ تھی' جو مومنین پر سختیاں کر کے انہیں تکالیف پہنچاتی ہو' یہ کام اس وقت ہر خاندان اپنے طور پر کر رہا تھا' جس خاندان کا کوئی فرد مسلمان ہوتا' وہ اسے سزا دیتا اور اگر غلام ہوتا تو اس کا مالک اس کی تعذیب اور تادیب کا بندوبست کرتا' اور اگر ایسے حالات میں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی جاتی "تو ہر خاندان میں قتل و غارت اور جنگ و فساد شروع ہو جاتا اور مخالفین اسلام کو یہ موقع ملتا کہ وہ تحریک اسلامی پر یہ الزام لگائیں کہ یہ ہے تمہارا اسلام؟ جب کہ جنگ نہ کرنے اور مصائب و مشکلات پر صبر کرنے کے باوجود مخالفین نے اسلام پر یہ الزام لگایا کہ اس نے گھر گھر میں فساد ڈلوا دیا ہے' قریش حج کے موقع پر تاجروں' حاجیوں اور عام عربوں میں اس مضمون کا زبردست پروپیگنڈا کیا کرتے تھے کہ دیکھ لو' محمد نے باپ بیٹے' فرد اور خاندان اور قوم کے افراد کے درمیان فتنے کے بیج بو دیئے ہیں' ان سے بچنا' لیکن اگر ایسے حالات میں آپ بیٹے کو حکم دیتے کہ وہ اپنے باپ کو قتل کر دے' غلام کو حکم دیتے کہ وہ آقا کو ختم کر دے اور ایک فرد کو قوم و قبیلہ کے خلاف ابھارتے تو ان کے پروپیگنڈا کا کیا عالم ہوتا؟

۴۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو لوگ مکہ میں مسلمانوں کو بے حد و حساب تکالیف پہنچا رہے تھے' ان کی اکثریت بعد میں مسلمان ہو کر اسلام کا سپاہی بننے والی تھی اور اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم تھا کہ حضرت عمر اور خالد بن ولید جیسے لوگ ان میں موجود ہیں۔

۵۔ ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عربوں کا موروثی غرور اور نخوت انہیں ہمیشہ اس بات پر آمادہ رکھتی تھی کہ وہ مظلوم کی حمایت کریں' بالخصوص ایسا مظلوم جو انتقام نہ لے سکتا ہو اور جب کہ ظلم شرفاء پر ہو رہا ہو۔ تاریخ میں ہمیں کئی ایسے

واقعات ملتے ہیں جو ہماری اس رائے کی تائید کرتے ہیں۔ابن دغنہ نے حضرت ابوبکرؓ کو ہجرت کرنے سے روکا کیونکہ وہ ایک معزز آدمی تھے۔اس کا خیال تھا کہ ایسے شخص کی ہجرت تمام عربوں کے لئے باعث ننگ ہے۔اس لئے انہوں نے حضرت ابوبکر کو امان دی اور اپنی حمایت کا یقین دلایا۔اسی جذبے کے تحت شعب ابی طالب میں بنی ہاشم کے محاصرے کی دستاویز کو ختم کر دیا گیا۔کیونکہ بعض لوگوں کو یہ ناگوار ہوا کہ شرفاء بھوک اور مصائب میں مبتلا رہیں۔ عربوں کے برعکس دوسرے معاشروں میں صورت حال یہ رہی ہے کہ ایذا رسانی پر خاموش رہنا معاشرہ میں طنز و مزاح اور ذلت و احتقار کا باعث رہا ہے اور ظالم اور موذی کو عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا رہا ہے۔

۶۔ یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ مکہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی' پورا جزیرہ عرب ابھی دعوت سے روشناس نہ ہوا تھا'کہیں اگر دعوت پہنچی بھی تھی تو منتشر اور غیر مصدقہ اطلاعات کی شکل میں اور دوسری طرف عربوں کی حالت یہ تھی کہ وہ قریش اور اس کے مسلم افراد کی کشمکش میں غیر جانبدار ہو گئے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ اس کی کشمکش کا اونٹ کس کروٹ پر بیٹھتا ہے۔اس صورت حال میں اگر جنگ کی اجازت دے دی جاتی تو مسلمان اگر اپنے آپ سے دوگنی تعداد کو بھی قتل کر دیتے پھر بھی وہ شکست کھاتے اور کفر و شرک اپنی جگہ جمے رہتے۔مٹھی بھر جماعت کا ختم کرنا ان کے لئے نہایت ہی آسان کام تھا اور اس طرح کرۂ ارض پر اسلامی نظام زندگی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا اور نہ ہی اس کا کوئی واقعی وجود پایا جاتا' حالانکہ مطلوب یہ تھا کہ اسلام ایک منظم اور عملی شکل میں قائم ہو' تاکہ وہ لوگوں کے لئے ایک نمونہ ہو۔

## ایک سوال

اب صرف یہ سوال ہمارے سامنے رہ جاتا ہے کہ مدینہ کے ابتدائی ایام میں جہاد و قتال کا حکم کیوں نہ دیا گیا۔اس کا جواب یہ ہے کہ مدینہ آتے ہی حضورؐ نے یہود اور حوالی مدینہ کے مشرکین کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا' وہ انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ اولاً اس لئے کہ اس معاہدے کی رو سے اس پورے علاقے میں مسلمانوں کو تحریک اور تبلیغ کے پورے مواقع حاصل ہو گئے تھے اور وہاں کی کوئی حکومت یا سیاسی طاقت ایسی نہ تھی جو اس کام کے لئے رکاوٹ بن رہی ہو۔اس معاہدے کے تمام شرکاء نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں چلنے والی اسلامی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا اور تمام سیاسی امور کے فیصلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آ گئے تھے' بیرونی طاقتوں سے 'کوئی شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر' کوئی تعلق قائم نہ کر سکتا تھا اور یہ بات مسلم تھی کہ اقتدار اعلیٰ دراصل مسلمانوں کے ہاتھوں میں آ چکا ہے۔دعوت کے سامنے میدان کار کھلا تھا اور تمام باشندوں کو یہ آزادی مل گئی تھی کہ وہ جو عقیدہ چاہیں اختیار کر لیں۔ ثانیاً یہ کہ اس مرحلے پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم صرف قریش کے مقابلے کے لئے یکسو ہونا چاہتے تھے۔یہ لوگ دراصل تحریک اسلامی اور پورے عالم عرب کے درمیان حائل ہو گئے تھے اور دعوت کے پھیلاؤ کی راہ میں سنگ گراں تھے۔صورت حال یہ تھی کہ عالم عرب کے تمام باشندے قریش اور فرزندان توحید کے درمیان برپا اس طویل کشمکش کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔یہی وجہ ہے کہ مدینہ آتے ہی حضورؐ نے حملہ آور دستے بھیجنے شروع کر دیئے اور ہجرت کے صرف سات ماہ بعد ہی پہلا علم حضرت حمزہ بن عبدالمطلب نے بلند کیا۔ اس کے بعد نویں مہینے' پھر تیرہویں مہینے' پھر

سولہویں مہینے اور بالآخر سترہویں مہینے کے بعد حضرت عبداللہ بن جحش کی فوج کشی ہوئی ۔ یہ پہلی فوج کشی تھی جس میں کفار کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی اور قتل و مقاتلہ کا آغاز ہوا۔ چونکہ یہ مقابلہ "حرام" مہینوں میں ہوا تھا اور کفار نے اس پر پروپیگنڈے کا ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا اس لئے اس کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں ۔

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ------ (۲:

۲۱۷) "اے محمد ؐ لوگ تم سے عزت والے مہینوں میں لڑائی کرنے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں ۔ کہہ دو کہ ان میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور خدا کی راہ سے روکنا اور اس کا کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور اہل مسجد کو اس میں سے نکال دینا خدا کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے اور فتنہ انگیزی خونریزی سے بھی بڑھ کر ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر مقدور رکھیں تو تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں ۔"

اس کے بعد اسی سال رمضان المبارک میں بدر الکبریٰ کی جنگ ہوئی جس کے بارے میں سورۂ انفال نازل ہوئی ۔

میرے اس نقطہ نظر کو اگر واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو محض دفاع اپنے محدود معنوں میں کبھی بھی تحریک اسلامی کا اساسی مقصد قرار نہیں پا سکتا ۔ یہ تو ان لوگوں کا معذرت خواہانہ انداز تاویل ہے جو موجودہ حالات کے سامنے سپر ڈال چکے ہیں اور مستشرقین کے مکروہ اور پرفریب پروپیگنڈے سے متاثر ہیں ۔

آج کل مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ان کے ہاتھ سے اقتدار جا چکا ہے' قوت و شوکت سے وہ محروم ہو گئے ہیں اور ان کی اکثریت ایسی ہو گئی ہے کہ جس کے ہاتھ سے رشتہ اسلام تک چھوٹ چکا ہے دوسری طرف سے باطل طاقتوں نے اپنے مکروہ پروپیگنڈے کا طوفان برپا کر رکھا ہے کہ اسلام طاقت کے زور سے پھیلا ہے ۔ ایسے حالات میں قدرتی طور پر بعض لوگ اس پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے ہیں اور وہ دور اول میں اسلام کے اس حیرت انگیز پھیلاؤ کے جواز کے لئے دفاعی اسباب و عوامل کا سہارا لیتے ہیں ۔ اس طرح وہ اسلام کے نظریہ جہاد کے لئے اخلاقی جواز تلاش کرتے ہیں' حالانکہ اسلام کے انقلابی عمل کو جائز ثابت کرنے کے لئے' ہمیں قرآنی نصوص کے علاوہ کسی اور اخلاقی جواز کی قطعاً" ضرورت نہیں ہے ۔ اس بارے میں صرف ان لوگوں کا موقف جاندار ہے جو یہ کہتے ہیں اور اس پر اصرار کرتے ہیں کہ ہم اسلام کے اس اعلان کو پورا کر کے رہیں گے کہ اس پورے کرۂ ارض پر سے تمام انسانوں کو انسانی سلطنتوں کی غلامی سے نجات دلائی جائے ۔ اس بارے میں قرآنی آیات بالکل واضح ہیں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ۔

فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا (۷٤) وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي

سَبِيلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ
اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ
لَّدُنْكَ نَصِيرًا (۷۵) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ
سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا

(۷٦) (٤: ۷٤ تا ۷٦)) ”اور جو لوگ آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو بیچنا چاہتے ہیں ان کو چاہئے کہ خدا کی راہ میں جنگ کریں اور جو شخص خدا کی راہ میں جنگ کرے پھر شہید ہو جائے یا غلبہ پائے ہم عنقریب اس کو بڑا ثواب دیں گے۔ اور تم کو کیا ہوا ہے کہ خدا کی راہ میں اور ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو دعائیں کیا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو اس شہر سے جس کے رہنے والے ظالم ہیں نکال کر کہیں اور لے جا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا حامی بنا اور اپنی ہی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار مقرر فرما۔ جو مومن ہیں وہ تو خدا کے لئے لڑتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ بتوں کے لئے لڑتے ہیں سو تم شیطان کے مددگاروں سے لڑو کیونکہ شیطان کا داؤ بودا ہوتا۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْآ اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ
الْاَوَّلِيْنَ (۳۸) وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا
فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۳۹) وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْآ اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰكُمْ نِعْمَ الْمَوْلٰى

وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (٤٠) (۸: ۳۸ تا ٤٠)) ”کفار سے کہہ دو کہ اگر وہ اپنے افعال سے باز آ جائیں تو جو ہو چکا وہ انہیں معاف کر دیا جائے گا۔ اور اگر پھر وہی کرنے لگیں گے تو اگلے لوگوں سے جو سلوک ہو چکا ہے وہی ان کے حق میں بھی برتا جائے گا۔ ان لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب کا سب خدا ہی کا ہو جائے۔ اور اگر باز آ جائیں تو خدا ان کے کاموں کو دیکھ رہا ہے اور اگر ”روگردانی کریں تو جان رکھو کہ خدا تمہارا حمایتی ہے اور وہ خوب حمایتی اور خوب مددگار ہے۔“

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ
رَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ
هُمْ صٰغِرُوْنَ (۲۹) وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ

اللّٰہ ذٰلِکَ قَوْلُھُمْ بِاَفْوَاھِھِمْ یُضَاھِوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قٰتَلَھُمُ اللّٰہُ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ (۳۰) اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَھُمْ وَ رُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَالْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَمَآ اُمِرُوْآ اِلَّا لِیَعْبُدُوْا اِلٰھًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ سُبْحٰنَہٗ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (۳۱) یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَیَاْبَی اللّٰہُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَہٗ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ (۳۲) (۹:۲۹ تا ۳۲) ”جو لوگ اہل کتاب میں سے خدا پر ایمان نہیں لاتے اور نہ ہی روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو خدا اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ ہی دین حق کو قبول کرتے ہیں' ان سے جنگ کرو' یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں۔ پہلے کافر بھی اسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ یہ بھی انہی کی ریس کرتے ہیں۔ خدا ان کو ہلاک کرے۔ یہ کہاں بہکے پھرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ اور مسیح بن مریم کو اللہ کے سوا خدا بنالیا ہے حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں اور خدا اپنے نور کو پورا کئے بغیر رہنے کا نہیں۔ اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔“

## اسلام کے نظریہ جہاد کے لئے صحیح اخلاقی جواز

حقیقت یہ ہے کہ اس زمین پر اللہ کی حکومت قائم کرنا' لوگوں کی زندگیوں میں اسلامی نظام حیات نافذ کرنا اور طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کرنا ہی وہ کافی وجوہ جواز ہیں' جو اسلام کے نظریہ جہاد کی صحت پر دلیل ہیں۔ اسلامی نظام زندگی میں جہاد اس لئے شروع ہوا ہے کہ ان لوگوں کے اقتدار کو ختم کیا جائے جنہوں نے اس دنیا میں اللہ کی مخلوق کو غلام بنا رکھا ہے' اسلام کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کرۂ ارض پر اپنی مرضی سے قوانین نافذ کرے۔ اسلام اقتدار اعلیٰ کو ہر حال میں صرف اللہ کے لئے مخصوص کرنا چاہتا ہے۔ اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے سائے میں پھر لوگوں کو آزادی دی جاتی ہے کہ وہ جو عقیدہ چاہیں اختیار کریں۔ یہی مقصد ہے لا اکراہ في الدین کا۔ بس صرف یہی ایک وجہ جواز ہی اسلامی نظریہ جہاد کے لئے کافی و شافی ہے اور ہمیں ضرورت نہیں ہے کہ ہم اس کے علاوہ کوئی اور وجوہ جواز تلاش کریں۔ صحابہ کرام کے دلوں میں یہ بات اس قدر جاگزیں ہوگئی تھی کہ ان میں سے کسی ایک نے بھی کبھی یہ سوال نہیں اٹھایا کہ مسلمان جہاد کے لئے کیوں نکلے پڑے۔ انہوں نے کبھی بھی اس نہج پر نہیں سوچا ”ہم اپنے ملک کی حفاظت کر رہے ہیں کیونکہ اس کی سلامتی خطرے میں ہے“ یا یہ کہ ہم اپنے گھروں سے اس لئے نکلے ہیں کہ ہمیں فارس اور روم سے حملوں کا خطرہ ہے یا ہم اس لئے نکلے ہیں کہ ہم تمام دنیا کے اموال سمیٹ لیں اور اپنے مقبوضات کا دائرہ وسیع کرتے چلے جائیں۔ کسی صحابی نے کبھی ان خطوط پر نہیں سوچا۔

صحابہ کرام کا نقطہ نظر، حضرت ربعی بن عامر، حضرت حذیفہ بن محصن اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم کے ایک تاریخی جواب سے خوب واضح ہوتا ہے۔ یہ جواب انہوں نے قادسیہ میں فارسیوں کے کمانڈر انچیف کے سامنے پیش کیا' جنگ شروع ہونے سے قبل مسلسل تین دن وہ ان بزرگوں سے پوچھتا رہا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں اور کیوں نکلے ہیں؟ اور اسے ہر دفعہ یہ جواب ملتا رہا۔ ''اللہ نے ہمیں اس لئے برپا کیا ہے کہ اپنے بندوں میں سے جسے وہ انسانوں کی غلامی سے نکالنا چاہے' ہم اسے غلامی سے چھڑالیں اور صرف ایک اللہ ہی کی غلامی میں داخل کریں' اسے ایک تنگ دنیا سے نکال لیں اور ایک وسیع جہان کی طرف لے آئیں' اور باطل نظامہائے زندگی کے ظلم و ستم سے اسے نجات دلا دیں اور اسلامی نظام زندگی کے عدل و انصاف میں داخل کر دیں' اس غرض کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک رسول کو مبعوث فرمایا' اسے اپنا تجویز کردہ نظام زندگی دیا' ہم اسی نظام کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں جو اسے قبول کرتا ہے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اور واپس لوٹ جاتے ہیں اور جو انکار کرتا ہے ہم اس سے لڑتے ہیں یہاں تک کہ یا تو ہم جنت تک رسائی حاصل کرلیں اور یا پھر فتح یاب ہو جائیں۔''

بلکہ میں کہوں گا کہ اسلامی نظام حیات کا مزاج ہی دراصل حقیقی وجہ جواز ہے۔ یہ نظام' مقررہ مراحل کے مطابق' اپنے پورے وسائل لے کر تمام باطل نظاموں کو چیلنج کرتا ہے اور اس کا یہ چیلنج اس بات پر موقوف نہیں ہے کہ دارالاسلام کو کوئی بیرونی خطرہ لاحق ہو' اسلامی نظام زندگی کا مزاج اس کی واقعیت پسندی اور اس کے مقابلے میں موجود باطل نظاموں کی کھڑی ہوئی رکاوٹوں کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ عملی جہاد شروع کر دے' اس کے نظریہ جہاد کے لئے دماغی اسباب کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

بلکہ میں کہوں گا کہ صرف یہ بات کہ ایک مسلم اپنے مال اور اپنی جان کو لے کر اللہ کی راہ میں نکل جاتا ہے' جہاد کرتا' اعلیٰ اقدار کی خاطر لڑتا ہے اور اس کے اس کام سے اس کی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں ہوتی۔ صرف یہی کافی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اسلام کے نظریہ جہاد کے جواز کے لئے صرف یہی عدیم المثال بے لوثی ہی کافی وجہ جواز ہے۔

مسلمان جب کفار کے مقابلے میں کسی معرکے میں اترتا ہے تو وہ اس سے پہلے خود اپنے نفس کے خلاف ایک بہت بڑا معرکہ سر کر چکا ہوتا ہے۔ یہ جہاد اکبر خود نفس شیطان کے خلاف ہوتا ہے' خود اپنی خواہشات اور شہوات کے خلاف ہوتا ہے' اپنی امیدوں اور مزعومات کے خلاف ہوتا ہے' خود اپنی ذات' اپنی قوم اور اپنے خاندان کی مصلحتوں کے خلاف ہوتا ہے' جائز زیب و زینت کے سوا تمام زیبائشوں کے خلاف ہوتا ہے اور جہاد کے محرکات کے سوا تمام محرکات کے خلاف ہوتا ہے۔ غرض اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اس زمین پر اللہ کی حکومت قائم کی جائے اور اس کے حقوق سلطنت پر دست درازی کرنے والے تمام طاغوتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔

جو لوگ نظریہ جہاد اسلامی کے اخلاقی جواز کے لئے صرف دارالاسلام کی حفاظت کے اسباب و وجوہ تلاش کرتے ہیں' انہوں نے دراصل نظام اسلامی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہی نہیں لگایا۔ وہ اس نظام کو ایک وطن سے بھی کم تر درجے کی کوئی چیز سمجھتے ہیں' حالانکہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ خیال درست نہیں ہے۔ یہ بالکل ایک نیا تصور ہے جو اسلامی تصور پر غالب ہو رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام پہلے عقیدے کو اہمیت دیتا ہے' پھر اس نظام کو جو اس عقیدے پر مبنی ہوتا ہے۔ پھر اس معاشرے کو جس میں وہ نظام قائم ہوتا ہے یہی چیزیں اسلامی تصور حیات میں اہمیت کی حامل

ہیں...... باقی رہی صرف کوئی سرزمین تو بذات خود اسلام میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ۔ کسی اسلامی سرزمین کو اہمیت صرف اس وجہ سے حاصل ہوتی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم ہوتی ہے اور وہ اسلامی عقیدے کا گہوارا اور اسلامی نظام حیات کے لئے ایک کھیت کی حیثیت اختیار کر کے' دارالاسلام قرار پاتی ہے اور "تحریک آزادی انسان" کے لئے مرکز بن جاتی ہے ۔

دارالاسلام کی حفاظت بھی اس لئے ہوتی ہے کہ اس عقیدے' اس نظام حیات اور اس معاشرے کی حفاظت ہو' جو اس دارالاسلام میں قائم ہوتا ہے ۔ بذات خود دارالاسلام کوئی مستقل بالذات مقصد نہیں اور نہ تحریک جہاد اسلامی کا منتہائے نظر صرف دارالاسلام کی حفاظت ہی ہے ۔ اس کی حفاظت تو محض اس لئے کی جاتی ہے کہ وہاں حکومت الہیہ کا قیام عمل میں لایا جا سکے اور اس کے بعد تمام روئے زمین پر پھیلنے اور تمام نوع انسانی تک دعوت اسلامی کو پہنچانے کے لئے اسے مرکز بنایا جا سکے ۔ اس طرح گویا پوری انسانیت اس دین کا موضوع ہے اور پورا کرۂ ارض اس کا میدان کار ہے ۔

جیسا کہ اس سے پہلے ہم کہہ چکے ہیں' جب بھی دین کو پھیلانے کا کام شروع ہو گا اس کے راستے میں اس وقت کی سیاسی طاقت' اس وقت کے موجودہ اجتماعی نظام اور اس وقت کے معاشروں کی عادات و اطوار کی جانب سے مادی رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں ۔ پھر اسلام بھی' ان تمام چیزوں کو اپنی قوت کے بل بوتے پر اپنے راستے سے ہٹاتا ہے تاکہ وہ براہ راست لوگوں کو اپیل کر سکے' ان کے ضمیر اور ان کے افکار کو مخاطب کر سکے اور تبلیغ دین اور انسانوں کے درمیان کوئی مادی رکاوٹ نہ رہے ۔ اس کے بعد انہیں اختیار دیا جائے کہ وہ اسلامی عقیدے کو قبول کرتے ہیں یا نہیں ۔

ہمیں اسلام کے نظریہ جہاد کے بارے میں کسی سے مرعوب نہ ہونا چاہئے اور نہ مستشرقین کی وسوسہ اندازیوں سے متاثر ہونا چاہئے ۔ موجودہ بین الاقوامی حالات سے دب کر' اسلام کے نظریہ جہاد کی جدید تعبیر کرنا مناسب نہیں ہے ۔ اس سے اس کی روح ختم ہو جائے گی ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ حالات اور واقعات جن کا تعلق وقتی دفاع سے تھا' اگر وہ نہ بھی ہوتے تو بھی مسلمان اسی طرح جہاد کرتے جس طرح انہوں نے ان حالات کے ہوتے ہوئے کیا ۔

## براہ راست مطالعہ

ہمیں صرف اسلامی نظام حیات کا تاریخی جائزہ لینا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وہ کن کن امور کو اولیت دیتا ہے ۔ اس کا مزاج کیا ہے' اور وہ کس چیز کا اعلان کرتا ہے ۔ اس کا طریق کار کیا ہے؟ ان تمام امور کے بارے میں کوئی حتمی فیصلے کرتے وقت ہمیں وقتی اور دفاعی اقدامات اور دائمی نصب العین میں فرق کرنا چاہئے ۔

یہ بات اپنی جگہ بالکل درست کہ یہ دین حملہ آوروں کا دفاع بھی کرتا ہے کیونکہ جاہلیت کسی حال میں بھی اسے برداشت نہیں کر سکتی ۔ محض یہ اعلان ہی جاہلیت کے لئے ایک بڑا چیلنج ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور الہ نہیں ہے ۔ اس کے سوا کوئی انسان کسی کا غلام نہیں ۔ خالی خولی اعلان ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک قیادت کے تحت عملی تحریک بھی منظم کرنا اور بالکل ایک نئے اور ممتاز معاشرہ کی بنیاد رکھنا' جو سیاسی لحاظ سے اللہ کے سوا تمام حاکمیتوں کا انکار کرتا ہو' یہ سب چیزیں ہمیشہ جاہلیت کے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہیں ۔ غرض اسلامی نظام زندگی کا وجود ہی اپنی اس تاریخی صورت میں' جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پیش کیا تھا' اس بات کے لئے کافی تھا کہ اس وقت کے تمام جاہلی

معاشرے اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں، جن کی بنیاد ہی اس بات پر تھی کہ انسان انسان کی غلامی کرے اور کوشش کر کے اس دین کو ختم کریں اور اپنے وجود کا دفاع کریں۔ ان حالات میں اسلامی نظام زندگی کے لئے بھی یہ ضروری تھا کہ وہ اپنا دفاع کرے اور پر خطر حالات میں بچاؤ کی تدابیر اختیار کرے۔ یہ ایک ناگزیر ضرورت تھی، اسلام کے وجود کے ساتھ اس کا دفاع بھی ضروری تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی نئی ابھرنے والی طاقت فوراً ہی اقدامی پوزیشن حاصل کرلے۔ ایک دور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی نئی ابھرنے والی طاقت فوراً ہی اقدامی پوزیشن حاصل کر لے۔ ایک دور ایسا بھی ہوتا ہے جس میں اپنا دفاع کرنا پڑتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اسلام ابد الآباد تک اپنا دفاع ہی کرتا رہے۔ بلکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے وجود کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ مناسب حالات میں، آگے بڑھے اور پوری انسانیت کو غیر اللہ کی غلامی سے رہائی دلائے۔ اس معاملہ میں اسلام کسی جغرافیائی حد بندی کا قائل نہیں ہے، یہ اسلام کے مزاج کے خلاف ہے کہ پوری انسانیت کو جہالت اور گمراہی کے اندھیرے میں بھٹکتا اور ظلم و ستم میں پستا چھوڑ کر صرف ایک نسل یا ایک مخصوص قوم کی اصلاح پر قانع ہو جائے۔

بعض اوقات ایسے حالات بھی پیش آسکتے ہیں کہ جاہلیت کے حامی نظام اسلام کے بارے میں نرم رویہ اختیار کرتے ہیں اور اس پر حملہ آور نہیں ہوتے اور اسلام بھی انہیں ان کی جغرافیائی حدود کے اندر آزاد چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ انسانوں کو غلام بنا کر ان پر حکمرانی کریں اور مداخلت نہیں کی جاتی اور نہ ہی تحریک اسلامی کو ان حدود تک وسیع کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ وقفہ عارضی ہوتا ہے، اصل پالیسی یہی ہوتی ہے کہ اسلام ان جاہلی معاشروں کے ساتھ اس وقت تک مصالحت نہیں کرتا، جب تک وہ اسلام کے اقتدار اعلیٰ کے سامنے سر تسلیم خم نہ کر دیں اور جزیہ ادا کر کے یہ ثبوت فراہم نہ کر دیں کہ ان کے ملک کے دروازے تحریک اسلامی کے لئے کھلے ہیں اور ان کی حدود میں قائم حکومت، اسلام کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے۔ یہ ہے اس دین کا مزاج اور اس کی اصل غرض و غایت یعنی تمام انسانیت کو غیر اللہ کی غلامی سے چھڑا کر صرف اللہ کی غلامی میں داخل کرنا۔

دین اسلام کے اس تصور اور اس تصور کے درمیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے جو اسے ایک محدود علاقے کے اندر بند کر کے رکھ دیتا ہے۔ اگر ہم اسلام کے اس محدود تصور کو اپنا لیں تو اس صورت میں ہمارے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ قرن اول میں اسلام کی وسعت پذیری کے لئے وجوہ جواز تلاش کریں۔

لیکن اگر ہمارے سامنے اسلامی نظام زندگی کا تصور یہ ہے کہ اسلام تمام انسانوں کے لئے، اللہ کا تجویز کردہ نظام زندگی ہے اور اس کا تعلق انسانوں کے کسی خاص گروہ اور نسل سے نہیں ہے تو اسلام کی وسعت پسندی کی حقیقی وجوہات خود بخود ہمارے سامنے آجاتی ہیں اور جب تک یہ حقیقت ہمارے ذہنوں سے اوجھل رہتی ہے، ہم اس وسعت پذیری کے لئے خارجی اسباب تلاش کرتے پھرتے ہیں حالانکہ مسئلہ کی اصلیت صرف اس قدر ہے کہ اسلام کا نصب العین پوری انسانیت کی حریت اور اللہ کی غلامی ہے اور جس کسی کے ذہن میں یہ حقیقت بیٹھ جائے اسے کسی اور اخلاقی جواز کے تلاش کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔

## دو نقطہ ہائے نظر

اسلام کے نظریہ جہاد کے بارے میں دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں' ایک یہ کہ اسلام مجبور تھا کہ وہ معرکہ جہاد میں کود پڑے کیونکہ جاہلی معاشرے اس کو مٹانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے' دوسرا تصور یہ ہے کہ اسلام از خود اقدام کرتا ہے اور معرکہ جہاد میں داخل ہوتا ہے۔ اگرچہ ابتدائی دور میں ان دونوں تصورات کے درمیان امتیاز کرنا دشوار نظر آتا ہے کیونکہ دونوں صورتوں میں اسلام کو معرکہ جہاد میں کودنا پڑا ہے لیکن آگے جاکر دونوں میں فرق واضح ہو جاتا ہے' جس سے اسلام کے بارے میں مسلمانوں کے نقطہ نظر اور احساس و شعور میں بڑی تبدیلی واقع ہوئی ہے اور اس کے دور رس نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

دوسرے نقطہ نظر کے مطابق اسلام ایک ایسا نظام زندگی بن جاتا ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے تجویز کیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ پوری انسانیت اللہ کی بندگی میں داخل ہو' انسانوں پر صرف اللہ کا حکم چلے اور اس کی شریعت ملک کا قانون ہو اور الوہیت کا مستحق صرف اللہ ہو' جب اسلام کے بارے میں یہ نقطہ نظر اختیار کیا جائے تو یہ اس کا طبعی حق ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے راستے میں حائل ہونے والی تمام مشکلات کو دور کرے تاکہ وہ براہ راست لوگوں کی عقل و شعور اور وجدان کو اپیل کر سکے۔ اسلام کے اس جامع تصور اور اس تصور کے درمیان بہت بڑا فرق ہے' جس کی رو سے اسے ایک "علاقائی اور مقامی" تصور کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اگر ہم اسے ایک علاقائی نظام سمجھیں تو پھر اس کا حق صرف یہ رہ جائے گا کہ وہ اپنے ان علاقائی حدود کے اندر اپنے وجود اور اپنی بقاء کے لئے مدافعت کر سکے۔ اسلام کے یہ دونوں تصورات نظریہ جہاد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر دونوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ دونوں صورتوں میں مسلمانوں کو معرکہ جہاد میں کودنا پڑتا ہے لیکن دونوں تصورات کے نتیجے میں نظریہ جہاد کی نوعیت اور حقیقت بدل جاتی ہے۔

جب اسلام کسی ایک قوم اور نسل کا دین نہیں ہے تو پھر اس کا یہ فطری حق ہے کہ وہ متحرک ہو' کیونکہ وہ ایک الہٰی نظام ہے اور پورے جہان کے لئے ہے۔ لہٰذا اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ آگے بڑھے اور زندگی کے باطل نظاموں کو ختم کر دے۔ غلط اوضاع و اطوار کے پردوں کو چاک کر دے اور ان بندشوں کو ختم کر دے جنہوں نے عوام الناس سے آزادانہ رد و قبول کے اختیار کو سلب کر رکھا ہے۔ اس معاملے میں اسلام نے صرف یہ احتیاط برتی ہے کہ وہ کسی ایک فرد پر جبر نہیں کرتا۔ بلکہ وہ زندگی کے اجتماعی نظم اور اجتماعی عادات و اطوار پر حملہ آور ہوتا ہے تاکہ زندگی پر اثر انداز ہونے والے غلط اثرات سے افراد کو محفوظ رکھا جاسکے جو انسان کی فطرت کو بگاڑ کر اس کی آزادی کو سلب کر لیتے ہیں۔

اسلام کا یہ حق ہے کہ وہ لوگوں کو غیر اللہ کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی غلامی میں داخل کرے اور اپنے اس مطمح نظر کو ایک حقیقت بنا دے کہ اللہ کے سوا کوئی رب اور آقا نہیں ہے۔ تمام لوگ اب جھوٹے آقاؤں کی غلامی سے آزاد ہیں۔ یہ کام صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ اس دنیا میں اسلامی نظام زندگی قائم ہو' کیونکہ صرف یہی ایک نظام ہے جس میں اللہ تعالیٰ ہی تمام انسانوں کے لئے قانون سازی کرتا ہے' خواہ وہ انسان حکمران ہوں یا محکوم ہوں' سفید رنگ ہوں یا سیاہ فام ہوں' دور کے رہنے والے ہوں یا قریب کے رہنے والے ہوں' فقیر ہوں یا امیر ہوں۔ غرض ایک ہی قسم کی قانون سازی ہے جس کے سامنے سب کے سب سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ جب اسلام کے سوا تمام دوسرے نظاموں میں حالت یہ ہے کہ

بعض انسان انسانوں کی بندگی کر رہے ہیں کیونکہ ان کے لئے انسان قانون بناتے ہیں اور قانون سازی، دراصل الوہیت کا ایک اہم خاصہ ہے' جو شخص بھی یہ دعوے کرتا ہے کہ اسے انسان کے لئے قانون سازی کا حق ہے تو وہ دراصل ربوبیت کا دعویدار ہے' خواہ وہ اپنے اس دعوے کا صریح الفاظ میں اعلان کرے یا نہ کرے۔ اور جو شخص بھی کسی ایسے شخص کے دعوے کو تسلیم کر لیتا ہے وہ دراصل اسے اپنا الٰہ مان لیتا ہے' خواہ وہ اس کا اعلان کرے یا نہ کرے۔

یہ بات اچھی طرح یاد رکھئے کہ اسلام محض فلسفہ اور نظریہ نہیں ہے کہ وہ فقط وعظ و بیان پر اکتفاء کرے۔ اور اپنے تصورات کو لوگوں کے گوش گزار کر دے بلکہ وہ ایک اجتماعی نظام زندگی ہے اور بڑی قوت اور زور سے آگے بڑھ کر لوگوں کو غیراللہ کی غلامی سے آزاد کرنا چاہتا ہے اور دوسرے اجتماعی نظام اس کے اہل نہیں ہیں کہ وہ انسانوں کی اجتماعی زندگی کی تنظیم ان خطوط پر کر سکیں جو اسلام کو مطلوب ہیں۔ اس لئے اسلام اپنے آپ کو اس میں حق بجانب سمجھتا ہے کہ وہ ان باطل نظاموں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے تاکہ وہ انسان کی حریت فکر کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔ یہی مفہوم ہے وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ کا۔ یعنی اسلامی نظام میں قانون سازی اور حاکمیت کے اصلی اختیارات صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہوتے ہیں۔

زمانہ حال کے بعض اہل قلم اسلامی نظام زندگی کی اس خصوصیت کو نہیں پا سکے اور اسلام کے نظریہ جہاد کو محض دفاعی نظریہ قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ مستشرقین کے اس پروپیگنڈے سے دب گئے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے اور وہ بہ جبر لوگوں کو مسلمان کرتا ہے۔ اپنی جگہ مستشرقین اسلامی نظام کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے نظریہ جہاد کی حقیقت کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کر دی جائیں۔ اس صورت حال کے مقابلے میں یہ اہل قلم اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ان سوالات کا جواب دیتے ہیں اور ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں ہوتا کہ وہ دفاعی جنگ کے وجوہ و اسباب تلاش کریں۔ یہ حضرات اسلام کے مزاج اور اس کے نصب العین کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں حالانکہ اسلامی نظریہ حیات کی رو سے اسلام کا یہ فرض ہے کہ وہ اقدام کرے۔ نہ کہ دفاع۔ ان شکست خوردہ اہل قلم کے دل و دماغ میں مذہب کا مغربی تصور اس قدر راسخ ہو چکا ہے کہ وہ اسلامی نظام زندگی کو بھی ایک مذہبی عقیدہ سمجھتے ہیں' جسے زندگی کے عملی اور اجتماعی نظام سے کوئی سروکار نہ ہو' اس لئے دینی جہاد (Holy War) کے معنے ان کی نظروں میں صرف یہ رہ جاتے ہیں کہ لوگوں کو دین میں داخل کرنے کے لئے جہاد کیا جائے اور ان پر ایک خاص عقیدہ مسلط کر دیا جائے' حالانکہ صورت حال بالکل اس کے برعکس ہے۔ اسلام پوری زندگی کے لئے ایک مکمل نظام حیات ہے اور اس کی اساس اس عقیدے پر ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے جو خود حاکم اور فرمان روا بھی ہے اور اس نے یہ مکمل نظام پوری انسانیت کے لئے تجویز کیا ہے اور اس کے مطابق جہاد کے معنے یہ ہیں کہ انسانوں پر اس نظام کو نافذ کیا جائے۔ رہا یہ سوال کہ کوئی اسلامی عقائد کو اپناتا ہے یا نہیں تو یہ بالکل اس کے آزادانہ اختیار تمیزی پر موقوف ہے۔ البتہ یہ بات ضروری ہے کہ آزادانہ غور و فکر کے لئے اسے آزاد فضاء میسر ہو اور ایسی فضا میسر ہونے کے لئے اسلامی نظام زندگی کا نفاذ ضروری ہے۔ یہ ہے مذہب کا وہ حقیقی اسلامی تصور جو مذہب کے مغربی تصور سے بالکل مختلف ہے۔

اسلامی معاشرے کے ظہور کے بعد اور اس میں اسلامی نظام زندگی کے قیام کے بعد اللہ تعالیٰ اس معاشرے کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ آگے بڑھے اور اقتدار پر قابض ہو اور اس نظام کو پورے کرۂ ارض پر جہاں تک ممکن ہو' نافذ کر

دے ۔ رہا یہ کہ شعوری طور پر کوئی اس نظام زندگی کو قبول کرتا ہے یا نہیں تو اس میں ہر کوئی آزاد ہے ۔ حالات اور مواقع کے اعتبار سے بعض اوقات یوں بھی ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جہاد بالسیف سے روکا ہے ۔ یہ مستقل پالیسی نہ تھی بلکہ وقتی حالات اور مصالح کا تقاضا تھا ۔ تحریک کے عملی تقاضوں کی بناء پر ایسا کیا گیا ۔ ہم نے اس مضمون میں مختلف ادوار کی آیات پر بحث کر کے ان کا مفہوم متعین کر دیا ہے ۔ اس کی روشنی میں ہمیں چاہئے کہ وہ پابندیاں جو مختلف مواقع پر عائد ہوئیں اور وہ نظریہ اور نصب العین جو ابد الاباد کے لئے طے ہوا ہے ' ان کے درمیان فرق کریں اور وقتی احکامات کے پیش نظر دائمی احکامات کو پس پشت نہ ڈالیں ۔

اب ہمارے سامنے صرف یہ نکتہ رہ گیا ہے کہ اسلام کے نظریہ جہاد کا مزاج کیا ہے؟ اور اسلامی نظام زندگی کی نوعیت کیا ہے تو اس سلسلے میں امیر جماعت اسلامی پاکستان سید ابوالاعلیٰ مودودی کی نہایت ہی مختصر مگر قیمتی بحث ہماری بہت ہی اچھی راہنمائی کرتی ہے ۔ یہ بحث انہوں نے اپنی کتاب "جہاد فی سبیل اللہ" میں کی ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں اس کتاب سے قدرے طویل اقتباسات نقل کرنے کی ضرورت ہے ۔ جو شخص اس موضوع کو اچھی طرح سمجھنا چاہتا ہے اس کے لئے اس کتاب کا پڑھنا نہایت ضروری ہے تاکہ وہ اس مسئلے کی گہرائی میں جاکر اسے اچھی طرح سمجھ سکے اور اس بات کا ادراک کر سکے کہ تحریک اسلامی کے برپا کرنے میں اس کا کیا کردار ہے ' فرماتے ہیں :

"عموماً لفظ "جہاد" کا ترجمہ انگریزی زبان میں (Holy War) مقدس جنگ " کیا جاتا ہے اور اس کی تشریح و تفسیر مدتہائے دراز سے کچھ اس انداز میں کی جاتی رہی ہے کہ اب یہ لفظ "جوش جنوں" کا ہم معنی ہوکر رہ گیا ہے ۔ اس کو سنتے ہی آدمی کی آنکھوں میں کچھ اس طرح کا نقشہ پھرنے لگتا ہے کہ مذہبی دیوانوں کا ایک گروہ ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے ' داڑھیاں چڑھائے ' خونخوار آنکھوں کے ساتھ اللہ اکبر کے نعرے لگاتا ہوا چلا آرہا ہے ۔ جہاں کسی کافر کو دیکھ پاتا ہے ' پکڑ لیتا ہے اور تلوار اس کی گردن پر رکھ کر کہتا ہے کہ بول لا الہ الا اللہ ورنہ ابھی سر تن سے جدا کر دیا جاتا ہے ۔ ماہرین نے ہماری یہ تصویر بڑی فنکاریوں کے ساتھ بنائی ہے اور اس کے نیچے موٹے حرفوں میں لکھ دیا ہے کہ :

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لطف یہ ہے کہ اس تصویر کے بنانے والے ہمارے وہ مہربان ہیں جو خود کئی صدیوں سے انتہا درجہ کی غیر مقدس جنگ (Unholy War) میں مشغول ہیں ۔ ان کی اپنی تصویر یہ ہے کہ دولت اور اقتدار کے بھوکے ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح ہوکر قزاقوں کی طرح ساری دنیا پر پل پڑے ہیں اور ہر طرف تجارت کی منڈیاں ' خام پیداوار کے ذخیرے ' نو آبادیاں بسانے کے قابل زمینیں اور معدنیات کی کانیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں تاکہ اپنی حرص کی کبھی نہ بجھنے والی آگ کے لئے ایندھن فراہم کریں ۔ ان کی جنگ خدا کی راہ میں نہیں بلکہ پیٹ کی راہ میں ہے ۔ ہوس اور نفس امارہ کی راہ میں ہے ۔ ان کے نزدیک کسی قوم پر حملہ کرنے کے لئے بس یہ کافی وجہ جواز ہے کہ اس کی زمین میں کانیں ہیں ' یا اجناس کافی پیدا ہوتی ہیں ' یا وہاں تیل نکل آیا ہے ' یا ان کے کارخانوں کا مال وہاں اچھی طرح کھپایا جاسکتا ہے ' یا اپنی زائد آبادی کو وہاں آسانی کے ساتھ بسایا جاسکتا ہے ۔ کچھ اور نہیں تو اس قوم کا یہ گناہ بھی کوئی معمولی گناہ نہیں ہے کہ وہ کسی ایسے ملک کے راستے میں رہتی ہے جس پر یہ پہلے قبضہ کر چکے ہیں یا اب قبضہ کرنا چاہتے ہیں ۔ ہم نے تو جو کچھ کیا وہ زمانہ ماضی کا قصہ ہے ۔ اور ان کے کارنامے حال کے واقعات ہیں جو شب و روز دنیا کی آنکھوں کے سامنے گزر رہے ہیں ۔ ایشیا ' افریقہ '

امریکہ ' غرض کرۂ زمین کا کون سا حصہ ایسا بچا رہ گیا ہے جو ان کی اس غیر مقدس جنگ سے لالہ زار نہیں ہو چکا مگر ان کی مہارت قابل داد ہے۔ انہوں نے ہماری تصویر اتنی بھیانک اور اتنی بری بنائی کہ خود ان کی تصویر اس کے پیچھے چھپ گئی اور ہماری سادہ لوحی بھی قابل داد ہے۔ جب ہم نے غیروں کی بنائی ہوئی اپنی یہ تصویر دیکھی تو ایسے دہشت زدہ ہوئے کہ ہمیں اس تصویر کے پیچھے جھانک کر خود مصوروں کی صورت دیکھنے کا ہوش ہی نہ آیا اور لگے معذرت کرنے کہ حضور! بھلا ہم جنگ و قتال کیا جانیں۔ ہم تو بھکشوؤں اور پادریوں کی طرح پرامن مبلغ لوگ ہیں۔ چند مذہبی عقائد کی تردید کرنا اور ان کی جگہ کچھ دوسرے عقائد لوگوں سے تسلیم کرا لینا' بس یہ ہمارا کام ہے۔ ہمیں تلوار سے کیا واسطہ؟ البتہ اتنا قصور کبھی کبھار ہم سے ضرور ہوا ہے کہ جب کبھی ہمیں مارنے آیا تو ہم نے بھی جواب میں ہاتھ اٹھا دیا۔ سو اب تو ہم اس سے بھی توبہ کر چکے ہیں۔ حضور کی خاطر اب کے لئے تلوار والے جہاد کو سرکاری طور پر منسوخ کر دیا گیا ہے۔ اب تو جہاد فقط زبان و قلم کی کوشش کا نام ہے۔ توپ اور بندوق چلانا سرکار کا کام ہے اور زبان و قلم چلانا ہمارا کام۔

## جہاد کے متعلق غلط فہمی کے اسباب

خیر' یہ تو سیاسی چالوں کی بات ہے مگر خالص علمی حیثیت سے جب ہم ان اسباب کا تجزیہ کرتے ہیں جن کی وجہ سے ''جہاد فی سبیل اللہ'' کی حقیقت کو سمجھنا غیر مسلموں ہی کے لئے نہیں' خود مسلمانوں کے لئے بھی دشوار ہو گیا ہے تو ہمیں دو بڑی اور بنیادی غلط فہمیوں کا سراغ ملتا ہے۔

پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ اسلام کو ان معنوں میں ایک مذہب سمجھ لیا گیا ہے جن میں لفظ مذہب عموماً بولا جاتا ہے۔

دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان معنوں میں محض ایک قوم سمجھ لیا گیا ہے جن میں یہ لفظ عموماً مستعمل ہوتا ہے۔

ان دو غلط فہمیوں نے صرف ایک جہاد ہی کے مسئلہ کو نہیں بلکہ مجموعی حیثیت سے پورے اسلام کے نقشہ کو بدل ڈالا ہے اور مسلمانوں کی پوزیشن کلی طور پر غلط کر کے رکھ دی ہے۔

''مذہب کے معنی عام اصطلاح کے اعتبار سے بجز اس کے اور کیا ہیں کہ وہ چند عقائد اور عبادات اور مراسم کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے مذہب کو واقعی ایک پرائیویٹ معاملہ ہی ہونا چاہئے۔ آپ کو اختیار ہے کہ جو عقیدہ چاہیں' رکھیں اور آپ کا ضمیر جس کی عبادت کرنے پر راضی ہو' اس کو جس طرح چاہیں پکاریں۔۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی جوش اور سرگرمی آپ کے اندر اس مذہب کے لئے موجود ہے تو آپ دنیا بھر میں اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے پھریئے اور دوسرے عقائد والوں سے مناظرے کیجئے۔ اس کے لئے تلوار ہاتھ میں پکڑنے کا کون سا موقع ہے؟ کیا آپ لوگوں کو مار مار کر اپنا ہم عقیدہ بنانا چاہتے ہیں؟ یہ سوال لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے جبکہ آپ اسلام کو عام اصطلاح کی رو سے ایک ''مذہب'' قرار دے لیں۔ یہ پوزیشن اگر واقعی اسلام کی ہو تو جہاد کے لئے حقیقت میں کوئی وجہ جواز ثابت نہیں کی جا سکتی۔

اسی طرح ''قوم'' کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ وہ ایک متجانس گروہ اشخاص (A homogeneous Group of Men) کا نام ہے جو چند بنیادی امور میں مشترک ہونے کی وجہ سے باہم مجتمع اور دوسرے گروہوں سے ممتاز ہو گیا ہے۔ اس معنی میں جو گروہ ایک قوم ہو وہ دو ہی وجوہ سے تلوار اٹھاتا ہے اور اٹھا سکتا ہے۔ یا تو اس کے جائز حقوق چھیننے کے لئے کوئی اس پر حملہ کرے' یا وہ خود دوسروں کے جائز حقوق چھیننے کے لئے کوئی اس پر حملہ کرے یا وہ خود دوسروں کے جائز حقوق

چھیننے کے لئے حملہ آور ہو۔ پہلی صورت میں تو خیر تلوار اٹھانے کے لئے کچھ نہ کچھ اخلاقی جواز موجود بھی ہے (اگرچہ بعض دھرماتماؤں کے نزدیک یہ بھی ناجائز ہے) لیکن دوسری صورت کو تو بعض ڈکٹیٹروں کے سوا کوئی بھی جائز نہیں کہہ سکتا حتیٰ کہ برطانیہ اور فرانس جیسی وسیع سلطنتوں کے مدبرین بھی آج اس کو جائز کہنے کی جرات نہیں رکھتے۔

## جہاد کی حقیقت

پس اگر اسلام ایک ''مذہب'' اور مسلمان ایک ''قوم'' ہے تو جہاد کی ساری معنویت 'جس کی بنا پر اسلام میں اسے افضل العبادات کہا گیا ہے ' سرے سے ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کسی ''مذہب'' کا اور مسلمان کسی ''قوم'' کا نام نہیں ہے۔ دراصل اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک ہے جو تمام دنیا کے اجتماعی نظم (Social Order) کو بدل کر اپنے نظریہ و مسلک کے مطابق اسے تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اور مسلمان اس بین الاقوامی انقلابی جماعت (International Revolution Party) کا نام ہے جسے اسلام اپنے مطلوبہ انقلابی پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے منظم کرتا ہے اور جہاد اس انقلابی جدوجہد (Revolutionary Struggle) کا اور اس انتہائی صرف طاقت کا نام ہے 'جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اسلامی جماعت عمل میں لاتی ہے۔

تمام انقلابی مسلکوں کی طرح اسلام بھی عام مروج الفاظ کو چھوڑ کر اپنی ایک خاص اصطلاحی (Terminology) اختیار کرتا ہے تاکہ اس کے انقلابی تصورات عام تصورات سے ممتاز ہو سکیں۔ لفظ جہاد بھی اسی مخصوص اصطلاحی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلام نے حرب اور اسی نوعیت کے دوسرے عربی الفاظ جو جنگ (War) کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں ' قصداً ترک کر دیئے اور ان کی جگہ ''جہاد'' کا لفظ استعمال کیا جو (Struggle) کا ہم معنی ہے بلکہ اس سے زیادہ مبالغہ رکھتا ہے۔ انگریزی میں اس کا صحیح مفہوم یوں ادا کیا جا سکتا ہے :

(To exert One's Utmost Endeavour in Promoting a Cause) ''اپنی تمام طاقتیں کسی مقصد کی تحصیل میں صرف کر دینا''

سوال یہ ہے کہ پرانے الفاظ کو چھوڑ کر یہ نیا لفظ کیوں اختیار کیا گیا؟ اس کا جواب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ''جنگ'' کا لفظ قوموں اور سلطنتوں کی ان لڑائیوں کے لئے استعمال ہوتا تھا اور آج تک ہو رہا ہے۔ جو اشخاص یا جماعتوں کی نفسانی اغراض کے لئے لڑی جاتی ہیں۔ ان لڑائیوں کے محرک محض اپنے شخصی یا اجتماعی مقاصد ہوتے ہیں جن کے اندر کسی نظریئے اور کسی اصول کی حمایت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اسلام کی لڑائی چونکہ اس نوعیت کی نہیں ہے اس لئے وہ سرے سے اس لفظ ہی کو ترک کر دیتا ہے۔ اس کے پیش نظر ایک قوم کا مفاد یا دوسری قوم کا مفاد نہیں ہے۔ وہ اس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا کہ زمین پر ایک سلطنت کا قبضہ رہے یا دوسری سلطنت کا۔ اس کی دلچسپی جس چیز سے ہے وہ انسانیت کی فلاح ہے۔ اس فلاح کے لئے وہ اپنا ایک خاص نظریہ اور ایک عملی مسلک رکھتا ہے۔ اس نظریئے اور مسلک کے خلاف جہاں کی حکومت بھی ہے 'اسلام اسے مٹانا چاہتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی قوم ہو اور کوئی ملک ہو۔ اس کا مدعا اپنے نظریئے اور مسلک کی حکومت قائم کرنا ہے۔ بلالحاظ اس کے کہ کون اس کا جھنڈا لے کر اٹھتا ہے اور کس کی حکمرانی پر اس کی ضرب پڑتی ہے۔ وہ زمین مانگتا ہے۔ زمین کا ایک حصہ نہیں بلکہ پورا کرۂ ارض --- اس لئے نہیں کہ ایک قوم یا بہت سی قوموں کے ہاتھ سے نکل کر زمین کی حکومت کسی خاص قوم کے ہاتھ میں آ جائے۔ بلکہ صرف اس لئے

کہ انسانیت کی فلاح کا جو نظریہ اور پروگرام اس کے پاس ہے' یا بالفاظ صحیح تر یوں کہئے کہ فلاح انسانیت کے جس پروگرام کا نام ''اسلام'' ہے' اس سے تمام نوع انسانی متمتع ہو۔ اس غرض کے لئے وہ تمام ان طاقتوں سے کام لینا چاہتا ہے جو انقلاب برپا کرنے کے لئے کارگر ہو سکتی ہیں' اور ان سب طاقتوں کے استعمال کا ایک جامع نام وہ ''جہاد'' رکھتا ہے۔ زبان و قلم کے زور سے لوگوں کے نقطہ نظر کو بدلنا اور ان کے اندر ذہنی انقلاب پیدا کرنا بھی جہاد ہے۔ تلوار سے زور سے پرانے ظالمانہ نظام زندگی کو بدل دینا اور نیا عادلانہ نظام مرتب کرنا بھی جہاد ہے اور اس راہ میں مال صرف کرنا اور جسم سے دوڑ دھوپ کرنا بھی جہاد ہے۔

## ''فی سبیل اللہ'' کی لازمی قید

لیکن اسلام کا جہاد نرا ''جہاد'' نہیں ہے بلکہ ''جہاد فی سبیل اللہ'' ہے۔ ''فی سبیل اللہ'' کی قید اس کے ساتھ ایک لازمی قید ہے۔ یہ لفظ بھی اسلام کی اسی مخصوص اصطلاحی زبان سے تعلق رکھتا ہے جس کی طرف ابھی میں اشارہ کر چکا ہوں۔ اس کا لفظی ترجمہ ہے ''راہ خدا میں'' اس ترجمے سے لوگ غلط فہمی میں پڑ گئے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ زبردستی لوگوں کو اسلام کے مذہبی عقائد کا پیرو بنانا جہاد فی سبیل اللہ ہے کیونکہ لوگوں کے تنگ دماغوں میں ''راہ خدا'' کا کوئی مفہوم اس کے سوا نہیں سما سکتا۔ مگر اسلام کی زبان میں اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ ہر وہ کام جو اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے کیا جائے اور جس کے کرنے والے کا مقصد اس سے خود کوئی دنیوی فائدہ اٹھانا نہ ہو بلکہ محض خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہو' اسلام ایسے کام کو ''فی سبیل اللہ'' قرار دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ خیرات دیتے ہیں۔ اس نیت سے کہ اس دنیا میں مادی یا اخلاقی طور پر اس خیرات کا کوئی فائدہ آپ کی طرف پلٹ کر آئے تو یہ فی سبیل اللہ نہیں ہے۔ اور اگر خیرات سے آپ کی نیت یہ ہے کہ ایک غریب انسان کی مدد کر کے آپ خدا کی خوشنودی حاصل کریں تو یہ فی سبیل اللہ ہے۔ پس یہ اصطلاح مخصوص ہے ایسے کاموں کے لئے جو کامل خلوص کے ساتھ' ہر قسم کی نفسانی اغراض سے پاک ہو کر' اس نظریئے پر کئے جائیں کہ انسان کا دوسرے انسانوں کی فلاح کے لئے کام کرنا خدا کی خوشنودی کا موجب ہے اور انسان کی زندگی کا نصب العین مالک کائنات کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

''جہاد'' کے لئے بھی ''فی سبیل اللہ'' کی قید اسی غرض کے لئے لگائی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ جب نظام زندگی میں انقلاب برپا کرنے اور اسلامی نظریئے کے مطابق نیا نظام مرتب کرنے کے لئے اٹھے تو اس قیام اور اس سربازی و جاں نثاری میں اس کی اپنی کوئی نفسانی غرض نہ ہو۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہ ہو کہ قیصر کو ہٹا کر وہ خود قیصر بن جائے۔ اپنی ذات کے لئے مال و دولت' یا شہرت و ناموری' یا عزت و جاہ حاصل کرنے کا شائبہ تک اس کی جدوجہد کے مقاصد میں شامل نہ ہو۔ اس کی تمام قربانیوں اور ساری محنتوں کا مدعا صرف یہ ہو کہ بندگان خدا کے درمیان ایک عادلانہ نظام زندگی قائم کیا جائے۔ اس کے معاوضہ میں اسے خدا کی خوشنودی کے سوا کچھ بھی مطلوب نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ

–––– (۴ : ۷۶) ''جو لوگ ایمان لائے ہیں' وہ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ طاغوت کی راہ

میں لڑتے ہیں۔"

"طاغوت" کا مصدر "طغیان" ہے جس کے معنی حد سے گزر جانے کے ہیں۔ دریا جب اپنی حد سے گزر جاتا ہے تو آپ کہتے ہیں طغیانی آگئی ہے۔ اسی طرح جب آدمی اپنی جائز حد سے گزر کر اس غرض کے لئے اپنی طاقت استعمال کرتا ہے کہ انسانوں کا خدا بن جائے یا اپنے مناسب حصہ سے زائد فوائد حاصل کرے تو یہ طاغوت کی راہ میں لڑنا ہے۔

اور اس کے مقابلہ میں راہ خدا کی جنگ وہ ہے جس کا مقصد صرف یہ ہو کہ خدا کا قانون عدل دنیا میں قائم ہو' لڑنے والا خود بھی اس کی پابندی کرے اور دوسروں سے بھی اس کی پابندی کرائے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَّ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (۲۸ : ۸۳) "آخرت میں عزت کا مقام تو ہم نے صرف ان لوگوں کے لئے رکھا ہے جو زمین میں اپنی بڑائی قائم کرنا اور فساد کرنا نہیں چاہتے۔ عاقبت کی کامیابی صرف خدا ترس لوگوں کے لئے ہے۔"

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا "راہ خدا کی جنگ سے کیا مراد ہے؟ ایک شخص مال کے لئے جنگ کرتا ہے۔ دوسرا شخص بہادری کی شہرت حاصل کرنے کے لئے جنگ کرتا ہے۔ تیسرے شخص کو کسی سے عداوت ہوتی ہے یا قومی حمیت کا جوش ہوتا ہے اس لئے جنگ کرتا ہے۔ ان میں سے کس کی جنگ فی سبیل اللہ ہے؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا "کسی کی بھی نہیں۔ فی سبیل اللہ تو صرف اس شخص کی جنگ ہے جو خدا کا بول بالا کرنے کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتا۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "اگر کسی شخص نے جنگ کی اور اس کے دل میں اونٹ باندھنے کی ایک رسی حاصل کرنے کی بھی نیت ہوئی تو اس کا اجر ضائع ہو گیا۔" اللہ صرف اس عمل کو قبول کرتا ہے جو محض اس کی خوشنودی کے لئے ہو اور کوئی شخصی یا جماعتی غرض پیش نظر نہ ہو۔ پس جہاد کے لئے فی سبیل اللہ کی قید اسلامی نقطہ نظر سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مجرد جہاد تو دنیا میں سب ہی جاندار کرتے ہیں۔ ہر ایک اپنے مقصد کی تحصیل کے لئے اپنا پورا زور صرف کر رہا ہے لیکن "مسلمان"، جس انقلابی جماعت کا نام ہے اس کے انقلابی نظریات میں سے ایک اہم ترین نظریہ بلکہ بنیادی نظریہ یہ ہے کہ اپنی جان و مال کھپاؤ' دنیا کی ساری سرکش طاقتوں سے لڑو' اپنے جسم و روح کی ساری طاقتیں خرچ کر دو' اس لئے کہ دوسرے سرکشوں کو ہٹا کر تم ان کی جگہ لے لو' بلکہ صرف اس لئے کہ دنیا سے سرکشی و طغیانی مٹ جائے اور خدا کا قانون دنیا میں نافذ ہو۔

جہاد کے اس مفہوم اور فی سبیل اللہ کی اس معنویت کو مختصراً بیان کر دینے کے بعد اس دعوت انقلاب کی تھوڑی سی تشریح کرنا چاہتا ہوں جو اسلام لے کر آیا ہے تاکہ آسانی کے ساتھ یہ سمجھا جا سکے کہ اس دعوت کے لئے جہاد کی حاجت کیا ہے اور اس کی غایت (Objective) کیا ہے۔

## اسلام کی دعوت انقلاب

اسلام کی دعوت انقلاب کا خلاصہ یہ ہے :-

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ "لوگو! صرف اپنے اس رب کی بندگی کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔"

اسلام مزدوروں یا زمینداروں یا کاشت کاروں یا کارخانہ داروں کو نہیں پکارتا بلکہ تمام انسانوں کو پکارتا ہے۔ اس کا خطاب انسان سے بحیثیت انسان ہے اور وہ کہتا یہ ہے کہ اگر تم خدا کے سوا کسی کی بندگی و اطاعت اور فرماں برداری کرتے ہو تو اسے چھوڑ دو۔ اگر خود تمہارے اندر خدائی کا داعیہ ہے تو اسے بھی دماغ سے نکال دو کیونکہ دوسروں سے اپنی بندگی کرانے اور دوسروں کا سر اپنے آگے جھکوانے کا حق بھی تم میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے۔ تم سب کو ایک خدا کی بندگی قبول کرنی چاہئے اور اس بندگی میں سب کو ایک سطح پر آ جانا چاہئے۔

تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِکَ بِهٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ---- (۳ : ۶۴) "آؤ ہم اور تم ایک ایسی بات پر جمع ہو جائیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اور خداوندی میں کسی کو خدا کا شریک بھی نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے بجائے امرونہی کا مالک بھی نہ بنائے۔"

یہ عالمگیر اور کلی انقلاب کی دعوت تھی۔ اس نے پکار کر کہا کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ "حکومت سوائے خدا کے اور کسی کی نہیں ہے۔" کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ بذات خود انسانوں کا حکمران بن جائے اور اپنے اختیار سے جس چیز کا چاہے حکم دے اور جس چیز سے چاہے روک دے۔ کسی انسان کو بالذات امرونہی کا مالک سمجھنا دراصل خدائی میں اسے شریک کرنا ہے۔ اور دنیا میں یہی اصل بنائے فساد ہے۔ اللہ نے انسان کو جس صحیح فطرت پر پیدا کیا ہے اور زندگی بسر کرنے کا جو سیدھا راستہ اسے بتایا ہے اس سے انسان کے ہٹنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگ خدا کو بھول جاتے ہیں اور نتیجۃً خود اپنی حقیقت کو بھی فراموش کر دیتے ہیں۔ اس کا انجام پھر لازمی طور پر یہی ہوتا ہے کہ ایک طرف بعض اشخاص یا خاندان یا طبقے خدائی کا کھلا یا چھپا داعیہ لے کر اٹھتے ہیں اور اپنی طاقت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر لوگوں کو اپنا بندہ بنا لیتے ہیں۔ اور دوسری طرف اسی خدا فراموشی و خود فراموشی کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگوں کا ایک حصہ طاقتوروں کی خداوندی مان لیتا ہے اور ان کے اس حق کو تسلیم کر لیتا ہے کہ وہ حکم کریں اور یہ اس حکم کے آگے سر جھکا دیں۔ یہی دنیا میں ظلم و فساد اور ناجائز انتفاع (Exploitation) کی بنیاد ہے اور اسلام پہلی ضرب اسی پر لگاتا ہے۔ وہ ہانکے پکارے کہتا ہے:

وَ لَا تُطِیْعُوْا اَمْرَ الْمُسْرِفِیْنَ (۱۵۱) الَّذِیْنَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَ لَا یُصْلِحُوْنَ (۱۵۲)(۲۶ : ۱۵۱ – ۱۵۲)) "ان لوگوں کا حکم ہرگز نہ مانو جو اپنی جائز حد سے گزر گئے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔"

لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰهُ وَ کَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۱۸ : ۲۸) "اس شخص کی اطاعت ہرگز نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات نفس کا بندہ بن گیا ہے

اور جس کا کام افراط و تفریط پر مبنی ہے۔"

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (۱۸) الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا

---- (۱۹) (۱۱: ۱۸ - ۱۹) "خدا کی لعنت ان ظالموں پر جو خدا کے بنائے ہوئے زندگی کے سیدھے راستے میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں اور اس کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں۔

وہ لوگوں سے پوچھتا ہے کہ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۲: ۳۹) "یہ بہت سے چھوٹے خدا، جن کی بندگی میں تم پسے جا رہے ہو، ان کی بندگی قبول ہے، یا اس ایک خدا کی جو سب سے زبردست ہے؟ اگر اس خدائے واحد کی بندگی قبول نہ کرو گے تو ان چھوٹے اور جھوٹے خداؤں کی آقائی سے تمہیں کبھی نجات نہ مل سکے گی۔ یہ کسی نہ کسی طور سے تم پر تسلط پالیں گے، اور فساد برپا کر کے رہیں گے:

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (۲۷: ۳۴) "یہ بادشاہ جب کسی بستی میں گھستے ہیں تو اس کے نظام حیات کو تہ و بالا کر ڈالتے ہیں اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور ان کا یہی وطیرہ ہے۔"

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (۲: ۲۰۵) "اور جب وہ اقتدار پالیتا ہے تو زمین میں فساد پھیلاتا ہے۔ کھیتوں کو خراب اور نسلوں کو تباہ کرتا ہے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔"

یہاں پوری تفصیل کا موقع نہیں۔ مختصراً میں یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی دعوت توحید و خدا پرستی محض اس معنی میں ایک مذہبی عقیدے کی دعوت نہ تھی جس میں عام طور پر مذہبی عقائد کی دعوت ہوا کرتی ہے، بلکہ حقیقت میں یہ ایک اجتماعی انقلاب (Social Revolution) کی دعوت تھی۔ اس کی ضرب بلا واسطہ ان طبقوں پر پڑتی تھی جنہوں نے مذہبی رنگ میں پروہت بن کر، یا سیاسی رنگ میں بادشاہ اور رئیس اور حکمران گروہ بن کر، یا معاشی رنگ میں مہاجن اور زمیندار اور اجارہ دار بن کر عامۃ الناس کو اپنا بندہ بنا لیا تھا۔ یہ کہیں علانیہ ارباب من دون اللہ بنے ہوئے تھے۔ دنیا سے اپنے پیدائشی یا طبقاتی حقوق کی بنا پر اطاعت و بندگی کا مطالبہ کرتے تھے اور صاف کہتے تھے کہ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اور اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى اور اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ اور مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً اور کسی جگہ انہوں نے عامۃ الناس کی جہالت کو استعمال (Exploit) کرنے کے لئے بتوں اور ہیکلوں کی شکل میں مصنوعی خدا بنا رکھے تھے جن کی آڑ پکڑ کر یہ اپنے خداوندی حقوق بندگان خدا سے تسلیم کراتے تھے۔ پس کفر و شرک اور بت پرستی کے خلاف اسلام کی دعوت، اور خدائے واحد کی بندگی و معبودیت کے لئے اسلام کی تبلیغ، براہ راست حکومت اور اس کو سہارا دینے والے یا اس کے سہارے چلنے والے طبقوں کی اغراض سے متصادم ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے جب کبھی کسی نبی نے يٰقَوْمِ اعْبُدُوْا

اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ کی صدا بلند کی' حکومت وقت فوراً اس کے مقابلے میں آن کھڑی ہوئی اور تمام ناجائز انتفاع کرنے والے طبقے اس کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے ۔ کیونکہ یہ محض ایک مابعد الطبیعی قضیہ (Metaphysical Proposition) کا بیان نہ تھا' بلکہ ایک اجتماعی انقلاب کا اعلان تھا اور اس میں پہلی آواز سنتے ہی سیاسی شورش کی بو سونگھ لی جاتی تھی ۔

## اسلامی دعوت انقلاب کی خصوصیت

اس میں شک نہیں کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب انقلابی لیڈر تھے اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے انقلابی لیڈر ہیں ۔ لیکن جو چیز دنیا کے عام انقلابیوں اور ان خدا پرست انقلابی لیڈروں کے درمیان واضح خط امتیاز کھینچتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے انقلابی لوگ خواہ کتنے ہی نیک نیت کیوں نہ ہو' عدل اور توسط کے صحیح مقام کو نہیں پا سکتے ۔ وہ یا تو خود مظلوم طبقوں میں سے اٹھتے ہیں یا ان کی حمایت کا جذبہ لے کر اٹھتے ہیں اور پھر سارے معاملات کو انہی طبقوں کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں ۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر غیر جانبدارانہ اور خالص انسانیت کی نظر نہیں ہوتی بلکہ ایک طبقے کی طرف غصہ و نفرت کا اور دوسرے طبقے کی طرف حمایت کا جذبہ لئے ہوئے ہوتی ہے ۔ وہ ظلم کا ایسا علاج سوچتے ہیں جو نتیجۃ ایک جوابی ظلم ہوتا ہے ۔ ان کے لئے انتقام' حسد اور عداوت کے جذبات سے پاک ہو کر ایک ایسا معتدل اور متوازن اجتماعی نظام تجویز کرنا ممکن نہیں ہوتا جس میں مجموعی طور پر تمام انسانوں کی فلاح ہو ۔ بخلاف اس کے انبیاء علیہم السلام خواہ کتنے ہی ستائے گئے ہوں اور کتنا ہی ان پر اور ان کے ساتھیوں پر ظلم کیا گیا ہو' ان کی انقلابی تحریک میں کبھی ان کے شخصی جذبات کا اثر آنے نہیں پایا ۔ وہ براہ راست خدا کی ہدایت کے تحت کام کرتے تھے اور خدا چونکہ انسانی جذبات سے منزہ ہے' کسی انسانی طبقے سے اس کا مخصوص رشتہ نہیں' نہ کسی دوسرے انسانی طبقے سے اس کو کوئی شکایت یا عداوت ہے ۔ اس لئے خدا کی ہدایت کے تحت انبیاء علیہم السلام تمام معاملات کو بے لاگ انصاف کے ساتھ اس نظر سے دیکھتے تھے کہ تمام انسانوں کی مجموعی فلاح و بہبود کس چیز میں ہے ۔ کس طرح ایک نظام بنایا جائے جس میں ہر شخص اپنی جائز حدود کے اندر رہ سکے ۔ اپنے جائز حقوق سے متمتع ہو سکے اور افراد کے باہمی روابط' نیز فرد اور جماعت کے باہمی تعلق میں کامل توازن قائم ہو سکے ۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی انقلابی تحریک کبھی طبقاتی نزاع (Class War) میں تبدیل نہ ہونے پائی ۔ انہوں نے اجتماعی تعمیر نو (Social Reconstruction) اس طرز پر نہیں کی کہ ایک طبقے کو دوسرے طبقے پر مسلط کر دیں' بلکہ اس کے لئے عدل کا ایسا طریقہ اختیار کیا جس میں تمام انسانوں کے لئے ترقی اور مادی و روحانی سعادت کے یکساں امکانات رکھے گئے تھے ۔

## جہاد کی ضرورت اور اس کی غایت

اس مختصر مقالہ میں میرے لئے اس اجتماعی نظام (Social Order) کی تفصیلات پیش کرنا مشکل ہے جو اسلام نے تجویز کیا ہے ۔ تفصیل کا موقع انشاء اللہ عنقریب آئے گا ۔ یہاں اپنے موضوع کی حد میں رہتے ہوئے جس بات کو مجھے واضح کرنا تھا' وہ صرف یہ تھی کہ اسلام محض ایک مذہبی عقیدہ اور چند عبادات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک جامع سسٹم ہے جو دنیا سے زندگی کے تمام ظالمانہ اور مفسدانہ نظامات کو مٹانا چاہتا ہے اور ان کی جگہ اپنا ایک اصلاحی پروگرام نافذ کرنا چاہتا ہے جس کو وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے سب سے بہتر سمجھتا ہے ۔

اس تخریب و تعمیر اور انقلاب و اصلاح کے لئے وہ کسی ایک قوم یا گروہ کو نہیں بلکہ تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے۔ وہ خود ان ظالم طبقوں اور ناجائز انتفاع کرنے والے گروہوں' حتیٰ کہ بادشاہوں اور رئیسوں کو بھی پکارتا ہے کہ آؤ اس جائز حد کے اندر رہنا قبول کر لو جو تمہارے خالق نے تمہارے لئے مقرر کی ہے۔اگر تم عدل اور حق کے نظام کو قبول کر لو گے تو تمہارے لئے امن اور سلامتی ہے۔یہاں کسی انسان سے دشمنی نہیں ہے۔دشمنی جو کچھ بھی ہے 'ظلم سے ہے' فساد سے ہے' بداخلاقی سے ہے' اس بات سے ہے کہ کوئی شخص اپنی فطری حد سے تجاوز کر کے وہ کچھ حاصل کرنا چاہے جو فطرت اللہ کے لحاظ سے اس کا حق نہیں ہے۔

یہ دعوت جو لوگ بھی قبول کر لیں وہ خواہ کسی طبقے' کسی نسل' کسی قوم اور کسی ملک کے ہوں' یکساں حقوق اور مساویانہ حیثیت سے اسلامی جماعت کے رکن بن جاتے ہیں اور اس طرح وہ بین الاقوامی انقلابی پارٹی تیار ہوتی ہے جسے قرآن "حزب اللہ" کے نام سے یاد کرتا ہے اور جس کا دوسرا نام "اسلامی جماعت" یا "امت مسلمہ" ہے۔

یہ پارٹی وجود میں آتے ہی اپنے مقصد وجود کی تحصیل کے لئے جہاد شروع کر دیتی ہے۔اس کے عین وجود کا اقتضاء یہی ہے کہ یہ غیر اسلامی نظام کی حکمرانی کو مٹانے کی کوشش کرے۔اور اس کے مقابلہ میں تمدن و اجتماع کے اس معتدل و متوازن ضابطہ کی حکومت قائم کرے جسے قرآن ایک جامع لفظ "کلمتہ اللہ" سے تعبیر کرتا ہے۔اگر یہ پارٹی حکومت کو بدلنے اور اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کی کوشش نہ کرے تو اس کے وجود میں آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے' کیونکہ یہ کسی اور مقصد کے لئے بنائی ہی نہیں گئی ہے اور اس جہاد کے سوا اس کی ہستی کا اور کوئی مصرف ہی نہیں۔قرآن اس کی پیدائش کا ایک ہی مقصد بیان کرتا ہے اور وہ یہ ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (۳: ۱۱۰) "تم وہ بہترین امت ہو جسے نوع انسانی کے لئے نکالا گیا ہے۔تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔"

یہ مذہبی تبلیغ کرنے والے واعظین (Preachers) اور مبشرین (Missionaries) کی جماعت نہیں ہے بلکہ خدائی فوجداروں کی جماعت ہے۔لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ اور اس کا کام یہ ہے کہ دنیا سے ظلم' فتنہ' فساد' بداخلاقی' طغیان اور ناجائز انتفاع کو بزور مٹا دے۔ءَاَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی خداوندی کو ختم کر دے۔بدی کی جگہ نیکی قائم کرے۔

قَاتِلُوْاهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ "ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور اطاعت صرف خدا کے لئے ہو جائے۔"

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ "اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ ہو گا اور بڑا فساد برپا رہے گا۔"

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ "وہ خدا ہی ہے جس نے اپنے رسول کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کا سیدھا راستہ اور حق کی اطاعت کا صحیح

ضابطہ دے کر بھیجا ہے تاکہ تمام اطاعتوں کو مٹا کر اسی ایک اطاعت کو سب پر غالب کر دے - خواہ وہ لوگ اس پر راضی نہ ہوں جو خداوندی میں دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں -"

لہٰذا اس پارٹی کے لئے حکومت کے اقتدار پر قبضہ کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے - کیونکہ مفسدانہ نظام تمدن ایک فاسد حکومت کے بل پر ہی قائم ہوتا ہے - اور ایک صالح نظام تمدن اس وقت تک کسی طرح قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ حکومت مفسدین سے مسلوب ہو کر مصلحین کے ہاتھ میں نہ آجائے -

دنیا کی اصلاح سے قطع نظر اس جماعت کے لئے خود اپنے مسلک پر عامل ہونا بھی غیر ممکن ہے - اگر حکومت کا نظام کسی دوسرے مسلک پر قائم ہو - کوئی پارٹی جو کسی سسٹم کو برحق سمجھتی ہو' کسی دوسرے سسٹم کی حکومت میں اپنے مسلک کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتی - ایک اشتراکی مسلک کا آدمی اگر انگلستان یا امریکہ میں رہ کر اشتراکیت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہے تو کسی طرح اپنے اس ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکتا - کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام کا ضابطہ حیات حکومت کی طاقت سے بہ جبر اس پر مسلط ہو گا اور وہ اس کی قہرمانی سے کسی طرح بچ نہ سکے گا - اسی طور پر ایک مسلمان بھی اگر کسی غیر اسلامی نظام حکومت میں رہ کر اسلامی اصول پر زندگی بسر کرنا چاہے تو اس کا کامیاب ہونا محال ہے - جن قوانین کو وہ باطل سمجھتا ہے جن ٹیکسوں کو وہ حرام سمجھتا ہے' جن معاملات کو وہ ناجائز سمجھتا ہے' جس تہذیب اور جس طرز زندگی کو وہ فاسد سمجھتا ہے' جس طریق تعلیم کو وہ مہلک سمجھتا ہے' وہ سب کے سب اس پر' اس کے گھر بار پر' اس کی اولاد پر اس طرح مسلط ہو جائیں گے کہ وہ کسی طرح ان کی گرفت سے بچ کر نہ نکل سکے گا - لہٰذا جو شخص یا گروہ کسی مسلک پر اعتقاد رکھتا ہو' وہ اپنے اعتقاد کے فطری اقتضاء ہی سے اس امر پر مجبور ہوتا ہے کہ مسلک مخالف کی حکومت کو مٹانے اور اپنے مسلک کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرے' کیونکہ مخالف نظریے کی حکومت مسلط ہو تو اس صورت میں وہ خود اپنے مسلک پر عمل نہیں کر سکتا - اگر وہ اس کوشش سے غفلت برتتا ہے تو اس کا صریح مطلب یہ ہے کہ وہ درحقیقت اپنے عقائد ہی میں جھوٹا ہے -

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (٤٣) لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ -------اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (التوبہ - ۴۳ تا ۴۵) "اے نبی! خدا تمہیں معاف کرے' تم نے ان لوگوں کو جہاد کی شرکت سے علیحدہ رہنے کی اجازت کیوں دے دی؟ تمہیں اجازت نہ دینی چاہئے تھی تاکہ یہ بات تم پر کھل جاتی کہ اپنے ایمان میں سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟ جو لوگ اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو کبھی تم سے یہ درخواست نہیں کر سکتے کہ انہیں اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کرنے سے معذور رکھا جائے ...... ایسی درخواست تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخر پر -"

ان الفاظ میں قرآن نے صاف اور صریح فتویٰ دے دیا ہے کہ اپنے اعتقاد (Conviction) میں کسی جماعت کے صادق ہونے کا واحد معیار یہی ہے کہ وہ جس مسلک پر اعتقاد رکھتی ہو اس کو حکمران بنانے کے لئے جان و مال سے جہاد کرے۔ اگر تم مسلک مخالف کی حکومت کو گوارا کرتے ہو تو یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ تم اپنے اعتقاد میں جھوٹے ہو اور اس کا فطری نتیجہ یہی ہے اور یہی ہو سکتا ہے کہ آخر کار اسلام کے مسلک پر تمہارا نام نہاد عقیدہ بھی باقی نہ رہے گا۔ ابتدا میں تم مسلک مخالف کی حکومت کو بکراہت گوارا کرو گے۔ پھر رفتہ رفتہ تمہارے دل اس سے مانوس ہوتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ کراہت رغبت سے بدل جائے گی۔ اور آخر میں نوبت اس حد تک پہنچے گی کہ مسلک مخالف کی حکومت قائم ہونے اور قائم رہنے میں تم خود مددگار بنو گے 'اپنی جان و مال سے جہاد اس لئے کرو گے کہ مسلک اسلام کے بجائے مسلک غیر اسلام قائم ہو یا قائم رہے۔ تمہاری اپنی طاقتیں مسلک اسلام کے قیام کی مزاحمت میں صرف ہونے لگیں گی اور یہاں پہنچ کر تم میں اور کافروں میں اسلام کے منافقانہ دعوے 'ایک بدترین جھوٹ 'ایک پرفریب نام کے سوا کوئی فرق نہ رہے گا۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نتیجہ کو صاف، صاف بیان فرما دیا ہے۔

والذی نفسی بیده لتامرن بالمعروف ولتنهن عن المنكر ولتاخذن يد المسئی ولتطرنه علی الحق اطراء وليضربن الله قلوب بعضكم علی بعض او ليلعنكم كما لعنهم "اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' یا تو تمہیں نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا اور بدکار کا ہاتھ پکڑنا اور اسے حق کی طرف بزور موڑنا ہو گا' یا پھر اللہ کے قانون فطرت کا یہ نتیجہ ظاہر ہو کر رہے گا کہ بدکاروں کے دلوں کا اثر تمہارے دلوں پر بھی پڑ جائے اور ان کی طرح تم بھی ملعون ہو کر رہو۔

## عالمگیر انقلاب

"اس بحث سے آپ پر یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ اسلامی جہاد کا مقصود (Objective) غیر اسلامی نظام کی حکومت کو مٹا کر اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ اسلام یہ انقلاب صرف ایک ملک یا چند ملکوں میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں برپا کرنا چاہتا ہے۔ اگرچہ ابتداءً مسلم پارٹی کے ارکان کا فرض یہی ہے کہ جہاں جہاں وہ رہتے ہیں وہاں کے نظام حکومت میں انقلاب پیدا کریں۔ لیکن ان کی آخری منزل مقصود ایک عالمگیر انقلاب (World Revolution) کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کوئی انقلابی مسلک جو قومیت کے بجائے انسانیت کی فلاح کے اصول لے کر اٹھا ہو' اپنے انقلابی مطمح نظر کو کبھی ایک ملک یا ایک قوم کے دائرے میں محدود نہیں کر سکتا بلکہ وہ اپنی فطرت کے عین اقتضاء ہی سے مجبور ہے کہ عالمگیر انقلاب کو اپنا مطمح نظر بنائے۔ حق جغرافی حدود کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ میں اگر کسی پہاڑ یا دریا کے اس پار حق ہوں تو اس پار بھی حق ہی ہوں۔ نوع انسانی کے کسی حصہ کو بھی مجھ سے محروم نہ رہنا چاہئے۔ انسان جہاں بھی ظلم و ستم کا اور افراط و تفریط کا تختہ مشق بنا ہوا ہے وہاں اس کی مدد کے لئے پہنچنا میرا فرض ہے۔ اسی تخیل کو قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ

وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا (۴ : ۷۵) "تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں ان مردوں' عورتوں اور بچوں کے لئے نہیں لڑتے جنہیں کمزور پاکر دبالیا گیا ہے اور جو دعائیں مانگتے ہیں کہ خدایا ہمیں اس بستی سے نکال جس کے کارفرما ظالم ہیں۔

علاوہ بریں قومی اور ملکی تقسیمات کے باوجود انسانی تعلقات و روابط کچھ ایسی عالمگیری اپنے اندر رکھتے ہیں کہ کوئی ایک مملکت اپنے اصول و مسلک کے مطابق پوری طرح عمل نہیں کر سکتی جب تک کہ ہمسایہ ممالک میں بھی وہی اصول و مسلک رائج نہ ہو جائے۔ لہٰذا مسلم پارٹی کے لئے اصلاح عمومی اور تحفظ خودی دونوں کی خاطر یہ ناگزیر ہے کہ کسی ایک خطہ میں اسلامی نظام کی حکومت قائم کرنے پر اکتفاء نہ کرے بلکہ جہاں تک اس کی قوتیں ساتھ دیں۔ اس نظام کو تمام اطراف میں وسیع کرنے کی کوشش کرے۔ وہ ایک طرف اپنے افکار و نظریات کو دنیا میں پھیلائے گی اور تمام ممالک کے باشندوں کو دعوت دے گی کہ اس مسلک کو قبول کریں جس میں ان کے لئے حقیقی فلاح مضمر ہے۔ دوسری طرف اگر اس میں طاقت ہوگی تو وہ لڑکر غیر اسلامی حکومتوں کو مٹا دے گی اور ان کی جگہ اسلامی حکومت قائم کرے گی۔

یہی پالیسی تھی جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے عمل کیا۔ عرب' جہاں مسلم پارٹی پیدا ہوئی تھی سب سے پہلے اسی کو اسلامی حکومت کے زیر نگیں کیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف کے ممالک کو اپنے اصول و مسلک کی طرف دعوت دی۔ پھر جب ان کے برسر اقتدار لوگوں نے اس دعوت اصلاح کو رد کر دیا تو آپ ؐ نے ان کے خلاف جنگی کارروائی کا تہیہ کر لیا۔ غزوۂ تبوک اسی سلسلہ کی ابتداء تھی۔ آنحضرت ؐ کے بعد جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پارٹی کے لیڈر ہوئے تو انہوں نے روم اور ایران دونوں کی غیر اسلامی حکومتوں پر حملہ کیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حملے کو کامیابی کے آخری مراحل تک پہنچایا۔ (۱)

دین اسلام کی اس تشریح اور اس کی ماہیت اور دین کے اندر جہاد کی اہمیت کے بارے میں سید مودودی ؒ کے اس بیان کی روشنی میں اور جہاد کے مراحل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی انقلاب کے منہاج اور اس کے تحریکی منصوبے کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ہمارے لئے یہ آسان ہے کہ ہم بدر الکبریٰ کے بارے میں کلام کریں جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے کہ وہ یوم الفرقان ہے۔ نیز اس کے بعد ہم سورہ انفال پر ایک طائرانہ نظر بھی ڈال سکتے ہیں جو غزوۂ بدر کے بارے میں نازل ہوئی۔

بدر تحریک جہاد اسلامی کا پہلا قدم نہ تھا' جیسا کہ ہم نے بتایا۔ اس سے پہلے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کئی سرایا ارسال کر چکے تھے۔ ہاں ان میں ماسوائے ایک کے کسی میں جنگ نہ ہوئی تھی۔ جس سریہ میں جنگ ہوئی تھی وہ سریہ عبداللہ ابن جحش ہے' جو ماہ رجب میں ہجرت کے سترہ ماہ بعد ہوئی تھی۔ اور تمام سرایا اس پالیسی کے مطابق تھیں جس کے اوپر اسلام کا نظریہ جہاد قائم تھا اور جس کے بارے میں ہم اس سے قبل تفصیلاً بحث کر آئے ہیں۔

(۱) (جہاد فی سبیل اللہ - سید مودودی ؒ ص ۳ تا ۴)

یہ تمام سرایا یا چھاپہ مار دستے اہل قریش کے خلاف بھیجے گئے تھے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور دوسرے معزز مسلمانوں کو مکہ سے نکالا تھا اور جنہوں نے بیت اللہ کی حرمت کا بھی پاس نہ رکھا۔ حالانکہ بیت اللہ کی حرمت دور جاہلیت اور دور اسلام دونوں میں قائم تھی۔ البتہ یہ سبب اسلام کے نظریہ جہاد میں کوئی اصولی سبب نہ تھا۔ اسلامی جہاد کا اصل سبب اور مقصد یہ اعلان کرنا تھا کہ کوئی انسان بھی آئندہ کے لئے غیر اللہ کا بندہ نہ ہو گا' آئندہ کے لئے سب لوگ صرف اللہ کے بندے ہوں گے۔ ان کا حاکم صرف اللہ ہو گا اور پوری زمین پر اس کی حکومت چلے گی۔ ان تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا جائے گا جو لوگوں کو غلام بناتے ہیں اور عوام الناس کو ان کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی غلامی میں داخل کیا جائے گا اور جزیرۃ العرب میں اہل قریش ہی وہ بڑے طاغوت تھے جو اس راہ میں حائل تھے کہ لوگ آزادانہ طور پر اللہ کی بندگی میں داخل ہوں اور اس کے سوا کسی کے غلام نہ ہوں۔ لہٰذا اسلام کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ اس طاغوت کو چیلنج کرے اور یہ چیلنج اس کی عمومی پالیسی کے بالکل مطابق تھا جبکہ ضمناً اس کے نتیجے میں اہل قریش کے اس ظلم اور زیادتی کا بدلہ بھی ہو گیا جو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف روا رکھا تھا۔ نیز ضمناً یہ مقصد بھی حاصل ہو گیا کہ اہل قریش دارالاسلام مدینہ کے خلاف جارحیت کا ارتکاب نہ کر سکیں۔ جب ہم قریش کے خلاف کارروائی کے ان فوری اسباب کی بات کریں تو ہمارے ذہن میں دین اسلام کا اصل منصوبہ اور اسلام کے نظریہ جہاد کی اصل غرض و غایت بھی موجود رہنا چاہئے۔ اس لئے اسلام کا اصل نظریہ جہاد اس دین کا حتمی تقاضا ہے۔ اصل پالیسی اور غرض و غایت یہ ہے کہ اس کرۂ ارض کے اوپر کوئی طاغوت موجود نہ ہو جو اللہ کے حق بادشاہت کا کوئی حصہ اپنے لئے مخصوص کرتا ہو اور جو اللہ کے بندوں کو اللہ کی بادشاہت کے سوا کسی اور نظام کا پابند بنا رہا ہو۔

غزوہ بدر کے اصل واقعات کو یہاں ہم تفصیلات کے ساتھ اس لئے دے رہے ہیں کہ سورہ انفال سے پہلے ہمارے مطالعہ کی فضا مکمل طور پر اس جنگی ماحول کے رنگ میں رنگ جائے اور اس مطالعہ میں ہمیں نصوص کا اصل ہدف اچھی طرح معلوم ہو جائے۔ نیز یہ معلوم ہو کہ ان واقعات پر نصوص قرآن نے کیا تبصرہ کیا اور واقعات سے کیا نصیحت اخذ کی گئی ہے۔ اس لئے کہ قرآن کے نصوص کو ہم صرف ڈکشنری اور لغوی مفہوم کی مدد سے نہیں سمجھ سکتے جب تک پورا بیک گراؤنڈ ہمارے پیش نظر نہ ہو۔ آیات کو سمجھنے کے لئے ہمیں چاہئے کہ ہم عملاً ان حالات میں داخل ہو کر بس جائیں اور ایسی فضا پیدا کر دیں کہ گویا تحریک اب بھی برپا ہے اور مثبت طور پر کام کر رہی ہے اور آیات ایک عملی اور زندہ صورت حال کے مقابلے میں اتر رہی ہیں۔ اگرچہ ان کے اثرات اس تاریخی صورت حال سے زیادہ گہرے اور دور رس ہیں اور یہ تاریخی صورت حال ہی ہے جو ان آیات کے اندر وسعت اور دور رس مفہوم پیدا کرتی ہے۔ اس کے بعد ان آیات میں انسان کے لئے دائمی راہنمائی پائی جاتی ہے اور وہ ہر دور میں موثر رہتی ہیں۔ لیکن یہ اثرات مرتب تب ہوتے ہیں کہ لوگ عملاً اس دین کے مطابق حرکت کریں اور ان نصوص سے وہ ہدایات اخذ کریں جو وہ لوگ اخذ کرتے تھے جن پر قرآن نازل ہوا تھا۔ اور ان کو ایسے ہی حالات سے سابقہ درپیش ہو جس طرح کے حالات نزول قرآن کے وقت درپیش تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے اسرار ان لوگوں پر نہیں کھلتے جو نکمے بیٹھے ہوتے ہیں اور وہ کسی تحریک کے بجائے محض لغت اور بیان کے ذریعے قرآن کی تشریحات کرتے ہیں۔ ابن اسحاق کہتے ہیں :

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ ابو سفیان شام سے قریش کا ایک عظیم قافلہ لے کر واپس آ رہے ہیں۔ اس

قافلے کے ساتھ قریش کے مال اور تجارتی سازوسامان تھا۔تیس یا چالیس قریشی بھی قافلے میں موجود تھے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مسلم زہری' عاصم ابن عمر ابن قتادہ' عبداللہ ابن ابوبکر' یزید ابن رومان' عروہ ابن الزبیر وغیرہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایات نقل کی ہیں۔ان سب نے مجھے واقعات کے بعض حصے بتائے۔بدر کے واقعات کے بارے میں انہوں نے جو بتایا وہ یہ تھا۔

جب حضورؐ کو یہ معلوم ہوا کہ ابوسفیان شام سے ایک بڑا قافلہ لے کر آ رہا ہے تو آپ نے لوگوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اس قافلے پر حملہ کریں۔آپ نے فرمایا"قریش کا یہ قافلہ آ رہا ہے۔اس میں قریش کا سامان ہے۔آپ اس کی طرف بڑھیں شاید اللہ ان اموال سے تمہیں بہرہ مند کر دے۔" لوگوں نے تیاری کی اور اس معاملے میں بعض لوگوں نے چستی دکھائی اور بعض نے کاہلی سے کام لیا' اس لئے کہ ان کو یہ یقین نہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی جنگ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ زاد المعاد اور امتاع الاسماع میں ہے کہ حضورؐ نے صرف ان لوگوں کو نکلنے کا حکم دیا تھا جن کی سواریاں موجود تھیں۔اور سب لوگوں کے نکلنے کا کوئی اہتمام نہ فرمایا تھا۔ابن قیم فرماتے ہیں کل افراد تین سو دس سے کچھ اوپر تھے۔ان میں سے ۸۶ مہاجر تھے۔اوس کے ۶۱ تھے اور خزرج کے ۱۷۰ تھے۔اوس کی تعداد کم تھی۔اگرچہ وہ خزرج کے مقابلے میں زیادہ' جنگجو اور اہل قوت تھے۔اس لئے کہ ان کی رہائش گاہیں مدینہ کے ارد گرد تھیں۔اور قافلے کے لئے نکلنے کا اعلان اچانک ہو گیا تھا اور حضورؐ کا حکم یہ تھا کہ جس کی سواری موجود نہ ہو تو وہ ہمارے ساتھ نہ جائے۔ بعض لوگوں نے یہ عرض کی کہ ان کی سواریاں مدینہ کے مضافات میں ہیں۔اس لئے آپ قدرے تاخیر کر لیں تاکہ وہ سواریاں لے آئیں لیکن حضورؐ نے تاخیر کرنے سے انکار کر دیا۔اس لئے کہ جنگ کرنے کا کوئی مصمم ارادہ نہ تھا۔اور نہ مسلمانوں نے جنگ کے لئے کوئی تیاری کی تھی۔نہ سامان جنگ جمع کیا تھا۔لیکن اللہ کی مرضی یہ تھی کہ مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان قبل از وقت معرکہ ہو جائے۔"

ابوسفیان رئیس قافلہ جب مدینہ کے قریب ہوا تو وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں چوکنا تھا۔راستے میں اسے جو سوار بھی ملتے وہ ان سے معلومات حاصل کرتا۔وہ لوگوں کے مال کے بارے میں بہت ہی فکرمند تھا جو اس کی تحویل میں قافلے کے پاس تھے۔راستے میں ملنے والے بعض سواروں سے اسے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو تمہارے اور تمہارے قافلے کے خلاف نکالا ہے۔اس لئے آپ محتاط رہیں۔اس نے ضمضم ابن عمرو غفاری کی خدمات حاصل کیں اور انہیں مکہ کو بھیجا۔اسے حکم دیا کہ وہ مکہ پہنچ کر قریش کو ان کی اس دولت کے بچانے کے لئے نکالے۔اہل مکہ کو اطلاع دیں کہ محمد نے اپنے ساتھیوں کو لے کر ہماری راہ روک لی ہے۔ضمضم ابن عمرو برق رفتاری کے ساتھ مکہ پہنچے۔

علامہ مقریزی امتاع الاسماع میں لکھتے ہیں' اہل مکہ کو تب ہی معلوم ہوا جب ضمضم نے چلا کر کہا:"اے قریش! لوی ابن غالب کے فرزندو! لطیمہ قافلہ کی مدد کو پہنچو (عرب لطیمہ اس قافلے کو کہتے تھے جس میں صرف آرائش و زیبائش کا سامان ہو۔مثلاً خوشبوئیں' کستوری' کپڑے' لیکن اس میں کریانہ اور دوسری کھانے کی چیزیں نہ ہوں۔(یعنی نہایت ہی قیمتی سامان تجارت) محمد کے ساتھیوں نے اس کی راہ روک لی ہے اور مجھے یقین نہیں ہے کہ تم اسے پا سکو۔" یہ اعلان اس نے ایسے حالات میں کیا کہ اس نے اپنی اونٹنی کے کان کاٹ دیئے تھے' اپنی قمیص پھاڑ دی تھی اور اپنے اونٹ کا

کچاوہ الشاکر دیا تھا۔ قریش کے لئے فوراً امداد کے لئے نکلنے کے سوا اب کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ وہ نکلے اور سہل اور دشوار گزار گھاٹیوں سے ہوتے ہوئے انہوں نے صرف تین دنوں میں تیاری مکمل کی۔ بعض روایات میں ہے کہ انہوں نے صرف دو دن کے اندر تیاری کر لی۔ جو لوگ اصحاب وسائل تھے، انہوں نے ناداروں کی امداد کی' سہیل ابن عمرو' زمعہ ابن الاسود' طعیمہ ابن عدی' حنظلہ ابن ابو سفیان اور عمر ابن ابو سفیان بہت تیز تھے اور لوگوں کو نکلنے کے لئے ابھار رہے تھے۔ "غالب کی اولاد! تم محمد اور یثرب کے صابیوں کے ہاتھوں اپنے قافلوں اور مالوں کو لٹتا دیکھ سکتے ہو' جو مال چاہتا ہے تو یہ ہے مال' جو سامان چاہتا ہے تو یہ ہے سامان۔" یہ تھی تقریر سہیل کی۔ اسی سہیل کے بارے میں امیہ ابن الصلت چند مدحیہ اشعار کہے ہیں۔ نوفل ابن معاویہ الدیلی اہل قریش کے مالداروں کے پاس گیا۔ انہوں نے ان کے اس قافلے کو بچانے کے لئے لشکر کے اخراجات اور ٹرانسپورٹ کے بارے میں بات کی۔ (انہوں نے اخراجات کے لئے ان سے خصوصی چندے کی اپیل کی) یہ ان لوگوں کے لئے جو جانا چاہتے تھے۔ عبداللہ ابن ابو ربیعہ نے کہا "یہ لو پانچ صد دینار' جہاں چاہو خرچ کرو" اس نے حویطب ابن عبدالعزی سے دو صد دینار لئے۔ اور تین صد دینار کا اسلحہ اور سواری اس نے فراہم کی۔ اس نے طعیمہ ابن عدی کو بیس اونٹ دیئے اور ان کے خاندان کو بھی امداد دی۔ قریش میں سے جو شخص اس مہم سے پیچھے رہتا تھا وہ اپنی جگہ کسی شخص کو بھیجتا۔ ان لوگوں نے ابولہب کو آمادہ کیا کہ وہ اس مہم پر نکلے مگر اس نے انکار کر دیا۔ اور یہ بھی نہ کیا کہ اپنی جگہ دوسرے کو بھیجے۔ یہ روایت ہے کہ اس نے اپنی جگہ ایک عاص ابن ہشام ابن مغیرہ کو بھیجا۔ عاص پر ان کا قرضہ تھا۔ ابولہب نے کہا تم میری جگہ جاؤ اور تمہارا قرضہ معاف۔ چنانچہ ان کی جگہ عاص گیا۔ شیبہ اور عتبہ پسران ربیعہ کو ان کے غلام عداس نے ملامت کی اور اس مہم پر جانے سے روک دیا (عداس وہ شخص ہے کہ جب حضور ؐ طائف کو گئے اور وہاں کے لوگوں نے آپ کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہوئے گاؤں کے اوباش آپ کے پیچھے لگا دیئے اور انہوں نے حضور ؐ پر سنگ باری کر کے آپ کو زخمی کر دیا اور آپ نے عتبہ اور شیبہ کے باغ میں پناہ لی تو اس وقت عتبہ اور شیبہ نے انگوروں کے گچھے عداس کے ہاتھ آپ کے لئے بھیجے۔ عداس حضور ؐ سے بہت ہی متاثر ہوا اور آپ کے ہاتھ اور پاؤں چوم لئے) اس طرح اس غلام نے عاص ابن منبہ ابن الحجاج' ابو امیہ ابن خلف کو بھی اس مہم پر جانے سے روک دیا۔ جب عقبہ ابن ابو معیط اور ابوجہل کو اس کا علم ہوا تو وہ آئے اور انہوں نے عداس کو سخت سست کہا۔ اس پر امیہ ابن خلف نے کہا کہ میرے لیے وادی مکہ کا بہترین اونٹ خریدو۔ چنانچہ اس کے لئے نعیمہ بنی قشیر سے تین صد درہم قیمت کا اونٹ خریدا گیا۔ اور اس جنگ کے بعد وہ مسلمانوں کو مال غنیمت میں ملا۔ حارث ابن عامر سب سے زیادہ بوجھل پاؤں کے ساتھ نکلے۔ ایک شخص ضمضم ابن عمر نے خواب میں دیکھا کہ وادی مکہ کے اوپر سے بھی خون کا سیلاب آیا ہوا ہے اور نیچے سے بھی اور عاتکہ بنت عبدالمطلب نے ایسے خواب دیکھے جن کی تعبیر یہ بنتی تھی کہ قریش کے ہر گھر میں سے کوئی نہ کوئی مارا جائے گا یا زخمی ہو گا۔ اس لئے سمجھدار لوگ اس لشکر پر نکلنے کو پسند نہ کرتے تھے۔ اس لئے بعض لوگ دوسروں کے پاس گئے بھی۔ چنانچہ سب سے زیادہ سست حارث ابن عامر' امیہ ابن خلف اور عتبہ و شیبہ پسران ربیعہ تھے۔ نیز حکیم ابن حزام اور ابوالبختری ابن ہشام علی ابن امیہ ابن خلف' عاص ابن منبہ۔ ان لوگوں پر ابوجہل نے بہت کام کیا اور آمادہ کیا اور عقبہ ابن ابو معیط' نضر ابن حارث ابن کلدہ نے اس کی امداد کی اور تب جا کر وہ اس لشکر کشی پر آمادہ ہوئے۔ قریش نے اپنے سات گانے والیوں اور گانے بجانے کے سامان بھی لئے جہاں بھی لشکر رکتا یہ لوگ گاتے

بجاتے ' اونٹ ذبح کرتے ' سات سو پچاس افراد لڑنے والے تھے ۔ ان کے پاس سو گھوڑے ' جن پر سازوسامان سے لیس سو افراد تھے ۔ ان کے علاوہ بھی پیدل زرہ پوش بھی تھے ۔ ان کے پاس سات سو اونٹ تھے ۔ ان کے حالات اس طرح تھے جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں بتایا ۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (۸ : ۴۷) "اور دیکھو ان لوگوں جیسے نہ بنو جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور شان دکھاتے ہوئے نکلے حالانکہ ان کا موقف یہ ہے کہ وہ لوگوں کو خدا کی راہ سے روکتے ہیں اور وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ ان کو گھیرے ہوئے ہے ۔"

اہل قریش کی یہ عظیم جمعیت سوئے مدینہ روانہ ہوئی ' ان کے دل حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کے خلاف بغض سے بھرے ہوئے تھے ۔ اس لئے کہ وہ ان کے عظیم قافلے کو لوٹنا چاہتے تھے ۔ اس سے پہلے مسلمان عمرو ابن الحضرمی کے قافلے کو لوٹ چکے تھے ( سریہ عبداللہ ابن جحش میں ) ابوسفیان جس قافلے کو لے کر آرہا ہے اس کی حفاظت کے لئے ستر آدمی تھے اور ابن اسحاق کی روایت کے مطابق صرف تیس آدمی تھے ۔ ان میں مخرمہ ابن نوفل اور عمرو ابن العاص بھی تھے ۔ قافلہ ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل تھا ۔ اور سب سامان سے لدے ہوئے تھے ۔ جب یہ قافلہ مدینہ کے قریب پہنچا تو انہیں بہت بڑا خوف دامن گیر ہو گیا ۔ وہ ضمضم اور قریش کے امدادی لشکر کو لیٹ سمجھ کر مایوس ہو گئے ۔ بدر کے قریب ابوسفیان قافلے سے آگے ہو گئے ۔ وہ اس بات سے خوفزدہ تھے کہ شاید مسلمان گھات میں بیٹھے ہوں گے ۔ اس نے قافلے کا رخ موڑ دیا ۔ مدینہ کے راستے سے آگے جاکر ساحل کی طرف نکل گیا ۔ بدر کو اپنے بائیں طرف چھوڑ دیا اور بہت ہی تیزی سے اس نے یہ راستہ طے کیا ۔ قریش جب مدینہ کی طرف آئے تو ہر گھات پر گاتے بجاتے اور کھاتے پیتے جاتے تھے ۔ اونٹ ذبح کرتے ۔ ابوسفیان نے اپنا ایک پیغام لانے والا بھیجا یعنی قیس ابن امرالقیس اور قریش کے لشکر کو مشورہ دیا کہ اب وہ واپس آجائیں اور یہ کہ ان کا قافلہ بچ کر نکل آیا ہے ' اس لئے مناسب نہیں ہے کہ تم اہل یثرب کے ہاتھوں قربانی کا بکرا بنو ۔ اپنے آپ کو خواہ مخواہ ذبح نہ کرو ۔ اس لئے کہ قافلے سے زیادہ مزید تمہیں کسی جنگ کی ضرورت نہیں ہے ۔ اس لئے کہ تم قافلے کے بچاؤ اور اپنے اموال کے بچاؤ کے لئے نکلے تھے اور یہ چیزیں اللہ نے بچا دی ہیں ۔ قیس نے بہت کوشش کی مگر قریش نے انکار کر دیا اور اس وقت ان کا لشکر جحفہ پہنچ چکا تھا ۔ ابوجہل نے کہا : "خدا کی قسم ہم ہرگز نہ لوٹیں گے ۔ ہم بدر تک ضرور جائیں گے ۔ تین دن رہیں گے ' اونٹ ذبح کریں گے ' کباب کھائیں گے اور شراب پئیں گے اور گانے والیاں ہم پر گائیں گی اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمام عرب ہم سے خائف ہوں گے ۔ قیس واپس ہوا اور اس نے اطلاع دی کہ قریش آگے بڑھ گئے ۔ ابوسفیان چیخا : "اے بدبخت قوم ! یہ ابوجہل کا فیصلہ ہو گا ۔ وہ رئیس قوم ہے ' اس کی یہ سرکشی ' بدشگونی اور کمزوری ہے اور اگر محمد نے اس لشکر کو مار لیا تو ہم ہمیشہ کے لئے ذلیل ہو جائیں گے ۔"

ابن اسحاق کی روایت کے مطابق ' اخنس ابن شریق ابن عمرو ' ابن وهب ثقفی نے بنی زہرہ سے کہا جبکہ وہ جحفہ میں تھے : "اے بنی زہرہ ' اللہ نے تمہارا مال بچا لیا ہے اور تمہارے سردار مخرمہ ابن نوفل بھی بچ گئے ہیں اور تم لشکر کے ساتھ اس لئے نکلے تھے کہ اسے اور اس کے مال کو بچاؤ ' اس لئے تم اس جنگ میں عدم شمولیت کی بزدلی میرے کھاتے میں

ڈال دو اور واپس ہو جاؤ اس لئے کہ بغیر نقصان کے لشکر کشی کرنا تمہارے لئے ضروری نہیں ہے اور ابو جہل کی بات نہ سنو۔" یہ لوگ واپس ہو گئے' اس لشکر میں کوئی ایک زہری بھی نہ تھا۔ ان کے علاوہ قریش کا کوئی قبیلہ نہ تھا جس سے لوگ نہ نکلے ہوں' ماسوائے بنی عدی ابن کعب کے جن کے بارے میں آیا ہے کہ ان میں سے کوئی نہیں گیا (امتاع الاسماع کی روایت یہ ہے کہ طعیمہ ابن عدی نے بیس اونٹوں پر لوگوں کو سوار کیا۔ اور انہیں امداد دی اور گھر کے لئے بھی اخراجات فراہم کئے۔ طالب ابن ابو طالب اور بعض قریش کے درمیان مکالمہ ہوا۔ لوگوں نے کہا کہ اے بنی ہاشم ہمیں یقین ہے کہ اگر تم ہمارے لشکر میں بھی نکلو لیکن تمہاری ہمدردیاں بہرحال حضرت محمد ؐ کے ساتھ ہیں۔ اس پر طالب ابن ابو طالب اپنے آدمیوں کو لے کر مکہ چلے گئے۔

ابن اسحاق کی روایت کے مطابق حضور ؐ رمضان شریف کی چند راتوں کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ نکلے تھے۔ حضور ؐ کے ساتھیوں کے پاس کل ستر اونٹ تھے اور یہ لوگ باری باری ان پر سوار ہوتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم' حضرت علی اور مرثد ابن ابو مرثد ایک اونٹ پر باری باری سوار ہوتے تھے۔ حمزہ ابن عبدالمطلب' زید ابن حارثہ' ابوکبشہ اور انس جو رسول اللہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ایک اونٹ پر باری باری سوار ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکر' حضرت عمر اور عبدالرحمٰن ابن عوف ایک اونٹ پر باری باری سوار ہوتے تھے۔

حضور ؐ تشریف لے گئے۔ جب بدر کے قریب پہنچے تو آپ کو قریش کی لشکر کشی کی اطلاع مل گئی۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشورہ کیا۔ حضرت ابوبکر اٹھے اور بہترین باتیں کیں۔ حضرت عمر اٹھے اور آپ نے بھی بہترین مشورے دیئے۔ حضرت عمر نے کہا کہ یہ معاملہ قریش کی عزت کا ہے اور قریش کو بھی ذلت اٹھانی نہیں پڑی اور اس نے جب کفر کرنا شروع کیا ہے تو اس نے آج تک تسلیم نہیں کیا اور چونکہ یہ اس کی عزت کا مسئلہ ہے اس لئے وہ کبھی بھی اپنی عزت کے معاملے سے ہاتھ نہ کھینچیں گے۔ قریش خواہ مخواہ آپ سے لڑیں گے اس لئے مناسب ہے کہ ہم جنگ کے لئے تیار ہو جائیں اور وقت ضائع کیے بغیر تیاری شروع کر دیں۔ اس کے بعد مقداد ابن عمرو اٹھے اور کہا: "رسول اللہ! آپ خدا کے حکم کے مطابق آگے بڑھیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں اور خدا کی قسم ہم وہ بات ہرگز نہ کریں گے جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کی تھی: "جاؤ تم اور تمہارا رب اور لڑو' ہم تو ادھر ہی بیٹھے ہیں۔" ہم تو یہ کہیں گے "جاؤ تم اور تمہارے رب اور لڑو اور ہم تمہارے لڑنے والوں میں سے ہیں۔ خدا کی قسم آپ اگر ہمیں برک الغماد تک لے جائیں تو ہم پھر بھی جانے کے لئے تیار ہیں۔ (برک الغماد یمن کے ساحل پر جگہ ہے) حضور ؐ نے اسے بہت شاباش دی اور ان کے لئے دعا کی۔ اس کے بعد آپ نے پھر لوگوں سے کہا کہ براہ کرم اپنی ضمیر کی بات ظاہر کرو۔ آپ کا اشارہ انصار کی طرف تھا۔ آپ کا خیال یہ تھا کہ شاید انصار اس جنگ میں حصہ نہ لیں اس لئے کہ انصار نے جو معاہدہ کیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ حضور کی مدافعت اس حد تک جس حد تک وہ اپنی اولاد اور مال کی مدافعت کرتے تھے کریں گے یعنی مدینہ کے اندر اندر۔ یعنی بیعت عقبہ ثانیہ میں جب انہوں نے حضور ؐ کے ساتھ معاہدہ کیا تو اس کے الفاظ میں یہ بات تھی جس کی اساس پر آپ نے ہجرت فرمائی تھی۔ اس دعوت پر حضرت سعد ابن معاذ تھے۔ انہوں نے کہا حضور ؐ انصار کی طرف سے میں جواب دیتا ہوں۔ حضور ؐ آپ گویا ہم سے مشورہ چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں میری مراد تم سے ہے۔ انہوں نے کہا کہ ممکن ہے کہ آپ کسی ایسے معاملے میں نکل پڑے ہیں جس کے بارے میں شاید آپ کو بذریعہ وحی ہدایت نہیں ہوئی یا

وحی کسی دوسرے معاملے میں آئی تھی (یعنی آپ ایسے معاملے کے لئے نکل گئے ہیں جس کے متعلق وحی نہ تھی اور وحی دوسرے معاملے کے بارے میں تھی 'یعنی آپ قافلے کی غرض سے نکلے تھے 'اب معاملہ لشکر کا ہے ) ہم تو آپ پر ایمان لائے ہیں 'آپ کی تصدیق کی ہے اور آپ پر جو کلام اترا ہے اس کی شہادت دی ہے کہ وہ حق ہے۔ ہم نے آپ کے ساتھ پختہ وعدے کئے ہیں اور ہم نے یہ پیمان باندھا ہے کہ ہم سمع و اطاعت کریں گے حتی المقدور۔ اس لئے آپ جو چاہتے ہیں 'کر گزریں۔ خدا کی قسم اگر آپ ہمیں حکم دیں کہ اس سمندر میں کود پڑو تو ہم کود پڑیں گے اور ہم میں سے کوئی شخص بھی پیچھے نہ رہے گا۔ آپ جس کے ساتھ چاہیں جڑیں 'جس کے ساتھ چاہیں قطع تعلق کریں 'ہماری دولت حاضر ہے۔ اس میں سے جو چاہیں لیں اور ہمارے مال سے آپ جو چیز لیں گے 'وہ ہمیں اس سے زیادہ محبوب ہوگی جو آپ چھوڑیں گے۔ اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے 'میں اس راہ پر کبھی نہیں آیا اور نہ میں اس کے بارے میں زیادہ علم رکھتا ہوں۔ ہم اس بات کو ناپسند نہیں کرتے کہ کل ہم اپنے دشمن کے ساتھ ٹکرا جائیں۔ ہم ایسے لوگ ہیں کہ جنگ میں صبر کرنے والے ہیں۔ سچی لڑائی لڑتے ہیں 'ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ذریعہ آپ کو ایسی باتیں دکھائے گا جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ سعد ابن معاذ ؓ نے فرمایا: ہم مدینہ میں بعض ایسے لوگوں کو چھوڑ آئے ہیں جو حقیقتاً ہم سے آپ کو زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ اور ہم سے زیادہ وہ آپ کے مطیع فرمان ہیں۔ لیکن وہ لوگ اس لئے نہیں آئے کہ انہوں نے سمجھا کہ شاید آپ کی مڈبھیڑ قافلے سے ہوگی۔ ہم آپ کے لئے ایک چبوترہ بناتے ہیں۔ آپ اس میں ٹھہریں گے اور ہم آپ کے پاس آپ کی سواریوں کو تیار رکھیں گے اور اس کے بعد ہم دشمن سے لڑیں گے۔

اگر اللہ نے ہمیں غالب کر دیا اور عزت بخشی تو یہ تو ہماری پسندیدہ مراد ہوگی اور اگر ہم کسی دوسرے انجام سے دوچار ہوگئے تو آپ سواری پر بیٹھ کر مدینہ پہنچ جائیں گے اور پیچھے آنے والوں کے ساتھ مل جائیں گے۔ حضور ؐ نے آپ کے لئے دعائے خیر کی اور فرمایا: "سعد' اللہ تعالیٰ اس سے بھی کوئی اچھا فیصلہ کر دے گا۔" جب سعد مشورہ سے فارغ ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ ان دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کیا ہے اور خدا کی قسم میں ان لوگوں کے مقامات قتل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔" لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ بس اب ان کو جنگ کرنی ہوگی۔ اور یہ کہ قافلہ جا چکا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں فتح کی امید پیدا ہوگئی کیونکہ حضور ؐ کے کلام میں اس کی طرف اشارہ تھا۔ آج حضور ؐ نے جھنڈے بلند کئے۔ تین جھنڈے بلند کئے گئے۔ ایک جھنڈا مصعب ابن عمیر کے ہاتھ میں تھا' دو سیاہ جھنڈے تھے ایک علی کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا انصار میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں تھا۔ (سعد بن معاذ تھے ) آپ نے اسلحہ ظاہر کر دیا۔ آپ جب مدینہ سے نکلے تھے تو اس وقت جھنڈے بلند نہ کئے گئے تھے۔

حضور ؐ میدان بدر کے نچلے حصے میں جمعہ کے دن پہنچے۔ رمضان شریف کے سترہ دن گزر چکے تھے۔ آپ نے حضرت علی 'حضرت زبیر 'سعد ابن ابی وقاص اور ---- ابن عمر رضی اللہ عنہم کو پانی کی تلاش میں بھیجا۔ آپ نے ایک چھوٹی سی پتھریلی پہاڑی کی طرف اشارہ فرمایا اور کہا شاید تم اس پہاڑی کے پاس موجود کنویں پر کچھ خبریں پاؤ گے۔ جب یہ لوگ اس کنویں پر پہنچے تو وہاں انہوں نے قریش کے پانی بردار اونٹ اور سقے پائے اور پکڑ لیا۔ عام لوگ بھاگ گئے اور ان میں ایک شخص عجیر تھا۔ وہ اپنے کیمپ میں پہنچا اور اطلاع دی کہ ابن ابی کبشہ کے بیٹے (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

قریب ہی موجود ہیں اور انہوں نے تمہارے پانی بردار اونٹ پکڑ لئے ہیں ۔ فوج کے اندر بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے اس واقعے کو اپنے لئے فال بد سمجھا ۔ آسمان سے بارش ہو رہی تھی ۔ اس رات کو مسلمانوں نے عبیدہ ابن سعید ابن العاص کے غلام کو پکڑ لیا ۔ منبہ ابن الحجاج اور ابو رافع امیہ ابن خلف کے غلام اسلام لے آئے ۔ وہ حضور ؐ کے سامنے پیش کئے گئے ۔ اس وقت آپ ؐ نماز پڑھ رہے تھے ۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو قریش کے سقے ہیں اور ان کے لئے پانی لے جا رہے تھے ۔ مسلمانوں نے ان کی اس اطلاع کو برا سمجھا اور انہیں پیٹنا شروع کر دیا ۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ہم ابو سفیان کے ساتھی ہیں اور قافلے کے لوگ ہیں ۔ اس پر مسلمانوں نے انہیں پیٹنا بند کر دیا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا اور فرمایا "اگر یہ لوگ تم سے سچ کہیں تو تم انہیں مارتے ہو اور اگر جھوٹ کہیں تو تم مارنے سے رک جاتے ہو ۔"

اس کے بعد آپ ؐ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے معلومات حاصل کیں ۔ انہوں نے بتایا کہ قریش اس ٹیلے کے پیچھے ہیں اور یہ کہ وہ کسی ایک دن دس اور ایک دن نو ذبح کرتے ہیں ۔ انہوں نے ان لوگوں کے بارے میں تفصیلاً بتایا جو مکہ سے آئے تھے تو حضور ؐ نے فرمایا کہ لشکر نو سو اور ہزار کے درمیان ہے اور اس کے بعد فرمایا : "مکہ نے تمہارے لئے اپنے جگر گوشوں کو جمع کر دیا ہے ۔"

آپ نے اپنی قیام گاہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشورہ کیا ۔ حباب ابن منذر ابن جموح نے عرض کی کہ حضور ؐ آپ ہمیں قریش کے مقابلے میں نچلے کنویں کے پاس لے جائیں ۔ میں اس کنویں اور اس کے محل وقوع کو خوب جانتا ہوں ۔ یہ پرانا کنواں ہے اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کا پانی بے حد میٹھا ہے ۔ اس کا پانی بہت ہی زیادہ ہے اور کبھی ختم نہیں ہوتا ۔ ہم اس چشمے پر حوض بنا دیں گے اور اس میں برتن ڈال کر پانی نکال سکیں گے ۔ دشمن کے ساتھ جنگ کریں گے ۔ اور دوسرے لوگوں کو ہم اس کنویں سے روکیں گے ۔ اس پر آپ ؐ نے کہا : حباب تو نے بہترین رائے دی ۔ ابن ہشام نے ابن اسحاق سے جو روایت نقل کی ہے کہ حباب ابن منذر نے کہا کہ حضور ؐ جس جگہ آپ ؐ نے پڑاؤ ڈالا ہے کیا یہ جگہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے منتخب کی ہے ؟ جس سے ہم لوگ آگے پیچھے نہیں ہٹ سکتے یا یہ بات ہماری رائے ، جنگ اور جنگی تدابیر کا معاملہ ہے ۔ حضور ؐ نے فرمایا : یہ تو رائے ' جنگ اور جنگی تدابیر کا معاملہ ہے ۔ تو اس پر حباب نے کہا کہ یا رسول اللہ پھر میں کہوں گا کہ یہ مناسب جگہ نہیں ہے اور اس کے بعد انہوں نے مذکورہ بالا مشورہ دیا ۔ چنانچہ حضور ؐ وہاں سے چلے اور بدر کے کنویں پر قیام کیا ۔ اس رات حضور ؐ ایک کٹے ہوئے درخت کی منڈی کی طرف نماز پڑھتے رہے ( یعنی جب درخت کاٹتے ہیں تو اس کے نچلے حصے سے جو اپنی جگہ رہ جاتا ہے ) یہ رمضان المبارک کی سترہویں اور جمعے کی رات تھی ۔ آپ ؐ نے حباب ابن منذر کے مشورے کے مطابق انتظام فرمایا ۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے بارش شروع ہو گئی اور ریگستانی زمین تر ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے اس پر چلنا آسان ہو گیا اور قریش ایسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے کہ ان کے لئے اس سے نکلنا مشکل ہو گیا ۔ اس لئے کہ ان کے درمیان ریت کا ایک ٹیلہ تھا ۔ چنانچہ یہ بارش مسلمانوں کے لئے رحمت بن کر آئی اور مشرکین کے لئے مصیبت بن گئی ۔ پھر اس رات اللہ کی جانب سے مسلمانوں پر خوشگوار نیند نازل ہوئی اور وہ خوب سوئے ۔ مثلاً وہ بیٹھے ہوئے ہوتے تو ان کا سر اپنے سینے پر جھک جاتا اور اسے پتہ بھی نہ ہوتا کہ وہ کروٹ لے کر مزے سے سو رہا ہوتا ۔ ایک شخص رافع ابن واقع ابن مالک تو اس قدر سوئے کہ انہیں احتلام ہو گیا اور رات کے آخری حصہ میں انہوں نے غسل فرمایا ۔ حضور ؐ نے عمار ابن یاسر اور عبداللہ ابن مسعود

کو بھیجا تاکہ وہ دشمن کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ انہوں نے دشمن کی قیام گاہ کے گرد چکر لگایا اور واپس آکر حضور ؐ کو یہ رپورٹ دی کہ دشمن بہت پریشان حال ہے اور یہ کہ بارش ان پر خوب برس رہی ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کنویں پر اترے تو آپ کے لئے ایک چبوترہ بنایا گیا' کھجور کی شاخوں سے۔ اور حضرت سعد ابن معاذ اپنی تلوار سونت کر اس کے دروازے پر کھڑے ہوگئے۔ حضور ؐ نے میدان جنگ میں گشت کیا۔ اور آپ نے اپنے ساتھیوں کو قریش کے سرداروں میں سے ایک ایک کی قتل گاہ بتائی۔ آپ فرماتے یہاں فلاں قتل ہو گا' یہاں فلاں قتل ہو گا' یہ سب قتل ہوئے اور ان میں سے کوئی بھی حضور اکرم ؐ کی مقرر کردہ جگہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ آپ ؐ نے مسلمانوں کی صفوں کو درست کیا اور اپنے چبوترے کی طرف لوٹے۔ آپ کے ساتھ صرف حضرت ابوبکر تھے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں' قریش ساری رات سفر کرتے رہے اور صبح کے وقت مقابلے پر آگئے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو دیکھا تو آپ نے اس ٹیلے سے منہ پھیر کر آپنا چہرہ وادی کی طرف موڑ دیا اور اس وقت آپ نے یہ دعا فرمائی ''اے اللہ یہ ہے قبیلہ قریش جو نہایت ہی کبرو غرور کے ساتھ بڑھتا چلا آرہا ہے اور یہ تیری دشمنی میں آیا ہے' اور تیرے رسول کی تکذیب کر رہا ہے۔ آج میں تیری اس امداد کا طلبگار ہوں جس کا تو نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا۔ اے اللہ کل انہیں پیس کر رکھ دیجئے۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہہ رہے تھے۔ آپ کی نظر عتبہ ابن ربیعہ پر پڑی جو سرخ اونٹ پر سوار تھے۔ وہ قریش کے ساتھ تھے۔ آپ نے فرمایا اگر اہل قریش میں سے کسی کے ہاں کوئی بھلائی ہو سکتی ہے تو صرف سرخ اونٹ والے سوار کے ہاں ہو سکتی ہے۔

حفاف ابن ایما ابن رحضہ الغفاری نے یا اس کے باپ ایما نے اہل قریش کو اپنے بیٹے کے ہاتھ کچھ مویشی برائے ذبح بھیجے۔ اور ساتھ ہی یہ پیغام بھی دیا کہ اگر تم چاہو تو ہم تمہیں اسلحہ اور افراد کی امداد بھی دے سکتے ہیں۔ قریش نے اس کے بیٹے کے ذریعے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ تونے صلہ رحمی کا حق ادا کر دیا ہے۔ اور تم پر جو حق تھا وہ تم نے ادا کر دیا ہے اور کہا خدا کی قسم اگر ہم انسانوں سے لڑنے نکلے ہیں تو انسانوں کے مقابلے میں ہم اپنے اندر کوئی کمزوری نہیں محسوس کرتے۔ اور اگر ہماری یہ جنگ خدا کے خلاف ہے جس طرح محمد سمجھتے ہیں تو خدا کے مقابلے میں کسی کی کوئی طاقت نہیں ہے۔

جب لوگ اپنی منزل پر اترے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تیار کردہ حوض پر کچھ لوگ پانی لینے آئے۔ ان میں حکیم ابن حزام بھی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انہیں پانی پینے دو۔'' غرض اس حوض سے جس نے بھی پانی پیا۔ وہ مارا گیا ماسوائے حکیم ابن حزام کے' یہ بعد میں مسلمان ہوگئے اور بہت اچھے مسلمان بنے اور جب حلف اٹھاتے اور بہت تاکید کرتے تو کہتے اس خدا کی قسم جس نے مجھے بدر کے دن نجات دی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں: مجھے ابو اسحاق ابن یسار جمی انصار کے دوسرے اکابر نے بتایا کہ جب اہل قریش نے اطمینان سے پڑاؤ کر لیا تو انہوں نے عمر ابن وہب جمحی کو بھیجا کہ وہ اصحاب محمد کا اندازہ لگا کر بتائیں کہ اسلامی لشکر کی کوئی خفیہ فوج بھی ہے یا کوئی امدادی فوج ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ دو بار وادی میں دور تک گیا۔ اسے کچھ نظر نہ آیا اور واپس آکر رپورٹ دی کہ مجھے کچھ سراغ نہیں ملا۔ لیکن اے اہل قریش میں ایک ایسی مصیبت دیکھ رہا ہوں جس میں بہت لوگوں کی موت ہے۔ یثرب کے ترشح میں موت واضح طور پر نظر آرہی ہے۔ ہمارا مقابلہ ایسی قوم سے ہے جن کا دفاع اور جن کا قلعہ صرف ان کی تلواریں ہیں۔ خدا کی قسم میں یہ نہیں سمجھتا کہ ان میں سے کوئی شخص مارا جائے گا الا یہ کہ وہ ہم سے ایک

آدمی کو قتل کر دے۔ اگر وہ اپنی تعداد جتنے لوگ بھی ہم سے مار لیں تو ہمارے لئے زندہ رہنے میں کوئی مزہ نہ ہو گا۔ اس لئے مناسب ہے کہ آپ لوگ اس جنگ کے بارے میں سوچ لیں۔

جب حکیم ابن حزام نے یہ باتیں سنیں تو وہ لوگوں میں گھوما اور اس نے سب سے پہلے عتبہ ابن ربیعہ سے ملاقات کی۔ اس نے کہا: "اے ابو الولید! تم قریش کے معمر بزرگ اور سردار ہو اور اس میں تمہاری بات بھی چلتی ہے۔ کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ تمہاری ایک بھلائی کو قوم قیامت تک یاد رکھے۔" اس نے کہا "حکیم وہ کیا بھلائی ہے۔" حکیم نے کہا بھلائی یہ ہے کہ تم لوگوں کو لے کر واپس ہو جاؤ۔ اور تمہارے حلیف عمرو ابن الحضرمی کا معاملہ تمہارے اوپر عائد ہو۔ اس نے جواب دیا مجھے یہ منظور ہے۔ تم اس پر میرے گواہ ہو۔ وہ میرا حلیف ہے' اس لئے اس کی دیت میرے ذمہ ہو گی۔ (یعنی اس کے بھائی کی دیت جو مسلمانوں کے ہاتھوں عبداللہ ابن جحش کے سریہ میں مارا گیا تھا) نیز مسلمانوں نے اس سے جو مال لیا تھا وہ بھی میرے ذمہ ہے۔ لیکن مناسب ہے کہ تم نے حنظیہ کے بیٹے کے پاس جاؤ کیونکہ مجھے یہ ڈر ہے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کے اندر اختلافات پیدا ہو جائیں گے۔ اس سے ان کی مراد ابوجہل سے تھی۔ اس کے بعد عتبہ ابن ربیعہ نے ایک تقریر کی۔

"اے اہل قریش خدا کی قسم تم محمد اور اصحاب محمد سے کیا لو گے' اگر تم نے انہیں قتل کر دیا تو تم سے کوئی شخص پسند نہ کرے گا کہ وہ مقتول کو دیکھے۔ اس لئے کہ اس کا مقتول یا اس کا چچازاد ہو گا یا خالہ زاد ہو گا یا اس کے خاندان میں سے کوئی ہو گا۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ تم لوگ لوٹ جاؤ اور محمد اور تمام عربوں کو مقابلہ کرنے دو۔ اگر عربوں نے اسے قتل کر دیا تو تمہاری مراد پوری ہوئی اور اگر اس کے سوا کوئی اور صورت حال ہو تو تم اسے اس حال میں ملو گے کہ تم نے اس کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا ہو گا۔

اس تقریر کے بعد میں ابوجہل کے پاس آیا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنی زرہ تھیلے سے نکالی ہوئی ہے اور اسے وہ تیار کر رہا ہے۔ میں نے اسے کہا اے ابو الحکم مجھے عتبہ نے آپ کے پاس یہ تجاویز دے کر بھیجا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ محمد اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے ہیں' ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ خدا کی قسم ہم ہرگز واپس نہ ہوں گے' جب تک کہ اللہ ہمارے اور محمد کے درمیان فیصلہ نہیں کر دیتا اور عتبہ جو باتیں کرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے دیکھ لیا ہے کہ محمد اور اس کے ساتھی جانور ذبح کر کے کھا کر رہے اور ان میں ان کے بیٹے ابو حذیفہ بھی ہیں جو مسلمان ہو گئے اور عتبہ کو ڈر ہے کہ لشکر قریش کے ہاتھوں وہ قتل نہ ہو جائیں۔

اس کے بعد اس نے عامر الحضرمی کو یہ پیغام بھیجا کہ دیکھو عتبہ تمہارا حلیف ہے اور وہ لوگوں کو لے کر واپس جانا چاہتا ہے حالانکہ تم نے اپنے شکار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے' اس لئے آپ اٹھیں اور اپنے عہد کا واسطہ دلائیں اور لوگوں کو یاد دلائیں کہ تمہارے بھائی قتل ہو چکے ہیں۔ اس پر عامر الحضرمی اٹھا اور اپنے آپ کو ننگا کر کے چلایا "اے عمر' اب جنگ شروع ہو گئی اور لوگوں کے درمیان معرکہ تیز ہونے لگا' اور انہوں نے جس فتنے کا فیصلہ کر رکھا تھا اس پر پر عزم ہو گئے اور لوگوں کے ذہنوں سے وہ بات نکل گئی جس کی طرف عتبہ لوگوں کو بلا رہے تھے۔ جب عتبہ کو معلوم ہوا کہ ابوجہل یہ باتیں کرتا ہے تو اس نے کہا کہ عنقریب اس کے چوتڑوں کی زردی کو معلوم ہو جائے گا کہ کس کے اوسان خطا ہو گئے ہیں۔ میرے یا اس کے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اسود ابن عبدالاسد مخزومی ایک نہایت ہی جری اور بدمزاج شخص تھے۔ انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم میں ان کے حوض سے پانی پیوں گا یا اسے منہدم کر دوں گا اور یا اس حوض کے پاس قتل ہو جاؤں گا۔ جب وہ نکلا تو حمزہ ابن عبد المطلب اس کی طرف بڑھے۔ جب حضرت حمزہ نے اس پر وار کیا تو اس کی ایک ٹانگ کو اڑا دیا۔ یہ اس وقت حوض کے قریب تھے۔ وہ پشت کی جانب پر گر پڑے اور اس کی ٹانگ سے خون کے فوارے اپنے ساتھیوں کی جانب چھوٹ رہے تھے لیکن وہ پیٹ کے بل حوض کی طرف بڑھا اور حوض میں گھس گیا۔ مقصد یہ تھا کہ اس نے اپنی قسم پوری کر دی ہے' لیکن حضرت حمزہ نے اس کا پیچھا کیا اور ایک ہی وار کر کے اسے حوض کے اندر قتل کر دیا۔

اس کے بعد عتبہ ابن ربیعہ نکلے' اس کے ساتھ اس کے بھائی شیبہ اور بیٹا ولد ابن عتبہ بھی تھے۔ جب یہ لوگ اپنی صف سے جدا ہوئے تو انہوں نے دعوت مبارزت دی۔ ان کے مقابلے میں انصار میں سے تین نوجوان آگے بڑھے جن کے نام عوف' معوذ پسران حارث جن کی والدہ عفرا تھی اور ایک شخص دوسرا تھا۔ یعنی عبداللہ ابن رواحہ۔ عتبہ کے گروپ نے کہا کہ تم کون ہو؟ تو انہوں نے کہا ہم انصاری ہیں۔ اس پر عتبہ نے کہا کہ ہمیں تم سے کوئی کام نہیں ہے۔ ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ عتبہ نے ان انصاری حضرات سے کہا کہ تم ہمارے معزز ہم پلہ ہو لیکن ہمارا مقصد اپنے بھائیوں سے لڑنا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے آواز دی اے محمد تم ہمارے مقابلے میں ہماری قوم کے ہم پلہ لوگوں کو سامنے لاؤ۔ اس پر حضور ؐ نے فرمایا : "عبیدہ ابن الحارث 'حمزہ اور علی تم نکلو۔" جب یہ لوگ نکلے اور عتبہ گروپ کے قریب گئے تو انہوں نے یہی سوال کیا تم کون ہو؟ عبیدہ نے کہا میں عبیدہ ہوں' حمزہ نے کہا میں حمزہ ہوں۔ اور علی نے کہا میں علی ہوں۔ اس پر انہوں نے کہا ہاں تم معزز ہم پلہ ہو۔ عبیدہ نے جو سن رسیدہ تھے عتبہ ابن ربیعہ کو دعوت مبارزت دی اور حمزہ نے شیبہ ابن ربیعہ کو اور حضرت علی ؓ نے ولید ابن عتبہ کو۔ حمزہ نے تو شیبہ کو ایک وار ہی میں ختم کر دیا۔ اور علی نے ولید کو ایک ہی وار میں قتل کر دیا۔ عبیدہ اور عتبہ کے درمیان دو دو وار ہوئے اور دونوں نے ایک دوسرے کو ایسا زخمی کر دیا کہ جگہ سے حرکت ممکن نہ رہی۔ لیکن حضرت علی اور حضرت حمزہ عتبہ کی طرف لوٹے اور اس کا کام تمام کر کے اپنے ساتھی کو اٹھا کر اپنے کیمپ میں لے گئے۔

اب لوگ آگے بڑھے اور جنگ شروع ہو گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ اس وقت تک حملہ نہ کریں جب تک آپ انہیں حکم نہ دیں۔ اور اگر وہ لوگ حملہ آور ہوں تو تیروں کے ذریعہ مدافعت کریں۔ اس کے بعد حضور ؐ نے صفیں درست کیں اور آپ اپنے چبوترے کی طرف لوٹ گئے۔ آپ اندر گئے اور اس وقت آپ کے ساتھ صرف ابوبکر تھے اور کوئی نہ تھا۔ حضور ؐ اپنے رب کو پکار رہے تھے اور وہ وعدہ یاد دلا رہے تھے جو آپ کے ساتھ نصرت کے بارے میں ہوا تھا۔ اور باتوں کے علاوہ آپ نے اس پکار کے موقعہ پر یہ باتیں کہیں۔ "اے اللہ! اگر یہ مٹھی بھر لوگ آج قتل ہو گئے تو تیری بندگی کبھی نہ ہو گی۔" حضرت ابوبکر فرما رہے تھے۔ آپ اپنی دعا کو کم کر دیں۔ اللہ اپنا وعدہ پورا کرنے والا ہے۔

امتاع الاسماع مصنفہ مقریزی میں ہے کہ عبداللہ ابن رواحہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ حضور ؐ میں آپ کو یہ مشورہ دیتا ہوں حالانکہ آپ ؐ کو کسی مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کہ اللہ کو اس کے وعدوں کی یاد دہانی کی ضرورت نہیں ہے۔ تو آپ ؐ نے فرمایا ابن رواحہ' کیا میں اللہ تعالیٰ کو وعدہ یاد نہ دلاؤں۔ اللہ تو وعدہ پورا کرنے

والے ہیں' کبھی خلاف نہیں کرتے۔

ابن اسحاق نے کہا' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چبوترے میں تھے تو آپ کو قدرے اونگھ نے آلیا۔ جب آپ جاگے تو فرمایا: ''ابوبکر مبارک ہو' اللہ کی مدد آگئی۔ یہ ہیں جبرئیل اپنے گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے چلے آرہے ہیں اور اس کی دونوں جانب غبار اٹھ رہا ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام مجع کو ایک تیر لگا اور وہ شہید ہو گیا۔ یہ مسلمانوں میں سے پہلا مقتول تھا۔ اس کے بعد حارثہ ابن سراقہ نے بنی عدی ابن نجار کے ایک شخص کو تیر مارا اور اسے ہلاک کر دیا۔ یہ شخص حوض سے پانی پی رہے تھے۔ نیز اس شخص کی گردن میں لگا اور وہ شہید ہو گیا۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم چبوترے سے نکلے اور آپ نے لوگوں کو جنگ کرنے پر اکسایا۔ آپ نے فرمایا: ''خدا کی قسم آج جو شخص بھی صبر' تحمل سے فی سبیل اللہ لڑا اور وہ آگے ہی بڑھتا رہا اور پیٹھ نہ پھیری وہ لازماً جنت میں داخل ہو گا۔''

ایک شخص عمر ابن الہمام بنی سلمہ کے بھائی تھے جو اس وقت کھجوریں کھا رہے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سنی اور کہا بہت خوب! حضور ؐ کیا میرے اور جنت کے درمیان صرف اتنا فاصلہ ہے کہ یہ لوگ مجھے قتل کر دیں؟ اس کے بعد اس نے وہ کھجوریں پھینک دیں۔ تلوار لی اور خوب لڑا یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔

ابن اسحاق نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص عوف ابن الحارث نے ''جو عفرا'' کا بیٹا تھا' نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اللہ اپنے بندے کے کس فعل پر ہنس دیتا ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ اس بات سے ہنس پڑتا ہے کہ ایک شخص کے جسم پر زرہ بھی نہ ہو اور وہ تلوار لے کر دشمن کی صفوں میں گھس جائے۔'' چنانچہ اس نے جو زرہ پہنی ہوئی تھی اسے اتار پھینکا۔ اس کے بعد تلوار لی اور دشمن کی صفوں میں گھس گیا اور اس قدر لڑا کہ شہید ہوا۔

ابن اسحاق نے زہری سے ایک روایت نقل کی ہے' وہ کہتے ہیں کہ جب لوگ ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو ابوجہل نے کہا' اے اللہ ہم سے جو قطع رحمی کرنے والا ہو اور ایسے کام کرنے والا ہو جو معروف نہ ہوں تو کل اسے شکست دے دے' چنانچہ اس کی دعا قبول ہوئی۔

ابن اسحاق نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی ریت لی اور اسے قریش کی طرف پھینکا اور فرمایا شاہت الوجوہ اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ زور لگاؤ اور اس کے بعد مخالفین کو شکست ہوئی اور قریش کے سرداروں میں سے اکثر مارے گئے اور باقی گرفتار ہوئے۔

جب لوگوں نے قتل سے ہاتھ کھینچ لئے اور لوگوں کو گرفتار کرنے لگے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ سعد ابن معاذ کے چہرے پر کراہت کے آثار نظر آتے ہیں کیونکہ لوگ مخالفین کو قتل کرنے کے بجائے گرفتار کر رہے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مخاطب کر کے کہا ''خدا کی قسم اور شاید تم لوگوں کی اس حرکت کو ناپسند کرتے ہو۔'' اس نے کہا ہاں جناب میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔ یہ پہلا معرکہ ہے جس میں کفر و اسلام کا تصادم ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس معرکے میں دشمن کا پوری طرح کچل دینا ہمارے لئے اس سے بہتر تھا کہ ہم انہیں گرفتار کرتے۔''

ابن اسحاق نے حضرت ابن عباس کی ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو

یہ حکم دیا تھا کہ بنی ہاشم میں سے بعض لوگ مجبوراً اس لشکر میں آئے ہیں اور وہ ہمارے خلاف لڑنا نہیں چاہتے۔ اس لئے تم میں سے جو شخص بنی ہاشم میں سے کسی کے سامنے آئے تو انہیں قتل نہ کرے۔ اور جو شخص ابو البختری ابن ہشام ابن الحارث ابن اسد کو پائے اسے بھی قتل نہ کرے۔ اور جو شخص عباس ابن عبدالمطلب کو پائے اسے بھی قتل نہ کرے۔ کیونکہ حضرت عباس مجبوراً لشکر کے ساتھ آگئے ہیں۔ اس پر ابو حذیفہ ابن عتبہ ابن ربیعہ نے کہا (یہ مسلمان تھے) "کیا ہم اپنے باپوں' بھائیوں اور بیٹوں اور خاندان کو قتل کریں اور عباس کو چھوڑ دیں۔ خدا کی قسم اگر وہ مجھے ملا تو اسے مزہ چکھاؤں گا۔" تو یہ بات حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گئی تو آپ نے حضرت عمر ابن الخطاب سے کہا "اے ابو حفص' (اور یہ پہلا دن تھا کہ حضور ؐ نے مجھے اس کنیت کے ساتھ خطاب فرمایا) "کیا رسول اللہ کے چچا کے چہرے کو تلوار سے مارا جائے گا۔" اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا رسول خدا ؐ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن کو اڑا دوں۔ خدا کی قسم یہ منافق ہے۔" اس گفتگو کے بعد ابو حذیفہ کہا کرتے تھے کہ اس وقت میں نے جو بات کی میں آج تک اس سے ڈرتا ہوں اور میں ہمیشہ اس سے ڈرتا رہوں گا۔ الا یہ کہ شہادت پاکر میں اس کا کفارہ ادا کروں۔ بعد میں ابو حذیفہ مرتدین کے ساتھ جنگ میں یوم الیمامہ میں شہید ہوئے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ حضور نے ابو البختری کے قتل سے اس لئے روکا تھا کہ جب آپ مکہ میں تھے تو وہ لوگوں کو آپ ؐ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے سے روکتا تھا۔ وہ حضور ؐ کو اذیت دینے والوں سے بچاتا تھا اور اس کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسی بات نہ سنی تھی جو آپ کے لئے موجب اذیت ہوتی۔ اور قریش نے بنی ہاشم کے ساتھ بائیکاٹ کا جو معاہدہ لکھا تھا اس کے توڑنے والوں میں وہ بھی تھا۔ لیکن اس دن وہ اس لئے مارا گیا کہ اس نے قیدی بننے سے انکار کر دیا۔

ابن اسحاق نے یحییٰ ابن عباد سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ان کے والد نے کہا کہ امیہ ابن خلف میرا دوست تھا۔ اور میرا نام جاہلیت میں عبد عمرو تھا۔ میں نے جب اسلام قبول کیا تو نام عبدالرحمٰن رکھ لیا۔ اس وقت ہم مکہ میں تھے۔ امیہ مجھے کہتا عبد عمرو تو نے اپنے اس نام کو چھوڑ دیا جس کے ساتھ تمہارے باپ نے تجھے موسوم کیا تھا۔ میں کہتا ہاں۔ اس نے کہا میں رحمٰن کو نہیں جانتا اس لئے تم میرے لئے آپس کا کوئی نام تجویز کر دو تاکہ میں تمہیں اس کے ساتھ پکاروں۔ اس لئے کہ تم پہلے نام کے ساتھ پکارنے کا جواب نہیں دیتے اور میں دوسرا نام نہیں لیتا جسے میں جانتا نہیں ہوں۔ جب وہ مجھے عبد عمرو کہتا' میں جواب نہ دیتا۔ میں نے اسے کہا کہ تم ہی کوئی نام رکھ دو' چنانچہ اس نے میرا نام عبد الالٰہ رکھ دیا۔ اور جب ہم ملتے تو وہ مجھے عبدالالٰہ کہتا اور ہم باتیں کرتے۔ بدر کے دن میں نے دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے علی ابن امیہ کے ساتھ کھڑا ہے۔ اور میں بعض زرہیں اٹھا کر جا رہا ہوں جو میں نے جنگ کے بعد لوٹ لی تھیں۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو اس نے کہا اے عبد عمرو' تو میں نے جواب نہ دیا۔ اس پر اس نے کہا اے عبد الالٰہ تو میں نے کہا' ہاں۔ کیا تمہیں ہمارے اندر کوئی دلچسپی ہے۔ میں سمجھتا ہوں میں تمہارے لئے ان زروں سے زیادہ مفید رہوں گا جو تو نے اٹھا رکھی ہیں۔ میں نے کہا' ہاں۔ تو انہوں نے کہا کہ میں نے زرہیں پھینک دیں۔ اور ان دونوں کو میں نے ہاتھ سے پکڑ لیا اور دونوں کو قیدی بنا لیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ایسا دن کبھی نہیں دیکھا۔ کیا تمہیں دودھ کی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی مجھے جس نے قید بنایا تو میں اسے دودھ دینے والی اونٹنیاں فدیہ میں دوں گا۔ میں انہیں لے کر کیمپ میں چلا گیا۔

ابن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن ابن عوف نے بتایا کہ مجھے امیہ ابن خلف نے کہا' اس وقت میں اس

کے اور اس کے بیٹے کے درمیان تھا اور میں نے دونوں کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ اے عبدالالہ' تم میں سے وہ شخص کون تھا جس نے اپنے سینے پر شتر مرغ کے پر لگا رکھے تھے؟ کہتے ہیں' میں نے کہا کہ وہ حمزہ ابن عبدالمطلب ہے۔ اس نے کہا کہ اس شخص نے ہمارے خلاف سخت کارہائے نمایاں کئے۔

عبدالرحمن کہتے ہیں 'خدا کی قسم میں ان لوگوں کو لے کر جا رہا تھا کہ اچانک اسے حضرت بلال نے میرے ساتھ دیکھ لیا۔ اور یہ وہی شخص تھا جو حضرت بلال کو اذیت دیتا تھا اور مکہ میں اسے ترک اسلام پر مجبور کیا کرتا تھا۔ وہ اسے مکہ کے ریگستان کی طرف لے جاتا۔ جب یہ ریت گرم ہوتی' تو یہ شخص انہیں الٹے لیٹاتا اور اس کے بعد ان کے سینے پر بڑا پتھر رکھ دیتا اور اس کے بعد کہتا کہ تم اسی طرح پڑے رہو گے الا یہ کہ تم دین محمد ؐ کو چھوڑ نہ دو۔ اور بلال کہتے جاتے 'احد احد۔ کہتے ہیں جب اسے بلال نے دیکھا وہ چلایا' یہ تو رئیس الکفار امیہ ابن خلف ہے۔ اگر یہ بچ نکلا تو میں نے نجات نہ پائی۔ میں نے کہا کہ بلال تم میرے اسیر کے ساتھ یہ کرتے ہو۔ اس نے پھر کہا اگر یہ نجات پا گیا' تو گویا مجھے نجات نہ ملی۔ میں نے پھر سختی سے کہا "اے کالی کے بیٹے تم سنتے نہیں' اس نے پھر کہا اگر یہ نجات پا گیا تو میں مرا۔ کہتے ہیں اس کے بعد بلال نے نہایت ہی بلند آواز سے پکارا۔ اے اللہ کے انصار' یہ ہے رئیس الکفار امیہ ابن خلف۔ اگر یہ بچ نکلا تو میں مر گیا۔ کہتے ہیں کہ لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ لیکن میں ان دونوں سے لوگوں کو روکتا ہی رہا۔ پیچھے سے ایک آدمی آیا اور اس نے اس کے بیٹے پر وار کیا اور وہ گر گیا۔ اس کے بعد امیہ ابن خلف نے ایک چیخ نکالی۔ اس پر میں نے کہا کہ جان بچاؤ تاکہ میں بھی بچ جاؤں خدا کی قسم اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کہتے ہیں کہ لوگوں نے ان پر تلواروں سے پے در پے وار کئے اور ان سے فارغ ہو گئے۔ عبدالرحمن کہا کرتے تھے۔ اللہ بلال پر رحم کرے کہ میری زرہیں بھی گئیں اور میرے قیدیوں کو بھی قتل کر کے اس نے مجھے دکھ پہنچایا۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم دشمن سے فارغ ہوئے تو حکم دیا گیا کہ مقتولوں میں سے ابوجہل کو تلاش کیا جائے۔ اور جیسا کہ روایات میں آتا ہے کہ معاذ ابن عمرو ابن الجموح بنی سلمہ کے بھائی نے کہا کہ میں نے لوگوں سے سنا کہ ابوجہل تک پہنچنا بہت مشکل ہے اور وہ اس وقت ایک درخت کی اوٹ میں تھا۔ جب میں نے یہ باتیں سنیں تو میں نے ارادہ کر لیا کہ میں یہ کام کروں گا۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ جب میرے لئے ممکن ہوا تو میں نے اس پر حملہ کر دیا۔ میں نے اس پر ایک ایسا وار کیا کہ میں نے اس کے پاؤں کو نصف پنڈلی کے ساتھ اڑا دیا۔ جب اس کا پاؤں اڑا تو مجھے ایسا لگا جس طرح گٹھلی توڑنے والے پتھر کے نیچے سے گٹھلی اڑتی ہے۔ اس وار کے بعد اس کے بیٹے عکرمہ نے مجھے مارا اور میرے کاندھے پر ایسی چوٹ آئی کہ میرا بازو کٹ گیا اور وہ ایک جانب سے میرے پہلو میں چمڑے کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ اب لڑائی میں جلدی اور تیزی آ گئی۔ میں نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور پورا دن لڑتا رہا۔ اور یہ ہاتھ میری پشت کے ساتھ لٹکا رہا۔ جب اس نے مجھے بہت تنگ کیا تو میں نے اس پر اپنا پاؤں رکھا اور اسے کاٹ کر پھینک دیا۔

اس کے بعد معوذ ابن عفرا ابوجہل تک جا پہنچا اور اس وقت اس کی ٹانگ کٹی ہوئی تھی۔ اس نے اسے اس قدر زخمی کر دیا کہ وہ اب حرکت کے قابل نہ رہا۔ اور معوذ لڑتا رہا یہاں تک کہ وہ قتل ہو گیا۔ اس کے بعد عبداللہ ابن مسعود ابوجہل تک جا پہنچا۔ یہ اس وقت ہوا جب حضور ؐ نے حکم دیا تھا کہ ابوجہل کو مردوں میں تلاش کیا جائے۔ تلاش کرنے والوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا کہ اسے تلاش کرو۔ اگر اسے پہچاننے میں دقت ہو' تو اس کے گھٹنے پر ایک

زخم ہے اسے دیکھو اس لئے کہ میں اور وہ دونوں ایک دن عبداللہ ابن جدعان کی دعوت میں شریک تھے اور اس وقت ہم دونوں لڑکپن میں تھے ۔ اژدھام میں 'میں نے اسے دھکہ دیا اور اگرچہ میں اس کے مقابلے میں دبلا پتلا تھا' وہ گھٹنوں کے بل گرا ۔ اس کا ایک گھٹنا اس قدر زخمی ہوا کہ زخم کے اثرات زائل نہ ہوئے ۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ میں نے اسے اس حال میں تلاش کر لیا کہ وہ زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا ۔ میں نے اپنا پاؤں اس کی گردن پر رکھا ۔ اس نے مکہ میں ایک بار میرے ساتھ بدسلوکی کی تھی ۔ مجھے مارا تھا اور مکے لگائے تھے ۔ اس کے بعد میں نے اسے کہا : اللہ کے دشمن تم نے جان لیا کہ آج اللہ نے تجھے ذلیل کیا ہے ؟" مجھے کیوں ذلیل کیا ہے ؟" اس نے کہا 'کیا تم نے مجھ سے کسی بڑے آدمی کو بھی قتل کر دیا ہے ۔ اس نے کہا یہ تو بتاؤ آج کی جنگ کس نے جیتی ؟ میں نے جواب دیا اللہ اور رسول ؐاللہ نے ۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ بنی مخزوم کے بعض لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ ابن مسعود نے کہا کہ اس نے مجھے یہ کہا کہ اے چرواہے 'تم ایک عظیم آدمی کی گردن پر سوار ہو' جس پر سوار ہونا کوئی آسان کام نہ تھا ۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے اس کی گردن کو تن سے جدا کیا اور لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دیا اور کہا اے رسول خدا یہ رہا خدا کے دشمن کا سر ۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا شکر ادا کیا ۔

ابن ہشام کہتے ہیں کہ مجھے مقامی کے ماہرین اہل علم نے بتایا کہ حضرت عمر ابن الخطاب نے سعید ابن العاص کو ایک مرتبہ یہ کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ تجھے میرے بارے میں غلط فہمی ہے کہ شاید میں نے تمہارے باپ کو قتل کیا ہے ۔ اگر میں نے اسے قتل کیا ہوتا تو میں اس کے قتل کی ہرگز معذرت نہ کرتا ۔ لیکن میں نے اپنے ماموں عاص ابن ہشام ابن المغیرہ کو قتل کیا تھا ۔ رہا تمہارا باپ تو میں جنگ میں اس کے پاس سے گزرا تھا ۔ اس طرح لڑ رہا تھا جس طرح ایک بیل جنگ کے وقت اپنے سینگوں کے ساتھ زمین کو چیرتا ہے ۔ تو میں اس سے ایک طرف ہو گیا اور مجھ سے آگے بڑھ کر اس کے چچا زاد نے اس کا رخ کیا اور اسے قتل کر دیا ۔

ابن اسحاق 'یزید ابن رومان' عروہ ابن الزبیر کے واسطے سے حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں 'جب حضور ؐ نے حکم دیا کہ مقتولین کو ایک گڑھے میں پھینکا جائے 'تو ایک گڑھا کھود کر سب کو اس میں پھینک دیا گیا' ماسوائے امیہ ابن خلف کے ۔ کیونکہ وہ اپنی زرہ کے اندر پھول گیا تھا اور زرہ کو بھر دیا تھا' لوگ اس کے پاس گئے اور اسے حرکت دی تو اس کا گوشت اپنی جگہ چھوڑ گیا ۔ لوگوں نے اسے اسی جگہ چھوڑ دیا اور اس کے اوپر مٹی ڈال دی ۔ جب تمام مقتولین کو گڑھے میں ڈال دیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گڑھے کے دہانے پر کھڑے ہوئے اور کہا :" اے گڑھے والو 'کیا تم نے وہ انجام دیکھ لیا جو تم سے تمہارے رب نے اس کا وعدہ کیا تھا ۔ میں نے تو وہ انجام دیکھ لیا جو مجھ سے میرے رب نے وعدہ کیا تھا پوری طرح ۔ کہتے ہیں کہ اصحاب رسول نے آپ سے سوال کیا :" کہ آپ تو مردوں سے بات کر رہے ہیں ۔" آپ نے کہا " حقیقت یہ ہے کہ وہ اب جانتے ہیں کہ ان سے ان کے رب نے جو وعدہ کیا تھا وہ سچ تھا ۔" عائشہ کہتی ہیں لوگ کہتے ہیں کہ حضور ؐ نے یہ فرمایا :" درحقیقت میں نے جو کہا وہ سنتے ہیں ۔" حالانکہ حضور نے فرمایا تھا :" دراصل وہ جانتے ہیں کہ رب کا وعدہ سچا تھا ۔"

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب حضور ؐ نے حکم دیا کہ انہیں گڑھے میں پھینک دیا جائے تو عتبہ ابن ربیعہ کو گڑھے کی

طرف کھینچا گیا تو حضور ؐ نے ان کی طرف دیکھا (یہ بات مجھ تک پہنچی ہے) کہ ابوحذیفہ ابن عتبہ نہایت ہی غمگین ہیں اور ان کا رنگ بدل گیا ہے تو آپ نے فرمایا: ابوحذیفہ، شاید تمہارے باپ کی وجہ سے تم پر اثر ہو گیا ہے۔" یا جو الفاظ حضور ؐ نے کہئے 'ابوحذیفہ نے کہا "حضور ؐ خدا کی قسم! ایسا نہیں ہے۔ مجھے اپنے باپ کے بارے میں کوئی شک نہیں اور نہ اس کے قتل کے بارے میں شک ہے 'لیکن میں جانتا تھا کہ میرا باپ بڑا مدبر' بردبار اور صاحب علم آدمی تھا۔ اور میری دلی خواہش تھی کہ اللہ اسے اسلام کی طرف ہدایت دے۔ جب میں نے دیکھا کہ اس کی یہ حالت ہے اور مجھے جب یہ خیال آیا کہ یہ تو کفر کی حالت میں دنیا سے چلا گیا اور میری آرزو پوری نہ ہوئی تو اس وجہ سے مجھے یہ دکھ ہوا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے باپ لئے دعائے خیر فرمائی اور اس کے لئے بھی بہت اچھے کلمات کہے۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر گاہ میں جو کچھ تھا' اسے یکجا کرنے کا حکم دیا۔ تمام مال غنیمت یکجا کر دیا گیا۔ اس کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہو گیا۔ جن لوگوں نے مال جمع کیا تھا' انہوں نے کہا کہ اس پر پورا ہمارا حق ہے کیونکہ ہم نے جمع کیا ہے' اور جو لوگ دشمن کو مار رہے تھے اور اس کا تعاقب کر رہے تھے انہوں نے کہا کہ اگر ہم نہ ہوتے تو تم کہاں جمع کرتے۔ ہم نے دشمن کو مشغول رکھا' اور تم نے مال جمع کیا۔ اور جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت پر مامور تھے انہوں نے کہا ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمن کے حملے سے بچایا ہے۔ لہٰذا تمہارے مقابلے میں ہمارا حق زیادہ ہے' ہم نے یہ سامان اس وقت دیکھ لیا تھا' مگر آپ کا محافظ کوئی نہ تھا۔ ہم اس بات سے ڈر گئے کہ اگر ہم چلے گئے تو دشمن آپ ؐ پر حملہ نہ کر دے۔ لہٰذا ہم حفاظت میں رہے۔ چنانچہ تم لوگ ہم سے زیادہ مستحق نہیں ہو۔

ابن اسحاق کہتے کہ عبدالرحمٰن ابن الحارث وغیرہ نے سلیمان' مکحول اور ابو امامہ باہلی سے روایت کی ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبادہ ابن الصامت سے انفال کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ سورہ ہم اصحاب بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس وقت ہمارے درمیان انفال کے بارے میں اختلافات ہو گئے تھے اور اس کے بارے میں ہماری اخلاقی حالت اچھی نہ رہی تھی تو اس وجہ سے اللہ نے انفال کو ہم سے لے کر اسے رسول اللہ کے اختیار میں دے دیا' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے درمیان مساویانہ تقسیم کر دی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ بنی عبدالدار کے بھائی نبیہ ابن وہب نے بتایا کہ حضور جب قیدیوں کی طرف لوٹے تو آپ نے انہیں اپنے ساتھیوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ اور آپ نے ان کو حکم دیا کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے۔ تو ابوعزیز ابن ہاشم' مصعب ابن عمیر کے سگے بھائی تھے اور قیدی تھے۔ ابوعزیز نے بتایا کہ ایک انصاری مجھے گرفتار کر رہے تھے اور مصعب ابن عمیر میرے بھائی آگئے تو انہوں نے انصاری سے کہا کہ اسے خوب باندھیئے کیونکہ ان کی والدہ مالدار خاتون ہیں وہ اس کا خوب فدیہ دیں گی۔ کہتے ہیں کہ جب میدان جنگ سے مجھے لے کر آئے تو میں انصاریوں کے پاس تھا۔ جب کھانے کا وقت ہوتا تو وہ لوگ مجھے روٹی دیتے اور خود کھجوروں پر اکتفاء کرتے کہ انہیں حضور ؐ نے ہمارے بارے میں وصیت کی تھی کہ حسن سلوک کرو' ان میں سے جس کے ہاتھ بھی روٹی آتی وہ مجھے دے دیتا۔ میں شرمندہ ہو کر انہیں واپس کرتا مگر وہ مجھے دوبارہ واپس کر دیتے اور اسے ہاتھ بھی نہ لگاتے۔

ابن ہشام کہتے ہیں ابوعزیز بدر کے دن مشرکین کے علم بردار تھے۔ اور یہ علم انہیں نضر ابن الحارث کے بعد ملا تھا'

جب ان کے بارے میں' اس کے گرفتار کرنے والے ابو الیسیر کو مصعب ابن عمیر نے وہ بات کہی (جو اوپر مذکور ہے) تو ابو عزیر نے کہا اے بھائی' تم میرے بارے میں یہ سفارش کرتے ہو' تو مصعب نے کہا کہ یہ انصاری تم سے پہلے میرا بھائی ہے۔ اس پر اس کی ماں نے معلوم کیا کہ کسی قریش کا زیادہ سے زیادہ فدیہ کیا رہا ہے؟ تو اسے بتایا گیا کہ چار ہزار درہم تو اس نے چار ہزار درہم بھیجے اور اس کا فدیہ دیا۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اس کے بعد قریش نے اسیروں کا تاوان بھیجا۔

---ooo---

یہ تھا غزوہ بدر کا واقعاتی نقشہ' ہم نے بقدر استطاعت اسے مختصراً بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ سورہ انفال اسی غزوہ پر بطور تبصرہ نازل ہوئی۔ اسی میں اس غزوہ کے ظاہری واقعات پر بھی تبصرہ ہے۔ اس کے تاریخی پس منظر کا بھی ذکر ہے۔ اور یہ تمام تبصرے قرآن کے منفرد اور معجز انداز بیان میں ہیں جن کی تفصیلات ہم آئندہ تشریح آیات کے درمیان بیان کریں گے۔ یہاں ہم نے صرف اس سورہ کے مضامین کے اساسی خدوخال مختصراً دے دیئے ہیں۔

یہ سورہ کس لائن پر جارہی ہے؟ اس کے اندر ایک مضمون اس کی پوری طرح وضاحت کرتا ہے۔ ابن اسحاقؒ نے حضرت عبادہ ابن الصامت سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ سورہ بدری لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جب ہم مال غنیمت کے بارے میں باہم اختلاف کرنے لگے اور اس سلسلے میں ہمارے اخلاق بھی خراب ہوئے تو اللہ نے انفال کا اختیار ہمارے ہاتھ سے لے لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا اور آپ نے انفال کو مساویانہ اصول کے مطابق تقسیم کر دیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اس سورہ کا آغاز کس طرح ہوا اور اس کی لائن کیا ہے۔ لوگوں نے اس واقعہ میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کے بارے میں اختلاف کیا تھا جسے اللہ تعالیٰ نے انسانی تاریخ میں قیامت تک فرقان قرار دیا تھا۔

اللہ کو مطلوب یہ تھا کہ ان کو اور ان کے بعد آنے والوں کو بعض اہم تعلیمات دیں۔ یہی تعلیم یہاں پوری طرح انہیں دی گئی اور یہ تعلیم اللہ نے جس تدبیر اور نظام قضا و قدر کے مطابق دی' ہر اقدام ایسا نظر آتا ہے جس کے پیچھے کوئی اصلاحی تدبیر ہے۔ اس لئے کہ جنگ بدر اور اس کے نتیجے میں جو عظیم فیصلے ہوئے اس کے بارے میں خود مسلمانوں کی منصوبہ بندی کو کوئی دخل نہ تھا۔ نہ انہوں نے جنگ بدر کے معمولی اموال غنیمت کے متعلق کوئی اپنی تدبیر کی تھی اور نہ اس جنگ کے عظیم نتائج انہوں نے سوچے تھے۔ یہ سب کام اللہ تعالیٰ کی منشا اور تدبیر کے ذریعے ہوئے۔ اس واقعہ میں اللہ نے مسلمانوں کو خوب آزمایا اور یہ اس کا فضل و کرم تھا۔

اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ لوگ اپنے بارے میں کیا سوچتے تھے۔ وہ یہ سوچتے تھے کہ قافلے کو لوٹ لیں۔ مگر اللہ نے ان کے لئے قافلے کے مقابلے میں ایک مسلح لشکر لا کر کھڑا کر دیا۔ دونوں میں کس قدر فرق ہے تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ خود ان کی اپنی سوچ کس قدر موثر ہے اور ان کے بارے میں اللہ کی تدبیر کس قدر دور رس حکمت کی حامل ہے۔ اور دونوں کے اندر کس قدر فرق ہے۔

سورہ کا آغاز اس طرح ہے کہ انفال کے بارے میں عوام کی جانب سے ایک سوال ہے اور اللہ کی طرف سے مختصر جواب ہے کہ یہ مال غنیمت اللہ اور اس کے رسول اللہ کا ہے۔ اس کے بعد کہا گیا ہے کہ وہ خدا سے ڈریں اور باہم

تعلقات کو درست کریں۔ جس طرح حضرت عبادہ ابن الصامت نے کہا کہ ہمارے اخلاق پر اثر پڑ گیا تھا۔ اسے دور کر دیں اور اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کریں۔کیونکہ سمع و اطاعت ایمان کا مقتضا ہے۔سورہ کے آغاز میں اہل ایمان کے لئے ایک نہایت ہی موثر تصویر کشی کی گئی ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (١) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (٢) الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (٣) اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (٤) (٨: ١ تا ٤)) ”اے پیغمبر لوگ تم سے غنیمتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں' کہہ دو کہ یہ غنیمتیں اللہ اور اس کے رسول کی ہیں' پس اللہ سے ڈرو اور آپس کے باہم تعلقات ٹھیک رکھو۔اگر تم مومن ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔مومن تو وہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب ان پر آیات الہٰی کی تلاوت ہوتی ہے تو ان کے ایمان کو زیادہ کر دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں اور مغفرت ہے اور عزت کی روزی ہے۔“

اس کے بعد بدر کے معاملے کو یاد دلایا جاتا ہے۔یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنے لئے کیا سوچتے تھے اور اللہ تعالیٰ ان کے لئے سوچ رہا تھا اور وہ زمین پر دنیاوی معیار کے مطابق جو کچھ دیکھ رہے تھے اور اللہ کا نظام تقدیر جو کچھ کر رہا تھا۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ (٥) يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (٦) وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (٧) لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (٨) (٨: ٥ تا ٨)) ”جیسا کہ تمہارے رب نے تجھے حق کے ساتھ اپنے گھر سے نکال دیا اور مومنوں کے ایک گروہ کو یہ ناگوار تھا۔وہ حق بات کے سلسلے میں تم سے جھگڑ رہے تھے۔حالانکہ واضح ہو چکا تھا۔ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں اور وہ موت اپنی آنکھوں

سے دیکھ رہے ہیں۔جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو گروہوں میں سے کوئی ایک گروہ تمہارے ہاتھ آ جائے گا۔ اور تم چاہ رہے تھے کہ کمزور گروہ تمہارے ہاتھ آئے لیکن اللہ چاہتا تھا کہ اپنے احکام سے حق کا حق ہونا ثابت کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق کو حق اور باطل کو باطل کر دکھائے خواہ مجرموں کو ناگوار ہی کیوں نہ لگے۔"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس غیبی امداد کے بارے میں یاد دہانی کراتے ہیں' جو امداد انہیں اس مشکل وقت میں دی گئی اور پھر آخرت میں ان کے لئے جو اجر تیار کیا گیا ہے وہ تو واضح ہے۔

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ (۹) وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۱۰) ع اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۱۱) اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (۱۲) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۱۳) ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ (۱٤) (۸: ۹ تا ۱٤)

"اور اس وقت کو بھی یاد کرو جب تم نے اپنے رب سے فریاد کی تھی تو اس نے تمہاری فریاد سن لی تھی کہ ہم ایک ہزار فرشتوں سے یکے بعد دیگرے تمہاری مدد کریں گے اور اللہ نے یہ بات اس لئے کی کہ تمہیں خوشخبری ہو اور تمہارے دلوں کو اس سے اطمینان ہو جائے' ورنہ مدد تو ہر حال میں اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ یقیناً اللہ زبردست اور حکمت والا ہے۔ اور وہ وقت بھی یاد کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے تمہاری تسکین کے لئے تم پر غنودگی طاری کر دی تھی اور آسمان سے تم پر پانی برسا دیا تھا کہ اس کے ذریعے سے تم کو پاک کرے اور تم سے شیطان کے وسوسوں کی گندگی دور کرے اور تمہارے دلوں کو مضبوط کرے۔ اور اس کے باعث تمہارے قدم جما دے۔ جب تمہارے رب نے فرشتوں پر وحی کی تھی کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں لہٰذا تم اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو' ہم ابھی کافروں کے دل میں رعب ڈالے دیتے ہیں پس تم ان کی گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا تو یاد رکھو اللہ سزا دینے میں سخت ہے۔"

یوں بات آگے بڑھتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ یہ تمام معرکہ اللہ کے حکم اور تدبیر سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اللہ کی

ہدایات کے مطابق جنگ ہو رہی ہے ۔ اس کی معاونت اسی میں شامل ہے ۔ اللہ کی تقدیر اور براہ راست دست قدرت کام کر رہا ہے ۔ اور یہ معرکہ صرف اللہ کے لئے ہے اور اس کی راہ میں ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ کے آغاز ہی میں یہ فیصلہ دے دیا جاتا ہے کہ انفال اللہ اور رسول کے لئے ہیں' اور اس کے بعد بھی حضور نے جو ان کے درمیان تقسیم کر دیئے تو یہ اللہ اور رسول اللہ کا خاص احسان تھا ۔ چنانچہ لوگوں نے انفال کے لئے جو امیدیں لگا رکھی تھیں وہ یہاں کاٹ دی جاتی ہیں ۔ ان کے دلوں کو تمام مفادات سے پاک کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کا جہاد خالص فی سبیل اللہ ہو جائے ۔ چنانچہ ان مضامین پر درج ذیل آیات کا مطالعہ کریں ۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۱۷) ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ (۱۸) (۸:۱۷ ـ ۱۸) "پس تم نے کافروں کو قتل نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ نے قتل کیا ۔ تم نے خاک نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی تاکہ ایمان والوں کو اپنی طرف سے اچھی آزمائش کرے یقیناً اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے ۔ یہ معاملہ تو تمہارے ساتھ تھا ۔ رہے کافر تو اللہ ان کی چالوں کو کمزور کرنے والا ہے ۔"

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

(۸:۲٦) "اس وقت کو یاد کرو جب تم سرزمین مکہ میں تھوڑے تھے اور کمزور سمجھے جاتے تھے ۔ اور تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں اچک نہ لے جائیں ۔ پھر اللہ نے تمہیں ٹھکانا دیا اور اپنی مدد سے تمہیں قوت بخشی اور تمہیں رزق کا بہترین سامان دیا تاکہ تم شکر کرو ۔"

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (٤١) اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ

حَیَّ عَنْ بَیِّنَةٍ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (٤٢) اِذْ یُرِیْکَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِكَ قَلِیْلًا وَلَوْ
اَرٰکَهُمْ کَثِیْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ اِنَّهٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ
الصُّدُوْرِ (٤٣) وَاِذْ یُرِیْکُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَیْتُمْ فِیْٓ اَعْیُنِکُمْ قَلِیْلًا وَّ یُقَلِّلُکُمْ فِیْٓ اَعْیُنِهِمْ
لِیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا کَانَ مَفْعُوْلًا وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (٤٤) (٨ : ٤١ - ٤٤)

"اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ بطور غنیمت تمہیں حاصل ہوا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول ؐ کے لئے ہے اور قرابت داروں کے لئے ' یتیموں ' مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔ اگر تم اللہ اور اس بات پر ایمان رکھتے ہو۔ جو فیصلے اور دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کے دن ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی اور اللہ ہرچیز پر قادر ہے۔ جب تم نزدیک والے کنارے پر تھے اور وہ دور والے کنارے پر ' اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف تھا۔ اور اگر تم دونوں فریقوں نے آپس میں لڑائی ٹھہرائی ہوتی تو ضرور اس تقرر کے بارے میں تم میں اختلاف ہو جاتا لیکن اللہ نے دونوں فوجوں کو بھڑا دیا تاکہ اللہ اس بات کو پورا کر دکھائے جو ہونے والی تھی کہ جسے ہلاک ہونا ہے ' وہ دلیل روشن کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ زندہ رہے۔ بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

وہ وقت یاد کرو جب اللہ تمہیں خواب میں کافروں کو تھوڑا دکھا رہا تھا اور اگر اللہ انہیں زیادہ دکھاتا تو تم ضرور ہمت ہار جاتے اور اس امر میں ضرور آپس میں جھگڑنے لگتے مگر اللہ نے تمہیں اس صورت حال سے بچا لیا۔ بلاشبہ وہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

اور وہ وقت یاد کرو جب تم کافروں کے مقابل ہوئے تو اللہ نے انہیں تمہاری نظر میں تھوڑا دکھایا اور ان کی نگاہوں میں تمہیں تھوڑا دکھایا تاکہ اللہ اس بات کو پورا کر دکھائے جو ہونے والی تھی اور آخر کار سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع ہوں گے۔"

---ooo---

یہ جنگ ' یا کوئی جنگ جس میں کوئی مومن لڑ رہا ہو وہ اللہ کی تدبیر اور اللہ کا کام ہوتا ہے۔ اور یہ معرکہ اللہ کی قیادت اور ہدایت کے مطابق ہوتا ہے ' اس کی معاونت اور نصرت سے ہوتا ہے۔ اللہ کے فضل اور اس کی قدرت سے ہوتا ہے۔ یہ معرکہ اللہ کے لئے ہوتا ہے اور اس کی راہ میں ہوتا ہے۔ اس پوری سورہ میں دعوت دی جاتی ہے کہ اس میں ثابت قدم رہو۔ اس میں پوری طرح حصہ لو ' اس کے لئے تیاری کرو اور یہ اطمینان رکھو کہ اس میں اللہ ہی تمہارا ولی ہے اور اس بات کا خیال رکھو کہ مال اور دولت کی محبت اس راہ میں تمہارے لئے رکاوٹ نہ بنے۔ اس معرکے کے آداب کو پورا کرو۔ اور اس میں دکھاوے اور غرور کے ساتھ شرکت نہ کرو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اس پر آمادہ کرو۔ ان مطالب کے بیان کے لئے درج ذیل آیات وارد ہیں۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ (١٥)

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (١٦) (٨: ١٥ - ١٦) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم جب میدان جنگ میں کفار سے دو بدو مقابل ہو تو انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ اور جو کوئی ایسے موقعہ پر پیٹھ دکھائے گا وہ اللہ کے غضب میں آ گیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے ۔ مگر جو شخص جنگی چال کے طور پر یا کسی دستے سے ملنے کے لئے ایسا کرے' تو جائز ہے ۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (٨: ٢٤) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو' جب رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے اور جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ کہ تم نے اسی کی طرف لوٹنا ہے ۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (٢٧) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (٢٨) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو اور اپنی امانتوں میں بھی خیانت نہ کرو' جبکہ تم اس بات کو خوب جانتے ہو اور جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے آزمائش ہیں اور یہ کہ اللہ کے پاس اجر عظیم ہے ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (٤٥) وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (٤٦) وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (٤٧) وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (٤٨) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم کسی گروہ کے مقابل ہو' تو ثابت قدم رہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ ۔ اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ

کرو ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو بلاشبہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور ان جیسے نہ بنو جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھاتے ہوئے نکلے تھے اور جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور جو کچھ بھی وہ کرتے ہیں اللہ ان پر چھایا ہوا ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (۸ : ۶۰) "اور جہاں تک تم سے ہو سکے قوت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے کافروں کے لئے مہیا کئے رکھو تاکہ اس طرح اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھائے رکھو اور ان کے سوا دوسروں پر بھی جنہیں تم نہیں جانتے 'مگر اللہ انہیں خوب جانتا ہے اور اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ پورا پورا تمہیں دے دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی نہ ہوگی۔"

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۶۵) "اے نبی' مومنوں کو کافروں کے ساتھ جنگ پر ابھارو' اگر تم میں سے بیس آدمی بھی ثابت دم رہیں گے تو وہ دو سو پر غالب رہیں گے۔ اور اگر تم میں سے سو آدمی ہوں گے تو وہ ایک ہزار پر غالب رہیں گے۔کیونکہ یہ کافر وہ لوگ ہیں جو سمجھتے ہی نہیں۔"

---ooo---

یہاں جنگ میں ثابت قدمی کی بابت بار بار ہدایات دی جا رہی ہیں۔ ساتھ ہی اہل ایمان کے قلب و نظر میں اسلامی نظریہ اور عقیدہ بھی بٹھایا جا رہا ہے اور تمام امور کو' تمام احکام کو اور تمام ہدایات کو بھی اسلامی نظریئے اور عقیدے کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ احکام و ہدایات محض ہوا میں نہیں دیئے جاتے بلکہ انہیں عقیدے اور اصولوں سے جوڑ دیا جاتا ہے۔

(الف) مسئلہ انفال میں انہیں ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ خدا سے ڈریں اور جب خدا کو یاد کریں تو خوف محسوس کریں اور ایمان کے ساتھ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کریں۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۱) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ

الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۳) اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (٤) (۸: ۱ تا ٤) "اے پیغمبر لوگ تم سے غنیمتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں' کہہ دو کہ یہ غنیمتیں اللہ اور اس کے رسول کی ہیں' پس اللہ سے ڈرو اور آپس کے باہم تعلقات ٹھیک رکھو۔ اگر تم مومن ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ مومن تو وہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دھل جاتے ہیں اور جب ان پر آیات الہٰی کی تلاوت ہوتی ہے تو ان کے ایمان کو زیادہ کر دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں اور مغفرت ہے اور عزت کی روزی ہے۔"

(ب) اس جنگ کی منصوبہ بندی کے سلسلے میں انہیں بتایا جاتا ہے کہ جنگ کا منصوبہ خود اللہ نے بنایا اور اللہ کی تقدیر اور تدبیر اس میں کارفرما رہی اور تمام مراحل میں دست قدرت کام کرتا رہا۔

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ---

(۸: ۲ ٤) "حقیقت یہ ہے کہ کافروں کو تم نے قتل نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ نے قتل کیا اور تم نے مٹی نہیں پھینکی جب پھینکی تھی' بلکہ اللہ نے پھینکی تھی تاکہ ایمان والوں کی اپنی طرف سے اچھی آزمائش کرے۔"

(ج) جب یہ حکم دیا جاتا ہے کہ تم جنگ میں ثابت قدم رہو' تو ساتھ ہی بتا دیا جاتا ہے کہ اس جنگ کے ذریعے اللہ تمہیں زندہ کرنا چاہتا ہے۔ اگر اللہ چاہے تو وہ تمہارے اور اس کے درمیان حائل ہو سکتا ہے۔ اگر تم اللہ پر بھروسہ کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۸: ٤ ۲) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو' جب رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے اور جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ کہ تم نے اسی کی طرف لوٹنا ہے۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

(۸: ٥ ٤) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم کسی گروہ کے مقابل ہو' تو ثابت قدم رہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

(ھ) اس معرکے کا ہدف اس طرح مقرر کیا جاتا ہے :

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ "اور کافروں سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لئے ہو جائے۔"

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ "نبی کے لئے سزاوار نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ ملک میں غلبہ حاصل نہ کر لے۔"

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (۷) لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (۸) (۸ : ۷ - ۸) "وہ وقت یاد کرو جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو گروہوں میں سے کوئی ایک تمہارے ہاتھ آ جائے گا۔ اور تم یہ چاہ رہے تھے کہ کمزور گروہ تمہارے ہاتھ آئے، لیکن اللہ چاہتا تھا کہ اپنے احکام سے حق کا حق ہونا ثابت کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق کو حق اور باطل کو باطل کر دکھائے، خواہ مجرموں کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو۔"

(و) اسلامی معاشرے میں لوگوں کا باہم تعلق اور پھر اسلامی معاشرے کا دوسری اقوام سے تعلق اسلامی نظریہ حیات کی اساس پر متعین ہو گا۔ اس نظریہ پر اکٹھ اور اسی پر جدائی ہو گی اور اسلامی صفوں میں لوگ آگے اور پیچھے اسی عقیدے کی اساس پر ہوں گے۔"

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ (۷۴) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۷۵) ع (۸ : ۷۴ - ۷۵) "جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا اور جن لوگوں نے مہاجرین کو جگہ دی اور مدد کی تو یہ لوگ ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو لوگ ایمان تو لے آئے اور ہجرت نہیں کی تو ان سے تمہارا رفاقت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک وہ ہجرت نہ کریں۔ ہاں اگر دین کے بارے میں تم سے مدد طلب کریں تو ان کی مدد کرنا تم پر لازم ہے، مگر اس قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ برپا ہو گا۔ جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی

راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے مہاجرین کو جگہ دی اور ان کی مدد کی تو یہی لوگ سچے مومن ہیں ۔ ان کے لئے مغفرت ہے اور عزت کی روزی اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ ہوکر جہاد بھی کیا تو وہ بھی تم ہی میں داخل ہیں ۔ قرابت دار تو اللہ کے حکم کے مطابق ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں ۔ یقیناً اللہ ہر شے کا علم رکھتا ہے ۔"

---○○○---

اس سورہ میں اسلامی نظریہ حیات کی لائن کے علاوہ ایک دوسری لائن پر بھی تفصیلی بات ہوئی ہے اور وہ ہے عمل جہاد' اور اس موضوع پر بتایا گیا ہے کہ جہاد کی ایمانی اور تحریکی حیثیت کیا ہے اور یہ کہ اس جہاد کو خالص اللہ کی راہ میں ہونا چاہئے اور اس کے اندر ذاتی خواہشات کا شائبہ تک داخل نہ ہونا چاہئے ۔ نیز جہاد کے اعلیٰ مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ہر مجاہد کو آگے بڑھنا چاہئے ۔ نہایت اعتماد' نہایت اطمینان اور نہایت ہی علو شان کے ساتھ ۔ اس پوری سورہ میں جہاد کے بارے میں ہدایات ہیں' ہم یہاں چند آیات کو بطور نمونہ پیش کریں گے اور تشریحات آیات پر تفسیر کے وقت دیکھئے ۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ (۱۵) وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۱۶) (۸ : ۱۵ – ۱۶) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم جب میدان جنگ میں کفار سے دوبدو مقابل ہو تو انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ اور جو کوئی ایسے موقعہ پر پیٹھ دکھائے گا وہ اللہ کے غضب میں آ گیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے ۔ مگر جو شخص جنگی چال کے طور پر یا کسی دستے سے ملنے کے لئے ایسا کرے' تو جائز ہے ۔"

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۵۵) اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ (۵۶) فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (۵۷) (۸ : ۵۵ تا ۵۷) "اے پیغمبر بلاشبہ اللہ کے نزدیک بدترین حیوان وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے ۔ تو وہ کسی طرح ایمان لانے والے نہیں اور خصوصاً وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا پھر وہ ہر موقعہ پر اپنا عہد توڑتے رہتے ہیں اور خدا سے ذرا نہیں ڈرتے' پھر اگر تم انہیں لڑائی میں پاؤ تو انہیں ایسی سزا دو کہ جو لوگ ان کے پس پشت ہیں ان کو بھاگتے دیکھ کر خود بھی بھاگ کھڑے ہوں اور شاید یہ عبرت پکڑیں ۔"

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ

سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (۸ : ۶۰) "اور جہاں تک تم سے ہو سکے قوت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے کافروں کے لئے مہیا کئے رکھو تاکہ اس طرح اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھائے رکھو اور ان کے سوا دوسروں پر بھی جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ انہیں خوب جانتا ہے اور اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ پورا پورا تمہیں دے دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی نہ ہوگی۔"

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْآ اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۸ : ۶۵) "اے نبی مومنوں کو کافروں کے ساتھ جنگ پر ابھارو' اگر تم میں سے بیس آدمی بھی ثابت قدم ہوں گے تو وہ دو سو کافروں پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے سو آدمی ایسے ہوں گے تو کافروں کے ایک ہزار پر غالب رہیں گے کیونکہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں۔"

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۸ : ۶۷) "نبی کے لئے سزاوار نہیں ہے کہ اس کے لئے قیدی ہوں جب تک کہ وہ ملک میں غلبہ حاصل نہ کرلے۔ تم تو دنیا کی متاع چاہتے ہو مگر اللہ تمہیں آخرت کی نعمتیں دینا چاہتا ہے اور اللہ زبردست اور حکمت والا ہے۔"

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۸ : ۷۴) "اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے مہاجرین کو جگہ دی اور اس کی مدد کی تو یہی لوگ سچے مومن ہیں ان کے لئے مغفرت ہے اور عزت و آبرو کی روزی ہے۔"

---OOO---

سب سے آخر میں' اس سورہ میں اسلام کے اجتماعی نظام اور اسلامی سوسائٹی کی بنیاد اسلامی نظریہ حیات پر رکھی گئی ہے اور وہ احکام بھی اس سورہ میں دیئے گئے جن کے مطابق اسلامی ریاست نے دوسری اقوام کے ساتھ معاملہ کرنا ہے۔ حالت جنگ میں بھی اور حالت صلح میں بھی' خصوصاً ان حالات میں جن میں یہ سورت نازل ہوئی تھی۔ اس میں اموال غنیمت کی تقسیم' معاہدات وغیرہ اور اسلامی حکومت کے قیام اور اسلامی معاشرے کی ترقی کے لئے اس میں بنیادی خطوط دیئے گئے ہیں اور یہ تمام امور نہایت ہی واضح الفاظ و عبارات ہیں۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (۸ : ۱) "اے پیغمبر' تم سے غنیمتوں

کے بارے میں پوچھتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ یہ غنیمتیں اللہ اور اس کے رسول کی ہیں۔"

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ (۱۵) وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۱٦) (۸ : ۱۵ - ۱٦) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم میدان جنگ میں کفار کے ساتھ دوبدو مقابل ہو' تو انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ اور سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرو اور جو کوئی ایسے موقعے پر پیٹھ دکھلائے گا' تو سمجھ لو کہ وہ اللہ کے غضب میں آگیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے۔ مگر ہاں جو شخص جنگی چال کے طور پر یا کسی گروہ سے جاملنے کے لئے ایسا کرے' تو کر سکتا ہے۔"

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو' اور حکم سننے کے بعد اس سے سرتابی نہ کرو۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ' جو کہتے تو ہیں کہ ہم نے سن لیا' حالانکہ وہ سنتے سناتے نہیں ہیں۔"

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۸ : ۲٤) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو' جب رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے اور جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ کہ تم اسی کی طرف لوٹتا ہے۔"

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۸ : ۲۷) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور رسول کی امانت میں خیانت نہ کرو اور نہ ہی اپنی امانتوں میں خیانت کرو اور تم اس بات کو خوب جانتے ہو۔"

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ (۳۸) وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۳۹) (۸ : ۳۸ - ۳۹) "اے پیغمبر جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے' ان سے کہہ دو کہ اگر وہ باز آجائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا' وہ سب انہیں معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہ

پچھلی روش کا اعادہ کریں گے تو پچھلی قوموں کے ساتھ جو کچھ گزر چکا ہے تو وہ سب کو معلوم ہے۔ اور ان کے ساتھ اس وقت تک لڑتے رہو کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لئے ہو جائے' پھر اگر یہ لوگ باز آ جائیں تو کچھ نہ کریں گے۔ اللہ دیکھنے والا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُم مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (۸: ۴۱) "اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ بطور غنیمت تمہیں حاصل ہوا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول کے لئے اور قرابت داروں' یتیموں' مسکینوں اور مسافروں کے لئے۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۴۵) وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (۴۶) وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (۴۷) (۸: ۴۵ تا ۴۷) "اے ایمان والو' جب تم کسی گروہ کے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرو' تاکہ تم فلاح پاؤ' اور اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرو' اور آپس میں جھگڑا نہ کرو' ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور لڑائی کی تکلیفوں پر صبر کرو' بلاشبہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور ان کافروں جیسے نہ بنو جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور جو کچھ بھی یہ لوگ کرتے ہیں' اللہ اپنے علم و قدرت سے اس پر چھایا ہوا ہے۔"

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۵۵) اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ (۵۶) فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (۵۷) وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ (۵۸) وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ (۵۹) وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (٦٠) (٨: ٥٥

تا ٦٠) "اے پیغمبر بلاشبہ اللہ کے نزدیک بدترین حیوان وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے تو وہ کسی طرح ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا' پھر وہ ہر موقعہ پر اپنا عہد توڑتے رہتے ہیں اور خدا سے ذرا نہیں ڈرتے' تو تم اگر انہیں لڑائی میں پاؤ تو انہیں ایسی سزا دو کہ جو لوگ ان کے پس پشت ہیں' ان کو بھاگتے دیکھ کر خود بھی بھاگ کھڑے ہوں اور شاید بدعہدی کے انجام سے عبرت پکڑیں اور اگر انہیں کسی قوم کی طرف سے دغا کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے سامنے پھینک دو تاکہ تم اور وہ برابر ہو جائیں۔ یقیناً اللہ دغا بازوں کو پسند نہیں کرتا اور کافر یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ بازی لے گئے۔ وہ ہمیں عاجز نہیں کر سکتے۔ جہاں تک تم سے ہو سکے قوت اور تیار بندھے ہوئے گھوڑے کافروں کے لئے تیار رکھو' تاکہ اس طرح اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو نیز ان کے سوا دوسروں پر بھی جنہیں تم نہیں جانتے' مگر اللہ انہیں خوب جانتا ہے اور اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی خرچ کرو گے وہ پورا پورا تمہیں دے دیا جائے گا اور ذرا بھی تمہاری حق تلفی نہ ہوگی اور اے پیغمبر' اگر دشمن صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اسی طرف جھکو اور اللہ پر بھروسہ رکھو بلاشبہ وہی سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اور اگر ان کا ارادہ تمہیں دھوکہ دینے کا ہو تو بھی کچھ پرواہ نہ کرو۔ اللہ تمہارے لئے کافی ہے وہی تو ہے جس نے تمہیں اپنی مدد سے اور مومنین کی جماعت سے تمہاری تائید کی۔"

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (٦٤) يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (٦٥) اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (٦٦) (٨: ٦٤ -

٦٦) "اے پیغمبر' تمہارے لئے اللہ کافی ہے اور مومنین کے لئے بھی جنہوں نے تمہارا اتباع کیا۔ اے پیغمبر مومنوں کو کافروں کے ساتھ جنگ پر ابھارو۔ اگر تم میں سے بیس آدمی بھی ثابت قدم ہوں گے تو وہ دو سو کافروں پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے سو آدمی ایسے ہوں گے تو کافروں کے ایک ہزار پر غالب رہیں گے۔ کیونکہ کافر ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے ہی نہیں۔ مسلمانو اب اللہ نے تم پر تخفیف کر دی۔ اس نے جان لیا کہ تم میں ابھی کمزوری ہے تو اگر تم میں سے ثابت قدم رہنے والے سو ہوں گے تو وہ دو سو کافروں پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں گے تو وہ اللہ کے اذن سے دو ہزار پر غالب رہیں گے اور یاد رکھو کہ اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔"

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۸: ۶۷) "نبی کے لئے سزاوار نہیں ہے کہ اس کے لئے قیدی ہوں جب تک کہ وہ ملک میں غلبہ حاصل نہ کرلے۔ تم تو دنیا کی متاع چاہتے ہو مگر اللہ تمہیں آخرت کی نعمتیں دینا چاہتا ہے اور اللہ زبردست اور حکمت والا ہے۔"

اور اگر اس بارے میں اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا تھا اس کی پاداش میں تمہیں بڑا عذاب پہنچتا۔ بہرحال جو کچھ تمہیں غنیمت میں ہاتھ لگا ہے اسے حلال و طیب سمجھ کر کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بلاشبہ اللہ غفور و رحیم ہے۔ اے پیغمبر قیدی جو ہنوز تمہارے قبضے میں ہیں' ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ کو تمہارے دلوں میں کچھ نیکی کا علم ہوا تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے بہتر تمہیں عطا فرمائے گا اور تمہیں بخش دے۔ اللہ غفور و رحیم ہے لیکن اگر وہ تم سے خیانت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو یہ اس سے پہلے اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں۔ تو اللہ نے ان کو تمہارے ہاتھ گرفتار کرا دیا۔ اللہ بڑے علم اور حکمت والا ہے۔"

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۷۴) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۷۵) ع (۸: ۷۴ - ۷۵) "جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا اور جن لوگوں نے مہاجرین کو جگہ دی اور مدد کی تو یہ لوگ ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو لوگ ایمان تو لے آئے اور ہجرت نہیں کی تو ان سے تمہارا رفاقت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک وہ ہجرت نہ کریں۔ ہاں اگر دین کے بارے میں تم سے مدد طلب کریں تو ان کی مدد کرنا تم پر لازم ہے' مگر اس قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو۔ اللہ اسے دیکھتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ برپا ہو گا۔ جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے مہاجرین کو جگہ دی اور ان کی مدد کی تو یہی لوگ سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے مغفرت ہے اور عزت کی روزی اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ ہو کر جہاد بھی کیا تو وہ بھی تم ہی میں داخل ہیں۔ قرابت دار تو اللہ کے حکم کے مطابق ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔ یقیناً اللہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔"

---ooo---

یہ تھے' اجمالاً اس سورہ کے بڑے بڑے خطوط۔ اگرچہ یہ سورہ غزوۂ بدر کے بارے میں نازل ہوئی اور اس کے مباحث اصلاً اس واقعہ پر تبصرہ ہیں۔ لیکن یہ سورہ بھی مسلمانوں کی تربیت کا ایک خاص انداز اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس

نے مسلمانوں کو انسانیت کی قیادت کے لئے تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔اور اس میں یہ بات بھی کھول کر بتا دی گئی ہے کہ اسلامی نظام زندگی اور دین اسلام زندگی کے عملی واقعات اور کرۂ ارض پر رونما ہونے والے حالات پر کس انداز سے نظر ڈالتا ہے اور زندگی کے حقائق کے بارے میں اسلام کا کیا تصور سامنے آتا ہے۔

درحقیقت یہ غزوہ' وہ پہلا بڑا ٹکراؤ تھا جو مسلمانوں اور ان کے مشرک دشمنوں کے درمیان ہوا' اس ٹکراؤ میں مشرکین کو سخت ہزیمت اٹھانی پڑی' لیکن فی الحقیقت مسلمان اپنے گھروں سے اس مقصد کے لئے نہ نکلے تھے مسلمان درحقیقت قافلہ قریش پر ہاتھ ڈالنے کے لئے نکلے تھے۔جنہوں نے مہاجرین کو اپنے گھروں سے نکال کر ان کے اموال پر قبضہ کر لیا تھا۔پس اللہ نے اس مومن گروہ کے لئے وہ بات پسند نہ کی جو انہوں نے خود اپنے لئے پسند کی تھی۔اللہ نے یہ پسند فرمایا کہ قافلہ بچ نکلے اور مسلمان دستے کا مقابلہ اس دشمن سے ہو جائے جس نے تحریک اسلامی کی راہ روک رکھی تھی اور انہوں نے آخر قائد تحریک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی سازش بھی کی تھی اور اس سے قبل انہوں نے آپ کے ساتھیوں پر وہ مظالم ڈھائے تھے جو آخری حدود تک پہنچ گئے تھے۔انہیں ناقابل تصور اذیت دی تھی۔

اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ یہ واقعہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن معرکہ بن جائے اور اس کے ذریعہ اسلامی تاریخ کا دھارا بدل جائے بلکہ اس کے ذریعے پوری انسانی تاریخ کا رخ پھیر دیا جائے۔اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اہل ایمان کو جتلا دے کہ وہ اپنے لئے جو بہتری سوچتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے لئے جو بہتری سوچتا ہے ان دونوں کے درمیان کس قدر تفاوت ہے۔حالانکہ وہ اللہ کی پسند کو ابتداء میں پسند نہ کرتے تھے۔نیز اس واقعہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ یہ بھی جتلانا چاہتے تھے کہ فتح اور شکست کے اسباب اور اصل عناصر کیا ہوتے ہیں' ان کو ان عوامل کا پتہ اس وقت چلا جب وہ میدان معرکہ میں تھے۔غرض اس پوری سورہ میں ان اعلیٰ مفاہیم کے اشارے پائے جاتے ہیں اور بڑے بڑے حقائق اس میں بیان کیے گئے ہیں۔نیز اس میں قوانین صلح و جنگ بھی وضع کیے گئے ہیں۔قوانین مال غنیمت' قوانین اسیران' اصول معاہدات و مواثیق اور اسباب فتح و شکست بیان ہوئے ہیں مگر نہایت ہی موثر اور معجزانہ انداز میں۔غرض ان سب امور کے بارے میں نظریات اور تصور حیات کو تمام انسانی سرگرمیوں کا اصل محرک بتایا گیا ہے۔اور یہ قرآنی فلسفہ تعبیر واقعات کا ایک خاص اسلوب ہے۔

پھر اس سورہ میں واقعات جنگ کے بعض مناظر بھی دکھلائے گئے۔اس جنگ سے قبل لوگوں کی سرگرمیاں' جنگ کے دوران لوگوں کی کشمکش اور جنگ کے بعد کے واقعات بھی ثبت کئے گئے ہیں۔یہ مناظر اس قدر تازہ اور زندہ ہیں کہ انسان کے تصور میں واقعات جنگ کو از سرنو تازہ کر دیتے ہیں۔یوں نظر آتا ہے کہ قارئین کی آنکھوں کے سامنے یہ واقعات نمودار ہو رہے ہیں۔اور پڑھنے والا واقعات کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔

اس سورہ میں حضور کی زندگی کے بعض واقعات' آپ کے ساتھیوں کی زندگیوں کے بعض واقعات جب وہ مکہ میں تھے اور قلیل و ضعیف تھے۔اس قدر ضعیف کہ ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ کوئی بڑی طاقت اس تحریک کو جڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینک دے۔اور یہ جھلک ان کو اس لئے دکھائی جاتی ہے کہ اس حالت فتح و کامرانی میں وہ ذرا اپنے پچھلے حالات کو بھی ذہنوں میں تازہ رکھیں اور سمجھیں کہ اللہ نے ان پر کس قدر کرم کیا ہے اور ان کو یہ بھی معلوم ہو کہ ان کو یہ نصرت اللہ کے فضل و کرم سے نصیب ہوئی ہے اور یہ کہ انہوں نے جان و مال کی قربانی دی ہے۔اسی لئے فتح نصیب ہوئی ہے۔اس سورہ

میں ہجرت سے قبل اور ہجرت کے بعد کے ادوار میں مشرکین کے حالات زندگی کی کچھ جھلکیاں بھی دکھائی گئی ہیں اور انسانی تاریخ سے اہل کفر و شرک کے انجام بھی بتائے گئے ہیں مثلاً اہل فرعون اور ان سے پہلے کے لوگوں کے واقعات تاکہ یہ بتایا جائے کہ اس کائنات میں اللہ کی جاری کردہ سنت کے مطابق واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں اور یہ کہ اللہ اپنے دوستوں کی مدد کرتے ہیں اور دشمنوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔

یہ ہیں اجمالاً اس سورہ کے موضوعات بحث 'یہ پوری سورہ ایک اکائی ہے۔اگرچہ ہم اس کے ایک حصے کا تجزیہ یہاں کریں گے اور دوسرے کا دسویں پارے میں کریں گے۔ان شاء اللہ ---- میں سمجھتا ہوں کہ اس سورہ پر یہاں اس قدر تبصرہ کافی ہے اور اب ہم نصوص قرآنی کی تفسیر اور تشریح کی طرف آتے ہیں۔'

# درس نمبر ۸۳ ایک نظر میں

یہ اس سورہ کا پہلا سبق ہے۔ اس کا موضوع انفال اور اموال غنیمت کی تقسیم ہے۔ اموال غنیمت اور انفال میں وہ تمام چیزیں شامل ہوتی ہیں جو میدان جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ لگتی ہیں' جبکہ یہ جنگ جہاد فی سبیل اللہ ہو۔ سب سے پہلے اہل بدر کے درمیان اموال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں اختلافات پھوٹ پڑے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا فیصلہ اس طرح کیا کہ ان کے بارے میں جو حکم دیا جارہا ہے وہ تمہارے لئے ضابطہ عمل ہو گا۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خدا خوفی اور اطاعت رسول کے معاملے کی طرف بھی متوجہ کیا اور لوگوں کے دلوں میں ایمان اور تقویٰ کے جذبات ابھارے گئے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں یاد دلایا کہ تم تو آغاز ہی سے یہ چاہتے تھے کہ قافلے پر حملہ کر کے مال غنیمت حاصل کر لو۔ لیکن اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ تمہیں نصرت اور عزت سے نوازے۔ پھر انہیں یاد دلایا کہ ذرا اس معرکے کے مراحل پر غور کرو کہ تمہاری تعداد اور سازو سامان دشمن کے مقابلے میں بہت ہی کم تھا' وہ تم سے کہیں زیادہ تھا۔ مگر اللہ نے فرشتوں کے ذریعے تمہارے قدم مضبوط کئے۔ پھر اس نے بارش برسا کر تمہارے لئے لڑنا آسان کر دیا۔ تمہارے پاؤں مضبوطی سے جمتے تھے' تم بارش کے پانی سے مویشیوں کو سیراب کرتے تھے اور غسل کرتے تھے کیونکہ جنگ بدر ریت کے میدان میں لڑی گئی تھی اور ریت میں انسانوں اور گھوڑوں کے قدم دھنس جایا کرتے ہیں۔ پھر یاد دلایا گیا کہ تم کو ایک قسم کی نیند نے آلیا اور نیند آتے ہی تم مطمئن ہو گئے۔ پھر اللہ نے تمہارے دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور ان پر شدید عذاب نازل کر دیا۔

ان تجربات کی روشنی میں قرآن ان کو حکم دیتا ہے کہ تم ہر جنگ میں ثابت قدمی اختیار کرو۔ اگرچہ بظاہر تمہیں دشمنوں کی قوت زیادہ نظر آئے کیونکہ قتل کرنے والا اللہ ہوتا ہے۔ اللہ ہی درصل تیر چلاتا ہے۔ وہی معاملات کی تدبیر کرتا ہے' تم تو دراصل تقدیر الٰہی کے لئے ایک پردہ ہو' وہ تمہیں جس طرح چاہتی ہے' چلاتی ہے۔

اس کے بعد اس سبق میں مشرکین کی اس احمقانہ حرکت پر تبصرہ کیا گیا ہے کہ یہ لوگ اس واقعہ سے قبل اللہ کے سامنے دست بدعا تھے کہ اے اللہ آپ آج کی جنگ میں اس فرقے کو تباہ کر دیں جو گمراہ ہو اور جو صلہ رحمی کا قاطع ہو۔ اللہ فرماتے ہیں اَنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَاءَ كُمُ الْفَتْحُ "اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو لو فیصلہ تمہارے سامنے آگیا۔"

مسلمانوں کو کہا جاتا ہے کہ اپنی زندگیوں سے نفاق کو دور کرو اور منافقوں کا رویہ اختیار نہ کرو۔ جو کہتے تو یہ تھے کہ ہم سنتے ہیں لیکن سنتے نہ تھے اس لئے کہ وہ سن کر مانتے نہ تھے۔

اس سبق کے آخر میں مسلمانو! کو بار بار پکارا جاتا ہے کہ مسلمانو! رسول تمہیں جب بھی پکارے تو لبیک کہو' اس لئے کہ وہ تمہیں ایک ایسی دعوت دیتا ہے جس کے نتیجے میں تمہیں زندگی دوام حاصل ہو گی۔ اگرچہ بظاہر وہ تمہیں موت اور قتل کی طرف بلا رہا ہو۔ اللہ اہل ایمان کو یاد دلاتا ہے کہ وہ وقت یاد کرو جب تم قلیل اور کمزور تھے۔ تمہیں ہر وقت ہر

طرف سے ڈر لگا رہتا تھا کہ دشمن کہیں تمہیں اچک نہ جائے ۔ان حالات میں اللہ نے تمہیں پناہ دی 'نصرت دی ۔اور اب تمہارے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ اگر تم تقویٰ کی راہ اختیار کرو تو اللہ تمہیں فیصلہ کن طرز عمل اور فیصلہ کن رائے عطا کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا' تمہاری تقصیرات سے درگذر کرے گا اور اللہ کے ہاں جو کچھ تمہارے لئے دار آخرت میں تیار ہے وہ اس جہاں کے تمام غنائم و اموال سے کہیں زیادہ ہے ۔

---000---

# درس نمبر ۸۲ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۲۹

سُوْرَۃُ الْاَنْفَالِ (۸) مَدَنِيَّةٌ (۸۸) اٰيَاتُهَا ۷۵ رُكُوْعَاتُهَا ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۠ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۲ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۴

(اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔ لوگ تم سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں ۔ کہو ”یہ انفال تو اللہ اور اس کے رسول ؐ کے ہیں‘ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو اور اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرو ‘ اگر تم مومن ہو ۔“ سچے اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں ‘ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں ۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں ۔ ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں ‘ قصوروں سے درگذر ہے اور بہترین رزق ہے ۔)

ان آیات کے نزول کے بارے میں جو روایات وارد ہیں ‘ ان کا ایک بڑا حصہ ہم نے اس سورۃ کے تعارف کے ضمن میں نقل کیا تھا ۔ یہاں ہم بعض دوسری روایات کا اضافہ کرتے ہیں ۔ تاکہ وہ حالات قاری کے پیش نظر رہیں جن میں عموماً یہ سورت نازل ہوئی ہے ۔ خصوصاً جن حالات میں وہ آیات نازل ہوئیں جن کا تعلق اموال غنیمت سے ہے ۔ ان روایات سے یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ مدینہ میں پہلی اسلامی حکومت کے قیام کے وقت جماعت مسلمہ کے خدوخال کیا تھے ؟ اور وہ کن عملی دشواریوں سے گزر رہی تھی ۔

ابن کثیر فرماتے ہیں : ابوداؤد' نسائی' ابن جریر' ابن مردویہ (الفاظ ان کے ہیں) ابن حبان' اور حاکم نے بواسطہ داؤد ابن ابوہند اور عکرمہ' ابن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب بدر کا دن آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے یہ یہ کیا' اسے یہ یہ جزا ہوگی۔" اسی طرح قوم کے نوجوان آگے بڑھ گئے اور بوڑھے لوگ جھنڈوں کے آس پاس رہے۔ جب اموال غنیمت کا وقت آیا تو انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ مطالبات شروع کر دیئے جن کا وعدہ حضورؐ نے فرمایا تھا۔ تو بڑے لوگوں نے یہ کہا کہ تم لوگ ترجیحات کا مطالبہ نہ کرو کیونکہ ہم لوگ تمہارے لئے چادر تھے' اگر تمہیں شکست ہوتی تو تم ہمارے پاس پناہ لیتے۔ اس پر ان دو گروہوں کے درمیان تنازعہ ہو گیا۔ اس موقعہ پر اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ (۸ : ۱) تا وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ اور ثوری نے کلبی سے' ابوصالح سے' ابن عباس سے یہ روایت کی ہے۔ کہتے ہیں : جب بدر کی جنگ ہوئی' تو حضورؐ نے فرمایا کہ جس نے کسی کو قتل کیا تو اس کے لئے یہ یہ انعام ہو گا اور جس نے کسی کو قید کیا تو اسے یہ یہ انعام دیا جائے گا۔" اس موقع پر ابو الیسیر نے دو آدمیوں کو قیدی بنا لیا تو انہوں نے عرض کیا یہ لیجئے حضورؐ آپ نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اس پر سعد ابن عبادہ کھڑے ہوئے اور فرمایا حضورؐ اگر آپ نے ان لوگوں کو اس طرح غنائم دیئے تو آپ کے ساتھیوں کے لئے کچھ نہ رہے گا۔ نیز ہم لوگ لڑائی کرنے سے اس لئے باز نہیں رہے کہ ہمیں اجر کی ضرورت نہ تھی یا ہم دشمن سے ڈرتے تھے۔ ہم یہاں اس لئے کھڑے رہے کہ آپؐ کی حفاظت ہو۔ یہ نہ ہو کہ دشمن پیچھے سے آپؐ پر حملہ کر دے۔ چنانچہ اس پر کافی تنازعہ ہو گیا اور اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (۸ : ۱) انہوں نے کہا اور اسی سلسلے میں یہ آیات بھی نازل ہوئیں وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ الخ

امام احمد نے ایک روایت نقل کی۔ فرماتے ہیں : ابو معاویہ نے روایت کی ہے' ابو اسحاق شیبانی سے' محمد ابن عبید اللہ ثقفی سے' سعد ابن ابو وقاص سے' یہ کہتے ہیں : بدر کی جنگ کے موقعہ پر میرے بھائی عمر قتل ہو گئے تھے' میں نے سعید ابن العاص کو قتل کیا اور اس کی تلوار لے لی۔ اس تلوار کا نام "ذوالکثیفہ" تھا۔ میں یہ تلوار لے کر حضورؐ کے پاس آیا۔ حضورؐ نے فرمایا جاؤ اور اسے مقبوضات میں پھینک دو۔ کہتے ہیں' میں تلوار پھینک کر لوٹا لیکن میرے حال کو صرف خدا ہی جانتا تھا کہ میرا بھائی بھی قتل ہو گیا اور میرے ہاتھ جو قیمتی چیز لگی تھی وہ بھی نہ مل سکی۔ میں تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ سورہ انفال نازل ہو گئی۔ حضورؐ نے مجھے حکم دیا کہ جاؤ وہ تلوار لے لو جو تمہارے ہاتھ لگی تھی۔

امام احمد فرماتے ہیں' اسود ابن عامر نے روایت کی' ابوبکر سے' عاصم ابن ابو النجود سے' مصعب ابن سعد سے' سعد ابن مالک سے۔ یہ کہتے ہیں : میں نے حضورؐ سے کہا کہ آج اللہ نے مشرکین سے مجھے شفا عطا کی تو یہ تلوار آپ مجھے بخش دیں۔ حضورؐ نے فرمایا یہ تلوار نہ میرے لئے ہے اور نہ تیرے لئے۔ اسے ادھر رکھ دو۔" تو اس نے کہا کہ میں نے تلوار رکھ دی اور واپس ہو گیا۔ ممکن ہے کہ یہ تلوار اس شخص کو ملے جس نے میری طرح اس کا حق ادا نہ کیا ہو۔ اچانک میں نے سنا کہ ایک شخص پیچھے سے مجھے پکار رہا ہے۔ کہتے ہیں میں نے یہی سمجھا کہ شاید میرے بارے میں کوئی آیت نازل ہو گئی۔ حضورؐ نے فرمایا تم نے مجھ سے تلوار مانگی تھی' اور یہ میری ملکیت نہ تھی اور اب یہ مجھے بخش دی گئی ہے لہذا اب یہ تمہاری ہے۔" اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (۸ : ۱) ابوداؤد' ترمذی' نسائی نے ابوبکر ابن عیاش سے یہ روایت نقل کی ہے ۔متعدد طریقوں سے،امام ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے ۔

ان روایات سے وہ فضامعلوم ہو جاتی ہے جس میں سورہ انفال نازل ہوئی ۔انسان یہ روایات پڑھ کر ایک بار حیران سا ہو جاتا ہے کہ اہل بدر اور یہ باتیں ! اس لئے کہ ان میں تو وہ لوگ تھے جو یا تو مہاجرین تھے جنہوں نے مکہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا اور محض اپنے نظریات کی وجہ سے مدینہ چلے آئے تھے اور ان کی نظروں میں اس دنیا کے مفادات بہرحال ہیچ تھے ۔یا ان میں وہ انصار سابقین تھے جنہوں نے ان مہاجرین کو پناہ دی تھی اور انہیں اپنے علاقے اور اموال میں شریک کر لیا تھا ۔وہ ان کے ساتھ اس دنیا کے مفادات میں سے کسی مفاد میں بھی بخل نہ کرتے تھے ۔ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۹ : ۵۹) " یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ محتاج ہوں ۔"

اس صورت حالات کی تشریح کی طرف اشارہ خود ان روایات میں موجود ہے ۔اس وقت مال غنیمت کا تعلق اس بہادری اور شجاعت سے تھا' جس کا مظاہرہ ایک فوجی میدان جنگ میں کرتا تھا اور یہ مالی انعام اس بات کی علامت بھی ہوا کرتا تھا کہ انعام پانے والے نے داد شجاعت دی ہے اور اس دور میں لوگ اس بات کی خواہش رکھتے تھے کہ انہیں رسول اللہ کے ہاتھوں انعام خصوصی ملے جو براہ راست اللہ کی طرف سے انعام تصور ہو گا ۔خصوصاً اس پہلے معرکے میں جو اسلام اور کفر کے درمیان برپا ہوا ۔اس حرص اور انعام کے اس لالچ میں ایک دوسری صفت دب کر رہ گئی اور بعض لوگوں نے اموال غنیمت کے بارے میں بات کی اور اللہ نے ان کو اس صفت کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا ۔وہ یہ کہ ایک دوسرے کے ساتھ معاملات میں ذرا حسن معاملت کی ضرورت ہے اور تمہاری قلبی اصلاح کی سخت ضرورت ہے ۔چنانچہ انہوں نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا اور سمجھ گئے ۔ایک موقع پر حضرت عبادہ ابن الصامت نے فرمایا :" یہ آیات ہم اصحاب بدر کے بارے میں نازل ہوئیں ۔جب ہم نے اموال غنیمت میں اختلاف کیا اور اس میں ہم اخلاقی حدود سے آگے نکل گئے ۔اللہ ان اموال کو ہمارے اختیار سے نکال لایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں دے دیا ۔"

اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کی عملی اور لسانی تربیت فرمائی ۔چنانچہ اموال غنیمت کی تقسیم کے اختیارات ان سے لے لئے اور کلی طور پر یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دے دیے ۔یہاں تک کہ تقسیم غنائم کے بارے میں تفصیلی احکامات نازل ہوئے ۔لہٰذا اس معاملے میں ان کے لئے کسی تنازعے کا کوئی حق ہی نہ رہا ۔یہ اللہ کا فضل ہو گیا ۔رسول اللہ نے ان کے درمیان ان کی تقسیم اس طرح فرمائی جس طرح رب تعالیٰ نے آپ کو ہدایت دی ۔اس عملی اصلاح کے ساتھ ساتھ یہ طویل اور مسلسل ہدایات بھی ان کو دی گئیں اور یہ ہدایات اس سورہ میں دور تک چلی گئیں ۔آغاز یوں ہوا :

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۸ : ۱) "تم سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو" یہ انفال تو اللہ اور اس کے رسول ؐ کے ہیں، پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔"

یہ سوال ان لوگوں کی جانب سے تھا جنہوں نے غنائم پر تنازعہ کیا تھا اور یہ پکار بھی انہی کے نام ہے کہ اللہ کا خوف کرو، اللہ تمہارے دلوں کا خالق ہے اور تمہارے دلوں میں جو باتیں آتی ہیں ان کو وہ جانتا ہے۔ اللہ اس بات پر گرفت نہیں کرتا کہ کسی کے دل میں دنیاوی مقاصد کی خواہش کیوں آتی ہے۔ اور اس پر نزاع کیوں واقع ہو گیا۔ اگرچہ اس نزاع کی تہ میں یہ جذبہ تھا کہ رسول کے ہاتھوں ان کو انعام ملے جو ان کے حسن کارکردگی پر دلیل و برہان ہو۔ لیکن اللہ نے دنیا و آخرت کی کامیابی کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ تم اپنے دلوں میں تقویٰ اور خدا خوفی کا جذبہ پیدا کرو، اس لئے کہ جس دل کا تعلق باللہ نہ ہو اور وہ اللہ کے غضب سے نہ ڈرتا ہو اور اسے رضائے الٰہی کے حصول کی خواہش نہ ہو تو وہ ہرگز دنیاوی مفادات کو نظر انداز نہیں کر سکتا اور وہ کبھی بھی شعوری طور پر ان آلودگیوں سے دور نہیں ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ دلوں کی لگام ہے اور تقویٰ ہی کے ذریعے دلوں کی قیادت کی جا سکتی ہے اور بڑی ہی سہولت کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ قرآن کریم اول سے آخر تک انسان کی قیادت اسی تقویٰ اور تعلق باللہ کی لگام کے ذریعے کرتا ہے اور اس کو اصلاح کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔

قرآن کہتا ہے فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ (۸ : ۱) "تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو۔" اور آگے کہا جاتا ہے کہ یہی وہ ذریعہ ہے جس کی وجہ سے تم اطاعت رسول کر سکتے ہو۔ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۸ : ۱) "اور اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔"

اللہ اور رسول ؐ کی پہلی اطاعت یہ ہے کہ تم ان احکام کو تسلیم کرو جو اللہ کی طرف سے انفال کے بارے میں آ رہے ہیں۔ مثلاً اموال غنیمت کو اب مجاہدین کی ملکیت سے نکال دیا گیا ہے اور ان کی ملکیت اللہ اور رسول ؐ کو دے دی گئی ہے۔ لہٰذا اب ان کے بارے میں تصرف کا حق صرف اللہ اور رسول ؐ کو ہے۔ اہل ایمان کا فرض یہ ہے کہ اس کے بارے میں اللہ اور رسول ؐ کے احکام کو تسلیم کریں۔ اور اللہ کی ہدایات کے مطابق رسول اللہ ؐ کی تقسیم کو قبول کریں اور بطیب خاطر قبول کریں، راضی برضا ہوں اور اپنے مابین کے تعلقات کی اصلاح کریں اور اپنے شعور اور احساسات کو درست کریں اور اپنے دلوں کو ایک دوسرے کے معاملے میں صاف کر لیں۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۸ : ۱) "اگر تم مومن ہو۔"

یہ ضروری ہے کہ ایمان کی کوئی عملی اور واقعی صورت ہو۔ اور اس عملی صورت میں ایمان نظر آئے اور واضح طور پر نمایاں ہو۔ وہ مجسم شکل میں نظر آئے اور انسان کے اعمال اس کے ایمان کے ترجمان ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ليس الايمان بالتمني ولكن هو ما وقر في القلب وصدقه الاعمال "ایمان صرف تمنا نہیں، یہ دل میں جاگزیں ہوتا ہے اور اعمال ایمان کی تصدیق کرتے ہیں۔" یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اس قسم کے فقرے فیصلہ کن انداز میں بار بار آتے ہیں اور ان سے مقصود یہی ہوتا ہے کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے اور اس کا اعمال کے

ساتھ کیا تعلق ہے۔ایمان صرف الفاظ کا نام نہیں ہے جو زبان پر جاری ہوتے ہیں' یا وہ محض تمنا بھی نہیں ہے جو نہ عالم واقعہ میں کچھ حقیقت رکھتی ہو اور نہ عالم اعمال میں اس کا وجود ہو!

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ ایک سچے مومن کی حقیقی صفات کیا ہوتی ہیں تاکہ ان کو یہ بتایا جائے کہ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۸: ۱) سے مراد کیا ہے؟ چنانچہ بتایا جاتا ہے کہ رب العالمین کے نزدیک مومن ایسا ہوتا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۲) الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۳) اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (٤) (۸: ۲ تا ٤) "سچے اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں۔جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں' قصوروں سے درگذر ہے اور بہترین رزق ہے۔"

لفظی اور نحوی اعتبار سے ان آیات کا طرز تعبیر نہایت ہی معنی خیز ہے اور نہایت ہی گہری معنویت رکھتا ہے۔یہاں لفظ قصر (انما) استعمال کیا گیا ہے۔اور یہاں کوئی ایسی وجہ نہیں ہے کہ ہم لفظ انما کی قصر کی تاویل کریں جبکہ اللہ تعالیٰ نہایت ہی تاکید سے ایک بات کہنا چاہتے ہیں' تاویلات یوں کی گئی ہیں کہ اس سے مراد ایمان کامل ہے۔اگر اللہ اس طرح کہنا چاہتا تو کہتا کہ کامل مومن وہ ہیں جو ایسے ایسے ہوں' درحقیقت یہ ایک نہایت مفصل تعبیر ہے۔مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کا احساس و شعور ایسا ہو اور جن کے صفات و اعمال ایسے ہوں وہی درحقیقت مومن ہوتے ہیں۔اور جن لوگوں کے اندر یہ صفات و اعمال نہیں ہیں وہ مومن نہیں ہیں اس لئے کہ اس آیت کے آخر میں اس نکتے کی بتکرار تاکید کی گئی ہے۔اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا "ایسے ہی لوگ فی الحقیقت مومن ہیں۔" اور جو لوگ فی الحقیقت مومن نہیں ہوتے وہ پھر کس طرح کے لوگ مومن کہلاتے ہیں---- قرآن کی تعبیرات خود ایک دوسرے کی تشریح و تفسیر کرتی ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ "حق سے آگے گمراہی کے سوا اور ہو کیا سکتا ہے۔" اس لئے جو حق نہ ہو گا وہ ضلالت ہو گی۔میں یہ کہتا ہوں کہ اَلْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا کے مقابلے کی تعبیر یہ نہیں ہو سکتی۔اَلْمُؤْمِنُوْنَ اِيْمَانًا غَيْر------ لہذا قرآن مجید کی اس قدر واضح اور دقیق انداز تعبیر کو تاویلات کے خراد پر نہیں چڑھانا چاہئے جن کی وجہ سے ہر صحیح تصور اور ہر صحیح تعبیر اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ بعض سلف صالحین یہ کہتے تھے کہ جس شخص کے عقیدے کے اندر اور اعمال کے اندر یہ صفات نہ ہوں اس نے ایمان نہیں پایا۔اور وہ سرے سے مومن ہی نہیں ہے۔ابن کثیر میں ہے' علی ابن طلحہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ آیت

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ (۸: ۲) "میں درحقیقت منافقین کا ذکر ہے' وہ جب نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں ان کے دلوں میں کچھ بھی داخل نہیں ہوتا اور وہ درحقیقت آیات الہیہ پر ایمان ہی نہیں رکھتے اور اللہ پر توکل ہی نہیں کرتے - اور جب لوگوں کے سامنے نہ ہوں تو ان کے ساتھ صلہ رحمی بھی نہیں کرتے اور وہ اپنے اموال کی زکوۃ بھی نہیں دیتے -" تو اللہ نے ان منافقین کے بارے میں خبر دی کہ وہ مومن نہیں ہیں - اس کے بعد اللہ نے حقیقی مومنوں کی صفات گنوا دیں - مثلاً

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ (۸: ۲) "اہل ایمان وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں -" اس طرح وہ اپنے فرائض ادا کرتے ہیں - وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا (۸: ۲) "جب ان پر آیات الہیہ پڑھی جائیں تو ان کا ایمان زیادہ ہو جاتا ہے -" یعنی ان کی تصدیق میں اضافہ ہوتا ہے - وَعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ (۸: ۲) "اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں -"

آئندہ سطور میں ہم یہ ثابت کریں گے کہ ان حقائق کے بغیر سرے سے ایمان کا وجود ہی نہیں قائم رہتا - اور اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان کی وجہ سے ایمان کامل ہوتا ہے اور نہ ہونے سے ناقص ہوتا ہے بلکہ سوال ایمان کے عدم یا وجود کا ہے -

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ (۸: ۲) "اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں -" جب کوئی مومن کسی امر یا نہی کے سلسلے میں اللہ کو یاد کرتے ہیں تو ان کے دل کے اندر ایک وجدانی ارتعاش پیدا ہوتا ہے - ان کے دل پر اللہ کی جلالت شان کی وجہ سے ہیبت طاری ہو جاتی ہے اور ان کے دل میں خوف خدا کی لہریں اٹھتی ہیں' اس طرح ان کی تقصیرات اور گناہوں کے بالمقابل اللہ کی ہیبت آ کھڑی ہوتی ہے اور اس طرح وہ باعث بنتی ہے عمل اور طاقت کا - جیسا کہ ام الدرداء رضی اللہ عنہا نے کہا: الوجل فی القلب کا فراق السعفة اما تجد له قشطریره؟ قال بلی قالت اذا وجدت فاذا وجدت ذلك فادع الله عند ذلك فان الدعا یذهب ذلك "وجل" کا مطلب یوں سمجھئے کہ جب کسی کو پھنسیاں نکل آئیں تو اسے جلن ہوتی ہے - کیا تم ایسی حالت میں کپکپی محسوس نہیں کرتے - کہا' ہاں ایسا ہی ہوتا ہے - فرمایا جب تم ایسی حالت کو پاؤ تو اللہ کو پکارو' دعا کے نتیجے میں یہ حالت چلی جاتی ہے -"

غرض یہ وہ حالت ہے جس میں دل میں بے قراری پیدا ہو جاتی ہے اور ایسے حالات میں ذکر اور دعاء کے نتیجے میں انسان کو راحت اور قرار نصیب ہوتا ہے اور یہ وہ حالت ہے جب انسان کسی امر اور نہی کے معاملے میں اللہ کو یاد کرتا ہے -

وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا (۸: ۲) "اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے -" قلب مومن کے لئے فی الحقیقت ان آیات میں وہ نکات ہیں جو اس کے ایمان کے لئے اضافے کا باعث ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے مومن کو اطمینان قلب نصیب ہوتا ہے - قرآن قلب مومن کے ساتھ براہ راست سلوک اور برتاؤ کرتا ہے اور قرآن اور قلب مومن کے درمیان صرف کفر کا پردہ حائل ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے قرآن

سے قلب مجوب ہو جاتا ہے اور قلب سے قرآن ۔جب ایمان کی وجہ سے حجاب اٹھتا ہے تو دل حلاوت قرآن کو محسوس کرنے لگتا ہے اور اس طرح قرآنی اثرات پڑتے پڑتے ایمان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے ۔یہاں تک کہ انسان کامل اطمینان کے مقام تک پہنچ جاتا ہے ۔جس طرح قرآن کے اثرات دل میں ایمان کی زیادتی کا باعث ہوتے ہیں ۔اسی طرح دل بھی قرآن کے اثرات کو اپنی طرف کھینچتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں یہ فقرہ بار بار آتا ہے ۔انّ فی ذٰلك لآیات للمُؤْمنینَ "بے شک اس میں مومنین کے لئے نشانیاں ہیں ۔" اس فقرے میں اسی حقیقت کو دہرایا جاتا ہے ۔انّ فی ذٰلكَ لآیَات لقَوْمٍ یُؤْمنُوْنَ "اس میں نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو ایمان لاتی ہے ۔" اور بعض صحابہ کرام کے اس قول کا یہی مطلب ہے کہ "ہمیں قرآن دیئے جانے سے قبل ایمان دیا جاتا تھا ۔"

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام قرآن کے ساتھ ایک مخصوص تعلق اور ذوق رکھتے تھے ۔ اور اس میں ان کی مدودہ فضا کرتی تھی جس میں وہ بادنسیم کے جھونکے پاتے تھے جبکہ قرآن ان کی عملی زندگی تھا ۔ایک عمل تھا' محض ذوق و ادراک نہ تھا۔ اس آیت کے نزول کی روایات میں ایک روایت سعد ابن مالک کا قول ہے ۔انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی تھی کہ ان کو مال غنیمت کے طور پر ایک تلوار دے دیں ۔اس وقت قرآن کی وہ آیات نازل نہ ہوئی تھیں جن میں غنائم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیارات کی طرف لوٹا دیا گیا تھا ۔آپ ؐ کو نہ یہ اختیار دیا گیا تھا کہ آپ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں ۔اور حضور ؐ نے انہیں جواب دیا تھا :"بے شک یہ تلوار نہ میری ہے اور نہ تیری ہے ۔اسے اموال کے ساتھ رکھ دیں ۔" جب سعد کو دوبارہ پیچھے سے پکارا گیا حالانکہ وہ تلوار رکھ کر واپس ہو گئے تھے تو وہ توقع رکھتے تھے کہ شاید اللہ نے اس معاملے میں کچھ آیات اتار دی ہیں ۔کہتے ہیں :"میں نے کہا کیا اللہ تعالیٰ نے میرے بارے میں کچھ آیات نازل کر دی ہیں؟" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'تم نے مجھ سے تلوار کے لئے درخواست کی تھی' حالانکہ اس وقت وہ میرے اختیار میں نہ تھی' اب چونکہ اللہ نے غنائم مجھے دے دیئے ہیں لہذا میں نے تجھے دے دی ۔" یہ تھا ان لوگوں کا معاملہ اپنے رب کے ساتھ اور یہ تھا ان کا سلوک اس قرآن کے ساتھ جو مسلسل نازل ہو رہا تھا ۔یہ ایک عظیم طرز عمل ہے ۔

انسانی تاریخ میں یہ ایک عجیب دور تھا ۔اس لئے وہ قرآن کو اس طرح چکھتے تھے اور اسے سنتے ہی اپنی عملی زندگی میں واقعیت دے دیتے تھے ۔ان کا یہ ذوق خاص اس واقعیت کو ایک نہایت ہی اچھی کیفیت عطا کر دیتا تھا اور سامع اور قاری دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوتے تھے ۔اگرچہ یہ پہلا تجربہ تو دہرایا نہیں جا سکتا لیکن جب بھی اس کرۂ ارض پر کوئی مومن گروہ وجود میں آتا ہے تو ایسے ہی تجربات سامنے آتے رہتے ہیں بشرطیکہ اٹھنے والی تحریکات دین کو اسی طرح قائم کرنے کا مقصد پیش نظر رکھتی ہوں جس طرح جماعت مسلمہ اولیٰ کا مقصد تھا اور ایسی ہی جماعتیں جو کہیں کہیں اٹھتی ہیں اور جماعت اول کی طرح اقامت دین کا نصب العین رکھتی ہیں' انہی کے اندر قرآن فہمی کا وہ ذوق پیدا ہوتا ہے' جو جماعت اولیٰ کے مماثل ہوتا ہے ۔اس کی تلاوت سے ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے ۔ان جماعتوں کے نزدیک دین اس تحریک کا نام ہوتا ہے جس کا مقصد دین کی اقامت ہو اور اس پہلے تجربے کو دہرانا مقصود ہوتا ہے ۔ایسے لوگوں کے نزدیک ایمان محض تمنا نہیں ہوتا بلکہ ایمان اس حقیقت کو کہا جاتا ہے جو دل میں اچھی طرح جاگزیں ہو اور عمل کی صورت میں اس کا ظہور ہو ۔وَعَلٰی رَبّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ "اور وہ اپنے رب پر اعتماد کرتے ہیں ۔" صرف رب پر ۔نحوی ترکیب کی رو سے

اس کا یہی معنی ہے یعنی حصری۔
وہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کر کے اس سے نہ استعانت کرتے ہیں اور نہ اس پر توکل کرتے ہیں۔ امام ابن کثیر نے لکھا ہے "وہ اس کے سوا کسی سے امید نہیں رکھتے 'کسی کی طرف قصد ہی نہیں کرتے 'کسی کے ہاں پناہ ہی نہیں لیتے 'کسی سے حوائج طلب نہیں کرتے 'کسی کی طرف ان کی رغبت اور میلان ہی نہیں ہوتا اور وہ جانتے ہیں کہ اللہ جو کچھ چاہے وہی ہوتا ہے اور جو کچھ نہیں چاہتا' نہیں ہوتا۔ وہ اس کائنات میں اکیلا صاحب اختیار ہے 'اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے 'نہ اس کے حکم سے کوئی سرتابی کر سکتا ہے۔وہ جلد حساب لینے والا ہے۔چنانچہ حضرت سعید ابن جبیر کہتے ہیں۔اللہ پر توکل کرنا ایمان کی لذت ہے۔
یہ تو ہے اللہ کی وحدانیت کے عقیدے کا اخلاص 'اللہ کی بندگی کا اخلاص 'لہذا اب یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک دل میں عقیدہ توحید بھی ہو اور اس کے ساتھ وہ شخص اللہ کے سوا اوروں پر بھروسہ بھی کرتا ہو۔جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں پر بھروسہ کرتے ہیں اور دوسروں پر تکیہ کرتے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ ذرا غور سے اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور دیکھیں کہ آیا ان میں ایمان بھی ہے یا نہیں۔
ہاں اللہ پر توکل مانع اسباب نہیں ہے کیونکہ مومن اسباب کو بھی ایمان اور اطاعت کی راہ سے لیتا ہے۔ہمارا ایمان ہے کہ مسبب الاسباب بھی اللہ ہے اور اسی نے انسان کو راہ اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔لیکن مومن کا یہ ایمان بھی ہوتا ہے کہ نتائج کا نکلنا اسباب پر موقوف نہیں ہے۔جس طرح اسباب اللہ کی مخلوق و مقدور میں ہیں اسی طرح نتائج بھی اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔مومن کے شعور و عقیدہ میں یہ بات لازمی نہیں ہے کہ خدا کے مہیا کردہ اسباب کے بعد بھی نتائج نمودار ہوں۔لہذا اسباب کا اختیار کرنا عبادت و اطاعت ہے اور نتائج اللہ کی تقدیر پر نمودار ہوں گے۔نتائج کا صدور اللہ کی تقدیر کے تابع ہے۔صرف اللہ چاہے تو نتائج نمودار ہوں گے۔ایک مومن کے شعور میں اسباب و نتائج کے درمیان کوئی لازمی تعلق نہیں ہوتا۔اسی طرح ایک مومن کا شعور اسباب کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے اور اس آزادی کے ساتھ ساتھ ایک مومن اسباب کو برائے حصول ثواب اختیار کرتا ہے تاکہ وہ اللہ کا مطیع ہو۔
جاہلیت جدیدہ ابھی تک اپنے اس نظریہ کے تاریک سمندر میں غوطے کھا رہی ہے کہ اسباب و مسبب کا باہم تعلق قطعی ہے اور قوانین طبیعی اٹل ہیں تاکہ اللہ کی تقدیر اور اللہ کی غیبی قوت کی نفی کر سکیں۔لیکن جونہی اس جاہلیت نے اس راہ پر ایک حد تک سفر طے کیا' اسے معلوم ہو گیا کہ اس کے آگے تو اللہ کی تقدیر کی حدود شروع ہو گئی ہیں اور اس سرحد پر یہ جاہلیت حیران و پریشان کھڑی ہے اب اس نے عالم مادی میں قوانین طبیعت کے اٹل ہونے کے نظریے کو ترک کر کے "احتمالات" کا نظریہ اپنا لیا ہے۔گویا پہلے جس چیز کو وہ اٹل کہتے تھے اب "محتمل" ہو گئی ہے اور عالم غیب کی جس سرحد پر یہ جاہلیت کھڑی ہے۔اس سے آگے اس کے تمام راستے بند ہیں اور یہی حقیقت تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ یہ تقدیر الٰہی ہی ہے جو اس عالم میں کام کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی یہ آیت اس عالم غیب پر حکمران ہے۔لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا "تمہیں نہیں معلوم کہ شاید اللہ اس کے بعد کوئی بات پیدا کر دے"۔تقدیر الٰہیہ کا نظریہ ہی حتمی اور آخری نظریہ ہے۔اور یہ نظریہ صاف کہتا ہے کہ اس دنیا کے مادی قوانین کے پیچھے ارادہ الٰہیہ کارفرما ہے اور اللہ کا ارادہ بے قید ہے۔جو چاہتا ہے' کرتا ہے اور اس کا ارادہ مطلق اور آزاد ہے۔اپنے بنائے ہوئے نظام اسباب و مسبب کا پابند نہیں ہے۔

سر جیمس طبیعیات اور ریاضی کے پروفیسر ہیں - وہ کہتے ہیں :"قدیم سائنس یہ بات وثوق سے کہتی تھی کہ طبیعت صرف ایک ہی راہ لے سکتی ہے اور وہ وہی راہ ہے جو اس کے لئے اس کے چلنے سے پہلے ہی تجویز کر دی گئی ہے - اس پر اسے آغاز سے لے کر انجام تک چلنا ہے - اور مسلسل اور دائماعلل اور معلول کا قانون اس کائنات میں جاری ہے - اس بات میں تخلف نہیں ہو سکتا کہ حالت (الف) کے بعد حالت (ب) پیدا ہو گی - رہی جدید سائنس تو اس کی رو سے صرف یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ حالت (ب) کے بعد اس بات کا احتمال ہے کہ حالت(ب) کے ظہور کا احتمال دوسرے احتمالات سے زیادہ ہے - یا ج کا احتمال (د) سے زیادہ ہے علیٰ ھذا القیاس -

نیز سائنس کے دائرہ قدرت کے اندر یہ بات بھی ہے کہ وہ (ب)' (ج) اور (د) کے احتمالات کی نسبت کا تعین کر دے - لیکن نتیجے کے بارے میں کوئی یقینی بات کہنا مشکل ہے - کہ (الف) کی حالت کے بعد کون سی حالت کا ظہور ہو گا کیونکہ احتمال بہرحال احتمال ہوتا ہے لیکن کون سی حالت صادر ہوئی ہے - یہ پھر تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے - اب تقدیر کی حقیقت کیا ہے' جو حقیقت بھی ہو -" (تفصیلی بحث ہم آیت عندہ مفاتح الغیب میں کر آئے ہیں) (دیکھئے پارہ ہفتم ص )

جب قلب مومن اسباب ظاہریہ کے دباؤ سے آزاد ہو جائے تو پھر غیراللہ پر بھروسہ کرنے کا کوئی جواز ہی نہیں رہتا- اس لئے کہ یہ اللہ کی تقدیر ہی ہے 'جس کے پیچھے سے سب کچھ نمودار ہو رہا ہے اور یہی یقینی حقیقت ہے - رہے ظاہری اسباب تو ان کے نتیجے میں صرف حتمی احتمالات ہی وجود میں آ سکتے ہیں - یہ ہے وہ عظیم انقلاب جو اسلامی نظریہ حیات انسانی قلب کے اندر پیدا کر دیتا ہے اور اسی کے مطابق انسانی سوچ پروان چڑھتی ہے - جدید جاہلیت تین سو سال تک اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہی اور پورے تین سو سال کے بعد وہ اس ابتدائی حقیقت کے دروازے تک پہنچ سکی ہے - یعنی خالص عقلی اعتبار سے - لیکن ابھی تک شعوری طور پر وہ اس حقیقت میں داخل نہیں ہوئی ہے اور نہ انسانیت نے ابھی تک وہ طرز عمل اختیار کیا ہے جو اللہ کے نظام قضا و قدر کے ساتھ اختیار کیا جانا چاہئے یا جو اسباب ظاہریہ کے ساتھ اختیار کیا جانا چاہئے - یہ انقلاب دراصل عقلی آزادی اور عقلی انقلاب ہے - شعوری انقلاب' سیاسی انقلاب ہے - معاشرتی انقلاب ہے اور اخلاقی انقلاب ہے - اور کوئی انسان جب تک وہ اسباب کا غلام ہے اور طبیعت کو اٹل سمجھتا ہے' آزاد نہیں کہلا سکتا - کیونکہ جب وہ اسباب کو اٹل سمجھتا ہے تو پھر وہ انسانوں کے ارادے کا غلام بن جائے گا یا طبیعت کے ارادے کا غلام تصور ہو گا - کیونکہ اگر کوئی شخص اللہ کے ارادے اور تقدیر کے سوا کسی اور چیز کو بھی حتمی سمجھتا ہے تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ آزاد نہیں ہے' غلام ہے - یہی وجہ ہے کہ اللہ نے حکم دیا کہ صرف اللہ پر بھروسہ کرو اور اللہ اور صرف اللہ پر بھروسہ ہی ایمان اور عدم ایمان پر دلالت ہے اسلام کا نظام تصورات ایک کل اور اکائی ہے - اور اس تصور حیات پر جو نظام تجویز ہوا ہے وہ بھی ایک کل' متکامل اور اکائی ہے - اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ "جو نماز قائم کرتے ہیں -" یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ایمان ایک متحرک صورت میں ہمارے سامنے ہے - اس سے قبل جو حقائق بیان ہوئے' ان میں ایمان ایک قلبی اور ذہنی حقیقت تھی' جو نظر نہ آتی تھی - کیونکہ ایمان کی تعریف ہی یہ ہے جو دل میں پروقار طریقے سے بیٹھا ہو اور اعمال جوارح ہی اس کی تصدیق کر رہے ہوں کہ وہ ہے - لہذا عمل ایمان کی دلالت ظاہری ہے - اور یہ ظاہری علامات کا ظہور لابدی ہے تاکہ یہ گواہی فراہم ہو سکے کہ دلوں کے اندر ایمان موجود ہے -

اقامت صلوٰۃ کا مفہوم صرف یہ نہیں ہے کہ نماز کو ادا کر لیا جائے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ نماز کو حقیقی معنوں

میں ادا کیا جائے یوں کہ نظر آئے کہ نمازی اللہ کے حضور کھڑا ہے۔ نماز محض قیام تعوذ اور قراۃ ہی نہ ہو کہ رکوع و سجود ہو اور دل غافل ہو۔ نماز اگر صحیح طرح قائم ہو تو وہ ایمان پر گواہ ہے۔ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ "اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے' اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔" یہ عام ہے خواہ زکوۃ ہو یا دوسرے صدقات ہوں۔ جو بھی خرچ کیا جائے وہ اللہ کے دیئے ہوئے سے ہوگا۔ اس لئے وہ اللہ کے دین کا حصہ تصور ہوگا۔ قرآن کی ہدایت کا اپنا رنگ ہوتا ہے اور اس کے اندر خاص تعبیری اشارات ہوتے ہیں۔ یہاں یہ اشارہ ہے کہ اس مال و دولت کو تم نے نہیں پیدا کیا۔ یہ تو اللہ نے تمہیں دیا ہے اور تمہیں جو بھی دیا گیا ہے وہ اللہ کا دیا ہوا رزق ہے اور اللہ کا دیا ہوا اس قدر زیادہ ہے کہ انسان اسے گن ہی نہیں سکتا۔ اور جب انسان اللہ کے دیئے ہوئے میں سے دیتا ہے تو ظاہر ہے اس کا ایک حصہ دیتا ہے اور باقی کو اپنے لئے محفوظ رکھتا ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہوتی ہے کہ وہ اللہ کا دیا ہوا ہوتا ہے۔

یہ وہ صفات ہیں جن کے اندر اللہ نے ایمان کو محدود کر دیا ہے۔ ان صفات میں ایک تو اللہ کی وحدانیت کا اعتقاد ہے اور اس کی وحدانیت کو قبول کرتے ہوئے ذکر الہی اور پھر اللہ کی آیات اور ذکر الہی سے قلبی تاثر لینا' پھر اللہ وحدہ پر توکل کرنا' پھر اقامت صلوٰۃ کماحقہ' اور سب سے آخر میں یہ کہ اللہ کے دیئے ہوئے میں سے کچھ حصہ اس کی راہ میں صرف کرنا' یہ ہیں اس مقام پر علامات ایمان۔

یہ آیات و صفات درحقیقت ایمان کے اجزاء اور تفصیلات نہیں ہیں۔ جیسا کہ دوسری آیات میں ذکر ہوا ہے بلکہ یہاں ایمان کی واقعی صورت حالات کو بیان کیا گیا ہے یعنی وہ واقعی صورت حالات جن میں انفال و غنائم کے بارے میں اختلاف ہو گیا اور اہل ایمان کے باہم تعلقات خراب ہو گئے۔ لہذا یہاں اہل ایمان کو مومنین کی صفات سے آگاہ کیا جاتا ہے اور انہیں یاد دلایا جاتا ہے کہ اہل ایمان کی صفات ایسی ہوتی ہیں لیکن اگر ان صفات میں سے کسی میں کوئی صفت بھی موجود نہ ہو تو ایسے لوگوں سے حقیقت ایمان عملاً منفی ہو سکتی ہے۔ لہذا یہ صفات ایمان کی اساسی علامات ہیں' چاہے یہ ایمان کی پوری صفات ہوں یا پوری نہ ہوں' کیونکہ یہ اسلامی نظام تربیت کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ مخصوص حالات کے لئے ایمان کی کون سی شرائط کا تذکرہ کرتا ہے اور کون سی شرائط کا نہیں کرتا۔ کیونکہ اسلامی منہاج تربیت ایک عملی اور حقیقت پسندانہ منہاج ہے۔ یہ محض نظریاتی طریقہ کار نہیں ہے کہ وہ ایک نظریہ وضع کرے اور اسے پھیلائے فقط۔ اسی قاعدے کے مطابق یہ آخری تبصرہ ہوتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ

(۸: ٤) "ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں' قصور سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے۔"

یہ وہ صفات ہیں جو کوئی بھی حقیقی مومن اپنے نفس اور اپنے اعمال کے اندر موجود پاتا ہے۔ اگر یہ تمام صفات کسی کی ذات سے غائب ہوں تو گویا اس میں ایمان کی کوئی صفت نہیں ہے۔ یہ آیات چونکہ ایک واقعی صورت حالات کی طرف مخاطب ہیں اس لئے ان کا تقاضا یہ ہے کہ مخصوص حالات میں جس کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والوں کے لئے اجر عظیم ہے اور جن لوگوں کے اندر یہ صفات ہیں ان کے لئے اللہ کے نزدیک اجر عظیم ہے اور بڑے درجے ہیں۔ اسی

طرح ان میں ان واقعات کی طرف بھی اشارہ ہے جو اس وقت اہل ایمان کے درمیان رونما ہوئے جیسا کہ حضرت عبادہ ابن الصامت نے فرمایا۔ تو ان آیات میں کہا گیا کہ ان لوگوں کے لئے مغفرت ہے۔ اور جن لوگوں نے اموال کے لئے نزاع کیا ان کے لئے بہترین رزق ہے۔ لہٰذا ان آیات میں ان جزوی واقعات کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اور اپنی جگہ بات اصولی طور پر کہہ دی گئی ہے کہ مومن ایسے ہوتے ہیں۔ یہ ان کی صفات ہیں اور جس میں یہ نہ ہوں وہ اپنے ایمان کی خبر لے۔ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا (۸: ۴) "ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔"

پہلی اسلامی جماعت کو یہ بات سکھائی جا رہی ہے کہ ایمان کی ایک حقیقت ہے اور ہر مومن کو چاہئے کہ اس کے نفس میں وہ حقائق پائے جائیں۔ ایمان محض دعویٰ نہیں ہے۔ نہ ایمان چند کلمات کا نام ہے اور نہ چند معصوم تمناؤں کا نام ہے۔ حافظ طبرانی ایک روایت کرتے ہیں' محمد ابن عبداللہ حضرمی سے 'ابوبکر سے' ابد ابن الحباب سے' ابن لہیعہ سے' خالد ابن یزد سکسکی سے' سعید ابن بلال سے' محمد ابن ابو الجہم سے' حارث ابن مالک انصاری سے' یہ کہتے ہیں: کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا اور رسول اللہ نے کہا "حارث تم صبح کیسے اٹھے؟" تو حارث نے کہا کہ "میں ایک سچے مومن کی طرح اٹھا ہوں۔" آپ نے فرمایا ذرا دیکھو کیا کہہ رہے ہو؟ کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ بتاؤ تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ حارث نے کہا "میں نے دنیا سے نفرت کر لی ہے' رات کو جاگتا ہوں اور دن کو مطمئن رہتا ہوں۔ میری حالت یہ ہے کہ گویا میں اللہ کے عرش عظیم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ گویا میں اہل جنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک دوسرے سے ملاقاتیں کر رہے ہیں اور میں اہل جہنم کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک دوسرے پر لعنت کر رہے ہیں۔

حضور ؐ نے فرمایا "حارث تم نے پا لیا ہے لہٰذا اسے پکڑے رکھو۔" یہ بات آپ نے تین بار کہی۔ یہ صحابی جو رسول اللہ کی طرف سے سند معرفت کے مستحق قرار پائے انہوں نے اپنے نفس کا حال بیان کرتے ہوئے ایسی باتوں کا ذکر کیا جس سے اس کے شعور کا اچھی طرح اظہار ہوتا ہے اور اس نے ایسی چیزوں کا تذکرہ بھی کیا جن کا تعلق اعمال و حرکات سے ہے' گویا وہ عرش ربی کو دیکھ رہا ہے۔ اہل جنت کو دیکھ رہا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اہل جہنم کو دیکھ رہا ہے۔

یہ صحابی محض نظریات کی بات نہیں کرتے۔ وہ مسلسل اعمال کی بات کرتے ہیں۔ یہ اعمال اور حرکات اسی شعور سمیت اس کی زندگی پر حاوی ہیں۔ وہ رات کو جاگتے اور دن کو اطمینان کے ساتھ سوتے ہیں اور یقین ایسا ہے کہ انہیں سب کچھ نظر آ رہا ہے۔

حقیقت ایمان کے بارے میں ہمیں بہت ہی سنجیدہ ہونا چاہئے۔ اس لئے اس معاملے میں ہمیں اس قدر لبرل نہیں ہونا چاہئے۔ ایمان چند کلمات کا نام رہ جائے جو زبان پر جاری ہوتے رہیں لیکن عملی زندگی اس کے برعکس گواہی دے رہی ہو۔ تو یہ حالت حقیقت ایمان سے خالی ہے۔ احتیاط کے معنی یہ نہیں کہ ہم ایمان کے بارے میں صرف لبرل ہو جائیں۔ ایمان کی شعوری حقیقت کا وجود لازمی ہے۔ اور اس کے تصور میں احتیاط ضروری ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کے معاملے میں جن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ امامت دین کا فریضہ سرانجام دینے کے لئے اٹھے ہیں جبکہ آج یہ لوگ جس آبادی میں اقامت دین کا کام کرنے اٹھے وہ مکمل جاہلیت میں ڈوبی ہوئی ہے اور جاہلیت کے قالب میں ڈھل چکی ہے۔

---○○○---

اب اس معرکے کے واقعات یہاں بیان کئے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں یہ اموال غنیمت ہاتھ آئے تھے اور نتیجۃً مسلمانوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ الجھ گئے تھے جیسا کہ حضرت عبادہ ابن الصامت نے نہایت ہی خلوص ' وضاحت اور صاف گوئی سے بتایا۔ یہاں حالات و واقعات پر اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے اور اس کے بارے میں مختلف لوگوں کے موقف اور احساس کو قلم بند کیا گیا ہے۔اس پورے تبصرے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معرکے میں مسلمان دست قدرت کے لئے گویا ایک پردہ تھے اور جو واقعات بھی پیش آئے اور ان کے جو نتائج بھی رونما ہوئے ان میں اموال غنیمت اور ان کے بارے میں تنازعات بھی شامل ہیں۔ یہ سب کے سب تقدیر الٰہی کے کرشمے تھے ' اللہ کی تدبیر' تقدیر اور ہدایت کے مطابق سب کچھ رونما ہوا۔ اس جنگ کے بارے میں خود مسلمانوں کی جو پلاننگ تھی یا جو ارادے تھے وہ بہت ہی معمولی سی بات تھی، نہایت ہی محدود۔ اور اللہ نے جو چاہا تھا وہ نہایت ہی بڑا اور لامحدود تھا۔ کیونکہ اللہ چاہتا تھا کہ یہ معرکہ عظیم ہو اور فیصلہ کن (یوم الفرقان) ہو۔ اور زمین اور آسمان دونوں پر اس کے اثرات ہوں۔ اس سے ملاء اعلیٰ کے لوگ بھی فائدہ اٹھائیں اور زمین کی مخلوق بھی متاثر ہو۔ اس کے ذریعے انسانی تاریخ کا دھارا بدل کر رکھ دیا جائے۔ فرماتے ہیں کہ تم میں سے ایک فریق تو نہایت ہی بددلی کے ساتھ اس معرکے میں جا رہا تھا۔ بعض نے انفال پر تنازعہ شروع کر دیا۔ تو دیکھو کہ تم جو کچھ سوچ رہے تھے اور جسے تم پسند یا ناپسند کرتے تھے ' وہ اللہ کے ہاں جو فیصلے ہو رہے تھے ان کی نسبت سے بہت ہی حقیر تھا۔ تمام امور آخر کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔

---

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۵ۙ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا
يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶ۭ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ
اِحْدَى الطَّاۗىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ
لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۷ۙ
لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸ۚ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ
رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝۹ وَ

مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَ لِتَطْمَىِٕنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ ا
عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾ؑ اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَ ع ۱۰
يُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَ يُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ ۱۵
الشَّيْطٰنِ وَ لِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ يُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ﴿۱۱﴾ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ
اِلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَ اضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿۱۲﴾ ؕ
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ
اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَ اَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾

---

"(اس مال غنیمت کے معاملہ میں بھی ویسی ہی صورت پیش آرہی ہے جیسی اس وقت پیش آئی تھی جب کہ) تیرا رب تجھے حق کے ساتھ تیرے گھر سے نکال لایا تھا اور مومنوں میں سے ایک گروہ کو یہ ناگوار تھا۔ وہ اس حق کے معاملہ میں تجھ سے جھگڑ رہے تھے۔ در آں حالیکہ وہ صاف صاف نمایاں ہو چکا تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ آنکھوں دیکھتے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں۔

یاد کرو وہ موقع جب کہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا۔ تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے۔ مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل' باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

اور وہ موقع جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے' جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لئے پے در پے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں۔ یہ بات اللہ نے تمہیں صرف اس لئے بتا دی کہ تمہیں خوشخبری ہو اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں' ورنہ مدد تو جب بھی ہوتی ہے اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے یقیناً اللہ زبردست اور دانا ہے۔

اور وہ وقت جب کہ اللہ اپنی طرف سے غنودگی کی شکل میں تم پر اطمینان و بے خوفی کی کیفیت طاری کر رہا تھا اور آسمان سے تمہارے اوپر پانی برسا رہا تھا تاکہ تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست دور کرے اور

تمہاری ہمت بندھائے اور اس کے ذریعے سے تمہارے قدم جما دے۔

اور وہ وقت جب کہ تمہارا رب فرشتوں کو اشارہ کر رہا تھا کہ ''میں تمہارے ساتھ ہوں' تم اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو' میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں' پس تم ان کی گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ۔'' یہ اس لئے کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول ؐ کا مقابلہ کیا اور جو اللہ اور اس کے رسول ؐ کا مقابلہ کرے اللہ اس کے لئے نہایت سخت گیر ہے ---- یہ ہے تم لوگوں کی سزا' اب اس کا مزہ چکھو' اور تمہیں معلوم ہو کہ حق کا انکار کرنے والوں کے لئے دوزخ کا عذاب ہے۔''

اللہ نے اموال غنیمت کا اختیار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دے دیا تاکہ آپ ان کے درمیان برابری کے اصول پر تقسیم کریں۔ جیساکہ آگے آرہا ہے کہ آپ کو اختیار دیا گیا کہ قومی مصارف کے لئے خمس حضور ؐ کے لئے مختص کر دیا گیا اور یہ انتظام اس لئے کیا گیا کہ جہاد کے مقدس فریضے میں مسلمانوں کے دلوں سے یہ لالچ بھی جاتی رہے کہ انہیں اموال غنیمت میں سے بھی کچھ ملے گا۔ تاکہ اموال غنیمت پر آئندہ اس قسم کے تنازعات پیدا نہ ہوں۔ اس میں حق تصرف حضور اکرم ؐ کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ حضور ؐ کی تقسیم کے نتیجے میں ظاہر ہے کہ کسی کو کوئی شکایت پیدا ہونے کا سوال ہی نہ تھا اور تاکہ ان لوگوں کے دلوں سے خلش دور ہو جائے جنہوں نے اموال غنیمت کو جمع کیا تھا کیونکہ وہ بہرحال تمام لوگوں کے ساتھ اصول مساوات کے مطابق برابر کے شریک تھے۔

اب اللہ تعالیٰ یہاں خود ان کے طرز عمل سے ایک مثال پیش کر کے سمجھاتے ہیں کہ جو اللہ چاہتا ہے وہی بہتر ہے۔ اور جو وہ خود چاہتے ہیں وہ اللہ کی اسکیم کے مقابلے میں حقیر ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ انفال کے بارے میں اللہ جو اسلامی قانون نازل کر رہا ہے وہی بہتر رہے گا۔ اس لئے کہ لوگ تو سامنے کے فائدے کو دیکھ سکتے ہیں' عالم غیب پر ان کی نظروں کے سامنے نہیں ہے اور اللہ یہ تبصرہ اللہ اسی واقعہ کو موضوع بنا کر فرما رہا ہے جو ان کے سامنے ہے اور اسی معرکے کا حصہ ہے جس کے نتیجے میں غنائم ملے اور انہوں نے جھگڑا شروع کر دیا۔ اس معرکے کے بارے میں وہ کیا ارادہ رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے کس کا ارادہ کر لیا۔ اب زرا دیکھو اپنے ارادے کو بھی اور اللہ کے ارادے کو بھی۔ دونوں میں قدر و قیمت کے اعتبار سے کس قدر فرق ہے۔ دونوں ارادوں کا یہ فرق کس قدر بعید ہے۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ (٥)
يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (٦)
وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ
تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (٧) لِيُحِقَّ
الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (٨) (٨: ٥ تا ٨) ''(اس مال غنیمت کے معاملہ میں بھی ویسی ہی صورت پیش آرہی ہے جیسی اس وقت پیش آئی تھی جب کہ) تیرا رب تجھے حق کے ساتھ تیرے گھر سے

نکال لایا تھا اور مومنوں میں سے ایک گروہ کو یہ ناگوار تھا۔ وہ اس حق کے معاملہ میں تجھ سے جھگڑ رہے تھے۔ در آں حالیکہ وہ صاف صاف نمایاں ہو چکا تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ آنکھوں دیکھتے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں۔

یاد کرو وہ موقع جب کہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا۔ تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے۔ مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل' باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

اموال غنیمت کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹانا اور پھر ان کو جمع کر کے مسلمانوں کے درمیان اصول مساوات کے مطابق تقسیم کرنا اور اس اصول مساوات کو بعض لوگوں کی کا ناپسند کرنا اور اس سے قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بعض نوجوانوں کو دوسروں کے مقابلے میں بہتر حصہ دینا اسی طرح لوگوں کو پسند نہ تھا جس طرح ان لوگوں کو میدان جنگ کی طرف نکلنا پسند نہ تھا۔ کیونکہ مد مقابل بہتر سازو سامان سے لیس تھا۔ اس لئے بعض مومنین اس وقت جنگ کو پسند نہ کرتے تھے لیکن نتائج سب کے سب ان کے سامنے تھے۔

کتب سیرۃ سے غزوۂ بدر کے واقعات کے بیان میں ہم یہ بات کہہ آئے ہیں کہ جب قافلہ نکل گیا اور خبر ملی کہ اب مقابلہ تو لشکر قریش کے ساتھ آن پڑا ہے جو بہتر سازو سامان سے لیس ہے اور جب رسول اللہ نے مشاورت طلب کی تو اس میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر نے نہایت ہی اچھا اور مثبت جواب دیا اور مقداد ابن عمرو اٹھا اور اس نے نہایت ہی طویل تقریر میں یہ کہا کہ رسول خدا ہم قوم موسیٰ کی طرح آپ کو یہ جواب نہیں دیتے کہ جایئے اور اپنے رب کی معیت میں جنگ کیجئے' ہم تو یہاں بیٹھے ہیں بلکہ ہمارا جواب یہ ہے کہ جایئے اور اپنے رب کے ساتھ اور جنگ کیجئے ہم بھی آپ کے ساتھ جنگ کرنے والوں میں شامل ہیں۔ لیکن یہ سب تقاریر مہاجرین کی طرف سے تھیں۔ اس کے بعد حضور اکرم ؐ نے دوبارہ لوگوں کو کچھ کہنے کی دعوت دی۔ اس پر انصار سمجھ گئے کہ روئے سخن ہماری طرف ہے۔ اس پر سعد ابن معاذ اٹھے اور نہایت ہی طویل تقریر کی اور فیصلہ کن اور اطمینان بخش بات کر دی۔

لیکن حضرت ابوبکر و عمر کی بات اور مقداد اور سعد کی بات ان سب لوگوں کی بات نہ تھی جو آپ کے ساتھ مدینہ سے نکلے تھے' ان میں سے بعض لوگ پھر بھی یہ خیال کرتے تھے کہ جنگ مناسب نہیں ہے اور وہ رکاوٹ بن رہے تھے' اس لئے کہ اس عظیم جنگ کے لئے مسلمان تیار نہ تھے' ان کی تیاری تو محض غیر مسلم قافلے کے لئے تھی اور اس قافلے کی حفاظت ایک معمولی قوت کر رہی تھی۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ قریش کی فوج اپنے سواروں اور پیادوں کے ساتھ' اپنے بہادروں اور شہ سواروں کے ساتھ بڑھتی چلی آ رہی ہے تو بعض لوگ اسے پسند نہ کرتے تھے اور قرآن کی اس آیت میں اسی ناپسندیدگی کو ریکارڈ کیا گیا ہے۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ (٥) يُجَادِلُوْنَكَ فِى الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (٦) (٨ : ٥ — ٦) "تیرا رب تجھے حق کے ساتھ تیرے گھر سے نکال لایا تھا اور مومنوں میں سے ایک گروہ کو

یہ ناگوار تھا۔ وہ اس حق کے معاملہ میں تجھ سے جھگڑ رہے تھے ۔ در آں حالیکہ وہ صاف صاف نمایاں ہو چکا تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ آنکھوں دیکھتے موت کی طرف ہانکے جارہے ہیں ۔"

حافظ ابوبکر ابن مردویہ اس آیت کی تفسیر میں ابو ایوب انصاری سے روایت کرتے ہیں ۔ہم مدینہ میں تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ ابوسفیان واپس آرہا ہے ۔کیا یہ مناسب ہو گا کہ ہم اس قافلے کی طرف نکلیں شاید اللہ ہمیں مال غنیمت سے نواز دے ۔" ہم نے کہ یہ تجویز بالکل درست ہے ۔ حضور بھی نکلے اور ہم سب بھی نکلے ۔جب ہم نے ایک دن یا دو دن کا راستہ طے کیا' تو حضورؐ نے فرمایا کہ قریش کے ساتھ جنگ کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے ۔ قریش کو تمہارے نکلنے کی خبر ہو گئی ہے ۔" تو ہم نے یہ جواب دیا کہ خدا کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا' ہم دشمن سے لڑنے کے لئے نہ تیار نہیں اور نہ موت کے لئے ۔ہمارا ارادہ تو قافلے کے بارے میں تھا۔ اس کے بعد حضورؐ نے دوبارہ اس موضوع کو غور کے لئے پیش کیا اور فرمایا کہ اس مسئلے پر سوچ کی ضرورت ہے ۔صحیح رائے دو۔ تو ہم نے دوبارہ وہی منفی جواب دیا۔ اس پر مقداد ابن عمرو اٹھا اور اس نے کہا :"حضورؐ ہم آپ کو وہ جواب نہ دیں گے جو قوم موسیٰ نے حضرت موسیٰ کو دیا کہ جاؤ تم اور تمہارا رب اور دونوں لڑو' ہم یہاں بیٹھے ہیں ۔" اس پر ہم انصاریوں سے یہ تمنا کی گئی کہ ہم نے کیوں وہ جواب نہ دیا جو مقداد نے دیا۔ اگر ہم یہ جواب دیتے تو یہ مال عظیم سے زیادہ قیمتی ہوتا۔ کہتے ہیں' اسی کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں ۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ

(۸ : ۵) یہ تھی وہ بات جو مومنین کے ایک فریق کے لئے خلجان کا باعث تھی ۔اور جس کی وجہ سے وہ اس وقت جنگ کو پسند نہ کرتے تھے ۔چنانچہ قرآن کریم نے یہ رائے رکھنے والوں پر یہ تبصرہ کیا كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (۸: ۶) "ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ آنکھوں دیکھے موت کی طرف دھکیلے جا رہے ہیں ۔" اور یہ تبصرہ اس وقت ہوا جب سچائی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تھی ۔ انہوں نے جان لیا تھا کہ ان کی قسمت میں ایک گروہ بہرحال ہے ۔ ان کو اختیار ہی نہ تھا کہ وہ کس گروہ کو لیں کیونکہ قافلہ تو چلا گیا تھا' اب ان کی مڈبھیڑ لشکر قریش سے ہونا ہی تھی ۔ یہ اللہ نے مقدر کر دیا تھا اور یہ بھی مقدر تھا کہ وہ فتح پائیں گے ۔جو ہونا تھا' وہ ہو چکا تھا یا قافلہ تھا اور یا لشکر تھا یا ضعیف گروہ تھا جو صرف قافلے کی حفاظت پر مامور تھا اور یا زاد و عتاد کا مالک لشکر تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب نفس انسانی کے سامنے خطرہ مجسم شکل میں موجود ہو تو ایسے ہی حالات فطری ہوتے ہیں ۔ انسان کا عقیدہ جو بھی ہو لیکن جب اسے فی الواقعہ عملی خطرات سے سابقہ پیش آتا ہے تو ایسی ہی صورت حالات ہوتی ہے اور خوف بہرحال پیدا ہو جاتا ہے ۔یہاں قرآن کریم جو تصور پیش کرتا ہے ہمیں چاہئے کہ ہم اپنا عملی معیار ذرا کم کر دیں اور محض نظریاتی اور اعتقادی دنیا سے باہر نکل آئیں ۔ ہمیں انسان کی فطری کمزوریوں کو مدنظر رکھنا چاہئے اور ہمیں نفس انسانی سے اس وقت مایوس نہیں ہو جانا چاہئے جب وہ عملی خطرات کے وقت لرز جائے 'بشرطیکہ اس کا قلب عقیدے پر مطمئن ہو۔ خصوصاً جبکہ بعد میں تزلزل دکھانے والے نفوس اس راستے پر چل پڑیں ۔ عملاً خطرات کا مقابلہ کر دکھائیں اور اپنی کمزوری پر قابو پالیں ۔یہ لوگ تو اہل بدر تھے اور ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یہ ہے

"شاید اللہ نے اہل بدر کو یہ اطلاع کر دی ہو اور کہا ہو کہ جاؤ جو مرضی ہے کرو کیونکہ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔
غرض اس بارے میں یہی کافی ہے۔

لیکن جماعت مسلمہ یہی خواہش رکھتی تھی کہ ان کی مڈبھیڑ کمزور گروہ سے ہو۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ

(۸: ۷) "اور یاد کرو وہ موقعہ کہ جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا اور تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے۔"

یہ بات اس وقت امت مسلمہ اپنے لئے پسند کرتی تھی لیکن اللہ کا ارادہ کچھ اور تھا۔

وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (۷) لِيُحِقَّ الْحَقَّ

وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (۸) (۸: ۷ - ۸)) "مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے، خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

اللہ کا فضل و کرم تھا کہ اس نے مسلمانوں کے لئے غنیمت کے بجائے قتال اور جہاد کو پسند کیا تاکہ حق و باطل کے درمیان ایک کھلا معرکہ پیش آ جائے، حق کا بول بالا ہو اور باطل کی جڑ کاٹ دی جائے اور وہ کمزور اور زائل ہو جائے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہوا۔ کفار میں سے کچھ لوگ قتل ہوئے اور باقی قید ہوئے۔ ان کے سردار قتل ہوئے۔ ان کا رعب جاتا رہا۔ اور اسلام کے جھنڈے بلند ہو گئے۔ اور یوں اللہ کا کلمہ بلند ہوا اور امت مسلمہ کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ اپنے نظام زندگی کے مطابق امن سے رہے اور اس زمین پر اللہ کی الوہیت پر مبنی نظام زندگی قائم کیا جائے اور دنیا سے طاغوتی نظاموں کی جڑ اکھاڑ کر رکھ دی جائے۔ اسلامی اقتدار اعلیٰ کا قیام ایک حقیقت بن جائے محض گپ شپ نہ ہو بلکہ یہ نظام جہاد و قتال اور مسلسل جدوجہد کے ذریعے قائم کیا جائے۔ عالم واقعہ میں ہو، محض نظریہ نہ ہو۔

اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ امت مسلمہ امت بن جائے، اس امت کی اپنی حکومت ہو، اور اس حکومت کی ایک قوت ہو۔ یہ بھی ارادہ تھا کہ دشمن اسلامی حکومت کی قوت کو صحیح طرح سمجھیں اور اسلامی قوت دشمن کی قوت سے برتر ہو۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ فتح و نصرت صرف سازوسامان اور تعداد اور تیاری پر موقوف نہیں ہوتی بلکہ فتح کا مدار تعلق باللہ پر ہوتا ہے۔ کیونکہ تعلق باللہ کی قوت کے مقابلے میں انسانوں کی قوت نہیں ٹھہر سکتی۔ اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ یہ سب کچھ ایک واقعی تجربے کی صورت میں ہو۔ محض اعتقادی تصور نہ ہو اور نہ محض نظریہ ہو تاکہ امت مسلمہ اس تجربے کی روشنی میں اپنے لئے مستقبل کے منصوبے بنائے۔ اسے یہ یقین ہو جائے کہ اس کی تعداد چاہے کتنی ہی کم ہو اور دشمن کی تعداد چاہے بہت ہی زیادہ ہو وہ اس پر فتح پا سکتی ہے۔ نیز سازوسامان چاہے کتنا ہی تھوڑا ہو اور دشمن کے ساتھ سازوسامان چاہے جس قدر بھی زیادہ ہو اس پر فتح و شکست کا مدار نہیں ہے۔ اور اگر بدر کا فیصلہ کن معرکہ پیش

نہ آتا تو یہ حقائق واضح طور پر سامنے نہ آتے۔

ناظرین ذرا دقت نظر سے دیکھیں کہ مسلمانوں نے اپنے لئے جو راہ پسند کی تھی اور اللہ نے ان کے لئے جو راہ پسند کی تھی ان کے درمیان کس قدر فرق ہے۔ انہوں نے خود اپنے لئے جو بھلائی سوچی تھی اس میں اور اللہ نے جو ان کے لئے پسند کیا تھا اس میں کس قدر فرق ہے۔ آج یا کل اگر اس پر غور کیا جائے تو ان دونوں منصوبوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کی بات کس قدر غلط ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے لئے اچھا یا برا خود سوچ سکتے ہیں اور اس معاملے میں خدا کی راہنمائی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ اللہ نے انسانوں کے لئے جو راہ تجویز کی ہے' وہ مضر ہے اور اس میں اذیت و مشقت ہے حالانکہ اپنے نتائج کے اعتبار سے اس میں اس قدر خیر اور بھلائی ہوتی ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

لہٰذا اس موقعہ پر امت مسلمہ کے اختیار کردہ اور پسندیدہ امر میں اور اللہ کے اختیار کردہ اور پسندیدہ امر میں بہت بڑا فرق ہے۔ اگر وہ کمزور گروہ کو لیتے تو کہانی فقط یہ ہوتی کہ ایک مظلوم قوم نے ظالم قوم کے ایک قافلے پر ہلہ بول دیا۔ اسے لوٹ لیا اور بہت سا مال ان کے ہاتھ لگا۔ لیکن واقعہ بدر کی تاریخی اہمیت ایک نظریاتی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ کا ایک فیصلہ کن معرکہ شمار ہوتا ہے۔ جس میں ایک طرف ایک تھوڑی تعداد ہے جن کے پاس خاطر خواہ اسلحہ اور سامان نہیں ہے اور دوسری طرف اسلحہ سے لیس اور سازو سامان سے مسلح پیادوں' سواروں اور بہادروں کی ایک بڑی تعداد پر مشتمل لشکر ہے۔ ایک طرف حق اور دوسری جانب باطل ہے لیکن ایک طرف وہ گروہ ہے جو اللہ کے لئے لڑتا ہے اور دوسری جانب وہ گروہ ہے جو ذاتی مفادات کے لئے لڑتا ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو قتال کو پسند نہیں کرتے لیکن اکثریت ثابت قدم ہے۔ ان کے تصور میں مادی سازو سامان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسے یقین ہے کہ حقیقی قوت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے اعلیٰ اقدار کو سینے سے لگایا ہوا ہے اور نفسانی خواہشات پر قابو پالیا ہے۔ اگرچہ بظاہر کفار کا پلہ ہر لحاظ سے بھاری تھا لیکن انہوں نے تعلق باللہ اور یقین کی بدولت ظاہری اور مادی پلڑے کو شکست دی۔

حقیقت یہ ہے کہ جنگ بدر اپنے ان حالات اور واقعات کے ساتھ انسانی تاریخ میں ایک ممتاز مثال ہے اور یہ جنگ فتح و شکست کے لئے ایک الگ دستور اور پیمانے وضع کرتی ہے۔ یہ جنگ بتاتی ہے کہ فتح و شکست کے حقیقی اسباب کیا ہوتے' حقیقی اسباب' نہ کہ ظاہری اسباب۔ یہ ایک کھلی کتاب ہے اور صدیوں تک اور جب تک یہ جہاں قائم ہے' اس کو پڑھا جائے گا کیونکہ اس کے حقائق ناقابل تغیر ہیں۔ یہ جنگ گویا اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور اس کی سنت جاریہ کی بہترین اور اعلیٰ ترین مثال ہے' جب تک یہ جہاں قائم و دائم ہے۔ آج جاہلیت دنیا پر چھائی ہوئی ہے' اور امت مسلمہ اس کے خلاف بر سر پیکار ہے۔ ان حالات میں امت کو چاہئے کہ وہ اس جنگ پر طویل غور و فکر کرے اور اس کے فیصلہ کن پہلوؤں کو نظروں میں لائے۔ ذرا دیکھے کہ انسانی خواہشات اور منصوبوں کے مقابلے میں انسانی خواہشات اور منصوبے کس قدر حقیر ہوتے ہیں' ذرا پھر غور کیجئے۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (۷) لِيُحِقَّ

الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ (۸) (۸:۷ ـ ۸) "یاد کرو وہ موقع جب کہ اللہ نے تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا۔ تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے۔ مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل 'باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

اس وقت امت کے جو گروہ اسلامی نظام حیات کو عملاً قائم کرنا چاہتے ہیں 'وہ تحریکی اعتبار سے ہو سکتا ہے کہ اس مرحلے تک نہ پہنچے ہوں جن تک مسلمان جنگ بدر کے موقع پر پہنچ چکے تھے لیکن جنگ بدر کے جو حالات تاریخ نے ریکارڈ کیے ہیں 'ان کے اندر اسلام نے اور قرآن نے جو ہدایات دی ہیں اور جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں اور جو تبصرے اس پر ہوتے وہ آج بھی تحریک اسلامی کو واضح ہدایات دے رہے ہیں چاہے تحریک اسلامی جس مرحلے میں بھی ہو 'کیونکہ یہ اقدار' یہ اہداف اور یہ نصب العین دائمی ہیں اور جب بھی کوئی گروہ' جاہلیت کے مقابلے میں اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد شروع کرے گا اسے ان مراحل سے گزرنا پڑے گا۔"

---ooo---

اب سیاق کلام میں اس فیصلہ کن جنگ کے مناظر میں سے ایک منظر پیش کیا جاتا ہے۔ اس منظر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جماعت مسلمہ کا حال کیسا تھا' اور اللہ نے ان کے لئے کیسی تدابیر اختیار کیں اور اللہ کی تائید و نصرت ان کو محض مشیت الہیہ اور تائید ایزدی کی وجہ سے نصیب ہوئی۔ قرآن کریم کا بے مثال انداز بیان اس معرکے کے مشاہدات' تاثرات' واقعات' پریشانیوں اور امیدوں کو نہایت ہی وقت سے قلم بند کرتا ہے اس طرح کہ قاری گویا اپنے آپ کو اس معرکے کے اندر محسوس کرے مگر قرآنی تبصرے کے ساتھ' تاکہ وہ حقائق کو بدر سے وسیع تر دائرے میں سمجھیں۔ جزیرۃ العرب سے بھی ان کی نظر وسیع بلکہ ان کا نقطہ نظر پوری کائنات سے بھی زیادہ وسیع ہو۔ اس بیان میں اب اس معرکے کا پس منظر ملاء اعلیٰ تک وسیع ہو جاتا ہے۔ اب یہ معرکہ یوم بدر سے بھی آگے' پوری انسانی تاریخ سے بھی آگے بڑھ کر' پوری دنیاوی زندگی کے دائرے سے بھی وسیع تر دار آخرت تک پہنچ جاتا ہے اور اس پیش منظر میں جماعت مسلمہ کو یہ شعور دیا جاتا ہے کہ اللہ کے ہاں اس کی کیا قدر و قیمت ہے' اس کے اعمال کس قدر اہم ہیں اور اس کی اقامت دین کی جدوجہد اور حرکت کس قدر مقدس ہے۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ (۹) وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۱۰) ع إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ (۱۱) إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا سَأُلْقِي

فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ

(١٢) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ

الْعِقَابِ (١٣) ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ (١٤) (٨: ٩ تا

١٤)) ”اور وہ موقع جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے۔ جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لئے پے درپے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں۔ یہ بات اللہ نے تمہیں صرف اس لئے بتا دی کہ تمہیں خوشخبری ہو اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں' ورنہ مدد تو جب بھی ہوتی ہے اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے یقیناً اللہ زبردست اور دانا ہے۔

اور وہ وقت جب کہ اللہ اپنی طرف سے غنودگی کی شکل میں تم پر اطمینان و بے خوفی کی کیفیت طاری کر رہا تھا' اور آسمان سے تمہارے اوپر پانی برسا رہا تھا تاکہ تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست دور کرے اور تمہاری ہمت بندھائے اور اس کے ذریعے سے تمہارے قدم جما دے۔

اور وہ وقت جب کہ تمہارا رب فرشتوں کو اشارہ کر رہا تھا کہ ”میں تمہارے ساتھ ہوں' تم اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو' میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں' پس تم ان کی گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ۔“ یہ اس لئے کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا مقابلہ کیا اور جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا مقابلہ کرے' اللہ اس کے لئے نہایت سخت گیر ہے۔ یہ ہے تم لوگوں کی سزا' اب اس کا مزا چکھو' اور تمہیں معلوم ہو کہ حق کا انکار کرنے والوں کے لئے دوزخ کا عذاب ہے۔“

یہ ایک معرکہ ہے جو اللہ کے امر اور اس کی مشیت کے مطابق چل رہا ہے۔ اللہ کا نظام قضا و قدر اس کی تدبیر خود کر رہا ہے۔ اللہ کے خاص دستے اس میں شریک ہیں۔ اس معرکے میں حرکت الابزن کے مناظر اور اس کی خطرناکیاں اور اس کی کامیابیاں قرآنی عبارات میں صاف نظر آ رہی ہیں۔ یہ ایک زندہ منظر ہے اور یوں نظر آتا ہے کہ شاید یہ نظر ابھی آنکھوں کے سامنے ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس معرکے میں اہل ایمان کی فریاد کیا تھی؟ امام احمد حضرت عمر ابن الخطاب سے روایت کرتے ہیں' جب بدر کا واقعہ درپیش ہوا' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا کہ وہ تین سو سے کچھ اوپر ہیں اور جب کفار کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک ہزار سے کچھ اوپر ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف چہرہ مبارک پھیرا' آپ چادر اور تہہ بند اوڑھے ہوئے تھے اور کہا: ”اے اللہ آپ نے میرے ساتھ جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کر دیجئے۔ اے اللہ اگر آج آپ نے اہل اسلام کے اس گروہ کو ہلاک کر دیا تو پھر دنیا میں کبھی تیری بندگی نہ ہوگی۔“ کہتے ہیں آپ اللہ کے سامنے اسی طرح فریاد کرتے رہے اور پکارتے رہے' یہاں تک کہ آپ کے کاندھوں سے چادر گر گئی۔ حضرت ابوبکر آئے' انہوں نے چادر کو پکڑا اور اسے اپنی جگہ پر رکھ دیا اور پیچھے سے اسے پکڑے رکھا اور اس کے بعد آپ نے کہا ”اے اللہ کے نبی' بس اللہ کے سامنے آپ کی یہ فریاد کافی ہے' بے شک اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا کرے گا۔

اس پر اللہ نے یہ آیات نازل کیں ۔

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ

(۸ : ۹) ”اور وہ موقع جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے ۔ جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لئے پے درپے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں ۔“ یوم بدر میں فرشتوں کی تعداد اور ان کے طریقہ جنگ کے بارے میں متعدد اور مفصل روایات وارد ہیں ۔ اور ان میں بتایا گیا ہے کہ وہ اہل ایمان کو کیا کہتے تھے اور کس طرح ان کو جرأت دلاتے تھے اور کفار کو کیا کہتے تھے اور کس طرح انہیں شرمندہ کرتے تھے ۔ لیکن ظلال القرآن میں ہمارا جو طریقہ ہے ' اس کے مطابق ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہیں کیونکہ یہ معاملہ عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے بارے میں قرآن و سنت کی نصوص واضح ہیں ۔ یہاں قرآنی آیات بالکل واضح ہیں ۔ مثلاً

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ

(۸ : ۹) ”اور وہ موقع جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے ۔ جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لئے پے درپے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں ۔“ یہ تو تھی ان کی تعداد ۔ اور ان کا طریقہ جنگ یہ تھا ۔

اِذْ يُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (۸ : ۱۲)

”اور وہ وقت جب کہ تمہارا رب فرشتوں کو اشارہ کر رہا تھا کہ ”میں تمہارے ساتھ ہوں ' تم اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو ' میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں ' پس تم ان کی گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ ۔“

یہ تھا ان کا عملی کام ۔ اس سے مزید تفصیلات کی سرے سے ضرورت نہیں ہے کیونکہ آیت اپنے مفہوم میں واضح ہے ۔ ہمیں اس قدر یقین کر لینا چاہئے کہ اس معرکے میں اللہ نے مسلمانوں کو اپنے حال پر نہ چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ تعداد و اسباب کے اعتبار سے بہت کم تھے اور جس طرح قرآن کریم کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے ' اسی انداز سے فرشتوں نے اس جنگ میں شرکت کی ۔

امام بخاری باب شہود الملائکہ بدرا میں کہتے ہیں : ابن اسحاق سے ' جریر سے ' یحیٰی ابن سعید سے ' معاذ ابن رفاعہ ابن رافع الرزقی سے ' اس کے باپ سے (اور یہ اہل بدر میں سے تھے) کہتے ہیں کہ جبرئیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا تم اہل بدر کے بارے میں کیا خیال کرتے ہو ' آپ نے فرمایا ”ہم ان کو افضل المسلمین سمجھتے ہیں ۔ تو جبرئیل نے کہا اسی طرح ہم فرشتوں میں سے جو بدری تھے ' ان کو افضل سمجھتے ہیں ۔ (بخاری)

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ (۹) وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۱۰) ع (۸:۹ - ۱۰) "اور وہ موقع جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے - جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لئے پے در پے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں - یہ بات اللہ نے تمہیں صرف اس لئے بتا دی کہ تمہیں خوشخبری ہو اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں' ورنہ مدد تو جب بھی ہوتی ہے اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے یقیناً اللہ زبردست اور دانا ہے -"

مسلمان اللہ کے دربار میں زاری کر رہے تھے تو اللہ نے ان کو جواب دیا کہ میں ایک ہزار فرشتوں کی امداد تمہارے لئے بھیج رہا ہوں جو لگاتار نازل ہوتے رہیں گے - اس اعلان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ بہت عظیم تھا' اور اللہ کے نزدیک اقامت دین کی بہت اہمیت تھی' لیکن اللہ تعالیٰ یہاں اس بات کی وضاحت بار بار فرماتے ہیں کہ دنیا میں اسباب کی اس قدر اہمیت نہیں ہے کہ ان سے تخلف ممکن نہ ہو - اصل اختیار اللہ کی مشیت کا ہوتا ہے - لہٰذا اسباب کے معاملے میں مومن کو اپنا ذہن صاف رکھنا چاہئے - اللہ کی جانب سے مدد کی قبولیت اور پھر اس کی اطلاع محض ایک خوشخبری تھی جس کے ذریعے مومنین کو اطمینان دلانا مقصود تھا - رہی نصرت تو وہ اللہ کی جانب سے تھی -

یہ ہے وہ حقیقت جو یہاں قرآن مومنین کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے تاکہ وہ کلی تکیہ اسباب پر نہ کریں -

مسلمانوں کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنی پوری قوت کو اس معرکے میں جھونک دیں اور کچھ بھی باقی نہ رکھیں - ابتدائی طور پر بعض لوگوں کے اندر جو تزلزل پیدا ہو گیا تھا اس پر قابو پالیں - کیونکہ اس وقت وہ واقعی اور حقیقی خطرے سے دوچار تھے - وہ اللہ کا حکم بجا لاتے ہوئے آگے بڑھیں اور اللہ کی نصرت پر یقین رکھیں - بس یہی ان کے لئے کافی تھا تاکہ وہ اپنے حصے کا کردار اچھی طرح ادا کر لیں - آگے پھر قدرت الٰہیہ کا کام آتا ہے اور قدرت الٰہی اپنے معاملات کی تدبیر خود کرتی ہے - اس کے علاوہ جو اقدامات ہوئے اور اطلاعات دی گئیں وہ محض مسلمانوں کے اطمینان کے لئے ہیں - ان کے قدموں کو ثابت کرنے کے لئے تھیں کیونکہ وہ ایک حقیقی خطرے سے دوچار تھے - جماعت مسلمہ کے لئے یہ بات کافی تھی کہ اسے یہ اطمینان ہو کہ اللہ کے لشکر اس کے ساتھ ہیں اور یہ کہ نصرت ان کے لئے مقدر ہے - کیونکہ نصرت اللہ کی جانب سے ہوتی ہے اور اللہ ان کے ساتھ ہے' وہی عزیز ہے اور وہی غالب ہے' وہی حکیم ہے اور وہ ہر بات کو اپنے حقیقی مقام پر رکھتا ہے -

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ يُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۱۱) (۸:۱۱) "اور وہ وقت جب کہ اللہ اپنی طرف سے غنودگی کی شکل میں تم پر اطمینان و بے خوفی کی کیفیت طاری کر رہا تھا' اور آسمان سے تمہارے اوپر پانی برسا رہا تھا تاکہ تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست

دور کرے اور تمہاری ہمت بندھائے اور اس کے ذریعے سے تمہارے قدم جما دے۔"

یہ غنودگی کا واقعہ بھی نہایت ہی عجیب اور حیرت انگیز ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حالت تھی اور جنگ سے قبل مسلمانوں پر طاری ہوگئی تھی۔ یہ صرف امرالٰہی اور اللہ کی خاص تدبیر اور تقدیر کا کارنامہ تھا۔ جب لشکروں کا آمنا سامنا ہوا تو مسلمانوں پر قدرے خوف طاری ہوگیا کیونکہ ان کی توقع نہ تھی کہ اس قدر عظیم لشکر امنڈ آئے گا۔ اور اس وجہ سے ان کی تیاری بھی نہ تھی' اچانک انہیں غنودگی نے آلیا۔

جب یہ غنودگی دور ہوئی تو وہ بالکل فریش اور تروتازہ تھے۔ ان کے دل اطمینان سے بھرے ہوئے تھے۔ یہی حالت ان پر احد میں طاری ہوگئی تھی۔ لوگوں کے اندر بے چینی آگئی' اور اللہ نے ان پر غنودگی طاری کردی اور انہیں اطمینان ہوگیا۔ میں ان آیات کو پڑھ کر گذر جاتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ یہ دور ماضی کا ایک واقعہ ہے۔ میں اس واقعہ کے بارے میں قرآن کریم کے اس قصے کو پڑھتا اور یہ سمجھتا کہ اس کا راز اللہ ہی جانتا ہے جس نے ہمیں اس کی اطلاع دی ہے۔ لیکن جب مجھ پر مشکلات آئیں اور بعض لمحات نہایت ہی تنگی اور پریشانی کے بھی گذرے۔ تو مجھے ان آیات کا مفہوم سمجھ میں آیا۔ ایک بار میں نامعلوم خوف سے دوچار ہوگیا' غروب شمس کا وقت تھا' اچانک چند منٹوں کے لئے مجھ پر غنودگی آجاتی ہے اور جب یہ حالت دور ہوتی ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میں وہ نہیں ہوں جو اس غنودگی سے پہلے تھا۔ میرا نفس نہایت ہی پرسکون تھا۔ دل مطمئن تھا اور میں گہرے اطمینان میں غرق تھا۔ چند لمحات میں یہ عمل کیسے طے ہوگیا' یہ اچانک کس طرح انقلاب برپا ہوگیا۔ یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن یہ بات ضرور ہوگئی کہ قصہ بدر واحد میری سمجھ میں آگیا۔ اس واقعہ کے بعد میں نے اپنی پوری شخصیت کے ساتھ اس قصے کو سمجھ لیا' محض عقلی طور پر نہیں' یہ اب میرے وجود میں ایک زندہ حقیقت تھی۔ محض تصور اور خیال نہ تھا۔ مجھے صاف نظر آیا کہ اس میں دست قدرت کی کارفرمائی ہے اور نہایت ہی خفی طور پر مجھے اطمینان عطا ہوگیا۔

بدر کے دن جماعت مسلمہ کے لئے یہ غنودگی اللہ کی غیبی امداد تھی۔ اِذْ یُغَشِّیْکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً "اس وقت کو یاد کرو کہ تمہارا رب اپنی طرف سے غنودگی کی شکل میں تم پر اطمینان و بے خوفی کی کیفیت طاری کر رہا تھا۔" اس آیت میں یُغَشِّیْکُمُ النُّعَاسَ اور اَمَنَةً تینوں لفظ اس فضا پر ایک لطیف اور شفاف پرتو ڈالتے ہیں اور اس منظر کی عام فضا کی نقشہ کشی کرتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے شب و روز کیا تھے اور یہ کہ مسلمانوں کے عام حالات کے مقابلے میں اور ان کی اس نفسیاتی کیفیت میں فرق کیا تھا۔

اب بارش کا قصہ ملاحظہ فرمائیں۔

وَیُنَزِّلُ عَلَیْکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَهِّرَکُمْ بِهٖ وَیُذْهِبَ عَنْکُمْ رِجْزَ الشَّیْطٰنِ وَلِیَرْبِطَ عَلٰی قُلُوْبِکُمْ وَیُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۱۱) (۸: ۱۱) "اور آسمان سے تمہارے اوپر پانی برسا رہا تھا تاکہ تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست دور کرے اور تمہاری ہمت بندھائے اور اس کے ذریعے سے تمہارے قدم جما دے۔"

یہ واقعہ معرکہ سے قدرے پہلے پیش آیا۔ اور یہ بھی امت مسلمہ کے لئے ایک قسم کی خاص امداد تھی۔

علی ابن طلحہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے 'کہ یوم بدر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس جگہ پر قیام کیا اس کی پوزیشن یہ تھی کہ مشرکین اور پانی کے درمیان ایک ریت کا ٹیلہ تھا جو ایک پتھریلی جگہ تھی۔ اس دن مسلمان بہت ہی تھکے ہوئے تھے۔ ایسے حالات میں شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ اندازی شروع کر دی کہ تم دعویٰ تو یہ کرتے ہو کہ تم اللہ کے دوست ہو اور تمہارے اندر اللہ کے رسول موجود ہیں' حالانکہ مشرکین پانی پر قبضہ کر چکے ہیں اور تمہاری حالت یہ ہے کہ تم حالت جنابت میں نماز پڑھتے ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے شدید بارش برسائی۔ مسلمانوں نے پانی بھی پیا اور طہارت بھی حاصل کی اور اللہ نے شیطانی نجاست سے ان کو پاک کر دیا۔ جب بارش ہوئی تو ریت بھی بیٹھ گئی اور لوگ اور جانور اس کے اوپر آسانی سے چلنے لگے۔ اس طرح وہ آگے بڑھے۔ ”اللہ نے نبی کو ایک ہزار فرشتوں کی امداد حضرت جبریل کی کمان میں پانچ صد فرشتے تھے جو ہر قسم کے سامان سے لیس تھے۔ اور میکائیل کی کمان میں بھی پانچ صد فرشتے تھے۔

یہ حالت اس وقت پیش آئی جب کہ حضور ؐ نے حباب ابن منذر کے مشورے پر کیمپ نہیں بدلا تھا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ مناسب یہ ہے کہ ہم بدر کے پانیوں کے قریب فروکش ہوں اور پانی کا حوض بنا کر مخالف کیمپ کا پانی بند کر دیں۔

”معروف یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بدر کی طرف چلے تو آپ نے ابتدائی اور پہلے پانی پر قیام کیا لیا۔ اس پر حباب ابن منذر آگے بڑھے کہ جس مقام پر قیام کا حکم دیا گیا ہے آیا یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ ہم اس میں ردوبدل کر سکتے ہیں اور یہ مقام بطور جنگی چال اور تدبیر ہے۔ حضور ؐ نے فرمایا کہ میں نے یہ مقام محض جنگی سوچ کی بنا پر تجویز کیا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا پھر یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے فوجی کیمپ کے لئے۔ مناسب یہ ہے کہ آپ ہمیں آخری پانی پر لے چلیں جو مشرکین کے قریب ہے اور اس آخری پانی سے پیچھے جس قدر پانی ہیں' ان کو ہم دشمن سے روک لیں گے۔ ہم خود پئیں گے اور مویشیوں کو پلائیں گے۔ یوں ہمارے پاس پانی ہو گا اور ان کے پاس پانی نہ ہو گا۔ اس پر حضور ؐ نے لشکر کو ایسا ہی کا حکم دیا اور اس مشورے پر عمل کیا۔

حباب ابن المنذر کے مشورے سے قبل کی رات میں مسلمانوں کی یہ حالت تھی جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ بطور احسان اس جماعت سے کر رہے ہیں جو بدر میں شریک ہوئی۔ یہ جو امداد اللہ نے کی یہ دوسری امداد تھی۔ یہ روحانی بھی تھی اور مادی بھی تھی اس لئے کہ صحراؤں میں پانی پر زندگی موقوف ہوتی ہے۔ پانی فتح کا سامان ہوتا ہے اور صحراؤں میں جس لشکر کے پاس پانی نہ ہو وہ ذہنی طور پر شکست کھا جاتا ہے۔ اور روحانی اس طرح کہ مسلمان شیطانی وسوسوں سے بھی نکل آئے۔ وہ حالت جنابت میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اس وقت تک ان کو تیمم کی اجازت بھی نہ تھی۔ یہ اجازت بہت بعد میں غزوۂ بنی المصطلق میں دی گئی یعنی ۵ ہجری میں۔ ایسے حالات میں شیطان نے نفسیاتی وسوسے ڈالے اور لوگوں کے اندر نفسیاتی اور روحانی بے چینی پیدا کر دی تھی تاکہ جب یہ لوگ اس معرکے میں داخل ہوں تو روحانی اعتبار سے پریشان ہوں اور مادی شکست سے پہلے ان کو اندرونی طور پر شکست ہو چکی ہو اور وہ اندر سے ٹوٹ چکے ہوں۔ ایسے حالات میں امدادی یہ امداد خاص آئی ہے۔

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ يُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۱۱) (۸: ۱۱) ''اور آسمان سے تمہارے اوپر پانی برسا رہا تھا تاکہ تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست دور کرے اور تمہاری ہمت بندھائے اور اس کے ذریعے سے تمہارے قدم جما دے۔''

یوں مادی امداد کے ساتھ ساتھ روحانی امداد بھی پوری ہو جاتی ہے۔ پانی کی وجہ سے دلوں کو اطمینان ہو گیا اور روح کی پاکیزگی کی وجہ سے وہ تروتازہ ہو گئے۔ بارش کی وجہ سے ریت بیٹھ گئی اور قدم بھی مضبوط ہو گئے۔

یہ تدابیر اس کے علاوہ تھیں کہ اللہ نے فرشتوں کو خصوصی ہدایت دے دیں کہ تم اہل ایمان کے قدموں کو مضبوط کرو اور کفار کے دلوں میں ان کا رعب ڈالو' اور فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ تم عملاً جنگ میں شرکت کرو۔

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (۸: ۱۲)

''اور وہ وقت جب کہ تمہارا رب فرشتوں کو اشارہ کر رہا تھا کہ ''میں تمہارے ساتھ ہوں' تم اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو' میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں' پس تم ان کی گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ۔''

یہ ایک عظیم معاملہ ہے' اس معرکے میں فوج ملائکہ کے ساتھ خود اللہ بھی موجود ہیں اور ملائکہ اہل ایمان کی مدد کے لئے آ رہے ہیں۔ یہ اس قدر عظیم معاملہ ہے جو کسی صورت میں بھی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں ہے۔ سوچئے! ملائکہ کس طرح شریک ہوئے؟ انہوں نے کتنے افراد کو مارا؟ کس طرح مارا؟ یہ ایک عظیم معاملہ ہے اور بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ جو جماعت اقامت دین کا کام کرتی ہے اس میں اس کے ساتھ ملائکہ شریک ہوتے ہیں اور ملائکہ اس میں حصہ لیتے ہیں۔

ہمارا ایمان ہے کہ مخلوقات رب العالمین میں ایک مخلوق ایسی ہے جسے ملائکہ کہا جاتا ہے کہ ان کی طبیعت اور ماہیت کیا ہے؟ اس کے بارے میں ہمیں صرف اس قدر علم دیا گیا ہے جو اللہ نے بتایا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس کیفیت کا بھی علم نہیں جس کے مطابق اس مخلوق نے مومنین کی امداد کی۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ رب تعالیٰ نے ان کو یہ حکم دیا کہ وہ مومنین کے لئے ثابت قدمی کا باعث ہوں اور میں بھی تمہارے ساتھ ہوں اور انہوں نے یہ کام کیا' کیونکہ یہ وہ مخلوق ہے جو امرالٰہی کی پابند ہے۔ لیکن ہمیں معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے یہ کام کیسے کیا؟ اللہ نے یہ حکم بھی دیا کہ کفار کی گردنوں پر وار کرو اور ان کے ایک ایک جوڑ پر وار کرو تاکہ یہ کام کے ہی نہ رہیں اور انہوں نے ایسا کیا۔ لیکن کیسے کیا؟ یہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ ہمیں ان کے بارے میں اسی قدر علم ہے جو اللہ نے بتایا۔ پھر اللہ کا حکم یہ تھا کہ کفار کے دلوں کے اندر رعب ڈالا جائے اور یہ ڈال دیا گیا اور ایسا کر دیا گیا۔ کیونکہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ لیکن ہمیں اس کی کیفیات کا بھی علم نہیں ہے کیونکہ یہ کفار اللہ کی مخلوق ہیں اور وہ اپنی مخلوق کے بارے میں خوب جانتا ہے کہ اس پر کس طرح اثر ہو گا۔ وہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور وہ شاہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔

ان افعال کی کیفیات سے بحث کرنا' دین اسلام کے مزاج کے خلاف ہے اور اس دین کی سنجیدگی کے ساتھ یہ طرز عمل لگا نہیں کھاتا۔ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ یہ ایک عملی دین ہے اور یہ عقیدہ اور نظریات و تصورات کو بھی عملی حد تک رکھتا ہے۔ لیکن بعد کے ادوار میں مسلمانوں کے علم الکلام کے اندر یہ مباحث زیادہ اہم ہو گئے اور یہ اس وقت ہوا کہ جب لوگ اسلام کے مثبت اور عملی کام سے فارغ ہو گئے اور علمی اور ثقافتی رنگ ان پر غالب ہو گیا۔ لیکن اصل بات تو یہ تھی کہ مسلمان میدان معرکہ میں ہوتے' فرشتے ان کے ساتھ بزن کے عالم میں ہوتے اور فرشتوں اور مسلمانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہوتے تو یہ عملی صورت حال مسلمانوں کے لئے' اس ثقافتی جدل و جدال سے زیادہ نفع بخش ہوتی۔

اس تقریر کے آخر میں اور اس عظیم اور ہولناک حقیقت کے انکشاف کے آخر میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اس معرکے کا پس منظر کیا تھا اور کن حقائق کی وجہ سے کسی کو نصرت ملی اور کسی کے حصے میں ہزیمت آئی۔ وہ عظیم پس منظر یہ تھا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸ : ۱۳) "یہ اس لئے کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول ؐ کا مقابلہ کیا اور جو اللہ اور اس کے رسول ؐ کا مقابلہ کرے' اللہ اس کے لئے نہایت سخت گیر ہے۔"

یہ کوئی ایسا واقعہ نہ تھا کہ اچانک پیش آ گیا۔ اور نہ ہی یہ اتفاقی حادثہ تھا جو پیش آ گیا اور چلا گیا۔ اللہ نے جماعت مسلمہ کی نصرت کی اور اسے اس کے دشمنوں پر مسلط کر دیا اور اس کے دشمنوں کے دلوں کے اندر رعب بٹھا دیا۔ مسلح فرشتے ان کی امداد کے لئے پہنچ گئے۔ یہ اس لئے تھا کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کیا تھا۔ انہوں نے اپنے لئے وہ محاذ چن لیا جو اللہ کا محاذ نہ تھا' اور وہ اللہ اور رسول ؐ کی مخالف صفوں میں چلے گئے۔ انہوں نے خدا اور رسول سے محاذ آرائی شروع کر دی اور وہ اسلامی نظام حیات کے قیام کے لئے رکاوٹ بن گئے تھے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸ : ۱۳) "اور جو اللہ اور رسول سے محاذ آرائی کرے تو اللہ شدید عذاب دینے والا ہے۔" یعنی ایسے لوگوں پر وہ سخت عذاب نازل کرتا ہے۔ اللہ اس قدر طاقتور ہے کہ وہ ان پر عذاب نازل کر سکتا ہے اور وہ اس قدر ضعیف ہیں جو اس عذاب کو برداشت کرنے کی قدرت اپنے اندر نہیں رکھتے۔"

یہ اللہ کی سنت جاریہ ہے اور اس کا اصول ہے۔ یہ کوئی اچانک یا کوئی حادثہ یا اتفاق نہیں ہے۔ یہ اللہ کی سنت جاریہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر جب بھی کوئی جماعت اس لئے اٹھے کہ وہ یہاں اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو قائم کرے گی اور یہاں صرف اسلامی نظام حیات قائم ہو گا اور اس جماعت کے خلاف اللہ کا کوئی دشمن اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اس جماعت کے ساتھ محاذ آرائی شروع کر دی اور ایسے لوگ قوت اور رعب و داب کے مالک بھی ہوتے تو اللہ کی مدد اس جماعت کے ساتھ ہوا کرتی ہے بشرطیکہ یہ جماعت ثابت قدمی سے اپنے مقصد کی طرف گامزن ہو اور رب تعالیٰ کی راہ میں مطمئن ہو۔ اس پر توکل کرنے والی ہو اور اپنی راہ پر اس کا سفر جاری ہو۔

اس منظر کے آخر میں ان لوگوں کو مخاطب کیا جاتا ہے جنہوں نے اللہ اور رسول اللہ کے ساتھ محاذ آرائی شروع کر دی ہے کہ یہ رعب اور پھر یہ ہزیمت جو تمہیں اس دنیا میں اٹھانی پڑی اس پر یہ بات ختم نہیں ہو گئی ہے کیونکہ یہ دین'

اس کا قیام اور اس کی جماعت صرف اس مختصر سے زمانہ دنیا پر ختم ہو جانے والا معاملہ ہی نہیں ہے۔ یہ معاملہ اس دنیا اور اس کائنات سے بہت آگے تک جاتا ہے۔ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی پر بھی اس کے اثرات ہیں اور وہ یہ ہیں۔

ذٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ النَّارِ (۸: ۱۴) "یہ ہے تم لوگوں کی سزا' اب اس کا مزہ چکھو' اور تمہیں معلوم ہو کہ حق کا انکار کرنے والوں کے لئے دوزخ کا عذاب ہے۔" یہ ہو گا اصلی انجام اور یہ عذاب اس عذاب سے بہت ہی مختلف قسم کا اور زیادہ ہو گا جو تمہیں مرعوب کر کے اور تمہاری گردنوں پر اور جوڑوں پر ضربات لگا کر تمہیں دیا گیا۔

---ooo---

جنگ بدر کے واقعات اور حالات کی منظر کشی کے بعد اور یہ دکھانے کے بعد کہ اس کے پس منظر میں دست قدرت کام کر رہا تھا اور اللہ کی معاونت اور امداد اس میں شامل تھی اور یہ جان لینے کے بعد کہ مسلمان کو اس پوری تگ و دو میں دست قدرت کے لئے ایک پردہ تھے 'کیونکہ اللہ ہی نے رسول کو گھر سے نکالا۔ یہ محض نمائش قوت کے لئے نہ نکلے تھے اور نہ ہی مظالم کے لئے نکلے تھے' یہ اللہ ہی نے فیصلہ کیا کہ دو گروہوں میں سے کون سا گروہ مسلمانوں کے ہاتھ لگے اور وہی ہے جس نے مجرموں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی تاکہ حق 'حق ہو جائے اور باطل 'باطل ہو جائے۔ اگرچہ مجرم اس بات کو پسند نہ کرتے تھے اور یہ اللہ ہی تھا جس نے ان کی مدد کے لئے وہ فرشتے بھیجے جو لگاتار آ رہے تھے۔ پھر وہ اللہ ہی تھا جس نے ان پر غنودگی طاری کر دی تھی اور آسمانوں سے ان پر پانی اتارا تاکہ ان کو پاک کر دے اور ان کو شیطانی نجاست سے پاک کر دے ان کے دلوں کو مطمئن کر دے اور قدم مضبوط کر دے۔ اور یہ اللہ ہی تھا کہ اس نے فرشتوں کو حکم دیا کہ مسلمانوں کے قدم مضبوط کر دیں' اور کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں اور وہ اللہ ہی تھا جس نے اس معرکے میں فرشتوں کو شریک کیا۔ ان کو حکم دیا کہ ان کی گردنوں پر ضربات لگاؤ اور ان کے جوڑوں میں چوٹیں لگاؤ اور پھر اللہ ہی تھا جس نے ان کو اموال غنیمت عطا کئے حالانکہ جب وہ گھر سے نکلے تھے تو ان کے پاس نہ مال تھا اور نہ ساز و سامان تھا۔

اب جبکہ سابقہ واقعات بیان ہو گئے تو اس حقیقت کو ان کے ذہن نشین کرنے کے لئے دوبارہ بیان کیا جاتا ہے تاکہ یہ ان کی نظروں کے سامنے رہے کہ فیصلہ کن جنگ صرف ساز و سامان اور زاد و عتاد پر موقوف نہیں' بلکہ اس میں نصرت الٰہی اور اللہ کی تدبیر اور مشیت فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ اس راہ میں اصل ساز و سامان توکل علی اللہ ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف التجا اور اللہ کے ہاں فریاد و زاری اور اللہ کی تدبیر اور تقدیر اس میں فیصلہ کن ہوتی ہے۔

یہ منظر ابھی تک ان لوگوں کے ذہنوں میں اچھی طرح بیٹھا ہوا ہے۔ ایسے حالات اور ایسا ماحول اس بات کے لئے نہایت ہی مناسب ہوتا ہے اور اس میں بات مانی جاتی ہے۔ چنانچہ ایسے ماحول میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان کی صفت ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ جب کفار کے بالمقابل کھڑے ہوں تو ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں اور فرار اور ہزیمت کو ہرگز قبول نہ کریں۔ خصوصاً جبکہ نصرت اور ہزیمت اللہ کے اختیار میں ہوتی ہے اور اس پر تمہارا ایمان ہے۔ نصرت اور ہزیمت کا فیصلہ صرف اسباب ظاہریہ پر ہی نہیں ہوتا' خصوصاً جبکہ کسی معرکے کی تدبیر اور کمان خود اللہ نے اپنے ہاتھ میں لی ہوئی ہو۔ جیسا کہ تمام امور کی تدبیر وہی کرتا ہے اور وہی ہے جو مومنین کے ہاتھوں کفار کو قتل کراتا ہے۔ وہی ہے جو تیر کو نشانے پر بٹھاتا ہے۔

اہل ایمان تو دست قدرت کے لئے ایک پردہ اور بہانہ ہیں اور اللہ اس بہانہ سے انہیں جہاد کا ثواب عطا کرتا ہے اور کافروں کو مسلمانوں کی نسبت سے مرعوب کرتا ہے ۔ ان کی تدبیر کی چولیں ڈھیلی کرتا ہے اور دنیا و آخرت میں انہیں عذاب سے دوچار کرتا ہے اس لئے کہ وہ درحقیقت اللہ اور رسول سے محاذ آرائی کیے ہوئے ہوتے ہیں ۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ ﴿١٥﴾ وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٦﴾ فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ۚ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٧﴾ ذَٰلِكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ مُوهِنُ كَيْدِ الْكَافِرِينَ ﴿١٨﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم ایک لشکر کی صورت میں کفار سے دوچار ہو تو ان کے مقابلہ میں پیٹھ نہ پھیرو ۔ جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری ------ الا یہ کہ جنگی چال کے طور پر ایسا کرے یا کسی دوسری فوج سے جا ملنے کے لئے ------ تو وہ اللہ کے غضب میں گھر جائے گا ۔ اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا اور وہ بہت بری جائے بازگشت ہے ۔

پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور اے نبی ؐ تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا (اور مومنوں کے ہاتھ جو اس کام میں استعمال کئے گئے) تو یہ اس لئے تھا کہ اللہ مومنوں کو ایک بہترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزار دے ' یقیناً اللہ سننے اور جاننے والا ہے ۔ یہ معاملہ تو تمہارے ساتھ ہے اور کافروں کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ اللہ ان کی چالوں کو کمزور کرنے والا ہے ۔"

قرآن نے اس معاملے میں جو سخت انداز گفتگو اختیار کیا ہے اور سخت سزا تجویز کی ہے اور فیصلہ یہ کیا ہے کہ جو شکست کھاتے ہوئے بھاگے وہ غضب الٰہی کا مستحق ہو گا اور اس کا ٹھکانا جہنم میں ہو گا ۔ یہ ذرا دیکھئے ۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم ایک لشکر کی صورت میں کفار سے دوچار ہو تو ان کے مقابلہ میں پیٹھ نہ پھیرو ۔ جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری ------ الا یہ کہ جنگی چال کے طور پر ایسا کرے یا کسی دوسری فوج سے جا ملنے کے لئے ------ تو وہ اللہ کے غضب میں گھر جائے گا ۔ اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا' اور وہ بہت بری جائے بازگشت ہے ۔"

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب تم حالت "زحف" میں ہو یعنی جنگ میں دوبدو مقابلہ آن پڑے تو اس وقت فرار اختیار نہ کرو الا یہ کہ یہ فرار کسی جنگی چال کی صورت میں ہو' کہ تم بہترین مواقع کے لئے فرار اختیار کر رہے ہو یا کوئی اور بہترین منصوبے کی خاطر فرار کا حکم دیا گیا ہو ۔ یا تم کسی دوسری جنگی کمپنی سے ملنے کے لئے فرار اختیار کر رہے ہو ۔ یا تم جنگی ہیڈ کوارٹرز کی طرف بھاگ رہے ہو تاکہ دوبارہ حملہ کر سکو ۔ ان حالات کے سوا کسی اور صورت میں اگر تم دشمن کو پیٹھ دکھاؤ

گے تو تم عذاب کے مستحق بن جاؤ گے تم پر اللہ کا غضب ہو گا اور تمہارا ٹھکانا جہنم ہو گا۔

بعض اقوال ایسے منقول ہوئے ہیں کہ یہ حکم صرف اہل بدر کے لئے تھا یا ایسے غزوات کے لئے تھا کہ جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود شریک ہوا کرتے تھے لیکن جمہور علماء اور مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ آیت اور حکم عام ہے اور یہ کہ دوبدو مقابلے سے بھاگنا ان سات گناہ ہائے کبیرہ میں سے ایک ہے جن کے بارے میں حضور ؐ نے لفظ "مولقات" استعمال کیا ہے۔ بخاری اور مسلم نے ابو ہریرہ کی روایت نقل کی ہے کہ حضور ؐ نے فرمایا سات ان گناہوں سے اجتناب کرو جو مولقات ہیں۔ کہا گیا حضور ؐ وہ کیا ہیں؟ تو آپ ؐ نے فرمایا الشرک باللہ' سحر' ایسے شخص کا قتل جس کا قتل حرام ہو' اکل ربا' اکل مال یتیم' دوبدو جنگ میں پیٹھ پھیرنا اور محض بے خبر مومن عورتوں پر الزام لگانا۔

امام ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں اس کے بارے میں تفصیلات دی ہیں یہاں ان پر نظر ڈالنا مفید رہے گا۔ "اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَى فِئَةٍ (۸:۱۶) ابونضرہ نے ابو سعید سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ یوم بدر کے معاملے میں تھا کیونکہ اس دن وہ بھاگ کر کس سے ملتے؟ صرف یہ صورت تھی کہ وہ مشرکین سے ملتے۔ کیونکہ مسلمان تو ان کے سوا کوئی تھا نہیں۔ ابونضرہ نے جو رائے اختیار کی ہے یہ درست نہیں ہے کیونکہ اس موقعہ پر مدینہ میں بے شمار انصاری مسلمان موجود تھے۔ اور حضور ؐ نے سب لوگوں کو حکم نہ دیا تھا کہ وہ نکلیں' اور نہ ان لوگوں کی رائے تھی کہ جنگ ہو جائے۔ سب کا خیال یہ تھا کہ قافلے کے ساتھ ہی مڈبھیڑ ہو گی۔ حضور ؐ ایک خفیف سی قوت لے کر نکلے۔ لہذا ابونضرہ کا کہنا کہ اس دن ان لوگوں کے سوا اور کوئی مسلمان نہ تھا اور اگر وہ بھاگتے تو صرف کفار کی طرف بھاگ جاتے' غلط ہے اور دلیل وہی ہے جو ہم نے بیان کی۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ جنگ بدر کے دن ان کے لئے بھاگنا اور پیٹھ پھیرنا اس لئے جائز نہ تھا کہ اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود تھے اور حضور کو چھوڑ کر بھاگنا جائز نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ

وَلَا يَرْغَبُوا عَنْ نَفْسِهِ "اہل مدینہ اور اس کے ماحول میں رہنے والے اعراب مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بیٹھے رہتے اور اس کی طرف سے بے پرواہ ہو کر اپنے نفس کی فکر میں لگ جاتے۔" اس لئے ان کے لئے یہ جائز نہ تھا کہ وہ اپنے نبی کو ناکام بناتے اور اسے چھوڑ کر دشمن کے حوالے کر دیتے۔ اگرچہ اللہ اس کا کفیل تھا اور ان کا مددگار تھا۔ اس نے ذمہ داری قبول کی تھی کہ اسے کافروں سے بچائے گا۔ جیسا کہ کہا گیا وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ "اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا۔" لہذا ان پر حضور ؐ کی مدد کرنا فرض تھا۔ چاہے دشمن زیادہ ہو یا قلیل ہو۔ اور ان لوگوں کی دلیل یہ بھی ہے کہ اس دن حضور ؐ ہی ایک دستہ تھے اور جنگ میں پیٹھ پھیرنا اس شرط پر جائز تھا کہ وہ مجاہدین کی کسی دوسری کمپنی کی طرف پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ حضور ؐ اس دن واحد گروہ تھے' کوئی اور گروہ بدریوں کے علاوہ کسی جگہ تعینات نہ تھا۔ حضرت ابن عمر کہتے ہیں کہ میں ایک لشکر میں تھا۔ لوگوں نے یکبارگی حملہ کیا اور

ہم مدینہ کی طرف لوٹ آئے۔ ہم نے کہا کہ ہم تو بھاگنے والوں میں سے ہیں۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' میں تو تمہارے لئے فئہ ہوں۔ اس لئے جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دور ہو اور وہ واپس آجائے تو اس کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس ہونا جائز ہے۔ اور اگر حضور ؐ جنگ میں موجود ہوں تو پھر کوئی ایسا گروہ موجود نہ ہو گا جس کے ساتھ ملنے کے لئے فوجیوں کے لئے بھاگنا جائز ہو۔ و من یولھم یومئذ دبرہ "اور جو شخص اس دن پیٹھ کفار کی طرف پھیرے گا۔" اس آیت کے بارے میں ابن الحسن کہتے ہیں کہ اہل بدر پر بہت ہی سختی سے احکامات نافذ کرائے گئے اور یہ آیت

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا "وہ لوگ جو اس دن بھاگ گئے جس دن دو فوجوں کا آمنا سامنا ہوا' ان کو شیطان نے ان کی بعض بداعمالیوں کی وجہ سے پھسلا دیا۔" اس لئے کہ یہ لوگ حضور ؐ سے بھاگ گئے تھے۔ نیز حنین کی جنگ میں بھی یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اس لئے اللہ نے اس فعل پر ان کو سزا دی۔

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ (۹: ۲۵) "اور حنین کے دن کو یاد کرو جب تمہاری کثرت نے تمہیں غرور میں ڈال دیا تھا لیکن اس کثرت نے تمہیں کوئی فائدہ نہ دیا۔ اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔" تو یہ تھا حکم اس حالت کے لئے جب حضور ؐ ان کے ساتھ تھے۔ چاہے دشمن کم ہو یا زیادہ۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے کوئی رعایت نہیں دی۔" "ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۸: ۶۵) "اے نبی ؐ مومنوں کو جنگ پر ابھارو' اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو منکرین حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے۔" یہ حکم اس وقت کے لئے تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس نہ ہوتے' واللہ اعلم۔ ایسے حالات میں پہلے حکم یہ تھا کہ بیس دو سو سے مقابلہ کریں گے اور میدان چھوڑ کر نہ بھاگیں گے اور اگر دشمن اس تعداد سے زیادہ ہو تو پھر بہترین صورت میں حملے کے لئے پیچھے ہٹنا جائز ہو گا۔ لیکن یہ حکم بعد میں منسوخ ہو گیا اور دوسری آیت نازل ہوئی۔

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ (۸: ۶۶) "اچھا اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا' اور اسے معلوم ہوا کہ ابھی تم میں کمزوری ہے' پس اگر تم میں سے سو آدمی صابر ہوں وہ دو سو پر اور ہزار آدمی ایسے ہوں تو وہ دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آئیں گے۔"

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ پہلے فرض یہ کیا گیا تھا کہ ایک آدمی دس سے نہیں بھاگے گا۔ پھر اسے کم کر دیا گیا اور کہا گیا کہ اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنْکُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِیْکُمْ ضَعْفًا (۸: ٦٦) "اچھا رب نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا اور اسے معلوم ہوا کہ ابھی تم میں کمزوری ہے۔"

اب فرض یہ عائد ہوا کہ ایک صد دو صد سے نہ بھاگیں گے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ اب حکم یہ ہے کہ اگر ایک شخص دو سے بھاگے تو یہ فرار ہو گا اور اگر کوئی تین کے مقابلے میں بھاگ جائے تو فرار نہ ہو گا۔ شیخ کہتے ہیں کہ یہاں فرار سے مراد وہ فرار ہے جو اس آیت میں مقصود ہے۔ آیت نے یہ فرض کیا ہے کہ ایک آدمی دو کے مقابلے میں ڈٹ جائے گا اور اگر دو سے زیادہ تعداد ہو تو پھر مجاہد کے لئے دوبارہ جنگ کی تیاری کی نیت سے اور فوج کے ساتھ ملنے کی غرض سے فرار جائز ہے۔ لیکن اگر ایک شخص ایسے غیر مسلم مسلمانوں کی طرف فرار کرتا ہے تو بھی وہ اس وعید کا مستحق ہو گا جو اس آیت میں وارد ہے۔ کیونکہ آیت میں حکم ہے:

وَمَنْ یُّوَلِّھِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَہٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَۃٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ (۸: ۱٦) "جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری، الا یہ کہ جنگی چال کے طور پر ایسا کرے یا کسی دوسری فوج سے جا ملنے کے لئے ---- تو وہ اللہ کے غضب میں گھر جائے گا۔" یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ہر مسلمان کے لئے دوسری فوج (فئہ) ہوں۔ حضرت عمر ابن الخطاب کو جب معلوم ہوا کہ ابو عبید ابن مسعود نے ایک لشکر کے ساتھ جنگ کی اور شہید ہو گئے لیکن بھاگے نہیں تو انہوں نے کہا "اللہ ابو عبید پر رحم کرے اگر وہ میری طرف واپس آ جاتا تو میں اس کے لئے دوسری فوج ہوتا۔ اور جب ابو عبید کے ساتھی واپس آئے تو حضرت عمر نے کہا میں تمہارے لئے دوسری فوج ہوں۔ آپ نے ان پر کوئی سختی نہ کی اور نہ باز پرس کی۔ یہی حکم ہمارے ہاں ہے۔ (یعنی حنفیہ کے نزدیک جب تک مسلمانوں کی فوج کی تعداد ۱۲ ہزار تک نہیں پہنچ جاتی کیونکہ ۱۲ ہزار کے لئے اپنے مقابلے میں ہٹنا جائز نہیں ہے۔ اگر ان کی تعداد دگنی ہو الا یہ کہ وہ جنگی چال کے طور پر ایسا کریں۔ جنگی چال یہ کہ وہ ایک مورچے سے دوسرے مورچے میں چلے جائیں، یا کوئی دوسری چال اختیار کریں جس میں جنگ سے فرار کا عنصر نہ ہو۔ یا دوسری فوج اور یونٹوں سے ملیں۔ محمد ابن الحسن سے مذکور ہے کہ اگر فوج ۱۲ ہزار تک پہنچ جائے تو اس پر فرض ہے کہ ہر صورت میں دشمن کا مقابلہ کرے۔ اس بارے میں حنفیہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حنفیہ نے حدیث زہری سے استدلال کیا ہے جو انہوں نے عبید اللہ ابن عبد اللہ سے روایت کی ہے کہ ابن عباس نے حضور ؐ سے یہ روایت کی ہے۔ آپ نے فرمایا: "اچھے ساتھی چار ہیں اور اچھے فوجی دستے چار سو ہیں اور اچھے لشکر چار ہزار ہیں اور ۱۲ ہزار افراد کے لشکر کو قلیل نہ سمجھا جائے گا اور نہ ہی وہ مغلوب ہوں گے۔" بعض روایات کے الفاظ یہ ہیں: "کہ تم میں سے کوئی قوم بھی اگر ۱۲ ہزار ہو تو مغلوب نہ ہو گی بشرطیکہ کہ اس میں اتحاد ہو۔" امام طحاوی نے یہ نقل کیا ہے کہ امام مالک سے پوچھا گیا: "کیا ہمارے لئے ایسے شخص کے خلاف جہاد و قتال سے رکنا جائز ہے جو احکام الٰہی کی پیروی نہیں کرتا اور اللہ کے سوا دوسروں کے احکام کے مطابق فیصلے کرتا ہے تو انہوں نے کہا کہ اگر تمہارے جیسے ۱۲ ہزار افراد موجود ہوں تو پیچھے ہٹنا منع ہے۔ اور اگر اس قدر افراد نہ ہوں تو تمہارے لئے گنجائش ہے کہ قتال نہ کرو۔" اور یہ سائل عبد اللہ ابن عمر ابن عبد العزیز تھے۔ ابن عبد اللہ

ابن عمر تھے۔ اور یہ بات اس رائے کے مطابق ہے جو محمد ابن الحسن سے نقل کی گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ۱۲ ہزار کے بارے میں جو روایت ہے وہ اس موضوع پر اصل اور اصول ہے۔ اگرچہ کافروں کی تعداد بہت زیادہ ہو۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ فرار اختیار کریں۔ اگرچہ وہ ان سے کئی گنا زیادہ ہوں۔ کیونکہ حضور ؐ نے جو شرط لگائی "اگر ان کے اندر اتحاد ہو۔" تو اس سے حضور اکرم ؐ ان پر اتحاد کرنا فرض کر دیا ہے۔"

اسی طرح ابن عربی نے بھی اپنی کتاب احکام القرآن میں یہ تفصیلات دی ہیں۔ انہوں نے اس حکم کے بارے میں یہ کہا ہے :

"اس بارے میں اختلاف ہے کہ جنگ کے میدان سے فرار کی ممانعت یوم بدر کے لئے مخصوص تھی یا قیامت تک یہی حکم ہے۔

ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ یہ ممانعت یوم بدر کے ساتھ مخصوص تھی۔ کیونکہ اس دن اس کے لئے دوسری فوج صرف رسول اللہ کی ذات ہی تھی۔ یہی رائے نافع، حسن، قتادہ، یزید، ابن حبیب اور ضحاک کی ہے۔

"حضرت ابن عباس اور تمام دوسرے علماء سے یہ روایت ہے کہ یہ حکم قیامت تک کے لئے باقی ہے اور جن لوگوں نے اسے یوم بدر کے ساتھ مخصوص کیا ہے انہوں نے وَمَنْ یُّوَلِّھِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَہٗ (۸ : ۱۶) سے استدلال کیا ہے کہ اس سے مراد بدر ہے حالانکہ یومئذ سے مراد یوم الزحف ہے یعنی مطلق جنگ کا دن۔"

"اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ آیات یوم بدر کی قتال کے بعد نازل ہوئیں اور ان کے نزول کے وقت جنگ بدر ختم ہو چکی تھی۔ اور اس دن جو ہونا تھا، وہ ہو چکا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات ثابت ہے جیسا کہ اس سے قبل ہم حدیث نقل کر آئے کہ کبائر یہ ہیں۔ اور ان میں سے جنگ کے دن بھاگنے کو بھی شمار کیا گیا اور یہ اس مسئلہ پر نص صریح ہے جس کے بعد اختلاف رفع ہو جانا چاہئے اور ہم نے اس نکتے پر متنبہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ اشکال پیش آیا کہ اس سے مراد یوم بدر ہے۔"

ہمارے خیال میں ابن عربی نے تمام علماء کی جو رائے نقل کی ہے اور ابن عباس سے بھی وہی منقول ہے، ہم بھی اسی کی طرف جاتے ہیں۔ اس لئے کہ جنگ کی صفوں سے بھاگ نکلنا ایک نہایت ہی برا فعل ہے اور اس کے دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ تحریکی اعتبار سے بھی اور اعتقادی اور نظریاتی اعتبار سے بھی۔"

مومن کا دل و دماغ نہایت ہی پختہ ہونا چاہئے۔ اس طرح کہ وہ زمین کی کسی بھی قوت کے سامنے متزلزل نہ ہو۔ اور اس کا رابطہ ایسی قوت کے ساتھ ہونا چاہئے جسے اپنے امور پر مکمل کنٹرول حاصل ہو اور وہ بندوں کے اوپر مکمل غلبہ رکھتی ہو اور جب کسی مومن کا دل و دماغ خطرات کو دیکھ کر متزلزل ہو گیا تو یہ تزلزل فرار پر منتج نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ اس لئے کسی مومن کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ موت کے ڈر سے پیٹھ پھیرے۔ یہ حکم ایسا نہیں ہے کہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ حکم دیا جا رہا ہے، کیونکہ مومن بھی انسان ہے اور اس کا دشمن بھی انسان ہے۔ اس لحاظ سے وہ گویا ایک ہی سطح پر کھڑے ہیں۔ پھر مومن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ربط ایسی قوت کے ساتھ ہے جس پر کوئی غالب نہیں ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو پھر وہ اللہ کا بندہ ہے اور اسی طرف متوجہ ہے اور اگر مر گیا تو بھی اللہ کی طرف لوٹنے والا ہے۔ اگر اس کے لئے شہادت رکھ دی گئی ہے تو بھی وہ اس پوزیشن سے بہت اچھی ہے، جو اس

کے دشمن کی ہے کیونکہ دشمن تو اللہ اور رسول اللہ کے مقابلے میں آتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ یہ قطعی حکم دیا جاتا ہے ۔

وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ

مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۸:۱۶) ”جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری ' الا یہ کہ جنگی چال کے طور پر ایسا کرے۔ یا کسی دوسری فوج سے جا ملنے کے لئے --- تو وہ اللہ کے غضب میں گھر جائے گا ۔اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا اور وہ بہت بری جائے بازگشت ہے ۔“

---()()()---

یہاں قرآن کریم نے جو اسلوب گفتگو اپنایا ہے اس میں بہت سے اشارات ہیں' فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ (۸، ۱۵) اور وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ (۸ ۱۶) یہ دراصل ہزیمت اور شکست کی حسی تعبیر ہے اور نہایت ہی حقارت آمیز نقشہ دیا گیا ہے بھاگنے والوں کا۔اور یہ تصور دیا گیا ہے کہ دشمن کو منہ دکھانا چاہئے مقصد نہیں ۔ پھر فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ (۸: ۱۶) گویا شکست کھانے والا دراصل پیٹھ پھیرتا ہے اور اس کے ساتھ غضب الہی ہوتا ہے اور یہ غضب الہی اسے جہنم تک لے جاتا ہے جو برا ٹھکانا ہے ۔وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۸ ۱۶) یوں انداز کلام میں بھی جنگ کے دن پیٹھ پھیرنے کی منظر کشی اس طرح کی گئی ہے جس سے اس فعل کی قباحت اور کراہت بالکل واضح معلوم ہوتی ہے اور کوئی غیرت مند شخص اسے پسند نہیں کرتا۔

جنگ کے دن پیٹھ پھیرنے کی ممانعت کے بعد اب سیاق کلام میں یہ حقیقت بتائی جاتی ہے کہ اس معرکے کے پیچھے دراصل دست قدرت کام کر رہا ہے ۔یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے دشمنوں کو قتل کیا۔وہی ہے جو تمہارے تیر کو درست نشانے پر پہنچاتا ہے ۔اور تمہیں جو اجر دیا جاتا ہے وہ تو محض اس لئے ہے کہ اہل ایمان اس آزمائش میں کامیاب رہے اور انہوں نے جدوجہد کی اور اللہ نے ان کو اس ثواب کا مستحق بنایا اور اجر عطا کیا۔

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ وَلِيُبْلِيَ

الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۸: ۱۷) ”پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور اے نبی ؐ تو نے پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا (اور مومنوں کے ہاتھ جو اس کام میں استعمال کئے گئے ) تو یہ اس لئے تھا کہ اللہ مومنوں کو ایک بہترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزار دے ' یقیناً اللہ سننے اور جاننے والا ہے ۔“

روایات میں آتا ہے کہ اس مارنے سے وہ مارنا مراد ہے کہ حضور ؐ نے کنکریاں اور ریت ہاتھ میں لیں اور انہیں کفار کے لشکر کی طرف پھینکا اور حضور ؐ نے اس وقت یہ الفاظ کہے شاھت الوجوہ - شاھت الوجوہ ”ان کے چہرے بدشکل ہو جائیں ' قبیح ہو جائیں ۔“ اور یہ آیت اور کنکریاں ان چہروں پر جا کر لگیں جن کا اس جنگ میں قتل ہونا مقدر تھا۔

لیکن اس آیت کا مفہوم عام ہے۔مقصد یہ ہے کہ بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور لشکر اسلام جو کچھ کر رہا تھا' اس کے پیچھے دست قدرت کام کر رہا تھا۔اور یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد آیت میں یہ فقرہ ہے : وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا (۸: ۱۷) ”تاکہ مومنین کو اس آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزار دے۔“ یعنی تاکہ وہ مومنین کو آزمائش کا یہ موقعہ دے اور اس پر وہ اجر کے مستحق ہو جائیں جبکہ فتح تو اس نے لکھ دی تھی۔گویا یہ کامیابی ہر حال میں مزید اجر کا باعث تھی' پہلے بھی اور بعد میں بھی۔اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۸: ۱۷) ”یقیناً اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔“ وہ تمہاری دعاؤں کو سن رہا تھا' اور تمہارے حالات سے اچھی طرح باخبر تھا۔یہ سب معاملہ تو یہ تھا کہ تمہیں اس نے اپنی قدرت کے لئے ایک راہ بنایا۔لیکن یہ اس وقت بنایا جب تم نے خلوص کا اظہار کر دیا۔اسی لئے اس نے تمہیں نصرت بھی دی اور تم اجر کے مستحق بھی ٹھہرے۔ہمیشہ اللہ ایسا ہی کرتا ہے جیسا کہ اس نے بدر میں کیا۔ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ (۸: ۸) ”یہ معاملہ تو تمہارے ساتھ ہے اور کافروں کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ اللہ ان کی چالوں کو کمزور کرنے والا ہے۔“

یہ اللہ کی جانب سے دوسری امداد ہے' اللہ کی تدبیر اس بات پر ختم نہیں ہو جاتی کہ وہ تمہارے دشمنوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرتا ہے۔اور تمہارے تیروں کو ٹھیک نشانے پر بٹھاتا ہے' اور تمہارے لئے آزمائش کا اچھا میدان فراہم کرتا ہے تاکہ وہ تمہیں اجر دے۔وہ یہ کام بھی کرتا ہے کہ کفار جو جو سازشیں کرتے ہیں ان کے بند بھی ڈھیلے کرتا جاتا ہے اور ان کی تدابیر کو کمزور کرتا ہے۔لہٰذا تمہیں ڈرنا نہیں چاہئے اور اس معرکے میں اہل ایمان کی شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ مسلمانوں کی جانب سے پیٹھ پھیرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

چنانچہ ان فقرات سے تمام سوالات کا جواب خود بخود سامنے آجاتا ہے۔اگر اللہ خود کفار کو قتل کرتا ہے اور اگر اللہ خود تیر یا پتھروں کو مارنے والا ہے اور خود وہ یہ میدان آزمائش سجانے والا ہے تاکہ مسلمانوں کو انعام دے' اور اگر وہ خود دشمنوں کی تدابیر کو کمزور کرنے والا ہے' تو پھر انفال اور اموال غنیمت کے بارے میں نزاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' کیونکہ معاملات کا اختیار بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور آغاز و انجام بھی اسی کی تدابیر کے مطابق ہے۔رہے انسان اور مسلمان تو وہ صرف تقدیر الٰہی کے نشانات و علامات ہیں۔

---○○○---

جب بات یہاں تک پہنچی کہ ”اللہ کافروں کی چالوں کو کمزور کرنے والا ہے۔“ یہاں سے روئے سخن کفار کی طرف موڑ دیا جاتا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اس معرکے سے پہلے ہی فیصلہ چاہتے تھے اور اللہ کے سامنے دست بدعا تھے کہ اے اللہ دو مقابل فریقین میں سے جو گمراہ ہے' یہ جنگ اس کے خلاف کر دے۔جو ایسی باتیں کرتا ہے جو معروف نہیں ہیں' اسے تباہ کر دے اور جو صلہ رحمی کے خلاف ہے' اسے ہلاک کر دے۔یہ دعا ابوجہل نے کی تھی۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جنگ کا فیصلہ ان کے خلاف کر دیا اور اب ان کو خطاب کر کے ان پر طنز کیا جاتا ہے کہ تم ہی تو تھے جو بددعاء کرتے تھے۔مقصد یہ ہے کہ بدر میں جو کچھ ہوا' وہ اللہ کی سنت جاریہ کے مطابق ہوا اور یہ کہ کفار کی کثرت اور اجتماع نے انہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔کیونکہ اللہ کی سنت جاریہ کو وہ بدل نہ سکتے تھے اور اللہ مومنین کے ساتھ تھا۔

---

إِنۡ تَسۡتَفۡتِحُوۡا فَقَدۡ جَآءَكُمُ الۡفَتۡحُ ۚ وَإِنۡ
تَنۡتَهُوۡا فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ ۚ وَإِنۡ تَعُوۡدُوۡا نَعُدۡ ۚ وَلَنۡ تُغۡنِىَ عَنۡكُمۡ فِئَتُكُمۡ ۲
شَيۡـًٔا وَّلَوۡ كَثُرَتۡ ۙ وَأَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۹﴾ ۹ ع
۱۶

(ان کافروں سے کہہ دو) ”اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو لو' فیصلہ تمہارے سامنے آگیا۔ اب باز آ جاؤ' تمہارے ہی لئے بہتر ہے' ورنہ پھر پلٹ کر اسی حماقت کا اعادہ کرو گے تو ہم بھی اسی سزا کا اعادہ کریں گے اور تمہاری جمعیت' خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو' تمہارے کچھ کام نہ آسکے گی۔ اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔“

تم یہ دعائے فیصلہ کرتے تھے کہ مسلمانوں اور مشرکوں میں سے جو بھی حق پر ہو' اللہ یہ جنگ اس کے حق میں کر دے یا یہ کہ فریقین میں سے جو گمراہ اور صلہ رحمی کے خلاف موقف اختیار کر رہا ہو اس کے خلاف کر دے۔ اللہ نے یہ دعا قبول کر لی۔ جنگ تمہارے خلاف کر دی۔ اس سے تمہاری بات کی تصدیق ہوگئی اور جنگ گمراہ تر فریق کے خلاف فیصل ہو گئی۔ اگر تم فی الواقعہ گمراہ فریق کو معلوم کرنا چاہتے تھے' بھائی چارے کے خلاف فریق کو معلوم کرنا چاہتے تھے' تو تمہیں معلوم ہو گیا کہ یہ کون سا فریق ہے۔ لہٰذا تمہارا فرض تو یہ ہے کہ تم نتائج جنگ دیکھ کر اسلام کی طرف آجاؤ اور شرک و کفر کو ترک کر دو اور مسلمانوں اور رسول اللہ کے خلاف معاندانہ رویہ چھوڑ دو۔

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (۸:۱۹) ع

(ان کافروں سے کہہ دو) ”اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو لو' فیصلہ تمہارے سامنے آگیا۔ اب باز آجاؤ' تمہارے ہی لئے بہتر ہے۔“

اور اس کے بعد ایک ذرا دھمکی وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ (۸:۱۹) ع ”ورنہ پھر پلٹ کر اسی حماقت کا اعادہ کرو گے تو ہم بھی اسی سزا کا اعادہ کریں گے۔“

اور انجام سب کو معلوم ہے۔ حق و باطل کے معرکے میں کثرت افواج فیصلہ کن نہیں ہوا کرتی اور نہ نتائج اس طرح بدل سکتے ہیں۔ وَلَنْ تُغْنِیَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ (۸:۱۹) ع ”اور تمہاری جمعیت' خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو' تمہارے کچھ کام نہ آسکے گی۔“

اگر اللہ مسلمانوں کی طرف ہو تو کفار کی جمعیت کچھ بھی نہیں کر سکتی اور یہاں صورت یہ ہے: وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۸:۱۹) ع ”اور اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔“

اس لئے کہ اس رنگ میں جو معرکہ ہو گا' اس میں دونوں اطراف کی قوتوں کے درمیان کوئی توازن نہیں ہے۔ مومنین کے ساتھ اللہ ہے اور اللہ ان کے ساتھ صف میں ہو گا اور کفار کے ساتھ صرف ان ہی جیسے آدمی ہیں۔ یہ

دوسری صف میں ہوں گے اور ایسے فریقین کے درمیان معرکے کا نتیجہ پہلے سے معلوم ہے۔

مشرکین عرب بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے تھے۔ اللہ کے بارے میں ان کا تصور اور معرفت اس قدر سطحی نہ تھی اور نہ پیچیدہ تھی جس طرح بعد کے ادوار میں کفار نے اللہ کے بارے میں سطحی نظریات اختیار کئے۔ کیونکہ عربوں کا شرک اس نوعیت کا نہ تھا کہ وہ ذات باری کے صاف منکر ہوں۔ نہ یہ کہ وہ حقیقت سے بالکل بے بہرہ ہوں۔ ان کا شرک صرف یہ تھا کہ وہ عبودیت اور بندگی صرف اللہ کے لئے مخصوص نہ کرتے تھے اس طرح کہ وہ ہدایت اور قوانین صرف اللہ سے اخذ کرتے ہوں۔ اس قدر شرک بھی دراصل ان کی معرفت الوہیت کے ساتھ لگا نہ کھاتا تھا۔

اس سے قبل ہم اس معرکے کے واقعات میں یہ بات نقل کر آئے ہیں کہ خفاف ابن ایما ابن رحضۃ الغفاری یا ان کے والد ایما ابن رحضۃ الغفاری نے لشکر قریش کو اپنے بیٹے کے ہاتھ کچھ مویشی دے کر بھیجا اور یہ مویشی بطور ہدیہ ان کو دیئے۔ اور یہ پیشکش بھی کی کہ اگر تم چاہو تو میں تمہیں اسلحہ اور جوان بھی دے دوں۔ قریش نے اس کے بیٹے کے ذریعے یہ جواب دیا کہ "تم نے صلہ رحمی کا حق ادا کر دیا اور تم پر جو فرض تھا وہ تم نے ادا کر دیا۔ خدا کی قسم اگر ہماری جنگ انسانوں سے ہو تو ہم اس قدر کمزور نہیں ہیں اور اگر ہماری جنگ خدا کے ساتھ ہو------ جیسا کہ محمد خیال کرتے ہیں------ تو اللہ کے مقابلے میں کوئی انسان نہیں لڑ سکتا۔"

اسی طرح کی ایک بات اخنس ابن شریق کی کتب سیرت میں موجود ہے۔ انہوں نے بنی زہرہ سے کہا اور یہ دونوں اس وقت مشرک تھے۔ "اے بنی زہرہ' اللہ نے تمہارے اموال کو بچا لیا اور تمہارے ساتھی مخرمہ ابن نوفل بسلامت آگئے۔ اور خود ابوجہل (جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مسلمہ کا فرعون قرار دیا) کی ایک دعا کتب سیرت میں منقول ہے: "اے اللہ ہم میں سے جو بھائی چارے کے خلاف ہے' اور ایسی باتیں کرتا ہے جو معروف نہیں ہیں تو کل اس کے دشمن بن جائیں۔"

اسی طرح حکیم ابن حزام کا قول' جب ان کے پاس عتبہ ابن ربیعہ کا پیغام آیا کہ اس جنگ سے لوٹ آؤ۔ اس نے کہا:

"خدا کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم واپس نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ اللہ ہمارے اور محمد ؐ کے درمیان فیصلہ نہ کر دے۔"

ذات باری کے متعلق ان کا یہ تصور بہرحال تھا اور ہر موقعہ پر وہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے تھے۔ یہ بات نہ تھی کہ وہ ملحد تھے اور خدا کو مانتے اور جانتے نہ تھے۔ یا یہ نہ سمجھتے تھے کہ اللہ کے ساتھ کوئی جنگ نہیں کر سکتا۔ یا وہ یہ نہ سمجھتے تھے کہ فریقین میں فیصلہ کرنے والا اللہ ہے اور اس کے حکم کو کوئی رد کرنے والا نہیں ہے۔ ان کے شرک کی ابتداء یہاں سے ہوئی تھی کہ وہ نظام زندگی کے بارے میں ہدایات صرف اللہ سے نہ لیتے تھے' غیر اللہ سے بھی لیتے تھے حالانکہ وہ ذات باری کا بھی جیسا کہ ہم نے بیان کیا' اعتراف کرتے تھے۔ اور یہ وہ بات ہے جس میں آج کے مسلمان اور اس وقت کے مشرک برابر ہیں۔ حالانکہ آج کے مسلمان یہ گمان رکھتے ہیں کہ وہ دین محمد پر ہیں جبکہ اس وقت کے مشرکین مکہ میں یہ عقیدہ رکھتے تھے اور اس بات کے مدعی تھے کہ وہ اپنے باپ ابراہیم کے دین پر ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ابوجہل' ابوجہل ہونے کے باوجود اللہ سے فیصلہ طلب کر رہا تھا۔ "اے اللہ' ہم میں سے جو زیادہ بھائی چارے کے خلاف ہو' اور جس کی بات زیادہ عرف کے خلاف ہو' کل اس کے دشمن بن جائیں۔" یہ تھے اس کے الفاظ۔

رہے وہ بت جن کے بارے میں یہ بات متعارف ہے کہ وہ ان کی پرستش کرتے تھے' ان کے بارے میں ان کا اعتقاد یہ تھا کہ وہ بھی اسی طرح اللہ میں جس طرح اللہ الٰہ ہے' خدا کے بارے میں ان کے اعتقادی تصورات کے بارے

میں قرآن کریم نے یہ تصریح کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ وہ ان بتوں کی پوجا کیوں کرتے تھے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى

''وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے سوا اوروں کو ولی بنایا (کہتے ہیں) ہم ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔'' یہ تھا ان کا تصور الٰہ یعنی یہ الٰہ ان کے سفارشی ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو ان کا حقیقی شرک یہی تھا کہ وہ اپنے معبودوں کو اللہ کے دربار میں سفارشی تصور کرتے تھے اور نہ ان کا اسلام صرف یہ تھا کہ وہ ان سفارشیوں کا انکار کر دیتے تھے' ورنہ وہ لوگ جو حنفاء کہلاتے تھے اور جو بتوں کو نہ پوجتے تھے وہ مسلمان تصور ہوتے لیکن ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ اعتقاد اور عمل میں اللہ وحدہ کو حاکم تصور کیا جائے' اور جو لوگ اللہ کو وحدہ حاکم اور مطاع تصور نہیں کرتے وہ چاہے جس زمان و مکان میں ہوں' وہ شرک میں ہیں۔ ان کو اس شرک سے ان کا یہ عقیدہ نہیں نکال سکتا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے یعنی محض اعتقادی تصور اور صرف یہ بات بھی ان کو شرک سے نہیں نکال سکتی کہ وہ بندگی کے مراسم صرف اللہ کے سامنے بجا لائیں کیونکہ اس حد تک آج کے مسلمانوں کو صرف حنفاء کہا جا سکتا ہے۔ مسلمان' مسلمان تب تصور ہوں گے جب اسلام کے تمام حلقوں اور کڑیوں کو ملا سکیں۔ یعنی وہ اللہ کو ایک سمجھنے' اس کی عبادت بجا لانے اور اسے الٰہ سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس کی حاکمیت کا اقرار بھی کریں۔ اس کے احکام' اس کے قوانین' اس کی مقرر کردہ اقدار کو تسلیم کریں۔ صرف یہی اسلام حقیقی اسلام ہے۔ اور یہی اسلام کلمہ شہادت میں بیان ہوا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا یہی مفہوم ہے۔ اور یہی مفہوم اسلامی عقائد اور اسلامی معاشرے میں معروف اور معتبر ہے۔ اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لوگ جو اس مفہوم کے اعتبار سے کلمہ طیبہ کا اقرار کریں وہ ایک اجتماعی شکل میں منظم اور متحرک ہوں اور ان کی اپنی مسلم قیادت ہو اور وہ تمام جاہلی آلودگیوں سے اس طرح نکل کر باہر آ جائیں جس طرح مکھن سے بال نکل آتا ہے۔

جو لوگ حقیقتاً مسلمان بننا چاہتے ہیں' ان کو چاہئے کہ وہ اس حقیقت کو ذہن نشین کر لیں۔ اس لئے ان کو اس بات سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے کہ وہ محض عقیدے یا محض مراسم عبودیت کی وجہ سے مسلمان ہو گئے ہیں' صرف ان باتوں سے لوگ حقیقی مسلمان نہیں بن جاتے' جب تک وہ اللہ وحدہ کو اپنا حاکم تصور نہ کریں۔ اور تمام دوسرے لوگوں کی حاکمیت کا اقرار نہ کر دیں۔ اور جب تک وہ اپنی تمام ہمدردیاں اور دوستیاں جاہلی معاشروں سے واپس نہیں لے لیتے۔

یہ غلط فہمی بہت سے مخلص اور نیک مسلمانوں کو لاحق ہے۔ دراصل ایسے مخلص لوگ فی الحقیقت اسلام چاہتے ہیں لیکن وہ دھوکے میں مبتلا ہیں' لہٰذا ایسے مخلص مسلمانوں کا فرض ہے کہ پہلے وہ اسلام کی ماہیت کے بارے میں ذہنوں سے غلط فہمی دور کر دیں اور یہ معلوم کر لیں کہ جن لوگوں کو وہ مشرکین عرب کہتے ہیں وہ عقائد اور اعمال میں وہ ان سے مختلف نہ تھے۔ وہ اللہ کی ذات کو مانتے تھے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا' اپنے بتوں کو وہ اللہ کے ہاں سفارش تصور کرتے تھے۔ ان کا اصلی شرک' شرک فی الحاکمیت تھا' اعتقادی نہ تھا۔

جب عام مخلص مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اسلام کی اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھیں تو پھر وہ لوگ جو اقامت دین کا کام کرتے ہیں اور عالم واقعہ میں اسلامی نظام زندگی اور اللہ کی حاکمیت کا احیاء چاہتے ہیں ان پر تو فرض ہے

کہ اس حقیقت کو نہایت ہی واضح طور پر اور اس کی گہرائی تک سمجھیں - اور اس بارے میں وہ کوئی مجمل بات نہ کریں اور نہ شف شف کریں - لوگوں کو دو ٹوک انداز میں اور واضح طور پر بتا دیں کہ حقیقی اسلام یہ ہے - یہ ان کے کام کا نقطہ آغاز ہے - اگر کوئی تحریک اس سے ادنیٰ انحراف بھی کرے گی تو وہ گمراہ ہو جائے گی اور وہ غلط اساسوں پر تعمیر شروع کر دے گی - اگرچہ اس کے رکن مخلص ہوں اور تحریک خود عظیم جدوجہد کرنے والی ہو -

اب روئے سخن اہل ایمان کی طرف پھر جاتا ہے اور مسلسل یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ (۸ : ۲۰) سے انہیں مخاطب کیا جاتا ہے - اور یہ خطاب ان مضامین کے بعد آتا ہے کہ اللہ ان کے ساتھ ہے' اور اس خطاب میں ان کو یہ وصیت کی جاتی ہے کہ وہ اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کریں - ان کو اللہ اور رسول ؐ سے سرکشی کرنے سے خبردار کیا جاتا ہے اور انہیں ایسا نہیں ہونا چاہئے جو اللہ کی آیات کو سنتے ہیں اور ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں گویا انہوں نے سنا ہی نہیں ہے - یہ لوگ گونگے اور بہرے ہیں اگرچہ وہ آنکھیں اور کان رکھتے ہیں اور زبان رکھتے ہیں - یہ لوگ بد ترین جانور ہیں - اس لئے کہ یہ جانوروں کی طرح سنتے تو ہیں لیکن راہ ہدایت نہیں پاتے -

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰہُ فِیْھِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَھُمْ ؕ وَلَوْ اَسْمَعَھُمْ لَتَوَلَّوْا وَّھُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور حکم سننے کے بعد اس سے سرتابی نہ کرو - ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کہا کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ نہیں سنتے تھے - یقیناً خدا کے نزدیک بد ترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے - اگر اللہ کو معلوم ہوتا کہ ان میں کچھ بھی بھلائی ہے تو وہ ضرور انہیں سننے کی توفیق دیتا (لیکن بھلائی کے بغیر) اگر وہ ان کو سنواتا تو وہ بے رخی کے ساتھ منہ پھیر جاتے -"

یہ پکار ان لوگوں کو ہے جو ایمان لائے ہیں - انہیں کہا گیا ہے کہ وہ اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کریں - اللہ کی آیات و کلمات سنتے ہوئے روگردانی نہ کریں - یہ پکار ان اشارات کے بعد آئی ہے جو بطور مقدمہ و تمہید اس سے پہلے آنا ضروری تھے - اس سے قبل اس معرکے کے بڑے بڑے واقعات بیان کر دیئے گئے تھے - ذات باری کو دیکھنا' اس کی تدبیر کا تصور' اس کی معاونت اور امداد کی یقین دہانی' اور یہ تصریح کہ اللہ مومنین کے ساتھ ہے اور یہ کہ وہ کافروں کی تمام تدابیر کو ڈھیلا کرنے والا ہے لہذا اس کے بعد سمع و اطاعت کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں رہتا - ان حقائق کے ہوتے ہوئے بھی اللہ اور رسول اللہ سے روگردانی کرنا نہایت ہی قبیح اور منکر فعل نظر آتا ہے - کوئی عقلمند انسان ایسی حرکت نہیں کر سکتا - یہی وجہ ہے کہ یہاں چوپایوں کا بھی ذکر کیا جاتا ہے' کیونکہ لفظ (دواب) میں طبیعت کے لحاظ سے انسان بھی شامل ہیں - لیکن دواب کا لفظ انسانوں کے مقابلے میں مویشیوں پر زیادہ بولا جاتا ہے - اس لئے اس لفظ کا بعض انسانوں پر

اطلاق کرنے سے حیوانات کا تصور خود بخود سامنے آجاتا ہے اور جو لوگ گونگے اور بہرے ہیں اور علم نہیں رکھتے ان کے بارے میں حیوانیت کا تصور دیا جاتا ہے۔گویا جہلاء درحقیقت جانور ہیں بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔جانوروں کے کان تو ہیں لیکن وہ چند مبہم کلمات ہی سن سکتے ہیں۔ان کی زبان بھی ہے لیکن وہ معانی پر مشتمل کلمات نہیں بول سکتے۔ہاں بہائم کو فطری صلاحیت دے دی گئی اور وہ اس فطری صلاحیت کے مطابق اپنا کاروبار زندگی چلاتے ہیں جبکہ انسان مویشی اپنی ضروریات زندگی بھی خود اپنی عقل سے تجویز کرتے ہیں۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (۲۰) وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ ھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ (۲۱) اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (۲۲) (۸: ۲۰ تا ۲۲) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرو اور حکم سننے کے بعد اس سے سرتابی نہ کرو۔ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کہا کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ نہیں سنتے۔یقیناً خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔'' اور یہ لوگ کیوں شر الدواب ہیں؟

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰہُ فِیْھِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَھُمْ (۸: ۲۳) ''اگر اللہ کو معلوم ہوتا کہ ان میں کچھ بھی بھلائی ہے تو وہ ضرور انہیں سننے کی توفیق دیتا'' اس لئے کہ اللہ کو معلوم ہے کہ ان میں کوئی بھلائی نہیں ہے اور اگر ان میں بھلائی ہوتی تو اللہ ان کو سماعت اور قبولیت کی توفیق دے دیتا لیکن انہوں نے اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے اپنی فطری استعداد کو ختم کر دیا ہے۔چونکہ انہوں نے اپنے دل و دماغ کے دروازے بند کر دیئے تھے' اس لئے اللہ نے بھی ان کو سماعت کی توفیق سے محروم کر دیا۔اگر اللہ ان کو سمجھا بھی دیتا تو بھی ان کا رویہ ایسا ہو گیا تھا کہ وہ مان کر نہ دیتے۔

وَلَوْ اَسْمَعَھُمْ لَتَوَلَّوْا وَّ ھُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۸: ۲۳) (لیکن بھلائی کے بغیر) اگر وہ ان کو سنوارتا تو وہ بے رخی کے ساتھ منہ پھیر جاتے۔'' کیونکہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ عقل ایک بات کو پالیتی ہے لیکن دل اس قدر مسخ ہو چکے ہوتے ہیں کہ وہ مان کر نہیں دیتے۔اگر محض فہم و ادراک کی حد تک اللہ ان کو سنا بھی دے تو بھی یہ قبولیت سے محروم ہی رہتے ہیں۔دنیا میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جن کی عقل حق پر مطمئن ہوتی ہے لیکن ان کے دل قبول نہیں کرتے۔''

---ooo---

اب دوبارہ اہل ایمان کو مخاطب کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہیں۔کیونکہ رسول کی پکار پر لبیک کہنا تمہارے لئے مفید ہے اور اگر تم نے انکار کیا تو یہ تمہارے لئے برا ہو گا۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ

وَاَنَّهٗۤ اِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۲۴﴾ وَاتَّقُوۡا فِتۡنَةً لَّا تُصِيۡبَنَّ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡكُمۡ خَآصَّةً‌ ۚ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۲۵﴾ وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ اَنۡتُمۡ قَلِيۡلٌ مُّسۡتَضۡعَفُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ تَخَافُوۡنَ اَنۡ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰٮكُمۡ وَاَيَّدَكُمۡ بِنَصۡرِهٖ وَرَزَقَكُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۲۶﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول ؐ کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے' اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔ اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔ اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ یاد کرو وہ وقت جب کہ تم تھوڑے تھے' زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا' تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں مٹا نہ دیں۔ پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی' اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کیے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا' شاید کہ تم شکر گزار ہو۔"

ذرا رسول اللہ کی دعوت پر غور کرو۔ وہ تو تمہیں ان نظریات کی طرف بلاتی ہے' جن میں تمہاری زندگی کا سامان ہے۔ اور اس میں تمہاری روحانی اور طبعی اور اجتماعی ہر قسم کی زندگی کا سامان ہے۔

اس دعوت میں ان عقائد و تصورات کو پیش کیا گیا ہے جن سے دل و دماغ زندگی سے بھر جاتے ہیں اور تمام خرافات اور جہالتوں سے پاک و صاف ہو جاتے ہیں۔ اوہام اور افسانوں سے نجات پاتے ہیں اور ظاہری اسباب اور طبیعی قوانین کی جکڑ بندیوں سے بھی نجات پاتے ہیں اور غیر اللہ کی بندگی اور اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے انسان کو نجات دلاتے ہیں۔

یہ دعوت تمہارے سامنے ایک ایسا قانونی نظام پیش کرتی ہے جو اللہ کی طرف سے ہے۔ اس قانونی نظام میں انسانیت کی آزادی اور انسانیت کے احترام کے وہ اصول پیش کیے گئے ہیں جو من جانب اللہ ہیں۔ اس کے اجتماعی نظام میں تمام انسان صف واحد میں کھڑے ہیں۔ بالکل مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس نظام میں کسی فرد کی حکومت نہیں ہے' کسی طبقے کی حکومت کا تصور نہیں ہے۔ کسی نسل کی حکومت کا تصور نہیں ہے۔ کسی قوم کی حکومت کا تصور نہیں ہے' بلکہ اس نظام میں تمام لوگ آزاد اور باہم مساوی ہیں اور سب کے سب صرف قانون رب العالمین کے پابند ہیں۔

یہ دعوت انہیں ایک ایسے نظام حیات کی طرف بلاتی ہے' ایک ایسے نظام فکر کی طرف بلاتی ہے اور ایک ایسے نظام تصورات کی طرف بلاتی ہے کہ وہ انہیں ماسوائے ضوابط فطرت کے ہر قسم کی جکڑ بندیوں سے رہا کرتی ہے۔ یہ ضوابط فطرت وہی قوانین و ضوابط ہیں جسے خالق فطرت نے منظم کیا ہے۔ یہ خالق اپنی مخلوقات کو اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ قواعد و ضوابط انسان کی تخلیقی قوتوں کو باہم ٹکر اور مقابلے سے بچاتے ہیں اور یہ تخلیقی قوتوں کو ضائع بھی نہیں کرنے اور ان کا قلع قمع بھی نہیں کرتے اور نہ ان پر کوئی منفی پابندیاں لگاتے ہیں۔

یہ دعوت تمہیں قوت' عزت اور سربلندی کی دعوت دیتی ہے اور انہیں یہ سکھاتی ہے کہ وہ اپنے عقائد' اپنے نظام کو مضبوط کریں۔ اپنے رب اور اپنے دین پر پورا پورا بھروسہ کریں۔ اس دعوت کو لے کر انہیں اور دنیا کے تمام انسانوں کو

یہ آزادی عطا کر دیں۔ تمام لوگوں کو خود ان جیسے انسانوں کی غلامی سے آزادی عطا کر دیں۔ کیونکہ تمام دنیا میں انسانوں کو باغیوں اور سرکشوں نے غلام بنا رکھا ہے۔

یہ دعوت انہیں جہاد فی سبیل اللہ کی طرف بلاتی ہے تاکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا نظام قائم کیا جا سکے۔ لوگوں کی زندگیاں اس نظام کے مطابق استوار کی جا سکیں۔ اور دنیا سے اقتدار اعلیٰ کے ان نام نہاد مدعیوں کے اقتدار کو ختم کیا جا سکے۔ جن لوگوں نے اللہ کے حق حاکمیت اور منصب مقتدر اعلیٰ کو اپنے لئے خاص کر رکھا ہے یہاں تک کہ وہ اس کرہ ارض پر اللہ کے امر اور اقتدار کو تسلیم کر لیں اور یہ جہاد اس وقت تک جاری رہے جب تک دین صرف اللہ کا رائج نہ ہو جائے۔ اگر اس جہاد کے عمل میں ان کی جان بھی چلی جائے تو انہیں شہید کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔

یہ ہے اجمالی تعارف اس دعوت کا جو حضور اکرمؐ دے رہے ہیں اس لئے یہ دعوت ہر مفہوم اور ہر پہلو کے اعتبار سے زندگی عطا کرنے کی دعوت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہ کوئی خفیہ عقیدہ نہیں ہے۔ یہ ایک عملی نظام ہے اور اس نظام کے سائے میں دراصل انسانیت زندگی اور ترقی حاصل کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں یہ کہا گیا کہ رسول کی دعوت دراصل تمہیں زندہ کرنے کی دعوت ہے۔ اور یہ ہر مید ان میں اور ہر پہلو سے کسی بھی سوسائٹی کو زندہ جاوید کرنے والی ہے۔ قرآن کریم اس عظیم حقیقت کو چند الفاظ میں سمو دیتا ہے۔ ذرا دوبارہ غور کیجئے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (۸: ۲۴)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ اور اس کے رسولؐ کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے۔"

اس کی دعوت پر اس طرح لبیک کہو کہ اس کو بطیب خاطر قبول کرو اور مطیع فرمان بندے بنو۔ اللہ تعالیٰ اگرچہ تمہیں مجبور کر کے راہ ہدایت پر ڈال سکتا تھا مگر اس نے اس طرح نہیں کیا۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ (۸: ۲۴) "اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے۔" وہ قادر مطلق ہے اور اس کی قدرت نہایت ہی خوفناک قدرت ہے۔ خود انسان اور اس کے دل و دماغ کے درمیان بھی وہ حائل ہو جاتا ہے اور فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ اس پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس کی راہ روک دیتا ہے اور جس طرف چاہتا ہے اسے پھیر دیتا ہے۔ جس طرح چاہتا ہے اس کے رخ کو پھیر دیتا ہے۔ جس شخص کے پہلو میں دل ہوتا ہے اسے اس پر کوئی دسترس حاصل نہیں ہوتی۔

فی الواقعہ یہ ایک خوفناک قدرت ہے اور قرآن کریم اس کا نقشہ کیسے الفاظ میں کھینچتا ہے۔ انسانی طرز تعبیر فی الواقعہ اس قسم کی حسی، لفظی اور معنوی اور موثر تعبیر سے بالکل عاجز ہے۔

یہ خوفناک تصویر ایک مسلمان کی دائمی بیداری کی ضامن ہے۔ مومن ہر وقت چوکنا رہتا ہے۔ محتاط رہتا ہے اور اپنے دل کی دھڑکن، اس کے میلانات اور اس کے رجحانات کو قابو میں رکھتا ہے۔ وہ ہر قسم کے وسوسے اور ہر برے رجحان کو قابو میں رکھتا ہے تاکہ اس سے لغزش نہ ہو جائے۔ وہ ہر وقت اپنی راہ پر نظر رکھتا ہے کہ اس راہ میں کس کس جگہ ٹھوکر لگنے کا

خطرہ ہے۔ کہاں کہاں وسوسے اور پرکشش مقامات ہیں اس لئے کہ ایک مومن اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط رکھتا ہے کہ کسی بھی غفلت کے وقت کسی معمولی سی لغزش کے ذریعے کسی بھی اقدام کی وجہ سے وہ بھٹک نہ جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، رسول خدا ہونے کے باوجود یہ دعا اکثر اوقات پڑھا کرتے تھے

يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ "اے دلوں کے پھیرنے والے، میرے دل کو اپنے دین پر جما دے۔" اگر رسول اللہ کا حال یہ تھا تو پھر ہم لوگوں کا کیا حال ہو گا جو نہ رسول ہیں اور نہ معصوم ہیں۔

یہ وہ منظر ہے جس سے دل اٹھتے ہیں اور جب ایک مومن اپنے آپ کو قرآنی آیات کا مخاطب پاتا ہے تو اس کا پورا جسم لرز اٹھتا ہے۔ کیونکہ اگر اس کے پہلو میں اس کا دل بھی اس کا نہیں ہے، اللہ کے قبضے میں ہے تو پھر اسکی کیا حیثیت ہے؟ آیت پر ذرا دوبارہ غور فرمائیں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (۸: ۲۴)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ اور اس کے رسول ؐ کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے۔"

اس آیت کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ ان کو یہ کہتے ہیں کہ اللہ اس بات پر قدرت رکھتے ہیں کہ وہ تمہیں لبیک کہنے پر مجبور کر دیں۔ تم قہراً اس دعوت کو ماننے پر مجبور کئے جاسکتے ہو، اگر وہ چاہے، لیکن اللہ تمہیں یہ اعزاز دینا چاہتا ہے کہ تم مطیع فرمان ہو کر اور اپنے ارادے اور اختیار سے اس دعوت کو قبول کر لو۔ تاکہ اس پر تمہیں اجر و ثواب ملے اور تمہاری انسانیت کا مقام ایک مجبور کی سطح سے بلند ہو جائے۔ تم انسانیت کے ارفع مقام تک پہنچ جاؤ اور اپنے اختیار سے راہ ہدایت پا لینے والی مخلوق میں داخل ہو جاؤ۔ ایک فہیم اور مدبر مخلوق بن جاؤ، اور اپنے مقصد و ارادے اور علم معرفت سے اس راہ پر چل نکلو۔

کیونکہ وَاَنَّهٗۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۸: ۲۴) "اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔" تمہارے دل اس کے ہاتھ میں ہیں۔ تم نے اٹھ کر حشر کے میدان میں کھڑا ہونا ہے۔ اس کے سوا تمہارے لئے اور کوئی راہ نہیں ہے۔ نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ لیکن اس صورت حالات کے باوجود اللہ تم کو دعوت دیتا ہے کہ تم آزادانہ طور پر اس راہ پر چلو، مقہور اور مجبور بندے کی صورت میں نہیں۔

اس کے بعد اہل ایمان کو اس بات سے ڈرایا جاتا ہے کہ وہ کہیں جہاد فی سبیل اللہ کے عمل کو چھوڑ نہ دیں اور اس دعوت کو چھوڑ نہ دیں جو آب حیات ہے۔ کیونکہ جہاد کا مطلب دنیا سے منکر کو مٹانا ہے، جو سب کے لئے مضرت ہے۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۤصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸: ۲۵) "اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔ اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔"

فتنہ کیا ہے؟ ابتلا اور مصیبت فتنہ ہے ۔ اور وہ سوسائٹی جو اپنے بعض نادانوں کو کسی بھی صورت میں ظلم کرنے دیتی ہے ' اور ظالموں کی راہ نہیں روکتی ان کا مقابلہ نہیں کرتی ' یہ سوسائٹی اس بات کی مستحق ہے کہ وہ پوری کی پوری فساد کی لپیٹ میں آ جائے ۔ یاد رہے کہ اسلامی شریعت اور اسلامی نظام کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے سے اور کوئی بڑا فساد نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے اسلام ایک نظام ہے جس کے تمام اجزاء ایک دوسرے کے لئے کفیل ہیں ۔ یہ ایک مثبت نظام ہے اور یہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کے ماننے والے افراد باہم ظلم کریں اور اس سوسائٹی میں فساد پھیلے چہ جائیکہ اس سوسائٹی میں اللہ کا مکمل دین ہی معطل ہو' بلکہ اللہ کا اقتدار اعلیٰ ' اس کی حاکمیت اور الوہیت کا انکار ہو ۔ اس کی جگہ انسانوں کی بندگی قائم ہو اور یہ سوسائٹی خاموش رہے اور پھر یہ توقع بھی ہو کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو فتنے اور مصیبت سے بچائے گا ۔ اس لئے کہ ذاتی طور پر وہ صالح ہیں ۔

ظلم کا مقابلہ کرتے ہوئے چونکہ جانی اور مالی قربانی دینا پڑتی ہے اس لئے قرآن کریم اپنی مخاطب پہلی جماعت مسلمہ کو یہ یاد دلاتا ہے کہ تم یاد کرو کہ تم ضعیف تھے اور تعداد اور سازو سامان کے اعتبار سے قلیل تھے ۔ تم مصائب سے دوچار تھے اور ہر وقت تم پر خوف و ہراس کی فضا چھائی رہتی تھی ' لیکن دعوت اسلامی کی پناہ میں تم آئے تو تم معزز مالدار اور رزق طیب کے مالک بن گئے ۔ لہذا تم اس دعوت کی طرف سے غافل نہ ہو جاؤ جس میں تمہارے لئے آب حیات ہے ' جو اللہ کا عطیہ ہے اور اللہ ہی اس کا حامی ہے ۔

وَاذْكُرُوْآ اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۸ : ۲۶)

"یاد کرو وہ وقت جب کہ تم تھوڑے تھے ' زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا ' تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں مٹا نہ دیں ۔ پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی ' اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کئے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا ' شاید کہ تم شکر گزار بنو ۔"

اپنی یہ پوزیشن یاد کرو تاکہ تمہیں یہ یقین آ جائے کہ دعوت اسلامی درحقیقت آب حیات ہے ۔ یہ یاد رکھتے جاؤ تاکہ دعوت اسلامی کی راہ میں جدوجہد کرنے اور مشکلات کو انگیز کرنے سے تم رک نہ جاؤ ۔ زرا اپنے ایام ضعف اور خوف کو یاد کرو ۔ اب تو اللہ نے حکم دے دیا ہے کہ تم مشرکین کے ساتھ لڑو اور رسول ؐ نے تمہیں مشورہ دیا کہ قریش کے مسلح لشکر سے لڑو اور تم اس دعوت کو پسند نہیں کرتے لیکن کے کے وہ دن بھی یاد کرو کہ تمہیں ہر طرف سے خطرات لاحق ہوتے تھے اور اب تم انقلابی ' فاتح ' اجر اخروی کے مستحق اور رزق حسن کے پانے والے ہو ۔ کیا اچھے اچھے سامان خوراک تمہیں دے دیئے گئے ہیں ۔ تم اس پر اللہ کا شکر یہ ادا نہیں کرتے ۔

حالت خوف اور ضعف کی تعبیر قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے ۔ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ (۸ : ۲۶) "تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں مٹا نہ دیں ۔" یہ ایک ایسا منظر ہے جس میں کوئی شخص کسی بھی وقت نازل ہونے والی مصیبت کا انتظار کر رہا ہو ۔ وہ حالت خوف میں کسی بھی وقوعہ کا انتظار کر رہا ہو ' گویا وہ اپنی آنکھوں سے آنے والی مصیبت کو دیکھ رہا ہو ۔ خوفناک ہلچل میں اس کی آنکھیں بے قرار ہیں ۔ نظر آتا ہے کہ خوفناک ہاتھ آگے بڑھ رہے ہیں اور

مسلمانوں کی ایک قلیل تعداد ہے جو خوفناک حالت میں دبکی بیٹھی ہے۔

اس خوفناک منظر سے تمہیں نکال کر امن، فتح و نصرت اور عیش و عشرت اور ساز و سامان کی زندگی میں لایا گیا، اللہ کے سائے میں اور اللہ کی حمایت میں فَاٰوٰکُمْ وَ اَیَّدَکُمْ بِنَصْرِہٖ وَ رَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ (۸: ۲۶) "پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی، اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کئے، اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا شاید کہ تم شکرگزار بنو"

اور اللہ کی یہ راہنمائی ان کے شامل حال رہی تاکہ وہ شکر بجالائیں اور اجر آئیں لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (۸: ۲۶) "شاید کہ تم شکرگزار بنو۔" کون ہے جو اس عظیم انقلاب پر غور و تامل کرے اور پھر اس مضبوط، پرامن اور مکمل آواز پر لبیک نہ کہے یعنی حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر، اور کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے ان انعامات و اکرامات اس کی جانب سے نصرت و امداد اور اس کے ان مناظر پر غور کرے جو قرآن کریم میں پیش کئے گئے اور ان پر لبیک نہ کہے۔ اس لئے ان مناظر میں نہایت ہی قوی اثرات ہیں اور سامع کے لئے واضح اشارات و ہدایات ہیں۔

پھر جماعت مسلمہ کا یہ پہلا گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا، جو بذات خود ان حالات سے عملاً گزرا تھا اور سختی و ترشی اور فراوانی اور امن کے یہ دونوں مناظر ان کے پردۂ خیال پر تازہ تھے۔ وہ اپنے ماضی اور حال سے اچھی طرح باخبر تھے۔ اور اس طرح قرآن کریم کی یہ پکار ان پر زیادہ اثرات چھوڑتی تھی۔

آج کی ہر اسلامی تحریک جس کے پیش نظر یہ نصب العین ہو کہ اس نے مسلمانوں کی زندگیوں میں اس دین کو عملاً زندہ کرنا ہے اور اس کرۂ ارض پر اس کے مطابق اجتماعی نظام قائم کرنا ہے۔ اگرچہ وہ ان دو مراحل سے عملاً نہ گزر رہی ہو اور اس نے عملاً یہ دو حالات نہ بھی دیکھے ہوں لیکن قرآن کریم اس سے بھی یہی خطاب کر رہا ہے اور آج ہم اللہ کے اس قول کے مصداق ہیں :

اِذْ اَنْتُمْ قَلِیْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ یَّتَخَطَّفَکُمُ النَّاسُ

(۸: ۲۶) "یاد کرو وہ وقت جب کہ تم تھوڑے تھے، زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا، تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں مٹا نہ دیں۔" لہٰذا آج کی تحریک اسلامی کے لئے بہتر ہے کہ وہ اس دعوت حیات جدید پر لبیک کہے جس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دے رہے ہیں اور نہایت ہی یقین اور اعتماد کے ساتھ اس وقت کا انتظار کریں جس میں اللہ کا سچا وعدہ سامنے آئے گا۔ جو اس نے پہلی تحریک اسلامی کے ساتھ کیا تھا اور وہ پورا ہوا تھا۔ یہی وعدہ ہے اس کا ہر اس تحریک کے لئے جو اللہ کے نام برپا ہو اور جو اس راہ کی مشکلات کو برداشت کرے اور اس انجام کا انتظار کرے۔

فَاٰوٰکُمْ وَ اَیَّدَکُمْ بِنَصْرِہٖ وَ رَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (۸: ۲۶) "پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی، اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کئے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا شاید کہ تم شکرگزار بنو۔"

ظاہری حالات نظر فریب ہوتے ہیں لیکن تحریک اسلامی کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ اللہ کے وعدے پر

بھروسہ کرتی ہے اور اللہ کا وعدہ پورا ہونے والا ہوتا ہے۔اور اس تحریک اسلامی کے حق میں ہوتا ہے جس کا نصب العین اسلامی انقلاب برپا کرنا ہوتا ہے۔

---○○○---

اب پھر اہل ایمان کو دوبارہ پکارا جاتا ہے۔انسان کے مالی معاملات اور اس کی اولاد کے مفادات بعض اوقات انسان کو خوف اور بخل کی وجہ سے جدوجہد کرنے سے روک دیتے ہیں۔جس زندگی کی طرف رسول اللہ دعوت دے رہے ہیں وہ ایک باعزت زندگی ہے اور اس زندگی کے حصول کی راہ میں مشکلات لازماً پیش آتی ہیں ار اس کے لئے قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں لہٰذا قرآن کریم ان کمزوریوں کی اصلاح اس طرح کرتا ہے کہ وہ تحریک اسلامی کو فتنہ مال اور فتنہ اولاد کے بارے میں خبردار کرتا ہے۔یہ دونوں چیزیں اس طرح فتنہ ہیں کہ ان سے انسان کا امتحان مقصود ہوتا ہے۔اس امتحان اور آزمائش سے گزرنا مشکل کام ہے۔ان کی وجہ سے دعوت جہاد سے انسان رک جاتا ہے اور امانت' عہد اور بیعت کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے۔لہٰذا تم خبردار رہو کہ جہاد سے پیچھے رہ جانا رسول اللہ سے غداری ہے اور اس امانت سے غداری اور اس میں خیانت ہے جو مسلمانوں کے سپرد کی گئی ہے یعنی مقصد اعلائے کلمۃ اللہ اور قیام حاکمیت الٰہیہ اور لوگوں کو سچائی اور انسان کی دعوت اور ان کو یہ بھی یاد دلایا جاتا ہے کہ اللہ کے ہاں جو اجر عظیم ہے' اس تحریک جہاد پر وہ مال اور اولاد سے زیادہ قیمتی ہے۔

---

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَخُونُوا۟ ٱللَّهَ وَٱلرَّسُولَ وَتَخُونُوٓا۟ أَمَٰنَٰتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٧﴾ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّمَآ أَمْوَٰلُكُمْ وَأَوْلَٰدُكُمْ فِتْنَةٌ وَأَنَّ ٱللَّهَ عِندَهُۥٓ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٢٨﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جانتے بوجھتے اللہ اور اس کے رسول ؐ کے ساتھ خیانت نہ کرو' اپنی امانتوں میں غداری کے مرتکب نہ ہو اور جان رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد حقیقت میں سامان آزمائش ہیں اور اللہ کے پاس اجر دینے کے لئے بہت کچھ ہے۔“

اس کرۂ ارض پر امت مسلمہ کے ذمہ جو فرائض عائد کئے گئے ہیں' ان کو ترک کرنا اور ان سے دست بردار ہو جانا خدا اور رسول کے ساتھ خیانت ہے۔اسلام کی اساس کلمہ طیبہ (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ) ہے۔یعنی اللہ وحدہ لا شریک حاکم ہے۔اور یہ حاکمیت اس شکل میں ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی۔انسانوں نے اپنی پوری تاریخ میں کسی وقت بھی ذات باری سے بالکل انکار نہیں کیا بلکہ انسان یہ غلطی کرتے رہے ہیں کہ وہ اللہ کے ساتھ دوسرے الہوں کو شریک کرتے رہے ہیں۔کبھی تو یہ شراکت محدود پیمانے پر اعتقادات اور عبادات میں ہوتی ہے اور کبھی نہایت ہی وسیع پیمانے پر اللہ کے اقتدار اعلیٰ اور حق حاکمیت میں بھی ہوتی ہے۔اور یہ دوسری صورت عظیم شرک کی صورت ہے لہٰذا اسلام کے سامنے کبھی یہ مسئلہ اہم نہیں رہا ہے کہ لوگ خدا کو تسلیم کریں اور ان کو یہ دعوت دی جائے کہ خدا موجود

ہے 'بلکہ مسئلہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ یہ خدا وحدہ لاشریک ہے اور اسے اس حیثیت کے ساتھ تسلیم کیا جائے اور لا الہ الا اللہ کا مفہوم یہی ہے کہ اس کرۂ ارض پر حق حاکمیت بھی صرف اسے حاصل ہے اور جس طرح تمام لوگ اقرار کرتے ہیں کہ اس کائنات کا حاکم اللہ ہے 'اسی طرح وہ یہ اقرار بھی کریں کہ زمین پر بھی وہ الہ ہے۔ اور آسمان پر بھی هُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ "اللہ وہ ہے جو آسمانوں پر بھی الہ ہے' اور زمین پر بھی الہ ہے۔" یہ ہے اصل قضیہ۔ مزید یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کا پیغام لانے والے ہیں لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

یہ ہے دین اسلام کا اصل مسئلہ یعنی نظریات جن کا دل و دماغ میں جاگزیں ہونا ضروری ہے اور وہ عملی جدوجہد جس کے ذریعے اس کرۂ ارض پر عملی نظام قائم کیا جائے۔ لہٰذا ان مقاصد سے دستکش ہونا خیانت ہے اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو یہاں متنبہ کرتے ہیں کہ تم ہرگز ان مقاصد سے دستکش نہ ہونا۔ یہ خیانت تصور ہو گی۔ لہٰذا جو گروہ اپنے اس نظریہ کا اعلان کر دے اس کا فرض ہے کہ وہ اس کے لئے جدوجہد کرے۔ اس راہ میں جو جہاد اور اس کی مشکلات پیش آئیں انہیں برداشت کرے۔ چاہے مال دینا پڑے' چاہے اولاد کو قربان کرنا پڑے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ اس امانت میں خیانت کرنے سے بھی مسلمانوں کو خبردار کرتا ہے جس کے وہ اس وقت سے حامل ہیں جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا ہے 'کیونکہ اسلام صرف چند کلمات سے عبارت نہیں ہے جن کو جس زبان سے ادا کر دیا جائے' اور نہ چند عبادات اور دعاؤں کا نام ہے بلکہ وہ ایک مکمل نظام زندگی ہے جو پوری انسانی زندگی پر حاوی ہے۔ اس کے قیام کی راہ میں بڑی بڑی مشکلات پیش آتی ہیں۔ اسلام درحقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی پوری عملی زندگی کو کلمہ طیبہ کے اصولوں پر استوار کر دے۔ اور لوگوں کو اللہ کی بندگی کی طرف لوٹا دیا جائے۔ انسانی معاشرے کو اللہ کی حاکمیت اور اس کے قانون اور اخلاقی نظام کی طرف لوٹا دیا جائے۔ ان لوگوں کو رد کر دیا جائے جو اللہ کے حق حاکمیت پر دست درازی کرتے ہیں۔ اپنی الوہیت قائم کرتے ہیں اور اس نظام میں لوگوں کے درمیان مکمل عدل اور انصاف نافذ کیا جائے اور کرۂ ارض پر انسان فریضہ خلافت الٰہیہ ادا کرتے ہوئے یہ سب کچھ کرے۔

یہ ہیں وہ فرائض جو ہر مسلمان پر عائد ہوتے ہیں اور جو ان کو ادا نہیں کرتا وہ گویا خائن ہے۔ وہ اس عہد کی خلاف ورزی کر رہا ہے جو اس نے اللہ کے ساتھ کیا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کو توڑ رہا ہے اور اس میں خیانت کر رہا ہے۔

اور یہ فرائض کچھ قربانیوں کا تقاضا کرتے ہیں' ان کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ انسان مال اور اولاد کے فتنوں اور آزمائشوں میں کامیاب نکلے اور اس کا نصب العین رضائے الٰہی اور اجر اخروی ہو' جو عظیم اجر ہے اور جو ان لوگوں کے لئے محفوظ ہے جو امین ہیں' صابرین ہیں' قربانیاں دینے والے ہیں اور آخرت کو ترجیح دینے والے ہیں۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۸:۲۸)

"اور جان رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد حقیقت میں سامان آزمائش ہیں اور اللہ کے پاس اجر دینے کے لئے بہت کچھ ہے۔"

قرآن کریم انسانی حقیقت سے مخاطب ہے ۔ کیونکہ خالق کائنات انسان کو اچھی طرح جانتا ہے ۔ اسے اس کی ظاہری اور باطنی صلاحیتوں اور کمزوریوں کا علم ہے ۔ وہ اس راہ کے نشیب و فراز سے خوب واقف ہے ۔

وہ اس مخلوق کے کمزور پہلوؤں سے بھی واقف ہے اور وہ جانتا ہے کہ مال کے لالچ اور اولاد کے مفادات اس کی ذات میں رچے بسے ہیں ۔ اس لئے اللہ تعالیٰ انسان کو خبردار کرتا ہے کہ مال و اولاد کی حقیقت کیا ہے ۔ اللہ نے انسان کو یہ دو محبوب عطیات اس کی آزمائش کے لئے دیئے ہیں ۔ یہ دنیا کی زندگی کی زینت ہیں اور آزمائش ہیں ۔ اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ بندہ مال اور اولاد میں کس طرح تصرف کرتا ہے ۔ آیا شکر ادا کر کے حق نعمت پورا کرتا ہے یا غفلت اور نافرمانی کرتا ہے ۔ وَ نَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً "اور ہم تم کو خیر و شر کے ذریعے آزما کر فتنے میں ڈالتے ہیں ۔" فتنہ فقط مشکلات اور محرومیت کی شکل ہی میں نہیں آتا بلکہ یہ خوشحالی اور اللہ کے عطیات کی شکل میں بھی آتا ہے اور مال و اولاد کی شکل میں بھی آزمائشیں آتی ہیں ۔

یہ نہایت ہی اہم تنبیہ ہے وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۸ : ۲۸) "اور جان رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد حقیقت میں سامان آزمائش ہیں اور اللہ کے پاس اجر دینے کے لئے بہت کچھ ہے ۔" جب انسان کو دل سے یہ معلوم ہو جائے کہ کس بات سے اس کا امتحان لیا جا رہا ہے تو یہ بات اس کے لئے معاون ثابت ہوتی ہے تاکہ وہ بیدار رہے اور محتاط رویہ اختیار کرے ۔ یہ نہ ہو کہ امتحان میں اس سے بھول چوک ہو جائے اور وہ امتحان میں پیچھے رہ جائے ۔

لیکن اس امتحان میں بھی اللہ بندے کو بے سہارا نہیں چھوڑتا ۔ اللہ کو معلوم ہے کہ انسان امتحان میں فیل بھی ہو سکتا ہے ۔ باوجود احتیاطات کے ۔ اس لئے کہ اس راہ کی مشکلات بہت زیادہ ہیں ' خصوصاً جب معاملہ مال اور اولاد کا درپیش ہو لہٰذا اللہ انسان کو یہ روشنی دکھاتا ہے ۔ مال و اولاد کے مقابلے میں اللہ کا اخروی اجر عظیم ہی تو ہے ۔

وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۸ : ۲۸) "اور اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے ۔" یہ مال اور دولت دینے والا تو اللہ ہی ہے اور اللہ کے ہاں جو اجر ہے وہ اولاد اور دنیاوی مال سے زیادہ قیمتی ہے ۔ لہٰذا کوئی شخص بھی اس امانت کبریٰ کے حق ادا کرنے سے پیچھے نہ رہے اور یہ اللہ کی طرف سے ایک قسم کا تعاون ہے ۔ اس ضعیف انسان کے ساتھ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا "اور انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے ۔"

غرض اسلامی نظام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے ' اس میں اعتقادات و تصورات بھی ہیں ' اس میں ہدایت و تربیت کے سامان بھی ہیں ' اس میں فرائض و واجبات بھی ہیں ۔ یہ اللہ کا بنایا ہوا نظام ہے اور اللہ علیم و خبیر ہے ۔ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ "کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا جبکہ وہ لطیف و خبیر بھی ہے ۔"

---ooo---

اب اہل ایمان کے نام یہ آخری پکار ہے اور اس سبق کے آخیر میں ہے ۔ یہ پکار اس خاطر ہے کہ وہ تقویٰ اختیار کریں ۔ اس لئے کہ اس عظیم ذمہ داری کا حق صرف وہ لوگ ادا کر سکتے ہیں جن کے اندر نور تقویٰ ہو اور اس کے ذریعے وہ شیطانی شبہات اور وسوسوں کا مقابلہ کر سکیں اور اس راہ پر ان کے قدم مضبوط ہوں اور ان کو یہ فکری یکسوئی تب ہی نصیب ہو سکتی ہے جب وہ تقویٰ کے ذریعے حاصل کردہ ربانی نورانیت اور روشنی کو کام میں لائیں ۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۹ ع ۳ ۱۷

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم خدا ترسی اختیار کرو گے تو اللہ تمہارے لئے کسوٹی بہم پہنچا دے گا اور تمہاری برائیوں کو تم سے دور کرے گا اور تمہارے قصور معاف کرے گا۔ اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔"

یہ ہے زاد راہ اور حقیقی سامان سفر۔ زاد تقویٰ جو دلوں کو زندہ کرتا ہے ان کو بیدار کرتا ہے اور ان کے اندر ولولہ پیدا کرتا ہے۔ نیز اس کی وجہ سے دلوں کے اندر احتیاط اور بیداری پیدا ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے انسان کو ایسا نور بصیرت ملتا ہے جس کی وجہ سے اس راہ کے نشیب و فراز سب روشن ہو جاتے ہیں۔ انسانی سوچ پر ان شبہات و وساوس کا اثر نہیں ہے جن کی وجہ سے راہ تاریک ہو جاتی ہے نیز تقویٰ کی وجہ سے انسان کو اس کی کوتاہیوں پر معافی بھی مل جاتی ہے۔ اور انسان کی زندگی میں سنجیدگی اور ثبات پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان پر امید ہوتا ہے اور مشکلات اور تقصیرات کی وجہ سے وہ مایوس نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ کی وجہ سے انسان کے دل میں وہ دو ٹوک بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے انسان اپنی راہ کی مشکلات میں صحیح فیصلے کر سکتا ہے۔ لیکن یہ وہ حقیقت ہے کہ تمام روحانی تجربات کی طرح اس کو بھی عملاً اپنانے کے بعد ہی اس کی پوری ماہیت انسان پر منکشف ہوتی ہے۔ صرف کلام و بیان سے اس کی ماہیت کو پوری طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً ان لوگوں پر جن کا کوئی ذوق ہی نہ ہو۔

بعض امور حسن اور عمل کے درمیان پیچیدہ ہوتے ہیں۔ اور انسان کی فکر و نظر ہمیشہ جادہ حق کی نشاندہی میں پیچیدگی کا شکار رہی ہے۔ زندگی کی اہم راہوں پر انسان حق و باطل کے اندر مشکل سے تمیز کر سکتا ہے۔ بڑے بڑے دلائل بھی انسان کو اطمینان قلبی عطا کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ آخر کار خاموشی چھا جاتی ہے اور قلب و نظر مطمئن نہیں ہوتے۔ دلائل و براہین کا یہ جدل و جدال بے فائدہ ہوتا ہے لیکن آخر کار تقویٰ ہی سامنے آتا ہے۔ تقویٰ کے ذریعہ ہی عقل کو روشنی ملتی ہے۔ تقویٰ ہی حق کی شکل و صورت وضع کرتا ہے اور راستہ منکشف ہوتا ہے' دل مطمئن ہوتا ہے' ضمیر کے اندر استراحت آ جاتی ہے اور قدم جم جاتے اور انسان راستے پر چل نکلتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بذات خود سچائی فطرت سے اوجھل نہیں ہوتی' فطرت کی بنا اور تعمیر سچائی پر ہے اور اس سچائی ہی کے ساتھ زمین و آسمان کو پیدا کیا گیا ہے لیکن انسانی خواہشات سچائی اور فطرت کے درمیان حائل ہو جاتی ہیں۔ ذاتی خواہشات فضا میں آلودگی پیدا کر دیتی ہیں اور انسان کی حقیقی نظر کام نہیں کرتی اور انسان کو جادہ حق نظر نہیں آتا۔ محض دلیل و برہان سے ذاتی خواہشات کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تقویٰ اور خدا خوفی ہی ہے جس کے ذریعے خواہشات کو دبایا جا سکتا ہے۔ اور خوف خدا اور تقویٰ بروقت اپنا کام کرتے ہیں۔ خفیہ حالت میں بھی اور اعلانیہ حالات میں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ تقویٰ کو مبداء فرقان بتایا گیا ہے جس سے بصیرت منور ہوتی ہے اور ہر قسم کا التباس اور شک دور ہو جاتا ہے۔

یہ وہ قوت اور صلاحیت ہے جو بازار سے خریدی نہیں جا سکتی۔ یہ اللہ کا فضل عظیم ہی ہوتا ہے جسے چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے اور اس فضل عظیم ہی کے نتیجے میں خطائیں معاف ہوتی ہیں۔ اور یہ وہ عمومی بخشش ہے جو رب العالمین اپنے خصوصی کرم سے جس پر چاہتا ہے کر دیتا ہے۔

# درس نمبر ۸۴ ایک نظر میں

اس سورہ میں سلسلہ کلام آگے بڑھتا ہے ۔ حالات حاضرہ پر تبصرہ واقعات ماضی کی روشنی میں جاری ہے ۔ امت مسلمہ کے سامنے اس عظیم فتح کی تصویر کشی کر کے بتایا جاتا ہے کہ ذرا سوچو کہ تمہارا حال تمہارے ماضی کے مقابلے میں کس قدر بدل چکا ہے ۔ کس قدر عظیم انقلاب چشم زدن میں برپا کر دیا گیا ہے لیکن یہ کیونکر ہوا......؟ محض فضل ربی اور تدبیر الٰہی کے ذریعے ۔ اس عظیم انقلاب کو دیکھو! اس کے مقابلے میں اموال و غنائم کس قدر حقیر ہیں ۔ نیز تم نے جو قربانیاں دیں اور جو مشقتیں اٹھائیں وہ تمہیں تو بہت بڑی نظر آتی ہوں گی مگر اب نتائج کے مقابلے میں کس قدر حقیر ہیں ۔

درس سابق میں یہ بیان کر دیا گیا تھا کہ مکہ میں مسلمانوں کے حالات کس قدر خراب رہتے تھے ' اس جنگ سے قبل مدینہ میں بھی تمہاری پوزیشن کچھ اچھی نہ تھی ۔ تم قلیل و ضعیف تھے ۔ تم ہر وقت خطرات میں گھرے ہوئے تھے ۔ خطرہ تھا کہ تمہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے ۔ مدینہ میں آکر تم مامون ہوئے اور اس جنگ اور نصرت کے بعد 'محض تدبیر الٰہی سے تم عزیز اور مقتدر ہو گئے ۔

اس سبق میں مشرکین کے موقف کی تصویر کشی کی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ دیکھو یہ لوگ تمہارے خلاف چالیں چل رہے تھے ۔ ہجرت سے قدرے پہلے اور یہ دعوے کرتے تھے کہ یہ شخص جو آیات الٰہی پڑھتا ہے اگر ہم چاہیں تو ایسا کلام گھڑ سکتے ہیں اور وہ بغض و عناد میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ عذاب الٰہی کا خود مقابلہ کرنے لگے کہ اگر دعوت اسلامی حق ہے تو ہم پر عذاب آجائے ۔ اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ دیکھو یہ لوگ دعوت اسلامی کی راہ روکنے کے لئے اپنی قیمتی دولت بھی فضول خرچ کر رہے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کے لئے تیاریاں کر رہے ہیں ۔ لیکن یہ دنیا میں ناکام ہوں گے ۔ اور آخرت میں جہنم کا ایندھن ہوں گے نیز دنیا اور آخرت دونوں میں خسارے سے دوچار ہوں گے ۔

آخر میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو یہ حکم دیتے ہیں کہ وہ کافروں سے بات کر کے ان کو یہ اختیار دیں کہ وہ دو امور میں سے ایک کو قبول کر لیں ۔ یا تو وہ کفر ' عناد ' اور اللہ اور رسول کے خلاف صف آرائی سے باز آجائیں ' اگر وہ ایسا کریں تو اللہ ان کی سابقہ کوتاہیاں جو دور جاہلیت میں کی گئیں ان کو معاف کر دے گا ۔ یا وہ لوٹ کر اس حالت میں چلے جائیں جس میں وہ تھے اور اس برے انجام سے دوچار ہوں جو ہر اس شخص کو نصیب ہوا جس نے اس راہ کو اختیار کیا ۔ تب ان پر اللہ کی وہی سنت جاری ہوگی جس کا اللہ ارادہ کریں اور جس میں اس کی رضا ہو ۔

آخر میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہ ہدایت دیتے ہیں کہ وہ ان کفار کے ساتھ جنگ اس وقت تک جاری رکھیں یہاں تک کہ کفار کے ہاتھ میں ایسی قوت نہ رہے جس میں مسلمانوں کے لئے خطرہ ہو ۔ اس جہاں پر اللہ کی الوہیت قائم ہو جائے اور دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے ۔ اگر وہ سر تسلیم خم کر دیں تو حضور ان سے یہ قبول کر لیں گے ۔ رہی ان کی نیت تو اس پر معاملہ اللہ کے ہاں ہو گا ۔ کیونکہ اللہ خبیر و بصیر ہے ۔ اگر وہ روگردانی کریں ' اسلام کے خلاف یہ جنگ جاری

رکھیں اور اسلام کے خلاف ان کے بغض و عناد کا یہی عالم رہے اور اللہ وحدہ کی حاکمیت کا اعتراف نہ کریں اور اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے سامنے نہ جھکیں تو مسلمان ان کے خلاف جہاد جاری رکھیں گے ۔ اس میں وہ صرف اللہ پر بھروسہ کریں گے جو ان کا سرپرست ہے ۔ وہ اچھا سرپرست اور بہترین مددگار ہے ۔

---()()()---

# درس نمبر ۸۴ تشریح آیات

# ۳۰ ---تا--- ۴۰

وَ اِذۡ یَمۡکُرُ بِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِیُثۡبِتُوۡکَ اَوۡ یَقۡتُلُوۡکَ
اَوۡ یُخۡرِجُوۡکَ ؕ وَ یَمۡکُرُوۡنَ وَ یَمۡکُرُ اللّٰہُ ؕ وَ اللّٰہُ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ ﴿۳۰﴾

"وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ منکرین حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تجھے قید کر لیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں۔ وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔"

اب حالات مکہ معظمہ کی اسکرین پر لائے جاتے ہیں' جبکہ حالات کے اندر وہ انقلاب برپا نہ ہوا تھا جو اب ہو چکا ہے۔ اہل مکہ اپنے موقف پر سختی سے جمے ہوئے تھے مقصد یہ ہے کہ حالات بہت اچھے رخ پر جا رہے ہیں اور مستقبل تابناک ہے' لیکن اس میں تمہارا کوئی ذاتی کمال نہیں ہے یہ تو اللہ کی تدبیر اور تقدیر کی کارستانیاں ہیں۔ دنیا میں وہی کچھ ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ ابتداء میں جن لوگوں کو مخاطب کیا جا رہا تھا وہ تو حالات کے ان دونوں ادوار کو اچھی طرح جانتے تھے کیونکہ وہ ان ادوار سے ہو کر گزرے تھے۔ ان کے لئے تو سابقہ دور ماضی قریب تھا اور اس دور میں وہ جس خوف اور قلق میں مبتلا تھے وہ انہیں اچھی طرح یاد تھا۔ حال میں جو اطمینان تھا وہ ان کے سامنے تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کیا مکاریاں کی گئی تھیں اور کی جا رہی ہیں اور کس طرح وہ ان میں سے کامیاب ہو کر گزرے ہیں۔ انہوں نے مشکلات سے نجات ہی نہیں پائی بلکہ ان میں کامیاب بھی رہے ہیں۔

ان کی تدبیر یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قید کر کے بیڑیاں پہنا دیں یہاں تک کہ وہ رحلت کر جائیں یا انہیں قتل کر دیں یا آپ کو مکہ سے خارج کر دیں۔ انہوں نے ان تمام تجاویز پر غور کیا تھا اور آخر وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ آپ ؐ کو قتل ہی کر دیں۔ اس کام کو تمام قبائل کے نوجوان سرانجام دیں تاکہ آپ ؐ کا خون تمام قبائل پر منقسم ہو جائے۔ بنو ہاشم آپ کا بدلہ نہ لے سکیں آخرکار دیت پر راضی ہو جائیں۔

امام احمد نے روایت کی ہے۔ عبدالرزاق سے' معمر سے' عثمان جریری سے' ---- مولیٰ عباس سے' کہتے ہیں کہ ابن عباس نے فرمایا کہ وَاِذۡ یَمۡکُرُ بِکَ (۸ : ۳۰) کی تفسیر یہ ہے کہ ایک رات قریش نے مکہ میں باہم مشورہ کیا تو بعض نے کہا کہ جب وہ صبح نکلیں تو انہیں باندھ دیں یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں۔ بعض نے کہا اسے قتل کر دیا

جائے' بعض نے کہا کہ انہیں جلاوطن کر دیا جائے - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دے دی گئی - حضرت علی ؓ رات کو آپ ؐ کے بستر پر سوئے اور حضور ؐ نکل کر غار میں چھپ گئے لیکن مشرکین رات کو حضور ؐ کی چوکی کرتے رہے - جب صبح ہوئی تو وہ حملہ آور ہوئے - جب انہوں نے دیکھا کہ بستر پر حضرت علی ؓ سوئے ہوئے ہیں اور اللہ نے ان کی اس تدبیر کو ان پر الٹ دیا ہے' تو انہوں نے حضرت علی سے پوچھا کہ تمہارے صاحب کہاں ہیں تو حضرت علی ؓ نے فرمایا: "مجھے معلوم نہیں ہے -" چنانچہ انہوں نے آپ کی پتہ براری شروع کی اور نقش قدم پر چل پڑے - جب وہ پہاڑ کے پاس پہنچے تو ان سے آپ ؐ کے قدموں کے آثار خلط ملط ہو گئے - وہ پہاڑ پر چڑھ گئے' غار کے اوپر گئے - انہوں نے دیکھا کہ دروازے پر عنکبوت نے تانا بانا بن دیا ہے - انہوں نے کہا کہ اگر آپ یہاں داخل ہوئے ہوتے تو یہاں عنکبوت کا جالا نہ ہوتا - چنانچہ حضور ؐ نے وہاں تین راتیں گزار دیں -

وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ (۸: ۳۰) "وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا' اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے -" قرآن نے ان حالات کو جن الفاظ میں بیان کیا' وہ نہایت ہی موثر ہیں جس سے قریش کی مجلس کا نقشہ ذہن میں آجاتا ہے ان کی تدابیر' تجاویز اور چالیں سامنے آتی ہیں لیکن اللہ ان پر محیط ہے - ان کے معاملے میں اللہ کی چالیں سامنے آتی ہیں اور ان کی وجہ سے مشرکین کی تمام چالیں خاک میں مل جاتی ہیں لیکن انہیں آخر دم تک اس کا شعور ہی نہیں ہوتا -

یہ نہایت ہی مسحور کن تصویر کشی ہے' اور نہایت خوفناک بھی' کیونکہ کمزور انسان قادر مطلق کے مقابلے میں کر ہی کیا سکتے ہیں - اللہ قہار و جبار ہے اور ہر چیز پر محیط ہے - قرآن کریم اس حقیقت کو اپنے مخصوص انداز اور طرز پر بیان کرتا ہے کہ اسے پڑھ کر دل لرز اٹھتے ہیں اور انسانی شعور گہرائیوں تک متاثر ہو جاتا ہے -

---()()()---

اب یہاں سے آگے سیاق کلام میں کفار کے افعال اور احوال بیان کئے جاتے ہیں - ان کے دعوے اور ان کے اعتراضات کا بیان کیا جاتا ہے - یہاں تک کہ ان کا یہ دعویٰ بھی یہاں ریکارڈ کر دیا جاتا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو وہ اس قسم کا کلام پیش کر سکتے ہیں جبکہ یہ قرآن ان کے زعم میں محض پرانے قصوں پر مشتمل کتاب ہے -

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾

"جب ان کو ہماری آیات سنائی جاتی تھیں تو کہتے تھے کہ "ہاں سن لیا ہم نے' ہم چاہیں تو ایسی ہی باتیں ہم بھی بنا سکتے ہیں' یہ تو وہی پرانی کہانیاں ہیں جو پہلے سے لوگ کہتے چلے آرہے ہیں -"

علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں سعید' سدی اور ابن جریج وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ یہ بات کہنے والا النضر ابن الحارث تھا - "یہ ملعون فارس کے علاقوں میں پھرتا رہا تھا - اس نے ملوک فارس کی تاریخ اور رستم و اسفندیار کے قصے

یاد کر رکھے تھے ۔جب وہ فارس سے واپس ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو گئی تھی اور آپ ؐ لوگوں کے سامنے قرآن مجید پڑھتے تھے ۔ جب حضور ؐ کسی مجلس سے تبلیغ کر کے اٹھتے تو وہاں نضر ابن الحارث پہنچ جاتا اور لوگوں کو یہ قصے سناتا اور کہتا تمہیں خدا کی قسم سچ کہو ہم میں سے کون اچھا قصہ گو ہے ۔ میں یا محمد ؐ؟ جب بدر کی جنگ پیش آئی تو اللہ نے اسے گرفتار کیا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میرے سامنے اس کی گردن اڑا دی جائے اور ایسا ہی ہوا۔ اسے مقداد ابن الاسود ؓ نے گرفتار کیا تھا۔ اس بارے میں ابن جریر محمد ابن بشار سے محمد ابن جعفر سے 'شعبہ سے' ابوبشر سے 'سعید ابن جبیر سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن' عقبہ ابن ابو معیط' طعیمہ ابن عدی اور نضر ابن الحارث کی گردن اڑانے کا حکم دیا تھا۔ مقداد نے نضر کو گرفتار کیا تھا۔ جب حضور ؐ نے اس کے قتل کے احکام صادر کئے تو حضرت مقداد نے کہا "رسول اللہ' یہ تو میرا قیدی ہے ۔" اس پر حضور ؐ نے اس کے قتل کا حکم دیا۔ اس پر دوبارہ حضرت مقداد نے کہا حضور ؐ یہ میرا قیدی ہے ۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے اللہ مقداد کو اپنے فضل سے غنی بنا دے ۔" اس پر حضرت مقداد نے کہا "یہی تو میں چاہتا تھا" کہتے ہیں ان ہی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے :

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۸: ۳۱) "جب ان کو ہماری آیات سنائی جاتی تھیں تو کہتے تھے کہ "ہاں سن لیا ہم نے' ہم چاہیں تو ایسی ہی باتیں ہم بھی بنا سکتے ہیں' یہ تو وہی پرانی کہانیاں ہیں جو پہلے سے لوگ کہتے چلے آرہے ہیں ۔"

قرآن کریم میں مشرکین کی اس بات کو بار بار لایا گیا ہے کہ قرآن کریم میں پرانے لوگوں کی کہانیاں ہیں :

قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا "وہ کہتے ہیں یہ پرانی کہانیاں ہیں جو اس نے لکھ لی ہیں اور یہ صبح و شام اسے لکھوائی جاتی ہیں ۔"

یہ ان رکاوٹوں میں سے ایک ہے جو وہ قرآن کی انقلابی تعلیمات کے مقابلے میں کھڑی کرتے تھے' حالانکہ قرآن کریم کا خطاب فطرت انسانی سے تھا اور یہ کلمات انسانی فطرت پر ایسا اثر کرتے تھے کہ وہ جھوم اٹھتی اور لبیک کہتی ۔ جب دلوں پر یہ کلمات پڑتے تو وہ لرز اٹھتے اور اس کے مقابلے میں ٹھہر نہ سکتے ۔ چنانچہ اس کلام کے مقابلے میں قریش کے لیڈر اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ۔ لیکن وہ خود بھی جانتے تھے کہ یہ چالیں کارگر نہ ہوں گی ۔ بہرحال انہوں نے کلام الہی میں ایک ایسی چیز تلاش کر لی جو ان کی پرانی کہانیوں کے مشابہ تھی ۔ اس سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے جاہل عربوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ اس انقلابی تحریک سے متاثر نہ ہو جائیں اور عوام جس طرح ان کبراء کی غلامی میں چلے آرہے تھے' بدستور چلتے رہیں ۔

قریش کے لیڈر یہ بھی جانتے تھے کہ دعوت اسلامی کی حقیقت کیا ہے' وہ عرب تھے اور قرآن کے مضامین سے اچھی طرح واقف تھے ۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا مفہوم و مراد کیا ہے؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ شہادت دینے والا تمام انسانوں کے اقتدار اور حاکمیت کا انکار کر رہا ہے ۔ یہ اپنے آپ کو تمام انسانوں کی حاکمیت سے نکال رہا ہے اور یہ اعلان کر رہا ہے کہ آج سے وہ صرف اللہ کی بندگی اور حاکمیت میں داخل ہو گیا ہے ۔ پھر وہ یہ بھی

اعلان کر رہا ہے کہ آج سے وہ صرف اللہ کی بندگی اور حاکمیت میں داخل ہو گیا ہے۔ پھر وہ یہ بھی اعلان کر رہا ہے کہ آج سے وہ صرف اللہ کی بندگی اور حاکمیت میں داخل ہو گیا ہے۔ پھر وہ یہ بھی اعلان کر رہا ہے کہ آج کے بعد وہ ہر قسم کی ہدایات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کرے گا۔ اب وہ ان لوگوں سے کوئی ہدایت نہ لے گا جو بتوں کے نام پر بات کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جو لوگ یہ شہادت دے دیں وہ کلمہ پڑھتے ہی قریش کی غلامی 'ان کے اثر اور ان کے اقتدار سے نکل جاتے ہیں وہ اس اجتماعی نظام کے کل پرزے بن جاتے ہیں جس کی قیادت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے۔ یہ حضور ؐ کی قیادت و سیادت کے تابع اور مطیع ہو جاتے ہیں۔ خواہ وہ جس قبیلے کے افراد ہوں ان کا تعلق ولدیت اور معاشرت اس قبیلے سے ختم ہو جاتا ہے اور وہ جدید قیادت کے وفادار اور ذمہ دار بن جاتے ہیں جس کا نام 'قیادت محمدی ؐ ہے۔

یہ تھا کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا مفہوم۔ یہ مفہوم انہوں نے مکہ کی گلیوں میں چلتا پھرتا دیکھا تھا۔ وہ رات دن اس مفہوم سے خطرہ محسوس کرتے تھے۔ ان کا اجتماعی نظام' ان کا قبائلی وجود اور ان کی قیادت و سیادت انہیں ختم ہوتی نظر آتی تھی۔

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا وہ کمزور' بے مقصد اور بے اثر مفہوم کبھی بھی نہ تھا جو آج ہم اس کلمے سے سمجھتے ہیں یہ زعم رکھتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ محض اس لئے کہ ہم زبان سے کلمہ شہادت کو ادا کر رہے ہیں اور بعض مراسم عبودیت بھی بجالاتے ہیں جبکہ زمین پر اقتدار اعلیٰ اور لوگوں کی زندگیوں میں اسلامی نظام کا اتہ پتہ ہی نہیں ہے۔ اسلامی معاشرے پر جاہلی قیادتیں اور جاہلیت کے پیروکار سربراہ حکمران ہیں اور اپنی مرضی سے تمام امور سرانجام دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مکہ میں نہ تو اسلام کی حکومت تھی اور نہ وہاں شریعت نافذ تھی۔ لیکن جو لوگ کلمہ طیبہ کا اقرار کرتے تھے وہ اپنی پوری قیادت و اختیارات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دے دیتے تھے اور ان کی وفاداریاں خود اپنے معاشرے سے کٹ کر جماعت مسلمہ کے ساتھ وابستہ ہو جاتی تھیں۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ جاہلی قیادت کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکتے تھے بلکہ یہ جاہلی اقتدار سے باغی ہو جاتے تھے۔ اپنے قبیلے' اپنے خاندان اور جاہلی قیادت سے فوراً کٹ جاتے تھے وہ کلمہ شہادت پڑھتے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کی طرف سے کلمہ طیبہ محض خالی خولی بات ہی نہ تھی بلکہ وہ ایک مفہوم تھا اور وہ مفہوم جماعت مسلمہ کی زندگیوں میں نمودار ہوا کرتا تھا۔

یہ تھی وہ اصل بات جس سے قریش خوفزدہ تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ اسلام سیلاب کی طرح امنڈتا چلا آ رہا ہے۔ اس سے قبل حنفاء کی بھی ایک جماعت تھی مشرکین کے عقائد اور اعمال سے علیحدہ رہتے تھے اور ان کی طرح عبادت بھی نہ کرتے تھے۔ اللہ کو وحدہ لاشریک سمجھتے تھے' صرف اللہ کی عبادت کرتے تھے اور ان میں سے کوئی بھی بتوں کی عبادت نہ کرتا تھا۔ یہاں تک تو جو شخص جو رویہ چاہے اختیار کرے کوئی جاہلی نظام اسے نہ چھیڑے گا کیونکہ اس قدر رویہ اہل جاہلیت کے نظام کے لئے کوئی خطرہ نہ تھا۔ یہ تو محض مخالفانہ عقائد تھے اور ایک علیحدہ طریقہ عبادت تھا لیکن صرف یہ اسلام نہیں ہے جیسا کہ بعض پاکباز اور بھلائی پسند لوگ سمجھتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ وہ اچھے مسلمان بن گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھولے بھالے لوگ ہیں اور انہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے۔ اسلام صرف درست کلمہ کی تلاوت کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک تحریک کا نام بھی ہے اور تحریک یہ کہ انسان فوراً جاہلی تصورات اور جاہلی معاشرے اور جاہلی قیادت کی گرفت سے باہر نکل آئے اور جاہلی قیادت کے قوانین و شریعت سے نکل

کر اپنی پوری وفاداری کو اسلامی قیادت کے ساتھ وابستہ کر دے جو کسی خطہ زمین پر اسلام کو عملاً نافذ کرنا چاہتی ہے۔یہی وہ بات تھی جس کی وجہ سے قریش کے کبراء کی نیند حرام تھی اور وہ کانٹوں پر لوٹ رہے تھے۔اور تحریک اسلامی کے خلاف قسم قسم کے حربے لے کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ان حربوں میں سے ایک حربہ یہ بھی تھا کہ قرآن کریم کے بارے میں یہ شکوک پھیلائے جائیں کہ یہ پرانی کہانیاں ہی تو ہیں اور اگر وہ چاہیں تو ایسی کہانیاں تصنیف کر سکتے ہیں۔لیکن اس سے قبل قرآن نے ان کو بار بار چیلنج دیا تھا اور وہ ایسا کوئی کلام پیش کرنے سے عاجز ہو گئے تھے۔اساطیر کا واحد اسطورہ ہے۔اس سے مراد وہ قصص ہیں جن کے اندر مذہبی خرافات بھی ہوں یعنی خداؤں کی کہانیاں' پرانے لوگوں کے قصے اور مذہبی لیڈروں کی بہادریاں اور ایسے محیرالعقول واقعات جو تخیلات پر مشتمل ہوں تخیل ان قصوں کا بنیادی عنصر ہوتا ہے۔

قریش قرآن کریم میں بیان کردہ اقوام سابقہ کے قصص کی نشاندہی کر کے' ان میں سے معجزات کو لیتے اور اللہ تعالیٰ نے سابقہ زمانوں میں جھٹلانے والوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ واقعات لیتے اور مکہ کے غافل اور جاہل لوگوں کو یہ باور کراتے کہ تم خود پڑھو' یہ پرانے قصے ہیں۔یہ قصص محمد نے ان لوگوں سے اخذ کئے ہیں جو اس میدان کے ماہرین ہیں۔اور ماہرین سے لے کر وہ یہاں آکر تمہارے سامنے پڑھتا ہے۔اور یقین یہ رکھتا ہے کہ یہ اس پر وحی ہوتے ہیں۔یوں نضر ابن الحارث خود رسول اللہ کی مجلس میں بیٹھ کر یہ باتیں کرتا یا حضورؐ کی مجلس کے بالمقابل اپنی مجلس جماتا اور اس میں ایسی باتیں کرتا۔اس میں اہل فارس کے پرانے تاریخی قصے بیان کرتا اور پھر لوگوں کو کہتا یہ دیکھو یہ بھی ویسے ہی قصص ہیں جیسے قرآن کریم بیان کرتا ہے۔دیکھو ان قصوں کے بل بوتے پر وہ نبوت کا مدعی ہے اور میں یہ دعویٰ نہیں کرتا لیکن ہیں یہ صرف پرانے قصے۔

یہ تھی اس ملعون کی تقریر اور ضروری ہے کہ مکہ کے حلقوں میں خصوصاً ابتدائی دور میں ضرور اس کے کچھ اثرات بھی ہوں گے۔اس ابتدائی دور میں جس میں ابھی تک قرآن کریم کے قصص اور فارس والوں کی پرانی کہانیوں کے درمیان فرق و امتیاز لوگوں کے ذہنوں میں واضح نہ ہوا تھا۔یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کے منادی نے معرکہ بدر سے قدرے پہلے یہ اعلان کروا دیا تھا کہ نضر ابن الحارث بچنے نہ پائے اور قتل کر دیا جائے اور جب وہ اسیر ہو کر آیا تو آپ نے اسے قتل کرا دیا اور اس سے فدیہ قبول نہ کیا جس طرح دوسرے قیدیوں سے قبول کیا تھا۔

لیکن ابتدائی حملے کے بعد مکہ میں یہ سب تدابیر بیکار ہو گئیں' یہ انداز مخالفت جلد ہی ختم ہو گیا اور لوگوں پر اس کی حقیقت کھل گئی۔قرآن کریم کی چھا جانے والی قوت جو اسے اللہ کی جانب سے دی گئی ہے اور وہ قوت جو اس کے اندر پیش کردہ سچائی کے اندر پوشیدہ ہے وہ انسانی فطرت کو اپنے قبضے میں لے لیتی ہے۔چنانچہ اس کے مقابلے میں جلد ہی اس قسم کے ہتھکنڈے فیل ہو گئے اور اس کے مقابلے میں جلد ہی میدان صاف تھا۔اب قریش حیرانی و پریشانی کی حالت میں اپنی پالیسی بدلنے پر مجبور ہو گئے۔پہلے تو وہ لوگوں کو دعوت موزانہ دیتے تھے' اب کہنے لگے لَا تَسْمَعُوا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ "اس قرآن کو مت سنو اور جب وہ پڑھا جا رہا ہو تو شور مچاؤ' شاید کہ اس طرح تم غلبہ پا لو۔" لیکن ان میں نہایت ہی سرکردہ لوگ مثلاً ابوسفیان' ابوجہل اور اخنس ابن شریق جیسے لوگ بھی اس حکم پر عمل نہ کر سکے اور وہ ایک دوسرے سے چھپ کر رات کو جاتے اور قرآن کی تلاوت سنتے۔وہ رات کو تلاوت قرآن کے مقررہ وقت میں صبر نہ کر سکتے اور دوسروں سے چھپ کر پہنچ جاتے تھے۔لیکن جب ان کا راز ایک دوسرے پر کھلا تو پھر انہوں

نے کہا نہایت ہی سخت عہد کیا کہ ہرگز نہ آئیں گے ورنہ وہ قرآن کا شکار ہو جائیں گے۔

یہ بات یاد رہے کہ قرآن کے خلاف نضر ابن الحارث کی تحریک ختم نہیں ہوگئی اور نہ ہوگی اور نہ یہ کوئی آخری تحریک تھی۔ یہ تحریک بھی مختلف شکلوں میں انسانی تاریخ میں ہمیشہ رہی ہے۔ دین اسلام کے دشمنوں نے اہل اسلام کو ہمیشہ قرآن سے باز رکھنے کی سعی کی ہے۔ جب وہ اور طریقوں سے قرآن کو ختم نہ کر سکے تو انہوں نے اسے گانا شروع کر دیا۔ قراء کرام اسے خوش الحانی سے پڑھتے ہیں اور یہ لوگ اس پر جھوتے ہیں اور انہوں نے اس کے احکام و آیات سے گنڈے اور تعویذ بنانے شروع کر دیئے۔ کسی نے بازو پر باندھ لیا' کسی نے گلے میں لٹکالیا اور کسی نے تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ اور سمجھے کہ ہم تو مسلمان ہیں اور ہم نے قرآن کا حق ادا کر دیا ہے اور اس طرح اس دین کا حق ادا ہو گیا ہے۔

آج صورت حالات یہ ہے کہ قرآن لوگوں کی زندگی کے لئے مصدر رشد و ہدایت نہیں ہے۔ دشمنان دین نے قرآن کے مقابلے میں بعض اور مصادر اور مراجع وضع کر دیئے ہیں جہاں سے لوگ ہدایات لیتے ہیں۔ یہ ان نئے مراجع سے اپنے تصورات' اور مقاصد اخذ کرتے ہیں اور قوانین و ضوابط بھی یہ لوگ ان دوسرے مصادر سے لیتے ہیں۔ اقدار حیات اور حسن و قبح کے پیمانے بھی ان مصادر سے لیتے ہیں۔ لیکن زبان سے یہ لوگ کہتے ہیں کہ دین اسلام محترم ہے۔ قرآن محفوظ ہے اور وہ صبح و شام لوگوں پر پڑھا جاتا ہے۔ گانے والے اسے گاتے ہیں۔ قراء اس کی تلاوت کرتے ہیں اس ترنم اور اس ترتیل کے بعد آخر لوگ اور کیا چاہتے ہیں؟ رہے تصورات اور مطالب' حسن و قبح کے پیمانے اور اقدار حیات' اجتماع نظم اور معاشرتی طور طریقے' قوانین و ضوابط اور اصول و دستور تو ان کے بارے میں تو مسلمانوں نے کچھ اور قرآن گھڑ رکھے ہیں اور یہ لوگ اصل قرآن کی طرف لوٹتے ہی نہیں۔

کیا اس ہتھکنڈے اور نضر ابن الحارث کے ہتھکنڈوں میں کوئی فرق ہے؟ ہاں جدید ہتھکنڈے جدید اسلوب میں ہیں۔ یہ اس کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ اور زیادہ پوشیدہ ہیں اور یہ جدید چالیں جدید پیچیدگی زندگی میں زیادہ کامیاب ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی ویسی ہی سازشیں ہیں جیسی قریش کرتے تھے یا اسلام کی طویل تاریخ میں ہوتی رہی ہیں۔

لیکن قرآن کے بھی کیا کہنے؟ یہ ایک عجیب کتاب ہے اس کی طویل تاریخ میں اس کے خلاف یہ کھیل اور پیچیدہ سازشیں ہوتی رہی ہیں لیکن آخر کار فتح قرآن ہی کی ہوتی ہے۔ یاد رکھو' قرآن کریم کی عجیب خصوصیات ہیں' انسانی فطرت پر اس کی گرفت بہت ہی مضبوط ہے۔ اس کے خلاف یہود و ہنود اور انسانوں اور شیطانوں کی کوئی چال کامیاب نہیں ہوتی۔ آج اس کے خلاف جو عالمی سازشیں ہو رہی ہیں جن کا سررشتہ عالمی یہودیت اور عالمی صہیونیت کے ہاتھ میں ہے وہ جاری و ساری ہیں اور قرآن غالب و ناصر ہے۔

یہ قرآن آج بھی اس پورے کرۂ ارض پر اپنے دشمنوں کو شکست دے رہا ہے۔ یہ دشمن مجبور ہیں کہ اس کی تلاوت کو پوری دنیا میں نشر کریں۔ یہود و نصاریٰ اور ہندو وغیرہ اسے اپنے میڈیا سے نشر کرتے ہیں اور یہودیوں اور عیسائیوں کے وہ ایجنٹ حکمران بھی اسے نشریات کا حصہ بناتے ہیں' وہ ایجنٹ جو مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔

بے شک یہ لوگ قرآن کو اپنی نشریات کا حصہ تو بناتے ہیں لیکن انہوں نے قرآن مجید کو محض قراءت اور ترنم اور ترتیل کا ذریعہ بنا دیا ہے یا اس سے آگے اسے تعویذوں اور گنڈوں کے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ قرآن کریم کو انہوں نے مسلم فکر سے نکال دیا ہے اور اسے مسلمانوں کی فکری اور عملی راہنمائی کے مقام سے ہٹا دیا ہے مسلمانوں کی

فکری اور عملی راہنمائی کے لئے ان دشمنوں نے جدید فلسفے اور نظریات گھڑ لئے ہیں لیکن یہ کتاب بدستور تمام سازشوں کا مقابلہ کر رہی ہے۔ یہ بدستور اپنا کام کر رہی ہے اور اس دنیا کے ہر حصے میں ایسے گروہ موجود ہیں جو اس کو اپنا صحیح مقام عطا کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ جدوجہد کر رہے ہیں کہ یہ کتاب رشد و ہدایت کا مرجع ہو۔ یہ گروہ ہر جگہ مصروف کار ہیں اور اللہ کی جانب سے تائید و نصرت کے طلبگار اور امیدوار ہیں کہ اللہ ان کو اس کرۂ ارض کا اقتدار نصیب کرے اور قرآن کریم اپنے اصل مقام کو پالے۔ ایک موقع پہلے اگر یہ کامیاب ہو چکا ہے تو ان شاء اللہ دوبارہ بھی ہو کر رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

---()()()---

ذرا آگے ملاحظہ کیجئے۔ جب قرآن کے مقابلے سے یہ دشمن عاجز آجاتے ہیں اور ان کی سازش ناکام ہو جاتی ہے تو یہ اس کے مقابلے میں عجیب طرز عمل اختیار کرتے ہیں اور ان کا جذبہ عناد اور ان کا غرور انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ یہ رویہ اختیار کریں اور کسی صورت میں بھی مان کر نہ دیں۔ اب یہ لوگ تمناؤں کی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں کہ اگر یہ حق ہے تو اے اللہ ہم پر پتھر برسا دے۔ یا اور کوئی دردناک عذاب ہم پر نازل کر دے۔ لیکن وہ حق کے اتباع اور حق کی حمایت کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔

وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٢﴾

"اور وہ بات بھی یاد ہے جو انہوں نے کہی تھی "خدایا' اگر یہ واقعی حق ہے تیری طرف سے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا کوئی دردناک عذاب ہم پر لے آ۔"

یہ عجیب و غریب دعاء ہے۔ اس سے اس کمز بغض و عناد کا اندازہ ہو جاتا ہے جو ان لوگوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف پایا جاتا تھا کہ وہ ہلاکت اور بربادی کو دعوت دیتے ہیں۔ لیکن اسلام کو ماننے اور اس کی حمایت کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اگرچہ وہ حق ہو۔ فطرت سلیمہ کا رویہ تو یہ ہوتا ہے کہ جب اسے کسی معاملے میں خلجان ہو تو ایسا شخص دعا کرتا ہے کہ اے اللہ مجھے اس معاملے میں راہ راست دکھا۔ وہ کبھی بھی اس معاملے میں تلخی محسوس نہیں کرتا۔ لیکن جب کبر و غرور اور بغض و عناد فطرت سلیمہ کو بگاڑ دیں تو پھر عالم یہ ہوتا ہے کہ غرور و عناد انسان کو برائی پر آمادہ کرتا ہے۔ لوگ مرنا پسند کرتے ہیں لیکن سچائی کو قبول کرنا پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ ان کے سامنے حق و باطل واضح ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور اس میں خود ان کو کوئی شک نہیں رہتا۔ اس کی واضح مثال مشرکین مکہ کا رویہ ہے۔ یہ آخر دم تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مقابلہ کرتے رہے لیکن ان کے اس بغض و عناد کے باوجود یہ دعوت فتح یاب ہوئی۔

اس عناد اور اس دعاء کے جواب میں قرآن کیا کہتا ہے؟ ٹھیک ہے کہ یہ لوگ پتھروں کی بارش کے مستحق ہیں اور اس کا مطالبہ وہ اس شرط کے ساتھ کرتے ہیں کہ اگر یہ قرآن سچا ہو اور ظاہر ہے کہ قرآن سچا ہے اور شرط پوری ہے۔ لیکن ان کی جانب سے بربادی کی دعوت دینے کے باوجود اللہ ان پر یہ عمومی عذاب اس لئے نازل نہیں کرتا کہ حبیب خدا ان

میں موجود ہیں اور مسلسل ان کو دعوت حق دے رہے ہیں اور اللہ نے کسی قوم کو بھی اس وقت تک مکمل بربادی سے دوچار نہیں کیا جب تک رسول ان میں موجود ہوتا ہے ۔ دعوت دے رہا ہوتا ہے اور لوگوں کو بھی اللہ اس وقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک وہ اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے رہتے ہیں ۔ اور ان پر یہ عذاب صرف اس لئے نہیں نازل ہو رہا ہے کہ یہ لوگ بیت اللہ کے مکین ہیں اگرچہ وہ اس گھر کی تولیت کے مستحق نہیں ہیں ۔

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ مَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَ هُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ مَا كَانُوْۤا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

"اس وقت تو اللہ ان پر عذاب نازل کرنے والا نہ تھا جب کہ تو ان کے درمیان موجود تھا اور نہ اللہ کا یہ قاعدہ ہے کہ لوگ استغفار کر رہے ہوں اور وہ ان کو عذاب دے دے ۔ لیکن اب کیوں نہ وہ ان پر عذاب نازل کرے جب کہ وہ مسجد حرام کا راستہ روک رہے ہیں' حالانکہ وہ اس مسجد کے جائز متولی نہیں ہیں ۔ اس کے جائز متولی تو صرف اہل تقویٰ ہی ہو سکتے ہیں' مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے ۔ بیت اللہ کے پاس ان لوگوں کی نماز کیا ہوتی ہے؟ بس سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے ہیں ۔ پس اب لو' اس عذاب کا مزہ چکھو اپنے اس انکار حق کی پاداش میں جو تم کرتے رہے ہو ۔"

یہ اللہ کی عظیم رحمت ہے کہ انہیں مہلت دے دی اور ان کے اس گہرے عناد کی وجہ سے ان پر عذاب نہیں آ رہا ہے ۔ مسجد حرام سے یہ لوگ لوگوں کو روکتے ہیں اور پھر بھی ان کے لئے مہلت کی رسی دراز ہو رہی ہے ۔ اس دور میں یہ مسلمانوں کو حج کرنے سے بھی روکتے تھے ۔ جبکہ مسلمان کسی کو نہ روکتے تھے اور نہ کسی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے تھے ۔

یہ رحمت خداوندی ان کو اس لئے مہلت دیئے جا رہی تھی کہ شاید ان میں سے جن لوگوں کے دلوں میں مادۂ ایمان موجود ہے وہ ایمان لے آئیں اگرچہ وہ قدرے بعد میں آئیں ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو ابھی تک موجود ہیں اور کام کر رہے ہیں ۔ بعض لوگوں سے ابھی تک توقعات وابستہ تھیں ۔ لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود بابرکت کی وجہ سے ان کو مہلت مل رہی تھی ۔ ابھی تک عظیم عذاب سے بچنے کا دروازہ کھلا تھا' اگر وہ مان لیں' دعوت اسلامی کو قبول کر لیں اور اپنے رویے سے باز آ جائیں ۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ

"اس وقت تو اللہ ان پر عذاب نازل کرنے والا نہ تھا جب کہ تو ان کے درمیان موجود تھا اور نہ اللہ کا یہ (۸:۳۳)

قاعدہ ہے کہ لوگ استغفار کر رہے ہیں اور وہ ان کو عذاب دے دے۔"

لیکن اللہ اگر ان کے ساتھ ان کے حالات کے مطابق معاملہ کرنا چاہے تو وہ بے شک عذاب الہٰی کے مستحق ہیں۔

وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۸: ۳۴) "لیکن اب کیوں نہ وہ ان پر عذاب نازل کرے جب کہ وہ مسجد حرام کا راستہ روک رہے ہیں' حالانکہ وہ اس مسجد کے جائز متولی نہیں ہیں۔ اس کے جائز متولی تو صرف اہل تقویٰ ہی ہو سکتے ہیں' مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔"

ان پر یہ عذاب اس لئے نہیں لیٹ ہو رہا ہے جس کا وہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں یا وہ بیت اللہ کے متولی ہیں۔ یہ تو ان کا محض دعویٰ ہی دعویٰ تھا' اس کی کوئی اساس نہ تھی۔ یہ لوگ دراصل اس گھر کے خادم اور متولی تھے ہی نہیں۔ یہ تو اس گھر کے دشمن تھے۔ انہوں نے زبردستی اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ کوئی ترکہ تو تھا نہیں جو آباؤ اجداد سے وراثت میں لیا جاتا۔ بیت اللہ کی تولیت کا حق تو اللہ کے متقی بندوں کا حق ہے۔ ان کا یہ دعویٰ کہ وہ حضرت ابراہیم کے وارث ہیں' یہ بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ سچائی کا تعلق خون اور نسب سے نہیں ہوتا۔ سچائی میں وراثت تو دین اور عقیدے کی وراثت ہوتی ہے۔

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزی نیست

حضرت ابراہیم کے وارث تو اہل تقویٰ ہیں۔ حضرت ابراہیم نے اس گھر کو تعمیر کیا تاکہ لوگ اس کی زیارت کریں اور تم اس سے روکتے ہو اور تم نے اس کی تولیت کو بھی مستحق لوگوں سے چھین لیا ہے۔

یہ لوگ' اگرچہ اس گھر میں اپنی نماز پڑھتے ہیں۔ اس گھر کی تولیت کے مستحق نہیں ہیں۔ پھر ان کی نماز ہی کیا ہے؟ سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا۔ ایسا شور و شغب اور ہائے ہو جس میں کوئی متانت اور سنجیدگی نہیں ہے نہ ان گھر کے احترام کا شعور ہے اور نہ اس میں اللہ کے تقدس اور کبریائی کا کچھ احساس ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ یہ لوگ اپنی گالوں کو زمین پر رکھتے تھے اور سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے۔ اور اس سے عالم اسلام' نام نہاد عالم اسلام کی وہ تصویر ذہن میں آ جاتی ہے جس میں لوگ آستانوں پر گاتے بجاتے ہیں' شور و شغب کرتے ہیں اور اللہ ہو کے نعرے لگاتے ہیں اور قبروں کی چوکھٹوں پر چہرے رگڑتے ہیں۔ غرض یہ سب جاہلیت کے مظاہرے ہیں جو کبھی اس صورت میں ظاہر ہوتے تھے اور کبھی اس صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن ان تمام صورتوں کی اصل اور بنیادی صورت یہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کی حاکمیت قائم ہو اور لوگوں پر انسان حکمران ہوں۔ یہ بڑی اور عظیم اور ہمہ گیر جاہلیت ہے جو تمام چھوٹی بڑی جاہلیتوں کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے اور یہ دوسری جاہلیتیں اس کی شاخ اور فریم ہوتی ہیں۔

فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (۸: ۳۵) "پس اب لو اس عذاب کا مزہ چکھو اپنے اس انکار حق کی پاداش میں جو تم کرتے رہے ہو۔"

اور یہ عذاب کون سا عذاب ہے' وہی جو میدان بدر میں جماعت مسلمہ کے ہاتھوں ان پر پڑا۔ رہا وہ عذاب جو

انہوں نے خود طلب کیا تھا کہ ان کی جڑ کاٹ دی جائے تو اللہ نے ان پر وہ عذاب اس لئے نازل نہیں کیا کہ اللہ رحیم و کریم ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اس قسم کے عذاب کا نزول مناسب نہ تھا کیونکہ آپ ؐ نبی رحمت ہیں اور کفار میں سے کئی لوگوں کی جانب سے توبہ استغفار کی امید ابھی باقی ہے۔

---ooo---

اب ذرا ان کفار کے طرز عمل کو دیکھو یہ لوگ اپنے اموال اس مقصد کے لئے صرف کرتے ہیں کہ لوگوں کو راہ خدا سے روکیں۔ بدر میں ان کے مقاصد کیا تھے، یہی کہ اس جنگ سے ان کے پیش نظر صرف یہ تھا کہ اس گروہ کو ختم کر کے دین داری کی تحریک کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے جس طرح پہلے کیا گیا۔ بدر کے بعد بھی ان کی سوچ یہی رہی۔ اللہ تعالیٰ انہیں خبردار فرماتے ہیں کہ آخر کار تم نے ناکام ہونا ہے اور تمہیں اپنے رویے پر بے حد افسوس ہو گا اس لئے کہ تم نے دنیا میں شکست سے دوچار ہونا ہے اور آخرت میں تمہارے لئے دردناک عذاب ہو گا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ﴿٣٦﴾ لِيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٣٧﴾ ع ۹

۱۸ ”جن لوگوں نے حق کو ماننے سے انکار کیا ہے وہ اپنے مال خدا کے راستے سے روکنے کے لئے صرف کر رہے ہیں اور ابھی اور خرچ کرتے رہیں گے، مگر آخر کار یہی کوششیں، ان کے لئے پچھتاوے کا سبب بنیں گی۔ پھر وہ مغلوب ہوں گے، پھر یہ کافر جہنم کی طرف گھیر لئے جائیں گے تاکہ اللہ گندگی کو پاکیزگی سے چھانٹ کر الگ کرے۔ اور ہر قسم کی گندگی کو ملا کر اکٹھا کرے۔ پھر اس پلندے کو جہنم میں جھونک دے۔ یہی لوگ اصلی دیوالیے ہیں۔“

محمد ابن اسحاق نے زہری وغیرہ سے نقل کیا ہے۔ ان لوگوں نے کہا کہ جب قریش کو بدر میں شکست ہوئی اور ان کا شکست خوردہ لشکر مکہ پہنچا اور ابو سفیان قافلے کو لے کر وہاں پہنچا تو عبد اللہ ابن ربیعہ، عکرمہ ابن ابو جہل، صفوان ابن امیہ چند دوسرے لوگوں کو لے کر ان لوگوں کے گھروں میں گئے جن کے آباؤ اور اولاد اور بھائی اس جنگ میں قتل ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے ابو سفیان ابن حرب اور ان تمام لوگوں سے بات چیت کی جن کے اموال اس قافلے میں تھے۔ انہوں نے کہا کہ اے اہل قریش، محمد ؐ نے تم سے خوب بدلہ لیا اور اس میں حد سے بڑھ گئے۔ اور تمہارے بہترین لوگوں کو قتل کیا۔ لہٰذا تم قافلہ تجارت کے اموال چندے میں دے دو تاکہ ہم بدر کا بدلہ لے سکیں۔ انہوں نے یہ تجویز قبول کر لی۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ انہی لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ ---- (۸: ۳۶) یہ جو بدر میں ہوا یا بدر کے بعد ہوا یہ دین کے دشمنوں کا معمولی حربہ ہے۔ یہ لوگ اپنے اموال اور اپنی قوتوں کو دین کی بیخ کنی کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ دین کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں اور یہ لوگ ہر جگہ اور ہر دور میں اسلام کے خلاف جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

یہ معرکہ ختم نہیں ہوا ہے' دین کے دشمن کسی بھی وقت آرام سے نہیں بیٹھے اور انہوں نے کبھی بھی ایک لمحہ بھر کے لئے بھی' حامیان دین کو آرام سے بیٹھنے نہیں دیا۔ اس لئے کہ اس دین کی واحد راہ ہی یہی ہے کہ وہ متحرک رہے اور جاہلیت پر ہجوم کرے۔ اہل دین کی صفت اور نصب العین ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ ہروقت متحرک رہیں اور اہل جاہلیت کی کمر توڑ کر رکھ دیں۔ اللہ کے جھنڈے کو اس قدر بلند اور غالب کر دیں کہ کسی دشمن دین کو اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو خبردار فرماتے ہیں جو اپنے مال دین کی راہ روکنے میں صرف کرتے ہیں ان کا یہ فعل ان کے لئے حیرت کا باعث ہو گا۔ یہ تمام نفقات جلد ہی اکارت جائیں گے اور اہل حق اسی دنیا میں غالب و فتح یاب ہوں گے۔ اور آخرت میں تو یہ لوگ جہنم کی طرف رواں دواں ہوں گے اور یہ ان کے لئے عظیم حیرت ہو گی۔

لِیَمِیْزَ اللّٰهُ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ وَ یَجْعَلَ الْخَبِیْثَ بَعْضَهٗ عَلٰی بَعْضٍ فَیَرْکُمَهٗ جَمِیْعًا فَیَجْعَلَهٗ فِیْ جَهَنَّمَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۸: ۳۷) "تاکہ اللہ گندگی کو پاکیزگی سے چھانٹ کر الگ کرے اور ہر قسم کی گندگی کو ملا کر اکٹھا کرے پھر اس پلندے کو جہنم میں جھونک دے۔ یہی لوگ اصلی دیوالیے ہیں۔"

یہ عمل کس طرح جاری ہو گا' یہ مال جو خرچ کیا جا رہا ہے یہ باطل کی قوتوں کو مجتمع کرتا ہے اور ان کو حق پر دست درازی کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ اور حق اس کا مقابلہ کرتا ہے اور سعی و جہد کا میدان گرم ہوتا ہے۔ حق ایک تحریک کی شکل میں آگے بڑھتا ہے اور باطل کا سر پھوڑ دیتا ہے۔ اس کشمکش اور کڑوے عمل میں ہی حق و باطل کا امتیاز ہو جاتا ہے۔ اہل حق اور اہل باطل متمیز ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ اسلامی صفوں میں کھڑے ہوتے ہیں' ان کے درمیان سے بھی کمزور لوگ چھٹ جاتے ہیں اور وہی لوگ رہ جاتے ہیں جو ثابت قدم' صابر اور بہادر اور اللہ کی نصرت کے مستحق ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ایسے ہی لوگ اس عظیم امانت کے اٹھانے کے قابل ہوتے ہیں۔ وہ کسی فتنے اور کسی بھی مشکل کی وجہ سے اپنے موقف سے نہیں ہٹتے۔ اسی عمل سے خباثت کے پلندوں کو جمع کر کے جہنم رسید کیا جا سکتا ہے اور یہی صورت اہل باطن کے خسران کا سبب بنتی ہے۔

قرآن کریم نے یہاں خباثت کو مجسم شکل میں پیش کیا ہے گویا اس کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور اسے جہنم میں لے جا کر ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے سوا اس کے ختم کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔

فَیَرْکُمَهٗ جَمِیْعًا فَیَجْعَلَهٗ فِیْ جَهَنَّمَ "اور ہر قسم کی گندگی کو ملا کر اکٹھا کرے اور پھر اس پندے کو جہنم میں جھونک دے"، کسی مفہوم کو اس طرح مجسم شکل میں پیش کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ احساس و شعور کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہ قرآن کریم کا ایک منفرد اسلوب کلام ہے۔

---○○○---

اب بات اس فیصلہ کن نکتے تک آ پہنچتی ہے اور اہل کفر کا انجام طے کر دیا جاتا ہے 'اور گندگی کے ڈھیر کو ٹھکانے لگانے کا طریقہ متعین کر دیا جاتا ہے ۔ اب بات کا رخ حضور اکرم کی طرف پھرتا ہے کہ اہل کفر کو آخری تنبیہ کر دو 'اور اہل ایمان کو بھی حکم دے دیا جاتا ہے کہ تمہارے لئے جو راہ اور طریقہ کار متعین کر دیا گیا ہے اس کو مضبوطی سے پکڑے رکھو ۔ جہاد و قتال ہی اسلام کا واحد راستہ ہے ۔ اور یہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اس کرۂ ارض سے ہر قسم کا فتنہ و فساد ختم نہیں ہو جاتا 'اور دین خالص غالب نہیں ہو جاتا ۔ اور تحریک اسلامی مطمئن اور مامون نہیں ہو جاتی ۔ اسی صورت میں اللہ تحریک کا حامی و ناصر ہو گا اور لوگوں میں سے کوئی بھی بذریعہ جنگ یا بذریعہ سازش تحریک کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا ۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَ اِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾

"اے نبی" ان کافروں سے کہو کہ اگر اب بھی باز آ جائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے اس سے درگزر کر لیا جائے گا' لیکن اگر یہ اسی پچھلی روش کا اعادہ کریں گے تو گزشتہ قوموں کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے 'وہ سب کو معلوم ہے ۔"

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے ۔ پھر اگر وہ فتنہ سے رک جائیں تو ان کے اعمال کا دیکھنے والا اللہ ہے اور اگر وہ نہ مانیں تو جان رکھو کہ اللہ تمہارا سرپرست ہے اور وہ بہترین حامی و مددگار ہے ۔"

کافروں کو متنبہ کر دو کہ تمہارا ٹھکانہ جس طرح یہاں ہے اسی طرح جہنم میں ہو گا 'یہ اللہ کا فیصلہ ہے ۔ تمہیں ناکامی ہو گی اور پھر حسرتیں ہی حسرتیں تمہاری قسمت میں ہیں ۔ خصوصاً اس مال پر جو تم نے ناحق خرچ کیا ۔ اور بڑی حسرت یہ ہو گی کہ دنیا میں جو گندگی اکٹھی ہو رہی ہے 'یہ ختم ہو گی اور آخرت میں تم سب انہی خباثتوں کے ساتھ جہنم رسید ہو گے ۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ وَ اِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ (۸ : ۳۸) "اے نبی' ان کافروں سے کہو کہ اگر اب بھی باز آ جائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے اس سے

درگزر کیا جائے گا' لیکن اگر یہ اسی پچھلی روش کا اعادہ کریں گے تو گذشتہ قوموں کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے' وہ سب کو معلوم ہے۔"

لہٰذا تمہارے لئے اب بھی موقع ہے کہ تم اپنے آپ کو اس انجام بد سے بچالو' اور اسلام کے خلاف اٹھ نہ کرو اور اس میں اپنے اموال تجارت کو جھونکنے سے بچالو' توبہ کا دروازہ اب بھی تمہارے سامنے ہے اور کھلا ہے۔ اللہ کی راہ کی طرف واپس آجاؤ۔ اللہ تمہاری تمام کوتاہیاں معاف کر دے گا۔ اور اگر اس تنبیہ کے بعد پھر یہ لوگ وہی رویہ اختیار کریں تو سنت الٰہیہ لازماً اپنی راہ لے گی۔ وہی ان کا انجام ہو گا جو اس راہ پر چلنے والوں کا زمانہ قدیم سے ہوتا چلا آرہا ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے دوستوں کو غلبہ اور اقتدار اعلیٰ نصیب ہوتا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اب اے اہل کفر تم ایک فیصلہ کن دوراہے پر کھڑے ہو۔ یہ فیصلے کی گھڑی ہے۔

اب اہل کفر کے ساتھ ہم کلام ختم کر کے اہل ایمان کو اسلامی انقلاب کا طریقہ کار بتلایا جاتا ہے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۳۹) وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْآ اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰكُمْ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (۴۰)

(۸: ۳۹ - ۴۰) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے۔ پھر اگر وہ فتنہ سے رک جائیں تو ان کے اعمال کا دیکھنے والا اللہ ہے۔ اور اگر وہ نہ مانیں تو جان رکھو کہ اللہ تمہارا سرپرست ہے اور وہ بہترین حامی و مددگار ہے۔"

یہ ہیں اسلامی جہاد کے حدود و قیود۔ یہ ہر جگہ اور ہر دور کے لئے ہیں۔ یہ احکام حضور ؐ کے زمانے کے ساتھ مخصوص نہ تھے۔ اس سورہ میں جہاد کے متعلق جو احکام آئے ہیں وہ اپنی آخری صورت میں نہیں آئے۔ اسلام کا قانون جنگ سورہ توبہ میں مکمل ہوا ہے جو ۹ھ ہجری میں نازل ہوئی۔ جیسا کہ ہم نے اس سورہ کے آغاز میں کہا ہے کہ اسلام ایک مثبت تحریک ہے اور وہ پوری انسانیت کے مقابلے میں وہی وسائل اختیار کرتی ہے جو اس وقت کے حالات کے مطابق مناسب ہوں۔ پھر یہ تحریک ایک مرحلہ وار تحریک ہے اور ہر مرحلے کے لئے اس کے مخصوص احکام ہیں اور ہر مرحلے کے واضح اہداف و تقاضے ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ بات فیصلہ کن ہے کہ یہ حکم وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (۸: ۳۹) "ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے۔" یہ تحریک اسلامی کے لئے دائمی حکم ہے اور جاہلیت کے مقابلے کے لئے ایک مستقل پالیسی ہے۔

اس سورہ کے آغاز میں' اس کے تعارف کے دوران ہم نے کہا تھا کہ دنیا میں اسلام آیا ہی اس لئے ہے کہ انسان کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے نجات دلائے اور طرح کہ کوئی اپنے جیسے بندوں کی غلامی نہ کرے' اسی طرح کوئی شخص اپنی خواہشات نفسانیہ کی غلامی بھی نہ کرے اور یہ مقصد صرف اس صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر صرف اللہ وحدہ کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ قائم کیا جائے اور صرف اللہ ہی اس کرۂ ارض پر تمام انسانوں کے حاکم اور

رب ہوں۔ یہ اعلان دراصل تمام انسانوں کی مروجہ حاکمیتوں اور اقتداروں کے خلاف اعلان بغاوت ہوتا ہے اور ان تمام صورتوں کے خلاف عملی جنگ ہوتی ہے جن میں کسی بھی شکل میں انسان کی حکومت انسان پر چل رہی ہو۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے اس پارے کے صفحات .....)

لہٰذا اس عظیم نصب العین کے حصول کے لئے دو باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ایک یہ کہ اس دین پر اعتقاد رکھنے والے لوگ فتنہ و فساد سے مامون اور محفوظ ہوں۔ وہ اس پوزیشن میں ہوں کہ اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے آزادی کا اعلان کر سکتے ہوں اور صرف اللہ وحدہ کی غلامی کا اعلان کر سکتے ہوں۔ ان پر انسانوں میں سے کسی کا اقتدار اعلیٰ نہ ہو۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ایک ایسا گروہ موجود نہ ہو اور جس کی اپنی قیادت نہ ہو اور جو اس نظریہ کو کسی خطہ ارض پر عملاً نافذ نہ کر رہی ہو' اور اس خطے کے وہ عملاً ہر طاغوت کے مقابلے میں صف آرا نہ ہو رہی ہو۔ اور وہ ایسی قوتوں کا سدباب نہ کرے جو ایسی جماعت کو دین اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے سے روکتی ہو' یا ایسے لوگوں پر تشدد کرتی ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ دنیا میں ایسی کوئی قوت نہ ہو اور اگر ہو تو اسے پاش پاش کر دیا جائے جو مقصد اولیٰ کی راہ میں سد راہ ہو۔یعنی ایسی تمام قوتوں کو ختم کر دیا جائے جو اس کرۂ ارض پر حکومت الٰہیہ کے قیام کی راہ میں رکاوٹ ہوں۔ غرض اس کرۂ ارض پر اللہ کا اقتدار اعلیٰ پوری طرح قائم کر دیا جائے۔

یہاں یہ ضروری ہے کہ ایک اہم سوال کا جواب دے دیا جائے۔ وہ یہ کہ قرآن کریم میں اللہ کا حکم ہے

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ "دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ راہ ہدایت گمراہی سے ممتاز ہو چکا ہے۔"

اس کے باوجود کہ اسلام کے نظریہ جہاد کے بارے میں ہم بحث کر آئے ہیں۔ خصوصاً استاذ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی محترم کی کتاب الجہاد فی الاسلام سے ہم نے جو طویل اقتباس دیا تھا' اس کے بعد اس موضوع پر کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہاں ہم چاہتے ہیں کہ اس مضمون کی قدرے مزید وضاحت کر دی جائے اس لئے اس نکتے پر اسلام کے مکار دشمن ہر طرف سے پروپیگنڈہ کر کے شبہات پھیلاتے ہیں۔

اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے' وہ یہ ہے کہ "دین پورے کا پورا اللہ کا ہو جائے' اس سے مراد یہ ہے کہ دین کے مقابلے میں ایسی مادی رکاوٹیں نہ رہیں جو اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کریں۔ اور یہ مادی رکاوٹیں دراصل ان نظاموں کی شکل میں ہوتی ہیں جو طاغوتی نظام ہوتے ہیں اور ان کے حالات ایسے ہوتے ہیں جن میں انسان جبر کے شکنجوں میں کسے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا نظام نہ ہو جس میں ماسوی اللہ کا اقتدار اعلیٰ نافذ ہو اور نہ ایسا نظام ہو جس میں لوگ اللہ کے سوا کسی اور کے مطیع فرمان ہوں۔ جب اس قسم کی تمام رکاوٹیں انسان کی راہ سے دور کر دی جائیں تو پھر انسان آزاد ہوں گے۔ ان پر کوئی بھی عقیدہ اختیار کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو گی۔ یعنی ایسی صورت باقی نہ ہو گی کہ اسلام کے نظریہ حیات کے مخالف کسی نظریہ کی پشت پر مادی قوت ہو جو عوام کو متاثر کر رہی ہو اور جو لوگ اسلامی نظریہ حیات کو قبول کرنا بھی چاہیں تو ڈر سے ایسا نہ کر سکتے ہوں۔ جو لوگ اختیار کر چکے ہوں ان کے لئے

کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو۔ اس طرح انسان تمام طاغوتی فتنوں سے عملاً آزاد ہو گا اس لئے کہ لوگ عقیدہ و نظریہ اختیار کرنے میں آزاد ہوں گے اور ان پر رب العالمین کے اقتدار اعلیٰ کے سوا کوئی اور اقتدار نہ ہو گا۔

یاد رہے کہ انسانیت اس وقت تک شرف و عزت کے مقام پر فائز نہیں ہو سکتی جب تک وہ ماسوا اللہ کے کسی اور اقتدار سے آزاد نہ ہو۔ صرف اسی صورت میں یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے کہ دین صرف اللہ کا ہو اور مسلمانوں کے لئے کوئی فتنہ نہ ہو۔

لئے جدوجہد کرتا ہے جس میں صرف اللہ کا اقتدار اعلیٰ قائم ہو۔

یہ ہے اس دین کا عملی اور مثبت طریقہ کار اور ان لوگوں کی رائے درست نہیں ہے جو کج فکر اور شکست خوردہ ہیں اور جن کو دھوکہ دے دیا گیا ہے۔ نہ ان مخلص اور پاکباز لوگوں کا موقف درست ہے جو اچھے مسلمان تو بننا چاہتے ہیں لیکن ان کی دینی فکر صاف نہیں ہے۔

الحمدللہ کہ اللہ نے ہمیں صحیح دینی فکر عطا کی ہے۔ اگر اللہ نہ چاہتا تو ہمیں یہ فکر نصیب نہ ہو سکتی۔ (ہنگرام ۱۲ ستمبر ۱۹۹۱)

---()()()---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ------ ۱۰

## سورۃ الانفال آیات

۴۱ --- تا --- ۷۵

## سورۃ التوبہ آیات

۱ --- تا --- ۹۲

# پارۂ نمبر۱۰ ایک نظر میں

اس پارے میں سورت انفال کا باقی حصہ ہے' جس کا ابتدائی حصہ نویں پارے میں گزر گیا ہے۔اس کے بقیہ حصے میں سورت توبہ کا بیشتر حصہ ہے۔یہاں ہم سورت انفال کے زیر بحث حصے کا تعارف کرائیں گے اور سورت توبہ کا تعارف آغاز سورت توبہ میں حسب دستور آئے گا۔ان شاء اللہ!

نویں پارے کے آخر میں ہم نے سورت انفال کے تعارف میں اس سورت کے مباحث کے اہم خطوط کو واضح کر دیا تھا۔اس سورت کے حصہ زیر بحث کے خدوخال وہی ہیں جو اس کے پہلے حصے کے تھے۔لیکن چونکہ موضوعات بحث مختلف ہیں' اس لئے ان میں تکرار بالکل محسوس نہیں ہوتا۔موضوعات کی ترتیب ایسی ہے کہ نظر آتا ہے کہ اس کا پہلا حصہ اس کا پہلا دور تھا اور یہ حصہ دوسرا دور ہے۔کیونکہ مباحث و موضوعات کے اندر بے حد ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

پہلے حصے کا آغاز یوں ہوا تھا کہ لوگ انفال کے بارے میں سوالات کرتے ہیں اور اس کے بارے میں مسلمانوں کے مابین تنازع کا ذکر ہوا اور اس کے نتیجے میں انفال کی ملکیت اور اختیار تقسیم رسول اللہ کی طرف لوٹا دیا گیا۔اور لوگوں سے کہا گیا کہ ذرا خدا کا خوف کرو اور بتایا گیا کہ حقیقی ایمان کیا ہوتا ہے؟ اور انہیں دعوت دی گئی کہ اس حقیقی ایمان کی سطح تک بلند ہو جاؤ۔اس کے بعد انہیں بتایا گیا کہ بدر کے تمام واقعات اللہ کی تقدیر و تدبیر کا مظاہرہ تھا' سب اسکیم اللہ کی تھی' امداد سب کی سب اللہ کی طرف سے تھی۔تمام معرکہ اس لئے درپیش ہوا کہ اللہ کا ارادہ ظاہر ہو' جہاں تک لوگوں کا تعلق ہے' وہ محض کردار تھے۔اور اللہ کی تقدیر کے آلات تھے۔اس معرکے کی حقیقت کے انکشاف کے بعد ان کو پکارا گیا کہ جنگ کے وقت ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا کرو اور انہیں اطمینان دلایا کہ اللہ تمہاری نصرت اور معاونت کرے گا۔اور تمہارے دشمنوں کو ان کی بداعمالیوں کی سزا دے گا۔اس کے بعد انہیں اللہ اور رسول اللہ کے ساتھ خیانت کرنے سے ڈرایا گیا۔فتنہ مال اور فتنہ اولاد کے بارے میں خبردار کیا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ وہ کفار کو اس انجام سے خبردار کر دیں جس سے وہ دوچار ہونے والے ہیں۔اور اگر وہ توبہ کر کے بظاہر دعوت کو قبول کرتے ہیں تو ان کے اقرار کو مان لیا جائے اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔اور اگر وہ مان کر نہ دیں تو پھر ان سے اس وقت تک لڑا جائے جب تک دنیا فتنے سے پاک نہیں ہو جاتی اور نظام زندگی صرف اسلامی نہیں ہو جاتا۔

یہ تو تھا خلاصہ پہلے حصے کا' اب ذرا دیکھئے کہ اس دوسرے حصے میں بھی بات کا آغاز غنائم ہی سے ہوتا ہے اور پھر انہیں ایمان باللہ کی طرف دعوت دی جاتی ہے اور اس کلام پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے جو اس دن نازل ہوا جس دن دوگروہوں کا آمنا سامنا ہوا۔اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ جن حالات میں یہ غنائم تمہارے ہاتھ لگے اس کے لئے اللہ کی تقدیر نے منصوبہ بندی کی تھی اور اس معرکے کے مواقف اور مشاہدات کے کچھ دوسرے پہلو پیش کئے جاتے ہیں جن سے اس تقدیر و تدبیر کی فعالیت نمایاں نظر آتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان دراصل دست قدرت

کا پردہ تھے اور بطور آلات کام کرتے تھے۔ اس کے بعد ان کو پکارا جاتا ہے کہ تم کو جب کفار کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑے تو میدان جنگ میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا کرو کیونکہ واقعات کی حقیقت تو تم جان چکے ہو' اللہ کو ہر وقت یاد رکھو اور اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کرو' اور ہر قسم کے تنازعات سے بچو کیونکہ تنازعات کی صورت میں تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور تم کمزور ہو جاؤ گے۔ پھر ان کو صبر کی تلقین کی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ جہاد میں کبر و غرور اور خود نمائی سے بچو۔ ان کو بتایا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی طرح رویہ نہ اختیار کرو جو گھروں سے گھمنڈ میں نکلے' طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے' حالانکہ ان کے اس فعل کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے۔ اور یہ لوگ شیطان کی مکاری کے جال میں پھنس گئے تھے۔ پھر ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ صرف اللہ پر بھروسہ کریں' جو قادر' حکیم اور مدبر ہے اور تمام کام اس کے حکم سے سرانجام پاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کو بتایا جاتا ہے کہ وہ کافرین ہیں اور مکذبین کو کس طرح پکڑتا ہے اور یہ پکڑ ان کے اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے۔ حصہ اول میں بتایا گیا تھا کہ فرشتے کس طرح میدان جنگ میں اترے تھے اور کس طرح کفار کی گردنیں اڑا رہے تھے اور ان کو آگے اور پیچھے سے مار رہے تھے' تو اس دوسرے حصے میں یہ کہا گیا کہ جب فرشتے کفار کی روح قبض کرتے ہیں' ان کو خوب مارتے ہیں اور حصہ اول میں کہا گیا کہ وہ برے حیوان ہیں اسی طرح اس حصے میں بتایا گیا کہ یہ لوگ عہد کی پابندی نہیں کرتے اور اس موقعہ پر ان کی صفت حیوانیت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس حصے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض احکام بابت قانون بین الاقوام دیئے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض قوانین حتمی ہیں اور بعض عبوری ہیں۔ اور بعض کی تفصیلات بعد میں سورت توبہ میں آئیں گی۔

یہاں تک تو یہ دوسرا حصہ پہلے حصے کے مماثل ہے۔ یہاں تک کہ موضوعات اور واقعات کی بھی ایک ہی جیسی ترتیب ہے۔ ہاں بعض موضوعات پر ایک جگہ کلام مجمل ہے اور دوسری جگہ مفصل ہے۔ مثلاً اسلامی کیمپ اور غیر اسلامی کیمپوں کے بارے میں بعض احکامات اور معاملات کو مفصل لایا گیا ہے۔

سورت کے آخر میں بعض متفرق موضوعات اور احکامات بھی دیئے گئے جو انہی موضوعات کا تکملہ بحث ہیں جو ان دونوں حصوں میں آگئے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان پر اپنا یہ احسان واضح کرتے ہیں کہ اس نے تمہارے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا ہے۔ حالانکہ فطرتاً یہ لوگ سرکش تھے اور اگر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو ان کے درمیان یہ تالیف قلب پیدا کرنا کارے دارد۔

اللہ اہل ایمان کو یہ اطمینان بھی دلاتا ہے کہ وہ ان کے لئے کافی ہے۔ اور وہ ان کا حامی و مددگار ہے۔ اس لئے رسول اللہ کے واسطہ سے ان کو حکم دیا جاتا ہے کہ اہل ایمان کو قتال پر ابھارو۔ اور انہیں یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ وہ اپنے ایمان کی وجہ سے اپنے سے کئی گنا کفار پر غالب ہوں گے۔ اس لئے کہ کفار نافہم قوم ہوتے ہیں اور نافہم اس لئے ہوتے ہیں کہ یہ ایمان نہیں لاتے اور سمجھداری ایمان کے بغیر آ ہی نہیں سکتی بشرطیکہ تم لوگ صبر کرو اور اللہ بھی صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

اس کے بعد قیدیوں کے فدیے کے مسائل و احکام ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اے نبی ابھی تم نے کفار کو روند نہیں ڈالا اور نہ ہی ان کی قوت اور شوکت کو توڑا ہے' لیکن تم نے فدیہ قبول کر لیا ہے' یہ اچھا نہیں کیا ہے۔ کیونکہ تمہاری قوت اور سلطنت ابھی مضبوط نہیں ہوئی ہے۔ لہذا یہاں بتایا جاتا ہے کہ مختلف حالات میں مختلف منہاج اختیار کیا جاتا ہے' لہذا تحریک

اسلامی کی پالیسی کے اندر لچک رکھی گئی ہے تاکہ مختلف حالات میں مختلف پالیسیاں اختیار کی جاسکیں ۔ یہاں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کریں؟ کس طرح انہیں ایمان کی طرف مائل کریں اور ان کے دلوں میں ایمان کو مزین کریں ۔ اگر یہ قیدی پھر خیانت کریں گے تو جس طرح اللہ نے پہلے انہیں شکست دی اسی طرح دوبارہ بھی شکست دے گا ۔ اور وہ رسول اللہ کے سامنے ذلیل ہوں گے ۔

آخر میں وہ اصول ذکر ہوتے ہیں جن کے اوپر جماعت مسلمہ کے افراد نے باہم تعلقات کو استوار رکھنا ہے ۔ نیز ان لوگوں کے ساتھ تعلقات رکھنے ہیں جو دارالاسلام کو تو نہیں آئے لیکن اسلام قبول کر لیتے ہیں ۔ پھر کفار کے ساتھ تعلقات کے احکام ' ان تمام احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا اجتماعی نظام کیا نوعیت رکھتا ہے؟ اور اسلامی نظام کی پالیسی کیا ہے؟ ان احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ اور اسلامی نظام ایک متحرک نظام ہے ۔ اور یہ اسلامی نظام کا بنیادی اصول ہے کہ وہ متحرک رہے گا ۔ اور اس کی اس حرکت سے ہی اس کے داخلی اور خارجی احکام وضع ہوتے رہیں گے ۔ اس لئے اسلامی نظام میں اسلامی نظریات کو تحریکیت اور عملی وجود سے جدا نہیں کیا جا سکتا ۔ اسلامی معاشرے کا ہر دور اور ہر قسم کے حالات میں ایک عملی وجود ضروری ہے ۔

اس مختصر تمہید میں اس قدر تبصرہ کافی ہے ' لہٰذا اب ہم آیات کی تفصیلات کو لیتے ہیں ۔

---ooo---

# درس نمبر ۸۵ ایک نظر میں

اس سبق کے آغاز اور سابق سبق کے خاتمے کے درمیان سلسلہ کلام مسلسل اور مربوط ہے۔ نویں پارے کے آخر میں قتال کا حکم دیا گیا تھا' اور اس سبق میں احکام قتال کا بیان جاری ہے۔ سابق پارے کے آخر میں خاتمہ کلام یہ تھا۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ (۳۸) وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۳۹) وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (۴۰) (۸:۳۸ تا ۴۰) "اے نبی ان کافروں سے کہو کہ اگر اب بھی باز آجائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے تو اس سے درگزر کر لیا جائے گا' لیکن اگر یہ اسی پچھلی روش کا اعادہ کریں گے تو گزشتہ قوموں کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے وہ سب کو معلوم ہے ..... اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ان کافروں سے جنگ کرو' یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے۔ پھر اگر وہ فتنہ سے رک جائیں تو ان کے اعمال کا دیکھنے والا اللہ ہے' اور اگر وہ نہ مانیں تو جان رکھو کہ اللہ تمہارا سرپرست اور بہترین حامی و مددگار ہے۔"

اس کے بعد اس سبق میں بات انہی اموال کے بارے میں چل رہی ہے کیونکہ اموال غنیمت بہرحال جنگ کے نتیجے میں ہاتھ آتے ہیں جس کے مقاصد اور اہداف آیت سابقہ کے آخر میں دیئے گئے تھے حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (۸: ۳۹) "یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ کا ہو جائے۔"

اس حقیقت کے باوجود کہ اس نص صریح کے ذریعے جہاد کے مقاصد کو متعین کر دیا گیا کہ یہ جہاد و قتال اللہ کے لئے ہے۔ یہ دعوت اسلامی کے مقاصد کے لئے ہے' اور اسلامی نظام حیات قیام کے لئے ہے۔ اور اس کے باوجود کہ انفال کی ملکیت کے بارے میں سورت کے آغاز ہی میں ایک دو ٹوک فیصلہ کر دیا گیا کہ یہ اللہ اور رسول اللہ کی ملکیت ہیں۔ اور مجاہدین کو ان کے بارے میں دلچسپی لینے سے پاک کر دیا گیا تاکہ ان کے اندر خلوص نیت پیدا ہو اور ان کی تمام حرکات و سکنات اللہ کے لئے ہو جائیں' لیکن ان سب امور کے باوجود اسلامی نظام حیات کے ان اموال کے بارے میں منظم اور حقیقت پسندانہ احکام بھی عطا کرتا ہے' کیونکہ اموال غنیمت موجود ہیں اور مستحق مجاہدین بھی موجود ہیں اور یہ مجاہدین اپنے اموال اور اپنی جانوں کو اللہ کی راہ میں کھپا رہے ہیں۔ وہ رضاکارانہ طور پر جہاد میں شریک ہیں اور اپنے اخراجات خود برداشت کر رہے ہیں اور دوسرے رضاکار مجاہدین میں سے جو لوگ نادار ہیں ان کے اخراجات بھی وہ خود برداشت

کرتے ہیں - پھر یہ لوگ اس معرکے میں اموال غنیمت پر قبضہ کرتے ہیں - اور اپنے صبر و ثبات اور سعی و جہاد کی وجہ سے یہ اموال حاصل کر پاتے ہیں اور ان کے دلوں کو اللہ نے ان اموال غنیمت کے بارے میں ہر قسم کی حرص و آز سے پاک بھی کر دیا ہے کہ ان کی ملکیت اللہ رسول اللہ کی طرف منتقل کر دی ہے - لہٰذا اب اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ان اموال میں سے ایسے لوگوں کو بھی حصہ دیا جائے جبکہ وہ سمجھتے ہوں کہ یہ اللہ اور رسول اللہ کی طرف سے خالص عطیہ ہے - اور یہ محض اس لئے دیا جا رہا ہے کہ ان لوگوں کی حقیقی ضروریات کو پورا کیا جا سکے - ان کے جذبات انسانی کی تسکین بھی ہو اور اس میں کوئی انفرادی یا اجتماعی چھینا جھپٹی بھی نہ ہو - کوئی تنازعہ نہ ہو کیونکہ سورت کے آغاز میں حکم دے دیا گیا ہے کہ اصل مالک اللہ و رسول اللہ ہیں -

یہ اسلامی نظام حیات ہے اور یہ انسانوں کے مزاج کو اچھی طرح جانتا ہے - اس لئے وہ اس متوازن اور جامع انداز میں اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہے - اس سے انسان کے جذبات کی تسکین بھی ہوتی ہے اور اس کی حقیقی حاجات بھی پوری ہوتی ہیں - اور اس کے ساتھ معاشرے کے افراد کے دل بھی ایک دوسرے سے صاف رہیں - اجتماعی عدل کے تقاضے بھی پورے ہوں اور اموال غنیمت باعث شر نہ ہوں بلکہ باعث رحمت ہوں -

---○○○---

# درس نمبر ۸۵ تشریح آیات

## ۴۱ --- تا --- ۵۴

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴۱﴾

"اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول ؐ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔ اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو فیصلے کے روز' یعنی دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کے دن ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی' (تو یہ حصہ بخوشی ادا کرو) اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

اس آیت کے بارے میں جو روایات آئی ہیں ان میں طویل فقہی اختلافات مذکور ہیں۔ پہلا اختلاف غنائم کے مفہوم و مدلول کے بارے میں ہے۔ پھر انفال کے مدلول و مفہوم کے بارے میں ہے کہ آیا یہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یا دو مختلف چیزیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ پھر چار حصے مجاہدین میں تقسیم کرنے کے بعد پانچویں حصے کے بارے میں بھی اختلافات ہیں کہ یہ حصہ کیسے تقسیم ہوگا۔ تیسرے یہ کہ پانچویں کے پانچویں حصے کے بارے میں جو اللہ کے لئے ہے کہ آیا یہ مستقل خمس ہے یا وہی ہے جو رسول ؐ اللہ کے لئے ہے۔ چوتھے یہ کہ آیا رسول اللہ کا حصہ خاص آپ کی ذات کے لئے ہے یا آپ کے بعد دوسرے ائمہ کو بھی یہ حق حاصل ہوگا۔ پانچویں یہ کہ قرابت داروں کا جو حصہ ہے کیا وہ اب بھی رسول اللہ کے قرابت داروں کے لئے باقی ہے یعنی بنوہاشم اور بنی عبدالمطلب کے لئے جیسے کہ آپ کے دور میں تھا یا اب یہ ختم ہے۔ اور اس کا تصرف بھی رسول اللہ اور آپ کے بعد خلفاء کو حاصل ہے۔ اور اسی قسم کے دوسرے فروعی اختلافات ہیں۔

فی ظلال القرآن میں ہم نے جو طریقہ اختیار کیا ہے' اس کے مطابق ہم ان فروعی فقہی اختلافات میں نہیں جاتے' کیونکہ مناسب یہی ہے کہ یہ فقہی اختلافات ان کتابوں میں پڑھے جائیں جو مخصوص طور پر ان موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ یہ تو

تھی ایک عمومی بات ۔ لیکن اموال غنیمت کے بارے میں خصوصاً اب جو صورت حالات موجود ہے وہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں ہمارے سامنے کوئی واقعی اور عملی مسئلہ موجود نہیں ہے ۔ جو حل طلب ہو' نہ کوئی عملی مسئلہ موجود ہے' نہ کوئی اسلامی مملکت موجود ہے' نہ کوئی ایسی جماعت موجود ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کر رہی ہو اور ان کے ہاتھ کچھ مال غنیمت لگ گیا ہو ۔ اور اسے ضرورت پیش آگئی ہو کہ ان کو کس طرح تقسیم کیا جائے ۔ زمانہ اس طرح پھر گیا کہ اس دین کی حالت وہ ہو گئی جس طرح یہ پہلے دن دنیا میں اتارا گیا تھا ۔ اس وقت لوگ مکمل طور پر جاہلیت کی طرف لوٹ گئے تھے ۔ وہ اللہ کے ساتھ کئی ارباب کو شریک کر رہے تھے ۔ یہ ارباب لوگوں کو قانونی نظام دے رہے تھے ۔ اس دین کی حالت بعینہ ابتدائی حالات جیسی ہوگئی ہے اور ہمارا فرض یہ ہے کہ لوگ اس میں نئے سرے سے داخل ہوں ۔ وہ نئے سرے سے کلمہ شہادت لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھیں ۔ اللہ کو وحدہ لاشریک اور واحد حاکم مطلق سمجھیں ۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ہدایات حاصل کریں اور ایک ایسی جماعت کی صورت میں زندگی بسر کریں جس کا نصب العین یہ ہو کہ یہ دین از سر نو قائم ہو جائے اور ایسے تمام لوگ اپنی اس جدید جماعت اور قیادت کے پوری طرح وفادار ہوں اور ایسی وفاداری اور اطاعت وہ کسی بھی جاہلی قیادت و شہادت کے ساتھ نہ رکھیں ۔

یہ ایک واقعی اور زندہ مسئلہ ہے جو اس دین کو درپیش ہے ۔ ابتدائی طور پر اس کے سوا اس دین کو کوئی اور مسئلہ درپیش نہیں ہے ۔ یہاں اموال غنیمت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے کیونکہ اس وقت کسی جگہ بھی جہاد کا عمل جاری نہیں ہے بلکہ کسی بھی جگہ اسلام کو کوئی انتظامی مسئلہ درپیش نہیں ہے نہ داخلی تعلقات میں اور نہ خارجی تعلقات میں اور اس کی وجہ بہت سادہ اور سمجھ میں آنے والی ہے ۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں کسی بھی ملک میں اسلامی معاشرہ موجود نہیں ہے جس کا مستقل وجود ہو اور جس کے اندر باہمی تعلقات کے لئے اور دوسرے معاشروں کے ساتھ اس کے روابط کے لئے کچھ احکام و ہدایات کی ضرورت ہو ۔

اسلامی نظام حیات ایک عملی نظام ہے ۔ اسلامی نظام ایسے مسائل و قضایا سے بحث ہی نہیں کرتا جو عملاً موجود نہ ہوں ۔ اس لئے وہ ایسے مسائل سے بحث نہیں کرتا جو عملاً موجود نہ ہوں ۔ یہ اس قدر حقیقت پسندانہ 'عملی نظام ہے جو اس قسم کی لاحاصل بحثوں سے اجتناب کرتا ہے ۔ محض خیالی باتیں کرنا اس نظام کا طریقہ کار نہیں ہے ۔ یہ ان نکمے لوگوں کا کام ہے جو فارغ ہوتے ہیں اور جن کے سامنے کرنے کا کوئی عملی کام نہیں ہوتا ۔ اور اپنے خالی اوقات کو وہ محض نظری اور خالص تصورات باتوں میں صرف کرتے ہیں ۔ ایسے موضوعات جن کا عملی وجود اس دنیا میں نہیں ہوتا ایسے لوگوں کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی مساعی کو اور اپنی قوتوں کو اسلامی نظام حیات کے قیام کے کام میں کھپائیں ۔ اور ایک اسلامی معاشرہ عملاً وجود میں لائیں ۔ اور یہ کام بھی وہ اسلامی نظام کے قیام کے طریقہ کار کے مطابق سرانجام دیں ۔ یعنی سب سے پہلے وہ لوگوں کو کلمہ شہادت کی طرف بلائیں ۔ لوگ دین اسلام میں از سر نو داخل ہونے کا اعلان کریں ۔ جس طرح مکہ مکرمہ میں سب سے پہلے اس کام کا آغاز ہوا تھا ۔ ایک تحریک برپا ہوئی تھی' اس کی اپنی ایک قیادت تھی' اور یہ جماعت اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے جاہلی معاشرے سے کٹ کر آئی تھی ۔ پھر اس کے اور اس جاہلی معاشرے کے درمیان کشمکش برپا ہوئی اور اس کے بعد اللہ نے حق کو سربلندی نصیب فرما دی اور ایک اسلامی ریاست قائم ہوئی ۔ تب جا کر ایسے لوگوں کو غنائم اور انفال کے مسائل کی ضرورت ہوگی جب وہ عملاً ان کے سامنے پڑے ہوں گے تاکہ لوگوں کے درمیان معاملات کا تصفیہ اسلامی

قانون کے مطابق ہو' اور جب اسلامی ریاست قائم ہو گی تو پھر اس کے اور دوسری ریاستوں کے درمیان تعلقات کے لئے احکام سامنے آئیں گے ۔ اب دور جدید میں اگر کچھ نئے مسائل پیدا ہو گئے تو وقت کے مجتہدین ان کے لئے حل تلاش کریں گے ' خواہ یہ مسائل داخلی ہوں یا خارجی ۔ صرف اسی وقت اجتہادات کی کوئی قدر و قیمت ہو گی 'کیونکہ یہ ایک حقیقت پسندانہ اور واقعی اجتہاد ہو گا ۔

ہم چونکہ اسلامی نظام حیات کے اس عملی پہلو کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں ۔اس لئے ہم یہاں غنائم و انفال کے بارے میں ان فقہی اختلافات میں نہیں پڑتے جو ان کے بارے میں فقہی کتابوں میں موجود ہیں ۔ایک وقت ضرور آئے گا کہ ان کے بارے میں تحقیقات ہوں گی ۔اسلامی معاشرہ موجود ہو گا اور وہ عملاً جہاد پر عمل پیرا ہو گا اور اس میں غنائم و انفال کے احکام ہمارے سامنے آئیں گے ۔ہمیں چاہئے کہ ہم تحریک اسلامی کے تاریخی عمل کو دیکھتے ہوئے ایمانی اصول کو اپنائیں اور اسلام کے منہاج تربیت کو پیش نظر رکھیں ۔اس کتاب کا یہ ایک دائمی خاصہ ہے جو مرور زمانہ سے متاثر نہیں ہوتا ۔ دوسرے جو بھی طریق کار اور مسائل ہیں وہ اس کی تشریحات ہیں حکم عام جو اس آیت سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے :

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (۸ : ۴۱) "اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول ؐ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے ۔"

خلاصہ حکم یہ ہے کہ غنیمت کی ہر چیز سے چار حصے مجاہدین میں تقسیم ہوں گے اور پانچویں حصے میں رسول اللہ کو اختیار ہو گا کہ جس طرح چاہیں تصرف کریں اور آپ کے بعد ایسے سربراہان مملکت کو یہ اختیار ہو گا جو شریعت پر قائم ہوں اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرتے ہوں اور وہ اس حصے کو ان مصارف پر خرچ کریں گے ۔اللہ کی راہ میں' رسول ؐ اللہ پر' رشتہ داروں پر' یتیموں پر' مسکینوں پر ۔اس طرح یہ مد موجودہ لوگوں کی حقیقی ضروریات کو پورا کرے گی ۔یہاں بس اس قدر کہنا ہی کافی ہے ۔

اس کے بعد کوئی دائمی ہدایت یہ ہے یعنی آیت کا دوسرا حصہ ۔

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۸ : ۴۱) "اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو فیصلے کے روز' یعنی دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کے دن ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی' (تو یہ حصہ بخوشی ادا کرو) اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔"

ایمان کی بعض علامات ہوتی ہیں جو بتاتی ہیں کہ یہ شخص مومن ہے ۔ اللہ تعالیٰ اہل بدر کے ایمان کے اعتراف کے لئے بھی دلیل یہ دیتا ہے کہ انہوں نے غنائم و اموال کے بارے میں اللہ کی شریعت کو چونکہ تسلیم کر لیا ہے اس لئے وہ مومن ہیں حالانکہ اہل بدر اہل بدر تھے اور وہ مومن اس لئے بن گئے کہ انہوں نے یوم الفرقان میں اللہ کے بندے پر نازل ہونے والے احکام کو تسلیم کیا ۔گویا قانون شریعت کو تسلیم کرنا اللہ کے نزدیک شرط ایمان ٹھہرا اور اطاعت شریعت کو ان کے

ایمان کا مقتضا قرار دیا تاکہ معلوم ہو کہ ان کا اعلان ایمان درست ہے -
غرض ایمان کا مفہوم قرآن کریم میں بہرحال دوٹوک ہے 'اس میں کوئی لچک نہیں ہے ' نہ اس میں تاویل اور پیوند کاری کی ضرورت ہے - نہ ان موشگافیوں کی ضرورت ہے جو بعض میں فقہی مباحث کی وجہ سے پیدا کر دی گئیں - اس وقت جبکہ فقہی مذاہب وجود میں آئے اور انہوں نے نصوص کے اندر طرح طرح کی تاویلات پیدا کیں اور لوگوں نے ان فقہی اور دینی موضوعات پر منطقی اور کلامی انداز میں مفروضوں کی شکل میں جدل و جدال شروع کر دیا - بعد کے ادوار میں انہی فقہی اور کلامی اختلافات کی وجہ سے ہر فرقے نے دوسرے پر الزامات لگائے اور دوسروں نے ان الزامات کے جوابات دیئے - پھر لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف کفر کی نسبت کرنا شروع کر دی اور دوسروں نے جواب دینا شروع کر دیا اور یہ تمام جدل و جدال دین کے واضح اصولوں پر قائم نہ تھا 'بلکہ یہ سب مباحث ذاتی اغراض ' ہوا و ہوس اور مخالفین کے عناد اور دشمنی پر مبنی تھا - اور اب کیا تھا کفر کے فتووں کے بازار گرم ہوئے اور فروعی مسائل پر بحثیں ہوئیں - پھر ان الزامات کا جواب تشدد سے دیا جانے لگا اور لوگ ان الزامات میں بہت ہی سختی کرنے لگے - یہ غلو ان خاص تاریخی اسباب و عوامل کی وجہ سے ہوتا رہا - دین اسلام تو وہ بالکل واضح ہے - اس میں کوئی لچک نہیں ہے ' نہ اس میں پیوند کاری ہے اور اس میں غلو ہے - حدیث میں آتا ہے - لیس الایمان ........ "ایمان محض تمناؤں کا نام نہیں ہے 'بلکہ ایمان یہ ہے کہ وہ دل میں بیٹھ جائے اور عمل اس کی تصدیق کرے -" ایمان کے قیام کے لئے یہ ضروری ہے کہ اللہ نے جو قانون بنایا ہے اس کو عملاً زندگی میں نافذ کیا جائے اور کفر یہ ہو گا کہ اللہ نے جو قانون بنایا ہے ' اسے ترک کر دیا جائے ' اللہ کے قوانین کے ماسوا دوسرے قوانین کے مطابق فیصلے کرنا اور شریعت کے سوا دوسری عدالتوں سے فیصلے کرانا کفر ہے - خواہ چھوٹے معاملات ہوں یا بڑے معاملات ہوں - یہ ہیں خدا و رسول کے سادہ ' دوٹوک اور واضح احکام - اس کے ماسوا جو بھی آراہوں گی وہ محض تاویلات اور مذہبی اختلافات کا نتیجہ ہیں -
یہ ہے ایک واضح مثال 'جس میں اللہ تعالیٰ واضح ' دوٹوک 'تاکیدی انداز میں فرماتے ہیں -

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ (۸: ۴۱) "اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول ؐ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے - اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو فیصلے کے روز یعنی دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کے دن ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی -" بعینہ یہی مثال ہے ان تمام ہدایات و اعلانات کی جو قرآن مجید میں ایمان اور اس کی حدود و قیود اور اس کے تقاضوں کے بارے میں بالکل واضح طور پر دی گئی ہیں اور جو بالکل دوٹوک اور فیصلہ کن ہیں -
اللہ تعالیٰ نے اموال غنیمت کی ملکیت ان لوگوں سے لے کر جنہوں نے ان کو جمع کیا تھا ' اللہ اور رسول اللہ کے ہاتھ میں دے دی تھی - جیسا کہ سورت کے آغاز میں بصراحت بتلایا گیا تاکہ اس معاملے کا مکمل اختیار اللہ اور رسول اللہ کی طرف

منتقل ہو جائے اور مجاہدین کے دل اور عزائم ان آلودگیوں سے بالکل پاک ہو جائیں جن کا تعلق اس دنیا سے ہے۔ اور اپنا معاملہ اول سے لے کر آخر تک اللہ اور رسول اللہ کے سپرد کر دیں۔ اللہ ان کا رب ہے اور رسول ان کا قائد ہے اور وہ صرف اللہ کے لئے اس معرکہ میں شریک ہوں، صرف اللہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں۔ اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے وہ اپنی روح، اپنے جسم اور اپنے اموال میں اللہ و رسول اللہ کے احکام کو تسلیم کریں۔ اور اپنے تمام امور میں اللہ و رسول اللہ کے فیصلوں کو بے چون و چرا تسلیم کریں۔ یہ ہے حقیقت ایمان۔ اس سورت کے آغاز میں جب لوگوں سے ان کا حق ملکیت غنیمت لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا جا رہا تھا تو ان سے یوں خطاب کیا گیا تھا۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوْا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۸ : ۱) "تم سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں کہو یہ انفال تو اللہ اور اس کے رسول کے ہیں، پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اگر تم مومن ہو۔"

اور اس کے بعد جب انہوں نے سر تسلیم خم کر لیا اور اللہ کے اس حکم پر راضی ہو گئے ان کے دلوں میں حقیقت ایمان جاگزیں ہو گئی تو اللہ نے پانچ حصوں میں سے چار پھر ان تک لوٹا دیئے اور پانچویں حصے کو علی حالہ چھوڑ دیا کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح چاہیں تصرف فرمائیں۔ اس حصے سے جماعت مسلمہ کے مستحقین رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کیا جائے گا۔ اب چار حصے جب ان کی طرف لوٹائے گئے تو اس وقت ان کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ اللہ کا مال ہے۔ یہ جہاد اور فتح و نصرت کی وجہ سے ان کی ملکیت نہیں بن گیا۔ کیونکہ جہاد و غزئی اللہ کے لئے ہے اور فتح و نصرت ان کی نہیں اللہ کے دین کی ہے۔ یہ جو اس کے مستحق ہو گئے ہیں تو یہ محض عطائے الہٰی ہے۔ جیسا کہ فتح و نصرت بھی عطائے الہٰی ہے۔ کیونکہ اس معرکے کی تمام اسکیم اللہ نے اپنے ہاتھوں سے تیار فرمائی اور مکرر ان کے ذہن میں یہ بات بٹھائی گئی اللہ کے اس جدید حکم کو تسلیم کرنا بھی امر الہٰی کا تقاضا ہے اور عین ایمان ہے۔ یہ ایمان کی شرط ہے۔ یہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ ذرا دوبارہ غور کیجئے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ (۸ : ۴۱) "اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول ؐ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔ اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو فیصلے کے روز یعنی دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کے دن ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی۔"

یہ آیات مسلسل ایک واضح، دو ٹوک اور فیصلہ کن اصول کو متعین کرتی ہیں جس کا تعلق اصول دین سے ہے۔ ان میں ایمان کے مفہوم و مدلول کو متعین کیا گیا ہے۔ ایمان کی حقیقت اس کی شرائط اور اس کے تقاضوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لفظ "عبدنا" کا استعمال کیا گیا ہے۔"اپنے بندے" اور یہ لفظ اس صورت حال کے درمیان استعمال ہوا ہے جبکہ ابتداء تمام انفال و غنائم کا اختیار رسول اللہ کو دے دیا گیا اور پھر چار حصوں کو چھوڑ کر پانچویں حصے کا اختیار آپ کو دے دیا گیا (علی عبدنا) میں بھی یہی اشارہ ہے کہ عبدیت اور بندگی بھی حقیقت ایمان کا ایک حصہ ہے اور (عبدنا) کا مقام وہ بلند مقام ہے جس تک کبھی کوئی بندہ پہنچ سکتا ہے۔اور یہ بات اس ماحول میں کی جا رہی ہے جس میں حضور اکرم ؐ کو تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ دنیا کے انتظامی اختیارات بھی دیئے جا رہے ہیں ----- حقیقت یہ ہے کہ یہ مقام فی الواقعہ ایک بلند مقام ہے جس تک کبھی کوئی پہنچ سکتا ہے کہ وہ دین دنیا کے اختیارات کا بھی مالک ہو اور مقام عبدیت پر بھی فائز ہو۔

صرف اللہ کی بندگی ہی انسان کو اپنی خواہشات کی بندگی کے مقام سے بلند کر سکتی ہے۔ اسی طرح یہی بندگی انسان کو دوسرے انسانوں کی بندگی سے بچا سکتی ہے۔اور انسان انسانیت کی اعلیٰ شرف و برتری پر صرف اسی صورت میں فائز ہو سکتا ہے جب وہ اللہ کے سوا تمام لوگوں کی غلامی سے محفوظ ہو۔

جو لوگ اللہ وحدہ کے غلام بننے سے سرتابی کرتے ہیں' وہ اسی وقت ذلیل ترین غلامیوں کا جوا پہن لیتے ہیں۔وہ اپنی خواہشات نفسانیہ اور سفلی میلانات کے غلام بن جاتے ہیں اور اس کا فوری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے اپنی مخلوقات میں سے صرف انسان کو جو وصف دیا تھا کہ وہ متحرک بالارادہ ہے ان کا یہ وصف اسی وقت ختم ہو جاتا ہے جب ان کو اپنے ارادے پر کنٹرول نہیں رہتا تو وہ مطلق حیوان بن جاتے ہیں بلکہ وہ ان حیوانات سے بھی ذلیل تر ہو جاتے ہیں اور وہ اسفل سافلین بن جاتے ہیں جبکہ اللہ نے انہیں احسن تقویم میں پیدا کیا تھا۔

نیز جو لوگ اللہ کی غلامی سے روگردانی کرتے ہیں وہ دوسری خطرناک غلامیوں میں جکڑ جاتے ہیں۔وہ اپنے جیسے انسانوں کی غلامی اختیار کرتے ہیں۔یہ انسان آقا ان لوگوں کی زندگیوں کو اپنی خواہشات اور مقاصد کے مطابق ڈھالتے ہیں۔ان کی نظر کوتاہ جن نظریات کو پا سکتی ہے وہ ان لوگوں کی راہنمائی ان نظریات کی طرف کرتے ہیں اور ان نظریات کے پیچھے صرف یہ نظریات اور مقاصد ہوتے ہیں کہ ان کی وجہ سے انسان آقا اپنی برتری قائم کرتے ہیں اور لوگوں کی زندگی جاہلانہ نقائص سے پر اور خود سری پر مبنی ہوتی ہے۔

یہ انسان آقا ان کے لئے اصول موضوعہ تجویز کرتے ہیں اور کہتے ہیں اور انہیں باور کراتے ہیں کہ ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ان کو چاہئے کہ وہ ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور ان اصولوں کی مخالفت نہ کریں۔ بعض اصول تاریخی جدلیات پر مبنی ہیں' بعض اقتصادی حقائق پر مبنی ہیں 'بعض طبیعی ارتقاء پر مبنی ہیں۔ غرض یہ اور اس قسم کی دوسری غلامیاں جو مادیت نے انسان پر مسلط کر دی ہیں اور انسان ان کی دلدل میں اس طرح پھنس گیا ہے کہ نہ وہ ان سے نکلنا چاہتا ہے اور اگر چاہے تو اسے کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ اور وہ ان خود ساختہ اٹل اصولوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اور خوفناک جبریت کے تحت زندگی بسر کر رہا ہے۔

اس کے بعد یہاں دوسرا لفظ بھی نہایت ہی اہم ہے۔یہاں بدر کے لئے یوم الفرقان کہا گیا ہے۔يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ (۸ : ۴۱) "فیصلے کے دن یعنی دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کے دن" حقیقت یہ ہے کہ بدر کا دن فی الواقعہ ایک فیصلہ کن دن تھا۔اس دن کے بارے میں پوری اسکیم اللہ نے تیار کی تھی اور اللہ کی نصرت و ہدایت کے

مطابق اس میں کام ہوا۔ یہ دن حق و باطل کے درمیان فیصلے کا دن تھا۔ یہی بات مفسرین نے اجمالاً کہی ہے۔ یہ دن فیصلے کا دن تھا۔ اس لئے کہ اس کے نتائج نہایت ہی گہرے ' دور رس اور ہمہ گیر تھے۔

یہ دن عملاً حق و باطل کے درمیان فیصلے کا دن تھا۔ لیکن اس دن فیصلہ اس حقیقی سچائی اور باطل کے درمیان تھا۔ جس پر زمین و آسمان عملاً برپا ہیں۔ اس سچائی پر تمام اشیاء اور تمام زندہ مخلوقات کی فطرت استوار ہوئی ہے۔ وہ سچائی جو اللہ کی ذات کو وحدہ تسلیم کرتی ہے ' اللہ ہی کو بادشاہ تسلیم کرتی ہے اور اسے اس عالم کا مدبر متصرف تسلیم کرتی ہے ' وہ سچائی جو یہ سکھاتی ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ کی بندہ و غلام ہے۔ اس کائنات کے آسمان اس کی زمین ' اس کی چیزوں اور اس کی زندہ مخلوق سب میں اللہ وحدہ متصرف ہے۔ اور یہ سب چیزیں اللہ کی الوہیت ' اس کی بادشاہت اور اس کی تکوینی حکومت کے تحت ہیں اور کوئی اس سے سرتابی نہیں کر سکتا۔ اور باطل کون سا باطل ہے؟ اس سے مراد وہ باطل ہے جو کھوٹا ہے اور جو اس وقت یوم بدر کے وقت دنیا پر چھایا ہوا تھا ' اور اس نے اس عظیم سچائی کو دبایا ہوا تھا۔ اور اس باطل نے کرۂ ارض کے اوپر ایسی طاغوتی طاقتیں پیدا کر دی تھیں جو لوگوں کی زندگی کے معاملات میں جس طرح چاہتی تھیں ' فیصلے کرتی تھیں۔ اس نظام باطل میں یہ لوگوں کی خواہشات ہی تھیں جو اشیاء و احیاء سب کی قسمتوں کے فیصلے کرتی تھیں۔

یہ تھا وہ عظیم فیصلہ جو اس دن ہوا۔ یعنی عظیم بدر کے دن یعنی اس دن اس عظیم سچائی اور اس ہمہ گیر باطل کے درمیان فیصلہ کن معرکہ پیش آیا۔ ان کے درمیان یوم بدر میں ایسا فیصلہ اور فاصلہ ہوا کہ آئندہ کبھی ان کے درمیان کوئی التباس اور اشتراک نہ ہوا۔

یہ دن حق و باطل کے درمیان نہایت ہی وسیع اور گہرے معنوں میں ایک فیصلہ کن دن تھا۔ نہایت ہی دقیق اور لطیف معنوں میں۔ انسان کے ضمیر کی گہرائیوں میں حق و باطل کے درمیان فیصلہ تھا۔ انسانی تصورات اور شعور کے میدان میں وحدانیت اور شرک کے درمیان یہ فرقان تھا۔ انسانی اخلاق اور طرز عمل میں حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن دن تھا ' اللہ کی عبادت اور بندگی میں حق و باطل کے درمیان یہ فیصلہ کن معرکہ تھا۔ توحید اور شرک کی تمام شکلوں اور صورتوں کے درمیان یہ فیصلہ کن دن تھا ' چاہے اس کا تعلق اشخاص سے ہو ' اقتدار سے ہو ' رسم و رواج اور عادات سے ہو یا کسی اور شکل سے ہو۔ اور ظاہری واقعہ کے اعتبار سے بھی اس حق اور اس باطل کے درمیان یہ فیصلہ کن دن تھا۔ اس دن خواہشات اور اشخاص کی بندگی اور اقتدار اور تہذیب کے درمیان جنگ تھی ' ایک طرف ذاتی اغراض تھیں اور دوسری طرف الٰہی قوانین تھے اور ایک طرف صرف اللہ وحدہ کی حاکمیت ' الوہیت اور اقتدار اعلیٰ کے نظریات تھے اور دوسری جانب انسان پر انسانوں کی برتری تھی۔ چنانچہ یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ کے سوا کوئی نفع و نقصان دینے والا نہیں ہے۔ اس کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے ' اس کے سوا کوئی قانون ساز نہیں ہے۔ اب لوگوں کے سربلند ہو گئے۔ اب وہ کسی غیر کے سامنے نہ جھکتے تھے ' لوگ سب کے سب باہم مساوی قرار پائے۔ ان پر اگر کوئی برتری تھی تو اللہ اور اس کے قانون کی تھی۔ اب لوگ غول در غول اٹھتے اور آزادی کے جھنڈے بلند کرتے ' اور ظالموں اور سرکشوں سے نجات پاتے۔

یہ دن تحریک اسلامی کی تاریخ میں دو ادوار کے درمیان ایک حد فاصل تھا۔ پہلے تحریک صبر اور برداشت کے اصولوں پر عمل پیرا تھی ' وہ اپنی قوتوں کو مجتمع کر رہی تھی۔ اب تحریک اسلامی کی قوت ' آغاز کار اور ترقی کا دور شروع ہوا ' اسلام نے پوری زندگی کے لئے ایک جدید تصور دیا۔ انسانی معاملات کے طے کرنے کے لئے ایک جدید نظام دیا۔ ایک جدید اجتماعی

نظام پیش کیا گیا۔ حکومت کے لئے ایک نیا سیاسی نظام اور دستور تجویز ہوا۔ اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب کوئی انسان دوسرے انسان کا غلام نہ ہو گا۔ سب کے سب صرف اللہ رب العالمین کے غلام ہوں گے۔ اور اب ان طاغوتی قوتوں کو زندہ رہنے کے لئے کوئی جواز نہیں ہے جنہوں نے اللہ کے حق حاکیت کو غصب کر لیا ہے۔ اسلام کے ایسے نظریہ کے لئے ضروری تھا کہ اس کی اپنی قوت ہو' وہ ایک تحریک ہو' وہ اقدامی پوزیشن رکھتا ہو اور آگے بڑھنے کی سکت اس میں ہو' اس لئے کہ اسلام ایسے نظریات رکھتے ہوئے خاموش تماشائی بن کر رہنے کی پوزیشن اختیار نہیں کر سکتا اور پھر غیر معین عرصے تک۔ اسلام کا منشا یہ نہ تھا کہ وہ اس کے حاملین کے لئے محض ایک تصور اور عقیدہ رہے۔ یا اس کا ظہور چند مراسم عبودیت ہی میں ہو یا اس کے مخصوص انفرادی اخلاقی ضوابط ہوں' لہذا اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ جدید اخلاقی تصورات دے' وہ جدید نظام دے' جدید حکومت دے اور ایک جدید معاشرے کی بنیاد رکھے' اور یہ سب مثلاً ہر عملی ہوں۔ پھر وہ اپنے ان اہداف کے حصول کے لئے وہ تمام رکاوٹیں دور کر دے جو ان مقاصد کی راہ میں رکاوٹ بنیں اور مذکورہ بالا اصول کو مسلمانوں کی زندگی میں نافذ نہ ہونے دیں یا اس کرۂ ارض پر اسے رائج نہ کرنے دیں حالانکہ اسلام اللہ کی طرف سے آیا ہی اس لئے تھا کہ دنیا میں نافذ ہو۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے سورت انفال ص --)

یہ دن پوری انسانی تاریخ میں بھی یوم الفرقان تھا۔ اس لئے کہ اس سے قبل جو انسانیت کرۂ ارض پر بستی تھی' مجموعی اعتبار سے وہ اس انسانیت سے مختلف تھی۔ جو اس دن کے بعد آنے والے نظام میں نمودار ہوئی۔ یہ جدید تصور اور نظریہ جس کے نتیجے میں یہ جدید نظام تشکیل پایا یا اس جدید نظام نے انسان کو جو تصورات عطا کئے اور اس کے نتیجے میں جو نیا انسان نمودار ہوا' یہ دراصل پوری انسانیت کے لئے ایک نیا جنم تھا۔ یہ اقدار جن پر پوری زندگی استوار ہوتی ہے' اسی کی اساس پر اجتماعی نظام بھی تیار ہوتا ہے اور اسی کی اساس پر قانونی نظام بھی تیار ہوتا ہے۔ یہ تمام امور جنگ بدر کے صرف مسلمانوں کا اثاثہ نہ رہے جبکہ جدید اجتماعی نظام قائم ہو گیا تھا بلکہ آہستہ آہستہ یہ اقدار تمام انسانیت کا اثاثہ بن گئیں۔ اس تبدیلی سے انسانیت جس طرح دارالاسلام کے اندر متاثر ہوئی' اسی طرح دارالاسلام کے باہر بھی انسانیت اس سے متاثر ہوئی۔ اسلام کی دوستی میں بھی لوگ اس سے متاثر ہوئے اور اسلام کی دشمنی میں بھی لوگ اس سے متاثر ہوئے۔ وہ صلیبی قوتیں جنہوں نے مغرب کی جانب سے اسلام کے خلاف لشکر کشی کی اور جن کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسلام کے خلاف جنگ کریں اور اسلام کی برتری کو ختم کر دیں' وہ اسلامی معاشرے کے رسم و رواج اور اصول و قوانین سے متاثر ہوئے۔ یہاں سے واپس جا کر انہوں نے مغرب میں رائج جاگیردارانہ نظام کے خلاف جدوجہد شروع کر دی' اس لئے کہ انہوں نے اگرچہ حقیقی اسلامی نظام تو نہ دیکھا تھا مگر اسلامی اصولوں کے جو آثار شرق اوسط کے معاشرے میں باقی تھے' ان سے وہ متاثر ہوئے۔ تاتاری جنہوں نے مشرق سے اسلام پر حملے شروع کئے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیں اور اس کام پر ان کو یہودیوں اور صلیبیوں نے آمادہ کیا تھا۔ وہ اسلامی نظریات سے متاثر ہو گئے اور انہوں نے اسلام کو مزید نئے علاقوں تک پھیلایا اور انہوں نے ایک ایسا نظام حکومت یعنی اسلامی خلافت قائم کیا جو پندرھویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک یورپ کے دل میں قائم رہا' الغرض بدر کے بعد تمام انسانی تاریخ اسلامی افکار سے متاثر ہوئی اور یہ دن قدیم اور جدید تاریخ کے درمیان بھی حد فاصل اور فرقان تھا۔ اور انسانیت عالم اسلام کے اندر اور اس کے مخالف بلاک کے اندر بھی اسلام سے متاثر ہوئی۔

اسی طرح یہ دن فتح و نصرت کے دو تصورات کے درمیان بھی حد فاصل تھا۔ یہاں مشرکین کے حق میں فتح و نصرت کے تمام ضروری عناصر موجود تھے اور مسلمانوں کے محاذ پر بظاہر شکست کے تمام عوامل موجود تھے۔ یہاں تک کہ منافقین اور بیمار دل لوگوں نے یہ ریمارک پاس کیا کہ (غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ) ان کے نئے دین نے ان کو غرے میں مبتلا کر دیا ہے۔ لیکن اللہ کا ارادہ یہی تھا کہ اسی انداز پر یہ جنگ ہو جائے۔ کفار کی ایک کثیر تعداد اور اہل ایمان کی ایک قلیل تعداد کے درمیان معرکہ تھا، تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ فتح و نصرت کے معیار وہ نہیں ہیں جو عام لوگوں کے درمیان معروف ہیں۔ بلکہ اللہ نے چاہا کہ یہاں قوی نظریات قلت سازوسامان کے ساتھ ایک عظیم لشکر پر فتح یاب ہو، جو بے عقیدہ ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ نصرت ایک صالح عقیدے اور برحق نظریات کے لئے مقدر ہوتی ہے۔ محض تعداد اور اسلحہ کی بنیاد پر فتح نصیب نہیں ہوتی اور یہ بتانا بھی مقصود تھا کہ نظریاتی لوگوں کو چاہئے کہ وہ کفر کے خلاف معرکے میں کود جائیں اور اس وقت کا انتظار نہ کریں کہ فریقین کی ظاہری قوت برابر ہو جائے کیونکہ برحق نظریات رکھنے والے لوگوں کی پشت پر سچائی کی طاقت ہوتی ہے۔ یہ محض خالی خولی دعویٰ ہی نہیں ہے بلکہ جنگ بدر کے اندر اس کا دو ٹوک فیصلہ ہوا اور لوگوں نے آنکھوں سے دیکھا۔

آخر میں، میں کہتا ہوں کہ جنگ بدر ایک دوسرے زاویئے سے بھی حق و باطل کے درمیان فرقان تھا اور اس پہلو کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (۷) لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (۸)(۸:۷ - ۸)) "یاد کرو کہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا اور تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے۔ مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے، تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل، باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

جو لوگ بدر کے لئے نکلے تھے وہ صرف اس ارادے سے نکلے تھے کہ ابوسفیان کے قافلے کو لے لیں جو غیر مسلح تھا۔ لیکن اللہ نے ان کی آرزو کو پورا نہ کیا۔ اللہ نے ابوسفیان کے قافلے کو بچ نکل کر جانے کا موقعہ دیا۔ اور اہل اسلام کو ابوجہل کے پرشوکت لشکر سے ٹکرا دیا۔ اور اس کے نتیجے میں جنگ ہوئی، مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور کفار قید ہوئے اور قتل ہوئے۔ اور یہ نہ ہوا کہ مسلمان بطور تفریح نکلیں اور قافلے پر قبضہ کر کے آسان طریقے سے مال غنیمت حاصل کر لیں۔ اور یہ کام اللہ نے اس لئے کیا لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ (۸: ۸)) "تاکہ حق، حق ہو جائے اور باطل، باطل۔ اس میں اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتے تھے کہ اللہ کی اسکیم کے مطابق احقاق حق کا طریقہ کیا ہے؟ مطلب یہ تھا کہ محض وعظ و تبلیغ اور نظریاتی اور حکیمانہ تبلیغ ہی سے احقاق حق نہیں ہوتا اور نہ نظریاتی بحث و جدال کے نتیجے میں احقاق حق ہوتا ہے کہ کوئی دلائل سے یہ بات کرے کہ حق یہ ہے اور باطل یہ ہے۔ حق اس وقت تک عملی شکل اختیار نہیں کرتا اور باطل لوگوں کی

عملی زندگی سے اس وقت تک خارج نہیں ہوتا جب تک باطل کی قوت اور اقتدار کو ختم نہ کر دیا جائے اور اس کی جگہ حق کا اقتدار اعلیٰ قائم نہ کر دیا جائے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک حق کی فوجوں کو نصرت اور فتح مندی نصیب نہ ہو اور بطل کو شکست نہ ہو جائے یعنی کسی جنگی معرکے میں ۔ غرض یہ دین ایک حرکتی منہاج ہے 'محض نظریہ نہیں ہے 'محض علمی بحث و جدال نہیں ہے اور نہ ہی محض منفی اعتقاد ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے بلکہ اس کا مثبت پہلو بھی ہے ۔ احقاق حق اور ابطال باطل میدان جنگ میں ہوتا ہے اور عملاً حق کو نصرت نصیب ہوتی ہے اور یہ عملی نصرت فرقان ہوتی ہے اور اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم کیا چاہتے تھے اور یہ کہ اللہ نے رسول اللہ کو اس دن حق کے ساتھ گھر سے نکالا تھا اور حق یہ تھا کہ قافلہ چلا جائے اور ساز و سامان سے لیس لشکر سے تمہاری مڈبھیڑ ہو جائے ۔

یہ تھی اس دین اور اس دن کی حیثیت فرقانیت 'جس سے اس دین کی حقیقت 'اس کا مزاج واضح ہوتا ہے اور مسلمانوں کے احساس و شعور کا حصہ بن جاتا ہے ۔ یہ ایسی فرقانیت ہے جس کی ضرورت آج محسوس کی جاتی ہے کیونکہ مسلمانوں کے احساس و شعور کے اندر آج اسلام کے صحیح تصور کے اندر انحراف اور لچک پیدا ہو گئی ہے اور یہ ڈھیل اس قدر پھیل گئی ہے کہ بعض لوگ دعوت دین اور تبلیغ دین کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن احقاق حق کے اس منہاج کو وہ نہیں پا سکے ۔

یہ تھی یوم بدر کی حیثیت فرقانیت جس کے بارے کہا گیا کہ وہ (یوم الفرقان) اور (یوم التقی الجمعان) ہے جس کے اندر گہری معنویت پائی جاتی ہے ۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ "اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۔" اور یوم بدر قدرت الہیہ کی بہترین مثال ہے ۔ ایسی مثال جس میں کوئی مقال نہیں ہے اور نہ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہے ۔ یہ ایک مشاہدہ ہے اور اس کی تفسیر کے لئے کسی طویل کلام کی ضرورت نہیں ہے ۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔

---ooo---

اب سیاق کلام یوم الفرقان کی مزید تفصیلات میں چلا جاتا ہے ۔ معرکے کی جھلکیاں دی جاتی ہیں ۔ ان میں اس معرکے کو نہایت ہی عجیب موثر اور منظر کشی کے انداز میں پیش کیا جاتا ہے ۔ اس طرح کہ گویا یہ منظر اسکرین پر چل رہا ہے اور اس کے مناظر میں اللہ کی تدبیر اور تقدیر عیاں و نمایاں ہیں ۔ اس طرح کہ دست قدرت صاف صاف نظر آتا ہے کہ وہ اپنا کام کرتا ہے ۔ نیز ان جھلکیوں سے وہ مقاصد صاف صاف عیاں ہیں جو اللہ کو مطلوب ہیں اور اہل ایمان کا مقصود ہیں ۔

---

إِذْ أَنتُم بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُم بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنكُمْ ۚ وَلَوْ تَوَاعَدتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ۙ وَلَٰكِن لِّيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٤٢﴾ إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ۖ وَ

لَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَ لَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۭ اِنَّهٗ
عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا
وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ
۵ ع ۷ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾

۱ "یاد کرو وہ وقت جبکہ تم وادی کے اس جانب تھے اور وہ دوسری جانب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ اور قافلہ تم سے نیچے (ساحل) کی طرف تھا۔ اگر کہیں پہلے سے تمہارے اور ان کے درمیان مقابلہ کی قرارداد ہو چکی ہوتی تو تم ضرور اس موقع پر پہلوتہی کر جاتے' لیکن جو کچھ پیش آیا وہ اس لئے تھا کہ جس بات کا فیصلہ اللہ کر چکا تھا اسے ظہور میں لے آئے تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے' وہ دلیل روشن کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ زندہ رہے' یقیناً خدا سننے اور جاننے والا ہے۔

اور یاد کرو وہ وقت جب کہ اے نبی" خدا ان کو تمہارے خواب میں تھوڑا دکھا رہا تھا۔ اگر کہیں وہ تمہیں ان کی تعداد زیادہ دکھا دیتا تو ضرور تم لوگ ہمت ہار جاتے اور لڑائی کے معاملہ میں جھگڑا شروع کر دیتے' لیکن اللہ ہی نے اس سے تمہیں بچایا' یقیناً وہ سینوں کا حال تک جانتا ہے۔

اور یاد کرو جب کہ مقابلے کے وقت خدا نے تم لوگوں کی نگاہوں میں دشمنوں کو تھوڑا دکھایا اور ان کی نگاہوں میں تمہیں کم کر کے پیش کیا تاکہ جو بات ہونی تھی' اسے اللہ ظہور میں لے آئے اور آخر کار سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔"

اس معرکے میں فریقین کے کیمپ سامنے نظر آتے ہیں اور اس میں دست قدرت رواں دواں ہے۔ اللہ کی قدرت کا ہاتھ نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ ان لوگوں کا کیمپ ہے اور وہ دوسری جانب فریق مخالف ہے اور قافلہ دور سمندر کے ساحل سے گزر رہا ہے۔ الفاظ قرآن رسول اللہ کی خواب کا نقشہ کھینچ رہے ہیں' اس نقشے میں مسلمانوں کو کفار کم نظر آتے ہیں اور کفار کو مسلمان۔ یہ مناظر چند الفاظ میں صرف قرآن کریم ہی کا خاصہ ہے۔ مشاہد و مناظر اور ان کا پس منظر دونوں صاف و شفاف نظر آتے ہیں۔ منظر میں حرکات اور رنگ و دو صاف نظر آتی ہے' صرف چند فقرات میں۔

یہ مناظر جن کو ان آیات نے پیش کیا ہے۔ ان مناظر کی طرف ہم اس سے قبل سیرت سے تفصیلات دے چکے ہیں' جب مسلمان مدینہ سے نکلے تو وہ وادی میں مدینہ کے قریب اترے اور اسی وادی کی دوسری طرف اہل کفار نے کیمپ لگایا۔ ان دونوں کے درمیان ایک اونچا ٹیلہ تھا جو ان دونوں کے درمیان جدائی کر رہا تھا۔ رہا قافلہ' تو ابوسفیان اسے ساحل کی جانب لے چلا تھا۔ دونوں افواج سے نیچے کی طرف۔

کوئی فوج یہ نہ جانتی تھی کہ فریق مخالف کہاں ہے۔ اللہ نے ان کو ایک ٹیلے کے دونوں طرف جمع کر دیا۔ یہ اللہ کی خاص منشا تھی۔ اگر ان کے درمیان جگہ کا تعین پہلے ہو چکا ہوتا تو وہ اس طرح ایک دوسرے کے قریب نہ آسکتے۔ شاید ایک دوسرے سے پہلوتہی کر جاتے۔ اللہ تعالیٰ یہاں اسی بات کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ یہ اللہ کی خاص تدبیر تھی۔

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا (۸ : ۴۲) "یاد کرو وہ وقت جبکہ تم وادی کے اس جانب تھے اور وہ دوسری جانب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے ۔ اور قافلہ تم سے نیچے (ساحل) کی طرف تھا۔ اگر کہیں پہلے سے تمہارے اور ان کے درمیان مقابلہ کی قرارداد ہو چکی ہوتی تو تم ضرور اس موقع پر پہلوتہی کر جاتے 'لیکن جو کچھ پیش آیا وہ اس لئے تھا کہ جس بات کا فیصلہ اللہ کر چکا تھا 'اسے ظہور میں لے آئے ۔

پروگرام کے یوں ایک دوسرے کے ساتھ آمنا سامنا ہو جانا اور اس قدر قریب کی بھاگنے کی صورت ہی نہ ہو ۔ یہ بھی اللہ کی منشا تھی 'کچھ نتائج تھے جن کا ظہور پذیر ہونا منشائے الہی تھا ۔ اس لئے اللہ نے اس قدر خفیہ اور اچانک آمنا سامنا کرا دیا ۔ اور تمہیں ذریعہ بنا دیا ۔ ان نتائج کے ظہور کے لئے اور تمہارے لئے تمام حالات سازگار بنا دیئے گئے ۔

آخر وہ کیا امر تھا؟ وہ کیا بات تھی جس کے لئے یہ تمام تدابیر عالم بالا کے ذریعے ہوئیں؟ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸ : ۴۲) "تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے 'وہ دلیل روشن کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ زندہ رہے ۔"

ہلاکت سے اس کا ظاہری مفہوم بھی لیا جاتا ہے اور کفر پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے ۔ اسی طرح لفظ حیات بھی اپنے لغوی اور براہ راست مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے اور ایمان پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے ۔ یہاں یہ دوسرا مفہوم مراد ہے ۔ اس مفہوم میں یہ لفظ قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی استعمال ہوا ہے ۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا "وہ شخص جو مردہ ہو 'اور ہم نے اسے زندہ کر دیا اور اس کو ایک ایسی روشنی دے دی جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے 'وہ اس شخص کی طرح ہے جو اندھیروں میں ہے اور ان سے نکلنے والا نہیں ہے ۔" یہاں کفر کو موت 'ایمان کو حیات قرار دیا گیا ہے ۔ اس طرح اسلام کا نظریہ حیات حقیقت ایمان اور حقیقت کفر کے بارے میں اپنا نقطہ نظر متعین کرتا ہے اور مذکورہ بالا آیت کی تشریح کرتے وقت ہم نے 'سورت انعام میں اس پر قدرے تفصیلی بحث کی ہے ۔ (دیکھئے سورت انعام آیت ---)

یہاں اس مفہوم کو ہم اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ یوم بدر قرآن کے مطابق یوم الفرقان تھا ۔ اس جنگ میں اللہ نے حق و باطل کے درمیان خوب جدائی کر دی 'جس کا تذکرہ ہم کر آئے ہیں ۔ اس لئے اب جو شخص کفر اختیار کرتا ہے تو گویا وہ دلیل و برہان کا منکر ہے اور جو شخص ایمان لاتا ہے تو وہ دلیل روشن پر ایمان لاتا ہے ۔ اور یہ دلائل اب اس لئے روشن اور واضح ہیں کہ اس معرکہ نے سب کچھ کھول کر رکھ دیا ہے ۔

یہ جنگ جن حالات میں ہوئی اور جن ظروف و احوال میں وہ لڑی گئی بذات خود ایک ایسی محبت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ اس میں ایسے اشارات ہیں کہ انسانی تدابیر کے پیچھے دست قدرت کام کر رہی ہے 'یہ اشارات نہایت واضح اشارات تھے اور بتا رہے تھے کہ انسانی قوت کے علاوہ اور بھی فیصلہ کن قوتیں ہیں جو کام کرتی ہیں ۔ اس سے یہ

ثابت ہوتا ہے کہ اس دین کا ایک رب ہے اور وہ اپنے مخلص مجاہد بندوں کی پشت پر ہوتا ہے بشرطیکہ وہ صبر کریں اور ثابت قدمی اختیار کریں۔ اگر فیصلہ ظاہری مادی قوت کے مطابق ہوتا تو مشرکین کو شکست نہ ہوتی اور جماعت مسلمہ کو اس قدر عظیم کامیابی نصیب نہ ہوتی۔

مشرکین نے خود اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے 'جب وہ جنگ کے لئے جا رہے تھے تو ان کے حلیف نے ان کو امداد کی پیش کش کی تو انھوں نے کہا: "خدا کی قسم اگر ہمیں صرف انسانوں سے جنگ کرنا پڑتی تو ہم کمزور نہیں اور اگر یہ جنگ ہم خدا کے خلاف لڑ رہے ہیں 'جیسا کہ محمد ؐ کا دعویٰ ہے 'تو خدا کے مقابلے میں کسی کی کوئی بات نہیں ہے " وہ خود بھی یقین رکھتے کہ وہ خدا کے خلاف لڑ رہے ہیں جیسا کہ محمد ؐ کا دعویٰ ہے 'تو خدا کے مقابلے میں کسی کی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ خود بھی یقین رکھتے کہ وہ خدا کے خلاف لڑ رہے ہیں کیونکہ حضرت محمد ؐ نے ان کو یہ حقیقت بتا دی تھی اور وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتے تھے کہ حضرت محمد ؐ صادق و امین ہیں۔ اب اگر وہ ہلاک ہوئے تو برحق ہلاک ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات پر یہ تبصرہ جو کیا ہے لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ "تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ زندہ رہے۔"

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہاں ایک دوسرا اشارہ بھی نظر آتا ہے 'وہ یہ کہ میدان کارزار میں حق و باطل کا معرکہ آرائی کرنا' اور میدان میں حق کا فاتح ہونا 'جبکہ نظریاتی اعتبار سے حق نے میدان مار لیا ہو' اس بات کا سبب بنتا ہے کہ یہ لوگوں کی نظروں میں بالکل واضح اور نمایاں ہو جائے اور لوگوں کے دل و دماغ میں اس کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہ رہے۔ اس طرح کہ میدان میں حق کی فتح بالکل واضح ہو جائے اور اس وضاحت کے بعد بھی اگر کوئی ہلاکت اور کفر اختیار کرتا ہے تو اسے کوئی شبہ نہ ہو۔ اب اگر کوئی کفر کرتا ہے تو خودکشی کرتا ہے اور اسلام قبول کرتا ہے تو وہ بھی علی وجہ البصیرت زندگی اور سچائی کو قبول کرتا ہے اور اللہ کی نصرت کا اسے یقین ہوتا ہے کیونکہ وہ حق پر ہوتا ہے۔ اور اسے اللہ کی نصرت حاصل ہوتی ہے اور اس کے دشمنوں کو ہزیمت اور شکست ملتی ہے۔

اب ذرا پیچھے چلئے۔ نویں پارے اور سورت انفال کے تعارف میں ہم نے یہ بتایا تھا کہ جہاد اس لئے ضروری ہے کہ کرۂ ارض کے اوپر سے شرکی قوتوں کی کمر توڑ دی جائے اور طاغوتی اقتدار کو ختم کر دیا جائے اور اللہ کے کلمے اور اللہ کے جھنڈے کو بلند کر دیا جائے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ حق واضح اور جلی ہو جائے اور پھر اگر کوئی ہلاک ہوتا ہے تو علی وجہ البصیرت ہلاک ہو اور اگر کوئی زندہ ہوتا ہے تو علی وجہ البصیرت وہ زندہ ہو۔ اور اس سے اس سورت میں دی جانے والی ہدایت کے دور رس اثرات کا بھی اندازہ ہوتا ہے جس میں حکم دیا گیا ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (۸ : ۶۰) "اور تم لوگ 'جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے 'ان کے مقابلے کے لئے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوفزدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے۔" قوت کا تیار کرنا اور دشمنوں کو ڈرانا بھی ایک ذریعہ ہے جس کے باعث حق واضح ہوتا ہے۔ بعض لوگ اس طرح حق کو قبول کرتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قوت سے مرعوب ہو کر اور حق کی ضربات کو دیکھ کر سمجھتے

ہیں اور انہیں ایسا دیکھ کر نظر آتا ہے کہ یہ تحریک درحقیقت انسان کی آزادی کی تحریک ہے اور اس کے نتیجے میں انسان پوری کائنات میں آزادی حاصل کرتا ہے۔

اس پورے مضمون پر اس پہلو سے یہ تعقیب آتی ہے کہ اس معرکے میں تدبیرالٰہی ان مقاصد کے لئے کام کر رہی تھی۔ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۸: ۴۲) "یقیناً خدا سننے اور جاننے والا ہے۔" اللہ وہ ذات ہے کہ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے خواہ وہ سچے فریق کی ہو یا برسرباطل فریق کی طرف سے ہو۔ اور اپنے افعال و اقوال کی پشت پر جو سوچ وہ رکھتے ہیں اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ اس لئے وہ جو تدبیر کرتا ہے وہ ظاہر و باطن کی اطلاعات پر مبنی ہوتی ہے۔ وہ تو سمیع و علیم ہے۔

یہ تو تھا تبصرہ نظام تدبیر الٰہیہ پر کہ اس کی تدابیر کس قدر گہری، خفیہ اور لطیف تھیں۔ اب بتایا جاتا ہے کہ ان تدابیر کی شکل و صورت کیا تھی؟

اِذْ یُرِیْكَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِكَ قَلِیْلًا وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِیْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ اِنَّهٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۸: ۴۳) "اور یاد کرو وہ وقت جب کہ اے نبی ﷺ، خدا ان کو تمہارے خواب میں تھوڑا دکھا رہا تھا۔ اگر کہیں وہ تمہیں ان کی تعداد زیادہ دکھا دیتا تو ضرور تم لوگ ہمت ہار جاتے اور لڑائی کے معاملہ میں جھگڑا شروع کر دیتے لیکن اللہ ہی نے اس سے تمہیں بچایا، یقیناً وہ سینوں کا حال تک جانتا ہے۔"

اللہ کی تدابیر خفیہ میں سے ایک یہ تھی کہ اللہ کے رسول اللہ کو خواب میں کفار کی تعداد کم بتلائی۔ وہ یوں نظر آئے کہ ان کے پاس نہ قوت ہے اور نہ ان کا کوئی وزن ہے۔ حضور ﷺ نے اپنے ساتھیوں کے سامنے اپنا خواب بیان فرمایا۔ انہوں نے اسے بشارت سمجھا اور ان کے حوصلے بڑھ گئے اور معرکے میں کود پڑے۔ اللہ تعالیٰ یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ نبی کو دشمن کی تعداد کم کیوں بتائی گئی! اس لئے کہ اگر ان کی تعداد زیادہ بتلائی جاتی تو ان کی نظریں اپنی قلت تعداد اور قلت سامان جنگ پر مرکوز ہو جاتیں جبکہ وہ نکلے بھی قافلے کے مقابلے کے لئے تھے اور جنگ کی توقع نہ رکھتے تھے۔ اس طرح وہ ضعف اور کمزوری کا شکار ہو سکتے تھے۔ اور دشمن کے سامنے ٹکرا جانے میں بحث و جدال شروع ہو جاتا۔ بعض لوگ کہتے لڑنا اچھا ہے اور بعض کہتے مڈبھیڑ سے بچنا مفید ہے۔ اور ایسے حالات میں فوج کے درمیان یہ فکری انتشار ایسی فوج کے لئے مہلک ہوتا ہے جو جنگ کے لئے تیار ہو۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ اِنَّهٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۸: ۴۳) "لیکن اللہ نے اس سے تمہیں بچا لیا۔ یقیناً وہ سینوں کا حال تک جانتا ہے۔" اللہ تو دلوں کا حال جانتا ہے، اس نے مسلمانوں کے ساتھ بہت بڑی مہربانی کی کہ ان کو اس انتشار کی کیفیت سے بچایا جو باعث ضعف ہوتی ہے لہٰذا مشرکین کو خواب میں قلیل دکھایا گیا اور زیادہ نہ دکھایا گیا۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب کا مدلول بھی حقیقی تھا۔ حضور ﷺ نے دیکھا کہ کفار قلیل ہیں۔ اگرچہ تعداد میں زیادہ تھے، لیکن وزن کے اعتبار سے وہ ہلکے تھے۔ ان کی حقیقت کچھ نہ تھی، ان کے دل دماغ ٹھوس نظریات سے خالی تھے۔ ان کے دل ایمان سے خالی تھے اور وہ نفع بخش سازوسامان سے تہی دامن تھے۔ ان کی ظاہری حیثیت اگرچہ آنکھوں

کو دھوکہ دے رہی تھی لیکن اندر سے وہ بے حقیقت و بے وزن تھے - اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی باطنی حیثیت دکھائی تھی - اور اس طرح لوگوں کے دلوں کو اطمینان سے بھر دیا گیا - اس لئے کہ اللہ دلوں کے بھیدوں سے واقف تھا - اللہ جانتا تھا کہ مسلمانوں کی تعداد اور سازوسامان دشمن کے مقابلے میں کم ہے - اور اگر ان کو صحیح علم ہو جائے تو ان کے دلوں میں کیا خیالات ابھریں گے - اس طرح امکان تھا کہ وہ معرکے میں کمزوری دکھائیں اور معرکہ آرائی بذات خود متنازعہ امر بن جائے - یہ اللہ کی تدابیر میں سے ایک عظیم تدبیر تھی اس لئے کہ اللہ سمیع و علیم تھا -

اب جب فوجیں آمنے سامنے میدان بدر میں تیار کھڑی ہیں تو حضورؐ کا سچا خواب پھر سامنے آتا ہے اور یہ جانبین کی صف آرائی کی حالت میں آتی ہے - یہ بھی اللہ کی تدابیر میں سے ایک خاص تدبیر تھی - اللہ ان کو یاد دلاتا ہے کہ ذرا اس کو دوبارہ پیش نظر رکھو' اس معرکے کے واقعات پر تبصرے کے دوران یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ

وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّ يُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۸: ۴۴) "اور یاد کرو جب کہ مقابلے کے وقت خدا نے تم لوگوں کی نگاہوں میں دشمنوں کو تھوڑا دکھایا اور ان کی نگاہوں میں تمہیں کم کر کے پیش کیا تاکہ جو بات ہونی تھی' اسے اللہ ظہور میں لے آئے اور آخر کار سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع ہوتے ہیں -"

تدابیر الٰہیہ میں سے اہم تدابیر یہ تھی کہ یہ معرکہ ٹل نہ جائے اور فریقین اس معرکے کے لئے آمادہ ہو جائیں - مسلمان جو دشمنوں کو قلیل دیکھ رہے تھے تو یہ دشمنوں کو ان کی حقیقت کے اعتبار سے دیکھ رہے تھے اور کفار جو مسلمانوں کو قلیل دیکھ رہے تھے تو یہ بھی ظاہری آنکھ کے اعتبار سے دیکھ رہے تھے - دونوں کی نگاہ اپنے اپنے زاویہ سے تھی' دونوں میں تدبیر الٰہی کے مقاصد کام کر رہے تھے - یوں یہ واقعات امرالٰہی اور منشائے الٰہی کے مطابق رونما ہوئے -

وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۸: ۴۴) "اور آخر کار سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع ہوتے ہیں -" یہ تبصرہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے نہایت ہی مناسب ہے کہ تمام نتائج قضا و قدر کے نظام کے مطابق باہر ہوتے ہیں - تمام امور کا مرجع اللہ ہے' وہ جس طرح چاہتا ہے اپنی کائنات میں تصرف کرتا ہے' اپنے اقتدار' اور اپنے ارادے اور اپنی قدرت و حکمت کے ساتھ اور اس کائنات میں کوئی بات بھی اللہ کی تقدیر کے تقاضوں کے سوا ظہور پذیر نہیں ہو سکتی -

---ooo---

اگر معاملہ ایسا ہی ہے 'تدبیر سب کی سب اللہ کی ہے - نصرت اللہ کی جانب سے ہے - محض کثرت تعداد ہی فیصلہ کن فیکٹر نہیں ہے اور محض مادی سازوسامان ہی کسی معرکے کے لئے فیصلہ کن نہیں ہوتا' لہٰذا جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کو چاہئے کہ جب کفار کے ساتھ ان کی مڈبھیڑ ہو جائے تو وہ ثابت قدمی اختیار کریں - اور ان کو چاہئے کہ وہ حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی کے لئے حقیقی سازوسامان تیار کریں اور ان کو وہ وسائل اختیار کرنے چاہئیں جن کا تعلق صاحب تدبیر اور صاحب تقدیر کے اسلحہ خانہ سے ہو - اور فتح و نصرت اور صاحب عون مالک حقیقی سے امداد حاصل کریں - اس ذات کی طرف رجوع کریں جو مقتدر اعلیٰ اور قوت و سطوت کا مالک ہے - اور ان باتوں سے بچیں جو کفار مشرکین کے لئے باعث شکست ہوتی ہیں حالانکہ ان کی تعداد اور سازوسامان بہت زیادہ ہے - اور ان کو چاہئے کہ وہ کبر و غرور اور اترانے

اور دکھانے سے بچیں۔ شیطان کے دھوکوں سے ہشیار رہیں جس نے کفار کو مار ڈالا۔ لہٰذا ان کو چاہئے کہ وہ اللہ پر توکل کریں جو عزیز و حکیم ہے۔

---

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا
لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٤٥﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ
رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٤٦﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا
مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ
بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿٤٧﴾ وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا
غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ
عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْۤ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ
وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٤٨﴾ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ع ٦/٢
غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٤٩﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو' توقع ہے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہوگی اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو' یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور ان لوگوں کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کرو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کی روش یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں' جو کچھ وہ کر رہے ہیں' وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔

ذرا خیال کرو اس وقت کا جب کہ شیطان نے ان لوگوں کے کرتوت ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا کر دکھائے تھے اور ان سے کہا تھا کہ آج کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور یہ کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مگر جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو وہ الٹے پاؤں پھر گیا اور کہنے لگا کہ میرا تمہارا ساتھ نہیں ہے' میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم لوگ نہیں دیکھتے۔ مجھے خدا سے ڈر لگتا ہے اور خدا بڑی سخت سزا دینے والا ہے' جب کہ منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں کو روگ لگا ہوا ہے' کہہ رہے تھے کہ ان لوگوں کو تو ان کے دین نے خبط میں مبتلا کر رکھا ہے' حالانکہ اگر کوئی اللہ پر بھروسہ کرے تو

یقیناً اللہ بڑا زبردست اور دانا ہے ۔“

ان قلیل فقروں میں معانی و اشارات کا ایک سمندر موجزن ہے ۔ اہم اصول و ہدایات منضبط کر دی گئی ہیں ۔ مناظر اور مشاہد اس طرح نظر آتے ہیں کہ گویا اسکرین پر چل رہے ہیں ۔ اور تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو ۔ الفاظ دل کے خیالات ' ضمیر کے جذبات اور دماغ کے نہاں خانوں کی کیفیات کے مظہر ہیں ۔ اگر انہی معانی کو کوئی انسان اور ادیب قلم بند کرنا چاہے تو دفتر درکار ہیں اور پھر بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ حق ادا کر سکے ۔ غرض یہ حیرت انگیز تصویر کشی ہے جو قرآن کرتا ہے ۔

اہل ایمان کو پکارا جاتا ہے ' جس طرح اس صورت میں مسلسل پکاریں منضبط ہیں ۔ ہدایات دی جاتی ہیں کہ جب بھی کسی دشمن سے آمنا سامنا ہو تو ثابت قدم رہنے کی سعی کرو ۔ اور فتح و نصرت کے حقیقی وسائل اپنے اندر پیدا کرو ۔ اصل تیاری یہ تیاری ہے ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (٤٥) وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (٤٦) وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (٤٧) (٨:٤٥ تا ٤٨)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو ' جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو ' توقع ہے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہوگی ۔ اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی ۔ صبر سے کام لو ' یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۔ اور ان لوگوں کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کرو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کی روش یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں ' جو کچھ وہ کر رہے ہیں ' وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے ۔“

یہ ہیں فتح و نصرت کے حقیقی اسباب کہ دشمن کے مقابلے میں فوج اسلام ثابت قدم ہو ' اس کے دل اللہ کے ساتھ مربوط ہو ' وہ رسول اور اپنے قائد کی مطیع فرمان ہو ۔ اور اس کے افراد باہم نزاعات اور اختلاف سے مجتنب ہوں ۔ اس راہ میں ان کو جو مشکلات درپیش ہوں ان کو برداشت کرنے والے ہوں اور اترانے اور دکھانے والے نہ ہوں اور نہ اپنی قوت کی وجہ سے سرکشی کرنے والے ہوں ۔

جہاں تک ثبات اور جم جانے کا تعلق ہے تو یہ فتح و نصرت کی راہ میں پہلا قدم ہے ۔ جو بھی میدان میں جم جائے گا وہی نصرت پائے گا ۔ پھر جبکہ مسلمانوں کو اس کا بھی علم نہیں ہے کہ ان کا دشمن کس قدر مشکلات انگیز کر رہا ہے اور جس طرح ان کو دکھ پہنچ رہے ہیں ' دشمن کو بھی پہنچ رہے ہیں جبکہ اہل ایمان اللہ کی جانب سے عزا اور شہادت کی صورت میں

مرتبوں کے امیدوار ہیں اور ان کو یہ امید بھی نہیں ہے بلکہ جہنم یقینی ہے۔مومن اللہ کے ہاں سے اجر پانے کی صورت میں امید کرتا ہے۔اس لئے وہ ثابت قدم رہتا ہے جبکہ ان کو کوئی امید ہی نہیں ہے۔اگر وہ ذرا بھی صبر و ثبات کا مظاہرہ کریں تو دشمن ٹوٹنے ہی والا ہے۔اہل اسلام تو دو بھلائیوں میں ایک ضرور پائیں گے۔اور ان کو گارنٹی دے دی گئی ہے یا شہادت اور یا فتح و نصرت۔جبکہ ان کے دشمن کو اس دنیاوی زندگی کی بھی گارنٹی نہیں ہے' جس پر وہ فدا ہے' اس لئے کہ آخرت میں تو اس کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔

پھر جنگ میں ذکر الٰہی تو ایک دائمی زاد راہ ہے اور مومنین کو اس کی سخت تاکید کر دی گئی ہے اور اہل ایمان مجاہدین نے ہمیشہ ذکر الٰہی کو زبان اور دل میں زندہ رکھا اور قرآن کریم میں اہل ایمان کی تاریخ بیان کرتے ہوئے' اس کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔

اہل ایمان کی جانب سے ذکر الٰہی کا تذکرہ قرآن کریم بار بار کرتا ہے۔ ساحروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں جب ایمان قبول کیا اور فرعون نے ان سے دھمکی آمیز خطاب کیا۔تو ان کا جواب یہ تھا:

وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ اور تم ہم سے انتقام محض اس لئے لوگے کہ ہم اپنے رب کی آیات پر ایمان لائے ہیں' جبکہ یہ آیات ہم تک پہنچ گئیں۔اے ہمارے رب ہم پر صبر انڈیل دے اور ہمیں اس حال میں مار کہ ہم مسلمان ہوں۔"

اسی طرح بنی اسرائیل کی ایک قلیل فوج کے واقعات میں بھی اس صفت کا ذکر آیا ہے۔اس قلیل تعداد کا مقابلہ جب جالوت اور اس کی افواج کثیرہ سے آیا تو انہوں نے کہا وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۲: ۲۵۰) "جب وہ جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلے پر نکلے تو انہوں نے دعا کی "اے ہمارے رب ہم پر صبر کا فیضان کر' ہمارے قدم جما دے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر۔"

اسی طرح اسلامی تاریخ میں بے شمار مومن دستوں نے کفار کے مقابلے میں جو مواقف اختیار کئے ان کے بارے میں قرآن کریم یہ کہتا ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ (۱۴۶) وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۱۴۷) ((۳: ۱۴۶ – ۱۴۷)) "اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے' انہوں نے کمزوری

نہیں دکھائی اور وہ باطل کے آگے سرنگوں نہیں ہوئے۔ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ان کی دعا بس یہی تھی "اے ہمارے رب ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما۔ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو اسے معاف کر دے' ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔

جماعت مومنہ کے دلوں میں یہ تعلیم خوب بیٹھ گئی۔جب بھی اس کا مقابلہ دشمن سے ہوا کرتا تھا اس کا رویہ ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔اس کے بعد جنگ احد میں جماعت مسلمہ کو مشکلات درپیش ہوئیں اور وہ دل شکستہ ہو گئے اور بدر کے عین دوسرے دن جب اس شکست خوردہ لشکر کو دوبارہ پکارا گیا تو یہ تعلیم ان کے نفوس پر پوری طرح حاوی تھی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ "وہ لوگ جن سے لوگوں نے کہا کہ لوگ تمہارے خلاف جمع ہو گئے' لہٰذا ان سے ڈرو' تو ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو گیا اور انہوں نے کہا : اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور اچھا مددگار ہے۔"

دشمن کے آمنے سامنے ہونے کے وقت ذکر الٰہی کے بے شمار فوائد ہیں' ایک فائدہ یہ ہے کہ انسان کا رابطہ ایک ایسی قوت سے ہو جاتا ہے جس پر کوئی غالب قوت نہیں ہے' پھر یہ اللہ پر بھروسہ ہے جو اپنے دوستوں کی بھرپور نصرت کرتا ہے۔اس سے اس معرکے کی حقیقت' اس کے اسباب اور اس کے مقاصد ذہن میں مستحضر رہتے ہیں' کیونکہ یہ معرکہ اللہ کی خاطر لڑا جاتا ہے۔اس کرۂ ارض پر اللہ کی حکومت کے قیام کے لئے لڑا جاتا ہے۔اور ان طاغوتی طاقتوں کو ختم کرنے کے لئے لڑا جاتا ہے جنہوں نے ان کے حق اقتدار پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے' کیونکہ اس معرکے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کیا جائے۔یہ جنگ نہ ملک گیری کے لئے ہے' نہ اموال غنیمت اور لوٹ مار کے لئے ہے۔نہ شخصی حکومت کے قیام کے لئے ہے اور نہ قومی حکومت کے قیام کے لئے ہے۔نیز اس حکم سے یہ تاکید بھی مقصود ہے کہ مشکل ترین حالات میں بھی انسان کو ذکر الٰہی سے غافل نہیں رہنا چاہئے۔یہ تمام اشارات نہایت ہی قیمتی اشارات ہیں اور اللہ کی ان تعلیمات کی وجہ سے یہ حقیقت کا روپ اختیار کرتے ہیں۔

رہا اللہ کی اطاعت اور اللہ کے رسول کی اطاعت کا حکم تو ان کا مقصد یہ ہے کہ معرکے میں داخل ہوتے ہی انسان سرتسلیم خم کر دے اور وہ دواعی ہی ختم ہو جائیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان باہم نزاع پیدا ہو جاتی ہے۔اور حکم یہ ہے وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ (۸ : ۴۶) "آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔" لوگوں کے درمیان تنازعات صرف اس وقت سر اٹھاتے ہیں جب ان کی قیادت کے مراجع ایک سے زیادہ ہو جائیں اور وہ مختلف جہتوں سے ہدایات لینے والے ہوں یا وہ صرف اپنی خواہشات کے پیروکار ہوں اور ان کے افکار اور تصورات کا ماخذ صرف ان کے سفلی جذبات ہوں۔اس کے مقابلے میں جب لوگ صرف اللہ اور رسول اللہ کے مطیع فرمان ہوں تو نزاع کی پہلی بڑی وجہ سرے سے ختم ہو جاتی ہے' اگرچہ لوگوں کا نقطہ نظر مختلف ہے کیونکہ نزاع صرف اختلاف نقطہ نظر ہی کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کا مبدا ہوائے نفس ہوتی ہے۔ہوائے نفس کی وجہ سے ہر نقطہ نظر رکھنے والا شخص اپنے موقف پر اصرار شروع کر دیتا ہے۔اگرچہ اسے نظر آ جائے

کہ سچائی دوسری جانب ہے ۔ اب ترازو کے ایک پلڑے میں ایک شخص کی ذات ہوتی ہے اور دوسرے پلڑے میں سچائی ہوتی ہے ۔ اور ابتداء کے طور پر لوگ اپنی ذات کو سچائی پر ترجیح دے دیتے ہیں لہٰذا یہاں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ لوگ جنگ کے وقت اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت کریں ۔ یہ امر ڈسپلن کا تقاضا ہے اور معرکوں میں ڈسپلن اولین فیکٹر ہوتا ہے ۔ یعنی اعلیٰ کمان کی اطاعت اور پھر اس امیر کی اطاعت جو اس اعلیٰ کمان کو چلاتا ہے ۔ اسلام میں جو اطاعت ہوتی ہے وہ دلی اطاعت ہوتی ہے اور عام دنیاوی افواج کی طرح کی اطاعت نہیں ہوتی 'کیونکہ عام افواج کی معرکہ آرائی اللہ کے لئے نہیں ہوتی ۔ اور نہ ان کے افراد کے درمیان للہ فی اللہ اخوت ہوتی ہے ۔ لہٰذا اسلامی افواج کے ڈسپلن اور سیکولر افواج کے ڈسپلن کے درمیان بہت بڑا فرق ہوتا ہے ۔

رہا صبر تو وہ معرکہ آرائی خصوصاً اسلام کے لئے جنگ کرنے والوں کی اہم صفت ہوتی ہے ۔ چاہے یہ معرکہ انسانی نفسیات کے اندر حق و باطل کے درمیان ہو یا قتال کے میدان میں ہو ۔ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ''صبر سے کام لو 'یقیناً اللہ تعالیٰ صبر سے کام لینے والوں کے ساتھ ہوتا ہے ۔''

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ (۸:۴۷) ''اور ان لوگوں جیسے رنگ ڈھنگ اختیار نہ کرو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کی روش یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں ۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے ۔''

یہ ہدایات امت مسلمہ اور جماعت مجاہدین کی تطہیر کے لئے دی جا رہی ہیں کہ وہ قتال اور جہاد میں شرکت ایسے حالات میں نہ کریں کہ اپنی قوت اور کثرت پر اترا رہے ہوں اور اپنی قوت کو جو انہیں اللہ نے عطا کی ہے 'ان راہوں میں خرچ نہ کریں جن کے بارے میں اللہ کا حکم نہیں ہے ۔ کیونکہ مومنین کے دستے قتال فی سبیل اللہ کے لئے نکلتے ہیں 'ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی زندگیوں میں اللہ کی بادشاہت نافذ ہو ۔ لوگ صرف اللہ کے غلام ہوں اور یہ اس لئے علم جہاد بلند کرتے ہیں کہ ان تمام طاغوتی طاقتوں کو کرش کر کے رکھ دیں جنہوں نے لوگوں کو اپنا غلام بنا کر رکھا ہوا ہے اور جو طاقتیں زمین پر خدا کے مقابلے میں اپنی الوہیت قائم کر رہی ہیں حالانکہ اللہ کی جانب سے ان کو ایسا کرنے کی کوئی اجازت نہیں ہے ۔ نہ اللہ کی شریعت ان کے اس فعل کو تسلیم کرتی ہے ۔ یہ علم اس لئے بلند ہوتا ہے کہ پورے کرۂ ارض کے تمام انسانوں کو ہر قسم کی غلامی سے آزاد کر دیا جائے 'کیونکہ یہ غلامیاں انسان کی کرامت اور شرافت کے خلاف ہیں اور اسلامی دستے جہاد و قتال کے لئے نکلتے ہی اس لئے ہیں کہ لوگوں کی شرافت اور ان کی آزادی کا تحفظ ہو ۔ ان کا مقصد اپنا اقتدار قائم کرنا' زمین میں علو حاصل کرنا نہیں ہوتا ۔ نہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنا غلام بنائیں یا اتراتے پھریں اور انہیں اللہ نے جو قوت دی ہے اسے غلط مد میں صرف کریں ۔ اس طرح اسلامی دستوں کے مقاصد میں ذاتی مقاصد کا کوئی حصہ نہیں ہوتا اور اگر انہیں نصرت نصیب ہوتی ہے اور وہ غالب ہو جاتے ہیں تو انہوں نے امتثال امر کیا ہوتا ہے 'اسلامی نظام حیات قائم کرتے ہیں 'اللہ کا کلمہ بلند کرتے ہیں اور اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے طلبگار ہوتے ہیں ۔ یہاں تک کہ معرکے کے نتیجے میں جو اموال غنیمت ملتے ہیں' وہ ان سے بھی بے نیاز ہوتے ہیں ۔

کون اترا کر نکلا تھا' کون لوگوں کے سامنے اپنی قوت کی نمائش کر رہا تھا؟ اور کون لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتا تھا' یہ لوگ مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے تھے - یہ قریش کے لشکر کی شکل میں موجود تھے - جس طرح کہ یہ لشکر نکلا تھا - اور جو قریش فخر و مباہات کے ساتھ نکلے تھے' ان کا انجام بھی مسلمانوں کے سامنے تھا اور جس طرح ذلیل و خوار اور ٹوٹ پھوٹ کا وہ شکار ہو چکے تھے وہ بھی اہل اسلام کے سامنے تھی - اللہ تعالیٰ نے خود دستوں سے جو خطاب کیا اس کا مصداق ان کے سامنے تھا - ذرا دوبارہ ملاحظہ فرمائیں -

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (۸:۴۷) "اور ان لوگوں جیسے رنگ ڈھنگ اختیار نہ کرو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کی روش یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں - جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے -"

اترانا اور شان دکھانا اور اللہ کے راستے سے روکنا' یہ سب امور ابوجہل کے اس تبصرے سے ظاہر ہوتے ہیں - ابوجہل کے پاس جب ابوسفیان کا پیغام آیا کہ میں ساحل کی جانب سے بچ کر نکل آیا ہوں اور آپ اپنے لشکر کو لے کر واپس ہو جائیں اس لئے کہ تمہیں محمد اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے - قریش کی حالت یہ تھی کہ وہ ساتھ گانے والی لونڈیوں کو بھی لے کر چلے تھے - راستے پر گاتے بجاتے اور مویشی کاٹتے اور شراب و کباب کے دور چلاتے ہوئے آ رہے تھے - ابوجہل نے اس پیغام کے جواب میں کہا "ہم اس وقت تک واپس نہ ہوں گے جب تک ہم بدر کے میدان میں پہنچ نہ جائیں' تین دن قیام نہ کریں' جانور نہ کاٹیں' شراب نہ پئیں اور گانے بجانے کی محفلیں منعقد نہ کریں' اگر ہم نے ایسا کیا تو تمام عرب ہم سے خوف کھائیں گے -" جب ابوسفیان کا ایلچی واپس ہوا اور ابوجہل کا جواب پہنچایا تو ابوسفیان نے کہا "افسوس کہ میری قوم کا کیا بنے گا! یہ ابوجہل کی حرکت ہے - اس نے واپسی کو نہ پسند کیا کیونکہ یہ قوم کا لیڈر تھا' اور اس نے سرکشی اختیار کی - سرکشی بہرحال ایک نقص ہے اور شگون بد ہے - اگر محمد نے اس لشکر کو کرش کر دیا تو ہم ہمیشہ کے لئے ذلیل ہو جائیں گے -" ابوسفیان کی فراست درست نکلی - حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے اس لشکر کو تہس نہس کر دیا اور اس اترانے کی وجہ سے لشکر کفار ذلیل ہوا' اس لئے کہ وہ سرکشی' دکھاوے اور راہ خدا کو روکنے کے مقاصد لیے ہوئے تھے - یہی وجہ ہے کہ بدر میں ان کی کمر ٹوٹ گئی - وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (۸ : ۴۷) "جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ اللہ کی گرفت میں ہے -" اللہ سے ان کی کوئی تدبیر بچ کر نہیں نکل سکتی - ان کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی - ان کی قوت اور ان کا علم سب کچھ اس کی گرفت میں ہے -

اس سے آگے بیان کیا جاتا ہے کہ شیطان مشرکین کو مسلسل ابھار رہا تھا کہ وہ یہ جنگ لڑیں اور چونکہ یہ لوگ شیطان کے دھوکے میں آگئے تھے' اس لئے ان کو اس طرح ذلیل ہونا پڑا - اور وہ شکست و ریخت کا شکار ہوئے -

وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ

لَكُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸:۴۸) ”ذرا خیال کرو اس وقت کا جب کہ شیطان نے ان لوگوں کے کرتوت ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا کر دکھائے تھے اور ان سے کہا تھا کہ آج کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور یہ کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مگر جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو وہ الٹے پاؤں پھر گیا اور کہنے لگا کہ میرا تمہارا ساتھ نہیں ہے۔ میں کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم لوگ نہیں دیکھتے۔ مجھے خدا سے ڈر لگتا ہے اور خدا بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔“

یہاں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بارے میں متعدد روایات منقول ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی روایت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا درجہ نہیں رکھتی۔ صرف ایک حدیث ہے جو امام مالک نے موطا میں نقل کی ہے۔ احمد روایت کرتے ہیں 'عبدالمالک ابن عبدالعزیز سے' ابن الماجشون سے' مالک سے' ابراہیم ابن ابو عبلہ سے' طلحہ ابن عبیداللہ ابن کریز سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ابلیس یوم عرفہ میں جس قدر چھوٹا سا' حقیر سا غضبناک ہوتا ہے۔ اس قدر عام حالات میں نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ دیکھتا ہے کہ اس دن رحمت نازل ہوتی ہے۔ اللہ گناہوں کو معاف فرماتے ہیں۔ ہاں یوم بدر کے دن بھی وہ ایسا ہی تھا۔ صحابہ کرام ؓ نے دریافت کیا کہ حضور ﷺ بدر کے دن اس نے کیا دیکھا تھا کہ ایسا تھا۔ اس نے اس دن دیکھا کہ حضرت جبرائیل ملائکہ کو تقسیم کر رہے ہیں۔“

یہ حدیث مرسل بھی ہے اور اس میں عبدالمالک ابن عبدالعزیز الماجشون راوی ہے جو ضعیف ہے۔

اس کے علاوہ جو آثار ہیں وہ حضرت ابن عباس ؓ سے ہیں اور ان سے یہ روایات بذریعہ علی ابن ابو طلحہ اور بذریعہ ابن جریج نقل ہیں۔ یا عروہ ابن زبیر بذریعہ ابن اسحاق' قتادہ سے بذریعہ سعید ابن جبیر' حسن اور محمد ابن کعب سے ان سب کو ابن جریر طبری نے روایت کیا ہے۔

مثنی سے 'عبداللہ ابن صالح سے' معاویہ سے' علی ابن ابو طلحہ سے' حضرت ابن عباس ؓ سے: کہتے ہیں کہ ابلیس یوم بدر میں شیاطین کا ایک لشکر لے کر آیا۔ اس کے پاس جھنڈا بھی تھا۔ یہ شخص بنی مدلج کے ایک شخص کی شکل میں تھا۔ خود شیطان سراقہ بن مالک ابن جعشم کی شکل میں تھا شیطان نے مشرکین سے کہا: ”آج تم پر کوئی غالب نہ ہو گا اور میں تمہارا پڑوسی ہوں۔“ جب لوگوں نے صف آرائی کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹی کی ایک مٹھی لی۔ اور اسے مشرکین کے چہروں پر مارا۔ ان کو شکست ہوئی۔ حضرت جبرئیل ابلیس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس کا ہاتھ مشرکین میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں تھا تو اس نے اپنا ہاتھ اس مشرک سے چھڑایا اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا' اس کے ساتھی بھی بھاگے۔ ایک شخص نے کہا: اے سراقہ! تم یہ گمان کرتے ہو کہ تم ہمارے پڑوسی ہو۔ تو اس نے جواب دیا: ”کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں تم نہیں دیکھتے۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں' بے شک اللہ سخت عذاب دینے والے ہیں۔“ یہ اس نے اس وقت کہا جب اس نے فرشتوں کو دیکھا۔

ابن حمید سے' سلمہ سے' ابن اسحق سے' یزید ابن رومان سے' عروہ ابن الزبیر سے' کہتے ہیں کہ جب قریش جمع ہو کر نکلنے لگے تو میں نے ان کے اور بنی بکر کے درمیان معاملات کا ذکر کیا' یعنی جنگ کا۔ قریب تھا کہ وہ واپس ہو جائیں' انہیں اس

وقت ابلیس سراقہ ابن مالک ' ابن جعشم المدلجی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ شخص کنانہ کے شرفاء میں سے تھا۔ اس نے کہا کہ میں تمہارا ساتھی ہوں۔ اگر کنانہ تمہارے پیچھے کچھ اقدام کریں تو تم اسے پسند نہ کرو گے۔ اس پر وہ بڑی تیزی سے نکلے۔

بشر ابن معاذ سے ' یزید سے ' سعید سے ' قتادہ سے۔ کہتے ہیں کہ آیت وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ (۸ : ۴۸) سے وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸ : ۴۸) تک کی تفسیر میں یہ بات ذکر ہوئی ہے کہ شیطان نے دیکھا کہ حضرت جبرئیل نازل ہو رہے ہیں اور آپ کے ساتھ اور فرشتے ہیں۔ اس اللہ کے دشمن کو یہ یقین ہو گیا کہ فرشتوں کے مقابلے میں وہ تو کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ تو اس نے کہا "میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے ' میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں۔" یہ الفاظ اس دشمن خدا نے جھوٹ بولے ہیں۔ اس کے دل میں خدا کا خوف نہیں ہے لیکن اس کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ وہ مقابلہ نہیں کر سکتا اور اللہ کے اس دشمن کی عادت ہے کہ وہ اپنے پیروں کاروں کی قیادت کرتا ہے لیکن جب حق و باطل کا آمنا سامنا ہوتا ہے تو یہ اپنے ساتھیوں کو بری طرح چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے اور ان سے اپنی براءت کا اعلان کرتا ہے۔

فی ظلال القرآن میں ہم نے جو منہاج اختیار کیا ہے اس کے مطابق ہم ان غیبی امور کے ساتھ تعرض نہیں کرتے جن کے بارے میں قرآن و سنت میں کوئی تفصیل نہیں دی گئی کیونکہ غیبی امور کا تعلق اعتقادات سے ہوتا ہے اور اعتقادی امور کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن سے ثابت ہوں یا سنت نبوی ؐ سے ثابت ہوں لیکن ہمارا یہ طریقہ بھی نہیں ہے کہ ہم ہر غیبی امر کا انکار کر دیں اس لئے کہ یہ غیبی ہے۔

یہاں قرآن کریم کی آیت اس بات کی صراحت کرتی ہے کہ شیطان نے مشرکین کے اعمال کو ان کے لئے مزین بنا دیا تھا۔ شیطان نے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف لشکر کشی کریں اور یہ کہ وہ ان کی امداد کرے گا۔ اور بعدہ جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے اور انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو یہ شیطان الٹے پاؤں بھاگا اور کہا کہ میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نے نہیں دیکھا۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ اس طرح شیطان نے ان کو ذلیل کیا اور ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ تاکہ وہ اپنے انجام تک خود پہنچیں اور اس نے ان کے ساتھ جو عہد کیا تھا اس کو پورا نہ کیا۔

اب یہ کیفیت کیسی ہے کہ شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لئے مزین کیا اور کس طرح اس نے باور کرایا کہ آج مشرکین کے خلاف کوئی غالب و برتر نہیں ہے اور کس طرح اس نے امداد کا وعدہ کیا اور کس طرح وہ بھاگا۔ یہ سب تفصیلات قرآن میں نہیں ہیں۔

یعنی ان واقعات کی تفصیلی کیفیت کے بارے میں ہم جزم کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ شیطان اور اس کی سرگرمیاں سب کی سب غیبی امور سے متعلق ہیں۔ اور ہم اس کے بارے میں کوئی جزمی اور یقینی بات نہیں کہہ سکتے جب تک کوئی صریح نص نہ ہو۔ نص قرآن میں حادثہ اور واقعہ کا ذکر تو ہے لیکن تفصیلی کیفیات یہاں مذکور نہیں ہیں۔

یہاں آکر ہمارا اجتہاد ختم ہو جاتا ہے۔ ہم اس معاملے میں جناب محمد عبدہ کے مکتب فکر کی رائے کو اختیار نہیں کرتے جو اس قسم کے تمام غیبی امور کے سلسلے میں ایک متعین انداز تاویل اختیار کرتے ہیں کہ ان غیبی جہانوں میں وہ ہر قسم کے حسی اعمال کا انکار کرتے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں شیخ رشید رضا یہ فرماتے ہیں :

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ (۸: ۴۸) "اے پیغمبر مومنین کو یہ بات یاد دلائیں کہ شیطان نے اپنے وسوسوں کے ذریعہ ان مشرکین کے سامنے ان کے اعمال کو خوشنما بنا دیا تھا۔ اور ان کے دلوں میں یہ جذبات ڈال دیئے تھے کہ وہ یہ کہتے تھے کہ آج ان پر کوئی غالب نہیں ہے۔ محمد کے ضعیف و ناتواں متبعین بھی اور عربوں کے دوسرے قبائل بھی اس لئے کہ تم تعداد اور سازوسامان میں ان سے زیادہ ہو اور تمہارے فوجی ان سے زیادہ جنگجو ہیں۔ اور ان حالات کے ساتھ ساتھ میں تمہارا امدگار ہوں۔ بیضاوی نے کہا ہے کہ اس نے ان کے وہم میں یہ بات ڈال دی کہ وہ جو اس کی اطاعت کرتے ہیں تو یہ ان کا مددگار ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ یہ دعا کرتے تھے "اے اللہ ان دو گروہوں میں سے جو زیادہ ہدایت پر ہو' اس کی مدد کر اور ان دو ادیان میں سے جو دین زیادہ حق پر ہو اس کی امداد کر۔"

فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ (۸: ۴۸) یعنی جب دونوں لشکر ایک دوسرے کے قریب ہوئے اور وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور حالات کو سمجھنے لگے۔ اس سے پہلے کہ لوگ ایک دوسرے پر وار کریں اور قبل اس کے کہ میدان کارزار گرم ہو' شیطان بھاگ گیا اور الٹے پاؤں لوٹا یعنی پیچھے کی طرف اور جن مفسرین نے تراءی کا معنی یہ کیا کہ جب لوگ میدان کارزار میں ٹکرا گئے تو ان کی مراد غلط ہے۔ معنی یہ ہوا کہ شیطان اب ان کے لئے ان کے اعمال کی تزئین بند کر دیتا ہے اور اب انہیں ورغلانا ترک کر دیتا ہے۔ اب یہ کلام ایک قسم کی تمثیل ہے اور اس میں شیطان کی وسوسہ اندازی کو آنے والے شخص سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس وسوسہ اندازی کو ترک کرنے کے فعل کو اس شخص سے تشبیہ دی گئی جو پیچھے کی طرف الٹے پاؤں پھرتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کر دیا کہ اس کی جانب سے ان لوگوں کے ساتھ اپنے تعلق کی براءت کا ذکر کر دیا اور ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ وَقَالَ اِنِّىْ بَرِىْٓءٌ مِّنْكُمْ (۸: ۴۸) یعنی اس نے اعلان کر دیا کہ وہ ان سے بری الذمہ ہے۔ اور جب اس نے دیکھا کہ فرشتے مسلمانوں کی امداد کر رہے ہیں' وہ مایوس ہو گیا۔ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸: ۴۸) یہ شیطان کا قول بھی ہو سکتا ہے اور جملہ مستانفہ بھی ہو سکتا ہے۔" "میں کہتا ہوں کہ ان سب باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ شیطان کی فوجیں مشرکین کی صفوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے دلوں میں وسوسے ڈال رہی تھیں یعنی ان کے ارواح سے مل کر ان کو دھوکہ دے رہی تھیں اور دوسری جانب سے فرشتے مسلمانوں کی صفوں میں پھیلے ہوئے تھے اور یہ مسلمانوں کی پاک روحوں میں وہ ڈالتے تھے کہ جس سے ان کے دل مضبوط ہوتے تھے اور اللہ کی جانب سے ان کو نصرت کا جو وعدہ تھا' اس پر ان کا یقین اور مضبوط ہو جاتا تھا۔"

یہ رجحان کہ ملائکہ کے افعال اور ان کا حصہ اس جنگ میں صرف یہی تھا کہ وہ مسلمانوں کو روحانی امداد دیتے تھے۔ مصنف دوسری جگہ صراحت سے یہ اظہار کرتے ہیں کہ یوم بدر میں فرشتوں نے جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ یہ ایک غلط رجحان ہے کیونکہ قرآن مجید میں دوسری جگہ آتا ہے۔

فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ "پس تم ان کی گردنوں پر مارو اور ان کے ہر جوڑ پر ضرب لگاؤ۔" شیطان کے افعال کی ایسی تشریح کہ وہ محض روحانی اتصال ہو' یہ معنی محمد عبدہ کے مکتب فکر کی اہم خصوصیت ہے۔ ایسی ہی تاویل وہ ابابیل سے متعلق بھی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ دراصل چیچک کے جراثیم تھے اور یہ استاد محمد عبدہ کی تفسیر پارہ عم میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان آیات کی تاویل میں یہ بہت ہی مبالغہ

ہے اور اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہاں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جو الفاظ کی ظاہری تفسیر کو ناممکن بناتی ہو۔ ہاں ہم صرف اسی قدر کہہ سکتے ہیں کہ ان آیات میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ان واقعات کی تفصیلی کیفیت کو ظاہر کرتی ہو اور یہی طریق کار ہم نے اختیار کیا ہے۔

غرض اس طرف شیطان ان مشرکین کو دھوکہ دے رہا تھا جو اتراتے ہوئے اپنے گھروں سے نکلے تھے اور اپنی پوزیشن لوگوں کو دکھاتے آرہے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں' شیطان ان کو لشکر کشی پر آمادہ کر رہا تھا۔ اور پھر عین موقعہ میں ان کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ دوسری جانب مدینہ کے منافقین اور مریض لوگ دل ہی دل میں خوش تھے اور کہتے تھے کہ یہ لشکر تباہی کے راستے پر چل نکلا ہے۔ مشرکین کی عظیم قوت سے اس کا مقابلہ ٹھہرا ہے۔ جبکہ یہ لوگ قلیل تعداد میں ہیں اور ان کی تیاری بھی کوئی نہیں ہے۔ یہ لوگ امور کو صرف ظاہری طور پر دیکھتے تھے۔ اور بظاہر یہ بات نظر آتی تھی کہ اہل ایمان نے اپنے آپ کو بڑی تباہی سے دوچار کر دیا تھا۔ یہ لوگ اپنے دین کی وجہ سے دھوکے میں تھے اور انہیں اپنی نصرت کا پورا پورا یقین تھا۔ یہ تھے منافقین کے خیالات۔

اذْ يَقُولُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ (۸ : ۴۹) "جب کہ منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں کو روگ لگا ہوا ہے' کہہ رہے تھے کہ ان لوگوں کو تو ان کے دین نے خبط میں مبتلا کر رکھا ہے۔" منافقین جو دل کے مریض ہوتے ہیں یہ تعداد میں اکثر کم ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو مکہ میں تھے اور اسلام کی طرف مائل ہو گئے تھے لیکن ان کے عقائد صحیح نہ تھے اور نہ ہی ان کے دل اسلام پر مطمئن ہوئے تھے۔ یہ لوگ بھی اس کی لشکر کے ساتھ چلے آئے تھے لیکن یہ مذبذب تھے۔ ڈھل مل یقین۔ یہ تبصرہ ایسے لوگوں کا تھا کہ جنہوں نے دیکھا کہ مسلمان کم ہیں اور مشرکین بہت زیادہ ہیں۔

یہ منافقین جن کے دلوں میں بیماری ہوتی ہے۔ دراصل فتح و نصرت کے حقیقی اسباب سے باخبر ہی نہ تھے۔ یہ صرف ظاہری حالات کو دیکھ پاتے تھے اور ان کو اس قدر بصیرت نہ دی گئی تھی کہ وہ پوشیدہ امور کو یا ان حقائق کو سمجھتے جو بظاہر نظر نہیں آتے۔ ان کو پتہ نہ تھا کہ نظریات کے اندر کس قدر قوت ہوتی ہے۔ مومن کو اللہ پر بھروسہ کس قدر ہوتا ہے۔ وہ کس قدر متوکل ہوتا ہے اور اگر بڑے بڑے لشکر ہوں اور ایمان باللہ نہ ہو تو ان کے اندر کوئی قوت نہیں ہوتی۔ یہ لوگ اگرچہ مسلمانوں کو فریب خوردہ کہتے تھے اور اپنے دین کے بارے میں ان کو مغرور کہتے تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھے کے دھانے پر لا رہے ہیں کیونکہ مشرکین سیلاب کی طرح بہے چلے آرہے تھے لیکن ان کا یہ نقطہ نظر غلط تھا۔

ایک نظر آنے والی صورت حال ایک مومن کی نظر میں اور ایک غیر مومن دیکھنے والے کی نظر میں بظاہر یکساں ہوتی ہے۔ رہا باطن اور حقیقی قدر و قیمت تو اس اعتبار سے دونوں کے نزدیک وزن و پیمانے میں فرق ہو جاتا ہے۔ ایک غیر مومن ذہن کو صرف ظاہری صورت حالات ہی نظر آتی ہے اور پس منظر اس کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ لیکن ایک مومن کی نظر دور رس ہوتی ہے اور اسے ظاہری صورت حالات سے آگے بھی کچھ حقائق نظر آتے ہیں۔ مومن ظاہری صورت حال سے وراء اس کی حقیقت کا ادراک بھی رکھتا ہے اور وہ حقیقی وزن اور قدر متعین کرتا ہے۔

وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ (۸: ۴۹) "حالانکہ اگر کوئی اللہ پر بھروسہ کرے تو یقیناً اللہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔" یہ ہے وہ بات جسے قلب مومن سمجھ سکتا ہے اور اس حقیقت پر وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور جن دلوں میں ایمان نہیں ہوتا' ان سے یہ حقیقت اوجھل ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس وجہ سے مومن کا پلڑا بھاری ہوتا ہے اور نتیجہ اس کے حق میں ہوتا ہے اور آخر کار ہر معاملے میں یہ حقیقت فیصلہ کن ہوتی ہے۔ ہر دور اور ہر جگہ یہ حقیقت فیصلہ کن ہوتی ہے۔

بدر کے سلسلے میں منافقین اور دل کے روگی جو یہ کہتے ہیں "کہ ان لوگوں کو ان کے دین نے خبط میں مبتلا کر دیا ہے۔" یہ بات ہر دور کے منافقین اور مریض ذہنیت کے لوگ کہتے رہتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ طاغوتی قوتیں زوروں پر ہیں۔ لیکن اس دین کا اصل سازوسامان اس کا یہ عقیدہ ہے جس کے اندر بذات قوت واقعہ ہے۔ یہ کہ جماعت مومن اللہ کی عزت اور برتری کی خاطر لڑ رہی ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ غیور ہے اور وہ اپنے دوستوں کی ہر وقت مدد کرتا ہے۔

منافقین اور مریض ذہنیت کے لوگ تماشے کر رہے ہیں اور وہ دیکھتے ہیں کہ جماعت مسلمہ طاغوتی قوتوں کا مقابلہ کر رہی ہے۔ یہ لوگ ان کو حقارت آمیز نظر سے دیکھتے ہیں جبکہ جماعت مسلمہ خطرات کا مقابلہ کر رہی ہے اور ان کو ہیچ سمجھتی ہے۔ یہ مریض اور منافقین جب دیکھتے ہیں کہ جماعت مسلمہ خطرات میں کودتی ہے تو ان کو پہلے تعجب ہوتا ہے اور پھر ان پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ واضح خطرات میں کود رہے ہیں۔ اس قدر جرأت اور تہور کی کوئی حقیقی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آتی اور نہ ان کو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو کیوں ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ یہ لوگ دین اور نظریہ کو بازار کی تجارت سمجھتے ہیں' اگر اس میں ان کو واضح فائدہ نظر آئے تو یہ اس میں اقدام کرتے اور اگر واضح فائدہ نظر نہ آئے تو سلامتی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ یہ معاملات کو مومنانہ نظر سے نہیں دیکھتے اور نتائج کو بھی ایمان کے پیمانے سے نہیں ناپتے۔ لیکن مومن کے نقطہ نظر سے تو یہ کاروبار ہمیشہ ہی نفع بخش رہتا ہے۔ دو اچھے نتائج میں سے کوئی ایک نتیجہ ضرور ظاہر ہوتا ہے یا تو مومن فتح یاب اور غالب ہوتا ہے اور یا وہ سیدھا جنت میں داخل ہوتا ہے۔ رہی ذات باری تو منافقین اور مریض ذہنیت کے لوگوں کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

قرآن کریم اہل ایمان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ تمام امور کو دین و ایمان کے نقطہ نظر سے دیکھیں اور مومنانہ بصیرت کے ساتھ معاملات کا جائزہ لیں۔ اللہ کے نور اور اس کی ہدایات کی روشنی میں امور کو دیکھیں اور طاغوتی قوتوں کی عظمت کو خاطر میں نہ لائیں اور اپنی قوت اور اپنے وزن کو کم نہ سمجھیں کیونکہ اللہ کی ذات ان کے ساتھ ہے۔ اور ان کے دل میں ہمیشہ یہ بات تازہ رہنی چاہئے کہ "جس نے اللہ پر توکل اور بھروسہ کیا تو یقیناً اللہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔"

---ooo---

اب اللہ اس معرکے میں ربانی قوتوں کے عمل و دخل کی ایک مثال پیش کرتا ہے۔ اس منظر میں فرشتے کام کر رہے ہیں۔ چشم بصیرت سے اس منظر کو دیکھو۔ فرشتے اس معرکے میں شریک ہیں۔ اور کفار کی پکڑ دھکڑ انہوں نے شروع کر دی ہے۔ ان کی روحوں کو نہایت ہی حقارت سے قبض کر رہے ہیں اور ان کو سخت سے سخت اذیت دے رہے ہیں۔ یہ محض اس لئے کہ یہ لوگ نہایت ہی تکبر سے اتراتے ہوئے شان و شوکت سے آ رہے تھے۔ اس میں ان کو بتایا جاتا ہے کہ اس

سخت اور مشکل وقت میں تمہارے ساتھ یہ سلوک تمہارے اعمال بد کی وجہ سے ہو رہا ہے اور اس میں تم پر کوئی بھی ظلم نہیں ہے۔ پھر اس منظرکشی کے بعد بتایا جاتا ہے کہ جھٹلانے کی وجہ سے کفار کو جو سزا دی جاتی ہے یہ اللہ کی ایک جاری سنت ہے۔ جس طرح آل فرعون اور ان سے پہلے لوگوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔

اور یہ اس اصول کے مطابق کہ اللہ جب کسی قوم پر انعام کرتا ہے تو وہ اس وقت تک اپنے انعامات کو واپس نہیں لیتا' جب خود ان اقوام کا رویہ بدل نہیں جاتا۔ اسی اصول کے مطابق اللہ نے فرعون اور اس سے پہلے کی اقوام کے ساتھ معاملہ کیا۔ اور آئندہ بھی جو قوم ایسی روش اختیار کرے گی' اللہ کا سلوک بھی ویسا ہی ہو گا۔

---

وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ یَتَوَفَّى الَّذِیْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓىٕكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ۚ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ﴿۵۰﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴿۵۱﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ یَكُ مُغَیِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۵۳﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ كُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِیْنَ ﴿۵۴﴾

"کاش تم اس حالت کو دیکھ سکتے جب کہ فرشتے مقتول کافروں کی روحیں قبض کر رہے تھے۔ وہ ان کے چہروں' اور ان کے کولہوں پر ضربیں لگاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "لو اب جلنے کی سزا بھگتو' یہ وہ جزا ہے جس کا سامان تمہارے اپنے ہاتھوں نے پیشگی مہیا کر رکھا تھا' ورنہ اللہ تو اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔"

یہ معاملہ ان کے ساتھ اسی طرح پیش آیا جس طرح آل فرعون اور ان سے پہلے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ پیش آتا رہا ہے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا۔ اللہ قوت رکھتا ہے اور سخت سزا دینے والا ہے۔ یہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔ اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ آل فرعون اور ان سے پہلے کی قوموں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ اسی ضابطہ کے مطابق تھا۔ انہوں نے اپنے رب کی آیات کو

جھٹلایا۔ تب ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں ہلاک کیا اور آل فرعون کو غرق کر دیا۔ یہ سب ظالم لوگ تھے۔"

اس ٹکڑے کی دو پہلی آیات سے مراد یوم بدر میں کام آنے والے مشرکین سے ہے۔

وَلَوْ تَرٰی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمَلٰٓئِکَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ (۵۰) ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْکُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (۵۱) (۸: ۵۰ – ۵۱)) "کاش تم اس حالت کو دیکھ سکتے جب کہ فرشتے مقتول کافروں کی روحیں قبض رہے تھے۔ وہ ان کے چہروں' اور ان کے کولہوں پر ضربیں لگاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "لو اب جلنے کی سزا بھگتو' جزا ہے جس کا سامان تمہارے اپنے ہاتھوں نے پیشگی مہیا کر رکھا تھا' ورنہ اللہ تو اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

کیونکہ ملائکہ اس معرکے میں شریک تھے۔ جس طرح کہا گیا۔

فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ کُلَّ بَنَانٍ (۱۲) ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ یُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (۱۳) (۸: ۱۲ – ۱۳)) "پس تم ان کی گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ۔ یہ اس لئے کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کیا اور جو اللہ اور رسول کا مقابلہ کرے اللہ اس کے لئے نہایت ہی سخت گیر ہے۔"

اگرچہ ہمیں اس مار اور جوڑ جوڑ پر ضرب لگانے کی تفصیلی کیفیت کا علم نہیں ہے' جس طرح نویں پارے میں اس آیت پر بحث کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا۔ لیکن اگر ہمیں کسی مفہوم کی تفصیلی کیفیت کا علم نہ ہو یا ہماری سمجھ میں نہ آ رہی ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم آیت کو اپنے ظاہری مفہوم سے پھیر دیں۔ ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے ملائکہ کو حکم تھا کہ وہ ماریں' اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ملائکہ اللہ کے کسی حکم سے سرتابی ہی نہیں کرتے۔ وہ تو وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔ تو یہ دونوں آیات گویا واقعات بدر کو یاد رکھنے کی طرف اشارہ ہو گا اور یہ بتانا مقصود ہو گا کہ یہ بات بھی واقعات بدر میں شامل ہے کہ اس دن کفار کے ساتھ یہ یہ سلوک ہوا۔

لیکن یہ آیات بتا رہی ہیں کہ جب بھی کفار پر موت کا وقت آتا ہے تو فرشتے ان کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔ فرشتوں کا یہ سلوک مقتولین بدر کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اور یہ خطاب وَلَوْ تَرٰی گویا تمام اہل ایمان کے لئے ہو گا۔ اور یہ انداز کلام قرآن ہر اس مقام پر اختیار کرتا ہے جہاں لوگوں کو ایک کھلے منظر کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ جسے ہر دیکھنے والا دیکھ سکتا ہو۔

بہرحال ان دو آیات کی جو تفسیر بھی ہو اہل کفر کے قبض روح کا نظارہ نہایت ہی خوفناک ہے۔ ملائکہ ان کے اجسام سے ان کی روح کو نہایت ہی توہین آمیز انداز میں کھینچ لیتے ہیں اور اس حقارت و توہین کے ساتھ ساتھ یہ لوگ عذاب شدید میں مبتلا ہوتے ہیں۔

"کاش تم اس حالت کو دیکھ سکتے جبکہ فرشتے مقتول کافروں کی روحیں قبض کر رہے تھے - وہ ان کے چہروں اور ان کے کولہوں پر ضربیں لگاتے جاتے تھے -"

اب یہاں سے آگے بیانیہ انداز کے بجائے براہ راست خطاب شروع ہوتا ہے :

"لو اب جلنے کی سزا بھگتو" اور انداز خطاب اس لئے اختیار کیا گیا کہ یہ منظر آنکھوں کے سامنے آجائے 'گویا جہنم' اس کی آگ اور جلنے کے عمل کے ساتھ موجود ہے اور لوگوں کو اس میں پھینکا جا رہا ہے - لعنت و پھٹکار بھی ہو رہی ہے -

"یہ وہ جزاء ہے جس کا سامان تمہارے اپنے ہاتھوں نے پیشگی مہیا کر رکھا تھا" اس لئے تمہیں جو سزا دی جا رہی ہے یہ عادلانہ سزا ہے - تم اس کے مستحق ہو اور تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے ورنہ :"اللہ تو اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے -"

یہ آیت جو جہنم کے جلانے والے عذاب کی تصویر کشی کرتی ہے 'اس کو پڑھ کر ایک سوال ذہن میں اٹھتا ہے کہ آیا یہ تہدید جو ملائکہ کی طرف سے انہیں دی جا رہی ہے آیا اس عذاب کی ہے جو قیامت کے دن انہیں حساب و کتاب کے بعد دیا جائے گا یا کفار کے مجرد قبض روح کے ساتھ ہی وہ جہنم رسید ہو جاتے ہیں -

یہ دونوں صورتیں ممکن ہیں اور جائز ہیں - اور دونوں مفہوم ان آیات سے اخذ کئے جا سکتے ہیں - اس سے زیادہ ہم اس پر کوئی بحث نہیں کرتے - کیونکہ یہ ایک غیبی امر ہے اور اللہ نے اسے اپنے علم میں محفوظ کر لیا ہے - ہم پر فرض یہی ہے کہ ہم اس پر یقین کر لیں - ایسا ہو گا اور کوئی بات اس میں مانع نہیں ہے - ایسا کب ہو گا - مرتے وقت یا بعد الحساب تو یہ اللہ کے علم میں ہے جو علام الغیوب ہے -

بدر کے حالات پر ایک سرسری نظر نظر ڈالنے کے بعد اب سیاق کلام ایک قاعدہ کلیہ کے بیان کی طرف منتقل ہو جاتا ہے - یہ واقعہ اور یہ منظر اسی کلیہ کا ایک جزئیہ ہے - یہ کہ اہل کفر کو نہایت ہی توہین آمیز انداز میں گرفت میں لینا ایک جاری و ساری سنت ہے اور اس میں کوئی تبدیلی کبھی بھی نہیں ہوتی - یہ سلوک اس وقت سے جاری ہے جب سے اللہ نے حق و باطل کی کشمکش کو اس جہاں میں چلایا ہے -

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸ : ۵۲) "یہ معاملہ ان کے ساتھ اسی طرح پیش آیا جس طرح آل فرعون اور ان سے پہلے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ پیش آتا رہا ہے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا - اللہ قوت رکھتا ہے اور سخت سزا دینے والا ہے -"

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت نہیں ہے کہ لوگوں کو سمندر کی لہروں کے حوالے کر دے یا ان کو اتفاقات زمانہ کے سپرد کر دے - اور وہ کسی اصول اور ضابطے کے پابند نہ ہوں - بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو اپنے ضابطہ قضا و قدر کا پابند کیا ہے - مشرکین کو یوم بدر میں جو حالات پیش آئے یا آئندہ بھی وہ جن حالات سے دوچار ہوں گے - وہ اللہ اور اس کے نظام قضا و قدر کے مطابق ہیں - اور اسی نظام کے مطابق فرعون اور اس سے پہلے کے اہل کفر کے ساتھ ہوا -

"انہوں نے اللہ کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اللہ نے ان کے گناہوں پر ان کو پکڑ لیا -"

اور انہوں نے اللہ کی پکڑ میں اپنی کوئی مدافعت نہ کر سکی اور نہ وہ اس عذاب سے بچ سکے' اس لئے کہ :'' بے شک اللہ قوت رکھتا ہے اور سخت سزا دینے والا ہے۔''

اللہ نے ان لوگوں پر انعامات کی بارش کی۔ ان پر فضل و کرم کر کے انہیں بہت کچھ دیا۔ زمین پر ان کا اقتدار قائم کیا۔ اور وہ اس اقتدار کے وارث بنے' لیکن اللہ یہ سب چیزیں جسے بھی دیتا ہے وہ برائے امتحان دیتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہ لوگ شکر کرتے ہیں یا ناشکری کرتے ہیں لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے شکر نہ کیا بلکہ ناشکری کا مظاہرہ کیا بلکہ انہوں نے بغاوت و سرکشی کا رویہ اختیار کیا۔ ان انعامات اور قوتوں کی وجہ سے وہ جبار و قہار بن گئے۔ اور فسق و فجور میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو طاغوتی قوت کی شکل دے دی۔ ان کے پاس اللہ کی آیات و معجزات آئے تو انہوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا۔ لہٰذا اب وہ اس بات کے مستحق ہو گئے کہ انہیں اس قانون کے تحت پکڑا جائے جو اس کائنات کے لئے سنت جاریہ ہے کہ جب اللہ کی آیات کسی تک پہنچ جاتی ہیں اور لوگ ان کی تکذیب کرتے ہیں تو اللہ انہیں پکڑتا ہے اور ان کو پیس کر کے رکھ دیتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (٥٣) كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ (٥٤) (٨:٥٣ - ٥٤)

''یہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو' اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔ اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ آل فرعون اور ان سے پہلے کی قوموں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ اسی ضابطہ کے مطابق تھا۔ انہوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا تب ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں ہلاک کیا اور آل فرعون کو غرق کر دیا۔ یہ سب ظالم لوگ تھے۔

اللہ نے انہیں تب ہلاک کیا جب انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔ اس سے قبل ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی' باوجودیکہ وہ کافر تھے' کیونکہ یہ اللہ کی سنت جاریہ ہے اور اس کا کرم ہے کہ اس نے یہ اصول مقرر کیا ہے۔ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ''اور ہم اس وقت تک عذاب نہیں دیتے جب تک رسول نہ بھیج دیں۔'' یہاں آل فرعون اور ان سے پہلے کی اقوام جن کے پاس آیات الٰہی بھیجی گئیں اور انہوں نے تکذیب کی اور اللہ نے ان پر ہلاکت و بربادی نازل کی۔ یہ کارروائی ان کے خلاف کیوں کی گئی' اس لئے کہ (وہ ظالم تھے) یہاں لفظ ظلم بمعنی کفر یا شرک استعمال ہوا ہے۔ اور قرآن کریم میں یہ لفظ اکثر انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

یہاں اس آیت پر قدرے گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے :-

''یہ اس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو' اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔''

اللہ کی جانب سے بندوں کے ساتھ عدل و انصاف کا یہ ایک اہم پہلو ہے۔ اللہ نے جس بندے کو بھی کوئی نعمت دی ہے' وہ اس سے اللہ اس وقت تک نہیں چھینتا جب خود بندہ اپنی نیت نہیں بدل دیتا۔ اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتا' اور اپنے طور طریقوں کو نہیں بدل دیتا۔ اور اپنے آپ کو اس بات کا مستحق نہیں بنا لیتا کہ اللہ ان سے وہ نعمت چھین لے جو ان کو دی گئی۔ کیونکہ یہاں جسے بھی جو کچھ دیا جاتا ہے' وہ آزمائش اور ابتلا کے لئے دیا جاتا ہے اور جب بندے اس عطا کی قدر نہیں کرتے اور اس کا شکر نہیں بجالاتے تو وہ ان سے یہ عطا واپس لے لیتا ہے۔ اور اس میں ایک پہلو انسان کی عظمت اور تکریم کا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام قضا و قدر اور اخذ و عطا کو خود انسان کے طرز عمل کے ساتھ منسلک کر دیا ہے اور اپنے نظام قضا و قدر کو یوں چلاتا ہے کہ جس طرح انسان چلے اور کرے ویسا بھرے۔ انسان جو عمل اختیار کرے' اس کی نیت جس طرح کام کرتی ہے اور وہ اپنے لئے جو راہ' جو طرز عمل اور جو رویہ اختیار کرتے ہیں اس کے مطابق نظام قضا و قدر ان کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔ ایک تیسرا پہلو یہ ہے کہ یہاں حضرت انسان پر اس کے اعمال کی عظیم ذمہ داری بھی عائد کی جاتی ہے۔ اور عزت و تکریم کے ساتھ اسے یہ موقعہ بھی دیا جاتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اللہ کے انعامات اور اس کے فضل و کرم کے جواب میں شکر نعمت کر کے ان میں اور اضافہ کرا لے جس طرح ناشکری کے نتیجے میں یہ انعامات زائل بھی ہو جاتے ہیں۔

یہ ایک اہم حقیقت ہے اور اسلام کے تصور انسان میں یہ حقیقت تو بہت اہم ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کائنات میں نظام قضا و قدر کا مقام انسانیت کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اور انسان کا اس کائنات کے ساتھ کیا رابطہ ہے جس میں وہ رہا ہے؟ اس نظام قضا و قدر سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ہاں انسان کی اہمیت کس قدر ہے۔ اور اس پہلو سے اسلام نے انسان کو کس قدر اعزاز بخشا ہے کہ انسان کے اپنے معاملات میں اور اس کائنات میں رونما ہونے والے بڑے بڑے انقلابات میں انسان کی روش کو اہم فیکٹر قرار دیا گیا ہے۔ اور انسان کی اس مثبت روش ہی سے مثبت نتائج اور اس کی منفی روش سے اسے منفی اور ناخوشگوار نتائج سے دوچار ہونا پڑتا ہے جبکہ انسان کے بارے میں آج کا مادی تصور یہ ہے کہ اس میں وہ ایک ذلیل و حقیر مخلوق ہے اور وہ مادیت کے جبری قوانین میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ اقتصادی عوامل کے ہاتھوں میں بھی مجبور ہے۔ تاریخ کے حتمی اصولوں کے سامنے بھی مجبور محض ہے' اور ترقی کے جبری قواعد میں بھی اسے مجبور دکھایا گیا ہے۔ غرض دور جدید کے مادی تصور میں جو جبریات ہیں' ان کے مقابلے میں انسان کی کوئی حیثیت اور وقعت نہیں ہے۔ اس لئے اس کو یہ تصور دیا جاتا ہے کہ وہ ان طبیعی جبریات کے سامنے ایک بے بس' ذلیل اور کمزور مخلوق ہے۔

یہ حقیقت یہ تصور دیتی ہے کہ عمل اور جزاء کا باہم تعلق ہے اور اس کائنات میں انسان ایک موثر مخلوق ہے۔ اور اللہ اس کے ساتھ کوئی ظلم نہیں کرتا۔ اللہ کی سنت اور اس کے قوانین طبیعی اس کے نظام قضا و قدر کے مطابق چلتے ہیں جن میں انسانوں پر کوئی ظلم نہیں ہوتا۔

وَ اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ "اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔" اس لئے اللہ نے آل فرعون کو بھی ان کے کرتوتوں کی وجہ سے ہلاک کیا۔ محض بے وجہ ان پر ظلم نہیں کیا ہے۔ ایک بار پھر آیت پر غور فرمائیں۔

"یہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو' اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔"

# درس نمبر ۸۶ ایک نظر میں

سورت انفال کا یہ چوتھا اور آخری سبق ہے۔اس میں دوسرے ممالک اور بلاکوں کے ساتھ صلح و جنگ کے کچھ قواعد وضع کیے گئے ہیں۔اس کے علاوہ اسلامی معاشرے کی داخلی تنظیم اور دوسری تنظیموں کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کو منضبط کیا گیا ہے۔مختلف احوال میں اسلام اور دوسری اقوام کے ساتھ معاہدوں کی نوعیت پر بحث ہے۔نیز خون رنگ و نسل' علاقائیت اور عقائد و نظریات کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر کو متعین کیا گیا ہے۔

اس سبق میں ان موضوعات کے بارے میں ایسے احکام بھی دیئے گئے ہیں جو اپنے موضوع پر فائنل ہیں۔اور بعض ایسے ہیں جو اس مرحلے کے لئے تھے جن میں یہ سورت اتری ہے اور متعین حالات کے لئے تھے۔یا ایک متعین واقعہ کے لئے تھے اور جن میں بعد میں ترمیمیں کی گئیں اور انہوں نے بعد میں آخری صورت اختیار کی۔یعنی سورت توبہ میں ان احکامات نے آخری شکل اختیار کی۔سورت توبہ مدنی دور کی آخری سورتوں میں سے ہے۔

ان احکامات اور قواعد میں درج ذیل امور شامل ہیں۔

☆ جو لوگ اسلامی بلاک سے معاہدے کرتے ہیں اور بعد میں اپنے عہد کو توڑ دیتے ہیں وہ اس کرۂ ارض پر بدترین جانور ہیں۔لہٰذا اسلامی بلاک کے فرائض میں یہ بات شامل ہے کہ وہ ان کی سبق آموز تربیت کرے۔اور ان کو ایسا سبق سکھائے کہ یہ لوگ اور ان کے بعد آنے والے یا ان کی پشت پر جو قوتیں کھڑی ہوں ان کے لئے بھی وہ اچھی عبرت ہو۔

☆ جن معاہد اقوام سے اسلامی حکومت کو یہ خطرہ لاحق ہو کہ وہ بدعہدی کریں گی یا عہد میں امانت داری کے مقابلے میں خیانت کریں گی تو اسلامی قیادت کا یہ حق ہو گا کہ وہ اس عہد کو ان کے سامنے رکھ دے اور اعلان کر دے کہ اس کی اب کوئی حیثیت نہیں ہے اور اس کے بعد اگر اسلامی حکومت ان لوگوں کی سرزنش کرے تو وہ آزاد ہے تاکہ وہ ان لوگوں کو خوفزدہ کر سکے جو اسلامی حکومت کے خلاف سرگرم ہوں اور تیاریاں کر رہے ہوں کہ حملہ کر دیں۔

☆ یہ کہ اسلامی بلاک کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنی دفاعی افواج کو ہروقت چوکس رکھیں اور انتہائی ممکن حد تک اپنی فوجی قوت کو ترقی دیں۔اس طرح کہ اس کرۂ ارض پر ہدایت یافتہ قوت ہی بڑی قوت ہو اور اس سے تمام باطل قوتیں لرزہ براندام ہوں اور ان کی قوت کے بارے میں زمین میں تمام باطل قوتیں جانتی ہوں اور خائف ہوں اور یہ جراءت نہ کر سکیں کہ وہ حملہ آور ہوں اور وہ اللہ کی سلطنت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور صورت حال یہ ہو جائے کہ پوری دنیا میں کسی داعی اسلام کے لئے کوئی رکاوٹ نہ ہو اور کوئی رکاوٹ ان لوگوں کے سامنے نہ رہے جو دعوت اسلامی کو قبول کرنا چاہتے ہیں اور کوئی قوت سیاسی اقتدار اعلیٰ اپنے لئے مخصوص کرنے والی نہ ہو بلکہ نظام

حکومت صرف اللہ کا چلتا ہو۔

☆ یہ کہ اگر غیر مسلموں میں سے کوئی اسلامی کیمپ کے ساتھ کوئی معاہدۂ امن کرنا چاہے اور وہ اسلامی حکومت کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے تو اسلامی حکومت کی قیادت کا یہ فرض ہو گا کہ وہ اسے قبول کر لے اور معاہدہ کر لے۔ اگر وہ کوئی خفیہ سازش کرنا چاہتے ہوں اور بظاہر دھوکے کی کوئی علامت نظر نہ آتی ہو تو ان کا فرض ہے کہ ان کے خفیہ ارادوں کو اللہ پر چھوڑ دے۔ اللہ اس قسم کے فریب کاروں کے شر سے بچانے والا ہے۔

☆ جہاد مسلمانوں پر فرض ہے۔ اگرچہ دشمن کی تعداد مسلمانوں کی تعداد سے دوگنا ہو۔ خدا کے فضل سے مسلمانوں کو اپنے دشمنوں پر فتح نصیب ہوگی۔ ان میں سے ایک آدمی بیس کا مقابلہ کر سکتا ہے اور کمزور حالات میں بھی ان میں سے ایک آدمی دو آدمیوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ لہٰذا جہاد کا فریضہ اس موقع کے لئے انتظار کی مہلت نہیں دیتا کہ مومنین اور ان کے دشمن کی تعداد برابر ہو۔ اس لئے مسلمانوں کی تیار قوت ہی کافی ہے اور ان پر فرض ہے کہ زیادہ سے زیادہ قوت تیار رکھیں۔ اللہ پر بھروسہ کریں، معرکے میں ثابت قدم رہیں۔ مشکلات میں صبر سے کام لیں اور نتائج اللہ پر چھوڑ دیں۔ اس لئے کہ وہ مادی قوتوں کے علاوہ روحانی قوت بھی رکھتے ہیں۔

☆ اسلامی محاذ کا پہلا ہدف یہ ہونا چاہئے کہ وہ طاغوتی قوت کے تمام سرچشموں کو پاش پاش کر کے رکھ دے۔ اگر وہ سمجھتے ہوں کہ فوجیوں کو قید کرنا اور پھر تاوان جنگ لے کر چھوڑ دینا مفید مطلب نہیں ہے تو پھر ایسا ہرگز نہ کرنا چاہئے، اس لئے کہ رسول اور مسلمانوں کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ طاغوتی قوتوں کو اچھی طرح پاش پاش کرنے سے قبل ہی لوگوں کو قید کرتے پھریں۔ لہٰذا ان کا ہدف یہ ہو کہ وہ دشمن کی قوت کو پاش پاش کر کے علاقے میں اپنا اقتدار اعلیٰ نافذ کر دیں۔ اس سے پہلے قیدی بنا کر فدیہ لینے سے بہتر ہے کہ وہ دشمن کو پیس کر رکھ دیں۔

☆ مسلمانوں کے لئے مال غنیمت حلال کر دیا گیا ہے اور اسی طرح مسلمانوں کے لئے بھی یہ جائز کر دیا گیا ہے کہ وہ قیدیوں کو رہا کر کے جنگی تاوان وصول کریں لیکن اس وقت جب وہ دشمن کی قوت کو اچھی طرح توڑ دیں اور اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کر دیں اور ان کے اقتدار کی شان و شوکت قائم ہو جائے۔

☆ اسلامی کیمپ میں قید ہونے والے کفار سے کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام میں دلچسپی لیں اور یاد رکھیں کہ تم سے جو اموال غنیمت لئے گئے ہیں اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو اللہ تمہیں اس سے اچھا دینے والا ہے۔ لیکن اگر تم خیانت کرو گے تو جس طرح تمہارا انجام جنگ بدر میں ہوا ہے وہی دوبارہ ہو گا۔

☆ اسلامی معاشرہ میں اکثر نظریات پر ہوتا ہے لیکن تعلق موالات تو خصوصاً نظریات اور مشترکہ تحریک کی اساس پر ہوتا ہے، لہٰذا جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور جن لوگوں نے پناہ دی اور نصرت دی یہی لوگ دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے نظریہ تو قبول کر لیا اور ایمان بھی لائے مگر ہجرت نہ کی تو ان کے اور مومنین مہاجرین کے درمیان کوئی ولایت نہیں ہے۔ یعنی دارالاسلام ان کی نصرت اور ان کی کفالت اور ہمدردی کا پابند نہیں ہے۔ اور ان کی مسلمانوں پر نصرت اور ہمدردی صرف اس وقت فرض ہے جبکہ ان کا عقیدہ اور نظریہ زد میں ہو اور نظریات و عقائد کی وجہ سے ان پر ظلم ہو رہا ہو۔ لیکن اس بارے میں بھی ایک مزید شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ ظلم اور زیادتی اس قوم کی طرف سے نہ ہو جن کا اہل اسلام کے ساتھ کوئی معاہدہ ہو۔

☆ اسلامی معاشرے کے اندر بھی دوستی اور ہمدردی کا تعلق صرف اس آگھ کے دائرے کے اندر ہے جس کا عقیدہ و نظریہ حقیقی ایمان کا ہو اور ان کے اندر اسلامی انقلاب کے لئے مشترکہ تحریک کا تعلق بھی ہو۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رشتہ دار (اولو الارحام) دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ترجیح کے مستحق تصور نہ ہوں گے' لہذا وہ زیادہ قریب تصور ہوں گے۔بشرطیکہ یہ رشتہ دار سب کے سب اسلامی نظریہ حیات کے قائل ہوں اور باہم مل کر اسلام کے لئے کام کر رہے ہوں۔ صرف رشتہ داری کافی نہیں ہے' یعنی ایسی رشتہ داری جس میں نظریات وعقائد کا اشتراک نہ ہو اور جس میں ایک مقصد کے لئے حرکت نہ پائی جاتی ہو۔

اجمالاً اس سبق میں یہی بڑے مضامین ہیں اور یہ مضامین و موضوعات اسلامی معاشرے کی تنظیم کے داخلی اور خارجی موضوعات کے اہم مضامین ہیں۔اور تفصیلات آیات کی تشریح کے دوران ملاحظہ فرمائیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۸۶ تشریح آیات

## ۵۵ --- تا --- ۷۵

---

إِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِندَ اللّٰهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا
يُؤْمِنُونَ ﴿٥٥﴾ الَّذِينَ عٰهَدتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ
مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُونَ ﴿٥٦﴾ فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ
خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿٥٧﴾ وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانۢبِذْ إِلَيْهِمْ
عَلٰى سَوَآءٍ ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِينَ ﴿٥٨﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا ع ١٠
سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ ﴿٥٩﴾ وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَّ ٣
مِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِينَ مِن دُونِهِمْ
لَا تَعْلَمُونَهُمُ ۚ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ يُوَفَّ
إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿٦٠﴾ وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ
عَلَى اللّٰهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦١﴾ وَإِن يُرِيدُوا أَن يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۚ هُوَ
الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٢﴾ وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۚ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ
جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٦٣﴾

---

"یقیناً اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والی مخلوق میں سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جنہوں نے حق کو ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر کسی طرح وہ اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ (خصوصاً) ان میں سے وہ لوگ جن کے ساتھ تو نے معاہدہ کیا پھر وہ ہر موقع پر اس کو توڑتے ہیں اور ذرا خدا کا خوف نہیں کرتے۔ پس اگر یہ لوگ تمہیں لڑائی میں مل جائیں تو ان کی ایسی خبر لو کہ ان کے بعد دوسرے جو لوگ ایسی روش اختیار کرنے والے ہوں' ان کے حواس باختہ ہو جائیں۔ توقع ہے کہ بدعہدوں کے اس انجام سے وہ سبق لیں گے اور اگر کبھی تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو' یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔ منکرین حق اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ وہ بازی لے گئے' یقیناً وہ ہم کو ہرا نہیں سکتے۔

اور تم لوگ' جہاں تک تمہارا بس چلے' زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لئے مہیا رکھو' تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوفزدہ کر دو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا۔ اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہو گا۔

اور اے نبی" اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لئے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو' یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ دھوکے کی نیت رکھتے ہوں تو تمہارے لئے اللہ کافی ہے۔ وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعہ سے تمہاری تائید کی اور مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیئے۔ تم روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے' یقیناً وہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔"

یہ آیات ایک قسم کی عملی ہدایات ہیں' اس وقت جبکہ جماعت مسلمہ ایسے حالات سے عملاً دوچار تھی۔ اس وقت مدینہ میں اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ ان عملی حالات میں' امت مسلمہ کو ضروری احکامات دیئے گئے۔

ان میں سے اکثر ہدایات اس وقت کی قائم اسلامی مملکت یا اسلامی محاذ اور اس وقت کی اسلامی حکومت کے اردگرد قائم مملکتوں اور محاذوں کے درمیان قانون بین الممالک کے موضوع پر ہیں۔ ان آیات کے بعد' قرآن کریم نے ان میں معمولی ترمیمات کی ہیں لیکن یہ ہدایات اسلام کے قانون بین الممالک کے سلسلے کی اساسی ہدایات ہیں۔

ان ہدایات میں اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ مختلف بین الاقوامی گروہوں اور مملکتوں کے درمیان باہم سلامتی کے معاہدات ہو سکتے ہیں' بشرطیکہ فریقین معاہدہ اس کی شرائط کی نیک دلی کے ساتھ پابندی کرتے ہوں۔ اگر کوئی فریق اس معاہدے کے پردے میں غداری اور خیانت کی تدابیر کر رہا ہو اور حملے اور شرانگیزیوں کی تیاری کر رہا ہو تو اسلامی مملکت کے سربراہ کو یہ اختیار ہے کہ وہ ان معاہدوں کو علی الاعلان منسوخ کر دے اور اس کی اطلاع فریق مخالف کو بھی دے دے اور پھر اس کا اختیار ہے کہ وہ جس وقت چاہے اس قسم کے خائنوں اور غداروں پر ضرب لگائے اور یہ ضرب اس قدر شدید ہو اور اس قدر سبق آموز ہو کہ کوئی کینہ پرور کھلے طور پر یا خفیہ طور پر اسلامی مملکت کے خلاف کسی قسم کی کاروائی کی جراءت بھی نہ کر سکے۔ رہے وہ لوگ جو اسلامی محاذ سے دوستی کا معاہدہ کر لیں اور پھر دعوت اسلامی کی راہ میں رکاوٹ بھی نہ بنیں یا یہ کہ وہ ہر شخص تک دعوت اسلامی کے پہنچنے میں مزاحم نہ ہوں تو اسلامی حکومت کو یہ اختیار

حاصل ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی معاہدہ کرے اور جب تک ان سے کسی بدنیتی کا ظہور نہ ہو وہ ان کے ساتھ عہد پر قائم رہے۔

پڑوسی مملکتوں کے درمیان عملی حالات کا یہ ایک عملی ضابطہ ہے۔ یہ ضابطہ باہم تعلقات کو اس وقت تک ختم نہیں کرتا جب تک اسلامی مملکت کے پڑوسی ممالک دعوت اسلامی کے پھیلاؤ کی راہ میں کوئی مادی رکاوٹ کھڑی نہیں کر دیتے اور لوگوں کے کانوں تک اسلام کی تبلیغ کی رسائی کو ختم نہیں کر دیا جاتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ تحفظ بھی دیا جاتا ہے کہ یہ معاہدے دشمن کے لئے سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سبب نہ بن جائیں اور ان معاہدوں کے پس پردہ یہ لوگ اسلامی مملکت پر اچانک اور غدارانہ ضرب لگانے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں۔

وہ عملی حالات کیا تھے جن میں یہ ہدایات نازل ہوئیں۔ جب امت مسلمہ ہجرت کر کے مدینہ کو گئی تو اس وقت وہاں مسلمانوں کو جو حالات درپیش تھے ان کی تلخیص امام ابن قیم نے زاد المعاد میں یوں کی ہے: ”جب حضور ؐ مدینہ تشریف لائے تو ان کے اور کفار کے درمیان تین قسم کے تعلقات تھے۔ ایک قسم کے لوگ وہ تھے جنہوں نے حضور ؐ کے ساتھ مصالحت کی اور وعدہ کیا کہ وہ آپ ؐ کی مخالفت نہ کریں گے۔ آپ ؐ کے ساتھ جنگ نہ کریں گے نہ آپ ؐ کے دشمنوں کے ساتھ موالات کریں گے اور امداد دیں گے اور وہ اپنے کفریہ نظریات پر قائم رہیں گے اور پرامن رہیں گے۔ ان کا خون اور مال محفوظ ہوگا۔ دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جو آپ کے دشمن اور محارب تھے اور تیسری قسم ان لوگوں کی تھی جنہوں نے نہ تو عہد کیا اور نہ ہی آپ کے ساتھ جنگ کی بلکہ وہ انتظار کرتے رہے کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ ان لوگوں میں سے بعض تو ایسے تھے جو آپ کی کامیابی کے دل سے خواہاں تھے اور بعض ایسے تھے جو آپ کے دشمنوں کی کامیابی اور فتح چاہتے تھے۔ اور بعض ایسے تھے جو مسلمانوں کی صفوں میں بظاہر شریک ہوگئے تھے لیکن فی الباطن وہ دشمنوں کے ساتھ تھے۔ یہ منافقین تھے' تو حضور ؐ نے ان لوگوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جس کا رب تعالیٰ نے حکم دیا۔

جن لوگوں نے آپ کے ساتھ عہد امن کیا اور وعدہ کیا وہ مدینہ کے ارد گرد رہنے والے تین یہودی قبائل تھے۔ بنی قینقاع' بنو النضیر اور بنو قریظہ اور ان کے علاوہ بعض مشرک قبائل بھی تھے جو مدینہ کے ارد گرد بستے تھے۔

بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ حالات وقتی حالات تھے اور عملی حالات تھے' جو مسلمانوں کو درپیش تھے۔ اور اسلامی مملکت یا اسلامی نظام کے مستقل بین الاقوامی ضوابط نہ تھے۔ کیونکہ بعد میں ان کے اندر ترمیمات کی گئیں۔ اور سورت برأت میں جو احکام وارد ہوئے وہ آخری احکام تھے۔

بین الاقوامی تعلقات جن مراحل سے گزرے ان کا ذکر ہم نے امام ابن القیم کی کتاب زاد المعاد سے پارۂ نہم میں نقل کیا تھا۔ یہاں مناسب ہے کہ دوبارہ وہ اقتباس دے دیا جائے۔

”بعثت سے لے کر وفات تک کفار اور منافقین کے ساتھ آپ کا طرز عمل“ اس عنوان کے تحت آپ رقم طراز ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آپ کی طرف یہ وحی نازل کی کہ ”آپ اپنے رب کے نام سے پڑھیں' یوں ہوا آپ ؐ کی نبوت کا آغاز' اس وقت جو حکم دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ آپ اپنے دل میں پڑھیں ابھی آپ کو تبلیغ کا حکم نہ ملا تھا' کچھ

عرصہ بعد یہ آیت نازل ہوئی یٰاَیُّھَا الْمُدَثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ یعنی اقراء سے آپ کو نبوت ملی اور یٰاَیُّھَا الْمُدَثِّرْ سے آپ کو منصب رسالت عطا ہوا اور حکم دیا گیا کہ آپ اپنے رشتہ داروں کو ڈرائیں' رشتہ داروں کے بعد آپ نے اپنی قوم کو انجام بد سے ڈرایا۔ قوم کے بعد مکہ مکرمہ کے ارد گرد پھیلے ہوئے قبائل کو تبلیغ کی۔ اس کے بعد یہ پیغام پوری عرب دنیا تک عام کر دیا گیا اور بالاخر اس دعوت کو بین الاقوامی دعوت بنا دیا گیا۔

دعوت اسلامی کا کام شروع کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کئی سال تک صرف وعظ اور تبلیغ کرتے رہے اور طاقت کا استعمال نہ کیا۔ بلکہ آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ صبر اور درگزر سے کام لیں اور اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیں۔ ایک عرصہ بعد آپ کو ہجرت کی اجازت دی گئی اور ساتھ ہی دشمنوں سے لڑنے کی بھی اجازت دی گئی تاہم یہ اجازت اس حد تک تھی کہ صرف ان لوگوں سے جنگ کی جائے جو لڑنے کے لئے میدان میں اتر آئیں اور دوسروں سے نہ لڑا جائے اور سب سے آخر میں یہ حکم دیا گیا کہ کفار اور مشرکین سے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جائے جب تک دین اللہ کے لئے خالص نہیں ہو جاتا۔ لِیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہُ لِلّٰہ جس وقت آپ کو جہاد کا حکم دیا گیا اس وقت حضور ؐ اور کفار کے درمیان تعلقات کی صرف تین شکلیں تھیں۔ اہل صلح' اہل حرب اور اہل ذمہ۔ اہل صلح یعنی جن کے ساتھ امن کے معاہدات ہوئے تھے ان کے بارے میں حکم ہوا کہ عہد کو آخر تک نبھایا جائے' لیکن صرف اس صورت میں کہ جانب مخالف اپنے معاہدے کا پابند ہو اور اگر وہ عہد شکنی اور غداری کریں تو آپ بھی معاہدہ ان کے منہ پر دے ماریں' البتہ ایسے لوگوں کے ساتھ عملاً جنگ اس وقت تک نہ چھیڑی جائے جب تک انہیں باقاعدہ اطلاع نہ دے دی جائے کہ معاہدہ ختم ہو چکا ہے۔ جب سورۃ براءۃ نازل ہوئی تو ان تمام اقسام کے احکام علیحدہ علیحدہ بیان ہوئے' اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے اس وقت تک لڑیں کہ یا وہ جزیہ قبول کریں اور یا اسلام میں داخل ہو جائیں اور مشرکین اور منافقین سے بھی جہاد کا حکم دیا گیا۔ نیز منافقین سے مزید سختی برتنے کا حکم دیا گیا۔ کفار کے ساتھ آپ کا جہاد مسلح جنگ کی شکل میں تھا اور منافقین کے ساتھ زبان اور دلیل سے۔

سورہ براءۃ میں یہ حکم بھی دیا گیا کہ کفار کے ساتھ کئے ہوئے تمام معاہدات کو ختم کر دیا جائے اور علی الاعلان ان سے براءت کا اظہار کر دیا جائے۔ اس اعلان کے بعد اہل عہد کی تین اقسام قرار پائیں' وہ جن کے ساتھ جنگ کا حکم دیا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے عہد شکنی کی تھی اور اپنے عہد پر قائم نہیں رہے تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ حضور ؐ نے جنگ کی اور ان پر فتح پائی۔ دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جن کے ساتھ عہد تھا اور وہ اسے نبھاتے بھی رہے۔ آپ کو حکم دیا گیا کہ ان کے ساتھ جو معاہدہ ہے اسے مقررہ مدت تک برقرار رکھا جائے اور شرائط کی پابندی کی جائے۔ تیسری قسم ایسے لوگوں کی تھی کہ جن کے ساتھ اگرچہ معاہدہ تو نہ تھا لیکن یہ لوگ آپ کے خلاف کسی جنگ میں بھی شریک نہ ہوئے تھے' یا ان کے ساتھ تعین مدت کے بغیر معاہدہ طے پا گیا تھا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں حکم ہوا کہ انہیں چار ماہ کی مہلت دی جائے اور ان سے کہہ دیا جائے کہ اس کے بعد کوئی معاہدہ نہیں کیا جائے گا۔ یا مسلمان ہو جاؤ ورنہ لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

چنانچہ انہی ہدایات کے مطابق آپ نے عہد شکنوں کے ساتھ جنگ کی' اور جن کے ساتھ کوئی عہد نہ تھا انہیں چار ماہ کی مہلت دی اور راست باز معاہدین کے ساتھ اپنا عہد پورا کیا اور ایسے تمام لوگ معاہدہ کی مدت پوری ہونے سے پہلے

ہی اہل ایمان اور مسلمانوں کا جزو بن گئے اور اہل ذمہ پر جزیہ عائد ہوا۔

جیسا کہ کہا گیا سورۂ براءت کے نزول کے بعد کفار کے ساتھ آپ کے تعلقات تین قسم کے رہ گئے تھے یعنی محارب ' اہل ذمہ اور اہل عہد' اور چونکہ اہل عہد سب کے سب اسلام میں داخل ہو گئے تھے ' اس لئے صرف اہل ذمہ اور اہل حرب ہی باقی رہ گئے۔ اہل حرب کی حالت یہ رہتی تھی کہ آپ کے دور میں وہ ہمیشہ آپ سے خائف رہتے تھے۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے آخری دور میں حضورؐ اور تمام انسانوں کے تعلقات کی نوعیت صرف یہ رہ گئی تھی کہ ان میں سے بعض مسلم اور مومن تھے۔ بعض آمن اور مسالم تھے اور بعض آپ سے خائف اور محارب تھے۔

منافقین کے ساتھ آپ کا طرز عمل یہ تھا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ آپ ان کے اعلان سلام کو قبول فرمائیں اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کر دیں اور ان کے مقابلے میں علم و استدلال کے ہتھیار ہی استعمال کریں اور ان کے ساتھ سرد مہری کا رویہ اختیار کریں اور ان سے سختی برتیں اور ان کی نفسی کیفیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے ارشادات عالیہ سے ان کی اصلاح کی سعی کریں۔ ان کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کریں اور نہ حضور ان کی قبر پر کھڑے ہو کر دعا کریں اور یہ کہ اگر آپ ان کے لئے دعائے مغفرت مانگ بھی لیں تو بھی اللہ انہیں ہرگز نہ بخشے گا۔ یہ تھا مختصر بیان حضورؐ کے طرز عمل کا اپنے کفار اور منافق دشمنوں کے ساتھ۔"

اس تلخیص کے مطالعہ ' واقعات سیر کے مطالعہ اور ان آیات کے شان نزول کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن حالات میں سورت انفال نازل ہوئی وہ حالات ' مدینہ کے ابتدائی حالات اور سورت توبہ میں پیش کردہ آخری حالات کے درمیان ایک عبوری مرحلہ تھا۔ لہٰذا ان تاریخی مراحل کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان آیات کا مطالعہ ضروری ہے۔ اگرچہ ان میں بعض حتمی اصول بھی موجود ہیں لیکن یہ آخری شکل میں نہیں۔ ان کو آخری شکل سورت توبہ میں دی گئی اور عملی طور پر ان اصولوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے آخری ایام میں نافذ کیا گیا۔

ابن قیم کے اس تفصیلی بیان کی روشنی میں اب ہم ان نصوص قرآنی کی تشریح کرتے ہیں:

إِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۵۵) اَلَّذِينَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُونَ (۵۶) (۸:۵۵ - ۵۶))

"یقیناً اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والی مخلوق میں سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جنہوں نے حق کو ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر کسی طرح وہ اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ (خصوصاً) ان میں سے وہ لوگ جن کے ساتھ تو نے معاہدہ کیا پھر وہ ہر موقع پر اس کو توڑتے ہیں اور ذرا خدا کا خوف نہیں کرتے۔"

لفظ دواب کا اطلاق اگرچہ لغوی طور پر ان تمام چیزوں پر ہوتا ہے جو زمین پر چلتی پھرتی ہیں۔ لہٰذا انسان پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے ' لیکن جب اس کا اطلاق انسانوں پر کیا جائے تو اس وقت بات کو ایک خاص رنگ دینا بھی مطلوب ہوتا ہے۔ یعنی انسانیت کو حیوانیت کا رنگ اور شیڈ دینا مطلوب ہوتا ہے۔ اس طرح جن انسانوں پر اس لفظ کا اطلاق کیا جاتا ہے ' ان کے بارے میں یہ تاثر دے دیا جاتا ہے کہ وہ بد ترین بہائم ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کی روش اختیار کر لی ہے اور ان کے حالات ان کو یہاں تک لے آئے ہیں کہ اب وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کی

خصوصیت یہ ہے کہ یہ عہد کو توڑتے ہیں اور اللہ سے نہیں ڈرتے ۔

اس آیت سے مراد کون لوگ ہیں؟ اس کے بارے میں متعدد روایات وارد ہیں ۔ بعض لوگوں نے کہا کہ یہ بنو قریظہ ہیں ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ بنو نضیر ہیں ۔ بعض روایات میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ بنو قینقاع ہیں ۔ بعض میں یہ کہا گیا کہ اس سے وہ عرب مراد ہیں جو مدینہ کے اردگرد رہتے تھے ۔ اس آیت کے الفاظ اور تاریخی واقعات دونوں بتاتے ہیں کہ اس سے مراد یہ سب لوگ ہو سکتے ہیں کیونکہ یہودیوں میں سے ہر گروہ نے اپنی اپنی جگہ حضور کے ساتھ عہد شکنی کی ۔ اور مدینہ کے اردگرد مشرکین نے بھی بار بار عہد شکنی کی ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں بدر سے پہلے اور بعد میں پیش ہونے والے سب واقعات پر تبصرہ کیا ہے ۔ لیکن جو حکم دیا گیا ہے وہ قیامت تک کے لئے ہے اور ان تمام لوگوں پر اور تمام حالات پر صادق ہو گا جو قیامت تک اسی نہج پر پیش آئیں گے ۔

یہ لوگ جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی یہ لوگ کفر میں دور تک چلے گئے ہیں اور انہوں نے ایسی روش اختیار کی ہے کہ اب ان کے ایمان کا کوئی امکان نہیں رہا ہے ۔ اس طرح ان کی فطرت میں بگاڑ داخل ہو گیا ہے ۔ اور وہ جانوروں میں سے بدترین جانور بن گئے ۔ ان لوگوں کا رویہ یہ ہے کہ یہ جو عہد بھی کرتے ہیں اسے توڑتے ہیں ۔ تو اس طرح وہ انسانیت کے ایک اہم خاصہ یعنی وفائے عہد سے پاک ہو گئے ہیں' یہ ہر قید و بند سے اس طرح آزاد ہو گئے ہیں جس طرح بہائم آزاد ہوتے ہیں' اگرچہ بہائم تو اپنے فطری ضابطے کے اندر جکڑے ہوئے ہیں اور ان لوگوں کے لئے چونکہ کوئی جبری فطری ضابطہ نہیں اس لئے وہ اللہ کے نزدیک بہائم سے بھی بدتر مخلوق تصور ہوتے ہیں ۔

ایسے لوگ کہ جن کے عہد و پیمان پر کوئی مطمئن نہ ہو اور ان کی ہمسائیگی محفوظ نہ ہو ۔ ان کے لئے یہی موزوں جزاء و سزا ہے کہ ان کو امن و اطمینان سے محروم کر دیا جائے ۔ جس طرح خود انہوں نے دوسرے لوگوں کو امن سے محروم کر دیا ہے ۔ ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو خوفزدہ کر دیا جائے' علاقے سے نکال دیا جائے اور ان کے ہاتھ توڑ کر رکھ دیئے جائیں ۔ ان پر ایسی ضرب لگائی جائے کہ نہ صرف وہ خوفزدہ ہو جائیں بلکہ ان کے پیچھے رہنے والے تمام لوگوں کے لئے یہ ضرب عبرت بن جائے ۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ حکم ہے ۔ اسی طرح آپ کے بعد کے آنے والوں کے لئے بھی یہی حکم ہے ۔ اگر ان کو ایسے لوگوں سے واسطہ پڑے تو وہ یہی رویہ اختیار کریں ۔

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (۸:۵۷)

"پس اگر یہ لوگ تمہیں لڑائی میں مل جائیں تو ان کی ایسی خبر لو کہ ان کے بعد دوسرے جو لوگ ایسی روش اختیار کرنے والے ہوں ان کے حواس باختہ ہو جائیں ۔ توقع ہے کہ بدعہدوں کے اس انجام سے وہ سبق لیں گے ۔"

یہ ایک عجیب انداز کلام ہے ۔ اس میں ایک خوفناک گرفت اور ہولناک رعب و دبدبہ کی تصویر کشی کی گئی ہے ۔ اس کے سنتے ہی انسان بھاگنے اور اپنا مقام چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں ۔ یہ حال تو ان لوگوں کا ہو جائے گا جو سنیں اور دیکھیں ۔ رہے وہ لوگ جن کو یہ سزا دی جائے تو ان کی حالت تو معلوم ہے کہ کیا ہو گی؟ یہ وہ ضرب ہے جس کا حکم اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو دیا ہے اور خوفناک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ان لوگوں کے لئے عبرتناک بھی ہے جنہوں نے نقض عہد کی ٹھان رکھی ہو' جنہوں نے انسانی قواعد و ضوابط کو چھوڑ دیا ہو ۔ یہ ہدایات اس لئے دی گئیں تاکہ اسلامی محاذ امن

کا سانس لے اور اس کی ہیبت کی وجہ سے خارجی قوتیں ' جو بھی ہوں ' اس قدر سہم جائیں کہ وہ اسلام کے پھیلاؤ کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں خواہ وہ قریب کی ہوں یا دور کی ہوں۔

اسلامی نظام حیات کا یہ مزاج ہے اور اسلامی تحریک کے ذہن میں اسے اچھی طرح بیٹھ جانا چاہئے کہ اس دین کے لئے ہیبت اور رعب ضروری ہے ' اس کے لئے قوت ضروری ہے۔ اس کے لئے خوفناک شان لازی ہے اور یہ ضروری ہے کہ ان طاغوتی قوتوں کو مرعوب کر دیا جائے تاکہ وہ اسلام کے پھیلاؤ کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں ' اس لئے کہ اسلام پورے کرۂ ارض پر انسانوں کی آزادی کا علمبردار ہے اور وہ انسان کو ہر طاغوتی قوت سے نجات دینا چاہتا ہے ' جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اس دین کا طریق کار یہ ہے کہ محض دعوت و تبلیغ سے کام لیا جائے اور ان مادی رکاوٹوں کو نہ چھیڑا جائے جو طاغوت نے کھڑی کر دی ہیں ' وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اس دین کے مزاج کو بالکل نہیں سمجھا ہے۔

یہ تو تھا پہلا حکم ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے عمداً نقض عہد کا ارتکاب کر لیا تھا۔ ان کے بارے میں یہ کہا گیا کہ ان کی ایسی خبر لی جائے اور ان پر ایسی فیصلہ کن ضرب لگائی جائے کہ ان کے لئے اور ان کے بعد دوسرے دیکھنے سننے والوں کے لئے عبرت ہو اور ان کے کیمپوں میں خوف طاری کر دے۔

دوسرا حکم ان لوگوں کے بارے میں ہے جس سے نقض عہد کی علامات کا ظہور ہو چکا ہو اور یہ توقع پیدا ہو گئی ہو کہ وہ جلد ہی نقض عہد کا ارتکاب کریں گے۔ اور یہ علامات واضح ہوں تو ایسے لوگوں کے بارے میں یہ حکم ہے۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ

(۸ : ۵۸) "اور اگر کبھی تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو ' یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔" اسلام معاہدہ اس لئے کرتا ہے کہ وہ اس پر عمل کرے ' جب فریق دوم عمل کا ارادہ نہ رکھتا ہو تو وہ اس عہد کو منسوخ کرنے کا اعلان اس کے سامنے رکھ دیتا ہے اور علانیہ اس کو ختم کر دیتا ہے۔ خیانت اور غداری کا اسلام قائل نہیں ہے۔ دھوکے اور چالبازی کا بھی اسلام روادار نہیں ہے۔ اسلام فریق دوم کو علانیہ ببانگ دہل کہتا ہے کہ اس نے اس عہد کو منسوخ کر دیا ہے لہٰذا اب کوئی فریق بھی اس عہد کے مشمولات کا پابند نہیں ہے۔ اس طرح اسلام انسانیت ' شرف اور ثابت قدمی کا مقام و مرتبہ عطا کرتا ہے اور امن و اطمینان کا وسیع دائرہ عطا کرتا ہے۔ اسلام یہ گوارا نہیں کرتا کہ وہ شب خون اور وعدہ خلافی کر کے ایسے لوگوں پر حملہ کر دے جو عہد و میثاق کی بنا پر مطمئن بیٹھے ہوں اور ان کو یہ نوٹس نہ ہو کہ حملہ آور فریق نے عہد ختم کر دیا ہے۔ اسی طرح اسلام ایسے لوگوں کو خوفزدہ کرنا بھی نہیں چاہتا۔ جنہوں نے احتیاطی تدابیر اختیار نہ کی ہوں اور جن سے اسلام کو صرف خیانت کا خطرہ درپیش ہو ' ہاں عہد کے ختم کر دیئے جانے کے بعد جنگ کے دوران چالیں چلی جا سکتی ہیں کہ جنگ کے دوران جنگی چالیں جائز ہیں کیونکہ دشمن کو نوٹس مل گیا ہے۔ اس نے احتیاطی تدابیر اختیار کر لی ہیں۔ اب اگر اس کے خلاف کوئی جنگی چال چلی جاتی ہے تو وہ معذور نہیں ہے بلکہ غافل ہے اور غافلوں کے خلاف اگر کوئی جنگی چال چلی جاتی ہے تو وہ غداری نہیں ہے۔

اسلام انسانیت کی سطح کو بلند کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسانیت آلودگیوں سے پاک ہو۔ لہٰذا غلبے کے لئے غداری کو اسلام جائز نہیں سمجھتا۔ جبکہ وہ اعلیٰ مقاصد کے لئے جدوجہد کر رہا ہو ' کیونکہ اعلیٰ مقاصد کے لئے شریفانہ اسلوب

اختیار کرنا ضروری ہے۔

اسلام خیانت کے سخت خلاف ہے۔اور وہ ان لوگوں کو بہت ہی حقیر سمجھتا ہے جو نقض عہد کے مرتکب ہوئے ہیں لہٰذا اسلام اپنے پیرو کاروں کو عہد میں خیانت کی اجازت نہیں دیتا۔اگرچہ جن اہداف و غایات کے لئے یہ حرکت کی جارہی ہو' وہ بہت ہی بلند ہوں۔نفس انسانی کے حصے بخرے نہیں کئے جاسکتے۔ایک بار انسان حقیر اور خسیس طریقے کرنا شروع کر دے وہ کبھی بھی اعلیٰ اور شریفانہ طرز عمل اختیار نہیں کر سکتا۔وہ شخص مسلمان نہیں ہے جو اچھے مقاصد کے لئے ہر قسم کے ذرائع استعمال کرنے کو جائز سمجھتا ہو۔لہٰذا یہ اصول اسلامی سوچ اور اسلامی شعور کے لئے بالکل اجنبی ہے کیونکہ اسلامی ذہنیت میں مقاصد اور وسائل کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے'کیونکہ ایک مسلمان اگر پاک و صاف جگہ پر پہنچنا چاہتا ہے تو وہ گندے کیچڑ سے ہو کر نہ گزرے گا کیونکہ ان کے گندے پاؤں صاف جگہ کو بھی گندا کر دیں گے۔اگر کوئی اسے جائز سمجھتا ہے تو وہ خائن ہے اور اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ (۸: ۵۸) ہمیں یہاں ذرا یہ غور کرنا چاہئے کہ جن حالات میں یہ احکام نازل ہو رہے تھے۔ان حالات میں انسانیت کا مقام کیا تھا۔ان میں انسانیت کے سامنے اس قدر بلند نصب العین نہ تھا۔اس دور میں باہم لڑنے والے جنگل کے قانون پر عمل پیرا ہوتے تھے۔اس وقت ڈنڈے کا قانون چل رہا تھا اور ڈنڈے اور لوٹ پر کوئی قید و بند نہ تھا اور اس وقت سے لے کر اٹھارہویں صدی تک دنیا میں یہی جنگل کا قانون مروج رہا ہے اور یورپ تو خصوصاً اس قدر اندھیرے میں تھا کہ اسے اس وقت تک قانون بین الاقوام کا علم ہی نہ تھا۔یہ روشنی اس نے اس وقت حاصل کی تھی جب اس کا واسطہ اسلامی ممالک سے بڑا اور آج تک بین الاقوامی معاملات میں یورپ اس مقام تک نہیں پہنچ سکا جس تک اسلامی نظام ایک جست میں پہنچا۔حالانکہ یورپ نے کم از کم بین الاقوامی قانون کا نام سن لیا تھا۔جو لوگ آج یورپ کی صنعتی ترقی سے مرعوب ہیں ان کو اس موضوع پر غور کرنا چاہئے اور اسلام کے بین الاقوامی قانون اور دور جدید کے قانونی نظاموں کا تقابلی مطالعہ کرنا چاہئے۔تاکہ وہ حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوں۔

ان ہدایات اور صاف ستھری پالیسی کے نتیجے میں اللہ وعدہ کرتا ہے کہ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو فتح و سرخروئی حاصل ہوگی اور یہ کہ ان کے لئے کفار کی قوت کا مقابلہ بہت ہی آسان ہو جائے گا۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ (۸: ۵۹) "منکرین حق اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ وہ بازی لے گئے' یقیناً وہ ہم کو ہرا نہیں سکتے۔" ان لوگوں کے خفیہ مشورے اور بدعہدی کے ارتکاب کے بارے میں منصوبے ان کو کامیاب اور مسلمانوں پر برتری عطا نہ کر سکیں گے کیونکہ اللہ مسلمانوں کی پشت پر ہے۔اور خائن لوگ اللہ سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔کفار کو جب اللہ پکڑنا چاہے تو وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔اور جب اللہ مسلمانوں کی مدد کرنا چاہے تو یہ ان کو شکست نہیں دے سکتے۔

اس لئے وہ لوگ جو اچھے مقاصد کے لئے اچھے ذرائع اختیار کرتے ہیں' اگر ان کی نیت درست ہے تو انہیں مطمئن رہنا چاہئے کہ اوچھے ہتھیار استعمال کرنے والے ان سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔اس لئے کہ انہیں اللہ کی امداد حاصل ہے اور وہ اس کرۂ ارض پر سنت الٰہی قائم کرنا چاہتے ہیں' وہ اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔وہ اللہ

کا نام لے کر چلتے ہیں اور ان کا نصب العین یہ ہے کہ لوگوں کو تمام غلامیوں سے نکال کر صرف اللہ کی بندگی اور غلامی میں داخل کر دیں اور اس میں اللہ کے ساتھ کوئی بھی شریک نہ ہو۔

لیکن اسلام یہ حکم بھی دیتا ہے کہ جماعت مسلمہ کے دائرہ قوت کے اندر جو بھی ہو سکے وہ جائز ذرائع اختیار کرے اور تیاری کرے 'اگرچہ ان کو یہ اطمینان ہے کہ انہیں نصرت خداوندی حاصل ہے 'تاہم پھر بھی ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی تیاری مکمل رکھیں اور وہ وسائل فراہم کریں جن کو انسانی فطرت جانتی ہے اور جو انسانوں کے تجربے کے اندر ہیں' اسلام ان لوگوں کو عالم بالا کی نصرت کی طرف دیکھنے کا مشورہ اس وقت دیتا ہے جب وہ ظاہری اعتبار سے اپنی مکمل تیاری کر لیں اور حقیقت پسندانہ جدوجہد کے لئے تیار ہوں تاکہ وہ اعلیٰ اہداف حاصل کئے جا سکتے ہوں جو اسلام کے پیش نظر ہیں۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (۸: ۶۰)

"اور تم لوگ' جہاں تک تمہارا بس چلے' زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لئے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوفزدہ کر دو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہو گا۔

اپنی قوت اور مقدرت کے مطابق تیاری کرنا فریضہ جہاد کے ساتھ ساتھ ضروری ہے۔ یہ آیت حکم دیتی ہے مسلمانوں کو مختلف قسم کی جنگی تیاریاں اور سازوسامان فراہم رکھنا چاہئے اور یہاں خصوصاً تیار بندھے رہنے والے گھوڑوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ اس وقت کے جنگی سامان کا اہم حصہ تھے 'جس وقت قرآن کریم نازل ہو رہا تھا۔ اگر قرآن کریم اس وقت گھوڑوں کے بجائے موجودہ دور کے سازوسامان کی تیاری کا حکم دیتا تو یہ ایک نامعلوم اور حیران کن سازوسامان کا حکم ہوتا اور وہ سن کر ہی حیران ہو جاتے۔ اس لئے اللہ نے لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق بات کی اور اللہ سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایسی بات کرے جسے مخاطب سمجھ ہی نہ سکیں۔ مناسب بات یہی ہے' عام حکم دیا جائے اور وہ یہ ہے وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (۸: ۶۰)

"اور تم جہاں تک تمہارا بس چلے' زیادہ سے زیادہ طاقت تیار رکھو۔" اسلام کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس ضروری قوت موجود ہو اور وہ اس قوت کے بل بوتے پر آگے بڑھے اور تمام انسانوں کو تمام غلامیوں سے رہا کرائے۔ چنانچہ اس قوت کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس قدر آزاد کرا دے کہ وہ کوئی بھی نظریہ قبول کرنے میں آزاد ہوں۔ انہیں کوئی روکنے والا نہ ہو اور نہ دنیا میں ایسی قوت ہو کہ کسی کو کسی مخصوص عقیدے کے اختیار کرنے پر مجبور کر سکتی ہو۔ دوسرا فریضہ یہ ہے کہ یہ قوت دین اسلام کے دشمنوں کو اس قدر خوفزدہ کر دے کہ وہ اسلامی قوت کے

مرکز دارالاسلام پر حملے کے بارے میں سوچ ہی نہ سکیں - اور تیسرا فریضہ یہ ہے کہ دین اسلام کے دشمنوں کو اس قدر مرعوب کر دیا جائے کہ وہ اسلام کی راہ روکنے کے بارے میں کسی بھی وقت نہ سوچیں - تاکہ اسلامی تحریک اس کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسانوں کو آزاد کر سکے - اور چوتھا فریضہ یہ ہے کہ یہ اسلامی قوت ان تمام قوتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دے جو اللہ کے مقابلے میں اپنی حاکمیت قائم کرتی ہیں اور لوگوں پر اللہ کے مقابلے میں اپنی حاکمیت اور اپنا قانون جاری کرتی ہیں اور وہ یہ اعتراف نہیں کرتیں کہ حق حاکمیت صرف اللہ کو حاصل ہے - کیونکہ وہی اللہ ہے ' وحدہ لا شریک -

اسلام کوئی لاہوتی نظام نہیں ہے جس کا تعلق صرف عقائد و نظریات سے ہو ' یا وہ کچھ مراسم عبودیت میں دخیل ہو اور آگے بس اس کا کام ختم ہو - بلکہ اسلام پوری زندگی کا ایک عملی نظام ہے اور وہ تمام دوسرے نظاموں کے مقابلے میں آکر کھڑا ہوتا ہے اور وہ ان تمام قوتوں سے بر سرپیکار ہو جاتا ہے جو ان باطل نظاموں کی پشت پر کھڑی ہوتی ہیں - لہٰذا اس کے سوا اسلام کے لئے اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی راہ میں حائل ہونے والی تمام قوتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دے کیونکہ یہ قوتیں اسلام کی راہ روکتی ہیں اور اسے قائم ہونے نہیں دیتیں بلکہ یہ قوتیں اسلام کے بالمقابل دوسرے نظام قائم کرتی ہیں -

اس عظیم حقیقت کے اعلان کے وقت کسی بھی مسلمان کو شف شف نہیں کرنا چاہئے اور نہ جلدی جلدی سرسری بات کرنا چاہئے کہ کوئی سمجھ بھی نہ سکے - پھر اس حقیقت کا اعلان کرتے ہوئے مسلمانوں کو شرم بھی محسوس نہ کرنا چاہئے بلکہ انہیں اس حقیقت کا اعلان سر اٹھا کر کرنا چاہئے اور یہ کہنا چاہئے کہ یہ دراصل انسان کی آزادی کی تحریک ہے اور وہ اس کا علمبردار ہے - یہ کسی انسانی نظام حیات کا علمبردار نہیں ہے ' نہ کسی لیڈر کی حکومت کا قیام چاہتا ہے - نہ کسی طبقے کی نسلی گروہ اور فرقے کی حکومت چاہتا ہے - اس کا نصب العین یہ نہیں ہے کہ وہ مزارعین کو غلام بنائے تاکہ وہ جاگیرداروں کی خدمت کریں جیسا کہ رومی تہذیب والوں کا مقصد تھا ' اور اس کا مقصد یہ بھی نہیں ہے کہ دنیا پر قبضہ کر کے تمام دنیا کے خام مال پر قبضہ کیا جائے اور اپنی صنعتوں کو فیڈ کیا جائے جس طرح مغربی استعمار کا یہ مقصد تھا اور نہ وہ اس لئے اٹھا ہے کہ کسی علاقے میں کسی پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ قائم کر کے دوسرے لوگوں کو مویشیوں کی طرح غلام بنا دے جیسا کہ نظام اشتراکیت میں تھا - یہ تو علیم و خبیر اور حکیم و بصیر کے اقتدار اعلیٰ کے قیام کا علمبردار ہے - وہ اللہ کی حاکمیت کا قیام چاہتا ہے اور دنیا میں تمام انسانوں کو تمام غلامیوں سے نجات دینا چاہتا ہے - اس طرح کہ کوئی بندہ کسی بندے کا غلام نہ ہو -

یہ ہے وہ عظیم حقیقت جسے شکست خوردہ ذہنیت کے مسلمانوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے ' جو دین اسلام اور نظام اسلامی کی بے جا مدافعت کرتے ہیں اور اس مدافعت میں بھی وہ محض شف شف کرتے ہیں اور کوئی بات صاف ستھری اور واضح نہیں کر سکتے اور اسلام کے نظریہ جہاد کے لئے عذر لنگ تلاش کرتے ہیں - (تفصیلات کے لئے دیکھئے ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان کا قیمتی رسالہ الجہاد فی الاسلام) نیز ہم نے سورت انفال کے مقدمے میں اسلام کے نظریہ جہاد پر جو تفصیلی بحث کی ہے اس کا مطالعہ بھی ضروری ہے -

پھر اس آیت میں ہمیں جس حد تک تیاری کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس کی حدود کا بھی ہمیں اچھی طرح علم ہونا چاہئے کہ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ (۸ : ۶۰)

یعنی جس قدر تمہاری استطاعت میں ہو یعنی تیاری میں اپنی پوری قوت صرف کر دو ' یعنی جنگ اور فتح کے تمام

وسائل فراہم کیے جائیں یعنی ممکن حد تک۔

پھر اس آیت میں اس تیاری کی غرض و غایت بھی بتا دی گئی ہے کہ اس کی غرض یہ ہے تُرْھِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (۸ : ۶۰)

"تاکہ اس کے ذریعے تم اپنے دشمنوں اور اللہ کے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعدا کو خوفزدہ کر سکو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ یعنی اس تیاری کے مقاصد یہ ہیں کہ اس سے تمہارے دشمن جو اللہ کے دشمن ہیں' خوفزدہ ہو جائیں۔ ان میں وہ ظاہری دشمن بھی شامل ہیں جن کو مسلمان جانتے ہیں اور کچھ ان کی پشت پر دشمن طاقتیں ہیں جن کا علم مسلمانوں کو تو نہیں ہے لیکن اللہ کو ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی دشمنی کا اظہار نہیں کیا ہے اور اللہ ان کے دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے۔ ان لوگوں کو اسلام کی قوت مرعوب کر دے گی۔ اگرچہ ابھی ان کو مسلمانوں کی جنگی قوت عملاً نہ پہنچی ہو۔ غرض مسلمانوں پر یہ بات فرض ہے کہ وہ صاحب قوت ہوں اور ان پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنی استطاعت کی حد تک قوت جمع کریں تاکہ وہ زمین کے تمام لوگوں کے لئے باعث خوف ہوں اور یہ اس لئے کہ دنیا پر اللہ کا کلمہ بلند ہو اور دین پورے کا پورا اللہ کا ہو جائے۔

اب جنگی تیاریوں کے لئے چونکہ اخراجات ہوں گے اور تھے۔ پھر اس وقت اسلامی معاشرہ صرف باہم تکافل پر چل رہا تھا۔ لہذا جنگی تیاریوں کے حکم کے ساتھ ہی حکم دیا گیا کہ اللہ کی راہ میں اپنی دولت کو خرچ کرو۔ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (۸ : ۶۰)

"اور جو کچھ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے وہ پورے کا پورا تمہیں مل جائے گا اور تم پر ظلم نہ ہو گا۔" اس طرح اسلام جہاد فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل اللہ کو تمام دنیاوی اغراض و مقاصد سے پاک کر دیتا ہے۔ ان مقاصد کو ذاتی خواہشات سے بلند کر دیتا ہے۔ ہر قسم کی قومی' طبقاتی اور وطنی شعور اور جذبات سے انہیں جدا کر دیتا ہے تاکہ وہ محض فی سبیل اللہ ہوں اور اللہ کی رضامندی کے لئے ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام آغاز ہی سے ان تمام جنگوں کی ممانعت کر دیتا ہے جو بعض اشخاص کی برتری کے لئے لڑی جاتی ہیں' یا بعض حکومتوں کی برتری کے لئے لڑی جاتی ہیں یا منڈیوں پر قبضے کے لئے لڑی جاتی ہیں یا لوگوں پر غالب ہونے اور انہیں ذلیل کرنے کے لئے لڑی جاتی ہیں۔ یا ایک ملک کی دوسرے ملک پر برتری کے لئے لڑی جاتی ہیں' یا ایک قوم کی دوسری قوم پر برتری کے لئے لڑی جاتی ہیں یا ایک نسل کی برتری کے لئے یا ایک طبقے کی دوسرے طبقات پر برتری کے لئے لڑی جاتی ہیں۔ اسلام صرف ایک جنگ کی اجازت دیتا ہے یعنی جہاد فی سبیل اللہ۔ اور اللہ یہ نہیں چاہتا کہ کوئی نسل دوسری نسلوں' یا کوئی وطن دوسرے اوطان پر یا کوئی ایک طبقہ دوسرے طبقات پر' یا فرد دوسرے افراد پر یا کوئی دوسری قوم دوسری اقوام پر غالب ہو کر اپنی حاکمیت' اپنی حکومت اور اپنا اقتدار اعلیٰ کو قائم کرے۔ وہ تو تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔ وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کی حاکمیت دنیا میں قائم ہو تاکہ دنیا میں خیر' برکت' آزادی اور شرافت کا دور دورہ ہو۔ اور یہ صرف اللہ کی حاکمیت کے زیر سایہ ہو سکتا ہے۔

ان آیات میں تیسرا حکم ان اقوام کے بارے میں ہے جو اسلامی کیمپ کے ساتھ دوستی اور امن کا عہد کرنا چاہتے ہیں

اور امن و سلامتی کی طرف مائل ہیں اور ان کے ظاہری حالات بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ یہ لوگ فی الواقعہ امن چاہتے ہیں۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

(۸: ۶۱) "اور اے نبی "اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لئے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو' یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔" یہاں امن کی طرف میلان کی حقیقت کو "جنوح" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ ایک لطیف انداز تعبیر ہے۔ یعنی پرندے پر امن اور آشتی کی طرف مائل ہیں اور پرندہ اپنے پروں کو نرم کر رہا ہے اور حالت امن اور مصالحت اور موانست کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر مصالحت اور موادعت میں توکل علی اللہ کا حکم بھی دیا گیا ہے' جو سمیع اور علیم ہے۔ وہ ہر بات کو سنتا ہے اور پوشیدہ ارادوں کو دیکھ سکتا ہے اور اللہ پر توکل ایک بہت بڑا ضامن ہے۔

اب ہم ذرا واپس اس تلخیص کی طرف جاتے ہیں جو امام ابن قیم نے اسلامی مملکت کے خارجی تعلقات کے سلسلے میں پیش کی تھی کہ مدینہ کے ابتدائی دور میں حضور ؐ کے تعلقات کفار کے ساتھ کیا تھے یعنی جنگ بدر اور ان احکام کے نزول تک۔ تو اس تلخیص سے معلوم ہوتا ہے کہ اس گروہ کا تعلق اس طبقے سے ہے جن کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسالمت اختیار کر لی تھی اور اس کے ساتھ جہاد و قتال نہ کیا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ حضور ؐ کے ساتھ صلح پر مائل تھے۔ اور انہوں نے دشمنی کا اظہار نہ کیا تھا۔ اور نہ ہی دعوت اسلامی کی راہ روک کر کھڑے ہوئے تھے۔ نہ وہ اسلامی مملکت کے خلاف کوئی کاروائی کرتے تھے۔ اللہ نے رسول اللہ کو حکم دے دیا تھا کہ ان لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور ان کی روش مصالحت اور امن کو قبول کر لیا جائے۔ (یہ حکم اس وقت تک تھا کہ جب سورت براءت نازل ہوئی اور جن لوگوں کے ساتھ بے قاعدہ معاہدہ نہ تھا ان لوگوں کو ایک متعین مہلت دے دی گئی یا ان لوگوں کے ساتھ عہد تھا مگر اس میں وقت کا تعین نہ کیا گیا تھا اور یہ مدت چار ماہ مقرر کر دی گئی تھی اور اس کے اختتام پر بھی تعلقات کا از سر نو تعین کیا گیا تھا)۔ لہذا مذکورہ بالا حکم انتہائی اور آخری حکم نہ تھا بلکہ وہ خاص حالات کے اندر مخصوص حکم تھا اور بعد میں آنے والے احکام نے اسے منسوخ کر دیا اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس میں تبدیلیاں کیں۔

ہاں یہ آیت اپنے وقت پر ایک عمومی حکم تھا اور سورت براءت کے نزول تک یہی حکم معمول بہ تھا۔ چھٹی صدی ہجری میں ہونے والا صلح حدیبیہ بھی اس کی ایک مثال تھی۔

بعض فقہاء اس طرف گئے ہیں کہ یہ حکم فائنل اور حتمی ہے اور انہوں نے امن کی طرف میلان جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ وہ جزیہ ادا کرنے کو قبول کر لیں۔ لیکن یہ رائے تاریخی واقعات کے خلاف ہے۔ کیونکہ جزیہ کے احکام سورت براءت میں نازل ہوئے اور یہ سورت آٹھویں سن ہجری میں نازل ہوئی ہے اور زیر تفسیر آیت تو جنگ بدر کے بعد سن دوئم ہجری میں نازل ہوئی ہے۔ اس وقت جزیہ کے احکام موجود نہ تھے۔ اسلامی نظام حیات کے تحریکی مزاج' واقعات نزول قرآن اور سیرت کے واقعات کو مد نظر رکھ کر اگر سوچا جائے تو یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ یہ حکم فائنل نہیں ہے۔ اور اس میں سورت براءت میں نازل ہونے والے احکام کے ذریعہ تبدیلی اور ترمیم کی گئی ہے

اور جس میں دوسری اقوام کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کو یوں منضبط کیا گیا ہے کہ یا تو وہ اہل حرب ہوں گے اور مسلمانوں کے خلاف بر سرجنگ ہوں گے یا مسلمان ہوں گے اور اللہ کی شریعت کو نافذ کرنے والے ہوں گے یا اہل ذمہ ہوں گے اور جزیہ ادا کرتے ہوں گے۔ اور وہ اس وقت تک اہل ذمہ رہیں گے جب وہ اپنے ذمی ہونے کے عہد پر قائم رہیں گے۔ یہ ہے وہ آخری نوعیت بین الاقوامی تعلقات کی جس پر اسلامی تحریک جہاد ختمی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر اور کوئی صورت حالات موجود ہے تو وہ دراصل عملی صورت حالات ہے اور عملاً موجود ہے لیکن اسلامی نظام اس کی تبدیلی کے لئے جدوجہد کرتا ہے اور یہ جدوجہد اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک مذکورہ بالا تین حالات متعین نہیں ہو جاتے جن کا ذکر سورت براءت میں ہوا اور جو آخری احکام ہیں اور یہ آخری احکام مسلم کی روایت میں موجود ہیں جس کی روایت امام احمد نے کی ہے۔

احمد روایت کرتے ہیں وکیع سے 'سفیان سے 'علقمہ ابن مرثد سے 'سلیمان ابن زید سے ' ان کے باپ سے 'یزید ابن الخصیب اسلمی سے 'یہ کہتے ہیں کہ جب حضور ؐ کسی کو لشکر بنا کر بھیجتے یا کسی دستے کا کپتان بنا کر بھیجتے تو اسے نصیحت کرتے کہ خدا خوفی اختیار کرنا اور اپنے ساتھی مسلمانوں کی خیر خواہی کرنا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: "اللہ کے نام سے جہاد کرو' اللہ کی راہ میں کرو' ان لوگوں سے قتال کرو جنہوں نے اللہ کا انکار کیا اور جب تم مشرکوں میں سے اپنے دشمنوں کے ساتھ آمنا سامنا کرو تو انہیں دعوت دو کہ وہ تین پوزیشنوں میں سے کوئی ایک اختیار کریں۔ وہ ان میں سے جو پوزیشن بھی قبول کریں تم اسے منظور کر لو۔ اور ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ ان کو اسلام کی دعوت دو' اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو قبول کر لو۔ پھر ان کو یہ دعوت دو کہ وہ اپنے علاقے سے مہاجرین کے علاقے میں آجائیں۔ اگر وہ یہ پوزیشن قبول کر لیں تو ان کے اور مہاجرین کے حقوق مساوی ہوں گے اور ان پر وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو مہاجرین پر ہوں گی۔ اگر وہ انکار کریں اور اپنے ہی علاقے میں رہنا پسند کریں تو ان کو یہ اطلاع کر دو کہ ان کی حیثیت ان مسلمانوں کی طرح ہو گی جس طرح اعراب مسلمانوں کی ہے۔ ان پر بھی اللہ کے احکام جاری ہوں گے۔ جس طرح اعراب مسلمانوں پر ہوتے ہیں لیکن فئے اور غنیمت میں ان کا حق نہ ہو گا الا یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شریک ہوں۔ اگر وہ اس پوزیشن کا بھی انکار کریں تو پھر ان کو یہ پیشکش کرو کہ وہ جزیہ دینا قبول کریں۔ اگر وہ قبول کر لیں تو تم بھی قبول کر لو' اور جنگ سے باز آ جاؤ' اور اگر وہ انکار کر دیں تو اللہ کی استعانت لیں اور قتال شروع کر دیں۔"

اس حدیث میں مشکل بات یہ ہے کہ اس میں ہجرت اور دارالمہاجرین کا ذکر ہے اور پھر جزیہ کا بھی ذکر ہے۔ جبکہ جزیہ فتح مکہ کے بعد فرض ہوا تھا اور فتح مکہ کے بعد ہجرت ختم ہو گئی تھی (یعنی پہلی جماعت مسلمہ جب مدینہ آئی اور فتح مکہ تک اسے استقلال حاصل ہو گیا تو ہجرت اس وقت ختم ہو گئی تھی) اور یہ بات احادیث اور تاریخ سے ثابت ہے کہ جزیہ آٹھویں سن ہجرت میں فرض ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی عرب مشرک سے جزیہ نہیں لیا گیا۔ کیونکہ تمام عرب فرضیت جزیہ سے قبل ہی مسلمان ہو گئے تھے۔ اس سن کے بعد مجوسیوں سے اور مشرکوں سے جزیہ لیا گیا اور اگر فرضیت جزیہ کے وقت عربوں میں کوئی مشرک ہوتا تو وہ بھی لازماً جزیہ ادا کرتا جیسا کہ امام ابن قیم نے تشریح کی۔ امام ابو حنیفہ اور ایک قول کے مطابق امام احمد کی رائے بھی یہی ہے۔ (قرطبی نے یہ قول امام اوزاعی' مالک سے بھی نقل کیا ہے۔)

بہرحال آیت زیر بحث وَاِنْ جَنَحُوْا ------ میں کسی فائنل حکم کا ذکر نہیں ہے۔ اور اس سلسلے کے فائنل

احکام بعد میں سورت براءت میں نازل ہوئے۔ اس میں اللہ نے رسول اللہ کو حکم دیا کہ وہ ان لوگوں کی طرف سے مسالمت اور صلح کو قبول کرلیں جن کو آپ نے اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اور ان کے ساتھ لڑائی شروع نہ کی تھی چاہے اس وقت تک ان سے کوئی معاہدہ ہوا تھا یا نہیں۔ تو آپ سورت براءت کے نزول تک کفار اور اہل کتاب کی جانب سے مسالمت کو قبول کرتے رہے اور براءت کے نزول کے بعد حکم یہ ہوگیا کہ یا تو اسلام قبول کرو گے یا جزیہ دو گے اور یہ وہ حالت مسالمت ہے جو اس وقت تک قابل قبول ہوگی جب تک لوگ اپنے عہد پر قائم رہیں گے ورنہ مسلمان ان کے ساتھ جہاد کریں گے جب تک ان کی استطاعت ہو تاکہ دین تمام کا تمام اللہ کے لئے ہو جائے۔

میں نے اس آیت کے بیان اور تفسیر میں قدرے طوالت سے کام لیا ہے اور یہ اس لئے کہ ان لوگوں کے شبہات کو دور کر دیا جائے جو ذہنی لحاظ سے شکست خوردہ ہیں۔ اس قسم کے لوگ جب اسلام کے نظریہ جہاد کے موضوع پر لکھنے بیٹھتے ہیں تو موجودہ حالات کے دباؤ میں آجاتے ہیں اور ان کی سوچ اور ان کی روح ان حالات کے دباؤ کے نیچے بیٹھ جاتی ہے۔ وہ اس بات کا یقین ہی نہیں کر سکتے کہ دین اسلام کا یہ کوئی مستقبل قاعدہ ہو سکتا ہے کہ یا اسلام قبول کرو یا جزیہ ادا کرو ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یہ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ اس وقت جاہلیت اور طاغوت کی تمام قوتیں اسلام کے خلاف برسرپیکار ہیں اور اسلام کا مقابلہ کر رہی ہیں اور اہل اسلام اپنے آپ کو مسلمان تو کہتے ہیں لیکن اسلام کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور ان کے قلب و نظر میں اسلام کا حقیقی شعور نہیں ہے اور دوسرے مذاہب کی عظیم قوتوں کے سامنے اپنے آپ کو بہت ہی کمزور محسوس کرتے ہیں۔ دوسری جانب وہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کے ہراول دستے بہت ہی قلیل و نایاب ہیں اور اس کے ساتھ ضعیف و ناتواں ہیں۔ لہٰذا ان حالات میں یہ لکھنے والے قرآن و سنت کو توڑ موڑ کر ان میں تاویلات کرتے ہیں اور یہ حرکت وہ محض حالات کے دباؤ کے تحت کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ ایسا موقف اختیار کرتے ہیں کہ اسلام اس موقف کا متحمل نہیں ہو سکتا، نہ اسلامی نصوص سے یہ بات نکلتی ہے۔

یہ لوگ ان آیات سے استدلال کرتے ہیں جو تحریک اسلامی کے لئے وقتی ہدایات کے طور پر نازل ہوئی ہیں۔ یہ لوگ ان آیات کو فائنل ہدایات تصور کر کے ان آخری ہدایات کی تاویل کرتے ہیں۔ حالانکہ جن آیات سے وہ استدلال کرتے ہیں وہ وقتی اور مقید نصوص تھے۔ یہ کام وہ کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ اسلام کے نظریہ جہاد کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ صرف دارالاسلام اور جماعت مسلمہ کا دفاع کرتا ہے اور جہاد اس وقت شروع ہو سکتا ہے جب دشمن حملہ آور ہو اور یہ کہ اسلام ہر قسم کے امن و امان کی پیشکش کو قبول کرتا ہے۔ اور ان کے نزدیک امن و امان کا مفہوم صرف یہ ہے کہ کوئی دارالاسلام پر حملے سے باز رہنے کا معاہدہ کر لے۔ ان لوگوں کے تصور کے مطابق اسلام اپنی حدود کے اندر جو چاہے کرے لیکن اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے لوگوں سے مطالبہ کرے کہ وہ اسلام کو قبول کریں اور نہ اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ لوگوں سے اسلامی نظام کی اطاعت کرنے کا مطالبہ کرے۔ اسلام صرف تبلیغ کا حق رکھتا ہے۔ رہی وہ قوت 'طاغوتی قوت' جو جاہلیت کی پشت پر کھڑی ہے تو اسلام کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس قوت کو چیلنج کرے یا اگر یہ قوت اسلام کو چیلنج کرے تو اسلام صرف دفاع کا حق رکھتا ہے۔

اگر اس قسم کے لوگ جنہوں نے موجودہ حالات کے مقابلے میں عقلاً اور روحاً شکست کھائی ہے، ذرا سوچ کرتے اور موجودہ حالات کے مطابق قرآن و سنت میں سے احکام تلاش کرتے اور ان تاویلات کا راستہ اختیار نہ کرتے جن میں

قرآن و سنت کے نصوص کو توڑ موڑ کر پیش کرتے ہیں تو انہیں ان کے موجودہ حالات کے مماثل حالات کے بارے میں قرآن و سنت کے نصوص مل جاتے کیونکہ اسلام ایک حقیقت پسندانہ متحرک دین رہا ہے اور یہ کہتے کہ ایسے حالات میں اسلام نے یوں فیصلہ کیا تھا اور ہمیں بھی ایسا ہی کرنا چاہئے تو ان حضرات کو قرآن کی آخری اور فائنل ہدایات اور نصوص میں اس قسم کی تاویلات کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی - یہ لوگ کہہ سکتے تھے کہ موجودہ حالات میں اسلام کے یہ احکام مناسب ہیں لیکن یہ فائنل احکام نہیں ہیں - یہ وقتی تصرفات ہیں -

اسلام نے فی الواقعہ مختلف حالات میں مختلف حکمت عملی اختیار کی - چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں اور یہ مثالیں وقتی ضرورت کے مطابق تھیں -

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو مدینہ کے اردگرد بسنے والے یہودیوں اور مشرکین کے ساتھ آپ سے ایک میثاق طے کیا جس میں باہم بھائی چارے' امن اور مشترکہ دفاع کے امور طے گئے گئے اور یہ بھی طے کیا کہ مدینہ میں حق حاکمیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہو گا اور یہ کہ قریش کے مقابلے میں دفاع میں یہ سب لوگ مسلمانوں کے ساتھ ہوں گے - اور یہ کہ مدینہ پر جو کوئی بھی حملہ آور ہو گا یہ لوگ اس کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھیں گے - مشرکین کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ کریں گے الا یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اجازت دیں - اسی دوران حضور ؐ کو اللہ نے حکم دیا تھا کہ جو قوم بھی مسالمت اور امن کا معاہدہ کرے اس کی پیشکش کو قبول کیا جائے - اگرچہ وہ باقاعدہ تحریری معاہدہ نہ کریں' بہرحال جب تک وہ صلح چاہیں' صلح رکھی جائے - اس کے بعد یہ تمام احکام بدل گئے تھے جس طرح ہم نے اوپر تفصیلات دیں -

اسی طرح جب جنگ خندق کے زمانے میں تمام مشرکین نے حضور ؐ کے خلاف اشتراک کر لیا - بنو قریظہ نے بھی وعدہ کی خلاف ورزی کر دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کو ختم ہی نہ کر دیا جائے - تو حضور ؐ نے عیینہ ابن حصن الفزاری اور حارث ابن عوف المری رئیس غطفان کے سامنے مصالحت کی پیشکش کی اور طے کیا کہ وہ مدینہ کی یک تہائی پیداوار ان کو دیں گے اور آپ لوگ اپنی اقوام کو لے کر واپس ہو جائیں اور قریش کو اکیلے چھوڑ دیں - حضور ؐ کی پیشکش ان کو خوش کرنے کے لئے تھی کوئی معاہدہ نہ تھا - جب حضور ؐ نے دیکھا کہ یہ دونوں لوگ راضی ہو گئے ہیں تو آپ نے سعد ابن معاذ اور سعد ابن عبادہ کے ساتھ مشورہ کیا - ان دونوں نے کہا کہ حضور ؐ یہ کام اگر آپ پسند کرتے ہیں تو ہم آپ کی وجہ سے قبول کر لیں گے اور اگر اللہ کا حکم ہے تو ہم اطاعت کریں گے اور اگر یہ کام آپ ؐ ہمارے لئے کرتے ہیں؟ تو آپ ؐ نے فرمایا کہ میں یہ اقدام آپ لوگوں کو بچانے کے لئے کرنا چاہتا ہوں کیونکہ تمام عرب آپ لوگوں پر ایک ہی کمان سے تیر پھینک رہے ہیں - اس پر سعد ابن معاذ نے فرمایا : یا رسول اللہ خدا کی قسم ہم لوگ شرک میں مبتلا تھے' بت پرست تھے' اللہ کی عبادت نہ کرتے تھے اور نہ ہمیں اللہ کی معرفت حاصل تھی تو یہ مشرک ہم سے یہ توقع نہ کرتے تھے کہ ہم ان کو ایک کھجور بھی دیں' الا یہ کہ وہ مول لیتے یا ہم مہمان نوازی کے طور پر دیتے اور جب اللہ نے ہمیں بذریعہ اسلام عزت دے دی اور بذریعہ قرآن ہدایت دے دی اور آپ ؐ کے ذریعے ہم معزز ہو گئے تو کیا اب ہم ان کو اپنا مال دے دیں؟ ہم ان کو تلوار دیں گے تاکہ وہ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے - اس جواب سے حضور ؐ بہت خوش ہوئے اور فرمایا (تم جانو اور وہ) اور عیینہ اور حارث سے کہا' چلو ہمارے پاس

تمہارے لئے تلوار کے سوا کچھ نہیں ہے۔یہ بات جس کے بارے میں حضور ؐ نے مخصوص حالات میں سوچا ایک وقتی تدبیر تھی جو مخصوص حالات میں ضرورت کے لئے تھی' یہ کوئی فائنل حکم نہ تھا۔

ایک مثال یہ بھی ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ساتھ معاہدہ کیا۔یہ لوگ مشرک تھے اور اس معاہدے میں بعض شرطیں ایسی تھیں جن سے مسلمان خوش نہ تھے۔مثلاً یہ کہ مسلمانوں اور قریش کے درمیان بیس سال تک لڑائی نہ ہوگی۔لوگ ایک دوسرے سے امن میں رہیں گے۔مسلمان اس سال عمرہ کے بغیر واپس ہوں گے' اور اگلے سال وہ مکہ آئیں گے۔چنانچہ انہوں نے اگلے سال مسلمانوں کو مکہ آنے دیا' صرف تین دن کے لئے۔اسلحہ وہی لائیں گے جو ایک سوار لاتا ہے اور وہ بھی نیام میں ہوگا اور یہ کہ اگر کوئی مسلمان مدینہ چلا جائے تو اسے واپس کرنا ہوگا اور اگر کوئی مدینہ سے مکہ چلا جائے تو مشرک واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔اس معاہدے پر حضور ؐ راضی ہوگئے کیونکہ حضور ؐ کو اللہ نے بذریعہ الہام بتا دیا تھا کہ یہ شرائط اگرچہ بظاہر قریش کے حق میں نظر آتی ہیں لیکن دراصل مسلمانوں کے لئے مفید ہیں۔اس مثال میں بھی یہ گنجائش موجود ہے کہ اسلامی قیادت خاص حالات میں خاص فیصلے کر سکتی ہے۔

اسلام ایک دائمی تحریک ہے اور اس کا طرز عمل بھی تحریکی ہے۔وہ حالات کے مطابق فیصلے کرتا ہے۔یہ نہایت ہی واضح' پختہ اور آزمودہ کار قیادت رکھتا ہے۔لوگ جن حالات سے بھی دوچار ہوں اور ان کو قرآن و سنت سے حسب حال ہدایت بہرحال ملتی ہے اور ان کو کسی قسم کی تاویل کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی۔اسلام میں جو چیز مطلوب ہے' وہ یہ ہے کہ انسان میں تقویٰ ہو اور وہ اس بات سے محتاط ہو کہ وہ اپنے دین کو جاہلیت کی شریرانہ قیادت کے حوالے کر دے' وہ شکست خوردہ ہو اور جاہلیت کے مقابلے میں معذرت خواہانہ دفاعی موقف اختیار کرے' حالانکہ دین اسلام غالب ہے' چھا جانے والا ہے۔وہ انسان کی پوری ضروریات اور مسائل کو حل کرتا ہے اور وہ یہ مزاج رکھتا ہے کہ وہ بلند ہو اور ہر کام اور ہر مسئلے کے حل میں اقدامی پوزیشن کا مالک ہو۔

جب اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ اگر کوئی دوستی کرنا چاہئے تو آپ دوستی قبول کریں اور اگر کوئی امن و سلامتی کی طرف مائل ہو تو آپ بھی اس طرف مائل ہوں' تو ساتھ ہی یہ حکم بھی دے دیا کہ اللہ پر توکل کریں اور آپ کو مطمئن کر دیا کہ اگر اس قسم کے معاہدے کرنے والے دل میں کھوٹے ہوں تو اللہ سے بہرحال ان کی کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

(۸ : ۶۱) اس کے بعد اللہ ان لوگوں کے دھوکے سے حضور ؐ کو مطمئن اور مامون فرماتا ہے۔اگر یہ لوگ خیانت کا ارادہ کریں اور کوئی سازش کریں اور صلح اور دوستی کی پشت پر غداری کا کوئی منصوبہ ہو تو فرمایا کہ آپ مطمئن رہیں' اللہ کافی ہے۔وہ حافظ ہے' وہی مددگار ہے اور بدر میں اسی کی نصرت تمہارے شامل حال رہی ہے۔مومنین کے ذریعے اس نے تمہاری تائید کی۔مومنین کو اتفاق و اتحاد عطا کیا حالانکہ جاہلیت میں ان کے درمیان اتحاد و اتفاق کا پیدا ہونا ممکن ہی نہ تھا' یہ اللہ حکیم و قدیر کا کارنامہ ہے۔

وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ (٦٢) وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (٦٣) (٨: ٦٢ - ٦٣)) "اور اگر وہ دھوکے کی نیت رکھتے ہوں تو تمہارے لئے اللہ کافی ہے ۔ وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعہ سے تمہاری تائید کی اور مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیئے ۔ تم روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے ' یقیناً وہ بڑا زبردست اور دانا ہے ۔"

وہ تمہارے لئے کافی ہے ۔ آغاز تحریک میں اسی نے تو تمہاری امداد فرمائی اور تمہیں مومنین کا ایک ایسا سچا گروہ عطا کیا جنہوں نے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو خوب نبھایا ۔ اس نے ان کو متحدہ قوت کی شکل دے دی حالانکہ اس سے قبل ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے تھے ۔ ان کی باہم دشمنی علانیہ تھی اور باہم لڑائی شدید ترین لڑائی تھی ۔ اس سے مراد اوس و خزرج ہوں جو انصار تھے اور جاہلیت کے دور میں ان کے درمیان انتقام در انتقام کا لامتناہی سلسلہ تھا اور ان کے درمیان مصالحت ہی ممکن نہ تھی ' چہ جائیکہ کہ ان کے درمیان ایسی اخوت پیدا ہو جائے جس کی نظیر پوری دنیا کی تاریخ میں نہیں ہے یا اس سے مراد مہاجرین ہوں جو مکہ میں ویسے ہی حالات میں تھے جن میں انصار تھے یا اس سے تمام عرب ہوں کیونکہ اسلام سے قبل جزیرۃ العرب میں تمام عربوں کی حالت ویسی ہی تھی ۔

بہرحال یہ معجزہ عربوں کی سرزمین پر رونما ہوا' اللہ کے سوا درحقیقت کوئی طاقت اور کوئی ذریعہ اس معجزے کو رونما نہ کر سکتا تھا ۔ اور یہ کام صرف اسلامی نظریہ حیات کے ذریعے ہو سکتا تھا ۔ چنانچہ باہم نفرت کرنے والے یہ دل اور باہم ناقابل برداشت مزاج رکھنے والے یہ لوگ ایک ایسا جتھا بن گئے جس کے درمیان بے حد بھائی چارہ پیدا ہو گیا اور ان کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے اور وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں نہایت ہی نرم ہو گئے ' یار غار بن گئے ' اور ان کی اخوت ' دوستی اور اتفاق و اتحاد ایک تاریخی مثال بن گیا ۔ ان کی اجتماعی زندگی کا اہم رنگ ' رنگ محبت تھا اور وہ جنگ کی زندگی کے لئے ایک تمہید و مثال تھے ۔

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ "اور ان کے دلوں کے اندر جو کدورت تھی ' ہم وہ نکال دیں گے ' وہ بھائی بن جائیں گے اور تختوں پر ایک دوسرے کے بالمقابل بیٹھے ہوں گے ۔"

اسلامی نظریہ حیات ایک عجیب اور عملی عقیدہ ہے ۔ جب یہ دلوں کے اندر گھل مل جاتا ہے تو یہ ایک ایسے مزاج کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جس کا رنگ رنگ الفت و محبت ہوتا ہے ' اس کے حامل جگری دوست بن جاتے ہیں ۔ یہ اپنے ہم نشینوں کے لئے فرش بن جاتے ہیں ' ان کا پہلو نرم ہو جاتا ہے اور ان کے اخلاق اور طرز عمل سے خشونت دور ہو جاتی ہے ۔ اور ان کے اندر گہرے رابطے اور تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں ۔ حالات یہ ہو جاتے ہیں کہ آنکھ کی ایک نظر ' ہاتھ کا

معمولی چھونا' زبان کی گفتگو' دلوں کی دھڑکن' باہم مہر و محبت' دوستی اور ہمدردی اور ایثار و قربانی کے ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن کی حقیقت کو صرف وہ ذات جانتی ہے جس نے ان حالات کی تخلیق کی - اور ان کی حقیقت کا مزہ وہی شخص چکھ سکتا ہے جن کے اندر یہ انقلاب برپا ہو چکا ہوتا ہے -

یہ عقیدہ انسانیت کو الحب فی اللہ کا خون دیتا ہے - انسانیت کے تاروں کو خلوص و محبت اور جوڑ و ملاپ کا نغمہ عطا کرتا ہے اور جب انسانیت اس نظریہ حیات کو قبول کرتی ہے تو یہ معجزہ رونما ہو جاتا ہے - اور صرف اللہ ہی ہے جو اس معجزے کو ظہور میں لاتا ہے -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :" اللہ کے بندوں میں سے بعض بندے ایسے بھی ہیں کہ وہ انبیاء اور شہداء نہیں ہیں لیکن قیامت کے دن انبیاء و شہداء ان کے مقام اور مرتبے کے لئے ترسیں گے - صحابہ کرام نے کہا کیا آپ بتائیں گے کہ وہ لوگ کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہوں گے کہ وہ باہم اللہ کی روحانی قدروں کی وجہ سے محبت کرتے ہیں حالانکہ ان کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے' نہ ان کے درمیان کوئی مالی مفاد موجود ہے - خدا کی قسم ایسے لوگوں کے چہرے نور ہیں اور وہ نور پر ہیں - یہ لوگ اس وقت خوف میں نہ ہوں گے جب تمام لوگ خوف میں ہوں گے اور یہ لوگ اس وقت بھی پریشان نہ ہوں گے جب تمام لوگ پریشان ہوں گے - (ابوداؤد)

اور ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :" جب ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو ملتا ہے اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو ان دونوں کے گناہ اس طرح گرتے ہیں جس طرح سخت آندھی کے دن درختوں سے خشک پتے گرتے ہیں اور اللہ ان دونوں کے گناہ اس طرح بخش دیتے ہیں - اگرچہ وہ سمندروں کی جھاگ کی طرح زیادہ ہوں - (طبرانی)

اس موضوع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال بے حد زیادہ ہیں - اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں باہم محبت و الفت کی اہمیت پر یہ تمام اقوال ایک شاہد عادل ہیں' نیز اس کے علاوہ امت مسلمہ کی تشکیل اور ترقی سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقوال محض نعرے نہ تھے اور نہ خوشنما باتیں تھیں - نہ یہ محض انفرادی اعمال اور شاذ مثالیں تھیں بلکہ یہ ایک واقعہ تھا اور امت مسلمہ اور اسلامی معاشرے کی صورت میں نمایاں تھا - اذن الٰہی سے یہ اونچا ہوا تھا اور یہ وہ مینار تھا جسے اللہ کے سوا کوئی کھڑا نہ کر سکتا تھا -

---ooo---

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا جاتا ہے اور آپ کے واسطہ سے امت مسلمہ کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ اللہ تمہارا دوست اور والی ہے اور تم اس کے دوست ہو - تم اس لئے کافی ہو اور وہ تمہارے لئے کافی ہے - لہٰذا تم اللہ کی راہ میں لڑنے کے لئے حریص بن جاؤ اور تمہارے اندر جو قوت ایمانی ہے اس کی وجہ سے تم میں سے ایک آدمی دس کے برابر قوت رکھتا ہے اور اگر اہل ایمان بہت ہی کمزور ہو جائیں تو بھی وہ اپنے سے دگنے دشمنوں کو شکست دیں گے - ۸

ع ۶ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ حَسْبُكَ ٱللَّهُ وَمَنِ ٱتَّبَعَكَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٤﴾ يَـٰٓأَيُّهَا
۴ ٱلنَّبِىُّ حَرِّضِ ٱلْمُؤْمِنِينَ عَلَى ٱلْقِتَالِ ۚ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَـٰبِرُونَ

يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ
اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۭ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ
يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

”اے نبی ؐ، تمہارے لئے اور تمہارے پیرو اہل ایمان کے لئے تو بس اللہ کافی ہے۔

اے نبی ؐ، مومنوں کو جنگ پر ابھارو۔ اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو منکرین حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے۔ کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔ اچھا، اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کیا اور اسے معلوم ہوا کہ ابھی تم میں کمزوری ہے، پس اگر تم میں سے سو آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر اور ہزار آدمی ایسے ہوں تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آئیں گے اور اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔“

یہاں انسانی سوچ کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہے۔ وہ اس ناقابل شکست قوت پر غور کرتی ہے۔ اور انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔ یہ قوت اللہ کی قوت ہے جو نہایت ہی قوی اور غالب ہے۔ اور اللہ کی قوت کے مقابلے میں وہ حقیر انسانی قوت ہے جو اللہ کی افواج کو چیلنج کر رہی ہے۔ دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ معرکہ یقینی طور پر محفوظ انجام رکھتا ہے اور اس کا نتیجہ واضح ہے اور اللہ کی ضمانت اس کی پشت پر ہے۔ اللہ کی ضمانت یہ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۸: ۶۴) ”اے نبی ؐ، تمہارے لئے اور تمہارے پیرو اہل ایمان کے لئے تو بس اللہ کافی ہے۔“ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد مومنین کو کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں قتال کے لئے حریص بن جائیں۔ یہ حکم ایسے حالات میں دیا جاتا ہے کہ اس کے لئے ہر شخص تیار ہے، ہر دل مستعد ہے، تمام اہل ایمان کے اعصاب اس کے لئے تن گئے ہیں۔ رگ و ریشہ اس کے لئے آمادہ ہے اور کاسہ دل ایمان، اطمینان اور اللہ پر بھروسے سے بھر گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ (۸: ۶۵) ”اے نبی ؐ، مومنوں کو جنگ پر ابھارو۔“ ان کو آمادہ کرو کیونکہ وہ اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کے ہم پلہ ہیں۔ اگرچہ تعداد میں وہ کم ہیں اور دشمن زیادہ ہے اور ارد گرد پھیلا ہوا ہے۔

اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۸: ۶۵) ”اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر سو

آدمی ایسے ہوں تو منکرین حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے ۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ بات نہایت ہی اچانک اور عجیب ہے لیکن اس کے اندر گہرائی ہے اور سچائی ہے ۔ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۸: ۶۵) "کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے ۔" بظاہر فقاہت اور جنگ میں غلبے کے درمیان کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ لیکن ان کے درمیان حقیقی اور نہایت ہی مضبوط تعلق ہے ۔ مومن افواج اچھی طرح جانتی ہیں کہ ان کی راہ کیا ہے؟ ان کا منہاج کیا ہے؟ اس ذات کی حقیقت کیا ہے اور ان کا مقصد وجود کیا ہے؟ دراصل اہل ایمان کا دستہ اچھی طرح جانتا ہے کہ الوہیت کا مقام کیا ہے اور بندگی کے آداب کیا ہیں؟ وہ جانتے ہیں کہ الوہیت منفرد اور بلند ہوتی ہے اور بندگی کے آداب یہ ہیں کہ بندگی صرف اللہ کی کی جائے اور اس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہ ہو۔ اہل ایمان کا دستہ یہ بھی جانتا ہے' وہی امت مسلمہ ہے' وہی اللہ کی ہدایت کا حامل ہے اور یہ دستہ دنیا میں اس لئے نکالا گیا ہے اور اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی بندگی اور غلامی سے نکال کر اللہ وحدہ کی بندگی میں داخل کر دے اور صرف وہی اللہ کا خلیفہ ہے' اس کرۂ ارض پر۔ اسے یہاں اس لئے نہیں بٹھایا گیا کہ وہ خود اپنے آپ کو سربلند کرے اور عیش و عشرت کرے' بلکہ وہ اللہ کے کلمے کو سربلند کرے اور اس کی راہ میں جہاد کرے اور اس زمین کو سچائی سے بھر دے اور لوگوں کے درمیان انصاف سے فیصلے کرے اور اس زمین پر ایک ایسی مملکت قائم کرے جس کا مقصد لوگوں کے درمیان عدل قائم کرنا ہو۔ یہ ہے وہ فقہ جو اہل ایمان کے دلوں کو نور یقین اور قوت سے بھر دیتا ہے اور ان کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے آمادہ کرتا ہے اور وہ نہایت ہی قوت اور یقین کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے انجام کے بارے میں پہلے سے یقین ہوتا ہے جبکہ ان کے دشمن ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ان اہداف و مقاصد کو نہیں سمجھتے ۔ ان کے دل و دماغ پر تالے پڑے ہوتے ہیں' ان کی نظریں کمزور ہوتی ہیں' ان کی قوتیں شل ہوتی ہیں اگرچہ بظاہر وہ قوی ہیکل و تنومند نظر آئیں ۔ ان کی قوت دراصل اپنے اصلی سرچشمے سے منقطع ہوتی ہے ۔

یہ نسبت کہ ایک آدمی دس آدمیوں کے برابر ہو گا' یہ جاننے والے اہل ایمان اور نہ جاننے والے اہل کفر کے درمیان اللہ کے ترازو میں اصلی اور حقیقی نسبت ہے ۔ لیکن اگر مسلمان بہت ہی کمزور و ناتواں ہو جائیں تو بھی ان کے اور کفار کے درمیان ایک اور دو کی نسبت قائم رہے گی ۔

اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (۸: ۶۶)

"اچھا' اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کیا اور اسے معلوم ہوا کہ ابھی تم میں کمزوری ہے' پس اگر تم میں سے سو آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر اور ہزار آدمی ایسے ہوں تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آئیں گے اور اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو صبر کرنے والے ہیں ۔"

بعض فقہاء اور مفسرین نے اس آیت سے یہ سمجھا ہے کہ اس آیت میں اہل ایمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر وہ قوی ہوں تو ان میں سے ایک آدمی دس سے بھی نہ بھاگے گا اور اگر ضعیف ہوں تو ان میں سے ایک آدمی دو سے نہ بھاگے گا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے اختلافات ہیں جن کی تفصیل یہاں دینے کی ضرورت نہیں ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ہاں ناپ و

تول کے جو پیمانے ہیں' ان میں مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کی قوت کا یہ حقیقی موازنہ ہے اور یہ حق ہے اور یہاں اللہ اہل ایمان کو یہ بتلانا چاہتا ہے تم اپنی قوت کا ذرا اچھی طرح اندازہ کرلو' اپنے آپ کو کم نہ سمجھو اور اطمینان رکھو۔ اور اپنے قدموں کو میدان کارزار میں مضبوطی سے جما دو' یہ موازنہ کوئی قانونی موازنہ نہیں ہے بلکہ نفسیاتی موازنہ ہے۔

---ooo---

قتال کے لئے ابھارنے اور جوش دلانے کے بعد اب قیدیوں کے احکام کی طرف بات کا رخ پھر جاتا ہے۔ اور یہ بات یہاں بدر میں رسول اللہ اور مسلمانوں کے اقدامات کے حوالے سے ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ تمہارے پاس جو قیدی ہیں ان کی ذہنی تربیت اس طرح کرو' ان کو ایمان کی ترغیب دو اور کہو کہ اگر اب بھی وہ ایمان لائیں تو اس سے قبل ان سے جو مواقع جاتے رہے ہیں' ان کی تلافی ہو سکتی ہے۔

---

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ
فِي الْأَرْضِ ۚ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ
حَكِيمٌ ﴿٦٧﴾ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٦٨﴾
فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٦٩﴾ ع ۵
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَىٰ إِنْ يَعْلَمِ اللَّهُ فِي ۵
قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِمَّا أُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ
رَحِيمٌ ﴿٧٠﴾ وَإِنْ يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ فَأَمْكَنَ
مِنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٧١﴾

"کسی نبی کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو' حالانکہ اللہ کے پیش نظر آخرت ہے' اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔ پس جو کچھ تم نے مال حاصل کیا ہے اسے کھاؤ کہ وہ حلال اور پاک ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو' یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اے نبی" تم لوگوں کے قبضہ میں جو قیدی ہیں ان سے کہو اگر اللہ کو معلوم ہوا کہ تمہارے دلوں میں کچھ خیر ہے تو وہ تمہیں اس سے بڑھ چڑھ کر دے گا' جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہاری خطائیں معاف کرے گا' اللہ درگزر کرنے والا ہے

اور رحم فرمانے والا ہے لیکن اگر وہ تیرے ساتھ خیانت کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس سے پہلے وہ اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں' چنانچہ اسی کی سزا اللہ نے انہیں دی کہ وہ تیرے قابو میں آگئے' اللہ سب کچھ جانتا اور حکیم ہے۔"

ابن اسحاق نے غزوۂ بدر کے واقعات بیان کرتے ہوئے کہا ہے "جب لوگوں نے دشمن کو گرفتار کرنا شروع کر دیا اور رسول خدا ؐ اپنے چبوترے میں تھے۔ اور سعد ابن معاذ اس کے دروازے پر پہرہ دے رہے تھے۔ ان کے ساتھ دوسرے انصار بھی تھے۔ اور سعد نے تلوار سونتی ہوئی تھی۔ یہ سب لوگ رسول اللہ کی حفاظت پر مامور تھے۔ ان لوگوں کو ڈر تھا کہ دشمن کی جانب سے حضور ؐ پر کوئی حملہ آور نہ ہو جائے۔ مجھے بتایا گیا کہ حضور ؐ نے سعد کے چہرے پر کچھ ناگواری کے اثرات محسوس کئے کیونکہ انہیں وہ پسند نہ تھا جو لوگ کر رہے تھے تو حضور ؐ نے فرمایا: سعد! تم شاید لوگوں کے اس فعل کو پسند نہیں کر رہے ہو۔ انہوں نے فرمایا: رسول خدا ؐ آپ کی بات درست ہے۔ یہ پہلا واقعہ تھا جس میں اللہ نے مشرکین کو اس قسم کی شکست سے دوچار کر دیا۔ میرے خیال میں اس معرکے میں لوگوں کو نیست و نابود کر دینا' ان کے زندہ گرفتار کرنے کے مقابلے میں زیادہ مناسب تھا۔

امام احمد نے اپنی سند سے روایت کی ہے' ابن عباس سے' انہوں نے حضرت عمر سے' فرماتے ہیں: جب اس دن افواج کی مڈبھیڑ ہوئی تو اللہ نے مشرکین کو شکست سے دوچار کر دیا۔ ان میں سے ستر افراد قتل ہوئے اور ستر افراد گرفتار ہوئے۔ حضور ؐ نے ابوبکر' عمر اور علی رضوان اللہ علیہم سے مشورہ کیا۔ ابوبکر ؓ نے فرمایا کہ حضور ؐ یہ لوگ چچازاد' ہم قوم اور بھائی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ ان سے فدیہ لے لیں' اس لئے جو ہم نے ان سے لیا وہ کفار کے خلاف بطور قوت استعمال ہو گا۔ اور یہ امکان ہے کہ یہ لوگ ہدایت پالیں اور یہ ہمارے لئے امداد کا سبب بنیں۔ اس کے بعد حضور ؐ نے فرمایا ابن خطاب تم بتاؤ؟ انہوں نے کہا کہ میں نے اس موقعہ پر یہ مشورہ دیا' خدا کی قسم میری رائے ابوبکر کی رائے کے مطابق نہیں ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ فلاں شخص (ان کے رشتہ دار) کو میرے حوالے کرو' تاکہ میں اس کی گردن اتار دوں اور حضرت علی کے حوالے عقیل ابن ابی طالب کر دیں تاکہ وہ ان کی گردن اڑا دیں اور حمزہ کے حوالے ان کے بھائی کو کر دیں تاکہ وہ اس کی گردن اڑا دیں' تاکہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے دل میں مشرکین کے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں ہے۔ یہ لوگ تو ان کے اکابر امام اور قائدین ہیں۔ تو حضور ؐ نے حضرت ابوبکر ؓ کی رائے کو اختیار کر لیا اور میری بات کو نہ تسلیم کیا اور لوگوں سے فدیہ قبول کر لیا۔ دوسرے دن میں صبح صبح حضور ؐ کے پاس گیا اور دیکھا کہ حضرت ابوبکر ؓ اور حضور ؐ رو رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ حضور ؐ آپ کو اور آپ کے ساتھی کو کیا چیز رلا رہی ہے؟ اگر کوئی رونے کی بات ہو تو میں بھی روؤں گا۔ اور اگر کوئی بات نہ ہو تو میں تمہارے رونے کی وجہ سے روؤں گا۔ اس پر حضور ؐ نے فرمایا: "وہ مشورہ جو آپ کے ساتھیوں نے فدیہ لینے کے بارے میں دیا' اس نے مجھے تمہارا عذاب اس قدر قریب کر کے دکھایا جس قدر یہ درخت قریب ہے۔ (آپ نے قریبی درخت کی طرف اشارہ کیا) اور اس پر اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ——— تا ———

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا (۸: ۶۷ تا ۶۹)) اس طرح مسلمانوں کے لئے اموال غنیمت کو جائز قرار

دے دیا۔ (روایت مسلم' ابوداؤد' ترمذی' ابن جریر اور ابن مردویہ بطریق عکرمہ ابن عمار الیمانی)

امام احمد روایت کرتے ہیں علی ابن ہاشم سے' حمید سے' حضرت انس ؓ سے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں مشورہ کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہاری قید میں دے دیا ہے' اس پر حضرت عمرؓ کھڑے ہوگئے اور مشورہ دیا کہ حضور ؐ ان سب کی گردنیں اڑادی جائیں۔ تو حضور ؐ نے ان کی جانب سے منہ پھیر لیا اور پھر فرمایا لوگو' اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہاری قید میں دے دیا ہے لیکن یہ بات پیش نظر رکھو کہ کل وہ تمہارے بھائی تھے۔ اس پر حضرت عمرؓ پھر کھڑے ہوگئے اور کہا حضور ؐ میرا مشورہ ہے کہ ان کی گردن اڑادی جائے۔ حضور ؐ نے پھر ان سے منہ پھیر لیا اور لوگوں کے سامنے پھر یہ مسئلہ رکھا۔ اس پر ابوبکرؓ نے مشورہ دیا کہ حضور ؐ مناسب یہ ہے کہ آپ ان کو معاف کر دیں اور ان سے فدیہ قبول کرلیں۔ اس مشورے کے بعد حضور ؐ کے چہرے پر پریشانی کے جو آثار تھے وہ ختم ہوگئے۔ حضور ؐ نے ان کو معاف کر دیا اور فدیہ قبول کر لیا۔ اس پر اللہ کی طرف سے یہ آیات نازل ہوئیں:

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۸:۶۸) "اگر اللہ کی طرف سے پہلے کتاب نہ ہوتی تو تم نے جو لیا' اس کی وجہ تمہیں عذاب عظیم چھو لیتا۔" اعمش' عمران' ابن مرہ سے' عبید اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ جب بدر کا دن تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ قیدیوں کے بارے میں کیا مشورہ دیتے ہو۔ ابوبکرؓ نے کہا' اے رسول اللہ ؐ یہ لوگ تمہاری قوم اور تمہارے رشتہ دار ہیں۔ ان کو زندہ رہنے دیں اور ان سے فدیہ قبول کریں شاید اللہ انہیں معاف کر دے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا حضور ؐ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے آپ کی تکذیب کی اور آپ ؐ کو اپنے گھر سے نکالا۔ انھیں اور ان کی گردن اڑا دیں۔ عبداللہ ابن رواحہ نے کہا اے رسول ؐ خدا آپ ایک لمبی وادی میں مقیم ہیں جس میں خشک لکڑیاں بہت ہیں۔ مناسب ہے کہ پوری وادی کو آگ سے بھر دیں اور ان کو اس میں پھینک دیں۔ حضور ؐ خاموش ہوگئے اور کوئی بات نہ کی اور اٹھ کر اپنے حجرے میں داخل ہو گئے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ حضور ؐ ابوبکرؓ کے مشورے کو قبول کریں گے۔ بعض نے کہا کہ آپ حضرت عمرؓ کے مشورے کو قبول کریں گے۔ بعض نے کہا کہ حضور ؐ عبداللہ ابن رواحہ کے قول کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور فرمایا: "اللہ بعض لوگوں کے دلوں کو نرم کر دیتے ہیں اور وہ اس قدر نرم ہو جاتے ہیں کہ دودھ سے بھی زیادہ نرم ہوتے ہیں اور اللہ بعض لوگوں کے دلوں کو سخت کر دیتے ہیں اور وہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتے ہیں۔ اے ابوبکرؓ آپ کی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے۔ جنہوں نے فرمایا:

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ "جس نے میری اطاعت کی تو وہ میرا ہو گا اور جس نے نافرمانی کی تو آپ غفور و رحیم ہیں۔" اور اسی طرح اے ابوبکرؓ تم حضرت عیسیٰ کی طرح ہو' جنہوں نے کہا:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ "اگر تو انہیں

عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو بخش دے تو تو ہی عزیز اور حکیم ہے۔" اور اے عمرؓ تیری مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح ہے رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰی اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰی يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ "اے اللہ ان کے اموال کو تباہ کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ وہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک عذاب الیم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیں۔" اور اے عمرؓ تمہاری مثال نوح علیہ السلام کی طرح ہے' جنہوں نے فرمایا: رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا "اے رب زمین پر کافروں سے کوئی زندہ بشر نہ چھوڑ۔ تم قابل اعتماد ہو' لہٰذا فیصلہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی رہا نہ ہو گا' الا یہ کہ فدیہ دے یا اس کی گردن اڑا دی جائے۔ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے کہا حضورؐ "ماسوائے سہل ابن بیضاء کے کیونکہ وہ اسلام کی توہین کیا کرتا تھا۔" اس پر حضورؐ خاموش ہو گئے۔ کبھی اس دن سے زیادہ مجھ پر حالت خوف طاری نہ ہوئی تھی۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ ابھی مجھ پر آسمان سے پتھر برسنے لگیں گے۔ یہاں تک کہ حضورؐ نے فرمایا: "ماسوائے سہل ابن بیضاء کے" --- اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ (۸:۶۷)

(احمد' ترمذی نے ابو معاویہ ابن اعمش کے واسطہ سے' حاکم نے کہا کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے لیکن صحیحین نے اسے روایت نہیں کیا ہے) اثخان مطلوب یہ ہے کہ ان میں سے اس قدر آدمیوں کو قتل کیا جائے کہ ان کی قوت ٹوٹ جائے۔ اور ان کے مقابلے میں مسلمانوں کی قوت برتر ہو جائے اور یہ بات اس سے قبل واقعہ ہو جانا چاہئے تھی یعنی گرفتاریوں سے قبل یعنی گرفتار کر کے اور فدیہ لے کر چھوڑنے کی پوری کاروائی سے قبل' اس لئے اللہ نے مسلمانوں کو سرزنش کی۔ انہیں چاہئے تھا کہ وہ لوگوں کو گرفتار ہی نہ کرتے۔

غزوۂ بدر مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان پہلا معرکہ تھا۔ اس وقت مشرکین کثیر تعداد میں تھے اور مسلمان قلیل تھے۔ اور ان میں سے زیادہ کو قتل کرنے سے ان کی عددی قوت میں کمی کرنا مطلوب تھا۔ اس طرح ان کے لیڈر ذلیل و خوار ہو جاتے اور ان کی قوت کم ہو جاتی اور وہ دوبارہ مسلمانوں پر حملے کی جراءت ہی نہ کر سکتے اور یہ اس قدر عظیم اور اہم ہدف تھا کہ اس کے مقابلے میں تاوان جنگ کی بڑی سے بڑی رقم بھی ہیچ تھی۔

نیز اس سے ایک اور غرض بھی مطلوب تھی۔ دلوں میں یہ نکتہ بٹھانا مقصود تھا' جس کی طرف حضرت عمرؓ نے واضح طور پر اشارہ فرمایا۔ دو ٹوک الفاظ میں اور نہایت ہی کھل کر "تاکہ اللہ کو معلوم ہو کہ ہمارے دلوں میں مشرکین کے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں ہے۔"

ہم سمجھتے ہیں انہی دو مقاصد کی خاطر' اللہ نے مسلمانوں کے اس فعل کو پسند نہیں کیا کہ وہ لوگوں کو قید کریں اور رقم لے کر چھوڑ دیں۔ اور انہی عملی اقدامات کے بارے میں یہ آیت آئی ہے' جب بھی مسلمانوں کو ایسے حالات کا سامنا ہو تو یہ آیت ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ (۸:۶۷)

"کسی نبی کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے - یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے پہلے ہی معرکے میں فدیہ قبول کیا اور دشمن کو قیدی بنایا' ان کے بارے میں یہ ریمارکس دیئے گئے :

تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۸:۶۷)

"تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو' حالانکہ اللہ کے پیش نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے -" یعنی تم نے قتل کرنے کے بجائے دشمن کو قیدی بنایا اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا - اللہ کی اسکیم یہ تھی کہ تم ان کو اس معرکے میں خوب کچل دیتے لہذا مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ اللہ کی اسکیم اور ارادے کے مطابق چلتے - کیونکہ اللہ آخرت کی بھلائی چاہتا ہے' اور یہ تب ہی حاصل ہو سکتی ہے جب دنیا کے مفادات کو ترک کر دیا جائے - اللہ عزیز و حکیم ہے - اسی نے تو تمہارے لئے فتح و نصرت کا سامان کیا - اور تمہیں اس کی توفیق دی - اور اس کی پشت پر حکمت یہ تھی کہ دشمنوں کی جڑ کٹ جائے' حق حق ہو جائے اور باطل' باطل ہو جائے - اگرچہ مجرم اس بات کو پسند نہیں کرتے -"

اس لئے پہلے اللہ نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ اہل بدر جو غلطی بھی کریں اللہ انہیں معاف کر دے گا - اس لئے اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کے نتیجے میں اسارائے بدر کے بارے میں انہوں نے جو نامناسب عمل اختیار کیا' اس پر وہ عذاب عظیم سے بچ گئے -

لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۸:۶۸) "اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے' اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی -"

نہ صرف یہ کہ عذاب سے بچ گئے بلکہ ان کے لئے ایک مزید انعام کا اعلان ہو گیا - جنگ کے نتیجے میں آنے والا مال بھی ان کے لئے حلال ہو گیا' جس میں فدیے کی آمدن بھی شامل ہے' جس کے بارے میں عتاب مذکور بھی ہوا تھا جبکہ اس سے پہلے رسولوں کی امتوں پر یہ حرام تھا - اللہ ان کو یاد دلاتا ہے کہ تمہارا اصل سرمایہ تقویٰ ہے اور اگر تم تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ غفور و رحیم ہے - یہ ایک عجیب توازن ہے' اہل ایمان پر فرض کیا گیا کہ تم خدا خوفی کا رویہ ہر وقت اپنائے رکھو' بے شک اللہ غفور و رحیم ہے لیکن تم ہر وقت اس سے ڈرتے رہو اور صفت غفوریت کی وجہ سے بدعمل نہ ہو جاؤ -

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۶۹) ع "پس جو کچھ تم نے مال حاصل کیا ہے' اسے کھاؤ کہ وہ حلال اور پاک ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو - یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے -" اب سیاق کلام قیدیوں کی طرف مڑ جاتا ہے - ان کو زندگی عطا کرنے اور خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے چٹکی بھری جاتی ہے - ان کے احساس کو جگایا جاتا ہے تاکہ ان کے شعور میں امید کی کرن روشن ہو' اور وہ پرامید ہو کر روشنی کی طرف آجائیں اور ماضی کے مقابلے میں ان کا مستقبل سنور جائے اور وہ جس زندگی میں ہیں' اس

کے مقابلے میں اچھی زندگی حاصل کر لیں اور ان کو جو مالی تاوان ہوا ہے اور ان کا جو علاقہ ہے' اس سے وہ اچھی جگہ آ جائیں اور اس پر اللہ کی رحمت اور مغفرت مستزاد۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِيٓ أَيْدِيكُمْ مِّنَ الْأَسْرٰى إِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ أُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۸: ۷۰) "اے نبی" تم لوگوں کے قبضہ میں جو قیدی ہیں' ان سے کہو اگر اللہ کو معلوم ہوا کہ تمہارے دلوں میں کچھ خیر ہے تو وہ تمہیں اس سے بڑھ چڑھ کر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہاری خطائیں معاف کرے گا' اللہ درگزر کرنے والا ہے اور رحم فرمانے والا ہے۔" یہ ہے ان کے لئے ہمہ گیر بھلائی لیکن یہ بھلائی ان تک تب ہی پہنچ سکتی ہے جب ان کے دل نور ایمان کے لئے کھل جائیں۔ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ ان کے اندر بھلائی کا عنصر موجود ہے اور یہ عنصر ایمان کا عنصر ہے۔ یہ اس قدر عام اور ہمہ گیر خیر ہے کہ اس میں ایمان کے لفظ کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ ایمان گویا خیر محض ہے اور کوئی بات اس وقت تک خیر اور بھلائی نہیں ہو سکتی جب تک وہ ایمان کے حوالے سے نہ ہو اور جس کا وجود ایمان کے عنصر کے نتیجے میں نہ ہو۔ اور وہ ایمان پر قائم نہ ہو۔

اسلام قیدیوں کا صرف اس لئے روادار ہے کہ وہ ان کے دلوں میں بھلائی کی تلاش کرے۔ اگر ان کے اندر کوئی خفیہ چنگاری ہو تو اسے جگا دے۔ ان کی فطرت کو خواب غفلت سے بیدار کرے اور وہ اسلامی نظریہ حیات کو قبول کرنے' اس سے متاثر ہونے کے لئے تیار ہو جائیں اور آخر کار نور ایمان سے منور ہو جائیں۔ اسلام دشمن کو اس لئے قید نہیں کرتا کہ وہ ان سے انتقام لے کر ان کو ذلیل کرے یا ان کا استحصال کرے جس طرح حضور ؐ کے دور میں رومی اور دوسری اقوام اور نسلوں میں یہ مقاصد عام طور پر مروج تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے کچھ لوگوں سے نقل کیا ہے اور انہوں نے ان کا نام بھی لیا ہے کہ اہل قریش نے اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لئے اور فدیہ کی ادائیگی کے لئے ایک وفد بھیجا۔ ہر قوم نے اپنے قیدی کو چھڑایا۔ جس پر لوگ راضی ہوئے۔ حضرت عباس ؓ نے فرمایا رسول خدا میں تو مسلم تھا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپ کے اسلام کے بارے میں صحیح علم اللہ کو ہے۔ اگر معاملہ ایسا ہے جس طرح تم کہتے ہو تو اللہ تمہیں جزا دے گا۔ جہاں تک ظاہرداری کا تعلق ہے تو تم ہمارے خلاف تھے۔ لہذا آپ اپنا' اپنے دو بھتیجوں نوفل ابن حارث ابن عبدالمطلب اور عقیل ابن ابی طالب ابن عبدالمطلب کا فدیہ دیں۔ نیز اپنے حلیف عتبہ ابن عمرو بنی الحارث ابن فہر کے بھائی کا فدیہ بھی دیں۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ میرے پاس ان لوگوں کا فدیہ کہاں ہے؟ تو اس پر رسول اللہ نے فرمایا وہ مال کہاں ہے جو تم نے اور ام الفضل نے دفن کیا تھا اور تم نے اسے کہا تھا کہ اگر میں اس سفر میں مرگیا تو یہ مال جو دفن کیا گیا ہے بنی فضل' عبداللہ اور قثم کا ہو گا۔' اس پر اس نے کہا: "خدا کی قسم رسول خدا میں جانتا ہوں کہ آپ رسول خدا ہیں۔ یہ تو وہ راز ہے جو میرے [illegible] فضل کے سوا کوئی نہیں جانتا۔" لہذا آپ لوگوں نے مجھ سے جو بیس اوقیہ مال لیا ہے' اسے فدیہ کی رقم میں حساب کر لیں۔ اس پر رسول ؐ اللہ نے فرمایا: "یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو مال غنیمت تھا جو اللہ نے آپ سے ہمیں دلا دیا۔" اس پر عباس نے اپنا فدیہ دیا' اپنے دو بھتیجوں کا فدیہ بھی دیا اور اپنے حلیف کا فدیہ بھی دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

يَآاَيُّهَا النَّبِىُّ قُلْ لِّمَنْ فِىْٓ اَيْدِيْكُمْ (۸: ۷۰) "اے نبی ؐ تم لوگوں کے قبضے میں جو قیدی ہیں ' ان سے کہو کہ اگر اللہ کو معلوم ہو کہ تمہارے دلوں میں کچھ خیر ہے ' تو وہ اس سے تمہیں بڑھ چڑھ کر دے جو تم سے لیا گیا ہے ' اور تمہاری خطائیں معاف کرے گا ' اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے ۔" لیکن روشنی کی یہ کرن دکھاتے ہوئے اور امید کا دروازہ کھولتے ہوئے ' اللہ ان کو متنبہ بھی کرتا ہے کہ اگر انہوں نے رسول کے ساتھ خیانت کی تو پھر ان کا حال یہی ہو گا جو ہوا۔

وَ اِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

(۸: ۷۱) "لیکن اگر وہ تیرے ساتھ خیانت کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس سے پہلے وہ اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں ' چنانچہ اسی کی سزا اللہ نے انہیں دی کہ وہ تیرے قابو میں آ گئے ' اللہ سب کچھ جانتا اور حکیم ہے ۔"

انہوں نے اللہ کے ساتھ یوں خیانت کی کہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کیا ۔ اور اللہ وحدہ کو اپنا رب تسلیم نہ کیا حالانکہ اس نے ان کی فطرت سے یہ عہد لیا تھا ۔ اور اگر انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی خیانت کا ارادہ کیا ۔ حالانکہ اب وہ آپ ؐ کی قید میں ہیں تو ان کو پہلی خیانت کے نتائج پر غور کرنا چاہئے کہ اب وہ مسلمانوں کے ہاں قید ہیں اور اللہ نے ان کو رسول اللہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے ۔

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں ابن عربی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب مشرکین قید ہوئے تو ان میں سے بعض لوگوں نے اسلام کے متعلق بات کی ۔ لیکن وہ دل سے مسلمان نہ تھے ۔ اسلام کے بارے میں انہوں نے جو بات کی ' وہ بھی دو ٹوک نہ تھی ۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے قریب آ جائیں لیکن مشرکین سے بھی دور نہ ہوں ۔ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اگر کوئی کافر ایمان کی بات کرے ' زبان سے اقرار بھی کرے لیکن وہ اس میں صاحب عزیمت نہ ہو تو وہ مومن تصور نہ ہو گا ' لیکن اگر مومنین میں سے کوئی اس قسم کی مذبذب بات کرے تو وہ کافر ہو گا ۔ الا یہ کہ دل میں کوئی ایسا وسوسہ آ جائے جو انسان کی قدرت سے باہر ہوتا ہے ' کیونکہ اسے تو خود اللہ نے معاف کر دیا ہے ۔ اللہ نے اپنے رسول ؐ کے سامنے یہ حقیقت کھول دی ہے ۔ وَ اِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ (۸: ۷۱) یعنی یہ بات اگر ان کی جانب سے بطور مکر و فریب اور خیانت ہے تو انہوں نے اس سے قبل بھی اللہ کی خیانت کا ارتکاب کیا ہے کہ انہوں نے کفر کو اپنایا ' اسلام کے خلاف سازشیں کیں اور آپ ؐ کے خلاف آمادۂ جنگ ہو گئے ۔ اگرچہ ان کی یہ بات برائے ظاہرداری اچھی ہے اور اللہ بھی جانتا ہے کہ اس کی پشت پر کوئی بھلائی موجود ہے تو اللہ ان کو معاف کر دے گا اور ان کے سابقہ کرتوتوں کو ساقط کر دے گا ۔

اب یہ درس ختم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ یہ سورت بھی ختم ہو جاتی ہے ۔ اس میں اسلامی معاشرے کے اندرونی حالات و تعلقات اور اسلامی معاشرے اور دوسرے معاشروں کے مابین تعلقات کو منضبط کیا گیا ہے ۔ اور اس بارے میں منظم بین الاقوامی قانون کی بنیاد رکھی گئی ہے ۔ ان احکام و ضوابط پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلامی معاشرے اور اسلامی نظام کا مزاج کیا ہے ۔ وہ کیا بنیاد ہے جس کے اوپر اس کی عمارت اٹھتی ہے اور وہ کیا انتہا ہے جس تک یہ نظام بڑھتا ہے ۔ اس نظام کی بنیاد خونی رشتوں پر نہیں ہے ۔ زمین اور علاقائی رشتوں پر بھی نہیں ہے ۔ رنگ و نسل کے رشتوں پر بھی نہیں ہے ۔ تاریخی مشترکہ ورثے کے تعلقات پر بھی نہیں ہے ۔ مشترکہ زبان اور مشترکہ اقتصادی نظام کے تعلقات پر

بھی نہیں ہے - یہ نظام نہ رشتہ داری کا نظام ہے' نہ وطنیت ہے' نہ قومیت ہے اور نہ اقتصادی مصالح کا نام ہے - بلکہ یہ نظام ایک نظریے پر بنا ہے - یہ ایک رسول کی قیادت پر وجود میں آیا ہے - یہ ایک تحریک کا نام ہے' لہٰذا جو لوگ ایمان لائے' انہوں نے اپنا وطن چھوڑ کر دار ہجرت میں آگئے' اور انہوں نے اپنے تمام زمینی رشتے کاٹ دیئے' اپنی زمین کو چھوڑ دیا' قوم کو چھوڑ دیا' مفادات کو چھوڑ دیا اور اپنے مالوں اور اپنی جان کے ذریعے جہاد فی سبیل اللہ کیا اور وہ لوگ جنہوں نے پناہ دی اور امداد دی اور وہ ان لوگوں کے قریب ہوگئے' نظریات کی وجہ سے' اور انہوں نے اسلامی قیادت کو قبول کر کے تحریک میں شامل ہوگئے - یہی لوگ ہیں جو ایک دوسرے کے بھائی اور ولی ہیں - اور جو لوگ ایمان تو لے آئے مگر دارالاسلام کی طرف ہجرت نہ کی تو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی ولایت نہیں ہے کیونکہ اسلامی عقیدے کے قبول کرنے کے بعد وہ اس عقیدے کے لئے وقف نہ ہوئے اور اس عقیدے کے نظام کو قبول نہ کیا اور اجتماعی تحریک کی قیادت کے احکامات قبول نہ کئے' کیونکہ اسلامی معاشرے میں پائے جانے والے نظریاتی دو افراد کے درمیان پائے جانے والے تعلقات وراثت سے زیادہ اہم ہیں - اور اس کے مقابلے میں کفار ایک دوسرے کے ولی بھی ہیں اور وارث بھی ہیں - یہ ہیں وہ اہم خطوط جن پر اسلامی معاشرے کی عمارت اٹھتی ہے - اور ان لائنوں پر افراد معاشرہ کے درمیان تعلقات بنتے اور بگڑتے ہیں جیسا کہ ان قرآنی آیات میں ان کو ضبط کیا گیا ہے -

---

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٧٢﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ﴿٧٣﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٧٤﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا مِن بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ

فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ۭ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ۧ

۱۰ ع ۶ الربع ۶

"جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے' اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی' وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں - رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) آنہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے' جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں - ہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے' لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو - جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اسے دیکھتا ہے جو لوگ منکر حق ہیں' وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں - اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہو گا -

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی' وہی سچے مومن ہیں - ان کے لئے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے' اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کر کے آگئے اور تمہارے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے لگے وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں مگر اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں' یقیناً اللہ ہر چیز کو جانتا ہے -"

یوم بدر تک اسلام کے آغاز میں مسلمانوں کے درمیان ولایت کی نوعیت یہ تھی کہ ان کے درمیان توارث اور تکافل کے تعلقات تھے اور وہ اس کے تحت دیت ادا کرتے تھے اور ان کے درمیان ایک دوسرے کی نصرت اور اخوت کی ولایت قائم تھی اور یہ ولایت قرابت' نسب اور خون کی ولایت کے قائم مقام تھی - لیکن جب یوم بدر کے بعد اللہ نے مسلمانوں کو استحکام بخش دیا اور اسلامی مملکت مستحکم ہو گئی تو ولایت اور نصرت رہ گئی اور میراث اور دیات میں تکافل کو اسلامی معاشرے کے اندر خونی رشتوں کی طرف لوٹا دیا - اس آیت میں جس ہجرت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور جسے اس ولایت کے لئے شرط قرار دیا گیا ہے خواہ ولایت عامہ ہو یا خاصہ ہو' تو اس سے مراد دارالشرک سے دارالاسلام کی طرف ہجرت ہے جس کی استطاعت ہو' جو لوگ ہجرت کر سکتے ہیں اور نہ کریں اور اس لئے نہ کریں کہ انہیں دارالشرک میں مفادات اور رشتہ داریاں عزیز ہوں تو ایسے لوگوں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی ولایت نہیں ہے - اور یہی مسئلہ ان دیہاتی لوگوں کا تھا جو اسلام کو قبول کر چکے تھے لیکن ایسے ہی حالات کی وجہ سے انہوں نے ہجرت نہ کی - اس قسم سے بعض لوگ مکہ میں بھی تھے - ایسے لوگوں کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اللہ نے ان کی نصرت لازم کی ہے بشرطیکہ وہ نصرت طلب کریں اور ان کی جس قوم کے ساتھ دشمنی ہو' مسلمانوں اور اس قوم کے درمیان کوئی معاہدہ نہ ہو کیونکہ اسلامی معاشرے کا عہد و پیمان اور اس کا تحریکی منصوبہ انفرادی ضرورتوں سے زیادہ اہم ہے -

ہم سمجھتے ہیں کہ ان آیات اور ان میں مذکور احکام و ضوابط سے اسلامی معاشرے کے خدوخال اچھی طرح واضح ہو جاتے ہیں - ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کی ترجیحات کیا ہیں؟ اس کی عضوی ترکیب کیا ہے اور اس کی بنیادی اقدار کیا ہیں؟ لیکن یہ بات اس وقت پوری طرح واضح نہیں ہو سکتی جب تک اسلامی معاشرے اور اس کے تاریخی

ارتقاء پر ایک نوٹ نہ دے دیا جائے اور یہ وضاحت نہ کر دی جائے کہ ایک اسلامی معاشرے کے کیا اساسی قواعد ہیں اور اس کی حرکت اور جدوجہد اور اس کی ترجیحات کا منہاج کیا ہے۔

دعوت اسلامی جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر اٹھے تھے۔ دراصل اس عالمگیر دعوت اسلامی کے طویل سلسلے کی آخری کڑی ہے جسے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ؐ تک تمام انبیاء کرام پیش کرتے رہے۔ انسانیت کی اس طویل تاریخ میں دعوت اسلامی کا مطمع نظر اور نصب العین ایک ہی رہا ہے 'یعنی لوگوں کو شرک و بت پرستی سے ہٹا کر صرف ایک رب ذوالجلال کی ذات سے متعارف کرانا اسی کا بندہ و غلام بنانا اور اس کے سوا تمام الاہوں اور بندگیوں سے نجات دینا۔ انسانی تاریخ شاہد ہے کہ معدودے چند افراد کو چھوڑ کر اور چند مختصر وقفوں کے سوا' پوری انسانیت نے کبھی بھی الوہیت کے اصل سرچشمے ' اللہ کی ذات کا انکار نہیں کیا۔ تمام اقوام و ملل میں یہ عقیدہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور پایا جاتا رہا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوا ہے کہ لوگ کبھی تو اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل کرنے میں ٹھوکریں کھاتے رہے ہیں اور یا اس کی الوہیت اور ربوبیت میں کسی نہ کسی کو شریک کرتے رہے ہیں۔ یہ شرک یا تو پرستش اور عقیدے میں ہوا ہے اور یا یہ حاکمیت اور اطاعت کے دائرہ میں ہوا ہے اور اپنی نوعیت اور نتائج کے لحاظ سے دونوں قسم کے شرک ایک ہی جیسے ہیں۔ لوگ اس کا ارتکاب کر کے اللہ کے دین سے نکل جاتے رہے۔

تاریخ کے ہر دور میں رسولوں کے ذریعہ لوگوں تک دین پہنچتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ یوں ہوا کہ لوگ دین حق سے خارج ہو ہو کر اس جاہلیت کی طرف پلٹتے جس سے دین حق نے انہیں نکالا تھا۔ اگرچہ یہ لوگ مکمل طور پر خدا کا انکار نہ کرتے بلکہ اس کی ذات میں شرک کرتے یا عقائد و نظریات میں اور یا پھر اطاعت و حاکمیت میں یا ان سب میں۔

یہ ایک مقصد ہی دعوت اسلامی کا نصب العین رہا ہے اور پوری تاریخ انسانی میں تمام انبیاء کرام کی دعوت کا مقصد بھی ایک ہی رہا ہے یعنی اسلام۔ دوسرے لفظوں میں ایک اللہ اور رب کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا' لوگوں کو تمام الہٰوں کی بندگی اور غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی بندگی اور اطاعت میں داخل کرنا یعنی لوگوں کو حاکمیت ' شریعت ' حکومت اور زندگی کی تمام عادات و اطوار میں صرف للہ وحدہ کی اطاعت میں داخل کرنا یہی وہ مقصد تھا جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے اور آپ سے قبل تمام انبیاء کا نصب العین بھی یہی رہا ہے۔ اس کا نام ہے اسلام ' جو لوگوں کو دوبارہ صرف اللہ کی حاکمیت کے دائرہ میں لانا چاہتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اس پوری کائنات میں تکوینی طور پر اللہ کی حاکمیت جاری ہے۔ ایک پتہ بھی حکم الٰہی کے بغیر اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ سورج چاند اس کے حکم سے گردش کر رہے ہیں بعینہ اسی طرح تشریعی امور بھی سب کے سب اسی ذات برتر کے حکم کے مطابق چلیں اور لوگ اپنے لئے کوئی نظام زندگی کوئی حکومت اور ایسی تدابیر اختیار نہ کریں جو اللہ کے تجویز کردہ نظام حیات ' طرز حکومت اور تدبیر سے مختلف ہو یا ان کے متضاد ہو۔ کیونکہ اللہ ہی اس پوری کائنات پر متصرف ہے بلکہ وہ خود انسانی زندگی کے طبعی حصے پر بھی متصرف ہے۔ جو انسان کے دائرہ اختیار اور ارادے سے باہر ہے۔ مثلاً پیدائش نشوونما صحت و مرض حیات و ممات اور دوسرے وہ امور جو براہ راست اللہ کے تجویز کردہ طبعی قوانین کے تابع ہیں اور انسان اپنی طبعی اور اجتماعی زندگی میں ان فطری اصولوں کا طوعاً و کرھاً پابند ہے۔ اور کسی صورت میں بھی ان فطری اور طبعی قوانین کو نہیں بدل سکتا اور نہ آج تک کوئی مخلوق ان قوانین کو بدل سکی ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ بعینہ اسی طرح زندگی کے اختیاری حصے میں بھی انسان الٰہی قوانین کا پابند ہو اور

اپنی پوری زندگی میں صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا حاکم اور مطاع بنا لے اور اس کی زندگی کا یہ اختیاری حصہ بھی زندگی کے تکوینی حصے اور کائنات سے ہم آہنگ ہو جائے اور اس طرح ان تینوں میں ہم آہنگی پائی جائے۔"

مزید تشریح کے لئے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "مبادی اسلام" غالباً رسالہ دینیات مراد ہے۔

جاہلیت جس کی بنیاد انسانی حاکمیت پر رکھی گئی ہے ----- جو جمہوریہ یا ڈکٹیٹر کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ لوگوں کے لئے قانون بنائے ----- ظاہر ہے کہ جاہلیت کی یہ شکل ایک طرف کائنات کی فطرت سے باہر نکلی جارہی ہے اور دوسری طرف انسانی زندگی کے اختیاری اور غیر اختیاری دائروں میں تصادم برپا کر دیتی ہے۔

اس جاہلیت کا ہر اک پیغمبر نے مقابلہ کیا ہے اور انسانی تاریخ کے ہر دور میں لوگوں کو صرف اللہ وحدہ' لاشریک کی اطاعت کی دعوت دی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس جاہلیت کا مقابلہ کیا ہے۔ جاہلیت کی یہ شکل صرف نظریہ کی شکل میں موجود نہیں تھی بلکہ بسااوقات اس کے لئے کوئی مرتب دستوری ہیئت بھی نہیں رہی ہے۔

یہ جاہلیت "اجتماعی تحریک" کی شکل میں موجود رہی ہے۔ ایک منظم سوسائٹی میں اس کا مظاہرہ ہوتا رہا ہے۔ یہ اجتماعی تحریک اس سوسائٹی کی فراہم کردہ قیادت کے تابع فرمان رہی ہے۔ یہ تحریک جاہلی سوسائٹی کے افکار' اقدار' مطلوبات حیات' رسوم اور عادات پوری طرح اپنالیتی ہے۔ پھر یہ جاہلی سوسائٹی شیرازہ بند سوسائٹی رہی ہے۔ اس کے افراد میں عملی اشتراک' مل کر پروگرام کی تکمیل کرنا' نظم' باہمی قرب کا احساس اور آپس کا ایسا تعاون رہا ہے جو کسی پارٹی کے ارکان میں ہوا کرتا ہے۔

افراد کی یہ شیرازہ بندی اس جاہلی سوسائٹی کو شعوری یا غیر شعوری طور پر متحرک رکھتی رہی ہے تاکہ سوسائٹی اپنا تحفظ کر سکے اور اپنی ذات کے دفاع کا انتظام کر سکے اور اپنے وجود کے خلاف خطرات کی ان تمام بنیادوں کو ملیامیٹ کر سکے جو اسے کسی بھی صورت میں چیلنج کر رہی ہیں۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ جاہلیت محض ایک عقیدے اور نظریہ کی شکل میں ظاہر نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک معاشرے اور اجتماعی تحریک کی شکل میں آتی ہے' تو اس سے یہ بات از خود واضح ہو جاتی ہے کہ اس جاہلیت سے لوگوں کو دوبارہ اسلامی نظام حیات اور اللہ کی بندگی میں داخل کرنے کا کام محض نظریہ کی شکل میں ہرگز نہ ہو سکے گا اور نہ اس صورت میں کسی درجے میں یہ مفید ہو سکتا ہے کیونکہ اس شکل میں دعوت اسلامی کا نظریہ محض جاہلیت کے قائم شدہ نظام حیات کی برابری بھی نہ کر سکے گا۔ جس کے پیچھے ایک فعال معاشرہ ہو گا۔ چہ جائیکہ اسلامی نظریہ حیات جاہلیت پر غالب آ جائے اور اپنے آپ کو اس سے برتر ثابت کرے کیونکہ ایک قائم اور پرشوکت وجود کو گرانے اور اس کی جگہ ایک نئے وجود کو کھڑا کرنے کے لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ دوسرا وجود غالب ہو اور یہ نیا نظام حیات اپنے مزاج' اپنے طریق کار' اپنی ہستی اور اس کی جزئیات تک میں اس جاہلیت قائمہ سے بنیادی اختلاف رکھتا ہو' نیز یہ قائم ہونے والا نظام حیات ایک جاندار اور متحرک اور پرشوکت معاشرے کی شکل میں قائم ہو اور اس کے اساسی نظریات اور تفصیلی نظم کی بنیاد نہایت ہی ٹھوس اصولوں پر ہو اور اس کے ساتھ ساتھ یہ نظام اپنے روابط تعلقات اور ربط و ضبط اور تنظیم میں بھی اس جاہلی نظام حیات سے زیادہ مضبوط ہو۔

یہاں آکر یہ سوال سامنے آ جاتا ہے کہ وہ فکری اور نظریاتی اساس کیا ہے۔ جس پر تمام ادوار میں اسلامی نظام

حیات کی عمارت تعمیر ہوتی رہی ہے؟ یہ ہے لا الہ الا اللہ یعنی اس بات کی گواہی کہ اللہ تعالیٰ اپنی الوہیت ' قیومیت ' بادشاہی اور حاکمیت میں وحدہ' لا شریک ہے۔ انسان اپنے عقیدے اور ضمیر میں اسے ایک سمجھے۔ صرف اسی کی عبادت بجا لائے اور عملی زندگی میں صرف اسی کے قانون کی اطاعت کرے۔ یہ شہادت جب تک اس مفہوم میں نہ ہو شرعاً" وہ غیر موجود تصور ہوگی۔ اس کا شرعی وجود اس بات پر موقوف ہے کہ اس کا عملی میدان میں بھی ایک خارجی وجود ہو جس کی بنا پر فیصلہ کیا جاسکتا ہو کہ شہادت دینے والا مسلم ہے یا غیر مسلم ہے۔

اور اس نظریہ کے وجود میں آنے کے معنی یہ ہیں کہ لوگ اپنی پوری زندگی میں اللہ کی جانب لوٹ جائیں۔ زندگی کے ہر معاملے اور ہر شعبے میں صرف خدا کے فیصلے کو تسلیم کریں اور از خود فیصلہ نہ کریں بلکہ ہر معاملہ میں خدا کے حکم کی طرف رجوع کریں ' اس کی اطاعت کریں اور یہ ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو معلوم کرنے کے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کریں۔ آپ ؐ ہی نے اللہ تعالیٰ کا حکم ہم تک پہنچایا اور آپ ؐ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ہیں۔ اسلام کے رکن اول کے دو اجزاء میں سے یہ دوسرا جزو ہے جو اس اقرار سے وجود پذیر ہو جاتا ہے۔ یہ اسلام کا وہ بنیادی نظام عقیدہ ہے جس سے اسلامی نظام حیات تشکیل پاتا ہے۔ اس بنیادی عقیدہ کو جب پوری زندگی پر منطبق کیا جاتا ہے تو اس سے ایک مفصل نظام حیات جنم لیتا ہے۔ جسے اپنا کر ایک مسلمان آدمی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو حل کر لیتا ہے۔ ملک کے داخلی مسائل بھی اس سے حل ہو جاتے ہیں اور خارجی مسائل بھی اسے معلوم ہو جاتے ہیں کہ اس مسلم سوسائٹی سے کس قسم کا تعلق رکھنا ہے اور غیر مسلم سوسائٹیوں سے اس کے روابط کی نوعیت کیا ہونی چاہئے۔

جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں۔ اسلامی نظام حیات کو یہ مطلوب نہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو نظریہ محض کی شکل میں پیش کرے اور صورت یہ ہو کہ لوگوں میں سے جس کی مرضی ہو ' اس کو قبول کرے۔ چند مراسم عبادت بجا لائے اور اس کے بعد اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے جاہلی اور غالب معاشرے میں ضم ہو کر جاہلیت کے زیر سایہ زندگی بسر کرے۔ اس لئے کہ ایسے حالات میں مسلمان اگر ایک عظیم تعداد میں بھی ہوں تو بھی وہ اسلامی نظام حیات کو بالفعل اور عملاً قائم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ایسے افراد جو اسلامی نظام حیات پر ایمان بھی لا چکے ہوں اور اس کے بعد ایک جاہلی معاشرے کا جزو بھی بن رہے ہیں وہ شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر طوعاً" وکرھا" اپنے آپ کو اس جاہلی معاشرے کے مقاصد بروئے کار لانے میں مجبور پائیں گے اور ان کی زندگی کی ہر تگ و دو دراصل اس جاہلی معاشرے کے اساسی تقاضے پورے کر رہی ہوگی ' جو اس کے وجود کے لئے ضروری ہوں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ایسے لوگ اس جاہلی معاشرے کے وجود کے لئے خطرناک ہوں گے۔ کیونکہ ایک اجتماع نظام اپنے تمام اجزاء کو ہمیشہ اپنے دفاع میں لگائے رکھتا ہے۔ خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں ' دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایسے افراد اسلامی نظریہ حیات پر ایمان رکھنے اور جاہلی نظام حیات کا دشمن ہونے کے باوجود اس جاہلی معاشرے کی تعمیر اور خدمت میں مصروف ہوں گے اور ہر وقت اسے تقویت پہنچاتے رہیں گے۔ چلتی پھرتی زندہ لاشوں کی طرح یہ جاہلی معاشرے کی بقا اور دوام کے لئے اپنے وسائل صرف کریں گے۔ ان کی قابلیتیں ' ان کے تجربات اور ان کی چستی اس جاہلی معاشرے کے زندہ اور مضبوط بنانے میں صرف ہوگی حالانکہ ان کی ساری تگ و دو اسی امر کے لئے ہونی چاہئے کہ جاہلی معاشرہ کو توڑ کر اسلامی سوسائٹی کو برپا کیا جائے۔

اس لئے یہ نہایت ہی ضروری ہے کہ اسلام کا بنیادی عقیدہ پہلے ہی مرحلہ میں ایک ایسی اجتماعی تحریک کی شکل میں نمودار ہونا چاہئے جو اس جاہلی تحریک سے الگ اور مستقل بالذات ہو۔ جسے اسلام مٹانے کے لئے آیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اس اجتماعی تحریک کا محور ایسی قیادت ہو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو' جس کا نصب العین یہ ہو کہ وہ لوگوں کو اللہ وحدہ لاشریک کی الوہیت' ربوبیت' قوامیت حاکمیت اور اس کے غلبہ و اقتدار اور شریعت کی طرف دعوت دے۔

اور جو شخص بھی پورے شعور کے ساتھ کلمہ شہادت ادا کر کے اس تحریک میں شامل ہو' وہ اس جاہلی سوسائٹی سے ربط و تعلق کو کاٹ کر الگ ہو جائے ---- یہ وہی جاہلی سوسائٹی ہے جس سے کٹ کر وہ یہاں آیا ہے ----- اسی طرح اسے جاہلی سوسائٹی کی قیادت سے بھی الگ ہونا پڑے گا ---- یہ جاہلی قیادت مذہبی شکل میں بھی ہوتی ہے' یہ کاہن ہیں' پجاری ہیں اور مجاور ہیں۔ جادوگر اور قیافہ شناس ہیں اور یہ جاہلی قیادت سیاسی' قبائلی اور معاشی رنگ میں بھی ہوتی ہے۔ اسلام کے عہد اول میں دونوں طرح کی یہ قیادت قریش کی جاہلی سوسائٹی میں موجود تھی' اسے اس جاہلی قیادت سے الگ ہونا پڑے گا اور اسے اپنی وفاداری اسلامی تحریک اور اس کے قائدین تک محدود رکھنی پڑے گی۔

بنیادی عقیدہ اجتماعی تحریک کی شکل میں پہلے ہی مرحلہ میں نمودار ہو جانا چاہئے۔ جب کہ ایک مسلمان آدمی شعور کے ساتھ از سر نو اپنے ایمان کو تازہ کرتے ہوئے "شہادتیں" ادا کرے کیونکہ مسلم سوسائٹی کا وجود خارجی اس کے بغیر متحقق ہی نہیں ہو سکتا' اس بنیادی عقیدہ کا محض دلوں میں راسخ ہو جانے سے ہی مسلم سوسائٹی وجود میں نہیں آ جاتی۔ چاہے اس کے افراد کی تعداد کتنی زیادہ ہی کیوں نہ ہو جب تک کہ یہ افراد اجتماعی تحریک کی شکل میں منظم ہو کر باہمی تعاون کے ساتھ کام نہ کریں۔ یہ اجتماعی تحریک اپنے ذاتی وجود کے ساتھ مستقل طور پر قائم نہ ہو۔ اس کے ممبر تحریک کے ارکان کی حیثیت سے اپنا اجتماعی فریضہ انجام نہ دیں۔ جس طرح کہ ایک زندہ جسم کے اعضاء اپنا تکوینی وظیفہ عمل ادا کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ارکان مسلم سوسائٹی اپنے وجود کو برقرار رکھنے' اس کی جڑوں کو اور گہرا کرنے اور اسے مزید وسعت دینے کا کام کریں۔ نیز انہیں ان عوامل کے مقابلہ میں اپنا دفاع بھی کرنا ہو گا' جو اس سوسائٹی کو ملیامیٹ کرنے کے درپے ہیں اور یہ سارا کارنامہ انہیں جاہلی قیادت کے مقابلہ میں اپنی مستقل قیادت کی راہنمائی میں انجام دینا ہو گا جو انہیں منظم اور متحرک رکھے گی اور انہیں اپنے وجود کو برقرار رکھنے تحریک کی جڑوں کو اور گہرا کرنے اسے اور وسیع کرنے کی طرف متوجہ کرے گی اور اس طرح جاہلی تحریکات مقابلہ میں کھڑا کرے گی۔

اسلام اسی طرح وجود میں آیا کہ لوگوں کے سامنے پہلے ایک مجمل مگر جامع اصول اور نظریہ حیات رکھا گیا اور پھر ایک تحریک اٹھی اور ایک نئے معاشرے کی بنیاد پڑ گئی اور یہ نیا معاشرہ نہ صرف یہ کہ اس جاہلی معاشرے سے مختلف تھا بلکہ اس کے وجود کے لئے چیلنج بن گیا اور اس کے بالمقابل آ کھڑا ہوا۔ کسی دور میں بھی اسلام ایک مجرد نظریہ کی شکل میں نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ ایک فعال تحریک کی شکل میں آیا اور آئندہ بھی اس کا احیاء ہو سکتا ہے تو وہ صرف اس صورت ہی میں ہو سکتا ہے کہ اس کی پشت پر ایک فعال تحریک ہو اور یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ ایک غالب جاہلی معاشرہ کے زیر سایہ اسلامی معاشرہ کا از سر نو احیاء ہو سکے۔ محض نظریاتی بنیاد پر اسلام کا احیاء کسی وقت اور کسی جگہ بھی ممکن نہیں جب تک کہ اس کی پشت پر عملاً تحریک موجود نہ ہو۔

جب ہم یہ سمجھ گئے کہ اس دین کا فطری ارتقاء یوں ہوتا ہے اور اس کا یہ فلسفہ ہے تو ہم اس وقت اس دین کی حقیقت اور اس کے تحریکی مزاج کو سمجھ سکیں گے۔ جب ہم نے اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ لیا جس کی پوری تفصیلات ہم نے سورت انفال کے مقدمے میں دے دی ہیں۔ نیز صرف اس پس منظر ہی کے نتیجے میں ہم ان آیات کی حقیقت اور ان احکام کے مفہوم کو سمجھ سکیں گے جو اس سورت کے خاتمے پر دیئے گئے ہیں۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی معاشرے کی تنظیم کیا ہوگی؟ مہاجرین اور انصار کے تعلقات کیا ہوں گے؟ ان کی طبقاتی حیثیت کیا ہوگی؟ مقامی معاذین اور انصار کے تعلقات مہاجرین کے ساتھ کیا ہوں گے۔ نیز ان لوگوں کے ساتھ ان دونوں کے تعلقات کیسے ہوں گے جنہوں نے اس مرحلے پر ہجرت نہیں کی اور دوسرے کفار کے ساتھ اس اسلامی معاشرے کے بین الاقوامی تعلقات کیا ہوں گے؟ اور یہ تمام تدبر اور ادراک اس دین کے عضویاتی تشخص اور اس کے تحریکی ارتقاء کے تصورات کے رنگ میں ضروری ہو گا۔

اب ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ ہم ان اصولوں کی روشنی میں ان آیات پر تفصیلی بحث کر سکیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۷۲) وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ (۷۳) (۸:۷۲ — ۷۳) ) ”جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے‘ اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی‘ وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) آ نہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آ جائیں۔ ہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے‘ لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو‘ اللہ اسے دیکھتا ہے جو لوگ منکر حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہو گا۔“

مکہ مکرمہ میں جو شخص کلمہ شہادت پڑھ لیتا تھا‘ وہ اپنے خاندان‘ اپنے قبیلے‘ اپنے رشتہ داروں اور دور جاہلیت کی قیادت سے اپنے تعلقات ولایت توڑ دیتا تھا۔ اور اپنی ولایت اور قیادت کی زمام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دے دیتا تھا۔ اور وہ اس معاشرے اور خاندان کا فرد بن جاتا تھا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اٹھ رہا تھا اور قریش کا معاشرہ اپنے ذاتی قائم جاہلی وجود کی مدافعت کر رہا تھا کیونکہ یہ نیا معاشرہ درحقیقت سابق قائم معاشرے کے

خلاف بغاوت کر رہا تھا اور یہ کشمکش ان دونوں معاشروں کے درمیان جنگ بدر کے میدانی معرکے سے بہت پہلے برپا تھی اور قریش کا معاشرہ یہ چاہتا تھا کہ اس جدید معاشرے کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکے۔

ان حالات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جدید معاشرے کے افراد کے درمیان مواخات قائم فرمائی۔ اس طرح کہ قریش کے جاہلی معاشرے سے جو جو افراد ٹوٹ کر آئے تھے' وہ اس جدید باہم متکافل (Secure) معاشرے کے فرد بنتے چلے جاتے تھے اور یہ نیا معاشرہ خون اور نسب کے رشتوں کے بجائے نظریات و عقائد کے رشتوں پر قائم تھا۔ اور لوگوں کی وفاداریاں اس جدید قیادت کے ساتھ وابستہ ہوتی چلی جاتی تھیں اور قدیم جاہلی قیادت سے کٹتی چلی جاتی تھیں۔ نیز ان کی محبت اس قدیم جاہلی معاشرے سے کٹ کر اس جدید اسلامی معاشرے سے وابستہ ہو جاتی تھی۔

اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے دارالہجرت (مدینہ) کے دروازے کھول دیئے۔ مدینہ میں اہل ایمان کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جس نے اسلامی قیادت کے ہاتھ پہ غیر مشروط بیعت کر لی اور خوشی اور ناخوشی ہر حالت میں سمع و اطاعت کا عہد کر لیا اور یہ ذمہ لے لیا کہ وہ ہر حالت میں رسول اللہ کی حفاظت و حمایت کریں گے' جس طرح وہ اپنے اموال' اولاد اور اپنی عورتوں کی حفاظت کرتے ہیں اور پھر مدینہ میں رسول اللہ کی قیادت میں اسلامی مملکت قائم ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار مہاجرین کے درمیان دوبارہ مواخات قائم کی اور یہ مواخات بھی خون اور نسب کے رشتوں کے مقابلے میں اسلامی تصورات پر قائم ہوئی۔ اس مواخات میں بھی سابقہ مواخات کے پورے تقاضے ملحوظ رکھے گئے تھے یعنی وراثت دیت اور دوسرے معاوضوں میں اس کے افراد ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے بعینہ اسی طرح جس طرح خون اور نسب کے رشتوں کے تحت سابقہ نظام میں مواخات قائم تھی۔ اس سلسلے میں حکم یہ تھا:

"جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی' وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔"

یہ لوگ ایک دوسرے کی نصرت میں بھی ولی ہیں' ایک دوسرے کی میراث میں بھی ولی ہیں' دیت معاوضے اور تمام اجتماعی ادائیگیوں میں بھی ایک دوسرے کے ولی ہیں جو سابقہ ادوار میں خون اور نسب کے رابطے پر عائد ہوتی تھیں۔

ایک قسم کے لوگ وہ تھے جو دین اسلام میں تو داخل ہو گئے تھے لیکن وہ عملاً ہجرت کر کے اسلامی معاشرے میں داخل نہ ہوتے تھے۔ یعنی انہوں نے مدینہ کی اسلامی ریاست کی طرف ہجرت نہ کی جہاں اسلامی شریعت نافذ تھی۔ جہاں اسلامی قیادت کا انتظام و انصرام تھا۔ اور وہ اس معاشرے کی طرف نہ آئے جہاں شرعی قوانین حکمران تھے۔ اور جس میں مکمل اسلامی تشخص اور وجود قائم تھا۔ جبکہ مکہ میں اس معاشرے کا وجود نسبتاً کم درجے میں قائم تھا یعنی وہاں بھی لوگ جدید قیادت کے وفادار تھے اور ایک اجتماعی تحریکی شکل میں وہ یکجا ہو گئے تھے اور اپنا ایک مستقل وجود رکھتے تھے جو اس وقت کے قائم جاہلی وجود سے کٹ گئے تھے اور اپنے اس نئے وجود کے ساتھ پورے جاہلی معاشرے کا مقابلہ کر رہے تھے۔

غرض ایسے لوگ مکہ کے اردگرد بھی موجود تھے اور مدینہ کے اردگرد بھی موجود تھے۔ جنہوں نے عقیدہ قبول کر لیا تھا لیکن وہ جاہلی معاشرے سے کٹ کر اسلامی معاشرے میں داخل نہ ہوئے تھے۔ اور وہ پوری طرح مدینہ میں قائم اسلامی حکومت اور قیادت کے ماتحت نہ تھے اور نہ وہ اس کے تابع تھے۔

یہ لوگ اسلامی معاشرے کے ممبر تصور نہ ہوتے تھے' اس لئے اللہ نے ان کو اسلامی معاشرے کی ولایت کے حقوق

نہ دیجئے ' کیونکہ یہ لوگ عملاً اسلامی معاشرے کے افراد نہ تھے اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ حکم نازل ہوا :

"رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے ( دار الاسلام میں ) آنہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں ۔ہاں اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے ' لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو ۔"

یہ حکم جیسا کہ ہم نے کہا ' اس دین کے مزاج کے ساتھ اور اس کی عملی تحریکی سرگرمیوں کے ساتھ منطقی ربط رکھتا ہے کیونکہ یہ لوگ دراصل اسلام کے عملی معاشرے کے اجزاء نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اور اسلامی معاشرے کے درمیان ولایت کا تعلق قائم نہیں ہو سکتا ۔ہاں ایسے لوگوں کے ساتھ چونکہ عقائد و نظریات کا رابطہ موجود ہے لیکن محض نظریاتی رابطے کے نتیجے میں ان لوگوں کی ذمہ داری اسلامی معاشرے پر عائد نہیں ہوتی ۔الا یہ کہ ان کے دین اور نظریہ پر کوئی دست درازی ہو رہی ہو مثلاً ان پر ان کے نظریات کی وجہ سے تشدد ہوتا ہو ۔ایسے حالات میں اگر وہ مسلمانوں سے امداد طلب کریں تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ ان کو امداد دیں ۔بشرطیکہ اس امداد کا اثر اس معاہدے پر نہ پڑتا ہو جو اسلامی معاشرے نے کسی دوسری قوم کے ساتھ کیا ہو ۔اگرچہ یہ معاہدہ کرنے والی حکومت ہی یہ تشدد کر رہی ہو ۔اس لئے کہ اصل اہمیت اسلامی معاشرے اور اس کے معاہدات کی ہے ' افراد کی نہیں ہے ۔کیونکہ معاہدات سے اسلامی معاشرے کے تحریکی منصوبے متاثر ہوتے ہیں ' اس لئے معاہدوں کو افراد کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی گئی ہے ۔اگرچہ معاملہ نظریات کی اساس پر تشدد سے ہو لیکن چونکہ تشدد کا شکار ہونے والے مسلمان خود اپنی مرضی سے اسلامی دار الحرکت کی طرف نہیں آئے اس لئے ان پر شاید ظالم کو ترجیح دی گئی ۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں اجتماعی تحریکی مفادات کو افراد کے مقابلے میں کس قدر زیادہ اہمیت حاصل ہے ' کیونکہ اسلام کا اجتماعی وجود زیادہ اہمیت رکھتا ہے ' بمقابلہ ایک فرد اور اس کے مفادات کے ۔

اس پوری اسکیم پر تبصرہ آتا ہے وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ( ۸ ۷۲ ) "وہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے ) لہٰذا تمہارا پورا عمل اس کی نظروں میں ہے ۔وہ ان اعمال کی ظاہری صورت اور باطنی مقاصد سے اچھی طرح باخبر ہے ۔ان کے مقدمات اور ان کے نتائج سب کو جانتا ہے ۔ان کے اسباب اور ان کے آثار کو بھی اچھی طرح سمجھتا ہے ۔

جس طرح اسلامی معاشرہ باہم متوازن ' متکافل اور معاون اور ذمہ دار ہوتا ہے ' اسی طرح جاہلی معاشرہ بھی اپنے افراد کو سوشل سیکورٹی فراہم کرتا ہے ۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ( ۸ ۷۳ ) "اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ ایک دوسرے کے ولی ہیں ۔" جیسا کہ اوپر ہم نے تشریح کی ' دو محاذوں کی پوزیشن ایسی ہی ہے ۔ جاہلی معاشرہ بھی فرداً فرداً نہیں چلتا ۔وہ بھی ایک عضویاتی تشخص کا حامل ہوتا ہے ۔اس کے اعضاء جوارح اسی طرح کام کرتے ہیں جس طرح افراد کرتے ہیں اور وہ بھی اپنے ذاتی تشخص کا دفاع اسی طرح کرتا ہے جس طرح اسلامی معاشرہ کرتا ہے ' لہٰذا کفار ایک دوسرے کے دوست اور ولی ہیں ۔اور اسلام بھی اہل کفر کے مقابلے میں اپنے آپ کو ایک محاذ تصور کرتا ہے اور اسلام بھی ان کے معاشرے کے مقابلے میں اپنے آپ کو ایک معاشرے کی شکل میں پیش کرتا ہے لیکن اسلامی معاشرہ کفر کے مقابلے میں زیادہ گہری ' مضبوط اور قوی اساس پر قائم ہوتا ہے ۔ اگر اسلامی معاشرہ کفار کے مقابلے میں ایک ایسا ہی اجتماعی معاشرہ کھڑا کر کے نہ لائے گا تو جاہلی معاشرے کی طرف سے اسے ہر وقت فتنہ و فساد کا خطرہ درپیش رہے گا کیونکہ

انفرادی طور پر مسلمان جاہلیت کے مضبوط اور باہم پیوستہ اجتماعی معاشرے کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اور دنیا میں ایک عظیم فتنہ و فساد برپا ہو جائے گا کیونکہ جاہلیت کا معاشرہ اسلام پر غالب آ جائے گا اور اس صورت میں جاہلیت اسلام پر دست درازی اور سرکشی کرے گی اور بندوں کی خدائی اللہ تعالیٰ کی خدائی پر غالب آ جائے گی۔ اور لوگ پھر سے انسانوں کی غلامی میں چلے جائیں گے۔ ظاہر ہے اس سے بڑا فساد اور کیا ہو سکتا ہے؟

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ (۸: ۷۳) "اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ و فساد برپا ہو گا۔" اس تنبیہ کے بعد اور کیا تنبیہ ہو گی اور اس ڈراوے کے بعد اور کیا ڈراوا ہو گا۔ وہ مسلمان جو اپنے اجتماعی وجود کی اساس اس قسم کے عضویاتی اور تحریکی اتحاد پر نہیں رکھتے جس کے افراد کے درمیان گہری اخوت ہو اور جس کی ایک قیادت ہو' وہ اللہ کے سامنے اس عظیم فساد کے ذمہ دار ہوں گے جو ان کے اجتماعی وجود کو لاحق ہو گا اور قیامت کے دن تو بہرحال تمام ذمہ داریاں ان پر ہوں گی کیونکہ اگر مسلمان ایسا نہ کریں گے تو ان کا معاشرہ فساد کا شکار ہو گا۔

اس کے بعد قرآن کریم صریح الفاظ میں ان کو بتاتا ہے کہ حقیقی ایمان کا تحقق یوں ہوتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۸: ۷۴) "جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی' وہی سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے۔" وہی سچے مومن ہیں' بلکہ وہی مومن ہیں' کے الفاظ پر غور کریں۔ گویا ایمان کی حقیقی صورت یہی ہے۔ اور اسی صورت میں اور اسی شکل میں حقیقی دین نشو و نما پاتا ہے۔ دین اسلام کی حقیقت محض اعلان نظریہ سے وجود میں نہیں آتی۔ نہ مجرد عقیدے کو قبول کر لینے سے دین کی حقیقت وجود میں آ جاتی ہے' نہ صرف دین کے شعائر اور مراسم عبودیت کے بجا لانے ہی سے دین وجود میں آ جاتا ہے۔ یہ دین ایک ایسا نظام حیات ہے اور وہ عملاً تب ہی وجود میں آتا ہے کہ جب وہ اجتماعی تحریکی معاشرے کی شکل میں وجود میں آئے۔ صرف عقیدے کی صورت میں اقرار سے حکماً" تو دین وجود میں آ جاتا ہے لیکن حقیقتاً وجود میں نہیں آتا۔ حقیقتاً تب وجود میں آتا ہے جب وہ ایک عملی تحریکی معاشرے اور اجتماعیت کی شکل اختیار کرے۔

ایسے ہی لوگ حقا مومن ہیں اور ان کے لئے مغفرت اور رزق کریم واجب ہے۔ یہاں رزق کریم کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ یہاں جہاد فی سبیل اللہ' انفاق فی سبیل اللہ' پناہ گاہ کی فراہمی اور امداد کی فراہمی اور دوسری مشکلات کا موضوع چل رہا ہے اور ان سب کاموں کے اوپر اجر و صلہ اللہ کی مغفرت ہے جو عظیم انعام اور مہمان نوازی ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ اگرچہ مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین کا درجہ بلند ہے' لیکن بعد میں آنے والے لوگ بھی انہی کے ساتھ اور ان کے حکم میں شامل ہیں اور یہ بعد میں آنے والے بھی ولایت اور اسلامی تحریکی معاشرے کی ممبری کے مستحق ہیں۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا مِن بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنكُمْ (۸: ۷۵) ع

"اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کر کے آگئے اور تمہارے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے لگے وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں۔" ہجرت کا یہ نظام اس وقت تک قائم رہا جب تک مکہ فتح نہ ہو چکا۔ فتح مکہ کے بعد عرب کی سرزمین اسلامی قیادت کے زیر نگیں آگئی۔ اور لوگ سب کے سب اسلامی معاشرے میں منظم ہو گئے۔ لیکن فتح مکہ کے بعد ہجرت کا یہ حکم ختم کر دیا گیا اور جہاد کو جاری رکھا گیا۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ پوزیشن ۱۲ سو سال تک قائم رہی۔ اور اسلام اس کرۂ ارض پر حکمران رہا۔ اسلامی نظام قانون نافذ رہا اور اسلامی قیادت حاکم اور حکمران رہی۔ لیکن آج اس پوری دنیا پر جاہلیت پھر سے غالب اور حکمران ہو گئی ہے اور اس وقت کرۂ ارض کے کسی خطے میں بھی لوگوں کی زندگیوں پر اللہ کی شریعت نافذ نہیں بلکہ اقتدار اور قانونی نظام پوری دنیا میں طاغوت کا چل رہا ہے۔ لوگ اپنے جیسے انسانوں کی غلامی میں داخل ہو گئے ہیں جبکہ اسلام نے ان کو انسانوں کی غلامی سے نکال دیا تھا۔ لہٰذا اب تحریک اسلامی دوبارہ انہی ادوار سے گزرے گی جس طرح پہلے وہ گزری تھی۔ اس نے تنظیم شروع کی تھی' مرحلہ وار تحریک آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ دارالہجرت قائم ہو گا اور پھر وہ دارالاسلام اور دارالہجرت سے پھیلاؤ شروع کرے گی اور پھر ہجرت ختم ہو گی مگر جہاد جاری رہے گا جس طرح پہلی بار میں ہوا۔

پہلی بار جب تحریک اسلامی برپا ہوئی تو اس تحریکی عمل کے لئے کچھ مخصوص احکام تھے۔ اس تحریک پر مخصوص حالات کی وجہ سے کچھ مخصوص ذمہ داریاں تھیں۔ اس وقت اخوت اور برادری کے تعلقات کو خون اور نسب کی بنیادوں سے ہٹا کر اسلامی نظریات کی اساس پر رکھ دیا گیا تھا۔ مواخات کی تمام شکلوں' تمام ذمہ داریوں یعنی برائے اجتماعی تکافل دیت اور دوسرے معاہدات تاوان کو اسلامی اخوت پر قائم کر دیا گیا تھا لیکن جب اسلامی معاشرہ قائم ہو گیا۔ اور جنگ بدر میں مسلمانوں کو غلبہ نصیب ہو گیا تو بعض عبوری احکامات میں تبدیلی کر دی گئی کیونکہ یہ عبوری احکامات وقتی اور استثنائی حالات کے لئے تھے۔ اور ان میں سے اہم تبدیلیاں یہ تھیں کہ اجتماعی کفالت' دیت کی ادائیگی اور وراثت کے تعلقات کو لوٹا کر قرابت اور رشتہ داری کی بنیادوں پر قائم کر دیا لیکن اسلامی معاشرے کے اندر اور اسلامی خطوط کے اوپر۔

وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ (۸: ۷۵) ع "مگر اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔" لہٰذا اسلام کے عملاً قیام کے بعد' اسلام کے دائرے کے اندر اقربا کو اہمیت دی جا سکتی ہے۔ یہ انسان کی فطری خواہش کا ایک پہلو ہے۔ اور اسلام اس بات پر پابندی عائد نہیں کرتا کہ انسان کی فطری خواہشات کو دبایا جائے بشرطیکہ انسان کے یہ فطری میلانات معاشرے کے اسلامی اور اجتماعی پہلو کو نقصان نہ پہنچاتے ہوں اور اسی طرح کے دوسرے فطری احساس و شعور کے لئے مضر نہ ہوں۔ اسلام فطری میلانات کو توڑتا نہیں بلکہ ان کو منضبط کرتا ہے اور منضبط اس طرح کرتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے اعلیٰ وجود کے لئے وہ مفید بن جائیں۔ وہ ان کو منضبط بھی اسلامی معاشرے کے اجتماعی وجود کے لئے کرتا ہے۔ اگر اسلامی معاشرے کے اجتماعی وجود کی ضروریات نہ ہوں تو پھر اسلام انسان کے فطری میلانات کو آزاد چھوڑتا ہے۔ اسلامی نظام کے عمومی [illegible] کے اندر۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں بعض احکامات عارضی اور عبوری ہوتے ہیں اور یہ اسلام کے تحریکی عمل [illegible] ہوتے ہیں۔

ایسے احکام کو اسلام کے فائنل قانونی احکام تصور نہیں کیا جاتا جو اسلامی معاشرے کے قیام' جاری اور غالب وجود کو جاری رکھنے کے لئے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ان احکام کو جو اسلام کے ابتدائی قیام کے مرحلے میں وارد ہوئے اور اس کے ان فائنل احکام کے درمیان فرق کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے جو قائم معاشرے کو دائم رکھنے کے لئے دیئے گئے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۸: ۷۵) ع "یقیناً اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔" یہ تبصرہ اور تعقیب ان احکام کے آخر میں نہایت ہی موزوں ہے کہ یہ مختلف احکام اور انتظامی ہدایات اللہ کی طرف سے ہیں اور اللہ نہایت ہی وسیع علم کا مالک ہے۔ وہ ہر حکم علم سے دیتا ہے۔ یہاں ضروری ہے کہ اس قسم کے اسلامی معاشرے کے قیام و نظام پر ایک نوٹ دے دیا جائے۔

اسلام' امت مسلمہ کو' بنیادی عقیدہ دے کر اپنے مخصوص طریق کار کے تحت' اجتماعی تحریک کے ذریعہ اسے خارجی وجود بخش کر اور اس اجتماعی تحریک کے لئے بنیادی عقیدہ کو اساس بناکر اس لئے برپا کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ انسان کی انسانیت کو نمودار کر دے۔ اسلام اپنے مخصوص طریق کار کے تحت اپنے بنیادی نظریات کو نمودار کر دے۔ اسلام اپنے مخصوص طریق کار کے تحت اپنے بنیادی نظریات اپنی تعلیمات اور اپنے شرائع اور احکام میں انسانیت کی اسی نشوونما کو اصل ہدف بنائے ہوئے ہیں۔

چونکہ انسان تمام حیوانات بلکہ جمادات کے ساتھ بھی وجود میں اشتراک رکھتا ہے۔ اس لئے سائنٹیفک جہالت کے علمبردار کبھی کہتے ہیں کہ انسان ایک حیوان ہی تو ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ اس کا وجود محض ایک مادی وجود ہے لیکن یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ حیوانات اور مادہ کے ساتھ وجود میں اشتراک کے باوجود انسان ایسی خصوصیات کا حامل ہے جو اسے عام مادیات اور حیوانات سے ممتاز کرتی ہیں اور اسے ایک منفرد وجود بخشتی ہیں۔ اب آکر کہیں اس سائنٹیفک جہالت کے علمبرداروں کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا ہے اور وہ واقعاتی حقائق اور مشاہدوں اور تجربوں نے ان کی گردن غرور کو توڑ دیا ہے اور اب وہ بے بس ہو کر اس بات پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اخلاص اور تصریح کے بغیر اشاروں اشاروں میں اس حقیقت کا اعتراف کریں۔

جن لوگوں نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ غیر جانبداری سے کیا ہے اور پھر پوری تاریخ انسانی پر بھی ان کی نظر ہے' وہ جانتے ہیں کہ اسلامی نظام حیات اور اس کے قیام کے طریق کار کے نتائج کس قدر شاندار رہے ہیں۔ اسلام نے جدید معاشرے کی تعمیر' رنگ' وطن' قومیت' ملکی مصالح اور علاقائی تعلقات جیسے کمزور رشتوں کے بجائے صرف ایمان و نظریات اور عقائد و تصورات پر کی ہے اور اس نقطہ نظر سے اس نے انسانی وجود کے حیوانی اور مادی پہلو کو نظرانداز کیا اور انسان کی انسانیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ اس کا پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ اسلامی سوسائٹی میں داخل ہونے کے دروازے ہر جنس اور ہر طبقہ کے انسانوں کے لئے کھل گئے اور اس طرح محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے اور حیوانی بندشوں اور باہمی امتیازات میں سے کوئی بندش اور امتیاز درمیان میں نہ رہا۔ اس طرح اسلامی معاشرے کی کٹھالی میں بشریت کے مختلف اجناس کی خصوصیات اور قابلیتیں انڈھیل دی گئیں اور کٹھالی میں ان تمام خصائص نے ایک حسین امتزاج کی شکل اختیار کی اور اس خام مواد سے ایک نیا وجود سامنے آیا۔ یہ سب کام ایک نہایت مختصر عرصہ میں ہوا اور

اس سے انسانوں کا ایک عجیب یک رنگ و ہم آہنگ گروہ تیار ہو گیا۔ جس نے ایک تابندہ اور عظیم الشان تہذیب کو جنم دیا۔ وہ تہذیب جو اپنے دور میں انسانیت کے استعدادی جوہر کا خلاصہ تھی' حالانکہ اس زمانہ میں آبادیوں کے درمیان بڑے بڑے فاصلے تھے اور مواصلات کا نظام نہ ہونے کے برابر تھا۔

اس اعلیٰ ترین معاشرے میں بیک وقت عربی' فارسی' شامی' مصری' مغربی' ترکی' چینی' ہندوستانی' رومی' یونانی' انڈونیشی اور افریقی اور بے شمار دوسری قوموں اور نسلوں کے لوگ شامل ہو کر اس میں ضم ہو گئے تھے۔ اسلامی تہذیب اور اسلامی معاشرہ کی نشوونما میں ان تمام لوگوں کی قابلیتیں اور ذہانتیں مل کر باہمی تعاون اور ہم آہنگی کے ساتھ مصروف عمل ہو گئیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ کسی وقت بھی یہ عظیم الشان تہذیب صرف عربی تہذیب نہیں رہی اور نہ ہی کبھی معروف معنوں میں قومی تہذیب رہی ہے بلکہ یہ ہمیشہ سے فکری تہذیب ہی رہی ہے۔

یہ سب لوگ اس تہذیب میں خالص مساوات کے اصولوں پر جمع ہوئے۔ باہمی مروت اور شفقت نے انہیں جوڑا' منزل مقصود کے اتحاد کی وجہ سے وہ باہم ملے اور اس مقصد اور نصب العین کے لئے انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کر ڈالا جو مساوات پر مبنی ان سب کا اپنا ہی معاشرہ تھا۔

انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کر ڈالا اور اپنے تمام قومی اور تاریخی خصائص کو ظاہر کیا اور اپنے ذاتی اور موروثی کمالات کو نئے معاشرے کی تعمیر و ترقی میں صرف کر ڈالا جو مساوات پر مبنی ان سب کا اپنا ہی معاشرہ تھا' مساوات و اتحاد کی بنیاد پر ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان سب کا رب حاکم مالک اور خالق ایک ہی ہے۔ اس عقیدہ کے پس منظر میں بلاروک ٹوک انسانیت ابھر آئی۔ وحدت الٰہ کا عقیدہ "وحدت انسان" کا عقیدہ رکھتی ہو۔

معاشرہ مشہور ترین معاشرہ رہا ہے لیکن اس میں بھی متعدد رنگ بے شمار زبانیں اور کئی قومیتیں نظر آتی ہیں اور ہر ایک کا مزاج اور طرز فکر مختلف ہے۔ اس کے باوجود اس معاشرے کی اساس انسانیت یا بلند تر نظریات پر نہیں رکھی گئی تھی بلکہ یہ ایک قسم کا طبقاتی گٹھ جوڑ تھا جس میں ایک طرف اشراف کا طبقہ تھا اور ایک طرف غلاموں اور کمزوروں کا گروہ تھا۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ روم امپائر میں فاتح اور مفتوح اقوام علیحدہ علیحدہ نظر آتی ہیں۔ رومن فاتح ہر لحاظ سے بزرگ و برتر ہیں اور مفتوح اقوام غلام اور زیردست ہیں۔ یہی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے رومی معاشرہ ان بلندیوں تک نہ پہنچ سکا جہاں تک اسلامی معاشرہ پہنچا اور نہ ہی اس نے انسانی تاریخ میں وہ کارنامے سرانجام دیئے جو صحت مند اسلامی معاشرہ کے شایان شان ہوتے ہیں۔ اس کے بعد بھی کئی معاشرے عالم وجود میں آئے مثلاً انگریزی تہذیب کا قائم کردہ جدید معاشرہ' یہ معاشرہ بھی دراصل رومی معاشرے کا جانشین اور وارث تھا اور عملی میدان میں آکر یہ بھی طبقاتی اور استحصالی معاشرہ ثابت ہوا اور اس کا اصل الاصول یہ رہا کہ انگریز قوم کو قیادت اور برتری کا مقام حاصل رہے۔ اس کا بین ثبوت ان نوآبادیوں کے معاشری اور معاشرتی جائزے سے ملتا ہے جو کسی وقت انگریزوں کے زیرنگیں رہے ہیں اور بعینہ یہی طرز عمل یورپ کی دوسری شہنشاہیتوں اور معاشروں کا رہا ہے۔ انہوں نے بھی اپنے نوآبادیوں کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ ہسپانوی' پرتگالی اور فرانسیسی معاشروں نے اپنی تمام کالونیوں میں وہاں کے اصل باشندوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا اور ان کے طرز عمل نے خود بتا دیا کہ یہ معاشرے کس قدر گھناؤنے' مہلک اور گرے ہوئے تھے۔

اس کے بعد ہمارے سامنے اشتراکی معاشرہ نمودار ہوتا ہے۔ اگرچہ اس نے اپنے اساسی اصولوں میں سے رنگ و

قوم و جنس اور زبان و وطن کو خارج کر دیا لیکن اس کی اساس بھی خالص انسانی بنیادوں پر نہ اٹھی بلکہ ان کی نئی طبقاتی کشمکش پر اٹھی۔ یہ معاشرہ بھی رومی طرز کا طبقاتی معاشرہ بن گیا۔ فرق صرف یہ ہوا کہ رومی معاشرہ اشراف (Lords) کی حمایت پر سامنے آیا اور اشتراکی معاشرہ مساکین (Labours) کی حمایت میں نمودار ہوا۔ اس کی تکنیک یہ تھی کہ مزدوروں کے دلوں میں تمام دوسرے طبقات کے خلاف نفرت کے بیج بو دیئے جائیں۔ چنانچہ خونی کشمکش کا ایک طویل دور شروع ہو گیا' اور اس میں انسانیت ایسے ایسے مصائب سے دوچار ہوئی جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی' کیونکہ اس کی بنیاد انسانیت کے بجائے خالص حیوانی زندگی پر تھی۔ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ جنسی تعلقات خوراک اور مسکن ہی انسانیت کے بڑے مسائل ہیں اور انہی کے حل میں انسانیت کی فلاح مضمر ہے۔ اسی طرح اشتراکیت نے تاریخ کا جدلی فلسفہ پیش کر کے اسے تاریخ تلاش معاش قرار دے دیا۔

لیکن دنیا پر اسلامی معاشرہ کا یہ احسان عظیم ہے کہ اس نے اپنے نظام حیات میں انسان کی صرف ان خصوصیات کو اجاگر کیا جو خالص انسانی ہیں۔ اس طرح اس نے انسان کو محض ایک مادے اور ایک حیوان کی سطح سے بہت اونچا کر دیا اور پوری تاریخ انسانیت میں اس پہلو سے اسلامی نظام حیات بے مثال ہے۔ اس لئے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ اسلامی نظام حیات کو چھوڑ کر دوسرے نظام اختیار کرتے ہیں' وہ دراصل انسانیت کے دشمن ہیں اور وہ اعلیٰ انسانی قدروں کی جگہ قوم' وطن' جنس اور طبقات کی بنیاد پر انسانی زندگی کو منظم کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان سے زیادہ کمزور اور گھناؤنی ذلیل چیز کوئی اور نہیں ہے۔ یہ لوگ انسانیت کے دشمن ہیں اور فطری اصولوں کے مطابق انسانی معاشرہ کی تعمیر' خالص انسانی بنیادوں پر نہیں چاہتے اور نہ ہی یہ انسانی سوسائٹی کو یہ موقعہ دیتے ہیں کہ وہ تمام انسانی تجربوں اور تمام انسانی خصائص و کمالات سے فائدہ اٹھائے اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں :

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا (۱۰۳) الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا (۱۰۴) أُولٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (۱۰۵) ذٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا اٰيٰتِي وَرُسُلِي هُزُوًا (۱۰۶) (۱۸ : ۱۰۳ تا ۱۰۶))

"اے محمدؐ" ان سے کہو' کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد راہ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہیں کیا۔ اس لئے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے۔ قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے۔ ان کی جزا جہنم ہے کہ اس کفر کے بدلے جو انہوں نے کیا اور اس مذاق کی پاداش میں جو وہ میری آیات اور میرے رسولوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

کیونکہ یہ لوگ ترقی کے انسانی خطوط کے خلاف کام کرتے ہیں اور انسانی معاشرے کو دوبارہ بہائم کے معاشرے کی صورت میں بدلنا چاہتے ہیں جس کا مقصد صرف گھاس اور دانے کی تلاش ہوتی ہے اور یہ لوگ ایسے حالات میں یہ کام کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنی آخری کتاب کے ذریعہ لوگوں کو ایسی ہدایات دے دی ہیں جن پر تمام انسان مجتمع ہو سکتے ہیں۔

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ جو لوگ اعلیٰ انسانی قدروں پر انسانی معاشرے کو استوار کرنا چاہتے ہیں ان کو یہ لوگ جو خالص حیوانی نظریات پر معاشرے چلانا چاہتے ہیں' جامد رجعت پسند اور دوسرے ناموں سے پکارتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کی یہ تمام خوش نما باتیں اور تمام الزامات اس لئے ہیں کہ یہ اعلیٰ انسانی قدروں سے بھاگنا چاہتے ہیں۔

لیکن اللہ اپنے امور پر خود اختیار رکھتا ہے۔اس لئے یہ پستیاں جو انسانی معاشروں پر غالب آگئی ہیں اور انسان کو حیوان محض بنا دیا گیا ہے' ان کے لئے دوام مقدر نہیں ہے۔عنقریب وہ روشنی پھیلے گی اور وہ معاشرے وجود میں آئیں گے جن کو اللہ پسند کرتا ہے۔انسانیت عنقریب عزت کا مقام دوبارہ پالے گی جس طرح پہلی بار انسانیت انسانی قدروں پر اکٹھی ہوئی تھی اور تاریخ میں اس کی مثال نہیں ہے۔وہ آج بھی تاریخ کے افق پر روشن ہے اور لوگوں کے لئے ایک مثال ہے اور دوبارہ وہ معاشرہ منظم ہو گا اور کسی نہ کسی دن ایک مثالی معاشرہ ہو گا۔ان شاء اللہ!

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ------- ۱۰

## سورہ التوبة — ۹

## آیات ۱ --- تا --- ۹۳

# سورۂ التوبہ ایک نظر میں

یہ مدنی سورت ہے اور اگر یہ نہ کہا جائے کہ یہ قرآن کی آخری سورت ہے تو اس کا تعلق نزول قرآن کے بالکل آخری دور سے بہرحال ہے۔ کیونکہ راجح روایات میں ہے کہ سورت النصر آخری سورت ہے۔ چنانچہ اس میں امت مسلمہ اور کرۂ ارض پر رہنے والی دوسری اقوام کے درمیان تعلقات سے متعلق جو احکام و قوانین ہیں، وہ آخری اور فائنل قوانین ہیں۔ اس سورت میں خود مسلم معاشرے کے اندر پائے جانے والے مختلف طبقات کی قدر و قیمت کا تعین بھی کیا گیا ہے۔ ہر ایک کے حالات و کوائف بیان کئے ہیں۔ یہاں طبقات سے مراد وہ طبقات نہیں ہیں جن کے لئے آج کل یہ لفظ استعمال ہوتا ہے بلکہ ان سے مراد وہ گروہ ہیں جو اسلامی تصورات کے مطابق مختلف گروہ قرار پائے ہیں، مثلاً انصار، مہاجرین، اہل بدر، اصحاب بیعت رضوان، وہ لوگ جنہوں نے قبل فتح مکہ مال و دولت اسلام کی راہ میں خرچ کئے، وہ جنہوں نے فتح مکہ کے بعد اپنا مال خرچ کیا، وہ جو جہاد میں جانے کے بجائے گھر بیٹھ گئے اور پھر وہ جو منافق رہے، غرض اس سورت میں اسلامی معاشرے کے شب و روز اور ان میں مذکورہ تمام طبقات اور گروہوں کے حالات بڑی تفصیل اور تحدید کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

اس پہلو سے اس سورت کی اہمیت بہت زیادہ ہے کہ اس میں تحریک اسلامی کے مختلف مراحل، مختلف اقدامات بیان ہوئے ہیں۔ خصوصاً جب اس کے فائنل احکامات کا مقابلہ ان احکامات سے کیا جائے جو اس سے متصلاً پہلی سورت میں تھے اور جو وقتی تھے۔ یہ تقابلی مطالعہ بتائے گا کہ یہ انداز تفسیر کس قدر مضبوط اور فیصلہ کن ہے۔ اور اگر یہ انداز مطالعہ اختیار نہ کیا جائے تو احکام و ضوابط کی شکل ہی بدل جاتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص ان آیات کو لے جو ایک خاص مرحلے کے ساتھ مخصوص تھیں اور ان کو آخری اور فائنل احکام قرار دے اور ان آیات میں تاویل شروع کر دے جن میں آخری اور فائنل ہدایات دی گئی تھیں تاکہ یہ فائنل ہدایات ان آیات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں جو وقتی تھیں۔ خصوصاً جہاد اسلامی اور مسلم معاشرے اور دوسرے معاشروں کے درمیان بین الاقوامی تعلقات کے موضوع سے متعلق۔ امید ہے کہ ہم ان میں سے بعض موضوعات کی وضاحت تشریح آیات کے ضمن میں اور سورت توبہ کے اس مقدمے میں کر سکیں گے۔ یہ سورت کب نازل ہوئی؟ اس سورت کے موضوعات کے مطالعے، ان کے بارے میں روایات و احادیث کے مطالعے اسباب نزول کی روایات کے ملاحظے اور ان تاریخی حالات و واقعات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت پوری کی پوری نویں صدی ہجری میں نازل ہوئی ہے۔ لیکن یہ دفعتہ نازل نہیں ہوئی ہے۔ ہم جزم کے ساتھ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس سورت کے مختلف حصے کس کس وقت نازل ہوئے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سورت تین مرحلوں میں نازل ہوئی ہے۔ پہلا حصہ نویں سال ہجری میں غزوۂ تبوک سے قبل ماہ رجب میں نازل ہوا۔ دوسرا حصہ اس جنگ کے لئے تیاریوں کے دور میں اور جنگ کے دوران نازل ہوا اور تیسرا حصہ اس وقت نازل ہوا جب مسلمان اس غزوہ سے واپس ہو گئے۔

البتہ سورت کا ابتدائی حصہ یعنی آیت ۱ تا ۲۸ آخر میں سن نو ہجری کے آخری ایام میں نازل ہوئے یعنی حج سے قبل ذوالقعدہ یا ذوالحجہ میں۔ اجمالاً اسی قدر بات کہی جا سکتی ہے جس پر دل مطمئن ہوتا ہے۔

---ooo---

اس سورت کے پہلے حصے میں یعنی آیت ۱ تا ۲۸ جزیرۃ العرب میں بسنے والے مشرکین اور مسلمانوں کے تعلقات کی فائنل ضابطہ بندی کی گئی ہے۔ اس ضابطہ بندی کے حقیقی اور عملی اسباب' اس کی تاریخی وجوہات اور نظریاتی اساسوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اور یہ سب کچھ قرآن میں اشاراتی اسلوب اور موثر انداز بیان' فیصلہ کن اور واضح طرز تعبیر کے ساتھ پیش کیا گیا۔ مناسب ہو گا کہ اس کے چند نمونے برائے غور آپ کے سامنے پیش کئے جائیں۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱) فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ (۲) وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ رَسُوْلُهٗ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳) اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (٤) فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٥) وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (٦) كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (٧) كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً

يُرْضُونَكُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَى قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَسِقُونَ (٨) اشْتَرَوْا بِآيَتِ اللَّهِ ثَمَنًا
قَلِيلًا فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِهِ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (٩) لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا
ذِمَّةً وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ (١٠) فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ
فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَنُفَصِّلُ الْآيَتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (١١) وَإِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ مِنْ
بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ
يَنْتَهُونَ (١٢) أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُمْ بَدَءُوكُمْ
أَوَّلَ مَرَّةٍ أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (١٣) قَاتِلُوهُمْ
يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ
(١٤) وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (١٥)
أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَهَدُوا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ
اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (١٦) مَا كَانَ
لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسَجِدَ اللَّهِ شَهِدِينَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ أُولَئِكَ حَبِطَتْ
أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَلِدُونَ (١٧) إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَوٰةَ وَآتَى الزَّكَوٰةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ فَعَسَى أُولَئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ
الْمُهْتَدِينَ (١٨) أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُنَ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الظَّلِمِينَ (١٩) الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ
وَأَنْفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ (٢٠) يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ

بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ (٢١) خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ
عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (٢٢) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ
اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (٢٣)
قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ
اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ
رَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْفٰسِقِيْنَ (٢٤) لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ
كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ
(٢٥) ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا
وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ (٢٦) ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ
عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٢٧) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ
فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ
مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (٢٨) (٩: ١ تا ٢٨)) "جن لوگوں کے ساتھ تم نے صلح وامن کا معاہدہ کیا تھا اب اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان کو صاف صاف جواب ہے ۔ پس اے مشرکو ملک میں چار مہینے چل پھر لو' کوئی روک ٹوک نہیں اور جان لو کہ تم اللہ کو کبھی عاجز نہ کر سکو گے اور اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے ۔ اور حج اکبر کے دن اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے منادی کی جاتی کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکین سے بری الذمہ ہے ۔ اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے حق میں بہتر ہے ۔ اور اگر روگردانی کرتے رہے تو جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور اے پیغمبر کافروں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دے ۔ ہاں مشرکین میں سے جن لوگوں کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا تھا پھر انہوں نے تمہارے ساتھ کسی قسم کی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی وہ مستثنیٰ ہیں ۔ تو ان کے ساتھ جو معاہدہ ہے اس کی مدت تک پورا کرو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے ۔ پھر جب حرمت کے مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو جہاں پاؤ' قتل کرو اور انہیں گرفتار کرو اور ان کا محاصرہ کرو اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھو پھر

اگر وہ توبہ کر لیں ' نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو کیونکہ اللہ غفور و رحیم ہے اور اے پیغمبر مشرکین میں سے کوئی پناہ مانگے تو پناہ دے دو تاکہ وہ اچھی طرح کلام الٰہی سن لے پھر اسے اس کے امن کی جگہ پہنچا دو یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ علم نہیں رکھتے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان مشرکین کا عہد اللہ اور اس کے رسول ؐ کے نزدیک عہد ہو؟ ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے قریب عہد کیا تھا اور انہوں نے اسے نہیں توڑا تو جب تک وہ تمہارے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہیں ' تم بھی ان کے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے مگر ان کے سوا دوسرے مشرکین کے ساتھ عہد کیسے ہو سکتا ہے۔ جن کا حال یہ ہے کہ اگر تم پر غلبہ پائیں تو تمہارے بارے میں نہ تو قرابت کا پاس کریں اور نہ عہد و پیمان کا یہ لوگ اپنی زبانوں سے تمہیں راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ان کے دل ان باتوں سے انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔ ان لوگوں نے اللہ کی آیتیں تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالیں۔ پھر اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکنے لگے۔ افسوس ان پر بہت ہی برے کام تھے جو یہ کرتے رہے۔ یہ کسی مومن کے بارے میں نہ قرابت کا پاس کرتے ہیں نہ عہد و پیمان کا اور یہی لوگ زیادتی کرنے والے ہیں۔ بہرحال اگر یہ توبہ کر لیں ' نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں اور جو لوگ سمجھ دار ہیں ان کے لئے ہم اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کر دیتے ہیں اور اگر یہ لوگ عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر طعن کریں تو ان کفر کے سرغنوں سے جنگ کرو۔ ان کی قسمیں ' قسمیں نہیں اور تمہیں ان سے جنگ اس لئے کرنی چاہئے کہ یہ اپنی شرارتوں سے باز آ جائیں۔ مسلمانو کیا تم ان سے نہ لڑو گے جنہوں نے عہد کرنے کے بعد اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور اللہ کے رسول کو اس کے وطن سے نکال دینے کا قصد کیا اور تم سے لڑائی میں پہل بھی انہوں نے کی۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو۔ اگر تم مومن ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ مسلمانو ان لوگوں سے بلا تامل لڑو۔ اللہ تمہارے ہی ہاتھوں انہیں عذاب دے گا اور ان کو رسوا کرے گا اور ان پر تمہیں غلبہ دے گا اور مومنوں کو اور ان کے دلوں کو ٹھنڈا کرے گا اور ان کے دلوں میں کافروں کی طرف سے جو غصہ بھرا ہوا ہے اس کی خلش کو بھی دور کرے گا اور جس کی چاہے توبہ قبول فرمائے گا اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

مسلمانو کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ سستے چھوٹ جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے ان لوگوں کو جانا ہی نہیں جنہوں نے جہاد کیا اور اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا جگری دوست نہ بنایا۔ اور یاد رکھو جو کچھ بھی تم لوگ کرتے ہو' اللہ کو اس کی سب خبر ہے۔ مشرکین کو یہ حق نہیں کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں اور مشرکانہ اقوال و افعال سے اپنے اوپر کفر کی گواہی بھی دیتے جائیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے سارے عمل اکارت گئے اور یہ دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا تو ان لوگوں کا کام ہے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہوں۔ نماز قائم کرتے ہوں' زکوٰۃ دیتے ہوں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں۔ سو ایسے لوگوں سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ہدایت پانے والے ہوں گے۔ لوگو کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے والے اور مسجد حرام کو آباد رکھنے کو اس شخص کے عمل کے برابر سمجھ لیا ہے۔ جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اللہ کے نزدیک تو یہ لوگ ایک دوسرے کے برابر نہیں اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا۔ اللہ کے نزدیک درجے میں بڑے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور

ہجرت کی اور اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ کامیاب ہیں۔ ان کا رب انہیں اپنی رحمت اور خوشنودی کی بشارت دیتا ہے۔ نیز ایسے باغوں کی جن میں ان کی دائمی آسائش ملے گی اور وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ بے شک اللہ کے پاس نیک کرداروں کے لئے بڑا اجر ہے۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر تمہارے باپ اور تمہارے بھائی ایمان کے مقابلے میں کفر کو عزیز رکھیں تو ان کو اپنا رفیق نہ بناؤ اور تم میں سے جو انہیں رفیق بنائیں گے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں اے پیغمبر مسلمانوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تمہیں اندیشہ ہے اور وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں اگر یہ ساری چیزیں اللہ اور اس کے رسول اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے تمہیں زیادہ پیاری ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ کا مقررہ قانون ہے کہ وہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ مسلمانو! اللہ نے بہت سے موقعوں پر تمہاری مدد کی ہے اور خاص کر جنگ حنین کے دن جب کہ تم اپنی کثرت پر اترا گئے تھے مگر وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔ پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں پر اپنی طرف سے سکون قلب نازل فرمایا اور مدد کو فرشتوں کے ایسے لشکر اتارے جو تمہیں نظر نہیں آتے تھے اور اس طرح ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا تھا' سخت سزا دی اور کافروں کی یہی جزا ہے۔ پھر تم دیکھ چکے ہو کہ سزا کے بعد اللہ جسے چاہتا ہے توبہ کی توفیق بھی دیتا ہے اور اللہ غفور و رحیم ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یہ حقیقت ہے کہ مشرک ناپاک ہیں۔ لہٰذا اس کے بعد وہ مسجد حرام کے پاس بھی نہ آنے پائیں۔ اگر ان کے ساتھ لین دین بند ہو جانے سے تمہیں مفلسی کا اندیشہ ہے تو اللہ پر بھروسہ رکھو وہ چاہے گا تو تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

درج بالا جن آیات کا ہم نے اقتباس پیش کیا۔ ان میں اور اس سبق کی تمام دوسری آیات میں اس بات پر نہایت ہی تاکید اور شدت سے زور دیا گیا ہے کہ مشرکین عرب کے خلاف فیصلہ کن قدم اٹھاؤ اور مسلمانوں کو اس بات پر برانگیختہ کیا گیا ہے کہ مشرکین کے ساتھ بائیکاٹ کرو اور پورے جزیرۃ العرب میں ان کے خلاف جنگی کاروائی شروع کر دو۔ اس شدید تاکید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جماعت مسلمہ یا ان میں سے بعض افراد کے رویوں میں یہ خوف تھا کہ پورے جزیرۃ العرب میں مشرکین کے خلاف بیک وقت اس قسم کی کاروائی شروع کرنا مناسب امر نہیں ہے یا ان کو فیصلہ کن انداز میں اس قسم کی کاروائی خوفناک نظر آتی تھی اور وہ اس بارے میں یکسو نہ تھے۔ اور اس کی بعض وجوہات بھی تھیں جن کے بارے میں ہم عنقریب اس تبصرے اور پھر تشریح آیات کے وقت کلام کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

اس سورت کے دوسرے حصے میں 'اسلامی معاشرے اور اہل کتاب کے درمیان تعلقات کی حد بندی کی گئی اور اس میں جو احکامات دیئے گئے ہیں' وہ فائنل ہیں اور ان فیصلوں کے نظریاتی 'تاریخی اور عملی اسباب بھی بیان کئے گئے ہیں جن کی وجہ سے اسلام نے ان تعلقات کی ایسی ضابطہ بندی کی ہے۔ اس حصے میں اسلام اور اسلام کی مستقل حقیقت کو بھی بیان کیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اہل کتاب نے نظریاتی اور عملی ہر لحاظ سے اپنے صحیح دین سے انحراف کر لیا ہے۔ اس لئے اب وہ عملاً اس دین پر قائم نہیں رہے جو اللہ نے ان کی طرف بھیجا تھا اور جس کی وجہ سے وہ اہل کتاب قرار پائے تھے مثلاً درج ذیل آیات پر غور فرمائیں۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ (۹:۲۹) "جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے۔ اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں مانتے۔ (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔"

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُنِ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۳۰) اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۹ : ۳۰ – ۳۱) "یہود کہتے کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں۔ ان لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے۔ خدا کی مار ان پر یہ کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں۔ پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔"

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۳۲) هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۹ : ۳۲ – ۳۳) "یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کئے بغیر ماننے والا نہیں ہے۔ خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے۔ خواہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳۴) يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (۹ : ۳۴ — ۳۵) "اے ایمان لانے والو! ان اہل کتاب کے اکثر علماء اور درویشوں کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کا مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ دردناک عذاب کی خوشخبری دو' ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اس سونے اور چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔

اس حصے میں جو اسلوب گفتگو اپنایا گیا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات لوگوں کے اس خلجان کو دور کرنے کے لئے نازل ہوئیں' جو وہ اہل کتاب کے خلاف کسی سخت لڑائی کے سلسلے میں اپنے اندر پاتے تھے' یا یہ تردد اور خوف ان میں سے بڑی اکثریت کے دلوں میں پایا جاتا تھا کہ وہ اہل کتاب کے حوالے سے پہلی آیت کے مطابق تعلق کا آغاز کس طرح کریں' لیکن درحقیقت ان آیات میں روئے سخن رومیوں کی طرف تھا جن کے ساتھ شام اور عرب کے عیسائیوں کے حلیفانہ تعلقات تھے۔ رومیوں کے حوالے سے یہ تردد اور خوف بجا بھی تھا' اس لئے کہ جزیرۃ العرب کے باشندوں کے ہاں رومیوں کی تاریخی شہرت تھی۔ اگرچہ آیت کے الفاظ تمام اہل کتاب کے لئے عام ہیں اور آیت میں مذکور ہونے والے اوصاف سب ان پر منطبق تھے جیسا کہ آیت کی تشریح کے وقت ہم بتائیں گے۔

اس سورت کے تیسرے حصے میں ان کاہل اور سست لوگوں کا ذکر ہے جن کو جب جہاد کے لئے دعوت دی جاتی ہے تو وہ اپنے آپ کو بوجھل بنا کر زمین پر گرا دیتے ہیں اور نفیر عام سے سستی برتتے ہیں۔ یہ سستی کرنے والے سب کے سب منافق نہ تھے جیسا کہ بعد میں واضح ہو گا بلکہ یہ مہم چونکہ پرمشقت تھی اور بعض لوگ مشکلات راہ کی وجہ سے سست پڑ گئے تھے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (۳۸) اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۳۹) اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى

وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (٤٠) انْفِرُوا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوا
بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

(٤١) (۹: ۳۸ تا ٤١) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لئے کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسا ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ دنیا کی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔ تم نہ اٹھو گے تو خدا تمہیں دردناک عذاب دے گا۔ اور تمہاری جگہ کسی اور گروہ کو اٹھائے گا اور تم خدا کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ تم نے اگر نبی کی مدد نہ کی' تو کچھ پروا نہیں اللہ اس کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا۔ جب وہ صرف دو میں دوسرا تھا' جب وہ دونوں غار میں تھے' جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ "غم نہ کر و اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" اس وقت اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکون قلب نازل کیا اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور کافروں کا بول نیچا کر دیا اور اللہ کا بول تو اونچا ہی ہے۔ اللہ زبردست دانا و بینا ہے۔ نکلو خواہ ہلکے ہو یا بوجھل' اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ' یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ اگر تم جانو)

یہاں بار بار تاکید' تہدید اور ملامت کے الفاظ لائے جاتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جہاں تک رسول اللہ کی امداد کا تعلق ہے تو کسی انسان کی شرکت کے بغیر بھی اللہ نے ان کی مدد کی ہے۔ ذرا وہ وقت یاد کرو کہ جب مکہ سے کافروں نے انہیں نکالا تھا۔ کوئی فوج ان کے ساتھ نہ تھی لیکن وہ کامیاب رہے۔ پھر یہ تاکید کہ تم بوجھل ہو یا ہلکے بہرحال اس مہم میں نکلو' یہ سب امور بتاتے ہیں کہ یہ مہم بہت سخت تھی' لوگوں کے اندر سستی اور تردد بلکہ خوف طاری تھا۔ اس لئے یہاں سخت ترین الفاظ میں تاکید کی گئی ہے کہ لازماً اس مہم میں نکلو۔

اس کے بعد اس سورت کا چوتھا حصہ آتا ہے اور وہ قدرے طویل ہے۔ اس سورت کے نصف حصے پر مشتمل ہے۔ اس میں منافقین اور اسلامی معاشرے کے خلاف ان کی ریشہ دوانیوں کو کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ غزوۂ تبوک' اس سے پہلے اور اس کے بعد کے ادوار میں ان کی نفسیاتی حالت اور ان کی عملی بوکھلاہٹ کو لیا گیا ہے۔ ان کی نیات' ان کے حیلوں بہانوں اور ان کے عذرات لنگ کا مضحکہ اڑایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح وہ اس جہاد سے پیچھے رہے۔ کس طرح اسلامی صفوں میں کمزوری' افتراق اور بے چینی پھیلاتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مخلص مومنین کو ایذائیں دیتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مخلص مومنین کو ان کی ریشہ دوانیوں سے متنبہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کے ساتھ تعلقات کے سلسلے میں تجویز کیا جاتا ہے کہ مخلصین کو ان سے دور رہنا چاہئے۔ یہ حصہ سورت کا بنیادی حصہ ہے۔ اور بنیادی وجود ہے۔ اس حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ نفاق جو فتح مکہ کے بعد قریباً قریباً ختم ہو گیا تھا کس طرح دوبارہ پھیل گیا تھا اور اگلے پیراگراف میں آپ دیکھیں گے کہ اس نفاق کے پھیلنے کے اسباب کیا تھے۔ یہاں ہم اس پورے حصے کو تو نقل نہیں کر سکتے البتہ بطور نمونہ چند فقرات ملاحظہ ہوں۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ وَ

سَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ اَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (( ٩ : ٤٢ )) ”اے نبی “ اگر فائدہ سہل الحصول ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور تمہارے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو جاتے مگر ان پر تو یہ راستہ بہت کٹھن ہو گیا۔ اب وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم چل سکتے تو یقیناً تمہارے ساتھ چلتے۔ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ (٤٦) لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَاوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ (٤٧) لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (٤٨) ( ٩ : ٤٦ تا ٤٨ ) ”اگر واقعی ان کا ارادہ نکلنے کا ہوتا تو وہ اس کے لئے کچھ تیاری کرتے لیکن اللہ کو ان کا اٹھنا پسند ہی نہ تھا۔ اس لئے ان کو سست کر دیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھ رہو بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے تو تمہارے اندر سوائے خرابی کے کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے۔ وہ تمہارے درمیان فتنہ پردازی کے لئے دوڑ دھوپ کرتے اور تمہارے گروہ کا یہ حال ہے کہ ابھی اس میں بہت سے لوگ موجود ہیں جو ان کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں۔ اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اس سے پہلے بھی ان لوگوں نے فتنہ انگیزی کی کوششیں کی ہیں اور تمہیں ناکام کرنے کے لئے ہر طرح کی تدبیروں کا الٹ پھیر کر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی مرضی کے خلاف حق آ گیا اور اللہ کا کام ہو کر رہا۔

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ( ٩ : ٦١ ) ”ان میں سے کچھ لوگ اپنی باتوں سے نبی کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص کانوں کا کچا ہے۔ کہ..... [illegible] کی بھلائی کے لئے ایسا ہے ' اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے اور سراسر رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو تم میں سے ایماندار ہیں اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان کے لئے دردناک سزا ہے۔“

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ (٤٩) اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ

اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَ يَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ (۵۰) (۹: ۴۹ تا ۵۰) ”ان میں سے کوئی ہے جو کہتا ہے کہ ”مجھے رخصت دیجئے اور مجھ کو فتنہ میں نہ ڈالیے۔“ سن رکھو! فتنے میں ہی تو یہ لوگ پڑے ہوئے ہیں اور جہنم نے ان کافروں کو گھیر رکھا ہے۔ تمہارا بھلا ہوتا ہے تو انہیں رنج ہوتا ہے۔ اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ منہ پھیر کر خوش خوش پلٹتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ اچھا ہوا ہے ہم نے پہلے ہی اپنا معاملہ ٹھیک کر لیا تھا۔“

وَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَ لٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ (۵۶) لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ (۵۷) (۹: ۵۶ — ۵۷)) ”وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تمہیں میں سے ہیں۔ حالانکہ وہ ہرگز تم میں سے نہیں ہیں۔ اصل میں وہ تو ایسے لوگ ہیں جو تم سے خوفزدہ ہیں۔ اگر وہ کوئی جائے پناہ پالیں یا کوئی کھوہ یا گھس بیٹھنے کی جگہ تو بھاگ کر اس میں جا چھپیں۔“

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ (۵۸) وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ رَسُوْلُهٗ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ (۵۹) (۹: ۵۸ — ۵۹)) ”اے نبی ؐ ان میں بعض لوگ صدقات کی تقسیم میں تم پر اعتراض کرتے ہیں۔ اگر اس مال میں سے انھیں کچھ دے دیا جائے تو خوش ہو جائیں۔ اور نہ دیا جائے تو بگڑنے لگتے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ اللہ اور رسول نے جو کچھ بھی انہیں دیا تھا، اس پر وہ راضی رہتے اور کہتے کہ اللہ ہمارے لئے کافی ہے۔ اور وہ اپنے فضل سے اور بہت کچھ دے گا اور اس کا رسول بھی ہم پر عنایت فرمائے گا۔ ہم اللہ ہی کی طرف نظر جمائے ہوئے ہیں۔“

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۹: ۶۱) ”ان میں سے کچھ لوگ اپنی باتوں سے نبی کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص کانوں کا کچا ہے۔ کہو ”وہ تمہاری بھلائی کے لئے ایسا ہے، اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے اور سراسر رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو تم میں سے ایماندار ہیں اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان کے لئے دردناک سزا ہے۔“

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا

مُؤْمِنِيْنَ (٦٢) اَلَمْ يَعْلَمُوْآ اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ (٦٣) (٩: ٦٢ – ٦٣) ”یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمہیں راضی کریں، حالانکہ اگر یہ مومن ہیں تو اللہ و رسولؐ اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ یہ ان کو راضی کرنے کی کوشش کریں۔ کیا انہیں معلوم نہیں ہے کہ جو اللہ اور رسولؐ کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے لئے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ یہ بہت بڑی رسوائی ہے۔“

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ (٦٤) وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ (٦٥) لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (٦٦) (٩: ٦٤ تا ٦٦) ”یہ منافق ڈر رہے ہیں کہ کہیں مسلمانوں پر کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو ان کے دلوں کے بھید کھول کر رکھ دے۔ اے نبی ان سے کہو ”اور مذاق اڑاؤ، اللہ اس چیز کو کھول دینے والا ہے جس کے کھل جانے سے تم ڈرتے ہو۔“ اگر ان سے پوچھو کہ تم کیا باتیں کر رہے تھے، تو جھٹ کہہ دیں گے کہ ہم تو ہنسی مذاق اور دل لگی کر رہے تھے۔ ان سے کہو ”تمہاری ہنسی دل لگی اللہ اور اس کے آیات اور اس کے رسولؐ ہی کے ساتھ تھی۔ اب عذرات نہ تراشو، تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ہے، اگر ہم نے تم میں سے ایک گروہ کو معاف کر بھی دیا تو دوسرے گروہ کو ہم ضرور سزا دیں گے کیونکہ وہ مجرم ہیں۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (٦٧) وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا هِيَ حَسْبُهُمْ وَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (٦٨) (٩: ٦٧ – ٦٨) ”منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں۔ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے اور اپنے ہاتھ خیر سے روکے رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا۔ یقیناً یہ منافق ہی فاسق ہیں۔ ان منافق مردوں اور عورتوں اور کافروں کے لئے اللہ نے آتش دوزخ کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہی ان کے لئے موزوں ہے۔ ان پر اللہ کی پھٹکار ہے اور ان کے لئے قائم رہنے والا عذاب ہے۔“

يَاَيُّهَا النَّبِیُّ جٰهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۷۳) يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلٰمِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ فِی الْاَرْضِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۷۴) (۹ : ۷۳ — ۷۴) ”اے نبی کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ' آخر کار ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بد ترین جائے قرار ہے ۔ یہ لوگ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے وہ بات نہیں کہی' حالانکہ انہوں نے ضرور وہ کافرانہ بات کہی ہے ۔ وہ اسلام لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے اور انہوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے کر نہ سکے ۔ یہ ان کا سارا غصہ اس بات پر ہے' تاکہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے ان کو غنی کر دیا ہے ۔ اب اگر یہ اپنی روش سے باز آ جائیں تو انہی کے لئے بہتر ہے اور اگر یہ باز نہ آئے تو اللہ ان کو نہایت دردناک سزا دے گا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور زمین میں کوئی نہیں جو ان کا حمایتی اور مددگار ہو۔“

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۷۵) فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۷۶) فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (۷۷) (۹ : ۷۵ تا ۷۷) ”ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اس نے اپنے فضل سے ہم کو نوازا تو ہم خیرات کریں گے اور صالح بن کر رہیں گے ۔ مگر جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دولتمند کر دیا تو وہ بخل پر اتر آئے اور اپنے عہد سے ایسے پھرے کہ انہیں اس کی پرواتک نہیں ہے ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اس بدعہدی کی وجہ سے جو انہوں نے اللہ کے ساتھ کی اور اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بولتے رہے' اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا' جو اس کے حضور ان کی پیشی کے دن تک ان کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔“

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۷۹) اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ

وَ رَسُوْلِه وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۸۰) (۹ : ۷۹ — ۸۰) "جو لوگ برضا و رغبت دینے والے اہل ایمان کی مالی قربانیوں پر باتیں چھانٹتے ہیں اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے اوپر مشقت برداشت کر کے دیتے ہیں۔ اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لئے دردناک سزا ہے۔ اے نبی تم ایسے لوگوں کے لئے معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو، اگر تم ستر مرتبہ بھی انہیں معاف کر دینے کی درخواست کرو گے تو اللہ انہیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور اللہ فاسق لوگوں کو راہ نجات نہیں دکھاتا ہے۔"

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ (۸۱) فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّ لْيَبْكُوْا كَثِيْرًا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۸۲) فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ (۸۳) وَ لَا تُصَلِّ عَلٰى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِه اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِه وَ مَاتُوْا وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ (۸۴) وَ لَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۸۵) (۹ : ۸۱ تا ۸۵) "جن لوگوں کو پیچھے رہنے کی اجازت دی گئی تھی وہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دینے اور گھر پر بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے اور انہیں گوارا نہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کریں۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ "اس سخت گرمی میں نہ نکلو۔" ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے۔ کاش انہیں اس کا شعور ہوتا۔ اب چاہئے کہ یہ لوگ ہنسنا کم کریں اور روئیں زیادہ۔ اس لئے کہ جو بدی یہ کما رہے ہیں اس کی جزا ایسی ہی ہے۔ اگر اللہ ان کے درمیان تمہیں واپس لے جائے اور آئندہ ان میں سے کوئی گروہ جہاد کے لئے نکلنے کی تم سے اجازت مانگے تو صاف کہہ دینا کہ "اب تم میرے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے اور نہ میری معیت میں کسی دشمن سے لڑ سکتے ہو، تم نے پہلے بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا تو اب گھر میں بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ اور آئندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نماز جنازہ بھی تم ہرگز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہونا کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ مرے ہیں اس حال میں کہ وہ فاسق تھے۔ ان کی مالداری اور ان کی کثرت اولاد تم کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ اللہ نے تو ارادہ کر لیا

ہے کہ اس مال اور اولاد کے ذریعے سے ان کو اسی دنیا میں سزا دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔

یہ طویل تنقید جس میں بے شمار انکشافات کیے گئے اس بات کی مظہر ہے کہ اس وقت منافقین کی طرف سے اسلامی جماعت کی ایذارسانی کے لئے رات دن کوششیں ہوتی رہتی تھیں۔ یہ منافق مختلف قسم کی سازشوں' فتنہ انگیزیوں اور جھوٹے پروپیگنڈے کے ذریعے مسلمانوں کو اپنے نصب العین سے ہٹانے کی سعی کرتے رہتے تھے۔ نیز اس تنقیدی تقریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اسلامی صفوں میں ہم آہنگی اور مکمل اتحاد کی کمی تھی اور جماعت مسلمہ کی عضویاتی تکمیل ابھی تک ادھوری تھی۔ اس کی طرف اس فقرے کے ذریعے اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ وَ فِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ (۹: ۴۷) "اور تم میں ان کی بات پر کان دھرنے والے موجود ہیں۔" نیز ایسے لوگوں کے لئے دعا کرنے کی سخت ممانعت اور ان کا نماز جنازہ نہ پڑھنے کی تاکید سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ایسے لوگوں کے لئے ہمدردی کے جذبات اسلامی صفوں میں موجود تھے۔ یہ صورت حال اس لئے پیدا ہوگئی تھی کہ فتح مکہ کے بعد لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوگئے تھے اور ان کے دلوں میں ابھی تک ایمان اچھی طرح جاگزیں نہ ہوا تھا۔ نہ وہ ابھی تک پوری طرح اسلامی رنگ میں رنگے گئے تھے۔ اس کی تفصیلات ہم اس سورت میں ان آیات کے ضمن میں دیں گے جن میں اسلامی جماعت کے اجزائے ترکیبی پر بحث کی گئی ہے جن سے اس وقت جماعت کی تالیف ہوئی تھی۔

اس سورت کے پانچویں حصے میں جماعت مسلمہ کے اندر شامل مختلف قسم کے لوگوں سے بحث کی گئی ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کے اندر ایک طرف تو انصار و مہاجرین کے سابقون الاولون تھے جو اس جماعت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے تھے' دوسری جانب مسلمانوں کے اندر کچھ دوسرے لوگ بھی تھے مثلاً اعراب جن میں مخلص لوگ بھی تھے اور ان میں ایسے لوگ بھی تھے کہ جن کے دلوں تک ایمان کے اثرات نہ پہنچے تھے اور بعض منافقین بھی تھے جو اہل مدینہ میں سے تھے اور بعض ایسے مسلمان بھی تھے جو ایک جانب سے نیک عمل تھے اور دوسری جانب ان میں عملی کمزوریاں تھیں اور ابھی تک وہ پوری طرح اسلامی رنگ میں نہ رنگے گئے تھے' نہ وہ پوری طرح اسلامی سانچے میں ڈھلے تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے بارے میں کوئی کچھ نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ کیسے ہیں۔ ان کے بارے میں جماعت مسلمہ کی کوئی رائے نہ تھی اور ان کا حال انہوں نے اللہ پر چھوڑ دیا تھا کہ ان کا انجام کیسا ہو گا' ان میں ایسے سازشی بھی تھے جو دین کے عنوان سے سازشیں کرتے تھے۔ قرآنی آیات میں نہایت ہی اختصار کے ساتھ ان تمام انواع و اصناف کے لوگوں کے بارے میں ریمارکس دیئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ مخلص مسلمانوں اور رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے ان مختلف طبقات کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹۷) وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۹۸) وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹۹) (۹ : ۹۷ تا ۹۹) ”یہ بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں ' اور ان کے معاملے میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کے حدود سے ناواقف رہیں ' جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے۔ ان بدوی لوگوں میں ایسے ایسے لوگ موجود ہیں جو راہ خدا میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو اسے اپنے اوپر زبردستی کی چٹی سمجھتے ہیں اور تمہارے حق میں زمانہ کی گردش کا انتظار کرتے ہیں ' حالانکہ بدی کا چکر خود انہی پر مسلط ہے۔ اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ اور انہی بدویوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں اپنے تقرب کا اور رسول اللہ کی طرف سے رحمت کی دعائیں لینے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں! وہ ضرور ان کے لئے تقرب کا ذریعہ ہے۔ اور اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا ' یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔“

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۰۰) وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ (۱۰۱) (۹ : ۱۰۰ — ۱۰۱) ”وہ مہاجر و انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی ' نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے ' اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔ تمہارے گردو پیش جو بدوی رہتے ہیں ان میں بہت سے منافق ہیں اور اس طرح خود مدینہ کے باشندوں میں بھی منافق موجود ہیں جو نفاق میں طاق ہو گئے ہیں۔ تم انہیں نہیں جانتے ' ہم ان کو جانتے ہیں۔ قریب ہے وہ وقت جب ہم ان کو دہری سزا دیں گے ' پھر وہ زیادہ بڑی سزا کے لئے واپس لائے جائیں گے۔“

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۰۲) خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۱۰۳) (۹ : ۱۰۲ — ۱۰۳) ”اور کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کر لیا ہے۔ ان کا عمل مخلوط ہے '

کچھ نیک ہے اور کچھ بد۔بعید نہیں کہ اللہ ان پر مہربان ہو جائے کیونکہ وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اے نبیﷺ تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور نیکی کی راہ میں انہیں بڑھاؤ۔اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو کیونکہ تمہاری دعا ان کے لئے وجہ تسکین ہوگی۔اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

(۹:۱۰۶) "اور کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کا معاملہ ابھی خدا کے حکم پر ٹھہرا ہوا ہے، چاہے انہیں سزا دے اور چاہے ان پر از سرِنو مہربان ہو جائے اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے۔"

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۰۷) لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ، فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ

(۱۰۸)((۹:۱۰۷ ـ ۱۰۸)) "کچھ لوگ ہیں جنہوں نے مسجد ضرار بنائی اس غرض کے لئے کہ دعوت حق کو نقصان پہنچائیں اور کفر کریں اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں اور اس شخص کے لئے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف بر سرپیکار ہو چکا ہے۔وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لئے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔"

ان نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد مختلف طبقات، مختلف گروہ اور مختلف سطح کی ایمانی قوت رکھنے والے لوگ اسلامی صفوں میں داخل ہو گئے تھے۔اس لئے اسلامی صفوں کے اندر انتشار کی کیفیت تھی اس لئے ان آیات میں اسلامی معاشرے نے ان سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیا۔

اس سورت کے چھٹے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے ساتھ بیعت جہاد کی نوعیت کیا ہے اور جہاد فی سبیل اللہ کے مقاصد کیا ہیں۔اور اہل مدینہ اور اس کے اردگرد رہنے والے بدوی آبادی کے اس سلسلے میں کیا فرائض ہیں اور یہ کہ ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس جہاد سے پیچھے رہ جائیں اور نہ ان کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ رسول اللہ کو چھوڑ کر پیچھے رہ جائیں اور اپنی جان و مال سے اس کی مدافعت نہ کریں اور یہ کہ مسلمانوں اور مشرکین و منافقین کے درمیان مکمل بائیکاٹ ضروری ہے۔اور اسی حصے میں ان لوگوں کے کیس کا بھی فیصلہ مذکور ہے جو مخلص تھے، منافق نہ تھے لیکن جہاد سے

پیچھے رہ گئے تھے اور اس میں بعض منافقین کی جانب سے نزول قرآن کے بارے میں خاص رویہ اختیار کرنے کا بھی ذکر ہے ۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

( ۹ : ۱۱۱ ) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں ۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں ۔ ان سے اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے تورات اور انجیل اور قرآن میں ۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکالیا ہے ' یہی سب سے بڑی کامیابی ہے ۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۱۱۳) وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (۱۱۴) ( ۹ : ۱۱۳ — ۱۱۴ ) "نبی کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں ' زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لئے مغفرت کی دعا کریں ' چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں ۔ جبکہ ان پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں ۔ ابراہیم ؑ نے اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت کی تھی ' وہ تو اس وعدے کی وجہ سے تھی جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا ۔ مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا ۔ حق یہ ہے کہ ابراہیم بڑا رقیق القلب و خدا ترس اور بردبار آدمی تھا ۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۱۷) وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اِنَّ

اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (۱۱۸) "اللہ نے معاف کر دیا نبی کو اور ان مہاجرین کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا تھا۔ اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ مگر اللہ نے انہیں معاف کر دیا بے شک اس کا معاملہ ان لوگوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے۔ اور ان تینوں کو بھی اس نے معاف کیا جن کے معاملے کو ملتوی کر دیا گیا تھا۔ جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ خود اللہ کے دامن رحمت کے سوا نہیں تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں۔ یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَّتَخَلَّفُوا عَنْ رَّسُولِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهِ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَّغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (۱۲۰) وَلَا يُنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً وَّلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۲۱) وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ

(۱۲۲) (۹: ۱۲۰ تا ۱۲۲) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو۔ مدینہ کے باشندوں اور گرد و نواح کے بدویوں کو یہ ہرگز زیبا نہ تھا کہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر گھر بیٹھ رہتے اور اس کی طرف سے بے پرواہو کر اپنے اپنے نفس کی فکر میں لگ جاتے۔ اس لئے کہ ایسا کبھی نہ ہو گا کہ اللہ کی راہ میں بھوک پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ جھیلیں اور منکرین حق کو جو راہ ناگوار ہے اس پر کوئی قدم وہ اٹھائیں اور کسی دشمن سے کوئی انتقام وہ لیں اور اس کے بدلے ان کے حق میں ایک عمل صالح نہ لکھا جائے۔ یقیناً اللہ کے ہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا۔ اسی طرح یہ بھی کبھی نہ ہو گا کہ تھوڑا بہت کوئی خرچ وہ اٹھائیں اور کوئی وادی وہ پار کریں اور ان کے حق میں اسے لکھ نہ لیا جائے تاکہ اللہ ان کے اس اچھے کارنامے کا صلہ انہیں عطا کرے۔ اور کچھ ضروری نہیں کہ اہل ایمان سارے کے سارے ہی اٹھ کھڑے ہوتے۔ مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جاکر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ غیر مسلمانہ روش سے پرہیز کرتے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوْآ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۱۲۳) وَ اِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖ اِيْمَانًا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۱۲۴)(۹:۱۲۳ — ۱۲۴)) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تم سے قریب ہیں اور چاہئے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔"

وَ اِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ هَلْ يَرٰكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۹:۱۲۷) "اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو یہ لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں کہ کہیں کوئی تم کو دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ پھر چپکے سے نکل بھاگتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دل پھیر دیئے کیونکہ وہ ناسمجھ لوگ ہیں۔"

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۲۸) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۱۲۹)(۹:۱۲۸ — ۱۲۹)) "دیکھو تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے' خود تم ہی میں سے ہے' تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے' تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے' ایمان لانے والوں کے لئے وہ شفیق و رحیم ہے۔ اب اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرتے ہیں تو اے نبی' ان سے کہہ دو کہ "میرے لئے اللہ بس کرتا ہے' کوئی الٰہ نہیں مگر وہ' اس پر میں نے بھروسہ کیا اور وہ مالک ہے عرش عظیم کا۔"

اس اجمالی تبصرے میں' ہم نے اس سورت سے کافی طویل اقتباسات دیئے' جبکہ تفصیلی بحث بعد میں آنے والی تھی اور یہ طوالت ہم نے بالارادہ کی ہے کیونکہ فتح کے بعد اسلامی سوسائٹی کے جو خدوخال تھے ان کو اس سورت میں بڑی تفصیل کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔ اس سورت میں اس سوسائٹی کی عضویاتی تشکیل کی صورت حال کو دکھایا گیا ہے۔ اس کی تصویر کشی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں اسلامی صفوں میں ایک طرح کا انتشار تھا' بایں معنی کہ سوسائٹی کے اندر مکمل ہم آہنگی نہ تھی اور مختلف ایمانی درجات کے لوگ فتح مکہ کے بعد جمع ہوگئے تھے۔ لوگوں کے اندر بخل' کنجوسی' مال کی محبت' نفاق کی بیماری' سستی اور کمزوری دین اسلام کے تقاضے پورے کرنے میں تردد' دین کے مقاصد میں خلط اور عدم یکسوئی' اسلامی سوسائٹی اور جاہلیت کے معاشروں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کو نہ سمجھنا' پھر اسلامی اخوت کے مقابلے تمام دوسرے اجتماعی روابط کو توڑ دینا' اگرچہ اسلامی نظریہ کے سوا دوسرے جو روابط موجود تھے وہ اسلامی نظریہ حیات کی اساس پر روابط کے ساتھ متضاد نہ تھے لیکن اس کے باوجود یہ برادریاں وغیرہ موجود تھیں' اس لئے ان تمام کمزوریوں

اور کوتاہیوں کی اصلاح کے لئے اس سورت میں بھرپور اور واضح تنقید کی گئی تاکہ اسلامی سوسائٹی اور خالص اسلامی معاشرے کے خدوخال اور مقاصد کو واضح کیا جاسکے۔

اس سے پہلے ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ اسلامی معاشرے کے اندر اس دور میں یہ خرابیاں اس لئے سرایت کر گئی تھیں کہ فتح مکہ کے بعد ہر قسم کے لوگ فوج در فوج دین اللہ میں داخل ہوگئے تھے اور ان لوگوں کی ابھی اچھی طرح تربیت نہ ہوئی تھی۔ اور یہ لوگ ابھی پوری طرح اسلامی قالب میں نہ ڈھلے تھے لیکن ہمارے اس مجمل اشارے کو اچھا اس وقت تک نہیں سمجھا جاسکتا جب تک فتح مکہ سے پہلے اور اس کے بعد تاریخی پس منظر کو اچھی طرح ذہن میں تازہ نہ کر لیا جائے۔ اور اس میں تحریک اسلامی کے عملی ارتقاء کو ذہن میں نہ رکھا جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہاں نہایت ہی اختیار کے ساتھ فتح مکہ سے پہلے اور بعد کے حالات پر ایک نوٹ دے دیں۔ اس تاریخی نوٹ کی روشنی میں اس سورت میں آنے والی آیات و نصوص کو اچھی طرح سمجھا جاسکے کہ ان حالات میں یہ تحریک کس طرح گزری اور کس طرح آگے بڑھی

---000---

تحریک اسلامی مکہ مکرمہ میں نہایت ہی شدید حالات میں ابھری' اس کا مقابلہ قریش کے جاہلی معاشرے سے تھا۔ تحریک اسلامی کا کلمہ دعوت لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو قریش کے اس جاہلی معاشرے نے اپنے لئے ایک خطرہ سمجھا' اس لئے کہ یہ کلمہ درحقیقت ان تمام معاشروں اور ان کے اقتدار اعلیٰ کے لئے ایک گونہ بغاوت کا اعلان تھا جن کا اقتدار اعلیٰ اللہ کے اقتدار اعلیٰ اور اللہ کی حکومت سے ماخوذ نہ تھا۔ یہ کلمہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ کلمہ گو نے تمام طاغوتی قوتوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا ہے اور وہ صرف اللہ کی حکومت اور اقتدار کا وفادار ہے۔ پھر قریش کے جاہلی معاشرے نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ یہ نئی دعوت ایک نئی قیادت' قیادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت ایک منظم تحریک کی شکل میں ابھر رہی ہے۔ اور اس نئی تحریک کا شعار پہلے دن سے یہ ہے کہ اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کی جائے اور قریش کی جاہلی اور سرکش اور ظالم قیادت کی اطاعت کا انکار کر دیا جائے۔

جونہی قریش نے درج بالا خطرہ محسوس کیا کہ موجودہ نظام' اس کے مفادات اور اصولوں کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے تو اس جاہلی معاشرے نے تحریک اسلامی کے افراد کے خلاف تشدد اور ظلم کا طوفان کھڑا کر دیا۔ انہوں نے ایک جدید تحریک اور اس جدید سوسائٹی اور اس جدید قیادت کے خلاف وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیئے جو ان کے بس میں تھے۔ جن میں ایذارسانی' سازشیں' اوچھے ہتھیار اور فتنہ پردازیاں سب کچھ شامل تھے۔

قریش کا جاہلی معاشرہ یکلخت اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنا دفاع شروع کر دیا اور اس معاشرے نے بعینہ اسی طرح اپنا بچاؤ شروع کر دیا جس طرح ایک زندہ انسان اپنے آپ کو موت کے خطرات سے بچانا چاہتا ہے۔ اور قریش کے اس جاہلی معاشرے کا یہ ردعمل بالکل فطری تھا' اور جب بھی کوئی دعوت لوگوں کو صرف رب العالمین کی بندگی' ربوبیت اور اقتدار اعلیٰ کی طرف بلانا شروع کرتی ہے' اس وقت کی قائم جاہلی سوسائٹی کا ردعمل ایسا ہی ہوتا ہے' کیونکہ جاہلی سوسائٹی میں انسان انسانوں کے غلام ہوتے ہیں اور اسلامی دعوت صرف رب العالمین کی بندگی کی طرف ہوتی ہے۔ جب بھی دعوت اسلامی ایک عضویاتی تحریک کی شکل میں اٹھے گی جاہلیت' اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑی ہوگی جس طرح نقیض نقیض کے مقابلے میں ہوتا ہے۔

اور اس قسم کی تحریک کا ہر کارکن جاہلی معاشرے کی زد میں آجاتا ہے اور اسے ہر قسم کے فتنوں اور مشقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اور بسا اوقات اس تشدد کے نتیجے میں کارکنوں کا خون بھی بہایا جاتا ہے' جب ایسے حالات ہوتے ہیں تو تحریک اسلامی کی صفوں میں آگر شہادت حق دینے والے صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے فیصلہ کر لیا ہو کہ وہ اللہ کی راہ میں جان تک کا نذرانہ پیش کریں گے۔ اس دعوت اور تحریک اور اس جدید سوسائٹی کی رکنیت ایسے سرفروش ہی اختیار کرتے ہیں جو اذیت' فتنہ سامانیوں' بھوک' افلاس اور شدائد و مصائب برداشت کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں' یہاں تک کہ بعض اوقات انہیں قید و بند اور موت کے لئے بھی تیار ہونا پڑتا ہے۔

مکہ مکرمہ کے عربی معاشرے میں ایسے ہی مضبوط' طاقتور اور اولوالعزم لوگ ہی اسلامی قیادت کی بنیاد بنے۔ وہ لوگ جو مشکلات برداشت کر کے اور شدائد و مصائب انگیز نہ کر کے تحریک میں فوج در فوج داخل ہو گئے تھے وہ دوبارہ جاہلیت کی طرف مرتد ہو کر لوٹ گئے تھے۔ یہ اولوالعزم لوگ تعداد میں بہت ہی کم تھے اور یہ بات بالکل معروف اور کھلی ہے۔ اس لئے کہ ابتداء جاہلیت کو چھوڑ کر اسلام کی مشکل اور پرخطر راہ کو اپنانے کے لئے کوئی تیار نہ تھا ماسوائے ان ممتاز اور مختار اور برگزیدہ لوگوں کے جن کو اس مقصد کے لئے بنایا گیا تھا۔

سابقین مہاجرین ایسے ہی لوگوں میں سے تھے جو نادرۂ روزگار تھے اور یہ اس دین کا بنیادی اثاثہ تھے اور مضبوط بنیاد تھے اور انہوں نے ابتدائی مکی دور میں لبیک کہا۔ یہی لوگ جب مدینہ پہنچے تو یہ اس تحریک کے روح رواں اور دین کے مرکزی ستون تھے۔ ان کے ساتھ مدینہ میں انصار میں سے ایسے ہی اولوالعزم افراد مل گئے۔ ان لوگوں نے اگرچہ وہ مشکلات برداشت نہ کی تھیں جو مہاجرین نے کیں لیکن ان لوگوں نے چونکہ نہایت ہی مشکل حالات میں عقبہ کے مقام پر حضور ؐ کے ساتھ بیعت کی تھی' اس لئے یہ لوگ بھی پاک طینت اور اصلی مزاج کے لوگ تھے اور ان کے اندر وہ بنیادی اوصاف موجود تھے جو اس دین کے حاملین اولین میں ضروری تھے۔ علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں کہتے ہیں "محمد ابن کعب قرظی نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن رواحہ نے بیعت عقبہ کے موقعہ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: آپ اپنے لئے اور اپنے رب کے لئے جو شرائط ہم پر عائد کرنا چاہیں' عائد کر دیں۔ تو اس پر حضور ؐ نے فرمایا میں رب کے لئے تو یہ شرائط عائد کرتا ہوں کہ تم اس کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو' اور اپنے لئے یہ شرط عائد کرتا ہوں کہ تم میری مدافعت اس طرح کرو گے جس طرح تم اپنی جان و مال کی مدافعت کرتے ہو' اس پر لوگوں نے کہا کہ اگر ہم نے ایسا کیا تو ہمارے لئے کیا اجر ہو گا؟ تو حضور ؐ نے فرمایا الجنۃ تو انہوں نے کہا یہ بہت ہی اچھا سودا ہے' نہ ہم اقالہ کرتے ہیں اور نہ دوسرے فریق سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اقالہ کرے۔

یہ لوگ جو حضور ؐ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے' یہ جنت کے بغیر اور کچھ نہ چاہتے تھے۔ انہوں نے بڑے وثوق کے ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا کہ نہ تو وہ اس سودے کو واپس کریں گے اور نہ ہی فریق دوئم کو یہ اجازت دیں گے کہ وہ اس سودے کو ٹالیں۔ اور یہ جانتے تھے کہ یہ بیعت کوئی معمولی بیعت نہ تھی' وہ جانتے تھے کہ اب قریش ان کے پیچھے پڑیں گے اور نہ صرف قریش بلکہ تمام عرب ان پر ٹوٹ پڑیں گے اور وہ اب جاہلیت کے ساتھ مل کر پرسکون زندگی بسر نہ کر سکیں گے جو ان کے ارد گرد خیمہ زن ہے اور جزیرۃ العرب اور مدینہ کے اطراف و اکناف پر حکمران ہے۔

ابن کثیر نے اپنی کتاب البدایہ والنہایہ میں یہ روایت بھی نقل کی ہے "امام احمد نے عبدالرزاق سے' اس نے معمر

ابن خیثم سے 'اس نے ابو الزبیر سے 'اس نے جابر سے 'کہتے ہیں کہ حضور ؐ نے مکہ میں دس سال گزارے 'وہ لوگوں کو ان کے گھروں تک پیغام پہنچاتے 'عکاظ اور المجنۃ کے بازاروں میں ان کا پیچھا فرماتے 'میلوں اور عیدوں پر ان سے خطاب کرتے اور ہر قبیلے سے آپ کا مطالبہ یہی ہوتا 'کون ہے جو مجھے پناہ دے سکتا ہے؟ کون ہے جو میری نصرت کر سکتا ہے؟ تاکہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچا سکوں اور اس کے لئے جنت ہو گی؟" لیکن کوئی اس کام کے لئے تیار نہ ہوتا کہ آپ کو پناہ دے اور نصرت کرے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص یمن اور علاقہ مضر سے سفر پر نکلتا تو اس کو اس کے رشتہ دار متنبہ اور خبردار کر دیتے کہ ذرا قریش کے نوجوان سے بچ کر رہنا 'تمہیں فتنے میں نہ ڈال دے۔ اور جب حضور ؐ ان لوگوں کے درمیان دعوت کے سلسلے میں پھرتے تو وہ انگلیوں سے اشارے کرتے۔ لیکن اللہ کا کرنا ایسا تھا کہ اللہ نے یثرب سے ہمیں اٹھایا اور ہم نے آپ کو پناہ دی 'ہم نے اس کی تصدیق کی۔ ہم میں سے لوگ مکہ جاتے 'قرآن سیکھتے اور یہ شخص جب واپس آتا تو اس کے اسلام کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی مسلمان ہو جاتے۔ یہاں تک کہ انصار کے گھروں میں سے کوئی گھرانا ایسا نہ رہا جس میں علی الاعلان اسلام کا اظہار کرنے والے کئی لوگ نہ ہوں۔ اس کے بعد ہم نے مشورہ کیا کہ کب تک ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حال پر چھوڑیں گے کہ وہ مکہ کی پہاڑیوں میں پھریں اور لوگ ان کو مسترد کریں اور وہ خوف کی حالت میں ہوں۔ ہم میں سے ستر آدمی موسم حج میں جا کر آپ سے ملے۔ ہم نے عقبہ کی پہاڑی پر اجتماع رکھا۔ ہم ایک ایک 'دو دو آدمی وہاں پہنچے۔ سب جمع ہو گئے۔ ہم نے حضور ؐ سے کہا کہ ہم کس بات پر آپ کی بیعت کریں؟ تو حضور ؐ نے فرمایا: "آپ لوگ سمع اور اطاعت پر بیعت کریں 'چستی میں بھی اور سستی میں بھی اور خرچ پر بیعت کریں خواہ اسیری ہو یا غربت 'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر بیعت کریں۔ یہ کہ تم حق کہو گے اور اس میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کرو گے اور اس پر کہ تم میری مدد کرو گے 'اور جب میں مدینہ آگیا تو میرا دفاع کرو گے۔ جس طرح تم اپنی ذات 'اپنی بیویوں 'اپنے بچوں کا دفاع کرتے ہو اور تمہیں اس کے بدلے جنت ملے گی۔" اس پر ہم اٹھے اور اسعد ابن زرارہ نے حضور ؐ کا ہاتھ لیا اور وہ سب سے چھوٹے تھے۔ بیہقی کی روایت میں ہے کہ وہ ستر افراد میں سے چھوٹے تھے ماسوائے میرے۔ اس پر اسعد نے فرمایا: "اہل یثرب ذرا جلدی نہ کرو 'ہم حضور ؐ تک یہ طویل سفر کر کے محض اس لئے آئے ہیں کہ آپ رسول خدا ہیں اور آج اسے نکال کر لے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمام عرب اقوام کو چیلنج کر رہے ہیں 'ہم اپنے بلند مرتبہ لوگوں کو قتل کر رہے ہیں 'اور ہر طرف سے تمہیں تلواریں کاٹ رہی ہوں گی۔ اب تم اگر ایسے لوگ ہو کہ یہ سب کچھ برداشت کر سکو تو لو یہ بیعت اور اس کا اجر اللہ پر ہے۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم ایسے لوگ ہو جو اس بات سے ڈرتے ہو تو ابھی وقت حضور ؐ کو چھوڑ دو اور یہ بات صاف صاف کہہ دو اور اللہ کے نزدیک تم معذور تصور ہو گے۔" اس پر لوگوں نے کہا: اسعد ذرا ٹھہرو 'خدا کی قسم ہم یہ بیعت ضرور کریں گے اور کوئی اسے ہم سے سلب نہ کر سکے گا۔ چنانچہ ہم لوگ کھڑے ہو گئے اور بیعت کر لی۔ آپ نے ہم سے بیعت لی اور شرائط عائد کیں اور یہ وعدہ کیا کہ اس پر ہمیں جنت ملے گی۔ (اس کو امام احمد نے بھی نقل کیا ہے اور بیہقی نے بواسطہ داؤد ابن عبدالرحمن عطار روایت کی ہے۔ امام بیہقی حاکم سے یحییٰ بن مسلم تک زیادہ سند کے ساتھ روایت کی۔ ... دونوں نے پھر عبداللہ عثمان ابن خیثم سے ابو ادریس سے۔ اسی طرح یہ سندیں عمدہ ہیں اور مسلم کی شرائط پر ہیں۔ ... نے اسے روایت نہیں کیا ہے۔ بزار نے کہا ہے کہ ابن خیثم کے علاوہ کئی لوگوں نے اسے روایت کیا ہے لیکن اس کے

بارے میں ہمیں معلوم نہیں ہے کہ اس نے جابر سے اس طریقے کے سوا اور کوئی روایت کی ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ انصار کو یہ علم تھا اور یہ یقینی علم تھا کہ اس بیعت کے نتائج کیا ہوں گے اور انہوں نے یہ بات بھی اچھی طرح جان لی تھی کہ حضور ؐ نے ان کے ساتھ اس دنیا کے اندر کسی اجر و صلہ کا وعدہ نہیں فرمایا۔ یہاں تک کہ حضور ؐ نے ان کے ساتھ یہ وعدہ بھی نہیں کیا کہ تمہیں اس دنیا میں اس مقصد میں کامیابی نصیب ہو گی ماسوائے جنت کے۔ ان کے ساتھ کوئی اور وعدہ نہ تھا۔ یہ تھی ان کے فہم دین کی انتہا اور یہ تھی ان کی چاہت جو وہ اس دین کے ساتھ رکھتے تھے۔ لہٰذا یہ لوگ سابقون اولون کے مقام بلند پر فائز ہوئے اور یہ لوگ مہاجرین کے اولین ساتھیوں میں قرار پائے جنہوں نے تعمیر دین کی بنیادوں میں حصہ لیا اور اس عمارت کو تیار کیا۔ یہ لوگ مدینہ کی سوسائٹی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے تھے۔

لیکن مدینہ کا معاشرہ اور جماعت اسی طرح مخلص اور صاف رہی۔ اسلام کا ظہور مدینہ سے ہوا۔ وہ اس کے اندر دور تک پھیل گیا اور بہت سے لوگ خصوصاً ان میں سے صاحب مرتبہ اور سربراہ قسم کے لوگوں نے بھی اپنی قوم کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دیا تاکہ ان کی لیڈرشپ قائم رہے۔ جب جنگ بدر کا عظیم واقعہ پیش آگیا تو اس قسم کے لوگوں کے سرخیل عبد ابن ابی ابن سلول نے اس پر یہ تبصرہ کیا کہ یہ معاملہ تو اب بہت آگے نکل گیا ہے۔ اس لئے اس نے نفاق کے طور پر اسلام قبول کر لیا۔ یہ بات ضروری ہے کہ بعض لوگوں کو اسلام کا سیلاب بہاکر لے گیا اور انہوں نے دوسروں کی تقلید میں اسلام قبول کر لیا۔ اگرچہ یہ مقلد قسم کے لوگ منافق نہ تھے لیکن ان لوگوں نے اسلام کو ابھی تک اچھی طرح نہ سمجھا تھا اور نہ وہ اسلامی قالب میں اچھی طرح ڈھل گئے تھے' اس کی وجہ سے مدینہ کی اسلامی سوسائٹی میں افراتفری تھی کیونکہ مختلف لوگ ایمان کے مختلف درجات پر فائز تھے۔

قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اس قسم کے لوگوں کی تربیت شروع کی۔ چونکہ ایمان و اخلاق کے مختلف درجات کے لوگ اس سوسائٹی میں داخل ہو گئے تھے' اس لئے ضروری تھا کہ ان مختلف عناصر کے اندر توازن اور توافق اور ہم آہنگی پیدا کی جائے اور جدید سوسائٹی مضبوط بنیادوں پر استوار ہو۔

جب ہم مدنی سورتوں کا مطالعہ ترتیب نزولی کے مطابق کریں (اگرچہ یہ ترتیب اندازاً معلوم ہے) تو معلوم ہو گا کہ قرآن نے اسلامی معاشرے میں مسلسل داخل ہونے والے جدید عناصر کی تربیت اور تطہیر کے لئے مسلسل جدوجہد جاری رکھی کیونکہ آنے والے لوگ مختلف خاندانوں اور مزاجوں کے تھے اور مسلسل آ رہے تھے۔ قریش اگرچہ لوگوں کو دین اسلام میں داخل ہونے سے روکتے تھے اور تمام عرب قبائل کو وہ اس دین کے خلاف آمادہ جنگ کرتے تھے۔ اسی طرح یہودی بھی اس دین کی راہ میں رکاوٹ تھے اور وہ بھی رات دن لگے ہوئے تھے کہ تمام اقوام اس دین جدید پر حملہ آور ہوں اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ اس لئے جدید آنے والے لوگوں کی تربیت کی بہت ضرورت تھی۔

تربیت اور تطہیر کی اس مسلسل جدوجہد کے باوجود کبھی کبھار خصوصاً مشکل اور شدید وقت میں اسلامی صفوں میں کمزوریوں کا ظہور ہو جاتا تھا۔ بعض گوشوں میں نفاق ابھرتا' بعض میں تردد اور غیر یقینی صورت حال ہوتی۔ بعض لوگ دین جدید کی راہ میں مال خرچ کرنے میں بخل کرتے۔ بعض لوگ خطرات کا سامنا کرنے سے ڈرتے۔ بعض اوقات لوگ یہ نہ سمجھ سکتے کہ ان کے مابین اسلامی رابطے اور تعلق کا کیا مقام ہے اور ان کی سابقہ جاہلی رشتہ داریوں اور روابط کی

حیثیت اب کیا ہے؟ وہ اسلامی بھائی چارے کو اچھی طرح نہ سمجھتے تھے۔ اس سورت کی آیات سے ہمیں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ آیات قرآنیہ مختلف طریقوں سے اور مختلف زاویوں سے ایسے لوگوں کی تربیت کس طرح کرتی ہیں اور اس کے لئے کیا کیا اسلوب اختیار کرتی ہیں۔ ان آیات میں سے ہم بعض آیات کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ (۵) يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (۶) وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (۷) لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (۸) (۹: ۵ تا ۸) "جیسا کہ تیرا رب تجھے حق کے ساتھ تیرے گھر سے نکال لایا تھا اور مومنوں میں سے ایک گروہ کو یہ سخت ناگوار تھا۔ وہ اس حق کے معاملہ میں تجھ سے جھگڑ رہے تھے۔ در آں حالیکہ وہ صاف صاف نمایاں ہو چکا تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ آنکھوں دیکھے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں۔ یاد کرو وہ موقعہ جب کہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا۔ تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق حق ہو کر اور باطل باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۷) رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (۸) رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (۳: ۷ - ۹) "اللہ وہ ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی۔ اس میں بعض آیتیں محکم ہیں۔ وہی اصل کتاب ہیں اور بعض دوسری آیتیں متشابہ ہیں، تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ فتنے کی تلاش میں ان آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جو متشابہ ہیں۔ اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ان کا مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا مگر جو لوگ علم میں پختہ ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ان پر ہمارا ایمان ہے۔ یہ سب ہمارے رب کی طرف

سے ہے اور حقیقت یہ ہے کہ نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو دانشمند ہیں ۔اے ہمارے رب ‘ہمیں سیدھی راہ پر لگا دینے کے بعد ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر ۔ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا کر ‘ اے ہمارے رب تو یقیناً تمام لوگوں کو ایک دن جمع کرنے والا ہے جس میں شک نہیں ۔ بے شک اللہ وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا ۔“

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ
أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ وَاللَّهُ
يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ (١١) لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ وَلَئِنْ قُوتِلُوا لَا
يَنْصُرُونَهُمْ وَلَئِنْ نَصَرُوهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ (١٢) لَأَنْتُمْ أَشَدُّ رَهْبَةً فِي
صُدُورِهِمْ مِنَ اللَّهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ (٥٩ : ١١ – ١٣) ”کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے منافقت کی ۔وہ اپنے کافر اہل کتاب بھائیوں سے کہتے ہیں کہ اگر تم گھروں سے نکالے گئے تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل کھڑے ہوں گے اور تمہارے بارے میں ہم کسی کی بات نہ مانیں گے ۔ اور تم سے جنگ کی گئی تو ہم ضرور تمہاری مدد کریں گے مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہ نکلیں گے ۔اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی مدد نہ کریں گے اور اگر یہ ان کی مدد کریں بھی تو پیٹھ پھیر جائیں گے ۔پھر ان کو کوئی مدد نہ ملے گی ۔ تمہاری ہیبت تو ان کے دلوں میں اللہ سے بڑھ کر ہے یہ اس لئے کہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں ۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ
رِيحًا وَجُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا (٩) إِذْ جَاءُوكُمْ مِنْ
فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ
بِاللَّهِ الظُّنُونَا (١٠) هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا (١١) وَإِذْ
يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا
(١٢) وَإِذْ قَالَتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ
مِنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ إِنْ يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا (١٣)
وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِنْ أَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَآتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوا بِهَا إِلَّا يَسِيرًا

(۳۳: ۹ – ۱٤) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو، جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر آندھی بھیج دی۔ اور ایسی فوجیں جو تم کو دکھائی نہیں دیتی تھیں اور جو کچھ تم کر رہے تھے، اللہ دیکھ رہا تھا۔ جب تمہارے اوپر کی طرف سے اور تمہارے نیچے کی طرف سے تم پر چڑھ آئے اور جب آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے منہ کو آ گئے اور اللہ کے بارے میں تم لوگ گمان کرنے لگے۔ اس موقعہ پر ایمان والے آزمائے گئے اور بری طرح جھنجھوڑ دیے گئے اور جب منافقین نے اور ان لوگوں نے جن کے دلوں میں روگ تھا کہنا شروع کیا کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ نرا دھوکہ تھا اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب کے لوگو، تمہارے لئے اب ٹھہرنے کا موقعہ نہیں ہے، پس اپنے گھروں کو واپس جاؤ اور ان میں سے ایک فریق نبی سے یہ کہہ کر رخصت مانگ رہا تھا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں حالانکہ وہ غیر محفوظ نہ تھے۔ وہ جنگ سے بھاگنا چاہتے تھے۔ اگر وہ شہر کے اطراف سے گھس آئے ہوتے۔ اور ان سے فساد کو کہا جاتا تو یہ اسے مان لیتے اور اس میں ذرا بھی دیر نہ کرتے۔"

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا (۷۱) وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا (۷۲) وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا (۷۳) (٤: ۷۱ تا ۷۳) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی حفاظت اور تیاری میں لگے رہو۔ پھر نکلو الگ الگ گروہوں میں ہو کر یا اکٹھے ہو کر اور یقیناً تم میں کوئی ایسا بھی ہے جو دیر کرے۔ پھر اگر کوئی مصیبت آ پڑے تو کہتا ہے کہ اللہ نے مجھ پر بڑا ہی احسان کیا کہ ان لوگوں کے ساتھ نہ تھا اور اگر تم پر اللہ کا فضل ہو تو بول اٹھے کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا کوئی رشتہ تھا ہی نہیں کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑی کامیابی حاصل کر لیتا۔"

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (۷۷) اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَالِ هٰۤؤُلَاۤءِ الْقَوْمِ لَا

يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا (۷۸) (٤ : ۷۷ — ۷۸)) "کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا' جن کو حکم دیا گیا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو' پھر جب ان پر قتال فرض کر دیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ انسانوں سے ایسا ڈرنے لگا جیسے اللہ سے ڈرا جاتا ہے یا اس سے بھی بڑھ کر۔ وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب تو نے ہم پر جنگ کیوں فرض کر دی اور مہلت کیوں نہ دی' کہہ دو' اس دنیا کا سرمایہ بہت قلیل ہے اور جو شخص تقویٰ اختیار کرے اس کے لئے آخرت ہی بہتر ہے۔ اور تم لوگوں کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہوگی۔ تم کہیں بھی ہو' موت تمہیں پا لے گی۔ اگرچہ تم مضبوط قلعوں میں کیوں نہ ہو۔ اور ان لوگوں کو اگر کچھ فائدہ پہنچ جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ تمہاری طرف سے ہے۔ تم کہو کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ بات ہی نہیں سمجھتے۔"

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْئَلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ (۳٦) اِنْ يَّسْئَلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ (۳۷) هٰاَنْتُمْ هٰؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِىُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ (۳۷) (٤۷ : ۳٦ — ۳۸) "دنیا کی زندگی تو بس ز اکھیل تماشا ہے۔ اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ تمہارے اجر تمہیں عطا کرے گا۔ اور تمہارے مال تم سے طلب نہیں کرے گا۔ اور اگر وہ تم سے تمہارے مال طلب کرے پھر انتہا درجے تک تم سے طلب کرتا رہے تو تم ضرور بخل کرنے لگو اور وہ تمہاری ناگواری ظاہر کر دے۔ تم وہ لوگ ہو کہ تمہیں دعوت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اس پر بھی تم میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو بخل کرتے ہیں اور جو بخل کرتا ہے تو درحقیقت وہ خود اپنے سے بخل کرتا ہے۔ ورنہ اللہ تو بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو۔ اور اگر تم منہ موڑو گے تو وہ دوسری قوم کو لا بٹھائے گا اور وہ تم جیسی نہ ہوگی۔"

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (١٤) اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (١٥) اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (١٦) لَنْ تُغْنِىَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (١٧) يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ

لَكُمْ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْكَاذِبُونَ (۱۸) اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنسَاهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ (۱۹) إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ (۲۰) كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ (۲۱) لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۲۲) (۵۹: ۱۴ تا ۲۲))

”کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ جنہوں نے ایسے گروہ کو دوست بنایا جن پر اللہ کا غضب ہے اور وہ لوگ نہ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے اور باوجود یہ کہ وہ جانتے ہیں اور پھر بھی جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بہت برا کر رہے ہیں انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے رسواکن عذاب ہے۔ ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ سے انہیں ذرا نہ بچا سکیں گے۔ وہ ہیں دوزخ والے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ جس دن اللہ ان کو اٹھائے گا تو وہ اس کے آگے قسمیں کھائیں گے جس طرح تمہارے آگے اٹھاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ خوب کر رہے ہیں۔ خوب جان لو وہ جھوٹے ہیں۔ ان پر شیطان مسلط ہو چکا ہے اور اس نے ان کو اللہ کی یاد بھلا دی ہے۔ وہ شیطان کے گروہ کے لوگ ہیں' سن لو' شیطان کا گروہ ہی خسارے میں رہنے والا ہے۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں یقیناً وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں' اللہ تو لکھ چکا ہے کہ ہم اور ہمارے پیغمبر ہی غالب ہو کر رہیں گے۔ بلاشبہ اللہ ہی بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔ تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہوں وہ ایسوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں خواہ وہ لوگ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے کنبے کے ہی ہوں' یہی ہیں جن کے دلوں میں ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کی مدد کی ہے۔ اور وہ ان کو باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی' ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ وہ اللہ کا گروہ ہیں اور اللہ کا گروہ ہی فلاں پانے والا ہے۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ

وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۵۱) فَتَرَى الَّذِيْنَ
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ
يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ (۵۲)
وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ حَبِطَتْ
اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ (۵۳) (۵: ۵۱ تا ۵۳) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان کو دوست بنائے گا تو وہ بے شک ان ہی میں سے ہو گا۔ یقیناً اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھاتا۔ تم دیکھتے ہو کہ جن لوگوں کے دلوں میں روگ ہے' وہ ان لوگوں کی طرف دوڑے جارہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم ڈرتے ہیں کہ کسی مصیبت کے چکر میں نہ آجائیں۔ تو وہ وقت دور نہیں جب اللہ تمہیں فتح دے یا اپنی طرف سے کوئی بات لے آئے تو یہ لوگ اس بات پر نادم ہو جائیں جو وہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ اور اہل ایمان کہیں گے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو بڑے زور و شور سے اللہ کی قسمیں کھایا کرتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ان کے تمام اعمال اکارت گئے اور یہ سراسر نقصان میں آگئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ
قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ
رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ
وَ اَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَ مَآ اَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (۱)
اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّ يَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ
وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ (۲) لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَ لَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَفْصِلُ
بَيْنَكُمْ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۳) قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ
الَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ
بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ

لَاَبِيهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَ مَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْءٍ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَ اِلَيْكَ اَنَبْنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (٤) (٦٠ : ١ تا ٤) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم ہماری راہ میں جہاد کرنے اور ہماری رضا جوئی کے لئے نکلے ہو تو ہمارے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ کہ تم ان کے ساتھ دوستی ڈالتے۔ حالانکہ تمہارے پاس جو حق آیا ہے وہ اس کا انکار کر چکے ہیں۔ رسول کو اور تم کو صرف اس بات پر نکالتے ہیں کہ تم اپنے رب پر ایمان لائے ہو۔ تم چپکے چپکے ان کو دوستانہ پیغام بھیجتے ہو' حالانکہ ہم جانتے ہیں جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور جو علانیہ کرتے ہو اور جو تم میں سے ایسا کرے وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔ اگر یہ تم پر قابو پائیں تو تمہارے دشمن ہو جائیں اور تم پر برائی کے ساتھ دست درازی کریں اور زبان درازی کریں۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ۔ قیامت کے دن نہ تمہاری رشتہ داریاں تمہارے کام آئیں گی اور نہ تمہاری اولاد۔ اس دن اللہ تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ تمہارے لئے اچھا نمونہ تو ابراہیم" اور اس کے ساتھیوں میں ہے۔ جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کی تم عبادت کرتے ہو' قطعی بیزار ہیں۔ ہم تمہارا انکار کرتے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت ہو گئی۔ جب تک تم اللہ وحدہ پر ایمان نہ لاؤ مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ میں آپ کے لئے مغفرت کی دعا ضرور کروں گا' اگرچہ آپ کے لئے اللہ کی طرف سے کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ اے ہمارے رب ہم نے تجھ ہی پر بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں اور تیری ہی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔"

مختلف سورتوں میں یہ دس شواہد ہمارے مدعا کے لئے کافی ہیں کہ اسلامی معاشرہ میں بعض اوقات اس قسم کے عارضی حالات پیش آتے تھے اور یہ اس لئے پیش آتے تھے کہ اسلامی معاشرے میں اچانک نئے لوگوں کا ایک ریلا داخل ہو گیا تھا جو اپنے ساتھ اپنی پرانی عادات لے کر آئے تھے۔ اور یہ عادات مسلسل تربیت اور تطہیر کے بعد ہی دور ہو سکتی تھیں اور اس کے لئے مسلسل تربیتی جدوجہد کی ضرورت تھی۔

لیکن مدینہ طیبہ میں مسلم معاشرے کا بنیادی ڈھانچہ درست تھا' اس لئے کہ اس ڈھانچے میں بنیادی اہمیت صرف ان لوگوں کو حاصل تھی جو مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین تھے اور نہایت ہی مضبوط لوگ تھے۔ نیز اس معاشرے کی تعمیر و تربیت میں اتحاد و اتفاق اور اس کے ڈھانچے میں اس قدر پختگی تھی اس نے ان کمزوریوں اور عوارض اور انتشار پر قابو پا لیا تھا اور وہ عناصر جو خوف اور پریشانی سے متاثر ہو جاتے تھے اور جن کی ابھی تک پوری تربیت نہ ہوئی تھی اور وہ اس جدید معاشرے میں ابھی تک ڈھل نہ گئے اور ان کے اندر پوری ہم آہنگی پیدا نہ ہوئی تھی ان کو بھی اجتماعی معاشرتی نظام سنبھالا دیتا تھا۔

بہرحال آہستہ آہستہ یہ جدید عناصر تربیت پا رہے تھے۔ اس معاشرے میں ڈھل رہے تھے اور ان کی تطہیر مسلسل ہو رہی تھی اور وہ اسلامی معاشرے کی اصل قوت کے ساتھ ملتے رہتے تھے۔ اور ضعیف القلب' نافرمانی کرنے والوں اور ڈھل مل یقین قسم کے لوگوں کی تعداد روز بروز کم ہو رہی تھی۔ مفادات سے ڈرنے والے اور ایسے لوگ جن کے دلوں میں ابھی تک اسلامی نظریہ حیات پوری طرح نہ بیٹھا تھا کہ وہ اپنے سوشل روابط بھی اسی نظریہ کی اساس پر استوار کریں

یہاں تک کہ فتح مکہ سے پہلے حالت یہ ہو گئی تھی کہ اسلامی معاشرہ تعلیم و تربیت اور اپنی ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے مقام کمال کے قریب پہنچ گیا تھا اور اکثر لوگ مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین کے نقش قدم پر چل پڑے تھے۔ اور یہ معاشرہ اس قدر پاک اور تربیت یافتہ ہو گیا تھا کہ وہ اسلامی نظام حیات کے پیش نظر مطلوبہ معیار کے قریب تر تھا۔

یہ بات درست ہے کہ ابھی تک اس معاشرے میں ایسی قدریں نشوونما پا چکی تھیں کہ جن کا تعلق براہ راست اسلامی نظریات کے ساتھ تھا۔ ان اقدار کی وجہ سے تحریک کے اندر کچھ لوگ زیادہ ممتاز تھے اور زیادہ ثابت قدم تھے اور تحریک کی صفوں میں اوروں سے آگے تھے۔ مثلاً مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین' اہل بدر' حدیبیہ میں بیعت رضوان کرنے والے۔ پھر جن لوگوں نے فتح مکہ سے قبل جہاد' انفاق اور قتال میں حصہ لیا اور جنہوں نے بعد میں لیا۔ نصوص کتاب اللہ' احادیث نبوی اور تحریک کے بعض عملی اقدامات سے یہ تفاوت مراتب اور اقدار کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ اسلامی اقدار اور تفاوت اسلامی نظریہ حیات کو آگے بڑھانے کے نقطہ نظر سے متعین ہوئیں۔ قرآن مجید کی تصریحات

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۹ : ۱۰۰) "وہ مہاجرین و انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی' نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے' اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ نے ان کے لئے ایسے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔

ایک حدیث کے الفاظ میں یہ بھی ہے "شاید اللہ نے اہل بدر کو یہ اطلاع کر دی ہو کہ تم جو چاہو کرو' بس درحقیقت تمہارے لئے جنت واجب ہو چکی ہے۔" یہ بخاری کی حدیث کا ایک حصہ ہے۔ ان الفاظ میں حضرت عمرؓ کی اس تجویز کو مسترد فرمایا جس میں انہوں نے ایک بدری صحابی حضرت حاطب ابن ابی بلتعہ کی گردن اڑانے کی اجازت طلب فرمائی تھی' جنہوں نے یہ کمزوری دکھائی تھی کہ قریش کو فتح مکہ کی تیاریوں کے سلسلے میں اطلاع دی تھی جسے پکڑ لیا گیا تھا۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا (۱۸) وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۱۹) (۴۸ : ۱۸ — ۱۹) "اللہ مومنین سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے اور اللہ کو معلوم تھا' جو کچھ ان کے دلوں میں تھا۔ اس لئے ان پر سکینت نازل فرمائی۔ اور ان کو فتح بھی دے دی۔ اور بہت سی غنیمتیں بھی دیں جنہیں یہ لوگ لے رہے ہیں اور اللہ زبردست اور حکمت والا

ہے۔"

لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی وَ اللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ

(۵۷ : ۱۰) "تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور دشمنوں سے لڑے وہ لوگ بڑا درجہ رکھتے ہیں ان سے جنہوں نے بعد میں خرچ کیا اور دشمن سے لڑے۔ اگرچہ دونوں سے اللہ نے اچھے وعدے فرمائے ہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔"

"خالد ذرا آرام سے رہو' میرے ساتھیوں کو چھوڑ دو' خدا کی قسم اگر تمہارے پاس اور جتنا سونا بھی ہو اور تم اسے فی سبیل اللہ خرچ کر دو تو تم وہ ثواب نہیں کما سکتے جو انہوں نے صبح و شام جہاد میں حصہ لے کر کمایا۔" یہ حدیث ابن قیم نے زاد المعاد میں نقل کی ہے۔ یہ الفاظ حضور ؐ نے حضرت خالد کو متنبہ کرتے ہوئے کہے۔ جب انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کے ساتھ تلخ کلامی کی۔ خالد اگرچہ سیف اللہ تھے مگر ابن عوف سابقون اولون میں سے تھے۔ "میرے ساتھیوں کو چھوڑ دو۔" حضور ؐ کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی معاشرہ میں یہ ممتاز طبقہ ہے۔

اسلامی تحریک نے ان حضرات کے دلوں میں جو ایمان پیدا کیا اور اس کے نتیجے میں ان کے اندر جو قدریں پیدا ہوئیں ان کے اختلاف کے مطابق ان کے درجے بھی مختلف تھے' لیکن فتح مکہ سے قبل یہ تفاوت بہت کم ہو گیا تھا اور اسلامی معاشرہ پوری طرح ہم آہنگ تھا اور اس کی ناہمواریاں پوری طرح چھپ گئی تھیں۔ ان کی اکثر کمزوریاں دور ہو گئی تھیں اور جان و مال کے سلسلے میں ان کی شخصیات میں سے بخل دور ہو گیا تھا۔ ان کے عقائد واضح ہو گئے تھے اور ان کی زندگی سے نفاق پوری طرح دور ہو گیا تھا اور فتح مکہ سے قبل مدنی معاشرہ کی حالت یہ تھی کہ وہ ایک مکمل اسلامی معاشرہ بن گیا تھا جو اسلامی انقلاب کی اساس تھا۔

مگر جب سن آٹھویں ہجری میں مکہ فتح ہوا اور اس کے بعد جنگ حنین کے نتیجے میں ہوازن ثقیف اور دوسرے قبائل فتح ہو گئے۔ یہ دو قبائل قریش کے بعد عرب کی ممتاز قوتیں تھیں۔ تو انسانوں کا ایک سیلاب اسلامی معاشرے میں داخل ہو گیا تھا۔ ایمان و اخلاق کے اعتبار سے یہ مختلف سطح کے لوگ تھے۔ ان لوگوں میں منافقین کی ایک بڑی تعداد بھی تھی جو اسلام کو دل سے ناپسند کرتے تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو اسلام کی شوکت کو دیکھ کر بہہ گئے تھے۔ ان میں مؤلفۃ القلوب بھی تھے اور یہ طبقات ایسے تھے کہ وہ اسلامی قالب میں ابھی تک ڈھل نہ گئے تھے اور نہ ان کی پوری تربیت ہوئی تھی۔ اسلام کی حقیقی روح سے یہ نئے لوگ نابلد تھے۔

جزیرۃ العرب میں اسلام کے پھیلاؤ کی راہ میں قریش ایک دیوار اور بند کی طرح کھڑے تھے' کیونکہ دینی اور دنیاوی معاملات میں قریش کو ایک بڑا مقام حاصل تھا۔ پھر ادبی' ثقافتی اور علمی و اقتصادی اعتبار سے بھی وہ دوسرے عربوں کے لئے قابل تقلید تھے۔ اس وجہ سے ان کا مقابلے پر اتر آنا اور اس دین کی راہ روک دینا اس بات کا باعث ہوا کہ تمام عرب نے اس دین سے منہ پھیر لیا۔ اور اسلام میں داخل نہ ہوئے' یا اگر انہوں نے صرف نظر نہ کیا تو کم از کم یہ صورت

حالات ضرور تھی کہ لوگ تردد میں رہے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ انتظار کیا جائے' تاکہ مسلمانوں اور قریش کی کشمکش کا کوئی فیصلہ ہو جائے۔ جب فتح مکہ کے بعد قریش سرنگوں ہوئے تو ہوازن وثقیف بھی سرنگوں ہو گئے۔ مدینہ میں جو قوی یہودی قبائل تھے' ان کی قوت اس سے پہلے ہی ٹوٹ گئی تھی۔ بنی قینقاع اور بنو نضیر شام کی طرف جلاوطن ہو گئے۔ بنو قریظہ بھی ختم ہو کر رہ گئے اور خیبر کا معاملہ بھی صاف ہو گیا تھا۔ خیبر کو فتح کر لیا گیا۔ ان واقعات کی وجہ سے اب پورے جزیرۃ العرب میں اسلام پھیل گیا اور لوگ فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہونے لگے اور صرف ایک سال کے عرصے میں لوگ دین اسلام میں داخل ہو گئے۔

اسلام کا گراف افقی طور پر بلند ہونے کی وجہ سے وہ کمزوریاں اسلامی صفوں میں در آئیں جو جنگ بدر کی حیران کن کامیابی کی وجہ سے آ گئی تھیں۔ اب یہ کمزوریاں بہت بڑے پیمانے پر تھیں۔ بدر الکبریٰ کے بعد جو کمزور عناصر اسلامی صفوں میں در آئے تھے ان کو تعلیم و تربیت کے ذریعے اس قدر پاک و صاف کر دیا گیا کہ بدر الکبریٰ کے بعد فتح مکہ تک ست سالوں میں قریب تھا کہ مدنی معاشرہ تمام کمزوریوں سے پاک ہو جائے اور اہل مدینہ اسلامی انقلاب کے لئے مضبوط میں اور مضبوط بنیاد بن جائے۔ یہاں اولین' مہاجرین و انصار کی ایک ایسی جمعیت تیار بیٹھی تھی کہ وہ ہر وقت اسلامی نظام کے لئے امین تھی۔ اگر یہ جمعیت نہ ہوتی تو اس عظیم انقلاب کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ لیکن بدر الکبریٰ کے بعد اس جمعیت نے جو مہاجرین و انصار کے سابقین اولین پر مشتمل تھی اس عظیم انقلابی امانت کی مسلسل نگہبانی کی۔ ان سات سالوں میں اللہ تعالیٰ نے مدینہ طیبہ کی اس جمعیت کو اس کام کے لئے تیار کیا اور تربیت دی کہ یہ لوگ فتح عظیم کے بعد اسلام میں داخل ہونے والے انسانوں کے سیلاب کو کنٹرول کر سکیں۔ اللہ خوب جانتا تھا کہ وہ اپنی اس رسالت اور انقلابی رسالت کی حفاظت کا کام کس کے سپرد کرے۔

ان کمزوریوں کا سب سے پہلے ظہور یوم حنین میں ہوا۔ اس کا تذکرہ سورت توبہ میں ان الفاظ میں ہوا ہے :

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ (۲۵) ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ (۲۶) (۹:۲۵ — ۲۶) "اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوہ حنین کے روز۔ اس روز تمہیں اپنی کثرت تعداد کا غرہ تھا۔ مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول ؐ پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے۔ اور منکرین حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کا جو حق کا انکار کریں۔"

اس جنگ میں ابتدائی شکست کا پہلا سبب یہ تھا کہ دس ہزار اسلامی لشکر میں دو ہزار طلقاء شریک تھے ..... یہ یوم فتح

مکہ پر ایمان لائے تھے اور اسلامی لشکر کے ساتھ جہاد کے لئے نکلے تھے۔ چنانچہ اسلامی لشکر کے ساتھ ان دو ہزار افراد کا وجود ہی اس انتشار کا سبب بنا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ ہوازن نے بالکل اچانک حملہ کیا اور لشکر اسلام چونکہ صرف مدینہ طیبہ کی حقیقی تربیت یافتہ فوج پر مشتمل نہ تھا' جن کی تربیت گزشتہ سات سالوں میں مکمل ہو چکی تھی اور جو اس تحریک کی اصل اساس اور سرمایہ تھے۔ اس لئے انتشار پیدا ہو گیا۔

غزوۂ حنین میں جو کمزوریاں سامنے آئیں وہ اسلام کی عددی قوت کے گراف اچانک عمودی بلندی کی وجہ سے تھیں۔ جدید لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے۔ جو ایمان اور اخلاص کے اعتبار سے مختلف درجات کے لوگ تھے۔ جن کے درمیان تفاوت درجات تھا۔ اور سورت توبہ میں ان کمزوریوں سے بحث کی گئی ہے اور پھر مختلف زاویوں سے اور مختلف پہلوؤں سے سخت تنقید کی گئی ہے۔ جن کے تفصیلی اقتباسات ہم اس سے قبل دے آئے ہیں۔

اسلامی معاشرے کی تشکیل اور اس کی تربیت کی تاریخ کے مطالعے کے لئے ضروری ہے کہ ہم فتح مکہ کے ٹھیک دو سال بعد کی تاریخ کے واقعات پر نظر ڈالیں۔ ٹھیک دو سال بعد جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو تمام جزیرۃ العرب ایک بار مرتد ہو گیا۔ صرف مدینہ کی تربیت یافتہ اسلامی سوسائٹی اپنی جگہ پر قائم رہی اور جیسا کہ ہم نے کہا' یہی اسلامی معاشرے کی مضبوط بنیاد تھی۔ چنانچہ ان حالات کو اگر نظر میں رکھا جائے تو ان کمزوریوں کے ظہور کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ فتح مکہ کے بعد صرف دو سال کے عرصے میں یہ ممکن نہ تھا کہ اسلام میں داخل ہونے والے لوگوں کی اخلاقی تربیت اور تطہیر کردار کے کام کو مکمل کیا جا سکے۔ جبکہ آنے والوں کا معیار درجہ ایمانی کے اعتبار سے مختلف تھا۔ حضور ؐ کے انتقال کے بعد حالت یہ تھی کہ پورا جزیرۃ العرب فکری انتشار و خلفشار کا شکار تھا اور مدینہ طیبہ کا بیس (Base) اپنے موقف پر سختی سے قائم تھا۔ اپنی مضبوطی اور پختگی کے بل بوتے پر اور اپنے اتحاد اور یگانگت کے ذریعے سے اس انتشار اور سیلاب کے مقابلے میں یہ سوسائٹی جم گئی اور انسانوں کے اس سیلاب کو غلط بہاؤ سے روک کر اس کا دھارا پھر اسلام کی طرف پھیر دیا۔

ان حقائق کو اس زاویہ سے دیکھنے کے بعد ہمیں اچھی طرح یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ مکہ میں دعوت اسلامی کو جن مشکلات اور مصائب سے دوچار کیا گیا تھا وہ اللہ کی تعمیری حکمت کے تحت ایک بامقصد امر تھا تاکہ یہ سوسائٹی جو اسلام کی بنیاد تھی' ان مشکلات سے کندن ہو کر نکلے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مکہ میں مشرکین نے مسلمانوں کو کس قدر اذیت دی۔ فتنوں میں مبتلا کیا' ان کا خون بہایا اور ان کے ساتھ کیا کیا کیا۔

اللہ کو معلوم تھا کہ مضبوط اسلامی تحریک کے قیام کے لئے یہی منہاج تربیت ہے تاکہ جماعت کی بنیاد مضبوط ہو کیونکہ اس مضبوطی کے بغیر جو بھی عمارت کھڑی ہے' اس کا بوجھ برداشت کرنا مشکل تھا۔ کیونکہ تحریک کے آغاز کے لئے اس قدر مضبوطی' خلوص' نصب العین کے حصول پر اصرار' اللہ کی راہ میں مشکلات انگیز کرنا' قلت جلاوطنی' بھوک اور افلاس' قلت تعداد اور زمینی وسائل کی کمی جیسی مشکلات کو برداشت کرنے کی صلاحیت ضروری تھی۔ تحریک کے آغاز کے لئے اسی معیار کی پختگی ضروری تھی۔

جب یہ ابتدائی گروہ مدینہ پہنچا تو اس گروہ کے ساتھ انصار میں سے سابقون اولون آ ملے۔ اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ یہ لوگ اسلامی تحریک کے لئے بنیاد بنیں اور بدر الکبریٰ کے بعد آنے والوں کو سنبھال سکیں جن کی مکمل تربیت نہ

ہوئی تھی۔

فتح مکہ سے پہلے مدینہ طیبہ کی سوسائٹی کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ یہاں کے باسیوں کی اکثریت تکمیل و تربیت کے اعلیٰ مدارج طے کر چکی تھی۔ اور یہی تربیت یافتہ صحابہ کا گروہ تھا جنہوں نے فتح مکہ کے بعد آنے والی افواج کو سنبھالا اور پھر حضورؐ کی وفات کے بعد ارتداد کے سیلاب کا مقابلہ کیا۔

اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ پورے مکی دور میں اللہ تعالیٰ نے جو اسلامی تحریک کو سخت ترین مشکلات میں مبتلا کیا اور پھر مکی دور میں صلح حدیبیہ تک بروقت اس تحریک کو مشکلات' جنگوں اور خوف کی حالت میں رکھا۔ اس کی حقیقی حکمت کیا تھی اس سے تحریکی عمل سے ہم یہ اصول اخذ کر سکتے ہیں کہ ہمارے دور میں اسلام کے تحریکی عمل کا منہاج کیا ہونا چاہئے۔

ابتدائی مراحل میں' تمام اسلامی تحریکات کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ زیادہ توجہ اسلامی تحریک کی بنیادوں کو مضبوط کرنے پر صرف کریں۔ ابتدائی گروہ کی تربیت اور اخلاقی تطہیر پر توجہ دیں تاکہ تحریک کی عمارت کو مضبوط بنیادوں پر اٹھایا جائے۔ ان کے اندر ایمان کو گہرائی تک اتارا جائے تاکہ ان کے اندر پختگی پیدا ہو' وہ تحریک کے ساتھ لگن رکھتے ہوں اور ان کو اپنے نصب العین کا اچھی طرح شعور حاصل ہو۔ اور جب تک تحریک کے اندر ابتدائی گروہ کی اچھی طرح تربیت نہ ہو جائے' دعوت کی توسیع کا کام نہ شروع کیا جائے کیونکہ بنیادی گروہ کی اچھی تیاری سے قبل ہی کسی تحریک کو وسعت دے دینے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس آغاز ہی میں انتشار شروع ہو جائے۔ اگر کوئی اس طرح کرے گا تو وہ ربانی طریقہ تربیت کے خلاف کرے گا اور سنت نبوی اور طریقہ نبوی کے خلاف چلے گا۔

اس دعوت کی کامیابی کا کفیل اللہ ہے۔ جب اللہ کو منظور ہوتا ہے کہ کسی تحریک کو مضبوط بنیادوں پر اٹھایا جائے تو اللہ تعالیٰ تحریک کے ابتدائی دستوں کو بے پناہ مشکلات سے دوچار کر کے ان کو کردار کی پختگی عطا کر دیتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ان کو کامیابی کا طویل انتظار کراتا ہے۔ ان کی تعداد قلیل ہوتی ہے۔ لوگ ان سے دور رہتے ہیں لیکن جب معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ اب صبر کرنے والے ہیں۔ یہ ثابت قدم ہو چکے ہیں۔ اور انہوں نے تیاری مکمل کر لی ہے۔ اور وہ صلاحیت پیدا کر چکے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ ان کو ذریعہ بناتا ہے کہ ان سے اس عظیم کام کا آغاز ہو سکے۔ اور وہ اس کے امین اور علمبردار ہوں۔ پھر اللہ ان کو قدم بقدم آگے بڑھاتا ہے۔ اللہ اپنے کاموں پر غالب ہے۔ لیکن لوگ درحقیقت نہیں جانتے۔

ان مباحث کے بعد ہم اس طرف آتے ہیں کہ اس سورت کے مضامین کا اجمالی خلاصہ یہاں دے دیں۔ اس کے بڑے بڑے موضوعات اور خصوصاً وہ احکام جن میں مشرکین اور کافرین کے ساتھ اسلامی ریاست کے آئندہ تعلقات کی ضابطہ بندی کی گئی ہے کیونکہ اس موضوع پر جو احکام آئے ہیں' وہ آخری احکام ہیں۔ لہذا ان میں بلند ترین تحریکی خطوط کھینچے گئے ہیں۔

پارہ نہم میں سورت انفال کے تعارف میں ہم نے کفار و مشرکین کے ساتھ آخری ضابطہ کے بارے میں جو کچھ نقل کیا تھا' میں سمجھتا ہوں یہاں اس کا خلاصہ دوبارہ نقل کر دیا جائے۔ اگرچہ امام ابن قیم کا یہ اقتباس مکرر یہاں آجائے گا لیکن اس تکرار کے باوجود اس کے چند فقرے یہاں نہایت ہی موزوں اور سیاق کلام کے ساتھ مناسب رہیں گے اور ان کی وجہ سے بات میں جان پیدا ہوگی۔

امام ابن قیم جوزی نے اپنی مشہور کتاب زاد المعاد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجاہدانہ زندگی کے بارے میں ایک عنوان قائم کیا ہے۔"بعثت سے لے کر وفات تک کفار اور منافقین کے ساتھ آپ کا طرز عمل" اس عنوان کے تحت آپ رقم طراز ہیں :

"اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آپ کی طرف یہ وحی نازل کی کہ "آپ اپنے رب کے نام سے پڑھیں' یوں ہوا آپ کی نبوت کا آغاز' اس وقت جو حکم دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ آپ اپنے دل میں پڑھیں۔ابھی آپ کو تبلیغ کا حکم نہ ملا تھا' کچھ عرصہ بعد یہ آیت نازل ہوئی یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ یعنی اقراء سے آپ کو نبوت ملی اور یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ سے آپ کو منصب رسالت عطاء ہوا اور حکم دیا گیا کہ آپ اپنے رشتہ داروں کو ڈرائیں' رشتہ داروں کے بعد آپ نے اپنی قوم کو انجام بد سے ڈرایا۔قوم کے بعد مکہ مکرمہ کے ارد گرد پھیلے ہوئے قبائل کو تبلیغ کی۔اس کے بعد یہ پیغام پوری عرب دنیا تک عام کر دیا گیا اور بالاخر اس دعوت کو بین الاقوامی دعوت بنا دیا گیا۔

دعوت اسلامی کا کام شروع کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کئی سال تک صرف وعظ اور تبلیغ کرتے رہے اور طاقت کا استعمال نہ کیا' بلکہ آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ صبر اور درگزر سے کام لیں اور اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیں۔ ایک عرصہ بعد آپ کو ہجرت کی اجازت دی گئی اور ساتھ ہی دشمنوں سے لڑنے کی بھی اجازت دی گئی تاہم یہ اجازت اس حد تک تھی کہ صرف ان لوگوں سے جنگ کی جائے جو لڑنے کے لئے میدان میں اتر آئیں اور دوسروں سے نہ لڑا جائے اور سب سے آخر میں یہ حکم دیا گیا کہ کفار اور مشرکین سے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جائے جب تک دین اللہ کے لئے خالص نہیں ہو جاتا۔لِیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ جس وقت آپ کو جہاد کا حکم دیا گیا اس وقت حضورؐ اور کفار کے درمیان تعلقات کی صرف تین شکلیں تھیں۔اہل صلح' اہل حرب اور اہل ذمہ۔اہل صلح یعنی جن کے ساتھ امن کے معاہدات ہوئے تھے۔ان کے بارے میں حکم ہوا کہ عہد کو آخر تک نبھایا جائے۔لیکن صرف اس صورت میں کہ جانب مخالف اپنے معاہدے کا پابند ہو اور اگر وہ عہد شکنی اور غداری کریں تو آپ بھی معاہدہ ان کے منہ پر دے ماریں' البتہ ایسے لوگوں کے ساتھ عملاً جنگ اس وقت تک نہ چھیڑی جائے جب تک انہیں باقاعدہ اطلاع نہ دے دی جائے کہ معاہدہ ختم ہو چکا ہے۔جب سورۂ برأت نازل ہوئی تو ان تمام اقسام کے احکام علیحدہ علیحدہ بیان ہوئے۔اللہ تعالیٰ نے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے اس وقت تک لڑیں کہ یا وہ جزیہ قبول کریں اور یا اسلام میں داخل ہو جائیں اور مشرکین اور منافقین سے بھی جہاد کا حکم دیا گیا نیز منافقین سے مزید سختی برتنے کا حکم دیا گیا۔ کفار کے ساتھ آپ کا جہاد مسلح جنگ کی شکل میں تھا اور منافقین کے ساتھ زبان اور دلیل سے۔

سورہ برات میں یہ حکم بھی دیا گیا کہ کفار کے ساتھ کئے ہوئے تمام معاہدات کو ختم کر دیا جائے اور علی الاعلان ان سے براءت کا اظہار کر دیا جائے۔اس اعلان کے بعد اہل عہد کی تین اقسام قرار پائیں۔وہ جن کے ساتھ جنگ کا حکم دیا گیا' یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے عہد شکنی کی تھی اور اپنے عہد پر قائم نہیں رہے تھے۔ان لوگوں کے ساتھ حضور نے جنگ کی اور ان پر فتح پائی۔دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جن کے ساتھ عہد تھا اور وہ اسے نبھاتے بھی رہے۔آپ کو حکم دیا گیا کہ ان کے ساتھ جو معاہدہ ہے' اسے مقررہ مدت تک برقرار رکھا جائے اور شرائط کی پابندی کی جائے۔تیسری قسم ایسے لوگوں کی تھی کہ جن کے ساتھ اگرچہ معاہدہ تو نہ تھا لیکن یہ لوگ آپ کے خلاف کسی جنگ میں بھی شریک نہ ہوئے تھے' یا

ان کے ساتھ تعین مدت کے بغیر معاہدہ طے پا گیا تھا۔ایسے لوگوں کے بارے میں حکم ہوا کہ انہیں چار ماہ کی مہلت دی جائے اور ان سے کہہ دیا جائے کہ اس کے بعد کوئی معاہدہ نہیں کیا جائے یا مسلمان ہو جاؤ ورنہ لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

(یہ حکم صرف مشرکین عرب کے لئے ہے۔انہیں جزیہ دے کر اسلامی ریاست کے زیر سایہ ذمی کی حیثیت سے زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ اس لئے کہ حق کے پورے انکشاف کے بعد ان کے انحراف کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا تھا۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ نبی ہیں اور قرآن ان کی اپنی زبان میں انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے' محض ہٹ دھرمی کی بناء پر یہ انکار کئے جا رہے تھے۔اس لئے یہ کسی رعایت کے مستحق نہیں تھے۔عرب اہل کتاب اور غیر عرب مشرکین اور اہل کتاب کے ساتھ یہ رعایت رکھی گئی کہ اگر وہ چاہیں تو حفاظت جان و مال کا معاوضہ (جزیہ) دے کر اسلامی ریاست کے زیر سایہ باعزت شہری کے طور پر رہائش اختیار کر سکتے ہیں۔)

چنانچہ انہی ہدایات کے مطابق آپ نے عہد شکنوں کے ساتھ جنگ کی' اور جن کے ساتھ کوئی عہد نہ تھا انہیں چار ماہ کی مہلت دی اور راست باز معاہدین کے ساتھ اپنا عہد پورا کیا اور ایسے تمام لوگ معاہدہ کی مدت پوری ہونے سے پہلے ہی اہل ایمان اور مسلمانوں کا جزو بن گئے اور اہل ذمہ پر جزیہ عائد ہوا۔

جیسا کہ کہا گیا سورۂ براءت کے نزول کے بعد کفار کے ساتھ آپ کے تعلقات تین قسم کے رہ گئے تھے یعنی محارب' اہل ذمہ اور اہل عہد اور چونکہ اہل عہد سب کے سب اسلام میں داخل ہو گئے تھے' اس لئے صرف اہل ذمہ اور اہل حرب ہی باقی رہ گئے۔اہل حرب کی حالت یہ رہتی تھی کہ آپ کے دور میں وہ ہمیشہ آپ سے خائف رہتے تھے۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے آخری دور میں حضورؐ اور تمام انسانوں کے تعلقات کی نوعیت صرف یہ رہ گئی تھی کہ ان میں سے بعض مسلم اور مومن تھے' بعض آمن اور مسالم تھے اور بعض آپ سے خائف اور محارب تھے۔

منافقین کے ساتھ آپ کا طرز عمل یہ تھا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ آپ ان کے اعلان اسلام کو قبول فرمائیں اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کر دیں اور ان کے مقابلے میں علم و استدلال کے ہتھیار ہی استعمال کریں اور ان کے ساتھ سرد مہری کا رویہ اختیار کریں اور ان سے سختی برتیں اور ان کی نفسی کیفیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے ارشادات عالیہ سے ان کی اصلاح کی سعی کریں۔ان کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کریں اور نہ حضورؐ ان کی قبر پر کھڑے ہو کر دعا کریں اور یہ کہ اگر آپ ان کے لئے دعائے مغفرت مانگ بھی لیں تو بھی اللہ انہیں ہرگز نہ بخشے گا۔یہ تھا مختصر بیان حضورؐ کے طرز عمل کا اپنے کفار اور منافق دشمنوں کے ساتھ۔"

## اقامت دین کی جدوجہد اور اس کی خصوصیات

علامہ ابن قیم نے اسلامی جہاد کے مختلف مراحل کی یہ بہترین تلخیص پیش کی ہے اور اس سے دین حق کے تحریکی پہلو کی مستقل اور گہری بنیادیں واضح ہو جاتی ہیں جو اس لائق ہیں کہ خاصی دیر ٹھہر کر ان پر اچھی طرح غور کر لیا جائے۔اس مختصر سی بحث میں ہم صرف چند اشارات پر ہی اکتفاء کریں گے۔

۱۔ ابن قیم کے اس "سیرت پارہ" سے "اسلامی جہاد" کی جو پہلی بنیاد سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ دین حق اپنے طریق کار میں بھرپور واقعیت پسند ہے۔یہ طریق کار دراصل اس حرکت کا نام ہے' جو زمین پر موجود کسی انسانی سوسائٹی کا سامنا کرتی ہے اور ایسے سب ذرائع سے اس کا سامنا کرتی ہے' جو سوسائٹی کے واقعی وجود کے مقابلہ میں کام آ سکیں۔

وہ جاہلیت کے اس فکری دائرہ پر یلغار کرتی ہے جس پر عملاً زندگی کا چلتا پھرتا ایک نظام قائم ہے جسے وقت کا اقتدار مادی قوت کے ذریعہ سہارا دیئے چلا جاتا ہے۔

اسلامی تحریک عالم واقع میں اس واقعی صورت حال کا مقابلہ کرتی ہے۔ ان تمام ذرائع و وسائل کو کام لاکر جن سے کہ یہ جاہلیت کام لیتی ہے' وہ اس جاہلیت کا سامنا بیان و تقریر سے بھی کرتی ہے' تاکہ سوسائٹی کے افکار و عقائد کی اصلاح ہو سکے اور وہ بغایت درجہ سعی کے ساتھ طاقت بھی استعمال کرتی ہے' تاکہ جاہلیت کے نظام و اقتدار کو ملیامیٹ کیا جا سکے۔ وہی اقتدار جو عوام اور تعمیر افکار کی اصلاح کے کام میں روک بن کر کھڑا ہے اور جو جبراً ان پر مسلط ہے اور انہیں اندھیرے میں رکھے ہوئے ہے اور جو انہیں رب اکبر کے مقابلہ میں دوسروں کا بندہ بنائے ہوئے ہے۔

یہ ایک ایسی تحریک ہے جو صرف بیان و اظہار پر اکتفاء کر کے ختم نہیں ہو جاتی جس طرح کہ اس تحریک میں یہ بھی نہیں ہے کہ مادی غلبہ حاصل کر کے لوگوں سے جبراً اپنی بات منوالے..... یہ رد و قبول میں جبر کی قائل ہی نہیں۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ دین حق کے طریق کار میں یہ دونوں ہی باتیں نہیں ہیں۔ وہ تو ایک تحریک ہے' اس لئے برپا کی گئی ہے کہ لوگوں کو بندوں کی غلامی سے نجات دلاکر اللہ وحدہ لاشریک کی بندگی میں داخل کر دے۔

تفصیل آگے آتی ہے۔

۲۔ اس دین کی دوسری خصوصیت (علامہ ابن قیم کے سیرت پارہ کی روشنی میں) یہ ہے کہ اس کے اصلاحی طریق کار میں واقعیت پسندانہ تحریکیت پائی جاتی ہے۔ وہ ایک ایسی تگ و دو سے عبارت ہے جس کے کئی مراحل ہیں۔ ہر مرحلے میں اس کے مناسب ذرائع اور وسائل کو کام میں لایا جاتا ہے۔ جو اس مرحلے کے واقعی تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں اور اس مرحلے سے یہ تحریک بتدریج آگے بڑھتی ہے' اس تحریک کا طریق کار یہ ہے کہ یہ واقعی حالات کا مقابلہ مجرد نظریات سے نہیں کرتی اور نہ ہی اس کے اختیار کردہ وسائل و ذرائع جمود کا شکار ہیں۔

ہمارے دور میں جو لوگ اسلام کے نظریہ جہاد کے بارے میں لکھنے بیٹھتے ہیں اور قرآن کی آیات پر بحث کرتے ہیں' ان کے پیش نظر پہلی تحریک اسلامی کے مختلف مراحل نہیں ہوتے۔ نہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان مراحل میں سے کس مرحلے میں تحریک نے کیا تدابیر اختیار کی تھیں' انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ ان مراحل سے متعلق آیات کا شان نزول (پس منظر) کیا تھا' یہ لوگ' غلط مبحث کرتے ہیں اور دین کے نظریہ جہاد کے بارے میں گمراہ کن التباس و اشتباہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور قرآنی آیات کو ایسے معنی پہناتے ہیں جن کی وہ متحمل نہیں ہوتیں' بعض آیات کا تعلق تحریک کے ابتدائی مراحل سے ہے۔ یہ لوگ انہیں آخری مراحل کے لئے اصول قرار دیتے ہیں۔ یہ اس کا نتیجہ ہے کہ وہ بے شمار غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے اور ابتدائی ہدایات کو آخری فیصلے سمجھ بیٹھے۔ حد یہ ہے کہ یہ اس بات کے قائل ہو گئے کہ اسلام میں صرف دفاعی جنگ کا جواز ہے' دراصل "یہ" لوگ فکری و ذہنی طور پر شکست خوردہ ہو گئے اور یہ رائے انہوں نے اس لئے قائم کی کہ اس مادی دور کے حالات کی سنگینی سے "فرزندان اسلام" عہدہ بر آ نہیں ہو سکتے۔ جن کے ہاں اسلام کا صرف نام ہی نام رہ گیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ دین حق پر ڈھائے ہوئے اپنے ظلم کو اسلام کی خدمت قرار دیتے ہیں۔ اسلام کا اصل موقف تو یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر سے طاغوت کا اقتدار ختم کر دیا جائے اور تمام لوگوں کو غیراللہ کی غلامی سے نجات دی جائے۔ اس معاملہ میں اسلام کا

اصل رول یہ ہے کہ جاہلیت نے دنیا میں دین حق کے پھیلنے کی راہ میں جو جو رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں انہیں ہٹا دیا جائے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ حق کے مقابلہ میں باطل سرنگوں ہو جائے یا مٹ جائے۔ اور یا اتنا مغلوب ہو جائے کہ اسلام کی بالادستی کو تسلیم کر کے اس کے سایہ عاطفت میں تحفظ جان و مال کا معاوضہ (جزیہ) ادا کر کے پرامن شہری کی حیثیت سے رہائش پذیر اور اسلام اور عوام الناس کے درمیان حائل نہ ہو تاکہ لوگ اس بارے میں بالکل آزاد ہوں کہ وہ اسلام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں۔

۳۔ (ابن قیم کے "سیرت پارہ" کی روشنی میں) اس دین کی تیسری خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وسعت پذیر تحریکیت اور نئے نئے وسائل، اسے اپنے بنیادی اصولوں سے منحرف نہیں کر سکتے اور نہ اس نصب العین ہی میں کوئی فرق واقع ہوتا ہے جو شروع سے ایک ہی رہا ہے۔ یہ دین ہمیشہ اپنے اصولوں پر سختی سے جما رہا ہے۔ دعوت رشتہ داروں کو دی جا رہی ہو، قریش کو دی جا رہی ہو، تمام عرب کو بلایا جا رہا ہو، یا تمام کرۂ ارض کو خطاب کیا جا رہا ہو، اس کی دعوت ہروقت یہی رہی ہے کہ صرف ایک اللہ کی غلامی اختیار کرو اور اللہ کے سوا تمام غلامیوں کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکو، مصلحت کی خاطر اصول کو چھوڑا جا سکتا ہے، نہ نرمی برتی جا سکتی ہے اور نصب العین کے حصول کے لئے متعین طریق کار ہے، جس کی حدود متعین ہیں۔ پھر اس کے لئے جدوجہد کے مراحل بھی متعین ہیں اور ہر مرحلہ کے لئے وسائل و ذرائع میں سے نو بہ نو ذرائع اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ (یہاں بھی حدود اللہ کا لحاظ رکھنا لازم ہے) اس سلسلہ میں اوپر بھی "اشارہ" گزرا ہے۔

۴۔ (ابن قیم کے مطابق) دین حق کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ بین الاقوامی علائق کے لئے اس کا اپنا ایک ضابطہ ہے، اور اس ضابطہ و قانون کی اساس و بنیاد اس امر پر ہے کہ اسلام کا اپنا ایک موقف (Stand) ہے اور وہ یہ ہے کہ "تمام بنی آدم اللہ وحدہ لاشریک کی اطاعت کریں۔ یہ ان پر فرض ہے اور انہیں زندگی میں اللہ کی اطاعت ہی کی روش اختیار کرنی چاہئے۔ یہ نہیں تو کم از کم تمام بنی آدم کو "الہٰی اطاعت" کے اس نظام (اسلام) کو برداشت کرنا چاہئے اور مصالحانہ روش اختیار کرنا چاہئے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ بنی آدم میں سے کوئی بھی اس کی دعوت کی راہ میں حائل ہو۔ کوئی سیاسی نظام ہو یا مادی قوت...... وہ تمام بنی آدم کے لئے یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ دنیا کے عوام اور اس کے درمیان آڑے نہ آئیں تاکہ لوگ اپنے آزاد ارادے کے ساتھ، اسلام کو اختیار کریں۔ یا اسے رد کر دیں، اسلام بطور خود بھی رد و قبول میں جبر و طاقت کے استعمال کو جائز نہیں سمجھتا، اگر کوئی شخص، کوئی گروہ (...... وہ کوئی بھی ہو کہیں بھی ہو، کیسا ہی ہو......) اسلام اور عوام کے درمیان حائل ہوتا ہے تو اسلام اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے تا آنکہ اسے ملیامیٹ کر دیا جائے یا وہ اسلام کے آگے گھٹنے ٹیک دے۔"

---ooo---

اس بیان کی روشنی میں ہم یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اس سورت میں یہ آخری احکام کیوں دیئے گئے کہ اللہ اور رسول اللہ کی طرف سے مشرکین کے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں کو منسوخ کر دیا گیا اور جن لوگوں کے معاہدوں میں مدت کا تعین تھا، اور انہوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کی تھی اور نہ مسلمانوں کے خلاف لڑنے والی کسی قوت کے

ساتھ تعاون کیا تھا' ان کو مدت معاہدہ تک مہلت دے دی گئی اور جن لوگوں کے ساتھ معاہدے میں مدت مقرر نہ تھی اور انہوں نے معاہدے کی خلاف ورزی بھی نہ کی تھی اور نہ مسلمانوں کے خلاف کسی سے تعاون کیا تھا' ایسے لوگوں کو چار ماہ کی مہلت دے دی گئی اور یہی مہلت ان لوگوں کو بھی دی گئی جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ تھا۔ اور جن کے ساتھ معاہدے تھے مگر انہوں نے معاہدوں کی خلاف ورزی کی تھی۔ ان کے معاہدوں سے براءت کے ساتھ ساتھ ان کو بھی چار ماہ کی مہلت دے دی گئی کہ وہ چار ماہ تک خوب چل پھر لیں اور جب یہ ماہ ختم ہوں گے تو پھر حکم یہ ہو گا کہ وہ پکڑے جائیں گے' قتل ہوں گے' ان کو گھیرا جائے گا اور ان کی نقل و حرکت پر پابندی ہوگی۔ یہ ہیں وہ احکام جو ہم نے ان آیات سے سمجھے کہ جو لوگ جزیرۃ العرب میں دین اسلام اور اللہ کے حقیقی دین سے انحراف کریں گے ان کے بارے میں کیا پالیسی اختیار کی جائے گی؟ یہ کہ وہ اپنے ہاتھ سے فدیہ ادا کریں اور چھوٹے ہو کر زندگی بسر کریں۔ ان احکام و ضوابط کے بعد پھر یہ حکم آتا ہے کہ کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد میں اب ذرا سختی سے کام لو۔ ان کے مردوں کا جنازہ نہ بڑھاؤ۔ ان کی قبروں پر کھڑے نہ ہوں۔ یہ وہ احکام ہیں جنہوں نے سابق مراحل کے احکام منسوخ کر دیئے جو عبوری دور کے لئے تھے اور وہ احکام ان سورتوں میں تھے جو سورت توبہ سے قبل نازل ہوئی تھیں۔ اس بیان کی روشنی میں' ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے لئے آخری ہدایت ہے۔

اب ان آخری اور فائنل احکام کی مزید تفصیلات یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان پر مفصل کلام تشریح آیات کے ضمن میں آ رہا ہے لیکن یہاں یہ بات نوٹ کرنا ضروری ہے' وہ یہ کہ سابق مراحل میں جو عبوری احکام نافذ کئے گئے تھے' ہم یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ احکام اب منسوخ ہو گئے ہیں اور اب تمام حالات میں صرف ان احکام پر عمل ہو گا جو سورت توبہ میں اپنی آخری شکل میں وارد ہوئے ہیں بلکہ وہ احکام اپنی جگہ پر قائم ہیں لیکن ان کا اطلاق آنے والے ادوار میں ایسے ہی حالات میں ہو گا جیسے حالات میں وہ پہلی مرتبہ نازل ہوئے تھے اور ہر دور کے مجتہدین کا یہ کام ہے کہ وہ اپنے دور اور اپنے حالات کے مطابق اس بات کا تعین کریں کہ کون سے احکام موجودہ عملی حالات کے لئے زیادہ مناسب ہیں۔

کسی مخصوص زمان و مکان میں اس وقت کے مجتہدین یہ فیصلہ کریں گے لیکن ہر دور کے مجتہدین کو یہ بات پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ان کا اصل ہدف وہ حالات و احکام ہیں جو سورت توبہ میں موجود ہیں۔ جب بھی امت اس قابل ہو کہ وہ سورت توبہ کے اہداف پر عمل کر سکے' اسے کرنا چاہئے یعنی جب ایسے حالات وجود میں آ جائیں جیسے سورت توبہ کے وقت موجود تھے یا ایسے حالات آ جائیں جو سورت توبہ کے حالات کے بھی بعد میں اسلامی فتوحات کے دور میں نازل ہوئے' چاہے وہ حالات اور احکام مشرکین کے متعلق ہوں یا اہل کتاب کے متعلق ہوں۔

آج کل مسلمانوں کی بدترین صورت حالات کو دیکھ کر بعض لوگ مایوس ہو کر ذہنی طور پر شکست کھا جاتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کو اسلام کے نام اور عنوان کے بغیر کوئی چیز نظر بھی نہیں آتی۔ پھر مستشرقین کی جانب سے اسلام کے نظریہ جہاد پر جو حملے کئے جاتے ہیں وہ ان سے بھی بہت خوفزدہ اور پریشان ہیں' ایسے لوگ ان آیات کا مطالعہ کر کے ان میں راہ فرار تلاش کرتے ہیں اور وہ الٹی بچ سے اس مفہوم سے گریز اختیار کرتے ہیں جو ان آیات کا حقیقی مدلول ہوتا ہے۔ ان آیات جہاد کا حقیقی ہدف تو یہ ہے کہ بزور شمشیر تمام انسانوں کو دوسرے انسانوں کی غلامی سے نجات دلا کر انہیں اللہ کی

بندگی میں شامل کیا جائے۔ اور ان تمام قوتوں کو پاش پاش کر دیا جائے جو انسانوں کو غیراللہ کی غلامی میں جکڑ رہی ہیں۔ ان پر اللہ کے سوا دوسری حکومت قائم کرتی ہیں اور انسانی معاشروں میں اللہ کے قوانین کے سوا دوسرے قوانین نافذ کرتی ہیں۔

ایسے لوگ جب بات شروع کرتے ہیں تو وہ اپنی تقریر اسی طرح کرتے ہیں کہ اللہ سبحانہ کہتا ہے وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ "اگر وہ امن کے معاہدے کے لئے تیار ہوں تو کر لیں اور اللہ پر توکل کریں۔" اور دوسری جگہ اللہ فرماتے ہیں۔ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ --- (۸:۶۰) "اللہ تمہیں ان لوگوں سے نہیں روکتا، جنہوں نے تمہارے ساتھ لڑائی نہ کی اور جنہوں نے تمہیں اللہ کے گھروں سے نہیں نکالا، کہ تم ان کے ساتھ نیکی کرو اور انصاف کرو۔" اور دوسری جگہ یہ ہے وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (۲: ۱۹۰) "اور اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو، بے شک اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو محبوب نہیں رکھتا۔" اور اہل کتاب کے بارے میں اللہ کا حکم یہ ہے

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (۳: ۶۴) "اے اہل کتاب آؤ، ایسے کلمے کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی دوسرے کو رب نہ بنائے، اللہ کے سوا، اگر یہ اس دعوت سے منہ پھیریں تو پھر کہو کہ گواہ رہو کہ بے شک ہم مسلم ہیں۔"

لہٰذا ان آیات سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلام صرف ان لوگوں کے ساتھ لڑتا ہے جو اہل اسلام کے ساتھ دارالاسلام کے حدود کے اندر لڑتے ہیں یا وہ دارالاسلام کے حدود سے باہر رہ کر اس کے لئے باعث خوف بنتے ہیں۔ یہ کہ مشرکین کے ساتھ صلح حدیبیہ طے ہوا تھا۔ یہودیان مدینہ کے ساتھ بھی ایک معاہدہ ہوا تھا، لہٰذا (ان لوگوں کے شکست خوردہ خیال کے مطابق) اسلام کا پوری دنیا میں بسنے والے لوگوں کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے اور اسلام کو کیا کہ وہ لوگ جس کی چاہیں بندگی کریں۔ چاہے وہ ایک دوسرے کو رب بنالیں یا جو چاہیں کریں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اپنے حدود کے اندر پرامن رہیں۔ یہ خیالات دراصل اللہ پر سوء ظن کا اظہار ہے۔ یہ اسلام کے بارے میں بدظنی کا اظہار ہے۔ اور اس قسم کے خیالات ان لوگوں کے ذہنوں میں اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ ایسے لوگ درحقیقت مسلمانوں کے موجودہ حالات کے ہاتھوں شکست کھا چکے ہیں۔ یہ رویہ اور سوچ نہایت ہی ذلت کے ساتھ ہتھیار ڈالنے کے مترادف ہے۔ ایسے لکھنے والوں نے دراصل دنیا کی سپر طاقتوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اور یہ لوگ ان طاقتوں کے خلاف سوچ بھی نہیں

سکتے۔

اگر یہ لوگ دنیا کے لوگوں سے شکست کھاتے لیکن اپنی اس شکست خوردگی کو اسلام کی طرف منتقل نہ کرتے تو کوئی بات نہ تھی ۔ وہ اپنی کمزوریوں کو اگر اسلام کی طرف منسوب نہ کرتے تو ہمیں ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی سروکار نہ ہوتا لیکن ایسے لوگ اپنی اس شکست خوردہ سوچ کو اسلام کی طرف منسوب کرنے پر تلے ہوئے ہیں حالانکہ اسلام اللہ کا قوی اور متین دین ہے اور وہ غالب ہو کر رہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جن نصوص و آیات کا یہ لوگ سہارا لیتے ہیں یہ آیات دراصل اسلام کے آخری مراحل سے پہلے عبوری مراحل میں مسلمانوں کی راہنمائی کے لئے نازل ہوئی تھیں اور ایسے مراحل دوبارہ بھی امت مسلمہ کو پیش آسکتے ہیں جن میں ان آیات کی تطبیق کر کے ان پر عمل کیا جاسکتا ہے ۔ اور یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ یہ سیرۃ النبی کے تحرکی عمل میں ایسے حالات نہیں آئے تھے اور ان میں یہ احکام دیئے گئے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہ ہو گا کہ اسلام کا آخری ہدف یہ ہو گا یا اسلام کے غلبے کے حالات میں بھی یہ احکام ہوں گے ۔ آخری مراحل مین بھی ایسی ہدایات ہوں گی ۔ ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ امت مسلمہ اپنی قوت بڑھاتی رہے گی اور اپنے حالات درست کرتی رہے گی' وہ اپنے راستے سے مشکلات اور رکاوٹوں کو دور کرتی رہے گی یہاں تک کہ اسے دنیا میں ~~عروج وغلبہ نصیب~~ ہو اور عروج و غلبہ کے وقت بھی اس کے لیے آخری ہدایات وہ ہوں گی جو سورت توبہ میں دی گئیں ۔ وہ کیا ہدایات تھیں؟ جو آخر میں دی گئیں ۔ ملاحظہ کیجئے :

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱) فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ (۲) وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ رَسُوْلُهٗ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳) اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (٤) فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٥)

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (٦) (٩: ١ تا ٦) ”اعلان براءت ہے اللہ اور اس کے رسول ؐ کی طرف سے ' ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے ۔ پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو ' اور یہ کہ اللہ منکر حق کو رسوا کرنے والا ہے ۔ اطلاع عام ہے اللہ اور اس کے رسول ؐ کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لئے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے ' اور اس کا رسول ؐ بھی ۔ اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو تمہارے ہی لئے بہتر ہے ۔ اور جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو ۔ اور اے نبی انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سنا دو ۔ بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کئے پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی ' تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے ۔ تو پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو ' جہاں پاؤ ۔ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لئے بیٹھو ۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو ۔ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے ۔ اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اپنے مامن تک پہنچا دو ۔ یہ اس لئے کرنا چاہئے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے ۔“

اور اہل کتاب کے بارے میں یہ ہدایت ہے

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ

رَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ

هُمْ صٰغِرُوْنَ (٩: ٢٩) ”جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اللہ اور اس کے رسول ؐ نے جو حرام کیا ہے ' اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں ۔“

اگر اپنے حقیقی اور عملی حالات کی وجہ سے آج مسلمان ان احکام کو حقیقت کا جامہ نہیں پہنا سکتے تو موجودہ وقت اور مرحلے میں وہ اس کے مکلف نہیں ہیں اور اللہ کسی نفس کو اس کی وسعت کے مطابق ہی تکلیف دیتا ہے اور عبوری حالات میں وہ ان عبوری احکام سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور جب وہ آخری احکام کے حالات میں داخل ہوں گے تو وہ آخری اور فائنل آیات سورت توبہ کو نافذ کر سکیں گے لیکن کسی کو یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ قرآن کریم کی ان ہدایات کو جو آخری اور فائنل مراحل کے لئے ہیں ' توڑ مروڑ کر ان آیات کے تابع کر دیں جو عبوری دور کے لئے ہیں اور اپنی موجودہ کمزوریوں کے لئے قرآن سے وجہ جواز تلاش کریں ۔ ایسے لوگوں کو خدا کا خوف کرنا چاہئے اور اللہ کے قرآن کو مسخ کر کے دین اسلام پر اپنی رائے نہیں ٹھونسنا چاہئے کہ اسلام دین ہے امن و سلامتی کا ۔ حالانکہ اسلام کا آخری

نصب العین یہ ہے کہ تمام لوگ اپنے جیسے انسانوں کی بندگی سے نکل کر صرف اللہ کی بندگی میں داخل ہوں اور یہ کہ پوری انسانیت پوری کی پوری اسلام میں داخل ہو جائے۔ اسلامی نظام ایک ایسا نظام ہے کہ اللہ پوری انسانیت کو اس نظام تک سربلند کرنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ پوری انسانیت اس نظام سے متمتع ہو۔ یہ نظام انسانوں میں سے کسی انسان کا تخلیق کردہ نہیں ہے۔ نہ کسی انسانی فکر کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا انسانوں کو اس بات کے اعلان سے کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرنی چاہئے کہ اسلام کا آخری ہدف اور نصب العین یہ ہے کہ ان تمام قوتوں کو پاش پاش کر دیا جائے جو اسلام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

---○○○---

حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کو جن نظاموں کی اطاعت کرنی ہے اگر وہ نظام انسانوں کے بنائے ہوئے نظام ہیں اور ان کے پیچھے عمل پیرا نظریہ بھی ہم جیسے انسانوں کا پیش کردہ نظریہ ہے تو ایسے حالات میں پھر یہ سوچ درست ہے کہ ہر انسان یا انسانوں کے مجموعے کا پیش کردہ نظریہ اپنے حدود کے اندر زندہ رہے جب تک کہ وہ دوسرے نظریات اور حدود کو توڑتا نہیں ہے۔ اور ایسے انسانی نظریات اور انسانی نظاموں کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ وہ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کی پالیسی پر عمل پیرا ہوں۔

لیکن اگر مسلئہ یہ نہ ہو اور ایک طرف اللہ کا دین ہو اور اللہ کی بنائی ہوئی شریعت ہو، اس کے وضع کردہ حدود و قیود من جانب اللہ ہوں اور اس کے مقابلے میں انسانوں کے بنائے ہوئے دین اور قانونی نظام ہوں تو پھر صورت حال مختلف ہو جاتی ہے۔ پھر اللہ کے دین کا یہ حق ہے کہ وہ ان تمام رکاوٹوں کو پاش پاش کر کے اپنی راہ نکالے جو انسانوں کے دین ہیں اور جن میں انسان، انسان کا غلام اور بندہ ہوتا ہے۔ اور ان رکاوٹوں کو دور کر کے پھر یہ دین حق بندوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جو دین اور نظریہ چاہیں اپنالیں، لیکن جہاں تک اعلیٰ سیاسی نظام کا تعلق ہے وہ صرف اللہ کا ہو گا۔

وہ لوگ جو دنیا میں شکست کھا چکے ہیں وہ آیات اور قرآنی ہدایات میں تاویلات کر کے اپنے آپ کو ان مشکل تقاضوں سے بچاتے ہیں جن کا مطالبہ قرآنی آیات و ہدایات کرتی ہیں اور جن کو وہ اپنے خیال میں حرج سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں ایک دین اور ایک نظام حیات دیا ہے اور جس کا مقصد اعلان آزادی انسان ہے اور اس میں کوئی انسان، انسان کا غلام نہیں ہو سکتا جبکہ دوسرے تمام انسانی نظاموں میں انسان، انسان کا غلام ہوتا ہے۔

اسلام کے نظریہ جہاد کے لئے دلائل جواز ہیں اور وہ دلائل اسلامی نظام زندگی کے اندر سے فطرتاً اٹھتے ہیں۔ ان شکست خوردہ خیالات رکھنے والے منکرین کو چاہئے کہ وہ ان پر غور کریں۔ ممکن ہے کہ اللہ ان کی سمجھ میں یہ بات ڈال دے اور ان پر وہ رازہائے دروں اور حکمت دین واضح کر دے جو وہ اپنے متقی بندوں پر واضح کرتا ہے۔

---○○○---

آخری بات اس سورت کے بارے میں یہ ہے کہ اس کے آغاز میں بسم اللہ نہیں لکھا گیا۔ اور حضرت عثمان ؓ کے مرتب کردہ مصحف میں بسم اللہ موجود نہ تھی۔ امام ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان سے دریافت کیا کہ سورت انفال مثانی سے ہے اور سورت براءۃ مئین میں سے ہے۔ آپ لوگوں کو ان

کے ساتھ ملا کر رکھا ہے اور ان کے درمیان میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی سطر تحریر نہیں کی ہے ۔ اور دونوں کو سبع طوال میں رکھا ہے ۔ یہ کام آپ حضرات نے کیوں کیا ہے؟ اس پر حضرت عثمان ؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا وقت آیا تھا کہ متعدد سورتیں نازل ہوا کرتی تھیں تو جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ ان لوگوں کو بلاتے جو قرآن کریم کو لکھا کرتے تھے اور ان کو حکم دیتے کہ اس آیت یا آیات کو اس سورت میں رکھ دیں جس میں یہ ذکر ہوا ہے ۔ سورت انفال مدینہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی اور براءت مدینہ کے آخری دور میں نازل ہوئی ۔ دونوں کا مضمون ایک جیسا تھا ۔ میں نے تو یہاں تک خیال کیا کہ شاید یہ انفال ہی کا حصہ ہے ۔ حضور فوت ہوگئے اور اس سلسلے میں آپ نے کوئی وضاحت نہ فرمائی ۔ میں نے ترتیب کے وقت دونوں کو یکجا کر دیا اور ان کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی سطر نہ لکھی اور ان کو سبع طوال میں رکھ دیا ۔

ان سورتوں کو اسی طرح مرتب کرنے کے سلسلے میں یہ اقرب روایت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان بسم اللہ کی سطر نہیں لکھی گئی ۔ اس روایت سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کے اندر آیات کی ترتیب اور سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے اور یہ کام حضور ؐ کے زمانے ہی میں مکمل ہوا تھا ۔ اور یہ کہ بیک وقت کئی سورتوں کی تکمیل ہوتی رہتی تھی ۔ جب کبھی کسی عملی صورتحال کے لئے کوئی آیت نازل ہوتی تھی ' یا کسی حکم کی تکمیل کے لئے کوئی آیت یا آیات نازل ہوتی تھیں یا کسی حکم میں تخصیص اور تبدیلی ہوتی تھی ' اس دین کے تحریکی منہاج کے مطابق تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم فرماتے تھے کہ ان آیات کو فلاں سورت میں فلاں جگہ رکھ دو ۔ اور اس حکم کی خاص حکمت ہوتی تھی ۔ چنانچہ سورتوں میں آیات کی یہ ترتیب حکمت الہیہ کے مطابق ہوتی تھی ۔

ہم نے سورتوں پر تبصرہ کرتے وقت یہ بات بار بار کہی ہے کہ ہر سورت کی اپنی ایک شخصیت ہے ۔ ہر سورت کے اپنے خدوخال ہیں اور ہر سورت کی ایک خاص فضا ہے اور ایک خاص پس منظر اور سایہ ہوتا ہے اور ہر سورت کا اپنا خاص انداز تعبیر ہوتا ہے جس سے اس کی خصوصیات اور اس کے خدوخال کا اظہار ہوتا ہے ۔ حدیث ابن عباس سے اس بات کا اچھی طرح اظہار ہوتا ہے جس کی تشریح اور اس کی طرف اشارہ ہم نے بار بار کیا ہے ۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس سورت کا اس قدر تعارف اور اس کے مضامین اور موضوعات کا یہ اجمالی تعارف کافی ہو گا ۔ اب ہمیں آیات کی تفصیلی تشریح کی طرف آنا چاہئے ۔

---ooo---

# درس نمبر ۸۷ ایک نظر میں

یہ سبق پوری سورت کے بعد نازل ہوا ہے۔اگرچہ یہاں ترتیب سورت میں اسے پہلے رکھا گیا ہے۔جیسا کہ پہلے یہ بات واضح کر دی گئی ہے۔کسی سورت میں آیات کی ترتیب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہوتی تھی' لہٰذا سورتوں کی تشکیل ایک توقیفی امر ہے۔

اس حصے میں ان معاہدات کو ختم کرنے کی بات کی گئی ہے جو اس وقت تک مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان قائم تھے۔معاہدوں کی منسوخی کا اطلاق ایک تو ان معاہدوں پر تھا جن میں فریق مخالف نے' ان کی یکطرفہ خلاف ورزی شروع کر دی تھی' یا وہ مطلق معاہدے تھے اور ان کے لئے چار ماہ کی مدت مقرر کر دی گئی یا وہ معاہدے تھے جن کی مدت خود بخود ختم ہو رہی تھی اور انہوں نے اس عرصے میں کوئی نقض عہد نہ کیا تھا اور نہ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف کسی بھی دوسری قوت کی طرفداری کی تھی۔ان سب قسم کے معاہدوں کو بہرحال ختم کر دیا گیا۔اور ان آیات میں یہ فیصلہ بھی کر دیا گیا کہ آئندہ مشرکین کے ساتھ جزیرۃ العرب میں کوئی عہد نہ ہو گا' ان سے مطلقاً براءت کا اظہار کر دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ مشرکین کے لئے رسول اللہ کا عہد کس طرح قائم ہو سکتا ہے؟

معاہدات کے سلسلے میں ان ہدایات میں یہ ہدایت بھی شامل تھی کہ آئندہ مشرکین کو بیت اللہ کا طواف کرنے کی اجازت نہ ہو گی اور نہ ہی وہ بیت اللہ یا دوسری مساجد کی تعمیر میں کسی قسم کا حصہ لے سکیں گے۔اور یہ ہدایات اس معاہدے کے برعکس تھیں کہ جو رسول اللہ اور مشرکین کے درمیان طے شدہ تھا کہ وہ حرام مہینوں میں اور بیت اللہ میں ایک دوسرے کے خلاف کوئی جنگی کارروائی نہ کریں گے اگرچہ وہ مشرک ہوں۔

جو لوگ سیرت النبی کے احوال و واقعات کا مطالعہ کریں' انہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ احیائے اسلام کا تحریکی منہاج کیا ہے۔اس کی نوعیت اور طبیعت کیا ہے۔اور اس عمل میں مختلف اقدامات کے لئے مراحل کیا ہیں؟ اور اس کے آخری اہداف کیا ہیں؟ نیز وہ باسانی معلوم کر سکتا ہے کہ اسلامی محاذ اور جزیرۃ العرب کے مشرکین اور اہل کتاب کے مختلف کیمپوں کے درمیان اس سورت میں تعلقات کے جو آخری خطوط کھینچے گئے ہیں وہ بالکل بروقت تھے۔ان کے لئے زمین تیار ہو گئی تھی' حالات سازگار تھے اور یہی خطوط اور اقدامات فیصلہ کن تھے اور ان کو اپنے وقت پر واقع ہونا تھا۔

مسلسل عملی تجربات سے یہ بات عیاں ہوتی جا رہی تھی اور طویل مراحل سے گزرنے کے بعد تو یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ ان دو متضاد نظام ہائے حیات کے درمیان نہایت بنیادی اختلافات بلکہ تضادات پائے جاتے ہیں اور یہ دونوں ایک ہی علاقے میں متوازن طور پر نہیں چل سکتے۔یہ اختلاف اس قدر گہرے اور بنیادی ہیں کہ عقائد و تصورات' اعمال اور تنظیم اور طرز بود و باش اور اجتماعی اور اقتصادی نظام' سیاسی اور انسانی تصورات غرض ہر اعتبار سے ان کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے۔اور یہ وہ اختلاف ہے جو عقیدے اور سوچ سے لے کر زندگی کے تفصیلی شعبوں تک پھیلا ہوا ہے۔ایک نظام

اس عقیدے پر تعمیر ہوا ہے کہ بندگی صرف اللہ کے لئے ہے اور اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ دوسرا نظام اس اساس پر ہے کہ یہاں انسان' انسان کا غلام ہو گا اور اس میں خود ساختہ الٰہ الٰہ ہوں گے اور متفرق ارباب ہوں گے اور زندگی کے ہر شعبے میں ہر قدم پر ان کے درمیان تصادم ہو گا کیونکہ زندگی کے ہر قدم اور ہر مرحلے پر دونوں کے تقاضے مختلف اور متضاد تھے اور دو نظام مختلف رویے کا مطالبہ کرتے تھے۔

یہ کوئی عارضی امر نہ تھا کہ قریش دعوت اسلامی کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے اور انہوں نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا مقابلہ شروع کر دیا۔ اور انہوں نے اسلام کے خلاف نہایت ہی ظالمانہ مزاحمت شروع کر دی۔ اسی طرح مدینہ کے یہودیوں نے اسلام کے خلاف جو محاذ کھول دیا' وہ بھی کوئی عارضی بات نہ تھی۔ نیز یہودیوں اور مشرکین کا اسلام کے خلاف متحدہ محاذ بھی کوئی عارضی اور اتفاقی بات نہ تھی حالانکہ یہودی اہل کتاب تھے اور شرک کے خلاف تھے لیکن انہوں نے مشرکین عرب کے ساتھ جنگ احزاب میں ایکا کیا بلکہ یہ ان کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا اور مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے ساتھ ہی یہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ اب ان کے نظام کے لئے یہ نئی مملکت ایک واضح خطرہ ہے کیونکہ یہ مملکت ایک نظریہ پر قائم ہے اور اس کے پاس ایک مکمل نظام حیات ہے جو ربانی ہدایات پر مبنی ہے۔ بعد میں عنقریب ہم بتائیں گے کہ نصاریٰ نے اسلام کے خلاف جو لشکر کشی شروع کر دی تھی تو یہ بھی کوئی اتفاقی اور حادثاتی امر نہ تھا۔ یمن اور شام اور ان سے آگے کے علاقوں میں یہ عیسائی اس تحریک کو اپنے لئے ایک خطرہ سمجھتے تھے اور قیامت تک وہ سمجھتے رہے اور رہیں گے۔ یہ بالکل طبعی اور منطقی موقف تھا جو ان لوگوں نے اختیار کیا۔ یہ اسلامی نظریہ حیات کا ایک طبعی موقف تھا اور اس کا طبعی نتیجہ تھا کہ تمام دوسرے نظام اس کو اپنے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ اسلامی نظام کا مزاج یہ ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر اللہ کی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہے اور تمام انسانوں کو اللہ کی غلامی سے نکال کر خدا کی غلامی میں ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس مقصد کی راہ میں جو بھی رکاوٹ بنے اسلام اسے ایک ٹھوکر سے ہٹانا چاہتا ہے اور لوگوں کو ایک آزاد فضا کی ضمانت دیتا ہے کہ وہ اس آزاد فضا میں جو نظریہ چاہیں قبول کریں۔ پھر چونکہ اسلامی نظام اور دوسرے نظاموں کے درمیان ہر جزئیے میں اختلاف اور تضاد تھا اس لیے یہ ممانعت اور یہ محاذ آرائی بالکل قدرتی تھی۔ ان تمام نظاموں کی طرف سے یہ قدرتی محاذ آرائی تھی کہ وہ اپنے آپ کو اس خطرے سے بچائیں جو ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینک رہا تھا۔ لہٰذا ان قوتوں کی جانب سے یہ طرز عمل یقینی تھا اور ان لوگوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

ان نظاموں کی یہ مجبوری پوری اسلامی تاریخ میں انہیں اسلام کے خلاف محاذ آرائی پر مجبور کرتی رہی۔ اس سلسلے میں بار بار تجربات ہوئے۔ مختلف صورتوں میں اس کا ظہور ہوا۔ لہٰذا اس صورت میں جو آخری فیصلے کئے گئے وہ نہایت ہی ضروری تھے اور ان کے سوا اس صورت حالات کے مقابلے کی لئے کوئی اور راہ موجود نہ تھی۔ روایات میں جو بعض اسباب بیان کئے گئے ہیں وہ اس بڑے سبب اور ان حقیقی وجوہات کی بعض کڑیاں ہیں اور یہ کڑیاں اسلامی تاریخ اور سیرت النبی کی بعض روایات میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں۔

اس موقف کی گہرائی تک پہنچنے اور گہری فکر و نظر کے بعد اور مسلسل تحریکی تجربات کے بعد اسلام کا ان آخری اقدامات کو صحیح طرح سمجھا جاسکتا ہے لیکن ان گہرے اسباب کے ساتھ ساتھ ہمیں وہ فوری اسباب بھی پیش نظر رکھنے ہوں گے کیونکہ یہ فوری اسباب حقیقی اسباب کا تانا بانا تھے اور حقیقی اسباب سے جدا نہ تھے۔

امام بغوی نے اپنی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کی طرف نکلے تو منافقین نے بری خبریں پھیلانا شروع کر دیں۔ اور مشرکین نے ایک ایک کر کے عہد توڑنا شروع کر دیئے۔ تو اللہ نے ان کے بارے میں یہ آیات نازل کیں، ان میں ان لوگوں کو چار ماہ کی مدت دے دی جن کے معاہدے پہلے ختم ہو رہے تھے اور جن کے معاہدے کا عرصہ چار ماہ سے زیادہ رہتا تھا کہ ان کی مدت میں کمی کر دی گئی۔

امام طبری نے سورت کے آغاز میں مختلف تفسیری اقوال نقل کرنے کے بعد کہا "ان سب اقوال سے بہتر یہ قول ہے کہ یہ چار ماہ کی مدت کا تعین ان لوگوں کے لئے تھا جن کے ساتھ حضورؐ کا عہد تھا اور ان کو اس اعلان میں کہا گیا کہ تم فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ (۹: ۲) (زمین میں چار ماہ تک چلو پھرو) یہ ان معاہد لوگوں کے لئے تھا جنہوں نے حضورؐ کے ساتھ معاہدے کی خلاف ورزی کر کے حضورؐ کے خلاف لشکرکشی کی تھی، لیکن جن لوگوں نے حضورؐ کے ساتھ اپنے عہد کا پاس کیا تھا اور وہ حضورؐ کے خلاف کیمپ میں شامل نہ ہوئے تھے تو ان کے بارے میں حکم یہ تھا کہ ان کے ساتھ عہد کو اپنی مدت تک نبھایا جائے۔ اللہ کا فرمان تھا۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۹: ۴) "بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کئے، پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی معاہدے تک وفا کرو، کیونکہ اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے۔

امام طبری نے اپنی سند کے ساتھ مجاہد سے یہ روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۹: ۱) سے مراد اہل معاہدہ ہیں یعنی وہ عرب جن سے حضورؐ نے معاہدے کئے تھے یا جن کے ساتھ عہد تھا۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک سے فارغ ہوئے تو آپ نے حج کا ارادہ فرمایا لیکن اس کے بعد آپ نے فرمایا: "بیت اللہ میں چونکہ مشرک بھی حج کو کرتے ہیں اور ننگے طواف کرتے ہیں۔ اس لئے میں اس وقت تک حج کو نہ جاؤں گا۔ جب تک اس رسم کو ختم نہ کر دیا جائے۔" چنانچہ آپ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کو بھیجا۔ یہ دونوں لوگوں میں گھومے پھرے اور ذو المجاز اور ان مقامات میں گئے جہاں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بیع و شریٰ کرتے تھے۔ اس پورے موسم میں انہوں نے اعلان فرمایا کہ جو لوگ صاحب عہد میں وہ چار ماہ تک مامون رہیں اور یہ چار ماہ کا عرصہ مسلسل ہے یعنی ذوالحجہ کے آخری بیس دن اور ربیع الاخر کے ابتدائی دس دنوں سمیت اور اس کے بعد یہ معاہدہ ختم ہو گا اور اس کے بعد انہوں نے اعلان جنگ کر دیا الا یہ کہ لوگ ایمان لے آئیں۔ اس لئے تمام لوگ چار ماہ کے اندر اندر مسلمان ہو گئے اور کسی شخص نے فَسِيْحُوْا سے فائدہ نہ اٹھایا۔

مذکورہ بالا اسباب درحقیقت فوری اسباب تھے جن کی وجہ سے یہ انتہائی قدم اٹھایا گیا لیکن دراصل اس اقدام کے گہرے اسباب کی کڑیوں میں سے یہ بھی کڑیاں تھیں۔ اور یہ اسباب حقیقی اسباب نہ تھے، حقیقی اور گہرا سبب یہ تھا کہ دونوں نظام ایک جگہ متوازی طور پر جاری نہ رہ سکتے تھے۔ لہٰذا دونوں میں سے ایک کو کسی دن لازماً ختم ہونا تھا۔

مرحوم رشید رضا نے اپنی تفسیر میں ان کڑیوں کا ذکر تو کیا ہے لیکن اس آخری اقدام کے گہرے اور حقیقی سبب کا ذکر نہیں کیا ہے کہ ان دونوں نظاموں کے درمیان گہرا حقیقی تضاد تھا اور جس انجام تک نظام شرک پہنچا اس تک اس نے ایک دن پہنچنا تھا۔ وہ فرماتے ہیں :

"یہ بات قطعی ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حضور کو اللہ نے ایک ایسا دین دے کر بھیجا تھا جو ایک نظام تھا جس کے ذریعے اس دین کو مکمل کر دیا گیا۔ اور اس کے لئے عظیم معجزہ اس قرآن کو قرار دیا گیا جو شان اعجاز لئے ہوئے تھا اور اس کے اعجاز کے مختلف پہلو تھے۔ جن کے اصول ہم نے (۲:۳) ص ۱۹۰ تا ص ۲۲۸ - ج ۱) میں نقل کئے اور اسلام کی طرف دعوت کو عقلی' علمی اور تسلی بخش اور تشفی بخش دلائل پر رکھا۔ (۱)

اور دین کے معاملے میں ہر قسم کے جبر اور اکراہ کے استعمال کو ممنوع قرار دیا جس طرح ہم نے آیات (۲:۲۵۶' ص ۲۶ - ۴۰' ج ۳) میں تفصیل سے دیا ہے۔ چنانچہ مشرکین نے حضور ؐ کا مقابلہ کیا اور مسلمانوں کو فتنہ میں مبتلا کر کے ان پر تشدد کیا۔ اور ان کو اللہ کی راہ سے روکنے کی کوشش کی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی انہوں نے تبلیغ کرنے سے جبراً منع کر دیا۔ اور حالات ایسے ہو گئے کہ آپ کے متبعین میں سے کوئی بھی مامون نہ تھا۔ ہر کسی کو تشدد اور جان کا خطرہ لاحق تھا۔ الا یہ کہ وہ کسی کی پناہ میں ہوں یا کسی کے حلیف ہوں۔ لہٰذا مسلمانوں نے کئی بار ہجرت کی۔ اس کے بعد ان کی ایذا رسانی اور نیش زنی میں مزید اضافہ ہو گیا' چنانچہ انہوں نے خفیہ فیصلہ کیا کہ آپ کو دائمی طور پر قید کر دیا جائے یا ملک بدر کر دیا جائے یا قتل کر دیا جائے اور یہ مشورہ انہوں نے دارالندوہ میں علانیہ کیا۔ لیکن آخری فیصلہ یہ کیا کہ آپ کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ اللہ نے آپ کو ہجرت کا حکم دیا جیسا کہ اس کی تفصیلات ہم نے آیت (۸ : ۳۰) میں دے دی ہیں۔ وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ (ج ۹' ص ۶۵) چنانچہ آپ نے ہجرت فرمائی اور جن دوسرے لوگوں کی قسمت میں یہ اعزاز لکھا تھا انہوں نے بھی ہجرت فرمائی اور ان لوگوں کو مدینہ میں انصار ملے جن کے دلوں میں رسول اللہ اور ہجرت کرنے والوں کی محبت بھی ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے مثالی ایثار سے کام لیا اور اہل ہجرت اور رسول اللہ اور کفار مکہ کے درمیان اس وقت کے عرف کے مطابق حالت جنگ تھی۔ مدینہ کے ارد گرد پھیلے ہوئے اہل کتاب نے آپ کے ساتھ معاہدہ امن کیا لیکن انہوں نے اس معاہدے کو پورا نہ کیا اور خیانت اور غداری کی۔ اور مشرکین عرب کے ساتھ ساز باز کر کے وہ ہمیشہ رسول اللہ اور مسلمانوں کے خلاف قوتوں کی حمایت کرتے رہے جس کی تفصیلات ہم نے سورت انفال میں دی ہیں۔ دیکھئے اسی جلد کے صفحات (۵۳ تا ۶۸)

اس سے قبل آپ نے حدیبیہ میں مشرکین کے ساتھ دس سالہ معاہدہ کیا تھا اور یہ معاہدہ آپ نے کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ قوت اور غلبے کے باوجود مشرکین کے شرائط پر کیا۔ محض اس لئے کہ آپ امن و سلامتی کو پسند فرماتے تھے۔

---

(۱) یہاں اس بات کی تصریح کی ضرورت ہے کہ استاد محمد عبدہ اور آپ کے مکتب کے لوگ مغربی ممالک کے فلسفہ سے بہت متاثر تھے۔ خصوصاً ڈیکارٹ کے فلسفے سے جنہوں نے ہر معاملے میں عقل کی پیروی کا حکم دیا۔ اور اسلامی عقائد و نظریات کو بھی عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کا طریقہ ڈالا۔ لہٰذا یہاں یہ انتباہ ضروری ہے کہ اسلام کے حق میں عقلی اور سائنسی دلائل کے ساتھ ساتھ بدیہی فطری دلائل پر بھی غور کرنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ انسان کی شخصیت صرف عقل پر مشتمل نہیں ہے۔ عقل و برہان کے علاوہ بھی انسان کے اندر ملکات موجود ہیں۔ ان کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

اور اپنے دین کو حجت و دلیل کے ساتھ پھیلانا چاہتے تھے۔(۱)

بنو خزاعہ نے آپ کے ساتھ عہد کیا اور بنوبکر نے قریش کے ساتھ عہد کیا۔اس کے بعد قریش نے بنوبکر کی حمایت کرتے ہوئے خزاعہ پر حملہ کر دیا اور اس طرح نقض عہد کے مستحق قرار پائے۔اور اس نقض عہد کی وجہ سے مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان دوبارہ حالت جنگ عود کر آئی۔اس کے نتیجے میں مکہ فتح ہوا۔جس کی وجہ سے شوکت اسلام قائم ہوئی اور مشرکین ذلیل ہوئے۔لیکن اس کے باوجود جس وقت بھی ممکن ہوا یہ لوگ حضور اکرم کے ساتھ غداری کرتے رہے۔اور یہ بات تجربے سے ثابت ہو گئی کہ وہ قوی ہوں یا ضعیف ہوں' مسلمانوں کے ساتھ غداری ان کے دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے اور وہ ہرگز پاس عہد نہیں رکھتے۔جیسا کہ اسی سورت کی آیت کی تشریح میں آئے گا کہ وہ ہر وقت نقض عہد کے لئے آمادہ تھے۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ (۹:۷) تا آخر آیت ۱۲ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ (۹:۱۲) تک

یعنی ان کے بارے میں یہ سمجھ لو کہ وہ کسی عہد کو پورا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔یعنی ان لوگوں کے ساتھ مسلمانوں کا بذریعہ معاہدہ یکجا رہنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔اس طرح کہ ان میں سے ہر فریق دوسرے کے شر اور فتنہ سے محفوظ و مامون ہو اور مشرکین اپنے نظریات پر رہیں اور قانون ان کا نہ چلے۔اور اس طرح باہم مل کر دونوں فریق زندہ رہ سکیں۔کیونکہ ان کی سابقہ غداریوں اور مکاریوں کی وجہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے حالانکہ ان کے حسب حال یہ تھا کہ وہ اہل کتاب ہونے کے ناطے وفائے عہد کرتے۔۲(۲)

"یہ ہے وہ حقیقی شرعی اصول جس کے مطابق مطلق معاہدات کی منسوخی کے احکامات وارد ہوئے اور جن لوگوں نے معاہدے کی خلاف ورزی نہ کی تھی ان کے ساتھ معاہدات کو اپنی مدت تک پورا کرنے کی ہدایت آئی اور ان احکام کی حکمت یہ تھی کہ جزیرۃ العرب سے شرک جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے اور جزیرۃ العرب کو مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دیا جائے' لیکن سابقہ اصول اپنی جگہ قائم رکھے گئے مثلاً بقرہ ۱۹۰ میں کہا گیا وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ (۲:۱۹۰) (یعنی اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ جنگ کی جائے جو تمہارے ساتھ لڑتے ہیں) اور

---

(۱) یہ بات اس حد تک درست ہے کہ تحریکی انداز میں تبلیغ اسلام بھی حجت و دلیل کے ساتھ ہے۔لیکن اگر اس سے مراد یہ ہے کہ اسلام میں جہاد صرف دفاع کے لئے ہے تو یہ درست نہیں ہے۔دفاع کے سوا بھی جہاد مسلمانوں پر فرض ہے۔

(۲) ۱+۲۔تعجب کی بات ہے کہ مصنف اس گہری حقیقت تک پہنچ گئے ہیں جو ان اقدامات کا اصل سبب ہے اور یہ کہ ان معاہدات کا جو حشر ہوا اس سے ثابت ہو گیا کہ اسلامی محاذ اور مشرکین کے محاذ کے درمیان باہم سلامتی کا کوئی امکان نہیں ہے۔الا یہ کہ چند مختصر عرصے کے لئے کوئی وقفہ ایسا ہو لیکن اس کے باوجود مصنف اسلامی نظام اور شرکیہ نظام کے درمیان ایسے معاہدات کے قائل ہیں جن کی وجہ سے دار الاسلام میں دونوں نظام یکجا ہو کر رہ سکتے ہیں۔یہ ان کے نزدیک دائماً ممکن ہے اور اس کے خلاف اگر کوئی صورت ہوئی ہے تو وہ استثنائی ہے۔الا یہ کہ امر مشرکین مکہ کے ساتھ مخصوص ہے۔(کسی حد تک یہ بات درست ہے کہ یہ حکم مشرکین مکہ تک محدود ہے لیکن دوسرے مشرکین کی حالت بھی جزیرۃ العرب کے مشرکین سے مختلف کس طرح ہو سکتی ہے۔تفصیلات ہم آگے دے رہے ہیں۔

---

دوسری وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (۸: ۶۱) (یعنی اگر وہ سلامتی و امن کے لئے جھکیں تو تم بھی ان کی طرف جھکو۔) حتی الامکان یہ پالیسی رہی۔ اگرچہ جمہور علماء کی رائے یہی ہے کہ یہ سابقہ آیات اس سورت کی آیت سیف کے ذریعے منسوخ ہیں اور اہل شرک کے ساتھ تمام عہد منسوخ ہیں۔"

اس اقتباس اور اس پر آخری تعقیب اور تفسیر منار کی دوسری تشریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ مصنف معاہدات کی منسوخی اور مشرکین و اہل کتاب کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف آغاز جنگ کے حقیقی اسباب تک بہرحال پہنچ گئے ہیں لیکن وہ اس سبب کی حقیقی جڑوں تک نہیں پہنچے اور نہ اس سبب کو وہ وسعت دے کر اسے عام پالیسی بنانا چاہتے ہیں۔ اس لئے وہ اس معاملے میں دین کی حقیقت اور اس کے تحریکی مزاج تک نہیں پہنچ سکتے اور وہ اس نکتے تک بھی نہیں پہنچ سکے کہ اسلامی نظام حیات اور انسانوں کے بنائے ہوئے نظامہائے حیات کے درمیان بنیادی اور حقیقی تضاد پایا جاتا ہے اور ان دونوں کا ایک جگہ زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔

تفسیر منار کے علاوہ اس مسئلے پر استاد محمد عزہ کی تصریحات بھی قابل غور ہیں۔ وہ اپنی تفسیر "التفسیر الحدیث" میں جو کچھ فرماتے ہیں وہ اس حقیقت کبریٰ سے بہت دور ہے اور وہ ان واقعات و احکامات کے حقیقی اسباب کو پا ہی نہیں سکے۔ استاد محمد عزہ زمانہ حال کے دوسرے اہل قلم کی طرح رات دن اس تلاش میں رہتے ہیں کہ وہ اسلام کو امن و آشتی کا دین ثابت کریں اور اس کے لئے دلائل تلاش کریں' یہ لوگ آج کل جب ان نسلوں کے برے دنوں کو دیکھتے ہیں جن کے آباؤ اجداد مسلمان تھے اور پھر اس کے مقابلے میں دیکھتے ہیں کہ آج کل کے بے دین' ملحدین اور نام نہاد اہل کتاب مادی لحاظ سے عروج پر ہیں تو یہ لوگ رات دن یہ ثابت کرنے بیٹھ جاتے ہیں کہ اسلام تو نہایت ہی گوسفندانہ مذہب ہے اور وہ اپنے حدود کے اندر دبک کر رہنے والا ہے۔ اور جب بھی اس کے ساتھ کوئی امن و سلامتی کے سلسلے میں بات کرے وہ قبول کرتا ہے۔

یہ لوگ سورت توبہ کی ان آیات کا سبب نزول صرف اس بات کو قرار دیتے ہیں کہ بعض لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چونکہ نقض عہد کر دیا تھا لہٰذا ان کے خلاف یہ اقدام ہوا اور جن لوگوں نے نقض عہد نہ کیا تھا چاہے ان کے معاہدے موقت ہوں یا دائمی ہوں ان کو یہ سورت بحال رکھتی ہے۔ اور اگر کسی نے نقض عہد کر بھی لیا تھا تو یہ سورت اجازت دیتی ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ از سر نو عہد کر لیا جائے۔ یہ لوگ ابتدائی مراحل کی آیات کو اصل الاصول قرار دیتے ہیں اور اس سورت کی ان آخری آیات کو مقید قرار دیتے ہیں۔

اس لئے یہ صاحب اس آیت ۴' ۵ توبہ کی تشریح اس طرح کرتے ہیں۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۴) فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ

وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ

إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (٥) (٩ : ٤ — ٥) ”بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کئے۔ پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی، تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو کیونکہ اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے۔ پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لئے بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو۔ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

”ان دو آیات اور ان سے پہلی آیات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مدنی دور کے آخری دنوں کا ایک رنگ ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان فتح مکہ کے بعد یا فتح مکہ کے قبل کے دور میں منعقد ہونے والے کچھ معاہدے تھے۔ مشرکین میں سے کچھ لوگ تو ایسے تھے کہ وہ اپنے معاہدوں کو پورا کرتے رہے اور بعض لوگ ایسے تھے جنہوں نے عہد شکنی کی اور مسلمانوں کے خلاف اٹھنے والی قوتوں کی طرفداری کرتے رہے۔ اور غداری اور نقض عہد کے مرتکب ہوتے رہے۔“

”ہم اس سے قبل کہہ آئے ہیں کہ مفسرین اور اہل تاویل زیر تفسیر دو آیتوں میں سے دوسری آیت کو آیت السیف کہتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ آیت ان تمام آیات کو منسوخ کر دیتی ہے جن میں مشرکین کے حوالے سے تسامح، تساہل، چشم پوشی اور صرف نظر کے احکام یا اشارے موجود ہیں۔ بلکہ اس آیت کے بموجب علی الاطلاق ان کا قتل واجب ہے۔ بعض مفسرین نے اتنا کہا ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ معاہدہ ہے ' ان کے بارے یہ حکم دیا ہے کہ وہ لوگ اپنی مدت معاہدہ تک اس کے حکم سے مستثنیٰ ہوں گے اور بعض لوگ ان کو بھی مستثنیٰ نہیں کرتے اور ماسوائے قبول اسلام کے ان سے کوئی اور صورت قبول نہیں کرتے۔

ہم نے اس پر اس سے قبل متنبہ کر دیا ہے کہ اس رائے میں غلو پایا جاتا ہے اور یہ رائے قرآن مجید کے صریح احکام کے خلاف ہے۔ جن میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ماسوائے اعداء کے کسی اور کو قتل نہ کیا جائے اور یہ کہ دوستی کرنے والوں اور معاہدے کرنے والوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا جائے۔ مفسرین نے اپنے اقوال اور روایات مکرر اس حوالے سے قدیم اہل تفسیر و تاویل سے نقل کئے ہیں۔ علامہ ابن کثیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ آپ ان تمام لوگوں کی گردن پر تلوار رکھ دیں جن کے ساتھ معاہدات ہوئے تھے یہاں تک کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں اور ان کے ساتھ جو معاہدات ہوئے تھے ان کو ختم کر دیا جائے۔ خود اس مصنف نے سلیمان ابن عیینہ کا ایک عجیب قول نقل ہے جنہوں نے آیات اور سورت اور دوسری سورتوں میں آنے والی دوسری آیات جن میں مشرکین کے ساتھ قتال کا حکم نہیں ہے ' کے درمیان تطابق اس طرح پیدا کیا ہے کہ یہ آیات تین تلواریں ہیں اور یہ کہ حضور ؐ نے حج اکبر کے دن حضرت علی ؓ ابن ابو طالب کو یہ تین آیات دے کر بھیجا تھا اور ان میں سے یہ آیت بھی ہے اور اسے انہوں نے عرب مشرکین کے لئے تلوار کہا ہے اور ایک تلوار اہل کتاب کے لئے ہے اور وہ سورت توبہ کی آیت ۲۹ ہے یعنی

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (۹ : ۲۹) "جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور کو کچھ اللہ اور اس کے رسول ؐ نے حرام قرار دیا ہے' اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں ۔"

ایک تلوار منافقین کے لئے ہے اور وہ سورت توبہ کی آیت (۷۳) ہے ۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۹ : ۷۳) "اے نبی کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ آخر کار ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بد ترین جائے قرار ہے ۔" اور ایک تلوار باغیوں کے خلاف ہے اور وہ سورت الحجرات کی آیت (۹) ہے ۔

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ (۴۹ : ۹) "اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے ۔" اور مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ امام طبری اس طرف گئے ہیں کہ اس آیت کا اطلاق معاہدین اور غیر معاہدین سب پر ہوتا ہے ۔ ان دونوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے ۔حالانکہ سورت ممتحنہ کی آیت (۸) کی تفسیر میں انہوں نے یہ قرار دیا کہ یہ آیت محکم ہے ۔ آیت یہ ہے

لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (۶۰ : ۸) (اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ' اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۔" لہٰذا اللہ مسلمانوں کو اس بات سے نہیں منع کرتا کہ جو شخص ان کے معاملات سے غیر جانبدار رہتا ہے اور امن و سلامتی کا معاہدہ کرتا ہے خواہ جس مذہب و ملت کا ہو' اس کے ساتھ تم احسان و انصاف کا رویہ اختیار کرو ۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے لوگ معاہد بھی نہ ہوں ۔"

"یہ تمام دلائل اور اس آیت کے سیاق و سباق سے یہ بات واضح ہے کہ یہ حکم صرف ان لوگوں کے لئے آیا ہے جو معاہد تھے اور جنہوں نے اپنے عہد سے روگردانی کر لی تھی اس کے سوا کسی اور گروہ سے مطلق قتال جائز نہیں ہے ۔

لہٰذا یہ کہنا کہ یہ آیت السیف ہے اور ہر مشرک پر اس کا عموماً اطلاق ہوتا ہے ۔ یہ ایسی بات ہے جس کی متحمل یہ آیت نہیں ہے اور نہ ہی سیاق کلام سے یہ مطلب نکلتا ہے ۔ اور نہ یہ کہنا درست ہے کہ یہ آیت متعدد آیات کی ناسخ ہے ۔ خصوصاً ان آیات کی ناسخ ہے جن کا مضمون اصولی اور عمومی ہے ۔ مثلاً لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ یا الدعوت بالحکمت اور بذریعہ وعظ حسن یا مباحثہ و مجادلہ بطریق احسن' یا نیکی اور انصاف کی تلقین کرنے والی آیات خصوصاً ان لوگوں کے ساتھ جو مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑتے ۔ اور نہ انہوں نے مسلمانوں کو گھروں سے نکالا ہے ۔ خصوصاً جبکہ بعد میں اس مضمون کی آیات آ رہی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ مسجد حرام کے پاس تمہارے ساتھ جن لوگوں نے معاہدہ کیا ہے' جب تک وہ معاہدے پر قائم رہیں اس معاہدے کا احترام کیا جائے جس پر ہم عنقریب تفصیلی بحث کریں گے ۔"

"ان آیات میں جو احکامات ہیں ان کے بارے میں دو سوالات اٹھتے ہیں؟ پہلا یہ کہ پہلی آیت میں جو استثناء ہے وہ معاہدے کی مدت کے ختم ہونے تک ہے تو کیا معاہدہ کرنے والے مشرکین اس مدت کے خاتمے پر اللہ اور رسول اللہ کی ذمہ داری سے نکل جائیں گے اور اب ان کے ساتھ جنگ فرض ہو گی ۔ مفسرین کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اس سوال کا جواب اثبات میں ہے ۔ لیکن اس سلسلے میں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی قابل اعتبار روایت نہیں ملی ہے ۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر آیت اول کے' مفہوم کو علی الاطلاق لیا جائے تو مفسرین کا اخذ کردہ مفہوم درست ہے ۔ اور اس کی پھر وضاحت کی ضرورت ہے ۔ اس لئے یہ دیکھا جائے گا کہ جن لوگوں نے معاہدہ کیا تھا ان کی پوزیشن اس معاہدے سے پہلے کیا تھی؟ یا تو وہ معاہدے سے پہلے دشمن تھے اور ان کے ساتھ جنگ اور مقاتلہ ہوا تھا ۔ پھر مسلمانوں نے ان کے ساتھ معاہدہ کیا جس طرح قریش کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے مقام پر صلح کی تھی ۔ یا وہ ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے بغیر جنگ و جدال اور مقاتلہ کے مسلمانوں کے ساتھ امن اور دوستی کا معاہدہ کر لیا تھا ۔ سورت نساء کی یہ آیت (۹۰) انہی لوگوں کے بارے میں ہے ۔

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا (۴ : ۹۰) "البتہ وہ منافق اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے جا ملیں جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے' اسی طرح وہ منافق بھی مستثنیٰ ہیں جو تمہارے پاس آتے ہیں اور لڑائی سے دل برداشتہ ہیں' نہ تم سے لڑنا چاہتے ہیں اور نہ اپنی قوم سے' اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے لہٰذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لئے ان پر دست درازی کرنے کی کوئی سبیل نہیں رکھی ) ۔ تو ایسے لوگوں کا حکم اس آیت میں بطور واقعہ ذکر ہے ۔ سیرت کے بعض واقعات میں بھی ایسے لوگوں کی مثالیں موجود ہیں ۔ ابن اسحاق نے نقل کیا کہ حضور ؐ نے کنانہ کی شاخ بنو صخر سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ

آپ ان پر حملہ نہ کریں۔ اور نہ وہ مدینہ پر حملہ کریں گے۔ نہ وہ کسی قوم کی تعداد آپ کے خلاف بڑھائیں گے نہ آپ کے دشمن کی معاونت کریں۔ اسی سلسلے میں آپ نے ان کے ساتھ ایک تحریری معاہدہ بھی کیا تھا۔ پھر اس آیت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ کسی کے ساتھ تجدید عہد نہ کیا جاسکتا ہو یا یہ کہ کسی ایسی قوم کے ساتھ معاہدے کی مدت کو نہ بڑھایا جاسکتا ہو جبکہ ایسی قوم نے نہ وعدہ خلافی کی ہو اور نہ غداری کا ارتکاب کیا ہو۔ اور مسلمانوں کو اس کا کوئی اختیار بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑیں یا کسی نہ کسی شکل میں دست درازی کریں۔ خصوصاً اس آیت میں جو عنقریب آرہی ہے۔ بصراحت کہا گیا ہے کہ مشرکین کے ساتھ عہد کو پورا کرو جب تک وہ عہد کو پورا کرتے ہیں' اس آیت میں بھی اس بات پر قرینہ موجود ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ ان شاء اللہ۔

"دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ دوسری آیت کے آخر میں کہا گیا ہے اگر وہ نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دیا جائے اور ان کے ساتھ قتال کو ختم کر دیا جائے۔"

"اس سوال کے سلسلے میں جو بات ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے جن مشرکین نے نقض عہد کیا اور مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی تو اب وہ اس بات کے مستحق نہیں رہے کہ ان کے ساتھ دوبارہ کوئی معاہدہ کیا جائے لہٰذا مسلمانوں پر یہ فرض ہو گیا کہ ان پر ایسی شرائط مسلط کر دیں جن کے نتیجے میں علاقے میں امن و سلامتی کی ضمانت دی جاسکے اور وہ شرائط یہی ہو سکتی ہیں کہ وہ شرک سے توبہ کرلیں۔ اور اسلام میں داخل ہو جائیں اور اسلامی عبادات ادا کریں اور مالی ذمہ داریاں پوری کریں۔ اور ایسے اقدامات کو اِکْرَاہَ فِیْ الدِّیْنِ تصور نہ کیا جائے گا۔ قطع نظر اس بات سے کہ جس نظام شرک میں وہ پڑے ہوئے ہیں وہ انسانیت کو نہایت ہی ذلت کے مقام تک گراتا ہے اور انسانوں کو ایسے عقائد و اعمال دیتا ہے جو نہایت ہی بودے اور عقل و منطق کے خلاف ہوتے ہیں اور ان نظریات کے نتیجے میں ایک ایسا جاہلی نظام رائج ہوتا ہے جو نہایت ہی ظالمانہ نظام ہوتا ہے۔ جس میں نہایت ہی مکروہ اور منکر افعال کا ارتکاب ہوتا ہے اور لوگ عجیب قسم کے تعصبات کا شکار ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلام ان پر جس نظام اسلامی میں داخلے کی شرائط عائد کرتا ہے اس میں ان کے لئے آزادی' ترقی اور عقلی اور عملی کمال کی ضمانت دی گئی ہے۔ اسلامی نظام ان کو عبادت کے اچھے طریقے' اخلاق کا اعلیٰ معیار اور فکر و نظر کا منطقی نظام دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ایسے نقض عہد کرنے والوں کے ساتھ دوبارہ کسی معاہدے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر فریقین کی مصلحت اسی میں ہو اور بعض اوقات ایسا ہو سکتا ہے کہ مسلمان جنگ کرنے کے قابل ہی نہ ہوں یا ایسے لوگوں کو وہ جنگ کے ذریعے زیر نگیں لانے کی قوت ہی نہ رکھتے ہوں واللہ اعلم۔"

مصنف کی تفسیر سے ہم نے جو فقرے اوپر منتخب کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اور ان جیسے دوسرے لوگ اسلام کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ اٹھے اور اس پوری دنیا سے انسانوں کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے آزاد کرے اور انہیں اللہ کی غلامی میں داخل کر دے' جہاں جہاں بھی اسلام کے لئے یہ ممکن ہو اور جب بھی ممکن ہو' قطع نظر اس سے کہ کہیں مسلمانوں پر زیادتی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو اور نہ زیادتی مسلمانوں پر ان کے اقلیمی حدود کے اندر ہوئی ہو یا باہر۔ ایسے لوگ اس اصول ہی کو مسترد کرتے ہیں حالانکہ اس اصول پر اسلام کا نظام جہاد مرتب ہوتا ہے اور اس اصول کے سوا دین اسلام کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اپنی راہ سے وہ تمام مادی رکاوٹیں دور کر دے۔ اگر اس اصول کی نفی کر

دی جائے تو پھر اسلامی نظام واقعیت اور سنجیدگی کے ساتھ مساوی وسائل و مواقف کے ساتھ انسانیت کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہ وہ مختلف حالات اور مراحل میں ان کے حسب حال اور حالات کے مطابق کوئی حکمت عملی اختیار کر سکتا ہے اور اسلام کے لئے صرف یہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ مادی قوتوں کے سامنے صرف وعظ و تبلیغ سے کام لے۔ یہ ایک ایسی کمزور پوزیشن ہے جو اللہ اپنے دین کے لئے ہرگز پسند نہیں کرتا۔(۱)

ان اقتباسات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے فکر و نظر میں احیائے اسلام کا تحریکی منہاج نہیں ہے جس میں ہر موقع پر دشمن کے مقابلے میں برابر کے ہتھیار استعمال کئے جانے ضروری ہیں۔ مصنف نے جو انداز تفسیر اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ تحریک اسلامی کے سابقہ مراحل والی آیات کو فائنل قرار دے کر آخری دور میں آنے والی آیات کو ان کے ذریعے مقید کرتا ہے۔ اور وہ یہ نہیں دیکھتے کہ سابقہ ادوار میں جو آیات نازل ہوئیں وہ سابقہ مراحل اور حالات جیسے کے لئے ہیں۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ یہ احکام دراصل منسوخ نہیں ہیں بایں معنی کہ اب بھی کسی جگہ اگر ایسے حالات درپیش ہوں جس طرح کے حالات سابقہ آیات کے وقت تھے تو ان آیات کے احکام پر عمل نہ ہو گا اور سورت توبہ کی ان آخری آیات ہی کو لیا جائے گا۔ سابقہ آیات اب بھی باقی رہیں لیکن یہ آیات مسلمانوں کو اس بات کے لئے پابند نہیں کرتیں کہ اگر وہ سورت توبہ کی آخری آیات جیسے حالات میں داخل ہو چکے ہیں تو بھی وہ مناسب اقدامات نہ کر سکیں۔ اور زیر بحث آیات کو نافذ نہ کریں۔

یہ موضوع نہایت ہی وسعت قلبی اور گہری سوچ کا تقاضا کرتا ہے اور اس کا حق ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ احیائے اسلام میں اسلام کے مزاج اور اس کے تحریکی منہاج کو سمجھا جائے جیسا کہ ہم نے اوپر کہا۔

اب میں سمجھتا ہوں ان سطور پر ایک بار پھر نظر ڈالی جائے جن سے ہم نے اس سبق پر تبصرے کا آغاز کیا تھا۔

”جو لوگ سیرت النبی کے احوال و واقعات کا اچھی طرح مطالعہ کریں تو انہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ احیائے اسلام کا تحریکی منہاج کیا ہے۔ اس کی نوعیت اور مزاج کیا ہے اور اس عمل میں مختلف اقدامات کے لئے مراحل کیا ہیں؟ اور اس کے آخری اہداف کیا ہیں۔ نیز وہ باسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ اسلامی محاذ اور جزیرۃ العرب کے مشرکین اور اہل کتاب کے مختلف کیمپوں کے درمیان اس سورت میں تعلقات کے جو آخری خطوط کھینچے گئے ہیں وہ بالکل بروقت تھے۔ ان کے لئے زمین تیار ہو گئی تھی، حالات سازگار تھے اور یہی خطوط اور اقدامات فیصلہ کن تھے اور ان کو اپنے وقت پر ہونا تھا۔“

بار بار کے تجربات سے یہ اصول اور قانون متعین ہو رہا تھا کہ ایک ایسے معاشرے جس میں حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کے لئے مخصوص ہو اور جس کے قوانین اللہ کے بنائے ہوئے ہوں اور ایک ایسے معاشرے کے درمیان جو جاہلی معاشرہ ہو جس میں یہ تمام امور غیر اللہ کے لئے مخصوص ہوں یا ان میں اللہ کے ساتھ کوئی غیر اللہ بھی شریک ہو، کے درمیان تعلقات کی آخری نوعیت کیا ہو اور یہ تعلقات کا حتمی اصول وہ دائمی کشمکش ہے جو ایک اسلامی اور کسی بھی جاہلی

(۱) (تفصیلات کے لئے دیکھئے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب الجہاد فی الاسلام اور اس تفسیر کے نویں پارے میں ہم نے اس کتاب کے جو اقتباسات دیئے ہیں)

معاشرے کے درمیان ہر وقت برپا ہوتی ہے۔جس کا تذکرہ سورت الحج کی اس آیت میں کیا گیا ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (۲۲ : ۴۰) (اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں' جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے' سب مسمار کر ڈالی جائیں) اور جس کے بارے میں سورت بقرہ کی آیت ۲۵۱ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۲ : ۲۵۱)) (اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا رہے تو زمین میں فساد برپا ہو جائے)۔اس آخری اور حتمی قانون کے آثار دو طرح ظاہر ہوئے۔

ایک یہ کہ اسلام قدم بقدم آگے بڑھتا رہا۔ایک غزوے کے بعد دوسرا غزوہ پیش آیا۔ایک مرحلے کے بعد دوسرا مرحلہ آیا اور اسلام اردگرد کے علاقے میں پھیلتا رہا۔اور اللہ کا کلمہ علاقوں کے بعد دوسرے علاقوں اور قبیلے کے بعد دوسرے قبائل تک پھیلتا رہا۔اس طرح پورے کرۂ ارض تک دعوت اسلامی کو پہنچانا اور اس تبلیغ اور اشاعت کی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کرنا تاکہ دنیا کے تمام انسانوں تک یہ دعوت بغیر کسی مادی رکاوٹ کے پہنچ سکے۔ان مراحل کے آخر میں مسلمانوں نے مکہ مکرمہ کو فتح کر لیا اور اسلام کے پھیلاؤ کی راہ میں آنے والی بڑی رکاوٹ دور ہو گئی اور ہوازن اور ثقیف جو قریش کے بعد طاقتور قبیلے تھے' انہوں نے بھی اسلام کی برتری کو قبول کر لیا۔اور اس مرحلے میں اسلام ایک ایسی قوت بن گیا جس سے اسلام کے دشمن خوف کھانے لگے اور اس طرح جزیرۃ العرب میں آخری اور فیصلہ کن اقدام کے لئے راہ ہموار ہو گئی اور یہ بات جزیرۃ العرب تک موقوف نہ تھی بلکہ یہی پالیسی تھی۔پوری دنیا کے لئے۔جہاں جہاں بھی حالات سازگار ہوئے اسلام اور اسلامی تحریک یہ اقدامات اٹھاتی رہی تاکہ پوری دنیا میں کوئی فتنہ نہ رہے اور دین سب کا سب اللہ کے لئے ہو جائے۔

دوسرا مظہر یہ ہے کہ جاہلی کیمپ بار بار ان معاہدوں کو توڑ دیتا تھا' جو معاہدے وہ خود اسلامی محاذ سے کرتا تھا اور جب بھی اسے موقعہ ملتا وہ یہ عہد توڑ دیتا تھا۔جب بھی اہل جاہلیت کو یہ احساس ہوتا اسلامی محاذ خطرے میں ہے اور زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے یا کم از کم عہد توڑنے والے مشرکین اور اہل کتاب کو یہ یقین ہو کہ ان کا مستقبل محفوظ ہے۔جس قدر بھی معاہدے ان لوگوں نے کئے ان کے پیچھے یہ خواہش نہ تھی کہ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ فی الواقعہ امن و آشتی چاہتے تھے بلکہ یہ انہوں نے نہایت ہی مجبوری کی حالت میں کئے تھے اور ایک مناسب وقت کے لئے تھے۔یہ معاہدے تو وہ کر لیتے لیکن وہ جب دیکھتے کہ اسلام موجود ہے اور ترقی کر رہا ہے تو وہ بے بس ہو جاتے اور ان معاہدوں کو توڑ دیتے تھے۔کیونکہ اسلام اپنے وجود کے اعتبار سے ان کے وجود کے لئے متضاد تھا۔اور زندگی کے چھوٹے اور بڑے معاملات میں ان کے طور طریقوں کے متضاد تھا۔اسلام میں چونکہ سچائی' زندگی' حرکت' پھیلاؤ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔اس لئے وہ ان کے وجود کے لئے خطرہ تھا کیونکہ اسلام کا مقصد وحید ہی یہ تھا کہ تمام لوگوں کو اللہ کی غلامی میں داخل کیا جائے۔

یہ آخری مظہر اور وہ اصول جس کے نتیجے میں یہ رنگ ظاہر ہوتا تھا اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات میں اشارہ کیا ہے۔ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا (۲ : ۲۱۷) (اور وہ

مسلسل تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں' اگر وہ ایسا کر سکیں ) ۔ یہ تو تھا مشرکین کے بارے میں اور اہل کتاب کے بارے میں ۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ إِيمَٰنِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ( ۲ : ۱۰۹ ) "اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں اگر چہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے' مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمہارے لئے ان کی یہ خواہش ہے )۔ اور دوسری جگہ ہے وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ( ۲ : ۱۲۰ ) (یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک کہ تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو ۔) چنانچہ ان قطعی نصوص کے ذریعے اللہ تعالیٰ خود اسلام کے خلاف تمام محاذوں کی سرگرمیوں کی اطلاع دیتا ہے' کہ وہ اسلام کے خلاف متحد ہیں اور ان کا یہ موقف عارضی نہیں ہے بلکہ دائمی ہے اور عالمگیر موقف ہے اور کسی زمان و مکان کا پابند نہیں ہے ۔

اسلامی معاشرے اور اس کی حکومت اور جاہلی نظاموں اور حکومتوں کے درمیان تعلقات کے حوالے سے اسلام کے حتمی اور آخری قانون اور ضابطے کو سمجھے بغیر اور اس قانون اور ضابطے کے تاریخی مظاہر پر غور کئے بغیر اور اسلامی تاریخ کے حوالے سے دونوں محاذوں کے موقف کو سمجھے بغیر اسلام کے نظریہ جہاد کو بالکل نہیں سمجھا جاسکتا ۔ نہ اس طویل تاریخی کشمکش کو سمجھا جاسکتا ہے ۔ موجودہ سو سال سے اسلامی کیمپ اور جاہلیت کے کیمپوں کے درمیان قائم رہی ہے ۔ نہ یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ صحابہ کرام کے مجاہد گروہ نے کیوں یہ کارروائیاں کیں' نہ بعد کے ادوار میں ہونے والی اسلامی فتوحات کو سمجھا جاسکتا ہے' نہ بت پرستی اور اسلام کی جنگ کو سمجھا جاسکتا ہے' نہ اسلام اور صلیبی جنگوں کی طویل جنگوں کی طویل کشمکش کو سمجھا جاسکتا ہے' جو چودہ سو سال تک رہیں اور آج یہ جنگیں مسلمانوں کی اولاد کے خلاف بھی جاری ہیں' اگرچہ بدقسمتی کی وجہ سے انہوں نے اسلام کی حقیقت کو ایک عرصہ ہوا ہے' خیرباد کہہ دیا ہے' ان کے ہاں اسلام کا صرف نام اور عنوان ہی رہ گیا ہے ۔ مسلمانوں کی اولاد کے خلاف یہ صلیبی جنگ روسی علاقوں' بت پرستوں کے علاقوں اور عیسائی صلیبی علاقوں میں آج بھی جاری ہے ۔ روس میں' چین میں' یوگوسلاویہ میں' جاپان میں' ہندوستان اور کشمیر میں غرض ہر جگہ یہ جنگ جاری ہے ۔ حبشہ' زنجبار' کینیا' جنوبی افریقہ اور امریکہ ہر جگہ اسلام کے خلاف صلیبی جنگ جاری ہے ۔ پھر جہاں جہاں اسلامی تحریکات اٹھتی ہیں ان کو سر اٹھانے نہیں دیا جاتا ۔ خود عالم اسلام کے اندر یا اس خطے میں جو کبھی اسلامی تھا' اسلام کی احیاء کی تحریکات کو ختم کیا جاتا ہے بلکہ کچلا جاتا ہے ۔ اور اس معاملے میں بت پرست' مغرب کے صلیبی اور مشرق کے کمیونسٹ بالکل متفق اور متحد ہیں ۔ اور جو حکومتیں یہ فریضہ سرانجام دیتی ہیں ان کو اس قدر امداد دی جاتی ہے کہ ان کی تمام ضروریات کے لئے کفیل ہوتی ہے اور پھر یہ حکمران جو اسلامی لیڈروں پر ظلم کرتے ہیں ان کے بارے میں ان نام نہاد ترقی یافتہ اور بنیادی حقوق کے داعی ممالک مکمل خاموشی اختیار کرتے ہیں ۔ حالانکہ احیائے اسلام کا کام کرنے والے لوگ نہایت ہی معزز شہری ہوتے ہیں ۔

یہ اسلامی قانون بین الممالک سورت توبہ کے نزول سے قدرے پہلے ہی واضح ہو کر سامنے آگیا تھا اور فتح مکہ کے بعد یہ درج بالا دو مناظر و مظاہر کی شکل میں عیاں ہو گیا تھا' اس لئے جزیرۃ العرب میں مشرکین کے حوالے سے جو اقدامات بھی کیے گئے یا اہل کتاب کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا گیا اس کی تفصیلات سورت توبہ کے اس حصہ میں دی گئی ہیں۔

اس قانون اور ان اقدامات کے بارے میں تو اسلامی قیادت کو شرح صدر حاصل تھا لیکن اس وقت اسلامی جماعت کے اندر جو مختلف گروہ تھے' خصوصاً وہ لوگ جو ابھی ابھی ایمان لائے تھے یا مولفۃ القلوب میں شامل تھے یا ضعیف الایمان مسلمان یا منافقین تھے' ان کی سمجھ میں اسلام کا نظریہ جہاد یا جزیرۃ العرب میں یہ پالیسی نہ آرہی تھی۔

اسلامی معاشرے میں ایسے لوگ بھی تھے اور شاید وہ مسلمانوں میں معزز ترین اور مدبر و فہیم لوگ تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ تمام مشرکین کے ساتھ کیے ہوئے معاہدوں کو کیوں ختم کیا جا رہا ہے۔ یعنی جن لوگوں نے نقض عہد کیا تھا' ان کو چار ماہ کی مہلت دی گئی۔ جن کے معاہدے میں کوئی وقت مقرر نہ تھا' یا ایسے لوگ جن کے ساتھ نہ معاہدہ تھا اور نہ ہی انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی تھی' یا جن کے ساتھ چار ماہ سے کم کے لئے تھا' یا جن لوگوں کے ساتھ موقت معاہدے تھے لیکن انہوں نے معاہدوں کی خلاف ورزی نہ کی تھی اور نہ مسلمانوں کے خلاف محاذ میں شریک ہوتے تھے۔ مسلمانوں کے یہ گروہ اگرچہ نقض عہد کرنے والوں یا جن سے خیانت کا خطرہ ہوتا ان کے ساتھ معاہدوں کے ختم کرنے کے اس حکم کو سمجھ رہے تھے جیسا کہ سورت انفال میں آچکا ہے۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ

(۸ : ۵۸) "اگر کبھی تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو' یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔" لیکن دوسرے لوگوں کے معاہدوں کو چار ماہ کے بعد ختم کر دینا یا ان کو مقررہ مدت کے بعد ختم کر دینا ان کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کیونکہ وہ دور جاہلیت میں اس قسم کے احکام کے عادی ہیں کیونکہ جاہلیت میں جب تک فریقین معاہدے کی پابندی کرتے یا ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کرتے یا امن و سلامتی سے رہتے تو ایسے لوگوں کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا جاتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی اسکیم اس عادی اسکیم سے زیادہ دوررس تھی اور عربوں کے اندر انقلاب جہاں تک پہنچ گیا تھا یہ اس کا طبعی مرحلہ اور اقدام تھا۔

پھر اسلامی صفوں میں ایسے لوگ بھی موجود تھے اور ہو سکتا ہے کہ سربر آوردہ اور اہم لوگوں میں بھی ایسے لوگ ہوں جن کے خیال میں تمام مشرکین جزیرہ کے ساتھ قتال اور جنگ شروع کر دینا مناسب نہ تھا۔ خصوصاً یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھنا جب تک یہ لوگ اسلام کے سامنے جھک نہیں جاتے جبکہ اسلام جزیرۃ العرب میں فاتح و غالب ہو گیا تھا۔ صرف چند منتشر دور دراز علاقے رہ گئے جو اسلام کے زیر نگیں نہ تھے اور ان علاقوں سے اسلام کو کوئی ڈر نہ تھا۔ اور یہ توقع بھی تھی کہ یہ علاقے بھی اسلام کو قبول کر لیتے۔ خصوصاً پر امن حالات کے اندر خصوصاً ایسے لوگ اپنے اقرباء' ہم قبیلہ اور سماجی اور اقتصادی تعلقات رکھنے والے گروہوں اور لوگوں سے بھی لڑنا مناسب نہ سمجھتے ہوں۔ جبکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس سخت کارروائی کے بغیر بھی ان لوگوں کے داخل اسلام ہونے کی راہ ہموار ہو گئی ہے لیکن اللہ کی منشا یہ تھی کہ دار الاسلام میں لوگوں کے باہم تعلقات صرف اسلامی نظریہ حیات کی اساس پر رہ جائیں۔ دوسرے تمام روابط کٹ جائیں

اور جزیرۃ العرب اسلام کے لئے خالص ہو جائے اور یہ اسلام کا محفوظ مرکز بن جائے۔ جبکہ اللہ کو معلوم تھا کہ رومی شام کی جانب سے اسلام پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اسلامی معاشرے میں بعض ایسے لوگ بھی تھے' شاید یہ ان میں سے معتزز اور معتبر لوگ ہوں' جو یہ سمجھ رہے تھے کہ اس طرح مکہ و مدینہ کی منڈیاں کساد بازاری کا شکار ہو جائیں گی اور جزیرۃ العرب کے اقتصادی اور تجارتی تعلقات بگڑ جائیں گے کیونکہ اب مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان ہر جگہ جنگ اور قتل و مقاتلہ شروع ہو جائے گا۔ خصوصاً موسم حج اس سے متاثر ہو گا جبکہ اس اعلان میں یہ بات بھی ہے کہ مشرک اور ننگے حج نہ کریں گے۔ اور اب مشرکین کا حصہ تعمیر مساجد میں بھی نہ ہو گا جبکہ ایسے لوگوں کے خیال میں اس اقدام کی کوئی جنگی ضرورت نہ تھی۔ اور اس مقصد کو تدریجی اور پرامن طریقوں سے بھی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اللہ کا منشا یہ تھا کہ اجتماعی معاملات و تعلقات صرف نظریات کی اساس پر ہوں اور یہ کہ مومنین کے دلوں میں عقائد و نظریات کی اہمیت تمام دوسرے مقاصد و اہداف سے برتر ہو' چاہے یہ تعلقات قرابت داری کے ہوں' چاہے یہ صدقوں اور تجارتی منافع کے ہوں' چنانچہ اللہ نے فرمایا کہ وہی رزاق ہے اور اسباب رزق اس کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اللہ جس طرح چاہتا ہے انہیں پھیر دیتا ہے۔

پھر اسلامی معاشرے میں اس وقت ضعیف العقیدہ' متردد' مولفۃ القلوب 'منافقین اور دوسرے غیر جانبدار عافیت کوش لوگ بھی تھے اور یہ دین اسلام میں فوج در فوج داخل ہوگئے تھے اور یہ پوری طرح اسلامی رنگ میں نہ رنگے گئے تھے' اور یہ لوگ مشرکین کے خلاف، عمومی اعلان جنگ سے ذرا خوف کھاتے تھے۔ خصوصاً تجارتی کساد بازاری اور جنگ کی حالت میں مواصلات کی خرابی اور تجارتی راستوں کی بندش اور سب سے زیادہ یہ کہ جہاد کی مشکلات کو برداشت کرنا' جبکہ وہ اپنے اندر اس کی قوت نہ پاتے تھے' کیونکہ عوام کا جم غفیر اسلام کے غلبے کو دیکھ کر داخل ہوگیا تھا۔ کیونکہ یہ نفع کا سودا تھا۔ لیکن یہ اعلان عام تو ان کے حاشیہ خیال ہی میں نہ تھا کیونکہ یہ ' گ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور اس راہ کی مشکلات سے ابھی خبردار ہی نہ تھے اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ اسلامی صفوں کو پاک و صاف کر دے اس کا فرمان تو یہ تھا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۚ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۹:۱۶)

"کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور اللہ ان لوگوں کو ممتاز نہ کرے گا جو تم میں سے جہاد کرتے ہیں اور جنہوں نے اللہ اور رسول اللہ اور مومنین کے سوا کسی اور کو دل نہیں بنایا اور اللہ تمہارے تمام اعمال سے خبردار ہے۔"

غرض اس مخلوط اسلامی معاشرے میں فتح مکہ کے بعد مختلف الاغراض لوگ تھے' اس لئے سورت توبہ کے اس حصے میں اس قدر مفصل اور مختلف اسلوب کلام میں ہدایات دی گئیں اور اشارات دیئے گئے تاکہ لوگوں کے دلوں میں جو کمزوریاں یا غلط خیالات رہ گئے تھے ان کو دور کیا جا سکے' اسلامی صفوں میں سے بے چینی' انتشار اور خیالات و افکار سے شبہات کو پاک کیا جا سکے جو بعض مخلص ترین لوگوں کے دلوں میں بھی تھے۔

چنانچہ ایسے حالات میں اس سورت کا آغاز اس دوٹوک اعلان سے ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول مشرکین سے اب بری الذمہ ہیں۔ اور ایک آیت کے بعد اعلامیہ میں دوبارہ بتکرار یہ بات دہرائی گئی کہ اللہ اور رسول اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہیں

اور نہایت ہی پر زور الفاظ میں تاکہ کوئی مسلمان ان لوگوں سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھے جن سے اللہ اور رسول اللہ نے براءت کا اظہار کر دیا ہے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۹ : ۱) (اعلان براءت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان کو مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے) اور مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے اور کافروں کو ڈرانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ یہ اعلان بھی کر دیا جائے کہ اللہ منکرین حق کو رسوا کرنے والا ہے اور جو لوگ روگردانی کریں گے وہ اللہ کے عذاب سے بچ کر نکلنے والے نہیں ہیں۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ رَسُوْلُهٗ (۹ : ۳) "اطلاع عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لئے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی۔"

فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ (۹ : ۲) "ملک میں چار مہینے چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو الا یہ کہ اللہ منکرین حق کو رسوا کرنے والا ہے۔"

فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۹ : ۳) "اب اگر تم توبہ کر لو، تو تمہارے ہی لئے بہتر ہے اور جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور اے نبی انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سنا دو۔"

اس بات پر سخت ناراضی کا اظہار کیا گیا کہ ان مشرکین کے ساتھ اللہ اور رسول اللہ کا عہد کیسے ہو سکتا ہے؟ ماسوائے ان لوگوں کے جنہوں نے عہد کیا اور پھر اس پر پوری طرح قائم رہے، تو یہ عہد بھی مدت عہد تک جاری رہے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو متنبہ کر دیا گیا کہ یہ مشرکین جب بھی قدرت پائیں گے وہ عہد و پیمان کا کوئی پاس نہ رکھیں گے۔ اور وہ مسلمانوں کے خلاف کسی بھی اقدام کو مذموم نہیں سمجھتے۔ بشرطیکہ وہ اس پر قادر ہوں۔ چنانچہ ان کے کفر کا نقشہ کھینچا گیا اور کہا گیا کہ یہ لوگ بڑے جھوٹے ہیں۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۷)

كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَ اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ (۸) اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۹) لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ (۱۰) (۹:۷ تا ۱۰) "ان مشرکین کے لئے اللہ اور اس کے رسول ؐ کے نزدیک کوئی آخر کیسے ہو سکتا ہے؟ بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا تو جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے مگر ان کے سوا دوسرے مشرکین کے ساتھ کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے' جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ تم پر قابو پا جائیں تو تمہارے معاملے میں نہ کسی قرابت کا لحاظ کریں نہ کسی معاہدے کی ذمہ داری کا؟ وہ اپنی زبانوں سے تم کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دل ان کے انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔ انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت قبول کر لی پھر اللہ کے راستے میں سد راہ بن کر کھڑے ہو گئے۔ بہت برے کرتوت تھے جو یہ کر رہے ہیں۔ کسی مومن کے معاملے میں یہ نہ قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہد کی ذمہ داری کا اور زیادتی ہمیشہ انہی کی طرف سے ہوتی ہے۔"

مسلمانوں کے دلوں میں جو تلخ یادیں تھیں یا ان کے شعور اور جذبات میں انتقام کے لئے جو غیظ و غضب تھا' حالات کا تقاضا یہ تھا کہ ذرا اسے ابھارا جائے' اس طرح اللہ کے دشمنوں' اللہ کے دین کے دشمنوں اور خود مسلمانوں کے دشمنوں کو کچل کر دلوں کو ٹھنڈا کیا جائے۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۱۳) قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ (۱۴) وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۵) (۹: ۱۳ — ۱۵) "کیا تم نہ لڑو گے ایسے لوگوں سے جو اپنے عہد توڑتے رہتے ہیں اور جنہوں نے رسول کو ملک سے نکال دینے کا قصد کیا تھا اور زیادتی کی ابتدا کرنے والے وہی تھے؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر تم مومن ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ ان سے لڑو' اللہ تمہارے ہاتھوں' ان کو سزا دلوائے گا اور انہیں ذلیل و خوار کرے گا اور ان کے مقابلے میں تمہاری مدد کرے گا اور بہت سے مومنوں کے دل ٹھنڈے کرے گا اور ان کے قلوب کی جلن مٹا دے گا اور جسے چاہے گا توبہ کی توفیق بھی دے دے گا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا ہے۔"

حالات کا تقاضا یہ تھا کہ نظریات کی اساس پر مکمل جدائی ہو جائے اور ذاتی مصلحتوں اور رشتہ داری کے جذبات کا

مقابلہ کیا جائے اور ان کو اللہ 'رسول اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کی راہ میں رکاوٹ بننے نہ دیا جائے۔ چنانچہ مسلمانوں کو دو راستوں کے درمیان کھڑا کر دیا جاتا ہے کہ وہ ایک کے بارے میں فیصلہ کریں۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۗ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۳) قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ

(۲۴) (۹: ۲۳ — ۲۴) ) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو 'اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ تم میں جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔ اے نبی کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ 'تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں 'تم کو اللہ 'اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی راہنمائی نہیں کرتا۔"

یہاں اس بات کی ضرورت تھی کہ اللہ ان لوگوں کو یاد دلائے کہ اس نے کن کن مشکل حالات میں تمہاری مدد کی اور قریب ترین مثال یوم حنین کی ہے کہ جس میں تم نے شکست کھائی تھی اور صرف اللہ نے تمہاری امداد کی۔ اللہ کی خصوصی افواج کی مدد سے اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ثابت قدم بنا دیا۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ (۲۵) ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ (۲۶) "اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوہ حنین کے روز۔ اس روز تمہیں اپنی کثرت تعداد کا غرہ تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرین حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کے لئے جو حق کا انکار کریں۔"

پھر یہ بات بھی ضروری تھی کہ مسلمانوں کو اس طرف سے مطمئن کر دیا جائے کہ رزق دینے والا خدا ہے اور معاشی اور تجارتی کساد بازاری کا جو خطرہ تم محسوس کرتے ہو یہ بے جواز ہے ۔کیونکہ رزق فراہم کرنا اللہ کی مشیئت پر موقوف ہے ۔اسباب ظاہریہ پر نہیں ہے جس طرح تم سمجھتے ہو۔

یَآیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا وَاِنْ خِفْتُمْ عَیْلَةً فَسَوْفَ یُغْنِیْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ (۹: ۲۸) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' مشرکین ناپاک ہیں' لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکیں ۔اور اگر تمہیں تنگ دستی کا خوف ہے تو بعید نہیں کہ اللہ چاہے تو تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے ۔اللہ علیم و حکیم ہے۔"

یہ ہدایات اور تاکیدات' یہ حکمتیں اور تدابیر اور مختلف انداز سے تنقیدی تبصرے اور اشارات جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں یہ بتاتے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد اسلام میں جو مختلف طرز کے لوگ فوج در فوج داخل ہوئے تھے اور اس عظیم وسعت کی وجہ سے ایسے لوگ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے جن کی تربیت نہ ہوتی تھی اور اگر مدینہ طیبہ کی سوسائٹی تربیت یافتہ نہ ہوتی اور صحابہ کرام کے دور اول کے لوگ مختلف حالات و مشکلات سے نہ گزرے ہوتے تو ناتربیت یافتہ لوگوں کی یہ فوج اسلامی نظام کے لئے عظیم خطرہ بن جاتی جیسا کہ ہم نے بار بار اس بات کا تذکرہ کیا۔

اس سورت کے اس پہلے حصے پر ہم اس قدر کلام کے بعد اب ہم آیات کی تفصیلی تشریح کی طرف آتے ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۸۷ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۲۸

(۹) سُوْرَةُ التَّوْبَةِ مَدَنِيَّةٌ (۱۱۳)

اٰيَاتُهَا ۱۲۹ — رُكُوْعَاتُهَا ۱٦

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱
فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَ
اَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝۲ وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ
الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ
فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ؕ وَ
بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ
ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ
اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۴ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ
فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ
اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ
فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵ وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ
اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ

بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾ ع

"اعلان براءت ہے اللہ اور اس کے رسول ؐ کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے۔ پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور یہ کہ اللہ منکرین حق کو رسوا کرنے والا ہے۔

اطلاع عام ہے اللہ اور اس کے رسول ؐ کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لئے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی۔ اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو تمہارے ہی لئے بہتر ہے اور جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور اے نبی ؐ، انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سنا دو، بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کئے، پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی، تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو کیونکہ اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے۔

پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لئے بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو۔ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کے مامن تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کرنا چاہئے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔"

یہ آیات اور اس کے بعد آنے والی آیات تا آیت ۲۸، اسلامی معاشرے اور حکومت اور مدینہ طیبہ اور دیگر جزیرۃ العرب میں پائے جانے والے مشرکین اور کافرین کے درمیان باہم تعلقات کی آخری حدود مقرر کرتی ہیں۔ جن حالات میں یہ آیات نازل ہوئیں ان میں مدینہ طیبہ کے اندر موجود اسلامی مملکت کا اقتدار اعلیٰ پورے جزیرۃ العرب تک وسیع ہو گیا تھا، یہ احکام ان لوگوں پر جاری ہوئے جو دین اسلام میں داخل نہ ہوئے تھے، چاہے ان کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ تھا اور انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی تھی، خصوصاً ان حالات میں کہ جب انہوں نے دیکھا کہ روم کی سپر طاقت کے ساتھ تبوک میں جو ٹکراؤ ہونے والا ہے وہ اسلام پر ایک فیصلہ کن وار ہو گا یا اگر فیصلہ کن نہ ہو گا تو یہ جنگ مسلمانوں کی حکومت کی قوت کو توڑ کر رکھ دے گی۔ نیز ان احکام کا اطلاق ان لوگوں پر بھی تھا جن کے ساتھ معاہدہ تھا اور انہوں نے اس کی کوئی خلاف ورزی نہ کی تھی یا جن لوگوں کے ساتھ میعادی یا غیر میعادی معاہدے تھے اور انہوں نے یہ وعدے پورے کئے اور مسلمانوں کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا چنانچہ یہ احکام ان تمام قسم کے لوگوں کے معاملات کی حد بندی کرنے کے لئے وارد ہوئے اور یہ احکامات ان اسباب کی وجہ سے وارد ہوئے جن کے بارے میں ہم نے اس سورت کے مقدمہ میں تفصیلاً بات کی ہے۔ بہرحال یہ احکامات اسلامی حکومت اور غیر اسلامی گروہوں کے درمیان معاملات و تعلقات کی آخری اور فائنل حد بندی کے لئے نازل ہوئے۔

ان آیات کا انداز تعبیر اور اسلوب اعلامیہ یا نوٹیفکیشن جیسا ہے اور نہایت ہی پر قوت اور پر شوکت حاکمانہ انداز کلام ہے۔ لہٰذا موضوع کلام حالات مخاطبین کے عین مطابق انداز تعبیر اختیار کیا گیا ہے اور یہ قرآن کریم کا بہترین اور مناسب طریقہ کلام ہے جس کی وجہ سے یہ کلام معجزانہ بن گیا ہے۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن)

یہ اعلان جن حالات میں ہوا اس کے بارے میں متعدد روایات وارد ہوئی ہیں' نیز یہ اعلامیہ جس طرح مشتہر ہوا اس کے بارے میں بھی متعدد روایات وارد ہیں اور یہ کہ کس نے اس کی تشہیر کی۔

ان روایات میں سے ابن جریر نے جو روایات دی ہیں وہ زیادہ صحیح اور اس وقت اسلامی سوسائٹی کی جو صورت حال تھی' اس کے زیادہ مطابق ہیں اور ہم آہنگ ہیں۔ ہم ابن جریر کی روایات اور اس کے تبصروں سے بعض ایسے اقتباسات دیتے ہیں جو اس بارے میں ہمارے نقطہ نظر کی تائید کرتے ہیں۔ اس کے اقوال میں سے جو ہمارے نقطہ نظر کے خلاف ہے یا اس کے تبصروں میں جو باتیں متضاد ہیں ان سے ہم نے صرف نظر کیا ہے کیونکہ ہمارے یہاں یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم ان روایات کی تنقیح کریں یا طبری کی رائے پر کوئی محاکمہ پیش کریں ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ باتیں یہاں دے دیں جو ہمارے نقطہ نظر کی تائید کرتی ہیں۔

ابن جریر مجاہد کی ایک روایت نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۹: ۱) "اعلان براءت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے۔ پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو۔" (کیا اہل العہد سے مراد مدلج اور وہ عرب ہیں جن کے ساتھ حضور ؐ نے معاہدے کئے۔ کہتے ہیں کہ جب حضور اکرم ؐ تبوک سے واپس ہوئے اور اس سے فارغ ہوگئے تو آپ نے حج کا ارادہ کر لیا۔ اس کے بعد آپ نے یہ فرمایا کہ بیت اللہ کو مشرکین بھی حج کے لئے آتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض ننگے حج کرتے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اس وقت حج کروں جب یہ صورت حال نہ ہو۔ تو آپ نے حضرت ابوبکر اور حضرت علی کو بھیجا۔ یہ دونوں لوگوں کے پاس گئے۔ ذوالمجاز بازار میں اور دوسرے ان مقامات میں جہاں لوگ خرید و فروخت کرتے تھے اور حج کے تمام عرصے میں وہ یہ اعلان کرتے رہے۔ انہوں نے اہل معاہدہ کو یہ نوٹس دیا کہ چار ماہ تک تم لوگ امن و امان میں رہو گے۔ یہ چار ماہ پے درپے تھے۔ اور یہ عرصہ مہینوں سے اس طرح پورا کیا گیا تھا کہ ذوالحجہ کے آخری بیس دن اور ربیع الاول کے پہلے دس دن اس میں شامل تھے۔ اور اس کے بعد معاہدات ختم ہوں گے اور پھر تمام لوگوں کے خلاف اعلان جنگ ہوگا الا یہ کہ وہ ایمان لے آئیں۔ تو اس اعلان کے ساتھ ہی تمام لوگ ایمان لائے اور کسی نے بھی چار ماہ کی مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا۔"

تمام روایات نقل کرنے کے بعد طبری اس میعاد اس کی ابتداء و انتہا اور اس کی غرض و غایت کے بارے میں کہتا ہے :

"اس سلسلے میں سب سے زیادہ بہتر بات اس شخص کی ہے جس نے کہا ہے کہ اس میعاد سے مراد وہ میعاد ہے جو اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے لئے مقرر کی تھی کہ تم چار ماہ تک سیاحت کرو۔ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ (۹: ۲) وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ (۹: ۲) کہ یہ ان لوگوں کے لئے تھی جنہوں نے حضور ؐ کے ساتھ معاہدے کئے تھے اور پھر خلاف ورزی کی تھی اور مدت پوری ہونے سے پہلے ہی انہوں نے نقض عہد کر لیا تھا۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے اپنا عہد نہ توڑا تھا اور نہ حضور ؐ کے خلاف محاذ سے گٹھ جوڑ کیا تھا تو ان کے بارے میں اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ان کے ساتھ عہد کو مدت عہد تک پورا کرو۔ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا (۹: ۴) "بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کئے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی۔ اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی' تو

ایسے لوگوں کے خلاف تم بھی مدت معاہدہ تک وفاکرو' کیونکہ اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے ۔"

"اگر کوئی یہ گمان کرے کہ اس سے قبل تو اللہ نے فرمایا ہے فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا (۹: ۵) "پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لئے بیٹھو (توبہ ۔ ۵) اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار ماہ کے بعد میعاد ختم ہے اور اس کے بعد جہاں بھی مشرک ملے اسے قتل کرنا فرض ہے ۔ لہٰذا جس قول کو ترجیح دی جارہی ہے' وہ غلط ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگلی آیت یعنی (۷) اس بات کی تصدیق کرتی ہے جو ہم نے کہا ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ معاہدہ ہے ان پر آیت واقتلوا کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اگلی آیت یہ ہے :

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۹: ۷)

"مشرکین کے ساتھ رسول اللہ کا کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے --- بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس عہد کیا تو جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے ۔"

تو مذکورہ آیت میں جن لوگوں کے ساتھ عہد پورا کرنے کا حکم دیا ہے' وہ بھی تو مشرکین تھے اور ان کے ساتھ حضور ؐ کو سیدھا رہنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ جب تک وہ سیدھے رہیں اور حضور ؐ کے خلاف دشمنوں کی مدد نہ کریں ۔"

"نیز حضور ؐ سے آمدہ روایات میں یہ روایت بھی ہے کہ جو لوگ حج اکبر کے موقعہ پر اعلان کرتے تھے وہ ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی کرتے تھے کہ حضور ؐ اور جن قبائل کے درمیان عہد ہے تو وہ اپنی مدت تک پورا ہو گا ۔ ان روایات سے بھی اس موقف کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے ۔ کیونکہ ان آیات میں اللہ نے اپنے نبی کو یہ حکم نہیں دیا کہ آپ عہد کو توڑ دیں ان لوگوں کے ساتھ جو آپ کے ساتھ سیدھے چل رہے ہیں لہٰذا حقیقت ہے کہ چار ماہ کی مدت ان لوگوں کے لئے مقرر تھی جنہوں نے نقض عہد کیا تھا اور یہ نقض انہوں نے عہد کی میعاد کے اندر کیا تھا ۔ یہ جن لوگوں کے ساتھ غیر محدود عہد تھا ۔ رہے وہ لوگ جن کا عہد میعادی تھا اور انہوں نے اس عہد سے کسی قسم کا انحراف کر کے اپنے خلاف کسی اقدام کا راستہ ہموار نہ کیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حکم یہی تھا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ میعاد تک عہد کو پورا رکھیں اور انہی امور کا اعلان یوم حج اکبر کے موقع پر رسول اللہ کے منادیوں نے کیا تھا ۔

ان عہدوں کے بارے میں روایات نقل کر کے ابن جریر ایک دوسرے تبصرے میں یوں اظہار رائے کرتے ہیں ۔

"ان تمام روایات اور اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ ہم نے جو رائے اختیار کی ہے وہ درست ہے ۔ اور یہ کہ چار ماہ کی مدت ان لوگوں کے ساتھ مخصوص تھی جو ہم نے اوپر بیان کیا ۔ رہے وہ لوگ جن کے معاہدے کے اندر میعاد متعین تھی تو ان کے ساتھ معاہدے توڑنے کا اختیار اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو نہیں دیا ۔ بلکہ رسول اللہ نے بھی ایسے لوگوں کے ساتھ معاہدے کی مدت تک معاہدہ پورا کیا ۔ کیونکہ خدا کا حکم یہی تھا ۔ آیات کی ظاہری عبارت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور رسول اللہ سے مروی روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں ۔"

اگر ہم ضعیف روایات کو ترک کر دیں۔ اور یہ کہ ان روایات پر بعد کے ادوار میں شیعان علی اور حامیان بنو امیہ اور اہل سنت کے درمیان برپا ہونے والے اختلافات اثر انداز ہوئے ہوں۔ تو یہ بات ممکن ہے کہ حضور ؐ نے اس سال حضرت ابوبکر کو امیرالحج مقرر فرمایا ہو کیونکہ آپ اس سال حج میں شریک ہونا پسند نہ کرتے تھے کیونکہ مشرکین اور ننگے لوگ بھی حج میں شریک تھے۔ اس کے بعد سورت توبہ کی ابتدائی آیات نازل ہوگئی ہوں اور آپ نے ان کے پیچھے حضرت علی کو آخری ہدایات دے کر بھیجا ہو اور انہوں نے لوگوں کے اندر یہ اعلان کیا ہو کہ اب کوئی مشرک اور ننگا بیت اللہ میں طواف نہ کرے گا۔

امام ترمذی نے کتاب التفسیر میں نقل کیا ہے "جب سورت توبہ نازل ہوئی تو حضور ؐ نے چار باتوں کے اعلان کے لئے آدمی بھیجا کہ بیت اللہ میں کوئی ننگا شخص طواف نہ کرے ' اور آج کے بعد بیت اللہ کے قریب کوئی مشرک نہ آئے۔ اور یہ کہ رسول اللہ اور جس قوم کے درمیان معاہدے ہیں وہ اپنی مدت تک رہیں گے اور یہ کہ جنت میں مسلمانوں کے سوا کوئی شخص داخل نہ ہو گا۔ یہ حدیث اس بارے میں صحیح ترین حدیث ہے۔ لہٰذا ہم اسی ہی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۹ : ۱) "اعلان براءت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے۔" یہ ایک اعلان عام ہے اور یہ اعلان عام اس قدر حاکمانہ اور زوردار الفاظ میں ہے۔ اس کے اندر جو اصول بیان کیا گیا ہے وہ ایک اسلامی ریاست اور ایک غیر مسلم سوسائٹی کے مابین تعلقات کا اصل الاصول ہے۔ اس اصول کا اطلاق اس وقت پورے جزیرۃ العرب میں قائم اسلامی حکومت اور مشرکین کے جتھوں پر ہوا تھا۔ کیونکہ اس وقت حضور ؐ اور مشرکین کے درمیان جو معاہدے تھے وہ جزیرۃ العرب کے مشرکین کے ساتھ تھے۔ لیکن اللہ اور رسول اللہ کی طرف سے براءت کا اعلان تمام مسلمانوں کے موقف کا اعلان ہے۔ اور اس کا ہر مسلمان کے دل پر نہایت ہی گہرا اور شدید اثر ہوتا ہے۔ یہ دو ٹوک اعلان سن کر مسلمانوں کے دل میں کوئی تردد نہیں رہتا اور نہ اس فیصلے کی واپسی کی کوئی صورت رہتی ہے۔ اس اعلان کے بعد اس کی تفصیلات اور حدود و قیود اور وضاحتیں آتی ہیں:

فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ (۹ : ۲) "پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو' اور یہ کہ اللہ منکرین حق کو رسوا کرنے والا ہے۔" یہ تفصیلات ہیں اس مہلت کی جو اللہ نے مشرکین کو دی۔ چار مہینوں تک وہ آزادی سے پھر سکتے ہیں' ان میں نقل مکانی کر سکتے ہیں' بیع و شریٰ اور حسابات کی بے باقی' اپنے طور طریقوں کی تبدیلی ان چار مہینوں میں وہ آزادی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ ان کو کوئی شخص اچانک نہ پکڑے گا کہ ان کے خیال میں تو وہ معاہدے کے فریق ہوں اور حکومت انہیں اچانک پکڑ لے۔ مدینہ میں ایسے لوگ تھے جنہیں تبوک کے حالات میں یہ بات نظر آتی تھی کہ رسول اللہ ؐ اب تبوک سے واپس نہیں لوٹ سکتے اور یہ کہ رومیوں کی قوت اس قدر عظیم ہے کہ وہ اس تمام لشکر کو گرفتار کر لے گی۔ ایسے لوگ مدینہ میں حیرت انگیز افواہیں پھیلاتے تھے۔ منافقین نے

بھی ایسی ہی توقعات باندھی ہوئی تھی۔ ان لوگوں کا یہ طرز عمل کب سے تھا؟ ایک طویل عرصے سے یہ لوگ ایسا ہی کرتے رہے تھے۔ حضور ان سے معاہدے کرتے اور ابھی معاہدے کی سیاہی خشک نہ ہوتی تھی کہ یہ لوگ معاہدے توڑنا شروع کر دیتے۔ ان طویل عہد شکنیوں اور سرگرمیوں کے بعد یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ مشرکین نے مسلمانوں کے خلاف اس وقت جنگ کرنے کی ٹھانی ہوئی ہے جب تک مسلمان دوبارہ شرک کو قبول نہیں کر لیتے۔ بظاہر یہ اقدامات سخت نظر آتے ہیں لیکن یہ اقدامات اسلامی تحریک نے تاریخ کے اس دور میں جبکہ پوری بین الاقوامی دنیا میں جنگل کے قانون کی حکمرانی تھی۔ اور بین الاقوامی طور پر تعلقات صرف دو قسم کے تھے یا تو جنگ کرو اور فاتح ہو جاؤ اور دندناتے پھرو یا پھر شکست کھا کر کر یہ مسکین بن جاؤ اور یہ صورت حالات کسی بھی وقت پیش آسکتی تھی۔ کسی کو نوٹس دینا ضروری نہ سمجھا جاتا تھا۔ کسی کو خطرے سے آگاہ نہ دی جاتی تھی۔ کسی کے ساتھ کوئی رعایت وفاداری یا عہد کی پاسداری نہ تھی۔ جب بھی موقعہ ملا' مخالف کو دبوچ لیا۔ لیکن اسلام اس دور میں بھی اسلام تھا۔ وہ اپنے اصول و مبادی میں کسی زمان و مکان کا قائل نہیں ہے کیونکہ اسلامی نظام کو مرور زمانہ سے کوئی ترقی نہیں ہوتی بلکہ وہ تو خود انسانیت اور زمان و مکان کو بدل دیتا ہے۔ ہاں اسلام نے ہر دور کے لئے حقیقی اور واقعی صورت حالات کے لئے جامع اصول وضع کر دیئے ہیں اور وہ ان عظیم اصولوں کے ساتھ ہر صورت حالات کا سامنا کرتا ہے۔ وہ نئے سے نئے وسائل اصلاح انسانوں کے لئے استعمال کرتا ہے جو حالات زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں اور اسلام کے تحریکی مزاج کے ساتھ بھی جوڑ رکھتے ہیں۔

مشرکین کو مہلت دینے کے ساتھ ساتھ ایسی وارننگ بھی دی جاتی ہے کہ ان کے دل دہل جائیں۔ ایک واقعی صورت حال ان کے سامنے رکھ دی جاتی ہے تاکہ وہ خبردار ہو جائیں اور ان کی آنکھیں کھل جائیں یعنی اس عرصے میں وہ اللہ کا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گے۔ عرصہ سیاحت میں نہ وہ کچھ بگاڑ سکیں گے اور نہ بھاگ سکیں گے۔ ان کا جو نوشتہ ہے وہ دیوار پر پڑھ رہے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ذلت اور خواری ان کا مقدر ہے۔

وَّ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ (۹ : ۲) "یہ جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو بلکہ اللہ یقیناً کافروں کو خوار کرنے والا ہے۔" آخر وہ کہاں جائیں گے۔ کس طرف نکل جائیں گے کہ وہ ان کو پکڑ نہ سکتا ہو اور یہ پوری زمین تو اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اور اس نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ کافروں کو ذلیل و خوار کر دے۔ یہ نوشتہ دیوار ہے ان کے لئے۔

اس کے بعد اس اعلامیہ کے جائے صدور کا بھی تعین کر دیا جاتا ہے جس میں اسے جاری کرنا ضروری تھا تاکہ مشرکین کو علم ہو جائے اور وہ نوٹس لیں اور میعاد مقررہ تک اپنی تیاری کر سکیں۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۹ : ۳) "اطلاع عام ہے اللہ اور اس کے

رسول ؐ کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لئے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی۔اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو تمہارے ہی لئے بہتر ہے اور جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔اور اے نبی ؐ، انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سنا دو۔"

یوم حج اکبر کون سا دن ہے 'اس بارے میں روایات مختلف ہیں' یہ یوم عرفہ ہے یا یوم نحر ہے۔صحیح بات یہ ہے کہ یہ یوم نحر ہے۔اذان کے معنی اعلامیہ کے ہیں۔چنانچہ یوم حج اکبر پر یہ اعلامیہ جاری ہوا۔یہ حج اور اجتماع کا موقعہ تھا۔اس میں اللہ اور رسول کی طرف سے تمام ذمہ داریوں سے اعلان براءت کر دیا گیا۔اصولاً تمام مشرکین کے خلاف یہ اعلان جاری ہوا۔اگلی آیت میں استثنائی دفعہ دے دی گئی۔یہ بات قابل فہم ہے کہ اصل دفعہ عام اور شامل ہے کہ اللہ تمام مشرکوں سے بری الذمہ ہے۔کیونکہ آخر کار اصولاً اسی موقف کو جاری رہنا تھا۔اگلی آیت میں جو استثنائی دفعہ دی گئی ہے اس نے بہرحال وقت مقررہ کے بعد بے اثر ہو جانا تھا۔اسلامی محاذ جس کا نصب العین یہ ہے کہ لوگ صرف اللہ کی بندگی کے دائرے میں رہیں اس کی جانب سے مشرکین کے ساتھ تعلقات کی یہ فائنل شکل بالکل قابل فہم کیونکہ مقابل کے محاذ لوگوں کو شریکوں کے غلام بناتے ہیں' اس نکتے کی وضاحت ہم اس سبق پر تبصرے کے دوران کر آئے ہیں۔

اس اعلامیہ کے اندر ہی مشرکین کو راستہ بھی بتا دیا گیا ہے۔فَاِنْ تُبْتُمْ (۹: ۳) "اب اگر تم توبہ کرو تو تمہارے ہی لئے بہتر ہے۔اور جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو---- اور اے نبی' انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سنا دو۔" آیت براءت کے اندر یہ ترغیب اور ترہیب بذات خود اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ آئندہ کے لئے اسلامی نظام حیات سب سے پہلے ہدایت اور راہنمائی کا نظام ہے۔اسلام ان کو یہ موقع اور یہ میعاد جو دے رہا ہے اس لئے نہیں دے رہا کہ بس ادھر سے میعاد ختم ہو کہ ادھر وہ حملہ کر دے جیسا کہ بین الاقوامی تعلقات میں آج تک یہی ہو رہا ہے۔بلکہ وہ انہیں یہ مہلت جو دے رہا ہے تو یہ غور و فکر کے لئے دے رہا ہے اور یہ بہترین طریقہ ہدایت ہے۔اس مہلت کے عرصے میں اسلام انہیں ترغیب دیتا ہے کہ وہ لوٹ آئیں اور شرک کو چھوڑ کر اللہ وحدہ کی طرف آ جائیں۔وہ سرکشی اور روگردانی کے انجام بد سے انہیں خبردار کرتا ہے۔انہیں مایوس کرتا ہے کہ سرکشی سے انہیں کوئی فائدہ ہو گا۔دنیا کی ذلت و خواری کے علاوہ آخرت میں وہ عذاب الیم سے دوچار ہوں گے۔اس طرح قرآن کریم انہیں خوب جھنجوڑتا ہے تاکہ ان کی حقیقی فطرت جاگ اٹھے اور اس پر گرد و غبار کی جو دبیز تہہ جمی ہوئی ہے وہ چھٹ جائے اور اس طرح ان کی فطرت سنے اور بات مان کر دے۔

اس ترغیب و ترہیب میں اسلامی محاذ کے لئے ایک قسم کی تسلی بھی ہے نیز بعض لوگ جن کے دلوں میں خوف اور وسوسے تھے اور جو اس قدر شدید اعلان سے ڈرتے ہوں گے ان کے لئے بھی یہ موجب تسلی ہے کیونکہ انہوں نے بھی سمجھ لیا کہ یہ تو معاملہ قضائے الٰہی کا ہے۔اللہ نے پہلے سے فیصلے کر رکھے ہیں کہ وہ کافروں کو خوار کرنے والا ہے۔

عام اصول کے بیان کے بعد اب وقتی استثنائی حالت کی طرف آتے ہیں یعنی یہ استثنائی حالت بھی ختم ہو کر پہلی آیت میں آنے والی اصولی حالت کی طرف لوٹنے والی ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ شَیْــٴًـا وَّ لَمْ یُظَاهِرُوْا عَلَیْكُمْ

اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۹ : ۴) "بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کئے' پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی' تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو کیونکہ اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے۔" یہ استثنائی دفعہ جن لوگوں کے بارے میں آئی؟ اس بارے میں صحیح روایات یہی ہیں کہ بنی بکر کی ایک شاخ کے بارے میں ہے یعنی بنی خزیمہ ابن عامر' یہ بکر ابن کنانہ کی ایک شاخ تھی۔ حدیبیہ میں قریش اور اس کے حلفاء کے ساتھ جو عہد ہوا تھا انہوں نے اسے قائم رکھا اور یہ لوگ بنی بکر کے ساتھ خزاعہ کے خلاف لشکرکشی میں شریک نہ ہوئے تھے جبکہ قریش نے بنی بکر کی حمایت کی تھی اور ان کی حمایت ہی سے انہوں نے خزاعہ پر حملہ کیا تھا۔ اس طرح بنی بکر اور قریش نے صلح حدیبیہ کو توڑ دیا تھا اور اس معاہدۂ حدیبیہ کے دو سال بعد مکہ فتح ہوا تھا۔ حالانکہ یہ معاہدہ دس سالوں کے لئے تھا۔ یہ جماعت بنی بکر یعنی بنی خزیمہ ابن عامر نے عہد قائم رکھا اور شرک پر بھی قائم رہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان کے ساتھ عہد کو اپنی مدت تک پورا کیا جائے۔ ہماری اس رائے کی تائید محمد ابن عباد ابن جعفر کی روایت سے بھی ہوئی ہے۔ سدی کہتے ہیں :"کہ یہ لوگ بنی ضمرہ اور بنو مدلج تھے۔ یہ بنی کنانہ سے دو قبیلے تھے۔" اور مجاہد کہتے ہیں : "بنی مدلج و خزاعہ کے ساتھ عہد تھا اور انہی کے بارے میں اللہ نے فرمایا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ (۹: ۴) ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو۔" لیکن یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد خزاعہ نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ لہذا یہ بات ان مشرکوں پر صادق ہوگی جو شرک پر قائم رہے۔ اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۹ : ۷)

"مشرکین کے ساتھ رسول اللہ کا کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے --- بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس عہد کیا تھا تو جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔" چنانچہ یہ دو قبیلے تھے بنی کنانہ سے جنہوں نے حدیبیہ کے دن مسجد حرام کے پاس رسول اللہ ؐ سے عہد کیا تھا اور انہوں نے اس عہد میں کوئی کمی نہ کی تھی اور انہوں نے رسول اللہ کے مقابلے میں کسی دشمن کی مدد نہ کی تھی چنانچہ اس استثنائی دفعہ سے مراد یہی لوگ تھے اور بس اور تمام مفسرین نے یہی رائے قبول کی ہے۔ استاذ رشید رضا نے یہی قول اختیار کیا ہے لیکن استاذ عزہ دروزہ نے اپنی تفسیر میں ان سے مراد استثناء اول میں مراد لوگوں کے مقابلے میں اور لوگ لئے ہیں۔ اور یہ رائے انہوں نے اس لئے اختیار کی ہے کہ وہ دائمی طور پر مشرکین کے ساتھ معاہدات کے قائل ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے نظریئے کی بنیاد اس فقرے پر رکھی ہے۔ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ (۹: ۷) "جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں' تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو۔" اور وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ مشرکین کے ساتھ معاہدہ دائمی طور پر ہو سکتا ہے۔ یہ دراصل ایک بعید قول ہے اور یہ قول ان آیات اور اسلامی نظام کے حقیقی موقف اور خود اس دین

کے مزاج کے خلاف ہے جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے۔

اسلام نے یہ استثنائی دفعہ اس لئے رکھی ہے کہ جن لوگوں نے تحریک اسلامی کے ساتھ وفاداری کی ان سے وفاداری کی جائے۔ اس لئے اسلام نے ان کی مہلت کو چار مہینوں تک محدود نہ کیا۔ جیسا کہ دوسرے لوگوں کے لئے چار ماہ کی مہلت مقرر کر دی گئی تھی۔ بلکہ ان لوگوں کو مدت معاہدہ تک مہلت دی گئی کیونکہ انہوں نے نقض عہد نہ کیا تھا اور نہ دشمنوں کے ساتھ معاونت کی تھی۔ اس وفاداری کا تقاضا تھا کہ ان کے ساتھ وفاداری کی جائے اور یہ طویل مدت اس پالیسی کے باوجود دی گئی کہ اللہ تعالیٰ جزیرۃ العرب کو مشرکین سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ اور اسے اسلام کا محفوظ مرکز بنانا چاہتے تھے۔ کیونکہ جزیرۃ العرب کی حدود کے ساتھ متصل بڑے بڑے دشمنوں نے اسلام کو ایک عظیم خطرہ تصور کر لیا تھا اور جیسا کہ غزوہ تبوک کی تفصیلات میں بات آئے گی۔ انہوں نے اس نئی قوت کے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اس سے قبل موتہ کا واقعہ ہو چکا تھا۔ اور اس نے آنکھیں کھول دی تھیں کہ رومی کس قدر تیاریوں میں مصروف ہیں۔ پھر یہ مشرکین جنوبی یمن میں اہل ایران سے ہمدردی رکھتے تھے اور ایران کی حمایت سے دین جدید پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔

علامہ ابن قیم نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ جن لوگوں کو اس آیت کے ذریعے مستثنیٰ کیا گیا ہے اور ان کے ساتھ وفائے عہد کا حکم دیا گیا ہے وہ مدت عہد ختم ہونے سے پہلے ہی مسلمان ہو گئے تھے' بلکہ دوسرے لوگ جنہوں نے نقض عہد کا ارتکاب کیا تھا اور جن کو چار ماہ کی مہلت دی گئی تھی کہ وہ چار ماہ تک چل پھر لیں' انہوں نے بجائے چلنے پھرنے اور جلاوطنی کے اسلام قبول کر لیا۔

اللہ تعالیٰ کو خوب علم تھا اور اللہ تعالیٰ تحریک اسلامی کو اپنے دست قدرت سے آگے بڑھا رہا تھا یہ جانتا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ جزیرۃ العرب سے شرک و کفر کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ اس آخری ضرب کے لئے حالات تیار ہو گئے تھے اور صحیح وقت آ پہنچا تھا اور یہ اقدام صحیح اور مناسب وقت پر کیا گیا تھا۔ حقیقی حالات و واقعات کے عین مطابق' اللہ کے قانون قضا و قدر کے مطابق۔

اللہ نے وفائے عہد کا جو حکم دیا ہے وہ یہاں قابل غور ہے کہ وفا کرنے والوں کے ساتھ وفا کیا جائے۔ فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۹: ۴) "ان لوگوں کے ساتھ مدت عہد تک وفا کرو' بے شک اللہ متقین کو محبوب رکھتا ہے۔" جہاں وفائے عہد کو خوف خدا اور محبت الٰہی سے منسلک کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ متقین کو محبوب رکھتا ہے۔ لہٰذا وفائے عہد بھی ایک قسم کی عبادت ہے' تقویٰ ہے اور اللہ تقویٰ کو محبوب رکھتا ہے۔ یہ ہے اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر۔ اسلام کے نظام قانون و اخلاق میں مصلحت اور مفادات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ نہ اس میں رسم و رواج کی کوئی گنجائش ہے کیونکہ رسم و رواج بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اسلامی نظام اخلاق کی بنیاد اللہ کی بندگی اور خدا خوفی پر رکھی گئی ہے۔ ایک مسلمان کا اساسی فرض ہے کہ وہ ان امور پر عمل پیرا ہو جسے اس کا رب پسند کرتا ہے۔ چنانچہ اسلامی اخلاق خوف خدا اور رضائے الٰہی کی بنیاد پر مرتب ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام میں اخلاقیات اپنے اندر مضبوط قوت رکھتے ہیں۔ ان کو اس حقیقی اور وجدانی شعور سے قوت ملتی ہے۔ اس شعور کے ساتھ ساتھ عملاً اسلامی اخلاق لوگوں کے لئے مفید بھی ہوتے ہیں۔ اور ان میں ان کی مصلحت بھی پوشیدہ ہوتی ہے اور ان کے نتیجے میں ایک ایسا اجتماعی معاشرہ اور سوسائٹی وجود میں آتی ہے جس میں باہم مفادات کی کشمکش کم سے کم ہوتی ہے۔ اس نظام میں انسان کی شخصیت بلند ہو جاتی

ہے ـ اور وہ زمین کی آلودگیوں کے مقابلے میں عالم بالا سے متعلق ہوتی ہے ـ

اللہ اور رسول اللہ کی جانب سے مشرکین کے بارے میں اعلان براءت کے بعد ' یہ مشرکین چاہے معاہدہ کرنے والے ہوں یا غیر معاہد ہوں ' ماسوائے ان لوگوں کے جنہوں نے عہد نہ توڑا اور نہ مسلمانوں کے خلاف کسی کی معاونت کی ـ اب یہاں بتایا جاتا ہے کہ مسلمان اس مدت کے اختتام پر کیا اقدامات کریں گے ؟

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹ : ۵) "پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لئے بیٹھو ـ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو ـ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے ـ" یہاں لفظ الاشہر الحرام (حرام مہینے) کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں کہ ان سے مراد کون سے مہینے ہیں ؟ عام مشہور حرام مہینے ہیں یعنی ذوالقعدہ ' ذوالحجہ اور محرم اور پھر رجب تو پھر چار مہینوں سے مراد تین ماہ اور ذوالحجہ کے باقی بیس دن ہوں گے ـ یہ پچاس دن ہوئے ' یعنی اعلان کے بعد ـ یا اس سے مراد مدت چار ماہ ہے اور اس کا آغاز دس ذوالحجہ سے ہے اور اختتام دس ربیع الاخر تک ہے یا اس سے مراد یہ ہے کہ پہلی مدت ان لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے عہد توڑا اور دوسری مدت ان لوگوں کے لئے جن کے ساتھ اس سے قبل کوئی معاہدہ ہی نہ تھا ـ یہ ہیں مختلف اقوال ـ

میرے نزدیک یہاں جن چار مہینوں کا تذکرہ ہوا ہے اس سے اصطلاحی اشہر حرم مراد نہیں ہیں اور ان چار مہینوں کو اشہر حرم (محترم مہینے) اس لئے کہا گیا ہے کہ ان میں قتل و مقاتلہ حرام قرار دے دیا گیا تھا تاکہ اس عرصے میں مشرکین چل پھر سکیں ـ یہ عام میعاد تھی ـ البتہ جن لوگوں کے معاہدوں میں مدت مقرر تھی اور ان کے لئے مدت تک مہلت دے دی گئی تھی ...... چونکہ اللہ نے ان کو چار مہینے آزادی کا اختیار دے دیا تھا ـ اس لئے اس مدت کا آغاز اس کے اعلان سے ہونا چاہئے اور جس نوعیت کا یہ اعلامیہ تھا اس کی نسبت سے یہی راجح ہے کہ اس مدت کا آغاز روز اعلان سے چار ماہ تصور کیا جائے ـ

اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ اس مدت کے خاتمے کے بعد جہاں بھی مشرک ملے ' اسے قتل کر دیں یا قید کر دیں اور ہر راہ اور گھات پر بیٹھ جائیں تاکہ ان میں سے کوئی بھاگ کر نکلنے نہ پائے ' ماسوائے ان لوگوں کے جن کے بارے میں استثناء وارد ہے ـ اور وہ اس کے سوا کوئی دوسرا سلوک ان کے ساتھ نہیں کر سکتے ـ کیونکہ مشرکین کو ایک عرصہ تک انجام بد سے ڈرایا گیا اور انہیں مہلت دی گئی ـ اس لئے ان کے خلاف یہ لکشن نہ اچانک ہے اور نہ ہی غیر منصفانہ ہے ـ جبکہ ان کے ساتھ طے شدہ معاہدے ختم کر دیئے گئے ہیں ـ اب ان کے لئے کوئی بات غیر متوقع نہیں ہے ـ

بہرحال مشرکین کے خلاف یہ لکشن اس غرض کے لئے نہ تھا کہ ان کو نیست و نابود کر دے جائے بلکہ اس لئے تھا کہ وہ اسلام قبول کر لیں ـ

فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

(۹ : ۵) "پس اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو۔ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔" اس سے قبل ان کے ساتھ تحریک اسلامی کے ۱۲ سال گزرے تھے اور اس عرصے میں دعوت و تبلیغ کا حق ادا کر دیا گیا تھا۔ اس عرصے میں انہوں نے مسلمانوں کو بے پناہ اذیتیں پہنچائیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف لشکر کشیاں کیں اور ان کی حکومت کو ختم کرنے کی کوششیں کیں۔ پھر دین اسلام نے ان کے ساتھ جس قدر نرم رویہ اختیار کیا (اللہ کے رسول نے ان کے ساتھ جس قدر شریفانہ سلوک کیا وہ ایک طویل تاریخ ہے۔ اس کے باوجود اسلام کے دروازے ان کے لئے کھلے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں کو جن کو اذیت دی گئی' جن کے ساتھ جنگ کی گئی اور جن کو ملک سے نکالا گیا اور قتل کیا گیا ایسے مسلمانوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ اگر یہ مشرکین توبہ کر لیں تو ان سے ہاتھ کھینچ لو اگر وہ سچے دل سے اسلام کو قبول کرلیں اور اسلامی شعائر کو قبول کرلیں۔ جس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہو کہ وہ سچے دل سے مسلمان ہوگئے ہیں اس لئے کہ اللہ کسی بھی ایسے شخص کو مایوس نہیں کرتا جو سچی توبہ کر کے لوٹ آتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۹: ۵) "بے شک اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔" اس آیت کے بارے میں فقہاء کے درمیان جو فقہی مباحث چلے ہیں' ہم ان سے کوئی تعرض نہیں کرتے یعنی فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ (۹: ۵) "یعنی اگر توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں....." فقہاء نے یہ بحثیں کی ہیں کہ آیا ادائے نماز اور ادائے زکوۃ شروط اسلام میں سے ہیں یا ان کے تارک کو کافر کہا جائے گا؟ اور کب وہ کافر ہو گا؟ اور کیا نماز اور زکوۃ ہی کو علامت توبہ سمجھا جائے گا یا دوسرے ارکان اسلام کا مطالبہ بھی ان سے کیا جائے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان سوالات میں سے کسی سوال کے حل کے لئے یہ آیت نازل ہی نہیں ہوئی ہے۔ یہ نص اس وقت مشرکین عرب کے واقعی حالات کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور اس وقت یہ تصور ہی نہ تھا کہ کوئی توبہ کرے تو صرف نماز اور زکوۃ پر عمل پیرا ہو اور دوسرے اعمال کو نظرانداز کر دے' جو توبہ کرتا تھا وہ پورے اسلام میں داخل ہوتا تھا بلکہ اس آیت نے اگرچہ ان دو باتوں کا ذکر کیا ہے لیکن یہ اس لئے کہ اس وقت جو لوگ اسلام میں داخل ہوتے تھے وہ اسلام کی تمام شرائط کے ساتھ اس میں داخل ہوتے تھے۔ اور ان میں سے پہلی شرط یہ ہوتی کہ وہ پوری زندگی میں اللہ کا دین نافذ کریں گے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لے آئیں...... لہٰذا فقہاء اور مفسرین نے جو بحثیں کی ہیں۔ اس آیت کے وہ پیش نظر نہ تھیں بلکہ یہ ایک عملی کارروائی کے سلسلے میں ہدایت تھی۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ چار ماہ کی مدت کے بعد بھی اسلام رواداری' سنجیدگی اور واقعیت پسندی کا دامن نہیں چھوڑتا' جیسا کہ ہم نے کہا اسلام کی یہ جنگ نسل کشی کے لئے نہیں ہے' بلکہ وہ ہدایت کی ایک مہم ہے۔ وہ مشرکین جو جاہلی سوسائٹی کی صورت میں جتھ بند نہیں ہیں' افراد کی شکل میں ہیں' اور وہ اسلام کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے' ان کے لئے دارالاسلام میں مکمل امن و امان کے حقوق محفوظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ رسول اللہ اور مسلمانوں کو حکم دیتے ہیں کہ آپ ان کو پناہ دیں اور وہ اللہ کے کلام کو سنیں اور سمجھیں اور پھر ان کو ایسے علاقے میں پہنچا دیں جہاں وہ امن سے ہوں۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (۹ : ۶) "اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔پھر اسے اس کے مامن تک پہنچا دو۔یہ اس لئے کرنا چاہئے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی بے حد خواہش ہے کہ ہر شخص ہدایت پائے اور راہ راست پر آجائے اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص دار الاسلام میں پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دینا دار الاسلام کا فرض ہے کیونکہ جب مشرکین دار الاسلام میں پناہ گیر ہوں گے تو پھر وہ دار الاسلام کے ساتھ جنگ نہ کر سکیں گے۔لہٰذا ان کو پناہ دینا اور قرآن سنانا اور دین اسلام کے اصولوں سے ان کو شناسا کرنا مفید مطلب ہے۔ممکن ہے کہ اس طرح ان کے دل کھل جائیں 'وہ ہدایت پا لیں اور قبول کر لیں۔اگر وہ نہ بھی قبول کریں تب بھی اللہ نے اہالیان دار الاسلام پر یہ فرض کر دیا ہے کہ وہ ان کی حفاظت کریں اور ایسے ملک تک پہنچا دیں جہاں وہ امن و امان سے رہ سکیں۔

مشرکین کے لئے دار الاسلام کی یہ پناہ گاہ دراصل اسلام کے مقامات بلند سے ایک اعلیٰ مقام تھا۔اور اس کے علاوہ بھی اسلام میں ایک بلند چوٹی سے آگے دوسری بلند چوٹیاں اور رفعتیں نظر آتی ہیں' اور ان میں سے یہ ایک نہایت ہی بلند مقام ہے کہ ایک مسلمان ایک مشرک کا محافظ ہے۔وہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن کا محافظ ہے۔جس نے مسلمان اور اسلام کو سخت اذیتیں دی ہیں اور مشکلات میں مبتلا کیا اور یہاں تک حفاظت کی جا رہی ہے کہ وہ دار الاسلام سے باہر کسی مقام پر پہنچ جائے یہ رواداری کا ایک نہایت ہی بلند مقام ہے۔

معلوم ہوا کہ اسلام ہدایت کا نظام ہے اور یہ نسل کشی کا نظام نہیں ہے۔اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ اسلام کے لئے ایک نہایت ہی مامون اور محفوظ مرکز کا بندوبست کرے۔

جو لوگ اسلامی نظام کے نظریہ جہاد پر یہ اعتراضات کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے لوگوں کو زبردستی اسلامی عقائد قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور پھر مسلمانوں میں سے جو لوگ مستشرقین کے یہ الزامات پڑھتے ہیں تو وہ خائف ہو جاتے ہیں اور پھر ان الزامات کے جواب میں دفاعی انداز اختیار کرتے ہیں اور پھر یہ موقف اختیار کر لیتے ہیں کہ اسلام تو صرف دفاع میں لڑتا ہے اور وہ دفاع بھی اپنی ریاستی حدود کے اندر کرتا ہے۔ان دونوں طبقات یعنی الزامات لگانے والوں اور ان کا دفاع کرنے والوں کو ذرا اسلام کے اس مقام بلند پر جا کر دنیا پر نظر ڈالنا چاہئے اور پھر دوبارہ اس آیت کو پڑھ کر غور کرنا چاہئے۔انہیں انسان کی پوری تاریخ پست نظر آئے گی 'تہی دامن نظر آئے گی۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (۹ : ۶) "اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہئے تاکہ اللہ کا کلام سنے تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ کلام سن لے۔پھر اسے اس کے مامن تک پہنچا دے۔یہ اس لئے کرنا چاہئے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔" گویا یہ دین ان لوگوں کے لئے ایک خبرداری ہے جو جانتے

نہیں ہیں ۔ اور یہ دین ان لوگوں کے لئے جائے پناہ ہے جو پناہ چاہتے ہیں ۔بلکہ ان اعدا کے لئے بھی جنہوں نے اس کے خلاف تلوار اٹھائی' اس کے خلاف جنگ کی اور اس کے ساتھ عناد رکھا ۔ اسلام علم جہاد اس وقت بلند کرتا ہے جب دعوت اسلامی اور عوام الناس کے درمیان مادی قوتیں حائل ہو جاتی ہیں اور ان کے کان تک دعوت پہنچنے میں رکاوٹ ڈالتی ہیں ۔ اور کلام الٰہی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں ۔ ہدایت کی راہ روکتی ہیں ۔ نیز یہ مادی قوتیں لوگوں کو انسانوں کی غلامی اور بندگی سے رہا کرنے کی راہ میں مزاحم ہوتی ہیں اور لوگوں کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ غیراللہ کی بندگی کرتی رہیں ۔ اور جب ان قوتوں کو توڑ دیا جائے اور یہ رکاوٹیں دعوت اسلامی کی راہ سے دور ہو جائیں تو پھر تمام افراد آزاد ہو جاتے ہیں' اپنی رائے میں آزاد ہیں ۔ اسلام پھر انہیں صرف تعلیم دیتا ہے' نہ مجبور کرتا ہے اور نہ خواہ مخواہ کسی کو قتل کرتا ہے بلکہ ان کو پہنچا دیتا ہے' ان کی حفاظت کرتا ہے اور پھر ان کو ان کے جائے امن تک پناہ دیتا ہے ۔ یہ سلوک باوجود ان کے اس طرز عمل کے ہوتا ہے کہ وہ اسلامی نظام کا انکار کرتے ہیں ۔

اس وقت دنیا میں ایسے نظام اور ایسے طور طریقے رائج ہیں جنہیں خود انسانوں نے تشکیل دیا ہے ۔ اگر ان انسان کے بنائے ہوئے نظاموں اور طور طریقوں کی کوئی مخالفت کرے تو اس کی جان محفوظ نہیں رہتی' نہ اس کا مال محفوظ رہتا ہے' نہ اس کی عزت محفوظ رہتی ہے اور نہ اس کے دوسرے انسانی حقوق محفوظ رہتے ہیں ۔ بعض لوگ عملاً ایسی صورت حال کو دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور پھر بھی اسلام کے خلاف ان بے بنیاد الزامات اور اتہامات کے جواب میں شف شف کرتے ہیں اور ان کے جواب میں شکست خوردہ ذہنیت' کمزور موقف اور تلوار اور توپ کے مقابلے میں محض معذرت اور قلم کو کام میں لاتے ہیں اور پھر ہمارے دور جدید ہیں ۔

---ooo---

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ
اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ
فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۷ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا
عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى
قُلُوْبُهُمْ ۚ وَ اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا
عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا
وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝۱۰ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ

اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝

"ان مشرکین کے لئے اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کوئی عہد آخر کیسے ہو سکتا ہے؟--- بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا' تو جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے..... مگر ان کے سوا دوسرے مشرکین کے ساتھ کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ تم پر قابو پا جائیں تو نہ تمہارے معاملہ میں کسی قرابت کا لحاظ کریں نہ کسی معاہدہ کی ذمہ داری کا؟ وہ اپنی زبانوں سے تم کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دل ان کے انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔ انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت قبول کر لی۔ پھر اللہ کے راستے میں سد راہ بن کر کھڑے ہو گئے۔ بہت برے کرتوت تھے جو یہ کرتے رہے۔

کسی مومن کے معاملہ میں نہ یہ قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہد کی ذمہ داری کا۔ اور زیادتی ہمیشہ انہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ پس اگر یہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں اور جاننے والوں کے لئے ہم اپنے احکام واضح کیے دیتے ہیں۔ اور اگر عہد کرنے کے بعد یہ پھر اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر حملے کرنے شروع کر دیں تو کفر کے علمبرداروں سے جنگ کرو کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ شاید کہ (پھر تلوار ہی کے زور سے) وہ باز آئیں گے۔"

سابقہ آیات میں' میں اسلامی حکومت اور جزیرۃ العرب کے دوسرے معاشروں اور مشرکین جزیرۃ العرب کے مابین تعلقات کی آخری شکل کو منضبط کیا گیا تھا۔ اس اقدام کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی حکومت اور ان دوسرے گروپوں کے درمیان معاہدے اور امن کی حالت ختم ہو جائے اور ان میں سے بعض کو چار ماہ کی مہلت دے دی جائے اور بعض کو انتہائے مدت معاہدہ تک کی مہلت دی جائے اور ان حالات اور میعاد کے ختم ہونے کے بعد تعلقات کی صرف دو صورتیں رہ جائیں یا تو اسلام قبول کر کے نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں یعنی اسلام قبول کر کے تمام فرائض کے پابند ہو جائیں اور یا قتال' قیدی اور مورچہ بندی کے لئے تیار ہو جائیں۔

جب صورت حالات ایسی ہو جائے تو پھر اگلی آیات میں بطور استفہام انکاری اور سخت الفاظ میں یہ تنبیہہ کی جاتی ہے کہ یہ بات اب نہ مناسب ہے اور نہ ہی ایسا ہونا چاہئے کہ کسی مشرک کے ساتھ رسول اللہ کوئی معاہدہ کریں یعنی اصولاً ایسا ہونا ہی نہ چاہئے۔ یہ بات بنیادی طور پر اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖ (۹ : ۷) "ان مشرکین کے لئے

اللہ اور رسول اللہ کے پاس کوئی عہد آخر ہو کیسے سکتا ہے ) موجودہ آیات کے اندر استفہام انکاری سے یہ متبادر ہو سکتا تھا کہ پہلی آیات میں جن لوگوں کے معاہدات کے لئے مدت معاہدہ تک مہلت دی گئی تھی' جنہوں نے معاہدات کی پاسداری کی تھی اور مسلمانوں کے ساتھ کوئی دشمنی نہ کی تھی' شاید موجودہ آیات اور حکم سے وہ مہلت بھی واپس لے لی گئی ہے اس لئے یہاں بتکرار یہ کہا گیا کہ ایسے لوگوں کی مہلت باقی ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۹ : ۷) "بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا' تو جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔" لیکن اس جدید تاکید میں ایک اضافہ بھی آگیا ہے۔ پہلے حکم میں یہ تھا کہ ان کو مہلت دے دی گئی ہے کیونکہ انہوں نے ماضی میں نقض عہد نہ کیا تھا۔ یہاں یہ شرط عائد کر دی گئی کہ نزول آیت سے لے کر مدت معاہدہ تک بھی وہ عہد کا پاس رکھنے کے پابند ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے بین الاقوامی معاملات کو منضبط کرنے میں بڑی باریکی سے کام لیا ہے۔ محض ضمنی اشارے اور قیاس کے بجائے صریح نص کو لانا ضروری سمجھا گیا۔

اس سورت کے تعارف اور اس سبق کے تعارف میں ہم نے جو کچھ کہا اور نزول سورت کے وقت جو حالات اور جو مظاہر اسلامی معاشرے کے اندر موجود تھے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہ فیصلہ کن قدم کیوں اٹھایا گیا' اب یہاں سے آگے کی آیات میں مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے ان کے دلوں میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات اور تردد اور پریشانی کو دور کرتے ہوئے انہیں اس حقیقت سے آگاہ کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں اور اسلامی نظام کے سلسلے میں خود ان مشرکین کے خیالات اور نیات کیسی ہیں؟ وہ مسلمانوں کے ساتھ کئے ہوئے کسی عہد کا کوئی پاس نہیں رکھتے۔ اس معاملے میں وہ ہر کارروائی کرنے کو جائز سمجھتے ہیں اور ان معاہدات کی خلاف ورزی کے لئے وہ ہروقت تیار رہتے ہیں' وہ کبھی وفا نہیں کرتے' وہ کبھی اپنے عہد کے مطابق اپنے آپ کو پابند نہیں کرتے اور جب بھی وہ قدرت پائیں وہ مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کے لئے ہروقت تیار ہیں۔ اس لئے ان کے ساتھ سالمیت' امن کی صورت حال پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی ان پر اس سلسلے میں کوئی اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ الا یہ کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖ (۹ : ۷) "ان مشرکین کے لئے اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کوئی عہد آخر کیسے ہو سکتا ہے؟" مشرکین صرف ایک اللہ کی بندگی نہیں کرتے۔ وہ رسالت محمدی کا اعتراف بھی نہیں کرتے۔ تو کیسے ممکن ہے رسول اللہ کے نزدیک ان کا کوئی عہد ہو۔ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے جیسے بندوں کی حیثیت کا انکار نہیں کر سکتے' نہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے نظاموں کا انکار کر سکتے ہیں لیکن دوسری طرف وہ اپنے خالق اور رازق حقیقی کا انکار کرتے ہیں۔ وہ اللہ اور رسول کے ساتھ عداوت کرتے ہیں لہذا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ اور رسول اللہ کے ہاں ان کا کوئی عہد ہو۔

اس استفہام انکاری میں اس مسئلے کو اٹھایا گیا ہے اور یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ یہ اصولاً اس بات ہی کو رد کر دیتا ہے کہ کسی مسلمان اور اللہ اور رسول اور مشرک کے درمیان سرے سے کوئی معاہدہ ہو۔ قطع نظر موجودہ معاہدات سے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت تو عملاً مشرکین کے ساتھ معاہدات موجود تھے۔ اور ان میں سے بعض معاہدوں کے بارے میں تو خود اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کو اپنی مدت تک پورا کیا جائے اور مدینہ میں اسلامی مملکت کے قیام کے ساتھ ہی کفار کے ساتھ معاہدات ہوئے تھے۔ یہودیوں کے ساتھ معاہدات ہوئے تھے، مشرکین کے ساتھ معاہدات ہوئے تھے۔ چھٹی صدی ہجری میں معاہدۂ حدیبیہ ہوا تھا اور سابقہ آیات میں ایسے معاہدات کی اجازت بھی دی گئی ہے۔ اگرچہ ان آیات میں یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ اگر خیانت کا اندیشہ ہو تو ان معاہدات کو منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ اگر آیت زیر بحث میں اصولاً اس بات ہی کو مستبعد قرار دیا گیا ہے کہ مشرکین کے ساتھ معاہدہ کیسے ہو سکتا ہے تو پھر ان معاہدات کی اجازت کیوں دی گئی اور یہ معاہدات طے کیوں پا گئے اور پھر ان پر یہ استفہام انکاری کیوں آیا؟

اگر اسلام کے تحریکی منہاج کو اس طرح سمجھا جائے جس طرح ہم نے سابقہ صفحات کے اندر سمجھانے کی سعی کی ہے۔ اس سورت کے آغاز میں اور سورت انفال کے آغاز میں تو یہ اشکال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ درحقیقت یہ معاہدات ایک متعین وقت میں، بعض عملی حالات کی وجہ سے طے پائے تھے اور یہ موزوں وقت پر موزوں وسائل جنگ تھے۔ عبوری دور کے لئے تھے۔ آخری اور انتہائی اور فائنل ہدایت بہرحال یہ ہے کہ مشرکین کے ساتھ کوئی عہد نہ ہو اور اللہ اور رسول اللہ کے ہاں اب کوئی عہد مشرکین کے لئے نہیں ہونا چاہئے۔ تحریک اسلامی کا آخری ہدف یہی تھا کہ اسلامی نظام کے سوا کوئی نظام نہ ہو اور اللہ کے ساتھ کرۂ ارض پر کوئی شریک نہ ہو لیکن یہ معاہدات عبوری دور کے لئے کئے گئے۔ جہاں تک اسلام کا آخری ہدف ہے تو اس کا اعلان تو اول روز سے کر دیا گیا تھا۔ ابتدائی اور عبوری دور کا تقاضا یہ تھا کہ جو مشرک مسلمانوں کے ساتھ نہ لڑتے تھے انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور ان سے نمٹا جائے جو لڑتے تھے۔ اور یہ کہ جو لوگ تحریکی ادوار میں سے کسی دور میں دوستی چاہتے ہیں تو ان سے دوستی کی جائے۔ جو معاہدے کرنا چاہئے ان سے معاہدے کئے جائیں جو غیر جانبدار رہنا چاہتے ہیں ان کو رہنے دیا جائے لیکن آخری ہدف تو بہرحال یہ تھا کہ اور اس سے تحریکی حضرات کسی وقت بھی غافل نہیں رہے کہ پورے کرۂ ارض اور خصوصاً جزیرۃ العرب سے شرک کا خاتمہ کر دیا جائے۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ خود مشرکین نے جو معاہدات اہل اسلام سے کئے وہ بھی وقت مقرر کے لئے تھے اور یہ بات لازمی تھی کہ میعاد ختم ہونے کے بعد وہ حملہ آور ہو سکتے تھے۔ وہ کیسے حضور ﷺ کو چھوڑ سکتے تھے جبکہ ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آپ کے اہداف کیا ہیں، وہ حضور سے امن کی حالت اس لئے قائم کرتے تھے کہ وہ اس دوران آپ کے خلاف تیاریاں کر لیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دائمی ہدایت تو دے دی تھی اور وہ کسی زمان و مکان کے ساتھ مخصوص نہ تھی۔

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا (۲ : ۲۱۷) اور وہ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں اپنے دین سے لوٹا دیں اگر وہ ایسا کر سکیں) یہ ایک دائمی قول ہے، دائمی نصیحت ہے، جو کسی زمانے، کسی معاشرے اور کسی بھی دور کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

اصولاً تمام معاہدات کے انکار کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے معاہدات کو مدت معاہدہ تک باقی رکھا

جنھوں نے نہ تو معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور نہ ہی انہوں نے مسلمانوں کے خلاف کسی کارروائی میں حصہ لیا تھا' بشرطیکہ وہ آئندہ بھی ایسا ہی طرزِ عمل جاری رکھیں' یہ شرط یہاں نئی عائد کی گئی ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۹ : ۷) "بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس عہد کیا تھا تو جب تک وہ تمہارے سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔"

یہ لوگ جن کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ جنھوں نے مسجد حرام کے پاس آپ سے معاہدہ کیا' وہی ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۹ : ۷) "بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کئے' پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی' تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔"

اس آیت میں ان کے سوا کوئی اور مراد نہیں ہے جس طرح بعض مفسرین نے سمجھا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کا ذکر آیت چار میں عمومی براءت سے استثنائی کے لئے ہوا تھا' اور دوسری مرتبہ ان کا تذکرہ اس لئے ہوا کہ اللہ نے کیف یکون کے ساتھ اصولاً بھی ہر مشرک کے ساتھ معاہدے کی نفی کر دی۔ تو دوبارہ استثناء کی گئی کہ اس اصولی آیت سے کہیں سابقہ استثناء کو منسوخ تصور نہ کر لیا جائے۔ یہاں بھی تقویٰ کا ذکر ہوا اور اظہار کیا گیا کہ اللہ متقین کو پسند کرتا ہے اور وہاں بھی ایسا ہی اظہار کیا گیا تھا' اشارہ یہ مطلوب تھا کہ مضمون ایک ہے' موضوع آیت وہی ہے جبکہ دوسری آیت میں استثناء میں یہ اضافہ کر دیا گیا کہ جس طرح ماضی میں وہ رویہ درست رکھے ہوئے تھے اسی طرح مستقبل میں بھی انہیں اپنا رویہ درست رکھنا ہو گا۔ جیسا کہ ہم نے کہا یہ نہایت ہی باریک قانونی عبارت یعنی (Proviso) ہے اور دونوں آیات کو ملا کر پڑھنے سے یہ لازم آتا ہے کہ جس طرح وہ پہلے وفائے عہد کرتے رہے اسی طرح مہلت تب جاری رہے گی جب وہ آئندہ بھی درست رہیں یعنی دوران مہلت۔

اب یہ بات بتائی جاتی ہے کہ اصولاً مشرکین کے ساتھ اب معاہدے کیوں ممنوع کر دیئے گئے؟ اس کے تاریخی اسباب یہاں گنوائے جاتے ہیں۔ عملی ضرورت بتائی جا رہی ہے اور فریقین کے درمیان نظریاتی اور ایمانی جدائیاں اور تضادات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ (۸) اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ

اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۹) لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ (۱۰)(۹:۸ تا ۱۰) "مگر ان کے سوا دوسرے مشرکین کے ساتھ کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ تم پر قابو پا جائیں تو نہ تمہارے معاملہ میں کسی قرابت کا لحاظ کریں نہ کسی معاہدہ کی ذمہ داری کا؟ وہ اپنی زبانوں سے تم کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دل ان کے انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔ انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت قبول کر لی۔ پھر اللہ کے راستے میں سد راہ بن کر کھڑے ہو گئے۔ بہت برے کرتوت تھے جو یہ کرتے رہے۔ کسی مومن کے معاملہ میں نہ یہ قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہد کی ذمہ داری کا۔ اور زیادتی ہمیشہ انہی کی طرف سے ہوئی ہے۔"

مشرکین کے ساتھ اللہ اور رسول اللہ کا کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو عہد کرتے بھی اس وقت ہیں جب وہ تمہارے مقابلے سے عاجز ہو جائیں اور اگر وہ تم پر غالب آ جائیں اور فاتح ہو جائیں تو تمہارے ساتھ وہ کام کریں جن کا تم تصور ہی نہیں کر سکتے۔ پھر وہ کسی معاہدے کا بھی خیال نہ رکھیں، اپنی کسی ذمہ داری کا کوئی پاس نہ رکھیں، وہ تمہارے خلاف مذموم افعال کے ارتکاب سے بھی نہ ہچکچائیں کیونکہ وہ فطرتاً کسی عہد اور کسی رشتہ داری کا کوئی پاس نہیں رکھتے اور ظلم و زیادتی میں حدیں پار کر جاتے ہیں اور تمہارے معاملے میں تو اپنے ان مذموم افعال کو بھی مذموم نہیں سمجھتے جو عموماً وہ اپنے معاشرے میں بہت ہی مذموم سمجھتے ہیں اور ان کا ارتکاب نہیں کرتے۔ ان کے دل میں تمہارے خلاف اس قدر بغض بھرا ہوا ہے کہ وہ تم پر ہر ظلم کرنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ قدرت پالیں اگرچہ معاہدے قائم ہوں۔ یہ نہیں کہ وہ محض معاہدوں کی وجہ سے تمہارے خلاف ایکشن نہیں لیتے بلکہ وہ قدرت ہی نہیں رکھتے۔ آج جبکہ تم طاقتور ہو، وہ بظاہر تم سے نرم بات کرتے ہیں اور اظہار وفا کرتے ہیں لیکن ان کے دل تمہارے عناد کی وجہ سے کھول رہے ہیں اور وہ عہد پر قائم رہنے کا کوئی داعیہ نہیں رکھتے کیونکہ ان میں نہ وفاداری ہے اور نہ محبت ہے۔ ان کی حالت یہ ہے

وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ (۸) اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۹) (۹:۸ – ۹) "ان میں سے اکثر فاسق ہیں، انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت قبول کر لی ہے۔ پھر اللہ کے راستے میں سد راہ بن کر کھڑے ہو گئے۔ بہت برے کرتوت تھے جو یہ کرتے رہے۔" ان کے دلوں میں تمہارے خلاف حسد اور کینہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اس کی یہی حقیقی وجہ ہے اور اسی وجہ سے وہ تمہارے ساتھ طے پا جانے والے معاہدات کے معاملے میں وفا کرنے والے نہیں ہیں۔ اور جس وقت بھی وہ قوت محسوس کریں وہ تم سے انتقام لینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ کوئی خلجان اور کوئی حرج محسوس نہیں کرتے۔ ان وجوہات سے وہ فاسق قرار پاتے ہیں اور اللہ کی ہدایت سے خارج متصور ہوتے ہیں۔ ان کے پاس اللہ کی آیات آئیں اور انہوں نے چند ٹکوں کے عوض انہیں پس پشت ڈال دیا۔ یہ دنیا جس میں وہ رہتے ہیں انہیں اس قدر عزیز ہے کہ اس کے مفادات کو آیات الہیہ پر انہوں نے ترجیح دی۔ ان کو یہ خوف دامن گیر تھا کہ اسلام کے اصلاحی نظام کی وجہ سے ان کے مفادات پر زد پڑ جائے گی۔ یا انہیں کچھ مزید ادائیگیاں کرنی پڑیں گی۔ اس لئے وہ

دوسرے لوگوں کو بھی اسلام کی طرف آنے سے روکتے تھے اور خود بھی اس طرف نہ آتے تھے۔ اسی طرح یہ لوگ آئمہ کفر بن گئے تھے۔ اس لئے ان کے اس کرتوت کو اللہ نے اصل برائی یا برائیوں کی جڑ قرار دیا۔ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۹: ۹) "بہت برے کرتوت ہیں جو یہ کرتے ہیں۔" ان لوگوں کے دلوں میں پایا جانے والا بغض اور حقد تمہاری ذات تک محدود نہیں ہے اور ان کا یہ مکروہ منصوبہ صرف تم تک محدود نہیں ہے۔ یہ حسد انہوں نے تمام مومنین کے لئے چھپا رکھا ہے۔ ہر مسلم کے ساتھ وہ یہی مکروہ سلوک کرتے ہیں۔ دراصل ان کا یہ سلوک تمہاری صفت کے ساتھ ہے یعنی صفت ایمان و اسلام کے ساتھ' اور صفت ایمان اور اسلام۔ اسلامی تاریخ میں جن لوگوں کے اندر پائی گئی ہے ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا گیا اور اس بات کا اظہار ان ایمان لانے والے جادوگروں نے کیا تھا جو فرعون کے جذبہ انتقام اور غضب کا شکار بن گئے تھے۔ انہوں نے کہا وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا "اور تم ہم سے یہ انتقام جو لے رہے ہو تو یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم نے اپنے رب کی آیات کو مان لیا۔ جب وہ ہمارے سامنے آگئیں۔" اور رسول اللہ نے اپنے رب کی ہدایت کے مطابق اہل کتاب سے یہی کہا قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ (۵: ۵۹) "اے اہل کتاب تم جو ہم سے انتقام لیتے ہو تو یہ صرف اس لئے ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لے آئے ہیں۔" اور اللہ نے اصحاب الاخدود کے بارے میں یہی کہا تھا' جب ان کو جلایا گیا تھا۔ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ "اور ان لوگوں سے انتقام صرف اس لئے لیا کہ وہ اللہ عزیز و حمید پر ایمان لے آئے تھے۔" غرض مشرکین کی طرف سے انتقام کا سبب ماسوائے صفت ایمان کے اور کوئی بات نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دشمنان اسلام نے صرف ایمان کی وجہ سے ہر مومن سے دشمنی رکھی اور اس بارے میں کسی عہد و پیمان اور رشتہ داری کا کوئی خیال نہ رکھا۔

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ (۹: ۱۰) "یہ لوگ تمہارے بارے میں کسی قرابت داری اور کسی معاہدہ کی ذمہ داری کا کوئی لحاظ نہیں رکھتے اور یہی لوگ زیادتی کرنے والے ہیں۔" ان کے اندر زیادتی کرنے کی صفت رچی بسی ہے۔ اور اس کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ یہ لوگ ایمان کو ناپسند کرتے ہیں۔ ایمان سے لوگوں کو روکتے ہیں اور ایمان کی تحریک کے سامنے دیوار بن رہے ہیں۔ اور وہ ہر وقت اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ مومنین پر وار کرنے کا موقعہ مل جائے۔ اور وہ اہل ایمان سے نہ رشتہ داری کا تعلق رکھتے ہیں اور نہ معاہدے کی پرواکرتے ہیں بشرطیکہ ان کو غلبہ نصیب ہو جائے اور موقع مل جائے اور ان کو یہ خطرہ نہ ہو کہ مسلمان ان پر حملہ کریں گے۔ اور اگر ان کو معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں کے اندر قوت نہیں ہے تو یہ ان کے ساتھ کیا کیا کر گزریں۔ صرف موقعہ ہاتھ آنے کی دیر ہے' پھر نہ حقوق کا پاس ہے نہ رشتہ داری کا لحاظ ہے اور نہ کوئی معاہدہ ان کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ بڑے سے بڑا فعل کرنے کے لئے یہ لوگ تیار ہیں بشرطیکہ خود مامون ہوں۔

اب تفصیلاً بتایا جاتا ہے کہ ان حالات میں اہل ایمان مشرکین کے حوالے سے کیا طرز عمل اختیار کریں۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (١١) وَ اِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ (١٢) (٩:١١ — ١٢))

"پس اگر یہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں اور جاننے والوں کے لئے ہم اپنے احکام واضح کئے دیتے ہیں اور اگر عہد کرنے کے بعد یہ پھر اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر حملے کرنے شروع کر دیں تو کفر کے علمبرداروں سے جنگ کرو کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ شاید کہ (پھر تلوار ہی کے زور سے) وہ باز آئیں گے۔"

مسلمانوں کا مقابلہ ایسے دشمنوں سے ہے جو ہروقت تاک میں بیٹھا ہے اور وہ مسلمانوں پر بے رحم وار کرنے کے لئے محض اس لئے رکے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کے اندر وار کرنے کی سکت نہیں ہوتی۔ یہ وجہ نہیں ہوتی کہ وہ کسی عہد و پیمان کا لحاظ کرنے والے ہوتے ہیں یا کسی ذمہ داری کا احساس کرنے والے ہوتے ہیں یا ان پر کسی ملامت کرنے والے کی ملامت و مذمت کا کوئی اثر ہوتا ہے، نہ وہ کسی رشتہ داری یا تعلق کا خیال رکھتے ہیں۔ دین اور لادینی کی کشاکش کی یہ ایک طویل تاریخ ہے اور یہ تاریخ اسی راہ پر چلتی رہی ہے۔ اس شاہراہ سے اگر کوئی انحراف ہوا ہے تو وہ محض عارضی اسباب کی وجہ سے اور جلدی تاریخ اپنے اسی خط پر رکتی ہے جو مقرر و مرسوم رہا ہے۔

ایک تو ہمارے سامنے یہ عملی تاریخ ہے، دوسرے یہ کہ اسلامی نظام حیات کے اہداف کی نوعیت ہے کہ اس کے پیش نظر لوگوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی غلامی میں دینا ہے، جبکہ اسلامی نظام حیات کے مقابلے میں تمام جاہلی نظام ہائے حیات کے اہداف یہ ہیں کہ لوگ لوگوں کے غلام رہیں۔ ایسے حالات میں اسلامی نظام حیات کا تحریکی عمل دنیا کو اس طرح خطاب کرتا ہے۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (٩:١١) "پس اگر یہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں اور جاننے والوں کے لئے ہم اپنے احکام واضح کئے دیتے ہیں۔"

وَ اِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ (٩: ١٢) "اور اگر عہد کرنے کے بعد یہ پھر اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر حملے کرنے شروع کر دیں تو کفر کے علمبرداروں سے جنگ کرو کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ شاید کہ (پھر تلوار ہی کے زور سے) وہ باز آئیں گے۔"

پھر صورت یہ ہوگی کہ یا تو وہ اس دین میں داخل ہو جائیں گے جس میں مسلمان داخل ہوئے ہیں اور سابقہ گناہوں سے تائب ہو جائیں گے اور شرک اور ظلم کو چھوڑ دیں گے۔ تو مسلمان ان کے شرک اور ظلم سے صرف نظر کر دیں گے۔ اور ان کے درمیان نظریاتی تعلق قائم ہو جائے گا۔ اور یہ جدید مسلمان بھی قدیم مسلمانوں کے بھائی بن جائیں گے اور ان کا تمام ماضی بھلا دیا جائے گا۔ تاریخ سے بھی اور دلوں سے بھی۔ اور یہ کہا کہ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ

دو یعنی ان احکام کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں اور ان کی حکمت تک وہی لوگ رسائی حاصل کر سکتے ہیں جو اہل علم ہوں۔ یا پھر یہ صورت ہو گی کہ وہ دین اسلام سے روگردانی کرتے ہیں حالانکہ انہوں نے اس کا عہد کیا تھا۔ اور دین اسلام پر نکتہ چینیاں کرتے ہیں تو یہ کفر کے علمبردار ہوں گے۔ اور ان کے دلوں میں نہ ایمان ہو گا نہ ان کے عہد و پیمان کا کوئی اعتبار ہو گا۔ اور اب ہمارے لئے ماسوائے اس کے کہ ان کے ساتھ جنگ شروع کر دیں اور کوئی راستہ ہی نہ ہو گا۔ شاید بزور تلوار یہ باز آ جائیں۔ اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں کہ اسلامی کیمپ کی قوت اور اس کا جنگی غلبہ بعض اوقات لوگوں کو اس بات پر مائل کر دیتا ہے کہ وہ سچائی کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ حق غالب ہے لہٰذا وہ اسے قبول کر لیتے ہیں اور ان کا استدلال یہ ہوتا ہے چونکہ یہ نظام غالب ہے لہٰذا برحق ہے۔ اور یہ کہ اس کی پشت پر قوت الٰہیہ ہے اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخرکار اللہ اور اس کے رسولوں نے غالب ہونا ہے۔ اس طرح یہ لوگ ذہناً قائل ہو کر ہدایت کو قبول کر لیں گے اور توبہ کر لیں گے۔ یہ نہ ہو گا کہ جنگ کی وجہ سے ان کا دین زبردستی تبدیل کر دیا جائے گا۔ بلکہ وہ اس طرح مطمئن ہو جائیں گے کیونکہ دین اسلام کامیاب شکل میں ان کے سامنے چل رہا ہو گا اور بسا اوقات کسی بات کا عملی تجربہ ایسے ہی نتائج پیدا کرتا ہے۔

---ooo---

اب ہم یہاں اس نکتے کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس پالیسی کا دائرہ عمل کیا ہے؟ تاریخ کے کس دور میں یہ پالیسی روبعمل تھی' کس خاندان میں کس معاشرے میں اسے چلایا گیا۔ آیا یہ پالیسی آغاز اسلام کے زمانے میں جزیرۃ العرب کے باشندوں کے ساتھ مخصوص تھی یا کہ اس کا دائرہ عمل اور میدان نفاذ تاریخ میں اور کسی زمان و مکان میں بھی ہوا ہے۔

ابتدا میں تو یہ آیات جب نازل ہوئی تھیں تو ان کا نفاذ جزیرۃ العرب میں اسلام اور شرک کی کشمکش کے آخری دور میں ہوا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان احکام کا اطلاق پہلے پہل اسی صورت حالات پر ہوا تھا۔ اور ان آیات میں مشرکین سے مراد وہی مشرکین ہیں جن سے حضور کو واسطہ تھا۔

یہ بات تو بالکل برحق ہے کہ تاریخی پس منظر تو یہی تھا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہی ان آیات کا آخری دائرہ تھا اور یہ آیات اسی تک محدود ہیں؟

یہاں مناسب ہے کہ ہم مسلمانوں کے حوالے سے مشرکین کے موقف اور طرز عمل کا تاریخی جائزہ لیں' تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ ان آیات میں جس پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے اس کے اغراض و مقاصد اور حدود کیا ہیں اور ان کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔ ہمیں چاہئے کہ تاریخ کے اوراق الٹ کر ذرا دیکھیں۔

جہاں تک جزیرۃ عربیہ کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں فی ظلال القرآن کے اسی حصے میں کافی مواد موجود ہے۔ سیرت کے واقعات مشہور ہیں۔ مکہ میں مشرکین نے دین اسلام کے ساتھ جو سلوک کیا پھر مدینہ طیبہ کی اسلامی حکومت کے خلاف وہ جو کچھ کرتا رہے۔ ایمان لانے والوں پر انہوں نے جس قدر مظالم ڈھائے جن کا تفصیلی تذکرہ ان نصوص کے اندر مفصل آ گیا ہے۔

یہ بات بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام اور شرک کی کشمکش اس قدر طویل اور شدید نہیں رہی ہے جس قدر اسلام اور اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے درمیان یہ کشمکش شدید رہی ہے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ پر ہے کہ مشرکین نے

بھی اسلام کے خلاف ہمیشہ وہی موقف اختیار کیا جس کی تصویر ان آیات میں کھینچی گئی ہے :

كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ (۸) اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۹) لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ (۱۰)(۹: ۸ تا ۱۰)) "مشرکین کے ساتھ کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ تم پر قابو پا جائیں تو نہ تمہارے معاملہ میں کسی قرابت کا لحاظ کریں نہ کسی معاہدہ کی ذمہ داری کا؟ وہ اپنی زبانوں سے تم کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دل ان کے انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔ انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت قبول کر لی۔ پھر اللہ کے راستے میں سد راہ بن کر کھڑے ہو گئے۔ بہت برے کرتوت تھے جو یہ کرتے رہے۔ کسی مومن کے معاملہ میں نہ یہ قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہد کی ذمہ داری کا۔ اور زیادتی ہمیشہ انہی کی طرف سے ہوئی ہے۔"

مشرکین اور اہل کتاب کی طرف سے مسلمانوں کے مقابلے میں یہ دائمی اور طے شدہ موقف رہا ہے۔ اہل کتاب نے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا اس کا تذکرہ ہم اس سورت کے دوسرے سبق کے ضمن میں کریں گے اور جہاں تک مشرکین کا تعلق ہے تو وہ مسلمانوں کے مقابلے میں پوری اسلامی تاریخ میں اسی پالیسی پر گامزن رہے۔

اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے شروع نہیں ہوا بلکہ دعوت اسلامی کا خاتمہ آپ پر ہوا ہے اور پوری انسانی تاریخ میں مشرکین کا موقف دین رب العالمین کے مقابلے میں ایک ہی رہا ہے تو پوری اسلامی تاریخ کے ڈانڈے' باہم مل جائیں گے۔ اور اس طرح یہ موقف اچھی طرح سمجھ میں آ جائے گا اور یہ اسی طرح ایک حقیقت کی طرح ثابت ہو گا جس طرح ان نصوص میں اسے بیان کیا گیا ہے اور پوری اسلامی اور انسانی تاریخ اس پر گواہ ہو گی۔

مشرکین نے حضرت نوح' حضرت ھود' حضرت صالح' حضرت ابراہیم' حضرت شعیب' حضرت موسیٰ' حضرت عیسیٰ علیہم صلوات اللہ کے خلاف کیا کارروائیاں کیں' پھر ان کی امتوں کے ساتھ کیا سلوک وہ کرتے رہے' اپنے اپنے ادوار میں' پھر آخر کار مشرکین نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا سلوک کیا' اور آپ کے بعد اہل ایمان کے ساتھ انہوں نے کیا کیا سلوک کیا' حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے حوالے سے کسی رشتہ داری' اور کسی معاہدے کی کوئی پروا نہیں کی۔ جب بھی انہیں موقعہ ملا اور جب بھی انہوں نے قوت پکڑی انہوں نے دین رب العالمین کے مامن پر حملہ کیا۔

مشرکین نے تاتاریوں کی صورت میں مسلمانوں کے خلاف دوسری بار حملہ کیا تھا۔ اس کے حالات و واقعات کو ذرا ذہن میں رکھئے اور آج چودہ سو سال کے بعد تک بھی وہ مسلمانوں کے خلاف کیا کچھ نہیں کر رہے اور زمین کے کس حصے میں نہیں کر رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے حوالے سے کسی رشتے اور کسی معاہدے کا کوئی پاس نہیں رکھتے۔

اور یہ آیات الہیہ دائمی حقیقت سے پردہ کشائی کرتی ہیں۔

جب بت پرستوں نے بغداد پر غلبہ حاصل کیا تو اس وقت جو الیہ پیش آیا تاریخ کی کتابوں میں اس کی بعض جھلکیاں قلم بند ہو چکی ہیں۔ ہم تاریخ ابو الفداء سے کچھ جھلکیاں دیتے ہیں۔ ابو الفداء نے البدایہ والنہایہ میں ۶۵۶ ھ کے واقعات میں لکھا ہے:

"یہ لوگ اس شہر (بغداد) پر ٹوٹ پڑے جس قدر بچوں' عورتوں اور مردوں' بوڑھوں اور معمر افراد کو وہ قتل کر سکتے تھے انہوں نے قتل کئے۔ بہت سے لوگ ڈر کے مارے کنوؤں میں چھپ گئے' جھاڑیوں میں پناہ گزین ہو گئے' گندے تالابوں میں۔ یہ لوگ ایک عرصے تک ان جگہوں میں پوشیدہ رہے اور ظاہر نہ ہوئے۔ بعض لوگ دکانوں میں اپنے آپ کو بند کر لیتے تھے' دروازے بند کر دیتے' تاتاری دروازے توڑتے یا آگ لگا دیتے اور اندر داخل ہوتے' یہ لوگ چھتوں پر چڑھ جاتے چنانچہ مکان کی سطح پر یہ لوگ ان کو قتل کر دیتے اور ان کا خون پرنالوں سے بہہ کر گلیوں میں بہتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مساجد' مدارس اور سراؤں میں لوگوں کا قتل عام جاری رہا اور ماسوائے اہل ذمہ یہودیوں اور عیسائیوں کے اور کوئی شخص زندہ نہ رہا یا وہ لوگ زندہ رہے جنہوں نے تاتاریوں کی پناہ لے لی یا وہ لوگ زندہ رہے جنہوں نے ابن علقمی وزیر کے ہاں پناہ لی جو رافضی تھا' بعض تاجروں کو بھی بھاری رشوتوں کے عوض امان مل گئی تھی۔ اس طرح وہ اور ان کی دولت بچ گئی تھی اور اس حادثے کے بعد وہ بغداد جو شہروں کا سرتاج تھا اس طرح ہو گیا کہ گویا وہ ایک ویرانہ ہے' چند لوگ اس میں رہ گئے۔ وہ بھی حالت خوف میں۔ بھوک اور ذلت اور افلاس میں ڈوبا ہوا۔"

"اس واقعہ میں بغداد میں جو مسلمان تہہ تیغ کئے گئے ان کی صحیح تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ آٹھ لاکھ انسان قتل ہوئے۔ بعض نے یہ تعداد دس لاکھ بتائی ہے اور بعض نے اسے بیس لاکھ بتایا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ تاتاری بغداد میں محرم کے آخری دنوں میں داخل ہوئے۔ یہ لوگ پورے چالیس دنوں تک لوگوں کو تہہ تیغ کرتے رہے۔ خلیفہ معتصم امیر المومنین کو بروز منگل ۱۴ صفر قتل کیا گیا اور اس کی قبر کو بھی مٹا دیا گیا۔ ان کی عمر اس وقت ۴۶ سال چار ماہ تھی اور ان کی مدت خلافت پندرہ سال آٹھ ماہ اور کچھ دن تھی۔ ان کے ساتھ ان کے بڑے بیٹے ابو العباس کو بھی قتل کیا گیا۔ یہ سولہ سال کے تھے۔ پھر ان کے دوسرے بیٹے ابو الفضل عبد الرحمن کو قتل کیا گیا۔ یہ تیرہ سال کے تھے۔ ان کے چھوٹے بیٹے مبارک اور تین بیٹوں فاطمہ' خدیجہ اور مریم کو قیدی بنا لیا گیا۔"

"دار الخلافہ کے استاذ محی الدین یوسف ابن شیخ الفرج ابن الجوزی کو بھی قتل کیا گیا۔ یہ وزیر کے دشمن تھے۔ ان کے تین بچوں کو بھی قتل کیا گیا جن کے نام عبد الرحمن' عبد الکریم اور عبد اللہ تھے۔ اور حکومت کے اکابرین کو ایک ایک کر کے قتل کیا گیا۔ جن میں دو یدار صغیر مجاہد الدین ایبک' شہاب الدین سلیمان شاہ اور اہل سنت کے اکابرین اور شہر کے معززین شامل تھے۔ ان لوگوں کا طریقہ واردات یہ تھا کہ یہ لوگ دار الخلافت سے لوگوں کو ان کے اہل و عیال کے ساتھ بلاتے۔ ان کے ساتھ ان کے بچے اور عورتیں بھی ہوتیں۔ اسے مقبرہ خلال کی طرف لے جایا جاتا۔ المنظرہ کی جانب اور انہیں اس طرح ذبح کیا جاتا جس طرح بکری کو ذبح کیا جاتا ہے۔ ان کی لڑکیوں اور لونڈیوں سے جسے وہ پسند کرتے اسے قیدی بنا لیتے۔ خلیفہ کے مودب اور شیخ الشیوخ صدر الدین علی ابن النیار کو بھی قتل کیا گیا۔ خطباء' ائمہ اور حافظین قرآن

سب کو قتل کر دیا گیا۔

"جب نوشتہ دیوار پورا ہوا اور چالیس دن پورے ہو گئے تو بغداد مکمل تباہی سے دوچار ہو چکا تھا۔ پورے شہر میں خال خال لوگ نظر آتے تھے۔ راستوں میں کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے۔ اس پر بارش ہو گئی۔ لوگوں کے اجسام پھول گئے۔ پورا شہر بدبو اور تعفن میں ڈوب گیا۔ ہوا بدل گئی اور علاقے میں شدید وبا پھیل گئی۔ یہ وباء علاقہ شام تک پھیل گئی اور خلق کثیر لقمہ اجل بن گئی۔ پورے علاقے کے عوام وبا اور قحط میں گرفتار ہو گئے۔ تلوار اور طاعون کے ذریعے راہ عدم کو روانہ ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

"اور جب چالیس دنوں کے بعد بغداد میں امان کا اعلان ہوا اور لوگ تہ خانوں، کمین گاہوں اور قبرستانوں سے نکلے تو وہ ایسے تھے جس طرح مردے قبروں سے نکل آئے ہوں۔ وہ ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے یہاں تک کہ باپ نے بیٹوں کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ بھائی بھائی کو پہچان نہ سکا۔ لوگوں میں شدید وبا پھیل گئی اور اس طرح وہ بھی اس راہ پر چل بسے جس پر مقتولین گئے تھے۔" وغیرہ وغیرہ

یہ ایک تاریخی واقعہ کی صورت حالات تھی کہ جب مشرکین مسلمانوں پر غالب آ گئے تو انہوں نے کسی رشتہ داری اور کسی معاہدے کا کوئی خیال نہ رکھا اور کسی ذمہ داری کا کوئی ثبوت نہ دیا۔ تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہ ماضی بعید کی ایک تاریخی صورت حالات تھی اور اس کا ارتکاب مشرکین میں سے صرف تاتاریوں نے کیا۔ اور ان کا خاصہ تھا؟ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جدید دور کے واقعات بھی اپنے خدوخال کے لحاظ سے اس سے مختلف نہیں ہیں۔ جب تشکیل پاکستان کے وقت مسلمانوں کا علاقہ ہند سے علیحدہ ہوا تو اس وقت کے دلدوز واقعات کسی طرح بھی تباہی بغداد کے واقعات سے کم نہ تھے۔ اس موقعہ پر آٹھ ملین مسلمانوں نے ہجرت کی۔ ہندوستان کے اطراف واکناف میں وہاں بسنے والے مسلمانوں پر حملے کئے گئے۔ اس لئے انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ پاکستان کی طرف ہجرت کر جائیں۔ ان میں سے صرف تین ملین لوگ پاکستان پہنچ سکے اور باقی پانچ ملین کو راستے ہی میں تہ تیغ کر دیا گیا۔ ان پناہ گیروں اور راہ گیر پر حکومت ہند کو معلوم ہندو دستوں نے حملے کئے اور یہ دستے حکومت ہند کے اکابرین کے زیر نگرانی یہ قتل عام کرتے رہے۔ ہجرت کے اس پورے راستے میں ان مسلمانوں کو مویشیوں کی طرح ذبح کیا گیا اور ان کے جسموں کو کھلے پرندوں کے لئے چھوڑ دیا گیا جبکہ قتل کے بعد ان پر بدترین تشدد کیا گیا اور ان لوگوں پر جو مظالم ڈھائے وہ تاتاریوں سے کسی طرح بھی کم نہ تھے۔ اس سے بڑھ کر مظالم اس وقت ہوئے جب ایک ریل گاڑی پر ہوئے جو ہندوستان سے مسلمان مہاجر ملازمین کو لے کر پاکستان جا رہی تھی۔ یہ لیاقت نہرو معاہدے کے تحت ان ملازمین کو لے جا رہی تھی جنہوں نے پاکستان جانا پسند کیا تھا۔ اس گاڑی پر پچاس ہزار افراد سوار تھے۔ اور جب یہ گاڑی بعض حدود (پنجاب کے علاقے) تک پہنچی تو تجربہ کار ہندو سکھ دستے اس پر حملہ آور ہوئے اور جب وہ پاکستان پہنچی تو اس کے اندر لاشوں اور کٹے ہوئے اعضاء کے سوا کچھ نہ تھا۔ اللہ نے کیا خوب کہا ہے كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (۹: ۸) "یہ کیسے ہو سکتا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جب غالب ہو جائیں تو وہ تمہارے بارے میں کسی رشتہ داری اور ذمہ داری کا کوئی لحاظ نہ رکھیں۔" مختلف ادوار میں مطابق اور مختلف صورتوں میں یہ قتل عام ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس زمانے میں فسادات پنجاب اس کی واضح مثال تھے۔

اس کے بعد تاتاریوں کے خلفاء نے کمیونسٹ روس اور کمیونسٹ چین میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ انہوں نے

نے ان علاقوں میں صرف چھبیس سال کے عرصے میں ۲۶ ملین مسلمانوں کو نیست و نابود کیا۔ گویا وہ ایک سال میں دس لاکھ مسلمانوں کو قتل کرتے رہے۔ اور یہ عمل ابھی تک جاری ہے۔ اور مظالم و تشدد کے وہ واقعات اس کے علاوہ ہیں جنہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حالیہ دنوں میں چین میں اس قسم کے واقعات رونما ہوئے جن کے سامنے تاتاریوں کے مظالم بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے ایک لیڈر کو پکڑ کر لایا گیا۔ شارع عام پر ایک گڑھا کھودا گیا اور مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ انسانی غلاظت کو ٹوکریوں میں لے کر آئیں۔ ان علاقوں میں یہ رواج ہے کہ کھاد بنانے کے لئے لوگوں سے غلاظت اور کوڑا کرکٹ جمع کرایا جاتا ہے۔ وہاں اس کے بدلے ان کو روٹی دی جاتی ہے تاکہ اس سے کھاد تیار کی جا سکے۔ غرض ان لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ یہ غلاظت اس مسلم لیڈر پر پھینکیں۔ یہ عمل تین دن تک جاری رہا یہاں تک کہ اس طرح اس کی موت واقع ہو گئی۔

کمیونسٹ یوگوسلاویہ میں بھی مسلمانوں کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا اور جب دوسری عالمی جنگ کے بعد وہاں کمیونسٹ نظام جاری ہوا تو کئی ملین مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ بعض مقامات پر مسلمان مردوں اور عورتوں کو قیمہ بنانے کے کارخانوں میں پھینکا گیا تاکہ دوسری جانب سے ہڈیاں اور گوشت بر آمد ہو اور یہ عمل ابھی تک جاری ہے۔

یوگوسلاویہ میں جو کچھ ہو رہا ہے، مسلمانوں کے خلاف تمام اشتراکی ممالک میں یہ عمل رات دن جاری ہے۔ ابھی تک اور اس دور جدید میں یہ ہو رہا ہے۔ اور اس سے باری تعالیٰ کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (۹: ۸) "یہ کیسے ہو سکتا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جب غالب ہو جائیں تو وہ تمہارے بارے میں کسی رشتہ داری اور ذمہ داری کا کوئی لحاظ نہ رکھیں۔" اور لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (۹: ۸) "وہ کسی مومن کے معاملے میں رشتہ داری اور ذمہ داری کا کوئی لحاظ نہیں رکھتے۔" جزیرۃ العرب میں یہ نہ تو کوئی وقتی صورت حالات تھی اور نہ عارضی۔ نہ بغداد میں یہ کوئی وقتی حادثہ یا حالت تھی۔ یہ ایک دائمی اور مستقل طرز عمل ہے۔ جب بھی اہل شرک کسی مومن پر قابو پائیں ایسا مومن جو صرف اللہ وحدہ کی بندگی کرتا ہو تو ان کا طرز عمل اس مومن کے ساتھ یہی ہوتا ہے، ہر جگہ اور ہر زمانے میں۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

۲
وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ ع۱۰
۸

''کیا تم نہ لڑو گے ایسے لوگوں سے جو اپنے عہد توڑتے رہے ہیں اور جنہوں نے رسول کو ملک سے نکال دینے کا قصد کیا تھا اور زیادتی کی ابتدا کرنے والے وہی تھے؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر تم مومن ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو۔ ان سے لڑو' اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دلوائے گا اور انہیں ذلیل و خوار کرے گا اور ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا اور بہت سے مومنوں کے دل ٹھنڈے کرے گا اور ان کے قلوب کی جلن مٹا دے گا اور جسے چاہے گا' توبہ کی توفیق بھی دے گا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا ہے۔ کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے (اس کی راہ میں) جاں فشانی کی اور اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو جگری دوست نہ بنایا' جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اس سے باخبر ہے۔''

آیات کا یہ حصہ اس لئے نازل ہوا؟ کہ پہلے ٹکڑے میں اصولاً اس بات کا انکار کر دیا گیا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مشرکین اور اللہ و رسول کے درمیان کوئی عہد باقی رہ سکے اور یہ کہ اب جزیرۃ العرب میں مشرکین یا تو اسلام میں صحیح طرح داخل ہو جائیں اور یا جنگ کے لئے تیار ہو جائیں' ماسوائے اس شخص کے جو فہم قرآن و سنت کے لئے اسلامی مملکت میں پناہ لے تو اس کی حفاظت کی جائے گی اور پھر اسے دارالاسلام کے باہر اس کی جائے سکونت تک امن و امان کے ساتھ بحفاظت پہنچایا جائے گا اور یہ عمل اس لئے ہوا کہ یہ لوگ مومنین کے بارے میں کسی رشتے داری اور معاہدے کا کوئی خیال نہیں رکھتے۔ جب بھی ان کو غلبہ حاصل ہو۔

تو یہ پیراگراف اس لئے آیا ہے کہ اس وقت اسلامی سوسائٹی میں مختلف سطح کے لوگ تھے اور بعض لوگوں کے دلوں میں یہ کھٹک تھی کہ وہ اس قدر فیصلہ کن اور سخت اقدام کیوں کریں۔ اس نکتے کے بارے میں ہم اس سے قبل تفصیل سے بحث کر آئے ہیں۔ ایسے لوگوں کے دلوں میں یہ خواہش تھی اور وہ یہ امید بھی رکھتے تھے کہ شاید بقیہ مشرکین بھی اسلام قبول کر لیں گے اور شاید یہ قتال اور سختی ضروری نہ ہو۔ اس کے علاوہ دوسری مصلحتیں بھی ان کے پیش نظر ہوں گی اور وہ یہ ہی سمجھتے ہیں کہ آسان راستہ کیوں اختیار نہ کیا جائے۔

ان آیات میں انہی تصورات' اندیشوں اور وجوہات کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور ماضی قریب و بعید کے واقعات سامنے لاکر اس بات کی وضاحت کی گئی ہے اور مسلمانوں کے دلوں کو صاف کیا گیا ہے اور سمجھایا گیا ہے کہ جب مشرکین کے ساتھ معاہدے کئے گئے تو ان کا حشر کیا ہوا۔ جو قسمیں وہ کھاتے تھے وہ کس قدر کچی تھیں پھر رسول اللہ کو انہوں نے کس بے دردی کے ساتھ ملک بدر کیا۔ ۔ ت آپ کو مجبوراً نکلنا پڑا۔ پھر مدینہ پر پہلے انہوں ہی نے چڑھائی کی۔ اس کے بعد ان کو شرم دلائی گئی ہے اور ان کی خودی کو جگایا گیا اور پوچھا گیا کہ تم ان لوگوں سے ڈرتے ہو۔ اگر تم مومن ہو تو صرف اللہ سے ڈرو۔ اس کے بعد ان کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ جنگ کرو شاید اللہ کو منظور یہ ہو کہ وہ تمہارے ہاتھوں ان کو عذاب دینا چاہتا ہے۔ یوں تمہیں دست قدرت کا آلہ بننے کا اعزاز حاصل ہو گا۔ اور تمہارے ذریعے اللہ اپنے دشمنوں کو ذلیل کرے گا۔ اور وہ ذلت اور اللہ کے قہر کے مستحق بنیں گے۔ اور ان مومنین کے دل خوش ہوں گے جن کو اللہ کے راستے میں اذیت دی گئی۔ اس کے بعد ان لوگوں کی تمناؤں کو غلط بتایا جاتا ہے جو یہ سمجھتے تھے کہ

شاید بغیر قتال کے یہ لوگ دین اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ اور بتایا جاتا ہے کہ اللہ کی پالیسی یہ ہے کہ وہ انہیں شکست دلا کر اور ذلیل کر کے اسلام میں داخل کرائے۔ شکست کی صورت میں جس کے مقدر میں لکھا ہوا ہو وہ توبہ کر لے گا اور غالب اسلام کے سامنے سرنگوں ہو گا۔ آخر میں اللہ تعالیٰ اپنی اس سنت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی نیک جماعتوں کو ایسی آزمائشوں میں ڈالتا رہتا ہے اور سنت الہیہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۹:۱۳) ”کیا تم نہ لڑو گے ایسے لوگوں سے جو اپنے عہد توڑتے رہے ہیں اور جنہوں نے رسول کو ملک سے نکال دینے کا قصد کیا تھا اور زیادتی کی ابتدا کرنے والے وہی تھے؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر تم مومن ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو۔“

مسلمانوں اور مشرکین کے تعلقات کی تاریخ میں دو الفاظ کو بڑی اہمیت حاصل ہے ' ایمان سے روگردانی اور معاہدوں کی خلاف ورزی۔ اور زیر بحث آیات کے وقت قریب ترین مثال صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے الہام ربانی اور ہدایت ربانی کے تحت اس صلح کو مشرکین کے شرائط کے مطابق تسلیم کیا تھا۔ اور جسے بعض مقتدر اصحاب رسول اللہ نے نہایت ہی ذلت آمیز شرائط قرار دیا تھا۔ اور اس میں مشرکین نے جو سخت شرائط عائد کی تھیں حضور صلعم نے ان کی سختی سے پابندی کی اور نہایت ہی شریفانہ طرز عمل اختیار کیا تھا۔ لیکن خود انہوں نے اس صلح کی مخالفت کی۔ اور صرف دو سال کے بعد ہی اس کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ پھر یہ مشرکین ہی تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شہر سے نکالا اور ہجرت سے پہلے مکہ میں انہوں نے آپ کے قتل کا فیصلہ کر لیا اور یہ فیصلہ انہوں نے بیت الحرام میں کیا جہاں قاتل کو بھی پناہ ملتی تھی۔ اور جہاں قاتل کا خون اور مال بھی محفوظ ہوتے تھے اور یہ قانون اس قدر محترم تھا کہ ایک شخص بیت الحرام میں اپنے باپ اور بھائی کے قاتل کو پاتا لیکن وہ اسے وہاں کوئی گزند نہ پہنچاتا۔ رسول اللہ کا جرم کیا تھا۔ آپ تو لوگوں کو دعوت ایمان دیتے تھے کہ اللہ وحدہ کی بندگی کرو لیکن انہوں نے بیت اللہ کا بھی کوئی احترام نہ کیا۔ انہوں نے رسول اللہ کو وہاں سے نکالنے کی سعی کی۔ پھر آپ کے قتل کی سازش کی اور یہ حرکت انہوں نے بے دھڑک اور بغیر کسی جھجک کے کی۔ پھر انہوں نے مدینہ میں مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے منصوبے بنائے۔ انہوں نے ابوجہل کی سرکردگی میں یہ فیصلہ کیا کہ رسول اللہ سے جنگ ضرور کریں گے چاہے ہمارا قافلہ بچ کر نکل گیا ہے۔ پھر جنگ احد اور جنگ خندق میں تو واضح طور پر جارح تھے پھر حنین میں بھی وہ پوری طرح جنگ کے لئے تیار ہو گئے تھے اور نزول آیات کے وقت یہ سب تازہ واقعات تھے جو ان کی یادوں کا حصہ تھے۔ اور ان سب واقعات میں اس رویہ کی تصدیق تھی جو قرآن نے بیان کیا۔ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا (۲:۲۱۷) ”اور وہ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے پھر دیں اگر وہ ایسا کر سکیں۔“ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو محاذ صرف اللہ وحدہ کی غلامی کرتا ہے اور جو اللہ کے سوائی اور الٰہوں کی بندگی اور شرک کرتا ہے ان دونوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت ہمیشہ کیا رہی ہے؟

واقعات اور تلخ یادوں کی اس فہرست کو نہایت ہی اختصار اور سرعت اور نہایت ہی موثر انداز کے ساتھ پیش کرنے

کے بعد اللہ تعالیٰ آخر میں ان سے یوں مخاطب ہوتے ہیں اتخشونھم کیا تم ان سے ڈرتے ہو۔ ظاہر ہے کہ تم مشرکین کے خلاف جنگ اور جہاد نہیں شروع کرتے تو تمہارا یہ بیٹھا رہنا بغیر خوف اور کسی وجہ سے تو ہو نہیں سکتا۔ اور اس کے بعد اس سوالیہ فقرے کا جواب خود ہی دے دیا جاتا ہے جو مسلمانوں کے لئے نہایت ہی حوصلہ افزا ہے۔ فَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْہُ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۹: ۱۳) "حالانکہ اللہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔" مومن ہوتا ہی وہ ہے جو بندوں سے نہیں ڈرتا لہٰذا مومن وہی ہوتا ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔ تو یہ لوگ اگر مشرکین سے ڈرتے ہیں تو اللہ سے انہیں بہت زیادہ ڈرنا چاہئے۔ اللہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ لوگ اس سے ڈریں اور اللہ کے سوا کسی اور کا کوئی ڈر کم از کم مومنین کے دل میں نہیں ہونا چاہئے۔

غرض مسلمانوں کے اسلامی شعور کو جگایا جاتا ہے اور ان واقعات اور ان کی یادوں کو تازہ کر کے ان کے اندر جوش پیدا کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ یہ مشرکین وہی ہیں جنہوں نے ذات نبی کے خلاف سازش کی۔ پھر انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو معاہدے بھی کئے انہیں توڑا اور جب بھی مسلمانوں کو غافل پایا یا ان کی صفوں کے اندر کوئی سوراخ دیکھا۔ انہوں نے وار کرنے کی کوشش کی۔ پھر انہوں نے مسلمانوں پر حملہ کرنے اور جارحیت کرنے میں پہل کی۔ اور چنانچہ ان وجوہات اور اسباب کی بناء پر مسلمانوں کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ ان کے خلاف جنگی کارروائی کریں۔

قَاتِلُوْھُمْ یُعَذِّبْھُمُ اللّٰہُ بِاَیْدِیْکُمْ وَیُخْزِھِمْ وَیَنْصُرْکُمْ عَلَیْھِمْ وَیَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ (۱۴) وَیُذْھِبْ غَیْظَ قُلُوْبِھِمْ ------ (۹: ۱۴ — ۱۵) "ان سے لڑو' اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دلوائے گا اور انہیں ذلیل و خوار کرے گا اور ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا اور بہت سے مومنوں کے دل ٹھنڈے کرے گا۔"

تم ان کے ساتھ جنگ کرو' تم دست قدرت کے لئے پردہ بنو گے اور اللہ کی مشیئت کی صورت بنو گے۔ اس طرح تمہارے ہاتھوں اللہ ان پر عذاب نازل کرے گا۔ ان کو ہزیمت دے کر ذلیل کرے گا جبکہ وہ اپنے آپ کو نہایت ہی قوی سمجھتے ہوں گے لیکن اللہ ان کے مقابلے میں تمہاری نصرت کرے گا' تمہارے دلوں کو شفا دے گا کیونکہ اہل ایمان کو انہوں نے بہت ہی اذیتیں دی تھیں اور مسلمانوں کے دلوں میں وہ غیظ و غضب ابھی تک موجود تھا۔ اس طرح کفار و مشرکین کی شکست سے ان کے دل ہلکے ہو جائیں گے کیونکہ مشرکین نے ان کو اذیت دی' گھروں سے نکالا۔ صرف یہی نہیں' بلکہ اس سے بڑا انعام ان کے انتظار میں ہے۔

وَیُذْھِبْ غَیْظَ قُلُوْبِھِمْ وَیَتُوْبُ اللّٰہُ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ (۹: ۱۵)
"اور ان کے قلوب کی جلن مٹا دے گا اور جسے چاہے گا توبہ کی توفیق بھی دے گا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا ہے۔" مسلمانوں کی فتح کے نتیجے میں کئی لوگوں کے دل اسلام کی طرف مائل ہو سکتے ہیں اور ان کی بصیرت انہیں اس طرف لا سکتی ہے کہ مستقبل اسلام کا ہے کیونکہ مسلمانوں کو فتح نصیب ہو رہی ہے اور ظاہر ہے کہ انسانوں کی قوت سے اوپر کوئی اور قوت ہے جو مسلمانوں کی تائید میں ہے اور عملاً ایسا بھی ہوا کہ بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے اور اسی طرح مجاہدین کو دو

اجر ملے۔ ایک اجر ان کے جہاد فی سبیل اللہ کا اور دوسرا اجر ان گمراہ لوگوں کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا اور گمراہوں کو ہدایت دینے کا جو جہاد کی وجہ سے ہوا اور ان لوگوں سے اسلام کی افرادی اور جنگی قوت میں اضافہ ہوا۔

کہا گیا کہ اللہ علیم و حکیم ہے۔ وہ ان اقدامات کے اچھے نتائج کو اچھی طرح جانتا ہے اور وہ حکیم ہے وہ جن اقدامات کا حکم دیتا ہے وہ گہری حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

اسلام جب زوردار شکل میں سامنے آتا ہے تو وہ زیادہ پرکشش ہوتا ہے' اس اسلام کے مقابلے میں جس کی قوت لوگوں کو معلوم نہ ہو یا وہ ضعیف و ناتواں نظر آئے لیکن اسلامی جماعت جب قوت اور زور سے سامنے آئے اور وہ اپنے نظریہ و عمل پر سختی سے جمی ہو تو تحریک اسلامی کا نصف راستہ خود بخود طے ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ جو مکہ مکرمہ میں اسلامی جماعت کی تربیت اور نگرانی کر رہا تھا' وہاں اس نے جماعت مسلمہ کے ساتھ صرف جنت کا وعدہ کیا تھا' جبکہ مکہ میں جماعت قلیل تھی اور اس میں ضعیف لوگ تھے اور یہاں مسلمانوں کے لئے صرف ایک ہی ہدایت تھی وہ یہ کہ صبر کا دامن مضبوطی سے پکڑو اور جب جماعت نے کماحقہ صبر کیا اور صرف جنت کی طلبگار بن گئی تو اللہ نے اسے نصرت عطا کی اور وہ فاتح ہو گئی تو اللہ نے اسے سیاسی غلبے اور جہاد کے لئے ابھارا' اس لئے کہ یہ سیاسی غلبہ اس جماعت کا غلبہ نہ تھا بلکہ اللہ کے دین کا غلبہ تھا اور اس کی وجہ سے اللہ کا کلمہ بلند ہو رہا تھا۔

اس وقت صورت حال بھی ایسی تھی کہ اس میں مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ تمام مشرکین کے خلاف جنگ کریں اور مشرکین کے تمام معاہدوں کو منسوخ کر دیں اور ان کے مقابلے میں صف واحد بن کر کھڑے ہو جائیں۔ اور یہ اس لئے ضروری تھا کہ مسلمانوں کے خلاف پائے جانے والے خفیہ پیکٹ ختم ہو جائیں اور جن لوگوں کی نیت میں فتور تھا وہ کھل کر سامنے آ جائیں اور وہ پردے دور کر دیئے جائیں جن کے پیچھے منافق لوگ کھڑے ہو کر اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتے تھے اور ان کاروباری عذرات کو ختم کر دیا جائے جو بعض لوگ کاروبار کے بہانے سے تعلق رکھنے کے سلسلے میں کرتے تھے اور ان تعلقات کو بھی ختم کر دیا جائے جو رشتہ داری اور قرابت داری کے عنوان سے بعض لوگوں کے ساتھ قائم رکھے ہوئے تھے۔ ان پردوں کو گرانا ضروری تھا اور ان عذرات کو یکسر ختم کر دینا ضروری تھا۔ اس لئے اس قسم کے تمام لوگوں کے ساتھ تعلقات ختم کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ ان لوگوں کا انکشاف ہو جائے جن کے دلوں میں کوئی خباثت خفیہ تھی اور جو اللہ اور رسول اللہ کے سوا اور لوگوں کو بھی دوست بنا رہے تھے اور ان عذرات کے نتیجے میں وہ مخالف اسلام کیمپ کے لوگوں کے ساتھ روابط رکھے ہوئے تھے اور ان روابط کی نوعیت واضح نہ تھی' بلکہ مشکوک تھی اس لئے یہ حکم دیا گیا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۚ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۹:۱۶) "کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے (اس کی راہ میں) جاں فشانی کی اور اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو جگری دوست نہ بنایا' جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اس سے باخبر ہے۔"

"کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے (اس کی راہ میں) جاں فشانی کی اور اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو جگری دوست نہ بنایا' جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اس سے باخبر ہے۔"

جیسا کہ بالعموم ہوا کرتا ہے' اسلامی معاشرے میں بھی ایسے لوگ تھے جو چلتے پھرتے تھے' جو حدود سے آگے نکلتے تھے اور ان کے پاس بہت زیادہ عذرات ہوتے تھے' وہ جماعت کے علم و مشورہ کے بغیر اس کے دشمنوں سے بھی ملتے تھے اور اپنے مفادات کا تحفظ کرتے تھے اگرچہ اس میں اسلامی تحریک کا نقصان ہو۔ اور یہ لوگ مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان پائے جانے والے تعلقات سے فائدہ اٹھاتے تھے کیونکہ ابھی تک مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان مکمل قطع تعلق نہ ہوا تھا لیکن جب واضح طور پر اعلان کر دیا گیا کہ اب مشرکین عرب کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو گا اور اب رابطے کٹ گئے ہیں' اب ایسے لوگوں کے لئے کوئی بہانہ نہ رہا اور ان کی خفیہ ریشہ دوانیاں سامنے آگئیں۔

اسلامی جماعت اور اسلامی نظریہ حیات کے مفاد میں یہ بات ہے کہ پردے اٹھ جائیں اور تعلقات بالکل علی الاعلان ہوں اور چور دروازے ختم کر دیئے جائیں تاکہ مخلص جدوجہد کرنے والوں اور ہر طرف پھرنے پھرانے والوں کے درمیان اچھی طرح امتیاز ہو جائے اور دونوں کیمپوں کے لوگ اچھی طرح معلوم اور معروف ہو جائیں اور ان کی حقیقت اچھی طرح معلوم ہو جائے اگرچہ اللہ تو علیم و خبیر ہے۔ اسے تو پہلے سے معلوم ہے کہ کون کیا ہے' لیکن اللہ لوگوں کو تب پکڑتا ہے جب ان کی حقیقت تمام دیکھنے والوں پر واضح ہو جائے۔ یہی ہے سنت الہیہ کہ اللہ تعالیٰ کھرے اور کھوٹے کو جدا کرنے کے لئے دونوں کے درمیان اچھی طرح امتیاز کر دیتا ہے اور کھرے اور کھوٹے کا امتیاز اس طرح ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو مصائب و شدائد میں مبتلا کر دیتا ہے۔

---

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ
عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِي النَّارِ هُمْ
خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا
مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ
عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَ

جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ یُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِیْهَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۲۲﴾

"مشرکین کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے مجاور و خادم بنیں در آں حالیکہ اپنے اوپر وہ خود کفر کی شہادت دے رہے ہیں ۔ ان کے تو سارے اعمال ضائع ہو گئے اور جہنم میں انہیں ہمیشہ رہنا ہے ۔ اللہ کی مسجدوں کے آباد کار (مجاور و خادم) تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روز آخر کو مانیں' اور نماز قائم کریں' زکوۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں ۔ انہی سے یہ توقع ہے کہ سیدھی راہ چلیں گے ۔ کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھہرالیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روز آخر پر اور جس نے جانفشانی کی اللہ کی راہ میں؟ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا ۔ اللہ کے ہاں تو انہی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا وہی کامیاب ہیں ۔ ان کا رب انہیں اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسی جنتوں کی بشارت دیتا ہے جہاں ان کے لئے پائیدار عیش کے سامان ہیں ۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے یقیناً اللہ کے پاس خدمات کا صلہ دینے کو بہت کچھ ہے ۔"

اعلان براءت کے بعد کسی کے لئے اب کوئی حجت باقی نہ رہی کہ کیوں وہ مشرکین کے ساتھ نہ لڑے ۔ اب لوگوں کے ذہن میں یہ خلجان بھی نہ رہے کہ مشرکین زیارت حرم سے محروم ہوں گے الا یہ کہ وہ اب مسجد حرام کی عمارت میں حصہ نہ لے سکیں گے جبکہ جاہلیت میں یہ مشرکین ان کاموں میں شریک ہوا کرتے تھے ۔ اس لئے کہ مشرکین کا حق ہی نہیں ہے کہ وہ مسجدیں تعمیر کریں ۔ یہ صرف اہل ایمان کا حق ہے کہ وہ مساجد تعمیر کریں اور ان میں فرائض دینی ادا کریں ۔ دور جاہلیت میں تو وہ یہ کام کرتے تھے ۔ مسجد حرام کی تعمیر اور حاجیوں کو پانی پلانے کا تو اب اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا ۔ ان آیات میں ان خلجانات کو رفع کیا گیا ہے جو بعض مسلمانوں کے دلوں میں تھیں کہ اسی اصول نے ایک نیک کام سے لوگوں کو روک دیا ہے ۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِیْنَ اَنْ یَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِیْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ (۹: ۱۷) "مشرکین کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے مجاور و خادم بنیں در آں حالیکہ اپنے اوپر وہ خود کفر کی شہادت دے رہے ہیں ۔

یہ نہایت ہی مکروہ امر ہے اور اصول فطرت سے متضاد ہے کہ مشرکین مساجد کی تعمیر میں حصہ لیں ۔ مساجد تو صرف ذکر الٰہی کے لئے ہوتی ہیں اور اللہ کے سوا ان میں کسی اور کا نام نہیں لیا جاتا ۔ لہٰذا تعمیر مساجد میں وہ لوگ کیسے حصہ لے

سکتے ہیں جن کے دل میں توحید ہی نہ ہو اور وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہوں۔ پھر ان کی زندگی بھی شہادت حق کے بجائے شہادت کفر دے رہی ہو اور زندگی کی عملی شہادت ایسی شہادت ہوتی ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس کا تو اقرار ہی کرنا پڑتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ (۹:۱۷) "ان کے تو سارے اعمال ضائع ہوگئے اور جہنم میں انہیں ہمیشہ رہنا ہے۔" ان کے تو سب اعمال باطل ہیں۔ تعمیر مساجد پر بھی ان کو کوئی اجر ملنے والا نہیں ہے' کیونکہ انہوں نے عقیدۂ توحید قبول کرنے کے بجائے کفر و شرک کو اختیار کیا ہے۔

عبادات و اعمال میں سے معتبرہ ہوتے ہیں جو عقائد صحیحہ پر مبنی ہوں۔ اگر عقیدہ ہی ٹھیک نہ ہو تو اعمال کیسے ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ اس لئے جب تک ایمان و عقیدہ درست نہ ہو گا مسجد حرام کی تعمیر اور اس میں مراسم عبودیت بجالانا کوئی معنی نہیں رکھتے۔ لہٰذا اعمال کو خالص عقیدۂ توحید پر مبنی ہونا چاہئے اور یہ اعمال خالص اللہ کے لئے ہونے ضروری ہیں' تب قبول ہوں گے۔

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ (۹:۱۸) "اللہ کی مسجدوں کے آباد کار (مجاور و غلام) تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روز آخر کو مانیں' اور نماز قائم کریں' زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔

یہاں دو شرائط' یعنی ایمان باللہ جو باطنی صفت ہے اور اعمال ظاہریہ کے ساتھ ایک شرط یہ ہے کہ انسان اللہ کے سوا کسی چیز سے خائف نہ ہو' لازمی شرط ہے۔ یہ نفلی شرط نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ کے لئے خالص ہونا لازمی ہے۔ اور انسان کے شعور' اس کے طرز عمل میں شرک کا شائبہ تک نہ ہونا چاہئے۔ غیر اللہ سے ڈرنا بھی دراصل شرک خفی کا ایک رنگ ہے۔ اور یہاں قصداً اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاکہ شعور و اعتقاد اور عمل اور سلوک میں انسان مکمل طور پر خالص اور پاک وصاف ہو۔ اس خلوص کے بعد اب مومن اس بات کا مستحق ہو جاتا ہے کہ وہ مساجد کی دیکھ بھال اور تعمیر کرے اور ایسے ہی لوگ ہدایت کی امید کر سکتے ہیں۔

فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ (۹:۱۸) "انہی سے یہ توقع ہے کہ سیدھی راہ چلیں گے۔" اسی لئے کہ قلب متوجہ ہوتا ہے' تب اعضاء عمل کرتے ہیں اور یہ سب کچھ تب ہو سکتا ہے کہ اللہ راضی ہو' اللہ کی مشیئت ہو تو توجہ بھی ہوگی اعمال بھی ہوں گے اور ہدایت و کامیابی بھی ہوگی۔

یہ ہے اصول تعمیر مساجد کا اور یہ ہے اصل ذریعہ عبادات اور مراسم کی درستگی کا۔ اور مسلمانوں اور مشرکوں دونوں کے سامنے یہ اصول رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ لوگ جو جاہلیت میں خانہ کعبہ کی تعمیر کرتے تھے اور اس میں حاجیوں کو پانی پلاتے تھے' لیکن ان کے عقائد خالص نہ تھے اور انہوں نے نیک اعمال اور جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ بھی نہیں لیا اور وہ لوگ جنہوں نے بیت اللہ کی تعمیر میں حصہ لیا اور جن کا ایمان صحیح کیا اور اس صحیح ایمان پر انہوں نے اچھے اعمال بھی کئے اور

اللہ کی راہ میں جہاد بھی کیا باہم برابر نہیں ہو سکتے۔

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

وَجٰهَدَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ (۹: ۱۹) "کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھہرا لیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روز آخر پر اور جس نے جانفشانی کی اللہ کی راہ میں؟ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔"

بے شک برابر نہیں کیونکہ اللہ کے میزان اور پیمانوں کے مطابق نہیں اور پیمانے اور اقدار تو اللہ ہی کی ہوتی ہیں۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۹: ۱۹) "اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا۔" وہ مشرک جو دین حق کو قبول نہیں کرتے اور جو اپنے عقائد کو شرک سے پاک نہیں کرتے۔ اگرچہ وہ بیت اللہ کے معمار ہوں اور حاجیوں کے ساقی و خادم ہوں۔

یہ مضمون اب اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ مومنین' مہاجرین اور مجاہدین بلند مرتبہ لوگ ہیں۔ اللہ کی رحمت اور رضامندی ان کے انتظار میں ہے اور ان کے لئے جنت میں نعیم مقیم ہے۔ اور اس کے علاوہ اجر عظیم بھی ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (۲۰) يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ (۲۱) خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ

عَظِيْمٌ (۲۲) (۹: ۲۰ تا ۲۲) "اللہ کے ہاں تو انہی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا' وہی کامیاب ہیں۔ ان کا رب انہیں اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسی جنتوں کی بشارت دیتا ہے جہاں ان کے لئے پائیدار عیش کے سامان ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یقیناً اللہ کے پاس خدمات کا صلہ دینے کو بہت کچھ ہے۔

یہاں افضل تفضیل کے صیغے استعمال ہوئے ہیں اَعْظَمُ دَرَجَةً اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسرے لوگوں کے درجے اسفل ہیں بلکہ اس سے مطلق فضیلت مراد ہے کیونکہ ان لوگوں کے بالمقابل وہ لوگ جن کے اعمال اکارت گئے اور جہنم میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے درمیان اعمال و درجات کا کوئی تناسب نہیں ہے۔ ایک طرف کافر ہیں اور دوسری جانب مومنین مہاجرین اور مجاہدین ہیں جو اعلیٰ درجوں میں اور دائمی نعمتوں میں ہوں گے۔

---ooo---

اب اگلی آیات میں مسلمانوں کی سوچوں' شعور اور باہمی روابط کو پاک و صاف کر دیا جاتا ہے اس طرح کہ وہ دین

رب العالمین کے لئے یکسو ہو جائیں چنانچہ تمام رشتہ داریوں کی محبت' ہر قسم کے مفادات اور تمام انسانی لذات اور خوشیوں کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جاتا ہے اور اللہ' رسول اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کو دوسرے پلڑے میں رکھا جاتا ہے اور مسلمانوں کو اختیار دیا جاتا ہے کہ آپ اب جو چاہیں' پسند کر لیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَ
۳
اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ۧ
ع ۸

۹ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔ اے نبی صں' کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے' اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں' تم کو اللہ اور اس کے رسول صں اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے' اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔"

اسلامی نظریہ حیات بھی اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ قلب مومن میں کوئی شریک ہو' یا تو ہم اپنے دل میں صرف اسلامی نظریہ حیات کو جگہ دیں گے اور یا پھر ہم اسے ترک کر کے دوسری محبتوں کو دل میں جگہ دیں گے۔ لیکن یہاں مطلوب یہ نہیں ہے کہ ایک مسلمان اپنے اہل و عیال' اپنے خاندان' اپنی بیوی خاوند' اپنے مال و اولاد' اپنے کاروبار و سامان اور دنیاوی لذتوں سے قطع تعلق کر لے اور وہ رہبان اور تارک الدنیا بن جائے' یہ ہرگز نہیں ہے' لیکن اسلامی نظریہ حیات کا مطالبہ یہ ہے کہ ایک مسلمان اسلام کو عزیز و محبوب رکھے' اس کے دل اور اس کی سوچ پر فکر انقلاب اسلامی غالب ہو۔ یہ نظریہ اس کے لئے محرک اور حقیقی نصب العین بن جائے۔ اگر یہ صورت حال حاصل ہو جائے تو پھر ایسا مومن دنیا کی تمام سرگرمیوں میں شریک ہو سکتا ہے لیکن معیار یہ ہے کہ جب اسلامی انقلاب کا تقاضا ہو تو وہ اپنی تمام سرگرمیاں چھوڑ کر اس تقاضے کو پورا کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔

ان دو پوزیشنوں میں کیا لائن ہے' جو فرق و امتیاز کرتی ہے؟ یہ کہ آپ کے دل و دماغ اور زندگی پر نظریہ چھایا ہوا ہے یا دنیا کا سازوسامان۔ آپ کا پہلا نعرہ اور پہلی گفتگو اسلام کے لئے ہے یا اس دنیا کے اغراض و مطالبات میں سے کسی

غرض کے لئے ہے ۔جب ایک مومن مطمئن ہو جائے کہ اس کا دل اور اس کی سوچ پر اسلامی نظریہ حیات چھا گیا ہے تو اس کے بعد اس پر کوئی گرفت نہ ہو گی ۔اگر وہ بچوں' بھائیوں' بیوی خاوند' خاندان اور مال و دولت اور ساز و سامان سے لطف اندوز ہو اور زندگی کے تمام کاروبار میں شریک ہو' وہ زیب و زینت بھی اختیار کر سکتا ہے اور اچھا کھا پی بھی سکتا ہے' بغیر اسراف کے اور بغیر تکبر کے ۔بلکہ ایسے حالات اور ایسے تصورات کے درمیان اس کے لئے یہ تلذذ اور متاع کا استعمال مستحب ہے ۔اس طرح کہ یہ بھی شکر الہٰی کا ایک رنگ ہوتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کو یوں بھی نوازتا ہے جبکہ ان کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ رازق منعم اور وہاب ہے ۔

یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَکُمْ وَ اِخْوَانَکُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ (۹ : ۲۳) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ' اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں ۔"

یوں خالص خون اور نسب کے رابطوں کو توڑ دیا جاتا ہے ۔اگر ایسے افراد کے درمیان نظریاتی روابط ٹوٹ جاتے ہیں' اگر اللہ کی قرابت داری ختم ہو جائے تو خاندانی رشتے بھی ختم ہو جاتے ہیں ۔اصل دوستی اللہ کی ہے اور اللہ ہی کے نام پر پوری انسانیت جمع ہو سکتی ہے اور اگر نظریاتی اتحاد نہ ہو تو تمام اتحاد اور رابطے ٹوٹ جاتے ہیں ۔رسی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے ۔

وَ مَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۹ : ۲۳) "تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے ۔" یہاں ظالمون سے مراد ہے مشرکون ۔اگر قوم اور خاندان ایمان کے مقابلے میں کفر کو پسند کرتا ہو تو اس قوم اور خاندان کی دوستی کرنا کفر اور شرک ہے ۔یہ صورت حال ایمان کی کیفیات کے ساتھ لگا نہیں کھاتی ۔

یہاں سیاق کلام میں یہ نہیں کہا گیا کہ اس اصول کو بیان کر دیا جائے بلکہ محبتوں کی مثالیں اور رنگ بھی بتا دیئے جاتے ہیں ۔کون سے تعلقات' کون سے روابط اور اور کون سے لذائذ ایمان کے خلاف ہوں گے تاکہ انہیں ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور ایمان اور اسلام کے تقاضوں کو دوسرے پلڑے میں رکھ کر مشخص اور ممثل انداز میں بتایا جائے ۔مثلاً اباء' ابناء' اخوان' میاں بیوی اور خاندان یعنی عام خون اور نسب کے رشتے اور قرابت داریاں اور اموال تجارت جن کے ساتھ فطری رغبت ہوتی ہے اور مکانات اور کوٹھیاں جہاں آرام کیا جاتا ہے اور زندگی کی لذتوں سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے ان سب کو ایک پلڑے میں رکھ کر اور حب خدا' حب رسول اور جہاد کی دلچسپیوں کو دوسرے پلڑے میں رکھ کر دعوت انتخاب دی جاتی ہے یہاں جہاد کے معنی اس قدر سادہ نہیں ہیں ۔جہاد میں مشقتیں ہوتی ہیں اور اس کے مخصوص تقاضے ہوتے ہیں ۔اس میں مشکلات اور واماندگیاں ہوتی ہیں' اس میں تنگی اور ترشی ہوتی ہے اس میں قربانیاں اور محرومیاں بھی ہوتی ہیں اور اس میں زخم بھی کھائے جاتے ہیں اور جان بھی دینی ہوتی ہے ۔یہ سب کچھ جہاد کے لفظ میں آتا ہے اور یہ سب کچھ اس کیفیت کے ساتھ ہو کہ اس میں شہرت اور نمود و نمائش کا شائبہ تک نہ ہو' جس میں فخر و غرور اور تکبر کا شائبہ تک نہ ہو ۔اس میں ملک گیری اور منصب گیری کا بھی کوئی شائبہ اور اشارہ نہ ہو ۔اگر ان بیماریوں میں سے کوئی بیمار بھی ہو تو مجاہد اجر اخروی سے محروم ہو گا ۔ذرا دوبارہ غور سے پڑھئے :۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (۹ : ۲۴) "اے نبی صلعم 'کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ 'اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے 'اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں' تم کو اللہ اور اس کے رسول صلعم اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے۔"

خبردار! یہ نہایت ہی مشقت آمیز راہ ہے' یہ نہایت ہی عظیم ذمہ داری ہے! لیکن بات یہی ہے 'اگر یہ ذمہ داری پوری نہ کرو گے تو پھر انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے۔" اور وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۹ : ۲۴) "اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔" صرف ایک فرد ہی سے مطالبہ نہیں ہے کہ وہ اس قدر خلوص کا مظاہرہ کرے۔ پوری جماعت مسلمہ سے اس قسم کے خلوص کا مطالبہ ہو رہا ہے۔ اسلامی مملکت کو بھی اسی طرح مخلص ہونا چاہئے۔ اس لئے اسلامی معاشرے میں کوئی ترجیح اور کوئی نصب العین اسلامی نظریہ حیات اور جہاد فی سبیل اللہ کے مقتضیات سے اہم نہیں ہونا چاہئے۔

کیا فطرت انسانی اس معیار پر جا سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اللہ نے جب اہل ایمان سے اس معیار کا تقاضا کیا ہے تو ایسا معیار پیش کرنا ممکن ہے تبھی تو کیا ہے۔ کیونکہ اللہ کسی بھی نفس سے وہ مطالبہ نہیں فرماتے جو اس کے دائرہ طاقت میں نہ ہو۔ یہ اللہ کی نہایت کریمی ہے کہ اس نے اس ضعیف انسان کے اندر اس قدر صلاحیت اور طاقت رکھی ہے کہ وہ اس قدر مخلصانہ معیار پیش کرے اور اس قدر مشکلات برداشت کرے اور اس کو اس شعور اور خلوص کے اندر اس قدر لذت دی ہے کہ وہ اس کے لئے تمام لذات ارضی کو خیرآباد کہہ سکتا ہے۔ خدا کے ساتھ اتصال اور خدا رسیدگی کا شعور۔ اللہ کی رضا کے حصول کا شعور۔ انسان کو انسانی ضعف اگر اوٹ اور خون اور گوشت و پوست کی لذتوں سے بلند کر دیتا ہے اور اس کی نظر دور افق پر کسی بلند مقام پر مرکوز ہوتی ہے۔ جب بھی اس دنیا کی سفلی لذات اس کا دامن کھینچتی ہیں تو وہ نظریں بلند افق پر ایک روشن نصب العین پر مرکوز کر دیتا ہے اور اس طرح وہ دامن چھڑا لیتا ہے۔

---○○○---

اب ذرا ماضی قریب کی یادوں کی ایک جھلکی ملاحظہ فرمائیں۔ مسلمان قریب ہی کے زمانے میں ان حالات سے ہو کر گزرے تھے۔ ان حالات میں اللہ کی خاص نصرت نے کرشمہ دکھایا تھا۔ یہ کرشمہ ان کی قوت اور تعداد کا نہ تھا۔ حنین کے دن تو وہ بڑی تعداد میں تھے اور بڑی قوت رکھتے تھے مگر شکست کھا گئے۔ بعد میں اللہ کی نصرت جب آئی تو حالات کا نقشہ بدل گیا۔ اس دن فتح مکہ کے دو ہزار طلقاء اسلامی لشکر میں گھل مل گئے تھے۔ چند لمحے مسلمانوں پر ایسے آ گئے تھے جب وہ قوت اور کثرت کے نشے میں غافل ہو گئے تھے۔ محض تعداد اور ساز و سامان کی وجہ سے۔ یہ سبق تھا اہل ایمان کے لئے کہ

خلوص اور للہ فی اللہ جہاد کے کیا معنی ہوتے ہیں کہ جب اللہ سے رابطے ہوں تو قلت تعداد میں بھی فتح ہے لیکن اگر اعتماد سازوسامان اور غیر مخلص بڑی تعداد پر کر لیا جائے تو میدان مارنا مشکل ہو گا۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِىْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝۲۵ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۶ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۷

"اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوۂ حنین کے روز (اس کی دستگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو) اس روز تمہیں اپنی کثرت تعداد کا غرہ تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرین حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کے لئے جو حق کا انکار کریں۔ پھر (تم یہ بھی دیکھ چکے ہو کہ) اس طرح سزا دینے کے بعد اللہ جس کو چاہتا ہے توبہ کی توفیق بھی بخش دیتا ہے 'اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بے شمار مقامات و ایام میں مسلمانوں کی نصرت کی تھی اور ان ایام کی یاد میں ان کے ذہن میں تازہ تھیں۔ حنین کی جنگ شوال آٹھ ہجری میں فتح مکہ کے بعد پیش آئی جب حضور صں فتح مکہ کے معاملات سے فارغ ہوئے اور فتح مکہ کے امور درست ہو گئے اور عام اہل مکہ مسلمان ہو گئے۔ اور حضور صں نے ان کو معاف کر دیا اور اس طرح وہ "طلقاء" کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اس موقعہ پر آپ کو یہ اطلاع ملی کہ قبائل ہوازن آپ کے خلاف جنگی کاروائی کرنے والے ہیں اور ان کے امیر مالک ابن عوف نضری قبائل ثقیف بنو جشم و بنو سعد ابن بکر اور کچھ لوگ بنی ہلال اور کچھ لوگ بنی عمر ابن عامر اور عوف ابن عامر کے 'اس کی تائید میں ہیں۔ یہ لوگ عورتوں اور بچوں اور مال مویشی کو بھی ساتھ لائے ہیں اور سب کے سب اس لشکر میں نکل آئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے لشکر کو لے کر ان کے مقابلے میں نکلے۔ یہ لشکر دس ہزار انصار و مہاجرین پر مشتمل تھا۔ اور کئی عرب قبائل اس میں شریک تھے۔ اور ان لوگوں میں وہ لوگ بھی تھے جو کل ہی مکہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ جنہیں طلقاء کہا جاتا تھا اور ان کی تعداد دو ہزار تھی۔ اس لشکر کو لے کر حضور دشمن کی طرف نکلے۔ مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی میں ان دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ اس وادی کو وادی حنین کہا جاتا تھا۔ یہ مڈبھیڑ دن کے آغاز ہی میں صبح کی سیاہی میں ہو گئی۔ مسلمان جب اس وادی میں اترے تو آگے ہوازن کمین گاہوں میں چھپے ہوئے تھے۔ جب مسلمان وادی میں اترے تو انہیں پتہ چلا کہ ہوازن حملہ آور ہو گئے۔ انہوں نے تیروں کی بارش کر دی اور تلواریں سونت لیں اور اس طرح حملہ کیا جس طرح ایک انسان حملہ

کرتا ہے۔ یہ یکبارگی حملہ تھا اور اس کی پلاننگ ان کے بادشاہ نے کی تھی۔ پہلے حملے میں مسلمان بھاگ گئے جیسا کہ اللہ نے نص میں فرمایا۔ حضور صلعم شہبا خچر پر سوار تھے۔ آپ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ حضور صلعم کے خچر کا دایاں لگام حضرت عباس نے پکڑا ہوا تھا اور بائیں جانب سے ابو سفیان لگام کو تھامے ہوئے تھے۔ یہ لوگ اس خچر کو روک رہے تھے کہ وہ جلدی دشمن کے درمیان تک نہ پہنچ جائے۔ حضور صلعم نے اپنا نام لے کر لوگوں کو پکارا اور دعوت دی کہ لوٹ آؤ۔ ''اے لوگو میری طرف آؤ میں رسول اللہ ہوں۔'' اور ایسے ہی حالات میں آپ نے رجز پڑھا انا النبی لاکذب انا ابن عبدالمطلب۔ تقریباً سو افراد آپ کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اسی افراد تھے۔ ان میں سے حضرت ابوبکر' حضرت عمر' عباس' علی' فضل ابن عباس' ابو سفیان ابن الحارث' ایمن ابن ام ایمن' اسامہ بن زید وغیرہ رضی اللہ عنہم۔ اس کے بعد حضورؐ نے حضرت عباس سے کہا' یہ بہت بلند آواز تھے کہ بلند آواز سے پکاریں۔ اے درخت کے نیچے بیعت رضوان کرنے والو! اس درخت کے نیچے مسلمانوں نے بیعت کی تھی کہ وہ جنگ میں فرار اختیار نہ کریں گے۔ اس طرح اس نام سے بھی ان کو پکارا گیا' اے اصحاب سمرہ' اے اصحاب سورت بقرہ' اس طرح لوگ سنتے اور یا لبیک یا لبیک کہتے ہوئے لوٹتے۔ چنانچہ سب لوگ واپس ہوئے اور رسول اللہ کے پاس جمع ہو گئے۔ لوگ اس طرح لوٹے کہ اگر کسی کا اونٹ واپس نہ ہوتا تو وہ اپنی زرہ پہن کر کود پڑتا اور اونٹ کو چھوڑ دیتا۔ اور اپنی ذات کو رسول اللہ تک پہنچاتا۔ جن لوگوں کی ایک تعداد حضور صلعم کے پاس جمع ہو گئی تو آپ نے ان کو سچائی کے ساتھ لڑنے کا حکم دیا۔ چنانچہ کفار کو شکست ہوئی اور وہ بھاگنے لگے۔ مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا اور ان کو قتل کیا اور گرفتار کیا اور لوگ تب واپس ہوئے کہ رسول اللہ کے سامنے قیدیوں کی ایک فوج جم گئی۔

یہ تھی وہ جنگ جس میں پہلی مرتبہ مسلمانوں کے پاس ۱۲ ہزار کی ایک عظیم تعداد جمع ہو گئی تھی۔ یہ تعداد انہیں ناقابل شکست نظر آئی۔ وہ پہلی فتح یابیوں کی وجہ سے غافل ہو گئے۔ اللہ کے اس معرکے کے آغاز میں ان کو شکست سے دوچار کر دیا۔ اس طرح ان کی غفلت دور ہوئی اور اس کے بعد جب حضور صلعم کے پاس ایک نسبتاً قلیل تعداد جمع ہوئی تو اللہ نے کامیابی عطا کی کیونکہ یہ تعداد حضور کے ساتھ جم گئی تھی۔

آیت میں اس معرکے کے بعض مناظر کو دہرایا گیا ہے اور اس کے شعوری تاثرات یہاں نقل کیے ہیں۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ (۹ : ۲۵)

''اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوۂ حنین کے روز (اس کی دستگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو) اس روز تمہیں اپنی کثرت تعداد کا غرہ تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔''

پہلا تاثر یہ کہ ہم بہت زیادہ ہیں' پھر روحانی شکست کہ جب انسان پر عرصہ زمین تنگ محسوس ہونے لگتا ہے' پھر وہ مشکل وقت کہ جس میں انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اس پر ہمہ جہت دباؤ ہے۔ پھر حسی شکست کہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے ان تمام تاثرات کے بعد یہ تاثر

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (۹:۲۶) وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ (۹:۲۶) "پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مومنین پر نازل فرمائی۔" گویا سکینہ ایک چادر ہے جو آسمان سے اتری۔ اس نے دلوں کو مضبوط کر دیا اور اس نے ان عارضی تاثرات کو ٹھنڈا کر دیا۔

وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (۹:۲۶) "اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے۔" یہ کیسے لشکر تھے 'ان کی ماہیت اور طبیعت سے ہم واقف نہیں اور اللہ کی قوتوں اور افواج کو اللہ ہی جانتا ہے۔

وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۹:۲۶) "اور منکرین حق کو سزا دی۔" ان کو قتل ہونے ' لٹنے اور شکست کے ذریعے سزا دی گئی۔ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ (۹:۲۶) "کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کے لئے جو حق کا انکار کریں۔"

ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹:۲۷) "پھر (تم یہ دیکھ چکے ہو کہ) اس طرح سزا دینے کے بعد اللہ جس کو چاہتا ہے توبہ کی توفیق بھی بخش دیتا ہے ' اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔" کیونکہ مغفرت کا دروازہ اللہ کے ہاں ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور خطا کار جس وقت چاہیں توبہ کر کے واپس آ سکتے ہیں۔

یہاں غزوہ حنین کی اس جھلکی کو اس لئے پیش کیا گیا ہے تاکہ یہ بتایا جائے کہ جو لوگ اللہ سے غافل ہو جاتے ہیں اور اللہ کے بجائے دوسری قوتوں پر اعتماد کرنے لگتے ہیں اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ لیکن اس واقعہ سے ہمارے سامنے ایک دوسری ضمنی حقیقت بھی آ جاتی ہے۔ اور یہ دوسری حقیقت یہ ہے کہ وہ کون سی قوت ہے جس پر کوئی نظریہ اعتماد کر سکتا ہے۔ نظریاتی تحریکات میں تعدادی کثرت کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی بلکہ ثابت قدم اور نظریات کے جاننے والے مخلص لوگوں کی ایک چھوٹی تعداد ہی اہمیت رکھتی ہے۔ بعض اوقات بڑی تعداد ہزیمت کا سبب بنتی ہے کیونکہ بعض وقتی قسم کے لوگ اس میں داخل ہو جاتے ہیں اور انہوں نے نظریہ حیات کو اچھی طرح سمجھا ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ حالات کے دھارے میں بہہ نکلے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر جب مشکل حالات آتے ہیں تو ان کے قدم متزلزل ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ نظریاتی صفوں میں اضطراب پیدا کر دیتے ہیں اور ہزیمت اور شکست کا باعث بنتے ہیں پھر ایک بھیڑ قیادت کے لئے بھی دھوکے کا سبب بنتی ہے۔ اور بھیڑ میں لوگوں کا باہم مضبوط روابط اور تعلقات نہیں ہوتے نہ وہ اللہ کے ساتھ مضبوط تعلق رکھتے ہیں اور یوں قیادت کو دھوکہ ہوتا ہے کہ نصرت اور کامیابی تعداد کی وجہ سے ہے ' حالانکہ راز یہ ہے کہ فتح و نصرت ' اخلاص اور تربیت کی وجہ سے ہوتی ہے۔

ہمیشہ یوں ہوا ہے کہ مخلصین کی ایک چھوٹی سی پاکیزہ تعداد کسی نظریہ کو لے کر اٹھتی ہے۔ عوام کی بھیڑ جو پانی پر جھاگ کی طرح ہوتی ہے کسی نظریہ کی حامل نہیں ہو سکتی اور گھاس اور کوڑا کرکٹ مشکلات کی آندھیوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

جب بات یہاں تک آپہنچی ہے اور مسلمانوں کے شعور میں قر تاریخ واقعات بیٹھا دیئے جاتے ہیں تو اب مشرکین کے بارے میں فائنل پالیسی کو آخری الفاظ دے دیئے جاتے ہیں جو پالیسی قیامت تک رہے گی۔

---

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا ۚ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ إِن شَآءَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٨﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' مشرکین ناپاک ہیں' لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں۔ اور اگر تمہیں تنگ دستی کا خوف ہے تو بعید نہیں کہ اللہ چاہے تو تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے' اللہ علیم و حکیم ہے۔"

مشرکین نجس عین ہیں' ان کی روح اس قدر ناپاک ہے کہ یہ ناپاکی ان کے خون اور گوشت میں بھی سرایت کر گئی ہے۔ لہٰذا وہ کلیۃ نجس ہیں۔ پاکیزہ احساس ان کا تصور کرتے ہی ابا کرتا ہے۔ کراہت محسوس کرتا ہے اور پاکیزہ مزاج لوگ ان سے دور رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ معنوی نجاست ہے جو حسی نجاست سے زیادہ تیز ہے۔ ان کے اجسام نجس نہ ہوں گے یہ قرآن کریم کا نہایت ہی موثر انداز تعبیر ہے جو روحانیات کو بھی حسی بنا دیتا ہے۔ جب نجس ہیں تو پھر کیا حکم ہے؟

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا (۹ : ۲۸) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' مشرکین ناپاک ہیں' لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں۔" چونکہ مسجد حرام پاک ہے اور یہ ناپاک ہیں اس لئے ان کو مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے دیا جائے۔ حکم کو ان کی شخصیت سے متعلق کر دیا گیا۔

لیکن اس اقدام کے معاشی نتائج بھی تو بھیانک تھے۔ موسم حج اور موسم تجارت آنے ہی والے تھا' جس پر ان کا سالانہ بجٹ چلتا تھا۔ جزیرۃ العرب کے اکثر لوگ اس میں تجارت کرتے تھے اور ان کی گرمیوں اور سردیوں کے سفر بھی اسی نظام پر موقوف تھے۔ اور یہ ان کی معاشی زندگی کا خلاصہ تھا۔ اگر مشرکین کو یوں یکلخت منع کر دیا جائے تو پوری زندگی کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ پھر جب کفار اور مشرکین کے خلاف اعلان جنگ بھی کر دیا جائے۔

یہ سب واقعات و حقائق درست ہیں لیکن اس مسئلے کا تعلق نظریات سے ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم اس نظریے کے لئے مخلص ہو جاؤ اور قربانی کے لئے تیار ہو جاؤ--- رہا رزق اور تجارتی مفادات تو اس کا کفیل کوئی نظام نہیں ہے' اللہ ہے اور اللہ ایسے اسباب کے ذریعے رزق پہنچاتا ہے جو عادی اور معروف نہیں ہوتے۔

وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ إِن شَآءَ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ

(۹ : ۲۸) ’’اور اگر تمہیں تنگ دستی کا خوف ہے تو بعید نہیں کہ اللہ چاہے تو تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے ‘ اللہ علیم و حکیم ہے۔‘‘ اللہ جب چاہتا ہے ‘ اسباب بدل دیتا ہے اور وہ ایک دروازہ بند کرتے دوسرے دروازے کھول دیتا ہے ‘ وہ علیم و حکیم ہے۔ وہ اپنے علم اور اپنی حکمت کی وجہ سے اور اپنے اندازے اور حساب کی وجہ سے یہ انتظامات کرتا رہتا ہے۔

---ooo---

غرض اب اسلامی نظام ایک ایسے معاشرے میں کام کر رہا تھا جو فاتح تھا اور اس کے اندر مختلف درجات ایمانیہ کے لوگ شامل ہو گئے تھے اور جیسا کہ اس پورے سبق میں ہم نے بتایا کہ اس معاشرے میں مختلف مقامات پر کمزور پہلو موجود تھے اور قرآن کریم ان کمزوریوں کو دور کر کے اس سوسائٹی کی تربیت کر رہا تھا۔ اس طرح قرآن کریم امت مسلمہ کی اصلاح میں اپنے منہاج کے مطابق مسلسل جدوجہد کر رہا تھا تاکہ یہ کمزور پہلو مضبوط ہو جائیں۔

قرآن کریم اس امت کو پاکیزگی اور اخلاص کے اعلیٰ ترین مقام اور بلندی تک لے جانے کی جدوجہد کر رہا تھا تاکہ وہ اس دین اور اس نظام کے لئے مخلص ترین امت بن جائے۔ اس کی محبتیں ‘ اس کے روابط اور اس کی ترجیحات مکمل طور پر اس نظام کے لئے علیحدہ ہو جائیں اور یہ کام صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ ایک ایسا سیاسی نظام قائم کیا جائے جس میں لوگ اپنے جیسے انسانوں کی بندگی کے نظام سے نکل کر اسلامی نظام میں داخل ہو جائیں جس میں صرف رب ذوالجلال کی بندگی ہو اور لوگ مکمل طور پر دو کیمپوں میں تقسیم ہو جائیں چونکہ ان دو کیمپوں کے درمیان ملاپ ممکن ہی نہیں ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۸۸ ایک نظر میں

اس سورت کا یہ دوسرا سبق ہے۔ اس دوسرے حصے میں اسلامی مملکت اور اہل کتاب کے درمیان بین الاقوامی تعلقات کی آخری شکل بتائی گئی ہے۔ جیسا کہ پہلے حصے میں اسلامی مملکت اور جزیرۃ العرب کے مشرکین کے درمیان بین الاقوامی تعلقات کی آخری نوعیت کی حد بندی کی گئی تھی۔

پہلے حصے کی آیت کا تعلق جزیرۃ العرب کے مشرکین کے ساتھ تھا اور ان آیات میں ان صفات کا ذکر تھا جو مشرکین میں پائی جاتی تھیں۔ وہ واقعات اور حادثات جو عملاً اس وقت جزیرۃ العرب میں واقع ہوئے تھے پہلے سبق کے موضوع بحث تھے اور یہ آیات ان پر براہ راست منطبق تھیں جبکہ اس حصے کی آیات کا تعلق عموماً اہل کتاب کے ساتھ ہے۔ اور اس حصے کی آیات لفظاً اور معنی عام ہیں خواہ اہل کتاب جزیرۃ العرب میں ہوں یا اس سے خارج کسی جگہ ہوں۔

ان نصوص کے ذریعے ان تعلقات میں بنیادی تبدیلی کر دی گئی ہے جو اس سے قبل مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان قائم تھے، خصوصاً نصاریٰ کے ساتھ۔ یہودیوں کے ساتھ تو جنگی حالت اس سے پہلے بھی کئی بار قائم ہوگئی تھی لیکن نصاریٰ کے ساتھ اعلان جنگ کی حالت نہ تھی۔

کیا تبدیلی ہوئی؟ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ حکم دیا گیا منحرف اہل کتاب کے ساتھ جنگ کی جائے جو دین الٰہی کے منکر ہیں اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھی جائے جب تک وہ چھوٹے ہو کر جزیہ ادا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اب وہ وقت گزر گیا کہ ان کے ساتھ معاہدے کئے جائیں یا دوستی اور امن کے تعلقات قائم ہوں ان کے ساتھ اب یا جنگ ہے اور یا ان کی جانب سے قبول جزیہ ہے۔ اور ان کے لئے صرف یہ حق محفوظ ہے کہ وہ اسلامی مملکت کے تحت ذمی ہو کر رہیں اور ان کے اور مسلم رعایا کے درمیان امن قائم ہو۔ ہاں جب وہ اسلامی نظریہ کو قبول کر لیں اور پوری طرح اسلام میں داخل ہو جائیں تو پھر وہ دوسرے مسلمانوں کی طرح مسلمان ہیں۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ اسلامی ریاست کے تحت وہ اپنا عقیدہ آزادانہ رکھ سکتے ہیں اور انہیں اسلام لانے پر مجبور نہ کیا جائے گا کیونکہ اسلام کا محکم اور طے شدہ اصول یہ ہے لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ "دین قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔" لیکن وہ اپنا دین صرف اس صورت میں عالم اسلام میں جاری رکھ سکتے ہیں جب تک وہ جزیہ ادا کرتے رہیں۔ اور اس سلسلے میں ان کے اور اسلامی ریاست کے درمیان معاہدہ طے ہو جائے۔

اسلامی معاشرے اور اہل کتاب کے درمیان تعلقات کی اس تبدیل شدہ نوعیت کو تب ہی سمجھا جا سکتا ہے جب اسلامی نظام حیات اور جاہلی نظاموں کے درمیان تعلقات کی اس حتمی شکل کو اسلام کے تحریکی مزاج کے مطابق سمجھنے کی سعی کی جائے۔ اچھی طرح سمجھ کر بصیرت کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کی جائے۔ خصوصاً اس زاویہ سے کہ ان بین الاقوامی تعلقات کے قوانین کو کئی مراحل سے گزر کر اس آخری شکل تک پہنچنا پڑا ہے۔ اور اس میں عملی حالات کی وجہ سے اور

نئے نئے مراحل کی وجہ سے ترمیم اور تبدیلی ہوتی رہی ہے۔

یہ آخری شکل کیا ہے؟ وہ یہ کہ اسلامی نظام حیات اور جاہلی نظامہائے حیات چند مخصوص شرائط کے تحت باہم زندہ رہ سکتے ہیں۔ایک یہ کہ یہ جاہلی نظام اسلامی نظام کے اس ہدف کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والا نہ ہو کہ اس کرۂ ارض پر کوئی شخص دوسرے اشخاص کا غلام اور بندہ نہ ہو گا۔کوئی انسان اپنے جیسے انسان کی غلامی نہ کرے گا۔اور اس کرۂ ارض پر کوئی نظام کوئی حکومت اور کوئی معاشرہ ایسا نہ ہو گا جو اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنے۔اس لئے کہ اسلام کا مزاج ہی یہ ہے کہ وہ غالب ہونا چاہتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کرے۔اور یہ اسلام کا اعلان عام ہے جبکہ جاہلی نظامہائے حیات کا اولین ہدف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا دفاع کریں کیونکہ یہ اعلان ان کے لئے اعلان موت ہے اور اس لئے وہ اس قسم کی ہر تحریک کو ختم کرنا چاہتے ہیں جبکہ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ ہر جاہلی نظام اسلام کی راہ نہ روکیں۔

اسلامی نظام حیات اور اسلامی تحریک کا مزاج ہی یہ ہے کہ وہ جاہلیت کے مقابلے میں ایسے ہتھیار لے کر آئے جو جاہلیت کے ہتھیاروں کے ساتھ ہم پلہ ہوں یا اس ہتھیار سے زیادہ موثر ہتھیار ہوں اور اسلامی نظام جاہلیت کے مقابلے میں مرحلہ وار پروگرام کے تحت مناسب رویہ اور طرز عمل اختیار کرے۔اور جب آخری مرحلہ ہو تو اس مرحلے میں وہ حتمی ضوابط اور قوانین پر عمل کرے جو اسلام نے آخری مراحل کے لئے وضع کر دیئے ہیں۔

اس سورت کے اس حصے میں قرآن کریم نے مسلمانوں اور اسلامی ریاست اور اہل کتاب کے درمیان تعلقات کی آخری اور فائنل صورت متعین کی ہے۔اہل کتاب کی بھی آخری پوزیشن بتائی گئی ہے۔اور یہ کہا ہے کہ وہ شرک کفر اور باطل پر عمل پیرا ہیں۔اور ان واقعات اور اسباب کی نشاندہی کی ہے۔جن کی وجہ سے یہ حکم دیا گیا ہے۔چاہے وہ سبب یہ ہو کہ ان کے معتقدات کفریہ ہیں جس طرح کہ دوسرے کفار کے عقائد تھے اور دونوں کے درمیان مکمل مماثلت پائی جاتی ہے یا ان کا طرز عمل' ان کے تصرفات اور ان کی حقیقی صورت حالات ایسی ہے۔درج ذیل وجوہات یہاں گنوائی گئی ہیں۔

۱۔ یہ کہ یہ لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

۲۔ یہ کہ وہ اللہ اور رسول اللہ کے حرام کردہ امور کو حرام نہیں سمجھتے۔

۳۔ یہ کہ وہ دین حق (اسلامی نظام) کے مطیع نہیں ہیں۔

۴۔ ان اہل کتاب میں سے یہودیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عزیر ابن اللہ ہیں۔اور نصاریٰ کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ ابن اللہ ہیں۔اور ان دو اقوال میں یہ اہل کتاب دوسرے کفار اور مشرکین کے مشابہ تھے۔چاہے وہ یونانی بت پرست ہوں یا رومی بت پرست ہوں' یا ہندو بت پرست ہوں یا فرعونی بت پرست ہوں یا دوسرے اہل کفر ہوں۔(بعد میں ہم یہ توضیح کریں گے کہ نصاریٰ کے نزدیک تثلیث اور ابنیت کا دعویٰ یا یہودیوں کی طرف سے ابنیت کا دعویٰ سابقہ بت پرستیوں سے ماخوذ ہے۔اصل نصرانیت اور اصل یہودیت کے اندر یہ عقیدہ ہرگز نہ تھا۔

۵۔ یہ کہ ان لوگوں نے اپنے احبار اور رہبان کو اللہ کے سوا رب قرار دے دیا تھا۔جیسا کہ انہوں نے مسیح کو رب قرار دے دیا تھا حالانکہ انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی توحید پر قائم رہیں اور دین صرف اللہ کے لئے خالص کریں

ورنہ وہ مشرک ہوں گے۔

۶۔ یہ کہ وہ اللہ کے دین کے خلاف بر سرپیکار ہیں اور ان کا ارادہ یہ ہے کہ اس نئے چراغ کو اپنی منہ کی پھونکوں سے بجھا دیں لہٰذا یہ کافر ہیں۔

۷۔ اکثر احبار و رہبان لوگوں کا مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور اللہ کے دین سے لوگوں کو روکتے ہیں۔

ان اوصاف کی وجہ سے اور اہل کتاب جس موقف پر قائم تھے اس کی وجہ سے قرآن کریم نے اہل کتاب کے حوالے سے درج بالا آخری موقف متعین کیا۔ اب اس آخری ضابطے کے مطابق اسلامی مملکت اور اسلامی معاشرہ اور اہل کتاب کے درمیان بین الاقوامی ضابطہ مرتب ہوا ہے۔

یہاں یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم کے سابقہ فیصلوں کے برعکس یہ فیصلہ بالکل مختلف نوعیت کا حامل ہے۔ اور مستشرقین اور عیسائی مشنریوں نے یہ کہا بھی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کیا کہ ان کی تحریک زور پکڑ گئی ہے تو آپ نے "اپنے" سابقہ احکام کو بدل دیا۔ یعنی اہل کتاب کے بارے میں پہلے اور رویہ تھا اور حصول قوت کے بعد اب یہ احکام آگئے۔

ہم یہ کہیں گے کہ اہل کتاب کے بارے میں تمام مکی آیات اور مدنی آیات پر اچھی طرح غور کر لیجئے۔ اس سے اچھی طرح معلوم ہو گا کہ اہل کتاب کے موقف اور نظریات کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اسلام ان کو اب آخری مرحلے میں اسی طرح گمراہانہ نظریات سمجھتا ہے جس طرح ابتدائی مراحل میں ان کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر تھا۔ یعنی یہ کہ یہ مشرکانہ عقائد ہیں اور دین حق کے انکار کے مترادف ہیں۔ اور اس دین کے بھی خلاف جس کے متبع ہونے کے وہ خود مدعی ہیں۔ جو تبدیلی ہوئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ بحیثیت بین الاقوامی کمیونٹی ان کے ساتھ اسلامی ریاست کا آئندہ سلوک کیا ہو گا' اور بین الاقوامی تعلقات ایک ایسا موضوع ہے جس کے بارے احکام اور پالیسی کسی بھی وقت کے موجودہ حالات کے مطابق ہوتی ہے اور حالات ظاہر ہے کہ بدلتے رہتے ہیں۔ رہے وہ عقائد جو اہل کتاب رکھتے ہیں تو ان کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر وہی تھا جو پہلے روز سے تھا۔

اب ہم یہاں مناسب سمجھتے ہیں کہ اہل کتاب کے عقائد و نظریات کے بارے میں قرآن کریم کے بعض تبصرے پیش کریں۔ پھر ہم اسلام کے بارے میں ان کے عملی طرز عمل کو پیش کریں گے جس کے نتیجے میں ان کے بارے میں یہ آخری اور فائنل پالیسی طے کی گئی۔

مکہ میں تو یہودی کمیونٹی موجود ہی نہ تھی نہ نصرانی بڑی تعداد میں موجود تھے نہ کوئی زور ہی رکھتے تھے۔ چند افراد نصرانی ضرور تھے۔ قرآن کریم نے یہ بتایا ہے کہ مکہ کے نصرانیوں نے بڑی خوشی سے اسلام کو قبول کر لیا تھا۔ وہ اسلام میں داخل ہوگئے۔ اور انہوں نے اس کی صداقت کی شہادت دی کہ یہ دین اور یہ رسول برحق ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو نصاریٰ میں سے اہل توحید تھے۔ اور ان کے پاس انجیل کی اصل تعلیمات بھی موجود تھیں۔ ان کے بارے میں قرآن مجید نے یہ تبصرے کئے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِہٖ ھُمْ بِہٖ یُؤْمِنُوْنَ (۵۲) وَاِذَا یُتْلٰی عَلَیْھِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا

بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ (۵۳) (۲۸ : ۵۲ — ۵۳) "جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی تھی' وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں "ہم اس پر ایمان لائے ' یہ واقعی حق ہے ہمارے رب کی طرف سے 'ہم تو پہلے ہی سے مسلم ہیں۔"

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا (۱۰۷) وَّ يَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا (۱۰۸) وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا (۱۰۹) (۱۸ : ۱۰۷ تا ۱۰۹) "اے نبی تم لوگوں سے کہہ دو کہ اسے مانو یا نہ مانو جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے۔ انہیں جب یہ سنایا جاتا ہے تو وہ منہ کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں "پاک ہے ہمارا رب' اس کا وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا' اور وہ منہ کے بل روتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اسے سن کر ان کا خشوع اور بڑھ جاتا ہے۔"

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ كَفَرْتُمْ بِهٖ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَ اسْتَكْبَرْتُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۴۶ : ۱۰) اے نبی ان سے کہو "کبھی تم نے سوچا بھی کہ یہ قرآن اگر اللہ ہی کی طرف سے ہو اور تم نے اس کا انکار کر دیا؟ اور اس جیسے کلام پر بنی اسرائیل کا ایک گواہ شہادت بھی دے چکا ہے۔ وہ ایمان لے آیا اور تم اپنے گھمنڈ میں پڑے رہے اور ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔"

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ مِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ (۲۹ : ۴۷) "ہم نے اسی طرح تمہاری طرف یہ کتاب نازل کی ہے' اس لئے وہ لوگ جن کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں' اور ان لوگوں میں سے بھی بہت سے اس پر ایمان لا رہے ہیں اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں۔"

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (۶ : ۱۱۴) "کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں ' حالانکہ اس نے تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کر دی ہے ؟ اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمہارے رب ہی کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے لہٰذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو"

وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَ اِلَيْهِ مَاٰبِ (۱۳ : ۳۶) "اے نبی جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی تھی ' وہ اس کتاب سے جو تم پر ہم نے نازل کی ہے ' خوش ہیں اور مختلف گروہوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کی بعض باتوں کو نہیں مانتے۔ تم صاف کہہ دو کہ "مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤں اور اس کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے۔"

یہ تو تھے مکی نصاریٰ ' مدینہ میں بھی بعض نصاریٰ نے دعوت اسلامی کو قبول کیا اور مدنی سورتوں میں قرآن نے ان کے شواہد کو نقل کیا ہے۔ بعض آیات میں منصوص طور پر بتایا گیا ہے کہ یہ نصاریٰ تھے۔ اس لئے کہ مدینہ میں یہودیوں نے وہ موقف اختیار نہ کیا جو ان کے بعض افراد نے مکہ میں کیا تھا۔ اس لئے کہ مدینہ میں اسلام ان کے دنیاوی مفادات کے لئے خطرہ بن گیا تھا۔

وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۱۹۹) "اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں اور اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف بھیجی گئی ہے اور اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی طرف بھیجی گئی تھی۔ اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں اور اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر فروخت نہیں کر دیتے۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اللہ حساب چکانے میں دیر نہیں لگاتا۔"

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۸۲) وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (۸۳) وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ (۸۴) فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ (۸۵) (۵ : ۸۲ تا ۸۵) "تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے

زیادہ سخت یہود و مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کے لئے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرور نفس نہیں ہے جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔ وہ بول اٹھتے ہیں کہ "پروردگار' ہم ایمان لائے' ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔" اور وہ کہتے ہیں کہ "آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اسے کیوں نہ مان لیں جبکہ ہم اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے۔" ان کے اس قول کی وجہ سے اللہ نے ان کو ایسی جنتیں عطاکیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزا ہے نیک رویہ اختیار کرنے والوں کے لئے۔"

لیکن یہ چند افراد کا رویہ تھا اور یہ جزیرۃ العرب میں بسنے والے اہل کتاب کی اکثریت کے رویے کی عکاسی نہیں کرتا۔ خصوصاً یہودیوں کے رویے کی۔ ان لوگوں نے مدینہ طیبہ کے اندر جب محسوس کیا کہ ان کے مفادات اور ان کا دین خطرے میں ہے تو انہوں نے اسلام کے خلاف زبردست حملہ شروع کر دیا۔ اور وہ اسلام کے خلاف وہ تمام اوچھے ہتھیار استعمال کرنے لگے جن کی تفصیل قرآن نے دی ہے۔ اسلام میں داخل ہونا تو بہت بڑی بات تھی۔ انہوں نے ان پیش گوئیوں کا بھی صاف صاف انکار کر دیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کی کتابوں میں موجود تھیں۔ حالانکہ قرآن کریم ان کے پاس موجود کتابوں کی تصدیق کر رہا تھا۔ اور یہ اس حقیقت کے باوجود کہ خود ان میں سے پاک فطرت لوگوں نے اسلام کی حقانیت کا اعتراف کیا تھا' اور منکرین اور مخالفین کے سامنے علی الاعلان انہوں نے اسلام کا اقرار اور اعلان کیا تھا۔ چنانچہ اسلام نے ان کے اس عام رویے اور طرز عمل کو بھی قلم بند کر دیا اور متعدد سورتوں میں یہ تبصرہ کیا کہ اہل کتاب کس قدر فسادی' کس قدر باطل پرست اور خود اپنے دین سے کس قدر منحرف ہوگئے ہیں بلکہ عام اہل کتاب کے رویے کو بھی قرآن مجید نے بھی لیا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں۔

وَلَمَّا جَآءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُم بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُم بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ (٦٣) إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ (٦٤) فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِن بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ (٦٥) (٤٣ : ٦٣ تا ٦٥) "اور جب عیسیٰ صریح نشانیاں لئے ہوئے آیا تو اس نے کہا تھا کہ "میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور اس لئے آیا ہوں کہ تم پر بعض ان باتوں کی حقیقت کھول دوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو' لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ اسی کی تم عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔" مگر گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ پس تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ظلم کیا ایک دردناک دن کے عذاب کی۔"

وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ

وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓئٰتِكُمْ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ (١٦١) فَبَدَّلَ

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا

كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ (١٦٢) وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ

فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ

نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (١٦٣) (٧: ١٦١ تا ١٦٣) "یاد کرو وہ وقت جب ان سے کہا گیا تھا کہ "اس بستی میں جا کر بس جاؤ اور اس کی پیداوار سے اپنے حسب منشا روزی حاصل کرو اور حطہ حطہ کہتے جاؤ اور شہر کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو' ہم تمہاری خطائیں معاف کریں گے اور نیک رویہ رکھنے والوں کو مزید فضل سے نوازیں گے۔" مگر جو لوگ ان میں سے ظالم تھے انہوں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی' بدل ڈالا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کے ظلم کی پاداش میں ان پر آسمان سے عذاب بھیج دیا۔ اور ذرا اس بستی کا حال پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھی۔ انہیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں کے لوگ سبت (ہفتہ) کے دن احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ مچھلیاں سبت ہی کے دن ابھر ابھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں۔ یہ اس لئے ہوتا تھا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ اِنَّ

رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٧: ١٦٧) "اور یاد کرو جب تمہارے رب نے اعلان کر دیا کہ "وہ قیامت تک ایسے لوگ بنی اسرائیل پر مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے۔" یقیناً تمہارا رب سزا دینے میں تیز دست ہے اور یقیناً وہ درگزر اور رحم کرنے والا ہے۔"

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ

سَيُغْفَرُ لَنَا وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا

يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا

تَعْقِلُوْنَ (٧: ١٦٩) "پھر اگلی نسلوں کے بعد ناخلف ان کے جانشین ہوئے جو کتاب الٰہی کے وارث ہو کر اس دنیائے دنی کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ توقع ہے ہمیں معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہی متاع دنیا سامنے

آتی ہے تو پھر لپک کر اسے لیتے ہیں کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا جا چکا کہ اللہ کے نام پر وہی بات کہیں گے جو حق ہو؟ اور یہ خود پڑھ چکے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے۔ آخرت کی قیام گاہ خدا ترس لوگوں کے لئے ہی بہتر ہے۔ کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے؟"

مدنی دور کی آخری سورتوں میں پھر اہل کتاب کے بارے میں آخری اور فیصلہ کن پالیسی بتا دی گئی۔ اور تفصیلاً بتایا گیا کہ اسلام کی جنگ میں یہ لوگ کس قدر برے اور اوچھے ہتھیار استعمال کرتے ہیں اور ان سورتوں میں ان کے کردار پر مفصل تبصرے کئے گئے ہیں۔ مثلاً سورۃ بقرہ' آل عمران' سورت نساء' مائدہ وغیرہ میں اور ان کے بارے میں آخری اور دائمی پالیسی' پھر سورت توبہ میں بتائی گئی۔ ان کے بارے میں احکام اور تبصرے یہ ہیں :

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (٧٥) وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (٧٦) اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ (٧٧) وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (٧٨) فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (٧٩) (٢ : ٧٥ تا ٧٩)) "اے مسلمانو' اب کیا ان لوگوں سے تم توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف کی۔ ایمان لانے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی انہیں مانتے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے سے تخلیے کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بیوقوف ہو گئے ہو؟ ان لوگوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ تمہارے رب کے پاس تمہارے مقابلے میں انہیں حجت میں پیش کریں؟ اور کیا یہ جانتے نہیں ہیں کہ جو کچھ یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں' اللہ سب باتوں سے باخبر ہے؟ ان میں سے ایک دوسرا گروہ امیوں کا ہے جو کتاب کا تو علم رکھتے نہیں ہیں بس اپنی بے بنیاد امیدوں اور آرزوؤں کو لئے بیٹھے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں۔ پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے۔ تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کر لیں۔ ان کے ہاتھوں یہ لکھا بھی ان کے لئے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لئے موجب ہلاکت ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ (۸۷) وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ (۸۸) وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۸۹) بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (۹۰) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۹۱) (۲: ۸۷ تا ۹۱) ’’ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، اس کے بعد پے درپے رسول بھیجے، آخر کار عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں دے کر بھیجا اور روح پاک سے اس کی مدد کی۔ پھر یہ تمہارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشات نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمہارے پاس آیا تو تم نے اس کے مقابلے میں سرکشی کی، کسی کو جھلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا۔ وہ کہتے ہیں ہمارے دل محفوظ ہیں۔ نہیں، اصل بات یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہے، اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے اس کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے؟ باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی۔ باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے، مگر جب وہ چیز آگئی جسے وہ پہچان بھی گئے تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ خدا کی لعنت ان منکرین پر، کیسا برا ذریعہ ہے جس پر وہ اپنے نفس کی تسلی حاصل کرتے ہیں کہ جو ہدایت اللہ نے نازل کی ہے، اس کو قبول کرنے سے صرف اس ضد کی بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل سے اپنے بندے کو خود چاہا نواز دیا۔ لہٰذا یہ اب غضب بالائے غضب کے مستحق ہوگئے ہیں اور ایسے کافروں کے لئے سخت ذلت آمیز سزا مقرر ہے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ، تو وہ کہتے ہیں ’’ہم تو صرف اس چیز پر ایمان لاتے ہیں، جو ہمارے ہاں اتری ہے۔‘‘ اس دائرے کے باہر جو کچھ آیا ہے، اسے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور اس کی تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی۔ اچھا ان سے کہو: ’’اگر تم اس تعلیم

ہی پر ایمان رکھنے والے ہو جو تمہارے ہاں آئی تھی تو اس سے پہلے اللہ کے ان پیغمبروں کو کیوں قتل کرتے رہے؟

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ (۹۸) قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۹۹) (۳: ۹۸ تا ۹۹) ”کہو اے اہل کتاب، تم کیوں اللہ کی باتیں ماننے سے انکار کرتے ہو؟ جو حرکتیں تم کر رہے ہو اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ کہو اے اہل کتاب یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اسے بھی تم اللہ کی راہ سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے حالانکہ تم خود گواہ ہو۔ تمہاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں۔“

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا (۵۱) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَ مَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا (۵۲) (۴: ۵۱ — ۵۲) ”کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کر دے پھر تم اس کا مددگار نہیں پاؤ گے۔“

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۷۲) لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۷۳) اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۷۴) مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۷۵) (۵: ۷۲ تا

۷۵)) "یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے۔ حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ "اے بنی اسرائیل اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔" جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے حالانکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے۔ اس کو دردناک سزا دی جائے گی۔ پھر کیا یہ اللہ سے توبہ نہ کریں گے اور اس سے معافی نہ مانگیں گے؟ اللہ بہت درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ مسیح ابن مریمؑ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول تھا اس سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے۔ اس کی ماں ایک راستباز عورت تھی۔ اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو ہم کس طرح ان کے سامنے حقیقت کی نشانیاں واضح کرتے ہیں پھر دیکھو یہ کدھر الٹے پھرے جا رہے ہیں۔"

ان جیسی دوسری قرآنی آیات مکی اور مدنی قرآن کے اندر بے شمار ہیں' جو واضح طور پر یہ بتاتی ہیں کہ اہل کتاب نے اپنے حقیقی دین سے انحراف اختیار کر لیا ہے اور اہل کتاب کے بارے میں قرآن کا جو نقطہ نظر پہلے روز سے تھا اس میں آخر میں نازل ہونے والی سورتوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔ اگرچہ ان پر انحراف' فسوق' شرک اور کفر کے جو الزامات لگائے گئے ہیں ان میں کوئی بات بھی جدید نہیں ہے۔ جہاں تک ان کے عقائد و نظریات کا تعلق ہے اس کے بارے میں پہلے دن سے قرآن کریم نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ ہے کہ ان میں سے جو لوگ اچھے اور صالح تھے اور صحیح عقائد پر قائم تھے اس کا بھی قرآن نے اعتراف کیا ہے۔ مثلاً درج ذیل آیات پر غور کریں:

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (۷: ۱۵۹) "موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو حق کے مطابق ہدایت کرتا تھا اور حق کے مطابق ہی انصاف کرتا۔"

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَاۗىِٕمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ (۳: ۷۵) "اہل کتاب میں سے کوئی ایسا ہے کہ اگر اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دے دو تو وہ یقیناً تمہارا مال ادا کر دے گا اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملہ میں بھی اس پر بھروسہ کرو تو وہ ادا نہ کرے گا۔ الا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں "امیوں کے معاملہ میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں" اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں' حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔"

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ

يَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (۱۱۲) لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ (۱۱۳) يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۱۱۴) وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ (۱۱۵) (۳: ۱۱۲ تا ۱۱۵) ”یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار پڑی، کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں، ان پر محتاجی اور مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔ مگر سارے اہل کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہ راست پر قائم ہیں۔ راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں اور جو نیکی بھی یہ کریں گے ان کی ناقدری نہ کی جائے گی۔ اللہ پرہیزگار لوگوں کو خوب جانتا ہے۔“

جس بات میں تبدیلی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اہل کتاب کے ساتھ اب اسلامی مملکت کا طرز عمل اور سلوک کیا ہو گا۔ یہ طرز عمل اور سلوک حالات کے ساتھ بدلتا رہا ہے۔ مختلف مراحل میں اس میں تبدیلی آتی رہی ہے اور یہ تبدیلی ان کی جانب سے پیش آنے والے واقعات کی وجہ سے آتی رہی ہے۔ کیونکہ دین اسلام کا قیام ایک تحریک کی شکل میں تھا اور اس تحریک کے ساتھ اہل کتاب نے جو عملی رویہ اختیار کیا، اسلامی ریاست نے بھی اسی کے مطابق ان کے ساتھ طرز عمل اختیار کیا۔

ایک وقت یہ تھا کہ اہل کتاب کے ساتھ طرز عمل یہ تھا

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ

(۴۶) (۲۹: ۴۶) ”اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے ----- سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں اور ان سے کہو کہ ”ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس چیز پر جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی۔ ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اس کے مسلم ہیں۔“

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَ

يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۱۳۶) فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۱۳۷)

(۲: ۱۳۶ تا ۱۳۷) مسلمانو' کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم' اسماعیل' یعقوب اور اولاد یعقوب کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی اور ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔ اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔ پھر اگر وہ اس طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت پر ہیں اور اگر اس سے منہ پھیریں تو کھلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں لہٰذا اطمینان رکھو کہ ان کے مقابلے میں اللہ تمہاری حمایت کے لئے کافی ہے۔ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (۳: ۶۴) "اے نبی کہو' "اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے' یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے وہ منہ موڑیں تو صاف صاف کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں۔"

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲: ۱۰۹) "اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں۔ اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمہارے لئے ان کی یہ خواہش ہے۔ اس کے مقابلے میں تم عفو و درگزر سے کام لو تو یہاں تک کہ اللہ کو خود ہی اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔ مطمئن رہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

اور ان حالات اور پالیسیوں کے بعد وہ احکام آئے جن پر اللہ نے اہل ایمان کو مامور کیا۔ چنانچہ کئی واقعات پیش آئے۔ ان واقعات کی وجہ سے طرز عمل کے بارے میں احکام بدلتے رہے اور اسلام کا مثبت اور تحریکی عمل اپنی نہج پر جاری

رہا اور وہ آخری احکام نازل ہوئے جن کے بارے میں اس سورت میں ہم نے تفصیلی بحث کی ہے۔

اہل کتاب کے جو عقائد و نظریات تھے' ان کے بارے میں قرآن کا نظریہ اول روز سے ایک ہی تھا۔ کہ یہ کفریہ اور شرکیہ نظریات ہیں۔ جو تبدیلی آئی ہے وہ صرف یہ کہ اہل کتاب کے مشرکین اور کفار کے ساتھ ہمارا سلوک کیا اور اسلامی ریاست کا سلوک کیا ہو۔ اس سورت کے تعارف میں ہم نے اسی کے بارے میں جو محاکمہ پیش کیا تھا' اس پر ذرا دوبارہ نظر ڈالیں۔

"یہ آخری تبدیلی جو اسلامی معاشرے اور اہل کتاب کے درمیان محض سلوک اور طرز کے بارے میں آئی ہے۔ اسے صرف اس صورت میں سمجھا جا سکتا ہے کہ اسے اسلامی ریاست اور اہل کتاب کے درمیان بین الاقوامی تعلقات کے زاویہ سے دیکھا جائے پھر یہ دیکھا جائے کہ اسلامی نظام کا قیام ایک عملی تحریکی عمل کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے۔ اور اس میں جدید وسائل کے مقابلے میں جدید وسائل اختیار کئے گئے اور سوسائٹی کی بدلتی ہوئی تحریکی صورت حال کے مختلف مراحل میں مختلف طرز ہائے عمل اختیار کئے گئے....."

اب ہم تفصیل سے یہ بتائیں گے کہ اسلامی معاشرے اور اسلامی حکومت اور اہل کتاب کے درمیان مستقل نظریاتی مواقف کیا ہیں اور تاریخی اعتبار سے مختلف مواقع پر کیا طرز عمل اختیار کیا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اسلام نے آخری احکام کیا دیئے ہیں۔

اسلامی ریاست اور اہل کتاب کے درمیان حقیقی موقف کے بارے میں اگر کوئی تحقیقات کرنا چاہے تو اسے درج ذیل حدود کے اندر یہ تحقیق کرنا چاہئے۔ اولاً یہ کہ اس سلسلے میں اللہ نے جو تصریحات کی ہیں وہ فائنل ہیں اور محفوظ ہیں اور برحق ہیں۔ ان میں کسی باطل کی آمیزش نہیں ہے۔ اور یہ تصریحات چونکہ اللہ رب العالمین کی طرف سے ہیں تو ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسانی تصریحات کی طرح ان میں کوئی غلطی ہو سکتی ہے۔ یا ان کے بارے میں انسانی ..... کی طرح کوئی تاویل اور استنباط اور استدلال کیا جا سکتا ہے۔ ثانیاً یہ کہ اہل کتاب کے بارے میں اور ان کے حوالے سے مسلمانوں کی جو تاریخ رہی ہے' اس کی روشنی میں ان دونوں کے درمیان طرز عمل' سلوک اور ضوابط کا تعین کیا جائے۔

پہلے یہ دیکھئے کہ خود مسلمانوں اور اسلامی ریاست کے بارے میں اہل کتاب کا موقف کیا رہا ہے۔ قرآن کریم میں متعدد آیات میں اس کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ کبھی تو صرف اہل کتاب کے بارے میں بات کی گئی ہے اور کبھی ان کے اور مشرکین کے مشترکہ موقف کو بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح کہ ان دونوں کا طرز عمل اور موقف مسلمانوں کے بارے میں یکساں رہا ہے۔ مسلمانوں کی مخالفت میں اہل کتاب و مشرکین چونکہ اکٹھے رہے ہیں۔ اس لئے قرآن نے اپنے تبصرے میں بھی ان کو یکجا کیا ہے اور کبھی یوں بھی ہوا ہے کہ ہر ایک کا موقف مسلمانوں اور اسلامی ریاست کے بارے میں علیحدہ علیحدہ ذکر کیا گیا ہے لیکن آیات قرآنیہ نے نہایت ہی دو ٹوک انداز میں ان کے موقف اور ارادوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ اس قدر وضاحت کے ساتھ کہ اس پر مزید کسی تبصرے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ

مِّنْ رَّبِّكُمْ --- (۲: ۱۰۵) "یہ لوگ جنہوں نے دعوت حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے' خواہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرک ہوں ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بھلائی نازل ہو۔"

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ (۲: ۱۰۹) "اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں۔ اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے۔"

وَلَن تَرْضٰى عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (۲: ۱۲۰) "یہ یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔"

وَدَّت طَّآئِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّونَكُمْ (۳: ۶۹) اہل کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمہیں راہ راست سے ہٹا دے۔"

وَقَالَت طَّآئِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوا بِالَّذِىٓ أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ اٰمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوٓا اٰخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۷۲) وَلَا تُؤْمِنُوٓا إِلَّا لِمَن تَبِعَ دِينَكُمْ (۳: ۷۲ تا ۷۳) "اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہو رہا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو' شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔ نیز یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں کہ اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات نہ مانو۔"

يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا إِن تُطِيعُوا فَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كٰفِرِينَ (۳: ۱۰۰) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھیر کر کفر کی طرف پھر لے جائیں گے۔"

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُونَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيدُونَ أَن تَضِلُّوا السَّبِيلَ (۴۴) وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَآئِكُمْ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا وَكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيرًا (۴۵) (۴: ۴۴ — ۴۵)) "تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جنہیں کتاب کے علم کا کچھ حصہ دیا گیا ہے؟ وہ خود ضلالت کے خریدار بنے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ گم کر دو۔ اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے۔"

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَاۤءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا (۵۱)

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ اجبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔"

بطور نمونہ یہ چند آیات اس بات کے تعین کے لئے کافی ہیں کہ اہل کتاب کا رویہ اور موقف مسلمانوں کے مقابلے میں کیا رہا ہے؟ وہ اس بات کی زبردست خواہش رکھتے تھے کہ مسلمانوں کو دوبارہ کافر بنا دیں اور یہ رویہ ان کی جانب سے کینہ پروری کی وجہ سے تھا۔ جبکہ ان پر اسلام کی حقیقت ظاہر ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کے بارے میں ان کا موقف صرف یہ تھا کہ مسلمان یہودی ہو جائیں یا عیسائی ہو جائیں اور وہ اس موقف میں کوئی تبدیلی کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے وہ مسلمانوں کے ساتھ نہ دوستی کرتے اور نہ پرامن حالات پیدا کرتے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف ان کے بغض و عداوت کا حال یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں بت پرستوں کو اچھا سمجھتے ہیں۔

اگر ہم درج ذیل آیات کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ اہل کتاب اور مشرکین کا رویہ بعینہ ایک جیسا ہے۔

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا (۲: ۲۱۷)

"اور وہ تم سے لڑتے ہی جائیں گے حتیٰ کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہارے دین سے تمہیں پھیر دیں۔"

وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً (۴: ۱۰۲) "کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔"

اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَاۤءً وَّيَبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْۤءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ (۶۰: ۲) "اگر وہ تم پر قابو پا جائیں تو تمہارے ساتھ دشمنی کریں اور ہاتھ اور زبان سے تمہیں آزار دیں۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کسی طرح کافر ہو جاؤ۔"

كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (۹: ۸) "اگر یہ تم پر غالب آ جائیں تو تمہارے معاملہ میں کسی قرابت کا لحاظ کریں نہ کسی معاہدے کی ذمہ داری کا۔"

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (۹: ۱۰) "وہ کسی مومن کے بارے میں کسی قرابت داری اور نہ کسی معاہدے کی ذمہ داری کا کوئی لحاظ کرتے ہیں۔" جب ہم ان ربانی فیصلوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو مشرکین کے بارے

میں ہیں' تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے حوالے سے ان کے جو مقاصد ہیں وہ وہی مقاصد اور پالیسیاں ہیں جو مسلمانوں کے بارے اہل کتاب کی بھی ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے۔ لہذا مشرکین اور اہل کتاب دونوں کا اسلام کے بارے میں بالکل ایک ہی رویہ اور موقف ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ان دونوں کے بارے میں اللہ نے مسلمانوں کو ہدایات دی ہیں اور ان کا مسلمانوں کے حوالے سے جو موقف قرآن نے ہمیں بتایا ہے وہ موقف دائمی اور ابدی نوعیت کا ہے۔ اور یہ آخری اور دائمی موقف اللہ نے کسی زمان و مکان سے مقید نہیں کیا ہے۔ مثلاً ان دو فریقوں کے بارے میں یہ دو آیات قابل غور ہیں:

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا (۲: ۲۱۷)

"اور یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں' اگر ان کا بس چلے۔"

اور اہل کتاب کے بارے میں

وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (۲: ۱۲۰) "اور تم سے یہود و نصاریٰ ہرگز راضی نہ ہوں گے یہاں تک کہ تو ان کے دین کے تابع ہو جائے۔" ان دو آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات کسی تاویل اور کسی توڑ موڑ کو قبول ہی نہیں کرتیں۔ یہاں لوگوں کے اصل مزاج کی نشاندہی ہے جو ان کا دائمی مزاج ہے اور رویہ ہے اور اس میں کسی زمان و مکان کی قید نہیں ہے' نہ مخصوص حالات کا ذکر ہے۔

اس کے بعد اگر ہم ان تعلقات کو تاریخی زاویہ سے دیکھیں کہ حضور اکرم صں کے بعد ان مشرکین اور اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا رہی ہے تو اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ان آیات اور نصوص کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اور یہ کہ اللہ کے کلام صادق میں جو کچھ کہا گیا تھا وہ کس طرح عملاً تاریخ اسلام میں ہوتا رہا اور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ان کفار اور مشرکین کا مسلسل اور ناقابل انفکاک خاصہ تھا اور ان کی فطرت میں اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی بھری ہوئی تھی۔ یہ کوئی وقتی لاحقہ یا عارضہ نہ تھا۔

اگر اہل کتاب میں سے بعض انفرادی واقعات کو مستثنیٰ کر دیا جائے یا بعض جماعتوں اور گروہوں کے رویہ سے صرف نظر کیا جائے جس کے بارے میں قرآن نے بھی ہمیں بتایا ہے کہ بعض لوگوں اور بعض گروہوں نے مسلمانوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے اور بعض لوگ دین اسلام کی سچائی اور رسول اللہ کی سچائی کے قائل ہوئے ہیں اور وہ اسلام اور جماعت مسلمہ میں داخل بھی ہوئے ہیں اور ان حالات کی طرف ہم اس سے قبل اشارہ بھی کر آئے ہیں۔ ان انفرادی رویوں اور بعض گروہوں کے رویے سے صرف نظر کر کے اگر اسلام اور مشرکین و اہل کتاب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دشمنی و عداوت کی تاریخ ہے۔ یہ سازشوں اور مسلسل جارحیت کی تاریخ ہے اور اسلام کے خلاف عناد کبھی اور کسی بھی وقت ان اقوام کے دلوں سے نہیں نکلا۔ یہ ہمیشہ اسلام کے خلاف جارح رہے۔

رہے یہودی تو ان کے کرتوتوں' سازشوں اور مکر و فریب سے قرآن نے بار بار پردہ اٹھایا ہے۔ یہودیوں نے تو اول روز سے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ آئے' آج تک اسلام دشمنی میں ایک دن کے لئے بھی وقفہ نہیں کیا۔

کیا ہم فی ظلال القرآن میں پوری اسلامی تاریخ کا خلاصہ پیش کر سکتے ہیں؟ یہ تو ممکن نہیں لیکن بہرحال ہم اسلام کے خلاف تاریخی یہودی سازشوں کی طرف اشارہ ضرور کر سکتے ہیں۔

جب حضورؐ ہجرت کر کے وارد مدینہ ہوئے تو یہاں کے یہودیوں نے اچھی طرح جانتے ہوئے کہ یہ رسول برحق ہے' آپ کی تصدیق نہ کی حالانکہ وہ اہل کتاب تھے۔

اس کے برعکس انہوں نے سازشوں اور جھوٹے پروپیگنڈے اور شبہات پھیلا کر اسلام کا استقبال کیا۔ انہوں نے مدینہ میں اٹھنے والی اسلامی جمعیت میں ہر قسم کے فتنے اور فساد برپا کرنے کی سعی کی۔ اور اس کام میں انہوں نے ہر قسم کی یہودی مہارت اور سازش کے عنصر کو استعمال کیا۔ انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلائے حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپ برحق نبی ہیں۔ انہوں نے منافقین کو تحفظ دیا۔ جو شبہات' الزامات اور جھوٹی خبریں وہ گھڑتے تھے' چپکے سے ان منافقین تک پہنچا دیتے تھے اور پھر وہ ان کو پھیلاتے تھے۔ مثلاً تحویل قبلہ کے موقعہ پر' افک کے واقعہ کے بارے میں اور ان بڑے واقعات کے علاوہ ہر موقعہ اور ہر مرحلہ پر وہ اپنی اس بدنیتی کا اظہار کرتے تھے۔ یہودیوں کے اس نظریاتی اور ثقافتی جنگ کے جوابات سورت بقرہ' آل عمران' نساء' مائدہ اور سورت حشر میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۸۹) بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ

(۹۰) (۲: ۸۹ تا ۹۰) "اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے' اس کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے؟ باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے' جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے مگر جب وہ چیز آگئی ہے جسے وہ پہچان بھی گئے تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ خدا کی لعنت ان منکرین پر کیسا برا ذریعہ ہے جس سے وہ اپنے نفس کی تسلی کرتے ہیں کہ جو ہدایت اللہ نے نازل کی ہے اس کو قبول کرنے سے صرف اس ضد کی بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل سے اپنے جس بندے کو خود چاہا' نواز دیا۔ لہٰذا اب یہ غضب بالائے غضب کے مستحق ہوگئے ہیں اور ایسے کافروں کے لئے سخت ذلت آمیز سزا مقرر ہے۔"

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲ : ۱۰۱) "اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول 'اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی تو ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو اس طرح پس پشت ڈالا گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔"

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲: ۱۴۲) "نادان لوگ ضرور کہیں گے: انہیں کیا ہوا کہ پہلے یہ جس قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے 'اس سے یکایک پھر گئے؟" اے نبی ان سے کہو: "مشرق و مغرب سب اللہ کے ہیں 'اللہ جسے چاہتا ہے 'سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔"

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ (۷۰) يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۷۱) (۳: ۷۰ تا ۷۱) "اے اہل کتاب کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو؟ اے اہل کتاب کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مشتبہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو؟"

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۳: ۷۲) "اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو' شاید اسی ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔"

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۳: ۷۸) "اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا الٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو کہ وہ جو کچھ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی' وہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ پڑھ رہے ہیں وہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا۔ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔"

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ (۹۸) قُلْ

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۹۹) (۳: ۹۸ تا ۹۹) "کہو اے اہل کتاب، تم کیوں اللہ کی باتیں ماننے سے انکار کرتے ہو؟ جو حرکتیں تم کر رہے ہو' اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ کہو اے اہل کتاب یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اسے بھی تم اللہ کے راستے سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے حالانکہ تم گواہ ہو۔ تمہاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں۔"

يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ ---- (۴: ۱۵۳) "اے نبی اہل کتاب اگر آج تم سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کر دو تو اس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰ سے کر چکے ہیں۔ اس سے تو انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو اور اس سرکشی کی وجہ سے یکایک ان پر بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔ پھر انہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنایا' حالانکہ یہ کھلی کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۹: ۳۲) "یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو وہ اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کئے بغیر ماننے والا نہیں ہے' خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

تاریخ نے دیکھا کہ یہودی یکے بعد دیگرے اپنے کئے ہوئے معاہدوں کو توڑ رہے ہیں اور دھوکہ دے رہے ہیں اور ان کی اسی پالیسی کی وجہ سے بنی قینقاع' بنی قریظہ وغیرہ کے واقعات رونما ہوئے اور جنگ احزاب میں یہودیوں نے جس طرح قبائل عرب کو مسلمانوں کے خلاف جمع کیا وہ تو معلوم ہی ہے۔

اس کے بعد بھی یہودی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ یہ لوگ اس عظیم فتنے کے پیچھے بھی درپردہ کام کر رہے تھے۔ جس میں حضرت عثمان شہید ہوئے اور اس کے بعد اسلامی معاشرے کا اتحاد و اتفاق بڑی حد تک ختم ہو گیا۔ پھر حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان جو فتنہ برپا ہوا' یہی لوگ اس کے بھی محرک تھے۔ پھر انہوں نے اسلامی احکام کو مشکوک بنانے کے لئے وضع حدیث کا فتنہ شروع کیا جس کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں نے علم جرح و نقد ایجاد کیا۔ پھر انہوں نے تاتاریوں کو بغداد کی خلاف اسلامیہ کے خلاف حملہ کرنے پر آمادہ کیا۔

دور جدید کی تاریخ کا حال تو یہ ہے کہ مسلمانوں پر جو مصیبت بھی آئی ہے اس کے پیچھے یہودیوں کا ہاتھ رہا ہے۔ اور اسلامی تحریکات کو جہاں جہاں بھی مٹانے کی سعی کی گئی ہے ان کے پیچھے بھی یہودی سازش کارفرما رہی ہے اور عالم اسلامی کے اندر اسلام کے خلاف تحریک بھی ہوتی ہے۔ اس کی پشت پر ان ہی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ تو تھی یہودیوں کی

حالت ۔ رہے دوسرے ' یعنی اہل کتاب کا دوسرا گروہ نصاریٰ تو وہ ان سے زیادہ مسلمانوں کی دشمنی پر ہروقت تلے ہوئے ہیں اور یہودیوں کے مقابلے میں زیادہ مسلمانوں کے خلاف جنگجو ہیں ۔ ہروقت حالت جنگ میں رہتے ہیں ۔

رومیوں اور فارسیوں کے درمیان صدیوں پرانی عداوت تھی لیکن جونہی اسلام جزیرۃ العرب میں غالب ہوا اور کنیسا نے محسوس کیا کہ ان کے لئے یہ دین نہایت ہی خطرناک ہے ۔ اور اس کے مقابلے میں ان کا خود ساختہ دین کنیسا نہ ٹھہر سکے گا کیونکہ اس میں پرانی بت پرستی اور اہل کنیسا کی سب گمراہیاں جمع ہو چکی ہیں اور ان کے اس دین میں حضرت مسیح کے حالات آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھے ۔ تو ہم نے دیکھا کہ صدیوں کے یہ دشمن اپنی دشمنیاں بھلا گئے ۔ ان کی عداوتیں مٹ گئیں اور ایک دوسرے کے خلاف بقایا حق انتقام ختم کر دیئے گئے اور یہ دونوں قوتیں اسلام کے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں ۔ شمال میں رومی اور ان کے عمال غسانی اکٹھے ہو رہے تھے تاکہ اس نئے دین کا خاتمہ کر دیں ۔ انہوں نے حارث ابن عمیر اروی کو قتل کر دیا ۔ یہ رسول اللہ کے ایلچی تھے اور ان کو حاکم بصریٰ کے پاس حضور ؐ نے بھیجا تھا ۔ بصریٰ کے حاکم رومیوں کے تحت تھے ۔ مسلمان تمام ایلچیوں کو مکمل امن فراہم کرتے تھے لیکن اسلام اور عیسائیت کے اس پہلے رابطے ہی میں عیسائیوں نے غداری کی اور حضور کے ایلچی کو قتل کر دیا ۔ اس پر آپ نے تین شہید امراء کا لشکر بھیجا ۔ اس لشکر کے امراء یکے بعد دیگرے زید ابن حارثہ ' جعفر ابن ابی طالب اور عبداللہ ابن رواحہ مقرر ہوئے تھے ۔ یہ جنگ غزوہ مؤتہ کے نام سے مشہور ہے ' جب یہ لشکر اپنی منزل تک پہنچا تو انہوں نے دیکھا کہ رومیوں نے عظیم جمعیت اکٹھی کی ہوئی ہے یعنی ایک لاکھ رومی جمع ہیں اور ان کے حامی قبائل کے مزید ایک لاکھ افراد ان کی حمایت میں آئے ہوئے ہیں ۔ مسلمانوں کا لشکر صرف تین ہزار افراد پر مشتمل تھا ۔ یہ ماہ جمادی الاخریٰ سن آٹھ ہجری کا واقعہ ہے ۔

اس کے بعد غزوۂ تبوک ہوا جس کے اردگرد سورت توبہ کے تمام موضوعات چل رہے ہیں ۔ اس کے بارے میں تفصیلات اپنی جگہ آئیں گی انشاء اللہ ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے قبل جیش اسامہ بھی تیار کیا تھا ۔ جسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے روانہ فرمایا تھا ۔ یہ لشکر بھی شام کی طرف گیا تھا اور یہ بھی ان افواج کی تیاری کے متعلق سن کر روانہ کیا گیا تھا جو رومی اسلام کو ختم کرنے کے لئے تیار کر رہے تھے ۔

یرموک کے کامیاب معرکے اور اس رومی نو آبادیوں کی آزادی شام ' مصر اور شمالی افریقہ کے فتوحات اور پھر اندلس میں اسلام کے مرکز کے قیام کے بعد اسلام کے خلاف عیسائی صلیبیوں کے سینے کینہ کے مارے کھولتے رہے ۔

تاریخ میں معروف صلیبی جنگیں ہی وہ پہلی جنگیں نہ تھیں جب عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف شروع کیں بلکہ وہ روز اول سے اسلام کے خلاف تمام کارروائیوں کی پشت پر رہے ۔ اور ظہور اسلام کے بعد ہی انہوں نے اپنی کارروائیوں کا آغاز کر دیا تھا ۔ اور یہ کارروائی انہوں نے اس وقت سے شروع کر دی تھی جب سے انہوں نے ایرانیوں کے ساتھ صلح کر لی اور صدیوں کی عداوت کو بھلا دیا ۔ جزیرۃ العرب کے جنوب میں رومیوں نے ایرانیوں کی کارروائیوں کی حمایت کی ۔ پھر مؤتہ میں انہوں نے ایک دوسرے کی امداد کی اور پھر یرموک میں بھی باہم معاون رہے ۔ پھر اندلس میں جب صلیبیوں نے جنگ کا آغاز کیا اور وہاں انہوں نے مسلمانوں پر جو مظالم کیے وہ تاریخ انسانیت کا مشہور المیہ ہے ۔ اور آج تک انسانی تاریخ میں ان کی نظیر نہیں ہے ۔ بعد کے ادوار میں مشہور صلیبی جنگوں میں (حالانکہ ان کی سب جنگیں صلیبی تھیں) مسلمانوں کے خلاف ان جرائم کا ارتکاب کیا جن کی کوئی مثال نہیں ہے اور ان کارروائیوں میں انہوں نے اسلام کے

ساتھ کیئے ہوئے کسی معاہدے کا کوئی لحاظ نہ رکھا۔

لیبان اپنی کتاب تمدن عرب میں لکھتے ہیں :

"برطانوی جنرل ریکار دو نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اس نے مسلمانوں کی فوج کے سامنے تین ہزار قیدیوں کو ذبح کر دیا۔ ان قیدیوں نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے کیونکہ اس نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ ان کو قتل کر دے گا۔ اس کے بعد اس نے لوٹ مار اور قتل کا بازار گرم کیا' جس کی وجہ سے شریف النفس صلاح الدین مشتعل ہو گئے۔ جنہوں نے قدس کے عیسائیوں کے ساتھ حسن سلوک کیا تھا۔ اور انہوں نے ان کو کوئی اذیت نہ دی تھی۔ اور وہ صلاح الدین جنہوں نے فلپ اور قلب الاسد کو ان کی بیماری کے دوران دوائیں اور دوسری ضروریات بطور تحفہ بھیجی تھیں۔"

ایک دوسرے مسیحی مصنف "یورجا" لکھتے ہیں :

"صلیبوں نے بیت المقدس کی طرف اپنا سفر نہایت ہی برے حالات میں شروع کیا۔ ان لوگوں کا ایک گروہ راستے میں آنے والے مسلمانوں کو قتل و غارت کرتا ہوا جاتا۔ انہوں نے جن علاقوں کو فتح کیا۔ ان پر ناقابل تصور مظالم ڈھائے۔ یہ مقتولوں کے پیٹ پھاڑ کر آنتوں میں بھی اشرفیاں تلاش کرتے۔ ان کے مقابلے میں صلاح الدین کا رویہ یہ تھا کہ جب انہوں نے بیت المقدس واپس لیا تو اس نے تمام صلیبوں کو عام معافی دے دی۔ اور ان کے ساتھ جو معاہدے بھی ہوئے وہ اس نے پورے کیئے۔ مسلمانوں نے دشمنوں کے ساتھ نہایت ہی حسن سلوک کا مظاہرہ کیا اور ان کے ساتھ نہایت ہی نرمی اور شفقت سے معاملہ کیا۔ یہاں تک کہ صلاح کے بھائی ملک عادل نے ہزار قیدیوں کو چھڑایا اور تمام آرمینیوں پر احسان کیا اور بطریق کو اجازت دی کہ وہ صلیب لٹکا کر چلے اور کنیسہ کے جامے زیب تن کرے اور شہزادیوں کو اجازت دی کہ وہ اپنے شوہروں اور بادشاہوں سے ملیں۔"

یہاں فی ظلال القرآن میں ہم صلیبی جنگوں کی تمام تاریخ نہیں دہرا سکتے کیونکہ یہ بہت طویل ہے۔ لیکن ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ طویل جنگ صلیبوں کی طرف سے موقوف نہ کی گئی البتہ یہاں مناسب ہے کہ ہم زنجبار کے حالیہ واقعات دیکھیں جہاں ۱۲ ہزار افراد کو تہ تیغ کیا گیا اور بقیہ لوگوں کو سمندر کے تھپیڑوں کے حوالے کر دیا گیا اور ملک سے سمندر میں پھینک دیا گیا اور حالیہ قبرص کے واقعات بھی ذرا دیکھیں کہ قبرص کے مسلمان علاقوں پر پانی اور راشن بھی بند کر دیا گیا کہ لوگ بھوک ہی سے مر جائیں۔ اریٹریا میں حکومت حبشہ جو کچھ رہی ہے اور کینیا میں لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا ہے جو صومالی نسل کے ہیں اور جو اپنے حقیقی ملک صومالی کے ساتھ ملنا چاہتے ہیں اور جنوبی سوڈان میں عیسائیوں کے جو منصوبے ہیں وہ کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہیں۔

موجودہ دور کے صلیبوں کا اسلام کے بارے میں جو نقطہ نظر ہے وہ درج ذیل اقتباس سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے۔ یہ اقتباس جس کتاب سے لیا گیا ہے وہ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ مصنف لکھتے ہیں :

"ہمیں مختلف قوموں سے ڈرایا جاتا رہا ہے۔ لیکن تجربے نے بتایا کہ ہمارا یہ خوف بے جا تھا۔ اس سے قبل ہمیں یہودی خطرے سے ڈرایا گیا۔ پھر جاپان کے خطرے سے' پھر سوشلسٹ روس کے خطرے سے' لیکن یہ تمام ڈراوے غلط ثابت ہوئے۔ ہم نے پایا کہ یہود ہمارے دوست تھے' لہٰذا یہودیوں کا دشمن ہمارا سخت دشمن ہو گا۔ پھر ہم نے دیکھا کہ روسی ہمارے دوست ہیں۔ رہے مشرق بعید کے لوگ تو وہاں تو بڑی بڑی جمہوریتیں پائی جاتی ہیں۔ جبکہ ہمارے لئے

حقیقی خطرہ اسلامی نظام میں پوشیدہ ہے۔جس میں توسیع اور چھا جانے کی قوت موجود ہے اور اس میں زندگی کے عنصر موجود ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ یورپی استعمار کے مقابلے میں صرف اسلام ایک مضبوط دیوار ہے۔" (دیکھئے جارج براؤن کی کتاب بحوالہ تبشیرو استعمار دربلاد عربیہ۔ مصنف ڈاکٹر معصر۔)

---○○○---

اس سرسری جائزے سے ہمیں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت میں جو احکام نازل ہوئے ہیں وہ ان حقائق کو مجموعی طور پر پیش نظر رکھ کر نازل ہوئے ہیں اور ان وجوہات میں سے اہم وجہ صرف یہ ہے کہ اسلامی نظام اس پورے کرۂ ارض کے انسانوں کے لئے ایک اعلان آزادی ہے اور اس کے مقابلے میں جاہلیت کا مشن یہ ہے کہ وہ اس پورے کرۂ ارض پر اسلامی تحریکات کے قلع قمع کرنے کے لئے رات دن سرگرم عمل ہے۔کیونکہ یہ تحریکات انسان کی آزادی کی تحریک کی حامل ہیں۔ لہٰذا یہ آخری احکام کسی زمان و مکان کے ساتھ محدود نہیں ہیں۔اگرچہ یہ آخری احکام مراحل ماقبل میں وارد احکام کو منسوخ نہیں کرتے۔اور ان احکام پر ویسے ہی حالات اور مراحل میں عمل کیا جا سکتا ہے۔ جن میں وہ نازل ہوئے تھے۔کیونکہ ہر دور میں تحریک احیائے اسلام کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مختلف مراحل سے ہو کر گزرتی ہے کیونکہ تحریک اسلامی ایک عملی تحریک ہوتی ہے اور اسے انسانی معاشرے کے عملی حالات سے گزرنا ہوتا ہے۔جس کے متعدد مراحل ہوتے ہیں اور جس کے لئے جدید سے جدید وسائل اختیار کئے جاتے ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سورت میں جو احکام وارد ہیں یہ بھی جزیرۃ العرب کے ایک عملی مرحلے میں نازل ہوئے تھے۔غزوہ تبوک کے مرحلے میں تحریک اسلامی کو جن حالات سے سابقہ تھا ان حالات کے لئے یہ قانون بنایا گیا تھا۔اس وقت جزیرۃ العرب کے شمال میں رومی ایک عظیم لشکر تیار کر رہے تھے تاکہ اسلام کی تحریک کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا جائے۔سورت توبہ کے تمام مضامین میں اسی غزوہ کے اردگرد گھومتے ہیں لیکن اہل کتاب نے اسلام کے ساتھ جو سلوک کیا یا اسلام کے مقابلے میں انہوں نے جو رویہ اختیار کیا وہ کسی مرحلے اور زمان و مکان تک موقوف نہ تھا۔لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اہل کتاب کی اسلام دشمنی تحریک اسلامی کے تمام مراحل میں علانیہ تھی اور ہمیشہ اعلانیہ رہے گی۔الا یہ کہ مسلمان اسلام کو پوری طرح خیر آباد کہہ دیں۔ان لوگوں کا عناد اسلام کے ساتھ بہت شدید ہے۔انہیں اس پر اصرار ہے کہ اسلام ختم ہو اور یہ نہایت ہی گہرا عناد ہے۔وہ اسلام کے خلاف ہر وسیلہ کام میں لاتے ہیں' لاتے رہے ہیں اور رہیں گے۔ لہٰذا یہ احکام جو اس سورت میں دیئے گئے ہیں یہ وقتی نہیں ہیں اور نہ مرحلہ وار ہیں۔ لیکن ان احکام پر عمل ایسے ہی مرحلے میں ہو گا جن میں وہ نازل ہوئے اور ان احکام کو ان کے مرحلی حالات کے دائرے میں سمجھنا چاہئے۔اور ان احکام کو ان حالات سے علیحدہ کر کے نہیں سمجھنا چاہئے اور نہ ہی ان ضعیف مسلمانوں کو اس پر کلام کرنا چاہئے جن میں اسلام کی صرف یہ بات رہ گئی کہ انہیں مسلمانوں کی اولاد کہا جا سکتا ہے اور جو ذہناً اور جسماً ضعیف و ناتواں ہیں اور اپنا ضعف و ناتوانی اسلام کی طرف منتقل کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام میں فقہی احکام تحریک اسلامی کی عملی ضروریات کے تحت دیئے گئے۔ لہٰذا ان احکام کو صرف ان حالات کے فریم ورک میں رکھ کر اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔نصوص و آیات کو حالات سے علیحدہ کر کے سمجھنے میں اور ان کو اسلام کی تحریکی حالات کے دائرے میں رکھ کر سمجھنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ لہٰذا اسلامی نظام کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام

کے تحریکی منہاج عمل کو سمجھا جائے۔ کیونکہ اسلامی تحریک اور اسلامی نظام ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ ہم اسلام کو واقعی صورت حال کے تابع نہیں کر سکتے الا یہ کہ کسی واقعی حالات کو اسلام نے تخلیق کیا ہو' ایسی واقعیت عین اسلام ہوگی۔

اس نکتے کی روشنی میں ہم ان احکام کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جو اسلامی معاشرے کے ساتھ اہل کتاب کے بین الاقوامی تعلقات کی ضابطہ بندی کے سلسلے میں دیئے گئے ہیں جبکہ اسلامی تحریک عملاً جاری تھی اور وہ ایک زندہ تحریک اور مثبت عمل کی شکل میں تھی محض فلسفہ نہ تھا۔

اس تمہید کے بعد اب میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں آیات کی تشریح کی طرف آنا چاہئے۔

---ooo---

# درس نمبر ۸۸ تشریح آیات

## ۲۹ --- تا --- ۳۵

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا
يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ ع ۵
۱۰

"جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔"

یہ آیت اور سیاق کلام میں اس کے پیچھے آنے والی آیات 'غزوہ تبوک کی تمہید تھیں۔ اور عربوں میں عیسائی شمال کے غسانی تھے۔ یہ رومیوں کے مقرر کردہ حاکم تھے۔ ان آیات میں جن صفات کا ذکر ہے وہ اس قوم کی دائمی اور واقعی صفات ہیں جن کے لئے اعلان قتال ہو رہا ہے۔ یہ ایک قائم اور دائم صورت حال ہے جس کے خدوخال ہمیشہ سے ایسے ہی رہے ہیں۔ ایسے مواقع پر قرآن کریم جو انداز کلام اختیار کرتا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دائمی صورت حال ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے یہ اس لئے مذکور نہیں ہوئیں کہ یہ آغاز قتال کے لئے اسباب یا شرائط ہیں بلکہ ان شرائط و صفات کو بطور امر واقعہ یہاں گنوایا ہے۔ ہاں یہ صفات ان کے ساتھ جنگ کرنے کا وجہ جواز ضرور ہیں۔ لہذا جن لوگوں کے اندر یہ صفات پائی جائیں ان کے ساتھ جنگ کا جواز ہو گا۔

یہاں ان صفات کی تحدید ان امور میں کی گئی ہے۔

۱۔ کہ یہ لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔

۲۔ انہوں نے ان چیزوں کو حرام قرار نہیں دیا جن کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔

۳۔ یہ کہ وہ سچے دین کو نہیں اپناتے۔

اور اس کے بعد آنے والی آیات میں یہ تفصیل دی گئی ہے کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر کس طرح ایمان نہیں لاتے۔ اور وہ کس طرح اللہ اور رسول کے حرام کئے ہوئے امور کو حرام نہیں قرار دیتے اور کس طرح دین حق پر عمل پیرا نہیں ہوتے؟ یوں کہ

۱۔ یہودیوں نے کہا کہ حضرت عزیر ابن اللہ ہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح ابن اللہ ہیں۔ اور ان لوگوں کا یہ نظریہ ان نظریات سے ملتا جلتا ہے جو ان سے پہلے بت پرستوں نے اپنائے تھے۔ لہٰذا یہ لوگ اپنے ان اعتقادات کی وجہ سے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے والے تصور نہ ہوں گے۔ (آگے ہم حقیقتاً ثابت کریں گے کہ یہ لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے)۔

۲۔ ان لوگوں نے اپنے احبار و رہبان کو اللہ کے سوا رب بنا رکھا ہے۔ اسی طرح یہ مسیح ابن مریم کو بھی رب سمجھتے ہیں اور یہ عقیدۂ دین حق سے متضاد ہے۔ دین حق یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور رب نہیں ہے۔ اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے اور یہ لوگ اس قسم کا اعتقاد نہیں رکھتے۔

۳۔ ان لوگوں کا ارادہ یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی اس نئی روشنی کے چراغ کو گل کر دیں۔ اس طرح یہ لوگ ہر وقت دین اسلام کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ اور جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے والا ہو وہ دین حق کے چراغ کو گل کرنے کی سعی کبھی نہیں کرتا۔

۴۔ احبار و رہبان کی اکثریت ایسی ہے، جو لوگوں کے اموال کو باطل طریقے سے کھاتی ہے۔ لہٰذا یہ لوگ اس چیز کو حرام نہیں قرار دیتے جسے اللہ اور رسول نے حرام قرار دیا ہے۔ یہاں رسول سے مراد عام ہے۔ چاہے وہ ان کا رسول مراد ہو تو مطلب یہ ہو گا کہ وہ اپنی شریعت پر نہیں چلتے یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے تو مطلب ہو گا وہ اسلامی نظام کو تسلیم نہیں کرتے۔

نصارائے شام و روم میں یہ صفات واقعی اور حقیقی تھیں اور دوسرے نصاریٰ کے معاملے میں بھی یہ درست تھیں جنہوں نے دین مسیح علیہ السلام میں تحریف کر دی تھی۔ اور اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ حضرت عیسیٰ ع اللہ کے بیٹے ہیں اور اقانیم ثلاثہ کے قائل ہو گئے اور پھر ان کے درمیان مختلف فرقوں کے درمیان اس مسئلے پر شدید اختلافات پیدا ہوئے۔

لہٰذا یہ ایک عام حکم ہے اور اہل کتاب کے ساتھ معاملات طے کرنے کے سلسلے میں یہ ایک اصولی قاعدہ ہے۔ جن اہل کتاب پر یہ صفات منطبق ہوں گی جو شام و روم کے ان اہل کتاب میں موجود تھیں تو ان کے ساتھ یہی معاملہ ہو گا۔ اس آیت کے عموم کو ان احادیث نے مخصوص نہیں کر دیا۔ جن میں بعض افراد کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان سے نہ لڑا جائے۔ مثلاً بچے، عورتیں اور عاجز بوڑھے اور وہ عبادت گزار راہب جنہوں نے اپنے آپ کو صرف عبادت کے لئے عبادت گاہوں میں بند کر لیا ہے۔ بشرطیکہ ایسے لوگ جنگ میں شریک نہ ہوں۔ کیونکہ اسلام نے تمام ملل کے ایسے لوگوں سے ساتھ جنگ کرنے سے منع کیا ہے جو نہیں لڑتے۔ جن لوگوں کو احادیث میں مستثنیٰ کیا ہے، ان کو اس لئے مستثنیٰ نہیں کیا گیا کہ وہ لوگ جنگ نہیں کرتے بلکہ اس لئے کہ وہ جنگ کرنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا ان استثنائی نصوص سے یہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کی پالیسی یہ ہے کہ جو لڑتا ہے اس سے لڑو۔ یہ رائے رکھنے والے لوگ ذہناً شکست خوردہ

ہیں اور بزعم خود اسلام کی مدافعت کر رہے ہیں - اس لئے کہ اہل کتاب کی جانب سے جارحیت بہرحال قائم ہوتی ہے۔ انہوں نے اللہ کی بادشاہت پر دست درازی کی ہوتی ہے - نیز انہوں نے پوری انسانیت پر بھی دست درازی کی ہوتی ہے کہ وہ انسانوں کو انسانوں کا غلام اور بندہ بناتے ہیں اور اسلام نے اپنے اوپر یہ فریضہ لیا ہے کہ وہ اللہ کی حاکمیت پر دست درازی کرنے والوں کا ہاتھ روکے اور پھر انسان کی آزادی پر دست درازی کرنے والوں کا بھی ہاتھ روکے - یہ ہوتی ہے جاہلیت اور جاہلیت کا مقابلہ جنگ' قوت اور اسلحہ سے کیا جا سکتا ہے - یہ ہے حقیقی صورت حال اور اس حقیقت سے فرار ممکن نہیں ہے -

یہ آیت اہل اسلام کو حکم دیتی ہے کہ وہ اہل کتاب کے خلاف جنگ کریں - اَلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (۹:۲۹) "جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے -" اور جو لوگ حضرت عزیر کو ابن اللہ سمجھتے ہیں اور حضرت مسیح کو ابن اللہ سمجھتے ہیں ان لوگوں کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں -

اسی طرح جو لوگ حضرت مسیح کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ ابن اللہ ہیں' وہ بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے - یا جو کہتے ہیں کہ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ ---- یا ---- اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ یا وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے مسیح کی صورت میں جسمانی شکل اختیار کی - اور وہ تمام عقائد جو مسیحی مجالس مذہبی نے از خود طے کئے اور پھر بھی وہ ان کے بارے میں مختلف الرائے رہے - یا وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ وہ تو دوزخ میں صرف چند دنوں کے لئے داخل ہوں گے اگرچہ وہ عظیم گناہوں کا ارتکاب کریں کیونکہ وہ اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں - یا اس کے پسندیدہ ہیں - یا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مسیحی بننے سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں یا عشائے مقدس کے کھانے میں شریک ہونے سے معاف ہو جاتے ہیں - اور یہ کہ مغفرت کا یہی واحد طریقہ ہے - تو ایسے تمام لوگوں کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے والے ہیں -

یہ آیت اہل کتاب کی یہ صفت بیان کرتی ہے کہ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ (۹:۲۹) یہاں رسول سے مراد خود ان کی طرف فرستادہ رسول ہو یا حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہوں' معنی ایک ہی ہے - آیت نے اس مفہوم کی تشریح اگلی آیت میں کر دی ہے کہ یہ لوگ دوسروں کے اموال ناجائز طریقے سے کھاتے ہیں اور دوسروں کا مال باطل طریقے سے کھانا تمام رسولوں نے حرام قرار دیا ہے اور لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھانے کی ایک مثال سودی کاروبار ہے - اور اہل کنیسا نے اس سودی کاروبار کی اجازت دے کر سود خواروں کے نام بخشش کا چیک جاری کر دیتے تھے - یوں وہ لوگوں کو اللہ کے دین سے روکتے تھے - اور دین پر عمل کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنتے تھے اور اہل ایمان کو فتنے میں ڈالتے تھے - یوں وہ لوگوں کو غیر اللہ کی بندگی میں داخل کرتے تھے اور ان کو ایسے احکام و قوانین کے تابع بناتے تھے جن کو اللہ نے نازل نہ کیا تھا - ان تمام امور پر یہ آیت صادق آتی ہے وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ (۹:۲۹) اور یہ تمام باتیں اہل کتاب کے اندر پوری طرح پائی جاتی تھیں اور آج بھی ان میں یہ امور اسی طرح موجود ہیں -

اور یہی وجہ ہے کہ آیت میں آگے ان پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ (۹:۲۹) یہ

ان کے سابقہ مذکور بالا رویہ کی مزید تشریح ہے کیونکہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنا دین حق نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اللہ کے قوانین کو چھوڑ کر کسی اور قانون پر چلنا دین حق نہیں ہو سکتا۔ اللہ کو چھوڑ کر احکام و ہدایات کسی اور منبع سے لینا صحیح دین نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اللہ کے سوا کسی اور کے اقتدار اعلیٰ کی اطاعت کرنا بھی دین حق نہیں ہو سکتا اور یہ صفت اہل کتاب میں جس طرح اس وقت قائم تھی آج بھی قائم ہے۔

یہ شرط نہیں کیا گیا کہ جب تک وہ مسلمان نہیں ہو جاتے ان سے لڑا جائے۔ کیونکہ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کا اصول اپنی جگہ قائم ہے بلکہ یہ شرط لگائی گئی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس شرط میں کیا راز ہے۔ اور اس انتہا پر پھر قتال کیوں رک جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا صفات کے ساتھ اہل کتاب کا وجود ہی اسلام کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اسی طرح وہ جہاں بھی ہوں اسلامی نظام کے خلاف اور اسلام کے معاشرہ کے خلاف عین جنگ میں ہیں کیونکہ اسلامی نظام اور اہل کتاب کے نظریات کے درمیان عین تضاد ہے جیسا کہ مذکور بالا آیات کے اندر اس کی وضاحت کی گئی ہے اور پھر ہم نے تاریخی واقعات اور تاریخی طرز عمل سے بتایا کہ اہل کتاب اسلامی نظام کو برداشت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ عملاً دین اسلام کی راہ روکتے ہیں اس کے خلاف جنگ کرتے ہیں' مسلمانوں کے خلاف وہ ہر وقت برگرم رہتے ہیں۔ ان آیات کے نزول کے بعد آج تک ان کی حالت یہی رہی ہے۔

اسلام اس کرۂ ارض پر ایک دین برحق ہے۔ اور اس کا یہ حق ہے کہ وہ اپنی راہ سے ناجائز مادی رکاوٹوں کو دور کرے۔ اور تمام انسانوں کو دین حق (اسلام) کے علاوہ تمام دینوں سے آزاد کر کے چھوڑے کہ وہ جبری حالت سے نکل کر آزادانہ' جو دین چاہیں اختیار کریں۔ ہر انسان کو آزادانہ طور پر یہ اختیار ہو کہ وہ جو دین چاہے اختیار کرے۔ کوئی بھی دین اختیار کرنے کے سلسلے میں اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

یہ حق کہ کوئی انسان کسی مادی رکاوٹ کے ہاتھوں مجبور نہ ہو اور اسلام یا غیر اسلام کوئی بھی دین قبول کرنے کے لئے آزاد ہو' تب ہی محقق ہو سکتا ہے کہ جاہلیت کی قوت اور شوکت کو توڑ دیا جائے۔ تمام غیر اسلامی قوتیں اسلامی مملکت کے تابع ہوں اور اسلامی نظام کی باج گزار ہوں۔

باج گزاری کے عمل سے انسان کی آزادی اپنی تکمیل کو پہنچ جاتی ہے۔ ہر فرد جس دین کو چاہے اختیار کرتا ہے جو فرد اسلام پر مطمئن ہو وہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص مطمئن نہ ہو وہ اپنے دین پر باقی رہتا ہے۔ لیکن اس آزادی کی فیس اسے بطور جزیہ ادا کرنی ہو گی اور اس سے درج ذیل مقاصد حاصل ہوں گے :۔

۱۔ جزیہ دے کر وہ اعلان کر رہا ہو گا کہ اب وہ اسلام کی دشمنی میں کوئی مادی قوت بطور رکاوٹ کھڑی نہ کرے گا اور دعوت اسلامی کا سد راہ نہ ہو گا۔

۲۔ وہ اپنے مال اور عزت کے دفاع اور آزادی کے حق جس کی ضمانت اسے اسلام دیتا ہے' کے عوض اخراجات میں مملکت میں اپنا حصہ ادا کرے گا۔ کیونکہ جو لوگ جزیہ دیتے ہیں اسلامی نظام مملکت ان کے مال اور جان اور آبرو کا محافظ ہوتا ہے۔ اور ان کی جانب سے دفاع کرتا ہے۔ خواہ خارجی حملہ ہو یا داخلی امن و امان ہو۔

۳۔ پھر یہ کہ وہ بیت المال میں اپنا حصہ ادا کرے گا جس سے مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی کفالت کا بندوبست ہوتا

ہے ۔ تمام ایسے لوگوں کو بیت المال سے وظیفہ دیا جاتا ہے جو کسب و عمل پر قادر نہ ہوں خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم ہو جبکہ غیر مسلموں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ۔

ہم اس سے آگے فقہی اختلافات میں نہیں پڑتے کہ کن کن غیر مسلموں سے جزیہ لیا جائے گا اور یہ کہ جزیہ کی مقدار کیا ہوگی اور یہ کہ اس کی وصولی کا طریقہ کار کیا ہو گا؟ کیونکہ آج ہمارے سامنے کوئی عملی مسائل اس قسم کا درپیش نہیں ہے ۔ فقہاء کے دور میں یہ مسئلہ عملاً درپیش تھا اس لئے انہوں نے اپنے دور کے لئے احکام جاری کئے اور فتوے دیئے اور ان مسائل پر اجتہادی کلام کیا ۔

آج یہ مسئلہ ایک تاریخی مسئلہ سمجھا جاتا ہے ۔ یہ واقعی سوال نہیں ہے اس لئے کہ آج مسلمان عمل جہاد میں سرگرم نہیں ہیں ۔ اور یہ اس لئے کہ حقیقی مسلمان ہمارے دور میں کمیاب ہیں ۔ آج ہمارے سامنے حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ آج اسلام موجود ہے یا دنیا میں موجود ہیں یا نہیں ۔

اسلامی نظام حیات کیا ہے؟ جیسا کہ ہم نے بار بار اس سوال کا جواب دیا کہ وہ ایک سنجیدہ اور عملی نظام ہے ۔ یہ نظام محض ہوائی باتوں پر بحث و جدال نہیں کرتا ۔ نہ وہ ایسے فقہی مباحث میں دماغ سوزی کو ضروری سمجھتا ہے جو عملاً موجود نہ ہوں کیونکہ عالم واقعہ میں مسلمانوں کی کوئی سوسائٹی موجود نہیں ہے ۔ جس میں اسلامی شریعت نافذ ہو ۔ اور اسلامی فقہ اس کی عملی زندگی پر متصرف ہو ۔ اسلام ایسے لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے جو مفروضے گھڑتے ہیں اور پھر ان پر مباحث کے سلسلے اٹھاتے ہیں ۔ ان کو اسلامی اصطلاح میں "ارئیتی" کہا جاتا ہے جو اس طرح سوال کرتے ہیں "دیکھو ' اگر یوں صورت حالات واقعہ ہو جائے تو کیا حکم ہو گا؟"

آج ہمیں احیاء اسلام کے کام کا آغاز اسی مقام سے کرنا ہے جس سے حضور اکرم ﷺ نے کیا تھا اور وہ یہ کہ دنیا میں کوئی ایسی سوسائٹی وجود میں آئے جو حکومت الہیہ قائم کر کے اس میں دین اسلام نافذ کر دے ۔ وہ پہلے شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی اور حاکم نہیں ہے اور محمد رسول اللہ ہیں ' شارع ہیں ۔ لہذا ہماری سوسائٹی میں اللہ حاکم اور شارع ہے ۔ اور ہم اللہ و رسول کے احکام کو اس سوسائٹی میں نافذ کرنے والے ہیں اور پھر وہ اس نظر کو لے کر پوری دنیا میں آزادی انسان کا بیڑا اٹھائیں اور پھر جب حکومت الہیہ قائم ہوگی اور کسی اسلامی سوسائٹی میں نافذ و جاری ہوگی تو تب جا کر یہ سوال اٹھے گا کہ اس سوسائٹی کے تعلقات دوسری ملل و نحل کے ساتھ کیا ہوں گے اور اسی وقت ان فقہی تحقیقات کی ضرورت ہوگی اور اس وقت پھر ماہرین اور اہل فکر و نظر اس وقت کے متعین حالات میں یہ فیصلہ کریں گے کہ اب دوسری ملتوں کے افراد اور حکومتوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کیا ہوں گے ؟"

ہم نے اصولی طور پر اس آیت کی تشریح یہاں کر دی ہے جس اصول اعتقاد اور اسلامی نظام کے منہاج کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے ۔ اور اسی پر ہم یہاں اپنی بات کو روک دیتے ہیں ۔ آج ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ یہاں فروعی مباحث پر کلام شروع کر دیں کیونکہ اسلامی نظام حیات ایک حقیقت پسندانہ اور عملی نظام ہے ۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ۖ ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن

قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۰﴾

"یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے' اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں۔ ان لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے۔ خدا کی مار ان پر' یہ کہاں سے دھوکا کھا رہے ہیں۔"

جب اللہ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اہل کتاب کے ساتھ جنگ شروع کر دیں اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھیں جب تک وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دے کر اپنے آپ کو چھوٹا ثابت نہیں کرتے۔ تو اس وقت مدینہ طیبہ کی اسلامی حکومت کو کچھ عملی حالات درپیش تھے اور اس سورت کے آغاز میں ہم نے ان پر تفصیلی بحث کی ہے۔ پھر ان کے بارے میں سورت کے حصہ اول پر اجمالی تبصرے میں بھی ہم نے بحث کی ہے۔ یہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ ان حالات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے نیز ان اسباب کو بھی اچھی طرح متعین کرنا چاہئے جن کی وجہ سے وہ حالات پیدا ہوئے۔ تاکہ ان تمام شبہات و خلجانات کو رفع کر دیا جائے جو بعض لوگوں کے اذہان میں پیدا ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حکم پر تعمیل کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان رومیوں کے مقابلے میں نکل آئیں جو اس وقت اطراف شام پر قابض تھے۔ اسلام سے پہلے بھی رومی عرب قبائل سے خوف کھاتے تھے کیونکہ یہ لوگ ایک طویل عرصے سے عرب کے شمالی علاقوں پر قابض تھے۔ عرب قبائل کے اندر بھی ان کی دوستیاں اور تعلقات تھے۔ شمال میں غسانیوں کی حکومت ان کی باجگزار تھی۔ لہذا مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان یہ پہلی مڈبھیڑ نہ تھی۔ یعنی جب عربوں کو اللہ نے اسلام کے ذریعہ سے عزت بخشی اور وہ ایک عظیم قوم کی شکل میں فارس اور روم جیسی عظیم قوتوں کے مقابلے میں اتر آئے اور اس سے پہلے تو وہ منتشر قبائل تھے اور ان کی بہادری اور جنگجوئی کے قصے صرف باہم قتل و قتال' ڈاکوں اور لوٹ مار کی کہانیوں پر مشتمل تھے لیکن اس کے باوجود رومیوں کے دلوں میں عربوں کا خوف بہرحال بیٹھا ہوا تھا۔ خصوصاً ان لوگوں کا خوف جنہوں نے ابھی تک پوری طرح اسلامی رنگ اختیار نہ کیا تھا۔ رومیوں کے ساتھ آخری ٹکراؤ اور جھڑپ غزوہ مؤتہ کی شکل میں ہوا تھا جس میں روایات کے مطابق دو لاکھ سے زیادہ رومی جمع ہوئے تھے اور اس غزوہ کا نتیجہ مسلمانوں کے مقاصد کے مطابق بر آمد بھی نہ ہوا تھا۔

ایک تو یہ حالات تھے کہ اسلامی معاشرے کے اندر ابھی تک تطہیر افکار کا کام مکمل نہ ہوا تھا' دوسرے یہ کہ رومیوں کی جانب سے ایک عام خوف بھی مسلمانوں کے دلوں میں تھا اور پھر یہ غزوہ تبوک جن حالات میں درپیش تھا' معاشی لحاظ سے اور دوسرے حالات کے لحاظ سے بھی یہ بہت ہی تنگی کا وقت تھا۔ اسی لئے اسے غزوۂ عسرت کہا گیا ہے۔ تفصیلی حالات بعد میں بیان ہوں گے۔ پھر مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات بھی تھی کہ رومی اور ان کے ایجنٹ عرب بہرحال اہل کتاب میں سے تو ہیں۔ یہ تھے وہ وجوہات جن کی بنا پر یہاں اس بارے میں زیادہ سے زیادہ وضاحتیں کی گئیں اور فیصلہ کن اور دو ٹوک انداز بیان اختیار کیا گیا۔ اور تمام ذہنی خلجان اور نفسیاتی الجھنوں کو دور کر دیا گیا۔ اور ان احکام کے حقیقی اسباب اور عوامل بھی بتائے گئے۔

چنانچہ آیت زیر بحث میں قرآن کریم ان اہل کتاب کی فکری ضلالت کی وضاحت کرتا ہے کہ ان کا نظریہ اور عرب

گمراہوں کا نظریہ اور بت پرستوں کا نظریہ باطل باہم مماثل اور ہم رنگ ہے۔ عرب بت پرستوں اور قدیم رومی بت پرستوں اور ان عیسائیوں کے درمیان کوئی نظریاتی فرق نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ نے ان کو جو صحیح عقیدے دیئے تھے اس پر وہ ثابت قدم نہیں ہیں لہٰذا ان کی حیثیت اہل کتاب محض نام کی رہ گئی ہے۔ ان کی کتابوں کے اندر ان کو جو صحیح اور درست نظریات و اعتقادات دیئے گئے تھے وہ انہوں نے ترک کر دیئے ہیں۔

یہاں یہودیوں کے اس قول کا بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں حالانکہ روئے سخن اور عملاً مقابلہ صرف رومیوں کے ساتھ تھا جو عیسائی اور نصاریٰ تھے۔ یہاں یہودیوں کو دو وجوہات سے بیچ میں لایا گیا ہے۔

۱۔ یہ کہ پہلی آیت عام تھی۔ کیونکہ اہل کتاب کا اطلاق یہودی و عیسائی دونوں پر ہوتا تھا۔ اور آیت سابقہ میں لڑنے کے بارے میں اور جزیہ وصول کرنے اور ان کو چھوٹا بنا کر رکھنے کا جو حکم دیا گیا تھا وہ تمام اہل کتاب کے برخلاف تھا۔ لہٰذا یہاں اہل کتاب کی نظریاتی اور اعتقادی ضلالت کے ذکر میں بھی دونوں کو شامل کیا گیا کہ نظریاتی اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔

۲۔ دوسرے یہ کہ عرب کے تمام یہودی نے ہجرت کر کے اطراف شام میں آباد ہو گئے تھے۔ جب سے رسول اللہ اور مسلمانوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی، یہودیوں نے اسلام کے خلاف جنگ جاری رکھی تھی جس کے نتیجے میں بنی قینقاع اور بنی نضیر اطراف شام کی طرف جلاوطن ہو گئے تھے۔ بنی قریظہ کے بعض افراد بھی۔ لہٰذا شام کی طرف اسلامی انقلاب کی وسعت کی راہ میں یہودی رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ لہٰذا اس حکم میں یہودیوں کو شامل کرنا بھی ضروری تھا۔

نصاریٰ کا قول کہ مسیح ابن اللہ ہیں' مشہور و معروف ہے۔ اور جب سے پولوس نے ان کو گمراہ کیا ہے' اس کے بعد آج تک وہ اسی عقیدے پر قائم ہیں۔ پھر پولوس کے بعد ان کی مذہبی کانفرنسوں نے پولوس کے عقائد کو سرکاری شکل دے کر ان کو مکمل گمراہ کر دیا۔ لیکن یہودیوں کا یہ عقیدہ کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں' بہت مشہور ہے۔ یہودیوں کی کتب مقدسہ میں ایک شخص عزرا کے نام سے مذکور ہے۔ اور اس کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کی تورات کا ماہر کاتب تھا۔ یہ کہ اس نے اپنے دل کو شریعت ربانی کی تلاش کی طرف متوجہ کیا لیکن قرآن نے ان کی جانب سے جو عقیدہ نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض یہودی اس کے قائل تھے خصوصاً وہ یہودی جو اطراف مدینہ میں بستے تھے۔ قرآن کریم مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ عملاً ہمکلام تھا۔ اس نے یہ عقیدہ نقل کیا ہے۔ اگر یہودیوں کے اندر یہ عقیدہ نہ ہوتا تو وہ فٹ کہہ دیتے کہ قرآن نے یہ غلط کہا ہے، ' ہمارا تو یہ عقیدہ نہیں ہے۔ لیکن مدینہ کے یہودیوں کی جانب سے اس موضوع پر مکمل سکوت ہے۔ لہٰذا کم از کم اس وقت کے یہودیوں میں یہ عقیدہ مروج تھا۔

تفسیر منار کی ج ۱۰ میں مرحوم رشید رضا نے ص ۳۸۵ تا ۳۸۷ عزرا کے بارے میں یہودیوں کے نظریات پر مفید بحث کی ہے۔ یہاں ہم اس سے چند فقرات نقل کرتے ہیں جو نہایت ہی مفید رہیں گے۔ وہ کہتے ہیں۔

"جیوس انسائیکلوپیڈیا طبع ۱۹۰۳ء میں ہے کہ عزرا کا زمانہ یہودیوں کی تاریخ کا موسم بہار تھا۔ جس میں ہر طرف پھول کھلے ہوئے تھے' اسے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا تھا کہ اس نے شریعت کی گاڑی چلائی۔ اگر موسیٰ علیہ السلام پر شریعت

نازل نہ ہوئی ہوتی۔کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد شریعت کو بھلا دیا گیا تھا۔عزرا نے شریعت کو دوبارہ پیش کیا اور زندہ کیا۔اگر بنی اسرائیل غلطیاں نہ کرتے تو وہ اسی طرح کے معجزات دیکھتے جس طرح انہوں نے حضرت موسیٰ کے عہد میں دیکھے۔کہا جاتا ہے کہ انہوں نے آشوری رسم الخط میں شریعت کو لکھا۔جن الفاظ میں انہیں شک نظر آتا ان پر وہ علامت ڈال دیتا۔یہودیوں کی تحریری تاریخ کے لئے ان کا عہد ماخذ ہے۔"

جارج لوست کتاب مقدس کی ڈکشنری میں لکھتے ہیں:عزرا یہودی کاہن ہے اور مشہور اہل قلم تھا جو طویل القامت ارتخششتا کے دور میں بابل میں رہائش پذیر تھا۔اس بادشاہ نے اپنی تخت نشینی کے ساتویں سال عزرا کو اجازت دی کہ اپنی قوم کی ایک بڑی تعداد کو لے کر یروشلم چلا جائے۔یہ تقریباً ۴۵۷ ق م کا واقعہ ہے۔یہ لوگ چار ماہ میں وطن پہنچے۔"

"اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ یہودیوں کے عقائد کے مطابق عزرا کا مقام موسیٰ اور ایلیا کے برابر ہے۔کہتے ہیں کہ اس نے ایک بہت بڑی اکیڈمی قائم کی اور کتاب المقدس کے مختلف اسفار کو جمع کیا اور قدیم عبرانی حروف کے بجائے اسے کلدانی حروف میں لکھا۔انہوں نے الایام اور عزرا اور نحمیاہ کے اسفار تالیف کئے۔"

"مزید کہتے ہیں کہ "عزرا" کی زبان ص ۴ : ۸ - ۶ : ۱۹ کلدانی ہے اسی طرح ص ۷ : ۱۲ - ۲۷ یہ لوگ غلامی سے واپس آنے کے بعد عبرانی مقابلے میں کلدانی زبان اچھی طرح سمجھتے تھے۔"

"میں کہتا ہوں کہ تمام اقوام اور خصوصاً اہل کتاب کے درمیان مشہور یہ ہے کہ جس تورات کو حضرت موسیٰ نے لکھا تھا اور جسے تابوت میں یا اس کے پاس رکھا تھا۔وہ عہد سلیمان سے گم ہو گئی تھی۔کیونکہ ان کے زمانے میں جب تابوت کھولا گیا تو اس میں صرف وہ دو تختیاں تھیں جن میں دس وصیتیں تحریر تھیں۔جیسا کہ سفر ملوک (۱) میں درج ہے۔اور دراصل بعد میں تورات وغیرہ کو عزرا نے لکھا اور یہ بابل کی غلامی کے دور کے بعد کلدانی رسم الخط میں تحریر ہوئی۔کلدانی زبان میں کچھ عبرانی الفاظ بھی شامل تھے جسے یہودیوں نے بھلا دیا تھا۔اہل کتاب کہتے ہیں کہ عزرا نے اسے اس طرح لکھا کہ گویا وہ اللہ کی طرف سے وحی ہے یا الہام ہے لیکن غیر لوگ اسے تسلیم نہیں کرتے۔اس سلسلے میں بہت بڑے شکوک و شبہات اور اعتراضات کیے گئے ہیں جو تفصیل کے ساتھ ان کتابوں میں مذکور ہیں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔خود اہل کتاب کی کتابوں میں بھی یہ مذکور ہیں مثلاً کیتھولک دین وغیرہ) جو فرانسیسی میں لکھی گئی جس کے فصل گیارہ اور بارہ میں خصوصاً یہ اعتراضات تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں کہ آیا موسیٰ کے اسفار خمسہ اس میں سے ہیں یا نہیں۔"

"سفر عزرا میں ہے (۴ ف ۱۴ نمبر ۲۱) کہ تمام مقدس اسفار آگ میں جل گئے تھے اور یہ بخت نصر کے دور میں۔اس میں ہے "آگ نے تمہاری شریعت کو باطل کر دیا ہے' اس لئے کسی کے لئے یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ تم نے کیا کیا۔(میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کلام صادق ہے' اور اس نے یہ خبر دی ہے کہ تابوت میں بقیہ تھا) مزید یہ کہ عزرا نے روح القدس کی وحی کے ذریعے ان اسفار مقدسہ کو دوبارہ جمع کیا جنہیں آگ نے جلا دیا تھا۔اور ان کی تالیف میں' ان کے معاصر پانچ لکھنے والوں نے ان کی امداد کی۔اور یہی وجہ ہے کہ پادری ترتلیانوس ' پادری ایریناؤس ' ایرونیموس اور پادری یوحنا' پادری باسلیوس وغیرہ۔کہتے ہیں کہ عزرا معروف اسفار مقدسہ کا ترمیم کنندہ ہے۔آخر میں لکھتے ہیں۔"

"میں سمجھتا ہوں یہاں اس قدر کافی ہے لیکن یہاں ہم دو باتیں عرض کریں گے 'ایک کہ یہ تمام اہل کتاب اس عزرا کے مرہون منت ہیں جس نے ان کے دین کی اساس کو قائم کیا۔ اور ان کے دین کے کتب مقدسہ کو مرتب کیا۔ دوسرے یہ کہ ان کی یہ مستند کتب نسیاں اور غلطی سے محفوظ نہیں ہیں اور یہ بات آزاد یورپین محققین نے تسلیم کی ہے۔

(ہم فی ظلال القرآن میں محمد عبدہ کی مدرسہ فکر کے اس طریقہ اظہار کی طرف تنبیہہ کرتے رہے ہیں۔ یہ لوگ مغرب کی آزاد فکر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں جو اسلامی طرز فکر سے اجنبی ہے۔ یہ لوگ اپنی اس طرز فکر کی وجہ سے یورپ کے آزاد خیال مفکرین کو اہمیت دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ مغرب کے جمہوری اداروں' بنیادی حقوق اور طرز حیات کو بنظر استحسان دیکھتے ہیں۔ ہم نے بارہا اس طریقے اور طرز عمل کی خطرناکیوں کی طرف فی ظلال القرآن میں قارئین کو متنبہ کیا ہے۔ ہمیں مغربی افکار کا نہایت ہی عمیق نظر سے جائزہ لینا چاہئے۔)

برٹش انسائیکلوپیڈیا میں ان کی سوانح اور ان کے "سفر" اور نحمیاہ کے سفر میں لکھا ہے کہ انہوں نے تلف شدہ اسفار کو بھی لکھا اور اس کے علاوہ ستر جعلی اسفار بھی تحریر کئے۔ اس کے بعد مقالہ نگار نے ان کے بارے میں لکھا۔ "جب حال یہ ہو کہ عزرا کی کہانی کو بعض مورخین نے اپنی جانب سے لکھا ہو اور اسے کسی دوسری کتاب کی طرف منسوب بھی نہ کیا ہو تو جدید دور کے اہل قلم یہ سمجھیں گے کہ ان اسفار کو راوی نے از خود گھڑ لیا ہے۔ (دیکھئے ج ۹' ص ۱۴)

"غرض یہودی پہلے بھی حضرت عزیر کا احترام کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں یہاں تک کہ بعض نے اسے ابن اللہ بھی کہا۔ سوال یہ ہے کہ انہوں نے ان کے لئے ابن اللہ کا لقب بطور احترام اس طرح استعمال کیا جس طرح انہوں نے سلیمان اور داؤد کے لئے استعمال کیا تھا یا اس معنی میں استعمال کیا جو ان کے ایک فیلسوف (فیلو) سمجھتے ہیں جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ جو ہندوستانیوں کا اصل فلسفہ ہے اور جو عقائد نصاریٰ کی بنیاد ہے۔ البتہ مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ تمام یہودی عزیر کو ابن اللہ نہ سمجھتے تھے بلکہ بعض لوگ ایسے تھے۔"

"ان کے بارے میں ابن اللہ ہونے کا عقیدہ کون لوگ رکھتے تھے۔ مدینہ کے بعض یہودیوں کا یہی عقیدہ تھا۔ جیسا کہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے صراحت کی۔ اور جس طرح وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے۔ یَدُ اللّٰہِ مَغْلُوْلَۃٌ اور یہ عقیدہ لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ یہ بات وہ لوگ قرآن کی اس آیت کے جواب میں کہتے تھے۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا اور یہ بھی ممکن ہے کہ مدینہ کے یہودیوں کے علاوہ بھی کوئی فرقہ ان کو ابن اللہ سمجھتا ہو' لیکن ان کا عقیدہ ہم تک نہ پہنچا ہو۔"

"ابن اسحق نے اور ابن جریر نے ابن ابو حاتم' ابو الشیخ' وابن مردویہ نے ابن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور صلعم کے پاس سلام ابن مشکم' نعمان بن اوفیٰ اور ابو انس' مالک ابن الضیف اور شاس ابن قیس آئے اور کہا: ہم کس طرح تمہاری اطاعت میں آجائیں۔ تم نے ایک تو ہمارا قبلہ ترک کر دیا دوسرے یہ کہ تم حضرت عزیر کو ابن اللہ نہیں سمجھتے۔"

"یہ بات بھی معلوم ہے کہ بعض نصاریٰ جو حضرت مسیح کو ابن اللہ سمجھتے تھے وہ یہودی الاصل تھے (فیلو) اسکندریہ کا معروف فلسفی جو مسیح کے معاصر تھے' یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ کا ایک بیٹا ہے اور یہ بیٹا اس کا وہ کلمہ ہے جس کے ذریعے اس نے تمام اشیاء کی تخلیق کی۔ لہٰذا یہ بعید از امکان نہیں ہے کہ بعثت محمدی کے وقت یہودیوں میں کچھ ایسے لوگ ہوں

جنہوں نے عرب کے بارے میں ابنیت کا عقیدہ اپنایا ہوا ہو۔اگر چہ اس مفہوم میں۔"

اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم نے یہودیوں کے بارے میں جو یہ کہا ہے کہ وہ عزیر کو ابن اللہ سمجھتے ہیں' ان کا پس منظر کیا ہے' اس موقع پر سیاق کلام سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے لہذا قرآن کریم نے جس حوالے سے بات کی ہے وہ یہ ہے کہ بعض یہودی یہ عقیدہ رکھتے تھے اور ان میں سے بعض لوگوں کا عقیدہ اس قدر فاسد ہو گیا تھا کہ وہ اپنے اس عقیدۂ ابنیت کے ساتھ ساتھ مومن نہ کہلا سکتے تھے اور نہ ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ دین حق پر تھے۔ اور اہل کتاب کے ساتھ یہاں قتال کا جو حکم دیا گیا کہ اس کی بنیادی صفت اور سبب بھی یہی فساد عقیدہ ہے۔ قتال کا مقصد یہ نہیں ہے کہ انہیں اپنا مذہب ترک کرنے پر مجبور کیا جائے اور پھر اسلام میں داخلے پر مجبور کیا جائے۔ بہرحال مقصد صرف یہ ہے کہ ان کی قوت اور شوکت کو توڑ کر ان کو ایک ایسے نظام مملکت کا تابع کر دیا جائے جس میں ہر انسان کے لئے مکمل حریت اور آزادی ہو اور وہ مملکت اسلامی کے پھیلاؤ کی راہ میں رکاوٹ نہ ہو سکے۔ اور ان کے سامنے حریت اختیار عقیدہ کے حوالے سے کوئی رکاوٹ نہ ہو اور نہ ان پر کسی جانب سے کوئی دباؤ ہو کہ وہ کیا عقیدہ اختیار کریں۔

رہا نصاریٰ کا یہ عقیدہ کہ مسیح ابن اللہ ہیں اور وہ تینوں میں سے ایک ہیں۔ تو یہ ان کا مشہور عقیدہ ہے۔ جب سے پولس نے عیسائیت کو رسولوں کے عام عقیدۂ توحید سے نکال کر انہیں ترکیبہ عقائد دیئے اور اس کے بعد ان کی مختلف مجالس نے اس تحریف کو مکمل کر کے عیسائیت کے نظام تصور سے عقیدہ توحید کو مکمل طور پر نکال دیا ہے۔ تب سے وہ عقیدہ تثلیث پر قائم ہیں اور ان کے تمام مذاہب نے اس عقیدے کو اپنا رکھا ہے۔

میں یہاں پھر استاد محمد رشید رضا کی تفسیر کے اقتباسات پر اکتفا کروں گا۔ وہ تثلیث (Trinity) کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"یہ لفظ عیسائیوں کے ہاں اقانیم ثلاثہ پر بولا جاتا ہے۔ ان کے لاہوتی مباحث میں اب' ابن اور روح القدس کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ مشرقی کیتھولک کنیسا کے عقائد ہیں اور عموماً تمام پروٹسٹنٹ بھی اسی کے قائل ہیں۔ شاذ و نادر افراد ہی اس کے خلاف ہوں گے جو لوگ اس عقیدے پر جمے ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کتاب مقدس کے نصوص پر یہ عقیدہ قریب تر ہے۔ لاہوتی علماء نے اس عقیدے کے حوالے سے نہایت ہی پیچیدہ فلسفیانہ تشریحات کا اضافہ بھی کیا ہے جو ان کی قدیم مجالس اور بڑے بڑے علماء کی تحریروں پر مبنی تھیں۔ اکثر مباحث کا تعلق اقنوم ثانی کی پیدائش کے طریقوں اور پھر اس سے اقنوم ثالث کے پھوٹنے کے طریق کار سے متعلق ہیں۔ پھر ان تین اقانیم کے درمیان جو نسبت ہے۔ اس پر مباحث ہیں۔ پھر ہر اقنوم کی صفات اور القاب کے بارے میں کلام ہے۔ لیکن لفظ "ثالوث" انجیل میں موجود نہیں ہے۔ اسی طرح عہد قدیم میں کوئی آیت بھی ایسی نہیں ہے جس میں تثلیث کی تصریح کی گئی ہو۔ قدیم مسیحی مولفین نے ایسی آیات نقل کی ہیں جن میں اس عقیدے کی اجمالی صورت نظر آتی ہے لیکن ان تمام آیات کی مختصر تفسیر اور تشریح بھی کی جا سکتی ہے لہذا ان آیات کو عقیدۂ تثلیث پر قطعی دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا' بلکہ وہ واضح وحی کی طرف اشارہ ہے جو ان کے عقیدے کے مطابق عہد جدید میں موجود ہے۔ عہد جدید آیات کے دو بڑے مجموعے اس عقیدے کے ثبوت کے لئے نقل کیے گئے ہیں۔ ایک مجموعہ ان آیات کا ہے جن میں اب' ابن اور روح القدس کا یکجا ذکر ہے۔ اور

دوسرا مجموعہ ان آیات کا ہے جن میں ہر ایک کا ذکر علیحدہ علیحدہ ہوا ہے اور جن میں ان کی اہم خصوصی صفات کا ذکر ہے اور ان کے باہم نسبت کا ذکر ہے۔"

"ذات باری میں اقانیم کا تنازعہ رسولوں کے زمانے میں پیدا ہوا۔ یہ ہیلانی اور غنوسطی فلسفوں کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ دوسری صدی میں تھیو فیلوس اسقف انطاکیہ نے یونانی کالفظ ترپاس استعمال کیا۔ اس کے بعد ترتلیانوس نے لفظ ترینیتاس استعمال کیا۔ یہ لفظ ثالوث کے مترادف تھا۔ اس عقیدے کے بارے میں نیقیا کی پہلی مجلس سے ماقبل سے زمانے میں زبردست جدل و جدال رہا۔ خصوصاً مشرقی کلیسا میں۔ اور مشرقی کلیسا نے ان تمام آراء کو بدعتی آرا قرار دیا۔ ان میں ابیونیوں کی آرا شامل ہیں۔ جن کا عقیدہ یہ تھا کہ مسیح انسان محض ہیں۔ اس طرح سا بیلیوں کے عقاید بھی اسی میں شامل تھے جو یہ عقیدہ رکھتے تھے۔ اب' ابن اور روح القدس تینوں مختلف اوصاف جن کا اطلاق اللہ نے اپنی ذات پر کیا ہے۔ اسی طرح اریوسی بھی تھے جن کے عقائد یہ تھے کہ بیٹا ازلی نہیں ہے بلکہ باپ کی مخلوق ہے۔ لیکن اس کی تخلیق 'تخلیق عالم سے پہلے ہوئی ہے۔ لہٰذا اس کا درجہ رب سے کم ہے۔ بلکہ یہ رب کے تابع اور مطیع ہے۔ ان میں مقدونی بھی تھے جن کا عقیدہ یہ تھا کہ روح القدس سرے سے اقنوم ہی نہیں ہے۔"

آج کل کلیسا کے جو عقائد ہیں انہیں ۳۲۵ میں نیقیائی مجلس نے وضع کیا ہے۔ اس کے بعد قسطنطنیہ کی کانفرنس نے ۳۸۱ء میں اس کی توثیق کی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ابن اور روح القدس دونوں خدائی اور الوہیت میں باپ کے برابر ہیں اور ابن ازل ہی میں باپ کے ساتھ ہی پیدا ہوا۔ جبکہ روح القدس رب سے نکلا۔ پھر طلیطلہ کی مجلس نے ۵۸۹ میں یہ فیصلہ کر دیا کہ روح باپ کے ساتھ بیٹے سے بھی پھوٹا۔ چنانچہ پورے لاطینی کلیسا نے اس ترمیم کو قبول کر لیا۔ رہا یونانی کلیسا تو وہ پہلے خاموش رہا۔ لیکن بعد میں اس نے یہ دلائل دیئے کہ یہ ترمیم بدعتی ہے۔

"عقائد کی کا فقرہ (اور بیٹے سے بھی) یونانی اور کیتھولک کلیسا کے درمیان ہمیشہ باعث اختلاف رہا۔ لوتھرین اور دوسرے اصلاح پسند کلیساؤں کیتھولک کلیسا کے اصل عقائد کو جاری رکھا لیکن تیرہویں صدی کے جمہور اہل کلیسا نے ان کی مخالفت کی اور بعض جدید علمائے الٰہیات اور بعض جدید فرقوں مثلاً سوسینین' جرمانین 'محصدین' عمومیوں وغیرہ نے یہ قرار دیا کہ یہ عقائد کتاب مقدس اور عقل دونوں کے ساتھ لگا نہیں کھاتے۔ مسٹر سویڈ نبرگ نے حضرت مسیح کے اوپر تثلیث کے لفظ کا اطلاق بطور نشان کیا۔ یعنی انہوں نے مختلف اقنونوں کی تثلیث کے بجائے ایک اقنوم کی تثلیث کا نظریہ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا مسیح کی ذات میں جو الوہیت تھی' وہ رب تھا۔ اور مسیح کی طبیعی ذات کے ساتھ جس کا تعلق تھا وہ ابن تھا اور اس سے جو پھوٹا وہ روح القدس تھا۔ لوتھرین کلیسوں میں جو خیالات ایک عرصے تک پہلے ان کی وجہ سے جرمانی علماء الہیات کے اعتقادات میں بڑا تزلزل پیدا ہوا اور ایک عرصے تک رہا۔"

"کنٹ کا نظریہ یہ تھا کہ الٰہہ میں جو تین صفات تھیں ان کا نام رب' ابن اور روح القدس ہے۔ ان سے مراد قدرت' حکمت اور محبت ہے۔ یا ان سے مراد تین اعلیٰ افعال ہیں یعنی تخلیق' حفاظت اور کنٹرول ہیں۔ ہیجین اور شلنگ نے ایک تخیلاتی اساس دی ہے اور متاخر جرمانی علمائے الٰہیات نے اس کی تقلید کی ہے۔ انہوں نے نظریہ تثلیث کا دفاع تخیلاتی اساس پر کیا۔ بعض علماء لاہوت جو وحی پر اعتماد کرتے ہیں وہ تحقیق کی بنیادوں پر اہل کلیسا کی آراء کو درست نہیں سمجھتے۔ یعنی ان آراء کو جن کا فیصلہ مجالس نیقیا' قسطنطنیہ' ماضی قریب میں سا بیلیوں کی حمایت بہت لوگوں نے کی ہے۔"

اس اجمالی بحث کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ اہل کنیسا کے تمام فرقے اور مذاہب دین حق پر نہیں ہیں۔ کسی کے ہاں عقیدۂ توحید صحیح معنوں میں نہیں پایا جاتا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ جیسا کوئی نہیں ہے اور یہ کہ اللہ لم یلد ولم یولد کا مصداق ہے۔

اریوسی بارہا یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ موحد ہیں، ان لوگوں کا یہ دعویٰ گمراہ کن ہے کیونکہ وہ اس طرح موحد نہیں جس طرح مسلمان موحد ہیں بلکہ انہوں نے اپنے عقائد کے اندر اختلاط کر دیا ہے۔ وہ ایک طرف یہ اقرار کرتے ہیں کہ حضرت مسیح اللہ کی طرح ازلی نہیں ہے اور ان کی یہ بات درست بھی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ابنیت کے بھی قائل ہیں اور اس کے بھی قائل ہیں کہ حضرت مسیح عالم سے بھی پہلے کی مخلوق تھے۔ لہذا یہ عقیدہ، عقیدۂ توحید نہیں کہلایا جا سکتا۔

اللہ نے تو ان لوگوں کو صریحاً کافر کہہ دیا ہے کہ مسیح ابن اللہ ہے یا وہ تینوں میں سے ایک ہے۔ لہذا کفر کی صفت اور ایمان کی صفت ایک ہی عقیدے میں کس طرح جمع ہو سکتے ہیں جبکہ یہ متضاد صفات اور متضاد امور ہیں۔

قرآن کریم نے یہودیوں کے قول (عزیر ابن اللہ ہیں) اور عیسائیوں کے قول کہ (عیسیٰ ابن اللہ ہیں) پر جو تبصرہ کیا ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کی بات دوسرے کفار کے تصورات اور معتقدات کے برابر ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذَلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ (۹ : ۳۰) "یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے، اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں۔ ان لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات ان سے صادر ہوئی تھی، محض ان کی طرف منسوب ہی نہیں ہے۔ اور یہاں (افواھھم) کے لفظ کو بے مقصد نہیں لایا گیا بلکہ جب وہ یہ قول کر رہے تھے تو اس وقت ان کے چہرے کی جو حسی کیفیت تھی اس کی طرف بھی اشارہ مقصود تھا لہذا یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ افواھھم کا لفظ زائد ہے اور بے مقصد ہے کیونکہ اللہ کے شایان شان یہ نہیں کہ وہ کوئی بے مقصد بات کرے۔ نہ یہ طوالت ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ وہ تصویر کشی میں حقیقی صورت حال کو سامنے لاتا ہے۔ پھر اس لفظ سے یہ اشارہ دینا بھی مطلوب ہے کہ یہ ان کی جانب سے محض ہوائی بات ہے۔ اس کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ صرف قول ہی قول ہے۔ اس کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔

پھر قرآن مجید کے اعجاز کا ایک دوسرا پہلو سامنے آتا ہے جو اس بات پر شاہد ہے کہ اس کا سرچشمہ ذات ربانی ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ (۹ : ۳۰) "یہ باتیں ان لوگوں کے دیکھا دیکھی یہ کر رہے ہیں جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے۔" مفسرین یہ کہتے تھے کہ ان لوگوں کا عقیدۂ ابنیت اسی طرح ہے جس طرح مشرکین کا عقیدۂ ابنیت ملائکہ تھا۔ اور ملائکہ کی ابنیت کے عرب قائل تھے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے۔ لیکن آیت کا مفہوم اس سے وسیع تر ہے۔ اور اس کی وضاحت اچھی طرح تب ہوئی جب لوگوں تک ہندو بت پرستوں کے عقائد

پہنچے - یہ عقائد قدیم مصری بت پرستوں اور یونانیوں کے عقائد سے ملتے جلتے ہیں - اور یہی عقائد اہل کتاب کے اندر سرایت کر گئے - خصوصاً نصاریٰ کے عقائد کے اندر - سب سے پہلے "پولوس رسول" کے عقائد میں یہ تصورات داخل ہوئے اور اس کے بعد نصاریٰ کی نظریاتی مجالس میں غلبہ پاکر یہ پھیل گئے -

مصری تثلیث کے اجزاء اوزوریس (رب) ازیس اور موریس (ابن) فرعون بت پرستی کا اصل الاصول ہے -

حضرت مسیح کی پیدائش سے بھی پہلے جو فلسفہ الہیات اسکندریہ میں پڑھایا جاتا تھا اس میں "کلمہ" کو دوسرا الہ کہا گیا تھا - اور اسے "اللہ کا کنوارا بیٹا" بھی کہا جاتا تھا -

ہندو بھی تین اقانیم کے قائل تھے یا وہ ان کو اللہ کے تین حالات سے تعبیر کرتے تھے جن میں اللہ تجلی فرماتا ہے - تخلیق و تکوین کی حالت میں اسے برہما کہا جاتا ہے - حفاظت اور قیم کی حیثیت سے وہ "وشنو" ہے اور ہلاک کرنے اور برباد کرنے کی حالت میں "وسیقا" کہا جاتا ہے - اس عقیدے کے مطابق وشنو (ابن) ہوتا ہے اور وہ برہما کی الوہیت سے پھوٹتا ہے -

اشوریٰ بھی کلمہ کے قائل تھے - اسے وہ "مردوخ" کہتے تھے اور وہ مردوخ کو "اللہ کا کنوارا بیٹا" کہتے تھے -

یونانی بھی مثلث الاقانیم الہٰ کے قائل تھے - جب ان کے کہان ذبیح کرتے تو ان پر تین بار مقدس پانی چھڑکتے اور اسی طرح وہ خوشبو کے برتن سے تین انگلیوں میں خوشبو لیتے - اور اس ذبیحے کے ارد گرد جتنے لوگ ہوتے - ان پر اس خوشبو کو تین بار چھڑکتے اور یہ سب اشارات وہ تثلیث کی طرف کرتے تھے - کنیسہ نے یہی اشارات اخذ کر کے اپنے ہاں رسوم و عبادات کو اس طرح منظم کیا کہ وہ دوسرے کفار کے اقوال سے مشابہ ہو گئے -

نزول قرآن کے وقت قدیم مشرکین کے یہ عقائد عام نہ تھے لیکن اس کے باوجود علیم و خبیر نے فرمایا یُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ (۹: ۳۰) "یہ لوگ یہ باتیں ان لوگوں کی دیکھا دیکھی کرتے ہیں جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے -" نیز ان عقائد سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اہل کتاب دین حق پر نہیں ہیں اور ان کا ایمان 'ایمان صحیح نہیں ہے اور اس کے علاوہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے قرآن مجید علیم و خبیر کی جانب سے ایک کلام معجز نما ہے اور اس کا سرچشمہ صرف ذات باری ہے -

اس فیصلے اور وضاحت کے بعد آیت کے آخر میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اہل کتاب شرک وکفر کے کس موقف پر قائم ہیں؟ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۹: ۳۰) "خدا کی مار ہو ان پر کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہیں -" ان کو خدا تباہ کرے کس طرح وہ حق سے روگردانی کرتے ہیں حالانکہ وہ سیدھا سادھا اور واضح ہے اور بت پرستی کو اپنانے میں جو نہایت ہی پیچیدہ اور گنجلک ہے اور کوئی عقلمند اور ذی ہوش انسان بت پرستی کو سمجھ ہی نہیں سکتا -

اب قرآن کریم اہل کتاب کی گمراہیوں اور انحرافات کا ایک دوسرا ورق الٹتا ہے - یہاں اب ان کی گمراہی محض اعتقاد اور اقوال تک محدود نہیں ہے بلکہ اس فاسد اعتقادات و تصورات پر ان کی جو عملی صورت حال بنتی ہے اس کے اعتبار سے بھی وہ گمراہ اور منحرف ہیں -

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ

ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾

"انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا ہے اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا' وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں' پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

اس آیت میں بھی یہی بات جاری ہے جو اس سبق کا اصلی موضوع یعنی یہ کہ یہ لوگ دراصل اہل کتاب ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا اس حوالے سے ان کو دین حق پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ دین اسلام پر نہیں ہیں۔ اس بات کی شہادت ان کی عملی زندگی دے رہی ہے۔ اس کی شہادت ان کے تصورات دے رہے ہیں' ان کو حکم تو یہ دیا گیا تھا کہ وہ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کریں مگر انہوں نے اپنے احبار و رہبان کو اللہ کے سوا الٰہ بنا دیا جیسا کہ انہوں نے حضرت مسیح کو رب بنایا جو ان کی جانب سے صریح شرک ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے شرک سے پاک ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے اعتقادات و تصورات کے اعتبار سے اور اپنے اعمال اور واقعی زندگی کے اعتبار سے دین حق پر نہیں ہیں۔

ان لوگوں نے اپنے احبار و رہبان کو کس طرح' اللہ کے مقابلے میں رب قرار دیا تھا؟ اس کی تشریح کرنے سے قبل ہم چاہتے ہیں کہ اس آیت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول تفسیری روایات یہاں نقل کر دیں۔ کیونکہ خود حضور ؐ کی تفسیر قول فیصل ہے۔

احبار لغت کے اعتبار سے حبر یا حِبر کی جمع ہے۔ یعنی حاء کے کسرے یا فتح کے ساتھ۔ یہ اہل کتاب کے علماء کا لقب ہے۔ اور علمائے یہود پر اس کا اطلاق زیادہ ہے۔ رہبان راہب کی جمع ہے۔ یہ عیسائیوں کے نزدیک اس شخص کو کہا جاتا ہے جو عبادت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے اور تمام دوسری سرگرمیوں سے کٹ جائے۔ بالعموم ایسا شخص شادی نہیں کرتا' نہ کوئی روزگار کرتا ہے۔ لہٰذا وہ معاشی تکلفات سے بے غم ہوتا ہے۔

در منثور میں امام ترمذی کی روایت ہے جسے انہوں نے حدیث حسن کہا ہے۔ نیز ابن منذر' ابن ابی حاتم' ابو الشیخ اور ابن مردویہ اور بیہقی وغیرہ نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ یہ روایت حضرت عدی ابن حاتم کی ہے۔ کہتے ہیں کہ میں حضور ؐ کے پاس آیا تو آپ سورۂ توبہ پڑھ رہے تھے۔ آپ نے یہ آیت پڑھی اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَ رُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (۹ : ۳۱) تو حضور ؐ نے فرمایا "یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ وہ ارباب و رہبان کی عبادت نہ کرتے تھے لیکن یہ بات تھی کہ جب وہ ان کے لیے کسی چیز کو حلال قرار دیتے تو یہ اسے حلال سمجھتے اور جس چیز کو وہ حرام قرار دیتے تو یہ اسے حرام سمجھتے"۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں حضرت عدی ابن حاتم کی یہ روایت نقل کی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب ان تک حضور اکرم ؐ کی دعوت پہنچی تو وہ شام کی طرف بھاگ نکلے۔ یہ صاحب جاہلیت میں عیسائی بن گئے تھے۔ چنانچہ ان کی بہن اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ گرفتار ہوئی' تو حضور اکرم ؐ نے ان کے ساتھ بہت ہی کریمانہ برتاؤ کیا اور اسے عطیات دیئے۔ یہ اپنے

بھائی کے پاس واپس گئی اور اسے اسلام کی طرف رغبت دلائی اور اس پر آمادہ کیا کہ وہ مدینہ جائیں ۔ چنانچہ حضرت عدی مدینہ گئے ۔ یہ اپنی قوم طی کے رئیس تھے اور ان کے والد حاتم الطائی جودوکرم میں مشہور زمانہ تھے ۔ لوگوں کے اندر مدینہ میں اس کی آمد کا چرچا ہوا ۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے ۔ ان کے گلے میں سونے کی صلیب تھی ۔ حضورؐ یہ آیت پڑھ رہے تھے اتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹ : ۳۱) تو وہ کہتے ہیں کہ میں نے سوال کیا کہ حضورؐ عیسائی تو احبار و رہبان کی عبادت نہیں کرتے ۔ تو حضورؐ نے فرمایا یہ درست ہے کہ وہ ان کی عبادت نہیں کرتے ۔ لیکن انہوں نے ان کے لیے حلال اور حرام کی حدود خود متعین کی ہیں اور لوگ اس معاملے میں ان کی اطاعت کرتے ہیں لہٰذا یہ ان عوام کی طرف سے ان کی بندگی ہے"۔

امام سدی کہتے ہیں کہ انہوں نے انسانوں کو اپنا مقتدا بنا لیا تھا اور اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ فرماتا ہے: وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا (۹ : ۳۱) "حالانکہ ان کو صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ صرف اللہ کی بندگی کریں"، یعنی اللہ جس چیز کو حلال قرار دے اسے حلال سمجھیں اور اللہ جسے حرام قرار دے اسے حرام سمجھیں ۔ یعنی اللہ نے جو قانون بنایا اس کی اطاعت ہو اور جو حکم دیا وہ نافذ ہو ۔

امام آلوسی اپنی مشہور تفسیر میں کہتے ہیں "مفسرین کی اکثریت نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ احبار و رہبان کو الہ العالم سمجھتے تھے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ ان کے اوامر و نواہی میں ان کی اطاعت کرتے تھے"۔

اس واضح ترین آیت اور پھر حضور اکرمؐ کی توضیح و تشریح پھر قدماء مفسرین اور متاخرین مفسرین کی تشریحات سے ہمارے سامنے دین اسلام کے اصلی تصورات و عقائد کے حوالے سے یہ نتائج سامنے آتے ہیں ۔ اور یہ نتائج نہایت ہی اہم اور مختصر ہیں

نص قرآن اور تشریحات رسول کے مطابق عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کا اتباع کیا جائے ۔ کیونکہ یہود و نصاریٰ اپنے احبار اور رہبان کو عقیدۃ الٰہ نہ سمجھتے تھے اور نہ ان کے سامنے مراسم عبودیت بجا لاتے تھے لیکن اس حقیقت کے باوجود اللہ نے ان پر کفر کا الزام لگایا ۔ محض اس لیے کہ یہ لوگ شریعت کو اپنے مذہبی مقتداؤں سے اخذ کرتے تھے اور پھر اس کی اطاعت کرتے تھے ۔ لہٰذا اگر کوئی کسی کو الہ نہیں بھی سمجھتا اور اس کے سامنے مراسم عبودیت نہیں بھی بجا لاتا لیکن اگر اس سے قانون و شریعت اخذ کرتا ہے کہ تو یہ شخص مشرک و کافر ہے اور جس سے وہ قانون اخذ کرتا ہے وہ بمنزلہ رب ہے ۔

یہود جو اپنے احبار سے قانون اخذ کرتے تھے اور نصاریٰ جو مسیح کو الٰہ بھی سمجھتے تھے اور رہبان سے قانون لیتے تھے دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی درجے میں رکھا ہے اور دونوں کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں فرمایا کیونکہ دونوں ارتکاب شرک میں برابر ہیں اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں ۔

جونہی ایک شخص اللہ کے سوا کسی اور کو حق قانون سازی دیتا ہے وہ مشرک ہو جاتا ہے ۔ اگرچہ وہ اسے الٰہ یا معبود نہ سمجھتا ہو اور اس کے سامنے مراسم عبودیت بجا نہ لاتا ہو ۔ جیسا کہ درج بالا تشریحات سے واضح ہو گیا ہے ۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس نکتے کی مزید تشریح کریں ۔

یہ حقائق جب مسلمانوں کے سامنے پیش کیے گئے تو اس وقت امت مسلمہ کو مخصوص حالات درپیش تھے ۔ اس میں رومیوں کے ساتھ جنگ کا مسئلہ درپیش تھا ۔ اور بعض مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ تردد اور خلجان تھا کہ رومی بہرحال اہل

کتاب تو ہیں' اس لیے اس تردد اور شبہ کو دور کرنے کے لیے یہ آیات اتریں اور یہ بتایا گیا کہ اگرچہ اہل کتاب مومن باللہ ہیں اور یہ کہ ان کے ایمان کی حالت یہ ہے لیکن مخصوص حالات میں نزول کے باوجود ان آیات میں دین اسلام کے عام اصول اور مطلق حقائق بتائے گئے ہیں۔

اللہ کے نزدیک دین حق صرف اسلام ہے اور اللہ تعالیٰ دین اسلام کے سوا لوگوں کی جانب سے کوئی اور دین قبول نہیں کرتا۔ اور دین اسلام دنیا میں مکمل طور پر قائم تب ہو گا جب اس زمین پر اللہ کی شریعت نافذ ہو جائے اور اس شریعت کے نفاذ سے بھی پہلے یہ کہ لوگ اللہ وحدہ کو الٰہ سمجھیں اور مراسم عبودیت بھی صرف اس کے سامنے بجا لائیں۔ تو اگر لوگ اللہ کی شریعت کے سواکسی اور قانون کے متبع ہوں تو ان میں وہ شرط موجود ہو گی جو یہود و نصاریٰ میں موجود تھی اور اس وجہ سے ان کو غیر مومن قرار دیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ بار بار مومن ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ کیونکہ اللہ کے سواکسی انسان کی شریعت کو قبول کرتے ہی وہ لوگ مشرک ٹھہرے۔ الا یہ کہ کوئی ایسی صورت حال ہو کہ وہ غیر اسلامی قانون نظام میں مجبوراً رہ رہے ہوں اور مجبوراً اس کا اتباع کر رہے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ اس نظام کو دور کرنے کی جدوجہد بھی کر رہے ہوں۔

لفظ دین کا مفہوم اس قدر سکڑ گیا ہے کہ لوگ اسے صرف دینی عقیدے کے مترادف سمجھنے لگے ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ مراسم عبودیت اور پرستش تک وسیع کرتے ہیں۔ اس حد تک تو یہودی بھی اپنے دین کے متبع تھے اور اس محدود معنی میں اپنے آپ کو دین دار کہتے تھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح تو یہ بتاتی ہے کہ حقیقی معنوں میں وہ نہ مومن تھے اور نہ دیندار تھے کیونکہ انہوں نے احبار و رہبان کو اللہ کے سوا رب بنا لیا تھا۔

دین کا پہلا مفہوم یہ ہے کہ کسی کے سامنے سر تسلیم خم کیا جائے اور اس کا تحقق تب ہو سکتا ہے جب کوئی خدا کے قانونی نظام کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ لہٰذا یہ معاملہ بہت ہی سنجیدہ ہے اور یہ مفہوم ان لوگوں کے اہل دین ہونے کو تسلیم نہیں کرتا جو شریعت کے علاوہ دوسرے قانونی نظاموں کے متبع ہیں' الا یہ کہ وہ مجبور ہوں۔ نہ اسلام میں ایسے لوگ مسلم اور مومن ہیں صرف اس لیے کہ وہ اللہ کو الٰہ واحد سمجھتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ ہمارے دور میں عوام کو جو ڈھیل دے دی گئی ہے یہ دین اسلام کے لیے بہت ہی خطرناک ڈھیل ہے۔ یہ دراصل ایک خطرناک ہتھیار ہے جو اسلام کے دشمن اسلام کی بیخ کنی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ ان حالات اور ان افراد پر اسلام کی تختی نصب کرتے ہیں جن کے بارے میں اور ان جیسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ واضح طور پر بتاتے ہیں کہ یہ اہل دین نہیں' یہ تو مومن نہیں۔ کیونکہ انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے لوگوں کو رب بنایا ہوا ہے۔ جب دشمنان دین کو یہ اصرار ہے کہ ایسے لوگوں کو وہ دیندار ثابت کریں جو درحقیقت دیندار نہیں ہیں۔ تو اسلام کے حامیوں کا بھی یہ فرض ہے کہ ایسے حالات کو غیر اسلامی حالات ثابت کریں۔ ایسے افراد اور ایسے معاشروں کو غیر اسلامی افراد اور معاشرے ثابت کریں۔ اور اس مسئلے کی حقیقت کو کھول کر بیان کریں کہ ایسے لوگوں نے دوسرے افراد کو رب بنا رکھا ہے۔ حالانکہ ان کو حکم یہ دیا گیا تھا:

اتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ

أُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۹ : ۳۱)

"انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا' وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں' پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں"۔

اس کے بعد سیاق کلام یوں بڑھتا ہے:

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۳۲ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۳۳ الصف

"یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کیے بغیر ماننے والا نہیں ہے خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔

یعنی اہل کتاب کا قصور صرف یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے حقیقی دین سے منحرف ہو گئے ہیں جو سچا دین تھا اور ان کا جرم صرف یہ نہیں ہے کہ انہوں نے اللہ کے سوا اور شخصیات کو رب بنا رکھا تھا اور آخرت پر ایمان نہ لاتے تھے جیسا کہ آخرت کے صحیح مفہوم کے تقاضے ہیں بلکہ اس کے علاوہ ان کا ایک اور ناقابل معافی جرم بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ انہوں نے دین حق کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دین حق کی شکل میں جو نئی روشنی پھیلا رہے ہیں وہ اپنی آنکھوں سے اس چراغ کو بجھانا بھی چاہتے اور اس دعوت کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو پوری دنیا میں پھیل رہی ہے۔ اور اس نظام زندگی کو برباد کرنا چاہتے ہیں جو اس جدید دعوت کے مطابق تشکیل پایا ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ (۹ : ۳۲) "یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں"۔

لہٰذا یہ لوگ اللہ کے نور کے دشمن ہیں۔ وہ اپنے جھوٹ' سازش اور فتنہ پردازی کی وجہ سے اس نور کو بجھانا چاہتے ہیں یا وہ اپنے متبعین اور اپنی جماعتوں اور اہالی و موالی کو اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ اس دین کے خلاف جنگ کریں اور اس کی راہ روکیں۔ جس وقت یہ آیات نازل ہو رہی تھیں اس وقت یہی صورت حال تھی اور آج بھی یہی صورت حال ہے۔

ان آیات سے اس وقت غرض و غایت یہ تھی کہ مسلمان اپنے دفاع کی تیاری جوش و خروش سے کریں لیکن اس وقت کے حالات کے بعد آج تک اسلام کے بارے میں اہل کتاب کا موقف یہی ہے۔ وہ اسلام کی روشنی کو ہر وقت بجھانے کی سعی کرتے ہیں لیکن اللہ کا موقف یہ ہے:

وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۹ : ۳۲) "مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کیے بغیر ماننے والا نہیں ہے خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔

یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور یہ وعدہ اللہ کی ناقابل تغیر سنت پر مبنی ہے کہ اگرچہ کافر اس بات کو ناپسند کریں گے لیکن اللہ اپنی روشنی کو پوری طرح چمکائے گا۔

یہ وعدہ ایمانداروں اور اسلامی انقلاب کے کارکنوں کے لیے باعث اطمینان ہے۔ انہیں اپنی پسندیدہ راہ پر مزید آگے بڑھنا چاہئے اور قدم بڑھاتے چلے جانا چاہئے اور مشکلات راہ کو انگیز کرنا چاہئے اور دشمن کی سازشوں اور دشمن کی مسلسل جنگ کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ ابتدا میں مراد تو اہل کتاب تھے لیکن مراد عام دشمن ہیں جو اسلام کی راہ روکنا چاہتے ہیں۔ چاہے جس عنوان سے روکیں اور چاہے جس کی امان میں روکیں۔

اب اس مضمون کی مزید تاکید کی جاتی ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۹ : ۳۳) "وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دین حق سے مراد وہ دین ہے جو آیت قتال میں دین مراد ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (۹ : ۲۹) "لڑو ان لوگوں سے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے، جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے، جو اللہ اور رسول کے حرام کیے ہوئے کو حرام نہیں کرتے۔ جو دین حق کی پیروی نہیں کرتے، ان میں سے جن کو کتاب دی گئی، یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں"۔ اور یہ دین حق وہی ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے۔ جو لوگ اس دین حق کو قبول نہیں کرتے ان کے ساتھ قتال لازم ہے۔

اس آیت کی جو تاویل بھی ہم کریں یہ بات درست ہے۔ کیونکہ دین کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اللہ کی مکمل اطاعت کرے اور وہ مراسم عبادت اور قانون بھی اللہ کا تسلیم کرے۔ پورے دین میں شمولیت کا یہی اصول ہے۔ اور اس دین حق کی آخری صورت وہ ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی اللہ کے دین، اس کے مراسم عبودیت اور اس کی شریعت کو قبول نہیں کرتا، اس پر اس بات کا اطلاق ہو گا کہ وہ دین کو قبول نہیں کرتا۔ اور اس پر آیت قتال مذکورہ کا اطلاق ہو گا لیکن آیت قتال کے انطباق کے وقت اسلام کے تحریکی اور تدریجی مراحل کو ضرور مدنظر رکھنا ہو گا کیونکہ اسلام میں بھی ہر اقدام کے لیے وقت مقرر ہے جس کی تشریح ہم نے بار بار کی ہے۔

یہ آیت ہے یعنی هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى ---- (۹ : ۳۳) آیت سابقہ کے مضمون کی

تاکید ہے جس میں کہا گیا تھا وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۹ : ۳۲) مطلب یہ تھا کہ جس نور کو اللہ تعالیٰ مکمل کرنا چاہتے ہیں وہ اسلامی نظام حیات کا قیام اور غلبہ ہے بلکہ قیام کے بعد عالم میں قائم تمام نظاموں پر اس کے غلبے کی صورت میں یہ روشنی مکمل ہوگی۔ اب دین حق کیا ہے؟ جیسا کہ اس سے قبل ہم بار بار کہہ چکے' دین حق ہے اللہ وحدہ پر اعتقاد رکھنا' اللہ وحدہ کی بندگی اور پرستش کرنا' اور اللہ کی نازل کردہ شریعت کی اطاعت کرنا اور اسے نافذ کرنا۔ اور یہ اجزا ان تمام ادیان کا حصہ تھے جو رسولان برحق نے انسانوں کے سامنے کبھی پیش کیے۔ لہٰذا دین حق میں وہ بت پرستانہ منحرف ادیان شامل نہیں ہیں جن کا اصل اگرچہ درست عناصر ان کی موجودہ شکل مسخ شدہ شکل ہے۔ اور وہ درحقیقت بت پرستانہ ادیان ہیں مثلاً عالمی یہودیت اور عیسائیت۔

نیز دین حق میں وہ ادیان و مذاہب بھی شامل ہیں جنہوں نے دین کی تختی تو لگا رکھی ہے لیکن دراصل ان نظاموں میں ارباباً من دون اللہ کی پرستش ہوتی ہے۔ یوں کہ ان میں انسان انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور جن قوانین کو اللہ نے نازل نہیں فرمایا۔

جبکہ اللہ کا صریح حکم یہ ہے کہ اس نے اپنے رسول کو دین حق اور ہدایت دے کر بھیجا ہے تاکہ وہ اس دین حق کو تمام ادیان پر غالب کر دے لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم دین کو اس کے وسیع مفہوم میں لیں تاکہ اللہ کے عہد کی وسعت ہمیں معلوم ہو۔

دین دراصل ایک نظام زندگی ہے۔ لہٰذا لوگ جس کسی نظام کو تسلیم کرتے ہوں' اس کی اطاعت کرتے ہوں' جن کے تصورات کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اور جس کی اتباع کر کے اس کی وفاداری کا دم بھرتے ہوں وہی ان کا دین ہے۔

پھر اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں بھی دین کا یہی وسیع مفہوم مراد ہے یعنی نظام زندگی۔ نظام زندگی صرف اللہ کا نظام زندگی ہے۔ اور تمام لوگوں نے اس کی اطاعت کرنی ہے۔ اور غالب بھی صرف اسی نظام کو کرنا مطلوب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ تو یہ کام کر کے دکھایا۔ آپ کے بعد آپ کے خلفائے راشدین نے غلبہ دین کو قائم رکھا۔ ان ادوار میں دین حق غالب اور ممتاز رہا۔ اور تمام وہ ادیان جن میں اطاعت خالصتاً اللہ کے لیے نہ تھی' وہ اس کے مقابلے میں لرزہ براندام تھے۔ اس کے بعد دین حق کے حاملین نے خود ہی اس دین کو چھوڑ دیا۔ آہستہ آہستہ وہ دین سے دور ہوتے گئے اور اسلامی نظام اور اسلامی معاشرے کے خلاف صلیبی اور بت پرستانہ ادیان کی مسلسل ریشہ دوانیوں اور کفار اور اہل کتاب کی مشترکہ کارروائیوں کے نتیجے میں اس نظام کو ختم کیا گیا۔

لیکن معرکہ شاپ نہیں ہو گیا۔ اللہ کا وعدہ اپنی جگہ قائم ہے۔ اللہ مومنین کو دیکھ رہا ہے۔ انتظار میں ہے۔ وہ مومنین جنہوں نے اللہ کے جھنڈے اٹھا رکھے ہیں۔ انہوں نے اپنے کام کا آغاز نکتہ آغاز سے کیا ہے۔ جہاں سے حضور اکرم نے کام کا آغاز کیا تھا اور دین حق کے احیاء کی یہ تحریک اب نور ربانی کی روشنی میں جادہ پیما ہے۔

اب اس سورہ کے اس سبق کی آخری یونٹ پر ہم پہنچ چکے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اہل کتاب اللہ کے حرام کیے ہوئے کو کس طرح حرام نہیں کرتے۔ جبکہ اس سے پہلے کہا تھا کہ وہ اپنے احبار و رہبان کو رب سمجھتے ہیں۔ اللہ کے سوا رب قرار دیتے ہیں اور جس کی تفسیر رسول اللہ ؐ نے یہ فرمائی تھی کہ یہ اہل کتاب احبار و رہبان کے حلال کردہ کو حلال اور حرام

کر دہ کو حرام سمجھتے ہیں ۔ یہاں یہ بتایا گیا کہ یہ احبار و رہبان اللہ کے حرام کر دہ کو حرام نہیں سمجھتے ۔ اللہ کے حلال کر دہ کو حلال نہیں سمجھتے ۔

اس آخری نکتے میں اہل کتاب کی حقیقت کھولتے ہوئے خطاب اہل ایمان سے ہے کہ ان اہل کتاب کی حقیقت پر اچھی طرح غور کرو ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو‘ ان اہل کتاب کے اکثر علماء اور درویشوں کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں ۔ دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں ۔ اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا ۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا‘ لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو‘‘ ۔

آیت میں احبار و رہبان کے کردار کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ عوام نے تو ان کو اللہ کے علاوہ رب بنا رکھا ہے ۔ اور یہ لوگ نتیجتاً لوگوں کے لیے حلال و حرام کے قوانین بناتے ہیں ۔ اس طرح انہوں نے اپنے آپ کو لوگوں کے لیے بطور رب پیش کیا ہے اور لوگوں نے اسے قبول کیا ہے ۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کے اموال باطل طریقے سے کھاتے پیتے ہیں ۔ اور لوگوں کو راہ راست پر آنے سے روکتے ہیں ۔

لوگوں کے اموال کھانے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں ۔ جو ابھی تک رائج ہیں ۔ ان میں سے ایک تو وہ فیس ہے جو حرام کو حلال قرار دینے یا حلال کو حرام قرار دینے کے عوض لی جاتی تھی اور اس قسم کے فیصلے بالعموم مالداروں کے حق میں ہوتے تھے ۔ یا بادشاہوں کے حق میں جاری ہوتے تھے ۔ ان میں وہ فیس بھی شامل ہے جو مذہبی پیشوا ایک معترف گناہ سے لیتے تھے اور پھر اسے بخش دیتے تھے اور ان مذہبی پیشواؤں کے زعم میں وہ یہ اختیارات ازروئے شریعت رکھتے تھے اور اس میں مشہور مسئلہ ربا ہے کہ وہ اسے حلال قرار دے دیتے تھے ۔

اس میں وہ اموال بھی شامل ہیں جو وہ لوگوں سے دین حق کے مقابلے کے لیے لیتے تھے ۔ احبار اور رہبان اسقف

اور دوسرے مذہبی پیشوا صلیبی جنگوں کے لیے لاکھوں روپے جمع کرتے رہے ہیں اور اب وہ مستشرقین اور مبشرین کے لیے اربوں روپے جمع کر کے عالم اسلام میں خرچ کرتے ہیں' یوں وہ لوگوں کو گمراہ کر کے اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

قرآن کریم کی درج ذیل آیت بڑے گہرے غور و فکر کی مستحق ہے۔اس میں بات کس قدر عدل و انصاف کے ساتھ کہی گئی ہے۔

انَّ كَثِيْراً مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ (۹: ۳۴) "یعنی احبار و رہبان میں سے بیشتر لوگ"۔اس سے ان لوگوں کی وہ قلیل تعداد نکل جاتی ہے جو اس غلطی کا ارتکاب نہیں کرتی۔اس لیے کہ دنیا کے مختلف فرقوں اور جماعتوں میں اچھے لوگوں کا پایا جانا ایک فطری امر ہے۔اور ذات باری تعالیٰ بہرحال ہر کسی کے ساتھ انصاف کرتی ہے۔

اکثر احبار و رہبان لوگوں سے حاصل کردہ اموال کو جمع کرتے تھے۔یہود و نصاریٰ کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ لوگوں کے اموال کنیسوں میں جمع کرتے اور ان کے تکیوں پر بے حد شکرانے جمع ہوتے تھے۔اور بعض اوقات مذہبی لیڈروں کے پاس بادشاہوں اور راجوں و مہاراجوں کے مقابلے میں بھی زیادہ دولت جمع ہو جاتی تھی۔

اس لیے یہاں سیاق کلام میں قیامت کے دن ان کی اس جمع کردہ دولت ہی کو ان کے لیے باعث عذاب بنایا ہے۔ اور یہی سزا ان تمام لوگوں کو ملے گی جو دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اور اس بات کی تصویرکشی نہایت ہی خوفناک انداز میں کی گئی ہے۔

...وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳۴) يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (۹: ۳۴ — ۳۵)

"دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں۔اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا' لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو"۔

تعذیب کے اس منظر کی یہاں بہت سی تفصیلات دے دی گئی ہیں اور تعذیب کے ابتدائی مراحل سے لے کر آخری مراحل کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے تاکہ حس و خیال میں یہ منظر اچھی طرح بیٹھ جائے لہٰذا تعذیب کی تفصیلات دینا بامقصد ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ (۹: ۳۴) "دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔" اس کے بعد سیاق کلام پر خاموشی طاری ہو جاتی ہے اور اجمال اور ابہام کے بعد تفصیلات دوسری آیت میں دی جاتی ہیں۔

يَوْمَ يُحْمَى عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ (۹ : ۳۵) "ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی۔" ...... اب اس کے بعد سامع دیکھتا ہے کہ ان دھاتوں کو کس طرح گرم کیا جاتا ہے۔ اب اگلے منظر میں ہاتھوں میں گرم سلاخیں لئے ہوئے کارندے نظر آتے ہیں۔ سلاخیں تیار ہیں اور دردناک عذاب کا عمل شروع ہوتا ہے۔ اب ان مجرموں کے ہاتھوں اور چہروں کو داغا جاتا ہے اور جب ان کے چہروں کو اچھی طرح داغ دیا جاتا ہے تو اب ان کے پہلوؤں پر داغ لگائے جاتے ہیں اور جب ان کے پہلو داغ دیئے جاتے ہیں تو ان کی پیٹھوں پر داغ وہی کا عمل شروع ہوتا ہے اور جب یہ جسمانی عذاب ختم ہوتا ہے تو اب ان کو سرزنش کی جاتی ہے تاکہ ان کی روحانی تذلیل ہو۔

هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ (۹ : ۳۵) "یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔" یہ تو تم نے لذت کے لئے جمع کیا تھا لیکن یہ اب تمہارے لئے عذاب الیم کا آلہ بن گیا ہے۔

فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ (۹ : ۳۵) "اب اپنی اس سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔" بذاتہ وہی دولت ہے۔ اب دیکھو کہ تمہارے چہروں، تمہارے پہلوؤں اور تمہاری پیٹھوں کے ساتھ اس کا صرف مس ہی موجب اذیت ہے۔

غرض یہ ایک نہایت ہی خوفناک منظر ہے اور اس میں ہر ہر حرکت کی تفصیلات دی گئی ہیں اور ان تفصیلات سے دوچار ہوں گے احبار و رہبان کی اکثریت۔ پھر وہ لوگ جو بلاضرورت مال و دولت جمع کرتے اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ یہ بات یہاں پیش نظر رہے کہ یہ آیات غزوۂ تبوک کے موقع پر نازل ہوئیں جسے غزوۃ العسرۃ بھی کہا جاتا ہے۔

---ooo---

میں سمجھتا ہوں یہاں ہمیں قدرے رکنا چاہئے اور اس پوری بحث کا از سر نو جائزہ لینا چاہئے اور ذہن میں اس پوزیشن کو مستحضر کر لینا چاہئے جو ان ربانی ہدایات کے مطابق اہل کتاب کی فی الحقیقت ہے کہ ان کے عقائد کیا ہیں؟ ان کے اخلاق کیا ہیں ان کا طرز عمل کیا ہے؟ خصوصاً ان اشارات کی روشنی میں جو ہم نے ان آیات کی تشریح کے دوران دیئے۔

اہل کتاب کے بارے میں اس شبہ کو صاف کر دینا کہ آیا وہ دین حق پر ہیں، نہایت ہی ضروری تھا۔ صریحاً مشرک لوگ تو بہرحال مشرک ہوتے ہیں اور سب کو نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے عقائد، اعمال اور مراسم عبودیت کے اعتبار سے نظر آتے ہیں کہ وہ مشرک ہیں لیکن اہل کتاب کے نام سے شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید وہ **دیندار** ہیں۔ یہ شبہات دور کرنا اس لئے ضروری تھا کہ مسلمان اس جاہلیت کے مقابلے کے لئے اچھی طرح تیار ہو جائیں جہاں تک مشرکین کا تعلق ہے تو یہ بات ہر کسی کو معلوم ہے کہ وہ جاہلیت کے پیروکار ہیں لیکن اہل کتاب کے بارے میں پوزیشن واضح نہ تھی کیونکہ اہل کتاب کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ پہلے سے مسلمانوں کی طرح ایک دین سماوی کے پیرو ہیں۔ جس طرح آج کے نام نہاد مسلمانوں کی اکثریت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔

اس سورت کے آغاز ہی سے مشرکین سے مکمل بائیکاٹ اور ان کے مکمل مقابلے کی بات تفصیلاً اس سورت کا موضوع رہی ہے اور ان حالات کا بھی تقاضا تھا جس کی تشریح ہم نے اس سورت کے مقدمے میں کر دی ہے۔ جہاں اللہ

تعالیٰ نے فرمایا تھا :

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۷) كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ (۸) اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۹) لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ (۱۰) (۹ : ۷ تا ۱۰) "مشرکین اور اللہ اور رسول کے درمیان عہد کیسے ہو سکتا ہے؟ بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا تو جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جبکہ ان مشرکین کا حال یہ ہے کہ تم پر قابو پا جائیں تو نہ تمہارے معاملے میں کسی قرابت کا لحاظ کریں نہ کسی معاہدے کی ذمہ داری؟ وہ اپنی زبانوں سے تم کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دل ان کے انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں ۔ انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت قبول کر لی ۔ پھر اللہ کے راستے میں سد راہ بن کر کھڑے ہو گئے بہت برے کرتوت تھے جو یہ کرتے رہے ۔ کسی مومن کے معاملے میں نہ یہ قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہد کی ذمہ داری کا ۔ اور زیادتی ہمیشہ انہی کی طرف سے ہوتی ہے ۔"

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۱۳) قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ (۱۴) وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۵) (۹ : ۱۳ تا ۱۵) "کیا تم نہ لڑو گے ایسے لوگوں سے جو اپنے عہد توڑتے رہے ہیں اور جنہوں نے رسول اللہ کو ملک سے نکال دینے کا قصد کیا تھا اور زیادتی کی ابتدا کرنے والے وہی تھے؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر تم مومن ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو ۔ ان سے لڑو ' اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دلوائے گا اور انہیں ذلیل و خوار کرے گا اور ان کے مقابلے میں تمہاری مدد کرے گا اور بہت سے مومنوں کے دل ٹھنڈے کرے گا اور ان کے قلوب کی جلن مٹا دے گا اور جسے چاہے گا توبہ کی توفیق دے گا ۔ اللہ سب کو جاننے والا اور دانا ہے ۔"

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَى أَنفُسِهِم بِالْكُفْرِ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ (۹ : ۱۷) ”مشرکین کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے مجاور اور خادم بنیں۔ در آں حالیکہ اپنے اوپر وہ خود کفر کی شہادت دے رہے ہیں۔ ان کے تو سارے اعمال ضائع ہوگئے اور جنہم میں انہیں ہمیشہ رہنا ہے۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۹ : ۲۳) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔“ مشرکین کے خلاف جہاد کے لئے اٹھنے کا یہ لازمی تقاضا تھا کہ ان پر تنقید کی جائے اور ان کا کیس بھی سادہ تھا۔ کیونکہ اس وقت اسلامی جماعت کو جس قسم کے حالات درپیش تھے اس میں اسلامی معاشرے کے مدمقابل مشرکین تھے لیکن اہل کتاب کے خلاف جہاد کرنے کے لئے مشرکین سے بھی زیادہ شاید تنقیدی نکتہ کی ضرورت تھی۔ اور اس بات کی ضرورت تھی کہ اہل کتاب پر اہل کتاب اور اہل دین ہونے کا جو بورڈ لگا ہوا تھا انہیں اس سے محروم کر دیا جائے۔ اور ان کی اصل حقیقت کو ظاہر کیا جائے کہ وہ مشرکین کی طرح مشرکین ہیں اور ان میں اور دوسرے مشرکین میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دوسرے کفار کی طرح وہ بھی کفار ہیں اور کفار و مشرکین دونوں کی طرح یہ بھی دین اسلام کے خلاف شب و روز جنگ میں مصروف ہیں۔ یہ گمراہ ہیں اور لوگوں کے اموال نہایت ہی باطل طریقوں سے کھاتے ہیں۔ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ چنانچہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے دوٹوک موقف نازل فرمایا۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (۲۹) وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ (۳۰) اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ (۳۱) يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۳۳) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ------ (۳٤)(۹ : ۲۹ — ۳٤)) "جنگ کرو' اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے' اسے حرام نہیں کرتے۔ اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔ یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبان سے نکالتے ہیں۔ ان لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے خدا کی مار ان پر' یہ کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ وہ جس کے سوا کوئی مستحق نہیں۔ پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کئے بغیر ماننے والا نہیں ہے۔ خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے' تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو' اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ ان اہل کتاب کے اکثر علماء درویشوں کا یہ حال ہے کہ وہ لوگوں کے مال باطل طریقے سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔"

دوسری مکی اور مدنی سورتوں میں ان اہل کتاب کے بارے میں جو دوٹوک فیصلے کئے گئے ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔ تمام مکی اور مدنی سورتوں میں ان کے بارے میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ یہ لوگ مکمل طور پر کفر اور شرک میں داخل ہو گئے ہیں اور پوری طرح دین حق سے نکل چکے ہیں۔ انہوں نے اس دین کو پوری طرح چھوڑ دیا ہے جو ان کے نبی ان کے پاس لائے تھے۔ نیز انہوں نے نہ صرف یہ کہ موجودہ دین حق کو قبول نہیں کیا بلکہ وہ اس کی راہ روکنے کے لئے کمربستہ ہیں۔ لہٰذا دین جدید کے حوالے سے اپنے موقف کی بنا پر بھی یہ مکمل طور پر کافر اور مشرک ہیں۔

اس سے پہلے آیات گزر چکی ہیں جن میں اہل کتاب کو یہ خطاب کیا گیا تھا کہ وہ دین سماوی اور دین الٰہی سے مکمل طور پر نکل چکے ہیں۔

قُلْ یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَیَزِیْدَنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْیَانًا وَّكُفْرًا فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ (۵ : ٦۸) "صاف صاف کہہ دو کہ "اے اہل کتاب' تم ہرگز کسی اصل پر

نہیں ہو جب تک کہ تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔" ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دے۔ مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔"

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ---- (۵ : ۷۲) "یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہے۔"

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (۵ : ۷۳) "یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے۔"

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ

(۹۸ : ۱) "اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے وہ اپنے کفر سے باز آ جانے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس دلیل روشن نہ آ جائے۔"

یہ اور اس قسم کی دوسری کثیر آیات جن کو ہم نے اس سے پہلے نقل کیا۔ یہ آیات مکی قرآن میں بھی ہیں اور مدنی میں بھی ہیں اور کافی تعداد میں ہیں۔

صورت حال یہ تھی کہ قرآن کریم نے اہل کتاب کو بعض معاملات میں امتیازی پوزیشن دی تھی۔ مثلاً مسلمانوں پر ان کا کھانا حلال کیا تھا۔ اور ان کی پاک دامن عورتوں کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیا گیا تھا۔ لیکن یہ امتیازی پوزیشن ان کو اس لئے نہ دی گئی تھی کہ وہ دین حق کے کسی حصے پر عمل پیرا تھے۔ بلکہ یہ مراعات ان کو اس لئے دی گئی تھیں کہ اصلاً وہ دین حق کے حامل تھے اور تاریخی طور پر وہ تحریک اسلامی کا حصے تھے۔ اگرچہ حالا وہ خود اپنے دین پر بھی قائم نہ تھے۔ اس طرح ان کے ساتھ مکالمے میں یہ بات ممکن تھی کہ ہمارا اور تمہارا اصل دین تو ایک ہے۔ لہذا قرآن نے ان کو بت پرستوں اور مشرکوں کے مقابلے میں یہ امتیازی پوزیشن دے دی جبکہ بت پرستوں کے ہاں کوئی ایسا اصول نہ تھا جس کو ہاتھ میں لے کر اسلام ان کے ساتھ کوئی مکالمہ کر سکے۔ رہی یہ بات کہ خود اہل کتاب کی دینداری کی حقیقت کیا ہے؟ ان کے عقائد کیا ہیں؟ ان کی دینی حیثیت کیا ہے؟ تو اس معاملے میں قرآن کریم نے کوئی اجمال نہیں چھوڑا بلکہ دو ٹوک بات کی ہے کہ وہ بالکلیہ دین سے خارج ہیں۔ انہوں نے اپنے اصل دین عقائد و اعمال کو چھوڑ دیا ہے اور اب ان کے عقائد و اعمال وہ ہیں جو ان کے لئے ان کے احبار اور رہبان نے تصنیف کئے ہیں اور ان کو باقاعدہ مجالس عقائد و قانون میں طے کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر کلام الٰہی فیصلہ کن اور واضح ہے۔

اس مقام پر اہم بات یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے اس دو ٹوک فیصلے کے نتائج سے بحث کریں کہ اہل کتاب کے موجودہ نظریات اور دینی حالت کے ہوتے ہوئے ان کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی؟

یہ عنوان اور بورڈ جو ان پر لگا ہوا ہے غلط فہمی کا باعث ہے۔ اس بورڈ کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس بورڈ

کی وجہ سے ان لوگوں کی جاہلیت کے مقابلے میں اسلامی تحریک سامنے نہیں آتی۔ لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اس بورڈ کو اتار پھینکا جائے اور اس خطاب سے جو غلط فہمی ہوئی ہے اسے اچھی طرح دور کر دیا جائے اور ان لوگوں کی اصل حقیقت اور ان کے اصل چہرے سے لوگوں کو شناسا کیا جائے۔ اس سے پہلے ہم اس بات کی طرف اشارہ کر آئے ہیں کہ اسلامی معاشرے میں اس وقت ایسے حالات پائے جاتے تھے کہ اسلامی معاشرے کے بعض عناصر ان کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے خصوصاً غزوہ تبوک کے وقت بعض مخصوص حالات بھی تھے۔ نیز اس وقت عربوں کے دلوں پر روما کا رعب بھی چھایا ہوا تھا' لیکن جیسا کہ اس سے قبل ہم تفصیلات دے آئے اصل بات یہ تھی کہ بعض مسلمان رومیوں کے ساتھ ایسی ہمہ گیر جنگ کو محض اس لئے سمجھ نہ پائے تھے کہ رومی بہرحال اہل کتاب تھے۔

آج دین کے دشمن جو اس وقت احیاء اسلام کے لئے چلنے والی تحریکات پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں' یہ لوگ ان تحریکات کا مطالعہ نہایت ہی مہارت سے کرتے ہیں' یہ لوگ ماہر نفسیات ہوتے ہیں' ان کا اسلامی تحریکات کے بارے میں وسیع مطالعہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ اسلام کے خلاف بھی اگر کوئی اسکیم تیار کرتے ہیں تو اس پر بھی اسلامی بورڈ لگا دیتے ہیں' یہ لوگ جدید حالات' نئی تحریکات' نئے رجحانات اور افکار و تصورات پر اسلامی لیبل لگاتے ہیں اور اس اسلامی لیبل کے ساتھ وہ عالم اسلام میں حقیقی اسلامی تحریکات کے خلاف کام کرتے ہیں۔ یہ کاروبار انہوں نے پورے عالم اسلام میں شروع کر رکھا ہے۔ یہ کام وہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ جس جاہلیت کو عالم اسلام میں رائج کرنا چاہتے ہیں' اس کے خلاف مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ نہ ہوں اور لوگوں پر یہ بات کھل نہ جائے کہ اس جھوٹے اسلامی لیبل کے تحت وہ اسلام کے خلاف کیا کیا سازشیں کرتے ہیں۔

انہوں نے بعض حالات سے مجبور ہو کر اسلامی تاریخ میں صرف ایک بار کھل کر جاہلیت کے نام اور عنوان سے اسلام کے خلاف کام کیا اور اپنے سیاہ چہرے کو کھول کر اسلام پر حملہ آور ہوئے یہ ماضی قریب میں مصطفیٰ کمال کی تحریک تھی جو ترکی میں کھلی بے دینی اور جاہلیت کی شکل میں نمودار ہوئی۔ اس معاملے میں وہ مجبور یوں ہوئے کہ ان کے لئے اسلام اجتماعیت کی آخری نشانی یعنی خلافت اسلامیہ ترکیہ کو مٹانا ضروری ہو گیا تھا۔ یہ نظام خلافت بھی دراصل حقیقی خلافت نہ تھا۔ ایک قسم کا صرف نام اور عنوان ہی تھا لیکن یہ اسلامی اجتماعیت کی آخری رسی اور رابطہ تھا اور ان کے لئے اس کا توڑنا لازم تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "اسلام ایک ایک تار ہو کر ٹوٹ جائے گا۔ اس کا پہلا تار اس کا نظام حکم ہے اور آخری تار صلوٰۃ ہے۔"

یہ عیار دشمنان اسلام جو اہل کتاب میں سے بھی ہیں اور ملحدین اور کافرین کی صورت میں بھی ہیں اور یہ آپس میں بھی کبھی اکٹھے نہیں ہوتے' یہ آپس میں تب ہی اکٹھے ہوتے ہیں جب ان کو اسلام کے ساتھ کوئی معرکہ درپیش ہوتا ہے۔ لیکن اتاترک کی تحریک کے بعد ان لوگوں نے اضطرار کے حدود سے تجاوز نہیں کیا۔ اب وہ نہایت ہی سختی سے اپنی ریشہ دوانیوں کو چھپا کر سرانجام دیتے ہیں۔ اتاترک کی تحریک کے سوا ان کی تمام تحریکات دوبارہ اسلامی لیبل اور اسلامی بورڈ کے تحت ہی چل رہی ہیں۔ یہ خفیہ ریشہ دوانیاں دراصل مصطفیٰ کمال کی علانیہ تحریک لادینی کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہیں۔ ان کے ذریعے وہ ایسے حالات کو پیدا کرنا اور قائم رکھنا چاہتے ہیں اور ان اجتماعی حالات کو قائم رکھنے کے لئے وہ اقتصادی اور سیاسی امداد بھی دیتے ہیں۔ ان کے خفیہ ادارے اپنے تجربات' خفیہ رپورٹوں اور پروپیگنڈے کے ذریعے

ایسے اجتماعی حالات کے مد و معاون ہوتے ہیں۔ اس کام میں وہ تمام وسائل اور تمام مہارتیں صرف کرتے ہیں۔ عالم اسلام میں ایسے حالات قائم رکھنے کے لئے ملحد اور اہل کتاب دست بدست ہمقدم ہو کر چلتے ہیں اور ہم سفر ہیں۔ حقیقت ہے کہ اسلام کے خلاف قدیم صلیبی جنگوں کو یہ لوگ نئی شکل اور عنوان کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہیں اور یہ جنگ قدیم جنگ سے اس لئے زیادہ خطرناک ہے کہ صلیبی جنگ بہرحال علانیہ تھی اور یہ خفیہ ہے۔

ان سادہ لوح جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں وہ اس عنوان اور لیبل سے خوب دھوکہ کھائے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض داعیان اسلام بھی اس لیبل سے دھوکہ کھائے ہوئے ہیں۔ یہ داعی بھی یہ کوشش نہیں کرتے کہ اس ننگی جاہلیت کے چہرے پر سے یہ پردہ اتار پھینکیں۔ بعض داعیان اسلام جو اس حقیقت کو سمجھتے ہیں وہ بھی یہ جرأت نہیں کرتے کہ ان نام نہاد اسلامی عنوانات کے تحت کام کرنے والوں کی حقیقت کو اجاگر کریں۔ حالانکہ اسلامی لیبل کے تحت یہ لوگ کفر اور شرک کے لئے کام کرتے ہیں۔ یہ داعی لوگوں کو صورت حالات کی صحیح تصویر نہیں دکھاتے حالانکہ عام لوگ دھوکہ کھا کر ان حالات پر راضی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دور جدید میں عوام الناس اسلام کی جانب آگے اس لئے نہیں بڑھ رہے کیونکہ وہ موجودہ حالات ہی کو اور موجودہ جاہلیت ہی کو اسلام سمجھتے ہیں۔ اور اس کے باقی رہنے میں کوئی شرعی حرج محسوس نہیں کرتے۔ نہ وہ موجودہ حالات میں زندگی بسر کرنے کو گناہ سمجھتے ہیں حالانکہ درحقیقت ہم سب کافرانہ اور مشرکانہ زندگی کے تحت چل رہے ہیں۔

غرض یہ لیبل اسلامی تحریکات کے احساس کی شدت کو کم کر دیتا ہے اور ان کے احساسات کو سلا دیتا ہے۔ اسلام کی حقیقی سمجھ لوگوں میں پھیلنے نہیں دیتا۔ اور اس جاہلیت کے مقابلے میں مسلمانوں کے اٹھنے کی راہ میں بھی حائل ہے حالانکہ جاہلیت اس بات پر تلی ہوئی ہے کہ اسلام کے باقی آثار کو بھی مٹا کر رکھ دے اور اس کی جڑیں بھی اکھاڑ پھینکے جو ابھی تک بچی ہوئی ہیں۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے کتاب جاہلیۃ القرن العشرین' محمد قطب)

اس قسم کے سادہ لوح داعیان اسلام' میرے خیال میں اسلام کے کھلے دشمنوں کے مقابلے میں' اسلام کے لئے زیادہ مضر ہیں' جو ان حالات' ان تحریکات' ان رجحانات ان افکار اور ان اقدار پر اسلامی لیبل لگاتے ہیں' جن کو دشمنان اسلام' اسلام کی بیخ کنی کے لئے رائج کر رہے ہیں۔

جب بھی مسلمان اس دین کی حقیقت اور اس کے بالمقابل جاہلیت کی حقیقت کو سمجھ جاتے ہیں' اسلام دنیا میں غالب ہو جاتا ہے۔ جب اور جہاں بھی یہ صورت پیدا ہو جائے۔ اسلام کے لئے کبھی یہ امر خطرناک نہیں بنا کہ اس کے دشمن طاقتور ہیں اور تجربہ کار ہیں' البتہ اسلام کے لئے زیادہ خطرہ' ان نادان دوستوں سے ہوتا ہے جو سادہ اور فریب کھانے والے ہوتے ہیں' وہ غیر مضر چیزوں سے تو سختی سے بچتے ہیں لیکن اسلام کے لیبل میں ان کے سامنے جو زہر پیش کیا جاتا ہے اسے آسانی سے نگل جاتے ہیں۔ اور پھر اس لیبل کے تحت وہ اسلام کے خلاف بر سرپیکار ہوتے ہیں اور انہیں خبر نہیں ہوتی۔ اس لئے احیائے اسلام کے لئے کام کرنے والوں کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اقدار جاہلیت کی بوتلوں سے اسلامی لیبل اتار پھینکیں جبکہ یہ اقدار اسلامی لیبل کے تحت اسلام کی بیخ کنی کے لئے رائج کی جا رہی ہیں اور یہ عمل پوری دنیا میں رائج ہے۔ کسی اسلامی تحریک کا پہلا اقدام یہ ہونا چاہئے کہ وہ جاہلیت کے چہرے سے اس جھوٹے لیبل کو اتار پھینکے۔ اور اس کی اصل حقیقت لوگوں پر کھول دے کہ یہ شرک ہے اور کفر ہے۔ اور واقعات کی ایسی تعبیر کرے جو حقیقت حال سے مطابق ہو۔ وہ اپنا جائزہ

بھی اسی طرح لے جس طرح اس کا حال ہے جس طرح قرآن نے اہل کتاب کی حقیقت کو کھول کر بیان کر دیا کہ اگرچہ وہ اہل کتاب تھے مگر اب وہ کافر اور مشرک ہیں۔ حالات کی اس حقیقت کو اسلامی تحریکات اگر اچھی طرح سمجھ لیں تو شاید وہ اپنے آپ کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں کہ وہ کس حد تک اسلامی تحریکات ہیں تاکہ وہ اپنی موجودہ بدحالی' تکلیفات اور اس عذاب الیم سے نجات پالیں جس میں وہ خود مبتلا ہیں۔

کسی بھی اسلامی تحریک کے آغاز کے لئے دو امور رکاوٹ بنا کرتے ہیں' ایک یہ کہ تحریک اپنے موقف میں غیر ضروری سختی کرے دوسرے یہ کہ وہ ظاہری صورت حال سے دھوکہ کھا جائے اور معاملات کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش نہ کرے۔ ان دو غلطیوں کی وجہ سے دشمن کے منصوبے کامیاب ہوتے ہیں' ان کی سازشوں کو تقویت ملتی ہے۔ کیونکہ دشمن نے اپنا کام جعلی اسلامی لیبل کے تحت شروع کیا ہے۔ جب سے اسے معلوم ہوا ہے کہ اسلام کی تاریخ جدید میں اتاترک کا تجربہ بری طرح فیل ہو چکا ہے۔ اس نے اب اسلامی لیبل سے کام شروع کیا ہے۔ ترکی میں اسلام کی نظریاتی علامت نظام خلافت کو ختم کرنے کے بعد لادینیت کے لیبل کے تحت اس کے لئے کام کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ زمانہ حال کے ایک مکار' صلیبی مصنف ولفرڈ سمتھ اپنی کتاب "اسلام تاریخ جدید میں" میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ اتاترک کی تحریک کو ایک بار پھر اسلامی رنگ میں پیش کریں اور اس میں سے علانیہ الحاد کے عناصر کی نفی کر دیں۔ اور یہ باور کرائیں کہ اسلام کے احیائے جدید کے باب میں یہ نہایت ہی موزوں اور اچھی تحریک تھی۔ بہت خوب! ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ دشمنان اسلام اب کس انداز اور کس لباس میں آتے ہیں؟

---ООО---

# درس نمبر۸۹ ایک نظر میں

سیاق کلام اپنے منطقی انداز میں، رومیوں اور شمالی عرب میں ان کے حلیف نصرانی قبائل کے خلاف جنگ کی تیاریوں کی راہ میں رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ تیاریاں اور لشکرکشی بظاہر رجب کے مہینے میں ہو رہی تھی۔ لیکن دراصل یوں نہ تھا۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ اس سال ماہ رجب اپنی حقیقی جگہ پر نہ تھا۔ اور یہ اس لئے کہ انہوں نے حساب وکتاب کے لئے النسی کا جو نظام جاری کر رکھا تھا (تفصیلات آگے آ رہی ہیں) تو اس کے مطابق ماہ ذوالحجہ اپنی جگہ پر نہ تھا۔ یہ ذوالقعدہ کی جگہ تھا اور رجب جمادی الاخری کی جگہ آ رہا تھا اور اس اضطراب کا اصل راز یہ تھا کہ جاہلیت کا نظام خود اپنے اصول و قواعد کی پابندی بھی نہ کرتا تھا۔ وہ قانون اور اصولوں کا احترام محض ظاہرداری کے طور پر کرتا تھا۔ ہر جاہلی نظام میں چونکہ حلال و حرام کے حدود و قیود خود انسان ہی مقرر کرتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے بنائے ہوئے حدود میں تاویلات کر کے خود حدود شکنی کا فریضہ بھی سرانجام دیتے ہیں۔

اس کی کہانی یوں ہے کہ اللہ نے تو چار مہینوں کو حرام قرار دیا تھا۔ ان میں تین ملے ہوئے تھے یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور چوتھا منفرد تھا یعنی رجب۔ یہ تحریم حج کے مشہور مہینوں میں تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے تھی۔ اگرچہ عربوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین میں بے حد تحریف کر دی تھی اور جو دین صحیح بھی تھا، اس سے انہوں نے انحراف کر لیا تھا لیکن حرام چار مہینوں کی حرمت کو وہ بہرحال حضور کے دور تک ملحوظ رکھتے تھے۔ اس لئے کہ ان کا تعلق موسم حج سے تھا اور حجازیوں کی معاشی زندگی کا تو دارومدار ہی ان مہینوں پر تھا۔ خصوصاً اہل مکہ کے سکان کا۔ کیونکہ موسم حج میں تجارت کی کامیابی کا دارومدار ہی اس پر تھا کہ لوگوں کی نقل و حرکت آزادانہ طور پر جاری رہے اور تجارت ہوتی رہے۔

اس کے بعد یوں ہوا کہ بعض عربی قبائل کی ذاتی ضروریات کا ٹکراؤ اس تحریم سے ہوا، اور ان کی خواہشات نے بھی اپنا اثر دکھانا شروع کیا اور ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے ان لوگوں کو باور کرایا کہ حرام مہینوں کے اندر اپنی خواہشات کے مطابق تقدیم و تاخیر کی جا سکتی ہے۔ اس طرح کہ کسی مہینے کو کسی سال میں مقدم کر دیا جائے اور کسی سال میں موخر کر دیا جائے۔ مہینوں کی تعداد تو چار ہی رہے لیکن ان مہینوں کے نام بدل دیئے جائیں۔ "اس طرح وہ اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینوں کی تعداد پوری بھی کر دیں اور اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینوں کو حلال بھی کر دیں۔ لہٰذا جب ۹ ہجری کا سال آیا تو اس میں ماہ رجب حقیقی رجب نہ تھا۔ اسی طرح ماہ ذوالحجہ بھی حقیقی ذوالحجہ نہ تھا۔ رجب دراصل جمادی الاخری تھا اور ذوالحجہ دراصل ذوالقعدہ تھا اور فی الحقیقت یہ لشکرکشی درحقیقت تو جمادی الاخری میں تھی لیکن نام کے اعتبار سے یہ رجب میں تھی اور یہ ان لوگوں کے نسئ کے تصرفات کی وجہ سے ایسا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان احکامات کی وجہ سے عمل نسئ کو آئندہ کے لئے موقوف قرار دے دیا۔ اور اس بات کی وضاحت کی کہ اس عمل نسئ کے ذریعے یہ

لوگ چونکہ خود مہینوں کو حلال قرار دیتے ہیں یا حرام قرار دیتے ہیں اور یہ عمل چونکہ اصول دین کے خلاف ہے۔کیونکہ دین کا یہ اصل الاصول ہے کہ حلال و حرام کے حدود کا تعین صرف اللہ تعالیٰ کر سکتا ہے۔یہ اللہ کا مخصوص حق ہے۔ اور اس حق اور اختیار کو اللہ کے ازن کے بغیر استعمال کرنا کفر اور شرک ہے۔بلکہ یہ عمل کفر کے میدان میں آخری حدود تک بڑھ جانے کے مترادف ہے۔اس طرح ان آیات کے ذریعے لوگوں کے دلوں سے خلجان کو دور کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ اصول بھی واضح کر دیا گیا کہ اسلامی نظام زندگی میں حرام و حلال کے تعین کا اختیار صرف اور صرف اللہ کو ہے۔اور اس عقیدے کا تعلق اس عظیم حقیقت سے ہے جو اس پوری کائنات کے ناموس کے اندر پوشیدہ حقیقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے اندر ودیعت کی ہے اور تخلیق کے پہلے دن سے۔اس طرح اللہ کی جانب سے لوگوں کے لئے قانون سازی دراصل اس اصول پر مبنی ہے جو اللہ نے اس کائنات کے لئے ودیعت کیا ہے۔اس لئے لوگوں کے لئے کسی شخص کی جانب سے قانون سازی کا کام کرنا گویا کفر میں آگے بڑھنا ہے اور دوسروں کو گمراہ کرنا ہے۔

آیات کے اس حصے میں اس حقیقت کو بھی دوبارہ ذہن نشین کرانا مطلوب ہے۔جو ان آیات سے متصلا پہلے بھی بیان کی گئی ہیں۔وہ یہ کہ اہل کتاب بھی مشرکین ہیں اور دشمنی اور جہاد کے زاویہ سے وہ مشرکین کے محاذ میں شامل ہیں اور حکم یہ ہے کہ ان سب کے ساتھ جنگ کی جائے یعنی مشرکین اور اہل کتاب دونوں کے ساتھ۔اس لئے کہ یہ سب کے سب اہل اسلام کے خلاف جہاد اور جنگ کرتے ہیں اور پوری اسلامی تاریخ سے ان کا یہ طرز عمل پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے اور قرآن کے الفاظ تو اس معاملے میں بالکل واضح ہیں کہ اہل کتاب اور مشرکین دونوں کا مشترکہ ہدف یہی ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہروقت برسرپیکار رہتے ہیں۔اور جب بھی ان کا سامنا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہے تو وہ اپنے درمیان کی عداوتوں کو بھول جاتے ہیں' چاہے یہ اختلافات باہم عداوتوں کے حوالے سے ہوں یا عقائد و نظریات کے حوالے سے ہوں چنانچہ اسلام کی راہ روکنے کے لئے پھر ان کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی اور وہ اسلام کی بیخ کنی کے لئے متحد اور متفق ہو جاتے ہیں۔

یہ حقیقت کہ اہل کتاب دوسرے مشرکوں کی طرح مشرک ہیں اور یہ کہ وہ مسلمانوں کے خلاف مشرکوں کی طرح لڑتے ہیں۔اس بات کی متقاضی ہے کہ مسلمان بھی ان تمام مشرکوں کے خلاف لڑیں چاہے ان کا تعلق مشرکین اہل کتاب سے ہو یا مشرکین عرب سے ہو۔اور دوسری یہ کہ نسیٔ کا عمل کفر کی ایڈوانس شکل ہے کیونکہ ایک غلط کام ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں اللہ کے اختیار قانون سازی پر دست درازی بھی ہے اس لئے یہ سادہ کفر سے زیادہ کفر ہے۔یہی وہ مناسبت ہے جس کی وجہ سے سابقہ مضمون کے ساتھ ان آیات کا تعلق پیدا ہوتا ہے۔کیونکہ سابقہ آیات میں ان رکاوٹوں کا ذکر تھا جو جہاد کے لئے نکلنے میں حائل ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ جہاد اہل کتاب اور مشرکین دونوں کے خلاف تھا۔

---ooo---

# درس نمبر۸۹ تشریح آیات

۳۶---- تا ---- ۳۷

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ

''حقیقت یہ ہے کہ مہینوں کی تعداد جب سے اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے اللہ کے نوشتے میں بارہ ہی ہے اور ان میں سے چار مہینے حرام ہیں۔یہی ٹھیک ضابطہ ہے۔ان چار مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو۔اور مشرکوں سے سب سے مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں ہی کے ساتھ ہے۔'' یہ آیت زمانے کو اس معیار اور قانون کی طرف لوٹا دیتی ہے اور زمانے کا دوران اس نظام کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تخلیق کی ہے یعنی زمانے کا تعین تخلیق کائنات کے مطابق ہو گا۔اس آیت میں اسی طرف بھی اشارہ ہے کہ اس کائنات میں زمانے کا ایک نہایت ہی مستحکم دور کام کرتا ہے اور اس دوران میں سال کو بارہ مہینوں کے اندر تقسیم کیا گیا ہے۔اس مستحکم دوران میں کمی و بیشی نہیں پیدا کی جا سکتی۔اور یہ دوران زمان اور حولان حول میں نہایت ہی منضبط ہے اور یہ اس قانون قدرت کے مطابق ہے جس کے تحت اس کائنات کی تخلیق ہوئی ہے۔یہ نظام اور ضابطہ یا ناموس یا قدر اس قدر دقیق اور مستحکم ہے کہ اس میں کوئی کمی و بیشی نہیں کی جا سکتی۔کیونکہ زمانے کا دوران نہایت ہی دقیق معیار کے مطابق سرانجام پاتا ہے۔اور آغاز تخلیق کائنات سے اس ضابطے کو جاری و ساری کیا گیا ہے اور یہ کبھی موقوف نہیں ہوا ہے۔

زمان و مکان کے قانون حرکت کے اس استحکام کو یہاں اس لئے لایا گیا ہے کہ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ حرام و حلال کے حدود و قیود کا تعین کائنات کے اس مستحکم اصول پر مبنی ہے۔لہٰذا حلال و حرام کا تعین محض وقتی خواہشات اور میلانات کی اساس پر نہیں ہو سکتا۔نہ اس کی حرکت میں تقدیم و تاخیر کی جا سکتی ہے کیونکہ یہ نہایت ہی غیر معمولی امر ہے۔

ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (۹ : ۳۶) ''یہی ٹھیک ضابطہ ہے۔'' پس یہ دین اس کائنات کے مضبوط ضابطے کے مطابق ہے اور کائنات کا مضبوط ضابطہ وہ ہے جس کے مطابق یہ کائنات روز اول سے چل رہی ہے جب سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے۔

یہ ایک مختصر آیت ہے لیکن اس میں معانی و مدلولات کا ایک لامتناہی سلسلہ رکھ دیا گیا ہے ۔ یہ معانی و مدلولات پے در پے چلے آ رہے ہیں ۔ بعض 'بعض کے لئے تشریح اور توسیع کا سامان فراہم کرتے ہیں ۔ بعض کی وجہ سے دوسرے مطالب قوی ہوتے ہیں ۔ وہ تمام علمی اور سائنسی انکشافات اس کے مفہوم میں داخل ہیں جو جدید انسان اس دنیا میں سائنس کے ذریعے سامنے لاتا ہے اور مسلسل تجربات کر کے مزید حقائق کو سامنے لا رہا ہے ۔ اس طرح اصول دین اور اصول کائنات کے درمیان مسلسل تطابق کا اظہار ہوتا ہے اور دینی اصول دور جدید میں اچھی طرح ذہنوں میں بیٹھ رہے ہیں اور اس کے اصول اور اس کی بنیادیں مضبوط ہو رہی ہیں ۔ یہ تمام مدلولات صرف ۱۲ الفاظ کے ذریعے منضبط کئے گئے ہیں اور یہ الفاظ بھی بظاہر نہایت ہی معمولی اور سادہ ہیں اور عام فہم اور سادہ ہیں ۔

فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ

"ان چار مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو ۔" ان چار مہینوں میں ایک دوسرے کے اوپر ظلم نہ کرو کیونکہ یہ اصول اس اصول سے مربوط ہے جس کے اوپر کائنات کو منظم کیا گیا ہے اور یہ اصول اعظم یہ ہے کہ جس طرح اس کائنات کا قانون ساز اللہ ہے ' اسی طرح لوگوں کے لئے بھی ضابطہ بندی کرنے والا اللہ ہے ۔ لہٰذا ان ضوابط کی خلاف ورزی ظلم ہو گا لہٰذا تم ان حرام مہینوں کو اپنے لئے حلال کر کے امن و سلامتی کے خلاف اقدام مت کرو ۔ یہ اللہ کے ارادے اور مشیئت کی خلاف ورزی ہو گی اور یہ خلاف ورزی ظلم ہے اور یہ ظلم کر کے اپنے آپ کو دنیا و آخرت کے عذاب کے لئے مستحق نہ ٹھہراؤ اور اپنے معاشرے کے اندر قلق و اضطراب نہ پیدا کرو اور اس دنیا کو اس جنگ کا شکار نہ بناؤ جس کا کوئی مقصد نہیں ہے جو امن و سلامتی سے متضاد ہے ۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ۗ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۶﴾

"اور مشرکوں سے سب سے مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں ہی کے ساتھ ہے ۔" یعنی حرام مہینوں کے علاوہ دوسرے مہینوں میں الا یہ کہ مشرکین حرام مہینوں میں تم پر حملہ کر دیں ۔ اگر وہ حرام مہینوں میں تم پر دست درازی کریں تو تم ان مہینوں میں بھی اپنا دفاع کر سکتے ہو کیونکہ اگر یکطرفہ طور پر جنگ بندی کا اعلان کر دیا جائے تو اس طرح اچھے اخلاق کی حامل قوتیں کمزور پوزیشن میں چلی جائیں گی اور انسانی اخلاق کی حامل قوتیں اشرار کا مقابلہ نہ کر سکیں گی اور دنیا میں شر و فساد کا دور دورہ ہو جائے گا اور دنیا پر طوائف الملوکی کا غلبہ ہو جائے گا ۔ لہٰذا حرام مہینوں میں جارحیت کا مقابلہ کرنا بھی دراصل ان مہینوں کی حرمت کو بچانا ہے تاکہ آئندہ ان کا احترام کیا جائے اور کوئی کسی کے خلاف جارحیت کا ارتکاب نہ کرے ۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً (۹ : ۳۶) "اور مشرکوں سے سب مل کر

لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں۔" یعنی تم سب ان کے ساتھ لڑو' بلا استثناء' سب کے سب' اس حکم سے کوئی جماعت بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ سب تم سے لڑتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ اور وہ بھی تم میں سے کسی کو مستثنیٰ نہیں کرتے۔ لہٰذا معرکہ جہاد درحقیقت شرک اور توحید کے نظریات کے درمیان معرکہ ہے۔ یہ ایمان اور کفر اور ہدایت و ضلالت کے درمیان معرکہ آرائی ہے۔ یہ ایسے دو بلاکوں کے درمیان محاذ آرائی ہے جن کے درمیان کسی بھی وقت امن قائم نہیں ہو سکتا' نہ ان کے درمیان کوئی مکمل اتفاق ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ اختلاف کوئی عارضی اور جزوی اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ دائمی اور بنیادی اختلاف ہے۔ یہ ایسے مصالح اور مفادات کا اختلاف نہیں ہے جن کے درمیان یگانگت پیدا کی جا سکتی ہو۔ نہ زمین کے کسی رقبے پر اختلاف ہے جسے تقسیم کر کے اس کی حد بندی کی جا سکتی ہو' اگر امت مسلمہ یہ سمجھے کہ اس کے اور کفار اہل کتاب اور بت پرستوں کے درمیان برپا جنگ اقتصادیات کی جنگ ہے یا کوئی قومی جنگ ہے تو یہ اس کی غلط فہمی ہوگی یا اگر اسے کوئی یہ بات سمجھاتا ہے تو وہ اسے دھوکہ دیتا ہے۔ یہ معرکہ محض وطنی یا پالیسی کا معرکہ نہیں ہے' یہ تو ایک ہمہ گیر نظریاتی معرکہ ہے۔ اور یہ اس نظام اور دین اسلام اور کفر کے درمیان معرکہ ہے۔ اس ہمہ گیر معرکے کا فیصلہ انصاف اور کچھ لے اور کچھ دے کے اصول پر نہیں ہو سکتا' نہ مذاکرات کے ذریعے اسے حل کیا جا سکتا ہے۔ اس کا حل تو صرف عمل جہاد میں مضمر ہے۔ مسلسل جدوجہد اور پیہم عمل میں اس کا حل مضمر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ سنت ہے جو کسی طرح بھی نہیں ٹل سکتی۔ یہ وہ نظام اور قانون ہے جس کے اوپر نظام کائنات کھڑا ہے۔ آسمان و زمین اسی ناموس اکبر کے مطابق قائم اور رواں دواں ہیں۔ دنیا کے ادیان اور نظریات بھی اس ناموس کے مطابق چل رہے ہیں۔ دل اور دماغ کا نظام بھی یہی تکوینی نظام ہے اور یہ اسی روز سے قائم ہے جس روز سے اللہ نے زمین و آسمان کی تخلیق کی ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۹: ۳۶) "اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں ہی کے ساتھ ہے۔" لہٰذا کامیابی ان متقین کے لئے لکھ دی گئی ہے جو اللہ کی حدود کا احترام کرتے ہیں' اللہ جسے حرام قرار دے اسے حرام قرار دیتے ہیں اور اللہ کے قوانین سے انحراف نہیں کرتے۔ لہٰذا قانون قدرت یہ ہے کہ مسلمان مشرکین کے خلاف عمل جہاد کو لحہ بھر کے لئے بھی موقوف نہ کریں' اس سے انحراف نہ کریں اور اس مسلسل جہاد میں وہ حدود اللہ کو پامال نہ کریں اور حدود اللہ کا احترام کریں اور عمل جہاد کو اس کے پورے قوانین اور آداب کے مطابق جاری رکھیں اور اس جہاد میں ان کے پیش نظر صرف رضائے الٰہی ہو' دل میں بھی اور علانیہ طور پر بھی۔ اگر وہ ان اصولوں کے مطابق جہاد میں داخل ہوں تو فتح ان کے قدم چومے گی کیونکہ اس صورت میں اللہ ان کے ساتھ ہو گا اور جس کا ساتھی اللہ ہو' اس کی کامیابی میں کوئی شک نہیں رہتا۔

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ
عَامًا وَّ يُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ

۵۰

اللّٰهُ ۭ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْۗءُ اَعْمَالِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ع ۸

۱۱

"نسی تو کفر میں ایک مزید کافرانہ حرکت ہے جس سے یہ کافر لوگ گمراہی میں مبتلا کئے جاتے ہیں۔ کسی سال ایک مہینے کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اس کو حرام کر دیتے ہیں' تاکہ اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینوں کی تعداد پوری بھی کر دیں اور اللہ کا حرام کیا ہوا حلال بھی کر لیں..... ان کے برے اعمال ان کے لئے خوشنما بنا دیئے گئے ہیں اور اللہ منکرین حق کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔"

حضرت مجاہد کا کہنا ہے کہ "بنی کنانہ کا ایک شخص اپنے گدھے پر سوار ہو کر ہر سال موسم حج میں آتا' اور یہ اعلان کرتا: "لوگو! مجھ پر نہ کوئی عیب جوئی کی جا سکتی ہے اور نہ میں ناکام ہوتا ہوں۔ نہ میری بات کو رد کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے محرم کو حرام قرار دیا ہے اور صفر کو موخر کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ دوسرے سال آتا اور یہی بات کہتا۔ ہم نے صفر کو حرام قرار دیا ہے اور محرم کو مؤخر کر دیا ہے اور یہی مطلب ہے۔ لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ (۹ : ۳۷) "تاکہ اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینوں کی تعداد پوری کر دیں۔" یعنی چار ماہ کی تعداد پوری کر دیں۔ اس طرح وہ حلال مہینوں کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیں۔ عبدالرحمن ابن زید ابن اسلم کا کہنا ہے کہ یہ شخص بنی کنانہ میں سے تھا اور اس کا نام قلمس تھا۔ جاہلیت کا رواج یہ تھا کہ ان میں سے کوئی قبیلہ دوسرے پر حرام مہینوں میں ڈاکہ نہ ڈالتا تھا۔ بعض اوقات یہ ہوتا کہ ایک شخص کے سامنے اس کے باپ کا قاتل آ جاتا لیکن وہ اس پر ہاتھ نہ ڈالتا۔ اگر حرام مہینوں میں کوئی شخص مقاتلہ کے لئے دوسروں سے امداد طلب کرتا تو لوگ کہتے' دیکھتے نہیں حرام مہینہ ہے تو امداد طلب کرنے والا یہ کہتا کہ اسی سال ہم اسے ملتوی کر دیں گے۔ چنانچہ اس سال محرم کے بجائے دو صفر ہوں گے اور دوسرے سال ہم دو محرم کر دیں گے۔ اس طرح وہ لوگ کر لیتے۔ اور اگلے سال وہ صفر کے مہینے کو بھی محرم کی طرح حرام قرار دیتے۔ اس طرح دو مہینے حرام قرار پاتے۔

اس آیت کی تفسیر میں یہی دو اقوال ہیں اور یہی نسیئ کی دو صورتیں رائج تھیں۔ پہلی صورت میں وہ محرم کے بدلے صفر کو حرام قرار دیتے۔ اور چار کی تعداد پوری کرتے لیکن اللہ نے منصوص طور پر جن مہینوں کو حرام قرار دیا تھا یہ چار بعینہ وہ نہ ہوتے کیونکہ ان میں محرم نہ ہوتا۔ اور دوسری صورت میں ایک سال میں تین مہینے حرام ہوتے اور دوسرے میں پانچ حرام ہوتے اور اس طرح دو سالوں کی اوسط آٹھ کی تعداد پوری ہو جاتی۔ لیکن اس طرح بھی محرم کا احترام بہرحال ٹوٹ جاتا۔ اور اس کی جگہ صفر حرام ہو جاتا۔

ان دونوں صورتوں میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا جاتا جو اسلامی شریعت کے خلاف عمل تھا۔ اسے زیادۃ فی الکفر قرار دیا گیا کیونکہ نظریاتی کفر کے ساتھ یہ از خود قانون سازی کر کے کفر کا ارتکاب کیا گیا۔

يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۹ : ۳۷) "جس سے یہ کافر لوگ گمراہی میں مبتلا کئے جاتے ہیں۔" وہ دھوکہ دیتے ہیں' دین کو کھیل بناتے ہیں اور نصوص میں تاویل و تحریف کرتے ہیں۔

زُيِّنَ لَهُمْ سُوْۗءُ اَعْمَالِهِمْ (۹ : ۳۷) "ان کے برے اعمال ان کے لئے خوشنما بنا دیئے گئے ہیں۔"

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کو برائی اچھائی نظر آتی ہے' وہ بدز  کو زیبائش سمجھتے ہیں۔اس طرح وہ گمراہی کو گمراہی سمجھتے ہی نہیں اور کفریہ اعمال میں بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۹:۳۷) "اور منکرین حق کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔" کیونکہ انہوں نے خود اپنے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں۔انہوں نے دلائل ہدایت پر غور کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔لہذا انہوں نے اپنے آپ کو اس بات کا مستحق بنا لیا ہے کہ وہ جس حال میں ہیں' اللہ انہیں اس میں چھوڑ دے۔

---()()()---

# درس نمبر ۹۰ ایک نظر میں

آیات کا یہ حصہ 'بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر حکم نفیر عام کے بعد نازل ہوا ہو گا۔ جب حضورؐ کو معلوم ہوا کہ رومی جزیرۃ العرب کے شمالی علاقے شام کی حدود پر جمع ہو گئے ہیں۔ الا یہ کہ ہرقل نے اپنے ساتھیوں اور فوجیوں کو ایک سال کا راشن فراہم کر دیا ہے اور ان افواج کے ساتھ قبائل لخم' جذام' عاملہ اور غسان بھی شامل ہو گئے ہیں جو شمالی عربی قبائل تھے۔ ان کے ہراول دستے مقام بلقا تک آ پہنچے ہیں۔ ان حالات میں حضورؐ نے بھی مسلمانوں کو عام لشکر کشی کی تیاری کا حکم دے دیا۔ حضورؐ جب بھی کسی غزوے کے لئے نکلتے تو آپ جنگی چال کے طور پر تیاریوں کا رخ دوسری جانب پھیرتے۔ پتہ نہ ہوتا کہ آپ نشانہ کہاں لگائیں گے مگر آپ نے غزوہ تبوک میں اس اصول کو چھوڑ دیا چونکہ یہ دور کا سفر تھا اور موسم نہایت ہی سخت تھا۔ اس لئے حضور نے اس سفر کی بات صاف صاف بتا دی تھی۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ چھاؤں خوشگوار تھی۔ باغات پک چکے تھے۔ اور لوگوں کے لئے سفر کے مقابلے میں گھروں پر قیام بہت ہی محبوب تھا۔ ان حالات میں اسلامی معاشرے میں ان کمزوریوں کا ظہور ہوا جن کے بارے میں ہم نے اس سورت کے مقدمے میں تفصیلاً بتایا ہے۔ ان حالات میں منافقین کے لئے بھی اپنی ذلیلانہ حرکات کے لئے مواقع پیدا ہو گئے' انہوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ گرمی میں لشکر کشی نہ کی جائے۔ انہوں نے طویل سفر کی صعوبتوں کو بیان کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے لوگوں کو رومیوں کی قوت سے بھی خوب ڈرایا۔ اور اس پروپیگنڈے کا اثر بھی اسلامی معاشرے پر پڑا۔ چنانچہ آیات کے اس حصے میں ان تمام باتوں کے خلاف متنبہ کیا گیا۔

———○○○———

# درس نمبر ۹۰ تشریح آیات

۳۸---- تا---- ۴۱

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا
مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿٣٨﴾ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا
اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٣٩﴾ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ
اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ
فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٤٠﴾
اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ
ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٤١﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو‘ تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لئے کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسا ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ دنیوی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔ تم نہ اٹھو گے تو خدا تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہاری جگہ کسی اور

گروہ کو اٹھائے گا اور تم خدا کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے 'وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ تم نے اگر نبی کی مدد نہ کی تو کچھ پروا نہیں' اللہ اس کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا' جب وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا' جب وہ دونوں غار میں تھے 'جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ "غم نہ کر' اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" اس وقت اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکون قلب نازل کیا اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور کافروں کا بول نیچا کر دیا۔ اور اللہ کا بول تو اونچا ہی ہے' اللہ زبردست اور دانا و بینا ہے۔ نکلو' خواہ ہلکے ہو یا بوجھل' اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ' یہ تمہارے لئے بہتر ہے' اگر تم جانو۔"

پیچھے رہ جانے والوں کے لئے یہ آغاز عتاب ہے' ان کو یہاں سخت دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر انہوں نے جہاد کے معاملے میں سستی کی تو اس کے نتائج سخت ہوں گے۔ اس موقع پر انہیں یاد دلایا جاتا ہے کہ تم حضرت محمد ؐ کو اکیلا اور محتاج نہ سمجھو۔ ان کے ساتھ اللہ کی نصرت اور مدد ہروقت موجود رہتی ہے۔ غار میں اس کے ساتھ تم میں سے کوئی نہ تھا اور تمہارے بغیر بھی اللہ نے اپنی قدرت سے ان کو بچایا۔ حضور ؐ کو تو تمہارے تخلف سے کوئی نقصان ہو گا یا نہ ہو گا' تمہیں بہرحال گناہ ہو گا اور تم سے ایک بڑی کوتاہی کا صدور ہو جائے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ (۹ : ۳۸) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لئے کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟"

یہ سب زمین کے بوجھ ہیں' زمین کے لالچ' زمین کے تصورات' زندگی کے چلے جانے کا خوف' مال کے نقصان کا خوف' دنیاوی لذتوں اور مال و متاع کے ضائع ہو جانے کا خوف' عیاشی' آرام اور امن و سکون کے تباہ ہو جانے کا خوف۔ فنا ہونے والی لذتوں' زندگی کے مختصر اور عارضی مقاصد اور خود اس کرۂ ارض کی مختصر زندگی کے ساتھ چمٹ جانے کی رکاوٹ۔ غرض تمام رکاوٹیں' خون' گوشت اور مٹی سے متعلق ہیں۔ اور ان تمام رکاوٹوں کو ایک نہایت ہی زمزمہ انگیز لفظ اثاقلتم کے ذریعے بتایا گیا۔ اس میں ایک قرات تثاقلتم بھی آئی ہے لیکن حفص کی عام قراءت نہایت ہی موثر ہے۔ یہ لفظ جس مفہوم کو ظاہر کرتا ہے کہ ایک جثہ ہے جو زمین پر گرنے کے لئے ڈھیلا پڑ رہا ہے۔ لوگ اسے مشکل سے اوپر کی طرف اٹھانے کی سعی کرتے ہیں لیکن وہ اس قدر بوجھل ہو چکا ہے کہ وہ زمین پر گر جاتا ہے۔ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ (۹ : ۳۸) ان الفاظ میں سے اظہار ہوتا ہے کہ زمین اسے اپنی جانب کھینچ رہی ہے لیکن روحانی قوت اور تحریک اور شوق کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اوپر اٹھے۔ جہاد کے لئے اٹھنے کا عمل دراصل اپنے آپ کو اس زمین کی کشش ثقل سے آزاد کرنا ہے۔ زمین کے اندر پائی جانے والی گوشت و پوست کی آلودگیوں سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کا عمل ہے۔ انسان کو روحانی دنیا اور بلند مقاصد کی دنیا کی طرف مشتاق کرنے کا عمل ہے۔ انسانی روح کو دنیاوی قید و بند سے آزاد کر دینے کا عمل ہے۔ اس عارضی اور مختصر زندگی کو ترک کر کے دائمی اور طویل زندگی میں داخل ہونے کا عمل ہے۔

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ

۳۸) "کیا تم نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسا ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ دنیوی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔" کسی عقیدے اور نظریے کے پیرو کار اگر جہاد فی سبیل اللہ سے رکتے ہیں یا اپنے نظریات کی خاطر جنگ نہیں کرتے تو اس کا صرف ایک ہی سبب ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے نظریہ اور عقیدہ کے اندر فتور اور کمزوری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں من مات و لم یغز و لم یحدث نفسه بغزو مات علی شعبة من شعب نفاق "جو شخص مر گیا اور اس نے نہ تو جہاد میں حصہ لیا اور نہ ہی اس کو کبھی اس کا خیال گزرا تو ایسا شخص نفاق کے شعبوں میں سے ایک شعبے پر مرا۔" لہٰذا نفاق جب کسی عقیدے میں داخل ہوتا ہے تو وہ اسے بلندی اور کمال سے روکتا ہے۔ یہ نفاق ہی ہے جو انسان کو موت سے ڈرا کر' فقر و فاقے سے ڈرا کر جہاد سے روکتا ہے حالانکہ موت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور رزق ہر شخص کا اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آخرت کے مقابلے میں اس پوری زندگی کا مال و متاع شیئ قلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آگے یہ بیان آتا ہے۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۹: ۳۹) "تم نہ اٹھو گے تو خدا تمہیں دردناک سزا دے گا' اور تمہاری جگہ کسی اور گروہ کو اٹھائے گا اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے' وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔" یہ خطاب ایک متعین واقعہ میں ایک متعین جماعت کو ہے۔ لیکن اپنے مفہوم کے اعتبار سے یہ ہر صاحب عقیدہ اور نظریہ کے لئے عام ہے۔ یہ عذاب جس سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے صرف آخرت کا عذاب ہی نہیں ہے۔ یہ دنیاوی عذاب بھی ہے۔ جو لوگ جہد و جہاد سے پہلوتہی کرتے ہیں اور غلبہ و سربلندی کے لئے جہد مسلسل نہیں کرتے وہ محروم رہتے ہیں اور ذلت کے عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں کیونکہ وہ بھلائی کے کاموں میں حصہ لینے سے محروم رہتے ہیں۔ اور یہ میدان وہ اپنے دشمنوں کے لئے خالی چھوڑ دیتے ہیں۔ یاد رہے کہ جہاد فی سبیل اللہ اور اسلام کی راہ میں جدوجہد کی راہ چھوڑ دینے کے نتیجے میں نظریاتی لوگوں کا جانی اور مالی نقصان جہاد و قتال میں حصہ لینے کی صورت میں ہوتا ہے۔ جہاد کا شریفانہ عمل ان سے جس قربانی کا مطالبہ کرتا' اس کے مقابلے میں ذلت اور پست ہستی ان سے زیادہ قربانی کا مطالبہ کرتی ہے۔ غرض جس قوم نے بھی جہاد کے عمل کو ترک کیا' اس کے مقدر میں ذلت لکھ دی جاتی ہے۔ وہ دشمن کے لئے لقمہ تر بن جاتی ہے اور دشمن اسے بڑی آسانی کے ساتھ غلام بنا لیتا ہے۔

وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (۹: ۳۹) "تمہاری جگہ اور گروہ اٹھائے گا۔" یہ دوسرا گروہ ایسا ہو گا جو اپنے نظریات پر مضبوطی سے قائم ہو گا' وہ اپنی عزت اور وقار کے لئے قربانی دینے والا ہو گا اور وہ اللہ کے دشمنوں پر سربلندی حاصل کرنے والا ہو گا۔"

وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا (۹: ۳۹) "تم خدا کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے۔" پھر تمہاری کوئی حیثیت نہ ہوگی اور نہ صف اول میں تمہاری حیثیت ہوگی اور نہ صف آخر میں۔"

وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۹: ۳۹) "اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔" وہ اس بات سے عاجز نہیں ہے کہ تمہیں ختم کر دے اور تمہاری جگہ دوسری اقوام کو اٹھا لائے اور تمہیں نظرانداز کر کے گوشہ گم نامی میں ڈال دے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیاوی مفادات سے بلند ہونا اور نفس انسانی کی کمزوریوں پر قابو پانا، دراصل مقام شرافت و کرامت کو پانا ہے۔ اس کے نتیجے میں بلند ترین زندگی عطا ہوتی ہے لیکن ذلت کو اختیار کر کے زمین سے چمٹ جانا اور دشمن سے خائف ہونا کرامت اور شریعت اور عظمت کی زندگی کی نفی ہے۔ اور اللہ کے معیار کے مطابق یہ فنا اور ذلت ہے اور روحانی اقدار کی تباہی ہے۔

اب اللہ تعالیٰ ایک تاریخی واقعہ کو ذکر کر کے ایک مثال بیان فرماتے ہیں۔ یہ مثال ان کے علم میں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ بعض حساس مواقع پر دست قدرت نے کس طرح رسول اللہ اور اسلامی تحریک کی دستگیری فرمائی۔ اس میں افراد تحریک کا کوئی دخل نہ تھا۔ یہ خالص غیبی امداد تھی اور مہاجرین و انصار میں سے کوئی ایک شخص بھی اس وقت امداد کے لئے موجود نہ تھا۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۹: ۴۰) "تم نے اگر نبی کی مدد نہ کی تو کچھ پروا نہیں، اللہ اس کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا، جب وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ "غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" اس وقت اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکون قلب نازل کیا اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور کافروں کا بول نیچا کر دیا۔ اور اللہ کا بول تو اونچا ہی ہے، اللہ زبردست اور دانا و بینا ہے۔"

جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قریش کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ سرکش قوتوں کو جب کامیابی نصیب نہیں ہوتی تو ان کا پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا ہے اور وہ تشدد پر اتر آتی ہیں۔ چنانچہ قریش نے بھی حضور کے خلاف تشدد کی سازشیں شروع کر دیں۔ یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ حضور کو قتل کر کے ان سے جان چھڑائی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم کو ان کی خفیہ سازشوں کی بابت اطلاع کر دی۔ اور حکم دیا کہ آپ اب مکہ سے نکل جائیں۔ آپ کے ساتھ صرف ابوبکر صدیق رفیق تھے۔ آپ کے پاس نہ تو کوئی لشکر تھا اور نہ سامان جنگ تھا۔ آپ کے دشمن ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور وہ بہت ہی طاقتور تھے۔ یہاں سیاق کلام میں اس کی نہایت ہی خوبصورت منظرکشی کی گئی ہے۔

اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ (۹: ۴۰) "جب وہ دونوں غار میں تھے۔" اور قوم ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ حضرت صدیق سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ وہ اپنی جان کے بارے میں فکرمند نہ تھے۔ ان کو قائد کی فکر تھی کہ وہ ان کے آثار نہ پا لیں اور ان کے حبیب تک رسائی حاصل نہ کر لیں۔ کہتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی اپنے پاؤں کی جگہ سے نظر اٹھاتا تو ہم اسے اس کے پاؤں کے نیچے نظر آ جاتے۔ اس موقع پر حضور کے قلب پر اللہ کی جانب سے سکون و ثبات کی کیفیت نازل

ہو چکی تھی ۔ آپ نے صدیق اکبر کے خوف کو کم کرنے کی کوشش کی اور فرمایا :"ابوبکر تمہارا ان دو آدمیوں کے بارے میں کیا خیال ہے جن کا تیسرا ساتھی اللہ ہو"

نتیجہ کیا نکلا؟ حالات ایسے ہیں کہ ایک طرف پوری مادی قوتیں ہیں اور حضور ؐ اور ان کے اکیلے ساتھی ہر قسم کی مادی قوتوں سے محروم ہیں ۔ اب اللہ کی افواج میدان میں آتی ہیں ۔ ان میں سے کوئی فوج اور کوئی قوت نظر نہیں آتی ۔ اس منصوبے میں کفار کو بری طرح شکست ہوتی ہے اور وہ ذلیل ہو کر رہ جاتے ہیں ۔

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ( ۹ : ۴۰ ) "اور اللہ نے کافروں کا بول نیچا کر دیا ۔" اور اللہ کا کلمہ اپنی جگہ سربلند رہا جیسا کہ وہ ہمیشہ سربلند رہتا ہے ' قوی ہوتا ہے اور اسے نفوذ حاصل ہوتا ہے ۔

وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ( ۹ : ۴۰ ) بعض قراءتوں کے مطابق

وَكَلِمَةَ اللّٰهِ ( ۹ : ۴۰ ) نصب کے ساتھ بھی آیا ہے ۔ لیکن وَكَلِمَةُ اللّٰهِ ( ۹ : ۴۰ ) رفع کے ساتھ زیادہ قوی ہے ۔ مفہوم کے اعتبار سے بات زور دار ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں تاکید اور دوام کا مفہوم ہوتا ہے ۔ یعنی وَكَلِمَةُ اللّٰهِ ( ۹ : ۴۰ ) کا مزاج اور اس کی حقیقی پوزیشن ہی یہ ہے کہ وہ سربلند ہوتا ہے ۔ اس کی سربلندی کسی ایک واقعہ اور حادثہ میں محدود نہیں ہے ۔ اللہ عزیز ہے اور اس کے دوست کبھی ذلیل نہیں ہوتے اور وہ بہت بڑا حلیم ہے ۔ اس لئے وہ اپنے دوستوں کے لئے کامیاب پالیسی وضع فرماتا ہے اور اس نے ان کے مقدر میں کامیابی لکھ دی ہے ۔

یہ ایک مثال تھی کہ کس طرح اللہ نے اپنے رسول اور اپنے کلمات کو کامیابی عطا فرمائی اور اللہ تعالیٰ ایسی مثالیں دہرا سکتا ہے لیکن اس قسم کی امداد صرف ان لوگوں کو پہنچ سکتی ہے جو سستی نہیں کرتے اور بیکار نہیں بیٹھے ۔ اگر مسلمان ایسا نہ کریں گے تو اللہ دوسرے گروہ پیدا کر سکتا ہے ۔ یہ ایک واقعی اور عملی مثال تھی اور اس کو سمجھانے کے لئے کسی بڑی دلیل اور منطقی استدلال کی ضرورت ہی نہ تھی ۔

اس مثال کی فضا میں اور اس گہرے تاثر کی حالت میں اب اللہ تعالیٰ حکم فرماتے ہیں کہ تمام مسلمان اس مہم میں نکل کھڑے ہوں ' کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لائیں ' کوئی عذر ان کی راہ میں حائل نہ ہو ' نکل کھڑے ہوں اگر وہ دنیا میں کامرانی اور فتح مندی چاہتے ہیں اور آخرت میں دائمی فلاح چاہتے ہیں ۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ( ۹ : ۴۱ ) "نکلو ' خواہ ہلکے ہو یا بوجھل ' اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ ' یہ تمہارے لئے بہتر ہے ' اگر تم جانو ۔" ہر حال میں نکلو ' جانی اور مالی قربانی دو ' حجتیں نہ گڑھو اور عذرات نہ پیش کرو ' مشکلات اور رکاوٹوں کو پاٹتے جاؤ ۔

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ( ۹ : ۴۱ ) "تمہارے لئے یہ بہتر ہے ' اگر تم جانتے ہو ۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ مخلص مومنین ان حقائق کو پا گئے ۔ وہ تمام رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود نکل کھڑے ہوئے ۔ ان

کے پاس عذرات موجود تھے لیکن انہوں نے عذرات سے فائدہ نہ اٹھایا۔ تو اللہ نے ان کے سامنے زمین کے دروازے کھول دیئے۔ ان کے لئے لوگوں کے دل بھی کھل گئے۔ اور ان مخلصین کے ذریعے اللہ نے اپنے کلمے کو بلند کر دیا۔ اور اللہ کے کلمات کے ذریعے خود ان کو بلند اور ممتاز کر دیا۔ اور ان کے ہاتھوں وہ وہ کارنامے وجود میں آئے کہ آج بھی وہ تاریخ انسانی کا اعجوبہ ہیں۔

حضرت ابو طلحہ سورت توبہ پڑھ رہے تھے ' جب وہ اس آیت پر آئے تو انہوں نے فرمایا: "ہمارے رب نے ہمیں نکلنے کا حکم دیا ہے ' خواہ ہم بوڑھے ہوں یا نوجوان! بیٹو! مجھے تیار کرو ' اس کے بیٹوں نے کہا: "ابو تم پر اللہ کا رحم ہو ' تم نے تو رسول اللہ کے ساتھ جہاد کیا یہاں تک کہ وہ فوت ہو گئے ' تم نے حضرت ابوبکر کے ساتھ جہاد کیا یہاں تک کہ وہ فوت ہو گئے ' تم نے حضرت عمر کے ساتھ جہاد کیا یہاں تک کہ وہ فوت ہو گئے۔ اب تو ہم آپ کی طرف سے جہاد کریں گے۔ لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور بحری بیڑے میں چلے گئے۔ سمندر میں آپ کو موت نے آلیا۔ بحریہ کو کوئی جزیرہ نہ ملا کہ اسے دفن کر دے۔ نو دنوں کے بعد انہیں جزیرہ ملا۔ ان نو دنوں میں ان کے جسم میں کوئی تغیر واقع نہ ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اسے اس جزیرے میں دفن کر دیا۔"

ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ وہ ابو راشد حرانی سے روایت کرتے ہیں ' کہتے ہیں: "میں نے رسول اللہ کے سوا مقداد ابن اسود رضی اللہ عنہ سے ملا۔ یہ ایک صراف کے تابوت پر بیٹھے ہوئے تھے اور جہاد کا ارادہ رکھتے تھے۔ میں نے ان سے کہا: چچا آپ تو عند اللہ ور ہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم پر سورت البحوث نازل ہوئی ہے (یعنی توبہ)۔

انْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا (۹: ۴۱) "نکلو خواہ ہلکے ہو یا بوجھل۔" حبان ابن زید الشرعی سے روایت ہے کہ ہم صفوان ابن عمرو کے ساتھ جہاد پر نکلے ' یہ حمص کے گورنر تھے۔ ہم افسوس کی جانب جراجمہ کی طرف گئے۔ میں نے ایک ایسے بوڑھے کو دیکھا جس کی بھنویں اس کی آنکھوں پر گری ہوئی تھیں اور یہ اہل دمشق کے لوگوں سے تھا اور گھوڑے پر سوار تھا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہا اے چچا تم تو اللہ کے نزدیک رہو۔ کہتے ہیں اس بوڑھے نے اپنی دونوں بھنویں اوپر کو اٹھائیں اور کہا: بھتیجے اللہ نے تو ہم سے مطالبہ کیا ہے کہ نکلو اللہ کی راہ میں ہلکے ہو یا بوجھل۔ یاد رکھو ' جسے اللہ محبوب رکھتا ہے اسے مشکلات سے دوچار کرتا ہے اور پھر اسے صحیح و سلامت واپس لاتا ہے لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے صرف اس شخص کو آزمائش میں مبتلا کرتا ہے جو صبر کرے ' شکر کرے اور اسے یاد کرے اور اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرے۔

یہ تھی وہ جدوجہد اور جہاد مسلسل جس کے ذریعے اللہ نے اسلام کو دنیا میں پھیلایا اور اللہ کے ان بندوں نے تمام انسانیت کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ وحدہ کی بندگی میں داخل کر دیا۔ اور اسلام کی مدوجزر کی تاریخ میں وہ معجزہ رونما ہوا جس کی کوئی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۹۱ تشریح آیات

۴۲ ---- تا ---- ۹۳

یہاں سے ان لوگوں کے بارے میں تبصرہ شروع ہوتا ہے۔ جن سے اس موقعہ پر کمزوریوں اور کوتاہیوں کا ظہور ہوا۔ اس پورے سبق میں ان منافقین کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جو اسلام کے نام پر اسلامی صفوں میں گھسے ہوئے تھے ' خصوصاً اس وقت جب اسلام غالب ہوگیا تھا اور ان لوگوں کی سلامتی اور ان کے مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ یہ لوگ اسلام کے سامنے سرنگوں ہو جائیں اور اسلامی صفوں میں داخل ہوکر اسلام کے خلاف سازشیں کریں کیونکہ ظاہری حالات ایسے ہوگئے تھے کہ اسلام سے باہر رہ کر وہ اسلام کے خلاف کچھ نہ کر سکتے تھے۔

اس سبق میں وہ تمام حالات ہمارے سامنے آئیں گے جن کی طرف سے ہم نے اس سورت کے مقدمے میں اشارہ کیا تھا' ان حالات کی تصویرکشی قرآن کے الفاظ میں ہوگی۔ سورت کے آغاز میں ہم نے جو اصولی بحث کی تھی اس کی روشنی میں اب ان نصوص کو سمجھنا کوئی زیادہ مشکل کام ہرگز نہ ہوگا جیسا کہ پہلے ہم کہہ آئے ہیں۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّ سَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ
بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ
يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ ع ۵ ۶
لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَا يَسْتَاْذِنُكَ ۱۲
الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ
وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ
يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ

فَثَبَّطَهُمْ وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقَاعِدِينَ ﴿٤٦﴾ لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَا زَادُوكُمْ
إِلَّا خَبَالًا وَلَأَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيكُمْ سَمَّاعُونَ لَهُمْ ۗ
وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿٤٧﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوا لَكَ
الْأُمُورَ حَتَّىٰ جَاءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ كَارِهُونَ ﴿٤٨﴾

''اے نبی ''اگر فائدہ سہل الحصول ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور تمہارے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو جاتے 'مگر ان پر تو یہ راستہ بہت کٹھن ہو گیا۔ اب وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم چل سکتے تو یقیناً تمہارے ساتھ چلتے۔ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

اے نبی ''اللہ تمہیں معاف کرے 'تم نے کیوں انہیں رخصت دے دی؟ (تمہیں چاہئے تھا کہ خود رخصت نہ دیتے) تاکہ تم پر کھل جاتا کہ کون لوگ سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے ہو۔ جو لوگ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو کبھی تم سے یہ درخواست نہ کریں گے کہ انہیں اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے سے معاف رکھا جائے۔ اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔ ایسی درخواستیں تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں رکھتے 'جن کے دلوں میں شک ہے اور وہ اپنے شک ہی میں متردد ہو رہے ہیں۔

اگر واقعی ان کا ارادہ نکلنے کا ہوتا تو وہ اس کے لئے کچھ تیاری کرتے۔ لیکن اللہ کو ان کا اٹھنا پسند ہی نہ تھا۔ اس لئے اس نے انہیں سست کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھ رہو بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے تو تمہارے اندر خرابی کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے۔ وہ تمہارے درمیان فتنہ پردازی کے لئے دوڑ دھوپ کرتے اور تمہارے گروہ کا حال یہ ہے کہ ابھی ان میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو ان کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں' اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اس سے پہلے بھی ان لوگوں نے فتنہ انگیزی کی کوششیں کی ہیں اور تمہیں ناکام کرنے کے لئے یہ ہر طرح کی تدبیروں کا الٹ پھیر کر چکے ہیں یہاں تک کہ ان کی مرضی کے خلاف حق آ گیا اور اللہ کا کام ہو کر رہا۔''

اگر یہ معاملہ دنیاوی مفادات کا ہوتا اور ہوتا بھی سہل الحصول 'یا کوئی مختصر اور نفع بخش سفر ہوتا جس کے نتائج یقینی ہوتے تو یہ لوگ ضرور آپ کے ساتھ ہو لیتے۔ لیکن یہ سفر دور کا سفر ہے اور پر مشقت ہے اور ہمت شکن سفر ہے۔ کمزور ہمتوں اور ضعیف العزم لوگ جراءت کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہ سفر اس عظیم اور بلند نصب العین کی طرف ہے جس کو دیکھ کر کمزور ارواح کے لوگ ڈر جاتے ہیں 'کمزور دل والوں پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ اور کم ظرف لوگ اس سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

یہ مہم دراصل ایک مثالی مہم تھی اور انسانیت کی تاریخ میں ایسی مہمات ہمیشہ مثالی حیثیت رکھتی ہیں اور کسی بھی ملک کے لئے فخریہ حکایات و روایات فراہم کرتی ہیں۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ (۹ : ۴۲)
"اے نبی ﷺ ' اگر فائدہ سہل الحصول ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور تمہارے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو جاتے 'مگر ان پر تو یہ راستہ بہت کٹھن ہو گیا۔"

اگر مقام شرف و منزلت کی طرف بسہولت آگے بڑھا جا سکتا ہو ' تو امیدواران منزل بکثرت سامنے آ جاتے ہیں لیکن اگر راستہ دشوار گزار ہو تو لوگوں کی بڑی تعداد پہلوتہی کرتی ہے۔ اور راستے کی مشکلات کی خاطر لشکر سے پیچھے رہ جاتی ہے اور ان کے پیش نظر دنیا کا نہایت ہی بے قیمت اور بے حقیقت مقصد ہوتا ہے۔ ہر دور اور ہر زمانے میں ایسے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں اور مشہور و معروف ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ شاذ و نادر نہیں ہوتے بلکہ ایسے لوگ تو ہر زمانے میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ زندگی کے ایک کنارے پر بے وقعت مقام کے مکین ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ اپنے زعم میں یہ خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے قیمتی مفادات حاصل کئے ' انہوں نے اعلیٰ دنیاوی مقاصد پا لئے اور وہ کسی بھی مقصد کے لئے اعلیٰ قربانیاں دینے سے بچ گئے۔ لیکن انہیں معلوم نہیں کہ کوئی جس قدر قیمت دے گا ' اسے اس کی قیمت ہی کے مطابق مقام ملے گا۔ اس دنیا میں بھی کسی کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ قیمت ادا کرتا ہے۔

وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ (۹ : ۴۲) "اب وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم چل سکتے تو یقیناً تمہارے ساتھ چلتے۔" یہ وہ جھوٹا عذر ہے جو ہمیشہ کمزور لوگ پیش کیا کرتے ہیں۔ عذرات پیش کرنے والے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر عذرات پیش کرنے والے قوی اور بہادر نظر آئیں لیکن درحقیقت یہ کمزور قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بہادر وہ ہوتا ہے جو مشکلات کا سامنا کرتا ہے اور ضعیف وہ ہوتا ہے جو پہلوتہی کرتا ہے۔ یہ وہ اصول ہے جس میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ یہ اصول ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ (۹ : ۴۲) "وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔" یہ جھوٹ بول کر اور جھوٹی قسمیں کھا کر ' وہ سمجھتے ہیں کہ وہ لوگوں کے نزدیک گویا کامیاب ہو گئے ' حالانکہ حقیقت حال کا علم تو اللہ کو ہے کہ یہ کامیاب نہیں ہیں اور اللہ ان کی حقیقت کو لوگوں کے سامنے کھول بھی سکتا ہے ' لہٰذا یہ لوگ دنیا میں بھی اپنے جھوٹے عذرات کی وجہ سے بے وقعت ہوں گے اور آخرت میں بھی کیونکہ آخرت میں تو کوئی بہانہ نہ چلے گا۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۹ : ۴۲) "اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔"

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (۹ : ۴۳)

"اے نبی ﷺ ' اللہ تمہیں معاف کرے ' تم نے کیوں انہیں رخصت دے دی؟ (تمہیں چاہئے تھا کہ خود رخصت نہ دیتے) تاکہ تم پر کھل جاتا کہ کون لوگ سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے ہو۔"

اللہ تعالیٰ اپنے رسول پر اس قدر مہربان ہے کہ عتاب سے پہلے ہی معافی کا اعلان فرماتا ہے۔ جب ان لوگوں نے جھوٹے عذرات پیش کئے تو رسول اللہ نے ان کے عذرات قبول کر لئے اور ایسے لوگوں نے ان عذرات کی اوٹ میں اپنے آپ کو

چھپایا۔ حضور ؐ نے ان لوگوں کے عذرات کو اس لئے قبول کر لیا تھا کہ اس وقت سچے اور جھوٹے عذرات کی تحقیقات کا موقعہ نہ تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ بعض لوگ لشکر سے بلا کسی عذر کے پیچھے رہ جائیں اور اس طرح ان کی حقیقت عامۃ الناس پر کھل جائے اور پردۂ نفاق بھی گر جائے۔ اور ننگے ہو کر رہ جائیں اور لوگوں کے سامنے ان کی حقیقت کھل جائے اور ان کے لئے اذن رسول کا بہانہ بھی نہ رہے۔

حضور ؐ نے چونکہ منافقین کے نفاق کا انکشاف نہ کیا تھا' اس لئے اللہ نے یہاں ایسے اصول اور ایسی صفات کو بیان کر دیا جن کی روشنی میں منافقین کو اچھی طرح پہچانا جا سکے۔ اور یہ صفات مومنین اور منافقین کے درمیان امتیازی صفات ہوں۔

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ (۹ : ٤٤) ”جو لوگ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو کبھی تم سے یہ درخواست نہ کریں گے کہ انہیں اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے سے معاف رکھا جائے۔ اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔“

إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ (۹ : ٤٥) ”ایسی درخواستیں تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں رکھتے' جن کے دلوں میں شک ہے اور وہ اپنے شک ہی میں متردد ہو رہے ہیں۔“

یہ وہ اصول ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتا۔ جو لوگ صحیح معنوں میں اللہ پر ایمان لے آتے ہیں اور جن کو یقین ہوتا ہے کہ ایک دن انہوں نے اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ وہ اس بات کا انتظار نہیں کرتے کہ وہ جہاد سے پیچھے رہنے کی اجازت لیں۔ اور جب بھی ان کو اللہ کی راہ میں جان اور مال قربان کرنے کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ ایک منٹ کے لئے بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ بلکہ وہ ہلکے ہوں یا بوجھل ہوں' اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں' اطاعت امیر کرتے ہیں اور ان کو یقین ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے ملنے والے ہیں۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ ان کو پوری پوری جزا دے گا اور ان سے راضی ہو گا۔ وہ جہاد کے لئے اس قدر بے تاب ہوتے ہیں کہ از خود اس عمل کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور انہیں اس بات کی ضرورت نہیں پڑتی کہ کوئی انہیں اس کے لئے جوش دلائے' جہاد سے پیچھے رہنے کے لئے عذرات پیش کرنا تو بہت بڑی بات ہے۔ عذرات تو صرف وہ لوگ پیش کرتے ہیں جن کے دل ایمان و یقین کی دولت سے خالی ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ پس و پیش کرتے ہیں اور عذرات تلاش کر کے چھٹیاں لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس عقیدے کا انہوں نے اظہار کیا ہے اس کے تقاضے پورے کرنے سے ان کی راہ میں رکاوٹیں ہیں۔ در حقیقت وہ شک کے مریض ہوتے ہیں اور متردد ہوتے ہیں۔

اللہ کی طرف جو راستہ جاتا ہے وہ واضح ہے اور بالکل سیدھا ہے۔ اس سلسلے میں تردد اور پس و پیش وہی شخص کر سکتا ہے جو دولت یقین سے محروم ہو یا وہ شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ رسول برحق ہیں۔ لیکن ذاتی کمزوریوں کی وجہ سے وہ مشکلات راہ سے گھبرا جاتا ہے۔

اس موقعہ پر جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے وہ لشکرکشی کی قدرت رکھتے تھے۔ ان کے پاس وسائل سفر موجود تھے' سازوسامان بھی موجود تھا۔

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً ( ۹ : ۴۶ ) "اگر واقعی ان کا ارادہ نکلنے کا ہوتا تو وہ اس کے لئے کچھ تیاری کرتے۔" ایسے لوگوں کے سرخیل عبداللہ ابن ابی ابن سلول تھے' جد ابن قیس بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ یہ اپنے قبائل کے معتبرین میں سے تھے اور بااثر اور مالدار تھے۔

وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ( ۹ : ۴۶ ) "لیکن اللہ کو ان کا اٹھنا پسند ہی نہ تھا' اس لئے انہوں نے انہیں سست کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھ رہو' بیٹھنے والوں کے ساتھ۔"

اللہ کو ان لوگوں کے مزاج اور ان کے نفاق کا علم تھا اور ان لوگوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف بغض و عداوت جس طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس کا تذکرہ آگے آ رہا ہے۔ اس لئے اللہ نے انہیں اس موقع پر بٹھا دیا اور ان کی ہمت ہی ختم کر دی۔ یہ لوگ وروں اور عورتوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ بچوں اور ناداروں کے ساتھ وہ پیچھے رہ گئے جو حقیقتاً اس لشکر میں جانے کی طاقت و وسائل نہ رکھتے تھے۔ لہٰذا گری ہوئی ہمتوں اور کمزور یقین رکھنے والوں کے لئے بہتر یہی تھا کہ وہ بیٹھے رہیں اور اس اعزاز سے محروم رہیں۔ اور اس میں دعوت اسلامی کی بھلائی تھی۔

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَاوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ( ۹ : ۴۷ ) "اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے تو تمہارے اندر خرابی کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے۔ وہ تمہارے درمیان فتنہ پردازی کے لئے دوڑ دھوپ کرتے اور تمہارے گروہ کا حال یہ ہے کہ ابھی ان میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو ان کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں' اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔"

پست ہمت اور بزدل پوری فوج کو پست ہمت اور بزدل بنا دیتے ہیں اور خیانت کار پوری سوسائٹی کو خائن بنا دیتے ہیں۔ اگر یہ منافقین مسلمانوں کے ہمراہی بن بھی جاتے تو اسلامی صفوں کے اندر بے چینی' بزدلی اور انتشار پیدا کر دیتے اور اسلامی فوج کے اندر فتنہ و فساد اور تفرقہ اور خذلان پیدا کر دیتے' یہ اس لئے کہ مسلمانوں کے اندر بھی ایسے لوگ موجود تھے جن کے ان سابقہ قائدین کے ساتھ سماجی تعلقات تھے اور ابھی تک مسلمان ان لوگوں کی باتوں پر کان دھرتے تھے لیکن اللہ اپنی دعوت کا محافظ خود تھا اور وہ داعیوں کی نگہبانی بھی اپنی نگرانی میں کر رہا تھا۔ اللہ نے مومنین کو فتنے سے اس طرح بچایا کہ منافقین اور ذلیل لوگ بیٹھے ہی رہ گئے۔

وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ( ۹ : ۴۷ ) "اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔" یہاں ظالموں سے مراد مشرک ہیں۔ زیر بحث لوگوں کو بھی اللہ نے مشرکین کے زمرے میں ڈال دیا ہے۔ ان کا ماضی ان کے دلوں کا غماز ہے۔ اور ان کی بدفطرتی پر ان کی تاریخ گواہ ہے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے رسول خدا ﷺ کی راہ روکی۔ اور تحریک اسلامی کی مخالفت میں انہوں

نے وہی کچھ کیا جو ان لوگوں کے بس میں تھا۔ لیکن جب تحریک اسلامی غالب ہوئی تو انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا البتہ ان کے دلوں میں نفاق کی بیماری موجود رہی۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ حَتَّى جَاءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ كَارِهُونَ (۹:۴۸) ''اس سے پہلے بھی ان لوگوں نے فتنہ انگیزی کی کوششیں کی ہیں اور تمہیں ناکام کرنے کے لئے یہ ہر طرح کی تدبیروں کا الٹ پھیر کر چکے ہیں یہاں تک کہ ان کی مرضی کے خلاف حق آ گیا اور اللہ کا کام ہو کر رہا۔''

یہ واقعہ اس وقت ہوا جب حضور ؐ عوامی تائید کے ذریعے مدینہ تشریف لائے اور حالات یہ تھے کہ ابھی تک انہیں اپنے دشمنوں پر فیصلہ کن غلبہ حاصل نہ ہوا تھا اور مدینہ میں جب حضور ؐ کو کامیابیاں نصیب ہوتی رہیں تو ان اعداء نے بھی سر جھکا دیے لیکن دل سے وہ تحریک جدید کو بدستور ناپسند کرتے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ اسلام پر کوئی برا وقت آئے اور انہیں ریشہ دوانیوں کا موقعہ ملے۔

---000---

اب قرآن کریم ان لوگوں کی مختلف اقسام کی طرف اشارات کرتا ہے اور ان کے جعلی عذرات پر بھی کلام ہوتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ رسول اللہ کے خلاف ان کے سینوں میں کیا کیا عناد اور بغض بھرے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف وہ کس قدر کینہ رکھتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُولُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ؕ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

''ان میں سے کوئی ہے جو کہتا ہے کہ ''مجھے رخصت دے دیجئے اور مجھ کو فتنے میں نہ ڈالئے۔'' سن رکھو! فتنے ہی میں

تو یہ لوگ پڑے ہوئے ہیں اور جہنم نے ان کافروں کو گھیر رکھا ہے۔

تمہارا بھلا ہوتا ہے تو انہیں رنج ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ منہ پھیر کر خوش خوش پلٹتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ اچھا ہوا ہم نے پہلے ہی اپنا معاملہ ٹھیک کر لیا تھا۔ ان سے کہو "ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے' اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے اور اہل ایمان کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

ان سے کہو' "تم ہمارے معاملہ میں جس چیز کے منتظر ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہے۔ اور ہم تمہارے معاملہ میں جس چیز کے منتظر ہیں۔ وہ یہ ہے کہ اللہ خود تم کو سزا دیتا ہے یا ہمارے ساتھ دلواتا ہے؟ اچھا تو اب تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔"

محمد ابن اسحاق نے زہری وغیرہ سے روایت کی ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کی تیاریوں میں مصروف تھے (تبوک کے موقع پر) تو آپ نے بنو سلمہ کے بھائی جد ابن قیس سے کہا کہ جد کیا تم کو بنی اصغر (رومیوں) کے ساتھ جہاد میں دلچسپی ہے؟ تو اس نے کہا حضور' آپ مجھے اجازت ہی دے دیں اور فتنے میں نہ ڈالیں؟ خدا کی قسم میری قوم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھ سے زیادہ عورتوں کے ساتھ دلچسپی لینے والا کوئی نہیں ہے۔ اور مجھے یہ خوف ہے کہ اگر میں نے بنی الاصفر (رومیوں) کی عورتوں کو دیکھا تو میں صبر نہ کر سکوں گا۔ رسول اللہ نے اس سے منہ پھیر لیا اور کہا= "میں نے تمہیں اجازت دے دی۔" تو اس جد ابن قیس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

تمام منافقین اسی قسم کے عذرات پیش کرتے اور اللہ نے ان کو یہی جواب دیا۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ

بِالْكٰفِرِيْنَ (۹: ۴۹) "ان میں سے کوئی ہے جو کہتا ہے کہ "مجھے رخصت دے دیجئے اور مجھ کو فتنے میں نہ ڈالئے ..... سن رکھو! فتنے ہی میں تو یہ لوگ پڑے ہوئے ہیں اور جہنم نے ان کافروں کو گھیر رکھا ہے۔" منظرکشی اس طرح ہے کہ گویا جہنم ایک فتنہ ہے۔ اور یہ لوگ اس میں گرتے جا رہے ہیں۔ جہنم ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور ان کے بچنے کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ اور جہنم کا واحد راستہ کھلا ہے اور یہ لوگ آتے جاتے ہیں اور گرتے جاتے ہیں۔ یہ انداز تعبیر اس بات سے کنایہ ہے کہ انہوں نے پیچھے رہ کر ایک عظیم غلطی کا ارتکاب کر لیا ہے اور اب عذاب جہنم ان کے لئے حتمی ہے۔ اور یہ جزاء ان کے لئے جہاد سے پیچھے رہ جانے 'گرا ہوا موقف اپنانے اور بھونڈے عذرات پیش کرنے کی وجہ سے مقدر ہو چکی ہے۔ اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اگرچہ یہ لوگ اظہار اسلام کرتے ہیں لیکن درحقیقت یہ منافق ہیں اور کافروں سے بدتر ہیں۔

ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ یہ رسول اللہ اور مسلمانوں کی بھلائی نہیں چاہتے اور اس بات پر بہت کڑھتے ہیں کہ رسول اللہ اور مسلمانوں کو کوئی برتری نصیب ہو۔

اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَ اِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَ

يَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ (۹ : ۵۰) "تمہارا بھلا ہوتا ہے تو انہیں رنج ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ منہ پھیر کر خوش خوش پلٹتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ اچھا ہوا ہم نے پہلے ہی اپنا معاملہ ٹھیک کر لیا تھا" اگر مسلمانوں پر کوئی مصیبت آئے تو یہ خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے تو پہلے سے احتیاطی تدابیر اختیار کر لی تھیں اس لئے ہم بچ گئے اور ہمیں ان مشکلات سے دوچار ہونا نہ پڑا اور اپنی جگہ یہ خوشیاں مناتے ہیں۔

لیکن یہ بہت ہی کم عقل ہیں۔ صرف ظاہری باتوں پر ان کی نظر ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ مصائب ہر حال میں برے ہوتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ گھروں میں بیٹھ کر اور جہاد سے پیچھے رہ کر انہوں نے بھلائی کما لی۔ حالانکہ ان کے دلوں میں اطاعت الہی نہ رہی اور انہوں نے رضائے الہی کے مقصد عظیم کو گنوا دیا۔ حالانکہ ان کی بھلائی تو تسلیم و رضا اور جہاد میں تھی۔ ایک سچا مسلمان تو ہوتا ہی وہ ہے جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کرتا ہے' آگے ہی بڑھتا ہے اور ڈرتا نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ خیر و شر تو اللہ کی طرف سے آتا ہے اور اللہ ہی ناصر اور معین ہے۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

(۹ : ۵۱) "ان سے کہو "ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے' اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے اور اہل ایمان کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔" اور اللہ نے تو مومنین کے حق میں فتح لکھ دی ہے اور ان کے ساتھ آخری فتح کا وعدہ بھی کر رکھا ہے۔ ان کو چاہئے جس قدر مشکلات بھی پیش آئیں' وہ عظیم ابتلاؤں کے ساتھ دوچار کیوں نہ ہوں' آخر کار ان کو فتح نصیب ہوگی اور یہ مشکلات اس فتح کی تمہید ہیں تاکہ مسلمانوں کو جب فتح نصیب ہو تو نظر آئے کہ وہ اس کے مستحق ہیں۔ اور یہ کہ وہ ان کی صفوں کو چھان کر صاف کر دیا جائے اور یہ فتح و نصرت' دنیاوی ذرائع اور وسائل کے اندر ہو اور مشکلات کے بعد ہو تاکہ مسلمان اس قدر و منزلت کا احساس کریں' اور یہ فتح بلند ہمت لوگوں کی عظیم قربانیوں کے نتیجے میں حاصل ہو۔ ابتلاؤں کے بعد حاصل ہو اور لوگوں نے اس کے لئے قربانیاں دی ہوں۔ اور حقیقی ناصر چونکہ اللہ ہی ہے اس لئے مسلمان ہمیشہ اسی پر بھروسہ کرتے ہیں' اپنی قربانیوں پر نہیں کرتے۔ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۹ : ۵۱) لیکن اللہ کی تقدیر پر ایمان اور اللہ پر بھروسہ اس بات کے منافی نہیں ہیں کہ کوئی کسی کام کے لئے تیاری کرے اور ضروری وسائل جمع کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاد کے بارے میں اللہ کا صریح حکم ہے کہ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ "کہ تیار رکھو دشمنوں کے لئے اس قدر قوت جو تمہاری استطاعت کے اندر ہو۔" اور جو شخص اللہ کے احکام کو نافذ نہ کرے گا' اس کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ متوکل ہے۔ پر توکل بازو استرمید اور جو شخص حکم الہی کے مطابق اسباب مہیا نہیں کرتا وہ سنت الہی کے ادراک سے قاصر ہے جو اس کائنات میں جاری و ساری ہے۔ یہ سنت اٹل ہے اور وہ کسی کی رو و رعایت نہیں کرتی۔

مومن پر تو ہر حال میں وارے نیارے ہیں' اگر اسے فتح ملے تو بھی کامیاب شہادت ملے تو بھی کامیاب۔ رہا کافر تو وہ ہر طرح ناکام ہے۔ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں دنیا ہی میں عذاب پالے اور جہنم رسید ہو تو بھی ناکام اور طبعی موت مرنے کے بعد جہنم رسید ہو تو بھی ناکام۔

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ (۹ : ۵۲) "ان سے کہو "تم ہمارے معاملہ میں جس چیز کے منتظر ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہے۔ اور ہم تمہارے معاملہ میں جس چیز کے منتظر ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ خود تم کو سزا دیتا ہے یا ہمارے ہاتھوں دلواتا ہے؟ اچھا تو اب تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔"

آخر منافقین مسلمانوں کے بارے میں کس بات کا انتظار کریں۔ مسلمانوں کو ہر حال میں بھلائی اور کامیابی کی توقع ہے۔ یا تو فتح مند ہوں گے اور اللہ کا کلمہ بلند کر دیں گے اور یہ کامرانی اس جہاں کی ہے۔ یا انہیں شہادت نصیب ہوگی اور شہید اعلیٰ درجات پر فائز ہوتا ہے۔ ہاں مومنین ضرور انتظار کریں کہ منافقین کا انجام کیا ہوتا ہے۔ ان کو اس طرح عذاب سے دوچار ہونا ہوگا۔ جس طرح تمام مکذبین عذاب سے دوچار ہوئے یعنی آخرت میں اور یا یہ ہوگا کہ وہ اس دنیا ہی میں پکڑے جائیں گے جس طرح تمام اہل باطل پکڑے جاتے ہیں۔ لہٰذا دونوں گروہوں کا انجام مشہور و معروف ہے۔

پیچھے رہنے والوں میں سے اور انتظار کرنے والوں میں سے بعض ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے اپنا مالی تعاون پیش کر دیا تھا لیکن ذاتی طور پر جہاد میں شرکت سے وہ دوری کا اظہار کر رہے تھے اور یہ رویہ وہ اس لئے اختیار کر رہے تھے کہ وہ بدنام بھی نہ ہوں اور بین بین رہیں نہ ادھر کے نہ ادھر کے۔ چنانچہ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ ان جیسے لوگوں کے مالی تعاون کو مسترد کر دیں کیونکہ یہ لوگ مالی تعاون کی پیشکش خوف اور دکھاوے کے لئے کرتے ہیں۔ ایمان کے تقاضوں اور اللہ پر بھروسے کی وجہ سے وہ یہ انفاق نہیں کر رہے۔ خواہ وہ یہ کام دکھاوے کے لئے کر رہے ہوں اور اہل ایمان کو دھوکہ دے رہے ہوں یا مشرکین کے ڈر کی وجہ سے کر رہے ہوں۔ دونوں صورتوں میں ان کا یہ فعل اللہ کے نزدیک مردود ہے اور اللہ کے ہاں اس کا کوئی اجر نہیں ہے۔

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝

"ان سے کہو "تم اپنے مال خواہ راضی خوشی خرچ کرو یا بکراہت' بہرحال وہ قبول نہ کئے جائیں گے۔ کیونکہ تم فاسق لوگ ہو۔ ان کے دیئے ہوئے مال قبول نہ ہونے کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے کفر کیا ہے' نماز کے لئے آتے ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے ہیں اور راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں تو بادل ناخواستہ خرچ کرتے ہیں"۔

ہر دور میں منافقین کے یہی خدوخال ہوتے ہیں۔ وہ ہر وقت خوف اور پیچ و تاب میں ہوتے ہیں۔ ان کے دل خالی خالی اور ضمیر اور ان کی سوچ یکسوئی سے تہی دامن ہوتی ہے۔ ان کے مظاہر میں حقیقت کی روح نہیں ہوتی اور ان کا ظاہر

ان کے باطن سے بالکل جدا ہوتا ہے۔

ذرا قرآن کے انداز تعبیر کو دیکھو وَلَا يَأْتُونَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى (۹: ۵۴) (نماز کے لئے آتے ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے)۔ وہ نماز دکھاوے کے لئے پڑھتے ہیں وہ ظاہراً تو نماز ہوتی ہے لیکن ان کے اندر نماز کی روح نہیں ہوتی۔ وہ نماز کو درست کر کے استقامت کے ساتھ نہیں پڑھتے۔ کیونکہ نماز پڑھنے پر جو جذبہ مجبور کرتا ہے وہ ان کے دل اور اندرون میں نہیں ہوتا بلکہ بعض بیرونی اسباب کے دباؤ کی وجہ سے وہ اس طرف مجبور ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں یہ فعل مجبوراً کرنا پڑ رہا ہے۔ اس طرح وہ اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کرتے وہ بھی محض ظاہر داری کے لئے کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ مقبول نہیں ہیں کیونکہ اللہ کسی بھی عبادت کو قبول نہیں کرتا جو دلی جذبہ اور شعوری ایمان کے نتیجے میں نہ ہو۔ لہٰذا معیار یہ ہے کہ اچھا عمل ہو اور اچھی نیت سے کیا جائے۔

یہ منافقین اصحاب مال و اولاد تھے لیکن یہ جہاد کو ناپسند کرتے تھے اور بڑے بااثر لوگ تھے۔ لیکن اللہ کے نزدیک مال و دولت اور جاہ و شرف کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لہٰذا رسول اور اہل ایمان کے نزدیک بھی مال و دولت اور جاہ و شرف کی کوئی اہمیت نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ چیزیں اللہ کے ایسے انعامات نہیں ہیں کہ وہ ان کے ذریعے مزے لوٹتے رہیں اور ان سے کوئی بازپرس نہ ہو بلکہ یہ تو ایک فتنہ اور آزمائش ہے۔ اس پر ان سے باز پرس ہوگی اور ان کو سزا ہوگی۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝

”ان کے مال و دولت اور ان کی کثرت اولاد کو دیکھ کر دھوکا نہ کھاؤ‘ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ انہی چیزوں کے ذریعہ سے ان کو دنیا کی زندگی میں بھی مبتلائے عذاب کرے اور یہ جان بھی دیں تو انکار حق ہی کی حالت میں دیں“۔

مال و اولاد تو کبھی ایک نعمت ہوتے ہیں اور اس سے اللہ اپنے بندوں میں سے کسی کو نوازتے ہیں اور پھر اسے توفیق دیتے ہیں کہ وہ اس کا شکریہ ادا کرے۔ اور اپنی اس قوت کو اصلاح فی الارض کے لئے استعمال کرے۔ اس کے ذریعے اللہ کی طرف متوجہ ہو اور اس طرح اس کا ضمیر مطمئن ہو۔ اس کے نفس میں سکون و اطمینان ہو اور اسے اپنے انجام‘ اچھے انجام کا پورا پورا یقین ہو۔ اور اس کا طرز عمل ایسا ہو کہ وہ نہایت اخلاص کے ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کرتا ہو اور آخرت کے لئے توشہ جمع کرتا ہو اور جب اسے مالی یا جانی نقصان ہو تو بھی وہ اسے اللہ کی طرف سے سمجھے اور اللہ کی رحمت کا امیدوار ہوتا ہے اور یہی مال و اولاد کبھی اللہ کی جانب سے سزا ہوتے ہیں اور یہ سزا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو دنیا ہی میں دے دیتا ہے۔ چنانچہ یہ اموال اور اولاد اس کے لئے موجب قلق اور اذیت ہوتے ہیں اور اس قلق اور پریشانیوں کی وجہ سے وہ جہنم میں ہوتا ہے اور زیادہ مال و دولت کو مزید بڑھانے کے لئے اس کی راتوں کی نیند ختم ہو جاتی ہے اور وہ اعصابی طور پر شل ہو جاتا ہے۔ اب اسے انفاق مال اتلاف مال کے برابر نظر آتا ہے۔ اگر اس کی اولاد بیمار ہو تو بھی وہ کڑھتا ہے اور اگر اولاد تندرست ہو تب بھی اس کے لئے باعث اذیت ہوتی ہے۔ بے شمار ایسے لوگ موجود ہیں کہ ان کے لئے خود ان کی اولاد وبال جان ہوتی ہے۔

اس قسم کے لوگ رسول اللہ کے دور میں موجود تھے ۔ اب بھی یہ موجود ہیں اور ہمیشہ موجود رہیں گے ۔ ان کے پاس دولت ہوگی ، ان کی اولاد ہوگی ، لوگ ان کی ظاہری پوزیشن کو دیکھ کر ان سے متاثر ہوں گے لیکن در حقیقت یہ سب کچھ ان کے لئے عذاب ہو گا ، اس دنیا میں عذاب اور ان کے اندرون اور انجام سے چونکہ اللہ خوب واقف ہے ۔ اس لئے وہ جہنم کے لئے پابہ رکاب ہوتے ہیں ۔ پس حالت کفر پر ان کی موت کی دیر ہوتی ہے ۔ جان دیتے ہی وہ جہنم رسید ہو جاتے ہیں ۔

قرآن کا انداز تعبیر و تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ (۹: ۵۵) سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ لوگ نفسیاتی طور پر فرار اور ہلاکت کی حالت میں ہیں ۔ ان کی حالت کچھ اس طرح ہے کہ وہ سکون ، ٹھہراؤ اور اطمینان کی دولت سے محروم ہیں ۔ لہٰذا جس طرح وہ آخرت میں سخت عذاب میں ہوں گے ، اسی طرح یہ دنیا بھی ان کے لئے جہنم سے کم نہیں ہے ۔ تو گویا دنیا و آخرت دونوں میں وہ عذاب میں ہوں گے ۔ اور اس قسم کے مال و دولت اور ایسی اولاد کی ، ظاہر ہے ، کہ کوئی معقول شخص خواہش مند نہ ہو گا جس کے اندر عذاب ہی عذاب پوشیدہ ہو ۔

---ooo---

اس قسم کے منافقین اسلامی صفوں میں اپنے لئے مقام پیدا کر رہے تھے ۔ وہ اسلامی صفوں میں اپنے اعتقادات اور اپنے ایمان کی وجہ سے نہیں گھس رہے تھے بلکہ وہ نفاق کے مرض میں مبتلا تھے اور خوف کی وجہ سے بھی وہ مسلمانوں کے ساتھ ہاں میں ہاں ملاتے تھے ۔ ان کے کچھ مفادات تھے اور حالات سے بھی وہ مجبور تھے ۔ یہ لوگ قسمیں اٹھا اٹھا کر اپنے اسلام کا یقین دلاتے تھے کہ وہ سچے مسلمان ہیں اور انہوں نے اپنے اعتقادات اور نظریات کی وجہ سے ایمان کا اظہار کیا ہے ۔ لیکن اس سورت نے ان کے اندرون کو ظاہر کر دیا ہے ۔ اسی وجہ سے اسے "کاشفہ" اور "فاضحہ" بھی کہا جاتا ہے ۔ اس نے منافقین کا پردہ چاک کر کے انہیں اچھی طرح شرمندہ کر دیا ہے ۔

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ۝ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ۝

"وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تمہی میں سے ہیں ، حالانکہ وہ ہرگز تم میں سے نہیں ہیں ۔ اصل میں تو وہ ایسے لوگ ہیں جو تم سے خوفزدہ ہیں ۔ اگر وہ کوئی جائے پناہ پالیں یا کوئی کھوہ یا گھس بیٹھنے کی جگہ ، تو بھاگ کر اس میں جا چھپیں" ۔

یہ پرلے درجے کے بزدل ہیں اور انداز بیان ایسا ہے کہ یہ لوگ مجسم طور پر بھاگتے اور سہمے ہوئے کھڑے نظر آتے ہیں ۔ ان کے نفس اور دل میں فرار ہے ۔ ان کے رویے میں فرار اور خوف ہے ۔

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ (۹: ۵۷)

"اگر وہ کوئی جائے پناہ پالیں یا کوئی کھوہ یا گھس بیٹھنے کی جگہ ، تو بھاگ کر اس میں جا چھپیں" ۔ یہ ہر وقت چھپ جانے کی جگہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور جائے امن کی تلاش میں رہتے ہیں ۔ قلعہ بند جگہ یا غار اور تہ خانہ ۔ یہ خوفزدہ اور فرار کی

حالت میں ہوتے ہیں۔گویا کوئی ان دیکھی قوت یا اچانک آنے والی مصیبت ان کا پیچھا کر رہی ہو۔یہ روحانی طور پر شکست خوردہ اور بزدل ہیں۔

وَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ (۹ : ۵۶) "وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تمہی میں سے ہیں"۔بہت بہت تاکیدوں کے ساتھ حلف اٹھاتے ہیں تاکہ یہ لوگ وہ باتیں چھپا دیں جو ان کے دلوں میں ہیں اور ان کا کسی طرح انکشاف نہ ہونے پائے اور ان کی جان و مال محفوظ رہ جائیں۔ان کی صورت حال نہایت ہی قابل رحم ہے۔بزدل' ریاکاری اور چاپلوسی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور قرآن ان کے لئے ایسے ہی اسالیب استعمال کر رہا ہے۔عجیب تصویر کشی ہے جس کے ذریعے ان کے خفیہ بھیدوں کا ایکسرے ہو جاتا ہے اور نہایت ہی موثر انداز میں۔

---○○○---

اس سے آگے بھی منافقین پر تبصرہ جاری ہے۔اور ان کے اقوال اعمال اور نیات پر کلام ہے۔ان کی نیتوں کے بارے میں انکشافات ہیں جن کو چھپانے کا انہوں نے بہت ہی احتیاط کے ساتھ اہتمام کیا تھا۔لیکن وہ پھر بھی چھپا نہ سکے۔کیونکہ وہ حضور ؐ کی جانب سے تقسیم صدقات کے بارے اعتراض کرتے ہیں۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت پر نکتہ چینی آخر ایک مسلمان کیسے کر سکتا ہے۔آپ ؐ تو معصوم ہیں اور خلق عظیم کے مالک ہیں۔پھر ان میں سے بعض حضور ؐ کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص کانوں کا کچا ہے۔ہر شخص کی بات سنتا ہے اور ہر شخص کو سچا سمجھتا ہے۔حالانکہ حضور نبی اور صاحب بصیرت ہیں' مفکر و مدبر ہیں اور ان کو حکمت کے خزانے دیئے گئے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو اپنے کافرانہ اور فاجرانہ عقائد و اعمال کو اچھی طرح چھپاتے ہیں لیکن جب ان کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے تو جھوٹی قسموں کا سہارا لیتے ہیں تاکہ اپنے معاملات و اعمال کو چھپا سکیں۔اور بعض تو ایسے سہمے اور ڈرے رہتے ہیں کہ کہیں ان کے بارے میں نبی پر سورت ہی نازل نہ ہو جائے۔

ان جیسے لوگوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا جاتا ہے کہ منافقین کے یہ خدوخال ہیں اور ان میں اور ان سے پہلے گزرے ہوئے منافقین کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور جس طرح اللہ نے ازمنہ سابقہ کے منافقین کو ہلاک کیا تھا ان کو بھی ہلاک کر دے گا اور جس طرح اللہ نے ان کو مہلت دی تھی ان کو بھی دی جا رہی ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ جھوٹے منافقین کون ہوتے ہیں اور سچے مومنین کیسے ہوتے ہیں۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا
وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ
اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗۤ ۙ اِنَّآ
اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا ع
۱۳ وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ

السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۶۰

"اے نبی ؐ، ان میں سے بعض لوگ صدقات کی تقسیم میں تم پر اعتراضات کرتے ہیں، اگر اس مال میں سے انہیں کچھ دے دیا جائے تو خوش ہو جائیں، اور نہ دیا جائے تو بگڑنے لگتے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ اللہ اور رسول ؐ نے جو کچھ بھی انہیں دیا تھا اس پر وہ راضی رہتے اور کہتے کہ "اللہ ہمارے لئے کافی ہے، وہ اپنے فضل سے ہمیں اور بہت کچھ دے گا اور اس کا رسول بھی ہم پر عنایت فرمائے گا، ہم اللہ ہی کی طرف نظر جمائے ہوئے ہیں"۔

یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں اور ان لوگوں کے لئے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں، اور ان کے لئے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو۔ نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرضداروں کی مدد کرنے میں اور راہ خدا میں اور مسافرنوازی میں استعمال کرنے کے لئے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔

یعنی بعض منافقین ایسے جری ہیں کہ وہ علانیہ یا اشاروں سے آپ کے انتظام تقسیم صدقات کے بارے میں نکتہ چینی کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انصاف کے بجائے آپ اپنی پسند کے مطابق تقسیم کرتے ہیں اور یہ نکتہ چینی وہ قیام عدل یا سچائی کی حمایت یا دینی غیرت کے پاک جذبوں کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ ذاتی مفادات، طمع و لالچ اور اپنے منافع اور خودداری کی وجہ سے وہ ایسا کرتے ہیں۔

فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ (۹ : ۵۸) "اگر اس مال میں سے انہیں کچھ دے دیا جائے تو خوش ہو جائیں، اور نہ دیا جائے تو بگڑنے لگتے ہیں"۔ اگر ان کو دیا جائے تو خوش ہو جاتے ہیں پھر انہیں عدل و انصاف کی کوئی پروا نہیں ہوتی اور نہ ان کی دینی غیرت جاگتی ہے۔ ان آیات کے نزول کے بارے میں بہت سی روایات وارد ہیں جن میں بعض متعین لوگوں کے واقعات کی نشاندہی کی گئی ہے جنہوں نے حضور ؐ کے منصفانہ تقسیم صدقات پر اعتراضات کئے تھے۔

بخاری اور نسائی نے ابو سعید خدری سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضور ؐ صدقات کی تقسیم میں مصروف تھے کہ ذوالخویصرہ تمیمی آئے اور کہا رسول اللہ! انصاف کیجئے۔ حضور ؐ نے فرمایا تم ہلاک ہو جاؤ، اگر میں نے انصاف نہ کیا تو پھر کون کرے گا۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے کہا حضور مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں۔ اس پر حضور ؐ نے فرمایا= چھوڑ دو اسے، اس کے کچھ ساتھی ایسے ہیں جن کی نمازوں کے ساتھ تم میں سے ایک شخص اپنی نماز کو حقیر بناتا ہے اور اپنے روزوں کو ان کے روزہ کے ساتھ حقیر بناتا ہے۔ وہ دین سے اس طرح نکل جاتے ہیں جس طرح تیر اپنی کمان سے تیزی سے نکل جاتا تھا۔ ابو سعید کہتے ہیں اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ (۹ : ۵۸) ابن مردویہ نے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے "جب حضور ؐ نے حنین کا مال غنیمت تقسیم کرنا شروع کیا تو میں نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا "یہ تو ایسی تقسیم ہے جو خدا کے لئے نہیں ہے۔ میں حضور ؐ کے پاس آیا اور ان سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا= "اللہ حضرت موسیٰ پر رحم فرمائے، ان کو اس سے بھی زیادہ اذیت دی گئی اور انہوں نے صبر کیا" اور اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ (۹ : ۵۸) سنید

اور ابن جریر نے داؤد ابن عاصم سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضور ؐ کے پاس صدقات آئے تو آپ نے وہیں ان کو تقسیم کر دیا۔ کسی کو کچھ دیا اور کسی کو کچھ دیا۔ ایک انصاری نے انہیں دیکھا اور کہا یہ منصفانہ تقسیم نہیں ہے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

قتادہ کہتے ہیں کہ آیت وَمِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ (۹: ۵۸) کے معنی یہ ہیں کہ ان میں سے بعض لوگ صدقات کے بارے میں آپ پر طعن کرتے ہیں۔ روایات میں آیا ہے کہ ایک شخص تازہ تازہ دیہات سے وارد ہوا تھا اور اس نے دیکھا کہ حضور ؐ سونا اور چاندی تقسیم کر رہے ہیں۔ تو اس نے کہا حضور اگر اللہ نے آپ کو عدل کا حکم دیا ہے تو پھر آپ نے عدل نہیں کیا۔ اس پر حضور ؐ نے فرمایا: تم ہلاک ہو جاؤ اگر میں نے عدل نہ کیا تو پھر کون عدل کرے گا۔

بہرحال آیت اس بات پر منصوص ہے کہ یہ قول منافقین کا تھا۔ اور یہ بات وہ دینی غیرت کی وجہ سے نہ کہتے تھے بلکہ وہ اپنے آپ کو زیادہ کا مستحق سمجھتے تھے یا اگر ان کو کسی موقع پر کچھ نہ دیا گیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ اور یہ بات ان کے نفاق پر واضح دلیل تھی۔ کیونکہ اگر کوئی شخص دین اسلام پر سچا مومن ہو اور یقین رکھتا ہو تو وہ رسول اللہ کے بارے میں اس قدر سوء ظن نہیں کر سکتا۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو رسالت سے قبل ہی صادق و امین کے نام سے معروف تھے۔ خصوصاً جبکہ عدل تمام اہل ایمان کا فریضہ ہے چہ جائیکہ رسول اللہ عدل نہ کریں۔ ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ان واقعات اور ان باتوں پر تبصرہ ہوا ہے جو واقعہ ہو چکی تھیں اور غزوۂ تبوک سے بھی پہلے واقعہ ہو چکی تھیں مگر ان کو یہاں بھی لایا گیا تاکہ معلوم ہو سکے کہ منافقین کے دائمی خدوخال کیا ہوتے ہیں اور ان کی ذہنیت کیا ہوتی ہے۔ اس موقع پر قرآن کریم اہل ایمان کو بتاتا ہے کہ ان کا طرز عمل کیا ہونا چاہئے۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا۟ مَآ ءَاتَىٰهُمُ ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥ وَقَالُوا۟ حَسْبُنَا ٱللَّهُ سَيُؤْتِينَا ٱللَّهُ مِن فَضْلِهِۦ وَرَسُولُهُۥٓ إِنَّآ إِلَى ٱللَّهِ رَٰغِبُونَ (۹: ۵۹) ”کیا اچھا ہوتا کہ اللہ اور رسول ؐ نے جو کچھ بھی انہیں دیا تھا اس پر وہ راضی رہتے اور کہتے کہ ”اللہ ہمارے لئے کافی ہے' وہ اپنے فضل سے ہمیں اور بہت کچھ دے گا اور اس کا رسول بھی ہم پر عنایت فرمائے گا' ہم اللہ ہی کی طرف نظر جمائے ہوئے ہیں“۔

یہ ہے اسلام کی سوچ کا طریقہ اور یہ ہیں اسلام میں انداز گفتگو اور یہ ہیں اسلام میں آداب ایمان۔ یہ کہ انسان اللہ اور رسول اللہ کی تقسیم پر راضی ہو۔ وہ اللہ اور رسول کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ محض دباؤ کی وجہ سے یا ماحول کے غلبے کی وجہ سے بات مانے۔ اللہ پر بھروسہ کرنا ادب اسلامی ہے کیونکہ اپنے بندوں کے لئے اللہ ہی کافی ہے۔ انسان کو اللہ اور رسول اللہ کی دین کا امیدوار رہنا چاہئے اور وہ ہر کام محض رضائے الٰہی کے لئے کرے اور اس کے سامنے کوئی مادی مفاد نہ ہو۔ کوئی دنیوی لالچ اس کے پیش نظر نہ ہو۔ یہ ہیں ایمانی آداب جن کی وجہ سے انسان کا قلب و ضمیر تروتازہ اور سرشار ہوتا ہے۔ منافقین کے دل اور ان کا طرز عمل ان آداب سے خالی اور نابلد ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی ارواح میں ایمان کی تازگی اور خوشی داخل ہی نہیں ہوا کرتی اور ان کے دل نور یقین سے خالی ہوتے ہیں۔

اللہ اور رسول اللہ کی بارگاہ کے لائق آداب کے بیان کے بعد یعنی مکمل اطاعت' مکمل تسلیم و رضا اور مکمل سپردگی کے بیان کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کرتے ہیں وہ خود اپنی مرضی سے نہیں کرتے۔ وہ امر اللہ

سے ہر کام کرتے ہیں۔ اللہ کے احکام بابت تقسیم صدقات یہ ہیں اور رسول ان احکام کی پیروی کرتے ہیں اور یہ احکام رب العالمین کی طرف سے ہیں یعنی صدقات اور زکوٰۃ ایک فریضہ ہے جو اغنیاء سے لیا جاتا ہے اور یہ بھی فرض ہے کہ اسے فقراء میں تقسیم کیا جائے۔ اس کی تقسیم چند قسم کے لوگوں کے درمیان کی جاتی ہے۔ کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنی صوابدید پر اسے تقسیم کرے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ بھی اسے ان مدات کے علاوہ اپنی صوابدید سے تقسیم نہیں کر سکتے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ

(۹ : ۶۰) "یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں اور ان لوگوں کے لئے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لئے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو۔ نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور راہ خدا میں اور مسافرنوازی میں استعمال کرنے کے لئے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے"۔

اس آیت کے ذریعے اسلامی شریعت میں زکوٰۃ کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ اب زکوٰۃ محض نفلی صدقہ اور رضاکارانہ چندہ نہیں رہی۔ اب یہ حتمی فریضہ اور واجبی ٹیکس ہے۔ نیز زکوٰۃ کے تقسیم کنندہ گان کی جانب سے بھی یہ کوئی عطیہ تصور نہ ہو گا نہ دینے والوں کی جانب سے عطیہ ہو گا بلکہ معلوم فریضہ ہو گا۔ اسلامی حکومت کا یہ ایک اہم مالی فریضہ ہے۔ اس کی وصولی کا ایک نظام ہو گا اور تقسیم کا بھی ایک ضابطہ جاری ہو گیا ہے۔ غرض زکوٰۃ دینے والوں پر فریضہ ہے اور لینے والوں کے لئے ان کا حق ہے۔ یہ خیرات اور سوال نہیں ہے کیونکہ اسلام یہ اجازت نہیں دیتا کہ کوئی زکوٰۃ گداگری کے تصور سے وصول کرے۔

اسلامی نظام میں زندگی کو عملی اور سعی پر استوار کیا گیا ہے۔ عمل کا مفہوم بڑا وسیع ہے۔ اسلامی حکومت کا یہ فرض اور اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ہر اس شخص کے لئے روزگار کا بندوبست کرے جو عمل اور محنت پر قدرت رکھتا ہو' وہ اسے کام کے لئے ہنرمندی سکھائے اور اس کے لئے موقع فراہم کرے۔ اور پھر یہ مزدور اور محنت کش کو یہ ضمانت دے کہ اس کو اس کی محنت کی پوری اجرت ملے۔

اسلامی نظام کے ضوابط کی رو سے عمل پر قدرت رکھنے والوں کا زکوٰۃ میں کوئی حق نہیں ہے۔ زکوٰۃ ایک ایسا ٹیکس ہے جو اہل ثروت سے لیا جاتا ہے اور محتاجوں کو دیا جاتا ہے اور اس کی وصولی اور تقسیم کا انتظام حکومت کے ہاتھوں میں رہتا ہے۔ بشرطیکہ حکومت اسلامی اصولوں پر قائم ہو' نظام شریعت کو نافذ کرنے والی ہو اور زکوٰۃ کو بھی وہ مکمل اسلامی ضوابط کے مطابق وصول کرتی ہو اور خرچ کرتی ہو۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا لاتحل الصدقة لغني ولا لذي مرة سوى "زکوٰۃ غنی کے لئے حلال نہیں ہے اور نہ تندرست و توانا کے لئے"۔ (احمد' ابوداؤد' ترمذی)

عبداللہ ابن عدی ابن خیارؓ سے روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ دو آدمیوں نے مجھے بتایا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے زکوۃ کے لئے درخواست کی تو حضور ؐ نے ان کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ وہ دونوں تندرست و توانا ہیں تو فرمایا ”اگر تم چاہو تو میں تمہیں زکوۃ دیئے دیتا ہوں لیکن ضابطے کی رو سے اس میں غنی اور ایسے شخص کا حصہ نہیں ہے جو قوی ہو اور کمائی کر سکتا ہو۔ (احمد ' ابوداؤد ' نسائی)

اسلام کے اجتماعی نظام نے اسلامی سوسائٹی کے لئے سوشل سیکورٹی کا جو نظام تجویز کیا زکوٰۃ اس کا ایک حصہ ہے۔ یہ نظام زکوۃ سے زیادہ وسیع اور جامع ہے کیونکہ اسلام کے سوشل سیکورٹی کے نظام کے کئی شعبے ہیں۔ یہ شعبے پوری انسانی زندگی تک پھیلے ہوئے ہیں۔ زکوۃ بہرحال اس نظام کا ایک اہم حصہ ہے۔

زکوۃ کی شرح دسواں ' بیسواں اور چالیسواں حصہ ہے۔ مختلف اموال میں اس کی شرح مختلف ہے۔ جو شخص ۲۰ مصری دینار سے زیادہ مال رکھتا ہو اور مال اس کی ضروریات سے زیادہ ہو تو وہ صاحب نصاب تصور ہو گا اور اس پر زکوٰۃ فرض ہو گی۔ اس طرح اس مد میں دینے والوں کی ایک بڑی تعداد فراہم ہو جاتی ہے اور اس کو ان مدات میں خرچ کیا جاتا ہے جن کی تصریح اس آیت میں کر دی گئی ہے۔ اس کا پہلا مستحق فقیر و مسکین ہیں۔ فقراء وہ ہیں جن کے پاس بقدر ضرورت سے کم ہو ' مساکین بھی ایسے ہی ہوتے ہیں ' لیکن یہ فقراء کے مقابلے میں سفید پوش ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ضرورت کا اظہار نہیں کرتے اور سوال بھی نہیں کرتے۔

یہ اس قدر وسیع ٹیکس ہے کہ ایک سال جو زکوٰۃ دیتا ہے وہ دوسرے سال اس کا مستحق بھی بن جاتا ہے جبکہ زکوۃ دینے والے کی آمدن اس کی ضروریات سے کم ہو جائے۔ اس اعتبار سے یہ ایک بہترین اجتماعی فنڈ ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اگرچہ کبھی بھی اس فنڈ میں ادائیگی نہیں کرتے لیکن مستحق ضرور ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ اجتماعی ضمانت ہے۔ لیکن اجتماعی فنڈ یا ضمانت ہونے سے پہلے یہ اللہ کی جانب سے ایک فریضہ ہے۔ اس سے تزکیہ نفس اور تزکیہ اموال ہوتا ہے۔ انسان اللہ کی بندگی کرتا ہے اور دل کا بخل اس سے دور ہوتا ہے اور انسان دے کر خوشی پاتا ہے اور اس کے اندر احساس برتری پیدا ہوتا ہے۔

## زکوٰۃ کی مدات

۱۔ الفقراء و المساکین — فقیر اور مسکین کی تعریف اور فرق ہم بیان کر چکے ہیں۔
۲۔ و العاملین علیھا — (جو صدقات کے کام پر مامور ہیں)
۳۔ و المؤلفة قلوبھم — (جن کی تالیف قلب مطلوب ہو)

مولفتہ القلوب کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو ابھی ابھی اسلام میں داخل ہوئے تھے اور اس مد سے ان کی امداد کی غرض و غایت یہ تھی کہ وہ اسلام پر ثابت قدم ہو جائیں۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کی تالیف قلب کر کے ان کو اسلام میں داخل کرنا مطلوب ہو۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں کہ جو اسلام پختگی کے ساتھ داخل ہو گئے لیکن ان کو انعامات اور اعزازات دے کر ان کے اہل قوم کو یہ تاثر دینا مطلوب تھا کہ وہ بھی اسلام کی طرف راغب ہو جائیں۔ جب وہ دیکھیں کہ ان کے بھائی اسلامی نظام کے برکات سے فائدے اٹھا رہے ہیں لیکن اس مد کے بارے میں فقہاء کے درمیان فقہی اختلافات پائے جاتے ہیں کہ آیا مولفتہ القلوب کی مد غلبہ اسلام کے بعد باقی

رہی تھی یا نہیں ۔ لیکن اسلام کا تحریکی مزاج اس بات کا متقاضی ہے کہ یہ مد جاری رہے کیونکہ مختلف حالات میں تحریک اسلامی کو مختلف تقاضے پیش آ سکتے ہیں اور بعض لوگوں کی تالیف قلب کی ضرورت ہوتی ہے ۔ کیونکہ بعض اوقات تحریک اسلامی کے کارکنوں کو تحریک کی وجہ سے مالی نقصانات ہوتے ہیں اور ان کا مداوا ضروری ہوتا ہے اور بعض اوقات بعض لوگوں کی تالیف قلب سے اسلام کو فائدہ ہوتا ہے ۔ یہ ایک عظیم حکمت ربانی ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کو اپنے مسائل حل کرنے کے لئے یہ خصوصی فنڈ فراہم کیا ہے تاکہ مختلف ظروف و احوال میں اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے ۔

۵۔ وفي الرقاب (گردنوں کے چھڑانے میں) یہ اس وقت کی بات ہے جب غلامی ایک عالمی نظام تھا۔ اور یہ نظام بیک وقت مسلمانوں اور ان کے مخالفین میں رائج تھا۔ کیونکہ جنگی قیدیوں کو غلام بنا لیا جاتا تھا۔ اور اسلام اس وقت کے بین الاقوامی حالات میں مجبور تھا کہ وہ قیدیوں کے معاملے میں وہ فیصلے کرے جو اس کے قیدیوں کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اس مد میں ان لوگوں کی امداد بھی ہوتی تھی جو اپنے آقا کے ساتھ آزادی کا معاوضہ طے کر کے مکاتبت کرتے تھے ۔ ایسے لوگوں کو اقساط مکاتبت ادا کرنے کے لئے زکوٰۃ سے رقم دی جاتی تھی ۔ نیز اس مد کی رقم سے غلاموں کو خرید کر آزاد بھی کر دیا جاتا تھا یعنی اسلامی حکومت کی طرف سے ۔

۶۔ والغارمين (قرض داروں کی مدد میں) وہ قرضدار جو بدکاریوں کی وجہ سے مقروض نہ ہوئے ہوں' ان لوگوں کو زکوٰۃ سے رقم ادا کی جاتی تھی تاکہ وہ اپنے قرضے ادا کر سکیں ۔ آج کل کے جدید معاشی نظام جو نام نہاد مغربی تہذیب کے پیدا کردہ ہیں اس قدر ظالمانہ ہیں کہ لوگوں کے قرضے لے کر کھا جاتے ہیں اور بڑی آسانی کے ساتھ اپنے آپ کو دیوالیہ کر دیتے ہیں اور لوگوں کی رقومات ڈوب جاتی ہیں ۔ لیکن اسلام ایک متکافل اور ضامن نظام ہے ۔ اس میں شرفاء کو آسانی کے ساتھ لوٹا نہیں جا سکتا اور نہ اس میں امانت داروں کو اس طرح تباہ کر کے دیوالیہ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور نہ لوگوں کو یہ اجازت دی جاتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مال کھا جائیں ۔ اور قوانین ان کے لئے خود راستہ ہموار کریں جب کہ آج کل دنیا کے تمام مالی قوانین کی رو سے ایسا ہوتا ہے ۔

۷۔ وفي سبيل الله (اور راہ خدا میں) یہ ایک وسیع مد ہے ۔ اس میں سے ہر اس موقع پر خرچ کیا جا سکتا ہے جس میں اسلامی معاشرے کی بھلائی ہو جیسا کہ لفظ فی سبیل اللہ کی وسعت سے معلوم ہوتا ہے ۔

۸۔ وابن السبيل (مسافر نوازی میں) یعنی وہ مسافر جو اپنے مال سے دور ہو اگرچہ اپنے مقام پر وہ غنی ہو ۔

یہ ہے نظام زکوٰۃ جس پر آج کے دور میں بعض لوگ نکتہ چینی کرتے ہیں ۔ اور یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ گداگری اور احسان کرنے والے اور دوسروں کی دست نگری کا نظام ہے ۔ حالانکہ یہ ایک اجتماعی فریضہ ہے ۔ اور اسے بطور اسلامی فرض اور عبادت ادا کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کے مال پاک ہوں اور لوگوں کے دلوں سے کنجوسی کا زنگ صاف ہو ۔ اور یہ نظام لوگوں کی بھلائی اور افراد امت کے درمیان محبت اور بھائی چارے کا سبب بنے ۔ انسانی سوسائٹی کی فضا اس سے تروتازہ ہو اور انسانیت کے زخموں کے لئے مرہم کا کام کرے ۔ اور ان برکات کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانے پر سوشل سیکورٹی کا بھی انتظام کر دے ۔ لیکن اس کا حقیقی رنگ عبادت اور تقرب الی اللہ رہے ۔ اور اللہ اور لوگوں کے درمیان ایک رابطہ ہو ۔ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ (۹ : ۶۰) (اللہ کی طرف سے ایک فریضہ ہے) اور یہ احکام اللہ نے عائد کئے کیونکہ

وہ حکیم و دانا ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹: ۶۰) (اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا اور بینا ہے۔

---○○○---

زکوٰۃ و صدقات کے اصول وضع کرنے کے بعد' اور ان کے مصارف کی نشاندہی کے بعد اب سیاق کلام پھر منافقین کے اعمال و افعال کی طرف مڑ جاتا ہے۔ اور یہاں آیت صدقات کو اس لئے لایا گیا کہ جو لوگ تقسیم صدقات کے سلسلے میں رسول اللہ علیہ وسلم پر نکتہ چینی کرتے تھے ان کے موقف کی کمزوری واضح ہو جائے۔

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ۭ
قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۭ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦١﴾
يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ
كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٢﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ
لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٣﴾ يَحْذَرُ
الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ قُلِ
اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿٦٤﴾ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ
لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ۭ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ
تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٦٥﴾ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ۭ اِنْ نَّعْفُ عَنْ
طَاۗىِٕفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَاۗىِٕفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿٦٦﴾ ۸ ع ۷ ۱۴

''ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو اپنی باتوں سے نبی کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص کانوں کا کچا ہے۔ کہو ''وہ تمہاری بھلائی کے لئے ایسا ہے' اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے اور سراسر رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو تم میں سے ایماندار ہیں اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان کے لئے دردناک سزا ہے''۔

یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمہیں راضی کریں' حالانکہ اگر یہ مومن ہیں تو اللہ اور رسول اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ یہ ان کو راضی کرنے کی فکر کریں۔کیا انہیں معلوم نہیں ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرتا ہے' اس کے لئے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا' یہ بہت بڑی رسوائی ہے۔

یہ منافق ڈر رہے ہیں کہ کہیں مسلمانوں پر کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو ان کے دلوں کے بھید کھول کر رکھ دے۔اے نبیؐ' ان سے کہو ''اور مذاق اڑاؤ' اللہ اس چیز کو کھول دینے والا ہے جس کے کھل جانے سے تم ڈرتے ہو''۔ اگر ان سے پوچھو کہ تم کیا باتیں کر رہے تھے' تو جھٹ کہہ دیں گے کہ ہم تو ہنسی مذاق اور دل لگی کر رہے تھے۔ان سے کہو ''کیا تمہاری ہنسی دل لگی اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول ہی کے ساتھ تھی؟ اب عذرات نہ تراشو۔تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ہے۔اگر ہم نے تم میں سے ایک گروہ کو معاف کر بھی دیا تو دوسرے گروہ کو تو ہم ضرور سزا دیں گے کیونکہ وہ مجرم ہے''۔

یہ رسول اللہ کے بارے میں سوء ادب' ایک صریح گستاخی' معلوم ہوتا ہے کہ یہ گستاخی صدقات کے معاملے کے علاوہ ہے۔یہ دیکھتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی باتیں کس قدر سلیقے' شرافت اور سنجیدگی کے ساتھ سنتے ہیں اور یہ کہ حضورؐ شریعت کے قانون کے مطابق لوگوں کی ظاہری حالت کے مطابق ان سے معاملہ کرتے تھے۔لوگوں کی طرف اچھی طرح متوجہ ہوتے تھے اور ان کے ساتھ دل کھول کر بات فرماتے تھے۔لیکن ان نکتہ چینی کرنے والوں نے حضورؐ کی اس شائستگی کو آپ کی کمزوری سے تعبیر کیا اور اچھائی کو برائی کہہ دیا۔کہنے لگے کہ حضورؐ کان کے کچے ہیں۔یعنی ہر کسی کی بات سنتے ہیں اور یہ ممکن ہے کہ کوئی آپ سے جھوٹ کہے' دھوکہ دے اور چرب لسانی سے کام نکالے اور آپ بات کو سمجھ نہ سکیں۔وہ یہ باتیں اپنی اس خام خیالی کی وجہ سے کہتے تھے کہ حضورؐ ان کے معاملے کو کس طرح کھول سکتے ہیں یا یہ کہ حضورؐ ان کے نفاق کو کس ذریعے سے معلوم کر لیں گے۔اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان منافقین کے اعمال و اقوال کے بارے میں مخلص مومنین آپ کو جو اطلاعات فراہم کرتے تھے اور آپ ان پر یقین کرتے تھے تو یہ لوگ اس صورت حال پر نکتہ چینی کرتے تھے۔اس آیت کے سبب نزول کے سلسلے میں اس قسم کی بعض روایات بھی وارد ہیں۔یہ دونوں امر یہاں اس آیت کا پس منظر ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ دونوں امر منافقین میں موجود تھے۔

قرآن کریم پہلے ان کا قول نقل کرتا ہے 'یَقُولُونَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ (۹: ۶۱) (کہتے ہیں کہ یہ شخص کان کا کچا ہے ہاں یہ درست ہے لیکن کہو تمہاری بھلائی کے لئے ایسا ہے) کیا اس میں تمہاری بھلائی نہیں ہے کہ وہ غور سے وحی سنتا ہے اور پھر تم تک اسے پہنچاتا ہے جس میں تمہاری بھلائی ہے اور تمہاری اصلاح ہے۔پھر کان کا کچا ہونا تمہارے لئے یوں بھی بہتر ہے کہ تمہاری بات کو غور سے سنتا ہے اور شرافت سے سنتا ہے اور تمہیں یہ تاثر نہیں دیتا کہ تم تو منافق ہو۔یہ اشارہ بھی نہیں دیتا کہ تم دھوکہ دیتے ہو اور تم اس کے ساتھ جو ریاکارانہ برتاؤ کرتے ہو جانتے ہوئے بھی وہ تمہاری سرزنش نہیں کرتا۔

يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ (۹: ۶۱) (وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے) اور اللہ تعالیٰ اس کو تمہارے بارے میں جو اطلاع دیتا ہے اس پر اسے پورا پورا یقین ہے۔دوسرے لوگوں کے بارے میں اس کو جو اطلاع دی جاتی ہے' اس پر بھی اسے یقین ہے)

وَ یُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ (۹ : ۶۱) (اور اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے) وہ پورے اطمینان سے ان کی باتوں کو سچ تسلیم کرتا ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ وہ سچے مسلمان ہیں اور ان کا ایمان اس قدر مضبوط ہے کہ جھوٹ' ریاکاری اور بہانہ سازی سے انہیں روکتا ہے۔

وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۹ : ۶۱) (اور تم میں سے ایماندار لوگوں کے لئے سراسر رحمت ہے) اس لئے کہ وہ تمہارا ہاتھ تھام کر تمہیں بھلائی کی طرف کھینچتا ہے۔

وَ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۹ : ۶۱) (اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان کے لئے دردناک سزا ہے"۔ اس لئے کہ اللہ غیور ہے۔ وہ کس طرح برداشت کر سکتا ہے کہ لوگ اس کے رسول کو اذیت دیں حالانکہ وہ ان تک اللہ کا پیغام پہنچانے والا ہے۔

یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِیُرْضُوْكُمْ وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ

(۹ : ۶۲) (یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمہیں راضی کریں' حالانکہ اگر یہ مومن ہیں تو اللہ اور رسول اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ یہ ان کو راضی کرنے کی فکر کریں) یہ لوگ خدا کی قسمیں کھا کر تم کو راضی کرنا چاہتے ہیں اور منافقین کا ہر دور میں یہی وطیرہ رہا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ سامنے ان کا رویہ اور ہوتا ہے اور پیٹھ پیچھے ان کا رویہ اور ہوتا ہے۔ پھر ایک وقت یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ مومنین صادقین کے ساتھ آنکھیں بھی نہیں ملا سکتے۔ نہ ان کے ساتھ بات کر سکتے ہیں چنانچہ پھر وہ قسموں کا سہارا لے کر چاپلوسی اور ذلت اختیار کر کے لوگوں کی رضامندی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن "اگر یہ سچے مومن ہیں تو اللہ و رسول اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ یہ ان کو راضی کرنے کی فکر کریں" کیونکہ لوگوں کا مقام ہی کیا ہے؟ لوگوں کی حیثیت ہی کیا ہے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اللہ پر ایمان نہیں لاتا اور اس کے سامنے نہیں جھکتا' وہ لوگوں پر ایمان لاتا ہے اور اپنے جیسے انسان سے ڈرتا ہے۔ ان کے لئے بہتر تو یہ تھا کہ یہ لوگ اللہ کے سامنے سرنگوں ہوتے جو سب کا خدا ہے۔ اس میں ان کے لئے کوئی ذلت نہیں ہے' ذلت تو اس میں ہے کہ کوئی اپنے جیسے انسان کے سامنے جھکے جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے۔ وہ جھوٹا نہیں ہوتا بلکہ جو شخص اللہ کے سوا دوسروں سے ڈرتا ہے وہ جھوٹا ہوتا ہے۔

اَلَمْ یَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِیْهَا ذٰلِكَ الْخِزْیُ الْعَظِیْمُ (۹ : ۶۳) (کیا انہیں معلوم نہیں ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرتا ہے' اس کے لئے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا؟ یہ بہت بڑی رسوائی ہے) یہ استفہام انکاری ہے اور مخاطبین کو جھڑکنا اور متنبہ کرنا مطلوب ہے' کہ یہ لوگ دعوائے ایمان کرتے ہیں اور پھر بھی اللہ اور رسول اللہ کے ساتھ محاربت اور جنگ کرتے ہیں۔ لہٰذا انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ اور رسول اللہ کے ساتھ جنگ کرنا ایک عظیم گناہ ہے اور جو شخص اللہ اور رسول اللہ کے ساتھ دشمنی رکھتا ہے' جہنم اس کے انتظار میں ہے۔ اور ان کے اس غرور اور سرکشی کے بدلے انہیں

ذلت اور رسوائی کی سزا دی جائے گی۔اگر وہ سچے مومن ہیں' جیسا کہ وہ دعوائے ایمان کرتے ہیں تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس حقیقت سے بے خبر ہوں۔

یہ اللہ کے بندوں سے تو ڈرتے ہیں اور ڈر کر جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ ان کو راضی کریں اور ان خبروں کی تردید کریں جو ان بندوں تک ان کی بابت پہنچ رہی ہیں۔لیکن یہ بات حیرت انگیز ہے کہ وہ خالق کائنات سے نہیں ڈرتے کہ وہ اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں اور اس کے دین کی دشمنی کرتے ہیں۔گویا وہ اللہ سے لڑتے ہیں اور اس کی طاقت اس قدر برتر ہے کہ اس سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔بلکہ وہ شرمناک گناہ کا ارتکاب کرتے اور یہ ایک عظیم غلطی ہے جو یہ کر رہے ہیں اور یہ بات ان کے لئے بہت ہی خطرناک ہے کہ وہ دین کے خلاف سازشیں کریں اور رسول اللہ کو اذیت دیں۔

یہ لوگ بزدل اس قدر ہیں کہ یہ دین اور اہل دین اور رسول اللہ کے مقابلے میں کھل کر نہیں آ سکتے۔پھر یہ اس سے بھی ڈرتے ہیں کہ اللہ ان کے راز اہل ایمان پر بھی کھول نہ دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی خفیہ نیتوں سے مطلع نہ کر دیا جائے۔

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ (٦٤) وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ (٦٥) لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (٦٦)(٩ : ٦١ تا ٦٦))

(یہ منافق ڈر رہے ہیں کہ کہیں مسلمانوں پر کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو ان کے دلوں کے بھید کھول کر رکھ دے۔اے نبیؐ' ان سے کہو ''اور مذاق اڑاؤ' اللہ اس چیز کو کھول دینے والا ہے جس کے کھل جانے سے تم ڈرتے ہو''۔ اگر ان سے پوچھو کہ تم کیا باتیں کر رہے تھے 'تو جھٹ کہہ دیں گے کہ ہم تو ہنسی مذاق اور دل لگی کر رہے تھے۔ان سے کہو ''کیا تمہاری ہنسی دل لگی اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول ہی کے ساتھ تھی؟ اب عذرات نہ تراشو۔تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ہے۔اگر ہم نے تم میں سے ایک گروہ کو معاف کر بھی دیا تو دوسرے گروہ کو تو ہم ضرور سزا دیں گے کیونکہ وہ مجرم ہے''۔

یہ آیت تمام منافقین کے عمومی رویے پر تبصرہ ہے کہ وہ اس بات سے ہروقت ڈرتے رہتے ہیں کہ ان کے دلوں میں جو کھوٹ ہے اس کے بارے میں کہیں آیات نازل نہ ہو جائیں۔اور ان کی دلی کیفیات کا انکشاف نہ ہو جائے۔ان کے راز لوگوں پر کھل نہ جائیں۔اس موضوع پر کئی روایات میں متعدد واقعات متعین طور پر بھی نقل ہوئے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ ان آیات کا سبب نزول یہ خاص واقعات ہیں۔

ابو معشر مدینی نے محمد ابن کعب قرظی سے روایت کی ہے۔کہتے ہیں کہ منافقین میں سے ایک شخص نے یہ کہا کہ میرے خیال میں ہم سے جو لوگ زیادہ قرآن پڑھتے ہیں وہ ہم سے پیٹ کے بارے میں زیادہ لالچی ہیں اور بات میں ہم سے زیادہ

جھوٹے ہیں اور جنگ کے وقت بزدل ہیں (ان کا تبصرہ ان لوگوں کے بارے میں تھا جو قاری قرآن تھے)۔ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ تو یہ منافق رسول اللہ کے پاس پہنچا۔ اس وقت رسول اللہ سفر پر روانہ ہونے کے لئے ناقہ پر سوار ہوگئے تھے۔ اس منافق نے کہا رسول خدا ہم تو گپ شپ لگا رہے تھے۔ تو حضورؐ نے فرمایا کیا تم اللہ، اس کی آیات اور اس کے رسول کی بابت گپ شپ لگا رہے تھے۔ اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں قُلْ اَبِاللّٰه تا کَانُوْا مُجْرِمِیْنَ اس شخص کے پاؤں پتھروں پر رگڑے جا رہے تھے اور رسول اللہ اس کی طرف دیکھ بھی نہ رہے تھے اور یہ شخص رسول اللہ کی تلوار کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ محمد ابن اسحاق نے یہ نقل کیا ہے کہ منافقین کی ایک جماعت تھی جن میں ودیعہ ابن ثابت بنی امیہ کے بھائی، ولد زید ولد عمرد، ولد عوف تھے اور ایک شخص مخشی ابن حمیر بھی تھا جو اشجع قبیلے کا فرد تھا اور اشجع بنی سلمہ کا حلیف تھا۔ یہ جماعت حضورؐ کے ساتھ تبوک کی طرف جا رہی تھی۔ ان میں سے بعض نے دوسروں سے کہا کیا تم سمجھتے ہو کہ رومی اس طرح لڑتے ہیں جس طرح عرب عربوں کے ساتھ لڑتے ہیں؟ خدا کی قسم ہم تو دیکھتے ہیں کہ کل ہم رسیوں میں بندھے ہوں گے۔ یہ لوگ اہل ایمان کے اندر خوف و ہراس پھیلانے کے لئے کہتے تھے۔ اس موقع پر مخشی ابن حمیر نے کہا خدا کی قسم میں تو اپنے لئے یہ سزا تجویز کرتا ہوں کہ ہم میں ہر شخص کو سو کوڑے مارے جائیں مگر ہمارے بارے میں تمہاری ان باتوں کی وجہ سے قرآن مجید نازل نہ ہو جائے، مجھ تک جو اطلاعات بھی پہنچی ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ حضورؐ نے عمار ابن یاسر کو حکم دیا کہ ان لوگوں کی مدد کو پہنچو یہ تو جہنم رسید ہوگئے ہیں۔ اور ان سے پوچھو کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ اگر وہ انکار کریں تو پھر بتا دو کہ تم نے تو یہ کہا تھا۔ عمار ان تک گئے اور ان سے یہ بات کی۔ یہ لوگ رسول اللہ کے پاس آئے اور معذرت کرنے لگے۔ رسول اللہ اپنی سواری پر بیٹھ چکے تھے اور ودیعہ ابن ثابت پہنچے۔ اس نے سواری کا کجاوا پکڑا ہوا تھا اور اور کہہ رہا تھا کہ ہم تو گپ شپ لگا رہے تھے۔ مخشی ابن حمیر نے رسول اللہ سے کہا فعدبی اسمی او ر اسم ابی چنانچہ اس آیت میں جسے معافی ملی وہ مخشی ابن حمیر تھے۔ بعد اس نے اپنا نام عبدالرحمن رکھ دیا تھا۔ اور اس نے خدا سے سوال کیا تھا کہ وہ خدا کی راہ میں اس طرح شہید ہوں کہ اس کا نام و نشان بھی معلوم نہ ہو۔ چنانچہ یمامہ کی جنگ میں وہ شہید ہوا اور اس کا کوئی اتا پتا نہ ملا۔

ابن منذر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ غزوہ تبوک کے لئے پابہ رکاب تھے کہ آپ کے ساتھ ایک گروہ منافقین بھی تھا۔ جنہوں نے کہا: کیا یہ شخص یہ امید لگائے بیٹھا کہ شام کے محلات اور قلعے اس کے لئے کھل جائیں گے۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے حضورؐ کو اس کی اطلاع دے دی تو حضورؐ نے حکم دیا کہ ان لوگوں کی سواریوں کو روک دو۔ حضورؐ نے ان لوگوں سے جاکر دریافت کیا کہ کیا تم نے یہ کہا ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ ہم تو ہنسی مذاق کر رہے تھے تو ان کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

ہم ہنسی مذاق کر رہے تھے یعنی جن موضوعات پر وہ بات کر رہے تھے ان کا تعلق تو اصل ایمان سے تھا اور یہ ایسے مسائل نہ تھے جن کے بارے میں محض گپ شپ کے انداز میں بات کی جائے۔ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ (۹: ۶۵) (کیا تم اللہ، اس کے رسول اور اس کی آیات کے بارے میں ہنسی مذاق کرتے ہو) چونکہ انہوں نے ایک عظیم جرم کا ارتکاب کیا تھا، اس لئے ان پر کفر کا فتویٰ صادر ہوا کہ انہوں نے کفریہ کلمات کہے ہیں۔ اور ایمان کے اظہار کے بعد انہوں نے کفر کیا ہے۔ چنانچہ ان کو خوفناک انجام سے ڈرایا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ جلدی توبہ کرلیں

اور صحیح ایمان لے آئیں تو یہ عذاب ان سے ٹل بھی سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ نفاق پر قائم رہے اور بدستور استہزائیہ انداز ان کا باقی رہا تو وہ عذاب کے مستحق ہوں گے کیونکہ اِنَّھُمْ کَانُوْا مُجْرِمِیْنَ (٦٦) (یہ مجرم تھے)۔۔۔۔۔۔۔۔۔

منافقین کے تصورات ' اعمال اور اقوال پر یہاں تک تبصرہ کرنے کے بعد اب یہاں منافقین کی عمومی حقیقت کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ ان کی وہ عمومی صفات بیان کر دی جاتی ہیں جن کی بنا پر وہ مومنین صادقین سے جدا تصور ہوتے ہیں۔ اور بتایا جاتا ہے کہ ان کے لئے کس قسم کا عذاب انتظار میں ہے۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُھُمْ مِّنْ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْکَرِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَیَقْبِضُوْنَ اَیْدِیَھُمْ نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَھُمْ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَعَدَ اللّٰہُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْکُفَّارَ نَارَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ھِیَ حَسْبُھُمْ وَلَعَنَھُمُ اللّٰہُ وَلَھُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ﴿۶۸﴾

(منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں۔ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ خیر سے روکتے ہیں۔ یہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا۔ یقیناً یہ منافق ہی فاسق ہیں۔ ان منافق مردوں اور عورتوں اور کافروں کے لئے اللہ نے آتش دوزخ کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے ' وہی ان کے لئے موزوں ہے۔ ان پر اللہ کی پھٹکار ہے اور ان کے لئے قائم رہنے والا عذاب ہے)

منافقین اور منافقات کی ایک ہی فطرت اور خمیر ہے۔ ان کا مزاج بھی یکساں ہے۔ ہر زمان و مکان اور ہمیشہ ان کے یہی خدوخال رہے ہیں۔ ان کے اقوال و اعمال اگرچہ مختلف ہیں لیکن وہ ایک ہی مزاج اور ایک ہی سرچشمے سے ماخوذ ہوتے ہیں یعنی کینہ پروری اور بدفطرتی' خفیہ سازشیں کرنا اور بے جا تنقیدیں کرنا اور کھل کر سامنے آنے سے کترانا اور کھل کر بات کرنے کی جرات نہ کرنا۔ یہ ہیں منافقین کی اصل علامتیں۔ اب ان کا طرز عمل کیا ہے۔ وہ منکر کا حکم دیتے ہیں اور معروف سے روکتے ہیں اور وہ پرلے درجے کے بخیل ہیں۔ اور اگر خرچ کرتے ہیں تو لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور وہ جب امر بالمنکر اور نہی عن المعروف کرتے ہیں۔ تو یہ کام وہ چھپ چھپا کر کرتے ہیں' اشاروں کنایوں میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں کیونکہ ان کے اندر اس قدر جراءت نہیں ہے کہ یہ لوگ کھل کر کام کریں یہ کھل کر کام اس وقت کرتے ہیں جب ان کو یقین ہو کہ حالات درست ہیں اور ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ انہوں نے اللہ اور اس کی رضا کو بھلا دیا ہے نَسُوا اللّٰہَ (٩: ٦٧) لہٰذا ان کے ہر کام کی غرض و غایت لوگوں کی رضا یا مالی مفاد ہوتا ہے۔ یہ لوگ جب خدا سے نہیں ڈرتے تو پھر یہ زمین کے زور آور لوگوں سے بہت ہی ڈرتے ہیں۔ یہ ان کے سامنے ذلیل ہو کر رہتے ہیں اور ان کی خوشامد کرتے ہیں۔ لہٰذا اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا فَنَسِیَھُمْ (٩: ٦٧) لہٰذا اب ان کا کوئی وزن و اعتبار نہیں ہے۔ یہ دنیا میں لوگوں کے سامنے بھی بے وزن اور بے اعتبار ہوں گے اور آخرت میں بھی اللہ

کے ہاں بے وزن اور بے اعتبار ہوں گے۔ کیونکہ دنیا میں لوگ تو جاندار اور زور آور لوگوں کو اہمیت دیتے ہیں جو صاف صاف بات کرتے ہیں اور علی الاعلان بات کرتے ہیں جو اپنے نظریات پر رہتے ہیں اور جو اپنے نظریات کے معاملے میں لوگوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ اگر جنگ کرتے ہیں تو پھر بھی علانیہ اور اگر صلح کرتے ہیں تو پھر بھی علانیہ۔ یہ لوگ لوگوں کو بھول جاتے ہیں اور لوگوں کے الہ العالمین کو یاد رکھتے ہیں لہٰذا وہ حق کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے اور وہ چونکہ اللہ کو یاد کرتے ہیں اس لئے لوگ انہیں یاد کرتے ہیں اور ان کی قدر کرتے ہیں۔

بے شک منافق ہی فاسق ہوتے ہیں اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۹:۶۷) لہٰذا وہ دائرۂ ایمان سے خارج ہوتے ہیں۔ یہ اصل راہ سے منحرف ہیں اور اللہ نے ان کے لیے ایسا انجام تجویز کر دیا ہے جو کفار کے لیے تجویز ہوا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا هِيَ حَسْبُهُمْ وَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (۹:۶۸) ”ان منافق مردوں اور عورتوں اور کافروں کے لیے اللہ نے آتش دوزخ کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہی ان کے لیے موزوں ہے۔ ان پر اللہ کی پھٹکار ہے اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے“۔ بس یہ انجام ان کے لیے اور ان کے اس مجرمانہ طرز عمل کے لیے کافی ہے۔ اس انجام اور جہنم کے ساتھ ساتھ ان پر لعنت بھی ہوتی رہے گی اور اس عذاب میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

---○○○---

منافقوں کا بے عمل، منحرف اور گمراہ طبقہ انسانی تاریخ میں ہمیشہ رہتا ہے۔ یہ کسی بھی وقت انوکھا نہیں رہا ہے۔ اسلام سے قبل بھی انسانی تاریخ میں اس کے نمونے موجود رہے ہیں اور ادوار سابقہ کے منافقین کا انجام بھی ان کے فسق و فجور کے مطابق ایسا ہی رہا ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کی فطرت میں کجی آجاتی ہے اور وہ صحیح راہ پر نہیں چلتے۔ اس سے قبل جو کافر اور منافق گزرے ہیں وہ حضور کے دور کے منافقین سے زیادہ مالدار اور زیادہ افرادی قوت کے مالک تھے۔ لیکن یہ مالی اور افرادی وسائل انہیں نہ بچا سکے۔

قرآن کریم امم سابقہ کے منافقین کی طرف اشارہ کر کے انہیں بتاتا ہے کہ دیکھو تم ان لوگوں ہی کے راستے پر تو چل رہے ہو۔ آخر کیوں تمہارا انجام ان سے مختلف ہو گا۔

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَ خُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۹﴾

”تم لوگوں کے رنگ ڈھنگ وہی ہیں جو تمہارے پیش رووں کے تھے۔ وہ تم سے زیادہ زور آور اور تم سے بڑھ کر

مال، اور اولاد والے تھے۔ پھر انہوں نے دنیا میں اپنے حصہ کے مزے لوٹ لیے اور تم نے بھی اپنے حصے کے مزے اسی طرح لوٹے جیسے انہوں نے لوٹے تھے' اور ویسی ہی بحثوں میں تم بھی پڑے جیسی بحثوں میں وہ پڑے تھے' سو ان کا انجام یہ ہوا کہ دنیا اور آخرت میں ان کا سب کیا دھرا ضائع ہو گیا اور وہی خسارے میں ہیں"۔

قوت کا فتنہ بھی خطرناک فتنہ ہوتا ہے۔ مالی قوت اور افرادی قوت سے انسان فتنے میں پڑ جاتا ہے۔ جن لوگوں کا رابطہ بڑی قوت سے ہوتا ہے وہ چھوٹی قوتوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ صرف قوی تر قوت سے ڈرنے والے ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ سمع و اطاعت اس بڑی قوت کی کرتے ہیں اور اس بڑی قوت کی بات کو اونچا کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر مالی قوت اور افرادی قوت اثر نہیں کرتی کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مال و دولت اور انصار و اولاد دینے والا تو اللہ ہے جو برتر قوت ہے۔ لہٰذا اگر ان کے پاس نعمت آ جائے تو وہ شکر ادا کرنے میں بہت حریص ہوتے ہیں اور وہ مالی قوت اور افرادی قوت کو بھی اللہ کی اطاعت میں کھپا دیتے ہیں اور جن لوگوں کی فطرت میں انحراف ہوتا ہے اور وہ نہیں جانتے کہ اس قوت کا سرچشمہ کیا ہے۔ تو وہ تکبر' غرور اور سرکشی اختیار کر لیتے ہیں اور اپنی سرگرمیوں کو کھانے پینے تک محدود کر دیتے ہیں جس طرح مویشی کھاتے پیتے ہیں۔

أُولَئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ

"سو ان کا انجام یہ ہوا کہ دنیا اور آخرت میں ان کا سب کیا دھرا ضائع ہو گیا اور وہی خسارے میں ہیں"۔ (۹ : ۶۹)

حبط اعمال کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اعمال بنیاد ہی سے باطل ہو گئے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے پودے کے مانند تھے جس کی جڑیں نہ تھیں۔ اس قسم کا پودا نہ سرسبز ہوتا ہے اور نہ پھلتا پھولتا ہے۔ اور ایسا پودا لگانے والے آخر کار گھاٹے میں ہوتے ہیں اور ان کا گھاٹا ہمہ گیر ہوتا ہے۔

اب منافقین کو چھوڑ کر روئے سخن عام ہو جاتا ہے۔ یہ عام خطاب تعجب کرتے ہوئے کیا جاتا ہے کہ عجیب ہیں یہ لوگ کہ سابقہ لوگوں کے انجام کو دیکھتے ہوئے اور جانتے ہوئے یہ لوگ اس راہ پر بدستور چلتے ہیں۔

أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ ۙ وَقَوْمِ إِبْرَاهِيمَ وَأَصْحَابِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكَاتِ ۚ أَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٧٠﴾

"کیا ان لوگوں کو اپنے پیش روؤں کی تاریخ نہیں پہنچی؟ نوح کی قوم' عاد' ثمود' ابراہیم کی قوم' مدین کے لوگ اور وہ

بستیاں جنہیں الٹ دیا گیا۔ ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے 'پھر یہ اللہ کا کام نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا مگر وہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے"۔

یہ لوگ اس دنیا کے مزے لوٹ رہے ہیں اور اس کو اپنی حالت کا اچھی طرح شعور نہیں ہے ۔یہ لوگ ہلاکت کی راہ پر مسلسل چل رہے ہیں اور کسی نصیحت کو پلے نہیں باندھتے ۔

اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۹: ۷۰) "کیا ان لوگوں کو اپنے پیش رووں کی تاریخ نہیں پہنچی؟" جو اسی راہ پر چلے جس پر یہ چلتے ہیں ۔ ذرا قوم نوح کی تاریخ کو پڑھیں کہ کس طرح انہیں طوفان نے گھیر لیا اور ہلاک کیے گئے اور یہ سخت خوفناک ہلاکت تھی ۔ قوم عاد جسے ایک شدید آندھی نے آلیا۔ قوم ثمود جسے ایک زبردست چیخ اور آواز نے ہلاک کر دیا۔ قوم ابراہیم ؑ جو بڑے بڑے جباروں پر مشتمل تھی 'اسے ہلاک کر کے اللہ نے حضرت ابراہیم کو معجزانہ طور پر نجات دی ۔ اصحاب مدین جن کو شدید زلزلے نے آلیا۔ اور قوم لوط جن کی نسل کو اللہ نے کاٹ کر رکھ دیا اور چند لوگ ہی اس عذاب سے بچے ۔ کیا ان لوگوں کو ان تاریخی واقعات کا علم نہیں ہے ۔ ان اقوام کے پاس بھی رسول روشن دلائل دے کر بھیجے گئے تھے ۔ لیکن ان اقوام نے ناحق ان کی تکذیب کی اور اللہ نے ان کو پکڑا۔

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۹: ۷۰) "پھر یہ اللہ کا کام نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا مگر وہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے"۔ ایک منحرف انسان کو قوت اور اقتدار مزید سرکش بنا دیتا ہے ۔ پھر مال و دولت کی وجہ سے ایسے لوگ اندھے ہو جاتے ہیں ۔ لہٰذا ماضی کے تاریخی واقعات صرف ان لوگوں کو فائدے دیتے ہیں جن کی چشم بصیرت وا ہوتی ہے اور وہ لوگ سنت الٰہی کو سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں کیونکہ سنت الٰہی اٹل ہوتی ہے ۔ اور ہمیشہ کام کرتی رہتی ہے ۔ اور وہ کسی شخص کی کوئی رعایت بھی نہیں کرتی ۔ اکثر لوگ جو قوت و اقتدار اور انعام و اکرام سے نوازے جاتے ہیں اور ان کو آزمائش میں ڈالا جاتا ہے 'اندھے ہو جاتے ہیں اور ان کی قوت بصارت و بصیرت پر پردے پڑ جاتے ہیں اور وہ حقائق کے ادراک سے قاصر رہتے ہیں ۔ وہ دیکھ نہیں سکتے کہ تاریخ میں بڑی بڑی قوتیں کس طرح سرنگوں ہوئیں ۔ اکثر لوگ ان باغیوں اور سرکشوں کے انجام پر غور نہیں کرتے ۔ جب انسان اپنے آپ کو اس طرح اندھا اور بہرا بنا دے تو پھر وہ اللہ کے عذاب کا مستحق ٹھہرتا ہے ۔ اب سنت الٰہیہ اپنا کام کرتی ہے اور مکافات عمل کا اصول سامنے آتا ہے اور ایسے لوگ اور اقوام پکڑی جاتی ہیں ۔ ان کو اپنی قوت پر غرہ ہوتا ہے اور انعامات و عیاشیوں میں سرکش ہو کر غفلت میں ہوتے ہیں اور اچانک اللہ کے گھیرے میں آجاتے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ غفلت 'نادانی اور نا بینی مال و دولت کے ساتھ چمٹی رہتی ہے اور اس کا انجام ہر دور میں اچھا نہیں ہوتا اور اس برے انجام سے جو لوگ بچ نکلتے ہیں وہ وہی ہوتے ہیں جن پر اللہ کا خصوصی کرم ہو۔

---ooo---

اور کفار و منافقین کا محاذ بالمقابل کیا ہے 'اور اس کا انجام کیا ہوگا یہ مومنین صادقین ہیں ۔ ان کا مزاج منافقین اور کفار سے یکدم مختلف ہے ۔ ان کا طرز عمل ان سے بالکل الٹ ہے ۔ اور ان کا انجام بھی ان کے انجام سے بالکل مختلف ہے ۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ
وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ۝ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ
اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ ع ٩ ٦ ١٥

"مومن مرد اور مومن عورتیں ' یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں ' بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں ' نماز قائم کرتے ہیں ' زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرتے ہیں ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی ' یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے ۔ ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انھیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ۔ ان سدا بہار باغوں میں ان کے لیے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انھیں حاصل ہوگی ۔ یہی بڑی کامیابی ہے"۔

اگر منافقین ایک دوسرے کے دوست ہیں اور ایک ہی فطرت رکھتے ہیں اور ایک ہی مزاج رکھتے ہیں تو مومنین و مومنات بھی ایک ہی مزاج اور ایک ہی نظریات کے قائل ہیں اور ایک دوسرے کے محب اور دوست ہیں ۔ لیکن منافقین باوجود ہم طبع اور ہم جنس ہونے کے مومنین اور مومنات کی طرح شیر و شکر نہیں ہیں کیونکہ دوست تو وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو بہادر ہوں ' جو ایک دوسرے کی مدد کو پہنچنے والے ہوں اور باہم معاون و انصار ہوں جبکہ منافقت کا مزاج ہی ان باتوں سے مختلف ہوتا ہے ۔ کیونکہ بہادری کے مقابلے میں منافق بزدل اور ذلیل ہوتے ہیں ۔ وہ ایک دوسرے کے ہمدرد نہیں ہوتے اور نہ ہی باہم جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور نہ باہم معاون و کفیل ہوتے ہیں ۔ حالانکہ ان کے خیالات اور ان کا طرز عمل ایک دوسرے کے ساتھ ملتا جلتا ہوتا ہے ۔ قرآن کریم دونوں کے لیے قدرے مختلف اسلوب اختیار کرتا ہے ۔ منافقین کے لیے صرف یہ لفظ ہیں بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ (۹ : ۷۱) (وہ ایک دوسرے سے ہیں اور اہل ایمان کے لیے الفاظ ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۹ : ۷۱) ایک مومن کا مزاج امت مومنہ کا مزاج ہوتا ہے ۔ وہ اجتماعی ذہن رکھتا ہے ۔ وہ اتحاد ' باہم متکافل اور مددگار ہوتا ہے اور اس کا یہ اتحاد اور باہم نصرت حصول خیر اور دفع شر کے لیے ہوتی ہے ۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ

عَنِ الْمُنْكَرِ (۹: ۷۱) "مومن مرد اور مومن عورتیں' یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں' بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں"۔ اور یہ مقاصد یعنی خیر کو حاصل کرنا اور شر کی مدافعت کرنا اس قدر اونچے اور مشکل مقاصد ہیں جن کے لیے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو یک جان دو قلب ہو۔ اس کے افراد باہم محبت کرنے والے اور مدد کرنے والے ہوں اور وہ شر کے مقابلے میں ایک صف میں صف آرا ہونے والے ہوں اور ان میں تفرقہ اور جدائی اور عدم اتفاق کا کوئی عامل موجود نہ ہو۔ اور جب جماعت مسلمہ کے اندر تفرقہ پیدا ہو جائے تو وہاں لازماً جماعت کے اندر کوئی ایسا عنصر داخل ہو گا جو اس کے مزاج کے خلاف ہو گا' جو اس کے نظریات کے ساتھ لگا نہ کھاتا ہو گا اور اسی عنصر کی وجہ سے تفرقہ جماعت کے اندر داخل ہو گا۔ تفرقے کی وجہ سے جماعت کے اندر پھر امراض اور اعراض پیدا ہوں گی اور اب اس کے پیش نظر نہ وہ مقصد رہے گا جو اس کا اصل مقصد ہے اور نہ اس کے اندر امت کی صف اول موجود رہے گی یعنی بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۹: ۷۱) غرض اس صفت کی وجہ سے یعنی صفت ولایت ہی کی وجہ سے جماعت مسلمہ اپنا فرض امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ادا کرتی ہے اور وہ دنیا کے اندر اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ (۹: ۷۱) اقامت صلوۃ اس کی علامت ہوتی ہے۔

وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ (۹: ۷۱) ادائے زکوۃ وہ فریضہ ہے جو افراد جماعت کو باہم مربوط کرتا ہے اور اس کے ذریعے افراد جماعت کے اندر روحانی اور جسمانی رابطے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے نصب العین کی طرف بڑھتے ہیں۔

وَيُطِيعُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ (۹: ۷۱) "وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں" اور یہ ہے ایک مومن کا اصلی ہدف۔ لہٰذا حکم الٰہی اور حکم رسول کے سوا ان کے لیے کوئی اور حکم قانون نہیں ہوتا۔ اور اللہ کی شریعت اور رسول کی سنت کے سوا ان کے لیے کوئی دستور نہیں ہوتا۔ اور اللہ اور رسول کے دین کے سوا ان کے لیے کوئی اور نظام نہیں ہوتا اور جب کسی قضیے کا فیصلہ اللہ اور رسول اللہ کر دیں تو وہ چون و چرا نہیں کرتے۔ ان کے سامنے ایک ہی راہ' راہ مستقیم ہوتی ہے اور وہ ادھر ادھر کی پگڈنڈیوں کی طرف نہیں لپکتے۔ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ (۹: ۷۱) "یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو گی"۔ اور یہ رحمت صرف عالم آخرت تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس رحمت کا آغاز اس جہاں سے ہی ہو جاتا ہے اور یہ رحمت اس فرد پر بھی ہوتی جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتا ہے اور نماز کی اقامت اور زکوۃ کی ادائیگی کرتا ہے۔ اور ایسے افراد سے جو جماعت تشکیل پاتی ہے اس پر بھی رحمت کی بارش ہوتی ہے۔ یہ رحمت اطمینان قلب کی شکل میں بھی ہوتی ہے' تعلق باللہ کی شکل میں بھی ہوتی اور حادثات اور فتنوں سے بچانے کی شکل میں بھی ہوتی ہے اور جماعت کی اصلاح' اس کی ثابت قدمی اور اطمینان اور اس کے افراد کے درمیان باہم محبت اور تکافل کی شکل میں بھی ہوتی ہے اور جذبہ اخلاص اور رضائے الٰہی پیدا ہو جانے کی صورت میں بھی ہوتی ہے۔

مومنین کی یہ چار صفات منافقین کی چار صفات کے بالمقابل ہیں۔ مومنین کی صفات امر بالمعروف' نہی عن المنکر' ادائے صلوۃ' اداء زکوۃ ہیں اور منافقین کی صفات نہی عن المعروف' امر بالمنکر' اللہ کو بھلانا اور بخل کرنا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی جانب سے مومنین پر نزول رحمت ہوتا ہے۔ اور منافقین کے لیے اس کے بدلے میں لعنت ہوتی ہی اور ان صفات کے نتیجے ہی میں اللہ نے مومنین کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ انہیں فتح و نصرت اور زمین کے اوپر اقتدار و برتری ملے گی اور

اس طرح وہ پوری انسانیت کے صالح اور مصلح نگران ہوں۔

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۹:۷۱) "یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے"۔ وہ اس پر قادر ہے کہ جماعت مومنین کو ایک دوسرے کا دوست بنائے اور ان کو اعزاز بخشے اور وہ پھر اللہ کے احکام و فرائض ادا کریں۔ اور وہ حکیم ہے اور اپنی حکمت کے ذریعے اس جماعت کی نصرت کرتا ہے اور اسے اعزاز دیتا ہے تاکہ یہ جماعت بر سر اقتدار آکر زمین میں اصلاح کا کام کرے اور لوگوں کے درمیان اللہ کے کلمے کی حفاظت کرے۔

ایک طرف جہنم کا عذاب منافقین اور کافرین کے انتظار میں ہے۔ اور اللہ کی جانب سے لعنت و ملامت ان کے گھات میں بیٹھی ہے۔ اور یہ وعید بھی ان کے لیے سوہان روح ہے کہ اللہ ان کو نسیا منسیا کر دے گا تو دوسری جانب اہل ایمان کے لیے خوشیوں کے سامان ہیں اور یہ دائمی خوشیاں ان کے انتظار میں ہیں۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا
وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

(۹:۷۲) "ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انہیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان سدا بہار باغوں میں ان کے لیے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انہیں حاصل ہوگی۔ یہی بڑی کامیابی ہے"۔

یہ لوگ ان جنات میں باعزت طور پر رہیں گے --- لیکن ان کے لیے ان اعلیٰ رہائش گاہوں سے بھی بڑا انعام اللہ کی رضامندی ہے اور جنت اپنی تمام آسائشوں کے ساتھ اس بڑے انعام کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔ اور یہ خوشی یعنی رضائے الٰہی کی خوشی سب سے بڑی خوشی ہے۔

اللہ کے ساتھ رابطے کا اعلیٰ مقام انسان کو اس وقت ملتا ہے کہ جب وہ اللہ اپنی آنکھوں سے نظر آئے یعنی حالت شہود۔ اس مقام میں انسان دنیا کی کثافتوں، اس کی پریشانیوں اور اس کی دلچسپیوں سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس مقام میں انسان کے دل کی گہرائیوں سے ایک روشنی نکلتی ہے۔ انسانی آنکھیں اس نور کو نہیں دیکھ سکتیں اور یہ نور، نور الٰہی ہوتا ہے اور اس کا تعلق روح اللہ سے ہوتا ہے۔ یہ مقام انسانوں میں سے نہایت ہی قلیل تعداد کو نصیب ہوتا ہے۔ اس مقام کا ایک لحظہ اور ایک چمک ہی پوری زندگی کے مال و متاع سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ جبکہ اللہ کی رضامندی کا مقام تو اس سے بھی بلند مقام ہے اور اس میں انسان کی روح کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور انسان تسلسل کے ساتھ اس کا شعور اپنے اندر پاتا ہے۔

---ooo---

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ

وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿٧٣﴾ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا
قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا بِمَا
لَمْ يَنَالُوا ۚ وَمَا نَقَمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ ۚ فَإِنْ
يَتُوبُوا يَكُ خَيْرًا لَهُمْ ۖ وَإِنْ يَتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا فِي
الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿٧٤﴾

"اے نبی' کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ آخر کار ان کا ٹھکانا جنہم ہے اور وہ بد ترین جائے قرار ہے۔ یہ لوگ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے وہ بات نہیں کہی' حالانکہ انہوں نے ضرور وہ کافرانہ بات کہی ہے۔ وہ اسلام لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے اور انہوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے کر نہ سکے۔ یہ ان کا سارا غصہ اسی بات پر ہے تاکہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے ان کو غنی کر دیا ہے! اب اگر یہ اپنی اس روش سے باز آئیں تو انہی کے لیے بہتر ہے' اور اگر یہ باز نہ آئے تو اللہ ان کو نہایت دردناک سزا دے گا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی' اور زمین میں کوئی نہیں جو ان کا حمایتی اور مددگار ہو"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے ساتھ بہت نرمی کا سلوک کیا۔ ایک عرصے تک آپ ان سے صرف نظر کرتے رہے اور چشم پوشی فرمائی۔ لیکن اب صبر کا پیانہ لبریز ہو گیا ہے۔ خوش اخلاقی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ خداوند قدوس کی طرف سے اب حکم آ جاتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ اپنے رویے میں اب ذرا سنجیدگی پیدا کریں۔ اور اب ان کے ساتھ وہی سلوک اختیار کیا جائے جو کفار کے ساتھ ہوتا ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ اب جہاد کا اطلاق دونوں پر کیا جائے اور ان کے ساتھ ایسا سخت رویہ اختیار کیا جائے جس میں کوئی نرمی نہ ہو۔

تحریک اسلامی کو کئی مراحل درپیش ہوتے ہیں۔ بعض مواقع پر نرمی ضروری ہوتی ہے اور بعض حالات میں سختی مفید ہوتی ہے۔ جب نرمی کا دور ختم ہو اور سختی کا تقاضا ہو تو سختی ضروری ہے۔ صبر بھی ایک دور کے لیے ہوتا ہے جس صبر کا پیانہ لبریز ہوتا ہے تو پھر سختی کا دور شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ تحریک کو مختلف حالات درپیش ہوتے ہیں اور مختلف حالات کے مختلف تقاضے ہوتے ہیں۔ نرمی اور مہلت پر مہلت دیئے چلے جانے سے بعض اوقات حالات اور خراب ہوتے ہیں۔

منافقین کے ساتھ سختی اور جہاد کے بارے میں اہل علم کے درمیان اختلاف رائے واقعہ ہوا ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ ان کے ساتھ سختی کی جائے جس طرح حضرت علی سے روایت ہے اور ابن جریر نے اسے ترجیح دی ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ ان کو معاشرے میں ننگا کر دیا جائے اور ان کے ساتھ رویے میں سختی کی جائے جیسا کہ حضرت ابن عباس سے نقل ہے کہ حضور نے کسی منافق کو قتل نہیں کیا۔

يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا

بِمَا لَمْ يَنَالُوْا (۹ : ۷۴) ”یہ لوگ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے وہ بات نہیں کی، حالانکہ انہوں نے ضرور وہ کافرانہ بات کہی ہے۔ وہ اسلام لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے اور انہوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے کر نہ سکے“۔

یہ آیت منافقین کی عمومی حالت کو ریکارڈ کرتی ہے۔ ان کا عمومی موقف کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہروقت رسول اللہ اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف رہتے تھے لیکن بعض روایات میں ان آیات کے نزول کا ایک خاص سبب اور واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے۔

قتادہ نے کہا ہے کہ یہ عبداللہ ابن ابی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک جہنی اور انصاری کے درمیان جنگ ہوگئی اور جہنی نے انصاری پر غلبہ حاصل کر لیا۔ اس پر عبداللہ نے انصاریوں سے کہا کہ تم اپنے بھائی کی مدد نہیں کرتے ہو۔ خدا کی قسم ہماری اور محمد کی مثال اس طرح ہے جس طرح کسی نے کہا ہے کہ اپنے کتے کو خوب موٹا کرو تاکہ تمہیں کاٹے۔ اس نے اس پر مزید یہ بھی کہا کہ ہمیں مدینہ کی طرف لوٹنے دیں، وہاں ہم میں سے معزز لوگ ذلیل لوگوں کو نکال دیں گے۔ یہ بات کسی مسلمان نے رسول اللہ تک پہنچا دی۔ حضور نے عبداللہ سے دریافت کیا تو وہ قسمیں کھانے لگا کہ اس نے یہ بات نہیں کی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

امام ابو جعفر ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ رسول اللہ ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھے تھے۔ تو آپ نے فرمایا ”تمہارے پاس ایک شخص آئے گا اور وہ تمہیں شیطان جیسی نظروں سے دیکھے گا۔ جب وہ آئے تو اس سے کوئی شخص بات نہ کرے۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد ایک شخص نیلی آنکھوں والا سامنے آیا۔ اسے رسول اللہ نے بلایا اور کہا تم اور تمہارے ساتھی کس پر چلتے ہو“ یہ شخص گیا اور اپنے ساتھیوں کو بلا کر لایا اور سب قسمیں کھانے لگے کہ ہم نے یہ باتیں نہیں کی ہیں۔ چنانچہ حضور نے ان سے درگزر فرما دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا (۹ : ۷۴) عروہ ابن الزبیر وغیرہ سے روایت ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ آیت جلاس ابن الصامت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا ایک پروردہ تھا جو اس کی بیوی کا بیٹا تھا۔ اس کا نام عمیر ابن سعد تھا۔ جلاس نے کہا کہ اگر محمد پر جو کلام نازل ہوا ہے یہ برحق ہے تو ہم ان گدھوں سے زیادہ بدتر ہیں جن پر ہم سوار ہیں۔ اس پر عمیر نے کہا: جلاس میں تمام لوگوں کے مقابلے میں تم سے محبت کرتا ہوں اور میرے نزدیک تم بہت بڑے بہادر ہو اور مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ تمہیں کوئی دکھ پہنچے لیکن تم نے ایسی بات کہہ دی ہے کہ اگر میں اسے افشا کرتا ہوں تو اس سے مجھے شرمندگی ہوگی اور اگر اسے چھپاتا ہوں تو خود ہلاک ہوتا ہوں۔ ان دونوں صورتوں میں سے ایک میرے لیے قابل برداشت ہے۔ چنانچہ اس نے رسول اللہ کو اس بات کی اطلاع کر دی۔ لیکن جلاس نے اس کا انکار کر دیا اور قسم اٹھالی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس پر جلاس نے کہا میں نے بے شک یہ بات کہی ہے لیکن اللہ نے میرے لیے توبہ کی گنجائش رکھ دی ہے۔ اس لیے میں توبہ کرتا ہوں چنانچہ اس کی توبہ قبول ہوگئی۔

لیکن یہ تمام روایات قرآن مجید کی عبارت وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا (۹ : ۷۴) ”اور انہوں نے کچھ کرنے کا ارادہ کیا مگر نہ کر سکے“۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روایات پیچیدہ ہیں۔ اور اس سے مراد وہ حادثہ ہے کہ جو غزوۂ تبوک سے واپسی پر پیش آیا۔ بعض منافقین اچانک چھپ کر رسول اللہ کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک روایت یہ

ہے جسے ہم یہاں اختیار کرتے ہیں ۔

---ooo---

امام احمد نے یزید ' ولید ابن عبداللہ ابن جمیع ' ابو طفیل کے ذریعے روایت نقل کی ہے ۔ یہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ تبوک سے واپس ہو رہے تھے تو حضورؐ نے منادی کو حکم دیا کہ وہ اعلان کر دیں کہ حضور تنگ گھاٹی سے گزرنے والے ہیں ۔ لہٰذا اس راہ پر کوئی نہ گزرے ۔ حضورؐ کی سواری کی لگام حضرت حذیفہ کے ہاتھ میں تھی اور حضرت عمار اسے ہانک رہے تھے کہ کچھ لوگ اپنی سواریوں پر نقاب پہنے ہوئے آئے ۔ انہوں نے عمار کو دبالیا ۔ یہ حضورؐ کی سواری کو چلا رہے تھے ۔ عمار پہنچے اور انہوں نے ان سواریوں کا منہ پھیرلیا ۔ رسول اللہ نے حذیفہ سے کہا (روکو روکو) یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتر گئے اور عمار واپس آگئے تو حضورؐ نے عمار سے پوچھا کیا تم نے ان لوگوں کو پہچانا ۔ انہوں نے کہا میں نے تمام سواریوں کو تو پہچان لیا ہے لیکن لوگ نقاب پوش تھے ۔ تو حضورؐ نے دوبارہ پوچھا تمہارا کیا خیال ہے یہ کیا چاہتے تھے ؟ تو عمار نے کہا اللہ اور رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں ۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ رسول اللہ کی سواری کو بھگا کر رسول اللہ کو گرانا چاہتے تھے ۔ عمار نے رسول اللہ کے ساتھیوں میں سے ایک ایک سے دریافت کر کہ عقبہ کے دن سوار کتنے تھے ؟ تو انہوں نے کہا کہ چودہ تھے تو عمار نے کہا کہ اگر تم ان میں سے تھے تو وہ پندرہ تھے ۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے ان میں سے تین آدمیوں کی نشاندہی کی تو انہوں نے قسم اٹھائی کہ ہم نے رسول اللہ کی منادی کا اعلان نہیں سنا ۔ اور نہ ہمیں علم ہے کہ لوگ کیا چاہتے تھے ۔ اس پر عمار نے کہا کہ باقی ۱۲ افراد اللہ اور رسول اللہ کے ساتھ برسرپیکار تھے ۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ۔

یہ حادثہ بتاتا ہے کہ ان لوگوں کے ارادے کیا تھے ؟ بہرحال اس آیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہو یا کسی دوسرے واقعہ کی طرف ' بہرحال ابھی تک مسلمانوں مین ایسے کینہ پرور موجود تھے ۔ اس لیے آیت میں ان کے رویے پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے ۔

وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ (۹ : ۷۴) "یہ ان کا سارا غصہ اسی بات پر ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے اپنے فضل سے ان کو غنی کر دیا ہے" ۔ غرض اسلام نے ان کے ساتھ کوئی دشمنی نہ کی تھی جس کی وجہ سے وہ اسے یہ بدلہ دینا چاہتے تھے ۔ ان کے ساتھ اگر کوئی برائی کی گئی تھی تو صرف یہ تھی اسلام کے بعد ان کو مالدار بنا دیا تھا اور وہ آسودہ حال ہو گئے تھے اور اس آسودہ حالی کی وجہ سے یہ بدمستیاں کر رہے تھے ۔

اور اس تعجب اور معنی خیز تعجب کے بعد اور فیصلہ کن بات کی جاتی ہے ۔

فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۹ : ۷۴) "اب اگر یہ اپنی اس روش سے باز آئیں تو انہی کے لیے بہتر ہے ' اور اگر یہ باز نہ آئے تو اللہ ان کو نہایت دردناک سزا دے گا ' دنیا میں بھی اور آخرت

میں بھی ' اور زمین میں کوئی نہیں جو ان کا حمایتی اور مددگار ہو"۔

ان حرکات کے باوجود توبہ کا دروازہ پوری طرح کھلا ہے۔ لہٰذا جو اپنا بھلا چاہتا ہے تو وہ دوڑ کر اندر داخل ہو جائے اور جو بدستور ٹیڑھی راہ پر چلنا چاہے تو انجام واضح ہے۔ دنیا اور آخرت میں اسے دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور اس دنیا میں بھی اس کا کوئی ناصر و مددگار نہ ہو گا۔ لہٰذا اگر کوئی یہ راستہ اپناتا ہے تو وہی خود ملامت زدہ ہو گا۔

---ooo---

سیاق کلام بدستور آگے بڑھ رہا ہے اور منافقین کے خدوخال سامنے آ رہے ہیں۔ ان کے افعال و اقوال پر تبصرہ ہو رہا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾

"ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اس نے اپنے فضل سے ہم کو نوازا تو ہم خیرات کریں گے اور صالح بن کر رہیں گے۔ مگر جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دولتمند کر دیا تو وہ بخل پر اتر آئے اور اپنے عہد سے ایسے پھرے کہ انہیں اس کی پروا تک نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اس بدعہدی کی وجہ سے جو انہوں نے اللہ کے ساتھ کی ' اور اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بولتے رہے ' اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا ' جو اس کے حضور ان کی پیشی کے دن تک ان کا پیچھا نہ چھوڑے گا"۔

منافقین میں سے بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے اللہ کے ساتھ یہ عہد کر رکھا تھا کہ اگر اللہ نے ان کو مال و دولت سے نوازا تو وہ راہ خدا میں خوب خرچ کریں گے اور اچھے اعمال کریں گے۔ لیکن یہ عہد فقر و فاقہ کے حالات میں تھا۔ اور اس وقت تھا جب کچھ ملنے کی امید تھی لیکن جب اللہ نے ان کی آرزو کو پورا کر دیا تو یہ لوگ اپنے وعدوں کو بھول گئے۔ ان لوگوں نے بخل اور کنجوسی کو اپنا لیا اور ہاتھ روک لیا۔ بلکہ وفائے عہد سے سرکشی کرنے لگا گویا اس نے کوئی عہد کیا ہی نہیں ہے۔ چنانچہ وعدہ خلافی اور پھر جھوٹ کی وجہ سے اللہ نے ایسے لوگوں کے دلوں میں نفاق کو اچھی طرح بٹھا دیا۔ یہ لوگ آخر تک منافق رہے اور برے انجام تک پہنچے۔

نفس انسانی بہت ہی بخیل ہے۔ اس سے صرف وہ لوگ بچ نکلتے ہیں جنہیں اللہ بچاتا ہے۔ صرف وہی لوگ بخل سے بچ سکتے ہیں جن کا دل ایمان سے لبریز ہو۔ وہ دنیاوی ضروریات سے اپنے آپ کو سربلند کر دیں۔ اور تمام لالچوں اور مفادات پر لات مار دیں اور ان کی آنکھیں آخرت کے عہد پر ہوں۔ اور رضامندی خالق ان کا نصب العین ہو۔ اور ان کے دل ایمان کی وجہ سے مطمئن ہو جائیں اور انفاق کی وجہ سے وہ مسکین ہونے سے نہ ڈرتے ہوں کیونکہ ان کو یقین ہوتا ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ ختم ہونے والا ہے اور اللہ کے خزانے میں جو کچھ ہے ' وہ باقی رہنے والا ہے۔ یہی وہ

نظریہ ہے جو انسان کو راہ خدا میں خرچ کرنے پر ابھارتا ہے اور انسان خوشی خوشی سے مال خرچ کرتا ہے۔ایک مومن یہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے اگر مال چلا بھی جائے تو بھی آخرت کا اجر اجر عظیم ہے۔

لیکن جب کسی کا دل ایمان سے تہی دامن ہو تو وہ فطرتاً بخیل ہو جاتا ہے جب بھی اسے پکارا جائے کہ راہ خدا میں انفاق کی ضرورت ہے تو وہ فقر کے ڈر کے مارے بخل کرتا ہے اور ہاتھ روک لیتا ہے لیکن اسے کبھی بھی چین و قرار نصیب نہیں ہوتا۔وہ ہمیشہ بے قرار رہتا ہے۔جو شخص اللہ کے ساتھ عہد کرتا ہے اور پھر اسی کی خلاف ورزی کرتا ہے اور جو اللہ کے ساتھ جھوٹ کرتا ہے وہ کسی کے ساتھ بھی سچ نہیں کر سکتا۔اور اس کا دل نفاق سے پاک نہیں ہو سکتا' جس کی تین علامات جو رسول نے متعین کی ہیں۔"جب بولے تو جھوٹ بولے' جب وعدہ کرے تو توڑ دے۔جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے"۔

چنانچہ عہد شکنی اور اللہ پر جھوٹ بولنے کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے لوگوں پر نفاق مسلط ہو جائے اور وہ آیت کے فیصلے کے مطابق اس انجام تک پہنچیں۔

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ (۹: ۷۷) "نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اس بدعہدی کی وجہ سے جو انہوں نے اللہ کے ساتھ کی' اور اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بولتے رہے' اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا جو اس کے حضور ان کی پیشی کے دن تک ان کا پیچھا نہ چھوڑے گا"۔

---ooo---

اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۷۸﴾

"کیا یہ لوگ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ کو ان کے مخفی راز اور ان کی پوشیدہ سرگوشیاں تک معلوم ہیں اور وہ تمام غیب کی باتوں سے پوری طرح باخبر ہے"۔

کیا ان کے دعوائے ایمان کے باوجود ان کو اس قدر علم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے دلوں سے خبردار ہے' ان کے دلوں میں جو خیالات گزرتے ہیں وہ باہم جو گفتگو کرتے ہیں' جو وہ خفیہ باتیں کرتے ہیں' ان سے خبردار ہے کیونکہ اللہ پوشیدہ سے پوشیدہ امور کا بھی عالم ہے۔دلوں کی نیات سے بھی باخبر ہے۔ان کو اس بات کا اچھی طرح علم ہے پھر بھی چھپاتے ہیں۔اور پھر بھی وعدہ خلافی کرتے ہیں۔یہ خود ان کے علم کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ان کے علم کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ نہ کوئی بات چھپاتے اور نہ وعدہ خلافی کرتے اور اللہ پر کوئی جھوٹ نہ باندھتے۔

اس آیت کے نزول کے بارے مین متعدد روایات وارد ہیں۔ان میں سے ہم ابن جریر کی روایت نقل کرتے ہیں۔انہوں نے اور ابن ابو حاتم نے معان سے نقل کیا ہے۔انہوں نے ابو امامہ باہلی سے انہوں نے ثعلبہ ابن حاطب انصاری سے کہ انہوں نے حضورؐ سے یہ درخواست کی کہ ان کے حق میں بہت سے مال کی دعا کریں۔اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ثعلبہ وہ تھوڑا مال جس کی تم شکرگزاری کر سکو۔اس زیادہ سے بہتر ہے جس کی تم شکرگزاری نہ کر سکو"۔

کہتے ہیں کہ اس نے دوبارہ درخواست کی تو حضورؐ نے فرمایا کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم اللہ کے نبی کے مانند ہو۔ خدا کی قسم اگر میں چاہتا کہ میرے لیے پہاڑ سونے چاندی کے ہو جائیں تو ہو جاتے"۔ اس نے پھر درخواست کی کہ خدا کی قسم اگر آپ نے میرے حق میں دعا کی اور اللہ نے مجھے مال کثیر دے دیا تو میں اس میں سے ہر صاحب حق کو حق دوں گا۔ اس پر رسول اللہ نے فرمایا "اے اللہ ثعلبہ کو مال دے دے"۔ کہتے ہیں کہ اس نے بکریاں پالنا شروع کیں اور وہ کیڑے مکوڑوں کی طرح بڑھنے لگیں۔ یہاں تک کہ مدینہ میں ان کا سمانا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ وہ مدینہ سے ہٹ کر ایک وادی میں چلا گیا اور ظہر و عصر کی نماز باجماعت پڑھتا اور باقی نمازیں ترک ہو گئیں۔ اس کے بعد اس کے مال میں اور اضافہ ہو گیا اور وہ اس قدر دور چلا گیا کہ صرف جمعے کی نماز کو حاضر ہوتا۔ یہ مال اس طرح بڑھتا رہا جس طرح کیڑے بڑھتے ہیں یہاں تک کہ جمعے کی نماز بھی چھوٹ گئی۔ اب وہ ان سواروں سے راستے میں ملتا جو جمعہ پڑھنے جاتے تھے تاکہ حالات دریافت کرے۔ اس پر رسول اللہ نے فرمایا کہ "ثعلبہ کا کیا ہوا؟" حضور کو بتایا گیا کہ اس نے بکریاں پالیں۔ مدینہ میں ان کا سمانا مشکل ہوا اور اس طرح وہ دور چلا گیا اور اس کے حالات انہوں نے بتائے۔ حضورؐ نے فرمایا "ثعلبہ ہلاک ہوا ثعلبہ ہلاک ہوا ثعلبہ ہلاک ہوا"۔ اس کے بعد اللہ کا یہ حکم نازل ہوا خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (ان کے اموال سے زکوٰۃ وصول کرو) اور زکوٰۃ کے احکام نازل ہوئے۔ تو حضورؐ نے زکوٰۃ کی وصولی کے لیے دو مسلمان بھیجے۔ ایک جہینہ سے تھا اور دوسرا سلیم سے۔ آپ نے ان کو تحریری احکام دیئے کہ وہ مسلمانوں سے کس حساب سے زکوٰۃ وصول کریں گے اور خصوصاً فرمایا کہ ثعلبہ اور فلاں کے پاس ہوتے ہوئے جاؤ (یہ فلاں بنو سلیم کا ایک شخص تھا) اور ان سے زکوٰۃ وصول کرو۔ یہ لوگ پہلے ثعلبہ کے پاس آئے اور اس سے زکوٰۃ کا مطالبہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم پڑھ کر سنایا تو ثعلبہ نے کہا یہ تو فقط جزیہ ہے۔ اگر نہیں تو جزیہ کی بہن ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ کیا ہے۔ تم جاؤ اور دوسرے لوگوں سے فارغ ہو کر میرے پاس آؤ۔ دوسرے شخص سلیمی نے یہ حکم سنا تو اس نے اپنے اونٹوں میں سے بہت اچھے اونٹ زکوٰۃ کے لیے علیحدہ کیے اور رسول اللہؐ کے تحصیلداروں کا انتظار کیا۔ جب انہوں نے ان اونٹوں کو دیکھا تو انہوں نے کہا کہ تم پر اس قسم کے اچھے اونٹوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لیے ہم ان کو وصول نہیں کر سکتے۔ اس شخص نے کہا تم لوگ ان اونٹوں کو وصول کر لو۔ میں بطیب خاطر یہ دے رہا ہوں۔ یہ ان کے لیے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اونٹ لے لیے اور دوسرے لوگوں سے وصولی کرتے ہوئے دوبارہ پھر ثعلبہ کے پاس آئے۔ اس نے کہا تم اپنا حکم مجھے دکھاؤ۔ اس نے رسول اللہ کا حکم پڑھا تو پھر کہا کہ یہ تو جزیہ ہے یا جزیہ کی بہن ہے۔ تم جاؤ میں سوچ کر فیصلہ کروں گا۔ یہ لوگ رسول اللہؐ کے پاس آئے اور جب حضورؐ نے ان کو دیکھا تو فرمایا "وہ ہلاک ہو گیا" حضورؐ نے ان کی بات سے پہلے ہی بتا دیا اور سلیمی کے لیے برکت کی دعا فرمائی۔ ان لوگوں نے حضورؐ کو ثعلبہ اور سلیمی دونوں کی روئیداد سنائی۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ اس وقت رسول اللہ کے پاس ثعلبہ کے رشتہ داروں میں سے ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے یہ سب کچھ سن لیا۔ وہ مدینہ سے چلا۔ اس سے ملا۔ اسے کہا ثعلبہ تم تباہ ہو جاؤ۔ تمہارے بارے میں تو یہ آیات نازل ہو گئی ہیں۔ ثعلبہ حضورؐ کے پاس آیا اور درخواست کی کہ میری زکوٰۃ قبول کریں۔ تو حضورؐ نے فرمایا مجھے تو اللہ نے آپ کی زکوٰۃ لینے سے منع کر دیا ہے۔ ثعلبہ اپنے سر پر مٹی ڈالنے لگا تو حضورؐ نے فرمایا یہ تو تمہارا اپنا کرنا ہے۔ میں نے تو تمہیں مشورہ دیا تھا مگر تم نے میری بات نہ مانی۔ جب رسول اللہؐ نے اس سے زکوٰۃ لینے سے انکار کر دیا تو وہ اپنی رہائش گاہ کی طرف

واپس ہوا۔ تو حضور فوت ہو گئے اور اس سے زکوٰۃ وصول نہ کی۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کا دور آیا تو ثعلبہ نے ان سے درخواست کی کہ تم رسول اللہؐ کے ساتھ میرے تعلق سے بھی واقف ہو اور انصار میں میرا جو مقام ہے اس سے بھی واقف ہو' میری زکوٰۃ وصول کیجیے۔ اس پر ابوبکرؓ نے فرمایا چونکہ حضورؐ نے آپ کی زکوٰۃ کو قبول نہیں فرمایا اس لیے میں نہیں لے سکتا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے زندگی بھر ان سے زکوٰۃ نہ لی۔ پھر ان کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ بنے اور ان کے پاس بھی ثعلبہ زکوٰۃ لے کر آئے اور درخواست کی امیرالمومنین میری زکوٰۃ قبول فرمائیں تو انہوں نے فرمایا کہ رسول نے قبول نہ کی' حضرت ابوبکرؓ نے قبول نہ کی میں کیسے قبول کر سکتا ہوں۔ چنانچہ وہ بھی فوت ہوئے اور ثعلبہ سے زکوٰۃ نہ لی۔ جب حضرت عثمان خلیفہ بنے تو ان کے پاس ثعلبہ آئے تو ان سے بھی درخواست کی کہ میری زکوٰۃ وصول کریں۔ چنانچہ انہوں نے بھی یہی کہا کہ رسول اللہ نے قبول نہ کی ابوبکرؓ نے قبول نہ کی' عمرؓ نے قبول نہ کی کیا میں لے لوں؟ چنانچہ انہوں نے بھی وصول نہ کی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں وہ فوت ہو گیا۔

ان آیات کے نزول کا تعلق اس واقعہ کے ساتھ ہو یا کسی دوسرے واقعہ کے ساتھ' آیت بہرحال عام ہے اور ایک عام حالت کی نشاندہی کر رہی ہے۔ یہ آیت ایک ایک شخص کی نفسیاتی تصویرکشی کرتی ہے جو بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہو اور ان کے دل و دماغ میں ابھی تک ایمان متمکن نہ ہوا ہو۔ اگر ان آیات کا شان نزول یہی ہو تو پھر ہم یہ کہیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ علم تھا کہ ثعلبہ قیامت تک منافق رہے گا اس لیے اس کی جانب سے زکوٰۃ کو قبول نہ کیا گیا اور اس کے ساتھ عام شرعی اصول کے مطابق معاملہ نہ فرمایا۔ عام شرعی اصول یہ ہے کہ منافقین کے ساتھ ان کے ظاہر کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔ ثعلبہ کے معاملے میں چونکہ اللہ کی جانب سے حضور کو خصوصی معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ اس لیے ان کے ساتھ حضورؐ نے سخت تادیبی معاملہ کیا تاکہ دوسروں کے لیے عبرت ہو۔ چنانچہ ان کو مرتد بھی قرار نہ دیا گیا تاکہ انہیں ارتداد کی سزا دی جائے اور مسلمان تصور کر کے ان سے زکوٰۃ بھی قبول نہ کی گئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ازروئے شریعت منافقین پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے' کیونکہ شریعت ان لوگوں کے ساتھ ان کے ظاہر کے مطابق معاملہ کرتی ہے' کیونکہ زیرنظر معاملے میں ایک نبی کو خصوصی علم تھا۔ اس پر کوئی دوسرا شخص قیاس کر کے ایسا طرزعمل اختیار نہیں کر سکتا۔

ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دور اول کے مسلمان زکوٰۃ کو کن نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ان پر اللہ کی جانب سے ایک رحمت ہے۔ جو شخص اس کے ادا کرنے سے محروم ہوا یا جس کی طرف سے قبول نہ کی گئی وہ گویا عظیم بھلائی سے محروم رہا۔ وہ اس قدر محروم اور گھاٹے میں رہا کہ اس پر رحم کیا جانے لگا۔ قرون اولیٰ کے مسلمان اس آیت کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا "ان کے اموال سے زکوٰۃ وصول کرو جو تم ان کی تطہیر کرتے ہو اور جس کے ذریعے تم ان کا تزکیہ کرتے ہو"۔ ان کے نزدیک زکوٰۃ ایک غنیمت تھی ٹیکس نہیں تھا جس سے ان کا تاوان ہوتا۔ لہٰذا جو مال فرض اللہ کی جانب سے عاید ہوتا ہے اور اس سے اللہ کی رضامندی مطلوب ہوتی ہے اس میں اور اس مالی فریضے میں جو لوگوں پر بطور جبر عاید ہوتا ہے' بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔

منافقین زکوۃ کے بارے میں کیا تصورات رکھتے تھے اور سچے اہل ایمان زکوۃ و صدقات کے بارے میں کیا سوچتے تھے ۔ان دونوں تصورات کی ایک جھلکی ملاحظہ ہو ۔ منافقین مخلص اور غریب اہل ایمان کے انفاق کا مذاق اڑاتے تھے ۔

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾

(وہ خوب جانتا ہے ان کنجوس دولت مندوں کو) جو برضا و رغبت دینے والے اہل ایمان کی مالی قربانیوں پر باتیں چھانٹتے ہیں اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کے پاس (راہ خدا میں دینے کے لیے) اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے اوپر مشقت برداشت کر کے دیتے ہیں ۔ اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لیے دردناک سزا ہے"۔

اس آیت کے نزول کا بھی ایک خاص قصہ ہے ۔جس سے اظہار ہوتا ہے کہ منافقین کی بگڑی ہوئی طبیعت انفاق فی سبیل اللہ کے بارے میں کیا سوچتی تھی؟

ابن جریر نے بواسطہ یحییٰ ابن کثیر اور سعید ابن قتادہ اور ابن ابی حاتم' حکم ابن ابان سے' عکرمہ سے نقل کیا ہے (روایت کے الفاظ مختلف ہیں) کہتے ہیں کہ حضورؐ نے تبوک کے موقعہ پر چندے کے لیے لوگوں کو آمادہ کیا ۔ عبدالرحمٰن ابن عوف نے چار ہزار دیئے ۔ انہوں نے کہا حضورؐ میری کل جائیداد آٹھ ہزار ہے اس میں سے نصف لایا ہوں ۔ نصف چھوڑ رکھا ہے ۔ تو حضورؐ نے فرمایا اللہ اس میں بھی برکت دے جو تو نے دیا اور اس میں بھی برکت دے جو پس انداز کر دیا ہے ۔ ابو عقیل ایک صاع کھجوریں لائے اور کہا رسول خداؐ میں دو صاع کھجور کما کر لایا ہوں ۔ ایک صاع میں اللہ کو قرض دیتا ہوں اور ایک اپنے بچوں کے لیے چھوڑ دیا ہے ۔ ان دونوں کے ساتھ منافقین نے مذاق کیا ۔ عبدالرحمٰن ابن عوف کے بارے میں کہا کہ اس نے دکھاوے کے لیے اتنا مال دیا اور ابو عقیل کے بارے میں کہا کہ اللہ اور رسولؐ کو ایک صاع کی ضرورت ہی کیا تھی ۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے ابو عقیل کے بارے میں کہا کہ یہ شخص خواہ مخواہ اپنے آپ کو یاد کرانا چاہتا ہے' حالانکہ اس نے ساری رات مزدوری کی اور دو صاع کمائے تھے اور ایک صاع حضورؐ کے سامنے پیش فرمایا ۔

منافقین اہل ایمان کے بارے میں اس قسم کی باتیں کرتے تھے حالانکہ وہ دل و جان سے فدا ہو رہے تھے اور بطیب خاطر خرچ کر رہے تھے اور جس کے مقدر میں جس قدر تھا وہ جہاد میں حصے کے طور پر فنڈ میں دیتے تھے لیکن منافقین کی سمجھ میں مسلمانوں کا اخلاص اور ان کے پاکیزہ جذبات نہ آتے تھے ۔ ان کے دل بجھے ہوئے تھے اس لیے وہ مسلمانوں کے حساس دلوں کا ادراک نہ کر سکتے تھے ۔ وہ مسلمانوں کی بے تابی کو نہ پا سکتے تھے جو وہ راہ خدا میں انفاق کے لیے دکھا رہے تھے ۔ وہ داعیہ ایمانی کے نتیجے میں تھوڑا یا بہت ملا کر پیش کرتے تھے اور یہ لوگ داعیہ ایمانی سے محروم تھے ۔ چنانچہ وہ اس کے سوا اور کہہ کیا سکتے تھے کہ اگر زیادہ دیا جائے تو ریاکار ہے اور اگر قلیل دیا جائے تو نام لکھوا رہا ہے ۔ اگر کوئی زیادہ دیتا

تو وہ بھی مجرم اور اگر کوئی تھوڑا دیتا تو بھی مجرم ۔ لہٰذا ان کی اس تنقید کو صالح ذہن قبول ہی نہ کرتا تھا ۔ اس لیے کہ وہ ذاتی طور پر جہاد سے پیچھے رہنے والے تھے 'پشت کی طرف سے نقب لگانے والے تھے اور ایک پیسہ جہاد میں دینے کے لیے تیار نہ تھے ۔ وہ اگر کچھ دیتے بھی تو محض ظاہرداری کے قیام کے لیے اور بری نیت سے اور حقیر اور ذلیل اسباب کی وجہ سے ۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ بھی ان کو خوب جواب دیتا ہے سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۹ : ۷۹) "اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لیے دردناک سزا ہے" ۔ کس قدر ہولناک انجام ہے یہ ۔ اور کس قدر ہولناک مذاق ہو گا خالق کی جانب سے ۔ ایک طرف ایک چھوٹی سی جماعت 'ضعیف و ناتواں' ذلیل اور فانی اور اس کے مقابلے میں خالق کائنات اور اس کا دردناک عذاب کس قدر خوفناک عذاب کے لیے یہ ضعیف و ناتواں انسان اپنے آپ کو پیش کرتا ہے ۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ
سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ
۱۰ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۸۰ ع
۱۲

"اے نبی' تم خواہ ایسے لوگوں کے لیے معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو' اگر تم ستر مرتبہ بھی انہیں معاف کرنے کی درخواست کرو گے تو اللہ انہیں ہرگز معاف نہ کرے گا ۔ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا ہے 'اور اللہ فاسق لوگوں کو راہ نجات نہیں دکھاتا" ۔

یہ منافقین جو مخلص اور رضاکار مومنین کا مذاق اڑاتے تھے 'کہ یہ لوگ اس کا کیوں مال لٹاتے ہیں ان کا انجام یہ ہے کہ خود حضورؐ کی جانب سے طلب مغفرت بھی ان کے لیے مفید نہ ہو گی ۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شفقت کی وجہ سے ان خطاکاروں کے لیے بھی مغفرت طلب کرتے تھے شاید کہ اللہ معاف کر دے ۔

لیکن ان لوگوں کے بارے میں اللہ نے صاف صاف بتا دیا کہ ان منافقین کا انجام طے شدہ ہے ۔ اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے ۔ ان لوگوں نے صحیح راہ سے انحراف کر لیا ہے 'لہٰذا ان کا اب اچھے انجام تک پہنچنا ممکن ہی نہیں ہے ۔ ان کے دل اس قدر فاسد ہو چکے ہیں کہ ان کی اصلاح ممکن ہی نہیں ہے ۔

لہٰذا حضورؐ کو کہا جاتا ہے کہ اب اگر ستر مرتبہ بھی طلب مغفرت کریں 'کوئی فائدہ نہ ہو گا ۔ ستر مرتبہ سے مراد کوئی متعین عدد نہیں ہے ۔ اس سے مراد کثرت ہوتی ہے یعنی اب ان کی مغفرت کی کوئی امید نہیں ہے ۔ کیونکہ ان کے لیے توبہ کا دروازہ بند ہو چکا ہے ۔ کیونکہ انسانی دل اگر فجور اور فساد کی ایک حد سے آگے بڑھ جائے تو پھر اصلاح کی کوئی امید نہیں رہتی اور انسان جب گمراہی میں حد سے گزر جائے تو پھر راہ راست پر واپس آنے کی کوئی امید نہیں رہتی ۔ اور اللہ تو دلوں کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہے ۔

---ooo---

اب سیاق کلام ایک بار پھر ان لوگوں کی طرف پھر جاتا ہے جو رسول اللہؐ سے پیچھے رہ گئے تھے یعنی غزوۂ تبوک کے اہم مرحلے میں۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا
اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا
فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾ فَلْيَضْحَكُوْا
قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ
اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا
وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا
مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى
قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَلَا تُعْجِبْكَ
اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَ
تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

"جن لوگوں کو پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی گئی تھی وہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دینے اور گھر بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے اور انہیں گوارا نہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کریں۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ "اس سخت گرمی میں نہ نکلو"۔ ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے' کاش انہیں اس کا شعور ہوتا۔ اب چاہئے کہ یہ لوگ ہنسنا کم کریں اور روئیں زیادہ' اس لیے کہ جو بدی یہ کماتے رہے اس کی جزا ایسی ہی ہے (کہ انہیں اس پر رونا چاہئے)۔ اگر اللہ ان کے درمیان تمہیں واپس لے جائے اور آئندہ ان میں سے کوئی گروہ جہاد کے لیے نکلنے کی تم سے اجازت مانگے تو صاف کہہ دینا "اب تم میرے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے اور نہ میری معیت میں کسی دشمن سے لڑ سکتے ہو' تم نے پہلے بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا تو اب گھر بیٹھنے والوں ہی کے ساتھ بیٹھے رہو"۔

اور آئندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نماز جنازہ بھی تم ہرگز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہونا' کیوں

کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ؐ کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ مرے ہیں اس حال میں کہ وہ فاسق تھے ۔ ان کی مالداری اور ان کی کثرت اولاد تم کو دھوکے میں نہ ڈالے ۔ اللہ نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ اس مال و اولاد کے ذریعہ سے ان کو اسی دنیا میں سزا دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں"۔

یہ لوگ جو پیچھے رہ گئے تھے ان سے یہ جرم دنیا پرستی کی وجہ سے سرزد ہوا۔ انہوں نے آرام اور راحت کو پسند کیا۔ انہوں نے انفاق فی سبیل اللہ سے پہلوتہی کی ۔کم ہمتی اور بے حمیتی اور بے ایمانی اور دلی کمزوری نے ان کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ یہ موقف اختیار کریں ۔ ان کے لیے جو لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ بھی نہایت ہی حقارت آ ہے یعنی یہ کوئی سامان ہے جو پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے رسول اللہ کو چھوڑ کر اس کے مقابلے میں امن و سکون اور عیش و راحت کو قبول کیا۔ انہوں نے رسول اللہ اور مجاہدین کو اکیلے چھوڑ کر سخت ترین گرمی کی مشقتوں کے لیے چھوڑ دیا اور اس بات کو پسند نہ کیا کہ اپنی جان و مال کے ذریعے اللہ کی راہ میں جہاد کریں ۔ انہوں نے کہا کہ اس "جھلسا دینے والی گرمی میں مت نکلو" یہی اقوال ان تمام لوگوں کے منہ سے نکلتے ہیں جو عیش کوش ہوتے ہیں ۔ یہ پست ہمت زنانہ چال والے لوگ ہوتے ہیں اور ان کو کسی صورت میں بھی مرد نہیں کہا جا سکتا۔

یہ لوگ ضعف ہمت کا نمونہ ہیں ۔ یہ کمزور ارادے کے لوگ ہیں ۔ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو مشکلات سے گھبراتے ہیں اور جدوجہد سے نفرت کرتے ہیں اور جہد و مشقت کے مقابلے میں ذلت آمیز راحت کو پسند کرتے ہیں ۔ اور جہد و مشقت کی باعزت زندگی انہیں گوارا نہیں ہوتی ۔ وہ شیر کی زندگی کے مقابلے میں گیدڑ کی زندگی کے خوگر ہوتے ہیں ۔ یہ لوگ آگے بڑھنے والی صفوں کے پیچھے تھکے ماندے پڑے رہتے ہیں ۔ لیکن باہمت لوگوں کی یہ اگلی صفیں پر خطر اور کانٹوں والی راہوں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں ۔ اس لیے کہ ان کی فطرت زندہ ہوتی ہے اور وہ جانتے ہیں کہ مشکلات کو انگیز کرنا اور آگے ہی بڑھتے چلے جانا انسانی فطرت کا تقاضا ہے ۔ پیچھے رہنے اور گھروں میں بیٹھنے کے مقابلے میں ایسے لوگوں کو دشمن کا سامنا کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے ۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ (۹ : ۸۱) "انہوں نے لوگوں سے کہا کہ "اس سخت گرمی میں نہ نکلو" ۔ ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے 'کاش انہیں اس کا شعور ہوتا'"۔

دنیا میں تو وہ گرمی سے جان بچا کر چھاؤں میں بیٹھ جائیں گے لیکن آخرت کی گرمی کا کیا علاج کریں گے ۔ وہاں تو وہ دائماً آگ میں رہیں گے ۔ اللہ کی جانب سے یہ ایک حقیقت پسندانہ طنز ہے ۔ دنیا میں اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنا تو بہت قلیل مدت کی مشقت ہے ۔ بمقابلہ جہنم کی گرمی کے جہاں جو بھی جائے گا ایک طویل عرصہ تک رہے گا ۔ اور معلوم نہیں کہ کس قدر وہاں رہے گا۔

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّ لْيَبْكُوْا كَثِيْرًا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۹ : ۸۲) "اب

چاہئے کہ یہ لوگ ہنسا کم کریں اور روئیں زیادہ' اس لیے کہ جو بدی یہ کماتے رہے ہیں اس کی جزا ایسی ہی ہے (کہ انہیں اس پر رونا چاہئے)"۔ یہاں اگر کوئی ہنسے گا تو اس کی ہنسی مختصر ہو گی کیونکہ دنیا کی زندگی محدود ہے۔ اور آخرت میں پھر اسے ہمیشہ کے لیے رونا ہو گا' اور جیسا کرے گا ویسے بھرے گا۔ یہ نہایت ہی منصفانہ جزا ہے۔

یہ لوگ جنہوں نے جہاد کے مقابلے میں آرام کو پسند کیا اور اپنایا۔ اور مشکل حالات میں قافلہ اسلام سے پیچھے رہ گئے۔ یہ کسی بھی مشکل مہم کے لیے نااہل ثابت ہو چکے ہیں۔ یہ جہاد کے قابل ہی نہیں رہے۔ اس لیے ان کے ساتھ کسی قسم کی نرمی مناسب نہیں ہے۔ لہٰذا اب کسی بھی موقعہ پر انہیں شریک جہاد کر کے ان کو عزت نہ دی جائے کیونکہ اس اہم موقعہ پر انہوں نے خود اس اعزاز کو لات مار دی۔

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِىَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِىَ عَدُوًّا اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ

(٩ : ٨٣) "اگر اللہ ان کے درمیان تمہیں واپس لے جائے اور آئندہ ان میں سے کوئی گروہ جہاد کے لیے نکلنے کی تم سے اجازت مانگے تو صاف کہہ دینا" اب تم میرے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے اور نہ میری معیت میں کسی دشمن سے لڑ سکتے ہو' تم نے پہلے بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا تو اب گھر بیٹھنے والوں ہی کے ساتھ بیٹھے رہو"۔

دعوت اسلامی اور اسلامی تحریکات کو نہایت ہی مضبوط' نہایت ہی سلیم الفطرت اور نہایت ہی راست باز لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے' جن کے ارادے مصمم ہوں' جو مشکلات کو انگیز کرنے والے ہوں' دشمن کے سامنے سینہ سپر ہونے والے ہوں اور لیک طویل اور پر مشقت جدوجہد کے لیے تیار ہوں۔ لیکن جب اسلامی تحریکات کی صفوں میں عیش پسند' راحت طلب' اور کمزور یقین کے لوگ گھس آئیں تو وہ مشکل وقت میں اس کی شکست کا باعث بنتے ہیں۔ مشکل وقت وہ اضطراب اور انتشار کا سبب بنتے ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے لوگ جن سے تحریک کے دوران ضعف وکمزوری کا صدور ہو جائے ان کو تحریک سے دور پھینکنا چاہئے تاکہ مشکل اوقات میں وہ کمزوری اور انتشار کا باعث نہ بنیں۔ اور یہ نہ ہو کہ جب خوشحالی کا دور دورہ ہو اور فتح و کامرانی کا دور ہو تو یہ لوگ لوٹ کر مزے لوٹتے رہیں۔ صاف صاف کہہ دو" اب تم میرے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے۔ نہ تم میری معیت میں کسی دشمن کے ساتھ لڑ سکتے ہو۔ تم نے خود پہلے بیٹھے رہنے کو پسند کیا۔

اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ (٩ : ٨٣) تم نے جنگ تبوک کے لیے نکلنے کا شرف کھو دیا ہے۔ لشکر تبوک میں شمولیت کے اعزاز سے تم محروم ہو چکے ہو کیونکہ یہ شرف وہی حاصل کر سکتا تھا جو اس کے لیے اہل تھا۔ لہٰذا اس معاملے میں تمہارے ساتھ کوئی نرمی نہیں برتی جا سکتی۔ اور نہ تم حسن سلوک اور معافی کے مستحق رہے ہو۔ لہٰذا اب تم انہی لوگوں کے ساتھ بیٹھے رہو جو تمہارے ہم جنس اور ہم محفل اور ہم مشرب تھے۔ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ (٩ : ٨٣) " لہٰذا پیچھے رہنے والوں کے ساتھ ہی بیٹھے رہو"۔ یہ تھی وہ راہ جو اللہ نے اپنے نبی کے لیے تجویز کی تھی اور آج بھی نبی کے نقش قدم پر جو دعوت و تحریک برپا ہو گئی ہے' اس کی بھی یہی راہ و روش ہو گی۔ لہٰذا تحریک اسلامی کے

داعیوں اور کارکنوں دونوں کو یہ نکتہ یاد رکھنا چاہئے ۔ ہر دور میں اور ہر جگہ ۔

جس طرح حضورؐ کو یہ حکم بھی دیا گیا کہ ان لوگوں کو دوبارہ اسلامی صفوں میں شامل نہ کیا جائے 'کیونکہ انہوں نے مشکل حالات میں ساتھ چھوڑا' اسی طرح یہ حکم بھی دیا گیا ۔ آئندہ کے لیے ان کو اسلامی معاشرے میں کوئی اعزاز و امتیاز نہ دیا جائے ۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ (۹ : ۸۴) "اور آئندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نماز جنازہ بھی تم ہرگز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہونا 'کیوں کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ مرے ہیں اس حال میں کہ وہ فاسق تھے" ۔

اس آیت کے پس منظر کے بارے میں بھی مفسرین نے متعین واقعات ذکر کیے ہیں لیکن اس آیت کا مفہوم ان واقعات سے عام ہے ۔ یہاں اسلامی نظریہ حیات کی راہ میں جدوجہد کرنے والے گروہ کے بارے میں ایک اصول وضع کیا گیا ہے ۔ یہ کہ اس جدوجہد کے معاملے میں جو لوگ عیش کوش ' آرام پسند ہیں اور مشکلات کو انگیز نہیں کرتے اور مشکل مہمات میں شامل نہیں ہوتے ' اسلامی قیادت کی طرف سے ایسے لوگوں کے ساتھ نہ نرمی برتی جائے اور نہ ایسے لوگوں کو اعزاز دیا جائے ۔ اسلامی صفوں سے ایسے لوگوں کو دور رکھا جائے یا نہایت ہی پچھلی صفوں میں اور اس معاملے میں کوئی نرمی 'حسن سلوک یا رواداری نہ برتی جائے ۔

یہاں اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ان کا جنازہ نہ پڑھا جائے اور ان کی قبر پر آپ کھڑے نہ ہوں کیونکہ انہوں نے اللہ اور رسولؐ کے ساتھ کفر کیا اور یہ لاعمل فاسق تھے اور منافق تھے ۔ لیکن اس حکم سے جو عمومی اصول نکلتا ہے وہ زیادہ عام ہے ۔ کیونکہ نماز جنازہ اور قبر پر کھڑے ہونے سے میت کو اعزاز ملتا ہے اور اسی اعزاز کے یہ لوگ مستحق نہیں ہیں ۔ خصوصاً جو لوگ نہایت ہی مشکل وقت میں مجاہدین کی صفوں میں کھڑے نہیں ہوتے ان کو اعزاز نہ دیا جائے تاکہ لوگوں کو اسلامی جدوجہد کی اہمیت معلوم ہو ۔ اور کارکنوں کو معلوم ہو کہ اس معاملے میں اعزاز کے مستحق وہی لوگ ہوتے ہیں جو عملی جدوجہد کریں گے ' مشکلات کو انگیز کریں گے ۔ مشکلات میں ثابت قدم رہیں گے ۔ تب جاکر وہ اسلامی صفوں میں معزز 'مکرم اور ممتاز ہوں گے ۔ اسلامی تحریک میں ایسے لوگوں کو نہ ظاہری اعزاز دیا جائے اور نہ باطنی ۔

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ (۹ : ۸۵) "ان کی مالداری اور ان کی کثرت اولاد تم کو دھوکے میں نہ ڈالے اللہ نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ اس مال و اولاد کے ذریعہ سے ان کو اسی دنیا میں سزا دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں" ۔

تحریک اقامت دین کے لیے یہ ہمہ گیر ہدایت ہے کہ کسی کے مال و دولت کی وجہ سے اسے اعزاز نہ دیا جائے ۔ نہ دل اور شعور میں ایسے لوگوں سے کوئی تاثر لیا جائے ۔ یہ مال خود ان کے لیے وبال جان ہوں گے ۔ کیونکہ اگر کوئی ان کے

ظاہری مال سے متاثر ہو گا تو یہ بھی ان کے لیے اکرام ہو گا۔ دل کے اندر بھی ایسے لوگوں کی تکریم کا شعور نہ آنے پائے۔ ان کو مکمل طور پر نظرانداز کیا جائے۔

وَإِذَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ ءَامِنُوا بِاللَّهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ
اسْتَأْذَنَكَ أُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا ذَرْنَا نَكُن مَّعَ الْقَاعِدِينَ ﴿۸۶﴾
رَضُوا بِأَن يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا
يَفْقَهُونَ ﴿۸۷﴾ لَٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ ءَامَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَ
أَنفُسِهِمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۸۸﴾ أَعَدَّ اللَّهُ
لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ 11
الْعَظِيمُ ﴿۸۹﴾ ع 17

"جب کبھی کوئی سورۃ اس مضمون کی نازل ہوئی کہ اللہ کو مانو اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو تم نے دیکھا کہ جو لوگ ان میں سے صاحب مقدرت تھے وہی تم سے درخواست کرنے لگے کہ انہیں جہاد کی شرکت سے معاف رکھا جائے اور انہوں نے کہا کہ ہمیں چھوڑ دیجئے کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ رہیں۔ ان لوگوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں شامل ہونا پسند کیا اور ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا گیا' اس لیے ان کی سمجھ میں اب کچھ نہیں آتا۔ بخلاف اس کے رسولؐ نے اور ان لوگوں نے جو رسول کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی جان و مال سے جہاد کیا اور اب ساری بھلائیاں انہی کے لیے ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہے عظیم الشان کامیابی"۔

یہاں دو مزاجوں کا ذکر ہے۔ ایک ہے مزاج نفاق' کمزوری اور ذلت کا اور دوسرا مزاج ہے ایمان' قوت آزمائش کا۔ ایک مزاج کی منصوبہ بندی چالاکی' پیچھے رہ جانے اور ذلت قبول کرنے کے خطوط پر ہوتی ہے اور دوسرے مزاج کی منصوبہ بندی استقامت' خرچ اور عزت و شرف کے حصول کے لیے ہوتی ہے۔

جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے اور اس میں جہاد کا حکم ہوتا ہے تو بعض لوگ جو استطاعت رکھتے ہیں جن کے پاس جہاد کے اخراجات کے لیے مناسب وسائل ہوتے ہیں' وہ اپنی پوزیشن کے مطابق آگے نہیں بڑھتے۔ اس طرح اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے بلکہ یہ لوگ ذلت' شرمندگی کی روش اختیار کرتے ہیں' یہ لوگ عورتوں اور درول کے ساتھ بیٹھے رہنے کو پسند کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی عزت اور اپنے مقام کی مدافعت نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کو یہ شعور ہی

نہیں ہوتا' نہ وہ یہ احساس کرتے ہیں کہ ان کی اس روش کی وجہ سے وہ کس قدر ذلیل و خوار سمجھے جاتے ہیں۔ بس وہ یہی چاہتے ہیں کہ ہر قیمت پر زندہ رہیں۔ کیا وہ نہیں سمجھتے کہ ہر قیمت پر زندہ رہنا ذلیلوں کا کام ہے۔

رَضُوْا بِاَنْ یَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (۹: ۸۷)

"ان لوگوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں شامل ہونا پسند کیا اور ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا گیا' اس لیے ان کی سمجھ میں اب کچھ نہیں آتا"۔ اگر یہ سمجھتے تو اس حقیقت کو پا لیتے کہ جہاد میں قوت' عزت اور باعزت زندگی کا راز ہے اور جہاد سے پیچھے رہنے میں کمزوری' ذلت اور ذلت کی موت ہے۔

"یاد رہے کہ ذلت کے لیے بھی قیمت ادا کرنا ہوتی ہے اور عزت و شرف کے لیے بھی انسان کو قیمت دینا ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات انسان شرف کے مقابلے میں ذلت کے لیے بڑی قیمت ادا کرتا ہے۔ بعض کمزور مزاج کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عزت کے لیے بہت بڑی قیمت دینا پڑتی ہے اور ہم اس قدر قیمت کی ادائیگی نہیں کر سکتے۔ اس لیے یہ لوگ ذلت کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں اور مشکلات اور تکالیف دیکھ کر بھاگ نکلتے ہیں۔ ایسے لوگ نہایت ہی ذلیلانہ اور حقیرانہ اور خوفناک زندگی بسر کرتے ہیں۔ خود اپنے سائے سے ڈرتے رہتے ہیں۔ خود اپنی آواز سے کانپ اٹھتے ہیں۔ ہر آوازے کو یہ سمجھتے ہیں کہ ان پر ہے۔ ان لوگوں کی علامت یہ ہوتی ہے کہ زندگی انہیں بہت محبوب ہوتی ہے۔ لیکن یہ لوگ عز و شرف کے مقابلے میں اس ذلت کی زیادہ قیمت ادا کرتے ہیں۔ پوری پوری قیمت جان کی قیمت' عزت و آبرو کی قیمت' شہرت کی قیمت' اطمینان کی قیمت اور خوف اور دولت کی قیمت۔ لیکن ان بدبختوں کو اس کا شعور نہیں ہے"۔ ایسے ہی لوگوں میں وہ لوگ شامل تھے جو مدینہ میں عورتوں کے ساتھ بیٹھے رہے' ان کے دلوں پر مہر لگ گئی اور ان کی فہم و ادراک نے کام کرنا چھوڑ دیا۔

لیکن رسول اور وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے تھے وہ دوسرے طرز کے لوگ تھے۔ جاھدوا باموالھم وانفسھم (انہوں نے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا)۔ انہوں نے ایمان کے تقاضے پورے کیے اور نظریات کی قیمت ادا کی۔ اور وہ عزت کمائی جو بیٹھنے والے نہ کما سکے۔ یہی لوگ ہیں جو اس زمین کا کریم ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ ان کے سامنے سب خزانے کھلے ہیں اور ان کا نام اور ان کی شہرت دور دراز تک ہے۔ یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں نہ دنیا میں بھی جبکہ وہ باعزت زندگی بسر کر رہے ہوں گے اور آخرت میں بھی جن کے لیے اللہ نے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی فوز عظیم ہے۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾

"بدوی عربوں میں سے بھی بہت سے لوگ آئے جنہوں نے عذر کیے تاکہ انہیں بھی پیچھے رہ جانے کی اجازت دی جائے۔ اس طرح بیٹھ رہے وہ لوگ جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے ایمان کا جھوٹا عہد کیا تھا۔ ان بدویوں میں سے

جن لوگوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا ہے عنقریب وہ دردناک سزا سے دوچار ہوں گے"۔

پہلے لوگ تو وہ ہیں جن کے عذرات حقیقی ہیں۔ لہٰذا ان کو اجازت دے دی گئی اور وہ مجبوراً رہ گئے' رہے دوسرے تو وہ بلاعذر رہے۔ کیونکہ انہوں نے اللہ اور رسول اللہ کے سامنے جھوٹے عذرات پیش کیے۔ ان میں سے جن لوگوں نے کفر کا ارتکاب کیا وہ تو عذاب الیم سے دوچار ہوں گے۔ ہاں جن لوگوں نے توبہ کر لی تو ان کا ذکر یہاں نہیں ہے کہ ان کا انجام کیا ہو گا۔

---○○○---

آخر میں بتایا جاتا ہے کہ اس لشکر میں خروج کا حکم اندھیرے کا سوٹا نہ تھا بلکہ اس میں وروں کا خیال رکھا گیا تھا۔ کیونکہ اسلام تو ایک معقول اور سہولت کا دین ہے۔ اس میں کسی سے اس کی استطاعت سے زیادہ کا مطالبہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا وروں سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

"ضعیف اور بیمار لوگ اور وہ لوگ جو شرکت جہاد کے لیے زاد راہ نہیں پاتے' اگر پیچھے رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں جب کہ وہ خلوص دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے وفادار ہوں۔ ایسے محسنین پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے' اور اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں پر بھی کوئی اعتراض کا موقع نہیں ہے جنہوں نے خود آکر تم سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لیے سواریاں بہم پہنچائی جائیں' اور جب تم نے کہا کہ میں تمہارے لیے سواریوں کا انتظام نہیں کر سکتا تو وہ مجبوراً واپس گئے اور حال یہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور انہیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے خرچ پر شریک جہاد ہونے کی مقدرت نہیں رکھتے۔ البتہ اعتراض ان لوگوں پر ہے جو مالدار ہیں اور پھر بھی تم سے درخواستیں کرتے ہیں کہ انہیں شرکت جہاد سے معاف رکھا جائے۔ انہوں نے گھر بیٹھنے والوں میں

رہنا پسند کیا اور اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا' اس لیے اب یہ کچھ نہیں جانتے ۔)

جو لوگ ضعیف ہیں' بوڑھے ہیں' ور ہیں اور بیٹھے ہیں ان سے کوئی مواخذہ نہیں ہے ۔ وہ بیمار جو عارضی طور پر اس مہم میں شریک نہ ہو سکتے تھے' قابل ملامت نہیں ہیں ۔ وہ لوگ بھی ور تصور ہوں گے جو سواری اور زاد راہ نہیں رکھتے ۔ یہ لوگ اگر میدان معرکہ سے دور رہے تو ان کا کیا قصور ہے ۔ لیکن ان کے دل اور ضمیر اور ان کے جذبات اللہ اور رسول کے ساتھ ہیں ۔ ان لوگوں نے کسی بات کو چھپا نہیں رکھا' دھوکہ نہیں کرتے اور مدینہ میں رہ کر وہ حفاظت' چوکیداری اور دارالاسلام کی دوسری خدمات سرانجام دے رہے ہیں جو اسلامی ریاست کے لیے مفید اور ضروری ہیں ۔ ایسے لوگ ور ہونے کے ساتھ محسن بھی ہیں ان سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا اور نہ وہ قابل ملامت ہوں گے ۔

اس طرح جنگی قوت رکھنے والے لیکن سواری نہ رکھنے والے بھی ور ہوں گے جو پیادہ اس دور دراز سفر پر نہیں جا سکتے تھے ۔ ایسے لوگ مجبوراً رہ گئے لیکن ان کے دل پھٹے جا رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ وہ مجبوراً اس اعزاز سے محروم ہو رہے ہیں ۔

جہاد کی سچی چاہت کی یہ کس قدر اچھی تصویر کشی ہے ۔ دلی رنج و الم کو کن خوبصورت الفاظ میں ادا کیا گیا ہے ۔ رسول اللہ کے زمانے میں بعض عملی واقعات کی یہ اس آیت میں تصویر کھینچی گئی ہے ۔ مختلف روایات میں مختلف فدایان اسلام کا ذکر ہے لیکن یہ سب اس آیت کا صحیح مصداق ہیں ۔

وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ (٩ : ٩٢) "اسی طرح ان لوگوں پر بھی کوئی اعتراض کا موقع نہیں ہے جنہوں نے خود آ کر تم سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لیے سواریاں بہم پہنچائی جائیں' اور جب تم نے کہا کہ میں تمہارے لیے سواریوں کا انتظام نہیں کر سکتا تو وہ مجبوراً واپس گئے اور حال یہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور انہیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے خرچ پر شریک جہاد ہونے کی مقدرت نہیں رکھتے ۔

عوفی نے ابن عباس سے روایت کی ہے "یہ کہ رسول اللہ نے حکم دیا کہ لوگ آپ کے ساتھ جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں ۔ ایک جماعت آپ کے پاس آئی جن میں عبداللہ ابن مغفل ابن مقوی المازنی بھی تھا ۔ تو انہوں نے مطالبہ کیا کہ رسول خدا ہمیں سواری عنایت کیجئے ۔ تو حضورؐ نے فرمایا خدا کی قسم میرے پاس کچھ نہیں ہے کہ میں تمہاری سواری کا بندوبست کروں ۔ یہ لوگ واپس ہوئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے ۔ ان کے لیے یہ بات بہت ہی گراں تھی کہ وہ جہاد سے پیچھے رہ جائیں لیکن کوئی نفقہ اور سواری نہیں بنے ۔ جب اللہ نے دیکھا کہ ان کو اللہ اور رسول اللہ سے کس قدر محبت ہے تو ان کے اعزاز میں یہ آیت نازل ہوئی ۔

مجاہد کہتے ہیں کہ یہ مزینہ کے بنی مقرن کے بارے میں نازل ہوئی ہے ۔ محمد ابن کعب فرماتے ہیں کہ یہ سات آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے ۔ بنی عمر ابن عوف کے سالم ابن عوف' بنی واقف سے حری ابن عمر' بنی مازن ابن نجار سے عبدالرحمن ابن کعب جس کی کنیت ابویعلی ہے' بنی معلی سے فضل اللہ بنی سلمہ سے عمر ابن عتبہ اور عبداللہ ابن عمر المزنی ۔

ابن اسحاق نے واقعات غزوۂ تبوک میں کہا ہے "اس کے بعد مسلمانوں میں سے بعض لوگ رسول اللہ کے پاس آئے ' یہ لوگ انصار وغیرہ کے سات آدمی تھے ۔بنی عمر ابن عوف سے سالم ابن عمیر اور علیہ ابن زید بنی حارثہ کے بھائی اور ابولیلی عبدالرحمن ابن کعب بنی مازن کے بھائی اور عمرو ابن حمام ابن جموح بنی سلمہ کے بھائی' عبداللہ ابن مغفل مزنی' بعض نے اسے عبداللہ ابن عمرمزنی بتایا ہے ۔حرمی ابن عبداللہ' بنی واقف کے بھائی اور عیاض ابن ساریہ الفزاری تو ان لوگوں نے رسول اللہ سے سواری کا مطالبہ کیا اور یہ لوگ فی الواقع غریب تھے تو حضورؐ نے فرمایا کہ میرے پاس تو کچھ نہیں کہ میں تمہاری سواری کا بندوبست کروں ۔یہ لوگ واپس ہوگئے اور حال یہ تھا کہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے ۔ سواری نہ ملنے پر یہ لوگ دکھیا تھے ۔

یہ روح اور یہ جذبہ تھا جس کی وجہ سے اسلام غالب ہوا ۔اور ان قربانیوں کی وجہ سے اسلام کا جھنڈا بلند ہوا ۔ہمیں سوچنا چاہئے کہ ان لوگوں کے مقابلے میں ہماری حالت کیا ہے ۔ہمیں اپنے جذبہ اسلام کا جائزہ لینا چاہئے ۔ہمیں اگر اپنی کمزوری نظر آئے تو ہمیں اللہ کے سامنے دست بدعا ہونا چاہئے کہ ہماری یہ کمزوری دور کر دے ۔اور ہمیں اسلامی جہاد کے جذبے سے اس طرح سرشار کر دے جس طرح صحابہ کرام تھے ۔واللہ المستعان

---○○○---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ------------------ ۱۱

## سورۃ التوبہ — ۹

آیات ۹۳ --- تا --- ۱۲۹

## سورۃ یونس — ۱۰

آیات ۱ --- تا --- ۱۰۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# پارہ ۱۱ ایک نظر میں

یہ پارہ سورت توبہ کے بقیہ حصہ اور سورت یونس پر مشتمل ہے۔ سورت توبہ کا بڑا حصہ پارہ دہم میں گزر چکا ہے۔ یہاں ہم سورت توبہ کے بقیہ حصہ پر تبصرہ کریں گے اور سورت یونس پر تبصرہ اس کے آغاز میں ہو گا۔ ان شاء اللہ۔

سورت توبہ کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے چند فقرے کہے تھے' کہ اس سورت کا موضوع اور اس کے مضامین کی نوعیت کیا ہے۔ پھر یہ کہ کن حالات میں اس کا نزول ہوا' اور یہ کہ اسلامی معاشرے اور اسلامی حکومت کے دوسرے معاشروں اور حکومتوں کے ساتھ بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت کے تعین کے حوالے سے اس سورت کی اہمیت کیا ہے اور اس سورت سے اسلامی نظام کے قیام کے لیے جو تحریکی منہاج انقلاب سمجھ میں آتا ہے وہ کیا ہے۔ لہٰذا ان اہم فقرات کا یہاں دہرانا فائدہ سے خالی نہ ہو گا۔ ''یہ مدنی سورت ہے اور نزول قرآن کی آخری جھلکیاں اس میں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ اسے آخری قرآن نہیں کہہ سکتے۔ آخری جھلکیاں اس لیے کہ اس میں امت مسلمہ اور دوسری اقوام عالم کے درمیان بین الاقوامی تعلقات کے ضوابط کو آخری شکل دی گئی ہے۔ نیز اس کے اندر خود اسلامی سوسائٹی کی تشکیل اس کی اقدار کا تعین' اس میں مختلف طبقات کی قدر و قیمت کا تعین اور مجموعی طور پر اس میں کسی اسلامی معاشرے کے بنیادی خدوخال کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں پائے جانے والے تمام طبقات اور ان کے اوصاف کی بڑی گہری تصویر کشی کی گئی ہے''۔

اس زاویہ سے یہ سورت تو بڑی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس میں اسلامی نظام کے قیام کے منہاج کے تحریکی عمل کے خدوخال کو اور اس کے تمام مراحل کو بڑی تفصیل کے ساتھ متعین طور پر بیان کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں اس موضوع پر اس سورت میں آخری اور فائنل احکام دیئے گئے ہیں۔ اس جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منہاج کس قدر ٹھوس ہے اور کس قدر فیصلہ کن ہے۔ اس جائزے کے بغیر احکام شریعت و قواعد شریعت کی اصل تصویر سامنے نہیں آتی۔ اگر اس مجموعی جائزے کے بغیر آیات کو اپنے سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو عبوری دور کے لیے جو احکام نازل ہوئے تھے وہ دائمی اور فائنل احکام نظر آئیں گے۔ اور پھر جو شخص چاہے ان آخری آیات و ہدایات کی تاویل کر کے بھی انہیں عبوری دور کے لیے آنے والے احکام کے تابع اور مطابق کر دے۔ خصوصاً جہاد اسلامی کے موضوع پر اس قسم کی مساعی عملاً بھی کی گئیں اور اسلامی معاشرے اور دوسرے جاہلی معاشروں کے باہم تعلقات کے سلسلے میں بھی ایسا ہی رویہ اختیار کیا گیا۔

اس سورت کے تعارف میں ہم نے یہ بات بتائی تھی کہ باوجود اس کے کہ اس سورت کا موضوع ایک ہے اور وہ ایک جیسے حالات میں نازل ہوئی ہے لیکن اس کے کئی حصے ہیں اور ہر حصے میں آخری اور فائنل احکام بیان کیے گئے ہیں۔

اس کے پہلے حصے میں کسی مسلم معاشرے اور دوسرے جاہلی معاشروں اور حکومتوں کے درمیان بین الاقوامی تعلقات کی حد بندی کی گئی ہے جبکہ دوسرے حصے میں مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان تعلقات کی حد بندی کی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں ان لوگوں کے حالات پر تبصرہ ہے جنہیں غزوۂ تبوک میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور انہوں نے اس فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی اور سستی کی تھی۔ یہ غزوہ ان اہل کتاب کے خلاف تھا جو جزیرۃ العرب کے مغربی کنارے پر بستے تھے اور جو اس نئی اسلامی مملکت پر فیصلہ کن وار کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے' چوتھے حصے میں اسلامی معاشرے میں رہنے والے منافقین کی سازشوں اور کرتوتوں کو بے نقاب کیا گیا تھا۔ ان کی نفسیاتی اور عملی کیفیات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ نیز غزوۂ تبوک سے قبل اس غزوے کے دوران اور اس کے بعد ان کے رویے کو قلم بند کر کے ان کی اصل نیتوں' حیلہ سازیوں اور ان عذرات لنگ کی نقاب کشائی کی گئی جو وہ غزوۂ تبوک کی عدم شمولیت کے بارے میں پیش کرتے تھے۔ نیز یہ لوگ اسلامی صفوں میں جو فتنے پھیلاتے تھے' فساد برپا کرتے تھے' جو انتشار پھیلاتے تھے اور حضور م اور مخلص مومنین کے لیے جس اذیت کا باعث بنے ہوئے تھے۔ یہ تمام حالات اس میں ریکارڈ کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مومنین کو ان کے رویے سے متنبہ بھی کیا گیا اور مومنین اور منافقین کے درمیان سماجی تعلقات کی نوعیت کو بھی متعین کیا گیا اور بتایا گیا کہ ان کے ساتھ سماجی بائیکاٹ ہونا چاہئے تاکہ ہر طبقہ اپنی صفات کی وجہ سے متمیز ہو جائے۔

ooo

یہ چار حصے اپنے مضامین کے ساتھ پارہ دہم میں گزر چکے ہیں۔ البتہ آخری حصے کے کچھ مضامین جو جنگ سے پیچھے رہ جانے والے لوگوں کے متعلق ہیں اور جہاد سے پیچھے رہنے والوں کی سزا اور ان کے انجام کے بارے میں اس حصے میں آگئے ہیں۔

دسویں پارے کی آخری آیت یہ تھی:

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹۱) وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ (۹۲) ((۹: ۹۱ — ۹۲))

"ضعیف اور بیمار لوگ اور وہ لوگ جو شرکت جہاد کے لیے زاد راہ نہیں پاتے' اگر پیچھے رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں جبکہ وہ خلوص دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے وفادار ہوں۔ ایسے محسنین پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں پر بھی کوئی اعتراض کا موقعہ نہیں ہے جنہوں نے خود آکر تم سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لیے سواریاں بہم پہنچائی جائیں اور جب تم نے کہا کہ میں تمہارے لیے سواریوں کا انتظام نہیں کر سکتا تو وہ مجبوراً واپس ہوگئے اور حال یہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور انہیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے خرچ پر جہاد میں شریک ہونے کی مقدرت نہیں رکھتے"۔

اور وہ جملہ جس سے اس پارے کا آغاز ہوتا ہے، وہ یہ ہے:

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۹۳) يَعْتَذِرُونَ إِلَيْكُمْ إِذَا رَجَعْتُمْ إِلَيْهِمْ قُلْ لَا تَعْتَذِرُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّأَنَا اللَّهُ مِنْ أَخْبَارِكُمْ وَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَى عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۹۴) سَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ إِذَا انْقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوا عَنْهُمْ فَأَعْرِضُوا عَنْهُمْ إِنَّهُمْ رِجْسٌ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۹۵) يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَى عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ (۹۶) (۹:۹۳ تا ۹۶)

"البتہ اعتراض ان لوگوں پر ہے جو مالدار ہیں اور پھر بھی تم سے درخواستیں کرتے ہیں کہ انہیں ترکِ جہاد سے معاف رکھا جائے۔ انہوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں رہنا پسند کیا اور اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا، اس لیے اب یہ کچھ نہیں جانتے۔ تم پلٹ کر ان کے پاس پہنچو گے تو یہ طرح طرح کے عذرات پیش کریں گے مگر تم صاف کہہ دینا کہ "بہانے نہ کرو ہم تمہاری کسی بات کا اعتبار نہ کریں گے۔ اللہ نے ہم کو تمہارے حالات بتا دیئے۔ اب اللہ اور رسول تمہارے طرزِ عمل کو دیکھے گا۔ پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کا جاننے والا ہے اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔ تمہاری واپسی پر یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے صرفِ نظر کرو۔ تو بے شک تم ان سے صرفِ نظر ہی کر لو کیونکہ یہ گندگی ہیں اور ان کا اصل مقام جہنم ہے جو ان کی کمائی کے بدلے میں انہیں نصیب ہوگی۔ یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ۔ حالانکہ اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے تو اللہ ہرگز ایسے فاسق لوگوں سے راضی نہ ہوگا"۔

یہ تو اللہ کی جانب سے اطلاعات تھیں جو اللہ نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیں کہ مدینہ واپسی پر پیچھے رہنے والے کیا کیا عذرات پیش کریں گے۔ یہاں بتا دیا گیا ہے کہ جب آپ صحیح و سالم واپس ہوں گے تو آپ رہ جانے والوں کے ساتھ یہ اور یہ سلوک کریں۔

○○○

اس کے بعد سورت کا حصہ پنجم آتا ہے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ اسلامی معاشرے کی تشکیل میں کیسے کیسے عناصر موجود ہیں یعنی فتح مکہ سے جنگ تبوک تک کیسے کیسے عناصر اسلامی صفوں میں جمع ہو گئے ہیں، جیسا کہ ہم نے اس سورت کے ابتدائی تبصرے میں واضح کیا کہ ایک تو وہ لوگ تھے جو سابقین اولین تھے اور جو اسلامی معاشرے کے لیے ریڑھ کی ہڈی

تھے اور انہی لوگوں پر اسلام کے اجتماعی نظام کی بنیاد تھی لیکن ان کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے گروہ بھی اسلامی صفوں میں جمع ہو گئے تھے۔ اعراب اور بدوی لوگ جن میں مخلصین بھی تھے اور مفاد پرست منافقین بھی تھے۔ اہل مدینہ میں بھی منافقین کا ایک بڑا طبقہ موجود تھا۔ کچھ ایسے لوگ تھے کہ جن کے بعض اعمال اچھے تھے اور بعض باتیں خلاف شریعت تھیں۔ اور ابھی یہ لوگ اچھی طرح اسلامی سانچے میں نہ ڈھلے تھے اور نہ پوری طرح اسلامی رنگ میں رنگے گئے تھے اور کچھ ایسے لوگ تھے جن کے بارے میں کچھ نہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد تھا۔ بعض ایسے سازشی تھے جو اسلام کے نام کے پردے میں سب کچھ کرتے تھے' سازش تیار کرتے تھے۔ بیرونی دشمنان اسلام سے بھی ان کا رابطہ تھا۔ قرآنی آیات نے بڑے اختصار کے ساتھ ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان سب اور مختلف الاقسام لوگوں کے ساتھ اسلامی نظام حکومت میں کس طرح کا سلوک کیا جائے گا۔ اللہ نے اس حصے میں رسول اللہ اور مخلص مسلمانوں کو ہدایات دی ہیں کہ انہوں نے ان طبقات کے ساتھ کیا اور کس طرح معاملہ کرنا ہے۔ چند آیات ملاحظہ فرمائیں :

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹۷) وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۹۸) وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹۹) (۹ : ۹۷ تا ۹۹) یہ

بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملے میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کے حدود سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے۔ ان بدویوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں تو اسے اپنے اوپر زبردستی چٹی سمجھتے ہیں۔ اور تمہارے حق میں زمانہ کی گردشوں کا انتظار کر رہے ہیں حالانکہ بدی کا چکر خود ان پر مسلط ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے اور انہی بدویوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں تقرب کا اور رسول کی طرف سے رحمت کی دعا لینے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں وہ ضرور ان کے لیے تقرب کا ذریعہ ہے۔ اور اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے''۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ

الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۹: ۱۰۰) "وہ مہاجر اور انصار جنھوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی' نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے' اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ۔ یہی عظیم الشان کامیابی ہے"۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ (۹: ۱۰۱)

"تمہارے گرد و پیش جو بدوی رہتے ہیں ان میں بہت سے منافق ہیں ۔ اسی طرح خود مدینہ کے باشندوں میں بھی منافق موجود ہیں جو نفاق میں طاق ہو گئے ہیں ۔ تم انھیں نہیں جانتے' ہم ان کو جانتے ہیں ۔ قریب ہے وہ وقت جب ہم ان کو دہری سزا دیں گے ۔ پھر وہ دوبارہ بڑی سزا کے لیے واپس لائے جائیں گے ۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۰۲) خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۱۰۳) (۹:

۱۰۲ — ۱۰۳) "اور کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کر لیا ہے ۔ ان کا عمل مخلوط ہے' کچھ نیک ہے اور کچھ بد ۔ بعید نہیں کہ اللہ ان پر پھر مہربان ہو جائے کیونکہ وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے ۔ اے نبی تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور انہیں بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو کیونکہ تمہاری دعا ان کے لیے وجہ تسکین ہو گی' اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے ۔

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

(۱۰۶) "کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کا معاملہ بھی خدا کے حکم پر ٹھہرا ہوا ہے' چاہے انہیں سزا دے اور چاہے تو ان پر از سر نو مہربان ہو جائے ۔ اللہ سب کچھ جانتا اور حکیم و دانا ہے ۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۰۷) لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ

أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ، فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ

(۱۰۸) "کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لیے کہ (دعوت حق کو) نقصان پہنچائیں، اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں، اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں، اور (اس بظاہر عبادت گاہ کو) اس شخص کے لیے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف برسرپیکار ہو چکا ہے۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا۔ مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔ جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں"۔ تشریح آیات کے وقت ہم تفصیلاً بتائیں گے کہ ان گروہوں سے کون کون لوگ مراد ہیں:

اس سورت کے آخری اور چھٹے حصے میں اسلام کے نظریہ بیعت جہاد فی سبیل اللہ کی نوعیت بتائی گئی ہے۔ اس جہاد کی حقیقت اور اس کے حدود و کیفیات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ اہل مدینہ، مدینہ کے اردگرد بدوی آبادی کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو ذہناً اور عملاً ہر لحاظ سے اہل کفر سے دور کر لیں۔ اور اپنے تمام روابط اسلامی نظریہ حیات کے عقیدے پر استوار کریں اور دوسرے تمام روابط کاٹ دیں۔ خون اور قرابت کے رشتوں کو نظرانداز کر دیں۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا کہ جو لوگ سازشی نہ تھے اور نہ منافق تھے مگر دوسری وجوہات سے وہ اس غزوہ میں شریک نہ ہوئے تھے ان کا انجام کیا ہو گا۔ منافقین کے بعض خدوخال بھی بیان کیے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کا رویہ احکام الٰہیہ کے ساتھ کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ

(۹ : ۱۱۱) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال، جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے مرتے ہیں۔ ان سے اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے توراۃ اور انجیل اور قرآن میں اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ بس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے"۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ (۱۱۳) وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ

إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ

(۱۱۴) (۹:۱۱۳ — ۱۱۴) "نبی اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔ چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جبکہ ان پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔ ابراہیم نے اپنے باپ کے لیے جو دعائے مغفرت کی تھی وہ تو اس وعدے کی وجہ سے تھی جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا۔ مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا۔ حق یہ ہے کہ ابراہیم بڑا رقیق القلب، خدا ترس اور بردبار آدمی تھا"۔

لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (۱۱۷) وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا حَتَّى إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَن لَّا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (۱۱۸) (۹:۱۱۷ — ۱۱۸) "اللہ نے معاف کر دیا نبی کو اور ان مہاجرین و انصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے مگر اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔ بے شک اس کا معاملہ اس کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے۔ اور ان تینوں کو بھی اس نے معاف کر دیا تھا جن کے معاملے کو ملتوی کر دیا گیا تھا، جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامن رحمت کے سوا نہیں ہے تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں، یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے"۔

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ الْأَعْرَابِ أَن يَتَخَلَّفُوا عَن رَّسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُم بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (۱۲۰) وَلَا يُنفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ

(۱۲۱) وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ

(۱۲۲)(۹: ۱۲۰ تا ۱۲۲)) "مدینہ کے باشندوں اور گردونواح کے بدویوں کے لیے یہ ہرگز زیبا نہ تھا کہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر بیٹھ رہتے اور اس کی طرف سے بے پروا ہو کر اپنے نفس کی فکر میں لگ جاتے۔ اس لیے کہ ایسا کبھی نہ ہو گا کہ اللہ کی راہ میں بھوک 'پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ جھیلیں اور منکرین حق کو جو راہ ناگوار ہے اس پر کوئی قدم وہ اٹھائیں اور کسی دشمن سے کوئی انتقام وہ لیں اور ان کے بدلے ان کے حق میں ایک عمل صالح نہ لکھا جائے۔ یقیناً اللہ کے ہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا ہے۔ اس طرح یہ بھی کبھی نہ ہو گا کہ تھوڑا یا بہت کوئی خرچ وہ اٹھائیں اور کوئی وادی وہ پار کریں اور ان کے حق میں اسے لکھ نہ لیا جائے تاکہ اللہ ان کے اس اچھے کارنامے کا صلہ انہیں عطا کرے۔ اور کچھ ضروری نہ تھا کہ اہل ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے 'مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جاکر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ پرہیز کریں۔

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ (۹: ۱۲۳) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تم سے قریب ہیں۔ اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے"۔

وَإِذَا مَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ هَلْ يَرَاكُم مِّنْ أَحَدٍ ثُمَّ انصَرَفُوا صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُم بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ (۹: ۱۲۷) "جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو یہ لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں کہ کہیں کوئی تم کو دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ پھر چپکے سے نکل بھاگتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دل پھیر دیے ہیں کیونکہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں"۔

اس سورت کا خاتمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف پر ہوتا ہے اور آپ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ..... صرف اپنے رب پر بھروسہ کریں اور اسی کی طرف متوجہ ہوں۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (۱۲۸) فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ (۱۲۹)(۹: ۱۲۸ — ۱۲۹) "دیکھو تم لوگوں کے پاس ایک

رسول آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے' تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے' تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے ۔ ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق و رحیم ہے ۔ اب اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرتے ہیں تو اے نبی ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ بس کرتا ہے' کوئی معبود نہیں مگر وہ' اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہ مالک ہے عرش عظیم کا"۔ اب اس مختصر تشریح کے بعد ہم آیات کی تفصیلی تشریح کی طرف آتے ہیں ۔

---○○○---

# درس نمبر ۹۱ تشریح آیات

۹۳ ـــ تا ـــ ۹۶

---

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ۭ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ۭ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۡ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾

"البتہ اعتراض ان لوگوں پر ہے جو مالدار ہیں اور پھر بھی تم سے درخواست کرتے ہیں کہ انہیں شرکت جہاد سے معاف رکھا جائے۔ انہوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں شامل ہونا پسند کیا اور اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا' اس لیے اب یہ کچھ نہیں جانتے (کہ اللہ کے ہاں ان کی اس روش کا کیا نتیجہ نکلنے والا ہے)۔

تم جب پلٹ کر ان کے پاس پہنچو گے تو یہ طرح طرح کے عذرات پیش کریں گے۔ مگر تم صاف کہہ دینا کہ "بہانے نہ کرو ہم تمہاری کسی بات کا اعتبار نہ کریں گے۔ اللہ نے ہم کو تمہارے حالات بتا دیئے ہیں۔ اب اللہ اور اس کا رسول تمہارے طرز عمل کو دیکھے گا' پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کا جاننے والا ہے۔ اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔ تمہاری واپسی پر یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے صرف نظر کرو۔ تو بے شک تم ان سے صرف نظر ہی کر لو' کیونکہ یہ گندگی ہیں اور ان کا اصلی مقام جہنم ہے جو ان کی کمائی کے بدلے میں انہیں نصیب ہوگی۔ یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ۔ حالانکہ اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے تو اللہ ہرگز ایسے فاسق لوگوں سے راضی نہ ہو گا"۔

ضعیفوں، مریضوں اور فقیروں سے کوئی مواخذہ نہیں ہے اور نہ ان کو دل میں اپنی کوتاہی کا احساس کرنا چاہیے۔ وہ لوگ جن کے پاس زادسفر اور سواری کے لیے کچھ نہیں، حضور اکرم ؐ یا اسلامی حکومت بھی ان کو ضروریات مہیا نہیں کر سکتی تاکہ وہ میدان جنگ تک پہنچ سکیں۔ یہ مواخذہ ان لوگوں سے ہے اور وہ لوگ قابل مواخذہ ہیں جو حضورؐ سے چھٹیاں لیتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں، تومند و توانا ہیں اور ان کے پاس کوئی حقیقی عذر نہیں ہے۔ یہ لوگ سخت قابل مواخذہ ہیں کیونکہ انہوں نے قدرت شرکت جہاد کے باوجود پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ بیٹھنا پسند کیا گھروں میں عیش کرتے رہے۔

ان لوگوں سے مواخذہ کیوں ہو رہا ہے، اس لیے کہ یہ لشکر اسلام سے پیچھے رہ گئے، اس لیے کہ انہوں نے جھوٹے عذرات کی بنا پر چھٹی لی۔ انہوں نے عہد شکنی کی، ان کو اللہ نے غنی بنایا لیکن انہوں نے حق نہ ادا کیا، ان کو اللہ نے اسلامی نظام سے نوازا لیکن انہوں نے اسلامی نظام کا حق ادا نہ کیا، کیونکہ اسلام نے ان کو تحفظ دیا اور عزت بخشی اور انہوں نے اس سوسائٹی کا حق نہ ادا کیا حالانکہ اس سوسائٹی نے بھی انہیں عزت بخشی تھی اور مکرم بنایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے یہ قابل شرم فقرہ استعمال کیا:

رَضُوْا بِاَنْ یَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ (۹: ۹۳) "انہوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں شامل ہونا پسند کیا"۔ جو بڑے درجے کی پست ہمتی ہے، کمزوری ہے، اور اس ذلت آمیز پوزیشن کو قبول کرنا ہے کہ ہمت و مردانگی کے مقام پر کوئی عاجزوں، عورتوں، بچوں کے ساتھ بغیر عذر کے بیٹھ جائے اور گھروں میں رہ جائے اور ناحق معذوروں کے زمرے میں شامل ہو جائے اور واضح طور پر نظر آ رہا ہو کہ وہ معذور نہ ہو۔

وَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۹: ۹۳) "اور اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا، اس لیے اب یہ کچھ نہیں جانتے (کہ اللہ کے ہاں ان کی اس روش کا کیا نتیجہ نکلنے والا ہے)۔

یہ پوزیشن انہوں نے اس لیے اختیار کی اللہ نے علم و شعور کے دروازے ان پر بند کر دیئے۔ اور ان کے فہم و ادراک کے ادوات معطل کر دیئے گئے کیونکہ انہوں نے خود اپنے لیے بلادت، کم ذہنی اور ذلت کو پسند کیا اور اپنے آپ کو زندہ اور متحرک اور فعال ہونے سے محروم کیا اور ان کے اندر آگے بڑھنے، جرأت کرنے اور جارح ہونے کا جذبہ ہی نہ رہا۔ دنیا میں جو انسان بھی عافیت کوش ہو جائے، آرام طلب ہو جائے اور کند ذہن بن جائے تو وہ ذوق اکتشاف، ذوق تجربہ اور ذوق علم سے محروم ہو جاتا ہے اور اپنی سوسائٹی میں ایک عضو معطل کی طرح بن جاتا ہے جو نہ کسی کو متاثر کر سکتا ہے اور نہ اچھا اثر کسی اور سے قبول کر سکتا ہے اور اظہار ذات سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

عیش و عشرت اور سلامت کوشی ایک ایسی بیماری ہے جو انسان پر شعور و آگہی کے دروازے بند کر دیتی ہے۔ اور انسانی فہم و ادراک کی قوت مر جاتی ہے جبکہ حرکت اور آگے بڑھنا زندگی کی دلیل ہے، حرکت زندگی کا سبب اول ہے، اور مشکلات کو چیلنج کرنے سے نفس انسانی اور عقل انسانی کے چند گوشے اجاگر ہو جاتے ہیں۔ انسان کے اعصاب قوی ہو جاتے ہیں اور وہ خفیہ قوتیں سامنے آ جاتی ہیں جو ہمیشہ خطرات کے وقت وجود میں آ کر مدافعت کرتی ہیں۔ اور انسانی قوتوں کو عمل اور کسی پکار پر لبیک کہنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ یہ سب گوشے علم اور ادراک کے مختلف پہلو ہیں اور ان سے وہ لوگ محروم ہو

جاتے ہیں جو ذلت اور سلامتی اختیار کر لیتے ہیں اور عافیت کوش ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص عافیت کا طلبگار ہوتا ہے لیکن یہ ذلت آمیز عافیت ہے، باوقار عافیت نہیں ہے۔

انہی مالداروں اور جہاد پر قدرت رکھنے والوں کے امور پر بحث جاری ہے جنہوں نے عورتوں کے ساتھ رہنے کو پسند کیا کہ عیش کوشی، دوں ہمتی، پست ہمتی اور مشکلات سے فرار کے علاوہ یہ کس قدر ذلیل ہیں اور کہتے کیا ہیں:

يَعْتَذِرُونَ إِلَيْكُمْ إِذَا رَجَعْتُمْ (۹ : ۹۴) "تم جب پلٹ کر ان کے پاس پہنچو گے تو یہ طرح طرح کے عذرات پیش کریں گے"۔ یہ اللہ کی جانب سے رسول اللہ کو پیشگی کے طور پر بتایا جا رہا ہے اور مخلصین اہل ایمان کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ جب تم اس مہم سے واپس لوٹو گے تو تمہارے ساتھ ان کا طرز عمل کیا ہو گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات مدینہ کو پہنچنے سے پہلے دوران سفر یا اس سے بھی پہلے نازل ہو گئی تھیں۔

بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ تمہارے پہنچتے ہی عذرات پیش کرنا شروع کر دیں گے۔ کیونکہ وہ محسوس کریں گے کہ ان کی یہ حرکت ایک ننگا نفاق ہے۔ اور ان کی اس حرکت کے اسباب بھی واضح تھے کہ ان کا ایمان ضعیف تھا' انہوں نے عافیت کوشی کی' اور مشکلات جہاد سے گھبرا گئے۔

قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّأَنَا اللَّهُ مِنْ أَخْبَارِكُمْ (۹ : ۹۴) مگر تم صاف کہہ دینا کہ "بہانے نہ کرو، ہم تمہاری کسی بات کا اعتبار نہ کریں گے" اللہ نے ہم کو تمہارے حالات بتا دیئے ہیں۔

تم جس قدر بھی عذرات پیش کرو' ہم تمہارے بارے میں اب مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ہم تمہاری تصدیق نہیں کر سکتے، اب تمہارے ساتھ وہ معاملہ جاری نہیں رہ سکتا جو ہم منافقین کے ساتھ اس سے قبل ان کے ظاہری اسلام کے مطابق رکھ رہے تھے۔ کیونکہ اللہ نے اپنی مہربانی سے تمہارے حالات ہم پر منکشف کر دیئے ہیں۔ تمہارے دلوں میں جو گندگی بھری ہوئی ہے اس کا بھی اللہ نے انکشاف کر دیا ہے اور تمہارے اعمال کے پیچھے جو جذبہ کام کر رہا ہے۔ وہ بھی اب واضح ہو گیا ہے۔ اللہ نے تو تمہارے سب حالات طشت از بام کر دیئے ہیں۔ اب تم چھپ نہیں سکتے ہو' چاہے جو رنگ اختیار کرو۔

قرآن کریم نے ان پر اعتبار نہ کرنے' ان کی جانب سے عدم اطمینان اور ان کے عذرات کو قبول نہ کرنے کا حکم جن الفاظ میں دیا ہے۔

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ (۹ : ۹۴) "ہم ہرگز اعتبار نہ کریں گے" اس کا ایک خاص مفہوم ہے 'تصدیق' 'اعتبار' 'اعتماد اور اطمینان کے لیے ایمان کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ دل میں رب پر یقین و اعتماد ہو اور انسانی شعور اس پر مطمئن ہو۔ زبان سے ایمان کا اظہار ہو اور تصدیق و تسلیم اور عقل و ضمیر اس کی تصدیق کر رہی ہو۔ قرآن تعبیرات میں ہمیشہ اس قسم کے اشاراتی مفہوم پائے ہیں۔

اے پیغمبر تم کہہ دو کہ اب عذرات پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب صرف باتوں سے یہ فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اب ضرورت عمل کی ہے۔ اگر تمہارے اعمال نے تمہارے اقوال کی تصدیق کی تو تب معاملہ بنے گا۔ خالی خولی باتیں اب بیکار ہیں۔

وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهٗ (۹ : ۹۴) "اب اللہ اور اس کا رسول تمہارے طرز عمل کو دیکھے گا"۔ اور اللہ کی ذات تو ایسی ہے کہ نہ اس سے بندوں کے اعمال پوشیدہ ہیں اور نہ وہ داعیہ پوشیدہ ہے جو ان اعمال کی پشت پر ہے۔ اور رسول اللہ تمہاری بات کو تمہارے عمل کے ترازو میں پرکھے گا۔ اب اس اصول کی بنیاد پر اسلامی سوسائٹی تمہارے ساتھ معاملہ کرے گی۔

لیکن یاد رکھو کہ تمہارے تمام معاملات صرف اس دنیا ہی میں طے نہیں ہو جاتے۔ یہاں تو زندگی کا نہایت ہی مختصر حصہ گزرتا ہے۔ حقیقی اور طویل زندگی اور سزا و جزاء تو آنے والے ہیں جہاں ہر بات کا فیصلہ اللہ کے تیار کیے ہوئے ریکارڈ پر ہو گا۔

ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۹ : ۹۴) "پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کا جاننے والا ہے اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔

غیب کیا ہے، وہ جو انسانی ذرائع ادراک سے ورا ہے، عالم شہادت وہ ہے جس کا انسان علم و ادراک کر سکتا ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے اللہ عالم الغیب بھی ہے اور عالم الشہادہ بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے اعتبار سے عالم الشہادہ اور عالم الغیب ہے۔ ان دونوں کا اللہ کو علم ہے، یہاں جو للہ نے فرمایا۔

فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۹ : ۹۴) "وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔ اس میں بظاہر بتانے کی کوئی بات نہیں کیونکہ وہ خود اپنے اعمال کو تو جانتے ہی تھے لیکن اشارہ یہ ہے کہ تمہارے اعمال کی بابت بنسبت تمہارے اللہ کو زیادہ علم ہے۔ ان کی حقیقت وہ تمہیں بتائے گا۔ انسان کے اعمال کے بعض اسباب و علل ایسے بھی ہیں جو خود صاحب عمل پر بھی عیاں نہیں ہوتے۔ اور ان کی نسبت اللہ کا علم انسان سے زیادہ ہوتا ہے۔ پھر انسان کے اعمال کے بعض اثرات اس قدر دور رس ہوتے ہیں کہ ان کے بارے میں خود انسان کو بھی علم نہیں ہوتا لیکن اللہ کو ان کا علم ہوتا ہے۔ لہٰذا اصل مقصد یہ ہے کہ اس علم و اطلاع کے نتیجے میں تمہارے اعمال کا حساب و کتاب عمل میں آئے گا۔ اور یہ نہایت ہی سچا حساب و کتاب ہو گا۔ لیکن یہاں جزاء و سزا کا ذکر نہیں صرف یہ بتا کر آیت خاموش ہو گئی ہے کہ اللہ تم کو اصل صورت حالات بتا دے گا۔

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ اِنَّهُمْ رِجْسٌ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۹ : ۹۵) "تمہاری واپسی پر یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے صرف نظر کرو۔ تو بے شک تم ان سے صرف نظر ہی کر لو کیونکہ یہ گندگی ہیں اور ان کا اصلی مقام جہنم ہے جو ان کی کمائی کے بدلے میں انہیں نصیب ہوگی"۔

یہ دوسری پیشگی اطلاع ہے جو اللہ اپنے رسول کو دے رہا ہے کہ جب تم اور تمہارے ساتھی مخلص مومنین صحیح و سلامت مدینہ لوٹو گے جبکہ منافقین کو سو فیصدی یقین تھا کہ رومیوں کے ساتھ مڈبھیڑ کے بعد ان میں سے ایک بھی واپس نہ

ہو گا۔

تو اللہ رسول اللہ کو اطلاع کرتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے عذرات کو مؤکد بنانے کے لیے بیان حلفی دیں گے تاکہ مسلمان ان کے ان برے کرتوتوں سے صرف نظر کرلیں۔اس طرح عفو و درگزر کے نتیجے میں یہ لوگ محاسبے سے بچ جائیں اور ان معاملات سے چشم پوشی ہو جائے۔حکم دیا جاتا ہے کہ عملاً تو ان سے منہ موڑ لو' لیکن معافی اور درگزر کے طور پر نہیں بلکہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور ان سے دور رہو' جس طرح گندگی سے ایک آدمی دور رہتا ہے اور اپنے آپ کو بچاتا ہے۔

فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ اِنَّهُمْ رِجْسٌ (۹ : ۹۵) "ان سے صرف نظر ہی کرو کیونکہ یہ گندگی ہیں"۔یعنی یہ لوگ بذات خود ہی مجسم گندگی ہیں' اگرچہ ان کا جثہ عطر بیز ہے' گندہ اور بدبودار نہیں ہے لیکن ان کی حقیقت اور ان کے اعمال اور ان کی روح گندی ہے لیکن ان کے جسم کو گندگی کہہ کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ لوگ قابل نفرت ہیں اور حقیر ہیں اور ان سے دور رہنا ہی عین فطرت ہے۔

وہ تحریک جو اسلامی انقلاب کے لیے قائم کی گئی ہو' اس کے وہ کارکن جو جہاد اور قتال اور عملی جدوجہد سے محض اس لیے اپنے آپ کو دور رکھیں کہ وہ کہیں ہلاک نہ ہو جائیں تو یہ لوگ گندگی ہیں۔اس حقیقت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔اس گندگی نے ان کی روح کو گھیر رکھا ہے۔ان کا شعور اور ان کے تصورات گندے ہیں جس طرح ایک گندی مچھلی پورے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے' یہی ان کی مثال ہے۔

وَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۹ : ۹۵) "ان کا اصلی مقام جہنم ہے جو ان کی کمائی کے بدلے میں انہیں نصیب ہوگی"۔وہ یہ سمجھتے تھے کہ پیچھے رہ کر وہ کمائی کر رہے ہیں اور فائدے میں ہیں اور آرام اور سلامتی اور عافیت میں ہیں اور وہ مالی تاوان سے بھی بچ گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں وہ گندگی ہیں اور آخرت میں جو صلہ ان کو ملے گا وہ حسرت ناک ہو گا کیونکہ یہ بہر رنگ و بہرقدر خسارہ ہو گا۔یہ ہے بات اللہ کی اور کون ہے جو اللہ سے زیادہ سچا ہو سکتا ہے۔

تمہاری واپسی پر ان بیٹھنے والوں کا طرز عمل کیا ہو گا؟

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (۹ : ۹۶) "یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ حالانکہ اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے تو اللہ ہرگز ایسے فاسق لوگوں سے راضی نہ ہو گا"۔

ان کی اسکیم یہ ہے کہ پہلے تو یہ لوگ یہ چاہیں گے کہ مسلمان ان کے اس جرم کو معاف کر کے درگزر کر دیں اور اس کے بعد یہ کوشش کریں گے کہ یہ مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کر لیں تاکہ مسلمان ان کے ساتھ اسلامی سوسائٹی میں وہی معاملہ جاری رکھیں جو ان کی ظاہرداری پر اس سے قبل تھا۔اور یہ لوگ ان امکانات کی زد سے بچ جائیں جو اس

سورت میں مسلمانوں کو دیئے گئے ہیں کہ کفار اور منافقین دونوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو اور اس طرح سکھوں اور غیر مسلموں کے باہم تعلقات کے لیے یہ آخری شکل طے کر دی گئی یعنی منافقین کو غیر مسلموں میں شامل کر دیا گیا۔

لیکن یہاں یہ تصریح کر دی گئی کہ یہ لوگ اس جہاد سے پیچھے رہ کر فاسق ہو چکے ہیں اور اللہ ایسے فاسقوں سے کبھی راضی نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہ چند بار قسمیں کھائیں اور مسلمانوں کو راضی کرنے کی سعی کریں۔ پس ان کے بارے میں اللہ کا حکم ہی صحیح حکم ہے اور بشمولیت مسلمین اگر تمام دنیا بھی ان سے راضی ہو جائے تو اللہ کے نزدیک ایک کوڑی کے برابر بھی ان کے لیے مفید نہ ہوگی۔ اللہ و رسول اللہ اور مسلمانوں کو راضی کرنے کی واحد سبیل ہے کہ یہ لوگ اس فسق سے ہٹ کر اور تائب ہو کر عمل جہاد میں شرکت کریں اور دین اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جائیں۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے بغیر عذر کے جہاد سے پیچھے رہنے والوں کی حقیقت کو طشت از بام کر دیا۔ اور جماعت مسلمہ سے ان کو دور کر دیا اور مسلمانوں اور منافقوں کے باہمی تعلق کے بارے میں بھی فیصلہ کر دیا جس طرح اس سے قبل مسلمانوں اور مشرکین کے باہم تعلق کی ضابطہ بندی کی گئی تھی یا مسلمانوں اور اہل کتاب کے باہم تعلقات کو منضبط کیا گیا تھا اور اس موضوع پر یہ آخری اور فائنل احکام تھے۔

---ooo---

# درس نمبر ۹۳ ایک نظر میں

یہ سبق غزوۂ تبوک سے قبل اسلامی معاشرے کے عناصر ترکیبی سے بحث کرتا ہے۔ نیز اس وقت اسلامی معاشرے میں جس قدر طبقات اہل ایمان شامل تھے۔ ان کی تفصیلات بتاتا ہے اور اس میں اسلامی معاشرے کی عضویاتی تشکیل سے بحث کی گئی ہے۔ مختلف طبقات کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے خدوخال بیان کیے گئے ہیں۔

اس سورت کے آغاز میں ہم نے تفصیل کے ساتھ بتایا تھا کہ وہ کیا تاریخی اسباب تھے جن کی وجہ سے اسلامی معاشرے میں اس قسم کے مختلف مزاج کے لوگ جمع ہوگئے تھے۔ یہاں مناسب ہے کہ چند پیراگراف یہاں دوبارہ نقل کر دیئے جائیں تاکہ وہ حالات ذہن کے سامنے آجائیں جن سے اس وقت اسلامی معاشرہ گزر رہا تھا۔ "جزیرۃ العرب میں اسلام کے پھیلاؤ کی راہ میں قریش ایک دیوار اور بند کی طرح کھڑے تھے کیونکہ دینی اور دنیاوی معاملات میں قریش کو ایک بڑا مقام حاصل تھا۔ پھر ادبی، ثقافتی اور علمی و اقتصادی اعتبار سے بھی وہ دوسرے عربوں کے لیے قابل تقلید تھے۔ اس وجہ سے ان کا مقابلے پر اتر آنا اور اس دین کی راہ روک دینا اس بات کا باعث ہوا کہ تمام عرب نے اس دین سے منہ پھیر لیا۔ اور اسلام میں داخل نہ ہوئے، یا اگر انہوں نے صرف نظر نہ کیا تو کم از کم یہ صورت حالات ضرور تھی کہ لوگ تردد میں رہے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ انتظار کیا جائے، تاکہ مسلمانوں اور قریش کی کشمکش کا کوئی فیصلہ ہو جائے۔ جب فتح مکہ کے بعد قریش سرنگوں ہوئے تو ہوازن و ثقیف بھی سرنگوں ہوگئے۔ مدینہ میں جو قوی یہودی قبائل تھے، ان کی قوت اس سے پہلے ہی ٹوٹ گئی تھی۔ بنی قینقاع اور بنو نضیر شام کی طرف جلاوطن ہوگئے۔ بنو قریظہ بھی ختم ہو کر خیبر کا معاملہ بھی صاف ہو گیا تھا۔ ان واقعات کی وجہ سے اب پورے جزیرۃ العرب میں اسلام پھیل گیا اور لوگ فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہونے لگے اور صرف ایک سال کے عرصے میں لوگ دین اسلام میں داخل ہو گئے۔

اسلام کا گراف افقی طور پر بلند ہونے کی وجہ سے وہ کمزوریاں اسلامی صفوں میں در آئیں جو جنگ بدر کی حیران کن کامیابی کی وجہ سے آگئی تھیں۔ اب یہ کمزوریاں بہت بڑے پیمانے پر تھیں۔ بدر الکبریٰ کے بعد جو کمزور عناصر اسلامی صفوں مین در آئے تھے۔ ان کو تعلیم و تربیت کے ذریعے اس قدر پاک و صاف کر دیا گیا کہ بدر الکبریٰ کے بعد فتح مکہ تک سات سالوں میں قریب تھا کہ مدنی معاشرہ تمام کمزوریوں سے پاک ہو جائے اور اہل مدینہ اسلامی انقلاب کے لیے مضبوط بیس اور مضبوط بنیاد بن جائے۔ یہاں اولین، مہاجرین و انصار کی ایک ایسی جمعیت تیار بیٹھی تھی کہ وہ ہر وقت اسلامی نظام کے لیے امین تھی۔ اگر یہ جمعیت نہ ہوتی تو اس عظیم انقلاب کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ لیکن بدر الکبریٰ کے بعد اس جمعیت نے جو مہاجرین و انصار کے سابقین اولین پر مشتمل تھی اس عظیم انقلابی امانت کی مسلسل نگہبانی کی۔ ان سات سالوں میں اللہ تعالیٰ نے مدینہ طیبہ کی اس جمعیت کو اس کام کے لیے تیار کیا اور تربیت دی کہ یہ لوگ فتح عظیم کے بعد اسلام میں داخل ہونے والے انسانوں کے سیلاب کو کنٹرول کر سکیں۔ اللہ خوب جانتا تھا کہ وہ اپنی اس رسالت اور انقلابی رسالت کی

حفاظت کا کام کس کے سپرد کرے۔

ان کمزوریوں کا سب سے پہلے ظہور یوم حنین میں ہوا۔اس کا تذکرہ سورت توبہ میں ان الفاظ میں ہوا ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ (٢٥) ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ (٢٦) (٩: ٢٥ – ٢٦)) ”اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے۔ابھی غزوۂ حنین کے روز۔اس روز تمہیں اپنی کثرت تعداد کا غرور تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اس وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرین حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کا جو حق کا انکار کریں“۔

اس جنگ میں ابتدائی شکست کا پہلا سبب یہ تھا کہ دس ہزار اسلامی لشکر میں دو ہزار طلقاء شریک تھے۔یہ فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے تھے اور اسلامی لشکر کے ساتھ جہاد کے لیے نکلے تھے۔چنانچہ اسلامی لشکر کے ساتھ ان دوسرے افراد کا وجود بھی اس انتشار کا سبب بنا۔دوسرا سبب یہ تھا کہ ہوازن نے بالکل اچانک حملہ کیا۔اور لشکر اسلام چونکہ صرف مدینہ طیبہ کی حقیقی تربیت یافتہ فوج پر مشتمل نہ تھا' جن کی تربیت گزشتہ سات سالوں میں مکمل ہو چکی تھی اور جو اس تحریک کی اصل اساس اور سرمایہ تھے' اس لیے انتشار پیدا ہو گیا۔

غزوۂ حنین میں جو کمزوریاں سامنے آئیں وہ اسلام کی عددی قوت کے گراف اچانک عمودی بلندی کی وجہ سے تھیں۔جدید لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے' جو ایمان اور اخلاص کے اعتبار سے مختلف درجات کے لوگ تھے۔جن کے درمیان تفاوت درجات تھا اور سورت توبہ میں ان کمزوریوں سے بحث کی گئی ہے اور پھر مختلف زاویوں سے اور مختلف پہلوؤں سے سخت تنقید کی گئی ہے جن کے تفصیلی اقتباسات ہم اس سے قبل دے آئے ہیں“۔

اس اجمال کی تفصیل میں اب ہم آیات کی تشریح کرتے ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۹۳ تشریح آیات

۹۷ ــــ تا ــــ ۱۱۰

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾ وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ
مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَ اللّٰهُ
سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾ وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ
مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ ۱۲
سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾ ع ۱۰

۱ ”یہ بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملہ میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کے حدود سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ اور حکیم و دانا ہے۔ ان بدویوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو راہ خدا میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو اسے اپنے اوپر زبردستی کی چٹی سمجھتے ہیں اور تمہارے حق میں زمانہ کی گردشوں کا انتظار کر رہے ہیں (کہ تم کسی چکر میں پھنسو تو وہ اپنی گردن سے اس نظام کی اطاعت کا قلادہ اتار پھینکیں جس میں تم نے انہیں کس دیا ہے۔ حالانکہ بدی کا چکر خود انہی پر مسلط ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے اور انہی بدویوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں تقرب کا اور رسول ؐ کی طرف سے رحمت کی دعائیں لینے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں! وہ ضرور ان کے لیے تقرب کا ذریعہ ہے اور اللہ ضرر ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا' یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے“۔

یہاں سے بدوی عربوں کی انواع و اقسام پر تبصرہ شروع ہوتا ہے۔ یہ بدوی عرب مدینہ کے اردگرد سکونت پذیر تھے۔ اسلام لانے سے قبل ان لوگوں نے اسلام کے خلاف ہر کارروائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اسلام لانے کے بعد وہ عموماً دو قسم کے تھے جن کا تذکرہ ان آیات میں ہوا ہے۔ یہاں ان دونوں اقسام کے بیان سے قبل ان بدوی لوگوں پر ایک

عمومی تبصرہ ہے۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹ : ۹۷) "یہ بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملہ میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کے حدود سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔ اللہ سب کچھ جانتا اور حکیم و دانا ہے"۔

ان عمومی الفاظ میں بدویوں کی تعریف کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بدویت کی صفات کیا ہوتی ہیں' لہذا ہر بدوی کی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ سخت کافر اور پرلے درجے کے منافق ہوتے ہیں اور ان کے حالات ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں وہ زیادہ جاہل اور حدود اللہ سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اور ان تعلیمات سے دور رہتے ہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہیں۔

یعنی ان کے عدم علم اور ناواقفیت کی اصل وجہ ہی ان کے ظروف و احوال ہیں۔ مشکل حالات میں رہ رہ کر یہ لوگ سخت جان' اجڈ اور دین کے راہ و رسم سے ناواقف رہتے ہیں۔ ان کا تعلق چونکہ ہروقت حسی مادی اشیاء سے ہوتا ہے' اس لیے وہ اعلیٰ اقدار اور اخلاقی اصولوں سے زیادہ مادی اشیاء کو اہمیت دیتے ہیں۔ اگرچہ ایمان ان کے مزاج میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ اور ان کی اقدار اور ترجیحات کو بلند کر دیتا ہے اور حسی افق سے ان کو بلند کر کے معنوی آفاق پر ان کی نظریں مرکوز کر دیتا ہے۔

بدویوں کی سنگدلی کے بے شمار واقعات' احادیث و روایات میں نقل ہوئے ہیں۔ علامہ ابن کثیر نے ان میں اکثر واقعات کو نقل فرمایا ہے۔

ooo

"اعمش نے ابراہیم سے نقل کیا ہے' کہتے ہیں کہ ایک بدوی زید ابن صوحان کے پاس آکر بیٹھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہے تھے۔ یاد رہے کہ ان کا ہاتھ جنگ نہاوند میں زخمی ہو گیا تھا۔ تو بدوی نے کہا تمہاری باتیں تو مجھے عجیب لگ رہی ہیں لیکن تمہارا ہاتھ مجھے شبہے میں ڈال رہا ہے تو زید نے کہا تم میرے ہاتھ کی وجہ سے شک میں کیوں پڑ گئے؟ دیکھتے نہیں کہ یہ تو بایاں ہے؟ اس پر بدوی نے کہا: خدا کی قسم مجھے یہ معلوم نہیں کہ مجرمین کا بایاں ہاتھ کاٹا جاتا ہے یا دایاں۔ اس پر زید ابن صوحان نے فرمایا

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ

(۹ : ۹۷) "یہ بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملہ میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کے حدود سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے"۔ امام احمد روایت کرتے ہیں عبدالرحمن ابن مہدی سے' سفیان نے' ابوموسیٰ سے' وھب ابن منبہ نے' ابن عباس نے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے' فرماتے ہیں

کہ جو شخص دیہات میں رہائش رکھتا ہے' وہ خشک ہو جاتا ہے اور جو شکار کا پیچھا کرتا ہے وہ غافل ہو جاتا ہے' اور جو بادشاہوں کے ہاں جاتا ہے' فتنے میں پڑتا ہے۔شدت اور ظلم چونکہ بدوی لوگوں میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے بدویوں میں سے کبھی رسول نہیں بھیجا۔تمام رسول قصبوں اور شہروں سے مبعوث ہوئے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى (۱۲:۹ ۱۰۹)

"اور آپ سے پہلے بھی اہل قریہ میں سے مردوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا گیا جن کی طرف وحی کی گئی"۔"ایک بار جب ایک بدوی نے رسول اللہ کو ہدیہ دیا تو رسول اللہ ﷺ نے جواب میں کئی گنا دیا' چنانچہ وہ راضی ہو گیا۔حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے ارادہ کیا کہ میں کسی قریشی' ثقفی' انصاری اور دوسی کے سوا کسی اور کا ہدیہ قبول نہ کروں" کیونکہ یہ لوگ شہروں میں رہتے تھے یعنی مکہ' طائف' مدینہ اور یمن میں رہتے تھے۔یہ لوگ نہایت نرم مزاج تھے جبکہ بدوی لوگوں کے مزاج میں درشتی ہوتی ہے۔

امام مسلم نے ابوبکر ابن ابوشیبہ سے اور ابو کریب سے' انہوں نے ابو امامہ سے اور ابن نمیر سے' ہشام سے' اس کے باپ سے انہوں نے' عائشہ سے' فرماتی ہیں: "بعض دیہاتی حضور ﷺ سے ملاقات کے لیے آئے تو انہوں نے کہا" کیا تم لوگ اپنے بچوں کو بوسہ دیتے ہو تو لوگوں نے کہا: "ہاں" تو انہوں نے کہا: "خدا کی قسم ہم تو بوسہ نہیں دیتے" اس پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "میں کیا کر سکتا ہوں کہ اللہ نے تمہارے دلوں سے شفقت نکال دی ہے"۔

غرض بے شمار روایات میں عرب دیہاتیوں کی درشت مزاجی اور سنگدلی کے واقعات نقل ہوئے ہیں۔اور بعض واقعات کا تعلق ان واقعات سے ہے جو اسلام کے بعد کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کی یہ صفت بجا طور پر اسلام کے بعد بھی ہو سکتی ہے کہ بعض بدوی کفر میں اور نفاق میں زیادہ شدید ہوں' اور ان کے بارے میں زیادہ امکان اس بات کا ہو کہ وہ حدود اللہ سے لاعلم ہوں' جو رسول اللہ پر نازل ہوئے تھے کیونکہ انہوں نے پوری زندگی دیہاتوں میں درشتی اور سختی کے ماحول میں گزاری تھی' جس میں وہ دوسروں کو کنٹرول میں رکھتے تھے اور جب کمزور زیر دست ہوتے تھے تو وہ اظہار نفرت میں نفاق اور عیاری سے کام لیتے تھے۔یہ لوگ چونکہ دین جدید کی راہ و رسم سے واقف نہ تھے اس لیے وہ بسا اوقات حدود سے تجاوز کر جاتے تھے۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹:۹۷) "اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے"۔اسے اپنے بندوں کے حالات کا اچھی طرح علم ہے۔ان کی صفات اور ان کے مزاج کا اچھی طرح علم رکھتا ہے۔اور وہ حکیم دانا ہے' اس نے مختلف لوگوں کو مختلف خصوصیات' صفات اور استعدادات سے نوازا ہے اور اس نے لوگوں کو مختلف نسلوں' جنسوں اور خاندانوں اور اقوام کی شکل میں منقسم کر رکھا ہے۔

بدوی لوگوں کی عمومی صفات کے بیان کے بعد اب اسلامی تحریک اور اسلامی تربیت کے نتیجے میں جو تغیرات ہوئے' اس زاویہ سے ان کے درمیان جو فرق پیدا ہو گیا ہے' اس کی تفصیلات دی جا رہی ہیں۔بعض دل بہرحال ایسے تھے جن میں حقیقی ایمان داخل ہو گیا تھا' اور بعض ایسے تھے جو ابھی تک اپنی سابقہ حالت پر قائم تھے اور حالت کفر و نفاق ان کے اندر موجود تھی۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۹ : ۹۸) ”ان بدویوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو راہ خدا میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو اسے اپنے اوپر زبردستی کی چٹی سمجھتے ہیں اور تمہارے حق میں زمانہ کی گردشوں کا انتظار کر رہے ہیں (کہ تم کسی چکر میں پھنسو تو وہ اپنی گردن سے اس نظام کی اطاعت کا قلادہ اتار پھینکیں جس میں تم نے انہیں کس دیا ہے۔ حالانکہ بدی کا چکر خود انہی پر مسلط ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے“۔

چونکہ اس سے پہلے کے پورے سبق میں منافقین مدینہ کا ذکر تھا اس لیے یہاں مومنین سے بھی پہلے منافقین کا ذکر کیا گیا تاکہ بدوی منافقین اور مدینہ کے منافقین کا ذکر ایک جگہ ہو جائے۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا (۹ : ۹۸) ”اور ان بدویوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو راہ خدا میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو اپنے اوپر زبردستی کی چٹی سمجھتے ہیں“۔ اپنے ظاہری اعلان ایمان کی وجہ سے یہ لوگ مجبور ہیں کہ زکوٰۃ ادا کریں اور مسلمانوں کی جنگی مہمات کے لیے مالی امداد دیں کیونکہ اس ظاہرداری کے بغیر وہ اسلامی معاشرے میں پر امن زندگی کے ثمرات سے متمتع نہ ہو سکتے تھے۔ نیز مدینہ میں، چونکہ اسلامی حکومت قائم تھی اور اس کے ساتھ بھی انہیں ہاں میں ہاں ملانا تھی۔ لیکن در حقیقت وہ ان تمام اخراجات کو زبردستی کی چٹی سمجھتے تھے، وہ دل کی خوشی سے یہ اخراجات نہ کرتے تھے کیونکہ ان کو مسلمانوں کی فتح اور نصرت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ (۹ : ۹۸) ”اور تمہارے حق میں زمانہ کی گردشوں کا انتظار کر رہے تھے“۔ وہ انتظار کرتے تھے کہ مسلمان کسی چکر میں پھنس جائیں اور ان کو شکست ہو اور ان کے غازی صحیح سلامت واپس نہ لوٹیں“۔

اب یہاں ان کے حق میں اللہ کی جانب سے بددعا آ جاتی ہے۔ اللہ کی جانب سے بددعا کا مفہوم تو یہ ہے کہ بددعا کا مفہوم عملاً ان پر واقعہ ہو جاتا ہے۔

عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ (۹ : ۹۸) ”حالانکہ بدی کا چکر ان پر مسلط ہے“۔ گویا بدی ایک دائرہ ہے جس نے انہیں گھیرے میں لے لیا ہے، اور اس سے وہ کسی طرح بچ کر نہیں نکل سکتے۔ وہ مکمل گھیرے میں ہیں۔ یہاں یہ معنی و مفہوم کو مجسم شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ خیالی تجسیم ہے جس کے ذریعے مفہوم زیادہ موثر اور زندہ نظر آتا ہے۔

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۹ : ۹۸) ”اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے“۔ یہاں اللہ کی صفات سمع اور علم کو لایا گیا ہے، جو زیر بحث صورت حال میں نہایت موزوں اور مناسب ہے۔ یہ لوگ دلوں میں خفیہ خواہشات بسائے اور چھپائے ہوئے ہیں کہ کوئی مصیبت مسلمانوں پر نازل ہو، نیز کفر کو چھپا کر ایمان کو ظاہر کر رہے تھے اس لیے اللہ ان کی خفیہ باتوں کو سنتا ہے اور چھپائے ہوئے بھیدوں اور کفر کا علم رکھتا ہے۔ اور دوسرا گروہ جن کے دلوں کے اندر ایمان کی چمک پیدا ہو گئی:

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

(۹ : ۹۹) "اور انہی بدویوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں تقرب کا اور رسول ؐ کی طرف سے رحمت کی دعائیں لینے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں! وہ ضرور ان کے لیے تقرب کا ذریعہ ہے اور اللہ ضرر ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا' یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔

اللہ پر ایمان اور جزائے یوم آخرت کی امیدواری کی وجہ سے یہ لوگ خرچ کرتے ہیں' عوام الناس کے خوف کی وجہ سے نہیں اور نہ اہل اقتدار کو خوش کرنے کے لیے۔ نہ ان لوگوں کے پیش نظر دنیا کا سود و زیاں ہے۔ بلکہ یہ فریق اللہ اور یوم آخرت پر پختہ ایمان رکھتا ہے اور جو کچھ خرچ کرتا ہے محض رضائے الٰہی کے لیے خرچ کرتا ہے۔ اور اس بات کا طلبگار ہے کہ رسول خدا ان کے حق میں دعائے خیر کر دیں اور حضور ؐ کسی کے لیے تب ہی دعا کرتے ہیں جب وہ کسی سے راضی ہوں اور جب آپ ؐ کسی کے لیے دعا کر دیں تو یقینی ہے کہ وہ شخص مفہوم دعا کو پا گیا۔ کیونکہ حضورؐ کی دعا ہی ان کے ایمان' بعد' ایمان بالآخرت اور طلب رضائے الٰہی اور خلوص کی گارنٹی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فوراً اعلان کر دیا جاتا ہے کہ ایسے لوگوں کی یہ سعی مشکور ہوئی۔

اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ (۹ : ۹۹) "بے شک' وہ ضرور ان کے لیے تقرب کا ذریعہ ہے"۔ اور ساتھ ہی اعلان ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ مقصد کو پا گئے۔

سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ (۹ : ۹۹) "اور اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا"۔ یہاں قرآن کریم اللہ کی رحمت کو بھی مجسم شکل میں پیش کرتا ہے کہ وہ گویا ایک محل ہو گا جس میں یہ لوگ داخل ہو جائیں گے' جس طرح اس سے قبل فریق مخالف کے ان منافقین اور کفار کے لیے مصیبت کو ایک دائرے کی شکل میں مجسم کر کے انہیں اس میں گھیرے ہوئے دکھایا تھا' جو مسلمانوں کے لیے دل میں کینہ رکھتے تھے۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹ : ۹۹) "یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔ وہ توبہ بھی قبول کرتا ہے' نفقہ بھی قبول کرتا ہے' اور جو تقصیرات اسلام کی راہ میں ہو گئی ہوں ان کو بھی معاف کرتا ہے اور جو رحمت کا طلبگار ہے' اسے مایوس نہیں کرتا۔

○○○

بدوی معاشرے کے اس تجزیے کے بعد اب اگلی آیات میں اس وقت کے پورے اسلامی معاشرے کی پوزیشن کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ اس وقت اسلامی سوسائٹی میں چار طبقات تھے۔ انصار و مہاجرین کے سابقین اولین مسلمان اور وہ لوگ جو صحیح معنوں میں ان کے تبع تھے۔ دوسرے وہ منافقین جو مدینہ کے باشندوں میں سے بھی تھے

اور مدینہ کی اردگرد کی آبادیوں میں بھی پھیلے ہوئے تھے اور عمل نفاق میں خوب طاق ہو گئے تھے' تیسرے وہ لوگ تھے جن کے کچھ کام اچھے تھے اور کچھ برے تھے اور چہارم وہ تھے جن کے بارے اللہ نے اپنا فیصلہ محفوظ کر لیا تھا۔ اس فیصلے کا انتظار تھا۔

پہلا گروہ:۔

وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

"وہ مہاجر و انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی' نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے' اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے' اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے' یہی عظیم الشان کامیابی ہے"۔

دوسرا گروہ:۔

وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛؕ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ؔۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

"تمہارے گردوپیش جو بدوی رہتے ہیں ان میں بہت سے منافق ہیں اور اسی طرح خود مدینہ کے باشندوں میں بھی منافق موجود ہیں جو نفاق میں طاق ہو گئے ہیں۔ تم انہیں نہیں جانتے' ہم ان کو جانتے ہیں۔ قریب ہے وہ وقت جب ہم ان کو دوہری سزا دیں گے' پھر وہ زیادہ بڑی سزا کے لیے واپس لائے جائیں گے"۔

تیسرا گروہ:۔

وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ

سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۰۲ خُذْ
مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ
صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱۰۳ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ
يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ
الرَّحِيْمُ ۝۱۰۴ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ
وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ۝۱۰۵

"کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کیا ہے۔ ان کا عمل مخلوط ہے، کچھ نیک ہے اور کچھ بد۔ بعید نہیں کہ اللہ ان پر پھر مہربان ہو جائے کیونکہ وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اے نبی ﷺ تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انہیں بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو، کیوں کہ تمہاری دعا ان کے لیے وجہ تسکین ہو گی، اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی خیرات کو قبولیت عطا فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے؟ اور اے نبی ﷺ ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم عمل کرو، اللہ اور اس کا رسول ﷺ اور مومنین سب دیکھیں گے کہ تمہارا طرز عمل اب کیا رہتا ہے، پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کو جانتا ہے، اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو"۔

چوتھا گروہ:-

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۭ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰۶

"کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کا معاملہ ابھی خدا کے حکم پر ٹھہرا ہوا ہے، چاہے انہیں سزا دے اور چاہے ان پر از سرنو مہربان ہو جائے۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے"۔

بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ اس وقت کے اسلامی معاشرے کے عناصر ترکیبی پر یہ تبصرہ تبوک کی واپسی کے بعد اور

لوگوں کے عذرات سننے کے بعد نازل ہوا۔ یہ عذرات ان منافقین نے بھی پیش کیے تھے جو اس غزوے کے باوجود تاکیدی حکم کے پیچھے رہ گئے تھے اور بعض مخلص مومنین نے بھی پیش کیے تھے۔ ان میں بعض لوگ وہ تھے جنہوں نے سچے عذرات پیش کیے' بعض نے اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستون سے باندھ لیا تھا اور وہ اس وقت تک بندھے رہنے پر مصر تھے جب تک رسول اللہ انہیں نہیں کھولتے۔ اور بعض ایسے تھے جنہوں نے کوئی عذر پیش نہیں کیا تھا اور امید رکھتے تھے کہ اللہ انہیں معاف کر دے گا۔ اور یہ وہ تین افراد تھے جو پیچھے رہ گئے تھے تو ان کے بارے میں حضورؐ نے کوئی فیصلہ ہی نہ فرمایا تھا' یہاں تک کہ ان کے بارے میں اللہ نے معافی نازل کر دی اور ان کی توبہ قبول کر لی۔ جیسا کہ عنقریب ان کے بارے میں تفصیلات آجائیں گی۔ یہ لوگ اس وقت تحریک اسلامی میں شامل ہونے والے مختلف اصناف میں سے تھے اور غزوۂ تبوک کے مابعد یہ سب قسم کے لوگ اسلامی صفوں میں شامل تھے۔ اللہ تعالیٰ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت کی تحریکی صفوں سے اچھی طرح آگاہ فرما رہے تھے کہ اسلامی تحریک کے شب و روز کیا ہیں اور تحریک اسلامی کے اس پہلے مرحلے کے اختتام پر یعنی جزیرۃ العرب میں تکمیل انقلاب کے اختتام پر اور عالمی انقلاب کے مرحلے کے آغاز کے موقعہ پر آپ کو بتایا جا رہا تھا کہ اگلے مرحلے میں کام کے لوگ کون ہوں گے تاکہ اسلامی تحریک ان کو لے کر عالمی سطح پر اللہ وحدہ کی بندگی کا نظام قائم کر دے اور اس طرح تمام کرۂ ارض پر ہر انسان کو کسی بھی انسان کی غلامی سے آزاد کر دے اور زمین پر کوئی انسان بھی کسی طرح کسی دوسرے انسان کا غلام نہ رہے۔

تحریک اسلامی کے لیے اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ اسے اچھی طرح معلوم ہو کہ اسے کس گراؤنڈ پر کھیلنا ہے۔ ہر مرحلے اور ہر قدم پر اسے کیا کرنا ہے۔ اور یہ معلومات اس کے لیے ضروری تھیں تاکہ لوگ یہ جان سکیں کہ ان کی پوزیشن کیا ہے اور اگلے مرحلے کے لیے اس نے کیا اقدامات کرنے ہیں؟

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۹ : ۱۰۰) "وہ مہاجر و انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی' نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے' اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے' اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے' یہی عظیم الشان کامیابی ہے"۔

مسلمانوں کا یہ طبقہ جو تین عناصر پر مشتمل تھا' سابقون اولون از مہاجرین' سابقون اولین از انصار اور وہ لوگ جو ان کے بعد راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے' یہ تین طبقات اس وقت کی تحریک اسلامی کی ریڑھ کی ہڈی تھے اور فتح مکہ کے بعد جزیرۃ العرب میں یہی لوگ حقیقی حاملین دعوت تھے۔ دسویں پارے میں اس سورت پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے اس کی تفصیلات دے دی ہیں۔ غرض یہی لوگ تھے جنہوں نے اس دعوت کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور اس سوسائٹی پر ان کو پورا کنٹرول حاصل تھا۔ اور یہی لوگ ہر اچھی حالت اور ہر بری حالت میں اس سوسائٹی کو تھامے ہوئے تھے اور یہ بات ہر تحریک کو

اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ مشکلات کی آزمائشیں بمقابلہ خوشحالی اور فتح کی آزمائش کے بہت ہی آسان ہوتی ہیں۔

مہاجرین میں سے سابقون اولون کون لوگ ہیں؟ ہماری رائے میں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے بدر سے قبل ہجرت فرمائی۔اسی طرح انصار سے سابقون اولون وہ لوگ ہیں جو جنگ بدر سے قبل ایمان لائے' رہے وہ لوگ جو ان کے بعد راست بازی کے ساتھ ایمان لائے' وہ وہی لوگ ہیں جو غزوۂ تبوک کی آزمائش میں پورے اترے۔یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اسلامی نظام زندگی اختیار کیا' پوری طرح ایمان لائے اور اس کے بعد ایمانی تقاضے پورے کیے۔اور اعلیٰ ایمانی معیار تک پہنچ گئے۔اگرچہ ان پر ان لوگوں کو سبقت حاصل ہے جنہوں نے نہایت ہی شدید حالات میں اسلام کے دامن کو تھاما۔

روایات اس بارے میں مختلف ہیں کہ انصار اور مہاجرین میں سے سابقون اولون کون ہیں؟ ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے بدر سے قبل ہجرت کی اور نصرت کی۔ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دو قبلوں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔بعض نے کہا ہے کہ یہ اہل بدر ہیں۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے صلح حدیبیہ سے قبل ہجرت کی اور نصرت کی۔بعض نے کہا ہے کہ یہ بیعت رضوان والے ہیں۔ہماری رائے وہی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اور اس رائے کو ہم نے اسلامی معاشرے کی تشکیل کے مختلف مراحل اور اہل ایمان کے مختلف طبقات کی تشکیل کے مراحل کے گہرے مطالعے کے بعد قائم کیا ہے۔واللہ اعلم!

بہتر ہو گا کہ ہم یہاں دسویں پارے سے چند فقرے نقل کر دیں جو ہم نے وہاں اسلامی معاشرے کی تشکیل اور اس کے اندر اہل ایمان کے مراتب کے تعین کے بارے میں وہاں لکھے تھے تاکہ قارئین کے ذہن میں وہ نکات دوبارہ تازہ ہو جائیں اور اسے دوبارہ پارۂ دہم کی ورق گردانی نہ کرنی پڑے۔اور ان نکات کی روشنی میں قارئین اسلامی معاشرے کی طبقاتی تقسیم (Classification) کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔یہ اسلامی معاشرے کی آخری تقسیم تھی کیونکہ زیر بحث آیات قرآن کریم کی آخری دور کی آیات ہیں۔

○○○

"تحریک اسلامی مکہ مکرمہ میں نہایت ہی شدید حالات میں ابھری' اس کا مقابلہ قریش کے جاہلی نظام اور جاہلی معاشرے سے تھا۔تحریک اسلامی کا کلمہ دعوت لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو قریش کے اس جاہلی معاشرے نے اپنے لیے ایک خطرہ سمجھا' اس لیے کہ یہ کلمہ در حقیقت ان تمام معاشروں اور ان کے اقتدار اعلیٰ کے لیے ایک گونہ بغاوت کا اعلان تھا جن کا اقتدار اعلیٰ اللہ کے اقتدار اعلیٰ اور اللہ کی حکومت سے ماخوذ نہ تھا۔یہ کلمہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ کلمہ گو نے تمام طاغوتی قوتوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا ہے اور وہ صرف اللہ کی حکومت اور اقتدار کا وفادار ہے۔پھر قریش کے جاہلی معاشرے نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ یہ نئی دعوت ایک نئی قیادت' قیادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت ایک منظم تحریک کی شکل میں ابھر رہی ہے اور اس نئی تحریک کا شعار پہلے دن سے تھا کہ اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کی جائے اور قریش کی جاہلی اور سرکش اور ظالم قیادت کی اطاعت کا انکار کر دیا جائے"۔

"جونہی قریش نے درج بالا خطرہ محسوس کیا کہ موجودہ نظام' اس کے مفادات اور اصولوں کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے تو اس جاہلی معاشرے نے تحریک اسلامی کے افراد کے خلاف تشدد اور ظلم کا طوفان کھڑا کر دیا۔انہوں نے ایک جدید تحریک اور اس جدید سوسائٹی اور اس جدید قیادت کے خلاف وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیئے جو ان کے بس میں

تھے۔ جن میں ایذا رسانی، سازشیں اوچھے ہتھیار اور فتنہ پردازیاں سب کچھ شامل تھے"۔

"قریش کا جاہلی معاشرہ یکلخت اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنا دفاع شروع کر دیا اور اس معاشرے نے بعینہ اسی طرح اپنا بچاؤ شروع کر دیا جس طرح ایک زندہ انسان اپنے آپ کو موت کے خطرات سے بچانا چاہتا ہے اور قریش میں اس جاہلی معاشرے کا ردعمل بالکل فطری تھا، اور جب بھی کوئی دعوت لوگوں کو صرف رب العالمین کی بندگی، ربوبیت اور اقتدار اعلیٰ کی طرف بلانا شروع کرتی ہے، اس وقت کی قائم جاہلی سوسائٹی کا ردعمل ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ جاہلی سوسائٹی میں انسان، انسانوں کے غلام ہوتے ہیں اور اسلامی دعوت صرف رب العالمین کی بندگی کی طرف ہوتی ہے۔ جب بھی دعوت اسلامی ایک عضویاتی تحریک کی شکل میں اٹھے گی جاہلیت اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑی ہوگی جس طرح نقیض نقیض کے مقابلے میں ہوتا ہے"۔

اور اس قسم کی تحریک کا ہر کارکن جاہلی معاشرے کی زد میں آ جاتا ہے اور اسے ہر قسم کے فتنوں اور مشقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اور بسا اوقات اس تشدد کے نتیجے میں کارکنوں کا خون بھی بہایا جاتا ہے، جب ایسے حالات ہوتے ہیں تو تحریک اسلامی کی صفوں میں آکر شہادت حق دینے والے صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے فیصلہ کر لیا ہو کہ وہ اللہ کی راہ میں جان تک کا نذرانہ پیش کریں گے۔ اس دعوت اور تحریک اور اس جدید سوسائٹی کی رکنیت ایسے سرفروش ہی اختیار کرتے ہیں جو اذیت، فتنہ سامانیوں، بھوک، افلاس اور شدائد و مصائب برداشت کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات انہیں قید و بند اور موت کے لیے بھی تیار ہونا ہوتا ہے"۔

مکہ مکرمہ کے عربی معاشرے میں ایسے ہی مضبوط، طاقتور اور اولوالعزم لوگ اسلامی قیادت کی بنیاد بنے۔ وہ لوگ جو مشکلات برداشت کر کے اور شدائد و مصائب انگیز نہ کر کے تحریک میں فوج در فوج داخل ہو گئے تھے۔ وہ دوبارہ جاہلیت کی طرف مرتد ہو کر لوٹ گئے تھے۔ یہ اولوالعزم لوگ تعداد میں بہت ہی کم تھے۔ اور یہ بات بالکل معروف اور کھلی ہے۔ اس لیے کہ ابتداء جاہلیت کو چھوڑ کر اسلام کی مشکل اور پر خطر راہ کو اپنانے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ ماسوائے ان ممتاز اور مختار اور برگزیدہ لوگوں کے جن کو اس مقصد کے لیے بنایا گیا تھا"۔

سابقین مہاجرین ایسے ہی لوگوں میں سے تھے جو نادرۂ روزگار تھے اور یہ اس دین کا بنیادی اثاثہ تھے اور مضبوط بنیاد تھے اور انہوں نے ابتدائی کی دور میں لبیک کہا۔ یہی لوگ جب مدینہ پہنچے تو یہ اس تحریک کے روح رواں اور دین کے مرکزی ستون تھے۔ ان کے ساتھ مدینہ میں انصار میں سے ایسے ہی اولوالعزم افراد مل گئے۔ ان لوگوں نے اگرچہ وہ مشکلات برداشت نہ کی تھیں جو مہاجرین نے کیں لیکن ان لوگوں نے چونکہ نہایت ہی مشکل حالات میں عقبہ کے مقام پر حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اس لیے یہ لوگ بھی پاک طینت اور اصلی مزاج کے لوگ تھے اور ان کے اندر وہ بنیادی اوصاف موجود تھے جو اس دین کے حاملین اولین میں ضروری تھے۔ علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں کہتے ہیں: "محمد ابن کعب قرظی نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن رواحہ نے بیعت عقبہ کے موقعہ پر حضور اکرمؐ سے کہا: آپ اپنے لیے اور اپنے رب کے لیے جو شرط ہم پر عائد کرنا چاہیں، عائد کر دیں۔ تو اس پر حضورؐ نے فرمایا میں رب کے لیے تو یہ شرائط عائد کرتا ہوں کہ تم اس کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور اپنے لیے یہ شرط عائد کرتا ہوں کہ تم میری مدافعت اس طرح کرو گے جس طرح تم اپنی جان و مال کی مدافعت کرتے ہو۔ اس پر لوگوں نے کہا اگر ہم نے ایسا کیا تو ہمارے لیے کیا اجر ہو گا؟ تو حضورؐ نے فرمایا "الجنۃ" تو انہوں نے کہا یہ بہت ہی اچھا سودا ہے، نہ ہم اقالہ

کرتے ہیں اور نہ دوسرے فریق سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اقالہ کرے"۔

"یہ لوگ جو حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے' یہ جنت کے علاوہ اور کچھ نہ چاہتے تھے۔ انہوں نے بڑے وثوق کے ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا کہ نہ تو وہ اس سودے کو واپس کریں گے اور نہ ہی فریق دوئم کو یہ اجازت دیں گے کہ وہ اس سودے کو لوٹا دیں۔ اور یہ جانتے تھے کہ یہ بیعت کوئی معمولی بیعت نہ تھی' وہ جانتے تھے کہ اب قریش ان کے پیچھے پڑیں گے۔ اور نہ صرف قریش بلکہ تمام عرب ان پر ٹوٹ پڑیں گے اور وہ اب جاہلیت کے ساتھ مل کر پر سکون زندگی بسر نہ کر سکیں گے جو ان کے ارد گرد خیمہ زن ہے۔ اور جزیرۃ العرب اور مدینہ کے اطراف اکناف پر حکمران ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ انصار کو یہ علم تھا اور یہ یقینی علم تھا کہ اس بیعت کے نتائج کیا ہوں گے اور انہوں نے یہ بات بھی اچھی طرح جان لی تھی کہ حضور ﷺ نے ان کے ساتھ اس دنیا کے اندر کسی اجر و صلہ کا وعدہ نہیں فرمایا' یہاں تک کہ حضور ﷺ نے ان کے ساتھ یہ وعدہ بھی نہیں کیا کہ تمہیں اس دنیا میں اس مقصد میں کامیابی نصیب ہوگی ماسوائے جنت کے' ان کے ساتھ کوئی اور وعدہ نہ تھا۔ یہ تھی ان کے فہم دین کی انتہا اور یہ تھی ان کی چاہت جو وہ اس دین کے ساتھ رکھتے تھے۔ لہٰذا یہ لوگ سابقون اولون کے مقام بلند پر فائز ہوئے اور یہ لوگ مہاجرین کے اولین ساتھیوں میں قرار پائے جنہوں نے تعمیر دین کی بنیادوں میں حصہ لیا اور اس عمارت کو تیار کیا۔ یہ لوگ مدینہ کی سوسائٹی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے تھے"۔

لیکن مدینہ کا معاشرہ اور جماعت اسی طرح مخلص اور صاف رہی۔ اسلام کا ظہور مدینہ سے ہوا۔ وہ اس کے اندر دور تک پھیل گیا اور بہت سے لوگ خصوصاً ان میں سے صاحب مرتبہ اور سربراہ قسم کے لوگوں نے بھی اپنی قوم کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دیا تاکہ ان کی لیڈر شپ قائم رہے۔ جب جنگ بدر کا عظیم واقعہ پیش آ گیا تو اس قسم کے لوگوں کے سرخیل عبداللہ ابن ابی ابن سلول نے اس پر یہ تبصرہ کیا کہ یہ معاملہ تو اب بہت آگے نکل گیا ہے اس لیے اس نے نفاق کے طور پر اسلام قبول کر لیا۔ یہ بات ضروری ہے کہ بعض لوگوں کو اسلام کا سیلاب بہا کر لے گیا اور انہوں نے دوسروں کی تقلید میں اسلام قبول کر لیا۔ اگرچہ یہ مقلد قسم کے لوگ منافق نہ تھے لیکن ان لوگوں نے اسلام کو ابھی تک اچھی طرح نہ سمجھا تھا اور نہ وہ اسلامی قالب میں اچھی طرح ڈھل گئے تھے' اس کی وجہ سے مدینہ کی اسلامی سوسائٹی میں افراتفری تھی کیونکہ مختلف لوگ ایمان کے مختلف درجات پر فائز تھے۔

قرآن کریم نے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اس قسم کے لوگوں کی تربیت شروع کی۔ چونکہ ایمان و اخلاق کے مختلف درجات کے لوگ اس سوسائٹی میں داخل ہو گئے تھے' اس لیے ضروری تھا کہ ان مختلف عناصر کے اندر توازن اور توافق اور ہم آہنگی پیدا کی جائے اور جدید سوسائٹی مضبوط بنیادوں پر استوار ہو۔

"جب ہم مدنی سورتوں کا مطالعہ ترتیب نزولی کے مطابق کریں (اگرچہ یہ ترتیب اندازاً معلوم ہے) تو معلوم ہو گا کہ قرآن نے' اسلامی معاشرے میں مسلسل داخل ہونے والے جدید عناصر کی ترتیب اور تطہیر کے لیے مسلسل جدوجہد جاری رکھی' کیونکہ آنے والے لوگ مختلف خاندانوں اور مزاجوں کے تھے اور مسلسل آ رہے تھے۔ اگرچہ قریش لوگوں کو دین اسلام میں داخل ہونے سے روکتے تھے اور تمام عرب قبائل کو وہ اس دین کے خلاف آمادہ جنگ کرتے تھے۔ اسی طرح یہودی بھی اس دین کی راہ میں رکاوٹ تھے اور وہ بھی رات دن لگے ہوئے تھے کہ تمام اقوام اس دین جدید پر حملہ آور

ہوں اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ اس لیے جدید آنے والے لوگوں کی تربیت کی بہت ضرورت تھی"۔ "تربیت اور تطہیر کی اس مسلسل جدوجہد کے باوجود کبھی کبھار خصوصاً مشکل اور شدید دقت میں' اسلامی صفوں میں کمزوریوں کا ظہور ہو جاتا تھا۔ بعض گوشوں میں نفاق ابھرتا' بعض میں تردد اور غیر یقینی صورت حال ہوتی' بعض لوگ دین جدید کی راہ میں مال خرچ کرنے میں بخل کرتے' بعض لوگ خطرات کا سامنا کرنے سے ڈرتے۔ بعض اوقات لوگ یہ نہ سمجھ سکتے کہ ان کے مابین اسلامی رابطے اور تعلق کا کیا مقام ہے اور ان کی سابقہ جاہلی رشتہ داریوں اور روابط کی حیثیت اب کیا ہے؟ وہ اسلامی بھائی چارے کو اچھی طرح نہ سمجھتے تھے۔ اس سورت کی آیات سے ہمیں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ آیات قرآنیہ مختلف طریقوں سے اور مختلف زاویوں سے ایسے لوگوں کی تربیت کس طرح کرتی ہیں اور اس کے لیے کیا کیا اسلوب اختیار کرتی ہیں۔ ان آیات میں سے ہم بعض آیات کو بطور مثال پیش کرتے ہیں"۔

"لیکن مدینہ طیبہ میں مسلم معاشرے کا بنیادی ڈھانچہ درست تھا' اس لیے کہ اس ڈھانچے میں بنیادی اہمیت صرف ان لوگوں کو حاصل تھی جو مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین تھے اور جو نہایت ہی مضبوط لوگ تھے۔ نیز اس معاشرے کی تعمیر و تربیت میں اتحاد و اتفاق اور اس کے ڈھانچے میں اس قدر پختگی تھی کہ اس نے ان کمزوریوں اور عوارض اور انتشار پر قابو پالیا تھا اور وہ عناصر جو خوف اور پریشانی سے متاثر ہو جاتے تھے اور جن کی ابھی تک پوری تربیت نہ ہوئی تھی اور وہ اس جدید معاشرے میں ابھی تک ڈھل نہ گئے اور ان کے اندر پوری ہم آہنگی پیدا نہ ہوئی تھی۔ ان کو بھی اجتماعی معاشرتی نظام سنبھالا دیتا تھا"۔

"بہرحال آہستہ آہستہ یہ جدید عناصر تربیت پا رہے تھے' اس معاشرے میں ڈھل رہے تھے اور ان کی تطہیر مسلسل ہو رہی تھی اور وہ اسلامی معاشرے کی اصل قوت کے ساتھ ملتے رہتے تھے اور ضعیف القلب' نافرمانی کرنے والوں اور ڈھل مل یقین قسم کے لوگوں کی تعداد روز بروز کم ہو رہی تھی۔ مفادات سے ڈرنے والے اور ایسے لوگ جن کے دلوں میں ابھی تک اسلامی نظریہ حیات پوری طرح نہ بیٹھا تھا تاکہ وہ اپنے سوشل روابط بھی اسی نظریہ کی اساس پر استوار کریں۔ یہاں تک کہ فتح مکہ سے پہلے حالت یہ ہو گئی تھی کہ اسلامی معاشرے تعلیم و تربیت اور اپنی ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے مقام کمال کے قریب پہنچ گیا تھا اور اکثر لوگ مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین کے نقش قدم پر چل پڑے تھے اور یہ معاشرہ اس قدر پاک اور تربیت یافتہ ہو گیا تھا کہ وہ اسلامی نظام حیات کے پیش نظر مطلوبہ معیار کے قریب تر تھا"۔

"یہ بات درست ہے کہ ابھی تک اس معاشرے میں ایسی قدریں نشوونما پا چکی تھیں کہ جن کا تعلق براہ راست اسلامی نظریات کے ساتھ تھا۔ ان اقدار کی وجہ سے تحریک کے اندر کچھ لوگ زیادہ ممتاز تھے اور زیادہ ثابت قدم تھے اور تحریک کی صفوں میں آگئے تھے۔ مثلاً مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین' اہل بدر حدیبیہ میں بیعت رضوان کرنے والے۔ پھر جن لوگوں نے فتح مکہ سے قبل جہاد انفاق اور قتال میں حصہ لیا اور جنہوں نے بعد میں لیا۔ نصوص کتاب اللہ' احادیث نبوی اور تحریک کے بعض عملی اقدامات سے یہ تفاوت مراتب اور اقدار کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ اسلامی اقدار اور یہ درجات اسلامی نظریہ حیات کو آگے بڑھانے کے نقطہ نظر سے متعین ہوئے"۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ انصار و مہاجرین میں سے جو لوگ سابقون اولون تھے ان کے ایمانی معیار اور ان کی تحریکی آزمائشوں نے انہیں کس مقام بلند تک پہنچایا اور اس سے ہمیں اچھی طرح معلوم ہو۔

جاتا ہے کہ تعمیر اسلام اور عملاً اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں صحابہ کرام کا کردار پوری انسانی تاریخ میں کس قدر اہم ہے اور مبنی بر حقیقت ہے۔ اور اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان (رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ) کا حقیقی مفہوم کیا۔

اللہ ان سے راضی ہوا اور اللہ کی رضا کا نتیجہ ہوتا ہے اللہ کی طرف اجر و ثواب۔ اللہ کی رضامندی بذات خود بھی بڑا انعام ہے۔ اور لوگوں کی طرف سے اللہ سے راضی ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اللہ سے مطمئن ہوتے ہیں، اللہ کے فیصلوں پر راضی ہوتے ہیں اور اللہ کے فیصلوں کے بارے میں حسن ظن رکھتے ہیں۔ اور اللہ نے انہیں جو انعامات دیئے ہیں ان پر وہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اگر اللہ کی جانب سے ان پر کوئی آزمائش آجائے تو اس پر صبر کرتے ہیں۔ لیکن یہاں جن الفاظ اور جس انداز میں رضامندی کا ذکر کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مختار زمانہ گروہ اور ذات باری کے درمیان ایک عمومی 'گہری' دو طرفہ 'وسیع الاطراف اور دونوں جوانب سے رضامندی کا تبادلہ ہو گا' اور اللہ تعالیٰ نے اس برگزیدہ گروہ کو یہ مقام عطا فرمایا ہے کہ وہ بھی اس قابل ہو گئے کہ وہ اللہ سے راضی ہوں حالانکہ اللہ رب اور حاکم ہے اور یہ لوگ اس کی مخلوق اور بندے ہیں۔ فریقین کے درمیان یہ تعلق اس قدر گہرا اور اس قدر شاندار ہے کہ انسانی الفاظ میں اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ صحابہ کرام کی یہ شان نصوص قرآنی کے بین السطور سے صرف اس شخص کے سامنے کھلتی ہے جو روحانی تڑپ رکھتا ہو اور جس کا سینہ معانیٔ قرآن کے لیے کھلا ہو اور جس کا حس اور شعور عالم بالا کے ساتھ جڑا ہوا ہو۔

یہ ہے ان کا دائمی اور مخصوص تعلق اپنے رب کے ساتھ کہ وہ اللہ سے راضی ہو گئے اور اللہ ان سے راضی ہو گیا۔ اس رضامندی کی علامت کیا ہے؟ یہ کہ!

وَاَعَدَّلَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ

(٩ : ١٠٠) "ان کے لیے ایسے باغات مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی عظیم الشان کامیابی ہے"۔

○○○

یہ تو ہے ایک معیار اور اس کے مقابلے میں دوسری سطح کے لوگ بھی ہیں:

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَیْنِ ثُمَّ یُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِیْمٍ (٩ : ١٠١)

"تمہارے گرد و پیش جو بدوی رہتے ہیں ان میں بہت سے منافق ہیں اور اسی طرح خود مدینہ کے باشندوں میں بھی منافق موجود ہیں جو نفاق میں طاق ہو گئے ہیں۔ تم انہیں نہیں جانتے، ہم ان کو جانتے ہیں۔ قریب ہے وہ وقت جب ہم ان کو دوہری سزا دیں گے، پھر وہ زیادہ بڑی سزا کے لیے واپس لائے جائیں گے"۔

اس سے قبل منافقین کے بارے میں عمومی بات ہو چکی ہے اور ان کے احوال کا انکشاف کر دیا گیا ہے۔ ان کا تعلق اہل مدینہ سے بھی تھا اور اہل مدینہ کے ارد گرد پھیلے ہوئے بدوی منافقین سے بھی تھا۔ یہاں منافقین کی ایک خاص صنف کا تذکرہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہنر نفاق میں طاق ہو گئے ہیں اور اس آرٹ میں انہوں نے بہت ہی اچھا تجربہ حاصل کر لیا ہے۔ یہ عمل نفاق میں ڈوب چکے ہیں اور وہ اس قدر فنکار بن گئے ہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پیغمبرانہ بصیرت کے باوجود ان کو نہیں پہچان سکے حالانکہ آپ نے اس دور تک ان کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کر لی تھیں اور تجربات کے ایک طویل دور سے گزر چکے تھے۔

اللہ فرماتے ہیں کہ اس قسم کے منافقین اہل مدینہ اور ارد گرد کی آبادی میں اب بھی موجود ہیں۔ اس قسم کے منافقین کی سازشوں اور نیش زنیوں سے حضورؐ اور اہل ایمان مطمئن ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایک طرف حضورؐ کو فرماتے ہیں کہ آپ کے علم میں ان کی ریشہ دوانیاں نہیں ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کو بھی سخت تنبیہہ کر دی جاتی ہے کہ وہ اس سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔ ان کی مکاری اور ہوشیاری اور شاطرانہ چالیں اللہ کے مقابلے میں کارگر نہیں' اللہ ان کو اس دنیا و آخرت دونوں میں ذلیل و خوار کرے گا جبکہ آخرت میں ان کو دوگنا عذاب دیا جائے گا۔

لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ

(۹: ۱۰۱) "تم انہیں نہیں جانتے' ہم ان کو جانتے ہیں۔ قریب ہے وہ وقت جب ہم ان کو دو ہری سزا دیں گے' پھر وہ زیادہ بڑی سزا کے لیے واپس لائے جائیں گے"۔ دنیا میں ان کو دوگنا عذاب دیا جائے گا؟ قریب الفہم مفہوم یہ ہے کہ ایک تو ان کو اس بات پر سخت قلق ہو گا کہ اسلامی سوسائٹی میں ان کی شاطرانہ چالوں کے باوجود ان کی حقیقت لوگوں پر واضح کر دی گئی اور دوسرا عذاب یہ کہ ان کو موت اس حالت میں آئے گی کہ ان کی روح کو سختی سے قبض کیا جائے گا اور قبض روح کی حالت میں ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر ضربات رسید کی جائیں گی یا یہ عذاب کہ وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ مسلمانوں کو فتح پر فتح نصیب ہو رہی ہے اور وہ دل ہی دل میں جلتے ہیں اور دوسرا عذاب یہ کہ یہ لوگ ہر وقت اس ڈر میں رہتے ہیں کہ ان کی حالت کا انکشاف مسلمانوں پر نہ ہو جائے اور یہ کہ وہ عمل جہاد کا نشانہ نہ بن جائیں۔

یہ تو تھے دو انتہائی معیار اور ان کے درمیان کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بین بین ہیں — ان میں سے پہلا گروہ یہ ہے۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۰۲) خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۱۰۳) اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

(۱۰۴) وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۰۵) (۹: ۱۰۲ — ۱۰۵)

"کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کیا ہے۔ ان کا عمل مخلوط ہے' کچھ نیک ہے اور کچھ بد۔ بعید نہیں کہ اللہ ان پر پھر مہربان ہو جائے کیونکہ وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اے نبیؐ، تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انہیں بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو' کیوں کہ تمہاری دعا ان کے لیے وجہ تسکین ہوگی' اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی خیرات کو قبولیت عطا فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے؟ اور اے نبیؐ' ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم عمل کرو' اللہ اور اس کا رسولؐ اور مومنین سب دیکھیں گے کہ تمہارا طرز عمل اب کیا رہتا ہے' پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کو جانتا ہے' اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو"۔

اور اللہ نے اس گروہ کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک متعین سلوک کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گروہ چند متعین افراد پر مشتمل تھا اور یہ لوگ حضورؐ کے علم میں تھے۔

بعض روایات مین آتا ہے کہ یہ آیات چند متعین افراد کے بارے میں نازل ہوئیں۔ یہ لوگ غزوۂ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ کر پیچھے رہ گئے۔ پھر انہوں نے محسوس کیا کہ انہوں نے تو گناہ کا ارتکاب کر لیا ہے اور ان کا ضمیر ان کو ملامت کرتا رہا۔ انہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا۔ ان کو امید تھی کہ ان کی توبہ قبول کر لی جائے گی۔ انہوں نے جنگ میں شرکت اختیار نہ کی اور یہ ان کی جانب سے سخت کوتاہی تھی۔ لیکن انہوں نے گناہ کا اعتراف کیا۔ سچی توبہ کی اور ندامت کا اظہار کیا تو یہ ان کی جانب سے اچھا طرز عمل تھا۔

ابو جعفر ابن جریر طبری کہتے ہیں مجھے حسین ابن الفرح کے ذریعے معلوم ہوا کہ انہوں نے ابو معاذ' انہوں نے عبیداللہ ابن سلام سے' وہ کہتے ہیں کہ میں نے ضحاک سے سنا جو کہتے تھے کہ آیت:

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا (۹: ۱۰۲) ابولبابہ اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ رسول اللہ سے غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے۔ جب حضورؐ واپس آئے اور آپ مدینہ کے قریب پہنچ گئے تو انہیں اپنی پسماندگی پر سخت ندامت ہوئی کہ ہم لوگ چھاؤں اور کھانے پینے میں آرام سے رہے اور اپنی بیویوں کے پاس رہے اور اللہ کے نبی جہاد میں تکلیف برداشت کرتے رہے۔ خدا کی قسم ہم لوگ اپنے آپ کو ستونوں سے باندھیں گے اور ہم اپنے آپ کو اس وقت تک نہ کھولیں گے جب تک رسول اللہ ہمیں نہ کھولیں اور ہمارا اعذر قبول نہ کریں۔ تین اشخاص ایسے رہ گئے جنہوں نے اپنے آپ کو ستونوں سے نہ باندھا۔ جب حضورؐ اس غزوہ سے واپس آئے تو آپ مسجد میں تشریف لائے اور آپؐ کا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ اکثر مسجد میں تشریف لاتے۔ آپ نے جب دیکھا تو پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ بتایا گیا کہ ابولبابہ اور ان کے ساتھی ہیں۔ آپ سے پیچھے رہ گئے ہیں اور

اب انہوں نے اپنے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے جو آپ دیکھتے ہیں۔ انہوں نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس وقت تک نہ کھولیں گے جب تک آپؐ ان کو نہ کھولیں گے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ میں ان کو اس وقت تک نہ کھولوں گا جب تک مجھے ان کے کھولنے کا حکم نہ دیا جائے اور میں ان کی معذرت اس وقت تک قبول نہ کروں گا جب تک اللہ ان کی معذرت قبول نہیں کرتا۔ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ غزا کرنے کے مقابلے اپنی جانوں کو ترجیح دی ہے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی:

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ (۹ : ۱۰۲) اور عسی کا فاعل جب اللہ ہو تو وہ فعل گویا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نبیؐ نے انہیں کھول دیا۔

بعض دوسری روایات بھی وارد ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ صرف ابولبابہ کے بارے میں ہے کہ جب غزوہ بنی قریظہ میں انہوں نے اشارتاً بنو قریظہ کو بتا دیا تھا کہ ان کے بارے میں کیا فیصلہ ہونے والا ہے۔ انہوں نے اپنی گردن کی طرف اشارہ کر کے یہ کہا تھا کہ تمہارے بارے میں 'تمہارے قتل کا فیصلہ ہونے والا ہے لیکن یہ نہایت مستبعد روایت ہے اس لیے کہ ان آیات کا تعلق بنی قریظہ سے کیسے ہو سکتا ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے یہ اعراب اور بدویوں کے بارے میں ہو سکتا ہو۔ ان سب روایات کے نقل کرنے کے بعد ابن جریر نے یہ تبصرہ کیا ہے:

"ان سب اقوال میں سے بہتر قول ان لوگوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں ہے جنہوں نے اپنے اس قصور کا برملا اعتراف کر لیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مہم سے پیچھے رہ کر انہوں نے بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے کیونکہ انہوں نے رسول اللہ کی معیت میں فریضہ جہاد ادا کرنے میں کوتاہی کی اور حضورؐ رومیوں کے مقابلے میں ان کے سوا نکلے۔ یہ قصور ایک جماعت سے ہوا تھا' جن میں ابولبابہ بھی شامل تھا"۔

"ہم نے جو رائے اختیار کی ہے وہ اقرب الی الصواب بھی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ (۹ : ۱۰۲) "کچھ دوسرے لوگ وہ تھے جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا تھا"۔ گویا کوتاہیوں کا اعتراف کرنے والی ایک جماعت تھی۔ ابولبابہ کے سوا کوئی ایک شخص نہ تھا جس نے اعتراف قصور کرتے ہوئے اپنے آپ کو حصار میں بعینہ ستون کے ساتھ باندھ لیا تھا۔ جب حقیقت یہ ہو اور اللہ تعالیٰ نے

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ (۹ : ۱۰۲) کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ متخلفین ایک جماعت تھے۔ صرف ایک شخص نہ تھا۔ نیز مورخین' محدثین اور مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف غزوۂ تبوک کے متخلفین نے اپنے آپ کو ستونوں کے ساتھ باندھا تھا اور ان میں ابولبابہ بھی تھے لہٰذا یہ اجماعی قول ہو گا۔ کیونکہ تمام مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ یہ عمل غزوۂ تبوک کے موقع پر ہوا۔

پیچھے رہنے والوں اور توبہ کر کے معذرت کرنے والوں کا تذکرہ کر کے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ تبصرہ بھی فرمایا۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹ : ۱۰۲) "بعید نہیں کہ اللہ ان پر

مہربان ہو جائے کیونکہ وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔

ابن جریر نے کہا ہے ' اللہ کی جانب سے لفظ عسی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ کام ایسا لازماً ہو گا۔کیونکہ یہ لفظ اس ذات سے امیدواری کو منسوب کرتا ہے جو امیدوں کو پورا کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے اور اختیار بھی۔اور جس انداز میں ان لوگوں نے اعتراف گناہ کیا' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل زندہ تھے اور ان کے اندر ایمان کا احساس پوری طرح موجود تھا۔اس لیے امید واثق تھی کہ ان کی توبہ قبول ہوگی۔اور اللہ غفور ورحیم ان کی تقصیرات کو لازماً معاف کر دے گا۔چنانچہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور ان کو معاف کر دیا۔

اب اللہ حضرت نبیؐ سے کہتے ہیں:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۹: ۱۰۳) "اے نبیؐ' تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انہیں بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو' کیوں کہ تمہاری دعا ان کے لیے وجہ تسکین ہو گی' اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔

ان لوگوں کے دل میں جو شدید احساس تھا اور جس کی وجہ سے وہ نادم ہو کر توبہ پر مائل ہوئے' یہ احساس ہی اس بات کا مستحق تھا کہ وہ مطمئن ہو جائیں کیونکہ انہوں نے رجوع کر لیا ہے اور ان کے لیے حقیقتاً امید کے دروازے کھل چکے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ایک تحریک کی قیادت کر رہے تھے اور ایک امت کی تربیت کر رہے تھے اس لیے آپ نے ان کے بارے میں خود کوئی فیصلہ کرنے میں احتیاط سے کام لیا اور اس بات کا انتظار کیا کہ ان کے بارے میں اللہ کی طرف سے کوئی صریح حکم آ جائے۔

ooo

ابن جریر' ابن سعد' ان کے چچا' ان کے والد کی روایت سے حضرت ابن عباس نے نقل کیا ہے۔کہتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابولبابہ اور اس کے دو ساتھیوں کو رہا کر دیا (بعض روایت میں ان کی تعداد ۳' بعض ۷' بعض ۱۰ بتائی جاتی ہے جن میں سے تین نے اپنے آپ کو باندھا نہ تھا) تو ابولبابہ اور ان کے ساتھی اپنی پوری دولت لے کر حضورؐ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ ہمارے اموال میں سے جو چاہیں لے لیں اور ہماری طرف سے صدقہ کر دیں اور ہمارے لیے دعا فرمائیں۔مطلب یہ تھا کہ ہمارے لیے طلب مغفرت کریں اور ہمیں پاک کریں۔تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک اللہ کا حکم نہ آ جائے میں تمہاری دولت میں سے کچھ بھی نہیں لے سکتا۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی

خُذْ مِنْ (۹: ۱۰۳) "اے نبیؐ' تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انہیں بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو' کیوں کہ تمہاری دعا ان کے لیے وجہ تسکین ہوگی"۔تو جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ نے ان کے اموال میں سے ایک حصہ لیا اور اسے راہ خدا میں ان کی طرف سے خرچ کر دیا۔

اس طرح' اللہ نے ان پر احسان فرمایا' اس لیے کہ اللہ کو معلوم تھا کہ وہ دل سے سچے ہیں انہوں نے صدق دل سے

یہ کی ہے 'تب ہی تو حضورؐ کو حکم دیا گیا کہ آپ ان کا صدقہ قبول کر لیں 'ان کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں ۔لفظ صلو
ۃ کا ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ ان پر نماز پڑھو لیکن صلوٰۃ کا حقیقی مفہوم دعا ہے ۔

مالی صدقہ اس لیے لیا گیا کہ ان کے دلوں میں یہ شعور پیدا ہو جائے کہ وہ اب جماعت مسلمہ کے مکمل ارکان بن گئے ہیں 'اب اسلامی سوسائٹی کی اجتماعی ذمہ داریوں میں حصہ دار ہیں ۔اب وہ اس سوسائٹی سے نکلے ہوئے یا متروک لوگ نہیں ہیں جبکہ یہ صدقہ ان کے لیے روحانی تطہیر کا بھی سبب ہے ۔ان کے دل سے یہ احساس ختم ہو جائے گا کہ انہوں نے جہاد میں حصہ نہیں لیا اور حضورؐ کی دعا سے ان کو مزید اطمینان قلب نصیب ہو گا۔

وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۹ : ۱۰۳) "اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔وہ دعاؤں کو خوب سنتا ہے 'دلوں کی باتوں کو جانتا ہے اور وہ اپنے علم کے مطابق فیصلے کرتا ہے ۔اپنے بندوں کے حق میں فیصلے وہ اپنے ذاتی علم کی بناء پر کرتا ہے ۔اس طرح اللہ ان کی توبہ قبول کرتا ہے 'ان سے صدقات لیتا ہے ۔اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بندوں کے بارے میں اللہ کے احکام بجالاتے ہیں 'وہ ان کے بارے میں از خود کوئی فیصلہ نہیں فرماتے ۔اس حقیقت کو اگلی آیت میں یوں بیان کیا جاتا ہے ۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ يَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۹ : ۱۰۴) "کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی خیرات کو قبولیت عطا فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے ؟"

اس آیت میں استفہام تقریری کا انداز اختیار کیا گیا ہے ۔مفہوم یہ ہے کہ ان کو اس حقیقت سے آگاہ ہونا چاہئے 'کہ توبہ قبول کرنے والا صرف اللہ ہے 'اور صدقہ لینے والا بھی اللہ ہی ہے اور وہی معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے ۔اور یہ اختیارات اس نے اپنے کسی بندے کے سپرد نہیں کیے ۔ابن جریر کہتے ہیں کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو باندھنے والوں کے کھولنے سے اجتناب فرمایا 'جو جہاد سے پیچھے رہ گئے تھے اور اپنے آپ کو ستونوں سے باندھ لیا تھا 'اور ان کا صدقہ بھی قبول کرنے سے انکار کیا تھا 'یہ اس لیے کہ حضورؐ کو بھی یہ اختیارات حاصل نہ تھے کہ وہ خود کسی کی توبہ قبول کر لیں ۔یہ اختیارات صرف اللہ کے تھے ۔حضورؐ نے اس سلسلے میں وہی کچھ کیا جو حکم ہوا 'ان کو کھولا تو اللہ کے حکم سے 'ان کا صدقہ قبول کیا تو اللہ کے حکم سے 'سب کام اللہ کے حکم کے بعد سرانجام دیئے"۔

اب براہ راست خطاب ہے پیچھے رہنے والوں سے :

وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ سَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۹ : ۱۰۵) "اور اے نبیؐ 'ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم عمل کرو 'اللہ اور اس کا رسولؐ اور مومنین سب دیکھیں گے کہ تمہارا طرز عمل اب کیا رہتا ہے 'پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کو جانتا ہے 'اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو"۔یہ کیوں؟ اس لیے کہ اسلامی نظام زندگی کا طریقہ کار ہی یہ ہے کہ اس میں نظریات اور نظریات کے بعد پھر طرز عمل کو دیکھا جاتا ہے ۔

انسان کا طرزعمل ہی اس کے نظریات کی تصدیق کر سکتا ہے ۔ان کی توبہ کی ظاہری کسوٹی ان کا طرزعمل ہو گا۔ مومنین او رسول تو ظاہری عمل ہی کو دیکھ سکتے ہیں۔رہی آخرت تو اس میں فیصلہ وہ ذات کرے گی جو ظاہری حالت کے سوا اندرونی حالات سے بھی باخبر ہے۔وہ ظاہری حرکات اعضاء کو بھی جانتی ہے اور دلوں میں جو کچھ ہے اس کو بھی۔

حرف ندامت اور رجوع اور توبہ ہی آخری بات نہیں ہے ۔اس کے بعد طرزعمل میں مثبت تبدیلی کی بھی ضرورت ہے۔ انسان کا طرزعمل ہی اس کے اندرون کی غمازی کرتا ہے ۔تصدیق اور تکذیب طرزعمل سے ہوتی ہے کہ انسان کا اندرونی شعور اور میلان کیا ہے ۔اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کے شعور اور عقیدے میں عمل کی وجہ سے مزید پختگی آتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک عملی نظام زندگی ہے ۔اس میں صرف شعور اور نیت اور خیال پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ شعور اور نظریات کو عملی شکل دی جاتی ہے ۔اچھا میلان اور اچھا شعور اور جذبہ بھی اپنی جگہ اہم چیز ہے ۔ لیکن صرف شعور اور جذبات اور نیات پر اسلام میں مدار حکم و فیصلہ نہیں ہے ۔نہ اس پر جزاء و سزا ہوتی ہے ۔جب تک کہ یہ شعور اور نیت عملی شکل اختیار نہ کرے اور یہی مفہوم ہے

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ کا کہ صرف نیت ہی درکار نہیں نہ مفید جب اس کے ساتھ عمل نہ ہو (جبکہ عمل کی پشت پر نیت بھی ضروری ہے)۔

یہاں سے آگے اب دوسرے فریق کی بات چلتی ہے ۔اس فریق نے اپنے بارے میں خود کوئی فیصلہ نہیں کیا بلکہ اس معاملے کو اللہ پر چھوڑ دیا۔

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

(۹:۱۰۶) ”کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کا معاملہ ابھی خدا کے حکم پر ٹھہرا ہوا ہے ' چاہے انہیں سزا دے اور چاہے ان پر ازسرنو مہربان ہو جائے ۔اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے“۔

یہ غزوۂ تبوک سے پیچھے رہنے والوں کی آخری قسم ہے ۔یہ لوگ منافقین 'عذرات پیش کرنے والوں اور غلطی کے بعد تائب ہونے والوں سے مختلف لوگ ہیں۔یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اس آیت کے نزول تک اپنے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کیا تھا۔ اسلامی سوسائٹی نے بھی ان لوگوں کے بارے میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہ کیا تھا۔ ان کا فیصلہ اللہ کے سپرد تھا۔ نہ ان کو اپنے انجام کا پتہ تھا اور نہ لوگوں کو ان کے انجام کا پتہ تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ یہ آیت ان تین افراد کے بارے میں نازل ہوئی جن کی معافی ملتوی کر دی گئی ۔یہ حضرات مرارہ ابن الربیع 'کعب ابن مالک اور ھلال ابن امیہ تھے۔ یہ لوگ محض سستی' آرام طلبی اور عیش کوشی کی وجہ سے رہ گئے تھے ۔کیونکہ زمانہ سخت گرمی کا تھا۔ ان لوگوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک مخصوص تعلق بھی تھا جس کی تفصیلات اگلے سبق میں آرہی ہیں۔

ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ جب آیت :

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (۹: ۱۰۳) نازل ہوئی تو حضورؐ نے ان لوگوں کے اموال کا ایک حصہ وصول کر لیا۔ یعنی ابولبابہ اور اس کے دو ساتھیوں کے اموال سے۔ تو حضورؐ نے یہ اموال ان کی جانب سے صدقہ کر دیئے اور وہ تین افراد رہ گئے جنہوں نے ابولبابہ سے مخالف رویہ اختیار کیا اور اپنے آپ کو ستونوں سے نہ باندھا اور انہوں نے مزید کوئی عذر بھی پیش نہ کیا۔ ان کی معافی کا حکم بھی نہ آیا۔ ان لوگوں کی حالت یہ ہوگئی کہ اپنی وسعت کے باوجود زمین ان پر تنگ ہوگئی اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

(۹: ۱۰۶) یہ آیت نازل ہوتے ہی لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ بس یہ تو ہلاک ہوئے کیونکہ ان کی معافی نہ آئی۔ بعض نے کہا کہ شاید اللہ ان کو بھی معاف کر دے۔ چنانچہ یہ لوگ امیدوار ہو گئے اللہ کی معافی کے۔ چنانچہ اس کے بعد یہ آیات نازل ہوئیں۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ

(۹: ۱۱۷) یعنی وہ لوگ جو حضورؐ کے ساتھ شام کی طرف نکل گئے تھے۔

مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

(۹: ۱۱۷) اور اس کے بعد یہ کہا

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا (۹: ۱۱۸) یعنی وہ لوگ جو اپنے بارے میں کسی حکم کے نزول کے امیدوار تھے۔ مگر عام معافی کا اعلان ہوا تو یہ بھی معاف ہو گئے اور آیت

حَتّٰى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ (۹: ۱۱۸) سے لے کر اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۹: ۱۱۸) تک۔ ایسی ہی روایت عکرمہ، مجاہد، ضحاک اور قتادہ سے منقول ہے۔ نیز ابن اسحاق نے بھی ایسی ہی روایت کی ہے۔ یہی روایت راجح ہے۔

اور اللہ نے چونکہ ان کے معاملے کو ملتوی کر دیا تھا اس لیے ہم بھی اس کی تفسیر کو اگلے سبق میں ان لوگوں کے معاملے تک ملتوی کرتے ہیں۔

○○○

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ

الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ لَيَحْلِفُنَّ
اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ
لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ
رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ اَفَمَنْ اَسَّسَ
بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى
شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ
۱۳ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ ع
۱۱ع
۲

"کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لیے کہ (دعوت حق کو) نقصان پہنچائیں' اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں' اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں' اور (اس بظاہر عبادت گاہ کو) اس شخص کے لیے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف بر سرپیکار ہو چکا ہے۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔ جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو' اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔ پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جا گری؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے' ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی (جس کے نکلنے کی اب کوئی صورت نہیں) بجز اس کے کہ ان کے دل ہی پارہ پارہ ہو جائیں۔ اللہ نہایت باخبر اور حکیم و دانا ہے"۔

غزوۂ تبوک کے دور میں مسجد ضرار کا قصہ مشہور و معروف قصہ ہے۔ منافقین میں بعض منافقین نے مسجد ضرار کی سازش تیار کی تھی۔ اس دور میں اسلامی سوسائٹی میں پائے جانے والے مختلف عناصر کے تذکر کے بعد ان کی کہانی کو دوسروں سے علیحدہ کر کے بیان کیا گیا۔ علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ مدینہ میں حضور اکرمؐ سے قبل ایک

شخص تھا جس کا نام ابو عامر راہب تھا۔ زمانہ جاہلیت ہی میں اس نے عیسائیت قبول کر لی تھی' یہ اہل کتاب کے علوم و فنون سے واقف تھا۔ دور جاہلیت میں یہ بڑا عبادت گزار تھا۔ یہ قبیلہ خزرج سے تھا اور اپنے قبیلے میں بڑی عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ جب حضورؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور آپ کے اردگرد مسلمانوں کا اجتماع ہو گیا اور اسلام کی بات چل نکلی اور پھر بدر کے دن اللہ نے اسلام کو غالب کر دیا تو ابو عامر ملعون جل بھن گیا اور اس نے اسلام سے اپنی دشمنی اور بغض کا اظہار کرنا شروع کر دیا اور مدینہ سے بھاگ کر اس نے کفار قریش کے ہاں پناہ لی اور یہ قریش کو رسول اللہ کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کرنے لگا۔ چنانچہ انھوں نے عربوں کے دوسرے قبائل کی مدد سے احد کے دن مدینہ پر چڑھائی کر دی۔ احد میں جو حالات پیش آئے وہ تاریخ کا حصہ ہیں' اللہ نے مومنین کو آزمایا اور انجام بہرحال اہل تقویٰ کے ہاتھ میں رہا۔ اس شخص نے دونوں لشکروں کے درمیان خفیہ خندقیں کھدوا رکھی تھیں جن میں سے ایک میں حضورؐ بھی گر پڑے تھے۔ اس دن رسول اللہ کو بھی زخم آئے۔ آپؐ کا چہرہ مبارک زخمی ہوا۔ اور چار بڑے دانتوں میں نچلا دایاں دانت بھی ٹوٹ گیا۔ آپ کے سر پر بھی زخم آئے۔ ابوعامر جنگ شروع ہونے سے پہلے اپنی قوم خزرج سے مخاطب ہوا اور اس نے ان کو دعوت دی کہ وہ اس کے ساتھ آملیں۔ جب انھوں نے اس کو پہچان لیا تو انھوں نے انکار کر دیا اور کہا اے فاسق اللہ تیرا بھلا نہ کرے۔ تم اللہ کے دشمن ہو۔ انھوں نے اسے خوب برا بھلا کہا بلکہ اسے گالیاں دیں۔ یہ شخص یہ کہتے ہوئے لوٹا کہ افسوس ہے کہ میرے بعد میری قوم بری طرح بدل گئی ہے۔

اس شخص کو رسول اللہؐ نے اسلام کی طرف آنے کی خصوصی دعوت دی تھی اور اس کو قرآن پڑھ کر سنایا تھا لیکن اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا اور سرکشی اختیار کی اور مدینہ کی طرف بھاگ گیا۔ چنانچہ حضورؐ نے اسے بددعا دی کہ یہ شخص اپنے علاقے سے دور ابطور پناہ گزیں غربت کی موت مرے۔ چنانچہ اس کو یہ بددعا لگ گئی' وہ اس طرح کہ جب لوگ احد کے صدمے سے فارغ ہوئے اور دنیا نے دیکھا کہ اسلام کی دعوت روبعروج ہے اور غالب ہو رہی ہے تو یہ شخص ہرقل بادشاہ روم کے پاس پہنچ گیا اور اس سے مدد طلب کی۔ اس نے اس کے ساتھ امداد کا وعدہ کیا' اس پر بہت احسان کیا اور اسے اپنے پاس ٹھہرایا۔ اس نے اپنی قوم کے منافقین کے ساتھ خط و کتابت شروع کر دی۔ یہ خط و کتابت انصار میں سے اہل نفاق اور ڈھل مل یقین لوگوں کے ساتھ کی۔ اس نے ان کو یقین دلایا کہ وہ جلد ہی ایک عظیم لشکر لے کر رسول اللہ کے خلاف اٹھے گا اور یقیناً وہ اس جنگ میں غالب رہے گا اور حضرت محمدؐ کے موجودہ حالات بدل دے گا۔ اس شخص نے ان لوگوں کو یہ مشورہ دیا کہ یہ لوگ اپنے لیے ایک مرکز بنالیں تاکہ میرے نمائندے ان کے پاس اس مرکز میں رابطہ رکھیں اور پیغام لائیں اور لے جائیں اور یہ مرکز ان کے لیے کمین گاہ ہو خصوصاً جب وہ خود ان کے پاس آئے۔ چنانچہ ان لوگوں نے مسجد قبا کے پاس ہی ایک مسجد کی بنیاد رکھی۔ جب حضورؐ تبوک کے لیے نکلنے لگے تو ان لوگوں نے یہ مسجد تیار کر لی تھی۔ ان لوگوں نے اس موقع پر حضورؐ سے درخواست کی کہ آپ تشریف لائیں اور اس مسجد میں نماز کا افتتاح فرمائیں۔ اس طرح ان کا مطلب یہ تھا کہ وہ حضورؐ کی امامت سے اس مسجد کو متبرک کر کے اس کو مسلم الثبوت کر دیں۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ ہم نے اپنے لوگوں میں سے مریض اور ضعیف لوگوں کے لیے یہ مسجد بنائی ہے خصوصاً سردیوں کی مشکل راتوں میں ایسے لوگوں کے لیے مسجد نبوی میں جانا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اللہ نے آپ کو اس مسجد میں نماز پڑھنے سے بچالیا۔ حضورؐ نے فرمایا "میں اب سفر پر جا رہا ہوں لیکن جب واپس ہوں گا تو ان شاء اللہ نماز

پڑھوں گا"۔ جب حضور تبوک سے مدینہ واپس ہوئے اور سفر اس قدر رہ گیا کہ قافلہ دو روز میں مدینہ پہنچنے ہی والا تھا کہ حضرت جبرئیل نے حضورؐ کو اس مسجد کے بارے میں اطلاع دے دی اور بتا دیا کہ اس مسجد کی اساس کس جذبے پر رکھی گئی' یہ تو کفر تفریق بین المسلمین اور اس مسجد کے خلاف بطور ایک سازش رکھی گئی جس کی بنیاد اول روز سے تقویٰ کی اساس پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے لوگوں کو بھیجا کہ میرے مدینہ پہنچنے سے قبل ہی اس مسجد کو منہدم کر دیا جائے۔ اسی قسم کی روایت ابن عباس' سعید ابن جبیر' مجاہد اور عروہ ابن زبیر سے منقول ہے۔

یہ تھا قصہ مسجد ضرار کا جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپؐ اس میں ہرگز کھڑے نہ ہوں اور آپؐ اب کے بھی مسجد قبا میں قیام فرمائیں جو اول روز سے تقویٰ و طہارت کے جذبات پر مبنی ہے۔ اور اس کے اندر ایسے لوگ نماز پڑھتے ہیں جو طہارت کو بہت ہی پسند کرتے ہیں۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ (۹:۱۰۸) "اور اللہ پاک لوگوں کو بہت ہی پسند کرتا ہے"۔ یہ مسجد ضرار جو حضورؐ کے دور میں تعمیر ہوئی تھی اسلام اور مسلمین کے خلاف ایک گہری سازش تھی' اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچایا جائے۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ کفر کو تقویت دی جائے اور اسلامی تحریک کے خلاف سازش کرنے والوں کے لیے ایک کمین گاہ مہیا کی جائے تاکہ وہ اندھیروں میں اسلام کے خلاف منصوبہ بندی کر سکیں اور اس طرح وہ دین کے پردے میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازش کر سکیں۔

آج بھی دشمنان دین مختلف شکل و صورت میں مساجد ضرار بناتے رہتے ہیں اور دور جدید میں جدید وسائل کے مطابق اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص خالصتاً اسلام کے لیے کام کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً وہ اسلام کی بیخ کنی کے لیے کام کرتا ہوتا ہے۔ اگر وہ اسلام کی بیخ کنی نہیں کر سکتا تو اس کی شکل بدلنے' اس کی چولیں ڈھیلی کرنے اور اسے پھلدار بنانے کا کام کرتا ہے۔ یہ مساجد ضرار ایسی ہوتی ہیں جن کے اوپر خدمت دین کا بورڈ لگایا جاتا ہے اور خدمت دین کے بورڈ کے نیچے سے دین پر تیر پھینکے جاتے ہیں۔ یہ مساجد ضرار انجمنوں' جماعتوں' کتابوں' تحقیقاتی اداروں اور ایسے کلبوں کی صورت میں ہیں جہاں لوگوں کے دلوں میں شک پیدا کیا جاتا ہے۔ ایسے لوگ شکی اور کمزور ایمان لوگوں کو شکار کرتے ہیں جو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ اسلام ذبح ہوتا ہے لیکن ان کے ماتھے پر بل بھی نہیں آتا۔ ایسے لوگ کمزور ایمان والے لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ اسلام تو بالکل خیریت سے ہے اور یہ کہ ان کو کوئی خوف نہیں کھانا چاہئے۔ غرض دشمنان اسلام نے مختلف شکل و صورت میں مساجد و ضرار بنا رکھی ہیں۔

ان مساجد ضرار کی پردہ دری کرنا مسلمانوں کے لیے بہت ہی ضروری ہے اور ہم پر یہ فرض ہے کہ ہم دشمنان اسلام کی ان کمین گاہوں کے اوپر سے خدمت اسلام کے بورڈ اتار دیں کیونکہ یہ بورڈ غلط فہمی پیدا کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے دور کا یہ فریضہ ہے کہ ہم ایسی مساجد ضرار کی اصل حقیقت لوگوں پر عیاں کر دیں۔ اور ہمارے لیے رسول اللہ کے دور میں مسجد ضرار کے ساتھ ہونے والے سلوک اور اس پر قرآن کریم کے عظیم تبصرے کی صورت مین ایک گائیڈ لائن موجود ہے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ

حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۰۷) لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ، فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ (۱۰۸) اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۱۰۹) لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِىْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۱۰) (۹:۱۰۷ تا ۱۱۰)

"کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لیے کہ (دعوت حق کو) نقصان پہنچائیں' اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں' اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں' اور (اس بظاہر عبادت گاہ کو) اس شخص کے لیے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول ؐ کے خلاف برسر پیکار ہو چکا ہے۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔ جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی تھی وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو' اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔ پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جا گری؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے' ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی (جس کے نکلنے کی اب کوئی صورت نہیں) بجز اس کے کہ ان کے دل ہی پارہ پارہ ہو جائیں۔ اللہ نہایت باخبر اور حکیم و دانا ہے"۔

اب میں' ان آیات کے انداز بیان کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتا ہوں۔ یہاں ایسی تصویر کشی کی گئی ہے کہ منظر کے اندر ہر طرف تک دو ہے۔ یہ تک دو بتاتی ہے کہ مساجد تقویٰ کے مقابلے میں جو مساجد ضرار بنائی جاتی ہیں ان کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔ ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا ہے جو دور نبوی کی مسجد ضرار کے ساتھ کیا گیا۔ اس طرح اسلام کے خلاف ہر بری سازش کا مقابلہ اہل تقویٰ کرتے ہیں اور پاکباز کارکن ہر سازش کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اگرچہ سازش کرنے والے نہایت ہی پاکباز لوگوں کے جامہ میں آئیں کیونکہ مخلص لوگ دانشمند بھی ہوتے ہیں اور

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى

جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۹ : ۱۰۹) ”پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جا گری؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا“۔ ہم ان آیات میں دو مناظر کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ایک میں اخلاقی عمارت تقویٰ کی مضبوط اساس پر قائم اور وہ اپنی پختہ بنیادوں پر کھڑی ہے اور دوسرا منظر ہمارے سامنے ایک ایسی اخلاقی عمارت کا ہے جو وادی کی کھوکھلی کگر پر تعمیر کی گئی ہے۔ یہ دریائے جہنم کے ایسے کٹاؤ شدہ کنارے پر قائم ہے جو گرنے ہی والا ہے۔ مٹی کے اس تودے میں دراڑیں پڑ چکی ہیں اور اس کی حالت یہ ہے کہ آج گرا یا کل۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ گرنے کے لیے متحرک ہے، متزلزل ہے اور پھسلنے ہی والا ہے۔ یہ گرا، وہ گرا ایک خوفناک فضا ہے اور لوگ ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں اور ضروری سامان گویا اس زمین بوس ہونے والی عمارت سے نکال رہے ہیں۔ آخر یہ عمارت دریائے جہنم میں گر جاتی ہے، اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا، ظالموں سے مراد کافر اور مشرک ہیں کیونکہ انہوں نے ایسی ناپختہ یعنی کفر و شرک کی ناپختہ بنیادوں پر اپنی اخلاقی عمارت کو استوار کیا۔ درحقیقت اپنے طور پر تو انہوں نے اس عمارت کو بہت ہی پختہ بنایا تھا مگر وہ بودی اساس پر تھی۔

○○○

یہ ایک عجیب منظر ہے۔ ڈر اور افراتفری کے اس خوفناک منظر کو چند کلمات کے اندر قرآن نے ادا کر دیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ داعیان حق کو معلوم ہو جائے کہ ان کی اخلاقی عمارت مضبوط بنیادوں پر ہے۔ کفر اور نفاق اور سازشیوں کی مساجد ضرار کی عمارت کے نیچے نہایت ہی بودی بنیادیں ہیں اور جب اسلام کی اخلاقی بنیادوں کا مقابلہ کفر کی اخلاقیات سے ہو گا تو وہ مقابلے میں نہ ٹھہر سکیں گی۔

ایک دوسرا منظر جس میں مسجد ضرار کے شرپسند معمار دکھائے جاتے ہیں۔ اس میں ان کی حالت ان کی نفسیات کی یوں غمازی کرتی ہے۔

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹ : ۱۱۰) ”یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے، ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی (جس کے نکلنے کی اب کوئی صورت نہیں) بجز اس کے کہ ان کے دل ہی پارہ پارہ ہو جائیں۔ اللہ نہایت باخبر اور حکیم و دانا ہے“۔

وہ کگر تو گر گیا، کیونکہ وہ تو شاخ نازک تھی جس پر تہذیب کی عمارت اٹھائی گئی تھی اور نیچے وادی جہنم تھی اور یہ عمارت ضرار اپنے منافق معماروں کے ساتھ وادی جہنم میں جا گری جو نہایت ہی بری جائے قرار ہے۔ لیکن ان بانیوں کے دلوں میں اس عمارت کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ ان کے دلوں میں شک، قلق اور حیرانی و پریشانی بدستور موجود ہے۔ اور یہ بے یقینی قائم و دائم رہے گی، اس لیے ایسی اخلاقی عمارت کے معماروں کے دل کبھی مطمئن، پرسکون اور پروقار نہ ہوں گے، الا یہ کہ یہ دل ریزہ ریزہ ہو جائیں، اور کسی زندہ انسان کے دل ہی میں نہ رہیں۔

غرض گرتی ہوئی دیواروں کے معمار ہمیشہ حیران و پریشان رہتے ہیں۔ اہل کفر و نفاق کی نفسیاتی اور روحانی کیفیت کی اس سے زیادہ خوبصورت انداز میں حسی اور مادی تصویر کشی نہیں کی جا سکتی' اس تصویر کشی میں قرآن نے کس قدر خوبصورت رنگ بھرے ہیں' یہ تو قرآن کا معجز انداز بیان ہے جو صدیوں سے منفرد ہے۔ یہ تصویر صدیاں گزرنے کے بعد بھی پرانی نہیں ہوتی۔ نہ اس کے رنگ مدھم پڑتے ہیں کیونکہ منافق' سازشی اور مکار منکر حق کے یہی رنگ ڈھنگ ہوتے ہیں۔ اس کا وجدان حیران' اس کا دل غیر مطمئن اور اس کا جسم متزلزل ہوتا ہے۔ وہ دائمی قلق اور بے یقینی کا شکار ہوتا ہے۔ جب روح بے قرار ہو تو جسم کو کیسے قرار ملے۔

یہ قرآنی قلم کا اعجاز جس میں الفاظ کے ذریعہ فنی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ تصویر کے رنگ نہایت ہی مناسب لیکن سہل ممتنع رنگ' سادہ الفاظ اور مفہوم دونوں ہی سہل۔

لیکن ان ادبی الفاظ کے اندر قرآن کریم کی حکیمانہ تعلیمات کی قدر و قیمت اور زیادہ ہوتی ہے کہ جب قرآن اس وقت کے اسلامی معاشرے کی اس طرح Classification کرتا ہے' اور یوں ابد الآباد تک اسلامی تحریکات کے لیے نشاندہی کرتا ہے کہ ان کے لیے راہ حقیقت کیا ہے اور اس میں کارکنوں کو کس قدر چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ قرآن کریم دراصل اسلامی معاشرے کے قیام کی تحریک کے لیے ایک گائیڈ بک تھا۔ وہ تحریک کی ذہنی پرورش کر رہا تھا۔ تحریک کے سامنے جو عظیم انقلابی نصب العین تھا اس کے لیے اسے تیار کر رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک اس قرآن کو تحریکی انداز میں نہ پڑھا جائے گا' اس وقت تک اسے صحیح معنوں میں نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور صرف وہی لوگ اس قرآن کو سمجھ سکتے ہیں جو اسلامی انقلاب کے لیے برپا کی جانے والی تحریک کے کارکن ہوں۔ جب لوگ دعوت اسلامی کو تحریکی انداز میں لے کر اٹھیں گے تو پھر قرآن صحیح معنوں میں ان کی سمجھ میں آ جائے گا۔

ooo

# درس نمبر ۹۴ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا آخری حصہ یا آخری سبق ہے۔ اس میں اسلامی سوسائٹی اور غیر اسلامی سوسائٹیوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کا تعین کیا گیا ہے۔ آغاز میں ایک مسلمان کے تعلق باللہ کی نوعیت کی نشاندہی ہے۔ پھر یہ جتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان جب اسلام کا اعلان کرتا ہے تو اس کے کیا تقاضے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ وہ کیا دینی فرائض ہیں جو کسی شخص پر اعلان اسلام کے ساتھ ہی عائد ہو جاتے ہیں یعنی انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے۔

یعنی اسلام میں داخل ہونے کے لیے جو معاہدہ ہوتا ہے اس میں ایک فریق یعنی مسلم بائع ہوتا ہے۔ اور دوسرا فریق یعنی اللہ مشتری ہوتا ہے۔ سودا کچھ اس طرح کا ہے کہ ایک مومن اپنی کل جائیداد یعنی اپنی ذات' اپنا مال اور سب کچھ اللہ کے ہاں فروخت کر دیتا ہے۔ ایک مومن اپنا مال اور جان جہاد فی سبیل اللہ کے لیے حاضر کر دیتا ہے تاکہ اللہ کا دین غالب ہو اور اللہ کا حکم بلند ہو۔ اس سودے میں ایک معلوم قیمت کے عوض مومن اپنی جان و مال فروخت کر دیتا ہے۔ ثمن بیع جنت ہے۔ انسان کی جان اور اس کا مال جنت کے مقابلے میں قیمت کے لحاظ سے کچھ نہیں ہے لیکن یہ اللہ کی ذرہ نوازی ہے کہ وہ یہ سودا کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ

(۹ : ۱۱۱) ”حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور مارتے مرتے ہیں۔ ان سے جنت کا وعدہ اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے تورات' انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے“۔

جن لوگوں نے یہ سودا کیا وہ تھے کون لوگ؟ وہ تو ممتاز اور برگزیدہ لوگ تھے اور ان کی صفات نہایت ممتاز تھیں۔ ان کی صفات کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ وہ شعور اور عمل میں اللہ کے معاملے میں بہت ہی سچے تھے۔ اپنی انفرادیت میں بھی وہ ممتاز تھے اور ان کے اوپر اسلامی نظام کے قیام کے لیے جو ذمہ داریاں عائد کی گئیں ، ان میں بھی وہ لاثانی تھے۔ وہ ہر وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے رہتے تھے۔ وہ خود بھی حدود اللہ کی رعایت کرنے والے تھے

اور دوسروں سے بھی حدود اللہ کی پابندی کراتے تھے۔

التَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۹ : ۱۱۲) "اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے' اس کی بندگی بجالانے والے' اس کی تعریف کے گن گانے والے' اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے' اس کے آگے رکوع و سجدے کرنے والے' نیکی کا حکم دینے والے' بدی سے روکنے والے اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے' اور اے نبی ان مومنوں کو خوش خبری دے دو"۔

اب اگلی آیات میں یہ بزنس کرنے والے ایک فریق پر ایک خاص شرط عائد کی جاتی ہے کہ جن لوگوں نے یہ سودا کر لیا ہے' وہ تمام دوسرے لوگوں سے جنہوں نے یہ سودا نہیں کیا وہ قطع تعلق کر لیں گے۔ اگرچہ سودا نہ کرتے والے سودا کرنے والوں کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ دونوں کی زندگی کے اہداف اور رخ مختلف ہیں۔ دونوں کا انجام مختلف ہے۔ کیونکہ جنہوں نے سودا کیا وہ اصحاب جنت ہیں اور جنہوں نے یہ سودا نہ کیا وہ اصحاب جہنم ہیں۔ ظاہر ہے کہ جنتیوں اور جہنمیوں کے درمیان نہ آخرت میں ملاپ ہو گا نہ دنیا میں ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ رابطے نسب اور خون کے رابطے نہیں اور نہ اہل جنت اور اہل جہنم کے درمیان کسی قسم کے رابطے ہو سکتے ہیں۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۱۱۳) وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (۱۱۴) (۹ : ۱۱۳ — ۱۱۴) "نبی اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں' زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔ چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں' جبکہ ان پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔ ابراہیم نے اپنے باپ کے لیے جو دعائے مغفرت کی تھی وہ تو اس وعدے کی وجہ سے تھی جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا۔ مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا۔ حق یہ ہے کہ ابراہیم بڑا رقیق القلب' خدا ترس اور بردبار آدمی تھا"۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک مومن کی وفاداری اس اللہ کے لیے خالص ہو جائے جس پر ایک مومن نے اپنا سب کچھ فروخت کر دیا ہے اور نئی سوسائٹی میں تمام رابطے اور تمام تعلقات صرف اس نئی سوچ کی اساس پر قائم ہوں۔ اللہ تعالیٰ یقین دہانی فرماتے ہیں کہ وہ مومنین کا ولی و نگہبان رہے گا۔ ان کو ہر گمراہی سے بچائے گا اور یہ کہ ان کے لیے اللہ کی نصرت اور نگہبانی کافی ہے' اس نصرت کی وجہ سے وہ پوری دنیا سے مستغنی ہو گئے ہیں' اللہ مالک الملک ہے اور اس

کے سوا کوئی حقیقی معنوں میں قادر نہیں ہے۔

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۱۱۵) اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ (۱۱۶) (۹: ۱۱۵ — ۱۱۶) "اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ لوگوں کو ہدایت دینے کے بعد پھر گمراہی میں مبتلا کرے جب تک کہ انہیں صاف صاف بتا نہ دے کہ انہیں کن چیزوں سے بچنا چاہئے۔ در حقیقت اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اللہ ہی کے قبضہ میں آسمان و زمین کی سلطنت ہے اور اسی کے اختیار میں زندگی اور موت ہے اور تمہارا کوئی حامی و مددگار ہی نہیں ہے جو تمہیں اس سے بچا سکے"۔

مومن اور اللہ کے درمیان جو سودا طے پایا ہے اس کی نوعیت یہ تھی جس کا اوپر ذکر ہوا تو ایسے معاہدے کی موجودگی میں گویا جہاد سے پیچھے ہٹنا ایک عظیم بات تھی۔ اس جہاد کے بارے میں تردد اور تخلف کے بعد جن لوگوں کی نیت اچھی تھی اور وہ صدق دل سے نادم تھے ان کو اللہ نے محض اپنی رحمت اور مہربانی سے معاف کر دیا۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۱۷) وَّ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَ ظَنُّوْا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّا اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۱۱۸) (۹: ۱۱۷ — ۱۱۸) "اللہ نے معاف کر دیا نبی کو اور ان مہاجرین و انصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے مگر اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔ بے شک اس کا معاملہ اس کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے۔ اور ان تینوں کو بھی اس نے معاف کر دیا تھا جن کے معاملے کو ملتوی کر دیا گیا تھا' جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامن رحمت کے سوا نہیں ہے تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں' یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے"۔

مدینہ کے باشندوں اور مدینہ کے اردگرد دیہاتی لوگوں کو نئے انقلابی دور کے لیے متعین ہدایات دی جاتی ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ ان پر بہت زیادہ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار بھی ہیں اور قریب کے رہنے والے بھی ہیں اور یہ اسلامی انقلاب کے لیے مرکز ہیں اور انقلاب کی وسعت کے لیے مرکز عمل ہیں۔ اگر

یہ لوگ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں غفلت کریں گے تو اس کے نتائج بہت ہی برے ہوں گے اور اگر یہ اپنی ڈیوٹی پوری طرح ادا کریں گے تو اس کا اجر بھی ان کو پورا پورا ملے گا۔

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۲۰) وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

(۱۲۱) (۹: ۱۲۰ — ۱۲۱)) "مدینہ کے باشندوں اور گرد و نواح کے بدویوں کے لیے یہ ہرگز زیبا نہ تھا کہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر بیٹھ رہتے اور اس کی طرف سے بے پروا ہو کر اپنے نفس کی فکر میں لگ جاتے۔ اس لیے کہ ایسا کبھی نہ ہو گا کہ اللہ کی راہ میں بھوک پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ جھیلیں اور منکرین حق کو جو راہ ناگوار ہے اس پر کوئی قدم وہ اٹھائیں اور کسی دشمن سے کوئی انتقام وہ لیں اور ان کے بدلے ان کے حق میں ایک عمل صالح نہ لکھا جائے۔ یقیناً اللہ کے ہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی کبھی نہ ہو گا کہ راہ خدا میں تھوڑا یا بہت کوئی خرچ وہ اٹھائیں اور کوئی وادی وہ پار کریں اور ان کے حق میں اسے لکھ نہ لیا جائے تاکہ اللہ ان کے اس اچھے کارنامے کا صلہ انہیں عطا کرے"۔

جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کے ان احکام اور فضیلت کے ساتھ ساتھ یہ بھی متعین کر دیا جاتا ہے کہ جہاد کے لیے تمام لوگوں کا گھروں سے نکل کھڑے ہونا ضروری نہیں ہے۔ بعض لوگ لازماً دوسرے مقاصد اور اہداف میں بھی مصروف ہوں گے مثلاً صنعت و حرفت کیونکہ اسلامی مملکت کی حدود وسیع ہو گئی ہیں اور لوگوں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے۔ کچھ لوگوں کو دوسری مشغولیات میں رہ کر اجتماعی مقاصد کے لیے کام کرنا ہو گا اور اپنے آخری ہدف کے اعتبار سے تمام مشغولیات کے مقاصد باہم آکر ملیں گے (مثلاً بعض لوگ علمی کاموں میں مشغول رہیں گے)

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (۹: ۱۲۲) "اور کچھ ضروری نہ تھا کہ اہل ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ پرہیز کریں"۔

اگلی آیات میں تحریک جہاد کی ضابطہ بندی کی گئی ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ جزیرۃ العرب کو تحریک اسلامی کا

مرکز اور مخصوص و محفوظ علاقہ قرار دے دیا گیا تھا اور اب اس مرکز سے اسلامی انقلاب کو پھیلایا جانا مطلوب تھا۔ اور پالیسی یہ قرار پائی تھی کہ تمام مشرکین سے جنگ کی جائے یہاں تک کہ دنیا میں کوئی فتنہ نہ رہے اور دین صرف اللہ کا غالب ہو جائے۔ نیز پالیسی یہ قرار پائی کہ تمام اہل کتاب کے ساتھ اس وقت تک جنگ کی جائے گی جب تک کہ وہ زیر دست ہو کر جزیہ ادا نہیں کرتے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۹ : ۱۲۳) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تم سے قریب ہیں۔ اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے"۔

اسلامی بیعت، اس کے تقاضوں اور اس کے فرائض اور اس کی پالیسی کے طے کر لینے کے بعد اب آخر میں قرآن کریم کے حوالے سے دو تصورات کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ ایک سوچ منافقین کی ہے اور دوسری سوچ اہل ایمان کی ہے۔ قرآن کریم ایمانی اور تصوراتی ہدایات اور عملی ہدایات دے رہا ہے۔ اس میں عقائد و نظریات بھی ہیں اور فرائض و اعمال بھی ہیں لیکن یہ نظریاتی اور عملی ہدایات منافقین کو کوئی فائدہ نہیں دے رہی ہیں۔ یہ نصیحت اور آزمائش ان کی آنکھیں کھولنے میں کامیاب نہیں ہیں۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۱۲۴) وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ (۱۲۵) اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (۱۲۶) وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۱۲۷) (۹ : ۱۲۴ تا ۱۲۷) "اور جب کوئی نئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ کہو تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ ہوا؟" جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں فی الواقعہ اضافہ ہی کیا ہے۔ اور وہ اس سے دلشاد ہیں البتہ جن لوگوں کے دلوں کو روگ لگا ہوا تھا ان کی سابق نجاست پر ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیا اور وہ مرتے دم تک کفر ہی میں مبتلا رہے۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک دو مرتبہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں؟ مگر اس پر بھی نہ توبہ کرتے ہیں نہ کوئی سبق لیتے ہیں۔ جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو یہ لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا، پھر چپکے سے نکل بھاگتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دل پھیر دیئے ہیں کیونکہ یہ نادان لوگ ہیں"۔

اب یہ سبق بھی ختم ہوتا ہے اور سورت بھی ختم ہوتی ہے۔دو آیات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کے بارے میں آتی ہیں اور آپؐ کی شخصیت کا تعارف کراتی ہیں کہ آپؐ مؤمنین کے بارے میں بے حد فکر مند ہیں اور اہل ایمان کے لیے نہایت ہی مہربان اور رحیم و شفیق ہیں۔اور دوسری آیت میں آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ پر بھروسہ رکھیں اور جو لوگ دعوت سے منہ موڑتے ہیں ان کو نظر انداز کر دیں۔ان لوگوں کے نصیب میں ہدایت نہیں ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۲۸) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۱۲۹) (۹:۱۲۸ — ۱۲۹) ”دیکھو تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے' تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے' تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے۔ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق و رحیم ہے۔اب اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرتے ہیں تو اے نبی ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ بس کرتا ہے' کوئی معبود نہیں مگر وہ' اس پر میں نے بھروسہ کیا اور وہ مالک ہے عرش عظیم کا“۔

اس سبق پر ایک اجمالی نظر ڈالنے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں جہاد فی سبیل اللہ پر بہت زور دیا گیا ہے اور یہ کہا گیا کہ اسلامی سوسائٹی کو نظریاتی بنیادوں پر تمام دوسری سوسائٹیوں سے مکمل علیحدگی اختیار کر لینا چاہئے۔اور پورے کرۂ ارض پر قرآن و سنت کی دعوت کو پھیلانا چاہئے۔اور یہ کام ان کے لیے اس بیعت کے نتیجے میں ان پر ایک لازمی فریضہ ہے تاکہ دنیا میں حدود اللہ کو قائم کیا جائے اور پھر ان کو قائم رکھا جائے۔تاکہ دنیا میں اللہ کی حاکمیت پر مبنی نظام قائم ہو اور اللہ کے نظام کے مقابلے میں جتنے جاہلی نظام کہیں بھی قائم ہیں ان کا پیچھا کیا جا سکے جن میں لوگوں کے حقوق بھی غصب ہوتے ہیں اور اللہ کی حاکمیت پر بھی دست درازی ہوتی ہے۔

اس اجمالی تبصرے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دور جدید کے بعض مفکرین کی سوچ کس قدر بودی ہے اور ان کی ذہنیت کس قدر شکست خوردہ ہے کہ وہ اللہ کی ان واضح ہدایات 'جہاد کی تشریح' زمانے کے مروجہ نظریات سے متاثر ہو کر کرتے ہیں۔یہ لوگ بالخصوص جہاد اسلامی کو ایک دفاعی جنگ کے محدود دائرے میں بند کرتے ہیں اور ان کے نظریات یہ ہیں کہ اسلام تو اسلامی حدود و مملکت کے دفاع کا نظریہ رکھتا ہے حالانکہ یہ آیات صراحت کے ساتھ حکم دیتی ہیں کہ اسلامی حدود کے پاس پاس بسنے والے کفار کے ساتھ بھی جہاد جاری رکھا جائے اور اس میں کوئی ایسی شرط نہیں لگائی گئی کہ ان کے ساتھ صرف اس صورت میں جہاد کیا جائے جب وہ حملہ آور ہوں۔اس لیے کہ جب انہوں نے اللہ کے حق حاکمیت کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کر لیا تو یہ جارحیت ہی ان کے خلاف آغاز جہاد کے لیے کافی وجہ جواز ہے۔کیونکہ ایک تو وہ اللہ کی حاکمیت سے بغاوت کرتے ہیں دوسرے یہ کہ انسانوں کو اللہ کا غلام اور بندہ بنانے کے بجائے اپنا غلام اور بندہ بناتے ہیں۔پس ان لوگوں کی یہی جارحیت ان کے خلاف جہاد کے لیے کافی وجہ جواز ہے بشرطیکہ مسلمان قوت رکھتے ہوں۔یہاں اس سبق کے مشمولات کی طرف یہی مختصر اشارہ ہی کافی ہے' تفصیلات کا انتظار کریں تشریح آیات کے وقت۔

○○○

# درس نمبر ٩٤ تشریح آیات

١١١ ـــ تا ـــ ١٢٩

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١١١﴾ التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١٢﴾

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں ۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں ۔ ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے 'تورات اور انجیل اور قرآن میں ۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے 'یہی سب سے بڑی کامیابی ہے ۔ اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے 'اس کی بندگی بجا لانے والے 'اس کی تعریف کے گن گانے والے ' اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے 'اس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے ' نیکی کا حکم دینے والے 'بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ' (اس شان کے ہوتے ہیں وہ مومن جو اللہ سے بیع کا یہ معاملہ طے کرتے ہیں) اور اے نبیؐ ان مومنوں کو خوشخبری دے دو"۔

میں اس سے قبل بارہا اس آیت کی تلاوت کرتا رہا ہوں 'جبکہ میں قرآن مجید حفظ کر رہا تھا ۔ اس کے بعد میں نے بھی اسے بارہا پڑھا اور بارہا اس کی تلاوت سنی ۔ پھر ایک چوتھائی صدی تک میں اس کی تدریس اور تلاوت بھی کرتا رہا ۔ لیکن یہی آیت جسے میں نے لاتعداد مرتبہ پڑھا تھا 'جب میں نے فی ظلال القرآن میں اس پر غور کیا تو مجھ پر وہ حقائق واشگاف ہوئے

جو اس سے قبل میرے پردۂ خیال پر کبھی نمودار نہ ہوئے تھے۔ پوری زندگی میں' میں ان حقائق کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہ سکا تھا۔

یہ نہایت ہی خوفناک آیت ہے! اس میں ایک سچے مومن اور اللہ کے ساتھ اس کے رابطے کی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام قبول کر کے ایک مسلمان اللہ کے ساتھ کیا معاہدہ کرتا ہے اور پوری زندگی میں پھر اس پر کیا فرائض عائد ہو جاتے ہیں۔

اگر گویم مسلمانم بلرزم کہ دانم مشکلات لا الٰہ را

جن لوگوں نے فی الواقعہ اس قسم کی بیعت کی اور پھر انہوں نے پوری زندگی میں اس بیعت کو پورا کیا تو وہی سچا مومن ہے جس پر مومن کے تمام اوصاف منطبق ہوتے ہیں اور اس کے دل میں حقیقت الحال بیٹھ جاتی ہے۔ اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر دعوائے ایمان محض دعویٰ ہوتا ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے شہادت درکار ہوتی ہے۔

اس بیعت کی حقیقت کیا ہے؟ یا اس سودے کی حقیقت کیا' اللہ نے ازروئے عنایت اسے سودا کہا ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمان کی جان و مال کا مالک ہی اللہ ہوتا ہے۔ لیکن اس سودے کے بعد تو مسلمانوں کی جان اور مال ان کا نہیں رہتا۔ لہٰذا ایک مومن اپنے مال اور جان میں سے کسی چیز کو بھی انفاق فی سبیل اللہ سے بچا کر نہیں رکھ سکتا' نہ اسے یہ اختیار رہتا ہے کہ وہ خرچ کرے یا نہ کرے۔ ہرگز نہیں' اس نے تو اپنی جان اور مال اللہ کے ہاں فروخت کر دیا ہے۔ اب یہ اللہ کی مرضی ہے کہ جان مومن اور مال مومن کو جس طرح چاہے خرچ کرے۔ اور اس کے لیے اللہ نے فرائض و حدود مقرر کر دیے ہیں۔ فروخت کنندہ کو اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں ہے ماسوائے اس کے کہ وہ اللہ مشتری کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑے اور بالکل ادھر ادھر نہ دیکھے۔ نہ حیران و پریشان ہو' نہ جھجک اور جدل کرے۔ بس اس کا کام اطاعت ہے' مکمل طور پر سرتسلیم خم کرنا ہے۔ کیونکہ اس سودے کا عوضانہ اس نے جنت کی صورت میں لکھوا لیا ہے۔ اب راستہ کیا ہے' راستہ جہاد و قتال کا ہے اور انجام منزل کیا ہے یا شہادت اور یا نصرت و فتح۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ (۹ : ۱۱۱) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں"۔

غرض جس نے اس پر بیعت کی' اس نے اس سودے کو پورا کیا۔ اور جو اس سودے کے زرثمن پر راضی ہو گیا تو وہی حقیقی مومن ہے۔ کیونکہ مومنین وہی لوگ ہیں جن سے اللہ نے ان کی جان و مال کو خرید لیا اور انہوں نے بیچ دیا۔ جہاں تک زربیع کا تعلق ہے تو یہ تو اللہ کی خاص مہربانی اور شفقت ہے کہ اس نے اس سودے میں قیمت بھی لگائی۔ ورنہ جان و مال تو اللہ ہی کے تھے' جان دی' دی ہوئی اسی کی تھی۔ یہ اس کا بڑا کرم ہے کہ اس نے انسان کو صاحب عزم و ارادہ بنایا' پھر اسے یہ اختیار دیا کہ وہ اللہ کے ساتھ معاہدہ کرے۔ یہ خالص ذرہ نوازی ہے۔ چنانچہ اللہ نے اس عہد اور معاہدے میں وفاداری کو مقام انسانیت قرار دیا اور جو لوگ اس عہد کو وفا نہ کریں ان کے بارے میں قرار دیا کہ وہ انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر ہیں۔

اس کا فرمان ہے :

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۸: ۵۵) "بے شک برے جانور اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور وہ ایمان نہیں لاتے' وہ لوگ جن سے تم نے عہد کیا تو انہوں نے ہر بار اس عہد کو توڑا اور وہ خدا سے نہیں ڈرتے" چنانچہ اللہ نے حساب و کتاب کا دارومدار بھی اس سودے میں وفا اور عدم وفا پر رکھا۔

بے شک یہ نہایت ہی خطرناک سودا ہے لیکن یہ سودا تو ہر مومن نے کر لیا ہے اور کوئی مومن جب تک کہ وہ مومن ہے اس سودے کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ یہ ہے وہ خوف جو اس وقت مجھ پر طاری ہے جبکہ میں یہ کلمات لکھ رہا ہوں۔ ذرا غور سے پڑھیں اور دوبارہ پڑھیں۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ (۹ : ۱۱۱) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں"۔

اے اللہ! مدد فرمانا' یہ تو بہت ہی بھاری ذمہ داری ہے۔ آج اطراف عالم میں جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں اور بڑے مزے سے بیٹھے ہوئے ہیں اور اس دنیا میں اللہ کی حاکمیت کے قیام کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کرتے اور ان طاغوتی قوتوں کے دفاع کے لیے جدوجہد نہیں کرتے۔ جنہوں نے اللہ کے حق حاکمیت پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اور اللہ کے بجائے لوگوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے' حالانکہ حق حاکمیت اللہ تعالیٰ کا مخصوص حق ہے۔ یہ لوگ جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں کرتے اور قتال فی سبیل اللہ بھی نہیں کرتے اور پھر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔

یہی الفاظ حضور اکرمؐ کے دور میں جب سنے جاتے تھے تو یہ عملی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ صحابہ کرام کے نزدیک یہ الفاظ محض تصورات نہ دیتے تھے جن کے بارے میں صرف یہ کہ سوچا جاتا اور یہ کلمات صحابہ کرام کو محض نظریات عطا کرتے تھے۔ بلکہ یہ حضرات سنتے ہی ان معانی کو عملی جامہ پہنا دیتے تھے۔ یہ الفاظ شعور کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی میں ایک تحریک پیدا کر دیتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن رواحہ نے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقعہ پر یہی کہا تھا۔ محمد ابن کعب قرظی کہتے ہیں کہ عبداللہ ابن رواحہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا آپ اپنے لیے اور اپنے رب کے لیے جو چاہیں شرط لگا دیں تو حضورؐ نے فرمایا کہ میں رب کے لیے شرط کرتا ہوں کہ تم اس کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرو اور اپنے لیے میں یہ شرط کرتا ہوں کہ تم میری مدافعت اسی طرح کرو گے جس طرح تم اپنی جان و مال کی مدافعت کرتے ہو تو اس پر عبداللہ ابن رواحہ نے کہا: اگر ہم نے ایسا کیا تو ہمارے لیے کیا اجر ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: الجنۃ۔ تو انہوں نے کہا یہ بہت مفید سودا ہے' نہ تو ہم اقالہ کرتے ہیں اور نہ دوسرے فریق کو اقالہ کرنے کی اجازت دیتے ہیں

اس طرح صحابہ کرام اور اللہ تعالیٰ کے درمیان یہ سودا طے ہوا اور یہ قطعی اور ناقابل منسوخی سودا تھا۔ یہ طے ہوا۔ اس پر عمل ہو گیا اور اس میں اقالے اور منسوخی کا کوئی موقعہ ہی نہ رہا۔ کیونکہ سودا قطعی تھا۔ اس میں کسی فریق کے لیے خیار رجوع

نہ تھا۔ جنت اس کا زر ثمن تھا۔ جس کا پختہ وعدہ کر دیا گیا تھا اور یہ وعدہ اللہ کی طرف سے ہے اور یہ وعدہ اللہ نے اپنی تمام کتابوں میں کیا ہے۔ تورات میں بھی اور انجیل میں بھی۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر وفائے عہد کرنے والا ہو۔

وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ

(۹ : ۱۱۱) ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے تورات اور انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟"

جہاد فی سبیل اللہ کے لیے ہر مومن نے ایمان کے لازمی تقاضے کے طور پر بیعت کی ہوئی ہے۔ اور یہ عہد اس کی گردن میں باندھا ہوا ہے۔ مطلق مومن اس عہد کا پابند ہے، چاہے وہ جس نبی کے دین پر ایمان لانے والا ہو۔ یہ ایک سنت جاریہ ہے۔ انسانی زندگی کی اصلاح اس کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اس بیعت کے ترک کرنے کی صورت میں کبھی انسانی زندگی میں اصلاح ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (۲ : ۲۵۱)) (اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض دوسروں کے ذریعہ روکتا نہ تو زمین میں فساد پیدا ہو جاتا۔

اور دوسری جگہ ہے

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ---- (۲۲ : ۴۰)) "اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض دوسروں کے ذریعہ روکتا نہ تو صومعے، گرجے، عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں بکثرت اللہ کا نام لیا جاتا ہے، منہدم کر دی جائیں"۔

سچائی نے لازماً اپنی راہ پر گامزن رہنا ہے اور باطل نے لازماً اس کی راہ روکنا ہے بلکہ برائی نے اس پر حملہ آور ہونا ہے۔ دین اسلام نے یہ فریضہ ادا کرنا ہے کہ ان لوگوں کو غیر اللہ کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی غلامی میں داخل کیا جائے اور طاغوت نے دین اسلام کی راہ کو روکنا ہے، بلکہ طاغوت نے دین اسلام کے مقابلے میں راہ زنی کرنی ہے۔ دین اسلام کو پورے کرہ ارض پر پھیلانا ہے تاکہ تمام انسانیت کو آزادی بخشی جائے۔ سچائی نے سیدھی راہ لینا ہے اور کسی جگہ بھی ٹیڑھ اختیار نہیں کرنا تاکہ باطل کے لیے کوئی راستہ نکلے۔ جب تک دنیا میں کفر ہے، جب تک باطل موجود ہے، جب تک زمین میں غیر اللہ کی بندگی ہے۔ جس میں انسانیت ذلیل ہو رہی ہو، تب تک جہاد جاری رہے گا اور ہر مسلمان پر معاہدہ جہاد لازم ہے۔ اس نے جہاد میں حصہ لینا ہے، ورنہ دعوائے ایمان جھوٹا ہے۔ حدیث میں آتا ہے

من مات و لم يغز و مات على شعبة من النفاق "جو اس حال میں مرا کہ اس نے اللہ کی راہ میں غزا نہیں کی تو وہ گویا نفاق کے ایک شعبے پر مرا"۔

فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِىْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۹ : ۱۱۱) "پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے' یہی سب سے بڑی کامیابی ہے"۔

پس خوشیاں مناؤ' اپنی جان و مال سے دست بردار ہو جاؤ اور اس کے عوض جنت کو خوشی خوشی قبول کرو' ایک مومن کا نقصان کیا ہے اگر وہ اپنی جان و مال دے دے اور جنت قبول کر لے۔ یہ جان و مال تو اللہ ہی کے تھے اور جان تو بہرحال جانی ہے اور مال تو بہرحال فنا ہونے والا ہے۔ مال تو فنا ہوتا ہے چاہے اسے راہ خدا میں خرچ کیا جائے یا راہ دنیا میں۔ اور جنت تو مفت میں مل رہی ہے۔ حقیقی منافع ہے۔ جنت دائمی ہے اور جو چیز اللہ مانگتا ہے وہ فانی ہے اس لیے خوشیاں مناؤ اس سودے پر۔

زرا ایمان کی سربلندی کو تو دیکھو! ایک انسان جو اللہ کے لیے جیتا ہے وہ اگر کامیاب رہتا ہے تو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کامیاب ہوتا ہے' اپنے دین کو آزاد کرتا ہے' سربلند کرتا ہے' اور پوری انسانیت کو غیراللہ کی غلامی سے چھڑاتا ہے۔ اور اگر وہ شہید ہو جاتا ہی تو اپنے دین کی راہ میں شہید ہوتا ہے' وہ اپنے دین کے حق میں شہادت حق دیتا ہے' وہ گواہی دیتا ہے کہ اس کے دین کی قدر و قیمت اس کی زندگی سے زیادہ ہے۔ وہ اپنی تمام حرکات و سکنات میں یہ بات ثابت کرتا ہے کہ وہ زمین کی آلودگیوں سے بلند ہے' اس کا ایمان ہر قسم کے رنج و الم کو برداشت کرتا ہے۔ اس کے نظریات اس کی زندگی سے زیادہ قیمتی ہیں۔

یہ ہے اصل کمائی۔ یہ ہے اعلیٰ انسانیت جو دنیا کی ضروریات و مفادات سے بہت بلند ہے۔ اس میں ایمان' دنیاوی مشکلات اور تکلیفات کو برداشت کرتا ہے اور اس انسانیت' بلند انسانیت کے ساتھ جب جنت بھی ملے تو بلاریب یہ عظیم کامیابی ہے۔

فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِىْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۹ : ۱۱۱) "پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے' یہی سب سے بڑی کامیابی ہے"۔

اور پھر یہ الفاظ قابل غور و تدبر ہیں

وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِى التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ (۹ : ۱۱۱) "ان سے اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے' تورات' انجیل اور قرآن میں"۔

اب ہم اللہ کے اس فرمان پر قدرے غور کرتے ہیں۔

وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِى التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ (۹ : ۱۱۱) "ان سے اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے' تورات' انجیل اور قرآن میں"۔

قرآن کریم میں تو یہ وعدہ مشہور اور مکرر ہے اور اس کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احیائے اسلام کے سلسلے میں جہاد ایک بنیادی عنصر ہے اور احیائے اسلام کا ربانی طریقہ کار یہی ہے۔ کیونکہ انسانی سوچ اور انسانوں کی عملی صورت حال میں یہی طریقہ کار کارگر ہو سکتا ہے۔ اور یہ طریقہ کار کسی مخصوص زمان و مکان تک محدود

نہیں ہے' کیونکہ جاہلیت سے ہمارا مقابلہ محض نظریاتی نہیں ہوتا بلکہ جاہلیت ایک ٹھوس عملی معاشرے اور ایک رائج سوسائٹی کی شکل میں ہوا کرتی ہے اور اس کے پاس ٹھوس مادی قوت ہوا کرتی ہے اور جب بھی کوئی دینی تحریک اس دنیا میں اٹھی ہے' جاہلیت نے اس کا عملی مقابلہ کیا ہے اور اس کے مقابلے میں وہ پورے مادی وسائل لے کر میدان میں آئی ہے اور جاہلیت نے ہمیشہ لوگوں کو روکا ہے کہ وہ دعوت اسلامی کی طرف کان لگا کر سنیں بلکہ جاہلیت کا طریقہ واردات ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو آزادی دینے کے بجائے وہ لوگوں کو بعض دوسرے لوگوں کا غلام بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اور دینی اور اسلامی تحریک جب لوگوں کے سامنے دعوت اسلامی پیش کر کے ان کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرنے اور صرف اللہ وحدہ کی غلامی میں داخل ہونے کے کام کا آغاز کرتی ہے تو جاہلیت اپنی پوری قوت کے ساتھ راستہ روک لیتی ہے۔ چنانچہ اس مقام پر اسلام کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ جاہلیت کے مقابلے میں قوت استعمال کرے اور اس قوت کو پاش پاش کر دے جو جاہلیتوں کی سرپرستی کرتی ہی اور مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ تمام انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزادی دلائی جائے جبکہ جاہلیت کا ہدف ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کو انسانوں کا غلام رکھتی ہے۔

رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے تورات اور انجیل میں بھی مسلمانوں کے ساتھ یہ وعدہ کیا تھا تو اس کی قدرے تشریح کی ضرورت ہے۔

اس وقت یہود و نصاریٰ کے ہاں جو کتابیں تورات اور انجیل کے نام سے پائی جاتی ہیں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہی کتابیں اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی تھیں بلکہ خود یہود و نصاریٰ اس بات کے قائل ہیں کہ ان کتابوں کا اصلی نسخہ موجود نہیں ہے۔ یہ کتابیں ان انبیاء کے عرصہ بعد مرتب ہوئیں اور ان سے اسلام کے اصلی اصول غائب ہو گئے۔ صرف وہ باتیں ان میں موجود ہیں جن کا تعلق لوگوں کی یادداشت سے تھا اور اس پر لوگوں نے بار بار اضافہ بھی کیا۔

لیکن اس کے باوجود عہد قدیم کی کتابوں میں جہاد کی طرف اشارات موجود ہیں اور یہودیوں کو بار بار حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے بت پرست مخالفین کے خلاف جنگ کریں اور اپنے دین اور اللہ کی مدد کریں۔ اگرچہ بار بار کی تحریفات نے ان کے نظریہ جہاد میں کافی تبدیلیاں کر دیں۔

رہیں اناجیل جو اس وقت عیسائیوں کے ہاں مروج ہیں تو ان میں جہاد کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ عیسائیوں کے ہاں جو تصورات رائج ہیں ان کو بدلا جائے۔ کیونکہ عیسائیوں کے ہاں یہ تصورات ان انجیلوں کی وجہ سے رائج ہوئے جو حضرت عیسیٰ کے بعد لکھی گئیں اور اس حقیقت کو خود عیسائی محققین تسلیم کرتے ہیں۔ اور اس بات پر قرآن کریم بھی شہادت دیتا ہے جو کتب سماوی میں سے ایک محفوظ کتاب ہے اور اس کے اندر باطل کی آمیزش نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اللہ نے خود اس کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھائی ہے۔ وہ آگے اور پیچھے سے محفوظ ہے۔

اللہ کا فرمان یہ ہے کہ مسلمانوں کی یہ صفت تورات' انجیل اور قرآن میں موجود ہے اور تینوں کتابوں میں ان کے ساتھ جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ ایک فیصلہ کن بات ہے کہ اگر ان کتابوں میں یہ حکم نہیں ہے تو وہ منحرف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاد ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس بارے میں ایک مومن اور خدا کے درمیان عہد ہو چکا ہے ہر مومن کے ساتھ مطلقاً" مومن کے ساتھ جب سے اللہ نے رسول بھیجے ہیں تمام مومنین پر جہاد فرض رہا ہے۔

لیکن جہاد فی سبیل اللہ محض جنگ و جدال اور قتل و قتال ہی نہیں ہے۔ یہ وہ فریضہ ہے جسے اہل ایمان سرانجام دیتے ہیں اور اہل ایمان کے کچھ اصول ہوتے ہیں ان کے اندر کچھ لازمی صفات ہوتی ہیں ان کا ایک مخصوص طرز عمل ہوتا ہے۔ وہ مومنین جن کے ساتھ اللہ نے سودا کیا ہے وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر درج ذیل صفات ایمانی مذکور ہوتی ہیں۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ (۹: ۱۱۲) "اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے' اس کی بندگی بجالانے والے' اس کی تعریف کے گن گانے والے' اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے' اس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے' نیکی کا حکم دینے والے' بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے' (اس شان کے ہوتے ہیں وہ مومن جو اللہ سے خرید و فروخت کا یہ معاملہ طے کرتے ہیں۔)

اَلتَّآئِبُوْنَ (۹: ۱۱۲) وہ اپنے سابقہ گناہوں سے توبہ کرنے والے ہیں اور توبہ و استغفار کرتے ہوئے اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ توبہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے کیے پر ندامت محسوس کرے اور اپنی بقیہ زندگی میں اللہ کی طرف لوٹ جانے کا عزم کرے اور آئندہ گناہوں سے بچنے کا عزم کرے۔ توبہ کی حقیقت کی شکل عمل صالح دیتا ہے اور برائی کے ارتکاب سے رک جانے سے توبہ حقیقت کی شکل اختیار کرتا ہے۔ تو درحقیقت پاکیزگی' اصلاح' توجہ اور صفائی کا نام ہے۔

الْعٰبِدُوْنَ (۹: ۱۱۲) وہ لوگ جو صرف اللہ وحدہ کی طرف متوجہ ہوں' مراسم عبادت' بندگی اور اقرار ربوبیت صرف اسی کا کریں' یہ صفت ان کی زندگیوں میں رچی بسی ہو اور ان کی عملی زندگی میں اس کا شعور ہو' ان کی زندگی ان کے اس شعور اور صفت کی ترجمان ہو' یوں کہ وہ اپنے قول' فعل اور ہر عمل اور ہر سوچ میں اللہ کے مطیع فرمان ہوں۔ غرض عابدوں کی صفت عملی شکل میں الوہیت اور ربوبیت کے اقرار کا نام ہے۔

الْحٰمِدُوْنَ (۹: ۱۱۲) ان کے دلوں میں صفت اعتراف موجود ہو کہ اللہ تعالیٰ منعم حقیقی ہے اور اس نے انسانوں پر بے شمار انعامات کر رکھے ہیں۔ ان کی زبانوں پر بھی حمد باری ہو' خوشی میں بھی اور مشکلات میں بھی۔ خوشی میں تو وہ حمد اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ کے انعامات ظاہری طور پر موجود ہیں اور مشکلات میں وہ اس لیے شکر کرتے ہیں اور حمد کرتے ہیں کہ مومنین کے لیے ابتلا بھی اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ ظاہری انعامات میں تو وہ اللہ کی حمد میں رطب اللسان ہوتے ہی ہیں لیکن مشکلات میں بھی وہ اللہ کی حمد کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اللہ نے مشکلات میں بھی ان کے لیے اچھا ہی سوچا ہو گا' اگرچہ فی الحال وہ اس کو نہیں سمجھتے۔

السَّآئِحُوْنَ (۹: ۱۱۲) سائحون کے مفہوم میں مختلف روایات ہیں۔ بعض میں ہے کہ ان سے مراد مہاجرین ہیں' بعض میں ہے کہ وہ مجاہدین ہیں' بعض میں ہے کہ طلب علم میں پھرنے والے ہیں' بعض میں ہے کہ اس

سے صائمون مراد ہیں۔ ہماری رائے میں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے اس کارخانہ قدرت میں غور و فکر کرنے والے ہیں۔ اس لیے کہ ایسے لوگوں کے بارے میں دوسری جگہ قرآن مجید کہتا ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (۱۸۹) اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۱۹۰)

(۳:۱۸۹ — ۱۹۰) "زمین و آسمان کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں 'ان ہوش مندوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ پروردگار 'یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے 'پس اے رب ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔

تو یہ عبادت اور حمد کی صفت کے بعد یہاں سائحون کا مفہوم یہی مناسب ہے کہ مراد وہ لوگ ہیں جو آسمان و زمین کی ساخت میں فکر کرتے ہیں۔ تو یہ عبادت اور حمد کے بعد اللہ کی کائنات میں غور و فکر ہی انسان کو اللہ کی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔ اس غور و فکر کے ذریعے انسان حکمت تخلیق کا ادراک کر سکتا ہے۔ اس سچائی کا ادراک کر سکتا ہے جس پر حق قائم ہے۔ صرف ادراک اور علم ہی نہیں بلکہ اس غور و فکر کی اساس پر وہ اپنی سوسائٹی اور اپنے تمدن کی تعمیر کر سکتا ہے۔

الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ (۹:۱۱۲) یعنی وہ نماز کے پابند ہیں بلکہ نماز ان کی مخصوص صفت ہے۔ رکوع اور سجدہ ان کی خاص نشانی ہے۔ اور دوسرے لوگوں سے وہ اس صفت کی وجہ سے ممتاز ہیں۔

الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ (۹:۱۱۲) جب ایک ایسا اسلامی معاشرہ وجود میں آجائے جس میں اسلامی شریعت نافذ ہو جائے تو ایسا معاشرہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں کرتا۔ ایسے معاشرے کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام جاری ہوتا ہے۔ اور ایسے معاشرے میں اسلامی شریعت سے جو انحرافات ہوتے ہیں یہ عمل ان کو درست کرتا ہے' لیکن اگر کسی ملک میں اسلامی معاشرہ ہی موجود نہ ہو اور ایک ایسا نظام حکومت موجود نہ ہو جس میں حاکمیت صرف اللہ کی ہو۔ لہذا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام صرف یہ ہوگا کہ ایک اسلامی ریاست کے قیام پر تمام تر توجہات مرکوز کر دی جائیں۔ اور سب سے پہلے اللہ کی ربوبیت اور حاکمیت کو قائم کیا جائے اور نہی عن المنکر کے فریضے کو نہی عن المنکر الاکبر کی طرف متوجہ ہونا چاہیے یعنی سب سے بڑے منکر کی طرف یہ کہ کوئی طاغوتی حکومت چلائے اور لوگوں پر اللہ کی شریعت کے بجائے انسانوں کی شریعت کے ذریعے حکومت چلائے۔ جو لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے 'انہوں نے سب سے پہلے ہجرت اور جہاد کیا اور ایک ایسی حکومت قائم کی جس میں شریعت رائج کی گئی اور اس میں شریعت کے ذریعے پھر ایک اسلامی معاشرہ قائم کیا جب یہ کام تمام ہوا تو انہوں نے پھر

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام شروع کیا اور یہ کام انہوں نے ان شاخوں اور شعبوں میں کیا جس کا تعلق خدا اور رسول کی اطاعت سے تھا۔ ان حضرات نے اسلامی مملکت کے قیام سے قبل اپنی قوت کو کسی اور کام میں صرف نہیں کیا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام اسلامی حکومت کے قیام کے بعد شروع ہوا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مفہوم کیا ہے؟ یعنی برائیوں سے روکنا اور یہ فریضہ اسلامی مملکت کے قیام سے قبل سرانجام دیا ہی نہیں جا سکتا' اس لیے کہ اسلامی مملکت کا قیام معروف اکبر ہے اور غیر اسلامی حکومت کا وجود ہی منکر اکبر ہے۔ جب تک طاغوتی قوتیں موجود ہوں جو اسلامی شریعت کے سوا کسی اور نظام و قانون کے تحت چلتی ہیں۔ یہ فریضہ سرانجام دیا ہی نہیں جا سکتا ہے اور صحابہ کرام نے یہی طریقہ کار اپنایا۔

وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ (۹ : ۱۱۲) یعنی اپنے نفس اور ذاتی زندگی میں اور تمام عوام الناس میں اور پوری سوسائٹی میں اللہ کے حدود کو قائم کرنے والے اور ان قوتوں کا مقابلہ کرنے والے جو ان حدود کو توڑتے ہیں یا ان سے آگے بڑھتے ہیں۔ یہ فریضہ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرح صرف اسلامی حکومت کے بعد ہی سرانجام دیا جا سکتا ہے اور اسلامی حکومت وہ ہوتی ہے جو اسلامی قانون' اسلامی دستور یعنی اسلامی شریعت کو نافذ کرنے والی ہو اور تمام معاملات میں طاغوتی احکام کو منسوخ کر کے اللہ کے احکام کو رائج کرتی ہو۔ جس میں ربوبیت و حاکمیت صرف اللہ کی ہو اور قانون شریعت کا ہو۔ لہذا ضروری ہے کہ سب کاموں سے قبل اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے جب حکومت قائم ہو گئی تو پھر محافظین حدود اللہ کا کام شروع ہو گا۔ جب کہ حضور اکرمؐ کے دور میں اسلامی حکومت کے قیام کا مرحلہ طے ہوا اور اسلامی معاشرہ قائم ہوا۔ یہ ہے اہل ایمان کی جماعت جس کے ساتھ اللہ نے عہد کیا ہے اور یہ ہیں اس کی صفات و خصوصیات۔ یعنی صفت توبہ جو بندے کو اللہ کی طرف لوٹاتا ہے اور اس کو گناہوں سے روکتا ہے اور عمل صالح پر آمادہ کرتا ہے اور دوسری صفت 'صفت بندگی ہے جو انسان کو اس کے معبود کے ساتھ پیوست رکھتی ہے اور اللہ اس کا قبلہ و کعبہ ہوتا ہے اور خوشی و غم ہر حالت میں اللہ کی تعریف کرنا وہ صفت ہے جو انسان کی جانب سے پوری طرح سر تسلیم خم کرنے کو ظاہر کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ اس بندے کو اللہ کی رحمت' مہربانی اور عدل پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ اللہ کی کائنات میں غور و فکر اور اس کے انعامات اور اس کی گہری حکمت میں غور و فکر اور پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی صفات اور آخر میں یہ کہ اللہ کی سرحدوں کی حفاظت کہ ان کو کوئی ضائع نہ کرے' دست اندازی نہ کرے اور ان کا احترام نہ کرے۔

یہ ہے وہ جماعت مسلمہ جس کے ساتھ اللہ نے جنت کا سودا کیا ہے اور جنت کے بدلے ان کا مال اور ان کی جان خرید لی ہے تاکہ وہ اس سنت کو پورا کرے جو اللہ نے آغاز کائنات اور اس وقت سے جاری کر رکھی ہے جب سے اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے رسولوں کو بھیجنا شروع فرمایا ہے۔ سنت یہ ہے کہ اعلائے کلمتہ اللہ کے لیے جہاد و قتال جاری رہے گا۔ اور یہ کہ اس قتال کے ذریعے ان لوگوں کے ساتھ جنگ کی جائے گی جو دین کے دشمن ہیں اور اس معرکہ حق و باطل میں شہادت کا مرتبہ حاصل کیا جائے۔ یہ معرکہ حق و باطل اور معرکہ اسلام و جاہلیت' معرکہ شریعت و طاغوت اور معرکہ ہدایت و ضلالت آغاز کائنات سے قائم ہے۔

یاد رہے کہ انسانی زندگی محض لہو و لعب کے لیے پیدا نہیں کی گئی۔ یہ محض کھانے پینے کے لیے وجود میں نہیں

لائی گئی کہ انسان دوسرے حیوانات کی طرح کھائے اور پئے۔ اسلام کسی ذلت آمیز سلامتی کا قائل نہیں ہے۔ نہ اسلام اندھی عیش کوشی کا قائل ہے۔ نہ وہ سستی' سلامتی اور عافیت کا روادار ہے۔ اسلام حق کے لیے رزم آرائی کا قائل ہے۔ وہ خیر کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کا قائل ہے' وہ کلمتہ اللہ کی حمایت کا قائل ہے اور اس کے نزدیک شہادت فی سبیل اللہ مقصود مومن ہے۔

یہی وہ زندگی ہے جس کی طرف اہل ایمان کو بلایا جاتا ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا اللّٰه و للرَّسُوْلِ اذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (٨: ٢٤)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور رسول اللہ کی دعوت پر لبیک کہو جب وہ تمہیں ایسی بات کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے"۔ صدق اللہ العظیم۔

○○○

وہ مومن جن کے ساتھ اللہ نے مذکورہ بالا سودا کیا ہے کہ ان کی جان اور مال کے بدلے ان کو جنت دی ہے' وہ ایک علیحدہ امت ہیں اور ان کے درمیان اجتماعیت کی اساس صرف ان کا عقیدہ ہے' ان کے باہم روابط کی اساس صرف ان کا عقیدہ ہے۔ یہ سورت جو آخری سورتوں میں سے ہے اور جو امت مسلمہ اور دوسری رسم کے درمیان تعلقات کی نوعیت کا تعین کر رہی ہے۔ یہ اسلامی نظریہ حیات کے سوا اجتماعی روابط کے تمام دوسری بنیادوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ فتح مکہ کے بعد اسلامی مملکت اور اسلامی سوسائٹی کا دائرہ بے حد وسیع ہو گیا تھا اور ایسے لوگ اور اقوام اور قبائل بھی اسلامی سوسائٹی میں داخل ہو گئے تھے جو پوری طرح اسلامی سانچے میں ڈھل نہ سکے تھے اور ابھی تک اجتماعیت کی دوسری اساسیں موجود تھیں۔

چنانچہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ اس وقت موجود تمام اجتماعی روابط کو مسترد کر کے صرف ایک ہی رابطے کو بحال رکھتے ہیں۔ اور وہ رابطہ ہے یعنی اسلامی نظریئے اور عقیدہ دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی کا دارومدار صرف اس عقیدے پر ہو گا' دوسری اساسوں پر نہ ہو گا۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿١١٣﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿١١٤﴾ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١١٥﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ۝۱۱۶

"نبی ؐ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں ' زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں ' چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں ' جبکہ ان پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔ ابراہیم ؑ نے اپنے باپ کے لیے جو دعائے مغفرت کی تھی وہ تو اس وعدے کی وجہ سے تھی جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا ' مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا ' حق یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام بڑا رقیق القلب و خدا ترس اور بردبار آدمی تھا۔

اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ لوگوں کو ہدایت دینے کے بعد پھر گمراہی میں مبتلا کرے۔ جب تک کہ انہیں صاف صاف بتا نہ دے کہ انہیں کن چیزوں سے بچنا چاہئے۔ درحقیقت اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اللہ ہی کے قبضہ میں زمین اور آسمانوں کی سلطنت ہے ' اسی کے اختیار میں زندگی و موت ہے اور تمہارا کوئی حامی و مددگار ایسا نہیں ہے جو تمہیں اس سے بچا سکے"۔

بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہل ایمان اپنے مشرک آباؤ اجداد کے حق میں دعا فرمایا کرتے تھے۔ اور بعض اوقات یہ مطالبہ کرتے تھے کہ رسول اللہ بھی ان مشرکین کے لیے دعا فرمائیں۔ اس لیے یہ آیات نازل ہوئیں کہ صحابہ کرام کے اندر ان کے ماضی کے تعلقات نسب اور قوم میں سے صرف یہی رابطہ باقی تھا کہ وہ اپنے والدین کے لیے دعا کرتے تھے۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ یہ تعلق بھی باقی نہ رکھا جائے اور اپنے ماضی کو بھلا دیا جائے اور نبی اور اہل ایمان کے لیے یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ ان کی موجودہ پوزیشن کے بھی خلاف ہے اور یہ ان کے نظریہ حیات کے بھی منافی ہے۔ یہ کہ یہ کس طرح معلوم ہو گیا ہے کہ وہ دوزخی ہیں؟ اس لیے کہ وہ حالت شرک پر وفات پا گئے اور اب کوئی امید نہیں ہے کہ وہ ہدایت پا لیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نظریہ اور عقیدہ ہی وہ اعلیٰ رابطہ ہے جس کے اوپر پوری جمع ہو سکتی ہے۔ جب یہ اجتماعی رابطہ وجود میں آجاتا ہے تو تمام دوسرے روابط جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں۔ نظریاتی اور اہل ایمان کی سوسائٹی کے اندر پھر نسب کی اساس پر کوئی اکٹھ نہیں ہوتا۔ کسی رشتہ داری کی اساس پر کوئی اکٹھ نہیں ہوتا ' کسی قومیت کی اساس پر سوسائٹی نہیں بنتی ' کسی علاقے اور جغرافیہ کی اساس پر کوئی اجتماع نہیں ہوتا۔ یا تو اسلامی نظریہ اور عقیدہ ہو گا اور دوسرے روابط اسی کے تابع اور اس کی شاخ ہوں گے۔ اور یا ایمان و عقیدہ نہ ہو گا تب دوسرے روابط پر کسی انسان اور انسان کے درمیان روابط ہوں گے اور یہ روابط نہایت ہی بودے ہوں گے۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (۹ : ۱۱۴) "ابراہیم ؑ نے اپنے باپ کے لیے جو دعائے مغفرت کی تھی وہ تو اس وعدے کی وجہ سے تھی جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا ' مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا ' حق یہ ہے کہ ابراہیم ؑ بڑا رقیق القلب و خدا ترس اور بردبار

آدمی تھا"۔

اس لیے حضرت ابراہیم ؑ کے استغفار کو دلیل نہ بناؤ' حضرت ابراہیم ؑ نے استغفار اس لیے تھا کہ انہوں نے باپ کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے لیے استغفار کرے گا۔ شاید کہ اللہ ان کو ہدایت دے کر مغفرت کر دے۔ حضرت ابراہیم ؑ نے فرمایا تھا۔

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا (٤٧) وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا (٤٨) ((١٩ : ٤٧ — ٤٨)) سلام ہے آپ کو میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے۔ میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں کو چھوڑتا ہوں اور ان ہستیوں کو جنہیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا۔ امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہ ہوں گا"۔

لیکن جب ان کا باپ شرک پر فوت ہو گیا اور ابراہیم ؑ کو معلوم ہو گیا کہ ان کا باپ کافر مر گیا ہے اور اب اس کی ہدایت کے لیے کوئی موقعہ باقی نہیں ہے تو اس نے ان سے براءت کا اظہار کر دیا اور ان سے تمام روابط کاٹ دیئے۔ "بے شک وہ نہایت ہی رقیق القلب و خدا ترس اور بردبار تھے۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (٩ : ١١٤) "حضرت ابراہیم نہایت رقیق القلب اور حلیم تھے"۔ بہت عاجزی سے دعا مانگنے والے تھے اور اگر ان کو مشکلات پیش آئیں اور ان کو تکلیف دی جائے تو حلیم الطبع تھے۔ ان کے باپ نے بھی ان کو بہت ہی اذیت دی تھی' لیکن جب معلوم ہوا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس نے اس سے فوراً براءت کا اظہار کر دیا۔

احادیث میں آتا ہے کہ جب یہ دو آیات نازل ہوئیں تو وہ لوگ بہت ڈر گئے جو اپنے آباء و اجداد کے لیے دعا کیا کرتے تھے۔ انہوں نے خیال کیا کہ وہ تو منشائے الٰہی کے خلاف عمل کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا وہ گمراہ ہو گئے۔ ایسے لوگوں کی تسلی کے لیے یہ آیت نازل ہوئی کہ وہ مطمئن ہو جائیں اور یہ قاعدہ طے کر دیا گیا کہ کسی نص کی عدم موجودگی میں کسی فعل پر سزا نہیں دی جا سکتی۔ نیز اگر کسی بات کو جرم نہ قرار دیا گیا اور اس کا اعلان نہ کر دیا گیا تو وہ جرم نہیں قرار دی جا سکتی۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًاۢ بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (٩ : ١١٥) "اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ لوگوں کو ہدایت دینے کے بعد پھر گمراہی میں مبتلا کرے۔ جب تک کہ انہیں صاف صاف بتا نہ دے کہ انہیں کن چیزوں سے بچنا چاہئے۔ در حقیقت اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کو صرف ان امور پر سزا دیتا ہے جن کے بارے میں ان کو صاف صاف بتا دے کہ ان باتوں سے بچو اور ان کا ارتکاب ہرگز نہ کرو' نیز اللہ کے لیے یہ بات بھی شایان شان نہیں ہے کہ وہ کسی قوم کو محض ایک چھوٹے سے فعل کی

وجہ سے گمراہ قرار دے دے جبکہ اس فعل سے ابھی تک اس نے روکا بھی نہ ہو۔ کیونکہ انسان کا علم محدود ہے۔ وہ ازخود تو گمراہی کے اسباب کا پتہ نہیں چلا سکتا' یہ بات صرف اللہ کے علم میں ہے۔ لہٰذا تعلیم اور بیان اسی کی جانب سے ہو گا۔

اللہ نے اس دین کو آسان بنایا ہے' اسے مشکل نہیں بنایا ہے۔ اس لیے اس نے ممنوعات کو واضح طور پر بیان کیا ہے اور مامورات کو بھی واضح طور پر بتایا ہے۔ بعض چیزوں کے بارے میں اللہ نے خاموشی اختیار کی ہے اور ان کے بارے میں کوئی واضح بات نہیں بتائی ہے۔ یہ نہیں کہ اللہ ان کے بارے میں کچھ کہنا بھول گیا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا تھا کہ دین میں آسانی رہے اور یہ بھی نہیں بلکہ اللہ نے ایسے امور کے بارے میں پوچھنے سے بھی منع فرمایا تاکہ سوال کے جواب میں سخت حکم نہ آجائے۔ اس لیے کسی قانون ساز ادارے کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ایسی چیزوں کو حرام قرار دے جن کے بارے میں قرآن و سنت خاموش ہیں' ایسی چیزوں کی ممانعت سے بھی اللہ نے منع فرمایا ہے کیونکہ اللہ رحیم و کریم ہے۔

ان آیات کے آخر میں اور ایسی فضا میں جس میں خون اور نسب کے رشتوں کو ترک کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ کے دین کے سلسلے میں ذات و اموال کو چھوڑ دینے کا حکم بھی دیا ہے۔ اللہ یہ یقین دہانی فرماتے ہیں کہ وہی تمہارا حامی اور ناصر ہے۔ وہ زمین و آسمان کا مالک و مختار ہے اور زندگی اور موت اس کے اختیار میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (٩: ١١٦) "اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اللہ ہی کے قبضہ میں زمین اور آسمانوں کی سلطنت ہے' اسی کے اختیار میں زندگی و موت ہے اور تمہارا کوئی حامی و مددگار ایسا نہیں ہے جو تمہیں اس سے بچا سکے"۔

جان و مال' زندگی اور موت بلکہ زمین و آسمان سب کے سب اللہ کے ہیں لہٰذا حامی اور ناصر بھی اللہ ہے۔ یہ سب امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے جو اس میں تصرف کر سکے۔ لہٰذا اللہ کے ساتھ جس کا رشتہ جڑ جائے۔ اسے اور رشتوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

یہ بار بار کی تاکیدیں' اور یہ قطعی بیانات اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ ابھی تک بعض لوگوں کے نزدیک خون اور نسب کے رشتے اہمیت رکھتے تھے کیونکہ اس وقت کے عربی معاشروں میں ان کی اہمیت موجود تھی' اس لیے بعض لوگوں کے دلوں میں ابھی تک یہ خلجان تھا کہ وہ صدیوں کے ان روابط کو چھوڑ کر کس طرح خالص نظریاتی روابط اختیار کر لیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں قطعی اور فیصلہ کن انداز بیان اختیار فرمایا اور یہ پوری سورت بھی اسلامی اور غیر اسلامی معاشروں کے درمیان روابط کی فیصلہ کن شکل متعین کرتی ہے۔ یہاں تک کہ کسی غیر مسلم اور مشرک کے لیے استغفار تک جائز نہیں ہے۔ اور اس کے بارے میں سختی کی گئی۔ یہ سختی اس لیے کی گئی کہ لوگ تمام جاہلانہ روابط اور ہمدردیاں چھوڑ دیں۔

صرف نظریاتی بنیادوں پر سوسائٹی کی تشکیل تحریک اسلامی کا اصول اول ہے۔ یہ اعتقادی اور نظریاتی اصول ہے اور حرکت اور پھیلاؤ کے لیے بھی یہی اصول اختیار کیا گیا ہے۔ اس اصول کا اس سورت میں بار بار نہایت ہی قطعی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ اس سودے کا یہ مزاج تھا کہ کوئی بھی چیز تمہاری نہیں ہے۔ تم فروخت کر چکے ہو' تو ایسے حالات میں ایسے لوگوں کے لیے جو جہاد پر قدرت رکھتے ہوں اور وہ جہاد میں شرکت نہ کریں' ایک نہایت ہی مکروہ غلطی تھی' چاہے سبب کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس جنگ میں بعض لوگوں سے کمزوریوں کا ظہور ہوا تھا' اس پر غور و فکر کی نہایت ضرورت تھی' چنانچہ

اگلی آیات میں بتایا جاتا ہے کہ جن لوگوں سے غلطیوں کا ظہور ہوا وہ اگرچہ بڑی غلطیاں تھیں لیکن اللہ چونکہ بڑا کریم ہے۔ اس نے ان غلطیوں سے درگزر فرمایا۔ یہ غلطیاں کبیرہ ہوں یا صغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ ان تین افراد کی معافی کا بھی اعلان کر دیا گیا جن کے معاملے کو ملتوی کر دیا گیا تھا' اور انہوں نے اپنا یہ طویل وقت بڑے کرب سے گزارا تھا۔

--------

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ
سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ
عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا
ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ
لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ ۱۴
الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ ع ۸
۳

"اللہ نے معاف کر دیا نبی کو اور ان مہاجرین و انصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا۔ اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے' (مگر جب انہوں نے اس کجی کا اتباع نہ کیا بلکہ نبی کا ساتھ دیا تو) اللہ نے انہیں معاف کر دیا' بے شک اس کا معاملہ ان لوگوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے۔ اور ان تینوں کو بھی اس نے معاف کیا جن کے معاملہ کو ملتوی کر دیا گیا تھا۔ جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامن رحمت کے سوا نہیں ہے تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں' یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے"۔

نبی کو معاف کر دینے کا کیا مفہوم ہے؟ اگر غزوۂ تبوک کے تمام واقعات پر نظر ڈالی جائے تو اس کا مفہوم سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اس کا تعلق ایک سابقہ آیت سے ہے جس میں کہا گیا ہے

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ

(۹: ۴۳) "اللہ نے آپ کو معاف کر دیا کہ کیوں آپ نے ان کو اجازت دی' تاکہ آپ کو معلوم ہو جاتا کہ کون سچا ہے اور آپ جھوٹوں کو بھی معلوم کر لیتے"۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ لشکر کی روانگی کے وقت بعض ایسے لوگ جو اس جنگ میں جانے کی قدرت تو رکھتے تھے مگر انہوں نے بہانہ سازی کی اور جھوٹے عذرات پیش کیے اور آپ نے ان کو

اجازت دے دی - یہ حضورؐ کا اجتہادی فعل تھا اللہ نے اسے معاف کر دیا - حالانکہ بہتر یہ تھا کہ آپ اجازت نہ دیتے' انتظار فرماتے اور معلوم ہو جاتا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے - اور مہاجرین و انصار کی توبہ اور معافی کا کیا مطلب ہے؟ اس کی طرف زیر تفسیر آیت اشارہ ہے کر رہی ہے جس میں ان حالات کی طرف اشارہ جن میں انصار و مہاجرین نے اسلام کے لیے کام کیا -

الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ یَزِیْغُ قُلُوْبُ فَرِیْقٍ مِّنْهُمْ (۹ : ۱۱۷) "جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت نبی کا ساتھ دیا - اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے" - ان میں سے بعض نے جنگ کے لیے نکلنے میں سستی کی لیکن بعد میں لشکر کے ساتھ جا ملے اور یہ مخلص ترین مومن تھے - بعض منافقین کے اس پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے کہ رومی بہت بہادر ہیں لیکن ان کے دل بھی بعد میں مضبوط ہو گئے' لیکن ان کو قدرے تردد رہا -

یہاں مناسب ہے کہ ہم غزوۂ تبوک کے بعض حالات یہاں درج کر دیں تاکہ اس غزوے کی فضا میں ان آیات کو اچھی طرح سمجھ سکیں - کیونکہ اس غزوے کے موقعہ کو اللہ نے ساعۃ العسرۃ کہا ہے - یہاں تو خلاصہ دیا جا رہا ہے سیرۃ ابن ہشام' المقریزی' بدایہ والنہایہ اور تفسیر ابن کثیر سے دے رہے ہیں تاکہ اس غزوے کے حقیقی تاثرات اور اقدامات ہماری سمجھ میں آ جائیں -

غزوۂ تبوک کا آغاز سورت توبہ کی اس آیت کے نزول سے ہوتا ہے :

قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (۹ : ۲۹) "جنگ کرو اہل کتاب میں سے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے' جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے' اسے حرام قرار نہیں دیتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے' یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں" -

اس آیت کے نزول کے بعد حضور اکرمؐ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ رومیوں کے ساتھ جنگ کی تیاری کریں - یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اس سے پہلے بھی غزوۂ مؤتہ کے موقعہ پر رومیوں سے جنگ ہو چکی تھی' اس آیت کا نزول دراصل اس منصوبے کی آخری کڑی تھی جو روز اول سے اسلامی تحریک کے پیش نظر تھا - بہرحال یہ حکم بہت مشکل حالات میں آیا - بہت شدید گرمی تھی' خشک سالی تھی' باغات اور کھجوروں کے پھل تیار ہو رہے تھے اور لوگ پسند کرتے تھے کہ اپنے ہرے بھرے باغوں کی چھاؤں میں آرام کریں اور پھل کھائیں اور وہ ان حالات اور ایسے اوقات میں سفر کے لیے تیار نہ تھے -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ آپ جب کبھی کسی مہم کے لیے تیاری فرماتے تو لوگوں کو اپنا اصل

ٹارگٹ نہ بناتے 'مگر غزوۂ تبوک کے بارے میں آپ نے صاف صاف بتا دیا اس لیے کہ حالات نہایت ناساعد تھے 'سفر دور کا تھا اور جس دشمن سے مقابلہ درپیش تھا وہ تعداد میں بہت زیادہ تھا۔ تاکہ لوگ اچھی طرح تیاری کر سکیں۔ چنانچہ آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ جہاد کے لیے تیاری کریں۔ آپ نے لوگوں کو بتایا کہ رومیوں کے ساتھ جنگ ہوگی۔

بعض منافقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ عذر پیش کیا کہ رومیوں کی عورتیں بہت خوبصورت ہیں اور انہیں ڈر ہے کہ وہ فتنے میں پڑ جائیں گے۔ آپ نے ان کو چھٹی دے دی۔ اس پر حضورؐ سے باز پرس کی گئی کہ آپ نے یہ اجتہادی فیصلہ درست نہیں کیا 'فرمایا :

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ

(۹ : ۴۳) "اللہ نے آپ کو معاف کر دیا کہ کیوں آپ نے ان کو اجازت دی 'تاکہ آپ کو معلوم ہو جاتا کہ کون سچا ہے اور آپ جھوٹوں کو بھی معلوم کر لیتے"۔

منافقین میں سے بعض نے دوسروں کو یہ مشورہ بھی دیا

لَا تَنْفِرُوْا فِى الْحَرِّ "گرمی میں نہ نکلو"۔ یہ لوگ جہاد کی اہمیت کو نہ جانتے تھے اور انہیں اسلام کی حقانیت میں شک تھا 'اور یہ لوگ رسول اللہؐ کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ ان لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی :

قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِى الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ (۸۱)

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۹ : ۸۱ — ۸۲) "اور انہوں نے کہا کہ گرمی میں نہ نکلو۔ کہہ دو جہنم کی گرمی زیادہ شدید ہے 'کاش کہ وہ سمجھتے 'انہیں چاہئے کہ ہنسیں کم اور روئیں زیادہ 'بوجہ ان اعمال کے جو وہ کما رہے ہیں۔ اب چاہئے کہ یہ لوگ ہنسنا کم کریں اور روئیں زیادہ 'اس لیے کہ جو بدی یہ کماتے رہے ہیں اس کی جزا ایسی ہی ہے (کہ انہیں اس پر رونا چاہئے)"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ بات پہنچی کہ سویلم یہودی کے گھر پر کچھ لوگ اجتماع کر رہے ہیں۔ اور وہ لوگوں کو اس پر آمادہ کر رہے ہیں کہ غزوۂ تبوک کی مہم میں رسول اللہ کو چھوڑ کر گھروں میں بیٹھ رہیں 'حضورؐ نے حضرت طلحہ ابن عبیداللہ کی سربراہی میں اپنے کچھ ساتھی بھیجے اور حکم دیا کہ ان کو اسی حالت میں سویلم کے گھر میں جلا دیا جائے۔ حضرت طلحہ نے ایسا ہی کیا۔ ان میں سے ایک شخص ضحاک ابن خلیفہ گھر کی پشت سے کودا اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور اس کے ساتھی بھی بھاگ کر نکل گئے۔ بعد میں ضحاک نے توبہ کر لی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سفر کی تیاریوں میں سخت جدوجہد کی اور ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ جلدی کریں اور تیار ہو جائیں۔ مالدار لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ اخراجات کا بندوبست کریں۔ آپ نے ان مجاہدین کے لیے سواریوں کا بندوبست فرمایا جن کے پاس سواری نہ تھی۔ چنانچہ بعض اہل ثروت نے فی سبیل اللہ لوگوں کے لیے سواریوں کا بندوبست

کیا۔ حضرت عثمان ابن عفان ایسے لوگوں کے صف اول میں تھے۔ اس موقعہ پر انہوں نے اس قدر خرچ کیا جس کی مثال آج تک نہیں ہے۔ ابن ہشام کہتے ہیں کہ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عمر نے غزوۂ تبوک جیسی مشکل مہم میں ایک ہزار دینار عطا کیے۔ اس پر رسول اللہ نے فرمایا "اے اللہ عثمان سے راضی ہو جا کیونکہ میں اس سے راضی ہوں"۔ عبداللہ ابن احمد نے اپنے والد کی مسند میں عبدالرحمن ابن خباب سلمی سے روایت کی ہے کہ اس موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر فرمائی اور لوگوں کو اس مشکل مہم پر آمادہ کیا' تو حضرت عثمان نے فرمایا میں سو اونٹ مع سازوسامان دوں گا۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ممبر کی ایک سیڑھی نیچے آگئے اور مزید عطیات کے لیے کہا اور لوگوں کو آمادہ کیا تو حضرت عثمان نے فرمایا میں مزید ایک سو اونٹ مع سازوسامان دوں گا۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ سے اشارہ کر رہے ہیں (عبدالصمد نے اپنا ہاتھ نکال یوں اشارہ کیا جس طرح کوئی تعجب کرتا ہے) اور فرمایا "اس کے بعد عثمان اگر عمل نہ کرے تو اس پر کوئی گرفت نہیں ہے"۔ (ترمذی نے محمد ابن یسار' ابو داؤد عباسی' سکن ابن مغیرہ سے نقل کی ہے اور کہا ہے کہ غریب من ھذا الوجہ) نیز اسے بیہقی نے عمر ابن مرزوق سکن ابن مغیرہ سے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ حضورؐ نے یہ الفاظ تین مرتبہ دہرائے اور یہ کہ حضرت عثمان نے تین صد اونٹوں کا ذمہ لیا مع سازوسامان کے۔

ابن جریر نے بروایت یحییٰ ابن ابوکثیر' سعید' قتادہ اور بروایت ابن ابو حاتم بواسطہ حکم ابن ابان' عکرمہ سے مختلف الفاظ میں روایت کی ہے کہ حضورؐ نے لوگوں کو اعانت دینے پر آمادہ فرمایا تو عبدالرحمن ابن عوف چار ہزار روپے لے کر آئے تو انہوں نے فرمایا میرا کل سرمایہ آٹھ ہزار ہے۔ میں نے نصف صدقہ کر دیا ہے اور نصف باقی چھوڑا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: "اللہ اس میں بھی برکت دے جو تو نے صدقہ کیا اور اس میں بھی جو تو نے روک لیا"۔ ایک شخص ابو عقیل ایک صاع کھجور لے کر آیا کہ حضور میرے پاس دو صاع کھجور ہی تھے۔ میں نے ایک صاع اپنے اہل و عیال کو دے دیا ہے اور ایک بطور صدقہ لایا ہوں۔ کہتے ہیں منافقین نے اس پر یہ طعن کیا کہ ابن عوف نے بطور ریاکاری اس قدر مال دیا ہے اور ابن عقیل کے صدقہ سے کیا اللہ اور رسول اللہ کو اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔

بعض دوسری روایات میں آیا ہے کہ انہوں نے ابن عقیل کے بارے میں کہا کہ وہ اپنا نام لکھوانا چاہتا تھا' حالانکہ اس شخص نے پوری رات ایک یہودی کے ہاں مزدوری کی' اس نے اسے دو صاع کھجوریں دیں جس میں ایک صاع اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کی۔

اس کے بعد ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ یہ رونے والوں کا گروہ تھا۔ یہ گروہ سات انصاریوں پر مشتمل تھا۔ یہ غریب لوگ تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ارض جہاد تک ان کو سواری فراہم کی جائے تو حضورؐ نے فرمایا اب تو میرے پاس کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ لوگ لوٹ گئے لیکن ان کی آنکھیں خون کے آنسو رو رہی تھیں' اس لیے کہ ان کو سواری نہ مل سکی اور خود وہ غریب تھے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ ابن یامین ابن عمیر ابن کعب 'نضری ابویعلی عبدالرحمن ابن کعب اور عبداللہ ابن مغفل سے ملا (یہ ان سات آدمیوں میں سے تھے) یہ رو رہے تھے تو اس نے پوچھا تم رو کیوں رہے ہو؟ انہوں نے کہا ہم رسول اللہ کے پاس آئے تھے کہ آپ ہمیں سواری عطا کریں تو آپ کے پاس کوئی گنجائش نہیں رہی اور

خود ہماری مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ ہم بندوبست کر سکیں۔ چنانچہ اس کے پاس پانی کھینچنے والا ایک اونٹ تھا' اس نے ان کو دے دیا۔ یہ دونوں اس پر سوار ہو کر چل پڑے۔ اس نے ان کو کچھ کھجوریں بھی دے دیں اور یہ دونوں رسول اللہ کے ساتھ ہی چل پڑے۔

یونس ابن بکیر نے ابن اسحاق سے مزید یہ روایت کی ہے کہ علیہ ابن زید جو ان سات رونے والوں میں سے ایک تھا' رات کو نکلا اور رات کو نماز پڑھتا رہا اور روتا رہا۔ اور دعا مانگتا رہا۔ اے اللہ تو نے جہاد کا حکم دیا ہے اور اس کی ترغیب بھی دی ہے لیکن یہ آپ ہی ہیں جس نے مجھے غریب پیدا کیا ہے' پھر آپ ہی نے رسول اللہ کو اس قدر مالی وسائل نہ دیئے کہ وہ مجھے سواری عطا کرتے' اے اللہ میں اپنی تمام تکالیف کا اجر خواہ ان کا تعلق میری ذات سے ہو' میرے مال سے ہو' میری آبرو سے' تمام مسلمانوں پر صدقہ کرتا ہوں۔

صبح ہوئی تو یہ شخص بھی تمام اہل اسلام میں آکر بیٹھ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا آج رات جس شخص نے صدقہ کیا ہے وہ کہاں ہے؟ کوئی شخص نہ اٹھا' پھر حضورؐ نے فرمایا: "کون ہے آج رات کو صدقہ کرنے والا' اسے چاہئے کہ وہ کھڑا ہو جائے' یہ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے حضورؐ کے سامنے رات کا واقعہ پیش کیا۔ رسول اللہ نے فرمایا: تمہارے لیے خوشخبری ہے' خدا کی قسم تمہارے لیے آنے والی زکوٰۃ میں لکھ دیا گیا ہے"۔

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نکلے' آپؐ کے ساتھ مدینہ و اطراف مدینہ سے تقریباً تیس ہزار افراد تھے۔ مسلمانوں میں سے بعض لوگوں کی نیت سست رہی لیکن کسی شک یا بے یقینی کی وجہ سے نہیں' ان میں کعب ابن مالک' مرارہ ابن الربیع اور ہلال ابن امیہ شامل تھے (یہ وہی تین افراد ہیں جن کے بارے میں تفصیلات آ رہی ہیں) نیز ابو حیثمہ' عمر ابن وھب الجمحی حضورؐ نے ثنیۃ الوداع میں لشکر کا پڑاؤ کیا اور عبداللہ ابن ابی رئیس المنافقین نے اپنے لشکر کو علیحدہ نیچے کی طرف فروکش کیا۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ یہ لوگ دو لشکروں سے کم تھے' لیکن دوسری روایات بتاتی ہیں کہ جو لوگ عملاً رک گئے وہ سو سے کم تھے۔ جب حضورؐ چلے گئے تو عبداللہ ابن ابی اپنے منافقین اور اہل شک ساتھیوں کے ساتھ واپس لوٹ گیا۔

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر روانہ ہوا۔ بعض لوگ آپ سے پیچھے رہ جاتے' لوگ کہتے حضورؐ فلاں تو راستے میں رہ گیا۔ حضور فرماتے چھوڑو اسے اگر اس میں کوئی بھلائی ہوئی تو ہمارے ساتھ آ ملے گا اور اگر اس میں کوئی بھلائی نہ ہوئی تو اللہ نے اسے ہٹا کر تمہیں مطمئن کر دیا۔ یہاں تک کہ حضورؐ سے کہا گیا کہ ابوذر بھی پیچھے رہ گئے ہیں حالانکہ ان کا اونٹ سست رفتار تھا تو حضورؐ نے یہی فرمایا: اسے چھوڑو' اگر اس میں کچھ بھی بھلائی ہوئی تو اللہ اسے تمہارے ساتھ ملا دے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو اللہ نے تمہیں اس سے آرام میں کر دیا"۔ ابوذر نے اپنے اونٹ کا انتظار کیا۔ جب اونٹ کی رفتار مزید سست ہوئی تو اس نے اپنا سامان خود اپنے کاندھوں پر لیا اور رسول اللہ کے پیچھے چلتا رہا۔ حضورؐ کسی جگہ فروکش تھے کہ کسی نے خبر دی کہ حضور ایک شخص پیدل چلتا ہوا آ رہا ہے تو حضورؐ نے فرمایا= "خدا کرے ابوذر ہو"۔ جب لوگوں نے اسے اچھی طرح دیکھا تو پکار اٹھے حضور یہ ابوذر ہی ہے۔ تو حضورؐ نے فرمایا= "اللہ ابوذر پر رحم فرمائے کہ وہ اکیلا چل رہا ہے' اکیلا رہے گا اور اکیلا قیامت کے دن اٹھایا جائے گا"۔

پھر ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکلے ہوئے چند دن ہوئے تھے کہ ایک دن سخت گرمی تھی اور ابو حیثمہ گھر آئے' دیکھا کہ اس کے باغ میں اس کی دونوں عورتوں نے اپنی اپنی جھونپڑیوں میں چھڑکاؤ کیا ہوا ہے۔ پانی ٹھنڈا کیا ہوا

ہے 'کھانا تیار کیا ہوا ہے' جب وہ اندر آئے تو ایک جھونپڑی کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ اس نے اپنی دونوں بیویوں کو دیکھا اور انہوں نے اس کے لیے جو تیاری کی تھی اس پر بھی نگاہ ڈالی تو چیخ اٹھے 'اوہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو گرمی میں شرابور ہیں اور لو میں چل رہے ہیں اور ابوحیثمہ یہاں ٹھنڈی چھاؤں' خوبصورت عورتوں مین کھا پی رہا ہے اور اپنے مال میں مقیم ہے۔ یہ تو کوئی انصاف کی بات نہیں ہے؟ اس کے بعد اس نے کہا: خدا کی قسم میں تم میں سے کسی ایک کی جھونپڑی میں داخل نہ ہوں گا جب تک میں رسول اللہ تک جا نہ پہنچوں۔ لہذا دونوں میرے لیے زاد راہ تیار کرو' دونوں نے تیار کیا' پھر اپنے آس پاس کے اونٹ کو تیار کیا اور رسول اللہ کی تلاش میں نکلے۔ یہ حضورؐ کے پاس اس وقت پہنچے جب حضورؐ میدان تبوک میں تھے۔ ابوحیثمہ کو ایک دوسرے شخص عمیر ابن وھب الجمی بھی راستے میں مل گئے تھے۔ یہ بھی رسول اللہ کی تلاش میں تھے۔ لہذا دونوں ساتھی بن گئے تھے۔ جب یہ دونوں تبوک کے قریب پہنچے تو ابوحیثمہ نے عمیر سے کہا: بھائی میں تو قصور وار ہوں اس لیے آپ ذرا پیچھے رہ جائیں تاکہ میں حضور کے ہاں حاضری دے دوں' عمیر ابن وھب ذرا رک گئے جب یہ حضورؐ کے قریب پہنچ گئے' اس وقت حضورؐ تبوک میں اترنے ہی والے تھے' تو لوگوں نے کہا راستے میں ایک شخص دوڑتا ہوا آرہا ہے تو حضورؐ نے فرمایا: "خدا کرے ابوحیثمہ ہو"۔ تو لوگوں نے کہا: حضورؐ خدا کی قسم وہ ابوحیثمہ ہی ہے۔ اس نے اونٹ کو بٹھایا اور حضورؐ کو سلام کیا تو حضورؐ نے اسے کہا: "ابوحیثمہ تمہارے لیے بہت اچھا ہوا"۔ (یہ لفظ سرزنش کا تھا) اس کے بعد ابوحیثمہ نے حضورؐ کو پوری کہانی سنائی تو حضورؐ نے اس کے عمل کو پسند کیا اور دعا فرمائی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ منافقین کا ایک گروہ' جس میں ودیعہ ابن ثابت برادر بنی عمر ابن عوف اور ایک اشجعی جو بنی سلمہ کا حلیف تھا' اس کا نام مخشن ابن حمیر تھا اور اسے مخشی بھی کہتے تھے' یہ کہتا تھا تم رومیوں کے ساتھ جنگ کو عربوں کی باہم لڑائیوں پر قیاس کرتے ہو۔ ان کا اشارہ رسول اللہ کے سفر تبوک کی طرف تھا۔ یہ لوگ کہتے خدا کی قسم ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم لوگ رسیوں میں باندھے جا رہے ہو' یہ لوگ مومنین کے اندر بددلی پیدا کر رہے تھے۔ مخشن ابن حمیر نے کہا: "خدا کی قسم تم جو باتیں کر رہے ہو' اگر ہمارے بارے میں یہ فیصلہ ہو کہ ہمیں سو سو کوڑے لگائے جائیں اور ہمارے بارے میں قرآن نازل نہ ہو تو یہ فیصلہ مجھے پسند ہو گا"۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حضورؐ نے ان کے پاس عمار ابن یاسر کو بھیجا اور کہا: "ان لوگوں کو سنبھالو یہ تو جل گئے۔ تو عمار ان سے پوچھو کہ تم کیا باتیں کر رہے ہو؟ اگر وہ انکار کریں تو انسے یہ یہ کہو۔ عمار ان کے پاس گئے' ان سے وہ بات کی' یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آگئے اور معذرت کی۔ ودیعہ ابن ثابت نے کہا: (اس وقت رسول اللہ اپنی اونٹنی پر کھڑے تھے' ودیعہ نے اس وقت حضورؐ کے اونٹ کی وہ رسی پکڑی ہوئی تھی جو پیٹ پر باندھی جاتی ہے' اور یہ کہہ رہا تھا "حضور ہم تو گپ شپ لگا رہے تھے" اس پر یہ آیت نازل ہوئی

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِءُونَ (۹: ۶۵) "اگر تم ان سے پوچھو تو کہیں گے ہم تو ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ کہہ دیجئے کہ اللہ' اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ تم مذاق کر رہے تھے"۔ مخشن ابن حمیر نے کہا اور اس آیت میں جن لوگوں کو

معاف کیا گیا تھا ان میں سے مخشن ابن حمیر بھی تھا۔ اس نے اپنا نام عبدالرحمٰن رکھ لیا۔ اس نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ وہ اسے شہید کے طور پر مارے اور اس کی شہادت یوں ہو کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں مارا گیا۔ چنانچہ جنگ یمامہ میں وہ مارا گیا۔ لیکن کسی کو اس کا کوئی اتا پتہ نہ ملا۔

ابن لہیعہ نے عروہ ابن زبیر سے بواسطہ ابوالاسود روایت کی ہے کہ جب حضور تبوک سے واپس ہوئے، حضور نے دس سے کچھ زیادہ راتیں وہاں گزاریں اور وہاں کوئی جنگ نہ ہوئی تو بعض منافقین نے آپ کے قتل کی سازش تیار کی۔ راستے میں ایک گھاٹی آتی تھی۔ راستہ تنگ تھا، ان لوگوں نے سوچا کہ حضورؐ کو اس گھاٹی سے گرا دیں، اللہ تعالیٰ نے اس بات کی اطلاع حضورؐ کو دے دی، آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ وادی سے نکلیں اور آپ گھاٹی پر چڑھ گئے اور یہ سازشی آپ کے ساتھ تھے۔ انہوں نے اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔ حضورؐ نے اس موقعہ پر عمار ابن یاسر اور حذیفہ ابن یمان کو حکم دیا کہ یہ دونوں آپ کے ساتھ رہیں، عمار نے لگام تھام رکھی تھی اور حذیفہ پیچھے سے اسے چلا رہے تھے۔ یہ لوگ جا رہے تھے کہ یہ سازشی چڑھ آئے، حضورؐ کو سخت غصہ آیا اور حذیفہ نے بھی حضور کی غضبناکی کو محسوس کر لیا۔ حذیفہ ان لوگوں کی طرف لوٹے اور ان کے پاس ایک ڈھال تھی انہوں نے اپنی ڈھال سے ان کی سواریوں کو روکا تو جب ان سازشیوں نے دیکھا کہ حذیفہ ان کی طرف بڑھ رہے ہیں تو ان کو معلوم ہو گیا کہ جو عظیم سازش انہوں نے تیار کی تھی وہ تو طشت ازبام ہو گئی ہے۔ یہ لوگ بھاگے اور لوگوں میں مل گئے۔ حضرت حذیفہ بھی واپس لوٹے اور حضورؐ کے ساتھ جا ملے، حضورؐ نے دونوں کو حکم دیا کہ جلدی کریں تو انہوں نے اس دشوار گزار راستے کو طے کر لیا۔ اب حضورؐ کھڑے ہو گئے اور لوگوں کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ پھر حضورؐ نے حذیفہ سے کہا "کیا تم نے ان لوگوں کو پہچانا؟" تو حذیفہ نے کہا کہ میں نے رات کے اندھیرے میں جب انہیں گھیرا تو میں صرف ان کی سواریوں کو دیکھ سکتا تھا۔ پھر حضورؐ نے فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ ان لوگوں کے ارادے کیا تھے؟" دونوں نے کہا نہیں۔ تو حضورؐ نے بتایا کہ یہ لوگ حضورؐ پر برے ارادے سے حملہ کرنا چاہتے تھے، حضورؐ نے ان دونوں کو ان کے نام بھی بتا دیئے تو انہوں نے کہا حضورؐ کیا آپ اجازت نہیں دیتے کہ ہم انہیں قتل کر دیں تو حضورؐ نے فرمایا کہ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ لوگ کہیں کہ محمدؐ نے اپنے ساتھی قتل کرنا شروع کر دیئے۔

اس قصے کو ابن کثیر نے بھی نقل کیا ہے لیکن اس میں یہ کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے صرف حذیفہ ابن یمان کو ان لوگوں کے نام بتائے تھے اور یہ زیادہ مناسب ہے۔ اس مہم میں مسلمانوں کو جو مشکلات درپیش ہوئیں اس کے بارے میں بعض روایات وارد ہیں۔ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں اور دوسرے مفسرین بھی فرماتے ہیں کہ یہ آیت غزوۂ تبوک کے بارے میں ہے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

(۹:۱۱۷) "اللہ نے معاف کر دیا نبیؐ کو اور ان مہاجرین و انصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبیؐ کا ساتھ

دیا۔ اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے' (مگر جب انہوں نے اس کجی کا اتباع نہ کیا بلکہ نبی ﷺ کا ساتھ دیا تو) اللہ نے انہیں معاف کر دیا' بے شک اس کا معاملہ ان لوگوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے''۔

یہ اس طرح کہ مسلمان اس جنگ کے لیے نہایت ہی مشکل حالات میں نکلے تھے' یہ سال خشک سالی کا تھا' سخت گرمی تھی اور راشن اور پانی کی بے حد تکلیف تھی۔ قتادہ کہتے ہیں لوگ شام کی طرف بطرف تبوک نکلے' جھلسا دینے والی دھوپ تھی' اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ لشکر کن مشکلات میں نکلا' راستے میں اس قدر مشکلات پیش آئیں کہ دو افراد ایک کھجور کو نصف کر کے چوستے اور بعض اوقات ایک ہی کھجور کو باری باری چوستے اور اوپر پانی پی لیتے تو اللہ نے ان پر یہ مہربانی فرمائی کہ ان کے لشکر کو تبوک سے واپس کر دیا۔

ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ عبداللہ ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر سے پوچھا گیا کہ جنگ تبوک کی سختیاں کیسی تھیں؟ تو انہوں نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تبوک کی طرف نکلے' ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں پانی نہ تھا' لوگ پیاس سے نڈھال ہو گئے' یوں نظر آتا شاید ہماری گردنیں تن سے جدا ہو جائیں گی' ایک شخص پانی کی تلاش میں پھرتا' مایوس ہو کر اسے یوں لگتا کہ شاید اس کا سر تن سے جدا ہو کر گر پڑے گا' لوگ اونٹ ذبح کر کے اس اوجھ سے غلاظت کو نچوڑتے تھے اور اس سے پیاس بجھاتے تھے اور باقی حصہ اپنے جگر پر ملتے تھے۔

ابن جریر لکھتے ہیں کہ ساعۃ العسرۃ سے مراد یہ ہے نفقہ' سواری اور پانی کی تنگی تھی اور

مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ (۹:۱۱۷) سے مراد یہ ہے کہ ان کے دل سچائی سے کجی کی طرف مائل ہونے کو تھے۔ اس سفر میں لوگ اس قدر مشقت سے دوچار ہوئے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے دین میں شک کرنے لگے تھے لیکن اللہ نے ان کی طرف رجوع کیا۔ وہ حق کی طرف مائل ہو گئے اور انہوں نے ثابت قدمی اختیار کی۔ بے شک اللہ کا برتاؤ نہایت ہی مہربانی کا تھا۔ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (۹:۱۱۷) ان حوالوں سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اس غزوہ میں حالات کس قدر دگرگوں تھے اور اس میں ایک مسلمان کے لمحات کس قدر مشکل سے گزر رہے تھے' انسانوں کی ایمانی کیفیت میں لحہ بہ لحہ کس طرح تبدیلی ہو رہی تھی' بعض لوگ تو پختہ یقین کے مالک تھے' بعض لوگ اس غزوے کی مشکلات میں متزلزل ہو گئے' کچھ بیٹھ ہی گئے' بعض دین کو سچا سمجھتے ہوئے سستی کر گئے' بعض نفاق کا شکار ہو گئے' بعض دشمنی پر اتر آئے' بعض سازشیں کرنے لگے۔ ان واقعات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی اسلامی سوسائٹی میں کیسے کیسے لوگ موجود تھے' جبکہ اسلامی سوسائٹی نہایت ہی نامساعد حالات کے باوجود رومیوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی تھی' ان مشکل حالات میں اس مہم کا برپا کرنا درحقیقت کھرا کھوٹا معلوم کرنا تھا' اللہ تعالیٰ کی منشاء یہ تھی اسلامی سوسائٹی میں سے کھوٹے لوگ چھٹ کر رہ جائیں اور یہ فیصلہ اللہ نے اس لیے فرمایا تھا کہ کھرے کھوٹے کو صاف صاف جدا کر دیا جائے۔

یہ تھے وہ مشکل حالات جن میں پیچھے رہنے والے پیچھے رہ گئے اور ان میں سے اکثریت منافقین کی تھی جن کی تفصیلات اس سے قبل بیان ہو چکی ہیں اور بعض سچے مسلمان بھی تھے جو شک و نفاق کی وجہ سے نہیں بلکہ محض سستی' کاہلی اور آرام طلبی کی وجہ سے رہ گئے تھے' یہ لوگ دو گروہ تھے۔ ایک گروہ تو وہ تھا جن کے بارے میں فیصلہ پہلے ہو چکا ہے' یہ وہ

لوگ تھے جن کے اعمال خلط ملط تھے ' بعض اچھے تھے اور بعض برے تھے ۔ انہوں نے اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کر لیا تھا اور دوسری جماعت وہ تھی ۔

مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ اِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ (۹ : ۱۰۶) "جن کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا گیا تھا کہ یا ان کو سزا دے دے یا معاف کر دے " ۔ اور یہ لوگ تین افراد تھے ۔ ان کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا تھا اور فیصلے کا انتظار تھا ۔ ان کے معاملے کی تفصیلات درج ذیل ہیں اور یہ فیصلہ بڑی تاخیر سے آیا تھا ۔ آیت ان کے حال کی جس طرح تصویر کشی کر رہی ہے ' اس کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل ہم چاہتے ہیں کہ ان میں سے ایک شخص خود اپنے حالات کو بتائے ۔ یہ ہیں حضرت کعب ابن مالک ۔ امام بخاری اور امام مسلم نے زہری ' عبدالرحمن ابن عبداللہ ابن کعب ابن مالک ' یہ بنی کعب کے سربراہ تھے اور اندھے ہو گئے تھے ۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے کعب ابن مالک سے خود یہ بات سنی ہے کہ وہ کس طرح رسول اللہ سے پیچھے رہ گئے تھے ۔ کعب کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ کے تمام غزوات میں ان کے ساتھ رہا ' سوائے تبوک کے ۔ ہاں غزوۂ بدر میں بھی میں شریک نہ تھا لیکن اس وقت رسول اللہ اور مسلمان قریش کے قافلے پر حملے کے ارادے سے نکلے تھے اور اچانک دشمن کے ساتھ مڈ بھیڑ ہو گئی تھی اور اس غزوے میں جو لوگ شریک نہ ہوئے تھے ان میں سے کسی سے حضورؐ نے بازپرس بھی نہ فرمائی تھی ۔

میں عقبہ ثانیہ کی رات بھی حاضر تھا جب ہم نے اسلام قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی ۔ میں اس بات کی تمنا نہیں کرتا کہ لیلۃ عقبہ کے بدلے میں ' میں بدر میں ہوتا ' اگرچہ لوگوں میں بدری ہونا زیادہ قابل فخر ہے ۔ تو میرے پیچھے رہنے کی کہانی یہ ہے کہ جن حالات میں ' میں پیچھے رہ گیا ان میں میرے مالی و جسمانی حالات بہت اچھے تھے اور اس وقت جس قدر میں خوش حال تھا ایسا کبھی نہ تھا ۔ اس سے قبل میرے پاس کبھی دو سواریاں نہ تھیں ۔ اس غزوہ کے موقعہ پر میں نے دو سواریاں تیار کی تھیں ۔ اس سے قبل رسول اللہ جو مہم شروع کرتے اسے نہایت ہی خفیہ رکھتے اور ان کا ظاہری اشارہ دوسری طرف ہوتا ۔ یہ مہم حضورؐ نے سخت گرمی میں شروع کی ۔ اس میں سفر دوری کا تھا ' راستے میں نشیب و فراز تھے اور دشمن کی تعداد زیادہ تھی ۔ حضورؐ نے احکامات صادر کر دیئے کہ اس مہم کے لیے تیاری کروں ' لوگوں کو صاف صاف بتا دیا گیا کہ آپ کس طرف جانا چاہتے ہیں ۔ اب مسلمان اس قدر زیادہ ہو گئے تھے کہ ان کی تعداد کو کوئی کتاب منضبط نہ کر سکتی تھی ۔

کعب فرماتے ہیں کہ جو شخص بھی چھپنا چاہتا تھا وہ یہی سمجھتا تھا کہ جب تک وحی نازل نہ ہو اس کا حال چھپا ہی رہے گا ۔ یہ مہم حضورؐ نے اس وقت شروع کی جب پھل پک گئے تھے ' باغوں کے سائے گہرے تھے اور میں ان کا دلدادہ تھا ۔ حضورؐ نے اس جنگ کے لیے تیاری کی ' تمام مسلمان آپ کے ساتھ تھے ' میں بھی روز سوچتا کہ جاؤں اور مسلمانوں کے ساتھ تیاری کروں ' مگر میں بغیر کسی فیصلے کے لوٹ آتا ۔ میں دل میں کہتا اچھا تیاری کی کیا ضرورت ہے ' جب چاہوں گا لشکر کے ساتھ ہو لوں گا ۔ وقت یونہی گزرتا رہا یہاں تک کہ تیاریوں میں تیزی آگئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوچ فرما گئے ' مسلمان آپ کے ساتھ تھے اور میں نے اپنی تیاری کے بارے میں کوئی فیصلہ بھی نہ کیا تھا ۔ وقت یونہی گزرتا رہا ۔ قافلہ تیزی سے گزر گیا اور میرے ہاتھ سے یہ غزا نکل گئی ۔ میں نے ارادہ کیا کہ نکل جاؤں اور ان کو پالوں ' کاش کہ میں

نے ایسا کیا ہوتا' لیکن مجھے توفیق نہ ہوئی' اب میری حالت یہ ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب میں باہر نکلتا تو میں دیکھتا کہ میرا کوئی ساتھی نہیں ہے نہ میری مثال ہے' صرف وہ لوگ مدینہ میں ہیں جو مشہور منافق ہیں' یا وہ لوگ ہیں جو معذور ہیں۔ رسول اللہ نے تبوک تک جاتے ہوئے راستے میں میرا تذکرہ بالکل نہیں کیا' جب آپ تبوک پہنچ گئے تو دوستوں میں بیٹھے ہوئے آپ نے صرف اس قدر فرمایا: "کعب نے کیا کیا؟" بنی سلمہ کے ایک شخص نے کہا حضورؐ اسے اس کی دو چادروں اور غرور نے مصروف رکھا۔ اس پر معاذ ابن جبل نے فرمایا' تم نے بہت بری بات کی ہے۔ رسول خدا! خدا کی قسم ہم نے کعب میں ماسوائے خیر کے اور کچھ نہیں دیکھا۔ اس پر حضورؐ خاموش ہو گئے۔

کعب کہتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس ہوئے تو مجھے پریشانی لاحق ہوئی۔ میں جھوٹ یاد کرنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ کل رسول خدا کے غضب سے مجھے کس طرح نجات ملے گی۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے خاندان کے تمام اہل الرائے سے مدد لی۔ جب یہ آواز آئی کہ حضورؐ آپہنچے ہیں تو میرے ذہن سے تمام جھوٹے بہانے چھٹ گئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں اس بحران سے صرف سچائی کے ذریعے نجات پا سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے سچی بات دل میں بٹھا لی۔ جب حضور پہنچے تو آپ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ مسجد تشریف لے جاتے' دو رکعت نماز پڑھتے اور لوگوں میں بیٹھ جاتے۔ حضورؐ بیٹھے تو پیچھے رہنے والے پہنچ گئے اور عذرات پیش کرتے اور قسمیں کھاتے۔ یہ لوگ اسی افراد سے کچھ اوپر تھے' تو حضورؐ نے ان کے ظاہری عذرات کو قبول کر لیا' ان سے بیعت لی اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔ اور ان کی اندرونی حالت کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ میری باری آئی۔ جب میں نے سلام کیا تو حضورؐ کے ہونٹوں پر ایک غضبناک تبسم تھا۔ مجھے کہا "آؤ"۔ میں چلتا ہوا حضورؐ کے سامنے بیٹھ گیا تو حضورؐ نے پوچھا: بتاؤ تمہیں کس چیز نے روک دیا۔ کیا تو نے سواری نہیں خرید لی تھی؟" میں نے کہا رسول خدا اگر میں کسی اور شخص کے سامنے بیٹھا ہوتا ایک دنیا دار حکمران کے سامنے تو میں سمجھتا تھا کہ میں کوئی بہانہ بنا کر اس کے غضب سے بچ سکتا تھا' آپ کو معلوم ہے کہ میں بات کرنا جانتا ہوں' لیکن خدا کی قسم مجھے یقین تھا کہ آج اگر میں جھوٹے عذرات پیش کر کے آپ کو راضی کر لوں تو اللہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا اور اگر میں سچ کہوں تو بے شک آپ تو ناراض ہو جائیں گے لیکن مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آخر کار مجھے معاف کر دے گا۔ خدا کی قسم میرا کوئی عذر نہ تھا اور جن حالات میں' میں آپ سے پیچھے رہا' ان جیسے اچھے حالات میرے کبھی نہ تھے۔ اس پر رسول اللہ نے فرمایا: "اس شخص نے تو سچ کہا ہے' اچھا جاؤ اور تمہارا فیصلہ خود اللہ کرے گا"۔ میں اٹھ گیا' میرے قبیلے بنی سلمہ کے لوگ پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا خدا کی قسم ہمیں معلوم نہیں ہے کہ اس سے قبل تم نے کوئی گناہ کیا ہو' کیا یہ ممکن نہ تھا کہ تم حضورؐ کے سامنے کوئی عذر پیش کر دیتے جیسا کہ تمام دوسرے لوگوں نے حضورؐ کے سامنے عذرات پیش کیے۔ کیا یہ کافی نہ تھا کہ رسول اللہ تمہارے لیے اس گناہ پر طلب مغفرت کر دیتے۔ خدا کی قسم مجھے اسی طرح ملامت کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے ارادہ کر لیا کہ میں دوبارہ حضورؐ کے پاس جاؤں اور اپنے آپ کو جھوٹا کروں۔ یعنی اپنے سابقہ بیان کو واپس لے لوں۔ میں نے برادران قوم سے کہا: کیا میرے ساتھ جو سلوک ہوا وہ کسی اور کے ساتھ بھی ہوا ہے یا نہیں؟ تو انہوں نے کہا: ہاں دو افراد کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا ہے۔ انہوں نے بھی یہی بات کہی جو تم نے کہی۔ میں نے کہا: وہ کون ہیں؟ تو انہوں نے بتایا مرارہ ابن ربیع اور امیہ الواقفی ہیں۔ انہوں نے جن دو آدمیوں کا تذکرہ کیا وہ نیک لوگ تھے' دونوں بدری تھے' میں نے سوچا کہ میں ان کی پیروی کروں گا تو میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے موقف پر قائم

رہوں گا جب ان دو آدمیوں کا ذکر ہوا۔

کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ہمارے ساتھ بات کرنے سے منع کر دیا۔ یہ حکم ہم تین افراد کے بارے میں تھا۔ ہم نے دیکھا کہ لوگ اچانک اجنبی بن گئے ہیں۔ ان کا رویہ ہمارے ساتھ ایک دم بدل گیا۔ یہاں تک کہ ہمیں مدینہ کی سرزمین بھی اجنبی محسوس ہونے لگی۔ زمین یوں نظر آتی گویا ہم نے اسے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے۔ پچاس شب و روز یوں ہی گزر گئے۔ میرے دو سرے دو ساتھی تو گھروں میں بند ہو کر رہ گئے۔ لیکن میں بہت ہی سخت جان تھا۔ میں گھر سے نکلتا اور مسلمانوں کے ساتھ نماز بھی پڑھتا' بازاروں میں بھی پھرتا مگر کوئی شخص مجھ سے بات نہ کرتا۔ میں رسول اللہ کے پاس بھی جاتا' سلام کرتا آپ مجلس میں بیٹھے ہوتے۔ نماز کے بعد اور میں سوچتا کہ حضورؐ نے وعلیکم السلام کہتے ہوئے ہونٹ ہلاتے ہیں یا نہیں۔ پھر میں نماز بھی حضورؐ کے قریب پڑھتا اور دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتا رہتا۔ جب میں نماز میں ہوتا تو حضورؐ میری طرف دیکھتے اور جب میں حضورؐ کی طرف متوجہ ہوتا تو حضورؐ منہ موڑ لیتے۔ مسلمانوں کا یہ سوشل بائیکاٹ جب بہت ہی طویل ہو گیا تو میں ابو قتادہ کی دیوار پر چڑھ گیا۔ یہ میرے چچازاد بھائی تھے اور مجھے ان سے بہت ہی محبت تھی' میں نے سلام کیا۔ خدا کی قسم اس نے بھی سلام کا جواب نہ دیا۔ میں نے اسے کہا: اے ابو قتادہ' خدا کے لیے گواہی دو' کیا میں خدا اور رسول کے ساتھ محبت نہیں رکھتا؟ کہتے ہیں کہ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے دوبارہ اپنی بات دہرائی اور اسے قسم دی کہ تم سچی بات کرو' تو اس نے صرف یہ کہا اللہ اور رسول اللہ زیادہ جانتے ہیں' کہتے ہیں کہ میرے آنسوؤں کی لڑیاں لگ گئیں اور میں دیوار پھلانگ کر واپس ہو گیا۔

اور ایک دن یوں ہوا کہ میں مدینہ کے بازاروں میں پھر رہا تھا کہ شام کے نبطیوں میں سے ایک نبطی جو بازار میں غلہ فروخت کر رہا تھا' یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے کعب کے گھر کا راستہ کون بتاتا ہے؟ لوگوں نے اشارہ کیا کہ کعب تو وہ رہا۔ وہ آیا اور اس نے مجھے ایک خط دیا۔ یہ بادشاہ غسان کی طرف سے تھا۔ میں نے خط کو پڑھا اس کا مضمون یہ تھا:

"اما بعد' ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے لیڈر نے تم پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ اللہ نے تو تمہیں ذلت اور بربادی کے شہر میں نہیں رکھا۔ آپ ہمارے ساتھ مل جائیں' ہم تمہارے ساتھ ہمدردی کریں گے"۔ جب میں نے خط پڑھا تو کہا یہ ایک دوسری آزمائش ہے۔ چنانچہ میں نے اس خط کو جلتے ہوئے تنور میں ڈال دیا۔ پچاس راتوں میں سے ابھی چالیس ہی گزری تھیں کہ رسول خداؐ کا ایک پیغام لانے والا آیا اور کہا کہ رسول خداؐ حکم دیتے ہیں کہ تم اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کر لو۔ تو میں نے اس سے پوچھا کہ میں اسے طلاق دے دوں یا انہوں نے کیا کہا ہے؟ اس نے کہا بیوی سے علیحدگی اختیار کر لیں۔ اس کے قریب نہ جائیں اور دوسرے دو ساتھیوں کو بھی ایسا ہی پیغام دیا گیا۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا تم اپنے میکے چلی جاؤ یہاں تک کہ اللہ اس معاملے کا فیصلہ کر دے۔ ہلال ابن امیہ کی بیوی رسول خداؐ کے پاس آئی اور کہا رسول خداؐ ہلال تو بہت بوڑھا ہے اور اس کا کوئی خادم نہیں کیا آپ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ میں اس کی خدمت کروں؟ تو آپؐ نے فرمایا "نہیں کرو' لیکن وہ آپ کے قریب نہ آئے' تو اس نے کہا کہ اس کی حالت یہ ہے کہ وہ کسی چیز کی طرف حرکت ہی نہیں کر سکتا اور خدا کی قسم وہ تو اس وقت سے رو رہا ہے۔ جب سے اس کے بارے میں یہ احکامات صادر ہوئے ہیں۔ تو میرے بعض رشتہ داروں نے کہا کہ اگر آپ بھی رسول خدا سے اپنی بیوی کے بارے میں اس قسم کی اجازت حاصل کر لیں؟ کیونکہ ہلال کی بیوی کو اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ اس کی خدمت کرے۔ میں نے کہا خدا کی

قسم میں اس بارے میں حضورؐ سے اجازت نہیں مانگوں گا۔ مجھے معلوم نہیں کہ حضورؐ اجازت دیتے ہیں یا نہیں کیونکہ میں ایک نوجوان آدمی ہوں۔

ایسے حالات میں دس شب و روز مزید گزر گئے۔ پچاس شب و روز مکمل ہو گئے اور لوگوں نے ہم سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ پچاسواں دن تھا کہ میں اپنے گھروں میں سے ایک گھر کے اوپر صبح کی نماز پڑھ رہا تھا۔ میں ایسے حال میں تھا جس کا ذکر اللہ نے خود فرمایا ہے کہ میرا دل تنگ ہو گیا تھا' اور زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ہم پر تنگ ہو گئی تھی کہ اچانک میں نے جبل سلع پر سے ایک اونچی آواز سنی۔ پکارنے والا پکار رہا تھا: اے کعب ابن مالک! خوشخبری ہے۔ میں سجدے میں گر گیا۔ معلوم ہو گیا کہ مشکل دور ہو گئی۔ رسول خدا نے جب صبح کی نماز پڑھی تو ہماری توبہ قبول ہونے کا اعلان کر دیا۔ لوگ مبارک سلامت کرتے ہوئے ہمارے پاس پہنچ گئے۔ میرے دو ساتھیوں کی طرف بھی خوشخبری دینے والے دوڑ پڑے۔ ایک شخص نے میری طرف گھوڑا سرپٹ دوڑایا اور قبیلہ اسلم کا ایک شخص دوڑتے ہوئے میرے پاس آیا اور پہاڑ پر چڑھ گیا۔ چنانچہ اس کی آواز گھوڑے سے پہلے پہنچ گئی۔ جب وہ شخص آیا جس کی آواز خوشخبری میں نے سنی تھی تو میں نے اپنے کپڑے اتار دیئے اور اسے پہنا دیئے' یہ اس کی بشارت کا صلہ تھا۔ خدا کی قسم ان دنوں میرے پاس یہی ایک جوڑا تھا۔ میں نے عاریتاً مانگے اور پہن کر رسول خداؐ سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ لوگ فوج در فوج مجھ سے مل رہے تھے اور قبولیت توبہ پر مبارکبادیں دے رہے تھے۔ خدا کی جانب سے معافی قبول ہو۔ یہاں تک کہ میں مسجد میں داخل ہوا۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ مسجد میں بیٹھے ہوئے ہیں اور لوگ ان کے اردگرد بیٹھے ہیں۔ طلحہ ابن عبید کھڑے ہوئے اور دوڑ کر مجھے مبارکباد دی' خدا کی قسم اس کے سوا مہاجرین میں سے کوئی شخص میری طرف نہ اٹھا۔ حضرت کعب طلحہ کی اس محبت کو آخرت تک نہ بھولے۔

حضرت کعب فرماتے ہیں کہ جب میں حضورؐ کے پاس آیا اور سلام کیا تو حضورؐ کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ آپ نے فرمایا: "تم کو ایک ایسا دن مبارک ہو' جو تمہاری پیدائش سے لے کر موت تک اچھا دن ہے۔ میں نے کہا کہ حضور یہ معافی آپ کی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے؟ تو حضورؐ نے فرمایا نہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ حضورؐ جب بھی خوش ہوتے تو آپ کا چہرہ اس طرح چمکتا جس طرح آفتاب۔ ہم حضور اکرمؐ کی اس خصوصیت کو جانتے تھے۔ جب میں حضورؐ کے سامنے بیٹھا تو میں نے کہا: میں اپنا تمام مال اللہ اور رسول اللہ کے نام صدقہ کرتا ہوں۔ تو حضورؐ نے فرمایا تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ بعض حصہ اپنے لیے رکھ لو' تو میں نے کہا کہ خیبر میں میرا جو حصہ ہے وہ میں اپنے لیے رکھتا ہوں۔ میں نے کہا رسول خداؐ مجھے اللہ نے سچ کہنے کی وجہ سے بچا لیا اور میری توبہ یہ ہے کہ اپنی پوری عمر میں سوچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔ جب سے میں نے رسول اللہ سے یہ وعدہ کیا ہے' میں نے مسلمانوں میں سے کسی ایک کو بھی نہیں دیکھا کہ محض سچائی کی وجہ سے اس پر کوئی مصیبت آئی ہو۔ اور اس وقت سے لے کر آج تک میں نے جھوٹ کا کوئی لفظ اپنی زبان سے نہیں نکالا۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ میری جو زندگی باقی ہے اس میں بھی اللہ مجھے جھوٹ بولنے سے بچائے گا۔ اس موقعہ پر یہ آیات نازل ہوئیں لَقَدْ تَّابَ ------ (۹ : ۱۱۷) حضرت کعب فرماتے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد اللہ نے مجھ پر اس سے بڑا انعام نہیں فرمایا کہ میں نے بتوفیق الہی اللہ کے رسول کے سامنے سچ کہہ دیا۔ اگر میں اس دن جھوٹ بولتا تو اس طرح خوار ہوتا جس طرح جھوٹے عذرات گھڑنے والے خوار اور ہلاک ہوئے۔ ان لوگوں پر اللہ

نے ایسی تنقید فرمائی اور اس قدر برے ریمارکس ان کے بارے میں آئے جو کسی کے بارے میں قرآن میں نہیں آئے ' ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ نے فرمایا۔ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ اِنَّهُمْ رِجْسٌ وَّمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۹۵) يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (۹٦) (۹:۹۵ – ۹٦) "تمہاری واپسی پر یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے صرف نظر کرو ' تو بے شک تم ان سے صرف نظر ہی کرو 'کیونکہ یہ گندگی ہیں اور ان کا اصل مقام تو جہنم میں ہے ' جو ان کی کمائی کے بدلے میں انہیں نصیب ہوئی۔ یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ حالانکہ اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے تو اللہ ہرگز ایسے فاسق لوگوں سے راضی نہ ہو گا"۔

یہ ہے قصہ ان تین افراد کا جن کے بارے میں فیصلہ ملتوی کر دیا گیا تھا۔ جیسا کہ ان میں ایک حضرت کعب ابن مالک نے اسے تفصیلاً بیان کیا۔ اس قصے کے ہر فقرے میں ایک سبق ہے ' اس کے ہر فقرے میں وہ پختہ بنیاد درج ہے جس پر اسلامی معاشرے کو تعمیر ہونا ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرے کی بنیادیں پختہ اصولوں پر ہوتی ہیں اور اس کی تعمیر نہایت ہی پختگی سے کی جاتی ہے۔ اس میں اجتماعیت کا تصور صاف و ستھرا ہوتا ہے۔ اس میں دعوت زندگی میں مشکلات سامنے آتی ہیں۔ اس میں احکامات کی قدر و قیمت ہوتی ہے اور اس میں اطاعت پر زور دیا جاتا ہے۔

کعب ابن مالک اور ان کے دو ساتھیوں کی زندگی پر غور کرو ' یہ اس مشکل مہم میں حضورؐ سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ انسانی کمزوریاں ان پر غالب آ جاتی ہیں۔ پختہ پھل اور چھاؤں سخت گرمیوں میں ان کو اپنی طرف راغب کر لیتے ہیں۔ وہ سخت گرمی میں مشکلات سفر پر آرام کو ترجیح دے دیتے ہیں۔ لیکن حضرت کعب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چلے جانے کے بعد غلطی کو اچھی طرح محسوس کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے جانے کے بعد مدینہ کا ماحول ان کے لیے یہ تھا:

"مجھے یہ بات کھائے جا رہی تھی کہ مدینہ میں جن لوگوں کی پیروی میں نے کی وہ مشہور و معروف منافق ہیں یا وہ لوگ ہیں جو عند اللہ معذور ہیں یعنی ضعفاء اور مریض یا وہ لوگ جن کے پاس جانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ غرض اس مشکل مہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف ان لوگوں نے چھوڑا جو منافق تھے یا معذور تھے یا بہت غریب تھے ' باقی مسلمانوں نے ان مشکلات کا مقابلہ کیا اور مہم میں نکلے۔ اگرچہ سفر دور کا تھا ' تو معلوم ہوا کہ تحریک اسلامی کے ابتدائی کارکن نہایت ہی تربیت یافتہ اور نہایت ہی جفاکش تھے اور ان کی سخت ترین تربیت کی گئی تھی۔ یہ تو تھی ایک بات۔

دوسری بات یہ کہ یہ لوگ نہایت ہی متقی اور خدا سے ڈرنے والے تھے ' یہ تقویٰ ہی تھا جس نے ان لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ سچ کہیں اور غلطی کا اعتراف کر لیں اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیں۔ ذرا حضرت کعب کے الفاظ پر غور کریں:

"میں نے کہا اے رسولِ خدا اگر میں آپ کے علاوہ کسی اور دنیوی حکمران کے سامنے ہوتا تو آپ دیکھتے کہ میں اس کے غضب سے کوئی عذر تلاش کر کے نکل آتا۔ میں تو ایک قادر الکلام شخص ہوں ' لیکن اگر میں آپ کے سامنے جھوٹ بولوں اور جان چھڑا لوں تو ممکن ہے کہ اللہ کا غضب مجھے پکڑ لے۔ اور اگر میں آپ کے سامنے سچ کہوں اور آپ مجھ پر عتاب

کریں تو امید ہے کہ اللہ مجھے معاف کر دے گا۔ خدا کی قسم میرے پاس کوئی عذر نہیں ہے۔ میں تو ان دنوں اس قدر قوی اور خوشحال ہوں کہ ایسا کبھی نہ تھا لیکن میں پیچھے رہ گیا"۔ غرض غلطی کے مرتکب اس مومن کے ضمیر میں اللہ موجود ہے اور حاضر ہے' باوجود اس کے کہ یہ شخص رسول اللہ کی رضامندی کے حصول کے لیے بے تاب تھا' لیکن اس کے دل میں خدا کا خوف قوی تھا اور اسے پوری امید تھی کہ اللہ اسے معاف کر دے گا حالانکہ اس وقت رسول اللہ کی ناراضگی کے معنی یہ تھے کہ ایک ذلیل ہو جائے' خوار ہو جائے اور لوگ اشاروں کنایوں سے کہیں کہ یہ ہے منافق' یا لوگ ایسے شخص سے بات کرنا بھی پسند نہ کریں۔

حضرت کعب کے بیان کا یہ حصہ دیکھیں: "حضورؐ نے لوگوں کو ہم سے بات تک کرنے سے روک دیا۔ ہم تینوں سے جو پیچھے رہ گئے تھے' لوگ ہم سے اجنبی ہوگئے' چہرے ہی بدل گئے۔ یہاں تک کہ مدینہ کی زمین ہی ہمارے لیے اجنبی ہوگئی' یوں لگتا کہ شاید یہ زمین ہم نے پہلی مرتبہ دیکھی ہے' ہم سوچتے کہ کیا یہ وہی زمین نہیں ہے' چنانچہ ایسے ہی حالات میں پچاس دن گزر گئے' میرے دو دوسرے ساتھی تو چھپ کر گھروں میں لیٹ گئے۔ لیکن میں بہت ہی سخت جان تھا۔ میں مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ بازاروں میں پھرتا تھا لیکن کوئی بھی مجھ سے بات نہ کرتا۔ میں رسول اللہ کے پاس آتا' انہیں سلام کرتا' جب آپ نماز کے بعد مجلس صحابہ میں ہوتے' میں دل میں کہتا کہ آیا حضورؐ نے جواب سلام میں اپنے ہونٹوں کو حرکت دی ہے یا نہیں۔ پھر میں آپ کے قریب نماز پڑھتا اور دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتا۔ جب مسلمانوں کی جانب سے یہ بائیکاٹ بہت طویل ہوگیا تو میں ابو قتادہ کی دیوار پھلانگ کر اس کے پاس گیا۔ وہ میرا چچازاد تھا اور مجھے بہت ہی پیارا تھا۔ میں نے اس کو سلام کیا' خدا کی قسم اس نے بھی سلام کا جواب نہ دیا۔ میں نے اسے کہا ابو قتادہ تمہیں خدا کی قسم سچ کہو کیا میں اللہ اور رسول سے محبت نہیں کرتا۔ وہ خاموش ہوگیا۔ میں نے دوبارہ اسے قسم دی' وہ پھر خاموش ہوگیا۔ میں نے سہ بارہ اسے قسم دی تو اس نے فقط یہ کہا اللہ اور رسول زیادہ جانتے ہیں۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ میں واپس ہوا اور دیوار پھلانگ کر چلا گیا"۔

یہ تھا اس جماعت کا ڈسپلن۔ یہ تھی مکمل اطاعت امر' اگرچہ فتح مکہ کے بعد ہر قسم کے لوگ جماعت میں آگئے تھے اور اس مشکل وقت میں یہ جنگ ہوئی تھی' لیکن رسول خداؐ نے جب ان تینوں سے گفتگو کی ممانعت کر دی تو مجال ہے کہ کوئی منہ ان سے ہم کلام ہو۔ کوئی نہیں جو کعب سے محبت کرے' کوئی نہیں جو اس کے ساتھ لین دین کرے' یہاں تک کہ ان کا چچازاد اور محبوب ترین فرد بھی بات کرنے سے انکاری۔ یہ دیوار پھلانگ کر جاتے ہیں' وہ وعلیکم السلام تک نہیں کہتا۔ کسی سوال کا جواب نہیں دیتا اگر دیتا ہے تو صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ "اللہ اور رسول اللہ زیادہ جانتے ہیں"۔

کعب آگ کے انگاروں پر کھڑے ہیں' مدینہ کی سرزمین ان کے لیے انوکھی ہوگئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ کسی اجنبی ملک میں ہیں۔ وہ جواب سلام میں حضور کے ہونٹوں کی حرکت کے لیے بھی ترس رہے ہیں۔ وہ حضورؐ کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ حضورؐ کی توجہ ان کے لیے امید کی کرن ثابت ہو اور ان کو امید بندھ جائے کہ وہ اس شجر طیبہ سے کٹ نہیں گئے ہیں اور یہ کہ اس کے لیے خشکی اور مٹنے کا فیصلہ نہیں ہوگیا ہے۔

اس مغضوبیت کی حالت میں کہ کوئی ان سے بات کرنے کا روادار نہیں ہے' محض مہربانی کے طور پر بھی' بادشاہ غسان ان کو خط بھیجتا ہے اور ان کو بلند و مقام و مرتبہ دینے کی یقین دہانی کرتا ہے' لیکن وہ فوراً اس سے منہ پھیرتے ہیں

اور اس عظیم پیشکش کو جلتی ہوئی آگ کے سپرد کر دیتے ہیں اور اس خط کو بھی وہ ایک آزمائش سمجھتے ہیں۔

یہ بائیکاٹ اور طویل ہو جاتا ہے ' بیوی سے بھی مقاطعہ کا حکم آ جاتا ہے تاکہ وہ بالکل اکیلے ہو جائیں ۔ زمین و آسمان میں ان کا کوئی سہارا نہ رہے ' وہ اب بھی حیا کرتے ہیں کہ رسول اللہ کے پاس اپنی بیوی کے بارے میں کوئی اپیل کریں کیونکہ ان کو رسول اللہ کے جواب کے بارے میں کوئی یقین نہیں ہے۔

یہ تو تھا ایک صفحہ ' اب ذرا دوسرا ورق الٹیے ۔ ان کی توبہ قبول ہوتی ہے ' خوشخبری آتی ہے ' حکم آ جاتا ہے کہ آپ اب ہماری سوسائٹی کی طرف لوٹ آئے ہیں ' توبہ قبول ہو گئی ہے ۔ اب آپ کو گویا نئی زندگی مل گئی ہے ۔ ذرا ان کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"میں ایسے حالات میں تھا جس کا ذکر خود قرآن نے کیا کہ میں اپنے آپ سے بیزار تھا اور زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ہم پر تنگ تھی ' کہ میں نے سلع پہاڑ کے اوپر سے ایک پوری آواز سنی "اے کعب تمہیں بشارت ہو" ۔ میں فوراً سجدے میں گرا ' اب تو آسانیاں آ گئی ہیں ' نماز فجر کے وقت رسول اللہ نے اعلان فرمایا کہ ہمیں اللہ نے معاف کر دیا ہے ۔ لوگ ہماری طرف مبارکبادی کے لیے دوڑ پڑے ' میرے ساتھیوں کی طرف بھی خوشخبری پہنچانے والے دوڑ پڑے ۔ ایک شخص نے میری طرف گھوڑے کو ایڑھی دی ' ایک شخص میری طرف دوڑا ۔ یہ اسلم قبیلے کا تھا ۔ یہ پہاڑ پر چڑھ گیا اور وہاں سے بلند آواز سے پکارا ' چنانچہ گھوڑے والے سے آواز پہلے پہنچ گئی ۔ جب وہ شخص آیا جس کی آواز میں نے سنی تھی تو میں نے اپنے کپڑے اتار دیئے اور اسے خوشخبری کے صلے میں عطا کر دیئے ۔ ان دنوں میرے پاس یہی کپڑے تھے ۔ میں نے دو کپڑے کسی سے مانگے اور انہیں پہن کر رسول اللہ کی طرف چل پڑا ۔ راستے میں لوگ فوج در فوج میرا استقبال کر رہے تھے اور بشارتیں دے رہے تھے ۔ تمہیں اللہ کی جانب سے معافی مبارک ہو ۔ میں مسجد میں داخل ہوا ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور آپ کے ارد گرد لوگ بیٹھے تھے ۔ طلحہ ابن عبید میرے استقبال کے لیے اٹھے اور میرے ساتھ مصافحہ کیا اور مبارکبادی دی ۔ مہاجرین میں سے کوئی اور نہ اٹھا ۔ کعب حضرت طلحہ کے اس احسان کو عمر بھر نہ بھولے"۔

جماعت صحابہ میں واقعات کا یوں جائزہ لیا جاتا تھا اور غلطیوں کو یوں درست کیا جاتا تھا ۔ اللہ کی جانب سے معافی کا اس طرح احترام کیا جاتا تھا ' اس کی خوشخبری دینے کے لیے گھوڑسوار دوڑ رہا تھا اور دوسرا اونچی جگہ سے آواز دے کر اس پر سبقت لے جا رہا تھا ' اور اس مسترد شدہ شخص کی واپسی اور مبارکبادی ایک ایسا واقعہ تھا جسے وہ زندگی بھر نہ بھول سکا ۔ جماعت میں واپس آنے کو اس نے بڑا احسان اور مہربانی سمجھا ۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے یہ تاثر دیا کہ یہ دن تمہارے لیے تمہاری پوری زندگی کا بہترین دن ہے ' جبکہ حضورؐ کا چہرہ خوشی کی وجہ سے چمک رہا تھا ' جیسا کہ حضرت کعب نے فرمایا کہ حضورؐ کا چہرہ خوشی کے وقت چاند کا ٹکڑا نظر آتا تھا اور ان تین افراد کے قبولیت توبہ کے وقت حضورؐ بے حد خوش اور مسرور تھے کہ اس کے تین ساتھی باعزت طور پر بری ہو کر جماعت کی طرف لوٹ آئے۔

یہ تھا قصہ ان تین آدمیوں کا جن کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا تھا اور بعد میں ان کی معافی کا حکم آ گیا تھا ۔ یہ لمحات بتاتے ہیں اس وقت کی تحریک اسلامی ایک زندہ تحریک تھی اور یہ کہ اس کی کچھ قدریں تھیں جن کے لیے وہ زندہ تھی۔

اب اس قصے کی روئیداد پڑھنے کے نتیجے میں یہ آیات اچھی طرح ہماری سمجھ میں آ جاتی ہیں۔

حَتّٰی اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَیْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَیْهِ (۹: ۱۱۸) "جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامن رحمت کے سوا نہیں ہے"۔

"جب زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی"۔ زمین کیا اگر اس میں مکین نہ ہو۔محض زمین کیا حقیقت رکھتی ہے اگر اس میں اقدار نہ ہوں۔ ملک کے معنی ہوتے ہیں اہل ملک کے باہم تعلقات و روابط' اگر یہ نہ ہوں تو نہ ملک اور نہ سرزمین ۔یہ اندازبیان اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے بھی درست اور معنوی اعتبار سے بھی درست ۔اور اس کی فنی خوبصورتی تو لاجواب ہے ۔نظریوں آتا ہے کہ تین افراد پر مدینہ کی سرزمین تنگ ہوگئی ہے ۔اس کی تنابیں کھچ گئی ہیں' وہ سکڑ گئی ہے اور وہ اس کے اندر تنگی محسوس کرتے ہیں۔

ضَاقَتْ عَلَیْهِمُ (۹: ۱۱۸) "وہ ان پر تنگ ہوگئی ہے" گویا وہ ایک برتن ہے جس کے اندر یہ لوگ سما نہیں سکتے' اگر ڈھکنا رکھ دیا جائے تو یہ سانس نہیں لے سکتے۔

وَظَنُّوْا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَیْهِ (۹: ۱۱۸) "اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامن رحمت کے سوا نہیں ہے"۔ارض و سما کے تمام اطراف اس کی گرفت میں ہیں۔ اس طرح اس کربناک صورت حال میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ یقین ہو جاتا ہے کہ اندوہناکیوں اور کربناکیوں کے بعد خوشخبری صرف اللہ ہی دے سکتا ہے ۔وہی ہے جو غم و اندوہ کے بعد خوشیاں عطا کرتا ہے چنانچہ حکم آتا ہے۔

ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ لِیَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (۹: ۱۱۸) "تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں' یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے"۔اللہ نے ان کی اس عظیم غلطی کو معاف کر دیا تاکہ وہ اپنی تمام دوسری کوتاہیوں سے بھی رجوع کریں اور اپنی آئندہ زندگی میں اللہ کے مطیع فرمان ہو کر رہیں اور حضرت کعب کے قول اور بیان میں اس کا مفہوم موجود ہے کہ انہوں نے کہا کہ میری توبہ یہ ہے کہ میں اپنی تمام جائیداد اللہ کے نام صدقہ کر دوں' لیکن رسول اللہ نے فرمایا کہ کچھ حصہ اپنے لیے چھوڑ دو۔یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔انہوں نے اپنا خیبر کا حصہ رکھ لیا اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس بحران میں میری نجات محض سچائی کی وجہ سے ہوئی ہے ۔اس لیے میری توبہ یہ ہے کہ میں بقیہ زندگی میں سچائی کا دامن نہ چھوڑوں گا۔کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سچائی میں مجھے جس طرح آزمایا اس طرح سے اچھی آزمائش شاید کسی اور کی نہ کی گئی ہو کیونکہ میں نے جب سے حضورؐ کے سامنے یہ وعدہ کیا ہے میں نے کبھی عمداً جھوٹ نہیں بولا' آج تک ۔اور بقیہ زندگی میں بھی مجھے امید ہے کہ اللہ جھوٹ سے بچائے گا۔

اس قصے کے بارے میں فی ظلال القرآن میں مزید کچھ کہنا ممکن نہیں ہے ۔اس کی طرف قرآن کریم نے نہایت ہی

بلیغانہ انداز میں اشارہ کیا ہے اور یہاں یہی کافی ہے۔

○○○

جو لوگ پیچھے رہ گئے اور جنہوں نے اس مہم میں تردد کیا ان کے حالات پر تبصرے کی فضا میں، اور تین افراد جن کے بارے میں فیصلہ موخر کر دیا گیا تھا، ان کے کردار میں عنصر صداقت کے اظہار کے بعد، اب تمام اہل ایمان کو پکارا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو، اور مدینہ اور اس کے ماحول میں جو لوگ اس مہم سے پیچھے رہ گئے تھے۔ ان کے اس طرز عمل پر سخت تنقید کی جاتی ہے، کیونکہ اس مہم میں جو مجاہدین شریک ہوئے ان کے لیے عظیم جزاء ہے اور یہ لوگ اس سے محروم ہو گئے ہیں۔

---

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَكُونُوا۟ مَعَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴿۱۱۹﴾ مَا كَانَ لِأَهْلِ ٱلْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ ٱلْأَعْرَابِ أَن يَتَخَلَّفُوا۟ عَن رَّسُولِ ٱللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا۟ بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِۦ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَلَا يَطَـُٔونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ ٱلْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُم بِهِۦ عَمَلٌ صَٰلِحٌ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا يُنفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ ٱللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ﴿۱۲۱﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو۔ مدینے کے باشندوں اور گرد و نواح کے بدویوں کو یہ ہرگز زیبا نہ تھا کہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر گھر بیٹھ رہتے اور اس کی طرف سے بے پروا ہو کر اپنے اپنے نفس کی فکر میں لگ جاتے۔ اس لیے کہ ایسا کبھی نہ ہو گا کہ اللہ کی راہ میں بھوک پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ جھیلیں، اور منکرین حق کو جو راہ ناگوار ہے اس پر کوئی قدم وہ اٹھائیں، اور کسی دشمن سے (عداوت حق کا) کوئی انتقام وہ لیں، اور اس کے بدلے ان کے حق میں ایک عمل صالح نہ لکھا جائے۔ یقیناً اللہ کے ہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی کبھی نہ ہو گا کہ وہ (راہ خدا میں) تھوڑا یا بہت کوئی خرچ اٹھائیں اور (سعی جہاد میں) کوئی وادی وہ پار کریں اور ان کے حق میں اسے لکھ نہ لیا جائے تاکہ اللہ ان کے اس اچھے کارنامے کا صلہ انہیں عطا کرے“۔

اہلِ مدینہ ہی تھے جنہوں نے تحریک اسلامی کی تعمیر کی اور سب سے پہلے دعوت اسلامی پر لبیک کہا اور اس کی حمایت کی۔ یہ لوگ تحریک اسلامی کے زیادہ قریب اور حقدار تھے۔ وہ اس تحریک کے سپاہی تھے اور یہ تحریک ان کی تھی' یہی لوگ تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دی۔ سب سے پہلے انہوں نے بیعت کی اور یہ لوگ اس تحریک کے بانی مبانی اور اس کا بنیادی اثاثہ تھے کیونکہ جزیرۃ العرب میں تحریک اسلامی کا پودا انہی نے لگایا تھا۔ اس طرح مدینہ کے اردگرد جو اہم قبائل تھے اور جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا' جو دور دور تک پھیلے ہوئے تھے' یہ اس تحریک کے بیرونی معاون و مددگار تھے' اس لیے تحریک کے عالمی پھیلاؤ کے وقت ان لوگوں کے لیے مناسب نہ تھا کہ وہ رسول اللہ کو ایک مشکل مہم میں جاتا دیکھ کر پیچھے رہ جاتے' ان کا فریضہ تو یہ تھا کہ رسول اللہ پر اپنی جانیں قربان کر دیتے' یہ تو مناسب نہ تھا کہ اپنی جانوں کو بچانے کی کوشش کرتے۔ ان کو چاہئے تھا کہ رسول اللہ کا ساتھ دیتے۔ گرمی ہو کہ سردی ہو' سختی ہو یا نرمی ہو' آسانی ہو یا مشکل ہو' ان کا فرض تو یہ ہے کہ ہر حال میں تحریکی ذمہ داریاں پوری کریں۔ اہل مدینہ تو اس دعوت کے بانی ہیں اور اس کے اردگرد رہنے والے مسلمان بھی حضورؐ کے ساتھ اور آپ کو دیکھنے والے ہیں۔ حضورؐ کی ذات مبارکہ کے قریب ہیں اور پڑوسی ہیں۔ اور جب ان کو معلوم تھا کہ حضورؐ کس مشکل مہم پر نکلے ہوئے ہیں تو ان کا فرض تھا کہ وہ پیچھے نہ رہتے اور آپ کے ساتھ تکالیف برداشت کرتے۔

لہٰذا اپنی ان نسبتوں کی وجہ سے ان کا فرض ہے کہ اللہ سے ڈریں اور سچے لوگوں کے ساتھ رہیں' یہ سچے لوگ کون تھے' وہ جو رسول اللہ کو چھوڑ کر گھروں میں نہ بیٹھے اور ان مشکل حالات میں بھی ان کے ایمان میں تزلزل پیدا نہ ہوا۔ ان کی ہمتوں میں کوئی کمی نہ آئی اور جو تحریک اسلامی کے ہراول دستہ تھے یا وہ لوگ تھے جو اس ہراول دستے کے صحیح متبع تھے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (۹: ۱۱۹) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو"۔ اس کے بعد اصولاً اس بات کو معیوب قرار دیا جاتا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہو اور اپنے قائد کو اکیلا چھوڑ کر بیٹھ جائے خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو' ایمان کے ساتھ یہ عمل لگا نہیں کھاتا۔

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ

وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ (۹: ۱۲۰) "مدینے کے باشندوں اور گردونواح کے بدویوں کو یہ ہرگز زیبا نہ تھا کہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر گھر بیٹھ رہتے اور اس کی طرف سے بے پرواہ ہو کر اپنے اپنے نفس کی فکر میں لگ جاتے"۔ ان الفاظ میں ایک اشاراتی ملامت ہے' اور رسول اللہ کے ساتھیوں کو اس سے بڑی ملامت کیا ہو سکتی ہے کہ وہ رسول خدا کے ساتھی بھی ہوں' ان کو یہ عظیم اعزاز بھی حاصل ہو اور وہ اپنے نفس کی فکر میں لگ جائیں اور ذات رسولؐ سے اپنی ذات سے زیادہ محبت رکھیں۔

لیکن یہ اشارہ قیامت تک کے لیے ہے۔ ہر دور میں دعوت اسلامی کے کارکنوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی قیادت پر جان نثار کریں۔ ایک مومن کی شان یہ ہرگز نہیں ہے کہ ذات رسولؐ تو مشکلات سے دوچار ہو اور اپنی ذات کی فکر کریں

اور پھر بھی یہ دعویٰ کریں کہ وہ داعی ہے اور وہ رسول اللہ کا ہمدرد و معاون ہے۔

ایک تو یہ کہ ذات رسول سے حیا چشمی کرتے ہوئے بھی سب کو ساتھ ہو لینا چاہئے ' جبکہ اللہ کے صریح احکام بھی موجود تھے اور اس مہم میں آپ کے ساتھ جانے والوں کے لیے اجر عظیم اور ثواب اخروی کے وعدے بھی تھے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۲۰) وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۲۱) (۹: ۱۲۰ - ۱۲۱)

"اس لیے کہ ایسا کبھی نہ ہو گا کہ اللہ کی راہ میں بھوک پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ جھیلیں ' اور منکرین حق کو جو راہ ناگوار ہے اس پر کوئی قدم وہ اٹھائیں ' اور کسی دشمن سے (عداوت حق کا) کوئی انتقام وہ لیں ' اور اس کے بدلے ان کے حق میں ایک عمل صالح نہ لکھا جائے۔ یقیناً اللہ کے ہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی کبھی نہ ہو گا کہ وہ (راہ خدا میں) تھوڑا یا بہت کوئی خرچ اٹھائیں اور (سعی جہاد میں) کوئی وادی وہ پار کریں اور ان کے حق میں اسے لکھ نہ لیا جائے تاکہ اللہ ان کے اس اچھے کارنامے کا صلہ انہیں عطا کرے"۔

اس راہ میں پیاس پر بھی جزاء ہے ' تھکاوٹ پر بھی جزاء ہے۔ بھوک پر بھی جزاء ہے۔ ایک ایک قدم پر بھی جزاء جو کفار کو ناگوار گزرے ' دشمن کا جس قدر نقصان بھی ہو جائے اس پر بھی جزاء ہے ' اس کے ساتھ ساتھ مجاہد کے لیے عمل صالح بھی لکھا جاتا ہے۔ اور اللہ اس کا نام ایسے محسنین میں لکھ دیتا ہے جن کے اعمال محفوظ ہو جاتے ہیں اور وہ بالکل ضائع نہیں ہوتے۔

پھر اس راہ میں جو اخراجات اٹھیں گے چاہے کم ہوں یا زیادہ ' غرض اس کام میں اجر اعمال کے بجائے کچھ قدم چلنے پر ہے۔ قدموں کے نشانوں پر بھی اجر ہے جس طرح بڑے بڑے کارناموں پر اجر ہے۔

تحریک اسلامی کے کارکنوں ' یقین رکھو خدا کی قسم ہمارے کام پر اللہ کے ہاں عظیم اجر ہے ' کھلے انعامات اور سخاوتیں تم پر ہوں گی اور یہ بڑی شرم کی بات ہوگی کہ اس دعوت کے سلسلے میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح تکالیف برداشت نہ کریں اور آپ جیسی مشکلات بھی برداشت نہ کریں حالانکہ ہم رسول اللہ ؐ اور آپ کے ساتھیوں کے جانشین ہیں اور آپ کے بعد اس دعوت کے امین ہیں۔

ooo

معلوم ہوتا ہے کہ جب اس سورت میں رسول اللہ کو چھوڑ کر پیچھے رہنے والوں کی مذمت کی گئی تو مدینہ کے اطراف و اکناف سے تمام سچے مسلمان مدینہ کی طرف امنڈ آئے تاکہ وہ حضورؐ سے اشارہ پاتے ہی عمل جہاد میں شریک ہو جائیں ' اس طرح مدینہ میں لوگوں کو ازدحام ہو گیا ہو گا ' اس لیے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ نفیر عام کے حدود کا تعین کر دیا جائے کیونکہ اس وقت تمام جزیرۃ العرب دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا تھا ' اسلامی حدود میں اچانک وسعت ہو گئی تھی

اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جہاد کے لیے ہروقت تیار تھی ۔ تعداد مجاہدین کی کثرت کا اندازہ اس بات سے با آسانی ہو سکتا ہے کہ جنگ تبوک کے موقعہ پر پیچھے رہ جانے والوں کو چھوڑ کر شرکاء کی تعداد تقریباً تیس ہزار تھی ۔ اس سے قبل مسلمانوں کے کسی غزوہ میں اس قدر عظیم تعداد شریک نہ ہوئی تھی ۔ لہٰذا ایسے حالات ہو گئے تھے مسلمانوں کی مساعی کو تقسیم کار کے تحت منظم کر دیا جائے 'کچھ لوگ اسلامی مملکت کی تعمیر و ترقی میں لگ جائیں 'کچھ تجارت میں مصروف ہوں اور وہ خدمات فراہم کریں جو اس جدید مملکت کے لیے ضروری ہیں 'کیونکہ عربوں نے پہلی مرتبہ یہ دیکھا تھا کہ ایک سادہ قبائلی نظام سے آگے بڑھ کر ایک عظیم تہذیب اور مملکت کی بنیاد رکھ دی گئی ہے اور اس جدید تہذیب اور نظام مملکت کو مختلف النوع خدمات کی ضرورت ہے ۔ اس لیے یہ آیت نازل ہوئی ۔

---

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ
فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا
15 إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿۱۲۲﴾
ع ۴
۴

"اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہل ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے 'مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے ) پرہیز کرتے"۔

اس آیت کی تفسیر میں متعدد آیات وارد ہیں اور مفسرین نے اس گروہ کے تعین میں مختلف آراء کا اظہار کیا ہے ' جو نکلیں اور تفقہ فی الدین حاصل کر کے واپس آئیں اور اپنی قوم کو ڈرائیں ۔ ہمارے خیال میں درست تفسیر یہ ہے کہ تمام مسلمان گو ظاہر ہے گھروں سے نہیں نکل سکتے ' بلکہ مسلمانوں کے ہر فرقے سے ایک گروہ ہی نکل سکتا ہے اور یہ لوگ باری باری ایسا کریں گے 'یعنی پہلے کچھ لوگ جائیں گے اور دوسرے مقیم رہیں گے ۔ پھر دوسرے لوگ اپنی باری پر جائیں گے ۔ یہ جو لوگ نکلیں گے تو یہ لوگ جہاد 'تحریک اور مہم کی شکل میں اسلامی نظریہ حیات کو لے کر نکلیں گے ' اس جہاد اور تحریک کے دوران وہ جو عملی اور علمی تجربات کریں گے ان سے ان لوگوں کو آگاہ کریں گے جو گھروں میں مقیم تھے ۔

اس آیت کی جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے اور حضرت ابن عباس کے قول میں اس طرف اشارہ بھی ہے نیز حسن بصری 'ابن جریر اور ابن کثیر نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ دین اپنا ایک تحریکی منہاج رکھتا ہے ۔ اس دین کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اسے لے کر چلتے ہیں ' جو لوگ اس دین کی راہ میں جہاد کے لیے نکلتے ہیں وہی در حقیقت اس دین کے اصل فقیہ ہوتے ہیں اور اس دین کے اسرار و رموز الٰہی ان پر منکشف ہوتے ہیں ' جب کوئی قوم اس دین کو لے کر عملاً چلتی ہے تو اس کے معجزات اور اسرار عملاً اس پر واشگاف ہوتے ہیں ۔ جو لوگ بیٹھے رہتے ہیں 'تو ان لوگوں کو اس بات کی ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ لوگ تحریکی لوگوں سے اس کو سمجھیں کیونکہ بیٹھنے والے ان اسرار کا مشاہدہ نہیں کر سکتے جو اس کو لے کر چلنے والے کرتے ہیں ۔ نہ یہ لوگ تحریکی لوگوں کی طرح اسلام کو سمجھ سکتے

ہیں۔ پیچھے رہنے والے اور گھروں میں بیٹھنے والے اس دین کے اسرار و رموز کو ان لوگوں کی طرح نہیں پا سکتے۔ جو اس دین کے لیے حرکت جہاد میں ہوں' خصوصا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں گھروں سے نکلنا بذات خود انسان میں بیداری اور سمجھ پیدا کرتا ہے۔

یہ مفہوم اس مفہوم سے بالکل متضاد ہے' جس کے مطابق لوگ سمجھتے ہیں کہ جہاد' تحریک اور غزات جو لوگ پیچھے رہتے ہیں اور گھروں میں بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے آپ کو علمی کاموں کے لیے یکسو کرتے ہیں وہ فقہاء ہوتے ہیں' یہ خام خیالی ہے۔ یہ اس دین کے مزاج کے خلاف ہے۔ اس دین کا بنیادی عنصر اس کی "تحریک" ہے لہذا وہ لوگ جو تحریکی نہیں ہوتے وہ اس دین کو سمجھ ہی نہیں سکتے جو اس دین کو لے کر عملاً لوگوں کے اندر واقعی صورت حالات پر منطبق نہیں کرتے۔ اور اسے کسی معاشرے میں موجود جاہلیت پر غالب کرنے کی سعی نہیں کرتے۔

تجربہ شاہد ہے' بلکہ تجربات شاہد ہیں کہ جو لوگ دینی تحریکات میں ضم نہیں ہوتے وہ اس دین کے حقیقی فہم سے بہت دور ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اس دین کا صرف خشک مطالعہ کرتے ہیں حالانکہ اس دین کے اسرار و رموز کا ظہور صرف ان لمحات میں ہوتا ہے جب کوئی انسان اس دین کی عملی اقامت کے لیے جدوجہد کرتا ہے جو لوگ کتابوں کے صفحات میں گم رہتے ہیں وہ حقیقی دین سے بہت ہی دور رہ جاتے ہیں۔

اس کا فقہی نظام اس سرزمین پر رائج ہو سکتا ہے جس میں کسی تحریک کے دین کے قیام کے لئے جدوجہد کی ہو۔ ایسا فقیہ جو اقامت دین کی تحریک سے علیحدہ بیٹھا ہے اس سے دینی ہدایات نہیں لی جا سکتیں اور جس طرح صلیبی مستشرقین ہدایات دیتے کہ کتابوں اور صفحات میں گم ہو کر اس دین کی تجدید کرو' اسے ترقی یافتہ بناؤ اور ان اسلامی تحریکات سے دور رہو جن کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کو تمام دوسرے انسانوں کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی بندگی اور غلامی میں داخل کیا جائے اور ان کے اوپر ایک اسلامی نظام مملکت قائم کی جائے اور ان کے سروں پر سے طاغوتی اقتدار کو اتارا جائے' تو ایسے لائبریرین قسم کے لوگ دین اسلام کو ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔

اسلامی فقہ اسلامی تحریک جہاد کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے' پہلے دینی نظام قائم ہوا ہے اور بعد میں اس کے لئے فقہ و قانون بنا ہے اس کے برعکس نہیں ہوا' پہلے یہ نظریہ وجود میں آیا کہ دین صرف اللہ کا چلے گا' پھر وہ معاشرہ وجود میں آیا جس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ دین صرف اللہ کا چلے گا' جس نے تمام جاہلی نظاموں اور جاہلی قوانین کو رد کیا اس نے ان تمام قوانین کو رد کیا جس میں کوئی انسان قانون ساز ہو' اس معاشرے نے اسلامی شریعت کے اصولی اور دستوری کلیات کے مطابق زندگی بسر کرنا شروع کی اور عملی میدان میں آگے بڑھنا شروع کیا تو اس عملی رفتار کے دوران اصول دین کی روشنی میں جزوی احکام آتے رہے اور قانون سازی ہوتی رہی اور اس طرح فقہ اسلامی تشکیل پاتی رہی۔ اور فقہ و قانون کی نشوونما شروع ہوئی۔ غرض تحریک دین نے فقہ اسلامی کو وجود بخشا اور تحریک اقامت دین کے دوران ہی فقہ اسلامی کی ترقی اور نشوونما ہوئی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ٹھنڈے ماحول میں صرف کتابوں کے اوراق و صفحات سے اور اقامت دین کی تحریک سے علیحدہ کہیں اور فقہ مرتب ہوئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جو فقہاء فہم دین میں گہرے تھے وہ تحریک کی بھٹی سے ہو کر گزرے تھے۔ وہ ایک زندہ اسلامی معاشرے کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے' وہ اس دین میں زندگی بسر کرتے تھے' اس کے لئے لڑتے تھے' اور تحریک احیائے دین اور اقامت دین کے دوران ہی ان کی فقہ وجود میں آتی تھی۔ اور وہ فی الواقع ایک

عملی فقہ تھی۔

آج صورت حالات کیا ہے؟ آج وہ معاشرہ کہاں ہے جس نے فیصلہ کیا ہو کہ بندگی اور دستور صرف اللہ کا ہو گا' حاکمیت صرف اللہ کی ہو گی اور اللہ کے سوا کسی انسان کو حق حاکمیت نہ ہو گا' اور یہ نظام قانون اللہ کی شریعت ہو گی اور جس نے یہ بھی فیصلہ کر لیا ہو کہ وہ تمام قوانین کالعدم ہوں گے جو قرآن و سنت سے ماخوذ نہ ہوں گے۔

میں کہتا ہوں کہ کوئی شخص یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ اس وقت ایسا معاشرہ کہیں موجود ہے' لہٰذا جو شخص اسلامی تاریخ' اسلامی فقہ کے مزاج اور اسلامی نظام کی نوعیت سے واقف ہو وہ قبل از وقت اسلامی فقہ کے ارتقاء اس کی تجدید اور ترقی کے لئے کام نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ہم ایسے معاشروں میں زندگی بسر کر رہے ہیں جو سرے سے اس اصول ہی کو تسلیم نہیں کرتے کہ ہمارا قانونی نظام صرف شرعی ہو گا اور قرآن و سنت پر مبنی ہو گا' ایک حقیقی مسلم کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ اقامت دین کی جدوجہد کا آغاز کر دے' پہلے کسی ملک میں اللہ کی حاکمیت کے اصول کو تسلیم کرائے اور یہ اصول اور یہ دستور تسلیم کرائے کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم نہ ہو گا اور اللہ کی شریعت کے سوا کوئی قانون نہ ہو گا۔

یہ دین ایک سنجیدہ دین ہے اور اس کے ساتھ مذاق کرنا مناسب نہیں ہے' یہ مذاق ہی ہے کہ کوئی مملکت فقہ اسلامی کو تسلیم ہی نہ کرے اور لوگ بیٹھ جائیں لائبریریوں میں اور فقہ اسلامی کی تجدید اور ترقی کے لئے بزعم خود سعی کریں' حالانکہ جس معاشرے میں وہ یہ سعی کر رہے ہیں وہ سرے سے اسلامی فقہ کو رائج کرنے کا روادار ہی نہیں ہے۔ یہ بھی ایک بڑی جہالت ہے کہ کوئی یہ کہے کہ وہ محض دفتروں میں بیٹھ کر تفقہ فی الدین حاصل کر لے گا' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ فقہ کو شریعت اسلامی سے مستنبط تب ہی کیا جا سکتا ہے جب شریعت اور دین کو تحریک کی شکل دی جائے اور دین کو غالب کر کے وہاں فقہ نافذ کیا جائے۔

جب دین صرف اللہ کا ہو جائے اور حاکمیت صرف اللہ کی ہو جائے تو اسلامی معاشرہ وجود میں آجاتا ہے' اور اس کے بعد اس معاشرے اور سوسائٹی میں اسلامی قانون نافذ ہوتا ہے۔ یہ ترتیب ضروری ترتیب ہے' جب اسلامی دستور کے نفاذ پر ایک سوسائٹی وجود میں آجائے اور وہ سوسائٹی یہ عہد کر لے کہ اس نے اسلامی شریعت کو نافذ کرنا ہے تو اس کے بعد فقہ اسلامی وجود میں آتا ہے' اس سے قبل نہیں یہ نہیں ہوتا کہ قانون و فقہ کی ایک مفصل کتاب لکھ کر رکھ دی جاتی ہے اور اس کے بعد اسلامی نظام قائم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہر فقہی حکم دراصل دستور' دین اور شریعت کا نفاذ کنندہ ہوتا ہے اور قانون دستور اور نظام اور شریعت کو عملاً ایک جزوی واقعہ پر نافذ کرتا ہے اور اسے ایک متعین صورت دیتا ہے۔ یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ یہ عمل تحریکی صورت میں ہو اور ایک اسلامی دستوری ڈھانچے کے قیام کے بعد اور اس کے اندر ہو' اس سے باہر نہ ہو اور وہ اسلامی سپر سٹرکچر کے دائرے اور اس کے عملی حالات کے اندر ہو' اس دستوری ڈھانچے کے تحت کوئی بھی قانون اس ڈھانچے کے عملی حالات اور سوسائٹی کے تقاضوں کے مطابق ایک عملی قدم ہوتا ہے۔ رہے احکام جو کتابوں میں ہوتے ہیں جو معاشرے اور دستوری نظام سے علیحدہ ہوتے ہیں وہ نافذ نہیں ہو سکتے۔ اسلامی فقہ کی کتب میں جو احکام موجود ہیں وہ کسی وقت ایک اسلامی معاشرے اور عملی اسلامی حکومت کے لیے بنائے گئے تھے وہ اس وقت کے عملی حالات' دستور اور معاشرے سے علیحدہ نہ تھے۔ یہ فقہ کی کتب اس وقت کے زندہ و تابندہ قوانین تھے اور عملاً جاری کرنے کے لیے مرتب کیے گئے تھے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم بھی جدید حالات کے لیے ایسے ہی اسلامی قوانین مرتب کریں۔

لیکن اسلامی قوانین مرتب کرنے سے قبل ضروری ہے کہ ایک ایسی سوسائٹی موجود ہو جس نے فیصلہ کر لیا ہو کہ وہ اسلامی نظام زندگی کے مطابق زندگی بسر کرے گی اور اسلامی شریعت پر مبنی قوانین نافذ کرے گی۔

اس مقصد کے لئے ایک سنجیدہ سعی کی ضرورت ہے اور یہ اس دین کا سنجیدہ تقاضا ہے اور اس کے لئے اگر جہاد شروع کیا جائے تو اس سے انسان کے فکر و نظر کو جلا ملے گی اور تفقہ فی الدین حاصل ہو گا۔ اس کے سوا اگر ہم کوئی اور طریقہ کار اختیار کریں گے تو یہ اس سنجیدہ دین کے ساتھ ایک مذاق ہو گا اور یہ اسلامی جہاد سے فرار ہو گا اور بہانہ یہ ہو گا کہ ہم فقہ اسلامی کی تجدید چاہتے ہیں یا اسے ترقی یافتہ بنانا چاہتے ہیں اس فرار سے بہتر ہے کہ ہم اپنی تقصیرات اور کوتاہیوں کا صاف صاف اعتراف کر لیں۔ اور اللہ سے مغفرت طلب کریں کہ ہم جہاد سے عملاً پیچھے رہ گئے ہیں۔

○○○

اگلی آیت میں اسلام کی تحریک جہاد کا ایک دائمی منصوبہ پیش کیا جاتا ہے' یہ وہ منصوبہ ہے جس پر حضورؐ نے اپنی پوری زندگی میں جدوجہد فرمائی آپؐ کے بعد آپ کے خلفائے راشدین نے اس کے مطابق اپنی پوری زندگی میں جدوجہد جاری رکھی اور یہ منصوبہ اسلامی تاریخ میں صرف اس وقت موقوف ہوا جب عملی دشواریاں پیش آئیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿١٢٣﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تمہارے پاس ہیں۔ اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں' اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے"۔

یہ ہے اسلامی جہاد کا دائمی منصوبہ۔ "جنگ کرو ان منکرین حق کے ساتھ جو تمہارے قریب ہیں۔

الَّذِينَ يَلُونَكُمْ (۹ : ۱۲۳) سے کیا مراد ہے۔ وہ یہ کہ عمل جہاد سب سے پہلے ان اقوام کے خلاف شروع کیا جائے جو تمہارے قریب اور پڑوس میں ہیں۔ یعنی دارالاسلام سے متصل ہیں اور یوں اس جہاد کو مرحلہ وار آگے بڑھایا جائے۔ جس وقت جزیرۃ العرب فتح ہو گیا اور فتح مکہ کے بعد چند غیر اہم پاکٹوں کے سوا جن سے دارالاسلام کو کوئی خطرہ نہ تھا' اسلامی لشکروں نے جزیرۃ العرب کے شمال میں رومیوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا اور اسلامی افواج کو رومیوں کے خلاف تبوک میں جمع کر دیا۔ اس کے بعد اسلامی افواج روم اور فارس کی طرف بڑھیں اور تب بڑھیں کہ جزیرۃ العرب کے اطراف و اکناف میں اسلامی انقلاب کے خلاف کوئی پاکٹ نہ رہا۔ اسلامی علاقہ ایک مضبوط خطہ بن گیا اور اس کی حدود فارس و شام تک پھیل گئیں اور اسلامی مملکت ایک وسیع و عریض اور متحدہ مملکت بن گئی۔ اس اسلامی مملکت کو ضعف نے اس وقت لیا جب اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے وہ بادشاہتوں' نوابوں اور شاہی خاندانوں کے قیام کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی یا بعد کے ادوار میں اس نے قومی مملکتوں کی صورت اختیار کی یاد رہے کہ قومیت کا فتنہ بھی دشمن اسلام قوتوں کا ایک گہرا منصوبہ تھا جس کے ذریعے انہوں نے اسلامی قوت کو پاش پاش کر دیا۔ اور دشمنان اسلام

آج تک اس منصوبے پر بڑی کامیابی سے عمل پیرا ہیں۔ اور آج وہ امت جس نے رنگ و نسل اور قوم اور علاقہ کے تصورات پر مبنی تمام حدود و قیود مٹا دیئے تھے اور ایک عظیم قوت تھی وہ آج ایک نحیف و ضعیف امت ہے۔ آج بھی اس کا یہ ضعف اور وھن تب ہی ختم ہو سکتا ہے جب وہ صرف اسلامی جھنڈے تلے جمع ہو جائے اور وسعت اسلام کے اسلامی اور نبوی منصوبے پر عمل پیرا ہو جائے اور ربانی راہنمائی کے اسرار و رموز کو پالے جس کی وجہ سے اسے اس کرۂ ارض پر عظیم برتری حاصل ہوئی تھی۔

ذرا اس آیت کو ایک بار پھر دہرا لیں

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۹: ۱۲۳) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تمہارے پاس ہیں۔ اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں، اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے"۔ اس آیت میں مسلمانوں کو ان کفار کے ساتھ قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو ان کے قریب ہیں۔ اس میں یہ قید نہیں لگائی گئی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف جارحیت کے مرتکب ہوئے ہوں یا جارحانہ عزائم رکھتے ہوں۔ نیز اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کے پھیلانے کا یہ فائنل حکم ہے اور دین کے پھیلانے کے اس دائمی حکم سے اصول جہاد نکلتا ہے اور جہاد کا یہ فعل اور یہ حکم کوئی وقتی حکم نہیں اور نہ کوئی دفاعی حکم ہے۔

بعض ہمعصر مصنفین جب اسلام کے بین الاقوامی قوانین اور روابط پر بحث کرتے ہیں اور پھر اسلام کے نظریہ جہاد کو زیر بحث لاتے ہیں اور پھر قرآن کریم میں آیات جہاد کی تاویل کرتے ہیں وہ اس آیت کو ان آیات کے ذریعے محدود کرتے ہیں جو اس سے قبل عبوری دور کے لئے نازل ہوئی تھیں جن میں یہ کہا گیا کہ تم ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں یا جن سے تمہیں خطرہ ہے کہ تم پر حملہ کر دیں گے۔ حالانکہ یہ حکم بے قید ہے اور یہ بھی آخری حکم۔ اس سے قبل ہم اس بات کی وضاحت کر آئے ہیں کہ قرآن کریم کا یہ اصول ہے کہ احکامات صادر کرتے وقت عبارت نہایت جامع اور مانع ہوتی ہے۔ اس میں ایک جگہ دوسری آیات کا حوالہ نہیں ہوتا بلکہ نہایت جامع الفاظ چنے جاتے ہیں اور اگر کسی حکم کے لئے کوئی تحفظ 'استثناء تخصیص ہو تو آیت کے اندر اسے لایا جاتا ہے۔

اس نکتے کو اس سے قبل دسویں پارے کے مقدمے میں بیان کر آئے ہیں جہاں اہل کتاب اور مشرکین کے ساتھ جہاد کا حکم دیا گیا تھا، وہاں ہم نے جہاد کے بارے میں عبوری احکام اور جہاد کے بارے میں فائنل احکام اور اسلام کے تحریکی عمل اور تحریکی مزاج کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی تھی۔ میں سمجھتا ہوں ان صفحات پر دوبارہ نظر ڈالی جائے تو وہ کافی ہیں دیکھئے پارہ دہم کے صفحہ نمبر________

آج جو لوگ اسلام کے بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں لکھتے ہیں 'اسلام کے قانون جہاد کے بارے میں بات کرتے ہیں اور پھر وہ آیات جہاد کی تفسیر و تاویل کرتے ہیں تو ان کو یہ بات نہایت ہی مشکل نظر آتی ہے اور وہ اس بات سے خائف ہو جاتے ہیں کہ ان احکام کو اسلام کے احکام تسلیم کیا جائے۔ اور یہ کہ اللہ نے مومنین کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے قریب کفار سے جنگ شروع کر دیں۔ اور وہ مسلسل اپنی حدود کو آگے بڑھاتے رہیں اور قتال کو بھی آگے بڑھاتے

رہیں یعنی وسیع سرحد پر بھی اگر کفار ہوں تو انہیں اور پیچھے دھکیل دیا جائے ۔ وہ اللہ کی جانب سے ایسا حکم ماننے سے خائف ہیں لہٰذا وہ شروع ہو جاتے ہیں تاویلات کرنے اور مطلق احکام کو مقید کرنے اور اس میں سے استثناء تلاش کرتے ہیں ۔ یہ لوگ آخری احکام کو عبوری احکام قرار دیتے ہیں ۔

ہم جانتے ہیں کہ وہ اس بات سے کیوں گھبراتے ہیں اور یہ بات انہیں کیوں انہونی لگتی ہے ۔

من خوب می شناسم پیران پارسا را

یہ لوگ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اسلام میں جہاد ' جہاد فی سبیل اللہ ہوتا ہے یا اس کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ اس کرۂ ارض پر سے تمام طاغوتی قوتوں کو ختم کر دیا جائے اور اس پر صرف اللہ وحدہ کی حاکمیت کا نظام قائم کیا جائے ' اور ان لوگوں کی حکومت ختم کر دی جائے جو اللہ کے حق حاکمیت پر دست درازی کرتے ہیں ۔ گویا یہ جہادی عمل اس لئے ہے کہ تمام انسانوں کو غیراللہ کی غلامی اور نظام حاکمیت سے نکال کر صرف اللہ کی حاکمیت کے اندر داخل کیا جائے یوں وہ تمام انسانوں کی غلامی سے آزاد ہو جائیں تاکہ دنیا میں کوئی فتنہ نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لئے ہو جائے حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ یہ جہاد اس لئے نہیں ہے کہ مذاہب عالم میں سے کوئی مذہب دوسرے مذاہب پر غالب ہو جائے بلکہ یہ جہاد اس لئے ہے کہ اللہ کا نظام انسانی نظاموں پر غالب ہو جائے ' یہ جہاد اس لئے نہیں ہے کہ ایک قوم (مثلاً عرب) دوسری اقوام پر غالب آجائیں بلکہ یہ اللہ کی حاکمیت کو غالب کرنے کے لئے ہوتا ہے ' یہ جہاد اس لئے بھی نہیں ہے کہ کسی ایک انسان (ڈکٹیٹر یا بادشاہ) کی حکومت کو قائم کیا جائے ' یہ حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے جہاد ہے ' یہی وجہ ہے کہ اس عمل جہاد کا حق بنتا ہے کہ وہ پورے کرۂ ارض پر حکومت الٰہیہ قائم کرے ' تاکہ تمام انسان انسانوں کی غلامی سے آزاد ہوں ' بلاتفریق کے چاہے وہ مذہب اسلام میں داخل ہوں یا نہ ہوں یا کوئی سرزمین حدود اسلام میں داخل ہو یا نہ ہو ' کیونکہ یہ ملک اللہ کا ملک ہے اور تمام انسان اللہ کے بندے ہیں اور حکومت الٰہیہ کے خلاف جو لوگ بھی اپنا اقتدار قائم کرتے ہیں وہ طاغوت ہیں ۔

جب ان لوگوں کی نظروں میں یہ حقیقت نہیں ہوتی تو پھر ظاہر ہے کہ وہ اس بات کے کہنے سے خوف محسوس کرتے ہیں کہ کوئی نظام اٹھے اور وہ دنیا سے تمام دوسرے نظاموں کو ختم کرنے کی مہم شروع کر دے ۔ یا کوئی قوم اٹھے اور وہ دنیا کی دوسری اقوام کو اپنا تابع بنا کر رکھے ۔ موجودہ حالات میں یہ بات نہیں چل سکتی ' اور عملاً بھی نہیں ملتی ۔ جب تک کہ ہم اسلام کے نظریہ جہاد کی وہ تعبیر نہ کریں جو ہم نے کی ہے ۔ کیونکہ موجودہ نظام ہائے زندگی تمام کے تمام انسان کے بنائے ہوئے نظام ہیں اور ان میں کوئی ایسی مثال نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی ایک نظام یہ دعویٰ کرے کہ وہ نظام حق ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا نظام اس قابل نہیں ہے کہ وہ زندہ رہے کیونکہ اسی طرح ان تمام انسانی نظاموں کے درمیان پر امن بقائے باہمی کا اصول نہیں رہتا جو ان کا مسلم اصول ہے ' جبکہ ایک اسلامی اور الٰہی نظام زندگی کا مقابلہ انسانی نظاموں کے ہوتا ہے اور اس کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ تمام انسانی نظام باطل ہیں اور اس بات کے مستحق ہیں کہ انہیں نیست و نابود کر دیا جائے اور ان کی غلامی میں پسے ہوئے انسانوں کو رہائی دلائی جائے تاکہ وہ اللہ وحدہ کی بندگی اور غلامی میں آجائیں ۔

ان لوگوں کو اس نظریہ کے اعلان میں یہ خوف دامن گیر ہے ' اس لئے ان لوگوں کا مقابلہ ایک منظم اور مکر... ثقافتی یلغار سے ہے ۔ اور یہ مکروہ صلیبی یلغار ان کو یہ باور کراتی ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے اور یہ کہ جہاد کا عمل اس

لئے شروع کیا گیا ہے کہ دوسروں کو اپنے مذاہب ترک کر کے اسلام میں داخل کرنے پر مجبور کیا جائے اور لوگوں کے عقائد ونظریات کا احترام نہ کیا جائے حالانکہ بات یہ نہیں ہے۔

اسلام کے نظریہ جہاد کی اگر یہ تعبیر نہ کی جائے تو دَورِ جدید میں اس کی تفسیر اور عمل کوئی آسان کام نہ ہوگا۔کیونکہ اسلام عدم اکراہ کے اصول پر قائم ہے

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے' ہدایت ضلالت سے اچھی طرح ممتاز ہو چکی ہے) ایسے حالات میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام پھر تلوار لے کر کیوں چلتا ہے اور پھر اللہ نے مسلمانوں کے ساتھ یہ سودا کیوں کیا ہے کہ ان کے مال اور جان جنت کے بدلے خرید لئے ہیں اور ان کی ڈیوٹی یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے راستے میں قتال کرنا ہے جس میں ماریں گے اور مریں گے۔ظاہر ہے کہ یہ قتال اس لئے نہیں ہے کہ لوگوں کو اپنا دین عقیدہ ترک کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ کسی اور غرض کے لئے ہے۔یہ جہاد اس لئے ہے کہ لوگوں کو آزادی رائے کا حق دلایا جائے۔کیونکہ اسلام تو اس اعلان عام کا نام ہے کہ اس کرۂ ارض پر کوئی انسان کسی انسان کا غلام نہ ہوگا۔کیونکہ اس کرۂ ارض پر ہمیشہ ایسے انسان اور ایسے طاغوتی نظام موجود رہے ہیں جو انسان کو انسانوں کا غلام بناتے ہیں' ایسے نظاموں کی پشت پر حکومتوں کی قوت ہوتی ہے یا کسی نہ کسی صورت میں یہ طاغوتی نظام قوی اور منظم ہوتے ہیں اور یہ نظام لوگوں تک دعوت اسلامی کے پہنچنے کی راہ میں حائل ہوتے ہیں اور یہ لوگوں کو اپنی مرضی کے عقائد قبول کرنے کی راہ میں حائل ہوتے ہیں یا مختلف طریقوں سے لوگوں کو فتنے میں ڈالتے ہیں اور یوں انسان کو حریت عقیدہ اور حریت رائے کی آزادی سے محروم کر دیتے ہیں' اب اسلام اپنی قوت سے ایسے نظاموں کو پاش پاش کر دینے کا حق لے کر اٹھتا ہے تاکہ ان ظالم اور جابر قوتوں کو تہس نہس کر دیا جائے۔اس کے بعد عوام الناس کو آزادانہ ماحول فراہم کیا جائے کہ وہ جو عقیدہ چاہیں اختیار کریں' اگر چاہیں تو اسلام میں داخل ہو جائیں اور اگر چاہیں تو وہ داخل نہ ہوں۔اگر وہ اسلام قبول کرتے ہیں تو انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہوں گے۔اور ان کے ذمے وہی فرائض ہوں گے جو دوسرے مسلمانوں کے ذمے ہوں گے۔یہ نئے داخل ہونے والے سابقین کی طرح دینی بھائی ہوں گے۔اور اگر وہ اسلام میں داخل نہ ہوں تو انہیں اختیار ہے کہ وہ اپنے عقائد پر قائم رہیں اور اسلامی حکومت کو جزیہ ادا کریں۔اور یہ جزیہ اس بات کا اعلان ہوگا کہ انہوں نے اسلامی نظام کی اطاعت قبول کر لی ہے اور اب وہ اس کے مخالف یا باغی نہیں ہیں اور یہ کہ یہ ان کی جانب سے ایک قسم کی شراکت ہے جو وہ اسلامی مملکت کے بجٹ میں کرتے ہیں اور اسلامی حکومت ان کی جان ومال کی حفاظت کرتی ہے اور ان مین سے جو عاجز' ضعیف اور فقیر ہوں ان کی کفالت بھی اسلامی حکومت کے ذمہ ہے۔تمام اجتماعی سہولیات میں وہ مسلمانوں کے ساتھ برابر ہیں۔

اسلام نے کبھی بھی کسی فرد کو اپنے عقائد تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا۔جس طرح اپنے دور میں عیسائیت نے اقوام وملل پر مظالم ڈھائے اور انہیں جڑ سے اکھاڑ کر نیست ونابود کر دیا۔قدیم تاریخ میں اندلس اس کی مثال ہے اور جدید تاریخ میں زنجبار اس کی مثال ہے عیسائیت نے یہاں عوام کو مجبور کیا کہ عیسائی بن جائیں۔اور اس کے علاوہ بھی عیسائیوں نے مسلمانوں کے ساتھ اس وقت حسن سلوک کیا جب وہ عیسائی بن گئے' بعض اوقات عیسائیوں نے اپنے مخالف عیسائی

فرقوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا خصوصا جبکہ کوئی فرقہ سرکاری مذہب کے خلاف عقائد رکھتا ہو۔ ۱۲ سو سال گزر گئے اور یہ لوگ مصر کے عیسائیوں پر مظالم ڈھاتے رہے کیونکہ وہ رومہ کے کلیسا کے عقائد میں جزوی اختلاف رکھتے تھے مثلا یہ کہ روح القدس اب یا ابن دونوں سے پیدا ہوا ہے یا مثلا یہ کہ حضرت عیسی کی ایک ہی طبیعت لاہوتی رکھتے تھے یا یہ کہ وہ دو طبیعت لاہوتی اور ناسوتی رکھتے تھے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے عقائد۔

آخری اور حقیقی بات یہ ہے کہ روحانی طور پر شکست خوردہ اہل قلم دراصل دیکھتے ہیں کہ ایک جانب قرآن کے یہ قطعی احکام ہیں کہ جہاد کرو اور دوسری طرف وہ دیکھتے ہیں کہ حالات بالکل ناساز گار ہیں تو ان پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ تو کیا یہ شکست خوردہ لوگ جن کو تو اپنے امور و معاملات میں تصرف کرنے کی اجازت نہیں ہے' جنہوں نے محض مسلمانوں کی طرح نام رکھ چھوڑے ہیں یہ لوگ مغلوب محکوم ہیں اور انہیں آزادی کے لئے کوئی تدبیر نہیں سوجھتی' کیا ان لوگوں میں کوئی بل بوتا ہے کہ وہ انہیں اور زمین پر موجود بڑی بڑی طوغوتی قوتوں کو چیلنج کریں اور ان کے ساتھ جہاد و قتال شروع کر دیں تاکہ دنیا میں کوئی فتنہ نہ رہے اور ہر قسم کا نظام زندگی اللہ کا ہو جائے یہ بات عقل سلیم ہرگز قبول نہیں کرتی۔ اور عملاً یہ بات ممکن ہی نہیں ہے۔

یہ لوگ اس قدر بات بھی نہیں سمجھ پاتے کہ اسلام کا عمل جہاد شروع کب ہوا ہے عمل جہاد و قتال کا آغاز اس وقت ہوا جب اسلامی حکومت قائم ہوگئی جس میں اللہ کے احکام بطور دستور و قانون چلنے لگے تھے' پورا جزیرۃ العرب زیر نگیں آگیا اور تمام عرب اسلام کے دائرے میں آگئے اور اس نظام میں پختگی اور تنظیم پیدا ہوگئی' اس سے قبل تو ایک جماعت ہی تھی جس نے اللہ کے ساتھ سچی بیعت کرلی تھی' اللہ نے اس جماعت کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی دی وہ ایک کے بعد ایک لڑائی میں کامراں ہوتے رہے اور ہر مرحلے سے سرفراز ہو کر گزرتے رہے' آج وہی دور لوٹ کر آگیا ہے جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دور تھا۔ حضورؐ لوگوں کو کلمہ شہادت کی طرف بلا رہے تھے اور ان کے اردگرد جاہلیت کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آپ نے جدوجہد شروع کی یہاں تک کہ مدینہ میں ایک اسلامی مملکت وجود میں آگئی۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاد و قتال کے بارے میں احکامات مختلف مراحل سے گزر کر موجودہ مرحلے تک پہنچتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ احکام یہ آخری شکل و صورت اختیار کر گئے۔ اس لئے ہمارا طریقہ کار یہ رہنا چاہئے کہ ہم لا الہ اللہ کی دعوت لے کر اٹھیں اور بتدریج آخری مرحلہ جہاد تک پہنچ جائیں' اگر اللہ چاہے۔ اگر تحریک اسلامی کا ارتقاء دور جدید میں بھی اس اسلوب پر کیا جائے تو مسلمان وہ بے کار عنصر نہ رہیں گے جو اس وقت ہیں کہ وہ فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے مفادات کے لئے اور اپنی اپنی خواہشات کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ ان کو قومی' نسلی' اور گروہی روایات نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے بلکہ وہ ایک ایسی جماعت اور امت کے طور پر اٹھیں گے جس کا شعار لا الہ اللہ ہو گا۔ اور کلمے کے جھنڈے اور شعار کے سوا ان کا کوئی اور شعار نہ ہو گا۔ ان کے ہاں نہ انسانوں کا بنایا ہوا کوئی نظام ہو گا اور نہ ہی انسان کا بنایا ہوا کوئی دستور و نظام ہو گا۔ یہ جماعت اللہ کا نام اور اللہ کا پیغام لے کر اٹھے گی اور دنیا پر چھا جائے گی۔

جن حالات میں اس وقت مسلمان ہیں وہ دین اسلام کی حقیقت و مسائل کو نہیں سمجھ سکتے' یہ غلاموں کا دین نہیں ہے' اس دین میں تفقہ وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے نکلیں اور ان کے جہاد کی غرض و غایت صرف اعلائے کلمتہ اللہ ہو۔ اس کے سوا کچھ نہ ہو۔ اسلامی حکومت کا قیام ہو اور کوئی غرض و غایت نہ ہو۔ طاغوتی قوتوں کو

مٹاتا ہو اور کچھ نہ ہو۔

اس دین میں تفقہ ان لوگوں سے حاصل نہیں کی جاسکتی جو عیش و عشرت میں گم ہیں' جن کا شغل صرف اوراق علم سے ہے' اس دین میں تفقہ جدوجہد' حرکت اور پھیلاؤ سے حاصل ہوتی ہے' محض متون کتب کا حفظ کرنا اور ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر نصوص پر بحث کرنا' انسان کو فقیہ نہیں بناتا' کسی وقت بھی مسلمانوں کے فقہاء ایسے نہیں رہے۔

آخر میں یہ سوچنا چاہئے کہ درجہ ذیل آیت آخر نازل کن حالات میں ہوئی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۹:۱۲۳) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تمہارے پاس ہیں اور چاہئے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے" ان آیات میں سب سے پہلے اشارہ اہل روم کی طرف ہے' یہ اہل کتاب تھے اس سورت میں ان کے اعتقادی کفر اور عملی کفر کو تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے' ان کا عقیدہ بھی غلط تھا۔ اور ان کا قانون اور دستور نظام بھی اسلام سے منحرف تھا۔

یہ ایک سائن بورڈ ہے اور ہمیں چاہیے کہ ہم اسے غور سے پڑھیں کہ اہل کتاب کے حوالے سے دین اسلام نے کیا پالیسی اختیار کی۔ یہ لوگ خود اپنی کتاب سے بھی منحرف ہو گئے تھے اور خدا کی شریعت کے بجائے مختلف بادشاہوں کی شریعت کے نافذ کنندہ تھے۔ تمام اہل کتاب چاہے وہ جہاں ہوں اور جس دور میں ہوں وہ انسانوں کی بنائی ہوئی شریعت کے پیرو کار ہوتے ہیں۔ اللہ کا حکم ہے کہ جہاں بھی اہل کفر ہوں ان کے ساتھ قتال کرو اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔ اور اس کے بعد کہا جاتا

اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۹:۱۲۳) (اللہ متقیوں کے ساتھ ہے) اس تعقیب کا خاص مفہوم ہے' یہاں تقویٰ سے مراد وہ تقویٰ ہے جسے اللہ محبوب رکھے' یہ تقویٰ وہ ہے جو انسان کو پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے لئے جنگ کرنے پر ابھارے اور اس تقویٰ کے اندر سختی ہو مریل تقویٰ نہ ہو' اور نرم اور پیچھے ہٹنے والا نہ ہو اور اس وقت تک آگے بڑھے جب تک پورے کا پورا دین اللہ کا نہیں ہو جاتا۔

یہاں ہمیں معلوم ہونا چاہئے اور لوگوں کو بھی معلوم ہونا چاہئے کہ "غلظۃ" سے مراد کرختگی نہیں ہے بلکہ دین کے اوپر جم جانا ہے۔ اور پھر اس کے لئے لڑنا بھی اسلامی ضابطہ جنگ کے مطابق لڑنا ہے۔ جنگ کے بھی اسلام نے آداب رکھے ہیں' سختی سے مراد بے قید اور بے ضابطہ سختی نہیں ہے۔

اعلان قتال سے قبل الٹیمیٹم ضروری ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یا تو اسلام قبول کرو' یا جزیہ دے کر اطاعت قبول کرو' یا جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور اگر کسی قوم کے ساتھ کوئی معاہدہ ہے تو اعلان جنگ سے پہلے معاہدے کی منسوخی ضروری ہے بشرطیکہ معاہدے پہ خطرہ لاحق ہو کہ وہ بد عہدی کرے گا۔ (اس سلسلے میں احکام یہ ہیں کہ معاہدہ ان لوگوں کے ساتھ کرنا ہے جو ذمی ہوں اور اسلام کے ساتھ پرامن بقائے باہمی کے اصول پر قائل ہوں یا جزیہ دینے پر راضی ہوں' اس کے سوا کسی کے ساتھ معاہدے کی اجازت نہیں الا یہ کہ مسلمانوں میں کمزوری ہو' اس وقت حسب ضرورت عبوری

معاہدہ کر سکتے ہیں۔)

حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے سلسلے میں جو ہدایات دی ہیں وہ درج ذیل ہیں :

- حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے 'فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی لشکر یا دستے پر کمانڈر مقرر فرماتے تھے تو اسے خصوصیت کے ساتھ خدا خوفی کی وصیت فرماتے تھے ' اور یہ حکم دیتے تھے کہ وہ اپنے ساتھی مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں ' اس کے بعد آپ فرماتے جنگ کرو اللہ کے نام کے ساتھ ' اللہ کے راستے میں ' صرف ان کو قتل کرو جو منکر خدا ہو ' ------------ ' حد سے تجاوز نہ کرو ' غداری نہ کرو ' مثلہ نہ بناؤ ' بچوں کو قتل نہ کرو ' اگر تم کو دشمن سے آمنا سامنا ہو تو اسے تین باتوں کی طرف دعوت دو ' تو اگر وہ کوئی ایک قبول کرلیں تو ان کے ساتھ جنگ سے رک جاؤ ' ان کو اسلام کی دعوت دو ' اگر مان جائیں تو قبول کرلو ' اور رک جاؤ ' اس کے بعد ان کو دعوت دو کہ وہ اپنا علاقہ چھوڑ کر دار لمہاجرین کی طرف آجائیں اگر وہ ایسا کریں تو ان سے کہہ دو کہ تمہارے وہی حقوق ہوں گے جو مہاجرین کے ہوں گے تو اگر وہ دار الحرب کی طرف منتقل نہیں ہوتے تو وہ مسلمانوں کی دیہاتی آبادی ہوگی اور انہیں بھی وہی احکام جاری ہوں گے جو مسلمانوں پر جاری ہوتے ہیں لیکن مال غنیمت اور فے میں ان کا حصہ نہ ہوگا۔ الا یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد کریں۔ اگر وہ یہ پوزیشن بھی اختیار نہیں کرتے تو ان سے جزیہ طلب کریں اگر جزیہ دینے پر راضی ہوجائیں تو ان سے قبول کرلیں اور جنگ نہ کرو ' اور اگر وہ یہ صورت بھی قبول نہ کریں تو اللہ سے نصرت طلب کرکے ان کے ساتھ جنگ کریں۔" (مسلم ' ابوداؤد ' ترمذی)

- حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ' فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض مغازی میں ایک عورت مقتول پائی گئی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا۔ (بخاری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی طرف بھیجا اور ان کو یہ وصیت فرمائی :

"تم اہل کتاب کے پاس جاؤ ' ان کو کلمہ طیبہ کی شہادت کی طرف دعوت دو ' کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ' اور میں اللہ کا رسول ہوں ' اگر وہ اس بات کو مان لیں تو پھر ان کو بتاؤ کہ اللہ نے تم پر رات دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر یہ بات بھی تسلیم کرلیں تو پھر ان کو بتائیں کہ اللہ نے تم پر زکوۃ فرض کی ہے جو اغنیا سے لی جاتی ہے اور فقراء کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔ اگر وہ اس بات کو بھی قبول کرلیں تو پھر ان کے بہترین اموال سے پرہیز کرو ' اور مظلوم کی پکار سے بچو ' کیونکہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے"

ابوداؤد نے ایک جہنی شخص سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "شاید تمہیں کسی قوم سے لڑنا پڑے اور تم ان پر غالب آجاؤ ' وہ اپنی جان اور اولاد کے بچانے کے لئے تمہارے ساتھ سال کے بدلے کچھ شرائط پر صلح کرلیں تو شرائط صلح سے زیادہ ان سے کچھ نہ لو ' یہ تمہارے لئے اچھا نہیں ہے"

- حضرت عرباض ابن ساریہ سے روایت ہے ' فرماتے ہیں "ہم رسولؐ کے ساتھ خیبر میں اترے اور آپ کے ساتھ مسلمانوں کی بڑی تعداد تھی ' خیبر کا حکمران بڑا سرکش اور متکبر تھا۔ وہ نبیؐ کے سامنے آیا اور کہا اے محمد کیا تمہیں اختیار ہے کہ ہمارے گدھوں کو ذبح کردو ' ہمارے پھل کھالو ' اور ہماری عورتوں کو مارو پیٹو؟ اس پر حضورؐ کو غصہ

آیا آپؐ نے فرمایا اے ابن عوف گھوڑے پر سوار ہو جاؤ اور اعلان کر دو ' یہ جنت صرف مومنین کے لئے ہے اور فوراً نماز کے لئے حاضر ہو جاؤ۔ اس کے بعد آپ نے نماز باجماعت ادا کی اور اس کے بعد کھڑے ہو کر یہ تقریر فرمائی تم میں سے ایک شخص اپنی نشست پر تکیہ لگا کر بیٹھ جائے گا اور یہ گمان کرے گا کہ اللہ نے کسی چیز کو حرام نہیں قرار دیا مگر وہ جو صرف قرآن کریم میں ہے۔ خبردار! میں نے وعظ کیا ہے ' بعض چیزوں کا حکم دیا ہے ' بعض سے منع کیا ہے ' یہ سب احکام قرآن کی طرح ہیں یا اس سے بھی زیادہ۔ اللہ نے تمہارے لیے یہ جائز نہیں قرار دیا کہ اہل کتاب کے گھروں میں داخل ہو جاؤ ' مگر ان کی اجازت سے ' نہ ان کی عورتوں کو مارنے کی اجازت دی ہے ' نہ ان کے پھل کھانے کی اجازت دی ہے جبکہ وہ حق ادا کر دیں جو ان پر ہے"۔

"یہ روایت مرفوع بیان کی گئی ہے کہ جنگی صفوں کے درمیان ایک بچی کو قتل کر دیا گیا ' اس پر حضورؐ بہت ہی دلگیر ہوئے ' بعض لوگوں نے پوچھا حضورؐ آپ کو کس چیز نے اس قدر مغموم کر دیا ہے۔ آخر وہ تو مشرکین کی بچی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت ہی غصہ ہوئے ' اور فرمایا (مفہوم یہ ہے) یہ بچے تم سے بہتر ہیں۔ یہ فطرت پر ہیں۔ کیا تم مشرکین کی اولاد نہیں ہو؟ لہٰذا بچوں کے قتل سے باز رہو ' بچوں کے قتل سے باز رہو۔"

یہ تھیں نبوی تعلیمات جن کی اساس پر خلافت راشدہ کی پالیسی جاری رہی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجاہدین کو یہ نصیحت فرمائی کہ تم ایسے لوگ پاؤ گے جن کا خیال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں بند کر لیا ہے تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور بچوں ' عورتوں اور بوڑھوں کو ہرگز قتل نہ کرنا۔

حضرت زید ابن وھب نے فرمایا کہ ہمارے نام حضرت عمرؓ کا یہ سرکلر پہنچا ' حد سے تجاوز نہ کرو ' غداری نہ کرو ' بچوں کو قتل نہ کرو اور مزارعین کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔

ان کی وصیتوں میں سے ایک یہ بھی ہے "بہت بوڑھے کو قتل نہ کرو ' عورت کو قتل نہ کرو ' بچوں کو قتل نہ کرو ' جب مڈبھیڑ ہو تب بھی ان کے قتل سے باز رہو اور حملے کے وقت بھی۔

یہ ہیں متواتر احادیث جو دشمنان اسلام کے ساتھ جنگ کے دوران مسلمانوں کے لیے ضابطہ اخلاق متعین کرتی ہیں۔ ان احادیث میں نہایت بلند جنگی اخلاق دیئے گئے ہیں جن میں انسان کی انسانیت کے شرف کو ملحوظ نظر رکھا گیا ہے۔ نیز ان میں جنگی عمل کو صرف ان صورتوں تک محدود کر دیا گیا ہے جن میں انسان کو دوسرے انسانوں کی غلامی سے چھڑانا مقصود ہو۔ نیز یہ جنگ بھی مہذب جنگ ہوتی ہے جس میں سختی ' شدت اور وحشیانہ اعمال کی گنجائش نہیں ہے جس کی رو سے بوڑھے ' بچے اور عورتیں بالکل محفوظ ہیں۔ اور وہ لوگ بھی جو جنگ نہیں کرتے۔ یہ ایسی جنگ نہیں ہے جو دور حاضر کے نام نہاد مہذب لوگ لڑتے ہیں۔ جس میں کشتوں کے پشتے لگا دیتے اور جس کی زد میں عورتیں اور بچے بھی آتے ہیں بلکہ جوان بھی۔ جبکہ اسلام نے تمام غیر محارب افراد کو جنگ کی زد سے محفوظ رکھا ہے۔ انسانیت کا احترام سکھایا ہے ' اسلام نے جنگ میں شجاعت اور جراءت و ثابت قدمی کی تعلیم دی ہے لیکن اس حد تک جس حد تک جنگ میں ضرورت ہو اس نے انتقام ' نسل کشی اور مثلہ بنانے کی اجازت نہیں دی۔

○○○

اس سورت میں منافقین کے بارے میں نہایت طویل بات کی گئی ہے۔ اب اس سورت کے اختتام کے قریب بتایا جاتا ہے کہ ان منافقین کا طریقہ واردات کیا ہے؟ وہ نزول آیات کے وقت اور نفاذ احکام و شریعت کے وقت کس ردعمل کا اظہار کرتے ہیں؟ کس طرح یہ منافقین آیات کی تکذیب کرتے ہیں۔

---

وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ
قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾
اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ
وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ
هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ
لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

"جب کوئی نئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے بعض لوگ (مذاق کے طور پر مسلمانوں سے) پوچھتے ہیں کہ کہو، تم میں سے کس کے ایمان میں اس سے اضافہ ہوا؟" جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں تو فی الواقع (ہر نازل ہونے والی سورت نے) اضافہ ہی کیا ہے اور وہ اس سے دلشاد ہیں، البتہ جن لوگوں کے دلوں کو (نفاق) کا روگ لگا ہوا تھا ان کی سابق نجاست پر (ہر نئی سورت نے) ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیا اور وہ مرتے دم تک کفر ہی میں مبتلا رہے۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک دو مرتبہ یہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں؟ مگر اس پر بھی نہ توبہ کرتے ہیں نہ کوئی سبق لیتے ہیں۔ جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو یہ لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں کہ کہیں کوئی تم کو دیکھ تو نہیں رہا ہے، پھر چپکے سے نکل بھاگتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دل پھیر دیئے ہیں کیونکہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں"۔

جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان کا پہلا سوال یہ ہوتا ہے:

"جب کوئی نئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے بعض لوگ (مذاق کے طور پر مسلمانوں سے) پوچھتے ہیں کہ کہو، تم میں سے کس کے ایمان میں اس سے اضافہ ہوا؟"

یہ ایک شکی مزاج کا سوال ہے، جس میں شرارت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایسے شخص کا سوال ہے جس کے قلب و نظر پر، نازل ہونے والی کسی سورت کا کوئی اثر بھی نہ ہوا ہو، اگر اس شخص کے قلب و نظر پر کسی سورت کا کچھ اثر ہوتا تو اس کو یہ سوال کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ پھر اس شخص کے سوال میں یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ یہ شخص اس نازل ہونے والی

سورت کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔اس کو سورت کی اثر انگیزی میں شک ہے۔

چنانچہ اس کا جواب دستی دے دیا جاتا ہے۔یہ ایسا جواب جسے رد نہیں کیا جا سکتا۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّهُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ (۱۲۴) وَ اَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ

(۱۲۵)(۹:۱۲۴ — ۱۲۵))"جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں تو فی الواقع (ہر نازل ہونے والی سورت نے) اضافہ ہی کیا ہے اور وہ اس سے دلشاد ہیں' البتہ جن لوگوں کے دلوں کو (نفاق) کا روگ لگا ہوا تھا ان کی سابق نجاست پر (ہر نئی سورت نے) ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیا اور وہ مرتے دم تک کفر ہی میں مبتلا رہے"۔ یعنی اہل ایمان کے لیے دلائل ایمان میں اضافہ ہو گیا اس لیے ان کے ایمان میں تو اضافہ ہو گیا' ان کے دل اللہ کے ذکر کے ساتھ دھڑکنے لگے' یوں ایمان میں اضافہ ہو گیا' ان کے دل میں یہ شعور پیدا ہو گیا کہ اللہ نے ان پر عنایت کی اور اپنی آیات نازل کر دیں تو اللہ پر ان کا ایمان زیادہ ہو گیا۔اور جن لوگوں کے دل میں منافقت کا مرض تھا' جن کے دل میں گندگی تھی تو اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔چنانچہ اس قسم کے لوگ مرتے دم تک ایسے ہی گندے' منافق اور کافر ہی رہے۔یہ اللہ کی طرف سے سچی خبر ہے اور ایسا ہی ہوا۔

اس سے قبل کہ قرآن مجید ان کے منافقانہ استعجاب کے ایک متحرک منظر کو پیش کرے۔اللہ تعالیٰ خود ان کی حالت کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ان کی حالت بذات خود تعجب انگیز ہے' اس لیے کہ آزمائش اور ابتلاء کا بھی ان منافقین پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

اَوَلَا یَرَوْنَ اَنَّهُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ وَ لَا هُمْ یَذَّكَّرُوْنَ (۹:۱۲۶) "کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک دو مرتبہ یہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں؟ مگر اس پر بھی نہ توبہ کرتے ہیں' نہ کوئی سبق لیتے ہیں"۔ مثلاً آزمائش یوں ہوتی ہے کہ بعض اوقات ان کا نفاق طشت ازبام ہو جاتا ہے۔بعض اوقات یہ لوگ جنگ سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور مسلمانوں کو پھر بھی فتح نصیب ہوتی ہے' ان کے علاوہ بھی مختلف طریقوں سے ان کی آزمائش ہوتی رہتی ہے لیکن ان کو پھر بھی توبہ کی توفیق نہیں ہوتی۔

اب ذرا نگاہ ڈالئے اسکرین پر' ان منافقین کی ایک متحرک اور چلتی پھرتی تصویر آپ کو نظر آئے گی جس میں ان کے پورے خدوخال نظر آئیں گے صاف صاف۔

وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ هَلْ یَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ (۹:۱۲۷) جب کوئی سورہ نازل ہوتی ہے تو یہ لوگ

آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں کوئی تم کو دیکھ تو نہیں رہا ہے ' پھر چپکے سے نکل بھاگتے ہیں ۔ اللہ نے ان کے دل پھیر دیے ہیں کیونکہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں ۔ نظر آتا ہے کہ جب یہ سورہ نازل ہو رہی تھی تو یہ لوگ ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے تھے ' کوئی دیکھ تو نہیں رہا؟ جب دیکھتے ہیں کہ مسلمان تو کلام الٰہی سننے میں منہمک ہیں تو یہ لوگ چپکے سے بھاگ جاتے ہیں ۔ نہایت ہی خاموشی دبے پاؤں بلکہ پاؤں کی انگلیوں پر چل کر ۔

انْصَرَفُوْا "یہ منہ پھیر کر چلے جاتے ہیں " لیکن جو آنکھ غافل نہیں ہے وہ دیکھ رہی ہے کہ وہ تو کبھی غافل اور مشغول نہیں ہوتی ---- چنانچہ ان کی اس حرکت کے عین مناسب بد دعا آجاتی ہے ۔

صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (۹ : ۱۲۷) "اللہ نے ان کے دل پھیر دیئے ) وہ راہ ہدایت سے بہت دور نکل جائیں اور اپنی اس گمراہی ہی میں مگن رہیں ۔

بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۹ : ۱۲۷) "کیونکہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں" انہوں نے اپنے دل و دماغ کو معطل کر دیا ہے اور یہ اس کے مستحق نہیں ہیں ۔ غرض یہ ایک متحرک اور بھرپور منظر کے چند الفاظ میں اس کی منظر کشی کی جاتی ہے اور نظروں کے سامنے تمام کردار پھرتے نظر آتے ہیں ۔

○○○

اس سورہ کا خاتمہ دو آیات پر ہوتا ہے ' بعض روایات میں آیا ہے کہ وہ مکی آیات ہیں ' بعض میں آتا ہے کہ یہ مدنی آیات ہیں ' ہم سمجھتے ہیں ' کہ یہ مدنی ہیں ' ان آیات کا ربط اس سبق کے ساتھ بھی واضح ہے اور پوری سورہ کے ساتھ بھی ان آیات کا مفہوم مربوط ہے ۔ شاید یوں کہ امت مسلمہ رسول اللہ ؐ کی قیادت اور حمایت میں ' دعوت اسلامی کی راہ میں اور دشمنان دعوت کے ساتھ جنگ و جہاد میں جو مشکلات اٹھا رہے ہیں اس پر رسول ؐ کو سخت تکلیف ہوتی ہے ' جبکہ دوسری آیت میں رسول اللہ ؐ کے فرائض یہ بتائے گئے ہیں کہ اگر ایسے جانفشاں ساتھی نہ بھی ہوتے تو بھی آپ کو یہ کام تن تنہا کرنا تھا ۔ صرف اللہ کے بھروسے پر لہٰذا منکرین و منافقین کے رویے سے پریشان نہ ہوں ۔

---

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ
۱۲ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ
ع ۷ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾
۵

دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے ' تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے ' تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے ' ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے ۔ اب اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرتے ہیں تو اے نبی ؐ ' ان سے کہہ دو کہ " میرے لیے اللہ بس کرتا ہے ' کوئی معبود نہیں مگر وہ اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہ ۱۲۹

ہے عرش عظیم کا"۔

یہاں تم میں سے نہیں کہا ہے بلکہ یہ کہا کہ تمہارے نفسوں میں سے۔ نفس کے لفظ سے گہرے تعلق کا اظہار ہوتا ہے اور یہ لفظ زیادہ حساس ہے' اس سے تعلق اور رابطے کی گہرائی ظاہر ہوتی ہے' یعنی رسول تمہاری جانوں کا ٹکڑا ہے' تمہارے وجود کا ایک حصہ ہی ہے' یعنی اس کا نفس تمہارے نفسوں سے ملا ہوا ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (۹ : ۱۲۸) "دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے"۔

تمہارا نقصان میں پڑنا اور مشقت میں گرفتار ہونا اس پر شاق گزرتا ہے۔

عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ (۹ : ۱۲۸) "تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے"۔ اور وہ تم پر حریص ہے۔ تمہیں وہ ہلاکت و بربادی سے دوچار نہیں کرتا۔ اس نے تمہیں جہاد و قتال کا سبق سکھایا اور مشکلات میں تمہیں جو عظیم مہم پر لے گیا ہے' یہ اس وجہ سے نہیں کہ اس کے نزدیک تمہاری کوئی وقعت نہیں ہے یا وہ سنگدل ہے۔ بلکہ یہ بھی ایک قسم کی رحمت اور مہربانی ہے۔ یہ در حقیقت تمہیں ذلت سے نکال کر عزت کا مقام دیا جا رہا ہے' اور گناہوں سے بچا کر تم پر رحم کیا جا رہا ہے اور رسول اس بات پر حریص ہیں کہ تم دعوت اسلامی کے حامل ہونے کا شرف پاؤ اور تمہیں اللہ کی رضامندی حاصل ہو اور تمہارے دلوں میں خدا کا خوف پیدا ہو' اس طرح تم جنت کے مستحق بن جاؤ۔

اب آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا جاتا ہے کہ اگر تمام لوگ بھی منہ موڑ لیں تو تمہارا طریقہ یہ ہو گا کہ تم پھر بھی اللہ پر بھروسہ کر کے آگے بڑھو۔ وہی تمہارا حامی و ناصر ہو گا۔

حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۲۸) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۱۲۹) (۹ : ۱۲۸ - ۱۲۹) "تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے' ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے --- اب اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرتے ہیں تو اے نبیؐ' ان سے کہہ دو کہ "میرے لیے اللہ بس کرتا ہے' کوئی معبود نہیں مگر وہ اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہ مالک ہے عرش عظیم کا"۔

تمام قوتوں' تمام بادشاہتوں اور تمام عظمتوں کا مالک تو وہی ہے جو شخص اس کے دربار میں پناہ لے اور اس کا دوست بن جائے وہ اس کے لیے کافی ہے۔

قتال و جہاد کی صورت کا یہ خاتمہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جنگی قوت اور ساز و سامان کے باوجود بھروسہ صرف اس پر کیا جانا چاہئے' اس سے مدد طلب کرنا چاہئے کیونکہ وہی رب عرش عظیم ہے۔

○○○

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کے قابل کہ یہ سورت محکم اور قانونی آیات پر مشتمل ہے اور اس میں اسلامی سوسائٹی

اور تمام جاہلی سوسائٹیوں کے درمیان روابط و تعلقات کی ایک مستقل صورت بتائی گئی ہے جب کہ ہم نے تفصیلات دی ہیں ۔ اس لیے اس سورت کی آیات کو اس موضوع کو آخری حکم اور آخری قانون تصور کرنا چاہئے اور ان آیات و ضوابط کو ان کے لیے مخصوص نہ ماننا چاہئے جو اس سے بہت پہلے نازل ہوئی تھیں ۔ کیونکہ سابقہ آیات اور احکام عبوری آیات و احکام تھے اور اس کا پہلے ثبوت تو یہ ہے کہ نزول کے اعتبار سے وہ آیات پہلے نازل ہوئیں ' نیز دعوت اسلامی اور تحریک اسلامی جن مراحل سے گزری اسی سورت میں اس کا آخری مرحلہ بیان ہوا ہے ۔ تیسری بات یہ کہ دعوت اسلامی کا مزاج اور منہاج جو ہم نے اس سورت کے آغاز میں بیان کیا اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہئے ۔

اور یہ منہاج وہ ہے جو صرف ان لوگوں کی سمجھ میں آسکتا ہے جو اس تحریک کو ایک عملی اور جہاد فی سبیل اللہ کی تحریک سمجھ کر اٹھتے ہیں تاکہ اس کرۂ ارض پر دین کا وجود قائم کیا جائے اور لوگوں کو اللہ کی ربوبیت کی طرف لوٹایا جائے اور انہیں لوگوں کی بندگی اور غلامی سے باہر نکالا جائے ۔

یاد رہے کہ تحریکی فہم و ادراک اور لائبریریوں کے فہم و ادراک میں بہت بڑا فرق ہے ' جو لوگ صرف لائبریری میں کتابوں کے اوراق سے دین کو سمجھتے ہیں وہ اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ لائبریری میں نہ اسلام پر عمل ہو سکتا ہے اور نہ عملاً اسے چکھا جا سکتا ہے ۔ رہی تحریکی فقہ اور تفقہ تو اس میں انسان جاہلیت کے بالمقابل بھی کھڑا ہوتا ہے ۔ وہ ایک ایک قدم آگے بڑھتا ہے ' مرحلہ وار چلتا ہے ' ایک ایک موقف سے عملاً دوچار ہوتا ہے ۔ وہ عملی واقعات کے سامنے آگے احکام پاتا ہے ' عملی مسائل میں اس کے سامنے احکام آتے ہیں اور وہ انہیں قبول کرتا ہے ۔ اور واقعات کے بدلنے سے احکام بدلتے رہتے ہیں ۔

اس سورت میں جو آخری احکام وارد ہوئے ہیں جس وقت یہ وارد ہوئے تو اسلام و جاہلیت آمنے سامنے تھے اور کشمکش برپا تھی ۔ ان عملی صف بندیوں میں یہ آخری احکام تھے ' رہے وہ احکام جو اس سے پہلے طویل تحریکی مرحلوں میں آئے تھے تو وہ عبوری تھے ۔

اب اگر کوئی اسلامی تحریک از سرنو کام کا آغاز کرے تو اس کے عبوری ادوار کے لیے عبوری احکام ہوں گے ۔ لیکن اسے بھی جاننا چاہئے کہ یہ عبوری احکام ہیں اور نئی تحریکوں کا بھی فرض ہے کہ وہ جہاد کے احکام کو عملی جامہ پہنانے آخری مرحلے تک جا پہنچیں اور ان آخری احکامات و مراحل تک تحریک کو پہنچا دیں جو اس سورت میں وارد ہیں ۔ واللہ ھوالموفق ۔

○○○

# سورۂ یونس ایک نظر میں

ایک بار پھر ہم مکی دور نزول قرآن میں آگئے ہیں۔ مکی دور کی ایک خاص فضا ہے۔ اس کی فضا اور اس کے اثرات اور اشارات بالکل جدا ہیں۔ سورہ انفال' سورہ توبہ میں ہم مدنی دور کی فضاؤں میں گھومتے رہے۔

قرآن کریم کا مکی حصہ بھی قرآن کا ہی حصہ ہے اور وہ قرآن کے عمومی خواص میں پورے قرآن کے ساتھ شریک ہے۔ لیکن وہ مدنی قرآن اور تمام انسانی اقوال کے مقابلے میں ایک منفرد اسلوب رکھتا ہے۔ اس کی یہ انفرادیت مضمون اور ادا ہر اعتبار سے ہے۔ البتہ مکی قرآن کی ایک خاص فضا ہے۔ ایک خاص ذوق اور انداز ہے۔ اور یہ انداز مکی موضوعات کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔ وہ کیا موضوعات ہیں' مختصراً یہ کہ مکی قرآن میں حقیقت الوہیت' حقیقت عبودیت اور ان کے درمیان تعلق کی نوعیت لوگوں کے سامنے اس رب کی ذات و صفات کی وضاحت جو واحد مستحق ہے کہ اس کی بندگی کی جائے' اس کے احکام و قوانین کی اطاعت کی جائے اور اسلامی نظریات و عقائد میں جو میل کچیل اور جو انحراف اور پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے اسے صاف کرنا اور لوگوں کو اللہ کی الوہیت اور ربوبیت اور اطاعت کی طرف لوٹا کر واپس لانا بالعموم مکی قرآن کا موضوع کلام ہے۔ ان موضوعات کے لیے نہایت ہی موزوں اور مناسب انداز اظہار اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ اسلوب حد درجہ موثر' اشاراتی اور ساحرانہ ہے۔ اس کے اندر معجزانہ اسالیب کلام کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ الفاظ کی خوبصورتی' موضوع کا حقیقت پسندانہ اور منطقی ہونا جس طرح ہم نے سورہ انعام میں اس پر قدرے بحث کی ہے اور آئندہ بھی کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

اس سے قبل ہم نے سورہ انعام اور سورہ اعراف کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ دونوں سورتیں باہم ترتیب میں پیوست بھی تھیں اور مکی تھیں۔ اگرچہ ان کی زمانہ نزول قریب نہ تھا۔ پھر سورہ انفال اور توبہ کا ہم نے مطالعہ کیا۔ ان کے مضامین اور حالات نزول مدنی تھے اور ان کا بھی ایک خاص مزاج اور اپنے اپنے موضوعات تھے۔ اب سورہ یونس اور سورہ ہود ترتیب مصحفی میں باہم پیوست مکی سورتیں ہمارے سامنے ہیں۔ ان کا ترتیب نزولی بھی قریب ہے۔ ان دونوں سورتوں کے درمیان بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان کے موضوعات بھی ایک جیسے ہیں اور ان میں اسلوب کلام بھی باہم مماثل اور ہم آہنگ ہے۔ سورہ انعام کا موضوع یہ ہے کہ وہ اسلامی نظریہ حیات کو لیتی ہے اور جاہلیت کے سامنے اسے پیش کرتی ہے' اور وہ جاہلیت کے نظریات اور اس کے شعور اور سوچ پر طنزیہ تبصرہ کرتی ہے۔ اہل جاہلیت کے اعمال اور عبادات کو ایک مذاق قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ سورہ اعراف اس نظریہ کو ایک تحریک کی شکل میں لے کر چلتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں جاہلیت کے مقابلے میں اسلامی تحریک اسی طرح کام کرتی رہی ہے جس طرح موجودہ تحریک کام کر رہی ہے۔ یہاں سورہ یونس اور ہود کی صورت حالات بھی یہی ہے۔ ان کے درمیان بے حد مماثلت پائی جاتی ہے۔ سورہ انعام اور سورہ یونس کے درمیان اگر مقابلہ کیا جائے تو سورہ انعام اپنی ضربات اور سرعت رفتار کے اعتبار سے

بہت ہی بلند اور ضخیم ہے۔ اور اس کے مضامین بڑی تیزی سے چلتے ہیں۔ رفتار و تصویر کشی میں وہ نہایت ہی روشن اور واضح ہے جبکہ سورہ یونس میں واقعات کی رفتار دھیمی ہے۔ اس کی نبض نہایت ہی نرمی، سلاست اور باقاعدگی سے چلتی ہے۔ ہود اعراف کے ساتھ مماثل ہے۔ موضوع، طرز ادا اور رفتار واقعات کے اعتبار سے لیکن ہر سورہ کی پھر اپنی امتیازی خصوصیات بھی ہیں اور ہر ایک کے اپنے خدوخال بھی ہیں جو دوسری سورتوں سے ملتے جلتے بھی ہیں اور مخالف بھی ہیں۔

جس طرح ہم نے سابقہ پیراگراف میں بتایا سورہ یونس کا بنیادی موضوع وہی ہے جو تمام مکی قرآن کا بنیادی موضوع ہے۔ اس سورہ نے جو مضامین لیے ہیں وہ اس سورہ کے خدوخال اور اس کی شخصیت کے مطابق ہیں۔ اس سورہ کے مضامین و مشمولات کی یہاں ہم صرف تلخیص ہی دے سکتے ہیں۔ تفصیلات تشریح آیات کے وقت آئیں گی۔ درج ذیل نکات یہاں پیش نظر رکھیں۔

سب سے پہلے اس میں یہ موضوع لیا گیا ہے کہ مشرکین مکہ کو حقیقت وحی کے بارے میں کیا کیا شبہات لاحق ہیں اور نتیجتاً یہی شبہات ان کے ذہنوں میں اس کتاب کے بارے میں بھی ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی اپنی طرف سے قرآن جیسا کلام کس طرح لا سکتا ہے؟

الر تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (۱) اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ (۲) (۱۰: ۱ — ۲) "ال ر، یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو حکمت و دانش سے لبریز ہے۔ کیا لوگوں کے لیے یہ ایک عجیب بات ہو گئی کہ ہم نے خود انہی میں سے ایک آدمی کو اشارہ کیا کہ لوگوں کو چونکا دے اور جو مان لیں ان کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس سچی عزت و سرفرازی ہے؟ منکرین نے کہا کہ یہ کھلا جادوگر ہے"۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۵) قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۶) فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ (۱۷) (۱۰: ۱۵ تا ۱۷) "جب انہیں ہماری صاف صاف باتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں،

کہ "اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو"۔ اے محمدؐ ان سے کہو "میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر اور تبدل کر لوں۔ میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے"۔ اور کہو "اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو میں یہ قرآن کبھی نہ سناتا اور اللہ تمہیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے۔ یقیناً مجرم کبھی فلاح نہ پائیں گے۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۳۷) اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۸)(۱۰ : ۳۷ - ۳۸)) "اور قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی کے بغیر تصنیف کر لیا جائے بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آ چکا تھا اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فرمانروائے کائنات کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو "اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورہ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو' مدد کے لیے بلا لو"۔

اب ان کے مطالبہ معجزہ' ماسوائے قرآن' کا جواب دیا جاتا ہے۔ اور اس مطالبے کا بھی جواب دیا جاتا ہے جو وہ جلد عذاب لے آنے کے سلسلے میں مطالبہ کرتے تھے۔ پہلے سوال کے بارے میں جواب یہ دیا جاتا ہے کہ سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے۔ وہ ایک منفرد انداز میں دلائل و براہین پیش کرتا ہے۔ اور منکرین کو چیلنج بھی دیتا ہے کہ اگر وہ اسے معجز کلام الہی نہیں مانتے تو ایسا کلام لے آئیں۔ اور یہ کہ ظہور معجزات صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ اور یہ کہ انہیں سزا تو ملے گی مگر کب یہ اللہ کے نظام قضا و قدر سے متعلق ہے۔ نبی کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ جب چاہے معجزہ صادر کر دے۔ وہ تو اللہ کے بندوں میں سے ایک عاجز بندہ ہے۔ یہ سوال کا جواب ہونے کے ساتھ ساتھ باری تعالیٰ کی تعریف اور تعارف بھی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ صدور معجزات کا محل و منبع ذات الوہیت ہے' یہ اختیارات عبودیت کے دائرے میں نہیں ہے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۳) ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۴)(۱۰ : ۱۳ - ۱۴)) "لوگو' تم سے پہلے

کی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا' جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ایمان لا کر ہی نہ دیا۔ اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو"۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ فَإِذَا جَآءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (٤٧) وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ (٤٨) قُل لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَآءَ اللَّهُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ إِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (٤٩) قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَتَىٰكُمْ عَذَابُهُ بَيَٰتًا أَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ (٥٠) أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ ءَامَنتُم بِهِ ءَآلْـَٰٔنَ وَقَدْ كُنتُم بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ

(٥١) (١٠ : ٤٧ تا ٥١) " ہر امت کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب کسی امت کے پاس اس کا رسول آ جاتا ہے تو اس کا فیصلہ پورے انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے اور اس پر ذرہ ظلم نہیں کیا جاتا۔ کہتے ہیں اگر یہ تمہاری دھمکی سچی ہے تو آخر یہ کب پوری ہو گی؟ کہو' میرے اختیار میں خود اپنا نفع ضرر بھی نہیں ہے' سب کچھ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ ہر امت کے لیے مہلت کی ایک مدت ہے۔ جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہوتی"۔ ان سے کہو کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ کا عذاب اچانک رات یا دن کو آ جائے؟ آخر یہ ایسی کون سی چیز ہے جس کے لیے مجرم جلدی مچائیں"۔

وَيَقُولُونَ لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ ءَايَةٌ مِّن رَّبِّهِۦ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانتَظِرُوٓا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ (١٠ : ٢٠) "اور یہ جو وہ کہتے ہیں کہ اس نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی تو ان سے کہو' غیب کا مالک و مختار تو اللہ ہی ہے' اچھا انتظار کرو' میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"۔

یہ سورہ حقیقت الوہیت اور حقیقت عبودیت کے بارے میں ان کے مضطرب تصورات پر بھرپور انداز میں بحث کرتی ہے۔ اس کے بارے میں حضور ان کے ساتھ ہم کلام ہیں اور انہیں دعوت حق دیتے ہیں لیکن وہ وحی کا انکار کرتے ہیں یا اس کے بارے میں شک کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی وہ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ حضور موجودہ قرآن کو بدل دیں' یا یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ ان کے سامنے کوئی مادی معجزہ پیش کریں جو ان کے دلوں میں صحت رسالت کی دلیل بن جائے حالانکہ وہ خود رات اور دن ایسے خداؤں کی بندگی میں لگے ہوئے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے اور نہ نفع۔ پھر وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے ہاں سفارشی ہوں گے۔ پھر ان لوگوں کے بغیر کسی علم اور ثبوت کے یہ عقیدہ گھڑ لیا ہے کہ اللہ کی [illegible] بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کو بتایا جاتا ہے کہ اللہ حق کی صفات کیا ہوتی ہیں۔ ان کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ اللہ کے

آثار قدرت کیا ہیں اور یہ کہ ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات میں آثار قدرت الٰہیہ موجود ہیں بلکہ خود ان کے اپنے وجود کے اندر قدرت الٰہیہ کے آثار موجود ہیں۔ اس کائنات کے اندر نمایاں تبدیلیاں اور گردش لیل و نہار اور پھر وہ بدلتے ہوئے خطرناک حالات جن سے وہ کبھی کبھار جب دوچار ہوتے ہیں تو ان میں خود ان کی فطرت پکار اٹھتی ہے کہ ایسے حالات میں صرف اللہ وحدہ ہی بچا سکتا ہے۔ اس سورہ کے مختلف ٹکڑوں میں اس موضوع یعنی موضوع توحید کو لیا گیا ہے۔ یہ اس کا اصل موضوع ہے اور دوسری باتیں اسی کی فرع اور شاخیں ہیں۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۳) اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا اِنَّهٗ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِیْمٌ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ (۴) هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (۵) اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ (۶) (۱۰: ۳ تا ۶) "حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا' پھر تخت حکومت پر جلوہ گر ہوا اور کائنات کا انتظام چلا رہا ہے۔ کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہے۔ الا یہ کہ اس کی اجازت کے بعد شفاعت کرے۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے۔ لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو۔ پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے۔ اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے۔ یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک پیدائش کی ابتدا وہی کرتا ہے' پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ان کو پورے انصاف کے ساتھ جزا دے۔ اور جنہوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا وہ کھولتا ہوا پانی پئیں اور دردناک سزا بھگتیں اس انکار حق کی پاداش میں جو وہ کرتے رہے' وہی ہے جس نے سورج کو اجیالا بنایا اور چاند کو چمک دی اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں ٹھیک ٹھاک مقرر کر دیں تاکہ تم اس سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ بامقصد ہی بنایا ہے۔ وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کی ہے' نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو بچنا چاہتے ہیں"۔

وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ وَیَقُوْلُوْنَ هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ

اللّٰہِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰہَ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ سُبْحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (۱۰ : ۱۸) "یہ لوگ اللہ کے سوا ان لوگوں کی پرستش کرتے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے اور نہ نفع اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ اے محمدؐ ان سے کہو"کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو' جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں؟" پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں"۔

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ حَتّٰۤی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْکِ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ (۲۲) فَلَمَّاۤ اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُکُمْ عَلٰۤی اَنْفُسِکُمْ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُکُمْ فَنُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۳) (۱۰ : ۲۲ - ۲۳) "وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر باد موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک باد مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے۔ اس وقت سب اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ "اگر تو نے ہم کو اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے"۔ مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔ لوگو! تمہاری بغاوت الٹی تمہارے خلاف پڑ رہی ہے۔ دنیا کے چند روزہ مزے لوٹ لو' پھر ہماری طرف پلٹ کر آنا ہے' اس وقت ہم تمہیں بتا دیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔

قُلْ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَمَّنْ یَّمْلِکُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ مَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَ مَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۳۱) فَذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ (۳۲) (۱۰ : ۳۱ - ۳۲) "ان سے پوچھو' کون تم کو آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان سے جاندار کو اور جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔ کہو' پھر تم (اس حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز

نہیں کرتے؟ تب تو پھر یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے۔ پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا باقی رہ گیا؟ آخر یہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو)"۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (٣٥) وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (٣٦) (١٠: ٣٥ - ٣٦)) "ان سے پوچھو، تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کون ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہو اور پھر اس کا اعادہ بھی کرے؟ کہو، وہ صرف اللہ ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور اس کا اعادہ بھی۔ پھر تم یہ کس الٹی راہ پر چلائے جا رہے ہو؟ ان سے پوچھو تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہو؟ کہو، وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ پھر بھلا بتاؤ، جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے وہ اس سے زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا الا یہ کہ اس کی راہنمائی کی جائے؟ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے، کیسے الٹے الٹے فیصلے کرتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ قیاس وگمان کے پیچھے چلے جا رہے ہیں، حالانکہ گمان حق کی ضرورت کچھ بھی پورا نہیں کرتا۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے"۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (٦٦) هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ

(٦٧) (١٠: ٦٦ - ٦٧)) "آگاہ رہو! آسمان کے بسنے والے ہوں یا زمین کے، سب کے سب اللہ کے مملوک ہیں اور جو لوگ اللہ کے سوا کچھ شریکوں کو پکار رہے ہیں وہ نرے وہم وگمان کے پیرو ہیں اور محض قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی کہ اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا۔ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے، جو سنتے ہیں"۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ هُوَ الْغَنِيُّ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (٦٨) قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ (٦٩) مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ

نُذِيقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ (۷۰) (۱۰:۶۸ تا ۷۰) ''لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ سبحان اللہ! وہ تو بے نیاز ہے' آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے' سب اس کی ملک ہے' تمہارے پاس اس قول کے لیے آخر دلیل کیا ہے؟ کیا تم اللہ کے متعلق وہ باتیں کہتے ہو جو تمہارے علم میں نہیں ہیں؟ اے محمد' کہہ دو کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پا سکتے۔ دنیا کی چند روزہ زندگی میں مزے کر لیں۔ پھر ہماری طرف ان کو پلٹنا ہے۔ پھر ہم اس کفر کے بدلے جس کا ارتکاب وہ کر رہے ہیں ان کو سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے''۔

أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ أَلَا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۵۵) هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۵۶) (۱۰:۵۵ ـ ۵۶)

''سنو' آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ سن رکھو' اللہ کا وعدہ سچا ہے' مگر اکثر انسان جانتے نہیں ہیں۔ وہی زندگی بخشتا ہے' وہی موت دیتا ہے اور اسی کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے''۔

یہ انسانوں کے سامنے اللہ کا یہ تصور پیش کرتی ہے کہ وہ حاضر و ناظر ہے اور انسان کا ہر اہم معاملہ اس کی نظروں میں ہے۔ ان کی نیات سے بھی وہ باخبر ہے اور ان کے اعمال بھی اس کے سامنے ہیں۔ اس تصور سے انسان کی ذات میں اللہ کا حق اور اس کا ڈر بیٹھ جاتا ہے۔ اللہ کے بارے میں انسان محتاط اور بیدار ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَّمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِن قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ وَمَا يَعْزُبُ عَن رَّبِّكَ مِن مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ أَصْغَرَ مِن ذٰلِكَ وَلَآ أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ (۱۰:۶۱) ''اے نبی تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور قرآن میں سے جو کچھ بھی سناتے ہو اور لوگو' تم بھی جو کچھ کرتے ہو اس کے دوران میں ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں۔ کوئی ذرہ برابر چیز آسمان اور زمین میں ایسی نہیں ہے' نہ چھوٹی نہ بڑی' جو تیرے رب کی نظر میں پوشیدہ ہو اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو''۔

اس سورہ میں انسان کو عذاب الٰہی سے ڈرایا جاتا ہے اور اسے یہ سکھایا جاتا ہے کہ ہروقت خوف خدا دل میں رکھو اور ہر لحظہ عذاب الٰہی کی توقع کرو' خوشحالی اور دولت کی فراوانی کی وجہ سے آنے والی غفلت سے تم صرف اسی صورت میں نجات پا سکتے ہو۔ دنیا کی سرسبزی اور شادابی اور زندگی کی ریل پیل تمہیں عذاب الٰہی سے غافل نہ کر دے جو اکثر اوقات اچانک آ لیتا ہے:

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعٰمُ حَتّٰى إِذَآ أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَآ

أَنَّهُمْ قَٰدِرُونَ عَلَيْهَآ أَتَىٰهَآ أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَٰهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَ بِٱلْأَمْسِ

كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ ٱلْءَايَٰتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (۱۰ : ۲۴) ) "دنیا کی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار' جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں' خوب گھنی ہوگئی' پھر عین اس وقت جبکہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں' یکایک رات کو یا دن کو' ہمارا حکم آگیا اور ہم نے اسے غارت کر کے رکھ دیا۔ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں"۔

قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَتَىٰكُمْ عَذَابُهُۥ بَيَٰتًا أَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ ٱلْمُجْرِمُونَ

(۵۰) أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ ءَامَنتُم بِهِۦٓ ءَآلْـَٰٔنَ وَقَدْ كُنتُم بِهِۦ تَسْتَعْجِلُونَ (۵۱) (۱۰ : ۵۰ -

۵۱) ) "ان سے کہو' کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ کا عذاب اچانک رات کو یا دن کو آجائے (تو تم کیا کر سکتے ہو) آخر یہ ایسی کون سی چیز ہے جس کے لیے مجرم جلدی مچائیں؟ کیا جب وہ تم پر آپڑے اس وقت تم اسے مانو گے؟--- اب بچنا چاہتے ہو؟ حالانکہ تم خود ہی اس کے جلدی آنے کا تقاضا کر رہے تھے"۔

یہ سورہ انہیں متنبہ کرتی ہے کہ تم اس دنیاوی زندگی اور آخرت پر اسے ترجیح دینے پر خوش و خرم اور مطمئن ہو' اور تم اس عقیدے کو جھٹلاتے ہو کہ ایک دن اللہ کے حضور سب انسانوں کو حاضر ہونا ہے۔ یاد رکھو کہ تمہارا یہ اطمینان جھوٹا اور دھوکہ دینے والا ہے اور تمہارا یہ سودا خسارے کا ہے۔ ان کو بتایا جاتا ہے کہ یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے اور آخرت جزاو سزا کی جگہ ہے۔ اس موقع پر مشاہد قیامت میں سے بعض مشاہد لوگوں کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں' خصوصاً یہ منظر کہ یہاں دنیا میں لوگ جن معبودوں کی عبادت کرتے تھے وہاں وہ معبود ان کی عبادت کا صاف صاف انکار کر دیں گے۔ وہ اللہ کے سامنے اپنی براءت کا اظہار کر دیں گے۔ اور یہ منظر کہ وہاں لوگ اگر بڑے بڑے کفارے اور عوض اور فدیے پیش کریں' کچھ بھی قبول نہ ہوگا' عذاب ٹل نہ سکے گا۔

إِنَّ ٱلَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَآءَنَا وَرَضُوا۟ بِٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا وَٱطْمَأَنُّوا۟ بِهَا وَٱلَّذِينَ هُمْ

عَنْ ءَايَٰتِنَا غَٰفِلُونَ (۷) أُو۟لَٰٓئِكَ مَأْوَىٰهُمُ ٱلنَّارُ بِمَا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ (۸) إِنَّ ٱلَّذِينَ

ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّٰلِحَٰتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُم بِإِيمَٰنِهِمْ تَجْرِى مِن تَحْتِهِمُ ٱلْأَنْهَٰرُ فِى جَنَّٰتِ

ٱلنَّعِيمِ (۹) دَعْوَىٰهُمْ فِيهَا سُبْحَٰنَكَ ٱللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَٰمٌ وَءَاخِرُ دَعْوَىٰهُمْ أَنِ

ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ (۱۰) (۱۰ : ۷ - ۱۰) ) "حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی

توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں ' ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہو گا' ان برائیوں کی پاداش میں جن کا اکتساب وہ کرتے رہے ہیں - اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے ' انہیں ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے سیدھی راہ پر چلائے گا' نعمت بھری جنتوں میں ' ان کے نیچے نہریں بہیں گی ' وہاں ان کی صدا یہ ہوگی "پاک ہے تو اے خدا" - ان کی دعا یہ ہوگی کہ "سلامتی ہو" اور ان کی ہر بات کا خاتمہ اس پر ہو گا کہ "ساری تعریف اللہ رب العالمین کے لیے ہے" -

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۳) ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۴) (۱۰:۱۳ — ۱۴) "لوگو' تم سے پہلے کی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا ہے جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ایمان لا کر ہی نہ دیا - اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں - اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے ' تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو؟

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۵) لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۶) وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ مَالَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۷) (۱۰:۲۵ تا ۲۷) "اور اللہ تمہیں دارالسلام کی طرف دعوت دے رہا ہے ' جس کو وہ چاہتا ہے ' سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے - جن لوگوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا ' ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید فضل - ان کے چہروں پر روسیاہی اور ذلت نہ چھائے گی - وہ جنت کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں ان کی برائی جیسی ہے ویسا ہی بدلہ پائیں گے ' ذلت ان پر مسلط ہو گی ' کوئی اللہ سے ان کو بچانے والا نہ ہو گا' ان کے چہروں پر ایسی تاریکی چھائی ہوئی ہو گی ' جیسے رات کے سیاہ پردے ان پر پڑے ہوئے ہوں - وہ دوزخ کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے" -

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ (۲۸) فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا

وَبَيۡنَكُمۡ اِنۡ كُنَّا عَنۡ عِبَادَتِكُمۡ لَغٰفِلِيۡنَ ( ۲۹ ) هُنَالِكَ تَبۡلُوۡا كُلُّ نَفۡسٍ مَّاۤ اَسۡلَفَتۡ وَ

رُدُّوۡۤا اِلَى اللّٰهِ مَوۡلٰٮهُمُ الۡحَـقِّ وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ( ۳۰ )( ۱۰ : ۲۸ تا

۳۰ )) "جس روز ان سب کو ہم ایک ساتھ اکٹھا کریں گے، پھر ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا ہے، کہیں گے ٹھہر جاؤ تم بھی اور تمہارے بنائے ہوئے شریک بھی۔ پھر ہم ان کے درمیان سے اجنبیت کا پردہ ہٹا دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے کہ "تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے کہ ہم تمہاری اس عبادت سے بالکل بے خبر تھے"۔ اس وقت ہر شخص اپنے کیے کا مزہ چکھ لے گا، سب اپنے حقیقی مالک کی طرف پھیرے جائیں گے اور وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے گم ہو جائیں گے"۔

وَيَوۡمَ يَحۡشُرُهُمۡ كَاَنۡ لَّمۡ يَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوۡنَ بَيۡنَهُمۡ قَدۡ خَسِرَ

الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوۡا مُهۡتَدِيۡنَ ( ۱۰ : ۴۵ )) "اور جس روز اللہ ان کو اکٹھا کرے گا، گویا (دنیا میں) یہ محض ایک گھڑی بھر آپس میں جان پہچان کرنے کو ٹھہرے تھے، فی الواقعہ سخت گھاٹے میں رہے، وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور ہرگز وہ راہ راست پر نہ تھے"۔

وَلَوۡ اَنَّ لِكُلِّ نَفۡسٍ ظَلَمَتۡ مَا فِى الۡاَرۡضِ لَافۡتَدَتۡ بِهٖ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا

الۡعَذَابَ وَقُضِىَ بَيۡنَهُمۡ بِالۡقِسۡطِ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ( ۱۰ : ۵۴ ) "اگر ہر اس شخص کے پاس جس نے ظلم کیا روئے زمین کی دولت بھی ہو، تو اس عذاب سے بچنے کے لیے وہ اسے فدیہ میں دینے کے لیے آمادہ ہو جائے گا۔ جب یہ لوگ اس عذاب کو دیکھ لیں گے تو دل ہی میں پچھتائیں گے مگر ان کے درمیان پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا، کوئی ظلم ان پر نہ ہو گا"۔

اس کے بعد ان کے ناقص تصور الوہیت پر بحث کی جاتی ہے، خصوصاً انکار قیامت کی وجہ سے اور وحی و رسالت کے انکار کی وجہ سے وہ جس فکری ژولیدگی کا شکار ہو گئے ہیں اور اپنی عملی زندگی میں اپنے لیے خود قوانین بناتے ہیں اور حلال و حرام کا تعین کرتے ہیں اس طرح وہ خود اللہ بن بیٹھتے ہیں۔ انکار خدا واحد اور اس کے بعد مختلف قسم کی بت پرستیوں کی جانب سے، مذہبی لیڈروں اور کاہنوں اور جادوگروں نے جو چاہا، ان کے لیے حرام کر دیا اور جو چاہا حلال کر دیا، کیونکہ کوئی بھی غلط اعتقاد اپنانے کے بعد انسانی زندگی کا یہ ایک اہم مسئلہ ہوتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے :

قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ لَـكُمۡ مِّنۡ رِّزۡقٍ فَجَعَلۡتُمۡ مِّنۡهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلۡ آٰللّٰهُ اَذِنَ

لَـكُمۡ اَمۡ عَلَى اللّٰهِ تَفۡتَرُوۡنَ ( ۵۹ ) وَمَا ظَنُّ الَّذِيۡنَ يَفۡتَرُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡـكَذِبَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ

إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ (٦٠) (١٠: ٥٩ - ٦٠)) "اے نبیؐ ان سے کہو' تم لوگوں نے کبھی یہ سوچا ہے کہ جو رزق اللہ نے تمہارے لیے اتارا تھا' اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو حرام اور کسی کو حلال ٹھہرالیا ہے"۔ ان سے پوچھو' اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی تھی؟ یا تم اللہ پر افترا کر رہے ہو؟ جو لوگ اللہ پر یہ جھوٹا افترا باندھتے ہیں ان کا کیا گمان ہے کہ قیامت کے روز ان سے کیا معاملہ ہو گا؟ اللہ تو لوگوں پر مہربانی کی نظر رکھتا ہے مگر اکثر انسان ایسے ہیں' جو شکر نہیں کرتے"۔

یہ سورہ جن حقائق کو قاری کے ذہن میں منتقل کرتی ہے انہیں اچھی طرح ذہن نشین کرانا چاہتی ہے اور انسانی دل و دماغ میں یہ سورہ جن حقائق کے لیے جوش و جذبہ پیدا کرنا چاہتی ہے' وہ اس غرض کے لیے نہایت ہی موثر تدابیر اختیار کرتی ہے' یہ موثرات قرآن کے مخصوص اور منفرد طرز ادا سے بھی متعلق ہیں' اور نفس موضوع اور مضمون سے بھی - یہ نہایت ہی گہرے' زندہ اور متحرک موثرات ہیں اور اس سورہ کے موضوع اور مضمون کے مزاج کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔ اس سورہ کے مزاج کے بارے میں ہم اس تبصرے کے پہلے ہی پیراگراف میں بات کر آئے ہیں۔ یہاں ان موثرات کے بارے میں ہم اجمالی اشارات کرتے ہیں۔ تفصیلات کا انتظار کیجئے تشریح آیات کے موقعہ پر۔

اس سورہ میں جگہ جگہ اس کائنات کے ان مناظر اور مظاہر کا بار بار ذکر کیا گیا' جو حقیقت الوہیت پر دلالت کرتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدبر و حکیم اس کائنات کے نظام کو چلا رہا ہے اور یہ کہ یہ کائنات ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق بنائی گئی ہے اور اسی کے مطابق چلائی جا رہی ہے۔ پھر اس کائنات میں تمام زندہ مخلوقات اور خصوصاً اس کی اہم مخلوق انسان کی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے بے شمار سہولیات اور موافقات رکھی گئی ہیں۔ مسئلہ وجود باری کو قرآن مجید' حقیقت پسندانہ اور نہایت ہی موثر انداز میں پیش کرتا ہے' فلسفیانہ پیچیدگیوں اور منطقی جدلیات کی صورت میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ انسان کا بھی خالق ہے اور اس کائنات کا بھی خالق ہے اور اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ فطرت کائنات اور فطرت انسان کے درمیان ایک خاص تعلق اور ربط ہے۔ اس کائنات کے مظاہر کے اندر وہ دلائل ہیں جو خشک ذہنی منطق کے اندر نہیں پائے جاتے۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ انسانی فطرت سب سے پہلے مظاہر کائناتی پر غور کرے' اس طرح فطرت انسانی اس بات کے لیے تیار ہوگی کہ وہ حقیقت کو پا سکے۔ جب فطرت انسانی اخذ حقیقت کے لیے تیار ہو جائے تو پھر وہ پھڑپھڑاتی' کھل جاتی ہے اور وہ حقائق کو قبول کرتی ہے اور ہر کسی دعوت کا جواب دیتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید بکثرت فطرت انسانی کو اس زبان میں خطاب کرتا ہے جسے وہ جانتی ہے' اس گہری فطری ہمکلامی اور خطاب کے چند نمونے ملاحظہ ہوں :

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مَا مِن شَفِيعٍ إِلَّا مِن بَعْدِ إِذْنِهِ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ

(١٠: ٣)) "حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب وہی خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا' پھر تخت حکومت پر جلوہ گر ہوا اور کائنات کا انتظام چلا رہا ہے۔ کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہے۔ الا یہ کہ اس کی اجازت کے بعد

شفاعت کرے۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے۔ لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو۔ پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے"۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۵) اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ (۶)(۱۰:۵ - ۶) "وہی ہے جس نے سورج کو اجیالا بنایا اور چاند کو چمک دی اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں ٹھیک ٹھیک مقرر کر دیں تاکہ تم اس سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ بامقصد ہی بنایا ہے۔ وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کی ہے 'نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غلط بینی اور غلط روی سے بچنا چاہتے ہیں"۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۳۱) فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (۳۲)(۱۰:۳۱ - ۳۲) "ان سے پوچھو' کون تم کو آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان سے جاندار کو اور جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔ کہو' پھر تم (اس حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز نہیں کرتے؟ پس تو پھر یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے۔ پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا باقی رہ گیا ہے؟ آخر یہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو)۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ (۱۰:۶۷) وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی کہ اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا۔ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے' جو کھلے کانوں سے پیغمبر کی دعوت کو سنتے ہیں"۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا

يُؤْمِنُوْنَ (۱۰:۱۰۱) ”ان سے کہو' زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو' اور جو لوگ ایمان لانا نہیں چاہتے' ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں“۔

وہ تاریخی واقعات اور تاریخی تجربے جو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور جن میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے بکثرت اس سورت میں بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن ان واقعات اور حادثات کو وہ غافل آنکھوں سے دیکھ کر گزر جاتے تھے۔ اور یہ نہ سوچتے تھے کہ ان کی پشت پر کیا تدبیر و تقدیر کام کر رہی ہے۔ قرآن کریم ان کے سامنے خود ان کی عملی زندگی کے واقعات و مناظر پیش کر کے ان کو ان سبق آموز واقعات کی تہہ تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے سامنے خود ان کے نفس کا آئینہ بھی رکھ دیا جاتا ہے تاکہ وہ دیکھ سکیں کہ وہ کیا ہیں؟ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں' قرآن کریم کے مخصوص اسلوب کلام میں :

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

(۱۰:۱۲) ”انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے' مگر جب بھی ہم اس کی مصیبت کو ٹال دیتے ہیں تو ایسا چل نکلتا ہے کہ گویا اس نے کبھی اپنے کسی برے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ اسی طرح حد سے گزر جانے والوں کے لیے ان کے کرتوت خوشنما بنا دیئے گئے ہیں“۔

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ (۲۱) هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ (۲۲) فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۳) (۱۰:۲۱ تا ۲۳) ”اور لوگوں کا حال یہ ہے کہ مصیبت کے بعد جب ہم ان کو رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو فوراً ہی وہ ہماری نشانیوں کے معاملے میں چالبازیاں شروع کر دیتے ہیں۔ ان سے کہو ”اللہ اپنی چال میں تم سے زیادہ تیز ہے' اس کے

فرشتے تمہاری سب مکاریوں کو قلم بند کر رہے ہیں"۔ وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر باد موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو' اور پھر یکایک باد مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے۔ اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ "اگر تو نے ہم کو اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے"۔ مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔ لوگو' تمہاری یہ بغاوت تمہارے ہی خلاف پڑ رہی ہے۔ دنیا کے چند روزہ مزے ہیں پھر ہماری طرف تمہیں پلٹ کر آنا ہے' اس وقت ہم تمہیں بتا دیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔

امم سابقہ میں سے ان لوگوں کی تباہی کے نقشے بھی اس سورہ میں کھینچے گئے ہیں جنہوں نے حق کو جھٹلایا' یہ نقشے بعض اوقات اخبار کی شکل میں ہیں اور بعض اوقات انبیاء کی صورت میں۔ دونوں میں مشترک بات یہ ہے کہ ان میں جھٹلانے والوں کی تباہی اور بربادی کا ذکر ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ تم اپنی چند روزہ زندگی پر مست نہ ہو جاؤ' تمہارا انجام بھی یہی ہو سکتا ہے جو ان کا ہوا۔ اس دنیا کی زندگی دراصل آزمائش ہے۔ اس کی مثال تو اس طرح ہے کہ ان کے ایک حصے میں کچھ لوگ باہم ملیں اور متعارف ہو جائیں اور پھر سب اپنی اپنی اقامت گاہوں کی طرف لوٹ جائیں' جنت میں یا جہنم میں۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۳) ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۴) (۱۰:۱۳ - ۱۴) "تم سے پہلے کی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا' جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ایمان لا کر ہی نہ دیا۔ اسی طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو"۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِىْ وَتَذْكِيْرِىْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَىَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ (۷۱) فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۷۲) فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِى الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَانْظُرْ

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ (۷۳) (۱۰ : ۷۱ تا ۷۳) ”ان کو نوح کا قصہ سناؤ' اس وقت کا قصہ جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ ”اے برادران قوم اگر میرا تمہارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات سنا سنا کر تمہیں غفلت سے بیدار کرنا تمہارے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے' تو میرا بھروسہ اللہ پر ہے تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک متفقہ فیصلہ کر لو اور جو منصوبہ تمہارے پیش نظر ہو اس کو خوب سمجھ لو تاکہ اس کا کوئی پہلو تمہاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے' پھر میرے خلاف اس کو عمل میں لے آؤ اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔ تم نے میری نصیحت سے منہ موڑا۔ میں تم سے کسی اجر کا طلبگار نہ تھا' میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں خود مسلم بن کر رہوں“۔ انہوں نے اسے جھٹلایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اسے اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے' بچا لیا اور انہی کو زمین میں جانشیں بنایا اور ان سب لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا' بس دیکھ لو جنہیں متنبہ کیا گیا تھا ان کا کیا انجام ہوا؟“

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (۷۵) فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۷۶) قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ (۷۷) ”پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا' مگر انہوں نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔ پس جب ہمارے پاس سے حق ان کے سامنے آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ موسیٰ نے کہا: ”تم حق کو یہ کہتے ہو جبکہ وہ تمہارے سامنے آ گیا؟ کیا یہ جادو ہے حالانکہ جادوگر فلاح نہیں پایا کرتے“۔

اور پورا مضمون قصہ کے آخر تک اس کی مثال ہے۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۹۰) آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۹۱) فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (۹۲) (۱۰ : ۹۰ تا ۹۲) ”اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار لے گئے۔ پھر فرعون اور اس کے لشکر ظلم اور زیادتی کی غرض سے ان کے پیچھے چلے۔ حتیٰ کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا: ”میں نے مان لیا کہ خداوند حقیقی اس کے سوا کوئی نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے

ہوں---"اب ایمان لاتا ہے! حالانکہ اس سے پہلے تک تو نافرمانی کرتا رہا اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ بعد کی نسلوں کے لیے نشان عبرت بنے۔ اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں"۔

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (١٠٢) ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ (١٠٣) قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

(١٠٤) (١٠: ١٠٢ تا ١٠٤) "اب یہ لوگ اس کے سوا اور کس چیز کے منتظر ہیں کہ وہی برے دن دیکھیں جو ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ دیکھ چکے ہیں؟ ان سے کہو "اچھا انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں"۔ ہمارا یہی طریقہ ہے۔ ہم پر حق ہے کہ مومنوں کو بچائیں"۔

پھر اس سورہ میں قیامت کے مناظر و مشاہد کو بڑی کثرت سے لیا گیا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مومنین کا انجام کیا ہوا اور مکذبین کا انجام کیا ہوا ہے۔ اور یہ منظر نہایت ہی زندہ اور متحرک انداز میں اس طرح کہ مناظر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور نہایت ہی پرتاثیر ہیں۔ اس طرح دنیا میں مکذبین کی بربادی اور مومنین کی نجات کے مناظر کے ساتھ ساتھ آخرت میں بھی دونوں طبقوں کے انجام کے بارے میں تفصیلات دی گئی ہیں۔ دونوں گروہوں کی سرگرمیوں کا آغاز اور انجام دونوں بتائے گئے ہیں۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّ لَا ذِلَّةٌ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (٢٦) وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (٢٧) (١٠: ٢٦ - ٢٧) "جن لوگوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید فضل۔ ان چہروں پر روسیاہی اور ذلت نہ چھائے گی وہ جنت کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں ان کی برائی جیسی ہے 'ایسا ہی وہ بدلہ پائیں گے' ذلت ان پر مسلط ہو گی' کوئی اللہ سے ان کو بچانے والا نہ ہو گا' ان کے چہروں پر ایسی تاریکی چھائی ہوئی ہو گی جیسے رات کے سیاہ پردے ان پر پڑے

ہوئے ہوں' وہ دوزخ کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ (۲۸) فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ (۲۹) هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۳۰)(۱۰: ۲۸ تا ۳۰)) "جس روز ہم ان سب کو ایک ساتھ اکٹھا کریں گے' پھر ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا ہے' کہیں گے کہ ٹھہر جاؤ تم بھی اور تمہارے بنائے ہوئے شریک بھی۔ پھر ہم ان کے درمیان سے اجنبیت کا پردہ ہٹا دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے کہ "تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے کہ ہم تمہاری اس عبادت سے بالکل بے خبر تھے"۔ اس وقت ہر شخص اپنے کیے کا مزہ چکھ لے گا' سب اپنے حقیقی مالک کی طرف پھیر دیے جائیں گی اور وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے گم ہو جائیں گے"۔

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۵۴) "اگر ہر اس شخص کے پاس جس نے ظلم کیا ہے روئے زمین کی دولت بھی ہو' تو اس عذاب سے بچنے کے لیے وہ اسے فدیہ میں دینے کے لیے آمادہ ہو جائے گا۔ جب یہ لوگ اس عذاب کو دیکھ لیں گے تو دل ہی دل میں پچھتائیں گے' مگر ان کے درمیان پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا' کوئی ظلم ان پر نہ ہو گا"۔

اس سورہ میں ان مشرکین کو بار بار چیلنج کیا گیا ہے کہ اگر وہ قرآن کریم کو کلام الٰہی نہیں مانتے تو وہ قرآن کریم کی طرح ایک آیت لے کر آجائیں۔ پھر رسول اللہؐ کو یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ آپ ان کو دعوت دے کر اور چیلنج دے کر چھوڑ دیں کہ وہ اپنے منطقی انجام تک جا پہنچیں اور انسانی تاریخ میں تمام جھٹلانے والوں اور ظالموں اور مشرکوں کا انجام یہی رہا ہے۔ آپ ان کی کوئی پرواہ نہ کریں اور اپنی راہ پر گامزن رہیں اور ان کو کوئی اہمیت بھی نہ دیں۔ اس طرح تحدی دینا اور پھر ان کو چھوڑ کر اپنی راہ پر چلنا اور دشمن کی پرواہ بھی نہ کرنا ایک ایسا طرز عمل ہے جس سے مخالفین کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ حضورؐ کو اپنے اچھے انجام کا پوری طرح وثوق ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس سے مخالف خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور ان کے دل میں سے عناد کم ہو جاتا ہے۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ

تَفْصِيلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۳۷) اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۸) بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ (۳۹) (۱۰: ۳۷ تا ۳۹) "اور قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی کے بغیر تصنیف کر لیا جائے بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آ چکا تھا اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے ـ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فرمانروائے کائنات کی طرف سے ہے ـ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو "اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورہ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو' مدد کے لیے بلا لو"۔

اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور جس کا مآل بھی ان کے سامنے نہیں آیا اس کو انہوں نے جھٹلا دیا ـ اسی طرح تو ان سے پہلے کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں ـ پھر دیکھ لو' ان ظالموں کا کیا انجام ہوا؟

قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰۴) وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۰۵) وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ (۱۰۶) وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۱۰۷) قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ (۱۰۸) وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ (۱۰۹) (۱۰: ۱۰۴ تا ۱۰۹) "اے نبیؐ کہہ دو کہ لوگو' اگر تم ابھی تک میرے دین کے متعلق کسی شک میں ہو تو سن لو کہ تم اللہ کے سوا جن کی بندگی کرتے ہو' میں ان کی بندگی نہیں کرتا بلکہ صرف اس خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے قبضے میں تمہاری موت ہے ـ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں ـ اور مجھ سے فرمایا گیا ہے کہ تو یکسو ہو کر اپنے آپ کو ٹھیک ٹھیک اس دین پر قائم کر دے اور ہرگز ہرگز مشرکوں سے نہ ہو' اور

اللہ کو چھوڑ کر کسی ایسی ہستی کو نہ پکارو جو تجھے فائدہ نہ پہنچا سکی ہے نہ نقصان ۔ اگر تو ایسا کرے گا' تو ظالموں میں سے ہو گا۔ اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا کوئی بھی نہیں ہے ۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے" ۔ اے محمد کہہ دو کہ "لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آ چکا ہے ۔ اب جو سیدھی راہ اختیار کرے اس کی راست روی اس کے لیے مفید ہے اور جو گمراہ رہے اس کی گمراہی اس کے لیے تباہ کن ہے ۔ اور میں تمہارے اوپر کوئی حوالہ دار نہیں ہوں" ۔ اور اے نبی ؐ تم اس ہدایت کی پیروی کیے جاؤ جو تمہاری طرف بذریعہ وحی بھیجی جا رہی ہے اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہی فیصلہ کرنے والا ہے" ۔

اب دو ٹوک بات پر یہ سورہ اختتام کو پہنچتی ہے اور وہ موثرات اور دلائل بھی یہاں ختم ہوتے ہیں جن کے اقتباس اور نمونے یہاں ہم دینا چاہتے تھے ۔ قرآن کریم انسانی دل و دماغ کو جن زاویوں سے مخاطب کرتا ہے اس کے عجائب کا احاطہ تو ممکن نہیں ہے' بہر حال ہم یہاں انہی پر اکتفا کرتے ہیں ۔

○○○

یہ سورہ' سورہ اسراء کے بعد نازل ہوئی ہے ۔ اس دور میں مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان وحی کی صداقت اور قرآن کے کتاب حق ہونے کے موضوع پر سخت مکالمہ شروع تھا اور قرآن زوردار انداز میں مشرکین کے عقاید کی تضحیک کر رہا تھا اور ان کی جاہلیت پر سخت ترین تنقید اور گرفت کر رہا تھا ۔ اور یہ واضح کر رہا تھا کہ ان کے نظام فکر و عمل میں سخت تضاد ہے اور ان کی ہر بات دوسری بات کی تردید کرتی ہے ۔ ایک طرف تو وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ خالق' رازق' زندہ کرنے والا' مارنے والا ہے ۔ اس کائنات کا مدبر' تمام اشیاء میں متصرف اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۔ یاد رہے کہ یہ وہ درست عقائد تھے جو حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی تعلیمات کی وجہ سے ان میں ابھی تک باقی تھے لیکن دوسری جانب سے وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ اللہ کی اولاد بھی ہے ۔ اور وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے ۔ اور ان کو اللہ کے ہاں سفارشی تصور کرتے تھے ۔ اور اس اعتبار سے فرشتوں کے بت بنا کر پوجتے تھے ۔ چنانچہ ان متضاد خیالات کی وجہ سے ان کی زندگی کے اندر تضاد رونما ہو گیا تھا ۔ چنانچہ ان کے کاہن اور پیشوا ان کے لیے حلال و حرام کا تعین کرتے تھے اور ان کے لیے انہوں نے بعض مویشیوں کو حرام قرار دیا تھا اور بعض قسم کے پھلوں کو بھی حرام قرار دے دیا تھا ۔ چنانچہ پھر ان مویشیوں میں سے بعض کو اللہ کے لیے خالص کر دیا تھا اور بعض کو اپنے بتوں کے لیے" ۔

چنانچہ ایسے حالات میں مشرکین کو قرآن کریم کے زبردست تنقیدی حملے کا سامنا کرنا پڑا ۔ جس میں قرآن نے ان کے از کار رفتہ عقائد اور متضاد اور متناقض نظام جاہلیت پر تنقید کی کہ تم لوگ حضور ؐ اور آپ ؐ پر نزول وحی میں شک کرتے ہو' یہ کہ تم حضور ؐ کو ساحر کہتے ہو ۔ یا تم حضور ؐ سے خارق عادت معجزے کے طلبگار ہو جو نبوت پر ثبوت ہو' وغیرہ وغیرہ ۔ اس سے قبل قرآن کریم نے سورہ اسراء میں ان اعتراضات کو بڑی تفصیل سے نقل کیا تھا :

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (۸۹) وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا (۹۰) اَوْ تَكُوْنَ لَكَ

جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا (۹۱) اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (۹۲) اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (۹۳) وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى اِلَّا اَنْ قَالُوْا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (۹۴) (۱۷ : ۷۹ تا ۹۴)) "ہم نے قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر اکثر لوگ انکار ہی پر مُصر رہے اور انہوں نے کہا "ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو ان میں نہریں رواں کر دے ـ یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے یا خدا اور فرشتوں کو رو در رو ہمارے سامنے لے آئے یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں ـ اے محمدؐ ان سے کہو "پاک ہے پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں"ـ لوگوں کے سامنے جب بھی ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے ان کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر ان کے اسی قول نے کہ "کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا"ـ

اور اس سورہ میں بھی اس مضمون کو یوں ادا کیا گیا :

وَ يَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (۱۰ : ۲۰) "اور جو یہ کہتے ہیں کہ اس نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی تو ان سے کہو کہ غیب کا مالک و مختار تو اللہ ہی ہے ـ اچھا ' انتظار کرو ' میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"ـ

اسی طرح وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے یہ مطالبہ بھی کرتے تھے کہ آپ اس قرآن کے بدلے کوئی اور قرآن لے کر آئیں جو ان کے الہوں اور خداؤں کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرے ـ ان کے عقائد کی تضحیک نہ کرے اور ان کے نظام جاہلیت کو بدلنے کا حکم نہ دے ـ ایسی صورت میں وہ بھی اسے قبول کر لیں گے اور ایمان لے آئیں گے ـ اس سورت میں ان کے اس مطالبے پر بھی بحث کی گئی ہے اور ان کے اس مطالبے کو سختی سے مسترد کر دیا گیا ہے :

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ (۱۰ : ۱۵) "جب انہیں ہماری صاف صاف باتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ' کہتے ہیں ' کہ "اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو"ـ

اور ان کی اس احمقانہ رائے کا رد یہی ہو سکتا تھا جو کر دیا گیا۔

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۵) قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۶) فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ (۱۷) (۱۰:۱۵ تا ۱۷)

"اے محمدؐ ان سے کہو "میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر اور تبدل کر لوں۔ میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے"۔ اور کہو "اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو میں یہ قرآن کبھی نہ سناتا اور اللہ تمہیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے۔ یقیناً مجرم کبھی فلاح نہ پائیں گے۔

غرض اس ماحول میں یہ سورہ نازل ہوئی، اس کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی خطبہ ہے اور ایک مخصوص ماحول میں دیا گیا ہے جو واقعات کے تسلسل سے عبارت ہے۔ یہ خطبہ اس قدر مربوط اور متحد ہے کہ دوسری سورتوں کی طرح اسے مختلف اسباق اور قطعات میں تقسیم کرنا بھی دشوار نظر آتا ہے۔ اس پوری سورہ کا ایک ہی مربوط خطبہ ہونا اس بات کی نفی کر دیتا ہے جو بعض مصاحف میں کہی گئی ہے کہ اس کی آیات ۴۰، ۹۴، ۹۵ اور ۹۶ مدنی ہیں کیونکہ یہ آیات سیاق کلام میں اس طرح پیوست ہیں کہ ان کے سوا اصل مضمون مربوط اور متصل نہیں رہتا۔

اس سورہ کے مربوط مضامین و سیاق سورت کے آغاز اور انجام کو بھی باہم مربوط کرتا ہے۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے :

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (۱) اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ (۲) (۱۰:۱ - ۲) "ال ر، یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو حکمت و دانش سے لبریز ہے۔ کیا لوگوں کے لیے یہ ایک عجیب بات ہو گئی کہ ہم نے خود انہی میں سے ایک آدمی کو اشارہ کیا کہ لوگوں کو چونکا دے اور جو مان لیں ان کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس سچی عزت و سرفرازی ہے؟ لیکن منکرین حق نے کہا کہ یہ تو کھلا جادوگر ہے"۔

اور خاتمہ اس آیت پر ہوا:

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ

"اور اے نبیؐ تم اس ہدایت کی پیروی کیے جاؤ جو تمہاری طرف بذریعہ وحی بھیجی جا رہی ہے اور صبر و کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے"۔

یعنی سورہ کے آغاز و اختتام دونوں پر بات وحی کے بارے میں اور دعوت و تبلیغ کے بارے میں ہے' لہٰذا آغاز و اختتام دونوں باہم مربوط اور موضوع سورہ سے پیوست ہیں۔

سورہ کے اندر بیان کردہ مختلف دلائل میں بھی باہم گہرا ربط ہے۔ مثلاً وہ لوگ اس مطالبہ میں جلد بازی کرتے تھے کہ پیغمبران کو جس عذاب سے ڈراتے ہیں وہ ان پر نازل کیوں نہیں کر دیتے' تو ان کو اس بات پر متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ جب عذاب الٰہی آتا ہے تو وہ اچانک آجاتا ہے اور اس وقت ان کے لیے ایمان لانا یا توبہ کرنا مفید نہ ہو گا اور اس رد کے بعد پھر سورہ میں متواتر قصے آتے ہیں اور اس میں قیامت کا منظر اور ان لوگوں کی حالت کی تصویر پیش کی جاتی ہے جن پر اس دنیا میں اللہ کا عذاب آیا۔

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۴۸) قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۴۹) قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ (۵۰) اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ (۵۱) ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ

(۵۲) (۱۰ : ۴۸ تا ۵۲) "کہتے ہیں اگر یہ تمہاری دھمکی سچی ہے تو آخر یہ کب پوری ہو گی؟ کہو' میرے اختیار میں خود اپنا نفع یا ضرر بھی نہیں ہے' سب کچھ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ ہر امت کے لیے مہلت کی ایک مدت مقرر ہے۔ جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہوتی"۔ ان سے کہو کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ کا عذاب اچانک رات یا دن کو آجائے تو تم کیا کر سکتے ہو؟ آخر یہ ایسی کون سی چیز ہے جس کے لیے مجرم جلدی مچائیں۔ کیا جب وہ تم پر آپڑے اسی وقت تم اسے مانو گے؟ --- اب بچنا چاہتے ہو' حالانکہ تم خود ہی اس کے جلدی آنے کا تقاضا کر رہے تھے۔ پھر ظالموں سے کہا جائے گا اب ہمیشہ کے لیے عذاب کا مزہ چکھو جو کچھ تم کماتے رہے ہو' اس کی پاداش کے سوا اور کیا بدلہ تم کو دیا جا سکتا ہے؟

اور اس سورہ میں قصہ موسیٰ علیہ السلام کے آخر میں یہ منظر آتا ہے اور نظر آتا ہے کہ یہ منظر ایسا ہی ہے :

وَ جٰوَزْنَا بِبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَ جُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّ عَدْوًا حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِيْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ

(۹۰) آٰلْئٰنَ وَ قَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۹۱) فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (۹۲) (۱۰ : ۹۰ تا ۹۲) "اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار لے گئے۔ پھر فرعون اور اس کے لشکر ظلم اور زیادتی کی غرض سے ان کے پیچھے چلے۔ حتیٰ کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا: "میں نے مان لیا کہ خداوند حقیقی اس کے سوا کوئی نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں۔" — "اب ایمان لاتا ہے! حالانکہ اس سے پہلے تک تو نافرمانی کرتا رہا اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ بعد کی نسلوں کے لیے نشان عبرت بنے۔ اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں"۔

اس کے بعد اس سورہ میں مختلف قصوں کے بیان کے درمیان بعض مناظر ایسے آتے ہیں جو اچانک مکذبین کو پکڑ لیتے ہیں۔ ایسے حالات میں کہ وہ کسی عذاب کی کوئی توقع نہیں رکھتے۔ نہ ان کو کسی قسم کے عذاب کے بارے میں علم ہوتا ہے۔ یہ تمام مناظر اس طرح ادا کیے جاتے ہیں کہ پوری سورہ کا موضوع و مضمون ایک ہی نظر آتا ہے اور پوری سورہ ایک ہی موضوع پر ایک ہی خطبہ نظر آتی ہے۔

سورہ کے آغاز میں مشرکین مکہ کی جانب سے حضورؐ کی بابت یہ قول نقل کیا گیا تھا۔

قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ (۱۰ : ۲) (کافروں نے کہا بے شک یہ ایک کھلا جادوگر ہے) اور فرعون کے قصے کے آخر میں فرعونی اور فرعون کہتے ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۱۰ : ۷۶) (پس جب وہ ان کے پاس ہماری طرف سے سچائی لے کر آیا تو کافروں نے کہا' بے شک یہ ایک کھلا جادوگر ہے)

اس سورہ کا نام سورہ یونس رکھا گیا ہے' لیکن اس میں حضرت یونس علیہ السلام کے قصے کی طرف ایک مختصر سا اشارہ ہے' مثلاً کہا گیا ہے:

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (۱۰ : ۹۸) "پھر کیا ایسی کوئی مثال ہے کہ ایک بستی عذاب دیکھ کر ایمان لائی ہو اور اس کا ایمان اس کے لیے نفع بخش ثابت ہوا ہو؟ یونس کی قوم کے سوا (اس کی کوئی نظیر نہیں) وہ قوم جب ایمان لے آئی تھی تو البتہ ہم نے اس پر سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ٹال دیا تھا اور اس کو ایک مدت تک زندگی سے بہرہ مند ہونے کا موقع دے دیا تھا"۔

لیکن قصہ یونس دراصل وہ واحد مثال ہے جو ان لوگوں کی راہنمائی کرتی ہے جو اپنے آپ کو اچانک عذاب الٰہی آ

جانے سے پہلے سنبھالنا چاہتے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں جبکہ لوٹنے کی مہلت ہو۔ کیونکہ حضرت یونس ؑ کی قوم کی مثال نبیوں اور قوموں کی تاریخ میں واحد مثال ہے جس میں کسی پیغمبر کی جانب سے وقوع عذاب کے اعلان کے بعد بھی کوئی قوم بچ نکلی ہو کیونکہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ تکذیب کرنے والوں کو جب بتا دیا جائے کہ تم پر فلاں وقت میں عذاب نازل ہو گا تو وہ عذاب نازل ہو کر رہتا ہے۔

غرض اس سورہ کے مضامین کے درمیان لفظی' معنوی اور اندازبیان کا ربط موجود ہے' اول سے اختتام تک اس کا ایک مضمون اور ایک ہی رنگ ہے۔ لہٰذا یہ سورہ ایک ہی خطبہ ہے۔

---○○○---

اس سے قبل' اس سورہ کے جو اقتباسات ہم نے دیئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ کا بنیادی مضمون اللہ کی بندگی اور اس کی حاکمیت کا قیام ہے۔ اللہ کی الوہیت اور اس کی حاکمیت کے تقاضوں کو اس میں بیان کیا گیا ہے یہ کہ اللہ کی بندگی اور حاکمیت کو تسلیم کرنے کے بعد انسان کی عملی زندگی میں کیا کیا تبدیلیاں لانی ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ اس سورہ میں جو بھی مضامین وارد ہیں مثلاً وحی الہٰی کے بارے میں توضیحات' آخرت کے مناظر اور واقعات' سابق رسالتوں اور ان کی اقوام کے واقعات وغیرہ تو یہ سب مضامین دراصل اسی مسئلہ کی توضیح کی خاطر لائے گئے ہیں تاکہ یہ عظیم حقیقت لوگوں کے ذہن میں اچھی طرح بیٹھ جائے۔ لوگوں کے تصورات' ان کی عملی زندگی اس حقیقت کبریٰ کے مطابق ڈھل جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ عظیم مسئلہ ہی پورے قرآن کا مسئلہ ہے' خصوصاً مکی قرآن میں تو اسی مسئلے کی مختلف اسالیب سے وضاحت کی گئی ہے۔ مثلاً اللہ کی الوہیت کی تعریف اور اس کے اہم خصائص' یعنی ربوبیت' قیومیت' حاکمیت اور عبودیت اور اس کے حدود و قیود اور اس کے بعد لوگوں کو اللہ کا حقیقی بندہ بنانے کے لیے عملی جدوجہد اور یہ کہ لوگوں کی جانب سے صرف اللہ کی ربوبیت' قیومیت اور حاکمیت کا اقرار' یہ اس سورہ کا حقیقی موضوع ہے۔ اس کے علاوہ جو امور لائے گئے ہیں وہ اس مقصد اعلیٰ کے عملی تقاضے ہیں جن کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے۔

یہ عظیم حقیقت اس قابل ہے کہ اگر ہم اس پر گہرا غور و خوض کریں' تو یہ پورے قرآن کریم کی دعوت کا اصلی موضوع قرار پاتی ہے۔ اس غرض کے لیے تمام رسولوں کو بھیجا گیا اور اسی ہدف کی طرف تمام کتابیں اور رسالتیں آگے بڑھتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِن رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیٓ اِلَیْہِ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ "اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا' اس کی طرف یہ وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی حاکم نہیں ہے' اس لیے تم لوگ میری ہی بندگی اور اطاعت کرو"۔

یہ بات پلے باندھ لو کہ اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی کی اصلاح ہرگز نہیں ہو سکتی الا یہ کہ لوگوں کے ذہن میں یہ حقیقت یعنی حاکمیت الہیہ کا یہ نظریہ بیٹھ نہ جائے' ان کے نظریات میں' ان کے تصورات میں اور ان کی زندگی میں بھی اور حتیٰ کہ ان کی پوری سوسائٹی عملاً اس پر استوار نہ ہو جائے۔

لوگوں کی زندگی اگر ان زندہ اور ان مردہ اشیاء کو الٰہ سمجھتے ہیں جو اوہام کے سوا کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور جب تک وہ اپنا تصور الٰہ عبادت کی حقیقت اور اللہ کی حاکمیت کی حقیقت کو اپنے ذہنوں میں اچھی طرح بیٹھا نہیں لیتے' نیز وہ جس

کائنات میں زندگی بسر کرتے ہیں اور اس کائنات کی مردہ اور زندہ اشیاء کے حوالے سے ان کے تعلقات حقیقت پسندانہ نہیں ہو سکتے ۔لوگ ان اشیاء بلکہ توہمات کی پوجا کرتے ہیں اور ان کا یہ فعل مضحکہ انگیز ہوتا ہے اس لیے کہ جن اشیاء کی وہ پوجا کرتے ' ان کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہوتی ۔ پھر ان باطل خداؤں کی چوکھٹ پر وہ اپنی محنت و مشقت کے نتیجے میں کمائی ہوئی دولت پیش کرتے 'محض اس لیے کہ اس میں مفاد پرست کاہنوں اور مذہبی پیشواؤں کا فائدہ ہوتا ہے ۔ بعض اوقات ان باطل معبودوں کے نذرانے کے طور پر اپنی جان اور اپنے دل کے ٹکڑوں کو پیش کرتے ہیں ۔ حالانکہ جن لوگوں کے سامنے یہ مراسم عبودیت پیش کیے جاتے ہیں وہ ہم جیسے اشخاص ہیں یا بے جان چیزیں ہوتی ہیں اور ان کے اندر قوت اور تصرف کا شائبہ تک نہیں ہوتا اور وہ نہ کوئی ضرر دے سکتے ہیں اور نہ نفع دے سکتے ہیں ۔ پھر لوگوں کی زندگی ان بے جان چیزوں اور ان اوہام سے خوف و خطر میں گزرتی ہے اور لوگ اپنی جیسی مخلوق یا بے جان اشیاء کا تقرب حاصل کرنے کے لیے حیلے بہانے تلاش کرتے ہیں اور ان کی ایسی بندگی کرتے ہیں جس طرح اللہ کی بندگی کی جاتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۱۳۶) وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ (۱۳۷) وَ قَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّ حَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَ اَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَ اَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۱۳۸) وَ قَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَ مُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا وَ اِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۱۳۹) قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (۱۴۰) وَ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّ النَّخْلَ وَ الزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَ

الزَّيْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ

حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (۱۴۱)(۶: ۱۳۶ تا ۱۴۱)) "ان لوگوں نے اللہ کے لیے خود اس کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے لیے ہے' بزعم خود' اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے' پھر جو حصہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے' وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لئے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے' کیسے برے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ۔ اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہیں کرتے' لہٰذا انہیں چھوڑ دو' کہ اپنی افتراء پردازیوں میں لگے رہیں' کہتے ہیں کہ یہ جانور اور کھیت محفوظ ہیں' انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھلانا چاہیں' حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے' پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور باربرداری حرام کر دی گئی ہے۔ جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے اور یہ سب کچھ انہوں نے اللہ پر افترا کیا ہے۔ عنقریب اللہ انہیں ان کی افتراپردازیوں کا بدلہ دے گا۔ اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے' یہ ہمارے مردوں کے لیے مخصوص ہے' اور ہماری عورتوں پر حرام ہے' لیکن اگر وہ مردہ ہے تو دونوں اس کے کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ باتیں جو انہوں نے گھڑی ہیں ان کا بدلہ اللہ انہیں دے کر رہے گا یقیناً وہ حکیم ہے اور سب باتوں کی اسے خبر ہے۔ یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت اور نادانی کی وجہ سے قتل کیا' اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو' اللہ پر افتراپردازی کر کے حرام ٹھہرا لیا۔ بالیقین وہ بھٹک گئے اور ہرگز وہ راہ راست پانے والوں میں سے نہ تھے"۔

یہ ہیں چند نمونے اللہ کے سوا اور الہوں کی بندگی کے' اپنے مال اور اولاد میں۔ یہ بندگیاں اللہ کے سوا اور الہوں کے سامنے بجا لائی جاتی ہیں۔ یہ الٰہ بعض اوقات زندہ مخلوقات میں سے ہوتے اور بعض اوقات بے جان مخلوق میں سے۔ اور ان کی جدائی کے بارے میں اللہ نے کوئی دلیل نہیں نازل فرمائی۔

نیز جب تک لوگوں کے قلب و نظر میں اللہ کی الوہیت اور اس کی بندگی کا تصور درست نہ ہو' اور اس بارے میں ان کے تصورات صاف نہ ہوں ان کے باہم تعلقات بھی درست نہیں ہو سکتے' اور نہ ایسی سوسائٹی کے لیے کوئی مستحکم بنیاد فراہم ہو سکتی ہے۔ انسان کی انسانیت' اس کی آزادی اور اس کا شرف اس وقت تک وجود میں نہیں آتا جب تک انسان اللہ کی وحدانیت' اس کی مکمل بندگی اور اس کی سیاسی حاکمیت پر پختہ یقین نہ رکھے۔ اور اللہ کو یہ حق نہ دے دے کہ انسانوں کی زندگی پر دنیا اور آخرت دونوں میں صرف اللہ کنٹرول کرنے والا ہے۔ اور یہ اسی کا حق ہے کہ وہ کنٹرول کرے۔ خفیہ طور پر بھی علانیہ امور میں بھی۔ اور یہ کہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کے لیے قانون سازی کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے۔

یہ وہ حقیقت ہے جو انسان کی صدیوں کی تاریخ کے مطالعے سے اچھی طرح ثابت ہوتی ہے۔ جب بھی لوگوں نے نظریہ اور عمل کے اعتبار سے اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کا جوا اپنی گردنوں سے اتارا ہے' وہ دوسری قوتوں کے غلام ہو گئے ہیں' اللہ کی حاکمیت سے مراد یہ ہے کہ یہ اعتقاد' مراسم عبودیت اور نظام حکومت کے اعتبار سے اللہ کی حاکمیت قائم کی جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو ہمیشہ یہ ہوا کہ انسان نے اپنی انسانیت' اپنا شرف اور اپنی آزادی گنوا دی ہے۔

انسانی تاریخ کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر یہ ہے کہ جو اقوام طاغوتی قوتوں کے تحت ذلیل ہو کر رہتی ہیں اور ان پر طاغوتی قوتوں کا غلبہ ہو جاتا ہے' اس کا بنیادی سبب یہ ہوتا ہے کہ یہ اقوام فاسق اور فاجر اور بدعمل ہوتی ہیں۔ اور ان کا فجور اور بدعملی یہ ہوتی ہے کہ یہ اقوام اللہ کو مالک' رازق اور حاکم تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہیں۔ فرعون اور قوم فرعون کے بارے میں قرآن کا تبصرہ یہ ہے :

وَ نَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱) اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ وَّلَا یَكَادُ یُبِیْنُ (۵۲) فَلَوْلَآ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ (۵۳) فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ (۵۴) (الزخرف ۵۱ تا ۵۴)

"فرعون نے اپنی قوم کو پکار کر کہا' لوگو' کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟ میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل و حقیر ہے اور اپنی بات کھول کر بیان نہیں کر سکتا؟ کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے؟ یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں نہ آیا۔ اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی۔ درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ"۔

جو لوگ اللہ کی غلامی' بندگی اور حاکمیت کا جوا اپنی گردنوں سے اتار کر فاسق ہو جاتے ہیں اور اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنا حاکم بنا لیتے ہیں جو ان پر اللہ کی شریعت کے بجائے اپنی شریعت چلاتے ہیں تو ایسے لوگ آخرکار دوسری اقوام کے غلام بن جاتے ہیں۔ اس غلامی میں پھر ان کی انسانیت' ان کی عزت نفس اور ان کی آزادی ختم ہو جاتی ہے' اگرچہ ان کی یہ غلامی مختلف اوقات میں مختلف النوع رہی ہے۔ بعض اوقات اس غلامی میں غلاموں کا ضمیر اس قدر بدل جاتا ہے کہ وہ اس غلامی کو اپنے لیے شرف اور آزادی سمجھنے لگتے ہیں۔

یورپ نے خدا کو چھوڑا' یہ خدا دشمنی اس کے اندر کلیسا نے پیدا کر دی تھی کیونکہ کلیسا بھی صحیح معنوں میں خدا پرست نہ تھا' کلیسا نے جس انداز میں مغربی اقوام پر حکمرانی کی وہ نہایت ہی جابرانہ اور ظالمانہ نظام تھا' جب کلیسا کے خلاف ردعمل سامنے آیا تو لوگوں نے سرے سے خدا سے بغاوت کر دی۔ اب لوگ یہ سمجھنے لگے کہ وہ لادین مغربی نظاموں کے تحت آزاد' باعزت اور مفید زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ مغربی نظام جمہوریت اس کے تحریری دستور اور اس کے بنیادی حقوق' ان کے ہاں ہر قسم کی آزادی اور آزادی صحافت' ان کے پارلیمانی نظام اور ان میں اکثریت کی حکومت یہ سب کچھ ان کی آزادی اور شرافت کے ضامن ہیں۔ وہ اپنے ان تصورات کے خول میں بند رہے۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ــــ ایک ظالم سرمایہ دارانہ نظام اس جمہوریت کے بطن سے نمودار ہوا۔ اس سرمایہ دارانہ نظام نے مغربی جمہوریت کے تمام نعروں کو بالکل بے معنی بنا دیا۔ بلکہ یہ باتیں محض خیالات و تصورات رہ گئیں۔ ایک نہایت ہی قلیل گروہ نے جو دولتمند تھا' حق حاکمیت حاصل کر لیا اور پوری کی پوری اقوام جمہوری نظام کے تحت غلام بن کر رہ گئیں۔ یہ اقوام باوجود اپنی پارلیمانی اکثریت کے

باوجود اچھے دساتیر کے ' باوجود آزاد صحافت کے ' اور باوجود وسیع بنیادی حقوق کے ایک مختصر مگر مالدار لوگوں کی غلامی سے اپنے آپ کو نہ چھڑا سکیں۔ اور انسانیت آزادی اور شرافت اور عزت نفس سے محروم کر دی گئیں۔

اب اس نظام کے ردعمل میں ایک دوسرا نظام سامنے آیا' انہوں نے اس ظالم سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی۔ ان ظالم طبقات کے خلاف مظلوم طبقات کو اٹھایا۔ انہوں نے سرمایہ داروں کے ایک محدود طبقے کی غلامی سے اپنے آپ کو چھڑا کر مفلوک الحال لوگوں کے ایک محدود طبقے کی غلامی میں اپنے آپ کو قید کروالیا۔ اب یہ لوگ چند سرمایہ داروں کے مقابلے میں چند غرباء کی غلامی میں آگئے۔ اور ان لوگوں کی ڈکٹیٹرشپ اب سرمایہ داروں کی جمہوریت سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

غرض ہر وہ نظام ' ہر وہ حکومت اور ہر وہ سوسائٹی جس میں انسان ' انسان کا غلام ہو تو اس کے باشندے اپنے مال ' اپنی آزادی اور اپنی شرافت کو قربان کر کے قسم قسم کے خداؤں کی غلامی میں پھنس جائیں گے۔

انسان تو بہرحال غلام رہے گا' ایک عام انسان بہرحال زیردست رہے گا۔ اگر یہ خدا کی غلامی نہ اختیار کرے گا تو کسی اور کا غلام ہو گا۔ صرف ایک اللہ کی غلامی کا فائدہ یہ ہو گا کہ انسان تمام انسانی خداؤں کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا۔ انسان آزاد' شریف اور سربلند ہو گا۔ جبکہ کسی بھی غیراللہ کی غلامی میں انسان سے اس کی اعلیٰ صفات سلب ہو جاتی ہیں اور آخر کار وہ مالی فوائد اور مصالح و مفادات سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔

چنانچہ اللہ کی وحدانیت کا مسئلہ اور اللہ کی حاکمیت اور لوگوں کی غلامی کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس پر پوری انسانی تاریخ میں تمام رسولوں نے توجہ دی ہے۔ ابتدائی ادوار میں نہایت ہی سادہ بت پرستی کے دور میں بھی اللہ کی عبودیت اور حاکمیت کے مسئلے پر پیغمبر نے زور دیا ہے' یعنی زمانہ ماقبل تاریخ میں' پھر تحریری تاریخ کے دور میں بھی ہر جگہ اور ہر زمانے میں یہ مسئلہ انسان کا اہم مسئلہ رہا ہے۔ عقیدۂ توحید میں حاکیت غیراللہ کی نفی کو شامل کیا گیا ہے اور آج بیسویں صدی کی جاہلیت میں بھی اس مسئلے کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ بیسویں صدی کی جاہلیت انسانوں کو دوسرے انسانوں کا غلام بنانے اور تسلیم کرنے کے اصول پر قائم ہے۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے 'کتاب اسلام اور جاہلیت' مصنفہ مسلم عظیم مفکر سید ابوالاعلیٰ مودودی' امیر جماعت اسلامیہ پاکستان ' اور کتاب جاہلیۃ القرن العشرین' محمد قطب )

یہی وجہ ہے کہ تمام رسالتوں اور تمام آسمانی کتابوں کی تعلیمات کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ' حاکم ' رب نہیں ہے۔ اللہ حاکم ہے اور تمام انسان صرف اللہ کے غلام ہیں اور ان کا فرض ہے کہ وہ صرف اللہ وحدہ کی غلامی اور عبادت کریں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ "اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے ' اس کی طرف یہ وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی حاکم نہیں ہے لٰہذا میری ہی بندگی کرو"۔

اور اس سورہ کا خاتمہ بھی اسی تعلیم پر ہوا :

قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ دِیْنِیْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۰۴) وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (۱۰۵) وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

مَا لَا يَنفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِن فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظَّٰلِمِينَ (١٠٦) وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِن يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهِ يُصِيبُ بِهِ مَن يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهِ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (١٠٧) قُلْ يَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَآ أَنَا عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ (١٠٨) وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَٰكِمِينَ

(١٠٩) (١٠: ١٠٤ تا ١٠٩)) "اے نبی کہہ دو کہ لوگو، اگر تم ابھی تک میرے دین کے متعلق کسی شک میں ہو تو سن لو کہ تم اللہ کے سوا جن کی بندگی کرتے ہو، میں ان کی بندگی نہیں کرتا بلکہ صرف اس خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے قبضے میں تمہاری موت ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔ اور مجھ سے فرمایا گیا ہے کہ تو یکسو ہو کر اپنے آپ کو ٹھیک ٹھیک اس دین پر قائم کر دے اور ہرگز ہرگز مشرکوں سے نہ ہو، اور اللہ کو چھوڑ کر کسی ایسی ہستی کو نہ پکارو جو تجھے فائدہ نہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔ اگر تو ایسا کرے گا، تو ظالموں میں سے ہو گا۔ اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔

اے محمدؐ کہہ دو "لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آچکا ہے۔ اب جو سیدھی راہ اختیار کرے اس کی راست روی اس کے لیے مفید ہے اور جو گمراہ رہے اس کی گمراہی اس کے لیے تباہ کن ہے۔ اور میں تمہارے اوپر کوئی حوالہ دار نہیں ہوں"۔ اور اے نبی تم اس ہدایت کی پیروی کیے جاؤ جو تمہاری طرف بذریعہ وحی بھیجی جا رہی ہے اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہی فیصلہ کرنے والا ہے"۔

اس سورہ کا اس قدر تعارف کافی ہے اب آیئے تشریح آیات کی طرف۔

---○○○---

# درس نمبر ۹۵ ایک نظر میں

جس طرح ہم نے اس سورہ کے دیباچے میں کہا ہے یہ پوری سورہ ایک ٹکڑا ہے۔اس کو مختلف اسباق میں تقسیم کرنا بہت ہی مشکل ہے۔یہ اسی طرح ہے جس طرح پارہ ہفتم میں سورہ انعام اور جس کے بارے میں یہی رائے ہم نے دی تھی کہ ہر سورہ کا اپنا مزاج اور اپنی شخصیت ہوتی ہے اور اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ سورہ بھی اسی طرح آگے بڑھتی ہے جس طرح سمندر میں ایک لہر کے بعد دوسری لہر اٹھتی ہے۔ ہر لہر انسان کے دل و دماغ پر ایک خاص اثر چھوڑتی ہے اور ایک خاص سبق پڑھاتی ہے۔یہ سورہ مشرکین کے دل و دماغ اور ان کی بصیرت پر تعجب کا اظہار کرتی ہے کہ ان پر وحی الٰہی کا کوئی اثر نہیں ہوتا' ان کے سامنے اس کائنات کے مختلف مناظر پیش کیے جاتے ہیں جن سے اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کا اظہار ہوتا ہے' پھر قیامت کے خوفناک مناظر ان کے سامنے لائے جاتے ہیں' پھر لوگوں پر جو مصیبتیں آتی ہیں اور جو عذاب اس دنیا میں آتے رہتے ہیں وہ پیش کیے جاتے ہیں' پھر امم سابقہ کی ہلاکت اور بربادی کے واقعات بھی پیش کیے جاتے ہیں۔یہ اور اس قسم کے بے شمار دلائل اور اثر آفریں وجدانی مشاہد جو سورہ پیش کرتی ہے اور دیباچے میں تفصیلات دی گئی ہیں۔

اگر ہم اس سورہ کو تقسیم کریں بھی تو اس کے دو حصے ہو سکتے ہیں۔حصہ اول میں وہ لہریں ہیں جو پے در پے آتی ہیں اور جن کا ہم نے ذکر کیا' حصہ دوئم میں چند قصے ہیں مثلاً قصہ نوح' قصہ موسیٰ علیہما السلام۔قصہ یونس ؑ کی طرف اشارہ' اور اس کے اختتامیہ ہے۔

ہم اس سورہ کو بھی لہروں کی صورت میں لیتے ہیں جو باہم مربوط ہیں۔جس طرح امواج دریا علیحدہ بھی ہوتی ہیں اور ایک بھی۔سورہ کا پہلا سبق تین حروف سے شروع ہوتا ہے :الف' لام' را۔سورۂ بقرہ' سورۂ آل عمران اور سورۂ اعراف بھی ایسے ہی حروف سے شروع ہوئیں۔ان کی تفسیر میں وہاں مختلف آراء سے جو رائے ہم نے اختیار کی تھی اس کا تذکرہ میں نے وہاں کر دیا تھا۔یہ حروف مبتداء ہیں اور۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ( ۱۰ : ۱ ) کا جملہ اس کی خبر ہے۔

اس کے بعد پھر اس سبق میں ان متعدد امور کا ذکر کیا گیا ہے جو حکیمانہ امور ہیں اور کتاب کی صفت حکمت کی تشریح کے طور پر ان امور کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً رسول اللہ کی طرف نزول وحی تاکہ آپ لوگوں کو انجام بد سے ڈرائیں اور ایمان لانے والوں کو خوشخبری دیں' پھر اس بات کا ذکر ہے کہ لوگوں کا یہ اعتراض عقل پر مبنی نہیں ہے کہ اللہ نے وحی ایک انسان پر کیوں اتاری ہے؟ اگر وحی انسان پر نہ اتاری جاتی اور کسی اور مخلوق کو وحی دے کر بھیجی گئی ہوتی تو یہ امر حکمت کے خلاف ہوتا۔پھر یہ بتایا گیا ہے کہ تخلیق کائنات اور زمین و آسمان کے فزیکل نظام میں کس قدر گہری حکمت ہے کہ اس میں سورج کو تیز روشنی اور چاند کو نورانیت عطا کی گئی اور پھر چاند کے لیے منازل طے کی گئیں تاکہ لوگ ماہ و سال کا حساب رکھ سکیں۔پھر رات اور دن کا اختلاف اور اس کی حکمتیں۔

اس کے بعد آیات کائناتی سے روئے سخن ان لوگوں کی طرف پھر جاتا ہے جو غافل ہیں؟ جو اس عظیم مرحلے سے غفلت میں پڑے ہیں جس میں انسان کو برائے جو ابدہی اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہو گا' باوجود اس کے کہ ایک نہایت ہی برا انجام ان کے انتظار میں ہے اور دوسری جانب یہ کہ ایک نہایت ہی اچھا انجام اہل ایمان کے لیے منتظر ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ نے مہلت کے لیے جو ایک وقت مقرر فرمایا ہے اس میں کس قدر حکمت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے مطالبے کے مطابق ان کو پکڑ لیتا' جس طرح وہ بہت ہی جلد بازی کے ساتھ اللہ سے مطالبہ کرتے تھے تو اللہ ان کو پکڑ لیتا اور ان کا قصہ اس جہاں سے تمام ہو جاتا اور وہ بغیر کسی مہلت کے یہاں دھر لیے جاتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ حکیم ہے' اس لیے اس نے لوگوں کو پوری پوری مہلت دینا مناسب سمجھا۔

اس کے بعد بتایا گیا کہ انسان کی فطرت یہاں بھلائی کا استقبال کس طرح کرتی ہے اور مشکلات کے وقت اس کی حالت کیا ہوتی ہے؟ جب مشکلات آتی ہیں تو وہ اللہ کے سامنے بڑی عاجزی سے دست بدعا ہوتا ہے لیکن جب مشکلات دور ہو جاتی ہیں تو وہ اچانک برے دنوں کو بھول جاتا ہے اور اسی طرح حرکت اور جھگڑالو بن جاتا ہے جس طرح پہلے تھا۔ نیز وہ امم سابقہ کی تاریخ سے بھی کوئی عبرت نہیں لیتا جو اسی راہ پر چلیں اور جن کو ناقابل عبور مشکلات پیش آئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے مخاطب عرب تھے' ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کے اردگرد کی امم سابقہ کس طرح ہلاکت سے دوچار ہوئیں لیکن اس کے باوجود ان کا مطالبہ یہی رہا کہ حضور اکرم جو کلام اور جو دعوت پیش کر رہے ہیں' اس کو تبدیل کر دیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ یہ کلام تو اللہ کا ہے اور یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ وہ کسی بات کو بدلے یا نہ بدلے پھر یہ کہ یہ کلام ایک محکم حکیمانہ نظام پیش کرتا ہے اور اس نظام کے ایک پرزے کو اگر بدل دیا گیا تو پورا نظام ختم ہو گا۔ نیز قرآن تو اللہ کی بندگی اور حاکمیت کی دعوت دیتا ہے لیکن وہ جس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ بتوں کی پوجا کرو اور ان کو الٰہ مانو' جو نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ اور ان کی الوہیت پر کوئی دلیل نہیں ہے اور اللہ کی بندگی کو وہ چھوڑ رہے ہیں جو وحی الٰہی پر مبنی ہے۔ پھر یہ لوگ خوارق کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن یہ قرآن ان کو خارق عادت معجزہ نہیں نظر آتا۔ اس کی آیات بذات خود عظیم معجزات ہیں۔

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کی رحمت اور اس کے عذاب کے مقابلے میں انسانی ردعمل کیسا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں انسانی نفسیات کے چند نمونے دیئے جاتے ہیں اور انسان کا یہ نفسیاتی تجزیہ نہایت ہی زندہ اور متحرک منظر کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ لوگ بحری جہاز پر سوار ہوتے ہیں' وہ خوب چلتا ہے' اچانک اسے موجوں کے تھپیڑے آ لیتے ہیں اور یہ موجیں ہر طرف سے جہاز کو آلیتی ہیں۔

ایک دوسرا منظر سامنے آتا ہے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ دنیا کی یہ زندگی سراسر دھوکہ ہے۔ اس کی رونقیں اور اس کی تروتازگیاں تو ایک لحظہ میں ختم ہونے والی ہیں۔ لوگ غفلت میں ہوتے ہیں کہ اچانک کوئی آفت آتی ہے اور سب کچھ ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔

ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے تم لوگ غور نہیں کرتے کہ اللہ دارالسلام کی طرف بلاتا ہے۔ وہ ایک ایسے نظام کی طرف بلاتا ہے جس میں دنیا و آخرت دونوں امن و اطمینان کا گہوارہ ہوں گے۔ جس میں کوئی خوف نہ ہو گا۔

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ "ہم آیات کو مفصل طور پر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو فکر کرتے ہیں" اور اللہ کی تخلیق اور اس کے نظام کی تدبیر کے لیے اس کی ہدایات کی حکمت کو پا لیتے ہیں"۔

# درس نمبر۹۵ تشریح آیات

۱ ـــ تا ـــ ۲۵

سُوْرَةُ يُوْنُسَ مَكِّيَّةٌ (۵۱) (۱۰) اٰيَاتُهَا ۱۰۹ رُكُوْعَاتُهَا ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ﴿۱﴾

"اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔ ال ر' یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو حکمت و دانش سے لبریز ہے"۔ اس کتاب کی آیات حکمت' انہی حروف سے مرکب ہیں' جن کے بارے میں اہل کفر انکار کرتے ہیں کہ من جانب اللہ وحی ہیں ۔ کیا یہی حروف تہجی ان کے پاس موجود نہیں ۔ پھر کیوں نہیں وہ ان حروف سے ایک آیت تک بنا سکتے؟ آگے سورہ میں واضح الفاظ میں بھی ان کو یہ چیلنج دیا جاتا ہے ۔ لیکن یہ بات بھی ان کو اس امر کے سمجھنے میں مدد معاون ثابت نہیں ہوتی کہ ان کے اور رسول خدا کے درمیان فرق ہی اس وحی کی وجہ سے ہے ۔ اگر یہ وحی نہ ہوتی تو رسول بھی تمہاری طرح قرآن کی ایک آیت لے آنے سے عاجز ہوتا حالانکہ یہ حروف سب کے دسترس میں ہیں اور عام کلامی حروف ہیں ۔

حکیم وہ ہوتا ہے جو لوگوں کے ساتھ ان کے مزاج اور ان کے دائرۂ ادراک کے اندر بات کرتا ہے ۔ اس سورہ میں حکمت قرآن کے بعض اہم پہلوبیان کیے گئے ہیں جو آج تک سچے' محکم ہیں اور آئندہ کی نسلوں کے لیے بھی وہ آیات حکمت باقی اور مستحکم رہیں گی ۔

حکیم وہ ہے جو لوگوں کو دعوت فکر دیتا ہے کہ وہ اس کائنات کے صفحات میں پوشیدہ حکمتوں پر غور کریں ۔ آسمانوں کی پنہائیوں میں کس قدر راز ہیں' زمین کی تہوں میں کس قدر بصائر ہیں ۔ چاند و سورج' رات اور دن' امم سابقہ کی ہلاکت و بربادی اور زوال' رسولوں کے قصوں' اور اس پوری کائنات کے اندر موجود ظاہر و باہر آیات اس حکیم نے عوام کے سامنے پیش کیں ۔

---

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲﴾

"کیا لوگوں کے لیے یہ ایک عجیب بات ہوگئی کہ ہم نے خود انہی میں سے ایک آدمی پر وحی بھیجی کہ (غفلت میں پڑے ہوئے) لوگوں کو چونکا دے اور جو مان لیں ان کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے ان کے رب کی موجودگی میں سچے قدم ہیں۔ منکرین نے کہا کہ یہ شخص تو کھلا جادوگر ہے"۔

سخت تنبیہہ آمیز سوال ہے۔ اللہ ان لوگوں کے عجیب و غریب رویے پر ناراضگی کا اظہار فرماتے ہیں' جو یہ لوگ رسول کے منصب اور حقیقت وحی کے بارے میں اختیار کیے ہوئے ہیں۔

تمام رسولوں کو ہمیشہ اس سوال کا سامنا کرنا پڑا کہ کیا اللہ نے ایک انسان کو رسول بنا کر بھیجا؟ لوگوں نے یہ سوال اس لیے کیا کہ ان کے نزدیک خود انسان اور مقام انسانیت کی کچھ قدر و قیمت نہ تھی۔ وہ خود اپنی نظروں سے گرے ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ اس بات پر تعجب کرتے تھے کہ آیا رسول بھی انسان ہو سکتا ہے۔ اور براہ راست خدا سے رابطہ کر سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ ایک انسان کے ذمے یہ ڈیوٹی لگائے کہ وہ تمام انسانوں کی ہدایت کا بیڑا اٹھائے۔ ان کا خیال تھا کہ رسول کوئی فرشتہ ہو یا کوئی اور مخلوق ہو' اور اس کا درجہ انسان سے اونچا ہو۔ ان کے خیال میں یہ پہلو نہ آیا کہ انسان کو مقام رسالت عطا کر کے اللہ نے انسان کو شرف دیا۔ اور پھر اسے رسالت کے بوجھ کے اٹھانے کے قابل بنا کر اسے عزت بخشی اور انسانوں میں سے بعض انسانوں کو مزید بلندی مراتب عطا کر کے اپنے ساتھ رابطے قائم کرنے کے اہل بنایا۔

یہ تو تھا شبہ ان لوگوں کے ذہنوں میں جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب تھے۔ اور قرون اولیٰ کے باشندے تھے۔ لیکن دور جدید میں بسنے والے انسانوں کے ذہنوں میں بھی ایسے ہی شبہات پائے جاتے ہیں۔ دور جدید گمراہوں کا شبہ یہ ہے کہ اللہ جیسا تو کوئی ہو نہیں سکتا' اس لیے ایک خالص مادی ذات انسان کا اللہ کے ساتھ رابطہ کیسے ہو سکتا ہے جو غیر مادی ہے اور لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ہے۔

لیکن یہ سوال وہی شخص کر سکتا ہے جو یہ دعویٰ کرے کہ اس نے ذات الہٰی کی ماہیت اور حقیقت کا احاطہ کر لیا ہے اور اسے معلوم کر لیا ہے جس طرح کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے انسانوں کی ماہیت اور حقیقت کا ادراک کر لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جس شخص کے اندر ذرہ بھر عقل ہے وہ ایسا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انسان کی قوت مدرکہ ذات باری کی ماہیت و حقیقت کے ادراک کے قابل ہی نہیں ہے۔ باوجود اس حقیقت کے خود انسان کی قوت مدرکہ کی پوری ماہیت کو بھی انسان پوری طرح معلوم نہیں کر سکتا' خود انسانی قوت کے بارے میں بھی نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں' انسانی نفسیات کے بارے میں بھی انسانی علم کی آخری سرحد نہیں آئی کہ کوئی یہ دعویٰ کر سکے کہ انسان اور ذات باری کا رابطہ ممکن نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی علم کے سامنے ابھی جہالت کے ناقابل عبور میدان حائل ہیں جن میں اس نے کام کرنا ہے۔ اور اپنے علمی افق کو وسعت دینی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خود ذات انسان کے اندر وہ خصوصیات رکھی ہوئی ہیں جن کے بارے میں صرف اللہ کو علم ہے۔ اور اللہ جانتا ہے کہ انسانوں میں سے کس انسان کو منصب رسالت عطا کر دے اور کون ہے جو اس کے قابل ہے؟ لوگ نہیں جانتے۔ خود ایک رسول بھی بعض اوقات نہیں جانتا کہ اس کے اندر یہ قوت اور صلاحیت موجود ہے۔ لیکن اللہ نے انسان کے اندر خود اپنی روح پھونکی ہے۔ خود اللہ کو معلوم ہے کہ انسان کا ہر ہر خلیہ کیا خصوصیات رکھتا ہے؟ اس کا ہر ہر عضو کیا کمالات رکھتا ہے اور اس کی دوسری مخلوق کیا خصوصیات رکھتی ہے اور اللہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ کسی مخصوص انسان کو یہ مخصوص

صلاحیت دے دے ' اس قدر مخصوص کہ دوسرے انسان اس کی حقیقت کے ادراک ہی سے قاصر ہوں ۔

کئی محدثین اور مفسرین نے علم و سائنس کے ذریعے حقیقت وحی کو انسانی ذہن کے قریب تر کرنے کی سعی کی ہے ۔ میں سرے سے اس منہاج بحث کا قائل ہی نہیں ہوں 'کیونکہ سائنس کا ایک محدود میدان ہے ' سائنس اپنے دائرۂ کار میں کام کرنے کے وسائل بھی رکھتی ہے ۔ سائنس کی جو علمی سرحدیں ہیں ان میں آگے جانے کے لیے اس کے پاس وسائل آلات بھی ہیں ' لیکن آج تک سائنس نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ روح کے بارے میں کوئی حقیقی ادراک رکھتی ہے کیونکہ روح اور روحانی دنیا سائنس کا موضوع ہی نہیں ہے ۔ کیونکہ سائنس کے وسائل صرف مادی دنیا کے اندر محدود ہیں ۔ چنانچہ سائنس ہمیشہ روحانی دنیا سے دور رہتی ہے ۔ رہے وہ علوم جن کو روحانی علوم کہا جاتا ہے تو وہ ایسی کوششیں ہیں جن کے آگے شکوک و شبہات کا ایک سیلاب ہے اور ماہرین روحانیات نے اس کو عبور نہیں کیا ہے ۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے ڈاکٹر محمد حسین کا مقالہ جدید روحانیت اور اس کی حقیقت اور مقاصد)

روحانی دنیامیں انسان کسی بھی یقینی نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا ' الا یہ کہ کوئی بات قرآن اور حدیث جیسے یقینی اور سچے ماخذ سے لی گئی ہو لیکن قرآن و حدیث میں بھی ہمیں ان ہی حدود کے اندر رہنا ہے جن کو قرآن و حدیث نے متعین کر دیا ہے ' بغیر تصرف اور بغیر کسی زیادتی کے اور بغیر مزید قیاسات کے ۔ کیونکہ زیادتی ' قیاس اور تصرف ہماری عقل کا فعل تصور ہو گا اور عقل اس میدان میں پائے چوبیں کی مالک ہے ' اس میدان میں چلنے کے لیے اس کے پاس پاؤں ہی نہیں ہیں ۔

---

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۱۰ : ۲) "کیا لوگوں کے لیے یہ ایک عجیب بات ہوگئی کہ ہم نے خود انہی میں سے ایک آدمی پر وحی بھیجی کہ (غفلت میں پڑے ہوئے) لوگوں کو چونکا دے اور جو مان لیں ان کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے ان کے رب کی موجودگی میں سچے قدم ہیں"۔

یہ ہے خلاصہ وحی ۔ یعنی لوگوں کو اس بات سے ڈرانا کہ وہ مخالفت نہ کریں ورنہ انجام برا ہو گا ۔ اور جو لوگ مخالفت ترک کر کے ایمان لاتے ہیں ان کو یہ خوش خبری دینا کہ ان کے لیے رب کے ہاں سچی عزت ہے ۔ انذار اور تبشیر میں وہ حدود عمل بھی آجاتے ہیں جن پر عمل پیرا ہونا لازمی ہے اور وہ حدود ممانعت بھی آجاتے ہیں جن سے آگے بڑھنا حرام ہے یعنی انذار اور تبشیرمیں ان کے تقاضے بھی آجاتے ہیں ۔

انذار تمام انسانوں کے لیے ہے 'کیونکہ تمام انسان تبلیغ ' بیان اور ڈرانے کے محتاج ہیں ' لیکن خوش خبری صرف اہل ایمان کے لیے ہے ۔ خوش خبری اللہ اس لیے دیتا ہے کہ وہ مطمئن رہیں ' اپنی راہ پر گامزن رہیں اور ثابت قدم رہیں ۔ لفظ "صدق" کے مفہوم میں یہ سب کچھ داخل ہے ۔ اس کی اضافت قدم کی طرف کی گئی ہے یعنی ایسا سچا قدم جو راسخ ' ثابت ' پر یقین ہو ' جس کے اندر کوئی اضطراب ' تزلزل ' تردد اور خوف نہ ہو ' یعنی خوف ' ڈر اور مشکل حالات میں یہ سچا اور قابل اعتماد قدم ہو ۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۱۰ : ۲) یعنی رب کی موجودگی میں ۔ رب کی موجودگی میں ایک مومن کو زیادہ قوت ملتی ہے جبکہ دوسرے لوگوں کے اقدام نزل ہوتے ہیں اور دل مردہ ہوتے ہیں ۔

یہاں اشارہ کیا گیا ۔ رَجُلٍ مِّنْهُمْ ان میں سے ایک آدمی کی طرف جسے وہ جانتے ہیں اور وہ ان کو جانتا ہے ' وہ اس

پر مطمئن ہیں' اس کے ساتھ لین دین کرتے رہے ہیں اور ان کے درمیان کوئی تکلف اور کوئی دوری نہیں ہے نہ کوئی حرج ہے۔ جہاں تک رسولوں کے بھیجنے کا معاملہ ہے تو وہ تو بہت ہی واضح ہے۔ کیونکہ اپنے مزاج کے اعتبار سے انسان بھلائی اور برائی دونوں کا متحمل ہو سکتا ہے' انسانی عقل خیر و شر میں تمیز کرنے کا آلہ ہے لیکن بعض اوقات اس پر بھی امور مشتبہ ہو جاتے ہیں کیونکہ انسان کے میلانات اور رجحانات مختلف معاشروں اور مختلف حالات میں بدلتے رہتے ہیں اس لیے ایک ایسے معیار کی ضرورت تھی جو متبدل نہ ہو' اور جو وقتی حالات و رجحانات سے بالاتر اور جو کسی شخص' علاقے اور قوم اور زمان و مکان کی قید میں مقید نہ ہو اور یہ دائمی معیار وہ ہے جو پیغمبروں نے شریعت کی شکل میں پیش کیا۔

یہ وجہ ہے کہ اللہ کے دین کو ایک ایسے ابدی اور دائمی معیار کی ضرورت ہے تاکہ فہم انسانی اس کی طرف رجوع کرے اور عقل انسانی کے اخذ کردہ نتائج کو اس معیار اور کسوٹی پر پرکھا جائے اور دیکھا جائے کہ ان میں سے صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ دین خداوندی وہ ہے جسے انسان سمجھیں کہ یہ دین خداوندی ہے' یہی وجہ ہے' کہ دین بھی ایک ترقی پذیر سوچ کا نام ہے تو یہ خیال خام خیالی ہے اور یہ خیال وحی الہی کے مقام و مرتبے کو یکسر بدل دیتا ہے' اس کے مطابق پھر اصل چیز عقل ہے اور دین وہ ہے جو عقل سمجھے۔ اس طرح دین اسلام اور اس کے اصول کوئی چیز اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتے۔ دین اور اس کے اصول متعین نہ ہوں گے۔ اس طرح تو دین کا کوئی معیار ہی نہ رہے اور نہ عقل کی صحت اور نص کو پرکھنے کے لیے کوئی معیار ہو گا۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دین وہی ہے جسے فہم انسانی کوئی مفہوم دے اور جو یہ کہتے ہیں کہ دین سرے سے انسانی مصنوعات میں سے ہے' ان کے اقوال کے درمیان کوئی زیادہ فرق نہیں رہتا۔ دونوں قسم کے خیالات کی منزل ایک ہے' انجام دونوں کا خطرناک ہے بلکہ گمراہی ہے اور اس قسم کے خیالات سے ہمیں بروقت محتاط رہنا چاہئے۔

بہرحال وحی الہی کو یہ مقام اور مرتبہ دینے کے لیے کافر تیار نہ تھے اور وہ تعجب کرتے تھے کہ اس طرح کی وحی انسان پر کیسے آسکتی ہے۔

قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ (۱۰ : ۲) "کافروں نے کہا' بے شک یہ کھلا جادوگر ہے"۔ یہ جادوگر اس لیے ہے کہ جو کلام یہ پیش کرتا ہے وہ معجزہ ہے' حالانکہ ان کے لیے مناسب یہ تھا کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص بے شک نبی ہے اس لیے کہ وہ جو کلام پیش کرتا ہے وہ معجزہ ہے کیونکہ جادو میں کوئی کائناتی حقیقت نہیں ہوتی' اس کے اندر کوئی نظام زندگی نہیں ہوتا' جادوگر دنیا میں اصلاحی تحریکات نہیں اٹھایا کرتے۔ نہ جادوگر ہادی ہوتے ہیں وہ ایسی قانون سازی کرتے ہیں جن کی اساس پر کوئی ترقی یافتہ سوسائٹی تشکیل پائے اور اس کے نتیجے میں ایک مکمل نظام زندگی وجود میں آجائے جو انفرادی حیثیت رکھتا ہو۔

ان لوگوں نے وحی الہی کو جادو اس لیے کہا کہ تمام بت پرست معاشروں میں دین اور جادو کے درمیان دامن چولی کا ساتھ رہا ہے اور جس طرح اہل اسلام پر دین اور بت پرستی کی حقیقت ظاہر ہو گئی تھی اور انہوں نے بتوں اور اوہام و خرافات کو ترک کر دیا تھا اس طرح ان پر ابھی یہ حقیقت منکشف نہیں ہوئی تھی۔ دین اور جادو میں فرق کیا ہے؟

---

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۖ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۖ مَا مِن شَفِيعٍ إِلَّا مِن بَعْدِ إِذْنِهِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٣﴾ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٤﴾ هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٥﴾ إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَّقُونَ ﴿٦﴾

”حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب وہی خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا' پھر تخت سلطنت پر جلوہ گر ہو کر کائنات کا انتظام چلا رہا ہے۔ کوئی شفاعت ”سفارش“ کرنے والا نہیں ہے۔ الا یہ کہ اس کی اجازت کے بعد شفاعت کرے۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے۔ لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو۔ پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے۔ اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے۔ یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک پیدائش کی ابتدا وہی کرتا ہے' پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ان کو پورے انصاف کے ساتھ جزا دے۔ اور جنہوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا وہ کھولتا ہوا پانی پئیں اور دردناک سزا بھگتیں اس انکار حق کی پاداش میں جو وہ کرتے رہے' وہی ہے جس نے سورج کو اجیالا بنایا اور چاند کو چمک دی اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں ٹھیک ٹھیک مقرر کر دیں تاکہ تم اس سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ برحق ہی پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کی ہے' نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غلط بینی و غلط روی سے بچنا چاہتے ہیں“۔

اسلامی نظریہ حیات کا یہ ایک نہایت ہی اساسی مسئلہ ہے یعنی اللہ کی ربوبیت اور حاکمیت کا مسئلہ۔ جہاں تک خدا کی خدائی کے مسئلے کا تعلق ہے کسی مشرک نے سنجیدگی کے ساتھ خدا کا انکار نہیں کیا۔ وہ خدا کے وجود کا اقرار کرتے تھے

کیونکہ انسانی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان جب اس عظیم کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ لازماً اس کے بنانے والے کو مانتا ہے۔ الا یہ کہ انسان کی فطرت میں 'کبھی کبھی بہت زیادہ بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اس لیے بعض اوقات انسان نے خدا کا انکار بھی کیا ہے مگر یہ شاذ و نادر ہی رہا ہے۔ جہاں تک مشرکین کی بڑی بے راہ روی کا تعلق ہے وہ یہ رہی ہے کہ انہوں نے خدا کے سوا بعض دوسرے الٰہ بنا رکھے تھے' وہ ان الٰہوں کی عبادت کرتے تھے اور یہ عبادت بھی وہ اس عنوان سے کرتے تھے کہ یہ بت اور الٰہ ہمیں خدا کے قریب کرتے ہیں اور یہ کہ یہ الٰہ خدا کے ہاں سفارشی ہوں گے' اس کے علاوہ یہ کہ یہ مشرکین اپنے ضابطے اور قوانین بھی خود بناتے تھے اسی لیے یہ لوگ مشرک قرار پائے۔

قرآن کریم مسئلہ ربوبیت اور حاکمیت کو ذہن نشین کرانے کے لیے خشک منطقی انداز کلام اختیار نہیں کرتا جیسا کہ بعد کے ادوار میں یونانی منطق کے رواج کے نتیجے میں مسلمانوں میں علم الکلام کے نام سے مدون ہوا۔ اس مسئلے کو قرآن نہایت ہی سادہ اور فطری انداز میں پیش کرتا ہے۔ براہ راست فطرت کے سامنے سادہ حقائق رکھتا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ یہ انداز زیادہ موثر ہے مثلاً: اللہ وہ ذات ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور اس کائنات میں سورج کی روشنی پیدا کی' پھر رات کو چاند کی نورانیت پیدا کی اور چاند کے لیے منازل اور مدار مقرر کیے' اور رات دن کے اختلاف اور بڑے چھوٹے ہونے کے لیے ایک صحیح اندازہ مقرر کیا۔ یہ کائناتی مظاہر براہ راست احساس میں آتے ہیں' انسانی فکر پہ یہ مناظر اثرانداز ہوتے ہیں بشرطیکہ انسان اپنی فکر و نظر کے دروازے بند نہ کر دے' پس جس خدا نے یہ کائنات بنائی ہے اور وہ اس کی تدبیر کر رہا ہے' اسے چلا رہا ہے' وہی اس لائق ہے کہ لوگ اس کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔

اس دلیل پر ذرا غور کریں کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے کس قدر منطقی ہے اور انداز کس قدر سادہ ہے۔ ایک زندہ دلیل جسے سمجھنے کے لیے کسی منطقی رد و قدح کی ضرورت نہیں پڑتی' نہ ذہن بوجھ محسوس کرتا ہے اور یہ دلیل اس خشک منطق صغریٰ و کبریٰ کی شکل میں بھی نہیں ہے کیونکہ منطقی دلائل میں قلب کی گرمی اور وجدان کا جوش و خروش نہیں ہوتا۔

یہ عظیم کائنات' اس کے آسمان اور اس کی زمین' اس کا چاند اور سورج اس کے رات اور دن' اور آسمان کے اندر مخلوقات' مختلف قسم کی جاندار چیزیں اور مختلف تکوینی قوانین' نباتات و حیوانات اور تمام دوسری مخلوقات اللہ کے مقرر کردہ سنن کے مطابق چل رہے ہیں'۔ گندم از گندم بروئد جو از جو یہ رات جو پوری کائنات کو ڈھانپ لیتی ہے اور لوریاں دے کر سلا دیتی ہے' مکمل سکوت طاری ہو جاتا اور ماسوائے تاریکی کے کچھ نظر نہیں آتا۔ اور یہ صبح جو ایک خوبصورت اور مطمئن بچے کی ہنسی اور تبسم کی صورت میں رات کے گہوارے سے نمودار ہے۔ صبح کے نمودار ہوتے ہی زندگی حرکت کرنے لگتی ہے اور دوڑ دھوپ شروع ہو جاتی ہے۔ یہ گھنے سائے جنہیں دیکھنے والا ساکن سمجھتا ہے لیکن یہ چلتے ہیں نہایت لطف کے ساتھ' اور یہ پرندے جو اچھلتے کودتے نظر آتے اور ہروقت ادھر ادھر اڑتے ہیں' اور یہ نباتات جو ٹھہرے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن یہ دراصل ہر وقت بڑھوتری میں ہیں۔ اور یہ لوگ جو آتے ہیں' جاتے ہیں' دوڑتے ہیں' کھیلتے ہیں اور سرگرم ہیں۔ اور رحم مادر جو زندگی عطا کر رہی ہے اور یہ قبریں جو لوگوں کو نگلتی چلی جا رہی ہیں او زندگی ایک سمت میں محو حرکت ہے اس کے لیے کوئی جائے قرار نہیں ہے۔

البتہ کائنات کی یہ تصویریں اور یہ سائے' یہ رنگ اور شکلیں' یہ فرصت اور سکون اور ماحول' یہ آنا اور یہ جانا' یہ بڑھاپا

اور یہ جوانی' یہ روئیدگی اور یہ خزاں کی تباہ کاریاں' یہ زندگی اور یہ موت' یہ مسلسل حرکت اور یہ مہیب سکوں' اور یہ ٹھہراؤ اور سکون بھی دائمی اور یہ حرکت بھی ایسی مسلسل کہ سکون محال نظر آئے' لیکن در حقیقت شب و روز حرکت۔

یہ تمام حقائق انسان کی رگ رگ کو سوچنے اور متاثر ہونے پر مجبور کرتے ہیں بشرطیکہ دل زندہ ہو اور اس کائنات میں بکھری ہوئی علامات و آیات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ ہے انداز قرآن مجید کا جو براہ راست فطرت انسانی پر نشانہ باندھتا ہے۔ اور عقل تو بہرحال غور و فکر اپنی جگہ کرتی ہی رہتی ہے۔ کیونکہ آیات و معجزات اور دلائل و علامات کے ان بے پناہ مواقع کو عقل کس طرح نظر انداز کر سکتی ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ (۱۰ : ۳) "حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب وہی خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا"۔ تمہارا وہ رب جو بندگی اور حاکمیت کے لیے استحقاق رکھتا ہے وہ تو ایسا خدا ہے' جو خالق ہے' جس نے اس زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور ان کو نہایت ہی حکیمانہ انداز میں پیدا کیا اور ان میں کوئی فتور نہیں ہے۔

فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ (۱۰ : ۳) چھ دنوں میں) یہ اس کی حکمت کا تقاضا تھا' جس میں اس کائنات کی ترتیب کو درست کرنا اس نے چاہا۔ یہ دن کیسے تھے؟ یہاں ہمیں اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ ان کی تحدید کریں کیونکہ اللہ نے یہاں ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے تاکہ ہم تشریح کریں اور ان کی نوعیت بتائیں۔ ان کی تعداد کا تذکرہ اس لیے کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کی تخلیق میں اللہ کی جو حکمت پوشیدہ ہے اس کا اظہار کر دیا جائے۔ جو مقصد کائنات ہے اور جو مقصد تخلیق ہے اسے کس طرح حاصل کیا جائے۔

بہرحال یہ چھ دن کیسے تھے' یہ ایک غیبی حقیقت ہے' اس کی حقیقت معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ علم ہمارے پاس ماسوائے وحی کے نہیں ہے' لہٰذا جب وحی خاموش ہے تو ہمیں بھی خاموش رہنا چاہیے۔ یہاں ذکر اس لیے کر دیا گیا کہ اللہ اپنی تقدیر اور تدبیر کی حکمت بتانا چاہتے ہیں اور اس نظام کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں جس کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے۔ ابتدا سے انجام تک اس کے مطابق چلے گی۔

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (۱۰ : ۳) "پھر تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوا" تخت پر جلوہ گر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اس کائنات پر پورا کنٹرول ہے۔ اور یہ انداز اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ لوگ اسے سمجھ سکتے ہیں۔ دراصل قرآن کریم مجرد معانی اور مفاہیم کو بھی حسی انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ عام لوگوں کے فہم و ادراک کے قریب ہو جائیں۔ ہم نے کتاب (التصویر الفنی فی القرآن) میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے کہ قرآن کریم کس طرح تخیل کو حسی تصویر دیتا ہے"۔

پھر لفظ ثم بھی یہاں اس کے لغوی مفہوم میں یعنی "اس کے بعد" میں نہیں ہے۔ یہ معنوی اعتبار سے بعد میں ہے' اللہ پہلے بھی استوا میں تھا اور بعد میں بھی۔ یہاں اللہ کا اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (۱۰ : ۳) اور اصل قید زمان و مکان سے باہر ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ اللہ پہلے نہ تھا اور پھر ہوا۔ کیونکہ زمان و مکان کے خیال سے جو نئے حالات پیدا ہوتے ہیں اللہ ان حالات سے پاک ہے۔ انسانی سوچ کے لیے ایک محفوظ اور مامون دائرہ ہے۔ اس سے آگے ہم نہیں جا سکتے

اور نہ جاتے ہیں کیونکہ اسلام نے یہ اصول وضع کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات شکل و ہیئت اور حدوث اور حالات سے منزہ ہے ۔ اسی طرح زمان و مکان کے تصور سے وہ وراء ہے کیونکہ زمان و مکان نہ تھا اور وہ تھا ۔

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ ( ۱۰ : ۳ ) "کائنات کا انتظام چلا رہا ہے" ۔ وہ تمام امور کو چلاتا ہے ' ان کے آغاز اور انجام کا تعین کرتا ہے ' ان کے حالات اور تقاضوں کا تعین کرتا ہے ' اسباب و نتائج کا تعین فرماتا ہے اور وہ قانون قدرت بناتا ہے جو ہر امر کے مراتب اور نتائج کو کنٹرول کرتا ہے ۔

مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ ( ۱۰ : ۳ ) "کوئی شفاعت ( سفارش ) کرنے والا نہیں ہے الا یہ کہ اس کی اجازت کے بعد شفاعت کرے" ۔ کیونکہ ہر قسم کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے ' اور کوئی ایسا سفارشی نہیں ہے جو کسی کو اللہ کا قریبی بنا سکے ۔ اور اس کی مخلوق میں سے صرف وہی کوئی سفارش کر سکے گا جس کو اجازت ہو گی اور یہ اللہ کی تدبیر اور تقدیر کا مسئلہ ہے کہ وہ کس کو اجازت دے گا ۔ اور مومنین میں کون اور اعمال صالحہ میں سے کس عمل کی برکت سے سفارش ہو سکے گی ' یہ نہیں ہے کہ سفارشیوں کو وسیلہ بنا کر خدا کا درجہ دے دیں ' کیونکہ مشرکین مکہ جن فرشتوں کی مورتیوں کی پوجا کرتے تھے ان کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان کی شفاعت مسترد نہیں ہوتی ۔

یہ ہے تمہارا خدا خالق ' مدبر جس کے ہاں کوئی سفارش نہیں چلتی ۔ الا یہ کہ وہ خود اجازت دے ۔ یہ رب اس قابل ہے کہ اسے تم معبود ' مالک اور حاکم سمجھو اور یہی اس قابل ہے کہ اسے رب تسلیم کیا جائے اور یہی اس بات کے قابل ہے کہ اس کی اطاعت اور فرمان برداری کی جائے ۔ کیا تم ہوش کے ناخن نہیں لیتے ۔ یہ معاملہ تو نہایت ہی واضح اور سادہ ہے ۔ اس کے سمجھنے کے لیے کسی بڑی مقدار علم و معرفت کی ضرورت نہیں ہے ۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ کے اس قول پر قدرے غور کریں ۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ( ۱۰ : ۳ ) "یہی اللہ تمہارا رب ہے ۔ لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو ۔ پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے" ۔ اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں کہ کفار مکہ وجود باری کا سنجیدگی کے ساتھ انکار نہ کرتے تھے ۔ وہ ذات باری کو تسلیم کرتے تھے ۔ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ وہ خالق رازق ' زندہ کرنے والا اور مارنے والا ہے اور وہی اس کائنات میں متصرف ہے اور ہر چیز پر وہی قدرت رکھتا ہے ۔ لیکن اس قدر اعتراف کرنے کے بعد وہ اس اعتراف کے تقاضے پورے نہ کرتے تھے کیونکہ اس اعتراف کرنے کے بعد وہ سمجھتے اور انہیں ایسا سمجھنا چاہئے تھا کہ رب بھی اللہ ہے اور یہ کہ ان کی پوری زندگی میں حاکم بھی وہی ہو گا کیونکہ الوہیت اور ربوبیت کا اظہار صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ لوگ اللہ کو اپنا بادشاہ اور حاکم سمجھیں ۔ اس کے سامنے مراسم عبودیت بجا لائیں ۔ اور اپنی پوری زندگی میں اللہ کی شریعت کو نافذ کریں ۔ یہ ہے مفہوم اس آیت کا ۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ( ۱۰ : ۳ ) "یعنی یہ ہے تمہارا رب لہٰذا اس کی بندگی کرو" ۔

کیونکہ عبادت اور بندگی کا مفہوم ایک ہے اور اللہ کے دین پر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے نظام زندگی کا اتباع

کیا جائے اور یہ کہ اللہ کی ان خصوصیات میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے۔ کیونکہ اگر ان میں ہم کسی اور کو شریک کریں گے تو مفہوم یہ ہو گا کہ ہم صرف اللہ کو حاکم تصور نہیں کرتے۔

تمام جاہلی تصورات میں یہ ہوتا ہے کہ الوہیت کے دائرے کو محدود کیا جاتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وجود ذات باری کو مان لیا تو ایمان مکمل ہو گیا۔ اور جن لوگوں نے اللہ کو الہٰ مان لیا تو ان کا ایمان مکمل ہو گیا اور وہ مراد کو پہنچ گئے۔ چاہے وہ زندگی میں اس ایمان اور اعتراف کے تقاضے پورے کریں یا نہ کریں اور اس کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کو رب اور حاکم بھی سمجھا جائے۔ اور اس کے سوا کسی اور کو حاکم نہ تصور کیا جائے۔

اسی طرح جاہلیتوں میں عبادت کا مفہوم بھی محدود ہوتا ہے۔ اس میں صرف مراسم عبودیت داخل ہوتے ہیں یعنی مذہبی فرائض۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر عبادت کی جائے تو صرف اللہ کی کی جائے بتوں وغیرہ کی نہ کی جائے۔ حالانکہ خود عبادت کا لفظ عبد سے نکلا جس کے معنی ہیں اطاعت کرنا اور حکومت ماننا ہے۔ مذہبی مراسم عبودیت بجا لانا تو اللہ کی حاکمیت کے تسلیم کرنے کی ایک علامت ہے۔ پوری خدا پرستی رسم عبودیت میں محدود نہیں ہے، یہ تو اس کا ایک مظہر ہے۔ پھر جاہلیت کسی دور کا نام نہیں ہے، نہ انسانی تاریخ کا کوئی مرحلہ جاہلیت ہے۔ جاہلیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی ربوبیت اور حاکمیت کو صرف عبادات تک محدود کر دیا جائے حالانکہ ربوبیت الٰہ کو محدود کرنے کے نتیجے میں انسان شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس وقت پورے عالم انسانیت کا یہی حال ہے، اس میں وہ علاقہ بھی شامل ہے جس میں لوگ مسلمانوں کی طرح نام رکھتے ہیں اور ان میں بعض مراسم عبودیت بھی بجا لاتے ہیں جبکہ ان کے رب اللہ کے سوا کچھ اور لوگ ہیں کیونکہ رب تو وہی ہوتا ہے جس کی شریعت اور حکومت کو نافذ کیا جائے جس کا قانون اور دستور نافذ ہو، اور جس کے اوامر و نواہی کے لوگ پابند ہوں اور اس کے قانون کے پابند ہوں جو بھی وہ بنا دے۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ عیسائیوں کے ارباب و رہبان ان کے لیے قانون بناتے ہیں۔ اور یہ بے چون و چرا اسے قبول کرتے ہیں تو یہ ان کی بندگی ہے۔ (ترمذی حدیث عدی)

عبادت کے مفہوم کو مزید واضح کرنے کے لیے اس سورہ میں آیا ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا قُلْ آللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ (۱۰:۵۹) "بتاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے رزق اتارا ہے، پس تم نے اس سے بعض کو حرام اور بعض کو حلال قرار دیا ہے، کہہ دیجئے کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دی ہے یا تم اللہ پر افترا باندھتے ہو"۔ اور آج ہم اسی حالت میں ہیں جس میں اہل جاہلیت تھے، جن کو اللہ نے فرمایا تھا کہ

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۱۰:۳) "یہ ہے تمہارا رب، پس اسی کی بندگی کرو، کیا تم نصیحت نہیں لیتے"۔ یعنی اس کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ تم نے اس کی طرف لوٹنا ہے۔ اس کے سامنے حساب دینا ہے، وہی مومنوں اور کافروں کو جزا و سزا دے گا۔

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا (۱۰ : ۴) "اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے' یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے"۔ یعنی تم سب کو صرف اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے' یہ جن کو تم شریک سمجھتے ہو' ان کے سامنے تم نے نہیں پیش ہونا۔ اور یہ حق بات ہے۔

اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ (۱۰ : ۴)

بے شک پیدائش کی ابتداء وہی کرتا ہے' پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان کو پورے انصاف کے ساتھ جزا دے۔ اور جنہوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا وہ کھولتا ہوا پانی پئیں اور دردناک سزا بھگتیں۔ اس انکار حق کی پاداش میں جو وہ کرتے رہے"۔

اللہ تعالیٰ نے چونکہ اٹھانے کا ذمہ اٹھایا ہے' اس لیے اٹھانے کا عمل لازمی واقعہ ہو گا۔ نیز تخلیق کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو آزمایا جائے اور اچھے لوگوں کو اچھا اور بروں کا برا صلہ دیا جائے اور یہ عین عدل ہو گا لہٰذا اقتضائے تخلیق ہو گا۔

اس کے علاوہ ایسی نعمتوں کا حصول جن کے استعمال میں کوئی رکاوٹ نہ ہو' جس کے استعمال کے نتیجے میں برے اثرات نہ ہوں اور یہ نعمتیں دائمی ہوں' تخلیق کائنات کا ایک اعلیٰ مقصد ہے۔ یعنی انسان کے لیے انتہائی کمال اور سربلندی تک پہنچ جانا اور اس کمال تک انسان اس زمین پر نہیں پہنچ سکتا کیونکہ اس دنیا میں خوشی کے ساتھ غم بھی موجود ہے۔ سہولت کے ساتھ مشکلات بھی موجود ہیں۔ اگر دنیا میں ہر کمال حاصل کر لیا جائے لیکن یہی ایک شعور اس کی ناتمامی کے لیے کافی ہے کہ یہ دنیا چھوٹنے والی ہے۔ لہٰذا انسانیت اس دنیا میں بھی اعلیٰ مراتب کمال تک نہیں پہنچ سکتی مثلاً وہ ہر نقص ' ہر ضعف' ہر کام کے تعقبات After effects سے پاک ہو اور بغیر کدورت' بغیر خوف ناکامی اور بغیر خوف انقطاع عشرت انسان یہاں لذت کام و ذہن کو جاری رکھ سکے۔ لہٰذا انسان کو من کل الوجوہ کمال صرف آخرت ہی میں حاصل ہو سکتا ہے۔ پس اس کائنات کی تخلیق کی اصل غرض و غایت یہ ہے کہ یہاں آزمانے کے بعد اسے اٹھایا جائے اور پھر وہ لوگ جو اس آزمائش میں کامیاب ہو جائیں وہ دائمی کامیابی پا کر ہر قسم کا کمال حاصل کر لیں۔ اور وہ انسانیت کے اعلیٰ مراتب تک پہنچ جائیں۔

اور جو لوگ کفر کریں اور اس آزمائش میں ناکام ہو جائیں اور وہ انسانی کمال تک نہ پہنچ سکیں اور نہ وہ اس راہ کو اختیار کریں لہٰذا ان کے بارے میں مناسب فیصلہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ انصاف کے مطابق مرتبہ کمال کو نہ پہنچیں کیونکہ انہوں نے خود کمال تک پہنچانے والے راستے کو چھوڑا۔ اور یہ بھی جائز بات ہے کہ وہ اس انجام تک جا پہنچیں جس تک ان کو پہنچنا چاہئے۔ مثلاً جو مریض صحت کے اصولوں کی پیروی نہیں کرتا وہ قبل از وقت اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ اور بیمار اور ضعیف ہو جاتا ہے اور یہ شخص زوال اور نہایت ہی تلخ زندگی تک پہنچ جاتا ہے۔ یہاں جنت کے دائمی لذائذ کے مقابلے میں تلخیاں ہی تلخیاں ہوں گی۔

یہ ہے مفہوم اس آیت کا۔

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِیْمٌ بِمَا کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ

(۱۰ : ٤) "اور جنہوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا وہ کھولتا ہوا پانی پیئیں گے اور دردناک سزا بھگتیں گے ' اس انکار حق کی پاداش میں جو وہ کرتے رہے"۔

اس کائنات میں سے وہ دلائل پیش کرنے کے بعد صرف اللہ وحدہ بندگی کے لائق ہے اور جزاو سزا کا مالک بھی وہی ہے۔ اب سیاق کلام اس طرف آتا ہے کہ اس کائنات کی ضخامت اور اس کی افادیت پر ذرا غور کرو اور دیکھو کہ اس میں کیا کیا نشانات و معجزات ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ

(۱۰ : ۵) "وہی ہے جس نے سورج کو اجیالا بنایا اور چاند کو چمک دی اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں ٹھیک ٹھیک مقرر کر دیں تاکہ تم اس سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ برحق ہی بنایا ہے۔ وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں"۔

سورج اور چاند اس زمین کے مشاہد و مظاہر میں سے جو اہم مشاہدے ہیں ' جو ہر وقت کھلے ہیں۔ ہم رات اور دن دیکھتے دیکھتے ان کی اہمیت کو کھو دیتے ہیں۔ اور بار بار کی گردش لیل و نہار کی وجہ سے ہم پہ ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی انسان کسی غار میں بڑا ہو جائے اور وہ اچانک اس کائنات میں نمودار ہو اور وہ دیکھے کہ یہاں سورج چمک رہا ہے اور پھر رات کو چاند طلوع ہو رہا ہے تو وہ دہشت زدہ ہو جائے گا اور اس کے تعجب اور حیرانی کی انتہا نہ ہو گی۔

یہ دو مظاہر اور حقائق جو پیش پا افتادہ ہیں اور بار بار ہمارے سامنے آتے ہیں ' قرآن ہمیں ان پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے ' تاکہ ہمارے اندر ایک حیرانی اور غور کرنے کا شعور پیدا ہو ' ہمارا احساس ذرا تیز ہو ' اور ان مظاہر کے تکرار پر بھی ہم تامل کریں اور ان کی تخلیق ' ان کی افادیت اور ان کی گردش کی محکمی اور تسلسل پر غور کریں۔

ذرا سورج کی تخلیق ' اس کا مسلسل ایٹمی اشتعال ' چاند کی روشنی دھیمے انداز میں --- پھر مدار میں ان کی مسلسل گردش --- آج جس مدار میں چاند ہے ' کل اس میں نہ ہو گا --- آج جس قدر ہے کل اس سے کم یا زیادہ نظر آئے گا۔ ماہرین فلکیات کے علاوہ ایک عام آدمی بھی مشاہدہ کر سکتا ہے۔ وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ (۱۰ : ۵) منزلیں مقرر کر دی گئیں۔

لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ (۱۰ : ۵) "تاکہ تم اس سے برسوں اور تاریخوں کا حساب معلوم کرو"۔ آج تک تمام تاریخیں اور حساب شمس و قمر کی گردش سے متعین ہیں تمام انسان ایسا ہی کرتے ہیں۔

کیا یہ سب کچھ ایک عبث کھیل ہے ' کیا یہ ایک حقیقی معاملہ ہے۔ محض ایک اتفاق ہے جو گزر رہا ہے۔ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ (۱۰ : ۵) "اللہ نے یہ سب کچھ برحق پیدا کیا ہے"۔ اس کی اساس حق ہے ' حق اس کا ذریعہ ہے ' اور حق اس کا مقصود ہے۔ اور سچائی اہم اور مضبوط ہے اور اس سے جو دلائل و حقائق معلوم ہوتے ہیں وہ مستقل ہیں۔

يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۱۰ : ۵) "وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں"۔ یہ مشاہد جو یہاں پیش کیے جا رہے ہیں ان کو معلوم کرنے کے لیے غور و فکر اور گہرے علم کی ضرورت ہے تاکہ ان کی غرض و غایت اور مقصد تخلیق کو معلوم کیا جا سکے۔

زمین و آسمان کی تخلیق' سورج کو روشنی اور چاند کو نور بنانے اور ان کے منازل و مدار مقرر کرنے کے نتیجے ہی میں' دن اور رات پیدا ہوئے اور اس کائنات میں جو شخص کھلے دل سے غور و فکر کرے اس کے لیے یہ اس کائنات کا عجیب و غریب منظر ہے۔

اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ (۱۰ : ٦) "یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کی ہیں' نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غلط بینی و غلط روی) بچنا چاہتے ہیں"۔ رات اور دن کے اختلاف سے مراد ان کا آگے پیچھے آنا ہے۔ نیز اس سے ان کے درمیان لمبائی اور اختصار کا اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ اور یہ دونوں ایسے مظاہر ہیں کہ جو رات دن دہرائے جاتے ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے مالوف اور معتاد ہو جاتے ہیں۔ الا یہ کہ بعض لمحات میں جب نفس انسانی متوجہ ہو اور اس کائنات کی بوقلمونیوں پر غور کرنے کے لیے انسانی وجدان تیار ہو تو انسان کے لیے طلوع و غروب اور شب و روز بالکل ایک نئے اور عجیب مظاہر بن جاتے ہیں۔ اور انسان ان کو اس طرح دیکھتا ہے کہ گویا یہ مناظر اس کے لیے بالکل نئے ہیں۔ اور وہ انہیں عجیب انداز میں محسوس کرتا ہے۔ یہی وہ لمحات ہوتے ہیں جن میں انسان زندہ ہوتا ہے' اور ان لمحات میں وہ خشکی ختم ہو جاتی ہے جو ان مظاہر کے ساتھ عادی ہونے کی وجہ سے انسان میں پیدا ہو جاتی ہے اور ان مظاہر کی اصل حقیقت کو دیکھ سکتا ہے۔

وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۱۰ : ٦) "اور جو اللہ نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کیا ہے"۔ اگر انسان چند لمحات بھی ان چیزوں پر غور کر سکے جو اللہ نے آسمانوں اور زمین کے درمیان پیدا کی ہیں اور یہ انواع و اقسام کی اشیاء ہیں' عجیب و غریب شکلیں اور عجیب و غریب احوال جو اس عظیم کائنات کے اندر بکھرے پڑے ہیں تو یہ چند لمحات اسے وہ کچھ عطا کر سکتے ہیں جو اس نے پوری زندگی میں نہ پایا تھا۔ اور پھر یہ تاثر اس کی پوری زندگی کے لیے ایک مشعل راہ بن سکتا ہے۔ اور اس پوری کائنات اور زمین و آسمان کی تخلیق تو ایک نہایت ہی بڑی چیز ہے اور اگر صرف ایک اشارہ کے طور پر بھی دل اس کی طرف متوجہ ہو جائے تو اس کی چمک اس کی زندگی کو بھر دے گی۔ پوری زندگی کو۔ بے شک ان میں ان لوگوں کے لیے آیات و دلائل ہیں جن کے دل میں ذرہ بھر خوف خدا بھی ہو۔

یہ متقی کون لوگ ہیں لِقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ وہ ہیں جن کے دلوں میں اسی قسم کی وجدانی چمک پیدا ہو۔ یہ خدا خوفی کا وجدان ہے اور اس کے نتیجے میں دلوں میں یقین و ایمان کا لاوا ابل پڑتا ہے۔ دل حساس ہو جاتے ہیں' ان پر بات کا اثر ہوتا ہے اور وہ قدرت الٰہیہ سے متاثر ہو کر حق کو قبول کر لیتے ہیں' وہ اللہ کی قدرت کی ان بوقلمونیوں سے متاثر ہو رہے ہیں' اس کائنات میں ان کے قلب و نظر اور ان کے احساس اور سننے کے لیے بہت کچھ مضمرات ہوتے ہیں۔

انسان کے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات میں جو آیات و علامات اللہ نے پیدا کر رکھی ہیں ان کی طرف متوجہ کرنے کے لیے قرآن کا یہ منہاج اور اسلوب کلام ہے۔ اللہ وہ ذات ہے جس نے انسان کو بھی پیدا کیا ہے اور اس کائنات کو بھی اور اس کو معلوم ہے کہ فطرت انسانی اور فطرت کائنات کے درمیان ہمکلامی کے لیے انسان کے اندر ایک خاص صلاحیت ہے۔ انسان فطرت کی پکار کو سن سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے۔

قرآن کریم نے اس سلسلے میں وہ اسلوب کلام اختیار نہیں کیا جو ازمنہ مابعد میں یونانی فلسفے اور منطق سے متاثر ہو کر متکلمین نے اختیار کیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح علم تھا کہ یہ اسلوب دل کی گہرائیوں کو نہیں چھوتا اور اس کی منطق اور طرز استدلال خشک ہے اور کسی انسان کو یہ اسلوب عمل کے لیے آمادہ نہیں کرتا۔ نہ اس طرز استدلال پر کوئی زندگی اور تہذیب استوار کی جا سکتی ہے۔ ہاں اسی طرز استدلال سے ذہن انسانی ضرور حرکت میں آتا ہے اور بہت سی ہوائی باتیں بنا لیتا ہے۔

لیکن وہ دلائل و براہین جو قرآن مجید اپنے اس منفرد طرز استدلال کے ذریعے پیش کرتا ہے یہ قوی ترین دلائل ہوتے ہیں' یہ انسان کے دل و دماغ کو مطمئن کر دیتے ہیں اور یہ اس طرز استدلال کا خصوصی امتیاز ہے کیونکہ سب سے پہلے اس کائنات کا وجود ہی ایک دلیل ہے۔ اس کے بعد اس کی منظم حرکت' نہایت ہی مستحکم نظام گردش اور اس کے نتیجے میں کائنات کے اس ماحول میں جو عجیب و غریب تغیرات پیدا ہوتے ہیں' جو ایک واضح قانون اور متعین اثرات و نتائج پیدا کرتے ہیں اور اس وقت سے پیدا کرتے چلے آ رہے ہیں جب سے انسان نہ تھا یا جانتا ہی نہ تھا۔ ان سب امور اور سوالات کا جواب اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ اس کائنات کا ایک خالق اور مدبر ہے۔

جو لوگ اس دلیل کو تسلیم نہیں کرتے یا اس میں شک پیدا کرتے ہیں وہ آج تک اس سے قوی' منطقی یا فلسفیانہ دلیل نہیں لا سکے۔ وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکے کہ یہ کائنات اپنے ان قوانین کے ساتھ یوں پائی گئی ہے اور اس کے وجود کے لیے کسی علت کی تلاش ضروری نہیں ہے' اس کے وجود کے اندر ہی یہ قوانین ودیعت ہیں۔ سوال یہ کہ ان لوگوں کی یہ بات کیا کوئی معقول بات ہے؟

سب سے پہلے یورپ میں یہ انداز کلام اختیار کیا گیا جبکہ یورپ تصور خدا سے فرار اختیار کرنے کے موڈ میں تھا کیونکہ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اللہ سے فرار کے سوا کلیسا کے چنگل سے آزاد نہیں ہو سکتے' اس کے بعد دوسرے علاقوں میں بھی یہ بات مقبول ہو گئی کیونکہ اس کے سوا خدا کا انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ دنیا کی تمام جاہلیتیں اپنی تمام خرابیوں کے باوجود منکر خدا نہ تھیں۔ ہاں خدا کو خالق تسلیم کرنے کے بعد وہ صرف اللہ کو رب اور حاکم تسلیم کرنے سے منکر تھیں اور اسی مسئلے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مشرکین عرب کے درمیان اختلاف تھا۔ چنانچہ قرآن کریم کے اس طرز استدلال نے ان لوگوں کو بالکل بے بس اور لاجواب کر دیا جبکہ بنیادی طور پر وہ اللہ کی ذات و صفات کے قائل تھے۔ قرآن کریم کا مطالبہ یہ تھا کہ تم جس اللہ کے قائل ہو' وہی اکیلا رب اور حاکم بھی ہے۔ لہٰذا مراسم عبودیت کے ساتھ سیاسی اور تشریعی حاکمیت بھی اسی کی تسلیم کرو۔ لیکن بیسویں صدی کی جاہلیت نے یہ رویہ اختیار کیا کہ سرے سے ذات باری کا انکار کر دو تاکہ تم سے کوئی اس کی حاکمیت اور شریعت کے اتباع کا مطالبہ ہی نہ کر سکے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ ممالک جو اپنے آپ کو اسلامی ممالک کہتے ہیں' ان میں تمام وسائل عالم و ادراک اور میڈیا کے ذریعے تصور خدا سے اس فرار کو بڑی حکمت کے ساتھ رائج کیا جا رہا ہے اور یہ کام علم اور سائنس کے نام سے

کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ سائنس کے ہاں عالم الغیب کی کوئی گنجائش نہیں ہے' وہ صرف علم شہادت کو تسلیم کرتی ہے اور الوہیت اور ربوبیت کے جو تصورات ہیں' وہ عالم غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ یوں خدا کے تصور سے فرار اختیار کرنے والے اس چور دروازے سے نکل بھاگنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ سے تو نہیں ڈرتے البتہ عوام الناس سے ضرور ڈرتے ہیں' اور اس طرح عوام الناس کو دھوکہ دیتے ہیں۔

لیکن آج تک ان مغروروں کو اس کائنات کا یہ عظیم وجود' اس کی حرکت اور نہایت ہی منضبط قوانین گھیر رہے ہیں اور ان کا دل' ان کی عقل اور ان کا فطری احساس اور شعور اور ان کا وجدان ہر طرف سے ان کا پیچھا کرتے ہیں اور ان کو گھیرتے ہیں اور ان سے جواب طلب کرتے ہیں۔ اور قرآن کریم کا یہی فطری اسلوب استدلال ہے جو ان سے مخاطب ہے۔ اس کا یہ استدلال نہایت ہی سادہ اور مختصر ہے۔ نہایت ہی وسیع اور انسان کے ماحول پر چھایا ہوا ہے۔ اور نہایت ہی گہرا ہے۔ انسان کے دل کی گہرائی تک چلا گیا ہے اور اس کائنات کے قلب میں بھی موجود ہے۔

ooo

جو لوگ یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور پھر بھی ان کے دل میں یہ خیال نہیں گزرتا کہ ان کو ایک دن اللہ کے سامنے جانا ہے اور وہ یہ ادراک نہیں کر سکتے کہ اس کائنات کا منطقی اور اخلاقی تقاضا یہ ہے کہ آخرت میں حساب و کتاب ہو گا' اور یہ کہ یہ دنیا ہی انجام نہیں ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں انسانیت معراج انسانیت تک نہیں پہنچ سکی' غرض وہ لوگ جو اللہ کی ان نشانیوں پر سے غفلت کے ساتھ گزرتے ہیں یا گزرنا چاہتے ہیں' ان کے دل میں تدبر کی تحریک نہیں ہوتی' ان کی عقل متفکر نہیں ہوتی' تو یہ لوگ' اس قسم کے لوگ کبھی بھی انسانی کمال اور عروج کے راستے پر نہیں چلتے اور نہ چلیں گے۔ اور یہ لوگ کبھی بھی جنت تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ جنت تو مومنین اور صالحین کی منزل ہے۔ جو اس دنیا کی تھکاوٹوں اور محنتوں سے آزاد ہو کر اللہ کی حمد و ثنا کے لیے فارغ ہوں گے اور اللہ کی رضامندی کے حصول کے بعد خوش و خرم ہوں گے۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ
اطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ ﴿۷﴾ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمُ
النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۸﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ ۖ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ
النَّعِيمِ ﴿۹﴾ دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۚ
وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۰﴾ ع۱۰

"حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں' اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں' ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہو گا ان برائیوں کی پاداش میں جن کا اکتساب وہ

(اپنے اس غلط عقیدے اور غلط طرز عمل کی وجہ سے ) کرتے رہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ ایمان لائے (یعنی جنہوں نے ان صداقتوں کو قبول کر لیا جو اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں ) اور نیک اعمال کرتے رہے انہیں ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے سیدھی راہ چلائے گا' نعمت بھری جنتوں میں ان کے نیچے نہریں بہیں گی' وہاں ان کی صدا یہ ہو گی کہ "پاک ہے تو اے خدا" ان کی دعا یہ ہو گی کہ "سلامتی ہو" اور ان کی ہر بات کا خاتمہ اس پر ہو گا کہ "ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے"۔

جو لوگ اس عظیم کائنات اور اس کی بوقلمونیوں پر غور و فکر کر کے اس نتیجے تک نہیں پہنچتے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے' ان کے ذہن میں یہ بات نہیں بیٹھتی کہ اس نظام کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ آخرت کا یوم الحساب برپا ہو' جس میں ایک طرف تو دنیا کی بے انصافیوں اور مظالم کا انصاف ہو دوسری طرف انسانیت اس دنیا میں جس عروج تک نہیں پہنچ سکی وہاں وہ عروج حاصل کرے اور وہ اللہ کے سامنے حاضری کا کوئی یقین بھی نہیں رکھتے اور ان کی پوری اور تمام سرگرمیاں اس دنیا کی اسی زندگی تک محدود ہیں' باوجود اس کے کہ اس میں بے شمار نقائص اور پستیاں موجود ہیں اور وہ اسی دنیا میں غرق ہیں' ان کو اس میں کوئی نقص نظر نہیں آتا' اور وہ اس بات کو بھی نہیں سمجھ سکتے کہ یہ حقیر دنیا انسان کی آخری منزل مقصود نہیں ہو سکتی' وہ دیکھتے ہیں کہ وہ اس دنیا کو چھوڑتے جا رہے ہیں حالانکہ ان میں سے ظالموں کو ان کے مظالم پر سزا نہیں دی گئی اور اچھے کام کرنے والوں کو ان کے کیے کا صلہ نہیں ملا' پھر انسان جس عروج و کمال کا متلاشی ہے وہ ابھی اسے حاصل نہیں ہوا ہے۔ اور پھر وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو اقوام صرف دنیا کو ہی اپنا منتہائے مقصود بنا لیتی ہیں وہ اخلاقی لحاظ سے گرتی ہی چلی جا رہی ہیں کیونکہ وہ دنیا کی گندگیوں میں سر جھکائے ہوئے جا رہے ہیں' انسانیت کے ارفع مقام کے لیے انہوں نے کبھی سربلند ہی نہیں کیا' نہ ان کی نظریں کبھی افق بلند کی طرف اٹھی ہیں۔ ان کے سر اور ان کی نظریں اس دنیا کی گندگیوں ہی کی طرف جھکے ہوئے ہیں اور اور جمی ہوئی ہیں۔ وہ اس کائنات میں موجود آیات الٰہیہ سے غافل ہیں جو دل کو جگانے والی ہیں' احساس و شعور کو اٹھانے والی ہیں اور انسان کو ایک بلند نصب العین دینے والی ہیں۔ ایسے لوگوں کا انجام یہ ہے اور وہ بہت ہی برا انجام ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَآءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ (۷) أُولٰٓئِكَ مَأْوٰهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۸) (۱۰: ۷ - ۸)

"حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں' اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں' ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہو گا ان برائیوں کی پاداش مین جن کا اکتساب وہ (اپنے اس غلط عقیدے اور غلط طرز عمل کی وجہ سے ) کرتے رہے"۔

دوسری جانب وہ لوگ ہوں گے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے' انہوں نے یہ پا لیا کہ ایک جہاں ایسا بھی آنے والا ہے جو اس دنیا کی زندگی سے اعلیٰ و ارفع ہے' پھر انہوں نے اپنے اس ایمان کے تقاضے بھی پوری کیے' جس طرح اللہ نے اہل ایمان کو عمل صالح کرنے کا حکم دیا تھا اور ان اعمال کا اجر وہ آخرت میں چاہتے تھے تو

ایسے لوگوں کا انجام یہ ہو گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ

الْاَنْهٰرُ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ (۱۰:۹) "اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ ایمان لائے (یعنی جنہوں نے ان صداقتوں کو قبول کر لیا جو اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں) اور نیک اعمال کرتے رہے انہیں ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے سیدھی راہ چلائے گا' نعمت بھری جنتوں میں ان کے نیچے نہریں بہیں گی"۔

ان کے اس ایمان کی وجہ سے' جو ان کے اور ان کے خدا کے درمیان رابطے کا نام ہے' اللہ ان کو ہدایت دے گا' ان کی آنکھیں کھلی ہوں گی اور وہ صاحب بصیرت ہوں گے' ان کے تقویٰ' ان کے احساس اور ان کے ضمیر کی بیداری کی وجہ سے ان کو ہدایت ملے گی اور یہ جنت میں داخل ہوں گے۔ اور جنت میں نہریں بہتی ہوں گی' پانی ہو گا اور پانی ہمیشہ سرسبزی اور تروتازگی کا ذریعہ رہا ہے' اب بھی ہے اور قیامت میں بھی ہو گا۔

یہ لوگ اس جنت میں کیا دلچسپیاں رکھیں گے اور ان کے مشاغل وہاں کیا ہوں گے؟ نہ مال اور نہ جاہ' نہ دفع مضرت کے لیے کوشاں ہوں گے اور نہ جلب منفعت کے لیے' ان چیزوں سے تو وہ نجات پا چکے ہوں گے۔ وہاں تو وہ سب کچھ پا چکے ہوں گے۔ ان کی کوئی ضرورت نہ ہو گی۔ ہر شخص غنی ہو گا اور ان چیزوں سے ان کی سطح بلند ہو چکی ہو گی' ان کے مشاغل وہاں یہ ہوں گے۔ خوشی سے وہ ایک دوسرے کو پکاریں گے کہ اے اللہ تو پاک ہے اور ایک دوسرے پر سلامتی بھیجتے ہوں گے' اور سب کی آخری بات یہ ہو گی کہ سب تعریفوں کا مستحق اللہ ہی ہے جو رب العالمین ہے۔

دَعْوٰهُمْ فِیْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱۰:۱۰) "وہاں ان کی صدا یہ ہو گی کہ "پاک ہے تو اے خدا"' ان کی دعا یہ ہو گی کہ "سلامتی ہو" اور ان کی ہر بات کا خاتمہ اس پر ہو گا کہ "ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے"۔

یہاں دنیا کے مشاغل اور پریشانیوں سے مطلق رہائی ہو جائے گی' انسان دنیا کی ضرورتوں اور محتاجیوں سے بالا ہو گا' بے نیاز ہو گا' اور اللہ کی رضامندی' تسبیح اور حمد کے ترانوں میں مگن ہو گا اور ہر پہلو سے انسان مقام کمال کو چھو رہا ہو گا' اخلاقی' روحانی اور جسمانی پہلوؤں سے۔

○○○

اب قرآن ایک دوسرا موضوع لیتا ہے' منکرین کی طرف سے بار بار چیلنج دیا جاتا تھا کہ حضورؐ جس برے انجام سے ڈراتے ہیں وہ ہم پر لاتے کیوں نہیں؟ بتایا جاتا ہے کہ نزول عذاب اس لیے مؤخر ہو رہا ہے کہ اس کے لیے سنت الٰہیہ میں ایک وقت مقرر ہے اور یہ اللہ کی نہایت ہی مہربانی ہے کہ اس نے ایسا کیا ہے۔ لیکن جب یہ آئے گا تو منظر کیسا ہو گا؟ جب عذاب آتا ہے تو انسان کی فطرت سے غبار دھل جاتا ہے' زنگ صاف ہو جاتا ہے اور یہ فطرت اپنے خالق حقیقی کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ مشکلات دور ہو جاتی ہیں تو انسان بدستور غفلت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کو امم

سابقہ کی بربادیوں کی طرف بھی متوجہ کیا جاتا ہے۔ جن کے قصے زبان زدعام تھے اور بتایا جاتا ہے کہ تمہارا انجام بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ دنیا تو دار الابتلاء ہے، دار الجزاء آنے والی ہے۔

---

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ ۖ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۱۱﴾ وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَسَّهُ ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا ۙ وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿۱۴﴾

"اگر کہیں اللہ لوگوں کے ساتھ برا معاملہ کرنے میں بھی اتنی ہی جلدی کرتا جتنی وہ دنیا کی بھلائی مانگنے میں جلدی کرتے ہیں تو ان کی مہلت عمل کبھی کی ختم کر دی گئی ہوتی۔ (مگر ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے) اس لیے ہم ان لوگوں کو جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوٹ دے دیتے ہیں۔ انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے، مگر جب ہم اس کی مصیبت ٹال دیتے ہیں تو ایسا چل نکلتا ہے کہ گویا اس نے کبھی اپنے کسی برے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ اس طرح حد سے گزر جانے والوں کے لیے ان کے کرتوت خوشنما بنا دیئے گئے ہیں۔ لوگو، تم سے پہلے کی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ایمان لا کر ہی نہ دیا۔ اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے، تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو"۔

مشرکین عرب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ چیلنج دیتے رہتے تھے کہ اگر وہ سچے ہیں تو ان پر وہ عذاب نازل کر دیں، جس سے وہ ہمیں ڈراتے رہتے ہیں۔ اور اسی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس مطالبے کو صراحت کے ساتھ نقل کیا ہے۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (اور وہ کہتے تھے کہ یہ وعدہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو؟) اور دوسری سورتوں میں یہ چیلنج یوں آیا ہے۔

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلَاتُ (اور یہ لوگ

اچھائی سے پہلے تم سے برائی کا مطالبہ کرتے ہیں 'حالانکہ ان سے پہلے کئی مثالیں گزر چکی ہیں) اور قرآن کریم نے ان کی اس بات کو ان الفاظ میں بھی نقل کیا ہے۔ وَاِذْ قَالُوا اللّٰھُمَّ اِنْ کَانَ ھٰذَا ھُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَۃً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (۸: ۳۲) (جب انہوں نے کہا اے اللہ اگر یہی حق پر ہے آپ کی طرف سے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کر دے یا ہم پر کوئی دردناک عذاب لے آ"۔ یہ تمام باتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ اللہ کی اس ہدایت سے کس قدر عناد رکھتے تھے لیکن اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ان کو مہلت دے۔ لہٰذا اللہ ان پر ایسا عذاب نازل نہیں فرما رہا تھا جو ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا اور ان کو ہلاک کر دیتا۔ جس طرح اللہ نے ان سے قبل دوسری اقوام کے ساتھ کیا۔ کیونکہ اللہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کی اکثریت آخر میں دین کو قبول کرنے والی ہے۔ اس کی خدمت کرنے والی ہے 'اور اسے لے کر اس پورے کرۂ ارض پر پھیلانے والی ہے۔ اور فتح مکہ کے بعد عملاً ایسا ہوا بھی۔ لیکن چیلنج دیتے وقت لوگوں کی نظروں میں تو یہ بات نہ تھی 'ان کو پتہ نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان پر خیروبرکت کا کس قدر فضل عظیم کرنے والا ہے' جبکہ وہ شر کا اس طرح مطالبہ کر رہے ہیں جس طرح انسان بھلائی کے لیے جلدی میں کرتا ہے۔

وَلَوْ یُعَجِّلُ اللّٰہُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَھُمْ بِالْخَیْرِ لَقُضِیَ اِلَیْھِمْ اَجَلُھُمْ فَنَذَرُ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ (۱۰: ۱۱) "اگر کہیں اللہ لوگوں کے ساتھ برا معاملہ کرنے میں بھی اتنی ہی جلدی کرتا جتنی وہ دنیا کی بھلائی مانگنے میں جلدی کرتے ہیں تو ان کی مہلت عمل کبھی کی ختم کر دی گئی ہوتی۔ (مگر ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے) اس لیے ہم ان لوگوں کو جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوٹ دے دیتے ہیں"۔

یعنی وہ عذاب کا مطالبہ کرنے میں جلدی کر رہے ہیں' اس طرح کہ جس طرح انسان بھلائی کے لیے جلدی کرتا ہے اور اللہ بھی اگر ان کے معاملے میں ایسی ہی جلدی کرتا اور ان کے چیلنج کو منظور کر لیتا تو ان کا کام کبھی کا تمام ہو چکا ہوتا۔ لیکن اللہ نے اپنی تقدیر میں ان کے لیے جو وقت مقرر کر رکھا ہے' ان کے ساتھ اسی کے مطابق معاملہ کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد اللہ ان کو متنبہ بھی کرتا ہے کہ یہ جو مہلت انہیں دی جا رہی ہے اس کے پیچھے جو خطرہ ہے اس سے وہ غافل نہ ہوں کیونکہ جن لوگوں نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا' اپنی سرکشیوں ہی میں بھٹکتے پھریں گے اور جب ان کا وقت اس حالت میں آگیا تو وہ خسارے میں رہ جائیں گے۔

اب یہاں ایک نفسیاتی تصویر دی جاتی ہے کہ انسان شر کا مطالبہ کرنے میں تو بڑا دلیر ہے لیکن جب مصیبت آ جاتی ہے تو اس کی حالت کیا ہوتی ہے۔ اس وقت اس کی حالت وہ نہیں ہوتی جس میں وہ مصیبت کا مطالبہ کر رہا تھا اور جب یہ مصیبت دور کر دی جائے تو یہ پھر کس طرح فوراً بدل جاتا ہے۔ ذرا اس کے مزاج کے اس تضاد کو دیکھو۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِہٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا کَشَفْنَا عَنْہُ ضُرَّہٗ

مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

( ۱۰ : ۱۲ ) "انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے' مگر جب ہم اس کی مصیبت ٹال دیتے ہیں تو ایسا چل نکلتا ہے کہ گویا اس نے کبھی اپنے کسی برے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔اس طرح حد سے گزر جانے والوں کے لیے ان کے کرتوت خوشنما بنا دیئے گئے ہیں"۔

یہ نہایت ہی بدیع اور انوکھی تصویر ہے۔ان انسانی نمونوں کی جو ہماری سوسائٹی میں رات اور دن دکھائے جاتے ہیں اور چلتے پھرتے ہیں۔ درحقیقت انسان زندگی کے حالات میں بہتا چلا جاتا ہے' غلط کاریوں' گناہوں' سرکشیوں اور اسراف میں ڈوبا ہوا' کیونکہ وہ صحت مند ہوتا ہے' حالات اس کے لیے سازگار ہوتے ہیں' خوشحالی اسے سب کچھ بھلا دیتی ہے' مالداری کا احساس سرکش بنا دیتا ہے۔لیکن جب اس پر کوئی مصیبت آ جاتی ہے تو یہ یک دم جزع فزع کرنے لگتا ہے۔ راتوں کو دست بدعا ہوتا ہے۔اس کی امیدوں کا میدان وسیع ہو جاتا ہے' مصیبت میں بہت تنگدل ہوتا ہے اور جلدی سے آسانیاں چاہتا ہے۔لیکن جب اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے' مصیبت دور ہو جاتی ہے تو اب آپ دیکھیں گے کہ وہ اسی سابقہ روش کے ساتھ دوڑ رہا ہے۔ بالکل پیچھے کی طرف نہیں دیکھ رہا ہے' کوئی غور و فکر نہیں ہے' کوئی نصیحت آموزی نہیں ہے اور پھر برائی کی راہ میں آگے بڑھ رہا ہے۔الا یہ کہ بعض اللہ کے بندے اس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ جن پر اللہ کا رحم ہو چکا ہوتا ہے۔وہ قوت اور مالداری کے وقت بھی غربت اور ضعیفی کو یاد کرتے ہیں۔

سیاق کلام میں بری حالت کو بیان کرتے وقت ذرا طوالت اختیار کی گئی ہے۔اور یہ اس نمونے کی نفسیاتی حالت کی صحیح تصویر ہے۔کیونکہ وہ بھی برے دنوں کو بہت ہی طویل محسوس کرتا ہے۔اس لیے قرآن کریم بھی اس کا بیان قدرے طویل کرتا ہے۔

دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ( ۱۰ : ۱۲ ) "تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے"۔

یوں اس کی ہر حالت' ہر ہیئت اور ہر منظر کو سامنے تفصیل کے ساتھ لایا جاتا ہے تاکہ انسان کے اس موقف کی تصویر کشی کی جائے' اس وقفے میں اس کی جسمانی رفتار رک گئی ہے' اس کے مالی معاملات اور اس کی قوت کے مظاہر موقوف ہیں' اس طرح جب سیلاب کی رفتار کو کوئی بند روک دیتا ہے' یہ سیلاب اور یہ موج دریا رک جاتی ہے یا واپس ہو جاتی ہے اور جب یہ رکاوٹ دور ہو جائے تو یہ موج پھر رواں دواں ہوتی ہے۔اب صرف ایک لفظ استعمال ہوا ہے (مر) لیکن یہ اس حرکت رفتار اور تسلسل کا اظہار کر دیتا ہے جو ایک غافل انسان اس وقفے سے قبل اور بعد جاری رکھ رہا ہوتا ہے' اب وہ چل پڑتا ہے' نہ شکر خداوندی ہے۔نہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے اور نہ غور و فکر کر کے کوئی عبرت لیتا ہے۔

مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ( ۱۰ : ۱۲ ) "ایسا چل نکلتا ہے کہ گویا اس نے کبھی اپنے کسی برے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا"۔یہ زندگی کی موجوں کے ساتھ آگے بڑھتا جاتا ہے' اس کی رفتار کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہے' نہ کوئی منع کرنے والا راستے میں ہے' نہ از خود اس کے ذہن میں کوئی پروا ہے۔

اس مزاج کے لوگ' جو مصیبت کے وقت تو عاجزی و زاری کرتے ہیں اور جب مصیبت ٹل جائے تو اکڑ کر پھر سابقہ

روش پر چل پڑتے ہیں - یہ مسرفین ہیں اور یہ اپنے اسراف میں آگے جا رہے ہیں اور ان کو احساس نہیں ہوتا کہ وہ حد سے گزر رہے ہیں - ایسے لوگوں اور مسرفین کی روش ایک جیسی ہوتی ہے -

كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۰ : ۱۲) (اسی طرح حد سے گزرنے والوں کے لیے ان کے کرتوت خوشنما بنا دیئے گئے ہیں)

ذرا غور کرو کہ ان مسرفین کا انجام قرون اولیٰ میں کیا ہوا۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۰ : ۱۳) "لوگو، تم سے پہلے کی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ایمان لا کر ہی نہ دیا۔ اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں"۔

اسراف کی وجہ سے یہ لوگ حد سے گزر گئے اور انہوں نے ظلم اور شرک شروع کر دیا۔ اس لیے ہلاک کر دیئے گئے اور جزیرۃ العرب میں ان کے آثار اب بھی موجود ہیں - قوم عاد، ثمود اور قوم لوط کی بستیاں۔ ان بستیوں کے پاس ان کے رسول روشن دلائل لے کر آئے تھے جس طرح اے اہل عرب تمہارے پاس رسول اللہ ؐ واضح دلائل لے کر آئے ہیں، لیکن انہوں نے مان کر نہ دیا۔ نہ انہوں نے ایمان لانا تھا؟ کیوں؟ اس لیے کہ انہوں نے ایمان کی راہ ہی نہ اپنائی، انہوں نے تو اپنے اختیار سے سرکشی کی راہ اختیار کی۔ اس لیے وہ ایمان کے لیے اہل ہی نہ رہے اور ان کو مجرموں کے انجام سے دوچار ہونا پڑا۔

اہل مکہ کو بتایا جاتا ہے کہ جب اقوام سابقہ کا انجام ایسا رہا تو لازماً تمہارا انجام بھی ایسا ہی ہو گا کیونکہ تم لوگ ان لوگوں کے صحیح جانشین ہو، لہٰذا تمہارا بھی وہی انجام ہو گا جو ان کا ہو چکا ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۰ : ۱۴)

"اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے، تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو"۔ یہ بات اور یہ تصور انسان کے دل و دماغ پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے کہ انسان یہ بات پالے کہ وہ اس زمین پر بطور جانشین آیا ہے - اس سے قبل اس زمین کے مالک و مختار کچھ اور لوگ تھے، ان کو زوال نصیب ہوا اور وہ اسی طرح ان کی جگہ اقتدار میں آیا ہے، اور یہ کہ یہ اقتدار اس سے بھی جانے والا ہے - یہ تو چند دن ہیں جو اسے دیئے گئے ہیں بطور آزمائش، اس کی آزمائش ہو رہی ہے اس کا بھی محاسبہ ہونے والا ہے اور بہت ہی جلدی ہونے والا ہے -

یہ ہے وہ قیمتی تصور جو اسلام ہر انسانی دل میں بٹھانے والا ہے - یہ ایک حقیقت ہے اور اسلام یہ حقیقت انسان کے قلب میں بٹھانا چاہتا ہے، اس لیے اسے دھوکہ نہیں دیتا۔ اسلام لوگوں کے دل میں ایک احساس بیدار کر دیتا ہے - یہ خدا خوفی کا احساس ہے اور یہی احساس اس سوسائٹی کے امن و امان اور خوشحالی اور خوش اسلوبی کا ذمہ دار ہوتا ہے جس میں

ایک مومن رہتا ہے۔

یہ شعور کہ اس دنیا میں انسان نے مقرر دن گزارنے ہیں اور جس طرح گزارنے ہیں اس کے بارے میں اس سے باز پرس ہونے والی ہے' اس کی ہر مملوک چیز کے بارے میں' اس کے تمام مال و متاع کے بارے میں اور اس کی جان و اولاد کے بارے میں بھی' اس احساس و شعور کی وجہ سے ایک انسان پیدا ہو جاتا ہے' اور وہ کسی کے بھلاوے میں نہیں آتا۔ اس احساس کی وجہ سے وہ دنیا کے عیش و عشرت میں مست نہیں ہو جاتا' بلکہ وہ عیش و عشرت اور اس دنیا کے لیے حرص و لالچ سے بھی بچ جاتا ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کو امتحان سمجھتا ہے' کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ دیکھنے والا دیکھ رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ( ۱۰ : ۱٤ ) (تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو) اس طرح انسان چوکنا ہو جاتا ہے' ڈرنے لگتا ہے' اچھائی کی طرف شدت سے مائل ہو جاتا ہے' اور وہ ہر وقت نجات اخروی کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ یہ ہے فرق اس نظام تربیت کا جو اسلام کے پیش نظر ہے اور ان تصورات کا جو اسلام نہایت ہی موثر اشارات اور موثر یاد دہانیوں کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں بٹھاتا ہے۔ اور اس سیکولر نظام تربیت کا جو انسان کو ان تصورات سے غافل بناتی ہیں' اور لوگوں کے دل سے احساس جوابدہی اور آخرت کے حساب و کتاب سے منکر بناتی ہیں۔ یہ دونوں نظامہائے تربیت ایک دوسرے سے اس قدر دور ہیں کہ ان کے درمیان باہم ملنے کا کوئی مقام نہیں ہے۔ دونوں تصورات اور نظام دو مختلف قسم کے انسان تیار کرتے ہیں۔

انسانی زندگی کا اسلامی تصور ایک جامع اور باہم پیوست نظام ہے۔ جس کی تمام بنیادوں اور جس کے تمام اصول باہم جڑے ہوئے ہوتے ہیں' یہاں ہمارے لیے یہ بات کافی ہے کہ ہم اسلامی تصورات حیات کے اس اساسی فرق کو واضح کر دیں اور اس اساسی تصور کے اوپر جو عمارت اٹھتی ہے' جو سوسائٹی تیار ہوتی ہے' جو افراد اور جو معاشرہ تیار ہوتا ہے اس کے فرق کو واضح کر دیں۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ یہ دو قسم کے معاشرے باہم پیوست ہو جائیں اور رل جائیں۔ نہ دونوں کے نتائج ایک طرح کے ہو سکتے ہیں۔

جو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اسلامی طرز زندگی میں کسی دوسرے نظام کے متعین کردہ طرز زندگی کا پیوند لگایا جا سکتا ہے اور یہ سمجھتے نہیں کہ اسلامی طرز زندگی کی عمارت جن بنیادوں پر رکھی ہوئی ہے وہ ان بنیادوں کے سراسر متضاد ہیں جن کی اساس پر کوئی بھی جاہلی نظام استوار ہوتا ہے وہ لوگ دراصل اسلامی نظام کی نوعیت اور جاہلیت کی حقیقت کو سمجھے ہی نہیں ہوتے۔

○○○

اب یہاں سیاق کلام ایک کروٹ لیتا ہے' بات کا رخ ان کے بعض اعمال کی طرف مڑ جاتا ہے کہ جب ہلاکت یافتہ اقوام کی جگہ تمہیں آباد کیا گیا تھا تو تم نے کیا کیا؟ کیا تم نے حق خلافت ادا کر دیا؟

---

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ

أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٥﴾
قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ بِهِ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ
عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ
كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُونَ ﴿١٧﴾ وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ
اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ ۚ
قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ سُبْحَانَهُ وَ
تَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿١٨﴾ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ وَ
لَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١٩﴾ وَ
يَقُولُونَ لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانْتَظِرُوا
إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ﴿٢٠﴾ ع ۲ ۱۰ ۷

---

”جب انہیں ہماری صاف صاف باتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے‘ کہتے ہیں کہ ”اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو“۔ اے نبی ؐ ‘ ان سے کہو ”میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کر لوں۔ میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے“ اور کہو ”اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو میں یہ قرآن تمہیں کبھی نہ سناتا اور اللہ تمہیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں‘ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے۔ یقیناً مجرم کبھی فلاح نہیں پا سکتے“۔

یہ لوگ اللہ کے سوا ان کی پرستش کر رہے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع‘ اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ اے نبی ؐ ‘ ان سے کہو ”کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں؟“ پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

ابتداء سارے انسان ایک ہی امت تھے۔ بعد میں انہوں نے مختلف عقیدے اور مسلک بنا لیے' اور اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات طے نہ کر لی گئی ہو تو جس چیز میں وہ باہم اختلاف کر رہے ہیں اس کا فیصلہ کر دیا جاتا۔

اور یہ جو وہ کہتے ہیں کہ اس نبیؐ پر اس کی رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی' تو ان سے کہو "غیب کا مالک و مختار تو اللہ ہی ہے' اچھا انتظار کرو' میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"۔

اس زمین پر ان لوگوں کو ہلاک شدہ لوگوں کا وارث بنانے کے بعد ان کا طرز عمل کیسا رہا' وہ ایسا تھا اور رسول کے اللہؐ کے ساتھ وہ کیا سلوک کر رہے تھے' وہ یہ تھا:

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ ھٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ (۱۰:۱۵) "جب انہیں ہماری صاف صاف باتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے' کہتے ہیں کہ "اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو"۔ ان کی جانب سے یہ ایک عجیب مطالبہ تھا' یہ کوئی سنجیدہ مطالبہ نہ تھا۔ یہ محض مذاق اور کھیل تھا۔ نیز اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مطالبہ کرنے والے لوگ قرآن مجید کی سنجیدہ تعلیمات سے بے خبر تھے اور قیامت کے منکر تھے۔ کیونکہ ایسے مطالبات وہی شخص کر سکتا ہے جو قیامت کے دن پر یقین نہ رکھتا ہو۔

یہ قرآن تو دراصل مکمل دستور حیات ہے' یہ اس قدر جامع ہے کہ انسانوں کی زندگی کے تمام مسائل کو حل کرتا ہے خواہ وہ مسائل انفرادی ہوں یا اجتماعی۔ یہ دستور انسانوں کی استطاعت کے مطابق اس زندگی میں بھی انسانوں کو ترقی دیتا اور آخرت میں تو یہ نظام مکمل کامیابی کا ضامن ہے' جو شخص اس قرآن کو اس کی حقیقت کے مطابق سمجھ لے وہ پھر اس دستور حیات سے آگے کسی اور چیز کا طالب نہیں رہتا' نہ اس کے اجزاء کو تبدیل کرنے کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

غالب گمان یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے سامنے پیش ہونے کا یقین نہیں رکھتے' وہ اس کو مہارت کا مسئلہ سمجھتے تھے' جاہلیت میں وہ اپنے بازاروں اور میلوں میں فصیح ترین کلام پیش کرنے کے مقابلے کیا کرتے تھے' اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک ماہر فن شخص ہیں جو اس قرآن کی جگہ دوسرا لا سکتے ہیں' ان کے لیے کیا مشکل ہے۔ ورنہ اس میں ترمیم کرنا تو کوئی مشکل کام ہی نہیں ہے۔

قُلْ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآیِٔ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۱۰:۱۵) "اے نبیؐ' ان سے کہو "میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کر لوں۔ میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے"۔

مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن کوئی کھیل تماشا نہیں ہے' نہ یہ کسی ماہر فن کا کلام ہے' یہ تو مدبر کائنات کی جانب سے ایک مکمل دستور حیات ہے۔ یہ مکمل اس لیے ہے کہ خالق کائنات انسان کی ضروریات اور مصلحتوں سے زیادہ واقف

ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اپنی جانب سے اس میں تبدیلی کر دیں۔ رسول اللہ کا مقام تو صرف یہ ہے کہ آپ پر جو کلام نازل ہوتا ہے آپ اسے لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں اور اگر وہ اس میں کوئی بھی تبدیلی کریں گے تو وہ یوم عظیم کے عذاب کے مستحق ہوں گے۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا

تَعْقِلُوْنَ (۱۰:۱۶) ”اور کہو اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو میں یہ قرآن تمہیں کبھی نہ سناتا اور اللہ تمہیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟“ یہ تو اللہ کی جانب سے وحی ہے، اور تم تک اس کا پہنچانا بھی اللہ کا حکم ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی کہ میں نہ پڑھوں تو میں نہ پڑھتا، اگر اللہ چاہتا کہ میں تمہیں اس کی تعلیم نہ دوں تو ہرگز نہ دیتا، غرض اس قرآن کے نازل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کے تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اے پیغمبرؐ ان سے یہ باتیں کہہ دیں اور یہ بھی کہہ دیں کہ اس تلاوت و تبلیغ سے پہلے بھی میں ایک عرصہ تک تمہارے اندر زندگی بسر کر چکا ہوں، پورے چالیس سال تک اور میں نے اس قرآن کا کوئی حصہ تمہارے سامنے نہیں پڑھا کیونکہ تم ایسا نہیں کر سکتے تھے، تمہارے اوپر یہ نازل ہی نہ ہوا تھا۔ اگر تم بذات خود ہی یہ بنانے والے تھے تو کیوں نہ تم نے ایسا کیا؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک وحی من جانب اللہ ہے اور آپ کا فریضہ اور کردار یہی ہے کہ آپ اسے لوگوں تک پہنچائیں گے۔

اے پیغمبر ان سے کہہ دے کہ میں اللہ پر یہ افترا کیسے باندھ سکتا ہوں کہ اس نے میری طرف وحی بھیجی ہے اور درآں حالیکہ کہ اس نے نہ بھیجی ہو۔ یہ تو اللہ پر جھوٹ ہو گا اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ بولے۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ

(۱۰:۱۷) ”پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے۔ یقیناً مجرم کبھی فلاح نہیں پا سکتے“۔ یہ کیسے ہو سکتا؟ میں تو تمہیں منع کرتا ہوں کہ اللہ کی آیات کی تکذیب نہ کرو، خود میں اللہ پر جھوٹ کیسے بول سکتا ہوں کیونکہ ہر جھوٹ بولنے والا کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اب سیاق کلام ان کے اعتقادات اور مقولات میں سے چند یہاں پیش کرتا ہے کہ اللہ نے دوسری اقوام کو ہلاک کر کے زمین پر ان کو آباد کیا اور یہ اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ قرآن کی تکذیب کر کے اسے بدل دینے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ وَیَقُوْلُوْنَ هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ

اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا

یُشْرِکُوْنَ (۱۰ : ۱۸) "یہ لوگ اللہ کے سوا ان کی پرستش کر رہے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع ' اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں ۔ اے نبی ' ان سے کہو "کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں؟" پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں"۔

جب ایک انسان کی سوچ غلط راہوں پر پڑ جاتی ہے تو وہ پھر کسی حد پر بھی جا کر رکتی نہیں ۔ یہ لوگ بتوں کو پوجتے ہیں جو ان کے ارباب ہیں ' ان کی حالت یہ ہے کہ وہ ان کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان لیکن ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں یہ بت شفاعت کریں گے ۔

یَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (۱۰ : ۱۸) (یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہوں گے ) اللہ کے علم میں تو یہ بات نہیں ہے کہ اس کے ہاں کوئی شفاعت کرنے والا ہے ۔ یعنی دراصل کسی شفیع کا کوئی وجود نہیں ہے ' اگر ہوتا تو اللہ کو اس کا علم ہوتا ۔

قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ (۱۰ : ۱۸) (کہہ دو تم اللہ کو اس بات کی اطلاع دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں ) یہ ایک مذاقیہ انداز کلام ہے ' اور ان لوگوں کی گھٹیا سوچ کے عین مطابق ہے ' لیکن آخر میں اللہ کی ذات کی پاکی کی سنجیدہ وضاحت کر دی جاتی ہے ۔

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (۱۰ : ۱۸) (پاک ہے وہ اور بالاتر اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں ) اس سے قبل کہ ان کے قول و فعل پر تبصرہ کیا جائے یہاں بتا دیا جاتا ہے کہ انسانی فطرت اصل میں توحید پر ہوتی ہے ۔ شرک اس پر عارضی طور پر لاحق ہونے والی بیماری ہے ۔ عقائد کے اختلاف بعد کی پیداوار ہے ' اصل میں لوگ عقیدہ توحید پر تھے ۔

وَمَا کَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰ : ۱۹) (ابتداء سارے انسان ایک ہی امت تھے ' بعد میں انہوں نے مختلف عقیدے اور مسلک بنا لیے ) ۔ اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ لوگوں کو ایک مقررہ وقت تک مہلت دی جائے تاکہ وہ مہلت کے وقت کو پورا کر لیں اور یہ فیصلہ اللہ نے پہلے چونکہ کر دیا ہے ' اس لیے اب اس میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں ہے ' کیونکہ اس کی حکمت کا یہی تقاضا ہے ۔

وَلَوْلَا کَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ فِیْمَا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ (۱۰ : ۱۹) "اور اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات طے نہ کر لی گئی ہوتی تو جس چیز میں وہ باہم اختلاف کر رہے ہیں اس کا فیصلہ کر دیا جاتا"۔

اب بتایا جاتا ہے کہ ان لوگوں کا موقف کیا ہے؟

وَیَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَکُمْ

مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ (۱۰ : ۲۰) "اور یہ جو وہ کہتے ہیں کہ اس نبیؐ پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی، تو ان سے کہو "غیب کا مالک و مختار تو اللہ ہی ہے، اچھا انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"۔

کیا ان لوگوں کے لیے وہ معجزات اور دلائل کافی نہیں ہیں جن سے یہ کتاب بھری پڑی ہے۔ کیا اس عظیم کائناتی نظام اور کارخانہ قدرت میں جو دلائل و براہین ہیں وہ ان کے لیے کافی نہیں ہیں۔ یہ لوگ ایسے خوارق عادت معجزات طلب کرتے ہیں جس طرح امم سابقہ کو دکھائے گئے حالانکہ یہ لوگ امت محمدیہ کی نوعیت سے خبردار نہیں ہیں۔ یہ لوگ ان معجزات کو سمجھ نہیں پا رہے جن کا ظہور نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ذریعے ہو رہا ہے۔ یہ تو کوئی وقتی معجزہ نہیں ہے کہ اسے فقط ایک نسل دیکھ لے، یہ ایک دائمی معجزہ ہے، جو ہر آنے والی نسل کے عقل و خرد کو خطاب کر رہا ہے اور قیامت تک یہ معجزہ زندہ و تابندہ رہے گا۔

حضورؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو اللہ کے حوالے کر دے جو غیب کو جانتا ہے اور وہی اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ ان کے لیے کسی معجزے کا صدور کر دے یا نہ کرے۔ کہو: "غیب کا مالک و مختار تو اللہ ہی ہے، اچھا انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"۔

یہ ایک ایسا جواب ہے جس کے اندر مہلت بھی ہے اور دھمکی بھی ہے۔ اور اس میں یہ بات بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں ایک بندے کو کیا آداب اختیار کرنے چاہئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبیوں کے سردار ہیں، ان کو غیب کا علم نہیں دیا گیا، غیب کا علم تو صرف اللہ کے پاس ہے، لوگوں کے معاملات کے اختیارات ان کو نہیں دیئے گئے۔ تمام امور تو اللہ کے حوالے ہیں۔ یوں دربار الوہیت میں بندے کی حدود کا تعین کر دیا جاتا ہے اور اللہ اور بندے کے درمیان ایک واضح خط فاصل کھینچ دیا جاتا ہے کہ یہ ہے بندے کا مقام اور یہ ہے اللہ کا مقام۔

○○○

قرآن کے مخاطبین اولین کے اقوال و افعال پر تبصرے کے بعد اب بعض انسانوں کے خصوصی مزاج پر تبصرہ کیا جاتا ہے، کہ جب ایسے لوگوں کو مشکلات کے بعد فراخی نصیب ہوتی ہے، اس سے قبل یہ کہا گیا تھا کہ جب ان پر مصیبت آتی ہے تو وہ کیا کرتے ہیں، یہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ جب مصیبت کے بعد آسانیاں آ جاتی ہیں تو کیا ہوتا ہے۔ انسان کی اس کمزوری کو انسانی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کی تمثیل سے سمجھایا جاتا ہے، لیکن یہ تمثیل بھی قرآنی اسلوب کے عین مطابق زندہ اور متحرک تمثیل ہے۔ ذرا غور سے پڑھیں:

وَإِذَآ أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيٓ اٰيَاتِنَا ۚ قُلِ اللّٰهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ۚ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ حَتّٰىٓ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ

عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

"لوگوں کا حال یہ ہے کہ مصیبت کے بعد جب ہم ان کو رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو فوراً ہی وہ ہماری نشانیوں کے معاملہ میں چالبازیاں شروع کر دیتے ہیں۔ ان سے کہو "اللہ اپنی چال میں تم سے زیادہ تیز ہے' اس کے فرشتے تمہاری سب مکاریوں کو قلم بند کر رہے ہیں"۔ وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر باد موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک باد مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے' اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ "اگر تو نے ہم کو اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکرگزار بندے بنیں گے"۔ مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔ لوگو' تمہاری یہ بغاوت تمہارے ہی خلاف پڑ رہی ہے۔ دنیا کی زندگی کے چند روزہ مزے ہیں (لوٹ لو)' پھر ہماری طرف تمہیں پلٹ کر آنا ہے' اس وقت ہم تمہیں بتا دیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔

انسانی زندگی کا تعجب انگیز پہلو یہ ہے کہ انسان خدا کو مشکل اوقات میں یاد کرتا ہے۔ وہ ان مشکل اوقات میں فطرت کی طرف لوٹتا ہے۔ جب وہ کربناک حالات سے دوچار ہوتا ہے تو اس کی فطرت پر جو پردے پڑ چکے ہوتے ہیں وہ ہٹ جاتے ہیں' لیکن جب وہ پرسکون حالات میں ہوتا ہے تو یا تو وہ بھول جاتا ہے اور یا پھر وہ سرکشی کرتا ہے یعنی یا غافل ہے اور یا سرکش۔ وہ لوگ جن کو اللہ کی طرف سے ہدایت نصیب ہو جائے تو یہ لوگ ہروقت امتثال حکم کے لیے تیار رہتے ہیں' ان کا ایمان ہروقت تروتازہ رہتا ہے۔

وَ اِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا (۱۰: ۲۱) "لوگوں کا حال یہ ہے کہ مصیبت کے بعد جب ہم ان کو رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو فوراً ہی وہ ہماری نشانیوں کے معاملہ میں چالبازیاں شروع کر دیتے ہیں"۔ قوم فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ جب بھی ان پر کوئی مصیبت آئی' انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دعا کرائی اور وعدہ کیا کہ اگر اللہ نے مشکلات دور کر دیں تو وہ کافرانہ رویہ ترک کر دیں گے اور جب مشکلات دور ہو گئیں اور ان پر اللہ کی رحمتیں نازل ہونے

لگیں اور وہ مزے میں ہو گئے تو انہوں نے اللہ کی ان رحمتوں اور انعامات کی کوئی اور تاویل کرنا شروع کر دی' انہوں نے یہ کہا کہ یہ تو اس وجہ سے اور فلاں وجہ سے یہ مصیبت ٹل گئی ہے۔ اسی طرح جب قریش پر مصیبت آگئی اور یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اب لوگ مرنا شروع ہو جائیں گے تو یہ پورا قبیلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور برادرانہ تعلقات کا واسطہ دے کر کہا کہ آپ خدا سے رحم کی اپیل کریں اور جب آپ نے دعا فرمائی اور مشکلات دور ہوئیں تو اہل قریش اپنی سابقہ روش پر اتر آئے اور وہی کافرانہ اور ظالمانہ رویہ جاری رکھا۔

قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ (۱۰: ۲۱) "ان سے کہو" اللہ اپنی چال میں تم سے زیادہ تیز ہے' اس کے فرشتے تمہاری سب مکاریوں کو قلم بند کر رہے ہیں"۔ اللہ کے پاس بہت سی تدابیر ہیں' وہ ان کی تدابیر اور سازشوں کو باطل کر سکتا ہے' اس کی نظروں میں ہیں وہ تمام سازشیں' جو یہ کر رہے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ریکارڈ بھی تیار ہو رہا ہے۔

اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ (۱۰: ۲۱) (تم جو مکاریاں کرتے ہو ہمارے نمائندے لکھ رہے ہیں) لہذا کوئی چیز مخفی نہیں ہے' کوئی چیز بھلائی بھی نہیں جا سکتی اور یہ کہ اللہ کے یہ نمائندے کون ہیں اور کس طرح لکھتے ہیں' تو یہ ایک غیبی معاملہ ہے' ہمیں اس کی حقیقت صرف اس قدر معلوم ہے جو اس آیت میں آئی ہے۔ اس لیے ہمیں چاہئے کہ ہم کسی تاویل کے بغیر اسے قبول کر لیں۔

اب ایک زندہ اور متحرک منظر آتا ہے' یہ منظر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ گویا ابھی نظروں کے سامنے واقعہ ہو رہا ہے' آنکھیں اسے دیکھ رہی ہیں' شعور اس کا پیچھا کر رہا ہے' دل واقعات کے ساتھ ساتھ دھڑکتا ہے۔ اس کا آغاز اس اعلان سے ہوتا ہے کہ اس کائنات کی حرکت اور سکون دونوں پر قدرت الہیہ کنٹرول کرتی ہے' وہی تمہیں خشکی و تری میں چلاتی ہے' بحر و بر پر اسی کا کنٹرول ہے۔

هُوَ الَّذِىْ يُسَيِّرُكُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (۱۰: ۲۲) (وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے) اس پوری سورہ میں اس قسم کے مناظر جابجا بتائے گئے ہیں کہ یہ پوری کائنات اللہ کے کنٹرول میں ہے اور اس کنٹرول میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔

حَتّٰى اِذَا كُنْتُمْ فِى الْفُلْكِ (۱۰: ۲۲) (چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر چلتے ہو) اب ہم اس منظر کے قریب ہیں اور کشتی سفر کے لیے تیار ہے۔

وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّ (۱۰: ۲۲) (باد موافق سفر کر رہے ہوتے ہو) اب یہ کشتی نہایت سکون کے ساتھ سطح سمندر کو چیرتی ہوئی جا رہی ہے۔

وَّفَرِحُوْا بِهَا (۱۰: ۲۲) (اور وہ شاداں اور فرحاں ہیں) لیکن اس خوشی اور مسرت کے ماحول پر

ایک سرپرائز آتی ہے اور ان خوشیوں میں مست لوگوں کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے۔

جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ (۱۰ : ۲۲) (اور پھر یکایک باد مخالف کا زور ہوتا ہے) اور ایک خوفناک افراتفری ماحول پر چھا جاتی ہے۔

وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ (۱۰ : ۲۲) (اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں) اب یہ کشتی ڈول رہی ہے' اس کے سواروں کے درمیان عظیم اضطراب برپا ہے' موجوں کے تھپیڑے اسے مار رہے ہیں اور موجیں اسے اوپر چڑھاتی اور نیچے گراتی ہیں اور یہ سمندر کے آگے اس طرح ہے جس طرح سطح سمندر پر ایک چھوٹا سا پر۔ اور سوار اب اس قدر پریشان ہیں کہ ان پر یقین ہو چلا ہے کہ مارے گئے۔

وَّ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ (۱۰ : ۲۲) (اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے) اور اب نجات کا کوئی موقعہ نہیں ہے۔ اب ایسے حالات ہیں جبکہ مسافر امواج کے تلاطم میں گھرے ہوئے ہیں' ہولناک حالات ہیں' اب ان کی فطرت پر پڑے ہوئے تمام پردے یکلخت اتر جاتے ہیں اور ان کے دل و دماغ پر غلط افکار کا چڑھا ہوا زنگ یکلخت صاف ہو جاتا ہے اور اب خالص انسانی فطرت کے سامنے' اور صرف اللہ کے سامنے دست بدعا ہوتی ہے۔ اب سب لوگوں کے چہرے آسمانوں کی طرف ہیں اور ہاتھ بلند ہیں :

دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ

(۱۰ : ۲۲) "اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ "اگر تو نے ہم کو اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکرگزار بندے بنیں گے"۔ اچانک سخت ہوا تھم جاتی ہے۔ موجیں آہستہ آہستہ اتر جاتی ہیں' لوگوں کے چہروں پر اب اطمینان کے آثار لوٹ رہے ہیں۔ پھڑپھڑانے والے دل اب نارمل ہوتے جا رہے ہیں اور کشتی پھر سے ساحل کی طرف رواں دواں ہے۔ لوگوں کو یقین ہو چلتا ہے کہ زندگی بچ گئی' اب وہ قدم رکھتے ہیں ساحل پر' قدم رکھتے ہی ایک اور انقلاب :

فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۱۰ : ۲۳) (مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں) یہ ہے اچانک انقلاب قلب و نظر۔ یہ ایک مکمل منظر ہے' اس منظر کی کوئی حرکت اور اس کے کرداروں کی کوئی سوچ ہم سے پوشیدہ نہیں رہتی ہے۔ یہ واقعہ ہے' لیکن زندہ واقعہ۔ اور یہ ایک ایسا منظر ہے کہ ہر دور میں اس قسم کے انسان اس کے کردار ہوتے ہیں اور یہ منظر پیش آتا رہتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس پر تبصرہ پوری انسانیت کے لیے ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ (۱۰ : ۲۳) (لوگو' تمہاری یہ بغاوت تمہارے ہی

خلاف پڑ رہی ہے ) یہ بغاوت و سرکشی خود تمہارے خلاف پڑے گی - خود تمہارے اپنے نفس کے خلاف کہ تم اسے ہلاکت میں ڈال رہے ہو اور اس کو ایسی مصیبتوں میں ڈال رہے ہو کہ انجام شرمندگی ہو گا' یا تمام معاشرے ' تمہارے اپنے معاشرے پر اس کے برے اثرات مرتب ہوں گے 'کیونکہ بغاوت کرنے والے اور اس کی اجازت دینے والے دونوں اس کی زد میں آئیں گے اور نتائج بھگتیں گے -

بغاوت اور سرکشی کی بدترین صورت وہ بغاوت ہے جس کا علم خداتعالیٰ کے حق حاکمیت کے خلاف بلند کیا جائے اور اس کرۂ ارض پر اللہ کو حاکم اور اس کی شریعت کو نظام اور قانون تسلیم نہ کیا جائے -

جو لوگ اللہ کی حاکمیت اور اس کی ربوبیت اور شریعت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں' وہ آخرت کے عذاب جہنم سے بھی پہلے یہاں اس دنیا کو بھی اپنے لیے جہنم بنا لیتے ہیں - وہ اس دنیا کو اس طرح جائے فساد بنا لیتے ہیں کہ جس سے کوئی شخص مامون اور محفوظ نہیں رہتا - اور انسانی سوسائٹی سے ...... انسان کی شرافت اور اس کا وقار ختم ہو جاتا ہے -

لوگ یا تو اپنا نظام زندگی خالص اللہ کی شریعت کے مطابق بنا کر اللہ کی حکومت کو تسلیم کریں گے ورنہ ان پر اللہ کے نافرمانوں کی حکومت مسلط ہو گی --- اور جو لوگ اس کرۂ ارض پر اللہ کی حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں وہ دراصل انسان کی انسانیت ' اس کی کرامت اور اس کی خیریت اور وقار کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں - وہ ان اعلیٰ اقدار کے لیے لڑ رہے ہیں جن کے قیام سے انسان کی انسانیت بلند ہوتی ہے اور انسان گندگیوں ' ناپاکیوں اور آلودگیوں سے پاک ہوتا ہے اور انسانی معاشرہ بھی ان گندگیوں سے پاک ہوتا ہے -

لوگو ' یہ تمہاری بغاوت خود تمہارے ہی خلاف پڑ رہی ہے اور یہ حرکت تم دنیاوی زندگی کی خاطر کرتے ہو جبکہ

مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۰ : ۲۳)

" دنیا کی زندگی کے چند روزہ مزے ہیں (لوٹ لو) ' پھر ہماری طرف تمہیں پلٹ کر آنا ہے ' اس وقت ہم تمہیں بتا دیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو" - تو اس دنیا کی بدبختی اور تلخیوں کے بعد آخرت میں بھی تمہیں حساب و کتاب دینا ہو گا - اور ناکامی پر دائمی تلخی تمہارے نصیب میں ہو گی -

---ooo---

اگلی آیت میں بتایا جاتا ہے کہ اس پوری دنیاوی زندگی کی حقیقی قیمت کیا ہے؟ اس زندگی کے سازوسامان کی حقیقت کیا ہے؟ اس کو بھی قرآن کریم ایک ایسی تصویر کشی کی صورت میں پیش کرتا ہے ' جو زندگی اور حرکت سے مالا مال ہے ' قرآن اپنے اسلوب کے مطابق ' روز مرہ واقعات کو زیر غور لاتا ہے - یہ مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے ہیں مگر ہم ان کے دیکھنے کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا -

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ
مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّیَّنَتْ وَ ظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْهَاۤ ۙ اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا لَیْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِیْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۴

"دنیا کی یہ زندگی (جس کے نشے میں مست ہو کر تم ہماری نشانیوں سے غفلت برت رہے ہو) اس کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار' جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں' خوب گھنی ہو گئی' پھر عین اس وقت جب کہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں' یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آ گیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں"۔

یہ دنیاوی زندگی' جس میں لوگوں کا حصہ صرف سامان زندگی ہے' جب لوگ اس میں مگن ہو جاتے ہیں' پس اسی کے لیے ان کا قیام و قعود ہوتا ہے اور اس سے اعلیٰ و ارفع مراتب کے لیے وہ کوئی جدوجہد نہیں کرتے جو زیادہ باعث عزت اور زیادہ باقی رہنے والے ہوتے ہیں۔

اس کی مثال ایسی ہے' کہ آسمان سے سے پانی برستا ہے۔ اس سے ہری بھری فصلیں گھنی ہو جاتی ہیں اور یہ زمین اس قدر خوبصورت ہو جاتی ہے جس طرح دلہن کا کمرہ۔ اور لوگ خوش و خرم ہوتے ہیں اور اس امید میں ہوتے ہیں کہ انسانوں اور جانوروں کے کھانے کی فصل' اب وہ اٹھالیں گے اور شاید یہ سب کچھ ان کے دست قدرت کا کمال ہے اور اب یہ پوری طرح ان کے کنٹرول میں ہے اور وہ جس طرح چاہیں تصرفات کر سکتے ہیں اور نہ اس میں کسی کا حق ہے اور اس حق کا کوئی طلبگار ہے۔

اس تروتازہ اور ہرے بھرے کھیت اور اس خوشی اور پر امیدی کی حالت میں انسان نہایت اطمینان سے رہ سہہ رہا ہوتا ہے کہ اچانک ایک عذاب آتا ہے۔ چند لمحات میں آنکھ جھپکتے ہی کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔

اَتٰهَآ اَمْرُنَا لَیْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِیْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۰ : ۲۴) "یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آ گیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں"۔

یہ ہے وہ اصل مقصود اس منظر کے پیش کرنے سے' یعنی زندگی کا چراغ اس طرح اچانک گل ہو جاتا ہے جس طرح یہ سرسبزی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ ناپائیدار دنیا جس میں بعض لوگ غرق ہیں اور آخرت کو چھوڑ کر لوگ اس کے ناپائیدار سازوسامان کو لے لیتے ہیں۔

یہ ہے دنیا جس میں کوئی امن و اطمینان نہیں ہے' جس میں کوئی ثبات و قرار نہیں ہے' جس میں لوگوں کے اختیارات اور ان کی استطاعت بہت ہی محدود ہے۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۲۵

"(تم اس ناپائیدار زندگی کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہو) اور اللہ تمہیں دارالسلام کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ (ہدایت اس کے اختیار میں ہے) جس کو وہ چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے"۔

کس قدر طویل مشقت کرتے ہیں۔ہم اس دنیا کے لیے جو ایک لمحہ میں فنا کی جا سکتی ہے' حالانکہ بظاہر وہ نہایت ہی سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔بہت ہی خوبصورت نظر آتی ہے' اور لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ اب بس پھل ان کی جھولی میں گرنے ہی والا ہے لیکن اچانک وہ کیا دیکھتے ہیں کہ دنیا کا یہ کھیت کسی آگ بگولے کی وجہ سے کٹ جاتا ہے اور چشم زدن میں وہ یوں ہو جاتی ہے کہ گویا کچھ تھا ہی نہیں...... لیکن اس کے مقابلے میں اللہ انسانوں کو دارالسلام کی طرف بلاتا ہے اور وہ ہر مفہوم میں دارالسلام ہے۔اور اس دعوت کے بعد یہ اللہ ہی ہے جسے وہ چاہتا ہے' راہ راست بھی دکھا دیتا ہے۔ جب کوئی اپنی بصیرت کی آنکھیں کھول دے اور اس دارالسلام کی طرف آگے بڑھے۔

---ooo---

# درس نمبر ۹۶ ایک نظر میں

یہ سبق سب کا سب وجدانی احساسات پر مشتمل ہے۔ یہ احساسات پے درپے آتے ہیں۔ ان سب کا ہدف ایک ہی ہے یعنی اللہ کی توحید اور رسول اللہ کی صداقت کے بارے میں لوگوں کی فطرت کو براہ راست جگانا' یعنی یہ ثابت کیا جائے کہ قیام قیامت اور حساب و کتاب برحق ہے۔

یہ وجدانی احساسات نفس انسان کو ہر طرف سے گھیرتے ہیں' انسان کو اس کائنات کا مشاہدہ کراتے ہیں۔ اس کائنات کی نہایت ہی وسیع سیر کراتے ہیں۔ کونے کونے میں پھراتے ہیں' زمین سے آسمانوں تک لے جایا جاتا ہے' اور آسمانوں سے اتار کر خود ذات انسان کی گہرائیوں میں اسے پھرایا جاتا ہے' ماضی کے دور دراز زمانوں سے حالات حاضرہ کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے اور پھر دنیا سے نکال کر اسے آخرت کی سیر کرائی جاتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ایک مسلسل بیانیہ انداز میں۔

درس سابق میں بھی ایسے ہی احساسات اور ایسے ہی اسباق تھے لیکن اس معاملے میں یہ سبق ذرا زیادہ واضح ہو کر سامنے آتا ہے' ابھی ہم حشر کے میدان میں ہیں' ابھی ہم اس کائنات کی وسعتوں میں خیال کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں' وہاں سے اچانک اپنے گریبان میں اپنے نفس کی دنیا میں پھر رہے ہیں' اب ہم قرآن کا مطالعہ کر رہے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ تو معجز کتاب ہے۔ اس جیسا کلام لانا ممکن نہیں ہے' اب ہم دور دراز زمانوں کی اقوام و ملل کی تاریخ کا فلسفیانہ جائزہ لے رہے ہیں اور اب ایک جدید اور نئے منظر میں ہم واقعات حشر دیکھ رہے ہیں اور اب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ کہیں اچانک عذاب ہم پر ٹوٹ نہ پڑے' اب ہمارا موضوع ذات باری کی وسیع قدرت ہے اور وسیع علم ہے۔ اور آیات کائناتی اور آخرت کا عذاب ہمارے سامنے ہے جو منکرین اور افتراپردازی کرنے والوں کے انتظار میں ہے۔ یہ ہیں وہ وجدانی احساسات۔

غرض یہ گہرے احساسات اور سچے وجدانی لمحات کا ایک ہجوم ہے اور فطرت سلیمہ اور احساس رکھنے والی نفسیات کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے کہ وہ اسے قبول کریں' اس کی پکار پر لبیک کہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ احساسات کے اس حملے کے بعد فطرت سلیمہ اور حقیقت کے درمیان کوئی پردہ رہ جائے یا کوئی رکاوٹ حائل ہو۔ کیونکہ موثرات اور احساسات کا یہ ایک سیلاب ہے جو امڈتا چلا آتا ہے' جس میں کائناتی حقائق' فطری حقائق' انسانی نفسیات کے رجحانات اور میلانات بہتے چلے آتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل کفر قرآن کریم سے جو خطرہ محسوس کرتے تھے اور لوگوں کو اس بات سے روکتے تھے کہ وہ اس قرآن کو نہ سنیں' یہ اس لیے تھا کہ اس قرآن کے اثرات ان کی ذہنی دنیا میں زلزلہ پیدا کر دیتے تھے' ان کے افکار کی دنیا میں بڑے بڑے سلائڈ واقع ہو جاتے تھے۔ اور ان کے دل و دماغ کی دنیا میں زلزلہ آ جاتا تھا۔ چونکہ وہ اپنے شرکیہ عقائد پر قائم رہنا چاہتے تھے اس لیے وہ لوگوں کو بجا طور پر قرآن سننے سے روکتے تھے' کیونکہ وہ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ قرآن سنا نہیں' ایمان لایا نہیں۔

---

# درس نمبر ۹۶ تشریح آیات

۲۶ ---- تا ---- ۷۰

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾

"جن لوگوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید فضل ۔ ان کے چہروں پر روسیاہی اور ذلت نہ چھائے گی ۔ وہ جنت کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں ان کی برائی جیسی ہے ویسا ہی وہ بدلہ پائیں گے ' ذلت ان پر مسلط ہوگی 'کوئی اللہ سے ان کو بچانے والا نہ ہو گا ' ان کے چہروں پر ایسی تاریکی چھائی ہوئی ہوگی جیسے رات کے سیاہ پردے ان پر پڑے ہوئے ہوں ' وہ دوزخ کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔

سابقہ سبق کی آخری آیت یہ تھی۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ( ۱۰ : ۲۵ ) "اللہ دارالسلام کی طرف دعوت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے"۔ تو اب یہاں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے ہاں جزاء و سزا کے اصول کیا ہیں ۔ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کس قدر رحیم ہے اور مخلوق پر فضل کرنے والا ہے ' وہ نہایت ہی منصف اور عادل ہے اور جزاء و سزا دونوں میں عدل کو ملحوظ رکھتا ہے ۔

وہ لوگ جنہوں نے احسان کیا ' نیکیاں کیں ' عقاید درست رکھے ' اعمال درست رکھے اور انہوں نے صراط مستقیم کے معلوم کرنے میں سعی کی ' اور انہوں نے وہ قوانین فطرت معلوم کر لیے جو دارالسلام تک پہنچانے والے ہیں ' تو ایسے لوگوں کے لیے بھلائی ہے ' اس لیے کہ انہوں نے بھلائی کی راہ اختیار کی ۔ اس بھلائی پر مزید اللہ کے فضل کرم اور رحمت سے ان کو استحقاق سے زیادہ انعامات ملیں گے جو غیر محدود ہوں گے ۔

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ (۱۰:۲۶) ''جن لوگوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید فضل''۔ یہ لوگ حشر کے غموں سے محفوظ ہوں گے' اور ان ہولناک مشکلات سے بھی بچے رہیں گے جو حساب و کتاب سے قبل ہوں گے۔

وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ (۱۰:۲۶) (ان کے چہروں پر روسیاہی اور ذلت نہ چھائے گی) قتر سے مراد وہ غبار' سیاہی' رنگ کی کدورت ہے جو پریشانی اور تنگی کی وجہ سے چہرے پر نظر آتی ہے۔ نیز اس سے مراد ذلت 'ٹوٹ پھوٹ' درجے میں کمتری اور توہین آمیز سلوک۔ تو ان چہروں پر نہ سیاہی ہوگی اور نہ مرتبہ و مقام کے اعتبار سے ان کے ساتھ ذلت آمیز سلوک ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حشر کے میدان میں اس قدر ہولناک اور کربناک حالات ہوں گے کہ انسان کے چہرے پر درماندگی' خوف اور ذلت کی وجہ سے سیاہی ہوگی اور جو شخص ان ہولناکیوں سے نجات پا جائے گا اور اس پر مزید فضل کا بھی حقدار ہو جائے گا تو وہ بہت ہی کامیاب رہے گا۔

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۱۰:۲۶) ''وہ جنت کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے''۔ یہ اور ان کے ساتھی بلند مرتبوں والے ہوں گے۔

وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۖ مَّا لَهُم مِّنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ (۱۰:۲۷) ''اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں ان کی برائی جیسی ہے ویسا ہی وہ بدلہ پائیں گے' ذلت ان پر مسلط ہوگی' کوئی اللہ سے ان کو بچانے والا نہ ہوگا''۔

یعنی زندگی کے سودے میں انہوں نے یہ کمائی کی۔ ان کے ساتھ بھی عادلانہ برتاؤ ہوگا۔ ان کی جزاء و سزا میں اضافہ نہ ہوگا اور نہ ان کی کمائی سے زیادہ ان کے ساتھ بدسلوکی ہوگی' برابر کی سزا ہوگی' ہاں ان کے چہروں پر مارے خوف کے ذلت چھائی ہوئی ہوگی اور کوئی ان کو بچانے والا نہ ہوگا جو ان کو ان کے مقررہ انجام سے بچائے۔ یہ ان کی حتمی سزا ہوگی اور سنت الٰہیہ کے مطابق ہوگی اور ان کے لیے ہوگی جو راستہ چھوڑ کر اور ناموس الٰہی کو توڑ کر زندگی بسر کریں۔

یہاں سے آگے اللہ تعالیٰ نہایت ہی حسی انداز میں ان کی بدحالی کا نقشہ کھینچتے ہیں کہ اس دن جہنمیوں کے ظاہری خد و خال کیسے ہوں گے۔

كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۱۰:۲۷) ''ان کے چہروں پر ایسی تاریکی چھائی ہوئی ہوگی جیسے رات کے سیاہ پردے ان پر پڑے ہوئے ہوں' وہ دوزخ کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے''۔

یعنی سیاہ رات کو کاٹ کر اس سے ایک ٹکڑا لیا گیا اور اس سے ان کے اصلی چہروں کو ڈھانپ دیا گیا' اب فضا پر رات کی تاریکی چھا جاتی ہے اور رات کی تاریکی میں قدرتی خوفناکی چھا جاتی ہے اور اس خوفناک منظر میں تاریک پردوں کے اندر

ان کے چہرے خوفناک نظر آتے ہیں۔

یہ خوفناک چہرے 'تاریکی کی اس ہیبت ناک فضا میں' جہنم کے مستقل دوست ہیں اور یہ ہمیشہ اس میں رہیں گے گویا یہ ان کی مملوکہ چیز ہے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا
مَكَانَكُمْ أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ ۖ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم مَّا كُنتُمْ إِيَّانَا
تَعْبُدُونَ ﴿٢٨﴾ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِن كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ
لَغَافِلِينَ ﴿٢٩﴾ هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ ۚ وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ ۳
۱۰ ع مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ ۖ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٣٠﴾ النصف

۸ "جس روز ہم ان سب کو ایک ساتھ (اپنی عدالت میں) اکٹھا کریں گے 'پھر ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا ہے 'کہیں گے کہ ٹھہر جاؤ تم بھی اور تمہارے بنائے ہوئے شریک بھی' پھر ہم ان کے درمیان سے اجنبیت کا پردہ ہٹا دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے کہ "تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے کہ (تم اگر ہماری عبادت کرتے بھی تھے تو) ہم تمہاری اس عبادت سے بالکل بے خبر تھے"۔ اس وقت ہر شخص اپنے کیے کا مزہ چکھ لے گا' سب اپنے حقیقی مالک کی طرف سے پھیر دیئے جائیں گے اور وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے گم ہو جائیں گے"۔

یہ ہو گا قصہ سفارشیوں اور شریکوں کا' قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کی شکل میں اسے یہاں لایا گیا ہے۔ یہ منظر بتاتا ہے کہ عملاً یہ سفارشی اور شریک وہاں بے بس کھڑے ہوں گے اور یہ نہ کسی کو چھڑا سکیں گے اور نہ بچا سکیں گے۔

کفار اور ان کے ٹھہرائے ہوئے شریک سب اٹھائے جائیں گے' یہ لوگ ان کو بزعم خود اللہ کا شریک تصور کرتے تھے' یہ لوگ ان لوگوں کو "اللہ کا شریک" سمجھتے تھے اور اللہ ان کو "ان کے شریک" کہتے ہیں' اس لیے کہ اللہ کا تو کوئی شریک ہے نہیں' یہ تو انہوں نے خود بنائے ہیں' یہ ان کی اپنی صنعت کاری ہے' لہٰذا ان کے ہیں۔

چنانچہ ان سب کو کہا جائے گا: "ٹھہر جاؤ تم خود بھی اور تمہارے بنائے ہوئے شریک بھی" جہاں ہو رک جاؤ' تو وہ لازماً سٹینڈ ٹو ہوں گے کیونکہ اس دن تو احکام کی خلاف ورزی نہ ہو سکے گی۔ اب ان کے اور ان کے مزعومہ شریکوں کو جدا کر دیا جائے گا' ان کے درمیان پردہ حائل ہو گا۔

اب کافر تو بات نہ کر سکیں گے اور نہ ان کے پاس کوئی بات ہو گی' البتہ یہ دوسرے لوگ جن کو وہ ناحق شریک بناتے تھے' اپنی براءت میں عرض کریں گے کہ وہ اس جرم میں شریک نہیں ہیں۔ یہ جرم کہ کفار نے اللہ کے ساتھ ان کی بھی بندگی کی۔ یا اللہ کو چھوڑ کر صرف ان کی بندگی کی۔ وہ اعلان کریں گے کہ ہمیں تو ان لوگوں کی طرف سے اس عبادت اور شرک کا سرے سے نہ علم ہے اور نہ شعور ہے اور وہ اس جرم میں کسی طرح بھی شریک نہیں ہیں' وہ اپنی

اس براءت پر اللہ کو گواہ ٹھہرائیں گے ۔

---قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ (۲۸) فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ (۲۹) (۱۰:۲۸ - ۲۹) "اور ان کے شریک کہیں گے کہ "تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے ۔ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے کہ (تم اگر ہماری عبادت کرتے بھی تھے تو) ہم تمہاری اس عبادت سے بالکل بے خبر تھے"۔ یہ وہی شریک ہوں گے 'جن کی عبادت اس دنیا میں کی جاتی تھی ۔ یہ لوگ اس بات کی صفائی پیش کر رہے ہوں گے کہ ان کے متبعین ان کے حوالے سے اس عظیم گناہ کا ارتکاب کرتے تھے ۔ یہ لوگ اللہ کو شہید اور گواہ ٹھہرائیں گے اور اپنے آپ کو اس جرم سے لاتعلق ثابت کر دیں گے کہ وہ اس جرم میں ہرگز شریک نہیں ہیں ۔

اس وقت 'اس کھلی کچہری میں ہر شخص کا امتحان ہو گا اور یہ امتحان اس کے دنیاوی اعمال کی تفتیش اور تنقیح پر ہو گا اور سب کو سنا دیا جائے کہ ان کا انجام کیا ہے ۔

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۱۰:۳۰) "اس وقت ہر شخص اپنے کیے کا مزہ چکھ لے گا' سب اپنے حقیقی مالک کی طرف سے پھیر دیئے جائیں گے اور وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے گم ہو جائیں گے"۔ تبھی اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ اللہ اور رب تو ایک ہی ہے ۔ آج تمام لوگ اس کی طرف لوٹ آئے ہیں اور اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے ۔ اس دن "مشرکین کے تمام دعوے 'تمام مزعومات اور تمام الٰہ غائب ہوں گے کیونکہ یہ تو ان پر دعویٰ ہی تھے ۔

لیکن قرآن کا انداز بیان اسے یوں پیش کرتا ہے کہ یوم حشر برپا ہے 'اس میں حساب و کتاب ہو رہا ہے ۔ تمام حقائق و واقعات کا ریکارڈ پیش ہو رہا ہے ۔ تمام موثرات اور تمام سوال و جواب کو قرآن کریم چند الفاظ میں ریکارڈ کر دیتا ہے ۔ یہ منظر تمام حقائق کو ذہن نشین کرا دیتا ہے ۔ مجرد بیانیہ انداز یا مجرد استدلالی انداز حقائق کو اس طرح ذہن نشین نہیں کر سکتا ۔

---()()()---

میدان حشر کا منظر پیش کرنے کے بعد جس میں ان کے تمام دعاوی اور تمام خرافات کی عمارات زمین بوس ہو گئیں ' اور یہ معلوم ہو گیا کہ وہاں تو منظر پر صرف اللہ کا حکم چلے گا 'اب اگلی آیات میں ان کو ان کے موجودہ حالات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ ذرا تم اپنے ان حالات پر خود ہی غور کرو 'خود اپنی نفسیاتی کیفیات پر غور کرو جے تم خوب جانتے ہو ' اپنی سوسائٹی کے کوائف کا مشاہدہ کرو 'خود اپنے تصورات پر بھی غور کرو کہ تم خود بھی اللہ کی خالقیت اور حاکمیت کو مانتے ہو کہ اللہ ہی مالک اور خالق ہے ۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَ

مَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾

"ان سے پوچھو' کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔ کہو' پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز نہیں کرتے؟ تب تو یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے۔ پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ آخر یہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو؟"

اس سے قبل یہ بات آگئی ہے کہ عرب اللہ کے وجود کے منکر نہ تھے' اس کے بھی منکر نہ تھے کہ خالق اور رازق صرف وہ ہے۔ اس کے بھی منکر نہ تھے کہ اس کائنات کا مدبر صرف وہی ہے۔ خرابی یہ تھی کہ وہ اللہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کچھ دوسرے اشخاص کو اللہ کا شریک بناتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کی قدرت کے ساتھ ان کے پاس بھی قدرت ہے' لہٰذا اللہ ان کا مواخذہ اس طرح فرماتے ہیں کہ خود تم ان باتوں کو تسلیم کرتے ہو۔ لہٰذا تم اپنے بقیہ غلط تصورات کے اندر تصحیح کر لو' ذرا آنکھیں کھولو' ذرا غور و فکر کرو' ذرا منطقی انداز اختیار کر کے اس گمراہی اور مخبوط الحواسی سے نکلو۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۱۰ : ۳۱) (ان سے پوچھو' کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے) یہ پہلا سوال ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کے ذریعے بذریعہ بارش اور فصلات اور حیوانات تمہیں کون رزق دیتا ہے' زمین کا رزق نباتات حیوانات' چرندوں اور پرندوں' مچھلیوں اور بحری حیوانات' پھر زمین کے اندر پوشیدہ وہ تمام خزانے جو وہ خود اپنے لیے اور اپنے حیوانات کے لیے نکالتے ہیں یہ سب کس نے پیدا کیے ہیں' یہ تو تھے اس وقت جو عملاً وہ حالات کے مطابق نکال رہے تھے جبکہ اللہ کے خزانے ان سے بہت ہی وسیع ہیں۔ اس وقت سے لے کر آج تک انسان مزید انکشافات کر رہے ہیں اور آسمانوں اور زمین دونوں سے اپنے لیے رزق کے وسائل تلاش کر رہے ہیں۔ یہ سب اس آیت میں شامل ہیں۔ ہاں انسان ان جدید انکشافات کو کبھی تو خیر میں استعمال کرتا ہے اور کبھی شر میں یہ اس کی اپنی سوچ کی راستی اور کجی پر موقوف ہے' زمین کی سطح پر بھی رزق ہیں' اس کی سطح کے اندر بھی رزق ہیں' سمندر کی سطح پر بھی رزق ہیں اور اس کے اندر بھی رزق ہیں۔ سورج کی کرنوں کے اندر بھی رزق ہے اور چاند کی نورانی ضوپاشیوں کے اندر بھی رزق ہے۔ غرض زمین کے تعفن میں بھی دوا اور تریاق دریافت ہوا ہے۔

اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ (۱۰ : ۳۱) "یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں"۔ یہ دوسرا سوال ہے۔ کون ہے جو کان اور آنکھ کو اپنے فرائض سرانجام دینے کی قدرت دیتا ہے اور کون ہے کہ ان کو محروم کر دیتا ہے۔ کون ہے جو ان اعضاء کو صحت دیتا ہے یا بیمار کر دیتا ہے۔ کوئی ہے جو ان کو کام میں لگاتا ہے اور کون ہے جو معطل کر دیتا ہے۔ کون ہے جو ان کو دکھاتا اور سنتا ہے خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں۔ یہ تو تھیں وہ چیزیں جو اس وقت آنکھ اور کان کے بارے میں سنتے تھے۔ ان کے لیے اس سوال اور اس کی تشریح کے لیے یہ کافی تھا۔ لیکن زمانہ مابعد کے

لوگوں نے مسلسل قوت سامعہ اور قوت باصرہ اور آنکھ اور کان کے بارے میں بے شمار انکشافات کیے ہیں اور کر رہے ہیں۔ اور ان دو آلات کے اندر اللہ نے جو نہایت ہی پیچیدہ صنعت کاری فرمائی ہے تو ان جدید انکشافات کی روشنی میں یہ سوال مزید وسیع سوال بن جاتا ہے۔ آنکھ کی ساخت' اس کے اعصاب اور دیکھی ہوئی چیزوں کا ادراک کرنا' کان کی ساخت' اس کے اجزا اور طریقہ سماعت اور ہوا کی لہروں کو محسوس کرنا' یہ ایک جہاں معلومات ہے جس پر غور کرنے سے سر چکرا جاتے ہیں' اللہ کے بنائے ہوئے ان آلات اور دور جدید کے حساس ترین آلات جن کو دور جدید کے معجزات کہا جاتا ہے' کا اگر باہم تقابلی مطالعہ کیا جائے تو باوجود اس کے کہ لوگوں کو انسانوں کے بنائے ہوئے آلات حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔ یہ وقت صنعت میں خدا کے بنائے ہوئے ان آلات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اللہ کے بنائے ہوئے ان عجیب و غریب آلات کو دیکھ کر یوں ہی گزر جاتے ہیں اور ان کی تہہ تک نہیں پاتے۔

وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ (۱۰ : ۳۱) "کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے"۔ قدیم زمانے کے لوگ ساکن کو مردہ اور متحرک کو زندہ تصور کرتے تھے' مثلاً سوال ان سے یہ تھا کہ کون ہے جو ایک مردہ دانے سے نباتات نکالتا ہے' اور پھر نباتات سے ایک مردہ دانہ نکالتا ہے۔ انڈے سے بچہ اور مرغی سے انڈہ نکالتا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے مشاہدات۔ یہ بات ان کے نزدیک بھی عجیب تھی اور اب اس سے بھی زیادہ تر عجیب ہیں کہ جب یہ معلوم ہو گیا دانے' انڈے اور اس قسم کی دوسری چیزیں بھی مردہ نہیں ہیں بلکہ زندہ ہیں۔ اس طرح زندہ ہیں کہ ان کے اندر خفیہ زندگی ہے اور بعض میں زندگی کی استعداد ہے۔ کیونکہ زندگی کی خفیہ استعداد' پھر اس کی وراثتی صفات' علامات اور خصوصیات جن پر دور جدید میں تحقیق ہوئی۔ وہ اس سے زیادہ عجیب چیزیں اور انکشافات ہیں اور یہ ان آیات کے مفہوم کو زیادہ وسعت دیتی ہیں اور قدرت الہیہ کا اظہار مزید ہیں۔

صرف دانے اور گٹھلی کا مطالعہ اگر کیا جائے کہ کس طرح اس سے نباتات اور کھجور جیسا درخت نکلتا ہے' انڈہ یا وہ چھوٹا بیضہ جن سے مرغی کا بچہ اور پورا انسان نکل آتا ہے اگر انسان صرف ان دو چیزوں پر غور و فکر کرے اور پوری زندگی لگا دے تو وہ ان چیزوں کے عجائبات و کمالات کا شمار نہیں کر سکتا۔

سوال یہ ہے کہ دانے میں خوشہ کہاں تھا' اور پھر اس کا دوبارہ اسی طرح دانوں کی شکل اختیار کرنا اور پھر جڑیں' ان کی نال اور پتے اس پر مستزاد۔

ایک کھجور کی ایک گٹھلی کو لیجیے۔ اس میں گودا' اس میں ریشے' اور طویل تنا کہاں تھا؟ اس کی طویل ٹہنیاں اور ان کے باریک پتے اس میں کہاں تھے؟ اس میں ذائقہ' اس کی خوبصورتی' اس کا رنگ اور اس کی خوشبو یہ سب چیزیں گٹھلی میں کہاں تھیں' پھر کھجور کی مختلف اقسام تازہ' خشک وغیرہ۔

اب ذرا انڈے پر غور کریں' کیا اس میں بچہ موجود تھا' گوشت پوست اور ہڈیاں اس میں کہاں تھیں' بال و پر' رنگ و روغن اور اس کی اڑان اور اس کے نرم پر اور پشم۔

پھر ذرا اس چھوٹے سے بیضہ پر غور کریں جس کے اندر انسانی مخلوق پرورش پاتی ہے۔ کیا عجیب چیز ہے۔ اس کے

اندر انسانی خدوخال کہاں تھے ' انسان کی خصوصیات اور دور دراز کی موروثی صفات کہاں تھیں ' اس کی آواز ' اس کی بصارت ' اس کا چہرہ مہرہ ' اس کے اعصاب ' اس کی جنس اور صنف ' والدین سے موروثی صفات خصوصیات اور دوسری خصوصیات اس کے اندر کہاں پوشیدہ تھیں؟

کیا بظاہر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ وسیع و عریض حقائق و صفات سب کی سب دانے 'گٹھلی' انڈے اور بیضے کے اندر موجود تھیں تاکہ ہمارا یہ تعجب اور حیرانی ختم ہو سکے ۔ یہ حیرت اور تجسس صرف اس صورت میں ختم ہو سکتا ہے کہ ہم ان تمام امور کو اللہ کی قدرت کے سپرد کر دیں اور اسے اللہ کی تدبیر کے حوالے کر دیں ۔

انسان لگے ہوئے ہیں اور رات اور دن موت و حیات کے بارے میں نئے نئے اسرار و رموز کے انکشافات کرتے رہتے ہیں ۔ وہ سوچتے رہتے ہیں کہ کس طرح مردے سے زندہ اور زندہ سے مردے نکل آتے ہیں ' اور کس طرح مختلف عناصر مختلف طبیعی مراحل میں موت و حیات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں ' یہ آئے دن کے انکشافات ' ماسوائے اس کے کہ موت و حیات کے بارے مین کچھ اور سوالات پیدا کر دیں اور حیرت و اعجاب کے دائرے کو قدرے اور وسیع کر دیں اور کچھ نہیں کر سکتے ۔ ہر لحظہ کے انکشافات سوالات کو اور گہرا کر دیتے ہیں ۔ ہم کھانے کو پکانے کے عمل اور آگ سے گزار کر مار دیتے ہیں لیکن یہ خوراک ایک زندہ خون کی شکل اختیار کر لیتی ہے ' اور یہ خون جل کر مردہ فضلات کی شکل اختیار کرتا رہتا ہے ۔ غرض یہ ایسے عجوبے ہیں کہ ان میں جس قدر انسانی علم آگے بڑھتا ہے ' حیرت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن ان اعجوبوں کا وقوع رات اور دن ہر لمحے ہوتا رہتا ہے ۔ غرض زندگی ایک ایسا اعجوبہ ہے جو نہایت غامض ہے ' جو انسانی فہم و ادراک پر ایسے سوالات کرتی رہتی ہے جس کا صرف ایک ہی جواب ہے ' اور صرف یہی کافی و شافی جواب ہے ' وہ یہ کہ ایک اللہ رب العالمین ہے جو یہ تصرفات کرتا رہتا ہے ۔

وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ( ۱۰ : ۳۱ ) "کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟" ۔ یعنی ان امور کا جن کا ذکر کیا گیا اور تمام دوسرے امور کا مدبر کون ہے؟ وہ قانون قدرت جس کے مطابق یہ پوری کائنات اور سیارے ستارے چل رہے ہیں ۔ کون ہے جو اس کو چلاتا ہے اور کون ہے جو اس قانون کی اس قدر وقت کے ساتھ پابندی کراتا ہے ۔ پھر وہ کون ہے جو قافلہ حیات کو ایک نہایت ہی لطیف اور باریک ضابطے کے مطابق رواں دواں رکھے ہوئے ہے ۔ پھر انسانی زندگی کے اجتماعی اصول اور عمرانی قاعدے کس نے چلائے؟ یہ اصول اور قاعدے کبھی بھی غلط نتائج نہیں دکھاتے ۔ صراط مستقیم پر رواں ہیں ۔

فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ ( ۱۰ : ۳۱ ) (وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ) یہ لوگ دراصل اللہ کے وجود کے منکر نہ تھے اور نہ اس بات کے منکر تھے کہ ان بڑے بڑے امور میں صرف اللہ کا دست قدرت کارفرما ہے ۔ لیکن اس اعتراف کے باوجود ان کی فطرت میں جو کجی آگئی تھی اس کی وجہ سے وہ شرک میں مبتلا ہو گئے تھے ' اس لیے وہ اللہ کے سوا دوسروں کی پرستش کرتے تھے جس طرح وہ ایسے لوگوں کے قوانین کو تسلیم کرتے تھے جس کو قانون سازی کا کوئی اختیار اللہ نے نہ دیا تھا ۔

فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ( ۱۰ : ۳۱ ) "کہو ' پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز نہیں کرتے" ۔ تو کیوں تم اس ذات سے نہیں ڈرتے جو تمہیں آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے ' جو تمہاری بصر اور تمہارے کانوں کا بھی مالک ہے '

جو زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ نکالتا ہے اور ان کے علاوہ بھی تمام دوسرے کائناتی امور کی تدبیر کرتا ہے۔ جو ذات ان امور کو سرانجام دیتی ہے وہی اللہ اور رب ہے، وہ حق ہے اور اس کے سوا کوئی حق نہیں ہے۔

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ (۱۱ : ۳۲) (تب تو یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے) اور حق صرف ایک ہوتا ہے، حق میں تعدد ممکن نہیں ہے۔ جو شخص حق سے آگے بڑھ گیا تو سمجھو کہ وہ باطل کی حدود میں داخل ہو گیا اور گمراہ ہو گیا۔

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (۱۱ : ۳۲) "پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ آخر تم کدھر پھرائے جا رہے ہو"۔ تم کس طرح سچائی سے دور جا پڑے ہو حالانکہ سچائی بالکل واضح اور بین ہے اور سامنے نظر آ رہی ہے۔ چشم بینا اسے دیکھ رہی ہے۔

سچائی جس کا اعتراف مشرک بھی کرتے تھے، لیکن اصولاً سچائی کو تسلیم کر کے اس کے نتائج کا انکار کرتے تھے۔

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ (۱۱ : ۳۲) (تب تو یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے) اور حق صرف ایک ہوتا ہے، حق میں تعدد ممکن نہیں ہے۔ جو شخص حق سے آگے بڑھ گیا تو سمجھو کہ وہ باطل کی حدود میں داخل ہو گیا اور گمراہ ہو گیا۔

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (۱۱ : ۳۲) "پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا

کرے؟ — کہو وہ صرف اللہ ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہے اور اس کا اعادہ بھی ' پھر تم یہ کس الٹی راہ پر چلائے جا رہے ہو؟ ان سے پوچھو تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو؟ کہو وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پھر بھلا بتاؤ جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا الا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے؟ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے ' کیسے الٹے الٹے فیصلے کرتے ہو؟"

یہ چند امور کے بارے میں سوالات ہیں ' یہ کہ کون پیدا کرتا ہے اور کون اعادہ کرے گا؟ کون ہدایت دینے والا ہے؟ یہ امور ان کے ہاں سابقہ امور کی طرح مسلم نہ تھے لیکن یہاں بھی سابقہ امور کی طرز پر ان سے ایسے سوالات کیے گئے کہ گویا یہ مسلم امور ہیں۔ کیونکہ اگر تھوڑا سا غور و فکر بھی کیا جائے تو یہ امور مسلمات کے تقاضوں میں سے ہیں ' ان امور کا جواب ان سے طلب نہیں کیا جاتا ' بلکہ خود ہی جواب دے دیا جاتا ہے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (۱۱ : ۳٤) "ان سے پوچھو ' تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ہے جو تمہاری تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہو اور پھر اس کا اعادہ بھی کرے"۔ یہ لوگ تسلیم کرتے تھے کہ اللہ نے ابتدا میں کائنات کی تخلیق کی لیکن یہ لوگ یہ بات تسلیم نہ کرتے تھے کہ تخلیق کا اعادہ بھی وہی کرے گا۔ نہ وہ بعث بعد الموت ' حشر اور حساب و کتاب اور جزاء و سزا کے قائل تھے۔ لیکن اگر یہ تصور کیا جائے کہ خالق نے اس دنیا میں انسان کی تخلیق کی اور یہاں وہ اس کا قصہ تمام کر دے گا اور کوئی حساب و کتاب نہ ہو گا ' یہ کوئی حکیمانہ اور عادلانہ تصور نہ ہو گا ' کیونکہ نیکوکاروں کو جزاء نہ ملے اور بدکاروں کو سزا نہ ملے تو اس طرح عدل مکمل نہ ہو گا کہ صراط مستقیم پر چلنے والوں اور انحراف کرنے والوں دونوں کا ایک ہی انجام ہو۔ لہٰذا حکمت خداوندی ' اور اللہ کے عدل و انصاف کا یہ ضروری تقاضا ہے کہ آخرت برپا ہو۔ لہٰذا اگر وہ تسلیم کرتے ہیں کہ آغاز میں تخلیق کرنے والا اللہ ہے ' اگر وہ تسلیم کرتے ہیں کہ مردے سے زندہ اور زندہ سے مردہ نکالنے والا وہی ہے ' تو ان کو جزاء و سزا اور حشر و نشر کو بھی تسلیم کرنا چاہئے۔ آخرت میں حشر و نشر بھی تو مردہ سے زندہ نکالنے کے عین مشابہ امر ہے۔ جسے وہ تسلیم کرتے ہیں۔

قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (۱۱ : ۳٤) "کہو صرف اللہ ہی ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہے اور اس کا اعادہ بھی"۔ لہٰذا یہ عجیب بات ہے کہ وہ اس قدر واضح حقیقت کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ حالانکہ وہ اس کے مقدمات کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان مقدمات کے تسلیم کے بعد تو انہیں اسے سمجھ لینا چاہئے۔

فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۱۱ : ۳٤) "پھر تم کس الٹی راہ پر چلائے جا رہے ہو"۔ تم حق سے دور ہو کر جھوٹ کی طرف متوجہ ہوتے ہو اور اس طرح گمراہ ہو رہے ہو۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ (۱۱ : ۳۵) (ان سے پوچھو تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہو؟) جو قرآن کی طرح کتابیں نازل کرتا ہو ' جو رسول بھیجتا ہو ' جو ایک مکمل نظام زندگی وضع کرتا ہو ' جو شرعی قانون بتاتا ہو ' جو انجام بد سے ڈراتا ہو ' جو بھلائی کی طرف متوجہ کرتا ہو ' جو نفس

انسانی کے اندر موجود نشانیوں اور اس کائنات کے اندر موجود نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کرتا ہو' جو غافل دلوں کو جگاتا ہو' جو معطل کردہ قوائے مدرکہ کو از سرنو جگاتا ہو' جبکہ حقیقی اللہ یہ سب کام کرتا ہے اور وہ تمہارے سامنے موجود ہیں اور یہ کام بذریعہ رسول کیے جارہے ہیں تاکہ تم ہدایت پالو' چنانچہ فیصلہ کن انداز میں رسول اللہ کے ذریعے جواب دیا جاتا ہے۔

قُلِ اللّٰهُ يَهْدِىْ لِلْحَقِّ (۱۱:۳۵) "کہو وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے"۔ جب اللہ ہی ایسا کرتا ہے اور کوئی دوسرا ایسا نہیں ہے تو پھر تمہیں اگلی حقیقت تسلیم کرنے میں کوئی مشکل درپیش نہیں ہونا چاہئے۔

اَفَمَنْ يَّهْدِىْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّىْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى (۱۱:۳۵) "پھر بھلا بتاؤ جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا اِلّا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے"۔ اس کا جواب بھی طے شدہ ہے' جو لوگوں کو ہدایت دیتا ہے وہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے بمقابلہ اس کے جو خود دوسرے کی راہنمائی کا محتاج ہو۔ یہ اصول تمام شرکاء پر منطبق ہوتا ہے' چاہے وہ پتھر ہوں' درخت ہوں' ستارے ہوں یا انسان ہوں کیونکہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام شرکاء میں شامل ہیں۔ کیونکہ وہ بشر تھے اور اللہ کی ہدایت کے محتاج تھے۔ اگرچہ انہیں ہادی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ جو انسانی شرکاء ہیں ان پر تو بطریق اولیٰ یہ اصول صادق آتا ہے۔

فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (۱۱:۳۵) "آخر تمہیں کیا ہوگیا ہے" کیسے الٹے الٹے فیصلے کرتے ہو"۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے' تمہیں کیا بیماری لاحق ہوگئی ہے۔ تم حقائق کا کس طرح جائزہ لیتے ہو کہ صحیح نتائج اخذ کرنے کے بجائے الٹے گمراہ ہو رہے ہو۔

سوال و جواب سے فراغت کے بعد اور اپنی طرف سے وہ جوابات دینے کے بعد جو ہدایت پر مبنی تھے اور جو ان مقدمات پر مبنی تھے' جو ان کے نزدیک بھی مسلم تھے۔ اس کے بعد ان کے موقف کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جاتا ہے جو فکر ونظر اور دلیل و برہان کے پیمانوں کے مطابق فی الواقع ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کے مزعومات پر ان کے پاس کوئی علمی اور یقینی سند نہیں ہے۔ وہ جو فیصلے کرتے ہیں وہ وہم و ظن پر مبنی ہوتے ہیں' وہ ایسے مسلمہ حقائق پر مبنی نہیں ہوتے جن کو دیکھ کر عقل انسانی مطمئن ہو جائے اور فطرت سلیمہ ان کو تسلیم کرے۔ ان کے اعتقادات اور نظریات اوہام و خرافات پر مبنی ہیں۔ اور انہی اوہام اور ظنیات پر ان کی زندگی کا دارومدار ہے اور ظاہر ہے کہ ظن و گمان اور ثابت شدہ سچائی کے درمیان کوئی مقابلہ نہیں ہوتا۔

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۭ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَـيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶

"حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ محض قیاس و گمان کے پیچھے چلے جارہے ہیں' حالانکہ گمان حق کی ضرورت

کو کچھ بھی پورا نہیں کرتا جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے"۔

ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ کے کچھ شریک ہیں اور اپنے اس گمان کو وہ عقل کی کسوٹی پر پرکھنا نہیں چاہتے' نہ عملاً اس کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بس یہی کہہ کر رہ جاتے تھے کہ اگر ان بتوں میں اور شریکوں میں کچھ کمال نہ ہوتا تو ہمارے آباؤ اجداد ان کی پوجا ہرگز نہ کرتے۔ لیکن آباء کے طرز عمل کو چھوڑ کر یہ لوگ ان خرافات پر نظر ثانی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور یہ لوگ ظنیات کی اساس پر مبنی اپنے آباء کی تقلید سے جان نہیں چھڑاتے۔ پھر ان کا مزید گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے کسی ایک شخص کی طرف وحی کیسے بھیج سکتا ہے' اور دلیل ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے کہ کیوں اللہ انسانوں میں سے کسی کو رسول نہیں بنا سکتا۔ یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید حضرت محمدؐ نے بنایا ہے اور یہ سوچتے نہیں کہ محمدؐ جو ایک انسان ہیں اگر قرآن جیسی کتاب بنا سکتے ہیں جبکہ خود ان کو بار بار چیلنج دیا گیا ہے تو خود یہ لوگ ایسی کتاب لے کر کیوں نہیں آتے۔ غرض یہ اور اس قسم کے کئی دوسرے مزعومات ہیں جن میں یہ لوگ غرق ہیں اور یہ وہم اور خرافات ان کے کسی کام کے نہیں ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (۱۰:۳۶) (جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے) صرف اللہ ہی جانتا ہے کہ ان لوگوں کے کرتوت کیا ہیں اور اللہ ہی کا علم یقینی ہے۔ اس تبصرے کے بعد اب قرآن مجید کے بارے میں ان کے ردعمل پر تبصرہ کیا جاتا ہے' سب سے پہلے اس خیال کو رد کیا جاتا ہے کہ یہ قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی جانب سے بطور افترا باندھا ہوا ہو' اگر وہ ایسا خیال کرتے ہیں تو پھر قرآن کی طرف سے چیلنج ہے کہ تم بھی ایسا فصیح و بلیغ کلام و نظام پیش کرو' دوسرے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ یہ لوگ ایسا کلام پیش کریں' ان کی یہ عادت ہے کہ یہ ان معاملات میں بھی ایسے فیصلہ کن الزامات عائد کرتے ہیں جن کے بارے میں ان کو کوئی علم ہی نہیں ہے۔ نہ وہ ان موضوعات پر کوئی کلام کر سکتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ یہ لوگ قرآن مجید کے مقابلے میں ہٹ دھری اختیار کیے ہوئے ہیں لہٰذا رسول اللہ اور اہل اسلام کو بھی اپنے موقف پر جم جانا چاہئے۔ چاہے وہ مان کر دیں یا نہ دیں۔ آخر میں یہ بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو ان کی طرف سے مایوس ہو جانا چاہئے اور اپنی راہ پر آگے بڑھنا چاہئے کیونکہ یہ لوگ آنکھیں رکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور کان رکھتے ہوئے نہیں سنتے۔ لہٰذا وہ اپنے اس انجام تک پہنچنے والے ہیں جس کے وہ مستحق ہیں' اپنی اس ضلالت کی وجہ سے جس پر وہ جمے ہوئے ہیں۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ
الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۳۷
اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ
اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۳۸ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا

يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۖ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الظَّالِمِينَ ﴿٣٩﴾ وَمِنْهُم مَّن يُؤْمِنُ بِهِ وَمِنْهُم مَّن لَّا يُؤْمِنُ بِهِ ۚ وَرَبُّكَ
أَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٤٠﴾ وَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل لِّي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۖ أَنتُم
بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٤١﴾ وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُونَ
إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ ﴿٤٢﴾ وَمِنْهُم مَّن يَنظُرُ
إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ ﴿٤٣﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ
النَّاسَ شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٤٤﴾

''اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی و تعلیم کے بغیر تصنیف کر لیا جائے بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آ چکا تھا اس کی تصدیق اور کتاب کی تفصیل ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فرمانروائے کائنات کی طرف سے ہے۔

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو ''اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو' مدد کے لیے بلا لو''۔ اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور جس کا مآل بھی ان کے سامنے نہیں آیا' اس کو انہوں نے خواہ مخواہ اٹکل پچو جھٹلا دیا۔ اسی طرح تو ان سے پہلے کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں' پھر دیکھ لو ان ظالموں کا کیا انجام ہوا؟ ان میں سے کچھ لوگ ایمان لائیں گے اور کچھ نہیں لائیں گے اور تیرا رب ان مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔ اگر یہ تجھے جھٹلاتے ہیں تو کہہ دے کہ ''میرا عمل میرے لیے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لیے' جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری سے تم بری ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں''۔

ان میں بہت سے لوگ ہیں جو تیری باتیں سنتے ہیں' مگر کیا تو بہروں کو سنائے گا' خواہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں؟ ان میں بہت سے لوگ ہیں جو تجھے دیکھتے ہیں' مگر کیا تو اندھوں کو راہ بتائے گا خواہ انہیں کچھ نہ سوجھتا ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا' لوگ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں''۔

وَمَا كَانَ هَٰذَا الْقُرْآنُ أَن يُفْتَرَىٰ مِن دُونِ اللَّهِ (۱۰:۳۷) ''اور قرآن وہ چیز نہیں ہے کہ اللہ کی وحی اور تعلیم کے بغیر تصنیف کر لیا جائے''۔ وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے اور اپنے مضامین اور انداز بیان کے اعتبار سے نہایت ہی کامل اور مربوط اور ہم آہنگ کتاب ہے۔ جو عقائد اور نظریات وہ پیش کرتا ہے وہ کامل اور ٹھوس ہیں۔ انسانی زندگی کے لیے جو نظام تجویز کرتا ہے وہ نہایت ہی کامیاب اور حق ہے' وہ خدا کا جو تصور پیش کرتا ہے وہی خدا

کے لائق ہے اور اس سے حقیقت الوہیت کا اظہار ہوتا ہے' وہ انسان کی وہی تصویر پیش کرتا ہے جس طرح فی الواقع انسان ہے' وہ زندگی کو اس کی حقیقت کے مطابق لیتا ہے' وہ اس کائنات کو اس طرح لیتا ہے کہ آج تک اس کا کوئی نظریہ باطل نہیں ہوا' لہٰذا یہ کلام ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ اللہ کے سوا کسی اور کی تصنیف ہو' ایسے کلام کو صرف قدرت الٰہیہ ہی وجود میں لا سکتی ہے۔ کیونکہ قدرت الٰہیہ ہی ہے جو اولین اور آخرین کے علوم کو محیط ہے' جو ظاہر اور باطن سے واقف ہے' جو ایسا نظام تجویز پیش کر سکتی ہے جو نقص' جہل اور ناکامی سے محفوظ ہو۔

مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۱۰: ۳۷) "قرآن وہ چیز نہیں ہے کہ اللہ کی وحی اور تعلیم کے بغیر تصنیف کر لیا جائے"۔ اس کی حقیقت بذات خود اس کی نفی کرتی ہے' نہ صرف یہ افتراء نہیں بلکہ یہ کہ قرآن کے بارے میں اس کی نسبت ہی ناجائز ہے' یعنی قرآن کی طرف افتراکا استناد ہی ممکن نہیں یہ نہایت بلیغانہ نفی ہے۔

وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ (۱۰: ۳۷) (بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آ چکا تھا' اس کی تصدیق اور کتاب کی تفصیل ہے) یعنی ان کتابوں کی تصدیق ہے جو حضور اکرمؐ سے قبل رسولوں پر اتاری گئیں۔ اصل عقیدے اور نظریہ میں ان کی تصدیق کرتی ہے' بھلائی کی طرف دعوت دینے میں بھی ان کی تصدیق کرتی ہے اور یہ الکتاب کی تفصیلات پیش کرتی ہے۔ الکتاب دراصل ایک ہے' جس سے مختلف رسولوں کو ہدایات دی گئیں۔ اس کے اصول تمام رسولوں کے ہاں ایک ہیں۔ تفصیلات مختلف ہیں۔ قرآن کریم نے الکتاب کے اصول کو ذرا مفصل طریقے سے پیش کیا۔ بھلائی کے مختلف وسائل بتائے اور ان کو محفوظ کیا۔ مثلاً اللہ پر ایمان تمام رسولوں کے ہاں ایک ہے' تمام رسولوں کی دعوت بھلائی اور سچائی کی طرف تھی' مثلاً خیر کی شکل کی مختلف تفصیلات ہو سکتی ہیں اور اس کے حصول کے لیے قانون سازی اور ضابطہ بندی مختلف ہو سکتی ہے۔ اور جوں جوں انسان ترقی کرتا ہے' وسائل خیر بھی ترقی کرتے جاتے ہیں اور جب انسانیت بلوغ کو پہنچ گئی تو اسے قرآن کی شکل میں آخری ضابطہ دیا گیا۔ اور اسے عقل و خرد استعمال کرنے کی ہدایت کی گئی۔ قرآن نے خارق العادت معجزات پیش نہیں کیے کیونکہ خارق العادت معجزے سے تعقل و تفکر کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۰: ۳۷) (اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ فرمانروائے کائنات کی طرف سے ہے) یہ اس بات کی تاکید ہے کہ قرآن مجید حضرت نبی کریم کی طرف سے گھڑا نہیں گیا بلکہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ (۱۰: ۳۸) (کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے) تصنیف کرنے کی نفی کرنے اور پھر مثبت طور پر یہ کہنے کے بعد کہ یہ رب العالمین کی طرف سے ہے' کیا پھر بھی اس بات کی گنجائش ہے اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا اپنا بنایا ہوا ہے۔ حضرت تو وہی زبان بولتے ہیں جو یہ بولتے ہیں۔ وہی حروف تہجی و کلمات ہیں جو ان کی میں ہیں (الف لام میم) (الف لام را) (الف لام میم صاد) وغیرہ۔

تو آئیں ' یہ خود اور جس قدر مددگار بھی یہ لا سکتے ہیں لائیں اور جس طرح محمدؐ نے کلام پیش کیا ہے ' یہ بھی ایسا کوئی کلام پیش کر دیں ۔ پورا قرآن تو دور کی بات ہے ' ایک سورہ ہی بنا لائیں ۔

قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

( ۱۰ : ۳۸ ) "کہو "اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے تو ایک سورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو ' مدد کے لیے بلا لو"۔ قرآن کا یہ چیلنج سچا ثابت ہو چکا ہے اور یہ حقیقت سامنے آ چکی ہے کہ یہ لوگ آج تک اس قسم کی صرف ایک سورہ بنانے سے بھی عاجز آ چکے ہیں اور آئندہ بھی صورت حال میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے ۔ جو لوگ قرآن کریم اور عربی زبان کی فصاحت و بلاغت سے ذرا بھی تعلق رکھتے ہیں اور اس کی فنی خوبیوں اور اس کے اسالیب بیان کی ہم آہنگی سے واقف ہیں تو وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن کریم کی طرح نظم کلام ممکن ہی نہیں ہے اور کسی انسان کی طرف سے ایسا کلام پیش ہی نہیں کیا جا سکتا ۔ اسی طرح جو لوگ اجتماعی نظاموں کے طالب العلم ہیں ' جو اصول قانون اور دساتیر عالم کو جانتے ہیں وہ اس بات کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن کریم نے جو نظام پیش کیا ایسا نظام کسی انسان یا انسانی گروہ کے لیے ممکن نہیں ہے ۔ کسی انسانی سوسائٹی کی شیرازہ بندی اس طرح نہیں کی جا سکتی جس طرح قرآن نے کی ہے ۔ اس نظام میں اللہ تعالیٰ نے ایسی لچک چھوڑی ہے کہ قیامت تک آنے والے نئے نئے حالات کے لیے بھی اس میں گنجائش ہے اور بدلتے ہوئے حالات کے بدلتے ہوئے جوابات اس میں موجود ہیں ۔ اور نہایت ہی مہارت سے ہر مسئلے کا حل اس کے اندر موجود ہے ۔ یہ صورت حالات ایسی ہے کہ کسی ایک انسان کے دماغ میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ یہ کام کر سکے ۔ نہ کوئی گروہ یہ کام کر سکتا ہے اور نہ نسلیں یہ کام کر سکتی ہیں ۔ اسی طرح جو لوگ نفس انسانی کے بارے میں کچھ علم رکھتے ہیں اور پھر قرآن مجید کی طرف سے نفس انسانی کے ساتھ ڈیلنگ کو دیکھتے ہیں وہ بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ کسی انسان کا کارنامہ نہیں ہے ۔

غرض قرآن مجید کا اعجاز فقط الفاظ ' طرز ادا ' اور حسن تعبیر تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ عام اور مطلق اور بے قید اعجاز ہے ' ان امور کے ساتھ ساتھ مضامین ' انسانی نفسیات کے ساتھ ڈیلنگ اور اپنے دستوری اور قانونی اور معاشی اور معاشرتی نظام کے پہلو سے بھی قرآن معجزہ ہے ۔

جو لوگ فن تعبیر اور حسن ادا میں کسی قدر تجربہ رکھتے ہیں اور جو لوگ فصاحت و بلاغت کے اصولوں سے واقف ہیں ' وہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم غایت درجے کا فصیح و بلیغ کلام ہے اور اس میں طرز ادا کی فنی خوبیاں اپنی انتہا پر ہیں ۔ اسی طرح جو لوگ اجتماعی علوم اور سوشیالوجی ' نظام قانون اور انسانی نفسیات کے موضوعات پر شدبد رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن کریم اپنے موضوع سخن کے اعتبار سے بھی معجزہ ہے ' اور یہ اعجاز اپنی آخری انتہا پر ہے ۔

میں یہاں یہ حقیقت برملا کہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ ہم جیسے لوگوں کے لیے تو یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ہم قرآن کریم کے اعجاز کا احاطہ کر سکیں ۔ نہ انسانی اسالیب کلام میں قرآن کا اعجاز بیان ہو سکتا ہے ۔ اور اگر ہم اس پر مفصل کلام کرنا چاہیں بھی تو بھی اس کے لیے ایک مستقل کتاب کے صفحات درکار ہیں ۔ بہرحال یہاں میں سرسری نظر ڈال کر مختصر نکات قارئین کے سامنے رکھتا ہوں ۔

قرآن کا اسلوب بیان انسانی اسلوب بیان سے بنیادی طور پر مختلف ہے ۔ قرآن کا انداز بیان ایسا ہے کہ وہ دل و دماغ پر مکمل طور پر حاوی ہو جاتا ہے ۔ اس کے الفاظ اور تراکیب سے ایک ایسا شخص بھی مسحور ہو جاتا ہے جو سرے سے عربی زبان جانتا بھی نہیں ۔ بعض واقعات ایسے ہیں کہ انسان ان کی تفسیر اور تعبیر اس کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا کہ یہ قرآن کا اعجاز ہے جو اپنا اثر دکھاتا ہے ۔ اگرچہ یہ کوئی اصول نہیں ہے لیکن ایسے واقعات کا تجزیہ ضروری ہے ۔ میں یہاں دوسرے لوگوں کے واقعات ذکر نہیں کرتا البتہ ایک واقعہ یہاں قارئین کے لیے پیش کرتا ہوں جو کہ خود میرے ساتھ ہوا ۔ (۱)

پندرہ سال قبل کا واقعہ ہے کہ ہم نام نہاد چھ مسلمان ایک مصری بحری جہاز کے ذریعے بحراوقیانوس میں امریکہ کی طرف جا رہے تھے ۔ اس جہاز میں کل ۱۲۰ افراد مرد و زن سوار تھے جن میں سے مسلمان ہم صرف ۶ تھے ۔ ہمارے دل میں یہ بات آئی کہ ہم اس جہاز کے عرشے پر نماز جمعہ ادا کریں ۔ ہمیں نماز پڑھنے کا کوئی زیادہ شوق نہ تھا لیکن یہ نماز ہم نے دینی حمیت کے جذبے کے تحت ادا کی ۔ کیونکہ جہاز میں ایک عیسائی مبلغ تھا اور وہ رات دن جہاز پر تبلیغی کام کرتا تھا ' اس نے ہمارے سامنے بھی عیسائیت کی تبلیغ کی ۔ جہاز کا کپتان انگریز تھا ۔ اس نے ہمیں نماز پڑھنے کی سہولت فراہم کی اور اجازت بھی دے دی ۔ اس نے جہاز کے عملے کو بھی اجازت دی کہ وہ بھی نماز میں شریک ہو سکتے ہیں ۔ یہ سب نوجی مسلم تھے ۔ بشرطیکہ اس وقت وہ ڈیوٹی پر نہ ہوں ۔ یہ مسلمان بھی اس پر بہت خوش ہوئے کہ انہیں نماز جمعہ ادا کرنے کا موقعہ ملے گا ۔ اور یہ کہ کسی جہاز کے اوپر یہ پہلا جمعہ تھا ۔ میں نے خطبہ جمعہ دیا اور نماز کی امامت کرائی ۔ جب ہم نماز پڑھنے لگے تو جہاز کے مسافر حلقہ باندھ کر ہمارے ارد گرد کھڑے تھے اور اس کے بعد سب ہمارے پاس آئے اور انہوں نے اس مذہبی تقریب کی کامیابی پر ہمیں مبارکباد دی ۔ کیونکہ ہماری نماز کے بارے میں وہ یہی کچھ سمجھ سکتے تھے ۔ لیکن ایک عورت جس کی بارے ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ یوگوسلاویہ کی سوشلسٹ جہنم سے بھاگی ہوئی ہے اور عیسائی ہے ۔ وہ ہماری نماز سے بے حد متاثر ہوئی ۔ وہ بے حد جذباتی ہو گئی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے وہ آئی اور اس نے نہایت ہی گرم جوشی سے ہمارے ہاتھ پکڑ لیے ۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہہ رہی تھی : "کہ تمہاری نماز کے اندر جو خضوع و خشوع اور جو روحانیت ہے اس سے وہ بے حد متاثر ہوئی ہے ' اس قدر کہ وہ اپنے تاثرات پر کنٹرول نہیں کر سکتی" ۔ یہ بات تو ہمارے موضوع سے متعلق نہیں جو بات ہمارے موضوع سے متعلق ہے وہ اس کا یہ قول ہے : "یہ کہ تمہارے یہ پادری صاحب کس زبان میں دعا پڑھ رہے تھے" ' وہ تو یہی سمجھ سکتی تھی کہ پادری کے بغیر نماز کیسے ہو سکتی ہے یا کسی مذہبی پیشوا کے بغیر نماز کس طرح ہو سکتی ہے ؟ عام مسیحی گرجوں میں تو یہی ہوتا ہے کہ سبق پادری پڑھتا ہے ۔ ہم نے اس کی غلط فہمی کو دور کر دیا ۔ اس نے کہا : "پھر یہ زبان کون سی تھی ' کیونکہ یہ زبان ایک خاص موسیقی اپنے اندر رکھتی ہے ۔ اور موسیقی بھی عجیب ہے ۔ اگرچہ میں سمجھتی نہیں" ۔ اس کے بعد اس نے ایک اور بات کی جو ہمارے لیے حیرانی کا باعث تھی ۔ اس نے کہا : "یہ کہ میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ امام جو خطبہ دے رہا تھا اس کے خطبے کے اندر جگہ جگہ موسیقی والا یہ انوکھا کلام آ رہا تھا ۔ اس کی عام تقریر علیحدہ تھی ' لیکن بعض اوقات اس کے اندر وہ مخصوص کلام بھی آتا تھا جو ایک خاص

---

(۱) ہندوستان میں ایسے واقعات بکثرت ہوتے ہیں ' لوگ قرآن کریم کا مفہوم نہیں سمجھتے لیکن مجرد براءت سے متاثر ہوتے ہیں ۔ بعض علماء کی تلاوت ہندو مسلم سنتے رہتے تھے اور محظوظ ہوتے تھے ۔ مترجم

موسیقی اثر اپنے اندر رکھتا تھا۔ دوسرے فقروں سے یہ چند فقرے ممتاز ہوتے تھے ۔ وہ کانپتی ہوئی کہہ رہی تھی کہ یہ کلام ایک عجیب اور موثر کلام تھا اور دوسرے کلام سے بالکل جدا تھا۔ یوں نظر آتا تھا کہ گویا امام روح القدس سے بھرا ہوا ہے"۔ یہ اس کا سیجی انداز گفتگو تھا۔ ہم نے اس کی گفتگو پر غور کیا۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ خطبے کے درمیان جو آیات قرآنی جگہ جگہ آتی ہیں اس کی مراد ان آیات سے تھی' خطبہ جمعہ میں اور نماز کی قراءت میں۔ ہمارے لیے حیرانی یہ تھی کہ ایک ایسی عورت جو عربی زبان سے بالکل نابلد ہے لیکن اس پر کلام الہی کا ایسا اثر ہوتا ہے۔

یہ کوئی اصول نہیں ہے لیکن ایسے واقعات جن کا ذکر میرے سامنے بہت سے لوگوں نے کیا ہے اپنے اندر ایک اہمیت ضرور رکھتے ہیں کہ قرآن کریم کی محض تلاوت سے بھی سامعین متاثر ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس عورت کے پختہ ایمان اور اپنے ایمان کی وجہ سے سوشلسٹ جہنم سے فرار کی وجہ سے وہ کلام الہی سے اس قدر متاثر ہو گئی ہو۔ لیکن مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ لاکھوں کی تعداد میں قرآن سنتے ہیں۔ وہ اسے سمجھتے نہیں لیکن ان کے دلوں پر قرآن کریم کی تلاوت کا اثر ہوتا ہے ۔ یہ لوگ فہم قرآن میں اس طرح ہیں جس طرح یہ یوگوسلاوی عورت' لیکن قرآن کا کلامی اعجاز ان پر جادو کا سا اثر کرتا ہے ۔ یہ اثر کیسے ہوتا ہے ہم اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

یہ تو تھی قرآن کی وہ خفیہ اور ناقابل تعبیر اثر آفرینی جس کی ہم وضاحت نہیں کر سکتے ۔ میں نے یہاں اس کا ذکر ان نکات سے قبل کیا جن کو ہم سمجھ سکتے ہیں ۔ اب میں ان نکات کی طرف آتا ہوں جن کو اسالیب کلام کو سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں اور غور و فکر کر سکتے ہیں۔

قرآن کریم کے طرز ادا کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ عظیم اور بڑے بڑے مسائل و معانی کو اس قدر مختصر عبارت میں ادا کر دیتا ہے کہ انسان کے لیے ایسے مقاصد و مفہومات کو اس مختصر سی جگہ میں بیان کرنا محال نظر آتا ہے ۔ مفہوم کو نہایت وسعت اور وضاحت سے بیان کیا جاتا ہے ۔ تعبیر نہایت ہی لطیف و دقیق ہوتی ہے اور حسن و جمال کی تو انتہا نہیں ہوتی ۔ پھر مفہوم اور الفاظ و عبارت اور اس کے اثرات میں مکمل ہم آہنگی اور تناسق بھی ہوتا ہے ۔ ماحول' فضا' خوبصورتی اور حسن تعبیر اور حسن الفاظ سب کے سب ایک جگہ جمع ہوتے ہیں ۔ ایک ایک لفظ اپنی جگہ ضروری ہوتا ہے اور لفظی خوبصورتی کی وجہ سے مفہوم متاثر ہوتا ہے اور نہ مفہوم کی وجہ سے فنی کمال ۔ اور یہ حسن ایک ایسے اعلیٰ مقام تک پہنچتا ہے کہ اس مقام اعجاز تک رسائی ممکن نہیں ہے ۔ قرآن کریم کی اس خوبی کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو اسالیب تعبیر کا کسی قدر علم ہو' کیونکہ فصاحت و بلاغت اور اسالیب تعبیر کو جاننے والے پھر یہ بھی جانتے ہیں کہ اس میدان میں انسان کہاں تک جا سکتا ہے ۔ اور یہ کہ قرآن کا اسلوب کلام انسانی طاقت و قدرت سے وراء ہے ۔

اس خصوصیت کے نتیجے میں قرآن کریم کی ایک دوسری صفت سامنے آتی ہے کہ ایک ہی آیت میں کئی قسم کے مفہوم اس طرح بیان کر دیئے گئے ہیں کہ وہ باہم نہایت ہی ہم آہنگ اور مربوط ہوتے ہیں ۔ ایک ہی آیت میں ہر مضمون اور مفہوم اس طرح وضاحت اور صفائی کے ساتھ بیان ہوتا ہے کہ کسی دوسرے مفہوم سے کوئی صورت نہیں ہوتا اور ہر مفہوم کے لیے اس کی حسب حال عبارت اور جگہ تجویز ہوتی ہے ۔ چنانچہ ہم ایک ہی آیت سے مختلف موضوعات اور مختلف مقاصد کی خاطر استدلال کرتے ہیں اور جس موضوع پر بھی کسی آیت سے استدلال کیا جائے ۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ شاید اس آیت کا اصل موضوع ہی یہ ہے ۔ گویا یہ آیت ابتداء اس مقصد کے لیے بیان ہوئی ہے ۔ یہ قرآن کریم کی وہ

خصوصیت ہے اور اس قدر مکرر ہے کہ اس کی طرف یہاں یہ اشارہ ہی بس کرتا ہے۔ اس سورہ کے مقدمے میں ہم نے قرآن کریم کے جو ٹکڑے دیئے ہیں اگر قاری ان پر نظر دوڑائے تو اسے نظر آئے گا کہ یہ خصوصیت قرآن میں کس قدر مکرر ہے کہ ایک ہی آیت میں متعدد مضامین درج ہیں اور اس سے استدلال مختلف مواقع پر ہوتا ہے۔

قرآن کریم کے طرز ادا کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ قرآن ایک منظر کو اپنی تمام جزئیات کے ساتھ قاری کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ منظر نظروں کے سامنے موجود ہے اور یہ منظر کشی ایسے انداز میں کی جاتی ہے جو کسی انسانی کلام میں موجود نہیں ہے' نہ پہلے اور نہ بعد میں۔ پھر یہ کہ آج تک کوئی ادیب اس طرز ادا کی نقالی بھی نہیں کر سکا۔ اگر کوئی کرتا بھی ہے تو وہ قرآن کا مربوط اور ہم آہنگ انداز قائم نہیں رکھ سکتا اور اس کے اندر اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک مثال پر غور کریں اور پھر دیکھیں کہ کیا انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسے موقع پر یہ طرز ادا اختیار کرے مثلاً

وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَ جُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّ عَدْوًا حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (۱۰: ۹۰) (یہاں تک تو ایک قصہ تھا اس کی حکایت ہوگئی لیکن اس کے بعد متصلاً ایک تقریر آجاتی ہے جو حاضر منظر میں پیش کی جاتی ہے)

آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ (۹۱) فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً (۹۲) (۱۰: ۹۱ - ۹۲)) (اب اس منظر پر ایک تبصرہ آجاتا ہے' منظر آنکھوں کے ابھی سامنے ہے)

وَ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (۱۰: ۹۲)

ایک دوسری مثال

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ (۶: ۱۹) یہاں تک تو حضورؐ کو ہدایت کی جاتی ہے اور حضورؐ ہدایت لیتے ہیں۔ اب آگے اچانک کلام کا رخ مڑ جاتا ہے۔ رسول اللہؐ قوم سے سوال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی (۶: ۱۹) اگلی آیت میں اللہ کی طرف سے اس سوال کا جواب آتا ہے جو خود انہوں نے قوم سے کیا تھا اور انہوں نے گویا جواب دے دیا تھا کہ "ہاں"

قُلْ لَّآ اَشْهَدُ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (۶: ۱۹) قرآن میں موجوں کی طرف روئے سخن مڑتا رہتا ہے اور یہ عمل بار بار یوں ہوتا ہے کہ کلام کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔ ایک دوسری مثال :

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۱۲۸) وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۱۲۹) يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ (۱۳۰) ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ (۱۳۱) (۶: ۱۲۸ تا ۱۳۱) ) غرض اس کی کئی مثالیں قرآن کریم سے دی جا سکتی ہیں۔ یہ انداز کلام انسانوں کے انداز گفتگو سے بالکل مختلف ہے۔ اگر کسی ادیب کو اس میں شک ہے تو اسے چاہئے کہ وہ مشق سخن کر کے اس اسلوب پر کوئی پارۂ ادب لے آئے۔ اور اس کا یہ پارہ ایسے کلام پر مشتمل ہونا چاہئے کہ ایک بامقصد اور قابل فہم اور معقول کلام ہو۔ اس طرح خوبصورت بھی ہو اور موثر بھی ہو اور اس کے اندر وہ موسیقی بھی ہو جو اس کلام میں ہے۔

یہ تو ہیں قرآن کے اعجاز بیان کے بعض پہلو جنہیں ہم نے یہاں محض سرسری طور پر بیان کر دیا ہے۔ اب رہا قرآن کا موضوعاتی اعجاز اور قرآن کی وہ ربانی خصوصیات جو انسانی کلام سے اسے جدا اور ممیز کرتی ہیں تو وہ اور ہیں۔

موضوع کے اعتبار سے قرآن کریم پوری انسانیت اور انسان کی پوری شخصیت سے ہمکلام ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ کبھی انسان کے ذہن کے بارے میں بات کرے، یا اس کا موضوع سخن انسان کا قلب ہو، یا وہ انسانی احساسات کے بارے میں بات کرے بلکہ انسان کی شخصیت بحیثیت مجموعی قرآن کا موضوع ہے اور اس کا خطاب نہایت ہی مختصر طریقے سے ہوتا ہے۔ وہ جب بھی انسان سے مخاطب ہوتا ہے وہ انسان کے قوائے مدرکہ کو ایک ہی بار جھنجوڑتا ہے۔ اور سب کو ایک ہی بار خطاب کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے خطاب سے انسانی دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑتا ہے، انسان سوچنے لگتا ہے اور وہ بے حد متاثر ہوتا ہے۔ آج تک انسان اس قسم کا اثر آفریں کلام یا کوئی اور ذریعہ ایجاد نہیں کر سکا، جو انسان پر اس طرح کا گہرا، ہمہ گیر اور اس طرح کا دقیق اور اس طرح کا واضح اثر چھوڑتا ہو۔ خصوصاً اس انداز اور اس اسلوب میں جو قرآن نے پیش کیا ہے۔

میں اپنی کتاب (خصائص التصور ومقوماتہ) سے بعض فقرے یہاں نقل کرتا ہوں، امید ہے کہ ان سے قرآن کریم کا موضوعی اعجاز کا کچھ تصور ذہنوں میں بیٹھ جائے گا۔ اس کتاب میں ایک باب کا عنوان ہے (المنہج القرآنی فی عرض خصائص

التصور الاسلامی ) یعنی قرآن کریم اسلامی تصورات کو کس طرز پر پیش کرتا ہے ' اس کا طرز ادا کس قدر خوبصورت ہے اور اس کے واضح ترین خد و خال کیا ہیں؟ یہ قرآن کا طرز ادا انسانی اسالیب کلام سے چند پہلوؤں سے ممتاز ہے ۔

(۱) ''وہ حقائق کو اسی طرح پیش کرتا ہے جس طرح وہ عالم واقعہ میں ہوتے ہیں اور اس کا انداز بیان اس قدر جامع ہے کہ اس حقیقت کے تمام زاویے نظروں کے سامنے آ جاتے ہیں ۔ موضوع کے تمام پہلو اور اس کے متعلق تمام امور اور اس کے تمام تقاضے پورے ہو جاتے ہیں لیکن قرآن کا اسلوب کلام نہ موضوع میں کوئی پیچیدگی پیدا کرتا ہے نہ کلام میں' بلکہ مخاطب کے مختلف درجات فہم کے اعتبار سے بھی یہ کلام اس قدر معجز ہے کہ فہم و ادراک کے اعتبار سے ہر سطح کا آدمی اسے بڑی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے ۔ جہاں تک انسانی کلام کا تعلق ہے ہر ادیب ایک متعین سطح کے لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے اور اس نچلی سطح کے لوگ اس کو نہیں سمجھ سکتے ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و مہربانی کی وجہ سے یہ فرض کر کے بات نہیں کی کہ اس کلام کو فلاں فلاں درجے کا علم ' فہم اور ادراک رکھنے والے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں ۔ کیونکہ عقیدہ اور نظریہ ہر انسان کی ضرورت ہے خواہ وہ عالم ہو یا جاہل ہو ۔ اس کائنات کے بارے میں عقیدہ اور نظریہ ہی وہ چیز ہے جو انسان کے طرز عمل اور اس پوری کائنات کے ساتھ اس کے تعلق اور معاملے کو ایک متعین شکل دیتا ہے ۔ پھر انسان کا نظریہ اور اس کی فکر ہی انسان کو وہ سمت عطا کرتی ہے کہ وہ اس کائنات کے بارے میں علم و معرفت کی متعین راہیں تلاش کرے اور طریقہ تعلیم و ترقی متعین کرے ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنیادی عقیدے اور بنیادی تصور کے سیکھنے کے بارے میں کوئی سابق علم بطور شرط نہیں رکھا ہے ' بلکہ علم و معرفت کا نکتہ آغاز ہی اسلامی عقیدے اور تصور کو قرار دیا ہے ۔ اس عقیدے کی روشنی میں انسان نے اس پوری کائنات کی تشریح و توضیح کرنی تھی ۔ کائنات کی حرکت اور خود انسان کی ذات کی حرکت کو اس نے اسی عقیدے اور تصور کی روشنی میں دیکھنا ہوتا ہے تاکہ انسانی علم و معرفت ایک ایسی ٹھوس اور مستحکم اساس پر ترقی کرے جس کے سوا کوئی اور ٹھوس اور مستحکم حقیقت نہیں ہے کیونکہ اس عقیدے کی عطا کردہ سمت کے علاوہ اگر انسان علم و معرفت کی کسی اور سمت میں جا نکلے گا تو وہ ظنیات ' احتمالات کی وادیوں میں بھٹکتا پھرے گا اور کبھی بھی قطعیت تک نہ پہنچ سکے گا ۔ یہاں تک کہ آج کل کا علم جسے ہم تجربی علم کہتے ہیں ' یہ بھی ایک ظنی علم ہے کیونکہ تجربی علم اور سائنس کی بنیاد قیاس پر ہے ۔ کسی نکتے پر انسان استقراء کرتا ' تمام جزئیات کو جمع کرتا ہے اور پھر وہ فرض کر لیتا ہے کہ ہر تجربے کا نتیجہ یہی ہو گا جو ان جزئیات میں ہے جو اس نے جمع کی ہیں ۔ اس میں ایک تو یہ مفروضہ ہے کہ ہم نے تمام جزئیات کا تجربہ اور استقراء درست کیا ہے ' لہٰذا ایسے تجربوں کا رزلٹ یہ آنا چاہئے ۔ ہمارے علم کی منتہا یہ ہے کہ وہ چند جزوی تجربات پر مبنی ہے ۔ اس کے بعد کے تمام نتائج قیاسی ہوتے ہیں ' لیکن خود سائنس اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ یہ تمام تجربات ظنی ہوتے ہیں اور تجربے میں یہ احتمال بھی ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ الٹ ہو ۔ لہٰذا یقینی ذریعہ علم وہی ہے ' جو انسان کے پاس اللہ علیم و خبیر کے ذریعے سے آتا ہے ۔ اس لیے کہ اللہ حقائق پر مبنی باتیں بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلے اور نتائج بیان کرتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ انسان بحیثیت انسان ان تصورات کو معجزانہ طور پر قبول کرتا ہے اور کسی اور ذریعہ علم کو اس طرح یقین اور بھروسے سے قبول نہیں کرتا جس طرح قرآنی تصورات کو قبول کرتا ہے اور یہ ہے قرآن کا موضوعاتی اعجاز''۔

(۲) ''قرآن کریم کا اسلوب انسانی علمی انداز سے مختلف ہے ' انسان کی علمی بحث کا طریقہ یہ ہے کہ انسان کسی مسئلے کے

ایک ہی پہلو پر بحث کرتا ہے' وہ علم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کی تقسیم و تبویب کرتا ہے ـ فلسفیانہ انداز کلام اور فنی انداز مختلف ہوتے ہیں ـ لیکن قرآن مجید بغیر تقسیم و ترتیب ہے ـ اس پوری کائنات اور انسان کے موضوع پر کلام کرتا ہے' یہ کلام نہایت مستقل اور حقیقی ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ جامع بھی ـ اس میں عالم شہادت اور عالم غیب کی باتیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں ـ اس میں کائناتی حقائق' انسان کی ذات کے ساتھ متعلق حقائق اور خدا تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کے مضامین ساتھ ساتھ چلتے ہیں ـ ایک طرف دنیا کی بحث ہے اور ساتھ ہی آخرت کی بحث ہے ـ یہاں انسان کی ارضی زندگی سماوی زندگی کے ساتھ ساتھ موضوع سخن ہے' اور ایسے اسلوب میں کہ انسان کے لیے اس کا اختیار کرنا ہی ممکن نہیں ہے کیونکہ انسان اگر اس اسلوب کی نقالی بھی کرنا چاہے تو وہ ایک دو قدم بھی نہیں چل سکتا ـ قدم ڈگمگاتے ہیں اور وہ اپنا کوئی مقصد قرآنی اسالیب کی طرح کے اسلوب میں بیان ہی نہیں کر سکتا"ـ

"یہ درست ہے کہ قرآن کا موضوع یہ کائنات اور اس کا خالق و مخلوق بطور کل ہے اور وہ بحیثیت مجموعی اس کل سے مخاطب ہوتا ہے' لیکن بعض اوقات مقصد کے اعتبار سے قرآن اپنے بعض پہلوؤں پر زیادہ ارتکاز کرتا ہے ـ مثلاً قرآن کریم اگر اللہ اور انسان کے باہم تعلق کے موضوع پر ہمکلام ہو اور انسان کو رب تعالیٰ سے متعارف کرا رہا ہو تب بھی اللہ تعالیٰ کارخانہ قدرت اور انسان کی ذات اور اس کے نفس سے متعلق حقائق کی روشنی میں یہ تعارف کراتا ہے ـ پھر عالم شہادت کے ساتھ ساتھ عالم غیب میں قدرت الٰہیہ کے کرشمے بھی وہ پیش کرتا ہے اور اگر قرآن کائناتی حقائق اور ان کے آثار سے بحث کر رہا ہو تو بھی وہ قدرت الٰہیہ اور اس کائنات میں اس کی فعالیت کی تمثیلات سے بحث کرتا ہے ـ اور پھر عموماً قرآن کریم اس کائنات میں زندگی اور اس کے آثار کو پیش کرتا ہے ـ خصوصاً انسان کو اور پھر کائنات کے قوانین طبیعت اور اس کے اندر جاری سنن الٰہیہ کو بھی پیش کرتا ہے ـ اگر ذات انسانی زیر بحث ہو تو اس بحث کے دوران کائنات اور اس کائنات میں حیات انسانی کے موضوعات و مشاہدات بھی سامنے لائے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ عالم غیب و عالم شہادت دونوں مربوط ہو جاتے ہیں ـ قرآن عالم شہادت سے عالم غیب کی طرف رخ پھیر دیتا ہے اور اگر دار آخرت کا ذکر ہو تو اس کے ساتھ ساتھ دنیا کی زندگی پر بھی تبصرہ ہوتا ہے اور دنیا و آخرت کو دوسرے حقائق کے ساتھ بھی ملا دیا جاتا ہے اور یہی صورت ہے کہ خالص دنیاوی بحث کے ساتھ بھی آخرت کو جوڑ دیا جاتا ہے"ـ

(۳) "قرآن کریم کے موضوعات کے اختلاف اور تنوع اور ان پر کلی بحث کے باوجود قرآن کریم اپنے اندر ہر حقیقت اور ہر موضوع کو صرف اسی قدر جگہ دیتا ہے جس قدر اس کا حق ہو' اور اللہ کے اس موضوع کی جس قدر اہمیت ہو' اسی قدر اس پر کلام ہوتا ہے ـ یہی وجہ ہے کہ اللہ کی الوہیت' لوگوں کی طرف سے اللہ کی بندگی اور اطاعت اور اس کائنات اور انسان پر اللہ کے اقتدار اور حاکمیت کے قیام کے مضامین قرآن پر چھائے ہوئے ہیں اور یوں نظر آتا ہے کہ توحید' اللہ کی ربوبیت اور حاکمیت وہ مسئلہ ہے جو قرآن کا اصل موضوع ہے ـ اسی طرح عالم غیب' دار آخرت' قیامت کے حالات و مناظر کو قرآن کریم نے بہت ہی جگہ دی ہے ـ اس کے بعد حقیقت انسان اور حقیقت کائنات' اس کائنات میں زندگی وجود میں لانے اور اسباب حیات کی فراہمی کے موضوع کو نہایت ہی بسط سے لیا گیا ہے کیونکہ اللہ کے نزدیک ان امور کی بہت اہمیت ہے ـ غرض حقائق کائنات قرآن میں ملے جلے آئے ہیں ـ کسی بھی حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاتا اور کسی حقیقت کو اس مجموعی غرض اور بیان میں بالکل قلم زد نہیں کیا جاتا ـ ہر حقیقت کو اس کی اہمیت کے مطابق پیش کیا جاتا

ہے۔ اس طرح کہ کسی حقیقت اور موضوع کا کوئی پہلو دوسرے کے ساتھ متضاد نظر نہیں آتا۔ اور اس کتاب کی فصل "توازن" میں ہم نے اس پر کلام کیا ہے۔ یوں کہ اگر قرآن کریم اس کائنات کی وسعت، اس کے عجائبات اور اس کے آثار اور انسانی زندگی کے لیے اس کی افادیت کے بیان سے یہ تاثر نہیں دیتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے نوامیس ہی اللہ اور رب ہیں، جب کہ قدیم اور جدید مادیت پرستوں نے کائنات کی وسعت اور عظمت کو دیکھ کر یہ تاثر قائم کیا۔ اسی طرح اس کائنات میں آثار حیات اور حیات انسانی اور اس کی دقیق حکمتوں اور پیچیدہ عملیات کو سامنے لاکر قرآن نے یہ تاثر نہیں دیا کہ زندگی ہی دراصل اللہ ہے اور حیات ہی کو الوہیت کا درجہ حاصل ہے، اسی طرح ذات انسان اور اس کی شخصیت اور صلاحیتوں کو بیان کر کے قرآن یہ تاثر نہیں دیتا کہ یہ انسان ہی خدا ہے جیسا کہ قدیم و جدید انسان پرستوں نے یہ وطیرہ اختیار کیا۔ اسی طرح اللہ العالمین اور اس کی قوتوں اور قدرتوں کو بیان کرنے کے بعد قرآن یہ تاثر نہیں دیتا کہ اس کائنات میں بس اللہ ہی ہے، مادہ انسان اور دوسرے حقائق کچھ بھی نہیں، سب دوسری چیزیں حقیر ہیں مثلاً ہندو اور بدھ مت وغیرہ میں ہے یا تحریف کردہ عیسائیت میں ہے۔ غرض اسلامی تصور حیات میں یہ ایک حکیمانہ توازن ہے، اس طرح اس متوازن موضوع کے نتیجے میں قرآن کریم کے اسلوب ادا میں بھی ایک خاص توازن ہے اور قرآن تمام حقائق کو ان کی اہمیت کے مطابق اپنے اندر جگہ دیتا ہے۔ تمام حقائق اپنی حقیقی جگہ پر نظر آتے ہیں۔ اور جس قدر اہم وہ فی الحقیقت ہوتے ہیں وہی نظر آتے ہیں اور یہ قرآن کریم کا ایک مخصوص انداز ہے جو کسی انسانی کلام میں نہیں ہوتا، انسانی کلام میں عموماً موضوع کا ایک پہلو غالب آجاتا ہے"۔

(۴) یہ زندہ موثر، پرجوش اور اشاراتی خصوصیات کے ساتھ جب قرآن ان حقائق کو پیش کرتا ہے تو وہ زندہ، موثر اور حسن و جمال سے بھرپور حقائق ہوتے ہیں اور یہ انداز تعبیر نہایت ہی لطیف، جامع اور متعین اور فیصلہ کن ہوتا ہے۔ انسانی انداز کلام اپنے اسلوب بیان، اور تمام انسانی اسالیب کے ساتھ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس بیانی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ حقائق کو نہایت ہی گہرائی اور فیصلہ کن انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ بیان کی فلسفیانہ گہرائی کلام کے حسن و جمال کو ذرہ بھر متاثر نہیں کرتی۔ اور بات کا واضح تعین اس کے اثر اور حسن کو بھی متاثر نہیں کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے انسانی اسلوب کلام میں قرآنی منہاج بیان کی خوبیوں کو قلم بند بھی نہیں کر سکتے۔ اس طرح کہ ہم اپنے ذوق اور احساسات کو پوری طرح قلم بند کر سکیں۔ نیز ہم اپنی شوخی بیان کے باوجود اسلامی تصور حیات اور اس کے بنیادی عناصر کو اس طرح بیان بھی نہیں کر سکتے جس طرح ان کو قرآن نے بیان کیا ہے۔ یہ مباحث ہم لوگوں کے سامنے اس لیے پیش کرتے ہیں کہ لوگ درحقیقت قرآنی زندگی سے بہت دور ہو گئے ہیں اور اس وقت دنیا میں ویسی فضا موجود ہی نہیں ہے، جو نزول قرآن کے وقت موجود تھا۔ نہ وہ قرآنی ماحول موجود ہے اور نہ لوگوں کے اندر قرآن کے بارے میں وہ ذوق و شوق موجود ہے، جس طرح صحابہ کرام کے اندر موجود تھا۔ جس وقت یہ قرآن نازل ہو رہا تھا اور صحابہ کرام اس وقت موجود حالات کے علی الرغم قرآنی ماحول میں زندگی بسر کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے دور میں لوگوں کے اندر قرآن کے منہاج کا ذوق ہی نہیں رہا ہے اور نہ وہ ہمارے دور میں خصوصیات قرآن کے بارے میں سنتے ہیں اور نہ ہی اس کا ذوق ان کے اندر موجود ہے"۔

قرآن عقیدے سے متعلق حقائق بعض اوقات ایسے میدانوں میں بھی بیان کر دیتا جن میں فکر انسانی بالعموم دلچسپی

نہیں لیتی کیونکہ یہ ایسا میدان ہوتا ہے کہ عادتاً لوگ اس کے بارے میں گہرائی کے ساتھ نہیں سوچتے اور نہ ایسے میدان میں نظریاتی سوچ کی جاتی ہے۔

مثلاً سورہ انعام میں علم الٰہی کی وسعت کی تصویر کشی اس طرح کی گئی ہے:

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ

(۶: ۵۹) "اور اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں ان کو اس کے ماسوا کوئی نہیں جانتا۔ وہ جانتا ہے جو خشکی میں ہے اور جو سمندر میں ہے۔ نہیں گرتا کوئی پتہ مگر وہ اسے جانتا ہے اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ بھی، جو خشک ہے یا تر ہے مگر ایک کھلی کتاب میں درج ہے"۔

یہ خفیہ اور ظاہر دور افتادہ مقامات ایسے ہیں کہ ان کے بارے میں انسان عموماً نہیں سوچتا، خصوصاً اس طرز پر۔ انسان اللہ کے علم کی ہمہ گیری کے بارے جس قدر بھی سوچے اور اس کی تصویر کشی اور وسعت کے بارے میں وہ جو کچھ بھی کہے وہ اس قدر وسعت کو بیان نہیں کر سکتا، جیسا کہ سورہ انعام میں اس آیت کی تفسیر کے موقع پر میں نے عرض کیا تھا، اگر انسان اللہ کی وسعت علمی بیان کرتا تو وہ اپنی دلچسپی کے دوسرے میدانوں سے مثالیں تلاش کرتا۔ جلد ہفتم میں ہم نے کہا تھا:

"اس مختصر آیت کا جائزہ ہم جس پہلو سے بھی لیں ہمیں قرآن کا اعجاز نظر آتا ہے اور یہ بات ذہن میں اچھی طرح بیٹھ جاتی ہے کہ قرآن کریم کا مصدر کیا ہے"۔

"موضوع اور مفہوم کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو بھی بادنیٰ تامل یہ بات معلوم کی جا سکتی ہے کہ یہ موضوع ایسا ہے کہ انسان اس طرز پر اس پر کوئی کلام نہیں کرتا۔ انسان جب علم کی عمومیت اور احاطہ علمی کے موضوع کو بیان کرتا ہے تو اس کی نگاہ ان وسعتوں تک جاتی ہی نہیں جو اس آیت میں اختیار کی گئی ہیں۔ انسانی ذہن جب علمی وسعت بیان کرتا ہے تو وہ ان حدود میں جاتا ہے جن کو وہ اہم سمجھتا ہے۔ انسان جب اللہ کے علم کلی کو بیان کرتا ہے تو اس کا دوسرا ہی رنگ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ انسان کا ذہن اس طرف جاتا ہی نہیں کہ اقطار عالم میں موسم خزاں و بہار میں رطب و یابس اور گرنے والے پتوں کو شمار کیا جائے؟ اس لیے انسان اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا اور نہ اس میں دلچسپی لیتا ہے۔ اس لیے انسانی طرز تعبیر بالعموم ایسی نہیں ہوتی کہ کلی علم کی تعبیر کے لیے یہ انداز اختیار کرے۔ یہ کام چونکہ اللہ تعالیٰ کا ہے اس لیے وہی اس کا ذکر کر سکتا ہے۔

"اسی طرح رطب و یابس کے بارے میں بھی انسان کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کائنات کے رطب و یابس سے استفادہ کرے۔ لیکن رطب و یابس سے اللہ کے علم کلی کا استدلال کرنا بھی انسان کا طرز استدلال نہیں ہے۔ یہ صرف اللہ کا کام ہے کہ تمام رطب و یابس کو شمار کرے۔

"اسی طرح انسان اس بارے میں بھی نہیں سوچ سکتا کہ ہر گرنے والا پتہ، ہر وہ دانہ جو زمین کی تاریکیوں میں پڑا ہے اور ہر رطب و یابس ایک کتاب میں ریکارڈ ہوتے ہوں۔ کیونکہ انسانوں کو اس بات کی ضرورت ہی کیا پڑتی ہے۔ ان کو اس

شمار میں فائدہ کیا ہے ۔ پھر اس کا ریکارڈ تیار کرنا انسان کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے ۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کام ہے کہ اپنی کائنات کے اندر جس قدر بھی چیزیں ہیں ان کا شمار کرے ' ریکارڈ کرے ' خواہ وہ چھوٹی چیزیں ہوں یا بڑی چیزیں ہوں ' پہاڑ ہوں یا رائی ہو ۔ کیونکہ اس کے علم میں سب چیزیں حاضر ہیں اور اس کے نزدیک دور قریب برابر ہیں ۔

یہ وسیع ' عمیق اور کلی منظر اور نہایت ہی خوبصورت منظر کہ ایک درخت سے بے شمار پتے گر رہے ہیں اور پورے کرۂ ارض پر یہ پتے گر رہے ہیں ' پھر مختلف قسم کے دانے اور بیج جو اس کے اطراف و اکناف میں پیدا ہوتے ہیں اور گرتے ہیں ۔ اور پھر پورے عالم اور اس کرۂ ارض کی سطح پر جو بھی رطب و یابس ہے وہ سب کے سب یہ ایک وسیع منظر ہے ۔ اور نہ صرف یہ کہ اس منظر کی طرف عادتاً انسانی سوچ متوجہ ہی نہیں ہوتی بلکہ انسانی فکر و نظر کے احاطے سے بھی یہ منظر باہر ہے ۔ صرف اللہ کا علم اس کا احاطہ کر سکتا ہے جس کا علم کلی ہے ۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے ۔ اور ہر چیز اس کے احاطے میں ہے ۔ اس کے علم کے سامنے چھوٹا و بڑا ' چھپا اور ظاہر ' معلوم اور مجہول بعید اور قریب یکساں ہیں ۔

جو لوگ انسانی شعور کے بارے میں کچھ علم رکھتے ہیں جو لوگ انسانی طرز تعبیر کے مختلف اسالیب سے واقف ہیں وہ انسانی تصور کے حدود سے بھی واقف ہوتے ہیں اور وہ انسانی تعبیرات کی حدود سے بھی واقف ہیں اور وہ لوگ اپنے انسانی تجربے سے بھی معلوم کر لیتے ہیں کہ اس قسم کے مناظر انسانی ذہن میں نہیں آتے اور نہ انسان اس انداز سے بات کرتا ہے اور جن لوگوں کو اس بارے میں شک ہے تو ان کا فرض ہے کہ وہ آج تک کے تحریر شدہ انسانی کلام کو پڑھیں کہ انسان کبھی بھی ان جیسی باتوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور نہ ہی ہو سکتا ہے "۔

" قرآن کریم میں یہ آیات اور اس قسم کے جو بے شمار مناظر دکھائے گئے ہیں جو انسانی فکر اور سوچ کی جولانگاہ سے بھی بہت دور ہیں ' یہی اس بات کے لیے کافی ہیں کہ یہ کلام خدا کا کلام ہے "۔

" بذات خود تعبیر کے پہلو سے اس آیت کے اندر فنی خوبیاں موجود ہیں ۔ اس میں خوبصورتی اور سلاست کا ایک جہاں آباد ہے ۔ اس طرح انسان ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اور اس بلند سطح پر کہ

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ (٦ : ٥٩) " اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں اور جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا "۔ آفاق اور گہرائیاں اور عالم مجہول مطلق میں سربستہ راز ہیں ' زمان و مکان میں اور کسان میں ' ماضی میں ' حاضر میں اور مستقبل کے اندھیروں میں ' واقعات زندگی میں اور تصورات اور وجدان میں ۔

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَحْرِ (٦ : ٥٩) " بر و بحر میں جو کچھ ہے وہ جانتا ہے "۔ طویل فاصلے میں ' طویل و عریض آفاق ہیں ۔ بلندیوں پر بھی اور گہرائیوں میں بھی ' وسیع اور شامل و کامل اور اس پورے عالم شہود میں بھی اور یہ عالم غیب میں بھی ہیں جو نظروں سے اوجھل ہے ۔

وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا (٦ : ٥٩) " نہیں گرتا کوئی پتہ مگر وہ اسے جانتا ہے "۔ ہر وقت موت اور نابودی رواں دواں ہے ۔ انسان اور پتے گر رہے ہیں ' زندگی بطرف عدم چل رہی ہے ' اللہ اسے جانتا ہے ۔

وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمٰتِ الْأَرْضِ "زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ بھی ہے تو اسے وہ جانتا ہے"۔ یہ نباتات کی زندگی ہے، بیج مسلسل اگ رہے ہیں اور گہرائیوں سے سطح پر آرہے ہیں۔ ایک دانہ پردے سے ظہور کی طرف آتا ہے اور آگے بڑھتا ہے، اسے وہ جانتا ہے۔

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ (٦: ٥٩) "جو رطب و یابس ہے، وہ کتاب میں درج ہے"۔ یہ ایک عام جامع اور مانع عمومیت ہے، جو زندگی اور موت، جو بہار و خزاں اور ہر قسم کی ذی حیات کو شامل ہے۔

اب ذرا غور فرمائیں اس طرز کی دقت اور شمولیت کا تصور کوئی انسان کر سکتا ہے پھر نہایت ہی خوبصورتی اور حسن کے ساتھ اور جامع و مانع عمومیت کے ساتھ، ماسوائے اللہ علیم و بصیر کے اس قدر دقیق نظر کس کی ہو سکتی ہے۔

اسی طرز کی ایک دوسری آیت کا ٹکڑا ملاحظہ کریں

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ الرَّحِيمُ الْغَفُورُ (٣٤: ٢) "جو چیزیں زمین میں گھستی ہیں اور جو اس سے نکلتی ہیں، جو آسمانوں سے نازل ہوتی ہیں اور جو اس میں سوار ہوتی ہیں وہ جانتا ہے، وہ نہایت رحیم اور غفور ہے۔" ذرا غور کیجئے، یہ چند الفاظ ہیں، لیکن پوری صفحہ ہستی کو نظروں کے سامنے پھیلا دیتے ہیں، ایک عظیم تعداد ہے مختلف اشیاء کی، ان اشیاء کا حجم شکل اور تعداد بھی مختلف ہے، ان کا فہم، ہیئت اور تصور بھی رنگا رنگ ہے۔ کیا اس قدر قلیل الفاظ میں انسان اس جہاں کو گھیر سکتا ہے۔

انسان اگر اس مفہوم کو ریکارڈ کرنا شروع کر دیں اور یہ ریکارڈ بھی چند منٹوں میں تیار کرنا ہو تو کیا وہ یہ ریکارڈ تیار کر سکتے ہیں کہ ان منٹوں میں کیا کچھ زمین میں گیا اور کیا نکلا اور کیا اترا اور کیا آسمان کی طرف چڑھا؟ ممکن نہیں کیونکہ کتنی ہی چیزیں ہیں جو زمین کے اندر جاتی ہیں، کتنی ہیں جو باہر آتی ہیں اور کتنی ہیں جو نازل ہوتی ہیں اور کتنی ہیں جو آسمانوں کی طرف عروج کرتی ہیں۔

کس قدر چیزیں زمین میں گھستی ہیں؟ کس قدر بیج زمین کی پہنائیوں میں گرتے ہیں؟ کس قدر ذرے، کیڑے مکوڑے زمین کے اندر گھسے جا رہے ہیں، کس قدر پانی کے قطرے کس قدر گیس کے ذرات، کس قدر سورج کی شعاعیں، کیا کیا چیزیں اور کس قدر چیزیں؟ لیکن اللہ کی آنکھ دیکھ رہی ہے، وہ غافل نہیں ہے۔

کس قدر چیزیں نکلتی ہیں؟ نباتات کے پودے پھوٹتے ہیں، چشمے ابلتے ہیں، کس قدر آتش فشاں پھٹتے ہیں، کس قدر ذرات گیس نکلتے ہیں، کس قدر مستور چیزوں کا ظہور ہوتا ہے، کس قدر حشرات نکلتے ہیں، کس قدر جراثیم جو نظر آتے ہیں اور جو نہیں آتے اور وہ جہاں جن سے انسان کا علم دور ہے اور وہ پردہ جہالت میں مستور ہیں جبکہ اللہ جانتا ہے۔

کتنی چیزیں ہیں جو آسمانوں سے نازل ہو رہی ہیں، بارش کے کتنے قطرے نازل ہوتے ہیں؟ کس قدر شہاب ثاقب اترتے ہیں؟ کس قدر جلانے والی شعاعیں اترتی ہیں؟ کس قدر روشنی پھیلانے والی شعاعیں نازل ہو رہی ہیں؟ کس قدر فیصلے ہیں جو نفاذ کے لیے آتے ہیں اور کس قدر تقدیریں ہیں جو مقدر ہیں اور ظاہر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ کتنی ہی رحمتیں ہیں

جو انسانی وجود پر نازل ہوتی ہیں؟ اور کتنی ہیں جو بعض بندوں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں اور کتنے ہی ارزاق ہیں جن کو اللہ بعض بندوں کے لیے پھیلا دیتا ہے۔ غرض اس کائنات کے عالم بالا سے کیا کچھ ہے جو اترتا ہے اور اسے صرف اللہ ہی گن سکتا ہے۔

اور کیا کیا اوپر چڑھتا ہے؟ کتنی روح ہیں خواہ وہ نباتات کے ہیں' انسانوں کے ہیں' یا دوسری مخلوقات کے ہیں جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ کتنی ہی پکاریں ہیں' خفیہ بھی ہیں یا علانیہ ہیں جو اللہ کے دربار میں اوپر لے جائی جاتی ہیں؟ اور ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں سنتا اور نہ سن سکتا ہے؟

اس عظیم مخلوقات کی ارواح کا شمار کیا ہے جن میں سے بعض کو تو ہم جانتے ہیں اور بعض کو سرے سے جانتے ہی نہیں اور کتنے ہی فرشتے ہیں جو روح الامین کے احکام لے کر چڑھتے ہیں اور اترتے ہیں اور کتنی ہی ارواح ہیں جو اس کائنات میں پھڑپھڑا رہی ہیں اور اللہ کے سوا کوئی انہیں جانتا ہی نہیں؟

ذرا سوچو تو سہی! سمندروں سے کس قدر بخارات اور ان کے ذرات اٹھتے ہیں؟ گیس کے کس قدر ذرات اٹھتے ہیں اور کس قدر جراثیم و اشیاء ہیں جنہیں ہم ابھی تک نہیں جانتے؟

اور ذرا وقت کو دیکھو! ایک لحظہ! پھر علم انسانی نے لحظہ کا تجزیہ کر کے اس کے اندر کس قدر بے شمار عمریں اور کس قدر اجزاء و تعداد نکالی ہے۔ جبکہ اللہ کا علم کلی محیط' ہر آن اور ہر لحظہ اور ہر مکان' ان سب لحظات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ پھر ایک ایک دل کو لیجیے۔ اس میں بے شمار نیات' خیالات' اور امنگیں اور پھر اس کے مطابق انسان کے اعضاء کی حرکات یہ سب کچھ اللہ کی نگاہ میں اور ان میلان اور امنگوں میں اچھی بھی ہیں اور بری بھی اور سب کی سب اللہ نے پردے میں رکھ دی ہیں اور وہ ہر وقت غفور و رحیم ہے۔

قرآن کی ایک ہی آیت جیسا کہ آیت زیر بحث ہے اپنے اندر مفاہیم کی یہ وسعتیں اور معانی کا یہ سمندر اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ کیا انسان ایسا کر سکتا ہے اور اس طرح سوچ سکتا ہے۔

مَا هٰذَا قَوْلُ الْبَشَرِ ایسے خیالات و تصورات انسان کی قوت مخیلہ میں سما ہی نہیں سکتے۔ اور نہ انسانی میلانات میں ایسے تصورات کا کوئی داعیہ ہے۔ اور پھر چند الفاظ میں اور پلک جھپکتے ہی یہ مفاہیم و معانی کے اس سمندر کو چند الفاظ کے کوزۂ محدود میں بند کر دینا صرف باری تعالیٰ کی صفت کاری ہو سکتی ہے اور انسانی الفاظ کی بازی گری یہ کام نہیں کر سکتی!

ایک اور پہلو بھی اعجاز لیے ہوئے' قرآن کریم بعض اوقات بظاہر نہایت ہی چھوٹے واقعات سے ربانی طرز استدلال کرتا ہے۔ بظاہر چھوٹا سا واقعہ ہوتا ہے لیکن اس کی حقیقت عظیم ہوتی ہے اور اس سے ایک عظیم حقیقت کو ثابت کر دیا جاتا ہے۔ اللہ کے کلام میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں مثلاً:

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ (۵۷) اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ (۵۸) ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ (۵۹) نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ

(٦٠) عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَکُمْ وَنُنْشِئَکُمْ فِیْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (٦١) وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ

النَّشْاَۃَ الْاُوْلٰی فَلَوْلَا تَذَکَّرُوْنَ (٦٢)(٥٦: ٥٧ تا ٦٢)) "ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے پھر کیوں تصدیق نہیں کرتے؟ کبھی تم نے غور کیا' یہ نطفہ جو تم ڈالتے ہو' اس سے بچہ تم بناتے ہو یا اس کے بنانے والے ہم ہیں؟ ہم نے تمہارے درمیان موت کو مقدر کیا ہے' اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری شکلیں بدل دیں اور کسی ایسی شکل میں تمہیں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے اپنی پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہی ہو' پھر کیوں سبق نہیں لیتے؟"

اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ (٦٨) ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْہُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ

الْمُنْزِلُوْنَ (٦٩) لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰہُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْکُرُوْنَ (٧٠) اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ

تُوْرُوْنَ (٧١) ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَھَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ (٧٢) نَحْنُ جَعَلْنٰھَا

تَذْکِرَۃً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ (٧٣) فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّکَ الْعَظِیْمِ (٧٤)(٥٦: ٦٨ تا

٧٤)) "کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا' یہ پانی جو تم پیتے ہو' اسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اس کے برسانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا کر رکھ دیں' پھر کیوں تم شکر گزار نہیں ہوتے؟

کبھی تم نے خیال کیا' یہ آگ جو تم سلگاتے ہو' اس کا درخت تم نے پیدا کیا ہے' یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اس کو یاد دہانی کا ذریعہ اور حاجت مندوں کے لیے سامان زیست بنایا ہے پس اے نبیؐ' اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو"

قرآن کریم کا کمال یہ ہے کہ یہ انسان کے عادی اور مالوف امور کو عظیم کائناتی مسائل بنا دیتا ہے اور ان کو اس قدر عظیم تکوینی امور ثابت کر دیتا ہے جن کے اندر فی الواقع محیر العقول تکوینی ضوابط پوشیدہ نظر آتے ہیں۔ لیکن اس سے قبل انسان ان پر بالکل سرسری نظر ڈالتا تھا۔ قرآن ان کو روز مرہ کے واقعات کے لیے قابل غور و فکر موضوعات بنا دیتا ہے اور ایک طرز فکر عطا کرتا ہے۔ اور یہ غور و فکر اور نقطہ نظر ایک عظیم عقیدے اور ایک مکمل تصور کائنات کی شکل میں سامنے آتا ہے اور یوں انسان کو ایک خاص سوچ اور شعور اور حکمت و دانائی ملتی ہے۔ پہلے بھی یہ مناظر انسان کی نظروں سے روز گزرتے تھے اور انسان کبھی ان پر گہرا غور کرنے کی زحمت ہی نہ کرتا تھا۔ لیکن قرآن کی اس حقیقت افروز تعلیم کی وجہ سے انسان اپنے اندر اور اپنے ماحول کے اندر ان عجائبات پر غور کر کے ایک بیدار انسان بن جاتا ہے۔

قرآن کریم انسان کو فقط معدودے چند خارق عادت معجزات دکھا کر مبہوت نہیں کرتا۔ اسی طرح قرآن کریم انسان کو صرف ان معجزات و دلائل کی طرف متوجہ نہیں کرتا جو اس کی ذات سے باہر ہیں' یا جو انسانوں کے روز مرہ واقعات سے دور ہیں اور کبھی انہوں نے دیکھے نہیں ہیں مثلاً پیچیدہ فلسفیانہ مسائل عقلی صغریٰ و کبریٰ یا ایسے سائنسی تجربے جن تک عام انسان کی پہنچ نہیں ہے۔ اس غرض کے لیے کہ انسان کو کوئی عقیدہ و تصور دے یا اس کائنات اور انسانی زندگی کے بارے

میں انسان کو کوئی سوچ دے بلکہ قرآن انسان کے روز مرہ واقعات سے گہری سوچ پیدا کرتا ہے۔

انسان کا نفس بھی اللہ کی مصنوعات میں سے ایک صنعت ہے۔ انسان کے ارد گرد ماحول میں جس قدر مظاہر ہیں وہ بھی بہرحال اللہ کی قدرت ہی کے کرشمے ہیں۔ اور اللہ کی صنعت میں سے ہر ایک صنعت کے اندر ایک معجزہ ہے۔ اور ان تمام معجزات کی کتاب یہ کتاب اللہ ہے۔ لہٰذا قرآن مجید لوگوں کو اس کائناتی معجزات کی طرف متوجہ کرتا ہے جو انسان کے ارد گرد اللہ کی مخلوقات کے اندر پوشیدہ ہیں۔ یہ معجزات روز کے واقعات کی شکل میں ہمارے سامنے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ اس سے پہلے انسان ان معجزات کو دیکھتا تھا مگر وہ ان کے اندر اعجاز کے پہلو کا ادراک نہ کر سکتا تھا کیونکہ یہ روز مرہ واقعات ہوتے تھے اور دیکھتے دیکھتے انسان کے لیے ان کا اعجاب و اعجاز ختم ہو جاتا تھا لیکن قرآن انسان کی آنکھیں کھولتا ہے اور ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ان پر غور کرے تاکہ وہ ان کے اندر پائے جانے والے عظیم اعجاز کو پا سکے کہ ان واقعات کے اندر قدرت معجزہ کیا ہے۔ ان کے اندر اللہ وحدہ کی حکمت وحدانیہ کس طرح کارفرما ہے۔ اور یہ کہ کاریگر ازل کی صنعت کاری خود ان مشاہدات اور انسان کی ذات کے اندر کس طرح کارفرما ہے۔ اور ان کے اندر کیا کیا دلائل ایمان موجود ہیں اور کیا دلائل ہیں جو انسان کو عقیدۂ توحید عطا کرتے ہیں اور کس طرح فطرت انسانی کی بیداری کا باعث بنتے ہیں۔

اسی منہاج پر قرآن کریم آگے بڑھتا ہے۔ لوگوں پر وہ نشانیاں پیش کرتا ہے جو خود ان کی تخلیق میں پوشیدہ ہیں' ان کے نفس کے اندر موجود ہیں۔

اس نظام زراعت اور نباتات میں موجود ہیں جس کو وہ اپنے ہاتھوں سے چلاتے اور اگاتے ہیں' پھر یہ آیات قدرت اس پانی میں موجود ہیں جسے وہ رات اور دن پیتے ہیں' یہ آگ جو وہ جلاتے ہیں' اس میں بھی اللہ کی قدرت کی نشانیاں موجود ہیں اور ان کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ان کے مالوفات میں سے ہیں۔ پھر قرآن کریم ان کے سامنے ان کی زندگی کی انتہا کو پیش کرتا ہے۔ آخری لمحات ہوتے ہیں ان کے اس زمین پر۔ ہر فرد ان لمحات سے دوچار ہوتا ہے۔ تمام حیلے اور تمام تدابیر ختم ہو جاتی ہیں اور اب انسان کو اللہ کی قدرت کا براہ راست آمنا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ تمام تدابیر اور حیلے بہانے یہاں ختم ہو جاتے ہیں اور ہر شخص کی زندگی کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم کا یہ طریقہ کہ وہ انسانی فطرت سے براہ راست مخاطب ہوتا ہے' یہ بتاتا ہے کہ اس کا مصدر اور منبع کہاں ہے؟ یہ وہی سرچشمہ ہے جس سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کا تعمیر شخصیت کا طریقہ وہی ہے جو اس کائنات کی تعمیر کا ہے۔ کائنات کی تعمیر میں ایٹم چھوٹا ہونے کے بجائے خود معجزہ ہے' ایک خلیہ چھوٹا ہونے کے باوجود ایک معجزہ ہے۔ لہٰذا قرآن کریم اس دنیا کی معمولی اور عادی چیزوں کو لے کر ان سے وہ عظیم نظریاتی نتائج اخذ کرتا ہے اور اس کائنات کا ایک وسیع تصور پیش کرتا ہے۔ مشاہدات ایسے لیتا ہے جو ہر انسان کے زیر تجربہ ہوتے ہیں مثلاً نسل' فصلیں' پانی' آگ' زندگی اور موت۔ اب بتایئے کہ اس زمین میں رہنے والا کوئی انسان ہے جو ان امور کے تجربے سے نہ گزرا ہو۔ اگر کوئی غار میں زندگی بسر کرتا ہے تو زندگی کے جنین کو دیکھتا ہے' نباتات کو دیکھتا ہے۔ پانی کو بہتا دیکھتا ہے' آگ کو دیکھتا ہے' اور موت اس کی نظروں کے سامنے واقعہ ہوتی ہے۔ یہی مشاہدات ہیں جن کو نہایت ہی گہرائی سے قرآن مشاہدہ کراتا ہے اور اس سے عظیم عقیدہ اور نظریات اخذ کرنے کی تربیت دیتا ہے۔ کیونکہ قرآن ہر انسان سے مخاطب ہے خواہ وہ جس ماحول اور جس سوسائٹی میں رہتا ہو' جبکہ یہ سادہ حقائق جو قرآن پیش کرتا ہے اپنی حقیقت کے اعتبار سے عظیم حقائق ہیں۔ اور نظام ربوبیت

کے اعلیٰ ترین اسرار ہیں' یہ نہایت ہی سادہ ہیں اور ان سادہ حقائق کے ذریعہ قرآن کریم فطرت انسانی کے قریب ہوتا ہے' لیکن یہ حقائق ہی اعلیٰ درجے کے علماء سائنس کا موضوع تحقیق اور موضوع تعلیم وتحقیق ہیں ـ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے مزاج سے اس کے سرچشمے کو معلوم کرنے کے موضوع پر اس قدر بات کافی ہے اور اس سورت کو سمجھنے کے سلسلے میں اس قدر بحث کافی ہے ـ صدق اللہ العظیم ـ

مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۱۰ : ۳۷) "قرآن کریم کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اللہ کی وحی کے بغیر اسے تصنیف کر لیا جائے"۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۰ : ۳۸) "کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو' اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورت اس جیسی تصنیف کر لاؤ' اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو' مدد کے لیے بلا لو"۔

یہاں قرآن مجید مخالفین کو صرف ایک چیلنج دے دیتا ہے اور اس موضوع پر کسی مزید جدل و جدال سے احتراز کرتا ہے اور یہ فیصلہ دے دیتا ہے کہ یہ لوگ محض ظن وتخمین کی بنیاد پر کام کرتے ہیں ـ یہ لوگ ایسے معاملات کے بارے میں فیصلہ کن رائے دیتے ہیں جن کے بارے میں انہیں کوئی علم ہی نہیں ہے ـ حالانکہ فیصلہ کن رائے دینے سے قبل یہ ضروری ہے کہ رائے دینے والا اس موضوع پر وافر مقدار علم رکھتا ہو' محض رائے پسندی اور ظن وتخمین پر بات نہ کرتا ہو' یہاں وہ جو فیصلہ کرتے ہیں' وہ قرآن کا وحی من جانب اللہ ہونا ہے اور اس بات کی تکذیب کہ اس میں جو وعدو عید ہے وہ سچی نہیں ہے' حالانکہ تکذیب کا یہ حکم کسی علم پر مبنی نہیں ہے اور جب وعدو عید کا فیصلہ ہو گا اور قیامت آ جائے گی تو ان کے سامنے حقیقت تب آئے گی ـ

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ (۱۰ : ۳۹) "اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور جس کا مآل بھی ان کے سامنے نہیں آیا' اس کو انہوں نے (خواہ مخواہ) جھٹلا دیا"۔

ان کی پوزیشن اس معاملے میں ویسی ہی ہے جیسے ان سے قبل کے جھٹلانے والوں کی تھی' جو ظالم بھی تھے اور اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے بھی تھے ـ لہٰذا سوچنے والا سوچ لے اور دیکھ لے کہ ان سابقہ مکذبین کا انجام کیا ہوا اور ان کا کیا ہونے والا ہے؟

كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ (۱۰ : ۳۹)
(اسی طرح تو ان سے پہلے کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں پھر دیکھ لو ان ظالموں کا کیا انجام ہوا)۔

جب ان کی اکثریت محض ظن کی تبع ہے اور ایک ایسی حقیقت کی تکذیب کر رہی ہے جس کا انہیں علم نہیں ہے'

لیکن بعض لوگ اس کتاب کی سچائی پر یقین بھی رکھتے ہیں' سب کے سب ہی تکذیب کرنے والے نہیں ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ

( ۱۰ : ۴۰ ) (ان میں سے کچھ ایمان لاتے ہیں اور کچھ نہیں لاتے' اور تیرا رب ان مفسدوں کو خوب جانتا ہے)۔
اور ظاہر ہے کہ مفسد وہی ہیں جو ایمان نہیں لاتے۔ اس کرۂ ارض پر اس سے بڑا اور کوئی فساد نہیں ہے کہ لوگ ایمان نہ لائیں اور صرف اللہ وحدہ کی بندگی اور غلامی نہ کریں۔ تمام فسادوں کی جڑ یہ ہے کہ لوگ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کریں اور حاکمیت اللہ وحدہ کی نہ رہے اور وہ فسادات رونما ہو جائیں جو غیر اللہ کی حاکمیت کے نظام کی وجہ سے دنیا میں چلتے ہیں۔ یہ فساد اتباع نفس اور اتباع غیر اللہ کی وجہ سے رونما ہوتا ہے۔ اور پھر زمین میں کئی قسم کے خدا اگ آتے ہیں اور وہ اپنی ربوبیت کے قیام کے لیے شر و فساد برپا کرتے ہیں۔ لوگوں کی روحانی زندگی کو برباد کرتے ہیں' ان کے خیالات کو برباد کرتے ہیں' ان کی اقدار اور تصورات کو بگاڑ دیتے ہیں۔ پھر وہ ان کی دولت کو برے کاموں اور برے طریقوں سے خرچ کرتے ہیں اور ان کی معیشت کو تباہ کر دیتے ہیں اور اس طرح وہ اپنا جھوٹا اقتدار قائم کرتے ہیں۔ جاہلیت کی قدیم اور جدید تاریخ اس فساد پر شاہد ہے جو ایمان نہ لانے والے مفسدین نے اس جہاں میں برپا کیا۔

کتاب اللہ کے بارے میں ان کا موقف بیان کرنے کے بعد اب روئے سخن حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو جاتا ہے۔ آپ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ آپ مکذبین کی تکذیب کی وجہ سے متاثر نہ ہوں' ان سے اپنا دامن جھاڑ لیں اور اعلان کر دیں کہ آپ ان سے بری الذمہ ہیں اور آپ کے ساتھ جو سچائی ہے اس کی بنا پر یہ ان سے علیحدہ ہو جائیں اور ان سے دو ٹوک بات کریں۔

وَ اِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓئُوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ

مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ( ۱۰ : ۴۱ ) (اگر یہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے کہ میرا عمل میرے لیے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لیے' جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری سے تم بری ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو' اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں)

یہ ان کے وجدان کو جگانے کی آخری کوشش ہے کہ بس اب ہم نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو چھوڑ دیا ہے' تم جانو اور تمہارا انجام۔ جبکہ اوپر بتا دیا گیا کہ انجام کیا ہو گا۔ یہ بعینہ اسی طرح ہے کہ بعض اوقات انسان ایک نافرمان بچے کو بیچ راہ کے چھوڑ دیتا ہے کہ اچھا جاؤ تم جس راہ پر چلتے ہو' اور یہ اسلوب عتاب بسا اوقات کامیاب رہتا ہے۔

اب یہاں رسول اللہ کے حوالے سے ان میں سے بعض لوگوں کے مخصوص رویے کے بارے میں یہاں بتایا جاتا ہے کہ بعض لوگ سنتے ہیں مگر غور نہیں کرتے۔ اور آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور ان کی حقیقی حالت ایسی ہے گویا ان کی آنکھوں میں بینائی ہی نہیں ہے یعنی یہ سننا اور یہ دیکھنا ان کے لیے مفید نہیں ہے۔ وہ راہ راست پر نہیں آتے۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَ لَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ( ۴۲ ) وَ

مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ اَفَاَنْتَ تَهْدِی الْعُمْیَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ (۴۳)(۱۰: ۴۲ ـ ۴۳)) (ان میں سے بہت سے لوگ ہیں جو تیری باتیں سنتے ہیں مگر کیا تو بہروں کو سنائے گا خواہ وہ کچھ ہی نہ سمجھتے ہوں ـ ان میں سے بہت سے لوگ ہیں جو تجھے دیکھتے ہیں 'مگر کیا تو اندھوں کو راہ راست بتائے گا خواہ انہیں کچھ نہ سوجھتا ہو) ـ

یہ لوگ ایسے ہیں کہ سنتے ہیں لیکن جو کچھ وہ سنتے ہیں ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے' وہ دیکھ رہے ہیں لیکن اپنے مشاہدات سے کچھ سبق نہیں لیتے ـ اور ہر زمان و مکان میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہی ہوتی ہے ـ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایسے لوگ موجود تھے اور حضورؐ کا بس نہ چلتا تھا کہ ان کو تبدیل کر دیں کیونکہ ان کے اعضائے مدرکہ اس طرح مسخ ہو گئے تھے کہ وہ کوئی حقیقت ان کی عقلوں تک منتقل ہی نہ کرتے تھے ـ گویا یہ اعضاء معطل تھے اور اپنے فرائض طبیعی ادا نہ کرتے تھے اور رسول اللہ کی قدرت میں یہ بات نہ تھی کہ وہ بہرے کو سنائیں یا اندھے کو دکھائیں ـ یہ قدرتی کام تھا اور خالق کائنات ہی یہ کر سکتے تھے ـ اللہ نے تو اپنی مخلوق کے لیے ایک سنت مقرر کی ہے اور لوگوں کو سنن الٰہیہ کے مطابق آزاد چھوڑ دیا ہے ـ ان کو کان 'نظر اور دوسری قوتیں دی ہیں تاکہ وہ حقائق کا ادراک کریں ـ تو اگر وہ جان بوجھ کر اپنی قوائے مدرکہ کو معطل کرتے ہیں تو یہ ان کا اپنا قصور ہے اور اس کے نتائج بھی انہی کو بھگتنا پڑیں گے اور وہ منصفانہ ہوں گے ـ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۱۰: ۴۴) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا' لوگ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں" ـ ان آخری آیات میں رسول اللہؐ کے لیے تسلی ہے 'کیونکہ جب آپ لوگوں پر سچائی پیش کرتے تھے اور لوگ نہ مانتے تھے تو اس پر آپ بے حد پریشان ہوتے تھے اور بار بار کی یاد دہانی پر بھی وہ نہ مانتے تھے تو آپ دل تنگ ہوتے تھے ـ چنانچہ اللہ کی طرف سے تسلی آئی کہ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے اور اس سچائی میں کچھ کمی نہیں ہے جو آپ بیان کر رہے ہیں ـ بلکہ یہ خود اندھے اور بہرے ہو رہے ہیں اور کان اور آنکھیں کھول کر بات پر غور نہیں کرتے ـ لہٰذا انکار کا سبب نہ داعی میں ہے اور نہ دعوت میں ـ یہ قصور خود ان لوگوں کا ہے جن کو دعوت دی جا رہی ہے ـ

ان آیات میں عبودیت اور اللہ کی حاکمیت کی ایک قطعی صورت بتائی گئی ہے ـ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو بھی دیکھا جائے تو آپ بھی اللہ کے بندوں میں سے بندے ہیں' دائرہ بندگی سے باہر آپ کی کوئی قدرت اور طاقت نہیں ہے ـ تمام امور کے فیصلے اللہ کے اختیار میں ہیں ـ

اب اچانک ان کے سامنے قیامت کا ایک منظر پیش کر دیا جاتا ہے 'یہ منظر انسان کی قوت مدرکہ کو چھوتا ہے ـ اس منظر میں دنیا کی پوری زندگی کو چشم زدن میں لپیٹ لیا جاتا ہے ' اب دنیا کا احساس ختم ہے 'اب وہ مشغولیت ختم ہے کہ رات اور دن ہم دنیا کے پیچھے پڑے تھے اور ہمارے سب منصوبے اس دنیا کے لیے تھے ـ یہ زندگی اچانک ختم ہو جاتی ہے ـ لوگ اب اپنے اصلی' دائمی اور مستقل گھر میں چلے جاتے ہیں ـ

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ

بَيْنَهُمْ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللّٰهِ وَ مَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿٤٥﴾

" (آج یہ دنیا کی زندگی میں مست ہیں) اور جس روز اللہ ان کو اکٹھا کرے گا تو (یہی دنیا کی زندگی انہیں ایسی محسوس ہوگی) گویا یہ محض ایک گھڑی بھر آپس میں جان پہچان کرنے کو ٹھہرے تھے (اس وقت تحقیق ہو جائے گا کہ) فی الواقع سخت گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور ہرگز وہ راہ راست پر نہ تھے"۔

اس منظر میں جو اچانک نظروں میں آتا ہے 'ہم دیکھتے ہیں کہ قبروں سے اٹھنے والے اچانک پکڑے جاتے ہیں' اب ان کو احساس ہوتا ہے کہ ان کا یہ دنیاوی سفر بہت ہی مختصر تھا۔ گویا وہ اس قدر مختصر تھا کہ شاید ایک دن کے کسی پروگرام میں ان کا باہم تعارف ہو گیا ہو' اور بس یہ سفر ختم۔

دنیاوی زندگی کی یہ ایک تشبیہ ہے۔ ایک مثال ہے کہ لوگ دنیا میں آئے اور گئے۔ یہاں وہ صرف باہم ملے' تعارف ہوا اور کچھ انہوں کیا ہی نہیں۔

بظاہر تو یہ محض ایک مثال اور تشبیہ بیان ہوئی ہے لیکن یہ حق الیقین ہے' بلکہ اس جہاں میں لوگوں کا باہم تعارف ہی مکمل نہیں ہو پاتا کہ وہ چلے جاتے ہیں' نہ انفرادی تعارف ختم ہوتا ہے اور نہ اجتماعی تعارف ختم ہوتا ہے اور وہ چل نکلتے ہیں۔

اور یہ لوگ جو ہر وقت باہم نزاع میں رہتے ہیں' ایک دوسرے کے خلاف معرکے برپا رکھتے ہیں اور یہ تمام تنازعات اور معرکے دراصل غلط فہمی کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ درحقیقت ان کا باہم حقیقی تعارف نہیں ہوا ہے۔

یہ پسماندہ ممالک' یہ باہم برسرپیکار ممالک' یہ جو باہم دست و گریبان ہیں' ان کا جھگڑا کسی عمومی حق پر نہیں ہے اور نہ یہ کسی اچھے نظام زندگی کی خاطر باہم لڑتے ہیں' یہ محض عزت کے لیے لڑتے ہیں بلکہ جہنم کے لیے لڑتے ہیں۔ کیا ان لوگوں میں سے بعض نے بعض کو پہچان لیا ہے نہیں۔ ان کی حالت تو یہ ہے کہ یہ لوگ ایک جھگڑے سے نکلتے ہیں اور دوسرے میں پھنس جاتے ہیں۔

یہ ایک تمثیل ہے کہ دنیا کی زندگی نہایت ہی مختصر ہے لیکن یہ تمثیل لوگوں کے درمیان جاری حیات زندگی کے نہایت ہی گہرے حقائق بیان کرتی ہے کہ لوگ کس طرح اس دنیا سے جا رہے ہیں۔

بہرحال اس حقیقت کے ہوتے ہوئے وہ لوگ بڑے خسارے میں ہیں جو نہایت ہی مختصر اس دنیاوی زندگی پر اپنا پورا وقت خرچ کر دیتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ اس بات کی تکذیب کرتے ہیں کہ انہوں نے اللہ سے ملنا ہے۔ اللہ کو ایک طرف چھوڑ کر ان کے تمام اہتمامات اس مختصر مرحلے کے لیے ہیں۔ یہ مرحلہ نہیں ہے بلکہ پلک جھپکنے کے برابر ایک لمحہ ہے' یہ لوگ بھی عجیب ہیں کہ انہیں اللہ کے سامنے پیش ہونے کی کوئی فکر نہیں ہے اور نہ دار آخرت طویل زمانوں کی کوئی فکر ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (۱۰ : ۴۵) "فی الواقع سخت گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور ہرگز وہ راہ راست پر نہ تھے"۔

---ooo---

ایک تیزی سے گزرنے والا یہ منظراب ختم ہوتا ہے ' یہ ایک جھلکی تھی کہ دنیا کی زندگی کس قدر مختصر ہے اور اب روئے سخن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مڑ جاتا ہے ۔ آپ کو مکذبین کے انجام کے بارے میں تسلی دی جاتی ہے ۔ ان کا انجام مستقبل کے پردوں میں پوشیدہ ہے ' معلوم نہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے 'کل کیا پیش آنے والا ہے ۔ یہ اس دنیا میں پکڑ لیے جائیں گے یا ان کو قیامت تک مہلت ہے ۔ یہ تلوار بہرحال ان کے سروں پر لٹک رہی ہے ۔ کفار کو وعید کی یہ بات آگے بڑھتی ہے اور اب ہم میدان قیامت میں ہیں جہاں تقصیرات کا کوئی کفارہ نہ ہو گا اگرچہ کوئی پورے کرۂ ارض کی پیشکش کرے اور یہ انداز سخن قرآن کا خاص طریقہ ہے کہ وہ دنیا کو آخرت سے جوڑ دیتا ہے ۔ دنیا و آخرت کے یہ ڈانڈے چند کلمات و الفاظ کے ذریعہ ملا دیئے جاتے ہیں ۔ اور ان مختصر کلمات میں اس قدر دلچسپ تصویر کشی کر دی جاتی ہے کہ بات دل تک اتر جاتی ہے اور دنیا کی زندگی اور آخرت کی زندگی باہم مل جاتے ہیں اور ایک اس طرح کی طرز زندگی پیش کر دی جاتی ہے جو قدیم اسلامی زندگی ہو۔

---

وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ
فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ
رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِىَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَ
يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ
ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا
يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ
بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّا ذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ
بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا
عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَ يَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ
اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِىْ وَ رَبِّىْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؔؕ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَ لَوْ اَنَّ
لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِى الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا

رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾

"جن برے نتائج سے ہم انہیں ڈرا رہے ہیں ان کا کوئی حصہ ہم تیرے جیتے جی دکھا دیں یا اس سے پہلے ہی تجھے اٹھالیں' بہرحال انہیں آنا ہماری طرف ہی ہے اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں اس پر اللہ گواہ ہے۔

ہر امت کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب کسی امت کے پاس اس کا رسول آ جاتا ہے تو اس کا فیصلہ پورے انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے اور اس پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جاتا۔

کہتے ہیں اگر تمہاری یہ دھمکی سچی ہے تو آخر یہ کب پوری ہوگی؟

کہو "میرے اختیار میں تو خود اپنا نفع و ضرر بھی نہیں' سب کچھ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ ہر امت کے لیے مہلت کی ایک مدت ہے' جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہوتی"۔ ان سے کہو' کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ کا عذاب اچانک رات کو یا دن کو آ جائے (تو تم کیا کر سکتے ہو؟) آخر یہ ایسی کون سی چیز ہے جس کے لیے مجرم جلدی مچائیں؟ کیا جب وہ تم پر آپڑے اسی وقت تم اسے مانو گے؟--- اب بچنا چاہتے ہو؟ حالانکہ تم خود ہی اس کے جلدی آنے کا تقاضا کر رہے تھے! پھر ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کے عذاب کا مزہ چکھو' جو کچھ تم کماتے رہے ہو' اس کی پاداش کے سوا اور کیا بدلہ تم کو دیا جا سکتا ہے؟

پھر پوچھتے ہیں کیا واقعی یہ سچ ہے جو تم کہہ رہے ہو؟ کہو "میرے رب کی قسم' یہ بالکل سچ ہے' اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے ظہور میں آنے سے روک دو"۔ اگر ہر اس شخص کے پاس جس نے ظلم کیا ہے' روئے زمین کی دولت بھی ہو تو اس عذاب سے بچنے کے لیے وہ اسے فدیہ میں دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ جب یہ لوگ اس عذاب کو دیکھ لیں گے تو دل ہی دل میں پچھتائیں گے مگر ان کے درمیان پورے انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا' کوئی ظلم ان پر نہ ہو گا۔

یہ پیرا اس بات سے شروع ہوتا ہے کہ تمام لوگوں نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے' چاہے وہ سزا جس سے رسول انہیں ڈرا رہے تھے' اس دنیا ہی میں ان پر نازل ہو جائے اور رسول اللہ کی زندگی میں نازل ہو جائے یا ان کی وفات کے بعد نازل ہو جائے۔ دونوں صورتوں میں ان لوگوں نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے اور اللہ کو وہ بھی معلوم ہے جو یہ لوگ حضورؐ کی زندگی میں کر رہے تھے' جو آپ کی وفات کے بعد انہوں نے کرنا تھا۔ لہٰذا اللہ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے اور حضورؐ کی وفات کی وجہ سے اللہ کی وعید ان سے ٹل نہ جائے گی۔

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ (۱۰ : ۴۶) "جن برے نتائج سے ہم انہیں ڈرا رہے ہیں ان کا کوئی حصہ ہم تیرے جیتے جی دکھا دیں یا اس سے پہلے ہی تجھے اٹھالیں' بہرحال انہیں آنا ہماری طرف ہی ہے اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں اس پر اللہ گواہ ہے"۔

تمام امور منصوبہ تقدیر الٰہیہ کے مطابق چل رہے ہیں۔ تقدیر کا ایک حرف بھی بدلتا نہیں اور نہ ظروف و احوال میں تقدیر بدل جاتی ہے۔ ہر قوم کو صرف اس وقت تک مہلت ملتی ہے جب تک اس کا رسول نہیں آ جاتا۔ جب رسول آ جاتا

ہے تو وہ انہیں ڈراتا ہے' یوں ان کا یہ حق پورا ہو جاتا ہے جو اللہ نے اپنے اوپر فرض کر لیا ہے کہ وہ اس حق کو پورا کرے گا اور یہ کہ وہ کسی قوم کو سوائے ارسال رسالت کے عذاب نہ دے گا اور یہ کہ رسول کے لیے یہ ضروری ہو گا کہ وہ پیغام ان تک پہنچا دے اور سمجھا دے۔ اور اس کے بعد اب جو فیصلہ بھی اللہ کرے وہ برحق ہو گا۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ

(۱۰: ۴۷) " ہر امت کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب کسی امت کے پاس اس کا رسول آ جاتا ہے تو اس کا فیصلہ پورے انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے اور اس پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جاتا"۔

ان دو آیات پر ذرا غور کرنا چاہئے' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تصور حیات کے مطابق حقیقت الوہیت کیا ہے اور مقام بندگی کیا ہے؟ اور یہ کہ قرآن کریم ہر موقعہ پر حقیقت الوہیت اور مقام بندگی کی وضاحت ضروری سمجھتا ہے۔ اور ہر صورت میں اور مختلف انداز میں اس کو بیان کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس عقیدے اور اس قوم کا معاملہ سب کا سب اللہ کے ہاتھ میں ہے اور دین کے معاملے میں لے پیغمبر آپ کا بھی کوئی اختیار نہیں ہے۔ آپ کا فریضہ صرف اس قدر ہے کہ آپ نے پیغام صحیح طرح پہنچانا ہے۔ پیغام پہنچا دینے کے بعد اب تمام امور کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپؐ اس دنیا سے چلے جائیں اور وہ لوگ جو آپ کو اذیت دیتے رہے' تکذیب کرتے رہے اور سخت دشمنی کرتے رہے وہ یونہی رہ جائیں۔ یہ لازمی نہیں ہے کہ اللہ اس دنیا ہی میں ان لوگوں کا انجام آپ کو دکھا دے یا یہاں ہی ان کو سزا و جزاء دے دے۔ یہ اختیارات صرف اللہ کے ہیں۔ لے پیغمبر آپ کی ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ آپ لوگوں تک یہ پیغام پہنچا دیں۔ پیغام پہنچا کر انجام اللہ پر چھوڑ دیں۔ یہ اس لیے کہا گیا کہ بندے ذرا اپنا مقام پہچان لیں اور نیز داعی جلد بازی نہ کرنے لگیں۔ اگرچہ ایک طویل عرصے تک دعوت کیوں نہ دینی پڑے اور دعوت کی راہ میں انہیں ایک طویل عرصے تک مشکلات سے دوچار کیوں نہ ہونا پڑے۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۱۰: ۴۸) "کہتے ہیں کہ اگر تمہاری یہ دھمکی سچی ہے تو آخر یہ کب پوری ہو گی؟" اہل مکہ یہ سوال نہایت ہی عجلت میں چیلنج کے طور پر کرتے تھے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس عذاب سے ڈراتے ہیں وہ واقع کیوں نہیں ہوتا؟ اللہ ان کا فیصلہ اسی طرح نہیں کر دیتا جس طرح اس نے امم سابقہ کا کیا تھا جنہوں نے رسولوں کی تکذیب کی تھی' ان کو تو اللہ نے پکڑ لیا تھا۔

قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ

فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (۱۰: ۴۹) کہو "میرے اختیار میں تو خود اپنا نفع و ضرر بھی نہیں' سب کچھ اللہ کی مشیئت پر موقوف ہے۔ ہر امت کے لیے مہلت کی ایک مدت ہے' جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہوتی"۔

اگر حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نفس کے لیے نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے تو ان کے لیے لازماً وہ اختیار

نہیں رکھتے - یہاں اس آیت میں مضرت کو پہلے لایا گیا ہے اگرچہ آپ کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ اپنے نفس کے بارے میں بات کریں - حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ مضرت طلب کہاں کرتے تھے لیکن یہاں مناسبت کلام کی وجہ سے مضرت کو پہلے لایا گیا تھا' جبکہ دوسرے مقامات پر مثلاً سورۂ انعام میں خیر کا ذکر پہلے کیا گیا - جہاں اپنی ذات کے لیے طلب خیر کی بات ہو رہی تھی -

وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ (۷:۱۸۸)

بہرحال یہاں کہنا یہ مقصود ہے کہ میں اپنی ذات کے لیے بھی نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں' یہ اللہ کا اختیار ہے کہ وہ جس وقت بھی چاہے' عذاب لے آئے - اللہ کی ایک سنت ہے جو جاری و ساری ہے - اور اس میں تخلف نہیں ہوتا - اس کی ایک میعاد ہے - اس سے پہلے کچھ بھی نہیں ہوتا - جب وقت آتا ہے تو پھر گھڑی کی مہلت بھی نہیں ہوتی اور وقت سے پہلے اس گھڑی کو ایک لحہ کے لیے بھی پہلے نہیں لایا جا سکتا -

اور جب میعاد پوری ہوتی ہے تو کبھی تو ایک قوم حسی طور پر ہلاک ہوتی ہے اور لوگ اسے دیکھتے رہ جاتے ہیں اور اس قوم کا نام و نمود ہی نہیں رہتا - انسانی تاریخ میں ایسی متعدد اقوام ہو گزری ہیں - کبھی یوں ہوتا ہے کہ معنوی لحاظ سے اور روحانی لحاظ سے ایک قوم ہلاک ہو جاتی ہے - یہ دنیا میں مغلوب اور شکست خوردہ ہوتی ہے - یہ شکست بعض اوقات ایک مدت متعین کے لیے ہوتی ہے اور بعض اوقات دائمی ہوتی ہے اور اس صورت میں اس امت کی شخصیت اور اس کے آثار مٹ جاتے ہیں - اگرچہ اس کے افراد باقی رہیں - اقوام کا یہ اٹھنا اور بیٹھنا اللہ کی سنت الٰہیہ کے عین مطابق ہے - یہ سنت اس کائنات میں جاری و ساری ہے اور اس کے قوانین کبھی بدلتے نہیں - اقوام کا عروج و زوال نہ اتفاقی ہے' نہ بے مطلب ہے' نہ ظلم کے طور پر ہے اور نہ اس میں اللہ کو کسی سے رو رعایت کرنی ہے - جو اقوام زندگی اور ترقی کے اصولوں پر عمل کرتی ہیں' وہ زندہ رہتی ہیں اور جو اقوام زندگی اور ترقی کے اصولوں کے خلاف چلتی ہیں وہ مر جاتی ہیں یا کمزور پڑ جاتی ہیں - اور سب کچھ ان کے طرز عمل کے مطابق ہوتا ہے - جہاں تک امت اسلامیہ کا تعلق ہے اس کی زندگی کا سامان اتباع رسول میں ہے - رسول کی دعوت ہے ہی اس لیے کہ ان کو زندہ کیا جائے' صرف عقیدہ کے اعتبار سے زندہ نہیں' بلکہ اس عقیدے کے مطابق عمل بھی ضروری ہے' اور اس نظام زندگی کا قیام بھی ضروری ہے جس کے لیے اس امت کو برپا کیا گیا ہے - اگر یہ امت اپنے مقاصد پورے نہ کرے گی تو پھر اس کا مرنا ضروری ہو گا' یہ ہے سنت الٰہیہ -

اب سیاق کلام ان کو وجدانی طور پر جھنجوڑتا ہے - ذرا ان کی پوزیشن کو بدل کر بات کی جاتی ہے' اس سے قبل تو وہ استہزا کرنے والے اور چیلنج دینے والے تھے - اب ان کو دھمکی دی جاتی ہے - انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ کسی بھی وقت ان پر عذاب آ سکتا ہے -

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ (۱۰:۵۰) "کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ کا عذاب اچانک رات کو یا دن کو آ جائے (تو تم کیا کر سکتے ہو؟) آخر یہ ایسی کون سی چیز ہے جس کے لیے مجرم جلدی مچائیں؟" عذاب تو پردۂ غیب کے پیچھے ہے اور تیار

ہے' صرف ہمیں اس کے نزول کا وقت معلوم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم مزے سے سو رہے ہو اور وہ آ جائے' یا دن کو تم کام و کاج میں مصروف ہو اور وہ آ جائے' بیدار ہوتے ہوئے بھی تم اسے رد نہ کر سکو۔ تعجب ہے کہ آخر تم لوگ اس عذاب کی شتابی کا مطالبہ کیوں کر رہے ہو؟

اس دھمکی کے نتیجے میں اور استفہام انکاری کے نتیجے میں انسانی شعور نے وقوع عذاب کا تصور کیا ہی تھا کہ اگلی آیت میں بتا دیا گیا کہ عذاب تو واقع ہو گیا۔۔۔ یہ عذاب تو اہل مکہ پر واقع نہیں ہوا لیکن قرآن کریم اسے واقع تصور کر کے اب بتاتا ہے کہ ان کی حالت کیا ہے؟ گویا عذاب واقعہ ہو گیا اور انسانی احساس و شعور اسے محسوس کرتا ہے۔

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ اٰلْئٰنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ (۱۰ : ۵۱) "کیا جب وہ تم پر آ پڑے اسی وقت تم اسے مانو گے؟۔۔۔ اب بچنا چاہتے ہو؟ حالانکہ تم خود ہی اس کے جلدی آنے کا تقاضا کر رہے تھے!" گویا یہ عذاب آ چکا' عذاب کو دیکھ کر وہ ایمان لا چکے اور اب ان کو شرمندہ کیا جا رہا ہے کہ اب کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

اس منظر کا خاتمہ یوں ہوتا ہے :

ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ

(۱۰ : ۵۲) "پھر ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کے عذاب کا مزہ چکھو' جو کچھ تم کماتے رہے ہو' اس کی پاداش کے سوا اور کیا بدلہ تم کو دیا جا سکتا ہے؟" یوں ہم سیاق کلام میں میدان حشر میں پہنچ جاتے ہیں جبکہ چند فقرے قبل ہم دنیا میں تھے اور رسول اللہ کا خطاب سن رہے تھے۔

اس مکالمے کے اختتام پر حضورؐ کے ساتھ ان کے ایک مکالمے کا ذکر ہے۔ اس مکالمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اندر سے متزلزل ہیں' اب حضورؐ سے کچھ یقین دہانیاں چاہتے ہیں۔ جواب قرآن کے دو ٹوک انداز میں دیا جاتا ہے۔

وَيَسْتَنْبِئُوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ (۱۰ : ۵۳)

"پھر پوچھتے ہیں کیا واقعی یہ سچ ہے جو تم کہہ رہے ہو؟ کہو" "میرے رب کی قسم' یہ بالکل سچ ہے' اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے ظہور میں آنے سے روک دو"۔ میں تو جانتا ہوں کہ اللہ کی شان الوہیت کیا ہے؟ اس لیے میں اسی کے نام سے جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا۔ اللہ کے نام کی قسم سنجیدہ اور یقینی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سچائی تمہارے سامنے آ جائے گی' تم اس کے حساب و کتاب سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔ وہ ضرور سزا دے گا۔

ابھی تو ہم اس دنیا میں سوال و جواب میں مشغول تھے لیکن قرآن کریم کے انداز گفتگو کے مطابق اچانک ہم میدان حشر میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور یہ تصویر سازی یوں کی جاتی ہے کہ بطور فرض اگر ہم میدان حشر میں پہنچ گئے تو کیا ہو گا۔

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ (۱۰ : ۵۴) "اگر ہر اس شخص کے پاس جس نے ظلم کیا ہے' روئے زمین کی دولت بھی ہو تو اس عذاب سے بچنے کے لیے وہ اسے فدیہ میں دینے پر آمادہ ہو

جائے گا" ۔ لیکن اس سے یہ بھی قبول نہ کیا جائے گا 'اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ دولت اس کے پاس آگئی ہے ۔

لیکن اگلی آیت میں گویا یہ دولت اس شخص کے پاس آگئی 'اس نے پیش کش کر دی اور فدیہ قبول نہ ہوا اور اب وہ شرمندگی چھپا رہا ہے ۔ قرآن کریم کا انداز کلام بتا رہا ہے کہ وہاں ایسا شخص بے حد مشقت میں ہے ۔

وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ( ۱۰ : ۵۴ ) (مگر ان کے درمیان پورے انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا 'کوئی ظلم ان پر نہ ہو گا ) اب یہ منظر اختتام کو پہنچتا ہے ۔ تقریباً نصف آیت قبل تو یہ فرض تھا مگر آخر میں بطور واقع بیان ہوا اور یہ قرآن کریم کا ایک نہایت موثر انداز ہے ۔

---ooo---

اب آخری تاکیدی تبصرہ ہے کہ حشر اور حساب و کتاب حق ہے اور ذرا آسمانوں اور زمین میں قدرت خداوندی کا ملاحظہ کرو ' ذرا حیات و ممات کے رازوں پر غور کرو ' ان سب حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ بے مقصد نہیں ہے ۔ لوگو ' قرآن کریم جو روشنی تمہارے سامنے پیش کرتا ہے ۔ اس پر غور کرو ' اس سے فائدہ اٹھاؤ ' یہ وعظ ہے ۔ یہ ہدایت ہے اور تمام روحانی اور نفسیاتی مسائل کا حل ہے جبکہ سیاسی مسائل تو عین دین ہے ۔

أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ أَلَا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥٥﴾ هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٥٦﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٧﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ﴿٥٨﴾

"سنو ' آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے ۔ سن رکھو! اللہ کا وعدہ سچا ہے مگر اکثر انسان جانتے نہیں ہیں ۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے اور اسی کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے ۔

لوگو ' تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے ۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کر لیں ان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے ۔ اے نبی ؐ 'کہو کہ "یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی ' اس پر تو لوگوں کی خوشی منانی چاہئے ' یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ سمیٹ رہے ہیں" ۔

سنو ' خبردار! اس جری اعلامیہ کے ساتھ بتایا جاتا ہے کہ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ( ۱۰ : ۵۵ ) (آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے ) وہ ان سب چیزوں کا مالک ہے ۔ وہ ایسا مالک ہے کہ وہ اپنے وعدے کو سچا ثابت کر سکتا ہے 'لہٰذا حشر اور نشر کی راہ میں کوئی قوت رکاوٹ نہیں ہو سکتی اور اس سچائی کی راہ میں کوئی

حائل نہیں ہو سکتا۔

اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ (۱۰: ۵۵) "اللہ کا وعدہ سچا ہے"۔ لیکن اکثر لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے نہیں مانتے اس لیے وہ اس سچائی کی تکذیب کرتے ہیں۔

وَھُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ (۱۰: ۵۶) "وہی ہے جو زندگی بخشتا ہے' وہی ہے جو موت دیتا ہے"۔ وہی موت و حیات کا مالک ہے' اس لیے وہی ہے جو حشر و نشر کا بھی مالک ہے۔

وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (۱۰: ۵۶) "اس کی طرف پلٹنا ہے"۔ چنانچہ موثر انداز کلام کے بعد یہ فقرہ تاکید مزید ہے۔ اب ایک جامع پکار آتی ہے' تمام انسانوں کے لیے:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَھُدًی وَّ

رَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۱۰: ۵۷) "لوگو' تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کرلیں ان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے"۔ یہ کتاب تمہارے پاس آگئی ہے' تم اس میں شک کر رہے ہو' یہ تمہارے رب کی طرف سے وعظ ہے۔ یہ از خود گھڑی ہوئی کتاب نہیں ہے۔ اس کے مضامین انسانوں کی طرف سے نہیں ہیں۔ یہ نصیحت تمہارے دلوں کو زندہ کرنے کے لیے ہے۔ تمہارے دلوں کی بیماریوں اور خلجانوں کو رفع کرتی ہے' اور تمہارے دل و دماغ میں جو غلط تصورات جمع ہو چکے ہیں' ان کو دور کرتی ہے' ان میں جو فکری کجی ہے' اس کو دور کرتی ہے' حیرانی اور پریشانی سے نجات دیتی ہے' صحت' عافیت اور یقین کی دولت سے دلوں کو بھر دیتی ہے' ایمانی اور سلامتی کی راہ بتاتی ہے اور جن لوگوں کو ایمان لانا نصیب ہو جائے ان کو ایمان واثق دیتی ہے اور گمراہی اور عذاب سے نجات ہے۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا ھُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ (۱۰: ۵۸)
"اے نبیؐ' کہو کہ "یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی' اس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہئے' یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ سمیٹ رہے ہیں"۔ یعنی اس کا یہ فضل تھا اور رحمت تھی کہ اس نے یہ قرآن اتارا اور لوگوں کو اس کے ذریعے ایمان نصیب ہوا' لوگوں کو چاہئے کہ وہ اس پر خوش ہوں اور یہ بات اس کی مستحق ہے کہ اس پر خوشیاں منائی جائیں۔ رہا اس دنیا کی عزو جاہ اور مال و دولت تو وہ چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ عالم بالا سے نزول رحمت کی خوشی ہی ہے جو انسان کو دنیا کی آلودگیوں اور ایسی باتوں سے سربلند کر دیتی ہے جو زوال پذیر ہیں۔ جہاں تک دنیا کے عزو جاہ اور مال و دولت کا تعلق ہے یہ تو اس دنیا کی زندگی گزارنے کے لیے اسباب ہیں' انسان دنیا کے خادم ہیں' مخدوم نہیں ہیں۔ انسان کو دنیاوی اسباب سے سربلند ہونا چاہئے۔ اس کے ماتحت نہیں ہونا چاہئے۔ اسلام یہ تعلیم نہیں دیتا کہ دنیاوی سازوسامان کو ترک کر دیا جائے بلکہ انسان کے زاویہ سے توازن اختیار کرتا ہے اور دنیاوی معاملات کو

اسی قدر اہمیت دیتا ہے جس قدر اہمیت کے وہ مستحق ہیں ۔ انسانوں کو اسلام دنیا کی پرستش اور غلامی سے بھی آزاد کرتا ہے ۔ ان کا نصب العین اور مطمح نظر دنیا سے بلند ہو جاتا ہے ۔ ان کے آفاق نظر دنیا سے وسیع تر ہوتے ہیں ۔ ان کے نزدیک ایمان بڑی نعمت ہے ' ایمان کے تقاضے پورے کرنا ان کے نزدیک اولیت رکھتا ہے ۔ دنیا ان کی غلام ہوتی ہے ۔ وہ دنیا کے غلام نہیں ہوتے ۔ پس یہ ہے کہ باعث فرحت بات اور اسی پر لوگوں کو خوش ہونا چاہئے ۔

عقبہ ابن ولید بواسطہ صفوان ابن عمرو سے روایت کرتے ہیں ۔ میں نے ایفع ابن عبداللہ الکلاعی کو یہ کہتے سنا کہ جب عراق کا خراج حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو حضرت عمرؓ اور ان کے ایک غلام آزاد کردہ نکلے ۔ حضرت عمرؓ نے اونٹ گننا شروع کیے ' جب گنے تو وہ اس سے زیادہ تھے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا الحمدللہ ۔ اور ان کے مولیٰ نے کہا کہ یہ اللہ کا فضل و رحمت ہے ۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا تم نے جھوٹ بولا ہے ۔ اللہ کا فضل و رحمت اس کو نہیں کہا جو تم کہتے ہو ۔ وہ تو ہے ۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۱۰: ۵۸)

یوں یہ سمجھتے تھے قرون اولیٰ کے مسلمان ۔ وہ اللہ کے فضل اور رحمت قرآن کو سمجھتے تھے ۔ جس میں ان کے لیے نصیحت و ہدایت اتری تھی ۔ رہا مال و دولت ' اور فتح و سربلندی تو یہ تابع چیزیں تھیں ان کے نزدیک ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو فتح نصیب ہوتی تھی ' ان پر دولت کی بارش ہو رہی تھی ۔ مال ان کو ڈھونڈتا پھرتا تھا ' لیکن وہ دولت ایمانی کے گرویدہ تھے ۔ یہ تھا طریق حیات صحابہ کرام کا ۔ اور یہی ہے زندگی گزارنے کا طریقہ اور راہ ہدایت ۔

مادی اقدار ' سامان زیست ' اور دولت و ثروت ان کے ہاں سامان عظمت نہ تھا ۔ یہ سامان زیست ' یہ مادی اقدار اور دولت و ثروت تو اقوام کی تباہی کا سامان بھی ہو جاتے ہیں ۔ صرف آخرت میں نہیں بلکہ اس دنیا میں بھی یہ سامان ہلاکت ہو جاتے ہیں ۔ اور آج مغربی دنیا اس کا پورا نقشہ پیش کرتی ہے ۔

حیات انسان پر حکمرانی کے لیے کچھ اور اقدار درکار ہیں ۔ یہ اقدار سامان زیست اور مادی اقدار اور مال و دولت کو بھی ایک قیمت عطا کرتی ہیں ۔ یہ اعلیٰ اقدار انسان کے لیے ان چیزوں کو باعث سعادت بھی بنا سکتی ہیں لیکن حکمرانی قرآنی اقدار کی ہونا چاہئے ۔

اصل اہمیت ان اقدار کی ہے جو حکمران ہیں ۔ یہ اعلیٰ حکمران اقدار مادی اقدار ' سامان اہمیت اور دولت و ثروت کو یا انسان کی کامیابی کا ذریعہ بنا دیتی ہیں اور یا ان کو لغزش اور گمراہی کا ذریعہ بنا دیتی ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اصل نصب العین دینی اقدار کو بنایا گیا ہے ۔ ذرا غور سے پڑھو : "لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے ۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کر لیں ان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے ۔ اے نبی کہو ' کہ یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی ' اس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہئے ' یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں یہ لوگ سمیٹ رہے ہیں "۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ سب سے پہلے اس باران رحمت کو پا رہے تھے وہ اس کی قدر و قیمت کو اچھی طرح جان رہے تھے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ مال اور دولت کو اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ سمجھتے تھے ۔ وہ سمجھتے تھے کہ اللہ کا اصل فضل و رحمت قرآن مجید ہے ۔ رہا مال و دولت تو وہ قرآن کے مقابلے میں بہتر نہیں ہے ' نہ خیر ہے ' نہ اس پر خوشی منانا چاہئے ۔

حضرت عمرؓ اپنے دین کو بہت اچھا سمجھتے اور جانتے تھے ۔ وہ سمجھتے تھے کہ اعلیٰ فضل و رحمت قرآن ہے ۔ اسلامی نظریہ حیات ہے' جو اللہ کی طرف سے وعظ اور ہدایت اور روحانی مسائل کا حل ہے ۔ جہاں تک گائے اونٹ کا تعلق ہے ۔ اس پر صرف الحمدللہ کہا جا سکتا ہے ۔

وہ جانتے تھے کہ دین اسلام اور قرآن نے ان کے دل و دماغ میں کس قدر انقلاب فکر پیدا کر دیا ہے ۔ قرآن نے جاہلی اقدار بدل دی ہیں اور ہر زمانہ جاہلیت میں قرآن یہی تبدیلی پیدا کرتا ہے ۔ اور بیسویں صدی کی جاہلیت کو بھی اسلام اسی طرح بدلتا ہے ۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب اسلام اور جاہلیت )

اس دین کا بنیادی انقلابی کام یہ ہے کہ یہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکالتا ہے ۔ انسانی غلامی سے انسانوں کو آزاد کر کے وہ ان کو اللہ وحدہ کی غلامی میں داخل کرتا ہے اور ان کی پوری عملی زندگی کو اس آزادی کے تصور پر استوار کرتا ہے جس کی وجہ سے انسانوں کے خیالات و تصورات' ان کی اقدار اور پیمانے' ان کے اخلاق اور قوانین حیات بدل جاتے ہیں اور ان میں کسی جگہ غلامی نہیں پائی جاتی ۔

اس کے بعد سامان زیست اور مادی سہولیات کا مقام آتا ہے ۔ مادی برتری اور مادی استقلال اس ایمانی حریت کے نتیجے میں خود بخود حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ دور اول کے مسلمانوں کو حاصل ہوا ۔ جبکہ انہوں نے اپنی جاہلیت کے علاوہ اپنے اردگرد دنیا سے تمام جاہلیتوں کی کھال اتار کر پھینک دی ۔ اور اس وقت وہ پورے کرۂ ارض پر برتر حکمران بن گئے ۔ اور اس اعلیٰ فضل کے زیر سایہ تمام دوسری فضیلتیں بھی انہیں حاصل ہو گئیں ۔

جن لوگوں نے مادی اقدار ہی کو اپنا مطمح نظر بنا لیا ہے' جو صرف مادی پیداوار کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور ان اعلیٰ قدروں کو پس پشت ڈال رہے ہیں ۔ وہ نہ صرف یہ کہ دین کے دشمن ہیں بلکہ انسانیت کے بھی دشمن ہیں ۔ وہ انسانوں کو اعلیٰ مقام سے گرا کر حیوانات کے مقام ذلیل پر لا کر باندھنا چاہتے ہیں ۔

یہ لوگ مادی اقدار کی پیروی میں بھی مخلص نہیں بلکہ مادی اقدار کی دعوت کے ذریعے یہ دینی قدروں کو ختم کرنا چاہتے ہیں ۔ وہ ان عقائد و نظریات کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو انسان کو حیوان سے اونچا مرتبہ عطا کرتی ہیں ۔ یاد رہے کہ دین اسلام اعلیٰ اقدار عطا کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی انسانی ضروریات اور میلانات کو بھی نظرانداز نہیں کرتا' بلکہ اسلام انسان کو سامان زیست ' مکان اور کپڑے کے علاوہ کچھ اعلیٰ قدریں بھی دیتا ہے ۔

ہر طرف سے یہ مسلسل واویلا کہ مادی ترقی پر سب کچھ موقوف ہے 'سب سے بڑی چیز مادی پیداوار ہے 'لوگوں کے تصورات ' ان کی سوچ اور ان کی پوری زندگی کو متاثر کر رہا ہے ۔ انسان اپنی انسانیت سے گر کر محض ایک آلہ پیداوار بن گیا ہے ۔ پیداوار کی کثرت ہی کو انسان اعلیٰ زندگی تصور کرتا ہے ۔ کثرت پیداوار کے لیے اس مسلسل چیخ و پکار نے انسان کی اخلاقی اور روحانی قدروں کو پس پشت ڈال دیا ہے ۔ انسان کی تمام قوتیں صرف حصول پیداوار کے لیے صرف ہو رہی ہیں ۔ مادی ترقی اور صنعتی پیداوار نے دراصل جاہلیت اولیٰ میں پوجے جانے والے بتوں کی حیثیت اختیار کر لی اور اس طرح مادی ترقی اور صنعتی پیداوار کو اعلیٰ و ارفع مقام دیا جا رہا ہے اور اسی کی قیادت و سیادت تسلیم کی جا رہی ہے ۔

جب مادی پیداوار ایک بت بن جائے اور تمام انسان رات دن اس کی بندگی کرنے لگیں اور اس کے آگے جھکنے لگیں تو پھر تمام دوسری اخلاقی اور دینی قدریں اس بت پر نچھاور کر دی جاتی ہیں اور روندی جاتی ہیں ۔ نہ پھر کسی قوم کا اخلاقی

نظام رہتا ہے' نہ خاندانی نظام قائم رہتا ہے' نہ اس قوم میں عصمت اور پاکیزگی رہتی ہے' نہ آزادی رہتی ہے اور نہ سوشل سیکورٹی ۔ کیونکہ ان میں سے جو چیز بھی مادی پیداوار کی راہ میں رکاوٹ بنے اسے ختم کر دیا جاتا ہے ۔ یہ ہے مطلب ہمارے اس نظریے کا کہ مادی پیداوار کو جدید دنیا نے معبود بنا دیا ہے ۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جس چیز کی پوجا کی جائے اسے بت کی طرح سامنے کھڑا کر دیا جائے' اصل بات یہ ہے کہ دور جدید میں مادی ترقی اور صنعتی پیداوار کو ایک بت کی شکل دے دی گئی ہے اور اس اعتبار سے وہ معبود ہے ۔

ایک اسلامی معاشرہ میں اعلیٰ قدر اللہ کا وہ فضل و رحمت ہے' جو دلوں کی کدورت اور بیماری کے لیے شفاء ہے' جو انسان کو انسانوں کی غلامی سے چھڑاتا ہے' جو مادی اقدار کے مقابلے میں اعلیٰ انسانی اقدار کو پروان چڑھاتا ہے اور یہ ہے قرآن اور قرآنی تعلیمات' اس کی روشنی میں انسان اس کرۂ ارض پر صحیح اور متوازن زندگی بسر کر سکتا ہے' اس میں صنعتی ترقی بھی ہوگی' اس میں مادی سہولتوں کی اہمیت بھی ہے اور اس میں وہ تمام جاہلی سہولیات بھی ہوں گی جن کے لیے جاہلیت جدیدہ کے پیروکار مرے جا رہے ہیں ۔

لیکن قرآنی اقدار فضل و رحمت کی برتری کے سوا تمام مادی سہولیات اور صنعتی پیداوار انسان کے لیے لعنت' مصیبت اور مشکلات کا باعث ہوتی ہیں ۔ کیونکہ قرآن کی اعلیٰ اقدار کی عدم موجودگی کی صورت میں انسان پھر ایک وحشی درندے اور حیوان کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور انسان کے اس وحشی پن اور حیوانیت کی خوراک بھی اعلیٰ انسانی اقدار ہوتی ہیں ۔

صدق اللہ العظیم

يَأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (٥٧) قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهِ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (٥٨)(١٠: ٥٧ - ٥٨))

اس حقیقت کے بیان کے ضمن میں کہ قرآن اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے اور یہ لوگوں کے لیے وعظ اور ہدایت کا ذریعہ اور دلوں کی بیماریوں کے لیے ایک شفاء اور علاج ہے ۔ یہاں بتایا جاتا ہے کہ جاہلی نظام کون سا ہوتا ہے اور اس کی بڑی علامت کیا ہوتی ہے ۔ یہ کہ جاہلی نظام کی عملی زندگی قرآن کے مطابق نہیں ہوتی' وہ لوگوں کی اپنی خواہشات کے مطابق ہوتی ہے اور اس میں وہ اللہ کے حق اقتدار اعلیٰ اور حق قانون سازی اور حلال و حرام کی حدود مقرر کرنے کے حق پر دست درازی کرتے ہیں ۔ اپنی مادی زندگی کے لیے حلال و حرام کی حدود خود متعین کرتے ہیں ۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَ مَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٦٠﴾

"اے نبیؐ ان سے کہو "تم لوگوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ جو رزق اللہ نے تمہارے لیے اتارا تھا' اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو حرام اور کسی کو حلال ٹھہرالیا"۔ ان سے پوچھو' اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی تھی؟ یا تم اللہ پر افترا کر رہے ہو؟ جو لوگ اللہ پر یہ جھوٹا افتراء باندھتے ہیں ان کا کیا گمان ہے کہ قیامت کے روز ان سے کیا معاملہ ہو گا؟ اللہ تو لوگوں پر مہربانی کی نظر رکھتا ہے۔ مگر اکثر انسان ایسے ہیں جو شکر نہیں کرتے"۔

اللہ نے تمہارے لیے یہاں جو سامان زیست بھیجا ہے' اس کے بارے میں تمہارا خیال کیا ہے؟ اللہ بلند ہے اور اس نے اس کائنات کے اندر جو سامان بھیجا ہے 'گویا یہ اس کے مقام بلند سے آیا ہے' اس کے استعمال کا ضابطہ تم خود بناؤ گے یا اللہ نے اس کے لیے کوئی ضابطہ کار اور حدود استعمال بھی متعین کیے ہیں۔ یہ کیا ہے کہ تم خود بعض چیزوں کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیتے ہو' یہ حلال کرنا اور حرام کرنا تو قانون سازی ہے اور قانون سازی کا اختیار صرف رب ذوالجلال کو حاصل ہے۔ اور تم خود قانون سازی کا کام کرتے رہو۔

قُلْ آللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ (۱۰:۵۹) (اللہ نے تم کو اجازت دی ہے یا تم اللہ پر افترا کر رہے ہو) یہ وہ سوال ہے جس کا ذکر قرآن میں بار بار ہوتا ہے۔ اور یہ جاہلیت کے مقابلے میں ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت کلمہ طیبہ کا لازمی تقاضا ہے' بلکہ یہ عین کلمہ طیبہ ہے اور کلمہ طیبہ عملی شکل حلال و حرام کی صورت ہی میں اختیار کرتا ہے۔

یہ اعتراف کہ اللہ خالق و مالک ہے اپنے اندر یہ اعتراف بھی رکھتا ہے کہ معبود اور رب بھی اسی کو ہونا چاہئے۔ اور پھر نظام مملکت بھی اسی کے احکام کے مطابق ہونا چاہئے۔ اور نظام مملکت کے اندر مالیاتی پالیسی سب سے اہم پالیسی ہوتی ہے کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام؟ اور یہ سب چیزیں چونکہ آسمان سے نازل ہوئی ہیں' اور اس بات کا اعتراف مکہ کے مشرکین بھی کرتے تھے کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے انسانوں کے لیے آسمانوں سے یہ چیزیں نازل کی ہیں اور آج کے جدید جاہلیت پرست بھی یہ اعتراف کرتے ہیں۔ جس طرح تمام وہ لوگ یہ اعتراف کرتے ہیں جو مسلمانوں جیسے نام رکھتے ہیں' لیکن اس اعتراف کے ساتھ ساتھ وہ اپنے لیے حلال و حرام کی حدود و قیود خود متعین کرتے ہیں۔ قرآن کریم ان لوگوں کو متوجہ کرتا ہے کہ تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو' اور اس کے باوجود رزق الٰہی میں سے ازخود بعض چیزوں کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیتے ہو' تم رزق کے علاوہ دوسرے شعبوں میں ازخود قانون سازی کرتے ہو۔ حالانکہ قانون بنانا رب العالمین کا کام ہے۔ لہٰذا تم شرک میں مبتلا ہو' لہٰذا دور اول کے زمانے کے بعد جب بھی کوئی سوسائٹی یہ کام کرے گی وہ مشرک سوسائٹی ہوگی۔ اگرچہ نام اور عنوان لوگوں نے اچھے رکھ رکھے ہوں۔ کیونکہ اسلام حقائق کا نام ہے۔ محض نام اور عنوان سے کیا بدلتا ہے۔

عرب جاہلیت کے پیروکار بھی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں۔ جس طرح آج کے نام نہاد مسلمان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں' جاہل عرب جو حلال و حرام مقرر کرتے تھے وہ کہتے تھے کہ اللہ نے ہمیں یہ اجازت دے دی

ہے یا ان کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ (بذریعہ اجتہاد) شریعت ہے ۔
سورہ انعام میں بصراحت بتایا گیا کہ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ حلال و حرام جو وہ خود قرار دیتے ہیں ۔ یہ اللہ کی شریعت ہے ۔ سورہ انعام میں صراحت کے ساتھ آیا ہے

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (٦ : ١٣٨) (اور وہ کہتے ہیں کہ یہ مویشی اور فصل ہیں ممنوع' اسے وہی شخص کھا سکے گا جسے ہم اجازت دیں گے' یہ بات وہ بزعم خود کرتے تھے اور بعض مویشی ایسے ہیں جن کی پیٹھ حرام ہے' اور بعض مویشی ایسے ہیں جن کے اوپر وہ اللہ کا نام لینا ضروری خیال نہیں کرتے' اللہ پر افتراء باندھتے ہوئے' عنقریب اللہ ان کو ان کے اس افتراء کی سزا دے گا) یہ لوگ یہی دعویٰ کرتے تھے کہ اللہ یہ چاہتا ہے اور یہ نہیں چاہتا۔ اور یہ اپنی جانب سے افترا پردازی کرتے تھے جس طرح آج بعض لوگ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں' از خود قانون بناتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے شریعت ہے' اس کے جواب میں اللہ ان کو کہتا ہے کہ تم افتراء باندھ رہے ہو' اس کے بعد اللہ خود ان سے پوچھتا ہے کہ قیامت کے دن تمہارا کیا حال ہو گا' تم قیامت کو کیا سمجھتے ہو؟

وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (١٠ : ٦٠) "جو اللہ پر جھوٹا افترا باندھتے ہیں ان کا کیا گمان ہے کہ قیامت کے روز ان سے کیا معاملہ ہو گا"۔ یہاں غائب کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تمام لوگ جو اللہ پر افترا باندھتے ہیں ان کا یہی حال ہو گا ۔ وہ کیا سمجھتے ہیں؟ قیامت کے دن ان کا کیا حال ہو گا' اس کا اصل تصور درحقیقت ان کے ذہن میں نہیں ہے ۔ یہ اس قدر خوفناک سوال ہے کہ سخت سے سخت انسان بھی اس کے سامنے پگھل جاتا ہے ۔

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ (١٠ : ٦٠) (اللہ تو لوگوں پر مہربانی کی نظر رکھتا ہے مگر اکثر انسان ایسے ہیں جو شکر نہیں کرتے) اللہ لوگوں پر فضل کرتا ہے' اس کا ایک فضل تو یہ ہے کہ اس نے اس کائنات میں لوگوں کے لیے سامان زیست کے وسیع ذخائر رکھے ہیں ۔ پھر اللہ نے انسان کو یہ قدرت اور علم و ہنر دیا ہے کہ وہ اس کائنات سے یہ وسائل رزق نکال رہے ہیں ۔ پھر انسانوں نے وہ سائنسی اصول دریافت کر لیے ہیں جو اللہ نے اس کائنات میں جاری رکھے ہیں ۔ پھر اللہ نے انسان کو یہ قدرت دی ہے کہ وہ ان مفید اشیاء کو مختلف صورتوں کی شکل دیتا ہے اور ان کا تجزیہ اور تحلیل کرتا ہے ۔ اور یہ سب چیزیں اس کے لیے مفید ہیں اور سامان حیات ہیں ۔
پھر اللہ کا فضل یہ ہے کہ اس نے ایک نظام زندگی اور منہاج حیات پر مشتمل ایک کتاب اتاری جس میں ہدایت و رحمت ہے اور وہ دلی روگوں اور بیماریوں کا علاج ہے تاکہ اللہ لوگوں کو ایک صحیح اور متوازن نظام زندگی بھی عطا کر دے جسے وہ اپنی زندگیوں میں نافذ کریں ۔ اور ان کو جو قوتیں' جو فکر' سوچ اور شعور دیا گیا ہے وہ اس کے مطابق ان سے

استفادہ کریں اور اس کے ذریعے وہ دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی پائیں ہیں اور اس طرح ان کی زندگی اور ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی فطرت میں ہم آہنگی پیدا ہو۔

لیکن بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی اس رحمت روحانی پر اور فضل مادی پر اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے' وہ اللہ کے نظام سے روگردانی اختیار کرتے ہیں' اللہ کی شریعت سے دور بھاگتے ہیں' اللہ کے ساتھ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں' اور اس طرح وہ اپنے آپ کو مشکلات میں ڈال کر اپنی دنیا کو تلخ کرتے ہیں اور آخرت کو خراب کرتے ہیں۔ اور اس ہدایت نامہ سے فائدہ نہیں اٹھاتے جو شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ہے۔

ایک گہری حقیقت کی یہ عجیب تصویر کشی ہے کہ یہ قرآن دلی بیماریوں کے لیے شفاء ہے۔ شفاء کا یہ بھی ایک مفہوم ہے۔ یہ شفاء انسانی دلوں میں اتری چلی جاتی ہے جس طرح ایک بیمار جسم کو شفایابی حاصل ہوتی ہے اور یہ قرآن اپنی خفیہ قوتوں کی وجہ سے دلوں کو شفا بخشتا ہے۔ یہ انسان کے دل و دماغ کے دروازے کھول دیتا ہے اور انسان کی قوائے مدرکہ عظیم حقائق کا ادراک کرتی چلی جاتی ہیں اور ان کو نہایت ہی کیف و سرور اور وجد حاصل ہوتا ہے اور وہ ایک ایسا نظام زندگی عطا کرتا ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی اگر اسے نافذ کر دیا جائے تو انسانی زندگی کے اندر پائے جانے والے تمام تضادات ختم ہو جائیں' پھر اس کے اندر ایک ایسی شفاء ہے کہ انسان اللہ کی طرف رخ کر کے نہایت ہی مطمئن زندگی بسر کرتا ہے۔ اسے اللہ کے عدل' انصاف اور جزاء و سزا پر یقین ہو جاتا ہے۔ وہ غلبہ خیر کا طالب ہوتا ہے اور اپنے اچھے انجام کے لیے ساعی اور کوشاں ہوتا ہے۔

غرض یہ مختصری عبارت ہے لیکن اس کے پیچھے حقائق و معانی کا ایک سمندر ہے۔ انسان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ اس کا استیعاب کر سکے۔ جس قدر غور کیا' جائے معانی کا ایک نیا سمندر سامنے آتا ہے۔

----ooo----

لوگ شکر نہیں کرتے' لیکن اللہ تو دلوں کے بھید تک جانتا ہے۔ وہ تو ظاہر و باطن سے خبردار ہے۔ زمین و آسمان میں کوئی ذرہ بھی اس کے علم و قدرت سے باہر نہیں ہے۔ اب انسانی ضمیر اور اس کے شعور کو ایک دوسرے زاویہ سے جگانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ انسان حساس ہو کر اس اطمینان کی دنیا میں داخل ہو جائے جو حضور اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ ؓ کو حاصل تھا' جو پورے کے پورے یکسو تھے۔ جو کسی سے نہ ڈرتے تھے اور نہ کسی کے سامنے جھکتے تھے' نہ اللہ کے ساتھ کسی وہمی رب کو شریک کرتے تھے۔

وَمَا تَكُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ
قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَیْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ ؕ وَ
مَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَلَاۤ
اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرَ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝۶۱ اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا

خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾
لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ
هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۴﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ هُوَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۵﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ ؕ وَمَا
يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ
اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾ هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ
النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾

"اے نبیؐ، تم جس حال میں بھی ہوتے ہو، اور قرآن میں سے جو کچھ بھی سناتے ہو، اور لوگو، تم بھی جو کچھ کرتے ہو، اس سب کے دوران میں ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں۔ کوئی ذرہ برابر چیز آسمان اور زمین میں ایسی نہیں ہے، نہ چھوٹی نہ بڑی، جو تیرے رب کی نظر سے پوشیدہ ہو اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو۔ سنو! جو اللہ کے دوست ہیں، جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ کا رویہ اختیار کیا، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ اے نبیؐ، جو باتیں یہ لوگ تجھ پر بناتے ہیں وہ تجھے رنجیدہ نہ کریں۔ عزت ساری کی ساری خدا کے اختیار میں ہے، اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

آگاہ رہو! آسمانوں کے بسنے والے ہوں یا زمین کے، سب کے سب اللہ کے مملوک ہیں اور جو لوگ اللہ کے سوا کچھ (اپنے خود ساختہ) شریکوں کو پکار رہے ہیں وہ نرے وہم و گمان کے پیرو ہیں اور محض قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی کہ اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا۔ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (کھلے کانوں سے پیغمبر کی دعوت) سنتے ہیں۔

اس حصے کی پہلی آیت ذہن انسان کو اللہ کا جو شعور دیتی ہے، وہ نہایت ہی اطمینان بخش بھی ہے اور نہایت ہی خوفناک بھی ہے۔ بیک وقت خوش کن بھی ہے اور ڈرانے والا بھی ہے۔

وَمَا تَكُوْنُ فِىْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ

شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ (۱۰ : ۶۱) "اے نبیؐ، تم جس حال میں بھی ہوتے ہو، اور قرآن میں سے جو کچھ بھی سناتے ہو، اور لوگو، تم بھی جو کچھ کرتے ہو، اس سب کے دوران میں ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں"۔ انسان کی حالت

کیا سے کیا ہو جائے گی جب وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اسے اللہ دیکھ رہا ہے۔ وہ گواہ ہے' وہ حاضر ہے اور اللہ اپنی تمام برائیوں کے ساتھ ساتھ حاضر و ناظر ہے۔ اپنی تمام قوتوں اور لشکروں کے ساتھ ساتھ خود بھی شاہد ہے۔ اللہ اس کائنات کا خالق ہے اور اس کے لیے یہ کام بہت ہی آسان ہے۔ وہ اس کائنات کے ہر چھوٹے بڑے امر کا مدبر ہے۔ اور وہ اپنی پیدا کردہ انسانی مخلوق کے ساتھ ہے۔ ایک چھوٹا سا ذرہ جو اس کائنات کی وسعتوں میں تیرتا ہے' وہ اللہ کے کنٹرول میں ہے۔ یہ ہے وہ حقیقی شعور جو قرآن ایک مومن کے دل میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہ شعور بیک وقت خوفناک بھی ہے اور امید افزا بھی۔ امید افزا یوں کہ جب اللہ ایک چھوٹے سے ذرے کو بھی بغیر کسی مونس اور دوست کے نہیں چھوڑتا' اس کی تدبیر بھی کرتا ہے تو اپنے دوست انسان کو کس طرح چھوڑ دے گا۔ اپنے دوستوں کی حمایت و ولایت کس طرح نہ کرے گا۔ یقیناً اللہ ان کے ساتھ ہو گا۔

وَ مَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ (۱۰ : ۶۱) "اے نبیؐ' تم جس حال میں بھی ہوتے ہو' اور قرآن میں سے جو کچھ بھی سناتے ہو' اور لوگو' تم بھی جو کچھ کرتے ہو' اس سب کے دوران میں ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں"۔ یہ صرف اس حد تک محدود نہیں ہے کہ اللہ کا علم وسیع اور شامل ہے بلکہ اللہ کی نگرانی اور نگہبانی بھی وسیع ہے وہ رقیب بھی ہے۔

وَ مَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۱۰ : ۶۱) "کوئی ذرہ برابر چیز آسمان اور زمین میں ایسی نہیں ہے' نہ چھوٹی نہ بڑی' جو تیرے رب کی نظر سے پوشیدہ ہو اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو"۔

اب اس وسیع کائناتی فضا میں تیرنے والے ہر ذرے کے ساتھ ہمارا راہوار خیال دوڑتا ہے۔ ان سب ذرات کے ساتھ علم الہی وابستہ ہے' چھوٹے اور بڑے سب ذرات اور کرات اس کے علم و نگہبانی میں ہیں۔ اللہ کی نگہبانی کی وسعتوں کے بارے میں سوچتے ہی انسان خوف کے مارے کانپ اٹھتا ہے۔ اللہ کا خوف دل پر چھا جاتا ہے اور انسان بیم و رجاء کے درمیان محصور ہو جاتا ہے اور اس کا دل ڈرتے ڈرتے اللہ کی رحمت کا امیدوار ہوتا ہے۔

اب اس انس اور اطمینان اور قرب الہی کے تصورات میں اللہ کی جانب سے یہ اعلان آتا ہے۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۶۲) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ (۶۳) لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۶۴) (۱۰ : ۶۲ تا ۶۴) "سنو! جو اللہ کے دوست ہیں' جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ کا رویہ اختیار کیا' ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں

زندگیوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے ۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں ۔ یہی بڑی کامیابی ہے"۔

سوال یہ ہے کہ اللہ کے دوست کس طرح ڈر سکتے ہیں اور کیوں ان کو خوف لاحق ہو سکتا ہے جبکہ اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے ۔ ہر حال ' ہر عمل ' ہر حرکت اور ہر سکون میں اللہ ان کے ساتھ ہے ' وہ اللہ کے دوست ہیں اور اللہ سے ڈرنے والے ہیں ۔ کیوں نہ اللہ ان کی حمایت کرے گا۔

ان کے لیے ڈر اور حزن و ملال کا مقام ہی نہیں ہے ۔ وہ تو اللہ کے دوست ہیں ' وہ اللہ کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں ۔ دنیا و آخرت میں ان کے لیے خوشخبریاں ہی خوشخبریاں ہیں اور یہ اللہ کا وعدہ اور اللہ کا قول ہے اور اللہ کا قول اور اللہ کا وعدہ بدلتا نہیں ہے ۔ لہٰذا اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے ۔

یہاں قرآن کریم جن اولیاء اللہ کا ذکر کر رہا ہے وہ سچے مومن ہیں ' وہ صحیح معنوں میں خدا سے ڈرنے والے لوگ ہیں ۔ ایمان کی حقیقت کیا ہے ؟ یہ کہ وہ دلی یقین ہے جس کی تصدیق و تائید عمل سے ہوتی ہے اور عمل کا مفہوم کیا ہے ؟ یعنی ان باتوں کو نافذ کرنا جن کا اللہ نے حکم دیا ہے اور ان چیزوں سے رکنا جن سے رکنے کا اللہ نے حکم دیا ہے ۔ یہ ہے وہ طریقہ جس کے ذریعے سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اللہ کے دوست کون لوگ ہوتے ہیں ۔ عوام الناس اولیاء اللہ کا جو مفہوم سمجھتے ہیں وہ ایسے لوگ ہیں جو مخبوط الحواس ہوتے ہیں اور حواس باختہ ہوتے ہیں ۔

یہاں اللہ کے دوستوں کے بیان کے ضمن میں اللہ کے دوستوں کے سرخیل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور تسلی چند کلمات سے خطاب کیا جاتا ہے کہ آپ ان مکذبین کے رویہ سے پریشان نہ ہوں اور نہ آپ ان افتراپردازوں کے افتراء کی پروا کریں ۔ یہ لوگ حضورؐ کے زمانے میں نہایت ہی معتبر اور طاقتور لوگ تھے ۔

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۱۰:۶۵) "اے نبیؐ ' جو باتیں یہ لوگ تجھ پر بناتے ہیں وہ تجھے رنجیدہ نہ کریں ۔ عزت ساری کی ساری خدا کے اختیار میں ہے ' اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے عزت کی نسبت صرف اپنی ذات کی طرف کی ہے اور اس میں رسول اور مومنین کو شریک نہیں کیا جس طرح دوسرے مقام پر لفظ عزت کی نسبت سب کی طرف کی تھی ۔ کیونکہ بات یہ ہو رہی ہے کہ اللہ اپنے دوستوں کو بچانے والا ہے ' اس لیے لفظ عزت کی نسبت صرف اللہ کی طرف کی گئی اور در حقیقت بھی عزیز حقیقی تو اللہ ہی ہے ۔ اور اہل ایمان اور رسول اللہ کی عزت اللہ کی وجہ سے ہے تاکہ نافرمان اہل قریش کو معلوم ہو کہ وہ جو اپنے آپ کو بڑا اور عزیز سمجھتے ہیں وہ کچھ نہیں ہیں ۔ اصل عزت اور غلبہ اللہ کے لیے ہے اور اہل ایمان اور رسول اللہؐ اللہ کی حفاظت میں ہیں ۔ لہٰذا پیغمبر کو ان نافرمانوں کی باتوں پر پریشان نہیں ہونا چاہئے ۔ اللہ اس کے ساتھ ہے جو سمیع و علیم ہے ۔ وہ ان کی باتوں کو سنتا ہے ۔ ان کی سازشوں سے باخبر ہے اور اپنے دوستوں کے بچانے کی تدابیر کرتا ہے ۔ آسمانوں اور زمینوں کی سب قوتیں اس کے ہاتھ میں ہیں ۔ انس و جن اور ملائکہ اس کے قبضے میں ہیں ' نافرمان اور فرمانبردار بھی اس کے دائرہ قوت میں ہیں ۔ اللہ کی مخلوقات میں سے قوی سے قوی تر بھی اس کے قبضے میں ہے ۔

أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ (۱۰:۶۶) (آگاہ رہو ' آسمانوں کے بسنے

والے ہوں یا زمین کے 'سب کے سب اللہ کے مملوک ہیں ) یہاں مَا فِی السَّمٰوٰتِ کے بجائے مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ اس لیے کہا گیا ہے کہ مقصود ذی قوت چیزوں کا ذکر ہے اور ذی قوت خواہ ضعیف ہوں یا قوی وہ زندہ ہوتی ہیں ' یعنی سب قوتیں اللہ کے دست ملک و تصرف میں ہیں - اور من کے مفہوم میں بھی ہر قوت شامل ہے -

وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (۱۰:٦٦) "اور جو لوگ اللہ کے سوا کچھ (اپنے خود ساختہ) شریکوں کو پکار رہے ہیں وہ نرے وہم و گمان کے پیرو ہیں اور محض قیاس آرائیاں کر رہے ہیں" - یہ شریک حقیقی شریک نہیں صرف وہمی شریک ہیں - حقیقت واقعہ میں وہ اللہ کے کسی کام میں شریک نہیں ہیں اور خود یہ شرک کرنے والے بھی اپنے عمل کے بارے میں زیادہ مطمئن نہیں ہیں -

اب یہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بعض کائناتی کرشمے ذکر کیے جاتے ہیں - وہ کرشمے جن سے لوگ غافل ہیں اور ان میں ان شریکوں کا کوئی دخل بادی النظر میں نہیں ہے -

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ (۱۰:٦٧) "وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی کہ اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا - اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (کھلے کانوں سے پیغمبر کی دعوت) سنتے ہیں" - اس کائناتی حرکت و سکون کا مالک وہ ہے ' اس نے رات بنائی جس میں وہ پرسکون رہیں اور دن کو روشن بنایا تاکہ لوگ اس میں حرکت کریں اور دیکھیں اور اللہ بھی ان کو دیکھے - یہ اللہ ہی ہے جو حرکت و سکون کی کنجیاں لیے ہوئے ہے - یہ اس پوری کائنات پر قدرت رکھتا ہے ' وہ اپنے دوستوں کو بچا سکتا ہے - وہ اپنے رسول کو بچانے پر قادر ہے - اور رسول! وہ تو اس کے دوستوں کے قائد ہیں --- دیکھو! سننے والوں کے لیے اس میں نشانات راہ موجود ہیں 'بشرطیکہ وہ سنیں اور تدبر کریں -

قرآن میں جب اللہ کی ربوبیت اور انسانوں کی بندگی کا موضوع آتا ہے تو اس موضوع پر بطور دلیل اللہ تعالیٰ کائناتی مشاہد کو ضرور پیش فرماتے ہیں - یہ اس لیے کہ یہ کائنات اپنے وسیع و عریض مشاہد کے ساتھ اس بات پر گواہ ہے کہ اس کا ایک مدبر ہے اور فطرت کے اس گہرے منطقی استدلال کی کوئی دلیل رد نہیں کر سکتی - اسی طرح قرآن مجید لوگوں کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ دیکھو تمہاری زندگی اور اس کائنات کے اندر گہرا ربط ہے -

لوگو ' تم تو دلیل ہدایت کے اندر رہتے ہو ' یہ رات جس میں تم رہتے ہو ' یہ دن جس میں تم دیکھتے اور پھرتے ہو ' یہ دو مظاہر تمہاری حیات کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں - رات اور دن کا نظام تمہاری زندگی کے ساتھ گہری ہم آہنگی رکھتا ہے - یہ ایک مکمل دلیل ہے ' اس کے ہوتے ہوئے تمہیں کسی گہرے علمی اور سائنسی استدلال کی ضرورت نہیں ہے - انسانی فطرت اس کائنات کی زبان کو سمجھتی ہے -

انسان کبھی بھی منطق فطرت کی زبان سے غافل نہیں رہا ہے - اس نے ہمیشہ کائنات کے استدلال پر غور کیا ہے -

یہاں تک کہ وہ دور جدید کے سائنسی زمانے میں داخل ہو گیا۔ لیکن علیم و خبیر نے تو انسان کو پہلے سے ہی خبردار کر دیا۔ ہاں منطق فطرت علوم و فنون کی تجدید سے جدید ہوتی جاتی ہے۔ جوں جوں انسان علوم اور سائنس میں ترقی کرے گا' وہ اس فطری استدلال کو مزید اچھی طرح سمجھتا رہے گا۔ بشرطیکہ ان کے دل و دماغ کو ایمان کے ذریعے اور اللہ کی نورانیت کے ذریعے وسعت حاصل ہو جائے۔

---o o o---

اللہ کے ساتھ شرک کی ایک شکل یہ تھی کہ اللہ کی اولاد ہے اور عرب مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔ اس سبق کے خاتمے پر اس مخصوص قسم کے شرک کو بھی رد کر دیا گیا کہ یہ بھی اللہ پر ایک افتراء ہے۔ اس شرک کو اس دنیا میں استدلال کے ذریعے رد کیا جاتا ہے اور آخرت میں تو اس کے لیے سزا ہی ہوگی :

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ۝﴿۶۸﴾ قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝﴿۶۹﴾
مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ
۱۰ع بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝﴿۷۰﴾ الثلثة

۱۲ "لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ سبحان اللہ! وہ تو بے نیاز ہے' آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کی ملک ہے۔ تمہارے پاس اس قول کے لیے آخر دلیل کیا ہے؟ کیا تم اللہ کے متعلق وہ باتیں کہتے ہو جو تمہارے علم میں نہیں ہیں؟ اے نبی' کہہ دو کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پا سکتے۔ دنیا کی چند روزہ زندگی میں مزے کر لیں' پھر ہماری طرف ان کو پلٹنا ہے' پھر ہم اس کفر کے بدلے جس کا ارتکاب وہ کر رہے ہیں' ان کو سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے"۔

یہ عقیدہ کہ اللہ کی کوئی اولاد ہے۔ یہ نہایت ہی سادہ لوحی پر مبنی ہے اور یہ ان معاشروں میں پھیلا ہے جن میں سوچنے کی کوئی صلاحیت نہ تھی۔ ایسے لوگ اس پر یقین رکھتے رہے ہیں جو اللہ کی ربوبیت' ازلیت اور ابدیت اور انسان کی مخلوق اور فانی فطرت کو نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح وہ اس سنت الٰہیہ کے ادراک سے بھی عاجز ہیں۔ فانی تو مرنے والی مخلوق اولاد عطا کرنے کے اندر مضمر ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ سلسلہ توالد ہی انسان کے نقص پر دلیل ہے۔ اور اللہ کی طرف کسی نقص کی نسبت نہیں ہو سکتی۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے وہ مرتا ہے' لیکن زندگی کا سلسلہ وقت معلوم تک باقی ہے' جب تک قیامت نہیں آ جاتی۔ سلسلہ حیات و ممات جاری رہے گا۔ اور سلسلہ توالد امتداد حیات کا ایک ذریعہ ہے۔

انسان بوڑھے ہوتے ہیں' ضعیف ہوتے ہیں اور بچے اس ضعف کا عوض بنتے ہیں اور اس زمین پر اپنا فرض ادا

کرتے ہیں اور اس طرح ضعفاء اور بوڑھوں کے مرنے کے بعد ان کے جانشین ہوتے ہیں۔

انسان اپنے ماحول میں جدوجہد کرتے ہیں۔وہ اپنے دشمن انسانوں اور حیوانوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔اس لیے انہیں سہاروں اور اولاد کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسے حالات میں اولاد انسانوں کے لیے مناسب سہارا ہوتی ہے۔انسان یہاں اپنے لیے دولت جمع کرتے ہیں اور اس جدوجہد میں اولاد ان کے لیے مفید ہوتی ہے۔یہ اور اس قسم کی تمام دوسری حکمتیں جن کے مطابق اللہ نے یہاں سلسلہ انسانیت جاری اور ساری فرمایا یہ قیامت تک جاری رہے گا۔

مذکورہ بالا امور میں سے کوئی امر بھی اللہ کے ساتھ متعلق نہیں ہے' نہ مقام ربوبیت کے ساتھ مناسب ہے' نہ اللہ کو اپنی الوہیت کے نظام کو چلانے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت ہے' وہ بوڑھا نہیں ہوتا کہ اسے اولاد کی ضرورت ہو' نہ وہ محتاج ہوتا ہے کہ اسے نصرت لینے کی حاجت ہو' اسے مال کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ غنی ہے۔اسے ان اشیاء میں سے کسی کی ضرورت نہیں ہے جس کے بارے میں انسان ضرورت مند ہوتا ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر اللہ کی اولاد کا عقیدہ رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے' کیونکہ الوہیت کی ماہیت ہی یہ ہے کہ اسے خارج کے ساتھ کوئی احتیاج نہیں ہے۔نہ ان اغراض سے حقیقت الوہیت وابستہ ہے جو بیٹے کے ساتھ ہوتی ہیں۔اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سلسلہ تولید اس لیے جاری فرمایا ہے کہ امتداد حیات کے لیے یہ سلسلہ ضروری تھا۔نظام انسانیت کا تقاضا یہی تھا کہ اس میں سلسلہ تولید جاری ہو۔

جن لوگوں نے کہا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا (۱۰:۶۸) ان کے جواب میں صرف یہ کہا گیا

سُبْحٰنَهٗ هُوَ الْغَنِیُّ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (۱۰:۶۸) وہ غنی ہے' یعنی سلسلہ تولید کا تعلق تو احتیاج کے ساتھ ہے اور اللہ غنی ہے۔اس لیے اس کو اولاد کی ضرورت ہی نہیں ہے اور وہ غنی بھی وسیع معنوں میں غنی ہے۔اس کو ان ضروریات میں سے کوئی ضرورت لاحق نہیں ہے جن کا اوپر ذکر ہوا۔لہذا اللہ کے لیے اولاد کا تصور ہی عبث ہو گا۔

قرآن کریم طبیعت الٰہیہ اور طبیعت ناسوتیہ جیسی منطقی اور کلامی مباحث میں نہیں پڑتا۔یہ مباحث متکلمین اور فلاسفہ کے ہاں عام ہیں کیونکہ قرآن کریم عوام الناس کو فطری انداز اور عمومی اسلوب میں مخاطب کرتا ہے۔قرآن کریم کے موضوع پر جدلیاتی انداز کلام اختیار نہیں کرتا بلکہ ڈائریکٹ انداز میں اور فطرت کے عین مطابق پھر قرآن موضوع پر کوئی بات فرض کر کے کلام نہیں کرتا۔

انسان اپنے آپ کو اولاد کی طرف محتاج سمجھتا ہے۔اس لیے قرآن کریم اللہ کی ذات کے حوالے سے ہر قسم کے احتیاج کی نفی کر کے اسے زمین و آسمان کے خزانوں کا مالک قرار دیتا ہے تاکہ لوگ اس بات پر مطمئن ہو جائیں کہ اللہ کی اولاد کا تصور دراصل ایک لغو تصور۔یہ ایک فطری انداز کلام ہے اور انسانی فطرت اس سے مطمئن ہو جاتی ہے نہایت آسانی کے ساتھ۔

لیکن قرآن کریم ان کو بھی ایک مشکل صورت حال سے دوچار کر دیتا ہے جب ان کے عقائد پر خود ان سے استدلال پوچھتا ہے کہ تم جو یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ اللہ کی اولاد ہے تو اس پر تمہارے پاس کیا برہان ہے۔سلطان بمعنی برہان اس

لیے آتا ہے کہ صاحب دلیل بادشاہ کی طرح مضبوط ہوتا ہے۔

اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۰ : ۶۸)

(تمہارے پاس اس قول کے لیے آخر دلیل کیا ہے؟ کیا تم اللہ کے متعلق وہ باتیں کہتے ہو جو تمہارے علم میں نہیں ہیں؟)

ظاہر ہے کہ ان کے پاس کوئی حجت و دلیل نہیں ہے اور یہ لوگ وہ بات کہتے ہیں جو ان کے ہاں علمی درجہ نہیں رکھتی۔

انسان کے لیے کسی اور کے بدلے میں ایسی بات کا عقیدہ رکھنا جو علمی حیثیت سے ثابت نہ ہو' ایک نقص ہے۔ اور اگر انسان اللہ کے بارے میں کوئی ایسا عقیدہ رکھے تو یہ بڑا نقص اور جرم عظیم ہے۔ یہ بات اللہ کی ذات کے حوالے سے بھی نقص ہے اور انسان کے لیے بھی نقص ہے کہ وہ اپنے خالق کی طرف ایسی بات منسوب کرے جو موجب نقص ہو' جبکہ اللہ تعالیٰ اس نقص سے برتر ہے۔ اللہ کی طرف نقص کا منسوب کرنا' خدا اور بندے کے تعلق کے حوالے سے گمراہی ہے۔ اگر کوئی اللہ کے بارے میں ناقص تصور رکھے گا تو اس کے تمام تصورات دنیاوی امور کے بارے میں بھی ناقص ہوں گے کیونکہ انسان کے تمام تصورات اس کے تصور الہٰ کے تابع ہوتے ہیں۔ کاہنوں اور پادریوں نے جو الٰہیاتی عقائد گھڑے ہیں وہ اسی ناقص تصور الٰہ کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً اللہ اور حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کے بارے میں غلط تصورات' یا ارتکاب گناہ کی کہانی اور اس کا کفارہ وغیرہ تمام عقائد باطلہ ان کے اس اصل عقیدۂ تصور الٰہ کی غلطی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اگر الٰہ کے بارے میں ان کے عقیدے میں غلطی نہ ہوتی تو یہ عقائد نہ گھڑے جاتے۔

لہٰذا یہ مسئلہ صرف ایک لاہوتی تصور کا نہیں ہے' بلکہ اس کے نتیجے میں زندگی کے تمام تصورات غلط ہو جاتے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں اہل کنیسہ نے جس عقل دشمنی اور علوم طبیعیہ کی دشمنی کا بونڈھا مظاہرہ کیا وہ اسی غلط تصور الٰہ کا نتیجہ تھا۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ تمام انسانی زندگی نے جہاد کر کے اپنے آپ کو کنیسہ کی غلامی سے آزاد کرا لیا۔ بلکہ اس کے نتیجے میں مطلق دین سے پوری انسانیت دور ہوگئی۔ یہ تمام فساد اس لیے برپا ہوا کہ کنیسہ نے الٰہ اور عبد کے درمیان تعلق کا ایک غلط تصور دیا' اور اس کے نتیجے میں نہایت ہی غلط تصورات ابھرے۔ اور پھر اس کے نتیجے میں پوری انسانیت پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے بندے اور خدا کے تصور کو نہایت ہی صاف اور شفاف انداز میں پیش کیا ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں چھوڑا ہے۔ اللہ خالق' ازلی غیر محتاج' صمد' اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا ہے۔ تمام مخلوقات اللہ کی پیدا کردہ اور اس کی غلام ہیں۔ یہ کائنات بھی اللہ کی پیدا کردہ ہے اور اس کے سائنسی ضابطے بھی اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس دنیا میں رہنے والوں نے اگر ان سائنسی ضابطوں کے مطابق زندگی بسر کی تو وہ کامیاب ہوں گے۔ یہ سنت الٰہیہ ہیں اور سنت الٰہیہ کبھی نہیں بدلتی۔ جو شخص سنت الٰہیہ کے مطابق چلے گا' کامیاب ہو گا' جو سنت الٰہیہ کی خلاف ورزی کرے گا' نقصان اٹھائے گا۔ سب انسان برابر ہیں اور سب نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ اللہ کے ہاں حساب و کتاب ہو گا اور وہاں کوئی سفارشی نہ ہو گا' اللہ کا کوئی شریک نہ ہو گا' قیامت کے دن ہر شخص انفرادی طور پر جوابدہ ہو گا۔ ہر شخص کے لیے وہی ہو گا جو اس نے کمایا اور کسی پر ظلم نہ ہو گا۔

یہ نہایت ہی سادہ عقیدہ ہے۔ اس میں نہ فساد ہے اور نہ تاویل ہے اور پیچیدگی ہے اور نہ انحراف ہے اور نہ گمراہی

اور کجی ہے۔ اس عقیدے کے نتیجے میں انسان کا یہ تصور سامنے آتا ہے کہ سب انسان اللہ کے سامنے جوابدہ ہیں' سب شریعت کے تابع ہیں' سب ذمہ دار ہیں' یہی وجہ ہے کہ سب کے سب باہم بھائی بھائی ہیں اور ان کے آپس میں تعلقات بہت ہی اچھے ہیں۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ ان کا تصور الٰہ اور عقیدہ' عقیدۂ توحید درست ہے۔

قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ (۱۰:۶۹) "کہہ دو کہ جو لوگ اللہ پر افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پا سکتے"۔ وہ کسی معنی میں بھی فلاح نہیں پا سکتے۔ وہ کسی راہ پر منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ نہ دنیا میں کامیاب ہوں گے نہ آخرت میں۔ مکمل کامیابی اس قوم کو حاصل ہوتی ہے جو سنن الٰہیہ پر قائم ہو جس میں خیر ہی خیر ہوتی ہے۔ جس میں انسانیت کی رفعت ہوتی ہے' جس میں انسانی سوسائٹی کی بھلائی ہوتی ہے' جس میں زندگی ترقی پاتی ہے' جس میں زندگی آگے بڑھتی ہے۔ وہ ایسی زندگی نہیں ہوتی جس میں محض صنعتی اور مادی پیداوار کے لیے تمام اخلاقی اور روحانی اقدار کو قربان کر دیا جاتا ہو۔ اور انسان کو انسانی مرتبے سے گرا کر حیوان بنا دیا جاتا ہو۔ یہ تو وقتی کامیابی ہوتی ہے' اور اس میں انسانیت کو جزوی فلاح تو حاصل ہوتی ہے لیکن کلی فلاح حاصل نہیں ہوتی۔

مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِیْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ (۱۰:۷۰) (دنیا کی چند روزہ زندگی میں مزے کر لیں' پھر ہماری طرف ان کو پلٹنا ہے' پھر ہم اس کفر کے بارے جس کا ارتکاب وہ کر رہے ہیں' ان کو سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے)۔

یعنی یہ مزہ صرف مزہ ہے اور نہایت ہی مختصر وقت کے لیے ہے۔ یہ کٹ جانے والا مزہ ہے' کیونکہ یہ دائمی فلاح پر مبنی نہیں ہے جو انسانیت کے شایان شان ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر آخرت میں وہ عذاب شدید سے دوچار ہوں گے۔ ان کا تصور الٰہ' الٰہ کے شایان شان نہ تھا' اس لیے ان کی فلاح انسان کے شایان شان نہیں ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۹۷ ایک نظر میں

اس سورہ کے آغاز میں ازمنہ گزشتہ کے بارے میں اشارہ کیا گیا تھا کہ ان میں کئی اقوام نے انبیاء کی تکذیب کی تھی اور وہ انجام ناسور سے دوچار ہوئے تھے اور اللہ نے ان کو ہلاک کر کے دوسری اقوام کو ان کی جگہ بسایا تھا۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۳) ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۴) (۱۰: ۱۳ - ۱۴) "تم سے قبل ہم نے قوموں کو ہلاک کیا جب انہوں نے ظلم کیا اور ان کے پاس ان کے رسول آئے دلائل کے ساتھ' لیکن وہ مان کر دینے والے نہ تھے۔ اس طرح ہم قوم مجرم کو جزاء دیتے ہیں۔ ان کے بعد ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو"۔

اس سے قبل یہ بات بھی اسی سورت میں آئی تھی کہ ہر امت کے پاس رسول بھیجے گئے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِىَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ

(۱۰: ۴۷) (ہر امت کے لیے ایک رسول ہوتا ہے' جب ان کا رسول ان کے پاس آتا ہے تو ان کے معاملے کا انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا)

اب اس سبق میں انہی دو موضوعات پر بات آگے بڑھتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے قصے کا ایک پہلو یہاں لایا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ اور فرعون کے قصے کا بھی ایک پہلو لایا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ تکذیب کا انجام کیا ہوتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ جب رسول آجاتا ہے اور پیغام سنا دیا جاتا ہے تو پھر انجام یوں ہوتا ہے :

ایک اشارہ حضرت یونس کی قوم کی طرف بھی یہاں آتا ہے کہ اس قوم پر عذاب آنے ہی والا تھا کہ وہ ایمان لے آئی۔ اور اس کا ایمان قبول ہوا اور اسے نجات مل گئی۔ یہ مکذبین کے لیے ایک اشارہ ہے کہ وہ وقت کو غنیمت سمجھیں اور فیصلہ سے قبل ہی ایمان لے آئیں اور جس عذاب سے انہیں ڈرایا جاتا ہے اس سے بچ جائیں اور اس کا انجام ایسا نہ ہو جس طرح قوم نوح یا قوم فرعون کا ہوا۔

اگلے سبق کا خاتمہ اس بات پر ہوا تھا کہ حضورؐ کو حکم دیا گیا کہ وہ ان لوگوں کو متنبہ کریں جو اللہ پر افترا باندھتے

ہیں۔ اور وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں اور کہا گیا تھا۔

قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ (٦٩) مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِیْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ بِمَا کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ (٧٠) (١٠ : ٦٩ — ٧٠) "کہہ دو' جو لوگ اللہ پر جھوٹ کا افترا باندھتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے' دنیا کے مزے ہیں۔ پھر ہماری طرف لوٹنا ہے' پھر ہم ان کو چکھائیں گے شدید عذاب' اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتے تھے) اور یہ دھمکی ان کو رسول اللہ نے اس لیے دی کہ ان کو مطمئن کر دیا جائے۔

وَلَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا (١٠ : ٦٥) "اور آپ کو ان کی یہ بات غم میں نہ ڈال دے' بے شک عزت سب کی اللہ کے لیے ہے) اور یہ کہ اللہ کے اولیاء کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ حزن کا مقام ہے۔ اب حضورؐ کو مزید حکم دیا جاتا ہے کہ ان کے سامنے قصہ نوح پڑھیں کہ کس طرح مکذبین ہلاک ہوئے اور مومنین نے نجات پائی اور پھر زمین کا اقتدار ان کے حوالے کر دیا گیا۔ اس قوم کے مکذبین نہایت ہی طاقتور اور بڑی تعداد میں تھے۔

اس سورت کے موضوع کے ساتھ ان قصص کی مناسبت ہے۔ قرآن مجید میں قصص ہمیشہ سورت کے اصل موضوع کی تائید میں لائے جاتے ہیں۔ اور مختلف سورتوں میں موضوع سورت کی مناسبت سے قصص لائے جاتے ہیں' یعنی قصص کی وہی کڑی لائی جاتی ہے جو موضوع سخن کے مناسب ہو۔ یہاں قصہ نوح ؑ' قصہ فرعون اور حضرت یونس ؑ کے قصے کی اس سورت کے موضوع کے ساتھ مناسبت ہے کہ حضورؐ ویسے ہی حالات میں اپنے ساتھیوں کی مختصر اور کمزور جمعیت کے ساتھ کام کر رہے تھے جس طرح حضرت نوح ؑ اور حضرت موسیٰ ؑ کر رہے تھے اور بالمقابل قوت اس طرح تھی جس طرح ان انبیاء کے بالمقابل قومیں تھیں۔ لیکن نتائج یہاں بھی ایسے ہی نکلیں گے جیسے ان اقوام کے نکلے۔ قصص کے ربط کے سلسلے میں تفصیلی بات آئندہ ہو گی۔

---O O O---

# درس نمبر ۹۷ تشریح آیات

۷۱ ــــ تا ــــ ۱۰۳

وَ اتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَاَ نُوۡحٍ ۘ اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖ يٰقَوۡمِ اِنۡ كَانَ كَبُرَ عَلَيۡكُمۡ مَّقَامِىۡ وَ تَذۡكِيۡرِىۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلۡتُ فَاَجۡمِعُوۡۤا اَمۡرَكُمۡ وَ شُرَكَآءَكُمۡ ثُمَّ لَا يَكُنۡ اَمۡرُكُمۡ عَلَيۡكُمۡ غُمَّةً ثُمَّ اقۡضُوۡۤا اِلَىَّ وَلَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۷۱﴾ فَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَمَا سَاَلۡتُكُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ ؕ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَ اُمِرۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ﴿۷۲﴾ فَكَذَّبُوۡهُ فَنَجَّيۡنٰهُ وَمَنۡ مَّعَهٗ فِى الۡفُلۡكِ وَجَعَلۡنٰهُمۡ خَلٰۤئِفَ وَ اَغۡرَقۡنَا الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُنۡذَرِيۡنَ ﴿۷۳﴾

"ان کو نوح ؑ کا قصہ سناؤ' اس وقت کا قصہ جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "اے برادران قوم' اگر میرا تمہارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات سنا سنا کر تمہیں غفلت سے بیدار کرنا تمہارے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے تو میرا بھروسہ اللہ پر ہے' تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک متفقہ فیصلہ کر لو' اور جو منصوبہ تمہارے پیش نظر ہو' اس کو خوب سوچ سمجھ لو تاکہ اس کا کوئی پہلو تمہاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے' پھر میرے خلاف اس کو عمل میں لے آؤ اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔ تم نے میری نصیحت سے منہ موڑا (تو میرا کیا نقصان کیا) میں تم سے کسی اجر کا طلب گار نہ تھا' میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (خواہ کوئی مانے یا نہ مانے) میں خود مسلم بن کر رہوں"۔ انہوں نے اسے جھٹلایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اسے اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے' بچا لیا اور انہی کو زمین میں جانشین بنایا اور ان سب لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔ پس دیکھ لو کہ جنہیں متنبہ کیا گیا تھا (اور پھر بھی انہوں نے مان کر نہ دیا) ان کا کیا انجام ہوا"۔

یہاں قصہ نوح ؑ کی آخری کڑی پیش کی گئی ہے۔ طویل ڈرانے اور سمجھانے کے بعد اور طویل تبلیغ و تکذیب کے

بعد اس قصے کا آخری منظر یہاں لایا گیا ہے۔ یہاں سفینے اور اس کے سواروں کی تفصیلات نہیں دی گئیں۔ نہ طوفان کا ذکر ہے' نہ قصے کے اس حصے کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ یہاں مقصد صرف یہ بتانا ہے چیلنج دے کر اللہ پر بھروسہ کیا جائے اور انجام سامنے لایا جائے جس میں رسول کامیاب نظر آئے' اہل ایمان کامیاب و کامران ہوں اور مکذبین ہلاک و برباد ہوں۔ اگرچہ وہ قوی اور کثیر ہوں۔ اس لیے یہاں قصے کو نہایت ہی اختصار کے ساتھ لیا گیا ہے۔ صرف آخری انجام و تحدی کا ذکر ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَ تَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ (۱۰ : ۷۱) "ان کو نوح کا قصہ سناؤ' اس وقت کا قصہ جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "اے برادران قوم' اگر میرا تمہارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات سنا سنا کر تمہیں غفلت سے بیدار کرنا تمہارے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے تو میرا بھروسہ اللہ پر ہے' تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک متفقہ فیصلہ کر لو' اور جو منصوبہ تمہارے پیش نظر ہو' اس کو خوب سوچ سمجھ لو تا کہ اس کا کوئی پہلو تمہاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے' پھر میرے خلاف اس کو عمل میں لے آؤ اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو"۔

اگر تم اس قدر تنگ ہو گئے ہو اور تمہارے اندر میرا کام کرنا تمہارے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے اور تم میری یاد دہانی کو بالکل قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو' اور میں اپنی راہ پر رواں ہوں۔ میرا صرف اللہ پر بھروسہ ہے۔

فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ (۱۰ : ۷۱) "میرا بھروسہ صرف اللہ پر ہے"۔ صرف اللہ پر اور میرے لیے کافی ہے اس کے سوا مجھے کسی مددگار اور دوست کی ضرورت نہیں ہے۔

فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ (۱۰ : ۷۱) "تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک متفقہ فیصلہ کر لو"۔ یعنی اپنے معاملے کے ہر پہلو پر غور کر لو' اپنی تیاریاں مکمل کر لو اور خوب جتھا بنا لو۔

ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً (۱۰ : ۷۱) "اور جو منصوبہ تمہارے پیش نظر ہو' اس کو خوب سوچ سمجھ لو تا کہ اس کا کوئی پہلو تمہاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے"۔ تمہارا منصوبہ تمہارے دلوں میں واضح ہو' اس میں کوئی التباس نہ ہو' نہ پیچیدگی ہو' نہ تردد ہو اور نہ پھر واپسی پختہ فیصلہ کر لو۔

ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ (۱۰ : ۷۱) "پھر میرے خلاف اس کو عمل میں لاؤ"۔ یعنی جو عزم تم نے کر لیا اسے نافذ کرو' میرے خلاف جو تدابیر تم نے سوچ لی ہیں' ان کو نافذ کرو' لیکن اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور منصوبے کے ساتھ۔

وَلَا تُنْظِرُوْنِ (۱۰: ۷۱) "اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو"۔ یعنی مجھے تیاری کی مہلت بھی نہ دو' کیونکہ میری تیاری صرف یہ ہے کہ میں اللہ وحدہ پر اعتماد اور بھروسہ کرتا ہوں اور اس کے ساتھ تمام وسائل تو محض وسائل ہی ہوتے ہیں - یہ نہایت ہی پر تاثیر تحدی ہے اور اس قسم کا چیلنج وہی شخص دے سکتا ہے جسے اپنی قوت پر پورا پورا اعتماد ہو اور اپنی تیاریاں مکمل نظر آتی ہوں' اور وہ دشمن کو اعتماد دلا رہا ہو کہ وہ بہرحال حملہ آور ہو جائیں - سوال یہ ہے کہ حضرت نوح ؑ کے پاس کوئی جنگی تیاری نہ تھی' نہ اسلحہ نہ تعداد افراد' دنیاوی قوتوں کے اعتبار سے ان کے پاس کوئی قوت نہ تھی -

حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس ایمان تھا - ایمان وہ قوت ہے جس کے مقابلے میں کوئی قوت ٹھہر نہیں سکتی - اس کے مقابلے میں افراد کی بڑی تعداد بھی چھوٹی ہو جاتی ہے - ایمان کے مقابلے میں تمام دنیاوی منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں ان کی پشت پر خدا کی کوئی قوت تھی اور خدا کی قوت کے مقابلے میں کوئی ٹھہر نہیں سکتا کیونکہ اللہ اپنے دوستوں کو یکہ و تنہا نہیں چھوڑتا -

اللہ وحدہ پر ایمان لانا اتنی عظیم قوت ہے' کہ اس کے ذریعے مومن کا رابطہ اس قوت سے ہو جاتا ہے جس کے کنٹرول میں زمین و آسمان ہیں اور وہ تمام افراد و اشیاء ہیں جو زمین و آسمان کے اندر ہیں - حضرت نوح ؑ کا یہ چیلنج محض دھمکی نہ تھی' نہ کوئی جسورانہ اقدام تھا' نہ خودکشی کا اقدام تھا —— ———— - یہ درحقیقت عظیم الٰہی قوت کی جانب سے چیلنج تھا اور یہ چیلنج ایسی جنگی قوت کو تھا جو الٰہی قوت کے سامنے حقیر تھی -

انبیاء ؑ کی سیرتوں میں داعیان حق کے لیے نمونے اور نشانات راہ ہیں ان کو چاہئے کہ وہ اللہ پر یقین اور بھروسہ سے اپنے جام قلب کو لبریز رکھیں اور عظیم سے عظیم تر طاغوتی قوتوں کے مقابلے میں اللہ پر بھروسہ کر کے دیوار بن جائیں -

طاغوت اہل ایمان کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا' وہ چھوٹی موٹی اذیتیں ہی دے سکتا ہے - اور یہ اذیت بھی اللہ کی طرف سے بطور ابتلا آتی ہے' اس لیے آتی کہ اللہ نعوذ باللہ اپنے دوستوں کی مدد سے عاجز ہے' یا یہ کہ اللہ اپنے دوستوں کو یکہ و تنہا چھوڑ دیتا ہے - یہ ابتلا اس لیے آئی ہے کہ لوگوں کی اصلاح ہو جائے' ان کے دل و دماغ صاف ہو جائیں - ان کے اندر اخلاص پیدا ہو جائے - اس کے بعد آخری فتح بہرحال اہل ایمان کی ہوتی ہے اور آخر کار اللہ زمین کا اقتدار اعلیٰ اہل ایمان کو دیتا ہے - اللہ تعالیٰ اپنے بندے حضرت نوح ؑ کا قصہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ اپنے دور کی طاغوتی قوتوں کو چیلنج دے رہے ہیں' یہ چیلنج نہایت ہی واضح ہے' مناسب ہے کہ ہم دراصل قصے ہی کو پڑھیں :

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۱۰: ۷۲) "تم نے میری نصیحت سے منہ موڑا (تو میرا کیا نقصان کیا) میں تم سے کسی اجر کا طلب گار نہ تھا' میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے - اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (خواہ کوئی مانے یا نہ مانے) میں خود مسلم بن کر رہوں"۔ اگر تم مجھ سے منہ پھیرتے ہو تو تم جانو اور تمہارا کام' میں جو تمہیں راہ راست دکھاتا ہوں تو اس سے میری کوئی دنیاوی غرض وابستہ نہیں ہے کہ مجھے نقصان ہو گا - میرا اجر تو اللہ پر ہے - اس لیے مجھے اپنی راہ اور اپنے نظریہ پر چلنے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی - میں اپنی ذات پر اسلام کو نافذ کروں گا - لہٰذا میں اسی قدر مکلف ہوں کہ اپنی زندگی کو تمہارے

سامنے نمونہ بناکر پیش کر دوں۔

فَكَذَّبُوهُ فَنَجَّيْنَهُ وَمَنْ مَّعَهُ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنَهُمْ خَلَئِفَ فِي الْأَرْضِ وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَتِنَا (۱۰: ۷۳) "انہوں نے اسے جھٹلایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اسے اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے ' بچالیا اور انہی کو زمین میں جانشین بنایا اور ان سب لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا"۔ یہ ہوا مختصراان کا انجام۔ حضرت نوح ؑ اور کشتی میں سوار ہونے والے آپ کے ساتھی یعنی اہل ایمان اور باقی غرق ہوئے اور اہل ایمان کو زمین کا اقتدار ملا۔ اہل طاغوت اپنی قوت اور کثرت کے باوجود غرق ہوئے۔

فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِينَ (۱۰: ۷۳) "پس دیکھ لو کہ جنہیں متنبہ کیا گیا تھا (اور پھر بھی انہوں نے مان کر نہ دیا) ان کا کیا انجام ہوا"۔ یعنی تمام جہاں نے دیکھ لیا کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا کرتا ہے اور اہل ایمان کے انجام سے بھی کوئی عبرت حاصل کرنا چاہتا ہے تو حاصل کرے۔

یہاں نہایت ہی اختصار سے قصہ کی طرف اشارہ کر کے اہل ایمان کی نجات کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ حضرت نوح ؑ اور اس کے ساتھی معدودے چند ہیں اور کافر نہایت ہی مضبوط اور تعداد میں بے شمار ہیں۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ ہلاک ہوئے بلکہ ان چند اہل ایمان کو زمین کا اقتدار اعلیٰ نصیب ہوا اور انہوں نے اس کرۂ ارض پر اسلامی نظام حیات کو نافذ کر کے ایک عرصے تک حکمرانی کی اور اپنا کردار ادا کرتے رہے حالانکہ بظاہر وہ کمزور و ناتواں تھے۔

یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر سنت الٰہیہ' یہ ہے کہ اللہ کا مستقل وعدہ اپنے دوستوں کے ساتھ۔ تحریک اسلامی کے کارکنوں کو یہ بات پلے باندھ لینا چاہئے کہ وہ اس راہ کی طوالت سے گھبرانہ جائیں۔ ان کو یقین کرنا چاہئے کہ آخری انجام اہل ایمان کا ہے۔ اور انہی کو فتح نصیب ہونی ہے۔ ان کو اپنی راہ پر چلنا چاہئے' چلتے رہنا چاہئے اور اللہ کے وعدے کے ظہور کے لیے جلدی نہ کرنا چاہئے۔ اللہ اپنے دوستوں کے ساتھ نہ دھوکہ کرتے ہیں' نہ اللہ ان کی نصرت سے عاجز ہے' نہ وہ اپنے دوستوں کو یکہ و تنہا چھوڑنے کا عادی ہے لیکن اللہ ان کو آزمانا ضرور ہے۔ ان کو تربیت ضرور دیتا ہے اور ابتلاء و آزمائش تو زاد راہ ہیں۔

---○○○---

یہاں حضرت نوح ؑ کے بعد آنے والے رسولوں کی طرف بھی اختصار کے ساتھ اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ وہ دلائل و معجزات لے کر آئے لیکن مکذبین کی روش بھی وہی رہی :

---

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿٧٤﴾

"پھر نوح ؑ کے بعد ہم نے مختلف پیغمبروں کو ان کی قوموں کی طرف بھیجا اور وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے 'مگر جس چیز کو انہوں نے پہلے جھٹلا دیا تھا' اسے پھر مان کر نہ دیا۔ اس طرح ہم حد سے گزر جانے والوں کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیتے ہیں"۔

یہ سب رسول اپنی اپنی قوم کے پاس آئے' دلائل لے کر آئے' قرآن کریم کہتا ہے "مگر جس چیز کو انہوں نے پہلے جھٹلا دیا تھا' اسے پھر مان کر نہ دیا" یعنی آیات و معجزات کے صدور سے قبل بھی انہوں نے جھٹلایا' اور آیات و معجزات کے صدور کے بعد بھی جھٹلایا اور آیات کی وجہ سے ان کے عناد میں کوئی فرق نہ آیا۔ ایک تو ہے یہ مفہوم دوسرا مفہوم یہ ہے کہ قرآن طاغوتی قوتوں کو ایک ہی جماعت تصور کرتا ہے کیونکہ ان کا مزاج اور ان کی روش ہی ایک ہوتی ہے۔ اس لیے یہ لوگ اس چیز پر ایمان نہیں لا سکتے جس کی تکذیب ان کے اسلاف نے کر دی تھی یا خود انہوں نے کی جبکہ وہ ان کے اسلاف کی صورت میں متشخص تھے۔ کیونکہ یہ انہی کی اولاد ہیں۔ ان کا مزاج ایک ہے' سوچ ایک ہے اور موقف ایک ہے۔ وہ قرآنی دلائل کے لیے اپنا دل نہیں کھول رہے' وہ اپنی عقل سے کام لے کر ان دلائل پر غور نہیں کرتے' ان لوگوں نے راہ اعتدال اور حد اعتدال سے تجاوز کر لیا ہے اور صراط مستقیم سے ہٹ گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے ذرائع ادراک کو معطل کر دیا ہے اور اس طرح حق کے نفوذ کی خاطر ان کے دلوں کی تمام راہیں بند ہو چکی ہیں اور یہ اللہ کی سنت ہے کہ "اسی طرح ہم حد سے گزر جانے والوں کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیتے ہیں۔

یہ اللہ کی قدیم سنت ہے کہ اگر صاحب قلب اپنے قلب کو سچائی کے لیے بند کر دے تو وہ منجمد ہو کر پتھر کی شکل اختیار کر لیتا ہے لہٰذا اس کے اندر حق کا نفوذ نہیں ہو سکتا۔ یہ صورت نہیں ہوتی کہ اللہ نے آغاز خلق میں سے کسی کو ہدایت سے محروم کر دیا اور وہ مجبوراً محروم ہوا۔

---ooo---

جہاں تک قصہ فرعون کا تعلق ہے تو وہ چیلنج اور تکذیب کے مرحلے سے شروع ہوتا ہے اور فرعون اور اس کے لشکر کے غرق ہونے پر وہ ختم ہوتا ہے۔ یہ قصہ نوح ؑ سے قدرے طوالت کے ساتھ بیان ہوا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ مشرکین مکہ نے بھی تحریک اسلامی کے مٹھی بھر کارکنوں کے حوالے سے وہی موقف اختیار کیا ہے جو فرعون نے حضرت موسیٰ ؑ اور ہارون ؑ اور کمزور بنی اسرائیل کے مقابلے میں اختیار کیا تھا۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَ هٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾ قَالَ مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَ مَا نَحْنُ لَكُمَا

بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨٣﴾

"پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا، مگر انہوں نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔ پس جب ہمارے پاس سے حق ان کے سامنے آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ موسیٰ نے کہا "تم حق کو یہ کہتے ہو جبکہ وہ تمہارے سامنے آگیا؟ کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر فلاح نہیں پایا کرتے"۔ انہوں نے جواب میں کہا "کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ داداکو پایا ہے اور زمین میں بڑائی تم دونوں کی قائم ہو جائے؟ تمہاری بات تو ہم ماننے والے نہیں ہیں"۔

یہاں آیات سے مراد وہ معجزات ہیں جن کی تفصیل سورت اعراف میں بیان ہوئی ہے، لیکن یہاں ان کی تفصیلات نہیں دی گئیں کیونکہ سیاق کلام میں تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں اجمالی تذکرہ ہی ضرورت پوری کر دیتا ہے۔ یہاں اصل مقصود یہ ہے کہ فرعون اور اس کے حاشیہ نشین دعوت کو قبول کریں اور دلائل و معجزات کو سمجھیں۔

فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (۱۰ : ۷۵) "مگر انہوں نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ مجرم لوگ تھے"۔ یہاں نہایت ہی تہدید آمیز لہجے میں کہا جاتا ہے

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا (۱۰ : ۷٦) (جب ہمارے پاس سے حق ان کے پاس آگیا) مقصد یہ ہے کہ ان کا جرم بہت ہی ناپسندیدہ اور گھناؤنا ہے کہ ہماری طرف سے بات آجائے تو پھر بھی۔

قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۱۰ : ۷٦) "تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کھلا جادو ہے"۔ یعنی وہ بات بلا دلیل کرتے ہیں لیکن اسے اس قدر تاکیدی الفاظ میں کہتے ہیں "بے شک یہ تو کھلا جادو ہے"۔ اور یہ انداز کلام ایسا ہے کہ ہر دور میں سچائی کو جھٹلانے والے ایسی ہی بات کرتے ہیں۔ یہی بات اسی انداز میں مشرکین قریش بھی کرتے تھے اور ان سے بہت ہی قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو دیکھ کر فرعون نے بھی یہی بات کہی تھی اور دور جدید کے اسلام دشمن بھی یہی بات کرتے ہیں۔

قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ اَسِحْرٌ هٰذَا وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ

(۱۰ : ۷۷) "موسیٰ نے کہا، تم حق کو کہتے ہو جب وہ تمہارے سامنے آگیا؟ کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر فلاح نہیں پایا کرتے"۔ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حقیقی فقرہ تو یوں تھا کہ تم حق کو کہتے ہو کہ یہ جادو ہے؟ کیا یہ جادو ہے؟ لیکن دوسرے فقرے سے معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ حق کے بارے میں کیا کہتے تھے۔ اس لیے اسے حذف کر دیا۔ اب پہلے فقرے کا مطلب ہے کہ حق کو جادو کہنا ایک منکر بات ہے اور دوسرے فقرے کا مطلب ہے کہ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ نہایت ہی مکروہ بات کرتا ہے، یہ کیوں ناقابل توقع بات ہے؟ اس لیے کہ جادو او جادوگروں کے مقاصد یہ نہیں ہوتے کہ وہ لوگوں کو ہدایت دیں، نہ جادوگر کا کوئی نظریہ ہوتا ہے۔ جادوگروں کے کوئی اعلیٰ تصورات نہیں ہوتے، نہ ان کا

موضوع حق و باطل میں تمیز کرنا ہوتا ہے - نہ جادوگر کوئی نظام زندگی پیش کرتے ہیں اور لوگوں کو اس نظام کی طرف دعوت دیتے ہیں لہٰذا دعوت اسلامی اور جادوگر کا باہم التباس نہیں ہو سکتا - جادوگروں کو ان اہداف و مقاصد سے کیا غرض جو حضرت موسیٰ کے سامنے ہیں - پھر یہ کہ جادوگر تو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا کیونکہ جادوگری اور شعبدہ بازی تو محض تخیل اور ملمع کاری ہوتی ہے - آخر کار جادو کا عمل زائل ہو جاتا ہے -

لیکن فرعون کے عمائدین یہاں اپنے وہ رجحانات بتا دیتے ہیں جن کی بنا پر وہ دعوت حق اور ان معجزات و دلائل کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں -

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ

" انہوں نے جواب میں کہا : کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا تھا اور زمین میں بڑائی تم دونوں کی قائم ہو جائے ' تمہاری بات ہم ماننے والے نہیں ہیں " - (۱۰ : ۷۸)

اصل بات یہ ہے کہ ان کو اپنے موروثی عقائد کی ٹوٹ پھوٹ کا خطرہ ہے ' کیونکہ ان عقائد اور تصورات پر تو ان کا سیاسی اور اقتصادی نظام استوار تھا ' بات دراصل یہ تھی کہ ان کو اپنے اقتدار اعلیٰ کے خاتمے کا خطرہ تھا اور یہ اقتدار اعلیٰ قائم بھی ان عقائد پر تھا جو ان کے موروثی خرافات پر قائم تھا -

انکار حق کا یہی سبب قدیم بھی ہے اور جدید بھی - اسی سبب کی بنا پر سرکش لوگ ہمیشہ سچائی کی دعوت کو رد کرتے ہیں اور پھر لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے مختلف قسم کے عذرات گھڑتے ہیں - اور داعیان حق پر قسم قسم کے الزامات عائد کرتے ہیں - اور اسلامی تحریکات کے مقابلے میں فسق و فجور اور ظلم و ستم لے کر آتے ہیں - اصل بات اَلْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ کی ہے ' اصل جھگڑا یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنی قوت کے بل بوتے پر اس کرۂ ارض پر اپنا کھوٹا اقتدار اعلیٰ قائم کر رکھا ہے وہ یہ چاہتے ہیں کہ جن کھوٹے افکار اور تصورات کی وجہ سے ان کا اقتدار قائم ہے اور جو عوام الناس کے دلوں میں رچے بسے ہیں وہ جوں کے توں رہیں - اگرچہ وہ محض اوہام و خرافات ہیں - اگر لوگوں کا دل و دماغ صحیح عقائد کے لیے کھل گیا اور وہ نئی روشنی سے آگاہ ہو گئے اور ان کا دل و دماغ منور ہو گیا تو اس کے نتیجے میں موروثی اقدار تباہ ہو جائیں گی - لوگوں کے دل و دماغ پر سے ان سرکشوں کا رعب جاتا رہے گا اور وہ بنیادیں ہل جائیں گی - جن پر ان کا اقتدار قائم ہے - صریح الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اوہام و بت پرستی کے تصورات پر ان کا جو اقتدار قائم ہے اس کے لیے خطرہ ہے ' کیونکہ ان سرکشوں نے تو عوام الناس کو غیراللہ کا غلام بنا رکھا ہے جبکہ تمام انبیاء کی دعوت یہ رہی ہے کہ لوگوں کو تمام انسانوں کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی غلامی میں داخل کیا جائے اور اس کرۂ ارض پر سے ان تمام انسانوں کی حکمرانی کو ختم کر دیا جائے جنہوں نے اللہ کی حکمرانی ' ربوبیت اور حاکمیت کو غصب کر رکھا ہے - اس کے مقابلے میں اللہ کی حاکمیت کو قائم کیا جائے - یہی وجہ ہے کہ یہ غاصب حکمران ہمیشہ یہ رویہ اختیار کرتے ہیں کہ عوام الناس کے کانوں تک ایسے خیالات نہ پہنچ جائیں - اس لیے اس قسم کے سرکش حکمران اس بات کی اجازت کب دے سکتے ہیں کہ لوگوں کی گردنوں کو غلامی سے نجات دے کر صرف اللہ کی غلامی میں داخل کیا جائے - اور پھر ان نظریات کی دعوت کھلے بندوں عوام الناس تک پہنچ جائے - کیونکہ ایسے حکمران اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ تو ان کے اقتدار اعلیٰ کے خلاف ایک قسم کی

بغاوت ہے۔ اور انقلابی کوشش ہے۔ ان کی حکومت کو ختم کرنا ہے اور انسان جن کو انہوں نے اپنے مقاصد کے لیے غلام اور مقید رکھا ہوا ہے اسے آزادی کی ایسی فضا فراہم کرنا ہے جو انسانیت کے لائق ہو اور یہ بات ان کے لیے ناقابل برداشت ہے۔

غرض حق و باطل کی کشمکش کے پیچھے یہی حقیقی علت ہوتی ہے۔جب بھی کوئی عوام کو رب العالمین کی طرف بلاتا ہے یہ کشمکش جاری ہو جائے گی۔

کیا قریش کے اکابر نہیں سمجھتے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچائی اور صداقت اور راستی کی جو دعوت دیتے ہیں اس کی قوت کیا ہے؟ اور ان کے شرکیہ عقائد میں کھوٹ اور فساد کیا ہے؟ وہ بالکل جانتے تھے لیکن وہ ساتھ ساتھ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر وہ جدید دعوت کو قبول کرتے ہیں تو ان کا موروثی مقام و مرتبہ ان سے چلا جائے گا۔کیونکہ وہ تو انہی خرافاتی عقائد پر قائم ہے۔ یہ وہی حقیقت ہے جس کا اندیشہ فرعون کے حاشیہ بردار اور افسران نے ظاہر کیا تھا اور کہا تھا وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِينَ (۱۰: ۷۸) (ہم ہرگز تمہاری بات ماننے والے نہیں ہیں)۔

---ooo---

فرعون اور اس کے درباریوں نے اب یہ سوچا کہ انہوں نے موسیٰ ؑ پر جادوگری کا الزام لگا دیا ہے' لہٰذا مناسب ہے کہ اسے مناظرے اور مقابلے کی شکل میں ثابت کر کے عوام الناس کو اچھی طرح باور کرا دیا جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے انہوں نے مقابلہ جادوگری کی ایک عظیم مجلس کے انعقاد کا فیصلہ کیا تاکہ وہ ثابت کریں کہ موسیٰ ایک بڑے جادوگر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس طرح ان کا موجودہ نظام اور ان کے خیالات اس عظیم خطرے سے بچ نکلیں گے جو انہیں درپیش ہے۔کیونکہ ان کا اقتدار ان خیالات اور ان پر مبنی نظام پر ہی قائم ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس تقریب کے انعقاد کی اصل غرض و غایت یہی تھی۔جب اعیان مملکت نے حضرت موسیٰ ؑ کی تحریک سے یہ محسوس کر لیا کہ وہ انقلاب برپا کر سکتے ہیں تو انہوں نے کہا۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُونِي بِكُلِّ سَاحِرٍ عَلِيمٍ ﴿٧٩﴾ فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنتُم مُّلْقُونَ ﴿٨٠﴾ فَلَمَّا أَلْقَوْا قَالَ مُوسَىٰ مَا جِئْتُم بِهِ السِّحْرُ ۖ إِنَّ اللَّهَ سَيُبْطِلُهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ ﴿٨١﴾

۸
وَيُحِقُّ اللَّهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ﴿٨٢﴾
۱۲ع

۱۳ ''اور فرعون نے (اپنے آدمیوں سے) کہا کہ ''ہر ماہر فن جادوگر کو میرے پاس حاضر کرو''۔جب جادوگر آگئے تو موسیٰ ؑ نے ان سے کہا' جو کچھ تمہیں پھینکنا ہے ' پھینکو''۔پھر جب انہوں نے اپنے انچھر پھینک دیے تو موسیٰ ؑ نے کہا''یہ جو کچھ تم نے پھینکا ہے یہ جادو ہے' اللہ ابھی اسے باطل کیے دیتا ہے' مفسدوں کے کام کو اللہ سدھرنے نہیں دیتا اور اللہ اپنے فرمانوں سے حق کو حق کر دکھاتا ہے' خواہ مجرموں کو وہ کتنا ہی ناگوار ہے''۔

یہاں معاملے کے بیان میں نہایت ہی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔کیونکہ یہاں مقصد صرف مقابلے کے نتائج کا ذکر

ہے۔حضرت موسیٰ ؑ نے جو کہا

مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ (۱۰ : ۸۱) "یہ جو تم نے پھینکا ہے یہ محض جادو ہے"۔یہ قول در حقیقت اس الزام کا جواب ہے جو انہوں نے حضرت موسیٰ ؑ پر لگایا تھا کہ حضرت موسیٰ ؑ جادوگر ہیں۔حضرت موسیٰ نے جواب میں کہا کہ جادوگری تو وہ ہے جو وہ دکھا رہے ہیں کیونکہ ان کی کارستانی محض تخیل ہے 'محض فریب نظر ہے اور محض خیالاتی شعبدہ بازی ہے 'اس کے اندر دعوت اصلاح نہیں ہے اور تحریک و انقلاب کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہذا ان کی یہ کارستانی سحر ہے اور اللہ کے معجزات تو جادو نہیں ہیں۔

حضرت موسیٰ ؑ نے اس کے بعد یہ فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ (۱۰ : ۸۱) "اللہ ابھی اسے باطل کر دیتا ہے"۔ان الفاظ ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سچا مومن کس قدر اعتماد کے ساتھ بات کرتا ہے 'اسے یقین ہوتا ہے کہ اللہ اپنے معجزات کے مقابلے میں ہرگز ایسی صورت حال وجود میں آنے کی اجازت نہ دے گا کہ جادوگری کامیاب ہو جائے۔ حالانکہ یہ کوئی اصلاحی کام نہیں ہے بلکہ فسادی کام ہے۔اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ "مفسدوں کے کام کو اللہ سدھرنے نہیں دیتا" کیونکہ جادوگر تو لوگوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں اور فرعون کے جو سردار ان کو جمع کر کے لائے ہیں فساد و گمراہی کی جڑ ہی وہ ہیں۔ بلکہ و

يُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ (۱۰ : ۸۲) "اللہ اپنے نافرمانوں سے حق کو حق کر دکھاتا ہے"۔یعنی اس کے وہ تکوینی فرامین جو اس کائنات میں جاری ہیں 'جن سے اس کی مشیت کا اظہار ہوتا ہے اور اللہ کے معجزات اور دلائل کا تعلق اس کے خصوصی کلمات سے ہے جن کی تعبیر ہم کن فیکون سے کرتے ہیں۔

وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (۱۰ : ۸۲) (خواہ مجرموں کو وہ کتنا ہی ناگوار ہو) وہ جس قدر چاہیں ناپسند کریں 'اللہ کی مشیت کا راستہ وہ روک نہیں سکتے۔اور اللہ کے معجزات کی راہ نہیں روک سکتے۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔جادو بالاخر باطل ہو گیا 'حق کا کلمہ بلند ہو گیا 'یہاں اس پورے واقعہ کو نہایت ہی اختصار کے ساتھ لیا گیا۔کیونکہ مقام و محل کا تقاضا اختصار تھا۔

یہاں پردہ گرتا ہے 'یہ منظر اوجھل ہوتا ہے تاکہ موسیٰ ؑ اور ان کے ساتھی مومنین کو سامنے لایا جائے۔یہ قلیل تعداد میں تھے اور قوم کے نوجوان عنصر پر مشتمل تھے 'ان میں شیوخ کی تعداد بہت کم تھی 'اس پورے قصے اور اس سورت میں دراصل یہ سبق دینا مقصود تھا جو یہاں تحریک اسلامی کے کارکنوں کو دینا مقصود ہے جو اس وقت حضرت موسیٰ ؑ اور ان کے نوجوان ساتھیوں کو دیا گیا۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ

الْمُسْرِفِيْنَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(پھر دیکھو کہ موسیٰؑ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا' فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے سربر آوردہ لوگوں کے ڈر سے (جنہیں خوف تھا) کہ فرعون ان کو عذاب میں مبتلا کرے گا اور واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر رکتے نہیں ہیں۔

موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ "لوگو' اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اس پر بھروسہ کرو' اگر مسلمان ہو"۔ انہوں نے جواب دیا "ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا' اے ہمارے رب ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا اور اپنی رحمت سے ہم کو کافروں سے نجات دے"۔

اور ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی کو اشارہ کیا کہ "مصر میں چند مکان اپنی قوم کے لیے مہیا کرو اور اپنے ان مکانوں کو قبلہ ٹھہرالو اور نماز قائم کرو' اور اہل ایمان کو بشارت دے دو"۔

اس آیت سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیا اور اپنے ایمان کو ظاہر کیا وہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے کچھ نوجوان تھے' بنی اسرائیل کی پوری قوم ایمان نہ لائی تھی۔ ڈر صرف اس بات کا تھا کہ ان نوجوانوں پر مظالم ڈھاکر انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت و حمایت سے کہیں روک نہ دیا جائے۔ فرعون کی جانب سے اس بات کا قوی خدشہ موجود تھا' خود ان نوجوانوں کے سرپرستوں کی جانب سے بھی خدشہ موجود تھا کیونکہ بڑے اور بوڑھوں کی اپنے مفادات ہوتے ہیں اور وہ اہل اقتدار کے ہاں اپنے مفادات کے ہاتھوں سے مجبور ہوتے ہیں۔ نیز ایسے لوگوں کی جانب سے بھی خدشات تھے جنہوں نے ذلت کی زندگی کو اپنا لیا تھا۔ اور وہ اس کے خوگر ہو گئے تھے اور ایسے لوگ اہل اقتدار کے زیردست ہو جاتے ہیں۔ اور بنی اسرائیل میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی کیونکہ فرعون کی حکومت نہایت ہی سخت جابرانہ اور سرکشی کی حدود کو چھونے والی تھی بلکہ وہ ظلم میں کسی حدود و قیود کی پابند ہی نہ تھی۔ سخت سے سخت اقدام وہ کر سکتی تھی۔ ایسے حالات میں ایسے ایمان کی ضرورت تھی جس کے مقابلے میں خوفناک طوفان بھی ہلکے ہوں' سخت کے سخت حالات میں بھی وہ دلوں کو اطمینان دے سکے۔ اور اس کی وجہ سے لوگ سچائی پر ثابت قدم ہوں۔ یہی حالات تھے جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس قسم کے خطاب کی ضرورت پیش آئی:

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ

(اور موسیٰ ؑ نے اپنی قوم سے کہا : لوگو! اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو ' تو اس پر بھروسہ کرو اگر تم مسلمان ہو) ایمان کا تقاضا ہے کہ مومن اللہ پر بھروسہ کرے ' بلکہ اللہ پر بھروسہ کرنا علامت ایمان ہے ۔ ایمان ہی وہ سروسامان ہے جو ایک ظالم اور جابر کے سامنے ایک ضعیف اور ناتواں اقلیت کا بہترین ہتھیار ہوتا ہے ۔ بڑے بڑے فرعونوں کا مقابلہ صرف ایمان ہی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے ۔ یہاں موسیٰ علیہ السلام نے ایمان اور اسلام دونوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ دونوں کا تقاضا ہے کہ تم اللہ پر بھروسہ کرو یعنی تم اللہ پر پورا پورا یقین کرو اور پھر پوری طرح اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دو ' اس کے احکام پر چل پڑو ۔

اہل ایمان نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کال پر فوراً لبیک کہا :

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا (۱۰ : ۸۵) ''انہوں نے جواب دیا ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا'' ۔ اور بھروسے کا اعلان کرتے ہی وہ دست بدعا ہو گئے ۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۱۰ : ۸۵) ''اے ہمارے رب ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا'' ۔

''ہمیں ظالموں کے لیے فتنہ نہ بنا'' کا مقصد یہ ہے کہ ظالموں کو اس قدر قوت نہ دے کہ وہ ہم پر دست درازی کر سکیں ۔ مگر ایسا ہوا تو لوگ یہ گمان کریں گے کہ اہل ایمان پر مظالم کیے جاتے ہیں اور اہل کفر غالب ہیں ' لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ اہل کفر حق پر ہیں ' اس لیے تو وہ غالب ہیں اور مومنین مغلوب ۔ یہ ان کے لیے تو رسی دراز کرنے کا عمل ہو گا اور اللہ ان پر حجت تمام کرنا چاہے گا لیکن عوام کا تاثر غلط ہو گا ۔ اس لیے اہل ایمان دعا کرتے ہیں کہ اللہ ان کی ایسی آزمائش سے بچائے اور اہل کفر کے لیے کوئی اور تدبیر کرے اور دوسری آیت میں صراحت کے ساتھ بتایا جاتا ہے کہ ان کو ان ظالموں سے چھڑا لیا جائے ۔

وَ نَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۱۰ : ۸۶) ''اور اپنی رحمت سے ہم کو کافروں سے نجات دے'' ۔ ان کی یہ دعا کہ اللہ انہیں ظالموں کے لیے فتنہ نہ بنائے اور اپنی رحمت سے کافروں کی ریشہ دوانیوں سے نجات دے ' یہ اللہ پر توکل اور اللہ پر بھروسے اور استعانت کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ دعا اس بات پر دلیل ہے کہ دعا کرنے والا اللہ پر زیادہ توکل اور بھروسہ کر رہا ہے ۔ مومن کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آزمائش کا مطالبہ نہیں کرتا ' اس سے اللہ کی پناہ مانگتا ہے ۔ لیکن اگر اللہ کی طرف سے آزمائش آ جائے تو وہ ثابت قدم رہتا ہے ۔

حق و باطل کی اس پہلی جھڑپ اور حق کی باطل کے مقابلے میں فتح اور امتیازی پہچان اور اگلے مرحلے کے انتظار کے عرصے میں ' اللہ نے حضرت موسیٰ ' حضرت ہارون ؑ کی طرف یہ وحی بھیجی ۔ بنی اسرائیل کے لیے کچھ مخصوص سنٹر مقرر کر دیئے جائیں تاکہ ان کو علیحدہ کر کے ان کی چھان بین کر کے اور انہیں منظم کر کے ' اگلے سفر کے لیے انہیں آمادہ اور تیار کیا جائے ۔ ان سنٹروں کے بارے ان کو یہ ہدایات دی گئیں کہ ان کے ماحول کو پاکیزہ بنایا جائے ' ان لوگوں کے نفوس کو پاک کیا جائے جو ایمان لا چکے ہیں اور انہیں یہ خوشخبری دی جائے کہ اللہ کی تائید تمہارے ساتھ ہو گی ۔

وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَ اَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّ اجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰ : ۸۷) "اور ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی کو اشارہ کیا کہ مصر میں چند مکان اپنی قوم کے لیے مہیا کرو اور اپنے ان مکانوں کو قبلہ ٹھہراؤ اور نماز قائم کرو اور اہل ایمان کو بشارت دے دو"۔ یہ انتظامی تیاری کے ساتھ روحانی تیاری ہے ـ افراد اور جماعتوں کے لیے دونوں قسم کی تیاریاں اشد ضروری ہیں ـ ابتلاء اور عملی کشمکش سے پہلے انتظامی تیاری کے ساتھ ساتھ اخلاقی تیاری بھی ضروری ہے ـ بعض لوگ اخلاقی تیاری کو اہمیت نہیں دیتے لیکن آج تک تمام تجربات یہی بتاتے ہیں کہ اخلاقی اور نظریاتی ہتھیاروں کی اہمیت روایتی ہتھیاروں سے بہت زیادہ ہے ـ اگر نظریاتی اور اخلاقی لحاظ سے تہی دامن فوجی کے پاس جنگی اسلحہ بہت وافر کیوں نہ ہو' وہ کامیابی کا ضامن نہیں ہوتا ـ

اہل ایمان کے سامنے اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ کا تجربہ رکھ رہے ہیں تاکہ ان کے لیے ایک نمونہ ہو' یہ احکام و تدابیر بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں' یہ تو خالص ایمانی تجربہ ہے ـ آج بھی اہل ایمان کو ایسے تجربات کی ضرورت ہے ـ جاہلی معاشروں کے اندر آج بھی جگہ جگہ ان پر تشدد ہو رہا ہے ـ ہر طرف طاغوت کا دور دورہ ہے' لوگوں کے اخلاق بگڑ چکے ہیں اور فرعونیوں کے دور میں بھی یہی تھا' حضور اکرمؐ کو بھی ایسے حالات درپیش تھے اور ہمارے دور میں بھی ایسے ہی حالات ہیں ـ اس وقت بنی اسرائیل کو یہ ہدایت دی گئی تھی :

(۱) جاہلیت کی گندگی' شر اور فساد سے ایک طرف ہو جاؤ' جہاں تک ممکن ہو' اور جو جو لوگ پاک' صاف اور اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے تیار ہیں' ان کو منظم کیا جائے ـ ان کو تربیت دی جائے اور جہاد کے لیے تیار کیا جائے تاکہ اللہ کی نصرت آ جائے ـ

(۲) جاہلیت کے پیروکاروں کی عبادت گاہوں سے دور ہو جاؤ اور اہل ایمان کے لیے علیحدہ مراکز عبادت قائم کرو' جہاں وہ محسوس کریں کہ وہ جاہلی معاشرے سے الگ ہو چکے ہیں اور وہ صحیح خطوط پر اللہ کی بندگی کر رہے ہیں اور علیحدہ اور پاکیزہ ماحول میں اپنے آپ کو منظم کریں ـ

---ooo---

ان حالات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں' وہ اب فرعون اور اس کے ساتھیوں سے مایوس ہو چکے ہیں ـ وہ نہیں سمجھتے کہ ان میں کوئی بھی ایسا عنصر موجود ہے جس کی اصلاح کی توقع کی جا سکتی ہو ـ آپ صراحت کے ساتھ فرعون اور فرعونیوں کے لیے بددعا کرتے ہیں ـ آپ کی شکایت یہ ہے کہ اے اللہ آپ نے ان کو مالی وسائل دیئے ہیں جن سے وہ زیب و زینت کر کے عوام الناس کو مرعوب کرتے ہیں' مالی لحاظ سے اس بااثر طبقے سے اچھے اچھے دین دار لوگ بھی متاثر ہو جاتے ہیں اور اس طرح پورا معاشرہ جاہ و مال کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور گمراہی کے گڑھے میں گرتا ہے ـ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بددعا یہ ہے کہ اے اللہ ان لوگوں کو ہلاک و برباد کر دے ـ اے اللہ ان کے دلوں کو اور سخت کر دے تاکہ یہ لوگ عذاب کے مستحق ہو جائیں ـ چنانچہ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کو قبول فرمایا ـ

وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۸۹

"موسیٰ ؑ نے دعا کی" اے ہمارے رب تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور اموال سے نواز رکھا ہے۔ اے رب 'کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکائیں؟ اے رب 'ان کے مال غارت کر دے اور ان کے دلوں پر ایسی مہر کر دے کہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں"۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا "تم دونوں کی دعا قبول کی گئی۔ ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے طریقے کی ہرگز پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے"۔

حضرت موسیٰ کی دعا میں بڑی حقیقت موجود ہے۔

رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱۰:۸۸)

"اے رب تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور اموال سے نواز رکھا ہے"۔ یہ لوگ اپنی مالی مرتبے کو لوگوں کے گمراہ کرنے کے نامسعود کام میں استعمال کرتے ہیں۔ یوں کہ لوگ ان کی حیثیت اور مرتبے کو دیکھ کر ان سے متاثر ہوتے ہیں اور وہی کام کرنے لگتے ہیں جو یہ بڑے لوگ کرتے ہیں۔ نیز اپنے مرتبے اور دولت کی وجہ سے ان کو جو قوت حاصل ہوتی اس کو وہ ظلم میں استعمال کرتے ہیں 'لوگوں کو دباتے ہیں اور ذلیل کر کے گمراہی پر مجبور کرتے ہیں۔ مفسدین کے ہاتھ میں اختیار و اقتدار اور دولت کے انعامات دیکھ کر سادہ لوح عوام کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس ادراک سے قاصر ہوتے ہیں کہ یہ چیزیں درحقیقت اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہوتی ہیں۔ نیز وہ اس حقیقت کے ادراک سے بھی قاصر ہوتے ہیں کہ دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کے حقیقی فضل و کرم کے مقابلے میں ان اشیاء کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی عوامی ذہنیت کی بات یہاں بشکل دعا کر رہے ہیں کہ اے اللہ ان باغیوں اور سرکشوں کے ہاتھوں اس قسم کے موثر وسائل کا چھیننا ضروری ہے۔ اس لیے وہ دعا کرتے ہیں۔ اللہ ان کے اموال اور ان کی حیثیت کو نیست و نابود کر دے۔ ان کی یہ حالت کر دے کہ وہ اپنے اموال اور حیثیت کو عوام کے گمراہ کرنے کے لیے استعمال نہ کر سکیں۔ رہی یہ دعا کہ اللہ ان کے دلوں کو سخت کر دے گا اور ان پر مہر لگا دے کہ وہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک وہ اپنی آنکھوں سے عذاب الیم دیکھ نہیں لیتے۔ تو یہ ایک ایسی داعی کی دعا ہے جو مخاطبین کے بارے میں پوری طرح مایوس ہو گیا ہو 'اور اسے کوئی امید نہ رہی ہو کہ ان میں سے کوئی توبہ کرے گا یا مان کر دے گا۔ چنانچہ ایسا داعی آخر کار اپنے لوگوں کو چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ اپنے کیے کا مزہ چکھیں۔ جب وہ عذاب الیم دیکھ لیں گے تو

پھر سنت الٰہیہ کے مطابق عذاب نازل ہو جانے کے بعد پھر ایمان قبول نہیں ہوتا۔

قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا (۱۰:۸۹) "تم دونوں کی دعا قبول کی گئی"۔ اللہ نے دعا کے مطابق فیصلہ کر دیا ہے۔ اس لیے تم دونوں فَاسْتَقِیْمَا (۱۰:۸۹)

"لٰہذا تم ثابت قدم رہو"۔ اپنی راہ پر چلتے رہو یہاں تک کہ اللہ کا مقررہ فیصلہ اپنے وقت پر ظاہر ہو جائے۔

وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (۱۰:۸۹) (اور ان لوگوں کے طریقے کی ہرگز پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے) کیونکہ بے علم اور جاہل لوگ عموماً راہ بھول جاتے ہیں۔ ان کے منصوبے اور تدابیر ٹھوس نہیں ہوتیں وہ خود مضطرب ہوتے ہیں اور ان کو شرح صدر نہیں ہوتا کہ وہ سیدھی راہ پر ہیں یا غلط راہ پر۔

اب اگلا منظر وہ ہے جس میں اللہ کا منصوبہ روبعمل آتا ہے۔

وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَ جُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّ عَدْوًا ؕ حَتّٰٓی اِذَآ اَدْرَکَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۹۰﴾ آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ کُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۹۱﴾ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوْنَ لِمَنْ خَلْفَکَ

۹

اٰیَةً ؕ وَ اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾ ۱۰ع

۱۴ "اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار لے گئے۔ پھر فرعون اور اس کے لشکر ظلم اور زیادتی کی غرض سے ان کے پیچھے چلے۔ حتیٰ کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا "میں نے مان لیا کہ خداوند حقیقی اس کے سوا کوئی نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے، اور میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں"۔ جواب دیا گیا "اب ایمان لاتا ہے! حالانکہ اس سے پہلے تک تو تو نافرمانی کرتا اور فساد کرنے والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ بعد کی نسلوں کے لیے نشان عبرت بنے اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں"۔

تکذیب اور چیلنج پر مشتمل اس کہانی کا یہ آخری منظر ہے۔ یہاں اس قصے کو نہایت ہی اختصار اور اجمال سے لایا گیا ہے۔ کیونکہ یہاں مقصد صرف فرعونیوں کے انجام کی طرف اشارہ تھا اور یہ بتانا مضمون سورت کے پیش نظر تھا کہ اللہ اپنے دوستوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا' اللہ اپنے دشمنوں کو بھی ایک حد تک ڈھیل دیتا ہے اور آخر کار اللہ پکڑتا ہے اور دشمنوں پر عذاب نازل کرتا ہے' کون ہیں اللہ کے اعداء؟ وہ جو نہ اللہ کے دلائل تکوینی پر غور کرتے ہیں اور نہ پیغمبروں کے دکھائے ہوئے معجزات کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں اور جب اللہ کی پکڑ آتی ہے تو پھر نہ ندامت کا فائدہ ہوتا ہے اور نہ توبہ مفید ہوتی ہے۔ اس سے قبل اس سورت میں اس مضمون کو مفصل طور پر بیان کیا گیا ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ فَإِذَا جَآءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (٤٧) وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ (٤٨) قُل لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَآءَ اللَّهُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ إِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (٤٩) قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَتَىٰكُمْ عَذَابُهُ بَيَٰتًا أَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ (٥٠) أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ ءَامَنتُم بِهِ ءَآلْـَٰٔنَ وَقَدْ كُنتُم بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ (٥١) (١٠: ٤٧ تا ٥١) "ہر امت کے لیے ایک رسول ہے' پھر جب کسی امت کے پاس اس کا رسول آ جاتا ہے تو اس کا فیصلہ پورے انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے اور اس پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جاتا۔ کہتے ہیں اگر تمہاری یہ دھمکی سچی ہے تو آخر یہ کب پوری ہوگی؟ کہو "میرے اختیار میں خود اپنا نفع و ضرر بھی نہیں' سب کچھ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے' ہر امت کے لیے مہلت کی ایک مدت ہے' جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہوتی"۔ اس سے کہو کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ کا عذاب اچانک رات کو یا دن کو آ جائے (تو تم کیا کر سکتے ہو؟) آخر یہ ایسی کون سی چیز ہے جس کے لیے مجرم جلدی مچائیں"۔

اس سورت میں تمام قصص اسی مضمون اور حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں چنانچہ کہا گیا۔

وَجَٰوَزْنَا بِبَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ الْبَحْرَ (١٠: ٩٠) "اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار لے گئے"۔ اور ان کا سمندر سے معجزانہ طریقے سے گزرنا ہماری راہنمائی' ہماری ہدایات اور ہماری نگرانی میں ہوا۔ یہاں جاوزنا کی نسبت اللہ کی طرف کرنا اپنے اندر مخصوص مفہوم رکھتا ہے۔

فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُۥ (١٠: ٩٠) (فرعون اور اس کے لشکر نے پیچھا کیا) اور ان کا پیچھا کرنا کوئی اچھا کام نہ تھا' نہ کوئی مومنانہ حرکت تھی' نہ وہ اپنی مملکت سے کوئی دفاعی کارروائی کر رہا تھا۔ اس کا یہ تعاقب کسی مفہوم میں بھی جائز نہ تھا بلکہ۔

بَغْيًا وَعَدْوًا (١٠: ٩٠) (ظلم اور زیادتی کرنے کی غرض سے یہ تعاقب کر رہا تھا) سرکشی اور حد سے تجاوز کر رہا تھا۔ کیونکہ اگر کوئی بھاگتا ہے تو تم کیوں اسے پکڑتے ہو۔

چنانچہ وہ اچانک غرقابی کے منظر سے دوچار ہوتا ہے۔ اب وہ ظالم اور سرکش نہیں ہے بلکہ اچانک وہ بے کس اور بے سہارا ہو گیا ہے۔

حَتَّىٰٓ إِذَآ أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ (١٠: ٩٠) (جب وہ ڈوبنے لگا) موت آنکھوں کے سامنے آ گئی۔

نجات کی کوئی صورت نہ رہی تو اب وہ کہتا ہے :

قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

(۱۰: ۹۰) (جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا) میں نے مان لیا کہ خداوند حقیقی اس کے سوا کوئی نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں سراطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں) اب فرعون کے تن سے وہ تمام لباس اتر چکے تھے جن میں وہ بڑا نظر آتا تھا۔ اور لوگ اس کی شخصیت سے ڈرتے تھے۔ اب وہ نحیف و نزار اور ذلیل و خوار تھا۔ اب وہ نہ صرف یہ کہ اس خدا پر ایمان لا رہا ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لا چکے تھے بلکہ وہ اس پر مسلمان ہونے اور سر تسلیم خم کرنے کا اعلان بھی کرتا ہے۔

آٰلْئٰنَ وَ قَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ (۹۱) ((۱۰: ۹۱)) "اب ایمان لاتا ہے حالانکہ اس سے پہلے تک تو تو نافرمانی کرتا رہا' فساد کرنے والوں میں سے تھا"۔ یعنی اب تو مان رہا ہے کہ نہ تجھے اختیار حاصل ہے اور نہ راہ فرار موجود ہے۔ اب جبکہ سرکشی اور بڑائی کا دور گزر گیا ہے اب!

فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ (۱۰: ۹۲) "اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے"۔ نہ اسے مچھلیاں کھائیں گی اور نہ موجودہ کے ذریعے وہ نامعلوم لاش رہے گی تاکہ تمہارے بعد میں آنے والے عوام کو معلوم ہو کہ یہ ہے وہ فرعون جس کا تاریخ میں یہ انجام ہوا تھا۔

لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً (۱۰: ۹۲) "تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشان عبرت ہو"۔ تجھے لوگ دیکھتے رہیں اور عبرت لیتے رہیں اور یہ دیکھ لیں کہ اللہ کی قوت' اللہ کی تنبیہات کا انکار کرنے والوں کا انجام کیسا ہوتا ہے؟

وَ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (۱۰: ۹۲) "اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری آیات سے غفلت برتتے ہیں"۔ وہ اللہ کی آیات اور اس کے نشانات کی طرف اپنے قلوب اور عقول کو متوجہ نہیں کرتے۔ آفاق اور انفس میں اللہ کے جو نشانات ہیں' ان پر تدبر نہیں کرتے۔

---

یہاں یہ دردناک منظر اب آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور یکلخت بنی اسرائیل کے انجام کی ایک آخری جھلکی دکھائی جاتی ہے کہ بعد کے زمانوں میں بنی اسرائیل پھر کیا کرتے رہے۔ حالانکہ انہوں نے فرعون کی سرکشی' چیلنج اور نافرمانی کا منظر خود دیکھا تھا۔ اس علم کے باوجود بعد میں انہوں نے یہی کچھ کیا۔

وَ لَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا

كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴿۹۳﴾

"ہم نے بنی اسرائیل کو بہت اچھا ٹھکانا دیا اور نہایت عمدہ وسائل زندگی انہیں عطا کیے۔ پھر انہوں نے باہم اختلاف نہیں کیا مگر اس وقت جب کہ علم ان کے پاس آ چکا تھا۔ یقیناً تیرا رب قیامت کے روز ان کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کر دے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں"۔

المبوأ کا مفہوم ہے نہایت ہی امن کی جگہ' اس کو صدق کی طرف مضاف کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ پر امن ہونے کے ساتھ ساتھ سچائی اور صداقت کے اصولوں پر مشتمل ایک ٹھوس سوسائٹی کے مالک تھے۔ ان کی سوسائٹی کے اندر کوئی کمزوری تزلزل اور جھوٹ اور افتراء نہ تھا۔ مصر میں غلامی کے طویل تجربات کے بعد بنی اسرائیل نے ایک عرصے تک نہایت ہی مستحکم نظام قائم کر دیا تھا۔ یہاں اس کی تفصیلات نہیں دی گئیں۔ اس لیے کہ یہاں مضمون اور موضوع کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کو اس عرصے میں بہترین معاشی سہولتیں دی گئیں اور ضروریات زندگی کو وافر کر دیا گیا لیکن انہوں نے فسق و فجور کی راہ لی اور اللہ نے دوبارہ ان کو ان سے محروم کر دیا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے تفصیلات کو چھوڑ کر صرف ایک بات ذکر کر دی کہ اتفاق کے بعد وہ نفاق کا شکار ہو گئے۔ دینی اعتبار سے وہ فرقے فرقے ہو گئے اور دنیاوی اعتبار سے اس کی مملکت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی' اس لیے نہیں کہ وہ جاہل اور نادان تھے بلکہ علم و دانش کے باوجود انہوں نے ایسا کیا' اور ہر حکم الٰہی کی وہ باطل تاویلات کرتے رہے۔

یہاں موضوع اور مضمون صرف یہ بتا رہا ہے کہ حب و ایمان کو کامیابی ہوتی ہے اور سرکشی اور ظلم کو آخر کار ناکامی ہوتی ہے' اس لیے سیاق کلام میں وہ تفصیلات ترک کر دی گئی کہ بعد کے ادوار میں وہ کس طرح اجڑے اور کس طرح انہوں نے اختلافات کیے بلکہ یہاں اختصار کے ساتھ اس قصے کو یوں لپیٹ کر رکھ دیا جاتا ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۱۰ : ۹۳) (یقیناً تیرا رب قیامت کے روز ان کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کر دے گا جس میں وہ اختلافات کرتے ہیں) یوں اس قصے کے اثرات بھی قائم رہتے ہیں اور اس واقع کا رعب بھی دلوں میں بیٹھ جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم میں بیان قصص کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے اور اس غرض اور موضوع کے لیے قصے کی کڑیوں کا انتخاب کس خوبصورتی سے ہوتا ہے۔ مقصد محض قصہ گوئی نہیں ہوتی بلکہ نہایت ہی موزوں انداز میں مخصوص اشارات اور اثرات چھوڑ دیے جاتے ہیں۔

اب قصہ فرعون و موسیٰ پر ایک مکمل تبصرہ آتا ہے۔ پہلے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ بتایا جاتا ہے کہ اہل مکہ کیوں آپ کی تکذیب کر رہے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ دلائل و معجزات کی کمی ہے۔ بلکہ مکذبین کا ہمیشہ یہی انداز ہوتا ہے اور یہ روز اول سے اللہ کی حکمت تخلیق کا ایک حصہ ہے کہ بعض لوگ ہدایت کی راہ لیتے ہیں اور بعض ضلالت کے مدعی بن جاتے ہیں۔ درمیان میں قصہ یونس کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ ان کی قوم ایمان لے آئی۔ ایسے حالات میں کہ ان پر عذاب آنے ہی والا تھا' اللہ نے عذاب روک لیا اور یہ قصہ اس لیے لایا گیا کہ مکہ کے مکذبین کو یہ اشارہ دے دیا جائے کہ

مہلت کی گھڑیاں بہت ہی کم ہیں۔ جلدی سے ایمان لے آؤ 'کیونکہ اللہ کی سنت ' پہلی اقوام اور آخری زمانے میں آنے والی اقوام کے بارے میں ایک ہی ہے کہ مکذبین کو ہلاک کیا جاتا ہے۔ اور رسولوں اور ان کے متبعین کو بچا دی جاتی ہے اور یہ اصول اور یہ سنت اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر فرض کر دی ہے اور اس میں تخلف ممکن نہیں ہے۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ
قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿٩٤﴾ وَ لَا
تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٩٥﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَ لَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى
يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٩٧﴾ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا
قَوْمَ يُوْنُسَ ۗ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٩٨﴾ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ
جَمِيْعًا ۗ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٩﴾ وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ
اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَ يَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿١٠٠﴾
قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۗ وَ مَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ
قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠١﴾ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ
قَبْلِهِمْ ۗ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿١٠٢﴾ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾

———————

"اب اگر تجھے اس ہدایت کی طرف سے کچھ بھی شک ہو جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو پہلے

سے کتاب پڑھ رہے ہیں۔فی الواقع یہ تیرے پاس حق ہی آیا ہے تیرے رب کی طرف سے۔ لہٰذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو' اور ان لوگوں میں نہ شامل ہو جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا ہے' ورنہ تو نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں پر تیرے رب کا قول راست آگیا ہے' ان کے سامنے خواہ کوئی نشانی آ جائے وہ کبھی ایمان لاکر نہیں دیتے جب تک کہ دردناک عذاب سامنے آتا نہ دیکھ لیں۔ پھر کیا ایسی کوئی مثال ہے کہ ایک بستی عذاب دیکھ کر ایمان لائی ہو اور اس کا ایمان اس کے لیے نفع بخش ثابت ہوا ہو؟ یونس ؑ کی قوم کے سوا (اس کی کوئی نظیر نہیں) وہ قوم جب ایمان لے آئی تھی تو البتہ ہم نے اس پر دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ٹال دیا تھا اور اس کو ایک مدت تک زندگی سے بہرہ مند ہونے کا موقع دے دیا تھا۔

اگر تیرے رب کی مشیئت یہ ہوتی (کہ زمین میں سب مومن و فرمانبردار ہی ہوں) تو سارے اہل زمین ایمان لے آئے ہوتے۔ پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں؟ کوئی متنفس اللہ کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا' اور اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ ان پر گندگی ڈال دیتا ہے۔

ان سے کہو ''زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے' اسے آنکھیں کھول کر دیکھو''۔ اور جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں؟ اب یہ لوگ اس کے سوا اور کس چیز کے منتظر ہیں کہ وہی برے دن دیکھیں جو ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ دیکھ چکے ہیں؟ ان سے کہو ''اچھا' انتظار کرو' میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں''۔ پھر جب ایسا وقت آتا ہے تو ہم اپنے رسولوں کو اور ان لوگوں کو بچا لیا کرتے ہیں جو ایمان لائے ہوں۔ ہمارا یہی طریقہ ہے۔ ہم پر یہ حق ہے کہ مومنوں کو بچا لیں''۔

اس پوری مدت میں آخری قصہ بنی اسرائیل کا تھا جو اہل کتاب تھے۔ ان کو حضرت نوح ؑ اور ان کی قوم کا قصہ اور موسیٰ ؑ اور فرعون کا قصہ اچھی طرح معلوم تھا' وہ تورات دن ان قصص کو پڑھتے تھے۔ یہاں حضور اکرم ؐ کو خطاب کر کے کہا جاتا ہے کہ اگر آپ اور آپ کی امت میں سے کسی کو ان واقعات میں شک ہے تو جو لوگ آسمانی کتابوں کے حامل ہیں ان سے پوچھ لو' کہ یہ واقعات درست ہیں یا نہیں۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (۱۰ : ۹۴) ''اگر تجھے اس ہدایت سے کچھ بھی شک ہو جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو پہلے سے کتاب پڑھ رہے ہیں۔ فی الواقع یہ تیرے پاس حق ہی آیا ہے۔ تیرے رب کی طرف سے ہے لہٰذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو قرآن کی آیات کے بارے میں بہرحال شک نہ تھا۔ اس سلسلے میں حضور ؐ سے مروی ہے کہ آپ نے اس آیت کے نزول کے بعد فرمایا۔

لا اشك و لا اسئل (نہ میں شک کرتا ہوں اور نہ اہل کتاب سے پوچھتا ہوں) تو سوال یہ ہے کہ پھر یہ بات کیوں کہی گئی جبکہ اس کے بعد یہ فقرہ بھی آیا۔

لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ (۱۰ : ۹۴) (بے شک تمہارے پاس تو حق آیا ہے) اور اس فقرے کے بعد تو کوئی شک رہتا ہی نہیں۔

لیکن جن حالات میں یہ سورت نازل ہوئی ان کو پیش نظر رکھا جائے تو اس ہدایت کا اصل سبب معلوم ہو جاتا ہے۔ اس وقت مکہ میں صورت حالات یہ تھی کہ واقعہ معراج کے نتیجے میں کفار نے پروپیگنڈے کا طوفان کھڑا کر دیا تھا' بعض ڈھل مل یقین قسم کے لوگ اسلام کو چھوڑ چکے تھے' حضرت خدیجہ اور حضرت ابو طالب فوت ہو گئے تھے اور حضور اکرمؐ اور اہل ایمان پر سختیاں زیادہ ہو گئی تھیں اور دعوت اسلامی اہل مکہ کے تحت عناد کی وجہ سے منجمد ہو کر رہ گئی تھی' ان سب حالات کی وجہ سے حضورؐ کے دل پر بھی اثر ہوتا تھا' اس لیے ان قصص میں حضور اکرمؐ کو تسلی دی گئی کہ آپ حق پر ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ اہل حق ہمیشہ کامیاب رہے ہیں۔ اب شک کرنے والوں اور تکذیب کرنے والوں کی مذمت اس طرح کی جاتی ہے کہ تم ان کے گروہ میں شامل نہ ہو۔

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۱۰ : ۹۵) (لہذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو اور ان لوگوں میں نہ شامل ہو جنہوں نے آیات الہٰی کو جھٹلایا ورنہ تو نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا)

اس بالواسطہ ہدایت کا مطلب یہ ہے کہ شک کرنے والوں سے کہا جاتا ہے کہ لوٹ آؤ بہت کم وقت رہ گیا ہے' دیکھو اللہ رسول اللہ کو کہتا ہے کہ اگر شک ہے تو اہل کتاب سے اپنا شک رفع کر لو اور آپ ایسا نہیں کرتے تو معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ کو حق الیقین حاصل ہے کہ وہ سچے ہیں۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم اس حق کو قبول کر لو' سوچ لو اور ممترین سے باہر نکل آؤ۔

یہاں اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کر کے کہ آپ اہل ذکر سے پوچھ لیں یہ منہاج وضع فرماتے ہیں۔ امت مسلمہ کو چاہئے کہ وہ اپنے عقائد و نظریات ماہرین دین سے لیں اور اپنے نظریات کے بارے میں سوال و جواب کے ذریعے اچھی طرح چھان بین کر لیں اور اندھی تقلید کسی معاملے نہ کریں۔ اچھی طرح سمجھ کر راہ متعین کریں۔

یہاں دو باتیں کہی گئی ہیں ایک یہ ہے کہ شک کرنے والوں میں سے نہ ہو اور دوسری یہ کہ اگر شک ہو تو اہل ذکر سے پوچھ لو' کیا ان دونوں میں تعارض نہیں ہے؟ تعارض اس لیے نہیں ہے کہ شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا' کا مقصد یہ ہے کہ حالت شک پر باقی نہ رہو اور شک کو دور کرو' یہاں ''ممترین'' میں سے نہ ہونے کا مقصد یہ ہے کہ دائمی طور پر حالت شک میں نہ رہو۔ یوں کہ شک کو رفع کرنے کی سعی ہی نہ کرو اور سوال و تفتیش اور تحقیق کی جدوجہد ہی چھوڑ دو۔ جو شخص وصول الی الحق کی سعی کر رہا ہو وہ ممترین میں سے خارج ہو جاتا ہے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کلام اترا وہ اگر حق ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ اس کی تکذیب کرتے ہیں؟ اور مقابلہ کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کا فیصلہ یہ ہے اور یہ اس کی سنت کے عین مطابق ہے کہ جو شخص ہدایت کے اسباب و ذرائع اختیار نہ کرے گا اسے ہدایت نہ دی جائے گی۔ جو شخص روشنی کو دیکھنا ہی نہ چاہے اور آنکھیں بند کر دے' وہ نہ دیکھ سکے گا۔ جو شخص فہم و ادراک کے ذرائع کو بند کر دے

وہ حقائق کا ادراک نہ کر سکے گا تو آخر کار گمراہ ہو جائے گا۔ اگرچہ اس کے سامنے آیات و دلائل کا ڈھیر لگا دیا جائے۔ ایسے حالات میں پھر اللہ کا فیصلہ اس کی مشیت کے عین مطابق یہ ہوتا ہے :

اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (٩٦) وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (٩٧) (١٠: ٩٦ - ٩٧) "حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں پر تیرے رب کا قول راست آ گیا' ان کے سامنے کوئی نشانی آ جائے وہ کبھی ایمان لا کر نہیں دیتے جب تک کہ دردناک عذاب سامنے آتا نہ دیکھ لیں"۔ اور جب عذاب آ جائے تو پھر ان کا ایمان ان کے لیے مفید نہ ہو گا کیونکہ یہ ایمان وہ اپنے اختیار اور مرضی سے نہیں لائے۔ اب تو ایمان کی میعاد ختم ہو گئی ہے اور یہ منظر ہمارے سامنے سے تو ابھی گزرا ہے کہ فرعون اس وقت ایمان لے آیا جب اس نے دیکھا کہ غرقابی مقدر ہے۔ اس نے کہا تھا اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (١٠: ٩٠) "میں ایمان لاتا ہوں کہ کوئی الٰہ نہیں ہے ماسوائے اس کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں سر تسلیم خم کرنے والوں میں سے ہوں"۔ ایسے حالات میں تو جواب وہی ہوتا ہے جو فرعون کو دیا گیا۔

آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (١٠: ٩١) (اب' حالانکہ پہلے تو نے نافرمانی کی اور تو مفسدین میں سے تھا) ایسے مقامات پر جب کہ سنت الٰہیہ کے مطابق جب حجت تمام ہو جاتی ہے تو ایمان مفید نہیں رہتا' ایسے مقامات پر بھی شمع امید کو روشن رکھا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اگر کوئی ذرا بھی خیال رکھے اور وقوع عذاب سے قبل ہی ایمان لے آئے تو بچ سکتا ہے لیکن جب عذاب آنا شروع ہو گیا تو بچنے کی کوئی امید نہ رہے گی۔ ماسوائے قوم یونس ؑ کے واقعہ کے جو استثنا ہے۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (١٠: ٩٨) "پھر کیا کوئی ایسی مثال ہے کہ ایک بستی عذاب دیکھ کر ایمان لائی ہو اور اس کا ایمان اس کے لیے نفع بخش ثابت ہوا ہو؟ یونس ؑ کی قوم کے سوا (اس کی کوئی نظیر نہیں) وہ قوم جب ایمان لے آئی تھی تو البتہ ہم نے اس پر سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ٹال دیا تھا اور اس کو ایک مدت تک زندگی سے بہرہ ور ہونے کا موقع دے دیا تھا"۔

فلولا کا مفہوم تو یہ ہے کہ کیوں ایسا نہیں ہے؟ یعنی ایسا کبھی نہیں ہوا اور جن بستیوں کا ذکر ہوا ان میں سے کسی نے بھی مان کر نہ دیا۔ بہت کم لوگوں نے مان کر دیا' اس لیے گویا کسی نے بھی نہ مانا۔ اور غالب بستیاں ایمان سے محروم ہیں۔ ماسوائے یونس علیہ السلام کی بستی کے۔ یہاں قَرْيَةٌ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے پیغمبروں کو بستیوں اور اقوام کی طرف بھیجا گیا' بدوی رہائش گاہوں میں کبھی بھی نبی نہیں بھیجے گئے۔ یہاں حضرت یونس ؑ کے قصے کی طرف مجمل اشارہ کیا جاتا

ہے۔ تفصیلات نہیں دی گئیں کیونکہ مقصد قوم کے انجام کا ذکر ہے۔ تفصیلات کی ضرورت اس مقام پر نہیں ہے۔ بات یہ تھی کہ قوم یونس ؑ پر ایک نہایت ہی توہین آمیز عذاب آنے والا تھا لیکن چونکہ وہ آخری وقت میں مان گئے اس لیے اللہ نے عذاب ٹال دیا اور ایک وقت تک وہ اس زمین میں کھاتے پیتے رہے۔ اور اگر یہ لوگ ایمان نہ لاتے تو عذاب کی لپیٹ میں آجاتے۔ اور سنت الٰہیہ کے مطابق ان پر عذاب آجاتا۔ اس آیت کی اسی قدر تشریح کافی ہے اور اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں :

(۱) منکرین کو اس بات سے ڈرانا اور اس طرف متوجہ کرنا کہ اب وقت تھوڑا رہ گیا اور اب بھی اگر مشرکین مکہ مان جائیں تو وہ قوم یونس ؑ کی طرح عذاب دنیا سے بچ سکتے ہیں۔ یہاں اس قصے سے اصل غرض و غایت ہی یہ ہے :

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ خود حضرت یونس کی قوم کے بارے میں بھی سنت الٰہیہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ ایمان لے آئے اور انہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ یہاں بھی سنت الٰہیہ جاری رہی اگر وہ ایمان نہ لاتے تو یہ عذاب نہ ٹلتا، واقع ہو جاتا۔ لیکن چونکہ اس عذاب کے آنے سے قبل انہوں نے اپنے اندر تبدیلی پیدا کر دی تو سنت الٰہیہ نے ان کی اس تبدیلی کے مطابق تبدیلی کر دی۔ لہٰذا لوگوں کے کاموں کی اندر کوئی جبریت نہیں ہے۔ البتہ لوگوں کے اعمال کے اوپر جو نتائج مرتب ہوئے وہ جبری ہیں اور اٹل ہیں۔

اب کفر و ایمان کے سلسلے میں اسی اصول پر یہ قاعدہ سامنے آتا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (۹۹) وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (۱۰۰) (۱۰:۹۹ - ۱۰۰) ”اگر تیرے رب کی مشیت ہوتی (کہ زمین میں سب مومن و فرمانبردار ہوں) تو سارے اہل زمین ایمان لے آئے ہوتے۔ پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں؟ کوئی متنفس اللہ کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا اور اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ ان پر گندگی ڈال دیتا ہے“۔

اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ جنس انسانی کو کسی دوسری حقیقت پر پیدا کر دیتا اور وہ ایسے ہوتے کہ ایمان کے سوا کوئی اور عقیدہ ہی نہ اپنا سکتے مثلاً فرشتے یا ان کے اندر ایسی استعداد پیدا کر دی جاتی کہ وہ لازماً ایمان لاتے۔

اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو اللہ موجودہ انسانوں ہی کو ہدایت اور ایمان لانے پر مجبور کر دیتا کہ کفر کا ارادہ ہی ان سے سلب کر لیتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم انسان بعض اوقات اللہ کی حکمتوں کو پا لیتے ہیں اور بعض اوقات نہیں پا سکتے۔ لیکن اگر ہم کسی حکمت کو نہیں پا سکتے تو ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم حکمت الٰہیہ کے وجود ہی کا انکار کر دیں۔ اللہ کی حکمت کا تقاضا یوں ہوا کہ اس نے حضرت انسان کے اندر ہدایت و ضلالت کی استعداد ودیعت کر دی اور اسے اختیار دے دیا کہ وہ یہ راہ لے یا وہ۔ اللہ نے یہ فیصلہ بھی کر دیا کہ اگر کسی انسان نے اپنے حواس، اپنے میلانات اور اپنے قوائے مدرکہ کو دلائل ہدایت کے سمجھنے میں لگا دیا اور سعی کی اور پیغمبروں کے معجزات اور پیش کردہ دلائل پر غور کیا تو اللہ ایسے ہر شخص کو

ایمان نصیب کرے گا اور وہ نجات کی راہ پالے گا۔ اور اس کے برعکس اگر کسی انسان نے اپنے قوائے مدرکہ کو معطل کر دیا اور اس نے پیغمبروں کے پیش کردہ دلائل و معجزات پر غور نہ کیا تو اس کا دل سخت ہو جائے گا' اس کی عقل منجمد ہو جائے گی اور نتیجتاً وہ جمود و انکار کی راہ پر لگ جائے گا اور آخر کار وہ منکرین اور جاحدین کی راہ لے گا۔

خلاصہ یہ کہ ایمان لانا انسان کے اختیار پر موقوف ہے' رسول اللہ کو بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ آپ کسی کو ایمان پر مجبور کریں۔ کسی انسان کے نفسیاتی رجحانات پر کوئی کنٹرول نہیں کر سکتا۔

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۱۰:۹۹) "پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں" ۔ یہ استفہام انکاری ہے یعنی ایسا نہیں ہو سکتا۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۱۰:۱۰۰) (کوئی متنفس اللہ کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا) اور یہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہے جس کا تذکرہ ابھی ہم نے کیا۔ اگر کوئی نفس راہ ایمان پر گامزن نہیں ہوتا تو وہ کیسے منزل ایمان تک پہنچ سکتا ہے کیونکہ جس راہ پر وہ چل رہا ہے وہ راہ ایمان نہیں ہے۔ یوں نہیں ہے یوں نہیں ہے کہ وہ ایمان چاہتا ہو اور ایمان کی راہ پر چل رہا ہو اور اللہ اس کے اور ایمان کے درمیان حائل ہو جائے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ کوئی نفس منزل ایمان تک نہیں پہنچ سکتا الا یہ کہ وہ اللہ کی سنت کے مطابق راہ ایمان پر چلے اور سنت الہیہ کے قوانین عامہ کے مطابق یہ راہ اختیار نہ کرے۔ جب وہ یہ راہ لے گا تو اللہ اسے ہدایت دے گا اور یہ ہو گا مطلب کہ یہ ایمان اللہ کے اذن سے نصیب ہوا۔ اس مفہوم میں یہ بات بھی درست ہے کہ کوئی امر اللہ کی تقدیر کے بغیر واقعہ نہیں ہوتا۔ لوگ کسی راہ کو اختیار کرتے ہیں تو اللہ ان کے لیے اس راہ کو آسان کر دیتا ہے اور پھر اس راہ میں جدوجہد کرنے پر ان کو جزاء و سزا دیتا ہے۔

اس مفہوم کی وضاحت اگلے فقرے سے بھی ہوتی ہے۔

وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۱۰:۱۰۰) "اور اللہ کا طریقہ ہے کہ جو عقل سے کام نہیں لیتے اللہ ان پر گندگی ڈال دیتا ہے"۔ جو لوگ اپنی عقول کو اچھی تدابیر کرنے سے معطل کر دیتے ہیں تو اللہ ان پر گندگی ڈال دیتا ہے۔ رجس بدترین روحانی نجاست کو کہتے ہیں۔ چونکہ ان لوگوں کے تدبر اور تعقل کے ذرائع کو معطل کر دیا ہے۔ اس لیے اللہ ان کو اس قسم کی گندگی میں لت پت کر دیتا ہے اور انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ تکذیب کرتے ہیں اور کفر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اسی مضمون کی مزید وضاحت یوں کی جاتی ہے کہ دلائل و معجزات اور پیغمبر اور ڈرانے والے بھی ایسے لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے جو ایمان کی راہ نہیں لیتے اور تعقل و تدبیر سے کام نہیں لیتے۔ باوجود اس کے کہ ان کے سامنے اس کائنات میں بے شمار دلائل بکھرے پڑے ہیں۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا تُغْنِى الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا

یُؤْمِنُوْنَ (۱۰: ۱۰۱) "ان سے کہو زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو، اور جو لوگ ایمان لانا نہیں چاہتے، ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہات آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں"۔ یہ انداز بیان استفہام انکاری ہو یا یہ تقریری بیان ہو، دونوں صورتوں میں مفہوم ایک ہی ہو گا کہ زمین و آسمان میں آیات الٰہیہ وافر مقدار میں موجود ہیں، لیکن یہ آیات و دلائل اور رسولوں کی تنبیہات ان لوگوں کے لیے ہرگز نہیں جنہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ایمان نہ لائیں گے، کیونکہ انہوں نے سنجیدگی سے غور و فکر ہی نہیں کیا۔

اس بحث کے خاتمے سے قبل ہمیں چاہئے کہ قرآن کریم کی اس آیت پر قدرے مزید غور و فکر کریں۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰: ۱۰۱) "ان سے کہو "زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اسے آنکھیں کھول کر دیکھو"۔ اور جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں؟)

جو لوگ قرآن کریم کے پہلے مخاطب تھے ان کے پاس ان چیزوں کے بارے میں زیادہ علم و معرفت نہ تھا جو آسمانوں میں ہیں، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے اور اس کی طرف ہم نے بار بار اشارہ بھی کیا ہے کہ انسانی فطرت اور اس کائنات کے درمیان ہمیشہ ایک مکالمہ موجود رہا ہے۔ انسانی فطرت اس کائنات کے زمزمہ زلزلہ کو خوب سنتی ہے، بشرطیکہ یہ فطرت جاگ رہی ہو اور متوجہ ہو اور اس سے بہت کچھ پاتی ہے۔

اسلامی تصورات کی تشکیل کے لیے قرآنی طریقہ کار یہ ہے کہ انسانی قوت مدرکہ ان حقائق کو سمجھے جو آسمان و زمین کے درمیان پیش پا افتادہ ہیں اور ان حقائق کا ادراک کرے۔ انسان کی نظر، اس کا دل اور اس کی عقل اس کائنات کی طرف متوجہ ہو لیکن انسان کا یہ تعقل اور تدبر نہایت متوازن ہو اور یہ نہ ہو کہ وہ اس تعقل اور تدبر کے نتیجے میں خود اس کائنات کو اللہ اور معبود بنا دے اور یہ کائنات ہی انسانی حیات کے اندر حقیقی موثر ہو جائے جس طرح کہ آج کے ملحد مادہ پرست خشک مادیت کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہیں اور اسے سائنٹیفک دین کہتے ہیں اور اپنی اجتماعی زندگی کے نظام کو اس پر استوار کرتے ہیں اور اس نظام کو انہوں نے سائنٹیفک سوشلزم کا نام دیا ہوا ہے حالانکہ ان کے خیالات کا سائنس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

جب انسان زمین و آسمان پر تدبر کرتا ہے تو انسان کے قلب و نظر کے سامنے سوچ کے نئے نئے دروازے کھلتے ہیں۔ وہ نئے تاثرات لیتا ہے اور اس کے سوالات کا اسے نہایت ہی پختہ جواب ملتا ہے۔ اس وجود کے بارے میں اس کے شعور کو جلا اور وسعت ملتی ہے۔ اسے اس کائنات کے ساتھ ایک خاص انس پیدا ہو جاتا ہے اور اس کائنات کی ہر حرکت اور اس کا ہر زمزمہ اسے اللہ کی موجودگی اور اللہ کی قدرت کی برتری، اللہ کی گہری تدبیر، اللہ کے وسیع علم اور اللہ کی عظیم حکمت کا سبق دیتا ہے۔

زمانہ گزرتا ہے، اور انسان کے علوم و معارف میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ اس کائنات کے بارے میں اپنے ادراک کو گہرا کرتا چلا جاتا ہے۔ اگر یہ انسان ہدایت یافتہ ہو، ایک مومن کی حیثیت سے یہ مطالعہ ربانی روشنی میں کر رہا ہو تو اس کی شخصیت کو اس علمی سفر میں اس کائنات کے ساتھ ایک انس، ایک سوچ اور گہری ہم آہنگی ملے گی۔ اس پر مزید علوم و

معارف کھلیں گے اور اسے نظر آئے گا کہ اس کائنات کی ہر چیز ذات باری کی مداح ہے اور انسان کے ساتھ ساتھ وہ بھی اللہ کی پاکی بیان کر رہی ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (۱۷:۴۴)

"اور اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان کر رہی ہے لیکن تم اس کی تسبیح کو نہیں سمجھتے"۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس تسبیح کو صرف وہی شخص سمجھتا ہے جو خدا رسیدہ ہو' اس کا دل اللہ سے جڑا ہوا ہو۔ لیکن اگر انسان کے یہ علمی انکشافات نور ایمان اور نور ربانی سے منور نہ ہوں تو وہ اس کے لیے مزید گمراہی کا سبب بنتے ہیں اور اس کے نتیجے میں انسانیت خوفناک مصائب کا شکار ہوتی ہے۔

وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰:۱۰۱) "اور جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہات آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں"۔ جب دلوں پر پردے پڑ جائیں' جب عقل جمود کا شکار ہو جائے اور جب اخذ اور ادراک کی قوتیں معطل کر دی جائیں اور جب فطری سوچ اور تعقل سے کام نہ لیا جائے تو انسان کو کوئی دلیل دلیل نظر نہیں آتی اور اس کے لیے تنبیہات مفید نہیں رہتیں۔ یہ پوری کائنات اور اس کے راز اور اس کی حکمتیں انسانی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ اب نہ وہ سنتا ہے' اور نہ اس کائنات میں کسی چیز کی حمد و تسبیح کا وہ ادراک کر سکتا ہے۔

معرفت الٰہیہ کے موضوع پر قرآن کریم کا منہاج بحث یہ ہے کہ قرآن اس پوری کائنات کو بطور ایک نمائش گاہ اور ایک شفاف اور واضح منظر کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس منظر اور نمائش میں قدرت الٰہیہ کے آثار رواں دواں نظر آتے ہیں اور یہ مشاہد انسانی شخصیت کو یقین و معرفت سے مالا مال کر دیتے ہیں۔ اسلامی منہاج بحث خالص منطق صغریٰ و کبریٰ کے انداز میں نہیں ہوتا' بلکہ قرآنی منہاج ان مناظر اور فعال آثار الٰہی کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ قلب بشری ان سے نہایت ہی گہرا اثر لیتا ہے اور اسے اس قدر یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ جدل و جدال اور بحث و مناظرے کا موقع ہی نہیں رہتا۔ قرآن کریم اس کائنات کی کھلی کتاب سے وجود باری کے آثار پیش کرتا ہے۔ یہ آثار قابل مشاہدہ ہوتے ہیں اور قلب بشری اپنے ضمیر و شعور میں ان آثار کے لازمی نتائج کو شعوری اور لاشعوری طور پر بیٹھا دیتا ہے۔

قرآن معرفت کردگار کے سلسلے میں ایک بنیادی حقیقت کو اپنے سامنے رکھتا ہے' وہ یہ کہ انسان کی ذات کو بہرحال خدا نے پیدا کیا ہے' اور اللہ تعالیٰ اپنی اس مخلوق کی نفسیاتی کیفیات کو خوب جانتا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ "درحقیقت انسان کو ہم نے پیدا کیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اس کا نفس اس کے اندر کیا کیا وسوسے ڈالتا ہے"۔ انسان کی فطرت میں یہ داعیہ موجود ہے کہ وہ ایک دین کا محتاج ہے۔ وہ فطرتاً خدا کا قائل ہے۔ اور انسانی فطرت اگر صحت مند ہو تو وہ اپنی گہرائیوں میں رب واحد کا شعور رکھتی ہے۔ اس لیے کسی صحت مند عقیدے اور دین اور نظریہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ فطرت انسانی کے اندر اللہ کا کوئی شعور پیدا کرے اور اس کی ضرورت کا احساس دلائے۔ تصور اللہ واحد اور اس کا شعور تو فطرت انسانی کے اندر موجود ہوتا

ہے بلکہ صحیح عقیدے کا یہی کام ہے کہ وہ کسی انسان کے اندر پائے جانے والے شعور باری تعالیٰ کو درست سمت دے ۔ درست شکل دے اور حق تعالیٰ کی ایسی معرفت دے کہ اس کے ساتھ کوئی اور شریک نہ ہو ۔ اس کے بعد یہ شعور دے کہ اگر اللہ موجود ہے تو انسانی زندگی میں اس شعور اور تصور کے مطابق کیا کیا تبدیلیاں ضروری ہیں ۔ مثلاً یہ کہ یہ اللہ قیوم ہے ۔ یہ رب ہے اور یہ حاکم ہے اور یہ شارع ہے ۔ چنانچہ اگر کوئی وجود باری میں شک کرتا ہے تو سمجھ لیں کہ یہ شخص فطرت سلیمہ سے محروم ہے اور اس کی شخصیت میں نقصان ہے اور یہ شخص نفسیاتی مریض ہے ۔ اور اس کے تعقل اور ادراک کے ذرائع اور قویٰ ناقص ہیں ۔ لہٰذا ایسے کج فطرت اور بیمار ذہن شخص کا علاج کسی جدل و جدال سے نہیں ہو سکتا ۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات ایک مومن اور مسلم کائنات ہے ۔ یہ کائنات اپنے خالق کو پہچانتی ہے ۔ اور اس کائنات کی ہر زندہ اور غیر زندہ چیز ہر وقت اس کی تسبیح کرتی ہے اور اس کی مطیع فرمان ہے ۔ ذات باری کا منکر اور اس کی ثنا سے اگر کوئی منکر ہے تو وہ صرف کج فطرت انسانوں میں سے بعض لوگ ہیں ۔ اگر کوئی انسان سلیم الفطرت ہو کر اس کائنات میں زندگی گزارے تو اس کے ارد گرد خدا کی تسبیح اور سجود کرنے والے اسے نظر آئیں ' ایمان اور اسلام کی صدائیں وہ سنے ۔ خود انسان کے وجود کے ہر ذرے ' اور اس کے جسم کے ہر خلیے اس صدا میں اور اس پکار میں اس کے شریک ہیں ۔ انسانی جسم کے تمام ذرات انسان کے ساتھ اور اس کائنات کے ساتھ ساتھ اللہ کے نوامیس فطرت کے مطیع فرمان ہیں اس لیے وہ سب انسان جو فطرت کی ان صداؤں کو نہیں سنتے ' جن پر اللہ کے قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کا کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ اور وہ خود اپنی فطرت کی صداؤں کو نہیں سنتے اور وہ فطرت کے پیغامات اور سگنلز کو وصول نہیں کرتے ' معلوم ہونا چاہئے کہ ایسے تمام انسانوں کے تعقل و ادراک کے آلات کا کوئی نہ کوئی پرزہ معطل ہے ۔ لہٰذا جب تک ان کی فطرت کی تاریں درست نہیں کر دی جاتیں محض منطقی جدل اور فلسفیانہ مباحث کے ذریعے ایسے لوگوں کی فطرت کے تاروں کو درست نہیں کیا جا سکتا ' اس لیے سب سے پہلے یہ سعی ضروری ہے کہ ایسے کج فطرت اور بدفطرت انسانوں کی فطرت کو درست کیا جائے ' تاکہ وہ فطری انداز میں سوچ سکیں ۔ فطرت کے زلزلے کو سن سکیں اور از سر نو صحیح سمت میں سوچ کا آغاز کر سکیں (تفصیلات کے لیے دیکھئے خصائص التصور الاسلامی حصہ دوئم)

انسان کی ان فطری تاروں کو قرآنی منہاج کے مطابق یوں جوڑا جاتا ہے کہ انسان کو اس کائنات میں غور و فکر کی دعوت دی جاتی ہے ۔ اس طرح اس کی فطرت کی تاریں مل جاتی ہیں اور وہ فطری سگنلز کا ادراک کرنے لگتا ہے اور جب وہ فطرت کے اشارے پاتا ہے تو سوال و جواب فطری انداز میں شروع کر دیتا ہے اور اس کی اصلاح شروع ہو جاتی ہے ۔

لیکن جاہل لوگ جس طرح کہ عرب تھے ' یا جس طرح دوسرے جاہلی معاشرہ ہوتے ہیں وہ کائنات میں تدبر نہیں کرتے لہٰذا ان کو اپنے اس وافر علم کے باوجود کائنات میں آثار الٰہیہ نظر نہیں آتے ۔

اللہ کی سنت دائمی ہے ' اس میں تخلف ممکن نہیں ہے ۔ لہٰذا تکذیب کرنے والوں کا انجام ہر دور میں ایک ہی ہو گا ۔ ہاں اللہ کے ہاں مہلت کی رسی دراز ہوتی ہے لیکن آخر کار مکذبین کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ان کا نام و نشان نہیں رہتا ۔

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (۱۰ : ۱۰۲) ” اب یہ لوگ اس کے سوا کس چیز کے منتظر ہیں کہ وہی برے دن دیکھیں جو ان

سے پیچھے گزرے ہوئے لوگ دیکھ چکے ہیں۔ ان سے کہو اچھا انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"۔

یہ ایک خوفناک الٹی میٹم ہے۔ یہ مباحثہ کو ختم کر دیتا ہے لیکن ہر شخص خوفناک انجام کا انتظار کرنے لگتا ہے۔

اب یہاں بات اس آخری نتیجے پر ختم ہو جاتی ہے جو ہر دعوت اور دعوت کی ہر تکذیب کے بعد نکلا کرتا ہے۔ ان تمام قصوں کا خلاصہ اور سبق ہے اور اس آخری تبصرے کا بھی نچوڑ ہے۔

ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰:۱۰۳)

"جب وقت آتا ہے تو ہم اپنے رسولوں کو اور ان لوگوں کو بچالیا کرتے ہیں جو ایمان لائے ہوں اور ہمارا یہی طریقہ ہے 'ہم پر یہ حق ہے کہ مومنین کو بچالیں"۔

یہ وہ بات ہے جسے اللہ نے اپنے اوپر فرض کر لیا ہے کہ ایمان کا بیج باقی رہے گا' اسے روئیدگی نصیب ہو گی اور تمام خطرات 'تمام ایذاؤں' تمام سختیوں اور ہر قسم کی تکذیب کے بعد اسے کامیابی نصیب ہو گی۔

پوری انسانی تاریخ میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور اس سورت میں آنے والے قصص بھی اس کا بین ثبوت ہیں اور آئندہ بھی ایسا ہی ہو گا۔ اہل ایمان خوشیاں منائیں اور مطمئن رہیں۔

---ooo---

# درس نمبر۹۷ ایک نظر میں

یہ سبق اس سورت کا خاتمہ ہے اور اس سورت میں ہم نے اس کائنات کے آفاق میں جو سیر و سفر کیے اس کی بھی یہ آخری کڑی ہے ۔ اس سورت میں ' جیسا کہ مطالعہ کے بعد ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے دور تک سفر کیا ' انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کیا ۔ فکر ' سوچ اور گہرے تاملات کے مختلف جہانوں کی سیر کی ۔ اس سیر و سیاحت کے نتیجے میں ہم نے بہت کچھ سیکھا ' بہت کچھ پایا اور خوب تھک کر واپس ہوئے ۔

اس سورت کا یہ خاتمہ ہے ' جس میں اسلامی نظریہ حیات اور اسلام کے عقیدے کے حوالے سے اہم مسائل بیان ہوئے تھے ' مثلاً توحید ذات باری ' اس کی قیومیت ' اس کی حاکمیت ' ہر قسم کے شرک کی نفی ۔ ہر قسم کی سفارش کی نفی اور یہ کہ تمام امور کا آخری فیصلہ اللہ کے ہاں ہو گا اور یہ کہ یہ پوری کائنات اللہ کی سنت کے مطابق چل رہی ہے جس کے اندر کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے ' جس کے دھارے کو بدلا نہیں جا سکتا ' یہ کہ وحی ایک سچائی ہے ' قرآن کریم کی تعلیمات حق ہیں ' اور یہ کہ موت کے بعد لوگوں کو اٹھایا جائے گا اور ان سے باز پرس ہو گی اور تمام فیصلے عدل و انصاف کے ساتھ ہوں گے ۔

اس پوری سورت کا موضوع یہ امور تھے اور انہی کے بارے میں اس میں بات چلتی رہی ہے ۔ اس کے لیے قصے اور امثال بیان ہوئے ۔

لیجئے ' اب یہ تمام امور بطور خلاصہ اس آخری سبق میں دے دیئے گئے ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا جاتا کہ آپ ان امور کو بطور اعلان عام لوگوں تک پہنچا دیں اور یہ فیصلہ کن آخری خطاب ان کے ساتھ کریں کہ وہ تو اس راہ پر چل پڑے ہیں اور اس وقت تک چلتے رہیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کا آخری فیصلہ نہیں آ جاتا ۔

---O O O---

# درس نمبر ۹۷ تشریح آیات

۱۰۴ ـــــ تا ـــــ ۱۰۹

---

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚۖ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

اے نبی ؐ کہہ دو کہ "لوگو' اگر تم ابھی تک میرے دین کے متعلق کسی شک میں ہو تو سن لو کہ تم اللہ کے سوا جن کی بندگی کرتے ہو' میں ان کی بندگی نہیں کرتا' بلکہ صرف اسی خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے قبضے میں تمہاری موت ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں"۔

اے لوگو! اور سب لوگو! اس وقت تو خطاب قریش کے مشرکین سے تھا کہ اگر تمہیں اس نظام زندگی کے بارے میں شکوک و شبہات ہیں' تو تمہارے شکوک میرے عمل اور یقین کو متزلزل نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ مجھے تو اپنے دین اور نظریہ پر پورا پورا یقین ہے اور میں تمہارے معبودوں کی بندگی نہیں کر سکتا۔ میں تو اس ذات کی بندگی کروں گا جس کے قبضے میں تمہاری موت اور حیات ہے۔

وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِىْ يَتَوَفّٰكُمْ (۱۰ : ۱۰۴) "میں صرف اس خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے قبضے میں تمہاری موت ہے"۔

یعنی تمہاری زندگی اور موت کے اختیارات اس کے پاس ہیں۔ اللہ کی اس صفت کو یہاں بیان کرنے کی خاص حکمت ہے کہ موت و حیات کا مالک اللہ ہے' اس لیے کہ جن الہوں کی بندگی وہ کرتے تھے ان میں سے کوئی بھی نہ زندگی عطا کر سکتا تھا اور نہ کسی کو مار سکتا تھا۔

وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِين (۱۰ : ۱۰۴) "اور مجھے حکم دیا گیا کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں اس لیے اس ایمان کے حکم سے میں منہ نہیں موڑ سکتا"۔

وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

''اور مجھ سے فرمایا گیا ہے کہ یکسو ہو کر اپنے آپ کو ٹھیک ٹھیک اس دین پر قائم کر دے اور ہرگز ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہو''۔

یہاں آکر انداز کلام اب بیانیہ انداز کو ترک کر دیتا ہے اور ڈائریکٹ خطاب شروع ہو جاتا ہے۔ گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ خطاب لوگوں کے سامنے سن رہے ہیں۔ یہ نہایت ہی موثر انداز کلام ہے۔ خاص طور سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے۔

وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا (۱۰:۱۰۵) ''اور یکسو ہو کر اپنے آپ کو ٹھیک ٹھیک اس دین پر قائم کر دے''۔ یہ خطاب صرف آپ کی ذات کو ہے۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۰:۱۰۵) ''اور ہرگز ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہو''۔ یہ نہایت ہی تاکیدی حکم ہے۔ یعنی مومنین میں ہو جاؤ۔ مشرکین سے نہ ہونے کو یہ بات مستلزم ہے کہ مومن ہو جاؤ۔

---

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۰۶

''اور اللہ کو چھوڑ کر کسی ایسی ہستی کو نہ پکار جو تجھے نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے اگر تو ایسا کرے گا تو ظالموں میں سے ہو گا''۔ یعنی مشرکین مکہ نے اللہ کے ساتھ جو خود ساختہ شریک ٹھہرائے ہوئے ہیں اور ان کو وہ اپنے سفارشی سمجھتے ہیں ان کو ہرگز نہ پکارو۔ ان کو وہ نفع حاصل کرنے اور نقصان سے روکنے کی غرض سے پکارتے ہیں حالانکہ نفع دینے والا اور نقصان سے بچانے والا صرف اللہ ہے۔ اے پیغمبر اگر تم نے بھی ایسا کیا تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔ اس میں کسی کی رو رعایت نہیں ہے۔ اللہ کا ترازو ایک ہے' اس کا قانون توحید اٹل ہے۔

---

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۱۰۷

''اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے' اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا بھی کوئی نہیں ہے' وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے' اور وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے''۔

اس کائنات میں نفع و نقصان اللہ کی سنت جاریہ کے مطابق جاری و ساری ہے ۔ اگر انسان اسباب خیر اور نفع اپنائے تو اسے نفع ملے گا ۔ اور اگر وہ اسباب نقصان اپنائے تو نقصان ملے گا ۔ اگر اللہ اپنے قانون قدرت کے مطابق ' جو اس کائنات میں جاری ہے 'تمہیں نقصان دیتا ہے تو پھر کوئی بھی تمہیں اس نقصان سے بچا نہیں سکتا ۔ تم صرف سنت الٰہیہ پر چل کر نقصان سے بچ سکتے ہو ۔ صرف اس صورت میں کہ تم اسباب نقصان سے بچو ۔ اگر تمہیں معلوم ہوں اور اگر تمہیں معلوم نہ ہوں تو پھر اللہ سے دعا اور زاری کے ذریعے تم بچ سکتے ہو کہ اے اللہ ہمیں ایسے ذرائع کی طرف ہدایت فرما کہ ہم نقصانات سے بچ سکیں ۔ اور اگر تم اللہ کی سنت کے مطابق چل رہے اور اس کی وجہ سے اللہ تمہیں فائدہ دینا چاہتا ہے تو اس کے اس فضل و کرم کو کوئی رد کرنے والا نہیں ہے تو یہ فضل ربی گویا اس طرح ملتا ہے کہ انسان اللہ کے اسباب کے مطابق اس کائنات میں اس کی جاری کردہ سنت کے مطابق چلتا رہے ۔

وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ( ۱۰ : ۱۰۷ ) (وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے ) یعنی جب انسان غلطیوں کے بعد باز آتا ہے اور تائب ہوتا ہے تو وہ معاف کر دیتا ہے اور نہایت ہی رحیم و شفیق ہے ۔ وہ گناہوں کو معاف کر دیتا ہے بشرطیکہ وہ توبہ کر کے اپنے طرز عمل کو تبدیل کر دیں اور صراط مستقیم پر چل پڑیں ۔

یہ ہے اس پوری سورت کا خلاصہ ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اس کا کھلا اعلان فرما دیں اور انداز خطاب یوں ہے کہ گویا لوگ کھڑے ہیں اور آپ کو یہ حکم دیا جاتا ہے ۔ اصل بات تو یہ ہے کہ حکم ہی ان کو دیا جا رہا ہے اگرچہ مخاطب حضور اکرم ہیں ۔ یہ ایک خاص اسلوب ہے اور نہایت ہی موثر انداز کلام ہے ۔ چنانچہ حضور اکرمؐ یہ موقف اپنا لیتے ہیں ۔ اگرچہ ان کے مخالفین نہایت ہی قوی اور تعداد میں بھی کثیر ہیں ۔ آپ کے سامنے جاہلیت کے تہہ بہ تہہ رسم و رواج ہیں اور تاریخی طور پر زیر عمل عقائد شرکیہ ہیں جو لوگوں کے قلب و نظر کی گہرائیوں میں رچے بسے ہیں لیکن حضورؐ نہایت ہی قوت اور صراحت اور معقول انداز میں اسے چیلنج فرماتے ہیں ۔ اگرچہ اس دور میں مکہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی ۔ اور ظاہری قوت و شوکت مشرکین مکہ کو حاصل تھی ۔

لیکن یہ فریضہ دعوت اسلامی ہے ۔ یہ سچائی ہے اور حق یہ ہے کہ سچائی کو نہایت ہی زوردار انداز میں اور نہایت ہی دو ٹوک انداز میں پیش کیا جائے ۔

---

قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنِ ٱهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِى لِنَفْسِهِۦ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ وَمَآ أَنَا۠ عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ ﴿١٠٨﴾

"اے محمدؐ ' کہہ دو کہ "لوگو ' تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آ چکا ہے ۔ اب جو سیدھی راہ اختیار کرے اس کی راست روی اسی کے لیے مفید ہے اور جو گمراہ رہے اس کی گمراہی اسی کے لیے تباہ کن ہے اور میں تمہارے اوپر

کوئی حوالہ دار نہیں ہوں"۔

یہ آخری اعلان ہے۔ فیصلہ کن اور دو ٹوک۔ یہاں آکر حق و باطل کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔ ہر شخص کو اختیار دے دیا جاتا ہے کہ اپنے لیے جو راہ چاہے اختیار کرلے۔ اللہ کی طرف سے سچائی کے راستے کی طرف یہ راہنمائی آگئی ہے۔

فَمَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا (۱۰ : ۱۰۸) "اب جو سیدھی راہ اختیار کرے تو اس کی راست روی اسی کے لیے مفید ہے اور جو گمراہ رہے اس کی گمراہی اسی کے لیے تباہ کن ہے) رسول خدا نہ وکیل ہیں اور نہ حوالدار" کہ لوگوں کو زبردستی پکڑ کر راہ راست پر لائیں۔ آپ تو مبلغ ہیں۔ اللہ نے لوگوں کو اختیار دیا ہوا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جو راہ چاہیں اختیار کریں۔ اور اپنے اختیار کو استعمال کرنے کے نتائج بھگتیں اور آخر کار اللہ کا آخری فیصلہ سنیں۔

آخری خطاب حضورؐ کو ہے کہ آپ اللہ کے احکام کی اطاعت کریں اور اللہ کے احکام پر صبر کر کے عمل کریں۔ اللہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے اور اس کا وقت قریب ہے۔

١٠
وَاتَّبِعْ مَا یُوْحٰۤی اِلَیْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰی یَحْكُمَ اللّٰهُ ۚۖ وَهُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾ ع٦
١٦

"اور اے نبیؐ، تم اس ہدایت کی پیروی کیے جاؤ جو تمہاری طرف بذریعہ وحی بھیجی جا رہی ہے، اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کردے، اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے"۔

یہ خاتمہ کلام ہے، اور آغاز سورت کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور یہ آخری کلمات پوری سورت کے مضامین کے ساتھ بھی مناسب ہیں۔ قرآن کریم کا طرز کلام ہی یہ ہے کہ وہ بات متوازن تصویر کشی کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ صدق اللہ العظیم!

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ۔۔۔۔ ۱۱

## سورۃ ھود ۔۔۔۔ ۱۱

آیات ۱ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۵

## پارہ ۔۔۔۔ ۱۲

## سورۃ ھود ۔۔۔۔ ۱۱

آیات ۶ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۱۲۳

## سورۃ یوسف ۔۔۔۔ ۱۲

آیات ۱ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۵۳

# سورۂ ھود ایک نظر میں

یہ پوری سورت مکی ہے۔ البتہ مصحف امیری میں آیات ۱۲، ۱۷ اور ۱۱۴ کے بارے میں ہے کہ یہ مدنی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پوری سورت مکی ہے اور مذکورہ آیات کو اگر اپنے سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ اگر ان آیات کو ان کے مقام سے ہٹا دیا جائے تو ان کے بغیر سلسلہ کلام واضح طور پر منقطع نظر آتا ہے۔ پھر ان آیات کے اندر جو موضوع بحث ہے وہ بھی ان موضوعات میں سے ہے جو مکی موضوعات ہیں جن کا تعلق عقیدے اور نظریات کے ساتھ ہے۔ ان نظریاتی موضوعات پر قریش کے موقف اور اس موقف کا رسول اللہؐ اور اہل اسلام پر اثرات اور پھر قرآن مجید نے اس سلسلے میں جو احکام و ہدایات دیں اور جس طرح ان اثرات کو دور کیا یہ خالص مکی اور مربوط مباحث اور موضوعات ہیں۔

مثلاً دیکھئے آیت ۱۲

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (۱۱:۱۲)

”تو اے پیغمبر کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان چیزوں میں سے کسی چیز کو (بیان کرنے سے) چھوڑ دو جو تمہاری طرف وحی کی جا رہی ہیں اور اس بات پر دل تنگ ہو کہ یہ کہیں گے ”اس شخص پر کوئی خزانہ کیوں نہ اتارا گیا؟“ یا یہ کہ ”اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا“، تم تو محض خبردار کرنے والے ہو۔ آگے ہر چیز کا حوالہ دار اللہ ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ قریش کی طرف سے یہ چیلنج اور یہ مطالبے مکہ میں ہو رہے تھے اور یہ اس حد تک بڑھے گئے تھے کہ حضورؐ ان سے تنگ آگئے تھے اور اللہ کی جانب سے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ آپ کو تسلی دی جائے اور آپ کو ہر اس ہدایت پر جم جانے کی تلقین فرمائی جائے جو آپ پر وحی ہو کر آتی ہے۔ یہ حالات مکہ کے اس دور سے متعلق ہیں جب کہ حضرت ابو طالب فوت ہو گئے تھے اور حضرت خدیجہ الکبریٰ بھی فوت ہو گئی تھیں اور حضورؐ کو اس دور میں عالم بالا کی سیر کرائی جا چکی تھی۔ لیکن مشرکین حضورؐ کے خلاف ہر قسم کی کارروائیاں بڑی جرأت کے ساتھ کرتے تھے اور دعوت اسلامی کا پھیلاؤ پوری طرح روک دیا گیا تھا۔ غرض اس دور میں دعوت اسلامی مکہ میں نہایت ہی مشکل حالات سے گزر رہی تھی۔

آیت ۱۷ یہ ہے۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا

وَّ رَحْمَةً اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ فَلَا تَكُ فِیْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۱:۱۷) "بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا' اس کے بعد ایک گواہ بھی پروردگار کی طرف سے آگیا اور پہلے موسیٰ کی کتاب راہنما اور رحمت کے طور پر آئی ہوئی بھی موجود تھی ۔ ایسے لوگ تو اس پر ایمان ہی لائیں گے اور انسانی گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے لیے جس جگہ کا وعدہ ہے وہ دوزخ ہے ۔ پس اے پیغمبر تم اس چیز کی طرف سے کسی شک میں نہ پڑنا ۔ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے"۔

یہ مضمون بھی واضح طور پر کی مضمون نظر آتا ہے ۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ یہ وحی اللہ کی طرف سے ہے اور مشرکین سے متعلق کیا گیا ہے کہ ان کو بتا دیا جائے کہ یہ کتاب لاریب رب کی طرف سے ہے اور اس سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کتاب نازل ہوئی تھی اور اس میں بھی نبی آخر الزمان پر شہادت موجود ہے اور بعض اہل کتاب نے بھی شہادت دی ہے اور ظاہر ہے کہ مکہ میں بھی اہل کتاب موجود تھے جن میں سے بعض نے ایمان قبول کر لیا تھا ۔ اور ان کے ایمان لانے کو اہل مکہ کے خلاف دلیل اور تردید کے طور پر یہاں استعمال کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ جو گروہ بھی اے پیغمبر آپ کی وحی کا انکار کریں گے ان کی جگہ جہنم ہے ' لہٰذا آپ اپنی راہ پر ثابت قدم رہیں ۔ کیونکہ آپ حق پر ہیں اور یہ کہ دعوت حق پر جو عارضی جمود طاری ہے یا اکثر اہل مکہ اس کے انکار پر مصر ہیں تو ان باتوں سے آپ پریشان نہ ہوں ۔ یہاں حضرت موسیٰ کی کتاب کا ذکر تو ہوا ہے لیکن آیت میں خطاب بنی اسرائیل کو نہیں ہے ۔ نہ بنی اسرائیل کو یہاں کوئی چیلنج دیا گیا ہے جیسا کہ بعد کے مکی دور کی خصوصیت ہے ۔ بلکہ نزول وحی پر ایک دلیل ہے کہ پہلے بھی وحی کا نزول ہوتا رہا ہے ۔ مکی دور کے جن مشکل حالات میں یہ سورت نازل ہوئی یہ ان میں مناسب انداز کلام ہے کہ اس سے پہلے بھی تو کتاب نازل ہوئی ہے ۔

اب آیت ۱۱۴ کو لیجئے ۔ یہ ایک ایسے سیاق کلام میں وارد ہے جس میں حضور اکرم ؐ کو تسلی دی گئی ہے ۔ آپ کی ڈھارس بندھائی گئی ہے کہ اس قسم کی رکاوٹیں اور مشکلات حضرت موسیٰ کو بھی پیش آئی تھیں اور حضرت موسیٰ ؑ کو بھی یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ ثابت قدم رہیں اور یہ کہ آپ ظالموں کی طرف نہ جھکیں اور ان مشکل حالات میں صبر و استقامت سے کام لیں ۔ ذرا ان آیات پر غور کریں ۔ آیت ۱۱۰ سے آیت ۱۱۵ تک سب کا مضمون مسلسل ہے اور مکی حالات خصوصاً جو حالات اس وقت تھے ' کے عین مطابق ہے ۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (۱۱۰) وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۱۱۱) فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَ لَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۱۱۲) وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ

مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (۱۱۳) وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ ذٰلِکَ ذِکْرٰی لِلذّٰکِرِیْنَ (۱۱۴) وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ (۱۱۵) ((۱۱: ۱۱۰ تا ۱۱۵)) "اور ہم اس سے پہلے موسیٰ کو بھی کتاب دے چکے ہیں' اور اس کے بارے میں اختلاف کیا گیا تھا۔ اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان کبھی کا فیصلہ چکا دیا گیا ہوتا۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اس طرف سے شک اور خلجان میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تیرا رب انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا' یقیناً وہ ان کی سب حرکتوں سے باخبر ہے۔

پس اے نبی تم اور تمہارے وہ ساتھی جو پلٹ آئے ہیں ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو' اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے۔

ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی اور سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تمہیں مدد نہ پہنچے گی۔

اور دیکھو نماز قائم کرو' دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر۔ درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں' یہ ایک یاددہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کو یاد رکھتے ہیں۔ اور صبر کرو نیکی کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں ہوتا"۔

اس طرح یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ پورا بیان مسلسل مکی آیات پر مشتمل ہے۔ موضوع' حالات اور عبارت کی ساخت ہر اعتبار سے۔

یہ پوری سورت یکبار سورت یونس کے بعد نازل ہوئی ہے اور سورت یونس' سورت بنی اسرائیل (اسرا) کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اسی طرح ان حالات کے خدوخال کا تعین ہو جاتا ہے جن میں یہ سورت نازل ہوئی تھی۔ یہ کہ اس وقت کے حالات نہایت ہی دلدوز' پریشان کن اور ہمت شکن حالات تھے' مکہ کی پوری دعوتی زندگی میں اس قدر مشکلات کبھی پیش آئی تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ اس سے قبل ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ فوت ہو چکے تھے اور مشرکین اب ایسی جرأتیں کرنے لگے تھے جو وہ ابوطالب کی زندگی میں نہ کر سکتے تھے۔ خصوصاً جب معراج کا واقعہ پیش آ گیا۔ حضورؐ نے اس کا اعلان کر دیا۔ بظاہر یہ واقعہ ناممکن الوقوع نظر آتا تھا۔ اس کے نتیجے میں بعض لوگ مرتد بھی ہو گئے تھے۔ مخالفین نے ہنسی و مذاق کا طوفان مچا دیا تھا' خصوصاً جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہؓ کی وفات سے بہت ہی پریشان تھے اور قریش آپؐ اور آپؐ کی دعوت کے مقابلے میں سخت زیادتیاں کر رہے تھے اور یہ جنگ نہایت ہی شدت اختیار کر گئی تھی اور اس جنگ اور کشمکش کی وجہ سے دعوت اسلامی پر جمود کی حالت طاری ہو گئی تھی۔ یہ وہ حالات تھے جو بیعت عقبہ اول سے قبل مکہ میں پائے جاتے تھے۔ چنانچہ اس بیعت کے بعد رسول اور دعوت رسول کے لیے مدینہ والوں کے دل اللہ نے کھول دیئے۔

ابن اسحاق واقعات کے بیان کے بعد یہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ایک ہی سال میں خدیجہ بنت خویلد اور ابوطالب فوت ہو گئے۔ خدیجہ کی وفات کے بعد حضورؐ پر مصائب ٹوٹ پڑے۔ خدیجہ آپؐ کا ایک سچا اور مخلص وزیر تھیں۔ آپ پر جب مشکلیں آ پڑتیں تو آپؐ ان کے سامنے اپنی مشکلات کا اظہار کرتے۔ ابوطالب کی وفات کا اثر یہ ہوا کہ آپؐ ایک

مضبوط اور طاقتور حامی سے محروم ہو گئے۔ ابو طالب ہی تھے جو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح آپ ؐ کے اور آپ ؐ کے مخالفین کے درمیان کھڑے تھے۔ یہ واقعہ مدینہ کی طرف ہجرت کے واقعے سے تین سال قبل پیش آیا۔ ابو طالب جب سامنے نہ رہے تو قریش نے حضورؐ پر وہ زیادتیاں شروع کر دیں جو وہ اس سے قبل نہ کر سکتے تھے۔ یہاں تک کہ قریش کے بے وقوفوں میں سے ایک بے وقوف نے حضورؐ کے سر پر مٹی ڈال دی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ ہشام ابن عروہ نے اپنے والد عروہ ابن الزبیر کے ذریعے یہ روایت کی ہے کہ جب اس بے وقوف نے حضورؐ کے سر پر مٹی ڈالی تو حضورؐ اپنے گھر میں داخل ہوئے اور آپ ؐ کے سر پر مٹی پڑی ہوئی تھی۔ آپ ؐ کی بیٹیوں میں سے ایک اٹھی اور مٹی دھونے لگی اور ساتھ ساتھ روتی بھی تھی اور رسول اللہ ؐ ان سے کہتے تھے "بچی مت رو' اللہ تمہارے باپ کا مانع (محافظ) ہے"۔ کہتے ہیں کہ اس موقعہ پر حضورؐ نے فرمایا "میرے ساتھ قریش اس قسم کا مکروہ سلوک تب ہی کر سکے جب ابو طالب فوت ہو گئے"۔

مقریزی امتاع الاسماع میں کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ ان دونوں کی موت کی وجہ سے یہ مشکلات دوچند ہو گئیں۔ آپ نے اس سال کو عام الحزن قرار دیا اور کہا "قریش نے میرے ساتھ یہ سلوک تب کیا جب ابو طالب فوت ہو گئے"۔ کیونکہ آپ کے خاندان میں اور آپ کے چچوں میں آپ ؐ کا ان کے سوا کوئی حامی نہ تھا جو آپ ؐ سے ان لوگوں کو روکتا۔

ان حالات میں سورت ھود نازل ہوئی جبکہ اس سے قبل سورت یونس نازل ہو گئی تھی اور اس سے بھی پہلے سورت اسرا (بنی اسرائیل) اور سورت الفرقان نازل ہو چکی تھی۔ یہ سب سورتیں اس خاص مرحلے کے خدوخال لیے ہوئے ہیں اور ان میں تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ قریش کس قدر حد سے آگے بڑھ گئے تھے۔

اس دور کے کیا حالات تھے اور کیا رنگ ڈھنگ تھا اور کیا فضا تھی۔ یہ سب کچھ اس سورت کے ماحول اور موضوعات سخن سے اچھی طرح واضح ہے۔ خصوصاً ان آیات سے جن میں حضور اکرم ؐ اور آپ کے ساتھیوں کو یہ نصیحت کی گئی ہے کہ اپنے موقوف پر جم جائیں اور آپ ؐ اس دور میں 'جس طرح ایک جاہلی معاشرے میں اپنے آپ کو تنہا سمجھتے تھے' دلگیر تھے اور وحشت میں مبتلا تھے 'اس پر آپ کی ڈھارس بندھائی گئی ہے۔

ان حالات میں یہ سورت اپنے اندر چند خصوصیات لیے ہوئے ہے اور میں ان میں سے بعض کی طرف یہاں اشارہ کروں گا۔

○ اس سورت میں حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اسلامی نظریات کی تبلیغ اور تحریک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں اسلام کے بنیادی عقائد ایک ہی رہے ہیں اور وہ یہ کہ اللہ کی بندگی کی جائے اور اس بندگی میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے' پھر اس کی مکمل اطاعت کی جائے اور اس میں بھی اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے اور اس مکمل بندگی اور اطاعت کے سلسلے میں ہر دور میں اس وقت کے رسول سے ہدایات اور طریقے اخذ کیے جائیں اور تمام رسولوں کی ہدایات عقیدۂ آخرت اور آخرت کی جواب دہی کے اعتقاد پر مبنی ہیں۔ اور یہ کہ رسولوں نے جس راہ ضلالت اور راہ ہدایت کی نشاندہی کر دی اس کے اختیار کرنے میں اللہ نے انسان کو مکمل طور پر خود مختار چھوڑا ہے کہ وہ جس راہ کو چاہے اختیار کرے۔ ہدایت کی راہ یا ضلالت کی راہ۔

حضور اکرمؐ تشریف لائے تو آپ کے ہاتھ میں (كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ) "ایک فرمان تھا جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوئی ہیں ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے"۔ اور اس کتاب کی اساسی تعلیمات یہ ہیں:

أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنَّنِي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ (٢) وَأَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيرٍ (٣) إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (٤) (١١: ٢ تا ٤) "کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی۔ میں اس کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی۔ اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو، اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔

لیکن یہ بنیادی دعوت بھی کوئی نئی دعوت نہ تھی اور یا یہ ایسی بات نہ تھی کہ اس سے قبل کسی نے یہ نہ کی ہو۔ اس سے قبل حضرت نوحؑ، حضرت ھودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہم السلام جیسے پیغمبر اسی کی طرف دعوت دیتے آئے ہیں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَى قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُبِينٌ (٢٥) أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ أَلِيمٍ (٢٦) (١١: ٢٥ - ٢٦) "اور ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ (اس نے کہا) "میں تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک روز دردناک عذاب آئے گا"۔

وَإِلَى عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ (٥٠) يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي أَفَلَا تَعْقِلُونَ (٥١) وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ (٥٢) قَالُوا يَا هُودُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَ

مَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَ مَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۵۳) (۱۱ : ۵۰ تا

۵۳) "اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' تمہارا کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے۔ تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں۔ اے برادران قوم' اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا' میرا اجر تو اس کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے' کیا تم عقل سے ذرا کام نہیں لیتے؟ اور اے میری قوم کے لوگو' اپنے رب سے معافی چاہو' پھر اس کی طرف پلٹو وہ تم پر آسمان کے دھانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا تم' مجرم بن کر بندگی سے منہ نہ پھیرو انہوں نے (جواب میں) کہا" تو ہمارے پاس کوئی واضح دلیل لے کر نہیں آیا' اور ہم تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور نہ ہی ہم تجھ کو ماننے والے ہیں"۔

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ (۱۱ : ۶۱) "اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے اور یہاں تم کو بسایا ہے لہٰذا تم اس سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ' یقیناً میرا رب قریب ہے اور وہ دعاؤں کا جواب دینے والا ہے"۔

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ (۸۴) وَ يٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (۸۵) بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ وَ مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (۸۶) (۱۱ : ۸۴ تا ۸۶) "اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے اور ناپ و تول میں کمی نہ کیا کرو' آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں' مگر مجھے ڈر ہے کہ تم پر ایسا دن آئے گا جس کا عذاب سب کو گھیر لے گا اور اے برادران قوم ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ پورا ناپو اور تولو اور لوگوں کو ان چیزوں میں گھاٹا نہ دیا کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اللہ کی دی ہوئی بچت تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو۔ بہرحال میں تمہارے اوپر نگران کار نہیں ہوں"۔

غرض تمام انبیاء یہی کلمہ دہراتے رہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور حاکم نہیں ہے اور یہی تمام انبیاء کی دعوت رہی۔

○ اس سورت میں تمام رسولوں کی ثابت قدمی کی جھلکیاں بھی دکھائی گئی ہیں۔ کہ یہ رسول قوم کی طرف سے تکذیب، روگردانی، مذاق اور استہزا اور ایذا رسانیوں اور دھمکیوں کے مقابلے میں کس طرح برداشت، صبر اور اعتماد و یقین کے ساتھ حق پر جمے رہے اور انہیں پوری نبوی اور تحریکی زندگی میں یہ یقین رہا کہ اللہ کی مدد ضرور آ کر رہے گی۔ چنانچہ دنیا میں بھی ان کی پیش گوئیاں حق ثابت ہوئیں اور آخرت میں بھی ہوں گی۔ چنانچہ ان رسولوں کو پختہ یقین رہا کہ مکذبین تباہ ہوں گے، اور مومنین نجات پائیں گے۔

مثلاً حضرت نوح کے قصے میں یہ منظر قابل دید ہے:

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا
الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ
(۲۷) قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰىنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّیَتْ
عَلَیْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ (۲۸) وَیٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مَالًا اِنْ
اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ
قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ (۲۹) وَیٰقَوْمِ مَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ
(۳۰) وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَكٌ وَّلَاۤ
اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْۤ اَعْیُنُكُمْ لَنْ یُّؤْتِیَهُمُ اللّٰهُ خَیْرًا اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ اِنِّیْۤ اِذًا
لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ (۳۱) قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ
مِنَ الصّٰدِقِیْنَ (۳۲) قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ

(۳۳) (۱۱: ۲۷ تا ۳۳) "جواب میں اس کی قوم کے سردار، جنہوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا، بولے "ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذل تھے۔ بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے ہو، بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں"۔ اس نے کہا "اے برادران قوم، ذرا سوچو تو سہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ کو اپنی

خاص رحمت سے بھی نواز دیا مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو تمہارے سر چپک دیں؟ اور اے برادران قوم میں اس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا' میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور میں ان لوگوں کو دھکے دینے سے بھی رہا جنہوں نے میری بات مانی ہے' وہ آپ ہی اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔ اور اے قوم' اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کی پکڑ سے کون مجھے بچانے آئے گا؟ تم لوگوں کی سمجھ میں کیا اتنی بات بھی نہیں آتی؟ اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں' نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں' نہ یہ میرا دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔ اور یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو تمہاری آنکھیں حقارت سے دیکھتی ہیں۔ انہیں اللہ نے کوئی بھلائی نہیں دی۔ ان کے نفس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو ظالم ہوں گا"۔ آخر کار ان لوگوں نے کہا کہ اے نوح' تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت کر لیا۔ اب تو بس وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو' اگر سچے ہو"۔ نوح نے جواب دیا "وہ تو اللہ ہی لائے گا اگر چاہے گا اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے روک دو"۔

اس کے بعد طوفان کا منظر آتا ہے' جس میں جھٹلانے والے ہلاک ہوتے ہیں اور مومن نجات پاتے ہیں اور حضرت ھود کے قصے' میں ہم یہ منظر پاتے ہیں :

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۵۳) اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (۵۴) مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ (۵۵) اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۵۶) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ (۵۷)

(۱۱: ۵۳ - ۵۷) "انہوں نے جواب دیا "اے ہود' تو ہمارے پاس کوئی صریح شہادت لے کر نہیں آیا ہے اور تیرے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اور نہ ہی تجھ کو ہم ماننے والے ہیں۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ تیرے اوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے"۔ ہود نے کہا: "میں اللہ کی شہادت پیش کرتا ہوں' اور تم گواہ رہو کہ یہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو تم نے خدائی میں شریک ٹھہرا رکھا ہے' اس سے میں بیزار ہوں۔ تم سب کے سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کسر نہ اٹھا رکھو۔ اور مجھ کو ذرا مہلت نہ دو' میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔ بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے۔ اگر تم منہ پھرتے ہو تو پھیر لو' جو پیغام دے کر میں تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں تم کو پہنچا چکا ہوں۔ اب میرا رب تمہاری جگہ

دوسری قوم اٹھائے گا اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے' یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگران ہے"۔

اب اس قوم کا انجام ملاحظہ فرمائیں :

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ (۵۸) وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (۵۹) وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ (۶۰) (۱۱ : ۵۸ تا ۶۰) "اور پھر جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے ہود کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے' نجات دے دی اور ایک سخت عذاب سے انہیں بچا لیا --- یہ ہیں عاد' اپنے رب کی آیات سے انہوں نے انکار کیا اور اس کے رسولوں کی بات انہوں نے نہ مانی اور ہر جبار دشمن حق کی پیروی کرتے رہے ۔ آخر کار اس دنیا میں بھی ان پر پھٹکار پڑی اور قیامت کے روز بھی ۔ عاد نے اپنے رب سے کفر کیا ۔ سنو دور پھینک دیئے گئے عاد ہود کی قوم کے لوگ"۔

اور حضرت صالح کے قصے میں یہ منظر ہے :

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ (۶۲) قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ (۶۳) (۱۱ : ۶۲ تا ۶۳) "انہوں نے کہا :" اے صالح' اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں ۔ کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے ۔ جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ تو جس طریقے کی طرف ہمیں بلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے"۔ صالح نے کہا :" اے برادران قوم' تم نے کچھ اس بات پر غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھ کو نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھ کو کون بچائے گا اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ تم میرے کس کام آ سکتے ہو' سوائے اس کے کہ مجھے اور زیادہ خسارے میں ڈال دو"۔ اس کے بعد وہ جن کی جانب سے ناقہ کے پاؤں کاٹ دیئے گئے ان کی تکذیب کی وجہ سے ان پر عذاب الٰہی نازل ہوا۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ (۶۶) وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ

دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ (٦٧) كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ (٦٨) (١١: ٦٦ تا ٦٨) ”آخر کار جب ہمارے فیصلے کا وقت آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، بچالیا اور اس دن کی رسوائی سے ان کو محفوظ رکھا۔ بے شک تیرا رب ہی دراصل طاقتور اور بالادست ہے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا تھا تو ایک سخت دھماکے نے ان کو دھرلیا اور وہ اپنی بستیوں میں اس طرح بے حس و حرکت پڑے رہ گئے گویا وہ وہاں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ سنو ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا، سنو اور پھینک دیئے گئے ثمود۔“

اب حضرت شعیب کے قصے کا منظر پیش ہوتا ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ (٨٧) قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا وَ مَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰكُمْ عَنْهُ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَ مَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ (٨٨) وَ يٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ وَ مَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ (٨٩) وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ (٩٠) قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ (٩١) قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (٩٢) وَ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ وَ ارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ (٩٣) وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ اَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ (٩٤) كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ (٩٥)

(۱۱ : ۸۷ تا ۹۵) ''انہوں نے جواب دیا''اے شعیب کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنی منشا کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟ بس تو ہی تو ایک عالی ظرف اور راست باز آدمی رہ گیا'' --- شعیب نے کہا''بھائیو' تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر تھا' اور پھر اس نے مجھے اپنے ہاں سے اچھا رزق بھی عطا کیا۔ (تو اس کے بعد میں تمہاری گمراہیوں اور حرام خوریوں میں تمہارا شریک حال کیسے ہو سکتا ہوں؟) اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں ان کا خود ارتکاب کروں۔ میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں جہاں تک بھی میرا بس چلے۔ اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے' اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ اور اے برادران قوم' میرے خلاف تمہاری ہٹ دھرمی کہیں یہ نوبت نہ پہنچا دے کہ آخر کار تم پر بھی وہی عذاب آکر رہے جو نوح ؑ یا ہود ؑ یا صالح ؑ کی قوم پر آیا تھا۔ اور لوط ؑ کی قوم تو تم سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ دیکھو' اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ' بیشک میرا رب رحیم ہے اور اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے''۔

انہوں نے جواب دیا''اے شعیب ؑ تیری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں' اور ہم دیکھتے ہیں کہ تو ہمارے درمیان ایک بے زور آدمی ہے' تیری برادری نہ ہوتی تو ہم کبھی کا تجھے سنگسار کر چکے ہوتے' تیرا بل بوتا تو اتنا نہیں ہے کہ ہم پر بھاری ہو''۔

شعیب ؑ نے کہا:''بھائیو' کیا میری برادری تم پر اللہ سے زیادہ بھاری ہے کہ تم نے (برادری کا تو خوف کیا اور) اللہ کو بالکل پس پشت ڈال دیا؟ جان رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔ اے میری قوم کے لوگو' تم اپنے طریقے پر کام کیے جاؤ اور میں اپنے طریقے پر کرتا رہوں گا' جلدی ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر ذلت کا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ چشم براہ ہوں''۔

آخر کار ہمارے فیصلے کا وقت آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے شعیب اور اس کے ساتھی مومنوں کو بچا لیا اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو ایک سخت دھماکے نے ایسا پکڑا کہ وہ اپنی بستیوں میں بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے۔ گویا وہ وہاں رہے بسے ہی نہ تھے' سنو مدین والے بھی دور پھینک دیئے گئے جس طرح ثمود پھینکے گئے تھے''۔

○ ان تمام قصوں پر ایک جامع تبصرہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کا مطلب سمجھایا گیا ہے اور آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں ان پر ان کو تسلی دی گئی ہے' خصوصاً یہ یاد دہانی کر کے کہ اللہ کی حفاظت اور نگہبانی ان کے شامل حال رہی اور وہ ہر وقت مددگار رہا۔ اور حضورؐ کو حکم دیا گیا کہ آپ بھی ان جیسے لوگوں سے اس طرح بائیکاٹ کریں جس طرح آپ سے قبل تمام رسولوں نے اس قسم کے لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ اور اس میں اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ حضورؐ کی رسالت' اور آپؐ پر نازل ہونے والی وحی برحق ہے اور آپؐ سچے رسول ہیں۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کے قصے کے اختتام پر یہ کہا گیا ہے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا

فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ (۱۱:۴۹) "اے نبی یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں، اس سے پہلے نہ تم ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم۔ پس صبر کرو، انجام کار متقیوں کے حق میں ہے"۔ اور اس سورت کے تمام قصوں کے اختتام پر یہ طویل تبصرہ ہے جو سورت کے اختتام تک چلا گیا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ (۱۰۰) وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَ مَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ (۱۰۱) وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِيَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ (۱۰۲) (۱۱:۱۰۰ تا ۱۰۲) "یہ چند بستیوں کی سرگزشت ہے، جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض اب بھی کھڑی ہیں اور بعض کی فصل کٹ چکی ہے۔ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا انہوں نے آپ ہی اپنے اوپر ظلم ڈھایا۔ اور جب اللہ کا حکم آگیا تو ان کے وہ معبود جنہیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارا کرتے تھے، ان کے کچھ کام نہ آسکے۔ اور انہوں نے ہلاکت اور بربادی کے سوا انہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ اور تیرا رب جب کسی ظالم بستی کو پکڑتا ہے تو اس کی پکڑ ایسی ہوا کرتی ہے۔ فی الواقعہ اس کی پکڑ بڑی سخت اور دردناک ہوتی ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (۱۱۰) وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۱۱۱) فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَ لَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۱۱۲) وَ لَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (۱۱۳) وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ (۱۱۴) وَ اصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۱۵) (۱۱:۱۱۰ تا ۱۱۵) "ہم اس سے قبل موسیٰ کو بھی کتاب دے چکے ہیں اور اس کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا۔ اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے سے طے نہ کر دی گئی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان بھی کا فیصلہ چکا دیا ہوتا۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اس کی طرف سے شک اور خلجان میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تیرا رب انہیں ان کے اعمال کا بدلہ پورا پورا دے کر رہے گا۔ یقیناً وہ ان کی سب حرکتوں سے باخبر ہے۔ پس اے نبی، تم، اور تمہارے وہ ساتھی جو پلٹ آئے ہیں،

ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو' جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو' جو کچھ تم کر رہے ہو' اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے - ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے - اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا' جو خدا سے نہیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی اور دیکھو نماز قائم کرو' دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر در حقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں - یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں اور صبر کرو نیکی کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں ہوتا"۔

وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ جَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۲۰) وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ (۱۲۱) وَ انْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ (۱۲۲) وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۱۲۳) (۱۱: ۱۲۰ تا ۱۲۳) "اور اے نبی پیغمبروں کے یہ قصے' جو ہم تمہیں سناتے ہیں' یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں - ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا - اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی - رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے' تو ان سے کہہ دو کہ تم اپنے طریقے پر کام کرتے رہو اور ہم اپنے طریقے پر کیے جاتے ہیں' انجام کار تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں - آسمانوں اور زمین میں جو کچھ چھپا ہوا ہے - سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے - اور سارا معاملہ اسی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے - پس اے نبی' تو اس کی بندگی کر اور اسی پر بھروسہ رکھ' جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو' تیرا رب اس سے بے خبر نہیں ہے"۔

ان تمام قرآنی ہدایات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کس تحریک پر زور دیا گیا ہے - چنانچہ تحریک کے ہر مرحلے اور ہر موقف پر قرآن کریم پوری پوری ہدایات دیتا ہے - تحریک اسلامی جاہلیت کے عملی مقابلے میں جس مقام پر ہوتی ہے قرآن حکیم اس مقام و محل اور ظروف و احوال کے مطابق عملی حکمت بتاتا جاتا ہے اور یہ حکمت قصص انبیاء کی شکل میں سمجھائی جاتی ہے - اس طرح یہ قصے تحریک کے حالات اور سورت کی فضا میں نہایت ہی برمحل اور موزوں اور سیاق کلام میں مربوط اور متناسق ہوتے ہیں اور ہدایات و احکام اور اشارات اور حکمتوں سے لبریز بھی۔

---ooo---

گیارہویں پارے میں سورت یونس کے تعارف میں ہم نے یہ کہا تھا:

"اس سے قبل ہمارے مطالعے میں جو آخری مکی سورتیں تھیں وہ سورت انعام اور سورت اعراف تھیں - موجود مصحف کی ترتیب میں وہ باہم پیوست تھیں - اگرچہ ترتیب نزول کے مطابق ان کا زمانہ نزول ایک نہیں ہے - اس کے بعد سورت انفال اور سورت توبہ آتی ہیں اور یہ محل نزول اور موضوع کے اعتبار سے مدنی سورتیں ہیں - اب ہم دوبارہ مدنی

دور میں ہیں ۔ سورت یونس اور سورت ہود دونوں ترتیب مصحفی اور ترتیب زمانہ نزول کے اعتبار سے ایک محل اور ایک زمانے کی ہیں ۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ سورتوں کے اس جوڑے اور اس جوڑے کے درمیان کئی باتیں مشترکہ ہیں ۔ موضوع کے اعتبار سے بھی اور موضوع کی ادائیگی کے اعتبار سے بھی ۔ سورت انعام اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقائد کو لیتی ہے اور اسے جاہلیت کے بالمقابل پیش کرتی ہے ۔ جاہلیت پر تنقید کرتی اور جاہلیت کے نظریات کے عقائد، نظام عبادات اور نظام اعمال پر حقارت آمیز نظر ڈالتی ہے ۔ جبکہ سورت اعراف ان عقائد و نظریات کو عملی اور تحریکی انداز میں سامنے لاتی ہے ۔ اور پوری انسانی تاریخ میں اسلام اور جاہلیت کی کشمکش کا نقشہ پیش کرتی ہے ۔ یہاں سورت یونس اور سورت ہود کا بھی یہی [illegible] اس جوڑے اور اس جوڑے کے درمیان مکمل مشابہت ہے ۔ ہاں اس قدر فرق ہے کہ

دور میں ہیں ۔ سورت یونس اور سورت ہود دونوں ترتیب مصحفی اور ترتیب زمانہ نزول کے اعتبار سے ایک محل اور ایک زمانے کی ہیں ۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ سورتوں کے اس جوڑے اور اس جوڑے کے درمیان کئی باتیں مشترکہ ہیں ۔ موضوع کے اعتبار سے بھی اور موضوع کی ادائیگی کے اعتبار سے بھی ۔ سورت انعام اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقائد کو لیتی ہے اور اسے جاہلیت کے بالمقابل پیش کرتی ہے ۔ جاہلیت پر تنقید کرتی اور جاہلیت کے نظریات کے عقائد، نظام عبادات اور نظام اعمال پر حقارت آمیز نظر ڈالتی ہے ۔ جبکہ سورت اعراف ان عقائد و نظریات کو عملی اور تحریکی انداز میں سامنے لاتی ہے ۔ اور پوری انسانی تاریخ میں اسلام اور جاہلیت کی کشمکش کا نقشہ پیش کرتی ہے ۔ یہاں سورت یونس اور سورت ہود کا

مثلاً وہ اساسی مقاصد کیا ہیں، جن کے لیے اس سورت کو لایا گیا ہے؟ درج ذیل نکات کا غور سے مطالعہ فرمائیں۔

○ یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جو تعلیمات دیتے ہیں اور جو ہدایات ان کے پیش نظر ہیں، وہ آپ سے پہلے آنے والے رسولوں کی تعلیمات و ہدایات تھیں۔ وہ یہ کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اور وہی حاکم ہے۔ اور اسی سے ہم نے اپنی زندگیوں کا نظام اخذ کرنا ہے اور یہی وہ نظریہ ہے اور یہی وہ معیار ہے جس کے مطابق انسانوں کے اندر صف بندیاں ہوتی رہی ہیں۔ سورت کے آغاز ہی میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دعوت کے بارے میں یہ حقائق سامنے لائے گئے ہیں:

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (۱) اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ

اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ (۲) (۱۱: ۱ - ۲) ''ال ر، فرمان ہے جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوئی ہیں، ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی۔ میں اس کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی''۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ

دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۳) فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ

وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۴) (۱۱: ۱۳ تا ۱۴) ''کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ کہو ''اچھا یہ بات ہے۔ تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بنا لاؤ اور اللہ کے سوا اور جو جو ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لو اگر تم سچے ہو۔ اب اگر وہ تمہاری مدد کو نہیں پہنچتے تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے، اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے۔ پھر کیا تم سر تسلیم خم کرتے ہو''۔

قصص میں بھی انبیاء کی دعوت کی تعریف جابجا موجود ہے اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ انبیاء اپنی قوم اور اپنے اہل و عیال سے مکمل بائیکاٹ کر دیں اور یہ صف بندی صرف نظریات کے اصول پر ہو۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۲۵) اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ

اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ (۲۶) (۱۱: ۲۵ تا ۲۶) ''اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ ''میں تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک روز دردناک عذاب آئے گا''۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ

عَلَيْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ (۱۱ : ۲۸) ’’اس نے کہا‘ اے برادران قوم‘ ذرا سوچو تو سہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ کو اپنی ایک خاص رحمت سے بھی نواز دیا مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو تمہارے سر چپیک دیں؟‘‘

وَ نَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ (۴۵) قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّيْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (۴۶) (۱۱ : ۴۵ تا ۴۶)

) ) ’’اور نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا‘ کہا: ’’اے میرے رب میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے۔ اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے‘‘۔ جواب میں ارشاد ہوا: ’’اے نوح وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے۔ لہٰذا تو اس بات کی مجھ سے درخواست نہ کر جس کی حقیقت تو نہیں جانتا‘ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنا لے‘‘۔

وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ (۱۱ : ۵۰) ’’اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا ’’اے برادران قوم اللہ کی بندگی کرو‘ تمہارا کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے۔ تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں‘‘۔

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ (۱۱ : ۶۱) ’’اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا‘ اس نے کہا ’’اے میری قوم کے لوگو‘ اللہ کی بندگی کرو‘ اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے اور یہاں تم کو بسایا‘ لہٰذا تم اس سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ یقیناً میرا رب قریب ہے‘ اور وہ دعاؤں کا جواب دینے والا ہے‘‘۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ (۱۱ : ۶۳) ’’صالح نے کہا‘ اے برادران قوم‘ تم نے کچھ اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھ کو نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھے کون بچائے گا۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ تم میرے کس کام آ

سکتے ہو سوائے اس کے کہ مجھے اور خسارے میں ڈال دو"۔

وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ -----

(۱۱: ۸۴) "اور مدین والوں کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو' اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی الہ نہیں ہے"۔

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کُنْتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ رَزَقَنِیْ مِنْہُ رِزْقًا حَسَنًا

(۱۱: ۸۸) "شعیب نے کہا' بھائیو' تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک مکمل شہادت پر تھا اور پھر اس نے مجھے اپنے ہاں سے اچھا رزق بھی عطا کیا"۔ ان تمام قصص اور مباحث سے جو نتائج اس سورت میں اخذ کیے گئے ان کے بارے میں یہ آیات قابل ملاحظہ ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ نظریات کی اساس پر مکمل صف بندی کی ضرورت ہے :

وَلَا تَرْکَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (۱۱: ۱۱۳) "ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے اور تمہیں ایسا کوئی ولی اور سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی"۔

وَلِلّٰہِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَیْہِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّہٗ فَاعْبُدْہُ وَتَوَکَّلْ عَلَیْہِ وَ مَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۱۱: ۱۲۳) "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ چھپا ہوا ہے سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے اور سارا معاملہ اسی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ پس اے نبی' تو اللہ کی بندگی کر اور اس پر بھروسہ رکھ' جو کچھ تم کر رہے ہو' اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے"۔

اس طرح اس سورت کے مذکورہ بالا تینوں حصے ایک دوسرے سے پیوستہ اور مربوط ہو جاتے ہیں۔

○ اس غرض کے لیے کہ لوگ اللہ وحدہ کے نافذ کردہ نظام زندگی کو اپنا لیں اور صرف اس کی بندگی کریں۔ اس سورت میں اللہ کی بزرگی اور کبریائی کو بھی بیان کیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ پوری کائنات اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اور یہ کہ تمام انسانوں نے قیامت کے دن اس کے سامنے پیش ہونا ہے اور تب صرف اللہ ہی جزاو سزا کے بارے میں فیصلے کرے گا۔ سورت کے مذکورہ بالا تینوں حصوں میں اس مضمون کو لیا گیا ہے۔

سورت کے آغاز میں کہا گیا ہے :

اَلَآ اِنَّھُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَھُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْہُ اَلَا حِیْنَ یَسْتَغْشُوْنَ ثِیَابَھُمْ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ اِنَّہٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۵) وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا

عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (٦) وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (٧) وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (٨)

(۱۱: ۵ تا ۸) "دیکھو یہ لوگ سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ اس سے چھپ جائیں' خبردار جب یہ کپڑوں سے اپنے آپ کو ڈھانپتے ہیں' اللہ ان کے چھپے کو بھی جانتا ہے اور کھلے کو بھی' وہ تو ان بھیدوں سے بھی واقف ہے جو سینوں میں ہیں' زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو' اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے۔ سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے۔ اور وہی ہے جس نے آسمان اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ جب کہ اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ تم کو آزما کر دیکھے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ اب اگر اے نبی تم کہتے ہو کہ لوگو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے تو منکرین فوراً بول اٹھتے ہیں کہ یہ تو صریح جادوگری ہے۔ اگر ہم ایک خاص مدت تک ان کی سزا کو ٹالتے ہیں تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ آخر کس چیز نے اسے روک رکھا ہے؟ سنو' جس روز اس سزا کا وقت آ گیا تو وہ کسی کے پھیرے نہ پھر سکے گا اور وہی چیز ان کو آگھیرے گی جس کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں"۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ (١٥) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (١٦) (۱۱: ۱۵ تا ۱۶) "جو لوگ بس اس دنیا کی زندگی اور اس کی خوشنمائیوں کے طالب ہوتے ہیں' ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ انہوں نے اس دنیا میں بنایا وہ سب کچھ ملیامیٹ ہو گیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے"۔

اسی طرح جس حصے میں نبیوں کے جو قصے ہیں اس میں بھی اللہ کی کبریائی کے نمونے موجود ہیں:

اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (٥٦) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ وَ

يَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا إِنَّ رَبِّي عَلَى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ (٥٧)

[redacted]

مختلف طریقوں پر چلتے رہیں گے اور بے راہ رویوں سے صرف وہ لوگ بچیں گے جس پر تیرے رب کی رحمت ہے ۔ اسی کے لیے تو اس نے انہیں پیدا کیا تھا' اور تیرے رب کی وہ بات پوری ہوگئی جو اس نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا"۔

اس طرح اس سورت کے تینوں حصوں میں حقیقت الوہیت اور آخرت کی جواب دہی کے مضمون کو مسلسل لایا جا رہا ہے ۔ اس میں اس سورت کا زور اس نکتہ پر نہیں ہے کہ آیا اس کائنات کا کوئی الٰہ ہے یا نہیں ہے' اصل زور اس پر ہے کہ انسانوں کے لیے الٰہ واحد ہی اللہ رب العالمین ہے اور وہی حاکم مطلق ہے' کیونکہ نفس وجود باری میں مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان اختلاف نہ تھا۔ نبیوں اور ان کے مخاطبین کے درمیان اکثر و بیشتر نکتہ اختلاف یہ رہا ہے کہ رب العالمین صرف الٰہ واحد ہے یا اور بھی کوئی ہے ۔ اور یہی اختلاف مشرکین مکہ اور خاتم النبیین کے درمیان بھی تھا۔ پس حضور اور مشرکین مکہ کے درمیان نکتہ اختلاف یہی تھا کہ اطاعت صرف اللہ العالمین کی کرنی ہے یا کسی اور کی بھی ۔ آیا دنیا میں اللہ کا دین اور اللہ کا نظام اور اس کی شریعت اور اس کے فیصلے نافذ ہوں گے یا کسی اور کے بھی ہوں گے ۔ ان مذکورہ اقتباسات میں یہی مرکزی نکتہ اختلاف مذکور ہے ۔

---○○○---

عوام الناس کے ذہنوں میں یہ نظریاتی عقائد و تصورات جاگزیں کرنے کی غرض اور انہیں انسانی شخصیت کی سوچ و عمل کا حصہ بنانے کی خاطر اور ان تصورات کو ایک مضبوط اور متحرک اور مثبت قوت بنانے کے لیے اس سورت میں' ان تصورات کو مختلف اور موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے تاکہ یہ عقائد و تصورات اس قدر مضبوط اور موثر ہو جائیں کہ انسان کی پوری شخصیت پر چھا جائیں اور انسان ان تصورات کے لیے ہروقت پرجوش ہو اور اس کے لیے وہ بروقت جدوجہد کرتا ہو۔

○ چنانچہ اس سورت میں ترغیب اور ترہیب کی آیات بہت زیادہ ہیں ۔ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ دعوت اسلامی کو قبول کریں گے ۔ انہیں دنیا و آخرت کی بھلائی نصیب ہوگی ۔ جو قوم بھی اسلامی نظام قبول کرے وہ اس دنیا میں بھی خوب ترقی کرے گی اور آخرت میں بھی فلاح پائے گی اور جو قوم اس نظام سے منہ پھیرے گی وہ دنیا میں بھی خوار ہوگی اور آخرت کی دائمی بھلائیوں سے بھی محروم ہوگی ۔ کیونکہ جو شخص داعی حق کی دعوت سے منہ موڑے گا وہ طاغوت کا پیرو ہوگا اور طاغوت اسے واصل جہنم کر دے گا ۔ اس لئے کہ طاغوتی قوتوں کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ لوگوں سے اپنی پیروی کرائیں یا لوگ ان کی پیروی کریں ۔ اور اللہ تعالیٰ کے نظام زندگی کو ترک کر دیں ۔ اس ترغیب اور ترہیب کے چند نمونے ملاحظہ ہوں :

أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنَّنِي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ (٢) وَأَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيرٍ (٣) إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (٤) (١١ : ٢ تا ٤) "کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی ۔ میں اس کی طرف سے تم کو خبردار

کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی۔ اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ (۱۵) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۶) (۱۱: ۱۵ تا ۱۶) "جو لوگ بس اس دنیا کی زندگی اور اس کی خوشنمائیوں کے طالب ہوتے ہیں ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ انہوں نے دنیا میں بنایا وہ سب ملیامیٹ ہو گیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۷) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (۱۸) الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۱۹) اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ (۲۰) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۱) لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ (۲۲) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ

فِيهَا خٰلِدُوْنَ (۲۳) مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِيْرِ وَ السَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۲٤) (۱۱: ۱۷ تا ۲٤) ”پھر بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا‘ اس کے بعد ایک گواہ بھی پروردگار کی طرف سے (اس شہادت کی تائید میں) آگیا‘ اور پہلے موسیٰ ؑ کی کتاب رہنما اور رحمت کے طور پر آئی ہوئی بھی موجود تھی (کیا وہ بھی دنیا پرستوں کی طرح اس سے انکار کر سکتا ہے؟) ایسے لوگ تو اس پر ایمان ہی لائیں گے اور انسانی گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے لیے جس جگہ کا وعدہ ہے وہ دوزخ ہے۔پس اے پیغمبرؐ‘ تم اس چیز کی طرف سے کسی شک میں نہ پڑنا‘ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔

اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ گھڑے؟ ایسے لوگ اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے اور گواہ شہادت دیں گے کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا۔سنو! خدا کی لعنت ہے ظالموں پر--- ان ظالموں پر جو خدا کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں‘ اس کے راستے کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں‘ اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔وہ زمین میں اللہ کو بے بس کرنے والے نہ تھے اور نہ اللہ کے مقابلہ میں کوئی ان کا حامی تھا۔انہیں اب دوہرا عذاب دیا جائے گا۔وہ نہ کسی کی سن ہی سکتے تھے اور نہ خود ہی انہیں کچھ سوجھتا تھا۔یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ خود گھاٹے میں ڈالا اور وہ سب کچھ ان سے کھو دیا گیا جو انہوں نے گھڑ رکھا تھا۔ناگزیر ہے کہ وہی آخرت میں سب سے بڑھ کر گھاٹے میں رہیں۔رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اپنے رب ہی کے ہو کر رہے‘ تو یقیناً وہ جنتی لوگ ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی تو ہو اندھا بہرا اور دوسرا ہو دیکھنے اور سننے والا‘ کیا یہ دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تم (اس مثال سے) کوئی سبق نہیں لیتے؟

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ (۱۱: ۵۲) ”اور اے میری قوم کے لوگو‘ اپنے رب سے معافی چاہو‘ پھر اس کی طرف پلٹو‘ وہ تم پر آسمان کے دھانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کر دے گا۔مجرم بن کر منہ نہ پھیرو“۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْئًا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ (۱۱: ۵۷) اگر تم منہ پھیرتے ہو تو پھیرلو۔جو پیغام دے کر میں تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں تم کو پہنچا چکا ہوں۔اب میرا رب تمہاری جگہ دوسری قوم کو اٹھائے گا اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگران ہے“۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۹۶) اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ

فِرْعَوْنَ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ (۹۷) يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَ

بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ (۹۸) وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِئْسَ الرِّفْدُ

الْمَرْفُوْدُ (۹۹) (۱۱: ۹٦ تا ۹۹) "اور موسیٰ کو ہم نے اپنی نشانیوں اور کھلی سند ماموریت کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کے پاس بھیجا مگر انہوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی' حالانکہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔ قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہو گا اور اپنی پیشوائی میں وہ انہیں دوزخ کی طرف لے جائے گا' کیسی بدترین جائے ورود ہے یہ جس پر کوئی پہنچے"۔

---○○○---

○ اسلامی نظریہ حیات کی طویل تاریخ اس سورت میں بیان کی گئی ہے' ان تاریخی قصص کے درمیان بھی جابجا ترغیب و ترہیب وارد ہے۔ ان قصص میں مجرمین کی ہلاکت اور مومنین کی کامیابیاں مذکور ہیں۔ جن کے بہت سے اقتباسات ہم نے اس سے قبل دیئے ہیں خصوصاً طوفان نوح کی جو منظرکشی کی گئی ہے وہ اس کی واضح مثال ہے۔ اس منظر کے درمیان جو قدرتی مناظر پر مشتمل ہے رفتار واقعات تیز ہو جاتی ہے۔

وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا

يَفْعَلُوْنَ (۳٦) وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ

مُّغْرَقُوْنَ (۳۷) وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ قَالَ اِنْ

تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ (۳۸) فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ

عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (۳۹) حَتّٰى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ

قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ وَمَا

اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ (٤٠) وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا اِنَّ رَبِّيْ

لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٤١) وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَ نَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ وَ كَانَ

فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ (٤٢) قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ

يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ وَ حَالَ بَيْنَهُمَا

الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ (٤٣) وَقِيلَ يَأَرْضُ ابْلَعِي مَآءَكِ وَيَسَمَآءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّلِمِينَ

(٤٤) (١١: ٣٦ تا ٤٤) "نوح ؑ پر وحی کی گئی کہ تمہاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے' بس وہ لا چکے' اب کوئی ماننے والا نہیں ہے۔ ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑ دو اور ہماری نگرانی میں ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنانی شروع کر دو۔ اور دیکھو جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حق میں مجھ سے کوئی سفارش نہ کرنا' یہ سارے کے سارے اب ڈوبنے والے ہیں۔ نوح ؑ کشتی بنا رہا تھا اور اس کی قوم کے سرداروں میں سے جو کوئی اس کے پاس سے گزرتا تھا وہ اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ اس نے کہا "اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہو' عنقریب تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے گا اور کس پر وہ بلاٹوٹ پڑتی ہے جو ٹالے نہ ٹلے گی۔ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور وہ تنور ابل پڑا تو ہم نے کہا " ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو' اپنے گھر والوں کو بھی --- سوائے ان اشخاص کے جن کی نشاندہی پہلے کی جا چکی ہے۔ اس میں سوار کرا دو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں"۔ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح ؑ کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ نوح ؑ نے کہا "سوار ہو جاؤ اس میں' اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھہرنا بھی' میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔ کشتی ان لوگوں کو لیے چلی جا رہی تھی اور ایک ایک موج پہاڑ کی طرح اٹھ رہی تھی۔ نوح ؑ کا بیٹا دور فاصلے پر تھا۔ نوح ؑ نے پکار کر کہا: "بیٹا ہمارے ساتھ سوار ہو جا' کافروں کے ساتھ نہ رہ"۔ اس نے پلٹ کر جواب دیا: "میں ابھی ایک پہاڑ پر چڑھا جاتا ہوں جو مجھے پانی سے بچا لے گا"۔ نوح ؑ نے کہا: "آج کوئی چیز اللہ کے حکم سے بچانے والی نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم فرمائے"۔ اتنے میں ایک موج دونوں کے درمیان حائل ہو گئی اور وہ بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہو گیا۔ حکم ہوا "اے زمین' اپنا سارا پانی نگل جا اور اے آسمان رک جا"۔ چنانچہ پانی زمین میں بیٹھ گیا' فیصلہ چکا دیا گیا' کشتی جودی پر ٹک گئی اور کہہ دیا گیا کہ دور ہوئی ظالموں کی قوم!"

○ اس سورت میں بعض لوگوں کی نفسیاتی تصویر کشی بھی کی گئی ہے' جو بدبختی کی گرفت میں ہیں اور اندھوں کی طرح اس کائنات کے مشاہد سے غیر متاثر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ جھٹلانے والوں کو عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے' جس کے لیے وہ بار بار بے صبری سے مطالبہ کرتے تھے اور جو لوگ ان کو عذاب سے ڈراتے تھے ان کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔ اور جب خود ان کا طلب کردہ یہ عذاب ان پر نازل ہوتا تھا تو اس وقت ان کی جو نفسیاتی کیفیت ہوتی اس کی بھی خوب تصویر کشی کی گئی ہے اور ان حسرتوں کا خوب نقشہ کھینچا گیا ہے جو ان کی نفسیات کو گھیرے ہوئے تھیں۔ اب وہ تمام انعامات اور عیاشیاں ختم تھیں جن کے مزے وہ لوٹ رہے تھے۔ اور اگر ان سے عذاب ایک لمحے کے لیے بھی ہٹا دیا جائے تو پھر غافل!

وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِلَى أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ لَّيَقُولُنَّ مَا يَحْبِسُهُ أَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (٨) وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنسَانَ

مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ (۹) وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ (۱۰) اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ (۱۱)(۱۱: ۸ تا ۱۱)) ”اور اگر ہم ایک خاص مدت تک ان کی سزا کو ٹالتے ہیں تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ آخر کس چیز نے اسے روک رکھا ہے؟ سنو' جس روز اس سزا کا وقت آگیا تو وہ کسی کے پھیرے سے نہ پھر سکے گا۔ اور وہی چیز ان کو آگھیرے گی جس کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں۔ اور اگر کبھی ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازنے کے بعد پھر اس سے محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس ہوتا ہے اور ناشکری کرنے لگتا ہے' اور اگر اس مصیبت کے بعد جو اس پر آئی تھی ہم اسے نعمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ کہتا ہے میرے تو سارے دلدر پار ہو گئے۔ پھر وہ پھولا نہیں سماتا اور اکڑنے لگتا ہے۔ اس عیب سے پاک اگر کوئی ہیں تو بس وہ لوگ جو صبر کرنے والے اور نیکوکار ہیں اور وہی ہیں جن کے لیے درگزر بھی ہے اور بڑا اجر بھی“۔

○ اس سورت میں مناظر قیامت میں سے بعض مناظر بھی پیش کیے گئے ہیں اور ان میں جھٹلانے والوں کی ایک جھلک بھی دکھائی گئی ہے۔ اس وقت جب کہ وہ اس رب کے سامنے پیش ہوں گے جس کا وہ انکار کرتے تھے اور جس کے رسولوں سے وہ منہ پھیرتے تھے۔ اس وقت ان کو جو شرمندگی لاحق ہو گی اس کا ذکر ہے اور اس وقت صورت یہ ہو گی کہ جن لوگوں کو وہ رب بناتے تھے اور اپنے سفارشی سمجھتے تھے وہ اس وقت کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (۱۸) الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۱۹) اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ (۲۰) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۱) لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ (۲۲)(۱۱: ۱۸ تا ۲۲)) ”اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ گھڑے؟ ایسے لوگ اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے اور گواہ شہادت دیں گے کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا۔ سنو! خدا کی لعنت ہے ظالموں پر ــــ ان ظالموں پر جو خدا کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں' اس کے راستے کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں' اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ زمین میں اللہ کو بے بس کرنے والے نہ

تھے اور نہ اللہ کے مقابلہ میں کوئی ان کا حامی تھا۔ انہیں اب دوہرا عذاب دیا جائے گا۔ وہ نہ کسی کی سن ہی سکتے تھے اور نہ خود ہی انہیں کچھ سوجھتا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خود گھاٹے میں ڈالا اور وہ سب کچھ ان سے کھو دیا گیا جو انہوں نے گھڑ رکھا تھا۔ ناگزیر ہے کہ وہی آخرت میں سب سے بڑھ کر گھاٹے میں رہیں"۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ (۱۰۳) وَ مَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ (۱۰۴) یَوْمَ یَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّ سَعِیْدٌ (۱۰۵) فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ (۱۰۶) خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ (۱۰۷) وَ اَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ (۱۰۸) (۱۱: ۱۰۳ تا ۱۰۸)

"حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایک نشانی ہے۔ ہر اس شخص کے لیے جو عذاب آخرت کا خوف کرے۔ وہ ایک دن ہو گا جس میں سب لوگ جمع ہوں گے اور پھر جو کچھ بھی اس روز ہو گا سب کی آنکھوں کے سامنے ہو گا۔ ہم اس کے لانے میں کچھ بہت زیادہ تاخیر نہیں کر رہے ہیں بس ایک گنی چنی مدت اس کے لیے مقرر ہے۔ جب وہ آئے گا تو کسی کو بات کرنے کی مجال نہ ہو گی' الا یہ کہ خدا کی اجازت سے کچھ عرض کرے۔ پھر کچھ لوگ اس روز بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت جو بدبخت ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے وہ ہانپیں گے اور پھنکارے ماریں گے اور اس حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں' الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔ بے شک تیرا رب پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے۔ رہے وہ لوگ جو نیک بخت نکلیں گے تو وہ جنت میں جائیں گے اور وہاں ہمیشہ رہیں گے۔ جب تک زمین و آسمان قائم ہیں الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔ ایسی بخشش ان کو ملے گی جس کا سلسلہ منقطع نہ ہو گا"۔

○ اور بعض اثر انگیز مناظر وہ ہیں کہ جن میں کہا گیا ہے کہ اللہ حاضر و ناظر ہے۔ اور وہ انسان کے تمام خفیہ معاملات جانتا ہے کھلے ہوں یا پوشیدہ' جبکہ انسان کو پتہ نہیں ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے اور اس کا علم محیط ہے اور انسان اس قدر غافل ہے اور بے حس ہے کہ اس کو یہ احساس ہی نہیں ہے کہ اللہ کے کنٹرول میں ہے سب کچھ اور وہ محیط ہے۔ اور خود اللہ کو جھٹلانے والے بھی دراصل اس کے قبضہ قدرت کے اسیر ہیں لیکن ان کو شعور نہیں ہے۔

اَلَاۤ اِنَّهُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْهُ اَلَا حِیْنَ یَسْتَغْشُوْنَ ثِیَابَهُمْ یَعْلَمُ مَا

يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (٥) وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (٦) (١١: ٥ تا ٦)) دیکھو یہ لوگ سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ اس سے چھپ جائیں 'خبردار جب یہ کپڑوں سے اپنے آپ کو ڈھانپتے ہیں ' اللہ ان کے چھپے کو بھی جانتا ہے اور کھلے کو بھی ' وہ تو ان بھیدوں سے بھی واقف ہے جو سینوں میں ہیں ' زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو ' اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے ۔سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے"۔

اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (١١ : ٥٦) "میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی ۔کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو ' بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے"۔

○ دوسری اثر انگیزیوں اور سحر آفرینیوں کے علاوہ اس سورت میں قافلہ ایمان کو مسلسل سفر کرتا ہوا دکھایا گیا ہے ۔ اس قافلے کی قیادت رسولوں کے ہاتھ میں ہے اور یہ صدیوں سے اس سیدھی راہ پر رواں دواں ہے ' اور اس قافلے نے ہر دور اور ہر زمانے اور ہر جگہ یہی دو ٹوک اور فیصلہ کن کلمہ حق بلند کیا ہے ' بڑی صفائی اور بے باکی کے ساتھ ' پورے اطمینان اور وثوق کے ساتھ ۔

گذشتہ اقتباسات و آیات میں اس کی مثالیں ناظرین نے اچھی طرح دیکھ لی ہیں ۔ تفصیلات تفسیر کے دوران آئیں گی ۔ اس میں شک نہیں کہ تمام رسولوں کا موقف جاہلیت کے مقابلے میں لیک رہا ' ایک ہی حقیقت رہی جس کے وہ داعی تھے اور تقریباً ایک ہی انداز کلام میں وہ بات کرتے رہے اور اس سے ہر قاری کے دل میں وثوق و اطمینان پیدا ہوتا ہے اور وہ گہرے اثر قبول کرتا ہے ' ان اشارات کے بعد اب تفصیلات !

---ooo---

# درس نمبر۹۹ ایک نظر میں

یہ پہلا سبق ایک مقدمے کی شکل میں ہے۔اس کے بعد قصص کا حصہ اور آخر میں نتائج اور تبصرے ہیں۔اس تمہیدی حصے میں وہ تمام اساسی باتیں کی گئی ہیں جو اسلامی نظریۂ حیات کی اساسی باتیں ہیں اور بنیادی حقائق ہیں۔یعنی اطاعت اور بندگی صرف اللہ وحدہ لا شریک کی ہوگی اور دین صرف اللہ کا ہو گا۔اور یہ اعتقاد رکھنا لازم ہو گا کہ ایک دن ہم نے جزاء و سزا اور حساب و کتاب کے لیے اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔اور یہ حساب و کتاب دنیا میں اچھے اور برے اعمال کی اساس پر ہو گا۔کیونکہ دنیا دارالامتحان ہے۔اس ابتدائیہ میں اللہ کی معرفت اور اللہ کی صفات کو اس زاویہ سے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی ذات و صفات اس کائنات میں کس قدر موثر ہیں۔نیز اس سبق میں ذات باری کی حقیقت اور اس کی حکمرانی' انسان کی جانب سے اس کی بندگی اور اطاعت اور اس کے تقاضوں سے مومنین کو آگاہ کیا گیا ہے۔اور انسان کی بندگی کے تقاضے یہ ہیں کہ جس طرح دنیا میں انسان اس کا بندہ ہو گا۔اسی طرح آخرت میں بھی انسان اس کا بندہ ہو گا۔

اس مقدمے میں قیام رسالت اور حقیقت رسول پر بھی بحث ہے۔اور رسول کو مخاطب کر کے انہیں تسلی دی گئی ہے کہ آپ کی دعوت کے مقابلے میں منکرین جس طرح اٹھ کھڑے ہوئے ہیں' چیلنج دے رہے ہیں اور بلاوجہ عناد کر رہے ہیں تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔اور جیسا کہ ہم نے کہا کہ مکہ میں پوری دعوتی تاریخ میں نبی اکرمؐ کے لیے یہ مشکل ترین دور تھا۔اور مشرکین قرآن کو کلام الٰہی تسلیم نہ کرتے تھے۔اس کے جواب میں مشرکین سے کہا گیا کہ اگر وہ اس قرآن کو کلام الٰہی تسلیم نہیں کرتے تو وہ اس جیسی دس سورتیں تو پیش کر دیں' جیسا کہ ان کا زعم تھا۔اس طرح حضورؐ کو تسلی دی گئی کہ وہ ہرگز اس قرآن جیسا کلام نہیں پیش کر سکتے۔اس طرح ان لوگوں کے لیے یہ چیلنج باعث تسلی تھا' جو ایمان لا چکے تھے۔

اس تسلی کے ساتھ منکرین حق کو دوٹوک دھمکی بھی دی گئی ہے کہ وہ جس عذاب کے آجانے کی خواہش کا اظہار کر رہے ہیں وہ بہت ہی دردناک ہے اور ان کا انتظار کر رہا ہے۔ان کی حالت یہ ہے کہ جب دنیا میں ان پر کوئی معمولی تکلیف آجاتی ہے تو وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے حالانکہ آخرت کے عذاب کے مقابلے میں دنیا کی ہر تکلیف معمولی ہے۔

اس دھمکی کو مناظر قیامت کے ایک منظر کی صورت میں بھی پیش کیا جاتا ہے۔اس منظر میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ مشرکین اور مکذبین اور ان کے شرکاء اور سفارشی قیامت کے دن ان کو کسی طرح بھی عذاب سے نہ بچا سکیں گے۔جبکہ اہل ایمان جنتوں میں ہوں گے اور انعامات و اکرامات ان کا حصہ ہو گا۔یہ منظر قرآن کے مخصوص انداز کے مطابق نہایت ہی مجسم اور مصور ہے اور چلتا پھرتا نظر آتا ہے اور قرآن کہتا ہے۔

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِيْرِ وَ السَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۱۱ : ۲٤) "اور ان دو فریقوں کی مثال اس طرح ہے کہ ایک آدمی اندھا اور بہرا ہوا۔ دوسرا دیکھنے والا اور سننے والا ہو' کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم اس بات سے نصیحت نہیں پکڑتے؟"

---OOO---

# درس نمبر ۹۹ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۲۴

سُوْرَةُ هُوْدٍ (۱۱) — مَكِّيَّةٌ (۵۲) — اٰيَاتُهَا ۱۲۳ — رُكُوْعَاتُهَا ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝١ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا
اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ ۝٢ وَّ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا
اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ يُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ
فَضْلَهٗ ؕ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝٣ اِلَى اللّٰهِ
مَرْجِعُكُمْ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٤

"ال ر ۔ فرمان ہے جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوتی ہیں ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی ۔ میں اس کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں ' اور بشارت دینے والا بھی ۔ اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا ۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ۔ تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔

ان آیات میں درج ذیل حقائق بیان ہوئے جو دین اسلام کے بنیادی حقائق ہیں :

○ وحی اور رسالت کا ثبوت ۔

○ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کا اثبات ۔

○ جو لوگ اس وحی اور ہدایت کی اتباع کریں گے دنیا اور آخرت میں ان کے لیے انعام ہو گا بشرطیکہ وہ اس

ہدایت کو بطور نظام زندگی اپنائیں۔

○ وہ لوگ جو اسے جھٹلائیں گے وہ مستوجب سزا ہوں گے چاہے کوئی مطیع فرمان ہو یا منکر ہو' اسے ایک دن اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہو گا۔

○ اللہ کی قدرت اور سلطنت غیر محدود ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ال ر' یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر آگے پورا جملہ کتاب اُحْكِمَتْ اٰیٰتُهٗ (۱۱ : ۱) ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب ایسے ہی حروف سے بنی ہے جو لوگوں کی دسترس میں ہیں اور یہ لوگ اس کی تکذیب کرتے ہیں' اگر ان سے کہا جائے کہ ان حروف سے تم ایسی ہی کتاب بناؤ تو یہ عاجز رہ جاتے ہیں۔

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (۱۱ : ۱) ''فرمان ہے جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوتی ہیں۔ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے''۔

اس کی آیات محکم ہیں یعنی وہ مضبوط ترکیب رکھتی ہیں' گہرا مفہوم رکھتی ہیں' ان کا ہر حرف اور ہر حکم بامقصد ہے' ہر مفہوم اور ہر ہدایت مطلوب اور بامقصد ہے۔اس کا ہر اشارہ ایک ٹارگٹ کی طرف ہے اور یہ نہایت ہی ہم آہنگ اور مربوط ہیں' تمام آیات کا نظم اور تصور ایک ہے۔ان آیات کی پھر تفصیلات ہیں اور موضوع اور مطلب کے مطابق وہ منقسم ہیں اور ان کی تبویب کی گئی ہے اور ہر آیت کو اس کے لیے موزوں جگہ پر رکھا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان آیات کو اس طرح مستحکم ترکیب اور نہایت ہی بلیغ مفہوم میں کس نے مرتب فرمایا ہے۔تو یاد رہے کہ اللہ جل شانہ' نے یہ کام خود کیا ہے' ان آیات کی تشکیل و تسوید میں رسول اللہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔یہ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (۱۱ : ۱) ہیں یہ کتاب اللہ کے احکام بتاتی ہے اور ان کی ضروری تفصیلات بھی دیتی ہے۔اور یہ اسی طرح اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور جس طرح ہمارے سامنے ہے۔اس میں کوئی تغیر و تبدل کسی جگہ نہیں ہوا ہے۔

○ اور ان آیات میں کیا بنیادی نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ان کی تعلیمات کی اساس یہ کلمہ ہے۔

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ (۱۱ : ۲) ''کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی''۔یعنی نظام زندگی اللہ کا ہو' عبادت اللہ کی ہو اور اطاعت و حکمرانی اللہ کی ہو صرف اور صرف اللہ کی۔

اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ (۱۱ : ۲) ''میں اس کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی''۔یہ تصور رسالت ہے اور رسالت کا بڑا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے انعام کی خوشخبری دے اور برے انجام سے ڈرائے۔

وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ (۱۱ : ۳) ''اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ''۔یعنی شرک و کفر اور نافرمانی کو چھوڑ کر اللہ کی طرف پلٹ آؤ اور توحید اور اسلامی نظام زندگی کو قبول کر لو۔

يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلَىٰٓ اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِىْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ( ۱۱ :

۳ ) "تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا" ـ یہ توبہ و استغفار کرنے والوں کے لیے جزاء ہے ـ

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ( ۱۱ : ۳ ) "لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں" ـ یہ ان لوگوں کے لیے ڈراوا ہے جو دعوت سے منہ موڑتے ہیں ـ

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ( ۱۱ : ٤ ) "تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے" ـ اس میں اس عقیدے کا اظہار ہے کہ آخر کار سب کو اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے" ـ

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ( ۱۱ : ٤ ) "اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے" ـ اور اس میں اللہ کی قدرت مطلقہ کا ذکر ہے ـ اور یہ کہ وہ ہر کام پر قادر ہے ـ

یہ ہیں کتاب اللہ کے مقاصد اور اس کی آیات انہی کی طرف اشارہ کرتی ہیں ـ یہ ہیں وہ بنیادی عقائد اور تصورات جن کے اوپر اسلامی نظام حیات کی عمارت کو اٹھایا گیا ہے ـ

یہ بات ہر شخص کو اچھی طرح ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اس کرۂ ارض پر کوئی دین اور کوئی نظام اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا اور کوئی تہذیب اور کلچر دنیا میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ ان اساسی سوالات کا جواب نہ دے ـ دنیا میں ہر فلسفے اور نظام فکر کو ان سوالات کا جواب دینا لازمی ہے ـ

یہ عقیدہ کہ دنیا میں ہر قسم کی بندگی صرف اللہ وحدہ کی ہوگی' ان تمام راستوں کو بند کر دیتا ہے جن پر انسان جاکر انتشار کا شکار ہوتا ہے اور وہ نظریاتی اور فکری بے راہ روی میں مبتلا ہوتا ہے ـ انسانیت کو خام خیالی' وہم پرستی اور کھوٹے نظریات اور جھوٹے خداؤں کی بندگی اور غلامی سے صرف اس صورت میں نجات دلائی جا سکتی ہے کہ اسے اللہ وحدہ کا غلام بنا دیا جائے ـ دنیا میں کچھ ایسے لوگ اور چیزیں ہم نے تجویز کر رکھی ہیں ـ جن کو ہم اللہ اور بندے کے درمیان رابطے کا مقام دیتے ہیں' اور یہ لوگ روحانی طور پر لوگوں کو بدراہ کرتے ہیں' کوئی لوگ اور ادارے ایسے ہیں جن کو ہم نے حاکم اور مقتدر اعلیٰ تصور کر لیا ہے اور یہ لوگ انسانوں کی دنیاوی زندگی کو اپنی منشاء کے مطابق چلاتے ہیں ـ اور اللہ کی مختص ترین خصوصیات یعنی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کے اختیارات وہ خود اپنے لیے حاصل کر لیتے ہیں ـ اس طرح وہ لوگوں کو ان کھوٹے اور جھوٹے خداؤں کا غلام بناتے ہیں جو شرک جلی ہے ـ

دنیا میں جب تک عقیدۂ توحید کو اس وسیع مفہوم میں نکھار کر قائم نہ کیا جائے گا اس وقت تک کوئی ایسا اجتماعی' سیاسی' اقتصادی' اخلاقی' قومی اور بین الاقوامی نظام قائم نہیں ہو سکتا جس میں انسان بعض دوسرے انسانوں کی خواہشات' ان کی تاویلات اور ذاتی مقاصد کا آلہ کار بننے سے نجات پا سکے ـ

ماسوائے قیام عقیدۂ توحید کے ' انسان وہ آزادی اور شرف حاصل نہیں کر سکتا جو اللہ نے انسان کے لیے تجویز کیا ہے اور نہ انسان ذلت ' خوف اور بے چینی سے نجات پا سکتا ہے جس سے وہ ہمیشہ دوچار رہتا ہے عقیدۂ توحید بھی صرف ان معنوں میں کہ اللہ کو رب ' معبود ' تکوینی حاکم و مدبر اور تشریعی حاکم و قانون ساز تسلیم کیا جائے اور اس دائرہ اختیار سے انسان کو بالکل بے دخل کر دیا جائے اور انسان کا کوئی عمل دخل ان امور میں نہ رہے ' صرف اس صورت میں مکمل عقیدۂ توحید قائم ہو سکتا ہے۔

پوری انسانی تاریخ میں اسلام اور جاہلیت کے درمیان جو کشمکش رہی ہے اور حق اور طاغوت کے درمیان تاریخی معرکہ آرائی اور مقابلہ اس موضوع پر نہیں رہا ہے کہ اللہ اس کائنات کا الہٰ اور رب ہے ' اور اس کائنات کو وہی اپنی تدبیر اور اپنے تکوینی قوانین کے ساتھ چلا رہا ہے بلکہ یہ معرکہ اور یہ اختلاف اس بات پر تھا کہ رب الناس کون ہو؟ لوگوں پر نظام اور شریعت کس کی نافذ ہو؟ اور لوگ کس کی اطاعت کریں اور کس کے احکام خصوصاً سیاسی احکام قبول کریں؟

اس دنیا کی طاغوتی قوتیں اللہ کے اس حق کو غصب کر کے لوگوں کی زندگیوں میں اپنے قوانین و فرامین نافذ کرتی رہیں اور اس طرح لوگوں کو اللہ کی حاکیت سے نکال کر اپنی حاکیت کے دائرے میں داخل کرتی رہی ہیں۔ تمام انبیاء ' تمام رسالتوں اور تمام اسلامی تحریکات کا ہدف ہمیشہ یہی رہا ہے کہ لوگوں کو ان طاغوتی قوتوں کے غصب کردہ اختیارات کے دائرے سے نکال کر اللہ کی حکومت ' اللہ کی بادشاہت اور اللہ کی حاکیت میں داخل کیا جائے۔

اللہ تو تمام جہانوں سے بے نیاز بادشاہ ہے۔ لوگوں کی نافرمانی اور سرکشی اس کی حکومت میں پرکاہ کی نہیں کر سکتی اور اگر تمام مخلوقات اس کی بندگی پر متفق ہو جائے اور اس کی حکومت کو تسلیم کر لے تب بھی اللہ کی مملکت میں پرکاہ کا اضافہ نہیں ہو سکتا لیکن جب لوگ اللہ کے سوا کسی اور ذات یا ادارے کی حاکیت کو قبول کر لیں تو خود وہ ذلیل و خوار اور غلام ہو جاتے ہیں۔ اور اگر وہ اللہ وحدہ کی سیاسی اور نظریاتی حاکیت کو قبول کر لیں تو خود ان کے لیے یہ بات باعث عز و شرف ہے۔ وہ غلامی کی جگہ آزادی اور پستیوں کی جگہ سربلندی حاصل کر لیتے ہیں کوئی انسان کسی انسان یا غیر انسان کا غلام نہیں رہتا۔ اللہ چونکہ اپنے بندوں کو معزز شرف اور سربلند دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے رسولوں کو بھیجا تاکہ وہ ان کو یہ عزت اور شرف عطا کریں۔ اور ان کو اپنے جیسے بندوں کی غلامی سے نجات دیں۔ غرض اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام میں اگر کوئی بھلائی ہے تو وہ خود انسانوں کے لیے ہے اللہ تو تمام جہانوں سے غنی اور مستغنی ہے۔

اللہ تعالیٰ انسانی زندگی کو جس قدر معزز دیکھنا چاہتا ہے ' اور اسے جس سطح تک بلند کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس وقت تک بلند نہیں ہو سکتی جب تک تمام انسان اس بات کا عزم نہ کر لیں کہ وہ اپنے گلوں سے غیر اللہ کی غلامی کا جوا اتار پھینکیں گے کیونکہ غیر اللہ کی غلامی کا یہ پٹا انسان کے لیے باعث ذلت ہے ' چاہے اس کی صورت جو بھی ہو۔

دین صرف اللہ کے لیے تب ہو گا جب لوگ صرف اللہ وحدہ کو رب تسلیم کر لیں اور اللہ کی ربوبیت کا مفہوم یہ ہے کہ لوگ اللہ کا نظام ' اللہ کا دستور اور اللہ کے قوانین و فرامین کو اپنا لیں۔ یہ ہے وہ حقیقت جو اس سورت کے آغاز ہی میں منضبط کی گئی ہے۔

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (۱) اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ

(۱۱: ۱-۲) "فرمان ہے جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوتی ہیں ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی"۔

یہ ہے عبادت کا مفہوم جس طرح اسے عرب اچھی طرح سمجھتے تھے جن کی زبان میں قرآن کریم نازل ہوا تھا۔ اب دوسرا اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اللہ کی اس حاکمیت کو قائم کس طرح کیا جائے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ انسان رسالت کا اقرار کریں 'کیونکہ حاکمیت الٰہیہ کا یہ نظریہ اور نظام صرف اللہ نے پیش کیا ہے اور رسالت کو تسلیم کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ رسول جو کچھ دیتا ہے وہ من عند اللہ دیتا ہے۔ اگر کسی رسول کی تعلیمات کو من عند اللہ تسلیم نہ کیا جائے تو انسانی ضمیر میں ان تعلیمات کا جو تقدس اور احترام ہوتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اگر یہ تعلیمات کسی رسول اللہ کی جانب سے تصور ہوں تو رسول کا کوئی چاہے جس قدر بھی احترام کرے 'ان تعلیمات کی وہ قدر و قیمت انسان کے دل و دماغ میں جگہ نہیں پکڑتی اور نہ انسان چھوٹے بڑے معاملات میں ان تعلیمات کا احترام کرتا ہے۔ جب انسان کے قلب و نظر میں یہ شعور جاگزیں ہوتا ہے کہ یہ تعلیمات اللہ کی طرف سے ہیں تو پھر یہ شعور ہر وقت انسان کا پیچھا کرتا ہے۔ اور انسان اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ شعور ہی ہے جو متقیوں اور اطاعت شعاروں کو صراط مستقیم سے ادھر ادھر بھٹکنے نہیں دیتا۔

نیز اقرار بالرسالت کے ذریعے ہی وہ سرچشمہ اور ضابطہ متعین ہوتا ہے جس سے انسان وہ تمام ہدایات اخذ کر سکتا ہے جن کا تعلق اسلامی نظام اور دین سے ہے۔ صرف یہی ایک راستہ ہے جس کے ذریعے طاغوتی قوتوں کو ختم کیا جا سکتا ہے جن کا طریقہ واردات یہ ہوتا ہے کہ وہ ازخود کوئی قانون اور ضابطہ اور نظریہ و عقیدہ گھڑ لیتی ہیں اور پھر کہتی ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے حالانکہ یہ سب کچھ انہوں نے ازخود تصنیف کیا ہوتا ہے۔

ہر جاہلیت کی تاریخ یہ ہے کہ کچھ لوگ کھڑے ہوئے 'انہوں نے اپنی جانب سے کوئی قانون اور ضابطہ بنایا' لوگوں کے لیے اقدار اور رسم و رواج وضع کیے اور پھر کہا کہ یہ اللہ کی جانب سے ہیں۔ اللہ کے نام پر یہ انتشار تب ہی ختم ہو سکتا ہے کہ ایک رسول پر ایمان لاکر اس کے اقوال کو من جانب اللہ تسلیم کر لیا جائے۔

یہاں شرک سے استغفار اور توبہ کو اس لیے لایا گیا ہے کہ استغفار اس بات کی دلیل ہے کہ دل کے اندر احساس موجود ہے۔ وہ برائی کے خلاف فعال ہے اور اسے گناہ کا شعور ہے اور رجوع اور لوٹنے کی طرف مائل ہے۔ لیکن احساس و شعور کے ساتھ ساتھ حقیقی توبہ یہ ہے کہ انسان عملاً اس گناہ کو ترک بھی کر دے اور برے اعمال کے مقابلے میں اچھے کاموں پر عمل پیرا بھی ہو جائے۔ ترک معاصی اور عمل صالح کے بغیر توبہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ توبہ کے لیے دو عملی علامات ہیں۔ یہ دونوں شمیں توبہ کی ترجمان ہوتی ہیں اور توبہ کا عملی وجود صرف ان دو صورتوں میں متحقق ہوتا ہے اور صرف ایسی ہی توبہ کے بعد مغفرت کی امید کی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی یہ گمان رکھے کہ وہ شرک سے تائب ہو گیا اور اسلام میں داخل ہو گیا ہے لیکن اس کے بعد وہ عملاً اللہ کی اطاعت نہیں کرتا' اسلامی نظام کو قبول نہیں کرتا اور زندگی کی اقدار اور ترجیحات اسلام سے اخذ نہیں کرتا تو اس قسم کے زعم اور گمان کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور اس اقرار کی تکذیب اس کا عمل کر رہا ہے کہ عملاً وہ طاغوتی نظام کو قبول کرتا ہے۔

رسالت کا بنیادی ذریعہ دو چیزوں سے مرکب ہے۔ بشارت و نذارت' نیکوں کے لیے اچھا اجر اور بروں کے لیے برا انجام دکھانا' رسالت کا بنیادی کام ہے۔ اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے اور انسانی نفسیات سے اللہ اچھی طرح باخبر ہے' اس

لیے برے انجام سے ڈرانا اور اچھے انجام کی خوشخبری دینا انسان پر گہرے اثرات چھوڑتا ہے اور اس کے اندر داعیہ عمل پیدا کرتا ہے۔

آخرت کی جواب دہی کا عقیدہ بھی ضروری اور حق ہے اور اس کے نتیجے میں اس زندگی کے بارے میں یہ شعور پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک بامقصد اور حکیمانہ زندگی ہے اور وہ بھلائی جس کی طرف تمام رسول دعوت دیتے چلے آئے ہیں۔ وہ زندگی کا اصل مقصد اور مدعا ہے۔ لہٰذا انسان کو دعوت رسل کے قبول کرنے کا اجر ضرور ملے گا' اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور اگر اس دنیا میں اسے کوئی صلہ نہ ملا تو آخرت میں ضرور ملے گا۔ جہاں اس زندگی کی تکمیل ہوگی۔ وہ لوگ جو اسلامی نظام سے کج روی اختیار کرتے ہیں اور اپنی زندگیوں میں بے راہ روی اختیار کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو عذاب کا مستحق ٹھہراتے ہیں۔ اس تصور کے ساتھ فطرت سلیمہ سیدھی راہ پر چل نکلتی ہے اور وہ بے راہ روی اختیار نہیں کرتی۔ اور اگر وہ کبھی بے راہ روی پر چل نکلے تو توبہ کا دروازہ کھلا ہوتا ہے' اس لیے یہ نہیں ہوتا کہ وہ نافرمانی میں ڈوب ہی جائے۔ توجہ اور رجوع الی اللہ کے نتیجے ہی میں انسان کی زندگی کا سدھار ہے۔ اور زندگی کا رخ خیر اور بھلائی کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔ عقیدۂ آخرت بذات خود آخرت کے اجر کا باعث نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے بلکہ یہ عقیدہ انسان کو اس دنیا میں عمل پر آمادہ کرتا ہے اور اسے صالح اور پاکبازی کی زندگی پر قائم کرتا ہے۔ اور اس طرح انسان وہ زندگی حاصل کر لیتا ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔ یہ طرز زندگی انسان کے لائق ہے اور اسی کے ذریعے انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہو سکتا ہے۔ اسلام نے انسان کو جو تصور دیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے اسے بطور خاص بنایا ہے۔ پھر اس کے اندر اپنی خاص روح پھونکی ہے اور اسے اپنی تمام مخلوقات پر ترجیح دی ہے۔ اور اس طرح اسے حیوانیت کے مقام سے اوپر اٹھایا ہے تاکہ اس کی زندگی کے مقاصد حیوانوں سے بلند ہو سکیں اور اس کے میلانات اور مقاصد محض حیوانی میلانات اور مقاصد سے ذرا برتر ہو جائیں۔

یہ وہ غرض و غایت ہے جس کی وجہ سے اس کتاب محکم میں عقیدۂ توحید' اسلامی نظام کے قیام و اطاعت' عقیدۂ رسالت اور اتباع رسول کے بعد یہ دعوت دی گئی ہے کہ لوگو' شرک سے توبہ کرو اور اللہ کی طرف لوٹ آؤ یہی عمل صالح اور پاکیزہ زندگی کے قیام کی سبیل ہے۔ عمل صالح کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ انسان کوئی اچھا عمل کرے اور بس بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر اس کرۂ ارض پر اصلاح کے ہر مفہوم کے مطابق جدوجہد کی جائے' اس زمین کی آبادی اور تعمیر کے لیے جدوجہد کی جائے۔ اس کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور جب کوئی قوم اصلاح کے اس مقام پر فائز ہو جائے تو پھر اسے یہ انعام دیا جاتا ہے۔

يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُۥ (۱۱ : ۳)

"تو ایک مدت خاص تک تم کو سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا"۔ اس دنیا میں متاع حسن کبھی تو نوعیت کے اعتبار سے ہوتا ہے اور کبھی کمیت کے اعتبار سے۔ اور آخرت میں تو نوعیت اور کمیت دونوں کے اعتبار سے ہوگا اور اس قدر ہوگا جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ البتہ ہم چاہتے ہیں کہ اس دنیا کے متاع حسن پر کچھ بات کریں۔

اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے پاکباز اور نیکوکار اور توبہ و استغفار کرنے والے' اس دنیاوی زندگی میں بڑی تنگی اور ترشی سے جسم اور روح کا رشتہ جوڑے ہوئے ہوتے ہیں' حالانکہ ان آیات میں اللہ کی جانب سے متاع حسن کا صریح وعدہ ہے۔یہ سوال ہم بے شمار لوگوں کی زبان سے سنتے ہیں۔

اس آیت میں جو معنویت پائی جاتی ہے اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم زندگی کو اسکے وسیع تر مفہوم میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ زندگی کے ظاہری حالات سے ہٹ کر اور وسیع اور گہرے مفہوم کے مطابق سمجھنے کی سعی کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ جس سوسائٹی میں بھی ایک صالح نظام رائج کیا جائے' جو ایمان باللہ کی اساس پر تشکیل پایا ہو' جس میں اطاعت و فرمانبرداری صرف اللہ کی ہو' صرف اللہ کو اس میں شارع اور قانون ساز تسلیم کیا گیا ہو' اور اس میں لوگ اچھے اعمال اور کردار کے مالک ہوں' تو لامحالہ وہ سوسائٹی ترقی یافتہ ہو جاتی ہے' اس میں زندگی کی سہولیات وافر ہو جاتی ہیں' اور وہ سوسائٹی عمومی طور پر پاک و صاف زندگی کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ایسی سوسائٹی میں ہر فرد کو اس کی جدوجہد کے مطابق اجرت ملتی ہے۔اس سوسائٹی کے افراد مطمئن ہوتے ہیں اور انہیں خوشحالی نصیب ہو جاتی ہے اور اس کے مقابلے میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی سوسائٹی میں صالح اور پاک طینت لوگ بڑی مشکل سے وقت گزار رہے ہیں اور وہ سازوسامان اور وسائل رزق کے اعتبار سے محروم لوگوں میں شمار ہوتے ہیں تو لازماً صورت حال یہ ہوگی کہ اس سوسائٹی کی عمارت ایمان باللہ پر تعمیر نہ ہوگی اور اس کا نظام عادلانہ نہ ہو گا اور اس پوری سوسائٹی میں کسی بھی شخص کو اس کی جدوجہد کے مطابق معاوضہ نہ ملتا ہو گا۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ صالح اور نیکوکار لوگ اگر مالی وسائل اور رزق کے اعتبار سے تنگ و ترش زندگی بسر کر رہے ہوں بھی' اور ان پر موجود سوسائٹی کی طرف سے مظالم بھی ڈھائے جا رہے ہیں اور ان کا ہر طرف سے پیچھا کیا جا رہا ہو' جیسا کہ مکہ کے مشرکین اس سورت کے نزول کے وقت مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت پر مظالم ڈھا رہے تھے' اور جس طرح ہر جاہلیت اسلام کے علم بردار داعیوں کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی سلوک کرتی رہتی ہے' تب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ اچھی زندگی بسر کر رہے ہیں۔یہ بات محض خیال یا دعویٰ ہی نہیں ہے' کیونکہ تعلق باللہ' اطمینان قلب اور آخرت کی جانب سے اطمینان اور اللہ کے فضل و کرم کی امید بھی درحقیقت بہتر سازوسامان ہے۔اور جن لوگوں کی نظریں حسی اور مادی زندگی سے ذرا اونچی ہوتی ہیں۔یہ روحانی دولت ان کے لیے زیادہ متاع حسن ہوتی ہے۔

ہم یہ بات اس لیے نہیں کہتے کہ جن لوگوں کو ان کی محنت کے مطابق اجرت اور متاع حسن عادلانہ اور منصفانہ طور پر نہیں ملتا وہ متاع حسن کی جدوجہد ترک کر دیں۔کیونکہ اسلام کبھی ظلم پر راضی نہیں ہوتا۔اور اس قسم کے حالات کو دیکھتے ہوئے ایک مومن کبھی خاموش نہیں ہو سکتا' ایک مومن فرد اور ایک مومن جماعت سے اسلام تقاضا کرتا ہے کہ وہ ایسے حالات کو بدلنے کی سعی اور جدوجہد جاری رکھیں تاکہ نیکوکار اور صالح کارکن اپنی محنت کے مطابق متاع حسن حاصل کر سکیں۔بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک صالح فرد کو اپنے حقوق کا احساس کرنا چاہئے اور یہ صورت قبول نہ کرنا چاہئے کہ وہ عمل تو کرتا رہے' محنت کرتا رہے لیکن اسے اس کا بدلہ اور مزدوری نہ ملے۔ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کریں جن میں نیک اور خدا ترس لوگوں کو ان کے پورے پورے حقوق ملیں۔

وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ (۱۱ : ۳) "اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا ہو"۔ بعض مفسرین نے اسے آخرت کے فضل سے مختص کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی دنیا اور آخرت دونوں سے متعلق ہے۔ جس طرح ہم نے المتاع الحسن کی تفسیر کی ہے۔ ہر صاحب فضیلت اپنی فضیلت کا اظہار کرتے ہی جزا پا لیتا ہے۔ اسے نفسیاتی اور شعوری خوشی نصیب ہوتی ہے۔ یہ فضل عملی ہو یا مالی..... اگر فی سبیل اللہ ہو تو اس وقت جزا ملتی ہے۔ اس پر اللہ کی جانب سے جو جزاء ملے گی وہ فضل پر فضل ہو گا اور احسن الجزاء ہو گی۔

وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيرٍ (۱۱ : ۳) "اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔ یہ قیامت کے دن کا عذاب ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد یوم بدر کا عذاب ہے۔ لیکن یہ رائے درست نہیں ہے کیونکہ یوم کبیر کا لفظ اگر مطلقاً بولا جائے تو اس سے مراد قیامت کا دن ہوتا ہے اور اس رائے کو تقویت اگلے فقرے سے ملتی ہے۔

إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ (۱۱ : ۴) "تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے"۔ اگرچہ دنیا و آخرت دونوں میں مرجع اللہ ہے اور ہر لمحہ اور ہر لحظہ انسان اللہ ہی کی طرف لوٹتا ہے۔ لیکن قرآنی تعبیرات کی رو سے مراد اس دنیا کی زندگی کے بعد کی حالت ہے"۔

وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۱۱ : ۴) "اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔ اور یہ فقرہ بھی بتاتا ہے کہ اس یوم کبیر سے مراد یوم القیامت ہے کیونکہ اس میں لوگوں کو دوبارہ اٹھایا جائے گا جسے مشرکین عرب مستبعد سمجھتے تھے، اس لیے کہا گیا کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

---ooo---

اس اعلان کے بعد کہ یہ کتاب ایک فرمان الہی ہے جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ہیں۔ اور ایک دانا اور باخبر خدا کی طرف سے ہیں۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس حقیقت کے باوجود جب ڈرانے والے اور بشارت دینے والے نبی ان کو سناتے ہیں تو ان آیات کے حوالے سے بعض لوگوں کا ردعمل کس قدر غلط ہے۔ قرآن کریم ان کے ردعمل اور ان کی جسمانی حرکت کو یکجا کر کے پیش کرتا ہے کہ یہ لوگ سر جھکا لیتے ہیں اور اپنے سینوں کو ایک طرف موڑ لیتے ہیں تاکہ چھپ جائیں اور پہلوتہی کر جائیں۔ کیا خدا سے یہ چھپ سکتے ہیں۔ ان کی یہ کوشش کس قدر عبث ہے۔ خدا تو اس وقت بھی سب کچھ جانتا ہے جب یہ بزعم خود کپڑے اوڑھ کر چھپے ہوتے ہیں بلکہ اللہ تو اس کرۂ ارض پر ہر چلنے اور رینگنے والی چیز کو بھی جانتا ہے۔ وہ تو لطیف و خبیر ہے۔

أَلَا إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ ۚ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٥﴾

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ۝۶

"دیکھو' یہ لوگ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ اس سے چھپ جائیں - خبردار' جب یہ کپڑوں سے اپنے آپ کو ڈھانپتے ہیں' اللہ ان کے چھپے کو بھی جانتا ہے اور کھلے کو بھی' وہ تو ان بھیدوں سے بھی واقف ہے جو سینوں میں ہیں - زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے' اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے' سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے"-

یہ دو آیتیں وہ منظر پیش کرتی ہیں کہ اگر اسے اچھی طرح ذہن میں لایا جائے اور اس پر غور کیا جائے تو انسان مارے خوف کے کانپ اٹھے - یہ منظر کس قدر خوفناک ہے اور لرزا دینے والا ہے' ذرا سوچو تو سہی کہ بندۂ ضعیف اللہ سے چھپنا چاہتا ہے جبکہ اللہ کا علم اسے گھیرے ہوئے ہے - جب ان کو اللہ کی آیات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ چھپتے ہیں لیکن کب چھپ سکتے ہیں؟

اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۱۱ : ۵) "دیکھو' یہ لوگ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ اس سے چھپ جائیں - خبردار' جب یہ کپڑوں سے اپنے آپ کو ڈھانپتے ہیں' اللہ ان کے چھپے کو بھی جانتا ہے اور کھلے کو بھی' وہ تو ان بھیدوں سے بھی واقف ہے جو سینوں میں ہیں"-

شاید اس آیت میں بعض واقعات کی تصویرکشی کی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو کلام الٰہی سنانا چاہ رہے ہیں اور یہ لوگ روگردانی کر کے اس سے چھپنا چاہتے ہیں اور اپنے سر لٹکائے گزرنا چاہتے ہیں اور اپنی طرف سے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ گویا وہ چھپ گئے ہیں اور انہوں نے نظر بچا کر اپنے آپ کو گزار لیا - ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات انہوں نے ایسی حرکت کی ہو -

ایک مختصر فقرے میں بتا دیا جاتا ہے کہ ان کی یہ حرکت کس قدر بھونڈی ہے - اللہ جس نے یہ آیات نازل کی ہیں' ہر حال میں ان کے ساتھ ہے' یہ ظاہر ہوں یا چھپے ہوں - قرآن کریم ایسے مخصوص انداز میں یہاں ان کی اس حرکت کو ان کی خفیہ ترین حسی صورت کو سامنے لا کر غلط بتاتا ہے کہ جب وہ رات کے وقت اپنے گھروں کے اندر' رات کی تاریکی میں اپنے بستروں پر لیٹے ہوتے ہیں اس وقت بھی اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ نہیں چھپ سکتے - وہ تو حاضر و ناظر اور قاہر ہے - ہر ظاہر اور چھپی بات کو جانتا ہے -

اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ (۱۱ : ۵) "خبردار' جب یہ کپڑوں سے اپنے آپ کو ڈھانپتے ہیں اس وقت اللہ ان کی سری اور علانیہ باتوں سے واقف ہے"- بلکہ اللہ اس سے بھی زیادہ خفی باتوں سے واقف ہے - ان کے پردے علم الٰہی کے سامنے کیا رکاوٹ بنیں گے؟ البتہ ایسے حالات میں صرف انسان خود یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اکیلا ہے اور اسے کوئی نہیں دیکھ رہا ہوتا - یہ انداز تعبیر انسان کے وجدان کو چھوتا ہے'

اسے جگاتا ہے اور اسے جھنجوڑتا ہے کہ وہ ذات باری کے بارے میں ذرا غور کرے اور سمجھے کہ ایک آنکھ ہر وقت اسے دیکھتی رہتی ہے۔

اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۱۱ : ۵) "وہ تو ان بھیدوں سے بھی واقف ہے جو سینوں میں ہیں"۔ جو راز دلوں میں چھپے ہیں ان کا بھی اسے علم ہے۔ حالانکہ یہ راز ابھی دل میں ہوتے ہیں اور دل کے ساتھ اس طرح جڑے ہوتے ہیں۔ جس طرح مالک اپنی ملک سے جڑا ہوتا ہے یا دوست ' دوست کے ساتھ۔ یعنی انتہائی رازداری کی وجہ سے ان کو ذات الصدور کہا گیا۔ جب اللہ ایسے دلی بھیدوں سے بھی واقف ہے' تو پھر اور کیا ہے جو اس سے مخفی رہ سکتا ہے۔ غرض انسان کی کوئی حرکت اور اس کا کوئی سکون اس سے مخفی نہیں رہ سکتا۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۱۱ : ٦) "زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے' اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے' سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے"۔

اللہ کے علم محیط کی یہ ایک دوسری شکل ہے۔ نہایت ہولناک' ذرا زمین پر چلنے والے حیوانات اور رینگنے والے کپڑے مکوڑوں پر غور کریں' ہر وہ چیز جو زمین پر حرکت کرتی ہے وہ دابہ ہے۔

زمین پر حرکت کرنے والے لاتعداد اور بے شمار دواب (جانداروں) میں سے جو کچھ بھی ہے' زمین کے اطراف و اکناف میں سے جہاں بھی ہے' اوپر ہے یا اندر ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہے۔ صرف علم بھی نہیں بلکہ اللہ ان کو رزق بھی فراہم کرتا ہے اور اللہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ کہاں قرار و سکون حاصل کرتے ہیں اور کہاں سونپے جاتے ہیں۔ بلکہ یہ سب دواب اللہ کے علم محیط کے ضبط اور کنٹرول میں ہیں۔

یہ اللہ کے علم الہی کی نہایت ہی واضح مثال ہے۔ یہ علم ہر وقت مخلوقات کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔ جب انسان اس وسیع علم کے بارے مین سوچتا ہے اور اسے اپنے محدود تصور میں لانا چاہتا ہے تو وہ کانپ اٹھتا ہے اور اس کے تصور ہی سے عاجز آجاتا ہے۔

اب صرف علم کی بات نہیں ہے۔ دواب ارض کی اس ناقابل تصور تعداد کے ہر فرد کے لیے اللہ نے رزق کی کفالت بھی اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ اس زمین میں ہر مخلوق کے لیے وسائل رزق پیدا کیے ہیں اور ہر چیز کو یہ قوت دی کہ وہ بقدر ضرورت رزق حاصل کرے۔ بعض کا رزق بہت سادہ ہے۔ بعض اپنے لیے رزق پیدا کرتے ہیں' بعض مصنوعات اور مرکبات اپنے لیے تیار کرتے ہیں اور اب دور جدید میں تو ذرائع رزق بہت ہی پھیلے ہوئے اور متنوع ہیں۔ بعض مخلوق ایسی ہے کہ وہ زندہ مخلوق کے خون پر پلتی ہے مثلاً مچھر اور پسو وغیرہ۔

اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح پیدا کیا اور جس طرح اس کے اوپر ہیں نے متنوع مخلوقات کو وجود بخشا' اسی طرح ان کے وسائل رزق بھی مہیا کیے۔ اور ہر ایک مخلوق کو اس کی تکنیک تخلیق کے مطابق استعداد اور وسائل بھی فراہم کیے۔

خصوصاً دواب ارض میں سے انسان ہماری توجہ اور مطالعہ کا زیادہ مستحق ہے جو خَلِيفَةُ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ ہے۔ جسے تحلیل و تجزیہ اور ترکیب اور صنعت کی استعداد بھی دی گئی ہے۔ وہ ترقی اور پیداوار میں بھی آگے جا سکتا ہے۔ وہ اس کرۂ ارض کے چہرے کو بھی بدل سکتا ہے۔ زندگی کے رنگ ڈھنگ بدلتا رہتا ہے۔ وہ اپنے لیے متنوع وسائل رزق مہیا کرتا ہے لیکن وہ کسی چیز کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ اللہ نے اس زمین کے اندر جو وسائل ودیعت کر دیئے صرف انہی میں رد و بدل کرتا ہے اور یہ رد و بدل اور تحلیل و ترکیب بھی وہ ان قوانین فطرت کے مطابق کرتا ہے جو اللہ نے اس کائنات کے اندر وضع کیے ہیں۔ اس طرح یہ زمین اپنے زندہ دواب کے لیے ہر قسم کی ضروریات فراہم کرتی ہے۔

اللہ کے ذمے رزق ہے' اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سعی کے بغیر کسی کو کوئی رزق مل سکتا ہے یا اگر کوئی بیٹھ جائے تو بھی اسے ضرور ملے گا یا سستی اور منفی رویے سے وہ ضائع نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے غلط طور پر سمجھا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اسباب اور وسائل اللہ نے کیوں مقرر فرمائے۔ اور یہ کیوں لازم کیا کہ اسباب کو اختیار کیا جائے اور اسباب وسائل کو قوانین قدرت کا حصہ پھر کیوں بنایا اور پھر اللہ نے اپنی مخلوقات میں سے مختلف لوگوں کو مختلف صلاحیتیں کیوں دیں اور ان وسائل و اسباب کے کام میں لانے کے سوا دنیا کی تعمیر و ترقی کیسے ممکن ہو گئی حالانکہ یہ سب کچھ اللہ کے علم میں تھا اور اللہ نے اس غرض کے لیے انسان کو اس کرۂ ارض پر خلیفہ بنایا تاکہ وہ اپنا کردار ادا کرے۔

ہر مخلوق کے لیے رزق مقرر ہے' یہ حق ہے۔ لیکن یہ رزق اس کائنات کے اندر ودیعت شدہ ہے اور اللہ کی سنت کے مطابق ہر مخلوق کے لیے مقدر اور متعین ہے۔ اور سنت الٰہی یہ ہے کہ ہر شخص اپنے مقدر کے لیے جدوجہد کرے گا۔ لہٰذا سعی و جدوجہد کو کوئی شخص ترک نہ کرے جبکہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ آسمانوں سے سونے اور چاندی کی بارش نہیں ہوا کرتی بلکہ پانی کی بارش ہوتی ہے اور ہر قسم کا رزق زمین کے اندر پوشیدہ ہے۔ اور تمام مخلوقات کے لیے یہ کافی ہے۔ بشرطیکہ یہ مخلوق خدا سنن الٰہیہ کے مطابق اس کی تلاش کرے اور سنن الٰہیہ کسی کی رو رعایت نہیں کرتیں۔

دنیا میں معاملہ کسب اور عمل پر ہے۔ کسب و عمل یا طیب ہو گا یا خبیث اور گندہ ہو گا۔ دونوں کے لیے جدوجہد ضروری ہے۔ دونوں کی نوعیت میں فرق ہے اور نتائج جدا جدا ہیں۔ حلال' حلال ہے اور حرام' حرام ہے۔

یہاں دواب کے لیے لفظ رزق کا لفظ استعمال ہوا ہے جبکہ اس سے قبل مومنین کے لیے رزق حسن کہا گیا ہے۔ انسانوں اور حیوانوں کے لیے سیاق میں بہترین الفاظ کا انتخاب کرنا قرآن مجید کا ایک خاص اسلوب ہے۔ الفاظ کا انتخاب موقعہ و محل اور ماحول کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ دو آیات اس رب کی تعریف اور شان کے بیان کا آغاز ہیں جس کے بارے میں حکم دیا گیا ہے کہ لوگ صرف اس کی بندگی اور غلامی کریں۔ کیونکہ وہی عالم ہے' محیط ہے' رزاق ہے' کوئی شخص اس کی ریاست میں بھوکا نہیں رہتا اور یہ تعریف باری تعالیٰ اور یہ حمد ربی ضروری ہے تاکہ بندے اور مخلوق اور خالق کے درمیان حقیقی تعلق پیدا ہو اور لوگ صحیح طرح علی وجہ البصیرت رب اور خالق کی اطاعت اور بندگی کریں۔

---ooo---

اب اس سے آگے رب کریم کی شان کا ایک دوسرا رخ پیش کیا جاتا ہے۔ رب کریم کی قدرت کے بعض آثار اور مظاہر پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کی حکمت اور کارگریوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ دیکھو' اللہ نے زمین اور آسمانوں کو

کس قدر حکیمانہ انداز دیا ہے۔ یہاں اس کائنات کے ان پہلوؤں کو سامنے لایا جاتا ہے جو عمل، حساب و کتاب، اور بعث بعد الموت کے عقائد کے ساتھ متناسب ہوں بلکہ یہ تصور دیتے ہوں:

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَّ كَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۗ وَلَئِنْ قُلْتَ إِنَّكُمْ مَّبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝

"اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا--- جب کہ اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا--- تاکہ تم کو آزما کر دیکھے تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ اب اگر اے نبیؐ، تم کہتے ہو کہ لوگو، مرنے کے بعد تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے، تو منکرین فوراً بول اٹھتے ہیں کہ یہ تو صریح جادوگری ہے"۔

اللہ نے زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کیا، اس موضوع پر ہم سورت یونس میں بات کر آئے ہیں۔ وہاں یہ بات سیاق و سباق میں آئی تھی۔ وہ یہ تھا کہ اس کائنات کے قوانین فطرت جن کے مطابق زمین و آسمان چلتے ہیں اور اس نظام کے درمیان جن کے مطابق لوگوں کی زندگی چلتی ہے، ربط اور مطابقت ہے۔

لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (۱۱ : ۷) "تاکہ تم کو آزما کر دیکھے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔ یہاں جو نئی بات ہے وہ یہ ہے، خلق آسمان و زمین کے بیان کے بعد ایک جملہ معترضہ ہے

وَّ كَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ (۱۱ : ۷) "جبکہ اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا"۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق کے عمل میں وہ جس طرح کہ موجودہ شکل میں ہیں اس تک پہنچنے سے پہلے یہاں پانی تھا اور اللہ کا عرش پانی پر تھا"۔

یہ پانی کیسے تھا، یہ پانی کہاں تھا اور اس کی حالت کیا تھی، اور اس کے بعد عرش الٰہی کس طرح تھا، اس آیت میں ان امور کی کوئی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں۔ جن مفسرین کو اپنے مبلغ علم کی حدود کا علم ہے، وہ اس سے زیادہ بہرحال کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ غیبی امور ہیں اور ان کے بارے میں اللہ نے ہمیں فقط یہی معلومات دی ہیں جو اس آیت میں ہیں اور محدود ہیں۔

ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ ہم قرآنی نصوص کی تائید میں سائنسی نظریات پیش کریں۔ خواہ کوئی نص کسی سائنسی نظریے کے ساتھ منطبق کیوں نہ ہو اس لیے کہ سائنسی نظریات بار بار بدلتے ہیں بلکہ الٹتے رہتے ہیں۔ علماء طبیعیات جب کوئی نظریہ پیش کرتے اور سائنسی تجربات کر کے اسے ثابت کرتے ہیں تو وہ اس جدید نظریے کو سابقہ نظریات کے مقابلے میں تکوینی مظاہر سے زیادہ قریب پاتے ہیں جبکہ نص قرآنی بذات خود صادق اور حق ہے۔ چاہے سائنس اس حق اور حقیقت تک پہنچ سکی ہو یا نہیں۔ پھر سائنسی حقیقت اور سائنسی نظریات کے درمیان فرق بھی ہے۔ سائنسی حقیقت وہ ہوتی ہے جو تجربے میں آ جائے۔ اگرچہ تجربات بھی ہمیشہ احتمالی رہتے ہیں، قطعی نہیں ہوتے۔ رہے سائنسی نظریات تو وہ مفروضوں پر مبنی ہوتے ہیں اور یہ

مفروضے بعض کائناتی مظاہر یا چند مظاہر کے مجموعے کی بنا پر قائم کیے جاتے ہیں اور ان میں ہر وقت تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اس لیے نہ ہم ان نظریات سے قرآن کی تائید کر سکتے ہیں اور نہ ان نظریات پر قرآن سے استدلال کر سکتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کا طریقہ کار اور ہے اور سائنس کا اور۔ اس طرح قرآن اور سائنس کے موضوعات کار بھی مختلف ہیں۔

ہمارے دور میں قرآن کریم میں بعض سائنسی نظریات پیش کیے جاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ طرز فکر نصوص قرآن پر ہمارے ایمان کے منافی ہے۔ قرآن کریم حکیم اور خبیر کی طرف سے ہے' یہ غلطی اس لیے کی جاتی ہے کہ ہم سائنس کو اپنے دائرہ کار کے اندر محدود نہیں رکھتے۔ اور اسے اپنے دائرے سے وسعت دیتے ہیں۔ یہ دراصل ہماری اخلاقی اور ذہنی شکست خوردگی ہے' جبکہ ایسا کرنے والے لوگ اپنے اس فعل کو خدمت قرآن سمجھتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے ایمان کو ثابت کرتے ہیں۔ وہ ایمان جسے سائنس کے کسی اصول سے ثابت کیا جاتا ہے' میں یہ کہوں گا کہ ایسے ایمان پر نظرثانی کی ضرورت ہے۔ یہ محل نظر ہے۔ قرآن کریم اصل الاصول ہے اور سائنسی نظریات اس کے موافق ہوں یا مخالف' قرآن کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ رہے وہ سائنسی حقائق جو تجربات سے ثابت ہیں تو ان کے دائرہ کار اور قرآن کے دائرۂ کار میں فرق ہے۔ دونوں موضوعات ہی مختلف ہیں۔ قرآن کریم نے سائنسی حقائق کے دریافت کے کام کو عقل انسانی کے لیے چھوڑ دیا ہے اور اسے مکمل آزادی دی ہے کہ وہ اس میدان میں کام کرے اور تجربے کر کے جن نتائج تک پہنچ جا سکتا ہو' پہنچا جائے۔ قرآن کریم نے اپنے ذمے صرف یہ ڈیوٹی لی ہے کہ عقل انسانی کی تربیت صحیح سلامت اور مستقیم انداز میں کرے۔ اور اسے وہم و خرافات اور دیومالائی سوچ سے باہر نکالے۔ اس طرح قرآن نے اپنے ذمہ یہ کام لیا ہے کہ انسانی زندگی کے درست چلن کے لیے ایک نظام تجویز کرے جس کے دائرے کے اندر عقل انسانی بھی درست راہ پر آگے بڑھے اور آزاد ہو کر امن و سلامتی کے ساتھ رہے اور اپنے محدود اور مخصوص دائرے میں کام کرے تاکہ اصول کی روشنی میں جزوی حقائق دریافت کرے۔ قرآن کریم نے سائنسی حقائق کا تذکرہ شاذ و نادر ہی کیا ہے مثلاً یہ کہ تمام جاندار پانی سے زندہ ہیں اور پانی ان کی زندگی کا اہم عنصر ہے۔ مثلاً تمام زندہ جانور اور نباتات جوڑے جوڑے پیدا ہوئے ہیں۔ اور جوڑوں کے ملاپ سے زندگی انسانی' حیوانی اور نباتاتی اشکال میں نشوونما پاتی ہے۔ یہ وہ بعض حقائق ہیں جن کا قرآن نے تذکرہ کیا ہے۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے پارۂ دوم اور پارۂ ہفتم)

اس جملہ معترضہ کے بعد ہم دوبارہ قرآنی آیات کی طرف آتے ہیں :

وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ( ۱۱ : ۷ ) "اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا --- جب کہ اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا --- تاکہ تم کو آزما کر دیکھے تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔

آسمان اور زمین کو چھ دنوں کے اندر پیدا کیا۔ اس کے بعد کئی فقرے اور جملے محذوف ہیں۔ ان پر بعد کی عبارت دلالت کرتی ہے یعنی اس عرصے میں اسے پیدا کر کے انسان کی رہائش کے لیے اسے صالح اور کار آمد بنایا گیا۔ زمین میں سب چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کیا اور آسمانوں میں وہ انتظام کیا تاکہ تم یہاں زندہ رہ سکو اور اللہ کی ذات اس پوری کائنات پر حاوی ہے۔

لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ( ۱۱ : ۷ ) "تاکہ تم کو آزماکر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پوری کائنات کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں اس کی کنجیاں اور کنٹرول ہے اور یہ سب انتظام انسان کی آزمائش کے لیے ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہ آزمائش ایک اہم معاملہ ہے' اور یہ محض کھیل تماشا نہیں ہے بلکہ ایک بامقصد اور سنجیدہ اسکیم ہے۔اور انسان کی تخلیق ایک بامقصد منصوبے کے تحت ہوئی ہے۔

جس طرح اللہ نے زمین و آسمان کو اس طرح تیار کیا ہے کہ وہ جنس انسان کے لیے مد و معاون ہوں' اسی طرح جنس انسان کو بھی ایک مخصوص اور عجیب صلاحیت اور قوت دی ہے۔انسان کی تخلیق بھی اسی قانون فطرت کے مطابق ہوئی ہے' جس کے مطابق اس کائنات کی تخلیق ہوئی ہے۔لیکن انسان کے اس تکوینی پہلو کے علاوہ اسے ایک صلاحیت اختیار و ارادے کی بھی دی ہے۔اس اختیاری صلاحیت کی وجہ سے وہ کبھی راہ ہدایت اختیار کرتا ہے اور اللہ اس کے ساتھ معاونت کرتا ہے اور اسے ہدایت مل جاتی ہے اور کبھی وہ راہ ضلالت اختیار کرتا ہے اور اللہ بھی اسے ڈھیل دیتا ہے۔اور ایسے لوگوں کو چھوڑتا ہے تاکہ وہ عمل کریں اور یہ اس کی جانب سے ایک آزمائش ہے کہ کون اچھی راہ لیتا ہے اور کون بری۔اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو آزماتا اور ڈھیل دیتا ہے۔اس لیے نہیں کہ اللہ علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔وہ تو پہلے سے جانتا ہے۔آزمائش اور عمل کے ذریعے دراصل لوگوں کے خفیہ اعمال لوگوں پر ظاہر ہو جاتے ہیں اور پھر وہ ان اعمال پر جزا پاتے ہیں۔اور اس طرح اللہ نے یہ اسکیم تیار فرمائی۔

اس لیے بعث بعد الموت اور جزاء و سزا کے عمل کا سرانجام پانے سے انکار اس فضا میں عجیب ہی لگتا ہے۔کیونکہ قانون مکافات عمل ایک تکوینی قانون ہے۔اور یہ اس کائنات کے اصول میں سے ایک مستقل اور بنیادی اصول ہے۔اور جو لوگ اس اصول کی تکذیب کرتے ہیں' معلوم ہوتا ہے کہ ان کا رویہ معقول رویہ نہیں ہے۔اور ایسے لوگ اس کائنات کے عظیم اصولوں کے ادراک سے محروم ہیں۔اپنی اس ناقص سوچ ہی کی وجہ سے وہ تعجب کرتے ہیں کہ انسان پھر اٹھے گا' یہ ایک عجیب بات ہوگی:

وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ( ۱۱ : ۷ ) "اب اگر اے نبی' تم کہتے ہو کہ لوگو' مرنے کے بعد تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے' تو منکرین فوراً بول اٹھتے ہیں کہ یہ تو صریح جادوگری ہے"۔

بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ بعث بعد الموت کو عجیب سمجھنے والوں کا یہ قول عجیب و غریب ہے اور مذکورہ بالا واقعات کی روشنی میں اس سے زیادہ جھوٹ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

---

وہ جس طرح بعث بعد الموت کی تکذیب کرتے ہیں اور اس کائنات کے اٹل اصولوں کی روشنی میں نہیں سمجھتے' اسی طرح دنیاوی عذاب الٰہی اور تکوینی باحکمت آفرینیوں کو بھی سمجھ نہیں پا رہے۔وہ یہ پوچھتے ہیں کہ ان پر پھر عذاب الٰہی نازل کیوں نہیں ہوتا؟ حالانکہ اس میں تاخیر بھی بوجہ حکمت ہے۔اللہ ہر کسی کو مہلت دیتا ہے۔

وَ لَئِنۡ اَخَّرۡنَا عَنۡهُمُ الۡعَذَابَ اِلٰۤی اُمَّةٍ مَّعۡدُوۡدَةٍ لَّيَقُوۡلُنَّ مَا
يَحۡبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوۡمَ يَاۡتِيۡهِمۡ لَيۡسَ مَصۡرُوۡفًا عَنۡهُمۡ وَ حَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ
۸ع يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۝

"اور اگر ہم ایک خاص مدت تک ان کی سزا کو ٹالتے ہیں تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ آخر کس چیز نے اسے روک رکھا ہے؟ سنو! جس روز اس سزا کا وقت آ گیا تو وہ کسی کے پھیرے نہ پھر سکے گا اور وہی چیز ان کو آگھیرے گی جس کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں"۔

قرون اولیٰ کی اقوام پر ایسے ایسے عذاب نازل ہوئے' جن کی وجہ سے ان اقوام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا گیا لیکن تباہ اور فنا کر دینے والے یہ عذاب اس وقت آئے جب رسول اپنی قوم کے سامنے معجزات پیش کر چکے اور انہوں نے معجزات کے باوجود تکذیب جاری رکھی۔ یہ ہمہ گیر تباہی اس لیے آتی رہی کہ اس وقت کی رسالتیں وقتی رسالتیں تھیں' ایک محدود پیریڈ کے لیے تھیں اور بسا اوقات وہ ایک نسل کے لیے تھیں اور ان معجزات کا مشاہدہ بھی وہی لوگ کر سکتے تھے جو موجود تھے۔ یہ معجزات مسلسل اور جاری اور باقی نہ ہوتے تھے تاکہ بعد میں آنے والی نسلیں بھی انہیں دیکھ سکیں جیسا کہ پہلی نسل نے دیکھا تھا۔

رسالت محمدی ؐ کی نوعیت سابقہ رسالتوں سے ذرا مختلف ہے۔ آپ خاتم الرسل ہیں۔ تمام نسلوں کے لیے رسول ہیں اور آپ ؐ کو جو معجزہ دیا گیا وہ مادی معجزہ نہیں ہے۔ یہ ایسا معجزہ ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ آنے والی نسلیں بھی اسے دیکھ سکتی ہیں اور اس پر تدبر کر سکتی ہیں اور نسلاً بعد نسل اس پر ایمان لا سکتی ہیں۔ اس لیے اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ آپ کی امت پر ایسا عذاب نازل نہ ہو جس کے ذریعے اسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے بلکہ یہ عذاب افراد پر نازل ہو اور یہی صورت اللہ نے ان اقوام کے لیے اختیار کی جن کو کتاب دی گئی تھی۔ کسی کتابی قوم کو جڑ سے اکھاڑ کر نہیں پھینکا گیا۔

لیکن مشرکین مکہ کی حالت یہ تھی کہ وہ نہ تو اس کائنات کے نظام تخلیق اور اس کے لیے اللہ کے تجویز کردہ قانون قدرت کو سمجھتے تھے اور یہ بات سمجھتے تھے کہ اس کائنات کے اندر اللہ نے انسان کو آزادی اور اختیار کے ساتھ کام کرنے کے مواقع فراہم کیے ہیں اور اسے نیک و بد اختیار کرنے کی آزادی ہے اور زمین کی تخلیق اس طرح ہے کہ وہ انسان کی آزادی و ارادہ کے لیے مواقع فراہم کرتی ہے۔ اپنے اس جہل کی وجہ سے وہ بعث بعد الموت کا انکار کرتے تھے اور اپنی اس جہالت ہی کی وجہ سے وہ پوچھتے تھے کہ اللہ نے ان کی تکذیب اور انکار کے باوجود ابھی تک انہیں ہلاک کیوں نہیں کیا۔ وہ نہ جانتے تھے کہ موجودہ رسالت اور سابقہ رسالتوں کے لیے اللہ نے کیا اصول طے کر رکھے ہیں۔ چنانچہ وہ پوچھتے تھے کہ کئی سال گزر گئے اور عذاب نہیں آ رہا ہے۔ یہ لوگ نہ تو اللہ کی حکمت سے واقف تھے اور نہ ہی اللہ کی رحمت سے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ جب یہ عذاب آئے گا تو اسے پھر کوئی بھی پھیر نہ سکے گا بلکہ وہ پوری طرح انہیں گھیر لے گا اور یہ ان کے استہزاء اور بد عملی کی سزا ہو گی' اور وہ نہایت ہی خود سری کی صورت میں سوالات کر رہے تھے۔

اَلَا یَوْمَ یَاْتِیْهِمْ لَیْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ

( ۱۱ : ۸ ) ''سنو جس روز اس سزا کا وقت آگیا تو وہ کسی کے پھیرے سے نہ پھر سکے گا اور وہی چیز ان کو آگھیرے گی جس کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں''۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی سنجیدہ فرد اور صاحب ایمان شخص عذاب الہٰی کے نزول کے مطالبے میں جلدی نہیں کرتا۔ اگر عذاب الہٰی نہیں آتا تو اس میں بھی کوئی حکمت ہوگی اور اللہ کی رحمت اس میں مانع ہوگی تاکہ جو لوگ ایمان کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ ایمان لے آئیں۔

مثلاً قریش پر اللہ نے عذاب نازل کرنے میں جلدی نہیں کی۔ ان کو مہلت دی جاتی رہی۔ اس عرصے میں بے شمار لوگ ایمان لائے۔ ایمان لا کر پھر انہوں نے اسلام کے لئے کار ہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ اور کفار کے ہاں بھی کئی ایسے بچے پیدا ہوئے جنہوں نے بعد کے ادوار میں اسلام کی خدمات سرانجام دیں۔ یہ اور ایسی ہی دیگر معلوم اور نامعلوم حکمتیں ہو سکتی ہیں' جو جلد باز لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔

---ooo---

یہ لوگ مطالبہ نزول عذاب میں بے صبری کا مظاہرہ کر رہے ہیں' انسانی مزاج کے اس پہلو پر یہاں مزید روشنی ڈالی جارہی ہے کہ انسان کسی حالت پر بھی ثابت قدم اور صحیح رائے قائم کرنے میں صحیح الفکر نہیں ہوتا۔ اس کی نفسیات یہ ہیں :

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَیَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ﴿۹﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَیَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّیِّاٰتُ عَنِّیْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿۱۰﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِیْرٌ ﴿۱۱﴾

''اگر کبھی ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازنے کے بعد پھر اس سے محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس ہوتا ہے اور ناشکری کرنے لگتا ہے۔ اور اگر اس مصیبت کے بعد جو اس پر آئی تھی' ہم اسے نعمت کا مزا چکھاتے ہیں تو کہتا ہے میرے تو سارے دلدر پار ہو گئے' پھر وہ پھولا نہیں سماتا اور اکڑنے لگتا ہے۔ اس عیب سے پاک اگر کوئی ہیں تو بس وہ لوگ جو صبر کرنے والے اور نیکو کار ہیں اور وہی ہیں جن کے لیے درگزر بھی ہے اور بڑا اجر بھی''۔

انسان فطرتاً جلد باز اور پر تقصیرات ہے اور ان آیات میں اس کی کیا ہی اچھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ وہ اس قدر کوتاہ نظر ہے کہ صرف حاضر حالات ہی کو دیکھ سکتا ہے اور اپنے اوپر وہی حالات طاری کر دیتا ہے جو اس کے ماحول پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ نہ ماضی پر غور کرنے کی تکلیف کرتا ہے اور نہ مستقبل کی فکر کرتا ہے۔ کبھی وہ اس قدر مایوس ہو جاتا ہے کہ اسے کسی بھلائی کی اور اچھے حالات کی امید نہیں رہتی۔ اور اگر اچھے دن گزرتے ہیں تو وہ تمام گزشتہ نعمتوں کا انکار کر دیتا ہے۔ حالانکہ یہ تو اللہ کی جانب سے ایک انعام و اکرام تھا۔ اس کا کوئی استحقاق نہ تھا اور مشکلات کے بعد اگر اس کے اچھے دن آجائیں تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے' غرور کرتا ہے۔ نہ وہ مشکلات برداشت کر کے اللہ کے رحم و کرم کا امیدوار ہوتا ہے اور

نہ اپنی خوشی میں اعتدال اختیار کرتا ہے اور خوشیوں اور نعمتوں کے زوال کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتا ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّلِحَتِ أُولَئِكَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ

(۱۱:۱۱) "اس عیب سے پاک اگر کوئی ہیں تو بس وہ لوگ جو صبر کرنے والے اور نیکوکار ہیں اور وہی ہیں جن کے لیے درگزر بھی ہے اور بڑا اجر بھی"۔ یعنی انہوں نے انعامات و اکرامات پر بھی صبر کیا اور مشکلات پر بھی صبر کیا۔ مشکلات میں تو بیشتر لوگ صبر کرتے ہیں اپنی خودداری اور سفید پوشی کی وجہ سے اور اس لیے کہ ان کی کمزوری اور مشکلات کا لوگوں کو پتہ نہ لگ جائے۔ لیکن کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خوشحالی اور مالداری میں اپنے آپ کو سنبھال سکتے ہیں اور غرور اور سرکشی سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں۔ تاہم جو لوگ اچھی روش بحال رکھتے ہیں' مشکلات میں بھی اور خوشحالی میں بھی اچھے کام کرتے ہیں اور نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں یعنی وعملوا الصّلحٰت کے پیکر ہوتے ہیں ان کے تعلق ارشاد ہے۔

أُولَئِكَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ (۱۱:۱۱) "وہی لوگ ہیں جن کے لیے درگزر بھی ہے اور بڑا اجر بھی"۔ اس لیے کہ انہوں نے مشکلات میں صبر کیا اور خوشحالی میں انہوں نے سنجیدگی اور اعتدال سے کام لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک سنجیدہ اور مخلص اور سچا ایمان ہی انسان کو نہایت ہی مشکل حالات میں کافرانہ مایوسی سے بچاتا ہے۔ اسی طرح سچا ایمان باللہ ہی انسان کو اس کی خوشحالی اور فراوانی میں کبر و غرور سے بچاتا ہے۔ غرض قلب انسانی کو یہ سچا ایمان ہی اچھے اور برے دونوں حالات میں متوازن اور مستقیم رکھتا ہے۔ اور قلب مومن اچھی طرح بندھا ہوا ہوتا ہے۔ مشکلات و مصائب میں ڈانواں ڈول نہیں ہوتا اور خوشحالی اور مالداری میں پھولتا نہیں اور یوں اہل ایمان کی دونوں حالات اچھے رہتے ہیں اور اہم مقام صرف مومنین کو ملتا ہے جس طرح حضورؐ نے فرمایا۔

---

اللہ کی مخلوقات میں سے جو لوگ سنن الہیہ سے واقف نہیں ہوتے' اللہ کی حکمت تخلیق سے وہ بے بہرہ ہوتے ہیں۔ وہ کم فہم' غافل' مایوس' متکبر اور جھوٹی باتوں پر فخر کرنے والے ہوتے ہیں جن کو معلوم نہیں ہے کہ رسولوں کے بھیجنے کی حکمت کیا ہوتی ہے اور پھر یہ کہ رسول انسانوں میں سے کیوں بھیجے گئے ہیں اس قسم کے لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ خود رسول فرشتہ کیوں نہیں ہے یا اس کے ساتھ فرشتہ مامور کیوں نہیں ہے؟ یہ لوگ رسول اور رسالت کے مقام سے اس قدر بے خبر ہوتے ہیں کہ رسول کے لیے مالدار ہونا ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہ لوگ جھوٹے عقائد میں گم رہتے ہیں اور یہ لوگ تکذیب کے لیے اس قسم کے بھونڈے جواز تلاش کرتے ہیں۔ لہٰذا آپ متاثر نہ ہوں۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَى إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ صَدْرُكَ أَن يَقُولُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ كَنزٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ إِنَّمَا أَنتَ نَذِيرٌ وَاللَّهُ

عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ﴿۱۲﴾

"تو اے پیغمبرؐ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان چیزوں میں سے کسی چیز کو (بیان کرنے سے) چھوڑ دو جو تمہاری طرف وحی کی جارہی ہیں اور اس بات پر دل تنگ ہو کر وہ کہیں گے "اس شخص پر کوئی خزانہ کیوں نہ اتار اگیا؟" یا یہ کہ "اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا؟" تم تو محض خبردار کرنے والے ہو' آگے ہر چیز کا حوالہ دار اللہ ہے"۔

لعل کا مفہوم یہاں استفہامی ہے۔ اگرچہ خالص استفہامی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نفس انسانی سے شاید متوقع یہی ہے کہ ایسے حالات مین وہ تنگ دل ہو جائے اور اس کام ہی کو چھوڑ دے۔ کیونکہ لوگ جہالت اور عناد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اور اس قسم کی بوگس اور لایعنی تجاویز پیش کر رہے ہیں' جن کارسالت کے مزاج اور اس کی نوعیت اور منصب کے ساتھ کوئی ہم آہنگی نہیں ہے اللہ تعالیٰ اس صورت حالات کے بارے میں ایک متبادل اور ناقابل عمل صورت پیش کر کے سوال کرتا ہے کہ حالات گو برے ہیں لیکن آپ ان میں کیا اپنی دعوت اور ما انزل اللہ کا کچھ حصہ چھوڑ سکتے ہیں' شاید کہ وہ اس جاہلیت اور بغض و عناد کا مظاہرہ نہ کریں؟..... ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ آپ ان باتوں کو تو چھوڑ نہیں سکتے۔

اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِیْرٌ (۱۱ : ۱۲) " آپ تو خبردار کرنے والے ہیں"۔ آپ کے فرائض تو یہی ہیں کہ آپ پورا پورا پیغام پہنچا کر لوگوں کو ڈرائیں۔ اور ڈرانا اس لیے ضروری ہے کہ وہ لوگ ایسا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں کہ انہیں ڈرانا ضروری ہے۔ لہٰذا آپ اپنے فرائض سرانجام دیتے چلے جائیں۔

وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ (۱۱ : ۱۲) "آگے ہر چیز کا حوالہ دار اللہ ہے"۔ اللہ ہی ان سب کا ذمہ دار ہے اور وہ اپنی سنت کے مطابق جس طرح چاہے گا' انہیں پھیر دے گا۔ اور اس کے بعد جو کچھ وہ کمائیں گے اس کی جزاء و سزا دے گا۔ آپ ان کے ذمہ دار یا حوالہ دار نہیں ہیں۔ نہ آپ ان کے کفر کے ذمہ دار ہیں اور نہ ایمان کے۔ آپ تو فقط نذیر ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں اسلامی تحریک کس قدر مشکل حالات سے گزر رہی تھی اور اس دور میں آپ کے دل پر کس قدر بوجھ تھا۔ خصوصاً جبکہ تحریک کے حامی اور مددگار اور خاندانی معاون فوت ہوگئے تھے۔ حضورؐ کے دل پر پریشانی کا غلبہ تھا۔ اور مسلمانوں کی قلیل تعداد مشکلات میں گھری ہوئی تھی اور ہر طرف مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

اس آیت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ کس قدر مشکل حالات تھے اور ان حالات میں حضور اکرمؐ کو اللہ کی جانب سے کس قدر تسلی اور اطمینان دلایا جارہا تھا اور آپ کے اعصاب کو کس قدر سکون اور تازگی عطا ہو رہی تھی۔

ایک دوسری بات جسے وہ بار بار دہراتے چلے جاتے تھے' یہ کہ حضور نبی کریمؐ اس کتاب کو اپنی جانب سے پیش کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تم اس جیسی دس سورتیں تو بنا لاؤ اور اس مہم میں پورے جہاں سے مدد بھی لے لو۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ

وَّ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾

''کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ کہو ''اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بنالاؤ اور اللہ کے سوا اور جو جو (تمہارے معبود) ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لو اگر تم (انہیں معبود سمجھنے میں) سچے ہو''۔

اس سے قبل سورت یونس مین ان کو چیلنج دیا گیا تھا کہ وہ لوگ اس قسم کی ایک سورت ہی لے آئیں۔ تو سوال یہ ہے کہ اس کے بعد دس سورتوں کا چیلنج کیوں دیا گیا؟

قدماء مفسرین نے کہا ہے یہ چیلنج علی الترتیب تھا۔ پہلے یہ تھا کہ اس قرآن جیسا قرآن لاؤ' پھر دس سورتوں کا چیلنج تھا' آخر میں ایک سورت کا چیلنج دیا گیا۔ لیکن چیلنج کی اس مخصوص ترتیب پر کوئی معقول دلیل نہیں ہے۔ بظاہر دلیل اس کے خلاف ہے کیونکہ سورہ یونس اس سورت سے پہلے نازل شدہ ہے اور اس میں ایک سورت کا چیلنج دیا گیا ہے اور زیر نظر سورت اس کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اور اس میں دس سورتوں کا چیلنج ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آیات کا نزول سورتوں کی ترتیب کے مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ بعض اوقات کوئی آیت نازل ہوتی تھی لیکن اسے بعض اوقات تو سابقہ سورتوں میں رکھ دیا جاتا تھا اور بعض اوقات ایسی سورت میں جو اس آیت کے بعد نازل ہوئی تھی۔ وقت نزول کی مکمل طور پر نقلی دلیل پر موقوف ہے۔ اسباب نزول میں کوئی ایسی روایت نہیں ہے جو یہ ثابت کرے کہ سورہ یونس سورہ ہود کے بعد نازل ہوئی ہے اور اپنی جانب سے قیاسی حکم اس موضوع پر مقبول نہیں ہے۔

علامہ رشید رضا مرحوم نے دس سورتوں کے چیلنج کی ایک خاص وجہ بیان کرنے کی سعی ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں طویل کوشش کی ہے (دیکھئے تفسیر منار' ص ۳۲ تا ۴۱' ج ۱۲) فرماتے ہیں کہ یہاں تحدی سے مراد قصص القرآن کا چیلنج ہے۔ تحقیق و تفتیش سے معلوم ہوتا ہے کہ جن سورتوں میں طویل قصص نازل ہوئے ہیں' سورت ہود کے نزول تک ان کی تعداد دس تھی' چنانچہ یہاں دس سورتوں کے لیے چیلنج دیا گیا' کیونکہ ایک سورت کا چیلنج ان کے لیے دس سورتوں کے چیلنج سے زیادہ مشکل تھا۔ اس لئے کہ دس سورتوں میں بہرحال زیادہ قصے اور زیادہ اسالیب کلام تھے اور جن لوگوں کو یہ چیلنج دیا گیا تھا' ان کو دس سورتوں جیسی نقل کی ضرورت تھی اگر وہ نقل کرتے .....''

لیکن' حقیقت تو خدا جانتا ہے' یہ بات اس قدر مشکل نہیں ہے جس قدر انہوں نے مشکل بنا دی ہے کیونکہ چیلنج کے معاملے میں اعتراض کرنے والوں کے اعتراض اور حالات نزول دونوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے اس لئے کہ قرآن کریم عملی حالات کے پیش نظر نازل ہوتا رہا ہے اور ہر سورت اور آیت کے نزول کے وقت متعین صورت حالات ہوا کرتی تھی۔ اس لیے بعض حالات میں کہا گیا کہ قرآن جیسی کتاب لاؤ' بعض میں کہا گیا' ایک سورت لاؤ اور بعض میں دس سورتوں کا مطالبہ ہوا۔ ان مطالبات میں ترتیب زمانی کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ اصل مقصد چیلنج تھا کہ نفس قرآن جیسا کلام لاؤ۔ کل قرآن یا جزء یا ایک سورت وغیرہ۔ لہٰذا چیلنج قرآن جیسے کلام کے بارے میں تھا' کسی خاص مقدار کی بات نہ تھی۔ اور مخالفین جو عاجز آئے تو وہ قرآن جیسے کلام سے عاجز آئے۔ یہ نہ تھا کہ وہ کوئی سورت نہ لا سکے' لہٰذا اس موضوع پر کل اور جزء کا ذکر برابر ہے اور اس سلسلے میں ترتیب لازم نہیں ہے بلکہ بعض مخصوص حالات کی وجہ سے مقدار کا ذکر ہوا۔ یعنی اعتراض کرنے والوں کے اعتراضات کی نوعیت کے اعتبار سے یہ کہا گیا کہ ایک سورت' دس

سورتیں یا پورا قرآن لاؤ۔ یہ مخصوص حالات کیا تھے؟ آج ہم ان کا تعین بہرحال نہیں کر سکتے۔

وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۱: ۱۳) ”اور اللہ کے سوا جو جو (تمہارے معبود) ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لو اگر تم (انہیں معبود سمجھنے میں) سچے ہو“۔ اپنے شرکاء و خصماء کو بلاؤ، شعراء اور بلغاء کو بلاؤ، جنوں اور انسانوں سب کو بلاؤ اور اس چیلنج کو قبول کرو، اور اپنی طرف سے بناوٹی دس سورتیں لاؤ۔ اگر تمہارا یہ دعویٰ سچا ہے کہ قرآن حضرت نبی کریم کی طرف سے بنایا گیا ہے اور اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔

فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ

”اب اگر وہ (تمہارے معبود) تمہاری مدد کو نہیں پہنچتے“۔ اور تم دس سورتیں گھڑ کر نہیں لاتے کیونکہ تمہارے معبود اس سلسلے میں تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتے اور یہ تو کام بھی ایسا ہے جس کا ہونا ناممکن ہے، اور تم خود بھی یہ کام بہرحال نہیں کر سکتے کیونکہ تم اپنے معبودوں کو تب ہی بلاتے ہو جب تم خود عاجز آ جاؤ۔

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ

”تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے“۔ صرف اللہ ہی اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ اسے نازل کرے۔ اور صرف اللہ کا علم ہی اس انداز میں اس کتاب کو نازل کر سکتا ہے اور اس قسم کے علوم اور دلائل دے سکتا ہے۔ اور کائنات کے احوال اور سنن بیان کر سکتا ہے اور انسانوں کے ماضی اور حال اور مستقبل کے لیے وہی یہ سب کچھ وضع کر سکتا ہے جو ان کی زلت و معاش کے لیے مفید ہے۔

وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

”اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے“۔ اگر ان کے الہٰ دس سورتیں نہیں لا سکتے تو پھر اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ یہ کتاب منجانب اللہ ہے اور وہ جو دعوت دیتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں وہ برحق ہے اور یہ کتاب اسی نے نازل کی ہے۔

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ

”تو کیا تم سر تسلیم خم کرتے ہو؟“ اس چیلنج اور پوری دنیا کی ناکامی کے بعد آخر کوئی معقول آدمی دعوت اسلامی کو تسلیم کرنے کے سوا اور کر کیا سکتا ہے؟ لیکن یہ لوگ اس قدر ظالم ہیں کہ یہ اس عاجزی کے بعد بھی حق کا انکار کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں پر سچائی تو بالکل واضح ہو گئی تھی لیکن اسلامی نظام کی وجہ سے ان کے مفادات ختم ہو رہے تھے۔ موجودہ جاہلی نظام ان کے لیے مفید تھا، پھر اس نظام میں ان کو اقتدار اور سلطنت حاصل تھی۔ دعوت اسلامی تو

آزادی' انصاف اور ہر انسان کو عزت اور شرف عطا کرنے کی تحریک تھی۔ اور ان لوگوں نے دوسرے لوگوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ لہذا لا الہ الا اللہ کی دعوت ان کے مفادات کے خلاف تھی۔ چنانچہ اب ان کے حسب حال یہ تبصرہ کیا جاتا ہے جو ان کے حالات کی صحیح تصویر کشی کرتا ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

"جو لوگ بس اس دنیا کی زندگی اور اس کی خوشنمائیوں کے طالب ہوتے ہیں ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ (وہاں معلوم ہو جائے گا کہ) جو کچھ انہوں نے دنیا میں بنایا وہ سب ملیامیٹ ہو گیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے"۔

اس دنیا میں جو لوگ بھی جدوجہد کرتا ہے وہ اس کا ثمرہ پاتا ہے۔ اب بات اس کے نصب العین پر موقوف ہے۔ بعض لوگوں کی نظر اعلیٰ مقاصد اور بلند افق پر ہوتی ہے۔ اور بعض لوگ صرف اپنے قدموں پر نظر رکھتے ہیں اور دنیا کے قریب اور محدود مقاصد ان کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ جو شخص دنیاوی زندگی اور اس کے کروفر کے متلاشی ہوتے ہیں تو وہ صرف اس کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ ان کو ان کے عمل کا نتیجہ اس دنیا ہی میں ملتا ہے۔ اور پھر وہ اس سے نفع اٹھاتے ہیں جس طرح ان کی مرضی ہوتی ہے۔ لیکن آخرت میں ان کا حصہ صرف آگ ہوتی ہے کیونکہ ایسے شخص نے آخرت کے لیے کچھ کمائی نہیں کی اور نہ آخرت کو اس نے اہمیت دی۔ اس لیے وہ دنیا میں جو بھی اچھا عمل کرے گا' اس کی جزاء اسے یہاں ہی مل جائے گی اور آخرت میں وہ عمل باطل ہو گا۔ وہاں اس کے اعمال کا کوئی وزن نہ ہو گا۔ آخرت میں ایسے لوگوں کے اعمال حبط ہوں گے۔ یعنی اس طرح جس طرح کسی مویشی کو زہر آلود گھاس پھلا دیتی ہے جبکہ در حقیقت وہ بیمار ہوتا ہے' موٹا نہیں ہوتا اور اس کا یہ موٹاپا موجب ہلاکت ہوتا ہے۔

اس دنیا میں ہمیں بہت سے افراد اور اقوام نظر آتے ہیں جو رات دن اس دنیا کے لیے کام کرتے ہیں اور ان کو ان کی جدوجہد کے ثمرات بھی ملتے ہیں۔ ان کی دنیا نہایت ہی ترقی یافتہ اور فلاح یافتہ ہوتی ہے' اور اس طرح پھولی ہوتی ہے جس طرح بیمار جانور۔ لہذا ہمیں ایسے لوگوں سے متاثر نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی پوچھنا چاہئے کہ کیوں؟ کیونکہ زمین میں یہی سنت الٰہی ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا

یَبْخَسُوْنَ (۱۱ : ۱۵) "جو شخص حیات دنیا اور اس کی زینت کا طلبگار ہے اس دنیا میں ہم اس کے اعمال کا ثمر پورا پورا دیں گے اور ان کا کچھ نقصان نہ کیا جائے گا" ۔ لیکن اللہ کی اس سنت کو تسلیم کرتے ہوئے اور اس کے نتائج کو یقینی مانتے ہوئے ہمیں یہ حقیقت بھولنا نہ چاہئے کہ ایک شخص دنیا کے لیے کام کرتے ہوئے بھی آخرت پر نظر رکھ سکتا ہے اور دنیا کی جدوجہد کے دوران بھی آخرت کے لیے کام کر سکتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ اس کی دنیا بھی اچھی اور مزین ہو اور دنیا میں بھی کوئی کمی نہ ہو اور آخرت میں بھی کوئی کمی نہ ہو اور آخرت بھی کامیاب ہو ۔

حقیقت یہ ہے کہ آخرت کے لیے کام کرنا' دنیا کے لیے کام کرنے کے ساتھ تضاد نہیں رکھتا بلکہ دنیا کا کام بھی آخرت کے لیے کام ہے بشرطیکہ توجہ الی اللہ قائم ہو اور اگر ایک انسان دنیا کی جدوجہد میں اللہ کو یاد رکھے تو اس کی جدوجہد میں کمی نہیں ہوتی بلکہ اس میں مزید برکت ہوتی ہے ۔ اس کی کمائی پاکیزہ اور ستھری ہوتی ہے اور دنیا کے ساتھ آخرت بھی اسے ملتی ہے ۔ الا یہ کہ جو شخص دنیا میں حرام خواہشات کی پیروی کرے ناجائز شہوات نہ صرف یہ کہ آخرت میں مردود ہیں بلکہ دنیا میں بھی وہ پسندیدہ نہیں ہیں ۔ اس کا تجربہ مغربی اقوام کو ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہو چکا ہے اور انسانی تاریخ کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے وہ بھی اچھی طرح ان نتائج تک پہنچ چکے ہیں ۔

اب سیاق کلام اس رویے کی طرف مڑ جاتا ہے' جو مشرکین نے رسول اللہ کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ حضورؐ کی سچائی منجانب اللہ ہے اور پھر یہ قرآن بھی حضورؐ کی رسالت اور حقانیت پر گواہ ہے ۔ اور یہ کہ حضور مرسل من جانب اللہ ہیں اور اس پر حضرت موسیٰ کی کتاب بھی گواہ ہے ۔ چنانچہ رسول اللہؐ اور آپ کی دعوت کے بارے میں تمام براہین اور دلائل بیان کئے جاتے ہیں ۔ اس طرح حضورؐ کی تالیف قلب مقصود ہے ۔ نیز آپ کے ساتھ جو مختصر جماعت اس عظیم مقصد کے لیے کام کر رہی ہے ۔ اس کی ڈھارس بندھانا بھی پیش نظر ہے ۔ اور مخالفین اور کفار کو ان کے انجام بد سے ڈرانا بھی مطلوب ہے کہ اگر انہوں نے روش نہ بدلی تو انجام آگ ہے ۔ ان کو قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جس میں وہ شرمندگی' بے عزتی اور ذلت کا شکار ہیں' محض اس لیے کہ انہوں نے دنیا میں کبر اور غرور کا رویہ اختیار کیا ۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ جو اب ڈینگیں مار رہے ہیں ۔ قیامت میں کس قدر ذلیل و خوار اور عاجز ہوں گے اور اللہ کے عذاب سے بچ نکلنے کا کوئی موقعہ نہ ہو گا اور نہ ان کا کوئی ولی اور مددگار ہو گا ۔

لَا جَرَمَ اَنَّھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ ھُمُ الْاَخْسَرُوْنَ (۱۱ : ۲۲) "یہ لازمی بات ہے کہ آخرت میں یہی لوگ سخت خسارے میں ہوں گے" ۔ چنانچہ کفار اور مومنین کے درمیان ایک مشاہداتی موازنہ کیا جاتا ہے اور دونوں کے درمیان فرق کو نمایاں کیا جاتا ہے کہ دونوں کا حال اور مآل کس قدر مختلف ہے ۔ ذرا غور سے پڑھئے :

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَ

لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ
يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَ يَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ
اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ ۙ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَ هُمْ
بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ
دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَ مَا
كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾
لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ
اَخْبَتُوْۤا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ ۲
كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِيْرِ وَ السَّمِيْعِ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ ع ۱۶ع ۲

”پھر بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا‘ اس کے بعد ایک گواہ بھی پروردگار کی طرف سے (اس شہادت کی تائید میں) آگیا‘ اور پہلے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت کے طور پر آئی ہوئی بھی موجود تھی (کیا وہ بھی دنیا پرستوں کی طرح اس سے انکار کر سکتا ہے؟) ایسے لوگ تو اس پر ایمان ہی لائیں گے اور انسانی گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے لیے جس جگہ کو وعدہ ہے وہ دوزخ ہے۔ پس اے پیغمبرؐ‘ تم اس چیز کی طرف سے کسی شک میں نہ پڑنا‘ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔

اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ گھڑے؟ ایسے لوگ اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے اور گواہ شہادت دیں گے کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا۔ سنو! خدا کی لعنت ہے ظالموں پر --- ان ظالموں پر جو خدا کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں‘ اس کے راستے کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں‘ اور آخرت کا انکار کرتے ہیں --- وہ زمین میں اللہ کو بے بس کرنے والے نہ تھے اور نہ اللہ کے مقابلہ میں کوئی ان کا حامی تھا۔ انہیں اب دوہرا عذاب دیا جائے گا۔ وہ نہ کسی کی سن ہی سکتے تھے اور نہ خود ہی انہیں کچھ سوجھتا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خود گھاٹے میں ڈالا اور وہ سب کچھ ان سے کھویا گیا جو انہوں نے گھڑ رکھا تھا۔ ناگزیر ہے کہ وہی آخرت میں سب سے بڑھ کر گھاٹے میں رہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اپنے رب ہی کے ہو کر

رہے ' تو یقیناً وہ جنتی لوگ ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے ۔ ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی تو ہو اندھا بہرا اور دوسرا ہو دیکھنے اور سننے والا' کیا یہ دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تم (اس مثال سے ) کوئی سبق نہیں لیتے"۔

یہ ایک طویل تنقیدی حملہ ہے ' اس کے اندر پائے جانے والے اشارات وہدایات ' متنوع یاد دہانیوں اور تنبیہات اور موثر ضربات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے اس دور میں مسلمانوں کی قلیل تعداد اور دعوت اسلامی کو کن مشکلات کا سامنا تھا اور یہ کہ اس اشاراتی تقریر کی اس دور میں کیوں ضرورت پیش آئی ۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم اپنے اندر ایک تحریکی مزاج رکھتا ہے ۔ اور وہ ایک واقعی حالات میں ان تھک جدوجہد کی ہدایات دیتا ہے اور قیامت تک کے لیے ایسی تحریکات کے لیے ایک گائیڈ بک ہے ۔

اس قرآن کا مزہ وہی شخص چکھ سکتا ہے جو عملاً احیائے اسلام کے معرکے میں کود چکا ہوتا ہے اور اسے انہی حالات سے سابقہ پیش ہوتا ہے جن حالات میں یہ قرآن سب سے پہلے نازل ہوا تھا اور پھر یہ شخص حالات کا مقابلہ کرتا ہے اور ان حالات کو اپنے راستے پر موڑتا ہے ۔ رہے وہ لوگ جو آرام سے گھروں میں بیٹھے ہوں اور قرآن کریم کو سمجھنا چاہیں اور اس کا مطالعہ فنی اور محض علمی انداز میں کریں تو اس قسم کے آرام طلب ' سرد مزاج اور امن پسند لوگ اس کتاب کو نہیں سمجھ سکتے ' جو زندگی کے عملی معرکے سے دور ہوں اور کسی اسلامی تحریک میں کوئی دلچسپی نہ رکھتے ہوں ۔ غرض اس قسم کے آرام طلب مسند نشینوں پر قرآن کے اسرار کبھی بھی نہیں کھلتے ' جو لوگ اللہ کے سوا دوسری قوتوں کے غلام ہوں ' امن پسند ہوں اور آرام طلب ہوں اور کسی بھی طاغوتی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے پر راضی ہوں ' ان کے لیے اسرار قرآن اسی طرح ہیں جس طرح کور مادر زاد و نور آفتاب ۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰى اِمَامًا وَّرَحْمَةً اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۱ : ۱۷) "پھر بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا ' اس کے بعد ایک گواہ بھی پروردگار کی طرف سے (اس شہادت کی تائید میں ) آگیا ' اور پہلے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت کے طور پر آئی ہوئی بھی موجود تھی (کیا وہ بھی دنیا پرستوں کی طرح اس سے انکار کر سکتا ہے ؟ ) ایسے لوگ تو اس پر ایمان ہی لائیں گے اور انسانی گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے لیے جس جگہ کو وعدہ ہے وہ دوزخ ہے ۔ پس اے پیغمبرؐ ' تم اس چیز کی طرف سے کسی شک میں نہ پڑنا ' یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے"۔

اس آیت کے بارے میں بے شمار روایات وارد ہیں کہ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (۱۱ : ۱۷ ) کا مطلب کیا ہے اور وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ (۱۱ : ۱۷ ) سے مراد کیا ہے ۔ نیز رَبِّهٖ اور يَتْلُوْهُ کے ضمیروں کا مرجع کیا ہے؟ منہ کے ضمیر کا مرجع کون ہے؟ میرے خیال میں اس عبارت کا سب سے راجح اور موزوں مفہوم یہ ہے کہ جو شخص (یعنی رسول اللہؐ ) اپنے رب کی طرف سے صاف صاف شہادت اور ثبوت رکھتا ہے اور رسول اللہؐ کے بعد اس سے مراد تمام مسلمان ہوں

گے اور اللہ کی طرف سے مزید گواہ جو آیا جو اس کی نبوت کے لیے ایک ناقابل انکار ثبوت ہے ۔ وہ قرآن کریم ہے ' جو بذات خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ وحی الہی ہے اور اس قسم کا کلام پیش کرنے سے لوگ عاجز آ گئے ہیں اور اس گواہ سے قبل یعنی قرآن سے قبل حضرت موسیٰ کی کتاب بھی موجود ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کرتی ہے کیونکہ اس کتاب میں رسول اللہ کے بارے میں واضح خوشخبری موجود ہے اور اس کتاب کی تعلیمات اور اس کی تعلیمات بالکل ایک جیسی ہیں ۔

اس آیت کی جو تاویل و تفسیر میں نے بیان کی ہے اس پر اس پوری سورت کا انداز کلام بھی دلالت کرتا ہے ۔ اس سورت میں تمام رسولوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ وہ خود اپنی ذات کے اندر باری تعالیٰ کی طرف سے دلائل پاتے ہیں اور ان کو اس بات پر بھرپور یقین اور مشاہدہ حاصل ہے کہ ان کی طرف اللہ کی جانب سے وحی آتی ہے ۔ وہ ذات باری کو اپنی ذات میں نہایت ہی واضح ' نہایت ہی یقینی اور نہایت ہی قریب پاتے ہیں اور ان کو ذات باری اور وحی الہی کے بارے میں مشاہداتی یقین حاصل ہے ۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ حضرت نوح ؑ نے فرمایا :

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ (۱۱ : ۲۸) "اے برادران قوم ' ذرا سوچو تو سہی کہ اگر میں اس رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ پر اپنی خاص رحمت سے بھی نواز دیا مگر تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو تمہارے سر چپیک دیں اور حضرت صالح ؑ نے بھی فرمایا" ۔

يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ (۱۱ : ۶۳) "اے برادران قوم ' تم نے کچھ اس بات پر غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھ کو نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھ کو کون بچائے گا ۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں گا ' تم میرے کس کام آ سکتے ہو ' سوائے اس کے کہ مجھے اور خسارے میں ڈال دو" ۔

اور حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی ایسی ہی بات کہی :

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا (۱۱ : ۸۸) "اے بھائیو ' تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر تھا ' اور پھر اس نے مجھے اپنے ہاں سے اچھا رزق بھی عطا کیا" ۔

یہ تمام تعبیرات بتاتی ہیں کہ ان میں رسولوں کا خدا کے ساتھ ایک مخصوص تعلق بتایا گیا ۔ اور اس کی نوعیت کچھ اس

طرح ہے کہ وہ اپنے اندر ایک ایسی بصیرت پاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ حقیقت الوہیت کو اپنے اندر واضح شہادت کی طرح پاتے ہیں کیونکہ وحی کے ذریعے ان کے ساتھ رب کا ایسا تعلق ہوتا ہے جس طرح کسی نظر کا مشاہدات کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ انداز تعبیر اور وحدت تعبیر یہ بتاتی ہے کہ ان آیات میں اللہ اور رسول کے ذاتی تعلق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جب کہ ہم نے کہا کہ اس بَيِّنَةٍ سے مراد ہے رسول کی اندرونی شہادت جس کی طرف دوسرے رسولوں کے کلام میں بھی اشارہ موجود ہے۔ اور یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ کے مشاہدات وہی ہیں جو سابقہ رسل کے تھے۔ لہٰذا مشرکین مکہ کے تمام دعوے باطل ہیں۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ آپ اور آپ کے مٹھی بھر ماننے والوں کو یہ تسلی ہو جائے کہ وہ سابقہ رسل کی طرح حق پر ہیں اور یہ کہ مسلمانوں نے جس تعلیم کو قبول کیا ہے وہ تمام نبیوں کی تعلیم ہے۔

اب اس آیت کا اصولی مفہوم یہ ہو گا کہ یہ نبی جس کی صداقت پر بے شمار دلائل و براہین قائم ہو گئے ہیں اس یقین و ایمان اور اس کے نظریات حق ہیں' کیونکہ ایک طرف وہ خود اپنے نفس میں اس ایمان کو مشاہداتی طور پر دیکھ رہا ہے اور اسے یقین ہے۔ اور اس کے اس یقین کے اوپر خدا کی طرف سے بھی ہر وقت قرآن کی صورت میں شواہد چلے آ رہے ہیں اور جو اس بات پر بین دلیل ہیں کہ یہ قرآن بھی اسی ربانی ........ سرچشمے سے آ رہا ہے اور ایک دوسرا بیرونی گواہ کتاب موسیٰ ہے۔ جو بنی اسرائیل کی قیادت کے لیے امام اور راہنما کتاب تھی اور ایک رحمت تھی جس کا نزول بنی اسرائیل پر ان کے رب کی طرف سے ہوا اور وہ کتاب بھی رسول اللہ کی تصدیق کر رہی ہے۔ کیونکہ آپ کے بارے میں اس کے اندر واضح بشارتیں ہیں اور ان بشارتوں کے علاوہ یہ کتاب اپنے بنیادی تصورات اور اصولوں کے اندر بھی قرآن سے مطابقت رکھتی ہے.... تو کیا ایسا شخص اس لائق ہے کہ اس کی تکذیب کی جائے جس طرح تم لوگ کر رہے ہو اور جس طرح مشرکین کے مختلف طبقات اسے لے رہے ہیں۔ یہ گویا نہایت ہی ناپسندیدہ امر ہے اور ایسے ہمہ جہت شواہد و دلائل کے مقابلے میں ایسا طرز عمل نہ اختیار کرنا چاہئے۔

اس کے بعد ان لوگوں کا موقف بھی بیان کر دیا جاتا ہے جن لوگوں نے قرآنی تعلیمات پر ایمان لا کر اسے تسلیم کیا اور ان لوگوں کا بھی جنھوں نے اس کا انکار کیا اور پھر ان دونوں کے انجام سے بھی خبردار کر دیا گیا۔

أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ (۱۱:۱۷) "ایسے لوگ تو اس پر ایمان ہی لائیں گے اور انسانی گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے لیے جس جگہ کو وعدہ ہے وہ دوزخ ہے۔ پس اے پیغمبرؐ ' تم اس چیز کی طرف سے کسی شک میں نہ پڑنا' یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے"۔

بعض مفسرین کے ذہن میں آیت أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ (۱۱:۱۷) کے مفہوم میں اشکال پیدا ہوا ہے خصوصاً اس صورت میں جبکہ أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ (۱۱:۱۷) سے مراد رسول اللہؐ کی ذات ہو جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ کیونکہ اس صورت میں أُولَٰئِكَ سے مراد مومنین کی وہ جماعت ہوگی جو حضورؐ پر آنے والی وحی پر ایمان لاتی ہو اور اس وحی سے وہی دلائل مراد ہوں گے جو حضورؐ پر نازل ہوتے ہیں لیکن اس میں کوئی امر مانع

نہیں ہے کیونکہ (اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ) میں ضمیر قرآن کی طرف راجع ہوگی اور من قبلہ کی ضمیر بھی قرآن کی طرف راجع ہو گی۔ معنی یہ ہو گا کہ لوگ اس گواہ یعنی قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور رسول اللہ تو اول مسلمان ہیں اول مومن ہیں ان باتوں پر جو ان کی طرف نازل ہوتی ہیں اور مومنین حضورؐ کے ایمان کا اتباع کرتے ہیں۔ دوسری جگہ سورت بقرہ میں ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ - كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ

وَرُسُلِهٖ "رسول اس پر ایمان لایا ہے جو اس کی طرف اتارا گیا اور مومنین بھی۔ سب اللہ پر ایمان لائے اور اس کے ملائکہ پر ایمان لائے۔ اس کی کتابوں پر ایمان لائے اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے"۔ یہاں رسول اللہ اور ان لوگوں کے ایمان کو یکجا کر کے بیان کیا گیا اور قرآنی تعبیرات میں یہ انداز کلام بالکل مالوف ہے لہٰذا اس آیت کے مفہوم میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ (۱۱ : ۱۷) "اور انسانی گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے لیے جس جگہ کا وعدہ ہے وہ دوزخ ہے"۔ اور یہ ایسا وعدہ ہے جس کی کوئی خلاف ورزی نہ ہوگی کیونکہ اس کی تقدیر اور تدبیر اللہ نے فرمائی ہے۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ

(۱۱ : ۱۷) "پس اے پیغمبرؐ، تم اس چیز کی طرف سے شک میں نہ پڑنا' یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے"۔ یہ تو حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو وحی آ رہی تھی اس میں حضورؐ نے شک نہیں فرمایا' نہ اس میں کبھی ان کو شبہ لاحق ہوا ہے۔ وہ تو اپنے رب کی طرف سے ایک خاص شہادت رکھتے تھے' لیکن ان دلائل و براہین کے بعد حضورؐ کو یہ ہدایت اس لیے دی کہ حضور اپنے دل میں تنگی محسوس کرتے تھے اور تبلیغ کرتے کرتے تھک جاتے تھے۔ اور معاندین کی کثرت اور شدید مخالفتوں کی وجہ سے آپ ڈرتے تھے کہ دعوت پر جمود کی حالت طاری نہ ہو جائے اس لیے آپ کو یہ ہدایات محض تسلی کے لیے دی گئیں تاکہ آپ نہایت ہی ثابت قدمی سے اپنے کام کو جاری رکھیں۔ نیز امت مسلمہ بھی ان دنوں نہایت ہی قلق' کرب اور تنگ دلی میں مبتلا تھی اور اسی طرح ان کے دلوں پر بھی باد یقین کے جھونکے آ گئے۔

ہمارے دور میں اسلامی تحریکات کو ہر جگہ اسی قسم کے حالات درپیش ہیں۔ ہر جگہ ان کو ایسے ہی مشکل حالات سے سابقہ درپیش ہے اور وہ پریشانی اور تنگ دلی کی کیفیات سے دوچار ہیں۔ ان کے خلاف ہر طرف سے استہزاء اور مذاق ہوتا ہے اور لوگ ان کی دعوت سے منہ موڑتے ہیں' ان کو سخت سے سخت ایذائیں دی جا رہی ہیں اور ان کے خلاف تمام فکری اور نفسیاتی اور مادی وسائل اختیار کیے جا رہے ہیں' ہر طرف سے جاہلیت کی قوتیں ان کے خلاف ٹوٹ پڑی ہیں۔ مقامی غیر اسلامی قوتیں اور عالمی قوتیں ان کے خلاف رات دن سازشوں میں مصروف عمل ہیں اور ان کے خلاف ہمہ گیر جنگ شروع ہے اور اسلامی تحریکات کے خلاف جو لوگ کام کرتے ہیں ان کی ہر طرف سے حوصلہ افزائی ہو رہی ہے ایسے

حالات میں اسلامی تحریکات کو ایسی ربانی تسلیوں کی بے حد ضرورت ہے۔

تمام اسلامی تحریکات کا فرض ہے کہ وہ ان آیات پر اچھی طرح غور کریں۔ان کے ہر ہر فقرے کو سمجھیں' ان کے اندر پائی جانے والی ہدایات سے اشارات اخذ کریں اور ان کے خطوط پر آگے گامزن رہیں۔

اللہ تعالیٰ ان آیات میں جس تاکید' یقین دہانی اور جس سچائی کو بیان کر رہا ہے۔وہ تحریک اسلامی کی پہلی ضرورت ہے۔ذرا پھر غور کریں۔

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ

( ۱۱ : ۱۷ ) ''پس اے پیغمبرؐ' تم اس چیز کی طرف سے شک میں نہ پڑنا' یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے''۔اسلامی تحریک کے ہر کارکن پر آج ایسے سایہ عاطفت کی ضرورت ہے جو تمام رسولوں پر ہر وقت سایہ فگن رہتا تھا اور جو خداوند قدوس کی طرف سے ایک گواہ کا مقام رکھتا تھا۔یہ خداوند کریم کی طرف سے ایک سایہ رحمت ہوا کرتا تھا۔وہ اس سایہ میں اپنی منزل کی طرف بڑھتے تھے اور اس راہ میں وہ اپنی کامیابی اور اس راہ کی سچائی میں انہیں کوئی شک نہ ہوتا تھا۔اور اس راہ میں ان کو جو جو مشکلات پیش آتیں وہ ان کو برداشت کرتے' جیسا کہ حضرت صالح نے فرمایا :

يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ( ۱۱ : ۶۳ ) ''اے برادران قوم' تم نے کچھ اس بات پر غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھ کو نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھ کو کون بچائے گا۔اگر میں اس کی نافرمانی کروں گا' تم میرے کس کام آسکتے ہو' سوائے اس کے کہ مجھے اور خسارے میں ڈال دو''۔

اس وقت عالم اسلام میں احیائے اسلام کے لئے کام کرنے والی تحریکوں کے مقاصد وہی ہیں جن کے لیے پیغمبروں کو بھیجا گیا تھا یعنی احیائے اسلام اور جن جاہلیتوں اور مشکلات کا واسطہ ان پیغمبروں کو پڑا تھا' آج وہی جاہلیتیں ان تحریکی دستوں کو درپیش ہیں۔جس طرح رسول اللہؐ نے پوری انسانیت کے سامنے مکمل دین پیش کیا تھا' آج وہی دین انسانیت کے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔گویا وہی زمانہ لوٹ کر آگیا ہے۔آج اسلامی تحریکات کا مقابلہ اسی جاہلیت سے ہے جس سے حضرت ابراہیمؑ کو واسطہ پڑا تھا' جس سے اسماعیلؑ' اسحاقؑ' یعقوبؑ' اسباطؑ' یوسفؑ' موسیٰؑ ہارونؑ' داؤدؑ' سلیمانؑ' یحیٰؑ اور عیسیٰؑ اور تمام دوسرے نبیوں کو پڑا تھا۔

بعض جاہلیتیں تو وجود باری ہی کی منکر ہوتی ہیں اور بعض وجود باری کو تسلیم کرتی ہیں۔لیکن وجود باری کو مانتے ہوئے بھی انہوں نے اس کرۂ ارض پر ایسے لوگوں کو رب اور حاکم بنا رکھا ہوتا ہے جو لوگوں پر ان قوانین کو نافذ کرتے ہیں جو اللہ نے نازل نہیں کیے۔اس طرح لوگ ان ارباب کے دین پر ہوتے ہیں۔آج پورے عالم اسلام میں اسلامی تحریکات

کی دعوت یہ ہے کہ لوگ اپنی زندگی کے تمام حالات میں' اپنے پورے معاشرے سے اپنی اقدار اور قوانین میں سے ان ارباب من دون اللہ کی حکومت اور اقتدار کو ختم کر دیں اور اللہ وحدہ کی ربوبیت میں داخل ہو جائیں اور اس طرح مکمل طور پر داخل ہو جائیں کہ ان کی زندگی میں اللہ کی ربوبیت کے ساتھ کوئی دوسرا رب نہ ہو۔وہ صرف اللہ کی شریعت کی تابع داری کریں۔صرف اللہ کے اوامر و نواہی کی پابندی کریں۔اس نظریاتی جدوجہد کے نتیجے میں اس وقت اسلام اور جاہلیت کے درمیان ایک ہمہ گیر کشکش برپا ہے اور اس معرکے میں اسلامی تحریکات کے مقابلے میں دنیا کے تمام طاغوت ایک صف میں کھڑے ہیں۔

لہٰذا اسلامی تحریکات کے ان ہراول دستوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے تمام نظریات اور تمام موقف اور تمام پالیسیاں قرآن سے اخذ کریں۔اور یہی ہے مطلب اس بات کا جو ہم بار بار کہتے ہیں کہ "اس قرآن کا مزہ وہی شخص چکھ سکتا ہے جو اس قسم کے معرکے میں کود پڑے۔جس میں حضور اکرمؐ کے ساتھی کود ے تھے اور وہ ویسا ہی موقف اختیار کرے اور ویسے ہی حالات سے دوچار ہو جس سے وہ لوگ دوچار تھے اور حالات کے دھارے کو اسی طرح بدلنا شروع کر دے جس طرح ان حضرات نے بدلا تھا۔وہ لوگ جو حجروں میں بیٹھ کر قرآن کے معانی تلاش کرتے ہیں اور احیائے اسلام کے لیے عملاً جدوجہد نہیں کرتے اور قرآن کی محض فنی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور محض بیان کی حد تک اس کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔وہ قرآن کی حقیقت تک رسائی نہیں پا سکتے۔ایسے لوگوں کا فہم قرآن محض جامد اور عملی زندگی سے بہت دور ہوتا ہے"۔

---ooo---

اب سیاق کلام ان لوگوں کی طرف رخ کرتا ہے جن لوگوں کا زعم یہ ہے کہ حضور نعوذ باللہ اپنی جانب سے اس قرآن کو پیش کرتے ہیں۔یہ لوگ اللہ اور رسول اللہ دونوں کی تکذیب کرتے ہیں۔یہ لوگ اب قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں موجود ہیں اور ایسے افتراء پردازوں کا مقدمہ اللہ کے ہاں پیش ہے۔چاہے ان لوگوں کی تکذیب یہ ہو کہ قرآن کریم اللہ کی طرف سے منزل نہیں ہے یا یہ کہ وہ اللہ کے ساتھ اور لوگوں کو شریک کرتے ہوں' یا یہ لوگ اللہ کے ساتھ دوسرے انسانی خداؤں کو اللہ کے اقتدار اعلیٰ میں شریک ٹھہراتے ہوں۔آیات عام ہیں تاکہ سب قسم کے افتراء پرداز اس کے مدلول میں شامل ہو جائیں--- غرض ان لوگوں کو قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں پیش کیا جاتا ہے' ان کی تشہیر ہو رہی ہے' انہیں شرمندہ کیا جا رہا ہے' سرعام۔اسی منظر میں دوسری جانب مومنین ہیں جو مطمئن کھڑے ہیں اور ان کے لیے ان کے رب کی طرف سے انعامات منتظر ہیں۔اللہ تعالیٰ ان دونوں قسم کے لوگوں کا تقابل اس طرح پیش فرماتا ہے۔ایک طرف اندھے اور بہرے ہیں اور دوسری جانب سننے اور دیکھنے والے ہیں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰی رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِيْنَ (۱۸) الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۱۹) فَاُولٰٓئِكَ

لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ (۲۰) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۱) لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ (۲۲) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۳) مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۲۴) ((۱۱: ۱۸ تا ۲۴)) اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ گھڑے؟ ایسے لوگ اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے اور گواہ شہادت دیں گے کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا۔ سنو! خدا کی لعنت ہے ظالموں پر --- ان ظالموں پر جو خدا کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں' اس کے راستے کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں' اور آخرت کا انکار کرتے ہیں --- وہ زمین میں اللہ کو بے بس کرنے والے نہ تھے اور نہ اللہ کے مقابلہ میں کوئی ان کا حامی تھا۔ انہیں اب دوہرا عذاب دیا جائے گا۔ وہ نہ کسی کی سن ہی سکتے تھے اور نہ خود ہی انہیں کچھ سوجھتا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خود گھاٹے میں ڈالا اور وہ سب کچھ ان سے کھویا گیا جو انہوں نے گھڑ رکھا تھا۔ ناگزیر ہے کہ وہی آخرت میں سب سے بڑھ کر گھاٹے میں رہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اپنے رب ہی کے ہو کر رہے' تو یقیناً وہ جنتی لوگ ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی تو ہو اندھا بہرا اور دوسرا ہو دیکھنے اور سننے والا' کیا یہ دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تم (اس مثال سے) کوئی سبق نہیں لیتے"۔

جھوٹ باندھنا تو بذات خود ایک بڑا جرم ہے' اور جس پر افترا باندھا جائے یہ اس پر ایک عظیم ظلم ہے۔ لیکن اگر یہ افترا ذات باری پر باندھا جائے تو یہ ایک عظیم جرم ہے' اور نہایت ہی خطرناک جسارت ہے۔ اس لیے کہ

اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ (۱۱: ۱۸) "ایسے لوگ اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے' اور گواہ شہادت دیں گے کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا"۔

کس پر جھوٹ؟ اپنے رب پر جھوٹ' کسی اور پر نہیں۔ اس منظر میں ان جیسے لوگوں کو اچھی طرح شرمندہ کیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس شرمناک جرم کی سزا کے طور پر ان پر لعنت اور ملامت وارد ہوتی ہے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (۱۱: ۱۸) "سنو' خدا کی لعنت ہے ظالموں پر"۔ اور گواہ بھی یہ شہادت دے دیں گے۔ یہ گواہ کون لوگ ہوں گے' ملائکہ' رسول' اور اہل ایمان یہ تمام مخلوق خدا سب کی سب گواہ بن

جائے گی - یہ نہایت ہی بڑی شرمندگی اور سرعام ملامت ہوگی' مجمع عام ہو گا اور اس کے سامنے ان کو اس شرمندگی سے دوچار ہونا ہو گا -

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (۱۱ : ۱۸) "سنو خدا کی لعنت ہے ظالموں پر" - ظالموں سے مشرکین مراد ہیں - اور یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ پر افتراء باندھتے ہیں تاکہ عوام الناس کو اللہ کی راہ سے روکیں اور يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا "ان کے راستے کو کج کرنا چاہتے ہیں" - وہ نہ درستگی چاہتے ہیں اور نہ راہ راست کو پسند کرتے ہیں - وہ ہر معاملے میں ٹیڑھ' پہلوتہی اور انحراف کے عاشق ہیں' چاہے وہ راستے پر جا رہے ہوں' چاہے وہ زندگی گزارنے کی کوئی حالت ہو یا کوئی اور معاملہ درپیش ہو - اور اس کا اصل سبب یہ ہے کہ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۱۹) "اور وہ آخرت کا انکار کرتے ہیں" - ھُمْ کے لفظ کو دو بار اس لیے لایا گیا ہے کہ اس سے حصر اور تاکید مقصود ہے اور یہ بتانا مطلوب ہے کہ یہ انکار ان کے رگ و پے میں بسا ہوا ہے اور وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ یہ ان کی علامت ہو - وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں وہی ظالم کہلاتے ہیں وہ جب اسلام کے صراط مستقیم اور سواء السبیل سے پھرتے ہیں تو ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے پورے نظام کو ٹیڑھا کر دیں - اسلامی نظام زندگی کو ترک کر کے جو بھی دوسرا نظام اپنایا جائے وہ انسانی زندگی کے ہر کل پرزے کو ٹیڑھا کر دیتا ہے اور انسان کی سوچ کے دھارے پیچیدہ ہو جاتے ہیں -

اللہ تو چاہتا ہے کہ انسان راہ مستقیم پر گامزن ہو کر شرف کے مقام تک پہنچ جائے' جبکہ غیر اللہ کی غلامی نفس انسانی کے اندر ذلت پیدا کر دیتی ہے اور اس کے نتیجے میں سوسائٹی کے اندر ظلم اور تجاوز پرورش پاتا ہے حالانکہ اللہ کا منشا یہ ہے کہ ہر سوسائٹی میں عدل و انصاف قائم ہو - اور لوگوں کی جدوجہد کا رخ اس فضول مقصد کے حصول کی طرف مڑ جاتا ہے کہ وہ لئل زمین کو اپنا رب اور الٰہ بنانا چاہتے ہیں اور انسانوں کے اردگرد ناچتے اور ڈھول پیٹتے ہیں اور ان کو اس قدر بڑھاتے چڑھاتے ہیں کہ یہ انسان حقیقی رب کی جگہ لے لیں حالانکہ یہ بونے اور حقیر لوگ جو خود مخلوق ہیں' خالق حقیقی کے خلا کو کس طرح بھر سکتے ہیں - ان ارضی ارباب کے یہ حقیر اور بونے بندے رات دن کوشش کرتے ہیں کہ ان جھوٹے خداؤں کی خدائی قائم ہو' یہ لوگ ان تھک جدوجہد کرتے ہیں - وہ ہر وقت ان ارضی بتوں کو روشن رکھتے ہیں اور ان کی شخصیات کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتے رہتے ہیں - ان کے اردگرد اور ان کے تکیوں اور آستانوں پر میلے اور ڈھول دھماکے برپا رکھتے ہیں اور گانے بجانے اور دوسری دلچسپیوں کے ذریعے ان کی تعریف اور تسبیح بھی کرتے رہتے ہیں لیکن ان تمام دلچسپیوں اور ان تمام انتھک مساعی کے نتیجے میں انسان کے لیے کوئی بھی مفید نتیجہ نہیں نکلتا - اس سے زیادہ انسانیت کی بدبختی اور کیا ہوگی کہ انسان کی پوری زندگی کی جدوجہد یوں اکارت جائے -

(اُولٰٓئِكَ) "یہ لوگ جو خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں اور جو اللہ کے نزدیک قابل ملامت اور لعنت ہیں -

فَاُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ (۱۱ : ۲۰) ان کی یہ تمام تدبیریں اللہ کو عاجز کرنے والی نہیں ہیں - لہٰذا اللہ جس وقت بھی چاہے ان پر اپنا عذاب نازل کر سکتا ہے اور خود اس دنیا میں بھی -

وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ (۱۱: ۲۰) "نہ اللہ کے مقابلے میں ان کا کوئی حامی تھا"۔ جو ان کو اللہ سے بچا سکتا یا اللہ کے مقابلے میں ان کی نصرت کر سکتا۔ لیکن اللہ نے ان لوگوں کو اخروی عذاب کے لیے یہاں مہلت دے دی ہے تاکہ وہاں ان کو دنیا اور آخرت دونوں کا عذاب دیا جائے۔

يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ (۱۱: ۲۰) "انہیں اب دہرا عذاب دیا جائے گا"۔ اس لیے کہ انہوں نے دنیا میں اپنی ان صلاحیتوں سے کام نہ لیا جن کے ذریعے وہ حقیقت کا ادراک کر سکتے تھے۔ انہوں نے زبردستی اپنی آنکھوں کو بند رکھا۔ وہ اس طرح تھے جیسے وہ نہ سن سکتے ہوں اور نہ دیکھ سکتے ہوں۔

مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ (۱۱: ۲۰) "وہ نہ کسی کی سن سکتے تھے اور نہ خود ہی انہیں کچھ سوجھتا تھا"۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (۱۱: ۲۱) "یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خود گھاٹے میں ڈالا"۔ یہ بہت ہی عظیم اور تباہ کن خسارہ ہے، اس لیے کہ اس کاروبار میں جو شخص خسارہ اٹھائے کوئی دوسرا شخص اس کی امداد نہیں کر سکتا۔ اس قسم کے لوگوں نے خسارہ اٹھا کر اپنی دنیا بھی ضائع کر دی، یہاں انہوں نے اپنے انسانی شرف کو بھی گنوایا۔ کیونکہ انسان کو یہاں شرف صرف اسلامی نظام زندگی کے ذریعے مل سکتا ہے اور انہوں نے آخرت بھی گنوا دی کیونکہ انہوں نے آخرت کا انکار کیا جس کی وجہ سے اخروی عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۱۱: ۲۱) "اور وہ سب کچھ ان سے کھو گیا جو انہوں نے گھڑ رکھا تھا"۔ دنیا میں انہوں نے جو جھوٹے خدا بنا رکھے تھے وہ سب غائب۔ اب کوئی بھی کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ سب ناپید اور گم ہو گئے۔

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ (۱۱: ۲۲) "ناگزیر ہے کہ وہی آخرت میں سب سے بڑھ کر گھاٹے میں رہیں گے"۔ اس قدر خسارے میں کہ دنیا و آخرت میں اس سے بڑھ کر کوئی خسارہ نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو تباہ کر دیا۔

اس کے مقابلے میں اہل ایمان ہیں اور وہ لوگ جو ایمان کے بعد عمل صالح بھی رکھتے ہیں، وہ اپنے رب کی جانب سے بے حد مطمئن ہوں گے، انہیں پورا وثوق ہو گا کہ ان کے اعمال صالح کا پورا پورا اجر ملے گا۔ نہایت ہی پرسکون، ہر قسم کی پریشانیوں اور شکوؤں سے دور۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۱۱: ۲۳) "رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اپنے رب

ہی کے ہو کر رہے 'تو یقیناً وہ جنتی لوگ ہیں اور جنت میں ہمیشہ رہیں گے"۔

اخبات کے معنی ہیں اطمینان 'استقرار' وثوق اور تسلیم و رضا۔یہ لفظ ایک حقیقی مومن اور اس کے رب کے درمیان پائے جانے والے تعلق کی بہت ہی اچھی تصویر کشی کرتا ہے۔مومن مکمل طور پر اللہ کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے۔اس کی طرف سے اس پر جو حالت بھی آتی ہے اس پر مطمئن ہوتا ہے اس کے نفس میں ایک ٹھہراؤ ہوتا ہے' اس کا دل مطمئن ہوتا ہے اور اسے امن 'قرار اور رضا کی کیفیت مل جاتی ہے اب دونوں پر تبصرہ

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِيْرِ وَ السَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۱۱ : ۲٤) "ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی تو ہو اندھا' بہرا اور دوسرا ہو دیکھنے اور سننے والا' کیا یہ دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تم (اس مثال سے) کوئی سبق نہیں لیتے"۔

یہ ایک حسی تصویر کشی ہے جس کے اندر دونوں فریقوں کو مجسم طور پر پیش کر دیا گیا ہے۔پہلا فریق ایک نابینا کی طرح جو کچھ دیکھ ہی نہیں سکتا' بہرے کی طرح ہے جو کچھ سن نہیں سکتا۔جس کے قوائے مدرکہ معطل ہیں اور وہ اعلیٰ مفاہیم کے ادراک سے عاجز ہے۔چونکہ اس کے اعضائے مدرکہ کام نہیں کرتے اس لیے وہ گویا ان اعضا ہی سے محروم ہے جبکہ دوسرا فریق ان سے کام لیتا ہے اور سمیع و بصیر ہے اور ان قوتوں سے اس کی عقل استفادہ کرتی ہے۔

آخر میں سوال کیا جاتا ہے کہ کیا یہ دونوں قسم کے لوگ برابر ہو سکتے ہیں؟ اور اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا کیونکہ جواب کی ضرورت ہی کیا ہے؟

بلکہ دوسرا سوال کر دیا جاتا ہے 'کہ کیا تم لوگ اس مثال سے سبق نہیں لیتے اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۱۱ : ۲٤) اس لیے کہ بات اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی گہرے غور و فکر کی تو ضرورت ہی نہیں ہے۔

---○○○---

# درس نمبر ۱۰۰ ایک نظر میں

قصص انبیاء اس سورت کا مرکزی موضوع ہے۔ لیکن ' اصل مقصود بذات خود قصہ نہیں ہے بلکہ اصل مقصود وہ حقیقت ہے جسے ان قصص کے ذریعے ثابت کیا جا رہا ہے اور سورت کے آغاز میں مجملاً اس کا تذکرہ کر دیا گیا ہے۔

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (۱) اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ (۲) وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ (۳) اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (٤) (۱۱: ۱ تا ٤ ))

''فرمان ہے جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوئی ہیں ' ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی۔ میں اس کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی۔ اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے''۔

سورت کے آغاز میں ان حقائق کے بارے میں متعدد اور مکرر بار تبصرہ ہو چکا ہے۔ زمین اور آسمان کے نظام ' انسانی نفس کی تخلیق اور حشر کے میدان کے مکالموں کے ذریعے ان حقائق کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب یہاں کرۂ ارض کے اطراف و اکناف میں بسنے والے انسانوں اور ان کی تاریخ کے حوالے سے ان حقائق کو پیش کیا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اسلام اور جاہلیت کی یہ کشمکش ایک تاریخی کشمکش ہے۔ اور ابتدائے آفرینش سے یونہی چلی آ رہی ہے۔

یہ قصص اس سورت میں قدرے تفصیل سے آئے ہیں ' خصوصاً حضرت نوح ؑ کا قصۂ طوفان۔ اس میں وہی نظریاتی کشمکش ہے جس کا سورت کے آغاز میں ذکر ہوا۔ اور وہی حقائق اس میں موضوع جدال ہیں جن کو لے کر ہر دور میں ہر رسول آیا ہے۔ گویا موجودہ مکذبین بھی وہی ہیں جو حضرت نوح ؑ سے ادھر تکذیب کرتے آئے ہیں۔ ان کا مزاج ایک ہے ' ان کی سوچ ایک جیسی ہے اور پوری تاریخ انسانی میں جس طرح رسولوں کی دعوت ایک ہے 'مکذبین کا جواب بھی ایک ہے۔

اس سورت کے قصے تاریخی ترتیب کے مطابق ہیں۔ آغاز حضرت نوحؑ سے ہوتا ہے' پھر حضرت ہودؑ' پھر حضرت صالحؑ کچھ اشارہ حضرت ابراہیمؑ کی طرف اور پھر بحث حضرت لوطؑ کی طرف چلی جاتی ہے' پھر حضرت شعیبؑ اور پھر حضرت موسیٰؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات آگے بڑھ جاتی ہے اور تاریخ ترتیب کو اس لیے یہاں بحال رکھا ہے کہ مقصد پچھلوں کو اگلوں کے انجام بد سے ڈرانا ہے اور یہ بتانا ہے کہ پوری انسانی تاریخ کا طرز عمل ایک جیسا ہے۔

قصہ نوحؑ تاریخی اعتبار سے بھی مقدم ہے' سورت میں بھی مقدم ہے تو لیجئے قصہ نوحؑ :

---ooo---

# درس نمبر۱۰۰ تشریح آیات

۲۵ --- تا --- ۴۹

---

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ٘ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌۙ۝۲۵ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ١ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ۝۲۶

"(اور ایسے ہی حالات تھے جب) ہم نے نوح علیہ السلام کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ (اس نے کہا) "میں تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک روز دردناک عذاب آئے گا"۔

یہ وہی الفاظ ہیں جو آغاز سورت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کے پیغام کے بارے میں کہے گئے ہیں کہ یہ کتاب ہے جس کی آیات پختہ ہیں اور مفصل ہیں اور ایک حکیم اور خبردار ذات کی طرف سے ہیں اور میں اس کی طرف سے نذیر اور بشیر ہوں۔ دعوت کے مفہوم اور مقصد کو ایک ہی جیسے الفاظ میں ادا کرنے سے یہ ثابت کرنا مطلوب ہے کہ تمام انبیاء کا مشن اور ان کی دعوت ایک ہی رہی ہے۔ ان کے نظریات ایک ہی رہے ہیں' اسی وجہ سے انداز تعبیر بھی ایک ہی جیسا اختیار کیا گیا ہے' یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ یہاں حضرت نوح علیہ السلام کے اپنے الفاظ کو نقل نہیں کیا گیا بلکہ ان کے مفہوم کو عربی میں ادا کیا گیا ہے اور یہی راجح مذہب ہے کیونکہ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی زبان کیا تھی؟

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۱۱: ۲۵) "(اور ایسے ہی حالات تھے جب) ہم نے نوح علیہ السلام کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ (اس نے کہا) "میں تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں"۔

یہاں متن قرآن میں لفظ "اس نے کہا" نہیں لایا گیا۔ ایک تو اس لیے کہ قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ گویا حضرت نوح علیہ السلام ہمارے سامنے کھڑے ہیں اور ایک زندہ اور چلتا پھرتا منظر ہمارے سامنے ہے اور آپ تقریر فرمارہے ہیں اور ہم سن رہے ہیں۔ اس لیے ماضی کا بیانی اور حکایتی انداز اختیار نہیں کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ یہاں فریضہ رسالت کو نہایت ہی مختصر الفاظ میں اور مختصر مفہوم میں بتا دیا گیا کہ "میں تم کو صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں"۔ یہ انداز سامعین کے وجدان میں مقاصد رسالت کو اچھی طرح ذہن نشین کر دیتا ہے"۔

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ (۱۱: ۲٦) "کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو" ۔ یہ اہداف رسالت کا تعین ہے کہ پیغمبر تمہارے سامنے صرف یہ ابتدائی حقیقت پیش کرتا ہے اور اگر اسے تسلیم نہ کیا گیا تو عذاب الٰہی آنے کا اندیشہ ہے ۔

اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ (۱۱: ۲٦) "ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک روز دردناک عذاب آئے گا" ۔ رسالت اور ڈراوے کی یہ اساسی حقیقتیں ہیں کہ میں تمہیں اس ہلاکت سے ڈراتا ہوں' اور بس اور ان ہی مختصر کلمات میں رسالت کے تمام اہداف کو مختصراً قلم بند کر دیا جاتا ہے ۔

یَوْمٍ اَلِیْمٍ (۱۱: ۲٦) دن دردناک نہیں ہے' الیم سے مراد مولم ہے ۔ الیم بمعنی مالوم ہے ۔ دراصل اس دن لوگ مالوم ہوں گے ۔ لیکن زیادہ مبالغے کے لیے یہ انداز تعبیر اختیار کیا گیا ہے کہ اس دن وقت بھی درد کو محسوس کرے گا ۔ دن بھی اس روز کے شدائد کو محسوس کرے گا ۔ اس سے لوگوں کے حالات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس قدر دردناک ہوں گے ۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ ﴿۲۷﴾

"جواب میں اس کی قوم کے سردار' جنہوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا' بولے: "ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے ۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذل تھے' بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے ۔ اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے ہو' بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں" ۔

یہ ہے اونچے طبقات کے متکبرین کا جواب' جو کسی بھی سوسائٹی کے صدر نشین ہوتے ہیں ۔ اور یہی جواب حضور ﷺ کو بھی آپ کی قوم قریش کے متکبرین نے دیا تھا ۔ وہ بھی کہتے تھے' ہم تو تمہیں اپنے جیسا انسان سمجھتے ہیں اور ہماری قوم کے کم درجے کے لوگوں نے بغیر سوچے تمہاری دعوت کو قبول کر لیا ہے اس لیے کہ عوام الناس گہری سوچ نہ رکھتے ۔ آخر تمہیں ہم پر کیا فوقیت حاصل ہے ۔ اس لیے ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں ۔

وہی شبہات' وہی الزامات' وہی تکبر و غرور' اور وہی جہالت اور کم فہمی جو قوم نوح ؑ نے اختیار کی اور یہ لوگ بھی اس مرض میں مبتلا ہیں ۔

انسانوں میں ہمیشہ یہ جہالت پائی جاتی رہی ہے کہ انسان حامل رسالت نہیں ہو سکتا اور اگر کسی انسان کو منصب رسالت عطا ہو سکتا ہے تو پھر یہ منصب کسی بادشاہ یا اس سے بھی کسی برتر مخلوق کو دیا جانا چاہئے ۔ یہ ایک نہایت ہی جاہلانہ

اور احمقانہ تصور ہے کہ وہ انسان جسے اللہ نے اس کرۂ ارض پر خلافت عطا کی' اور جس کو خلافت ارضی کی بھاری ذمہ داری سپرد کی گئی ہے وہ منصب رسالت کا اہل نہیں ہے کیونکہ منصب خلافت ارضی بھی تو ایک عظیم منصب ہے' اور ظاہر ہے کہ انسان کے اندر اللہ نے ایسی صلاحیتیں ودیعت کی ہوں گی جن کے ذریعے وہ اسے ادا کر سکے ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ جنس انسانی میں سے بعض افراد کو اس سے بھی بڑی صلاحیت عطا کر سکتا ہے کہ وہ اس کے ذریعے منصب رسالت کی ذمہ داریاں ادا کر سکے اور اپنی مخلوق میں سے اللہ جسے چاہے یہ ذمہ داریاں عطا کر دے ۔ کیونکہ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس نے کس ذات کے اندر یہ صلاحیت رکھی ہے تاکہ اس کے اندر یہ منصب بھی رکھ دے ۔

دوسری غلط فہمی انسانوں کو ہمیشہ یہ لاحق رہی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو یہ منصب عطا بھی کرتا ہے تو یہ منصب ان بڑوں اور مالداروں کا حق ہے 'کیونکہ وہ پہلے سے اپنی قوم پر مسلط ہیں اور ایک بلند مرتبہ رکھتے ہیں ۔ یہ درحقیقت ان اقدار سے لاعلمی ہے جو اللہ نے اس مخلوق انسانی کے لیے محترم گردانی ہیں اور جن کی وجہ سے انسان خلافت ارضی کا مستحق ہوا ہے اور پھر ان میں سے مزید اونچے مرتبے والے لوگ منصب رسالت کے اہل گردانے گئے ہیں ۔ ان اقدار کا تعلق مال اور مرتبے اور زمین پر قوت سے نہیں ہے ۔ ان کا تعلق نفس انسانی سے ہے اور یہ کہ کوئی نفس آیا اپنے اندر وہ مخصوص قوت رکھتا ہے جو عالم بالا سے رابطہ رکھ سکے ۔ اس رابطے کے لیے مال و دولت اور عزت مرتبے کی نہیں بلکہ خاص روحانی قوتوں اور صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ جو اس امانت کبریٰ اور منصب دعوت اور اقدار کو قبول کرنے کی استعداد رکھتی ہوں ۔ اور اس راہ میں مشکلات پر صبر کرنے کی صلاحیت بھی اس میں ہو ۔ یعنی وہ صفات جو منصب نبوت کے لیے ضروری ہوں ۔ ان صفات کا تعلق مال اور جاہ سے نہیں ہے اور نہ سوشل مقام و مرتبے سے ہے ۔

لیکن اس کے برعکس حضرت نوحؑ کی قوم کے اونچے طبقات کا خیال یہ تھا جیسا کہ ہر سوسائٹی کے اونچے طبقات یہ خیال رکھتے ہیں کیونکہ وہ اپنے اونچے مرتبے کی وجہ سے اندھے ہو جاتے ہیں اور مقام نبوت کے ادراک سے قاصر رہتے ہیں ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کوئی بشر نبی نہیں ہو سکتا اور اگر ہو سکتا ہے' تو پھر اس مقام کے وہ حقدار ہیں ۔

مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا "ہماری نظر میں تو تم ہم جیسے انسان ہو" ۔ ایک تو یہ بات ہے اور دوسری یہ ہے کہ

وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ (۱۱ : ۲۷) "اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذل تھے' بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے" ۔

یہ لوگ غریبوں کو "اراذل" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں اور ہمیشہ متکبرین ان لوگوں کو رزیل سمجھتے ہیں جن کو دولت و اقتدار نصیب نہیں ہوتا ۔ حالانکہ رسولوں اور اسلامی تحریکات میں ہمیشہ غریب اور سلیم الفطرت لوگ ہی سب سے پہلے دلچسپی لیتے ہیں اور اونچے لوگوں کے مقابلے میں وہ سچائی کو جلدی قبول کرتے ہیں ۔ ان کے دل رب واحد کے ساتھ زیادہ جڑے ہوتے ہیں ۔ جو بلند اور قاہر ہے ۔ اس لیے کہ مالداری' عیاشی اور سرکشی نے ان کی فطرت کو بگاڑا نہیں ہوتا' اس لیے ان کے ہاں قبولیت حق کی راہ میں رکاوٹیں کم ہوتی ہیں ۔ غریب لوگوں کو یہ ڈر نہیں ہوتا کہ اسلام قبول کر کے وہ اس چراے ہوئے مقام کو گنوا دیں گے جو جمہور لوگوں کی غفلت اور نادانی کی وجہ سے انہوں نے حاصل کر لیا ہوتا ہے اور جمہور

عوام کو بت پرستی اور شاہ پرستی میں مبتلا کر دیا ہوتا ہے اور سب سے بڑی بت پرستی تو یہ ہوتی ہے کہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر اپنے جیسے لوگوں کو بڑا بنا کر اور انہیں زمین کا اقتدار دے کر ان کا اتباع اور پرستش کریں ۔ تمام رسولوں کی دعوت تو دراصل عوام الناس کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے آزادی کی دعوت ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے اس دعوت کا مقابلہ سوسائٹی کے اکابر کرتے ہیں' اور جمہور عوام کو بھی یہ دعوت دی جاتی ہے کہ اسے قبول نہ کیا جائے اور وہ پیغمبر کی دعوت کو للکارتے ہیں' ان پر الزامات عائد کرتے ہیں اور لوگوں کو اس سے متنفر کرتے ہیں ۔

ذرا ان لوگوں کے الفاظ پر تو غور کرو ''ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذل تھے 'بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے'' ۔ یعنی انہوں نے تمہاری دعوت پر غور و فکر نہیں کیا ہے ۔ یہ ہے وہ الزام جو ہر دور میں سوسائٹی کے بلند اور بااثر طبقات اہل ایمان کی خلاف عائد کرتے ہیں' یہ کہ یہ لوگ بھولے بھالے ہوتے ہیں اور ان میں غور و فکر نہیں ہوتا ۔ اور بڑے لوگوں کے لیے یہ موزوں نہیں ہے کہ وہ عوام الناس کے پیچھے چلیں ۔ اب چونکہ یہ مومن ہو گئے ہیں اس لیے ہم کیسے مومن ہو سکتے ہیں کیونکہ بڑے لوگ چھوٹے لوگوں کے ایمان اور دعوت کا اتباع کیسے کر سکتے ہیں ۔

وَمَا نَرٰی لَکُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ (۱۱:۲۷) ''اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے ہو'' ۔ اب یہ لوگ داعی اور متبعین دونوں کے خلاف ایک ہی تبصرہ کرتے ہیں' کہ اہل ایمان کو ہمارے اوپر کوئی برتری حاصل نہیں ہے کہ تم لوگ زیادہ ہدایت یافتہ سمجھے جاؤ' یا تم لوگ ہمارے مقابلے میں زیادہ سچائی کے قریب ہو ۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو ہم تم سے پہلے ہوتے ۔ غرض وہ ہدایت کو بھی دنیا پرستی پر قیاس کرتے ہیں کہ دنیا پرستی کے معاملے میں ہم سے کوئی آگے نہیں ہے تو دین کے معاملے میں کیسے آگے ہو گیا ۔ کیونکہ ہم معاملات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ہمارے پاس اقتدار ہے ۔ لہٰذا اہل ثروت اور اہل اقتدار ہی افضل ہو سکتے ہیں ۔ اور زیادہ سمجھدار ہو سکتے ہیں ۔ جب کسی معاشرے سے عقیدۂ توحید غائب ہو جاتا ہے تو اس معاشرے کی ذہنیت وہ بن جاتی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ۔ جب بھی عقیدۂ توحید ختم ہوا' لوگ جاہلیت کی طرف لوٹ گئے اور انہوں نے مختلف پہلوؤں سے بت پرستی اختیار کر لی ۔ اگرچہ بظاہر ایسا معاشرہ نہایت سلجھا ہوا اور ترقی یافتہ نظر آتا ہے لیکن درحقیقت یہ پوری انسانیت کی پسماندگی ہوتی ہے ۔ کیونکہ ایسی سوسائٹی ان اقدار کی تحقیر کرتی ہے جن اقدار کی وجہ سے انسان 'انسان' بنتا ہے ۔ اور انہی کی وجہ سے انسان خلافت ارضی کا مستحق ٹھہرا ہے اور انہی کی وجہ سے انسان کو عالم بالا سے منصب نبوت عطا ہوا ۔ یہی وہ تصورات ہیں جن کی بنا پر انسان عالم بالا سے دور ہو کر خالص حیوانیت اور مادیت اور جسمانیت کے قریب چلا جاتا ہے ۔

بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ (۱۱:۲۷) ''بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں'' ۔ یہ وہ آخری الزام ہے جو وہ رسول اور آپ کے متبعین کے سر تھوپتے ہیں' لیکن اس میں بھی وہ اپنی متکبرانہ شان سے بات کرتے ہیں کہ ''ہم یہ سمجھتے ہیں ہمیں یہ گمان ہے'' ۔ یہ محتاط انداز گفتگو ہے جسے یہ مالدار طبقہ اپنایا کرتا ہے ۔ کیونکہ ان کے خیال میں ہر بات پر یقین کر لینا اور دو ٹوک بات کرنا ایک عامی بات ہے اور سطحی رائے والے نادان لوگ فوراً یقین کر لیتے ہیں ۔ یہ تو بڑے لوگ ہیں جو مفکرانہ انداز میں تحفظ کے ساتھ بات کرتے ہیں ۔

یہ ہے مزاج ان لوگوں کا جو مالدار ہوتے ہیں' جو فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے ہیں' جو اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں اور جن کی گردنیں موٹی اور پیٹ پھولے ہوئے ہوتے ہیں۔

حضرت نوح عم ان الزامات' اس سرکشی اور استکبار کو نہایت ہی خوش اخلاقی کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔ وہ یقین' ثابت قدمی اور نہایت ہی ٹھنڈے انداز میں اس سچائی کو ان کے سامنے پیش کرتے ہیں جو اللہ نے ان پر نازل کی ہے۔ وہ نہایت ہی وضاحت سے بات کرتے ہیں' نہایت ہی سلجھے ہوئے انداز میں گہرے شعور اور یقین کے ساتھ ان سے ہمکلام ہوتے ہیں۔ وہ ان کی زبان میں بات نہیں کرتے' وہ الزام کا جواب الزام سے نہیں دیتے۔ وہ ایسا دعویٰ نہیں کرتے جو وہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے بارے میں حقیقی تاثر کے بجائے کوئی مبالغہ آمیز تصور نہیں دیتے۔ وہ اپنی رسالت اور منصب رسالت کے بارے میں ان کے سامنے نہایت ہی حقیقی بات کرتے ہیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

"اس نے کہا "اے برادران قوم' ذرا سوچو تو سہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ کو اپنی خاص رحمت سے بھی نواز دیا مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو تمہارے سر چپیک دیں؟ اور اے برادران قوم' میں اس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا' میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور میں ان لوگوں کو دھکے دینے سے بھی رہا جنہوں نے میری بات مانی ہے' وہ آپ ہی اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔ اور اے قوم' اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کی پکڑ سے کون مجھے بچانے آئے گا؟ تم لوگوں کی سمجھ میں کیا اتنی بات بھی نہیں آتی؟ اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں' نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں' نہ یہ میرا دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں اور یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو تمہاری آنکھیں حقارت سے دیکھتی ہیں انہیں اللہ نے کوئی بھلائی نہیں

ان کے نفس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو ظالم ہوں گا"۔

"اے برادران قوم" کس قدر مہذب، پرخلوص داعیانہ خطاب ہے! ان کی نسبت اپنی طرف اور اپنی نسبت ان کی طرف۔ آپ فرماتے ہیں کہ تم اعتراض یہ کرتے ہو کہ میں تمہارے جیسا ایک آدمی ہی ہوں تو بظاہر تمہاری بات تو درست ہے لیکن اگر میرا میرے رب کے ساتھ پیغمبرانہ اتصال ہو تو ذرا سوچو تمہاری اس رائے کے نتائج تمہارے لیے کس قدر خطرناک ہو سکتے ہیں۔ میں تو واضح طور پر اپنے رب کے ساتھ رابطہ رکھتا ہوں۔ اور مجھے اس کا شعور بھی ہے اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس سے تم لوگ محروم ہو۔ اللہ نے مجھے اپنا رسول ہونے کا منصب دیا ہے اور یہ اس کی جانب سے میرے لیے رحمت ہے یا مجھے ایسے خصائص عطا کیے جن کی بنا پر میں اس رحمت الٰہی کا حامل ہو گیا ہوں اور یہ بے شک ایک عظیم رحمت ہے۔ تم اس پوزیشن پر بھی ذرا غور کر لو کہ اگر مجھ پر یہ رحمت ہو۔ اور تم اس کو سمجھ نہ پا رہے ہو، کیونکہ تم عقل کے اس قدر کورے ہو کہ اس عظیم حقیقت کے ادراک ہی سے محروم ہو۔ تم اس کو دیکھ نہیں سکتے ہو تو ہمارے پاس اب اور کیا ذریعہ ہے کہ ہم اس حقیقت کو زبردستی تمہارے ذہن میں ڈال دیں۔ نہ میں ایسا کر سکتا ہوں اور نہ ایسا کرنا میرے فرائض میں شامل ہے۔ خصوصاً جب کہ تم اس کے تسلیم کرنے کو ناپسند کرتے ہو۔ جب نفرت کی خلیج حائل ہے تو تم سمجھ ہی کب سکتے ہو۔

حضرت نوحؑ نہایت پیار کے ساتھ ان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ فرماتے ہیں اور ان کے احساس کو تیز فرماتے ہیں تاکہ وہ ان بلند حقائق کو سمجھنے کی سعی کریں۔ اور رسالت کے بارے میں وہ جس غلط فہمی اور غفلت کا شکار ہیں اس سے باہر نکل آئیں۔ ان کو حضرت نوحؑ یہ حقیقت سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ رسالت کا معاملہ اس قدر سطحی نہیں ہے جس قدر وہ اسے سمجھ رہے ہیں۔ لیکن حضرت نوحؑ اپنے اس نرم کلام میں ان کو یہ عظیم اصول بتا رہے ہیں کہ عقیدے کا معاملہ خالص کسی شخص کی سمجھ پر موقوف ہے اور کسی عقیدے کا اختیار ایک شخص کے ذاتی غور و فکر پر منحصر ہے۔ اس باب میں کسی پر کوئی زبردستی نہیں کی جا سکتی اور نہ کسی پر کوئی عقیدہ ٹھونسا جا سکتا ہے۔ خواہ کوئی جس قدر جبر اور تشدد چاہے، اختیار کر لے۔

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ (۱۱ : ۲۹) "اور اے برادران قوم، میں اس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور میں ان لوگوں کو دھکے دینے سے بھی رہا جنہوں نے میری بات مانی ہے، وہ آپ ہی اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو"۔

اے برادران قوم، جن لوگوں کو تم "رذیل" کہتے ہو یہ تو وہ لوگ ہیں جنہیں میں نے دعوت دی اور انہوں نے میری دعوت قبول کر لی اور ایمان لے آئے اور میرا مطالبہ لوگوں سے فقط یہ ہے کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اس کے سوا میرا ان پر کوئی حق نہیں ہے۔ میں جو دعوت دے رہا ہوں، اس کے عوض میں ان سے کوئی معاوضہ طلب کرنے کا حقدار نہیں ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں فقراء کے مقابلے میں امراء کے درپے ہو جاتا۔ میرے نزدیک تمام لوگ برابر ہیں، فقیر ہوں کہ

امیر۔ جو شخص لوگوں کی دولت میں دلچسپی نہیں رکھتا اس کے نزدیک فقراء اور امراء ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ (۱۱ : ۲۹) "میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے"۔ صرف اللہ کے ذمہ' اس کے سوا کسی اور سے میں کسی قسم کے معاوضے کا طلبگار ہی نہیں۔

وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۱۱ : ۲۹) "اور میں ان لوگوں کو دھکے دینے والا بھی نہیں' جو ایمان لائے ہیں"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید انہوں نے ایسا کوئی مطالبہ کیا تھا یا ایسے اشارات دیئے تھے کہ وہ ان عوام الناس کے ساتھ اکٹھے نہیں بیٹھ سکتے۔ اگر ان کو دور کر دیا جائے تو وہ ایمان لانے پر غور کر سکتے ہیں کیونکہ وہ مجلس نوحؑ میں ان رذیل لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے۔ نہ وہ یہ برداشت کر سکتے ہیں کہ ہم جیسے بڑے لوگ ان رذیلوں کے طریقے پر چلیں۔ میں ان لوگوں کو دھکے دینے والا نہیں۔ یعنی مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا وہ تو ایمان لے آئے ہیں۔ اب وہ جانیں اور ان کا رب جانے۔

اِنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ "وہ آپ ہی اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں"۔

وَلٰکِنِّیْٓ اَرٰکُمْ قَوْمًا تَجْھَلُوْنَ (۱۱ : ۲۹) "مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو"۔ یعنی تم ان اقدار کو نہیں سمجھ سکتے جن کے ساتھ اللہ کے ترازو میں لوگ تولے جاتے ہیں۔ اور تم اس حقیقت کو بھی نہیں سمجھتے کہ سب لوگوں کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔

وَیٰقَوْمِ مَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰہِ اِنْ طَرَدْتُّھُمْ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ (۱۱ : ۳۰) "اور اے قوم' اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کی پکڑ سے کون مجھے بچانے آئے گا؟ تم لوگوں کی سمجھ میں کیا اتنی بات بھی نہیں آتی؟"

اللہ موجود ہے' وہ فقراء کا بھی رب ہے اور اغنیاء کا بھی رب ہے۔ ضعیفوں کا بھی والی ہے اور طاقتوروں کو بھی سہارا دینے والا ہے۔ اللہ کے ہاں جو اقدار وزن رکھتی ہیں وہ اور ہیں۔ وہاں ایک ہی ترازو ہے' ترازوئے ایمان باللہ۔ لہٰذا یہ لوگ جو ایمان لا چکے ہیں' اب اپنے رب کی حفاظت میں ہیں۔

وَیٰقَوْمِ مَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰہِ اِنْ طَرَدْتُّھُمْ (۱۱ : ۳۰) "اور اے قوم' اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کی پکڑ سے کون مجھے بچانے آئے گا؟" جب میں نے اللہ کی قائم کردہ اقدار کو پامال کر دیا۔ اور اللہ کے ان بندوں پر زیادتی شروع کر دی جو ایمان لے آئے ہیں اور دعوت قبول کر لی۔ یہ لوگ تو اللہ کے ہاں معزز ہیں۔ اس صورت میں تو میں دراصل تمہاری اقدار کو قائم کرنے والا بن جاؤں گا حالانکہ اللہ نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہی اس لیے ہے کہ میں ان کھوٹی قدروں کو بدل کر رکھ دوں' اس لیے نہیں کہ میں خود ان کی پیروی کروں۔

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۱۱ : ۳۰) "تم لوگوں کی سمجھ میں کیا اتنی سی بات نہیں آتی"۔ تم جن اقدار کی پیروی کر رہے ہو، وہ کھوٹی ہیں اور انہوں نے تمہیں فطری اقدار بھلا دی ہیں۔

اس کے بعد حضرت نوحؑ ان کے سامنے اپنی شخصیت اور رسالت کی حقیقت نہایت ہی واضح طور پر رکھتے ہیں۔ بالکل سادہ اور غیر مصنوعی حقائق کی شکل میں۔ رسول کی شخصیت اور منصب رسالت کو دنیا کی کھوٹی قدروں سے بالکل الگ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ حقیقت کو سمجھ سکیں اور یہ جان سکیں کہ اللہ کے ہاں حقیقی قدریں کیا ہیں تاکہ ان کے سامنے دنیا کی ظاہری قدریں الگ ہو جائیں اور حقیقی قدریں صاف اور ستھری ہو کر واضح ہو جائیں تاکہ رسول اور رسالت اپنی اصلی شکل میں، بغیر کسی ملمع کاری کے ان کے سامنے ہوں چاہے وہ قبول کریں یا نہ کریں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے :

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ (۱۱ : ۳۱) "اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں"۔ اس لیے میں نہ دولت مندی کا دعویٰ کرتا ہوں اور نہ یہ قدرت رکھتا ہوں کہ تمہیں دولت مند بنا دوں۔

وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (۱۱ : ۳۱) "نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں"۔ تاکہ میں کسی ایسی قوت کا دعویٰ کروں جو عام انسانوں کے پاس نہیں ہے، ماسوائے تعلق رسالت کے"۔

وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ (۱۱ : ۳۱) "نہ میرا دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں"۔ تاکہ میں عام انسانوں کے مقابلے میں کسی بلند تر جھوٹی صفت کا دعویٰ کروں اور تمہاری نظروں میں، میں بلند تر ہو جاؤں اور اپنی قیادت اور سیادت تم سے منوا سکوں۔

وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا (۱۱ : ۳۱) "اور یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو تمہاری آنکھیں حقارت سے دیکھتی ہیں، انہیں اللہ نے کوئی بھلائی نہیں دی"۔ تاکہ اس طرح میں سوسائٹی کے ان مستکبرین کو راضی کر سکوں یا اس طرح میں تمہاری دنیاوی سطحی اقدار اور عارضی رسومات کے ساتھ ہاں میں ہاں ملاؤں۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (۱۱ : ۳۱) "ان کے نفس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے"۔ ان لوگوں کی حقیقت کا حال بھی اللہ ہی جانتا ہے۔ میں ان کے ساتھ ان کے ظاہری حالات کے مطابق ہی معاملہ کر سکتا ہوں۔ اور ان کا ظاہری حال اس بات کا مستحق ہے کہ میں ان کی قدر کروں اور یہ امید رکھوں کہ اللہ ان کا انجام اچھا کرے گا۔

اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۱۱ : ۳۱) "اگر میں ایسا کہوں تو ظالم ہوں گا"۔ اگر مذکورہ بالا دعاوی میں سے کوئی دعویٰ بھی میں نے کیا۔ اس صورت میں گویا میں سچائی کے ساتھ ظلم کروں گا حالانکہ مجھے حکم یہ دیا گیا ہے کہ میں سچائی کی تبلیغ کروں اور میں اپنے آپ کو غضب الٰہی کا مستحق ٹھہرا کر خود اپنے اوپر بھی ظلم کروں گا اور لوگوں سے ساتھ

بھی ظلم کروں گا کیونکہ میں ان کو وہ مقام دوں گا جو انہیں اللہ نے نہیں دیا ہے۔

اس طرح حضرت نوح عم اپنی ذات اور اپنے منصب رسالت سے ان جھوٹی اقدار کو جھاڑ دیتے ہیں جو ان کی قوم نے تصور رسول اور تصور رسالت کے ساتھ وابستہ کر رکھی تھیں۔ اور اپنی قوم کے سامنے رسول اور رسالت کو اپنے حقیقی روپ میں پیش فرماتے ہیں اور ان تمام سطحی اور جعلی تصورات سے ان حقائق کو پاک کر کے پیش فرماتے ہیں کیونکہ کسی بھی حقیقت کو مصنوعی رنگ و روغن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ سچائی کو اپنے حقیقی روپ میں اپنی حقیقی قوت کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور نہایت ہی محبت بھری اپیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں تاکہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوں اور اگر ان کی قسمت میں کچھ لکھا ہے تو اپنا حصہ وصول کر لیں۔ غرض حضرت نوحؑ کی دعوت میں نہ ہیر پھیر ہے' نہ کوئی کھوٹ ہے' نہ کوئی بناوٹ ہے' نہ کسی حقیقی قدر کی قربانی ہے۔ سیدھی سادی بات اپنے حقیقی روپ میں وہ پیش فرماتے ہیں۔ آپ اللہ کے سوا کسی اور کی رضامندی نہیں چاہتے اور پوری انسانی تاریخ کو دعوت پیش کرنے کا ایک نمونہ دیتے ہیں کہ سچائی کو اپنے حقیقی روپ میں پیش کرو' بغیر کسی ہیر پھیر کے' بغیر اس کے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی رضامندی مطلوب ہو۔ البتہ نہایت ہی ترغیبی اسلوب میں ہو۔

اب اس مقام پر قوم نوحؑ' صداقت نوحؑ' دلائل نوح اور اسلوب نوحؑ کے مقابلے سے عاجز آ جاتی ہے۔ چنانچہ وہ ضد پر اتر آتے ہیں اور محبت اور دلیل کا جواب استکبار اور ہٹ دھرمی سے دیتے ہیں اور اب بحث و مباحثہ اور غور و فکر کی راہ کو ترک کر کے وہ چیلنج دینے پر اتر آتے ہیں۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾

"آخر کار ان لوگوں نے کہا کہ "اے نوح' تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت کر لیا۔ اب تو بس وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو' اگر سچے ہو"۔

یہ ایک انوکھا انداز ہے' عاجزی نے قوت کا لباس پہن رکھا ہے۔ ضعیفی توانائی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ درحقیقت یہ لوگ ڈرتے تو ہیں لیکن زبان سے انکار کر کے نیز چیلنج کے الفاظ کا سہارا دے کر بہادری کا جھوٹا مظاہرہ کرتے ہیں۔

فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۱۱ : ۳۲) "اب تو بس وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو' اگر سچے ہو"۔ وہ دردناک عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے رہے ہو اب ہم پر نازل کر دو' ہم تو کسی صورت میں تصدیق کرنے والے نہیں ہیں اور ہم تمہارے ڈراوے کی اب کوئی پروا نہیں کرتے۔

اب ذرا دیکھئے کہ حضرت نوحؑ کا رد عمل کیا ہے؟ یہ تکذیب اور یہ معاندانہ چیلنج ان کو ایک دینی اور رسول کریم کے جادۂ مستقیم سے نہیں ہٹا سکتا۔ وہ حق اور صداقت کی تبلیغ سے ہاتھ نہیں کھینچ لیتے۔ وہ مسلسل ان کے سامنے وہ سچائی پیش کرتے چلے جاتے ہیں' بھلایا ہوا سبق یاد کراتے جا رہے ہیں حالانکہ ان کا رویہ بہت ہی جاہلانہ ہے اور وہ مطالبہ کر رہے

ہیں کہ لے آیئے وہ عذاب! آپ ان کو یہ جواب دیتے ہیں کہ بھائیو! میں تو فقط رسول ہوں اور میری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ پیغام تم تک پہنچا دوں ۔ رہا عذاب الٰہی تو وہ امر الٰہی کے تابع ہے اور تمام امور کی تدبیر تو اللہ کرتا ہے ۔ یہ فیصلہ اللہ کرتا ہے کہ عذاب جلدی لے آئے یا اسے کسی وقت تک موخر کر دے ۔ یہ اس کی سنت کے مطابق آئے گا اور سنت الٰہیہ میں کبھی تخلف نہیں ہوتا ۔ ایک نبی نہ تو سنت الٰہیہ میں تبدیلی کر سکتا ہے اور نہ اس کا رخ پھر سکتا ہے ۔ رسول کا فریضہ اور ذمہ داری فقط یہ ہے کہ وہ آخری لمحے تک تبلیغ کرتا رہے ۔ لوگوں کی جانب سے تکذیب اور روگردانی اور چیلنج کی وجہ سے رسول کبھی اپنا کام نہیں چھوڑتا ۔

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَ مَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾

"نوح ؑ نے جواب دیا" وہ تو اللہ ہی لائے گا' اگر چاہے گا' اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے روک دو ۔ اب اگر میں تمہاری کچھ خیر خواہی کرنا بھی چاہوں' تو میری خیر خواہی تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی جب کہ اللہ ہی نے تمہیں بھٹکا دینے کا ارادہ کر لیا ہو' وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تمہیں پلٹنا ہے" ۔

اگر سنت الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ تم اپنی گمراہی کی وجہ سے ہلاک ہو جاؤ تو یہ سنت تم پر جاری ہو کر رہے گی' چاہے میں جس قدر جدوجہد کروں' اس لیے نہیں کہ اللہ تمہیں میری نصیحت سے استفادہ کرنے سے روکتے ہیں' بلکہ اس لیے کہ تم اپنے اختیار تمیزی کو اس طرح استعمال کر رہے ہو کہ سنت الٰہی کے مطابق تم اس انجام تک پہنچ جاؤ گے ۔ اور اس سلسلے میں تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے ہو ۔ تم تو دائماً اس کے قبضہ قدرت میں ہو' اللہ ہی تدبیر امور کرتا ہے ۔ اور تقصیرات کا تعین کرتا ہے ۔ تم سب نے اسی کی طرف لوٹنا ہے' حساب و کتاب دینا ہے اور جزاء و سزا کا مستحق قرار پاتا ہے ۔

هُوَ رَبُّكُمْ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۱۱ : ۳۴) "وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم کو پلٹنا ہے" ۔

---ooo---

قصے کے اس مرحلے پر روئے سخن اچانک پلٹتا ہے ۔ اب ایک بات قریش مکہ اور مشرکین مکہ کی طرف بھی' کیونکہ ان کی حالت بھی ایسی ہی تھی جیسے حضرت نوح ؑ کی قوم کی تھی ۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ یہ قصے اپنی جانب سے گھڑتے ہیں' تو درمیان میں اچانک بات کاٹ کر ان کے اس اعتراض کا جواب دے دیا جاتا ہے اور بعد میں قصہ پھر شروع ہو جاتا ہے ۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَ اَنَا

۳
بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿۳۵﴾ ۱۱ع
۳

"اے نبی" کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ سب کچھ خود گھڑ لیا ہے؟ ان سے کہو "اگر میں نے یہ خود گھڑا ہے تو مجھ پر اپنے جرم کی ذمہ داری ہے' اور جو جرم تم کر رہے ہو' اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں"۔

افتراء پردازی بے شک ایک بڑا جرم ہے۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دیں کہ اگر میں نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے تو اس کا گناہ مجھ پر ہے۔ جب مجھے معلوم ہے کہ یہ بہت بڑا جرم ہے تو میں کیسے اس کا ارتکاب کر سکتا ہوں اور تم جو مجرمانہ تہمت مجھ پر لگا رہے ہو تو میں اس سے بھی بری الذمہ ہوں' نیز اس کے علاوہ تم جن دوسرے جرائم کا ارتکاب کر رہے ہو' یعنی شرک اور تکذیب اس سے بھی۔

یہ جملہ معترضہ سیاق قصہ میں برا نہیں لگتا اس لیے کہ سیاق قصہ کی غرض و غایت بھی تو یہی ہے جس کی اس جملے میں تصریح کر دی گئی۔

---ooo---

اب قصہ نوح دوبارہ شروع ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا منظر سامنے آتا ہے۔ حضرت نوح ؑ اب اپنے رب کی طرف سے ہدایات پاتے ہیں اور احکام الہی یوں وارد ہیں:

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾

"نوح ؑ پر وحی کی گئی کہ تمہاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے' بس وہ لا چکے' اب کوئی ماننے والا نہیں ہے۔ ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑو اور ہماری نگرانی میں ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنانی شروع کر دو۔ اور دیکھو جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حق میں مجھ سے کوئی سفارش نہ کرنا' یہ سارے کے سارے اب ڈوبنے والے ہیں"۔

اب دعوت و تبلیغ کا وقت گزر گیا۔ اب ڈرانے اور دھمکانے کا باب ختم' نمائش بہت ہو چکی۔

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ (۱۱: ۳۶) "نوح ؑ پر وحی کی گئی کہ تمہاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے' بس وہ لا چکے' اب کوئی ماننے والا نہیں ہے"۔

جو دل ایمان لانے کے لیے آمادہ تھے وہ ایمان لا چکے' جو رہ گئے ان کے اندر ایمان لانے کی استعداد باقی نہیں رہی ہے۔ نہ وہ اس طرف کوئی رجحان رکھتے ہیں۔ یہ تھی اللہ کی جانب سے حضرت نوح ؑ کو آخری اطلاع اور یہ اللہ کی جانب سے تھی اور اللہ تو علیم ہے۔ لہذا اب دعوتی مہم جاری رکھنے کا کوئی فائدہ نہ رہا۔ اور کہہ دیا گیا کہ اب ان کی جانب

سے کفر تکذیب اور خندہ و استہزاء کی کوئی پروا نہ کرو۔

فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۱۱: ۳۶) "ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑ دو"۔ آپ اپنی ناکامی پر رنج والم محسوس کرنا چھوڑ دیں۔ اور یہ لوگ جو کرتے رہے' اور جو کر رہے ہیں اس کی کوئی پروا نہ کریں۔ خود اپنی فکر بھی نہ کریں وہ آپ کو کچھ بھی تکلیف نہیں پہنچا سکتے۔ اور نہ ان کے لیے حسرت کریں کیونکہ ان سے خیر کی کوئی توقع نہیں ہے۔ لہٰذا ان کا معاملہ یہاں ختم کر دیجئے۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا "اور ہماری نگرانی میں ہماری وحی کے مطابق یہ کشتی بنانی شروع کر دو"۔ ہماری مرضی اور ہدایات کے مطابق۔

وَلَا تُخَاطِبْنِىْ فِى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ (۱۱: ۳۷) "اور دیکھو جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حق میں مجھ سے کوئی سفارش نہ کرنا' یہ سارے کے سارے اب ڈوبنے والے ہیں"۔

ان کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے اور ان کا انجام اب متعین ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب آپ ایسے لوگوں کے بارے میں مجھ سے بات نہ کریں۔ نہ ان کی ہدایات کے لیے دعاء کریں اور نہ ہی بد دعا کیونکہ دوسری جگہ قرآن مجید میں یہ آیا ہے کہ حضرت نوح ؑ نے ان کے خلاف بد دعا فرمائی۔ لہٰذا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مایوسی اس کے بعد تھی۔ جب فیصلہ ہو چکا تو اللہ کے ساتھ خطاب ممنوع ہو گیا۔

---ooo---

اب ایک تیسرا منظر سامنے آتا ہے۔ حضرت نوح ؑ کشتی بنا رہے ہیں۔ آپ نے اپنی قوم سے اب علیحدگی اختیار کر لی ہے اور ان کو دعوت دینا بند کر دیا ہے اب ان کے ساتھ کوئی مکالمہ نہیں ہے۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۣ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ۭ
قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۝۳۸ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ
يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝۳۹

"نوح ؑ کشتی بنا رہا تھا اور اس کی قوم کے سرداروں میں سے جو کوئی اس کے پاس سے گزرتا تھا وہ اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ اس نے کہا "اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں' عنقریب تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے گا اور کس پر وہ بلا ٹوٹ پڑتی ہے جو ٹالے نہ ٹلے گی"۔

ذرا انداز کلام ملاحظہ ہو' حالیہ فعل کو فعل مضارع کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔ اس سے کلام میں نہایت ہی سنجیدگی اور سرگرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب ہم اپنی تصوراتی دنیا میں گم ہو کر دیکھ رہے ہیں کہ حضرت نوح کشتی بنا رہے ہیں۔

اور ان کی قوم کے لوگ گروہ در گروہ ان کے پاس سے گزر رہے ہیں۔ اور مذاق کر رہے ہیں۔ یہ مذاق کس کے ساتھ کر رہے ہیں اس شخص کے ساتھ جو ان سے کہتا تھا کہ وہ رسول رب العالمین ہے۔ ان کو دعوت دیتا تھا۔ ان سے ساتھ بحث و مباحثہ کر رہا تھا اور یہ مکالمہ ایک طویل عرصے تک جاری رہا تھا۔ لیکن یہ پیغمبر اب بڑھئی کا کام کر رہے ہیں۔ اور یہ لوگ مذاق اس لیے کرتے تھے کہ یہ صرف ظاہری امور کو دیکھ سکتے تھے۔ اس فعل کے پیچھے جو اللہ کے احکامات و ہدایات تھیں' وہ ان کی نظروں سے اوجھل تھیں۔ وہ تو مویشیوں کی طرح صرف ظاہری امور کو دیکھ رہے تھے۔ ظاہری حالات کے پس پشت جو حکمت ربانی اور جو تقدیر الٰہی کام کر رہی تھی وہ پردے میں تھی۔ رہے نوح تو وہ پوری طرح مطمئن تھے۔ اللہ کا جو فرمان ہے وہ ہو کر رہے گا۔ وہ ان کے مذاق کے مقابلے میں نہایت ہی اطمینان' سربلندی اور بڑی شان سے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ وہ کہتے جاتے :

اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ (۱۱:۳۸) "اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں"۔ ہم تمہارے ساتھ اس لیے مذاق کر رہے ہیں کہ تم معاملات و واقعات کے پس منظر سے نابلد ہو۔ اللہ کی تقدیر تمہارے انتظار میں ہے۔ اور تمہارا انجام تمہارے سامنے آنے والا ہے۔

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (۱۱:۳۹) "عنقریب تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے گا اور کس پر وہ بلا ٹوٹ پڑتی ہے جو ٹالے نہ ٹلے گی"۔ سوچ لو کہ اس عذاب کے مستحق ہم ہوں گے یا تم۔ ذرا پردہ گرنے کا انتظار کرو۔

---

اور جب مقرر وقت آ جاتا ہے۔ وہ لمحہ جس کا انتظار تھا تو پھر اس کا منظر یہ اس طرح ہے :

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝۴۰ وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۴۱

"یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور وہ تنور ابل پڑا تو ہم نے کہا" ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو' اپنے گھر والوں کو بھی۔ سوائے ان اشخاص کے جن کی نشاندہی پہلے کی جا چکی ہے۔ اس میں سوار کرا دو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں"۔ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ نوح نے کہا "سوار ہو جاؤ اس میں' اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھہرنا بھی' میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے"۔

یہ تنور کس طرح جوش میں آیا؟ بعض اقوال ایسے ہیں جو تخیلات پر مبنی ہونے کی وجہ سے بہت دور کے نظر آتے ہیں اور بعض کے اندر اسرائیلیات کی بو آتی ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم بغیر کسی راہنمائی کے غیر آباد وادیوں میں گھومنے کے قائل نہیں۔ کیونکہ قرآن کریم جو خبریں دیتا ہے وہ عالم الغیب کی خبریں ہیں اور اس سلسلے میں اسی حد پر جاکر رک جانا چاہئے جس کی تصریح قرآن کریم کرتا ہے اور مدلول نص پر مزید کوئی حاشیہ آرائی نہیں کرنا چاہئے۔

زیادہ سے زیادہ ہم جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ تنور سے فوارہ چھوٹنا' خصوصاً جلتے ہوئے تنور سے' یوں ہو سکتا ہے کہ تنور سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑے یا اس کے اندر آتش فشانی کا عمل شروع ہو جائے اور یہ کہ یہ حضرت نوح ؑ کے لیے عذاب الٰہی اور خطرے کی آخری گھنٹی کے طور پر اللہ نے مقرر کیا تھا یا اللہ کے عذاب کی آمد کا یہ ایک حصہ تھا۔ اور بیک وقت زمین سے پانی ابلنا شروع ہو گیا اور آسمان سے موسلا دھار بارش برسنا شروع ہو گئی۔

جب یہ واقعات شروع ہوئے تو اللہ نے حکم دیا کہ :

قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ ( ۱۱ : ۴۰ ) "ہم نے کہا" ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو"۔ عملی نظام کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت نوح ؑ کو ہر مرحلے کے لیے اپنے وقت پر احکام دیئے جائیں۔ پہلے کہا کہ تم کشتی بناؤ تو وہ بنانے لگ گئے اور وہاں سیاق کلام میں یہ نہ بتایا گیا کہ یہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے اور یہ بھی نہ کیا گیا کہ خود حضرت نوح کو اس کی اطلاع کر دی گئی ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ( ۱۱ : ۴۰ ) "یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آگیا اور وہ تنور ابل پڑا تو"۔ اور اس کے بعد دوسرے مرحلے کے لیے حکم دیا گیا :

قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ

( ۱۱ : ۴۰ ) "ہم نے کہا" ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو' اپنے گھر والوں کو بھی --- سوائے ان اشخاص کے جن کی نشاندہی پہلے کی جا چکی ہے۔ اس میں سوار کرا دو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں"۔

اب زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ کے مفہوم میں بھی مفسرین کا اختلاف ہے۔ اور ان میں بھی زیادہ تر اختلاف ذوق ہے اور اسرائیلی رنگ ہے۔ اس لیے ہم اس آیت کے بارے میں بھی خیالی گھوڑے نہیں دوڑاتے کہ نوح ؑ نے کس قدر زندہ چیزوں کے جوڑے اپنے ساتھ لیے اور کن کے نہ لیے۔ یہ محض اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والی بات ہے۔

وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ( ۱۱ : ۴۰ ) "اور اپنے گھر والوں کو سوائے ان کے جن کی نشاندہی پہلے کی جا چکی ہے"۔ یعنی وہ لوگ جو سنت الٰہی کے مطابق مستحق عذاب ہو چکے ہیں۔

وَمَنْ اٰمَنَ "اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے"۔ یعنی تمہارے اہل و عیال کے علاوہ جو لوگ ایمان لائے ہیں۔

وَمَنْ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ (٤٠) وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا

اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٤١)(١١: ٤٠ تا ٤١)) "اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح ؑ کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ نوح ؑ نے کہا "سوار ہو جاؤ اس میں' اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھہرنا بھی' میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے"۔

یوں اللہ کا حکم نافذ ہوا اور جن کو ہلاک ہونا تھا' وہ ہلاک ہوئے۔ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا (١١: ٤١) کا مفہوم یہ ہے کہ اب یہ کشتی اللہ کی مشیت کے حوالے ہے۔ اس کا چلنا پانی کے اوپر اور پھر کسی مقام پر ٹھہرنا اللہ کے قوانین مشیت کے مطابق ہے۔ جب ناقابل کنٹرول لہریں اٹھتی ہیں تو ان میں انسان کی قوت کے حدود ختم ہو جاتے ہیں اور انسان اور کشتی طوفان کے حوالے ہو جاتے ہیں' پھر اللہ غفور و رحیم ہی فیصلے کرتا ہے۔

اب جو منظر آ رہا ہے وہ نہایت ہی خوفناک ہے یعنی طوفان اور کافروں کا غرق ہونا۔

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۣ وَنَادٰي نُوْحُۨ ابْنَهٗ وَكَانَ
فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٤٢﴾ قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰي جَبَلٍ
يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَاۗءِ ۭ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ
بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿٤٣﴾

"کشتی ان لوگوں کو لیے چلی جا رہی تھی اور ایک ایک موج پہاڑ کی طرح اٹھ رہی تھی۔ نوح ؑ کا بیٹا دور فاصلے پر تھا۔ نوح ؑ نے پکار کر کہا: "بیٹا ہمارے ساتھ سوار ہو جا' کافروں کے ساتھ نہ رہ"۔ اس نے پلٹ کر جواب دیا: "میں ابھی ایک پہاڑ پر چڑھا جاتا ہوں جو مجھے پانی سے بچا لے گا"۔ نوح ؑ نے کہا: "آج کوئی چیز اللہ کے حکم سے بچانے والی نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم فرمائے"۔ اتنے میں ایک موج دونوں کے درمیان حائل ہو گئی اور وہ بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہو گیا"۔

یہاں دو خوف باہم ملتے ہیں: ایک خاموش طبیعت کا خوف اور ایک نفس بشری کا خوف۔

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ (١١: ٤٢) "کشتی ان لوگوں کو لیے چلی جا رہی تھی اور ایک ایک موج پہاڑ کی طرح اٹھ رہی تھی"۔

ایسے خوفناک حالات حضرت نوح ؑ دیکھتے ہیں کہ ان کے بچوں میں سے ایک ان سے دور بھاگا جا رہا ہے اور ان کے ساتھ کشتی میں سوار نہیں ہو رہا۔ یہاں باپ کی خوابیدہ پدری شفقت جاگ اٹھتی ہے اور اس گمراہ بیٹے کو وہ پکار اٹھتے ہیں۔

وَنَادٰى نُوْحُ ۣابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ

(۱۱:۴۲) "نوح ؑ کا بیٹا دور فاصلے پر تھا۔ نوح ؑ نے پکار کر کہا: "بیٹا' ہمارے ساتھ ہو جا' کافروں کے ساتھ نہ رہ"۔

لیکن یہ نافرمان بیٹا اپنے شفیق باپ کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ یہ نوجوان اور مغرور ہے' یہ اندازہ نہیں کر پاتا کہ طوفان کس قدر شدید ہے اور کہتا ہے:

قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ (۱۱:۴۳) "اس نے پلٹ کر جواب دیا: "میں ابھی ایک پہاڑ پر چڑھا جاتا ہوں جو مجھے پانی سے بچا لے گا"۔

لیکن شفیق باپ تو جانتے ہیں کہ یہ عذاب کس قدر ہولناک ہے اور وہ آخری اپیل کرتے ہیں"۔

قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ (۱۱:۴۳) "نوح ؑ نے کہا" آج کوئی چیز اللہ کے حکم سے بچانے والی نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم فرمائے"۔

اللہ کے عذاب کو نہ پہاڑ ٹال سکتے ہیں اور نہ غاروں میں کوئی اس سے چھپ سکتا ہے۔ نہ اس کے مقابلے میں کوئی حامی ہے اور نہ کوئی بچا سکتا ہے۔ صرف وہی بچ سکتا ہے جس پر اللہ کا رحم ہو جائے۔

وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ (۱۱:۴۳) "اتنے میں ایک موج دونوں کے درمیان حائل ہوگی اور وہ بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہو گیا"۔ ہزارہا سال گزر چکے ہیں' آج بھی جب ہم اس ہولناک صورت حالات کا تصور کرتے ہیں۔ تو ہماری سانس رک جاتی ہے اور ہم پر اس قدر ہیبت طاری ہو جاتی ہے کہ گویا یہ منظر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ کشتی پہاڑوں جیسی موجوں کے درمیاں ڈول رہی ہے۔ حضرت نوح ؑ بار بار اپنے بیٹے کو پکارتے ہیں اور ان کا مغرور بیٹا انکار کرتا جاتا ہے اور پہاڑ پر چڑھتا جاتا ہے۔ اچانک ایک عظیم پہاڑ جیسی موج آتی ہے اور چشم زدن میں قصہ تمام ہو جاتا ہے۔ سب کام ختم ہو جاتا ہے اب نہ پکار ہے اور نہ انکار ہے۔

اس خوفناک فضا کا تصور دو پہلوؤں سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ پہلو ہے کہ والد اور بیٹے کے درمیان ایک حقیقی اور زندہ تعلق ہوتا ہے۔ اور دوسرا پہلو انسان کا طبعی مزاج ہے کہ طوفان پہاڑوں اور وادیوں کو اپنی لپیٹ میں لینے کے بعد اب خود انسان کے بچوں کو لپیٹ میں لے رہا ہے۔ یہ دونوں قسم کے جذبات انسان کی شخصیت کے اندر موجود ہوتے ہیں اور قرآن کریم نے ان کی خوب تصویر کشی کی ہے۔

---OOO---

اب یہ طوفان تھم جاتا ہے۔ تلاطم میں ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو جاتا ہے اور جس طرح میدان واقعہ میں ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ اسی طرح الفاظ قرآن میں بھی ایک قسم کا ٹھہراؤ اور سکون آ جاتا ہے۔

وَ قِيۡلَ يٰۤاَرۡضُ ابۡلَعِىۡ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقۡلِعِىۡ وَ غِيۡضَ الۡمَآءُ وَ قُضِىَ الۡاَمۡرُ وَ اسۡتَوَتۡ عَلَى الۡجُوۡدِىِّ وَ قِيۡلَ بُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ۝ الربع

"حکم ہوا "اے زمین 'اپنا سارا پانی نگل جا اور اے آسمان رک جا"۔ چنانچہ پانی زمین میں بیٹھ گیا' فیصلہ چکا دیا گیا' کشتی جودی پر ٹک گئی اور کہہ دیا گیا کہ دور ہوئی ظالموں کی قوم!"

اب خطاب زمین و آسمان سے ہے۔ گویا وہ سمجھتے ہیں۔ دونوں تعمیل کرتے ہیں۔ زمین نے پانی کو چوسنا اور نگلنا شروع کر دیا اور آسمان نے برسانا چھوڑ دیا۔

وَ قِيۡلَ يٰۤاَرۡضُ ابۡلَعِىۡ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقۡلِعِىۡ وَ غِيۡضَ الۡمَآءُ وَ قُضِىَ الۡاَمۡرُ وَ اسۡتَوَتۡ عَلَى الۡجُوۡدِىِّ وَ قِيۡلَ بُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ (۱۱ : ۴۴) "حکم ہوا "اے زمین 'اپنا سارا پانی نگل جا اور اے آسمان رک جا"۔ چنانچہ پانی زمین میں بیٹھ گیا' فیصلہ چکا دیا گیا' کشتی جودی پر ٹک گئی اور کہہ دیا گیا کہ دور ہوئی ظالموں کی قوم!" پانی زمین کے پیٹ میں چلا گیا اور سطح زمین معمول پر آگئی۔۔ اللہ نے جو کرنا تھا وہ انجام کو پہنچا اور یہ کشتی جودی پہاڑ پر آکر رک گئی۔۔۔۔ "اور یہ کہہ دیا گیا کہ دوری ہو ظالموں کی قوم کے لیے"۔ یہ ایک مختصر سا جملہ ہے لیکن نہایت ہی دو ٹوک اور فیصلہ کن انجام کا اظہار کرتا ہے۔ جس کے اندر بہت بڑی گہرائی ہے اور یہ اسلوب اظہار "کہہ دیا گیا" کہنے والے کا نام نہ لیا گیا۔ مطلب یہ کہ اس باب کو اب بند کر دیا گیا ہے اور بُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ یعنی اب یہ نیست و نابود ہو گئے' زندگی سے دور ہو گئے' اللہ کی رحمت سے بہت دور جا پڑے اور اب وہ عوام کی یاد سے دور ہو گئے اور اقوام کی تاریخ سے ان کو حذف کر دیا گیا۔

---()()()---

جب یہ مصیبت دور ہو جاتی ہے' خوف کی حالت جاتی رہتی ہے اور کشتی جودی پہاڑ پر آکر رک جاتی ہے تو اب ایک حقیقی والد کے دل میں درد اٹھتا ہے اور وہ غم زیادہ ہو جاتا ہے۔

وَ نَادٰى نُوۡحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابۡنِىۡ مِنۡ اَهۡلِىۡ وَ اِنَّ وَعۡدَكَ الۡحَـقُّ وَ اَنۡتَ اَحۡكَمُ الۡحٰكِمِيۡنَ ۝

"نوح ؑ نے اپنے رب کو پکارا' کہا "اے رب' میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے"۔ میرا بیٹا میرے خاندان میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے کہ میرے خاندان والوں کو بچایا جائے گا اور تو بہترین فیصلے کرنے والا ہے۔ تیرے فیصلے حکمت اور تدبیر پر مبنی ہوتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام یہ بات اس لیے فرما رہے تھے کہ اللہ نے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا فرمادے اور یہ وعدہ آپ کے اہل خاندان کی نجات کی بابت تھا۔ نیز حضرت نوح علیہ السلام یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ وعدے اور فیصلے کی بابت حکمت دریافت کریں۔

اس سوال کا جواب بہت ہی اہم ہے۔ یہ حقیقت حضرت نوح علیہ السلام کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی کہ اللہ کے ہاں نیک و بد کا جو معیار ہے اس میں خون اور رشتہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہاں نظریاتی قرابت داری کی اہمیت ہے۔ آپ کا یہ لڑکا مومن نہ تھا لہٰذا یہ آپ کے خاندان کا فرد نہ رہا۔ آپ تو نبی اور مومن اول ہیں اور یہ جواب نہایت ہی فیصلہ کن اور دو ٹوک انداز میں دیا گیا اور سخت تنبیہی اور باز پرسی کے انداز میں دیا گیا۔

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝

"جواب میں ارشاد ہوا" اے نوح علیہ السلام "وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے، وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے، لہٰذا تو اس بات کی مجھ سے درخواست نہ کر جس کی حقیقت نہیں جانتا، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنا لے"۔

دین اسلام کا یہ ایک عظیم اصول ہے۔ وہ سررشتہ جس تک تمام تاریں پہنچتی ہیں وہ عقیدے کا سررشتہ ہے۔ اسلام میں ایک فرد اور فرد کے درمیان اصل تعلق عقیدے کا ہے۔ یہاں نسب اور قرابت داری کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صٰلِحٍ ( ۱۱ : ۴۶ ) "اے نوح، وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے، وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے"۔ وہ آپ سے کٹ چکا ہے اور آپ اس سے کٹ چکے ہیں، اگرچہ وہ تمہارا حقیقی بیٹا ہے کیونکہ اسلام میں اصل تعلق اور رابطہ نظریاتی رابطہ ہے، اس کے علاوہ کوئی رابطہ اور قوت جامعہ اسلام میں معتبر نہیں ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے جن حالات میں دعا کی تھی وہ ایسے تھے کہ ان کی دعا منظور نہ ہوئی اس لیے اس کا جو جواب انہیں دیا گیا اس میں قدرے تہدید اور تنبیہ بھی ہے۔

فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ( ۱۱ : ۴۶ )
"لہٰذا تو اس بات کی مجھ سے درخواست نہ کر جس کی حقیقت تو نہیں جانتا، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنا لے"۔ میں اس بات سے ڈر کر تمہیں تاکیدی نصیحت کرتا ہوں کہ کہیں تم اسلامی روابط کی حقیقت اور اسلامی اخوت کی ماہیت کے سمجھنے میں غلطی نہ کر جاؤ یا اللہ نے جو وعدہ کیا تھا اس کے سمجھنے میں غلطی نہ کر بیٹھو۔ اللہ کا وعدہ تو پورا ہو چکا ہے اور جو تمہارے اہالی و موالی تھے وہ سب نجات پا چکے ہیں اور یہ حقیقت ہے۔

اس تنبیہ آمیز جواب کو سنتے ہی حضرت نوح علیہ السلام کانپ اٹھتے ہیں جس طرح ایک حقیقی مومن اس وقت کانپ اٹھتا

ہے، جب اسے یہ سوچ آتی ہے کہ بارگاہ الٰہی میں اس سے کہیں غلطی اور گستاخی نہ ہو جائے ۔ چنانچہ حضرت نوح فوراً توبہ و استغفار فرماتے ہیں :

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ اَسۡـئَلَكَ مَا لَيۡسَ لِىۡ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ وَاِلَّا تَغۡفِرۡ لِىۡ وَتَرۡحَمۡنِىۡۤ اَكُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۴۷﴾

”نوح ؑ نے فوراً عرض کیا ”اے میرے رب، میں تیری پناہ مانگتا ہوں، اس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں ۔ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا“ ۔

اللہ کی رحمت نے حضرت نوح ؑ کو ڈھانپ لیا، آپ کا دل مطمئن ہو گیا ۔ آپ اور آپ کی نسل اور آپ کے ساتھی نجات پا گئے اور دوسرے لوگ نذر طوفان ہو گئے ۔

قِيۡلَ يٰـنُوۡحُ اهۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيۡكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ‌ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمۡ ثُمَّ يَمَسُّهُمۡ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۴۸﴾

”حکم ہوا“ اے نوح ؑ ”اتر جا، ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں ہیں تجھ پر اور ان گروہوں پر جو تیرے ساتھ ہیں، اور کچھ گروہ ایسے بھی ہیں جن کو ہم کچھ مدت سامان زندگی بخشیں گے، پھر انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا“ ۔

معاملہ یہاں ختم ہو جاتا ہے ۔ حضرت نوح ؑ کو خوشخبری ملتی ہے ۔ آپ کے ساتھی مومن نجات پاتے ہیں، اب ان سے ایک مومن نسل چلتی ہے ۔ اور ان میں سے جو لوگ صرف بنیادی ترقی اور دنیاوی سازوسامان چاہتے تھے ان کو عذاب الیم کی خوشخبری دی جاتی ہے اور سورت کے ابتداء میں بھی یہی خوشخبری اور یہی ڈراوا تھا جو لوگوں کو بتایا گیا تھا ۔ اور اسی مقصد کے لیے یہ قصص یہاں لائے گئے تھے تاکہ مثالوں اور مناظر پیش کر کے لوگوں کو سمجھایا جائے ۔

---ooo---

آغاز سورت کے مقدمے اور پھر ان تمثیلات کے بعد نتیجہ یوں اخذ کیا جاتا ہے :

تِلۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهَاۤ اِلَيۡكَ‌ ۚ مَا كُنۡتَ تَعۡلَمُهَاۤ اَنۡتَ وَلَا قَوۡمُكَ ۴
مِنۡ قَبۡلِ هٰذَا‌ ۛؕ فَاصۡبِرۡ‌ ۛؕ اِنَّ الۡعَاقِبَةَ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۴۹﴾ ۱۴ع
۴

”اے نبی ؐ، یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں ۔ اس سے پہلے نہ تم ان کو جانتے تھے اور نہ

تمہاری قوم ۔ پس صبر کرو ' انجام کار متقیوں ہی کے حق میں ہے "۔

یہ آخری تبصرہ یہ بتاتا ہے کہ قرآن مجید میں قصص قرآن لانے کے اہداف و مقاصد کیا ہیں :

○ یہ کہ وحی منجانب اللہ ہے 'جس کا مشرکین مکہ انکار کرتے تھے اور ان قصص سے وحی کا ثبوت اس طرح ہوتا ہے کہ عربوں یا کسی اور اقوام کے پاس ان نصوص کا کوئی ریکارڈ موجود نہ تھا ۔ یہ غائبانہ قصے ہیں اور اس سے قبل تمام لوگ جانتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان کا کوئی ذریعہ علم نہ تھا ۔ یہ حکیم اور خبیر کی طرف سے وحی آرہی تھی ۔

○ دوسرا مقصد ان قصوں کے لانے سے یہ ہے کہ حضرت نوح ؑ جو انسانوں کے لیے آدم ثانی ہیں ' سے لے کر آج تک تمام انبیاء کا نظریہ اور عقیدہ ایک ہی رہا ہے ' تمام انبیاء کا عقیدہ بھی ایک رہا ہے اور الفاظ تعبیر بھی تقریباً ایک ہی رہے ہیں ۔

○ ان قصص سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تمام مکذبین کے اعتراضات بھی ایک ہی نوعیت کے رہے ہیں حالانکہ ان کے سامنے آیات و دلائل پیش کیے گئے اور باوجود اس کے کہ پیغمبروں کی تاریخ میں یہ اعتراضات بار بار باطل ثابت ہو چکے ہیں لیکن بار بار انہی کو دہرایا جاتا ہے ۔

○ یہ حقیقت بتانا کہ رسول کس بات کی خوشخبری دیتے ہیں اور کس سے ڈراتے رہے ہیں اور آج حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی انہی باتوں کے بارے میں بشارت اور ڈراوا دکھاتے ہیں اور یہ تاریخی شہادت ہے حضور اکرم ؐ کی سچائی پر ۔

○ اور یہ بتانا کہ اس کائنات میں وہ کیا سنت الہیہ ہے جو جاری و ساری ہے اور وہ کسی کے ساتھ کوئی رو رعایت نہیں کرتی اور نہ اس میں کسی رشتہ داری کا لحاظ ہوتا ہے اور خلاصہ یہ کہ انجام متقی لوگوں کے لیے ہوتا ہے ۔ آخر کار سنت الہی کو کامیاب ہونا ہے ۔

○ ان روابط کی حقیقت جو ایک فرد اور دوسرے فرد کے درمیان اسلامی نظام میں پائے جائیں گے نیز ایک نسل اور دوسری نسل کے درمیان جو وجود میں آئیں گے یہ ہے کہ وہ صرف اسلامی عقیدہ ہے ' جو تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی بنا دیتا ہے ' جن کا الٰہ ایک ہے اور جن کا رب اور حاکم اللہ وحدہ ہے اور اس میں اس کا نہ کوئی شریک ہے اور نہ کوئی مقابل ۔

---ooo---

اب طوفان نوح ؑ کے بارے میں چند سوالات ہیں؟ پہلا سوال یہ ہے کہ آیا یہ طوفان پورے کرۂ ارض پر تھا یا اس علاقے میں آیا تھا جس میں حضرت نوح ؑ مبعوث ہوئے تھے ۔ یہ زمین کہاں تھی ' قدیم دنیا میں اس کے حدود کیا تھے اور جدید دنیا میں اس کی حدود کہاں تک ہیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب محض ظن اور تخمین سے دیا جاتا ہے اور ظن اور تخمین سے یقین اور سچائی کا ثبوت نہیں ہو سکتا ۔ یا پھر ان سوالات کا جواب اسرائیلیات سے ملتا ہے ۔ اور اسرائیلیات بذات خود ایک مشکوک ریکارڈ ہے ۔ نیز قرآن کریم نے جن مقاصد کے لیے قصے بیان کیے ہیں ان مقاصد کے حوالے سے ان سوالات کے جوابات کی کوئی اہمیت بھی نہیں ہے ۔

البتہ قرآن کریم کے نصوص سے یہ اشارات ملتے ہیں کہ حضرت نوح ؑ کے زمانے میں تمام آبادی وہی تھی جس کی طرف حضرت نوح ؑ کو بھیجا گیا تھا اور حضرت نوح ؑ کی قوم جس علاقے میں آباد تھی ' اس وقت انسانی آبادی اسی علاقے میں تھی اور طوفان نے اس تمام علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا جس میں انسان آباد تھے ۔ اور اس طوفان

کی زد سے وہی لوگ بچے تھے جو کشتی نوح علیہ السلام میں سوار تھے۔

یہ عظیم کائناتی حادثہ جس کے بارے میں قرآن کریم نے ہمیں اطلاع دی جبکہ قرآن کریم واحد مصدقہ دستاویز ہے' اور یہ عظیم حادثہ ہے بھی زمانہ ماقبل التاریخ کے دور کا۔ اس کے بارے میں انسانی تحریری تاریخ خاموش ہے۔ اس دور میں تو تاریخ کا کوئی ریکارڈ موجود نہ تھا۔ انسانی تاریخ تو دور جدید کی چیز ہے اور پھر تاریخ نے جو ریکارڈ تیار کیا ہے اس میں بھی غلطی کا پورا امکان ہے' تاریخی واقعہ سچا بھی اور جھوٹا بھی ہو سکتا ہے۔ ان واقعات کو جرح و تعدیل کے عقلی اصول کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ اس بارے میں کسی اور ذریعہ سے پوچھا جائے جبکہ ایک سچے خبر دینے والے نے اس بارے میں اطلاع دے دی ہو۔ کیونکہ اگر ہم ایسے واقعات کے بارے میں کسی اور سے پوچھیں گے تو ہم الٹی گنگا بہائیں گے اور اس بات کو کوئی ایسی عقل تسلیم نہ کرے گی جس کے اندر دین کی حقیقت اچھی طرح بیٹھ چکی ہو۔

اس وقت دنیا میں جس قدر اقوام آباد ہیں' ان کی قدیم' پیچیدہ اور غیر مصدقہ لٹریچر میں بھی طوفان نوح ؑ کا ذکر ملتا ہے۔ ان تذکروں میں یہ کہا گیا ہے کہ قدیم زمانوں میں کسی وقت اس قسم کا ایک طوفان گزرا ہے۔ اور یہ عظیم حادثہ ان اقوام کی نافرمانی اور جہالت کی وجہ سے پیش آیا تھا۔ اور بنی اسرائیل کی مرتب کردہ کہانیوں میں جن کو وہ عہد قدیم کے نام سے پکارتے ہیں' طوفان نوح کا تذکرہ موجود ہے' لیکن قرآن کریم نے طوفان نوح ؑ کے بارے میں جو کچھ کہا اس کے ضمن میں ان اسرائیلی کہانیوں کا تذکرہ موزوں نہیں ہے۔ اور قرآن کریم کی پی اور صاف کہانیوں کے ساتھ ان مجہول الاصل' پیچیدہ افسانوں کو نہیں ملانا چاہئے۔ جن کی پشت پر کوئی سند نہیں ہے۔ اگرچہ ان تمام کہانیوں سے ایک حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ان اقوام کی سرزمین پر بھی طوفان آیا تھا یا یہ کہ اس طوفان سے کشتی نوح ؑ میں جو لوگ بچ گئے تھے اور ان کی اولاد جہاں جہاں بھی گئی تھی انہوں نے اپنے ساتھ ان یادوں کو سینہ بہ سینہ یہاں سے وہاں تک پھیلایا۔ یوں ان لوگوں نے جہان کے اطراف و اکناف میں پھیل کر زمین کو آباد کیا۔

یہاں یہ بات اچھی طرح نوٹ کر لینی چاہئے کہ جس دستاویز کو کتاب مقدس کا نام دیا جاتا ہے' چاہے وہ یہودیوں کی کتابوں پر مشتمل عہد قدیم یا عیسائی لٹریچر پر مشتمل عہد جدید ہو' ان میں سے کوئی چیز بھی اللہ کی جانب سے نازل شدہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ تورات کا وہ نسخہ جو اللہ نے نازل فرمایا تھا' اسے اہل بابل نے برباد کر کے اس کے اندر تحریف کر دی تھی۔ اس دور میں جب انہوں نے تمام یہودیوں کو غلام بنا کر بابل منتقل کر دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ ؑ کی آمد سے قریباً پانچ صدیاں پہلے تک عہد قدیم کتابی شکل مین بھی دوبارہ مرتب نہ کیا جا سکا۔ اسے عزرا کاہن نے مرتب کیا اور ممکن ہے کہ عزرا حضرت عزیر ہی ہوں۔ انہوں نے تورات کے باقی ماندہ حصوں کو جمع کیا۔ تورات کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ان کی تالیف ہے۔ یہی حال اناجیل کا ہے۔ ان میں بھی وہی مضامین مذکور ہیں جو حضرت مسیح ؑ کے شاگردوں کے حافظے میں محفوظ رہے تھے اور ان کو بھی تقریباً حضرت عیسیٰ ؑ کے اٹھائے جانے کے ایک صدی بعد لکھا گیا۔ اس کے بعد بھی ان میں بے شمار قصے کہانیاں اور افسانے جمع کر دیئے گئے۔ چنانچہ مسلمانوں کو ہدایت یہی ہے کہ وہ ان کتابوں کی کسی چیز کو بھی ہدایت نہ سمجھیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس قصے سے انسان کو کیا نصیحت حاصل ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لئے اس میں عبرت کے کئی پہلو ہیں۔ صرف ایک ہی عبرت نہیں ہے۔ درج ذیل صفحات میں ہم ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کریں گے اور اس کے بعد پھر حضرت ہود ؑ کے قصے کی طرف بات چل نکلے گی۔

---○○○---

حضرت نوح ؑ کے قصے سے ان کی قوم کے جو خدوخال معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ لوگ انتہائی درجے کے جاہل ہیں۔ وہ باطل پر سخت اصرار کرتے ہیں اور حضرت نوح ؑ کی خالص دعوت کا مسلسل انکار کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان کی دعوت یہ تھی کہ ہمارا خالق الہٰ واحد ہے۔ اور تمام انسانوں کا فرض ہے کہ وہ صرف اسی الہٰ واحد کی غلامی کریں اور اسے اپنا بادشاہ اور حاکم تصور کریں اور اللہ کے سوا کسی اور کو حاکم نہ سمجھیں۔

قوم نوح ؑ حضرت آدم ؑ کی اولاد سے تھی اور حضرت آدم ؑ کا قصہ اس سے قبل سورت اعراف میں مذکور ہو چکا ہے۔ اسی طرح سورت بقرہ میں بھی اس کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ حضرت آدم ؑ کو جنت سے زمین پر اس لیے اتارا گیا تھا کہ وہ اس زمین پر فریضۂ خلافت ادا کریں اور یہ وہ ذمہ داری ہے جس کی تمام صلاحیتیں اللہ نے حضرت آدم کے اندر پیدا کی ہوئی تھیں۔ حضرت آدم سے جنت میں جو لغزش ہوئی اللہ تعالیٰ نے ان کی معافی کے لیے ان کو تعلیم دے دی تھی۔ انہوں نے اللہ سے کچھ کلمات سیکھے اور ان کی ادائیگی کے بعد اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔ اور اس کے بعد اللہ نے ان سے ان کی بیوی سے اور ان کی اولاد سے وعدہ لیا تھا کہ جب بھی اللہ کی طرف سے ان کے پاس کوئی رسول ہدایت لے کر آئے گا تو وہ اس پر ضرور ایمان لائیں گے۔ اور یہ کہ وہ شیطان کی پیروی نہ کریں گے کیونکہ شیطان خود ان کا دشمن ہے' ان کی اولاد کا دشمن ہے اور قیامت تک کے لیے دشمن ہے۔

اب حضرت آدم جنت سے زمین پر ایک مسلمان کی حیثیت میں اترے' اللہ کی ہدایات کی اطاعت کرتے ہوئے اترے اور اس میں شک نہیں ہے کہ حضرت آدم نے نسلاً بعد نسل اپنی اولاد کو اسلام کی تعلیم دینے کا انتظام فرمایا ہوگا۔ اور یہ کہ اسلام ہی وہ پہلا اور حقیقی نظریہ حیات ہے جو انسانیت نے سیکھا اور اسے سکھایا گیا۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کے بالمقابل نہ کوئی دوسری نسل تھی اور نہ کوئی دوسرا عقیدہ تھا۔ اور جب حضرت آدمؑ کے صدیوں بعد حضرت نوح ؑ تشریف لائے' اگرچہ آج ہمارے پاس کوئی ذریعہ علم نہیں ہے کہ حضرت آدم ؑ کے کتنے عرصہ بعد حضرت نوح ؑ تشریف لائے' تو اس عرصے میں آدم کی تمام اولاد نے اسلام کو ترک کر کے جاہلیت کا عقیدہ اختیار کر لیا تھا۔ اور اس جاہلیت کی تفصیلات اس قصے میں قرآن کریم نے دی ہیں۔ تو ہم یقینی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ جاہلیت کی موجودہ بت پرستیوں' دیومالائی کہانیوں' خرافاتی عقائد' بت پرستیوں' غلط تصورات اور غلط رسم و رواج کو انسان پر اس کے ماحول اور اس کی جاہلیت نے مسلط کیا ہے۔ اور انسان پہلے جادۂ مستقیم پر تھا اور وہ شیطان لعین کی سعی نامشکور کی وجہ سے گمراہ ہو کر جاہلیت کا پیرو بنا ہے۔ یہ گمراہی اس پر اس لیے مسلط ہو گئی کہ شیطان کی بیرونی مساعی کے ساتھ ساتھ خود نفس انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ نے بعض کمزوریاں رکھ دی تھیں اور ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر شیطان نے انسان کو گمراہ کیا جو اللہ کا بھی دشمن ہے اور انسان کا بھی ازلی دشمن ہے۔ اور شیطان انسان پر اس وقت کامیاب حملہ کرتا ہے۔ جب انسان ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اللہ کی ہدایت کو مضبوطی سے پکڑے نہیں رکھتا۔ اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اسے کسی قدر اختیار بھی دیا۔ اور انسان کا یہ اختیار تمیزی ہی اس کے لیے سبب ابتلا ہے۔ اگر وہ اپنے اس اختیار تمیزی کو درست طور پر اختیار کر کے صرف اللہ کی رسی اور ہدایت کو مضبوطی سے پکڑ لے تو اس کے دشمن شیطان کا انسان پر کوئی داؤ نہ چلے گا۔ اور انسان کو یہ اختیار بھی ہے کہ وہ اس ہدایت سے انحراف کرے اگرچہ وہ معمولی انحراف ہو اور جب انسان معمولی سا انحراف کر لے تو

شیطان پھر اسے اسلام اور راہ مستقیم سے بہت ہی دور پھینکتا ہے۔ اور آخر کار اسے مکمل طور پر جاہلیت کا پیرو کار بنا دیتا ہے۔ جس طرح حضرت نوح ؑ کی قوم نے جاہلیت کو اختیار کیا۔ اور یہ عمل صدیوں کے تغیرات کے بعد مکمل ہوتا ہے جس کا علم صرف اللہ کو ہے۔

یہ حقیقت کہ اسلام وہ عقیدہ ہے جس سے یہ دنیا سب سے پہلے متعارف ہوئی اور وہ عقیدہ یہ ہے کہ الہٰ ' حاکم ' مقتدر اعلیٰ ' اور رب صرف اللہ وحدہ ہے ' ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتی ہے کہ نام نہاد علماء ادیان اور ان کے درمیان تقابلی مطالعہ کرنے والوں کا یہ نظریہ کہ عقیدۂ توحید درحقیقت ترقی کرتے کرتے اپنی موجودہ شکل کو پہنچا ہے اور اس موجودہ شکل سے پہلے یہ مختلف ادوار سے گزرا ہے۔ محض ایک مفروضہ ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ان لوگوں کے تصورات یہ ہیں کہ پہلے لوگ کئی راہوں کے قائل تھے۔ وہ طبیعی قوتوں کو الہٰ مانتے تھے ' پھر وہ ارواح کو الہٰ مانتے تھے ' پھر شمس و قمر اور مختلف ستاروں کو الہٰ مانتے تھے۔ ان لوگوں کے نظریات کی حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ پہلے ادیان کو لوگوں کے نفسیاتی ' سیاسی اور ماحول کے حالات سے وابستہ کرتے ہیں۔ اس طرح یہ تو درپردہ ادیان سماوی کا انکار کرتے ہیں اور یہ بات لوگوں کے ذہن میں ڈالتے ہیں کہ دینی تصورات بھی مختلف مرحلوں سے گزر کر اپنے موجودہ مقام تک پہنچے ہیں اور ان تبدیلیوں اور ترقی میں زمانے کے ماحول کا دخل ہے۔ اس طرح یہ لوگ دراصل وحی الہٰی ' منصب رسالت کا انکار کرکے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تمام ادیان اور ان کے بنیادی تصورات بھی انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں اور انسانی فکر کا شاخسانہ ہیں۔

اب ذرا ان لوگوں کے طرز عمل کا جائزہ لیجئے جو ادیان سماوی کے بارے میں لکھتے ہیں اور جو ان مغربی اہل علم سے متاثر ہوتے ہیں چنانچہ یہ لوگ اسی لغزش میں مبتلا ہوتے ہیں اور یہ مستشرقین کے وضع کردہ طریقے کے مطابق تحقیقات کرتے ہیں اور وہ لاشعوری طور پر اس غلطی میں پڑ جاتے ہیں جس میں ان کے اساتذہ مستشرقین مبتلا ہوئے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس قسم کے مسلمان مصنفین اپنے زعم میں اسلام کی مدافعت کر رہے ہوتے ہیں اور اسلام کے حامی ہوتے ہیں لیکن درحقیقت یہ لوگ اسلام کی بیخ کنی کرتے ہیں اور اسلام کے ان اصل نظریات اور اعتقادات کی نفی کرتے ہیں جن کا اثبات پورے قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔ قرآن کریم نہایت ہی وضاحت کے ساتھ اور نہایت ہی دو ٹوک الفاظ میں اس عقیدے کو ثابت کرتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام مکمل اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقائد لے کر جنت سے زمین پر اترے تھے اور پھر صدیوں بعد حضرت نوح ؑ نے اولاد آدم کو اسی اسلام کی طرف دعوت دی جنہیں شیطان نے گمراہ کر کے بت پرستی میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ عقائد و نظریات مکمل توحید پر مبنی تھے۔ اور حضرت نوح ؑ کے بعد دوبارہ یہ شیطانی چکر چلا اور اس نے پھر لوگوں کو جاہلیت کی طرف لوٹا دیا۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے رسول آتے رہے اور انسانیت کو پکڑ پکڑ کر پھر جادۂ مستقیم پر ڈالتے رہے۔ اور توحید مطلق پر مبنی نظریہ حیات انہیں عطا کرتے رہے۔ اور یہ بات بالکل غلط ہے کہ کتب سماوی کے اندر مذکور صحیح اعتقادات کے اندر کسی قسم کی تبدیلی یا ترقی ہوئی ہے۔ البتہ اگر کوئی ترقی اور تبدیلی ہوئی ہے تو وہ ان قانونی نظاموں میں ہوئی ہے جو مختلف اوقات میں اسلامی نظریہ حیات پر قائم ہوئے۔ اگر جاہلیت کے عقائد میں سے کسی عقیدے میں تغیر اور ترقی ہوئی ہے تو اس سے یہ بات کس طرح ثابت ہوتی ہے کہ اسلامی نظریہ حیات میں بھی ارتقاء کا عمل ہوا ہے۔ اور جاہلیت کے عقائد میں بھی اگر کوئی ارتقائی عمل ہوا ہے تو وہ بھی اسلام کے حقیقی عقیدۂ

توحید کے اثرات کی وجہ سے ہوا ہے ' جو وقتاً فوقتاً نسلوں پر اثر انداز ہوتا رہا ہے اور باوجود اس کے کہ بعد کی نسلیں عقیدۂ توحید سے منحرف ہوتی رہی ہیں لیکن وہ تدریجاً عقیدۂ توحید کے قریب آتی رہی ہیں۔ رہا عقیدۂ توحید تو اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ تاریخ کا قدیم ترین عقیدہ ہے اور یہ تمام بت پرستانہ عقائد سے پہلے موجود تھا۔ جب سے حضرت آدم نے اسے پیش کیا ہے۔ اسی وقت سے یہ ہمیشہ اپنی اصل شکل میں موجود رہا ہے۔ اس لیے کہ عقیدۂ توحید انسانی دماغ کا ایجاد کردہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی طرف سے آیا ہے۔ جب سے انسان کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور اسے عقیدۂ توحید سکھایا ہے اسی وقت سے یہ عقیدہ موجود ہے اور اسی وقت سے اپنی اس شکل میں موجود ہے۔ یہ سچائی ہے اللہ کی طرف سے آئی ہے اور پہلے ہی دن سے اپنی مکمل شکل میں ہے۔

یہ ہے وہ حقیقت جس کو قرآن ایک اٹل حقیقت کے طور پر پیش کرتا ہے اور اسی حقیقت پر پورا اسلامی تصور حیات قائم ہے ' اس لیے کوئی مسلم محقق خصوصاً وہ شخص جو اسلام کی مدافعت میں قلم اٹھاتا ہے ' اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا اور نہ ان خطوط کے علاوہ کسی اور لائن پر تحقیق کر سکتا ہے کیونکہ ادیان کے بارے میں اہل عرب کے ہاں جو تصورات پائے جاتے ہیں وہ غلط ہیں اور ان کو ایک خاص مقصد کے لیے مدون کیا گیا ہے۔

یہاں فی ظلال القرآن میں ہم اس قسم کے غلط تصورات سے تفصیلی بحث نہیں کر سکتے ' کیونکہ اس کے لیے میری ایک مستقل کتاب زیر ترتیب ہے جس کا عنوان ہو گا "موجودہ دور میں فکر اسلامی میں ضروری تصحیحات"۔ البتہ یہاں ہم بطور مثال ایک موضوع کو پیش کرتے ہیں کہ بعض محققین کیا کہتے ہیں اور قرآن مجید کیا کہتا ہے۔ استاد عقاد اپنی کتاب "اللہ" میں لکھتے ہیں :

"انسان نے جس طرح علوم میں ترقی کی ہے اسی طرح عقائد میں ترقی کی ہے۔ اور جس طرح اس نے علوم میں ترقی کی ہے اسی طرح صنعتوں میں ترقی کی ہے۔ ابتدائی دور میں جس طرح اس کی زندگی تھی اسی طرح اس کے عقائد بھی تھے۔ یہی حالت اس کے علوم اور صنعتوں کی ہے۔ لہٰذا اس کے ابتدائی دور کے علوم اور صنعت اس کے ابتدائی دور کے ادیان اور عبادات سے زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہیں اور ان میں سے کسی ایک کے اندر حقیقت کے عناصر کسی اور کے اندر پائے جانے والے حقیقت کے عناصر سے زیادہ نہیں ہیں"۔

"یہ بات قرین قیاس ہے کہ دین کے معاملے میں انسانی کاوشیں ' علوم اور صناعات کے میدان میں انسانی کاوشوں سے بہت زیادہ رہی ہیں"۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کائنات کی عظیم سچائی تک پہنچنا بہت زیادہ مشکل کام ہے بمقابلہ ان متفرق اشیاء اور مفردات کی حقیقت تک رسائی کے ' جن تک رسائی محض علمی یا محض صنعتی مطلوب ہو"۔

"ذرا دیکھیے کہ سورج روز طلوع ہوتا ہے اور یہ اس کائنات کی ان چیزوں میں سے ہے جو بالکل ظاہر ہیں اور جسے انسانی جسم محسوس کرتا ہے اور ماضی قریب تک اس کے بارے میں لوگوں کے خیالات یہ تھے کہ یہ سورج زمین کے ارد گرد پھرتا ہے اور علماء فلکیات سورج کی حرکات اور اس کے حالات کے بارے میں ایسی تفسیرات بیان کرتے تھے جس طرح پہیلیوں کی تشریح کی جاتی ہے یا محض تخیلات کو بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن کسی شخص کو یہ ہمت نہیں ہوئی کہ وہ سورج کا سرے سے انکار کر دے۔ اس لیے کہ لوگوں کے سورج کے بارے میں جو خیالات تھے وہ تاریکیوں کے تہ بہ تہ پردوں میں

تھے اور شاید اب بھی سورج کے بارے میں لوگ تاریک خیالی میں مبتلا ہوں"۔

"لہٰذا قدیم جاہلیت کے ادوار میں لوگوں کا اصول دین کی طرف رجوع کرنے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ دینداری کی کوئی حقیقت نہیں ہے یا یہ کہ دین داری محالات پر طبع آزمائی کرتی ہے۔ مطالعہ ادیان سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے عظیم سچائی یکبارگی ظاہر نہیں ہوئی اور وہ کسی ایک ہی زمانے میں حقیقت کبریٰ کو نہیں سمجھ سکے۔ لوگ عظیم حقیقت کے سمجھ سکنے کے لیے زمانے گزرنے کے بعد تیار ہوئے اور اس راہ میں انہیں طویل راستے طے کرنے پڑے اور وہ مختلف اسالیب سے غور کر کے اس حقیقت تک پہنچے جیسا کہ وہ دوسرے چھوٹے حقائق تک بھی صدیوں کے غوروفکر کے بعد پہنچے بلکہ انسانی حس اور قوت مدرکہ نے اپنی قوت سے کہیں زیادہ عجیب و غریب حقائق بڑی صبر آزما جدوجہد کے بعد دریافت کیے"۔

"ادیان کے تقابلی مطالعہ کے موضوع نے بے شمار وہ حقائق غلط ثابت کر کے رکھ دیئے ہیں جن پر ابتدائی دور کے انسان ایمان لاتے تھے اور آج بھی دنیا کے پسماندہ قبائل میں ان لوگوں کے بقایا اور نمونے موجود ہیں بلکہ ان متمدن اقوام کے اندر بھی ایسے لوگ پائے جاتے جن کی تہذیب و تمدن کی خاصی طویل تاریخ ہے۔ علم تقابل ادیان کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور نہ یہ ممکن ہے کہ ابتدائی دور کے ادیان ان جہالتوں اور گمراہیوں سے خالی ہوں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ یہی وہ معقول نتیجہ ہے جس کی توقع کسی بھی معقول انداز فکر سے کی جا سکتی ہے۔ اس اسلوب فکر کے اندر کوئی ایسی تعجب انگیز بات بھی نہیں ہے جسے کوئی اہل علم بعید از قیاس سمجھے یا دین کی حقیقت اور اصلیت کے بارے میں کوئی نیا نظریہ اپنالے۔ علمائے ادیان کے جو محققین اس تلاش میں ہیں کہ ابتدائی ادیان میں کوئی ایسی حقیقت بھی پائی جاتی تھی یا ان کے ہاں سچائی کا کوئی ایسا تصور بھی موجود تھا جو ہر قسم کے شکوک و شبہات سے پاک ہو تو ایسے محققین محال کی تلاش میں سرگرداں ہیں"۔

اس کتاب کی فصل "تصور خدا میں ارتقاء" میں وہ لکھتے ہیں :

"علماء تقابل ادیان اس بات پر متفق ہیں کہ ابتدائی زمانے کی اقوام کے ہاں جو تصور دین تھا اس میں تصور خدا اور تصور رب تین مراحل سے گزرا۔ پہلے دور میں متعدد الٰہوں (Poly theism) کا تھا۔ اس کے بعد دوسرے دور میں لوگوں نے ان الٰہوں اور ارباب کے درمیان فرق و امتیاز کیا اور کسی کو کسی پر ترجیح (Heno therism) دی۔ اور سب سے آخر میں واحدانیت (Mono theism) کا دور آیا"۔

"تعدد ارباب کے ابتدائی دور میں دسیوں بلکہ سینکڑوں ارباب اور الٰہ تھے۔ اس دور میں ہر خاندان اور ہر قبیلے کا اپنا الٰہ ہوا کرتا تھا۔ یہ الٰہ یا تو بذات خود الٰہ تصور ہوتا تھا یا نائب الٰہ ہوتا اور لوگ اس کی پناہ مانگتے تھے اور یہ الٰہ قربانیاں اور عبادات قبول کرتا تھا۔

دوسرا دور جو دور تمیز و ترجیح کہلاتا ہے اگرچہ اس میں الٰہ اور ارباب متعدد ہی رہے لیکن ان میں سے بعض ارباب اور الٰہ متعدد اسباب کی وجہ سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہو گئے۔ مثلاً یوں کہ اگر کوئی قبیلہ علاقے اور ملک میں سیاسی طور پر چھا گیا تو اس کا معبود بھی علاقے میں چھا گیا۔ اور اس الٰہ سے لوگ معاشی حاجات اور آفات و بلیات سے بچاؤ کی مدد مانگتے تھے۔ بعض الٰہ اس لیے نمایاں ہو گئے کہ لوگوں کے زعم کے مطابق وہ زیادہ لوگوں کے لیے زیادہ

مفید تھے اور دوسرے الہوں کے مقابلے میں وہ انسان کے زیادہ مطالبات پورے کرتے تھے۔ مثلاً بارش کا دیوتا' اس علاقے میں بہت مانا جاتا جہاں بارش کی ضرورت ہوتی تھی یا جن سے ڈر زیادہ ہوتا تھا مثلاً مصائب کے الٰہ یا طوفان باد و باراں کا الٰہ' یعنی جہاں ڈر ہوتا لوگ اس سے ڈر کے الٰہ سے ڈرتے اور جہاں امید ہوتی لوگ اس الٰہ سے امید رکھتے' غرض اس کائنات میں دوسرے طبعی مظاہر کے مطابق الہوں کا تصور بھی قائم ہوتا"۔

"تیسرے دور میں جب قبائل اقوام و امم کی شکل اختیار کر گئے ہیں تو اب ارباب متفرقہ کے ہوتے ہوئے انہوں نے ایک مشترکہ عبادت کا طریقہ ایجاد کر لیا اور مختلف علاقوں اور مختلف اقوام کے ہاں عبادت کے مختلف طریقے رائج ہو گئے۔ اس دور کی خصوصیت یہ بھی رہی کہ جس طرح ایک قوم دوسری اقوام پر اپنا اقتدار اور قیادت و سیادت اور کلچر مسلط کرتی اسی طرح ان پر اپنا طریقہ عبادت بھی مسلط کرتی۔ بعض اوقات مغلوب کے الہوں کو یہ حکمران تسلیم کر لیتے تھے جس طرح کوئی بادشاہ اپنے حاشیہ نشینوں کی کوئی بات مان لیتا ہے اس طرح تابع اور متبوع کا تعلق باہم قائم رہتا"۔

"اس کمزور قسم کے ذہنی اتحاد تک بھی کوئی قوم ایک طویل تہذیبی جدوجہد کے بعد پہنچتی ہے۔ اور اس کے بعد پہنچی جب اس کے اندر علم و معرفت کی ایک وافر مقدار پیدا ہو گئی اور اس علم و معرفت کی بدولت انسان کے لیے خالص جاہلانہ تصورات کا قبول کرنا مشکل ہو گیا۔ اب انسان نے اپنے سابقہ تصورات کے ملبے میں سے اچھے اور اللہ کی پاکی اور قدوسیت کے قریب تر صفات کے ساتھ اللہ کو متصف کرنا شروع کر دیا۔ عبادت کے اندر اس کائنات کے اسرار و رموز کو بھی شامل کر دیا گیا۔ اور اس کائنات کے پیچھے کام کرنے والی گہری حکمت کی بات بھی ہونے لگی۔ اور ان اقوام و ملل کے اندر اللہ کو حقیقی مقام ربوبیت دیا جانے لگا۔ اور دوسرے تمام اچھے درجے کے الہوں کو فرشتوں کا مقام دیا جانے لگا یا ان کو ایسے خدا قرار دیا گیا جو اللہ تعالیٰ کے حظیرۂ قدس سے دھتکارے گئے تھے یعنی جو برے تھے"۔

درج بالا اقتباسات میں مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہو یا ان علماء کے خیالات نقل کیے گئے ہیں جو اپنے لیے اپنے عقائد خود ہی گھڑتے ہیں' بہرحال یہ خیالات اسلام کے خلاف ہیں کیونکہ ان لوگوں کے دینی تصورات میں انسان کے عقلی' علمی' تہذیبی اور سیاسی واقعات دخیل نظر آتے ہیں۔ اور ان کے سلسلہ خیال کے مطابق ترقی یوں ہوئی ہے کہ لوگ شرک اور بے شمار الہوں کے قائل ہونے کے بعد توحید کی طرف لوٹے ہیں اور یہ بات مؤلف کے مقدمہ کتاب کے پہلے فقرے ہی سے واضح ہے جس میں وہ کہتے ہیں: "اس کتاب کا موضوع یہ ہے کہ انسان نے عقیدۂ الٰہ کس طرح اختیار کیا۔ جب انسان نے اپنے لیے مختلف الہوں کو رب تسلیم کیا' پھر اس نے اللہ وحدہ کو دریافت کیا اور پھر وہ عقیدۂ توحید کی پاکیزگی میں داخل ہوا"۔

یہ تو ہیں دور جدید کے علمائے ادیان اور کتاب "اللہ" کے مصنف کے خیالات۔ اس کتاب میں مصنف دور جدید کے علمائے تقابل ادیان سے متاثر نظر آتے ہیں حالانکہ اللہ نے دین کی اصلیت کے بارے میں اس سے بالکل علیحدہ اور دو ٹوک بات کہی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت آدم جو ابوالبشر ہیں پوری طرح حقیقت توحید کو جانتے تھے اور ان کا عقیدۂ توحید اسی طرح صاف اور ستھرا تھا جس طرح حضرت محمدؐ کا تھا اور اس میں شرک کوئی آلودگی نہ تھی' اس میں کوئی تعدد اور ثنائیت نہ تھی۔ حضرت آدم براہ راست اللہ سے ہدایت لیتے تھے۔ اور صرف اللہ کی ہدایات کے متبع تھے اور حضرت آدم نے اپنی اولاد کو یہی پاک صاف تعلیم دی۔ لہٰذا انسان کی قدیم ترین تاریخ میں ایسی نسلیں تھیں جو اسلام کے بغیر کسی اور دین سے

واقف ہی نہ تھیں۔ ان کا عقیدہ صرف عقیدۂ توحید تھا۔ ہاں جب آدم کے بعد ان کی اولاد پر ایک طویل عرصہ گزرا تو کی اولاد نے عقیدۂ توحید سے انحراف اختیار کر لیا۔ بعض اوقات انہوں نے دو خداؤں کا اور بعض اوقات متعدد خداؤں کا نظریہ اپنایا۔ اور متعدد الٰہوں کا دین اختیار کر لیا۔ اس کے بعد حضرت نوح ؑ مبعوث ہوئے اور انہوں نے پوری نسل انسانی کو از سرنو عقیدۂ توحید پر قائم فرمایا اور جو لوگ شرک کرتے تھے اور نظام جاہلیت پر مصر تھے' ان سب کو طوفان نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور اس طوفان سے صرف ان لوگوں نے نجات پائی جو پاک و صاف توحید کو جانتے تھے۔ اور وہ دو خداؤں یا بے شمار الٰہوں اور متعدد ارباب کے دین سے بیزار تھے۔ اس تاریخ کے مطابق ہم پر فرض ہے کہ ہم یہ عقیدہ رکھیں کہ ایک عرصے تک کشتی نوح کے سواروں کی اولاد توحید مطلق کے عقیدے پر قائم رہی۔ ایک طویل عرصہ کے بعد انہوں نے پھر عقیدۂ توحید کو ترک کر کے شرک اور بت پرستی کو اپنایا۔ چنانچہ انسانی تاریخ میں جو رسول مبعوث کیے گئے ان سب کا مشن قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ "اور آپ سے پہلے ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے' اس کی طرف ہم نے وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی الٰہ و حاکم نہیں ہے اس لیے صرف میری پیروی کرو"۔ اب یہ بات واضح ہے کہ اگر اللہ کی کتاب کسی معاملے کو ایک فیصلہ کن انداز میں بیان کر دے اور اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا شخص اسی بات کو بالکل متضاد صورت میں پیش کرے تو ایک مسلمان کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے کہ وہ صرف اللہ کے قول کی اطاعت کرے۔ خصوصاً ایسا شخص جو بزعم خود اسلام کی مدافعت کر رہا ہو' اور وہ یہ بتاتا ہو کہ وہ اسلام اور دین کے بارے میں اساسی شبہات کو دور کرنے کے موضوع پر کلام کر رہا ہے۔ یہ بات ہر لکھنے والے کو ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ یہ اس دین کی کوئی خدمت نہیں ہے کہ اس بات کا سرے سے انکار کر دیا جائے کہ دین اسلام اللہ کی طرف سے بذریعہ وحی آیا ہے۔ اور یہ ثابت کیا جائے کہ اس دین کو اس حد تک خود انسان نے پہنچایا ہے۔ انسان نے نہیں بلکہ ابتدائے آفرینش سے اللہ نے انسان کو عقیدۂ توحید بذریعہ وحی سکھایا۔ اور اللہ نے انسان کو کسی دور میں بھی یہ اجازت نہیں دی کہ وہ عقیدۂ توحید کے علاوہ کوئی اور عقیدہ اختیار کرے نہ اس مضمون کی کوئی رسالت اللہ نے بھیجی ہے۔ نہ اس قسم کے نظریات کا پیش کرنا کسی معنی میں بھی اسلام کی کوئی خدمت ہے۔ خصوصاً اس حال میں کہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہو کہ علمائے تقابل ادیان اسلام کے خلاف ایک خاص منصوبہ بندی اور ایک خاص لائن پر کام کرتے ہیں اور اسلام کے بنیادی تصورات کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ جبکہ اسلام کا بنیادی تصور ہی یہ ہے کہ اسلام اللہ کی جانب سے وحی پر مبنی ہے اور یہ انسان کے ترقی پذیر فکر کا نتیجہ نہیں ہے جس طرح مادی میدان میں انسان نے آہستہ آہستہ تجربات حاصل کر کے علمی ترقی کی۔

اس نکتے پر یہ مختصر نوٹ' امید ہے کہ اس مسئلے کی اہمیت کو سمجھانے کے لیے کافی ہو گا۔ اس سے زیادہ طویل بحث ہم یہاں فی ظلال القرآن میں نہیں کر سکتے۔ غرض ایسے اساسی تصورات اور موضوعات پر ہم کسی غیر اسلامی سرچشمے سے کوئی ہدایت نہیں لے سکتے اور ہمیں اس مختصر بحث سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ جو لوگ ایسے حساس موضوعات پر مغربی افکار پڑھتے ہیں اور مغربی مفکرین کی نہج پر تحقیقات کرتے ہیں وہ کس قدر صحیح راہ سے دور چلے جاتے ہیں اور دعویٰ یہ کرتے

ہیں کہ وہ اسلام کا دفاع کرتے ہیں حالانکہ

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ "قرآن ہی مضبوط ہدایت و رہنمائی فراہم کرتا ہے"۔ اب حضرت نوح ؑ کے قصے کا ایک دوسرا پہلو' ذرا مزید رکیے۔ نئی بات یہ ہے کہ اللہ حضرت نوح ؑ کے حقیقی بیٹے کے بارے میں فرماتا ہے کہ یہ تمہارا بیٹا نہیں ہے۔

اسلام کے نظریاتی اور تحریکی سفر کا یہ ایک اہم پڑاؤ ہے۔ ایک اہم موڑ ہے اور اس پر رک کر غور کرنا نہایت ہی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۳۶) وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ (۳۷) (۱۱ : ۳۶ – ۳۷) "نوح ؑ پر وحی کی گئی کہ تمہاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے' بس وہ لا چکے' اب کوئی ماننے والا نہیں ہے۔ ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑو اور ہماری نگرانی میں ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنانی شروع کر دو۔ اور دیکھو جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حق میں مجھ سے کوئی سفارش نہ کرنا' یہ سارے کے سارے اب ڈوبنے والے ہیں"۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ (۱۱ : ۴۰) "یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور وہ تنور ابل پڑا تو ہم نے کہا" ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو' اپنے گھر والوں کو بھی۔۔۔ سوائے ان اشخاص کے جن کی نشاندہی پہلے کی جا چکی ہے۔ اس میں سوار کرا دو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں"۔ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح ؑ کے ساتھ ایمان لائے تھے"۔

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَنَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ (۴۲) قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ (۴۳) (۱۱ : ۴۲ – ۴۳) "کشتی ان لوگوں کو لیے چلی جا رہی تھی اور ایک ایک موج پہاڑ کی طرح اٹھ رہی تھی۔ نوح ؑ کا بیٹا دور فاصلے پر تھا۔ نوح ؑ نے پکار کر کہا :" بیٹا ہمارے ساتھ سوار ہو جا' کافروں کے ساتھ نہ رہ"۔ اس نے پلٹ کر جواب دیا :" میں ابھی ایک پہاڑ پر چڑھا جاتا ہوں جو مجھے پانی سے بچا لے گا"۔ نوح

نے کہا: "آج کوئی چیز اللہ کے حکم سے بچانے والی نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم فرمائے"۔ اتنے میں ایک موج دونوں کے درمیان حائل ہوگئی اور وہ بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہوگیا"۔

وَ نَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ (۴۵) قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ (۴۶) قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْئَلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَ تَرْحَمْنِیْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ (۴۷)

((۱۱:۴۵ - ۴۷)) "نوح نے اپنے رب کو پکارا۔ کہا "اے میرے رب، میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے۔ جواب میں ارشاد ہوا "اے نوح"، وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے، وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے، لہذا تو اس بات کی مجھ سے درخواست نہ کر جس کی حقیقت نہیں جانتا، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنالے۔ نوح نے فوراً عرض کیا "اے میرے رب، میں تیری پناہ مانگتا ہوں، اس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا"۔

وہ تعلق اور اساس جس پر اس دین میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور بکھرتے ہیں وہ ایک منفرد اساس ہے وہ صرف دین اسلام میں پائی جاتی ہے۔ اور اس کا تعلق ان آفاق و ابعاد سے ہے جن کے اندر وہ وسعتیں ہیں جو اس ربانی نظام حیات کے سوا کسی اور نظام میں نہیں ہیں۔

یہ رابطہ، خون اور نسب کے رشتے پر مبنی نہیں ہے۔ یہ رشتہ مشترکہ زمین، مشترکہ وطن کا بھی نہیں ہے، یہ قوم اور خاندان کا رشتہ بھی نہیں ہے، یہ زبان اور رنگ کا رشتہ بھی نہیں ہے۔ یہ نسل اور طبقے کا رشتہ بھی نہیں ہے۔ یہ طبقات اور پیشوں کا رشتہ بھی نہیں ہے۔ یہ سب رشتے بعض اوقات موجود ہوتے ہوئے بھی لوگوں کے درمیان قطع تعلق اور دشمنی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اپنے بندے حضرت نوح سے فرمایا کہ (یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ) "اے نوح یہ تیرے خاندان سے نہیں" اور یہ اس وقت فرمایا جب انہوں نے استفسار فرمایا۔ (رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ) "اے میرے رب، میرا بیٹا تو میرے اہل میں سے ہے"۔ اور اس کی توجیہ یہ فرمائی (اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ) "یہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے"۔ اس لیے کہ تمہارے درمیان جو حقیقی رشتہ تھا وہ رشتہ ایمان تھا اور یہ رشتہ کٹ گیا ہے۔ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (۱۱:۴۶) "لہذا مجھ سے ایسے سوال نہ کر تا جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔ تم تو یہ سمجھتے ہو کہ یہ تمہارے خاندان کا فرد ہے۔ لیکن تمہاری یہ سمجھ غلط ہے۔ حقیقی بات یہ ہے کہ وہ تمہارے اہل خاندان میں سے نہیں رہا ہے۔ اگرچہ صلبی اعتبار سے وہ تمہارا بیٹا ہے۔

انسانی روابط و تعلقات اور جاہلی روابط و تعلقات کی شاہراہ کے اس اہم موڑ پر یہ نکتہ ایک سنگ میل ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی روابط کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے ۔ یہ جاہلیت کا حال یہ ہے کہ وہ کبھی انسانی سوسائٹی کے باہم روابط کو خون اور نسب کی بنیاد پر استوار کرتی ہے ۔ کبھی زمین و وطن کی اساس پر رابطے بناتی ہے ۔ کبھی قوم اور خاندان کی اساس پر بناتی ہے ۔ کبھی رنگ اور زبان کی اساس پر بناتی ہے ۔ کبھی نسل اور طبقات کی بنیاد پر استوار کرتی ہے ۔ کبھی ہنر اور پیشہ کی بنیاد پر یہ تعلقات استوار کرتی ہے ۔ اور کبھی یہ تعلقات مشترکہ مفادات پر استوار ہوتے ہیں ۔ کبھی مشترکہ تاریخ پر اور کبھی مشترکہ انجام پر ۔ یہ سب جاہلی تصورات ہیں اگرچہ بظاہر یہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن یہ سب کے سب اپنی حقیقت اور مزاج کے اعتبار سے اسلامی تصورات کے خلاف ہیں ۔

اسلامی نظام حیات جو نہایت ہی مستحکم نظام ہے ' اور جس کی دعوت قرآن کریم دیتا ہے اور حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تعلیمات اور احادیث پر وہ نہایت ہی مشرح ہے ۔ یہ نظام امت مسلمہ کو یہ تربیت دیتا ہے کہ وہ اپنے اجتماعی روابط کو صرف عظیم تر سچائی کی اساس پر استوار کرے ۔ اور اس کے لیے نہایت ہی واضح اور مضبوط نشانات راہ متعین کرے ۔

قصہ نوح میں والد اور بیٹے کی مثال دی گئی ہے اور یہی حکم ہے ان تمام دوسرے جاہلی تعلقات کا ۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں صرف ایمانی اخوت کی اساس پر قائم ہونے والے تعلقات ہی معتبر ہیں اور تمام دوسری بنیادوں پر استوار ہونے والے تعلقات مسترد ہیں ۔

○ اللہ تعالیٰ نے والد اور اس کے بیٹے کے درمیان پائے جانے والے تعلقات و روابط کی ایک دوسری مثال بھی دی ہے ۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے والد کے درمیان جو واقعہ پیش آیا یعنی ان کی قوم کے نظریات کے حوالے سے اسے قرآن کریم نے یوں کہا ہے :

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (٤١) اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا (٤٢) يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا (٤٣) يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا (٤٤) يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا (٤٥) قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَ اهْجُرْنِيْ مَلِيًّا (٤٦) قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا (٤٧) وَ اَعْتَزِلُكُمْ وَ مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ اَدْعُوْا رَبِّيْ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا (٤٨) فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ

وَ يَعْقُوْبَ وَ كُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا (٤٩) وَ وَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا (٥٠) (١٩: ٤٠ تا ٥٠) "اور کتاب میں ابراہیمؑ کا قصہ بیان کرو' بے شک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا۔ جبکہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ "اباجان' آپ کیوں ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں' نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں؟ اباجان میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا' آپ میرے پیچھے چلیں' میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔ اباجان آپ شیطان کی بندگی نہ کریں' شیطان تو رحمان کا نافرمان ہے۔ اباجان مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمان کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں"۔ باپ نے کہا: "ابراہیم' کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔ بس تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے الگ ہو جا"۔ ابراہیم نے کہا: "سلام ہے آپ کو' میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے۔ میرا رب مجھ پر بڑا مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں کو چھوڑتا ہوں اور ان ہستیوں کو بھی جنہیں آپ خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا' امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر' نامراد نہ ہوں گا"۔ پس جب وہ ان لوگوں سے اور ان کے معبودان غیراللہ سے جدا ہو گیا تو ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو نبی بنایا اور ان کو اپنی رحمت سے نوازا اور ان کو سچی ناموری عطا کی"۔

○ اور اس کے لیے حضرت ابراہیمؑ اور اولاد ابراہیمؑ کی مثال بھی دی گئی۔ حضرت ابراہیمؑ کو یہ بات اللہ نے اس وقت سمجھائی جب اللہ اور حضرت ابراہیم کے درمیان عہد طے پا رہا تھا اور اللہ ان کے ساتھ یہ عہد کر رہا تھا کہ ان کو زمین کا اقتدار اعلیٰ دیا جا رہا ہے اور حضرت ابراہیم نے اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ یہ منصب اور مقام میری اولاد میں بھی باقی رہے۔

وَ اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ (٢: ١٢٤) "یاد کرو جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا' تو اس نے کہا: "میں تجھے سب لوگوں میں پیشوا بنانے والا ہوں' ابراہیم نے عرض کیا: "اور کیا میری اولاد سے بھی یہی عہد ہے" اس نے جواب دیا: "میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے؟؟"

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ (٢: ١٢٦) "اور یہ کہ ابراہیم نے دعا کی' اے میرے رب' اس شہر کو امن کا شہر بنا دے' اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں' انہیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے"۔ جواب میں اس کے رب نے فرمایا: "اور جو نہ مانے گا چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اسے بھی دوں گا' مگر آخر کار اسے عذاب جہنم کی طرف

گھسیٹوں گا اور وہ بدترین ٹھکانا ہے"۔

○ اس کے لیے خاوند اور بیوی کے درمیان موجود خاص تعلق کی مثال بھی دی گئی' حضرت نوح ؑ اور ان کی بیوی کا واقعہ' حضرت لوط اور ان کی بیوی کا واقعہ اور فرعون اور اس کی بیوی کا واقعہ پیش کر کے وضاحت کی گئی:

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ کَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰھُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْھُمَا مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا وَّ قِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ　وَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ، اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَکَ بَیْتًا فِی الْجَنَّۃِ وَ نَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (٦٦ : ١٠ — ١١) "اللہ تعالیٰ کافروں کے معاملے میں نوح اور لوط کی بیویوں کو بطور مثال پیش کرتا ہے۔ وہ ہمارے دو صالح بندوں کی زوجیت میں تھیں' مگر انہوں نے اپنے ان دو شوہروں سے خیانت کی اور وہ اللہ کے مقابلے میں ان کے کچھ بھی نہ کام آ سکے۔ دونوں سے کہہ دیا گیا کہ جاؤ آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی چلی جاؤ اور اہل ایمان کے معاملہ میں اللہ فرعون کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے جبکہ اس نے دعا کی "اے میرے رب میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچالے اور ظالم قوم سے مجھ کو نجات دے"۔

○ اللہ تعالیٰ نے مومنین اور ان کے خاندانی تعلقات کے بارے میں بھی ایک مثال دی۔ ان کی قوم اور وطن کے بارے میں بھی تمثیلات دیں۔ ان کی زمین اور ان کے علاقوں کے متعلق مثالیں بھی دیں۔ ان کے اموال و مفادات کی بھی تمثیلات پیش کی۔ ان کی تاریخ اور انجام کے بارے میں بھی مثال دی۔ مثلاً حضرت ابراہیم اور ان کی قوم کی مثال' اصحاب کہف اور ان کی قوم کا واقعہ جس میں ایک نظریاتی انسان کا تعلق اپنی قوم اور ملک کے حوالے سے بتایا گیا ہے۔

قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِھِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْکُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کَفَرْنَا بِکُمْ وَ بَدَا بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ ——— (٦٠ : ٤) "تم لوگوں کے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف صاف کہہ دیا "ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو' قطعی بیزار ہیں"۔

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْکَھْفِ وَ الرَّقِیْمِ کَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا (٩) اِذْ اَوَی الْفِتْیَۃُ اِلَی الْکَھْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً وَّ ھَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا

(۱۰) فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا (۱۱) ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ
الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا (۱۲) نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ
اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى (۱۳) وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا (۱۴) هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا
اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ
كَذِبًا (۱۵) وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ
رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا (۱۶) (۱۸: ۹ تا ۱۶)) "کیا تم سمجھتے ہو کہ غار اور کتبے والے ہماری کوئی بڑی نشانیوں میں سے تھے' جب وہ چند نوجوان غار میں مقیم ہوئے اور انہوں نے کہا: "اے پروردگار' ہم کو اپنی رحمت خاص سے نواز اور ہمارا معاملہ درست کر دے"۔ تو ہم نے انہیں اسی غار میں تھپک کر سالہا سال کے لیے گہری نیند سلا دیا۔ پھر ہم نے انہیں اٹھایا تاکہ دیکھیں کہ دو گروہوں میں سے کون اپنی مدت قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے اور ہم ان کا اصل قصہ تمہیں سناتے ہیں۔ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔ ہم نے ان کے دل اس وقت مضبوط کر دیئے جب وہ اٹھے اور انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بے جا بات کریں گے' یہ ہماری قوم تو رب کائنات کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا بیٹھی ہے۔ یہ لوگ ان کے معبود ہونے پر کوئی دلیل کیوں نہیں لاتے؟ آخر اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟ اب جبکہ تم ان سے اور ان کے معبودان غیراللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو۔ تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمہارے کام کے لیے سروسامان مہیا کرے گا"۔

---000---

یہ تمثیلات' جو انسان کے طویل تاریخی سفر کے نشیب و فراز سے انسانوں کے برگزیدہ گروہ' یعنی جماعت انبیاء کی سیرت اور طرز عمل سے امت مسلمہ کے لیے پیش کی گئیں' ان کے پیش کرنے کا واحد مقصد صرف یہ ہے کہ یہ امت اپنے لیے نشانات راہ متعین کر لے اور ان سنگ ہائے میل میں سے جو نشان زیادہ ممتاز ہے وہ یہ ہے کہ وہ تعلق اور ربط کیا ہے جس کے ذریعے کسی اسلامی سوسائٹی کو باہم مربوط کیا جا سکتا ہے اور اس کے سوا تمام رابطے اسلامی سوسائٹی میں مسترد اور مردود ہیں۔ چنانچہ ان مثالوں کے ذریعے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت سے اللہ نے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اس جادۂ مستقیم پر پختگی سے جم جائیں' ان کی یہ علامت ربط بالکل ان کے اندر واضح ہو۔ ان تمثیلات میں جو مضمون بیان ہوا ہے وہ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں بیان ہوا ہے' یہ تو چند نمونے تھے جو یہاں پیش کر دیئے گئے' مزید نمونے

ملاحظہ ہوں :

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَ يُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

( ۲۲ : ۵۸ ) ”تم کبھی نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور ' آخرت پر ایمان رکھنے والے ہوں ' وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے ' خواہ وہ ان کے باپ ہوں ' یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان - یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے - اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے - وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی - ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے - اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے - وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں خبردار رہو ' اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں“ -

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ

( ۶۰ : ۱ ) ”اے لوگو ' جو ایمان لائے ہو ' اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضا جوئی کی خاطر نکلے ہو ' تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ - تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو ' حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس کے ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں اور ان کی روش یہ ہے کہ رسول کو اور خود تم کو صرف اس قصور پر جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب اللہ پر ایمان لائے ہو - تم چھپا کر ان کو دوستانہ پیغام بھیجتے ہو ' حالانکہ جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور علانیہ کرتے ہو ' ہر چیز کو میں جانتا ہوں - جو شخص بھی تم میں سے ایسا کرے وہ یقیناً راہ راست سے بھٹک گیا -

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

بَصِیْرٌ (۶۰:۳) "قیامت کے دن نہ تمہاری رشتہ داریاں کسی کام آئیں گی نہ تمہاری اولاد۔ اس روز اللہ تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا اور وہی تمہارے اعمال دیکھنے والا ہے"۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِیْمَانِ وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۳:۹) (۹:۲۳)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے"۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِیَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۵:۵۱) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی انہیں میں سے ہے۔ یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی راہنمائی سے محروم کر دیتا ہے"۔

غرض اسلامی سوسائٹی میں اجتماعیت کے قیام کے لیے اس نظریاتی اساس کو دوٹوک انداز میں متعین کر دیا گیا اور یہ نظریاتی عنصر اس سوسائٹی کا وہ بنیادی عنصر ہے جو اسے قدیم جاہلی سوسائٹیوں سے اور جدید جاہلی سوسائٹیوں سے ممتاز کرتا ہے۔ اور یہ اصول قیامت تک کے لیے ثبت ہے۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنے معاشرے کے لیے اس اساس کے مقابلے میں کوئی اور اساس رکھے اور پھر وہ ایمان کا بھی دعویٰ کرے۔ اور جو لوگ ایمان کا دعویٰ بھی کرتے ہیں' مسلمان بھی کہلاتے ہیں اور اپنے ہاں اجتماعیت کا مدار ان جاہلی تصورات پر رکھتے ہیں جن کو اسلام تسلیم نہیں کرتا۔ ایسے لوگ یا تو سرے سے اسلام کی حقیقت سے ناواقف ہیں یا وہ اسلام کے منکر ہیں۔ دونوں صورتوں میں اسلام ایسے لوگوں کے اس لقب کو تسلیم نہیں کرتا جو یہ اختیار کرتے ہیں کیونکہ یہ لوگ اسلامی نظریہ حیات کو نہیں بلکہ جاہلی نظریات کو قائم کرتے ہیں اور ان کا پرچار کرتے ہیں۔

یہ اصول تو اب واضح ہو گیا اور اسے ہم یہاں چھوڑتے ہیں۔ اب ہم ذرا اس حکمت پر بحث کرتے ہیں جو اللہ نے اسلامی سوسائٹی کو نظریاتی بنیادوں پر استوار کرنے کے معاملے میں اختیار کی۔

ایمان اور نظریہ انسان کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو اسے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے کیونکہ حیوانات کی تخلیق جن عناصر سے کی گئی ہے عقل و خرد اور سوچ اور نظریہ ان سے ایک زائد عنصر ہے۔ یہ ایک روحانی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے انسان' انسان قرار پایا اور وہ حیوان سے ممتاز ہو گیا۔ مادیت کے اندر گم گشتہ اور پرلے درجے کے ملحدین نے بھی اب اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ عقل و خرد اور روحانیت ہی وہ خصوصیت ہے جو انسان کو حیوانات اور دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے (مثلاً جدید ڈارونزم کے جان ہاکسلے نے)

لہٰذا مناسب یہ ہے کہ کسی بھی ترقی یافتہ انسانی سوسائٹی میں انسانوں کا اجتماع و افتراق عقائد و نظریات کی اساس پر

ہو۔ کیونکہ عقائد و نظریات وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے انسان دوسرے بہائم پر امتیاز حاصل کرتا ہے۔ انسانی سوسائٹی کی تشکیل ایسی خصوصیات کی اساس پر نہیں ہونا چاہئے جس میں انسان اور دوسرے جانور دونوں برابر کے شریک ہوں۔ مثلاً سوسائٹی کی تشکیل زمین' وطن' حدود' علاقہ جات اور جسمانی اور مادی مفادات کی اساس پر نہیں ہونا چاہئے۔ اس طرح رنگ' خون اور نسب کی بنیاد پر بھی اور زبان اور رسم و رواج کے اشتراک پر بھی انسانی سوسائٹی کی تعمیر نہ ہونا چاہئے کیونکہ ان امور میں انسان اور بہائم برابر کے شریک ہیں اور ان میں عقل و خرد کا وہ عنصر نہیں ہوتا جس میں صرف انسان باہم شریک ہوں۔

○ ایک دوسری خصوصیت ایسی ہے جو انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے اور اس سے حیوانات محروم ہیں۔ وہ ہے اختیار اور حرکت بالارادہ' انسانوں میں سے ہر ایک کو یہ اختیار ہے کہ سن رشد تک پہنچتے ہی جو عقیدہ اور نظریہ چاہے اختیار کرے۔ اس طرح انسان خود فیصلہ کرتا ہے کہ وہ کس معاشرے میں آزادانہ زندگی بسر کرے۔ یا کس نظریاتی منہاج کو اپنائے اور کون سا اخلاقی اور سیاسی نظام پسند کرے یا یہ کہ اس کے لیے کون سا اقتصادی نظام بہتر ہے اور یہ فیصلہ وہ پوری آزادی کے ساتھ کرے۔

لیکن انسان کا یہ اختیار اور یہ آزادی اس کے خون' اس کے نسب' اس کی قوم اور اس کے طبقے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ اسی طرح انسان ازخود یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ کس سرزمین پر پیدا ہو' نہ وہ اپنی مادری زبان کے بارے میں خود کوئی فیصلہ کر سکتا ہے۔ غرض وہ تمام بنیادیں جن پر دور جدید کے جاہلی معاشروں کی عمارات تعمیر ہوئی ہیں وہ انسان کے دائرۂ اختیار و ارادہ کے اندر نہیں ہیں۔ ان تمام امور کا فیصلہ اس کرۂ ارض پر انسان کے وارد ہونے سے پہلے کر دیا جاتا ہے۔ ان امور کے بارے میں انسان سے کوئی مشورہ بھی نہیں لیا جاتا۔ بلکہ طوعاً وکرھاً اس پر یہ امور لازم کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر ہم انسان کی قسمت کو ان امور سے وابستہ کر دیں جن کے ہاتھ میں وہ مجبور محض ہے۔ اور ان امور کے بارے میں اس کی آزادی اور ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے تو اس قسم کے انسان کو ہم انسان کے مخصوص خصائص سے محروم کر دیں گے اور انسان کے عزوشرف اور اس کی برتری کے اہم اصول اور خصوصیت سے اسے الگ کر دیں گے۔ بلکہ اس صورت میں انسان اپنی اس اساسی خصوصیت سے محروم ہو جائے گا جو اسے دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔

چنانچہ انسان کی ان ذاتی اور مخصوص خصوصیات کی حفاظت اور نشوونما کے لیے اور اس شرف و کرم کے تحفظ اور رعایت کی لیے جو اللہ نے انسان کو اپنی تمام دوسری مخلوقات کے مقابلے میں دی ہیں' باری تعالیٰ نے دین اسلام میں یہ قرار دیا کہ انسانی سوسائٹیوں میں اجتماعیت کا دارومدار اس عقیدے اور نظریئے پر ہو جسے کوئی انسان پوری آزادی کے ساتھ سن بلوغت تک پہنچنے کے بعد اختیار کرے۔ اور ہر انسان کے انجام کا مدار اس کے اس ذاتی عقیدے اور فیصلے پر ہو۔ اس طرح انسان کی اجتماعیت کا نظام ایسے ناقابل تغیرو تبدل اصولوں پر نہ ہو جن کو کسی حالت میں بھی انسان بدل نہیں سکتا' ان عوامل کی حیثیت اضطراری ہو اور وہ ایسے ہوں کہ انسان کے دائرے سے کسی طرح بھی باہر نہ نکل سکتا ہو۔

○ انسانی سوسائٹی اور اس کے اجتماعی نظام کی بنیاد صرف عقیدے اور نظریئے پر رکھنے کا فائدہ کیا ہو گا؟ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ ... عالمی' انسانی اور کھلا معاشرہ وجود میں آ جائے گا۔ ایسی سوسائٹی اور معاشرے میں ہر قسم کے لوگ'

مختلف رنگوں اور نسلوں والے ' مختلف قوموں اور زبانوں والے ' مختلف علاقوں اور خون والے ' پوری آزادی کے ساتھ آ کر بس جائیں گے ۔ کسی پر کوئی بندش نہ ہوگی ۔ ان کے سامنے کوئی مصنوعی پردہ نہ ہوگا ' ملکوں اور قومیتوں کی حدود اس کے لیے سرراہ نہ بنیں گے اور تمام ایسے حدود مٹ جائیں گے جو اعلیٰ انسانی معیار سے فروتر ہوں ۔ تمام انسانی طاقتیں ' تمام انسانی خواص اور صلاحیتیں ایسے معاشرے اور ایسی سوسائٹی میں جمع ہوتی ہیں اور اس کے نتیجے میں ایک انسانی تہذیب وجود میں آتی ہے اور یہ تہذیب و تمدن تمام انسانی صلاحیتوں سے مستفید ہوتی ہے اور یہ نہیں ہوتا کہ کسی ملک کی صلاحیت اور وسائل سے خاص نسل ' خاص رنگ اور زبان اور زمین کے لوگ ہی مستفید ہوں ۔

میری کتاب ''معالم فی الطریق'' سے یہ اقتباسات یہاں مفید ہوں گے :

اسلام ' امت مسلمہ کو ' بنیادی عقیدہ دے کر اپنے مخصوص طریق کار کے تحت ' اجتماعی تحریک کے ذریعے اسے خارجی وجود بخش کر اور اس اجتماعی تحریک کے لیے بنیادی عقیدہ کو اساس بنا کر اس لیے برپا کرتا ہے کہ اس کے ذریعے وہ انسان کی انسانیت کو نمودار کر دے ۔ اسلام اپنے مخصوص طریق کار کے تحت اپنے بنیادی نظریات اپنی تعلیمات اور اپنے شرائع اور احکام میں انسانیت کی اسی نشوونما کو اصل ہدف بنائے ہوئے ہیں ۔

چونکہ انسان تمام حیوانات بلکہ جمادات کے ساتھ بھی وجود میں اشتراک رکھتا ہے اس لیے سائنٹیفک جہالت کے علم بردار کبھی کہتے ہیں کہ انسان ایک حیوان ہی تو ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ اس کا وجود محض ایک مادی وجود ہے لیکن یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ حیوانات اور مادہ کے ساتھ وجود میں اشتراک کے باوجود انسان ایسی خصوصیات کا حامل ہے جو اسے عام مادیات اور حیوانات سے ممتاز کرتی ہیں اور اسے ایک منفرد وجود بخشتی ہیں ۔ اب آکر کہیں اس سائنٹیفک جہالت کے علم برداروں کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور واقعاتی حقائق اور مشاہدوں اور تجربوں نے ان کی گردن غرور کو توڑ دیا ہے اور اب وہ بے بس ہو کر اس بات پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اخلاص اور تصریح کے بغیر اشاروں میں اس حقیقت کا اعتراف کریں ۔

جن لوگوں نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ غیر جانبداری سے کیا ہے اور پھر پوری تاریخ انسانی پر بھی ان کی نظر ہے ۔ وہ جانتے ہیں کہ اسلامی نظام حیات اور اس کے قیام کے طریق کار کے نتائج کس قدر شاندار رہے ہیں ۔ اسلام نے جدید معاشرے کی تعمیر ' رنگ وطن ' قومیت ' ملکی مصالح اور علاقائی تعلقات جیسے کمزور رشتوں کے بجائے صرف ایمان و نظریات اور عقائد و تصورات پر کی ہے اور اس نقطہ نظر سے اس نے انسانی وجود کے حیوانی اور مادی پہلو کو نظرانداز کیا اور انسان کی انسانیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ۔ اس کا پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ اسلامی سوسائٹی میں داخل ہونے کے دروازے ہر جنس اور ہر طبقہ کے انسانوں کے لیے کھل گئے اور اس طرح محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے اور حیوانی بندشوں اور باہمی امتیازات میں سے کوئی بندش اور امتیاز درمیان میں نہ رہا ۔ اس طرح انڈیل دی گئیں اور اس کٹھالی میں ان تمام خصائص نے ایک حسین امتزاج کی شکل اختیار کی اور اس خام مواد سے ایک نیا وجود سامنے آیا ۔ یہ سب کام نہایت مختصر عرصہ میں ہوا اور اس سے انسانوں کا ایک عجیب یک رنگ و ہم آہنگ گروہ تیار ہو گیا جس نے ایک تابندہ اور عظیم الشان تہذیب کو جنم دیا ۔ وہ تہذیب جو اپنے دور میں انسانیت کے استعدادی جوہر کا خلاصہ تھی ' حالانکہ اس زمانہ میں آبادیوں کے درمیان بڑے بڑے فاصلے تھے اور مواصلات کا نظام نہ ہونے کے برابر تھا ۔

اس اعلیٰ ترین معاشرے میں بیک وقت عربی' فارسی' شامی' مصری' مغربی' ترکی' چینی' ہندوستانی' رومی' یونانی' انڈونیشی اور افریقی اور بے شمار دوسری قوموں اور نسلوں کے لوگ شامل ہو کر اس میں ضم ہو گئے تھے۔ اسلامی تہذیب اور اسلامی معاشرہ کی نشوونما میں ان تمام لوگوں کی قابلیتیں اور ذہانتیں مل کر باہمی تعاون اور ہم آہنگی کے ساتھ مصروف عمل ہو گئیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ کسی وقت بھی یہ عظیم الشان تہذیب صرف عربی تہذیب نہیں رہی اور نہ ہی کبھی معروف معنوں میں قومی تہذیب رہی ہے۔ بلکہ یہ ہمیشہ سے فکری تہذیب ہی رہی ہے۔

یہ سب لوگ اس تہذیب میں خالص مساوات کے اصولوں پر جمع ہوئے۔ باہمی مروت اور شفقت نے انہیں جوڑا' منزل مقصود کے اتحاد کی وجہ سے وہ باہم ملے اور اس مقصد اور نصب العین کے لیے انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کر ڈالا جو مساوات پر مبنی ان سب کا اپنا ہی معاشرہ تھا۔

انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کر ڈالا اور اپنے تمام قومی اور تاریخی خصائص کو ظاہر کیا اور اپنے ذاتی اور موروثی کمالات کو نئے معاشرے کی تعمیر و ترقی میں صرف کر ڈالا جو مساوات پر مبنی ان سب کا اپنا ہی معاشرہ تھا' مساوات و اتحاد کی بنیاد پر ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان سب کا رب حاکم' مالک' اور خالق ایک ہی ہے۔ اس عقیدہ کے پس منظر میں بلاروک ٹوک انسانیت ابھر آئی۔ وحدت الٰہ کا عقیدہ ''وحدت انسان'' کے لیے بنیاد بنا--- پوری انسانی تاریخ میں یہ اونچائی کسی اور سوسائٹی کو حاصل نہیں ہوئی کہ وہ انسانی مساوات کی بنیاد پر وحدت انسان کا عقیدہ رکھتی ہو۔

## اسلامی معاشرے کا دوسرے معاشروں سے تقابل

قدیم انسانی تاریخ میں رومن معاشرہ مشہور ترین معاشرہ رہا ہے لیکن اس میں بھی متعدد رنگ' بے شمار زبانیں اور کئی قومیتیں نظر آتی ہیں اور ہر ایک کا مزاج اور طرز فکر مختلف ہے۔ اس کے باوجود اس معاشرے کی اساس انسانیت یا بلند تر نظریات پر نہیں رکھی گئی بلکہ یہ ایک قسم کا طبقاتی گٹھ جوڑ تھا جس میں ایک طرف اشراف کا طبقہ تھا اور ایک طرف غلاموں اور کمزوروں کا گروہ تھا۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ رومن امپائر میں فاتح اور مفتوح اقوام علیحدہ علیحدہ نظر آتی ہیں۔ رومن فاتح ہر لحاظ سے بزرگ و برتر ہیں اور مفتوح اقوام غلام اور زیر دست ہیں۔ یہی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے رومی معاشرہ ان بلندیوں تک نہ پہنچ سکا۔ جہاں تک اسلامی معاشرہ پہنچا اور نہ ہی اس نے انسانی تاریخ میں وہ کارنامے سرانجام دیئے جو صحت مند اسلامی معاشرہ کے شایان شان ہوتے ہیں۔ اس کے بعد بھی کئی معاشرے عالم وجود میں آئے' مثلاً انگریزی تہذیب کا قائم کردہ جدید معاشرہ' یہ معاشرہ بھی دراصل رومی معاشرے کا جانشین اور وارث تھا اور عملی میدان میں آکر یہ بھی طبقاتی اور استحصالی معاشرہ ثابت ہوا اور اس کا اصل الاصول یہ رہا کہ انگریز قوم کو قیادت اور برتری کا مقام حاصل رہے۔ اس کا بین ثبوت ان نو آبادیوں کے معاشی اور معاشرتی جائزے سے ملتا ہے جو کسی وقت انگریزوں کے زیر نگیں رہے ہیں اور بعینہ یہی طرز عمل یورپ کی دوسری شہنشاہیتوں اور معاشروں کا رہا ہے۔ انہوں نے بھی اپنی نو آبادیوں کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ ہسپانوی' پرتگالی اور فرانسیسی معاشروں نے اپنی تمام کالونیوں میں وہاں کے اصل باشندوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا اور ان کے طرز عمل نے خود بتا دیا کہ یہ معاشرے کس قدر گھناؤنے' مہلک اور گرے ہوئے تھے۔

اس کے بعد ہمارے سامنے اشتراکی معاشرہ نمودار ہوتا ہے ۔ اگرچہ اس نے اپنے اساسی اصولوں میں سے رنگ و نسل، قوم و جنس اور زبان و وطن کو خارج کر دیا۔ لیکن اس کی اساس بھی خالص انسانی بنیادوں پر نہ اٹھی بلکہ ان کی نئی طبقاتی کشکش پر اٹھی، یہ معاشرہ بھی رومی طرز کا طبقاتی معاشرہ بن گیا، فرق صرف یہ ہوا کہ رومی معاشرہ اشراف (Lords) کی حمایت پر سامنے آیا اور اشتراکی معاشرہ مساکین (Labours) کی حمایت میں نمودار ہوا۔ اس کی تکنیک یہ تھی کہ مزدوروں کے دلوں میں تمام دوسرے طبقات کے خلاف نفرت کے بیج بو دیئے جائیں ۔ چنانچہ خونی کشکش کا ایک طویل دور شروع ہو گیا، اور اس میں انسانیت ایسے ایسے مصائب سے دوچار ہوئی جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ کیونکہ اس کی بنیاد انسانیت کے بجائے خالص حیوانی زندگی پر تھی ۔ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ جنسی تعلقات خوراک اور مسکن ہی انسانیت کے بڑے مسائل ہیں اور انہی کے حل میں انسانیت کی فلاح مضمر ہے ۔ اسی طرح اشتراکیت نے تاریخ کا جدلی فلسفہ پیش کر کے اسے تاریخ تلاش معاش قرار دے دیا۔

لیکن دنیا پر اسلامی معاشرہ کا یہ احسان عظیم ہے کہ اس نے اپنے نظام حیات میں انسان کی صرف ان خصوصیات کو اجاگر کیا جو خالص انسانی ہیں ۔ اس طرح اس نے انسان کو محض ایک مادے اور ایک حیوان کی سطح سے بہت اونچا کر دیا اور پوری تاریخ انسانیت میں اس پہلو سے اسلامی نظام حیات بے مثال ہے ۔ اس لیے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ اسلامی نظام حیات کو چھوڑ کر دوسرے نظام اختیار کرتے ہیں وہ دراصل انسانیت کے دشمن ہیں اور وہ اعلیٰ انسانی قدروں کی جگہ قوم، وطن، جنس اور طبقات کی بنیاد پر انسانی زندگی کو منظم کرنا چاہتے ہیں ۔ حالانکہ ان سے زیادہ کمزور اور گھناؤنی ذلیل چیز کوئی اور نہیں ہے ۔ یہ لوگ انسانیت کے دشمن ہیں اور فطری اصولوں کے مطابق انسانی معاشرہ کی تعمیر، خالص انسانی بنیادوں پر نہیں چاہتے اور نہ ہی یہ انسانی سوسائٹی کو یہ موقعہ دیتے ہیں کہ وہ تمام انسانی تجربوں اور تمام انسانی خصائص و کمالات سے فائدہ اٹھائے ۔ (۱) یہاں ہمیں یہ حقیقت اچھی طرح نوٹ کر لینا چاہئے کہ اس دین کے دشمن اس کی قوت کے اصل سرچشموں اور رازوں سے اچھی طرح واقف ہیں ۔ وہ اس کے مزاج اور اس کی حرکت سے بھی اچھی طرح آگاہ ہیں ۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ تبصرہ ہے ۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ "وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں"۔ ظاہر ہے کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عقائد کی اساس اور نظریات کی بنیاد پر اسلامی معاشرے کی تشکیل ہی میں اس کی قوت کا راز مضمر ہے ۔ یہ لوگ چونکہ اسلامی معاشرے پر غلبہ چاہتے ہیں اس لیے وہ اس کی قوت کو منہدم کرنا چاہتے ہیں ۔ اس طرح کہ یہ لوگ اسلام کی نظریاتی اساس کو منہدم کرنے کے درپے ہیں ۔ اس لیے ان لوگوں کی غرض یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کا استحصال کرنا چاہتے ہیں ۔ اسلامی ممالک کے خام مال اور صلاحیتوں کا استحصال چاہتے ہیں، چونکہ ان لوگوں کے یہ خطرناک عزائم ہیں اس لیے مسلمانوں کو ان کی قوت کے اصل سرچشموں سے کاٹ پھینکنا چاہتے ہیں ۔ چنانچہ وہ اللہ وحدہ کی پرستش اور

---

(۱)(۱) معالم فی الطریق

بندگی سے مسلمانوں کو بد راہ کر کے اس سے بعض خود ساختہ خداؤں کی بندگی کرانا چاہتے ہیں۔ان خداؤں میں ایک وطن کا دیوتا ہے۔کوئی نسل کا دیوتا ہے' کوئی قوم کا دیوتا ہے۔یہ جھوٹے خدا تاریخ کے مختلف مراحل میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ کبھی قوم کے نام سے' کبھی عربی نام سے' کبھی تورانی نام سے اور کبھی دوسرے ناموں سے۔ غرض یہ خدا اور ان کے پیروکار امت اسلامیہ کے اندر خود امت کے خلاف بر سر پیکار رہے ہیں۔یہ امت اسلامی شریعت کی اساس پر قائم تھی اور ان کی مسلسل ریشہ دوانیوں اور زہریلے پروپیگنڈے کی وجہ سے اسلامی معاشرے کو ختم کر دیا گیا اور ان جھوٹے خداؤں کی علی الاعلان عبادت کی جانے لگی اور جن لوگوں نے اسلام کی طرف دعوت دی ان کو باغی اور قومی مفادات کے مخالف کہا جانے لگا اور اسلامی معاشرے سے شریعت کے قانون کو ختم کر کے ان خداؤں کی شریعت کو نافذ کیا گیا۔

اس نقطہ نظر سے خبیث ترین محاذ یہودی محاذ ہے۔جس نے مسئلہ قومیت کو بطور ہتھیار استعمال کر کے اسلام کی ان مضبوط بنیادوں کو گرایا جن پر اسلام کا اجتماعی نظام استوار تھا۔اس سے قبل یہودیوں نے یورپ میں مسئلہ قومیت کے ذریعے عیسائیت کو تباہ کیا تھا۔اس نے ان ممالک کے اندر کلیسا کو بھی تقسیم کیا اور ہر ملک کا قومی کلیسا تشکیل دیا۔اس طرح یہودیوں کے مقابلے میں عیسائیت کا جو گھیرا تھا' اسے انہوں نے توڑ دیا۔اور اس کے بعد انہوں نے یہودیوں کے خلاف موجود اسلامی محاذ کو بھی شکست دے دی۔اس کے بعد ان یہودیوں کے شاگرد صلیبیوں نے بھی مسلمانوں کے خلاف صدیوں تک یہی ہتھیار استعمال کیا۔اور وہ طویل عرصے تک اسلامی سوسائٹی کے خلاف لڑتے رہے۔چنانچہ انہوں نے اس دین کے خلاف اپنے قومی۔کینہ اور دشمنی کا انتقام لیا۔انہوں نے اس پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ قومیت کے اس مہلک تصور کے ذریعے اسلامی سوسائٹی اور مملکت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے غلام بنا لیا اور آج تک کسی نہ کسی طرح عالم اسلام صلیبیوں کا غلام ہے۔اور اس وقت تک رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ ان باطل بتوں کو پارہ پارہ کرنے کا فیصلہ نہیں کر دیتا۔اور اسلامی معاشرہ اپنی محکم اساس پر از سرنو قائم نہیں ہو جاتا۔

○ آخر میں' میں اس بات کو واضح کروں گا کہ لوگ پوری طرح جاہلیت کے چنگل سے اس وقت تک نکل نہیں سکتے۔جب تک ان کا اجتماعی نظام عقیدے اور نظریات پر قائم نہ ہو جائے اور عقیدہ یہ نہ ہو جائے کہ حاکم مطلق اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے علاوہ کوئی بھی حاکمیت میں اس کا شریک نہیں ہے۔جب تک یہ عقیدہ لوگوں کے فکر و عمل میں رچ بس نہیں جاتا اور ان کا اجتماعی نظام اس پر استوار نہیں ہو جاتا' لوگ پوری طرح جاہلیت کے دائرے سے باہر نہیں آ سکتے۔ اس طرح کہ تقدس صرف اللہ وحدہ کو حاصل ہو اور اللہ کے سوا کوئی اور مقدس نہ ہو۔ایک ہی شعار ہو اور اس کے علاوہ تمام شعاروں کو ختم کر دیا جائے۔ایک ہی قبلہ ہو اور لوگ تمام دوسرے قبلوں کو ترک کر کے پوری طرح اس کی طرف رخ کر لیں۔

بت پرستی صرف یہ نہیں ہے کہ لوگ بتوں اور پتھروں کی پوجا کریں' جن کے بارے میں انہوں نے عجیب و غریب قصے گھڑ رکھے ہیں بلکہ بت پرستی کی متعدد اور صورتیں بھی ہیں۔ان بتوں کے علاوہ اور بھی بہت سے بت انسانوں نے تراش رکھے ہیں اور ان کو ایسی حیثیت دے دی ہے جس طرح اللہ کی حیثیت ہوتی ہے لیکن یہ محض نام ہیں جو لوگوں نے گھڑ رکھے ہیں اور ان کے لیے مختلف مراسم اور فرائض مخصوص کر دیئے ہیں۔

اسلام کا ہدف صرف یہاں تک نہ تھا کہ پتھروں کے بتوں اور دیومالائی الہوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔اور اس کے بعد

قوم پرستی 'نسل پرستی اور وطن پرستی وغیرہ کی اجازت دے دی جائے۔ اور لوگ ان نئے بتوں کے شعار اور مراسم کے تحت زندگی بسر کریں اور اللہ کو چھوڑ کر ان بتوں کے دین اور قانون اور رسم و رواج کو اپنا لیں۔

چنانچہ اسلام نے پوری تاریخ میں انسانیت کو صرف دو خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک امت مسلمہ جو رسولوں کی تعلیمات کی پیروکار رہی ہے اور دوسری امت کافرہ جو رسولوں کی تعلیمات کے علاوہ مختلف قسم کی بت پرستیوں اور گمراہیوں میں مبتلا رہی ہے۔ اس امت کافرہ کی نوعیت مختلف ادوار میں مختلف رہی ہے اور مختلف زمانوں میں اس کی شکل و صورت بھی بدلتی رہی ہے۔

جب اللہ نے پسند فرمایا کہ امت مسلمہ کو ان کی تاریخی شناخت سے آگاہ کرے تو اللہ تعالیٰ نے رسولوں کے متبعین کا تعارف کرایا کہ یہ ہے تمہاری شناخت جو آدم علیہ السلام سے ادھر پوری انسانی تاریخ میں تمہاری شناخت ہے اور آخر میں فرمایا

انَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ "یہ ہے تمہاری امت' واحد امت اور میں تمہارا رب ہوں' پس میری بندگی کرو"۔ اللہ نے عربوں سے یہ نہیں کہا کہ تمہاری امت' امت عربیہ ہے اور اس کی حیثیت جس طرح جاہلیت میں تھی' اسی طرح اسلام میں بھی ہے۔ اسی طرح یہودیوں سے بھی یہ خطاب نہیں کیا گیا کہ تمہاری امت' امت بنی اسرائیل اور عبرانی امت ہے اور جاہلیت اور اسلام دونوں میں اس کا اعتبار ہے۔ حضور ؐ نے حضرت سلمان فارسی سے یہ نہیں کہا کہ تمہاری امت' امت فارسیہ ہے اور نہ صہیب سے کہا کہ تمہاری امت امت رومیہ ہے۔ آپ ؐ نے حضرت بلالؓ سے یہ نہیں کہا کہ اس کی امت' امت حبشی ہے بلکہ اللہ نے عرب' ایرانی' رومی اور حبشی مسلمانوں سے کہا کہ تمہاری امت مسلمانوں کی امت ہے۔ تم موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے دور میں بھی ایمان لائے۔ ابراہیم اور لوط علیہما السلام پر بھی تم ایمان لائے۔ حضرت نوحؑ' حضرت داؤد' حضرت سلیمان' حضرت ایوب' حضرت اسماعیل' حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل پر اور حضرت ذوالنونؑ' حضرت زکریاؑ' حضرت یحییٰؑ اور حضرت مریمؑ پر تم ایمان لائے۔ (دیکھئے سورہ انبیاء آیات ۴۸ تا ۹۱)

یہ ہے امت مسلمہ' اللہ تعالیٰ نے جس طرح اس کی تعریف فرمائی۔ اگر کوئی امت کے سلسلے میں کوئی اور مفہوم اور کوئی دیگر طریقہ اپناتا ہے تو یہ اس کی اپنی مرضی ہے۔ البتہ ایسے شخص کو پہلے یہ اعلان کر دینا چاہئے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ رہے ہم مسلمان تو ہم صرف اس امت کو جانتے اور پہچانتے ہیں جس کی تعریف اللہ نے فرمائی۔ اللہ تو سچی بات کرتا ہے اور اس کے فیصلے بہت ہی دوررس ہوتے ہیں۔

قصہ نوح ؑ کے الہامات و اشارات کے بارے میں یہی بات کافی ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ دین اسلام کا نقطہ نظر اس مسئلے کے بارے میں کیا ہے؟

اس مقام پر ضروری ہے کہ ہم ایک بار پھر قدرے غور و فکر کریں اور یہ معلوم کریں کہ اللہ کے ترازو میں اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اور اسلامی اقدار کے کس قدر وسیع نکات اس میں ثبت کیے گئے ہیں۔ اسلام کی نظر میں ان مٹھی بھر مسلمانوں کی قدر و قیمت کیا ہے؟

حضرت نوح عم کے یہ مٹھی بھر متبعین کیا تھے؟ یہ ساڑھے نو سو سال کی مسلسل دعوت کے نتیجے میں مسلمان ہوئے تھے ۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ صرف گیارہ افراد تھے ۔ یہ طویل دعوت جس کی اطلاع قرآن کریم نے دی ' اس ابتدائی دور کے بارے میں واحد ذریعہ معلومات ہے ۔

جیسا کہ قرآن نے بتایا یہ مٹھی بھر مومنین حضرت نوح عم کی طویل ترین جدوجہد کے نتیجے میں پیدا ہوئے تھے ۔ یہ لوگ اس قدر اہم تھے کہ ان کی خاطر اللہ نے اس کائنات کی طبعی زندگی کے عادی دھارے کو بدل دیا اور ایک عظیم طوفان برپا ہوا جس نے اس آباد زمین کے اندر پائی جانے والی ہر چیز کو تباہ کر دیا اور ان مٹھی بھر افراد کو از سرنو خلیفہ بنا کر اس زمین کا وارث بنا دیا ۔ اور اسے یہ ڈیوٹی سپرد کی کہ وہ اس کائنات کو از سرنو آباد کرے ۔

یہ نہایت ہی اہم نکتہ ہے اور اس پر ہمیں غور کرنا چاہئے ۔

اس وقت اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے ہراول دستے کرۂ ارض پر احیائے اسلام کی جدوجہد میں مصروف ہیں ۔ یہ دستے اس کرۂ ارض پر عجیب و غریب لگ رہے ہیں اور اپنے اس انوکھے پن کی وجہ سے بعض اوقات وحشت بھی محسوس کرتے ہیں ۔ ذاتی طور پر وحشت کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے معاشروں میں انھیں اذیت دی جاتی ہے ۔ ہر طرف سے ان کا پیچھا کیا جاتا ہے اور ان پر ظلم اور تشدد کے نئے نئے طریقے آزمائے جاتے ہیں ۔ ان ہراول دستوں کو چاہئے کہ وہ قصہ نوح عم پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں ۔ یہ ایک اہم معاملہ ہے اور اس سے ہمیں جو سبق ملتا ہے وہ بڑا دور رس ہے اور تدبر اور تفکر کے بعد ملتا ہے ۔

یاد رہے کہ اس کرۂ ارض پر احیائے اسلام کا ایک چھوٹا سا بیج بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے ۔ اس لیے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ جاہلیت ' اس کی سرزمین ' اس کی تعمیر و ترقی ' اس کی نشوونما اور اس کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو تباہ کرتا ہے ۔ اور اس تخم کا اللہ پر حق ہے کہ اللہ اس کی نشوونما کرے ' اس کی پرورش کرے یہاں تک کہ یہ بیج آخر کار دنیا میں ترقی کرے ' کامیاب ہو اور زمین پر اس کا قبضہ ہو اور وہ اسے از سرنو تعمیر کرے ۔

حضرت نوح عم اللہ کی نظروں میں تھے ' اور اللہ کی ہدایات کے مطابق کشتی کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ

( ۱۱ : ۳۷ ) "اور بناؤ کشتی ہماری نظروں میں اور ہماری وحی سے اور مجھ سے مخاطب نہ ہو ان لوگوں کے بارے میں جنھوں نے ظلم کیا ' بے شک وہ غرق ہونے والے ہیں"۔

اس سے قبل ایک وقت حالات ایسے تھے کہ حضرت نوح عم کی پوری قوم آپ کا پیچھا کر رہی تھی ' آپ کو دھمکیاں دی جا رہی تھیں اور آپ پر افتراء کیا جا رہا تھا تو ان مشکل حالات میں حضرت نوح عم نے یوں مناجات فرمائی ۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ ( ۹ ) فَدَعَا رَبَّهٗ

اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (۱۰) (۵۴ : ۹ - ۱۰) ”اس سے قبل نوح کی قوم نے جھٹلایا۔ پس انہوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا اور کہا کہ یہ مجنوں ہے۔ اسے دھمکیاں دی گئیں تو انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہو گیا لہٰذا میرا انتقام لیجئے“۔

جب حضرت نوح عم دربار الٰہی میں دست بدعا ہوئے اور یہ اعلان فرمایا کہ میں مغلوب ہو چکا ہوں اور قوم کے حق میں بددعا کی کہ اے اللہ اس قوم سے انتقام لے۔ تو اس مرحلے پر اللہ نے اپنی عظیم کائناتی قوتوں کو کھول دیا اور یہ کائناتی قوتیں اللہ کے بندے کی مدد کو آپہنچیں۔

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ (۱۱) وَّ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ (۱۲) (۵۴ : ۱۱ - ۱۲) ”پھر ہم نے موسلا دھار بارش سے آسمان کے دروازے کھول دیئے اور زمین کو پھاڑ کر چشموں میں تبدیل کر دیا اور یہ سارا پانی اس کام کو پورا کرنے کے لیے مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا“۔

جب اللہ کی یہ عظیم قوتیں اپنی سطح پر اپنا کام کر رہی تھیں تو ذات باری اپنی شان کے مطابق اپنے بندے کے ساتھ تھی۔

وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّ دُسُرٍ (۱۳) تَجْرِیْ بِاَعْيُنِنَا جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ (۱۴) (۵۴ : ۱۳ - ۱۴) ”اور نوح کو ہم نے تختوں اور کیلوں والی کشتی پر سوار کر دیا جو ہماری نگرانی میں چل رہی تھی۔ یہ تھا بدلہ اس شخص کی خاطر جس کی ناقدری کی گئی“۔ یہ ایک اہم اور عظیم صورت حال ہے اور احیائے اسلام کے لیے کام کرنے والے ہراول دستوں کو اس کے سامنے توقف کر کے ذرا گہرا غور و فکر کرنا چاہئے۔ یہ دستے جہاں اور جس زمانے میں احیاء اسلام کا کام کر رہے ہوں اور ان کا مقابلہ جاہلیت سے ہو اور وہ ان کا پیچھا کر رہی ہو اور خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ جاہلیت کا پلڑا غالب ہو۔

اسلام کے سپاہی اس بات کے مستحق ہیں کہ اس کائنات کی تمام قوتیں ان کے ہمرکاب ہوں۔ اور یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ قوتیں طوفان ہی کی صورت میں اسلام کے لیے کام کرنے والوں کی مددگار ہوں۔ طوفان تو ایسی قوتوں میں سے صرف ایک قوت ہے۔ اللہ کی اور بھی بے شمار قوتیں ہیں۔

وَ مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ”اللہ کی افواج کا علم صرف اللہ ہی کو ہے“۔ ہاں اسلامی قوتوں کا یہ فرض ضرور ہے کہ وہ اپنے کام کو جاری رکھیں اور مسلسل جاری رکھیں۔ اپنی راہ پر مسلسل گامزن رہیں۔ پھر اسلامی قوتوں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنی قوت کے اصل سرچشمے کو سمجھنے کی سعی کریں۔ اور اسی کے ہاں پناہ لیں۔ اور ان کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اس وقت تک صبر سے کام لیں جب تک اللہ کا امر آ نہیں جاتا۔ ان اسلامی قوتوں کو پورا یقین ہونا چاہئے کہ اللہ ان کا دوست ہے اور وہ علیم و قدیر ہے اور اسے اس کائنات میں کوئی قوت عاجز نہیں کر سکتی۔ نہ آسمان میں اور نہ زمین

ہیں - وہ یہ بھی یقین رکھیں کہ اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کی آزمائش اور مشکلات کا دور ایک محدود وقت کے لیے ہوتا ہے اور جب یہ پیریڈ ختم ہوتا ہے تو اللہ اپنے دوستوں کے لیے پھر کارہائے نمایاں کرتا ہے اور پھر ان کے ذریعے زمین کے اوپر انقلاب لاتا ہے -

یہ ہے وہ عظیم سبق جو اس واقعہ میں مضمر ہے - یہ حقیقت ہے کہ جو شخص اسلام کے نظریہ حیات کو لے کر جاہلیت کا مقابلہ کرتا ہے اللہ اسے جاہلیت کے مقابلے میں بے سروسامان نہیں چھوڑتا - بشرطیکہ داعی یہ دعوت دے رہا ہو کہ رب کائنات صرف ایک ہے - اس جنگ میں اسلام کے لیے کام کرنے والوں کو اللہ پر یہ بدگمانی نہیں کرنی چاہئے کہ اللہ ان کی مدد کو نہیں پہنچے گا - اسی طرح اسلامی کارکنوں کو یہ خیال بھی نہیں کرنا چاہئے کہ ایک طرف ان کی ذاتی اور چھوٹی قوت ہے اور دوسری جانب جاہلیت کی عظیم قوت ہے - بلکہ اسلامی قوتوں کو ہروقت نصرت الٰہیہ کا طلبگار رہنا چاہئے -

بظاہر داعیان اسلام کی قوت اور جاہلیت کی قوتوں کے درمیان کوئی نسبت ہی نہیں ہوتی - جاہلیت کی قوتیں عظیم نظر آتی ہیں ' لیکن داعی اسلام کا بھروسہ اللہ پر ہوتا ہے اور اللہ کے ہاتھ میں یہ بات ہے کہ وہ کسی بھی وقت کائناتی قوتوں کو تحریک اسلامی کی خدمت میں لگا دے ' جب چاہے اور جہاں چاہے - اور الہی قوتیں اسی عظیم ہیں کہ ان میں سے ایک معمولی قوت بھی جاہلیت کا چورا کر رکھ دیتی ہے اور جاہلیت کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس پر یہ وار کہاں سے ہوا؟

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ابتلا کا دور قدرے طویل ہو جاتا ہے اور یہ اللہ کی مشیت ہوتی ہے - حضرت نوح ؑ اپنی قوم میں پچاس کم ایک ہزار سال تک رہے - لیکن اس قدر طویل عرصے کے بعد اللہ کا حکم آیا اور اس طویل عرصے میں حضرت نوح ؑ صرف گیارہ افراد کو قائل کر سکے - لیکن اللہ کے ترازو میں ان گیارہ افراد کا وزن یہ تھا کہ اسے پوری کائنات کے مساوی قرار دیا گیا اور ان کی مدد کے لیے کائنات کی عظیم قوتوں نے مداخلت کی اور تمام انسانیت کو تباہ کر دیا گیا اور پوری کائنات اور وسیع و عریض زمین کا وارث صرف گیارہ افراد کو بنا دیا گیا اور اس کائنات کی تعمیر از سر نو شروع کی گئی -

میں یقین سے کہتا ہوں کہ معجزات کا دور ختم نہیں ہو گیا ہے - معجزات اور حوادث کا ظہور تو ہروقت اور ہر لمحہ ہوتا ہی رہتا ہے - البتہ یہ بات ہے کہ یہ خوارق اور معجزات اللہ کی مشیت کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں - ہاں اللہ تعالیٰ معجزات کی شکل و صورت بدلتے رہتے ہیں اور ایسے معجزات صادر فرماتے ہیں جو زمان و مکان کے حالات کے مطابق ہوتے ہیں - ہاں بعض اذہان کے لیے بعض معجزات اس قدر دقیق ہوتے ہیں کہ وہ ان کو سمجھ نہیں سکتے - لیکن جو لوگ معرفت خداوندی کے مقام پر فائز ہوتے ہی ہیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ کام کر رہا ہے - اور اللہ کے دست قدرت کے کمالات کو وہ اچھی طرح پاتے ہیں -

جو لوگ اللہ کی راہ پر چل پڑتے ہیں ' ان کا فرض صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرتے رہیں ' اپنی پوری قوت اس راہ میں لگا دیں اور پھر پورے یقین و اطمینان اور بھرپور یقین کے ساتھ انجام اللہ پر چھوڑ دیں اور جب وہ حالات پر قابو نہ پا سکیں تو پھر اللہ کے سامنے یوں عاجزی اور تضرع کے ساتھ گڑگڑائیں جس طرح حضرت نوح ؑ گڑگڑائے -

فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ "انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ وہ مغلوب ہو گئے ہیں لہذا اب انتقام لیں"۔ اس دعا کے بعد اب اللہ کی طرف سے کشادگی آ جاتی ہے۔ اللہ کی جانب سے کشادگی آنے کا انتظار بھی عبادت میں شمار ہوتا ہے اور اس انتظار کا بھی اجر ملتا ہے۔

میں یہ بات پھر کہوں گا کہ یہ قرآن اپنے رازہائے دروں کا دروازہ صرف اس شخص پر کھولتا ہے جو قرآن کو لے کر حق و باطل کی کشمکش کے میدان میں اترتا ہے۔ اور اس کو لے کر جہاد عظیم برپا کرتا ہے۔ صرف ایسے ہی لوگ ان فضاؤں کو محسوس کر سکتے ہیں جن میں پہلی بار یہ کتاب نازل ہوئی تھی۔ ایسے مجاہد کارکن ہی قرآن کا ذوق رکھتے ہیں اور اسے سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ ایک مجاہد جب قرآن پڑھتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ قرآن صرف مجھ ہی سے مخاطب ہے۔ جس طرح پہلی تحریک اسلامی سے وہ مخاطب تھا۔ اور اس نے اسے چکھا اسے پایا اور اس کے ساتھ حرکت میں آئی۔

---()---

# درس نمبر ۱۰۱ ایک نظر میں

تاریخ کی گزرگاہ سے قوم نوح گزر گئی۔ اس کی اکثریت سچائی کو جھٹلانے والی تھی۔ طوفان نے اس قوم کو لپیٹ لیا اور پھر تاریخ نے اسے سمیٹ لیا۔ وہ جس طرح زندگی سے محروم ہوئے اسی طرح رحمت خداوندی سے بھی محروم ہوگئے۔ جن لوگوں کو نجات نصیب ہوئی وہ زمین کے اوپر اللہ کی سنت کے مطابق مقتدر اعلیٰ بن گئے کیونکہ اللہ کا مستقل وعدہ یہ ہے

( وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ) "اچھا انجام ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں"۔ اللہ نے حضرت نوح کو حکم دیا:

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَ عَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۱ : ۴۸) "حکم ہوا' اے نوح اتر جا ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں ہیں تجھ پر اور ان گروہوں پر جو تیرے ساتھ ہیں اور کچھ گروہ ایسے بھی ہیں جن کو ہم کچھ مدت سامان زندگی بخشیں گے' پھر انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا"۔

غرض ایک بار پھر جاہلیت کا دور دورہ ہو گیا تھا۔ جس طرح آدم علیہ السلام کے بعد کئی نسلیں گزر جانے کے بعد جاہلیت کا دور دورہ ہو گیا۔ یہ کتنے عرصے بعد ہوا تھا' صرف اللہ ہی جانتا ہے' بہرحال آدم علیہ السلام کے بعد صدیوں تک لوگ بطور مسلم زندہ رہے ہوں گے اور خلافت ارضی کا فریضہ سرانجام دیتے رہے ہوں گے اور اس کے بعد شیطان نے آہستہ آہستہ انہیں گمراہ کر کے جاہلیت میں داخل کر دیا ہو گا اور وہ اپنے حقیقی دین سے منحرف ہوگئے ہوں گے۔ اس کے بعد حضرت نوح ؑ تشریف لائے اور حضرت نوح ؑ کی قیادت میں اسلام از سرنو زندہ ہوا۔ کفار ہلاک کر دیئے گئے اور مسلمانوں نے نجات پائی اور زمین پر کوئی ایک کافر باشندہ بھی زندہ نہ رہا۔ جیسا کہ قرآن کریم بتاتا ہے کہ حضرت نوح ؑ نے اس طرح کی دعا کی تھی۔ ظاہر ہے کہ نوح ؑ کے بعد افراد کشتی نوح ؑ اور ان کی ذریت ایک عرصہ تک اسلام کے مطابق زندگی بسر کرتی رہی ہوگی۔ یہاں تک کہ شیطان پھر ان پر غالب ہو گیا ہو گا اور پھر وہ جاہلیت کی طرف چلے گئے ہوں گے۔ اس طرح قوم عاد جاہلیت کی طرف لوٹی اور ہلاک ہوئی۔ پھر قوم ثمود نے جاہلیت کا مظاہرہ کیا اور ہلاک ہوئی۔

جہاں تک عاد کا تعلق ہے تو وہ ایک قوم تھی جو احقاف میں رہتی تھی۔ احقاف حقف کی جمع ہے جس کے معنی ریت کے ایسے ٹیلے ہیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف چلے جاتے ہیں۔ یہ علاقے عرب کے جنوب میں ہیں۔ ثمود کا قبیلہ حجر کے علاقے میں آباد تھا۔ یہ جزیرۃ العرب کے شمال میں تبوک کے علاقے میں ہے۔ یہ دونوں اقوام اپنے دور میں

نہایت ہی ترقی یافتہ اقوام تھیں لیکن اپنی ترقی اور فراوانی کی وجہ سے انہوں نے اپنے آپ کو عذاب الہی کا مستحق بنا دیا کیونکہ انہوں نے ترقی کو ذریعہ بغاوت قرار دیا۔ توحید کی جگہ بت پرستی کو اپنایا۔ اللہ کی بندگی کے نظام کو چھوڑ کر انہوں نے انسانوں کی بندگی اور غلامی کا نظام قبول کرلیا۔ اور انہوں نے رسولوں کی سخت تکذیب کی عاد وثمود کے قصص میں بھی وہی حقائق پوشیدہ ہیں جو قصہ نوح میں تھے۔

---()()()---

# درس نمبر ۱۰۱ تشریح آیات

۵۰ ---تا---- ۶۸

وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ یٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَ یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ یَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ ﴿۵۲﴾

"اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' تمہارا کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے۔ تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں۔ اے برادران قوم' اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا' میرا اجر تو اس کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے' کیا تم عقل سے ذرا کام نہیں لیتے؟ اور اے میری قوم کے لوگو' اپنے رب سے معافی چاہو' پھر اس کی طرف پلٹو' وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ مجرم بن کر (بندگی سے) منہ نہ پھیرو"۔

حضرت ہود قوم عاد کے فرد تھے۔ گویا ان کے بھائی تھے۔ اس قبیلے کے افراد کے درمیان اجتماعی تعلق اور ربط کی بنیاد محض رشتہ داری پر تھی۔ یہاں اس تعلق کو اس لیے ظاہر کیا گیا ہے کہ ایک بھائی اور اس کے اخوان کے درمیان شفقت اور محبت کا تعلق ہونا چاہئے لیکن اخوت اور نبوت دونوں مناصب کے ہوتے ہوئے بھی عاد کے لوگوں کا رویہ نہایت ہی مکروہ تھا' انداز کلام اسے ایک مکروہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ اشارہ بھی مقصود ہے کہ اسلامی تصور کے مطابق اگر اتحاد فکر نہ ہو تو بھائی بھائی سے جدا ہو جاتا ہے اور یہ ظاہر کرنا مطلوب ہے کہ جب عقیدہ نہ ہو تو تمام دوسرے روابط کٹ جاتے ہیں اور ان کی کوئی حقیقت نہیں رہتی تاکہ لوگ اس حقیقت کو پا سکیں کہ کسی اسلامی معاشرے کے اندر انسان اور انسان کے درمیان ربط و تعلق صرف نظریہ حیات کے مطابق ہوتا ہے۔ نیز اس سے اس طرف اشارہ بھی مطلوب ہے کہ اسلام کا مزاج تحریکی ہے۔ کیونکہ جب ایک نبی دعوت کا آغاز کرتا ہے تو اس کی قوم کے افراد کے درمیان خون اور نسب کے رشتے موجود ہوتے ہیں اور خاندانی روابط مضبوط ہوتے ہیں۔ بعد میں عقیدے کی بنیاد پر ایک بھائی اور

بھائی کے درمیان خون اور نسب کے رشتے کٹ جاتے ہیں اور عقیدے کی اساس پر ایک قوم دو قوموں کی شکل میں بٹ جاتی ہے۔ایک قوم امت مسلمہ ہوتی ہے اور دوسری قوم امت مشرکہ اور ان کے درمیان تمام روابط کٹ جاتے ہیں اور جب امت مسلمہ تمام قومی اور خونی روابط کاٹ دیتی ہے۔تو اس کے بعد پھر وہ اللہ کی تائید اور نصرت کی مستحق ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی امداد کر کے مشرکین کی جڑ کاٹ دیتے ہیں۔اللہ کا یہ عہد اور اسکی یہ نصرت صرف اس وقت آتی ہے جب اہل ایمان مشرکین کے ساتھ تمام ارضی رابطے مکمل طور پر کاٹ نہ دیں اور اہل ایمان اور اہل شرک کے درمیان پوری طرح فرق و امتیاز نہ ہو جائے۔اور نبی اور اس کے پیروکار اہل ایمان اپنی قوم سے بالکل جدا نہیں ہو جاتے اور اپنے سابقہ جاہلی روابط کو کاٹ نہیں دیتے اور اپنی محبت اور وفاداریاں اپنی قوم اور قومی قیادت سے کاٹ کر اپنے نظریات کے سپرد نہیں کر دیتے۔اپنی تمام محبتیں اور وفاداریاں امت مسلمہ کے سپرد نہیں کر دیتے۔جب امت مسلمہ اور امت کافرہ اور مشرکہ کے درمیان اس طرح پوری جدائی ہو جاتی ہے تو پھر اللہ کی نصرت آتی ہے۔

وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا (۱۱ : ۵۰) ”اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود ؑ کو بھیجا“۔ ہم نے عاد کی طرف حضرت ہود ؑ کو بھیجا جس طرح قصہ سابقہ میں حضرت نوح ؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا گیا تھا۔

قَالَ یٰقَوْمِ (۱۱ : ۵۰) ”اس نے کہا‘ اے برادران قوم!“ نہایت ہی پیارے انداز میں‘ برادری کے روابط کا واسطہ دیتے ہوئے‘ تاکہ ان کا اجتماعی شعور جاگ اٹھے‘ وہ مطمئن ہو جائیں کیونکہ کسی بھی قوم کا لیڈر‘ اپنی قوم کے سامنے جھوٹ نہیں بولتا اور نہ ہی کوئی ناصح مشفق اپنی قوم اور مخاطبین کو دھوکہ دیتا ہے۔

اعْبُدُوْا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۱۱ : ۵۰) ”اللہ کی بندگی کرو تمہارا کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے“۔یہ وہی بات ہے جسے تمام رسولؐ لے کر آئے۔اس لیے کہ جب بھی کوئی رسول آتا ہے تو ضروری ہوتا ہے کہ اس وقت کی قوم راہ حق سے منحرف ہو۔چنانچہ کشتی نوح ؑ کے سواروں کی اولاد جب گمراہ ہوگئی تو حضرت ہود ؑ آئے۔شاید ان لوگوں کی بدراہی کا آغاز اس نکتے سے ہوا کہ انہوں نے ان لوگوں کو نہایت ادب اور تعظیم سے یاد کرنا شروع کر دیا جو کشتی نوح میں سوار تھے۔یہ تعظیم اکابر یہاں تک بڑھی کہ انہوں نے پتھروں اور درختوں کی صورت میں ان کی ارواح کی پوجا شروع کر دی۔اور آخر کار یہ اشیاء بذات خود معبودات کی شکل اختیار کر گئیں۔اب کاہنوں اور درباریوں کا ایک طبقہ وجود میں آگیا اور وہ مسندوں پر بیٹھ گئے اور ان کا مشن یہ قرار پایا کہ اپنے ذاتی مفادات کے لیے لوگوں سے ان معبودوں کی پوجا کرائیں اور یہ پوجا پھر مختلف نظام ہائے جاہلیت میں مختلف رنگ میں رہی۔اس لیے کہ انسان جب صحیح عقیدۂ توحید سے انحراف کرتا ہے تو اس کے ابتدائی قدم کے بعد پھر انحرافات شروع ہو جاتے ہیں اور آخر کار انسان اس قدر گمراہ ہو جاتا ہے اور اس قدر دور چلا جاتا ہے جس کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔

غرض قوم ہود بھی اسی طرح مشرک تھی جس طرح دوسری اقوام تھیں۔یہ لوگ صرف اللہ وحدہ کی بندگی اور پرستش نہ کرتے تھے لہٰذا انہوں نے اپنی قوم کو وہی دعوت دینا چاہی جو ان سے قبل اور بعد ہر رسول نے دی کہ اے برادران قوم‘ صرف اللہ کی بندگی کرو اور یہ کہ اللہ کے سوا تمہارا کوئی رب نہیں ہے۔

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ (۱۱ : ۵۰) "تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں"۔ یعنی اللہ کے سوا' تم جن دوسرے معبودوں کی بندگی کرتے ہو یہ محض افترا ہے۔ اس لیے تم ان کو نہ پکارو' کیونکہ یہ اللہ کے ساتھ شریک نہیں ہیں۔

اس موقعہ پر حضرت ہود اپنی قوم کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ جو دعوت دے رہے ہیں یہ محض خیرخواہی ہے اور تمہارے لیے ہمدردی اور نیک نیتی پر مبنی ہے۔ اس کے پیچھے کوئی ذاتی مقصد کارفرما نہیں ہے۔ اس خیرخواہی پر کوئی اجر اور معاوضے کے وہ طلبگار نہیں ہیں ان کا اجر تو اس ذات کے ذمے ہے' جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔

یٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی الَّذِیْ فَطَرَنِیْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

(۱۱ : ۵۱) "اے برادران قوم' اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا' میرا اجر تو اس کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے' کیا تم عقل سے ذرا کام نہیں لیتے؟؟"

یہ جو کہا گیا کہ میں تم سے کسی قسم کا اجر و معاوضہ نہیں چاہتا' یہ محض اس لیے کہا گیا کہ شاید بعض لوگ ان پر یہ الزام لگاتے تھے کہ حضرت ہود دولت جمع کرنا چاہتے ہیں یا کوئی اور مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور (اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ) کے ذریعے انہیں یہ سمجھانے کی سعی کی جارہی ہے کہ تم عقل سے کام نہیں لیتے کہ رسول تو عقیدۂ توحید کی دعوت دے رہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی مالک و رازق نہیں اور خود تم سے مفادلت کا طلبگار ہے' حالانکہ پوری قوم کے فقراء کو اللہ رزق دیتا ہے۔

چنانچہ حضرت ہود ان کو توبہ و استغفار کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور سورت کے آغاز مین جس طرح حضرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی کہا گیا تھا انہی الفاظ میں حضرت ہود لوگوں کو ڈراتے ہیں یعنی صدیوں بعد بھی انبیاء کی دعوت مین کوئی تغیر نہیں ہوا ہے۔

وَیٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا وَّ یَزِدْکُمْ قُوَّةً اِلٰی قُوَّتِکُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ (۱۱ : ۵۲) "اور اے میری قوم کے لوگو' اپنے رب سے معافی چاہو' پھر اس کی طرف پلٹو' وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ مجرم بن کر (بندگی سے) منہ نہ پھیرو"۔

یعنی تم لوگ جس شرک و کفر میں مبتلا ہو اور جو خیالات رکھتے ہو اس پر اللہ سے مغفرت طلب کرو' توبہ کرو' اللہ کی طرف لوٹ آؤ اور نیا طریقہ اپناؤ جس کے پس پشت نیت و ارادہ ہو اور یہ نیت اور ارادہ حقیقی عمل پر منتج ہو۔

یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا (۱۱ : ۵۲) "وہ تم پر آسمان کے دھانے کھول دے گا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کو اپنی فصلوں وغیرہ کے لیے بارشوں کی سخت ضرورت تھی۔ نیز مویشیوں کو پانی پلانے اور ان کے چارے کے لیے ان کو پانی اور بارش کی ضرورت تھی۔

وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ (۱۱ : ۵۲) "تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کر دے گا"۔ یعنی یہ قوت جسے تم جانتے ہو۔

وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ (۱۱ : ۵۲) "مجرم بن کر بندگی سے منہ نہ پھیرو"۔ یعنی تکذیب اور روگردانی کے جرم کا ارتکاب نہ کرو۔

یہاں اللہ نے جو وعدہ فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ تم پر موسلا دھار بارش برسے گی اور تمہاری موجودہ مالی قوت پر مزید اضافہ ہو گا۔ سوال یہ ہے کہ یہ تو وہ امور ہیں جن میں مقررہ طبیعی قوانین ہیں اور سنت الٰہیہ کے مطابق دنیا میں یہ امور چلتے رہتے ہیں۔ اور یہ کائناتی قوانین کے مطابق طے پاتے ہیں لہٰذا یہاں توبہ و استغفار کا ان امور کے ساتھ تعلق کیا ہے؟ جہاں تک قوت میں اضافے کا تعلق ہے تو یہ بات قریب الفہم ہے اور اس کا سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کیونکہ دل کی پاکیزگی اور عمل کی پاکی کی وجہ سے پاکبازوں اور متقیوں کی قوت کارکردگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کی جسمانی صحت بھی اچھی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ خوراک اور تمام دوسرے کاموں میں اعتدال سے کام لیتے ہیں۔ ان کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے اور اعصاب میں ٹھہراؤ ہوتا ہے اور پھر ان کو اللہ کے فضل اور اللہ کی رحمت پر یقین ہوتا ہے۔ ان کی معاشرتی اور اجتماعی قوت میں اضافہ یوں ہوتا ہے کہ ان کے معاشرے میں اسلامی شریعت حکمران ہوتی ہے اور شریعت کی روشنی میں وہ آزاد اور معزز ہوتے ہیں۔ اللہ کے سوا کسی قانون و دستور کے وہ پابند نہیں ہوتے۔ ان کے درمیان کوئی قہار و جبار نہیں ہوتا جس کے سامنے دوسرے لوگ سجدہ ریز ہوں۔ ان کے معاشرے انسانی قوتوں اور صلاحیتوں کے لیے آزاد مواقع ہوتے ہیں۔ اور ان صلاحیتوں کی وجہ سے زمین کی تعمیر و ترقی ہوتی ہے اور وہ زمین کے خود ساختہ ارباب کی ماتحتی میں نہیں ہوتے۔ نہ وہ آستانوں اور میلوں ٹھیلوں میں مشغول ہو کر انسانوں کو خدائی کے امور میں شریک کرتے ہیں اور پیروں فقیروں کے تکیوں پر ڈھول ڈھمکے اور خوشبوئیں لگا کر انسانوں کو الہٰوں کا انعام دیتے ہیں۔

یہ بات پیش نظر رہنا چاہئے کہ زمین میں پائے جانے والے خدا اور ان کے پیرو کار گدی نشین اور درباری ہمیشہ اس بات کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ وہ ان خداؤں اور پیشواؤں کی طرف بعض ایسی صفات کی نسبت کریں مثلاً قدرت، نفع و نقصان، مخلوقات کا احاطہ، قہاری اور مہربانی کی صفات تاکہ لوگ اللہ کے سوا ان ارباب کی اطاعت پر آمادہ ہوں۔ کیونکہ رب تو وہی ہو سکتا ہے جس میں کچھ نہ کچھ ایسی صفات پائی جاتی ہوں اور یہ مقصد تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب ان الہٰوں کی بندگی کرنے والے اور مذہبی مقامات کے منتظمین اور گدی نشین کی ایک فوج ان کی جلو میں ہو اور لوگ ان ارباب کے تابع ہوں۔ اس مقصد کے لیے ان الہٰوں کے پیرو کار رات دن ان تھک جدوجہد کرتے ہیں اور ایسے کام کرتے ہیں جن کی وجہ سے بعض لوگوں کے مفادات کا انتظام ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اللہ کی حقیقی ربوبیت کے قیام کے لیے بھی ضروری ہے کہ دنیا میں خلافت فی الارض کے مقاصد کے حصول کے لیے دینداروں کو اس قسم کی جدوجہد کرنا چاہئے کہ وہ ایسے کام کریں جو عوام الناس کے لیے مفید ہوں اور لوگ جعلی اور خود ساختہ ارباب کی پرستش کرنے کے بجائے رب حقیقی کی پرستش کریں تاکہ رب العالمین کا حقیقی نظام ان جعلی ارباب کے خود ساختہ نظام کے مقابلے میں عوام الناس کے لیے زیادہ مفید ہو کیونکہ ان جعلی خداؤں کا نظام تو ڈھول ڈھمکے اور گانے بجانے کے چند مراسم کی اساس پر قائم ہوتا ہے۔

بعض اوقات ایسے لوگوں کے پاس بھی بظاہر بڑی قوت جمع ہو جاتی ہے جو اسلامی شریعت کو نافذ نہیں کرتے۔ شریعت نہ ان کی ذہنی دنیا پر حکمران ہوتی ہے نہ ہی ان کے معاشرے پر لیکن یہ قوت عارضی ہوتی ہے' لیکن جب دنیا کے معاملات اللہ کی حقیقی سنت کے مطابق طے ہونا شروع ہوتے ہیں اور وہ مرکز قوت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے جو مضبوط اساس پر مبنی نہیں ہوتا تو عارضی قوت کا یہ سرچشمہ خشک ہو جاتا ہے۔ یہ عارضی قوت کائنات کے جزوی اصولوں پر مبنی ہوتی ہے مثلاً جدوجہد' سعی' زیادہ پیداوار کا انتظام' لیکن ان چیزوں کی وجہ سے انسانی کو حقیقی قوت حاصل نہیں ہوتی' کیونکہ اگر لوگوں کے نظریات اور شعور کی دنیا میں توڑ پھوڑ اور فساد برپا ہو تو آخر کار مادی اور جزوی قوتوں کے سرچشمے بھی ایک وقت کے بعد خشک ہو جاتے ہیں۔

اب رہا یہ کہ زیادہ بارشیں کس طرح ہوں گی۔ بظاہر تو نظریہ آتا ہے کہ بارشوں کا نظام ایک کائناتی نظام ہے اور یہ بارشیں اپنے مستحکم اصولوں کے مطابق ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن بارشیں ہونے کے باوجود یہ ہو سکتا ہے کہ بعض جگہ یہ بارشیں پیداواری اثرات کی حامل ہوں اور بعض اوقات بے وقت اور ہلاکت آفریں ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک قوم کے لیے تو یہ بارشیں باعث روئیدگی اور حیات ہوں اور دوسری اقوام کے لیے مہلک ہوں اور اللہ تعالیٰ طبعی عوامل کو کسی کے حق میں اور کسی کے خلاف موڑ دیں۔ کیونکہ قوانین طبعی اور طبعی عوامل کا خالق بھی تو اللہ ہے۔ اور ہر حال میں اسباب کو متوجہ بھی اللہ ہی کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان اسباب کو اس طرح بھی موڑ سکتا ہے جس کے دیکھنے کے لوگ عموماً عادی نہیں ہوتے اور نتائج ظاہری قوانین قدرت کے خلاف نکل آئیں۔ جس طرح چاہے' جہاں چاہے اور جب چاہے کیونکہ سچائی کی قوت ہر وقت آسمانوں اور زمینوں میں کام کرتی رہتی ہے۔ اور یہ عظیم قوت ان اصولوں کی پابند نہیں ہے جنہیں لوگ بالعموم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جس طرح کائنات کے امور بظاہر چلتے ہیں۔

یہ تھی حضرت ہود ؑ کی دعوت اور بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس دعوت کے ساتھ کوئی خارق العادت معجزہ نہ تھا' کیونکہ حضرت ہود کے زمانے کے قریب زمانے میں طوفان نوح ؑ کا واقعہ پیش آ گیا تھا۔ یہ عظیم واقعہ لوگوں کو یاد تھا اور ان کی زبانوں پر بروقت اس کے بارے میں اس کی کہانیاں تھیں۔ نیز دوسری سورتوں میں اللہ نے بتایا ہے کہ ان کو اس واقعہ کی یاد دہانی بھی کرائی گئی تھی۔ رہی قوم ہود تو ان کا رویہ یہ تھا کہ وہ حضرت ہود کی دعوت اور ان کی سچائی کے بارے میں خلجان میں مبتلا تھے۔

قَالُوْا یٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَةٍ وَّ مَا نَحْنُ بِتَارِكِیْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَ مَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ۝۵۳ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ

”انہوں نے جواب دیا ”اے ہود' تو ہمارے پاس کوئی صریح شہادت لے کر نہیں آیا ہے اور تیرے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے' اور تجھ پر ہمیں یقین بھی نہیں ہے ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ تیرے اوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے“۔

وہ اس قدر گمراہ ہو گئے تھے کہ خود حضرت ہود ؑ کے بارے میں ایسے خیالات رکھتے تھے ۔ وہ یہ کہتے تھے کہ حضرت ہود مجنونانہ بات کرتے ہیں چونکہ ان کو ان کے الہوں میں سے کسی اللہ کی مار پڑ گئی ہے ۔ اس لیے وہ حواس باختہ ہو گئے ہیں ۔ چنانچہ ان کے ریمارکس یہ تھے :

قَالُوْا مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ (۱۱ : ۵۳) ''انہوں نے جواب دیا'' اے ہود' تو ہمارے پاس کوئی صریح شہادت لے کر نہیں آیا ہے''۔ یعنی تم جن خیالات کا اظہار کرتے ہو' ان کی پشت پر کوئی دلیل نہیں ہے ۔ لیکن ان کی یہ بات غلط اس لیے تھی کہ عقیدۂ توحید کے لیے کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہے ۔ صرف یاد دہانی اور نصیحت کی ضرورت ہے اور صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ فطرت سلیمہ سے اپیل کی جائے اور اس کے ضمیر کو جگایا جائے ۔

وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ (۱۱ : ۵۳) ''اور تیرے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے''۔ کیونکہ تم بغیر کسی دلیل اور حجت کے بات کرتے ہو۔

وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۱۱ : ۵۳) ''اور تجھ پر ہمیں یقین بھی نہیں ہے''۔ نہ ہم آپ کی تصدیق کرتے ہیں اور نہ آپ کی بات مانتے ہیں ۔ ہمارے نزدیک تمہاری یہ باتیں ہذیان ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ تمہیں ہمارے الہوں کی مار پڑ گئی ہے ۔

ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ حضرت ہود کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ ان کو آخری چیلنج دے دیں اور اب صرف اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے آخری رپورٹ پیش کر دیں اور اپنی قوم کو آخری وارننگ دے دیں جنہوں نے ہر حالت میں جھٹلانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور وہ اگر تکذیب پر اصرار کرتے ہیں تو حضرت ہودؑ ان کے ساتھ مکمل بائیکاٹ کا اعلان کر دیں ۔

قَالَ اِنِّیْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۵۶﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَیْكُمْ ؕ وَیَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ ﴿۵۷﴾

''ہود ؑ نے کہا ''میں اللہ کی شہادت پیش کرتا ہوں اور تم گواہ رہو کہ یہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو تم نے خدائی میں شریک ٹھہرا رکھا ہے اس سے میں بیزار ہوں ۔ تم سب کے سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کسر نہ اٹھا رکھو اور

مجھے ذرا مہلت نہ دو ' میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی ۔ کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو ۔ بیشک میرا رب سیدھی راہ پر ہے ۔ اگر تم منہ پھیرتے ہو تو پھیر لو ۔ جو پیغام دے کر میں تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں تم کو پہنچا چکا ہوں ۔ اب میرا رب تمہاری جگہ دوسری قوم کو اٹھائے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے ' یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگراں ہے"۔

حضرت ہود اس قوم سے تھے ' ان کے بھائی تھے لیکن دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور قوم سے مکمل بائیکاٹ کر دیا ۔ انہوں نے چونکہ ہلاکت کا راستہ اختیار کر لیا تھا اس لیے انہوں نے سمجھا کہ اب اس قوم کے ساتھ رہنا نہایت ہی خطرناک ہے ۔ پوری قوم دو گروہ ہو گئی ہے جس کے اتحاد کے لیے کوئی نظریاتی بنیاد موجود نہیں ہے ۔

حضرت ہود ؑ اللہ کو گواہ ٹھہراتے ہیں کہ وہ اب اس قوم سے بری الذمہ ہیں اور وہ ان گمراہوں سے مکمل طور پر جدا ہو رہے ہیں ۔ وہ ان کے منہ پر یہ اعلان کرتے ہیں تاکہ ان کے دلوں میں یہ غلط فہمی باقی نہ رہے کہ وہ اب بھی اس ملت مشرکہ کے فرد ہیں ۔

حضرت ہود ؑ اعلان برأت اور لاتعلقی بھی نہایت ہی شریفانہ انداز میں کرتے ہیں ۔ نہایت اطمینان اور نہایت ہی وثوق سے بات کرتے ہیں ۔ حضرت کا انداز اس قابل ہے کہ اس پر غور کیا جائے ۔

یہ بات تعجب انگیز ہے کہ ایک طرف ایک فرد ہے ' اور دوسری جانب ایک پوری قوم ہے جو نہایت ہی سخت گیر اور احمق ہے ۔ ان کی حماقت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے یہ بت انسانوں کو پاگل بھی کر سکتے ہیں ' نیز ان کی فکری کجی کی حالت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ پیغمبرانہ دعوت کو ہذیان سمجھتے ہیں ۔ بت اور خود ساختہ اور بے حس الٰہوں کو وہ اس قدر طاقتور سمجھتے ہیں اور انہیں ان پر اس قدر اعتقاد ہے کہ وہ کسی کو پاگل بھی کر سکتے ہیں ۔ چنانچہ ایک پر عزم فرد پیغمبرانہ شان کے ساتھ اٹھتا ہے اور ان کے ان معتقدات کو چیلنج کرتا ہے ' پھر ان کو چیلنج کرتا ہے ' ان سے کوئی مہلت نہیں مانگتا ۔ ان کو بھی سوچ کا موقعہ نہیں دیتا کہ ان کا یہ غیظ و غضب ٹھنڈا پڑ جائے اور وہ سوچ لیں ۔

انسان کو ایک فرد واحد کو یوں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ صرف ایک شخص ہے اور وہ اس قدر جسارت کرتا ہے ۔ اس کے بالمقابل طاقتور اور سخت گیر دشمن ہے لیکن جب انسان اس صورت حالات کا حقیقی تجزیہ کرتا ہے تو یقیناً اس کی دہشت دور ہو جاتی ہے ۔

اس جسارت اور جسورانہ اقدام کا حقیقی سبب قوت ایمانی ہے ۔ اللہ پر مکمل بھروسہ اور اطمینان قلب ہی اس جسارت کا اصل سبب ہے ۔ جب انسان کو اللہ کی نصرت اور اس کے وعدوں پر بھروسہ ہو تو پھر وہ ایسے ہی اقدامات کرتا ہے ۔ جب کیفیت ایمانی دل کی گہرائیوں میں اتر جائے تو اللہ کی نصرت کے وعدے دل کو چھوتے ہیں اور وہ محسوسات کی شکل میں یقینی ہو جاتے ہیں ۔ انسان کا دل ' اس کے ہاتھ اور اس کا پہلو اللہ کی نصرت کو محسوس کرتا ہے ۔ یہ وعدہ پھر مستقبل کا وعدہ اور غیب کے پردوں میں مستور وعدہ نظر نہیں آتا ۔ یہ حاضر و موجود وعدہ اور محسوس نصرت ہوتی ہے ۔ آنکھیں اسے دیکھتی ہیں اور دل محسوس کرتا ہے ۔

قَالَ اِنِّیْ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْا اَنِّیْ بَرِیْءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (۱۱:۵٤) "ہود نے کہا "میں اللہ کی شہادت پیش کرتا ہوں ۔ اور تم گواہ رہو کہ یہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو تم نے خدائی میں شریک ٹھہرا رکھا ہے اس سے میں بیزار ہوں"۔

یعنی میں اس حقیقت پر اللہ کو بھی اور تم کو بھی گواہ ٹھہراتا ہوں کہ میں تمہارے شرک سے بری الذمہ ہوں اور گواہ رہو کہ میں نے اس برأت کا اعلان تمہارے سامنے کر دیا ہے ۔ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اب تم اور تمہارے یہ خود ساختہ الٰہ مل کر میرا کچھ بگاڑنا چاہو تو بگاڑ لو ۔ تم دونوں مل کر جو تدابیر بھی کر سکتے ہو 'کرو ۔ مجھے کوئی مہلت نہ دو ۔ میں تمہاری کوئی پروا نہیں کرتا اور نہ تم سے خوف کھاتا ہوں ۔

اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ (۱۱:۵٦) "میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی" ۔ تم جس قدر انکار کرو 'اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا ۔ یہ ایک حقیقت ہے جو اپنی جگہ قائم ہے کہ اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی ۔ وہ ہم سب کا پروردگار ہے ۔ بلکہ وہ پوری کائنات کا رب ہے 'اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے ۔

مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا (۱۱:۵٦) "کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو" ۔ غضبٌ اور انتہائی قدرت کی یہ ایک مخصوص شکل ہے کہ انسان کسی کو سر کے بالوں سے پکڑ کر اسے قابو کر لے ۔ اس مخصوص مثال میں انسان اور جانور سب شریک ہیں ۔ چنانچہ اس مختصر فقرے میں قوت غلبہ اور گرفت کو ایک نہایت ہی مخصوص شکل میں پیش کر دیا گیا ۔ اللہ کی قوت گرفت کو اس قدر مخصوص انداز میں پیش کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر سخت گیر اور قوی الجسم اور سخت مزاج تھے ۔ نیز اس سے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ اللہ کی سنت اس کائنات میں جاری و ساری ہے اور اس کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں ۔

اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۱۱:۵٦) "بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے" ۔ اللہ صاحب قدرت ہے 'اور اس نے جو راہ بتائی ہے وہ سیدھی ہے ۔ ان الفاظ میں قوت 'سیدھی بات اور پختہ عزم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ۔

یہ فیصلہ کن اور دوٹوک انداز کلام اس راز کو کھول دیتا ہے جو اس سربلندی اور چیلنج میں مضمر ہے ۔ اس سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے جو حضرت ہود علیہ السلام کی شخصیت میں رچی بسی تھی ۔ اور بالکل نمایاں تھی ۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا رب قوی ہے اور قاہر ہے اور وہ ان کے علاوہ تمام عالمین کا رب ہے ۔

مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا (۱۱:۵٦) "کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو" ۔ اور حضرت ہود کی قوم کے اجڈ سخت گیر اور کرخت مزاج لوگ اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہ وہ اس زمین کے دوسرے جانوروں کی طرح جانور ہیں اور ان کی چوٹی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ مکمل طور پر اللہ کے قبضہ

قدرت میں ہیں۔ لہٰذا حضرت ہود ؑ ان وحشیوں سے نہ ڈرتے ہیں اور نہ ان کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ ان پر مسلط نہیں ہو سکتے الا یہ کہ اللہ تعالیٰ ان وحشیوں کو ان پر مسلط کرنا چاہے۔ رہا ان کے ساتھ اکٹھے رہ کر زندگی گزارنے کا مسئلہ تو یہ ممکن نہیں کیونکہ دونوں کا انداز حیات ہی متضاد ہے۔

ایک داعی جب اپنے دل میں اس قسم کی حقیقت کو جاگزیں کر لیتا ہے تو اسے اپنے کام اور دعوت کے انجام کے بارے میں کوئی شک اور شبہ نہیں رہتا اور وہ اپنی جدوجہد میں آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ حقیقت کیا ہے؟ یہ حقیقت مقام الوہیت کا صحیح تصور ہے اور یہ تصور خالص مومنین کے دل میں صاف و شفاف ہوتا ہے۔ اللہ کی قوت کے بھروسے پر یہ چیلنج دے کر اور اسے ایک واضح اور مجسم شکل میں پیش کرنے کے بعد آپ ان کو اخروی طور پر ڈراتے ہیں :

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَیْكُمْ (۱۱ : ۵۷) "اگر منہ پھیرتے ہو تو پھیرلو' جو پیغام دے کر میں تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں تم کو پہنچا چکا ہوں"۔ میں نے اللہ کی طرف سے عائد شدہ فریضہ ادا کر دیا ہے۔ اب میں تمہارے معاملات سے دامن جھاڑتا ہوں اور تمہیں اور اللہ کی قوت قاہرہ کو تنہا چھوڑتا ہوں جس کا اصول یہ ہے :

وَیَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ (۱۱ : ۵۷) "اب میرا رب تمہاری جگہ دوسری قوم کو اٹھائے گا"۔ اور یہ قوم اس قابل ہو گی کہ دعوت اسلامی کو اخذ کر دے' اللہ کی ہدایات پر قائم رہے۔ اور اس کا رویہ تم جیسا باغیانہ' ظالمانہ اور گمراہانہ نہ ہو گا۔

وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَیْئًا (۱۱ : ۵۷) "اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے"۔ کیونکہ تم اس پر قادر ہی نہیں ہو' نیز تمہارے اٹھالے جانے سے دنیا میں کوئی خلا پیدا نہ ہو گا اور نہ نقص واقع ہو گا۔

اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ (۱۱ : ۵۷) "یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگراں ہے"۔ اللہ اپنے دین کا بھی محافظ ہے اور اپنے دوستوں کا بھی۔ وہ اپنے دوستوں کو اذیتوں اور ہلاکت سے بچانے والا ہے اور وہ اس جہاں کا نگراں ہے اور تم اس سے نہ بچ کر نکل سکتے ہو اور نہ اللہ کو عاجز کر سکتے ہو۔

یہ تھی دو ٹوک بات جو انہوں نے کی۔ اب حضرت ہودؑ اور ان کی قوم کے درمیان مکالمہ ختم ہو گیا اور یہ لوگ اللہ کی سرزنش کے مستحق ہو گئے۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا هُوْدًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّیْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ ﴿۵۸﴾

"پھر جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے ہود ؑ کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے'

نجات دے دی اور ایک سخت عذاب سے انہیں بچالیا"۔

جب ہم نے فیصلہ کیا کہ اس ڈراوے کو حقیقت کی شکل دے دی جائے اور اب قوم ہود کا حساب چکا دیا جائے تو ہم نے ہود اور ان پر ایمان لانے والوں کو نجات دے دی اور یہ ہماری جانب سے رحمت کا کرشمہ تھا' حالانکہ عذاب عام تھا اور سب لوگوں پر نازل ہو رہا تھا لیکن ہود اور ان کے ساتھیوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ ان کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ یہ سخت عذاب صرف مکذبین کے لیے تھا۔ عذاب کی صفت یہاں غلیظ بتائی گئی ہے یعنی جسمانی اعتبار سے موٹا عذاب اور یہ لفظ قوم عاد کی سخت مزاجی اور اس وقت کی فضا کے لیے نہایت ہی موزوں ہے۔

اب قوم عاد تو فنا کر دی گئی ہے لیکن ان کی بربادی کی طرف یہاں سرسری اشارہ ہی کر دیا گیا۔ البتہ یہاں ان کے جرائم کو مفصل طور پر ریکارڈ کر دیا گیا کیونکہ اصل اہمیت عذاب کو نہیں' جرائم کو حاصل ہے۔ اب ان کو لعنت اور مذمت کے ساتھ رخصت کیا جا رہا ہے اور یہ لعنت و مذمت بار بار اور بتکرار کی جاتی ہے۔

وَ تِلْكَ عَادٌ ۟ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ وَ اتَّبَعُوْۤا اَمْرَ
كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۵۹﴾ وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا ۵
كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾ ۱۱ ع
۵

"یہ ہیں عاد' اپنے رب کی آیات سے انہوں نے انکار کیا' اس کے رسولوں کی بات نہ مانی' اور ہر جبار دشمن حق کی پیروی کرتے رہے۔ آخر کار اس دنیا میں بھی ان پر پھٹکار پڑی اور قیامت کے روز بھی۔ سنو! عاد نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سنو! دور پھینک دیئے گئے عاد' ہود کی قوم کے لوگ"۔

"وہ" ہے قوم عاد' بہت دور ہے' حالانکہ ذکر تو ان کا ابھی ہوا ہے اور ان کی لاشیں تو ابھی تک قارئین کی نظروں میں ہیں۔ لیکن فکر و نظر کی دنیا سے وہ دور ہو گئے اور نیست و نابود ہو کر تاریخ کی تنگ و تاریک اور دور دراز وادیوں میں دھکیل دیئے گئے۔

وَ تِلْكَ عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ (۱۱: ۵۹) "وہ ہیں عاد' اپنے رب کی آیات سے انہوں نے انکار کیا' اس کے رسولوں کی بات نہ مانی"۔ ان لوگوں نے صرف ایک رسول کی دعوت کو جھٹلایا تھا۔ لیکن کیا تمام رسولوں کی دعوت ایک دعوت نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی کسی ایک رسول کی دعوت کا انکار کر دے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس نے تمام رسولوں کی دعوت کا انکار کر دیا کیونکہ دعوت تو ایک ہے یعنی عاد نے تو دراصل ایک رسول حضرت ہود کی دعوت کا انکار کیا تھا' لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام رسولوں کی دعوت ایک جیسی ہے۔ نیز اسلوبی انداز میں بھی لفظ "رسل" کی اہمیت ہے کیونکہ آیات جمع ہے اور اس کے مقابلے میں رسل لایا گیا تاکہ ان کا جرم مزید گھناؤنا نظر آئے یعنی تمام آیات کا انکار اور تمام رسولوں کا انکار۔

وَ اتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (۱۱ : ۵۹) ”اور ہر جبار دشمن حق کی پیروی کرتے رہے“۔ یہ لوگ ہر اس شخص کے احکام مانتے تھے جو ان پر مسلط ہو جاتا اور جو دشمن حق ہوتا تھا۔ حالانکہ دعوت اسلامی کا براہ راست تقاضا یہ تھا کہ وہ تمام جباروں اور قہاروں کی غلامی سے اپنے آپ کو رہا کرائیں۔ اور وہ خود اسلامی شریعت کے مطابق اپنے معاملات طے کریں۔ وہ دوسرے درجے کے انسان بن کر زندگی نہ گزاریں جس میں ان کی انسانیت کی کوئی قدر و منزلت نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ہود ؑ اور ان کی قوم کے درمیان اصل تنازعہ اللہ وحدہ کی حاکمیت و ربوبیت کا تھا۔ حضرت ہود ؑ کی دعوت یہ تھی کہ حاکم اور مطاع اللہ ہے اور اس کے مقابلے میں کسی بندے کی حاکمیت اور اطاعت و اتباع نہیں جبکہ وہ لوگ ہر دشمن حق کو حاکم اور مطاع مانتے تھے اور ایسے جباروں اور منکرین حق کی حکومت کو تسلیم کرتے تھے۔ قرآن کے ان الفاظ پر ذرا دوبارہ غور فرمائیں :

”وہ تھے عاد اپنے رب کی آیات سے انہوں نے انکار کیا' اس کے رسولوں کی بات نہ مانی اور ہر جبار دشمن حق کی پیروی کرتے رہے“۔

گویا وہ رسولوں کے احکام کی نافرمانی کرتے تھے اور جباروں اور قہاروں کے احکام مانتے تھے جبکہ اسلام کا خلاصہ یہ ہے کہ رسولوں کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کیا جائے کیونکہ رسولوں کا حکم 'حکم الٰہی ہوتا ہے۔ یہ ہے اسلام اور جاہلیت کا فرق۔ اس ایک پوائنٹ پر اسلام اور کفر کی راہیں جدا ہوتی ہیں۔ ایمان اور کفر کا امتیاز ہوتا ہے۔ تمام رسولوں اور تمام دعوتوں میں یہ نکتہ دعوت کی بنیاد رہا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دعوت توحید کا پہلا اصرار اور اولین تقاضا یہ ہے کہ غیراللہ کی ہر قسم کی غلامی سے نجات حاصل کی جائے اور باطل خداؤں کی خدائی اور بادشاہت کے خلاف اعلان جنگ کیا جائے۔ یوں اس تصور کے مطابق انسان اگر اپنی شخصیت کو ذلیل کرے اور آزادی کے حق سے دست بردار ہو جائے اور جبار و قہار ڈکٹیٹروں کا اتباع اختیار کر لے تو یہ کفر اور شرک جیسا جرم ہے۔ اور یہ جرم اسلامی نکتہ نظر سے اس قدر عظیم ہے کہ اس پر دنیا میں ہلاکت اور آخرت میں جہنم کی سزا دی جا/تی ہے اس لیے کہ اللہ نے لوگوں کو آزاد پیدا کیا ہے اور ان کو حکم دیا ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق میں سے کسی کے دین کو اختیار نہ کریں' اپنی آزادی سے دست بردار نہ ہوں' اور کسی ڈکٹیٹر اور مقتدر اعلیٰ کے سامنے سر نہ جھکائیں 'کیونکہ اسی میں انسان کی انسانیت کا احترام ہے۔ اگر وہ اس قدر و منزلت کا احترام نہ کریں گے تو اللہ کے ہاں ان کو نجات نہ ہو گی۔ یاد رہے کہ انسانوں کی کوئی سوسائٹی غیراللہ کی بندگی کرتے ہوئے معزز اور محترم سوسائٹی نہیں کہلا سکتی۔ اور جو لوگ غیراللہ کی غلامی اختیار کرتے ہیں اور ان کے سامنے سر اطاعت خم کرتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ وہ مجبور ہیں تو اللہ کے ہاں ان کا یہ عذر مسموع نہ ہو گا۔ کیونکہ عوام الناس تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں اور جبار اور ڈکٹیٹر تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر لوگ آزادی کے حصول کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو ان کی راہ کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ قربانیاں دے کر جانی اور مالی ذلت سے نجات پا سکتے ہیں۔

عاد کے لوگ اس لیے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے ہر جبار اور دشمن دین کی اطاعت اختیار کی اور دنیا و آخرت' دونوں میں ملعون کر کے ان کو راہ ہلاکت کی طرف رخصت کیا گیا۔

وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ (۱۱ : ۶۰) ”آخرکار اس دنیا میں بھی ان پر پھٹکار پڑی اور قیامت کے روز بھی“۔ اب اللہ تعالیٰ ان کے حالات اور ان اسباب کو بھی یہاں ریکارڈ فرماتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس انجام بد تک پہنچے اور بطور سرکاری اعلامیہ بتایا جاتا ہے کہ

اَلَآ اِنَّ عَادًا کَفَرُوْا رَبَّهُمْ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ (۱۱ : ۶۰) ”سنو! عاد نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سنو! دور پھینک دیئے گئے عاد، ہود کی قوم کے لوگ“۔

یہ گویا دور پھینک دینے کے بعد ان کے لیے بد دعا بھی ہے۔ نہایت ہی تاکیدی الفاظ میں کہا گیا کہ لعنت ان کا عنوان ہے اور یہ لوگ جہاں بھی ہوں ان پر لعنت کی بارش ہوتی رہے گی۔

اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ (۱۱ : ۶۰)

---ooo---

اس سورت میں جس انداز سے قصہ قوم ہود بیان کیا گیا ہے اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے ذرا ہم یہاں رکیں گے۔ چند لمحات کے لیے آپ بھی رکیے۔ بعد میں ہم قصہ قوم صالح میں داخل ہوں گے' ان شاء اللہ۔

اصل بات یہ ہے کہ صدیوں اور زمانوں سے دعوت اسلامی اور تحریک اسلامی کے لیے جو ایک ہی لائن قرآن کریم دیتا ہے' اس میں ہمارے لیے نشانات راہ ہیں۔ یہ محض تاریخ فہمی کے لیے نشانات نہیں دیئے گئے اور نہ ہی تاریخ پر غور کرنے کا طریقہ بتایا گیا۔ بلکہ ان نشانات کی نشاندہی کا اصل مقصد یہ ہے کہ یہ ہمارے لیے مستقبل کا لائحہ عمل ہے۔ یہ لائن صرف اس جماعت صحابہ ہی کو نہیں دی گئی جنہوں نے دنیا میں انقلاب برپا کیا اور اس وقت حضورؐ کے دور میں اور ازمنہ مابعد میں کرۂ ارض سے جاہلیت کو اکھاڑ پھینکا بلکہ یہ لائن ہر اس جماعت اور تحریک کے لیے ہے جو قیامت تک ان خطوط پر کام کرنا چاہتی ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جس کی وجہ سے قرآن کریم تاریخی نہیں' دعوتی کتاب بن جاتی ہے اور اس کی راہنمائی یہ ہے کہ تحریک برپا کرو' ہر مکان و زمان میں۔

فی ظلال القرآن میں مختلف آیات کے تحت آیات کی تشریح اور تفسیر کرتے ہوئے مختلف مقامات پر ہم نے اس نکتے کی طرف سرسری اشارات کیے ہیں۔ مختلف مقامات پر سیاق کلام کی مناسبت سے بات کی گئی لیکن یہ بات مختصر تھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نکتے کو ہم قدرے تفصیل سے لیں اور وہ تمام نکات یہاں دہرا دیں جو دوسرے مقامات پر مختصراً بیان ہوئے تھے۔

○ تمام رسولوں کے پیغام کا مرکزی اور اساسی نکتہ دعوت توحید ہے۔ تمام رسولوں نے توحید کی طرف دعوت دی ہے اور توحید کے عقیدے کا مفہوم یہ ہے کہ بندگی صرف اللہ کی ہوگی۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس سلسلے میں جو تصریحات کی ہیں وہ ان الفاظ میں ہیں :

قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ (۱۱ : ۶۱) ”اے برادران قوم صرف اللہ کی

بندگی کرو اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی اور الٰہ نہیں ہے"۔ ہم نے اس پوری تفسیر میں لفظ عبادت کی تفسیریوں کی ہے کہ بندہ اپنے تمام دنیاوی اور اخروی امور میں اللہ کی اطاعت کرے۔ اس لیے کہ اس لفظ کا لغوی مفہوم یہی ہے۔ کیونکہ لفظ عَبَدَ کا مفہوم یہ ہے کہ "اس نے اطاعت کی' اس کے تابع ہوا اور اس کے لیے جھکا"۔ "طریق معبد" کے معنی ہوتے ہیں "ہموار اور جاری راستہ"۔ اور عَبَّدَہُ کے معنی ہیں "اس نے اسے غلام اور تابع فرماں بنایا"۔ ابتداء جن عربوں کو خطاب کر کے یہ لفظ استعمال کیا گیا تھا۔ وہ یہ نہ سمجھتے تھے کہ عبادت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ مراسم پرستش بجالائے جائیں بلکہ جس وقت اللہ کی عبادت اور بندگی کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس وقت مراسم عبادت کا تعین ہی نہ ہوا تھا۔ بلکہ ابتداء عرب عبادت سے یہی مفہوم سمجھتے تھے کہ تمام امور میں اللہ کی بندگی کی جائے اور اللہ کے سوا تمام شخصیات کی اطاعتیں اور بندگیاں ختم کر دی جائیں اور حضورؐ نے منصوص طور پر عبادت کا مفہوم اتباع بیان فرمایا ہے۔ محض مراسم عبودیت تک اسے مخصوص و محدود نہیں کیا گیا۔ جب عدی ابن حاتم کی طرف سے یہ سوال ہوا کہ ان لوگوں نے تو احبار و رہبان کو رب نہیں بنایا تو حضورؐ نے فرمایا "ہاں احبار و رہبان نے ان لوگوں کے لیے حلال و حرام مقرر کیا تو ان لوگوں نے ان کا اتباع کیا تو یہ لوگوں کی جانب سے احبار و رہبان کی عبادت تھی"۔ پرستش پر لفظ عبادت کا اطلاق تو اس لیے ہوا ہے کہ مراسم پرستش بھی ایک قسم کی اطاعت ہے۔ مراسم عبادت میں پوری طرح لفظ عبادت کا مفہوم نہیں سماتا بلکہ مراسم عبادت میں اصالتاً عبادت کا مفہوم نہیں ہے۔ بلکہ ان کو بالتبع عبادت کہا گیا ہے۔ جب لوگوں کے ذہنوں میں عبادت اور دین کا مفہوم خلط ملط ہو گیا تو انہوں نے یہ سمجھا کہ جس عبادت اور دین کو ترک کرنے سے لوگ کافر ہو جاتے ہیں وہ صرف مراسم عبادت ہیں کہ جب کوئی یہ مراسم اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے بجالائے تو وہ اسلام سے نکل کر جاہلیت میں داخل ہو جاتا ہے۔ مثلاً بتوں کی پوجا کرنا وغیرہ اور جو شخص بتوں کی پوجا نہ کرے' صرف اللہ وحدہ کی نماز پڑھے تو وہ شرک کو چھوڑ کر مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد اسے کافر کہنا جائز نہیں ہے۔ اس طرح وہ کسی اسلامی سوسائٹی میں وہ تمام حقوق حاصل کر سکتا ہے جو کسی حقیقی مسلمان کو حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً اس کی جان' اس کا مال اور اس کی عزت محفوظ ہوتی ہے۔ اور تمام دوسرے اسلامی حقوق بھی اسے حاصل ہوتے ہیں۔

یہ تصور دراصل خام خیالی پر مبنی ہے۔ یہ عبادت کے مفہوم میں کمی کرنا ہے اور اسے محدود کرنا ہے۔ بلکہ یہ اس لفظ کے مفہوم میں صریح تغیر اور تحریف ہے۔ کیونکہ اس لفظ کا اصل مفہوم مکمل اطاعت اور ہمہ گیر نظام زندگی ہے اور اس مفہوم کی تصریح خود نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمائی ہے۔ جب آپؐ نے آیت

اتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ کی خود تشریح فرمائی۔ اور حضورؐ کی تشریح اور تفسیر کے بعد کسی کے لیے مزید تفسیر کرنے کی کوئی گنجائش کہاں رہتی ہے؟

(اس سلسلے میں اس قیمتی بحث کو ضرور پڑھیں جو المسلم العظیم سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی کتاب "المصطلحات الاربعۃ فی القرآن" کے نام سے تحریر فرمائی ہے۔ جس میں الٰہ' رب' دین اور عبادت کا مفہوم بیان فرمایا ہے)

ہم نے فی ظلال القرآن میں بار بار اس نکتے کی وضاحت کی ہے۔ اور اس کے علاوہ ہم نے اسلام کے تحریکی مزاج کے بارے میں جہاں جہاں لکھا ہے یا اللہ نے ہمیں لکھنے کی توفیق دی ہے۔ ہم نے اس نکتے کی بار بار توضیح کی ہے۔ اس

زاویہ سے یہاں بھی ہمیں یہ موقعہ مل جاتا ہے کہ حضرت ہود ؑ کے دور میں اسلام و جاہلیت کی جو کشمکش برپا تھی اور جس طرح اس سورت میں اس قصے کو بیان کیا گیا ہے ۔ اس میں اس کشمکش کا اصل محور اور موضوع کیا تھا۔ اور حضرت ہود ؑ جو ان سے مطالبہ کر رہے تھے کہ

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۱۱ : ۶۱) کا مفہوم کیا تھا۔ حضرت ہود ؑ کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ تم بتوں کے سامنے سجدے نہ کرو' ان کی نماز نہ پڑھو جب کہ لوگ اس دین کے مفہوم کو محدود کر کے اور سکیڑ کر سمجھتے ہیں اور اس طرح دین اور عبادت کو صرف مراسم عبادت اور پرستش تک محدود کر دیتے ہیں بلکہ حضرت ہود کا مطالبہ یہ تھا کہ تم پورے کے پورے ' اپنی پوری زندگی کو اسلامی نظام میں داخل کر دو۔ اور کسی بھی معاملے میں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو پوری زندگی میں۔چنانچہ معلوم ہوا کہ جس جرم کی وجہ سے قوم ہود ؑ ہلاک کی گئی ۔وہ صرف بتوں کے سامنے مراسم عبادت اور پرستش بجا لانے کا جرم نہ تھا' یہ تو ان کے ہمہ گیر جرم کا ایک پہلو تھا جس کی وجہ سے وہ مشرک ہو گئے تھے ۔اصل جرم یہ تھا کہ وہ اللہ کی آیات و ہدایات کے منکر تھے ' رسولوں کی اطاعت کے بجائے ان کی نافرمانی کرتے تھے اور ان کے مقابلے میں دوسرے جباروں کے احکام کی تعمیل کرتے تھے ۔

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (۱۱ : ۵۹) اور یہ ہے قول رب العالمین اور اصدق القائلین کا کہ وہ (۱) آیات کا انکار کرتے تھے ' (۲) رسول کی اطاعت نہ کرتے تھے ' (۳) اور دشمن دین ڈکٹیٹروں کے مطیع فرمان تھے ۔

اللہ کی آیات کا انکار تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسولوں کی نافرمانی اور جباروں کی اطاعت کرتے تھے ۔یہ درحقیقت ایک ہی فعل ہے کیونکہ جب کوئی شخص اللہ رسول کے ذریعہ ارسال کردہ قوانین کی مخالفت کرتا ہے تو وہ مجرد اس فعل سے طاغوت کے تابع ہو جاتا ہے ۔اللہ اور رسول کی اطاعت سے نکل جاتا ہے ۔ان لوگوں نے چونکہ آیات الہیہ اور رسولوں کا انکار کیا اس لیے وہ اسلام سے نکل گئے اور مشرک ہو گئے ۔اس سے قبل ہم یہ بات ثابت کر آئے ہیں کہ اس کرۂ ارض پر سب سے پہلا دین ' دین اسلام تھا۔ حضرت آدم جنت سے اترے تو وہ دین اسلام لے کر اترے ۔ اور اس کرۂ ارض پر خلیفہ مقرر ہوئے ۔یہی دین ہے جسے حضرت نوح ؑ لے کر آئے اور پھر اسی کو لے کر وہ کشتی نوح ؑ سے اترے ۔ اس کے بعد یوں ہوتا رہا کہ لوگ اسلام سے نکل کر جاہلیت میں داخل ہوتے اور اللہ رسول بھیج کر دوبارہ انہیں اسلام میں داخل کرتا۔یہ سلسلہ آج تک جاری ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر عبادت کا مفہوم صرف یہی ہوتا کہ اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے مراسم عبادت بجا نہ لائے جائیں تو اس کے لیے اس قدر رسول بھیجنے کی ضرورت نہ ہوتی جو تاریخ انسانیت میں مبعوث ہوئے اور پھر اس کے لیے اس قدر جدوجہد اور قربانیوں کی بھی ضرورت نہ ہوتی جو اس مقصد کے لیے تاریخ میں دی گئیں اور تحریک اسلامی کے کارکنوں پر وہ مظالم ڈھانے کی ضرورت نہ ہوتی جو تاریخ کے مختلف ادوار میں اہل ایمان پر ڈھائے گئے ۔رسولوں کے یہ قافلے ' اور یہ ان تھک جدوجہد اور راہ حق میں تشدد' مشکلات اور تکالیف ان سب امور کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ لوگوں کو پوری طرح

جاہلیت کے نظام سے نکال کر اسلامی نظام میں داخل کیا جائے اور یہ تبدیلی اور انتقال ان کی پوری زندگی میں ہو۔

الوہیت کی توحید' ربوبیت کی توحید' قیومیت کی توحید' حاکمیت کی توحید' قانون سازی کے مراجع کی توحید' نظام زندگی کی توحید' دین اور نظام حیات کے سلسلے میں ہدایات لینے کے مرجع کی توحید' غرض یہ ہمہ جہت اور ہمہ گیر توحید ہی وہ مقصد تھا جس کے لیے رسول بھیجے گئے اور اس راہ میں اس قدر ہمہ گیر جہاد کیا گیا اور پوری انسانی تاریخ میں اس کے لیے داعیوں نے مشکلات کو برداشت کیا۔ ورنہ اللہ کی ذات تو غنی ہے اس کو اس کشمکش کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سب جدوجہد اس لیے کی گئی کہ انسانوں کی زندگی کی اصلاح اس کے بغیر ممکن ہی نہ تھی۔ اس کے بغیر انسان کے لیے انسان بننا ہی ممکن نہ تھا۔ انسان من کل الوجوہ انسان تب ہی بن سکتا تھا جب وہ پوری طرح من کل الوجوہ اسلام میں داخل ہو جائے۔ اس موضوع پر ہم انشاء اللہ اس سورت کے آخر میں دوبارہ بات کریں گے۔

ایک دوسری حقیقت جس کا انکشاف حضرت ہود ؑ نے اپنی قوم پر کیا وہ یہ ہے:

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ( ۱۱ : ۵۲ ) "اور اے میری قوم کے لوگو' اپنے رب سے معافی چاہو' پھر اس کی طرف پلٹو' وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ مجرم بن کر (بندگی سے) منہ نہ پھیرو"۔

یہ وہی بات ہے جس کا تذکرہ میں نے حضور اکرم ؐ کی دعوت کے سلسلے میں اس سورت کے مقدمے میں کیا ہے۔ آغاز سورت میں آیات کتاب کے بارے میں فرمایا گیا تھا:

وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ۭ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ

( ۱۱ : ۳ ) "اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔

ایمانی اقدار اور عملی اقدار کے درمیان رابطے پھر اس کائنات کے طبیعی قوانین اور شرعی قوانین کے درمیان تعلق ان آیات میں بیان کیے گئے ہیں' جو اس دین کے بنیادی حقائق ہیں۔ ان رابطوں اور پوشیدہ حقائق کی نقاب کشائی نہایت ضروری ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کے فکر و نظر کی صفائی کے لیے جو دنیا کے صرف ظاہری اور مادی پہلو پر نظر رکھتے ہیں۔ اور جن کی فکری دنیا اس قدر روشن نہیں ہے کہ جو ان حقائق کا ادراک کر سکیں یا انہیں دیکھ سکیں۔

وہ سچائی جو اس کتاب الٰہی میں پیش کی گئی ہے۔ وہ اس تکوینی سچائی سے متضاد نہیں ہے جو اللہ نے تخلیق کائنات میں ودیعت کر رکھی ہے۔ جو اس کائنات کے مزاج اور نوامیس فطرت میں بھی بالکل عیاں ہے۔ قرآن کریم بسا اوقات ان

دونوں حقائق کا یکجا ذکر کرتا ہے ۔ یعنی وہ حقیقت جو دین اسلام میں ہے اور وہ حقیقت جو نظام کائنات میں ثبت ہے ۔ یعنی عقیدۂ توحید اور کائنات کی طبیعت میں ۔ قرآن کریم شرعی حکومت اور فطری حکومت میں فرق نہیں کرتا اور بے شمار آیات میں دینی حقائق اور کائناتی حقائق کو باہم مربوط کر کے پیش کیا گیا ہے ۔ مثلاً درج ذیل آیات قابل غور ہیں :

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ (١٦) لَوْ أَرَدْنَا أَنْ نَتَّخِذَ لَهْوًا لَاتَّخَذْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا إِنْ كُنَّا فَاعِلِينَ (١٧) بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ (١٨) وَلَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ (١٩) يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ (٢٠) أَمِ اتَّخَذُوا آلِهَةً مِنَ الْأَرْضِ هُمْ يُنْشِرُونَ (٢١) لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ (٢٢) لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ (٢٣) أَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ هَذَا ذِكْرُ مَنْ مَعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِي بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ الْحَقَّ فَهُمْ مُعْرِضُونَ (٢٤) وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ (٢٥) (٢١: ١٦ تا ٢٥)

”ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ۔ اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتا ہے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے مٹ جاتا ہے اور تمہارے لیے تباہی ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو ۔

زمین اور آسمان میں جو مخلوق ہے وہ اللہ کی ہے اور جو فرشتے اس کے ہیں وہ نہ اپنے کو بڑا سمجھ کر اس کی بندگی سے سرتابی کرتے ہیں اور نہ ملول ہوتے ہیں ۔ شب و روز اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں ' دم نہیں لیتے ۔ کیا ان لوگوں کے بنائے ہوئے ارضی خدا ایسے ہیں کہ بے جان کو اٹھا کر کھڑا کرتے ہوں ؟

اگر آسمان و زمین میں ایک خدا کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان دونوں کا نظام بگڑ جاتا ۔ اس لیے پاک ہے ' اللہ رب العرش ان باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں ۔ وہ اپنے کاموں کے لیے کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہے اور سب جوابدہ ہیں ۔ کیا اسے چھوڑ کر انہوں نے دوسرے خدا بنا لیے ہیں ؟ اے نبی ' ان سے کہو ' کہ ”لاؤ اپنی دلیل ' یہ کتاب بھی موجود ہے جس میں میرے ساتھ والوں کے لیے نصیحت ہے اور وہ کتابیں بھی موجود ہیں جن میں مجھ سے پہلے لوگوں کے لیے نصیحت تھی “ ۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ حق سے بے خبر ہیں اس لیے منہ موڑے ہوئے ہیں ۔ ہم نے تم

سے پہلے جو رسول بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو"۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ (٥) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (٦) وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ (٧) (٢٢ : ٥ - ٧) "لوگو! اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے' پھر نطفے سے' پھر خون کے لوتھڑے سے' پھر گوشت کی بوٹی سے' جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس کو چاہتے ہیں ایک خاص وقت تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں' پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے' پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی۔ اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ قیامت کی گھڑی آ کر رہے گی۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ اور اللہ ضرور ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں جا چکے ہیں"۔

---ooo---

وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (٥٤) وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ (٥٥) اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (٥٦) وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (٥٧) وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ

اللّٰہِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (٥٨)
لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ (٥٩) ذٰلِكَ وَ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا
عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ (٦٠) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ
الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ (٦١) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ
هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (٦٢) اَلَمْ
تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ
(٦٣) لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (٦٤) اَلَمْ
تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَ يُمْسِكُ
السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (٦٥) وَهُوَ
الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ (٦٦) لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا
مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى
مُّسْتَقِيْمٍ (٦٧) (٢٢: ٥٤ تا ٦٧) "اور علم سے بہرہ مند لوگ جان لیں کہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے اور وہ اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل اس کے آگے جھک جائیں ' یقیناً اللہ ایمان لانے والوں کو ہمیشہ سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔

انکار کرنے والے تو اس کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہیں گے یہاں تک کہ یا تو ان پر قیامت کی گھڑی اچانک آ جائے ' یا ایک منحوس دن کا عذاب نازل ہو جائے۔ اس روز بادشاہی اللہ کی ہو گی ' اور وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا۔ جو ایمان رکھنے والے اور عمل صالح کرنے والے ہوں گے وہ نعمت بھری جنتوں میں جائیں گے ' اور جنہوں نے کفر کیا ہو گا اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہو گا ' ان کے لیے رسوا کن عذاب ہو گا۔ اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی ' پھر قتل کر دیئے گئے یا مر گئے ' اللہ ان کو اچھا رزق دے گا اور یقیناً اللہ ہی بہترین رازق ہے۔ وہ انہیں ایسی جگہ پہنچائے گا جس سے وہ خوش ہو جائیں گے۔ بے شک اللہ علیم و حلیم ہے۔ یہ تو ہے ان کا انجام ' اور جو کوئی بدلہ لے ' ویسا ہی جیسا اس کے ساتھ کیا گیا ' اور پھر اس پر زیادتی بھی کی گئی ہو ' تو اللہ اس کی مدد ضرور کرے گا۔ اللہ معاف کرنے والا اور درگزر کرنے والا ہے۔

یہ اس لیے کہ رات سے دن اور دن سے رات نکالنے والا اللہ ہی ہے اور وہ سمیع و بصیر ہے۔ یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور وہ سب باطل ہیں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں اور اللہ ہی بالا دست اور بزرگ ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور اس کی بدولت زمین سرسبز ہو جاتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ لطیف و خبیر ہے۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے' بے شک وہی غنی و حمید ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اس نے وہ سب کچھ تمہارے لیے مسخر کر رکھا ہے جو زمین میں ہے' اور اسی نے کشتی کو قاعدے کا پابند بنایا ہے کہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے' اور وہی آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر نہیں گر سکتا؟ واقعہ یہ ہے کہ اللہ لوگوں کے حق میں بڑا شفیق اور رحیم ہے وہی ہے جس نے تمہیں زندگی بخشی ہے' وہی تم کو موت دیتا ہے' اور وہی پھر تم کو زندہ کرے گا۔ سچ یہ ہے کہ انسان بڑا ہی منکر حق ہے۔

ہر امت کے لیے ہم نے ایک طریق عبادت مقرر کیا ہے جس کی وہ پیروی کرتی ہے' پس اے نبیؐ' وہ اس معاملہ میں تم سے جھگڑا نہ کریں۔ تم اپنے رب کی طرف دعوت دو' یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو"۔

ان آیات اور ان جیسی دوسری قرآنی آیات میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اللہ کی یہ کائنات بھی برحق ہے' اس کائنات کی تخلیق بھی سچائی پر ہے اور اس کائنات کی تدبیر بھی سچائی کے ساتھ اللہ کے مقرر کردہ قوانین قدرت کے مطابق ہے۔ اس کائنات کے تمام مظاہر بھی سچائی کے ساتھ انجام تک پہنچتے ہیں۔ اور یہ کتاب بھی سچائی کے ساتھ نازل ہوئی ہے اور اس کائنات میں اللہ نے جو انسان پیدا کیے ہیں ان کے درمیان فیصلے بھی اللہ سچائی کے ساتھ کرتا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہ سب امور سچائیاں ہیں اور سب کا منبع و مرجع ذات باری ہے جو بڑی سچائی ہے اور تمام قوتیں اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اللہ خیر کی قوتوں اور شر کی قوتوں کو جس طرح چاہتا ہے' استعمال کرتا ہے۔ جس طرح لوگ اس دارالامتحان میں اپنے آپ کو مستحق ٹھہراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان آیات میں توبہ و استغفار اور متاع حسن اور بارشوں اور آبادی ارض کا ذکر ایک جگہ آتا ہے۔ کیونکہ کائنات کی اخلاقی قدریں اور طبعی قدریں باہم مربوط ہیں۔ اس لیے کہ تمام فیصلے اللہ کے نظام قضا و قدر سے مربوط ہیں۔ کسی کے حق میں اچھے اور کسی کے حق میں برے فیصلے اللہ کے ہاں ہوتے ہیں لیکن اللہ کے نوامیس قدرت کے مطابق وہ نہایت منصفانہ ہیں۔

اس ربط و تعلق کے بیان سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی نظام میں ایمانی اور نظریاتی اقدار اور زندگی کی عملی اقدار میں کوئی فرق و امتیاز نہیں ہوتا ہے۔ یہ دونوں اقدار انسانی زندگی میں یکساں موثر ہوتی ہیں۔ چاہے ان کا تعلق ان اسباب غیبی سے ہو جو انسان کے علم و ادراک سے ماوراء ہوں یا ان کا تعلق ان آثار و شواہد سے ہو' جنہیں انسان دیکھ سکتا ہے اور ان کی ضابطہ بندی کر سکتا ہے۔ یعنی وہ آثار جو ایمانی اقدار کے وجود کے نتیجے میں بطور لازمی اثرات نمودار ہوتی ہیں۔

ایمانی اقدار کے نتیجے میں وجود میں آنے والی محسوس اقدار میں سے بعض کی طرف ہم نے اس سے قبل اشارہ کیا ہے' مثلاً یہ کہ اگر کسی سوسائٹی میں ایمانی تصورات اور شرعی نظام جاری ہو گا تو اس معاشرہ میں ہر فرد کو اس کی سعی کا عادلانہ اجر ملے گا۔ ہر فرد پرامن اور پرسکون زندگی بسر کرے گا' یہ امن و سکون اجتماعی نظام میں بھی ہو گا اور ایک فرد کی انفرادی زندگی میں بھی ہو گا اور اس کا مجموعی اثر یہ ہو گا کہ لوگ آخرت کی جزاء سے بھی قبل یہاں اس عارضی دنیا میں

بھی بھلائیاں پائیں گے ۔ (ظلال ج ۱۰ ص ۲۷ ۲۹ ۲۷ - ص ۵۱ - ج ا ص ۱۰ - ص ۱۲) نیز اس بارے میں ہم نے اس سے قبل کہا تھا کہ اسلامی نظام تب قائم ہو گا کہ معاشرے میں لوگوں کی افرادی قوت کو بے کار کاموں میں صرف ہونے سے بچایا جائے مثلاً گانا بجانا' عیش و عشرت اور جھوٹے خداؤں کے آستانوں پر چڑھاوے اور مراسم کو یکسر ختم کر دیا جائے اور لوگوں کو اس کرۂ ارض کی تعمیر اور دنیا میں بھلائی کے کاموں میں لگا کر خلافت فی الارض کے منصب کے تقاضوں کو پورا کیا جائے تاکہ یہاں لوگ اچھی زندگی بسر کر سکیں اور ان کو یہاں شریفانہ اور آزادانہ زندگی بسر کرنے کے مواقع نصیب ہوں تب یہ دعویٰ درست ہو گا کہ لوگوں کی زندگیوں میں ایمان کے ثمرات نمودار ہو گئے ہیں (اس موضوع پر قدرے تفصیلی بحث اس سورت میں قصص کے اختتام پر کی جائے گی - ان شاء اللہ)

---ooo---

اس قصے میں ہمیں یہ حقیقت بھی ملتی ہے کہ حضرت ہود اپنی قوم کے مقابلے میں دو ٹوک بات کرتے ہیں اور فیصلہ کن موقف اختیار کرتے ہیں - وہ ان سے علانیہ طور پر مقاطعے کا اعلان کرتے ہیں - وہ نہایت ہی شان برتری سے بات کرتے ہیں اور نہایت ہی خود اعتمادی سے اس حق بات پر جمے ہوئے ہیں جو ان کے اور رب کے درمیان طے شدہ ہے ۔

قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (٥٤) مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ (٥٥) اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَ رَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (٥٦) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ وَ يَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَ لَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْئًا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ (٥٧) (١١: ٥٤ تا ٥٧)

"ہود ؑ نے کہا "میں اللہ کی شہادت پیش کرتا ہوں اور تم گواہ رہو کہ یہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو تم نے خدائی میں شریک ٹھہرا رکھا ہے اس سے میں بیزار ہوں - تم سب کے سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کسر نہ اٹھا رکھو اور مجھے ذرا مہلت نہ دو' میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی - کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو - بیشک میرا رب سیدھی راہ پر ہے - اگر تم منہ پھیرتے ہو تو پھیر لو - جو پیغام دے کر میں تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں تم کو پہنچا چکا ہوں - اب میرا رب تمہاری جگہ دوسری قوم کو اٹھائے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے' یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگراں ہے"۔

یہ ایک دلفریب منظر ہے - تحریک اسلامی کے کارکن جہاں ہوں اور جس دور میں بھی وہ کام کر رہے ہوں' ان کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ اس منظر کے سامنے ذرا طویل وقفہ کر کے غور کریں اور یونہی نہ گزر جائیں - ایک فرد ہے' داعی فرد - اس پر ایمان لانے والوں کی تعداد معدودے چند ہے - اس کا مقابلہ دنیا کی نہایت ہی ترقی یافتہ اور سرکش قوم سے ہے - اپنے دور کی نہایت ہی مالدار قوم ہے - اور اس قوم کے بارے میں خود قرآن کریم دوسرے مقام پر یوں منظر کشی کرتا ہے ۔

كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِينَ (١٢٣) اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوهُمْ هُودٌ اَلَا تَتَّقُونَ (١٢٤)
اِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ اَمِينٌ (١٢٥) فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُونِ (١٢٦) وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ
مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِينَ (١٢٧) اَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُونَ
(١٢٨) وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ (١٢٩) وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ
جَبَّارِينَ (١٣٠) فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُونِ (١٣١) وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا
تَعْلَمُونَ (١٣٢) اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِينَ (١٣٣) وَّجَنّٰتٍ وَّعُيُونٍ (١٣٤) اِنِّيْٓ
اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (١٣٥) قَالُوا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ
مِّنَ الْوٰعِظِينَ (١٣٦) اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِينَ (١٣٧) وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ

(١٣٨) (٢٦ : ١٢٣ - ١٣٨) ”عاد نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جبکہ ان کے بھائی ہود ؑ نے ان سے کہا تھا کہ کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے۔ یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو' جبار بن کر ڈالتے ہو۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ڈرو اس سے جس نے وہ کچھ تمہیں دیا جو تم جانتے ہو۔ تمہیں جانور دیئے' اولاد دی' باغ دیئے اور چشمے دیئے۔ مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے“۔ انہوں نے جواب دیا ”تو نصیحت کر یا نہ کر ہمارے لیے سب یکساں ہے۔ یہ باتیں تو یونہی ہوتی چلی آئی ہیں اور ہم عذاب میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں“۔

یہ سخت سرکش' ڈکٹیٹر اور ظالم لوگ تھے اور جب پکڑتے پھر ان کے دل میں رحم نہ ہوتا۔ اور یہ سرکشی ان میں ان کی دولت مندی اور ترقیات کی وجہ سے آگئی تھی یہ لوگ بڑے بڑے کارخانے اور محلات تعمیر کرتے تھے تو ان کا تصور یہ تھا کہ یہ لوگ ہمیشہ یونہی رہیں گے۔ یہ لوگ تھے جن سے حضرت ہود کا مقابلہ تھا لیکن دیکھیے یہ کیا مقابلہ تھا۔ وہ کس بہادری کے ساتھ' کس اطمینان کے ساتھ اور کس خود اعتمادی کے ساتھ بات کرتے ہیں اور پھر ان کا چیلنج کس قدر دو ٹوک ہے' حق و باطل کو وہ کس طرح چھانٹ کر رکھ رہے ہیں۔ انہوں نے ان کو چیلنج دے دیا کہ تم جو سازشیں کر سکتے ہو کرو' جو تمہارے بس میں ہے' سامنے لاؤ۔ مجھے تو اس کی کوئی پرواہ نہیں۔

حضرت ہود ؑ ان کے مقابلے میں اس بہادری اور شجاعت کے ساتھ چیلنج کے انداز میں اس وقت آئے جب انہوں نے تبلیغ اور دعوت پہنچانے کا حق ادا کر دیا۔ اور انہوں نے یہ دعوت نہایت ہی پیار اور محبت کے انداز میں پیش کی

اس کے بعد انہوں نے یہ سخت رویہ اپنایا جبکہ انہوں نے دیکھا کہ مجرمین کفر پر اصرار کر رہے ہیں اور وہ اللہ اور اس کی پکڑ سے ذرہ برابر نہیں ڈرتے ۔

حضرت ہود ؑ نے یہ دو ٹوک اور کھلا موقف اس لیے اختیار کیا کہ وہ اپنے نفس کے اندر اپنے رب کی حقیقت کو پاتے تھے ۔ ان کو یقین تھا کہ ان سرکش ' ظالم اور جبار لوگوں کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے اس کرۂ ارض پر دوسرے درندے ہوتے ہیں اور ان کو یہ بھی یقین تھا کہ ان سب درندوں کی چوٹی اللہ کے دست قدرت میں ہے ۔ لہٰذا ان درندوں کی نہ اپنی کچھ قوت ہے اور نہ اپنی حیثیت ۔ یہ قوت اور حیثیت تو ان کو اللہ نے دی ہے ان کو جو افرادی قوت ' ٹیکنالوجی کی قوت اور انعامات اور دولت کی وافر مقدار دی گئی ہے تو یہ اللہ نے ان کو بطور آزمائش دی ہے ۔ یہ محض حب ہی نہیں ہے بلکہ آزمائش ہے ۔ اور اگر یہ لوگ آزمائش میں پورے اتر کر ان انعامات کا حق نہ اداکریں گے تو اللہ اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ ان سے سلب کر لے ۔ اور ان کی جگہ دوسری اقوام کو اٹھا دے جو شکرگزار ہوں اور اللہ جب چاہے ' یہ کر سکتا ہے ۔ اور یہ لوگ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے ۔ نہ یہ اللہ کے فیصلوں کو بدل سکتے ہیں ۔ لہٰذا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حضرت ہود ؑ ان سے کوئی خوف کھائیں جبکہ داتا اور محروم کرنے والا ان کا رب ہے ۔

میں یہ کہوں گا کہ اسلامی تحریکات کے کارکنوں کو اس نہج پر تربیت کر کے باری تعالیٰ کی حقیقت کو اپنی شخصیات کے اندر بسانا چاہئے اور صرف اسی صورت میں وہ اس کرۂ ارض میں جاہلیت کی جبار و قہار قوتوں کا مقابلہ کر سکیں گے ۔ رہی سائنس اور ٹیکنالوجی کی قوت ' صنعت و حرفت کی قوت ' مال و دولت کی قوت ' انسانی علوم اور تجربوں کی قوت ' انتظامیہ اور مسلح اداروں کی قوت اور مشینری اور صلاحیتوں کی قوت تو ان تمام قوتوں کا مقابلہ ایک مسلم اپنی اس ایمانی قوت کے بل بوتے پر کر سکتا ہے کہ اللہ کے دست قدرت میں سب کی چوٹی ہے ۔ اور اللہ کے مقابلے میں تمام انسان اس طرح بے بس ہیں ۔ جس طرح کسی جانور کو چوٹی سے پکڑ کر قابو کر لیا جاتا ہے ۔

ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ اسلام کے داعیوں کو اپنی قوم کے مقابلے میں اس نہج کا دو ٹوک انداز اختیار کرنا پڑتا ہے ۔ اور جب کوئی داعی تحریک اس طرح کا فیصلہ کن موقف اختیار کرتی ہے تو پھر قوم دو حصوں میں بٹ جاتی ہے ۔ ایک امت حزب اللہ ہوتی ہے جو صرف اللہ کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دیتی ہے اور دوسری امت اللہ کے سوا دوسرے ارباب اور جھوٹے خداؤں کے لیے لڑ رہی ہوتی ہے ۔ اور دشمن دین اور دشمن خدا ہوتی ہے ۔

جب کوئی تحریک یہاں تک آ پہنچتی ہے تو پھر اس وقت اچانک اللہ کی نصرت آ جاتی ہے ۔ اللہ پھر اپنے دوستوں اور اولیاء کی مدد کرتا ہے اور اپنے دشمنوں کو پاش پاش کر دیتا ہے اور یہ مدد ایک ایسے گوشے سے آتی ہے جس کے بارے میں کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کہ ایسا ہو سکتا ہے ۔ تحریک اسلامی کی تاریخ ' حضرت آدم ؑ کے بعد آج تک گواہ ہے کہ اللہ کی مدد اس وقت تک نہیں آتی جب تک اولیاء اللہ اور اولیائے جاہلیت کے درمیان مکمل مقاطعہ نہیں ہو جاتا اور جب تک یہ دونوں گروپ آمنے سامنے نہیں آ جاتے اور یہ علیحدگی صرف عقیدے کی اساس پر نہیں ہو جاتی ۔ اور حزب اللہ کے کارکن صرف اللہ پر اعتماد نہیں کر لیتے اور ان کا بھروسہ صرف اللہ پر نہیں ہو جاتا ۔ اور وہ یہ اعلان اور یقین نہیں کر لیتے کہ اللہ کے سوا اب ان کا کوئی ناصر و مددگار نہیں ہے ۔

---○○○---

حضرت ہود ؑ کے قصے کے الہامات و اشارات کے بارے میں، میں سمجھتا ہوں کہ اس قدر کافی ہے۔ اب ہم حضرت صالح ؑ کے قصے کی طرف آتے ہیں۔

وَ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ ؕ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ﴿۶۱﴾

"اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح ؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے اور یہاں تم کو بسایا ہے۔ لہٰذا تم اس سے معافی چاہو، اور اس کی طرف پلٹ آؤ، یقیناً میرا رب قریب ہے اور وہ دعاؤں کا جواب دینے والا ہے"۔

بنیادی کلمہ اور نعرہ ایک ہی ہے۔ وہی عقیدہ حضرت صالح ؑ بھی پیش کرتے ہیں جو حضرت ہود ؑ نے پیش فرمایا:

قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ (۱۱ : ۶۱) "اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں"۔ اور نظام اور مقاصد بھی وہی ہیں، کوئی تغیر نہیں ہے۔

فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ (۱۱ : ۶۱) "لہٰذا تم اس سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ"۔ پھر ذات باری کی معرفت کا انداز بھی وہی ہے، کیونکہ ذات باری کے بارے میں پیغمبر کی سوچ بھی وہی ہے جس طرح ان کو احساس ہوتا ہے:

اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ (۱۱ : ۶۱) "یقیناً میرا رب قریب ہے اور وہ دعاؤں کا جواب دینے والا ہے"۔
لیکن حضرت صالح ؑ ان کو یاد دلاتے ہیں کہ ذرا سوچو، اللہ تعالیٰ نے تمہارے وجود کو اس کرۂ ارض پر کس طرح پیدا کیا۔ یہ کہ تمہاری نوع کو کس طرح پیدا کیا اور اس جنس و نوع کے افراد کو کس طرح پیدا کیا۔ تمہارے جسم کے اجزائے ترکیبی وہی ہیں جو اس زمین کے ہیں لیکن تم اس زمین کے خلیفے اور مختار ہو، اور تمہاری نوع کو جاری رکھ کر اللہ نے تمہارے منصب خلافت کو اس کرۂ ارض پر برپا رکھا۔ یہاں لفظ ربی کی اضافت، اور لفظ قریب اور مجیب میں جو تصور دیا گیا ہے، وہ وہی ہے جو اللہ کے مختار اور برگزیدہ بندوں کے احساس و شعور کا حصہ ہوتا ہے۔ ان الفاظ سے فضا میں انس اور محبت قرب اور اتصال کی جھلک پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کے اثرات ہر اس شخص پر پڑتے ہیں جو سننا چاہے، یا اس کے اندر فی الحقیقت قوت سمع موجود ہو۔

لیکن ان لوگوں کے دل اس قدر مسخ ہو گئے تھے 'اس قدر بگڑ گئے تھے 'اور ان کی ماہیت اس قدر بدل گئی تھی کہ وہ اس کلام کے کمال و جمال کو سمجھنے سے عاجز تھے۔ وہ اس کلام کی جلالت قدر اور بلند تصورات و نظریات کے ادراک سے قاصر تھے۔ یہ کلام کس قدر نرم اور تشفی بخش ہے 'کس قدر صاف اور روشن ہے۔ لیکن ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ اس کو سن کر کس قدر ناموافق ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ ذرا سنئے اور غور کیجئے :

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾

"انہوں نے کہا"اے صالح " اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ تو جس طریقے کی طرف ہمیں بلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے"۔

ہماری امیدیں تم سے وابستہ تھیں۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ تمہارا علم 'تمہاری عقلمندی' تمہاری سچائی اور تمہارا حسن تدبیر یہ سب صلاحیتیں ہمارے لیے مفید ثابت ہوں گی لیکن یہ امیدیں سب کی سب اکارت گئیں اور ہم لوگ مایوسی کا شکار ہو گئے۔

اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ( ۱۱ : ۶۲ ) "کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے"۔ یہ تو ایک تباہ کن بات ہے۔ ہم ہر بات برداشت کر سکتے ہیں مگر یہ بات برداشت نہیں کر سکتے اور ہمیں تم سے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ یہ بات تمہارے منہ سے نکلے گی۔ تم سے ہمیں جو بلند توقعات تھیں 'وہ ڈھیر ہو گئیں۔ اس پر مزید یہ بھی ایک اہم حقیقت ہے کہ جو بات تم کرتے ہو اس سے ہم گہرے شک میں ہیں۔ یہ شک اس قدر قوی ہے کہ اس کی وجہ سے ہمارے دلوں میں ایک مستقل خلجان بیٹھا ہوا ہے۔

وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ( ۱۱ : ۶۲ ) "تو جس طریقے کی طرف ہمیں بلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے"۔ اس طرح یہ لوگ ایک ایسے معاملے میں تعجب کر رہے تھے جس میں تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی بلکہ وہ ایک لازمی اور فرض بات کو ایک ناپسندیدہ امر تصور کرتے تھے۔ ان کو اپنے بھائی سے محض اس لیے وحشت ہونے لگی کہ وہ انہیں صرف ایک خدا کی بندگی کی طرف بلا رہے تھے اور جو وحشت انہیں کسی دلیل کی بنا پر نہ تھی 'نہ انہوں نے اس معاملے پر کوئی تحقیق یا غور و فکر کیا تھا بلکہ محض اس لیے تھی کہ ان کے آباء و اجداد متعدد الٰہوں کی پوجا اور پرستش کرتے تھے۔

آباؤ اجداد کے رسم و رواج پر چلتے چلتے لوگوں کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ جمود کا شکار ہو جاتے ہیں اور ثابت شدہ اور واضح سچائی پر تعجب کرنے لگتے ہیں۔ عقائد پر دلیل و برہان پیش کرنے کی بجائے عقائد کو اپنے آباؤ اجداد کے عمل سے

ثابت کرتے ہیں ۔ ان تمام آیات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ عقیدۂ توحید دراصل ذہنی جمود کے خلاف بغاوت ہے اور یہ عقیدہ انسان کو فکری آزادی عطا کرتا ہے اور یہ ہدایت کرتا ہے کہ عقل انسانی کو آباؤ اجداد کے رسوم و قیود سے آزاد کیا جائے ۔ اسی طرح وہم و خرافات سے بھی، عقل انسانی کو نجات دی جائے اور ایسے عقائد کو قبول کیا جائے جنے عقل تسلیم کرتی ہو اور جس پر کوئی سند موجود ہو۔

اہل ثمود نے صالح ؑ کو جو کہا ۔ قَالُوا يصلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا ( ١١ : ٦٢ )

"انہوں نے کہا "اے صالح ؑ " اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں"۔ یہی توقعات اہل قریش درحقیقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ وابستہ کیے ہوئے تھے ۔ جب حضورؐ نے ان کو بتایا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے تو ان لوگوں نے حضورؐ سے ایسی ہی وحشت کا اظہار کیا جس طرح قوم صالح ؑ نے حضرت صالح ؑ سے کیا ۔ جس طرح انہوں نے کہا کہ تو ساحر ہے اور افترا باندھنے والا ہے ۔ اسی طرح انہوں نے بھی یہی کہا اور شہادت حق دینے سے انکار کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جاہلیت کا ہمیشہ ایک ہی مزاج ہوتا ہے اور پوری اسلامی تاریخ میں پیغمبر اور احیائے اسلام کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے ساتھ ایک ہی جیسا سلوک کیا گیا ۔ اور پھر پیغمبروں نے بھی پوری تاریخ میں ایک ہی بات کی ۔ چنانچہ حضرت صالح ؑ اور حضرت نوح ؑ کی بات بالکل ایک ہے ۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿٦٣﴾

"صالح ؑ نے کہا "اے برادران قوم، تم نے کچھ اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا، اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھ کو نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھے کون بچائے گا، اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ تم میرے کس کام آ سکتے ہو، سوائے اس کے کہ مجھے اور زیادہ خسارے میں ڈال دو"۔

اے میری قوم، تمہارا کیا خیال ہے؟ میں تو اپنے نفس میں اپنے رب کی حقیقت کو واضح طور پر پاتا ہوں اور یہ ربانی حقیقت مجھے صاف صاف بتاتی ہے کہ جس راہ پر میں چل رہا ہوں وہ بالکل واضح اور حقیقی ہے ۔ پھر اس پر مزید فضل مجھ پر یہ ہوا ہے کہ اللہ نے مجھے منصب رسالت کے لیے منتخب فرمایا ہے ۔ اور اللہ نے مجھے وہ صلاحیتیں دی ہیں جو اس منصب کے لیے ضروری ہیں ۔ اگر ان حقائق کو جانتے ہوئے بھی میں اللہ کی نافرمانی کروں اور تبلیغ دین میں قصور کا ارتکاب کروں تو میری مدد کون کرے گا؟ کیا میں تمہاری امیدوں کا پاس رکھوں یا اپنی نجات کی فکر کروں؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے انجام کو محض اس لیے داؤ پر لگا دوں کہ تمہاری امیدیں پوری ہوں۔

فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ( ١١ : ٦٣ ) "تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھے کون بچائے گا، اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ تم میرے کس کام آ سکتے ہو، سوائے اس کے کہ

مجھے اور زیادہ خسارے میں ڈال دو"۔ اگر میں تمہاری آرزوؤں کا خیال رکھوں تو میں عظیم خسارے میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ میں اللہ کے غضب کا مستحق ہو جاؤں گا۔ اور منصب رسالت سے معزول کر دیا جاؤں گا۔ دنیا میں بھی شرمندگی ہوگی اور آخرت میں بھی اللہ کے عذاب سے نہ بچ سکوں گا۔ اور یہ ایک عظیم اور مسلسل خسارہ ہو گا۔ چنانچہ یہ تباہ کن اور ناقابل برداشت گھاٹا ہو گا۔

وَ یٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِیْبٌ﴿۶۴﴾

"اور اے میری قوم کے لوگو' دیکھو یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے ایک نشانی ہے۔ اسے خدا کی زمین میں چرنے کے لیے آزاد چھوڑ دو۔ اس سے ذرا تعرض نہ کرنا ورنہ کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ تم پر خدا کا عذاب آ جائے گا"۔

یہاں قرآن کریم نے اس ناقہ کے بارے میں تفصیلات نہیں دی ہیں جو ان کے لیے ایک نشانی اور علامت تھی۔ لیکن اس ناقہ کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ "اللہ کی اونٹنی" ہے۔ اور تمہارے لیے یہ ایک نشانی ہے۔ ان ریمارکس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ممتاز اونٹنی تھی اور وہ جانتے تھے کہ یہ ان کے لیے اللہ کی جانب سے ایک نشانی ہے۔ بس ہم بھی یہاں صرف ان باتوں پر اکتفاء کرتے اور ناقہ صالح ؑ کی بارے میں اسرائیلی روایات کے مطابق مفسرین نے جو رطب و یابس جمع کی ہیں ان کے ساتھ یہاں تعرض نہیں کرتے۔

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ

(۱۱: ٦٤) "دیکھو یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے ایک نشانی ہے۔ اسے خدا کی زمین میں چرنے کے لیے آزاد چھوڑ دو۔ اس سے ذرا تعرض نہ کرنا"۔ ورنہ اللہ تمہیں بہت جلد پکڑ لے گا اور عذاب دے گا۔ عبارت میں فاء تعجیل کے لیے ہے۔

فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ (۱۱: ٦٤) "ورنہ کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ تم پر خدا کا عذاب آ جائے گا"۔ یعنی تم اللہ کی شدید پکڑ میں آ جاؤ گے۔ انداز تعبیر محض عذاب نازل ہونے یا عذاب کے نزول سے کہیں زیادہ کسی چیز کو ظاہر کر رہا ہے۔

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ﴿۶۵﴾

"مگر انہوں نے اونٹنی کو مار ڈالا۔ اس پر صالح ؑ نے ان کو خبردار کر دیا کہ "بس اب تین دن اپنے گھروں میں اور رہ بس لو۔ یہ ایسی میعاد ہے جو جھوٹی نہ ثابت ہوگی"۔ انہوں نے ناقہ کی ٹانگیں کاٹ دیں (فعقروھا) اور اس انداز میں اسے قتل کر دیا' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر مفسد تھے اور کس قدر بے باک تھے۔ سیاق کلام

میں یہاں نزول ناقہ اور قتل ناقہ کے درمیان مدت کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا گیا۔کیونکہ مدت کے ذکر کا دعوت دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔وہ محض ایک تاریخی پہلو ہے۔البتہ قتل ناقہ کے بعد سیاق کلام میں ان کے عذاب کا ذکر آ جاتا ہے۔یہاں واقعات کے تمام مراحل کو فاء تعقیب کے ساتھ لایا جاتا ہے یعنی پس یہ ہوا' پس یہ ہوا۔

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ

(١١: ٦٥) ”مگر انہوں نے اونٹنی کو مار ڈالا۔اس پر صالح ؑ نے ان کو خبردار کر دیا کہ ”بس اب تین دن اپنے گھروں میں اور رہ بس لو۔یہ ایسی میعاد ہے جو جھوٹی نہ ثابت ہوگی“۔یعنی اب تمہاری مہلت زندگی صرف تین دن رہ گئی اور یہ میعاد ایسی ہے جس میں کوئی تغیر و تخلف نہیں ہو سکتا۔اب یہ فائنل آرڈر ہے۔فاء تعقیب سے یہ مفہوم معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات آگے پیچھے وقوع پذیر ہوئے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ مِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ وَ اَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝

”آخر کار جب ہمارے فیصلے کا وقت آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالح ؑ کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے' بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے ان کو محفوظ رکھا۔بے شک تیرا رب ہی دراصل طاقتور اور بالا دست ہے۔رہے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا تھا تو ایک سخت دھماکے نے ان کو دھر لیا اور وہ اپنی بستیوں میں بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے“۔

جب اللہ کے امر کا وقت قریب ہو گیا اور امر یہ تھا کہ یا تو یہ لوگ ڈر جائیں اور ایمان لے آئیں ورنہ پھر انہیں نیست و نابود کر دیا جائے تو اس وقت ہم نے حضرت صالح ؑ اور ان پر ایمان لانے والے ساتھیوں کو اپنی رحمت کی وجہ سے نجات دی۔یہ نجات صرف ان کے لیے تھی اور ان کے ساتھ مخصوص تھی۔یعنی ان کو موت سے بھی نجات دی اور اس دن کی شرمندگی اور ذلت سے بھی نجات دی کیونکہ ان کو زندگی سے معمول کے مطابق محروم نہیں کیا گیا بلکہ بڑی ذلت کے ساتھ ان سے حیات کو چھینا گیا۔اور جب ایک سخت آواز نے ان کو آ لیا تو یہ سب کے سب مر گئے۔اور جو جہاں تھا' وہیں گر گیا اور یہ ان کے لیے ذلت آمیز موت تھی۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ (١١: ٦٦) ”بے شک تیرا رب ہی دراصل طاقتور اور بالا دست ہے“۔وہ نافرمانوں کو خوب پکڑتا ہے اور یہ کام اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔اسی طرح وہ اپنے دوستوں کی خوب رعایت بھی کرتا ہے اور ان پر فضل بھی کرتا ہے۔

اب یہاں قرآن مجید اشارہ بتاتا ہے کہ اس عذاب کے نتیجے میں ان کی حالت کیا ہو گئی - تعجب انگیز اور عبرت آموز طریقے سے بتایا جاتا ہے کہ وہ کس قدر عجلت کے ساتھ نیست و نابود کر دیئے گئے -

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ

"گویا وہاں کبھی بسے ہی نہ تھے" - گویا ان بستیوں میں کبھی انہوں نے قیام ہی نہ کیا تھا اور نہ عیش و عشرت کی تھی - یہ نہایت مؤثر نظر ہے' پر تاثیر احساس ہے - یہ منظر زندگی اور موت کے درمیان ایک کھلا منظر ہے - لیکن چشم زدن میں یہ نظر کے سامنے سے گزر جاتا ہے اور نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد گویا زندگی ایک ٹیپ ہے - جو تیزی سے گزر رہی ہے اور نظریوں آتا ہے کہ شاید خواب و خیال تھا۔

اب اس قصے پر حسب سابق آخری تبصرہ یہ ہے کہ ملامت اور لعنت کے ساتھ اس صفحے کو لپیٹ دیا جاتا ہے - اور یہ منظر جس طرح نظروں سے اوجھل ہوتا ہے' اسی طرح لوح حافظہ سے بھی مٹ جاتا ہے -

٦

اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾ ۸ ع

"سنو! ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا - سنو! دور پھینک دیئے گئے ثمود!" ٦

---ooo---

ایک بار پھر ہمارے سامنے' اس قصے کی صورت میں دعوت اسلامی کی تاریخ کی ایک لڑی موجود ہے - وہی دعوت ہے جو حضورؐ دے رہے ہیں - اسلامی نظام کے وہی خدوخال ہیں جو حضورؐ پیش کر رہے ہیں - دعوت یہ دی جا رہی ہے کہ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کرو' صرف اللہ کے وضع کردہ نظام زندگی کو اپناؤ - ہمیں نظر آتا ہے کہ جاہلیت اور اسلام کی وہی کشمکش ہے جو مکہ میں برپا ہے - شرک اور توحید کی ٹکر ہے - اہل ثمود بھی ان لوگوں میں سے تھے جو عاد کی طرح کشتی نوح میں بچ گئے تھے - کشتی نوح کے سواروں کی اولاد تھے لیکن وہ اپنے حقیقی دین' دین نوح سے منحرف ہو کر جاہلیت میں ڈوب گئے تھے اور تاریخ کے اس مرحلے میں حضرت صالح ؑ اب ان کی اصلاح کے لیے مامور ہوئے تھے تاکہ ان کو از سرنو اسلام میں داخل کر دیں -

اس قصے میں ہمیں نظر آتا ہے کہ انہوں نے خود ایک خارق عادت معجزے کا مطالبہ کیا تھا - یہ معجزہ انہیں دکھا دیا گیا لیکن انہوں نے اس کا جواب ایمان اور قبول حق کے ساتھ نہ دیا بلکہ انہوں نے صاف صاف انکار کر دیا اور ناقہ کی ٹانگیں کاٹ کر اسے ہلاک کر دیا۔

مشرکین عرب بھی حضورؐ سے ایسے ہی خارق عادت معجزات کے طلبگار تھے تاکہ وہ ایمان لائیں تو ان کو سمجھایا جاتا ہے کہ قوم صالح ؑ نے بھی معجزات طلب کیے - وہ آ گئے انہوں نے نہ مانا اور ان کو کوئی فائدہ نہ ہوا - جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ معجزات طلب نہیں کیا کرتے - اسلام تو ایک سادہ اور فطری دعوت ہے' اس کے قبول کرنے کے لیے کسی معجزے کی ضرورت نہیں ہوتی - اس لیے محض غور و فکر اور تعقل و تدبر کی ضرورت ہوتی ہے - لیکن جاہلیت کی وجہ سے لوگوں کی عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں اور ان کی عقل مسخ ہو جاتی ہے -

اس قصے میں بھی ہمارے سامنے حقیقت باری اپنے اس رنگ میں آتی ہے جس طرح اللہ کے مختار بندوں کے ذہنوں میں وہ موجود ہوتی ہے یعنی اللہ کے رسولوں کے ذہن میں۔ حضرت صالح ؑ کے قول پر ذرا غور فرمائیں :

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ (۱۱ : ۶۳) "صالح نے کہا 'اے برادران قوم' تم نے کچھ اس بات پر غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھ کو نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھے کون بچائے گا' اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ تم میرے کس کام آسکتے ہو سوائے اس کے کہ مجھے اور خسارے میں ڈال دو"۔ اور یہ اظہار حضرت صالح ؑ نے اس کے بعد کیا۔

اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ (۱۱ : ۶۱) "میرا رب قریب ہے اور وہ دعاؤں کا جواب دینے والا ہے"۔ ذات باری کی حقیقت حضرات انبیاء کے اذہان و قلوب میں اس طرح منعکس ہوتی ہے اور اس طرح جمال و کمال کے ساتھ موجود ہوتی ہے کہ اس شان سے وہ کسی اور کے دل میں نہیں ہوتی۔ کیونکہ انبیاء کے دل آئینہ کی طرح صاف ہوتے ہیں اور ان میں ذات باری کا انعکاس نہایت ہی صفائی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور نہایت ہی منفرد شان کے ساتھ۔

اس قصے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہمیں اس میں نظر آتا ہے کہ جاہلیت اپنے آپ کو ہدایت کی شکل میں پیش کرتی ہے اور ہدایت کو ضلالت کے بارے میں۔ اور وہ نہایت ہی عیاری سے سچائی پر تعجب کرنے لگتی ہے۔ وہ سچائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ صالح علیہ السلام سے ان کی قوم نے بہت امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں' کیونکہ وہ ایک صالح' عقلمند' باالخلاق اور پسندیدہ نوجوان تھے۔ لیکن اب قوم ان کے بارے میں سخت مایوسی کا اظہار کرتی ہے۔ یہ کیوں؟ یہ محض اس لیے کہ وہ ان کو اسلامی نظام زندگی کی طرف بلاتے ہیں' صرف اسلامی نظام کی اطاعت کا حکم دیتے ہیں اور ان کی دعوت آباؤاجداد کی موروثی ڈگر سے مختلف ہے۔

یاد رہے کہ انسانی فکر و نظر اگر جادۂ مستقیم سے بال برابر بھی ادھر ادھر ہو جائے تو ضلالت و گمراہی کی کسی حد پر وہ رکتی نہیں ہے۔ آخر کار انسانی سوچ کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اسے نہایت ہی واضح اور سادہ سچائی بھی گمراہی نظر آتی ہے اور وہ سچائی کو سن کر تعجب کرنے لگتا ہے۔ اور انسانی سوچ اور تصور اس قدر محدود ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر سادہ سے سادہ حقیقت بھی نہیں سماتی۔ اور کوئی فطری اور سیدھی منطق بھی سمجھ میں نہیں آتی۔

دیکھیے! حضرت صالح ؑ ان سے کہتے ہیں کہ اے قوم صرف اللہ کی بندگی کرو' اللہ کے سوا تمہارا اور کوئی الٰہ نہیں ہے۔ وہی ہے جس نے زمین سے تمہیں پیدا کیا اور یہاں تمہیں ترقی دی۔ وہ پکارتے ہیں کہ دیکھو تم اس کرۂ ارض پر موجود ہو' یہ وجود تمہیں اللہ نے بخشا ہے' یہ ایک حقیقت ہے جسے تم دیکھتے ہو اور جس کا تم انکار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو خود نہیں پیدا کیا اور نہ خود اپنے لیے حیات اور رزق کا انتظام کیا ہے۔

یہ بات بالکل واضح بھی تھی' کیونکہ وہ اس حقیقت کا انکار بھی نہ کرتے تھے کہ انہیں اللہ نے پیدا کیا ہے۔ وہی ہے جس نے انسان کو وہ عقل دی ہے جس کے ذریعے وہ اس کرۂ ارض کو ترقی دے رہا ہے لیکن وہ اس صغریٰ کبریٰ کو تسلیم

کرنے کے بعد اس کا منطقی نتیجہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے کہ اللہ ہی اللہ ہے اور اس نے انسان کو یہاں خلیفہ و مختار بنایا ہے۔ لیکن اس پر لازم کیا ہے اور اس کے لیے مناسب بھی یہی ہے کہ وہ صرف اللہ کی ربوبیت کو تسلیم کرے۔ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے اور نہ اس کے سوا کسی اور کی اطاعت کرے۔ یہی سادی حقیقت تھی جس کی طرف حضرت صالح ؑ دعوت دیتے تھے۔

(یٰقَوْمِ اعْبُدُوْا اللّٰہَ مَالَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ) مسئلہ کیا تھا؟ مسئلہ الوہیت و ربوبیت کا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ کون حاکم اور مطاع ہو گا۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس کے گرد تمام انبیاء کے مشن گھومتے ہیں اور اس کے گرد انبیاء کے بعد تمام دعوتی تحریکیں گھومتی ہیں اور یہی ہے آج بھی اسلام اور جاہلیت کی کشمکش کا محور۔

---○○○---

# درس نمبر ۱۰۲ ایک نظر میں

اب حضرت نوح ؑ کے دور کے بعد' دوسرے ادوار میں کاروان تاریخ اسلامی میں داخل ہوتا ہے ۔ اب منصۂ تاریخ پر کچھ اور بابرکت اقوام آتی ہیں اور کچھ اور ایسی اقوام آتی ہیں جنہیں عاد و ثمود کی طرح ہلاک کیا گیا ۔ حضرت ابراہیم ؑ کے واقعات زندگی کے ایک پہلو کو یہاں لیا جاتا ہے ۔ آپ کے قصے میں خیر و برکت کا جو پہلو ہے اس پر ایک نظر ڈال کر ہمیں تاریخ حضرت لوط ؑ کی قوم کی طرف بڑھ جاتی ہے جو مستحق عذاب ٹھہری اور جسے سخت عذاب دیا گیا ۔ حضرت ابراہیم ؑ اور حضرت لوط ؑ کے قصص میں اللہ کا وہ وعدہ حقیقت کا روپ اختیار کرتا ہے جو اللہ نے حضرت نوح ؑ سے کیا تھا ۔ کہا گیا تھا ۔

قِيلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَ عَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ( ۱۱ : ۴۸ ) "کہا گیا اے نوح' ہماری جانب سے سلامتی کے ساتھ اتر جا اور برکتوں کے ساتھ تم پر اور ان اقوام پر جو تمہارے ساتھ ہیں ۔ اور ان اقوام پر جن کو ہم عنقریب متاع دیں گے اور اس کے بعد ان کو ہماری جانب سے عذاب الیم پکڑ لے گا" ۔ برکات کے مستحق تو حضرت ابراہیم ؑ اور آپ کی اولاد ہوئی اور آپ کی اولاد حضرت اسحٰق اور حضرت اسماعیل ؑ کی اولاد سے انبیاء آئے اور حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے آخر میں آئے حضرت ابراہیم ؑ کی اولاد میں سے بعض مستحق عذاب بھی ہوئے ۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۰۲ تشریح آیات

۶۹ ---- تا ---- ۸۳

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى

"اور دیکھو' ابراہیم کے پاس ہمارے فرشتے خوشخبری لیے ہوئے پہنچے"۔ یہاں قرآن کریم نے خوشخبری کے بیان کو بعد میں آپ کی بیوی کی موجودگی کے وقت تک موخر کر دیا کیونکہ یہاں تو ابھی قاری کو معلوم نہیں کہ آنے والے فرشتے ہیں۔ یہاں مفسرین نے ان آنے والوں کے بارے میں جو تفصیلات دی ہیں ہم ان کے ذکر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ کیونکہ یہ تفصیلات بلا دلیل ہیں :

قَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۝ فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ

"کہا تم پر سلام ہو۔ ابراہیم نے جواب دیا تم پر بھی سلام ہو۔ پھر کچھ دیر نہ گزری کہ ابراہیم ایک بھنا ہوا بچھڑا (ان کی ضیافت کے لیے) لے آیا۔ مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے پر نہیں بڑھتے تو وہ ان سے مشتبہ ہو گیا اور دل میں ان سے خوف محسوس کرنے لگا"۔

حضرت ابراہیم عراق کے میدانوں میں پیدا ہوئے اور یہاں سے انہوں نے ہجرت کر کے دریائے اردن کو عبور کرتے ہوئے کنعان کی صحرائی سرزمین میں بود و باش اختیار کر لی۔ اور جس طرح دیہاتی لوگوں کا رسم و رواج ہوتا ہے' وہ مہمانوں کو دیکھتے ہی گھر گئے اور آنے والوں کو مہمان سمجھ کر ان کے لیے کھانا حاضر کیا۔

کھانا عجل سمین تھا یعنی گرم پتھروں پر بھنا ہوا بچھڑے کا گوشت' لیکن مہمان تو فرشتے تھے اور فرشتے ظاہر ہے کہ کھانا نہیں کھاتے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہ تو کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا رہے تو ان کو پریشانی لاحق ہوئی۔ کیونکہ دیہاتی رسم و رواج کے مطابق جو شخص کھانا نہیں کھاتا' اس سے یہ خوف کیا جاتا ہے کہ شاید یہ کسی جنایت' اور دشمنی کا ارادہ رکھتا ہے جبکہ تمام دیہاتی لوگ کھانا کھانے کے بعد اہل خانہ کے ساتھ برائی کا ارتکاب کرنے سے ابا کرتے ہیں۔ جب حضرت ابراہیم نے دیکھا کہ مہمان کھانا نہیں کھا رہے تو قدرتی طور پر انہیں خوف دامن گیر ہوا اور طرح طرح کی باتیں سوچنے

لگے۔ غرض اس صورت حالات کو دیکھ کر انہوں نے مناسب سمجھا کہ اپنا تعارف کرا دیں اور اپنی مہم سے ان کو آگاہ کر دیں۔

قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۰﴾

"انہوں نے کہا" ڈرو نہیں' ہم تو لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں"۔ حضرت ابراہیم ؑ تو فوراً سمجھ گئے کہ قوم لوط کی طرف فرشتوں کے بھیجنے کے کیا معنی ہیں' لیکن اچانک روئے سخن ایک ایسے موضوع کی طرف مڑ گیا جو زیر بحث نہ تھا۔

وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾

"ابراہیم ؑ کی بیوی بھی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ یہ سن کر ہنس دی۔ پھر ہم نے اس کو اسحٰق ؑ کی اور اسحٰق ؑ کے بعد یعقوب ؑ کی خوشخبری دی"۔

حضرت ابراہیم ؑ کی بیوی کیوں ہنس پڑی۔ اس لیے کہ اسے بھی معلوم تھا کہ حضرت لوط کس برائی اور غلاظت کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔

اور وہ چونکہ بانجھ تھی اس کی کوئی اولاد نہ ہوئی تھی اور اس طرح وہ معمر ہو گئی تھی اس لیے اس کے لیے یہ خوشخبری ایک عجوبہ تھی اور یہ خوشی اس وقت دوگنی ہو گئی جب ان کو خوشخبری دی گئی کہ حضرت اسحٰق ؑ کی اولاد میں حضرت یعقوب ؑ پیدا ہوں گے۔ عورت اور پھر بانجھ عورت کو اگر اس قسم کی خوشخبری ملے تو لازمی ہے کہ وہ غیر معمولی اور اچانک خوشی کا مظاہرہ کرے گی۔

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾

"وہ بولی" ہائے میری کم بختی! کیا اب میرے ہاں اولاد ہو گی جب کہ میں بڑھیا پھونس ہو گئی اور میرے میاں بھی بوڑھے ہو چکے؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے"۔

فی الواقعہ یہ ایک عجیب بات تھی۔ ایک معین مدت کے بعد عورت کا حیض ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد اس کا حمل رک جاتا ہے لیکن اللہ کی قدرت اپنے قوانین کی پابند نہیں ہے۔

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾

"فرشتوں نے کہا" اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو؟ ابراہیم ؑ کے گھر والو' تم لوگوں پر اللہ کی رحمت اور اس کی

برکتیں ہیں' اور یقیناً اللہ نہایت قابل تعریف اور بڑی شان والا ہے"۔

بے شک امرالٰہی میں تعجب کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔کیونکہ اگر ایک روٹین کسی حکم کے مطابق چل رہی ہو تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس عادت اور حکم کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔لیکن جب اللہ کی حکمت چاہے تو یہ روٹین بدل بھی سکتی ہے۔یہاں اللہ نے حضرت ابراہیم ؑ کے گھرانے پر رحم کرتے ہوئے اس کو بدلا لیکن جب ہمیں بظاہر نظر آتا ہے کہ واقعات کی روٹین بدل گئی ہے اور کوئی واقعہ خلاف عادت ہے تو بھی دراصل وہ ایک گہری عادت کے مطابق ہوتا ہے۔کیونکہ ہمیں سنن الٰہیہ کا بالاستیعاب علم حاصل نہیں ہے۔اس کی حدود بہت ہی وسیع ہیں۔ہم تو ایک حد تک حقائق کو دیکھ سکتے ہیں اور یہ حد بہت ہی مختصر اور محدود ہوتی ہے جبکہ ہم واقعات کی حقیقت کا استقراء اور استیعاب کرنے سے قاصر ہیں۔

جو لوگ ذات باری کی قدرت و حکمت کو اپنے علم کے محدود پیمانے سے ناپتے ہیں۔حتیٰ کہ وہ لوگ جو اللہ کی مشیت کو خود اللہ کے بنائے ہوئے قواعد میں محدود کرتے ہیں۔اس قسم کے لوگ ذات باری کی ماہیت اور حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکے۔کیونکہ اللہ کی مشیت خود اللہ کے بنائے ہوئے قواعد سے بھی آزاد ہے' اللہ کی مشیت خود اللہ کے بنائے ہوئے نوامیس قدرت کی پابند بھی نہیں ہے۔

• یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کو ان قوانین قدرت کے مطابق چلاتا ہے جو اس نے اس جہاں کے لیے تیار کیے ہیں لیکن یہ ایک علیحدہ بات ہے اور یہ کہنا کہ اللہ کی مشیت قوانین طبیعیہ کی پابند ہے تو یہ ایک دوسری بات ہے۔اصل حقیقت یہ ہے کہ قوانین طبیعیہ ٹھیک ٹھیک چلتے ہیں اور لیکن ہر مرتبہ ان کا جزئی عمل جو اثرات مرتب کرتا ہے وہ اللہ کے حکم سے کرتا ہے۔یہ اثرات خود کار طور پر ظاہر نہیں ہوتے۔تو اگر کسی موقعہ پر اللہ تعالیٰ یہ حکم کر دے کہ کوئی جزوی طبیعی عمل وہ اثرات نہیں ظاہر کرے گا تو ایسا نہ ہو گا اور پھر ہم یہ نہ کہیں گے کہ اللہ کا قانون قدرت بدل گیا ہے بلکہ درست یہ ہو گا کہ قانون قدرت اب یہ ہے جو خارق عادت نظر آتا ہے۔لہٰذا نوامیس قدرت اور قوانین طبیعت دراصل اللہ کے ارادے کا مظہر ہوتے ہیں جب اللہ کا ارادہ کچھ اور چاہتا ہے تو وہ اور قانون قدرت بن جاتا ہے۔اصل قانون قدرت اللہ کا بے قید ارادہ ہے۔

چنانچہ یہاں حضرت ابراہیمؑ مطمئن ہو گئے کہ یہ اللہ کے نمائندگان قدرت ہیں اور پھر وہ اس پر بھی مطمئن ہو گئے کہ ان کے لیے یہ لوگ جو خوشخبری لائے ہیں وہ بھی لازماً متحقق ہونے والی ہے۔لیکن وہ ان حالات میں بھی حضرت لوط اور ان کی قوم کو نہ بھولے 'کیونکہ وہ ان کے بھائی تارخ کے بیٹے تھے اور ان کے قریب ہی رہائش پذیر تھے۔اب چونکہ وہ سمجھ گئے تھے کہ اللہ نے جن لوگوں کو بھیجا ہے وہ تو قوم لوط ؑ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں گے اور حضرت ابراہیم نہایت ہی مشفق اور رحم دل تھے۔چنانچہ قوم لوط ؑ کے بارے میں فرشتوں سے یہ مکالمہ شروع کر دیا۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ۝ إِنَّ إِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝

"پھر جب ابراہیم کی گھبراہٹ دور ہوگئی اور (اولاد کی بشارت سے) اس کا دل خوش ہوگیا تو اس نے قوم لوط کے معاملہ میں ہم سے جھگڑا شروع کیا۔ حقیقت میں ابراہیم بڑا حلیم اور نرم دل تھے"۔

حضرت ابراہیمؑ ایسے حلیم الطبع تھے کہ وہ موجبات غیظ و غضب کو برداشت کر لیتے تھے' صبر کرتے تھے اور جوش میں نہ آتے تھے۔ اور اواہ کے معنی یہ ہیں کہ خدا خوفی کی وجہ سے وہ ہر وقت آہ و زاری فرماتے تھے اور منیب کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر معاملے میں جلدی سے اپنے رب کی طرف رجوع فرماتے تھے۔ ان تمام صفات کے باعث حضرت ابراہیم نے فرشتوں کے ساتھ قوم لوط کے حوالے سے جھگڑنا شروع کر دیا۔ اب یہ کہ حضرت نے کیا جھگڑا فرمایا؟ قرآن کریم نے اس کی کوئی تشریح نہیں کی ہے لیکن عین اس وقت اللہ کا حکم آگیا اور فرمایا گیا کہ اس معاملے میں نہ جھگڑو' لہٰذا جھگڑا ختم ہوگیا۔

يَٰٓإِبۡرَٰهِيمُ أَعۡرِضۡ عَنۡ هَٰذَآۖ إِنَّهُۥ قَدۡ جَآءَ أَمۡرُ رَبِّكَۖ وَإِنَّهُمۡ ءَاتِيهِمۡ عَذَابٌ غَيۡرُ مَرۡدُودٖ ﴿٧٦﴾

"(آخر کار ہمارے فرشتوں نے اس سے کہا) "اے ابراہیم" اس سے باز آجاؤ' تمہارے رب کا حکم ہو چکا ہے اور اب ان لوگوں پر وہ عذاب آکر رہے گا جو کسی کے پھیرے نہیں پھر سکتا"۔

پردہ گرتا ہے' اور یہ خوش کن اور دلربا منظر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ سیاق کلام پر خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ لازمی ہے کہ حکم باری کے سامنے حضرت ابراہیم بھی خاموش ہوگئے ہوں گے۔ لیکن اچانک آنکھوں کے سامنے ایک دوسرا منظر آجاتا ہے جو ہاؤ و ہو سے پر ہے۔ اردن کے ایک شہر میں قوم لوط سامنے آتی ہے۔ یہ شہر عموریہ اور صدوم ہیں :

وَلَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَا لُوطٗا سِيٓءَ بِهِمۡ وَضَاقَ بِهِمۡ ذَرۡعٗا وَقَالَ هَٰذَا يَوۡمٌ عَصِيبٞ ﴿٧٧﴾

"اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس پہنچے تو ان کی آمد سے وہ بہت گھبرایا اور دل تنگ ہوا اور کہنے لگا کہ آج بڑی مصیبت کا دن ہے"۔

آپ اپنی قوم کو اچھی طرح جانتے تھے' ان کی فطرت کے اندر جو بگاڑ اور گندگی پیدا ہوگئی تھی وہ ناقابل تصور اور بے مثل تھی۔ وہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ شہوانی تعلقات قائم کرتے تھے۔ اور یہ حرکت اس نظام فطرت کے خلاف تھی جس کے مطابق اللہ نے تمام مخلوقات کو نر اور مادہ کی شکل میں پیدا کیا' تاکہ تمام انواع کی بقا اور تسلسل قائم رہ سکے اور جس کے ذریعے نوامیس فطرت نے انسان کے لیے جو لذت اور خوشی ودیعت کی ہے اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

یہ راہ فطرت انسان خود اپنے غور و فکر اور اپنی تدابیر اور محنت سے حاصل نہیں کر سکتا' صرف راہ راست پر استقامت اور ہدایت ربانی سے یہ لذت مل سکتی ہے۔

جنسی بے راہ روی کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانوں کے اندر اس قسم کی شاذ و نادر بے راہ روی تو انسانی تاریخ کا حصہ ہے۔ بعض انسان بیمار ہوتے ہیں لیکن قوم لوط ؑ کی بیماری ایک عجیب اور ہمہ گیر بیماری تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفسیاتی بیماریاں بھی اسی طرح پھیل جاتی ہیں جس طرح جسمانی بیماریاں پھیل جاتی ہیں اور اگر کسی سوسائٹی کا معیار حسن و قبح بدل جائے تو اس کے اندر ایسی بیماریاں بھی پھیل جاتی ہیں اور قوم پوری کی پوری اخلاقی بگاڑ کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور یہ بگاڑ سوسائٹی کے بگڑے ہوئے تصورات کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بگاڑ انسانی فطرت سلیمہ کے ساتھ متصادم ہوتا ہے' کیونکہ فطرت سلیمہ تو کائنات کے نوامیس کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔ اور وہ موجبات حیات کی مد ہوتی ہے' متصادم نہیں ہوتی۔ جبکہ یہ جنسی بے راہ روی' امتداد حیات کے نظام کے ساتھ متصادم ہوتی ہے۔ انسان تخم حیات کو ایسی سرزمین میں بوتا ہے جہاں سے زندگی کی نشو و نما نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی جنسی بے راہ روی سے انسانی فطرت نہ صرف یہ کہ اخلاقی طور پر متصادم ہوتی ہے بلکہ قوانین فطرت بھی اس سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ عمل قوم لوط ؑ نہ صرف یہ کہ فطرت کے خلاف ہے بلکہ نظام امتداد حیات اور حقیقی لذت کے بھی خلاف ہے۔

بعض اوقات انسان موت میں وہ لذت محسوس کرتا ہے جو حیات میں نہیں ہوتی لیکن یہ لذت اعلیٰ اقدار اور بلند مقاصد کے حصول کے لیے ہوتی ہے۔ یہ حسی اور جسمانی لذت نہیں ہوتی۔ اور جہاد میں سر قربان کرنا نظام بقائے حیات کے ساتھ متصادم نہیں ہے بلکہ اس طرح زندگی کو کم کرنا دوسرے پہلو سے زندگی کو بلند کرنا ہے۔ اللہ کی راہ میں شہادت سے زندگی ختم نہیں ہوتی بلکہ زندگی ایک دوسرا انداز اختیار کرتی ہے۔

تو حضرت لوط ؑ مہمانوں کو دیکھ کر بہت ہی کبیدہ خاطر ہوئے' کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان کی قوم ان خوبصورت مہمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرے گی اور اس طرح انہیں بہت ہی شرمندہ ہونا پڑے گا۔ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ "آج بڑی مصیبت کا دن ہے"۔

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾

"(ان مہمانوں کا آنا تھا کہ) اس کی قوم کے لوگ بے اختیار اس کے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ پہلے سے وہ ایسی ہی بدکاریوں کے خوگر تھے۔ لوط ؑ نے ان سے کہا' "بھائیو' یہ میری بیٹیاں موجود ہیں' یہ تمہارے لیے پاکیزہ تر ہیں۔ کچھ خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے ذلیل نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں؟"

(يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ) یعنی اس طرح دوڑے جس طرح بخار میں مبتلا شخص کانپتے ہوئے دوڑتا ہے۔ بے چینی سے ' ہرع بخار کی حالت میں کانپنا۔

اس سے قبل ان کے ہاں مہمانوں کے ساتھ بدسلوکی عام تھی۔ اس لیے حضرت لوط ؑ ان فرشتوں کے بارے میں سخت دل تنگ ہوئے اور اس دن کو مصیبت کے دن سے تعبیر کیا۔

حضرت لوط ؑ نے دیکھا کہ یہ لوگ بدکاری کے لیے اس طرح بے اختیار دوڑے چلے آتے ہیں جس طرح بخار میں مبتلا شخص بے اختیار کانپتا ہے۔ اور ان کے مہمانوں کی توہین پر تلے ہوئے ہیں تو انہوں نے ان کی ذات کے اندر موجود فطرت سلیمہ کو اپیل کی۔ ان کو متوجہ کیا کہ دیکھو عورتیں موجود ہیں جن کو اللہ نے اسی مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ خود حضرت لوط ؑ کے گھر میں لڑکیاں موجود تھیں اور وہ اسی وقت جائز طریقوں سے ان کے جوش لذت کو تسکین دے سکتی تھیں۔ جن کو اسی مقصد کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ وہ اسی وقت ان کو نکاح کر کے ان کے حوالے کرنے کے لیے تیار تھے تاکہ وہ ان کی جنونی شہوت رانی کے لیے سکون کا سامان فراہم کریں۔

قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ (۱۱:۷۸) "لوط ؑ نے ان سے کہا" "بھائیو! یہ میری بیٹیاں موجود ہیں' یہ تمہارے لیے پاکیزہ تر ہیں۔ کچھ خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے ذلیل نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں؟"

هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ (۱۱:۷۸) "وہ تمہارے لیے پاکیزہ تر ہیں"۔ یعنی وہ ہر لحاظ سے پاکیزہ ہیں۔ نفسیاتی اعتبار سے پاکیزہ' حسی اعتبار سے پاکیزہ اور اخلاقی اعتبار سے پاکیزہ ہیں۔ وہ پاک فطرت ہیں اور پاک جذبات کی تسکین کے لیے تیار ہیں۔ ان کے اخلاق اور ان کا دین پاکیزہ ہے اور قدرت نے بھی انہیں اس پاک اور عظیم مقصد کے لیے تیار کیا ہے۔ اور یہ راستہ بھی بمقابلہ اس راہ کے جو وہ اختیار کر رہے ہیں پاکیزہ ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ (۱۱:۷۸) "پس اللہ سے ڈرو"۔ پہلے فقرے میں ان کو سمجھایا گیا کہ فطری طور پر پاکیزہ راہ اختیار کرو' یہاں کہا گیا کہ اللہ سے ڈرو اور اس غلط روش سے باز آجاؤ"۔

وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ (۱۱:۷۸) "اور میرے مہمانوں کے بارے میں مجھے ذلیل نہ کرو"۔ یہ فقرہ ان کے جذبہ انسانی غیرت کو بیدار کرنے کے لیے کہا گیا اور دیہاتی لوگ مہمان کا عموماً خیال رکھتے ہیں اور مہمانوں کی توہین کو بہت برا سمجھا جاتا ہے۔

اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ (۱۱:۷۸) "کیا تم میں سے کوئی بھلا آدمی نہیں ہے"۔ یہ معاملہ بھی ہدایت' نیکی اور بھلائی کا ہے۔ نیز فطرت اور مروت اور اخلاق کا بھی یہی تقاضا ہے۔ لیکن یہ تمام اپیلیں بدفطرت لوگوں پر

اثر انداز نہ ہو سکیں ۔ اس لیے کہ ان لوگوں کے دل منحرف ہو گئے تھے ۔ ان کی عقل ماؤف ہو گئی تھی اور ان کا ناقابل مثال شہوانی جوش ان پر غالب تھا۔

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ ﴿۷۹﴾

"انہوں نے جواب دیا" "تجھے تو معلوم ہی ہے کہ تیری بیٹیوں میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے ۔ اور یہ تو بھی جانتا ہے کہ ہم چاہتے کیا ہیں؟" انہوں نے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ اگر ہم تمہاری بیٹیوں کا رشتہ چاہتے تو تم ضرور نکاح کر کے ہمارے حوالے کر دیتے اور تم جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں؟ یہ ان کی جانب سے ان کے خبیث اور گندے ارادے کی طرف نہایت ہی خبیثانہ اشارہ ہے ۔

اس موقعہ پر حضرت لوط ؑ نڈھال ہو گئے ۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ اب ان کے مقابلے میں بالکل بے بس ہیں ' وہ اس قوم میں اس طرح ہیں جس طرح ایک مسافر ہوتا ہے ۔ گویا یہاں ان کا کوئی خاندان اور کوئی مددگار نہیں ہے ۔ اور اس مصیبت کے وقت کوئی نہیں ہے جو ان کی دستگیری کرے ۔ ایسے حالات میں وہ جس پریشانی کا اظہار کر رہے ہیں ' وہ یہ ہے :

قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ ﴿۸۰﴾

"لوط ؑ نے کہا" "کاش میرے پاس اتنی طاقت ہوتی کہ تمہیں سیدھا کر دیتا ' یا کوئی مضبوط سہارا ہی ہوتا کہ اس کی پناہ لیتا" ۔

جب حضرت لوط ؑ یہ کلمات کہہ رہے تھے تو روئے سخن ان نوجوانوں کی طرف تھا ۔ یعنی فرشتوں کی طرف جو خوبصورت نوجوانوں کی شکل میں موجود تھے ۔ حضرت لوط ؑ کی نظر میں یہ نوجوان اس قدر مضبوط نہ تھے کہ اپنا دفاع کر سکیں ۔ چنانچہ حضرت لوط ؑ یہ اشارہ دینا چاہتے تھے کہ اگر تم لوگ مضبوط ہوتے تو بھی ان ظالموں کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا یا یہ کہ اور کوئی ان کا حامی و مددگار ہوتا تو وہ اس کی مدد اور معاونت طلب کر لیتے لیکن کوئی نہیں ہے ۔

حضرت لوط جن مشکلات سے دوچار تھے اور جس پریشانی میں مبتلا تھے ۔ اس میں ان کی نظروں سے وقتی طور پر یہ حقیقت اوجھل ہو گئی کہ وہ تو ایک مضبوط سہارے کی پناہ میں ہیں ۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جب یہ آیت پڑھی ' ایک حدیث میں فرمایا : "اللہ حضرت لوط ؑ پر رحم فرمائے ' وہ تو اس وقت بھی ایک مضبوط سہارے کی پناہ میں تھے" ۔

غرض جب حضرت نوح ؑ کی پریشانی انتہاؤں کو چھونے لگی اور مصیبت کا دائرہ ان پر تنگ ہو گیا ' تو اس وقت اللہ کے رسولوں نے اپنا تعارف کرا دیا اور بتا دیا کہ وہ تو ایک نہایت ہی مضبوط سہارے کی پناہ میں ہیں ۔ خدائی قوت آپ کی پشت پر ہے ۔

قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ یَّصِلُوْۤا اِلَیْكَ

"تب فرشتوں نے اس سے کہ کہ "اے لوط' ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں' یہ لوگ تیرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے"۔

چنانچہ انہوں نے اپنے مشن کی بابت بتا دیا اور حکم دیا کہ وہ اپنے پاکیزہ خاندان کے ساتھ نکل جائیں ۔ ہاں تمہاری بیوی تمہارے ساتھ نہیں ہے ۔ یہ فاسقین کی جماعت میں شامل ہے ۔

فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنكُمْ أَحَدٌ إِلَّا امْرَأَتَكَ ۖ إِنَّهُ مُصِيبُهَا مَا أَصَابَهُمْ ۚ إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۚ أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ ﴿٨١﴾

"بس تو کچھ رات رہے اپنے اہل و عیال کو لے کر نکل جا۔ اور دیکھو تم میں سے کوئی شخص پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے ۔ مگر تیری بیوی (ساتھ نہیں جائے گی) کیونکہ اس پر بھی وہی کچھ گزرنے والا ہے جو ان لوگوں پر گزرنا ہے ۔ ان کی تباہی کے لیے صبح کا وقت مقرر ہے ۔ صبح ہوتے اب دیر ہی کتنی ہے!"

اسریٰ' عربی میں رات کے سفر کو کہتے ہیں اور قطعہ لیل کا مطلب ہے رات کے کسی حصے میں ۔ چونکہ صبح کے وقت قوم نے ہلاک ہونا تھا' اس لیے حکم دیا گیا کہ نہ کوئی پیچھے رہے اور نہ پیچھے مڑ کر دیکھے ۔ کیونکہ پیچھے رہنے والا اور مڑ کر دیکھنے والا بھی ہلاک ہو گا ۔

أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ (۱۱ : ۸۱) "کیا صبح کا وقت قریب نہیں ہے"۔ یہ فقرہ اس لیے آیا ہے کہ حضرت لوط کی روح خوش ہو جائے کیونکہ انہوں نے گزشتہ محفل بڑی اذیت کے ساتھ گزاری تھی ۔
مقصد یہ تھا کہ ان لوگوں کا انجام بہت ہی قریب ہے ۔ صبح ہوتے ہی یہ لوگ ہلاک ہو جائیں گے ۔ اب وہ خواہش اللہ پوری فرمائیں گے جو خواہش حضرت لوط اپنی کم قوت کی بنا پر پوری نہ کر سکتے تھے ۔

فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ مَّنضُودٍ ﴿٨٢﴾ مُّسَوَّمَةً عِندَ رَبِّكَ ۖ وَمَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِينَ بِبَعِيدٍ ﴿٨٣﴾ ۱۵ ع

"پھر جب ہمارے فیصلہ کا وقت آ پہنچا تو ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا' اور اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر تابڑ توڑ برسائے جن میں سے ہر پتھر تیرے رب کے ہاں نشان زدہ تھا اور ظالموں سے یہ سزا کچھ دور نہیں ہے"۔

یعنی جب ان پر عذاب نافذ کرنے کا وقت آیا تو ہم نے ان کی بستی کو اوپر نیچے کر دیا ۔ یعنی یہ سزا ان کے لیے اس لیے تجویز ہوئی کہ انہوں نے بھی اپنے آپ کو مقام انسانیت سے گرا کر مقام حیوانیت تک لے آئے تھے ۔ بلکہ وہ حیوانات سے بھی نیچے گر گئے تھے کیونکہ حیوانات بہرحال حیوانی فطرت کے اصولوں کے تابع ہوتے ہیں اور اپنی حدود کے اندر رہتے ہیں ۔ لیکن انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو فطرت کی حدود کو بھی پار کر لیتا ہے ۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ (۱۱ : ۸۲) "اور ہم نے ان پر مٹی آلود پتھر برسائے"۔ یعنی ایسے پتھر جن کے ساتھ مٹی لگی ہوئی تھی ۔اس مقام پر ان کے لیے خاک آلود پتھران کے حال اور مقام سے زیادہ مناسب تھے ۔ منضود کے معنی ہیں اوپر تلے آنے والے پتھراور یہ پتھر

● مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ (۱۱ : ۸۳) "تمہارے رب کے ہاں نشان زدہ تھے"۔جس طرح مویشیوں پر نشان لگا کر چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ پڑھے جا سکیں ۔گویا ان پتھروں کو اللہ نے اس طرح چھوڑا کہ وہ خودکار عمل سے پڑتے تھے اور ضرورت کے وقت اپنا کام کرتے تھے ۔یہ ایک عجیب تصویر کشی ہے ۔ذہن پر اس کے بے پناہ اثرات پڑتے ہیں ۔ اس تصویر کشی سے ذہن پر جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ لمبی لمبی تشریحات سے نہیں پڑتا۔

وَ مَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ (۱۱ : ۸۳) "ظالموں سے یہ سزا کوئی دور نہیں ہے"۔ یہ سزا قریب ہے' تیار ہے اور اللہ کسی بھی وقت نازل کر سکتا ہے ۔

یہاں آل لوط کی اس سزا کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے 'اس کی تصویر بعض آتش فشاں پہاڑوں کے بالکل مشابہ ہے ۔کیونکہ آتش فشانی کے عمل میں پتھراور غبار آلود پتھر برستے ہیں اور ظالم اقوام کو اللہ ان کے ظلم کی سزا دیتے ہیں ۔

ہم اس مشابہت کا ذکر کر کے یہ کہنا نہیں چاہتے کہ یہ سزا کوئی آتش فشانی تھی اور کسی مخصوص وقت میں عمل واقع ہو گیا۔ نہ ہم اس کی نفی کرتے ہیں کیونکہ یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاں ان لوگوں کے لیے آتش فشانی کی سزا مقرر کی ہو ۔یہ بھی سزا کا ایک طریقہ ہے ۔

اصل بات یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس قوم کو اللہ نے ایک عام اور معمولی آتش فشانی کے ذریعے سے سزا دی ہو ۔ اور روز ازل سے ان کے لیے یہ عمل تجویز ہوا ہو ۔ اور یہ بھی اللہ کی قدرت ہے کہ اس نے اس مجرم قوم کے لیے اپنے تصرفات قدرت میں سے ایک عمل کو مخصوص کر دیا ہو ۔ اور یہ بھی درست ہو سکتا ہے کہ یہ آتش فشانی عام طبیعی عمل کا حصہ نہ ہو اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے خارق عادت طریقے سے کوئی سنگ باری کی ہو ۔اور اس کا تعلق طبیعی آتش فشانی سے بالکل نہ ہو ۔یہ عمل اسی طرح خارق عادت ہو جس طرح حضرت ابراہیم کے ہاں بچے کی ولادت کا عمل معتاد طریقے کے بالکل برعکس ہو گیا تھا ۔اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے وہ جس طرح چاہے کر سکتا ہے ۔اس کی مشیت بے قید ہے اور انسان کے لیے اس کا سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے ۔

---ooo---

# درس نمبر۱۰۳ ایک نظر میں

اسلامی نظریہ حیات انسانی تاریخ میں ؛ حد ' دائی اور مسلسل نظریہ ہے ' اب ہم حضرت شعیب ؑ کے دور میں پہنچ گئے ۔ حضرت شعیب ؑ اپنی قوم اہل مدین میں اس کا بیڑا اٹھاتے ہیں ۔ لیکن ان کی دعوت میں اسلامی نظریہ حیات کے ساتھ ساتھ سوسائٹی کا ایک دوسرا اہم مسئلہ بھی سامنے آتا ہے ۔ وہ یہ کہ سوسائٹی میں امانت عدل اور حسن معاملہ کے اصول نافذ کرو ' ان معاملات کا تعلق بھی اسلامی عقائد سے ہے ۔ کیونکہ اللہ وحدہ کے دین میں داخل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ صرف اللہ کی شریعت کا اتباع کیا جائے ۔ لیکن اہل مدین کو حضرت شعیب ؑ کی یہ دعوت سن کر بڑا تعجب ہوا اور یہ بات ان کو انوکھی لگی ۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ دین کے ساتھ ناپ تول جیسے دنیاوی معاملات کا تعلق کیا ہے ؟ نماز اور ترازو کے درمیان کیا نسبت ؟ عبادت اور مالی معاملات بالکل الگ الگ نوعیت کے حامل ہیں ۔

یہ قصہ حضرت ہود ؑ اور ان کی قوم عاد کے قصے اور حضرت صالح ؑ اور ان کی قوم ثمود کے قصے کے بعد آتا ہے ۔ لیکن اس قصے کا انجام اور اس کا اسلوب بیان اور عذاب کی نوعیت قصہ صالح کے ساتھ زیادہ مماثلت رکھتی ہے ۔ ان کا عذاب بھی ایک جیسا ہے اور اس عذاب کا اسلوب تعبیر بھی یکساں ہے ۔

---O O O---

# درس نمبر ۱۰۲ تشریح آیات

۸۴---- تا---- ۹۵

---

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ

"اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے"۔

صرف اللہ کی بندگی کرنا دین اسلام کی خشت اول ہے۔ اور اسلامی نظام زندگی کی اساس ہے۔ اسلامی شریعت کا بھی یہ قاعدہ اول ہے۔ اسلامی سوسائٹی کا نظام عمل سب کا سب اسی قاعدے پر مبنی ہے۔ یہ وہ عقیدہ ہے جس کے بغیر کوئی عقیدہ، کوئی پرستش، کوئی طرز عمل مکمل اور اسلامی نہیں کہلا سکتی۔

وَلَا تَنقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ ۚ إِنِّي أَرَاكُم بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ ﴿٨٤﴾ وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٨٥﴾ بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ ﴿٨٦﴾

"اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو۔ آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں، مگر مجھے ڈر ہے کہ کل تم پر ایسا دن آئے گا جس کا عذاب سب کو گھیر لے گا۔ اور اے برادران قوم، ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ پورا ناپو اور تولو اور لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دیا کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اللہ کی دی ہوئی بچت تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو۔ اور بہرحال میں تمہارے اوپر کوئی نگران کار نہیں ہوں"۔

ان آیات میں جو اہم معاملہ اٹھایا گیا ہے وہ عدل و انصاف اور امانت و دیانت کا اور معاشی ضابطہ بندی کا مسئلہ ہے۔ اس سے قبل کی آیات میں اسلام کی نظریاتی اساس کا تعین تھا۔ لیکن یہاں جو مالی ہدایات دی گئی ہیں وہ اس نظریہ حیات کا

فطری نتیجہ ہیں - اہل مدین کا علاقہ حجاز سے شام تک جانے والے تجارتی راستے پر تھا- اور ان میں یہ کمزوری پائی جاتی تھی کہ وہ ناپ تول میں لوگوں کا حق مارتے تھے - لوگوں کی چیزوں کی قیمت کم دیتے - یہ وہ کمزوری ہے جو انسان کے قلب و عمل ' دونوں کو گندہ کر دیتی ہے - اور انسان سے مروت اور عزت نفس کے بلند اوصاف جاتے رہتے ہیں - اس رزالت کے علاوہ یہ لوگ شمالی عرب میں شام کی طرف آنے جانے والے قافلوں کو بھی لوٹ لیتے تھے اور آنے جانے والوں پر ناجائز راہداری عائد کر کے ظلم کرتے تھے - اس صورت میں ان کے اس عیب کی تفصیلات دی گئی ہیں -

اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلامی نظام حیات میں نظریات ' عقائد کا تعلق براہ راست امانت ' دیانت ' عدل و انصاف اور لین دین میں اصول انصاف کے قیام اور سوسائٹی سے چوری ' ذکیتی اور تمام دوسرے معاشری جرائم کے خاتمے سے ہوتا ہے - یاد رہے کہ کسی معاشرے میں عدل و انصاف تب قائم ہو سکتا ہے جب اس کے افراد کے اندر خدا خوفی اور آخرت کی جوابدہی کا احساس ہو - صرف ایسے عقائد اور ایسے اخلاق کے ذریعے سوسائٹی میں عدل و انصاف اور منصفانہ معاشی نظام اور معاشی روابط قائم ہو سکتے ہیں اور ایک ٹھوس انسانی معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے -

کسی بھی صحت مند معاشرے میں ' یہ ضروری ہوتا ہے کہ باہم معاملات کا نظام اور معاشرہ کا اخلاقی نظام ایک مستحکم نظریاتی اساس پر مبنی ہوں - اور معاملات اور اخلاق ایسے اصولوں اور تصورات پر مبنی نہ ہوں جو آئے دن بدلنے والے ہوں - اسلامی نظریہ حیات میں یہی خوبی ہے - اسلامی نظام تمام دوسرے نظاموں اور اسلامی سوسائٹی تمام دوسری سوسائٹیوں سے اس پہلو میں منفرد ہے کہ اس میں افراد کی پوری زندگی اسلامی عقائد و تصورات پر استوار ہوتی ہے اس میں محض عارضی اور ظاہری مظاہر و مطالب ہی پیش نظر نہیں ہوتے -

جب اسلامی سوسائٹی اپنے اخلاق و معاملات ان اصولوں اور مستحکم بنیادوں پر رکھتی ہے تو پھر وہ گردش دوران کے عارضی موثرات سے بدلتی نہیں اور نہ ہی وہ کسی مروجہ عارضی سیلاب اور تپش سے متاثر ہوتی ہے -

لوگوں کے اخلاق ' ان کے باہم معاملات کا اخلاقی رنگ یہ نہیں ہوتا کہ وہ زرعی معیشت پر تکیہ رکھتے ہیں یا وہ جانور پال کر زندگی بسر کرتے ہیں یا ان کا تعلق صنعت و حرفت کے پیشوں سے ہے ' یہ عوامل ان کے اخلاق اور طرز عمل پر اثر انداز نہیں ہوتے - اسلام کے اخلاقی نقطہ نظر میں اور اسلام کے اخلاقی اصولوں میں ان عوامل کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا ہے کیونکہ اسلامی اخلاقیات اور اسلامی شریعت و قوانین کا ماخذ قرآن اور سنت ہیں اور اسلامی قانون اور اخلاق کا نصب العین صرف رضائے الہی کا حصول ہے اور آخرت کے عذاب کا خوف اور ثواب کا حصول اسلامی نظام اور معاشرے میں اصل محرک ہے - دنیا میں انسانوں کے وضع کردہ نظام ہائے قانون و اخلاق چونکہ تجارتی روابط ' اقتصادی حالات اور ذاتی اور قومی مفادات کو پیش نظر رکھ کر بنائے اور وضع کیے جاتے ہیں ' اس لیے یہ تصورات اور یہ اخلاقیات اسلامی زاویہ نگاہ سے بالکل لغو اور بودے ہوتے ہیں - (تفصیلات کے لیے دیکھئے امیر جماعت اسلامی پاکستان سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب ""اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر"" اور مولف کی کتاب (نحو مجتمع اسلامی) کی فصل ""نظام اخلاق"")

وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ ( ۱۱ : ۸۴ ) ""اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو - آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں"" - یعنی اللہ نے تمہیں رزق حسن دیا ہے - اس لیے تمہیں اس قسم کی گھٹیا حرکت کرنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ مجبور ہے - تم پہلے سے غنی ہو - اگر تم ناپ اور تول کے پیمانوں میں یہ بے

قاعدگی چھوڑ دو تو تم غریب نہ ہو گے اور اگر اسے جاری رکھو تو تم امیر تر نہیں بن سکتے - بلکہ خطرہ یہ ہے کہ اس بے قاعدگی کی وجہ سے تمہارے اچھے دن ختم ہو جائیں اور تمہاری مالی مار دھاڑ کے مواقع ہی ناپید ہو جائیں -

وَّ اِنِّیٓ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ مُّحِیۡطٍ (۱۱ : ۸۴) "مگر مجھے ڈر ہے کہ کل تم پر ایسا دن آئے گا جس کا عذاب سب کو گھیر لے گا" - یہ عذاب آخرت میں بھی آ سکتا ہے جہاں پر چھوٹے بڑے معاملے کا فیصلہ ہو گا اور اس جہان میں بھی آ سکتا ہے - جب لوگوں پر تمہاری یہ غلط کاری واضح ہو گی اور تمہاری تجارت ماند پڑ جائے گی اور معاشرے کے اندر کشمکش شروع ہو گی اور تم ایک دوسرے کے برسرپیکار ہو جاؤ گے اور رسہ کشی شروع ہو جائے گی -

حضرت شعیب دوبارہ ان کو خطاب فرماتے ہیں اور نہایت ہی مثبت انداز میں ان کو صحیح راہ بتلاتے ہیں -

وَ یٰقَوۡمِ اَوۡفُوا الۡمِکۡیَالَ وَ الۡمِیۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ (۱۱ : ۸۵) "اور اے برادران قوم، ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ پورا ناپو اور تولو" - یہاں یہ کہا کہ ناپ اور تول پورا پورا کرو، یعنی کم ناپ تول کے مقابلے میں پورا ناپنے اور تولنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ پورے سے بھی قدرے زیادہ ہو - چنانچہ اس انداز تعبیر یعنی

اَوۡفُوا الۡمِکۡیَالَ (۱۱ : ۸۵) کے اندر وَ لَا تَنۡقُصُوا الۡمِکۡیَالَ (۱۱ : ۸۴) کے مقابلے میں زیادہ خوبصورتی ہے - اس میں یہ اشارہ ہے کہ زیادتی کی طرف مائل ناپ و تول کی راہ لو -

وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَهُمۡ (۱۱ : ۸۵) "اور لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دیا کرو" - یہ فقرہ ناپ تول کی اشیاء تک محدود نہیں ہے - یہ عام ہے یعنی تمام قیمتی اشیاء خواہ ناپ سے متعلق ہوں، یا تول سے، قیمت سے ہوں یا ویلیو سے - ان سب کی لین دین میں راستی کا موقف اختیار کرو - اس میں لوگوں کی لیبر اور محنت اور ان کی ہنرمندی بھی داخل ہے - کیونکہ "شَیۡءٌ" کے لفظ کا اطلاق بہت عام ہے - اس کا اطلاق محسوسات اور غیر محسوسات دونوں پر ہوتا ہے -

لوگوں کی چیزوں کو گھٹانا ایک پہلو سے تو ظلم ہے لیکن اس کے بعض دوسرے مفاسد بھی ہیں - لوگوں کے اندر اس کی وجہ سے نفرت اور دوسرے برے جذبات پیدا ہوتے ہیں - ان کو کوفت ہوتی ہے اور معاشرے کے اندر ایک دوسرے کے خلاف نفرت پیدا ہوتی ہے - اور جب عدل و انصاف کے اداروں پر لوگوں کا اعتماد اٹھ جاتا ہے تو معاشرے کے اندر اجتماعی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور لوگوں کے دل ایک دوسرے کے خلاف بھر جاتے ہیں اور اجتماعی زندگی سے اصلاح اور نیکی کا اثر ختم ہو جاتا ہے -

وَلَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ (۱۱ : ۸۵) "اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو" - عثو کے معنی بگاڑ پیدا کرنے کے ہیں - یعنی فساد پھیلانے کے منصوبے نہ بناتے پھرو - اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کے اندر موجود بھلائی کے میلانات کو ابھارتے ہیں کہ اللہ نے ان کو جائز ذرائع سے جو دولت دی ہے وہ اس ناپاک دولت سے بہت ہی بہتر ہے جو ناپ تول میں کمی بیشی کر کے وہ کماتے ہیں اور لوگوں کے حقوق مار کر جمع کرتے ہیں -

بَقِیَّتُ اللّٰهِ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ (۱۱ : ۸۶) "اللہ کی دی ہوئی بچت تمہارے لیے بہتر

ہے اگر تم مومن ہو" ۔کیونکہ اللہ کے ہاں جو اجر ہے یا اللہ کی شریعت کے مطابق جائز ذرائع سے آنے والی کمائی زیادہ قیمتی اور زیادہ باقی رہنے والی ہے ۔اس سے قبل اللہ نے بتایا تھا کہ صرف اللہ کی بندگی اور اطاعت کرو' اور اللہ کے دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ ۔اور اب یہ بتایا جاتا ہے کہ اس دین کے مطابق جو منافع وہ کمائیں گے وہ زیادہ نفع بخش کام ہے ۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور معاشی سرگرمیوں میں پاکیزہ راہ اختیار کرنا اس ایمان اور نظریہ کا لازمی تقاضا بھی ہے ۔

اب حضرت شعیب ؑ ان کو اور ان کے سامنے پیش کی گئی دعوت کو ایک طرف چھوڑتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ بذات خود ان تصرف کے مالک نہیں ہیں' کوئی گارنٹی تمہیں نہیں دے سکتے ۔ اور وہ عملاً شر اور عذاب اور فساد سے تمہیں روک دینے پر قدرت نہیں رکھتے ۔اور وہ اس بات کے ذمہ دار نہیں ہیں کہ وہ ہر حال میں تمہیں ہدایت پر لے آئیں اور اگر تم لوگ ضلالت پر اصرار کرتے ہو تو اس بات کی عند اللہ کوئی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے ۔ میرا فرض تو صرف ابلاغ مبین ہے ۔اور تبلیغ دین کا فریضہ ظاہر ہے کہ میں نے ادا کر دیا ہے ۔

وَ مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (۱۱ : ۸۶) "اور بہر حال میں تمہارے اوپر کوئی نگران کار نہیں ہوں" ۔یہ انداز کلام ایک سننے والے کو اس بات پر مجبور کر دیتا ہے کہ معاملہ بڑا سنگین ہے ۔اس کے نتائج خطرناک ہوں گے اور اگر وہ غور نہ کریں گے تو برے انجام سے خود وہ دوچار ہوں گے ۔اور کوئی وہاں نہ رکاوٹ ڈال سکے گا اور نہ کوئی بچانے والا ہو گا ۔

---○○○---

لیکن قوم بگڑی ہوئی تھی اور وہ فساد اور بے راہ روی کے عادی ہو گئے تھے ۔اور وہ لوگوں کا استحصال صدیوں سے کرتے چلے آئے تھے ۔چنانچہ وہ کہتے ہیں :

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ۝

"انہوں نے جواب دیا "اے شعیب ؑ کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشا کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟ بس تو ہی تو ایک عالی ظرف اور راست باز آدمی رہ گیا ہے!"

یہ جواب نہایت ہی توہین آمیز اور خود سری پر مبنی ہے ۔ایک جاہل اور بگاڑ میں مبتلا اور مسخ شدہ فطرت پر مبنی جاہل شخص کا جواب ہے اور جواب دینے والا مخاطب کے ساتھ سخت عناد اور دشمنی رکھتا ہے' ذرا غور کیجئے :

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (۱۱ : ۸۷) "انہوں نے جواب دیا "اے شعیب ؑ کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشا کے مطابق تصرف

کرنے کا اختیار نہ ہو؟"

وہ اس بات کو نہیں سمجھتے یا اس بات کو وہ سمجھنا نہیں چاہتے کہ نماز اسلامی نظریہ حیات اور ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ اور اللہ کی پرستش اور بندگی کا متعین طریقہ ہے۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ کوئی عقیدہ و نظریہ' عقیدۂ توحید کے بغیر حق نہیں ہو سکتا اور کوئی نظام اس کے سوا درست نہیں ہو سکتا کہ آباؤ اجداد کے تمام غلط طریقوں کی کلی نفی کر دی جائے۔ نیز اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک اسلامی شریعت قائم نہ کر دی جائے۔ اور اسلامی شریعت بھی زندگی کے تمام شعبوں میں نہ نافذ کر دی جائے۔ تجارت اور مالی معاملات میں' زندگی کے انفرادی معاملات میں اور زندگی کے اجتماعی معاملات میں۔ کیونکہ عقیدہ و عمل اسلامی نظام میں ایک ہی مجموعہ ہیں۔ ان میں تفریق نہیں ہو سکتی اور نہ عمل کے بغیر محض خالی خولی نعرے کی اسلام میں کوئی اہمیت ہے۔

اس سے قبل کہ ہم دین و معاملات کے درمیان افتراق کے اس احمقانہ تصور کی تردید میں مزید بحث کریں۔ یہاں اس بات کو نوٹ کرنا ضروری ہے کہ آج کی جاہلیت کے علم بردار اس سلسلے میں وہی کچھ سوچتے ہیں جو حضرت شعیبؑ کی قوم کی سوچ تھی۔ اور دور جدید کی جاہلیت نے اس غلط سوچ کے لیے قوم شعیب ؑ سے بڑھ کر آگے کوئی دلائل فراہم نہیں کیے۔ جس طرح' اس معاملے میں قوم شعیب مشرک تھی' جدید جاہلیت کے پیروکار بھی اس شرک میں مبتلا ہیں۔ چاہے وہ یہودی ہوں' چاہے عیسائی' چاہے وہ آج کے نام نہاد مسلمان ہوں کیونکہ یہ سب لوگ دور جدید میں ایمان و عقیدے اور اعمال و شعائر کے درمیان افتراق کرتے ہیں' شریعت اور عمل کو جدا کرتے ہیں' یہ لوگ عقائد و عبادات کو اللہ کے لیے مخصوص کرتے ہیں اور معاملات اور دنیاوی امور اپنے دوسرے معبودوں اور لیڈروں کے احکام کے مطابق سرانجام دیتے ہیں اور یہی ہے حقیقی اور اصلی شرک۔

ہاں' اس بات کا اعتراف کرنا بے جا نہ ہو گا کہ جو لوگ یہودی عقائد کے پیروکار ہیں اور ان کے عقائد بارہا کی تحریفات کے عمل سے بھی گزرے ہیں' لیکن اس کے باوجود ان کی اسمبلی میں جب یہ مسئلہ پیش ہوا کہ ان کے بحری جہاز بعض مسافروں کو غیر شرعی حرام کھانا پیش کرتے ہیں تو ان کی اسمبلی نے ایسے جہازوں کو حکم دے دیا کہ جس قدر خسارہ بھی ہو' ان کو چاہئے کہ ہر مسافر کو اسرائیلی شریعت کے مطابق صرف حلال کھانا پیش کیا جائے۔ اب ذرا ان لوگوں کو اپنے رویے پر غور کرنا چاہئے جو دعوائے مسلمانی کے ساتھ ساتھ یہ سب کچھ کرتے ہیں۔

آج ہم میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں' جو مسلمانی کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن وہ اخلاق نیز معاشی اور معاملات کے میدان میں شریعت کی پابندی نہیں کرتے۔

اور بعض ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس دنیا کی مشہور ترین یونیورسٹیوں کی ڈگریاں ہیں' یہ لوگ نہایت ہی تعجب سے پوچھتے ہیں' اسلام کو ہمارے ذاتی اور انفرادی معاملات سے کیا تعلق ہے۔ اسلام کو اس بات سے کیا تعلق ہے کہ کوئی ساحلوں پر ننگا پھرتا ہے یا باپردہ۔ اسلام کو اس سے کیا تعلق ہے کہ کوئی عورت گلیوں میں پھرتے ہوئے کیسا لباس زیب تن کرتی ہے۔ پھر اسلام کو اس سے کیا واسطہ کہ کوئی اپنی جنسی قوت کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ پھر اگر کوئی اپنا مزاج درست کرنے کے لیے شراب پیتا ہے تو اسلام کو کیا تکلیف ہے' پھر اس جدید دور کے تقاضے ہیں اور کچھ لوگ ان تقاضوں کو پورا کرتے ہیں تو اسلام کو کیا تکلیف ہے؟ یہ سوالات اور قوم شعیب کے اس سوال میں فرق کیا ہے؟ (اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ) "کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی

ہے کہ ہم اپنے ان تمام معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پوجا ہمارے آباء کرتے چلے آئے ہیں"۔

پھر وہ دوسرا سوال بڑی شدت اور استنکار سے کرتے ہیں کہ اسلام کو اقتصادی معاملات میں دخل اندازی کی کیا ضرورت ہے۔ یا یہ کہ اسلام اقتصادی تعلقات میں دخل دے یا ہمارے لیے اقتصادی اخلاقیات کا کوئی نظام وضع کرے۔ دین کا سودی لین دین کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ دین کو اس سے کیا لگی کہ اگر کوئی مہارت اور دھوکے سے لوگوں سے مال جمع کرتا ہے تو وہ ایسا نہ کرے بشرطیکہ یہ چالاکی و عیاری انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے دائرے کے اندر ہو' بلکہ یہ لوگ بڑی ڈھٹائی سے یہاں تک کہتے ہیں کہ جب بزنس میں اخلاق دخل اندازی کرے تو بزنس تباہ ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بعض مغربی مفکرین کے اخلاقی نظام اقتصاد کو بھی برا سمجھتے ہیں اور ان کا یہ خیال ہے کہ ہمارے دور کے بعض مخلصین کا مغالطہ ہے۔

قدیم جاہلیت کے علم بردار اہل مدین کی مذمت میں ہمیں بہت آگے نہیں بڑھنا چاہئے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دور جدید کی جاہلیت اس کے مقابلے میں کہیں آگے بڑھ گئی ہے۔ اگرچہ جدید جاہلیت علم' ترقی اور تہذیب کی مدعی ہے اور یہ جاہلیت ان لوگوں کو رجعت پسندی اور جہالت' جمود اور تعصب کا الزام دیتی ہے جو لوگ یہ دعوت دیتے ہیں کہ ایمان' شخصی طرزعمل اور بازار کے مادی اور اقتصادی طرزعمل کو باہم مربوط کر دیا جائے۔

کوئی شخص اس وقت تک صحیح موحد نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے شخصی معاملات کو' اپنے اجتماعی معاملات کو اپنے عقیدے کے ساتھ منسلک نہ کرے۔ کیونکہ اگر کوئی ایسا نہ کرے تو وہ مشرک ہے اور مشرک اور توحید ایک دل میں کس طرح جمع ہو سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ شرک کی کئی قسمیں اور کئی رنگ ہیں۔ ایک رنگ اس کا وہ ہے جو آج کل رائج ہے اور ہم اس کے اندر زندگی بسر کر رہے ہیں اور اصل اور حقیقی شرک کی طرح اس پر بھی تمام مشرکین کا اتفاق ہے' جدید ہوں کہ قدیم۔ جس دور میں ہوں اور جس مقام پر ہوں۔

ذرا ملاحظہ کیجئے اہل مدین حضرت شعیبؑ کے ساتھ کیسا طنز کرتے ہیں اور یہی حرکت آج کے مدعیان توحید بھی کرتے ہیں۔

اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ (۱۱: ۸۷) "بس تو ہی تو ایک عالی ظرف اور راست باز آدمی رہ گیا ہے!" ان کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ حضرت شعیب کو فی الواقعہ راست باز سمجھتے تھے' بلکہ وہ اس کے برعکس سمجھتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک دانش مندی اور راست بازی یہ تھی کہ وہ ان بتوں کی پوجا کریں جن کی پوجا ان کے آباؤاجداد کرتے چلے آئے ہیں اور یہ کام بغیر سوچے سمجھے کیا جائے' اور یہ کہ عبادت کے دائرے سے تجارت و معاملات کو آزاد رکھا جائے۔ اور یہی تنازعہ آج نام نہاد ترقی پسندوں اور بدنام رجعت پسندوں کے درمیان اسی انداز سے چل رہا ہے۔

---ooo---

اب حضرت شعیب ؑ ایک ایسے داعی حق کی طرح جسے اپنی سچائی پر پورا پورا یقین ہو' ان کے ساتھ نہایت ہی نرمی سے ہمکلام ہوتے ہیں' وہ ان کے اس مذاق کو سنجیدگی کے ساتھ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور ان کی جہالت اور ان کے قصور کو خاطر میں نہیں لاتے۔ آپ ان کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف سے پوری شہادت رکھتے ہیں اور ان کو اپنے مشن کے بارے میں شرح صدر حاصل ہے۔ اور یہ کہ ان کو وہ علم نبوت دیا گیا ہے جس سے یہ لوگ محروم ہیں' نیز جب یہ اپنے معاملات کو اسلامی طریقہ کار کے مطابق استوار کریں گے تو ان کو جلد ہی اسلامی نظام معیشت کے فوائد کا

علم ہو جائے گا۔ جیسا کہ خود حضرت شعیب ؑ اس پر عمل پیرا ہیں اور صاحب مال و تجارت ہیں۔ کیونکہ وہ اس دعوت پر ان سے کسی ذاتی مفاد کے طلبگار نہیں ہیں۔ اور نہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کو اچھے طرز عمل کی تلقین کر کے خود برے اعمال پر عمل پیرا ہوں اور بازار کو خالی پاکر خود مفاد سمیٹ لیں۔ ان کی دعوت تو ان لوگوں کے لیے اور عوام الناس سب کے لیے عام ہے اور اس میں ان کے لیے کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ یہ محض ایک وہم ہے کہ معیشت میں اسلامی ہدایات کے نفاذ سے شاید ان کو نقصان ہو گا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ مَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَ مَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ ۝۸۸

"شعیب ؑ نے کہا "بھائیو، تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر تھا اور پھر اس نے مجھے اپنے ہاں سے اچھا رزق بھی عطا کیا (تو اس کے بعد میں تمہاری گمراہیوں اور حرام خوریوں میں تمہارا شریک حال کیسے ہو سکتا ہوں؟) اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں ان کا خود ارتکاب کروں۔ میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں جہاں تک بھی میرا بس چلے اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں"۔

حضرت اپنی تقریر میں نہایت ہی ہمدردی، محبت اور برادرانہ جذبات کا خیال رکھتے ہوئے خطاب کرتے ہیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ (۱۱:۸۸) "شعیب ؑ نے کہا "بھائیو، تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر تھا"۔ میرے نفس کے اندر ایک حقیقت موجود ہے اور میں اسے سچ سمجھتا ہوں، پھر میری طرف وحی آتی ہے اور مجھے حکم دیا جاتا ہے کہ تم تبلیغ کرو، اور ان واضح شہادتوں کے بعد میں تمہارے سامنے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ دعوت پیش کرتا ہوں۔

وَ رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا (۱۱:۸۸) "پھر اس نے مجھے اپنے ہاں سے اچھا رزق بھی عطا کیا ہے"۔ میں خود بھی مالدار ہوں اور اپنی دولت میں تمہاری طرح تصرفات کرتا ہوں۔

وَ مَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ (۱۱:۸۸) "اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں ان کا خود ارتکاب کروں"۔ یعنی میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں اس بری حرکت سے تمہیں تو روک دوں اور دکان میں جاکر خود یہ کام کروں اور دولت کماؤں، ہرگز نہیں بلکہ

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ "میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں جہاں تک بھی میرا بس چلے"۔

اصلاح سے مراد عام اصلاح ہے جس میں پورے معاشرے کی بھلائی ہو، معاشرے کے تمام افراد اور تمام جماعتوں کی بھلائی ہو۔ اگرچہ بعض لوگ اس خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ اسلامی نظریہ حیات اپنانے سے مادی لحاظ سے نقصان پہنچتا

ہے اور انسان سے نفع اندوزی کے مواقع جاتے رہتے ہیں' حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان نہ صرف حرام اور خبیث اور ناپاک دولت کے سمیٹنے سے بچ نکلتا ہے۔ بلکہ حرام اور ناپاک کمائی کی جگہ رزق حلال اسے ملتا ہے اور اسلامی نظریہ حیات کے نتیجے میں ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ وجود میں آتا ہے جس میں تمام لوگوں کی ضروریات کی ضمانت ہوتی ہے اور جس کے اندر کوئی تعصب نہیں ہوتا اور نہ کوئی جنگ و جدال ہوتا ہے۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ (۱۱ : ۸۸) "اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے"۔ وہی ہے جو میرے اصلاحی کام کو کامیابی تک پہنچا سکتا ہے' کیونکہ اسے خوب علم ہے کہ میری نیت اور میرا ارادہ کیا ہے اور وہی ہے جو اس جدوجہد پر مجھے جزا دے سکتا ہے۔

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ (۱۱ : ۸۸) "اسی پر میں نے بھروسہ کیا"۔ یعنی میرا اعتماد صرف اس پر ہے اور اس کے سوا کسی اور پر میں کوئی بھروسہ نہیں کرتا۔

وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ (۱۱ : ۸۸) "اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں"۔ میرا رخ اسی کی طرف ہے' اور تمام امور میں میرا رجوع اسی کی طرف ہے۔ میری نیت' میرا ارادہ اور میرا عمل اسی کی طرف متوجہ ہے۔ اور تمام جدوجہد اس کے لیے ہے۔

اب حضرت شعیبؑ ان کو ایک دوسرے میدان میں فہمائش کرتے ہیں۔ ان کو بتاتے ہیں کہ ذرا قوم نوح' قوم ہود' قوم صالح اور قوم لوط کے انجام پر غور کرو۔ تاریخی واقعات کند ذہن افراد پر زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ جامد اور سنگدل لوگوں پر عقلی دلائل کے مقابلے میں واقعات کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾

"اور اے برادران قوم' میرے خلاف تمہاری ہٹ دھرمی کہیں یہ نوبت نہ پہنچا دے کہ آخر کار تم پر بھی وہی عذاب آکر رہے جو نوح ؑ یا ہود ؑ یا صالح ؑ کی قوم پر آیا تھا۔ اور لوط ؑ کی قوم تو تم سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے"۔

یعنی میری مخالفت اور دشمنی تمہیں اس بات پر مجبور نہ کر دے کہ تم مخالفت اور تکذیب میں بہت آگے چلے جاؤ اور حدوں کو پار کر لو۔ مجھے تو یہ خوف ہے کہ تم پر وہی عذاب نازل ہو جائے گا جو تم سے پہلی اقوام پر نازل ہوا تھا۔ تم ذرا قوم لوط کے حالات کو پڑھو جو ابھی گزرے ہیں اور جس کا مسکن بھی تمہارے قریب ہے۔ کیونکہ مدین کا علاقہ حجاز اور شام کے درمیان تھا۔

اب حضرت شعیب ؑ ان کو بتاتے ہیں کہ دیکھو تم عذاب کے دھانے پر کھڑے ہو اور تمہارے لیے توبہ کا دروازہ ابھی تک کھلا ہے اور اللہ کی رحمت اور مغفرت تمہارے لیے ہر وقت تیار ہے۔ وہ نہایت ہی نرم اور پرسوز الفاظ میں یہ

دعوت دیتے ہیں۔

وَ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡهِ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ رَحِیۡمٌ وَّدُوۡدٌ ﴿۹۰﴾

"دیکھو، اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ، بے شک میرا رب رحیم ہے اور اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے"۔

حضرت شعیب ؑ ان کو وعظ و نصیحت، یاد دہانی اور تخویف اور اچھے انجام کی یقین دہانی اور تمام دوسرے ذرائع سے راہ راست پر لانے کی سعی کرتے ہیں۔ ہر حربہ استعمال کرتے ہیں کہ ان کے دل نرم ہو جائیں۔ان کے اندر خدا خوفی پیدا ہو جائے۔ لیکن ان لوگوں کے دل انتہائی درجے تک بگاڑ اور فساد میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ان کا تصور حیات ہی غلط تھا، اس لیے ان کی روش بھی غلط تھی۔چنانچہ وہ ان کی پرسوز گفتگو کے نتیجے میں سرکشی کی راہ میں مزید آگے بڑھ جاتے ہیں۔

قَالُوۡا یٰشُعَیۡبُ مَا نَفۡقَهُ كَثِیۡرًا مِّمَّا تَقُوۡلُ وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیۡنَا ضَعِیۡفًا ۚ وَ لَوۡ لَا رَهۡطُكَ لَرَجَمۡنٰكَ ۫ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡنَا بِعَزِیۡزٍ ﴿۹۱﴾

"انہوں نے جواب دیا"اے شعیب ؑ،"تیری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں، اور ہم دیکھتے ہیں کہ تو ہمارے درمیان ایک بے زور آدمی ہے، تیری برادری نہ ہوتی تو ہم کبھی کا تجھے سنگسار کر چکے ہوتے، تیرا بل بوتا تو اتنا نہیں ہے کہ ہم پر بھاری ہو"۔

حق بالکل واضح ہے لیکن ان کا سینہ اس کے لیے تنگ ہے۔وہ چاہتے ہی نہیں کہ حق کا ادراک کر سکیں۔

قَالُوا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ (۱۱: ۹۱) "انہوں نے جواب دیا"اے شعیب ؑ،"تیری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں"۔

یہ کیوں؟ اس لیے کہ وہ اقدار حیات کا تعین صرف مادی مفادات کے اصولوں کے مطابق کرتے ہیں اور ہر معاملے کے ظاہری پہلو کو دیکھتے ہیں۔

وَ اِنَّا لَنَرٰكَ فِينَا ضَعِيفًا (۱۱: ۹۱) "اور ہم دیکھتے ہیں کہ تو ہمارے درمیان ایک بے زور آدمی ہے"۔ یہ لوگ مادی قوت ہی کو دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس حقیقت اور قوت کا کوئی وزن نہیں ہے جو حضرت شعیب ؑ ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

وَلَوْ لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ (۱۱: ۹۱) "اور اگر تیری برادری نہ ہوتی تو ہم کبھی کا تجھے سنگسار کر چکے ہوتے"۔ ان کے نزدیک گویا نظریاتی قوت کے مقابلے میں خاندان کی قوت زیادہ اہم ہے۔ دلی جوڑ کے مقابلے میں نسب کا جوڑ زیادہ مضبوط ہے لیکن یہ لوگ دراصل اس بات سے غافل ہیں کہ اللہ اپنے دوستوں پر، ایک بھائی کے حق

میں بھائی کی غیرت سے زیادہ غیور ہے۔

وَ مَآ اَنْتَ عَلَیْنَا بِعَزِیْزٍ (۱۱ : ۹۱) "تیرا بل بوتا تو اتنا نہیں ہے کہ ہم پر بھاری ہو"۔ یعنی تم ایک بھائی اور معزز آدمی کی حیثیت سے بھی ہم پر غالب نہیں ہو اور نہ ایک طاقتور شخص کی حیثیت سے تمہارا پلہ بھاری ہے' ہم اگر مجبور ہیں تو خاندانی روابط کی وجہ سے تجھ پر ہاتھ ڈالنے سے مجبور ہیں۔

جب انسان ایک پختہ نظریہ سے محروم ہو جاتا ہے' اس کے پیش نظر اعلیٰ قدریں اور اعلیٰ روایات نہیں ہوتیں تو وہ زمین پر گر پڑتا ہے' اس کے ذہن میں اس دنیا کے مفادات ہی اعلیٰ و ارفع ہو جاتے ہیں اور وہ دنیاوی قدروں کا گرویدہ ہو جاتا ہے لہٰذا وہ اس جیسی قیمتی اور بلند دعوت کی قدر نہیں کرتا۔ وہ اعلیٰ حقائق کے ادراک سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی ذہنیت کے لوگ ایسی بلند دعوت پر اگر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ تو بھی محض دنیاوی قوت کے ڈر سے نہیں اٹھاتے۔ ایسے لوگ محض مادی قوت کو خاطر میں لاتے ہیں۔ رہے بلند عقائد' اعلیٰ خیالات اور بلند اقدار تو یہ وہ چیزیں ہیں جن کی کسی مادہ پرست شخص کے ہاں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ گرے ہوئے پست لوگوں کی ذہنیت ہمیشہ کچھ ایسی ہی ہوتی ہے۔

اب حضرت شعیب ؑ کی غیرت ایمانی جوش میں آتی ہے' ان سے اللہ رب العالمین کی یہ توہین برداشت نہیں ہوتی' وہ اپنی قوم اور کنبے کی مادی قوت سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کو اس برے انجام کے حوالے کر دیتے ہیں جو اس کائنات میں ایسے لوگوں کے لیے مقدر ہوتا ہے اور اللہ کے بارے میں ان کے توہین آمیز رویے کی مذمت کرتے ہیں اور ان کے سامنے ایک آخری اور فیصلہ کن دعوت پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں میرا عمل میرا ہے اور تمہارا عمل تمہارا۔ اب وہ ان کو خدائی قوتوں کے حوالے کرتے ہیں اور ان کو صاف صاف بتاتے ہیں کہ تم جیسے لوگوں کے لیے اللہ کے ہاں ایک بہت بڑا عذاب ہروقت تیار رہتا ہے لہٰذا لو اپنا وہ انجام جو تم نے خود اپنے لیے اختیار کیا ہے۔

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَهْطِیْٓ اَعَزُّ عَلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِیًّا ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ﴿۹۲﴾ وَ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَ ارْتَقِبُوْٓا اِنِّیْ مَعَكُمْ رَقِیْبٌ ﴿۹۳﴾

"شعیب ؑ نے کہا "بھائیو' کیا میری برادری تم پر اللہ سے زیادہ بھاری ہے کہ تم نے (برادری کا تو خوف کیا اور) اللہ کو بالکل پس پشت ڈال دیا؟ جان رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔ اے میری قوم کے لوگو' تم اپنے طریقے پر کام کیے جاؤ اور میں اپنے طریقے پر کرتا رہوں گا' جلدی ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر ذلت کا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ چشم براہ ہوں"۔

فرماتے ہیں :

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَهْطِیْٓ اَعَزُّ عَلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ (۱۱ : ۹۲) "شعیب ؑ نے کہا "بھائیو' کیا میری برادری تم پر اللہ سے زیادہ بھاری ہے"۔ میری برادری تو انسانوں کا فقط ایک مجموعہ ہے۔ جس قدر بھی وہ قوی ہوں بہرحال وہ انسان ہی تو ہیں' ضعیف مخلوق ہی تو ہیں۔ اللہ کے تو بہرحال وہ بندے اور غلام ہیں' کیا چند لوگوں سے تم ڈرتے

ہو' اور اللہ سے نہیں ڈرتے ہو' کس قدر بودی سوچ ہے تمہاری۔

وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ( ۱۱ : ۹۲ ) "اور اللہ کو بالکل پس پشت ڈال دیا"۔ کسی کو چھوڑ دینے اور کسی سے منہ پھیر دینے کا یہ نہایت ہی مخصوص انداز بیان ہے' واضح تصویر کشی کے انداز میں۔ چونکہ یہ لوگ اللہ سے منہ پھیرتے ہیں اور اعراض کرتے ہیں اس لیے ان کا یہ فعل نہایت ہی گھناؤنا ہے۔ کیونکہ اللہ ہی نے ان کو پیدا کیا ہے۔ جن اچھے حالات میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں ان میں ان کا رازق وہی تو ہے۔ گویا ان کا یہ فعل نہایت متکبرانہ' ناسپاسی اور سفید چشمی ہے اور شرعی اعتبار سے کفر و تکذیب کا حامل ہے اور نہایت ہی برا اندازہ ہے جو انہوں نے لگایا۔

اِنَّ رَبِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ( ۱۱ : ۹۲ ) "جان رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو' وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے"۔ احاطہ کا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کا احاطہ کیا گیا ہو وہ پوری طرح محیط کے قبضہ اور زیر قدرت ہوتی ہے۔ اس سے مراد قدرت کاملہ ہے۔

لیکن مومن کی جانب سے بارگاہ رب العزت میں یہ بڑی جرأت ہے کہ وہ اللہ کی عزت کو ہاتھ ڈالے اور اللہ کے غضب کو دعوت دے۔ اللہ کا عذاب جب نازل ہوتا ہے تو اس کے مقابلے میں قوم' قبیلہ' خاندان اور ملازم بے بس ہو جاتے ہیں۔ حضرت شعیب ؑ کی خاندانی اور قوم قبیلے کی قوت کا تو انہوں نے اعتراف بھی کیا لیکن وہ تو مومن باللہ تھے۔ انہوں نے اس معمولی قوت کی کوئی پروا نہیں کی نہ اسے قابل ذکر سمجھا کہ قوم کی وجہ سے وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ نہ انہوں نے قوم اور قبیلے کی قوت پر اکتفاء کیا اور یہی رویہ ایک سچے مومن کا رویہ ہوتا ہے۔ ایک سچا مومن صرف اپنے رب پر ہی بھروسہ کرتا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ بھی صرف اللہ سے ڈریں۔ ایک مومن قوم اور قبیلے کی قوت اور عصبیت کو بھی اسلام اور رب کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہ ہے اسلامی اور غیر اسلامی قومیت کے درمیان فرق۔ ہر دور اور زمانے میں قوم قبیلے کے بارے میں اسلام اور جاہلیت کا یہی تصور اور فرق رہا ہے۔

یہ جذبہ ایمانی اور جوش ایمان ہے جس کی تہہ میں اللہ پر بھروسے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اسی سے حضرت شعیب ؑ اب اپنی قوم کے لوگوں کو یہ سخت چیلنج دیتے ہیں اور ان کے درمیان جدائی ہو جاتی ہے اور اب دونوں کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔

وَ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ ( ۱۱ : ۹۳ ) "اے میری قوم کے لوگو' تم اپنے طریقے پر کام کیے جاؤ"۔ تم اپنے راستے اور اپنے منصوبے پر عمل کرو میں اپنے پر کر رہا ہوں۔ اب میں نے تم سے اپنے ہاتھ جھاڑ لیے ہیں۔

اِنِّیْ عَامِلٌ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ وَ ارْتَقِبُوْٓا اِنِّیْ مَعَكُمْ رَقِیْبٌ ( ۱۱ : ۹۳ ) "اور میں اپنے طریقے پر کرتا رہوں گا' جلدی ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر ذلت کا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ چشم براہ ہوں"۔

تم اپنے طریقے پر کام کرو میں اپنے پر کر رہا ہوں۔ عنقریب تمہیں اپنا انجام معلوم ہو جائے گا اور ہمیں اپنا۔ نیز جو عذاب تمہارے انتظار میں ہے اس کے لیے انتظار کرو۔ (ارتقبوا) میں انہیں جو انتظار کا مشورہ دیا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر کے دل میں پورا یقین تھا کہ عذاب آنے والا ہے۔ نیز اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب ؑ نے ان سے مکمل جدائی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

---ooo---

اب اس منظر کا پردہ گرتا ہے۔ یہ منظر نظروں سے اوجھل ہونے سے پہلے ایک آخری بات یعنی حق و باطل کی مکمل جدائی کی بات کی جاتی ہے۔ دوسرا منظر اب اس قوم کی مکمل تباہی کا منظر ہو گا۔ اس منظر میں یہ لوگ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہیں۔ ان کو ایسی کڑک نے آلیا جیسے قوم صالح ؑ پر آئی تھی۔ چنانچہ دونوں کا انجام ایک جیسا تھا۔ ان کے محلات خالی پڑے تھے گویا کبھی یہاں کوئی بستا ہی نہ تھا گویا کبھی یہ محلات تعمیر ہی نہ ہوئے تھے۔ یہ لوگ بھی قوم صالح ؑ کی طرح تاریخ کا حصہ بن گئے اور ابد الاباد تک ملعون ٹھہرے۔ جس طرح ان کا وجود اس کرۂ ارض سے لپیٹ لیا گیا۔ اسی طرح صفحات تاریخ سے ان کا ذکر بھی مٹا دیا گیا۔

وَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا
وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۙ كَاَنْ لَّمْ
۱۲ع يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ۝

۸ "آخر کار جب ہمارے فیصلے کا وقت آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے شعیب ؑ اور اس کے ساتھی مومنوں کو بچا لیا اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا' ان کو ایک سخت دھماکے نے ایسا پکڑا کہ وہ اپنی بستیوں میں بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے گویا کبھی وہاں رہے بسے ہی نہ تھے۔ سنو! مدین والے بھی دور پھینک دیئے گئے جس طرح ثمود پھینکے گئے تھے"۔

تاریخ کا ایک دوسرا سیاہ ورق الٹ دیا گیا اور مکذبین پر عذاب الٰہی ایک حقیقت بن کر آیا۔ ان لوگوں پر جو پیغمبروں کے ڈراوے کو جھٹلاتے تھے۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۰۴ ایک نظر میں

یہاں قصص کا خاتمہ ہوتا ہے اور اس خاتمے میں حضرت موسیٰ اور فرعون کے قصے کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے تاکہ یہاں قوم فرعون کی ہلاکت کو بھی ریکارڈ پر لایا جائے اور یہ بتایا جائے کہ قوم فرعون نے بھی اللہ کے پیغمبر کے مقابلے میں فرعون کی اطاعت کی تھی اس لیے ہلاک ہوئی۔ اس اشارے میں قصہ فرعون کی ناگفتہ کڑیوں کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جبکہ قصے کی بعض اہم جھلکیاں بھی اس منظر میں موجود ہیں۔ ان تمام قصص میں یہی اہم اصول زیر بحث ہے کہ اسلام میں ہر فرد اپنے کیے کا ذمہ دار ہے اور اگر کوئی رؤسا اور کبراء کی اطاعت کرتا ہے تو خدا اور رسول کی اطاعت اور فرمانبرداری کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

---○○○---

قصہ فرعون کا آغاز اس منظر سے ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو آیات اور دلائل و بینات کے ساتھ فرعون کے پاس بھیجا جاتا ہے جن کے اندر خدائی قوت ہے اس لیے کہ فرعون عظیم مادی قوت کا مالک تھا۔ لہٰذا اس کی قوت کے مقابلے میں قوت کا ہونا ضروری تھا۔

---○○○---

# درس نمبر ۱۰۴ تشریح آیات

۹۶ ــــ تا ــــ ۹۹

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ

"اور موسیٰ ؑ کو ہم نے اپنی نشانیوں اور کھلی سند ماموریت کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کی طرف بھیجا"۔

یہاں سیاق کلام میں اس قصے کو نہایت ہی اجمال کے ساتھ لایا جاتا ہے کیونکہ یہاں مقصد یہ ہے کہ قصے کا آخری منظر پیش کیا جائے۔ چنانچہ نظر آتا ہے کہ آگے آگے فرعون ہے اور اس کے پیچھے پیچھے اس کی قوم ہے۔ یہ لوگ اللہ کی حکم عدولی کر کے فرعون کے احکام کو مانتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ فرعون کا حکم جاہلانہ' احمقانہ اور بودا ہے۔

فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿۹۷﴾

"مگر انہوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی' حالانکہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا"۔

یہ لوگ چونکہ فرعون کے متبعین تھے اس لیے یہ اس کے پیچھے چلیں گے۔ جس طرح یہاں وہ بغیر سوچ اور تدبیر کے اس کے پیچھے چلتے تھے۔ اپنی رائے اور عقل کو استعمال نہ کرتے تھے۔ وہ ذلت پر راضی تھے' اور اللہ نے عقل' ارادہ اور آزادی کی جو نعمتیں ان کو دی تھیں' انہوں نے ان نعمتوں سے دست برداری اختیار کر لی تھی' اور غلامی کی راہ اختیار کر لی تھی' یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن یہ عذاب میں بھی اسی غلامانہ شان سے داخل ہوں گے۔ فرعون وہاں بھی ان کا لیڈر ہو گا۔

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾

"قیامت کے روز وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہو گا اور اپنی پیشوائی میں انہیں دوزخ کی طرف لے جائے گا۔ کیسی بدتر جائے ورود ہے یہ جس پر کوئی پہنچے"۔

ذرا اس منظر کو دیکھئے! آغاز یوں ہوتا ہے کہ قصہ ماضی کا ہے اور مستقبل میں انجام بد کا ڈراوا ہے۔ اچانک یہ منظر عملاً شروع ہو جاتا ہے۔ مستقبل ماضی میں بدل جاتا ہے اور اسکرین پر ماضی کی حالت چلتی ہے۔ فرعون نے گویا قیامت میں

ان کی قیادت کر ہی ڈالی۔

(فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ) ”مویشیوں کی طرح انہیں آگ کے گھاٹ پر لے گیا“۔جس طرح ایک چرواہا اپنی بکریوں کو پانی پلانے کے لیے گھاٹ پر لے جاتا ہے۔بے شک یہ لوگ جانوروں کا ایک ریوڑ ہی تو تھے۔ریوڑ نے کبھی غوروفکر کیا ہے 'کیا انہوں نے انسانیت کی اعلیٰ صفات یعنی غوروفکر کرنے سے انکار نہیں کر دیا؟ اور حریت و ارادہ سے دست برداری اختیار نہیں کر لی؟ لہٰذا وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ جہنم کے گھاٹ پر پہنچ جائیں 'جہاں ان کی پیاس نہ بجھے گی۔جہاں ان کا سینہ ٹھنڈا نہ ہو گا بلکہ وہاں کا پانی تو ان کی آنتوں اور ہونٹوں کو بھون ڈالے گا' دل جلا دے گا۔

بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ (۱۱:۹۸) ”کیسی بدتر جائے ورود ہے یہ“۔یہ تو ایک منظر تھا جس میں فرعون ان کی قیادت کر رہا ہے اور ان کو آگ تک پہنچاتا ہے۔لیکن اس منظر پر تبصرہ یوں ہے :

وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾

”اور ان لوگوں پر دنیا میں بھی لعنت پڑی اور قیامت کے روز بھی پڑے گی۔کیسا برا صلہ ہے یہ جو کسی کو ملے!“ یہ ایک توہین آمیز تبصرہ ہے۔یوں کہ آگ کو تحفے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔محنت کا صلہ۔یہ تھا تحفہ جو فرعون نے ان کو دیا۔ہاں اس نے جادوگروں کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کو عظیم صلہ اور جزاء دے گا۔یہ ہے اس کی دی ہوئی جزا اور انعام۔یہ ہے اس کا عظیم انعام۔کیا ہی برا ہے وہ گھاٹ جس پر اس نے اپنی قوم کو اتارا اور کیا ہی برا ہے وہ صلہ جو اس نے اپنی قوم کو اس کی جانب سے اتباع پر دیا۔

یہاں قرآن کریم کا اسلوب بیان ایسا ہے کہ انسان عش عش کرنے لگتا ہے اور یہ ہے دراصل اعجاز اس کتاب عزیز کا جسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو قرآنی اسلوب کا ذوق رکھتے ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر۱۰۵ ایک نظر میں

یہ سبق اس سورت کا اختتامیہ ہے۔ اس میں کافی تبصرے اور متنوع نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ سورت کے تمام مضامین کو پیش نظر رکھ کر ایک مکمل اختتامیہ ہے۔ سورت کے آغاز اور قصص سب کا خلاصہ یہاں آگیا ہے۔ یہ تبصرے اور نتائج سورت کے مباحث کے ساتھ مکمل ہم آہنگی رکھتے ہیں اور سورت کے اغراض و مقاصد کے ساتھ مکمل مناسبت بھی رکھتے ہیں۔

مثلاً پہلا نتیجہ واضح طور پر قصص القرآن کے ساتھ متعلق ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ (۱۰۰) وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَ مَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ (۱۰۱) وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِيَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ (۱۰۲) ((۱۱: ۱۰۰ تا ۱۰۲)) "یہ چند بستیوں کی سرگزشت ہے جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں، ان میں سے بعض اب بھی کھڑی ہیں اور بعض کی فصل کٹ چکی ہے۔ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، انہوں نے آپ اپنے اوپر ظلم کیا، اور جب اللہ کا حکم آگیا تو ان کے وہ معبود جنہیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارا کرتے تھے، ان کے کچھ کام نہ آسکے اور انہوں نے ہلاکت و بربادی کے سوا انہیں کچھ فائدہ نہ دیا اور تیرا رب جب کسی ظالم بستی کو پکڑتا ہے تو پھر اس کی پکڑ ایسی ہوتی ہے۔ فی الواقعہ اس کی پکڑ سخت اور دردناک ہوتی ہے"۔

دوسرا تبصرہ ہے ان اقوام کی ہلاکت پر جو اس دنیا میں ہلاکت سے دوچار ہوئیں۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس دنیاوی پکڑ کے بعد آخرت کی پکڑ شدید ہوگی۔ آخرت کے عذاب کا یہ نقشہ اس طرح کھینچا جاتا ہے کہ منظر آنکھوں کے سامنے اسکرین پر چلتا پھرتا نظر آتا ہے جس طرح قرآن کریم مشاہد قیامت کے مناظر کو پیش کرتا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ (۱۰۳) وَ مَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ (۱۰۴) يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّ سَعِيْدٌ (۱۰۵) فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا

زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ (١٠٦) خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (١٠٧) وَ اَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ (١٠٨)

(۱۱ : ۱۰۳ تا ۱۰۸) ''حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایک نشانی ہے ' ہر اس شخص کے لیے جو عذاب آخرت کا خوف کرے ۔ وہ ایک دن ہو گا جس میں سب لوگ جمع ہوں گے اور پھر جو کچھ بھی اس روز ہو گا سب کی آنکھوں کے سامنے ہو گا ۔ ہم اس کے لانے میں کچھ زیادہ تاخیر نہیں کر رہے ہیں ۔ بس ایک گنی چنی مدت اس کے لیے مقرر ہے ۔ جب وہ آئے گا تو کسی کو بات کرنے کی مجال نہ ہو گی الا یہ کہ خدا کی اجازت سے کچھ عرض کرے ۔ پھر کچھ لوگ اس دن بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت جو بدبخت ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے ' جہاں وہ ہانپیں گے اور پھنکارے ماریں گے اور اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے ' جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے ۔ بے شک تیرا رب پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے ۔ رہے وہ لوگ جو نیک بخت نکلیں گے تو وہ جنت میں جائیں گے اور وہاں ہمیشہ رہیں گے جب تک زمین و آسمان قائم ہیں الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے ۔ ایسی بخشش ان کو ملے گی جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہو گا''۔

اس کے بعد ان ہلاک شدہ بستیوں کے انجام سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ جو انجام ان بستیوں کا ہوا ' وہی انجام اہل مکہ کا بھی ہو گا ۔ اگر دنیا میں ان کو ہلاک نہ کیا گیا اور ان کو مہلت دے دی گئی جس طرح قوم موسیٰ کو مہلت دی گئی کہ ان کے باہم اختلافات اور نافرمانیوں کے باوجود ان کو اس دنیا میں ہلاک نہ کیا گیا لیکن قیامت میں یہ لوگ قوم موسیٰ کی طرح ضرور عذاب سے دوچار ہوں گے ' لہٰذا اے رسول آپ اور آپ کے ساتھ چلنے والے ساتھی اپنی راہ پر سیدھے آگے بڑھیں اور ان مشرکین اور ظالموں کی طرف ذرا بھی جھکاؤ اختیار نہ کریں ' نماز قائم کریں ' مشکلات پر صبر کریں کیونکہ اللہ محسنین کے اجر کو ذرہ برابر ضائع نہیں کرتا ۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ (١٠٩) وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (١١٠) وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (١١١) فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَ لَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (١١٢) وَ لَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ
(۱۱۳) وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ
ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ (۱۱۴) وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۱۵)

(۱۱: ۱۰۹ تا ۱۱۵) "پس اے نبی' تو ان معبودوں کی طرف سے کسی شک میں نہ رہ' جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں۔ یہ تو (بس لکیر کے فقیر بنے ہوئے) اسی طرح پوجا پاٹ کیے جا رہے ہیں جس طرح پہلے ان کے باپ دادا کرتے تھے' اور ہم ان کا حصہ انہیں بھرپور دیں گے بغیر اس کے کہ اس میں کچھ کاٹ کسر ہو۔

ہم اس سے پہلے موسیٰ کو کتاب دے چکے ہیں اور اس کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا (جس طرح آج اس کتاب کے بارے میں کیا جا رہا ہے جو تمہیں دی گئی ہے) اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان کبھی کا فیصلہ چکا دیا ہوتا۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اس کی طرف سے شک اور خلجان میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تیرا رب انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا' یقیناً وہ ان کی سب حرکتوں سے باخبر ہے۔

پس اے نبیؐ' تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و اطاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں' ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو' جو کچھ تم کر رہے ہو' اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے۔ ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا' ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے۔ اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے۔ اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔ اور دیکھو' نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر۔ درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں۔ اور صبر کرو اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا"۔

اس کے بعد روئے سخن ان ازمنہ قدیمہ کی اقوام کی طرف مڑ جاتا ہے جن میں ایسے لوگ نہ تھے جو لوگوں کو فساد فی الارض سے روکتے۔ ان اقوام کی اکثریت اسی راہ پر چلتی رہی جس پر وہ چل پڑے تھے۔ اس لیے وہ اقوام ہلاکت کی مستحق قرار پائیں۔ اللہ کی یہ سنت نہیں ہے کہ وہ کسی بستی کو ہلاک کر دے اور اس کے باسی مصلح ہوں۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا
قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (۱۱۶)
وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (۱۱۷) (۱۱: ۱۱۶

— ۱۱۷) "پھر کیوں نہ ان قوموں میں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں' ایسے اہل خیر موجود رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت کم جن کو ہم نے ان قوموں میں سے بچا لیا ورنہ ظالم لوگ تو انہی

مزوں کے پیچھے پڑے رہے جن کا سامان انہیں فراوانی کے ساتھ دیا گیا اور وہ مجرم بن کر رہے ۔ تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ناحق تباہ کر دے حالانکہ ان کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں"۔

اس حصے میں اللہ نے ان سنتوں کا بھی ذکر فرمایا ہے جو اللہ نے اپنی مخلوقات کے اندر جاری کی ہوئی ہے اور وہ سنت یہ ہے کہ لوگوں کے رجحانات اور میلانات مختلف ہوں گے اور ان کے خیالات میں اختلاف ہو گا ۔ اگر اللہ چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی ملت کر دیتا ۔ لیکن اللہ نے لوگوں کو فکری اور اختیاری آزادی عطا کر دی اور اس وجہ سے ان کے درمیان اختلافات واقع ہو گئے ۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ (۱۱۸) اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (۱۱۹) (۱۱: ۱۱۸ ـ ۱۱۹) "بے شک تیرا رب اگر چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک گروہ بنا سکتا تھا ۔ مگر اب تو وہ مختلف طریقوں ہی پر چلتے رہیں گے اور بے راہ رویوں سے صرف وہی لوگ بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے ۔ اسی (آزادی انتخاب و اختیار اور امتحان) کے لیے تو اس نے انہیں پیدا کیا تھا ۔ اور تیرے رب کی وہ بات پوری ہوگئی جو اس نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا"۔

آخر میں 'اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ ان قصص کے بیان سے غرض و غایت کیا ہے؟ یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو مضبوط کیا جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ کفار کو آخری وارننگ دے دیں اور ان کو بتا دیں کہ کس قدر عظیم عذاب آخرت ان کے انتظار میں ہے' اور یہ کہ آپ اللہ پر توکل کر کے اللہ کی عبادت کریں اور لوگوں کو اللہ کے حوالے کر دیں تاکہ اللہ ان کو ان کے عمل کے مطابق جزا دے ۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۲۰) وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ (۱۲۱) وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ (۱۲۲) وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۱۲۳) (۱۱: ۱۲۱ ـ ۱۲۳) "اور اے نبیؐ، یہ پیغمبروں کے قصے جو ہم تمہیں سناتے ہیں یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں ۔ ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا ۔ اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی ۔ رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے تو ان سے کہہ دو کہ تم اپنے طریقے پر کام کرتے رہو اور ہم اپنے طریقے پر کیے جا رہے ہیں' انجام کار کا تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی منتظر ہیں ۔ آسمان اور زمین میں جو کچھ چھپا ہوا ہے ۔ سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے اور سارا معاملہ اللہ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے ۔ پس اے نبی تو اس کی بندگی کر اور اسی پر بھروسہ رکھ' جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو' تیرا رب اس سے بے خبر نہیں ہے"۔

# درس نمبر ۱۰۵ تشریح آیات

۱۰۰ ــــ تا ــــ ۱۲۳

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ۝۱۰۰
وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ۝۱۰۱
وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۝۱۰۲

"یہ چند بستیوں کی سرگزشت ہے جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض اب بھی کھڑی ہیں اور بعض کی فصل کٹ چکی ہے۔ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا' انہوں نے آپ ہی اپنے اوپر ستم ڈھایا اور جب اللہ کا حکم آگیا تو ان کے وہ معبود جنہیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارا کرتے تھے ان کے کچھ کام نہ آسکے اور انہوں نے ہلاکت و بربادی کے سوا انہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ اور تیرا رب جب کسی ظالم بستی کو پکڑتا ہے تو پھر اس کی پکڑ ایسی ہی ہوا کرتی ہے' فی الواقع اس کی پکڑ بڑی سخت اور دردناک ہوتی ہے"۔

اس سے قبل جو مناظر پیش کیے گئے وہ آنکھوں کے سامنے ہیں۔ پردۂ خیال پر مناظر و تصاویر بڑی تیزی سے آرہی اور گزر رہی ہیں۔ نظر آتا ہے کہ بعض لوگ ایک عظیم طوفان میں موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ بعض لوگ سخت آندھی میں گھرے ہوئے ہیں جو سب کچھ تباہ کرتی آگے بڑھ رہی ہے' بعض لوگوں پر اس قدر شدید آواز اور چیخ آئی وہ دھڑام سے گرے اور ڈھیر ہو گئے۔ بعض لوگ اپنے گھروں سمیت زمین کے پیٹ میں دھنس گئے اور بعض ایسے ہیں کہ جو اپنے متبعین کے جلوس کی قیادت کر رہے ہیں لیکن پورے کا پورا جلوس جا کر جہنم میں گر جاتا ہے' غرض اقوام سابقہ کو پیش آنے والے تمام واقعات نظروں کے سامنے آجاتے ہیں اور بات لوگوں کے دل و دماغ اور ان کے شعور کی گہرائیوں تک اتر جاتی ہے تو اس حالت میں درج ذیل تبصرہ آتا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ (۱۱ : ۱۰۰) "یہ چند بستیوں کی

سرگزشت ہے جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔ان میں سے بعض اب بھی کھڑی ہیں اور بعض کی فصل کٹ چکی ہے"۔
یہ چند بستیوں کی مختصر سرگزشت ہے' عبرت آموزی کے علاوہ یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ جو پیغمبر یہ علم پیش کر رہا ہے' مسلمہ طور پر اس سے قبل وہ ان باتوں کو نہ جانتا تھا' لہٰذا اس کے پاس یہ معلومات بذریعہ وحی ہی آ رہی ہیں اور قصص قرآن کے پیش کرنے کے بے شمار مقاصد میں سے یہ بھی ایک مقصد ہے۔
(مِنْهَا قَآئِمٌ) "یعنی ان کے آثار ابھی تک قائم ہیں' لوگ دیکھ رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ یہ کس قدر متمدن اور ترقی یافتہ اقوام تھیں مثلاً علاقہ احقاف میں عاد کے آثار ہیں' اور علاقہ حجر میں قوم ثمود کے آثار ابھی تک موجود ہیں اور ان میں سے بعض کی فصل کٹ چکی ہے۔یعنی وہ "زرع محصود" کی طرح ہیں کہ فصل کٹ جانے کے بعد زمین چٹیل رہ گئی ہے' مثلاً قوم نوح ؑ اور قوم لوط ؑ جن کے آثار بھی غائب ہیں۔
اقوام اور گروہوں کی حیثیت کیا ہے' کبھی ہم نے غور کیا ہے؟ دراصل وہ بھی انسانوں کی فصلیں ہیں' بوئی جاتی ہیں' بڑی ہوتی ہیں اور کٹ جاتی ہیں۔ان میں سے بعض فصلیں اچھی ہوتی ہیں اور بعض بری ہوتی ہیں' بعض فصلیں بڑھتی ہیں اور بعض گھٹتے گھٹتے مرجاتی ہیں۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (۱۱ : ۱۰۱) ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا' انہوں نے آپ ہی اپنے اوپر ستم ڈھایا"۔انہوں نے اپنے فہم و ادراک کے ذرائع کو معطل کر دیا تھا۔ہدایت سے منہ موڑ لیا تھا' اللہ کی آیات و معجزات کی تکذیب کر دی تھی' اور ان کو جن باتوں سے ڈرایا گیا تھا' اس کے ساتھ انہوں نے مذاق کیا تھا' لہٰذا وہ مظلوم نہ تھے بلکہ خود اپنے آپ پر ظلم کرنے والے تھے۔

فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ (۱۱ : ۱۰۱) "اور جب اللہ کا حکم آ گیا تو ان کے وہ معبود جنہیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارا کرتے تھے ان کے کچھ کام نہ آ سکے اور انہوں نے ہلاکت و بربادی کے سوا انہیں کچھ فائدہ نہ دیا"۔
ان قصص کے لانے کی یہ ایک دوسری غرض ہے۔اس سورت کا آغاز ہی اس بات سے ہوا تھا کہ جو لوگ اللہ کے سوا کسی اور کے دین اور نظام کی پیروی کرتے ہیں' ان کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔اس کے بعد قصص رسل میں تمام رسولوں نے لوگوں کو باری باری برے انجام سے ڈرایا۔تمام رسولوں نے لوگوں کو کہا کہ تم نے جن خود ساختہ الٰہوں کی پیروی اختیار کر رکھی ہے' وہ تمہیں نہیں بچا سکتے۔چنانچہ تمام قصص کا یہ خلاصہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہٰ بھی کسی کو کوئی فائدہ نہیں دے سکتا اور جب اللہ کا حکم آئے گا اور قیامت برپا ہو گی تو وہاں یہ الہٰ کسی بھی پیروکار کو عذاب سے نہ بچا سکیں گے بلکہ ان کی وجہ سے خسارہ اور بربادی ہو گی (یہاں لفظ تتبیب استعمال ہوا ہے۔جو لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے سخت بربادی کا اظہار کرتا ہے) یہ بربادی زیادہ اس لیے ہو گی کہ ان لوگوں نے ان جھوٹے خداؤں پر اندھا اعتماد کیا اور اس وجہ سے یہ اعراض اور تکذیب میں آگے بڑھ گئے' اس وجہ سے وہ زیادہ سے زیادہ سخت عذاب کے مستحق ٹھہرے۔یہ الہٰ تو جس طرح نفع نہیں دے سکتے تھے' اسی طرح نقصان بھی نہ دے سکتے تھے لیکن اس اندھے اعتماد کی وجہ سے خسارہ بڑھ گیا۔

وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِيَ ظَالِمَةٌ (۱۱:۱۰۲) "اور تیرا رب جب کسی ظالم بستی کو پکڑتا ہے تو پھر اس کی پکڑ ایسی ہی ہوا کرتی ہے"۔ (اسی طرح) کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح قصص میں بیان ہوا' جس طرح اقوام ملل کو تباہ اور ہلاک کیا گیا' جب انہوں نے ظلم کیا۔ ظالم سے مراد مشرک ہے یعنی جب وہ اللہ کی ربوبیت اور حاکمیت سے روگردانی کر کے کسی اور کو رب اور حاکم بنا لیتی ہیں اس طرح وہ اپنے اوپر ظلم کرتی ہیں کیونکہ شرک و فساد میں مبتلا ہو کر عذاب آخرت کی مستحق بنتی ہیں۔ ایسی اقوام شرک کی وجہ سے دعوت توحید' دعوت اصلاح سے محروم ہو جاتی ہیں اور اس طرح زمین ظلم و فساد سے بھر جاتی ہے۔

اِنَّ اَخْذَهٗ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ (۱۱:۱۰۲) "فی الواقع اس کی پکڑ بڑی سخت اور دردناک ہوتی ہے"۔ یہ سزائے شدید اللہ تعالیٰ مہلت کے بعد دیتا ہے' جب لوگ خوب عیاشی کر لیتے ہیں' یوں وہ ابتلا میں پڑ جاتے ہیں۔ پھر ان کے عذرات بھی ختم ہو جاتے ہیں' اس لیے کہ رسولوں کو بھیج کر اللہ تعالیٰ ان پر حجت تمام کر دیتا ہے۔ پھر جب ان اقوام میں ظلم کا دور دورہ ہوتا ہے اور مظلوموں پر ظالموں کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے اور حالت یہ ہو جاتی ہے کہ دعوت حق دینے والے مصلحین نہایت ہی قلیل اور بے اثر رہ جاتے ہیں اور ظالموں کے آگے ان کی ایک نہیں چلتی۔ کیونکہ وہ ظلم میں بہت آگے جا چکے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اہل ایمان ان ظالموں سے علیحدہ ہو جاتے ہیں جو ظلم میں بہت آگے بڑھ چکے ہوتے ہیں۔ یہ اہل ایمان پھر اپنے آپ ہی کو امت سمجھتے ہیں' اپنے دین اور اپنے رب کی پیروی کرتے ہیں' ان کا اپنا قائد ہوتا ہے اور اپنے روابط ہوتے ہیں اور امت ظالمہ کو وہ چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اپنے قدرتی انجام تک پہنچ جائے۔ اللہ کی اس سنت کے مطابق جو اس نے اس کائنات کے لیے تجویز کر رکھی ہے' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

---○○○---

یہ دنیاوی پکڑ دراصل آخرت کے لیے ایک علامتی سزا ہوتی ہے اور جو لوگ عذاب آخرت سے ڈرتے ہیں وہ اس پکڑ سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ اسے دیکھ رہے ہوتے ہیں ان کو اللہ نے بہرحال یہ بصیرت دے دی ہوتی ہے کہ جو خدا دنیا میں اس قدر شدید عذاب کسی قوم کو دے سکتا ہے وہ آخرت میں اس سے بھی شدید عذاب دے سکتا ہے۔ اس لیے وہ ڈرتے ہیں۔ یہاں قرآن مجید انسان کو اچانک دنیا کے مناظر سے قیامت کے مناظر کی طرف لے جاتا ہے اور یہ قرآن مجید کا خاص اسلوب ہے کہ وہ دنیا کے مناظر کے بعد اچانک آخرت کا منظر پیش کر دیتا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ
يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَ مَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ
مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّ سَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾
فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا

دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَ اَمَّا
الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِى الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا
شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾

"حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایک نشانی ہے ' ہر اس شخص کے لیے جو عذاب آخرت کا خوف کرے ۔ وہ ایک دن ہو گا جس میں سب لوگ جمع ہوں گے اور پھر جو کچھ بھی اس روز ہو گا سب کی آنکھوں کے سامنے ہو گا ۔ ہم اس کے لانے میں کچھ زیادہ تاخیر نہیں کر رہے ہیں ۔ بس ایک گنی چنی مدت اس کے لیے مقرر ہے ۔ جب وہ آئے گا تو کسی کو بات کرنے کی مجال نہ ہو گی الا یہ کہ خدا کی اجازت سے کچھ عرض کرے ۔ پھر کچھ لوگ اس دن بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت ، جو بدبخت ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے ' جہاں وہ ہانپیں گے اور پھنکارے ماریں گے اور اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے ' جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں ' الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے ۔ بے شک تیرا رب پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے ' کرے ۔ رہے وہ لوگ جو نیک بخت نکلیں گے تو وہ جنت میں جائیں گے اور وہاں ہمیشہ رہیں گے جب تک زمین و آسمان قائم ہیں الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے ۔ ایسی بخشش ان کو ملے گی جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہو گا" ۔

یعنی اس دردناک اور شدید پکڑ میں عذاب آخرت کے ساتھ ایک قسم کی مشابہت ہے ۔ دنیا کی یہ پکڑ عذاب آخرت کی یاد دہانی کرانے والی اور دل میں خوف بٹھانے والی ہے ۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ (۱۱ : ۱۰۳) "حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایک نشانی ہے ' ہر اس شخص کے لیے جو عذاب آخرت کا خوف کرے" ۔ لیکن حقیقت ہے کہ یہ عبرت وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جن کے دل میں آخرت کے عذاب کا ڈر ہو ' ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور ان کے فکر و نظر کو جلا ملتی ہے ۔

لیکن جن کے دل میں آخرت کا خوف نہیں ہوتا ' ان کے دل بہرے ہوتے ہیں ان کی آنکھیں بند ہوتی ہیں ' وہ اس بات کو سمجھ نہیں سکتے کہ جس نے پیدا کیا ہے وہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے ۔ ایسے لوگوں کی نظر قاصر ہوتی ہے اور وہ صرف اس دنیا ہی کو دیکھ سکتے ہیں ۔ اس دنیا میں جو عبرت انگیز حالات پیش آتے ہیں وہ ان سے بھی عبرت و نصیحت حاصل کر سکتے ہیں ۔

اب بتایا جاتا ہے کہ یہ دن کیسا ہو گا؟

ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ (۱۱ : ۱۰۳) "وہ ایک دن ہو گا جس میں سب لوگ جمع ہوں گے اور پھر جو کچھ بھی اس روز ہو گا سب کی آنکھوں کے سامنے ہو گا" ۔

یہ ایک منظر ہے جس میں سب لوگ جمع کر دیئے جائیں گے ' اس اکٹھ میں ان کے اپنے ارادے کا کوئی دخل نہ ہو گا بلکہ اس نظر آنے والے منظر میں ان کو چلا کر لایا جائے گا ' تمام کے تمام لوگ یکجا حاضر ہوں گے اور سب کی سب انجام کے منتظر ہوں گے ۔

يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (۱۱ : ۱۰۵) "جب وہ آئے گا تو کسی کو بات کرنے کی مجال

نہ ہوگی' الا یہ کہ خدا کی اجازت سے کچھ عرض کرے"۔ سب لوگوں پر ہیبت طاری ہوگی اور خوفناک سکوت کا ماحول ہو گا' لوگ سہمے ہوں گے' وہاں بات اجازت سے ہوگی مگر اجازت طلب کرنا کارے دارد۔ یہ اللہ ہی ہو گا جو کسی کو اجازت دے دے' تو کچھ عرض کی جا سکے گی۔

اب لوگوں کو ان کے انجام کے مطابق تقسیم کر دیا جائے گا:

فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّ سَعِيْدٌ (۱۱:۱۰۵) "پھر کچھ لوگ اس روز بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت"۔ انداز تعبیر ایسا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ جو لوگ بدبختی کا شکار ہوئے وہ دوزخ میں پڑے ہوئے ہیں' ان کی سانس پھولی ہوئی ہے اور ہانپ رہے ہیں اور پھنکارے مار رہے ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ جنت میں ہیں وہ بھی نظر آتے ہیں اور ان کے لیے ایسے عطیات ہیں جو دائمی ہیں اور ختم ہونے والے نہیں ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِى النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ (۱۰۶) خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ (۱۰۷) (۱۱:۱۰۶ – ۱۰۷)

"جو بدبخت ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے' جہاں وہ ہانپیں گے اور پھنکارے ماریں گے اور اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے' جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں' الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے"۔

یہ سب لوگ جنت و جہنم میں "اس وقت تک رہیں گے جب تک زمین و آسمان ہیں"۔ یہ عربی محاورہ ہے جو استمرار اور دوام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ محاورات کا اپنا مفہوم ہوتا ہے اور ایک خاص اثر انگیزی ہوتی ہے' یہاں بھی یہ محاورہ انداز تعبیر کے اعتبار سے بہت ہی خوب ہے۔

لیکن دونوں صورتوں میں اللہ نے دوام جنت اور دوام جہنم کو اپنی مشیت کے ساتھ معلق کر دیا ہے۔ اور آخر کار تمام فیصلے اس کی مشیت کے تابع ہوتے ہیں' یوں ہو رہا ہے کیونکہ اللہ کی مشیت کا یہ تقاضا ہے لیکن اللہ خود اپنی مشیت کا بھی پابند نہیں ہے جب چاہے اپنی سنت کو بدل دے۔

اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (۱۰۷) "بے شک تیرا رب پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے"۔ یہ فقرہ ان لوگوں کے قلبی اطمینان کے لیے ہے جو خوش قسمت واقعہ ہوئے تھے کہ ان کا انعام دائمی ہو گا اور کبھی منقطع نہ ہو گا' اگرچہ مفروضہ اپنی جگہ ہو کہ اللہ تبدیل کر سکتا ہے لیکن چونکہ اللہ نے ان کے لیے ایسا ارادہ کر لیا ہے' اس لیے انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگرچہ اس کی مشیت بہرحال آزاد ہے۔

---ooo---

جب بات یہاں تک پہنچ گئی کہ آخرت میں دونوں فریقوں کا انجام کیا ہو گا' اور یہ بتا دیا گیا کہ دنیا میں بدبخت اقوام کا حشر کیا ہو گا' اور آخرت میں ان کی حالت کیا ہوگی' یہاں ان پر کیا کیا عذاب آئے گا اور آخرت میں ان کے ساتھ کیا

سلوک ہو گا اب سیاق کلام میں بات کا رخ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے اور خطاب اب آپ کے مٹھی بھر ساتھیوں سے ہے جو مکہ میں کمزور حالت میں ہیں۔ ان کو تسلی دی جاتی ہے اور ان کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ جس راہ پر چل پڑے ہیں' اس پر ثابت قدم رہیں۔ اور مکہ کے منکرین کو مزید ڈرایا جاتا ہے کہ تمہارا انجام بھی وہی ہو گا جو ان اقوام کا ہوا جن کے قصص بیان ہوئے۔ اگرچہ عذاب الٰہی میں تاخیر ہوئی ہے لیکن اس سے قبل بھی اللہ نے کئی اقوام کو لمبی مہلت دی ہے۔ اور مہلت ختم ہونے کے بعد سب کو ان کے کیے کا اچھا یا برا پورا پورا بدلہ دے دیا گیا لیکن اپنی مقررہ میعاد کے بعد۔ عذاب اور حساب و کتاب میں تاخیر ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ اقوام حق پر تھیں' جس طرح ان اقوام کے آباؤاجداد باطل پر تھے اسی طرح یہ بھی باطل پر تھیں۔

فَلَا تَكُ فِىْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ؕ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا
يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾ وَلَقَدْ
اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِىَ
بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِىْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ
اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

"پس اے نبیؐ' تو ان معبودوں کی طرف سے کسی شک میں نہ رہ' جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں۔ یہ تو (بس لکیر کے فقیر بنے ہوئے) اسی طرح پوجا پاٹ کیے جا رہے ہیں جس طرح پہلے ان کے باپ دادا کرتے تھے' اور ہم ان کا حصہ انہیں بھرپور دیں گے بغیر اس کے کہ اس میں کچھ کاٹ کسر ہو۔

ہم اس سے پہلے موسیٰؑ کو کتاب دے چکے ہیں اور اس کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا (جس طرح آج اس کتاب کے بارے میں کیا جا رہا ہے جو تمہیں دی گئی ہے) اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان کبھی کا فیصلہ چکا دیا ہوتا۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اس کی طرف سے شک اور خلجان میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تیرا رب انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا' یقیناً وہ ان کی سب حرکتوں سے باخبر ہے"۔

آپ اپنے دل میں ذرہ برابر شک نہ کریں کہ یہ لوگ جن بتوں کی پیروی کرتے ہیں وہ غلط ہیں۔ خطاب تو حضورؐ کو ہے لیکن ذرا اوا قوم کو ہے' یہ اسلوب بسا اوقات زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور رسول اللہؐ کے درمیان یہ معاملہ طے ہو چکا ہے۔ اللہ نے رسول اللہؐ کو آخری احکامات دے دیئے ہیں۔ اب اس میں کوئی نزاع کا موقعہ نہیں ہے اور جو لوگ مجرم ہیں ان کو ایک طرف چھوڑ دیا گیا۔ گویا وہ بات کرنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ اس طرح ان پر زیادہ اثر ہو گا' بمقابلہ اس کے کہ اگر ان کو براہ راست خطاب کیا جاتا۔

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ

(۱۱ : ۱۰۹) "پس اے نبیؐ ' تو ان معبودوں کی طرف سے کسی شک میں نہ رہ ' جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں۔ یہ تو (بس لکیر کے فقیر بنے ہوئے) اسی طرح پوجاپاٹ کیے جارہے ہیں جس طرح پہلے ان کے باپ دادا کرتے تھے"۔

لہٰذا ان کا انجام بھی اقوام سابقہ کی طرح ہو گا ' یعنی دائمی عذاب۔ لیکن یہاں صراحت نہیں کی جاتی کیونکہ ان کا انجام معروف و معلوم ہے۔

وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ (۱۱ : ۱۰۹) "اور ہم ان کا حصہ انہیں بھرپور دیں گے ' بغیر اس کے کہ اس میں کچھ کاٹ کسر ہو"۔ اور ان کا انجام اسی طرح مشہور و معروف ہے جس طرح ان سے پہلے لوگوں کے بارے میں طے شدہ ہے اور سابقہ لوگوں کے کچھ مناظر اس سے قبل پیش کیے بھی جاچکے ہیں۔ ہاں دنیا میں تو یہ بھی ممکن ہے کہ قوم موسیٰ ؑ کی طرح انہیں مہلت دے دی جائے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ (۱۱ : ۱۱۰) "ہم اس سے پہلے موسیٰ ؑ کو کتاب دے چکے ہیں اور اس کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا (جس طرح آج اس کتاب کے بارے میں کیا جارہا ہے جو تمہیں دی گئی ہے)"

قوم موسیٰ نے اپنی کتاب کے بارے میں بہت سے اختلافات کیے ' ان کے اعتقادات کیا سے کیا بن گئے اور وہ فرقے فرقے بن گئے۔ لیکن اللہ کی طرف سے حکم یہ تھا کہ ان کو تباہ نہ کیا جائے اور ان سے پورا پورا حساب قیامت کے دن لیا جائے۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ (۱۱ : ۱۱۰) "اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان کبھی کا فیصلہ چکا دیا گیا ہوتا"۔

اور اللہ کے اس کلمے اور فیصلے سے بھی پہلے اللہ کی حکمت کا یہ تقاضا تھا کہ بنی اسرائیل کے مقدمے کو قیامت تک موخر کر دیا جائے کیونکہ بنی اسرائیل اہل کتاب تھے اور تمام ایسے رسول جو اہل کتاب تھے ' ان کی امتوں کو قیامت تک کے لیے مہلت دی گئی۔ کیونکہ کتاب اس بات پر دلیل تھی کہ ہدایت باقی ہے اور بعد کی نسلیں بھی ان پر اس طرح غور کر سکتی ہیں جس طرح انہوں نے غور کیا جن کی طرف نازل ہوئی تھی۔ اور مادی معجزات اور خارق عادت امور کا معاملہ بالکل مختلف ہے کیونکہ مادی معجزات کو صرف وہی لوگ دیکھ سکتے ہیں جن کے سامنے وہ معجزات ظاہر ہوئے ' لوگوں کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں یا تو ایمان لائیں اور یا پھر ہلاکت کے لیے تیار ہو جائیں۔ تورات اور انجیل دو مستقل کتابیں تھیں جو نزول قرآن تک لوگوں کے سامنے موجود تھیں۔ یہاں تک کہ قرآن مجید نازل ہوا۔ قرآن کریم نے تورات و انجیل کی تصدیق کی اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ اب آخری کتاب ہے اور تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے اور اب قیامت میں تمام انسانوں کا حساب و کتاب قرآنی احکام کی اساس پر ہو گا۔

وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (۱۱ : ۱۱۰) "یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اس کی طرف سے شک

اور خلجان میں پڑے ہوئے ہیں'' سے مراد یہ ہے کہ قوم موسیٰ اس کتاب کے بارے میں سخت خلجان میں ہے کیونکہ یہ کتاب موسیٰ ؑ سے صدیوں بعد لکھی گئی اور اس کی آیات و مضامین کے بارے میں روایات میں سخت اضطراب پیدا ہو گیا۔ لہٰذا یہ کتاب قابل یقین نہ رہی۔

یہ درست ہے کہ عذاب موخر کر دیا گیا ہے' لیکن قیامت میں سب کو ان کے اعمال کی جزاء و سزا دی جائے گی اور یہ سزا ان لوگوں کو علیم و خبیر دے گا جو ہرگز کسی چیز کو ضائع نہیں کرتا۔

وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۱۱:۱۱۱) ''اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تیرا رب انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا' یقیناً وہ ان کی سب حرکتوں سے باخبر ہے''۔

اس میں اس قدر تاکیدی انداز تعبیر اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ کوئی مہلت اور تاخیر کی وجہ سے پوری جزاء و سزا میں شک نہ کرنے لگے۔ کوئی یہ شک نہ کرے کہ اہل مکہ نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ باطل ہے اور اس کے باطل ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ شرک ہے اور یہ شرکیہ دین اس سے پہلے بھی کئی اقوام نے اختیار کیا ہے۔

یہاں یہ تاکیدی انداز اختیار کرنے کا پس منظر بھی تھا' اس وقت تحریک اسلامی کے حالات و واقعات یہ تھے کہ مسلمانوں کے مقابلے میں اہل کفر ایک معاند قوت کی طرح کھڑے تھے۔ وہ رسول اللہ کے راستے کو ہر طرف سے روک رہے تھے' مسلمان قلیل تعداد میں تھے اور ان پر مظالم ڈھائے جا رہے تھے' دعوت کا پھیلاؤ تقریباً منجمد ہو گیا تھا اور خدا کی طرف سے عذاب کا آنا بھی قیامت تک ملتوی ہو گیا تھا۔ مومنین کو ہر طرح کی اذیت دی جا رہی تھی اور ان کے دشمن بظاہر کامیاب جا رہے تھے۔ ایسے حالات میں بعض کمزور قسم کے دل متزلزل ہو سکتے تھے' نیز ثابت قدم لوگ بھی بہرحال پریشانی کا شکار ہو سکتے تھے' لہٰذا تحریک اسلامی کو اس قسم کی تسلی اور ہمت بندھانے کی ضرورت تھی۔ اس سے زیادہ مسلمانوں کے دل کسی اور چیز سے حوصلہ نہیں پاتے کہ اللہ ان کے دشمنوں کو اپنا دشمن بتلا دے۔ اور یہ اعلان کر دے کہ بلاشک و بلاریب وہ باطل پر ہیں۔

یوں ہم ان اشارات کو پاتے ہیں کہ کسی طرح قرآن کریم اسلامی نظریہ حیات کو لے کر چلنے والوں کے ساتھ مل کر اس معرکے میں حصہ لیتا ہے اور کس طرح صحابہ کرام کو موقع بموقع نشانات راہ بتلاتا جاتا ہے۔

---○○○---

یہ تاکیدی بیان کہ اللہ کے دشمنوں کا یہ انجام ہو کر رہے گا' نفس انسانی کے اندر قدرتی طور پر یہ بات بٹھاتا ہے کہ سنت الہیہ اس کی مخلوق میں جاری و ساری ہے۔ اس کا دین بھی اس کی سنت کے مطابق غالب ہو گا۔ اس کا وعدہ بھی اور اس کی دھمکی بھی سنت الہیہ کے مطابق روبعمل ہو گی۔ لہٰذا جو لوگ اس دین کو قبول کرتے ہیں اور جو لوگ اس دین کی دعوت دیتے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ مسنون طریقے کے مطابق دعوت دیتے رہیں جس طرح کہ ان کو حکم دیا گیا ہے' نہ اس میں کمی کریں' نہ اس میں زیادتی کریں: نہ ظالموں کے سامنے جھکیں' اگرچہ وہ جبار ہوں' وہ غیر اللہ کے دین کو قبول نہ کریں' اگرچہ راستہ طویل ہو جائے' وہ مشکلات راہ کے لیے تیاریاں کریں' اور اس وقت تک صبر کریں جب تک اللہ وہ کام نہیں کرتا جو وہ چاہتا ہے۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا

تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ
دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ
زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۭ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾
وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

"پس اے نبیؐ، تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و اطاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں' ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو' جو کچھ تم کر رہے ہو' اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے ۔ ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا' ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے ۔ اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے ۔ اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی ۔ اور دیکھو' نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر ۔ درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں ۔ یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں ۔ اور صبر کرو اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا"۔

یہ انعام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے کفر کو چھوڑ کر اسلام قبول کیا اور آپؐ کے ساتھی بن گئے ۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ (۱۱ : ۱۱۲) "پس اے نبیؐ، تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و اطاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں' ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے"۔

اس حکم کی مشکلات اور شدت اور ہیبت کو حضورؐ نے محسوس فرمایا تھا ۔ حضورؐ سے روایت میں آتا ہے کہ "مجھے ہود اور اس کی ساتھی سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے"۔ استقامت کا مفہوم ہے کہ اعتدال سے چلو اور اسلامی منہاج کے مطابق سیدھے چلو' کوئی انحراف نہ ہونے پائے ۔ چنانچہ اس حکم پر صحیح معنوں میں چلنے کے لیے دائمی بیداری کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ہر وقت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے ۔ ہر وقت غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے ۔ اور ہر وقت حدود اللہ پر نظر رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے اور ان انسانی میلانات اور رجحانات کو ضبط کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جو کبھی زیادہ ہوتے ہیں اور کبھی کم' غرض کسی بھی تحریک میں یہ ایک دائمی اور مسلسل ڈیوٹی ہے اور زندگی کی ہر حرکت اور ہر سکون میں اسے ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا ہے ۔

وَلَا تَطْغَوْا (۱۱ : ۱۱۲) "اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو"۔ یہاں اس بات کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ استقامت کے حکم کے بعد یہ نہی اس لیے نہیں ہے کہ استقامت میں قصور نہ کرو' بلکہ یہ نہی طغیان اور حد سے گزرنے کی نہی ہے' یہ اس لیے وارد ہوئی ہے کہ استقامت کے مسلسل حکم کے نتیجے میں انسان کے ذہن میں اس قدر بیداری پیدا ہو جاتی ہے اور انسان اس قدر حزم اور احتیاط کرنے لگتا ہے کہ وہ غلو اور مبالغے کے درجے تک پہنچ جاتا ہے اور اس غلو

اور مبالغے کے نتیجے میں "الدین یسر" کے بجائے "الدین عسر" بن جاتا ہے دین میں افراط وتفریط شروع ہو جاتی ہے - یہ نکتہ بہت اہم ہے اور ایک مسلمان کو معتدل مزاج اور صراط مستقیم پر گامزن رہنا چاہئے' غافل بھی نہیں ہونا چاہئے اور غالی بھی نہیں -

اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۱۱:۱۱۲) "جو کچھ تم کر رہے ہو' اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے" - بصیر' بصیرت کا لفظ یہاں برمحل ہے' یعنی دیکھتا بھی ہے اور اس کا دیکھنا سرسری نہیں ہے - بصیرت اور گہرائی سے دیکھتا ہے لہٰذا اے پیغمبرؐ تم اور تمہارے ساتھی خدا سے ڈرتے ہوئے سیدھی راہ پر گامزن رہو -

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (۱۱:۱۱۳) "ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے" - یعنی ظالموں پر بھروسہ نہ کرو اور نہ ان کی جانب سے کسی قسم کا اطمینان کرو' ظالموں سے مراد وہ جبار و قہار اور سرکش لوگ ہیں جو زمین پر اپنے مظالم کی بنیاد پر اپنی برتری قائم کرتے ہیں اور عوام الناس سے خدا کے مقابلے میں اپنی بندگی کراتے ہیں ان پر بھروسہ بھی نہ کرو اور ان کی جانب سے اطمینان کا اظہار بھی نہ کرو - کیونکہ اگر تم انکی جانب اسی طرح غیر جانبدار اطمینان و بھروسے کا اظہار کرو گے تو تم گویا بالواسطہ ان ظالمانہ کارروائیوں میں ان کے مؤید ہو گے اور اس طرح اس عظیم جرم میں تم بھی حصہ دار بن جاؤ گے' اگر تم نے ایسا کیا تو تم آگ کی لپیٹ میں آجاؤ گے -

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (۱۱:۱۱۳) "اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی" - ایسے مشکل حالات میں جن سے اس وقت تحریک اسلامی کے مٹھی بھر پیروکار گزر رہے تھے - سیدھی راہ پر جم جانا فی الواقعہ ایک مشکل کام ہوتا ہے اور اس کے لیے روحانی زاد راہ کی ضرورت ہوتی ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مٹھی بھر ساتھیوں کو اخلاقی اور روحانی تربیت اور تعلق باللہ پیدا کرنے کے لیے اس زاد راہ کی نشاندہی فرماتا ہے :

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱:۱۱٤) "اور دیکھو' نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر - درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں" -

اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ وہ زادسفر ہے جو اس وقت کام آتا ہے جب تمام زادسفر ختم ہو جاتے ہیں - یہ روحانی قوت کا زادسفر ہے اور یہ انسان کو ایسی قوت دیتا ہے جو عظیم تر مشکلات کو برداشت کرنے کے قابل بناتا ہے - اس لیے یہ زاد راہ معراج المومنین ہے اور یہ اہل ایمان کو رب کریم اور رحیم و ودود سے ملاتا ہے جو قریب ہے اور تمام پکاروں کو خوب سنتا ہے اور جب مومن تنہا ہوتا ہے اور پریشان ہوتا ہے تو ایسے حالات میں یہ زاد راہ اس انس و محبت کی باد نسیم چلاتا ہے اور اس طرح اس پر جاہلیت اور کفر کی گھٹن فضا میں قدرے کشادگی پیدا ہو جاتی ہے -

آیت میں دن کے دو سروں کا ذکر کیا گیا ہے 'یعنی اول اور آخر کا اور پھر رات کے قریب وقت کا۔ اس میں تمام کے تمام اوقات آ گئے۔ اگر نمازوں کی تعداد کا تعین نہیں ہوا۔ تعداد کا تعین بہرحال سنت رسول سے ہوا ہے اور نیز متعین اوقات کا تعین بھی سنت سے ہوا ہے۔

اس آیت میں نماز کی اقامت کے حکم 'یعنی پوری پوری ادائیگی کے حکم کے بعد یہ حکم آیا ہے کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ عام آیت ہے اس سے تمام نیکیاں مراد ہیں۔ اور نماز بہرحال عظیم ترین نیکی ہے لہٰذا یہ بھی اس آیت میں شامل ہے۔ بہرحال "الحسنات" نماز کے ساتھ مخصوص نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین کی رائے ہے۔

ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ (١١: ١١٤) "یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں"۔ نماز اپنی حقیقت کے اعتبار سے ذکر الٰہی ہے۔ اس لیے یہ صفت نہایت ہی مناسب ہے۔

استقامت انسان تب ہی اختیار کر سکتا ہے جب اس میں مشکلات پر صبر کرنے کا حوصلہ ہو' نیز اللہ کی سنت کے مطابق منکرین کے انجام بد سے دوچار ہونے کے لیے ایک مہلت ہوتی ہے اور اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور یہ انتظار بھی صبر کا محتاج ہے۔ لہٰذا استقامت اور تمام پچھلی ہدایات پر کامیابی سے عمل پیرا ہونے کے لیے حکم دیا جاتا ہے کہ صبر کرو۔

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (١١: ١١٥) "اور صبر کر' اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا"۔ اللہ کی راہ میں استقامت احسان ہے اور وقت پر نماز ادا کرنا بھی احسان ہے' جھٹلانے والوں کی طرف سے جھٹلانے پر صبر کرنا بھی احسان ہے اور اللہ محسنین کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا۔

اقوام و ملل کی ہلاکت اور بستیوں کی بربادی پر جو تبصرہ کیا گیا اس کی تکمیل کی طرف روئے سخن پھر جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ان بستیوں میں اہل خیر موجود ہوتے اور وہ نہی عن المنکر اور زمین سے فتنہ و فساد کے دور کرنے کی سعی جاری رکھتے اور زمین سے ظلم مٹانے کی سعی کرتے اور دست درازی کرنے والوں کے ہاتھ روکتے تو ان بستیوں اور قوموں پر ایسا عذاب نازل نہ ہوتا جس نے ان کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا 'کیونکہ اللہ تعالیٰ بستیوں پر ظلم نہیں کرتا جبکہ لوگ صالح ہوں اور مصلح ہوں۔ یعنی خود بھی نیک ہوں اور بقدر طاقت لوگوں کو نیک بنانے میں بھی مصروف ہوں۔ ہاں ان ہلاک شدہ بستیوں میں بھی اہل ایمان کی ایک قلیل تعداد موجود تھی لیکن ان کے پاس بقدر ضرورت قوت اور اثر نہ تھا۔ اس لیے اللہ نے ان کو نجات دے دی 'اکثریت چونکہ مترفین اور مفسدین کی تھی اور دوسرے لوگ ان کے تابع تھے اس لیے اللہ نے پوری کی پوری بستیوں کو ہلاک کر دیا۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَاۤ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿١١٦﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿١١٧﴾

"پھر کیوں نہ ان قوموں میں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں ایسے اہل خیر موجود رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت کم' جن کو ہم نے ان قوموں میں سے بچا لیا' ورنہ ظالم لوگ تو انہی مزوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان انہیں فراوانی کے ساتھ دیئے گئے تھے اور وہ مجرم بن کر رہے - تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ناحق تباہ کر دے حالانکہ ان کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں"۔

یہ مختصر سا اشارہ اس پالیسی کو ظاہر کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اقوام عالم کے بارے میں اختیار کی ہوئی ہے - جس قوم کے اندر بگاڑ اور فساد عام ہو جائے' جس میں انسان انسان کا غلام ہو' خواہ اس کی کوئی بھی صورت ہو' لیکن اس میں ایسے لوگ بھی موجود ہوں جو اصلاح احوال کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں تو یہ قوم بچنے والی قوم ہوتی ہے - اللہ تعالیٰ کسی ایسی قوم کو نیست و نابود نہیں فرماتا - لیکن ایسی اقوام جس میں ظالم ظلم کریں اور دندناتے پھریں' فسادی فساد کرتے رہیں اور کوئی روکنے والا نہ ہو' یا ان میں ایسے لوگ ہوں جو ظلم و فساد کو برا سمجھتے ہوں کہ وہ صورت حالات کو بدلنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں - تو ان قوموں کے بارے سنت الٰہیہ اپنا کام کرتی ہے' یا تو اس قوم کو نیست و نابود کر دیا جاتا ہے یا اس پر ایسا عذاب آتا ہے کہ یہ قوم من حیث القوم بکھر جاتی ہے -

لہٰذا وہ لوگ جو اس زمین پر اللہ کی ربوبیت کا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں' ایسا نظام جس میں صرف اللہ حاکم ہو اور وہ لوگ جو زمین میں اللہ کی حاکمیت اور شریعت کی عدالت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں اللہ کے سوا کسی کا حکم نہ چلتا ہو تو ایسے لوگ دراصل زمین کا نمک ہیں اور ان کی وجہ سے اقوام کی ہلاکت رکی ہوئی ہوتی ہے - لہٰذا وہ لوگ جو دنیا میں اسلامی نظام زندگی کے قیام کے لیے سعی کرتے ہیں - وہ بڑی قدر و قیمت کے مالک ہوتے ہیں' جو ظلم و فساد کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتے ہیں' نہ صرف یہ کہ یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے عائد شدہ فریضہ سرانجام دیتے ہیں بلکہ یہ جس قوم میں کام کرتے ہیں وہ قوم کلی ہلاکت اور من حیث القوم ہلاکت کے عذاب سے بچ جاتی ہے - ان کی وجہ سے اقوام پر اللہ کا عذاب موقوف رہتا ہے -

---()()()---

آخری تبصرہ یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے' بعض انسان بھلائی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور بعض بگاڑ کی طرف' اس کائنات میں اللہ نے یہ سنت بھی جاری کر دی ہے کہ کچھ لوگ اس طرف ہوں گے اور کچھ اس طرف

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

"بے شک تیرا رب اگر چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک گروہ بنا سکتا تھا' مگر اب تو وہ مختلف طریقوں ہی پر چلتے رہیں گے

اور بے راہ رویوں سے صرف وہ لوگ بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے۔ اسی (آزادی انتخاب و اختیار اور امتحان) کے لیے تو اس نے انہیں پیدا کیا تھا۔ اور تیرے رب کی وہ بات پوری ہوگئی جو اس نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا"۔

اگر اللہ چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی فکر و نظر پر پیدا کر دیتا' ایک ہی صلاحیت سب میں ہوتی۔ ایک ہی چھاپ کے لوگ ہوتے۔ ان میں کوئی تفاوت یا تنوع نہ ہوتا۔ لیکن اللہ کو ایسا مطلوب نہ تھا' کہ وہ مخلوق جو اس کی جانشین اور خلیفہ ہے وہ اس قسم کی ہو' اس لیے اس نے لوگوں کو مختلف صلاحیتیں اور میلانات دیئے۔

اللہ کی مشیت ہی ایسی تھی کہ انسان اپنی استعداد اور رجحانات کے لحاظ سے مختلف ہوں۔ اس کے بعد اللہ نے لوگوں کو یہ اختیار بھی دیا کہ وہ جس رجحان کو چاہیں 'اپنائیں' جو راستہ چاہیں اس پر چل پڑیں اور جس راہ پر چلیں اس کے نتائج بھگتیں۔ اگر اچھا راستہ اختیار کریں تو جزاء ملے' اگر برا راستہ اپنائیں تو سزا ملے۔ یہی اللہ کی سنت ہے جو اس کی مشیت کے مطابق جاری و ساری ہے۔ اس لیے جو ہدایت کی راہ لیتا ہے وہ اور جو ضلالت اختیار کرتا وہ دونوں ہی اللہ کی سنت کے مطابق چل رہے ہیں اور یہ سنت اللہ کی مشیت کے مطابق ہے اور سزاء و جزاء بھی اللہ کی سنت اور مشیت کے مطابق ہے۔

یہ اللہ کی اسکیم تھی کہ لوگ امت جامدہ نہ ہوں' سنت الٰہیہ کا تقاضا ہی یہ ہے کہ لوگوں کی درمیان اختلافات ہوں۔ پھر یہ اختلافات اصل اور بنیادی عقائد میں ہوں اور کامیاب وہ لوگ ہوں جن کو اللہ نے ہدایت کی توفیق دی اور وہ حق پر جمع ہو جائیں' کیونکہ ہدایت اور سچائی ایک ہی ہوتی ہے۔ ان میں تعدد نہیں ہے۔۔۔ اگرچہ وہ اہل ضلال کے خلاف ہوں۔ ہدایت یافتہ لوگوں کے بالمقابل یہ لوگ ہیں:

وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (۱۱:۱۱۹)

"اور تیرے رب کی وہ بات پوری ہوگئی جو اس نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا"۔

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جو لوگ ہدایت پر جمع ہوئے ان کا انجام اور ہے' وہ جنت ہے اور وہ ان سے بھر دی جائے گی جس طرح جہنم ان لوگوں سے بھر دی جائے گی جو اہل حق سے مختلف ہیں اور آپس میں بھی مختلف ہیں کیونکہ باطل کے انواع و اقسام بہت ہیں۔

اس سورت کا اختتامیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے خطاب پر ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ کی طرف قصص انبیاء وحی کرنے کا مقصد کیا ہے۔ خصوصاً اہل ایمان کو اس پر غور کرنا چاہئے۔ جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کو آخری وارننگ دے دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اب ان کے ساتھ تعلق ختم کر دیں اور ان کو چھوڑ دیا جائے کہ وہ اس انجام تک جا پہنچیں جو ان کے لیے منتظر ہے اور پردۂ غیب کے پیچھے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کہا جاتا ہے کہ آپ اللہ کی بندگی ' اللہ پر بھروسہ کریں اور ان لوگوں کو چھوڑ دیں کہ جو چاہیں' کریں۔

وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَ جَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا

يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿١٢١﴾ وَ انْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿١٢٢﴾ وَ
لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ
عَلَيْهِ ۭ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٢٣﴾ ۱۰ ۱۴ع

۱۰ ''اور اے نبیؐ' یہ پیغمبروں کے قصے جو ہم تمہیں سناتے ہیں' یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی۔رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے' تو ان سے کہہ دو کہ تم اپنے طریقے پر کام کرتے رہو اور ہم اپنے طریقے پر کیے جاتے ہیں' انجام کار کا تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی منتظر ہیں۔آسمانوں اور زمین میں جو کچھ چھپا ہوا ہے سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے اور سارا معاملہ اسی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔پس اے نبیؐ' تو اس کی بندگی کر اور اسی پر بھروسہ رکھ' جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو' تیرا رب اس سے بے خبر نہیں ہے''۔

خدا کے رسول اللہ صلی اللہ و آلہ وسلم کی ذات بابرکات بھی اپنی قوم کی طرف سے مشکلات کا مقابلہ کر رہی تھی' بعض لوگ حد درجہ منحرف اور گمراہ تھے۔پھر دعوت اسلامی کے سلسلے میں آپ پر بے حد ذمہ داریاں عائد ہو رہی تھیں۔اس لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ آپؐ کو تسلی دی جائے اور رب کی طرف سے آپؐ کی حوصلہ افزائی کی جائے' اگرچہ آپؐ ثابت قدم تھے اور تمام مشکلات کو مستقل مزاجی سے برداشت کر رہے تھے۔

وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ جَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۱ : ۱۲۰) ''اور اے نبیؐ' یہ پیغمبروں کے قصے جو ہم تمہیں سناتے ہیں' یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی''۔

تو قصص میں ایک تثبیت قلب ہے' دعوت اسلامی کے بارے میں حقائق اور سچائیاں ہیں' مختلف انبیاء کے نمونے اور اسوے ہیں۔سنن الہیہ کے مختلف نمونے ہیں' خوشخبریاں ہیں اور ڈراوے ہیں۔اور وہ نصیحت آموز واقعات ہیں جو ان قصص میں موجود ہیں۔

ان لوگوں کا انجام کیا ہو گا جو اس وعد و نصیحت کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے۔ان کے لیے یہ قصص بالکل مفید نہیں ہیں۔ان کے لیے ان میں فیصلہ کن بات ہے۔ان کو کہہ دیں :

وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ (۱۲۱) وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ (۱۲۲) (۱۱ : ۱۲۱ - ۱۲۲) ''رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے' تو ان سے کہہ دو کہ تم اپنے طریقے پر کام کرتے رہو اور ہم اپنے طریقے پر کیے جاتے ہیں' انجام کار کا تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی منتظر

ہیں"۔

اور اے پیغمبر تمہارے ایک دوسرے بھائی نے بھی اپنی قوم کو ایسا ہی کہا تھا جس کا تذکرہ اسی سورت میں ہو چکا ہے اور پھر اپنی قوم کو ایک طرف چھوڑ دیا تھا کہ وہ اپنے انجام کا انتظار کرے۔

وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۱۱ : ۱۲۳) "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ چھپا ہوا ہے سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے"۔ ان تمام امور کے آخری فیصلے اس کے ہاتھ میں ہیں۔ اے پیغمبر تمہارے معاملات اور اہل ایمان کے تمام معاملات۔ اور ان لوگوں کے معاملات جو ایمان نہیں لاتے اور تمام موجودہ مخلوقات کے معاملات اور تمام آنے والی مخلوقات کے معاملات سب کے سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ

(۱۱ : ۱۲۳) "اور سارا معاملہ اسی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ پس اے نبیؐ" تو اس کی بندگی کر اور اسی پر بھروسہ رکھ، جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو، تیرا رب اس سے بے خبر نہیں ہے"۔

چونکہ تمام امور اسی کی طرف برائے فیصلہ لوٹتے ہیں اس لیے وہی اس قابل ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ وہی اس قابل ہے کہ اس پر بھروسہ کیا جائے، کیونکہ وہی ولی ہے وہی جانتا ہے کہ کس کی کیا ضرورت ہے اور وہ ہر خیر اور شر سے واقف ہے۔ اس کے ہاں کسی کی جزاء ضائع نہیں ہوتی اور کوئی سزا سے بچ نہیں سکتا۔۔۔ وہ تمہارے کسی عمل سے غافل نہیں ہے۔

---()()()---

غرض اس سورت کا آغاز بھی عبادت، انابت الی اللہ اور آخر کار رجوع الی اللہ کے مضمون سے ہوا، تو اس کا خاتمہ بھی توحید، عبادت، توبہ و انابت اور آخر کار اللہ کی طرف لوٹنے کے مضامین پر ہوا جبکہ ان مضامین کی وضاحت اس پوری کائنات کے مطالعے، نفس انسانی کے مطالعے اور تاریخ انسانی کے مطالعے کے ذریعے کی گئی۔

اسی طرح قرآن کریم کا فنی حسن کلام کے آغاز و انجام میں یگانگت پیدا کر دیتا ہے اور قرآن کریم کے تمام قصص، مضامین اور ان کا فکری رخ باہم متناسب بن جاتے ہیں اور اگر یہ قرآن اللہ کا کلام نہ ہوتا تو اس میں بے شمار فکری تضادات موجود ہوتے۔

---()()()---

جو شخص اس سورت میں بات کی روانی، بلکہ تمام مکی قرآن مجید کے کلام کا ہدف معلوم کرنے کی کوشش کرے تو اسے آسانی کے ساتھ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس پورے کلام میں ایک لائن اختیار کی گئی۔ اس لائن پر پورا کلام آگے بڑھ رہا ہے بلکہ یہ لائن اس کلام کا محور ہے اور پورا کلام اس محور اور موضوع کے گرد گھوم رہا ہے۔ تمام خطوط اس مرکزی نکتے پر آکر ملتے ہیں اور اس کے تمام ریشے اس محور کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ یہ محور اس نظریہ حیات اور اس تصور حیات کا محور اور موضوع ہے جس کے ارد گرد کلام گھوم رہا ہے۔ وہ کیا ہے، یہ کہ قرآن انسان کے لیے ایک مکمل

نظام زندگی تجویز کرتا ہے اور اس کا قیام چاہتا ہے۔

مناسب یہ ہے کہ ہم اس مرکزی لائن' اس محور اور اس عمود پر قدرے بحث کریں۔ اس کا اظہار اس پوری سورت میں اچھی طرح ہوتا ہے۔ بعض نکتے تو ہم بیان بھی کر آئے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس تبصرے میں ربط قائم کرنے کے لیے ان کو دوبارہ یہاں لے لیں۔

---○○○---

ایک نہایت ہی اہم حقیقت اس پوری سورت میں بیان کی گئی۔ اس سورت کی ابتدائی تمہیدی آیات میں بھی' اس سورت کے قصص میں بھی جن میں پوری سورت اور پوری تاریخ انسانی کی لائن دی گئی ہے' اور اس سورت کی اختتامی آیات میں بھی جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپ مشرکین کو صاف صاف بتا دیں کہ وہ آخری نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں' وہ حقیقت ہے کیا؟

اس پوری سورت میں جس اہم مسئلے کو لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ تم لوگ صرف اللہ کی "عبادت" کرو اور اس بات کی ممانعت کی گئی ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی "عبادت" کرو' اور یہ کہ عبادت ہی دراصل پورے نظام زندگی یعنی "دین" کا نام ہے۔ اور ہر قسم کی سزا کی دھمکی اور ہر قسم کی جزاء کے وعدے اور حشر کے دن کا حساب و کتاب اور ثواب و عقاب سب کے سب اسی بنیادی عقیدے اور اصول پر مبنی ہیں جیسا کہ ہم نے سورت کے مقدمے میں بھی کہا کہ "عبادت" صرف اللہ کی کرو۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قرآن نے اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لیے کیا منہاج اختیار کیا ہے اور اس منہاج کی اہمیت کیا ہے؟ صرف اللہ کی "عبادت" کرنے کو قرآن کریم جن صیغوں اور طریقوں میں ادا کیا ہے ایک ان میں سے یہ ہے کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۱۱ : ۵۰) "اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے"۔ اور دوسرا طریقہ ہے

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنَّنِیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ (۱۱ : ۲) "اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو' بے شک میں اس کی طرف سے تمہارے لیے نذیر اور بشیر ہوں"۔

ان دونوں انداز ہائے تعبیر میں فرق یہ ہے کہ ایک امر ہے اور دوسرے میں نہی ہے۔ کیا مثبت امر اور منفی اور ممانعتی انداز تعبیر میں کوئی فرق ہے یا ایک ہی مفہوم ہے؟ پہلے انداز تعبیر کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ ہی کی بندگی کرو اور اس کے سوا کوئی قابل پرستش قدر ہی نہیں ہے اور دوسرے کا مفہوم یہ ہے کہ کسی غیراللہ کی بندگی نہ کرو۔

دوسرا مفہوم پہلے مفہوم کا تقاضا ہے۔ پہلا مفہوم تو مثبت مفہوم ہے اور صراحت کے ساتھ حکم ہے اور دوسرا مفہوم اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ لیکن اللہ نے صرف پہلے انداز یعنی مثبت حکم ہی پر اکتفاء نہ کیا بلکہ دوسرے الہوں کی بندگی سے بھی صراحت کے ساتھ ممانعت کر دی حالانکہ اگر دوسرا منفی مفہوم کو مستقلاً بیان نہ کیا جاتا تو بھی وہ پہلے مثبت حکم کا لازمی تقاضا تھا۔ پھر ایک ہی بات کو مثبت اور منفی دونوں طریقوں سے کیوں بیان کیا گیا اس لیے کہ اللہ کے ہاں یہ بات نہایت ہی اہم ہے اور اس اہمیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس پر اکتفاء نہیں کیا کہ نہی عبادت غیراللہ چونکہ حکم عبادت الٰہی کے منطوق کا لازمی نتیجہ

ہے اس لیے اس کے تکرار کی ضرورت نہیں ہے ۔اس اہمیت کے پیش نظر اسے منفی صیغوں سے بھی بیان کیا گیا۔
مثبت اور منفی عبادت میں توحید کے عقیدے کے بیان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو' یہ مثبت اور منفی انداز بیان اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ بعض اوقات انسانیت پر ایسے حالات آجاتے ہیں کہ انسان خدائے بزرگ و برتر کے وجود کے بھی قائل ہوتے ہیں لیکن وہ اللہ کے ساتھ ساتھ دوسری شخصیات اور الہوں کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور ان کی بھی عبادت کرتے ہیں ۔یوں لوگ در حقیقت شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن سمجھتے یہ ہیں کہ وہ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں ۔

صرف اس وجہ سے عقیدۂ توحید کو امر و نہی اور بیک وقت مثبت و منفی انداز میں بیان کیا گیا تاکہ ایک حکم دوسرے کا مؤید اور مؤکد ہو اور تاکہ عقیدۂ توحید کے اندر کوئی جھول اور کوئی سوراخ نہ رہے ۔جس سے شرک اندر آسکے ۔یہ انداز تعبیر قرآن میں متعدد مقامات پر دہرایا گیا ہے ۔اس کے چند نمونے اس سورت سے نیز دوسری سورتوں سے قابل ملاحظہ ہیں :

الٓر كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (۱) اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ (۲) ((۱۱:۱ – ۲)) "یہ کتاب ہے جس کی آیات کو محکم بنایا گیا پھر ان کو مفصل کیا گیا اس ذات کی طرف سے جو حکیم اور خبیر ہے' یہ کہ نہ عبادت کرو ماسوائے اللہ کے' میں تمہارے لیے اس کی جانب سے ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں"۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۲۵) اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ (۲۶) ((۱۱:۲۵ – ۲۶)) "بے شک ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف' اس نے کہا بے شک میں تمہارے لیے کھلا ڈرانے والا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو ۔میں تمہارے بارے میں عذاب الیم سے ڈرتا ہوں"۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ((۱۱:۵۰)) "اور عاد کی طرف ان کا بھائی ہود' اس نے کہا اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارے لیے کوئی الہ نہیں ہے' تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں"۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ((۱۶:۵۱)) "اور اللہ نے کہا' دو الٰہ نہ بناؤ' یہ حقیقت ہے کہ الٰہ صرف ایک ہے' بس مجھ ہی سے ڈرو"۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۳: ۶۷) "ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ یکسو مسلم تھے اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے"۔

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۶: ۷۹) "میں اپنے چہرے کو یکسو ہو کر اس ذات کی طرف پھیرتا ہوں جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں"۔

توحید اور اس کی حقیقت کے بیان میں یہ انداز بار بار قرآن میں آتا ہے اور اس مفہوم میں کوئی شک نہیں رہتا۔ اس انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں اس عقیدے کی اہمیت اور عظمت کیا ہے۔ اور یہ انداز اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ اس عقیدے کے ضمنی تقاضوں اور ضمنی مفہومات کو بھی واضح اور منصوص طریقے سے لایا جائے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی اس مخلوق کو اچھی طرح جانتے تھے اور اللہ نے اس طرح اس انسان کے مفاد میں ضروری سمجھا کہ عقیدۂ توحید کے کسی بھی پہلو میں کوئی اجمال اور کوئی جھول نہ رہے۔ اور اللہ تو حکمت بلیغہ کا مالک ہے' وہ اپنی مخلوق کی کمزوریوں کو اچھی طرح جانتا ہے اور نہایت ہی باریک بین اور خبردار ہے۔

---ooo---

اب ہم لفظ "عبادت" کے اصطلاحی معنی پر غور کرتے ہیں۔ یہ لفظ اس سورت اور پورے قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے تاکہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ قرآن کریم بار بار کیوں اس بات پر زور دیتا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ اور یہ کہ اس لفظ کو مثبت اور منفی صیغوں میں تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اس سے قبل قصہ ہود اور ان کی قوم کے ساتھ حضرت ہود کے مکالمے کے ضمن میں ہم نے "العبادۃ" کے مفہوم کو اچھی طرح واضح کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ اس نکتے کو قرآن کریم کیوں بار بار لاتا ہے اور یہ کہ اس نکتے پر کس طرح انسانی تاریخ میں انبیاء اور مصلحین نے زور دیا ہے؟ اور اس راہ میں انہوں نے کیا کیا مشکلات برداشت کی ہیں لیکن اس تشریح کے علاوہ یہاں ہم چاہتے ہیں کہ اس کے مفہوم کے بارے چند اور جھلکیاں یہاں دے دیں۔

عبادت کا یہ مفہوم کہ اس کا اطلاق ان مراسم پر ہوتا ہے جو اللہ اور اس کے بندے کے درمیان ہوتے ہیں اور یہ مفہوم بمقابلہ ان معاملات کے ہے جو ایک انسان دوسرے انسان کے درمیان ہوتے ہیں۔ یہ نزول قرآن کے وقت مروج نہ تھے۔ عبادات و معاملات دو الگ اصطلاحات بعد میں درج ہوئی ہیں۔ اسلام کے عہد اول اور دور نزول قرآن میں یہ تفریق نہ تھی۔

اس سے قبل ہم اپنی کتاب (خصائص التصور الاسلامی ومقوماتہ) میں اس کے بارے میں تفصیلات دی ہیں۔ مناسب ہے کہ یہاں چند فقرے نقل کر دیں۔

"انسانی اعمال اور سرگرمیوں کی یہ تقسیم کہ اس کا ایک حصہ "عبادات" پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ معاملات پر مشتمل

ہے - اسلامی تاریخ کا اس دور سے متعلق ہے جس میں فقہ کی تدوین ہوئی - ابتداء میں اس تقسیم کی غرض و غایت صرف علوم و مضامین کی فنی ترتیب و تدوین تھی - جس طرح کسی فن کی کتابوں کی ترتیب و تدوین میں ہوتا رہتا ہے - لیکن نہایت افسوس کے ساتھ یہ بات کہنا پڑتی ہے کہ محض اس فنی تقسیم کی وجہ سے اسلامی تصورات اور نظریات میں بہت ہی برے نتائج پیدا ہوئے - اور اس تصوراتی اور نظریاتی کجی کی وجہ سے اسلامی معاشرے کی عملی زندگی پر بھی برا اثر مرتب ہوا - لوگوں کے اندر یہ خیال پیدا ہو گیا کہ صرف وہی اعمال عبادت ہیں جن کا تعلق خدا کی پرستش کے مراسم سے ہے اور فقہی تقسیم کے مطابق دوسری سرگرمیاں جن کو فقہ میں "معاملات" کے عنوان سے بیان کیا گیا - ان پر عبادت کا اطلاق نہیں ہوتا - حالانکہ یہ بات اسلامی تصور حیات کے مطابق اصل بات سے انحراف ہے - اور اس تصور کی بے راہ روی کی وجہ سے مسلمانوں کی پوری زندگی میں انحراف پیدا ہو گیا -

اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اعمال میں سے کوئی عمل ایسا نہیں ہے جس پر لفظ عبادت کا اطلاق نہ ہوتا ہو بلکہ اسلامی نظام حیات کا ہر جزو اول سے لے کر آخر تک عبادت الہی کے لیے ہے - غرض اسلامی نظام کے اجزاء یعنی نظام حکومت و سیاست ' اقتصادی نظام ' اسلام کا قانون جرائم اور اسلام کا سول لاء ' اسلام کا عائلی قانون اور تمام دوسرے قوانین درحقیقت عبادات ہیں اور یہ تمام قوانین لفظ عبادت کے مفہوم کو بروئے کار لانے کے لیے وضع ہوئے ہیں - لیکن انسان کی تمام سرگرمیاں اسلامی نظام کے مطابق اور لفظ عبادت کی تعریف میں تب آئیں گی جب وہ قرآن و سنت اور اسلامی شریعت کے مطابق ہوں - اس طرح کہ ایک مسلمان اللہ وحدہ کو الٰہ اور خدا سمجھے - صرف اس کی بندگی اور عبادت کا اقرار کرے - اور پوری زندگی اس نظام کے مطابق عملاً بسر کرے - اور یہی تخلیق انسان اور تخلیق کائنات کی اصل غرض و غایت ہے ' اگر ایسا نہ ہو گا تو انسان اسلامی نظام کی اسکیم سے خارج ہو گا اور وہ دین اسلام کے اندر تصور نہ ہو گا -

وہ مضامین اور شعبے جن کے لیے فقہاء نے لفظ "عبادات" استعمال کیا ہے ' اگر ان پر غور کیا جائے اور قرآن کریم میں ان کے بارے میں جو احکام دیئے گئے ہیں ' ان کو پڑھا جائیں تو معلوم ہو گا کہ یہ شعبے اور مضامین قرآن نے ان شعبوں اور مضامین سے علیحدہ نہیں پیش کیے جن پر فقہاء نے لفظ معاملات کا اطلاق کیا ہے بلکہ دونوں قسم کے احکام قرآن اور سنت میں ایک ہی سیاق کلام میں باہم مربوط آتے ہیں اور ان کا ذکر اس طرح ہوا کہ دونوں ہی خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت اور خدا کی بندگی اور عبادت کے مفہوم میں آتے ہیں جس کے لیے اللہ نے زمین و آسمان اور جن و انس کو پیدا کیا ہے اور یہی مفہوم ہے لا الہ الا اللہ اور توحید کا ہے -

تاریخ اسلام میں ازمنہ متاخرہ میں اس تقسیم کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مسلمانوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ اگر وہ عبادات کے حصے پر عمل پیرا ہوں اور عبادات احکام خداوندی کے مطابق سرانجام دیں اور اگر معاملات میں وہ کسی دوسرے نظام کے پیرو ہوں اور معاملات میں وہ اللہ کے بجائے کسی اور ذریعے اور ماخذ سے ہدایات لیں تو بھی وہ مسلمان ہو سکتے ہیں ' حالانکہ قانون سازی اور زندگی کی ضابطہ بندی کے دوسرے نظام اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کیوں نہ کر رہے ہوں -

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی جانب سے یہ ان کی خالص خوش فہمی ہے - اسلام کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا اور نہ اسلامی نظام کے حصے بخرے کیے جا سکتے ہیں - اسلام کو اس انداز اور اس نہج پر جو بھی تقسیم کرے گا وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو گا اور اس کا اس دین سے کوئی تعلق نہ ہو گا -

یہ ہے وہ عظیم حقیقت جس کی فکر ہر مسلمان کو کرنی چاہئے کہ وہ اپنے اسلام کو حقیقی اسلام بنائے۔بشرطیکہ وہ اللہ کے اس مقصد کو پورا کرنا چاہئے جس کے لیے اللہ نے اس کی تخلیق کی ہے۔

یہ ہیں وہ چند مقصدی فقرے جو ہم نے اپنی کتاب خصائص التصور اسلامی سے نقل کیے۔ان فقروں پر ہم صرف چند کلمات کا اضافہ ہی کریں گے۔جو ہم نے اس سے پہلے اس پارے میں مفصل بیان بھی کر دیئے ہیں کہ جن عربوں کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لا الہ الا اللہ کی دعوت پیش کی اور کہا تھا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو' اس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے کہ وہ عرب اس لفظ کو صرف پرستش کے معنی میں نہ بولتے تھے اور نہ ان کو فقہاء کی تقسیم عبادات و معاملات کا علم تھا بلکہ مکہ میں جب یہ حکم آیا کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو تو اس وقت اسلامی عبادات ابھی تک فرض ہی نہ تھیں۔بلکہ ان کے نزدیک عبادت کا مفہوم یہ تھا کہ پوری زندگی اللہ کی اطاعت میں دے دو اور اپنی پوری زندگی کو غیراللہ کی اطاعت سے نکال دو' اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عدی ابن حاتم سے احبار و رہبان کے بارے میں فرمایا :

(بلی انهم احولهم الحرام وحرموا عليهم الحلال فاتبعوهم فذلك عبادتهم اياهم) ''ہاں انہوں نے ان (اہل کتاب) کے لیے حرام کو حلال کیا اور حلال کو حرام کیا۔اور انہوں نے ان کی اطاعت کی۔یہ تھی ان کی جانب سے ان کی عبادت''۔اور مراسم عبودیت پر لفظ عبادت کا اطلاق یوں ہوا کہ یہ بھی عبادت کا ایک جزء ہیں اور انسانی زندگی کی سرگرمیوں کا ایک حصہ ہیں لیکن لفظ عبادت کا پورا مفہوم و مدلول صرف ان مراسم میں منحصر نہیں ہے۔

---ooo---

اس سے قبل ہم اسی پارے میں یہ بات کہہ آئے ہیں ''واقعہ یہ ہے کہ اگر عبادت سے مراد صرف مراسم عبادت ہی ہوتے تو پھر رسولوں اور رسالتوں کی سرے سے ضرورت ہی نہ پڑتی' اور رسولوں نے انسانی تاریخ میں اقامت دین کے لیے جو ان تھک کوششیں اور مساعی کیں ان کی سرے سے ضرورت ہی پیش نہ آتی۔اور پوری انسانی تاریخ میں اہل ایمان نے جو عظیم قربانیاں دیں ان کی ضرورت بھی نہ تھی' حقیقت یہ ہے کہ یہ عظیم قربانیاں محض اس لیے دی گئیں کہ لوگوں کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی اور اطاعت سے نکال کر صرف اللہ کی بندگی اور اطاعت میں داخل کیا جائے اور ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں اللہ کی حاکمیت ہو اور لوگ دنیا و آخرت دونوں کے معاملات میں اللہ کے مطیع ہوں۔

صرف اللہ کی حاکمیت اور صرف اللہ کی اطاعت اور اللہ ہی کی قیومیت اور اللہ ہی کی مالکیت اور اللہ ہی کو ماخذ قانون تصور کرنا اور اللہ ہی سے زندگی کا نظام اخذ کرنا اور ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرنا اور صرف اسے اپنا مرجع بنانا اور ہر معاملے میں اس کی اطاعت اور بندگی کرنا ہی ایک ایسا مقصد اور جامع و مانع توحید ہے جس کے لیے رسالتوں کا طویل سلسلہ جاری کیا گیا۔اور اس کے لیے تاریخ میں عظیم جدوجہد کی گئی' اسی راہ میں اس قدر قربانیاں دی گئیں اور مشقتیں برداشت کی گئیں اور یہ کام اس لیے نہیں کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو کہیں اس کی ضرورت تھی' بلکہ اس لیے کہ اس کے سوا انسان کی زندگی نہ درست ہو سکتی ہے' نہ انسان معزز و سربلند ہو سکتا ہے اور نہ اس کا رہن سہن ایک انسان کے لائق ہو سکتا ہے۔یہ کام صرف اس ہمہ جہت اور ہمہ گیر عقیدہ توحید کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ایسا عقیدہ جس کی گرفت

میں انسان کی پوری زندگی ہو"۔

جہاں ہم نے مذکورہ بالا اقتباس دیا تھا' وہاں ہم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ آخر میں ہم اس موضوع پر طویل بحث کریں گے۔ لہٰذا ہم یہاں انسانی زندگی پر عقیدہ توحید کے اثرات کے بارے میں قدرے بحث کرتے ہیں۔

○ پہلا نکتہ یہ ہے کہ اگر انسان عقیدہ توحید کو اس کے اس جامع و مانع اور مکمل مفہوم کے ساتھ قبول کرلے تو اس کا اس کی ذاتی زندگی کی حد تک کیا اثر ہو گا' اس کی فطری ضروریات' اس کے مادی وجود' اس کے تصورات اور پھر ان تصورات کی وجہ سے اس کی عملی زندگی پر کیا اثر ہو گا۔

"یہ تصور اور یہ سوچ اپنی پوری عمومیت کے ساتھ جب تمام امور حیات کو اپنی تحویل میں لے لیتی ہے تو یہ تصور انسانی زندگی سے اس کے ہر پہلو سے مخاطب ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کی تمام دلچسپیوں' اس کی تمام ضروریات' اور اس کے تمام رجحانات کو اپنی گرفت میں لیتا ہے اور ان کے رخ کو صرف ایک سمت کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اب اس کا معاملہ صرف اسی سمت کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسان سب کچھ اسی جہت سے طلب کرتا ہے۔ انسان اپنی ہر چیز کے ساتھ اسی طرف آگے بڑھتا ہے' اس کی امیدیں بھی اسی سمت سے وابستہ ہوتی ہیں اور اس کے اندیشے بھی اسی سے ہوتے ہیں' وہ صرف اس سمت کی رضاجوئی کا طلبگار ہوتا ہے اور اسی کے غضب سے استغفار کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہی سرکار ہر چیز کی مالک و خالق ہے' اور وہی پوری کائنات کی مدبر ہے۔

"یہ تصور انسانی شخصیت کا رخ ایک ہی مرجع اور منبع کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اسی مصدر سے انسان حقائق و تصورات اخذ کرتا ہے' اسی سے اپنے پیمانے اور اقدار لیتا ہے' اس سے اصول و قوانین حاصل کرتا ہے۔ ہر سوال کا جواب وہ وہیں سے لیتا ہے' اور انسان اور اس کائنات کے حوالے سے جو سوالات بھی اس کے ذہن میں اٹھتے ہیں ان کا حل وہ اسی مصدر اور مرجع سے پاتا ہے"۔

اب انسان کی شخصیت ایک مجتمع شخصیت ہوتی ہے۔ اس کا شعور' اس کا طرز عمل' اس کے جذبات و میلانات' ان کا تعلق عقیدے سے ہو یا نظام زندگی سے' نصرت و اعانت سے ہو یا ہدایت اخذ کرنے سے ہو' زندگی سے متعلق یا آخرت سے متعلق ہو' زندگی کی جدوجہد اور تحریک سے ہو یا صحت اور رزق سے متعلق ہو' دنیاوی امر ہو یا اخروی امر سے یہ تمام امور باہم مجتمع ہو جاتے ہیں' اب ان میں کوئی تفریق اور جدائی نہیں رہتی اور ان امور میں انسانی شخصیت مختلف راستے اختیار نہیں کرتی اور نہ ہی مختلف اسالیب پر چلتی ہے"۔

"انسانی شخصیت جب اس نہج پر متحد و مجتمع ہو جاتی ہے۔ تو یہ اس کے بہت ہی اچھے دن ہوتے ہیں' کیونکہ یہ وحدت کی حالت میں ہوتی ہے اور سچائی کہ پہلی صفت یہ ہے کہ اس کے اندر وحدت ہوتی ہے' وہ ایک ہوتی ہے' اس لئے کہ جب حق تعالیٰ ایک ہے تو حق بھی ایک ہوتا ہے' بلکہ اس پوری کائنات میں یہ وحدت اور یگانگت ایک اہم حقیقت ہے' اگرچہ مظاہر' اشکال اور حالات مختلف نظر آتے ہیں۔ وحدت اور توحید دراصل زندگی کی حقیقت ہے اگرچہ انسان کے انواع و اشکال مختلف ہوں۔ انسان اپنی مختلف صلاحیتوں اور رنگوں اور شکلوں کے باوجود اصل میں ایک ہے۔ توحید اور وحدت دراصل انسانی وجود کا اصل مدعا ہے۔ انسان جب بھی اور جہاں بھی اپنی حقیقت کی تلاش میں نکلے گا' اپنی عادات اور شکلوں کے اختلاف کے باوجود اس کی حقیقت ایک ہی ہو گی۔"

"جب یہ انسانی شخصیت ایسے حالات میں ہوتی ہے کہ وہ حالات ہر میدان میں "حقیقت" کے مطابق اور اس کے ساتھ ہم آہنگ ہوں تو اس وقت شخصیت اپنے عروج پر ہوتی ہے وہ قوی تر ہوتی ہے۔ اور وہ اس پوری کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔ اس کی ذات اور اس کائنات کے درمیان کوئی تضاد اور ٹکراؤ نہیں ہوتا جس کے اندر وہ رہتی ہے۔ اس شخصیت اور اس کائنات دونوں کے درمیان ایک ہی حقیقت موثر ہوتی ہے۔ جب انسانی شخصیت اس عظیم کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر چلتی ہے تو اس ہم آہنگی کے نتیجے میں دنیا میں عظیم انقلابات برپا ہوتے ہیں اور عظیم ادوار وجود میں آتے ہیں۔"

"مثلاً جب مسلمانوں کی پہلی جماعت اپنی شخصیت کے اعتبار سے اس مقام حقیقت تک پہنچ گئی تو اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس کرۂ ارض پر دور رس تبدیلیاں کیں اور اس نے تاریخ پر گہرے اثرات چھوڑے اور خود انسانی شخصیت اور سوچ کے دھارے بدل گئے"۔

"اور آئندہ بھی جب کوئی ایسی جماعت اور اس قسم کی مجتمع شخصیت والے لوگ دنیا میں پیدا ہوئے تو انسانیت اور تاریخ پر ایسے ہی گہرے اثرات چھوڑیں گے اور ایسے افراد اور ایسی جماعت ضرور پیدا ہو گی ان شاء اللہ۔ اگر چہ ملت اسلامیہ کے دشمن ایسی جماعتوں کی راہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ اس لئے کہ جب ایسی جماعت وجود میں آجاتی ہے تو اس کے اندر ایسی قوت ہوتی ہے جس کا مقابلہ رکاوٹ نہیں کر سکتی کیونکہ ایسی جماعت کی قوت فطرت اور کائنات کی قوت سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور انسانی قوتوں اور کائناتی قوتوں کا مرجع و مبداء ایک ہوتا ہے"۔

"اس توحید اور وحدت کا فائدہ صرف یہ نہیں ہے کہ انسان کا ایمانی تصور درست ہو جاتا ہے۔ اگر چہ یہ تصحیح اور درستی بذات خود بہت اہم ہے کیونکہ پوری انسانی زندگی کی عمارت اس تصحیح پر قائم اور استوار ہوتی ہے، لیکن اس سے زیادہ اس عقیدے کی اہمیت یہ بھی ہے کہ عقیدۂ توحید انسان کے اندر حسن ذوق پیدا کر دیتا ہے۔ انسان زندگی کو بڑی خوبی سے گزارتا ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے درمیان ہم آہنگی اور تناسق پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ اس ہمہ گیر توحید کے نتیجے میں انسانی زندگی کا ہر بڑا چھوٹا پہلو اور ہر بڑا چھوٹا عمل عبادت بن جاتا ہے۔ جب انسان اللہ وحدہ کو اپنا حاکم اور رب قرار دیتا ہے اور زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں فقط اس کی بندگی کرتا ہے، تو انسان انسانیت کے اعلیٰ ترین مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے، یہی وہ مقام ہے جس کے تمام پہلوؤں پر فقط رسول اللہ فائز ہوئے ہیں۔ یہ مقام، مقام وحی اور اسراء ہے۔

تَبَارَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (۲۵ : ۱) "بڑی برکت والی ہے وہ ذات جس نے فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ وہ تمام جہانوں کے لیے ڈرانے والے بن جائیں"۔ اور دوسری جگہ ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِىْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا

الَّذِی بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ( ۱۷ : ۱ ) "پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو سیر کرائی رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں 'بے شک اللہ سمیع و بصیر ہے"۔

○ اب ہم بندگی کی توحید یعنی اللہ کو حاکم اور رب سمجھتے ہوئے اس کی مکمل بندگی اختیار کرنے کا ایک دوسرا فائدہ قارئین کے سامنے رکھتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں انسانی زندگی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

اللہ وحدہ کی بندگی اور غلامی اپنانے کے نتیجے میں انسان غیراللہ کی بندگی اور غلامی سے نکل آتا ہے 'اور ایک ایسا نظام قائم ہوتا ہے جسمیں ایک انسان' انسان کی غلامی سے آزاد ہوتا ہے۔ انسان ایک مکمل آزادی حاصل کر لینے کے بعد ایک باعزت مقام بھی حاصل کرلیتا ہے 'یہ آزادی اور یہ شرف انسان کو کسی بھی غیراسلامی اور جاہلی نظام میں حاصل نہیں ہوتا ہے 'کیونکہ ان دوسرے نظاموں میں انسان' انسان کا غلام ہوتا ہے 'اور انسانوں پر انسان کی حاکمیت کے رنگ ڈھنگ اگرچہ مختلف ہوتے ہیں' بعض اوقات انسان ذہناً دوسروں کا غلام ہوتا ہے 'بعض اوقات وہ غیروں کے سامنے سجدے بھی کرتا ہے' بعض اوقات وہ دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے ضوابط میں بندھا ہوا ہوتا ہے 'غلامی کی یہ مختلف اقسام ہیں اور نوعیت ایک ہی جیسی ہے کہ ان میں انسان' انسان کے تابع اور ماتحت ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی طرح وہ بندھا ہوا ہوتا ہے۔

یہ ممکن نہیں ہے کہ لوگ کسی قانون اور ضابطے کے پابند نہ ہوں' اگر وہ اللہ کے قوانین اور ضابطوں کے پابند نہ ہوئے تو ظاہر ہے کہ کسی اور کے قانون اور نظام کے پابند ہوں گے' یوں وہ دوسرے انسانوں کی غلامی میں پڑ جائیں گے۔

جب بھی انسان غیراللہ کی غلامی میں گرفتار ہو جائے تو یہ ہروقت غیراللہ کی خواہشات اور مرضی کا غلام ہوتا ہے اور اس غلامی کی وجہ سے یہ انسانیت کے مقام سے گر کر حیوانیت کے مرتبے تک جا پہنچتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّهُمْ

( ۴۷ : ۱۲ ) "وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا یہ متاع دنیا سے استفادہ کرتے ہیں اور اس طرح کھاتے ہیں جس طرح مویشی کھاتے ہیں۔ آگ ان کے لیے جائے آرام ہے"۔ انسان کے لیے اس سے بڑا خسارہ کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی انسانیت کھو بیٹھے اور جونہی ایک انسان صرف اللہ کی حاکمیت اور غلامی سے نکلتا ہے وہ پہلے تو اپنی خواہشات اور شہوات کا غلام بن جاتا ہے 'اور یوں وہ حیوانوں کے مرتبے تک جا گرتا ہے جو صرف اپنی خواہشات کے تابع ہوتے ہیں۔ اس کے بعد پھر وہ اپنے جیسے بندوں کی غلامی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ایسے انسان پھر حکام اور رؤساء کے غلام بن جاتے ہیں' یوں کہ یہ حکام اور رؤسا ان کو ایسے قوانین کے شکنجے میں کس دیتے ہیں جو انہوں نے خود اپنے مفاد میں بنائے ہوتے ہیں اور یہ قوانین صرف بنانے والوں کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ یہ قانون ساز بعض اوقات ایک بادشاہ اور ڈکٹیٹر کی شکل میں ہوتے ہیں' بعض اوقات ایک حاکم طبقے کی صورت میں ہوتے ہیں' بعض اوقات ایک حکمران نسل کی شکل میں ہوتے ہیں۔ یہ خصوصیت ان تمام نظاموں میں موجود ہوتی ہے جو اللہ کی ہدایات سے ماخوذ نہیں ہوتے یعنی جو اللہ کی شریعت سے ماخوذ نہیں ہوتے۔

انسان کی طرف سے انسان کی غلامی' یہ صرف حکام رؤسا اور قانون سازوں تک ہی محدود نہیں ہوتی۔ یہ غلامی

بظاہر ان طبقات تک [illegible] نظر آتی ہے' بلکہ اس طرح ہر انسان بعض دوسری خفیہ قوتوں کا بھی غلام ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ دوسری [illegible] قوتوں سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہیں۔ مثلاً رسم و رواج اور لباس تک میں انسان جکڑا ہوا ہوتا [illegible] اپنے آپ کو ترقی پسند ظاہر کر کے اپنے مفادات کے لیے رسومات و لباس وضع کرتے ہیں۔ یہ لوازمات لباس میں' گاڑیوں [illegible] بڑی بڑی کوٹھیوں کی شکل میں' مناظر کی شکل میں اور پھر مخصوص محفلوں کی شکل میں لوگوں پر عائد کیے جاتے ہیں۔ کوئی جاہلیت پرست مرد یا عورت ان ناجائز طور پر فرض کردہ لوازمات سے نکل نہیں سکتی۔ بلکہ ان جاہلی رسومات و لوازمات کے گرفتار ان کے دائرے پر ہمیشہ بند اور محدود رہتے ہیں۔ آج انسان جس طرح ان لوازمات اور رسومات کی اندھی پابندی کرتے ہیں اگر وہ اس قسم کی پابندی اللہ کے چند احکام ہی کی کرتے ہیں تو وہ زاہد شب زندہ دار کے مقام تک جا پہنچتے۔ یہ اندھی غلامی نہیں ہے' تو اور کیا ہے' غیر اللہ کی حاکمیت اگر یہ نہیں ہے تو اور کیا ہو گی کہ ایک انسان دوسرے انسانوں کے رائج کیے ہوئے فیشن کا بھی غلام ہو۔

بعض اوقات ایک شریف انسان ایک عورت کو دیکھتا ہے کہ وہ ایسا لباس پہنی ہوئی ہے کہ اس سے اس کا رنگ ڈھنگ نظر آتا ہے۔ یہ لباس نہ اس کی شکل و صورت کے مناسب ہوتا ہے اور نہ اس کی جسمانی ساخت کے مناسب ہوتا ہے اور پھر یہ عورت ایسے اطوار اور ایسی ادائیں اختیار کرتی ہے کہ جس کی جانب ہر طرف سے اشارے ہوتے ہیں اور وہ ایک مذاق بنی ہوئی ہوتی ہے۔ لیکن فیشن ہاؤسز کی قوت قاہرہ ان لوگوں کو مجبور کرتی ہے کہ لوگ ان کی اطاعت کریں اور ان لوگوں کو اس ذلت میں مبتلا کریں۔ اس طرح کہ یہ لوگ طاقت نہیں رکھتے کہ اس کا انکار کر دیں' جبکہ ان کا پورا ماحول اس غلامی میں گرفتار ہوتا ہے۔ یہ اگر غلامی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یہ فیشن ہاؤسز اگر حاکم اور رب نہیں تو اور کیا ہیں؟

جب لوگ اللہ کی بندگی سے نکلتے ہیں اور غیر اللہ کی بندگی اور غلامی اختیار کرتے ہیں تو وہ کئی قسم کی ذلالتوں میں گرفتار ہوتے ہیں۔ فیشن کی مذکورہ بالا ذلت تو ان میں سے ایک ہے' اسی طرح امراء اور روساء کی حاکمیت بھی وہ واحد مکروہ صورت نہیں ہے جس میں لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں' جب انسان' انسان کا غلام ہوتا ہے اور ایک بندہ بندے کی غلامی کر رہا ہوتا ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی اور خرابیاں ہیں جو ایسے معاشرے میں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اس بات سے ہمیں اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے' صرف اللہ وحدہ کی بندگی کرنے اور صرف اللہ کو رب اور حاکم مان لینے کے اثرات انسان کی روح' اس کی عزت اور اس کی ثروت پر کس قدر دوررس ہوتے ہیں۔ جب ایک انسان' انسان کا غلام ہو جائے تو اس کے اخلاق' اس کی عزت اور اس کی دولت محفوظ نہیں رہتی چاہے غیر اللہ کی بندگی کی نوعیت جو بھی ہو' غیر اللہ کی بندگی قانون سازی کے میدان میں ہو' یا رسم و رواج کی شکل میں' یا غلط اعتقادات اور تصورات کی صورت میں ہو۔

مثلاً اگر کوئی اعتقادات' خیالات اور تصورات اور نظریات میں غیر اللہ کا غلام ہو جائے تو وہ وہم پرستی' قصے کہانیوں اور خرافات میں یقین کرتا ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی بت پرستی کی جاہلیت کا غلبہ ہے' وہ اس غلط سوچ کی غلامی کے نتیجے میں ہے۔ ایسی گمراہیوں میں عوام مختلف قسم کے اوہام کا شکار ہوتے ہیں۔ اور ان سے ڈر کر وہ وہمی خداؤں کے درباروں میں نذر و نیاز گزارتے ہیں اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور قربانیاں بھی دیتے ہیں۔ بعض اوقات اولاد اور انسانوں کی قربانیاں بھی دیتے ہیں اور یہ محض فاسد اور ناکارہ خیالات کی غلامی کی وجہ سے ہوتا ایسے معاشروں میں لوگ محض وہم و گمان کے خود تراشیدہ خداؤں سے ڈرتے ہیں۔ پھر یہ لوگ کاہنوں اور پجاریوں سے بھی ڈرتے ہیں جو ان کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ان کا تعلق ان

خداؤں سے ہے ۔ ایسے معاشروں میں لوگ جنوں اور بلاؤں سے بھی ڈرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی بھی قدر کرتے ہیں جو یہ باور کرا دیں کہ ان کے قبضے میں جن ہیں ۔ پھر وہ ایسے بتوں اور آستانوں کے مجاور مذہبی پیشواؤں کی اطاعت کرتے ہیں اور ایسے معاشروں کے تمام لوگ ڈرپوک 'کم ہمت ہوتے ہیں اور ہروقت ڈرے سہمے ہوتے ہیں' اور ہروقت ایک خوف انہیں لاحق ہوتا ہے ۔ اور اس طرح تمام انسانی قوتیں ضائع ہو جاتی ہیں ۔

اس سے قبل ہم نے یہ مثال دی تھی کہ محض فیشن اور غلط رسم و رواج کی غلامی اختیار کر کے لوگ کس قدر مصیبتیں جھیلتے ہیں ۔ ہمیں ذرا تفصیل سے غور کرنا چاہئے کہ ہم اپنی قوت اور دولت کا کتنا بڑا حصہ ان فضول کاموں میں خرچ کرتے ہیں ۔ اور اس کے لیے ہم کس قدر عظیم قربانیاں دیتے ہیں' مالی بھی اور عزت و شرف کی بھی ۔ یہ محض فیشن اور رسومات کے خداؤں کو خوش کرنے کے لیے ۔

ایک متوسط گھرانا' اوسط درجے کی آمدنی رکھنے والا' تیل' خوشبو اور سرخی پوڈر پر ایک بڑی رقم صرف کرتا ہے ۔ بالوں کو سنوارنے اور ان کے بنانے پر وہ ایک بڑی رقم خرچ کرتا ہے ۔ پھر بدلتے ہوئے فیشنوں کا ساتھ دینے کے لیے ہر سال نئے نئے جوڑے خریدتا ہے ۔ ان جوڑوں کے ساتھ ان کے ہم رنگ بوٹ اور دوسرے ملبوسات بھی فراہم کرتا ہے ۔ اور یہ سب کچھ ان خداؤں کی اتباع میں ہوتا ہے جو پس پردہ بیٹھ کر یہ فیشن گھڑتے ہیں ۔ تفتیش کرنے سے معلوم ہو گا کہ ایک متوسط آمدنی والا گھرانہ اپنی کل آمدنی کا نصف حصہ فیشن اور رسم و رواج پر خرچ کر دیتا ہے ۔ فیشن اور سرخی پوڈر کے پیچھے بین الاقوامی یہودیت کا ہاتھ ہوتا ہے اور اس نے تمام انسانوں کو فیشن کے جال میں پھنسایا ہوا ہے اور اس کے نتیجے میں ان کی بین الاقوامی کمپنیاں چلتی ہیں ۔ اور یہ کمپنیاں لوگوں کے مال اور ان کی آبرو اور ناموس پر ڈاکے ڈالتی ہیں اور وہ مجبور محض ہیں ۔

اب سب سے آخر میں دیکھیں کہ جب انسان' انسان کا غلام ہوتا ہے اور آقا انسان غلام انسان کے لیے قانون بناتا ہے تو غلام انسان کو کس قدر قربانی دینا پڑتی ہے اور اللہ کی غلامی اختیار کرنے میں انسان کو کس قدر قربانی دینا نہیں پڑتی ہے ۔ معلوم ہو گا کہ انسان کو غیراللہ کی غلامی میں زیادہ مالی اور جانی قربانیاں دینا پڑتی ہیں ۔

اس کے علاوہ' وطن کا بت' قوم کا بت' طبقات کا بت' پیداوار کا بت اور ان کے علاوہ دوسرے بت جنہوں نے الوہیت کا درجہ اختیار کر رکھا ہے اور جو اس جہاں میں ان مصنوعی بتوں پر ڈھول بجائے جاتے ہیں اور جھنڈے لہرائے جاتے ہیں اور پھر ان کے بندوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ان بتوں کے نام پر جانی اور مالی قربانیاں دیں اور وہ دیتے ہیں' بلاتردد دیتے ہیں ۔ اگر وہ نہیں دیتے تو ان پر اس قدر معاشرتی دباؤ ہوتا ہے کہ انہیں غدار سمجھا جاتا ہے اور ان کی توہین ہوتی ہے ۔ اگر کسی کے مال اور آبرو اور ان بتوں میں سے کسی بت کا مقابلہ ہو تو مال و آبرو کو ان بتوں پر قربان کر دیا جاتا ہے اور ان مصنوعی بتوں کو اس قدر اونچا مقام دیا جاتا ہے کہ ان کے آستانوں پر خون بہایا جاتا ہے اور اس پوری اسکیم کے پیچھے ان ارباب من دون اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے ۔

وہ تمام قربانیاں جو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے دی جاتی ہیں' اور اس کے لیے کہ اس کرۂ ارض پر صرف اللہ کی بندگی کی جائے' اور اس لیے کہ لوگوں کو بتوں اور طاغوت کی غلامی سے نجات دلائی جائے' اور اس لیے کہ انسان کو اس مرتبہ بلند تک اٹھا دیا جائے اور اس بلند افق تک پہنچا دیا جائے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کیا ہے ۔ یہ تمام قربانیاں ان قربانیوں

سے بہت کم ہیں جو بعض لوگ انسانوں پر انسانوں کی خدائی کا نظام قائم کرنے کے لیے دیتے ہیں۔اگر کم نہیں تو اس کے برابر ضرور ہیں جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے سے کتراتے ہیں اور اس میں شہادت' جان' مال اور اولاد کی قربانی دینے سے ڈرتے ہیں' ان کو ذرا یہ سوچنا چاہیے کہ غیراللہ کی غلامی کی صورت میں انہیں اس سے کہیں زیادہ قربانیاں دینی ہوں گی۔بلکہ غیراللہ کے لیے انہیں جان و مال کے علاوہ عزت و آبرو کی قربانی بھی دینی ہو گی۔

○ یہاں اب آخر میں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ عقیدۂ توحید اور اللہ وحدہ کی حاکمیت کے قیام اور تمام دوسرے کھوٹے الہٰوں کی حاکیت کا انکار انسانی جدوجہد کے بچاؤ کے لیے نہایت ضروری ہے۔اس طرح انسان کی جو بدنی اور مالی قوت بچتی ہے اسے اس کرۂ ارض کی تعمیر اور ترقی پر خرچ کیا جا سکتا ہے اور اس کے نتیجے میں انسان کو اس دنیا میں بھی ایک ترقی یافتہ زندگی نصیب ہو سکتی ہے۔

ایک اہم صفت اور علامت تمام طاغوتی قوتوں کے اندر پائی جاتی ہے۔دنیا میں کوئی حکمران جب کسی جگہ اپنا طاغوتی نظام قائم کرتا ہے تو وہ لوگوں کو اپنی حکومت اور نظام کی اطاعت پر مجبور کرنے کے لیے اور لوگوں کو اپنا صحیح بندہ اور غلام بنانے کے لیے زمین پر ہر قسم کے اختیارات اور تمام قوتیں اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔تب ہی لوگ مجبور ہوتے ہیں کہ اس کی اطاعت کریں اور اس کی ذات کو الہ کا مرتبہ دیں' یہ شخص پھر ایسے متبعین اور ایسے حاشیہ نشینوں کا محتاج ہوتا ہے جو ہر وقت اس کے گن گاتے رہتے ہیں اور اس کی تعریفیں اور حمد و ثنا کرتے ہیں۔اس طرح وہ اس کی شخصیت کو بڑھاتے ہیں اور یہ بونا شخص ایک عظیم ذات نظر آتا ہے۔یہ لوگ ہر وقت اس الہ کی ذات میں غبارے کی طرح ہوا بھرتے رہتے ہیں۔اس کی تعریف اور تمید کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں' لوگ جمع ہوتے ہیں اور میڈیا اور مختلف وسائل و ذرائع سے اس کی شخصیت کا رعب ذہنوں میں بٹھایا جاتا ہے۔اس طرح ایک کمزور شخص سے لوگوں کو ذرا ڈرا کر اسے الہ بنا دیا جاتا ہے۔

شخصیت پرستی کا یہ ڈھول رات دن بجایا جاتا ہے اور اس کے لیے یہ ان تھک جدوجہد جاری رہتی ہے' ورنہ اس کمزور شخصیت کے غبارے سے ہوا نکلتی رہتی ہے۔اس لیے اس کی شخصیت کا امیج قائم رکھنے کے لیے مختلف وسائل و ذرائع رات دن لگے رہتے ہیں۔حمد و نعت کا ایک دور اور اسلوب ختم ہوتے ہی دوسرا دور اور اسلوب شروع کر دیا جاتا ہے۔اور اس جھوٹے الہ کی خدائی کا رعب بٹھانے کے لیے مسلسل نئے نئے طریقوں سے جدوجہد شروع ہوتی رہتی ہے۔

اس راہ میں انسانی ذات کا ضیاع ہوتا ہے۔جان و مال کی قربانی بھی دی جاتی ہے' لوگوں کی عزت اور ناموس لٹتی ہے۔یہ وسائل اور قربانیاں اگر ملک کو ترقی دینے میں صرف کی جاتیں تو ملک کے اندر تعمیر و ترقی میں اضافہ ہوتا اور لوگوں کے لیے ضروری پیداوار بھی بڑھتی اور لوگوں کے لیے خیر کثیر جمع ہوتی۔لیکن انسانی قوتوں کا یہ ضیاع یوں ہی جاری رہے گا جب تک لوگ غیراللہ کی غلامی اور حاکمیت کا جُوا گردنوں سے اتار کر پھینک نہیں دیتے اور ان طاغوتی الہوں کی بجائے الہ العالمین کی غلامی میں داخل نہیں ہو جاتے۔

الغرض جب سے انسان نے اللہ وحدہ کی بندگی اور حاکیت سے منہ موڑا ہے تب سے وہ مالی اور جانی نقصان اٹھا رہا ہے۔اس کی تعمیر و ترقی کا نقصان ہو رہا ہے۔اور وہ خالص دنیاوی نقطہ نظر سے بھی سخت خسران میں ہے۔روحانی' اخلاقی' عزت اور اعلیٰ قدروں کا خسارہ اس پر مستزاد ہے اور اللہ کے سوا دوسرے خداؤں کی بندگی اور غلامی کر کے انسانیت ذلیل و خوار ہو رہی ہے۔

یہ ذلت اور خواری کسی ایک طاغوتی نظام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ یہ طاغوتی نظام دنیاوی ہوں یا غیر اسلامی دینی نظام ہوں، غرض جیسے بھی ہوں، سب میں انسان خسارے میں رہتا ہے۔

اس موضوع پر ہم گیارہویں پارے میں سورۂ یونس پر تبصرہ کرتے ہوئے جو بات کر آئے ہیں، اس سے چند اقتباسات یہاں مفید ہوں گے :

"جن لوگوں نے اللہ کی عبادت، بندگی اور حاکمیت سے منہ موڑا اور انہوں نے اپنے میں سے بعض افراد کو یہ اختیارات دیئے کہ وہ ان کے اوپر اللہ کے نظام کے سوا خود اپنے وضع کردہ نظام اور قانون کے مطابق حکمرانی کریں۔ آخر کار یہ لوگ مشکلات اور بدبختی کا شکار ہوگئے اور انسان انسانوں کا غلام بن گیا۔ اس غلامی نے ان کی انسانیت، ان کی عزت اور ان کی آزادی ان سے چھین لی۔ انسانوں کا یہ انجام ان تمام نظاموں میں ہوا جو بظاہر ایک دوسرے سے مختلف تھے مگر لادین تھے حالانکہ لوگوں نے ان نظاموں سے امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں کہ ان سے انسانیت کو آزادی اور عزت و شرف ملے گا"۔

"اس ضمن میں یورپ نے اللہ اور دین سے فرار اختیار کیا۔ حالانکہ یورپ فی الحقیقت خدا سے دور ہونا نہیں چاہتا تھا۔ دراصل یورپ کا فرار اس کلیسا سے تھا جو ان پر دین کے نام سے حکومت کرتا تھا۔ کلیسا کے خلاف بغاوت کے شور و غوغا میں لوگوں نے اللہ سے بھی فرار اختیار کیا۔ بلکہ یورپ نے تمام انسانی اقدار سے بھی فرار اختیار کیا۔ اور اس انقلابی عمل میں تمام اعلیٰ انسانی اقدار کو پامال کر دیا گیا۔ اس کے بعد لوگوں کا یہ خیال تھا کہ لادین جدید جمہوری نظام میں ان کی انسانیت، شرافت اور آزادی ان کو واپس مل جائے گی اور جدید نظام میں وہ بنیادی حقوق کے علاوہ دوسرے میدانوں میں بھی وہ خوشحال ہوں گے۔ اور جمہوری دستوروں میں جو حقوق انہیں دیئے گئے ہیں عملاً وہ انہیں حاصل ہوں گے۔ پارلیمنٹ کا اقتدار ہو گا۔ اخبارات کو آزادی حاصل ہو گی۔ عدالت میں ان کے ساتھ انصاف ہو گا اور اکثریت کی رائے کے مطابق قانون سازی ہو گی لیکن یہ سب کچھ سراب ثابت ہوا اور انجام یہ ہوا کہ سرمایہ دارانہ نظام نے عوام کو ان سب حقوق سے محروم کر دیا۔ چنانچہ یہ سب دساتیر، پارلیمنٹیں، بنیادی حقوق اور جمہوریت اور آزادیاں محض عنوانات ہی رہ گئے۔ بلکہ محض خام خیالی تصور ہوئے۔ اور عوام الناس کی غالب اکثریت مٹھی بھر سرمایہ داروں کے چنگل میں پھنس گئی اور وہ غالب اکثریت الخ تمام حقوق سے محروم ہوگئی جن کا وعدہ جدید لادین نظام جمہوریت نے ان سے کیا تھا۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ حقوق سے محروم ہوئے بلکہ شرافت، انسانیت اور عزت نفس سے بھی محروم ہوگئے"۔

"احمقوں کے ایک گروہ نے مغرب کے جمہوری نظام سے بھی فرار اختیار کیا۔ اب مٹھی بھر سرمایہ داروں کی جگہ بھوکے عوام نے اقتدار سنبھال لیا اور چند سرمایہ دار کمپنیوں کی جگہ حکومت آگئی۔ ان کمپنیوں کے مقابلے میں یہ زیادہ منظم تھی۔ اب چند سرمایہ داروں کی جگہ اور چند انٹرنیشنل کمپنیوں کی جگہ بیوروکریسی کی حکومت نے لے لی۔ بیوروکریسی کی یہ حکمرانی چند سرمایہ داروں کی حکمرانی سے بھی زیادہ شدید تباہ کن ثابت ہوئی"۔ (روس کا ڈرامہ یوں ختم ہوا)

"غرض جو نظام بھی ہو، اور جو شکل بھی ہو، اگر اس میں ایک انسان، انسان کا غلام ہے اور ایک انسان دوسرے انسان کا مطیع فرمان ہے تو وہ اپنی جان، مال اور عزت سب کچھ لوگوں کے حوالے کرتا ہے جو اس کے لیے بمنزلہ رب اور الٰہ ہوتے ہیں"۔

"انسان ایک عام انسان بہرحال غلام رہے گا' یہ یا تو اللہ کا غلام ہو گا' یا غیر اللہ کا غلام اور بندہ ہو گا۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ صرف اللہ ہی کی غلامی انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دے سکتی ہے۔ اور صرف اللہ ہی کی غلامی میں انسان کی جان' مال اور عزت محفوظ ہو سکتی ہے۔ جہاں تک غیر اللہ کی غلامی کا تعلق ہے تو وہ جان و مال کے ساتھ انسان سے اس کا شرف انسانیت اور اس کی دولت بھی چھین لیتی ہے"۔

"یہی وجہ ہے کہ تمام رسولوں کی دعوت کا یہ بنیادی عنصر رہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ' کوئی رب' کوئی حاکم نہیں ہے۔ تمام رسولوں کی یہی دعوت رہی ہے۔ حاکیت الٰہیہ تمام رسالتوں کی دعوت کا بنیادی جزو رہا ہے اور اس سورت میں اسے نہایت ہی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ مسئلہ یعنی حاکیت الٰہیہ کا مسئلہ محض قدیم بت پرستی کے دور ہی کے ساتھ متعلق نہ تھا' بلکہ حاکیت کا مسئلہ تمام سوسائٹیوں اور ہر زمان و مکان کا مسئلہ ہے۔ خواہ ان سوسائٹیوں کا تعلق جاہلیات ماقبل تاریخ کے ساتھ ہو' یا تحریری تاریخ کے دور کی جاہلیتوں کے ساتھ یا بیسویں صدی کی جاہلیت کے ساتھ ہو۔ تمام جاہلیتوں کا بنیادی عنصر یہی رہا ہے کہ ان میں انسان' انسان کا غلام ہوتا ہے؟"

غرض مختصر بات یہ ہے کہ اللہ کی اتباع' اللہ کی بندگی اور اللہ کی حاکیت جس پر اس سورت میں "عبادت" کے لفظ کا اطلاق کیا گیا ہے' ایمان کے اساسی عناصر میں سے ہے۔ یہ کوئی فقہی اور اجتہادی مسئلہ نہیں ہے' نہ سیاست اور نظام حکومت سے اس کا تعلق ہے' یہ ایمانی مسئلہ ہے۔

یہ ایمان اور عقیدے کا مسئلہ ہے۔ ایمان و عقیدہ یا تو موجود ہوں گے یا معدوم۔ یہ عین اسلام کا مسئلہ ہے' اسلام یا ہو گا یا نہ ہو گا۔ اس ایمانی مسئلہ کا ظہور پھر شریعت قانون اور نظام حکومت کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس کا ظہور پھر ایک اسلامی سوسائٹی کے ذریعے ہوتا ہے اور اس سوسائٹی میں اسلامی نظام کے عملی احکام نافذ ہوتے ہیں۔

تو ثابت ہوا کہ عبادت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ چند مراسم عبودیت اللہ کے سامنے بجا لائے جائیں بلکہ عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی مکمل اتباع ہو' اس کی شریعت اور اس کا نظام قائم ہو اور اس کی حاکیت کو جاری کیا جائے۔ اسلامی قانون' اسلامی فقہ اور اسلامی سوسائٹی کو برپا کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دین کی تاریخ میں تمام انبیاء نے اللہ کی عبادت اور بندگی کی طرف دعوت دی اور رسولوں کی تاریخ میں اس مقصد کے لیے بے انتہا قربانیاں دی گئیں۔

اب ہم اس نکتے پر آتے ہیں کہ اس سورت میں قصے پے درپے لائے گئے ہیں اور اسلامی نظریہ حیات کو ایک طویل تحریکی تاریخ کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اس سے قبل ہم نے قصۂ نوح پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ انسانیت کو سب سے پہلے جو عقیدہ حضرت آدم کے ذریعے سکھایا گیا وہ اسلام تھا۔ اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کے ذریعے اسے دہرایا گیا۔ حضرت نوح انسانوں کے دوسرے بابا آدم ہیں۔ ان کے بعد جو رسول بھی بھیجے گئے ان کو یہی پیغام دیا گیا۔ اس پیغام کا ملخص یہ تھا کہ اعتقاد و تصور کے پہلو سے بھی اللہ کو وحدہ لاشریک سمجھا جائے اور عمل اور طرز عمل کے اعتبار سے صرف اللہ وحدہ کی بندگی اور اطاعت کی جائے اور زمین پر اللہ کی حاکیت کا نظام قائم کیا جائے۔

اس کے بعد ہم نے بتایا تھا کہ اس تعلیم توحید کے بعد لوگ جاہلیت میں گرفتار ہوئے۔ جاہلیت مختلف اقسام و درجات میں رہی۔ کہیں تو اعتقاد اور نظریات کی جاہلیت رہی' کہیں مراسم عبودیت کی جاہلیت رہی اور کہیں بندگی' اطاعت

اور حاکمیت کی جاہلیت رہی اور بعض سوسائٹیوں میں یہ تمام جاہلیتیں یکجا بھی چھا گئیں - یہ جاہلیتیں بہرحال اسلام کے بعد آئیں - جب بھی کوئی رسول آیا اس نے اسلام کی تعلیم دی تو وہ ایسے حالات میں آیا کہ جاہلیت چھائی ہوئی تھی - جب رسول گیا تو دوبارہ جاہلیت چھا گئی - اور اس نے لوگوں کے تصورات' ان کی طرز بندگی اور ان کا نظام حکومت فاسد کر دیا - کسی پتھر' کسی درخت' کسی حیوان' کسی ستارے' کسی سیارے کی روح یا کسی جن یا کسی انسان کی بندگی اور حاکمیت قائم ہو گئی اور اس طرح تمام لوگ اسلام سے خارج ہو گئے -

قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جو سچائی پر مشتمل ہے اور باطل اس کے قریب تک بھی نہیں پھٹک سکتا - نہ آگے اور پیچھے سے اس پر باطل غالب اور حملہ آور ہو سکتا ہے' یہ کتاب نہایت ہی تسلسل کے ساتھ اسلام کی تاریخ بتا کر کہتی ہے کہ خدا کی طرف سے اسلام پہلے آتا ہے اور جاہلیت بعد میں ادوار زوال میں طاری ہو جاتی ہے - اور یہی سوچ کی درست لائن ہے - دور جدید میں مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنے والے علماء اسلام اور جاہلیت کے بارے میں نہایت ہی غلط سوچ رکھتے ہیں -

جدید علمائے مذاہب کی سوچ کی یہ لائن اور ان کا طرز فکر غلط ہے - یہ لوگ جاہلیت کی تاریخ تو بیان کرتے ہیں' لیکن اسلام نے رسولوں کی جو تاریخ پیش کی ہے اسے یہ لوگ بیان نہیں کرتے - پھر مذاہب کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بھی یہ لوگ صرف ان آثار تک محدود رہتے' جن آثار کی حفاظت جاہلیت نے کی ہے - حالانکہ جاہلیت تو انسانی تاریخ میں بعد کی پیداوار تھی اور انسان کے بارے میں جاہلیت کے پاس کوئی زیادہ معلومات بھی نہ تھیں اور یہ قلیل معلومات جو جاہلیتوں نے فراہم کیں یہ بھی یقینی معلومات نہ تھیں - یہ بھی محض ظن اور تخمین پر مبنی تھیں - یہاں تک کہ اگر کسی جاہلی نظام میں ان لوگوں کو توحید کے آثار نظر آ جائیں - اگرچہ وہ اپنی مسخ شدہ شکل میں کیوں نہ ہوں' تو یہ لوگ توحید کے ان آثار کو بھی عمداً چھوڑ دیتے ہیں - مثلاً شاہ مصر اخناتون کے عقیدۂ توحید کو یہ اہمیت نہیں دیتے - اخناتون مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد آیا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر میں توحید کی ہمہ گیر تبلیغ فرمائی تھی - ظاہر ہے کہ یہ توحید حضرت یوسف علیہ السلام کی تبلیغ کے آثار میں سے تھی - قرآن کریم کہتا ہے :

اِنِّىْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۳۷) وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (۳۸) يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۳۹) مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۰)

(۱۲ : ۳۷ - ٤٠) "میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے اور آخرت سے انکار کرتے ہیں اور اپنے بزرگوں' ابراہیم' اسحاق اور یعقوب کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے۔ ہم پر اور تمام انسانوں پر مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے زندان کے ساتھیو' تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے' اس کو چھوڑ کر تم جس کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤاجداد نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرمانروائی کا اختیار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو' یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں"۔

جدید دور کے علماء نے یہ منہاج بحث کیوں اختیار کیا' یہ اس لیے کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے دور میں جب وہاں علماء نے سائنسی تحقیقات شروع کیں تو کلیسا نے ان کی شدید مخالفت کی اور یوں سائنس دانوں اور کلیسا کے درمیان عداوت پیدا ہوگئی۔ اس عداوت کی وجہ سے مذہب کے بارے میں سائنس دانوں نے عمداً ایسی لائن اختیار کی جس کے نتیجے میں مذہب غلط ثابت ہو سکے۔ لیکن یہ منہاج بحث اختیار ہی اس لیے کیا گیا کہ اس کے نتائج برے نکلیں۔

سائنس اور مذہب کی اس پوری جنگ کے اختتام اور عیسائیت کی مکمل شکست کے بعد بھی یہ منہاج بحث بدقسمتی سے یورپ میں جاری رہا۔ حالانکہ سائنس دانوں نے کلیسا کی علمی' سیاسی اور اقتصادی گرفت کو ختم کر دیا تھا۔ کیونکہ یہ منہاج بحث جن بنیادوں پر شروع ہوئی تھی' وہ ابھی موجود تھیں اور بعد کے ادوار میں بغیر سوچ کے اس منہاج بحث کو سائنسی منہاج قرار دے دیا گیا اور آج تک مذہب کے بارے میں سوچ اسی لائن پر جاری ہے۔

بہرحال یورپ کا منہاج بحث جو بھی ہو' اور وہ لوگ جن نتائج پر بھی پہنچیں' وہ منہاج اور نتائج بہرحال ان حقائق اور تصریحات کے خلاف ہیں جو قرآن پیش کرتا ہے۔ یورپ والے تو غیر مسلم ہیں اور ان کے لیے جواز بھی ہے کہ وہ ایسے نتائج پر یقین رکھیں جو اسلام کے خلاف ہیں لیکن ایسے محققین جو اپنے آپ کو مسلمان بھی کہلاتے' وہ اگر وہی نتائج اخذ کریں تو یہ تعجب کی بات ہے۔ اسلامی تحقیق اور قرآنی تصریح یہ ہے کہ اسلام جاہلیت سے پہلے آیا' توحید کا عقیدہ شرک اور ثنویت سے پہلے آیا۔ اور یہ تحقیق اور تصریح ناقابل رد ہے۔ یہ بداہتہ دین میں ایک معلوم اور طے شدہ حقیقت ہے۔ اب یہ ہر کسی کا اپنا اختیار ہے کہ وہ کس حقیقت کو اختیار کرتا ہے اور کس کو نہیں کرتا۔ اسلامی نقطہ نظر کو اختیار کرتا ہے یا غیر اسلامی لائن پر چلتا ہے۔ کیونکہ کلام الہی اس نکتے پر صریح ہے' کوئی ضمنی یا دلالتہ النص سے یہ نکتہ ثابت نہیں ہے بلکہ صریح قطعی ہے۔

یہاں ہم اس موضوع پر مکمل بحث نہیں کرنا چاہتے بلکہ تاریخی منہاج بحث اور اسلامی تحریکی سوچ کے خطوط کی وضاحت چاہتے ہیں کہ اسلام اور جاہلیت کا تاریخی مقابلہ کس طرح ہوا ہے۔ اور ایک مسلمان محقق کی لائن یہ ہے کہ پہلے اسلام آیا' شیطان نے لوگوں کو گمراہ کرتے کرتے مکمل طور پر جاہلیت میں غرق کر دیا۔ پھر اللہ نے نبی بھیجا اور اس نے لوگوں کو دوبارہ اسلام میں داخل کر دیا اور یہ کہ شیطان لوگوں کو جاہلیت میں اس طرح داخل کرتا ہے کہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ارباب متفرقون کے پیروکار بن جاتے ہیں' وہ غیراللہ کے اقتدار کو قبول کرتے ہیں' گمراہی صرف مراسم عبودیت اور طریقہ پرستش تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اس میں سیاسی اور قانونی شرک بھی شامل ہوتا ہے۔ یہ نقطہ نظر اور یہ طرز فکر ہمیں اس بات میں مدد دیتی ہے کہ ہم آج پوری انسانیت کے موقف کو اچھی طرح سمجھ لیں اسی طرح اس کی وجہ سے ہم دعوت

اسلامی کے اہداف و مقاصد کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں۔

آج صورت حال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انسانوں کو جس جاہلیت سے نکالا تھا آج انسان پوری طرح دوبارہ اس میں داخل ہوگئے ہیں اور دور جدید کی جاہلیت اب مختلف صورتوں میں سامنے آرہی ہے۔ بعض جاہلتیں سرے سے خدا کا انکار کر رہی ہیں۔ یہ ملحد اور دہریہ جاہلیت ہے اور اسے ہم نظریاتی جاہلیت کہہ سکتے ہیں مثلاً کمیونزم اور سوشلزم۔

بعض ایسی ہیں کہ وہ خدا کی منکر تو نہیں لیکن ان کا تصور الٰہ غلط ہے' لیکن خدا کو مانتے ہوئے بھی مراسم عبودیت' پرستش' اطاعت اور اتباع میں یہ جاہلیت گمراہ ہے۔ اور اس میں غیراللہ کی پرستش اتباع اور اطاعت کی جاتی ہے' مثلاً ہندوؤں' یہودیوں اور عیسائیوں کی جاہلیت۔

بعض جاہلیتوں میں تصور الٰہ تو درست ہے' البتہ انہوں نے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں اللہ کے دائرہ حدود کو محدود کر دیا ہے۔ یہ جاہلتیں اتباع' اطاعت اور اقتدار اعلیٰ اور قانون سازی کے میدانوں میں شرک کا ارتکاب کرتی ہیں' مثلاً وہ جاہلتیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتی ہیں' اسلامی صفات اور حقوق سے متصف ہیں' کلمہ شہادت ادا کرتی ہیں لیکن وہ اللہ کے سوا دوسرے اداروں کی حاکمیت اور قانون سازی کو تسلیم کرتی ہوں اور اللہ کے بالمقابل دوسرے اداروں کی مطیع فرمان ہیں۔ یہ سب جاہلتیں ہیں' یہ سب کفر کے طریقے ہیں اور یہ شرک ہے (دیکھئے کتاب معالم فی الطریق لاالٰہ کا مفہوم)

آج پوری انسانیت پر اگر اس زاویہ سے نظر ڈالی جائے تو انسان واضح طور پر اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ آج انسانیت پوری طرح جاہلیت کا شکار ہے' اور یہ انسانیت کی بدبختی ہے کہ اسلام کو چھوڑ کر وہ دوبارہ جاہلیت کی پرستار ہوگئی ہے حالانکہ اسلام نے بار بار اسے جاہلیت سے نکال کر اسلام میں داخل کیا تھا۔ اور آخری طور پر یہ عمل نبی آخر الزمان خاتم النبیین کے ہاتھوں سرانجام پایا تھا۔ اس بات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آج دنیا میں جہاں جہاں اسلامی تحریکات اٹھ رہی ہیں۔ ان کے پیش نظر کس قدر اہم کام ہے اور انسانیت کی اصلاح کے لیے انہوں نے کس قدر فیصلہ کن کردار ادا کرنا ہے اور اپنے اصلاحی کام کا آغاز انہوں نے کس نکتے سے کرنا ہے۔

مناسب یہ ہے کہ یہ تحریکات اپنے کام کا آغاز اس طرح کریں جس طرح انہوں نے لوگوں کو از سرنو اسلام میں داخل کرنا ہے۔ اور ان کو دوبارہ اس جاہلیت سے نکالنا ہے جس کی طرف لوگ مرتد ہو کر لوٹ گئے ہیں اور یہ کہ ان تحریکات کو لوگوں کے سامنے اسلام کا مفہوم نہایت ہی واضح طور پر اور نہایت ہی جامع اور مانع انداز میں پیش کرنا ہے' مثلاً یہ کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے' بندگی کے مراسم صرف اس کے سامنے بجالانے ہیں۔ نظام زندگی اسی کا اختیار کرنا ہے اور اتباع' اطاعت اور خضوع و خشوع اس کے سامنے کرنا' اور پوری زندگی میں اس کے احکامات کو نافذ کرنا ہے اور یہ کہ اگر لوگ اپنی زندگیوں میں یہ تغیرات پیدا نہ کریں گے تو وہ مسلمان نہیں ہو سکتے' نہ اس کے سوا کسی کو صفت اسلام سے موصوف کیا جا سکتا ہے' نہ وہ اس کے سوا اسلامی حقوق حاصل کرنے کے حقدار ہیں۔ اور یہ کہ اگر مسلمان ان مفہومات میں سے کسی بھی مفہوم کو ترک کریں گے تو وہ اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو وہ اسلام سے جاہلیت کی طرف لوٹ جائیں گے۔

آج دنیا جس دور سے گزر رہی ہے یہ جاہلیت کے ادوار میں سے ایک دور ہے۔ لہٰذا اس دور کا مقابلہ ہم ایک ایسے

اسلامی دور سے کریں گے جو لوگوں کو جاہلیت سے نکال کر دوبارہ اسلام میں داخل کر دے 'تاکہ لوگ 'لوگوں کی عبادت سے نکل کر اسلام میں داخل ہو جائیں۔

اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دستے جو نظام اسلامی کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور وہ اس راہ میں مشکلات برداشت کر رہے ہیں ان کے فکر و نظر میں یہ نکتہ فیصلہ کن انداز میں بیٹھ جانا چاہئے۔اگر اسلامی تحریکات کے دل و دماغ میں یہ نکتہ واضح نہ ہو گا تو وہ اس مشکل دور میں اپنا فریضہ اچھی طرح ادا نہ کر سکیں گے۔ورنہ اس کا موقف متزلزل ہو گا۔ان کے سامنے ان کا نصب العین واضح نہ ہو گا' اور وہ جاہلیت کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اور ان کا آغاز ہی غلط سمت میں ہو گا اور ان کا زعم یہ ہو گا کہ وہ راہ راست پر ہیں لیکن مزعومات اور چیز ہوتے ہیں اور حقائق اور ہوتے ہیں۔

---ooo---

اس تبصرے میں اب ہم صرف ایک ہی موقف پر غور کریں گے 'وہ موقف کیا ہے؟ وہ یہ کہ رسولوں نے جب کام کا آغاز کیا تو اپنی قوم کے بارے میں ان کا موقف کیا تھا؟ آغاز میں انہوں نے اپنی قوم کے مقابلے میں کیا موقف اور کیا رویہ اختیار کیا اور اختتام پر اپنی قوم کے ساتھ ان کا رویہ کیا تھا اور یہ غور ہم ان قصص کی روشنی میں کریں گے جو اس سورت میں بیان ہوئے۔

ہر رسول کو اس کی قوم کی طرف بھیجا گیا۔آغاز دعوت میں رسول اپنی قوم ہی کا ایک فرد تھا۔وہ ان کو اسلام کی طرف اسی طرح دعوت دیتا تھا جس طرح ایک بھائی بھائی کو دعوت دیتا ہے اور وہ ان کا اسی طرح خیر خواہ تھا جس طرح ایک بھائی بھائی کا خیر خواہ ہوتا ہے۔فقط یہ کہ اسے اپنے رب کی طرف سے ہدایت مل چکی ہوتی ہے اور افراد قوم محروم ہوتے ہیں۔

آغاز کار میں اپنی قوم کے مقابلے میں ہر رسول کا موقف یہی رہا ہے لیکن جب دعوت کا انجام سامنے آتا تو رسول کا موقف وہ نہ رہتا جو آغاز میں ہوتا۔

ہوتا یوں رہا ہے کہ رسول کی قوم میں سے کچھ لوگ رسول پر ایمان لاتے ہیں اور جس طرح پیغمبر نے ان کو دعوت دی اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کریں۔اور غیر اسلامی نظام کا جوُا اپنی گردنوں سے اتار پھینکیں۔کیونکہ اسی طریقے سے وہ مسلمان ہو سکتے ہیں۔یہ عقیدہ قبول کر لینے کے بعد یہ لوگ امت مسلمہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ایک دوسرا گروہ رسول کی اطاعت کو قبول نہیں کرتا' ایمان نہیں لاتا اور وہ غیر اسلامی نظام زندگی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور اس حالت میں رہتا ہے جو رسول کے آنے سے پہلے تھی یعنی جاہلیت۔اپنے اس رویے کی وجہ سے یہ دوسرا گروہ ''امت کافرہ'' بن جاتا ہے۔

اب صورت حالات ہمیشہ یہ ہوتی رہی ہے کہ ایک قوم کسی نبی کے حوالے سے دو امتوں میں بٹ جاتی ہے۔ایک امت مسلمہ اور دوسری امت کافرہ اور یہ قوم ایک امت نہیں رہتی جس طرح پہلے تھی۔اس کے باوجود کہ نسل اور قوم کے اعتبار سے وہ ایک ہی ہوتے ہیں۔لیکن اب قوم اور نسل کے تعلقات اور علاقے اور معیشت کے مشترکہ مفادات بھی ان کو ایک قوم اور ایک امت کی صورت میں نہیں رکھ سکتے۔اب اس رسالت کی وجہ سے ایک نیا رابطہ اور ایک نیا تعلق وجود میں آ جاتا ہے اور یہ نیا تعلق اس قوم کو متحد بھی کرتا ہے اور جدا بھی۔اب اس نئے تعلق اور نظریہ کی وجہ سے سے

ایک امت دو اقوام کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور ان کے درمیان سوشل اور معیشت کا بائیکاٹ ہو جاتا ہے اور ان دونوں اقوام اور امم کا کسی نکتے پر بھی ملاپ نہیں ہوتا۔

وجہ یہ ہے کہ جب ان دو گروہوں کے درمیان نظریاتی بعد پیدا ہو جاتا ہے اور دونوں کے عقاید جدا ہو جاتے ہیں۔ وہ امت جو رسول کی دعوت قبول کر لیتی ہے' اس امت سے جدا ہو جاتی ہے جو رسول کی دعوت کو قبول نہیں کرتی۔ پہلی مسلم ہوتی اور دوسری کافر ہوتی ہے' چونکہ دو گروہوں کے نظریات طرز زندگی جدا ہو جاتے ہیں اس لیے دونوں گروہوں کی قومیت اور نسل بھی جدا ہو جاتی ہے۔ اور جب اللہ اس طرح امت مسلمہ کو امت کافرہ سے جدا کر دیتا ہے' تب تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ امت کافرہ کو نیست و نابود کر دیتا ہے جب کہ اس سورت میں ہم نے تاریخی مطالعہ کیا کہ اللہ کا یہ اصول اور یہ قاعدہ پوری تاریخ میں چلتا رہا ہے۔

یہاں اسلامی تحریکات کو یہ نکتہ بھی اچھی طرح پلے باندھ لینا چاہئے کہ اللہ نے اسلامی تحریک کے کارکنوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان اس وقت جدائی اور فیصلہ نہیں فرمایا جب تک وہ جدائی اختیار نہ کریں اور جب تک وہ علانیہ شرک اور غلط نظریات سے اپنی براءت کا علانیہ اظہار نہ کر دیں۔ اور اعلان نہ کر دیں کہ وہ صرف اسلامی نظام زندگی کے مطیع فرمان ہیں اور وہ اللہ کے سوا کسی جھوٹے رب اور جھوٹے حاکم کے مطیع فرمان نہیں ہیں نیز یہ کہ وہ کسی طاغوتی قوت' طاغوتی نظام اور طاغوتی حکمران کے مطیع فرمان ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اور وہ اس نظام' اس سوسائٹی میں شرکت کے لیے تیار نہیں ہیں جس پر ان طاغوتوں کی حکمرانی ہو اور ایسا نظام رائج ہو' جو شریعت پر مبنی نہ ہو اور جس کو حقیقی سرچشمہ یعنی اللہ کی ذات سے اخذ نہ کیا گیا ہو۔ چاہے اعتقاد و نظریہ ہو' چاہے نظام بندگی ہو' چاہے نظام قانون و دستور ہو۔

یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ کا عذاب اہل کفر اور کفر کے حامیوں پر اس وقت تک نہیں آتا جب تک اہل اسلام اہل کفر کے ساتھ مکمل جدائی اختیار نہیں کر لیتے۔ اور جب تک مسلمان اپنی اپنی اقوام سے علیحدہ ہو کر ان سے برأت کا اظہار نہ کر لیں' اور جب تک وہ ان سے دینی جدائی اختیار نہ کر لیں جب تک وہ ان سے اپنا طریقہ کار اور منہاج فکر جدا نہیں کریں گے اس وقت تک اللہ کا عذاب اہل کفر پر نہیں آ سکتا' نہ اللہ تعالیٰ ایسی اقوام کو اپنی گرفت میں لیتا ہے' ضروری ہے کہ اقوام کفر کے اندر سے اسلامی عناصر چھٹ کر نکل آئیں اور ان سے بر سرپیکار ہوں' تب اللہ کی مدد آتی ہے' اس سے پہلے نہیں۔

نبیوں کی پوری تاریخ میں یہ قاعدہ جاری و ساری نظر آتا ہے اور اسلامی تحریکات کا فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اپنی تحریکات کو اس نکتے کے پیش نظر رکھ کر اٹھائیں۔ دعوت کا آغاز اس نکتے سے کیا جائے کہ لوگ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جائیں اور وہ بلا شرکت غیرے اسلامی نظام زندگی کو اپنا لیں اور تمام دوسرے نظام ہائے زندگی اپنانے سے انکار کر دیں اور اس کے بعد جس قوم میں تحریک کام کر رہی ہے' اس کے اندر دو ٹکڑے ہو جائیں۔ ایک طرف ان لوگوں کی امت کھڑی ہو جو اللہ کے ساتھ شرک کرتی ہو' اور غیر اسلامی اقتدار کی بندگی کرتی ہو' ان کے درمیان جب بھی مکمل جدائی ہو گی' پھر اللہ کی نصرت آ جائے گی اور اہل ایمان اہل کفر پر فتح پائیں گے۔

یہ ممکن ہے کہ مکمل جدائی سے پہلے تحریک کو ایک طویل دور سے گزرنا پڑے لیکن شعوری جدائی روز اول سے ضروری ہے۔

ان دو گروہوں کے درمیان مکمل جدائی کا عمل طویل بھی ہو سکتا ہے اور ایک ہی قوم سے جدا ہو کر دو علیحدہ امتوں کی

تشکیل پر وقت لگ سکتا ہے اور اس عرصے میں داعیوں کی جماعت کو مشکلات بھی درپیش آ سکتی ہیں' ان پر مظالم بھی ہو سکتے ہیں اور نسلوں تک یہ جدوجہد جاری رہ سکتی ہے' لیکن تحریک اسلامی کو یقین رکھنا چاہئے کہ اللہ کی نصرت آئے گی ۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کے وعدے کے خلاف کبھی نہیں ہوتا۔ یہ سنت الٰہیہ ہے اور آدم علیہ السلام کے وقت سے یہ سنت جاری ہے۔

یاد رہے کہ تحریک اسلامی کے لیے سنت الٰہیہ کو اس طرح فیصلہ کن اور دو ٹوک انداز میں سمجھنا ضروری ہے ۔ صرف اسی صورت میں تحریک اسلامی پوری گمراہ انسانیت کا مقابلہ کر سکتی ہے ۔ یہ ایک جاری سنت ہے اور یہ زمان و مکان کے ساتھ مقید نہیں ہے ۔ جب تک تحریک اسلامی کو پوری جاہلی انسانیت کے ساتھ مقابلہ درپیش ہے' چاہے وہ جس قسم کی جاہلیت بھی ہو' اور تحریک اسلامی یہ مقابلہ اسی انداز اور اسی طریق کار اور انہی نظریات کی قوت سے کر رہی ہے جس سے انبیاء علیہم السلام جاہلیت کا مقابلہ کرتے آئے ہیں' تو تحریک اسلامی کا فرض ہے کہ وہ انبیاء کی طرح واضح سوچ' واضح طریق کار اور نہایت ہی یقین و اعتماد کے ساتھ آگے بڑھے کہ اللہ کی سنت اب بھی قائم ہے اور اس میں تخلف ممکن نہیں' لہٰذا نصرت الٰہی اور تائید الٰہی ان کو حاصل رہے گی ۔ اور آخری فتح متقی اور پرہیز گاروں کی ہوگی ۔

---ooo---

سب سے آخر میں' میں یہ کہوں گا کہ قصص القرآن اور ان کے اوپر قرآن کریم نے جو تبصرے کیے ہیں' ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دین کا مزاج کیا ہے اور قرآن کریم سے تحریک اسلامی کے لیے کیا منہاج نکلتا ہے ۔ اسلامی تحریک کا مزاج یہ ہے کہ اس کارکن عملاً میدان میں نکل آئیں اور وہ جاہلیت کا عملی مقابلہ کریں ۔

جب یہ قصص مکہ مکرمہ میں حضورؐ پر نازل ہو رہے تھے تو اس وقت تحریک اسلامی کے مٹھی بھر کارکن مکہ کی پہاڑیوں کے درمیان محصور تھے اور دعوت اسلامی مکہ میں جامد ہو کر رہ گئی تھی ۔ راستہ نہایت ہی دشوار گزار اور طویل تھا اور مسلمانوں کو دور تک منزل کے نشانات نظر نہ آ رہے تھے اور نہ منزل کا کوئی پتہ تھا۔ ان قصص کے ذریعے ان کو بتایا جا رہا تھا کہ ان کے نشانات راہ کیا ہیں اور منزل کہاں ہے؟ اور اس کو یہ بھی بتایا جا رہا تھا کہ آخری منزل تک پہنچنے کے مراحل کیا ہیں؟ چنانچہ قرآن مجید پہلی تحریک اسلامی کو ہاتھ سے پکڑ کر منزل کی طرف رواں تھا۔ اور ان کو اس اسلامی تحریک کے خطوط بتا رہا تھا جو آغاز انسانیت سے چل کر ان تک پہنچی تھی' پوری انسانی تاریخ کا سفر طے کرتے ہوئے یہ تحریک نہایت محبت' انس اور یگانگت کے ساتھ قافلہ انبیاء کے ساتھ ساتھ قرآن کے سائے میں چل رہی تھی ۔ اسے قرآن کے بتائے ہوئے اس راستے سے نہ وحشت تھی اور نہ ہی کوئی ڈر تھا۔ گویا یہ لوگ قافلہ انبیاء میں اس کے طویل سفر میں اس کے ساتھی تھے اور اسی قافلے کی آخری کڑی تھے ۔ یہ [illegible] تا سا کی گروہ قافلہ انبیاء سے کٹا ہوا کوئی علیحدہ گروہ نہ تھا جو نشانات راہ کے بغیر کسی صحرا میں گشت کر رہا ہو۔ چنانچہ یہ کی [illegible] وہ نقطہ آغاز سے شروع ہو کر انبیاء کی اسکیم کے مطابق آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ کوئی اتفاقی تحریک نہ تھی اور نہ بے مقصد گروہ تھا۔

اسلامی صفوں میں یہ قرآن اس طرح متحرک نظر آتا تھا اور یہ تحریک اپنی اسکیم اور نقشے کے مراحل مطابق مسلسل چل رہی تھی ۔ آج بھی یہ ممکن ہے کہ قرآن اسلامی دستور کے اندر متحرک نظر آئے اور کل بھی ایسا ممکن ہے ۔ آج بھی یہ ممکن ہے کہ قرآن اپنی اسکیم کے مطابق اسلامی تحریکات کو چلائے اور وہ چلیں ۔

آج کی تحریکات اسلامی کی ضرورت یہ ہے کہ وہ قرآن سے الہام اخذ کریں ۔ قرآن سے ان کو وحی اور اشارات

ملیں۔ وہ قرآن سے احیائے اسلام کا منہاج اخذ کریں۔ اس کے مختلف مراحل کا تعین کریں' ان کے تقاضوں کو پورا کریں اور انجام کار ان کے لیے جو کامیابیاں متعین ہیں' ان کے ظہور کا انتظار کریں۔

اگر قرآن کریم کو ہم تحریکی مقاصد کے لیے گائیڈ کے طور پر استعمال کریں تو پھر قرآن کی یہ حیثیت نہ ہوگی کہ وہ صرف ایک مذہبی کتاب ہے جو حصول برکت کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ بلکہ وہ ایک زندہ کتاب بن جائے گی گویا کہ وہ ابھی جماعت مسلمہ پر نازل ہو رہی ہے۔

ہم مسلسل فی ظلال القرآن میں یہ کہتے چلے آئے ہیں کہ قرآن کریم کے اسرار و رموز صرف ان لوگوں پر کھلتے ہیں جو اس کتاب کے ساتھ متحرک ہوں۔ قرآن کریم اپنا سینہ صرف ان لوگوں پر کھولتا ہے جو اس کے مفہوم اور احکام کو عملی شکل دینا چاہتے ہیں اور اسے عالم واقعہ کی طرف لانا چاہیں۔ ان لوگوں پر قرآن کے اسرار نہیں کھلتے جو اسے صرف برکت کے لیے پڑھتے ہوں۔ نہ ان لوگوں پر کھلتے ہیں جو اس کا مطالعہ محض ایک فن کے طور پر کرتے ہیں اور محض علوم القرآن سے واقف ہونا چاہتے ہوں۔ نہ ان لوگوں پر اس کے اسرار کھلتے ہیں جو محض اس کے بیان' اس کی تلاوت اور اس کی قرأت پر زور دے رہے ہوں۔

مذکورہ بالا قسم کے لوگوں پر قرآن کے اسرار و رموز میں سے بہت ہی قلیل چیز کھلتی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم اس لیے نازل ہی نہیں ہوا کہ اسے محض فنی اور علمی انداز میں پڑھا جائے بلکہ وہ اس لیے نازل ہوا ہے کہ وہ تحریک اور ہدایت کا ذریعہ بنے۔

جو لوگ باغی اور سرکش جاہلیت کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں اور اس کے مقابلے میں اسلام کو زندہ کرنا چاہتے ہیں' جو لوگ گمراہ انسانیت کو واپس دین اسلام کی طرف لانا چاہتے ہیں' جو لوگ اس کرۂ ارض پر طاغوت کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ انسانوں کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے رہائی دلائیں اور صرف اللہ رب العالمین کی بندگی میں داخل کریں۔ انہیں چاہئے کہ قرآن کے ساتھ اپنے تعلق پر نظرثانی کریں۔

ایسے ہی لوگ دراصل قرآن کو سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ ایسے لوگ ایسی فضاؤں میں زندگی بسر کرتے ہیں جس فضا میں سب سے پہلے یہ قرآن نازل ہوا تھا۔ اور ان کی جدوجہد دراصل وہی جدوجہد ہے جو وہ لوگ کر رہے تھے جن پر یہ قرآن سب سے پہلے نازل ہوا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ تحریکی لوگ ہوتے ہیں اور یہ لوگ حرکت بالقرآن کے ذریعے وہی ذوق رکھتے ہیں اور وہی مفہوم اپنے اندر پاتے ہیں جو قرآن کے نصوص سے مراد ہے اور اس کو مطلوب ہے اس لئے کہ ان کو قرآن کے معانی اور مفہومات واقعات کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ یہ ذوق اور فہم ان کے لیے ان مشکلات اور مصائب پر اجر ہے جو یہ لوگ پا رہے ہیں اور ان پر انہیں خوش ہونا چاہئے۔ اللہ فرماتا ہے۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ((۱۰:۵۸))

”کہو اللہ کے فضل اور رحمت پر خوشیاں مناؤ' یہ اس دولت سے بہتر ہے جو یہ لوگ جمع کر رہے ہیں“۔ و الحمد للہ رب العلمین

# فی ظلال القرآن

## پارہ ---------- ۱۲

## سورۂ یوسف -

## آیات ۱------تا------۵۳

# سورۂ یوسف ایک نظر میں

یہ مکی سورت ہے اور یہ سورت ہود کے بعد نازل ہوئی۔یہ اس مشکل دور میں نازل ہوئی جس کے بارے میں ہم سورت یونس اور سورت ہود کے دیباچے میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں تحریک اسلامی بے پناہ مشکلات سے دوچار تھی۔یہ عام الحزن کا زمانہ تھا' حضرت ابوطالب فوت ہو چکے تھے' حضرت خدیجہؓ فوت ہو چکی تھیں۔یہ دونوں شخصیات حضورؐ کی ذات اور تحریک اسلامی کے لیے بے حد مددگار اور سہارا تھیں۔ لیکن اس دور کے قدرے بعد بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ کے واقعات پیش آئے جن میں حضورؐ کے لیے اور اسلامی تحریک کے لیے ان مشکلات سے نکل جانے کی راہ فراہم ہوئی۔اور ہجرت الی المدینہ کے اسباب پیدا ہوئے۔بہرحال یہ سورت ان سورتوں میں سے ایک ہے جو اس مشکل دور میں نازل ہوئیں جبکہ حضورؐ اور آپ کے مٹھی بھر ساتھیوں کے لیے مکہ کی فضا حد درجہ ناسازگار تھی۔

یہ پوری سورت مکی ہے لیکن "مصحف امیری" میں یہ ہے کہ آیت ۱' ۲' ۳' ۷' مدنی ہیں۔یہ بات قرین قیاس نہیں ہے اس لیے کہ پہلی تین آیات یہ ہیں:

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۱) اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۲) نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ (۳) (۱۲ : ۱ - ۳) "ا ل ر۔یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے۔ہم نے اسے نازل کیا ہے' قرآن بنا کر' عربی زبان میں تاکہ تم اسے اچھی طرح سمجھ سکو' اے محمد ہم اس قرآن کو تمہاری طرف وحی کر کے بہترین پیرائے میں واقعات و حقائق تم سے بیان کرتے ہیں ورنہ اس سے پہلے تو تم بالکل بے خبر تھے"۔

ذرا بھی غور کیا جائے تو یہ آیات بعد میں آنے والی آیات کے لیے نہایت ہی قدرتی تمہید ہیں جن میں قصہ یوسف علیہ السلام کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ان کے بعد جو آیت آتی ہے وہ یہ ہے:

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّىْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِىْ سٰجِدِيْنَ (۱۲ : ۴) "جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا "ابا جان' میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے اور سورج اور چاند ہیں اور وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں"۔

اور اس کے بعد قصہ شروع ہو جاتا ہے اور آخر تک چلتا رہتا ہے۔ لہٰذا پہلی تین آیات میں جو یہ آیا ہے کہ "اے محمد ہم اس قرآن کو تمہاری طرف وحی کر کے بہترین پیرائے میں واقعات و حقائق تم سے بیان کرتے ہیں ورنہ اس سے پہلے تم بالکل بے خبر تھے"۔ یہ اس پورے قصے کی ایک قدرتی تمہید ہے۔

پہلی آیت میں تین حرف ہیں : ا ل ر اور یہ کہ یہ کتاب مبین کی آیات ہیں' یہ کہ اللہ نے اسے عربی زبان میں قرآن بنا کر نازل کیا ہے' یہ بھی مکہ والوں سے خطاب ہے جو یہ الزام لگاتے تھے کہ ایک عجمی شخص آپ کو پڑھاتا ہے اور پھر یہ کہ قرآن وحی من جانب اللہ اور اس کی دلیل ہے کہ حضورؐ قرآنی تصورات سے اس پورے عرصے میں آگاہ نہ تھے' نہ آپ نے کبھی ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔

پھر قرآن کریم کا یہ آغاز اس سورت کے اختتام سے بھی ہم آہنگ ہے' اختتام یوں ہوا :

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ يَمْكُرُوْنَ (۱۲ : ۱۰۲) "یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو تم پر وحی کر رہے ہیں' ورنہ تم اس وقت موجود نہ تھے جب یوسف کے بھائیوں نے آپس میں اتفاق کر کے سازش کی تھی"۔ چنانچہ اس قصے کے آغاز اور انتہا میں یہ ایک ناقابل جدائی ربط ہے۔ ظاہر ہے کہ قصے کی تمہید اور اس پر آخری سبق اور تبصرے کو ایک ساتھ ہی نازل ہونا چاہئے۔

رہی ساتویں آیت تو اگر اسے عبارت سے نکال دیا جائے تو عبارت درست ہی نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ سورت مکہ میں نازل ہوئی اور یہ آیت اس میں نہ ہو اور مدینہ میں اس کا اضافہ ہوا ہو۔ ذرا پوری عبارت پر غور فرمائیں :

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ (۷) اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِيْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ (۸)(۱۲ : ۷ - ۸))

"حقیقت یہ ہے کہ یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصے میں ان پوچھنے والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ اس کے بھائیوں نے آپس میں کہا "یہ یوسف اور اس کا بھائی دونوں ہمارے والد کو ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں' حالانکہ ہم پورا جتھا ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے اباجان بالکل بہک گئے ہیں"۔ اس پوری عبارت پر غور سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں آیات یکبار اتری ہیں اور سیاق کلام اسی طرح مربوط پڑھا جا سکتا ہے۔

پھر پوری سورت ایک ہی ٹکڑا ہے اور اس کا انداز بھی واضح طور پر مکی ہے۔ موضوع اور مضمون کے اعتبار سے بھی' انداز گفتگو کے اعتبار سے بھی اور اپنی فضا اور اثرات کے اعتبار سے بھی۔ بلکہ اس پوری سورت میں ان حالات کی ایک صاف صاف جھلک نظر آتی ہے۔ جن میں یہ سورت نازل ہوئی تھی۔ تحریک اسلامی کے لیے یہ نہایت ہی مشکل دور تھا۔ اس دور میں رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بہت ہی وحشت' غربت اور تنہائی محسوس کرتے تھے۔ اہل قریش نے حضورؐ سے بائیکاٹ بھی کر رکھا تھا اور عام الحزن کے بعد کے دور میں جماعت مسلمہ نہایت ہی دشوار وقت سے گزر رہی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان حالات میں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر ایک شریف بھائی کا قصہ نازل فرمایا یعنی یوسف ابن

یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم علیہم السلام اجمعین کا حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی ایسی ہی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا اور ان کے خلاف بھی خود ان کے بھائیوں نے ایسی ہی سازشیں کیں ۔ ان کو کنویں میں ڈالا گیا' اور جب کنویں کے خوف و ہراس سے نجات ملی تو مال کی طرح انہیں فروخت کیا گیا اور انہوں نے غلامی کا دور دیکھا اور ہاتھوں ہاتھ بکے آپ والدین' بھائیوں اور خاندان کی حمایت اور ہمدردی سے محروم رہے ۔ اس کے بعد آپ کے خلاف عزیز مصر کی بیوی اور مصری عورتوں کی سازشیں سامنے آئیں اور اس سے قبل انہوں نے آپ کو ورغلانے کی پوری پوری کوشش بھی کی ۔ پھر عزیز مصر کے گھر کی آرام دہ زندگی کے بعد آپ کو جیل کے شب و روز بھی دیکھنے پڑے ۔ اس کے بعد آپ پر وہ عظیم آزمائش بھی آئی کہ آپ کو ہر قسم کا اقتدار عطا کر دیا گیا ۔ وہ لوگوں کے بارے میں فیصلے کرنے لگے اور پوری مملکت کا معاشی نظام آپ کے ہاتھ میں آگیا اور آپ خزانوں کے مالک ہو گئے ۔ پوری قوم اور اطراف کی اقوام کی راشن بندی کر دی گئی اور آپ اختیارات کا سرچشمہ بن گئے ۔ اب اس کے بعد وہ آزمائش کہ آپ کے سامنے وہ بھائی آتے ہیں جنہوں نے آپ کو اندھے کنویں میں پھینکا تھا ۔ اور بظاہر وہی آپ کی ان تمام مشکلات کے ذمہ دار تھے ۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام نے ان تمام مشکلات کو نہایت ہی صبر سے انگیز کیا ۔ اور یوں پوری مشکلات کے درمیان وہ دعوت اسلامی کا کام مسلسل کرتے رہے ۔ اور ان مشکلات اور آزمائشوں سے گزرتے رہے ۔ آپ کی آخری توجہات اور ترجیحات اس وقت سامنے آتی ہیں جب آپ ان مشکلات سے پوری طرح کامیابی سے گزر جاتے ہیں اور فتح پاتے ہیں اور پھر جب آپ کا خاندان آپ کے ساتھ اٹھتا ہے اور پھر وہ لمحہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کی خواب کی تعبیر واضح طور پر سامنے آتی ہے ۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ گیارہ ستارے ہیں اور چاند و سورج ہیں اور انہیں سجدہ کر رہے ہیں ۔ یہ وقت حضرت یوسف کے لیے نہایت ہی مسرت کا وقت ہے ۔ اور اس میں وہ اللہ کی طرف پوری طرح رخ کیے ہوئے ہیں اور وہ اس دنیاوی مرتبے اور مقام سے پوری طرح برتر اور بالا ہیں ۔ اس مقام پر قرآن کریم نے واقعات کا نقشہ یوں کھینچا ہے :

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ
( ۹ ۹ ) وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا وَقَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ
مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ
الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ اِنَّهٗ هُوَ
الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ( ۱ ۰ ۰ ) رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ
فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ
بِالصّٰلِحِيْنَ ( ۱ ۰ ۱ ) ( ۱۲ : ۹۹ تا ۱۰۱ ) '' پھر جب یہ لوگ یوسف ؑ کے پاس پہنچے' تو اس

نے اپنے والدین کو اپنے ساتھ بٹھالیا اور (اپنے سب کنبے والوں سے) کہا ''چلو' اب شہر میں چلو' اللہ نے چاہا تو امن وچین سے رہو گے'' ـــ (شہر میں داخل ہونے کے بعد) اس نے اپنے والدین کو اٹھا کر اپنے پاس تخت پر بٹھایا اور سب اس کے آگے بے اختیار سجدے میں جھک گئے' یوسف نے کہا ''ابا جان یہ تعبیر ہے' میرے اس خواب کی جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ میرے رب نے اسے حقیقت بنا دیا۔ اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھے قید خانے سے نکالا' اور آپ لوگوں کو صحرا سے بلا کر مجھ سے ملایا حالانکہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال چکا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا رب غیر محسوس تدبیروں سے اپنی مشیت پوری کرتا ہے' بے شک وہ علیم وحکیم ہے 'اے میرے رب تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھایا۔ زمین و آسمان کے بنانے والے' تو ہی دنیا و آخرت میں میرا سرپرست ہے' میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجام کار مجھے صالحین کے ساتھ ملا''۔

یہ تھی حضرت کی آخری دعا۔ یہ دعا ان حالات میں وہ کرتے ہیں کہ وہ پوری طرح اقتدار پر فائز ہیں۔ عیش اور آرام کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور پورے خاندان میں اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دعا یہ ہے کہ اللہ ان کو ایک مسلم کی طرح مارے اور مرنے کے بعد صالحین کی رفاقت دے۔ یہ ہے ان کی آخری آرزو ابتلاؤں اور مصیبتوں کے بعد' طویل صبر اور مشقت جھیلنے کے بعد عظیم کامیابی کے حالات میں۔

جن حالات میں یہ قصہ وارد ہوا ہے اور اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات جس تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے' اور جس انداز سے پھر اس قصے کے واقعات پر تبصرے ہوئے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ مسلمانوں کی تسلی اور تشفی کے لیے نازل ہوا ہے۔ کیونکہ حضور اکرمؐ اور جماعت مسلمہ اس وقت جن حالات سے گزر رہے تھے وہ ایسے ہی تھے کہ کچھ لوگ ہجرت پر مجبور تھے' کچھ پر مظالم ہو رہے تھے' ان کو تسلی اور اطمینان اس بات کا دیا جا رہا ہے کہ جس طرح یوسف بے بس تھے' ان کو اقتدار اعلیٰ ملا' اسی طرح کے حالات تمہارے لیے بھی ہو سکتے ہیں۔

بلکہ اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ تم لوگوں کو بھی مکہ سے نکل کر کسی دوسرے علاقے کی طرف منتقل ہونا ہو گا۔ اور پھر اس دوسرے مرکز سے تمہیں عروج نصیب ہو گا' اگرچہ بظاہر یہ خروج اور ہجرت حالات سے مجبور ہو کر عمل میں آئے گی۔ بعینہ اسی طرح جس طرح حضرت یوسفؑ اپنے والد کی سرپرستی سے نکالے گئے اور مختلف مشکلات سے دوچار ہوئے اور بعد میں ان کو اللہ کی تائید حاصل ہوئی اور ان کو زمین کے اندر اقتدار اعلیٰ مل گیا۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲ : ۲۱) ''اسی طرح ہم نے یوسف کے لیے اس زمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا' اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں''۔

یہ عمل اس وقت شروع ہو گیا تھا جب انہوں نے مصر میں' عزیز مصر کے گھر قدم رکھنا شروع کر دیئے تھے۔ اگرچہ اس وقت وہ ایک نوجوان تھے اور غلاموں کی طرح فروخت ہو رہے تھے۔

اور جو چیز اس وقت میری سوچ پر حاوی ہے' میں اسے محسوس کر رہا ہوں لیکن بیان نہیں کر سکتا' وہ مخصوص تبصرہ

ہے جو اس قصے کے بعد آیا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰۹) حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۱۰) لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۱۱) (۱۲ : ۱۰۹ تا ۱۱۱)

"اے محمد' تم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھیجے تھے وہ سب بھی انسان ہی تھے اور انہی بستیوں کے رہنے والوں میں سے اور انہی کی طرف ہم وحی بھیجتے رہے ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان قوموں کا انجام انہیں نظر آ جاتا جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں' یقیناً آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے اور زیادہ بہتر ہے جنہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی۔ کیا اب بھی تم لوگ نہ سمجھو گے ---- یہاں تک کہ جب پیغمبر لوگوں سے مایوس ہو گئے اور لوگوں نے بھی سمجھ لیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا' تو یکایک ہماری مدد پیغمبروں کو پہنچ گئی۔ جب ایسا موقعہ آ جاتا ہے تو ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں' بچا لیتے ہیں اور مجرموں پر سے ہمارا عذاب ٹالا ہی نہیں جا سکتا۔--- اگلے لوگوں کے ان قصوں میں عقل و ہوش رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے۔ یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے۔ یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہوئی ہیں انہی کی تصدیق ہے اور ہر چیز کی تفصیل اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے"۔

اس تبصرے میں اس سنت الٰہیہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب رسول مایوس ہو جاتے ہیں تو پھر سنت الٰہیہ اپنا کام کرتی ہے' جس طرح حضرت یوسف اپنی طویل مشکلات میں مایوس ہوئے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ مشکلات کے بعد آسانی آ جاتی ہے اور انسان پھر اپنا مقصد پا لیتا ہے۔ یہ وہ اشارات ہیں جن تک صرف مومن دل کو رسائی حاصل ہوتی ہے' جبکہ یہ مومن ایسے ہی مشکل حالات میں زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔ ایسے حالات سے عملاً دوچار ہو کر نفس مومنہ قرآن کریم کا اصل ذائقہ چکھ سکتا ہے اور پھر اس پر نہایت ہی باریک تلمیحات اور گہرے اشارات القاء ہوتے ہیں۔

یہ سورت بعض منفرد خصوصیات کی حامل بھی ہے وہ یہ کہ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بھی پورا موجود ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں قصص کا اسلوب یہ ہے کہ موضوع سخن کے لحاظ سے کسی قصے کا جو حصہ موزوں اور مناسب ہوتا ہے' صرف اس حصے کو لایا جاتا ہے لیکن قصہ یوسف کا معاملہ دیگر قصص کے برعکس ہے۔ یہاں تک سورت ہود میں جو قصص پورے بھی آئے وہ بھی اجمالاً دیئے گئے ہیں لیکن قصہ یوسف مناسب حد تک طویل بھی ہے' مکمل بھی اور ایک

ہی سورت میں بھی۔اور یہ خصوصیت قرآن کے دوسرے قصص سے ممتاز ہے۔

اس قصے کی جو نوعیت تھی اس کے ساتھ مناسب یہی تھا کہ پورا قصہ ہی دے دیا جائے اور پوری طرح اس کی تمام کڑیاں یکجا کر کے لائی جائیں۔یوسف علیہ السلام کے خواب سے یہ قصہ شروع ہوتا ہے اور اس کی انتہا اس خواب کی تاویل پر ہوتی ہے۔کیونکہ قصے کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ ایک ہی جگہ ہونا چاہئے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے کچھ حصے ایک جگہ ہوں اور کچھ دوسری جگہ دوسرے موضوع گفتگو کے ساتھ ہوں۔

اس مخصوص نوعیت کی وجہ سے اس پورے قصے کو ایک ہی جگہ لایا گیا۔اور اس طرح وہ مقصد بھی پوری طرح بیان کر دیا گیا ہے جس کے لیے یہ قصہ بیان ہوا اور اس سے جو نتائج اخذ کیے جانے تھے وہ بھی اخذ ہوئے' اس بارے میں ہمیں عنقریب قدرے مفصل بات کرنی ہوگی جس سے معلوم ہو گا کہ قرآن مجید کا ایک منفرد طرز ادا ہے۔وباللہ التوفیق!

حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ جس طرح اسے قرآن کریم میں لایا گیا ہے وہ اسلام کے منہاج قصہ گوئی کی ایک خوبصورت مثال ہے۔اس قصے میں انسان کے نفسیاتی میلانات' انسانی نظریات اور اسلام کے طرز تربیت اور اسلامی تحریک کے مقاصد کی وضاحت کی گئی ہے۔قرآن کریم میں قصص لانے کا انداز عموماً ایک ہی ہے' لیکن حضرت یوسف ؑ کے قصے کا ایک مخصوص انداز ہے اپنے طرز ادا کے اعتبار سے بھی اور فنی خوبیوں کے اعتبار سے بھی۔

یہ قصہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کردار کے ہر پہلو کو سامنے لاتا ہے' ان کی زندگی کے ہر پہلو کو اجاگر کرتا ہے کیونکہ آپ ہی اس قصے کے ہیرو اور اصل کردار ہیں۔زندگی کے ہر موڑ پر ان کا ردعمل پیش کیا جاتا ہے اور پھر ان پر جو ابتلاء آئے ہیں وہ پوری طرح دکھائے جاتے ہیں۔ان پر جو ابتلاء آئے' اپنی نوعیت اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے مختلف تھے۔مشکلات کا ابتلاء بھی اور خوشحالی کا ابتلاء بھی ہے۔شہوت کے فتنے کا بھی اور حکومت کے اقتدار کا بھی ابتلاء ہے۔غرض مختلف مواقف اور مختلف شخصیات کے مقابلے میں ان کی سوچ اور ان کے تاثرات اس قصے میں موجود ہیں۔یہ ہیرو فی الحقیقت ان تمام ابتلاؤں میں ایک خالص مومن کی طرح سرخرو ہو کر نکلتا ہے اور اللہ کے سامنے دست بدعا ہو کر کھڑا ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے اس سے قبل کہہ دیا۔

اس قصے کے مرکزی کردار کے علاوہ دوسرے کرداروں کی تفصیلات بھی اس میں دی گئی ہیں۔ہر کردار کے خدوخال' اس کی اہمیت کے مطابق دیئے گئے ہیں' دیکھنے والے کے مقام سے کسی کو دور رکھا گیا ہے' اور کسی پر زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے۔یہ قصہ انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو مختلف کرداروں کی صورت میں نہایت ہی حقیقت نگاری کی شکل میں پیش کرتا ہے۔اس میں حضرت یعقوب بطور ایک صابر مطمئن نبی اور ٹوٹ کر اپنے بچوں کے ساتھ محبت کرنے والے انسان کی صورت میں نظر آتے ہیں جن کا عالم بالا کے ساتھ ہر وقت رابطہ قائم ہے۔دوسرا نمونہ اور کردار حضرت یوسف ؑ کے بھائیوں کا ہے جن کے دلوں میں غیرت' حسد اور کینہ پروری کے جذبات موجزن ہیں' وہ سازشوں میں لگے ہوئے ہیں اور جرم کا ارتکاب کرتے ہیں اور آثار جرم کا سامنا کرتے ہیں اور اس میں وہ کبھی سخت تعجب اور حیرانی میں مبتلا ہوتے ہیں اور کبھی شرمندہ ہو کر ناکام ہوتے ہیں۔ان میں سے بھی ایک شخص جو ممتاز کردار رکھتا ہے اس کی شخصیت اور امتیازی خصوصیات کو بھی قلم بند کر دیا جاتا ہے اور قصے کے مختلف مراحل میں اس کا کردار امتیازی نظر آتا ہے۔پھر اس میں عزیز مصر کی بیوی کا بھی ایک کردار سامنے آتا ہے' یہ اپنی نسوانی خواہشات میں اندھی نظر آتی ہے۔مصر

معاشرے کے بادشاہوں کے حرم کا یہ ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور اس کے ذاتی خدوخال بھی اس کے کردار سے اچھی طرح واضح ہیں۔ یہ مصر کے اعلیٰ طبقے کی خواتین کا نمونہ ہے۔ اس قصے میں اس وقت کے معاشرے اور اس میں عورتوں کی سرگرمیوں اور سوچ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ کس طرح وہ حضرت یوسف ؑ کو ورغلانے کی تدابیر کرتی ہیں اور عزیز مصر کی بیوی سب عورتوں کی موجودگی میں کس طرح حضرت یوسف کو برملا دھمکی دیتی ہے اور پھر کس طرح وہ سازشیں کر کے حضرت یوسف کو جیل تک پہنچا دیتی ہے۔ اس میں عزیز مصر کا بھی ایک کردار ہے جس پر اپنے طبقے اور اس وقت کے معاشرے کے رنگ ڈھنگ چھائے ہوئے ہیں۔ اس میں ایک کردار بادشاہ کا بھی ہے جو پس پردہ ہے جو عزیز مصر کی طرح اسٹیج سے دور ہی رہتا ہے۔ غرض اس قصے میں جو کردار بھی سامنے آتے ہیں وہ اپنی سچی اور واقعی تصویر پیش کرتے ہیں' جو لوگ بھی مختلف مواقف' مختلف حالات میں اسٹیج پر آتے ہیں وہ اپنے حقیقی اور قدرتی خدوخال کے ساتھ آتے ہیں۔

غرض مختلف حالات' اور مختلف مناظر میں یہ قصہ اپنے اندر ایک حقیقی واقعیت رکھتا ہے اور یہ اسلام کی فنی طرز ادا کی ایک معیاری اور ممتاز مثال ہے یعنی کسی واقعہ کے محض حقیقی واقعات پر ہی اکتفاء کرنا' گہری سچائی کو پیش کرنا اور اس کے ساتھ قصے کو مزین کرنا اور ہر مرحلے میں حقیقی اور واقعیت پسندی سے کام لینا۔ تمام تاثرات کو ظاہر کرنا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس گندگی سے بچنا جو واقعیت اور حقیقت پسندی کے نام سے آج کل ہمارے لٹریچر میں عام ہے۔

اس قصے میں انسان کی کمزوری کے مراحل بھی آتے ہیں' مثلاً جنسی کمزوری لیکن ایسے مواقع کو بھی اس قصے میں بغیر لگی لپٹی رکھے بغیر نہایت ہی حقیقت پسندی کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے' ایسے مواقع پر نفس انسانی کی جو کیفیات ہوتی ہیں' ان کو نظر انداز نہیں کیا گیا لیکن بیسویں صدی کی جاہلیت جس طرح سفلی جذبات کو ان کیفیات کے ذریعے ابھارتی ہے اور اس کو حقیقت پسندی کا نام دیا جاتا ہے اس سے پوری طرح اجتناب کیا جاتا ہے۔

غرض یہ قصہ طرز ادا کی واقعیت پسندی کے ساتھ ساتھ اور مختلف النوع کرداروں کی موجودگی کے باوجود اپنے ماحول کو مکمل طور پر پاک و صاف رکھتا ہے۔ اس قصے میں جو کردار آتے ہیں مناسب ہے کہ ان پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

○ حضرت یوسف کے بھائی --- ان کے دلوں میں حسد اور کینے کی آگ آہستہ آہستہ سلگ رہی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے دلوں میں اس ہولناک جرم کے ارتکاب کا کوئی خوف نہیں رہتا۔ یہ جرم ان کے نزدیک اب گھناؤنا' عظیم اور مکروہ نہیں رہتا۔ اس کے بعد وہ اس جرم کے ارتکاب کے لیے ایک شرعی جواز بھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ ایک دینی گھرانے کے فرزند تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے اور حضرت اسحاق کے پوتے' چنانچہ یہاں ان کی حقیقی ذہنیت کو قلم بند کیا گیا ہے۔ ان کا دینی رنگ' ان کی فکر' ان کا شعور اور ان کا رسم و رواج ایک ہی فقرے میں قلم بند کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ جرم کرنا بھی چاہتے ہیں اور نیک رہنا اور اچھا انجام بھی چاہتے ہیں' ذرا ملاحظہ فرمائیں:

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِّلسَّائِلِينَ (٧) إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (٨) اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِن بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ (٩) قَالَ

قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ (۱۰) قَالُوْا يٰاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ (۱۱) اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۲) قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ (۱۳) قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (۱٤) فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۱۵) وَ جَآءُوْ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ (۱٦) قَالُوْا يٰاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ (۱۷) وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (۱۸) (۱۲ : ۷ - ۱۸) ”حقیقت یہ ہے کہ یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصے میں پوچھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ اس کے بھائیوں نے آپس میں کہا ”یہ یوسف اور اس کا بھائی' دونوں ہمارے والد کو ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں' حالانکہ ہم ایک پورا جتھا ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ابا جان' بالکل ہی بہک گئے ہیں۔ چلو یوسف کو قتل کر دو یا اسے کہیں پھینک دو تاکہ تمہارے والد کی توجہ صرف تمہارے ہی طرف ہو جائے۔ یہ کام کر لینے کے بعد پھر نیک بن رہنا“۔ اس پر ان میں سے ایک بولا ”یوسف کو قتل نہ کرو' اگر کچھ کرنا ہی ہے تو اسے کسی اندھے کنویں میں ڈال دو۔ کوئی آتا جاتا قافلہ اسے نکال لے جائے گا“۔ اس قرارداد پر انہوں نے اپنے باپ سے کہا ”ابا جان کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے معاملے میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے سچے خیر خواہ ہیں۔ کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجئے' کچھ چر چگ لے گا اور کھیل کود سے بھی دل بہلائے گا۔ ہم اس کی حفاظت کو موجود ہیں۔ باپ نے کہا ”تمہارا اسے لے جانا مجھے شاق گزرتا ہے اور مجھ کو اندیشہ ہے کہ کہیں اسے بھیڑیا نہ پھاڑ کھائے جبکہ تم اس سے غافل ہو“۔ انہوں نے جواب دیا ”اگر ہمارے ہوتے اسے بھیڑیے نے کھا لیا جبکہ ہم ایک جتھا ہیں تو ہم بڑے نکمے ہوں گے“۔ اس اصرار کے ساتھ جب وہ اسے لے گئے' انہوں نے طے کر لیا کہ اسے ایک اندھے کنویں میں چھوڑ دیں تو ہم نے یوسف کو وحی کی کہ ”ایک وقت آئے گا جب تو ان لوگوں کو ان کی یہ حرکت جتائے گا۔ یہ اپنے فعل کے نتائج سے بے خبر ہیں“۔ شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہا ”ابا جان' ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے لگ گئے تھے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا آ کر اسے کھا گیا۔ آپ ہماری

بات کا یقین نہ کریں گے اگرچہ ہم سچے ہی ہوں"۔ اور وہ یوسف کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے تھے۔ یہ سن کر ان کے باپ نے کہا "بلکہ تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا۔ اچھا صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا جو بات تم بتا رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے"۔

اس پورے قصے میں ان کا کردار ایک ہی جیسا ہے' ان بھائیوں میں سے ایک کا موقف قدرے مختلف ہے اور وہ آغاز قصہ سے آخر تک دوسروں سے مختلف ہے۔ اب یہ کنعان سے مصر جاتے ہیں اور یوسف کے مطالبے پر اس کے بھائی کو دوبارہ مصر لے کر جاتے ہیں تاکہ یہ سات سالہ خشک سالی میں مصر سے گندم خرید کر لائیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت یوسف کو یہ تدبیر سمجھاتا ہے کہ وہ ان کے سامان میں پیمانہ رکھ کر اپنے بھائی کو روک لیں۔ اس بہانے سے کہ اس کے سامان سے پیمانہ برآمد ہوا۔ یہ لوگ تو حقیقت سے بے خبر ہیں لیکن اس موقعے پر ان کا پرانا کینہ جاگ اٹھتا ہے۔ کہتے ہیں :

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ (۱۲ : ۷۷) "بھائیوں نے کہا" یہ چوری کرے تو کچھ تعجب کی بات بھی ہے' اس سے پہلے اس کا بھائی (یوسف) بھی چوری کر چکا ہے"۔ یوسف ان کی یہ بات سن کر پی گیا' حقیقت ان پر نہ کھولی' بس اتنا کہہ کر رہ گیا" بڑے ہی برے ہو تم لوگ جو الزام تم لگا رہے ہو اس کی حقیقت خدا خوب جانتا ہے"۔ اور جب یہ لوگ اپنے بوڑھے باپ کو ایک دوسرے صدمے سے دوچار کرتے ہیں تو ان لوگوں کا کردار وہی ہے۔ جب یہ دیکھتے ہیں کہ اس بوڑھے کے دل کے اندر یوسف کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے تو ان کا پرانا کینہ پھٹ پڑتا ہے' اور وہ اپنے بوڑھے باپ کا لحاظ کیے بغیر یہ ریمارکس پاس کرتے ہیں۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ (۸۴) قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ (۸۵) (۱۲ : ۸۴ — ۸۵) "پھر وہ ان کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا" ہائے یوسف"۔ وہ دل ہی دل میں غم سے گھٹا جا رہا تھا اور اس کی آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں۔ بیٹوں نے کہا" خدارا آپ تو ابھی یوسف ہی کو یاد کیے جاتے ہیں۔ نوبت یہ آ گئی ہے کہ اس کے غم میں اپنے آپ کو گھلا دیں گے یا اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے"۔

اور جب آخری منظر سامنے آتا ہے کہ حضرت یوسف اپنی قمیص اپنے باپ کی طرف ارسال کرتے ہیں جب وہ اپنا تعارف کر چکتے ہیں تو انہوں نے جب دیکھا کہ ان کے باپ حضرت یوسف کی خوشبو سونگھ رہے ہیں تو انہیں حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کے درمیان پائے جانے والا یہ باطنی تعلق بھی ناگوار گزرتا ہے۔ اس وقت بھی یہ لوگ اپنے کینہ پر قابو نہیں پاتے اور حضرت یعقوب کو ملامت کرتے ہیں۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (۹۴)

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ (۹۵) (۱۲ : ۹۴ ـ ۹۵) "جب یہ قافلہ روانہ ہوا تو ان کے باپ نے کہا "میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں، تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا۔ گھر کے لوگ بولے "خدا کی قسم آپ ابھی تک اپنے اس پرانے خبط میں پڑے ہوئے ہیں"۔

m عزیز مصر کی بیوی :- اس کا کاسہ جسم شہوت سے لبریز ہے اور قریب ہے کہ جھلک جائے، یہ اندھی شہوت ہے، عورتوں کی قدرتی شرم و حیا کا پردہ اس نے چاک کر لیا ہے۔ ذاتی عزت اور مقام و مرتبے کا خیال بھی اس نے پس پشت ڈال دیا ہے۔ اسے نہ اپنے معاشرتی مقام و مرتبے کا خیال ہے اور نہ خاندانی شرمندگی کی کوئی پروا ہے بلکہ اپنے اس ذلیل مقصد کے حصول کے لیے وہ تمام نسوانی سازشیں بروئے کار لاتی ہے جو عموماً عورتوں کا وطیرہ ہوتی ہیں۔ اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے میں مکاری، اس پر الزام کے لگنے کی وجہ سے خاندان پر جو بدنامی آتی ہے اس سے بچنے کے لیے سازش کرتی ہے اور پھر اپنے آپ کو سزا سے بچا کر ایک بے گناہ شخص کے لیے سزا بھی جلدی سے تجویز کر دیتی ہے۔ یہ دوسری عورتوں کی کمزوریوں سے بھی خوب واقف ہے۔ جس طرح وہ اپنی کمزوریوں سے واقف ہے، اس لیے یہ ایک گہری سازش کے ذریعے اپنی ہم محفل عورتوں کو بھی ننگا کر دیتی ہے۔ اور جب وہ سب ننگی ہو جاتی ہیں تو یہ برملا اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ اس شخص کو میری خواہش پوری کرنا ہو گی۔ اب یہ عورت جامہ حیا چاک کر دیتی ہے اور اب اس کے لیے نہ شرم و حیا مانع ہے نہ اس کا مقام و مرتبہ کسی چیز سے مانع ہے جبکہ یہ اب محض ایک عورت ہی ہے۔ باوجود اس کے کہ قرآن مجید اس عورت کی واقعی تصویر کھینچتا ہے، خصوصاً ایک مخصوص شہوانی حالت میں جس میں ذرا سی بے احتیاطی بھی کلام کے معیار کو گرا سکتی ہے۔ لیکن قرآن کا یہ طرز ادا نہایت ہی معیاری ہے اور اسلامی فن و ادب کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ نازک ترین مراحل میں بھی اسلام یہ چاہتا ہے کہ طرز ادا پاک و صاف ہو اور اس میں کوئی فحاشی نہ ہو۔ اگرچہ ایسا مفہوم اور مقام زیر بحث ہو جس میں انسان نفسیاتی اور جسمانی لحاظ سے ننگا ہو اور جسمانی و شہوانی حالت اپنے اعلیٰ درجے میں ہو۔ ایسے مقامات اور حالات کو آج کل جدید لٹل فن عریانی اور فحاشی اور گندے انداز میں قلم بند کرتے ہیں اور پھر انہیں واقعیت اور فطرت کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ بہرحال جاہلیت جدیدہ کی یہ گندگی ہے اور اسلام واقعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی پاکیزہ فن پیش کرتا ہے۔ ذرا ملاحظہ ہو قرآنی فن۔

وَقَالَ الَّذِیْ اشْتَرٰهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۲۱) وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (۲۲) وَرَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَ قَالَتْ هَیْتَ لَكَ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ۔

۲۳) وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ
الْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (۲٤) وَ اسْتَبَقَا الْبَابَ وَ قَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ
دُبُرٍ وَّ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ
اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲٥) قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ
كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَ هُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ (۲٦) وَ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ
دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَ هُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲۷) فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ
كَيْدِكُنَّ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ (۲۸) يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَ اسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ اِنَّكِ
كُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِيْنَ (۲۹) وَ قَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ
نَّفْسِهٖ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۰) فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ
اِلَيْهِنَّ وَ اَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّ اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّ قَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ
فَلَمَّا رَاَيْنَهٗ اَكْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ
كَرِيْمٌ (۳۱) قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ وَ
لَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَ لَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ (۳۲) قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ
اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ
الْجٰهِلِيْنَ (۳۳) فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

(۳٤) (۱۲ : ۲۱ - ۳٤) ”مصر کے جس شخص نے اسے خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا ”اس کو اچھی طرح رکھنا، بعید نہیں ہے کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا بنا لیں گے“۔ اس طرح ہم نے یوسف کے لیے اس سرزمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا۔ اللہ اپنے کام کر کے رہتا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے قوت فیصلہ اور علم عطا کیا۔ اس طرح ہم نیک

لوگوں کو جزا دیتے ہیں ـــــ جس عورت کے گھر میں وہ تھا وہ اس پر ڈورے ڈالنے لگی اور ایک روز دروازے بند کر کے بولی "آ جا"۔ یوسف ؑ نے کہا "خدا کی پناہ میرے رب نے مجھے اچھی منزلت بخشی ہے ' ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے"۔ وہ اس کی طرف بڑھی اور یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا۔ ایسا ہوا' تا کہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی کو دور کر دیں۔ در حقیقت وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا۔ آخر کار یوسف ؑ اور وہ آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے اور اس نے پیچھے سے یوسف ؑ کی قمیص لے کر پھاڑ دی۔ دروازے پر دونوں نے اس کے شوہر کو موجود پایا۔ اسے دیکھتے ہی عورت کہنے لگی "کیا سزا ہے اس شخص کی جو تیرے گھر والی پر نیت خراب کرے؟ اس کے سوا اور کیا سزا ہو سکتی ہے کہ وہ قید کیا جائے یا اسے سخت عذاب دیا جائے"۔ یوسف نے کہا "یہی مجھے پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی"۔ اس عورت کے اپنے کنبے والوں میں سے ایک شخص نے شہادت پیش کی کہ "اگر یوسف ؑ کی قمیص آگے سے پھٹی ہو تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹا' اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہو تو عورت جھوٹی اور یہ سچا"۔ جب شوہر نے دیکھا کہ یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو اس نے کہا "یہ تم عورتوں کی چالاکیاں ہیں' واقعی بڑی غضب کی ہوتی ہیں تمہاری چالیں۔ یوسف اس معاملے سے درگزر کر اور اے عورت تو اپنے قصور کی معافی مانگ تو ہی اصل میں خطاکار ہے"ـــــ شہر کی عورتیں آپس میں چرچا کرنے لگیں کہ "عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام کے پیچھے پڑی ہوئی ہے' محبت نے اسے بے قابو کر رکھا ہے' ہمارے نزدیک تو وہ صریح غلطی کر رہی ہے"۔ اس نے جو ان کی یہ مکارانہ باتیں سنیں تو ان کو بلاوا بھیج دیا اور ان کے لئے تکیہ دار مجلس آراستہ کی اور ضیافت میں ہر ایک کے آگے چھری رکھ دی (پھر عین اس وقت جب پھل کاٹ کر کھا رہی تھیں) اس نے یوسف کو اشارہ کیا کہ ان کے سامنے نکل آ۔ جب ان عورتوں کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ دنگ رہ گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں اور بے ساختہ پکار اٹھیں "ماشاء اللہ' یہ شخص انسان نہیں ہے' یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے"۔ عزیز کی بیوی نے کہا "دیکھ لیا' یہ ہے وہ شخص جس کے معاملے میں تم مجھ پر باتیں بناتی ہو' بے شک میں نے اسے رجھانے کی کوشش کی تھی مگر یہ بچ نکلا۔ اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل و خوار ہو گا۔ یوسف نے کہا "اے میرے رب قید مجھے منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ میں وہ کام کروں جو یہ مجھ سے چاہتی ہیں۔ اور اگر تو نے ان کی چالوں کو مجھ سے رفع نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں شمار ہوں گا ـــــ اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی اور ان عورتوں کی چالیں اس سے رفع کر دیں۔ بے شک وہی ہے جو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے"۔

اب حضرت یوسف ان عورتوں کی مکاریوں اور عزیز مصر کی بیوی کی وجہ سے جیل میں چلے جاتے ہیں' ایک بار پھر اس عورت کا کردار سامنے آتا ہے' بادشاہ ایک خواب دیکھتا ہے' اس موقع پر وہ شخص جو جیل میں تھا اور رہا ہو گیا تھا' اسے یاد آ جاتا ہے کہ جیل میں خوابوں کی تعبیر بتانے والا شخص موجود ہے۔ اس شخص نے بادشاہ کو تفصیلات بتائیں' بادشاہ نے یوسف علیہ السلام کو طلب فرمایا۔ تو انہوں نے رہا ہونے سے اس وقت تک انکار کر دیا جب تک اس الزام کی تحقیقات نہیں ہو جاتی جس کی وجہ سے وہ جیل گئے۔ بادشاہ نے ان عورتوں کو بلایا۔ ان میں یہ زلیخا بھی موجود ہے۔ اب یہ عورتیں عمر رسیدہ ہیں اور حوادث زمانہ نے ان کو بالغ نظر اور سنجیدہ کر دیا ہے۔ اور اس عرصے میں یہ عورتیں ظاہر ہے کہ حضرت یوسف کی ایمانی قوت سے بھی متاثر ہو گئی تھیں۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ
النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ (۵۰) قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ
رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ
الْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۵۱) ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ
اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ (۵۲) وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ
النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۳) (۱۲ : ۵۰ تا

۵۳) ”اور بادشاہ نے کہا کہ اسے میرے پاس لاؤ“ مگر جب شاہی فرستادہ یوسف کے پاس پہنچا تو اس نے کہا ”اپنے رب (آقا) کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ میرا رب تو ان کی مکاری سے واقف ہی ہے“۔ اس پر بادشاہ نے ان عورتوں سے دریافت کیا ”تمہارا کیا تجربہ ہے اس وقت کا جب تم نے یوسف کو رجھانے کی کوشش کی تھی“۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا ”حاشاللہ ہم نے تو اس میں بدی کا شائبہ تک نہ پایا۔ عزیز کی بیوی بول اٹھی ”اب حق کھل چکا ہے‘ وہ میں ہی تھی جس نے اسے پھسلانے کی کوشش کی تھی‘ بے شک وہ بالکل سچا ہے“۔ (یوسفؑ نے کہا) اس سے میری غرض صرف یہ تھی کہ یہ جان لے کہ میں نے درپردہ اس کی خیانت نہیں کی تھی‘ اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں ان کی چالوں کو اللہ کامیابی کی راہ پر نہیں ڈالتا۔ میں کچھ اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں‘ نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے الا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو‘ بے شک میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے“۔

• حضرت یوسفؑ:- اس قصے میں حضرت یوسف علیہ السلام کا بھی ایک کردار دیا گیا ہے‘ یہ ایک انسان ہیں لیکن بندۂ صالح ہیں۔ قرآن کریم نے حضرت یوسف کی انسانیت پر ایک لمحے کے لیے بھی کوئی ملمع کاری نہیں کی۔ وہ انسان ہیں مگر ایک نبوت کے گھرانے کے پروردہ ہیں۔ دینی ماحول کے تربیت یافتہ‘ ان سب باتوں کے باوجود ان کی انسانیت کے بیان میں مکمل واقعیت سے کام لیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ ان کی انسانیت معصومیت الٰہیہ کے دھاگے سے بندھی ہوئی تھی ورنہ غلطی کا امکان تھا۔ وہ عورتوں کی مکاریوں کے مقابلے میں اپنی کمزوری کا احساس رکھتے ہیں‘ کہ ایک اونچا معاشرہ ہے‘ باغ و راغ اور محلات ہیں‘ شاہی بیگمات میں گھرے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں اگرچہ جیل ہو۔ غرض بحیثیت انسان حضرت یوسف علیہ السلام کی قرآن مجید حقیقی تصویر کھینچتا ہے۔ لیکن اس واقعیت میں مغربی تہذیب کی قصہ گوئی کی گندگی نہیں ہے جسے وہ واقعیت کا نام دیتے ہیں‘ بلکہ یہ فطرت سلیمہ کی حقیقت پسندی ہے؟

☆ عزیز مصر:- ان کا بھی ایک خاص مزاج ہے‘ امیرانہ کبریائی کے ساتھ یہ نخوت و غرور میں بھی مبتلا ہے‘ ظاہری رکھ رکھاؤ اور معاملات کی پردہ داری اور ہر چیز کو راز میں رکھنا اس وقت کے معاشرے کی اپر کلاس کی خصوصیات اس میں موجود ہیں۔

فَلَمَّا رَاٰقَمِيصَهٗ قُدَّمِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ (۲۸) يُوسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْبِكِ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِيْنَ (۲۹) (۱۲: ۲۸ — ۲۹)) جب شوہر نے دیکھا کہ یوسفؑ کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو اس نے کہا "یہ تم عورتوں کی چالاکیاں ہیں' واقعی بڑی غضب کی ہوتی ہیں تمہاری چالیں۔ یوسفؑ اس معاملے سے درگزر کر اور اے عورت تو اپنے قصور کی معافی مانگ تو ہی اصل میں خطاکار ہے"۔

☆ مصری عورتیں:۔ ان عورتوں میں اس معاشرے کے مکمل رنگ ڈھنگ موجود ہیں۔ یہ عزیز کی بیوی اور اس کے غلام کے ساتھ اس کی محبت کے بارے میں ہر طرف چہ میگوئیاں کر رہی ہیں' کہ یہ عورت اپنے نوجوان غلام کے ساتھ تعلقات قائم کرنا چاہتی ہے اور اس کی محبت میں اندھی ہوگئی ہے' ان کی ان چہ میگوئیوں کے پیچھے عزیز مصر کی بیوی کے ساتھ حسد کا جذبہ زیادہ ہے اور بذات خود اس برے فعل سے نفرت کا جذبہ کم ہے' پھر یہ عورتیں جب خود یوسفؑ کو دیکھتی ہیں تو ششدر رہ جاتی ہیں۔ پھر وہ یہ اقرار بھی کر رہی ہیں کہ وہ جو اس عورت کو برا بھلا کہہ رہی تھیں اور اس کے بارے میں داستانیں کہتی پھرتی تھیں اس میں وہ کس قدر حق بجانب ہے۔ اور اس کے جواب میں زلیخا جرأت کر کے اقرار جرم ہی کر لیتی ہے۔ اس کے بعد یہ سب عورتیں حضرت یوسف کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ جاتی ہیں حالانکہ انہوں نے پہلی نظر میں دیکھ لیا تھا کہ اگرچہ حضرت یوسفؑ صورت میں فرشتہ ہیں لیکن سیرت بھی فرشتوں کی ہے۔ اور انہوں نے کہہ دیا تھا کہ

وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (۱۲: ۳۱) "حاشاللہ' یہ بشر نہیں ہے' یہ تو ایک نہایت ہی شریف فرشتہ ہے"۔۔۔ اور حضرت یوسف ہر طرف کے ان حملوں سے تنگ آکر یہ دعا کرتے ہیں:

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ (۱۲: ۳۳) "یوسف نے کہا "اے میرے رب' قید مجھے منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ میں وہ کام کروں جو یہ مجھ سے چاہتی ہیں۔ اگر تو نے ان کی چالوں کو مجھ سے رفع نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا"۔

☆ معاشرہ:۔ اس پورے قصے سے مصری معاشرے کے خدوخال بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ یوسف کے معاملے میں جو اقدامات کیے گئے' باوجود اس کے کہ وہ بے گناہ ثابت ہوگئے تھے۔ ان اقدامات سے ان کا مقصد اپنی خاندانی شرمندگی کو دفن کرنا تھا۔ یہ پروا ان کو نہ تھی کہ حضرت یوسف جیسے بری الذمہ شخص جیل میں جاتے ہیں۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ (۱۲: ۳۵) "پھر ان لوگوں کو یہ سوجھی کہ ایک مدت کے لیے اسے قید کر دیں وہ صریح نشانیاں (پاکدامنی کی) دیکھ چکے تھے"۔

○ اگر ہم حضرت یوسف کی شخصیت اور کردار کو تلاش کریں تو اس پورے قصے میں وہ ہر جگہ نمایاں ہے۔ وہ اپنی شخصیت اور اپنے خاندان اور اپنے عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ وہ ایک عبد صالح ہیں' انسان ہیں' بشر ہیں لیکن خاندان نبوت نے ان کو یہ چمک دمک دی ہے۔ یہ ان کی دینی تربیت کا نتیجہ ہے۔

یہ جیل کے اندھیروں میں ہیں اور جیل کے اندھیرے اور تاریکیاں وہی جانے جس نے دیکھی ہو' لیکن وہ اپنی دعوت کو نہیں بھولتے۔ نہایت دانشمندی' نہایت حکمت اور نہایت ہی نرمی کے ساتھ وہ دعوت دیتے اور فیصلہ کن انداز میں دیتے ہیں۔ معاشرے کے حالات کو جانتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ کس راہ سے اس معاشرے میں اپنی دعوت داخل کر سکتے ہیں۔ وہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ وہ اپنی شخصیت' اپنے حسن اخلاق' اپنے طرز عمل کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور اپنے خاندان اور اپنے دین کی پاکیزگی کو بطور برہان سامنے لاتے ہیں:

وَ دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا وَ قَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ (٣٦) قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (٣٧) وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (٣٨) يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (٣٩) مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (٤٠) يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ (٤١) (١٢: ٣٦ - ٤١)

"قید خانے میں دو اور غلام بھی اس کے ساتھ داخل ہوئے' ایک روز ان میں سے ایک نے اس سے کہا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب کشید کر رہا ہوں"۔ دوسرے نے کہا کہ میرے سر پر روٹیاں رکھی ہیں اور

پرندے اس سے کھا رہے ہیں"۔ دونوں نے کہا "ہمیں اس کی تعبیر بتایئے ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ایک نیک آدمی ہیں"۔ یوسف نے کہا "یہاں جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ علم ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں' اپنے بزرگوں ابراہیمؑ' اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے تمام انسانوں پر' مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے' اے زندان کے ساتھیو' تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو' یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔ اے زندان کے ساتھیو تمہارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ تم میں سے ایک تو اپنے رب (بادشاہ) کو شراب پلائے گا' رہا دوسرا تو اسے سولی چڑھایا جائے گا اور پرندے اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے' فیصلہ ہو گیا اس بات کا جو تم پوچھ رہے تھے"۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حضرت یوسف ایک انسان ہیں' ایک ضعیف انسان۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس قید خانے سے باعزت طور پر نجات پائیں کم از کم بادشاہ کو خبر تو ہونا چاہئے کہ کوئی بے گناہ قید میں ہے۔ شاید اس طرف متوجہ ہو کر وہ اس سازش کی تحقیقات کا حکم دے جس کے نتیجے میں ظالم باہر ہیں اور مظلوم اندر۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو منظور یہی تھا کہ آپ کچھ عرصہ قید میں رہیں اور صرف اللہ پر تکیہ کریں۔

وَقَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ فَاَنْسٰىهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ

فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ (۱۲: ۴۲) "پھر ان میں سے جس کے متعلق خیال تھا کہ وہ رہا ہو جائے گا اس سے یوسف نے کہا کہ "اپنے رب (شاہ مصر) سے میرا ذکر کرنا۔ مگر شیطان نے اسے ایسا غفلت میں ڈالا کہ وہ اپنے رب (شاہ مصر) سے اس کا ذکر کرنا بھول گیا' یوسف کئی سال قید خانے میں پڑا رہا"۔

اب چند سال مزید قید خانے میں گزر جاتے ہیں۔ بادشاہ خواب دیکھتا ہے' اس کے درباری اور مذہبی پیشوا اس کی تعبیر میں حیران رہ جاتے ہیں۔ اس موقعے پر زندان کے ساتھی کو حضرت یوسف یاد آ جاتے ہیں' اب حضرت یوسف ربانی تربیت مکمل کر چکے ہیں اور مکمل بندۂ صالح ہیں۔ وہ اپنی تقدیر اور انجام پر بالکل مطمئن ہیں۔ یہاں تک کہ جب بادشاہ خواب کی بہترین تعبیر سن کر انہیں طلب کرتا ہے تو یہ پر اعتماد قیدی قید خانہ چھوڑ کر اس وقت تک باہر آنے کے لیے تیار نہیں جب تک اس پر الزام کے بارے میں مکمل تحقیقات نہیں ہو جاتی اور وہ باعزت طور پر اس سے بری نہیں ہو جاتا۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ

سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ

(۴۳) قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ (۴۴) وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ (۴۵) يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ لَّعَلِّيْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۴۶) قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ (۴۷) ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ (۴۸) ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ (۴۹) وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ (۵۰) قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۵۱) ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ (۵۲) وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۳) وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ (۵۴) قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ (۵۵) (۱۲ : ۴۳ تا ۵۵) "ایک روز بادشاہ نے کہا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں' اور اناج کی سات بالیں ہری ہیں اور دوسری سات سوکھی۔ اے اہل دربار' مجھے اس خواب کی تعبیر بتاؤ۔ اگر تم خوابوں کا مطلب سمجھتے ہو"۔ لوگوں نے کہا "یہ تو پریشان خوابوں کی باتیں ہیں اور ہم اس طرح کے خوابوں کے مطلب نہیں جانتے"۔ ان دو قیدیوں میں سے جو شخص بچ گیا تھا اور اسے ایک مدت دراز کے بعد اب بات یاد آئی' اس نے کہا "میں آپ حضرات کو اس کی تاویل بتاتا ہوں' مجھے ذرا (قید خانے) بھیج دیجئے"۔ اس نے جا کر کہا "یوسف' اے سراپا راستی' مجھے اس خواب کا مطلب بتا کہ سات موٹی

گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات بالیں ہری ہیں اور سات سوکھی۔ شاید کہ میں لوگوں کے پاس واپس جاؤں اور شاید کہ وہ جان لیں"۔ یوسف نے کہا "سات برس تک لگاتار تم لوگ کھیتی باڑی کرتے رہو گے' اس دوران جو فصلیں تم کاٹو ان میں بس تھوڑا سا حصہ جو تمہاری خوراک کے کام آئے نکالو' اور باقی کو بالیوں ہی میں رہنے دو' پھر سات برس بہت سخت آئیں گے۔ اس زمانے میں وہ سب غلہ کھا لیا جائے گا جو تم اس وقت کے لیے جمع کرو گے۔ اگر کچھ بچے گا تو وہی جو تم نے محفوظ کر رکھا ہو' اس کے بعد پھر ایک سال ایسا آئے گا' جس میں باران رحمت سے لوگوں کی فریاد سنی جائے گی اور وہ اس میں نچوڑیں گے"۔

بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لاؤ' مگر جب شاہی فرستادہ یوسف کے پاس پہنچا تو اس نے کہا "اپنے رب (آقا) کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟" میرا رب تو ان کی مکاریوں سے واقف ہی ہے"۔ اس پر بادشاہ نے ان عورتوں سے دریافت کیا "تمہارا کیا تجربہ ہے اس وقت کا جب تم نے یوسف کو رجھانے کی کوشش کی تھی؟" سب نے یک زبان ہو کر کہا' "حاشاللہ ہم نے تو اس میں بدی کا شائبہ تک نہ پایا"۔ عزیز کی بیوی بول اٹھی "اب حق کھل چکا ہے اور وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی' بے شک وہ بالکل سچا ہے"۔

(یوسف نے کہا) اس سے میری غرض یہ تھی کہ عزیز یہ جان لے کہ میں نے درپردہ اس کی خیانت نہیں کی تھی۔ اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں ان کی چالوں کو اللہ کامیابی کی راہ پر نہیں ڈالتا۔ میں کچھ اپنے نفس کی برات نہیں کر رہا ہوں نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے الا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو' بے شک میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔

بادشاہ نے کہا انہیں میرے پاس لاؤ تاکہ میں اسے اپنے لیے مخصوص کر لوں --- یوسفؑ نے ان سے گفتگو کی تو اس نے کہا "اب آپ ہمارے ہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور آپ کی امانت پر پورا پورا بھروسہ ہے"۔ یوسف نے کہا "ملک کے خزانے میرے سپرد کیجیے میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں"۔

اس مقام پر حضرت یوسف ایک کامل' مکمل' پختہ کار' دانشمند' منجھے ہوئے' سنجیدہ' پر اعتماد اور نہایت ہی چھا جانے والی شخصیت کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں تمام شخصیات صف ثانی میں چلی جاتی ہیں۔ بادشاہ' عزیز مصر' خواتین اور مصری معاشرہ اب اسکرین سے غائب ہے' یہاں سے قصے کا رخ مڑ جاتا ہے لیکن قرآن کریم اسلامی انقلاب کے ہدف کی طرف اشارہ کر دیتا ہے:

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (٥٦) وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ (٥٧) (١٢: ٥٦ - ٥٧) "اس طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسف کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی۔ وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے اپنے لیے جگہ بنائے۔ ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں' نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں مارا نہیں جاتا اور آخرت کا اجر ان لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے' جو ایمان لے آئے اور خدا

ترسی کے ساتھ کام کرتے رہے"۔

اب اس عظیم شخصیت کے سامنے آزمائشوں کا رنگ بدل جاتا ہے۔ پہلے اور قسم کی آزمائشیں تھیں اور اب دوسرے رنگ کی۔ اور وہ ایک پختہ کار شخص کی طرح ان میں سے کامرانی کے ساتھ نکلتے جاتے ہیں' اور نہایت ہی اطمینان اور خود اعتمادی کے ساتھ۔

○ سب سے پہلے ان کا سامنا اپنے ان بھائیوں سے ہوتا ہے جنہوں نے ان کے ساتھ نہایت ہی شنیع سلوک کیا تھا۔ لیکن اب وہ ان کے مقابلے میں بالادستی کے مالک ہیں۔ لیکن وہ ضبط کیے ہوئے ہیں' ان کا ردعمل نہایت ہی کھلا ہے' ان کے اقدام بالکل سیدھے ہیں۔

وَ جَآءَ اِخْوَةُ یُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَیْهِ فَعَرَفَهُمْ وَ هُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (۵۸) وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِیْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِیْكُمْ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْٓ اُوْفِی الْكَیْلَ وَ اَنَا خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ (۵۹) فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَا كَیْلَ لَكُمْ عِنْدِیْ وَ لَا تَقْرَبُوْنِ (۶۰) قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَ اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ (۶۱) وَقَالَ لِفِتْیٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِیْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓی اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ (۶۲) (۱۲ : ۵۸ تا ۶۲)

"یوسف کے بھائی مصر آئے اور اس کے ہاں حاضر ہوئے۔ اس نے انہیں پہچان لیا مگر وہ اس سے ناآشنا تھے۔ پھر جب اس نے ان کا سامان تیار کروادیا تو چلتے وقت ان سے کہا: "اپنے سوتیلے بھائی کو میرے پاس لانا دیکھتے نہیں ہو کہ میں کس طرح پیمانہ بھر کر دیتا ہوں اور کیسا اچھا مہمان نواز ہوں۔ اگر تم اسے نہ لاؤ گے تو میرے پاس تمہارے لیے کوئی غلہ نہیں ہے' بلکہ تم میرے قریب بھی نہ پھٹکنا"۔ انہوں نے کہا ہم کوشش کریں گے کہ والد صاحب اسے بھیجنے پر راضی ہو جائیں۔ اور ہم ایسا ضرور کریں گے"۔ یوسف نے اپنے غلاموں کو اشارہ کیا کہ ان لوگوں نے غلے کے عوض جو مال دیا ہے وہ چپکے سے ان کے سامان ہی میں رکھ دو"۔ یہ یوسف نے اس امید پر کہا کہ گھر پہنچ کر وہ اپنا واپس پایا ہوا مال پہچان جائیں اور عجیب نہیں کہ پھر پلٹیں"۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ انہیں تدبیر سمجھاتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کو روک لیں۔ دیکھتے ہیں کہ ان کی شخصیت نہایت ہی پختہ کار' دانشمند' پراعتماد' ضبط کرنے والی' صبر کرنے والی اور نہایت ہی حکیمانہ پالیسیوں والی بن گئی ہے۔

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓی اَبِیْهِمْ قَالُوْا یٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَیْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۶۳) قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَیْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓی اَخِیْهِ مِنْ قَبْلُ فَاللّٰهُ خَیْرٌ

حفظًا وهو ارحم الرحمين (٦٤) ولما فتحوا متاعهم وجدوا بضاعتهم ردت
اليهم قالوا يابانا ما نبغي هذه بضاعتنا ردت الينا ونمير اهلنا ونحفظ اخانا و
نزداد كيل بعير ذلك كيل يسير (٦٥) قال لن ارسله معكم حتى تؤتون موثقا من
الله لتاتنني به الا ان يحاط بكم فلما اتوه موثقهم قال الله على ما نقول وكيل
(٦٦) وقال يبني لا تدخلوا من باب واحد وادخلوا من ابواب متفرقة وما
اغني عنكم من الله من شيء ان الحكم الا لله عليه توكلت وعليه فليتوكل
المتوكلون (٦٧) ولما دخلوا من حيث امرهم ابوهم ما كان يغني عنهم من الله
من شيء الا حاجة في نفس يعقوب قضها وانه لذو علم لما علمنه ولكن اكثر
الناس لا يعلمون (٦٨) ولما دخلوا على يوسف اوى اليه اخاه قال اني انا
اخوك فلا تبتئس بما كانوا يعملون (٦٩) فلما جهزهم بجهازهم جعل السقاية
في رحل اخيه ثم اذن مؤذن ايتها العير انكم لسرقون (٧٠) قالوا واقبلوا
عليهم ماذا تفقدون (٧١) قالوا نفقد صواع الملك ولمن جاء به حمل بعير و
انا به زعيم (٧٢) قالوا تالله لقد علمتم ما جئنا لنفسد في الارض وما كنا
سرقين (٧٣) قالوا فما جزاؤه ان كنتم كذبين (٧٤) قالوا جزاؤه من وجد في
رحله فهو جزاؤه كذلك نجزي الظلمين (٧٥) فبدا باوعيتهم قبل وعاء اخيه ثم
استخرجها من وعاء اخيه كذلك كدنا ليوسف ما كان لياخذ اخاه في دين
الملك الا ان يشاء الله نرفع درجت من نشاء وفوق كل ذي علم عليم (٧٦)
قالوا ان يسرق فقد سرق اخ له من قبل فاسرها يوسف في نفسه ولم يبدها لهم

قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ (۷۷) قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا
كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ اِنَّا نَرٰكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۷۸) قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا
مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ (۷۹) (۱۲: ۶۳ – ۷۹) "جب وہ اپنے باپ کے پاس گئے تو کہا ابا جان' آئندہ ہم کو غلہ دینے سے انکار کر دیا گیا ہے' لہٰذا آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ ہم غلہ لے کر آئیں۔ اور اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں"۔ باپ نے جواب دیا "کیا میں اس معاملے میں تم پر ویسا ہی بھروسہ کروں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی کے معاملے میں کر چکا ہوں؟ اللہ ہی بہتر محافظ ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے"۔ پھر جیسا انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کا مال بھی انہیں واپس کر دیا گیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ پکار اٹھے "ابا جان اور ہمیں کیا چاہئے دیکھئے یہ ہمارا مال بھی ہمیں دے دیا گیا ہے' بس اب ہم جائیں گے اور اپنے اہل و عیال کے لیے رسد لے آئیں گے' اپنے بھائی کی حفاظت بھی کریں گے اور ایک بار شتر اور زیادہ بھی لائیں گے۔ اتنے غلے کا اضافہ آسانی کے ساتھ ہو جائے گا"۔ ان کے باپ نے کہا "میں اس کو ہرگز تمہارے ساتھ نہ بھیجوں گا جب تک تم اللہ کے نام سے مجھے کوئی پیمان نہ دے دو کہ اسے میرے پاس ضرور لے کر آؤ گے الا یہ کہ کہیں تم گھیر ہی لے جاؤ"۔ جب انہوں نے اس کو اپنے پیمان دے دیئے تو اس نے کہا "دیکھو ہمارے اس قول پر اللہ نگہبان ہے"۔ پھر اس نے کہا "میرے بچو' مصر کے دارالسلطنت میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا۔ مگر میں اللہ کی مشیت سے تم کو نہیں بچا سکتا' حکم اس کے سوا کسی کا بھی نہیں چلتا' اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور جس کو بھی بھروسہ کرنا ہے اسی پر کرے"۔ اور واقعہ بھی یہی ہوا کہ جب وہ اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق شہر میں داخل ہوئے تو اس کی یہ احتیاطی تدبیر اللہ کی مشیت کے مقابلے میں کچھ بھی کام نہ آ سکی۔ ہاں یعقوب کے دل میں جو ایک کھٹک تھی' اسے دور کرنے کے لیے اس نے اپنی سی کوشش کی۔ بے شک وہ ہماری دی ہوئی تعلیم سے صاحب علم تھا' مگر اکثر لوگ معاملے کی حقیقت کو جانتے نہیں ہیں --- یہ لوگ یوسف کے حضور پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس الگ بلا لیا اور اسے بتا دیا کہ "میں تیرا ہی بھائی ہوں"۔ اب تو ان باتوں کا غم نہ کر جو یہ لوگ کرتے رہے ہیں" --- جب یوسفؑ ان بھائیوں کا سامان لدوانے لگا تو اس نے اپنے بھائی کے سامان میں اپنا پیالہ رکھ دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا "اے قافلے والو تم لوگ چور ہو؟ انہوں نے پلٹ کر پوچھا "تمہاری کیا چیز کھو گئی ہے؟" سرکاری ملازموں نے کہا "بادشاہ کا پیمانہ ہم کو نہیں ملتا"۔ جو شخص لا کر دے گا اس کے لیے ایک بار شتر انعام ہے۔ اس کا میں ذمہ دار ہوں"۔ ان بھائیوں نے کہا "خدا کی قسم تم لوگ خوب جانتے ہو کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے اور ہم چوریاں کرنے والے لوگ نہیں"۔ انہوں نے کہا "اچھا اگر تمہاری بات جھوٹی نکلی تو چور کی کیا سزا ہے؟" انہوں نے کہا "اس کی سزا؟ جس کے سامان میں سے چیز نکلے وہ آپ ہی اپنی سزا میں رکھ لیا جائے' ہمارے ہاں تو ایسے ظالموں کو سزا دینے کا یہی طریقہ ہے؟ تب یوسفؑ نے اپنے بھائی سے پہلے ان کی خرجیوں کی تلاشی لینی شروع کی۔ پھر اپنے بھائی کی خرجی سے گم شدہ چیز برآمد کر لی۔ اس طرح ہم نے یوسف کی تائید اپنی تدبیر سے کی۔ اس کا یہ کام نہیں تھا کہ بادشاہ کے دین میں اپنے بھائی کو پکڑتا۔ الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔ ہم جس کے درجے چاہتے ہیں' بلند کر دیتے ہیں' اور ایک علم رکھنے والا ایسا ہے جو ہر صاحب علم سے

بالا تر ہے ۔ ان بھائیوں نے کہا "یہ چوری کرے تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے ۔ اس سے پہلے اس کا بھائی بھی چوری کر چکا ہے ۔ یوسف ان کی یہ بات سن کر پی گیا ۔ حقیقت ان پر نہ کھولی' بس اتنا کہہ کر رہ گیا" کہ بڑے ہی برے ہو تم لوگ' جو الزام تم لگا رہے ہو' اس کی حقیقت خدا خوب جانتا ہے"۔۔۔ انہوں نے کہا اے سردار ذی اقتدار' اس کا باپ بہت ہی بوڑھا آدمی ہے' اس کی جگہ آپ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے ۔ ہم آپ کو بڑا ہی نیک نفس انسان پاتے ہیں"۔ یوسف نے کہا "پناہ بخدا' دوسرے کسی شخص کو ہم کیسے رکھ سکتے ہیں جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے اس کو چھوڑ کر دوسرے کو رکھیں گے تو ہم ظالم ہوں گے"۔

○ ایک بار پھر ہم ان سے ملتے ہیں' حضرت یعقوب کی مشکلات اور مصیبتیں انتہا کو پہنچ گئی ہیں ۔ اب اللہ کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ خاندان یعقوب کی مشکلات کا دور ختم کر دیا جائے ۔ حضرت یوسف بھی مشتاق ہیں کہ اپنے والدین کو دیکھ سکیں ۔ انہوں نے اپنے بھائیوں کو بھی مشکلات میں دیکھا' ان کا دل پسیج گیا ۔ چنانچہ ان حالات میں وہ پردۂ راز داری سے باہر آگئے ۔ اس وقت انہوں نے بھائیوں کو بہرحال قدرے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور ایک شریف بھائی کی طرح معاف کر دیا ۔ جو بات بھی اس قصے' میں سامنے آتی ہے وہ نہایت ہی نیچرل اور ایک کڑی کے بعد متوقع کڑی آتی ہے' کیونکہ اس عظیم شخصیت سے قاری یہی توقع کرتے ہیں :

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ (۸۸) قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ (۸۹) قَالُوْۤا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَ هٰذَاۤ اَخِيْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۹۰) قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ (۹۱) قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (۹۲) اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا وَ اْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۹۳) (۱۲:

۸۸ تا ۹۳) "جب یہ لوگ مصر میں جا کر یوسفؑ کی پیشی میں داخل ہوئے تو انہوں نے عرض کیا کہ "اے سردار ذی اقتدار ہم اور ہمارے اہل و عیال سخت مصیبت میں مبتلا ہیں اور ہم کچھ حقیری پونجی لے کر آئے ہیں' آپ ہمیں بھرپور غلہ عنایت فرمائیں اور ہم کو خیرات دیں' اللہ خیرات کرنے والوں کو جزا دیتا ہے"۔ اس نے کہا تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا؟ جبکہ تم نادان تھے"۔ وہ چونک کر بولے "ہائیں! کیا تم یوسف ہو؟" اس نے کہا "ہاں" میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے ۔ اللہ نے ہم پر احسان فرمایا' حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی تقویٰ اور صبر سے کام لے

تو اللہ کے ہاں ایسے نیک لوگوں کا اجر مارا نہیں جاتا" ۔انہوں نے کہا "بخدا تم کو اللہ نے ہم پر فضیلت بخشی اور واقعی ہم خطاکار ہی تھے" ۔اس نے جواب دیا' آج تم پر کوئی گرفت نہیں' اللہ تمہیں معاف کرے ۔وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے ۔ جاؤ' میری یہ قمیص لے جاؤ اور میرے والد کے منہ پر ڈال دو ان کی بینائی لوٹ آئے گی اور اپنے سب اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ" ۔

○ سب سے آخر میں حضرت یوسف بارگاہ رب العزت میں کھڑے ہیں' جبکہ دنیا میں وہ اقتدار کے عروج پر ہیں ۔ روحانی علوم کے ذریعہ وہ خوابوں کی تعبیر کرتے ہیں' خود ان کی اپنی خوابوں کی تعبیر ان کے لیے اقتدار اعلیٰ کی صورت میں سامنے آگئی ہے ۔ایسے حالات میں وہ حقیقی مقتدر اعلیٰ کی بارگاہ یوں دست بدعا ہیں ۔ دنیاوی اقتدار کو نظرانداز کر کے اب وہ اک دوسرے جہان کا اقتدار طلب کرتے ہیں :

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ

( ۱۲ : ۱۰۱ ) "اے میرے رب' تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھایا ۔زمین و آسمان کے بنانے والے' تو ہی تو دنیا و آخرت میں میرا سرپرست ہے' میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجام کار مجھے صالحین کے ساتھ ملا" ۔

غرض حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت نہایت ہی جامع شخصیت ہے اور خاندان نبوت کی تربیت اور بنیادی خصائص اس میں حقیقت پسندانہ انداز میں پوری طرح جلوہ گر ہیں ۔

☆ حضرت یعقوب :- اس قصے کا ایک اہم کردار حضرت یعقوب ہیں' ان کو اپنے بیٹے سے بے حد محبت ہے' لیکن وہ خدارسیدہ نبی بھی ہیں اور خدا کی طرف سے جو بھی آزمائش آتی ہے اس پر صبر کرتے ہیں ۔وہ دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسف ؑ کی خوابیں نہایت ہی فرحت بخش ہیں' ان میں ان کے لیے عظیم خوشخبری ہے' لیکن اس ہونہار لڑکے کے درخشاں مستقبل کے بارے میں ان کی مومنانہ بصیرت خطرات کو بھی بھانپ لیتی ہے اور وہ اپنے خیالات کا اظہار نہایت ہی نیچرل اور حقیقت پسندانہ انداز میں کرتے ہیں :

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (٥) وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (٦) ( ۱۲ : ٤ - ٦ ) "جب یوسف ؑ نے اپنے باپ سے کہا' ابا جان میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند ہیں اور وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں" ۔جواب میں اس

کے باپ نے کہا "بیٹا اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا ورنہ وہ تیرے درپے آزار ہو جائیں گے' حقیقت یہ ہے کہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے اور ایسا ہی ہو گا' تیرا رب تجھے منتخب کرے گا' اور تجھے باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھائے گا اور تیرے اوپر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کرے گا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے بزرگوں ابراہیمؑ اور اسحاق پر کر چکا ہے' یقیناً تیرا رب علیم و حکیم ہے"۔

اب حضرت یعقوب علیہ السلام دوبارہ اس قصے میں ایک حقیقت پسند اور واقعیت پسند انسان کی شکل میں سامنے آئے کہ جب ان کے بیٹے انہیں حضرت یوسفؑ کے بارے میں ورغلاتے ہیں اور اس کے بعد انہیں ایک نہایت ہی دلدوز خبر سناتے ہیں۔

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ (۱۱) اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۲) قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ (۱۳) قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (۱۴) فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۱۵) وَ جَآءُوْۤ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ (۱۶) قَالُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ (۱۷) وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (۱۸)

(۱۲ : ۱۱ - ۱۸) "انہوں نے کہا "ابا جان کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے معاملے میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے سچے خیر خواہ ہیں۔ کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجئے' کچھ چر چگ لے گا اور کھیل کود سے بھی دل بہلائے گا۔ ہم اس کی حفاظت کو موجود ہیں۔ باپ نے کہا "تمہارا اسے لے جانا مجھے شاق گزرتا ہے اور مجھ کو اندیشہ ہے کہ کہیں اسے بھیڑیا نہ پھاڑ کھائے جبکہ تم اس سے غافل ہو"۔ انہوں نے جواب دیا "اگر ہمارے ہوتے اسے بھیڑیئے نے کھا لیا جبکہ ہم ایک جتھا ہیں تو ہم بڑے نکمے ہوں گے"۔ اس اصرار کے ساتھ جب وہ اسے لے گئے' انہوں نے طے کر لیا کہ اسے ایک اندھے کنوئیں میں چھوڑ دیں تو ہم نے یوسف کو وحی کی کہ "ایک وقت آئے گا جب تو ان لوگوں کو ان کی یہ حرکت جتائے گا۔ یہ اپنے فعل کے نتائج سے بے خبر ہیں"۔

شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہا "ابا جان' ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا آکر اسے کھا گیا۔ آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے

چاہے ہم سچے ہی ہوں اور وہ یوسف کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے تھے۔ یہ سن کر ان کے باپ نے کہا "کہ تمہارے نفس نے تمہارے لیے 'ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا' اچھا صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا' جو بات تم بتا رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے"۔

اس کے بعد اس شخصیت عظیمہ سے ہماری ملاقات ہوتی ہے۔ ان کے بیٹے دوسری بار ان سے وہی مطالبہ کرتے ہیں کہ دل کی تسلی کے لیے یوسف کا جو بھائی باقی تھا اسے بھی ان کے ساتھ کر دیں اور یہ کہ اس کا مطالبہ عزیز مصر نے کیا ہے' جو دراصل یوسف ہی تھے مگر وہ اسے جانتے نہ تھے اور یہ کہ عزیز مصر نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ایک بار شتر گندم ہمیں زیادہ دے گا۔ جبکہ سخت خشک سالی ہے اور قحط پڑا ہوا ہے۔

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۶۳) قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (۶۴) وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ (۶۵) قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ

(۶۶) (۱۲ : ۶۳ تا ۶۶) "جب وہ اپنے باپ کے پاس گئے تو کہا ابا جان' آئندہ ہم کو غلہ دینے سے انکار کر دیا گیا ہے' لہٰذا آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ ہم غلہ لے کر آئیں۔ اور اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں"۔ باپ نے جواب دیا "کیا میں اس معاملے میں تم پر ویسا ہی بھروسہ کروں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی کے معاملے میں کر چکا ہوں؟ اللہ ہی بہتر محافظ ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے"۔ پھر جیسا انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کا مال بھی انہیں واپس کر دیا گیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ پکار اٹھے "ابا جان اور ہمیں کیا چاہئے دیکھئے یہ ہمارا مال بھی ہمیں دے دیا گیا ہے' بس اب ہم جائیں گے اور اپنے اہل و عیال کے لیے رسد لے آئیں گے' اپنے بھائی کی حفاظت بھی کریں گے اور ایک بار شتر اور زیادہ بھی لائیں گے۔ اتنے غلے کا اضافہ آسانی کے ساتھ ہو جائے گا"۔ ان کے باپ نے کہا "میں اس کو ہرگز تمہارے ساتھ نہ بھیجوں گا جب تک تم اللہ کے نام سے مجھے کوئی پیمان نہ دے دو کہ اسے میرے پاس ضرور لے کر آؤ گے الا یہ کہ کہیں تم گھیر ہی لئے جاؤ"۔ جب انہوں نے اس کو اپنے پیمان دے دیئے تو اس نے کہا "دیکھو ہمارے اس قول پر اللہ نگہبان ہے"۔ پھر اس نے کہا "میرے بچو' مصر کے دارالسلطنت میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا۔ مگر میں اللہ کی مشیت سے تم کو نہیں بچا سکتا' حکم اس کے سوا کسی کا بھی نہیں چلتا' اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور جس کو بھی بھروسہ کرنا ہے اسی پر کرے"۔

اور واقعہ بھی یہی ہوا کہ جب وہ اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق شہر میں داخل ہوئے تو اس کی یہ احتیاطی تدبیر اللہ کی مشیت کے مقابلے میں کچھ بھی کام نہ آ سکی ۔ہاں یعقوب کے دل میں جو ایک کھٹک تھی 'اسے دور کرنے کے لیے اس نے اپنی سی کوشش کی 'بے شک وہ ہماری دی ہوئی تعلیم سے صاحب عالم تھا' مگر اکثر لوگ معاملے کی حقیقت کو جانتے نہیں"۔

اس کے بعد اس قصے میں ان کا کردار اس وقت سامنے آتا ہے جب وہ دوسرے صدمے سے دوچار ہوتے ہیں ۔یہ خدارسیدہ نبی ہیں اور بے پناہ محبت کرنے والے ہیں ۔یہ اس وقت جب اللہ نے ایک خاص تدبیر کے ذریعے یوسف کے بھائی کو مصر میں رکوا دیا۔ حضرت یعقوب کے بیٹوں میں ایک صاحب جو معتدل شخصیت کے مالک تھے وہ بھی مصر ہی میں رک جاتے ہیں 'ان کی شخصیت کا یہ اعتدال اس پورے قصے میں نمایاں رہا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ میں کن آنکھوں سے باپ کا سامنا کروں یا تو وہ اجازت دیں یا پھر اللہ کوئی اور صورت نکال دے ۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِیْ یُوْسُفَ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى یَاْذَنَ لِیْۤ اَبِیْۤ اَوْ یَحْكُمَ اللّٰهُ لِیْ وَ هُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ (٨٠) اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِیْكُمْ فَقُوْلُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا كُنَّا لِلْغَیْبِ حٰفِظِیْنَ (٨١) وَ سْـَٔلِ الْقَرْیَةَ الَّتِیْ كُنَّا فِیْهَا وَ الْعِیْرَ الَّتِیْۤ اَقْبَلْنَا فِیْهَا وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (٨٢) قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَنِیْ بِهِمْ جَمِیْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ (٨٣) وَ تَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ یٰۤاَسَفٰى عَلٰى یُوْسُفَ وَ ابْیَضَّتْ عَیْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِیْمٌ (٨٤) قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ یُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِیْنَ (٨٥) قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (٨٦) یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَ اَخِیْهِ وَ لَا تَایْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا یَایْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (٨٧) (١٢: ٨٠ - ٨٧)

"جب وہ یوسف سے مایوس ہو گئے تو ایک گوشے میں جا کر مشورہ کرنے لگے ان میں جو سب سے بڑا تھا وہ بولا "تم جانتے نہیں کہ تمہارے والد تم سے خدا کے نام پر عہد و پیمان لے چکے ہیں اور اس سے پہلے یوسف کے معاملے میں جو زیادتی تم کر چکے ہو وہ بھی تم کو معلوم ہے ۔اب میں تو یہاں سے ہرگز نہ جاؤں گا جب تک کہ میرے والد مجھے اجازت

نہ دے دیں یا پھر اللہ ہی میرے حق میں فیصلہ فرما دے کہ وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے - تم جاکر اپنے والد سے کہو کہ "ابا جان' آپ کے صاحبزادے نے تو چوری کی ہے 'ہم نے اسے چوری کرتے ہوئے نہیں دیکھا جو کچھ ہمیں معلوم ہے بس وہی ہم بیان کر رہے ہیں اور غیب کی نگہبانی تو ہم نہ کر سکتے تھے - آپ اس بستی کے لوگوں سے پوچھ لیجئے جہاں ہم تھے - اس قافلے سے دریافت کر لیجئے جس کے ساتھ ہم آئے ہیں - ہم اپنے بیان میں بالکل سچے ہیں"--- باپ نے یہ داستان سن کر کہا" دراصل تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک اور بڑی بات کو سہل بنا دیا' اچھا اس پر بھی صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا - کیا بعید کہ اللہ ان سب کو مجھ سے ملا دے' وہ سب کچھ جانتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہیں" - پھر وہ ان کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا" ہائے یوسف" وہ دل ہی دل میں غم سے گھٹا جا رہا تھا اور اس کی آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں - بیٹوں نے کہا" خدارا آپ تو بس یوسف ہی کو یاد کیے جا رہے ہیں - نوبت یہ آگئی ہے کہ اس کے غم میں اپنے آپ کو گھلا دیں گے یا اپنی جان ہلاکت میں ڈالیں گے" - اس نے کہا" میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا' اور اللہ سے جیسا میں واقف ہوں تم نہیں ہو - میرے بچو' جاکر یوسف اور اس کے بھائی کی کچھ ٹوہ لگاؤ' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو' اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں" -

یہ ضعیف بوڑھا' اس قصے کے آخری منظر میں بھی نہایت ہی واقعیت پسند ہے - اس طویل غم نے اسے توڑ پھوڑ دیا ہے - اب وہ دور سے یوسف کی قمیص کو سونگھ لیتا ہے' وہ اپنے بیٹوں کی ملامت کا بھی مقابلہ کرتا ہے لیکن اسے جو امید ہے وہ شک نہیں کرتا کہ وہ پوری نہ ہوگی - اسے اپنے رب پر پورا پورا بھروسہ ہے -

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ اَبُوهُمْ اِنِّي لَاَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (۹۴) قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ (۹۵) فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۹۶) قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ (۹۷) قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۹۸) (۱۲: ۹۴ - ۹۸)

"جب قافلہ مصر سے روانہ ہوا تو ان کے باپ نے (کنعان میں) کہا" میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں' تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں" - گھر کے لوگ بولے" خدا کی قسم آپ ابھی تک اپنے اسی پرانے خبط میں پڑے ہوئے ہیں"--- پھر جب خوشخبری لانے والا آیا تو اس نے یوسف کی قمیص یعقوب کے منہ پر ڈال دی اور یکایک اس کی بینائی عود کر آئی - تب اس نے کہا "میں تم سے کہتا نہ تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے" - سب بول اٹھے" ابا جان آپ ہمارے گناہوں کی بخشش کی دعا کریں واقعی ہم خطاکار تھے" - اس نے کہا: "میں اپنے رب سے تمہارے لیے معافی کی درخواست کروں گا' وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے" -

یہ ہے وہ شخصیت جس کے خدوخال یکساں ہیں' جس کا شعور حقیقت پسندانہ ہے' وہ ہر حالت اور ہر صورت میں

ربانی شعور رکھتے ہیں ۔ ان کے اندر کوئی ملمع کاری نہیں ہے ' ان کی سیرت میں کوئی جھول نہیں ہے اور ان کے معیار اخلاق میں کوئی تبدیلی نہیں ہے ۔

---OOO---

اس قصے کے کرداروں میں جو حقیقت پسندی ' صداقت ' پاکیزگی ' صفائی ہے وہ صرف اس قصے کے کرداروں تک ہی محدود نہیں ہے ۔ آپ نے دیکھ لیا کہ یہاں اشخاص کی ایک بڑی تعداد کا ذکر اس قصے میں لایا گیا ہے ' بلکہ اس قصے کے واقعات ' ان کا طرز ادا' ان کے زمان و مکان اور ظروف و احوال بھی بالکل نیچرل ہیں اور حسن و خوبی سے بھی مالا مال ہیں ' جس معاشرے اور سوسائٹی میں یہ واقعات ہو رہے ہیں ' وہ بھی نہایت ہی قدرتی اور بے ساختہ ہے ۔ اس قصے کی ہر حرکت ہر لفظ اور ہر سوچ اپنے قدرتی وقت اور انداز پر آتی ہے اور ایسی شکل و صورت میں آتی ہے جس کی انسان توقع کرتا ہے ۔ اور اس وقت آتی ہے جب اس کے لیے اسٹیج تیار ہوتا ہے ۔ ہر حرکت ' ہر بات اور ہر شخصیت ضرورت کے مطابق نمایاں کی گئی ہے ۔ اور ضرورت کے مطابق اسے پس منظر میں رکھا گیا ہے جیسا کہ اس سے قبل ہم کرداروں کے سلسلے میں تفصیل سے بحث کر آئے ہیں ۔

اس قصے میں جنسی لمحات بھی آتے ہیں لیکن وہ اس رنگ میں ہیں جس قدر پاکیزہ رنگ میں انسان کے ساتھ مناسب ہیں اور قدرتی ہیں ۔ کسی قدرتی اور طبیعی انداز میں نہ کمی کی گئی ہے اور نہ ہی اس میں بے جا مبالغہ ہے ۔ ہر بات ' ہر حرکت اور ہر لکٹ نہایت ہی متناسب قدرتی اور مکمل ہے ۔ لیکن جنس کو اس قصے پر حاوی نہیں کیا گیا کہ گویا انسانی اقدار میں ایک جنس اور سیکس ہی ہے اور تمام باتوں ' تمام مظاہر اور تمام افعال کو صرف اس محور کے گرد گھماتا ہے جیسا کہ آج کی جاہلیت جدیدہ نے قصص کو اس انداز میں پیش کیا ہے اور وہ اس کی داعی ہے اور اسے واقعیت کہتی ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ جاہلیت انسان کو بحیثیت انسان مسخ کر دیتی ہے ' اسے حیوان بنا دیتی ہے اور یہ کام وہ فنی سچائی اور واقعیت اور حقیقت کے عنوان سے کرتی ہے ۔ جاہلیت جب جنسی لمحات کا اظہار کرتی ہے ' وہ ان لمحات کو اس قدر طول دیتی چلی جاتی ہے کہ زمان و مکان اور حرکت میں اسے جنسی لمحات و حرکات ہی نظر آتے ہیں ۔ چنانچہ انسانی زندگی کو وہ ایک گندا تالاب بنا دیتی ہے جس کی سطح کو وہ خوب مزین کرتی ہے ۔ سطح پر پھول تیر رہے ہوتے ہیں لیکن سطح سے نیچے گند اگٹر ہی ہوتا ہے ۔

جاہلیت کیا فی الواقعہ اس کام کو واقعیت سمجھ کر کرتی ہے ؟ کیا وہ فی الواقعہ ایک حقیقی تصویر کھینچنا چاہتی ہے ؟ نہیں ' ہرگز نہیں ' نہیں یہ صیہونیوں کے پروٹوکولز کے مطابق سب کچھ ہو رہا ہے ۔ بین الاقوامی صیہونیت کی اسکیم یہ ہے کہ تمام انسانوں کو ننگا کر کے ' انسانی اقدار سے محروم کر کے دنیا کو یہ بتایا جائے کہ اعلیٰ اقدار کے حامل صرف یہودی ہیں اور وہی سپر انسان ہیں ۔ اس اسکیم کے مطابق یہودیت یہ چاہتی ہے کہ تمام انسانوں کو جنس کے اس گندے تالاب میں گرا دے ۔ انسانوں کی تمام بلند اقدار جنس کے اندر محدود ہو جائیں ' ان کی پوری قوت جنسی لذتیت کی نذر ہو ' کیونکہ انسانوں کو تباہ کرنے کا یہ تیر بہدف نسخہ ہے تاکہ تمام انسان عظیم صیہونی مملکت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں ۔ انسانی اخلاق کو تو ان لوگوں نے اسی طرح تباہ کیا اور انسانی افکار و عقائد کو انہوں نے سیکولرازم اور مادیت کے اندر محدود کر دیا ۔ یہاں تک کہ انسان کو سائنسی طریقے سے باور کرایا کہ وہ دراصل حیوان ہے ۔ اس کے نتیجے میں اسے ڈارونزم ' فرائڈازم ' مارکسزم ' سوشلزم اور دوسرے لادینی نظریات دیئے جو سب کے سب بوگس تھے اور ان کو ایک اسکیم کے تحت ایجاد کیا گیا اور رائج کیا گیا تاکہ

انسان محض حیوان بن جائے اور اسے چارے اور سیکس کے سوا کسی اور قدر کی کوئی پروا نہ ہو۔

---ooo---

شخصیات اور واقعات کے بعد اس قصے میں کچھ تاریخی اشارات بھی ہیں کہ یہ کس دور کا واقعہ ہے اور اس قصے میں جن کثیر التعداد کرداروں کو پیش کیا گیا ہے اور ان کی جن خصوصیات کو اس میں قلم بند کیا گیا ہے اور جو عمومی خدوخال بیان کیے گئے ان کا تعلق کس دور سے ہے۔ چنانچہ اس قصے کے بعض لمحات قابل غور ہیں اور بعض ایکشن اور اقوال اس طرف راہنمائی کرتے ہیں اور ان سے واضح طور پر اس زمانے کا تعین ہو جاتا ہے۔

o جس دور کے ساتھ اس قصے کا تعلق ہے اس دور میں مصر پر خاندان فراعنہ کی حکمرانی نہ تھی۔ یہ "گڈریوں" کے خاندان کا دور تھا، جس میں حضرت ابراہیم ؑ، حضرت اسحاق ؑ اور حضرت یعقوب ؑ مصر کے پڑوس کنعان میں تھے۔ اس دور میں مصر کے باشندوں میں دین اسلام کے بارے میں قدرے معلومات تھیں۔ اس لیے کہ اس دور کے بادشاہوں کے لیے قرآن نے "ملک" کا لفظ استعمال کیا ہے اور بعد کے ادوار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں بادشاہ کے لئے فرعون کا لقب استعمال ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کس دور میں گزرے تھے۔ یہ "گڈریوں" کا دور تھا اور یہ لوگ تیرہویں اور سترہویں خاندان حکمرانان مصر کے درمیانی زمانے میں گزرے ہیں۔ مصری اس خاندان کو ہیکوس (Heksus) کہتے ہیں، اور یہ لقب ان کو اس لیے دیا گیا ہے کہ مصری اس خاندان سے بہت نفرت کرتے تھے۔ ہیکس کا مفہوم قدیم مصری زبان میں خنزیر ہے یا خنزیر کے چرانے والے کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ خاندان ڈیڑھ سو سال تک مصر پر حکمران رہا ہے۔

o اسی دور میں حضرت یوسف علیہ السلام کی نبوت کا زمانہ رہا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے دین اسلام کے بنیادی نظریہ یعنی عقیدۂ توحید کی طرف دعوت زمانہ قید خانہ ہی سے شروع کر دی تھی۔ قیدیوں کے سامنے تقریر میں انہوں نے فرمایا کہ یہ میرے آباؤ اجداد کا دین ہے۔ حضرت ابراہیم ؑ، حضرت اسحاق ؑ اور حضرت یعقوب ؑ کا۔ جس طرح قرآن کریم نے آپ کی جیل کی تقریر نقل فرمائی ہے اس میں انہوں نے عقیدہ توحید کو بڑے واضح انداز میں پیش کیا ہے۔

اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۳۷) وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ (۳۸) یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۳۹) مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۴۰)

(۱۲ : ۳۷ - ۴۰) "واقعہ یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، اپنے بزرگوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرائیں۔

در حقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر، مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے زندان کے ساتھیو بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو، وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤاجداد نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام زندگی کی یہ ایک جامع تصویر ہے، اور تمام رسولوں نے اسلام کی یہی تصویر پیش کی ہے۔ اس میں ایک طرف بنیادی عقائد ہیں، یعنی اللہ پر ایمان، آخرت پر ایمان، اور اللہ کو وحدہ لاشریک الہٰ سمجھنا اور اللہ کی معرفت اس کی تمام صفات کے ذریعے حاصل کرنا کہ وہ واحد اور قہار ہے۔ اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی نہ حاکم ہے اور نہ مقتدر اعلیٰ ہے۔ اس لیے اس عقیدے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کے ماننے والا تمام ان ارباب کی نفی کرے جو اللہ کے سوا عوام الناس کو خود اپنا غلام بناتے ہیں اور صرف حکومت الٰہیہ کا اعلان کر دیا جائے کیونکہ اللہ نے حکم ہی یہ دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت اور غلامی نہ کی جائے اور بادشاہت، حکمرانی اور ربوبیت صرف اللہ کی ہوگی، حضرت یوسفؑ کے ہاں عبادت کا مفہوم ہی یہ ہے کہ حکومت اور اقتدار اعلیٰ اور بندگی اور اطاعت اور قانون اسی کا ہو۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲ : ۴۰) "فرماں روائی صرف اللہ کی ہے"۔

اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (۱۲ : ۴۰) "اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو"۔

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (۱۲ : ۴۰) "یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے"۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اسلام کا نہایت ہی جامع اور مانع تعارف کرایا اور خصوصاً اس کے نظریاتی اور سیاسی پہلو کو اجاگر کیا"۔

اس نظریہ کا لازمی نتیجہ ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ میں پورے مصر کا اقتدار آگیا تو انہوں نے دعوت اسلامی کو اسی طرح جامع شکل میں پھیلایا ہوگا۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ ان کے ذریعے مصر میں مکمل اسلامی نظام پھیل کر نافذ ہوگیا ہوگا۔ نہ صرف یہ کہ وہ مصر کے حکمران بن گئے تھے بلکہ مصر کے تمام خزانے ان کے ہاتھوں میں دے دیئے گئے تھے اور انہوں نے خشک سالی کے لیے جو ذخائر جمع کر رکھے تھے اور بعد میں وہ خود انہیں تقسیم کر رہے تھے، ان کے پاس دور دور سے لوگ غلہ خریدنے آتے تھے تو ان کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوا ہوگا اور اس طرح حقیقی دین اسلام دور دور تک پھیل چکا ہوگا۔ جس طرح خود ان کے بھائی کنعان جیسے دور دراز علاقوں سے غلے کے لیے آگئے تھے۔ اس قصے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خشک سالی کس قدر وسیع تھی۔

نیز اس قصے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کنعان سے دینی نظریات گذریوں کے دور میں مصر تک پہنچ چکے تھے اور ان

کے مشرکانہ نظریات میں کافی اصلاح ہو چکی تھی ۔ اس قصے میں مصر کی اعلیٰ طبقات کی خواتین کے اجتماع کے موقعہ پر جب انہوں نے حضرت یوسف ؑ کو دیکھا تو بے ساختہ کہا

فَلَمَّا رَاَيۡنَهٗۤ اَكۡبَرۡنَهٗ وَقَطَّعۡنَ اَيۡدِيَهُنَّ وَقُلۡنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيۡمٌ (۱۲ : ۳۱) "جب انہوں نے اسے دیکھا تو حیران رہ گئیں اور کہا' ماشاء اللہ یہ بشر نہیں یہ تو ایک معزز فرشتہ ہے ۔ اور پھر عزیز مصر اپنی بیوی سے کہتا ہے ۔

يُوۡسُفُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا ٚ وَاسۡتَغۡفِرِىۡ لِذَنۡۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنۡتِ مِنَ الۡخٰطِـئِيۡنَ (۱۲ : ۲۹) "یوسف اس سے صرف نظر کرو' اور تو (بیوی سے) اپنے گناہ سے استغفار کر' بے شک تو ہی غلط کاروں سے تھی" ۔

نیز اس پر امراۃ العزیز کا یہ کلام بھی دلالت کرتا ہے کہ وہ بھی حضرت یوسف ؑ کے عقائد کو تسلیم کر کے مومن ہو گئی تھی اور اس کی اصلاح ہو گئی تھی ۔

قَالَتِ امۡرَاَتُ الۡعَزِيۡزِ الۡـــٰٔنَ حَصۡحَصَ الۡحَـقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنۡ نَّـفۡسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰדِقِيۡنَ (۵۱) ذٰ لِكَ لِيَـعۡلَمَ اَنِّىۡ لَمۡ اَخُنۡهُ بِالۡغَيۡبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِىۡ كَيۡدَ الۡخَـآئِنِيۡنَ (۵۲) وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفۡسِىۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوۡۤءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّىۡ ؕ اِنَّ رَبِّىۡ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (۵۳) (۱۲ : ۵۱ ـ ۵۳) "عزیز کی بیوی بول اٹھی "اب حق کھل چکا ہے' وہ میں ہی تھی جس نے اسے پھسلانے کی کوشش کی تھی' بے شک وہ بالکل سچا ہے ۔ اس سے میری غرض یہ تھی کہ وہ جان لے کہ میں نے درپردہ اس کی خیانت نہیں کی اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں ان کی چالوں کو اللہ کامیابی کی راہ پر نہیں لگاتا ۔ میں کچھ اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ۔ نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے' الا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو' بے شک میرا رب غفور و رحیم ہے" ۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ عقیدۂ توحید حضرت یوسف ؑ کے برسراقتدار آنے سے قبل ہی مصر میں پھیل گیا تھا تو ظاہر ہے کہ حضرت یوسف ؑ کے برسراقتدار آنے کے بعد تو نہایت ہی وسیع پیمانے پر یہ عقیدہ پھیل گیا ہو گا اور "خاندان گڈریاں" کے بعد جب اٹھارویں خاندان کی شکل میں فراعنہ مصر نے دوبارہ حکومت مصر پر قبضہ کر لیا تو اس دور میں ایک تو بنی اسرائیل یہاں پھیل گئے تھے اور دوسرے یہ کہ عقیدۂ توحید کو بھی عروج نصیب تھا پھر فراعنہ نے دوبارہ یہاں بت پرستی کو رائج کیا ۔

یہاں ایک بات سمجھ آتی ہے اور وہ بھی بہت معقول کہ اقتدار پر قبضے کے بعد فراعنہ نے بنی اسرائیل پر ظلم و ستم

شروع کر دیا یہاں تک کہ ان کی نسل کشی پر اتر آئے۔ اس کی سیاسی اور ثقافتی وجوہات یہ تھیں۔ ایک یہ کہ وہ باہر سے آئے اور مصر میں اقتدار پر قابض ہوگئے اور دوسرے یہ کہ انہوں نے مصر میں ثقافتی انقلاب بھی برپا کر دیا اور تمام لوگ عقیدۂ توحید قبول کر کے اسلام میں داخل ہوگئے 'جب مصریوں نے گڈریوں کو شکست دی تو ساتھ ساتھ ان کے حامیوں بنی اسرائیل کو بھی خوب دبا کے رکھا۔ اگرچہ ثقافتی اور نظریاتی اختلاف اس کا اصلی اور حقیقی سبب تھا۔ وجہ یہ ہے کہ اسلامی نظریہ حیات اور عقیدۂ توحید کا اصلی اثر یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی فرعون نہ ہو اور اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کا ہو۔ چنانچہ عقیدۂ توحید کے ماننے والے تمام فرعونوں اور تمام طاغوتوں کے دشمن ہوتے ہیں۔

جس نکتے کو ہم یہاں بیان کر رہے ہیں۔ سورت غافر میں "رجل مومن" کی تقریر بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ یہ تقریر اس شخص نے فرعون موسیٰ کے دربار میں کی تھی اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دفاع میں تھی۔ اس وقت فرعون کے دربار میں اس کے تمام حواری موجود تھے اور وہ یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ حضرت موسیٰ کو قتل کر دیں اور وہ قتل محض اس لیے کر رہے تھے کہ حضرت موسیٰ عقیدۂ توحید کی تبلیغ کر رہے تھے جس کے نتیجے میں فرعون کی حکومت کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ (٢٦) وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ (٢٧) وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ (٢٨) يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ۭ قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ (٢٩) وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ (٣٠) مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (٣١) وَيٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ (٣٢) يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (٣٣) وَلَقَدْ جَآءَكُمْ

يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ (۳۴) الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (۳۵) (۴۰ : ۲۸ تا ۳۵)) ایک روز فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا "چھوڑو مجھے ' میں اس موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں اور پکار دیکھے یہ اپنے رب کو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تمہارا دین بدل ڈالے گا ' یا ملک میں فساد برپا کرے گا"۔۔۔ موسیٰ نے کہا "میں نے تو ہر اس متکبر کے مقابلے میں جو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتا اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے"۔ اس موقع پر آل فرعون میں سے ایک مومن شخص ' جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا ' بول اٹھا "کیا تم ایک شخص کو اس بنا پر قتل کر دو گے کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟ حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس بینات لے آیا۔ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اسی پر پلٹ پڑے گا۔ لیکن اگر وہ سچا ہے تو جن ہولناک نتائج کا وہ تم کو خوف دلاتا ہے ان میں سے کچھ تو تم پر ضرور آ ہی جائیں گے۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا اور کذاب ہو۔ اے میری قوم کے لوگو ' آج تمہیں بادشاہی حاصل ہے اور زمین میں تم غالب ہو ' لیکن اگر خدا کا عذاب ہم پر آ گیا تو پھر کون ہے جو ہماری مدد کر سکے گا"۔۔۔ فرعون نے کہا میں تو تم کو وہی رائے دے رہا ہوں ' جو مجھے مناسب نظر آتی ہے اور میں اس راستے کی طرف تمہاری راہنمائی کرتا ہوں جو ٹھیک ہے"۔۔۔ اور جو شخص ایمان لایا تھا اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو ' مجھے خوف ہے کہ کہیں تم پر بھی وہ دن نہ آ جائے جو اس سے پہلے بہت سے جتھوں پر آ چکا ہے ' جیسا دن قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ان کے بعد والی قوموں پر آیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اے قوم ' مجھے ڈر ہے کہ تم پر فریاد و فغاں کا دن نہ آ جائے۔ جب تم ایک دوسرے کو پکارو گے اور بھاگے بھاگے پھرو گے مگر اس وقت اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا۔ سچ یہ ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دے اسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس بینات لے کر آئے تھے مگر تم اس کی لائی ہوئی تعلیم کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہے۔ پھر جب ان کا انتقال ہو گیا تو تم نے کہا اب اس کے بعد اللہ کوئی رسول نہ بھیجے گا"۔ اسی طرح اللہ ان لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیتا ہے جو حد سے گزرنے والے اور شکی ہوتے ہیں اور اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی سند یا دلیل آئی ہو۔ یہ رویہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے نزدیک سخت مبغوض ہے۔ اسی طرح اللہ ہر متکبر اور جبار کے دل پر ٹھپہ لگا دیتا ہے"۔

غرض اصل جھگڑا تھا عقیدۂ توحید (بایں معنی کہ اللہ واحد ہے ' وہی رب اور حاکم ہے ' اس کی بندگی فرض ہے) اور فرعونیت کے درمیان جو بت پرستی پر مبنی تھی اور جس میں انسان ' انسان پر حکمران تھا۔

"اخناتون" نے مصر میں جس بگڑی ہوئی توحید کو متعارف کرایا وہ بھی شاید حضرت یوسف کی پھیلائی ہوئی صحیح توحید کے آثار میں سے تھی جیسا کہ پہلے ہم کہہ آئے ہیں خصوصاً جبکہ تاریخ کی یہ روایت درست ہو کہ اخناتون کی والدہ

ایشیائی تھی' وہ فرعونی نہ تھی -

اب آیئے اس طرف کہ اس دور کے لوگوں کا نفسیاتی اور معاشرتی مزاج کیسا تھا؟ تو اس دور کے کرداروں' ان کے علاقوں' مصر اور بیرون مصر اس . پورے دور میں لوگ پیشین گوئیو ں اور خوابوں کے بارے میں بہت ہی دلچسپی لیتے تھے - یہ ذہنیت کسی علاقے اور قوم تک محدود نہ تھی - خود حضرت یوسف ؑ کی خواب اور اس کی تعبیر' جیل کے دو ساتھیوں کے خوابیں اور حضرت یوسف کی جانب سے تعبیریں' شاہ مصر کی خوابیں اور ان کی تعبیر غرض جو خواب دیکھتے تھے جو تعبیر کرتے تھے - اہل زمانہ ان کے بارے میں بہت ہی دلچسپی لیتے تھے -

میں یہ بات اجمالاً کہہ سکتا ہوں اس قصے میں کئی فنی عناصر بھی موجود ہیں' مثلاً اس میں انسانی عناصر وافر مقدار میں موجود ہیں - تاثرات اور حرکات موجود ہیں' اس انسانی مواد اور تاثرات و حرکات کو نہایت ہی واضح طور پر ادا کیا گیا ہے - قرآن مجید کی مخصوص طرز ادا میں جو نہایت موثر ہوتی ہے اور اپنے مخصوص زیر و بم کے ساتھ' ہمہ جہت اور ہمہ پہلو ہوتی ہے -

اس قصہ میں باپ کی محبت' مختلف درجوں اور مختلف رنگوں میں ہمارے سامنے آتی ہے' جس کے خطوط واضح ہیں - ایک رنگ یوسف اور اس کے بھائی کی محبت کا ہے اور دوسرا رنگ دوسرے بھائیوں کا ہے - قصہ کے آغاز سے لے کر انتہا تک یوسف کے بارے میں جو حوادث سامنے آتے ہیں ان کے بارے میں ان کا ردعمل واضح طور پر سامنے آتا ہے -

پھر اس قصے میں بھائیوں کے درمیان غیرت' مسابقت اور حسد کے جذبات کا وجود بھی ایک رنگ لیے ہوئے ہے - خصوصاً جبکہ بھائیوں کی مائیں مختلف ہوں --- جبکہ باپ کی محبت کی مختلف شکلیں بھی ہمارے سامنے ہیں -

اس قصے میں غیرت' حسد اور باہم منافست کی وجہ سے مختلف ردعمل سامنے آتے ہیں - بعض کا ردعمل تو یہ ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے' بعض کا ردعمل یہ ہے کہ اسے اندھے کنویں میں ڈال دیا جائے شاید کوئی اٹھانے والا اٹھالے جائے' یہ ردعمل پہلے سے مختلف ہے -

اس قصے میں مکاریاں بھی سامنے آتی ہیں' یوسف کے بھائیوں کی مکاری' زلیخا کی مکاری' یوسف کے ساتھ' خاوند کے ساتھ اور مصر کی اعلیٰ طبقے کی عورتوں کے ساتھ -

اس قصے میں سیکس کے لحات بھی موجود ہیں' ان کے سامنے ردعمل آمادگی کا ردعمل اور انکار کا ردعمل اور اس میں کسی قدر خوف اور نفرت کا کردار -

اس قصے میں ندامتیں اور شرمندگیاں بھی موجود ہیں' معافیاں بھی موجود ہیں' خوشیاں بھی موجود ہیں' جدائیاں بھی اور ملاپ بھی -

یہ قصہ بہرحال ایک جاہلی معاشرے کے خدوخال بتاتا ہے - اس معاشرے کے اعلیٰ طبقات کے حالات' گھر میں' قید خانے میں' بازار میں' مصری معاشرے کے اندر اور عبرانی معاشرے کے اندر جس میں پیش گوئیوں اور تعبیرات خواب کا بہت زور ہے -

قصے کا آغاز ایک خواب سے ہوتا ہے جو حضرت یوسف ؑ اپنے باپ کے سامنے بیان کرتے ہیں' باپ یہ تعبیر بتاتے ہیں کہ مستقبل میں تمہیں بہت ہی اونچا مرتبہ ملنے والا ہے - باپ اسی وقت ان کو نصیحت کر دیتے ہیں کہ یہ خواب وہ ہرگز اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کریں ورنہ وہ تمہارے خلاف کینہ اور حسد کی وجہ سے سازشیں کریں گے - اب اس قصے

کی دوسری کڑیاں سامنے آتی ہیں گویا یہ تمام کڑیاں خواب کی تعبیر ہیں اور حضرت یعقوب ؑ کی توقعات کے عین مطابق ہیں اور قصے کے آخر میں یہی منظر آتا ہے جو اس خواب کی تعبیر سے متعلق ہے۔ اس قصے کو قرآن کریم نے اس انداز میں نہیں لیا جس طرح عہد قدیم لکھنے والوں نے اسے بیان کیا ہے۔ قرآن کریم نے اسے نہایت ہی فنی انداز میں لیا ہے۔ اور اختتام پر وہ مکمل دینی رنگ ہے نہایت ہی فنی انداز میں۔

قصے کے اندر وہ فنی خوبی بھی موجود ہے جسے جدید زبان میں عقدہ یا سسپنس کہتے ہیں۔ اور یہ عقدہ آہستہ آہستہ قصے میں حل ہوتا جاتا ہے۔ جوں جوں قصے کے واقعات آگے بڑھتے ہیں لیکن واقعات قصہ نہایت ہی نیچرل انداز میں آگے بڑھتے ہیں، انداز بیان میں کوئی تصنع نہیں ہے۔

پھر اس قصے کو مختلف کڑیوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ہر کڑی کے اپنے مشاہدات و مناظر ہیں۔ دو مناظر کے درمیان بعض اوقات غیر ضروری کڑیوں کو ترک کر دیا گیا ہے کیونکہ پڑھنے والے کا تخیل اس خلا کو خود پر کرتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض وہ ایکشن جو چھوڑ دیئے گئے یا بعض اقوال جو ترک کر دیئے گئے پڑھنے والے کا تخیل خود پڑھتا ہے۔ اس طرح وفور شوق کے ساتھ ساتھ قاری خوب لطف اٹھاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں قصہ یوسف پر اس قدر فنی تبصرہ کافی ہے۔ یہ قصہ دراصل اسلام کے ادبی منہاج ادا کی ایک بہترین مثال ہے۔ یہ قصہ اس شعبے میں انسان کی کوشش کے لیے اور ادب اسلامی پیش کرنے کے لیے ممکنہ راہیں اور طریق کار بھی متعین کرتا ہے تاکہ ہم فنی اور ادبی موضوعات پر مکمل اظہار مطلب بھی کر سکیں اور اس کے اندر واقعیت، صداقت اور صحت مند مواد بھی ہو، اور اسلامی ادب کے یہ فن پارے، اس گندگی، فحاشی اور پستیوں سے بھی پاک ہوں، جو دور جدید کے فن کا لازمہ بن گئے ہیں۔

---○○○---

اب صرف ایک پہلو رہ جاتا ہے کہ اس قصے کا مقصد اور اس میں سبق کیا ہے؟ اور اسلامی تحریک کو اس مرحلے پر یہ قصہ سنا کر کیا سبق دیا گیا ہے؟ اور یہ کہ اس کی کیا ضرورت تھی؟ نیز وقتی تقاضوں کے علاوہ اس قصے کی دائمی قدر و قیمت کیا ہے؟ نیز وہ حقائق کیا ہیں جو اس قصے میں، اس پوری سورت میں، اور خصوصاً اس سورت کے آخری تبصروں میں۔ مناسب ہے کہ یہاں اس سورت کے اس دیباچے میں ہم مختصر اشارات پر اکتفاء کریں۔

○ اس سورت کے نزول کے وقت مکہ میں تحریک اسلامی نہایت ہی مشکل دور سے گزر رہی تھی۔ اس کی طرف ہم نے اس سے قبل اشارہ بھی کیا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل ایمان کی قلیل سی تعداد سخت دشواریوں کا سامنا کر رہی تھی۔ چنانچہ بطور تسلی حضرت یوسف کا قصہ پیش کیا گیا کہ وہ کن کن مشکلات سے گزر کر منزل مقصود تک پہنچے اور اس طرح ان کو اس زمین پر اقتدار نصیب ہوا۔

اس وقت تحریک اسلامی کو، اپنی مشکلات کی وجہ سے ایسے حالات اور تاریخی واقعات بتانے کی بے حد ضرورت تھی۔ اور یہ قصہ دعوت اسلامی کے مقاصد و ضروریات کے لیے بہت ہی مفید تھا، کیونکہ یہ تحریک پیدا کرتا ہے، اور جماعت مسلمہ کو ایک مثبت سوچ عطا کرتا ہے کہ اسلامی انقلاب کا راستہ یہی ہے کہ منصب اقتدار تک پہنچ کر دعوت پھیلائی جائے۔

○ اس قصے میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اسلام کی ایک واضح، مکمل، گہری اور جامع دعوت پیش کی ہے۔

حضرت یوسف ؑ نے جس طرح دعوت کو پیش کیا ہے اس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔

مثلاً وہ کہتے ہیں کہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقیدہ تمام انبیاء کے ہاں ایک ہی رہا ہے۔ تمام رسالتوں میں اس عقیدے کے بنیادی عناصر موجود رہے ہیں یعنی توحید کامل' اللہ کی حاکمیت' اسلامی نظام زندگی کا نفاذ' اور واضح طور پر آخرت کی جواب دہی کا احساس یقین اور اقرار۔ حضرت یوسف ؑ کی اس تقریر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آج کل کے نام نہاد ماہرین ادیان' تقابل ادیان نے جو خود ساختہ نظریات پیش کیے اور کہتے ہیں کہ انسان عقیدہ توحید اور عقیدۂ آخرت تک بہت بعد کے زمانوں میں پہنچا۔ اس سے قبل انسان دو یا دو سے زیادہ خداؤں کا قائل تھا۔ اور عقیدۂ آخرت اس نے اس وقت اپنایا جب وہ علمی اعتبار سے کافی ترقی کر گیا۔ یہ سوچ ان لوگوں کی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ دین بھی انسانوں ہی کی ایجاد ہے جبکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔

یہ قصہ اور یہ سورت واضح کر دیتی ہے کہ عقیدۂ توحید تمام انبیاء کے ہاں ایک ہی رہا ہے۔ یہ صرف اللہ جل شانہ کی ذات کی توحید نہیں ہے بلکہ ربوبیت اور حاکمیت کی توحید یہ ہے اور حاکمیت کی توحید بھی ہے کہ نظام حکومت بھی اللہ کا ہو گا۔ اور یہ نظریہ اس بات سے نکلتا ہے کہ اللہ نے لوگوں سے کہا کہ وہ صرف اس کی عبادت اور بندگی کریں۔ اس طرح اس سورت میں عبادت کا مخصوص مفہوم بتایا گیا کہ اس کا مفہوم مکمل بندگی اور غلامی ہے یعنی اللہ کی حکومت اور بندوں کی جانب سے اس کی مکمل اطاعت' یہ ہے معنی عبادت کا۔ اور یہی دین قیم ہے یعنی درست اور صحیح دین۔ اگر کسی دین میں اللہ کی مکمل اطاعت نہیں ہے تو وہ دین ہی نہیں ہے۔ جب تک اس میں اللہ کا نظام حکومت شامل نہ ہو۔ اگر لوگ اپنی زندگی کے کسی بھی شعبے میں اللہ کی اطاعت اور بندگی سے آزاد ہیں تو وہ گویا اللہ کی عبادت سے خارج ہو گئے۔ لہٰذا ایک الٰہ ہونے کا مقصد یہ ہے کہ رب ایک ہے اور رب ایک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حاکم ایک ہے۔ یہی مفہوم ہے اللہ وحدہ کی عبادت اور بندگی کا۔ عبادت یا بندگی۔ ربوبیت حکومت الٰہیہ' سب ہی مترادف الفاظ ہیں۔ اگر لوگ تمام امور میں اللہ کے سامنے جھکتے اور سر تسلیم خم کرتے ہیں تو وہ مسلمان ہیں اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو وہ غیر مسلم ہیں۔

دین اور عبادت کا یہ مفہوم طے کر دیتا ہے کہ کسی بھی دور میں موجود کوئی سوسائٹی مسلمان ہے یا غیر مسلم ہے۔ وہ دین قیم کی پیروکار ہے یا نہیں ہے۔ یہ خصوصیت دین میں لازماً ملحوظ ہے۔ پس جو غیر اللہ کا مطیع ہو گا اور اپنی زندگی کے معاملات غیر اللہ کے احکام کے مطابق چلائے گا وہ غیر مسلم ہو گا اور جو صرف اللہ کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے گا اور غیر اللہ کی اطاعت کا انکار کرے گا وہ مسلمان ہو گا اور دین میں داخل ہو گا۔ اس کے علاوہ جو بھی ہے وہ محض ملمع سازی ہے اور یہ ان لوگوں کے خیالات ہیں جو تاریخ کے کسی بھی دور میں بے دینی سے شکست کھا جاتے ہیں اور واقعات اور عملی صورت حال کے دھارے میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اللہ کا دین واضح ہے اور اس سورت میں جو ایک آیت آ گئی ہے یہ اس دین کے مفہوم کے تعین کے لیے کافی ہے۔

○ اس قصے میں ایک خالص ایمان کی صورت اور اس کا ماڈل حضرت یوسف اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے ایمان کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

اس سے قبل ہم اس طرف اشارہ کر آئے ہیں کہ حضرت یوسف اپنے خالص ایمان' تمام آلودگیوں سے پاک ایمان' نہایت ہی عاجزی اور انکساری اور خضوع و خشوع کے ساتھ یوں پیش کرتے ہیں۔

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ

(۱۰۱:۱۲) ”اے میرے رب تو نے مجھے حکومت عطا کی اور باتوں کی تہہ تک پہنچنے کی تعلیم دی' زمین اور آسمانوں کے پیدا کرنے والے' تو ہی میرا ولی ہے' دنیا اور آخرت میں' مجھے ایک مسلمان کی طرح موت دے اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا دے“۔

لیکن خدا رسیدگی کے اس پہلو کا ذکر صرف ان کے آخری کلمات ہی میں نہیں جھلکتا بلکہ اس پورے قصے میں وہ ایک خدا رسیدہ پیغمبر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

مثلاً عزیز مصر کی عورت کی طرف سے ورغلانے اور نہایت ہی فتنہ انگیز حالات میں بھی خوف خدا ان کا لبادہ ہے۔ کہتے ہیں

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۳:۱۲) ”خدا کی پناہ' میرے رب نے مجھے اچھی منزلت بخشی ہے۔ ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے“۔

ایک دوسرے موقع پر جب وہ اپنے آپ کے بارے میں ڈرتے ہیں کہ ان سے کہیں کوئی کمزوری سرزد نہ ہو جائے تو وہ یوں اللہ کو پکارتے ہیں۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ (۳۳:۱۲) ”اے میرے رب' قید منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ میں وہ کام کروں جو یہ مجھ سے چاہتی ہیں اور اگر تو نے ان کی چالوں کو مجھ سے رفع نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا۔

جب وہ اپنے آپ کو بھائیوں سے متعارف کراتے ہیں تو اس وقت اترانے کی بجائے وہ یہ بتاتے ہیں کہ ان پر اللہ کا بہت ہی بڑا فضل ہوا ہے۔ وہ شکر بجالاتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کو یاد کرتے ہیں:

قَالُوْۤا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ یُوْسُفُ قَالَ اَنَا یُوْسُفُ وَ هٰذَاۤ اَخِیْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ وَ یَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ (۹۰:۱۲) ”وہ بولے کیا تم یوسف ہو' اس نے کہا ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر احسان فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی تقویٰ اور صبر سے کام لے تو اللہ کے ہاں ایسے نیک لوگوں کا اجر مارا نہیں جاتا“۔

یہ ہیں وہ تمام طرز عمل جو مکہ میں تحریک اسلامی کے لیے نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ قیامت تک آنے والی تمام تحریکوں کے لیے سنگ میل ہیں۔ یہ تھے حضرت یوسف۔

اب ذرا حضرت یعقوب ؑ کی خدا رسیدگی کے چند پہلو دیکھیں' وہ اپنے ہر موقف ہر مرحلے میں واضح طور پر اور نہایت ہی گہرائی کے ساتھ تعلق باللہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ جوں جوں ان پر مصیبتیں آتی ہیں وہ مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں تعلق باللہ جوش میں آجاتا ہے۔ وہ ہر مشکل میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور مکمل بھروسہ رکھتے ہیں۔

آغاز قصہ میں جب حضرت یوسف ؑ ان کے سامنے خواب بیان کرتے ہیں تو جناب خدا کو یاد فرماتے ہیں اور اللہ کے انعامات کا شکر ادا کرتے ہیں۔ وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۲ : ٦) "اور ایسا ہی ہوگا تیرا رب تجھے منتخب کرے گا اور تجھے باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھائے گا اور تیرے اوپر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کرے گا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے بزرگوں ابراہیم اور اسحاق علیہم السلام پر کر چکا ہے' یقیناً تیرا رب علیم و حکیم ہے"۔

اور یوسف ؑ کے بارے میں جب وہ پہلے صدمے سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ صرف اللہ سے مدد کے طلبگار ہوتے ہیں۔ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (۱۲ : ۱۸) "یہ سن کر ان کے باپ نے کہا "بلکہ تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا۔ اچھا صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا جو بات تم بتا رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے"۔

ایک دوسرے موقعہ پر جب ان کے بیٹے سب کے سب مصر کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو جس طرح ایک باپ اپنے جگر گوشوں کے لیے فکرمند ہوتا ہے وہ بھی فکرمند ہیں۔ ان کو وصیت کرتے ہیں کہ شہر میں ایک دروازے سے داخل نہ ہوں بلکہ متفرق دروازوں سے داخل ہوں۔ لیکن ان کو پورا پورا یقین ہے کہ ان کی یہ تدابیر اللہ کی مشیت کے مقابلے میں کچھ نہیں کر سکتیں۔ جو حکم ہر حال میں نافذ ہو کر رہتا ہے وہ اللہ ہی کا ہے۔ یہ تو حضرت یعقوب ؑ کے دل کی خواہش تھی اور ان کی کوشش

وَ قَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ وَ مَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ

(۱۲ : ٦٧) "اس نے کہا "میرے بچو' مصر کے دارالسلطنت میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا' مگر میں اللہ کی مشیت سے تم کو نہیں بچا سکتا' حکم اس کے سوا کسی کا بھی نہیں چلتا' اس پر میں نے بھروسہ کیا اور جس کو بھروسہ کرنا ہے اسی پر کرے"۔

اب وہ بہت ہی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ بڑھاپے اور ضعیفی کے دور میں ان کو ایک دوسرے صدمے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن وہ پھر بھی مایوس نہیں ہوتے اور ان کا دل ہر وقت رحمت خداوندی کا امیدوار ہے۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيلٌ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا

إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (۱۲ : ۸۳) "اس نے کہا" دراصل تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک اور بڑی بات کو سہل بنا دیا ہے' اچھا اس پر بھی صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا۔ کیا بعید ہے کہ اللہ ان سب کو مجھ سے ملا دے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہیں"۔

اب حضرت یعقوب کے آئینہ دل صافی میں ایک تصویر اور ایک روشنی اور چمک آتی ہے' جبکہ ان کے بیٹے انہیں ان کے حزن و ملال اور گریہ و زاری پر ملامت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ غم نے تمہاری آنکھیں تاریک کر دی ہیں۔ تو وہ ان کے مقابلے میں یہ موقف اختیار کرتے ہیں' کہ میرے آئینہ دل پر جو لکیریں ابھر رہی ہیں ان سے تم بے خبر و محروم ہو' ان کو نبوت کے علوم حاصل ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے حزن و ملال کو صرف بارگاہ رب العزت میں پیش کرتے ہیں اور ان کی امیدیں اللہ ہی سے وابستہ ہیں کیونکہ خود ان کے بیٹے بھی اس حزن کو بلاجواز سمجھتے ہیں۔

وَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَاأَسَفَى عَلَى يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ

(۸٤) قَالُوا تَاللَّهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوسُفَ حَتَّى تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ مِنَ الْهَالِكِينَ

(۸٥) قَالَ إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ

(۸٦) يَابَنِيَّ اذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ يُوسُفَ وَأَخِيهِ وَلَا تَيْأَسُوا مِنْ رَوْحِ اللَّهِ إِنَّهُ لَا

يَيْأَسُ مِنْ رَوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ (۸۷) (۱۲ : ۸٤ - ۸۷) "پھر وہ ان کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "ہائے یوسف" وہ دل ہی دل میں غم سے گھٹا جا رہا تھا اور اس کی آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں۔۔۔ بیٹوں نے کہا "خدارا! آپ تو بس یوسف ہی کو یاد کیے جاتے ہیں۔ نوبت یہ آگئی ہے کہ اس کے غم میں اپنے آپ کو گھلا دیں گے یا اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے"۔ اس نے کہا "میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا اور اللہ سے جیسا میں واقف ہوں تم نہیں ہو۔ میرے بچو' جا کر یوسف اور اس کے بھائی کی ٹوہ لگاؤ' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو' اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں"۔

انہوں نے ان کو یہ بات یاد دلا دی کہ رب تعالیٰ کی شان کیا ہے اور یہ کہ وہ اللہ کی حقیقت اپنے دل میں کس طرح واضح پاتے ہیں' وہ انہیں ملامت کرتے ہیں کہ یوسف کی خوشبو تمہیں کس طرح آ رہی ہے۔ اور اللہ نے ان کی امید اور یقین کو سچ کر دکھایا۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ (۹٤)

قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ (۹٥) فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَى وَجْهِهِ

فَارْتَدَّ بَصِيرًا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۹۶)(۱۲: ۹۴ تا ۹۶)) "جب قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے باپ نے (کنعان میں) کہا "میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں"۔ گھر کے لوگ بولے "خدا کی قسم آپ ابھی تک اپنے اسی پرانے خبط میں پڑے ہوئے ہیں"۔۔۔ پھر جب خوشخبری لانے والا آیا تو اس نے یوسف کی قمیص یعقوب کے منہ پر ڈال دی اور یکایک اس کی بینائی عود کر آئی۔ تب اس نے کہا "میں تم سے کہتا نہ تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"۔

اب اس بحث کے آخر میں ہم ان متنوع نتائج کی طرف آتے ہیں جو قرآن مجید نے آخری تبصرے کے طور پر یہاں نکالے ہیں۔

○ پہلا نتیجہ یہ ہے کہ قریش جو قرآن کے وحی من اللہ ہونے کا انکار کرتے ہیں یہ بادی النظر میں غلط ہے کیونکہ حضرت یوسف ؑ کے قصے میں بیان کردہ تمام واقعات میں حضور موجود نہ تھے ' نہ کسی ذریعہ علم ت یا عربوں سے آپ تک وہ پہنچے ہوئے تھے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ (۱۲: ۱۰۲) "اے محمد یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں ورنہ تم اس وقت موجود نہ تھے جب یوسف کے بھائیوں نے آپس میں اتفاق کر کے سازش کی تھی"۔

اور یہ نتیجہ آغاز قصہ کے اس ریمارکس سے ہم آہنگ ہے جس میں یہ کہا گیا تھا

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ (۱۲: ۳) "اے پیغمبر ہم قرآن کو تمہاری طرف وحی کر کے بہترین پیرایہ میں واقعات و حقائق بیان کرتے ہیں ورنہ اس سے پہلے تو تم ان چیزوں سے بے خبر تھے"۔ یوں آغاز و انجام ایک ہی تاثر دیتے ہیں۔ اور ایک ہی حقیقت کو ذہن نشین کرتے ہیں اور اہل قریش کی تکذیب اور انکار کے مقابلے میں ایک ہی دلیل فراہم کرتے ہیں۔

○ یہی وجہ ہے کہ اس موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو تسلی دی جاتی ہے اور آپ کو یہ بتایا جاتا ہے کہ مکذبین کی باتوں سے اثر نہ لیں۔ کیونکہ یہ عناد میں پڑے ہوئے ہیں اور اپنی جہالت پر اصرار کر رہے ہیں اور اس کائنات میں باری تعالیٰ کے وجود پر جو دلائل بکھرے ہوئے ہیں ان کی طرف سے انہوں نے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں حالانکہ کسی بھی فطرت سلیمہ کو راہ ہدایت پر آنے کے لیے یہ دلائل کافی و شافی ہیں 'اگر یہ لوگ دلائل کائنات کے بارے میں قرآن کا بیان سنیں۔ ان لوگوں کا انجام یہ ہونے والا ہے کہ اچانک ان کو عذاب الٰہی آئے گا جبکہ وہ غفلت ہی میں پڑے ہوں گے۔

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۱۰۳) وَمَا تَسْئَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ

هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (١٠٤) وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (١٠٥) وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ (١٠٦) اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْتَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (١٠٧) (١٢ : ١٠٣ - ١٠٧) "مگر تم خواہ کتنا ہی چاہو ان میں سے اکثر لوگ مان کر دینے والے نہیں ہیں ۔ حالانکہ تم اس خدمت پر ان سے کوئی اجرت بھی نہیں مانگتے ہو ۔ یہ تو ایک نصیحت ہے جو دنیا والوں کے لیے عام ہے ۔ زمین و آسمان میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے ۔ ان میں سے اکثر لوگ تو مانتے ہیں مگر اس طرح کہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں ۔ کیا یہ مطمئن ہیں کہ اللہ کے عذاب کی کوئی بلا انہیں دبوچ نہ لے گی یا بے خبری میں قیامت کی گھڑی اچانک ان پر نہ آ جائے گی" ۔

عظیم حقائق لیے ہوئے یہ نہایت ہی موثر ضربات ہیں جو ان لوگوں کے دلوں پر لگائی جا رہی ہیں جو ایمان نہیں لاتے اور لاتے بھی ہیں تو اللہ کے ساتھ بے شمار دوسری مخلوقات کو شریک ٹھہراتے ہیں --- یہ ہے نہایت ہی گہری اور باریک تصویر ان لوگوں کی جن کے دلوں میں ایمان باللہ شرک سے ملوث ہوتا ہے کیونکہ وہ عقیدہ توحید کو اس کے فیصلہ کن اور دو ٹوک انداز میں نہیں سمجھتے ۔

○ اس لیے حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اپنے نظریہ حیات کو نہایت ہی فیصلہ کن اور دو ٹوک انداز میں ' نہایت ہی تحدید اور امتیاز کے ساتھ پیش کر دیں اور نہایت ہی موثر الفاظ میں :

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (١٢ : ١٠٨) "تم ان سے صاف صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے ' میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں ' میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں" ۔

اب آخری جھلکی میں پورے قصص قرآن سے سبق لینے کی تلقین کی گئی ہے ۔ اس سورت میں بھی اور دوسری سورتوں کے قصص میں بھی ۔ اے پیغمبر تمہارے اور تمہارے مٹھی بھر ساتھیوں کے لیے اس میں بہت بڑی نصیحت ہے ۔ اس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جاتی ہے اور اچھے انجام کی خوشخبری سنائی جاتی ہے ۔ مشرکین اور اسلام کے دشمنوں کے لیے اس میں ڈراوا اور وعظ ہے ۔ اس جھلکی میں بتایا جاتا ہے کہ وحی سچ ہے ' رسول صادق ہے اور وحی علم کا مصدق ذریعہ ہے لیکن وحی اور اوہام کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ہو گا ۔ محض پرانے قصوں کو حقائق سے علیحدہ کرنا ہو گا ۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰۹) حَتّٰۤی اِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّیَ مَنْ نَّشَآءُ وَ لَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ (۱۱۰) لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی وَ لٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ تَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًی وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۱۱۱) (۱۲: ۱۰۹ ـ ۱۱۱) "اے محمدؐ، تم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھیجے تھے وہ سب بھی انسان ہی تھے اور انہی بستیوں کے رہنے والوں میں سے اور انہی کی طرف ہم وحی بھیجتے رہے ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان قوموں کا انجام انہیں نظر نہ آیا جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں، یقیناً آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے اور زیادہ بہتر ہے جنہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی۔ کیا اب بھی تم لوگ نہ سمجھو گے ـــ یہاں تک کہ جب پیغمبر لوگوں سے مایوس ہوگئے اور لوگوں نے بھی سمجھ لیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا، تو یکایک ہماری مدد پیغمبروں کو پہنچ گئی۔ جب ایسا موقعہ آ جاتا ہے تو ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں، بچا لیتے ہیں اور مجرموں پر سے ہمارا عذاب ٹالا ہی نہیں جا سکتا ـــ اگلے لوگوں کے ان قصوں میں عقل و ہوش رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے۔ یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے۔ یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہوئی ہیں انہی کی یہ تصدیق ہے اور ہر چیز کی تفصیل اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے"۔

---ooo---

سورت یوسف کے اس دیباچے میں مناسب ہے کہ اس قصے کی فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہاں ہم طرز ادا کے کمالات میں سے بعض نمونے اور بعض نکتے قارئین کے گوش گزار کر دیں۔ اس پوری سورت میں طرز ادا کے بعض نہایت ہی اہم نکتے اور لطائف پائے جاتے ہیں۔

○ متعین اور مخصوص انداز کلام، اس سورت میں بھی پایا جاتا ہے۔ متعین انداز گفتگو، سورت اور اس کے کرداروں کے خیالات اور حالات کے مطابق جگہ جگہ موجود ہے۔ مثلاً جگہ جگہ علم کی اہمیت کا ذکر ہے اور اس کے بالمقابل جہالت کی مذمت کی گئی ہے۔

وَ كَذٰلِكَ یَجْتَبِیْكَ رَبُّكَ وَ یُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ وَ یُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكَ وَ عَلٰۤی اٰلِ یَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤی اَبَوَیْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبَّكَ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ (۱۲: ۶) "اور ایسا ہی ہو گا، تیرا رب تجھے منتخب کرے گا اور تجھے باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھائے گا تیرے اوپر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح کرے گا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے بزرگوں ابراہیمؑ اور اسحاقؑ پر کر چکا ہے یقیناً تیرا رب علیم و حکیم ہے"۔

وَ قَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤی اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ

وَلَدًا وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲ : ۲۱) ''اس طرح ہم نے یوسف کے لیے اس زمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا اور اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں''۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِيْنَ (۱۲ : ۲۲)
''اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے قوت فیصلہ اور علم عطا کیا اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزا دیتے ہیں''۔

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۱۲ : ۳۴) ''اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی اور ان عورتوں کی چالیں اس سے رفع کر دیں بے شک وہی ہے جو سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے''۔

قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ (۱۲ : ۳۷) ''یہاں جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا' یہ علم ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں''۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲ : ۴۰) ''فرماں روائی کا اقتدار صرف اللہ کے لیے ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو' یہی ٹھیٹھ سیدھا طریقہ زندگی ہے 'مگر اکثر لوگ جانتے نہیں''۔

قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ (۱۲ : ۴۴) ''انہوں نے کہا یہ تو پریشان خوابوں کی باتیں ہیں' اور ہم اس طرح کے خوابوں کا مطلب نہیں جانتے''۔

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ لَّعَلِّيْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۱۲ : ۴۶)
''یوسف اے سراپا راستی' مجھے اس خواب کا مطلب بتا کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات بالیں ہری ہیں اور سات سوکھی شاید کہ میں ان لوگوں کے پاس جاؤں اور شاید کہ وہ جانیں''۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ

النِّسْوَةِ الّٰتِی قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ اِنَّ رَبِّی بِکَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ (۱۲ : ۵۰) ”اور بادشاہ نے کہا کہ اسے میرے پاس لاؤ“ مگر جب شاہی فرستادہ یوسف کے پاس پہنچا تو اس نے کہا ”اپنے رب (آقا) کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ میرا رب تو ان کی مکاری سے واقف ہی ہے“۔

ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّی لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ کَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ (۱۲ : ۵۲) ”اس سے میری غرض صرف یہ تھی کہ یہ جان لے کہ میں نے در پردہ اس کی خیانت نہیں کی تھی‘ اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں ان کی چالوں کو اللہ کامیابی کی راہ پر نہیں لاتا“۔

قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ (۱۲ : ۵۵) ”یوسف نے کہا ملک کے خزانے میرے سپرد کیجئے میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں“۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِی الْاَرْضِ وَ مَا کُنَّا سٰرِقِیْنَ (۱۲ : ۷۳) ”ان بھائیوں نے کہا خدا کی قسم تم لوگ جانتے ہو کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے“۔

قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّکَانًا وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ (۱۲ : ۷۷) ”اس نے کہا‘ تم بہت ہی برے لوگ ہو جو الزام تم لگا رہے ہو‘ اللہ اس کی حقیقت خوب جانتا ہے“۔

فَلَمَّا اسْتَیْئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِیًّا قَالَ کَبِیْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاکُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَیْکُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ (۱۲ : ۸۰) ”جب وہ یوسف سے مایوس ہو گئے تو ایک گوشے میں جا کر آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ ان میں جو سب سے بڑا تھا وہ بولا تم جانتے نہیں ہو کہ تمہارے والد تم سے خدا کے نام پر کیا عہد و پیمان لے چکے ہیں“۔

وَ مَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا کُنَّا لِلْغَیْبِ حٰفِظِیْنَ (۱۲ : ۸۱) ”اور جو کچھ تمہیں معلوم ہوا ہے وہی ہم بیان کر رہے ہیں اور غیب کی نگہبانی تو ہم نہ کر سکتے تھے“۔

عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَنِیْ بِهِمْ جَمِیْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ (۱۲ : ۸۳) ”کیا بعید ہے کہ اللہ ان سب کو مجھ سے ملائے‘ وہ سب کچھ جانتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہیں“۔

قَالَ اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۲ : ۸۶) ”اس نے کہا میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا اور اللہ سے جیسا میں واقف ہوں تم نہیں ہو“۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ (١٢: ٨٩) ”تمہیں کچھ یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا' جبکہ تم نادان تھے“۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (١٢: ٩٦) ”تب اس نے کہا کہ ”میں تم سے کہتا نہ تھا میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو“۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ (١٢: ١٠١) ”اے میرے رب تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھایا“۔

یہ تمام آیات اور ان میں علم وجاہلت کا ذکر بتاتا ہے کہ اس کتاب کی کس قدر گہری تعلیم ہے اور اس کلام میں کس قدر ہم آہنگی ہے۔

○ اس سورت میں ”الوہیت“ کے مفہوم کو بھی نہایت ہی خوبی سے واضح کیا گیا ہے۔ الوہیت کا ایک مخصوص خاصہ ہے یعنی حکومت اور اقتدار اعلیٰ۔ اس کی وضاحت بھی یوسف علیہ السلام کی زبانی کی گئی ہے۔ اس معنی میں کہ اللہ کا حکم یہ مفہوم رکھتا ہے کہ لوگ بالارادہ اللہ کے نظام حکم اور شریعت کی اطاعت کریں۔ کبھی حاکمیت کا تکوینی مفہوم بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پوری کائنات تکوینی اعتبار بھی اللہ کے زیر نگیں ہے۔ چنانچہ اس سورت میں الحکم کے دونوں مفہوم بیان کیے گئے ہیں تکوینی اور شرعی۔ اور یہ بات بطور موضوع سخن بیان کی گئی ہے محض اتفاقاً دوران کلام نہیں آگئی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام مصری حکام کی ربوبیت کو اللہ کے خاصہ الوہیت کے خلاف سمجھتے ہوئے فرماتے ہیں :

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (٣٩) مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ---- (٤٠) (١٢: ٣٩ - ٤٠) ”اے زندان کے ساتھیو' تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤاجداد نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو' یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے“۔

اور حضرت یعقوب اس موقعہ پر جب وہ یہ سمجھاتے ہیں کہ اس کائنات پر مشیت صرف اللہ ہی کی چلتی ہے' فرماتے ہیں :

وَ قَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ وَ مَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ عَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ

٦٧ ) "پھر اس نے کہا "میرے بچو 'مصر کے دار السلطنت میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا۔ مگر میں اللہ کی مشیت سے تم کو نہیں بچا سکتا' حکم اس کے سوا کسی کا بھی نہیں چلتا' اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور جس کو بھی بھروسہ کرنا ہے اسی پر کرے"۔

حکم کے مفہوم میں یہ جامعیت ہمیں بتاتی ہے کہ دین قیم اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتا جب تک تمام ارادی امور میں اللہ کی اطاعت نہ کی جائے' جس طرح کہ تمام تکوینی امور میں ہم اللہ کے احکام کی اطاعت کرنے پر مجبور ہیں ۔ یہ دونوں امور اسلامی شریعت اور دین کے نظریات میں داخل ہیں' لہٰذا خدا کے حکم میں صرف تکوینی اطاعت ہی داخل نہیں ہے' بلکہ اس مین ارادی اطاعت بھی داخل ہے۔ اور دونوں اسلام کے بنیادی عقائد کا حصہ ہیں۔

یہاں اس سورت میں جب کائناتی تصرفات کے نتیجے میں واقعات سامنے آتے ہیں تو حضرت یوسف ؑ اللہ کی صفت لطیف کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ اللہ معاملات کو نہایت ہی لطیف انداز سے چلاتا ہے۔

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (١٢ : ١٠٠) "اس نے اپنے والدین کو اٹھا کر اپنے پاس تخت پر بٹھایا اور سب اس کے آگے بے اختیار سجدے میں جھک گئے' یوسف نے کہا "ابا جان یہ تعبیر ہے' میرے اس خواب کی جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ میرے رب نے اسے حقیقت بنا دیا۔ اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھے قید خانے سے نکالا' اور آپ لوگوں کو صحرا سے لا کر مجھ سے ملایا حالانکہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال چکا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا رب غیر محسوس تدبیروں سے اپنی مشیت پوری کرتا ہے' بے شک وہ علیم و حکیم ہے"۔

○ اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں کہ اس سورت میں قصے کے آغاز و اختتام میں اور پھر سورت کے آخری تبصرے میں پوری سورت کے مضامین میں ایک نہایت ہی لطیف ربط اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے ۔ تمام تعقیبات اور تبصرے اور سورت کے آغاز و اختتام مخصوص مسائل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں اس سورت پر اس قدر تبصرہ کافی ہے۔ اب مناسب ہے کہ ہم اس کی آیات کی تشریح و تفسیر کی طرف آئیں۔

---○○○---

# درس نمبر ۱۰۶ ایک نظر میں

یہ سبق اس پوری سورت اور قصے کا مقدمہ ہے اور اس قصے کا پہلا حلقہ اور پہلی کڑی ہے۔ یہ پورا سبق چھ مناظر پر مشتمل ہے' اور قصے کا آغاز حضرت یوسف کے خواب سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام برادران یوسف کی سازش کی ناکامی پر ہوتا ہے۔ اور حضرت یوسف مصر چلے جاتے ہیں۔ اس میں ہم نصوص پر مفصل تبصرہ دوران تشریح ہی کریں گے اور جو اجمالی تبصرہ ہم نے اس سورت کے دیباچے میں کر دیا ہے' اور وہ کافی ہے۔ یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

---○○○---

# درس نمبر ۱۰۶ تشریح آیات

۱ ــــــ تا ــــــ ۲۰

---

سُوْرَةُ يُوْسُفَ مَكِّيَّةٌ (۵۳) — اٰيَاتُهَا ۱۱۱ — رُكُوْعَاتُهَا ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۱﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲﴾
نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ
مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔

"ا'ل 'ر ۔ یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے ۔ ہم نے اسے نازل کیا ہے 'قرآن بنا کر' عربی زبان میں تاکہ تم اسے اچھی طرح سمجھ سکو' اے محمد ہم اس قرآن کو تمہارے طرف وحی کر کے بہترین پیرائے میں واقعات و حقائق تم سے بیان کرتے ہیں ورنہ اس سے پہلے تو تم بالکل بے خبر تھے"۔

الرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۱۲ : ۱) "ا'ل 'ر ۔ یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے" ۔ یہ حروف وہی ہیں جن کو لوگ پڑھتے اور لکھتے رہے ہیں اور انہی حروف سے یہ آیات بنائی گئی ہیں جو بہت بلند ہیں اور انسانوں کے اندر یہ طاقت اور صلاحیت نہیں ہے کہ وہ ایسا کلام مرتب کر سکیں ۔ یہ آیات ایسی کتاب کی ہیں جس کا مقصد اور مدعا بالکل واضح ہے ۔ یہ کتاب عربی ہے اور انہی حروف سے مولف ہے جو عربی کے حروف تہجی ہیں ۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۱۲ : ۲) "ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم (اہل عرب) اس کو اچھی طرح سمجھ سکو" ۔ یعنی تم اس بات کو سمجھ سکو کہ متداول حروف تہجی اور عام

بولے جانے والے کلمات سے ایک ایسی کتاب مرتب کرنا جو معجز ہو کسی انسان کی استطاعت میں نہیں ہے۔ لہذا عقلاً یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ قرآن وحی الٰہی ہے 'گویا عقل کو دعوت دی جارہی ہے کہ وہ کتاب الٰہی کے اس اعجازی پہلو پر غور کرے اور اس سے نتائج اخذ کرے۔

چونکہ اس سورت کا بیشتر حصہ ایک قصے پر مشتمل ہے۔اس لیے اس کتاب کے موضوعات میں سے قصے کے موضوع کی صراحت کر دی گئی اور یہ فرمایا کہ یہ قصہ احسن القصص ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ( ۱۲ : ۳ )

"اے نبیؐ 'ہم اس قرآن کو تمہاری طرف وحی کر کے بہترین پیرایہ میں واقعات اور قصص تم سے بیان کرتے ہیں"۔یعنی قرآن کریم کی وحی تمہاری طرف کر کے ہم نے بہترین قصص تم پر نازل کیے اور یہ قصہ پھر تمام قصص سے احسن ہے اور یہ بھی وحی الٰہی ہے۔

وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ( ۱۲ : ۳ ) "ورنہ اس سے پہلے تو (ان چیزوں سے) تم بالکل ہی بے خبر تھے"۔کیونکہ آپ بھی اپنی پوری قوم کی طرح خواندہ نہ تھے 'نہ اس قسم کے موضوعات پر کلام کرتے تھے جن پر قرآن کریم نے بات کی ہے اور قرآن کریم کے موضوعات میں سے ایک موضوع اس قسم کے قصے بھی ہیں جو گہری دانشمندی پر مشتمل ہیں۔

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ۝ قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۝ وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ عَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ ؕ
اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝ ع ٦
۱۱

"یہ اس وقت کا ذکر ہے جب یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا "ابا جان 'میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند ہیں اور وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں"۔جواب میں اس کے باپ نے کہا "بیٹا اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا ورنہ وہ تیرے درپے آزار ہو جائیں گے 'حقیقت یہ ہے کہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے اور ایسا ہی ہو گا 'تیرا رب تجھے منتخب کرے گا 'اور تجھے باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھائے گا اور تیرے اوپر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت

اسی طرح پوری کرے گا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے بزرگوں ابراہیم اور اسحاق پر کر چکا ہے ' یقیناً تیرا رب علیم و حکیم ہے"۔

اس خواب کے وقت حضرت یوسف ؑ ابھی بچے تھے یا مراہق ۔ لیکن یہ خواب جو انہوں نے اپنے باپ کے سامنے بیان کیا یہ بچوں یا نوجوانوں کا خواب نہ تھا ' بچے اور نوجوان بچوں جیسے خواب دیکھتے ہیں یا وہ ایسے خواب دیکھتے ہیں جن کے بارے میں وہ کوئی سوچ رکھتے ہوں ' مثلاً یہ کہ سورج اور چاند ان کے ہاتھ میں ہوں اور یہ کہ اس نے انہیں پکڑ لیا ہو۔ لیکن یوسف ؑ نے دیکھا کہ شمس و قمر ایک عاقل شخص کی طرح ان کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور ستارے بھی ان کے سامنے سر جھکائے ہیں ۔ یہ سجدۂ تعظیم تھا۔ قرآن کریم نہایت ہی وضاحت سے اس بات کو یوں نقل کرتا ہے ۔

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ( ۱۲ : ۴ ) "یہ اس وقت کا ذکر ہے جب یوسف ؑ نے اپنے باپ سے کہا "ابا جان ' میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند ہیں اور وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں"۔

اس آیت میں لفظ "رئیت" کا اعادہ بطور تاکید ہے...... غرض حضرت یعقوب ؑ نے خواب کو سن کر معلوم کر لیا کہ یہ خواب بچوں کا خواب نہیں ہے اور حضرت یوسف ؑ کا مستقبل تابناک ہے ۔ یہ تعبیر ان کے شعور نبوت نے ان کو بتا دی تھی لیکن انہوں نے اس کا اظہار نہ کیا اور نہ قصے میں تعبیر کو بیان کیا گیا۔ یہاں تک اس خواب کے آثار بھی قصے کی دو کڑیوں کے پڑھنے کے بعد ہی قارئین پا سکتے ہیں ۔ رہا پورا خواب تو وہ قارئین کو پورا قصہ پڑھ لینے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے ۔ خواب چونکہ اہم تھا اس لیے انہوں نے یوسف علیہ السلام کو نصیحت کی کہ وہ اس خواب کا اظہار اپنے بھائیوں کے سامنے نہ کریں ' ہو سکتا ہے کہ وہ سمجھ جائیں کہ اس بچے کا مستقبل تو غیر معمولی ہے ۔کیونکہ حضرت یوسف ؑ ان کے چھوٹے بھائی تو تھے لیکن سگے نہ تھے ۔ حضرت یعقوب ؑ کے شعور نبوت نے یہ خطرہ محسوس کر لیا کہ شیطان کہیں ان بھائیوں کے درمیان عداوت ' حسد اور دشمنی پیدا نہ کر دے ۔ اور وہ ایک دوسرے کو نقصان نہ پہنچا دیں ۔

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ( ۱۲ : ۵ ) "جواب میں اس کے باپ نے کہا "بیٹا اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا ورنہ وہ تیرے درپے آزار ہو جائیں گے ' حقیقت یہ ہے کہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے"۔

حضرت یعقوب ؑ نے خواب کو راز میں رکھنے کا سبب یہ بتایا کہ شیطان انسان کا دشمن ہے اور بعض لوگوں کے دلوں کو دوسروں کے خلاف حسد اور بغض سے بھر دیتا ہے اور وہ لوگوں کو آمادہ کرتا رہتا ہے کہ وہ غلطی کریں ' شر کریں اور بڑی بڑی غلطیوں کو وہ لوگوں کے سامنے معمولی کر کے اور خوشنما کر کے پیش کرتا ہے ۔

حضرت یعقوب ' ابن حضرت اسحاق ابن حضرت ابراہیم علیہم السلام تھے نبوت کا خاندان تھا۔ انہوں نے خواب سنتے ہی محسوس کر لیا تھا کہ یہ بیٹا ایک تابناک مستقبل کا مالک ہے ۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ یہ تابناک مستقبل دین ' اصلاح اور علم

و معرفت کے میدان میں ہو گا۔ پھر ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت ابراہیم کی اولاد میں اس شمع نے روشن رہنا تھا' لہٰذا وہ یہ توقع رکھتے تھے کہ وارث نبوت یقیناً حضرت یوسف ؑ ہی ہیں۔ اس لیے انہوں نے ان کو اس کی بشارت دے دی :

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۲ : ۶) "اور ایسا ہی ہو گا' تیرا رب تجھے منتخب کرے گا' اور تجھے باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھائے گا اور تیرے اوپر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کرے گا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے بزرگوں ابراہیم اور اسحاق پر کر چکا ہے' یقیناً تیرا رب علیم و حکیم ہے"۔

حضرت یعقوب کی سوچ اس اہم خواب کے بارے میں یہ بتا رہی ہے کہ حضرت یوسف ؑ اللہ کے ہاں برگزیدہ بن گئے ہیں اور ان پر اسی طرح کا فضل و کرم ہو چکا ہے جس طرح ان کے باپ اور دادا پر ہو چکا ہے یعنی حضرت اسحاق اور ابراہیم پر۔ عربی میں باپ اور دادا دونوں کے لیے "اب" کا لفظ بولا جاتا ہے۔

البتہ آیت کا یہ حصہ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ (۱۲ : ۶) "تجھے باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھائے گا"۔ تاویل کا مفہوم یہ ہے کہ کسی بات کے انجام کا علم ہو جائے۔ احادیث سے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اللہ حضرت یوسف کو نبی کا منصب عطا کرے گا' اسے سچا شعور دے گا' دور رس بصیرت دے گا جس کی وجہ سے وہ ہر بات کے انجام اور نتائج کو پہلے سے معلوم کر لیں گے اور یہ صلاحیت الٰہی صلاحیت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ ان لوگوں کو دیتا ہے جن کو تیز فہم اور ادراک عطا ہوتا ہے۔

دوسرا مفہوم احادیث سے خوابیں بھی ہو سکتی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ حضرت یوسف کو خوابوں کی تعبیر کے سلسلے میں دور رس بصیرت دے گا۔ یہ دونوں مفہوم احادیث کے ہو سکتے ہیں اور دوسرا مفہوم تو عملاً قصے میں موجود ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۲ : ۶) "تمہارا رب علیم و حکیم ہے"۔ وہی علم اور حکمت کا سرچشمہ ہے جسے وہ یہ چیزیں چاہے دے سکتا ہے۔

خوابوں اور احلام کی حقیقت کیا ہے۔ مناسب ہے کہ یہاں ان پر ایک نوٹ دے دیا جائے کیونکہ اس قصے کی اہم کڑیاں خوابوں پر مشتمل ہیں۔

ایک مسلمان کو یہ عقیدہ لازماً رکھنا پڑتا ہے کہ بعض خوابیں ایسی ہوتی ہیں جو مستقبل قریب یا بعید کے بارے میں صریح پیشن گوئی کرتی ہیں' کیونکہ اس سورت میں حضرت یوسف کے خواب' حضرت یوسف ؑ کے دو ساتھیوں کے خواب اور شاہ مصر کے خواب اور ان کا ذکر صراحت سے اس بات کو لازم کرتے ہیں کہ خوابوں کے اندر پیشن گوئی آ جاتی ہے --- پھر ہم میں سے ہر شخص اپنی شخصی زندگی میں اس قسم کی خوابیں اور بشارتیں دیکھتا ہے اور وہ سچی ثابت ہوتی ہیں۔ اس قدر یہ کہ انسان خواب کی حقیقت کا انکار نہیں کرتا۔ کیونکہ عملاً ہر شخص اس حقیقت کو موجود پاتا ہے۔ خواب

پر یقین کرنے کے لیے یہ سورت اور قرآن کی تصریحات ہی کافی ہیں لیکن جس دوسری بات کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ بھی ایک عملی اور تجربی حقیقت ہے اور اس کا انکار کرنا ممکن نہیں۔

سوال یہ ہے کہ پھر خواب کی حقیقت کیا ہے۔ نفسیاتی تجربہ کرنے والوں نے کہا ہے کہ خوابیں دراصل انسان کے خفیہ اور خوابیدہ خواہشات کا عکس ہوتی ہیں۔ بے شک یہ بھی خوابوں کا ایک پہلو ہے' لیکن یہ تمام خوابوں کی تعبیر نہیں ہے۔ فرائیڈ اپنی مکمل بے دینی اور اپنی مکمل ہٹ دھرمی کے باوجود اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ بعض خوابیں یقیناً پیش گوئی کا درجہ رکھتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ان مبشرات کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ خواب کی حقیقت کو ہم سمجھ سکیں یا نہیں لیکن اس بات میں شک نہیں ہے کہ بعض خوابیں نہایت ہی سچی ہوتی ہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ انسان اللہ کی عجیب و غریب مخلوق ہے اور اللہ نے اس کے وجود کے اندر جو قوانین اور حکمت ودیعت کی ہے ہم اس کے بعض پہلوؤں کو جان سکیں۔

ایسی سچی خوابوں کی حقیقت کو ہم اس انداز سے تعبیر کرتے ہیں کہ ماضی اور مستقبل کے حوادث اور واقعات کو ہم اس لیے نہیں سمجھ سکتے کہ ہمارے اور ان کے درمیان زمان و مکان کا پردہ حائل ہوتا ہے یا ایک چیز حاضر بھی ہوتی ہے۔ لیکن ہماری نظروں سے پوشیدہ ہوتی ہے۔ ماضی اور مستقبل کو تو زمانے کا فیکٹر ہماری نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ جیسا کہ حاضر بعید کو مکان کا فیکٹر ہمارے علم سے دور رکھتا ہے۔ بعض اوقات انسان کے اندر ایسے حواس جاگ اٹھتے ہیں یا قوی ہو جاتے ہیں۔ جو زمانے کے پردوں کو پھاڑ کر آگے دیکھ لیتے ہیں' لیکن ان کی صورت مبہم ہوتی ہے۔ یہ مکمل علم نہیں ہوتا لیکن استشفاف ہوتا ہے اور بعض لوگوں کو یہ جاگتے ہوئے بھی حاصل ہوتا ہے اور بعض لوگوں کو یہ احساس سوتے میں ہوتا ہے لیکن ہمیں نہ اس کی حقیقت کا علم ہے اور نہ زمان کی حقیقت کا۔ اس طرح مکان جو مادے سے عبارت ہے یہ بھی ہمیں اچھی طرح معلوم نہیں ہے۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا "تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے"۔ بہرحال حضرت یوسف ؑ نے خواب دیکھا اور اس کی تعبیر آرہی ہے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں یہ کہوں گا کہ میں ہر چیز کی تکذیب کر سکتا ہوں لیکن میں ایک ایسے واقعہ کی تکذیب نہیں کر سکتا جو خود مجھے پیش آیا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میری ایک بھانجی کی آنکھوں میں خون ہے اور اسے نظر نہیں آرہا ہے۔ میں نے گھر خط لکھا اور اس میں اس کی آنکھوں کے بارے میں پوچھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ تو انہوں نے لکھا کہ اسے ایک ایسی تکلیف ہے کہ باہر سے نظر نہیں آرہی۔ بظاہر اس کی آنکھیں درست نظر آتی ہیں لیکن اسے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اور یہ کہ اس کا علاج ہو رہا ہے۔ میری خواب سچی تھی اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے جس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔

---000---

اب پردہ گرتا ہے' حضرت یعقوب ؑ اور حضرت یوسف ؑ پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ ایک دوسرا منظر سامنے

آتا ہے ۔ برادران یوسف ؑ اس میں متحرک نظر آتے ہیں ۔ ان کی حرکات سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ اہم واقعات پیش آنے والے ہیں ۔

لَقَدْ كَانَ فِىْ يُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ﴿۷﴾

اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِيْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِىْ

ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۚۖ ﴿۸﴾ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَ

تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ﴿۹﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ

فِىْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰﴾

"حقیقت یہ ہے کہ یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصے میں ان پوچھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں ۔ یہ قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ اس کے بھائیوں نے آپس میں کہا "یہ یوسف اور اس کا بھائی دونوں ہمارے والد کو ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں' حالانکہ ہم پورا جتھا ہیں ۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے ابا جان بالکل بہک گئے ہیں" ۔ چلو یوسف ؑ کو قتل کر دو یا اسے کہیں پھینک دو تاکہ تمہارے والد کی توجہ صرف تمہارے ہی طرف ہو جائے ۔ یہ کام کر لینے کے بعد پھر نیک بن رہنا" ۔ اس پر ان میں سے ایک بولا "یوسف کو قتل نہ کرو' اگر کچھ کرنا ہی ہے تو اسے کسی اندھے کنوئیں میں ڈال دو ۔ کوئی آتا جاتا قافلہ اسے نکال لے جائے گا" ۔

حضرت یوسف ؑ اور ان کے بھائیوں کے قصے میں بہت سی آیات اور نشانیاں ہیں اور ان کے ذریعہ انسان بڑے بڑے حقائق تک پہنچ سکتا ہے ۔ یہ افتتاحیہ کلمات قارئین کو متوجہ متنبہ اور بات کی اہمیت کی تحریک کرنے کے لیے کافی ہیں ۔ یہ کلمات اس طرح ہیں جس طرح اسٹیج پر سے پردہ گرا دیا جاتا ہے اور اسٹیج کے اوپر جو کچھ ہوتا ہے' وہ سامنے نظر آنے لگتا ہے کیونکہ ان کلمات کے بعد متصلاً برادران یوسف بات کرتے نظر آتے ہیں اور وہ اس مکالمے میں یوسف کے خلاف سازش کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔

کیا یہاں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یوسف ؑ نے اپنے بھائیوں کے سامنے اپنا خواب بیان کر دیا تھا جیسا کہ کتاب عہد قدیم کہتی ہے یا نہیں' یہاں سیاق کلام سے ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہوتی کیونکہ ان کا الزام یہ ہے کہ حضرت یعقوب یوسف ؑ اور ان کے سگے بھائی سے زیادہ محبت کیوں کرتے ہیں ۔ اگر ان کو معلوم ہوتا کہ حضرت یوسف نے خواب دیکھا ہے تو ان کی زبان سے اس کا ذکر ضرور ہو جاتا ۔ اور یوں وہ کینہ پروری اور حقد و حسد کے لیے معذور بھی ہوتے' اس لئے کہ حضرت یعقوب ؑ نے یوسف ؑ کو خواب کو پوشیدہ رکھنے کا جو مشورہ دیا تھا تو محض اسی لیے دیا تھا کہ آپ کو دوسرے حالات کے پیش نظر معلوم تھا کہ وہ جل بھن اٹھیں گے اور اس حسد اور کینے نے واقع تو ہونا ہی تھا کیونکہ اس بھٹی سے گزر کر ہی حضرت یوسف ؑ نے اپنے مقررہ مقام تک پہنچنا تھا ۔ ان کی زندگی کے حالات' ان کے

خاندانی حالات اور پھر ان کا حضرت یعقوب ؑ کے بڑھاپے میں پیدا ہونا' چھوٹا ہونا' کیونکہ بڑھاپے میں چھوٹے بچوں کے ساتھ بہت پیار ہوتا ہے' خصوصاً جبکہ چھوٹے بچے سوتیلی اور چھوٹی ماں کے ہوں۔

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَ اِخْوَتِهٖ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ (٧) اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ (٨) (١٢ : ٧ – ٨)

"حقیقت یہ ہے کہ یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصے میں ان پوچھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ اس کے بھائیوں نے آپس میں کہا "یہ یوسف اور اس کا بھائی دونوں ہمارے والد کو ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں' حالانکہ ہم پورا جتھا ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے ابا جان بالکل بہک گئے ہیں"۔

یہ کہ ہم ایک مضبوط جتھا ہیں' ہم اسلام اور خاندان کی مدافعت کرتے ہیں اور مفید ہیں۔ جبکہ ہمارے والد محترم ہمارے مقابلے میں ایک بچے اور ایک لڑکے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں' باوجود اس کے کہ ان کے مقابلے میں ہماری افادیت بھی زیادہ ہے اور تعداد بھی۔

ان کا غیظ و غضب اور کینہ جوش مارتا ہے' عین اس وقت شیطان ان کے دلوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب وہ واقعات کا صحیح اندازہ نہیں کر پاتے۔ معمولی باتیں ان کو پہاڑ نظر آتی ہیں۔ عظیم جرائم ان کو چھوٹے نظر آنے لگتے ہیں۔ ایک انسان کا قتل ان کے لیے اب ایک معمولی بات بن جاتی ہے۔ پھر ایک بچے کی وہ جان لینے کے درپے ہیں جو نہ جانتا ہے اور نہ اپنا دفاع کر سکتا ہے۔ پھر وہ ان کا بھائی بھی ہے اور اس کے باوجود کہ یہ ایک برگزیدہ نبی کے بیٹے ہیں۔ اگرچہ وہ خود نبی نہ تھے۔ ان کے لیے ان کے باپ کی زیادہ محبت ایک عظیم جرم بن گیا ہے' یہاں تک کہ باپ کی زیادہ محبت کرنا قتل کے لیے جواز بن گیا ہے حالانکہ قتل شرک کے بعد سب سے بڑا جرم ہے۔

اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا (١٢ : ٩) "چلو یوسف ؑ کو قتل کر دو یا اسے کہیں پھینک دو"۔ دونوں باتیں قباحت اور جرم کے اعتبار سے ایک ہیں' کیونکہ کسی بچے کو ایک ایسی زمین میں پھینکنا جو دور دراز ہو' گویا اسے قتل کرنے کے برابر ہے کیونکہ ایسے حالات میں اکثر موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور کیوں ایسا کرو؟

يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ (١٢ : ٩) "تاکہ تمہارے والد کی توجہ صرف تمہاری ہی طرف ہو جائے"۔ اب یوسف ؑ تمہاری راہ کی رکاوٹ نہ رہیں گے۔ یعنی ان کا دل یوسف ؑ کی محبت سے خالی ہو جائے گا۔ جب وہ دیکھیں گے کہ یوسفؑ موجود ہی نہیں ہے حضرت یعقوبؑ اس سے محبت نہ کریں گے۔ اور ان سے محبت شروع ہو جائے گی۔ اور یہ کس قدر عظیم جرم ہے؟ تو اس کا علاج یہ ہے کہ یہ اس سے توبہ کر لیں گے' صالح ہو جائیں گے اور توبہ و صلاح سے ماضی کے جرائم معاف ہو جائیں گے۔

وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ (١٢ : ٩) "یہ کام کر لینے کے بعد پھر نیک بن رہنا"۔ یوں شیطان کو موقعہ مل جاتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان تنازعات پیدا کر دے۔ جب لوگ ایک دوسرے پر غصے میں آ جاتے

ہیں تو وہ بعض کو بعض پر حملہ آور ہونے پر آمادہ کرتا ہے ۔ اور غصے کی حالت میں انسان کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے ۔ کیونکہ انسان کو اپنے اوپر کنٹرول نہیں رہتا ۔ اور انسان واقعات اور امور کا اچھی طرح جائزہ نہیں لے سکتا ۔ چنانچہ جب برادران یوسف ؑ کے دلوں میں کینہ کی آگ بھڑک اٹھی تو عین اس وقت شیطان پردے سے سامنے آیا اور کہا کہ اسے قتل کر دو' اس کے بعد توبہ کا دروازہ کھلا ہے' حالانکہ توبہ ایسی نہیں ہوتی ۔ توبہ اس صورت میں ہوتی ہے کہ انسان سے بتقاضائے بشریت کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور وہ اس پر پشیمان ہو جائے ۔ یہ توبہ نہیں کہ پہلے توبہ کرنے کے ارادے سے غلطی کرے ۔ منصوبے کے تحت جرم کرے ۔ درحقیقت یہ توبہ سے غلط فائدہ اٹھانا ہے اور توبہ کو ارتکاب جرائم کے لیے جواز کے طور پر استعمال کرنا ہے ۔ اور یہ انداز انسان کو شیطان سکھاتا ہے' رحمٰن نہیں ۔

ہاں اس موقعہ پر ان میں سے ایک شخص کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے ۔ وہ اس ہولناک منصوبے کو برداشت نہیں کر سکتا ۔ چنانچہ یہ شخص ایک ایسا حل پیش کرتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ قتل ہونے سے بھی بچ جائیں اور ان کے لیے ان کے باپ بھی فارغ ہو جائیں ۔ وہ یہ تجویز کرتا ہے کہ اسے بیابان میں پھینکنے کی بجائے قافلوں کی آمدورفت والے کنویں میں پھینک دیں' کوئی قافلے والے اسے پکڑ کر لے جائیں گے ۔ کیونکہ غیر آباد جنگل میں اس کی ہلاکت کا امکان زیادہ ہے اور شارع عام کے کنویں میں بہت ہی کم ہے کیونکہ کوئی قافلہ آئے گا اور اسے غنیمت سمجھ کر لے جائے گا ۔ اور وہ باپ کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گا ۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ (۱۲ : ۱۰) "اس پر ان میں سے ایک بولا" یوسف کو قتل نہ کرو' اگر کچھ کرنا ہی ہے تو اسے کسی اندھے کنویں میں ڈال دو ۔ کوئی آتا جاتا قافلہ اسے نکال لے جائے گا" ۔

اس شخص نے جو یہ کہا ہے اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ (۱۲ : ۱۰) "اگر کرنا ہی ہے" ۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابھی تک یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ برادران یوسف ؑ ان کے ساتھ یہ حرکت کریں گے ۔ نیز اگر انہوں نے کرنا ہے تو یہ ناپسندیدہ فعل ہے ۔ اور خوشی کا باعث نہیں ہے ۔ بہرحال یہ تجویز اس کے کینہ کو پوری طرح ٹھنڈا کرنے والی نہ تھی اور انہوں نے قتل یوسف کا جو فیصلہ کیا تھا اس سے وہ واپس آنے کے لیے تیار نہ تھے اور یہ باتیں اگلے منظر سے معلوم ہوتی ہیں ۔

---ooo---

اب یہ لوگ اپنے باپ کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور انہیں آمادہ کر رہے ہیں کہ یوسف ؑ کو ان کے ساتھ جانے دیں ۔ اب وہ باپ کو دھوکہ دے رہے ہیں' یوسف ؑ کے خلاف سازش کر رہے ہیں' ذرا براہ راست ان کی بات سنیں ۔

قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰی یُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ۝۱۱
اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا یَّرْتَعْ وَ یَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝۱۲ قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ

تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

"اس قرارداد پر انہوں نے اپنے باپ سے کہا "ابا جان کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے معاملے میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے سچے خیر خواہ ہیں۔ کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجئے' کچھ چر چگ لے گا اور کھیل کود سے بھی دل بہلائے گا۔ ہم اس کی حفاظت کو موجود ہیں۔ باپ نے کہا "تمہارا اسے لے جانا مجھے شاق گزرتا ہے اور مجھ کو اندیشہ ہے کہ کہیں اسے بھیڑیا نہ پھاڑ کھائے جبکہ تم اس سے غافل ہو"۔ انہوں نے جواب دیا "اگر ہمارے ہوتے اسے بھیڑیئے نے کھا لیا جبکہ ہم ایک جتھا ہیں تو ہم بڑے نکمے ہوں گے"۔

ان کے الفاظ اور انداز گفتگو سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ بوڑھے اور چھوٹے بچے سے محبت کرنے والے والد سے اس کے اس جگر گوشے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا کرنے کی خاطر ہر تدبیر بروئے کار لا رہے ہیں' والد کو ان سے بے حد محبت ہے اس لیے کہ وہ نور نبوت کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں کہ باپ دادا کی میراث کا وارث ہونے والے یہی ہیں۔ (یٰاَبَانَا) "اے ہمارے باپ" اس موقعہ پر وہ ابوت اور ابنیت کے نہایت ہی اپیل کرنے والے رشتے کو استعمال کر رہے ہیں۔

قَالُوْا يٰاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰي يُوْسُفَ (۱۲ : ۱۱) "کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے معاملے میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے"۔ یہ ایک سوال ہے' لیکن اس میں ایک خفیہ خباثت' غصہ اور ناگواری بھی ہے۔ لیکن وہ باپ کو آمادہ بھی کر رہے ہیں کہ وہ ان پر اعتبار کرتے ہوئے یوسف کو ان کے حوالے کر دیں' حضرت یعقوب کی عادت یہ تھی کہ وہ یوسف کو ساتھ ہی رکھتے تھے اور جب ان کے دوسرے بیٹے کسی دور دراز کی مہم پر جاتے تھے تو درازی سفر' مشکلات سفر اور مشقت مہم کی وجہ سے یوسف کو ساتھ جانے نہ دیتے تھے کیونکہ وہ چھوٹا تھا اور یہ بڑے تھے۔ انہوں نے نہایت ہی مکارانہ انداز میں گفتگو کرتے ہوئے باپ کو یہ تاثر دیا کہ شاید وہ ہم پر یوسف کے معاملے میں اعتماد نہیں کرتے۔ حالانکہ وہ ہمارے سب کے باپ ہیں اور یوسف بھائی ہیں۔ نہایت ہی مکارانہ انداز میں وہ بدگمانی کی نفی کر رہے ہیں۔ ذرا ان کی اس خبیث چال پر ایک بار پھر نظر ڈالیں۔

مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰي يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ (۱۲ : ۱۱) "کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے معاملہ میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں"۔ ہمارے دل تو صاف ہیں۔ ان میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ ہماری نیت صاف ہے اور ہم مخلص ہیں' یہاں ان کی جانب سے اخلاص اور صفائی کا دعویٰ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ نہایت ہی گہری چال چل رہے ہیں اور حد درجہ کے دھوکہ باز ہیں۔

اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۲ : ۱۲) "کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجئے' کچھ چر چگ لے گا اور کھیل کود سے بھی دل بہلائے گا' ہم اس کی حفاظت کو موجود ہیں"۔

یہ لوگ نہایت ہی تاکیدی الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ اور یوسف کو اس سفر میں جو خوشیاں ملنے والی ہیں ان کی خوب تصویر کشی کر رہے ہیں کہ وہ خوش ہوں گے، ورزش کریں گے، یوں وہ دھوکہ دے کر والد کو آمادہ کر رہے ہیں کہ وہ یوسف ؑ کو ان کے ساتھ بھیج دیں۔

ان کی اس چرب زبانی کا حضرت یعقوب ؑ بھی یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ بات نہیں ہے، کہ میں تم پر اعتماد نہیں کرتا بلکہ اصل خطرہ یہ ہے کہ علاقے میں بھیڑیئے زیادہ ہیں اور میں یہ خطرہ محسوس کرتا ہوں کہ کہیں اسے کوئی بھیڑیا نہ کھالے"۔

قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ

(۱۲ : ۱۳) "باپ نے کہا "تمہارا اسے لے جانا مجھے شاق گزرتا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اسے بھیڑیا نہ پھاڑ کھائے جبکہ تم اس سے غافل ہو"۔

یعنی تمہارا لے جانا مجھے شاق گزرتا ہے اور میں اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہی وہ بات جو ان کے دلوں میں کینہ کی آگ دھکا رہی تھی کہ اباجان یوسف ؑ کو ہروقت ساتھ رکھتے ہیں اور کسی بھی وقت اپنے سے جدا نہیں کرتے اگرچہ ایک دن کے لیے کیوں نہ ہو۔ حالانکہ وہ اسے سیروتفریح کے لیے لیے جا رہے ہیں۔

حضرت یعقوب ؑ نے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اسے بھیڑیا نہ کھالے جبکہ تم غافل ہو۔ دراصل وہ کینہ اور حسد کی وجہ سے اس قدر اندھے ہوگئے تھے کہ وہ سوچتے بھی نہ تھے کہ آخر یوسف ؑ کے قتل کے بعد وہ جواب کیا دیں گے، لیکن حضرت یعقوب ؑ کے اس اندیشے نے ان کو عذر بتا دیا۔

قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (۱۲ : ۱۴) "انہوں نے جواب دیا "اگر ہمارے ہوتے اسے بھیڑیئے نے کھالیا جبکہ ہم ایک جتھا ہیں، تب تو ہم بڑے ہی نکمے ہوں گے"۔

اب انہوں نے اس اندیشے کا رد کرنے کے لیے پھر نہایت ہی موثر اسلوب اختیار کیا، کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس قدر جتھے کے ہوتے ہوئے بھی کوئی بھیڑیا یوسف ؑ کو پھاڑ کھائے۔ یہ کیسے ممکن ہے ورنہ ہم تو بہت ہی نکمے اور خسارے میں ہوں گے۔

اس مکالمے کے نتیجے میں حضرت یعقوب ؑ اپنے تمام اندیشوں کے باوجود مجبور ہوگئے کہ وہ یوسف ؑ کو ان کے ساتھ چھوڑ دیں اور یوں تقدیر الہی کے مطابق قصے کی مزید کڑیاں ظہور پذیر ہوں۔

---○○○---

اب یہ لوگ انہیں لے کر جا رہے ہیں، اس مکروہ سازش پر یہ لوگ عمل پیرا ہو رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس بچے کے دل میں یہ بات ڈال رہا ہے کہ یہ ایک آزمائش ہے اور یہ ختم ہونے والی ہے اور یہ کہ ان شاء اللہ وہ زندہ رہے گا اور اپنے غافل بھائیوں کو اس کے بارے میں خود بتائے گا۔

---

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْٓا اَنْ یَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ وَ اَوْحَیْنَآ

اِلَيۡهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمۡ بِاَمۡرِهِمۡ هٰذَا وَ هُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۵﴾

''اس طرح اصرار کر کے جب وہ اسے لے گئے اور انہوں نے طے کر لیا کہ اسے ایک اندھے کنوئیں میں چھوڑ دیں' تو ہم نے یوسف ؑ کو وحی کی کہ ''ایک وقت آئے گا جب تو ان لوگوں کو ان کی یہ حرکت جتائے گا' یہ اپنے فعل کے نتائج سے بے خبر ہیں''۔

ان کے درمیان یہ بات طے پا گئی کہ اب یوسف کو کنوئیں میں ڈالنا ہے' جہاں وہ ان کی نظروں سے دور رہے گا۔اب ہر شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ اس وقت یوسف ؑ پر کیا گزری ہو گی کہ یہ سب بھائی مل کر اس کمزور بچے کو کنوئیں میں ڈال رہے ہوں گے۔جس کو اپنی موت قریب نظر آ رہی ہو گی اور بھائیوں کی نظریں بدل گئی ہوں گی' اس عالم بے بسی و بے کسی میں اب صرف اللہ کی مدد آتی ہے اور اللہ ان کے دل میں اطمینان اور سکینت ڈال دیتے ہیں کہ تم زندہ رہو گے' ان کو بتاؤ گے کہ تم نے کیا کیا تھا' اور ایسے حالات میں جبکہ کنوئیں میں ڈالا جانے والا یہ بچہ اب مملکت کا فرمانروا ہو گا۔

---○○○---

اب ہم یوسف ؑ کو اس اندھے کنوئیں میں چھوڑ کر ذرا کنعان چلتے ہیں۔یہ اب اللہ کی حمایت اور کفالت میں ہیں جب تک کہ اللہ ان کو وہاں سے نکال نہیں دیتا۔اب پردہ گرتا ہے اور یہ لوگ اس قدر برا کام کرنے کے بعد اب والد کے سامنے کھڑے ہیں ذرا ملاحظہ کریں ان کی بہانہ سازی۔

وَ جَآءُوۡۤ اَبَاهُمۡ عِشَآءً يَّبۡكُوۡنَ ﴿۱۶﴾ قَالُوۡا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبۡنَا نَسۡتَبِقُ وَ تَرَكۡنَا يُوۡسُفَ عِنۡدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئۡبُ ۚ وَمَاۤ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَلَوۡ كُنَّا صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۷﴾ وَ جَآءُوۡ عَلٰى قَمِيۡصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَكُمۡ اَنۡفُسُكُمۡ اَمۡرًا ؕ فَصَبۡرٌ جَمِيۡلٌ ؕ وَ اللّٰهُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوۡنَ ﴿۱۸﴾

''شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہا ''ابا جان' ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسف ؑ کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا آ کر اسے کھا گیا۔آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے چاہے ہم سچے ہی ہوں''۔اور وہ یوسف ؑ کے قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے تھے۔یہ سن کر ان کے باپ نے کہا ''بلکہ تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا۔اچھا' صبر کروں گا اور بخوبی صبر کروں گا' جو بات تم بنا رہے ہو' اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے''۔

ان کے دل میں کینے کی آگ جل رہی تھی اور یہ لوگ جھوٹ پر جھوٹ گھڑ رہے تھے۔اگر ان کو اپنے اعصاب پر ذرا بھی کنٹرول ہوتا تو وہ ایسا ہرگز نہ کرتے' وہ اس مکروہ سازش کا آغاز ہی نہ کرتے اور جب حضرت یعقوب ؑ نے ان پر اعتماد کر کے یوسف ؑ کو ان کے ساتھ رخصت کر دیا تھا تو ان کو باز آ جانا چاہئے تھا۔لیکن یوسف ؑ اب ان کی

برداشت سے باہر ہوگئے تھے۔ اور وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ان کے لیے اس سیاہ کارنامے کے سرانجام دینے کے لیے یہ بہترین موقعہ ہے۔ پھر ان کو خود حضرت یعقوب ؑ کی زبانی بھیڑیئے کا بہانہ بھی مل گیا تھا اور ان کی جلد بازی اور کچے پن کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے باپ کے اندیشے کے سوا کوئی اور بہانہ بھی نہ بنایا' کہ کل ہی تو حضرت یعقوب ؑ اس بہانے سے انہیں ڈراتے تھے اور یہ لوگ کہتے تھے کہ ہم تو بڑا جتھا ہیں۔ اب وہی بہانہ بنا رہے ہیں۔ بظاہر یہ بہانہ تو معقول نہیں ہے کہ رات کو جس بات سے انہیں متنبہ کیا گیا تھا وہی بہانہ صبح کو وہ پیش کر دیں۔ پھر ان کے سطحی پن کا اس سے زیادہ اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ یوسف ؑ کی قمیص پر وہ خون لگا کر لے آئے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بالکل بادی النظر میں ایک جھوٹا بہانہ تھا' لیکن انہوں نے یہ جھوٹ پیش کیا :

وَ جَآءُ وْ ا اَبَاھُمْ عِشَآءً یَّبْكُوْنَ (۱۶) قَالُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا یُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ (۱۲ : ۱۷) "شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہا "اباجان' ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسف ؑ کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا آکر اسے کھا گیا"۔

اور وہ خود بھی سمجھتے ہیں کہ بادی النظر میں نظر آتا ہے کہ یہ بہانہ جھوٹا ہے اور مشکوک آدمی تو نظر ہی یوں آتا ہے کہ چور کی داڑھی میں تنکا۔ چنانچہ کہتے ہیں :

وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِیْنَ (۱۲ : ۱۷) "آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے چاہے ہم سچے ہی ہوں"۔ یعنی نظر آتا ہے کہ آپ ہماری باتوں سے مطمئن نہیں' اگرچہ وہ سچی ہوں کیونکہ آپ کی نظروں مین ہم مشکوک ہیں۔

حضرت یعقوب نے حالات کو بھانپ لیا' خود نبوت نے انہیں بتا دیا کہ یوسف ؑ کو کم از کم بھیڑیئے نے نہیں کھایا۔ انہوں نے کوئی اور ہی سازش کی ہے۔ یہ جو بتا رہے ہیں وہ واقعہ نہیں ہے جو بتا رہے ہیں' یہ تو نہیں ہے۔ اس لیے انہوں نے صرف یہ تبصرہ کیا کہ تمہارے نفسوں نے تمہارے لیے کوئی بڑا برا کام آسان بنا دیا ہے اور اس کا ارتکاب تم نے کر لیا ہے اور یہ کہ ان کے لیے صبر کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ جزع و فزع ان کے شایان شان نہیں ہے اور یہ جھوٹ بادی النظر میں جھوٹ ہے جو یہ لوگ گھڑ رہے ہیں۔ اس کے بارے میں اللہ ہی سے شکایت کر سکتے ہیں۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (۱۲ : ۱۸) "یہ سن کر ان کے باپ نے کہا "بلکہ تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا۔ اچھا' صبر کروں گا اور بخوبی صبر کروں گا' جو بات تم بنا رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے"۔

---ooo---

اب ہم جلدی سے واپس ہوتے ہیں کہ اندھے کنوئیں میں یوسف علیہ السلام کس حال میں ہیں۔ اس طرح اس قصے

کی پہلی کڑی ختم ہوتی ہے :

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ ۖ قَالَ يَا بُشْرَىٰ هَٰذَا غُلَامٌ ۚ وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾ وَشَرَوْهُ
بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ﴿٢٠﴾ ع ۱۴

"ادھر ایک قافلہ آیا اور اس نے اپنے سقے کو پانی لانے کے لیے بھیجا۔ سقے نے جو کنوئیں میں ڈول ڈالا تو (یوسف کو دیکھ کر) پکار اٹھا "مبارک ہو یہاں تو ایک لڑکا ہے"۔ ان لوگوں نے اس کو مال تجارت سمجھ کر چھپا لیا' حالانکہ جو کچھ وہ کر رہے تھے خدا اس سے باخبر تھا۔ آخر کار انہوں نے تھوڑی سی قیمت پر چند درہموں کے عوض اسے بیچ ڈالا اور وہ اس کی قیمت کے معاملہ میں کچھ زیادہ کے امیدوار نہ تھے"۔

یہ اندھا کنواں شارع عام پر تھا' شارع عام کے ارد گرد لوگ ہمیشہ پانی کی تلاش میں بوقت ضرورت نکلتے ہی رہتے ہیں۔ خصوصاً بارش کا پانی بھی ایسے کنوؤں میں جمع ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ کنواں خشک بھی ہوتا ہے۔

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ (۱۲ : ۱۹) "ادھر ایک قافلہ آیا"۔ عربی میں قافلے کو سیارہ اس لیے کہتے ہیں کہ سیر کے معنی چلنے کے ہیں اور قافلہ بھی ایک طویل سفر پر ہوتا ہے' اسے نشانہ حوالہ اور قمامہ بھی کہتے ہیں۔

فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ (۱۲ : ۱۹) "اور اس نے اپنے سقے کو پانی لانے کے لیے بھیجا"۔ وارد بمعنی سقہ اسے وارد اس لیے کہتے ہیں کہ وہ پانی ان کی طرف لاتا ہے۔

فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ (۱۲ : ۱۹) "سقے نے کنوئیں میں ڈول ڈالا"۔ تاکہ وہ دیکھے کہ کنوئیں میں پانی ہے۔ اب یہاں سیاق کلام میں اس بات کو چھوڑ دیا جاتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ ڈول کے ساتھ لٹک گئے کیونکہ یہ بات بالکل عیاں ہے اور یہاں قارئین کو ایک حیران کن صورت حال سے دوچار کرنا مطلوب ہے۔ یہ کسی بھی قصے کا فنی کمال ہوتا ہے۔

قَالَ يَا بُشْرَىٰ هَٰذَا غُلَامٌ (۱۲ : ۱۹) ("یوسف ؑ کو دیکھ کر) مبارک ہو یہاں تو ایک لڑکا ہے"۔ یہاں قصے کی مزید تفصیلات کو حذف کر دیا جاتا ہے کہ یوسف ؑ کس قدر خوش ہوئے' یا ان کے تاثرات و حالات کیا تھے' صرف یوسف ؑ کے انجام کی طرف اشارہ آ جاتا ہے۔

وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً (۱۲ : ۱۹) "ان لوگوں نے اس کو مال تجارت سمجھ کر چھپا لیا"۔ انہوں نے اسے نہایت ہی خفیہ سامان تجارت سمجھا۔ ارادہ کر لیا کہ یہ غلام کی حیثیت میں بہت ہی اچھا فروخت ہو گا' چونکہ درحقیقت وہ

غلام تو تھا نہیں اس لیے انہوں نے اسے لوگوں کی نظروں سے چھپا لیا۔ اور چونکہ چوری کا مال تھا' اس لیے کم قیمت پر فروخت کر دیا اور اونے پونے سکوں کے عوض۔

وَ شَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ وَ كَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ (۱۲ : ۲۰)

"آخر کار انہوں نے تھوڑی سی قیمت پر چند درہموں کے عوض اسے بیچ ڈالا اور وہ اس کی قیمت کے معاملہ میں کچھ زیادہ کے امیدوار نہ تھے۔ ان کو توقع نہ تھی کہ اس سے وہ کچھ زیادہ نفع کمائیں گے..... غرض اللہ کے اس برگزیدہ نبی کے لیے یہ حالات نہایت ہی حوصلہ شکن تھے۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۰۷ ایک نظر میں

یہ سبق اس قصے کے دوسرے حلقے پر مشتمل ہے۔ اب یوسف علیہ السلام مصر پہنچ گئے ہیں۔ غلام کی طرح بک گئے ہیں، لیکن جس شخص نے اسے خریدا اس نے دیکھ لیا کہ یہ بچہ نہایت ہی ہونہار ہے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ چنانچہ اس نے اپنی بیوی کو ان کے بارے میں ہدایات دیں کہ یہ بچہ غیر معمولی ہے۔ یہاں سے حضرت یوسف ؑ کے خواب کی تعبیر شروع ہوتی ہے۔

لیکن بلوغ تک پہنچتے پہنچتے حضرت یوسف ؑ کے لیے ایک دوسرے قسم کا امتحان ابھی باقی تھا۔ حضرت یوسف ؑ کو اللہ نے منصب رسالت کے شایان شان علم و حکمت عطا کیا ہوا تھا اور یہ آزمائش ایسی تھی کہ محض اللہ کا فضل و کرم ہی اس امتحان میں کسی کو بچا سکتا تھا۔ حضرت یوسف اعلیٰ طبقات کے آزادانہ ماحول میں پل رہے تھے۔ ایسے طبقات بالعموم عیاشی اور فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان طبقات کے اکثر نوجوان بے راہ روی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حضرت یوسف ؑ محض فضل الٰہی سے اس گندے ماحول سے پاک دامن بن کر نکلے۔ ان کے لیے یہ مشقت سابقہ آزمائشوں سے کچھ کم نہ تھی۔

---○○○---

# درس نمبر ۱۰۷ تشریح آیات

۲۱ ---- تا ---- ۳۴

وَ قَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ٝ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

مصر کے جس شخص نے اسے خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا ''اس کو اچھی طرح رکھنا' بعید نہیں کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا بنالیں''۔ اس طرح ہم نے یوسف ؑ کے لیے اس سرزمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا۔ اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے قوت فیصلہ اور علم عطا کیا' اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزا دیتے ہیں''۔
ابھی تک ہمیں یہ نہیں بتایا گیا کہ حضرت کو کس نے خریدا۔ لیکن قدرے بعد یہ بتایا جائے گا کہ خریدار عزیز مصر ہے۔ کہا گیا ہے کہ وہ مصر کے اکابر میں سے تھا۔ لیکن ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ کو قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ اب مصیبت اور مشقت کے دن بیت گئے اور اب ان کے لیے اچھے سے اچھے دن آنے والے ہیں۔

اَكْرِمِيْ مَثْوٰهُ (۱۲ : ۲۱) ''اس کو اچھی طرح رکھنا'' مثوی ثوی سے اسم ظرف ہے یعنی رات گزارنے کی جگہ اور ٹھہرنے کی جگہ۔ اکرام مثوٰی سے مراد خود ان کا اکرام ہے۔ لیکن اس کے مقام کا اکرام کرو' زیادہ مبالغہ ہے اس سے کہ کوئی کہے اس کا اکرام کرو۔ یعنی صرف اس کی ذات کا اکرام ہی نہیں بلکہ اس کی بجائے قیام کا بھی اکرام ہو۔ اب ایک تو اس کا جائے قیام اندھے کنویں میں تھا جو ہر طرف سے خطرات میں گھرا ہوا تھا اور ہر طرف مصائب ہی مصائب تھے۔ اور اب یہاں ان کا تمکن ہے۔
عزیز مصر اپنی بیوی کو یہ بھی بتا دیتا ہے کہ اس بچے سے اس کی کیا امیدیں وابستہ ہیں؟

عَسٰی اَنْ یَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا (۱۲ : ۲۱) "بعید نہیں کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا بنالیں"۔ جس طرح بعض روایات مین آتا ہے شاید اس کے ہاں کوئی بیٹا نہ ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس شخص نے یہ عندیہ دیا کہ اگر یہ بچہ صاحب فراست نکلا تو اسے بیٹا بنالیں گے' جس طرح حضرت یوسف ؑ کے مزاج اور طور طریقوں سے معلوم ہوتا تھا' بعد میں وہ نہایت ہی رجل رشید ثابت ہوئے۔

اب یہاں قصے کے واقعات کو روک لیا جاتا ہے اور درمیان میں ایک مختصر سا تبصرہ آتا ہے اور بتایا جاتا ہے یہ تدابیر اللہ نے اس لیے اختیار کیں تاکہ حضرت یوسف ؑ کے قدم مصر میں جم جائیں۔ اب حضرت یوسف ؑ نے اس خریدار کے دل اور اس کے خاندان میں قدم جمالیے ہیں اور ان کی ترقی کا دور شروع ہو چکا ہے اور آگے جاکر ان کو اس بلند سوسائٹی میں رکھ کر معاملہ فہمی کے مواقع فراہم ہوں گے اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے تمام امور پر مکمل کنٹرول حاصل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے منصوبے اسی طرح نافذ ہوتے ہیں جس طرح اللہ چاہتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲ : ۲۱) "اس طرح ہم نے یوسف ؑ کے لیے اس سرزمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا۔ اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔

یہ کس طرح؟ دیکھو یوسف ؑ کے بھائیوں نے ان کے خلاف کیا سازش کی اور اللہ نے ان کے لیے کیا سوچا اور چاہا۔ اور اللہ نے جو چاہا وہ کامیاب رہا۔ کیونکہ اللہ کو تمام امور پر کنٹرول حاصل ہے لہٰذا ان کی تدابیر دھری کی دھری رہ گئیں اور حضرت یوسف ؑ کے بارے میں اللہ کا منصوبہ کامیاب رہا۔

مگر اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ جو اللہ چاہتا ہے' وہ ہوتا ہے اور لوگوں کے چاہنے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

"اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے قوت فیصلہ اور علم عطا کیا' اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزا دیتے ہیں"۔

حضرت یوسف ؑ کو اللہ نے یہ صلاحیت دی کہ وہ ہر معاملے میں صحیح فیصلہ کرنے' واقعات کے نتائج وہ پہلے سے معلوم کر لیتے' خوابوں کی تعبیر وہ بہت ہی اچھی طرح جانتے۔ تاویل احادیث اور تاویل رؤیا کا مفہوم عام بھی ہو سکتا ہے یعنی زندگی کے تمام معاملات کو وہ اچھی طرح سلجھاتے تھے اور یہ صلاحیت ان کو ان کی نیکی اور حسن سلوک کی وجہ سے دی گئی تھی اور اللہ تعالیٰ محسنین کو اسی طرح جزا دیتا ہے۔

---ooo---

اب حضرت یوسف ؑ پر ان کی زندگی کا سخت ترین امتحان آتا ہے اور یہ ان کے لیے سخت ترین آزمائش ہے۔ یہ ابتلا اس وقت آتا ہے جب اللہ نے ان کو علم دے دیا ہے اور صحیح فیصلے کی توفیق دے دی ہے تاکہ وہ ان کے ذریعے ان

مشکلات پر قابو پالیں اور سرخرو ہو کر ان سے نکلیں۔ کیونکہ یہ صالح اور پاکیزہ نوجوان ہیں اور محسنین کے ساتھ اللہ کا یہی سلوک ہوتا ہے۔

اب ذرا ملاحظہ کیجئے اس خطرناک منظر کو:

---

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَ
قَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ
الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ
لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَاسْتَبَقَا
الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا
جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ قَالَ هِيَ
رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ
مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ
فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ
اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَ
۳
۹ ع اسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚۖ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿۲۹﴾
۱۳

"جس عورت کے گھر میں وہ تھا وہ اس پر ڈورے ڈالنے لگی اور ایک روز دروازے بند کر کے بولی "آجا"۔ یوسف ؑ نے کہا "خدا کی پناہ، میرے رب نے تو مجھے اچھی منزلت بخشی (اور میں یہ کام کروں!) ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے"۔ وہ اس کی طرف بڑھی اور یوسف ؑ بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا۔ ایسا ہوا، تاکہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی کو دور کر دیں، درحقیقت وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا۔ آخر کار یوسف ؑ اور وہ آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے اور اس نے پیچھے سے یوسف ؑ کی قمیص (کھینچ کر) پھاڑ دی۔ دروازے

پر دونوں نے اس کے شوہر کو موجود پایا۔ اسے دیکھتے ہی عورت کہنے لگی : "کیا سزا ہے اس شخص کی جو تیری گھر والی پر نیت خراب کرے؟ اس کے سوا اور کیا سزا ہو سکتی ہے کہ وہ قید کیا جائے یا اسے سخت عذاب دیا جائے؟" یوسف ؑ نے کہا "یہی مجھے پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی"۔ اس عورت کے اپنے کنبہ والوں میں سے ایک شخص نے (قرینے کی) شہادت پیش کی کہ "اگر یوسف ؑ کی قمیص آگے سے پھٹی ہو تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹا' اور اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہو تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچا"۔ جب شوہر نے دیکھا کہ یوسف ؑ کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو اس نے کہا "یہ تم عورتوں کی چالاکیاں ہیں' واقعی بڑے غضب کی ہوتی ہیں تمہاری چالیں۔ یوسف ؑ اس معاملے سے درگزر کر۔ اور اے عورت' تو اپنے قصور کی معافی مانگ' تو ہی اصل میں خطاکار تھی"۔

یہاں قرآن مجید نے یہ نہیں بتایا کہ اس کی عمر کیا تھی اور نہ یہ بتایا ہے کہ حضرت یوسف ؑ کی عمر کیا تھی؟ یہاں ہم محض اندازے سے دونوں کی عمر کا تعین کر سکتے ہیں۔

جب حضرت یوسف ؑ کو قافلے نے اٹھایا تو وہ لڑکے تھے۔ انہیں مصر میں فروخت کر دیا گیا۔ گویا ان کی عمر چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔ کیونکہ عربی میں غلام اسی عمر کے لڑکوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس کے بعد کے لوگوں کے لیے فتی' شاب کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور اس کے بعد رجل کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ایسی عمر ہی میں حضرت یعقوب ؑ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں کہیں بھیڑیا کھا نہ لے جبکہ اس وقت عزیز مصر کی بیوی ایک بیوی ہے اور پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اولاد بھی نہیں ہے

اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ان کی اولاد نہ تھی۔ متبنی بنانے کا خیال ہی تب آتا ہے کہ اولاد نہ ہو' یا یہ کہ انسان جب مایوس ہو جاتا ہے کہ اب بچے پیدا ہونے کا کوئی موقعہ نہیں ہے تب وہ متبنی کے لیے سوچتا ہے۔ لہٰذا معلوم یوں ہوتا ہے کہ اس جوڑے کی شادی کے بعد کافی وقت گزر گیا ہے اور اب غالباً یہ جوڑا اولاد سے مایوس ہو گیا ہے' بہرحال یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ مصر کا وزیراعظم چالیس سال سے بھی کم عمر کا ہو' نیز اس وقت اس کی بیوی بھی کسی صورت میں تیس سال سے کم نہیں ہو سکتی۔

بہرحال قرین قیاس یہ ہے کہ یوسف کی عمر ۱۵ سال اور عزیز مصر کی بیوی کی عمر ۴۰ سال تھی تقریباً حالات یہ بتاتے ہیں کہ اس واقعہ کے وقت فریقین کی عمریں یہی تھیں۔ اس عورت کے معمر ہونے کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ اس واقعہ کے بارے میں اس نے جو موقف اختیار کیا وہ ایک پختہ عورت اور جرأت والی عورت کا موقف ہے' جو اپنی سازش کے تانے بانے پر مکمل کنٹرول رکھتی ہے۔ اس عورت کے بارے میں مصری خواتین کے تبصرے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ معمر عورت ہے۔

امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا (۱۲ : ۳۰) "کہ عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام کے پیچھے پڑی ہوئی ہے"۔ اگرچہ فتی غلام کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن عبد کے لیے بھی وہ اس لیے استعمال ہوتا ہے کہ اس میں فتوت کا مفہوم ہوتا ہے اور یوسف ؑ ایسے ہی تھے۔ بہرحال شہادت احوال و کوائف ان حقائق کی تائید میں ہے۔

یہ بحث ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ اس سے ایک متعین نتیجہ اخذ ہو۔ یہ کہ اس عورت نے صرف ایک حادثے میں

یوسف ؑ کو ورغلانے کی کوشش نہ کی تھی جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے زمانہ مراہقت سے مسلسل اس ابتلا میں رہے 'کیونکہ وہ وزیر اعظم کے محل میں تھے اور اس وقت عورت کی عمر ۳۰ / ۴۰ سال کے درمیان تھی۔ اور اس معاشرے کے اندر جو حالات تھے وہ اس عورت کے خاوند کے اس قول سے اچھی طرح معلوم ہوتے ہیں :

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِيْنَ

(۱۲ : ۲۹) "یوسف ؑ اس معاملے سے درگزر کر۔ اور اے عورت ' تو اپنے قصور کی معافی مانگ ' تو ہی اصل میں خطاکار تھی"۔

نیز عورتوں کی چہ میگوئیاں کہ عزیز مصر کی بیوی کیا کر رہی ہے اور اس کی جوابی تدبیر اور دعوت کا انتظام اور ان کے سامنے یوسف ؑ کا حاضر ہونا اور سب کا حیران رہ جانا اور اس کا یہ تبصرہ :

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ (۱۲ : ۳۲) "بے شک میں نے اسے رجھانے کی کوشش کی تھی مگر یہ بچ نکلا ' اگر یہ میرا کہا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل و خوار ہو گا"۔

یہ سوسائٹی جس میں اس قسم کی باتیں آزادانہ ہوتی ہوں ' یہ اونچے طبقے کی سوسائٹی ہوتی ہے۔ یوسف ؑ اس میں بطور غلام پھنسے ہوئے تھے اور اسی میں پل رہے تھے۔ اور عمر کا زمانہ ایسا تھا جسے فتنے اور آزمائش کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ یہ تھا یوسف ؑ کا ایک طویل اور کٹھن امتحان اور اس میں وہ ثابت قدم رہے۔ وہ اس سے سرخرو ہو کر نکلے ' اور اس سوسائٹی اور اس عمر کے فتنوں کے مقابلے میں کامیاب رہے۔ ان کی عمر اور عورت کی عمر کو مدنظر رکھ کر سوچا جائے کہ اس عورت کے ساتھ وہ ایک ہی گھر میں رہ رہے ہیں ' ان سب امور سے یہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ نے کس قدر طویل عرصے تک حالات کا مقابلہ کیا۔ اگر یہ واقعہ صرف یہی ایک ہوتا تو وہ بسہولت اس کا مقابلہ کر لیتے اور ان کے لیے مشکل پیش نہ آتی خصوصاً جبکہ مرد مطلوب ہو ' خود طالب نہ ہو ' خصوصاً جبکہ عورت کی خواہش ہو تو مرد اس سے انکار نہیں کر سکتا اور اس واقعہ میں عورت خواہشمند تھی۔

اس تمہید کے بعد اب تشریح آیات۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ (۱۲ : ۲۳) "جس عورت کے گھر میں وہ تھا وہ اس پر ڈورے ڈالنے لگی اور ایک روز دروازہ بند کر کے بولی "آجا"۔

اس بار یہ عورت کھلے بندوں حضرت یوسف ؑ کو ورغلانے کی کوشش کرتی ہے اور اس میں وہ واضح طور پر آخری مرحلے کے لیے دعوت دیتی ہے۔ دروازے بند کرنا آخری مرحلے پر ہوا کرتا ہے اور یہ عورت اب اس انتہا تک پہنچ چکی ہے ' جسمانی خواہش کا یہ آخری مرحلہ ہے۔

وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ (۱۲:۲۳) اور یہ آخری' واضح اور علانیہ دعوت کسی عورت کی طرف سے پہلی مرتبہ نہیں ہوتی۔ یہ بڑی تمہیدات کے بعد ہوتی ہے۔اگر عورت جسمانی خواہش کے اعتبار سے مجبور نہ ہو جائے تو ایسی دعوت وہ ہرگز نہیں دیتی۔نوجوان چونکہ ان کے گھر میں بھی رہا تھا' اس کی جسمانی قوت آہستہ آہستہ مکمل ہوئی تھی اور عورت کی خواہشات (هیت لك) کہنے سے قبل کئی مراحل سے گزری ہوں گی اور اس آخری مرحلے سے پہلے اس کی کئی اداؤں کا مقابلہ حضرت یوسف ؑ نے کیا ہو گا۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۱۲:۲۳) "یوسف ؑ نے کہا "خدا کی پناہ' میرے رب نے تو مجھے اچھی منزلت بخشی (اور میں یہ کام کروں!) ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے"۔ معاذ اللہ' میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔میں یہ کیسے کر سکتا ہوں۔

اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ (۱۲:۲۳) "میرے رب نے تو مجھے اچھی منزلت بخشی ہے"۔اس نے مجھے اندھے کنویں سے نجات دے کر باعزت جگہ دی اور ایسے اونچے گھرانے میں رکھا۔

اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۱۲:۲۳) "ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پاتے"۔جو حدود اللہ سے تجاوز کرتے ہیں اور تم جس بات کی دعوت دے رہی ہو یہ تو سراسر حدود اللہ سے تجاوز ہے۔

یہاں قرآن اس بات کی تصریح کرتا ہے اور قطعیت کے ساتھ تصریح کرتا ہے کہ عورت کے اس ورغلانے کے عمل اور دروازے بند کر کے حضرت یوسف ؑ کو علانیہ دعوت گناہ دینے کو حضرت یوسف ؑ نے بغیر تامل کے رد کر دیا۔ انہوں نے حدود اللہ کو یاد کیا' اللہ کے انعامات کو یاد کیا جبکہ قرآن نے اس کی دعوت گناہ کو بھی غلیظ الفاظ کے بجائے مہذب الفاظ میں بیان کیا یعنی

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (۱۲:۲۴) "وہ اس کی طرف بڑھی اور یوسف ؑ بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا"۔

یہ آخری مرحلہ تھا اور تمام مفسرین نے اس پر طویل کلام کیا ہے۔ قدیم مفسرین میں سے بعض لوگوں نے اسرائیلیات کا اتباع کیا ہے اور اس بارے میں متعدد روایات نقل کی ہیں۔ان روایات میں یہ ذکر ہوا ہے کہ یوسف ؑ بھی ایک عام نوجوان کی طرح اس آخری فعل کے ارتکاب پر مائل تھے' آگے بڑھ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ ان کو برہان پر برہان دکھا رہا تھا مگر وہ رک نہ رہے تھے۔اس تنہا خانے میں حضرت یعقوب ؑ کی تصویر ظاہر ہوئی اور انہوں نے اپنی انگلی دانتوں میں دبا رکھی تھی۔اور ان کے سامنے ایک ایسی تختی اچانک آگئی جس کے اوپر آیات قرآنی مکتوب تھیں۔قرآنی آیات! جن میں یہ لکھا تھا کہ ایسے کام سے باز آ جاؤ' لیکن . . پھر بھی نہ رکے تو اللہ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا اور کہا کہ پہنچو میرا بندہ گرنے لگا ہے۔وہ آئے اور انہوں نے حضرت یوسف کو سینے میں ایک ضرب لگائی۔یہ اور ایسی دوسری روایات جو واضح طور پر بتا رہی ہیں کہ یہ جعلی اور بناوٹی ہیں۔

رہے جمہور مفسرین ' تو انہوں نے یہ کہا ہے کہ عورت نے تو ارادہ گناہ کر لیا تھا اور حضرت یوسف ؑ نے بھی اس کے بارے میں سوچ لیا ہوتا ' اگر اس پر اللہ کا برہان روشن نہ ہوگیا ہوتا اور پھر انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر لیا۔

سید رشید رضا نے اپنی تفسیر المنار میں جمہور علماء کی اس تفسیر پر رد فرمایا ہے۔ اصل مفہوم یہ ہے کہ یہ جابر مالکہ تھی اور اس نے اسے دعوت گناہ دی اور اسے مارا پیٹا کیونکہ اس نے انکار کر کے اس کی توہین کی تھی اور حضرت یوسف ؑ نے اس کی زیادتی کا جواب دیا۔ اور اس کے بعد انہوں نے بھاگنے میں عافیت سمجھی اور اس طرح اس نے اسے پکڑ کر قمیص پھاڑ دی۔ (ھم) کا مفہوم مارنا اور مارنے کا جواب دینا ایک ایسی تفسیر ہے جس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ ایک کوشش سے پاک صاف ثابت کیا ہے۔ لیکن یہ تفسیر تکلف سے خالی نہیں ہے۔ اور نہ عربی الفاظ اس کے متحمل ہیں۔

ان نصوص پر غور کرنے کے بعد جو بات میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف ؑ اس پختہ کار عورت کے ساتھ ایک مکان میں رہ رہے تھے اور یہ ایک طویل عرصے تک رہ رہے تھے۔ علم و حکمت عطا ہونے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی موجود تھے۔

اس آیت سے میں جو سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ اس میں آخری مرحلے کو بیان کیا گیا ہے۔ اس عورت نے ایک طویل عرصہ ان کو ورغلانے کی سعی کی اور آپ نے انکار کیا ' اس عرصے میں حضرت یوسف ؑ ان مشکل حالات کا مقابلہ کرتے رہے اور قرآن اس آیت میں آخری مراحل کا ذکر کر دیا کہ انہوں نے پاکیزگی اختیار کی اور اللہ کے برہان کو دیکھ لیا۔ اس کشاکش کو یہاں قرآن مجید نے نہایت ہی مختصراً بیان کیا ہے اور اسے مختصر جگہ دی ہے۔ اس کے لیے مناسب اور ضروری الفاظ استعمال کیے۔ کشاکش کے آغاز اور انجام کو ان الفاظ میں قلم بند کر دیا کہ آغاز میں انہوں نے انکار کیا اور انتہا میں انہوں نے براہین الٰہیہ کو دیکھا لیکن ابتدائی اور آخری مرحلے کے درمیان ممکن ہے کہ کمزوری کے لمحات بھی آئے ہوں اور اس طرح حقیقت پسندانہ سچائی اور پاک فضا دونوں مکمل ہوئی ہوں۔

ان حالات و نصوص کا مطالعہ کرتے وقت میرے ذہن میں یہ بات آئی ہے۔ یہ بات انسانی مزاج اور طبیعت کے بھی قریب ہے اور منصب نبوت کے بھی ہم آہنگ ہے۔ حضرت یوسف ؑ بہرحال انسان تھے اور ایک برگزیدہ انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نفسیاتی میلان صرف میلان ہی رہا۔ اور جب ان کے اپنے قلب اور ضمیر میں اللہ کا برہان ظاہر ہوا تو ان کا یہ نفسیاتی میلان بھی ختم ہوگیا اور وہ حالت اعتصام اور مکمل انکار کی طرف لوٹ آئے۔

علامہ زمخشری کشاف میں کہتے ہیں "سوال یہ ہے کہ ایک نبی کس طرح برائی کا "ھم" کر سکتا ہے اور کس طرح وہ ارادہ کر سکتا ہے کہ وہ یہ کام کرے۔ جواب یہ ہے کہ یہ ایک نفسیاتی میلان تھا ' جوانی کی خواہشات کا دباؤ ہر انسان پر ہوتا ہے۔ یہاں اسے ھم اور قصد سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ ایسے حالات میں انسان پر سخت دباؤ ہوتا ہے اور عزم اور مدافعت کے ٹوٹنے کا خطرہ ہوتا ہے ' لیکن حضرت یوسف ؑ اللہ کے براہین کے ملاحظے کے بعد اس دباؤ کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اگر یہ میلان ہی نہ ہوتا اور جسمانی دباؤ نہ ہوتا تو حضرت یوسف ؑ اس کام سے رک کر قابل ستائش کس طرح ہوگئے۔ کیونکہ صبر ' برداشت اور ابتلا پر اجر تب ہی ہے کہ انسان کے اندر قوت اور میلان موجود ہو"۔

---ooo---

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ (۱۲:۲۴)

"ایسا ہوا' تاکہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی کو دور کر دیں' درحقیقت وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا"۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ (۱۲:۲۵) "آخر کار یوسف ؑ اور وہ آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے"۔ حضرت یوسف ؑ نے اپنے آپ کو اس کے چنگل سے آزاد کرنے کے لیے بھاگنے میں عافیت سمجھی اور یہ عورت بھی ان کے پیچھے بھاگی تاکہ ان کو پکڑے کیونکہ یہ ابھی تک جنسی ہیجان میں تھی۔

وَقَدَّتْ قَمِیْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ (۱۲:۲۵) "اور اس نے پیچھے سے یوسف کی قمیص پھاڑ دی"۔ اس کے کھینچنے کی وجہ سے قمیص پھٹ گئی کیونکہ اس کی کوشش یہ تھی کہ دروازے سے اسے واپس لے جائے۔

وَّاَلْفَیَا سَیِّدَهَا لَدَا الْبَابِ (۱۲:۲۵) "دروازے پر دونوں نے اس کے شوہر کو موجود پایا"۔ یہاں یہ عورت اب مکمل طور پر بالغ نظری کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ صورت حالات ایسی ہے کہ اس میں کسی بھی فریق پر شک کیا جا سکتا ہے' اس عورت کا جواب حاضر ہے' یہ کہ وہ فوراً نوجوان پر الزام لگا دیتی ہے۔

قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا (۱۲:۲۵) "کہنے لگی "کیا سزا ہے اس شخص کی جو تیری گھر والی پر نیت خراب کرے"۔ لیکن اس کو چونکہ حضرت یوسف ؑ سے محبت بھی تھی اور اسے ڈر تھا کہ کہیں اسے قتل ہی نہ کر دیا جائے اس لیے خود ہی ہلکی سی سزا تجویز کر دیتی ہے۔

اِلَّآ اَنْ یُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۱۲:۲۵) "سوائے اس کے کہ وہ قید کیا جائے یا اسے سخت عذاب دیا جائے؟" اور حضرت یوسف ؑ فوراً اس الزام کی تردید کرتے ہیں کہ خود اس عورت نے انہیں ورغلانے کی کوشش کی۔

قَالَ هِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ (۱۲:۲۶) "یوسف ؑ نے کہا "یہی مجھے پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی"۔

یہاں قرآن کریم واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ اس موقعہ پر اس عورت کے رشتہ داروں میں سے کوئی موجود تھا جس نے شہادت احوال یعنی موجود قرائن پر فیصلہ دے دیا اور نزاع ختم ہو گیا۔

وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ (۲۶) وَ اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ

(۲۷) (۱۲ : ۲۶ - ۲۷) ''اس عورت کے اپنے کنبہ والوں میں سے ایک شخص نے (قرینے کی) شہادت پیش کی کہ ''اگر یوسف ؑ کی قمیص آگے سے پھٹی ہو تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹا' اور اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہو تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچا''۔

سوال یہ ہے کہ اس شاہد نے کہاں شہادت دی؟ کیا یہ خاوند کے ساتھ اس وقت موجود تھا یا اس واقعہ کو دیکھ کر بیوی کے خاندان میں سے ایک معمر شخص کو بلایا گیا اور اس کے سامنے عزیز مصر نے یہ ماجرا رکھا جیسا کہ ایسے حالات میں اکثر ہوا کرتا ہے۔ خصوصاً ایسے اونچے طبقات میں ایسا ہی ہوتا ہے جن کا خون ٹھنڈا ہوتا ہے اور جن کے ہاں اخلاقی قدریں ڈھیلی ہوتی ہیں۔

یہ دونوں باتیں ہو سکتی ہیں اور مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس شخص کے فیصلے کو یہاں شہادت کہا گیا ہے کیونکہ فریقین کی طرف سے اپنا اپنا موقف اس کے سامنے پیش ہوا' اس نے فتویٰ دیا یا رائے دی اور اسے شہادت کہا گیا اس لیے کہ شہادت سے بھی انسان سچائی تک پہنچتا ہے۔ قرائن کی شہادت یہ ہے کہ اگر آگے سے قمیص پھٹی ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد حملہ آور ہے اور عورت مدافع ہے۔ لہٰذا وہ سچی اور یہ جھوٹا ہے۔ اگر قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو وہ بھاگ رہا تھا اور یہ اسے پکڑ کر کھینچ رہی تھی لہٰذا یہ جھوٹی ہے اور وہ سچا ہے۔ اس شخص نے پہلے عورت کی سچائی کی صورت پیش کی کیونکہ وہ مالکہ ہے اور یہ غلام ہے۔ لہٰذا مناسب یہی تھا کہ مالک اور ایرینڈ کے حق میں جانے والی بات پہلے کی جائے۔ دونوں صورتوں میں شہادت احوال موجود ہے۔

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ (۱۲ : ۲۸) ''جب شوہر نے دیکھا کہ یوسف ؑ کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے''۔ تو اس کو معلوم ہوا ہو گا کہ واقعاتی شہادت کے مطابق عورت جھوٹی ہے۔ اسی نے اس کو ورغلانے کی کوشش کی ہے۔ وہی ہے جس نے اسے متہم کرنے کی سازش کی ہے۔ یہاں ترقی یافتہ سوسائٹی کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ اور وہ بھی صدیوں اور ہزاروں سال پرانی ترقی یافتہ سوسائٹی۔ یوں نظر آتا ہے کہ گویا وہ آج ہی کی ترقی یافتہ سوسائٹی ہے۔ اس قسم کی سوسائٹی کی پہلی خصوصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ اس میں جنسی سکینڈل نظرانداز کر دیے جاتے ہیں۔ ان کو چھپایا جاتا ہے۔ ایسے معاشروں کی یہ اہم باتیں ہیں۔

قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ (۲۸) يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِيْنَ (۲۹) (۱۲ : ۲۸ - ۲۹)) ''تو اس نے کہا ''یہ تم عورتوں کی چالاکیاں ہیں' واقعی بڑے غضب کی ہوتی ہیں تمہاری چالیں۔ یوسف ؑ اس معاملے سے درگزر کر۔ اور اے عورت' تو اپنے قصور کی معافی مانگ' تو ہی اصل میں خطاکار تھی''۔

بالکل درست' واقعی عورتوں کی چالیں غضب کی ہوتی ہیں۔ یوسف اس سے درگزر کرو' یہ تو چاپلوسی ہے۔ ایسا واقعہ جو خون گرما دیتا ہے' اسے دیکھ کر صرف یہ کہنا کہ تمہارا مکر بڑا عظیم ہوتا ہے اور وہ بھی ان الفاظ میں کہ تمام عورتوں کا مکر غضبناک ہوتا ہے۔ یہ تو اس عورت کی تعریف ہے کہ یہ بڑی مکار اور پختہ کار ہے اور وہ کامیاب چال چلنے والی ہے۔

یوسف کی طرف متوجہ ہو کر بھی یہی کہا گیا

اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا (۱۲: ۲۹) ”درگزر کرو“ یعنی اس بات کو یہیں چھوڑ دے' اس کا تذکرہ نہ کر' حالات کو جوں کا توں رکھو۔ اس قسم کے معاشرے میں یہ اہم بات ہے۔

اور عورت جو رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی اس کے لیے یہی تبصرہ کہ تم خطاکار ہو لہٰذا اپنے گناہوں پر معافی مانگو۔ یہ ہیں اس وقت کے سرکردہ بیوروکریٹ اور بڑوں کے حاشیہ نشین۔ ہر جاہلیت میں یہ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

اب پردہ گرتا ہے اور یہ منظر ختم ہوتا ہے۔ سیاق کلام میں اس مرحلے کو اپنے تمام حالات' تاثرات اور اشارات کے ساتھ پیش کر دیا گیا' لیکن اس نازک مرحلے کو حیوانی لذتیت سے پاک رکھا گیا اور نہایت ہی انسانی اور شریفانہ انداز اختیار کیا گیا۔

---○○○---

حالات یہ ہیں کہ اس عورت اور اس کے اس غلام کے درمیان ابھی تک جدائی نہیں ہے۔ حالات روٹین کے مطابق آگے بڑھ رہے ہیں اور بڑے بڑے محلات میں حالات اسی طرح آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن محلات کی دیواریں ہوتی ہیں اور دیواروں کے کان ہوتے ہیں۔ خدم اور چشم ان کے اندر ہوتے ہیں' اندر جو کچھ ہوتا ہے' وہ لازماً باہر آتا ہے' خصوصاً اونچے اور مراعات یافتہ طبقات کے محلات ہیں۔ ان محلات کے اندر جو کچھ ہوتا ہے وہ لوگوں کی مجالس' محافل میں اور زبانوں پر ہوتا ہے۔ لوگوں کی راتوں کے لیے یہ چٹ پٹا مسالہ ہوتا ہے۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۳۰

”شہر کی عورتیں آپس میں چرچا کرنے لگیں کہ ”عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام کے پیچھے پڑی ہوئی ہے' محبت نے اس کو بے قابو کر رکھا ہے' ہمارے نزدیک تو وہ صریح غلطی کر رہی ہے“۔

یہ کلام اور یہ چہ میگوئیاں بعینہ ایسی ہیں جیسا کہ ہر جاہلی دور میں موضوع سخن ہوتی ہیں۔ یہاں آکر ہمیں پہلی مرتبہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورت عزیز مصر کی بیوی ہے اور یہ کہ حضرت یوسف کو مصر کے جس شخص نے خریدا تھا وہ عزیز مصر تھا' یعنی مصر کا وزیر اعظم۔ اس شخص کے نام اور اس کی بیوی کے نام کو ابھی تک مجمل رکھا گیا تھا' اب نام اس لیے لیا گیا کہ پورا مصر اس واقعہ سے خبردار ہو گیا ہے۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا اِنَّا لَنَرٰهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۱۲: ۳۰) ”شہر کی عورتیں آپس میں چرچا کرنے لگیں کہ ”عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام کے پیچھے پڑی ہوئی ہے' محبت نے اس کو بے قابو کر رکھا ہے' ہمارے نزدیک تو وہ صریح غلطی کر رہی ہے“۔

یعنی عورت کا حال یہ ہے کہ وہ اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ عاشق زار بن گئی ہے۔ غلام کی محبت اس کے دل کے پردے میں اتر گئی ہے۔ شغاف اس پردے کو کہتے ہیں جس کے اندر دل لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن یہ حرکت اس عورت کے لیے مناسب نہیں ہے کہ خاتون اول اور وزیراعظم کی بیوی ہوتے ہوئے وہ عبرانی غلام پر عاشق ہو جائے جو زرخرید ہے (فتٰھا) کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ شاید اس جاہلی سوسائٹی میں فری سیکس اس قدر معیوب نہ تھا مگر عبرانی زرخرید غلام کے ساتھ زیادہ معیوب تھا۔

---()()()---

اب وہ بات وقوع پذیر ہوتی ہے' جو ایسے ہی نام نہاد اونچے طبقات ہی میں وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔ یہ خود سر عورت ایک دوسرا منظر پیش کرتی ہے۔ یہ جانتی ہے کہ مصری عورتوں کی مکاریوں اور پروپیگنڈے کا جواب وہ کس طرح دے گی۔ ذرا ملاحظہ ہو:

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۞ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ۞

"اس نے جو ان کی یہ مکارانہ باتیں سنیں تو ان کو بلاوا بھیج دیا اور ان کے لیے تکیہ دار مجلس آراستہ کی اور ضیافت میں ہر ایک کے آگے ایک چھری رکھ دی' (پھر عین اس وقت جبکہ وہ پھل کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھیں) اس نے یوسفؑ کو اشارہ کیا کہ ان کے سامنے نکل آ۔ جب ان عورتوں کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ دنگ رہ گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں اور بے ساختہ پکار اٹھیں "حاشا للہ' یہ شخص انسان نہیں ہے' یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے"۔ عزیز کی بیوی نے کہا "دیکھ لیا' یہ ہے وہ شخص جس کے معاملہ میں تم مجھ پر باتیں بناتی تھیں۔ بے شک میں نے اسے رجھانے کی کوشش کی تھی مگر یہ بچ نکلا' اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل و خوار ہو گا"۔

اس نے ان عورتوں کو اپنے محل میں ایک دعوت میں بلایا' اس دعوت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعوت نہایت ہی ترقی یافتہ لوگوں کی دعوت تھی۔ ایسی ہی عورتوں کو محلات میں دعوتیں دی جاتی ہیں۔ اور نہایت ہی پر تکلف کھانے پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مشرقی روایات کے مطابق تکیہ لگا کر کھانا کھایا جاتا تھا۔ چنانچہ اس نے کھانے کے لیے ایسی جگہ تیار کی جہاں یہ عورتیں تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھیں۔ پھر ہر ایک کو چھری دی گئی تاکہ وہ اس کے ساتھ کھانا کھائے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مصر تہذیب و تمدن کے اعتبار سے بہت ہی آگے نکل گیا تھا اور محلات میں لوگ پر تعیش زندگی بسر کرتے تھے۔ کیونکہ ہزاروں سال قبل چھری کے استعمال کی اطلاع سے معلوم

ہوتا ہے کہ مادی اور تمدنی لحاظ سے مصری معاشرہ بہت آگے نکل چکا تھا۔ یہ عورتیں گوشت اور میوے کاٹنے میں مشغول تھیں کہ عزیز ہ نے یوسف ؑ کو حکم دیا کہ ذرا سامنے آؤ۔

قَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ (۱۲ : ۳۱) "اس نے یوسف ؑ کو اشارہ کیا کہ ان کے سامنے نکل آ"۔

فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ (۱۲ : ۳۱) "جب ان عورتوں کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ دنگ رہ گئیں" اس کو دیکھ کر مبہوت رہ گئیں اور ان پر دہشت طاری ہو گئی۔

وَ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ (۱۲ : ۳۱) "اور اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں" اچانک دہشت زدگی کی وجہ سے انہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر دیئے۔

وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ (۱۲ : ۳۱) "اور بے ساختہ پکار اٹھیں' "حاشاءللہ" "تخلیق قدرت پر حیران ہو کر حاشاءللہ کہا جاتا ہے۔ دراصل حاشاءللہ کلمہ تنزیہ' اس موقعہ پر بولا جاتا ہے جہاں کسی ذات سے کسی الزام کی شدت سے نفی کی جائے۔

مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (۱۲ : ۳۱) "یہ شخص انسان نہیں ہے' یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے"۔ جیسا کہ ہم نے اس سورت کے دیباچے میں کہا' ان تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام کے بعض تصورات مصری معاشرے میں پھیل چکے تھے۔

اب عزیز کی بیوی کو یقین ہو گیا کہ اس نے میدان مار لیا ہے' اور اس کے خلاف باتیں بنانے والی عورتوں سے انتقام لے لیا ہے' اور خود یہ عورتیں دہشت زدہ' حیران بلکہ مبہوت ہو کر رہ گئی ہیں۔ اب یہ عورتوں کے سامنے کھل جاتی ہے اور اپنے جنسی سیکنڈل کو عورتوں کے سامنے کھول کر بیان کرتی ہے اور کوئی شرم محسوس نہیں کرتی۔ اب وہ دھمکی آمیز لہجے میں اقرار کرتی ہے کہ اس شخص کو میری مرضی کے مطابق چلنا ہو گا ورنہ..... اب اس کی باتوں کا انداز اور ہے۔

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ (۱۲ : ۳۲) "عزیز کی بیوی نے کہا" "دیکھ لیا' یہ ہے وہ شخص جس کے معاملہ میں تم مجھ پر باتیں بناتی تھیں"۔ دیکھ لیا تم نے۔ ذرا اپنی حالت کو تو دیکھو' بتاؤ تم کیوں حیران و پریشان اور حواس باختہ ہو گئی ہو۔

وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ (۱۲ : ۳۲) "بے شک میں نے اسے رجھانے کی کوشش کی تھی مگر یہ بچ نکلا"۔ اس نے مجھے اسی طرح حواس باختہ کر دیا ہے' میں نے اسے ورغلانے کی بہت کوشش کی مگر یہ بچ نکلتا ہے۔ یہ میری تمام کوششوں اور فتنہ سامانیوں کے مقابلے میں اپنے اصول پر جما ہوا ہے لیکن..... تعجب یہ ہے کہ اس مصری معاشرے میں اونچے طبقے کی یہ عورت علانیہ تمام عورتوں کے سامنے اپنے جنسی عزائم کا اظہار کر رہی ہے اور دھمکی بھی دیتی ہے۔

وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ (۱۲: ۳۲) ’’اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل و خوار ہو گا‘‘۔

اب یہ عورت صنف نازک کے ورغلانے والے حربوں کے علاوہ بڑے فخر سے تشدد اور دھمکی کے ذرائع بھی استعمال کر رہی ہے ۔ یہ دھمکی عورتوں کے مجمعے میں یوسف ؑ کو کھلے بندوں دی جا رہی ہے ۔ اور انہی عورتوں کے سامنے جن میں سے ہر ایک اپنی فتنہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے ۔ اور یہ دھمکی اسے خود اپنی مالکہ دے رہی ہے ' چنانچہ ایسے نازک اور خطرناک حالات میں صرف رب تعالیٰ ہی سے مدد لی جا سکتی ہے ۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ

’’یوسف ؑ نے کہا‘‘ ’’اے میرے رب! قید مجھے منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ میں وہ کام کر۔ یہ مجھ سے چاہتی ہیں‘‘۔

حضرت یوسف اب صرف عزیز کی بیوی کے خلاف دست بدعا نہیں بلکہ مصر کے اس اعلیٰ طبقہ رتیں اب ان کے پیچھے پڑ گئی ہیں ' اپنی حرکات اور اپنی باتوں کی وجہ سے تمام عورتیں ان پر پھبتی جا رہی ہ اللہ کے سامنے دست بدعا ہوتے ہیں اور ان فتنوں کے مقابلے میں وہ اللہ کی نصرت طلب کرتے ہیں ت سے ڈرتے ہیں کہ انہیں ہر طرف سے ورغلایا جا رہا ہے اور کسی بھی وقت ان سے کمزوری ظاہر نہ ہو ۔ لیے وہ ان حالات میں اور ایسی سخت آزمائش میں خوف کھا رہے ہیں ۔

وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۳﴾

’’اور اگر تو نے ان کی چالوں کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا‘‘۔ یہ اس انسان کی پکار ہے جسے اپنی شریعت کا احساس ہے ' وہ جانتا ہے کہ انسان انسان ہے ۔ وہ اگرچہ بچے ہوئے ہیں لیکن اپنی کمزوریاں بھی ان کی نظر میں ہیں ۔ لہٰذا وہ اللہ کی حفاظت مزید چاہتے ہیں تاکہ وہ ان فتنوں کا مقابلہ اطمینان سے کر سکیں ۔

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۴﴾

’’اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی اور ان عورتوں کی چالیں اس سے دفع کر دیں ' بے شک وہی ہے جو سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے‘‘۔

اللہ نے ان کی سازشوں کو کس طرح پھیرا ' یہ کہ وہ ان سے مایوس ہو گئیں ' انہوں نے بہت سی چالیں چلیں اور تجربات کیے مگر وہ ان کے دام میں نہ آئے کہ عنقا را بلند است آشیانہ --- یہ بھی صورت تھی کہ ان فتنہ سامانیوں کا حضرت پر اثر ہی نہ ہوتا ' --- اللہ سمیع و علیم ہے وہ تو سب کچھ دیکھ رہا ہے ' سن رہا ہے ' یہاں آکر حضرت یوسف ؑ زندگی کے اس دوسرے امتحان اور آزمائش میں کامیاب رہے ۔ (بِفَضْلِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهٖ)

---ooo---

# درس نمبر ۱۰۸ ایک نظر میں

یہ سبق اس قصے کی تیسری کڑی ہے اور حضرت یوسف ؑ کی مشکلات زندگی کی بھی تیسری اور آخری کڑی ہے۔ اس کڑی کے بعد حضرت یوسف ؑ کی زندگی کے مشکل دن ختم ہونے والے ہیں۔اب آرام اور سکون ہی ہو گا۔اب حضرت یوسف ؑ کی زندگی کا امتحان دوسرے انداز میں ہو گا۔پہلے مصائب میں ان کی آزمائش تھی 'اب عیش و آرام اور اقتدار کی زندگی میں ان کی آزمائش ہوگی۔اس کڑی میں ان کی آزمائش جیل جانے میں ہو رہی ہے یہ عجیب آزمائش ہے کہ وہ الزام سے بری ہو گئے ہیں پھر بھی جیل میں ہیں' ایک گناہ گار تو صبر کر لیتا ہے کیونکہ اس کو علم ہوتا ہے کہ اس نے قصور کیا ہے لیکن ایک بے گناہ جب قید ہوتا ہے تو اس کے لیے سزا ناقابل برداشت ہوتی ہے۔اگرچہ دل میں اسے یہ سکون ہوتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔

اس عرصے میں حضرت یوسف ؑ پر اللہ کے انعامات ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں۔اب ان کو تعبیر رؤیا کا علم لدنی عطا کر دیا گیا ہے' اسی طرح وہ تاویل احادیث میں ماہر ہو چکے ہیں' واقعات کے آغاز ہی میں وہ معلوم کر لیتے ہیں کہ ان کے نتائج کیا ہوں گے اور اس کے بعد اب بادشاہ کے سامنے حضرت یوسف ؑ کی برات کا بھی انتظام ہو رہا ہے' خود بادشاہ عورتوں کو بلا کر انکوائری کرتا ہے۔اب حضرت یوسف ؑ کی خفیہ صلاحیتیں سامنے آ رہی ہیں۔وہ بادشاہ کے مقرب خاص ہو کر تمام اختیارات کے مالک اور مقتدر اعلیٰ بن جاتے ہیں۔اور جس مقام پر اللہ نے ان کو پہنچانا تھا وہ پہنچ جاتے ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۰۸ تشریح آیات

۳۵ ---- تا ---- ۵۲

۴ ۶ع ۱۴ ثُمَّ بَدَا لَهُم مِّنۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾

"پھر ان لوگوں کو یہ سوجھی کہ ایک مدت کے لیے اسے قید کر دیں حالانکہ وہ (اس کی پاک دامنی اور خود اپنی عورتوں کے برے اطوار کی) صریح نشانیاں دیکھ چکے تھے"۔

محلات کی فضاؤں میں، آمریت کی چھاؤں میں، نوابوں کے درباروں میں اور جاہلیت کے نظاموں میں ایسے ہی فیصلے ہوتے ہیں۔ انہوں نے یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا، انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ یہ عورت اس فرشتہ سیرت شخص کو عورتوں کی مجالس میں پیش کرتی ہے اور برملا دھمکیاں دیتی ہے، تمام مصری عورتوں کو یقین تھا کہ یہ عورت اپنے غلام کی محبت میں اندھی ہو رہی ہے اور اپنی فریفتگی کا اعلان کرتی پھر رہی ہے۔ یوسف علیہ السلام پر ان عورتوں کا دباؤ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ اللہ سے استعانت طلب فرماتے ہیں۔ دوسری جانب یہ عورت بھی اس بات پر تلی ہوئی ہے اور اعلان کر رہی ہے کہ یوسف کو اس کی مراد پوری کرنا ہوگی یا اسے قید خانوں میں ذلیل و خوار ہونا ہوگا، اب یا تو وہ حکم کی تعمیل کرے گا یا جیل جائے گا۔

ان حالات کے بعد یہ لوگ اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ ایک عرصے کے لیے یوسف ؑ کو قید کر دیا جائے۔ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ یہ عورت اب مایوس ہوگئی ہوگی، دوسری جانب چہ میگوئیاں عام ہوگئی ہوں گی اور اب ان نام نہاد اونچے گھرانوں کی عزت کا تحفظ اسی طرح ہو سکتا تھا کہ بے گناہ کو قید کر دیا جائے۔ یہ کام تو ان کے لیے بہت ہی آسان ہے۔ اس نے چونکہ اس ترقی یافتہ عورت کی خواہشات کو پورا نہ کیا تھا لہٰذا اسے لازماً جیل جانا تھا، کیونکہ وہ بیچاری بدنام ہوگئی اور ہر طرف سے چہ میگوئیاں تھیں اور ہر محفل میں وہ موضوع سخن تھی۔

وَ دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ (۱۲ : ۳۶) "قید خانے میں دو غلام اور بھی اس کے ساتھ داخل ہوئے"۔ عنقریب سیاق کلام میں یہ بات ظاہر ہوگی کہ یہ لوگ بادشاہ کے خواص اور خدام میں سے تھے۔ یہاں قرآن مجید میں حضرت یوسف ؑ کے زمانہ قید کے حالات تفصیل سے بیان نہیں کیے گئے، لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ قید خانے میں آپ کی طہارت اخلاق اور نیکی اور سنجیدگی اور وقار اس قدر عام ہوگیا کہ تمام قیدیوں میں آپ ایک مثال بن گئے۔

یہ تمام قیدیوں کے ۔لیے معتمد اعلیٰ بن گئے' ان قیدیوں میں وہ لوگ بھی تھے جو شاہی عتاب کی وجہ سے قید خانے میں پڑے تھے ۔کیونکہ شاہی محل اور شاہی دربار میں ان سے کچھ قصور سرزد ہو گئے ہوں گے ۔چنانچہ ان پر عارضی طور پر عتاب وارد ہو گیا تھا۔ بہرحال قرآن واقعات قصے کو جلدی آگے بڑھانے کے لیے باقی تفصیلات ترک کر دیتا ہے اور صرف دو نوجوانوں کا تذکرہ کرتا ہے ۔یہ دو نوجوان حضرت یوسف ؑ کے پاس آئے اور انہوں نے ان کے سامنے اپنے خوابوں کو پیش کیا اور یہ مطالبہ کیا کہ آپ ان کی تعبیر بتائیں ۔ان لوگوں نے تعبیر خواب کے لیے حضرت یوسف ؑ کا انتخاب کیوں کیا؟ اس لیے کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ سچے 'نیک' عبادت گزار اور ذکر و فکر کے مالک تھے ۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّىْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّىْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۳۶

''ایک روز ان میں سے ایک نے کہا ''میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں شراب کشید کر رہا ہوں''۔ دوسرے نے کہا ''میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیاں رکھی ہیں اور پرندے ان کو کھا رہے ہیں''۔ دونوں نے کہا ''ہمیں اس کی تعبیر بتایئے 'ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ایک نیک آدمی ہیں''۔

اب حضرت یوسف ؑ کو یہ موقعہ ہاتھ آگیا کہ وہ قیدیوں کے سامنے اپنا نظریہ حیات پیش کریں ۔ان کو صحیح عقیدہ دیں 'کیونکہ قیدی کے لیے یہ ممنوع نہیں ہے کہ ان کا عقیدہ اچھا ہو ۔قیدیوں کی نظریاتی اور عملی تربیت بھی ضروری ہے ۔ لہٰذا حضرت یوسف ؑ ان کو تلقین کرتے ہیں کہ تمام خرابیوں کی جڑ فاسد نظام زندگی ہے جس میں حکم اور اقتدار اعلیٰ اللہ کے سوا کسی اور کے لیے ہو۔ چنانچہ وہ ان کو تلقین کرتے ہیں کہ اللہ کو چھوڑ کر دوسرے لوگوں کو اس کرۂ ارض کا رب تسلیم کرنا اصل گمراہی ہے 'اس طرح حکمران فرعون بن جاتے ہیں ۔

حضرت یوسف ؑ اپنی بات کا آغاز اس موضوع سے کرتے ہیں جس میں اس کے جیل کے دونوں ساتھیوں کو دلچسپی ہے لیکن ان سے وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے دلچسپی کے موضوع پر بات ذرا بعد میں آئے گی ۔ اور وہ خوابوں کی صحیح صحیح تعبیر بتا دیں گے کیونکہ اس شعبے میں اللہ نے ان کو علم لدنی دیا ہے اور یہ اس لیے دیا ہے کہ میں اللہ کی بندگی کرتا ہوں اور اللہ کے ساتھ میں اور میرے آباؤ اجداد کسی کو شریک نہیں کرتے ' یوں حضرت یوسف ؑ ان لوگوں کو یقین دہانی کراتے ہیں کہ وہ تعبیر خواب بھی بتائیں گے اور یہ کہ حضرت یوسف ؑ کا دین بھی نہایت ہی متین دین ہے ۔

قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ۭ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ۭ اِنِّىْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ

بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

"یوسف ؑ نے کہا" یہاں جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر ' جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں ' اپنے بزرگوں ابراہیم ؑ، اسحاق ؑ اور یعقوب ؑ کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا) مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ کی بات کس قدر دل نشین ہے اور وہ بات سے کس طرح بات نکالتے چلے جاتے ہیں اور کس قدر نرمی اور لطافت کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ اس پورے قصے میں حضرت یوسف ؑ کی بات چیت کی یہ امتیازی خصوصیت ہے۔

قَالَ لَا یَاْتِیْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِیْلِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّاْتِیَكُمَا ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ (۱۲:۳۷) "یوسف ؑ نے کہا" یہاں جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں"۔

یہ تاکید اس بات کا اظہار کر رہی ہے کہ حضرت یوسف ؑ کو اس معاملے میں ایک خاص علم دیا گیا ہے کہ کھانے آنے سے قبل ہی وہ اپنے اس مخصوص علم کے ذریعے ان کو ان کے خوابوں کی تعبیر بتا دیں گے۔ اور یہ علم ان کو اس لیے دیا گیا تھا کہ اس دور میں خوابوں کی تعبیر کے فن نے کافی ترقی کی ہوئی تھی۔ "یہ ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں"۔ یہ الفاظ حضرت یوسف ؑ نے اس لیے استعمال کیے کہ ان لوگوں پر نفسیاتی اثر ہو جائے اور حضرت یوسف ؑ کی بات ان کے دل میں اتر جائے۔ اور وہ ان خوابوں کی تعبیر کی وجہ سے یوسف ؑ کی دعوت کو قبول کر لیں جبکہ یہ تعبیر نہایت ہی مخصوص انداز کی تھی۔

اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۱۲:۳۷)
"واقعہ یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر ' جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں"۔

یہ اشارہ اس قوم کی طرف بھی ہے جس میں ان کی تربیت ہوئی ' یعنی عزیز مصر کا گھرانا اور شاہ مصر کے حاشیہ نشین ' اور اس پوری قوم کی طرف بھی جو شاہ مصر کی مطیع فرمان تھی ' جبکہ یہ دونوں نوجوان ظاہر ہے کہ بادشاہ اور اپنی قوم ہی کے دین پر تھے لیکن حضرت یوسف ؑ ان کے ساتھ بات کرنے میں یہ نہیں فرماتے کہ میں نے تمہارا دین چھوڑ دیا ہے

بلکہ ایک عام بات فرماتے ہیں تاکہ ان نوجوانوں کے دلوں میں دین اسلام سے نفرت پیدا نہ ہو جائے۔ یہ نہایت ہی دانشمندی اور اعلیٰ درجے کی حکمت تبلیغ ہے اور نہایت ہی لطافت اور فراست کے ساتھ بات پہنچانے کا انداز ہے۔

نشانات کفر بتانے کے بعد یوسف علیہ السلام ان نوجوانوں کے سامنے نشانات ایمان بھی رکھتے ہیں' جن پر وہ اور ان کے آباء چل رہے ہیں۔

وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ

مِنْ شَیْءٍ (۱۲:۳۸) "اپنے بزرگوں' ابراہیم' اسحاق اور یعقوب کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو شریک ٹھہرائیں۔"

ملت اسلامیہ مکمل توحید کی ملت ہے' اور اس میں اللہ کے ساتھ شرک کا شائبہ تک موجود نہیں ہے۔ توحید کی طرف ہدایت کرنا اللہ کی طرف سے فضل و کرم ہے۔ اور یہ فضل و کرم اس قدر عام ہے کہ ہر شخص اس کو قبول کر سکتا ہے اور حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کا رجحان اور اس کے اصول انسان کی فطرت کے اندر موجود ہیں۔ اور اس کے اشارات اور براہین انسانی ماحول کے اندر بھی موجود ہیں۔ رسولوں کی ہدایات اور کتب سماوی میں اس کی تعلیمات بھی موجود ہیں لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اس عمومی فضل و کرم سے اپنے آپ کو محروم رکھ رہے ہیں۔

ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا

یَشْكُرُوْنَ (۱۲:۳۸) "در حقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا) مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے"۔

حضرت یوسف آہستہ آہستہ ان کے دلوں میں اپنی بات اتار رہے ہیں۔ نہایت ہی احتیاط کے ساتھ' نہایت نرمی کے ساتھ۔ ان کے دلوں میں بات کو بٹھاتے چلے جاتے ہیں اور اپنے عقائد و نظریات کا اظہار آہستہ آہستہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور ساتھ یہ بھی واضح کرتے چلے جاتے ہیں کہ تمہارے اور تمہاری قوم کے عقائد و نظریات غلط' فاسد اور باطل ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں وہ سوسائٹی ایک فاسد سوسائٹی ہے جس میں وہ رہ رہے ہیں۔ اس طویل تمہید کے بعد حضرت یوسف اصل بات کہتے ہیں۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ

"اے زندان کے ساتھیو' تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو' وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں' اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرمانروائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو' یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے ان نہایت ہی مختصر' واضح اور فیصلہ کن کلمات کے اندر دین اسلام کے پورے نشانات راہ نقش کر کے رکھ دیئے ہیں۔ اس دین کے پورے عناصر ترکیبی بیان کر دیئے گئے ہیں۔ حضرت یوسف ان نشانات اور ان عناصر کی طرف براہ راست دعوت نہیں دیتے بلکہ ان کو ایک موضوع غور و فکر کے طور پر ان کے سامنے رکھتے ہیں۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۲:۳۹)

"اے زندان کے ساتھیو' تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟"

یہ ایک ایسا سوال ہے کہ براہ راست انسانی فطرت کی گہرائیوں میں لگتا ہے اور فطرت انسانی کو خوب جھنجوڑتا ہے۔ انسانی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ الٰہ ایک ہونا چاہئے۔ اگر تم محسوس کرتے ہو کہ یہ فطرت کا تقاضا ہے تو پھر کیوں تم ارباب متفرقون کے قائل ہو' یعنی جو ذات اس بات کی مستحق ہے کہ اسے رب اور حاکم تسلیم کیا جائے' جس کی عبادت اور بندگی کی جائے اور جس کی اطاعت کی جاتی رہے۔ وہ صرف اللہ واحد اور قہار ہی ہے۔ اگر ہم اس بات کو تسلیم کر لیں کہ انسانی فطرت اور عالم کی فطرت کا الٰہ اور رب اللہ وحدہ ہے تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان کی اختیاری زندگی میں رب' حکم اور شارع وہی اللہ وحدہ ہو۔ اور یہ ممکن نہیں ہے کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ وحدہ ہی خالق اور قاہر ہے اور پھر بھی وہ غیر اللہ کی بندگی اور اطاعت کریں۔ اور اس کے سوا پھر کوئی ان کا حاکم ہو۔ رب ہی الٰہ اور حاکم ہوتا ہے۔ وہ اس پوری کائنات کے امور کو بھی چلاتا ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک ذات کائنات کو نہ چلا سکتی ہو اور وہ ھُو ربُّ النّاس ہو یہ عقلاً ممکن نہیں ہے۔

لہٰذا اللہ واحد اور قہار ہی اس بات کا مستحق ہے اور بہتر ہے کہ لوگ اس کی بندگی کریں۔ بجائے اس کے کہ وہ ارباب متفرقہ کی بندگی کریں جن کو اندھی جاہلیت نے گھڑ رکھا' جس کی نظر کوتاہ ہوتی ہے اور وہ فریب کے سوا کچھ بھی دیکھ نہیں سکتے۔ انسانیت کے لیے سب سے بڑی بدبختی ہی یہ ہے کہ وہ ایک اللہ کے بجائے متعدد الٰہوں کو مانے اور یہ متعدد الٰہ اس کی زندگی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ ان کے رجحانات اور میلانات کے اندر بھی کشمکش ہو اللہ کے سوا جس قدر ارباب ہم نے بنا رکھے ہیں یہ دراصل اللہ تعالیٰ کے حق حاکمیت پر دست درازی کرتے ہیں اور ہم نے اپنی جاہلیت کی وجہ سے' وہم پرستی کی وجہ سے خرافات اور قصے کہانیوں کی وجہ سے ان ارباب من دون اللہ کو رب تسلیم کر رکھا ہے۔ یا بعض جبار و قہار انسانی الٰہوں نے اپنی ربوبیت کا نظام لوگوں پر جبراً مسلط کر رکھا ہے۔ اور یہ انسانی ارباب ایک منٹ کے لیے بھی اپنے ذاتی مفادات' اپنے وجود اور اپنی عزت کی بقا کے جذبات اور خواہشات سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ اور ان کے دلوں میں یہ

خواہش کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے کہ عوام الناس پر ان کا تسلط جاری اور باقی رہے۔ ایسے الٰہوں کی پالیسی اور دائمی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ ان قوتوں کو کچل کر رکھ دیتے جن سے انہیں براہ راست یا بالواسطہ کوئی بھی خوف ہو۔ نیز یہ الٰہ ان قوتوں کو ہمیشہ زندہ رکھتے ہیں ان کی پرورش کرتے ہیں اور ان کے حق میں پروپیگنڈہ کرتے جو ان کی خدائی کے قیام اور بقا میں ممد و معاون ہوتی ہیں۔ یہ الٰہ ایسے تمام اداروں کی ترقی اور عزت افزائی کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔

جبکہ اللہ واحد اور قہار ہے اور وہ دونوں جہانوں سے غنی ہے۔ اللہ کا مطالبہ لوگوں سے صرف یہ ہے کہ وہ اللہ سے ڈریں، نیکی کی راہ لیں اور اپنی اصلاح اور اپنے ماحول کی اصلاح و تعمیر کریں اور یہ اصلاحی اور تعمیری کام اللہ کی قائم کردہ شریعت کے مطابق ہو۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کا کام بھی پورے کا پورا عبادت ہو گا۔ اللہ نے جو عبادات انسانوں کے لیے فرض کی ہیں وہ بھی ایسی ہیں جن سے خود انسانوں کے دل و دماغ اور سیرت و کردار کی اصلاح مطلوب ہے۔ ورنہ اللہ کو تو انسانوں کی طرف سے کسی عبادت اور بندگی کی ضرورت نہیں ہے۔

(یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ) "اے لوگو، تم اللہ کی طرف محتاج ہو اور صرف اللہ ہی غنی اور حمید ہے" اس لئے اللہ کی بندگی اور غلامی اور اللہ کے دوسرے الٰہوں کی بندگی اور غلامی میں بہت فرق ہے"

اس کے بعد حضرت یوسف ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں۔ اور اب وہ ذرا کھل کر جاہلیت کے افکار اور اوہام پر تنقید فرماتے ہیں۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۱۲ : ۴۰) "اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو، وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤاجداد نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی"۔

یہ ارباب، خواہ وہ انسانوں میں سے ہوں یا غیر انسان ہوں، مثلاً فرشتے، ارواح اور شیاطین یا دوسری کائناتی قوتیں جو اللہ کے تابع ہیں، یہ کسی معنی میں بھی رب نہیں ہیں۔ اور نہ ان کو حقیقت ربوبیت میں سے کوئی حقیقت حاصل ہے۔ کیونکہ حق ربوبیت اور مقام ربوبیت صرف اللہ وحدہ کو حاصل ہے اور وہی اس کا سزاوار ہے۔ کیونکہ وہی خالق ہے اور اسی کے کنٹرول میں تمام مخلوقات زندہ رہ رہی ہیں۔ لیکن مختلف جاہلیتوں میں لوگوں نے خود اپنی طرف سے بعض قوتوں کو رب کے نام سے موسوم کر دیا ہے، یہ رب حقیقی کی صفات کو ان نام نہاد ارباب کی طرف منسوب کرتے ہیں جبکہ درحقیقت ان کے اندر نہ صفات موجود ہیں اور نہ ان کو رب حقیقی کی طرح کسی پر قہر اور غلبہ حاصل ہے۔

اب حضرت یوسف علیہ السلام ان کے غلط عقائد پر آخری ضرب لگاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اصل سلطنت کا حقدار و سزاوار کون ہے؟ کون اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے؟ کون اس بات کا حقدار ہے کہ اس کی بندگی کی جائے فقط اس کی؟

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲: ۴۰) ''فرمانروائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو' یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے 'مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں''۔

حکم اور حاکیت صرف اللہ کے لیے ہے' حاکیت خاصہ خدائی ہے۔ اس لیے اللہ کے سوا کوئی اور حاکم ہو ہی نہیں سکتا۔ اللہ کے سوا کوئی اور شخص اگر اللہ کے اس حق میں کوئی دعویداری کرے گا تو اس کا مقدمہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہو گا' چاہے اللہ کے سوا حاکیت کا دعویٰ کرنے والا کوئی فرد واحد ہو' یا کوئی طبقہ ہو یا کوئی جماعت ' یا کوئی امت یا سب کے سب لوگ ہوں یا کوئی عالمی ادارہ ہو۔ اور جو شخص اللہ کے بالمقابل اپنی حاکیت (Sovereiqnty) کا مدعی ہو گا وہ گویا کفر کا ارتکاب کرے گا اور یہ اس کی جانب سے واضح کفر ہو گا۔ اور یہ آیت اس پر نص صریح ہے۔

اب کوئی شخص کس طرح اللہ کے بالمقابل دعوائے الوہیت کر سکتا ہے؟ کسی بھی صورت میں اگر کوئی دعویٰ کرے گا تو مدعی کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہو گا چاہے وہ فرعون کی طرح دعویٰ کرے اور کہے (اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى) یا وہ کہے (مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِىْ) یا وہ اسلامی شریعت کو نظام حکمرانی سے خارج کر دے یا وہ یہ فیصلہ کر دے کہ حکمرانی اور قانون سازی کا مرجع اللہ کے سوا کوئی اور ہو گا۔ اگرچہ وہ فرد ہو یا انسانوں کا کوئی مجموعہ ہو۔

اسلامی نظام میں امت مسلمہ ہی حاکم کا انتخاب کرتی ہے اور کسی شخص کو حاکیت کا اختیار دیتی ہے اور وہ یہ اختیارات استعمال کرتا ہے لیکن وہ اپنے اختیارات شرعی حدود کے اندر استعمال کر سکتا ہے۔ اسلامی نظام میں کوئی شخص یا کوئی ادارہ مصدر قانون سازی اور مصدر حاکیت نہیں ہوتا' حاکیت اور قانون سازی کا اختیار صرف اللہ کو حاصل ہو گا۔ بے شمار مسلم مفکرین حق حاکیت کے استعمال اور مصدر حاکیت کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ تمام انسان حق حاکیت کے مالک نہیں ہیں۔ حق حاکیت صرف اللہ کو حاصل ہے۔ جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے تو ان کی ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ اللہ نے جو نظام قانون اور دستور متعین فرما دیا ہے' انسان صرف اس کے نافذ کرنے والے ہیں۔ لیکن جو دستور اور قانون اللہ نے نہیں بنایا اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ اور اس کی قانونی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اس بات کی دلیل بھی بیان کرتے ہیں : (اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۱۲: ۴۰) ''اللہ نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو''۔ اس دلیل کو ہم تب ہی سمجھ سکتے ہیں جب ہم لفظ عبادت کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اسی طرح جس طرح عرب اسے سمجھتے تھے۔

عبد کا مفہوم عربی میں ہے (دان و خضع و ذل) یعنی تابع ہوا' تابع فرمان ہوا اور کسی کے سامنے جھکا اور ذلیل ہوا۔ آغاز اسلام میں عبادت کا مفہوم بھی مراسم عبودیت اور پرستش نہ تھا۔ اس لیے کہ جب سب سے پہلے یہ آیات نازل ہوئیں تو اس وقت مراسم عبودیت فرض ہی نہ تھے۔ یہ (نماز' روزہ' حج اور زکوۃ اور جہاد) بعد میں فرض ہوئے۔ ابتداء میں عبادت کا لفظ اپنے لغوی مفہوم میں استعمال ہوا تھا جو بعد میں اصطلاحی مفہوم میں استعمال ہوا۔ ابتداءمیں اس لفظ کا مفہوم یہ تھا کہ صرف اللہ کی اطاعت کی جائے' صرف اللہ کے سامنے جھکا جائے' صرف اللہ کے احکام مانے جائیں' ان

احکام کا تعلق عبادات کے مراسم سے ہو' یا اخلاقی امور سے ' یا قانونی امور سے ' ان تمام شعبوں پر لفظ عبادت کا اطلاق ہوتا تھا۔ اس کے مفہوم میں اطاعت اور بندگی شامل تھی جس کے بارے میں اللہ کا حکم تھا کہ اس کے سوا کسی کی اطاعت اور بندگی نہ کی جائے۔

جب ہم عبادت کے اس مفہوم کو معلوم کر لیں تو پھر ہماری سمجھ میں یہ بات آ جاتی ہے کہ یوسف علیہ السلام نے کہا حکم اللہ کا ہے' اس لیے عبادت اور بندگی اور اطاعت بھی صرف اسی کی ہے۔ اگر حکم کسی اور کا ہو تو پھر صرف اللہ کی بندگی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اور حکم اللہ کا ہے' ایک عام اصول ہے اس سے مراد تکوینی حکم بھی ہے کہ اس کائنات کے بارے وہی متصرف فی الامور ہے اور اس سے مراد شرعی اور قانونی حاکمیت بھی ہے کہ شرعی اور تکوینی امور بھی اللہ ہی کے ہوں گے۔

میں اس بات کو دوبارہ دہراتا ہوں کہ جو شخص حاکمیت کے حق میں اللہ کے برخلاف دعویداری کرتا ہے وہ دین اسلام سے خارج ہے۔ اور اس کے بارے میں اسلام کا حکم واضح اور لازمی ہے اور یہ دراصل بدترین شرک اور کفر بواح (صریح کفر) ہے۔ اسی طرح جو شخص اللہ کے بالمقابل حاکمیت کا دعویٰ کرتا ہے اور دوسرے لوگ اس کا اقرار کرتے ہیں اور دل سے اس کی اطاعت کرتے ہیں اور اپنے دل میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے وہ لوگ بھی کفر بواح کے مرتکب ہیں اور وہ دین اسلام سے خارج ہیں۔

حضرت یوسف ؑ فرماتے ہیں کہ چونکہ اللہ ہی حاکم مطلق ہے اس لیے اللہ ہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور یہی درست اور صحیح دین ہے۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (۱۲: ۴۰) "یہی دین قیم ہے" یعنی اس کے سوا دین قیم کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔ درست دین وہی ہے جس میں حاکمیت صرف اللہ کی ہو۔ اور اللہ کی حاکمیت کا اظہار اس طرح ہو کہ لوگ صرف اللہ کی بندگی اور اطاعت کریں۔

چونکہ لوگ حقیقت کو نہیں جانتے' اس لیے لازم نہیں آتا کہ اپنی جہالت کی وجہ سے وہ دین قیم پر متصور ہوں۔ اس لیے کہ جو دین اسلام کو جانتا ہی نہیں اس کی زندگی میں دین کا وجود متحقق کس طرح ہو سکتا ہے؟ اگر لوگوں کی حالت یہ ہو کہ وہ حقیقت دین ہی سے بے خبر ہیں تو عقلاً' حقیقتاً اور بطور واقعہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دین پر ہیں۔ یہ جہالت کوئی عذر نہیں ہے جو ان کو صفت اسلام سے متصف کر دے۔ کیونکہ جہالت تو سرے سے صفت دین ہی کی نفی کر دیتی ہے کیونکہ کوئی شخص اس وقت تک اسلام کا اعتقاد نہیں رکھ سکتا جب تک وہ اسلام کو جانے نہیں۔ یہ بات نہایت ہی منطقی اور بدیہی ہے۔

حضرت یوسف ؑ نے ان واضح اور فیصلہ کن اور مختصر کلمات کے ذریعے شرک کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے اور دین اسلام کے حقیقی نشانات مقرر کر دیئے ہیں۔ اور اسلامی نظریہ حیات کے تمام بنیادی عناصر یہاں بیان کر دیئے ہیں اور ایک دو فقروں میں جاہلیت کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے۔

دنیا میں طاغوتی نظام قائم ہی تب ہوتا ہے جب وہ اللہ سے حق حاکمیت چھین لے اور لوگوں سے اللہ کے بجائے اپنی اطاعت کرائے۔ یعنی لوگ اللہ کی شریعت اور قانون کے بجائے اس کی شریعت کے مطیع فرمان ہوں اور وہ طاغوتی سوچ' طاغوتی قانون اور طاغوتی احکام اور اطاعت رائج کر دیں۔ اس کے سوا طاغوت قائم ہی نہیں ہوتا۔

طاغوتی نظام قائم ہی تب ہوتا ہے جب دین اسلام دنیا سے غائب ہو جائے۔ جب لوگوں کے دل و دماغ میں یہ عقیدہ راسخ ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور حاکم اور مطاع نہیں ہے اور تمام معاملات زندگی میں انسانوں نے صرف اللہ کی اطاعت کرنا ہے تو اس وقت طاغوتی نظام قائم ہی نہیں ہوتا۔

یہاں حضرت یوسف اپنا حقیقی درس اور تعلیم ختم فرما دیتے ہیں اور اس تقریر کو انہوں کے ابتداء ہی میں قیدیوں کی مراد اور مطلب سے مربوط کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں تاکہ قیدیوں کے سوال کا جواب بھی دے دیں۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ

"اے زنداں کے ساتھیو' تمہارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ تم میں سے ایک تو اپنے رب (شاہ مصر) کو شراب پلائے گا' رہا دوسرا تو اسے سولی پر چڑھایا جائے گا اور پرندے اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے"۔

حضرت یوسف نے اچھے انجام پانے والے اور برے انجام تک پہنچنے والے کا یہاں تعین نہیں فرمایا کیونکہ انہوں نے مناسب نہیں سمجھا کہ برا انجام پانے والے کو ذاتی طور پر مخاطب کریں البتہ انہوں نے تاکید سے کہہ دیا کہ انجام یہی ہو گا۔ یہ امر فیصل شدہ ہے جس طرح فیصلہ ہے ویسا ہی ہونے والا ہے۔

قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۝۴۱

"فیصلہ ہو گیا اس بات کا جو تم پوچھ رہے تھے"۔

حضرت یوسف ایک نا کردہ گناہ قیدی تھے۔ بادشاہ نے ان کی قید کا حکم بغیر سوچ اور تحقیق کے صادر فرما دیا تھا۔ شاید اس کے حاشیہ نشینوں نے عزیز مصر کی بیوی کے واقعہ کو اس طرح اس کے سامنے پیش کیا کہ اس میں حضرت یوسف کو گناہ گار کر کے پیش کیا ہو' جس طرح بااثر طبقات عموماً ایسا کر لیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت یوسف نے اس موقعہ پر یہ مناسب سمجھا کہ وہ بادشاہ تک یہ بات پہنچا دیں کہ وہ ان کے معاملے میں تحقیق کرے۔

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ

"پھر ان میں سے جس کی متعلق خیال تھا کہ وہ رہا ہو جائے گا اس سے یوسف نے کہا کہ "اپنے رب (شاہ مصر) سے میرا ذکر کرنا"۔

یعنی میرے حالات' میرا واقعہ اور میری حقیقت کا ذکر اپنے رب اور حاکم کے سامنے کرنا جس کے قانونی اور دستوری نظام کے تم تابع ہو۔ اور جس کے احکام کے تم مطیع ہو۔ ان معنوں میں ہی وہ تمہارا رب ہے۔ کیونکہ رب کے

معنی ہی یہ ہیں کہ جو حاکم ' سردار اور قانون دہندہ ہو ۔ اسلامی اصطلاح میں ربوبیت کا جو مفہوم ہے یہاں اسے واضح کر دیا گیا ہے ۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہنا چاہئے کہ حضرت یوسف ؑ گڈریوں کے دور میں تھے اور گڈریئے بادشاہوں کا یہ عقیدہ نہ تھا کہ وہ خود رب ہیں جس طرح فراعنہ کا عقیدہ تھا ۔ نہ وہ فرعونوں کی طرح اپنے آپ کو الہ سمجھتے تھے ۔ ان کے نزدیک ربوبیت کا مفہوم حاکمیت تھا ' یہاں لفظ رب صریح طور پر حاکم کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔

اب یہاں سیاق کلام یہ تفصیلات نہیں دیتا کہ قیدی ساتھیوں کا انجام اسی طرح ہوا جس طرح حضرت یوسف نے خواب کی تعبیر کی تھی ۔ یہاں قصے میں خلا چھوڑ دیا جاتا ہے ۔ قارئین خود معلوم کر لیتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا ۔ لیکن جس شخص کے بارے میں حضرت یوسف ؑ کی تاویل یہ تھی کہ وہ نجات پائے گا ' اس نے حضرت یوسف کے بارے میں حضرت یوسف ؑ کی وصیت کو پورا نہ کیا ۔ جب وہ شاہی محلات کی زندگی کی ہماہمی میں دوبارہ پہنچا تو وہ ان سرگرمیوں میں مدہوش ہو گیا ' اس نے درس توحید بھی بھلا دیا ' حضرت یوسف ؑ کے مسئلے کو بھی پیش نہ کیا ۔

5
ع 7
فَأَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِى السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾
15

"مگر شیطان نے اسے ایسا غفلت میں ڈالا کہ وہ اپنے رب (شاہ مصر) سے اس کا ذکر کرنا بھول گیا اور یوسف کئی سال قید خانے میں پڑے رہے" ۔

یہ آخری ضمیر لبث ) حضرت یوسف ؑ کی طرف عائد ہے ۔ اللہ کی حکمت کی مشیت یہ تھی کہ حضرت یوسف ؑ تمام دنیاوی اسباب سے کٹ کر صرف اللہ پر بھروسہ کریں ۔ مشیت ایزدی کے نزدیک یہ بات حضرت یوسف ؑ کے شایان شان نہ تھی کہ ان کی رہائی کسی دنیاوی اور انسانی ذریعے سے ہو ۔

اللہ کے مخلص بندوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اللہ کے لیے خالص ہو جائیں ' وہ صرف اس کو اپنی حاجات میں پکاریں اور دعا کریں کہ اللہ ان کو ثابت قدم رکھے ۔ اور اگر کبھی ان بندوں سے کوتاہی ہو جائے تو پھر ان پر اللہ کا فضل ہوتا ہے ۔ اور وہ اپنی حقیقی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں ۔ وہ از سرنو شوق ' محبت اور رضامندی سے اللہ کی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں ۔ اور ان پر اس کا فضل و کرم پورا ہو جاتا ہے ۔

منظر پھر منتقل ہو جاتا ہے ۔ اب ہم بادشاہ کے دربار میں پہنچ جاتے ہیں ۔ بادشاہ نے ایک اہم خواب دیکھا ہے ۔ وہ اپنے حاشیہ نشینوں اور کاہنوں اور مذہبی لیڈروں سے اس کی حقیقی تاویل دریافت کرتا ہے ۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّىْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِىْ فِىْ رُءْيَاىَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

"ایک روز بادشاہ نے کہا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں' اور اناج کی سات بالیں ہری ہیں اور دوسری سات سوکھی۔اے اہل دربار مجھے اس خواب کی تعبیر بتاؤ اگر تم خوابوں کا مطلب سمجھتے ہو"۔لوگوں نے کہا "یہ تو پریشان خوابوں کی باتیں ہیں اور ہم اس طرح کے خوابوں کا مطلب نہیں جانتے"۔

بادشاہ نے اس خواب کی تعبیر چاہی اور اس کے ارد گرد بیٹھنے والے حاشیہ نشین اور درباری مذہبی لیڈر ان خوابوں کی تعبیر نہ بتا سکے۔یا انہوں نے محسوس تو کر لیا تھا کہ ملک کو کچھ مشکلات درپیش آنے والی ہیں لیکن وہ بادشاہ کے سامنے کسی بدشگونی کے اظہار کی جرأت نہ کر سکے۔شاہی درباریوں کا یہ طریقہ کار ہوتا ہے کہ وہ بات کو ٹال دیتے ہیں اور یا جو بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی اسے نظرانداز کر دیتے ہیں۔چنانچہ انہوں نے ان اہم خوابوں پر ایسا ہی تبصرہ کیا کہ یہ خواب ہائے پریشان ہیں اور ان کو ان تاویل کی کوئی سمجھ نہیں آ رہی ہے۔کیونکہ ان خوابوں میں کوئی واضح اشارہ نہیں ہے۔

یہاں تک تین خوابوں کے ساتھ ہمارا واسطہ پڑ چکا ہے۔حضرت یوسف ؑ کا خواب' یوسف ؑ کے دو قیدی ساتھیوں کے خواب' اور اب بادشاہ وقت کا خواب۔ان خوابوں کی تعبیر اور ان خوابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مصر اور مصر سے باہر ارد گرد کی دنیا میں تعبیر خواب کا فن بہت ہی زوروں پر تھا اور اللہ نے حضرت یوسف ؑ کو اپنی جانب سے جو صلاحیت دی' کہ وہ خوابوں کی تعبیر تک پہنچ جاتے تھے' وہ ایک ایسا کمال تھا جو روح عصر تھا۔اور تمام انبیاء کو جو بھی معجزات دیئے جاتے ہیں وہ ان کے عصری ماحول کی مناسبت سے ہوتے ہیں۔تو کیا خوابوں کی تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے ایک معجزہ تھا۔یہاں فی ظلال القرآن میں ہم ایسی بحثیں نہیں چھیڑتے۔بہرحال بادشاہ نے خواب دیکھا ہے اور اس کی تعبیر کی تلاش ہے۔

یہاں بچ جانے والے قیدی ساتھی کو حضرت یوسف ؑ یاد آ جاتے ہیں۔اس سے قبل شیطان نے اس سے حضرت یوسف ؑ کو بھلا دیا تھا اور یہ شخص محل کی ہماہمی' مہمانوں' شرابوں اور عیش و طرب میں مصروف ہو گیا تھا۔اب اسے حضرت یوسف ؑ یاد آتے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے تعبیر بتلائی تھی اور وہ حقیقت کی طرح نمودار ہوئی تھی۔

وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾

"ان دو قیدیوں میں سے جو شخص بچ گیا تھا اور اسے ایک مدت دراز کے بعد اب بات یاد آئی' اس نے کہا "میں آپ حضرات کو اس کی تاویل بتاتا ہوں' مجھے ذرا (قید خانے میں یوسف ؑ کے پاس) بھیج دیجئے"۔

---۰۰۰---

یہ شخص کہتا ہے کہ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس کی تاویل کیا ہے۔اب یہاں پردہ گرتے ہی یہ منظر ختم ہو جاتا ہے۔جب پردہ اٹھتا ہے تو ہم جیل میں حضرت یوسف ؑ کا مکالمہ سنتے ہیں۔

یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ

يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾

''اس نے جاکر کہا''یوسف ؑ''اے سراپا راستی' مجھے اس خواب کا مطلب بتا کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات بالیں ہری ہیں اور سات سوکھی' شاید کہ میں ان لوگوں کے پاس واپس جاؤں اور شاید کہ وہ جان لیں''۔

یہاں یہ شخص یوسف ؑ کے لیے صدیق کا لفظ استعمال کرتا ہے۔یعنی بکثرت سچائی بولنے والے یہ لفظ اس لیے استعمال کرتا ہے کہ اس نے دیکھ لیا کہ حضرت اعلیٰ درجے کے صدیق ہیں۔اور پھر بادشاہ کا خواب نقل کر دیتا ہے۔افتنا.....

یہ شخص خواب کے الفاظ پورے کے پورے نقل کرتا ہے کیونکہ خواب کی تعبیر چاہتا ہے۔لہٰذا پورا خواب بتانا ضروری ہے۔چنانچہ وہ خواب لفظ بلفظ نقل کرتا ہے۔

یہاں حضرت یوسف ؑ خواب کی تعبیر بھی بتاتے ہیں اور ساتھ ہی تجاویز اور مشورے بھی دیتے ہیں۔

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ

''یوسف ؑ نے کہا''سات برس تک لگاتار تم کھیتی باڑی کرتے رہو گے''۔یعنی مسلسل اور پے در پے۔یہ سرسبز اور شاداب سال ہوں گے اور ان کی طرف''بقرات سمان'' سے اشارہ کیا گیا تھا۔

فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾

''اس دوران میں جو فصلیں تم کاٹو ان میں سے بس تھوڑا سا حصہ' جو تمہاری خوراک کے کام آئے' نکالو اور باقی کو اس کی بالیوں ہی میں رہنے دو''۔

یعنی ان سالوں میں جو فصل تم کاٹو اسے خوشوں کے اندر چھوڑ دو تاکہ وہ حشرات ارض اور دوسرے موسمی اثرات سے محفوظ رہیں۔۔۔ ہاں جسے تم نے استعمال کرنا ہے اسے صاف کرو لیکن استعمال شدہ حصہ تھوڑا ہونا چاہئے تاکہ زیادہ سے زیادہ غلہ مشکل وقت کے لیے بچ جائے۔

ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾

''پھر سات برس بہت سخت آئیں گے۔اس زمانے میں وہ سب غلہ کھا لیا جائے گا جو تم اس برے وقت کے لیے جمع کرو گے۔اگر کچھ بچے گا تو بس وہی جو تم نے محفوظ کر رکھا ہو''۔

یہ سات سال اس طرح سخت ہوں گے کہ ان میں زرعی پیداوار نہ ہوگی۔''یہ سال سب کچھ کھا جائیں'' اس سے

مقصود یہ ہے کہ یہ سال قحط سالی کے ہوں گے اور ان سے وہی کچھ بچے گا جو تم نے سابقہ سالوں میں محفوظ کر لیا ہو گا۔

ثُمَّ يَأْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَ فِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ۝۴۹

''اس کے بعد پھر ایک سال ایسا آئے گا جس میں باران رحمت سے لوگوں کی فریاد رسی کی جائے گی اور وہ رس نچوڑیں گے''۔

اب یہ سات خشک سال ختم ہوں گے ' تمہارا سابقہ محفوظ غلہ بھی ختم ہو گا اور اب سرسبزی اور شادابی کا دور لوٹ آئے گا۔ بارشیں ہوں گی 'پانی اور فصل زیادہ ہوں گے 'انگوروں کی فصل بکثرت ہو گی اور لوگ ان کا جوس نکالیں گے ' شراب بنائیں گے۔ اسی طرح تل اور زیتون اور دوسرے مغزیات ہوں گے۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ سات سالہ خشک سالی کے بعد خوشحالی کے اس دور کی طرف بادشاہ کے خواب میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے لدنی اور نبوی علم کے بل بوتے پر کہہ رہے ہیں 'اس طرح حضرت یوسف ؑ نے اس شاہی فرستادے کو خوشخبری دی کہ سات سالہ مشکل دور کے بعد وسیع پیمانے پر خوشحالی کا دور آئے گا تاکہ وہ بادشاہ کو اس کی اطلاع دے۔

---ٹٹٹ---

اب یہاں ہمارے سامنے ایک دوسرا منظر آتا ہے اور ان دونوں مناظر کے درمیان ایک خلا ہے۔ یہ خلا انسانی تخیل خود بھر دیتا ہے۔ اب ہم دوبارہ شاہی دربار میں ہیں۔ یہاں فرستادۂ شاہی نے مکمل رپورٹ دے دی ہے' خواب کی تعبیر بتا دی گئی ہے۔ اب اس نے بادشاہ کو حضرت یوسف ؑ کی ناجائز سزا کے بارے میں بھی بتا دیا ہے۔ لیکن سیاق کلام میں یہ باتیں مذکور نہیں ہیں۔ ہمارے سامنے بادشاہ کی خواہش آتی ہے۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ

''بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لاؤ''۔

مزید تفصیلات ترک کر دی جاتی ہیں۔ بادشاہ کا حکم ہے۔ ہرکارہ خود حضرت یوسف ؑ کے پاس پہنچتا ہے۔ لیکن حضرت یوسف ؑ ہرکارے کو لوٹا دیتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ یہ ہرکارہ وہی ساقی ہے یا کوئی اور ہے۔ شاہی اوامر کا نفاذ شاید کسی اور کے ذمے ہو۔ لیکن حضرت یوسف ؑ طویل قید کے بعد بھی قید خانے سے نکلنے میں جلدی نہیں فرماتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے مقدمے کا صحیح فیصلہ ہو 'احقاق حق ہو اور غلط کار لوگوں کی سازشیں بے نقاب ہوں اور وہ باعزت طور پر بری ہو کر نکلیں۔ یہ اطمینان قلب اور یہ طمانیت صرف ربانی تربیت کے نتیجے میں آ سکتی ہے۔ اب وہ اس قدر پختہ کار ہو گئے ہیں کہ ان کے مزاج میں عجلت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

حضرت یوسف ؑ کی سنجیدگی اور پختہ کاری اور طمانیت دونوں موقف میں واضح ہوتی ہے' پہلے انہوں نے ساقی کو صرف یہ کہا کہ اپنے رب کے پاس میرا تذکرہ کر دے۔ اور دوسرے میں انہوں نے رہائی کے احکام کے باوجود یہ کہہ دیا

کہ پہلے میرے مقدمے کی تحقیقات کرو' لیکن پہلے موقف اور دوسرے موقف میں فرق ہے کیونکہ چند سالوں کی قید اور تربیت نے ان کو مزید پختہ کار بنا دیا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ۝۵۰

"مگر جب شاہی فرستادہ یوسف ؑ کے پاس پہنچا تو اس نے کہا" اپنے رب کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ میرا رب تو ان کی مکاری سے واقف ہی ہے"۔

حضرت یوسف ؑ نے رہائی کے شاہی احکام کو اس لیے مسترد کیا کہ بادشاہ کو صحیح طرح معلوم تو ہو جائے کہ ان کی معاملے کی حقیقت کیا ہے اور ان عورتوں کے الزامات کی حقیقت کیا ہے؟ حضرت یوسف ؑ نے عورتوں کے واقعات کی طرف اشارہ کر کے گویا یہ کہہ دیا کہ تحقیقات ہونے پر وہ عورتیں اصل صورت حال بتا سکتی ہیں جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ یہ تحقیقات یوسف ؑ کی عدم موجودگی میں ہو تا کہ یوسف کی شاہی دربار میں موجودگی غیر جانبدارانہ تحقیقات کو متاثر نہ کر دے۔ یہ سب اس لیے کہ حضرت یوسف ؑ کو اپنی بے گناہی کا یقین تھا اور وہ مطمئن تھے کہ نتیجہ لازماً ان کے حق میں ہو گا۔ کیونکہ سچائی چھپ نہیں سکتی' نہ اسے دیر تک چھپایا جا سکتا ہے۔

قرآن کریم نے حضرت یوسف ؑ کی زبان سے لفظ رب استعمال کرایا ہے اور اسے مخاطب کی طرف مضاف کیا ہے (ربک)۔ اس لیے کہ حضرت یوسف ؑ کا رب تو اللہ ہے جبکہ اس فرستادے کا رب بادشاہ جس کے نظام حکومت کا وہ کارندہ ہے اس سے رب کا یہ مفہوم سامنے آتا ہے کہ حکمران بھی رب ہوتا ہے۔

اب یہ فرستادہ واپس ہوتا ہے' رپورٹ دیتا ہے' لیکن قرآن کریم کی درمیانی کڑیاں انسانی تخیل پر چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ تحقیقاتی مجلس کا منظر

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ یُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ

"اس پر بادشاہ نے ان عورتوں سے دریافت کیا" "تمہارا کیا تجربہ ہے اس وقت کا جب تم نے یوسف ؑ کو رجھانے کی کوشش تھی؟"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عزیز مصر کے گھر کیا ہوتا رہا؟ پھر عورتوں نے اپنی مجلس میں جو گفتگو کی وہ پہلے ریکارڈ ہو چکی ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کسی قوم پر خوشحالی آتی ہے تو اس کے اعلیٰ طبقات کی عورتوں میں اس قسم کی اخلاقی گراوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ ان کا ماحول پسماندہ ہو' زیر بحث جاہلیت تو قدیم تاریخ کی جاہلیت ہے لیکن جاہلیت جس دور میں بھی ہو' وہ جاہلیت ہوتی ہے اور ہر جگہ اس کے خدوخال وہی ہوتے ہیں اور اس کے خوشحال

طبقات فسق و فجور میں ڈوب جاتے ہیں۔

اب شاہی دربار میں منعقد ہونے والی تحقیقاتی مجلس میں ان عورتوں کے لیے مقام نہ تھا کہ وہ کوئی اور جھوٹ تصنیف کریں۔

قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ

"سب نے یک زبان ہو کر کہا"حاشاللہ 'ہم نے تو اس میں بدی کا شائبہ تک نہ پایا"۔

یہ حقیقت تھی 'اب ان کے لیے مشکل تھا۔ یہ عورتیں نہایت ہی بدکار اور بے باک تھیں مگر معاملہ اس قدر واضح تھا کہ انکار کی کوئی صورت نہ رہی تھی۔

اب وہ عورت سامنے آتی ہے جو یوسف ؑ کی محبت میں گرفتار تھی۔ جو ان سے مایوس ہو گئی تھی لیکن وہ ان کے ساتھ وابستگی کو کاٹ نہ سکی تھی۔ یہ عورت سامنے آتی ہے اور صراحت کے ساتھ اقرار جرم کرتی ہے اور یوسف ؑ کی پاکی کی بشارت دیتی ہے۔

قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۵۱

"عزیز کی بیوی بول اٹھی "اب حق کھل چکا ہے 'وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی 'بے شک وہ بالکل سچا ہے"۔

اب بلی تھیلے سے باہر آگئی ہے سچائی سامنے آگئی ہے۔ میں ہی تھی جس نے اسے ورغلانے کی کوشش کی۔

اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَ صّٰدِقِيْنَ (۱۲ : ۵۱) "وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی 'بے شک وہ بالکل سچا ہے"۔ اس نے جس انداز میں شہادت دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اب بھی حضرت یوسف ؑ کی ہمدردی حاصل کرنے کی امید ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت یوسف ؑ کے عقائد اور نظریات اس کے دل میں گھر کر گئے ہیں اور وہ ایمان لے آئی ہو۔ اسی لیے وہ کہتی ہے:

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۝۵۲

"یہ اس لیے کہ عزیز مصر جان لے کہ میں نے درپردہ اس کی خیانت نہیں کی اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں 'اللہ ان کی چالوں کو کامیابی کی راہ پر نہیں ڈالتا"۔

اس اعتراف کو سیاق کلام میں اس طرح قلم بند کیا گیا ہے کہ اس کے پس منظر میں جذبات کا ایک طوفان نظر آتا

ہے 'جس طرح اس سے قبل اس نے واضح اعتراف کیا اور نہایت ہی خوبصورت انداز میں۔

اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ (۱۲ : ۵۱) "وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی ' بے شک وہ بالکل سچا ہے"۔ یہ حضرت یوسف ؑ کی پاک دامنی اور مکمل براءت کی واضح شہادت تھی۔ یہ شہادت اس نے بڑی جرأت سے دی اور اس کی کوئی پروا نہیں کی کہ اس کی ذات پر اس کے کیا اثرات پڑتے ہیں۔

کیا یہ عورت بادشاہ اور اس کے درباریوں کے ساتھ صرف سچائی کی خاطر شہادت دے دی؟ ہاں ایک دوسرا مقصد اور خواہش بھی اس کے دل میں ضرور ہے۔ وہ یہ کہ یہ مومن شخص جسے اس نے جسمانی مقاصد کے لیے پھسلانے کی سعی کی تھی 'اب اس شہادت اور اقرار پر اس کا احترام کرے۔ کیونکہ جب وہ جیل میں غائب تھا تو اس کے بعد وہ ایمان لے آئی ہے۔ یہ ہے مفہوم

ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ (۱۲ : ۵۲) "یہ کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کی"۔

اس کے بعد اس عورت کی طرف سے حالات کو درست کرنے کی مزید کوشش کی جاتی ہے کہ یہ کہتی ہے

وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ كَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ (۱۲ : ۵۲) "اللہ خیانت کرنے والوں کی سازشوں کو کامیاب نہیں کرتا"۔ یعنی یہ اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہے جسے حضرت یوسف ؑ پسند کرتے ہیں۔

یہ ایک قدم اور آگے بڑھتی ہے :

وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۵۳)

"میں کچھ اپنے نفس کی برأت نہیں کرتی 'نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے الا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو' بے شک میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے"۔

یہ عورت محبت کرنے والی تھی۔ یہ اس ذات کے ساتھ جاہلیت میں بھی جاہلانہ محبت کرتی تھی اور اب اسلام میں بھی اس کے ساتھ محبت کرتی ہے۔ چنانچہ اس کی سرتوڑ کوشش ہے کہ وہ کسی طرح حضرت یوسف ؑ سے کوئی کلمہ خیر یا توجہ 'یا خوشی حاصل کر لے۔

یہ اس قصے میں انسانی جذبات کا عنصر ہے۔ یہ محض فنکاری کی وجہ سے یہاں نہیں لایا گیا۔ محض عبرت اور نصیحت

کے لیے اسے یہاں لایا گیا ہے۔اس لیے تاکہ اس کے ذریعے نظریات و عقائد کو پھیلایا جائے اور دعوت اسلامی کو وسعت دی جائے۔اس قصے میں جہاں جہاں انسانی جذبات' میلانات اور انسانی تخیل و وجدان کو لایا گیا وہ نہایت ہی نرم اور محبت بھرے اور خوبصورت انداز میں لایا گیا ہے۔ایسے انداز میں کہ تمام مؤثرات' تمام واقعات' تمام کرداروں اور ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہو' اور جس ماحول کی طرف اشارہ ہو وہ قدرتی نظر آئے۔

یہاں آکر حضرت یوسف ؑ کے زمانہ اسیری کی مشکلات ختم ہو جاتی ہیں۔اب حضرت یوسف ؑ کو عزت و اقتدار دے کر آزمایا جائے گا۔انسان کے لیے ہرحال آزمائش۔

یہاں یہ پارہ اختتام کو پہنچتا ہے اور مزید واقعات اگلے پارے میں دیکھیں۔

بٹ گرام ۲ نومبر ۱۹۹۲ء

---O O O---

# تفسیر فی ظلال القرآن

## سید قطب شہیدؒ

ترجمہ

## سید معروف شاہ شیرازی

| | | |
|---|---|---|
| ☆ جلد اول | پارہ ۱--- تا--- ۴ | ہدیہ -/۲۵۰ روپے |
| ☆ جلد دوم | " ۵--- تا--- ۸ | " -/۳۲۵ " |
| ☆ جلد سوم | " ۹--- تا--- ۱۲ | " -/۳۲۵ " |
| ☆ جلد چہارم | " ۱۳--- تا--- ۱۹ | ۱۹۹۶ء میں مکمل |
| ☆ جلد پنجم | " ۲۰--- تا--- ۲۶ | ہو جائے گی۔ |
| ☆ جلد ششم | " ۲۷--- تا--- ۳۰ | انشاء اللہ |

# فی ظلال القرآن

پارہ ۱۳ تا ۱۹

جلد چہارم

سید قطب شہید

ترجمہ
سید معروف شاہ شیرازی

ادارہ منشورات اسلامی
بالمقابل منصورہ ملتان روڈ لاہور

# عرض ناشر

**شہید اسلام سید قطب** ۔ سید قطب کا شمار امت مسلمہ کی ان چند برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریک دور میں روشنی کے چراغ جلائے اور اسلامی نظام زندگی کی کھیتی کو اپنے خون سے سینچا۔

سید قطب ۱۹۰۶ء میں مصر کے ایک صوبہ "اسیوط" کے ایک گاؤں "موشاء" میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ دونوں عربی النسل تھے۔ سید قطب اپنے والدین کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔

آپ نے ثانوی تعلیم "تجہیزیہ دار العلوم" نامی ایک اسکول میں حاصل کی۔ اس اسکول میں طلباء کو دار العلوم میں داخلہ کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر آپ ۱۹۲۹ء میں قاہرہ کے دار العلوم میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں آپ نے بی۔ اے کی ڈگری اور ڈپلومہ ان ایجوکیشن حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے محکمہ تعلیم میں بحیثیت انسپکٹر تعلیم ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۵۲ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران ۱۹۵۳ء میں آپ اخوان المسلمون سے متعارف ہوئے۔ اور ۲ جولائی ۱۹۵۴ء میں آپ کو اخوان کے شعبہ نشرواشاعت کے اخبار "الاخوان المسلمون" کا ایڈیٹر مقرر کیا۔

شہید اسلام سید قطب ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک جیل میں رہے اور اگست ۱۹۶۴ء میں مرحوم عبدالسلام عارف صدر عراق کی کوشش سے رہا ہوئے۔ رہا ہوتے ہی پوری دنیا کے نوجوانوں نے آپ کی طرف رجوع کیا، اور آپ کا لٹریچر جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیلنے لگا۔ چنانچہ لادین مغرب پرست کمیونسٹ اور سوشلسٹ عناصر چیخ اٹھے اور بیک وقت ماسکو اور واشنگٹن سے ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ چنانچہ آپ کو ایک سال بعد اگست ۱۹۶۵ء میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور ایک سال بعد ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء میں آپ کو شہید کر دیا گیا۔

سید قطب اخوان المسلمون میں آنے سے پہلے خالص ادبی کام کرتے رہے۔ لیکن تحریک اخوان المسلمون میں شامل ہونے کے بعد اسلامی انقلاب، اور تحریک اسلامی، ان کا خاص موضوع رہا۔

**تفسیر فی ظلال القرآن** ۔ مصنف نے فی ظلال القرآن میں قرآن پاک کی اثر انگیزی، جس نے عرب کی کایا پلٹ دی تھی، کی راہ میں حائل پردوں کو چاک کر دیا ہے۔ اس کے ذریعے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والا اس تحریک کے ساتھ جا کھڑا ہوتا ہے جو ہبوط آدم علیہ السلام کے وقت سے روئے زمین پر برپا ہوئی اور انبیاء علیہم السلام کی قیادت میں چلتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک آپہنچی۔ آپ کے بعد بھی یہ تحریک زندہ ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ قاری توحید و رسالت اور آخرت کے عقیدے کو قافلے کے ایک رفیق اور تحریک کے ایک کارکن کی حیثیت سے سنتا اور سمجھتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان کو امت کے ایک فردکی حیثیت سے پڑھ کر اس سے سبق لیتا ہے۔

فی ظلال القرآن میں علمی موشگافیوں اور فقہی باریکیوں سے ہٹ کر قرآن پاک کے اصل مقصد اور دعوتی رنگ کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے لئے جو زبان استعمال کی گئی ہے۔ وہ سید کا ہی حصہ ہے اور اسے بلاشبہ الہامی زبان کہا جا سکتا ہے۔ اپنے اس رنگ میں یقیناً یہ ممتاز ترین تفسیر ہے۔ تفسیر کیا ہے ایک دعوت عمل اور دعوت انقلاب ہے 'الفاظ اور معنی کا دریا ہے۔ جس میں تحقیقی، علمی، وجدانی، اور ادبی نکات جابجا موجود ہیں۔ پورے ذخیرہ تفاسیر میں یہ پہلی تفسیر ہے۔ جو خود قرآن کے اسلوب بیان میں لکھی گئی ہے۔ دوسری تفاسیر بالعموم منطقی انداز بیان میں لکھی گئی ہیں اور فی ظلال القرآن قرآنی اور انقلابی انداز بیان میں ہے۔ اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ یہ اختلافی مسائل اور اسرائیلیات سے خالی ہے۔ اسلام کا جامع تصور لئے ہوئے، اس کے احیاء کا طریقہ کار نمایاں کرتی ہے۔ غرض اخلاص، روح ایمان، عمل صالح اور دعوت انقلاب اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ چودہ پارے جیل سے باہر اور بقیہ جیل میں لکھے گئے ہیں۔ عربی میں اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

**مترجم سید معروف شاہ شیرازی** ۔ سید معروف شاہ شیرازی ۱۸ اپریل ۱۹۳۲ء کو ضلع مانسہرہ کے ایک گاؤں ھروڑی میں پیدا ہوئے ' ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ ہی میں حاصل کی 'حصول علم کا شوق بچپن ہی سے انتہائی زیادہ تھا جس کی وجہ سے سرحد اور پنجاب کے مختلف دینی مدارس اور معروف علماء کرام سے تعلیم حاصل کرتے رہے ' پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۵۲ء میں منشی فاضل اور ۱۹۵۳ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور اگلے ہی سال مشہور دینی درس گاہ جامعہ اشرفیہ لاہور سے دورہ حدیث کر کے سند فراغت حاصل کی 'جبکہ ۱۹۶۴ میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا' اور بعد میں ۱۹۶۷ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔

درس نظامی پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۵ تا ۱۹۶۵ گورنمنٹ ہائی سکول بفہ میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے لیکن بعد میں اس پیشہ کو ترک کر کے تصنیف و تالیف اور صحافت کے شعبہ سے منسلک ہوگئے۔ایک سال تک ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی کے ایڈیٹر رہنے کے بعد اپنا رسالہ "اسوہ" راولپنڈی سے نکالنا شروع کیا لیکن بعد میں کراچی منتقل ہونے کی وجہ سے کراچی سے "اسوہ ڈائجسٹ" کے نام سے یہی رسالہ شائع کرتے رہے۔

اس دوران ادارہ معارف اسلامی کراچی میں ریسرچ اسکالر کے طور پر کام کرتے ہوئے مختلف عربی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا جو "اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو" "اسلام میں جرم و سزا" (دو حصے) "حسن البناء شہید کی یادداشتیں" اور "نشانات راہ" کے ناموں سے شائع ہوئیں۔

لیکن ۱۹۷۰ میں ناسازی طبع کی بناء پر کراچی سے آبائی علاقہ میں منتقل ہوگئے اور وہاں ضلع مانسہرہ کی تحصیل بٹگرام میں وکالت کے پیشہ سے منسلک ہوگئے اور ۱۹۹۲ء تک اسی پیشہ سے منسلک رہے۔پیشہ وکالت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس دوران "سیرت القرآن" حصہ اول دوم "اسلامی انقلاب کا منہاج" "اسلام اور جمہوریت ججوں اور جرنیلوں کے زیر سایہ" "مدارس عربیہ اور اسلامی انقلاب" "سید مودودی کے فکری کام کا ایک جائزہ" "جماعت اسلامی انصاف کے دروازے پر" اور انگریزی کی کتاب "The Shape Of Basic Organs in Islamic State" ادارہ منشورات اسلامی منصورہ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔

گزشتہ ۲۹ سال میں دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ سید قطب شہید کی تفسیر فی ظلال القرآن کے اردو ترجمہ کا کام بھی جاری رہا جو اکتوبر ۱۹۹۵ء میں مکمل ہوا۔

سید معروف شاہ شیرازی دوران تعلیم ہی سید مودودی ؒ سے متعارف ہوئے اور اکثر عصری مجالس میں حاضر رہتے تھے 'تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ مولانا مودودی ؒ کے ساتھ بھی رہے 'جبکہ مولانا مودودی ؒ اکثر انہیں مسکین شاہ صاحب کے نام سے یاد فرماتے تھے ' ۱۹۶۲ء میں جماعت اسلامی کے رکن بنے اور ہمیشہ تحریکی سرگرمیوں میں مصروف رہے 'قومی اتحاد کی تحریک کے دوران ہری پور جیل میں بھی رہے۔موصوف آجکل نائب امیر جماعت اسلامی ضلع مانسہرہ کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں اور جماعت اسلامی صوبہ سرحد کی شوریٰ کے بھی منتخب رکن ہیں۔

فی ظلال القرآن کے ترجمہ کے بعد موصوف اپنی زیر تکمیل کتب "حرمت سود" "تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل" "کتاب نکاح" "تحریکات اسلامیہ" "غربت اسلام کی نظر میں" "مغلیہ دور حکومت میں سرحد کے صوفیاء کرام کا کردار" کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

اب فی ظلال القرآن کی چوتھی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس سلسلہ کی مزید ۶ جلدیں جلد شائع کرنے کی توفیق نصیب فرمائے آمین ثم آمین (سید عارف شیرازی)

جملہ حقوق محفوظ ہیں

| | | |
|---|---|---|
| تفسیر | ------- | فی ظلال القرآن |
| مصنف | ------- | سید قطب شہید ؒ |
| مترجم | ------- | سید معروف شاہ شیرازی |
| ناشر | ------- | سید عارف شیرازی |
| جلد چہارم | ------- | پارہ ۱۳ تا ۱۹ |
| اشاعت اول | ------- | اگست ۱۹۹۶ء |
| تعداد | ------- | ۱۰۰۰ |
| اشاعت دوم | ........ | دسمبر ۱۹۹۷ء |
| تعداد | ------ | ۱۱۰۰ |
| مطبع | ------- | محمد رضا پرنٹرز لاہور |
| ھدیہ | ------- | ۳۵۰ روپے |


---ООО---

# جلد چہارم



---○○○---

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

# فہرست جلد چہارم

## پارہ نمبر- ۱۳-------- سورہ یوسف - ۱۲



## سورہ الرعد - ۱۳



## سورہ ابراھیم - ۱۴



## پارہ نمبر- ۱۴-------- سورہ الحجر-۱۵

## سورۃ النحل - ۱۶



## پارہ نمبر- ۱۵-------- سورہ بنی اسرائیل - ۱۷

## سورۃ الکھف - ۱۸



## پارہ - ۱۶

## سورۃ مریم ۔ ۱۹



## سورۃ طٰہٰ ۔ ۲۰



## پارہ نمبر۔ ۱۷------- سورہ الانبیاء ۔ ۲۱

## سورۃ الحج ـ ۲۲



## پارہ نمبر- ۱۸-------- سورہ المومنون ـ ۲۳



## سورۃ النور ـ ۲۴

## سورۃ الفرقان -۲۵



## پارہ -۱۹



## سورۃ الشعراء -۲۶

## سورۃ النمل - ۲۷



---○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد چہارم

## پارہ --- ۱۳

سورۃ یوسف - ۱۲

۵۳ -- تا -- ۱۱۱

سورۃ الرعد - ۱۳

۱ -- تا -- ۴۳

سورۃ ابراہیم - ۱۴

۱ -- تا -- ۵۲

# پارہ ۱۳ ایک نظر میں

یہ پارہ سورہ یوسف کے بقیہ حصے اور سورہ رعد اور سورہ ابراہیم پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں سورتیں بھی مکی ہیں۔ گویا یہ پورا پارہ مکی قرآن پر مشتمل ہے اور اس میں مکی سورتوں کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔

سورہ رعد اور سورہ ابراہیم پر تبصرے ہم آئندہ پر اٹھائے رکھتے ہیں۔ رہی سورہ یوسف تو اس کے بقیہ حصے کے مطالعہ سے قبل امید ہے کہ قارئین گذشتہ پارے میں سورہ یوسف پر کیے گئے تبصرہ کو ذہن میں رکھیں گے۔

اس پارے میں سورہ یوسف کا باقی حصہ ہے اور اس کے اندر جابجا تبصرے ہیں۔ اور آخر میں اس پوری سورہ پر ایک تبصرہ ہے۔ اس حصے میں ہم قصے کے مرکزی کردار حضرت یوسف علیہ السلام کی ذاتی زندگی اور ان کی شخصیت کے بعض نئے پہلوؤں سے متعارف ہوتے ہیں یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت اب ذرا مختلف روپ میں سامنے آتی ہے۔ اس شخصیت کے ان بنیادی عناصر ترکیبی کے ساتھ ساتھ جن کا ذکر ہم نے اس قصے کے کرداروں کے بیان کے ضمن میں کیا ہے' یہاں اس جدید مرحلے میں ان کی شخصیت کے کچھ نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ یہ شخصیت آغاز سے لے کر آخر تک ایک ہی سے خدوخال رکھتی ہے لیکن اس نئے مرحلے میں اس کی کچھ نئی خوبیاں سامنے آتی ہیں اور بظاہر یہ نئی خصوصیات کی نظر آتی ہیں۔

حضرت یوسف کی شخصیت اپنے نشوونما اور بات اور واقعات اور ان مشکلات کی وجہ سے جو ان کو پیش آتی رہیں اب ایک مکمل شخصیت ہے۔ شخصیت کی یہ تکمیل خالص ربانی تربیت کے تحت ہوتی ہے جس کے نتیجے میں وہ ایک بندہ صالح بن کر سامنے آتے ہیں۔ اس بندہ صالح کو تیار ہی اس لیے کیا جا رہا ہے کہ زمین میں اس کو تمکن حاصل ہو اور مشرق وسطیٰ کے ایک ایسے ملک میں اسے اقتدار ملے جہاں سے ہر چیز ہر طرف سپلائی ہوتی ہے۔

اس شخصیت کے نئے خدوخال کیا ہیں؟ سب سے پہلے یہ کہ ان کا تعلق باللہ بہت گہرا ہے اور وہ راضی برضا ہیں۔ وہ اللہ کے ہو گئے ہیں اور ان کو اللہ پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ انہوں نے تمام دنیاوی اقدار کا لبادہ اتار دیا ہے' زمین کے تمام بندھنوں سے آزاد ہو گئے ہیں۔ وہ اس دنیا کے حکمرانوں سے بے نیاز ہیں۔ یہ دنیاوی قدریں اور یہ قوتیں اس شخصیت کے ہاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں کیونکہ اس شخصیت نے اب صرف اللہ سے لو لگا لی ہے۔

حضرت یوسف ؑ کی شخصیت میں یہ اوصاف اس وقت سامنے آتے ہیں جب بادشاہ مصر کے فرستادے قید خانے میں ان کے پاس آتے ہیں اور اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ بادشاہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ تو حضرت یوسف ؑ اس موقع پر آپے سے باہر نہیں ہو جاتے۔ نہ وہ اس قید خانے کی تاریکیوں سے نکلنے اور بادشاہ وقت سے ملاقات کرنے کے لیے کسی بے تابی کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ ایسے مواقع پر بے تابی اور جلد بازی کا اظہار ہو ہی جاتا ہے خصوصاً جبکہ ایک شخص قید خانے کی کوٹھڑی میں بند ہو۔

حضرت یوسفؑ کے کردار میں اس تبدیلی کو تب ہی سمجھا جاسکتا ہے جب ہم ذرا چند سال پیچھے ہٹ کر حالات کا مطالعہ کریں۔ چند سال پیشتر خود انہوں نے اس شخص سے جو رہا ہونے والا تھا' درخواست کی تھی کہ بادشاہ کے سامنے ان کے کیس کو پیش کریں۔ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ اس طرح اس شخصیت کی قدریں بدل گئی ہیں' ایمان تو اپنی جگہ پہلے کی طرح موجود ہے' لیکن اب ان کی شخصیت میں ایک طمانیت ہے۔ وہ اب بھی اللہ کی تقدیر پر راضی ہیں اور تقدیر کے ساتھ چل رہے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ تقدیر اپنا کام کیسے کرتی ہے۔ ان کو وہ اطمینان حاصل ہے جس کے طلبگار ان کے جد اعلیٰ تھے جنہوں نے خدا سے مطالبہ کیا تھا "اے رب' مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے؟" تو رب تعالیٰ نے فرمایا: "کیا تجھے یقین نہیں ہے؟" لیکن انہوں نے کہا "یقین تو ہے لیکن میں قلبی اطمینان چاہتا ہوں"۔

یہ ہے وہ اطمینان جو ربانی تربیت نے اس بندۂ مختار کی دل میں انڈیل دیا ہے۔ ابتلاؤں سے گزار کر' مشکلات میں مبتلا کر کے' مختلف حالات اور مشاہدوں سے گزار کر اور علم و معرفت اور یقین و اطمینان عطا کر کے وہ اس مقام تک پہنچے ہیں۔

اس مرحلے کے بعد حضرت یوسفؑ کے کردار میں یہ صفت بہت واضح ہے۔ یہاں تک اس سورہ کے آخری تبصرے ہیں۔ وہ جب اپنے رب کے ساتھ مناجات میں ہیں تو وہ تمام دنیاوی قدروں سے بے نیاز نہیں۔ فرماتے ہیں:

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ (۱۰۱)

"اے رب تو نے مجھے مملکت عطا کر دی ہے' بات کی تہہ تک پہنچنا سکھا دیا ہے۔ دنیا و آخرت میں تو ہی میرا ولی ہے۔ مجھے ایک مسلمان کی طرح موت دے اور صالحین کے ساتھ ملا دے"۔

اب رہیں وہ تعقیبات اور تبصرے جو اس سورہ میں آئے ہیں ان کے بارے میں ہم بہت کچھ کہہ آئے ہیں اور مزید تشریحات تفسیر آیات میں آئیں گی۔ یہاں تو فقط اس تبدیلی کا تذکرہ مطلوب تھا جو اس بندۂ مختار کی شخصیت میں پیدا ہوئی جو اس قصے میں بڑا کردار ہیں۔ اس تبدیلی کے ساتھ دراصل ان کی شخصیت اب ایک مکمل شخصیت ہے۔ نیز یہ خصوصیت وہ ہے جسے اس پورے حصے میں ابھار کر نا مطلوب ہے کیونکہ حضرت یوسفؑ نے احیائے اسلام کا کام کرنا ہے اور یہی قرآن کا منہاج انقلاب ہے کہ وہ قارئین کے ذہن میں اصل مقصد بٹھا دیتا ہے۔

اب ہم آیات کی تشریح و تفسیر کی طرف آتے ہیں۔

---()()()---

# فی ظلال القرآن

## جلد چہارم

## پارہ ----- ۱۳

### سورۂ یوسف - ۱۲

### ۵۳---تا---۱۱۱

# درس نمبر۱۰۹ایک نظر میں

اس سبق میں قصہ یوسف علیہ السلام ذرا آگے بڑھ رہا ہے۔ اس قصے کے چار بڑے مناظر میں سے یہ چوتھا منظر ہے۔ پچھلے پارے میں اس قصے کی تین کڑیاں ختم ہو گئی تھیں۔ اب حضرت یوسف "قید خانے سے باہر آگئے ہیں۔ بادشاہ نے خود درخواست کی ہے کہ وہ انہیں ایک اہم منصب سپرد کرنے والے ہیں۔ ان کے اس نئے منصب کی ذمہ داریوں کے بارے میں یہاں اب بات ہو گی۔

یہ سبق سابقہ منظر کے آخری فقرے سے شروع ہوتا ہے۔ گذشتہ منظر کی آخری کڑی یہ تھی کہ اس میں حضرت یوسف ؑ کی خواہش کے مطابق بادشاہ نے ان عورتوں سے حضرت یوسف "کے بارے میں انکوائری کی تھی جنہوں نے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ وہ اسباب نکھر کر سامنے آجائیں جن کی وجہ سے حضرت یوسف ؑ کو ناحق جیل جانا پڑا تھا تاکہ ان کی بے گناہی کا اعلان ہو جائے اور یہ بات ان کے نئے منصب کے لیے ضروری تھی تاکہ وہ اپنی نئی ذمہ داریاں نہایت اطمینان 'نہایت وثوق اور اعتماد سے پوری کریں۔ ان کا نفس مطمئن ہو اور وہ اعتماد کے ساتھ امور مملکت سرانجام دیں۔ اب ان کی دعوتی زندگی دو قسم کی سرگرمیوں پر مشتمل تھی۔ ایک مملکت کی ذمہ داریاں اور ایک دعوت اسلامی کی ذمہ داریاں۔ لہذا مناسب یہ تھا کہ ان دہری ذمہ داریوں کے اس دور میں وہ ماضی کے گردوغبار کو جھاڑ کر اور ہلکے پھلکے ہو کر سامنے آئیں۔

ان کی شرافت یہ تھی کہ انہوں نے اس مرحلے پر عزیز مصر کی عورت کے بارے میں کچھ نہیں کہا 'بلکہ اس کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔ صرف یہ کہا کہ بادشاہ کو ان عورتوں کے معاملے میں تحقیق کرنا چاہئے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ لیکن عزیز مصر کی بیوی خود سامنے آتی ہے اور اعلان کرتی ہے کہ حقیقت کیا تھی اور ہوا کیا تھا؟

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۵۱) ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ(۵۲) وَ مَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۳) یوسف ۵۱ تا ۵۳ "اب حق کھل چکا ہے' وہ میں ہی تھی جس نے اسے

پھسلانے کی کوشش کی تھی' بے شک وہ بالکل سچا ہے' اس سے میری غرض یہ تھی کہ یہ جان لے کہ میں نے درپردہ اس سے خیانت نہیں کی اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں اللہ ان کی چالوں کو کامیابی کی راہ پر نہیں ڈالتا۔ میں کچھ اپنے نفس کی براءت نہیں کرتی۔ نفس بدی پر اکساتا ہی ہے الا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو' بے شک میرا بڑا غفور و رحیم ہے"۔

یہاں آکر حضرت یوسف ؑ کا المناک ماضی ختم ہو جاتا ہے اور اب خوشحالی' عزت اور اقتدار کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔

---O O O---

# درس نمبر ۱۰۹ تشریح آیات

## ۵۳ --- تا --- ۷۹

---

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْۗءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ
اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾ قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰي خَزَاۗىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّىْ حَفِيْظٌ
عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاۗءُ ۭ نُصِيْبُ
بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَاۗءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾ ع ۸ / ۷ / ۱

"میں کچھ اپنے نفس کی براءت نہیں کرتی۔ نفس بدی پر اکساتا ہی ہے الا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو' بے شک میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔ بادشاہ نے کہا "انہیں میرے پاس لاؤ تاکہ میں ان کو اپنے لیے مخصوص کر لوں"۔ جب یوسف نے اس سے گفتگو کی تو اس نے کہا "اب آپ ہمارے ہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور ہمیں آپ کی امانت پر پورا بھروسہ ہے"۔ یوسف ؑ نے کہا "ملک کے خزانے میرے سپرد کیجئے میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں"۔

اس طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسف ؑ کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی۔ وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے۔ اسی طرح ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں 'نوازتے ہیں' نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں مارا نہیں جاتا' اور آخرت کا اجر ان لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے جو ایمان لے آئے اور خدا ترسی کے ساتھ کام کرتے رہے"۔

بادشاہ کے ہاں یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی سب عیاں ہو گئی' اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنے خواب کی سچی تعبیر بھی معلوم ہو گئی' بادشاہ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ حضرت یوسف ؑ نے عورتوں کے معاملے کی چھان بین کس طرح کرائی۔ نیز ان کی

شرافت اور عزت نفس بھی اس کے سامنے کھل کر ثابت ہوگئی کہ یہ شخص براءت کے بغیر جیل خانے سے بھی باہر آنا گوارا نہیں کرتا' نہ ہی وہ بادشاہ سے ملاقات کے لیے بے تاب ہے۔ بادشاہ بھی کوئی معمولی بادشاہ نہ تھا بلکہ مصر جیسے بڑے ملک کا بادشاہ تھا۔ انہوں نے اس موقعے پر نہایت ہی شریف اور کریم شخص کا موقف اختیار کیا جو الزام کے ہوتے ہوئے جیل سے باہر آنا گوارا نہیں کرتا۔ وہ حصول مناصب' بادشاہ سے ملاقات اور جیل کی مشکلات سے رہائی سے قبل اپنی عزت اور شہرت پر سے داغ ہٹانا چاہتا ہے۔ اور یہ سب کچھ وہ بادشاہ کے دربار میں قدم رکھنے سے قبل چاہتا ہے۔ ان تمام امور نے بادشاہ کے دل میں ان کی وقعت اور اہمیت کو اور بڑھا دیا اس لیے اس نے کہا:

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي (۱۲ : ۵۴) بادشاہ نے کہا "انہیں میرے پاس لاؤ تاکہ میں ان کو اپنے لیے مخصوص کر لوں"۔ بادشاہ وقت حضرت یوسف ؑ کو محض رہائی کے لیے طلب نہیں فرماتے یا محض اس لیے نہیں بلا رہے کہ وہ نفسیات اور تعبیر خواب کے ماہر ہیں' نہ اس لیے بلا رہے ہیں کہ ان کو بادشاہ سلامت کی رضامندی کی اطلاع دے دیں اور حضرت یوسف ؑ پھولے نہ سمائیں۔ ان مقاصد کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ بادشاہ کے مخصوص مشیر اور ذاتی دوست اور معتمد علیہ ہوں۔

ہمیں ان لوگوں کی حالت پر رونا آتا ہے جو اپنی عزت اور شرافت کو بادشاہوں کے قدموں میں نچھاور کرتے ہیں۔ یہ لوگ آزاد اور بری الذمہ ہیں لیکن یہ خود غلامی کا جوا اپنے ہاتھ سے لے کر اپنی گردنوں میں ڈالتے ہیں اور بڑوں کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں یا ان کی طرف سے تعریف کا ایک لفظ سن کر خوش ہوتے ہیں اور پھر نہایت ہی مطیع فرمان بن کر رہتے ہیں بلکہ وہ اپنے آپ کو بڑوں کے سامنے ذلیل کرتے ہیں اور بچھے جاتے ہیں۔ کاش اس قسم کے لوگ سورہ یوسف پڑھتے اور معلوم کرتے کہ خودداری' عزت نفس اور شرافت اور سنجیدگی میں کیا مزہ ہے۔ حالانکہ خودداری' عزت نفس اور کرامت کے فائدے چاپلوسی' غلامی اور ذلت کی زندگی سے زیادہ ہیں۔ بہرحال بادشاہ نے یہ حکم دیا۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي (۱۲ : ۵۴) بادشاہ نے کہا "انہیں میرے پاس لاؤ تاکہ میں ان کو اپنے لیے مخصوص کر لوں"۔

اب یہاں سیاق کلام میں حضرت یوسف علیہ السلام کی رہائی وغیرہ کی کڑیاں حذف کر دی گئی ہیں اور انسانی تخیل پر چھوڑ دی گئی ہیں۔

فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ (۱۲ : ۵۴) "جب یوسف ؑ نے اس سے گفتگو کی تو اس نے کہا "اب آپ ہمارے ہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور ہمیں آپ کی امانت پر پورا بھروسہ ہے"۔ جب یوسف ؑ نے بادشاہ سے گفتگو کی تو اسے معلوم ہوگیا کہ یوسف ؑ کی علامات جو کچھ بتا رہی تھیں وہ ان کے مطابق سچے ہیں تو بادشاہ نے اعلان کر دیا کہ یوسف ؑ ہماری مملکت میں اب صاحب قدر و منزلت ہیں۔ اب یوسف ؑ عبرانی غلام نہیں ہیں' نہ ہی وہ اس تہمت میں گرفتار ملزم ہیں جو عزیز مصر کی بیوی نے ان پر لگائی تھی۔ اب وہ ایک باعزت شخصیت ہیں اور بادشاہ کے ہاں انہیں اونچا مقام حاصل ہے اور وہ بہت ہی امانت دار شخص ہیں۔

بادشاہ کی طرف سے اس اعلان کے بعد حضرت یوسف ؑ کا رویہ کیا رہا۔ انہوں نے بادشاہ کے سامنے سجدۂ شکر ادا نہیں کیا۔ جیسا کہ عموماً بادشاہوں کے مصاحب سجدے کرتے ہیں۔ نہ انہوں نے تملق اور چاپلوسی سے کہا اے میرے آقا!

تم زندہ رہو اور یہ غلام تمہارا خادم رہے گا۔ یا یہ کہ میں تمہارا امین ' خادم اور غلام ہوں۔ بلکہ تملق اور چاپلوسی کے بجائے انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ مملکت کو پیش آنے والی مشکلات میں وہ جو خدمات کر سکتے ہیں اس کے لئے وہ حاضر ہیں ان آنے والے حالات کے مطابق جو تعبیر خواب کے نتیجے میں لازماً آنے والے ہیں کیونکہ حضرت یوسف ؑ کو پختہ یقین تھا کہ آنے والی مشکلات کو صرف وہی دیکھ رہے ہیں اور صرف وہی ان کے لیے تیاری اور پیش بندی کر سکتے ہیں ورنہ لوگ قحط کی وجہ سے موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔ صرف یوسف ؑ ہی تھے جو اپنی دیانت و امانت کی وجہ سے ملک کو بچا سکتے تھے۔

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰي خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ (۱۲:۵۵) یوسف ؑ نے کہا "ملک کے خزانے میرے سپرد کیجئے 'میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں"۔

خواب کی تعبیر کا خلاصہ یہ ہے کہ سات سال سرسبزی کے ہیں اور ان میں اس بات کی ضرورت ہے کہ پیداوار کے ایک ایک دانے کو بچایا جائے 'امور مملکت کو اچھے طریقے سے چلایا جائے 'مملکت کے تمام شعبوں کو درست کیا جائے اور خوشحالی کے دور میں ایسی پلاننگ کی جائے کہ بدحالی اور خشک سالی میں اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اسی لیے حضرت یوسف ؑ نے ایسی ہی صلاحیتوں کا ذکر کیا اور جو ایسے حالات کے لیے ضروری تھیں یعنی حفیظ و علیم۔ اور مصر اور تمام علاقائی ممالک کے لیے یہ انتظام مفید تھا۔ اس لیے کہا اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ (۱۲:۵۵) حضرت یوسف ؑ کا یہ مطالبہ اس لیے نہ تھا کہ وہ وزارت خزانہ لے کر اپنے لیے کچھ مفادات حاصل کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ ایک صاحب رائے دانشور تھے اور انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ اس ڈیوٹی کے لیے ان سے زیادہ اور کوئی موزوں شخص نہیں ہے۔ آنے والا دور ایک بحرانی دور ہو گا کیونکہ پوری مصری قوم اور پڑوسی اقوام کے لیے غلے اور دوسری رسد کے انتظام کا عظیم مسئلہ درپیش ہو گا۔ سات اچھے سالوں میں کفایت شعاری اور سات مشکل سالوں میں سپلائی کو بحال رکھنے کا عظیم انتظام درپیش تھا۔ حضرت یوسف ؑ اپنی ذات کے لیے کچھ طلب نہ فرماتے تھے بلکہ یہ تو وہ عظیم ذمہ داری تھی جس سے ہر ایک بھاگ رہا تھا' کوئی شخص بھی خوشی سے غنیمت سمجھ کر اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ایک تو یہ کہ شاہی نظام میں گردن زدنی کا بھی خطرہ تھا' دوسرے یہ کہ عوام الناس کو بھوک اور افلاس کی حالت میں کنٹرول کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کیونکہ جب عوام بھوکے ہوں تو وہ مجنون کی طرح اہلکاروں کو پھاڑ کھاتے ہیں۔ یہ تمام امکانات حضرت یوسف ؑ کے پیش نظر تھے۔

یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ نے جو یہ فرمایا اور مطالبہ کیا کہ "مجھے زمین کے خزانوں پر نگراں کر دیجئے 'میں حفیظ و علیم ہوں"۔ کیا ان کی طرف سے یہ منصب کا مطالبہ نہیں ہے جو اسلامی نظام میں سخت معیوب ہوتا ہے۔ جبکہ یہ تو کسی منصب پر مقرر کرنے کا صریح مطالبہ ہے' اور حدیث میں آتا ہے (خدا کی قسم ہم اس معاملے کو اس شخص کے حوالے نہیں کرتے جو اس کا مطالبہ کرے) (متفق علیہ)۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ حضرت یوسف ؑ نے یہاں خود بتایا ہے کہ وہ حفیظ اور علیم ہیں۔ یہ ایک گونہ اعلان تزکیہ نفس ہے اور خود قرآن میں آتا ہے۔ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ "اپنی پاکی داماں کی حمایت مت کرو"۔ اس کا آسان جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ انتظامی اصول حضور اکرم ﷺ کے دور میں تو نافذ ہوئے لیکن ضروری نہیں ہے کہ حضرت یوسف ؑ کے دور میں بھی یہ ممنوع ہوں۔ کیونکہ تمام پیغمبروں کا اصول دین پر تو اتفاق رہا ہے لیکن انتظامی امور اور شرعی

قوانین ہر ایک کے ہاں جدا تھے۔

لیکن ہم یہ سرسری جواب نہیں دیتے کیونکہ اس مسئلے کو ذرا گہرائی کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے اور اس کے نتائج نہایت گہرے اور دور رس ہیں۔ اس کے کچھ اور پہلو اور اعتبارات ہیں' اسے ان پہلوؤں سے وسیع تناظر میں دیکھنا ضروری ہے تاکہ ہم احکام فقہیہ کے استنباط میں اس وسیع نقطہ نظر سے مسائل کا استنباط کر سکیں اور فقہی احکام کو بھی تحریکی انداز دے سکیں۔ کیونکہ فقہی احکام' ان کے استنباط کا طریق کار اور اصول فقہ بھی مسلمانوں کے دور جمود اور زوال میں منجمد ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کو بھی تحریکی Dynamic انداز دینا ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی فقہ محض خلاء میں وجود میں نہیں آئی نہ اسے محض خلاء میں سمجھا یا نافذ کیا جا سکتا ہے۔ فقہ اسلامی کا ارتقاء ایک ارتقاء پذیر اسلامی معاشرے کے اندر ہوا ہے۔ اس معاشرے کو اپنے ارتقائی دور میں اسلامی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنا تھا۔ یہ فقہ اسلامی نہ تھی جس نے کسی اسلامی معاشرے کو جنم دیا ہو' بلکہ ایک اسلامی معاشرہ کے اندر اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اسلامی فقہ ارتقاء پذیر ہوئی۔ یہ دو عظیم حقائق ہیں اور اسلامی تاریخ ان پر گواہ ہے۔ اسلامی معاشرے اور تخلیق فقہ کے باہم تعلق کو جب تک نہ سمجھیں گے اس وقت تک ہم اسلامی فقہ کو سمجھ ہی نہیں سکتے اور نہ اسلامی فقہ کی تحریکی اور ارتقائی حیثیت کو سمجھ سکتے ہیں۔

وہ لوگ جو آج ان نصوص کو پڑھتے اور فقہ کے مدون احکام کو لیتے ہیں اور ان کے پیش نظر یہ حقیقت نہیں ہوتی کہ پہلے اسلامی معاشرہ وجود میں آیا تھا اور پھر فقہ وجود میں آئی اور وہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ یہ نصوص کن حالات میں نازل ہوئیں اور اسلامی فقہی مسائل کس طرح مرتب ہوئے' خصوصاً وہ ماحول' وہ معاشرہ اور وہ مزاج جن میں یہ نصوص نازل ہوئیں ان کو بھی پیش نظر نہیں رکھتے تو اس قسم کے لوگ اس قانون کو محض خلاء میں نافذ کرنا چاہتے ہیں' حالانکہ کوئی قانونی نظام کسی خلاء میں نافذ نہیں ہوا کرتا بلکہ وہ معاشرے میں نافذ ہوتا ہے۔ ایسے لوگ دراصل فقہاء نہیں ہیں نہ یہ لوگ ماہرین قانون اسلامی ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت اسلامی نظام کے مزاج ہی کو نہیں سمجھے نہ اس دین کی حقیقت کو سمجھے ہیں۔

تحریکی فقہ دراصل اس فقہ سے مختلف ہے جو کتابوں کے اوراق میں ہے' اگرچہ فقہ تحریکی بھی ان اصول اور نصوص پر مبنی ہوتا ہے جن پر فقہ اوراق مبنی ہے۔ تحریکی فقہ ان حالات پر بھی نظر رکھتی ہے جن میں نصوص قرآن و سنت کا نزول ہوا۔ ایک عملی فقیہ کو نظر آتا ہے کہ شان نزول اور حالات نزول دونوں کو اصل نصوص سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کسی نص کو ہم ان حالات سے علیحدہ کر کے اس پر غور کریں گے جن میں وہ نازل ہوئی تھی تو ہمارا استنباط اور اجتہاد غلط ہو جائے گا۔ اور اس طرح جو فقہ مرتب ہوگی وہ درست نہ ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ کوئی فقہی حکم خداوندی ایسا نہیں ہے کہ وہ اپنی جگہ مستقلاً خلاء میں آیا ہو اور جس میں اس وقت کے ماحول اور معاشرے کے اثرات نہ ہوں جن میں وہ پہلی مرتبہ وارد ہوا۔ کوئی فقہی حکم اور اجتہاد چونکہ خلاء میں نہیں ہوا اس لیے وہ خلاء میں نہیں رہ سکتا۔

یہ اصول جو اوپر ہم نے بیان کیا اس کی مثال وہ احکام ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ کسی شخص کو اپنی پاکی داماں کا دعویٰ نہیں کرنا چاہئے یا کسی شخص کو اپنے آپ کو کسی منصب کے لیے پیش نہیں کرنا چاہئے۔ یہ احکام اس آیت فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ ''اپنے نفسوں کی پاکی کا دعویٰ نہ کرو'' اور حضور ؐ کی حدیث سے ماخوذ ہیں۔ انا و اللہ لاتولي هذا العمل

حدا اسالہ "ہم خدا کی قسم یہ منصب اس شخص کو نہیں دیتے جو اسے مانگتا ہے"۔

یہ احکام اس معاشرے میں آئے تھے جو ایک اسلامی معاشرہ تھا اور اس اسلامی معاشرے میں ان احکام کو عملاً نافذ بھی کر دیا گیا تھا۔ یہ احکام تھے ہی ایسے معاشرے کے لیے' تاکہ قائم اسلامی معاشرے کی ضرورت کو پورا کریں' اس وقت کا قائم اسلامی معاشرہ اپنا ایک تاریخی پس منظر اور اپنا ایک مخصوص عضویاتی ترکیب کا حامل تھا' اس معاشرے کی اپنی مخصوص اور ذاتی صورت حال تھی ۔یہ دونوں احکام ایسے احکام تھے جنہوں نے ایک مکمل قائم شدہ اسلامی معاشرے کے اندر نافذ ہونا تھا' انہی حالات میں وہ نازل ہوئے ۔یہ خلاء میں نازل نہیں ہوئے تھے' لہٰذا ان دونوں احکام کو ہم ایک قائم شدہ اسلامی معاشرے میں نافذ کر سکتے ہیں۔ ایسا معاشرہ جس کی ترکیب' جس کی اٹھان اور جس کی عضویاتی تحریک اسلامی ہو۔ جب بھی ایسا معاشرہ قائم ہو گا اس میں ایسے احکام اور ان کے مطابق نظام قائم ہو جائے گا۔ اگر کہیں اسلامی معاشرے کا نام و نشان ہی نہ ہو تو ان میں یہ احکام نافذ نہیں ہو سکتے' محض خلاء میں۔

یہی معاملہ تمام اسلامی احکام کا ہے لیکن ہم اسلام کے دوسرے احکام کے بارے میں یہاں تفصیلات دینا مناسب نہیں سمجھتے۔

سوال یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں لوگ خود اپنے منہ میاں مٹھو کیوں نہیں بنیں گے اور خود اپنے آپ کو امیدوار کیوں نہ بنائیں گے اور وہ اپنے پسندیدہ افراد کے لیے یہ پروپیگنڈہ کیوں نہ کر سکیں گے کہ ان کو مجلس شوریٰ گورنر یا کسی اور منصب کے لیے منتخب کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب اسلامی معاشرہ قائم ہو گا تو لوگوں کو اپنی صلاحیت اور افضلیت کے اظہار کے لیے کسی پروپیگنڈے کی ضرورت ہی نہ ہو گی۔ نیز اسلامی معاشرے میں منصب ایک قسم کی ذمہ داری ہے اور کوئی بے وقوف ہی ہو گا جو خواہ مخواہ کوئی ذمہ داری اپنے سر لینے کے لیے جدوجہد کرے گا الا یہ کہ اللہ کی رضامندی کے حصول' خدمت خلق کے ذریعہ حصول ثواب یا معاشرے کے اندر اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے اس منصب کی خواہش ہو سکتی ہے لیکن یہ بھی اس طرح کہ کوئی یہ منصب اور ذمہ داری کسی پر ڈال دے۔ جو لوگ خود مطالبہ کرتے ہیں اور مناصب کے پیچھے دوڑتے ہیں یہ ہلکے لوگ ہوتے ہیں اور ان کے پیش نظر ان مناصب سے کچھ اور اغراض حاصل کرنی ہوتی ہیں لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ ایسے لوگوں کو یہ مناصب ہرگز پیش نہ کیے جائیں۔

لیکن یہ حقیقت صرف اس وقت سمجھ میں آ سکتی ہے جب اسلامی معاشرے کے قیام اور اس کے مزاج کو سمجھا جائے اور اس کی تشکیل کی نوعیت ذہن میں ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ حرکت اور تحریک کسی بھی اسلامی معاشرے کی جان ہے۔ اسلامی معاشرہ دراصل تحریک اسلامی کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے' کس طرح؟

۱۔ مثلاً اللہ کی جانب سے ایک پیغام اور عقیدہ نازل ہوتا ہے ۔ایک رسول اس کی تبلیغ کرتا ہے ۔زمانہ نبوت میں تو رسول بذات خود تبلیغ کرتا تھا' جبکہ زمانہ نبوت کے بعد اب رسول کی جگہ کوئی داعی اسی عقیدے کی طرف دعوت دیتا ہے ۔اس دعوت کو کچھ لوگ قبول کرتے ہیں جبکہ دعوت کے ابتدائی ایام میں نظام حکومت جاہلی ہوتا ہے اور یہ جاہلی نظام حکومت اور یہ جاہلی معاشرہ اس تحریک پر ظلم کرتا ہے اور تشدد اور فتنے اور آزمائش کے دور میں کچھ لوگ تحریک کا ساتھ چھوڑ کر مرتد ہو جاتے ہیں جبکہ بعض لوگ مقابلہ کر کے شہید ہو جاتے ہیں اور بعض انتظار کرتے ہیں اور کام جاری رکھتے ہیں۔

جو لوگ مشکلات برداشت کر کے کام جاری رکھتے ہیں' اللہ ان کو فتح نصیب کرتا ہے' یہ لوگ پھر دست قدرت کا آلہ ہوتے ہیں' ان کو اللہ تعالیٰ تمکن فی الارض اور غلبہ اور اقتدار عطا کرتا ہے کیونکہ یہ اس کا مستقل وعدہ ہے۔ اس طرح یہ لوگ زمین پر حکومت الٰہیہ قائم کرتے ہیں اور اس میں اللہ کے احکام نافذ کرتے ہیں۔ یہ اقتدار اور تمکن فی الارض ان لوگوں کی ذات کے لیے نہیں ہوتا بلکہ یہ نصرت اور غلبہ اللہ کے دین کے لیے ہوتا ہے اور زمین پر اللہ کا نظام ربوبیت قائم کرنے کے لئے ہوتا ہے۔

دین کا یہ ہراول دستہ دین کو لے کر پھر کسی ارضی حدود پر ٹھہرتا نہیں' نہ کسی قوم اور نسل کی حدود کے اندر اپنے آپ کو محدود کرتا ہے۔ نہ کسی رنگ اور نسل تک محدود ہوتا ہے نہ کسی زبان اور شکل تک محدود ہوتا ہے' یہ تو بہت ہی کچے اور ناپائیدار عناصر اور محدود دائرے ہیں' بلکہ یہ ہراول دستہ اس پیغام کو لے کر اطراف عالم میں پھیلتا چلا جاتا ہے اور پورے کرۂ ارض سے تمام انسانوں کو انسانی غلامی سے آزاد کرتا ہے۔ تمام طاغوتی قوتوں سے ٹکراتا ہے اور پورے کرۂ ارض پر اللہ کی بندگی کا نظام قائم کرتا ہے۔

اس تحریکی عمل کے دوران اس دین کو لے کر تحریک برپا کرنے والے کسی ایک علاقے میں حکومت برپا کر کے رک نہیں جاتے۔ نہ کسی جغرافیائی یا نسلی یا قومی حدود پر وہ رکتے ہیں۔ یہ تحریک لوگوں کی قدریں بدل دیتی ہے۔ معاشرے کے اندر لوگوں کے مرتبہ و مقام کا از سر نو تعین ہوتا ہے۔ تمام اقدار ایمانی پیمانے کے اوپر استوار ہوتی ہیں۔ لوگوں کا معاشرے میں تعارف ان جدید اقدار پر ہوتا ہے اور ہر فرد کی قیمت از سر نو متعین ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرے میں افراد کی قدر و قیمت اس پر ہوتی ہے کہ انہوں نے اقامت دین کے لیے کس قدر جدوجہد کی' کس قدر آزمائشیں ان پر آئیں' تقویٰ' خدا خوفی' اخلاق اور صلاحیت کے اعتبار سے وہ کیسے ہیں۔ یہ وہ اقدار ہوتی ہیں جو واقعات کی صورت میں متعین ہوتی ہیں اور اسلامی تحریک ان کا اظہار کرتی ہے اور تمام اسلامی معاشرہ اور اسلامی تحریک ایسے افراد سے واقف ہوتی ہے۔ لہٰذا ایسے افراد کو اس بات کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی تعریف خود کریں یا کسی منصب اور ذمہ داری کا مطالبہ کریں' ایک تو ان کو اس بات کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ دوسرے یہ کہ ان کا تزکیہ اور تربیت اس قدر ہو چکی ہوتی ہے کہ وہ ایسا نہیں کرتے۔

بعض اوقات' بعض لوگ اس طرح سوچتے ہیں کہ یہ پہلے اسلامی معاشرے کی خصوصیت تھی کیونکہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ قرن اول کے ان لوگوں کی بہترین انداز میں تربیت فرمائی گئی تھی لیکن وہ یہ بات نہیں جانتے کہ کوئی ایسا معاشرہ بھی اس وقت وجود میں نہیں آسکتا جب تک اس کے لیے اس قسم کی تحریک برپا نہ کی جائے اور صحابہ کرام کی طرح ان کی تربیت کر کے اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے جدوجہد نہ کی جائے۔ جب بھی ہم کوئی ایسا معاشرہ قائم کریں گے ہمیں ایسی ہی راہوں سے گزرنا ہو گا۔ ایک تحریک برپا ہوگی' وہ لوگوں کو از سر نو دین اسلام کے اپنانے کی دعوت دے گی اور اس طرح لوگوں کو جاہلیت سے نکالنے کی سعی کی جائے گی۔ پھر اہل جاہلیت اسی طرح ان کارکنوں پر تشدد کریں گے۔ کچھ لوگ تحریک سے بھاگ نکلیں گے اور ارتداد کی راہ اختیار کریں گے لیکن بعض لوگ اپنی راہ پر جم جائیں گے۔ ان کے لیے دعوت اور تحریک کو چھوڑنا ایسا ہی ہو گا جس طرح کسی کو آگ میں ڈال دیا جائے۔ پھر اس کشمکش کا فیصلہ ہو گا' اللہ تحریک کو فتح دے گا اور کسی ایک جگہ اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی۔ اس مرکز سے اسلامی انقلاب کا پھیلاؤ شروع ہو گا۔ اس وقت مجاہدین

اور متحرکین بالکل سامنے آچکے ہوں گے۔اس وقت ایمانی اقدار اور اوصاف واضح ہو چکے ہوں گے اور کسی کو ضرورت نہ ہو گی کہ وہ کوئی درخواست کسی منصب کے لیے پیش کرے کیونکہ ایسے لوگ تو معاشرے کے خدوخال ہوں گے اور وہ خود ان کا تزکیہ کرے گا اور ان کو کوئی ذمہ داری سپرد کرے گا۔

بعض اوقات یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اس ابتدائی مرحلے کے بعد پھر ایسا ہو گا لیکن جب اسلامی معاشرہ مستقلاً قائم ہو گیا تو پھر کیا صورت ہوگی۔یہ سوال وہی لوگ کرتے ہیں جو اس دین کی حقیقت کو نہیں جانتے۔یہ دین ہمیشہ ایک تحریک کی شکل میں رہتا ہے۔یہ کسی وقت بھی ٹھہرتا نہیں۔اس کی تحریک اس مقصد کے لیے ہوتی ہے کہ تمام انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے رہا کر کے اللہ کی بندگی اور غلامی میں داخل کیا جائے۔یہ آزادی اور قربت تمام کرۂ ارض کے مکینوں کو حاصل ہو اور لوگ طاغوت کی بندگی کے بجائے اللہ کی بندگی کریں اور تحریک مسلسل جاری رہے۔رنگ 'نسل اور جغرافیہ کی حدود و قیود کے بغیر۔

جب یہ تحریک مسلسل جاری رہے گی تو اس میں ثابت قدم 'مخلص ' قربانی دینے والے لوگ ممتاز ہو کر خود بخود اوپر آتے جائیں گے۔چونکہ یہ تحریک جاری رہے گی اس لیے یہ معاشرہ کبھی بھی رک کر منجمد اور بدمزہ نہ ہو گا الا یہ کہ یہ معاشرہ اسلامی راہ سے منحرف ہو جائے۔غرض اپنی صفات کے بارے میں خاموش رہنے اور تزکیہ نفس اور عدم امیدواری کا حکم اپنی جگہ قائم رہے گا جس طرح کہ آغاز میں ایک دائرے میں یہ حکم آیا۔ایسے ہی دائرے میں یہ اپنی جگہ قائم رہے گا اور کام کرتا رہے گا۔

یہ سوال بھی کیا جاسکتا ہے کہ جب سوسائٹی میں وسعت ہوتی ہے اور لوگ ایک دوسرے کی صلاحیتوں اور شخصیتوں سے متعارف ہی نہیں ہوتے تو پھر باصلاحیت لوگوں کو مجبوراً اپنی صلاحیت کے بارے میں اشتہار دینا پڑے گا اور یہ بتانا پڑے گا کہ ان کا یہ اخلاق و کردار ہے اور وہ اس طرح کی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔

یہ سوال بھی ایک وہم پر مبنی ہے اور یہ موجودہ جاہلیتوں کی عملی صورت حالات پر مبنی ہے۔لیکن اسلامی معاشرے کی یہ صورت حال نہیں ہوتی۔اسلامی معاشرہ میں اہل محلہ ایک دوسرے سے متعارف اور باہم متکافل ہوتے ہیں کیونکہ اسلامی تربیت 'اسلامی معاشرے کی تشکیل اور اس کے رخ اور اس کے التزامات کا لازمی تقاضا ہی یہ ہے کہ اس کے لوگ ایک دوسرے سے بہت ہی اچھا طرح متعارف ہوں۔لہذا کسی بھی اسلامی معاشرے میں لوگ ایک دوسرے سے گہرے تعلقات رکھتے ہیں اور باہم متعارف ہوتے ہیں۔وہ ایک دوسرے کی ان صلاحیتوں کی جان پہچان ایمانی اقدار میں کرتے ہیں اس لیے یہ بات کوئی مشکل بات نہ ہوگی کہ اسلامی معاشرہ میں اچھے لوگوں کو مجلس شوریٰ یا انفرادی اور اجتماعی سرد سز کے لیے منتخب نہ کر سکے۔رہے بڑے عہدے مثلاً گورنر اور حاکم تو امام خود ان کے لیے آدمی تلاش کر سکتا ہے۔جو اہل حل و عقد میں سے ہوتے ہیں۔امام کے اہل شوریٰ بھی اس میں امداد کر سکتے ہیں اور اچھے افراد کو تلاش کرنے میں امیر اور امام کی مدد کر سکتے ہیں۔پھر جس طرح ہم نے کہا اسلام تو ایک تحریک ہے اور جہاد تو یوم القیامت تک جاری رہے گا۔ لہذا تحریک اور جہاد کے ہوتے ہوئے کوئی صاحب صلاحیت کس طرح پوشیدہ رہ سکتا ہے؟

جو لوگ آج اسلامی نظام حیات اور اس کی مفصل تنظیم کے بارے میں سوچتے ہیں یا اس موضوع پر لکھتے ہیں وہ ایک حماقت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔یہ لوگ اسلامی نظام حیات کے مدون فقہی اصولوں کو ایک خلاء میں نافذ کرنا چاہتے ہیں 'پھر

وہ اس جاہلی معاشرے میں ان احکام کا نفاذ چاہتے ہیں جو عملاً قائم اور غالب ہے۔ اس جاہلی معاشرے کی اپنی ایک مخصوص عضویاتی ترکیب ہے اور یہ عملاً قائم جاہلی معاشرہ اسلامی نقطہ نظر سے اور اسلام کے فقہی احکام کے نقطہ نظر سے ایک خلاء ہے اور اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ اس کے اندر اسلامی شریعت نافذ ہو کیونکہ موجودہ جاہلی معاشرے کی عضویاتی ترکیب سو فیصد اسلامی معاشرے کی عضویاتی ترکیب کے خلاف ہے۔ جیسا کہ ہم نے تفصیل سے بتایا کہ اسلامی معاشرے کی عضویاتی تشکیل ان شخصیات' ان گروہوں اور ان لوگوں سے ہوتی ہے جنہوں نے اسلامی نظام کے لیے تحریک چلائی' جاہلیت کے خلاف جدوجہد کی اور عالم اسلام کو عملی صورت میں نافذ کیا اور انہوں نے جاہلیت کے خلاف عملی جدوجہد کی تاکہ لوگوں کو جاہلیت سے نکال کر اسلام میں داخل کیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جاہلیت کے تمام دباؤ برداشت کیے' جاہلیت کی جانب سے ہر قسم کے تشدد اور ایذارسانی کو انگیز کیا اور تحریک اسلامی کے ساتھ جاہلیت کی ہمہ گیر جنگ میں وہ اسلام کے ثابت قدم سپاہی رہے اور آغاز سے انتہاء تک وہ اس جدوجہد میں شریک رہے۔ رہا موجودہ جاہلی معاشرہ' تو وہ ایک ٹھہرا ہوا معاشرہ ہے اور ایسی اقدار پر قائم ہے جن کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے' نہ اس معاشرے کا ایمانی اصولوں کے ساتھ تعلق ہے۔ اس لیے اسلامی شریعت کے زاویہ سے یہ معاشرہ اسلام کے لیے ایک خلاء ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس خلاء میں اسلامی نظام جڑ نہیں پکڑ سکتا۔

اس قسم کے محقق اور لکھنے والے جب اسلامی احکامات کو عملی شکل دینے لگتے ہیں تو وہ قدم قدم پر پریشانی اور حیرانی سے دوچار ہوتے ہیں۔ ان کو پہلی پریشانی یہ لاحق ہو جاتی ہے کہ اہل حل و عقد یا مجلس شوریٰ کو کس طرح چنا جائے۔ یعنی ایسا طریقہ کس طرح وضع کیا جائے کہ لوگ خود اپنے آپ کو امیدوار بھی نہ بنائیں اور خود اپنے منہ میاں مٹھو بھی نہ بنیں اور اچھے لوگ اوپر بھی آ جائیں۔ ایسے لوگوں کو اس معاملے میں مشکل یہ درپیش ہوتی ہے کہ موجودہ معاشرے جن میں ہم زندہ رہتے ہیں' لوگ ایک دوسرے سے متعارف ہی نہیں ہیں۔ نیز موجودہ دور میں ایسے لوگ بھی ناپید ہیں جو صلاحیت' پاکدامنی اور امانت و دیانت کے نوں پر پورے اترتے ہوں۔ اسی طرح امام اور خلیفہ کے انتخاب کے طریقے میں بھی یہ لوگ سخت پریشان ہیں۔ آیا خلیفہ کا انتخاب عوام الناس کریں گے یا اہل حل و عقد کریں گے۔ اگر اہل حل و عقد خود امیدوار نہ ہوں گے اور نہ اپنا تزکیہ کریں گے اور ان کا انتخاب امام کرے گا تو پھر وہ کس طرح امام کا انتخاب کریں گے۔ کیا اس کا اہل حل و عقد پر اثر نہ پڑے گا۔ پھر اگر یہ لوگ امام کو نامزد کریں گے تو کیا یہ لوگ امام کے مقابلے میں برتر نہ ہوں گے' حالانکہ امام برتر امام ہوتا ہے اور امام اگر اہل حل و عقد کو منتخب کرتا ہے یا نامزد کرتا ہے تو یہ لوگ اس کے پسندیدہ نہ ہوں گے اور ان کے انتخاب میں یہ بات سرفہرست نہ ہوگی کہ وہ اس کے وفادار ہوں --- یہ اور اس قسم کے دوسرے بے شمار سوالات ہیں جن کا جواب ضروری ہے اور ان محققین کی سطحی سوچ کی وجہ سے وہ اس کا کوئی جواب نہیں پا رہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایسے محققین اسی نکتے سے غلط راہ میں پڑ گئے ہیں۔ ان لوگوں کی غلط روی اس نکتے سے شروع ہوتی ہے کہ یہ لوگ ہمارے موجودہ معاشروں کو اسلامی معاشرہ سمجھتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام کے اصول و فروع موجودہ جاہلی معاشروں پر نافذ ہوں گے۔ موجودہ معاشروں اور سوسائٹیوں کی عضویاتی تشکیل اور ان کی اخلاقی اقدار کے ہوتے ہوئے ان میں اسلام نافذ ہو جائے گا۔ ایں خیال است و محال است و جنوں۔

ان لوگوں کی حماقت اور پریشانی اس نکتے سے شروع ہوتی ہے کہ یہ لوگ موجودہ جاہلی معاشرے کو بھی ایک اسلامی معاشرہ سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کی سوچ یہ ہے کہ اسلامی احکام اور قواعد اس معاشرے میں منطبق ہوں گے اور اس معاشرے کی عضویاتی ترکیب اور اخلاقی حالت جوں کی توں رہے گی۔

ان لوگوں کی حیرانی و پریشانی کا یہ نقطہ آغاز ہے اور جب یہ لوگ سوچ اور تحقیق شروع کرتے ہیں تو ہم خلاء میں ہوتے ہیں اور اس خلاء میں یہ لوگ اس قدر دور چلے جاتے ہیں اور ان کا مدار اس قدر وسیع ہو جاتا ہے کہ پھر ان سے اپنی راہ ہی گم ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ جاہلی معاشرہ جس میں ہم رہ رہے ہیں 'کوئی اسلامی معاشرہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں نہ شریعت نافذ ہو سکتی ہے اور نہ اس میں فقہی دستور نافذ ہو سکتا ہے اور یہ اسی وجہ سے نافذ نہیں ہو سکتے کہ اسلامی شریعت اور اسلامی دستور کبھی بھی خلا میں نافذ نہیں ہوتے کیونکہ اسلامی نظام ایک عملی نظام ہے اور یہ کسی اسلامی معاشرے ہی میں نافذ ہو سکتا ہے 'خلا میں نافذ نہیں ہو سکتا۔

اسلامی معاشرے کی عضویاتی تشکیل ہی دراصل موجودہ جاہلی معاشرے کی نظریاتی تشکیل سے مختلف ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرے کے افراد اور گروہ وہ نہیں ہوتے جو موجودہ معاشرے کے ہیں۔ اس کے افراد بالکل مختلف اور اس کے گروہ بالکل دوسرے ہوتے ہیں۔ اس کے افراد اور گروہوں کی اخلاقی قدریں تحریک کے دوران وجود میں آتی ہیں اور وہ بہت ہی مختلف اور عملی ہوتی ہیں۔

یہ ایک جدید اور نیا معاشرہ ہوتا ہے۔ یہ دائماً حرکت میں رہتا ہے۔ ترقی پذیر ہوتا ہے اور اس کے انسان ' پورے کرۂ ارض کے مقابلے میں آزاد انسان ہوتے ہیں۔ وہ اس کرۂ ارض پر کسی کے غلام نہیں ہوتے اور اس معاشرے سے طاغوتی قوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

یہ مسئلہ اور اس قسم کے دوسرے مسائل مثلاً اپنے آپ کو کسی منصب کا اہل جتانا 'منصب طلب کرنا' امام کا انتخاب ' اہل شوریٰ کا انتخاب اور اس جیسے دوسرے مسائل کے بارے میں لوگ عموماً خلا میں سوچتے ہیں۔ یہ مسائل اور جاہلی معاشروں میں ان کا نفاذ' یہ سوچ ہی متضاد ہے۔ خصوصاً جبکہ یہ جاہلی معاشرہ اپنی عضویاتی ترکیب میں اسلامی معاشرے سے بالکل متضاد ہو۔ اس کی اقدار' اخلاقی پیمانے 'تصورات اور سوچیں سب کی سب اسلامی معاشرے سے الٹ ہوں۔

موجودہ دور کے بینک اور ان کی تمام سرگرمیاں' انشورنس اور اس کے قواعد و ضوابط' ضبط تولید کے مسائل اور اس قسم کے دوسرے عقدے جن کو یہ محققین کھولنے کی کوشش کرتے ہیں' ان کے بارے میں صحیح حل موجودہ سوسائٹی میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

ان موضوعات پر آغاز بحث ہی سے محقق پریشانی کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی سعی یہ ہوتی ہے کہ وہ اسلامی شریعت کے قواعد و قوانین کو موجودہ جاہلی اور گندے معاشرے میں نافذ اور جاری کرنے کے بارے میں سوچتا ہے اور یہ معاشرہ سو فیصد اسلامی احکام سے متضاد ہے۔ اس لیے ایسے محققین کو ان میں دشواری پیدا ہوتی ہے۔ یہ لوگ اسلامی قوانین کو نافذ کر کے یہ امید رکھتے ہیں کہ یہ جاہلی معاشرے اسلامی بن جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نہایت ہی مضحکہ خیز سوچ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کو فقہ اسلامی نے وجود نہیں بخشا بلکہ اسلامی معاشرے کی تحریکی جدوجہد اور تحریک

اسلامی اور جاہلیت کے درمیان طویل کشمکش کے نتیجے میں اسلامی معاشرے کے وجود میں آنے کے بعد اور ایک اسلامی معاشرے کی عملی ضروریات سامنے آنے کے بعد اسلامی فقہ اس کے احکام اور اس کے اصول وجود میں آئے۔ لہٰذا دور جدید میں بھی فقہ اسلامی کا وجود اس طرح آسکتا ہے کہ اسلامی انقلاب کے ذریعے اسلامی سوسائٹی وجود میں لائی جائے۔ اس کے برعکس ممکن ہی نہیں ہے۔

یاد رکھیے کہ فقہ اسلامی اور اسلامی شریعت کا نفاذ خلاء میں ممکن نہیں ہے' نہ خلاء میں کوئی بھی قانون قائم رہ سکتا ہے۔ اسلامی شریعت دماغوں اور کتابوں میں قائم نہیں ہو سکتی' یہ تو ایک عملی زندگی کا عملی ضابطہ ہے اور ضابطہ بھی ہر عملی زندگی کا نہیں بلکہ ایک اسلامی زندگی کا ضابطہ ہے۔ ایک اسلامی سوسائٹی کی فضا ہی میں اسلامی نظام زندگی اور اسلامی قانون نافذ ہو سکتا ہے۔

جس وقت اسلامی معاشرہ وجود میں آئے گا اور وہ بھی ایک تحریکی شکل میں وجود میں آئے گا تو اس وقت اسے بینکوں اور تجارتی اداروں کی ضرورت درپیش ہو گی یا نہ ہو گی' یہ سوال اس وقت پیدا ہو گا۔ اب جبکہ اسلامی معاشرہ سرے سے وجود میں بھی نہیں ہے' وقت سے پہلے ہم اس معاشرے کی ضروریات کو کس طرح معلوم کر سکتے ہیں۔ نہ اس وقت کے معاشرے کی شکل یا اس کے حجم کے بارے میں کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔ وقت سے قبل ہم کسی معاشرے کے لیے قانون سازی کیسے کر سکتے ہیں۔ اس وقت اسلامی شریعت کے جو احکام مدون ہیں' وہ ایک جاہلی اور کافرانہ معاشرے میں نافذ ہی نہیں ہو سکتے' کیونکہ اسلامی شریعت موجودہ جاہلی اور کافرانہ سوسائٹیوں کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتی' اسے ان جاہلی سوسائٹیوں کے مسائل سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے۔

اس قسم کے محققین جس مصیبت میں گرفتار ہیں وہ یہ ہے کہ یہ لوگ موجودہ جاہلی معاشروں کو اصل سمجھتے ہیں اور دین اسلام کو ان کے تابع سمجھتے ہوئے' اسے ان کے مطابق بنانے کی سعی کرتے ہیں لیکن حقیقی صورت حالات اس کے برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام اصل ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم جدید سوسائٹی کو دین اسلام کے تابع بناتے چلے جائیں۔ یہ کام صرف ایک ہی ذریعے سے ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ جاہلیت کے مقابلے میں اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے تحریک برپا کی جائے۔ یہ تحریک اس کرۂ ارض پر اللہ کی حاکمیت کے قیام کے لیے ہو۔ اللہ کی حاکمیت کا نظام ہوتا ہی وہ ہے جس میں لوگ اللہ کے سوا کسی کے تابع فرمان نہیں ہوتے۔ وہ کسی طاغوت کے تابع نہ ہوں اور ان کی زندگیوں میں صرف شریعت کی حکمرانی ہو۔ جب بھی کوئی یہ تحریک برپا کرے گا اسے فتنوں' آزمائشوں اور تشدد کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ جب اس قسم کی تحریک پر تشدد ہو گا تو کچھ لوگ ان مشکلات کو برداشت کریں گے' کچھ لوگ الٹے پاؤں پھر جائیں گے اور کچھ لوگ اللہ کے پیغام کی تصدیق کرتے ہوئے مقام شہادت پر فائز ہوں گے جبکہ کچھ لوگ یہ جدوجہد اس وقت تک جاری رکھیں گے جب تک اللہ ان کے اور ان کی قوم کے درمیان صحیح فیصلہ نہیں فرما دیتے۔ جب اللہ ان انقلابیوں اور ان کی اقوام کے درمیان فیصلہ کر دے گا تو ان کو تمکن فی الارض نصیب ہو گا اور اس وقت ہی اسلامی نظام زندگی صحیح معنوں میں قائم ہو گا۔ اس وقت تمام لوگ اسلام میں رنگے ہوں گے اور وہ اسلامی اقتدار کو لے کر اس دنیا میں ممتاز مقام حاصل کر چکے ہوں گے۔ اس وقت پھر اس سوسائٹی کی کچھ ضروریات اور تقاضے ہوں گے اور یہ ضروریات اور تقاضے دوسری جاہلی سوسائٹیوں سے بالکل مختلف ہوں گے۔ ان ضروریات اور تقاضوں کے پورے کرنے کے انداز بھی مختلف

ہوں گے۔ اس وقت اسلامی نظام زندگی کے احکام کا استنباط ایک قائم سوسائٹی کے لیے ہو گا' ایک اسلامی فقہ اور شریعت وجود میں آئے گی۔ یہ شریعت خلاء میں نہ ہو گی بلکہ یہ شریعت ایک متعین اور موجود سوسائٹی میں نافذ ہو گی اور اس سوسائٹی کے مقاصد اور ضروریات بھی متعین ہوں گی۔

ہمیں کوئی بتائے کہ وہ سوسائٹی اس دنیا میں کہاں ہے جس میں نظام زکوٰۃ نافذ ہو اور زکوٰۃ لی جاتی ہو اور اسے اپنے حقیقی مصارف پر خرچ کیا جاتا ہو اور جس کے ہر محلے میں باہم محبت' رحمت اور نظام تکافل قائم ہو' پھر پوری سوسائٹی میں تکافل (Social Security) کا نظام قائم ہو اور اس سوسائٹی کا مالی نظام اسراف 'تعیش' خود نمائی اور زر اندوزی پر قائم نہ ہو۔ اس کا مالی نظام صحیح اسلامی خطوط پر قائم ہو' پھر اگر ایسا کوئی نظام قائم ہو جائے اور ایسی سوسائٹی وجود میں آ جائے تو ثابت کیا جائے کہ اس میں انشورنس کی ضرورت ہو گی اور انشورنس کے یہ ضابطے پھر اسلامی سوسائٹی کے حالات' اس کی اقدار اور مالی تصورات کے مطابق ہوں گے۔ اگر اسلامی سوسائٹی کو کسی انشورنس کی ضرورت بھی پڑے تو ثابت کیا جائے کہ اسے بعینہٖ اسی طرح ہونا لازمی ہے جس طرح کہ موجودہ جاہلی معاشروں میں انشورنس کا نظام موجود ہے۔ جو موجودہ جاہلی سوسائٹی جاہلی تصورات اور اقدار پر مبنی ہے اور اسے جاہلی سوسائٹی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔

پھر یہ ثابت کیا جائے کہ ایک متحرک اسلامی معاشرہ تحدید نسل اور ضبط تولید کا محتاج ہو گا جس طرح موجودہ غیر اسلامی معاشرہ ہے۔

جب ہم موجودہ حالات میں ایک اسلامی سوسائٹی کی ضروریات کا تعین ہی نہیں کر سکتے' نہ اس کی سوسائٹی کے حجم اور شکل کی کوئی متعین صورت ہمارے سامنے ہے' اور یہ ممکن بھی نہیں ہے کیونکہ ایک اسلامی سوسائٹی کی عضویاتی ترکیب ہی موجودہ جاہلی سوسائٹی سے بالکل جدا ہوتی ہے۔ اس کی سوچ' اس کی قدریں اور اس کے نے ہی مختلف ہوتے ہیں لہٰذا اس وقت جو لوگ ایک غیر موجود سوسائٹی کے لیے احکام مدون کرنے کی سعی کر رہے ہیں ان کی یہ سعی نامشکور ہو گی' اس لیے کہ جس طرح اسلامی سوسائٹی اس وقت ہوا میں ہے اسی طرح ان لوگوں کی یہ مساعی بھی ہوا میں ہیں اور لاحاصل ہیں۔

جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے کہ اس معاملے میں غلطی کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ یہ محققین موجودہ معاشروں کو اسلامی معاشرے سمجھتے ہیں اور وہ اسلامی فقہ کے اوراق سے احکام نکال کر ان معاشروں پر نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ موجودہ معاشروں کے اجزاء ترکیبی کو وہ نہیں چھیڑتے اور ان معاشروں کی اقدار اور تصورات اور نوں کو بھی جوں کا توں رہنے دیتے ہیں۔

پھر ان حضرات کے شعور اور لاشعور میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ موجودہ جاہلی معاشرے اصل اور قائم حقیقت ہیں اور یہ دین اسلام کا فرض ہے کہ وہ اپنے اندر تبدیلی لا کر اپنے آپ کو ان کے مطابق کر لے ۔ خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں ---- اس طرح دین اسلام کا فرض ہے کہ وہ جدید جاہلی سوسائٹی کے تقاضے پورے کرے۔ حالانکہ جدید جاہلی سوسائٹی کے تقاضے سراسر اسلام کے خلاف ہیں اور یہ تقاضے ایک مسلمان کو سرے سے اسلام سے خارج کرنا چاہتے ہیں"۔

میرا خیال یہ ہے کہ وقت آ گیا ہے کہ اب اسلام اہل اسلام کے دل و دماغ میں سربلند ہو جائے۔ اب اہل اسلام یہ روش ترک کر دیں کہ اسلام جاہلی سوسائٹی کے تقاضوں کو پورا کرتا پھرے۔ داعیان اسلام کو اب یہ اعلان کر دینا چاہیے کہ لوگو! تم اسلام کے مطیع فرمان بن جاؤ' اس کے احکام کو دل و جان سے تسلیم کرو' بلکہ یہ کہ لوگو! سب سے پہلے تم دین اسلام

میں داخل ہو جاؤ' اعلان کر دو کہ تم اب صرف اللہ کے بندے ہو' اور کلمہ طیبہ کے تمام تقاضے پورے کرتے ہوئے لا الٰہ الا اللہ کی شہادت دو' بایں معنی کہ اللہ کے سوا اس کرۂ ارض پر کوئی اور حاکم نہیں ہے۔ صرف وہی رب اور خالق' مالک اور رازق ہے۔ تمام لوگوں کی زندگی پر اسی کے احکام چلیں گے۔ آئندہ کوئی انسان انسان کا غلام نہ ہوگا اور کوئی انسان کسی انسان کے لیے اب قانون نہیں بنائے گا۔

جب لوگ یہ اعلان کر دیں گے تو اسلامی معاشرے کا پودا کونپل نکالے گا اور جب اس اعلان کی اساس پر کوئی سوسائٹی وجود میں آ جائے گی تو اس میں پھر فقہ اسلامی کا اجراء ہو گا۔ اس وقت پھر فقہ اسلامی اس سوسائٹی کی تمام ضروریات کو پورا کرے گا اور عملاً اسلامی شریعت نافذ ہوگی۔

جب تک اسلامی انقلاب کے نتیجے میں اسلامی سوسائٹی قائم نہیں ہو جاتی اسلام کے دستوری اور انتظامی احکامات کے بارے میں دماغ سوزی کرنا محض اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ محض ہوا اور خلاء میں تخم ریزی کرنا ہے جبکہ کوئی قانون کبھی کسی خلاء میں نہیں اگتا جیسا کہ ہوا میں کوئی فصل نہیں اگتی۔

---ooo---

اسلامی فقہ کے فکری میدان میں کام کرنا نہایت ہی دلچسپ کام ہے' کیونکہ اس میں کوئی خطرہ اور ابتلاء نہیں ہے۔ لیکن یہ اسلامی کام نہیں ہے یعنی اسلام کے لیے نہیں ہے' نہ یہ اس دین کے مزاج کے مطابق ہے نہ یہ اسلامی منہاج کار ہے' اور یہ طریقہ صرف ان لوگوں کا ہے جو خیر و عافیت کی زندگی بسر کرتے ہوئے محض علمی اور فنی امور میں اپنے آپ کو مشغول رکھتے ہیں' لیکن میرا خیال یہ ہے کہ تحریک کے اس مرحلے میں اسلامی فقہ کے موضوعات پر دماغ سوزی کرنا عمر ضائع کرنا ہے۔ موجودہ سوسائٹی کے ہوتے ہوئے میں سمجھتا ہوں اس میں کوئی اجراء ضروری نہ ہو گا۔

دین اسلامی جاہلیت کے لیے نوکری کا کام نہیں کرتا' نہ وہ جاہلیت کا بندہ فرمان بننا قبول کرتا ہے' جس کا مشن صرف یہ ہو کہ جاہلیت کی خواہشات کے لیے ہر وقت وجہ جواز فراہم کرتا پھرے۔ جبکہ یہ جاہلی سوسائٹی دین سے متنفر' دین سے دور اور دین پر فقدان ہو اور دین کی اطاعت نہ کرتے ہوئے یہ سوسائٹی دین سے اپنے اعمال کے لیے وجہ جواز مانگتی ہو۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے کہ اس دین کی فقہ اور اس کے احکام نہ خلاء میں ترقی کرتے ہیں اور نہ ہی خلاء میں روبعمل آتے ہیں۔ اسلامی سوسائٹی ابتداءً اللہ کی حاکمیت کو قبول کرنے والی ہوتی ہے۔ یہی سوسائٹی دراصل فقہ کو وجود بخشتی ہے اور یہی سوسائٹی اس کو ترقی دیتی ہے' یہ نہیں ہے کہ کوئی فقہی نظام سوسائٹی کو وجود بخشے۔

احیائے اسلام کے مراحل اور اس کا طریقہ کار آغاز ہی سے ایک ہی ہیں۔ جاہلیت سے کسی سوسائٹی کا اسلام کی طرف منقلب ہونا تو سہل امر نہیں ہوتا اور یہ اس طرح نہیں ہوتا کہ پہلے فقہی احکام کا کوئی سانچہ ڈھالا جائے اور اس کے مطابق انسان تیار ہوتے جائیں اور یہ سانچہ پہلے سے خلاء میں تیار کر دیا گیا ہو اور جب اسلامی انقلاب کے بعد اسلامی سوسائٹی تیار ہو تو اس میں اسے نافذ کر دیا جائے۔ جاہلیت سے کسی سوسائٹی کا اسلام کی طرف منقلب ہونا کسی قانونی نظام کی وجہ سے نہیں ہوا کرتا۔ اس لیے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ شاید قانونی نظام مفصل طور پر تیار نہ ہونے کی وجہ سے اسلامی معاشرہ وجود میں نہیں آ رہا ہے۔ بعض لوگ اس معاملے میں غلط فہمی کا شکار ہوا کرتے ہیں اور بعض اس غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی وجود میں اس لیے نہیں آ رہی ہے کہ کچھ طاغوتی قوتیں اس کی راہ روکے کھڑی

ہیں۔ یہ طاغوتی قوتیں اللہ کی حاکمیت کے اصول کو تسلیم نہیں کرتیں۔ اس سے کسی بھی اسلامی ملک میں اللہ کی ربوبیت اور حاکیت پر مبنی نظام وجود میں نہیں آ رہا ہے۔ ان طاغوتی قوتوں نے دراصل لوگوں کو اپنا بندہ اور غلام بنا لیا ہے اور اس طرح یہ قوتیں اور ان کے تحت تمام جمہور عوام شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ حقیقی شرک ہے اور اس شرک کا تعلق اللہ رب العالمین کے مخصوص اختیارات کے ساتھ ہے۔

اس نظریہ کی اساس پر جاہلیت زمین پر اپنا ایک مستقل نظام برپا کرتی ہے۔ یہ نظام بھی ان جاہلی تصورات کی اساس پر قائم کرتی ہے اور اس میں جاہلی تصورات کے ساتھ ساتھ مادی قوتوں پر بھی بھروسہ کرتی ہے۔

اس قائم نظام کا مقابلہ احکام فقہیہ سے نہیں کیا جاسکتا۔ نہ احکام فقہیہ اس جاہلی نظام اور اس کے تصورات کے لیے برابر کی قوت ہوتے ہیں۔ اس جاہلیت کا مقابلہ صرف اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ لوگوں کو از سر نو اسلام میں داخل ہونے کی طرف دعوت دی جائے۔ اور پھر اسلامی تصورات کے ساتھ تمام قوتوں کو لے کر جاہلیت کا مقابلہ کیا جائے۔ اس میدان کے اندر اسلام اور جاہلیت کی کھلی کشمکش کے بعد جو نتیجہ بھی ہو گا وہ سامنے آ جائے گا۔ کچھ لوگ صحیح طرح اسلام کے حامل ہوں گے اور باقی قوم ان کے مخالف ہو گی اور اس کشمکش کے نتیجے میں پھر تحریک اسلامی اور اس کی قوم کے درمیان اللہ اپنا فیصلہ لاتا ہے۔ جب تحریک اسلامی غالب آکر اسلامی سوسائٹی قائم کر دیتی ہے تو پھر فقہی احکام کی تدوین کا وقت آتا ہے۔ اس طرح جو قانونی نظام برپا ہوتا ہے وہ نظام اپنی حقیقی فضا میں نہایت ہی قدرتی ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک زندہ اسلامی معاشرے کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ اور اس نئی سوسائٹی کی حقیقی ضروریات کے لیے قانون سازی ہوتی ہے۔ اور اس میں قانون کا حجم اور اس کی شکل قدرتی ہوتی ہے۔ اب یہ سوسائٹی اور اس کی ضروریات ہمارے پیش نظر موجود نہیں ہیں اور انقلاب کے بعد وجود میں آنے والی سوسائٹی کے بارے میں ابھی تک ہم کوئی پیشین گوئی بھی نہیں کر سکتے۔ نہ ہی اس کی ضروریات کو ہم متعین کر سکتے ہیں۔ لہٰذا قبل از وقت اسلامی قانون کی تدوین و ترتیب کے کام میں ابھی سے مشغول ہونا یا اس کا مطالبہ کرنا' دین اسلام کی سنجیدگی اور متانت کے منافی ہے۔

میرے اس نکتے کے بیان کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قرآن اور سنت میں جو قائم منصوص احکام ہیں وہ اس وقت قانوناً نافذ نہیں ہیں بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ یہ احکام اسلامی سوسائٹی کے لیے نازل ہوئے تھے اور ان کو ایک اسلامی معاشرے کے اندر ہی نافذ بھی ہونا ہے۔ یہ احکام اس وقت عملاً نافذ نہیں ہیں۔ یہ احکام عملاً تب ہی نافذ ہو سکتے ہیں جب کوئی اسلامی معاشرہ قائم ہو اور اسلامی معاشرے کا قیام ہر اس مسلمان پر فرض ہے جو اس وقت جاہلی معاشرے میں زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے تاکہ اس میں اسلام کا قانونی نظام نافذ ہو سکے۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو دین کو لے کر ایک تحریک کی شکل میں اٹھیں اور ان طاغوتی قوتوں کو کریں جنہوں نے اس طاغوتی نظام کو قائم کر رکھا ہے اور لوگ اللہ وحدہ کی اطاعت کے بجائے مشرک ہو کر ان طاغوتی قوتوں کی اطاعت میں مبتلا ہیں۔

احیائے دین کے سلسلے میں اس نکتے کو جب لوگ پالیں گے کہ جب جاہلی نظام قائم ہو تو اس کے مقابلے میں اسلامی تحریک کا برپا کرنا ضروری ہے تو اس ادراک کے نتیجے ہی میں اسلامی انقلاب کا آغاز ہو جاتا ہے اور پھر لوگ احیائے اسلام کی تعمیری جدوجہد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے اسلامی قانون کی جگہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین نے لی ہے' اسلامی نظام قائم نہیں رہا ہے اور یہ کرۂ ارض حقیقی اسلام سے خالی ہو گیا ہے۔ اگرچہ اذان

خانے باقی ہیں اور مساجد باقی ہیں' دعائیں ہو رہی ہیں اور نمازیں ادا ہو رہی ہیں۔ گزشتہ دو سو سال سے یہی صورت حال ہے۔ مسلمانوں کے دلوں میں اس دین کے ساتھ ایک جذباتی لگاؤ ہے اور یہ نماز اور یہ دعا ان کے اندر یہ تسکین پیدا کر دیتی ہے کہ اسلام بخیر و عافیت ہے' حالانکہ اس کرۂ ارض سے طاغوتی قوتیں اس کا وجود مٹانے کے درپے ہیں۔

میں کہتا ہوں' اسلامی عبادات سے بھی قبل اسلامی معاشرہ وجود میں آگیا تھا۔ مساجد سے بھی قبل اسلامی معاشرہ وجود میں آگیا تھا۔ یہ معاشرہ اور یہ سوسائٹی اس وقت وجود میں آگئی تھی کہ جب ان سے کہا گیا تھا اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ "اللہ ہی کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارے لیے کوئی الٰہ نہیں ہے"۔ یاد رہے کہ یہ لوگ جو ان بتوں کی بندگی کرتے تھے تو یہ ان کی نمازیں اور ان کے روزے تو نہ رکھتے تھے' نماز اور روزہ تو اس آیت کے نزول کے وقت فرض ہی نہ تھے۔ صرف اللہ کی بندگی کا مطلب یہ تھا کہ صرف اللہ کو اپنا حاکم تصور کرو' اور اس وقت کوئی اسلامی قانونی نظام بھی نہ تھا۔ اور جب لوگوں نے اللہ کو اس زمین پر اپنا حاکم تسلیم کر لیا تو پھر حاکم کی طرف سے شریعت آگئی۔ یہ شریعت بھی اس طرح آئی کہ جب بھی اس اسلامی سوسائٹی کو کسی قانون کی حقیقی ضرورت درپیش ہوئی تو قانون نازل ہو گیا یا انہوں نے قرآن اور سنت کی روشنی میں خود اپنے لیے قانون کا استنباط کر لیا --- یہی ہے واحد منہاج کار اور قیامت تک کے لیے یہی منہاج رہے گا۔

اسلامی انقلاب کا اس سے آسان طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک داعی ایک تقریر کرے' اسلام کے احکام بیان کر دے اور اسلامی قانون کی تشریح کر دے۔ لوگ یکدم اسلام میں داخل ہو جائیں اور قصہ تمام شد۔ لیکن یہ طریقہ کار محض تمنا ہے۔ ایک اچھی خواہش ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عوام الناس طاغوتی قوتوں اور جاہلیت کو چھوڑ کر اسلامی نظام میں صرف اسی طریقہ کار کے مطابق ہی داخل ہو سکتے ہیں اور وہ طریقہ کار ایک دیرپا' تدریجی اور دعوت اسلامی کا طریقہ کار ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک فرد دعوت اسلامی کا آغاز کرتا ہے' ایک ہراول دستہ اس کی دعوت کو قبول کر لیتا ہے۔ یہ ہراول دستہ موجود اور قائم نظام جاہلیت کو     کرتا ہے اور اس کے بعد اس کے اور اس نظام جاہلیت کے درمیان کشمکش برپا ہو جاتی ہے۔ ایک قوم بلکہ معاشرے کی پوری قوم کے ساتھ اسی قوم سے اٹھے ہوئے ان داعیوں کی جنگ شروع ہوتی ہے۔ اللہ اس ہراول دستے کو فتح دیتا ہے اور لوگ فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہوتے ہیں اور یہ دین اسلام کیا ہے؟ یہ اللہ کا وہ نظام ہے جس کے سوا اللہ کسی نظام کو برداشت نہیں کرتا۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ "اور جو شخص بھی اسلام کے سوا کسی نظام زندگی کی تابع داری کرے گا' اس سے یہ تابع داری قبول نہ کی جائے گی"۔

شاید یہ طویل بیان حضرت یوسف ؑ کے موقف کو اچھی طرح واضح کر دے گا۔ یہ کہ حضرت یوسف ؑ کسی اسلامی سوسائٹی میں نہیں تھے جس میں کسی شخص کے لیے طلب عہدہ کا کوئی موقعہ نہ ہو' اور اس میں کوئی شخص کوئی منصب نہ طلب کر سکتا ہو۔ دوسری جانب وہ دیکھ رہے تھے کہ اس غیر اسلامی نظام میں انہیں ایک ایسا منصب مل رہا ہے جس میں تمام اختیارات ان کے ہاتھ آ رہے ہیں اور وہ اس میں حاکم مطاع ہوں گے' اس طرح انہیں موقعہ ملے گا کہ وہ اپنے عقائد پورے مصر میں پھیلا دیں۔ چنانچہ عملاً ایسا ہی ہوا کہ ان کے دور اقتدار میں پورے مصر میں عقیدۂ توحید پھیل گیا۔ اس دور میں حضرت یوسف ؑ

مصری سوسائٹی پر اس طرح چھاگئے کہ اعیان مصر اور بادشاہ مصر دونوں پس منظر میں چلے گئے۔

---ooo---

اب ہم سیاق کلام میں اصل مضمون اور قصے کی طرف واپس ہوتے ہیں۔یہاں سیاق کلام میں یہ نہیں کہا جاتا کہ حضرت یوسف کی درخواست منظور ہو گئی بلکہ ان کی جانب سے درخواست بذات خود منظوری تھی۔اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان لوگوں کے ہاں اب حضرت یوسف بہت ہی عظیم المرتبہ انسان تھے۔چنانچہ جواب درخواست کی جگہ اس پر ایک تبصرہ کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے منصب کا چارج بھی لے لیا ہے۔کہا جاتا ہے:

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (٥٦) وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ (٥٧)(١٢: ٥٦ - ٥٧)) "اس طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسف کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی۔وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے۔ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں' نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں مارا نہیں جاتا' اور آخرت کا اجر ان لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے جو ایمان لے آئے اور خدا ترسی کے ساتھ کام کرتے رہے"۔

"اس طرح!" یعنی اسے غلط الزام سے بری کر کے' بادشاہ مصر کو ان کا گرویدہ کر کے اور پھر ان کو ان کے طلب کردہ عظیم منصب پر فائز کر کے' یوں ہم نے ان کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی' ان کے قدموں کو مضبوط کر دیا اور انہوں نے اس سرزمین پر ایک بلند مقام حاصل کر لیا۔اس سرزمین پر کہ مصر ان دنوں ایک عظیم اور ترقی یافتہ ملک تھا گویا وہی ملک تھا۔يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ (١٢: ٥٦)) "وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے"۔جہاں چاہے چلا جائے' جہاں چاہے رہے' جو عہدہ چاہے لے' ذرا اس حالت کو اس حالت کے تناظر میں دیکھو کہ وہ اندھے کنوئیں میں تھے اور ہر لمحہ جان کی پڑی تھی' پھر ذرا اس حالت سے مقابلہ کرو کہ وہ قید و بند کی سختیاں جھیل رہے تھے۔

نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ (١٢: ٥٦)) "ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں"۔اسے مشکلات سے نکال کر آسانیوں میں لاتے ہیں' پریشانیوں کے بدلے اسے خوشیاں دیتے ہیں۔خوف کے بدلے امن دیتے ہیں' قید کے بدلے آزادی دیتے ہیں' لوگوں کی نظروں میں ہلکے پن کے بدلے مقام بلند دیتے ہیں۔

وَ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (١٢: ٥٦)) "اور نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں مارا نہیں جاتا"۔جو لوگ اللہ پر پختہ ایمان رکھتے ہیں' اس پر توکل کرتے ہیں' اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں' اس کے حوالے سے اپنے طرز عمل' اپنے معاملات اور لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات کو درست کرتے ہیں۔

وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ (١٢: ٥٧)) "اور آخرت کا اجر

ان لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے جو ایمان لے آئے اور خدا ترسی کے ساتھ کام کرتے رہے"۔ لہٰذا ان کا بنیادی اجر بھی کم نہ ہو گا اگرچہ آخرت کا اجر دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہے بشرطیکہ انسان ایمان اور تقویٰ کی راہ پر گامزن ہو جائے اور اپنی سری اور ظاہری زندگی کو خدا ترسی کی راہ پر استوار کر دے۔

یوں اللہ نے حضرت یوسف ؑ کی مشکلات دور کر دیں' انھیں زمین میں بلند مرتبہ دیا۔ آخرت میں ان کو خوشخبری دی 'صبر اور احسان کرنے والوں کی یہی مناسب جزاء ہے۔

--- ooo---

زمانے کی گاڑی چلتی رہی۔ سرسبزی و شادابی کے سات سال گزر گئے۔ قرآن کریم نے ان سات سالوں کی تفصیلات کو حذف کر دیا ہے کہ ان سالوں میں لوگ کیا کرتے رہے اور حضرت یوسف ؑ نے ان سالوں میں کیا تدابیر اختیار کیں۔ ملک کا نظم و نسق کس طرح چلایا' کیونکہ ان امور نے تو بطریق احسن چلنا ہی تھا کیونکہ حضرت یوسف ؑ نے کہہ دیا تھا۔ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ قرآن نے ملک میں قحط آنے کا تذکرہ کرنا بھی ضروری نہ سمجھا کہ ان میں لوگوں پر کیا گزری' کس طرح خشک سالی آئی اور کس طرح گئی۔ کیونکہ حضرت یوسف ؑ کی تعبیر خواب نے یہ تفصیلات گویا بتا دی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں :

ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ

( ۱۲ : ۴۸ ) "اس کے بعد سات سخت آئیں گی' یہ کھا جائیں گے جو تم نے ان کے لیے جمع کر رکھا تھا' مگر تھوڑا سا وہ جو تم نے بچایا"۔ سیاق کلام میں اب نہ بادشاہ سامنے آتا ہے نہ کوئی اور شاہی کارندہ۔ گویا اب یوسف ؑ ہی سب کچھ ہیں' جو اس خوفناک دور میں پوری ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ اب اسٹیج پر صرف حضرت یوسف ؑ ہیں۔ ہر طرف سے روشنی کی زد میں ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے اس قصے میں فنی طور پر بھی ظاہر کیا گیا ہے۔

جہاں تک خشک سالی کا تعلق ہے حضرت یوسف ؑ کے بھائیوں کی آمد سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خشک سالی سینائی سے اس طرف کنعان تک پھیل گئی ہے اس لیے یہ لوگ غلے کی تلاش میں مصر تک پہنچ گئے ہیں۔ اور علاقے میں مصری حکومت ہی حضرت یوسف ؑ کی تدابیر کے نتیجے میں ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہے۔ تمام پڑوسی ممالک کی نظریں مصر پر ہیں' تمام ممالک کے لیے مصر اب غلہ کا گودام ہے۔ ایسے حالات میں حضرت یوسف ؑ کی کہانی میں اب ان کے بھائی نمودار ہوتے ہیں اور اس میں فنی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اب دینی مقاصد بھی سامنے آتے ہیں۔

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾
وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ
اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۵۹﴾ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ
عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَقَالَ

لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾

"یوسف ؑ کے بھائی مصر آئے اور اس کے ہاں حاضر ہوئے۔ اس نے انہیں پہچان لیا مگر وہ اس سے ناآشنا تھے۔ پھر جب اس نے ان کا سامان تیار کروا دیا تو چلتے وقت ان سے کہا "اپنے سوتیلے بھائی کو میرے پاس لانا۔ دیکھتے نہیں ہو کہ میں کس طرح پیمانہ بھر کر دیتا ہوں اور کیسا اچھا مہمان نواز ہوں۔ اگر تم اسے نہ لاؤ گے تو میرے پاس تمہارے لیے کوئی غلہ نہیں ہے۔ بلکہ تم میرے قریب بھی نہ پھٹکنا"۔ انہوں نے کہا "ہم کوشش کریں گے کہ والد صاحب اسے بھیجنے پر راضی ہو جائیں، اور ہم ایسا ضرور کریں گے"۔ یوسف ؑ نے اپنے غلاموں کو اشارہ کیا کہ "ان لوگوں نے غلے کے عوض جو مال دیا ہے وہ چپکے سے ان کے سامان ہی میں رکھ دو"۔ یہ یوسف ؑ نے اس امید پر کیا کہ گھر پہنچ کر وہ اپنا واپس پایا ہوا مال پہچان جائیں گے (یا اس فیاضی پر احسان مند ہوں گے) اور عجب نہیں کہ پھر پلٹیں"۔

خشک سالی اور قحط نے سرزمین کنعان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ چنانچہ برادران یوسف بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ عازم مصر ہوئے تھے کیونکہ مصر نے اپنے غلے کے ذخائر دوسرے ممالک کے لیے کھول دیئے تھے۔ یہ ذخائر اس نے شادابی کے زمانے میں جمع کر رکھے تھے۔ ہمارے سامنے اب منظر یہ ہے کہ یہ لوگ اب حضرت یوسف ؑ کے مہمان ہیں، ایسے حالات میں کہ اپنے فرمان کو نہیں جانتے جبکہ وہ انہیں خوب جانتے ہیں۔ کیونکہ ان کے اندر کوئی زیادہ تبدیلی نہیں ہے اور حضرت یوسف ؑ تبدیل ہو گئے ہیں، پھر ان کے خیال میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ یوسف ؑ یہ مقام حاصل کر سکیں گے، ایک عبرانی لڑکا جسے انہوں نے اندھے کنویں میں ڈال دیا ہے وہ یہاں تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔ اور اس پر تقریباً بیس سال بھی گزر گئے ہیں۔ پھر وہ ہے بھی عزیز مصر کی صورت میں خدم و حشم اور نوکر شاکر اور منصب عالیہ کا رعب داب کس طرح ان کے تخیل کو اس طرف رخ کرنے دیتا ہے؟

ادھر حضرت یوسف ؑ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ وہ مناسبت سمجھتے ہیں کہ انہیں ذرا مزید سبق پڑھایا جائے۔

وَ جَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَ هُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (۱۲:۵۸)

"یوسف ؑ کے بھائی مصر آئے اور اس کے ہاں حاضر ہوئے۔ اس نے انہیں پہچان لیا مگر وہ اس سے ناآشنا تھے"۔

سیاق کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ نے ان کو عزت و احترام سے بٹھایا اور ان کو اس طرح سبق پڑھانا شروع کیا۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ (۱۲:۵۹) "پھر جب اس نے ان کا سامان تیار کروا دیا تو چلتے وقت ان سے کہا "اپنے سوتیلے بھائی کو میرے پاس لانا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں وہ حضرت یوسف ؑ کے ساتھ بے تکلف ہو گئے تھے، اس طرح انہوں نے عزیز مصر کو بتا دیا کہ وہ کون ہیں اور یہ کہ ان کا ایک سوتیلا بھائی بھی ہے جسے ہمارا باپ اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے وہ نہیں آیا۔ جب ان

لوگوں کا سامان تیار ہو گیا تو حضرت یوسف ؑ نے کہہ دیا کہ وہ تمہارے اس بھائی سے ملنا چاہتے ہیں۔ تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں خریداروں کو ٹھیک ٹھیک حق دیتا ہوں' اگر تمہارا بھائی آ جائے تو اس کا حصہ بھی ادا کر دوں گا۔ اور دوسروں کی طرح تمہاری قدر و منزلت کروں گا۔

اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْٓ اُوْفِی الْکَیْلَ وَ اَنَا خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ (۵۹) فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَا کَیْلَ لَکُمْ عِنْدِیْ وَ لَا تَقْرَبُوْنِ (۶۰) (۱۲: ۵۹ - ۶۰) "دیکھتے نہیں ہو کہ میں کس طرح پیمانہ بھر کر دیتا ہوں اور کیسا اچھا مہمان نواز ہوں۔ اگر تم اسے نہ لاؤ گے تو میرے پاس تمہارے لیے کوئی غلہ نہیں ہے۔ بلکہ تم میرے قریب بھی نہ پھٹکنا"۔

ان کو تو معلوم تھا کہ حضرت یعقوب ؑ حضرت یوسف ؑ کی گمشدگی کے بعد یوسف ؑ کے بھائی کو ہر وقت ساتھ رکھتے تھے اس لیے انہوں نے کہہ دیا کہ اسے لانا ان کے لیے کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ان کے باپ اس کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوں' بہرحال وہ کوشش کریں گے کہ وہ دوسری بار ان کے ساتھ آ جائے۔

قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَ اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ (۱۲: ۶۱) "انہوں نے کہا "ہم کوشش کریں گے کہ والد صاحب اسے بھیجنے پر راضی ہو جائیں' اور ہم ایسا ضرور کریں گے"۔ (نراود) کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس کام کے لیے انہیں بہت ہی سعی کرنی ہو گی۔

یوسف ؑ نے اپنے ملازمین کو حکم دے دیا کہ جو درشن یا سامان وہ غلے کے مبادلے میں لائے تھے وہ بھی انہیں ان کے بار میں رکھ کر لوٹا دیا جائے' ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ نقدی ہو یا کوئی صحراوی قیمتی غلات ہوں یا چمڑے اور دوسری چیزیں مثلاً اون وغیرہ جو شہروں میں اچھی قیمت پر بکتے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ جب یہ اپنے بار کھولیں گے تو یہ اپنی چیزیں دیکھ کر حیران رہ جائیں گے اور پہچان لیں گے کہ یہ تو ان کی اشیاء ہیں۔

وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۱۲: ۶۲) "یوسف ؑ نے اپنے غلاموں کو اشارہ کیا کہ "ان لوگوں نے غلے کے عوض جو مال دیا ہے وہ چپکے سے ان کے سامان ہی میں رکھ دو"۔ یہ یوسف ؑ نے اس امید پر کیا کہ گھر پہنچ کر وہ اپنا واپس پایا ہوا مال پہچان جائیں گے (یا اس فیاضی پر احسان مند ہوں گے) اور عجب نہیں کہ پھر پلٹیں"۔

--- ○○○---

اب حضرت یوسف ؑ مصر میں رہ جاتے ہیں اور کنعان میں حضرت یعقوب ؑ اور برادران یوسف ؑ منظر پر ہیں۔ ان کی واپسی کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ

فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ
اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۶۴﴾
وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ
هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ
بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿۶۵﴾ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ
اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى
مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۶۶﴾

"جب وہ اپنے باپ کے پاس گئے تو کہا "ابا جان' آئندہ ہم کو غلہ دینے سے انکار کر دیا گیا ہے ' لہٰذا آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ ہم غلہ لے کر آئیں اور اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں"۔ باپ نے جواب دیا "کیا میں اس کے معاملہ میں تم پر ویسا ہی بھروسہ کروں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی کے معاملہ میں کر چکا ہوں؟ اللہ ہی بہتر محافظ ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے"۔ پھر جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کا مال بھی انہیں واپس کر دیا گیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ پکار اٹھے "ابا جان' اور ہمیں کیا چاہئے' دیکھئے یہ ہمارا مال بھی ہمیں واپس دے دیا گیا ہے۔ اب ہم جائیں گے اور اپنے اہل و عیال کے لیے رسد لے کر آئیں گے ' اپنے بھائی کی حفاظت بھی کریں گے اور ایک بار شتر اور زیادہ بھی لے آئیں گے 'اتنے غلہ کا اضافہ آسانی کے ساتھ ہو جائے گا"۔ ان کے باپ نے کہا "میں اس کو ہرگز تمہارے ساتھ نہ بھیجوں گا۔ جب تک کہ تم اللہ کے نام سے مجھ کو  ن نہ دے دو کہ اسے میرے پاس ضرور واپس لے کر آؤ گے الا یہ کہ تم گھیر ہی لیے جاؤ"۔ جب انہوں نے اس کو اپنے اپنے  ن دے دیے تو اس نے کہا "دیکھو' ہمارے اس قول پر اللہ نگہبان ہے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ سیدھے باپ کے سلام کو حاضر ہوئے۔ سامان کھولنے سے بھی پہلے انہوں نے باپ کو یہ بتانا ضروری خیال کیا کہ ہمارے بارے میں تو فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ جب تک ہم اپنے چھوٹے بھائی کو عزیز مصر کے سامنے پیش نہ کریں گے ہمیں مزید کوئی غلہ نہ دیا جائے گا۔ چنانچہ پہنچتے ہی انہوں نے باپ سے مطالبہ شروع کر دیا کہ چھوٹے بھائی کو ساتھ بھیجیں تاکہ ایک اونٹ بار غلہ بھی مل جائے اور وہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی لیتے ہیں۔

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ

لَحٰفِظُوْنَ (۱۲: ۶۳) "جب وہ اپنے باپ کے پاس گئے تو کہا "ابا جان' آئندہ ہم کو غلہ دینے سے انکار کر دیا گیا ہے' لہٰذا آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ ہم غلہ لے کر آئیں۔ اور اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں"۔ اب حضرت یعقوبؑ کے خفیہ خدشات سامنے آجاتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کے بارے میں بھی انہوں نے ایسا ہی پختہ عہد کیا تھا۔ چنانچہ آپؑ اپنے درد کا اظہار کر دیتے ہیں۔

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓي اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ (۱۲: ۶۴) "باپ نے جواب دیا "کیا میں اس کے معاملہ میں تم پر ویسا ہی بھروسہ کروں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی کے معاملہ کر چکا ہوں؟" چھوڑو' یہ جھوٹے وعدے اور اپنے پاس رکھو اپنی حفاظت' میں اللہ کی حفاظت اور اللہ کی رحمت کا طالب ہوں۔ صرف وہی حفاظت کرنے والا ہے۔

فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (۱۲: ۶۴) "اللہ ہی بہتر محافظ ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے"۔ جانوروں کو سنبھالنے اور سفر سے ستانے کے بعد جب انہوں نے اپنے سامانوں کو کھولا تاکہ لائے ہوئے غلے کو ٹھکانے لگائیں' تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کا وہ پورا سامان انہیں واپس کر دیا گیا ہے جو وہ غلہ خریدنے کے لیے لے گئے تھے اور ان کے غلے کے ساتھ خود ان کا اپنا سامان دے دیا گیا۔

حضرت یوسفؑ نے انہیں گندم دینے کے ساتھ خود ان کا سامان بھی ان کے باروں میں رکھ دیا' تو جب سامان کھولا تو انہوں نے اپنا سامان پایا۔ اس لیے انہوں نے کہا اے باپ ہم سے گندم روک لی گئی اور یہ اس لیے کیا گیا تاکہ وہ مجبور ہو جائیں اور بھائی کو لے کر جائیں۔ حضرت یوسفؑ ان لوگوں کو جو سبق دینا چاہتے تھے یہ اس کا ایک حصہ تھا۔ انہوں نے اپنے سامان کی واپسی کو اس بات کے لیے بطور دلیل پیش کیا کہ وہ بھائی کو ساتھ لے جانے کے مطالبے میں زیادتی نہیں کر رہے اور نہ ظلم کر رہے ہیں۔

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ

(۱۲: ۶۵) "پھر جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کا مال بھی انہیں واپس کر دیا گیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ پکار اٹھے "ابا جان' اور ہمیں کیا چاہئے' دیکھئے یہ ہمارا مال بھی ہمیں واپس دے دیا گیا ہے۔ اب ہم جائیں گے اور اپنے اہل و عیال کے لیے رسد لے کر آئیں گے' اپنے بھائی کی حفاظت بھی کریں گے اور ایک بار شتر اور زیادہ بھی لے آئیں گے' اتنے غلہ کا اضافہ آسانی کے ساتھ ہو جائے گا"۔

ان کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ صرف خاندان کا بھلا چاہتے ہیں' جب خاندان کے لیے ہم زاد راہ کی تلاش میں جا رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ بھائی کی حفاظت کریں گے۔ بھائی کی وجہ سے ایک بار شتر غلہ اور زیادہ مل جائے گا۔ جب بھائی ساتھ ہو گا تو اس کا حصہ رسدی لازماً ملے گا۔

ان کی اس بات سے کہ ہم ایک بار شتر غلہ زیادہ لائیں گے' یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ ہر شخص کو ایک بار شتر غلہ دیتے تھے۔کسی شخص کو اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ جس قدر غلہ چاہے لے جائے۔کیونکہ خشک سالی کے دور میں کنٹرول کرنے میں حکمت تھا تاکہ سب کو تھوڑا تھوڑا غلہ ملتا رہے۔

حضرت یعقوب ؑ نے مجبور ہو کر ان کے اس مطالبے کو تسلیم کیا لیکن ایک شرط لگا دی اور بہت ہی کڑی شرط۔

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ (۱۲:۶۶) ان کے باپ نے کہا"میں اس کو ہرگز تمہارے ساتھ نہ بھیجوں گا۔جب تک کہ تم اللہ کے نام سے مجھ کو پیمان نہ دے دو کہ اسے میرے پاس ضرور واپس لے کر آؤ گے الا یہ کہ تم گھیر ہی لیے جاؤ"۔

یعنی تم اللہ کی قسم اٹھا کر یہ یقین دلاؤ گے کہ تم اسے لے کر آؤ گے الا یہ کہ تم سب کے سب گھیر لیے جاؤ اور تمہارے نکل آنے کی کوئی تدبیر نہ رہے اور ایسے حالات ہوں کہ تم بے بس ہو جاؤ۔

فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ (۱۲:۶۶) "جب انہوں نے اس کو اپنے اپنے پیمان دے دیئے تو اس نے کہا"دیکھو' ہمارے اس قول پر اللہ نگہبان ہے"۔یعنی نہایت تاکید کے طور پر اور بات کو پختہ کرنے کے لیے اور زیادہ نصیحت اور خدا خوفی کے لیے خدا کو شاہد کر دیا۔اس تاکید مزید کے بعد اب حضرت یعقوب ؑ ان کو زیادہ نصیحت کرتے ہیں کہ مصر کی مملکت میں داخلے کے وقت احتیاطی تدابیر اختیار کرو۔

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝۶۷

پھر اس نے کہا"میرے بچو' مصر کے دارالسلطنت میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا۔مگر میں اللہ کی مشیت سے تم کو نہیں بچا سکتا' حکم اس کے سوا کسی کا بھی نہیں چلتا' اسی پر میں نے بھروسہ کیا' اور جس کو بھی بھروسہ کرنا ہو' اسی پر کرے"۔

حضرت یعقوب ؑ نے فرمایا (اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ) اس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔اس بات کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے تقدیری اور جبری احکام اس کائنات میں اس طرح رواں اور دواں ہیں کہ ان کے اندر کوئی انفکاک ممکن نہیں ہے۔کوئی تخلف نہیں ہے۔ان احکام سے کوئی مفر نہیں ہے۔اور امنت باللہ میں و القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالٰی کا یہی مطلب ہے۔

اللہ کے تکوینی اور تقدیری احکام اس دنیا میں لوگوں پر نافذ ہوتے ہیں اور ان کا اجراء خود لوگوں کی مرضی اور ارادے پر موقوف نہیں ہے ۔ ان جبری اور تقدیری احکام الٰہیہ کے ساتھ ساتھ ایسے الٰہی احکام بھی ہوتے ہیں جو انسانوں کے دائرہ اختیار میں ہوتے ہیں ۔ اور یہ شرعی احکام ہیں جو قرآن اور سنت میں امر و نہی کی صورت میں موجود ہیں ۔ یہ احکام بھی صرف اللہ ہی کی جانب سے ہو سکتے ہیں ۔ اللہ کے سوا کوئی بھی از خود امر و نہی صادر نہیں کر سکتا ۔ ان احکام کا حکم بھی تقدیری اور تکوینی احکام کی طرح ہے ۔ فرق صرف یہ ہے کہ شرعی احکام میں لوگ مختار ہیں ' ان کو نافذ کریں یا نہ کریں ' اور اسی پر دنیا اور آخرت میں ان کی زندگی کے اعمال پر نتائج اور احکام مرتب ہوتے ہیں اور ہوں گے ۔ اور سزا اور جزاء کا فیصلہ ہو گا ۔ لیکن لوگ اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک وہ اللہ کے شرعی احکام کو بھی اپنی پوری زندگیوں میں نافذ نہ کریں ۔

غرض اب یہ قافلہ چلتا ہے اور وہ اپنے والد کی وصیت پر عمل پیرا ہوتے ہیں ۔

وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ ۖ مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ
مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا ۚ وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِّمَا
عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾ ۸ ۱۱ع ۲

"اور واقعہ بھی یہی ہوا کہ جب وہ اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق شہر میں (متفرق دروازوں سے) داخل ہوئے تو اس کی یہ احتیاطی تدبیر اللہ کی مشیت کے مقابلے میں کچھ بھی کام نہ آ سکی ۔ ہاں بس یعقوبؑ کے دل میں جو ایک کھٹک تھی اسے دور کرنے کے لیے اس نے اپنی سی کوشش کر لی ۔ بے شک وہ ہماری دی ہوئی تعلیم سے صاحب علم تھا مگر اکثر لوگ معاملہ کی حقیقت کو جانتے نہیں ہیں" ۔

سوال یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے ان کو یہ وصیت کیوں فرمائی ۔ اس موقعہ پر ان کے باپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ متفرق ابواب سے داخل ہونا ۔

روایات اور تفاسیر نے اس سلسلے میں دور دراز کی باتیں کی ہیں جبکہ ان کی سرے سے ضرورت ہی نہ تھی ۔ بعض مفسرین نے تو ایسی باتیں بھی لکھی ہیں جو سیاق قرآن کے خلاف ہیں ۔ قرآن کریم اگر اس کا کوئی سبب بتانا چاہتا تو ضرور بتا دیتا لیکن قرآن مجید نے تو صرف اس قدر کہا

إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا (۱۲ : ۶۸) "یعقوبؑ کے دل میں ایک کھٹک تھی اسے دور کرنے کی انہوں نے اپنی سی کوشش کی" ۔ لہذا مفسرین کو چاہئے تھا کہ بس وہ اسی بات پر توقف کرتے جو قرآن کریم نے کہہ دی ۔ اور اپنی رائے کو اس ماحول اور فضا تک محدود کرتے جس میں یہ وصیت کی گئی اور جس ماحول میں یہ بات ہو رہی تھی اس میں حضرت یعقوب اپنے بیٹوں کی سلامتی کے بارے میں خدشات رکھتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ متفرق

دروازوں سے غیر محسوس طور پر داخل ہو گئے تو جس خطرے کے بارے میں وہ سوچتے تھے وہ شاید ٹل جاتا لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے کہہ دیا کہ میں اللہ کی مشیت سے تم کو نہیں بچا سکتا۔ حکم اس کے سوا کسی کا نہیں چلتا۔ صرف اسی پر بھروسہ ہونا چاہئے۔ البتہ ان کے دل میں ایک کھٹک تھی اور ان کا وجدان کسی خطرے کو محسوس کر رہا تھا اور اس کا فیصلہ انہوں نے اس وصیت کے ذریعے کیا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اللہ کا ارادہ نافذ ہونے والا ہے اور یہ بات ان کو اللہ نے سمجھائی تھی اور یہ ان کے پیغمبرانہ علم میں تھی۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲: ۶۸) "مگر اکثر لوگ معاملہ کی حقیقت کو جانتے نہیں"۔ اب اس کا حقیقی سبب کیا تھا؟ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ان کو حاسدوں کی آنکھوں سے بچانا چاہتے تھے یا یہ بات بھی ہو سکتی تھی کہ اگر وہ جتھے کی شکل میں جاتے تو مصر کی مملکت اپنے لیے اس کو سیکورٹی کا مسئلہ بنا لیتی۔ یا ان کو اس کی شان و شوکت سے داخل ہونے سے غیرت آ جاتی۔ یا یہ کہ ان کو کوئی ڈاکو نہ سمجھے یا جو بھی ہو' یہاں اس کی وضاحت و صراحت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاں ایک قاری اور مفسر کو یہ نقصان ضرور ہوتا کہ وہ اصل قرآنی موضوع اور غرض و غایت سے ذرا ہٹ کر ان اسباب پر کلام کرتا اور قال وقیل کا سلسلہ چل نکلتا۔ اس قسم کے قال وقیل پر مشتمل مباحث بسااوقات بحث کو خالص قرآنی فضا اور موضوع سے دور لے جاتے ہیں۔

مناسب یہ ہے کہ ہم اس وصیت اور اس سفر کو اسی طرح لکھیں جس طرح قرآن کریم نے اسے لیا ہے۔ اب برادران یوسف ؑ کے ساتھ اگلے منظر میں ہم یوں ملتے ہیں :

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾

"یہ لوگ یوسف ؑ کے حضور پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس الگ بلا لیا اور اسے بتا دیا کہ "میں تیرا وہی بھائی ہوں (جو کھو یا گیا تھا) اب تو ان باتوں کا غم نہ کر جو یہ لوگ کرتے رہے ہیں"۔

اس منظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسف ؑ اور ان کے حقیقی بھائی کی ملاقات جلدی سے کرا دی جاتی ہے۔ پھر حضرت یوسف ؑ کسی تمہید کے بغیر بھائی کو اطلاع دے دیتے ہیں کہ میں تمہارا بھائی یوسف ؑ ہوں اور یہ مشورہ بھی ان کو دیتے ہیں کہ دوسرے بھائیوں نے ان کے ساتھ اس سے قبل جو سلوک کیا اس کو بھول جائیں۔ ماضی کی پریشان کن یادیں بہرحال کسی شخص کی زندگی کا حصہ ہوتی ہیں اور وہ چونکہ کنعان میں اسی خاندان میں رہتے تھے جن میں یہ واقعات رونما ہوئے تھے تو لازماً یہ ان کے لیے ہروقت پریشان کن تھے اور تکلیف دہ تھے۔

سیاق کلام نے کیوں اس بات کو پہلے بیان کر دیا؟ حالانکہ قدرتی امر یہ ہے کہ برادران کے درمیان یہ مکالمہ عین اس وقت نہ ہوا ہو گا جب یہ وفد حضرت یوسف ؑ حاکم مصر سے ملا ہو گا' بلکہ یہ اس وقت ہوا ہو گا جب یوسف ؑ اور ان کے چھوٹے بھائی تنہا ہوئے ہوں گے۔ ہاں جب یہ لوگ حضرت یوسف ؑ کو ملے ہوں گے اور انہوں نے اس طویل جدائی کے

بعد اپنے بھائی کو دیکھا ہو گا تو ان کے دل میں یہ خیال سب سے پہلے آگیا ہو گا کہ میں بھائی کو یہ اطلاع کر دوں۔

یہ چونکہ پہلا خیال تھا اس لیے اس منظر میں اسے خیال یوسف ؑ کی شکل میں دے دیا گیا اور یہ قرآن کریم کا ایک نہایت ہی لطیف اور خوبصورت اسلوب بیان ہے اور اس سے لطف اندوز وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو کلام کی فنی باریکیوں کو جانتے ہیں۔

اس منظر میں بھی بعض واقعات کے بیان کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے کاٹ دیا جاتا ہے۔ مثلاً برادران یوسف ؑ کی مہمانداری اور اس دوران ان کے درمیان ہونے والی گفتگو' اور برادران یوسف ؑ کی روانگی کا منظر لے لیا جاتا ہے۔ اس منظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسف ؑ اپنے بھائی کو اپنے ہاں روکنے کے لیے ایک خاص تدبیر کرتے ہیں تاکہ ان کے بھائیوں کو سبق دیا جائے بلکہ بہت سے سبق دیئے جائیں جو ان کے لیے ضروری تھے اور قیامت تک آنے والے لوگ بھی اس سے عبرت لیتے ہیں۔ چنانچہ اس تدبیر کو ابدی کتاب کا حصہ بنا دیا جاتا ہے۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ
ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿٧٠﴾ قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِم مَّاذَا
تَفْقِدُونَ ﴿٧١﴾ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَن جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ
زَعِيمٌ ﴿٧٢﴾ قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ عَلِمْتُم مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا
سَارِقِينَ ﴿٧٣﴾ قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِن كُنتُمْ كَاذِبِينَ ﴿٧٤﴾ قَالُوا جَزَاؤُهُ مَن وُجِدَ
فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿٧٥﴾ فَبَدَأَ بِأَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ
وِعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِن وِعَاءِ أَخِيهِ ۚ كَذَٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ ۖ مَا كَانَ
لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّن نَّشَاءُ ۗ وَفَوْقَ
كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ﴿٧٦﴾ قَالُوا إِن يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ أَخٌ لَّهُ مِن قَبْلُ ۚ فَأَسَرَّهَا
يُوسُفُ فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ أَنتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا
تَصِفُونَ ﴿٧٧﴾ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ ۖ

إِنَّا نَرَىٰكَ مِنَ ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿٧٨﴾

"جب یوسف ؑ ان بھائیوں کا سامان لدوانے لگا تو اس نے اپنے بھائی کے سامان میں اپنا پیالہ رکھ دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا "اے قافلے والو' تم لوگ چور ہو"۔ انھوں نے پلٹ کر پوچھا "تمہاری کیا چیز کھوئی گئی؟" سرکاری ملازموں نے کہا "بادشاہ کا پیمانہ ہم کو نہیں ملتا"۔ (اور ان کے جمعدار نے کہا) "جو شخص لا کر دے گا اس کے لیے ایک بار شتر انعام ہے' اس کا میں ذمہ لیتا ہوں"۔ ان بھائیوں نے کہا "خدا کی قسم' تم لوگ خوب جانتے ہو کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے ہیں اور ہم چوریاں کرنے والے لوگ نہیں ہیں"۔ انھوں نے کہا "اچھا' اگر تمہاری بات جھوٹی نکلی تو چور کی کیا سزا ہے؟" انھوں نے کہا "اس کی سزا؟ جس کے سامان میں سے چیز نکلے وہ آپ ہی اپنی سزا میں رکھ لیا جائے' ہمارے ہاں تو ایسے ظالموں کو سزا دینے کا یہی طریقہ ہے"۔ تب یوسف ؑ نے اپنے بھائی سے پہلے ان کی خرجیوں کی تلاشی لینی شروع کی' پھر اپنے بھائی کی خرجی سے گم شدہ چیز برآمد کرلی۔ اس طرح ہم نے یوسف ؑ کی تائید اپنی تدبیر سے کی۔ اس کا یہ کام نہ تھا کہ بادشاہ کے دین (یعنی مصر کے شاہی قانون) میں اپنے بھائی کو پکڑتا الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔ ہم جس کے درجے چاہتے ہیں' بلند کر دیتے ہیں' اور ایک علم رکھنے والا ایسا ہے جو ہر صاحب علم سے بالاتر ہے۔

ان بھائیوں نے کہا "یہ چوری کرے تو کچھ تعجب کی بات بھی نہیں' اس سے پہلے اس کا بھائی (یوسف ؑ) بھی چوری کر چکا ہے"۔ یوسف ؑ ان کی یہ بات سن کر پی گیا' حقیقت ان پر نہ کھولی' بس (زیر لب) اتنا کہہ کر رہ گیا کہ "بڑے ہی برے ہو تم لوگ' (میرے منہ در منہ مجھ پر) جو الزام تم لگا رہے ہو اس کی حقیقت خدا خوب جانتا ہے"۔

انھوں نے کہا "اے سردار ذی اقتدار (عزیز) اس کا باپ بہت بوڑھا آدمی ہے' اس کی جگہ آپ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے' ہم آپ کو بڑا ہی نیک نفس انسان پاتے ہیں"۔

یہ ایک نہایت ہی دلچسپ منظر ہے۔ اس میں متنوع حرکات' تاثرات' سرپرائز شامل ہیں۔ جیسا کہ کوئی نہایت ہی موثر' جذباتی اور زندگی سے بھرپور کوئی ڈرامائی منظر ہو سکتا ہے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ قرآن کریم زندہ اور حقیقی واقعات کو نہایت ہی موثر انداز میں بیان کرتا ہے۔

پس پردہ حرکت یہ ہے کہ حضرت یوسف ؑ بادشاہ کے پیمانے یا پیالے کو ان کے سامان میں رکھوا رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پیالہ بیک وقت پینے کے کام بھی آتا تھا اور غلہ ماپنے کا پیمانہ بھی تھا۔ اس دور میں گندم کو سونے کے پیمانے میں ناپنا تعجب انگیز امر نہیں ہے کیونکہ اس قحط کے دور میں سونے کے مقابلے میں گندم کی اہمیت زیادہ تھی۔ حضرت یوسف ؑ پس منظر میں اس پیالے کو اپنے بھائی کے بار میں رکھوا رہے ہیں تاکہ اللہ کی ہدایات کے مطابق اس تدبیر سے بھائی کو پکڑا جا سکے۔ تفصیلات ابھی آرہی ہیں۔

اب جبکہ یہ قافلہ بار لدوا کر واپس عازم کنعان ہو چکا تو ایک منادی نمودار ہوتا ہے اور وہ اعلان عام کی شکل میں آواز دیتا ہے اور یہ اعلان پورے قافلے کے لیے ہے۔

اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ (۱۲ : ۷۰) "اے قافلے والو! تم لوگ چور ہو"۔ برادران یوسف ڈر سے کانپ اٹھتے ہیں کیونکہ چوری کا الزام پورے قافلے پر لگ چکا ہے۔ ان کے لیے اس کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ وہ حضرت یعقوب" ابن اسحاق ابن ابراہیم علیہم السلام کے بیٹے ہیں۔ یہ لوگ اپنے جانور اور بار واپس کر لیتے ہیں تا کہ اس الزام کی تحقیقات کی جا سکے۔

قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ (۱۲ : ۷۱) "انہوں نے پلٹ کر پوچھا تمہاری کیا چیز کھوئی گئی؟" چنانچہ ان ملازمین نے' جن کی ڈیوٹی تھی کہ وہ ان کے بار تیار کریں' کہا چوکیداروں نے کہا جن میں سے یہ اعلان کنندہ بھی تھا۔

قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ (۱۲ : ۷۲) "سرکاری ملازمین نے کہا بادشاہ کا نہ ہم کو نہیں مل رہا"۔ اس دوران ایک دوسرا شخص منظر پر آتا ہے اوز وہ انعام' انعام کی ایک بڑی رقم کا اعلان کرتا ہے کہ اگر کوئی رضاکارانہ طور پر واپس کر دے تو یہ قیمتی انعام دیا جائے گا۔ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ (۱۲ : ۷۲) "جو شخص لاکر دے گا اس کے لیے ایک بار شتر انعام ہے اور اس کا میں ذمہ دار ہوں"۔ زعیم بمعنی ضامن کہ اسے ایک بار شتر گندم دوں گا۔

لیکن ان حضرات کو تو پورا یقین تھا کہ وہ بے گناہ ہیں' کیونکہ انہوں نے کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔ اور نہ ہی وہ اس لیے آئے تھے کہ ایسی حرکتیں کریں' جس سے باہم اعتماد تباہ ہو جائے اور مختلف ممالک کے بین الاقوامی تعلقات خراب ہوں۔ چنانچہ وہ قسمیہ بیان دیتے ہیں :

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ (۱۲ : ۷۳) "ان بھائیوں نے کہا خدا کی قسم' تم لوگ خوب جانتے ہو کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے ہیں"۔ تمہیں ہماری تاریخ کا بھی علم ہے' ہمارے نسب وحسب کا بھی علم ہے اور ہماری ظاہری پوزیشن بھی نظر آتی ہیں۔

وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ (۱۲ : ۷۳) "اور ہم چوریاں کرنے والے لوگ نہیں ہیں"۔ ہم سے یہ برا فعل ہرگز صادر نہیں ہو سکتا' ہرگز نہیں۔ بادشاہ کے کارندوں اور چوکیداروں نے کہا۔

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ (۱۲ : ۷۴) "اچھا' اگر تمہاری بات جھوٹی نکلی تو پھر چور کی سزا کیا ہے؟" اس سے وہ حکمت معلوم ہوتی ہے جو اس تدبیر کی شکل میں اللہ نے حضرت یوسف ؑ کو سجھائی۔ دین یعقوب ؑ میں قانون یہ تھا کہ چور کو چوری کے مال اور جرم کے بدلے رہن قیدی یا غلام بنا لیا جائے۔ برادران یوسف ؑ کو چونکہ اپنی بے گناہی کا پورا پورا یقین تھا' تو وہ خوشی خوشی اس پر راضی ہو گئے کہ دین یعقوبی کے مطابق فیصلہ ہو جائے جو بھی مجرم ہو۔ یوں اللہ نے حضرت یوسف ؑ اور ان کے بھائی کے لیے جو اسکیم تیار کی وہ پایہ تکمیل کو پہنچی۔

قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ

"انہوں نے کہا اس کی سزا؟ جس کے سامان میں سے چیز نکلے وہ آپ ہی اپنی سزا میں رکھ لیا جائے۔ ہمارے ہاں تو ایسے ظالموں کو سزا دینے کا یہی طریقہ ہے"۔

یہ سب گفتگو حضرت یوسف ؑ کی موجودگی میں ہو رہی تھی اور وہ یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے۔ اس لیے کہ انہوں نے تلاشی کا حکم دیا اور ان کی دانش مندی نے انہیں یہ سمجھایا کہ دوسرے بھائیوں کے باروں کی تلاشی پہلے لی جائے تاکہ تفتیش اور تدبیر کے بارے میں کوئی شبہ نہ ہو۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ (۱۲:۷۶) "تب یوسف ؑ نے اپنے بھائی سے پہلے ان کی خرجیوں کی تلاشی لینی شروع کی پھر اپنے بھائی کی خرجی سے گم شدہ چیز برآمد کر لی"۔

اس مرحلے پر قرآن اس دہشت اور پریشانی کو بیان نہیں کرتا جس سے برادران یوسف اچانک دوچار ہو گئے۔ ان کو تو سوفیصدی یقین تھا کہ وہ بے گناہ ہیں۔ انہوں نے بیان حلفی بھی دے دیا تھا اور بیک آواز دے دیا تھا۔ قرآن کریم نے منظر کا یہ حصہ انسانی تخیل پر چھوڑ دیا کیونکہ ایسے مواقع پر ایسے تاثرات خود بخود ظاہر ہوتے ہیں۔ اس تاثر کو انسانی خیال پر چھوڑ دیا گیا اور واقعہ پر ایک تبصرہ کر دیا گیا تاکہ ابنائے یعقوب ؑ جس دہشت اور شرمندگی سے دوچار تھے' ایک قاری اس سے ذرا نکل آئے۔

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ (۱۲:۷۶) "اس طرح ہم نے یوسف ؑ کی تائید اپنی تدبیر سے کی جو نہایت ہی گہری تدبیر تھی۔

مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ (۱۲:۷۶) "اس کو دین شاہی میں اپنے بھائی کو پکڑنے کا حق نہ تھا"۔ یعنی اگر اس کیس کا فیصلہ شاہی قانون کے مطابق کیا جاتا تو حضرت یوسف ؑ بھائی کو شخصی طور پر نہیں روک سکتے تھے۔ صرف اسے چور کی سزا دے سکتے تھے۔ لیکن بھائیوں نے یہ تجویز دی کہ ان کے اپنے دین کے مطابق چور کا فیصلہ ہونا چاہئے۔ یہ ہے وہ تدبیر جس کے اسباب اللہ نے حضرت یوسف ؑ کو سجھائے۔ یہ ہے اللہ کی جانب سے یوسف ؑ کے حق میں تدبیر۔ لفظ "کید" عربی میں خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں اور اس کا استعمال لغت میں خیر اور شر دونوں معنوں میں ہوتا ہے۔ لیکن عموماً اس کا استعمال شر میں ذرا زیادہ ہو گیا۔ بظاہر تو یہاں اس کے بھائی کے لیے بھی واقعہ شر ہی کا ہو رہا ہے' بھائیوں کے لیے بھی یہ بظاہر شر ہے کیونکہ ان کو والد کا سامنا کرنا مشکل ہو گیا۔ پھر حضرت یعقوب ؑ کے لیے بھی یہ وقتی طور پر تکلیف دہ امر ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے واقعہ کے ظاہری پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے لیے "کید" کا لفظ استعمال کیا جو قرآن کریم کا ایک نہایت ہی لطیف اسلوب بیان ہے۔

مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۱۲:۷۶) "وہ بادشاہ کے قانون میں اپنے بھائی کو نہ پکڑ سکتے تھے الا یہ کہ اللہ ایسا چاہتا"۔ جیسا کہ اللہ نے ان کے لیے زیر نظر تدبیر کی۔

اس آخری تبصرے میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ حضرت یوسف ؑ کو اللہ نے بہت ہی رفعتیں بہت ہی علم' عطا فرما دیا تھا۔

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ (۱۲:۷۶) "ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں لیکن ساتھ

ہی ساتھ یہ تنبیہ بھی کر دی جاتی ہے کہ اللہ کا علم سب سے اونچا اور اعلیٰ ہے۔

وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ (۱۲:۷۶) "اور ایک علم رکھنے والا ایسا ہے جو ہر صاحب علم سے بالا تر ہے"۔ یہ ایک لطیف احتیاط ہے۔

یہاں قرآن مجید نے اس آیت

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ (۱۲:۷۶) "ہم نے یوسف ؑ کے لیے یوں تدبیر کی .... وہ اپنے بھائی کو بادشاہ کے قانونی نظام میں گرفتار نہ کر سکتے تھے" میں لفظ "دین" کو ایک مخصوص مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے اور یہ نہایت ہی ٹیکنیکل اصطلاحی استعمال ہے۔ یعنی نظام اور شریعت کے مفہوم میں کیونکہ مصر کے قانونی نظام میں چور کے لیے یہ سزا نہ تھی کہ اسے جرم کے عوض رکھ ہی لیا جائے۔ یہ سزا صرف حضرت یعقوب علیہ السلام کے شرعی اور قانونی نظام میں تھی۔ برادران یوسف اس بات پر راضی ہو گئے تھے کہ کیس کا فیصلہ ان کے قانون کے مطابق کیا جائے۔ جب نہ اس کے بھائی کی خرجی سے نکلا تو حضرت یوسف ؑ نے ان پر انہی کا قانون نافذ کر دیا۔ یہاں قرآن کریم نے نظام اور قانون پر "الدین" کا اطلاق فرمایا ہے۔

دین کا یہ نہایت ہی واضح اور صریح مفہوم ہے' اور بیسویں صدی کی جاہلیت میں سب کے ذہن سے یہ مفہوم غائب ہے۔ ان لوگوں کے ذہن سے بھی جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور ان کے ذہن سے بھی جو اس جاہلیت کے داعی اور پیروکار ہیں۔

ان لوگوں نے دین کا مفہوم عبادت اور مراسم مذہبی تک محدود کر دیا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص اللہ کی وحدانیت پر اعتقاد رکھتا ہو' رسول کو سچا سمجھتا ہو' ملائکہ اور کتب پر ایمان رکھتا ہو' تمام رسولوں کو مانتا ہو' آخرت پر یقین رکھتا ہو' اور اچھی اور بری تقدیر کے من جانب اللہ ہونے کا قائل ہو اور پھر وہ فرائض و عبادات پر عمل پیرا ہو' بس وہ پکا دین دار ہے۔ اگرچہ زندگی کے دوسرے معاملات میں وہ دوسرے ارباب اور دوسرے حاکموں کی اطاعت کرتا ہے اور دوسروں کے قانون اور شریعت کے مطابق فیصلے کرتا ہو حالانکہ اس آیت میں صریح طور پر کہا گیا ہے کہ نظام قانون اور شریعت دین کا مسئلہ ہے اور اللہ کے دین کا مفہوم اللہ کا پورا نظام زندگی ہے۔

"الدین" کے مفہوم کو اس قدر محدود کر دیا گیا ہے اور اس قدر سکیڑ دیا گیا ہے کہ وہ عبادات اور اعتقادات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے لیکن حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد تک تمام انبیاء نے جو دین پیش کیا اس کا مفہوم اس طرح محدود نہ تھا۔

دین کا مفہوم ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مکمل بندگی کی جائے۔ ان تمام امور پر عمل کیا جائے جو شریعت کا حصہ ہیں۔ اور ان تمام امور کو ترک کیا جائے جو شریعت کے خلاف ہیں۔ جس طرح اللہ وحدہ آسمانوں میں حاکم ہیں اسی طرح زمین پر بھی اللہ وحدہ کی حکومت قائم کی جائے اور اللہ وحدہ کو تمام انسانوں کا رب سمجھا جائے یعنی وہی حاکم ہو' وہی قانون ساز ہو' اور اسی کے احکام و نواہی چلیں۔ اہم بات یہ ہے کہ کون لوگ اللہ کے دین میں ہیں اور کون لوگ بادشاہ کے دین میں ہیں؟ اس مفہوم کے اعتبار سے جو لوگ اللہ کے نظام' اللہ کے قانون کی اطاعت کرتے ہیں وہ دین الٰہی میں ہیں اور جو لوگ

بادشاہ کے نظام اور قانون کو مانتے ہیں وہ بادشاہ کے دین میں ہیں۔ یہ لوگ اگر شرک بھی کرتے ہیں تو پھر یہ اعتقادات و نظریات میں بھی شرک کے مرتکب ہوتے ہیں اور نظام اور قانون اور دستور میں بھی شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔

دین کے مفہوم کے یہ منطقی اور بدیہی نتائج ہیں اور اسلامی نظریۂ حیات کے بدیہیات میں سے ہیں۔

آج کل عوام الناس کے بعض ہمدرد عوام کی طرف سے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ یہ لوگ "دین اللہ" کا مفہوم ہی نہیں سمجھتے اس لیے ایسے لوگ نہ اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اسلامی قانون اور دستور کو نافذ کیا جائے اور نہ اس کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ پھر کیا ان لوگوں کی یہ جہالت اور دین کے حقیقی مفہوم سے لاعلمی ان کے لیے معافی کا عذر بن جائے گی؟

میں تو یہ نہیں سمجھتا کہ دین کے مفہوم کو نہ جاننا اور اس کی حقیقت سے بے خبر ہونا کسی کو دین دار بناتا ہے۔ کسی حقیقت پر یقین اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کسی کو وہ حقیقت معلوم ہو۔ اگر لوگ کسی عقیدے کا علم ہی نہیں رکھتے تو وہ اس کے معتقد کیسے ہو سکتے ہیں اور کس طرح انہیں اس عقیدے والا کہا جاسکتا ہے جبکہ وہ اس عقیدے کا مفہوم ہی نہیں سمجھتے۔

ہو سکتا ہے کہ دین کی حقیقت سے بے خبری آخرت میں ان کے حساب و کتاب میں کسی نرمی کا باعث ہو' یا عذاب میں کمی ہو جائے' اور یہ حساب ان سے لیا جائے جنہوں نے ان کو دین سکھایا نہیں جبکہ وہ دین کے حقیقی مفہوم سے واقف تھے۔ لیکن یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا تعلق اخروی حساب سے ہے' اور تمام اہل جاہلیت کی سزا کا مسئلہ جن تک دعوت نہ پہنچی ہو۔ اس میں بحث و مباحثہ کرنا ہمارے لیے کچھ زیادہ مفید نہیں ہے نہ یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ ہمارا فریضہ تو یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں اور ایک ایک تک پہنچائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارا یہ بھی فریضہ ہے کہ ہم لوگوں کو ان کے موجودہ دین کی حقیقت سمجھائیں۔ یہ کہ یہ دین اللہ کا دین قطعاً نہیں ہے۔ اللہ کا دین تو وہ ہے جو اس کے نصوص کی صورت میں بطور نظام زندگی اور نظام قانون کے موجود ہے۔ اس طرح اسلامی عقائد کے ساتھ جو شخص اللہ کے نظام اور قانون کو بھی رائج اور نافذ کرے گا وہی دین اسلام میں ہو گا۔ جو شخص کسی بادشاہ یا دوسرے شخص کا نظام رائج کرے گا وہ اس کے نظام اور دین میں ہو گا۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ نہیں ہے۔

وہ لوگ جو اس دین کے مفہوم ہی سے ناواقف ہیں' ان کے بارے میں اس بات کا امکان ہی نہیں ہے کہ وہ اس دین کا اعتقاد رکھتے ہوں۔ کیونکہ ان کی جہالت کا تعلق دین کی بنیاد سے وابستہ ہے اور جو شخص کسی چیز کی حقیقت کا علم نہ رکھتا ہو وہ عقلاً اور واقعتاً اس چیز پر اعتقاد رکھنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ کیونکہ عقیدہ علم کے بعد آتا ہے۔ یہ بات بداہتہً ثابت ہے کہ علم کے بغیر عقیدہ ممکن نہیں ہے۔

پس ہمارے لیے یہ بہتر ہے کہ ہم لوگوں کے سامنے دین کے اصل مفہوم اور دین کی حقیقت ظاہر کریں۔ بجائے اس کے کہ ہم ان کی جانب سے بے جا مدافعت کریں' ان کے لیے عذرات تلاش کریں' ان کے لیے ہم اللہ کریم سے بھی زیادہ رحمدل ہو جائیں۔ جبکہ وہ درحقیقت اللہ کے دین میں داخل نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں پالیسی یہ ہونا چاہئے کہ انہیں صاف صاف بتا دیا جائے کہ ان کی یہ پوزیشن ہے چاہے وہ دین کو اپنائیں یا چھوڑ دیں۔

یہ پالیسی ہمارے لیے بھی مفید ہے اور ان عوام الناس کے لیے بھی مفید ہے۔ اس طرح ہم ان جاہلوں کی گمراہی کے نتائج بھگتنے سے بھی بچ جائیں گے کیونکہ یہ لوگ دین کے مفہوم کو نہ پانے کی وجہ سے دین کے معتقد ہی نہیں رہے۔ اگر ہم ان لوگوں کے سامنے دین کی اصل حقیقت پیش کر دیں جو دراصل دین اسلام میں داخل نہیں ہیں بلکہ دین شاہ وغیرہ میں

ہیں تو ممکن ہے کہ ان کا ضمیر بیدار ہو جائے اور وہ درحقیقت دین اسلام میں داخل ہو جائیں۔

یہی پالیسی نبی کریم کی رہی ہے اور یہی پالیسی تمام داعیان حق کی ہونی چاہئے' ہر زمان و مکان میں ہونی چاہئے' تمام جاہلوں اور جاہلیت پرستوں کے مقابلے میں۔

اس مختصر سبق آموز تبصرے کے بعد اب ہم برادران یوسف ؑ کی طرف لوٹتے ہیں۔ حالات ایسے ہیں کہ اس مشکل مرحلے سے دوچار ہو کر یوسف ؑ اور ان کے بھائی کے خلاف ان کے دل میں چھپی ہوئی عداوت اور بغض وحسد اب اُبل پڑا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو اس جرم سے بری قرار دے کر' اس کا ذمہ دار حضرت یعقوب ؑ کی دوسری بیوی کی اولاد کو ٹھہراتے ہیں۔

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ (۱۲: ۷۷) ان بھائیوں نے کہا" یہ چوری کرے تو کچھ تعجب کی بات بھی نہیں' اس سے پہلے اس کا بھائی (یوسف ؑ) بھی چوری کر چکا ہے"۔ ہمارے تفاسیر کے ذخیرے میں اس الزام پر طویل تبصرے' حکایات اور روایات بیان کی گئی ہیں' جو سب کی سب اسرائیلیات پر مشتمل ہیں۔ یہ کہ اس کی طرف سے سرقہ قابل تعجب نہیں ہے۔ اس سے قبل اس کے بھائی (یوسف ؑ) اس جرم کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ گویا انہوں نے تو یوسف ؑ کے بارے میں باپ کے سامنے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ کیا وہ اب عزیز مصر کے سامنے جھوٹ نہیں بول رہے کہ اپنے آپ کو اس شرمندگی سے نکالیں اور اس طرح وہ اپنے آپ کو یوسف ؑ اور اس کے بھائی سے قدرے علیحدہ کر دیں۔ اس طرح یوسف ؑ اور ان کے بھائی کے حق میں اپنے قدیمی بغض اور حسد کو ظاہر کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف ؑ پر یہ بالکل ناحق اور جھوٹا الزام لگایا۔

فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ (۱۲: ۷۷) "یوسف ان کی یہ بات سن کر پی گیا اور یہ بات ان پر نہ کھولی"۔ یوسف ؑ نے ان کو اس الزام کے جواب میں' اپنی حقیقت ان پر نہ کھولی' بات کو پی گئے اور اپنے تاثرات کا اظہار نہ کیا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اور ان کے بھائی دونوں بری الذمہ ہیں۔ البتہ انہوں نے صرف اتنا کہا:

قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا (۱۲: ۷۷) "تم بہت ہی برے لوگ ہو"۔ یعنی تم یہ جھوٹا الزام لگا رہے ہو اور جس پر تم الزام لگا رہے ہو' اس کے مقابلے میں تم تو بہت ہی برے ہو"۔

قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا (۱۲: ۷۷) "یوسف ؑ نے کہا' تم بہت ہی برے ہو"۔ یعنی تم جس پر الزام سرقہ لگا رہے ہو اس کے مقابلے میں اللہ کے نزدیک تم خود بہت ہی برے ہو' اور حضرت یوسف ؑ نے جو کچھ کہا۔ یہ محض گالی نہ تھی بلکہ حقیقت تھی۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ (۱۲: ۷۷) "جو الزام تم لگا رہے ہو' اس کی حقیقت خدا خوب جانتا ہے"۔ اور اس واقعہ کی حقیقت بھی اور تمہارے الزام کی حقیقت بھی۔ یوں اللہ پر چھوڑ کر حضرت یوسف ؑ نے بات کو

یہاں ہی ختم کر دیا کیونکہ یہاں مطلب و موضوع کے ساتھ اس واقعہ کا تعلق نہیں ہے۔

اب یہ لوگ اس پریشان کن صورت حال پر غور کرنے لگے جس میں وہ گرفتار ہو گئے تھے۔ سوچنے لگے کہ والد نے تو پہلے ہی یہ کہا تھا کہ

لَتَأْتُنَّنِي بِهِ إِلَّا أَنْ يُحَاطَ بِكُمْ (۱۲ : ۶۶) "تم ضرور اسے لے کر آؤ گے الا یہ کہ تم سب گھر جاؤ"۔ اب وہ حضرت یوسف ؑ سے رحم کی اپیل کرنے لگے۔ اس نوجوان بھائی کے بہت ہی بوڑھے باپ کا واسطہ دینے لگے' یہ پیش کرنے لگے کہ اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو گرفتار کرلے۔ یہ ان کو یاد دلا رہے ہیں کہ یوسف "تم بہت محسن 'نیک نفس انسان ہو اور اس کے باپ ہی کی خاطر اسے رہا کر دو۔

قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ (۱۲ : ۷۸) "انہوں نے کہا" اے سردار ذی اقتدار (عزیز) اس کا باپ بہت بوڑھا آدمی ہے' اس کی جگہ آپ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے' ہم آپ کو بڑا ہی نیک نفس انسان پاتے ہیں"۔ لیکن حضرت یوسف "تو انہیں مزید سبق پڑھانا چاہتے تھے۔ وہ ان کو اس اچانک خوشی کے لیے تیار کر رہے تھے' جو ان کے لیے' ان کے والد کے لیے اور سب رشتہ داروں کے لیے آرہی تھی تاکہ وہ بے حد خوش ہوں اور ان پر اس کا گہرا اثر ہو۔

۹
قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ أَنْ نَأْخُذَ إِلَّا مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهُ إِنَّا إِذًا لَظَالِمُونَ ﴿۷۹﴾ ع ۱۱
۳

یوسف نے کہا "پناہ بخدا' دوسرے کسی شخص کو ہم کیسے رکھ سکتے ہیں' جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے اس کو چھوڑ کر دوسرے کو رکھیں گے تو ہم ظالم ہوں گے"۔

حضرت یوسف ؑ نے یہ نہیں کہا کہ پناہ خدا کی' کہ ہم کسی چور کے بدلے ایک بے گناہ کو پکڑ لیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بھائی چور نہیں ہے' اس لیے انہوں نے نہایت ہی ٹیکنیکل انداز تعبیر اختیار کیا۔ اگرچہ حضرت یوسف ؑ کی زبان مصری ہو گی لیکن قرآن نے ان کی جو حالت بتائی ہے ظاہر ہے وہ اصل کے مطابق ہے۔ "جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا"۔ ان الفاظ میں بالکل سادہ حقیقت کا اظہار ہے' نہ الزام ہے اور اس کی طرف اشارہ کہ مال رکھا کس نے۔

إِنَّا إِذًا لَظَالِمُونَ "اگر ہم دوسرے کو گرفتار کریں تو ہم ظالم ہوں گے"۔ بس یہ آخری بات تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب وہ سوچنے لگے کہ والد کو کس طرح منہ دکھائیں گے۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۱۰ تشریح آیات

## ۸۰ --- تا --- ۱۰۱

برادران یوسفؑ اب برادر خورد کے چھڑانے سے مایوس ہو چکے ہیں۔ یوسفؑ کے دربار سے ذرا ہٹ کر وہ ایک مجلس مشاورت منعقد کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک عجیب منظر ہے۔ سیاق کلام میں سب کے اقوال و تجاویز کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ البتہ اس مشاورت کا آخری قول اور فیصلہ کن تجویز یہاں دے دی گئی۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۭ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝۸۰ اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ۝۸۱ وَسْـَٔـلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝۸۲

"جب وہ یوسفؑ سے مایوس ہو گئے تو ایک گوشے میں جاکر آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ ان میں جو سب سے بڑا تھا وہ بولا "تم جانتے نہیں ہو کہ تمہارے والد تم سے خدا کے نام پر عہد و پیمان لے چکے ہیں؟ اور اس سے پہلے یوسفؑ کے معاملہ میں جو تم کر چکے ہو وہ بھی تم کو معلوم ہے۔ اب میں تو یہاں سے ہرگز نہ جاؤں گا جب تک کہ میرے والد مجھے اجازت نہ دیں 'یا پھر اللہ ہی میرے حق میں کوئی فیصلہ فرمادے کہ وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ تم جاکر اپنے والد سے کہو کہ ابا جان' آپ کے صاحبزادے نے چوری کی ہے۔ ہم نے اسے چوری کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے بس وہی ہم بیان کر رہے ہیں' اور غیب کی نگہبانی تو ہم نہ کر سکتے تھے۔ آپ اس بستی کے لوگوں سے پوچھ لیجئے جہاں ہم تھے۔ اس قافلے سے دریافت کر لیجئے جس کے ساتھ ہم آئے ہیں۔ ہم اپنے بیان میں بالکل سچے ہیں"۔

برادران یوسفؑ میں سے بڑے بھائی سب سے پہلے ان کو یاد دلاتے ہیں کہ والد نے تم سے پختہ عہد لیا ہے اور یہ کہ

اس سے پہلے تم یوسف ؑ کے ساتھ بھی زیادتی کر چکے ہو' اور وہ اس کا اقرار کر لیتے ہیں ۔ پھر وہ فیصلہ کن تجویز دیتے ہیں کہ وہ مصر کو اس وقت تک نہ چھوڑیں گے جب تک ان کے والد اجازت نہیں دیتے یا اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ نہیں فرماتے ' اللہ کے فیصلے کے وہ بہرحال پابند ہیں ۔

وہ کیا کریں ؟ تو ان سے انہوں نے کہا کہ تم جاؤ اور باپ سے صاف صاف کہو کہ آپ کے بیٹے نے چوری کا ارتکاب کیا ہے ۔ پکڑا گیا ' یہ ہے ان کا علم اور مشاہدہ ۔ اگر وہ بری الذمہ اور بے گناہ ہے اور اصل حقیقت کچھ اور ہے تو اس سے وہ بے خبر ہیں ۔ ان کو بالکل یہ توقع نہ تھی کہ ان کو ایسا حادثہ پیش آئے گا ۔ یہ تو ہے اس معاملے کا ظاہری پہلو ' اگر اصل بات کوئی اور ہو تو وہ امر غیبی ہوگی اور ہم اس کو نہیں جانتے ۔ نہ جاننے کے مکلف ہیں اور یہ بات ان کی نسبت غیب ہی تھی اور کوئی شخص غیبی واقعات کا دفاع نہیں کر سکتا ۔ اور یہ کہ اگر آپ کو ہماری بات پر یقین نہیں آتا تو آپ ' شہر کے دوسرے لوگوں سے پوچھ سکتے ہیں اور پھر مصر سے ہم جس قافلے کے ساتھ آئے ہیں ' اس سے بھی پوچھ سکتے ہیں کیونکہ وہ اکیلے تو نہ تھے ' آج کل مصر کو قافلے پر قافلہ جا رہا ہے اور وہاں سے لوگ غلہ لے کر آتے ہیں ۔ مصر کے گرد تمام علاقے قحط کی لپیٹ میں ہیں ' سخت خشک سالی ہے ۔

--- ○○○---

اب وہ کس حال میں واپس آئے ' سفر کس طرح طے ہوا ' یہاں ان تفصیلات کو حذف کر دیا گیا ہے ۔ یہ لوگ اب غم زدہ باپ کے سامنے کھڑے ہیں ۔ انہوں نے ماجرا سنا دیا ۔ غم زدہ باپ کا صرف ایک مختصر جواب سیاق کلام میں نقل کر دیا جاتا ہے ۔ نہایت ہی اندوہناک الفاظ میں ۔ لیکن ان کے کلام میں اب بھی امید کی ایک کرن باقی ہے ۔ وہ توقع کرتے ہیں کہ خدا دونوں بچے ان کو واپس کر دے گا ۔ بلکہ تینوں کو واپس کر دے گا ۔ کیونکہ تیسرا بھی مصر میں دھرنا مار کر بیٹھ گیا ہے ۔ اس بوڑھے باپ کے شکستہ دل میں اب بھی ایک عجیب امید ہے ۔ یہ ہے پیغمبرانہ بصیرت !

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾

" باپ نے یہ داستان سن کر کہا " دراصل تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک اور بڑی بات کو سہل بنا دیا ۔ اچھا میں اس پر بھی صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا ۔ کیا بعید کہ اللہ ان سب کو مجھ سے لا ملائے ' وہ سب کچھ جانتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہیں " ۔

تمہارے نفوس نے بہت ہی بڑے گناہ کو سہل بنا دیا ہے ۔ تم بھائیوں کے خلاف سازش کرتے ہو ۔ میں اس پر صبر ہی کر سکتا ہوں ۔ یہ الفاظ حضرت یعقوب ؑ نے یوسف ؑ کی گمشدگی کے وقت بھی کہے تھے ۔ لیکن اس بار یہاں وہ ایک امید بھی ظاہر کرتے ہیں کہ شاید اللہ ان سب کو واپس لا دے ۔ بے شک اللہ ہی علیم و حکیم ہے ۔ وہ میرے حالات سے بھی واقف ہے اور پسران کے بیانات کی حقیقت بھی جانتا ہے ۔ واقعات و امتحانات کی حقیقت بھی وہ جانتا ہے اور جب بھی اللہ

کی حکمت کا تقاضا ہو گا تمام واقعات و حقائق سامنے آ جائیں گے۔

امید کی یہ کرن اس بوڑھے کے دل میں کہاں سے آئی۔ یہ خدا تعالیٰ سے امید کی کرن تھی' ذات باری سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ اللہ اور اس کی رحمت کے وجود کا پختہ یقین تھا۔ اور یہ یقین اللہ کے برگزیدہ بندوں کے قلوب میں صاف نظر آیا کرتا ہے۔ اور ان کے نزدیک یہ یقین اس قدر حساس ہوتا ہے کہ اس کے مقابلے میں حواس خمسہ کا احساس کم نظر آتا ہے۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ۝

"پھر وہ ان کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ "ہائے یوسف!" اور اس کی آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں وہ دل ہی دل میں غم سے گھٹا جا رہا تھا"۔ یہ ایک غم زدہ والد کی نہایت ہی موثر تصویر کشی ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس غم کو جھیلنے کے لیے وہ تنہا ہیں' اس میں ان کے اہل و عیال کے دل شریک نہیں ہیں۔ نہ وہ اس کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور نہ یک جہتی کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ علیحدگی میں تنہا ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ اس سے قبل انہیں ایک صدمہ حضرت یوسفؑ کی گمشدگی کی صورت میں پہنچ چکا تھا' وہ اسے بھول نہ سکے۔ اور طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود اس صدمے میں بھی کوئی کمی نہ آئی تھی۔ اب تازہ صدمہ یوسفؑ کے چھوٹے بھائی کی گرفتاری کی صورت میں پیش آیا ہے' اور اس کی وجہ سے سابقہ زخم بھی تازہ ہو گئے ہیں۔ اب ان کے صبر جمیل کا پیمانہ لبریز ہوا چاہتا ہے۔

يَاَسَفٰي عَلٰي يُوْسُفَ (۱۲: ۸۴) "ہائے یوسف!" انسان اپنے غموں کو چھپاتا ہے' برداشت کرتا ہے' اس کے اعضاء ٹوٹ جاتے ہیں اس کی آنکھیں غم سے سفید ہو جاتی ہیں اور یہ غم انہیں اندر ہی اندر میں گھلا رہا ہے۔

وَ ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ (۱۲: ۸۴) "اور اس کی آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں اور وہ دل ہی دل میں غم کھائے جا رہا تھا"۔

لیکن اس کے دوسرے بیٹوں کے دل حضرت یوسفؑ کے حسد سے اس قدر بھرے ہوئے تھے کہ انہیں اپنے بوڑھے باپ کے حال پر بھی رحم نہ آ رہا تھا' ان کی سنگدلی کا یہ عالم تھا کہ ان کے والد کی یہ بے پناہ محبت بھی ان پر اثر انداز نہ ہو رہی تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ تعزیت کرتے' ان کے دل میں شمع امید روشن کرتے وہ ان کو اور مایوس کرتے اور امید کی آخری کرن کو بھی بجھانے کی سعی کرتے ہیں۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ۝

" بیٹوں نے کہا " خدارا! آپ تو بس یوسف ہی کو یاد کیے جاتے ہیں ۔ نوبت یہ آگئی ہے کہ اس کے غم میں اپنے آپ کو گھلا دیں گے یا اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے "۔

یہ نہایت ہی مکروہ اور بغض وحسد سے زہر آلود بات ہے 'خدا کی قسم آپ اپنے آپ کو یوسف ؑ کی یاد میں ہلاک کر رہے ہیں ۔ آپ دیکھتے نہیں کہ آپ پگھل کر رہ گئے ہیں۔ آخر اس غم و اندوہ اور ماتم کا اب کیا فائدہ؟ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے ۔ یوسف ؑ تو اب گیا وہ تو لوٹ کر آنے والا نہیں ہے ۔

لیکن والد ان کی اس بات کو رد فرماتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ بس چھوڑ دو مجھے ۔ میرا غم اور میرا شکوہ اللہ ہی سے ہے ۔ میرا میرے رب کے ساتھ تعلق ہے اور میں اللہ کی جانب سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۔

قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

" اس نے کہا " میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا' اور اللہ سے جیسا میں واقف ہوں' تم نہیں ہو "۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک پیغمبر کے دل میں اللہ کی حاکمیت اور اختیار مطلق کا کس قدر گہرا شعور ہوتا ہے ۔ خدا رسیدہ لوگوں کو اللہ کے انعامات کا بھی احساس ہوتا ہے اور اللہ کی جلالت شان کا گہرا شعور بھی ۔

حضرت یوسف ؑ کے متعلق جو ظاہری صورت حالات تھی وہ نہایت ہی مایوس کن تھی اور ایک طویل عرصہ بھی گزر چکا تھا ۔ ان کی تو زندگی کی امید ہی قطع ہو چکی تھی چہ جائیکہ یہ امید ہو کہ وہ اپنے والد کو اپنے پاس آنے کی دعوت دیں گے اور اس مایوس کن صورت حال ہی کے نتیجے میں ان کے بیٹوں نے ان کے اس تازہ تجسس پر سخت برہمی کا اظہار کیا ۔ لیکن یہ تمام حالات اس اللہ کے بندے کی اس پختہ امید کو متاثر نہ کر سکے جو وہ اللہ سے رکھتے تھے ۔ کیونکہ ان کا اپنے رب سے گہرا رابطہ تھا اور وہ اپنے رب کے بارے میں وہ کچھ جانتے تھے جو وہ دوسرے لوگ نہ جانتے تھے کیونکہ وہ حقائق ان کی نظروں سے اوجھل تھے ۔ خصوصاً اس واقعہ کے بارے میں ۔

یہ ہے حقیقی ایمان کی قدر و قیمت اور اللہ کی حقیقی معرفت کی شان ۔ جب اللہ کے بندوں کو معرفت حاصل ہوتی ہے تو ان پر تجلیات ہوتی ہیں ۔ اور وہ عالم شہود میں ہوتے ہیں ۔ وہ اللہ کی قدرت اور اللہ کی تقدیر سے وابستہ ہوتے ہیں ۔ اور اللہ کی نگرانی اور اس کی رحمت ان کے شامل حال ہوتی ہے ۔ وہ جانتے ہیں کہ اللہ اپنے صالح بندوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے ۔

یہ الفاظ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۲: ۸۶) " اور میں اللہ کی طرف سے جو کچھ جانتا ہوں تم نہیں جانتے " ایسے ہیں جن سے یہ حقیقت اس قدر عیاں ہے کہ ہم اس کو کسی طرح اپنے جملے میں ادا نہیں کر سکتے ۔ اس بات کو وہی شخص جان سکتا ہے جس کو حضرت یعقوب ؑ کی طرح صبر کا ذوق خاص دیا گیا ہو' ایسے ہی لوگ جان سکتے ہیں کہ ان کلمات کا مفہوم کیا ہے؟

اور جن قلوب کے اندر اس قسم کا ذوق پیدا ہو گیا ہو' یعنی معرفت الٰہی کا ذوق' ان پر اگر مشکلات اور شدائد کی بارش ہو جائے تو بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا' سوائے اس کے کہ ان شدائد سے ایسے قلوب کا تعلق باللہ' ذوق معرفت اور مشاہدۂ حق مزید قوی ہو جاتا ہے ۔

میں اس کے سوا اور کچھ کہنے کی طاقت نہیں رکھتا' لیکن میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کا مجھ پر بہت ہی بڑا کرم ہے۔ اس کا میرے ساتھ جو تعلق ہے اسے وہ جانتا ہے یا میں۔ وہ تو علیم و خبیر ہے۔

اب حضرت یعقوب علیہ السلام یوسف اور اس کے بھائیوں کی تلاش کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور لڑکوں کو کہتے ہیں کہ وہ مایوس نہ ہوں اللہ کی رحمت بہت ہی وسیع ہے' اس بات کا امکان ہے کہ وہ سب مل جائیں۔ رحمت الٰہی کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

"میرے بچو' جاکر یوسف ؑ اور اس کے بھائی کی کچھ ٹوہ لگاؤ' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو' اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں"۔

یہ ہے اس دل کی آواز جو اللہ تک پہنچا ہوا ہے!!--- "میرے بچو جاکر یوسف ؑ اور اس کے بھائی کی کچھ ٹوہ لگاؤ' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو"۔ اپنے پورے حواس کو استعمال کرو' نہایت رقت سے' گہری نظروں سے اور مستقل مزاجی سے تلاش کرو۔ اللہ کے فضل و کرم سے کسی بھی وقت مایوسی کا اظہار نہ کرو۔ یہاں اللہ کے کرم کے لیے (روح) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اللہ کی رحمت پر گہرائی سے دلالت کرتا ہے اور اس میں یہ اشارہ بھی پایا جاتا ہے کہ مشکلات کے بعد اب آسانیوں کا دور آنے والا ہے۔ کیونکہ جان کن مشکلات کی بعد اب اللہ کی رحمت کی شبنم سے روح کو تراوت ملنے والی ہے۔

وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ

(۱۲ : ۸۷) "اللہ کی رحمت سے تو صرف کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں"۔ رہے وہ مومن جن کے دل اللہ تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں جن کی روح پر معرفت الٰہی کی شبنم گرتی ہے' جن کے اوپر رحمت الٰہی کی روح پرور خوشگوار ہوا کے جھونکے چلتے ہیں' وہ کبھی بھی اللہ کے فضل و کرم سے مایوس نہیں ہوتے اگرچہ مشکلات ناقابل برداشت ہو جائیں اور ان کا کلیجہ منہ کو آ جائے۔ مومن ہمیشہ ایمان کی چھاؤں میں ہوتا ہے' وہ تعلق باللہ کی وجہ سے اللہ سے مربوط ہوتا ہے۔ اپنے مولا پر اسے بھروسہ ہوتا ہے۔ اور یہ بھروسہ انتہائی کرب و الم میں بھی زندہ رہتا ہے۔

--- ooo---

اب تیسری مرتبہ برادران یوسف مصر کے شہر میں داخل ہوتے ہیں۔ قحط نے ان کا برا حال کر رکھا ہے۔ نقدی ختم ہے' اب وہ ردی قسم کا مال اور روپیہ لے کر آئے ہیں اور اس کے سوا ان کے پاس کچھ بچا بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ اس حال میں داخل ہوتے ہیں کہ ان کی شخصیت ٹوٹی ہوئی ہوتی ہے' اب وہ پرانی باتیں کرنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ اس

موقعے پر انہوں نے اپنی بدحالی کا جو شکوہ کیا اس سے ان کا حال اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾

"جب یہ لوگ مصر جاکر یوسفؑ کی پیشی میں داخل ہوئے تو انہوں نے عرض کیا کہ "اے سردار بااقتدار' ہم اور ہمارے اہل و عیال سخت مصیبت میں مبتلا ہیں' اور ہم کچھ حقیر سی پونجی لے کر آئے ہیں' آپ ہمیں بھرپور غلہ عنایت فرمائیں اور ہم کو خیرات دیں' اللہ خیرات دینے والوں کو جزا دیتا ہے"۔

یوسفؑ نے جب دیکھا کہ اس کے بھائی اس قدر خستہ حال ہوگئے ہیں اور ان کے اندر اس قدر انکسار آگیا ہے اور وہ رحم کی اپیلیں کر رہے ہیں تو وہ اپنے مرتبے اور مقام کا مزید مظاہرہ جاری نہ رکھ سکے۔اب ان کے لیے ممکن ہی نہ رہا کہ اپنی شخصیت کو ان سے چھپا سکیں۔ جو سبق ان کو دینا مقصود تھا وہ دے چکے۔اب وقت آگیا ہے کہ ان کو وہ عظیم سرپرائز دیا جائے جس کے لیے وہ بالکل تیار نہ تھے۔ان کو تصور ہی نہ تھا کہ وہ یوسفؑ کے دربار میں کھڑے ہیں۔چنانچہ وہ براہ کرم ان پر اپنی حقیقت ظاہر فرماتے ہیں۔وہ اشارہ کرتے ہیں کہ دیکھو تم نے ماضی میں وہ کیا کرتوت کیا تھا؟ یہ تو ان کی زندگی کا راز تھے۔اس کے بارے میں انہوں نے کسی کو بتایا ہی نہ تھا۔ صرف اللہ جانتا تھا۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾

("یہ سن کر یوسفؑ سے نہ رہا گیا) اس نے کہا "تمہیں کچھ یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا جب کہ تم نادان تھے"۔اب ان کے کانوں میں ایک ایسی آواز پڑی جو انہیں مانوس نظر آئی۔انہیں حضرت یوسفؑ کے چہرے کے خدوخال اب ایسے نظر آئے کہ وہ دیکھا ہوا چہرہ ہے۔اس سے قبل وہ اپنے آپ کو بظاہر عزیز مصر کے سامنے پاتے تھے اور یہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ یہ شخص یوسفؑ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ وہ شاہی دربار کے رعب کے نیچے تھے لیکن اب دور ہی سے انہیں نظر آگیا کہ یہ تو بھائی کا چہرہ ہے۔

قَالُوْۤا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَ هٰذَاۤ اَخِیْ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾

"وہ چونک کر بولے "ہائیں! کیا تم یوسفؑ ہو؟" اس نے کہا "ہاں' میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔اللہ نے ہم پر احسان فرمایا۔حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی تقویٰ اور صبر سے کام لے تو اللہ کے ہاں ایسے نیک لوگوں کا اجر مارا نہیں

جاتا"۔ اب ان کو یقین ہو گیا اور کہا کہ تم ہی یوسف ہو۔ اگرچہ یوسف اب ایک معمر آدمی ہیں۔ اس کے بچپن کے خدوخال صاف صاف نظر آنے لگے۔

حضرت یوسف نے اچانک اپنے آپ کو ظاہر کیا اور اجمالاً وہ ان کو بتاتے ہیں کہ انہوں نے جہالت میں اپنے بھائی یوسف کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ بس وہ صرف یہی بات کہتے ہیں اور اللہ کے ان احسانات کا تذکرہ کرتے ہیں جو ان پر اور ان کے بھائی پر ہوئے۔ اور یہ احسانات اس لیے ہوئے کہ ہم نے تقویٰ اور صبر کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور یہ سب کچھ اللہ کے نظام عدل کا نتیجہ ہے۔ وہ متقین و صابرین کو جزائے خیر دیتا ہے۔

لیکن اس اچانک انکشاف کا اثر ان بھائیوں پر کیا ہوا؟ ان کی آنکھوں کے سامنے وہ پوری گھناؤنی صورت حال مجسم ہو گئی جو وہ یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کرتے رہے تھے۔ یہ بے حد شرمندہ ہیں۔ جس کے ساتھ انہوں نے برا کیا وہ بطور محسن کھڑا ہے، جس کے ساتھ انہوں نے سنگدلی کی وہ نہایت ہی حلیم ہے اور جس کے ساتھ انہوں نے ظلم کیا وہ کریم اور محسن ہے۔ اب اس کے سوا وہ کہہ کیا سکتے تھے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۱﴾

"انہوں نے کہا" بخدا کہ تم کو اللہ نے ہم پر فضیلت بخشی اور واقعی ہم خطاکار تھے"۔

انہوں نے اپنی غلطی کا صاف صاف اقرار کر لیا۔ گناہ کا اعتراف کر لیا۔ انہوں نے جان لیا کہ اللہ نے ان پر اسے ترجیح دے دی ہے کیونکہ وہ حلیم الطبع، متقی اور محسن تھے۔ اور ان کے اس صاف صاف اعتراف کے جواب میں حضرت یوسف ان کو تہ دل سے معاف فرماتے ہیں۔ اس طرح ان کی شرمندگی میں کمی آتی ہے اور اہل کرم کا شیوہ ہی عفو و درگزر ہوتا ہے۔ یوسف جس طرح مشکلات میں کامیاب ہوئے تھے، اسی طرح اقتدار کی آزمائش میں بھی کامیاب ہوتے ہیں۔ یقیناً وہ محسنین میں سے ایک تھے۔

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾

"اس نے جواب دیا" آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے، وہ ارحم الراحمین ہے"۔

آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں، کوئی انتقام نہیں اور تمہیں شرمندہ ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تمام کدورتوں کو دل سے نکال دیا ہے۔ اللہ بھی تمہیں معاف کر دے۔ بے شک وہ ارحم الراحمین ہے۔ اب روئے سخن ایک دوسرے اہم معاملے کی طرف پھر جاتا ہے۔ اب اس باپ کی فکر دامن گیر ہو جاتی ہے جن کی آنکھیں یوسف کے انتظار میں سفید ہو گئی ہیں۔ سب سے پہلے انہیں خوشخبری دینا ضروری ہے۔ سب سے پہلے ان سے ملنا فرض ہے۔ ان کے دل کی کدورتوں کو دور کرنا ضروری ہے اور وہ جس جسمانی اور روحانی اذیت میں ہیں، اس سے ان کو جلد از جلد نکالنا ضروری ہے اور سب سے پہلے ان کی بینائی!

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ ۱۰
۱۴ع وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۳﴾

۴ ''جاؤ' میری یہ قمیض لے جاؤ اور میرے والد کے منہ پر ڈال دو' ان کی بینائی پلٹ آئے گی اور اپنے سب اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ''۔

سوال یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ ان کی قمیض کی بو سے ان کے والد کی گئی ہوئی بینائی لوٹ آئے گی؟ یہ ہے وہ علم جو انہیں اللہ نے دیا تھا۔ اور اچانک خوشی اور اچانک غم میں بعض اوقات ایسے معجزات صادر ہو جاتے ہیں جبکہ حضرت یوسفؑ' نبی' رسول ہیں اور حضرت یعقوبؑ بھی نبی اور رسول ہیں۔

--- ○○○ ---

اب دوسری جانب کنعان کے منظر میں بھی غیر متوقع انکشافات ہو رہے ہیں اور کنعان کے مناظر اب یوسفؑ کے اس خواب کی آخری تعبیر پر ختم ہوتے ہیں جو انہوں نے بچپن میں دیکھا تھا۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ
لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾

''جب یہ قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے باپ نے (کنعان میں) کہا ''میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں' تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں''۔ گھر کے لوگ بولے ''خدا کی قسم آپ ابھی تک اپنے اسی پرانے خبط میں پڑے ہوئے ہیں''۔

یوسفؑ کی خوشبو! یہ کیا کہہ رہے ہیں' کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ اس قدر طویل عرصہ کے بعد بھی یوسفؑ زندہ ہو گا اور یہ بوڑھا اس کی بو سونگھ رہا ہو گا! --- یہی وجہ ہے کہ وہ کہتا ہے میں یوسفؑ کی خوشبو پا رہا ہوں' اگر تم میرا مذاق نہ اڑاؤ' در حقیقت میں یہ خوشبو پا رہا ہوں۔

سوال یہ ہے کہ ادھر مصر سے قافلہ چلا' ادھر کنعان میں حضرت یوسفؑ کی بو پا رہے ہیں۔ یہ کیونکر ہو گیا' کیا یہ قافلہ مصر سے چلا تو ان کو بو آنے لگی۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ قافلہ مصر سے چلا اور انہوں نے بو کو سونگھ لیا۔ اس قدر دور سے۔ لیکن آیت میں مصر کی تصریح نہیں ہے' ہو سکتا ہے کہ قافلہ کنعان کے قریب کسی دوراہے سے جب جدا ہوا تو حضرت یعقوبؑ کے مقام رہائش کے قریب انہیں یہ خوشبو آ گئی ہو۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم مصر کی دوری سے بطور معجزہ اس بو کو محسوس کرنے کو مستبعد سمجھتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ یہ معجزہ ہوا ہو۔ کیونکہ حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ دونوں نبی ہیں۔ ہمارا مقصد اور طریقہ یہ ہے کہ آیت قرآن

جس قدر مفہوم دیتی ہیں ہم اسی پر توقف کریں۔ خصوصاً جبکہ آیت پر اضافی مفہوم کے لیے سند صحیح کے ساتھ کوئی روایت بھی مروی نہ ہو۔ یہاں بھی اس بات پر صحیح سند سے مروی کوئی روایت نہیں ہے کہ یہ خوشبو مصر سے آئی۔ محض قیاس اور دلالۃ النص سے ایسے مفہوم کو اخذ نہیں کرنا چاہئے۔

لیکن حضرت یعقوب ؑ کے اردگرد جو لوگ بیٹھے تھے ان کے اندر وہ احساس نہ تھا جو رب نے ان کو عطا کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت یوسف ؑ کی خوشبو کو نہ پایا۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ (۱۲ : ۹۵) ''انہوں نے کہا خدا کی قسم بے شک آپ اپنی پرانی غلط فہمی میں پڑے ہیں''۔ آپ اپنی پرانی غلط فہمی میں مبتلا ہیں' اب بھی یوسف ؑ کا انتظار کر رہے ہیں حالانکہ وہ ان راستوں پر چل نکلا ہے جن سے واپسی ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس پوری کہانی میں جگہ جگہ معجزات اور مناجات ہیں۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ

''پھر جب خوشخبری لانے والا آیا تو اس نے یوسف کا قمیض یعقوب ؑ کے منہ پر ڈال دیا اور یکایک اس کی بینائی عود کر آئی''۔ اچانک ان کے چہرے پر قمیض ڈال دی جاتی ہے' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت یوسف ؑ کے ساتھ ملاقات اب بہت ہی قریب ہے۔ اچانک معجزانہ طور پر بینائی لوٹ آتی ہے۔ یہاں حضرت یعقوب ؑ اپنے حاشیہ نشینوں کو بتاتے ہیں کہ یہ ہے وہ چیز جس کا علم ان کو تھا۔ اور رب کی طرف سے تھا اور اسی علم کا میں نے تم سے تذکرہ کیا تھا۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚۙ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ۝

''تب اس نے کہا ''میں تم سے کہتا نہ تھا؟ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔ سب بول اٹھے ابا جان' آپ ہمارے گناہوں کی بخشش کے لیے دعا کریں' واقعی ہم خطاکار تھے''۔

یہاں یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ حضرت یعقوب اپنے بیٹوں سے ناراض تھے لیکن انہوں نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ بلکہ وہ ان کے ساتھ یہ وعدہ فرماتے ہیں کہ میں تمہارے لیے اللہ سے عفو و درگزر کی درخواست کروں گا۔ ذرا استا لینے دو' ذرا دل کی کدورتوں کو صاف ہونے دو اور ذرا سکون کا سانس لے لینے دو۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝

اس نے کہا ''میں اپنے رب سے تمہارے لیے معافی کی درخواست کروں گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے''۔ لفظ سوف کے ساتھ وعدہ دعا سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے زخمی دل سے کدورت نکلتے نکلتے وقت لگتا

ہے - دلوں کی کدورت جلدی صاف نہیں ہوتی -

--- ○○○---

اب یہاں اس قصے کا خاتمہ بھی اس قصے کے دوسرے اچانک مناظر اور معجزانہ واقعات کی طرح اچانک ہو جاتا ہے -
زمان و مکان کے فاصلوں کو لپیٹ لیا جاتا ہے اور آخری تبصرہ یوں آتا ہے اور اس میں بے شمار موڑ اور جذباتی مناظر ہیں -

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ
اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَ
قَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ؗ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَ قَدْ اَحْسَنَ
بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ
الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ
الْحَكِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

"پھر جب یہ لوگ یوسف ؑ کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے والدین کو اپنے ساتھ بٹھا لیا اور اپنے سب کنبے والوں سے کہا "چلو' اب شہر میں چلو' اللہ نے چاہا تو امن چین سے رہو گے" - (شہر میں داخل ہونے کے بعد) اس نے اپنے والدین کو اٹھا کر اپنے پاس تخت پر بٹھایا اور سب اس کے آگے بے اختیار سجدے میں جھک گئے - یوسف ؑ نے کہا "ابا جان' یہ تعبیر ہے میرے اس خواب کی جو میں نے پہلے دیکھا تھا - میرے رب نے اسے حقیقت بنا دیا - اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھے قید خانے سے نکالا' اور آپ لوگوں کو صحرا سے لا کر مجھ سے ملایا' حالانکہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال چکا تھا - واقعہ یہ ہے کہ میرا رب غیر محسوس تدبیروں سے اپنی مشیت پوری کرتا ہے' بے شک وہ علیم اور حکیم ہے" -

یہ کیا ہی خوب صورت منظر ہے! ایک عرصہ گزر گیا ہے اور یوسف ؑ لاپتہ ہیں - ان کے بارے میں مکمل مایوسی پائی جاتی ہے اور لوگ انہیں پوری طرح بھول چکے ہیں - رشتہ دار اس کے رنج سہ چکے ہیں' یوسف ؑ پر بھی اور پسماندگان پر بھی عرصہ بیت چکا ہے - حضرت یعقوب ؑ کا رنج و الم' ناقابل کنٹرول پدری محبت کا جوش اور جان کن رنج اور حزن کا طویل عرصہ اور پھر اچانک حالات کا یہ پلٹا --- یہ ایک ایسا اچانک منظر ہے کہ جس میں دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں' خوشی کے آنسو بہہ نکلتے ہیں اور ہر طرف گہرے تاثرات ہیں' خوشی کے بھی اور شرمندگی کے بھی -

یہ ایک ایسا منظر ہے جو اس قصے کے آغاز کے ساتھ ہم آہنگ ہے' آغاز میں عالم غیب کی طرف غائبانہ اشارات تھے لیکن وہ سب اشارات اب عالم واقعہ ہیں اور ایسے حالات میں بھی حضرت یوسف ؑ کی زبان پر ثنائے ربانی ہے -

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ (۱۲:۹۹)

"پھر جب یہ لوگ یوسفؑ کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے والدین کو اپنے ساتھ بٹھالیا اور اپنے سب کنبے والوں سے کہا "چلو' اب شہر میں چلو' اللہ نے چاہا تو امن چین سے رہو گے"۔

حضرت یوسفؑ اب اپنا خواب یاد کرتے ہیں اور اس کی تاویل ان کے سامنے ہے کہ ان کے بھائی ان کے سامنے سجدہ ریز ہیں ۔ درآنحالیکہ اس نے اپنے والدین کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا ہوا ہے ۔ اب گیارہ ستارے اور الشمس و قمران کے سامنے ہیں اور سجدہ ریز ہیں ۔

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا (۱۲ : ۱۰۰) "اس نے اپنے والدین کو اٹھا کر اپنے پاس تخت پر بٹھایا اور سب اس کے آگے بے اختیار سجدے میں جھک گئے ۔ یوسفؑ نے کہا "ابا جان' یہ تعبیر ہے میرے اس خواب کی جو میں نے پہلے دیکھا تھا ۔ میرے رب نے اسے حقیقت بنا دیا"۔

اور رب کے احسانات کی تو حد نہیں ہے ۔

وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ (۱۲ : ۱۰۰) "اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھے قید خانے سے نکالا' اور آپ لوگوں کو صحرا سے لا کر مجھ سے ملایا' حالانکہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال چکا تھا"۔

اور پھر حضرت یوسفؑ اللہ کی خفیہ تدابیر کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ للہ تعالیٰ کی حد ہی نہیں ہے ۔

اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ (۱۲ : ۱۰۰) "حقیقت یہ ہے کہ میرا رب غیر محسوس تدبیروں سے اپنی مشیت پوری کرتا ہے"۔ وہ نہایت ہی خفیہ طریقوں سے اپنی مشیت کے مقاصد پورے کرتا ہے ۔ اس قدر خفیہ طریقے سے کہ لوگ اس کو سمجھ ہی نہیں سکتے ۔

اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (۱۲ : ۱۰۰) "بے شک وہ علیم و حکیم ہے"۔ اور یہ وہی انداز ہے جو خود حضرت یعقوبؑ نے اختیار کیا ۔ جب حضرت یوسفؑ ان کے ساتھ اپنا خواب بیان کر رہے تھے ۔ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ "بے شک تمہارا رب علیم و حکیم ہے"۔ اس طرح آغاز قصہ اور اختتام قصہ ایک ہی تبصرے کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور اختتام پذیر ہوتا ہے ۔

آخری منظر کے اختتام سے قبل 'ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ اس ملاقات ' خوشی اور مسرت کے منظر اور پھر تخت و تاج اور جاہ و منزلت اور امن و سکون اور عیش و آرام کی تقریب سے اچانک نکل آتے ہیں ۔ آخر وہ پیغمبر خدا ہیں اور رب ذوالجلال کی تسبیح و تہلیل میں مشغول ہو جاتے ہیں اور ایک شکر گزار بندے کی شکل میں سامنے آتے ہیں ۔ اور دست بدعا ہوتے ہیں کہ جاہ و منزلت کے اس اونچے مقام پر اللہ ان کو ایک صحیح مسلمان ہونے کی توفیق بخشیں اور صالحین میں ان کو اٹھالیں ۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۟ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

"اے میرے رب ' تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھایا۔ زمین و آسمان کے بنانے والے ' تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا سرپرست ہے ' میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجام کار مجھے صالحین کے ساتھ ملا"۔ اے رب تو نے مجھے بادشاہت بخشی ' اونچا مقام و مرتبہ دیا۔ مال و دولت سے نوازا اور تمام دنیاوی نعمتیں عطا کر دیں۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ (۱۲ : ۱۰۱) "اے رب تو نے مجھے حکومت بخشی"۔ اور پھر تو نے مجھے معاملہ فہمی عطا فرمائی۔

وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ (۱۲ : ۱۰۱) "اور مجھ کو باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھایا"۔ مثلاً معاملات سے بر آمد ہونے والا انجام پہلے ہی میرے علم میں آجاتا ہے۔ خوابوں کی تعبیر کا علم مجھے سکھایا گیا اور یہ اے اللہ تمہارا بہت ہی بڑا انعام ہے۔ اے اللہ تو خالق ہے اور تیرے انعامات کا ذکر اور گننا ایک بندے کا فرض ہے۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۲ : ۱۰۱) "زمین و آسمان بنانے والے"۔ تو نے اس کائنات کو کن فیکون سے تخلیق کیا اور اس کا پورا کنٹرول تیرے ہاتھ میں ہے اور تو ہی اس کائنات پر اور اس کے اندر رہنے والوں پر قدرت رکھتا ہے"۔

اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (۱۲ : ۱۰۱) "تو ہی دنیا و آخرت میں میرا سرپرست ہے"۔ تو ہی مددگار اور نصرت کرنے والا ہے۔ اے اللہ یہ ہیں تیرے انعامات اور یہ ہیں تیری قدرتیں۔

اے میرے رب میں تجھ سے حکومت طلب نہیں کرتا ' میں تجھ سے صحت طلب نہیں کرتا ' اور میں تجھ سے مال طلب نہیں کرتا۔ رب ذوالجلال ' میں وہ چیز طلب کرتا ہوں جو دیر تک باقی رہنے والی ہے۔

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ (۱۲ : ۱۰۱) "میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجام کار مجھے صالحین کے ساتھ ملا"۔ یوں حکومت اور جاہ و مرتبت غائب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ملاقات کی خوشیاں اور اہل و عیال اور بھائیوں کا اجتماع نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور اب منظر پر ایک بندۂ خدا سامنے آتا ہے۔ یہ نہایت ہی عاجزی سے دست بدعا ہیں کہ اے رب ' میرے اسلام کو محفوظ کیجیو۔ یہاں تک کہ میں تیرے سامنے مسلم ہو کر آؤں اور یہ کہ مجھے اہل صلاح و تقویٰ کی سوسائٹی میں جگہ دیجئے --- یہ آخری امتحان ہے اور یہ ہے مکمل کامیابی!

--- ○○○ ---

# درس نمبر ۱۱۱ تشریح آیات

## ۱۰۲ --- تا --- ۱۱۱

یہاں آکر حضرت یوسف علیہ السلام کا اصل قصہ ختم ہو جاتا ہے اور اب اس پر سبق آموز تبصرے کیے جاتے ہیں۔ اس سورہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے ان اغراض و مقاصد کی طرف اشارہ کیا تھا جس کے لیے یہ قصہ تفصیل سے بیان کیا گیا۔ یہاں اب عبرت کے لیے کئی باتوں کی طرف قارئین کو متوجہ کیا جاتا ہے اور ان کے احساسات کو جگایا جاتا ہے۔ اس کائنات کی وسعتوں اور نفس انسانی کی گہرائیوں میں فکر انسانی کو دوڑایا جاتا ہے۔ گزشتہ لوگوں کے حالات 'موجودہ حالات اور پردۂ غیب کے پیچھے مستور حقائق بتائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس آخری تبصرے کے اندر بیان کردہ حقائق کو ہم اسی ترتیب سے لیتے ہیں کیونکہ یہ قرآنی ترتیب بھی حکمت پر مبنی ہے۔

--- ○○○ ---

یہ قصہ عربوں میں مشہور نہ تھا' وہ عرب معاشرہ جس میں حضور ﷺ نے پرورش پائی ان واقعات سے بے خبر تھا۔ انہی لوگوں میں حضور ﷺ کی بعثت ہوئی۔ چونکہ اس قصے کے کرداروں کے حالات میں بہتر اسرار و رموز تھے 'اگرچہ وہ صدیوں پرانے کردار تھے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورہ کے آغاز ہی میں اسے احسن القصص کہا ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ وَإِن كُنتَ مِن قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ (۱۲ : ۳) "ہم آپ کے سامنے احسن القصص بیان کرتے ہیں' یوں کہ ہم نے تمہاری طرف یہ قرآن وحی کیا اگرچہ اس سے قبل آپ غافلوں میں سے تھے"۔ اور اب اس قصے کے اختتام پر تعقیب یوں آرہی ہے' اور یوں اس کے اختتام میں بھی اس کے آغاز کی طرف اشارہ ہے۔

ذَٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ ۖ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ ﴿١٠٢﴾

"اے نبی ﷺ' یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں' ورنہ تم اس وقت موجود نہ تھے جب یوسف ؑ کے بھائیوں نے آپس میں اتفاق کر کے سازش کی تھی"۔ یہ قصہ جو گزشتہ صفحات میں بیان کیا گیا' ان غیبی خبروں

میں سے ہے جسے اللہ کے سوا کوئی نہ جانتا تھا۔ تم بھی نہ جانتے تھے اور ہم نے یہ تمہاری طرف وحی کیے اور یہ ایک زندہ معجزہ ہے' اے پیغمبر جب وہ یہ سازش تیار کر رہے تھے تو آپ ان کے پاس موجود نہ تھے' خصوصاً جب انہوں نے اپنا ایکشن پلان تیار کر لیا اور جس کی تفصیلات اس پورے قصے' میں دی گئیں ۔۔انہوں نے یوسف ؑ کے خلاف بھی سازش کی' اپنے باپ کے خلاف بھی سازش کی۔ پھر جب یوسف ؑ نے اپنے بھائی کو پکڑ لیا تو یہ لوگ علیحدہ ہو کر مشورہ کرنے لگے جو ان کی جانب سے ایک مکر یعنی تدبیر تھا۔ نیز اس میں عورتوں کی جانب سے یوسف ؑ کے خلاف بھی مکاریاں تھیں ۔پھر اس میں عزیز مصر کی پارلیمنٹ کی مکاری بھی تھی کہ انہوں نے ناحق حضرت یوسف ؑ کو جیل بھجوا دیا۔ یہ سب کچھ مکر تھا اور اے پیغمبر آپ کو ان میں سے کسی مکاری کا علم نہ تھا۔ نہ آپ اس وقت موجود تھے کہ آپ نے اس قدر دقت کے ساتھ قلمبند کر دیا بلکہ یہ وحی ہے اور اس سے اس نئے نظریہ حیات اور نئے دین کے بنیادی عقائد کو ثابت کرنا مقصود ہے ۔ اور اس قصے' کے مختلف مشاہد اور مناظر ہیں ۔اس جدید نظریہ حیات کے مسائل اور افکار اس میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔

---ooo---

یہ قصہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ یہ کلام وحی الہی ہے' اس کے اشارات' تاثرات اور ہدایات دلوں کو متحرک کرتی ہیں' اور ان سب کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ پھر اس کلام پر ایمان لائیں۔ خصوصاً جبکہ یہ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذاتی احوال سے بھی باخبر ہیں ۔ وہ آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں اور آپ ان کے سامنے ایسی ایسی نصیحت آموز غیبی دلچسپ خبریں دیتے ہیں' لیکن اس کے باوجود لوگوں کی اکثریت مان کر نہیں دیتی ۔ لوگوں کی اکثریت اس کائنات میں بکھری ہوئی آیات و معجزات کو رات دن دیکھتے ہیں لیکن انہیں ہوش نہیں آتا۔ یہ لوگ ان آیات و دلائل کے مفہوم کو نہیں سمجھتے ۔ مثلاً ایک اندھے کی طرح کہ وہ ایک جانب سے دوسری جانب منہ موڑتا ہے اور اسے کچھ خبر نہیں لگتی۔ سوال یہ ہے کہ اس معجزانہ قصہ کے بعد اب یہ لوگ کس بات کا انتظار کرتے ہیں۔ کیا وہ اللہ کے ایسے عذاب کا انتظار کر رہے ہیں کہ جو ان کو اچانک پکڑ لے اور ان کو کوئی شعور نہ ہو؟

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ
اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۱۱ ع ۱۱
يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ ۵
مُّشْرِكُوْنَ ۝ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ
بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

"مگر تم خواہ کتنا ہی چاہو' ان میں سے اکثر لوگ مان کر دینے والے نہیں ہیں۔ حالانکہ تم اس خدمت پر ان سے کوئی اجرت بھی نہیں مانگتے ہو۔ یہ تو ایک نصیحت ہے جو دنیا والوں کے لیے عام ہے۔ زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں

جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے۔ ان میں سے اکثر اللہ کو مانتے ہیں مگر اس طرح کہ اس کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں۔ کیا یہ مطمئن ہیں کہ خدا کے عذاب کی کوئی بلا انہیں دبوچ نہ لے گی یا بے خبری میں قیامت کی گھڑی اچانک ان پر نہ آجائے گی"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بڑی شدت کے ساتھ یہ چاہتے تھے کہ آپ کی قوم ایمان لے آئے۔ آپ چاہتے تھے کہ آپ جو بھلائی لے کر آئے ہیں وہ ان تک پہنچ جائے اور وہ محروم بھی نہ رہیں' نیز آپ کو اپنی برادری پر ترس آ رہا تھا کہ اگر وہ شرک کی حالت پر ہی رہے تو دنیا میں بھی ان کو روز بد دیکھنا ہو گا اور آخرت میں وہ دائمی عذاب میں مبتلا رہیں گے لیکن اللہ تعالیٰ تو انسانی دلوں کے بہت ہی قریب ہے' وہ علیم و خبیر ہے۔ وہ انسانوں کے مزاج اور ان کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اس لیے حضور اکرم ؐ کو بتلایا جاتا ہے کہ آپ کی یہ حرص اور یہ شدید خواہش ان کو اسلام کی طرف راغب نہ کر سکے گی' اور ان میں سے اکثر مشرک ہی رہیں گے اس لیے کہ یہ لوگ آیات الٰہی کو دیکھ کر یونہی گزر جاتے ہیں' منہ پھیر لیتے ہیں اور ان کا یہ اعراض ہی ان کے راستے کا روڑا ہے۔ ان کو ایمان سے روک رہا ہے۔ اس کائنات میں جگہ جگہ جو دلائل بکھرے ہوئے ہیں' یہ ان سے استفادہ نہیں کرتے۔

آپ تو فقط تبلیغ پر مامور ہیں' اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو آپ کا کچھ نقصان نہیں ہے۔ آپ اس کام کے لیے کسی سے کوئی اجر طلب نہیں کرتے۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اعراض کرتے ہیں اور ہدایات سے منہ پھیرتے ہیں حالانکہ یہ ہدایت انہیں مفت فراہم کی جا رہی ہے۔

وَ مَآ تَسۡـَٔلُهُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (۱۲: ۱۰۴) "یہ تو ایک نصیحت ہے جو دنیا والوں کے لیے عام ہے"۔ آپ اُن کو آیات الٰہیہ کی یاد دہانی کرا رہے ہیں' ان کی بصارت اور بصیرت دونوں کو راہ ہدایت کی طرف موڑنا چاہتے ہیں اور یہ رہنمائی تمام جہان والوں کے لیے عام ہے' یہ کسی ایک قوم' کسی مخصوص نسل اور کسی خاص قبیلے کے لیے محدود نہیں ہے۔ اس کی کوئی بھی قیمت مقرر نہیں ہے کہ کوئی ادا کرنے سے قاصر ہو' صرف اغنیاء ہی اسے خرید سکتے ہیں۔ فقراء کے بس کی بات نہ ہو۔ نیز اس کے حصول کے لیے کوئی جسمانی توانائی کی شرط بھی نہیں ہے کہ طاقتور لوگ اسے حاصل کر سکتے ہیں اور ناتواں اس کے حصول سے عاجز ہوں۔ یہ تو تمام جہان والوں کے لیے کھلی نصیحت ہے۔ یہ ایک ایسا کھلا دسترخوان ہے جس پر تمام لوگ مدعو ہیں جو چاہے اسے قبول کر لے۔

وَ كَاَيِّنۡ مِّنۡ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ يَمُرُّوۡنَ عَلَيۡهَا وَهُمۡ عَنۡهَا مُعۡرِضُوۡنَ

(۱۲: ۱۰۵) "زمین و آسمان میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے"۔ وہ نشانیاں جو ذات باری پر گواہی دے رہی ہیں' جو اللہ کی وحدانیت اور قدرت پر دلالت کرتی ہیں وہ اس کائنات میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں اور لوگوں کی بصارت اور بصیرت کو دعوت نظارہ دے رہی ہیں۔ یہ آسمانوں میں بھی ہیں اور زمین میں بھی ہیں اور یہ لوگ صبح و شام ان کا مشاہدہ بھی کر رہے ہیں۔ رات کے وقت بھی یہ ان کے سامنے ہوتی ہیں اور صبح کے وقت بھی۔ یہ لوگوں کو پکار پکار کر دعوت دے رہی ہیں اور یہ اس قدر کھلی ہیں کہ لوگوں کی نظروں اور ان کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہے۔ یہ انسان کے قلب و نظر کو دعوت فکر دے رہی ہیں' لیکن لوگ نہ ان کو دیکھتے

ہیں' نہ ان کی پکار کی طرف کان دھرتے ہیں اور نہ ان کے جھنجھوڑنے سے ان کا احساس جاگتا ہے۔

ذرا ایک لمحے کے لیے سورج کے طلوع اور غروب پر ہی غور کر لو' ذرا درختوں کے سائے پر ہی غور کر لو کہ کس طرح غیر محسوس انداز میں گھٹتا بڑھتا ہے۔ ذرا ناپید کنار سمندر کو دیکھو' ذرا زمین میں سے ابلتے ہوئے چشموں کو دیکھو' ذرا بہتی ہوئی ندیوں کا نظارہ کرو' ذرا فضائے آسمانی میں اڑنے والے پرندوں کو دیکھو' اور پھر ذرا پانی کے اندر تیرتی ہوئی رنگ برنگ مچھلیوں کو دیکھو' ذرا سطح زمین پر رینگنے والے کیڑوں کو دیکھو' چیونٹیوں اور دوسرے حشرات و حیوانات کے اس لشکر عظیم کو دیکھو اور وہ حیوانات و جراثیم جو نظر ہی نہیں آتے' اور گردش لیل و نہار کو دیکھو' رات کے سکون اور دن کی خوشیوں کو دیکھو۔ ایک لمحے کا غور و فکر انسان پر اس کائنات کے عجائبات کا دروازہ کھول سکتا ہے۔ یہ مختصر اور متفکرانہ لحظہ ہی انسانی ادراک کی دنیا میں ایک وسیع ارتعاش پیدا کر سکتا ہے اور انسان فطرت کائنات کی پکار پر لبیک کہہ سکتا ہے لیکن يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (۱۲:۱۰۵) "یہ لوگ ان پر گزرتے ہیں لیکن توجہ نہیں کرتے"۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ پھر وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں ان کی فکر و نظر میں بھی کسی نہ کسی راہ سے شرک داخل ہو گیا ہے۔ لہٰذا ایمان خالص کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر لمحہ بیدار اور چوکنا رہے اور دل سے ہر قسم کے شیطانی وسوسوں کو نکال باہر کرے۔ دل کو ہر قسم کی دنیاوی آلائشوں سے پاک کر دے۔ اپنی ہر سوچ' ہر عمل اور ہر قسم کے تصرفات و اقدامات میں رضائے الٰہی کو پیش نظر رکھے۔ ہر عمل اور ہر اقدام اللہ کرے' ایمان خالص وہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہو' وہ انسان کے قول و فعل اور طرز عمل پر پوری طرح حکمران ہو' اور وہ انسان پر اس طرح اثر انداز ہو کہ انسان کی زندگی پر اللہ کے سوا کسی اور کی حکمرانی باقی نہ رہے۔ انسان اپنے کسی معاملے میں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرے۔ اور وہ اس حاکم کا بندہ ہو جس کے حکم کو کوئی بھی رد کرنے والا نہیں ہے۔

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (۱۲:۱۰۶) "ان میں سے اکثر اللہ کو مانتے ہیں مگر اس طرح کہ وہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں"۔ یہ لوگ کیسے مشرک ہیں؟ یہ اس کرۂ ارض پر واقعات' اشیاء اور اشخاص کی قدر و قیمت کے تعین میں شرک کرتے ہیں۔ انسان کے نفع پہنچنے میں اور انسان کو مضرت سے بچانے کے سلسلے میں محض اللہ کی قدرت اور فیصلے کے سوا اور اسباب بھی تلاش کرتے ہیں۔ یہ اللہ اور اللہ کے قانون کے سوا کچھ اور شخصیات اور اداروں کو منبع ہدایت اور ذریعہ قانون اور شریعت قرار دیتے ہیں۔ یہ اللہ کے سوا اوروں سے امیدیں باندھتے ہیں' یہ ایسی قربانیاں اور خیراتیں کرتے ہیں جن کی تہہ میں رضائے الٰہی کے علاوہ کچھ اور شخصیات کی رضا بھی موجود و ملحوظ ہوتی ہے۔ یہ اللہ کے سوا اوروں سے نفع حاصل کرنے یا نقصان کے رکوانے کے عمل بے سود میں جدوجہد کرتے ہیں یا اللہ کی بندگی میں محض اللہ کی رضا کے سوا اوروں کی رضا کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ یہی شرک خفی ہے اور اسی وجہ سے حضور اکرم نے فرمایا تمہارے اندر شرک اس قدر غیر محسوس طور پر داخل ہو جاتا ہے جس طرح چیونٹی کے چلنے کی آواز خفیہ ہوتی ہے۔

حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس سلسلے میں چند نمونے بیان فرمائے ہیں جن سے شرک خفی کو سمجھا جا سکتا ہے۔ امام ترمذی نے ابن عمر سے روایت کی ہے "جس نے اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھائی اس نے شرک کا ارتکاب کیا"۔ امام ابوداؤد اور امام احمد وغیرہ نے حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے "حضور نے فرمایا کہ دم اور تعویذ شرک ہے"۔ مسند امام احمد میں عقبہ ابن عامر کی حدیث نقل ہوئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا "جس نے تعویذ

نکالیا اس نے شرک کا ارتکاب کیا"۔

حضرت ابو ہریرہ ؓ نے انہی کی سند کے ساتھ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں شریکوں کی شرکت کا محتاج نہیں ہوں جس نے بھی کوئی عمل کیا اور اس میں میرے ساتھ کسی غیر کو شریک کیا تو میں اسے اس غیر کے حوالے کر دیتا ہوں"۔

امام احمد نے ابو سعید ابن فضالہ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کہا میں نے حضور اکرم ؐ کو کہتے سنا "جب اللہ اولین اور آخرین کو اس دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں ہے تو ایک پکارنے والا پکارے گا "جس شخص نے ایسے کام میں اللہ کا کوئی شریک ٹھہرایا جو اللہ کا مخصوص تھا' تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے عمل کا اجر اس شریک سے طلب کرے 'کیونکہ اللہ شریکوں کی شراکت کا محتاج نہیں ہے"۔

امام احمد ؒ نے اپنی سند سے محمود ابن لبید سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا "میں تمہیں اس چھوٹے شرک سے ڈراتا ہوں جس کے بارے مجھے تشویش ہے"۔ صحابہ ؓ نے کہا "رسول خدا' وہ چھوٹی شرک کیا ہے؟" تو آپ نے فرمایا "وہ خواہیں ہیں"۔ جب قیامت میں لوگ اپنے اپنے اعمال لے کر آئیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ' جاؤ ان لوگوں کے پاس جن کو تم دنیا میں کچھ سمجھتے تھے اور دیکھو ان کے پاس ہے کچھ تمہیں جزاء کے طور پر دینے کے لیے۔"

غرض ایمان کے باوجود یہ شرک خفی کی اقسام ہیں۔ ایک مومن کو چاہئے کہ وہ ان کے بارے میں چوکنا رہے اور ان سے بچنے کی سعی کرے تاکہ اس کا ایمان خالص ہو جائے۔

شرک خفی کے علاوہ بعض واضح اعمال شرکیہ ہیں اور ان میں سے ایک یہ طرز عمل ہے کہ انسان اللہ کے سوا کسی اور کے دین اور نظام کی پیروی کرے ' زندگی کے معاملات میں سے کسی بھی معاملے میں۔ مثلاً وہ ایسے قانون کے مطابق فیصلے کرائے یا کرے جو شریعت کے خلاف ہو' یہ فعل ایک صریح اور منصوص اور واضح شرک ہے جس میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے مثلاً ایسے عرس اور میلے مقرر کرنا جو اللہ نے مقرر کیے ہوئے نہ ہوں یا دوسرے ایسے رسم و رواج جن کا کوئی ثبوت شریعت سے نہ ہو۔ یا ایسے لباس جن میں ستر عورت اور دوسرے احکامات کے سلسلے میں شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ یہ سب کے سب صریح شرکیہ افعال ہیں۔

ایسے معاملات جن کا تعلق ایسے رسوم اور ایسی تقریبات سے ہو جو خلاف اسلام ہوں اور جن کو اللہ کے سوا کسی اور نے رواج دیا ہو اور جن پر عمل پیرا ہونا لوگ ضروری سمجھتے ہوں' اس طرح جس طرح فرمودۂ خدا و رسول ہو تو ایسے افعال و رسوم محض گناہ ہی نہیں رہتے بلکہ یہ شرک کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں کیونکہ ان کی پیروی سے انسان غیر اللہ کے دین اور نظام کا اتباع کرتا ہے جو خلاف نظام اسلامی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ امر نہایت ہی اہم ' خطرناک اور شرک ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ (۱۲ : ۱۰٦) "ان میں سے اکثر اللہ کو مانتے ہیں مگر اس طرح کہ وہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں"۔ لہٰذا اس آیت کا اطلاق ان لوگوں پر بھی ہوتا ہے جو جزیرۃ العرب میں ایمان لانے کے بعد بھی شرک کرتے تھے اور آپ ؐ کے بعد آنے والے لوگوں پر بھی ہوتا ہے جو ایمان تو لاتے ہیں مگر پھر بھی کسی نہ کسی طرح شرک کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے کہ ہدایت سے اعراض کرنے والے یہ لوگ اس سے امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں اور آیات قرآنیہ کے بعد آیات کونیہ سے بھی وہ منہ موڑ رہے ہیں۔ آخر وہ کیا سہارا ہے؟ کیا یہ خدا کا خوف نہیں کرتے۔

اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ

"کیا یہ مطمئن ہیں کہ خدا کے عذاب کی کوئی بلا انہیں دبوچ نہ لے گی یا بے خبری میں قیامت کی گھڑی اچانک ان پر نہ آ جائے گی"۔ (١٢: ١٠٧) یہ ان کے شعور کے تاروں پر ایک قوی ضرب ہے' تاکہ وہ خواب غفلت سے جاگیں اور اس غفلت کے انجام بد سے ڈریں' کیونکہ عذاب الہی کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے' وہ تو کسی بھی وقت نازل ہو سکتا ہے۔ وہ کسی بھی وقت ان کو دبوچ سکتا ہے اور یہ عذاب عمومی بھی ہو سکتا ہے اور یہ عذاب اس خوفناک دن کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے جو اچانک نمودار ہو جائے گا اور کسی کو اس کا شعور تک نہ ہو گا۔ عالم غیب کے دروازے تو بند ہیں' پردۂ غیب کے پیچھے کیا ہے' کسی کان کو خبر نہیں' کوئی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ کسی کو معلوم نہیں کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے' لہذا ایک ذی ہوش شخص کس طرح غافل رہ سکتا ہے؟

جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے دلائل سے قرآن کریم بھرا پڑا ہے۔ جب اس کائنات کا ذرہ ذرہ شاہد ہے کہ اس کا ایک واحد خالق و مالک ہے اور یہ لوگ اس کائنات کو بھی دیکھ رہے ہیں اور قرآن کو بھی سمجھتے ہیں کہ وہ عرب ہیں' اور پھر بھی یہ اللہ کے ساتھ پوشیدہ یا ظاہری شرک کرتے ہیں اور لوگوں کی اکثریت اس مرض اور غفلت کا شکار ہے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اس کے سوا اور کیا راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ اپنی راہ پر گامزن رہیں اور آپ کے پیروکار بھی اپنے نصب العین کی طرف بڑھتے رہیں' وہ کسی کے عمل اور کسی کی بات سے متاثر نہ ہوں اور انحراف کرنے والوں کی طرف نہ دیکھیں۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣعَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝١٠٨

"تم ان سے صاف کہہ دو کہ "میرا راستہ تو یہ ہے' میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں' میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی' اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں"۔ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ "یہ ہے میرا راستہ"۔ یہ ایک راستہ ہے' یہ سیدھا راستہ ہے' اس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے' اور اس کے احکام و قوانین میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ "میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں' میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی"۔ یعنی ہمیں اللہ کی راہنمائی حاصل ہے اور ہمیں اس کی طرف سے روشنی دی گئی ہے۔ ہمیں اپنا راستہ اچھی طرح معلوم ہے اور ہم بصیرت و بصارت کے ساتھ اس پر چل رہے ہیں۔ ہمیں بھٹکنے کا

کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اور نہ کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہی راستہ ہے اسے ہم روشنی میں دیکھ بھی رہے ہیں۔ ہم اللہ کو ان چیزوں سے پاک سمجھتے ہیں جو اس کے شایان شان نہیں ہیں اور ہم ان سے جدا اور ممتاز اور قطع تعلق کرنے والے ہیں جو اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ "اور میں شریک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں"۔ نہ ظاہری شرک کرنے والوں میں سے اور نہ باطنی شرک کرنے والوں میں سے۔ یہ ہے براراستہ پس جو چاہے اسے قبول کر لے اور جو چاہے اس سے انکار کر دے۔ میں تو بہرحال اسی راہ پر چلوں گا کیونکہ یہی سیدھی راہ ہے۔

یہاں داعیان حق کو ایک بات نوٹ کر لینا چاہئے یہ کہ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ انہوں نے دو ٹوک بات کرنی ہے' ان کو اعلان کرنا ہے کہ وہ ایک علیحدہ امت ہیں۔ وہ ان لوگوں سے بالکل جدا ہیں جو ان کے نظریات کو من و عن تسلیم نہیں کرتے۔ جو ان کے مسلک اور طریق کار کے مطابق چلتے نہیں' یا جو ان کی قیادت کو تسلیم نہیں کرتے' انہیں جاہلی معاشرے سے چھٹ کر علیحدہ ہو جانا چاہئے' پوری طرح علیحدہ۔ داعیان حق کا صرف یہی فریضہ نہیں ہے کہ بس وہ دعوت دین کا حق ادا کر دیں اور پھر اپنے اردگرد پھیلے ہوئے جاہلی معاشرے میں گھل مل جائیں۔ اس قسم کی دعوت کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ ان کو صاف صاف اعلان کرنا ہو گا۔ کہ وہ جاہلیت سے ممتاز کچھ علیحدہ لوگ ہیں۔ ان کو ایک نظریہ کی بنیاد پر علیحدہ اجتماعیت اور تنظیم کی بنیاد رکھنی ہو گی اور ایک اسلامی قیادت کے نام اور عنوان سے منظم ہونا ہو گا۔ اور اس جاہلی معاشرے سے پوری طرح علیحدہ ہونا ہو گا۔ ان کی قیادت کو بھی ایک جاہلی قیادت سے ممتاز ہونا ہو گا۔

کسی جاہلی معاشرے میں گھل مل جانا اور جاہلی قیادت کے تحت زندگی بسر کرنا' اسلامی نظریہ حیات کی قوت اور جوش کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ اور ان کی دعوت کے تمام اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔ اور دعوت اسلامی کے اندر وہ جاذبیت نہیں رہتی جو اس صورت میں ہوتی ہے جب اسلامی نظام قائم ہو۔

یہ حقیقت صرف اسی وقت حقیقت نہ تھی جب حضور اکرم ؐ مشرکین مکہ کے جاہلی معاشرے میں کام کر رہے تھے بلکہ جب بھی جاہلیت غالب ہوگی اور کوئی اسلامی تحریک اس کے خلاف جدوجہد شروع کرے گی تو اس کے خلاف ایسا ہی کرنا ہو گا۔ اس وقت بیسویں صدی کی جو جاہلیت چھائی ہوئی ہے' وہ ان تمام جاہلیتوں کی طرح ہے جن کے خلاف انسانی تاریخ میں انبیاء کی اسلامی تحریکات نے کام کیا' سب کے خدوخال ایک جیسے ہیں۔

وہ لوگ جن کے ذہنوں میں یہ خیال خام جاگزیں ہے کہ وہ موجودہ جاہلی معاشرے کے اندر رہ کر' اور موجودہ جاہلی معاشرے کے طور طریقے اپنا کر اور ان جاہلی سوسائٹیوں کے اندر رہ کر نہایت ہی نرم انداز تبلیغ سے اسلام کی دعوت دیں گے اور کسی نتیجے تک پہنچ جائیں گے وہ کھلی خام خیالی میں مبتلا ہیں۔ وہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقائد کو سرے سے سمجھے ہی نہیں اور ان کو معلوم ہی نہیں کہ اسلامی نظریہ حیات دلوں میں کس طرح اترتا ہے۔ تمام جاہلی نظریات کے حامل لوگ اپنے نصب العین' اپنے طریقہ کار اور اپنا نام اور عنوان نہایت ہی واضح طور پر بتاتے ہیں اور اعلانیہ اپنے مقاصد کے لیے کام کرتے ہیں۔ کیا داعیان اسلام ہی رہ گئے ہیں جو چھپ چھپا کر کام کریں گے۔ حالانکہ ان کے کام کے لیے ایک طریقہ کار وضع شدہ ہے اور وہ جاہلیت کے طریقہ کار سے ممتاز ہے۔

--- ○○○---

اب ایک نکتہ توجہ طلب ہے کہ رسولوں اور رسالتوں کے بارے میں اللہ کی سنت کیا ہے؟ اور یہ کہ بعض سابقہ اقوام کا جو انجام ہوا اس میں بعد میں آنے والوں کے لیے کیا عبرت ہے؟ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کوئی پہلے نبی نہیں ہیں۔ آپ سے قبل بھی رسول آئے اور انہوں نے اپنی رسالت پیش کی۔ اس سے قبل جن لوگوں نے ناحق تکذیب کی' ان کا انجام تمہارے لیے سبق آموز ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

"اے نبی' تم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھیجے تھے' وہ سب بھی انسان ہی تھے اور انہی بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے' اور انہی کی طرف ہم وحی بھیجتے رہے۔ پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان قوموں کا انجام انہیں نظر نہ آیا جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں؟ یقیناً آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے اور زیادہ بہتر ہے جنہوں نے (پیغمبروں کی بات مان کر) تقویٰ کی روش اختیار کی۔ کیا اب بھی تم لوگ نہ سمجھو گے"۔

سابقہ اقوام کی تاریخ میں بعد میں آنے والوں کے لیے عبرت ہوتی ہے۔ اس لیے بعد میں آنے والوں کو چاہئے کہ وہ سابقین کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔ اس سے دل نرم ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ بڑے بڑے ڈکٹیٹروں کے دلوں میں خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ جب اقوام سابقہ کی سرگرمیوں اور ان کی چلت پھرت کو اپنے تخیل میں زندہ کیا جاتا ہے۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ لوگ اپنی اپنی شان و شوکت کے ساتھ ان مقامات پر چل پھر رہے ہیں' ڈرتے ہیں اور امیدیں باندھتے ہیں' آگے بڑھتے ہیں اور پیچھے ہٹتے ہیں' اور ان کی بڑی شان و شوکت ہے اور پھر پردۂ خیال پر یہ دور آتا ہے کہ وہ دیکھو یہ لوگ تو نیست و نابود ہو گئے اور مرمٹ گئے' بغیر حس و حرکت پڑے ہیں اور مٹی میں مل گئے ہیں۔ ان کے وہ شہر اور بستیاں کھنڈرات کی شکل اختیار کر گئیں اور ان کے ساتھ ان کا علم و ثقافت اور ان کی چلت اور پھرت اور ان کا عروج اور ان کے افکار بھی مرمٹ گئے تو ایسے تخیلات اور غور و فکر سے انسانوں کے دل دہل جاتے ہیں اور غافل سے غافل انسان کے بھی مارے خوف کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم لوگوں کو امم سابقہ کے عروج و زوال کی کہانیاں سناتا ہے اور ان کو لے جا کر ان کھنڈرات میں گھماتا ہے جو ان اقوام کی داستانیں سناتے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى (۱۲:۱۰۹) "تم سے پہلے جو ہم نے پیغمبر بھیجے تھے وہ سب بھی انسان تھے اور انہی بستیوں کے رہنے والے تھے اور انہی کی طرف ہم وحی بھیجتے رہے"۔ یعنی وہ نہ ملائکہ اور فرشتے تھے اور نہ وہ کوئی اور انوکھی مخلوق تھے' بلکہ اے پیغمبر وہ تو آپ ہی جیسے انسان تھے۔ شہری تھے' دیہاتی نہ تھے تاکہ وہ سلجھے ہوئے ہوں اور نرمی سے بات سنیں۔ لہٰذا آپ دعوت اسلامی کی راہ میں پیش آنے والی

مشکلات کو برداشت کرنے کی سعی کریں اور لوگوں کو راہ راست دکھاتے رہیں ۔ آپ کی تحریک اور دعوت بھی اسی سنت الٰہی پر قائم ہے جس کے مطابق اللہ نے تمام انبیاء کو بھیجا ۔ یہ لوگ بشر تھے اور ان کی طرف خدا کا پیغام وحی کیا گیا تھا؟

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

(۱۲ : ۱۰۹) "پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان قوموں کا انجام انہیں نظر نہ آیا' جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں" ۔ تاکہ وہ جان سکیں کہ ان کا انجام بھی وہی ہونے والا ہے جیسا کہ ان کا ہوا ۔ الا یہ کہ سنت الٰہیہ انہیں اپنی گرفت میں لینے ہی والی ہے اور تاکہ وہ یہ سمجھتے کہ اس دنیا سے تو جانا ہی ہے ۔

وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا (۱۲ : ۱۰۹) "یقیناً آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے جنہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی" ۔ اس لیے کہ اس جہان میں تو قرار نہیں ہے' یہاں سے تو جانا ہی ہے ۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۲ : ۱۰۹) "کیا اب بھی تم لوگ نہیں سمجھتے" ۔ کیا تم لوگ انسانی تاریخ میں سنت الٰہیہ کے عمل کو سمجھتے نہیں ۔ اور کیا تمہاری عقل ایسے معاملے میں بھی معقول فیصلہ نہیں کر سکتی کہ ایک چیز فانی ہے اور ایک باقی ہے اور فانی پر باقی کو ترجیح دینا چاہئے ۔

اب رسولوں کی زندگی کی بعض مشکل گھڑیوں کا ذکر کیا جاتا ۔ اور یہ مشکل مقامات آخری فتح سے قبل آیا کرتے ہیں ۔ یہ مشکلات اللہ کی سنت کا حصہ ہیں اور یہ داعی کو درپیش آتی ہیں کیونکہ سنت الٰہیہ ٹلنے والی نہیں ہوتی ۔

حَتّٰۤی اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾

"(پہلے پیغمبروں کے ساتھ بھی یہی ہوتا رہا ہے کہ وہ مدتوں نصیحت کرتے رہے اور لوگوں نے سن کر نہ دیا) یہاں تک کہ جب پیغمبر لوگوں سے مایوس ہو گئے اور لوگوں نے بھی سمجھ لیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا' تو یکایک ہماری مدد پیغمبروں کو پہنچ گئی ۔ پھر جب ایسا موقع آجاتا ہے تو ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں' بچا لیتے ہیں اور مجرموں پر سے تو ہمارا عذاب ٹالا ہی نہیں جا سکتا" ۔

یہ نہایت ہی خوفناک صورت حال ہے ۔ یہاں رسولوں کی زندگیوں کے نہایت ہی کربناک 'تنگی اور شدید مشکل حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے ۔ ایسے حالات کہ ان میں رسول کفر' انکار' ہٹ دھرمی اور کھلے اندھے پن کا مقابلہ کرتے رہے ہیں ۔ دن یوں ہی گزرتے گئے مگر رسولوں نے کبھی بھی دعوت کو نہیں چھوڑا اور لوگ بھی انکار کرتے رہے ۔ روز و شب کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہا اور باطل دندناتا رہا ۔ اہل باطل بہت ہی کثرت سے رہے اور اہل ایمان قلیل اور ضعیف رہے ۔

کس قدر سخت حالات ہیں' باطل ہانپ رہا ہے' سرکشی اور طغیانی کا ارتکاب کر رہا ہے' اور ظلم و عدوان اس کا شعار ہے ۔ رسول ان حالات میں اللہ کے وعدے کا انتظار کرتے ہیں ۔ لیکن اللہ کا وعدہ سامنے نہیں آرہا ہے ۔ ان حالات میں

ان کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے آرہے ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ انہیں مسترد کر دیا گیا' تم دیکھتے ہو کہ بظاہر ان کا یہ نظریہ مسترد کر دیا گیا کہ اس دنیا میں ان کو کامیابی نصیب ہوگی لیکن یہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

کوئی بھی رسول جب ایسے حالات سے دوچار ہوتا ہے تو اس وقت تنگی' شدت اور کرب اور اذیت اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ یہ آیت اور اس کے ساتھ ساتھ جب سورہ بقرہ کی درج ذیل آیت میں پڑھتا ہوں۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ

--- (۲ : ۲۱۴) "کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور تمہیں وہ حالات پیش نہ آئیں گے جو ان لوگوں کو پیش آئے جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ ان کو سخت مصیبت اور تکلیف نے چھوا اور وہ یہاں تک جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے تھے پکار اٹھے کہ کب آئے گی اللہ کی نصرت؟"

جب بھی ان دو آیات میں سے کوئی آیت پڑھتا ہوں تو میں مارے خوف کے کانپ اٹھتا ہوں کہ رسولوں کو کس قدر جان کن مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا' ایسے مشکل حالات میں انسان طرح طرح کے وسوسوں کا شکار ہوتا ہے' ایک تسلسل کے ساتھ تکلیف دہ اور ہلا مارنے والے حالات سے دوچار ہوتا ہے جن میں رسول تک متزلزل ہو جاتے ہیں' ایک کربناک نفسیاتی کشمکش سے انسان دوچار ہوتا ہے اور ایک ناقابل برداشت اذیت ہر وقت پیچھا کرتی رہتی ہے۔

ایسے حالات میں جن میں یہ رنج و غم مسلسل نظر آتا ہے اور کلیجہ منہ کو آجاتا ہے اور رسول اور اس کی جماعت اپنی پوری قوت صرف کر دیتی ہے' تو ایسے حالات میں اللہ کی نصرت آجاتی ہے۔ اور ایسے حالات مین جو نصرت آتی ہے وہ فیصلہ کن ہوتی ہے۔ جَآءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۲ : ۱۱۰)

"یکایک ہماری مدد پیغمبروں کو پہنچ گئی۔ پھر جب ایسا موقع آجاتا ہے تو ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں' بچا لیتے ہیں اور مجرموں پر سے تو ہمارا عذاب ٹالا ہی نہیں جاسکتا"۔ یہ ہے دعوت اسلامی کے بارے میں اللہ کی سنت۔ اس راہ میں مشکلات کا آنا ضروری ہے۔ کربناک حالات سے دوچار ہونا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ تحریک اسلامی اپنی پوری قوت اس راہ میں خرچ کر دے۔ اس کی قوت اور طاقت کا پورا حصہ صرف ہو جائے اور نہایت ہی مایوس کن حالات ظاہر ہو جائیں اور ظاہری اسباب جن پر لوگ تکیہ کرتے ہیں' ایک کے بعد ایک غائب ہو جائیں۔ ایسے حالات میں پھر صرف من جانب اللہ نصرت آتی ہے اور وہی لوگ نجات پاتے ہیں جن کے بارے میں اللہ کا کوئی حکم ہوتا ہے اور تحریک اسلامی کے مخالفین پر پھر ہلاکت آتی ہے' اس سے وہ لوگ بچ جاتے ہیں جو نجات کے مستحق ہوتے ہیں' اور ان پر وہ ہلاکت نہیں آتی جو مکذبین پر آتی ہے۔ یوں ایسے لوگ اس جبر اور تشدد کے ماحول سے نجات پاتے ہیں جو ظالموں اور جابروں نے ان پر مسلط کر دیا ہوتا ہے۔ اب مایوسی اور بے بسی مجرموں کے حصے میں آتی ہے۔ ان کو تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے اور ان کی قوت پاش پاش ہو جاتی ہے۔ اب نہ ان کا کوئی ولی ہوتا ہے نہ مددگار"۔

یہ سنت کیوں وضع کی گئی ہے؟ اس لیے کہ فتح و نصرت بے قدر نہ ہو۔ وہ محض مذاق نہ ہو' اگر قربانیوں کے بغیر فتح و

نصرت ہاتھ آجایا کرتی تو ہر کوئی اٹھ کر داعی بن جاتا اور کوئی قربانی دیئے بغیر وہ کامیابی سے ہمکنار ہو جاتا یا معمولی جدوجہد سے وہ انقلاب برپا کر دیتا۔ اس لیے اللہ نے دعوت اسلامی کو محض کھیل تماشے کی طرح آسان نہیں رکھا۔ دعوت اسلامی کا مقصد پوری زندگی کے طور طریقوں میں انقلاب برپا کرنا ہے۔ اور یہ انقلاب وہ لوگ نہیں برپا کر سکتے جو محض دعوئی ہی کریں ' اس کی پشت پر کوئی قربانی نہ ہو۔ ایسے لوگ دعوت اسلامی کی راہ میں دی جانے والی قربانیاں نہیں برداشت کر سکتے۔ ایسے لوگ پہلے تو دعوت اسلامی جیسے مشکل کام میں ہاتھ ہی نہیں ڈالتے لیکن اگر یہ غلطی کر بھی بیٹھیں تو وہ اس کا حق ادا نہیں کر سکتے اور جلد ہی عاجز آکر اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ جب راہ حق میں مشکلات آتی ہیں تو صرف صادق اور اولوالعزم لوگ ہی ان کا مقابلہ کرتے ہیں جو کسی حال میں بھی دعوت اسلامی کی راہ نہیں چھوڑتے اگرچہ ان کو یقین ہو جائے کہ اس جہان میں ان کو کامیابی نہ ہوگی۔

دعوت اسلامی کوئی ایسا سودا نہیں ہے جو ایک محدود وقت کے لیے ہو' نیز اس سودے کا منافع بھی اس دنیا کی محدود زندگی تک موقوف نہیں ہے اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ یہ سودا کرنے والے لوگ اس کا اقالہ کر کے کسی اور نفع بخش سودے کے لیے تیار ہو جائیں 'جس سے ان کو اس دنیا میں جلدی نفع مل جائے۔ جو لوگ دعوت اسلامی کا علم کسی بھی جاہلی معاشرے میں بلند کرتے ہیں (اور یاد رہے کہ جاہلی معاشرہ ہر وہ معاشرہ ہوتا ہے جس میں اللہ کے احکام کی اطاعت نہ ہو' اور اللہ کے سوا اور طاغوتوں کی اطاعت کی جاتی ہو) ایسے لوگوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ تحریک کا کارکن ہونا کوئی تفریح کا کام نہیں ہے' نہ یہ کام دنیا کے مفاد کا کوئی تجارتی عمل ہے۔ یہ تو ان طاغوتی قوتوں کے ساتھ کشمکش پیہم کا معاملہ ہے جو افراد اور مالی قوت رکھتی ہیں اور ان طاغوتی قوتوں نے جمہور کو اس طرح دبا رکھا ہے کہ وہ سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کہتی ہیں۔ اور عوام بے بس ہیں۔ پھر یہ قوتیں اس قدر بااثر ہیں کہ یہ عوام کالانعام کو اسلامی تحریکوں پر کتوں کی طرح چھوڑ دیتی ہیں اور عوام کے اندر ان کا طریقہ واردات یہ ہوتا ہے کہ لوگو! یہ لوگ تم کو ہر قسم کی تفریح اور عیاشی سے محروم کر دیں گے اور زندگی کی رنگا رنگی ختم کر کے چھوڑ دیں گے ...... غرض دعوت اسلامی کے حاملین کا فرض ہے کہ وہ سمجھ لیں کہ اس راہ میں کانٹے ہی کانٹے ہیں' اور پھر ان مشکلات کو انگیز کرنے کا عمل مزید مشکل ہے۔ لہٰذا قاعدہ یہ ہے کہ ابتداء میں تحریک اسلامی کے کارکن اولوالعزم لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔ عامۃ الناس اس تحریک سے دور بھاگتے ہیں۔ معاشرے کے چیدہ' پسندیدہ اور اولوالعزم لوگ ہی اس طرف آتے ہیں۔ یہ لوگ اقامت دین پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں اس دنیا کا سب آرام اور سامان قربان کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ابتداء میں ایسے لوگ قلیل ہوتے ہیں' لیکن اللہ ایسے لوگوں اور ان کی قوم کے درمیان حق پر فیصلہ فرماتے ہیں اور یہ حق تب ظاہر ہوتا ہے جب اس کے لیے طویل جدوجہد کی جائے اور جب حق آتا ہے' فیصلہ ہو جاتا ہے' فتح حاصل ہو جاتی ہے تو جمہور لوگ اس میں داخل ہوتے ہیں۔

قصہ یوسف میں رنگا رنگ مشکلات ہیں جن سے یہ داعی دوچار ہوتا ہے۔ اندھے کنویں میں ان کو ڈالا جاتا ہے۔ عزیز مصر کے گھر وہ ملازم اور غلام کی طرح رہتے ہیں۔ پھر ناحق جیل جاتے ہیں اور لوگوں کی امداد سے مایوس ہوتے ہیں لیکن آخری انجام انہی لوگوں کے حق میں ہوتا ہے۔ جو ایمان لاتے ہیں اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے ہیں جیسا کہ اللہ نے فرمایا اور اللہ کا وعدہ ہر حال میں سچا ہوتا ہے۔ قصہ یوسف قصص انبیاء میں سے ایک اہم نمونہ ہے اور ہر عقل رکھنے والے کے لیے

اس میں سبق ہے۔اس میں یہ سبق بھی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم انبیائے سابقہ کے حالات سے خبردار نہ تھے لیکن اس قصے میں یہ تفصیلات دی گئیں' اس لیے یہ دلیل ہے صداقت قرآن پر' ورنہ کسی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ایسے حالات اپنی طرف سے گھڑ کر بتائے اور وہ حرف بحرف درست ہوں اور مصنوعی کہانیوں پر دل مومن کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ
۱۲ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَ
ع ۷ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۱۱﴾
۶

"اگلے لوگوں کے ان قصوں میں عقل و ہوش رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے۔یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہوئی ہیں انہی کی تصدیق ہے اور ہر چیز کی تفصیل اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت"۔

--- ○○○---

ذرا غور کیجئے 'سورہ کا آغاز اور اختتام کس قدر ہم آہنگ ہیں۔اس طرح قصے کا آغاز و اختتام بھی باہم متماثل ہیں۔ قصے کے آغاز میں بھی نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔اس کے درمیان بھی عبرت آموزی کی گئی ہے اور اس کے آخر میں بھی نتائج اخذ کیے گئے ہیں اور مضمون اور موضوع باہم پیوست و ہم آہنگ ہے۔طرز ادا اور فقرے موزوں' فنی اعتبار سے قصہ نہایت ہی پرکشش ہے۔لیکن ان سب خصوصیات کے ساتھ واقعات حقیقت پر مبنی ہیں اور کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

یہ قصہ ایک ہی سورہ میں پوری طرح بیان ہو جاتا ہے۔یک جا پورے کا پورا۔اس لیے کہ اس قصے کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ یہ یکجا ہو۔کیونکہ واقعات آہستہ آہستہ رونما ہوتے ہیں۔ایک دن کے بعد دوسرا دن آتا ہے۔ایک مرحلے کے بعد دوسرا مرحلہ آتا ہے' اس لیے اس سے نتائج صرف اسی صورت میں اخذ کیے جا سکتے تھے کہ قصے کو پوری شکل میں ایک سورہ میں دے دیا جائے۔اگر دوسرے قصص کی طرح اس کے صرف بعض حلقے ہی لائے جاتے تو اس طرح وہ نتائج اخذ نہ ہو 2 سکتے تھے جو مکمل قصہ کی شکل میں سامنے آتے ہیں دوسرے قصص کا انداز قرآن میں مختلف رہا ہے۔مثلاً قصہ بلقیس یا قصہ تخلیق مریم۔حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا واقعہ 'حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کا واقعہ 'کیونکہ یہ ان قصوں کے بعض حلقے اپنی جگہ مکمل حصے اور کڑیاں ہیں اور ان سے ایک مستقل سبق ملتا ہے۔لیکن قصہ یوسف ایسا ہے کہ اس کو مکمل طور پر ایک ہی نشست میں پڑھنا ضروری ہے اور ابتداء سے انجام تک ایک ہی جگہ اس کا بیان بھی ضروری ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ وَإِن كُنتَ مِن قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ (۱۲:۳) "ہم اس قرآن کو تمہاری طرف وحی کر کے بہترین پیرائے میں واقعات و حقائق (قصص) تم سے بیان کرتے ہیں ورنہ اس سے پہلے تم بالکل بے خبر تھے"۔

# فی ظلال القرآن

## پارہ ----- ۱۳

## سورۃ الرعد - ۱۳

۱ --- تا --- ۴۳

# سورۂ رعد ایک نظر میں

بارہا میں نے قرآنی آیات پر غور و فکر کرتے ہوئے یہ ذرمحسوس کیا ہے کہ میں قرآن کریم کی تفسیر نصوص قرآنی کو چھوڑ کر کسی دوسرے انسانی اسالیب کلام کے انداز میں کروں۔ کیونکہ قرآن کریم کا انداز بیان بے مثال اور لاثانی ہے اور ہم اس کی جو تفسیر بھی کرتے ہیں اور اس کے لیے جو اسلوب بیان بھی اختیار کرتے ہیں وہ اس کے اسلوب سے فروتر ہے۔

یہ سورہ بھی سورہ انعام کے انداز اور اسلوب میں ہے۔ اس کا انداز بیان اس قدر صاف' سادہ اور واضح ہے کہ میں خیال کرتا ہوں کہ اس کی کوئی تشریح نہ کی جائے' اسے بیچ ہی نہ کیا جائے اور قاری اسے پڑھتا ہی چلا جائے۔

لیکن میں کیا کروں' ہم ایک ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں جس میں لوگ قرآن کریم سے بہت ہی دور ہو گئے ہیں' لہذا اس بات کی ضرورت پڑتی ہے کہ عوام کو قرآن کے مقاصد' اس کے مزاج' اس کے نظام اور اس کے موضوع سخن سے آگاہ کیا جائے۔ دراصل لوگ اس ماحول سے بے خبر ہیں جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔ لوگوں نے وہ اغراض و مقاصد پس پشت ڈال دیئے ہیں جن کے لیے قرآن مجید نازل ہوا۔ اس لیے ان کے شعور و احساس سے قرآن مجید کے مفہومات اور اس کے حدود کار زائل اور محو ہو چکے ہیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ لوگ قرآنی اصطلاحات کا مفہوم بھی نہیں جانتے' اس لیے کہ لوگ ایسی ہی جاہلیت میں ڈوبے ہوئے ہیں جس میں وہ لوگ ڈوبے ہوئے تھے جن پر یہ قرآن پہلی مرتبہ نازل ہوا۔ اب قرآن کو لے کر مسلمان جاہلیت کا مقابلہ نہیں کر رہے' نہ انہوں نے قرآنی نظام کے قیام کے لیے کوئی تحریک برپا کر رکھی ہے' جس طرح حضور اکرم کے وقت قرآن کو ماننے والوں نے اقامت دین کے لیے ایک تحریک برپا کی تھی۔ قرآنی نظام کے قیام کی تحریک کے بغیر لوگ ان مقاصد' مفاہیم اور مطالب کو سمجھ ہی نہیں سکتے جو قرآن کے پیش نظر تھے اور ہیں۔ ایک معطل اور بے عمل شخص مقاصد قرآن کو نہیں پا سکتا' اس کی حقیقت سے روشناس وہی شخص ہو سکتا ہے جو قرآن کی روشنی میں ایک تحریک برپا کر دے اور اسے لے کر جاہلیت کے مقابلے میں اتر آئے۔

لیکن ان حقائق کے باوجود میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ میں قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر کروں کیونکہ وہ خود بین اور واضح ہے۔

قرآن کریم کو پڑھ کر میرے پردہ احساس پر جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے اسے میں الفاظ کے جامے میں منتقل نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے اس احساس اور شعور کو پوری طرح ظلال القرآن میں الفاظ کی شکل میں منتقل نہیں کر سکتا۔ میں جو کچھ کر پاتا ہوں وہ کچھ اور ہے اور الفاظ ظلال کچھ اور ہیں۔

ہاں میں اس بات کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ ہمارے معاشرے اور اس معاشرے میں ایک بنیادی فرق ہے جس کے اندر قرآن کریم پہلے اترا۔ ابتدائی لوگ' صحابہ کرام براہ راست اس کے مخاطب تھے۔ وہ اپنے دل و دماغ کی تاروں پر براہ راست قرآن کی ضربات کو محسوس کرتے تھے۔ اس کے تصورات اور اس کی پرچھائیں اور اس کے اشارات اور اس

کی ہدایات کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور وہ براہ راست اس سے متاثر ہو کر بدل جاتے تھے۔ فوراً براہ راست۔ پھر وہ قرآنی تصورات کو عمل کا جامہ پہناتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی تاریخ کے ایک مختصر عرصے میں انہوں نے انقلاب برپا کرنے کا وہ معجزہ دکھایا جس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ہے۔ ایسا انقلاب 'جس نے ان کے تصورات' ان کے شعور' ان کے دل و دماغ اور ان کی پوری عملی زندگی کو بدل دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ماحول کے اندر بھی ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ پھر انہوں نے پورے عالم انسانی کی قدریں بدل دیں۔ پھر انہوں نے آنے والی تاریخ کے دھارے بدل دیئے۔

یہ لوگ قرآن کے سرچشمے سے براہ راست سیراب ہوتے تھے اور ان کے احساس کی تاروں پر قرآنی آیات کی ضربات براہ راست پڑتی تھیں اور اس کی شعاعیں اور حرارت وہ براہ راست محسوس کرتے تھے۔ وہ اس کی کیفیات میں ڈھل جاتے تھے۔ قرآنی اقدار کو زندہ کرتے جاتے تھے اور قرآنی تصور ان کا تصور ہوتا تھا۔

لیکن ہمارا انداز فکر بالکل مختلف ہے۔ ہم پہلے دوسرے مفکرین کی سوچ سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس کائنات کے بارے میں جاہلیت کے نظریات پڑھتے ہیں' اجنبی اقدار پر ایمان لاتے ہیں' غیروں کے طور طریقے اپناتے ہیں اور اپنے جیسے انسانوں کے فانی نظریات کو سینے سے لگاتے ہیں اور پھر قرآن پڑھتے ہیں۔

نیز ہم ان جاہلی اقوام کی ترقیات سے متاثر ہوتے ہیں 'جنہوں نے اس جہاں کو آباد کر دیا ہے اور مادی ترقی میں ہم سے آگے ہیں اور پھر قرآن کی تفسیر ہم ان مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کرتے ہین۔ تفسیر قرآن میں ہم وہ منطق استعمال کرتے ہیں جو مادی ترقیات کی منطق ہے۔ اس طرح بھی ہم تفسیر قرآن میں غلطی کر جاتے ہیں اور ہمارے فہم قرآن سے غلط نتائج برآمد ہوتے ہیں' اس لیے کہ مادی طور پر ترقی یافتہ معاشرے ان تصورات سے مختلف تصورات کی تخلیق ہیں جو قرآن کے پیش نظر ہیں۔

میں ظلال القرآن کے قارئین کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ ظلال القرآن کو پڑھتے ہوئے ایسے مقاصد پیش نظر نہ رکھیں۔ انہیں چاہئے کہ وہ قرآن کو اس لیے پڑھیں کہ وہ قرآن کریم کے قریب ہوں' اسے حقیقت پسندانہ طور پر سمجھیں اور تمام غلط خیالات و تصورات کو جھاڑ کر دور پھینک دیں۔

یاد رہے کہ ہمارے قارئین اس ہدف کو اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک وہ اپنی پوری زندگی میں قرآنی مدلولات کو روبعمل نہ لائیں' عملاً جاہلیت کے برخلاف کشمکش برپا نہ کر دیں اور قرآنی اصول و قواعد کے جھنڈے اٹھا نہ لیں۔

--- ○○○ ---

یہ تو تھیں تمہیدی باتیں' اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں' میرے سامنے سورہ رعد ہے' میں نے اس سے قبل اسے بارہا پڑھا ہے' بارہا اسے سنا ہے لیکن آج یوں نظر آتا ہے کہ میں اسے پہلی مرتبہ پڑھ رہا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم انسان کو اتنا ہی دیتا ہے جس قدر انسان قرآن کو دے۔ جب بھی آپ قرآن کو پڑھیں گے' اس کا نور' اس کی شعاعیں' اس کے اشارات سے دل و دماغ کی تاروں پر اس کی جانب سے نئی ضربات لگیں گی۔ یوں نظر آئے گا کہ گویا آپ اسے آج ہی پڑھ رہے ہیں اور اس سے قبل آپ نے کبھی اس کا مطالعہ نہ کیا تھا' نہ کبھی آپ نے اس پر غور و فکر کیا تھا۔

قرآن کریم کی سورتوں میں سے یہ ایک عجیب سورہ ہے جو آغاز سے انجام تک ایک ہی سانس میں' ایک ہی ٹون میں' ایک ہی فضا میں اور ایک ہی رنگ و بو میں چلتی ہے۔ انسانی پردۂ احساس پر مختلف تصاویر' مختلف سائے' مختلف مناظر اور مختلف

قسم کے خیالات آتے رہتے ہیں' جن کا تعلق انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں سے ہے۔ گویا ایک تصویری مقابلہ ہے' انوار' تاثرات اور تصورات کی ایک نمائش ہے۔ یہ انسانی غور و فکر کو وسیع تر کائنات کی سیر کراتی ہوئی روز و شب محدود دائرے سے لامکاں کی طرف لے جاتی ہے۔ اس سورہ کے درمیان انسان زندہ اور بیدار رہتا ہے اور وہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے بہت کچھ اخذ کرتا ہے۔

یہ سورہ محض الفاظ کی کرشمہ سازی نہیں ہے اور نہ ہی صرف خوبصورت عبارت کا مرقع ہے۔ بلکہ یہ انسانی شعور کو جھنجھوڑنے والی ہے۔ انسانی پردۂ احساس کو قسم قسم کی نئی تصاویر دیتی ہے۔ اس سے ایک شعور ابھرتا ہے اور اس کی عبارت کے اندر ایک خاص ترنم ہے اور اس کے اندر جگہ جگہ خالص وجدانی اشارات ہیں۔

اس کا موضوع کیا ہے؟ تمام مکی سورتوں کی طرح اس کا موضوع بھی اسلامی نظریہ حیات ہے۔ اسلامی عقیدۂ توحید اور اس کے متعلقہ مسائل' حاکمیت میں توحید' بادشاہت میں توحید' دین اور شریعت میں توحید' دنیا و آخرت میں توحید' وحی الٰہی کے مسائل اور آخرت کے حساب و کتاب کے مناظر وغیرہ۔

اسلامی نظریہ حیات کا عقیدہ ایک ہے اور مسائل متعین ہیں۔ اس پر اس سورہ اور دوسری مکی اور مدنی سورتوں میں قرآن کریم نے بار بار بحث کی ہے لیکن جب بھی اس موضوع پر قرآن کریم بحث کرتا ہے تو ایک نئے اسلوب سے بحث کرتا ہے۔ ہر جگہ ایک نئی روشنی ہوتی ہے' ہر جگہ نیا تاثر' نئے اشارات اور عقل و خرد کی تاروں پر نئی ضربات لگتی ہیں۔

پھر قرآن مجید ان مسائل اور موضوعات پر خشک منطقی اور فلسفیانہ انداز میں کلام نہیں کرتا کہ یہ صغریٰ ہے اور یہ کبریٰ بلکہ وہ ان مسائل کو اس کائنات کے ماحول میں رہ کر لیتا ہے۔ اس کائنات کے عجائبات کو ذہن انسانی کے سامنے پیش کرتا ہے اور یہ کوشش کرتا ہے کہ انسان اس پوری کائنات کے اندر موجود دلائل و براہین پر غور کرتے ہوئے کھلی آنکھ کے ساتھ سمجھے۔ جس طرح اس کائنات کے عجائبات ختم نہیں ہوتے۔ اسی طرح اس قرآن کے عجائبات ختم نہیں ہوتے۔ قرآن جتنی بار ان مسائل پر کلام کرتا ہے' اتنی ہی بار نیا اسلوب سامنے آتا ہے۔ کیونکہ مومن کی ہر دن نئی شان نئی آن ہوتی ہے' ہر دن انسانی ادراک آگے بڑھتا ہے اور ہر آن قرآنی عجائبات بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔ غرض جس طرح کائنات کے عجائبات ختم نہیں ہوتے اسی طرح قرآنی عجائبات ختم نہیں ہوتے۔ چنانچہ اسلامی نظریہ حیات پر جب بھی کلام ہوتا ہے' نئے انداز سے ہوتا ہے۔

یہ سورہ انسانی قوت ادراک کو لے کر اس کائنات کے طول و عرض میں اسے گھماتی ہے' اس کی گہرائیوں اور بلندیوں تک اسے لے جاتی ہے۔ وہ انسانی عقل و ادراک کے سامنے اس کائنات کی وسعتیں پیش کرتی ہے۔ دیکھو' آسمانوں کو کہ یہ بغیر کسی ستون اور سہارے کے کھڑے ہیں' ذرا شمس و قمر کو دیکھو' یہ کس طرح ایک نظام کے مطابق گردش کر رہے ہیں' دن رات کو ڈھانپ لیتا ہے اور رات دن کو ڈھانپ لیتی ہے۔ ذرا اس زمین ہی کو دیکھو کہ اس کے سینے پر پہاڑ کھڑے کر دیئے گئے ہیں اور اس پر نہریں اور دریا جاری ہیں۔ اس کی سرسبزیوں اور شادابیوں پر نگاہ ڈالو' باغات اور مختلف قسم اور رنگ برنگ کے پھل پھول اور فصلیں اور غلے۔ ایک ہی زمین اور ایک ہی پانی اور رنگ مختلف اور ذائقہ بھی مختلف ہے۔ پھر نظام باد باراں' کڑک و چمک کو دیکھو' رعد تسبیح خواں ہے۔ ملائکہ اللہ کے ثناخواں ہیں۔ کسی پر بجلی گرتی ہے اور کسی پر باران رحمت۔ بادلوں کو دیکھو' پانیوں سے لدے ہوئے کسی وادی کے اوپر سے گزر جاتے ہیں اور دوسری پر جا برستے ہیں۔ ندی نالے بہہ نکلتے ہیں اور جھاگ اور بے فائدہ مواد ختم ہو جاتا ہے اور جو مفید چیز ہوتی ہے وہ قائم رہتی ہے۔

اس سورہ میں غور و فکر کرتے ہوئے انسان جدھر جاتا ہے یہ اس کی راہنمائی کرتی ہے' یہ بتاتی ہے کہ اللہ کا علم بہت ہی وسیع ہے۔ وہ ہر آنے جانے والے کو دیکھتا ہے' دن کو چلنے والے اور رات کو چلنے والے دونوں اس کی نظر میں ہیں۔ وہ تمام زندہ انسانوں کے دلوں کے بھید بھی جانتا ہے۔

جو جہان انسانی نقطہ نظر سے غیب ہیں اللہ کے سامنے کھلے ہیں' وہ ماں کے پیٹ میں بھی سب کچھ جانتا ہے۔ خصوصاً بچے کی نشوونما اس کی نظر میں ہے۔ یہ سورہ کوشش کرتی ہے کہ اس کائنات کی حقیقت کبریٰ انسانی فہم و ادراک کے قریب آجائے۔ وہ ذات جو ظاہر و پوشیدہ ہر شے کو جانتی ہے وہ ذات جو صغیرہ و کبیرہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ اس کے حوالے سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے جس کے تصور ہی سے دل کانپنے لگتا ہے۔

ان تمام مضامین کو ایسی مثالوں کے ذریعے فہم انسانی کے قریب لایا جاتا ہے جو زندگی سے بھرپور اور متحرک ہوتی ہیں اور ان میں تاثرات' انفعالات بھرپور ہوتے ہیں' خصوصاً قیامت کے مناظر' حساب و کتاب اور جنت و دوزخ کے مناظر' نفس انسانی اور اس کے خلجانات' سابق امم کے مناظر بربادی' جن کو سنت الہیہ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

--- ○○○---

یہ تھے اس سورہ کے موضوعات و مسائل۔ اور یہ تھا اس کا دائرہ بحث یعنی یہ کائنات اور اس کی وسعتیں۔ ان کو نہایت ہی فصاحت و بلاغت اور فنی خوبیوں پر مشتمل سلیس عربی میں بیان کیا گیا۔ جس فریم ورک میں ان مسائل کو پیش کیا گیا ہے وہ یہ کائنات ہے۔ اس کائنات کے عجائبات کو خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا۔ کائنات کے مختلف قدرتی مناظر اور خود نفس انسانی کے اندر موجود قدرتی عجائبات' یہ فریم ورک ایک خاص فضا رکھتا ہے' مثلاً:

اس سورہ میں قدرتی مناظر کی فضا پائی جاتی ہے۔ آسمان و زمین' شمس و قمر' لیل و نہار' دھوپ اور چھاؤں' اونچے پہاڑ اور بہتے دریا' دریاؤں میں بے کار جھاگ اور مفید پانی' پھر زمین کے اندر مختلف ٹکڑے' زرخیز اور بنجر' پھل دار اور غیر پھلدار درخت' چنانچہ ہر قسم کے مشاہدات اور ... لی اور مفہومات ہیں۔ حرکات و نتائج میں بھی ایک قسم کا حسین تقابل پوری سورہ کا حصہ ہے۔ ایک طرف معنوی تقابل ہے تو دوسری طرف حسی تقابل ہے۔ چنانچہ شمس و قمر کی تسخیر کے بالمقابل استواء علی العرش آتا ہے۔ پھر رحم مادر میں کمی کے مقابلے میں بچے کی نشوونما و تربیت آتی ہے۔ جہری قول کے مقابلے میں قول خفی' رات کے وقت چلنے کے مقابلے میں دن کا چلنا' برق و باراں میں خوف کے مقابلے میں طمع' اور رعد کی حمد کے مقابلے میں فرشتوں کی ثنا' دعوت حق کے مقابلے میں شرک کی دعوت باطل'۔۔۔ جہالت کے مقابلے میں بصیرت اور نزول قرآن کے وقت بعض لوگوں کی خوشی اور اس کے مقابلے میں بعض دوسروں کی کبیدگی خاطر۔ پھر کتاب اللہ میں محو و اثبات کا عمل۔ غرض بے شمار معانی باہم متقابل' حرکات باہم متقابل اور رنگ کے مقابلے میں رنگ اور رجحان کے مقابلے میں رجحان۔ اس سورہ میں نہایت ہی موزوں' مناسب اور سورہ کی فضا اور مضامین کے مطابق ہے۔

بیان و ادا کے فنی اور معنوی کمالات میں سے ایک اس سورہ میں یہ بھی ہے کہ اس میں طبعی مناظر' زمین و آسمان' شمس و قمر' رعد و برق' کڑک اور بارش' زندگی اور نباتات کی اس فضا میں ایک نہایت ہی حساس اور انسانی زندگی سے قریب تر حقیقت رحم مادر کی کمی بیشی کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ ماتغیض الارحام وماتزداد اور اس کا تناسق' بارش اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نباتات سے ہے۔ اور الفاظ کے تناسب کے ساتھ مفہوم کے اندر بھی ایک خاص ہم آہنگی کو ملحوظ رکھنا

قرآن کریم کا ایک خاص انداز گفتگو ہے۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی وجہ سے میں نے اس سورہ پر بھی طویل غور کیا جس طرح دوسری سورتوں پر غور کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ ممکن نہیں ہے کہ انسانی انداز کلام کے پیمانوں کے ذریعے اس پر کوئی تبصرہ کیا جا سکے ۔کیونکہ جس طرح انسان کا انداز کلام تغیرات سے پر ہے' اسی طرح اس کے پیمانے بھی ناقص ہیں ۔یہ فانی ہیں اور قرآن لازوال ہے لیکن جس قدر گفتگو میں نے کی ہے' یہ اس لیے کی ہے کہ دور جدید میں جدید تعلیم یافتہ نسل کی یہ ضرورت ہے ۔اس لیے کہ جدید نوجوان قرآنی معاشرے اور قرآنی فضا سے نابلد ہے اور اپنے چاہتے ہیں کہ وہ قرآن کے قریب ہو جائے ۔اس معاملے میں ہم اللہ کی مدد چاہتے ہیں اور وہ حقیقی مددگار ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۱۲ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۱۸

سورہ کا آغاز اسلامی نظریہ حیات کے ایک بنیادی مسئلہ سے کیا جاتا ہے۔ یہ کہ یہ کتاب من جانب اللہ نازل ہوئی ہے۔ یہ جن حقائق پر مشتمل ہے' وہ حق اور سچے ہیں۔ یہ بات اسلامی نظریہ حیات کے اساسیات میں سے ہے۔ باقی تمام نظریات وعقائد اسی نکتے پر تعمیر ہوتے ہیں۔ عقیدۂ توحید' عقیدۂ بعث بعد الموت' زندگی میں عمل صالح کی افادیت اور تمام اخلاقی تعلیمات اس بات پر موقوف ہیں کہ یہ سب احکام من جانب اللہ ہیں اور یہ قرآن کی شکل میں جبرائیل علیہ السلام خدا کی طرف سے لے کر آئے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم برحق ہیں۔ یہ ہے وہ بنیاد جس پر پورا دین تعمیر ہوا ہے۔

سُورَةُ الرَّعْدِ (۱۳) مَدَنِيَّةٌ (۹۶) آیاتها ۴۳ رکوعاتها ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ا۔ل۔م۔ر۔ یہ کتاب الٰہی کی آیات ہیں' اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ عین حق ہے' مگر (تمہاری قوم کے) اکثر لوگ مان نہیں رہے ہیں۔

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ (۱۳ : ۱) "یہ کتاب الٰہی کی آیات ہیں"۔ یعنی یہ آیات اس بات کی شاہد ہیں کہ یہ وحی منجانب اللہ ہے۔ کیونکہ یہ آیات انہی حروف تہجی سے مرکب ہیں۔ اور جب آج تک ان حروف سے ایسی کتاب کوئی نہیں بنا سکا تو ثابت ہوا کہ یہ وحی الٰہی ہیں۔

وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ (۱۳ : ۱) "اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ عین حق ہے"۔ یہی حق ہے' یہ ایسا خالص حق ہے جس میں باطل کی کوئی ملاوٹ نہیں ہے اور جس

میں کوئی شک اور تردد نہیں ہے - یہ حروف تہجی بھی اس پر دلیل ہیں کہ یہ حق ہے کیونکہ یہ اس کتاب کے من جانب اللہ ہونے پر دلیل ناطق ہیں - کیونکہ اللہ کی جانب سے جو آتا ہے وہ حق ہی ہوتا ہے اور اس میں شک کی گنجائش نہیں رہتی -

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۳ : ۱) "مگر اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے" - وہ اس بات پر ایمان نہیں لاتے کہ یہ قرآن مجید من جانب اللہ ہے - اور نہ ان نتائج کو مانتے ہیں جو اس ایمان کے بعد سامنے آتے ہیں مثلاً عقیدۂ توحید، صرف اللہ کی مکمل اطاعت، عقیدہ بعث بعد الموت اور عقیدۂ توحید کے ساتھ عمل صالح - اور پوری زندگی کی اصلاح -

--- ○○○---

یہ ہے اس سورہ کا کلمہ آغاز اور اس کے اندر پوری سورہ کے مضامین کو نچوڑ کر بند کر دیا گیا ہے - ان تمام موضوعات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے جو اس میں موجود ہیں - چنانچہ تفصیلات کا آغاز مناظر قدرت الہیہ کے بیان سے کیا جاتا ہے - اس کائنات کی تخلیق، اس کی حرکت اور اس کے اثرات و آثار کس قدر گہری حکمت پر مبنی ہیں اور بذات خود یہ کائنات کس قدر عجیب چیز ہے - جب یہ کائنات عجیب ہے، اس کی مخلوق عجیب ہے اور اس کی حکمتیں ناقابل فہم ہیں تو انسان کی ہدایت کے لیے وحی و کتاب لابدی ہیں اور یہ کہ اس فانی دنیا کے بعد دائمی زندگی کا ہونا بھی ضروری ہے - نیز اس کائنات کی اس پیچیدہ قدرت و حکمت کا تقاضا - منطقی تقاضا بھی یہ ہے کہ موت کے بعد تمام مخلوقات زندہ کر کے اٹھائی جائے - تمام لوگ اس کے سامنے حاضر ہوں جس نے ان کو پیدا کیا اور جس نے ان کے لیے اس کائنات کو مسخر کیا اور اس کی نعمتوں سے نوازا تاکہ وہ پوری زندگی کا جواب دیں - حساب و کتاب ہو، جزاء و سزا ہو اور عمل آزمائش مکمل ہو -

مناظر قدرت کی عکاسی اور تصویر کشی یوں شروع ہوتی ہے کہ سب سے پہلے بڑے بڑے قدرتی مناظر کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے - ایک لمحہ آسمانوں کو دیا جاتا ہے اور ایک لمحہ طویل و عریض زمین کو دیا جاتا ہے اور پھر اس زمین پر بکھری ہوئی حیات اور اس کے عجائبات سامنے آتے ہیں -

اس کے بعد نہایت ہی تعجب سے کہا جاتا ہے کہ آخر ان لوگوں کے پاس کیا دلیل ہے کہ وہ بعث بعد الموت کے قائل نہیں - یہ لوگ دراصل ان قدرتی شواہد کے بعد آیات و معجزات کا مقابلہ کر کے دراصل عذاب الٰہی کو دعوت دیتے ہیں -

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ﴿۲﴾ وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۳﴾ وَفِيْ

الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَيْرُ
صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِى الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِىْ
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۴﴾ وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا
ءَاِنَّا لَفِىْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِىْٓ
اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۵﴾ وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ
بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ
مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۶﴾ وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿۷﴾ ع ۷

۷ وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں، پھر وہ اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا، اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا پابند بنایا۔ اس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقت مقرر تک کے لئے چل رہی ہے اور اللہ ہی اس سارے کام کی تدبیر فرما رہا ہے۔ وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔ اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے، اس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیے ہیں۔ اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں اور وہی دن رات طاری کرتا ہے۔ ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ اور دیکھو، زمین میں الگ الگ خطے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل واقع ہیں۔ انگور کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں، کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دوہرے۔ سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے، مگر مزے میں ہم کسی کو بہتر بنا دیتے ہیں اور کسی کو کمتر۔ ان سب چیزوں میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اگر تمہیں تعجب کرنا ہے، تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں۔ یہ جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ لوگ بھلائی سے پہلے برائی کے لیے جلدی مچا رہے ہیں حالانکہ ان سے پہلے (جو لوگ اس روش پر چلے ہیں ان پر خدا کے عذاب کی) عبرت ناک مثالیں گزر چکی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب لوگوں کی زیادتیوں کے باوجود ان کے ساتھ چشم پوشی سے کام لیتا ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تیرا رب سخت سزا دینے والا ہے۔ یہ لوگ جنہوں نے تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیا ہے، کہتے ہیں کہ "اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری؟"۔۔۔ تم تو محض خبردار کر دینے والے ہو، اور ہر قوم کے لیے ایک رہنما ہے"۔

آسمان کیا ہیں اور ان کا مفہوم مختلف ادوار میں لوگ کیا سمجھتے رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے، لیکن یہ ہماری نظروں کے

سامنے ہیں۔ یہ ایک عظیم منظر اور عظیم کائنات ہے۔ جب بھی کوئی ان پر غور کرتا ہے اور معلومات حاصل کرتا چلا جاتا ہے تو ان کی عظمت میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ پھر یہ سب نظام کسی ظاہری سہارے کے بغیر قائم ہے۔ جس طرح اس زمین پر کوئی چیز بغیر سہارے کے نہیں ہوتی' ایسا سہارا جو ہمیں نظر آئے۔ بغیر عمد ترونہا۔

یہ اس پوری کائنات کی تصویر کشی کے سلسلے میں پہلا ٹچ ہے اور انسانی وجدان اور قوت مدرکہ کے لیے یہ ایک پہلی ضرب ہے' خصوصاً جبکہ انسان اس عظیم کائنات پر غور کر رہا ہو اور وہ سوچے کہ وہ عظیم قوت کون ہے جو اس عظیم کائنات کی خالق ہے اور جس نے اسے یوں ٹھہرا رکھا ہے۔ یہ اللہ ہی ہو سکتا ہے۔

لوگ ستون کے ساتھ یا بغیر ستون زمین کے کسی کونے پر ایک چھوٹی سی عمارت تعمیر کرتے ہیں اور پھر ان عمارتوں کی تعریفیں کرتے ہیں کہ یہ کس قدر عظیم عمارت ہے؟ کس قدر خوبصورت عمارت ہے؟ لیکن وہ ان بلندیوں اور خوبصورتیوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں جو اس کائنات کے اندر موجود ہیں۔ بغیر ستونوں کے کرات اپنی اپنی جگہ قائم ہیں۔ اس کائنات کے پیچھے جو قدرت کارفرما ہے اور جو عظمت پوشیدہ ہے اور پھر اس کے اندر اس قوت نے جو خوبصورتی ودیعت کی ہے وہ بھی قابل دید ہے۔

یہ عظیم کائنات جو ہماری نظروں میں ہے اور وہ عظیم کائنات جو ہماری نظروں سے ابھی اوجھل ہے اور جہاں رب کائنات کا دارالخلافہ ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰي عَلَي الْعَرْشِ (۱۳ : ۲) "پھر وہ عرش پر متمکن ہوا"۔ یہ کائنات اگر بلند ہے تو عرش الٰہی بلند تر ہے۔ اور اگر یہ کائنات عظیم ہے تو عرش الٰہی عظیم تر ہے۔ ہر استواء کا مفہوم وسعت' عظمت اور تمکن ہے اور قرآن کریم نے لفظ استوی محض انسان کی قاصر قوت مدرکہ کو سمجھانے کے لیے استعمال کیا ہے کیونکہ انسانی قوت مدرکہ محدود اور کمزور ہے۔

یہ قدرت کے قلم معجز رقم کا ایک دوسرا ٹچ ہے۔ پہلا ٹچ تو ان بلندیوں کی بابت تھا جو انسان کو نظر آتی ہیں اور یہ دوسرا ٹچ ان بلندیوں کے بارے میں ہے جو ہماری حدود نظر کے دائرۂ نظارہ سے ماوراء ہیں۔ سیاق کلام میں یہ دونوں تصاویر ایک جگہ نظر آتی ہیں۔ اب بلندی کے عمومی تصور سے نیچے آکر' تسخیر کائنات کے مضمون کو لیا جاتا ہے۔ شمس و قمر کو اللہ نے جس فضا میں مسخر کر رکھا ہے اس کو ہم دیکھتے ہیں اور اس کے بارے میں جانتے ہیں۔ جس قدر ہم ان کے بارے میں جان سکے ہیں' اس میں اس نظام کی عظمت دامن فکر کو پکڑتی ہے' اور عقل کو دعوت دیتی ہے کہ یہ عظیم قوتیں اللہ عظیم کے قبضہ قدرت میں ہیں جس کے سامنے ہم نے حاضری دینی ہے۔

پھر جس منظر کی تصویر کھینچی گئی ہے اس کے اندر بے شمار متقابل مناظر ہیں۔ ایک تو اس کائنات کی وہ بلندیاں ہیں جو نظر آتی ہیں لیکن اس کے بالمقابل وہ بلندیاں بھی ہیں جو ہماری نظر سے اوجھل ہیں۔ پھر ایک تو اس کائنات کی بلندی اور اس بلندی اور عظمت کے بالمقابل اس عظیم کائنات کی بے بسی اور تسخیر ہے' شمس و قمر کا باہم مقابلہ ہے' رات اور دن کا مقابلہ ہے اور ستاروں اور سیاروں کا باہم مقابلہ ہے۔

پھر بلندیوں اور تسخیر کائنات کے علاوہ اس کے اندر ایک ممتاز پہلو حکمت الٰہیہ کا مدبرانہ پہلو ہے۔

كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّي (۱۳ : ۲) "کہ ہر چیز ایک وقت مقرر تک کے لیے چل رہی ہے"۔ اس کی بلندی اور چلت پھرت ایک مقرر وقت تک ہے' اور یہ وقت ایک مقرر کردہ ناموس الٰہی میں طے شدہ ہے۔ یہ وقت شمس و قمر کے دورہ یومیہ اور مدار میں چکر دونوں میں مقرر ہے۔ کسی جگہ بھی وہ اس اجل مسمی سے منحرف نہیں ہو سکتے اور وہ

وقت بھی مقرر ہے جب اس پورے نظام کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا اور یہ پوری کائنات ختم کر دی جائے گی۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ (۱۳ : ۲) "اللہ ہی اس سارے کام کی تدبیر فرما رہا ہے"۔ یعنی اس طرح کہ شمس و قمر اپنے اوقات کے مطابق اور اپنے وقت مقرر تک کے لیے ٹھیک ٹھیک جا رہے ہیں اور چلتے رہیں گے اور جو ذات باری ان عظیم الشان کرلت کو اس فضائے بسیط میں یوں بغیر ظاہری سہارے کے چلا رہی ہے' اس ذات نے ان کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا ہے اور یہ کسی صورت میں بھی وقت مقررہ سے آگے نہیں بڑھ سکتے کیونکہ وہ ذات بر تر مدبر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ جلیل القدر ہے۔

اللہ کی مدبرانہ شان کا ایک مظہر یہ ہے کہ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ (۱۳ : ۲) "وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے"۔ ان کو منظم طریقے سے باہم مربوط انداز میں پیش کرتا ہے اور ہر ایک چیز کو اپنی مقررہ میعاد پر لاتا ہے۔ اسباب کے مطابق لاتا ہے اور مقاصد متعین کر کے لاتا ہے۔ یہ کیوں؟

لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (۱۳ : ۲) "شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو"۔ کیونکہ جب ایک انسان دیکھتا ہے کہ آیات الہیہ مفصل اور مربوط ہیں اور ان کی پشت پر کائناتی آیات بھی موید ہیں' یہ تکوینی آیات وہ ہیں جو اللہ نے اس کائنات میں اس کی تخلیق کے وقت سے ودیعت کی ہوئی ہیں اور ان قدرتی دلائل اور آثار کے ساتھ ساتھ اللہ نے کتابی آیات و دلائل بھی نازل کیے اور یوں ان کی تائید فرمائی۔ ان تمام آیات دلائل کے نتیجے میں انسان لازمی طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہے۔ وہاں انسانی اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی' ان اعمال پر ان کو جزاء و سزا دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے یہ وہ نتائج ہیں جن کا اظہار حکمت تخلیق سے ہوتا ہے۔

اب مناظر قدرت کی تصویر کشی کا یہ عظیم خط عالم بالا سے عالم زیریں کی طرف آتا ہے اور عالم زیریں کی تصویر کشی یوں کی جاتی ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ۭ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۳ : ۳) "اور وہی ہے جس نے زمین پھیلا رکھی ہے' اس میں پہاڑ کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیئے ہیں' اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں اور وہی دن پر رات طاری کرتا ہے۔ ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں"۔ اس زمین کی تصویر کشی میں پہلا رنگ اس کا بچھایا جانا ہے۔ نظروں کے سامنے یہ بچھی ہوئی ہے اور طول و عرض میں یہ وسیع ہے۔ اگرچہ اس کی حقیقی شکل گول ہے گول ہونے کے ساتھ ساتھ یہ طویل و عریض ہے۔ یہ ہے اس تصویر کشی کا پہلا رنگ۔ اس کے بعد اس تصویر میں اونچے اونچے پہاڑ نمودار ہوتے ہیں۔ اس کے بعد پہاڑوں کے درمیان میں نہریں نظر آتی ہیں۔ یوں اس زمین کے ابتدائی خدوخال متعین ہوتے ہیں جو اس منظر کو نہایت ہی موزوں بناتے ہیں۔

زمین کے عمومی خدوخال کے تعین کے لیے ضروری ہے کہ یہاں نہایت ہی اصولی اور عمومی مظاہر کا تذکرہ ہو' زمین کے اندر زندگی کا اہم اصول اور اس زندگی کو قائم رکھنے کا اصولی مظہر یعنی حیوانی اور نباتی زندگی کے اندر مادہ اور نر کی تقسیم' حیوانی زندگی میں نر اور مادہ کا وجود تو ظاہر ہے لیکن نباتاتی حیات کے اندر نر و مادہ کا وجود صرف قرآن نے بتایا ہے' انسان حالیہ علمی ترقی سے قبل اس سے واقف نہ تھا' اور دوسرا مظہر شب و روز کا نظام جو بذات خود قیام حیات کے

لیے ایک اصول ہے ۔

مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ (۱۳ : ۳) "اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں"۔ یہ تو ہے پہلا اصولی مظہر اور يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ (۱۳ : ۳) "اور وہی دن پر رات طاری کرتا ہے"۔ تمام ثمرات کے جوڑے کیے ہیں ۔ ایک درخت میں دو قسم کے اعضاء ہوتے ہیں ۔ مادہ یا نر یا بعض درخت مادہ ہوتے ہیں ۔ اور بعض نر ہوتے ہیں ۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو انسان کے لئے اس کائنات کے اسرار و رموز کی نشاندہی کی راہ کھولتی ہے ۔ یعنی رات اور دن اور حیوانات میں نر و مادہ کے رنگ تو ظاہر ہیں پھلوں کے اندر تناسل و توالد ایک راز تھا ۔

خود رات اور دن کا یہ منظر کہ رات اور دن آگے پیچھے آ رہے ہیں ۔ ایک دوسرے کو ڈھانپ لیتے ہیں ۔ ان کا نظام بڑا ہی عجیب اور سحر انگیز ہے ۔ یہ گہرے غور و فکر کا موضوع ہے ۔ رات کا آنا اور دن کا بھاگ جانا' فجر کا نمودار ہونا اور رات کے اندھیروں کا چھٹ جانا ۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کو ہم رات اور دن دیکھتے دیکھتے اس کے ساتھ ایسے مانوس اور مالوف ہو گئے ہیں کہ ہمارے پردۂ احساس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ تعجب انگیز اور حیران کن ہیں ۔ اگر ہم اپنی عادت کو ذرا دور پھینک دیں اور اپنے ذہنی جمود کو ترک کر کے اس کائنات کو شاعرانہ حساسیت کے ساتھ دیکھیں اور اس رات دن کے چلتے رہنے کو ایک معمولی چیز نہ سمجھیں تو گردش ایام کا یہ نظام ایک گہری حکمت الٰہیہ کا پتہ دیتا ہے اور نظر آتا ہے کہ اس کے اندر صانع کائنات کی عجیب کاری گری عیاں ہے ۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۳ : ۳) "ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں"۔ اس منظر کو چھوڑ کر آگے بڑھنے سے قبل 'مناسب ہے کہ ہم ان تقابلی امور پر ایک نظر دوڑائیں جو اس منظر میں پیش کیے گئے ہیں ۔ مثلاً ایک طرف اپنی جگہ　　ہوئے بلند پہاڑ ہیں اور دوسری طرف بہتے ہوئے ندی نالے اور دریا ہیں ۔ تمام پھلوں میں نر اور مادہ ہیں ۔ رات اور دن ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل ہیں ' زمین ہے جو بچھی ہوئی ہے اور آسمان ہے جو بہت بلندیوں پر ہے ' اور دونوں اس عظیم کائنات کے اہم اور باہم متقابل نکتے ہیں ۔ دونوں عظیم کائنات کے اجزاء ہیں ۔

یہ تو تھے اس کائنات اور ارض و سما کے عمومی خد و خال اور بڑی لکیریں ۔ اب ذرا زمین کے نہایت ہی باریک خطوط اور رنگ ڈھنگ ملاحظہ کریں ۔

وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ

(۱۳ : ٤) "اور دیکھو زمین میں الگ الگ خطے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے متصل واقع ہوتے ہیں ۔ انگور کے باغ ہیں 'کھیتیاں ہیں ۔ کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دوہرے 'سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے 'مگر مزے میں ہم کسی کو بہتر بنا دیتے ہیں اور کسی کو کم تر ۔ ان سب چیزوں میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں"۔

یہ مظاہر قدرت ایسے ہیں کہ ہم میں سے اکثر لوگ ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن ان کے اندر یہ خیال بھی پیدا

نہیں ہوتا کہ وہ ان کی حقیقت معلوم کریں۔ الا یہ کہ انسان اس کائنات کی بھرپور زندگی پر غور کرے اور اپنے آپ کو اس کا حصہ سمجھتے ہوئے کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو اس کائنات سے الگ کر کے اس پر غور و فکر کرے اور اس میں مل جائے۔

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُتَجٰوِرٰتٌ (۱۳ : ۴) "اور زمین میں قطعات ہیں جو ایک دوسرے کے متصل واقع ہوئے ہیں"۔ ان قطعات کی خصوصیات الگ الگ ہیں۔ اگر یہ قطعات الگ الگ خصوصیت اور نوعیت کے نہ ہوتے تو ان کو قطعات نہ کہا جاتا بلکہ قطعہ کہا جاتا۔ یعنی ان میں بعض قطعات اچھے اور زرخیز ہیں اور بعض بنجر اور چٹیل ہیں۔ بعض صحراء میں جو بے آب و گیاہ ہیں اور بعض خالص چٹانیں ہیں۔ اور ان میں بھی پھر مختلف درجات کے ٹکڑے ہیں انواع واقسام کے۔ بعض شہروں اور آبادیوں کے لیے' بعض جنگلوں اور سبزیوں کے لیے' اور بعض بے آب و گیاہ اور مردہ میدان ہیں۔ اور بعض آبی ہیں اور بعض بارانی اور اس طرح قسم قسم کے ٹکڑے ہیں جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور باہم منفصل بھی ہیں اور سب کے سب اس زمین کا حصہ ہیں۔

یہ تھے زمین کی تصویر کشی کے سلسلے کے ابتدائی اور عمومی خطوط۔ اس کے بعد اب اس تصویر میں تفصیلی رنگ بھرے جاتے ہیں اور مختلف جزوی چیزیں نمودار ہوتی ہیں۔ فصل' کھجور اور انگور۔ یہ نباتات..... انگور وہ نباتات ہیں جو زمین پر پھیلتی اور درختوں پر رینگتے ہیں۔ کھجور ان نباتات کی نمائندہ ہے جو اونچے اونچے درختوں کی شکل میں ہوتے ہیں اور دوسرے فصل' پھول اور غلے کا نمائندہ جو درمیانی شکل میں کھڑے ہوتے ہیں۔ ان تینوں کے ذکر سے تین قسم کے مختلف مناظر کی طرف اشارہ مطلوب ہے۔ یوں اس تصویر میں رنگ بھرے جاتے ہیں اور اس کے اندر مختلف نمائندہ نباتات کے نمونے دیئے جاتے ہیں۔

یہ کھجور کے درخت اکہرے بھی ہیں اور دہرے بھی ہیں۔ یعنی بعض کا تنا ایک ہی ہے اور بعض ایک ہی جڑ سے دوہرے بھی ہیں' دو یا اس سے زیادہ۔ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں' ایک ہی مٹی ہوتی ہے لیکن سب درختوں کے پھل مختلف ہیں اور مختلف ذائقہ رکھتے ہیں۔

وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ (۱۳ : ۴) "مگر مزے میں ہم بعض کو بعض پر فضیلت دیتے ہیں"۔ ایک ہی خطے کے مختلف پھل اور نباتات ہم نے چکھے ہیں۔ ہر ایک کا ذائقہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ انسان کے دل و دماغ کو قرآن کریم جس نکتے کی طرف متوجہ کرتا ہے کیا کبھی ہم نے اس پر غور کیا ہے۔ ایسے ہی نکات ہیں جن کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم ایک جدید کتاب ہے۔ کیونکہ قرآن کریم انسانی احساس اور وجدان اور شعور کو پیش یا افتادہ حقائق کے بارے میں تازگی بخشتا ہے۔ خواہ یہ مناظر کائنات سے متعلق ہوں یا نفس انسانی سے متعلق ہوں۔ یہ نکات اس قدر زیادہ ہیں کہ انسان اگر پوری عمر لگا دے تو ان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی قرآن کے نکات اور عجائبات آنے والے ادوار میں ختم ہوں گے۔

اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۱۳ : ۴) "بے شک اس میں آیات و نشانات ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں"۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ یہاں پھر ایک نیا تقابل پایا جاتا ہے۔ زمین کے دو ٹکڑے باہم متقابل اور مختلف قسم کے ہیں۔ کھجور کے درخت بھی اکہرے اور دہرے باہم متقابل ہیں۔ پھر مختلف پھلوں کے ذائقے

مختلف ہیں ۔ اور نباتات بھی مختلف ہیں 'فصل' درخت اور انگور ۔

اس وسیع تر کائنات پر یہ سرسری نظر ڈالنے کے بعد اب لوگوں پر تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے کہ جو لوگ اس کائنات اور انفس و آفاق میں پائے جانے والے دلائل اور نشانات پر غور نہیں کرتے اور ان کی عقل اس نتیجے تک نہیں پہنچ پاتی کہ اس عظیم کائنات کا کوئی خالق بھی ہے یا کوئی عظیم قوت' قدرت اور حکمت مدبرہ ایسی موجود ہے جو اسے چلا رہی ہے تو گویا ان کے عقول جمود کا شکار ہیں ۔ ان کے دل تنگ ہیں' اور ان کی سوچ کے سوتے خشک ہو چکے ہیں ۔ کیا یہ صورت حالات تعجب انگیز نہیں ؟

وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَ اِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَ اِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْ اَعْنَاقِهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۱۳ : ۵) "اگر تمہیں تعجب کرنا ہے' تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں ۔ یہ جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے ۔ یہ ہے تعجب انگیز بات اور اس پر تعجب کرنا چاہئے کہ جو یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو پھر ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا؟

اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ جس ذات نے اس عظیم کائنات کی تخلیق کی ہے' جو اسے موجودہ حیرت انگیز انداز سے چلا رہا ہے وہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ لوگوں کو جدید شکل میں از سر نو زندہ کر دے ۔ اگر کوئی اس کو بعید از امکان سمجھتا ہے تو وہ اپنے خالق اور مدبر کائنات کا دراصل انکار کرتا ہے ۔ ایسے لوگوں نے دراصل اپنی عقل کو قید کر رکھا ہے اور وہ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے ۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ان کو سزا بھی ایسی ہی دے گا کہ ان کے گلوں میں بڑے بڑے طوق پڑے ہوں گے ۔ چنانچہ جب کہ ان کا عمل ایسا ہے یعنی عقل کو باندھنا' ایسی ہی سزا ہے یعنی ان کے گلوں میں بڑے بڑے طوق باندھنا ۔ اس لیے کہ انہوں نے اس خصوصیت انسانیہ کو معطل کر دیا ہے جس کی وجہ سے انسان دوسرے حیوانات پر مکرم ہے ۔ انہوں نے دنیا میں پسماندگی اختیار کر رکھی ہے ۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ان کے لیے ایسی زندگی تجویز کی ہے جو اس حیات دنیا سے بھی پسماندہ ہو کیونکہ یہ لوگ فکر و شعور اور احساس وجدان کو معطل کر کے یہاں محض حیوانات کی طرح زندگی گزارتے ہیں ۔

یہ لوگ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ اللہ ان کو ایک جدید مخلوق کے طور پر کس طرح اٹھائے گا؟ لیکن ان کا یہ تعجب ہی دراصل تعجب انگیز ہے ۔ یہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ ان پر جلدی عذاب لے آئیں تو یہ بھی تعجب انگیز ہے کہ وہ ہدایت کا مطالبہ کرنے اور اللہ کی رحمت کے طلبگار ہونے کے بجائے عذاب الٰہی کا مطالبہ کرتے ہیں ۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ (۱۳ : ۶) "اور یہ لوگ بھلائی سے پہلے برائی کے لیے جلدی مچا رہے ہیں" ۔ یہ لوگ اس کائنات اور انفس و آفاق میں غور نہیں کرتے' حالانکہ اللہ کی نشانیاں اس پوری کائنات میں بکھری پڑی ہیں' زمین میں بھی ہیں' آسمان میں بھی ہیں ۔ پھر کیا یہ لوگ اس سے پہلے ہلاک ہونے والے

لوگوں کے انجام پر بھی غور نہیں کرتے جنہوں نے نزول عذاب کے لیے شتابی کی' ان پر عذاب آیا اور وہ آنے والوں کے لیے ایک مثال اور نمونہ عبرت بن کر رہ گئے۔

وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ (۱۳ : ۶) "حالانکہ ان سے پہلے عبرتناک مثالیں گزر چکی ہیں"۔ اور یہ لوگ ان مثالوں پر غور نہیں کرتے حالانکہ ان میں ان کے لیے سامان عبرت تھا۔

اللہ تو اپنے بندوں پر بہت رحم کرنے والا ہے۔ اگرچہ وہ ایک عرصہ کے لیے ظلم کرتے ہیں' اللہ لوگوں کے لیے اپنی رحمت کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھتا ہے تاکہ وہ توبہ کے راستے اس میں داخل ہوں۔ لیکن عذاب صرف ان لوگوں پر نازل کرتا ہے جو عذاب الٰہی کے نزول پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ گناہوں میں گھرے جا رہے ہوں اور اللہ کے کھلے دروازے سے اندر جانے کے لیے تیار نہ ہوں۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ (۱۳ : ۶) "بے شک تیرا رب سخت سزا دینے والا ہے"۔ یہاں سیاق کلام میں اللہ کی مغفرت کو اس کی سزا پر مقدم رکھا گیا ہے' جبکہ یہ لوگ عذاب کے مطالبے میں جلدی کر رہے تھے' اور ہدایت قبول کرنے سے انکاری تھے تاکہ معلوم ہو کہ وہ بھلائی کس قدر عظیم ہے جو اللہ لوگوں کے لیے چاہتا ہے جبکہ یہ لوگ خود اپنے لیے ایک عظیم شر چاہتے ہیں۔ اس صورت حالات کے نتیجے میں نظر آتا ہے کہ یہ لوگ بصیرت کے اندھے ہیں' دلوں کے اندھے ہیں اور یہ کہ وہ نار جہنم کے مستحق ہیں بوجہ اپنی ہٹ دھرمی کے۔

اس کے بعد روئے سخن اس مضمون کی طرف مڑ جاتا ہے کہ ان لوگوں کا رویہ کس قدر عجیب ہے کہ ان کو اس کائنات کے اندر بے شمار جابجا بکھرے ہوئے دلائل تکوینی تو نظر نہیں آتے' مگر یہ لوگ ایک مخصوص معجزہ طلب کرتے ہیں۔ یہ رسول اللہ سے صرف ایک معجزہ طلب کرتے ہیں اور کائنات کے ہزارہا معجزات پر ان کی نظر نہیں ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (۱۳ : ۷) "یہ لوگ جنہوں نے تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیا ہے' کہتے ہیں کہ اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری؟ تم تو محض خبردار کرنے والے ہو' اور ہر قوم کے لیے راہنما ہے"۔ یہ لوگ ایک معجزہ طلب کرتے ہیں' جبکہ معجزات کا صدور رسول کے اپنے اختیار میں نہیں ہے' نہ ان کی ذاتی خصوصیت ہے۔ معجزات تو اللہ بھیجتا ہے اور اس وقت بھیجتا ہے جب اللہ اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اے رسول آپ تو محض ڈرانے والے ہیں جس طرح آپ سے قبل رسولوں کا منصب یہ تھا کہ وہ لوگوں کو ڈرانے والے تھے۔ اللہ نے بے شمار اقوام کی ہدایت کے لیے بے شمار رسول بھیجے ہیں۔ لہذا معجزات ارسال کرنا اس ذات کا کام ہے جو اس کائنات اور بندوں کا مدبر ہے۔

---ooo---

یہ تھی ایک اچٹتی سی نظر آفاق کائنات پر ۔ اس پر تبصرے تھے ' اب کائنات کی بعض مخصوص وادیوں میں آپ کو لے جایا جائے گا ۔ مثلاً نفس انسانی ' انسانی شعور و ادراک اور اس کرۂ ارض پر حیات انسانی اور دوسری زندہ اشیاء پر غور ۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ۝

" اللہ ایک ایک حاملہ کے پیٹ سے واقف ہے ' جو کچھ اس میں بنتا ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اس میں کمی یا بیشی ہوتی ہے اس سے بھی وہ باخبر رہتا ہے ۔ ہر چیز کے لیے اس کے ہاں ایک مقدار مقرر ہے ۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر ' ہر چیز کا عالم ہے ۔ وہ بزرگ ہے اور ہر حال میں بالاتر رہنے والا ہے ۔ تم میں سے کوئی شخص خواہ زور سے بات کرے یا آہستہ ' اور کوئی رات کی تاریکی میں چھپا ہوا ہو یا دن کی روشنی میں چل رہا ہو ' اس کے لیے سب یکساں ہیں ۔ ہر شخص کے آگے اور پیچھے اس کے مقرر کیے ہوئے نگران لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل لیتی ۔ اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کرلے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی ' نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے " ۔

جب حیات انسانی کی تصویر کشی کرتے ہوئے یہ مناظر پیش کیے جاتے ہیں تو انسانی حس اور شعور ششدر رہ جاتا ہے ۔ خصوصاً قرآن کے اس ترنم آمیز انداز بیان پر ۔ اللہ کے علم اور اللہ کی حکمتوں کی کرشمہ سازیاں دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے ۔ وہ علوم جو جنین کے بارے میں انسان پر ظاہر ہو چکے ہیں ' پھر وہ راز جو ہر انسان نے اپنے سینے میں چھپا رکھے ہیں ' راتوں میں انسان کی حرکات اور دوڑ دھوپ ' چھپ کر لوگوں کی سرگرمیاں اور دن کے وقت برملا لوگوں کی جدوجہد ' ان تمام امور کو اللہ اچھی طرح جانتا ہے ' اللہ کے گماشتے ان تمام سرگرمیوں کو ریکارڈ بھی کر رہے ہیں ۔ انسان کی یہ حیرانی دراصل خوف الٰہی کی وجہ سے ہے جس کے نتیجے میں انسان اللہ کی پناہ لیتا ہے ۔ وہ اللہ کی پناہ گاہ ہی میں پناہ لیتا ہے ۔ ایک مومن اچھی طرح جانتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ اللہ کا علم تمام چیزوں کو گھیرے ہوئے ہے ' لیکن اصولی طور پر اللہ کے علم کے شمول اور وسعت کا اقرار اور بات ہے اور یہاں قرآن مجید نے جس موثر انداز میں بعض جزئیات کا ذکر کیا ہے اس کی اثر انگیزی اور بات ہے ۔

محض تجریدی کلیہ کا بیان کر دینا اور بات ہے اور کلیہ کے تحت کسی مثالی جزئیہ کا مطالعہ اور بات ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ بعض جزئیات 'حساس جزئیات کا ذکر فرماتے ہیں۔

اَللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ کُلُّ اُنْثٰی وَ مَا تَغِیْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ وَ کُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِمِقْدَارٍ (۱۳ : ۸) "اللہ ایک ایک حاملہ کے پیٹ سے واقف ہے' جو کچھ اس میں بنتا ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اس میں کمی یا بیشی ہوتی ہے اس سے بھی وہ باخبر رہتا ہے۔ ہر چیز کے لیے اس کے ہاں ایک مقدار مقرر ہے"۔

ہر حاملہ سے خیال کے پردے پر ہر حاملہ 'مطلق حاملہ آ جاتی ہے' اس پوری کائنات میں تمام زندہ حاملہ 'وسیع معنوں میں ہر حاملہ شہروں میں اور دیہاتوں میں۔ آبادیوں میں اور پہاڑوں میں 'جنگلوں میں دریاؤں میں 'گھروں میں اور غاروں میں' ہر مادہ کے پیٹ میں جو کچھ پیدا ہو رہا ہے' بڑھ رہا ہے یا گھٹ رہا ہے' ہر وہ قطرۂ خون جو بڑھ رہا ہے یا گھٹ رہا ہے 'اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

یہ تو ہے ایک مخصوص مثال اور یہ کوئی تجریدی کلیہ نہیں ہے کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور بس 'بلکہ ایک مخصوص شعبہ علم کی بات ہے۔

سَوَآءٌ مِّنْکُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَہَرَ بِہٖ وَ مَنْ ہُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّیْلِ وَ سَارِبٌ بِالنَّہَارِ (۱۰) لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَ مِنْ خَلْفِہٖ یَحْفَظُوْنَہٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ ---

(۱۱) (۱۳ : ۱۰ - ۱۱) "تم میں سے کوئی شخص خواہ زور سے بات کرے یا آہستہ 'اور کوئی رات کی تاریکی میں چھپا ہوا ہو یا دن کی روشنی میں چل رہا ہو' اس کے لیے سب یکساں ہیں۔ ہر شخص کے آگے اور پیچھے اس کے مقرر کیے ہوئے نگراں لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں"۔

جب انسانی خیال پر سرگوشی کرنے والے' ہر جرأ بات کرنے والے کے بارے میں سوچ' اندھیروں میں چلنے والوں اور دن کی روشنی میں متحرک لوگوں کے بارے میں سوچ اور پھر اس پوری کائنات کے بارے میں سوچ اور پھر یہ سوچ کہ اللہ کا علم ان سب کا پیچھا کر رہا ہے اور اس کے گماشتے بھی لکھ رہے ہیں اور رات کے دونوں کناروں پر رپورٹ بھی بھیجتے ہیں۔ پھر ان جزئیات علم الٰہی کے انداز بیان پر بھی ذرا غور کیجئے :

اَللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ کُلُّ اُنْثٰی وَ مَا تَغِیْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ وَ کُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِمِقْدَارٍ (۱۳ : ۸) "اللہ ایک ایک حاملہ کے پیٹ سے واقف ہے' جو کچھ اس میں بنتا ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اس میں کمی یا بیشی ہوتی ہے اس سے بھی وہ باخبر رہتا ہے۔ ہر چیز کے لیے اس کے ہاں ایک مقدار مقرر ہے"۔

جب اللہ نے یہ فرمایا کہ رحم مادر میں جو کمی بیشی ہوتی ہے اللہ اسے جانتا ہے تو اس کے آخر میں فرمایا کہ اللہ کے ہاں ہر چیز

کی مقدار مقرر ہے - نقص و زیادتی کے ساتھ مقدار کا لفظ لانا ایک توازن پیدا کرتا ہے - پھر اس کا تعلق اس سے قبل کی اس آیت سے بھی ہے جس میں آیا ہے کہ لوگ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ مرنے اور مٹی بن جانے کے بعد خلق جدید کی شکل میں لوگ کس طرح اٹھ کھڑے ہوں گے - نیز موضوع اور ظاہری شکل کے اعتبار سے یہ اس مضمون کے بھی مماثل ہے جس میں بارش کا ذکر ہے کہ بارش برستی ہے اور ہر وادی اپنی مقدار کے مطابق پانی سے بہہ جاتی ہے - تمام امور میں مقدار ملحوظ ہے - کمی بیشی اور مقدار اس سورہ کا نکتہ خاص ہے -

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ (۱۳ : ۹) "وہ پوشیدہ اور ظاہر ہر چیز کا عالم ہے وہ بزرگ اور ہر حال میں بالاتر رہنے والا ہے" - لفظ کبیر اور لفظ متعال دونوں پردۂ احساس پر ایک خاص اثر چھوڑتے ہیں' اس کو میں پرتو سے تعبیر کرتا ہوں - کسی دوسرے لفظ سے اس کی تعبیر مشکل ہے - یعنی جو بھی مخلوق ہے' اس کے اندر کوئی نہ کوئی نقص ضرور ہوتا ہے جو اسے صغیر بنا دیتا ہے - اللہ کی مخلوقات میں سے کسی کو بھی ہم کبیر نہیں کہہ سکتے - یا کسی اور معاملے کو ہم کبیر نہیں کہہ سکتے - اللہ کا ذکر آتے ہی تمام دوسرے امور صغیر ہو جاتے ہیں - اسی طرح لفظ متعال کے بارے میں بھی ہماری سوچ محدود ہے - کسی مفسر نے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا کہ الکبیر المتعال کا دائرہ اطلاق کیا ہے -

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ (۱۳ : ۱۰) "تم میں سے کوئی شخص زور سے بات کرے یا آہستہ' اور کوئی رات کی تاریکی میں چھپا ہوا یا دن کی روشنی میں چل رہا ہو' اس کے لیے سب یکساں ہیں" - عبارت میں تقابل واضح ہے - لفظ سارب قابل غور ہے - خود لفظ سارب اپنے مفہوم پر روشنی ڈالتا ہے - مفہوم ہے اخفا اور پوشیدگی یا قریب قریب پوشیدگی - سارب کا مفہوم ہے روشنی میں چلنے والا یعنی خفیہ چیزوں کو بھی اللہ جانتا ہے - حمل جو چھپا ہوا ہے' راز جو خفیہ ہوتے ہیں' وہ شخص جو رات کے اندھیرے میں چلتا ہے پھر اللہ کے گماشتے جو نظر نہیں آتے' سارب خفیہ کے بالمقابل لفظ ہے لیکن خود اس کے اندر بھی نرمی' لطف اور اخفاء کا پرتو موجود ہے -

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (۱۳ : ۱۱) "ہر شخص کے آگے پیچھے اس کے مقرر کیے ہوئے نگراں موجود ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں" - وہ فرشتے جو انسانوں کی حفاظت کے لیے مقرر ہیں' ہر آنے جانے والے کی حفاظت کرتے ہیں' جو انسانوں کو ہر وسوسہ اور ہر طغیان سے بچاتے ہیں - یہ اللہ کے احکام کے مطابق کام کرتے ہیں - یہاں ان نگرانوں کی کوئی تعریف و تفصیل بیان نہیں کی جاتی - صرف یہ تعریف ان کی یہاں ہے کہ من امر اللہ - جو اللہ کے حکم سے کام کرتے ہیں' ہم بھی یہاں ان کو مجمل ہی چھوڑتے ہیں کہ وہ کیا ہیں' ان کی صفات کیسی ہیں' وہ کس طرح یہ نگرانی کرتے ہیں' کہاں ہوتے ہیں' اللہ نے چونکہ اس بات کو مخفی رکھا ہے' اور اس کے اخفاء ہی سے وہ خوف پیدا ہوتا ہے جس کو یہاں پیدا کرنا مطلوب ہے - لہٰذا قرآن نے جس قدر کہہ دیا ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہیں - اور یہ اخفاء اور اجمال اتفاقی اور بے مقصد نہیں ہے' جو لوگ قرآن کریم کے اسلوب

کے انکسار کے بارے میں کچھ بھی تعلق رکھتے ہیں ان کے لیے یہ بات مشکل ہے کہ وہ قرآن کی پیدا کردہ ایک فضا کو ختم کر دیں کیونکہ تفصیلات دینے سے وہ تاثر ختم ہو جائے گا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (۱۳ : ۱۱) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی"۔ اللہ ان کی نگرانی اپنے کارندوں کے ذریعے یوں کرتا ہے کہ وہ دیکھیں کہ لوگ اپنے اندر کیا کیا تبدیلیاں لاتے ہیں اور اپنے حالات کو بدلنے کی کیا سعی کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ترقی و پسماندگی میں 'عزت و ذلت میں' بلندی اور زوال میں کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک لوگ خود اپنی سوچ 'اپنے شعور' اپنے اعمال اور اپنی سرگرمیوں کو بدلتے نہیں۔ چنانچہ اللہ بھی لوگوں کی سوچ اور ان کے فکر و عمل کے مطابق لوگوں کے حالات میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ اگرچہ اللہ کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسا ایسا کریں گے اور یہ یہ نہ کریں گے۔ عملی نتائج لوگوں کے فکر و عمل کے مطابق ہی نکلتے ہیں۔ ہاں یہ نتائج عملاً اس دور میں پیدا ہوئے جو لوگوں کی زندگی کے ساتھ متعین ہوتا ہے۔

یہ وہ حقیقت ہے جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انسانیت پر بہت ہی بڑی ذمہ داری عائد کر دی ہے۔ یہ اللہ کی مشیت کا تقاضا تھا اور اسی کے مطابق سنت الہیہ جاری و ساری ہے کہ لوگوں کے حالات لوگوں کے بدلنے پر موقوف ہوں گے۔ سنت الہیہ ان کے طرز عمل اور ان کی طرز فکر پر مرتب ہوگی۔ یہ ایک صریح نص ہے 'لہٰذا اس میں کسی تاویل اور تحریف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس سنت الہیہ کے تعین کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انسان کو نہایت ہی مکرم بنا دیا ہے کہ خود انسان کے عمل سے سنت الہیہ چلتی ہے۔

اس سنت الہیہ کے تعین کے بعد سیاق کلام بتا دیتا ہے کہ اللہ کسی قوم کو ہلاکت میں ڈالتا ہے تو سنت کیا ہوتی ہے۔ وہ بھی یہی ہوتی ہے کہ جب لوگ اپنے اندر بری تبدیلی لاتے ہیں تو پھر سنت الہیہ بھی ان کو برے دن دکھاتی ہے۔

وَ اِذَآ اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَہٗ وَ مَا لَھُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ مِنْ وَّالٍ

(۱۳ : ۱۱) "اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کر لے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی 'نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے"۔

یہاں سیاق کلام زوال کا یہ پہلو اس طرح بیان کرتا ہے کیونکہ یہاں موضوع و مضمون ایسا ہے کہ لوگ اچھائی سے زیادہ برائی کے طلبگار ہیں۔ جبکہ اللہ نے ان کو بتایا کہ وہ عذاب سے قبل تمہاری مغفرت کے بارے میں سوچتا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ لوگ کس قدر غافل ہو گئے ہیں۔ اس لیے یہاں ان کے انجام بد کا ذکر کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ ڈریں اور عقل کے ناخن لیں کیونکہ اللہ کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں اور جب تمہاری ہلاکت کا فیصلہ آ گیا تو پھر کوئی تمہارا حامی و مددگار نہ ہوگا۔

---ooo---

اب سیاق کلام ہمیں ایک دوسری وادی میں لے جاتا ہے۔ یہ وادی بھی اس کے ساتھ متصل اور مربوط ہے جس

میں ہم ابھی گھوم رہے تھے - یہ وادی وہ ہے جہاں طبعی مناظر اور نفس انسانی کے شعور کے مناظر باہم ملتے ہیں - اس وادی کے مناظر طبیعی 'ان کا پرتو اور ان کے اثرات انسانی شعور کی تصویر میں باہم جمع ہو جاتے ہیں - خوف 'ڈر 'جدوجہد 'امید اور خوف باہم ملے ہوئے ہیں اور انسانی شعور اس وادی میں مختلف تاثرات لیتا ہے -

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿١٢﴾ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ ﴿١٣﴾ لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ إِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ﴿١٤﴾ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَظِلَالُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ ﴿١٥﴾ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ قُلِ اللَّهُ قُلْ أَفَاتَّخَذْتُمْ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ لَا يَمْلِكُونَ لِأَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿١٦﴾

"وہی ہے جو تمہارے سامنے بجلیاں چمکاتا ہے جنہیں دیکھ کر تمہیں اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں اور امیدیں بھی بندھتی ہیں - وہی ہے جو پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھاتا ہے - بادلوں کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اور فرشتے اس کی ہیبت سے لرزتے ہوئے اس کی تسبیح کرتے ہیں - وہ کڑکتی ہوئی بجلیوں کو بھیجتا ہے اور (بسا اوقات) انہیں جس پر چاہتا ہے عین اس حالت میں گرا دیتا ہے جبکہ لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں - فی الواقع اس کی چال بڑی زبردست ہے -

اسی کو پکارنا برحق ہے - رہیں وہ دوسری ہستیاں جنہیں اس کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں' وہ ان کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں - انہیں پکارنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس سے درخواست کرے کہ تو

میرے منہ تک پہنچ جا' حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں - بس اسی طرح کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں ہیں مگر ایک تیر بے ہدف! وہ تو اللہ ہی ہے جس کو زمین و آسمان کی ہر چیز طوعاً و کرھاً سجدہ کر رہی ہے اور سب چیزوں کے سائے صبح و شام اس کے آگے جھکتے ہیں -

ان سے پوچھو' آسمان و زمین کا رب کون ہے؟--- کہو' اللہ - پھر ان سے کہو کہ حقیقت یہ ہے تو کیا تم نے اسے چھوڑ کر ایسے معبودوں کو اپنا کارساز ٹھہرا لیا جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے؟ کہو 'کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوا کرتا ہے؟ کیا روشنی اور تاریکیاں یکساں ہوتی ہیں؟ اور اگر ایسا نہیں تو کیا ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں نے بھی اللہ کی طرح کچھ پیدا کیا ہے کہ اس کی وجہ سے ان پر تخلیق کا معاملہ مشتبہ ہو گیا؟--- کہو ہر چیز کا خالق صرف اللہ ہے اور وہ یکتا ہے 'سب پر غالب!''

چمک 'گرج اور بادل عام مناظر ہیں - اسی طرح بعض اوقات ان مناظر میں سے برق بھی گرتی ہے - یہ وہ مناظر ہیں جو ہر انسان کو متاثر کرتے ہیں چاہے کوئی ان کی طبعی حقیقت سے واقف ہو یا نہ ہو' یہاں قرآن مجید ان کو پیش کرتے ہوئے' ان کے ساتھ ملائکہ 'تسبیح' سجود' خوف' طمع اور ان مشاہد کے سائے کا بھی ذکر کرتا ہے اور اس بات کا بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ سچی پکار کیا ہے اور باطل اور ناحق پکار کیا ہے - ان مناظر میں ایک دوسرے شخص کی شکل یوں پیش کی جاتی ہے جو پانی پینا چاہتا ہے لیکن اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتا' بلکہ ہاتھ کھول کر اور منہ کھولے ہوئے یہ تمنا کرتا ہے کہ پانی خود بخود اس کے منہ میں پڑ جائے 'جبکہ وہ پڑنے والا نہیں 'ایک قطرہ بھی -

یہ تمام مناظر' مثالیں اور اشیاء اس آیت میں محض اتفاقاً اور بے مقصد جمع نہیں کر دی گئیں' ان سب چیزوں کا دراصل مدعا سے تعلق ہے - بلکہ یہ مناظر انسان کو ڈرانے 'امید و بیم اور طمع اور خوف اور نفع و نقصان کی امید دلانے اور اللہ کے ساتھ انسانوں نے جو دوسرے شریک ٹھہرا رکھے ان کی قوت کی نفی کے لیے لائے گئے ہیں -

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا (۱۳ : ۱۲) ''وہی ہے جو تمہارے سامنے بجلیاں چمکاتا ہے جنہیں دیکھ کر تمہیں اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں اور امیدیں بھی بندھتی ہیں'' - اللہ وہ ذات ہے جو تمہیں یہ تکوینی مظاہر دکھاتا ہے - یہ اس کائنات کے طبیعی اور موسمی مظاہر ہیں جسے اس نے پیدا کیا ہے اور اس خاص انداز پر اس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور یہ خواص ان اشیاء کے اندر پیدا کیے ہیں - وہ بجلی جو اللہ تمہیں دکھاتا ہے' یہ اس کے قانون قدرت کے مطابق کام کرتی ہے - تم اس سے ڈر بھی جاتے ہو کیونکہ اس کی ماہیت ہی ایسی ہے جو اعصاب کو ہلا مارتی ہے - کبھی کبھی یہ بجلی برق بن کر بھی گرتی ہے اور خوفناک شکل میں تباہی بھی مچاتی ہے - جیسا کہ بارہا تم کو یہ بھی ہوا ہو گا - تم اس چمک اور بجلی کے بعد باراں رحمت کے امیدوار بھی ہوتے ہو 'کیونکہ اس چمک اور گرج کے بعد بعض اوقات موسلا دھار بارش ہوتی ہے اور مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے -

وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۳ : ۱۲) ''وہی ہے جو بارش سے لدے ہوئے بادل اٹھاتا ہے'' - بادلوں کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے - سحاب ------ اس جنس کا واحد سحابہ ہے جو بادل کے ایک ٹکڑے کو کہتے ہیں - ثقال سے مراد وہ بادل ہیں جو بارش کی وجہ سے بوجھل ہیں - یہ بادل اللہ کے پیدا کردہ ناموس فطرت کے مطابق پیدا

ہوتے ہیں اور موسلا دھار بارشیں برساتے ہیں۔اگر اللہ تعالیٰ قانون قدرت اس طرح نہ وضع کرتا تو نہ بادل ہوتے اور نہ یوں بارشیں ہوتیں۔یہ کہہ کر کہ بادل کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور بارشیں کس طرح برستی ہیں' ان کی علمی اور سائنسی کیفیت معلوم ہونے سے ان کی خوبصورتی اور سحر آفرینی میں کوئی کمی نہیں آتی۔نہ اس سے اس مفہوم میں فرق پڑتا ہے جو قرآن کریم نے اخذ کیا ہے۔کیونکہ یہ تمام کام اور عمل صرف اللہ کے پیدا کردہ تکوینی نظام کے مطابق ہوتا ہے' اس میں کسی انسان کی صنعت کاری کا کوئی دخل نہیں ہے۔نہ انسانوں کا اس پورے نظام میں کوئی دخل و عمل ہے۔یہ تکوینی اور طبعی قواعد جن کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے نہ خود کائنات نے پیدا کیے ہیں اور نہ خود بخود چل پڑے ہیں' اس میں جو کچھ بھی چل رہا ہے ایک خالق مطلق کی وجہ سے چل رہا ہے۔

رعد' باد' باران کے مناظر میں ایک خاص منظر ہوتا ہے۔یہ طویل اور کڑاکے کی آواز۔یہ بھی اس کرۂ ارض کے قوانین قدرت کا ایک مظاہرہ ہے اور اللہ کی صنعت کاری ہے۔اس کا سائنسی تجزیہ جو بھی ہو' اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ اللہ کی تخلیق کا ایک حصہ ہے۔یہ حمد و تسبیح اس معنی میں کرتا ہے کہ یہ اس قانون قدرت کے مطابق رواں دواں ہے جس کے مطابق اللہ نے یہ نظام بنایا ہے' جیسا کہ ہر خوبصورت بنائی ہوئی چیز کو دیکھ کر بنانے والی کی حمد و ثنا بے ساختہ ہوتی رہتی ہے اور اس کی مصنوعہ چیز کے آثار اور جمال اور افادیت کو دیکھ کر ہر کوئی تعریف کرتا ہے۔اسی طرح اس کائنات کے اندر پائے جانے والے کمالات اور حیرت انگیز افادیت کی چیزوں کو دیکھنے سے بے ساختہ اللہ کی تسبیح زبان پر آجاتی ہے۔تسبیح کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے اور رعد تو خود ہی پکار رہی ہے اور تسبیح کر رہی ہے۔بہرحال ہم ان چیزوں کی تسبیح کو ابھی تک نہیں سمجھ سکے اور نہ سمجھتے ہوئے بھی ہم ان حقائق پر ایمان لاتے ہیں۔خود اپنے بارے میں بھی ابھی تک ہم کم ہی جانتے ہیں۔ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد ہم یہ بھی معلوم کر لیں کہ یہ چیزیں کیسے تسبیح کرتی ہیں۔

یہاں قرآن کریم نے رعد کے بارے میں ایسا انداز بیان اختیار کیا ہے کہ گویا رعد ایک زندہ مخلوق ہے اور وہ تسبیح کر رہی ہے' قرآن کریم کا یہ مخصوص انداز ہے کہ وہ مناظر قدرت کو آثار زندگی سے مزین کر دیتا ہے حالانکہ یہ مناظر قدرت خاموش ہوتے ہیں اور یہ اس لیے کہ اس پورے منظر میں تمام دوسرے مناظر زندہ ہیں جیسا کہ میں نے اپنی کتاب التصویر الفنی فی القرآن میں تفصیلات دی ہیں۔اس منظر میں چونکہ زندہ چیزوں کے مناظر ہیں مثلاً تسبیح کر رہے ہیں۔اللہ کو پکارنا' شرکاء کو پکارنا اور یہ منظر کہ ایک آدمی پانی کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے کہ وہ خود بخود منہ میں پڑ جائے جبکہ وہ پڑنے والا نہیں ہے' تو ایسے مناظر جن میں ایک طرف پکار' بندگی اور حرکت ہے' رعد کو بھی زندہ تصور کر کے تسبیح اور دعاء کی نسبت اس کی طرف کر دی گئی۔

اب اس منظر کو ذرا مزید خوفناک بنایا جاتا ہے' خوف' دعاء' برق اور رعد اور بھاری بادل اور بادو باراں کے ساتھ اب بجلیاں بھی گرتی دکھائی دیتی ہیں' اور کسی بیچارے پر برق گرتی ہے۔یہ بجلی جس طرح گرتی ہے وہ اس کائنات کے قدرتی نظام کا حصہ ہے۔بعض اوقات یہ برق ایسے شخص پر گر جاتی ہے جسے اللہ مزید مہلت دینا نہیں چاہتا کیونکہ اللہ ہی جانتا ہے کہ ایسے لوگوں کو اب مہلت دینا مناسب نہیں لہٰذا بعض لوگ اس برق کے ذریعے ہلاک کر دیئے جاتے ہیں۔

اور تعجب انگیز بات یہ ہے کہ رعد و برق اور طوفان باد و باراں کی اس فضا میں' اور رعد اور برق کی جانب سے تسبیح اور ملائکہ کی جانب سے حالت خوف میں اظہار اطاعت' اور اللہ کے ان غضبناک مظاہر قدرت کے عروج کی حالت میں بھی

بعض لوگ ایسے ہیں جو خود ذات باری کے متعلق شبہات کا اظہار کرتے ہیں' اللہ کے بارے میں مجادلے اور مباحثے کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کی قدرت کے مظاہر بلکہ خوفناک مظاہر وہ خود چشم سر دیکھ رہے ہیں۔

وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ (۱۳:۱۳) "یہ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں حالانکہ اس کی چال بڑی زبردست ہے"۔ بعض لوگ ایسے ہیں کہ جو ذات باری میں کلام کرتے ہیں لیکن اس ہولناک فضا' گریہ وزاری اور رعد اور برق' چیخ اور دھاڑ اور اس ہنگامہ خیز فضا میں جس کی تمام چیزیں وجود باری پر دلالت کرتی ہیں ایسے چند لوگوں کی آواز دب کر رہ جاتی ہے۔ کیونکہ اس کائنات کے تمام قابل ذکر مناظر اللہ کی وحدانیت' اللہ کی تسبیح و تحلیل پر دلیل ناطق ہیں' پھر فرشتوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو ہر وقت اللہ کے خوف کے مارے کانپتے رہتے ہیں' لہٰذا ان مناظر کی موجودگی' اور ان فرشتوں کے خوف اور تمام انسانوں کے خوف کی اس فضا میں اللہ کے بارے میں کلام کرنے والوں کی بات شاذ و نادر ہے اور بے محل ہے۔

یہ لوگ اللہ کے بارے میں کلام کرتے ہیں' مثلاً یہ کہ وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ وحدہ حق ہے اور اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے' زائل ہونے والا اور فانی ہے۔ اس فانی کو جو بھی پکارے گا' لاحاصل پکارتا رہے گا۔

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ

(۱۳:۱٤) "اسی کو پکارنا برحق ہے۔ رہیں وہ دوسری ہستیاں جنہیں اس کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں' وہ ان کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔ انہیں پکارنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس سے درخواست کرے کہ تو میرے منہ تک پہنچ جا' حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں۔ بس اسی طرح کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں ہیں مگر ایک تیر بے ہدف!"

یہ منظر بھی بولتا منظر ہے' متحرک اور پرمعنی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی پکار حق ہے' اور وہی اس بات کی مستحق ہے اور حقیقت پسندانہ ہے اور اس کے سوا جو پکاریں بھی ہیں وہ باطل' بے فائدہ اور گمراہانہ ہیں۔ کیا تم ذرا غور نہیں کرتے کہ جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو پکارتے ہیں ان میں سے ایک شخص کی مثال ایسی ہے کہ وہ پیاسا ہے اور پیاس کی وجہ سے نڈھال ہو رہا ہے' اس نے بازو پھیلا رکھے ہیں' ہاتھ کھول رکھے ہیں' منہ کھلا ہے اور مسلسل پکار رہا ہے کسی کو' اپنے سامنے موجود پانی کو' اے پانی میرے منہ میں آکر پڑ جا۔ حالانکہ وہ پڑنے والا نہیں ہے۔ یہ شخص اس پکار اور جدوجہد میں تھک کر چور ہو جاتا ہے اور اس کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ یہ ہے مفہوم اس آیت کا۔

وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (۱۳:۱٤) حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں۔ بس اسی طرح کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں ہیں مگر ایک تیر بے ہدف؟ یہ مثال اس فضا میں دی گئی ہے کہ

ایک پیاس سے نڈھال آدمی ایک قطرۂ آب بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ ایسی فضا میں جس میں ہر طرف برق اور باد و باراں کا طوفان ہے اور یہ تمام خوفناک مناظر اللہ کے قانون قدرت کے مطابق متحرک ہیں۔

جس وقت یہ ناکام اور غلط کار لوگ اللہ کے سوا دوسرے الہوں کو پکارتے ہیں' غیر اللہ سے امید رکھتے ہیں اور غیر اللہ کے سامنے دست بدعاء ہوتے ہیں' یہ پوری کائنات اور اس کی ہر چیز اللہ کے سامنے سربسجود ہوتی ہے' یہ سب لوگ اور یہ سب مخلوق اللہ کے حکم کے تابع ہے اور اللہ کے قانون قدرت میں جکڑی ہوئی ہے۔ اللہ کی سنت کے مطابق چل رہی ہے۔ اس مخلوق میں سے جو مومن ہے وہ خوشی اور مرضی سے اطاعت کرتا ہے اور جو کافر ہیں وہ بھی کرھا اطاعت کرتے ہیں کیونکہ کوئی چیز ارادۂ الہی سے نہیں نکل سکتی اور نہ کوئی چیز ناموس الہیہ سے نکلتی ہے۔

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ (۱۵) السجدہ "وہ تو اللہ ہی ہے جس کو زمین و آسمان کی ہر چیز طوعاً و کرھاً سجدہ کر رہی ہے اور سب چیزوں کے سائے صبح و شام اس کے آگے جھکتے ہیں"۔ کیونکہ یہ فضا ہی عبادت اور بندگی اور پکار کی فضا ہے۔ سیاق کلام میں قرآن اللہ کے احکام بجا لانے کو لفظ عبادت سے تعبیر کرتا ہے کیونکہ سجدے میں انسان غایت درجہ خضوع اور اطاعت اختیار کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آسمانوں اور زمین کی مخلوق کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کائنات کی تمام چیزوں کے سائے کو بھی اللہ کا مطیع کہا گیا کہ ان چیزوں کے سائے بھی اللہ کے سامنے جھکتے ہیں۔ گویا وہ اللہ کی عبادت اور بندگی کرتے ہیں کیونکہ یہ اطاعت الہیہ سے سرمو انحراف نہیں کر سکتے اور وہ قانون قدرت کے یوں تابع ہیں جس طرح وہ شخص تابع ہوتا ہے جو اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے۔ یہ تمثیل بھی ہے اور حقیقت بھی ہے کیونکہ سایہ سورج کی کرنوں کے تابع ہوتا ہے۔ اس تمثیل کا اس منظر کی فضا پر بھی اثر پڑتا ہے گو سجدے بھی دو قسم کے ہیں۔ افراد کے سجدے اور سایوں کے سجدے۔ اور یہ پوری کائنات بھی اللہ کے تابع فرمان ہے۔ چاہے راہ ایمان سے تابع ہو یا غیر ایمان یعنی قانون قدرت کے ذریعے۔ سب کی سب کائنات بہرحال سربسجود ہے۔ اور یہ بدبخت مشرک ایسے ہیں جو ان حالات میں بھی غیر اللہ کو پکارتے ہیں۔

اس عجیب و غریب منظر اور اس پرتاثیر فضا میں اب ان سے پوچھا جاتا ہے' ایسے سوالات پوچھے جاتے ہیں جن کا جواب ہاں کے سوا کچھ نہیں اور یوں ان کو اضحوکہ بنایا جاتا ہے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۳: ۱٦) "ان سے پوچھو' آسمان و زمین کا رب کون ہے؟ --- کہو' اللہ۔ پھر ان سے کہو کہ حقیقت یہ ہے تو کیا تم نے اسے چھوڑ کر ایسے معبودوں کو اپنا کارساز ٹھہرا لیا جو خود

اپنے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے ؟ کہو 'کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوا کرتا ہے ؟ کیا روشنی اور تاریکیاں یکساں ہوتی ہیں؟ اور اگر ایسا نہیں تو کیا ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں نے بھی اللہ کی طرح کچھ پیدا کیا ہے کہ اس کی وجہ سے ان پر تخلیق کا معاملہ مشتبہ ہو گیا؟۔۔۔کہو ہر چیز کا خالق صرف اللہ ہے اور وہ یکتا ہے 'سب پر غالب !"

ان سے پوچھو اور حال یہ ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اللہ کے ارادے اور اللہ کی قدرت سے ماخوذ ہے ۔ اللہ کی قدرت میں بندھا ہوا ہے خواہ وہ راضی ہو یا نہ ہو ۔ یہ بوجھ کہ کون ہے رب السموات والارض ؟ یہ سوال اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ کوئی جواب دیں اس کا جواب تو سیاق کلام میں آگیا ہے ۔ یہ سب اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ اپنی زبان سے اقرار کر لیں ۔ جواب تو یہی ہے کہ "اللہ" ہے ۔ پھر دوسرا سوال یہ کہ تم جن کو پکارتے ہو کیا وہ اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک ہیں ۔ یہ سوال بھی محض ان کی گوشمالی اور ان کو ذلیل کرنے کے لیے کیا گیا ہے ۔ تم سوال کرتے جاؤ 'جبکہ یہ مسئلہ بالکل واضح ہے ۔ حق و باطل میں امتیاز ہو چکا ہے ۔ اس قدر امتیاز ہو چکا ہے کہ جس طرح اندھے اور صاحب بصارت میں فرق ہے یا جس طرح روشنی اور تاریکی میں فرق ہے ۔ اعمی اور بصیر میں اشارہ اس طرف ہے کہ ایک مومن بصیر ہوتا ہے اور ایک کافر اندھا ہوتا ہے ۔ کیونکہ اندھا پن ہی انسان کو سچائی کے دیکھنے سے روکتا ہے حالانکہ یہ سچائی ظاہر و باطن ہے ۔ اور اس کے آثار زمین و آسمان میں محسوس کیے جا سکتے ہیں ۔ ظلمات اور نور کے تذکرے سے بھی منکرین کے حالات اور مومنین کے حالات کی طرف اشارہ ہے ۔ اندھیرا دیکھنے کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے اور ان کی حالت بھی یہ ہے کہ ان کے اور سچائی کے درمیان پردے حائل ہیں ۔

اہم سوال یہ ہے کہ کیا وہ ہستیاں جن کو یہ لوگ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں انہوں نے کوئی مخلوق پیدا کی ہے جس طرح کی مخلوقات اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ۔ اس طرح ان کو یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ شاید یہ بھی خالقیت میں شریک ہیں یا ان کو شبہ ہو گیا کہ کون سی مخلوق اللہ کی ہے اور کون سی مخلوق ان ہستیوں کی ہے ۔ یوں وہ بیچارے معذور ہیں اور یوں اس غلطی کا ارتکاب ممکن ہے کہ انہوں نے اللہ کی ذات و صفات میں ان دوسروں کو شریک کر لیا ۔ کیونکہ اس ضرورت میں یہ ہستیاں صفت خالقیت میں شریک تھیں لیکن اگر کسی اور کی کوئی مخلوق ہی نہیں ہے تو پھر شرکت چہ معنی وارد ۔

یہ اس قوم کے ساتھ ایک مذاق ہے کہ جو دعویٰ تو یہ کرتی ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک خالق ہے اور پھر دوسروں کو اللہ کے ساتھ شریک بھی ٹھہراتی ہے ۔ حالانکہ یہ ٹھہراتے ہوئے شریک خود ان کے قول کے مطابق بھی خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں لیکن اس کے باوجود ان کو الٰہ بھی مانتے ہیں' ان کی بندگی بھی کرتے ہیں ' لہذا فکر و نظر و عقل و بصیرت کا یہ نہایت ہی گھٹیا نمونہ ہے ۔

اور اس حقارت آمیز مذاق کے بعد یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے جس میں کوئی کلام اور مجادلہ کی گنجائش نہیں ہے ۔

قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۳ : ۱۶) "کہو' ہر چیز کا خالق اللہ ہے' وہ یکتا اور سب پر غالب ہے"۔ یعنی تخلیق میں بھی وہ واحد اور یکتا ہے ۔ غلبے اور زبردستی میں بھی وہی یکتا ہے ۔ قہار کے معنی ہیں انتہائی درجے کا غالب حکمران ۔ عقیدۂ توحید اور رد شرک کو یہاں یوں احاطہ کیا جاتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں اللہ ہی کے سامنے سجدہ ریز ہیں ' خواہ کوئی چیز خوشی سے سجدہ کرے (انسان) یا مجبوری ہے اور اس سبق کے

آخر میں اللہ کی قہاریت کا ذکر کر کے مسئلہ توحید کو یوں بیان کیا گیا کہ اللہ ایسا حکمران ہے جو غایت درجہ غالب اور گرفت والا ہے ۔ زمین و آسمان کی سب چیزیں اس کی مطیع فرمان ہیں جیسا کہ رعد و برق اور کڑک سب کی سب اللہ کی تسبیح کرنے والا ہیں ۔ ایسے حالات میں کوئی اندھا یا پتھر دل انسان ہی ہو سکتا ہے جو اللہ کا خوف نہ محسوس کرے اور ایسے شخص کی قسمت میں ہلاکت اور بربادی ہی ہے ۔

قبل اس کے کہ ہم اس سبق پر بات ختم کریں ضروری ہے کہ طرز ادا کے حوالے سے ہم بعض متقابل امور پر غور کریں ۔ مثلاً گرج و چمک اور بھاری بادلوں کے اندر خوف اور امید کا ذکر ہے ' جو متقابل ہیں ۔ سحاب کے ساتھ ثقال کا ذکر ہے اور ثقل کی وجہ سے وہ دھیمی رفتار سے چلتے ہیں جبکہ چمک اور برق نہایت ہی تیز رفتار ہوتی ہے ۔ یہ دونوں مفہوم بھی باہم متقابل اور متضاد ہیں ۔ رعد کی تسبیح اللہ کی حمد کے ساتھ ہے اور ملائکہ کی تسبیح خوف کے ساتھ ہے ۔ یہ دونوں بھی باہم متقابل مفہوم ہیں ۔ دعوت حق اور دعوت باطل دونوں متقابل مقاصد ہیں ۔ زمین و آسمان بھی باہم متقابل ہیں ' سجدۂ رضا و مجبوری ' طوعاً و کرھاً بھی باہم متقابل مفہوم ہیں ۔ افراد اور ان کے سائے ' صبح و شام ' اعمیٰ و بصیر ' ظلمات اور نور ' خالق حقیقی اور شرکائے عاجزین ' جو نفع و نقصان کا مالک ہے اور ان کے شرکاء کسی چیز کے مالک نہیں ہیں ۔ اس طرح اس پورے سبق میں باہم متضاد اور متقابل امور کا ذکر کر کے حق و باطل کو سمجھایا گیا ہے ۔ اور یہ نہایت ہی خوبصورت طرز ادا ہے اور ہے بھی عجیب و غریب ہم آہنگی کے ساتھ ۔

اب ہم ذرا مزید آگے بڑھتے ہیں ۔ اللہ حق و باطل کی ایک اور مثال بیان فرماتے ہیں ۔ ایک دعوت حق ہے جو ہمیشہ زمین پر باقی رہتی ہے اور ایک دعوت باطل ہے جو ادھر چلتی ہے جدھر ہوا کا رخ ہو ۔ ایک بھلائی ہے جو پر وقار اور جمی رہتی ہے ۔ ایک شر اور برائی ہے جو پھلتی پھولتی نظر آتی ہے ۔ یہاں جو مثال دی جا رہی ہے وہ اللہ واحد اور قہار کی قوت اور گرفت اور غلبے کو بتاتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ اللہ خالق اور مدبر نے ہر چیز کو کس اندازے اور ضرورت کے مطابق پیدا کیا ہے ۔ یہ مثال بھی انہی مناظر قدرت کی ہم جنس ہے جو اس سبق کا موضوع خاص ہیں ۔

أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ﴿١٧﴾

" اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا ۔ پھر جب سیلاب اٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آگئے ۔ اور ایسے ہی جھاگ ان دھاتوں پر بھی اٹھتے ہیں جنہیں زیور اور برتن وغیرہ بنانے کے لیے لوگ پگھلایا کرتے ہیں ۔ اسی مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے ۔ جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے ۔ اس طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے "۔

پانی کا نزول اور ندی نالوں کا اس کے ساتھ بہہ نکلنا ایک ایسا مفہوم ہے جو برق اور رعد اور بادلوں کے ساتھ ہم معنی و ہم جنس ہے۔ سابق منظر میں رعد و برق اور سحاب ثقال کا ذکر تھا۔ دونوں اس کائنات کے عام مناظر فطرت کا حصہ ہیں۔ اس سورہ کا پیشتر موضوع اور مضمون انہی کے گرد گھومتا ہے۔ اور ان مناظر سے اللہ واحد اور قہار کی قدرت ' غلبے اور گرفت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ ندی نالے اپنی مقدار کے مطابق بہہ نکلتے ہیں ' ہرایک اپنے ظرف کے مطابق۔

اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک مقدار مقرر کر رکھی ہے۔ ہر نالے اور ندی کے لیے بھی پانی کی مقدار مقرر ہے۔ یہ اللہ کی شان مدبرانہ ہے ' جو اس سورہ کا موضوع خاص ہے۔ تمثیل کا یہ دائرہ اور موضوع اور منظر وہی ہے جو پیش پا افتادہ ہے اور جس کو رات اور دن لوگ دیکھتے رہتے ہیں یہ منظر ان کی نظروں کے سامنے سے گزرتا ہے لیکن یہ اندھوں کی طرح اس پر کوئی غور نہیں کرتے اور نہ یہ مناظر ان کے دامن کش ہوتے ہیں۔

ہماری نظروں کے سامنے پانی برستا رہتا ہے ' ندی اور نالے بہتے رہتے ہیں اور اس دنیا کے خس و خاشاک کو ساتھ بہا کر لے جاتے رہتے ہیں۔ ان ندی نالوں پر جھاگ بھی اٹھتی رہتی ہے ' اس قدر کہ بعض اوقات پانی چھپ جاتا ہے۔ اور جھاگ کے پہاڑ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس جھاگ کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی ' اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ اور پانی جو جھاگ کے نیچے قائم رہتا ہے اپنی رفتار سے چلتا رہتا ہے۔ نہایت سکون کے ساتھ لگا بندھا۔ پھر یہ پانی اپنے اندر ایک افادیت رکھتا ہے۔ خیر ہی خیر اور زندگی اور شادابی۔ یہی صورت ان دھاتوں اور خزانوں کی ہوتی ہے جنہیں پگھلایا جاتا ہے۔ اس سے مصنوعات بنتی ہیں ' آلات بنتے ہیں اور انسانوں کی حیات کے لیے مد ثابت ہوتے ہیں مثلاً لوہا ' تانبا اور سیسہ وغیرہ۔ ان پر بھی جھاگ اٹھتی ہے جو بیکار ہوتی ہے اور جسے پھینک دیا جاتا ہے اور جو صاف چیز ہوتی ہے وہ نیچے رہ جاتی ہے۔ جب جھاگ اٹھ جاتی ہے تو اصل چیز نیچے سے نمودار ہوتی ہے۔

دنیا کی زندگی میں حق و باطل کی یہ مثال ہے۔ باطل کا یہ مظہر اور منظر بسااوقات سامنے آتا ہے وہ بلند ہوتا ہے ' پھولتا ہے ' دوڑتا بھاگتا ہے۔ اس کا بہت فلو نظر آتا ہے۔ لیکن یہ باطل جھاگ کی طرح ہوتا ہے یا گندے اور خبیث مادے کی طرح ہوتا اور فضلے کی طرح پھینک دیا جاتا ہے یا ختم ہو جاتا ہے اور اس کی نہ ٹھوس حقیقت ہوتی ہے اور نہ اس کے اندر ٹھہراؤ اور جماؤ ہوتا ہے جبکہ حق ہمیشہ پروقار ' ٹھہرا ہوا اور جما ہوا ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس پر شبہ ہوتا ہے کہ یہ جم گیا ہے ' اس میں جمود ہے ' بلکہ یہ ختم ہو گیا ہے۔ اس کا سکون موت کی علامت ہے۔ لیکن حق ہمیشہ دنیا میں باقی رہتا ہے جس طرح پانی باقی رہتا ہے اور جھاگ ختم ہو جاتی ہے اور جس طرح پگھلا ہوا مواد اپنی اصل حالت میں باقی رہتا ہے اور لوگوں کو نفع دیتا ہے اور اس کی جھاگ یا فضلہ ختم ہو جاتا ہے اسی طرح حق قائم رہتا ہے۔

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ (۱۳ : ۱۷) "اسی طرح اللہ مثالیں دیتا ہے"۔ اسی طرح اللہ ہر دعوت اور ہر تحریک کا انجام مقرر کرتا ہے ' ہر نظریہ اور اس کے احیاء کی جدوجہد کا یہی انجام ہوتا ہے۔ اللہ لوگوں کے اعمال و اقوال کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے۔ وہ مدبر کائنات ہے۔ واحد حاکم اور قہار ہے۔ وہ حق و باطل کی کشمکش کا بھی مدبر ہے اور اس نے یہ قانون قدرت وضع کیا ہے کہ آخر کار باطل نے زائل ہونا ہے اور حق نے غالب آنا ہے۔

لہذا یہ بات پلے باندھ رکھو کہ جن لوگوں نے حق پر لبیک کہا ان کا انجام اچھا ہو گا۔ اور جن لوگوں نے دعوت حق کا

انکار کر دیا وہ ایک نہایت ہی خوفناک اور ہولناک انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔ ان کی حالت یہ ہو گی کہ اگر ان میں سے کوئی پوری زمین اور آسمانوں کا مالک ہو تو وہ اس دن کے عذاب سے اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے بالکل تیار ہو گا' لیکن اس کے پاس زمین و آسمان کہاں ہوں گے کہ وہ دے سکے۔ ان کا حساب تو رسواکن ہو گا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہو گا اور کیا ہی برا ٹھکانا ہو گا۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ۭ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ
لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ سُوْۗءُ الْحِسَابِ ڏ ۲
وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ۧ ع ۱۱
۸

"جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت قبول کر لی ان کے لیے بھلائی ہے' اور جنہوں نے اسے قبول نہ کیا وہ اگر زمین کی ساری دولت کے بھی مالک ہوں اور اتنی ہی اور فراہم کر لیں تو وہ خدا کی پکڑ سے بچنے کے لیے اس سب کو فدیہ میں دے ڈالنے پر تیار ہو جائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے بری طرح حساب لیا جائے گا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے' بہت ہی برا ٹھکانا"۔ یہاں دعوت حق کو قبول کرنے والوں کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جو قبول نہیں کرتے اور حسنہ کے مقابلے میں سوء الحساب ہے۔ اور جنت کے مقابلے میں بئس المھاد ہے۔ اور یہ تقابلی انداز کلام اس پوری سورہ میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۱۳ ایک نظر میں

اس سورہ کے حصہ اول میں موضوع تھا اس کائنات کے آفاق اور عالم غیب کی گہرائیاں اور نفس انسانی کے عجائبات اور گہری انسانی نفسیات اور ان پر غور۔ اس دوسرے حصے میں انسانی وجدان کے محسوسات' انسانی عقل کے اخذ کردہ نتائج اور نہایت ہی لطیف اور گہری سوچ' خصوصاً رسالت' منصب رسالت اور وحی الٰہی کے بارے میں حقائق' عقیدۂ توحید اور رد شرک' لوگوں کی نادانی اور معجزات کا مطالبہ اور وقوع قیامت میں جلدی۔ مسائل وہی ہیں جو پہلے حصے میں تھے' البتہ سفر ایک دوسری وادی میں ہے یعنی وادی عقل و خرد میں۔

اس حصے میں سفر کا آغاز وادی کفر و ایمان میں ہوتا ہے۔ کفر کی وادی میں اندھیری رات جیسی تاریکی ہے جبکہ وادی ایمان میں روز روشن کی طرح روشنی ہے۔ ایک میں علم ہے اور دوسری میں تاریکی اور جہالت ہے۔ اس کے بعد روئے سخن کافرین کی خصوصیات و علامات اور مومنین کی صفات اور مزاج کی طرف پھر جاتا ہے اور پھر مشاہد قیامت میں سے ایک منظر سامنے آتا ہے جس میں اہل جنت کے انعامات اور اہل جہنم کے عذاب کا ذکر ہے۔ درمیان میں رزق کی کشادگی اور رزق کی تنگی کے موضوع پر بھی بات ہوتی ہے اور دونوں حالات کسی کو اللہ کی مشیت کے مطابق پیش آتے ہیں۔ ایک محفل ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جن کے دل ذکر الٰہی کے ساتھ مطمئن ہیں۔ پھر قرآن کریم کے اوصاف اور اس کی قوت کا ذکر' قریب ہے کہ اس سے متاثر ہو کر پہاڑ چل پڑیں' قریب ہے کہ زمین مارے خوف کے پھٹ پڑے اور قریب ہے کہ مردے بھی بات کرنے لگیں۔ پھر وہ عذاب اور مصائب جو کفار کو درپیش ہوتے ہیں یا ان کے علاقوں کے قریب ہی دوسری اقوام پر نازل ہوتے ہیں لیکن یہ لوگ عبرت نہیں لیتے۔ پھر مزاحیہ انداز کلام ان کے الہوں کے بارے میں' پھر قدرے ان اقوام کی وادی میں سیر جن کو ہلاک کیا گیا اور جن کے مقامات اور مصارع ان کے پاس ہی ہیں۔ آخر میں ان کو اس انجام سے ڈرایا جاتا ہے جو ان کے لیے بے چینی سے انتظار کر رہا ہے کیونکہ وہ رسول برحق کی تکذیب کر رہے ہیں۔ اچھا چلو اس انجام معلوم کی طرف اگر نہیں مانتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حصہ اول میں عقل و خرد کو جھنجوڑنے کے لیے جو ضربات لگائی گئی تھیں گویا اس دوسرے حصے میں اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اب عقل نے سوچنا شروع کر دیا ہے۔ انسانی عقل کے دروازے قدرے کھل گئے ہیں اور انسان نے دعوت اسلامی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ لہٰذا سورہ کے ان دونوں حصوں میں باہم ربط ہے۔ یعنی اس سورہ کے دونوں حصے انسانی عقل و کر دکی تاروں کو چھیڑ رہے ہیں تاکہ انسانی احساس اور عقل کام کریں۔

---○○○---

# درس نمبر ۱۱۳ تشریح آیات

## ۱۹ --- تا --- ۴۳

اس حصے میں پہلا مسئلہ 'مسئلہ وحی الہی ہے۔ اس سورہ کے آغاز میں بھی اسے چھیڑا گیا تھا۔ یہاں دوبارہ اس پر غور کیا جاتا ہے' نہایت ہی جدید انداز میں۔

أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَىٰ ۚ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿١٩﴾

"بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمہارے رب کی اس کتاب کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے حق جانتا ہے اور وہ شخص جو اس حقیقت کی طرف سے اندھا ہے' دونوں یکساں ہو جائیں؟ نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں"۔

یہاں ایک طرف وہ لوگ ہیں جو اس بات پر یقین کرتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے جو کچھ نازل ہوتا ہے وہ حق ہے اور ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جو یقین نہیں کرتے جو جانتے نہیں بلکہ ان کے بالمقابل جو لوگ ہیں وہ اندھے ہیں۔ قرآن کریم کا یہ نہایت ہی پیارا' موثر اور دل میں بیٹھ جانے والا انداز ہے کہ وہ کسی شخص یا کردار یا رویے کو مجسم شکل میں پیش کرتا ہے اور یہ تجسیم اور تمثیل بجائے خود حقیقت' سچی اور بلا مبالغہ بھی ہوتی ہے مثلاً یہاں مخالفین کو اندھا کہا گیا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس واضح اور ظاہر و باطن حقیقت کو جو شخص نہیں دیکھتا وہ اندھا ہی ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت کے سامنے اس کے حوالے سے لوگوں کی دو اقسام ہیں۔ ایک گروہ دیکھنے والا ہے تو وہ سمجھتا ہے۔ دوسرا اندھوں کا گروہ ہے اور وہ جاہل ہے۔ بعض اندھے پن سے مراد آنکھوں کا اندھا نہیں ہے بلکہ دل کا اندھا ہے۔ مطلب اس شخص سے ہے جس کی قوائے مدرکہ بجھ گئی ہوں' جن کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہوں اور جن کی روح آتش معرفت سے محروم ہو گئی ہو اور ان کے دلوں میں معرفت الہی کی آخری چنگاری بھی بجھ گئی ہو۔

إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ (۱۳ : ۱۹) "نصیحت تو دانش مند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں"۔ وہ لوگ جن کے دل و دماغ میں قوت ادراک ہو اور جن کو سچائی کی یاد دہانی کرائی جائے تو وہ اس یاد دہانی اور نصیحت کو قبول کریں اور اگر ان کے سامنے حق کے دلائل پیش کیے جائیں تو وہ ان پر غور و فکر کرتے ہوں۔ اولوا الالباب کی اعلیٰ اور اہم صفات

یہ ہیں :

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾

"اور ان کا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں' اسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے"۔ اللہ کا عہد مطلق ہے' اس سے وہ تمام عہد مراد ہیں جو اللہ کے ہیں اور میثاق بھی مطلق ہے اور اس سے مراد بھی وہ تمام میثاق ہیں جو اللہ کے ساتھ کیے گئے۔ سب سے بڑا عہد' عہد ایمانی ہے کیونکہ دوسرے تمام عہد اس کا نتیجہ اور اس کے تقاضے ہیں۔ سب سے بڑا میثاق یہ کہ ہم ایمان کے تقاضے پورے کریں گے۔

عہد ایمان قدیم بھی ہے اور جدید بھی ہے۔ قدیم عہد وہ ہے جو فطرت انسانی کے ساتھ مربوط ہے اور اس کا تعلق ناموس کائنات سے ہے' جس کے مطابق یہ پوری کائنات چلتی ہے اور فطرت انسانی براہ راست اس واحد ارادے کا ادراک کر لیتی ہے جس سے یہ کائنات پیدا ہوئی اور اس بات کا یقین کرتی ہے کہ اس کائنات کا خالق ایک ہے اور وہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ یہ فطری میثاق وہ ہے جو تمام انسانوں سے لیا گیا ہے جبکہ وہ آدم کی پشت میں تھے' اپنے محل پر ہم نے عہد الست کی یہی تفسیر پسند کی ہے۔ پھر اس عہد کی تجدید رسول اللہ کے دور میں ہوتی ہے جن کو اللہ نے امتوں کے لیے بھیجا اس لیے نہیں کہ وہ کوئی جدید عہد لیں بلکہ اس لیے کہ وہ یاد دہانی کرائیں اسی عہد الست کی اور اس کی تفسیر اور تشریح لوگوں کے سامنے کریں۔ وہ لوگوں کو بتائیں کہ اس عہد کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ صرف اللہ کی بندگی کریں اور اللہ کے سوا تمام دوسروں کی بندگی کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکیں اور علم صالح اور راہ راست پر چلنے کا مضبوط رویہ اختیار کریں۔ ہر معاملے میں اللہ وحدہ کی طرف رجوع کریں جس کے ساتھ انسانوں نے اصل عہد کیا ہوا ہے۔

اس عظیم عہد الہٰی کے حکم ہی میں بعد میں آنے والے عہد ہیں' خواہ وہ عہد و میثاق انسانوں کے ساتھ ہو۔ رسولوں کے ساتھ ہو' عوام الناس کے ساتھ ہو' قریب کے رشتہ داروں کے ساتھ ہو' امراء کے ساتھ ہو یا جماعتوں کے ساتھ ہو۔ چنانچہ جو شخص عہد اول اور میثاق اول کی فکر کرے گا وہ تمام دوسرے مواثیق کی رعایت کرے گا کیونکہ تمام عہود و مواثیق پر عمل کرنا ایک فریضہ ہے۔ جو شخص عہد اول کا پاس رکھتا ہے وہ دوسرے عہود کا بھی پاس رکھے گا کیونکہ یہ تمام عہد اسی کے ذیل میں آتے ہیں۔

یہ ایک عظیم اصول ہے جس کے اوپر پوری زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس اصول کو قرآن کریم چند کلمات کے اندر ضبط فرماتا ہے :

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً وَّ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾

"ان کی روش یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں' اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لئے صبر سے کام لیتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں' اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ آخرت کا گھر انہی لوگوں کے لئے ہے"۔

یہ اجمالی اور کلی قاعدہ ہے' یعنی اللہ نے جن روابط کے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے جوڑتے ہیں یعنی وہ مکمل اطاعت کرتے اور پوری طرح وفادار اور استوار ہوتے ہیں۔ سنت الٰہیہ کے مطابق سیدھے چلتے ہیں اور ان کی رفتار میں کوئی کجی نہیں ہوتی۔ اس لیے یہاں ایک کلی قاعدہ بیان کر دیا اور جس کے اندر اللہ کے وہ تمام مفرد احکام آگئے جن کا اللہ نے حکم دیا ہے کیونکہ تمام احکام کو یہاں ایک ایک کر کے بیان کرنا بہت ہی مشکل تھا اور یہاں مقصود بھی نہ تھا بلکہ یہاں مقصود یہ تھا کہ انسان تقاضا ہائے فطرت پر سیدھا چلے اور تمام معاملات میں اطاعت شعار ہو۔ اطاعت کا رشتہ ٹوٹنے نہ پائے اور آیت کے آخر میں یہ اشارہ بھی کر دیا گیا کہ وہ لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں اور اطاعت کاملہ کے بارے میں بہت حساس ہیں۔

وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ (۱۳ : ۲۱) "اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے"۔ اللہ کی مشیت اور قیامت کے برے حساب سے وہ ڈرتے ہیں کیونکہ وہ عقلمند ہیں اور عقلمند آدمی حساب وکتاب سے قبل ہی اپنا حساب تیار کرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ (۱۳ : ۲۲) "ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں"۔ صبر کی کئی انواع و اقسام ہیں اور صبر کے کچھ تقاضے ہیں۔ ایک صبر یہ ہے کہ انسان اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کی راہ میں مشکلات پر صبر کرے۔ مثلاً اعمال' جہاد اور دعوت اسلامی کی راہ میں مشکلات۔ نیز نعمتوں پر صبر اور مشکلات حیات میں صبر۔ ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جو خوشحالی میں صبر کریں اور کبر و غرور اور ناشکری نہ کریں۔ لوگوں کی حماقتوں اور جہالتوں پر صبر' جبکہ ان کی وجہ سے بسا اوقات انسان کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دوسرے معاملات اور اجتماعی زندگی کے روابط میں صبر۔ یہ سب صبر اللہ کی رضامندی کے لیے ہیں' اس لیے نہیں کہ لوگ یہ کہیں کہ یہ شخص باہمت ہے یا یہ کہ لوگ کہیں یہ شخص فریاد کر رہا ہے۔ نہ محض اپنے آپ کو شریف ثابت کرنے کے لیے یا محض اس لیے کہ جزع و فزع سے مزید نقصان ہو گا۔ غرض اللہ کی رضامندی کے سوا کسی بھی مقصد کے لیے کیا جانے والا صبر مقبول نہیں ہے۔ نعمت اور آزمائش میں صبر یوں ہے کہ انسان اللہ کے فیصلے پر شاکر اور قانع رہے۔

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۱۳ : ۲۲) "اور نماز قائم کرتے ہیں"۔ اقامت صلوۃ بھی اللہ کے میثاق اور عہد میں شامل ہے لیکن یہاں اس کا ذکر علیحدہ اس لیے کر دیا گیا کہ وفائے میثاق کی یہ پہلی علامت اور رکن رکین ہے۔ نیز اللہ کی طرف توجہ کامل کا یہ اہم اور اتم مظہر ہے اور بندے اور رب کے درمیان جسمانی رابطہ ہے۔ نماز خالص اللہ کے لیے ہے' اس کی ہر حرکت اور اس کا ہر کلمہ اللہ اور صرف اللہ کے لیے ہے۔

وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً (۱۳ : ۲۲) "اور ہمارے دیئے ہوئے رزق سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں"۔ یہ حکم بھی اس آیت میں شامل ہے کہ اللہ نے جو روابط جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں

جوڑتے ہیں اور میثاق الٰہی کی ذمہ داریاں اور تقاضے پورے کرتے ہیں۔ لیکن اس کو بھی یہاں خصوصیت کے ساتھ لایا گیا کیونکہ یہ اللہ کے بندوں کے درمیان اجتماعی روابط کا مظہر ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ سے خدائی اور اسلامی زندگی کے روابط مستحکم ہوتے ہیں۔ دینے والے کا دل بخل کی بیماری سے پاک ہوتا ہے اور لینے والے کا دل کینہ سے پاک ہوتا ہے۔ ایک اسلامی سوسائٹی کی اجتماعی زندگی باہم محبت اور تعاون پر مبنی ہو جاتی ہے۔ پوشیدہ خرچ ان مقامات میں ہوتا ہے جہاں لینے والے کی عزت نفس کو بچانا ہوتا ہے۔ اعلانیہ ایسے مقامات پر ہوتا ہے جہاں دوسروں کے لیے نمونہ بننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں شریعت کا نفاذ مقصود ہو یا قانون کی اطاعت مقصود ہو یا دوسرا کوئی اجتماعی فائدہ ہو۔

وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (۱۳ : ۲۲) "اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں"۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ روز مرہ کے معاملات میں وہ برائی کو بھلائی کے ذریعے دفع کرتے ہیں۔ اس سے مراد دینی معاملات میں نہیں ہیں کہ دینی معاملات میں اگر کوئی برا کرے تو تم اس کے ساتھ اچھا کر دو۔ لیکن یہاں قرآن کریم کی تعبیر تمہید سے آگے بڑھ کر نتیجے کا ذکر کرتی ہے۔ برائی کا جواب نیکی سے دینے سے ایک سرکش شخص کی سرکشی میں کمی آ جاتی ہے اور ایک انسان پھر برائی کے بدلے میں بھلائی پر مائل ہو جاتا ہے۔ اور شر کی آگ بجھ جاتی ہے اور شیطان کے وسوسے ختم ہو جاتے ہیں۔ یوں برائی کا دفعیہ ہو جاتا ہے اور وہ ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آیت میں حسنہ کا ذکر پہلے کیا گیا۔

پھر اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بدی کا جواب نیکی سے صرف اس وقت دیا جائے گا جب یہ امید ہو کہ اس طرح شر کا دفعیہ ہو گا اور برائی ختم ہو گی لیکن اگر کوئی شخص اس سے مزید اکڑتا ہے اور اسے جراءت ہوتی ہے تو ایسا رویہ اچھا نہ ہو گا۔ بلکہ ایسے حالات میں اس بات کی ضرورت ہو گی کہ برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے اور جہاں بھی مدافعت کی ضرورت ہو شر کا دفاع کیا جائے گا تاکہ شر کی قوتیں پھول نہ جائیں اور ان کو مزید سرکشی اختیار کرنے کی جرأت نہ ہو۔

برائی کا جواب نیکی سے اس وقت دیا جاتا ہے کہ دو افراد کے درمیان معاملہ ہو اور وہ دونوں مساوی حیثیت کے مالک ہوں۔ رہے وہ معاملات جن کا تعلق دین اسلام سے ہے تو اس میں یہ رویہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ دین کے معاملات میں کسی جسارت کرنے والے شخص کے سامنے ننگی تلوار ہی صحیح کاٹ کرتی ہے۔ نیز جن لوگوں کا وطیرہ یہ ہو کہ وہ زمین میں فساد کرتے پھریں ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا جانا چاہئے لیکن کسی معاملے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے قرآن نے ایسی ہدایات کو ایک فرد کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ عقل کو کام میں لا کر ایسا رویہ اختیار کرے جس میں خیر ہو اور بہتری ہو۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾

"یعنی ایسے باغ جو ان کی ابدی قیام گاہ ہوں گے وہ خود بھی ان میں داخل ہوں گے اور ان کے آباؤ اجداد اور ان کی

بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو جو صالح ہیں وہ بھی ان کے ساتھ وہاں جائیں گے ۔ ملائکہ ہر طرف سے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے اور ان سے کہیں گے "تم پر سلامتی ہے' تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اس کی بدولت آج تم اس کے مستحق ہوئے ہو' پس کیا ہی خوب ہے یہ آخرت کا گھر!"۔

ان ہی لوگوں کے لیے آخرت کا گھر ہے ۔ یہ آخرت میں عالی مقام ہوں گے ۔ ایسے باغات ہوں گے جو ان کے قیام کے لیے ابدی اور دائمی ہوں گے ۔ ایسے ہی باغات میں ان کے اقارب و رشتہ دار' آباء و اولاد ان کے ساتھ ہوں گے' یعنی ان میں سے وہ جو صالح ہوں گے اور یہ لوگ ان باغات میں اپنی نیکی اور صلاح کی بنیاد پر داخل ہوں لیکن ان کے ساتھ ان کے اکرام کے طور پر ان کے رشتہ دار بھی داخل ہوں گے ۔ دوست اور یار بھی وہاں ہوں گے ۔ دوست و احباب اور آباء و اولاد کا اجتماع ایک محبوب اور لذیذ چیز ہے جس سے جنت کے مزے دوچند ہوں گے ۔

اس اجتماع میں جہاں دوست و احباب ہوں گے اور جہاں اعزہ و اقارب ہوں گے ملائکہ کی طرف سے اہلاً وسہلاً اور مبارکباد کے پیغامات ہوں گے اور بے شمار لوگ وہاں آ جا رہے ہوں گے ۔

يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِم مِّنْ كُلِّ بَاب (۱۳ : ۲۳) "ہر طرف سے ان پر داخل ہوں گے" یہاں آکر انداز گفتگو اس طرح ہو جاتا کہ گویا ہم اس منظر کو دیکھ رہے ہیں کہ ہر طرف سے ملائکہ گروہ در گروہ آ رہے ہیں اور مبارک و سلامت ہو رہی ہے ۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَي الدَّارِ (۱۳ : ۲٤) "تم پر سلامتی ہے' تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اس کی بدولت آج تم اس کے مستحق ہوئے ہو"۔ گویا ایک محفل مسرت ہو گی اور ہر طرف سے خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی اور سلامت و مبارک اور جشن مسرت کی ہلچل برپا ہو گی ۔

اور دوسری طرف وہ لوگ ہوں گے جن کی عقل کام نہ کر رہی تھی اس لیے وہ نصیحت نہ پکڑ سکے' نہ ان میں بصیرت تھی کہ وہ مشکلات راہ حق پر صبر کرتے ۔ ان لوگوں کی حالت ہر لحاظ سے عقلمند اور دانشور لوگوں کے برخلاف اور علی العکس ہو گی ۔

وَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ۝۲۵

"رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں' جو ان رابطوں کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے' اور جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں' وہ لعنت کے مستحق ہوں گے اور ان کے لیے آخرت میں بہت برا ٹھکانا ہے"۔

یہ اس عہد الست کو توڑتے ہیں جو فطرت انسانی نے ناموس ازلی کی صورت میں اللہ کے ساتھ کیا ہوا ہے اور وہ اس کے بعد تمام وعدوں اور معاہدوں کو توڑتے ہیں ۔ اگر ایک انسان عہد الست کو توڑ دے تو گویا وہ ان تمام وعدوں اور عہدوں کا ناقض ہو گا جو اس عہد الست پر قائم ہیں ۔ جس شخص کے دل میں خوف خدا نہیں ہے وہ کسی شخص 'کسی عہد ، اور کسی میثاق کا پاس کیسے کر سکتا ہے ۔ یعنی ایسے شخص بالعموم ان روابط کو توڑتے ہیں جن کے جوڑنے کا حکم اللہ نے دیا ہے ۔ اہل عقل و دانش تو صبر کرتے تھے ' نماز قائم کرتے تھے اور اعلانیہ اور پوشیدہ راہ خدا میں انفاق کرتے تھے اور پھر ان کا عمومی رویہ یہ تھا کہ وہ برائی کا جواب نیکی سے دیتے تھے ۔ لیکن یہ لوگ فساد فی الارض برپا کرتے ہیں ۔ اہل دانش کی جن چیزوں کا اوپر ذکر ہوا ان میں سے کسی ایک کو چھوڑنے سے فساد فی الارض نمودار ہوتا ہے ۔

"وہ لوگ" وہ جو اللہ سے دور ہیں اور راندۂ درگاہ ہیں ان کے لیے لعنت ہے ۔ تکریم و استقبال کے مقابلے میں راندگی ہے اور نعم الدار کے مقابلے میں سوء الدار ہے ۔

یہ لوگ اس لیے راندۂ درگاہ ہوئے کہ وہ متاع حیات دنیا میں ہی غرق رہے اور ان کی نظریں آخرت کی دائمی نعمتوں کی طرف نہ اٹھ سکیں ۔ حالانکہ رزق کا تعین صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے ' وہی اس میں توسیع بھی کرتا ہے ' وہی رزق میں تنگی بھی کرتا ہے ' یہ سب کام اللہ کے اختیار میں تھا اور کوئی شخص اپنے لیے خود فراخی رزق کا انتظام نہیں کر سکتا تھا کہ اس پر اتراتا ۔ اگر یہ لوگ آخرت کے طلبگار ہوتے تو یہ ضروری نہ تھا کہ اللہ ان سے دنیا کی خوشحالی چھین لیتا کیونکہ وہی داتا تھا ۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ وَ فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ ۲
الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾ ع ۸
۹

"اللہ جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا رزق دیتا ہے ۔ یہ لوگ دنیوی زندگی میں مگن ہیں ' حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک متاع قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں ۔

--- ooo ---

اس سے قبل اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا ۔ ایک شخص اس حقیقت کو جانتا ہے اور مانتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جو سچائی نازل ہو رہی ہے ' وہ حق ہے ' وہی دانشمند اور عقلمند ہے اور جو نہیں جانتا وہ اعمیٰ ہے ۔ اب یہاں اہل کفر کی کم عقلی اور اندھے پن کی کچھ مثالیں دی جاتی ہیں کہ یہ لوگ اس کائنات میں اللہ کی آیات و نشانات کو نہیں دیکھ پا رہے ۔ دانشوروں کے لیے تو یہ قرآن ہی کافی معجزہ ہے لیکن عقل کے یہ کورے قرآن سے بھی بڑا کوئی معجزہ طلب کرتے ہیں ۔ سورہ کے پہلے حصے میں ان کے مطالبات کا ذکر ہو چکا ہے اور وہاں یہ جواب بھی دے دیا گیا تھا کہ رسول تو صرف ڈرانے والا ہے اور معجزات کا صدور اللہ کے اختیار میں ہے ۔ یہاں ایسے ہی مطالبات کو پھر دہرا کر بتایا جاتا ہے کہ ضلالت و ہدایت کے اسباب کیا ہوتے ہیں ۔ پھر ان دلوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو اللہ کے ذکر ہی سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور وہ اس قرآن اور ذکر الٰہی سے آگے مزید خوارق عادت معجزات کا مطالبہ نہیں کرتے ۔ یہ قرآن اپنی جگہ گہری اثر آفرینی کا حامل ہے یہاں

تک کہ اسے سن کر قریب ہے کہ پہاڑ چل پڑیں اور قریب ہے کہ زمین پھٹ پڑے اور قریب ہے کہ مردے بھی اس کی حقانیت کے نعرے لگانے لگ جائیں کیونکہ اس قرآن میں بے پناہ قوت' مادہ حیات اور انقلابی اسپرٹ ہے۔ آخر میں مومنین کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ان لوگوں سے مایوس ہو جائیں جو معجزات طلب کرتے ہیں اور انسانی تاریخ میں ان لوگوں کے رویہ کا مطالعہ کریں جنہوں نے اچھی مثالیں چھوڑی ہیں اور پھر ان لوگوں کی حالت کو بھی دیکھیں جو ان جیسے تھے اور جو اللہ کے عذاب میں گرفتار ہوئے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ
قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ﴿٢٧﴾ الَّذِينَ
آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللَّهِ ۗ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ﴿٢٨﴾ الَّذِينَ
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ ﴿٢٩﴾ كَذَٰلِكَ أَرْسَلْنَاكَ فِي
أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهَا أُمَمٌ لِّتَتْلُوَ عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهُمْ
يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَٰنِ ۚ قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ
مَتَابِ ﴿٣٠﴾ وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ
بِهِ الْمَوْتَىٰ ۗ بَل لِّلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا ۗ أَفَلَمْ يَيْأَسِ الَّذِينَ آمَنُوا أَن لَّوْ يَشَاءُ
اللَّهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا ۗ وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُم بِمَا صَنَعُوا
قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا ۴
يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿٣١﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ع ۵
ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿٣٢﴾ ۱۰

"یہ لوگ جنہوں نے (رسالت محمدیؐ کو ماننے سے) انکار کر دیا ہے' کہتے ہیں: "اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری"۔۔۔ کہو اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا

ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جنہوں نے (اس نبی ؐ کی دعوت کو) مان لیا ہے اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ خبردار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔ پھر جن لوگوں نے دعوت حق کو مانا اور نیک عمل کیے وہ خوش نصیب ہیں اور ان کے لیے اچھا انجام ہے۔

اے نبی ؐ ' اسی شان سے ہم نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے ایک ایسی قوم میں جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں ' تاکہ تم ان لوگوں کو وہ پیغام سناؤ جو ہم نے تم پر نازل کیا ہے۔ اس حال میں کہ یہ اپنے نہایت مہربان خدا کے کافر بنے ہوئے ہیں۔ ان سے کہو کہ وہی میرا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے ' اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی میرا ملجا و ماویٰ ہے۔

اور کیا ہو جاتا اگر کوئی ایسا قرآن اتار دیا جاتا جس کے زور سے پہاڑ چلنے لگتے یا زمین شق ہو جاتی ' یا مردے قبروں سے نکل کر بولنے لگتے؟ (اس طرح کی نشانیاں دکھا دینا کچھ مشکل نہیں ہے) بلکہ سارا اختیار ہی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پھر کیا اہل ایمان (ابھی تک کفار کی طلب کے جواب میں کسی نشانی کے ظہور کی آس لگائے بیٹھے ہیں اور وہ یہ جان کر) مایوس نہیں ہو گئے کہ اگر اللہ چاہتا تو سارے انسانوں کو ہدایت دے دیتا؟ جن لوگوں نے خدا کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کر رکھا ہے ان پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت آتی ہی رہتی ہے ' یا ان کے گھر کے قریب کہیں نازل ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آن پورا ہو۔ یقیناً اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے ' مگر میں نے ہمیشہ منکرین کو ڈھیل دی اور آخر کار ان کو پکڑ لیا ' پھر دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی"۔

ان لوگوں کی تردید کا خلاصہ یہ ہے کہ دلوں کے اندر ایمان پیدا ہونے کا حقیقی سبب وقوع معجزات نہیں ہے۔ ایمان کے داعی اور اسباب خود کسی انسان کے نفس کے اندر موجود ہوتے ہیں اور انسان خود اپنی نفسیاتی کیفیات اور داخلی فطری دواعی کی وجہ سے ایمان لاتا ہے۔

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ (۱۳ : ۲۷) "کہو اللہ جسے چاہتا ہے ' گمراہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے"۔

لہٰذا اللہ صرف ان لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف میلان رکھتے ہوں اور ان کا یہ میلان اور انابت الی اللہ کا جذبہ ہی ہے جس نے ان کو اہل ایمان بنایا۔ اس کا دوسرا مفہوم یہ ہوا کہ جو لوگ اللہ کی طرف میلان اور انابت نہیں رکھتے وہی گمراہ ہوتے ہیں ' لہٰذا اللہ بھی ان کو گمراہ کر دیتا ہے۔ لہٰذا دلوں کے اندر ہدایت کی استعداد اور پھر طلب ہدایت اور اس راہ میں سعی کرنے سے ہدایت ملتی ہے۔ لیکن جو دل اللہ کی ہدایت کی استعداد ہی سے محروم ہوتے ہیں اور جو اس سمت میں حرکت ہی نہیں کرتے وہ اللہ سے اور ہدایت سے دور ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد مومن دلوں کی ایک نہایت ہی شفاف تصویر کشی کی جاتی ہے۔ یہ تصویر کشی نہایت ہی اطمینان و قرار ' انس و محبت اور مسرت اور بشاشت کے رنگوں میں رنگی ہوئی ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ (۱۳ : ۲۸) "وہ جنہوں نے نبی کی دعوت کو مان

لیا ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے"۔ ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب سے متعلق ہیں۔ وہ اللہ کے جوار رحمت میں ہیں اور اللہ کے ہاں مامون اور محفوظ ہیں۔ وہ تنہائی کی مشکلات سے بھی مطمئن ہوتے ہیں' راہ حق کی پریشانیوں میں بھی مطمئن ہوتے ہیں۔ اور وہ تخلیق کائنات ' اس کے آغاز اور انجام کے بارے میں بھی شفاف سوچ رکھتے ہیں اس لیے مطمئن ہوتے ہیں' وہ ہر ظلم' ہر شر اور ہر زیادتی سے اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں سمجھتے ہیں اس لیے مطمئن ہوتے ہیں الا یہ کہ اللہ کی مشیت سے کوئی مصیبت آجائے تو وہ اس پر بھی راضی ہوتے ہیں اور اسے ابتلا سمجھ کر اس پر صبر کرتے ہیں۔ ہدایت ' رزق ' دنیا و آخرت کی پردہ پوشی کے بارے میں بھی ان کو اللہ پر پورا بھروسہ ہوتا ہے اس لیے وہ مطمئن ہوتے ہیں۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۱۳ : ۲۸) "بے شک اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے"۔ اہل ایمان کے دلوں میں اللہ کے ذکر سے جو اطمینان پیدا ہوتا ہے اس کا صحیح علم صرف ان لوگوں کو ہوتا ہے جن کے دلوں میں ایمان کی بشاشت اور مٹھاس پیدا ہو جائے اور ان کو اللہ کا فضل حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ اس ایمانی بشاشت اور طمانیت کو محسوس کرتے ہیں لیکن اس کی کیفیات ایسی ہوتی ہیں جن کو الفاظ کے ذریعہ دوسرے لوگوں تک منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً ایسے لوگوں تک جن کو یہ معرفت حاصل نہ ہو کیونکہ یہ حقائق الفاظ کی گرفت سے باہر ہوتے ہیں۔ یہ اطمینان دلوں میں سرایت کرتا ہے۔ ان کو سکون اور فرحت دیتا ہے' ہمت دیتا ہے۔ وہ امن و سلامتی کا شعور پاتے ہیں۔ ایسے اہل معرفت محسوس کرتے ہیں کہ وہ تنہا نہیں ہیں' ان کو ایک پورا ماحول اپنا دوست اور یار نظر آتا ہے۔ کیونکہ ان کے اردگرد اللہ کی صنعت کاریاں ہوتی ہیں جبکہ خود صاحب معرفت اللہ ہی کی حمایت میں ہوتا ہے۔

ان لوگوں سے بڑا بدبخت اس روئے زمین پر کوئی نہیں ہے جو تعلق باللہ کی وجہ سے اور ذکر الٰہی کی وجہ سے پیدا ہونے والے انس و محبت سے بے خبر ہوں۔ اس سے بڑا بدبخت کوئی نہیں ہے کہ وہ اس کرۂ ارض کے اوپر چلے پھرے اور اسے اپنے کائناتی ماحول سے کوئی انس و محبت نہ ہو۔ اس سے بڑا کوئی بدبخت نہ ہو گا جو اس دنیا میں چلے پھرے اور اسے معلوم نہ ہو کہ اس کا مقصد وجود کیا ہے؟ وہ کیوں آیا ہے اور کدھر جا رہا ہے؟ اور اس کے اوپر زندگی کا یہ بوجھ کیوں ڈالا گیا ہے؟ اور اس سے بدبخت اور کون ہو گا جو اس کرۂ ارض پر چلتا پھرتا ہو اور وہ اپنے ماحول کی ہر چیز سے اس لیے بدکتا ہو۔ اسے معلوم ہو کہ اس کے اور ہر چیز کے درمیان ایک نہایت ہی لطیف تعلق ہے؟ اس سے بدبخت اور کون ہو گا جو سفر حیات طے کر رہا ہے لیکن اکیلا ہے' راندہ ہے' گم کردہ راہ ہے اور پہاڑوں اور صحراؤں میں اکیلا پھر رہا ہے اور زندگی کا یہ کٹھن سفر وہ اکیلا بغیر گائیڈ کے' بغیر انیس سفر کے اور بغیر ہادی و مددگار کے طے کر رہا ہے۔ اور اسے نشان منزل تک معلوم نہیں۔

یاد رکھو! زندگی کے اس کٹھن سفر میں بعض لمحات ایسے بھی آتے ہیں' نہایت ہی تاریک گھڑیاں جن کا مقابلہ صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو اللہ کا ہو گیا ہو' جسے اللہ کی حمایت کا بھروسہ ہو' ورنہ خواہ کوئی کس قدر طاقتور' بہادر اور مستقل مزاج کیوں نہ ہو زندگی میں بعض ایسی تاریک گھڑیاں آتی ہیں کہ انسان کی تمام قوتیں جواب دے جاتی

ہیں - آخری سہارا صرف تعلق باللہ کی قوت اور ذکر الٰہی سے حاصل ہوتا ہے -

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۱۳ : ۲۸) "خبردار! ذکر الٰہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے"- یہ لوگ جو اللہ کی طرف جھکنے والے ہیں اور اللہ کے ذکر کی وجہ سے مطمئن ہیں' اللہ کے ہاں ان کا انجام بہت ہی اچھا ہو گا کیونکہ انہوں نے اچھا طرز عمل اختیار کیا اور وہ اللہ کے مطیع فرمان رہے -

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ (۱۳ : ۲۹) "جن لوگوں نے دعوت حق کو قبول کیا اور نیک عمل کیے وہ خوش نصیب ہیں اور ان کے لیے اچھا انجام ہے - طوبیٰ طاب یطیب سے ہے بوزن کبریٰ - یہ صیغہ تعظیم اور تفخیم کے لیے آتا ہے یعنی ان کے لیے بہت بڑی خوشخبری ہے - ان کا اچھا انجام اس خدا کے ہاں ہو گا جس کے وہ اپنی زندگی میں مطیع فرمان رہے -

وہ لوگ جو معجزات طلب کرتے ہیں' ایسے لوگوں کو ایمانی اطمینان کا شعور حاصل نہیں ہوتا - وہ ذہنی خلجان میں مبتلا ہوتے ہیں اور اپنی اس ذہنی پریشانی کو دور کرنے کے لیے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں اور اے پیغمبر آپ کسی قوم میں آنے والے پہلے رسول نہیں ہیں کہ ان لوگوں کے لیے یہ معاملہ ناقابل فہم ہو گیا ہے - اس سے قبل بھی کئی اقوام گزری ہیں اور کئی رسول گزرے ہیں - اگر یہ لوگ کفر پر تل گئے ہیں تو آپ اپنے منہاج پر کام کرتے رہیں اور اللہ پر بھروسہ کریں -

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ مَتَابِ

(۱۳ : ۳۰) "اے نبی اسی شان سے ہم نے تم کو رسول بنا کر بھیجا - ایک ایسی قوم میں جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں تاکہ تم ان لوگوں کو وہ پیغام سناؤ جو ہم نے تم پر نازل کیا ہے - اس حال میں کہ یہ اپنے نہایت ہی مہربان خدا کے کافر بنے ہوئے ہیں - ان سے کہو کہ وہی میرا رب ہے - اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے' اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی میرا ملجا و ماویٰ ہے"- تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ رحمٰن کا کفر کرتے ہیں جس کی رحمت بہت ہی بڑی ہے - جس کے ذکر سے دل مطمئن ہو جاتے ہیں اور اس کی عظیم رحمت کا شعور ان میں پیدا ہو جاتا ہے - اے پیغمبر آپ کی ڈیوٹی تو صرف یہ ہے کہ جو وحی آپ کی طرف آتی ہے آپ ان لوگوں کو پڑھ کر سنا دیں - آپ کے بھیجنے کا مقصد ہی یہ ہے - اگر وہ کفر کے ارتکاب پر تل گئے ہیں تو اعلان کر دیں کہ میرا بھروسہ تو صرف اللہ وحدہ پر ہے اور یہ کہ میں اسی کی طرف لوٹنے والا ہوں اور کسی اور کی طرف پناہ لینے کے لیے مجھے رجوع نہیں کرنا ہے -

ہم نے آپ کو صرف یہ ڈیوٹی دی ہے کہ آپ قرآن کی دعوت لوگوں تک پہنچا دیں - یہ قرآن پڑھیں بذات خود یہ کتاب اور یہ کلام بہت ہی عجائب اپنے اندر رکھتا ہے - اگر کسی قرآن کے ذریعہ پہاڑ چلائے جاتے' یا زمین کے ٹکڑے کر دیئے جاتے' یا اس کے ذریعہ مردے باتیں کرنے لگتے تو یہ باتیں اس قرآن میں بھی ہوتیں اور اس کے ذریعے یہ مذکور معجزات ظہور پذیر ہوتے لیکن قرآن (ہر کتاب الٰہی) تو اس لیے نازل کیا جاتا ہے کہ عوام کو ان کی ڈیوٹیاں اور ان کے

فرائض سے آگاہ کیا جائے۔ اگر یہ مخاطبین اب کفر کرنے پر تل گئے ہیں اور ہرگز مان کر نہیں دیتے تو وقت آگیا ہے کہ مومنین ان سے مایوس ہو جائیں اور ان کو چھوڑ دیں کہ مکذبین کے ساتھ اللہ کا جو سلوک ہوتا ہے وہ آجائے۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (۱۳ : ۳۱) "اور کیا ہو جاتا اگر کوئی ایسا قرآن اتار دیا جاتا جس کے زور سے پہاڑ چلنے لگتے یا زمین شق ہو جاتی' یا مردے قبروں سے نکل کر بولنے لگتے؟ (اس طرح کی نشانیاں دکھا دینا کچھ مشکل نہیں ہے) بلکہ سارا اختیار ہی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پھر کیا اہل ایمان (ابھی تک کفار کی طلب کے جواب میں کسی نشانی کے ظہور کی آس لگائے بیٹھے ہیں اور وہ یہ جان کر) مایوس نہیں ہو گئے کہ اگر اللہ چاہتا تو سارے انسانوں کو ہدایت دے دیتا؟ جن لوگوں نے خدا کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کر رکھا ہے ان پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت آتی ہی رہتی ہے' یا ان کے گھر کے قریب کہیں نازل ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آن پورا ہو۔ یقیناً اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا"۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے قرآن مجید کو قبول کیا اور اس کی کیفیات میں ڈوب گئے اس نے ان کے اندر اس قدر انقلاب برپا کر دیا کہ پہاڑوں کے چلائے جانے' زمین کے شق ہونے اور مردوں کے زندہ ہونے سے وہ بڑا معجزہ تھا۔ ان مذکور معجزات سے بھی ان لوگوں کی زندگیوں میں دور رس تبدیلی ہوئی اور بڑے معجزات رونما ہوئے۔ ان کی زندگی کی قدریں بدل دی گئیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں نے خود اس زمین کے چہرے کو بھی بدل کر رکھ دیا اور اسلام اور مسلمانوں نے اس کرۂ ارض کی تاریخ کو بدل کر رکھ دیا۔

اس قرآن کی اثر آفرینی' اس کی ذات اور طرز ادا میں' اس کی دعوت اور فلسفے میں اس کے موضوعات کلام اور طرز کلام میں بذات خود ایک بڑا معجزہ ہے۔ اس کے اندر کسی بڑے سے بڑے معجزے کے مقابلے میں بہت بڑی تاثیر ہے۔ اور اس کی اس معجزانہ شان سے وہی شخص واقف ہے جو ان معانی اور فلسفوں اور انداز تعبیر اور اسالیب کلام سے واقف ہو۔ اور ان کو ان چیزوں کے سمجھنے کی ذہنی قوت مدرکہ حاصل ہو۔ جن لوگوں نے اسے سمجھا' اس پر عمل کیا اور اس کی کیفیات اور اس کے انوار میں ڈوبے انہوں نے پہاڑوں کے چلانے سے بھی بڑے معجزے کر دکھائے۔ قرآن مجید کے اثرات کے نتیجے میں تو اقوام اور نسلوں کے حالات اور سوچ کے دھارے بدل گئے۔ انہوں نے ان چیزوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جو زمین کے مقابلے میں زیادہ سخت تھیں۔ فکری جمود اور رسم و رواج کا وہ جمود جو قرآن اور مسلمانوں نے توڑا وہ زمین اور پتھروں سے کہیں زیادہ سخت تھا۔ انہوں نے ایسی اقوام کو زندہ کیا جو مردوں سے زیادہ مردہ تھیں۔ زندہ ہو کر بھی مردہ تھیں' وہ اقوام جن کی روح کو وہم اور گمان نے قتل کر دیا تھا۔ وہ بتان وہم و گمان کے پجاری تھے۔ عربوں

کے اندر جو انقلاب رونما ہوا' ان کی زندگی کے اندر جو تبدیلی نمودار ہوئی اور اس میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں یہ کہ انقلاب صرف اور صرف قرآن کی وجہ سے آیا جس نے ان کی زندگی کا منہاج ہی بدل کر رکھ دیا تو کیا یہ انقلاب پہاڑوں کے چلنے' زمین کے ٹکڑے ہونے اور مردوں کے گویا ہونے سے کوئی کم انقلاب تھا۔

بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا (۱۳ : ۳۱) "بلکہ سارا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے"۔ وہی ہے' جو تحریک کی نوعیت کو اختیار کرتا ہے اور وہی ہے جو تحریک کے لیے وسائل اور ذرائع اختیار کرتا ہے۔ اگر اس قرآن کو سن کر بھی کسی قوم کے دلوں میں حرکت اور ولولہ پیدا نہیں ہوتا تو اہل ایمان جو ابھی ایسے دلوں کو حرکت میں لانے کی سعی کر رہے ہیں ان کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے مایوس ہو جائیں۔ ان کے معاملے کو اللہ پر چھوڑ دیں۔ اگر اللہ چاہتا تو تمام لوگوں کے اندر ہدایت کی استعداد پیدا کر دیتا۔ اور انسانوں کو بھی اسی طرح ہدایت کی جبلت پر تخلیق کر دیتا جس طرح فرشتوں کو اس نے ہدایت پر پیدا کیا ہے۔ یا لوگوں کو مجبور کر کے ہدایت کی راہ پر چلا دیتا لیکن اللہ نے انسانوں کے بارے میں نہ خیری اسکیم تیار کی اور نہ فرشتوں جیسی جبلت ان کو دی۔ کیونکہ اللہ نے انسان کو ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور اللہ کو معلوم تھا کہ انسان اس مقصد کے تقاضے کس طرح پورے کر سکتا ہے۔

لہذا چاہئے کہ لوگوں کو اب اللہ کے فیصلوں پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر اللہ نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ ان اقوام عرب کو اس طرح نیست و نابود نہ کرے گا جس طرح بعض اقوام کو ہلاک کیا گیا تھا تو ان پر کوئی نہ کوئی مصیبت آتی ہی رہتی ہے۔ یا ان کے گھروں کے قریب آتی رہتی ہے۔ اور یہ لوگ وقتاً فوقتاً اللہ کے عذابوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں اور ان میں سے بعض ان مصائب میں ہلاک بھی ہو جاتے ہیں۔

اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ (۱۳ : ۳۱) "یا ان کے گھروں کے قریب نازل ہوتی ہے"۔ جس سے وہ خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور پھر وہ نہایت ہی قلق اور خوف سے انتظار کرتے ہیں کہ کہیں اس جیسی مصیبت دوبارہ نہ آ جائے۔ بعض لوگ نرم بھی ہو جاتے ہیں' ان میں ایک تحریک پیدا ہوتی ہے اور ان کو حقیقی زندگی مل جاتی ہے۔

حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ (۱۳ : ۳۱) "یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آن پورا ہو"۔ یہ وہ وعدہ ہے جو اللہ نے لوگوں کے ساتھ کیا ہے اور اس وعدے اور میعاد تک لوگوں کو مہلت عمل دی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (۱۳ : ۳۱) "یقیناً اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا"۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ قیامت آنے والی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے اور ہر شخص اس دن اس انجام سے دوچار ہونے والا ہے جس کا وعدہ اللہ نے کیا ہے۔ اس بات کی مثالیں انسانی تاریخ میں موجود ہیں کہ اللہ مہلت دیتا ہے لیکن مہلت اور انتظار کے بعد اللہ کی پکڑ بھی آ جاتی ہے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ

عِقَابِ (۱۳ : ۳۲) "اور تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے 'مگر میں نے ہمیشہ منکرین کو ڈھیل دی اور آخر کار ان کو پکڑ لیا' پھر دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی" - یہ ایک سوال ہے جس کے جواب کی ضرورت ہی نہیں ہے - وہ عذاب ایسا رہا ہے کہ نسلیں اس کا چرچا کرتی رہیں -

--- ○○○---

دوسرا مسئلہ شرکاء کا ہے - سورہ کے حصہ اول میں بھی اسے چھیڑا گیا تھا - یہاں بھی ان بیچاروں کا ذکر نہایت ہی حقارت آمیز انداز میں کیا جاتا ہے - یہاں اللہ کے ساتھ ان کا تقابل یوں کیا جاتا ہے کہ اللہ تو ہر متنفس پر قائم ہے - وہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دنیا میں بھی دیتا ہے اور جو لوگ اللہ پر یہ افتراء باندھتے ہیں کہ اس کے شریک ہیں ان کو اس دنیا میں بھی سزا دی جاتی ہے اور آخرت کی سزا تو بہت ہی شدید ہے - جبکہ اہل تقویٰ کے لیے امن و سلامتی انتظار کر رہی ہے -

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَ صُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ عَذَابٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِىْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖ وَّ عُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

"پھر کیا وہ جو ایک ایک متنفس کی کمائی پر نظر رکھتا ہے (اس کے مقابلے میں یہ جسارتیں کی جا رہی ہیں کہ) لوگوں نے اس کے کچھ شریک ٹھہرا رکھے ہیں؟ اے نبی ' ان سے کہو (اگر واقعی وہ خدا کے اپنے بنائے ہوئے شریک ہیں تو) ذرا ان کے نام لو کہ وہ کون ہیں؟ --- کیا تم اللہ کو ایک نئی بات کی خبر دے رہے ہو' جسے وہ اپنی زمین میں نہیں جانتا؟ یا تم لوگ بس یونہی جو منہ میں آتا ہے کہہ ڈالتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے دعوت حق کو ماننے سے انکار کیا ہے ان کے لیے ان کی مکاریاں خوشنما بنا دی گئی ہیں اور وہ راہ راست سے روک دیئے گئے ہیں' پھر جس کو اللہ گمراہی میں پھینک دے اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں ہے - ایسے لوگوں کے لیے دنیا کی زندگی ہی میں عذاب ہے ' اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت ہے - کوئی ایسا نہیں جو انہیں خدا سے بچانے والا ہو - خدا ترس انسانوں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان یہ ہے کہ اس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' اس کے پھل دائمی ہیں اور اس کا سایہ لازوال - یہ انجام

ہے متقی لوگوں کا۔ اور منکرین حق کا انجام یہ ہے کہ ان کے لیے دوزخ کی آگ ہے"۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہر نفس پر نگراں ہے۔ ہر حال میں ہر شخص اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ کون کیا کر رہا ہے، ظاہر میں بھی اور چھپے ہوئے بھی۔ لیکن قرآن کا انداز بیان ایسا ہے کہ وہ اس نگرانی اور قبضے کو نہایت ہی مشخص انداز میں پیش کرتا ہے اور یہ قرآن مجید کا انداز کلام ہے کہ وہ معانی اور تصورات کو مشخص انداز میں پیش کرتا ہے۔ یوں کہ سننے والا متاثر ہو کر کانپنے لگتا ہے۔

أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ (۱۳ : ۳۳) "پھر کیا وہ جو ایک ایک متنفس کی کمائی کو کھڑے دیکھ رہا ہے"۔ ہر انسان کو ذرا یہ تصور کر لینا چاہئے کہ اس کے اوپر ایک نگران کھڑا ہے، اسے دیکھ رہا ہے اور اس کا حساب کر رہا ہے۔ کون؟ اللہ۔ اب کون ہے جو مارے خوف کے کانپ نہیں اٹھتا جبکہ یہ تصور ہو بھی حقیقت نفس الامری۔ قرآن انسانی قوائے مدرکہ کے سامنے اس معنوی مفہوم کو نہایت ہی حسی انداز میں پیش کرتا ہے کیونکہ انسان مجرد مفہومات کے مقابلے میں محسوس مناظر سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔

جب صورت حالات یہ ہو تو پھر بھی یہ لوگ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں؟ ان لوگوں کی یہ حرکت اس منظر کی روشنی میں نہایت ہی مکروہ اور گھناؤنی نظر آتی ہے۔ اس منظر کو دیکھنے والا ہر شخص ایسے لوگوں کے رویے پر تعجب کرنے لگتا ہے۔

وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ (۱۳ : ۳۳) "لوگوں نے اللہ کے کچھ شریک بنا رکھے ہیں"۔ حالانکہ اللہ ہر نفس پر نگراں ہے۔ ہر شخص کی کمائی اس کی نظروں میں ہے، کوئی چیز اللہ سے چھوٹ نہیں سکتی۔

قُلْ سَمُّوهُمْ (۱۳ : ۳۳) "کہو، ذرا نام لو ان کے"۔ کیونکہ ان شریکوں کے جو نام بولے جاتے ہیں وہ نکرے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعض بتوں اور شریکوں کے نام بھی ہوں لیکن انداز بیان محض تحکم اور حقارت کے انداز میں ان کو مجہول شخصیات تصور کر کے پوچھتا ہے کہ ذرا ان کے اصل نام تو لو۔

أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ (۱۳ : ۳۳) "کیا تم اللہ کو ایک نئی خبر دیتے ہو جسے وہ اپنی زمین میں نہیں جانتا"۔ یہ ان کے ساتھ ایک مذاق ہے یعنی تم انسان ہو کر بھی ایک ایسی خبر رکھتے ہو جس کا علم اللہ کو اپنی مملکت میں نہیں۔ عجیب سوچ ہے یہ تمہاری۔ تم تو جانتے ہو کہ اللہ کے سوا اور الٰہ بھی ہیں اور اللہ کو اس کا پتہ نہیں؟ جبکہ اس قسم کا دعویٰ کرنے کی جسارت یہ کفار بھی نہ کرتے تھے لیکن لسان الحال سے ان کا دعویٰ یہی تھا کہ اللہ تو پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور یہ لوگ کہتے تھے کہ فلاں فلاں بھی الٰہ ہیں۔

أَمْ بِظَاهِرٍ مِنَ الْقَوْلِ (۱۳ : ۳۳) "یا تم لوگ بس یونہی جو منہ میں آتا ہے، کہہ ڈالتے ہو"۔ تم لوگ دوسرے الہوں کے وجود کا قول محض سطحی بات کے طور پر کر دیتے ہو اور اس بات کا کوئی مفہوم اور معنی نہیں ہوتا جبکہ مسئلہ الوہیت کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اس کا فیصلہ محض سطحی باتوں سے ہو جائے اگر گپ شپ میں الوہیت اور توحید و شرک کے مسائل حل ہو جائیں۔

یہاں تک تو مذاقیہ جواب تھا۔اب سنجیدگی سے اس مسئلہ پر بات کی جاتی ہے۔

بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَ صُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ

هَادٍ (۱۳ : ۳۳) "حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے دعوت حق کو ماننے سے انکار کیا ہے ان کے لیے ان کی مکاریاں خوشنما بنا دی گئی ہیں اور وہ راہ راست سے روک دیئے گئے ہیں' پھر جس کو اللہ گمراہی میں پھینک دے اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں ہے"۔مسئلہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے کفر کیا۔اپنے آپ سے دلائل ایمان کو چھپایا' اپنے دل و دماغ کو دلائل ایمان و ہدایت سے مستور رکھا۔اس لیے ان پر سنت الٰہیہ کا اطلاق برحق ہو گیا۔ان کے نفوس نے ان کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ حق پر ہیں۔اور یہ باور کرا دیا کہ ان کی مکاریاں اور حق کے خلاف ان کی تدابیر بہت اچھی اور کامیاب ہیں۔اس طرح ان کے اس طرز عمل نے انہیں راہ حق سے روک دیا۔جس شخص کو اللہ کے سنن ہدایت و ضلالت کے تحت گمراہ قرار دے دیا جائے تو اس کے لیے پھر کوئی بھی ہادی نہیں ہو سکتا۔کیونکہ جب کوئی فرد یا قوم سنن الٰہیہ کے اسباب فراہم کر دے تو پھر اللہ کی سنت اٹل ہو جاتی ہے۔

اور ایسے لوگوں کا انجام کیا ہوتا ہے؟

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱۳ : ۳٤) "ایسے لوگوں کے لیے دنیا کی زندگی ہی میں عذاب ہے"۔اگر ان کو کوئی مصیبت آلے یا ان کے گھروں کے قریب ہی کوئی مصیبت نازل ہو جائے تو بھی ان کے لیے عذاب ہے کہ یہ لوگ ہر وقت اس خوف اور قلق میں رہیں گے کہ ابھی یہی مصیبت ہم پر ٹوٹنے والی ہے۔نیز اگر کسی کا دل ایمان کے لیے خشک ہو جائے اور پتھر بن جائے تو یہ کیا تھوڑا عذاب ہے جبکہ ایسے بے ایمان دل ہر وقت حیرت' پریشانی اور بے چینی کا شکار رہتے ہیں۔ان کو حادثات پیش آتے رہتے ہیں لیکن وہ نہیں سمجھتے کہ ان پر یہ عذاب کیوں آگیا۔

وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ (۱۳ : ۳٤) "اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت ہے"۔
یہاں آخرت کے عذاب کی سختیوں کی تفصیلات نہیں دی جاتیں تاکہ انسان خود اس کے بارے میں سوچ لے۔

وَ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ (۱۳ : ۳٤) "کوئی ایسا نہیں جو انہیں خدا سے بچانے والا ہو۔اللہ کی پکڑ سے چھڑا سکے اور اللہ کے عذاب سے بچا سکے۔ان پر جو عذاب بھی آئے گا وہ اسے جھیلتے رہیں گے۔

دوسری جانب اہل تقویٰ اور اہل ایمان ہیں۔یہ کفار تو ایسے ہوں گے کہ اللہ کے عذاب سے ان کو بچانے والا کوئی نہ ہو گا۔متقین وہ ہوں گے جنہوں نے ایمان' صلاح کے ہتھیار سے اپنے نفوس کو بچایا۔یہ لوگ عذاب سے مامون اور محفوظ ہوں گے۔بلکہ امن و سلامتی کے علاوہ ان کو رہائش کے لیے باغات ملیں گے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ

ظِلُّهَا (۱۳ : ۳۵) "خدا ترس انسانوں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان یہ ہے کہ اس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' اس کے پھل دائمی ہیں اور اس کا سایہ لازوال"۔ یہ ہے سازوسامان ان کے لیے اور یہ ہے ان کی تفریح اور خوشی ۔ یہ منظر کہ گھنی چھاؤں ہے اور باغات ہیں اور ان میں دائمی پھل ہیں ایک نہایت ہی فرحت بخش منظر ہے جبکہ دوسری جانب جہنم کی مشقتیں ہیں ۔ یہ عذاب اور یہ حیثیتیں ان لوگوں اور ان لوگوں کا قدرتی انجام ہیں ۔

تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ (۱۳ : ۳۵) "یہ انجام ہے متقی لوگوں کا اور منکرین حق کا انجام یہ ہے کہ ان کے لیے دوزخ کی آگ ہے"۔

---ooo---

اب بات وحی اور توحید ہی کے مسائل کو لے کر آگے بڑھتی ہے ۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے اہل کتاب کا موقف کیا ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ کتب سابقہ کے اندر جو ہدایات دی گئی تھیں' اب یہ آخری کتاب ان کے بارے میں حکم ہے ۔ اس کا فرمان قول فیصل ہے اور یہ آخری اور فائنل حکم ہے ۔ اس آخری کتاب میں اللہ نے وہ احکام دیئے ہیں جو ابد الآباد تک ثابت رہیں گے ۔ ان میں وہ امور بھی ہیں جن کو سابقہ رسولوں پر نازل کیا گیا تھا ۔ نیز اس کتاب کے ذریعے اللہ نے سابقہ کتب کی جن باتوں کو مٹانا مناسب سمجھا ان کو مٹا دیا ۔ ان کی حکمت سے اللہ ہی خبردار ہے ۔ لہٰذا اے پیغمبر آپ اس موقف پر جم جائیں جو قرآن کا موقف ہے اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں خصوصاً اہل کتاب کی ۔ نہ کسی چھوٹے معاملے میں اور نہ کسی بڑے معاملے میں ۔ رہے وہ لوگ جو معجزات طلب کرتے ہیں تو انہیں صاف صاف کہہ دو کہ میری ڈیوٹی دعوت پہنچانا ہے ۔ جب معجزات کی ضرورت ہو تو اللہ کے اذن سے ان کا ظہور و صدور ہوتا ہے ۔

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ
الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۭ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ
بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ۝ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ
اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ
۵ ع ۶ وَّلَا وَاقٍ ۝ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ۭ
۱۱ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝
يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ وَيُثْبِتُ ښ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ

بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَیْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾

"اے نبی ؐ جن لوگوں کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی' وہ اس کتاب سے جو ہم نے تم پر نازل کی ہے' خوش ہیں اور مختلف گروہوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کی بعض باتوں کو نہیں مانتے ۔ تم صاف کہہ دو کہ "مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤں' لہٰذا میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے" ۔ اسی ہدایت کے ساتھ ہم نے یہ فرمان عربی تم پر نازل کیا ہے ۔ اب اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمہارے پاس آچکا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمہارا حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچا سکتا ہے" ۔

تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا اور کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی خود لا دکھاتا ۔ ہر دور کے لیے ایک کتاب ہے ۔ اللہ جو کچھ چاہتا ہے' مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے' قائم رکھتا ہے ۔ ام الکتاب اسی کے پاس ہے ۔ اور اے نبی جس برے انجام کی دھمکی ہم ان لوگوں کو دے رہے ہیں اس کا کوئی حصہ خواہ ہم تمہارے جیتے جی دکھا دیں یا اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہم تمہیں اٹھالیں' بہرحال تمہارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے ۔

اہل کتاب میں سے جو سچے لوگ ہیں جو دین عیسیٰ کی بنیادی تعلیمات پر کاربند ہیں' وہ جب قرآن کو پڑھتے ہیں تو قرآن کی تعلیمات کو اپنی بنیادی تعلیمات سے ہم آہنگ پاتے ہیں ۔ مثلاً عقیدۂ توحید وغیرہ میں ۔ نیز وہ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید تمام ادیان سماوی اور تمام کتب سماوی کی حقانیت کا قائل ہے' ان سب کا ذکر نہایت ہی احترام سے کرتا ہے اور یہ تصور دیتا ہے کہ تمام اہل ایمان خواہ نبی آخرالزمان کے مومن ہوں یا انبیائے سابقین کے مومن ہوں وہ ایک ہی جماعت اور ایک ہی امت ہیں اور ذات باری ان کا آمرہ ہے ۔ ایسے لوگ بہت ہی خوش ہوتے ہیں اور ایمان لاتے ہیں ۔ یہاں ایسے لوگوں کی کیفیت قلبی کو فرحت سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ جب کوئی شخص سچائی پاتا ہے تو اسے بہت ہی خوشی ہوتی ہے اور وہ اپنے خیالات کی تصدیق جب قرآن میں پاتے ہیں تو ان کا عقیدہ اور بھی پختہ ہو جاتا ہے اور وہ قرآن پر ایمان لاکر اس تحریک کے حامی بن جاتے ہیں ۔

وَ مِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ یُّنْكِرُ بَعْضَهٗ (۱۳ : ۳۶) "اور مختلف گروہوں میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کی بعض باتوں کو نہیں مانتے" ۔ یعنی ان سے مراد اہل کتاب اور مشرکین کی بعض جماعتیں ہیں ۔ یہاں ان لوگوں کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں ۔ کیونکہ مقصد صرف یہ ہے کہ یہاں منکرین کا ذکر کر کے ان کا رد کر دیا جائے ۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَ لَاۤ اُشْرِكَ بِهٖ اِلَیْهِ اَدْعُوْا وَ اِلَیْهِ مَاٰبِ (۱۳ : ۳۶)

"تم صاف کہہ دو کہ مجھے صاف اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤں لہٰذا میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے" ۔ یعنی بندگی بھی اسی کی ہے ۔ دعوت بھی اللہ کی طرف ہے اور رجوع بھی صرف اللہ ہی کی طرف ہے ۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے مقابلے میں اپنا موقف واضح کر دیں جو قرآنی تعلیمات میں سے بعض چیزوں کے منکر ہیں - یہ کہ وہ پوری کتاب کو مضبوطی سے پکڑیں گے جو ان پر نازل ہوئی ہے چاہے اس پر اہل کتاب خوش ہوں یا ان میں سے کچھ لوگ ناراض ہوں کیونکہ جو کچھ ان پر نازل ہوا ہے وہ حکم اخیر ہے - سابقہ احکام منسوخ ہو گئے ہیں اور یہ کتاب عربی زبان میں نازل ہوئی ہے اور اس کا مفہوم بھی واضح اور مکمل ہے کیونکہ اب یہ اللہ کا آخری پیغام ہے - اس لیے ہم نے اب اپنے تمام نظریات اس سے اخذ کرنے ہیں -

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا (۱۳ : ۳۷) "اس طرح ہم نے یہ فرمان عربی تم پر نازل کیا ہے" -

وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا وَاقٍ

(۱۳ : ۳۷) "اب اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمہارے پاس آچکا ہے - لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمہارا حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچا سکتا ہے" - کیونکہ تمہارے پاس جو علم آرہا ہے وہ علم الیقین ہے' اور دوسرے گروہ جو کچھ کہتے ہیں وہ ان کی اپنی خواہشات ہیں' علم و یقین پر مبنی نہیں ہیں - یہ حکم حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تہدید آمیز الفاظ میں دیا گیا ہے - یہ انداز اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لیے زیادہ بلیغ طریقہ ہے - مقصد یہ ہے کہ اس معاملے میں تسامح کی کوئی گنجائش نہیں ہے یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کی اجازت نہیں حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا -

اگر کسی کو یہ اعتراض ہے کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بشر ہیں تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمام رسول بشر ہی گزرے ہیں -

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً (۱۳ : ۳۸) "تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا بنایا تھا" -

اور اگر اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کوئی مادی معجزہ لے کر نہیں آئے - تو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ ان کا کام ہی نہیں ہے' یہ تو اللہ کا کام ہے -

وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۱۳ : ۳۸) "اور کسی رسول کی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی خود لا دکھاتا" - اللہ اپنی حکمت کے مطابق' جہاں ضرورت ہو وہاں خارق عادت معجزات کا صدور کرا دیتا ہے -

ہاں اہل کتاب کو دی ہوئی کتابوں اور نبی آخر الزمان کو دی ہوئی کتاب میں بعض جزئیات کے حوالے سے اختلاف ضرور ہے - اس لیے کہ ہر دور کی کتاب الگ ہوتی ہے - لیکن یہ آخری کتاب ہے -

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۳۸) يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ وَ عِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتٰبِ

(۱۳ : ۳۸ - ۳۹) "ہر دور کے لیے ایک کتاب ہے' اللہ جو کچھ چاہتا ہے' مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور اس کے پاس ام الکتب ہے"۔ اللہ کی حکمت کا تقاضا ہو تو وہ جس حکم کو چاہتا ہے' مٹا دیتا ہے اور جو مفید ہو اسے قائم رکھتا ہے۔ تمام باتوں کی اصل کتاب اور سکیم اس کے پاس محفوظ ہے۔ جس کے اندر اس حذف اور فسخ اور نئے احکام کی تمام تفصیلات درج ہیں۔ لہذا سب کتب اسی کی ہیں' وہی اس میں تصرف اور فسخ کرتا ہے جہاں اور جب اس کی حکمت متقاضی ہو۔ اس کی مشیت کو نہ کوئی رد کر سکتا ہے اور نہ کسی کو اعتراض ہو سکتا ہے۔

اب اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جس عذاب کی دھمکی دی اور جس برے انجام سے انہوں نے دوچار ہونا ہے' چاہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی موجودگی میں وہ اس انجام سے دوچار ہوں یا حضور اکرم اس سے قبل ہی فوت ہو جائیں' اس سے ان لوگوں کے انجام پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس سے رسول کی رسالت اور باری تعالیٰ کی الوہیت پر بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳ : ۴۰) "اے نبی" جس برے انجام کی دھمکی ہم ان لوگوں کو دے رہے ہیں اس کا کوئی حصہ خواہ ہم تمہارے جیتے جی دکھا دیں یا اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہم تمہیں اٹھا لیں' بہرحال تمہارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے"۔

اس فیصلہ کن ہدایت میں' تحریک اسلامی کی نوعیت اور تحریک کی لیڈر شپ کے لیے سامان بصیرت ہے' لیڈر شپ کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ہر مرحلے میں مناسب پالیسی اختیار کرے اور اپنا فریضہ سرانجام دے۔ ان کا یہ فریضہ نہیں ہے کہ وہ تحریک کو اس انجام تک پہنچائیں جہاں تک اسے اللہ پہنچانا چاہتا ہے۔ نیز ان کا یہ فریضہ بھی نہیں کہ وہ تحریکی اقدامات اور مراحل میں شتابی دکھائیں نہ ان کا یہ کام ہے کہ تحریک کی ناکامی کا اعلان کر کے مایوس ہو جائیں۔ جب لیڈر شپ دیکھے کہ اللہ کے فیصلے میں دیر ہو رہی ہے اور ان کو تمکن فی الارض نصیب نہیں ہو رہا ہے اور اقتدار سے وہ ابھی دور ہیں تو پریشان نہ ہوں' وہ تو صرف داعی ہیں' محض داعی۔

اللہ کی قوت کے آثار تمہارے ماحول میں نظر آ رہے ہیں۔ اللہ بڑی بڑی مضبوط اقوام کو پکڑتا ہے۔ وہ زوال کے گڑھے میں گرتی ہیں' اس وقت جبکہ وہ زمین پر سرکشی اختیار کرتی ہیں اور فساد برپا کرتی ہیں۔ ایسی اقوام کی قوت میں کمی ہوتی ہے' دولت میں کمی ہوتی ہے اور ان کی اہمیت کم ہوتی جاتی ہے۔ کسی وقت تو ان کی حکومت سے سورج غروب نہیں ہوتا لیکن بعد میں وہ سکڑ کر رہ جاتی ہیں اور جب اللہ کسی قوم کی شکست و خسارے کا فیصلہ کرتا ہے تو اللہ سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہے اور اللہ کا فیصلہ نافذ ہو کر رہتا ہے۔[1]

---

(۱) بعض لوگوں نے تنقص الارض کا مفہوم قطبین میں زمین کے سکڑنے سے کیے ہیں۔ یہ تفسیر غلط ہے' ایسے لوگوں کو چاہئے کہ وہ قرآن مجید سے ایسا مذاق نہ کریں کیونکہ قرآن کا مضمون اور سیاق ان سائنسی مفہومات کا متحمل نہیں ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۚ وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٤١﴾

"کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم اس سرزمین پر چلے آ رہے ہیں اور اس کا دائرہ ہر طرف سے تنگ کرتے چلے آتے ہیں؟ اللہ حکومت کر رہا ہے۔ کوئی اس کے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے والا نہیں ہے اور اسے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی"۔

یہ لوگ امم سابقہ سے مکاری تدابیر اور سیاست اور دھوکہ بازی میں زیادہ نہیں ہیں لیکن اللہ نے اس کے باوجود ان اقوام کو پکڑا کیونکہ اللہ کی قوت اور تدبیر ان سے زیادہ محکم تھی۔

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا ۖ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۗ وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّارُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٤٢﴾

"ان سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں وہ بھی بڑی بڑی چالیں چل چکے ہیں، مگر اصل فیصلہ کن چال تو پوری کی پوری اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کیا کچھ کمائی کر رہا ہے، اور عنقریب یہ منکرین حق دیکھ لیں گے کہ انجام کس کا بخیر ہوتا ہے"۔

سورہ کا خاتمہ اس بات کی نقل سے ہوتا ہے کہ کفار نے آپ کی رسالت کا صاف صاف انکار کر دیا۔ اس سورہ کا آغاز آپ کی رسالت کے مضمون سے ہوا تھا۔ یوں آغاز و انجام میں سورہ کا مضمون اور محور بتا دیا گیا۔ اللہ یہاں خود شہادت دے رہے ہیں کہ اے پیغمبر' آپ کی رسالت پر میں خود گواہ ہوں اور اللہ کی گواہی کے بعد کسی کی گواہی کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کتاب اور وحی و رسالت کے بارے میں وہی سب سے زیادہ علیم و خبیر ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ٦
ع ٦ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ﴿٤٣﴾
١٢

"یہ منکرین کہتے ہیں کہ تم خدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہو۔ کہو "میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے اور پھر اس شخص کی گواہی جو کتاب آسمانی کا علم رکھتا ہے"۔

--- ()()() ---

یہ سورہ ختم ہوتی ہے' اس نے انسانی دل کو پوری کائنات کی سیر کرائی اور نفس انسانی کی دنیا میں بھی گھمایا' اور اس

پر نہایت ہی گہرے اور وسیع اثرات ڈالے اور پھر دل مومن کو اس دلیل پر لاکر کھڑا کر دیا کہ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر اللہ گواہ ہے اور یہ اللہ کی شہادت سورہ کے آغاز میں بھی لائی گئی اور اختتام پر بھی لائی گئی۔ اللہ کی شہادت کے بعد کسی دعویٰ کے ثبوت کے لیے اور کیا شہادت درکار ہو گی۔ اللہ کی شہادت پر تو بات ختم ہو جاتی ہے۔

اس سورہ کے خاتمہ پر یہ بات کہنا ضروری ہے کہ اس سورہ میں اسلامی نظریہ حیات اور جس منہاج پر قرآن نے اس نظریہ کو پیش کیا ہے اس پر غور کرنا ضروری ہے' حق تو یہ تھا کہ جن آیات میں اس کو بیان کیا گیا ہے' ہم وہاں ہی یہ تفصیل دے دیتے لیکن ہم نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ آیات کی تفسیر کے درمیان میں ایک تفصیلی بحث لاکر آیات کی روانی کو ختم کر دیں۔ اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ اس موضوع کو سورہ کے آخر تک موخر کر دیں۔

اسلامی نظریہ حیات اور اس کے منہاج کی طرف آیات کے ذیل میں ہم نے اشارات بہرحال کیے ہیں۔ یہاں سورہ کے اختتام کے بعد اب مناسب ہے کہ قدرے مفصل بات رکھی جائے۔ واللہ المستعان !

اس سورہ کا آغاز کلام' اس کے موضوعات' اور اس کے اندر دی جانے والی اکثر ہدایات یہ بتاتی ہیں کہ یہ سورہ مکی ہے' اور جس طرح بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ مدنی ہے' درحقیقت یہ مدنی نہیں ہے۔ جس طرح بعض مصاحف میں بھی اسے مدنی لکھا گیا ہے' ان کے دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ مکہ کے اس دور میں نازل ہوئی جس میں لوگ دعوت اسلامی سے سخت منہ موڑے ہوئے تھے۔ وہ جھٹلاتے تھے بلکہ دعوت اسلامی کو چیلنج دے رہے تھے۔ مثلاً یہ سورہ بتاتی ہے کہ مشرکین بار بار معجزات طلب کرتے تھے' اور یہ مطالبہ کرتے تھے کہ جس عذاب سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے وہ ان پر جلدی نازل کیوں نہیں ہوتا۔ اس لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مٹھی بھر ساتھیوں کو یہ مشورہ دیا جاتا کہ وہ گھبرائیں نہیں اور جس حق پر وہ ہیں اس پر جم جائیں۔ ان کے پاس جو دعوت ہے وہ چونکہ بلند دعوت ہے' اس لیے اس کے ذریعہ وہ اس اعراض' تکذیب اور اس چیلنج کا مقابلہ کریں اور صرف اللہ سے دعا کریں کہ وہ ان کی مشکلات کو دور کر دے اور کھل کر اعلان کریں کہ اللہ وحدہ حاکم اور خالق و رب ہے' اور اس موقف پر جم جائیں اور یہ عقیدہ رکھیں کہ یہی حق ہے اگرچہ مشرکین اس کی تکذیب کریں۔ یہ سورہ مشرکین کے سامنے یہ دلائل بھی رکھتی ہے جو اس کائنات میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں اور وہ دلائل بھی جو خود ان کے نفسوں میں ہیں۔ پھر تاریخ انسانیت اور اس کے اہم واقعات میں ہیں۔ غرض یہ اور اس قسم کے بے شمار دلائل ہیں جو اس سورہ میں نہایت ہی موثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں جن کے اثرات قلب پر گہرے پڑتے ہیں اور جن سے انسانی فکر کو بہت زیادہ غذا ملتی ہے۔

مثلاً اس سورہ میں بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب ہی حق ہے اور یہی سچائی ہے' اگرچہ لوگ اس سے منہ موڑیں' اس کو جھٹلائیں' اسے چیلنج دیں' اور اسے قبول کرنے میں دیر کریں۔ اس راہ کی مشکلات اس بات پر دلیل نہیں ہیں کہ یہ کتاب سچ نہیں ہے۔

الٓمٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۳ : ۱) "یہ کتاب الٰہی کی آیات ہیں اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ عین حق ہے۔ مگر اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے"۔

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ (۱۳ : ۱۷) "اسی مثال سے اللہ حق و باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے' جو جھاگ ہے وہ اڑ جاتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔ اس طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے"۔

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰي اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۱۳ : ۱۹) "بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمہارے رب کی اس کتاب کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے حق جانتا ہے' اور وہ شخص جو اس حقیقت سے اندھا ہے' دونوں یکساں ہو جائیں۔ نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں"۔

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ (۲۷) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۲۸) (۱۳ : ۲۷ - ۲۸) "یہ لوگ جنہوں نے (رسالت محمدی کو ماننے سے) انکار کر دیا ہے۔ کہتے ہیں: "اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری"۔ کہو' اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے' اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اس کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔ ایسے ہی لوگ ہیں وہ جنہوں نے (دعوت اسلامی) کو مان لیا ہے' اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے"۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ مَتَابِ (۱۳ : ۳۰) "اے نبی' اسی شان سے ہم نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے ایک ایسی قوم میں جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں' تاکہ تم ان لوگوں کو وہ پیغام سناؤ جو ہم نے تم پر نازل کیا ہے' اس حال میں کہ یہ اپنے نہایت مہربان خدا کے کافر بنے ہوئے ہیں۔ ان سے کہو کہ وہی میرا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے' اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی میرا ملجا و ماویٰ ہے"۔

وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَ لَآ اُشْرِكَ بِهٖ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَ اِلَيْهِ مَاٰبِ (۳۶) وَ كَذٰلِكَ

اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا

وَاقٍ (۳۷)(۱۳:۳۶ - ۳۷) "اے نبیؐ جن لوگوں کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی' وہ اس کتاب سے جو ہم نے تم پر نازل کی ہے' خوش ہیں اور مختلف گروہوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کی بعض باتوں کو نہیں مانتے ۔ تم صاف کہہ دو کہ "مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤں' لہٰذا میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے"۔ اسی ہدایت کے ساتھ ہم نے یہ فرمان عربی تم پر نازل کیا ہے ۔ اب اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمہارے پاس آ چکا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمہارا حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچا سکتا ہے"۔

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا

الْحِسَابُ (۱۳ : ۴۰) "اور اے نبیؐ جس برے انجام کی دھمکی ہم ان لوگوں کو دے رہے ہیں اس کا کوئی حصہ خواہ ہم تمہارے جیتے جی دکھا دیں یا اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہم تمہیں اٹھا لیں' بہرحال تمہارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے"۔

. وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ

عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (۴۳) "یہ منکرین کہتے ہیں کہ تم خدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہو۔ کہو "میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے اور پھر اس شخص کی گواہی جو کتاب آسمانی کا علم رکھتا ہے"۔

ذرا ان آیات پر غور کیجئے' ان سے محسوس ہوتا ہے کہ مشرکین مکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات اور اس قرآن کا کس طرح مقابلہ اور مزاحمت کر رہے تھے ۔ اور ان حالات میں اللہ تعالیٰ اور قرآن کریم نے مشرکین مکہ کے اس سخت موقف کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا۔

ان آیات میں جو بات کھل کر اور واضح طور پر کہی گئی ہے وہ یہ ہے 'کہ لوگوں کے منہ موڑنے 'جھٹلانے' کرنے' مزاحمت کرنے اور دعوت کو نہایت سست رفتاری سے قبول کرنے اور دعوت کی راہ میں بے پناہ مشکلات کھڑی کرنے کی اس مشرکانہ پالیسی کے بالمقابل اللہ نے حضور اکرمؐ کو صاف صاف ہدایت دی کہ آپ ان سے دو ٹوک انداز میں بات کریں اور جو سچائی آپ پر نازل کی گئی ہے وہ صاف صاف بتائیں ۔ دعوت اسلامی کے بنیادی نکات یہ ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ اور خالق نہیں 'اس کے سوا کوئی حاکم اور قانون ساز نہیں ہے 'اس کے سوا کوئی بندگی اور اطاعت کے لائق نہیں' وہی واحد اور قہار ہے' سب لوگوں نے اس کے پاس جانا ہے یا جنت میں یا آگ میں' اور یہی وہ نکات تھے جن کا مشرکین مکہ انکار کرتے تھے اور ان کی مزاحمت کرتے تھے ۔ حضور اکرمؐ سے کہا گیا کہ آپ اس سچائی میں سے بعض چیزوں کو چھپا کر یا بعض کے اعلان میں تاخیر کر کے ان مشرکین کی خوشنودی حاصل کرنے کی سعی نہ کریں ۔ اس سلسلے میں حضور اکرمؐ کو کھلی دھمکی دی گئی کہ اگر آپؐ نے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی تو آپ کے لیے بھی اللہ کے ہاں سزا ہے'

کوئی آپ کو بچا نہیں سکے گا۔

یہ کھلا اشارہ' بلکہ اعلان ان لوگوں کو صاف صاف بتاتا ہے' جو اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں' کہ اس دعوت کا یہی منہاج ہے' اور اس میں کسی اجتہاد کی ضرورت نہیں ہے' نہ اس میں کوئی خاص حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ داعیوں کو چاہئے کہ وہ اس دعوت کے بنیادی نکات کا اعلان صاف صاف کریں۔ ان میں سے کسی نکتے کو حذف نہ کریں۔ نہ اس کو موخر کریں۔ ان بنیادی حقائق اور نکات میں سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ چونکہ اللہ' حاکم اور رب اور قانون ساز صرف اللہ ہے اس لیے اللہ کے سوا کسی اور شخص یا ادارے کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ حالات جیسے بھی ہوں' مخالف قوتیں جس قدر بھی طاقتور اور سخت ہوں' اس نکتے کا اعلان ضروری ہے۔ اگرچہ لوگ نہ مانتے ہوں' منہ موڑتے ہوں' یا راہ میں سخت سے سخت مشکلات حائل ہوں' اور نہایت ہی خطرناک حالات ہوں۔ یہ بات نہ حکمت کے ضمن میں آتی ہے اور نہ موعظہ حسنہ کے ضمن میں آتی ہے کہ دعوت اسلامی کے کچھ نکات کو چھپا دیا جائے یا موخر کر دیا جائے محض اس لیے کہ ملک کے اندر موجود طاغوتی قوتیں اس بات کو پسند نہیں کرتیں' یا کارکنوں پر تشدد کرتی ہیں' یا اعراض کرتی ہیں۔ یا داعیوں کے خلاف سازشیں کرتی ہیں' کیونکہ ان وجوہات کی بنا پر داعیان حق کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اسلام کے ان اساسی نکات میں سے کسی کو ترک کر دیں یا موخر کر دیں۔ داعیان حق کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ایسے شعائر' اخلاق اور اطوار اپنائیں یا روحانی اور اخلاقی اصلاح کی راہ اختیار کریں اور اللہ کی وحدانیت اور حاکمیت کا صاف اعلان ترک کر دیں اور اس کے نتیجے میں صرف اسلامی نظام کی اطاعت کی دعوت اس لیے چھوڑ دیں کہ وہ ان طاغوتی قوتوں کے غضب اور انتقام سے بچ جائیں۔

یہ بات یاد رہے کہ اللہ نے اسلامی نظریہ حیات کے پیش کرنے کا منہاج یہی اور صرف یہی بتایا ہے' اور یہی منہاج ہے جس پر اللہ کے حکم کے مطابق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پوری زندگی میں چلتے رہے۔ نیز کسی بعد میں آنے والے داعی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس طریق کار کو ترک کر دے یا کوئی دوسرا طریق کار اختیار کرے۔ اللہ خود اپنے دین کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ وہ داعیوں کے بچانے کا بھی ذمہ دار ہے۔ اور خود سرکشوں کی ریشہ دوانیوں سے نمٹ لینے والا ہے۔

قرآن کریم نے دعوت اسلامی کا جو اسلوب اختیار کیا ہے اس میں وہ احکام اور ہدایات و دلائل بھی ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل فرمائے ہیں اور اس میں وہ دلائل' شواہد اور اشارات بھی ہیں جو اس کائنات کی کھلی کتاب میں موجود اور مشاہد ہیں۔ قرآن کریم اس پوری کائنات کو انسانی شخصیت کے لیے موضوع غور و فکر قرار دیتا ہے اور یہ حکم دیتا ہے کہ اس کائنات کے اشارات کو اخذ کرو' کیونکہ اس کائنات میں ایسے دلائل موجود ہیں جو اللہ کی تدبیر اور تقدیر کی طرف اشارات کرتے ہیں۔ پھر قرآن مجید وحی متلو اور کتاب کائنات کے ساتھ' انسانی تاریخ کے اہم واقعات کو بھی ماخذ علم و ہدایت قرار دیتا ہے۔ انسانی تاریخ میں دست قدرت کی تدبیر و تقدیر کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ چنانچہ قرآن انسان کو تاریخ کے سامنے بھی پیش کرتا ہے اور یہ حکم دیتا ہے کہ انسان اپنے حس و شعور اور قوت مدرکہ کو تاریخ پر غور کرنے کے لیے استعمال کرے۔

اب لیجئے اس کائنات کی کھلی کتاب کو' یہ سورہ اس کے کئی صفحات کو پیش کرتی ہے۔ اکثر مقامات پر آیات الہیہ قرآنیہ

پیش کرنے کے بعد کتاب کائنات کو پیش کیا جاتا ہے۔ بعض نمونے ملاحظہ ہوں :

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۳ : ۱) "یہ کتاب الٰہی کی آیات ہیں اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ عین حق ہے مگر اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے"۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (۲) وَ هُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْهٰرًا وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳) وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (٤) (۱۳ : ۲ تا ٤) "وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمان کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں 'پھر وہ اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا۔ اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا پابند بنایا۔ اس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقت مقرر تک کے لیے چل رہی ہے اور اللہ ہی اس سارے کام کی تدبیر فرما رہا ہے۔ وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو' اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے۔ اس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیئے ہیں۔ اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کر دیئے ہیں اور وہی دن پر رات طاری کرتا ہے۔ ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ اور دیکھو زمین میں الگ الگ خطے پائے جاتے ہیں' جو ایک دوسرے سے متصل واقعہ ہیں' انگور کے باغ ہیں' کھیتیاں ہیں' کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دوہرے 'سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے مگر مزے میں ہم کسی کو بہتر بنا دیتے ہیں اور کسی کو کمتر۔ ان سب چیزوں میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں"۔

چنانچہ اس پوری سورہ میں اس کائنات سے ایسے مناظر پیش کیے جاتے ہیں جو اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اللہ اس کا خالق 'مالک اور حاکم ہے اور اس پوری کائنات کو وہ چلا رہا ہے۔ اور اس کے اندر اس کا نظام تقدیر چل رہا ہے۔ اس کے بعد پھر قرآن کریم لوگوں کو نصیحت کرتا ہے۔ وہ ان تمام مشاہد و مناظر کو اچھی طرح دیکھتے ہیں اور پھر اس بات سے

انکار کرتے ہیں کہ اللہ دوبارہ تخلیق کرے گا۔ وحی کا انکار اس بنا پر کرتے ہیں کہ یہ قرآن بعث بعد الموت کا مدعی ہے۔

وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَ اِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَ اِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۱۳ : ۵) ”اگر تمہیں تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ ”جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے“۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہوں گے۔ یہ جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے“۔

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ يُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۲) وَ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ وَ يُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ (۱۳) (۱۳: ۱۲ - ۱۳) ”وہی ہے جو تمہارے سامنے بجلیاں چمکاتا ہے‘ جنہیں دیکھ کر تمہیں اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں اور امیدیں بھی بندھتی ہیں۔ وہی تو ہے جو پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھاتا ہے‘ بادلوں کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے‘ اور فرشتے اس کی ہیبت سے لرزتے ہوئے تسبیح کرتے ہیں۔ وہ کڑکتی ہوئی بجلیوں کو بھیجتا ہے اور بسا اوقات انہیں جس پر چاہتا ہے‘ گرا دیتا ہے“۔

اللہ اس کائنات کے صفحات ان لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں‘ حالانکہ وہ اللہ کی ربوبیت کے آثار رات دن مشاہدہ کرتے ہیں۔ اللہ کی قدرت اور اس کی سلطنت کے آثار ہر وقت دیکھتے رہتے ہیں‘ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ پوری کائنات اس کی مطیع فرمان ہے۔ وہ اس کائنات کے اندر اپنے بندوں کی بھلائی کے لیے تصرفات کرتا ہے اور اس کائنات میں اس کے سوا کوئی کسی قسم کا تصرف‘ اور تدبیر و تقدیر نہیں کر سکتا۔

وَ هُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ وَ هُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ (۱۳) لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (۱۴) وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ (۱۵) السجدہ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ

نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰي وَ الْبَصِيْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ اَمْ

جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ

الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۶) (۱۳:۱۳ تا ۱۶) "لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں' فی الواقع اس کی چال بڑی زبردست ہے۔ اسی کو پکارنا برحق ہے۔ رہیں وہ دوسری ہستیاں جنہیں اس کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں' وہ ان کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔ انہیں پکارنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس سے درخواست کرے کہ تو میرے منہ تک پہنچ جا' حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں۔ بس اسی طرح کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں ہیں مگر ایک تیر بے ہدف! وہ تو اللہ ہی ہے جس کو زمین و آسمان کی ہر چیز طوعاً و کرھاً سجدہ کر رہی ہے اور سب چیزوں کے سائے صبح و شام اس کے آگے جھکتے ہیں۔ ان سے پوچھو' آسمان و زمین کا رب کون ہے؟ کہو' اللہ۔ پھر ان سے کہو کہ حقیقت یہ ہے تو کیا تم نے اسے چھوڑ کر ایسے معبودوں کو اپنا کارساز ٹھہرالیا جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے؟ کہو 'کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوا کرتا ہے؟ کیا روشنی اور تاریکیاں یکساں ہوتی ہیں؟ اور اگر ایسا نہیں تو کیا ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں نے بھی اللہ کی طرح کچھ پیدا کیا ہے کہ اس کی وجہ سے ان پر تخلیق کا معاملہ مشتبہ ہو گیا؟ کہو ہر چیز کا خالق صرف اللہ ہے اور وہ یکتا ہے 'سب پر غالب!"

یوں یہ کائنات دلائل قدرت اور اشارات ایمان کی ایک بھرپور نمائش گاہ بن جاتی ہے۔ یہ انسانی فطرت کو نہایت گہری اور جامع منطق اور سوچ عطا کرتی ہے۔ اور یہ کائنات پوری انسانی شخصیت سے مخاطب ہوتی ہے۔ اس کے تمام قوائے مدرکہ سے ہمکلام ہوتی ہے' اور یہ مکالمہ عجیب ہے اور نہایت منطقی اور مرتب ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم انسان کے غور و فکر کے لیے انسانی تاریخ کو پیش کرتا ہے' انسان کو قرآن کریم یہ سکھاتا ہے کہ اس کی پوری زندگی اور اس کا بہاؤ' اللہ کے دست قدرت میں ہے' اللہ حاکم' قاہر' مدبر اور مکمل کنٹرول کرنے والا ہے۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ وَ اِنَّ رَبَّكَ

لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰي ظُلْمِهِمْ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ (۱۳:۶) "یہ لوگ بھلائی سے پہلے برائی کے لیے جلدی مچا رہے ہیں' حالانکہ ان سے پہلے عبرت ناک مثالیں گزر چکی ہیں اور بے شک تیرا رب بخشش والا ہے انسانوں کے لئے ان کے ظلم پر اور وہ سخت سزا دینے والا بھی ہے"۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰي وَ مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ

بِمِقْدَارٍ (۸) عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ (۹) سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ

الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌ بِالنَّهَارِ (۱۰) لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ

مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰي يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَ اِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْۗءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ

(۱۱)(۱۳:۸ تا ۱۱) "اللہ ایک ایک حاملہ کے پیٹ سے واقف ہے' جو کچھ اس میں بنتا ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اس میں کمی یا بیشی ہوتی ہے اس سے بھی وہ باخبر رہتا ہے۔ ہر چیز کے لیے اس کے ہاں ایک مقدار مقرر ہے۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر' ہر چیز کا عالم ہے۔ وہ بزرگ ہے اور ہر حال میں بالا تر رہنے والا ہے۔ تم میں سے کوئی شخص خواہ زور سے بات کرے یا آہستہ' اور کوئی رات کی تاریکی میں چھپا ہوا ہو یا دن کی روشنی میں چل رہا ہو' اس کے لیے سب یکساں ہیں۔ ہر شخص کے آگے اور پیچھے اس کے مقرر کیے ہوئے نگران لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل لیتی اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کرے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی' نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے"۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَ يَقْدِرُ وَ فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ (۱۳:۲۶) "اللہ جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا رزق دیتا ہے۔ یہ لوگ دنیوی زندگی میں مگن ہیں' حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک متاع قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں۔

وَ لَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰي يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (۳۱) وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ (۳۲) (۱۳:۳۱ - ۳۲) "جن لوگوں نے خدا کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ ان پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت آتی ہی رہتی ہے یا ان کے گھر کے قریب کہیں نازل ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آن پورا ہو۔ اور اللہ یقیناً اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے' مگر میں نے ہمیشہ منکرین کو ڈھیل دی اور آخر کار ان کو پکڑ لیا' پھر دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی"۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا وَ اللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ وَ هُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۴۱) وَ قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا يَعْلَمُ مَا تَكْ

كُلُّ نَفْسٍ وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ (۴۲) (۱۳:۴۱ - ۴۲)) "کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم اس سرزمین پر چلے آرہے ہیں اور اس کا دائرہ ہر طرف سے تنگ کرتے چلے آتے ہیں؟ اللہ حکومت کر رہا ہے۔ کوئی اس کے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے والا نہیں ہے اور اسے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ ان سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں وہ بھی بڑی بڑی چالیں چل چکے ہیں، مگر اصل فیصلہ کن چال تو پوری کی پوری اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کیا کچھ کمائی کر رہا ہے، اور عنقریب یہ منکرین حق دیکھ لیں گے کہ انجام کس کا بخیر ہوتا ہے"۔

یوں قرآن کریم اپنے منہاج کے مطابق انسانی تاریخ سے شواہد اور بصیرت افروز دلائل پیش کرتا ہے اور ان کو اس قدر موثر بنا دیتا ہے کہ وہ مجموعی طور پر انسانی فطرت کو اپیل کرتے ہیں اور یہ دلائل نہایت منظم اور مرتب انداز میں پیش کیے جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا تصریحات سے ہمیں ایک نشان راہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ دعوت اسلامی کا اہم نشان ہے۔ وہ یہ کہ قرآن کریم انسانی شخصیت کو ہمہ جہت اور ہمہ پہلو خطاب کرتا ہے۔ قرآن انسانی شخصیت کے کسی ایک پہلو کو خطاب نہیں کرتا مثلاً فکر و ذہن کا پہلو یا الہام و بصیرت کا پہلو، یا احساسات اور شعور کا پہلو۔ لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ہم قرآن کریم کو دعوت اسلامی کی گائیڈ بک بنالیں۔ داعی ہر مسئلہ کی تلاش تمام دوسرے ذرائع سے پہلے قرآن سے کرے، اور قرآن سے معلوم کرے کہ وہ لوگوں کو دعوت کس اسلوب اور کس طریقے سے دے اور کس طرح مردہ دلوں کو زندگی دے اور کس طرح وہ بجھی ہوئی روحوں میں آگ لگائے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس اللہ نے قرآن کو اتارا وہی خالق انسان ہے۔ وہ جانتا ہے کہ انسان کا مزاج کیسا ہے اور اس کی ساخت کیسی ہے۔ وہ انسانی نفسیات کے نشیب و فراز سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ان حضرت میں کہاں کہاں ٹیڑھ ہے۔ پھر داعیوں کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ اپنی دعوت کا آغاز اللہ کی وحدت الوہیت اور وحدت حاکمیت کے مسئلے سے کریں۔ اور یہ دعوت دیں کہ انسان پر اللہ کی بادشاہت کا قیام ضروری ہے اور ان داعیوں کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کو رب تعالیٰ سے متعارف کرانے کا وہی طریقہ اختیار کریں جو قرآن نے اپنایا ہے اور یہی طریقہ حق اور سچ ہے۔ ان لوگوں کو اللہ کے دین اور نظام حیات پر لے آئیں اور ان سے تسلیم کرائیں کہ اللہ بھی وہی ہے اور ایک ہے اور رب بھی وہی ہے اور حاکم ہے اور نظام اور قانون بھی اسی کا چلے گا جو شریعت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت کرانے کے لیے اور شرک کے ہر قسم کے شبہات کی مکمل نفی کے لیے قرآن کریم یہ تدبیر اختیار کرتا ہے کہ لوگوں کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقت بیان کر دی جائے اور منصب رسالت کی صحیح تعریف پیش کر دی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام سے پہلے اہل کتاب کے درمیان حقیقت الوہیت کو حقیقت نبوت کے درمیان خلط ملط کر کے فکری انحراف پیدا ہو گیا تھا۔ عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات میں ذات باری کے خصائص اور حاکمیت الہیہ کے خصائص کا اضافہ کر دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے لاہوتی اور ناسوتی مباحث نے عیسائیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا تھا۔ ایک عرصہ تک کئی فرقے دست و گریبان ہوتے رہے۔

یہ اختلاط صرف عیسائیوں کے ہاں ہی نہ ہوا بلکہ اس میدان میں بے شمار بت پرستانہ مذاہب کو دھوکہ ہوا۔ نبوت کے تصورات ناقابل فہم ہو گئے۔ بعض لوگوں نے نبیوں کو جادوگروں سے جوڑ دیا۔ بعض نے نبی اور کشفی فلاسفہ کو ایک

قرار دیا۔ بعض نے نبیوں اور جنوں کے درمیان رشتہ قائم کیا اور بعض نے نبیوں کو خفیہ ارواح کے ساتھ جوڑ دیا۔

عرب بت پرستوں میں ان میں سے اکثر باتیں پائی جاتی تھیں۔ اس لیے بعض لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ آپ غیب کے بارے میں ہمیں بتائیں۔ بعض یہ مطالبہ کرتے تھے کہ ہمیں خارق عادت معجزات دکھائیں۔ بعض متعین مطالبے بھی تھے۔ بعض آپ پر جادوگر ہونے کا الزام لگاتے تھے اور بعض لوگ یہ کہتے تھے کہ آپ پر جنوں کا اثر ہو گیا ہے اور آپ مجنون ہیں۔ بعض کا مطالبہ یہ تھا کہ آپ کے ساتھ فرشتے ہوں۔ غرض اس قسم کے چیلنج اور مطالبے وہ کرتے تھے اور الزامات لگاتے تھے۔ یہ سب مطالبات اس لیے تھے کہ وہ نبوت کے بارے میں بت پرستانہ جاہلی تصور رکھتے تھے۔

چنانچہ قرآن کریم نے نبی اور منصب نبوت کی اصلیت پر طویل کلام کیا اور یہ بتایا کہ رسول کی طبعی حیثیت کیا ہے اور رسالت کی ماہیت کیا ہے اور الوہیت کی حقیقت کیا ہے؟ جو اللہ وحدہ لاشریک کی ذات میں ہے' اور بندگی اور عبودیت کی حقیقت کیا جو ان تمام انواع و اقسام مخلوقات میں پائی جاتی ہے۔ یہ بندگی اور عبودیت انبیاء علیہم السلام کی شخصیات میں بھی مثل ہے۔ انبیاء علیہم السلام بھی اللہ کے صالح بندے ہیں۔ وہ بشر کے علاوہ کوئی اور مخلوق نہیں ہیں۔ ان کے اندر ان صفات میں سے کوئی صفت نہیں ہے جو الٰہی صفات ہیں اور ان کو جنات اور کسی اور خفیہ مخلوق کے ساتھ کوئی تعلق و نسبت نہیں ہے۔ بس فقط ان پر اللہ کی وحی آتی ہے اور اس اسلامی وحی کے ساتھ بھی ان کو کسی خارق عادت معجزہ کو ظاہر کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اگر کوئی معجزہ صادر ہوتا ہے تو وہ اللہ کے اذن سے ہوتا ہے' وہ انسانوں میں سے انسان ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اللہ نے ان کو منصب رسالت کے لیے منتخب کر لیا ہے اور نبی اور رسول منتخب ہونے کے بعد بھی وہ بشر اور بندے ہی رہے۔

چنانچہ اس سورہ میں کئی مقامات پر مقام رسالت اور طبیعت نبی کی وضاحت کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا کہ نبی اور رسول کے حدود کیا ہیں' چنانچہ بت پرستوں نے نبی کی ذات کے ساتھ جن غلط تصورات و افکار کو وابستہ کر دیا تھا ان کو صاف کیا گیا اور نبیوں کی طرف جن قصوں اور دیومالائی کہانیوں کی نسبت کی جاتی تھی اس کی مکمل نفی کر دی گئی۔ جن کی وجہ سے خصوصاً اہل کتاب کے افکار و عقائد میں فساد پیدا ہوا۔ چنانچہ اس سورہ نے ان اداروں کے اندر داخل شدہ بت پرستانہ اوہام اور کہانیوں کو مکمل طور پر صاف کر دیا۔

یہ مباحث قرآن نے محض لاہوتی اور ناسوتی فلاسفی کے طور پر نہیں چھیڑے۔ نہ کسی فلسفیانہ علمی بحث کے طور پر بلکہ یہ مباحث اس وقت کے معاشرے میں اٹھنے والے عملی سوالات کے جواب میں آئے ہیں۔ اس لیے یہ جوابات عملی چیلنج کے جواب میں ایک ردعمل اور تحریک کے طور پر آئے ہیں اور یہ اس وقت برپا جہاد میں سے ایک عملی جہاد تھا' مثلاً :

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (۱۳ : ۷) "یہ لوگ جنوں نے تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیا ہے کہتے ہیں کہ "اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری؟ تم محض خبردار کر دینے والے ہو اور ہر قوم کے لیے ایک راہنما ہے"۔

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ

يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ (۱۳ : ۲۷) "یہ لوگ جنہوں نے انکار کر دیا' کہتے ہیں "اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری" --- کہو' اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اس کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے"۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ

اِلَيْكَ وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ مَتَابِ

(۱۳ : ۳۰) "اے محمدؐ اسی شان سے ہم نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے' ایک ایسی قوم میں جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں' تاکہ تم ان لوگوں کو وہ پیغام سناؤ جو ہم نے تم پر نازل کیا ہے اس حال میں کہ وہ اپنے نہایت مہربان خدا کے کافر بنے ہوئے ہیں۔ ان سے کہو کہ وہی میرا رب ہے' اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی میرا ملجا و ماویٰ ہے"۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ

اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳ : ۳۸) "تجھ سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں' اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا' اور کسی رسول کو بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی خود لا دکھاتا۔ ہر دور کے لیے ایک کتاب ہے"۔

وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا

الْحِسَابُ (۱۳ : ۴۰) "اے نبی جس برے انجام کی دھمکی ہم ان لوگوں کو دے رہے ہیں' اس کا کوئی حصہ خواہ ہم تمہارے جیتے جی دکھا دیں یا اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہم تمہیں اٹھا لیں بہرحال تمہارا کام صرف پیغام دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے"۔

رسالت کے منصب کی نوعیت اور رسول کے اختیارات کی حدود کو ان آیات میں نہایت اچھی طرح واضح کر دیا جاتا ہے کہ رسول تو صرف ڈرانے والے ہیں' اس کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ جو پیغام آپ تک آیا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دے اور جو وحی آتی ہے اس کی تلاوت کرے۔ وہ کوئی معجزہ اللہ کے حکم کے بغیر نہیں پیش کر سکتا۔ وہ اللہ کے بندے ہیں' اللہ ان کے بھی رب ہیں اور آپ نے بھی اللہ ہی کے سامنے جانا ہے۔ آپ دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہیں۔ آپ نے شادی کی اور آپ کی اولاد ہوئی اور آپ نے اپنی انسانیت اور بشریت کو اپنے تمام تقاضوں کے ساتھ برتا۔ جس طرح آپ نے اللہ کی عملاً بندگی کی اور بندگی کے تمام حقوق ادا کیے۔

قرآن نے مکمل صفائی کے ساتھ دنیا کی فضا سے منصب نبوت اور ذات انبیاء کے ساتھ وابستہ اوہام و خرافات کو صاف کیا اور یہ ابر آلود مطلع صاف ہو گیا۔ کلیسا نے نبی اور نبوت کے ساتھ اور مسیح اور ان کی والدہ کے ساتھ جو خود ساختہ عقائد متعلق کر دیئے تھے قرآن کریم نے ان کی نفی کر دی۔ یا جس طرح دوسرے بت پرستانہ عقائد نے نبیوں کے ساتھ جو اوہام و خرافات وابستہ کر دیئے تھے قرآن نے ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ عیسائیت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو ایک سچے آسمانی دین کے رنگ میں پاک و صاف پیش کیا گیا تھا مگر ایک ہی صدی کے اندر عیسائیت ایک مکمل بت پرستانہ دین بن گیا حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو صرف اللہ کے بندے کے طور پر پیش کیا تھا۔

اس نکتے پر بحث کے خاتمے سے قبل درج ذیل آیت پر غور کرنا ضروری ہے۔

وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳ : ۴۰) ”اور اے نبی ؐ جس برے انجام کی دھمکی ہم ان لوگوں کو دے رہے ہیں اس کا کوئی حصہ خواہ ہم تمہارے جیتے جی دکھا دیں یا اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہم تمہیں اٹھا لیں' بہرحال تمہارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے“۔

یہ بات اس نبی سے کہی جا رہی ہے جس پر یہ قرآن وحی ہو کر نازل ہوا ہے۔ آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ خود یہ بات لوگوں کو بتائیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ دعوت دین کا انجام آپ کے اپنے اختیار میں نہیں ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ خود آپ کے ہاتھوں ہی سے دین غالب ہو اور پھیل جائے۔ آپ کا فریضہ اس حد تک محدود ہے کہ آپ تبلیغ کریں' ہدایت دینا یا نہ دینا اللہ کا کام ہے۔ اب یہ کام آپ کے جیتے جی ہو جائے یا اس سے پہلے آپ کو موت اپنی آغوش میں لے لے یہ امور آپ کے فرائض میں شامل نہیں۔ آپ کا فریضہ صرف یہ ہے کہ آپ یہ دعوت لوگوں تک پہنچا دیں۔ اس کے بعد حساب لینا اللہ کا کام ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے کچھ اختیارات لے لیے گئے اور آپ کی دعوت کو محدود کر دیا گیا۔ کیونکہ حضور ؐ کے فرائض ہی محدود ہیں اور فیصلہ کرنا صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔

اس سے یہ حکمت نکلتی ہے کہ داعیان حق کو چاہئے کہ وہ اللہ کے بتائے ہوئے آداب دعوت کو ساتھ لے کر چلیں اور نتائج اور انجام کے ظہور میں جلدی نہ کریں۔ ان کو یہ اختیار بھی نہیں ہے کہ وہ یہ مطالبہ کریں کہ لوگ کیوں ان کی دعوت کو قبول نہیں کرتے' نہ ان کو یہ حق حاصل ہے کہ اللہ نے ان کے ساتھ نصرت کا جو وعدہ کیا ہے اس کا مطالبہ کریں اور نہ یہ حق حاصل ہے کہ اللہ نے مکذبین کو نیست و نابود کرنے کا جو وعدہ کیا ہے' اس کے ظہور کا مطالبہ کریں۔ وہ اس انداز سے بات نہیں کر سکتے مثلاً: ”ہم نے اتنا عرصہ دعوت دی اور ہماری بات پر اس قدر قلیل لوگوں نے لبیک کہا“۔ یا ”ایک عرصہ ہوا کہ ہم مصائب جھیل رہے ہیں اور اللہ ظالموں کو نہیں پکڑ رہا ہے“۔ حقیقت یہ ہے کہ داعیان حق کے ذمہ صرف دعوت دینا ہے۔ رہی یہ بات کہ دنیا و آخرت میں جھٹلانے والوں اور نہ ماننے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے یہ بندوں کا کام نہیں ہے' یہ اللہ کا کام ہے۔ لہٰذا ایک داعی کو اللہ کے دربار میں نہایت ادب سے کھڑا ہونا چاہئے اور اپنی بندگی کا اعتراف کرنا چاہئے۔ یہ کام اللہ پر چھوڑ دینا چاہئے کہ وہ اپنے بندوں کو کس انجام تک پہنچاتا ہے۔

یہ سورہ چونکہ مکی سورتوں میں سے ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فرائض کو تبلیغ تک محدود کر

دیا گیا ہے' کیونکہ مکہ میں جہاد فرض نہ ہوا تھا' مدینہ میں تبلیغ کے بعد جہاد کا حکم بھی دیا گیا تھا۔ تحریک اسلامی میں اس نکتے پر غور کرنا بھی لازمی ہے اور ان آیات پر تحریکی انداز سے غور کرنا چاہئے جن میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ اس دین کے تحریکی انداز کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ کیونکہ جہاد کے نصوص تحریکی نصوص ہیں۔ یہ آیات دعوت اسلامی کی راہنمائی تحریکی صورت حالات کو دیکھ کر کرتی ہیں اور تحریک کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ان میں یہ ہدایات بھی موجود ہیں کہ ہم دعوت اسلامی کو تحریکی انداز دیں۔ ہمارے دور میں اسلام پر لکھنے والوں اور تحقیقات کرنے والوں کی اکثریت کے پیش نظر یہ بات نہیں ہوتی۔ وہ اسلام کو مجمد نظام کے طور پر دیکھتے ہیں' اسے بطور تحریک نہیں دیکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سمجھ میں نصوص جہاد نہیں آتے اور نہ وہ تحریکی زندگی میں نصوص جہاد کا کوئی مصداق تلاش کر سکتے ہیں۔

بعض لوگ تو یہ آیت یا اس قسم کی دوسری آیات پڑھتے ہیں۔

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳ : ۴۰) "بے شک تمہارا کام پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے" اور اس فیصلے تک پہنچتے ہیں کہ داعی کا کام تبلیغ کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ اگر انہوں نے پیغام پہنچا دیا تو یہی ان کا فریضہ ادا ہو گیا۔ رہا جہاد تو ان لوگوں کے تصور میں بڑے علم کی حد تک' اس کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

بعض لوگ اس قسم کی آیات کو پڑھ کر جہاد کو منسوخ تو نہیں کرتے لیکن جہاد کے دائرہ عمل کو محدود کر دیتے ہیں۔ ان کو اتنی بات بھی سمجھ نہیں آتی کہ یہ آیت مکی آیت ہے اور جہاد کے فرض ہونے سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ یہ اس حقیقت کو دیکھ نہیں پاتے کہ اسلام اور دعوت اسلامی ایک تحریک تھی اور اس تحریک کو مختلف مراحل میں مختلف ہدایات دی گئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے محققین صرف کمروں میں بیٹھ کر نصوص قرآنیہ کا مطالعہ کرتے ہیں' یہ کبھی تحریک اسلامی کا حصہ نہیں رہے۔ لیکن جو لوگ کمروں میں بیٹھے ہوں اور "قاعدون" ہوں یا "عابدون" ان کی سمجھ سے یہ آیات بالاتر ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ تبلیغ داعیان حق (خواہ رسول ہوں یا بعد میں آنے والے ہوں) کے کام کی اساس ہے۔ اور یہ تبلیغ بھی جہاد کے مراتب میں سے پہلا مرتبہ ہے۔ جب یہ تبلیغ صحیح خطوط پر ہو' اور اس دین کے اساسی حقائق کی تبلیغ کی جائے۔ ان اساسی عقائد کو فروعی باتوں سے مقدم رکھا جائے یعنی جب اللہ کی الوہیت کی تبلیغ کی جائے کہ وہ وحدہ خالق و مالک ہیں اور ربوبیت کی تبلیغ کی جائے کہ وہ وحدہ رب اور حاکم اور قانون ساز ہیں اور یہ تبلیغ سب سے اول درجے میں ہو' اور پھر یہ تبلیغ کی جائے کہ تمام لوگ صرف اللہ کے بندے اور غلام ہوں گے اور اس کے سوا کسی کی غلامی نہ کریں گے۔ نظام زندگی صرف اللہ سے اخذ کریں گے' اور کسی اور ذریعہ سے اخذ نہ کریں گے' تو اس قسم کے داعیوں پر جاہلیت پہلے دن ہی سے اپنی توجہ فوکس کر دیتی ہے۔ کیونکہ یہ صحیح تبلیغی ہوتے ہیں' ان کا نصب العین صحیح ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ جاہلیت کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے اعراض کرتی ہے اور ان کو نظر انداز کرتی ہے' پھر چیلنج کرتی ہے' پھر مقابلہ کرتی ہے' پھر تشدد کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک اسلام کے حامل داعیان کے سامنے جلد ہی جہاد کا مرحلہ آ جاتا ہے۔ اور یہ صحیح تبلیغ کا آخری مرحلہ ہوتا ہے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّ نَصِيْرًا

"اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے مجرمین میں سے ایک دشمن بنایا ہے' اور تیرا رب ہی تیرے لیے راہنمائی اور مدد

کرنے کے لیے کافی ہے"۔ یہ ہے صحیح طریق کار اور اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

اس سورہ میں داعیان حق کے لیے ایک دوسرا سنگ میل بھی آتا ہے کہ انسان کی نیت و ارادے اور پھر اس کے عزم کے مطابق اس کی حرکت اور اس کے انجام و نتائج کے درمیان تعلق کیا ہے۔ چنانچہ یہ سورہ طے کرتی ہے کہ اللہ کی مشیت انسان کو اسی انجام تک پہنچاتی ہے۔ جس کا وہ ارادہ کرے' اس جانب حرکت کرے اور اس کے لیے جدوجہد کرے۔ لیکن نیت' ارادہ اور تحریک اور نتائج بہر حال اللہ کے نظام قضا و قدر کے اندر ہی ہوتے رہتے ہیں۔ اس اہم نکتے کی وضاحت کے لیے اس سورہ کے اندر جو آیات آئی ہیں وہی کافی ہیں۔ یہ مسئلہ بہت اہم ہے اور اس پر درج ذیل آیات میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰي يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَ اِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ (۱۳:۱۱) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل لیتی' اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کرے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی۔ نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی اور مددگار ہو سکتا ہے"۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰي وَ الَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ (۱۳:۱۸) "جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت قبول کر لی' ان کے لیے بھلائی ہے اور جنہوں نے اسے قبول نہ کیا وہ زمین کی ساری دولت کے بھی مالک ہوں اور اتنی ہی اور فراہم کر لیں تو وہ خدا کی پکڑ سے بچنے کے لیے اس سب کو فدیے میں دے ڈالنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے بری طرح حساب لیا جائے گا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے جو بہت ہی برا ٹھکانا ہے"۔

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ (۲۷) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۲۸)(۱۳:۲۷ - ۲۸)) "کہو' اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔ ایسے ہی لوگ ہیں وہ جنہوں نے (اس نبی کی) دعوت کو مان لیا ہے اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے"۔

وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰي بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا

(۳۱) "پھر کیا اہل ایمان مایوس نہیں ہو گئے کہ اگر اللہ چاہتا تو سارے انسانوں کو ہدایت دے دیتا؟"

بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ (۱۳: ۳۳) "حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے دعوت کو ماننے سے انکار کیا ہے ان کے لیے ان کی مکاریاں خوشنما بنا دی گئی ہیں' اور وہ راہ راست سے روک دیئے گئے ہیں۔ پھر جس کو اللہ گمراہی میں پھینک دے اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں ہے"۔ ان آیات میں سے پہلی آیت اس امر میں صریح ہے کہ کسی قوم کے حال کو بدلنے کے معاملے میں اللہ کی مشیت اسی لائن پر چلتی ہے جس پر وہ قوم چلنے کا ارادہ کر لیتی ہے اور ایک ارادے 'ایک شعور اور عملی اقدام سے اپنے حال کو بدلنا شروع کر دیتی ہے۔ جب ایک قوم اس معنی میں اپنے حال کو بدلنا شروع کر دیتی ہے تو اللہ ان لوگوں کو ایسا کرنے کی توفیق دے دیتا ہے۔ لیکن جب کسی قوم کا حال یہ ہو جائے کہ اللہ ان کو برے انجام تک پہنچا دے تو اللہ کا ارادہ بھی نافذ ہو جاتا ہے اور اس پر کوئی حد بندی نہیں ہوتی اور پھر ان کو اللہ سے کوئی اور بچا نہیں سکتا اور نہ اللہ کے سوا ان کا کوئی دوست و مددگار ہو سکتا ہے۔

لیکن جب وہ اللہ کی دعوت پر لبیک کہہ دیں اور اس دعوت کو قبول کرنے کے بعد اپنے حالات بدلنا شروع کر دیں ' تو اللہ بھی ان کے ساتھ بھلائی کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے اور اگر وہ اللہ کی دعوت کو قبول نہ کریں تو اللہ ان کے ساتھ برائی کا ارادہ کر لیتا ہے۔ پھر ان کے ساتھ سخت حساب ہوتا ہے اور وہ پھر کوئی بڑے سے بڑا فدیہ یا جرمانہ دے کر بھی وہ اپنے آپ کو آزاد نہیں کر سکتے کیونکہ انہوں نے دعوت قبول ہی نہیں کی اور یہ ان کا ہو گا انجام آخرت میں!

دوسری آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دعوت پر لبیک کہنا یا نہ کہنا ان کی حرکت اور ان کے ارادے پر موقوف ہے۔ اور اللہ کی مشیت ان کے اس ارادے اور حرکت کے ذریعہ ہی کام کرتی ہے۔

تیسری آیت کا پہلا حصہ تو یہ بتاتا ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور اس کی مشیت بے قید ہے 'لیکن اس آیت میں دوسرا حصہ یہ ہے وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ "اور اپنی طرف ہدایت اس شخص کو دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے"۔ یعنی ہدایت کا فیصلہ اس کے بارے میں ہوتا ہے جو رجوع الی اللہ کرے۔ لہذا معلوم ہوا کہ گمراہ اس کو کرتا ہے جو اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ جو دعوت قبول کرتا ہے اور پھر اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے 'اس سمت میں چلتا ہے تو اس کو گمراہ نہیں کرتا اور یہ اللہ کا وعدہ ہے 'جو اس نے کیا۔ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا "جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کریں گے ' ہم ضرور اپنی راہوں کی طرف ان کی رہنمائی کریں گے"۔ تو یہ ہدایت اور یہ ضلالت اللہ کے اس نظام مشیت کا تقاضا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے جاری کیا ہے۔ لیکن یہ مشیت ان پر چلتی ہے 'جن خطوط پر لوگ اپنے حالات و اوصاف بدلنے کا ارادہ کر لیں اور چل پڑیں۔ قبولیت کی راہ پر یا انکار کی راہ پر۔

چوتھی آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت پر لے آتا۔ مقصد یہ ہے کہ اگر اللہ کی مشیت یوں ہوتی تو تمام لوگوں کو ایک ہی استعداد پر پیدا کر دیتا اور یہ استعداد ہدایت ہوتی یا ان کو راہ راست پر چلنے پر مجبور کر دیتا۔ لیکن اللہ کی مشیت کا تقاضا یوں ہوا کہ ان کے اندر ہدایت و ضلالت دونوں کی استعداد ہو۔ یہ نہ چاہا کہ ان سے ضلالت کی استعداد ہی سلب کر لی جائے یا ہدایت کی استعداد سلب کر لی جائے۔ بلکہ اللہ نے یوں چاہا کہ ہدایت و ضلالت کی

راہ پر چلانے کے لیے اپنی مشیت کو ان کے فعل کو قبول دعوت اور انکار دعوت پر چلا دیا۔ اب جو دلائل ایمان پر غور کر کے "ہاں" کہہ دے وہ ہدایت کی راہ پر چل پڑے گا اور جو "نہیں" کہہ دے وہ گمراہی کی راہ پر چل نکلے گا۔

رہی پانچویں آیت 'کہ جو لوگ انکار کرتے ہیں تو اللہ نے ان کی انکاری کو ان کے لیے مزین کر دیا ہے' اور وہ راہ راست پر آنے سے روک دیئے گئے ہیں' تو اس آیت کو جن لوگوں نے قرآن کے نصوص سے الگ کر کے پڑھا ہے' اس کے نتیجے میں اسلامی عقائد کی تاریخ میں مسئلہ جبر و اختیار کی مباحث پیدا ہوئے۔ لیکن اس آیت کو اگر دوسری آیات کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے' جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں تو اس سے بھی مسئلہ جبر و اختیار میں ایک جامع تصور سامنے آتا ہے۔ ان کے اعمال کو ان کے لیے' جو مزین کر دیا گیا ہے' اور انہیں راہ راست پر آنے سے روک دیا گیا ہے تو یہ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے انکار کر دیا اور انکار کی راہ پر اس قدر آگے بڑھے کہ پھر مکاریاں شروع کر دیں۔ یہ اس طرح ہوا جس طرح اللہ نے فرمایا کہ اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اسے بدلنے کا ارادہ اور سعی نہیں کرتی خواہ راہ ہدایت پر یا راہ ضلالت پر۔ لہٰذا ان کے اعمال کی تزئین اور راہ راست سے روکنا ان کے اپنے ارادے اور فعل سے ہوا۔

اب اس بحث کی تکمیل ہو گئی تاکہ یہ موضوع صاف ہو جائے جس میں مسلمانوں کے علاوہ دوسری ملتوں کے لوگوں نے بھی الجھن محسوس کی۔ وہ یہ کہ خود لوگوں کا ارادہ بھی ان کے انجام کے متعین کرنے میں فائل نہیں ہے۔ کیونکہ ارادہ اور عمل و نتائج بھی اللہ کی تقدیر کے تابع ہیں۔ ہر واقعہ اور حادثہ (ارادہ بھی واقعہ ہے) اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوتا ہے اور تقدیر کے ذریعہ اللہ کا ارادہ اور اس کی مشیت پوری ہوتی ہے۔ اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ "ہم نے ہر چیز کو ایک انداز کے مطابق پیدا کیا"۔ اس کائنات کے نظام میں خودکاری نہیں ہے' اور نہ اسباب کا ایسا نظام ہے کہ سبب کے نتیجے میں مسبب کا ہونا لازمی ہو۔ سبب اور مسبب دونوں نظام قضا و قدر کے تحت ہیں۔ لہٰذا لوگوں کی توجہ اور ارادہ جو وہ اپنے کسی فیصلے کے بارے میں کرتے ہیں وہ تب ہی کرتے ہیں کہ اللہ کا نظام مشیت ان کی راہ ہموار کر دے اور یہ مشیت نظام تقدیر کے مطابق چلتی ہے۔ وَ کُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِمِقْدَارٍ "اس کے ہاں ہر چیز کی مقدار متعین ہے"۔

یہ آیات' جس طرح ہم نے اس سورہ پر تبصرے کے وقت کہا' انسان کی ذمہ داریوں میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام کائنات میں انسان نہایت ہی اہم اور مکرم مخلوق ہے۔ کیونکہ یہ واحد مخلوق ہے کہ یہ جو ارادہ کرے گا خود اللہ کا نظام مشیت اس سمت پر چلتا ہے۔ خدا خود بندے سے پوچھتا ہے کہ تم نے کدھر جانا ہے۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ خدا بندے کی رضا پر اپنے نظام مشیت کو چلائے اور یہ اس انسان کے لیے بڑا اعزاز ہے۔

اس سورہ میں ان لوگوں پر جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور اس دین کو قبول کرنے سے انکار کیا' یہ فیصلہ نافذ کیا گیا ہے کہ ان لوگوں میں انسانی "شخصیت" فساد پذیر ہو گئی ہے اور انسان کے اندر قبول حق کی جو فطری استعداد اور صلاحیت رکھی گئی ہے اس نے کام چھوڑ دیا ہے اور انسان کا مزاج' اپنی متوازن اور درست سطح سے گر گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان کی فطرت اپنی جگہ درست معیار پر ہو' اور اس کی انسانیت کی سطح بھی برقرار ہو' وہ بگڑ نہ گئی ہو' معطل نہ کر دی گئی ہو اور اس کے اندر فساد نہ ہو گیا ہو' اور اس کے سامنے صحیح قرآنی انداز میں حق پیش کر دیا گیا ہو اور وہ قبول نہ کرے۔ اور اسلام نہ لے آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی دعوت ایسی فطری دعوت ہے کہ وہ ایک سلیم الفطرت انسان کی فطرت کی گہرائیوں میں از خود موجود ہے۔ اگر انسان اس راہ حق کو قبول نہیں کرتا یا اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ

ڈال دی گئی ہے تو یہ سب کچھ اس کے اپنے فساد انسانیت کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ انسان خود اپنے اس فطری بگاڑ کی وجہ سے ضلالت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اور پھر عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے جیسا کہ دوسری سورہ میں اللہ نے فرمایا:

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَۃٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِھَا وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَکَانُوْا عَنْھَا غٰفِلِیْنَ (۷: ۱۴۶) "میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں' وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں کبھی اس پر ایمان نہ لائیں گے۔ اگر سیدھا راستہ ان کے سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں گے اس لیے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پروائی کرتے رہے"۔

اس سورہ میں ایسی آیات ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کفر ہی دراصل اندھے پن اور فطری بصیرت کے خاتمے کا نام ہے۔ اور ہدایت کے معنی یہ ہیں کہ ہدایت پانے والی شخصیت اور فطرت سلامت ہے اور اس کی فہم و ادراک کی قوتیں کام کر رہی ہیں' ورنہ اس کائنات کے اندر واضح دلائل ہدایت موجود ہیں بشرطیکہ کوئی عقل سے کام لے اور غور و فکر کرے۔

اَفَمَنْ یَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ الْحَقُّ کَمَنْ ھُوَ اَعْمٰی اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۱۹) الَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ وَلَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ (۲۰) وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ (۲۱) وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْہِ رَبِّھِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً وَّیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عُقْبَی الدَّارِ (۲۲)

(۱۳: ۱۹ تا ۲۲) "بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمہارے رب کی اس کتاب کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے حق جانتا ہے اور وہ شخص جو اس حقیقت کی طرف سے اندھا ہے' دونوں یکساں ہو جائیں؟ نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں۔ اور ان کا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں' اسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے۔ ان کی روش یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں' اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں۔ ہمارے دیئے

ہوئے رزق سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں۔ اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں آخرت کا گھر ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے"۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ (۲۷) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۲۸) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ (۲۹)

(۱۳: ۲۷ تا ۲۹) "یہ لوگ جنہوں نے (رسالت محمدی کو ماننے سے) انکار کر دیا ہے کہتے ہیں: "اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری"--- کہو اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جنہوں نے (اس نبی کی دعوت کو) مان لیا ہے اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ خبردار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔ پھر جن لوگوں نے دعوت حق کو مانا اور نیک عمل کیے وہ خوش نصیب ہیں اور ان کے لیے اچھا انجام ہے"۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳) وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۴)

(۱۳: ۳ - ۴) "اور وہی ہے جس نے زمین پھیلا رکھی ہے' اس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیئے ہیں' اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں اور وہی دن پر رات طاری کرتا ہے۔ ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں"۔

یوں یہاں یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ جو لوگ کلمہ شہادت کو تسلیم نہیں کرتے وہ اندھے ہیں۔ وہ غور و فکر نہیں کرتے' اور عقل سے کام نہیں لیتے اور چونکہ وہ لوگ اس دعوت کو قبول کرتے ہیں وہ عقلمند ہیں۔ اس لیے ان لوگوں کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یعنی یہ قلوب اس منزل کو پالیتے ہیں جس کو ان کی فطرت جانتی ہے اور چونکہ وہ اسکے عادی ہوتے ہیں اس لیے وہاں پہنچ کر وہ مطمئن ہو جاتے ہیں۔

اس دنیا پر بسنے والے انسانوں کا مطالعہ اگر کیا جائے تو انسان اللہ کے ان اقوال و آیات کا مصداق وہ اس دنیا میں پائے

گا' ان لوگوں کی شکل میں جو اس حق سے منہ موڑتے ہیں جو دین اسلام کی شکل میں نازل ہوا ہے ۔ یہ دین کامل و مکمل حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر نازل ہوا ہے اور یہ لوگ بگڑی ہوئی فطرت کا نمونہ ہیں ان لوگوں کی شخصیت کے وہ پرزے ہی زنگ آلود ہو گئے ہیں جن کے ذریعے انسان اپنے گرد پھیلی ہوئی کائنات سے سچائی کے سگنل وصول کرتا ہے جبکہ یہ پوری کائنات حمد باری کر رہی ہے ۔ اس کی وحدانیت اور قدرت اور تقدیر اور تدبیر کے نظام کو اعلانیہ ظاہر کر رہی ہے ۔

قرآن کریم کا فیصلہ یہ ہے کہ جو لوگ اس سچائی پر ایمان نہیں لاتے وہ اندھے ہیں اور اللہ ان کو اندھا کہتا ہے ۔ لہٰذا پھر ایسے مسلمانوں کے لیے یہ بات شایان شان نہیں ہے جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں' قرآن کو وحی الٰہی سمجھتے ہیں' وہ اپنی زندگی کے معاملات میں سے کسی معاملے میں اندھوں سے تعلیم اور راہنمائی حاصل کریں ۔ خصوصاً ایسے معاملات میں جن کا تعلق ایسے امور سے ہو جن کے ذریعہ حیات انسانی پر خوب و ناخوب کا حکم لگایا جاتا ہو ۔ نہ ایسے لوگوں سے زندگی کی بنیادی اقدار کے بارے میں علم حاصل کرنا چاہئے ۔ نہ ان سے سوسائٹی کے رسوم و آداب اور کلچر سیکھنا چاہئے کیونکہ ان کی فطرت بگڑ چکی ہے اور وہ اندھے ہیں ۔

یہ ہے ہمارا موقف غیر اسلامی افکار و فلسفوں کے بارے میں ۔ ہاں خالص مادی علوم کو اس سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خود فرمایا : انتم اعلم بامور دنیا کم "تم اپنے دنیا کے امور کے بارے زیادہ جانتے ہو" ۔ غرض ایک مسلمان کے لیے یہ مناسب نہیں ہے جو اس حق کو جانتا ہو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف آیا ہے' وہ کسی کافر کے سامنے بیٹھے یا زانوئے تلمذ تہ کرے جبکہ وہ اس سچائی کا منکر ہو' کیونکہ قرآنی رو سے وہ اندھا ہے اور اگر کوئی مسلم اللہ کی شہادت کو رد کرتا ہے تو پھر وہ مسلم نہیں رہ سکتا ۔

ہمیں چاہئے کہ اس دین کو سنجیدگی سے لیں ۔ اور اس کے فیصلوں کو آخری فیصلے سمجھیں اور اگر کوئی ایسے معاملات میں ترقی کرتا ہے تو وہ بنیادی عقیدے اور بنیادی نظریہ میں مداہنت کرتا ہے' اللہ کی شہادت کو رد کرتا ہے ۔ اس صورت میں تو یہ واضح کفر ہو گا ۔

زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ آج ہمارے دور کے بعض لوگ یہ زعم رکھتے ہیں کہ وہ مسلم ہیں' اس کے بعد انسانوں کے نظام زندگی فلاں اور فلاں سے اخذ کرتے ہیں اور ان فلاں اور فلاں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

اَنَّهُمْ عَمٍيٌ "وہ اندھے ہیں" ۔ اور پھر بھی یہ زعم رکھتے ہیں کہ وہ مسلم ہیں ۔

یاد رہے کہ یہ دین ایک سنجیدہ دین ہے' اس کے ساتھ مزاح برداشت نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ تو ایک حتمی فیصلہ ہے ۔ اس میں کوئی مداہنت نہیں ہے ۔ اس کی ہر آیت اور ہر لفظ حق ہے ۔ اگر کوئی اس اعتماد' اس جزم اور اس عزم اور اس سنجیدگی سے اس دین کو قبول نہیں کرتا تو اس دین کو کسی ایسے مداہن کی ضرورت نہیں اور اللہ تو غنی عن العالمین ہے ۔

یاد رہے کہ کسی مسلم پر جاہلی کلچر کا اس قدر دباؤ نہیں ہونا چاہئے کہ مسلمان نظام جاہلیت سے اپنا نظام زندگی اور کلچر اخذ کرے جبکہ وہ جانتا ہو کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جو تعلیمات لے کر آئے ہیں وہ حق ہیں ۔ یہ بات بھی حق ہے کہ اس سچائی سے اندھا اس کو نہیں جان سکتا ۔ اگر پھر بھی وہ کسی اندھے کا شاگرد بنتا ہے اور اس سے علم و ثقافت لیتا ہے اور اللہ کی شہادت کے بعد تو یہ اس کی مرضی ہے ۔

اب ہمارے سامنے اس سورہ کا آخری سنگ میل آتا ہے جو اس سورہ نے نصب کیا ہے ۔ یہ کہ اللہ کی طرف سے جو

سچائی قرآن کی شکل میں آئی اور لوگوں نے اس کا انکار کر کے اندھے ہونے کا ثبوت دیا تو یہ انکار ہی دراصل مبداء اس فتنہ و فساد کا ہے جو اس دنیا میں پھیلا ہوا ہے کیونکہ اس سچائی کا پہلا کام ہی یہ ہے کہ انسانوں کو خیر اور بھلائی اور امن اور معروف کی طرف بلائے۔ لہٰذا جو لوگ اپنی فطرت کے عہد کو بھول جاتے ہیں اور اپنی عقل و فکر سے بھی کام نہیں لیتے اور اس سچائی کو مسترد کر دیتے ہیں جبکہ وہ جانتے بھی ہیں کہ حق اور سچائی صرف اس تعلیم میں ہے جو قرآن میں ہے تو یہی لوگ ہیں جو مفسد فی الارض ہیں جبکہ ان کے بالمقابل وہ لوگ ہیں جو اسے قبول کرتے ہیں۔ وہ مصلح ہیں اور اس دنیا کی زندگی کو پاک و صاف کرنا چاہتے ہیں۔

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۱۹) اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ (۲۰) وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ (۲۱) وَ الَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً وَّ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (۲۲)

(۱۳: ۱۹ تا ۲۲) "بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمہارے رب کی اس کتاب کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے حق جانتا ہے اور وہ شخص جو اس حقیقت کی طرف سے اندھا ہے، دونوں یکساں ہو جائیں؟ نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں۔ اور ان کا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں، اسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے۔ ان کی روش یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں۔ ہمارے دیئے ہوئے رزق سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں۔ اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں، آخرت کا گھر انہی لوگوں کے لیے ہے"۔

وَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (۱۳: ۲۵) "رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں، جو ان رابطوں کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اور جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، وہ لعنت کے مستحق ہیں اور ان کے لیے آخرت میں بہت برا ٹھکانا ہے"۔

یاد رہے کہ انسانوں کی زندگی اس وقت تک اصلاح پذیر نہیں ہو سکتی جب تک ان کی قیادت ایسے اصحاب بصیرت

اور عقلمند لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہو جو یہ جانتے ہوں کہ اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو کچھ نازل کیا ہے وہ برحق ہے' اور انہوں نے ازل کے دین تخلیق فطرت کے وقت اللہ کی دعوت کو تسلیم کرنے کا جو پختہ عہد کیا تھا اس کا پاس رکھتے ہوں ۔ پھر آدم علیہ السلام سے ادھر جو انبیاء لوگوں سے عہد لیتے آئے ہیں' اس کا بھی وہ پاس رکھتے ہوں اور ان کا یہ عزم ہو کہ صرف اللہ کی بندگی کریں گے ۔ صرف اس کے نظام زندگی کے مطابق زندگی بسر کریں گے ۔ کسی دوسرے سرچشمہ سے ہدایات اخذ نہ کریں گے' صرف اللہ کے اوامر اور نواہی پر عمل کریں گے' اللہ نے جن روابط کو جوڑنے کا حکم دیا انہیں جوڑیں گے ۔ جو ہروقت ڈرتے ہیں کہ ان سے کہیں کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جو اللہ کو ناراض کر دے' اور وہ آخرت میں برے حساب سے بھی ڈرتے ہیں اور اپنی ہر سوچ' ہر عمل اور ہر حرکت میں آخرت کے حساب کو مدنظر رکھتے ہوں ۔ وہ اس عہد الٰہی کی راہ میں آنے والی مشکلات کو انگیز کرتے ہیں ۔ نماز قائم کرتے ہیں اور اللہ کے دیئے ہوئے مال سے خفیہ اور ظاہری طور پر خرچ کرتے ہیں ۔ اور زمین میں سے برائی' فساد اور شر کی اصلاح برائے احسان سے کرتے ہیں ۔ صرف ایسے ہی لوگ اس زمین کی اصلاح کر سکتے ہیں اور یہی اس کے مستحق ہیں کہ وہ قائد ہوں ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر لوگوں کی زندگی کی اصلاح صرف ایسی ہی باصبر اور عقلمند شہادت کے ذریعے ممکن ہے جو صرف اللہ کی ہدایات پر چلے جو پوری زندگی کو اللہ کے احکام و ہدایات کے مطابق ڈھال دے اور یہ بھی حقیقت ہے ۔ گمراہ اور اندھی قیادت کے ذریعہ اصلاح ممکن ہی نہیں ہے جن کے پاس یہ یقین ہی نہ ہو کہ اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو کچھ نازل کیا ہے وہ حق ہے' اور اس وجہ سے وہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کی ہدایات اور طریقوں پر چلتی ہو' حالانکہ اللہ کی مرضی اس میں نہیں ہے کہ اس کے بندوں پر ایسے احکام اور نظام نافذ کیے جائیں جو اصلاح نہیں کرتے ۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانوں کی اصلاح نہ سرمایہ دارانہ نظام سے ہوتی ہے اور نہ اشتراکی نظام سے اور نہ کسی سیکولر نظام سے اس لیے کہ یہ سب نظام اندھا پن ہیں اور یہ نظام یہ یقین نہیں رکھتے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو کچھ نازل ہوا وہی حق ہے ۔ جس سے ادھر ادھر ہونا جائز نہیں ہے ۔ پھر انسانیت کی اصلاح نہ تھیاکریسی سے ہو سکتی ہے اور نہ کسی ڈکٹیٹرشپ سے ۔ نہ نظام جمہوریت سے انسانیت کی اصلاح ہو سکتی ہے کیونکہ یہ سب طریقہ ہائے کار اور سیاسی نظام اندھے ہیں ۔ یہ نظام خود اپنے لیے رب گھڑتے ہیں؟ خود اپنے لیے نظام ہائے حکومت تجویز کرتے ہیں اور لوگوں کے لیے ایسے قوانین بناتے ہیں جن کی اجازت اللہ نے نہیں دی ۔ پھر یہ لوگوں سے خود ان قوانین کی پابندی کراتے ہیں ۔ اور ان کو اپنا غلام بناتے ہیں ۔

یہ بات جو ہم کہتے ہیں اور ہماری بات نص قرآنی پر مبنی ہے لیکن اس کا ثبوت اس صورت حالات سے ملتا ہے جو اس وقت پوری دنیا میں پائی جاتی ہے ۔ ایک عام بدبختی ہے جس میں یہ کائنات گرفتار ہے ۔ مشرق سے مغرب تک' چاہے جاگیردارانہ سرمایہ داری ہو' یا لادینی اشتراکی ممالک ہوں ۔ یا دوسرے وہ علاقے جن میں ڈکٹیٹرشپ نافذ ہے' ایسے تمام علاقے اس وقت' بدنصیبی' بدحالی اور ظلم و عدوان سے بھرے ہوئے ہیں ۔ اس لیے کہ ان علاقوں کی تمام قیادتیں اندھی قیادتیں ہیں ۔ اور وہ اس سچائی سے محروم ہیں جو حضرت محمد پر اتری ہے ۔ نہ یہ الٰہی تعلیمات کا پاس رکھتی ہیں اس لیے انسانی زندگی ان نظاموں کے تحت کسی جگہ بھی درست نہیں ہے ۔

جہاں تک ایک سچے مسلم کا تعلق ہے وہ تو اپنے ایمان اور اس عقیدے کے تقاضوں کے مطابق ان تمام نظاموں کو

پرے پھینک دیتا ہے ' جو حضرت محمدؐ کی تعلیمات سے ماخوذ نہ ہوں ' چاہے وہ نظام اجتماعی سیاسی نظام ہو یا کوئی اقتصادی نظام ہو ' یا کوئی سیاسی طرز عمل ہو ۔ کیونکہ مسلمان کا تو یہ عقیدہ ہے کہ اسلامی شریعت ہی اس کا دستور اور منشور ہے ۔ وہی نظام اس کے ہاں مقبول ہو گا جو خدا اور رسول نے اپنے صالح بندوں کے لیے تجویز کیا ہے ۔ اور اگر کوئی مسلمان کوئی اور نظام اخذ کرنے کی مذموم حرکت کرتا ہے تو محض غیر اللہ کا نظام زندگی اپناتے ہی وہ دین اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور ان لوگوں کے دین اور طریق زندگی میں داخل ہوتا ہے جن سے وہ یہ نظام اخذ کرتا ہے ۔

کسی مسلمان کا کوئی جاہلی نظام اخذ کرنا ' ایک تو اسلام کے خلاف ایک حرکت اور بغاوت ہے لیکن اس سے بڑی بات یہ ہے کہ اس حرکت سے وہ خلافت فی الارض کے منصب جلیل کو ایسی قیادت کے حوالے کر دیتا ہے جو اندھی قیادت ہے ۔ جاہلی نظاموں کی قیادت پر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کے ساتھ کیے ہوئے ازلی اور فطری عہد کو توڑتے ہیں ۔ پھر دنیا میں اللہ نے جن روابط کو قائم کرنے کا حکم دیا ہوتا ہے یہ ان کو توڑتے ہیں ۔ پھر یہ فساد فی الارض مچاتے ہیں اور ان تمام فسادات کی جڑ بھی یہ اندھی قیادت ہوتی ہے ۔

انسانیت نے بدبختی اور مصیبت کے طویل دن دیکھے ہیں اور پوری تاریخ میں انسانیت مختلف نظام ہائے زندگی ' مختلف طور طریقوں اور مختلف کلچرز کے اندھیروں میں ' اس اندھی قیادت کی پیروی میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہی ہے ۔ اس اندھی قیادت نے کبھی فلاسفہ اور مفکرین کا لباس اختیار کیا ' کبھی صدیوں تک اس نے قانون سازوں اور سیاست دانوں کا لباس پہنا ' لیکن اسے فلاح اور کامیابی حاصل نہ ہوئی اور اندھی قیادت کے زیر سایہ انسانوں کی انسانیت بلند نہ ہو سکی اور انسان کبھی بھی اس معیار تک نہ پہنچ سکے کہ انہیں خلیفۃ اللہ فی الارض کہا جا سکے ۔ صرف اسلامی نظام حیات کے زیر سایہ ایک عرصہ کے لیے انسانیت نے سربلندی حاصل کی تھی اور اسلامی نظام حیات کا یہ پیریڈ انسانی تاریخ کا یادگار زمانہ رہے گا ۔

دعوت الی اللہ کی حقیقی شاہراہ پر اس سورہ نے یہ واضح سنگ ہائے میل نصب کیے تھے ۔ ہم نے قارئین کو ان سنگ ہائے میل کے پاس لا کھڑا کیا ۔ اگرچہ ہم اس سورہ کے اشارات کا حق ادا نہیں کر سکے ' البتہ ہم نے قارئین کو سمت دکھا دی ہے ۔

الحمدللہ الذي هدانا لهذا وما كنا لنهتدي لولا ان هدانا الله

---000---

# فی ظلال القرآن

## جلد چہارم

## پارہ ----- ۱۳

### سورۃ ابراہیم - ۱۴

### ۱ --- تا --- ۵۲

# سورۂ ابراہیم ایک نظر میں

سورۂ ابراہیم ایک مکی سورہ ہے اور اس کا موضوع وہی ہے جو اکثر مکی سورتوں کا موضوع ہے۔ یعنی اسلامی نظریہ حیات کے بنیادی مسائل 'وحی و رسالت' عقیدۂ توحید' بعث بعد الموت اور حساب و کتاب اور جزاء و سزا۔

لیکن اس موضوع کو پیش کرنے اور اس کے بنیادی حقائق بیان کرنے کے سلسلے میں یہ سورہ ایک خاص منہاج بحث و بیان اختیار کرتی ہے' جس طرح قرآن کریم کی تمام سورتوں میں منفرد نہج کلام اختیار کیا جاتا ہے۔ ہر سورہ کی اپنی فضا' اپنا طریقہ ادا' خاص رنگ اور روشنی ہوتی ہے جس کے مطابق وہ موضوع کے اساسی حقائق پیش کرتی ہے۔ اس سورہ کے اساسی حقائق کا رنگ ڈھنگ موضوع کے اعتبار سے دوسری مکی سورتوں جیسا ہی ہے لیکن ان حقائق کو مخصوص زاویہ سے پیش کر کے اور مخصوص روشنی میں پیش کر کے اس کے اشارات و اثرات کو دوچند کر دیا گیا ہے۔ ان بنیادی حقائق کو بیان کرتے ہوئے یہ سورہ اپنے طول و عرض اور ظرف و حال کے مطابق حقائق کے بعض اطراف میں کمی اور بعض میں بیشی کر دیتی ہے' یوں وہی حقائق یہاں جدید حقائق نظر آتے ہیں اور اس طرح یہ سورہ فنی اعتبار سے شاہکار ادبی اقتباسات کا مجموعہ نظر آتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ کے نام "سورہ ابراہیم" سے اس کی مخصوص فضا نمایاں ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ابو الانبیاء تھے۔ وہ نہایت ہی مبارک' اللہ کے شکر گزار اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے اور نہایت ہی عاجزی کے ساتھ عبادت کرنے والے تھے۔ ان صفات ابراہیمی کا پورا سایہ اس سورہ پر چھایا ہوا ہے۔ ان تمام حقائق پر بھی ابراہیمی رنگ غالب ہے جو اس سورہ میں بیان ہوئے ہیں۔ طرز ادا اور اس کے اثرات پر بھی ابراہیمی رنگ غالب ہے۔

اس سورہ میں کئی نظریاتی حقائق بیان کیے گئے ہیں' لیکن دو باتیں پوری سورہ پر چھائی ہوتی ہیں اور یہ دونوں باتیں حضرت ابراہیم کے زیر سایہ ہیں۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ یہ سورہ تمام رسالتوں اور تمام رسولوں کو ایک ہی حقیقت سمجھتی ہے اور یہ کہ تمام رسولوں کی دعوت ایک تھی۔ ان کا موقف ایک تھا' ایک ہی امت تھی جو ہمیشہ جاہلیت کے مقابلے میں کھڑی ہوگئی۔ جاہلیت بھی ہمیشہ ایک ہی رہی ہے یعنی وہ قوت جو دین اللہ کی تکذیب کرتی تھی۔ اگرچہ زمانے مختلف تھے اور اگرچہ رسولوں کے علاقے مختلف تھے۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں پر بے شمار نعمتیں نازل کیں اور اگر بندے اللہ کا شکر ادا کریں تو ان انعامات الہیہ میں شکر کے ذریعے اضافہ ہو جاتا ہے اور اگر کوئی قوم کفر اور ناشکری کرے اور اکثر لوگ ایسا کرتے رہتے ہیں تو اللہ کا عذاب بھی آتا ہے۔

یہ دونوں حقائق یا یہ دونوں پرتو اور رنگ اگرچہ اپنی جگہ ہیں اور ساری سورہ کے روح رواں ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ سورہ میں دوسرے حقائق بھی موجود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان دونوں حقائق کا سایہ اس پوری سورہ پر غالب ہے۔ یہاں اس نکتے کی طرف اشارہ ضروری تھا۔

سورہ کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ کسی رسول کا منصب رسالت ہوتا کیا ہے۔ اس کے بنیادی فرائض کیا

ہوتے ہیں؟ یہ کہ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنیوں میں لانا' یہ کام وہ اپنے شوق سے نہیں کرتے بلکہ اللہ کے حکم سے کرتے ہیں۔

الٓرٰ کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (۱۴ : ۱) لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ "اے محمدؐ' یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ' ان کے رب کی توفیق سے' اس خدا کے راستے پر جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔ اور زمین اور آسمانوں کی ساری موجودات کا مالک ہے"۔ اس کا خاتمہ بھی اسی مضمون پر ہوتا ہے۔ آخر میں اسی عظیم حقیقت یعنی عقیدۂ توحید پر ہوا ہے۔

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۱۴ : ۵۲) "یہ ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لیے اور یہ بھیجا گیا ہے اس لیے کہ ان کو اس کے ذریعے خبردار کر دیا جائے اور وہ جان لیں کہ حقیقت میں خدا بس ایک ہی ہے اور جو عقل رکھتے ہیں وہ ہوش میں آ جائیں"۔ اس سورہ میں بتایا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اسی پیغام کے ساتھ بھیجا گیا تھا جس کے ساتھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھیجے گئے ہیں اور ان کی بعثت کے مقاصد بھی وہی تھے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہیں۔ ان کے لیے قرآن کریم جو الفاظ استعمال کرتا ہے وہ بھی وہی ہیں جو حضرت محمدؐ کے لیے استعمال ہوئے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴ : ۵)
"ہم اس سے قبل موسیٰؑ کو بھی اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیج چکے ہیں۔ اسے بھی ہم نے حکم دیا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لا"۔ اس سورہ میں بتایا جاتا ہے کہ رسولوں کا عمومی فریضہ یہ ہے کہ وہ اللہ کا پیغام لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کریں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (۱۴ : ۴) "اور ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب بھی کوئی رسول بھیجا ہے' اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے"۔ رسولوں کے فرائض کے ساتھ ساتھ رسولوں کی شخصیت کی حقیقت بھی یہاں بیان کر دی گئی ہے اور ان کی ذات کی قوت اور اختیارات ہی ان کے فرائض منصبی کی حدود کا تعین کرتے ہیں۔ یہ کہ ایک رسول محض مبلغ' ناصح اور کھلا ڈرانے والا ہوتا ہے۔ وہ کوئی معجزہ ازخود نہیں دکھا سکتا۔ اگر ان کے ہاتھوں کسی معجزے کا صدور ہوتا ہے تو وہ اللہ کے اذن سے ہوتا ہے اور جس وقت اللہ کی مشیت ہوتی ہے اس وقت صدور ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ جس وقت رسول چاہے یا اس کی قوم چاہے معجزے کا صدور ہو جائے۔ اسی طرح کسی بھی رسول کے اختیار میں یہ بات نہیں ہوتی کہ وہ کسی کو ازخود ہدایت دے دے یا گمراہی میں چھوڑ دے۔ ہدایت اور ضلالت اللہ کی سنت کے مطابق لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔

رسولوں کی بشریت پر ہمیشہ اہل جاہلیت نے اعتراض کیا ہے ۔اس سورہ میں بھی اہل جاہلیت نے رسولوں کی بشریت پر ان الفاظ میں اعتراض کیا ہے ۔

قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ( ١٤ : ١٠ ) "انہوں نے کہا' تم کچھ نہیں ہو مگر ویسے ہی انسان جیسے ہم ہیں' تم ہمیں ان ہستیوں کی بندگی سے روکنا چاہتے ہو جن کی بندگی ہمارے باپ دادا کے وقت سے ہوتی چلی آرہی ہے ۔ اچھا تو لاؤ کوئی صریح سند" ۔اسی طرح رسولوں نے بھی یک زباں ہوکر ان کے اس خیال کی تائید کی ۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰي مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

( ١٤ : ١١ ) "ان کے رسولوں نے ان سے کہا' واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر تم ہی جیسے انسان لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے' نوازتا ہے اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ تمہیں کوئی سند لا دیں ۔ سند تو اللہ ہی کے اذن سے آسکتی ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہئے" ۔

دوران مضمون یہ بتایا جاتا ہے کہ لوگوں کو اندھیروں سے نکالنا اور روشنیوں میں داخل کرنا بھی اللہ کے اذن ہی سے ہو سکتا ہے ۔جہاں تک رسولوں کا تعلق ہے' ان کی ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ وہ قوم کے سامنے پیغام کھول کر بیان کر دیں ۔ اس کے بعد یہ کام اللہ کا ہے ۔

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ( ١٤ : ٤ ) "پھر اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے ۔وہ بالادست اور حکیم ہے" ۔ان باتوں سے رسولوں کی حقیقت کا تعین بھی ہو جاتا ہے اور ان کے فرائض کا تعین بھی ہو جاتا ہے ۔رسولوں کی بشری حقیقت اور صفات میں سے کوئی چیز بھی ذات الہٰی اور صفات الہیہ کے ساتھ مماثلت نہیں رکھتی ۔یوں اللہ کی ذات و صفات سے کسی قسم کی مماثلت کی نفی ہو جاتی ہے ۔

اس سورہ میں اہل ایمان کے ساتھ صاف صاف وعدہ کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یقیناً پورا ہوتا ہے ۔وہ یہ کہ اہل ایمان کو دنیا میں بھی اللہ کی مدد حاصل ہو گی اور ان کو اس زمین پر اقتدار اعلیٰ اور خلافت فی الارض کا منصب دیا جائے گا اور آخرت میں تو وہ جنتوں اور نعمتوں میں ہوں گے اور مکذبین کو واصل جہنم کیا جائے گا ۔

قرآن مجید اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے کہ تمام رسول یک زبان ہو کر یہ بات کہتے ہیں اور ان کی امتیں اور تمام اقوام بھی رسولوں کو یک زبان ہو کر یہی بات کہتی ہیں :

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ (۱۳) وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ (۱۴) وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (۱۵)

(۱۴:۱۳ تا ۱۵)) "اور منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہو گا ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے۔تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے۔یہ انعام ہے'اس کا جو میرے حضور جواب دہی کا خوف رکھتا ہو اور میری وعید سے ڈرتا ہو۔ انہوں نے فیصلہ چاہا تو ہر جبار دشمن حق نے منہ کی کھائی"۔ یہ سورہ معرکہ حق و باطل کی تصویر کشی مناظر قیامت میں بھی کرتی ہے۔وہاں اہل ایمان کی حالت یہ ہو گی۔

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ (۱۴ : ۲۳) "جو لوگ دنیا میں ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے وہ ایسے باغوں میں داخل کیے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔وہاں وہ اپنے رب کے اذن سے ہمیشہ رہیں گے اور وہاں ان کا استقبال سلامتی کی مبارکباد سے ہو گا"۔

اور کافروں کی حالت یوں ہو گی۔

وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ (۴۹) سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ (۵۰) (۱۴:۴۹ ـ ۵۰)) "اس دن تم مجرموں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں ہاتھ پاؤں جکڑے ہوں گے 'تارکول کے لباس پہنے ہوں گے اور آگ کے شعلے ان کے چہروں پر چھائے جا رہے ہوں گے"۔اس معرکے کو یہ سورہ ضرب الامثال کی صورت میں بھی بیان کرتی ہے۔اہل حق کی مثال یوں دی جاتی ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (۲۴) تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۲۵) وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (۲۶) يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ (۲۷) (۱۴ : ۲۴ تا ۲۷) "کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے اچھی ذات کا درخت 'جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے۔ یہ مثال اللہ اس لیے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بد ذات درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے' اس کے لیے کوئی استحکام نہیں ہے۔ ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قول ثابت کی بنیاد پر دنیا و آخرت' دونوں میں ثبات عطا کرتا ہے' اور ظالموں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے۔ اللہ کو اختیار ہے جو چاہے کرے"۔

اور دوسری جگہ ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ (۱۴ : ۱۸) "جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ہے ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اڑا دیا ہو۔ وہ اپنے کیے کا کچھ بھی پھل نہ پا سکیں گے۔ یہ پرلے درجے کی گم گشتگی ہے"۔

اس سورہ کی پوری فضا پر دو حقائق چھائے ہوئے ہیں اور یہ دونوں حقائق ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ حضرت ابراہیم عبد شکور تھے' اللہ کی طرف یکسو ہونے والے' اور اللہ کے سامنے گڑگڑانے والے بندے تھے۔ ان دو حقائق میں سے ایک یہ ہے کہ تمام رسول اور تمام رسالتیں درحقیقت ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ تمام رسولوں کی دعوت ایک تھی' تمام کی امت ایک ہی امت تھی اور تمام امتوں نے اپنے اپنے دور میں جاہلیتوں کا مقابلہ کیا۔ دوسری حقیقت اس پوری سورہ کی فضا پر یہ چھائی ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت عام ہے۔ تمام انسانوں پر اور ان میں سے اپنے مختار بندوں پر سب سے زیادہ اللہ کا احسان ہے۔ ان دونوں نکات پر ہم ذرا تفصیل سے بات کریں گے۔

پہلی حقیقت کو اس سورہ میں ایک منفرد طرز بیان میں ظاہر کیا گیا ہے لیکن یوں کہ ہر رسول انفرادی طور پر منظر پر آیا ہے' اس نے اپنی دعوت پیش کی ہے' اس نے اپنی قوم سے انفرادی طور پر خطاب کیا ہے۔ اس کے بعد دوسرا رسول آیا ہے' پھر تیسرا آیا ہے اور سب نے ایک ہی بات کی ہے اور سب کو اس کی قوم نے ایک ہی جواب دیا ہے۔ پھر اللہ نے سب کے ساتھ ایک ہی سلوک کر دیا ہے۔ بعض کو دنیا میں سزا دی ہے اور بعض کو آخرت کے لیے مہلت دے دی ہے۔ لیکن طرز ادا یہ تھی کہ ہر رسول اپنی باری پر اسٹیج پر آیا اور اپنی بات کی اور چلا گیا۔ جس طرح کوئی فلم چلتی ہے اور مختلف کردار آتے اور جاتے ہیں۔ سورہ اعراف اور سورہ ہود میں خصوصیت کے ساتھ یہ انداز اختیار کیا گیا تھا۔

لیکن سورہ ابراہیم' یعنی ابوالانبیاء کی سورہ میں تمام نبیوں کو ایک ہی جمعیت کی صورت میں ایک ہی صف میں کھڑا کیا گیا ہے۔ سب کی کشمکش اکٹھی دکھائی گئی ہے اور وہ قوم سے یکبارگی مخاطب ہیں۔ اقوام بھی یکبارگی جواب دیتی ہیں اور یہ کشمکش قیامت تک چلتی دکھائی گئی ہے۔

یوں نظر آتا ہے کہ سب رسولوں کی امت ایک جگہ ہے۔ تمام امم جاہلیہ بھی ایک جگہ جمع ہیں۔ زمان و مکان کے

فاصلے مٹا دیے گئے ہیں۔ گویا ان کے بیان مکان و زمان کے فاصلے عارضی تھے جو اٹھا دیے گئے۔ یہاں صرف دو عظیم حقائق کی کشمکش دکھائی گئی ہے یعنی ایمان اور کفر۔ ایک طرف ایمان ہے اور دوسری طرف کفر اور اشخاص کے بجائے یہ دونوں حقائق ایک دوسرے سے مخاطب ہیں۔ ان کے مقابلے میں زمان و مکان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْا اَيْدِيَهُمْ فِيْ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ (۹) قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓي اَجَلٍ مُّسَمًّي قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۱۰) قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰي مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۱۱) وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰي مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (۱۲) وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا فَاَوْحٰٓي اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ (۱۳) وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ (۱۴) (۱۴ : ۹ تا ۱۴)

”کیا تمہیں ان قوموں کے حالات نہیں پہنچے جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں؟ قوم نوح“ عاد“ ثمود اور ان کے بعد آنے والی بہت سی قومیں جن کا شمار اللہ ہی کو معلوم ہے“؟ ان کے رسول جب ان کے پاس صاف صاف باتیں اور کھلی کھلی نشانیاں لیے ہوئے آئے تو انہوں نے اپنے منہ میں ہاتھ دبا لیے اور کہا کہ ”جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کی طرف سے ہم سخت خلجان آمیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے رسولوں نے کہا ”کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔ وہ تمہیں بلا رہا ہے تاکہ تمہارے قصور معاف کرے اور تم کو ایک مدت مقرر تک مہلت دے۔ انہوں نے جواب دیا ”تم کچھ نہیں ہو مگر ویسے ہی انسان جیسے ہم ہیں‘ تم ہمیں ان ہستیوں کی بندگی سے روکنا چاہتے

ہو جن کی بندگی ہمارے باپ دادا سے ہوتی چلی آرہی ہے ۔ اچھا تو لاؤ کوئی صریح سند" ۔ ان کے رسولوں نے ان سے کہا "واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر تم ہی جیسے انسان ۔ لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ تمہیں کوئی سند لا دیں ۔ سند تو اللہ ہی کے اذن سے آسکتی ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہئے ۔ اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جب کہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی ہے؟ جو اذیتیں تم لوگ ہمیں دے رہے ہو ان پر ہم صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے والوں کا بھروسہ اللہ ہی پر ہونا چاہئے ۔ آخر کار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ "یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے" ۔ جب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ "ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے ۔ یہ انعام ہے اس کا جو میرے حضور جواب دہی کا خوف رکھتا ہو اور میری وعید سے ڈرتا ہو" ۔

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (١٥) مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ (١٦) يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ (١٧) (١٤ : ١٥ تا ١٧) "انہوں نے فیصلہ چاہا تھا (تو یوں ان کا فیصلہ ہوا) اور ہر جبار دشمن حق نے منہ کی کھائی' پھر اس کے بعد آگے اس کے لیے جہنم ہے ۔ وہاں اسے کچ لہو کا سا پانی پینے کو دیا جائے گا جسے وہ زبردستی حلق سے اتارنے کی کوشش کرے گا اور مشکل ہی سے اتار سکے گا ۔ موت ہر طرف سے اس پر چھائی رہے گی مگر وہ مرنے نہ پائے گا اور آگے ایک سخت عذاب اس کی جان کا لاگو رہے گا ۔

یہاں ان آیات میں نوح علیہ السلام سے لے کر تمام اقوام اور تمام رسولوں کا سوال و جواب ایک ایک کر کے دے دیا گیا ۔ یہاں زمان و مکان کے فاصلے دور ہو جاتے ہیں' ایک عظیم حقیقت سامنے آتی ہے' یہ کہ آدم کے بعد نبی آخر الزمان تک تمام رسولوں کی رسالت اور دعوت ایک ہے اور اس دعوت پر تمام اہل جاہلیت کا اعتراض بھی ایک ہے' اور یہ کہ تمام متکبرین' منکرین کا انجام بھی ایک ہے کہ وہ آخر کار شرمندہ و ناکام رہیں گے اور وہ عذاب جو ان سب منکرین حق کا انتظار کر رہا ہے' وہ بھی ایک ہے ۔ نیز اللہ کی طرف سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا :

الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (١٤ : ١) "یہ کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ" ۔ اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں نقل کرتا

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (١٤ : ٥)

"اور ہم نے موسیٰ کو رسول بنا کر بھیجا تھا اپنی نشانیوں کے ساتھ کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لاؤ ۔ یہ دونوں احکام ایک ہی قسم کے ہیں ۔ انبیاء و رسل اور اہل کفر کا یہ معرکہ یہاں ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ یہ معرکہ میدان آخرت میں بھی برپا ہوتا ہے ۔ قیامت کے مختلف مناظر میں بھی اس معرکے کے کچھ نشانات ملتے ہیں اور اس سورہ میں بھی

اس کے چند نمونے موجود ہیں۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ
مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ
اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ (٢١) وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ
وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ
فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ
اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (٢٢) وَاُدْخِلَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ
رَبِّهِمْ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ (٢٣) (١٤ : ٢١ تا ٢٣) ”اور یہ لوگ جب اکٹھے اللہ کے سامنے بے نقاب ہوں گے تو اس وقت ان میں سے جو دنیا میں کمزور تھے وہ ان لوگوں سے جو بڑے بنے ہوئے تھے کہیں گے ”دنیا میں ہم تمہارے تابع تھے' اب کیا تم اللہ کے عذاب سے ہم کو بچانے کے لیے بھی کچھ کر سکتے ہو؟“ وہ جواب دیں گے ”اگر اللہ نے ہمیں نجات کی کوئی راہ دکھائی ہوتی تو ہم ضرور تمہیں دکھا دیتے۔ اب تو یکساں ہے خواہ ہم جزع فزع کریں یا صبر' بہرحال ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں“۔

اور جب فیصلہ چکا دیا جائے گا تو شیطان کہے گا ”حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کیے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کیے ان میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا۔ میرا تم پر کوئی زور نہیں تھا' میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تم کو دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ اب مجھے ملامت نہ کرو' اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری۔ اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا میں اس سے بری الذمہ ہوں' ایسے ظالموں کے لیے تو دردناک سزا یقینی ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ دنیا میں ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں وہ ایسے باغوں میں داخل کیے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہاں وہ اپنے رب کے اذن سے ہمیشہ رہیں گے' اور وہاں ان کا استقبال سلامتی کی مبارکباد سے ہو گا“۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ
الْاَبْصَارُ (٤٢) مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَاَفْئِدَتُهُمْ هَوَآءٌ

( ١٤ : ٤٢ - ٤٣ ) ) "اب یہ ظالم لوگ جو کچھ کر رہے ہیں ' اللہ کو تم اس سے غافل نہ سمجھو ' اللہ تو انہیں ٹال رہا ہے ' اس دن کے لیے جب حال یہ ہو گا کہ آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئی ہیں ' سر اٹھائے بھاگے چلے جا رہے ہیں ' نظریں اوپر جمی ہوئی ہیں اور دل اڑے جا رہے ہیں"۔

وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ (٤٦) فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ (٤٧) يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (٤٨) وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ (٤٩) سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ (٥٠) ( ١٤ : ٤٦ تا ٥٠ ) ) انہوں نے اپنی ساری چالیں چل دیکھیں مگر ان کی ہر چال کا توڑ اللہ کے پاس تھا۔ اگرچہ ان کی چالیں ایسی غضب کی تھی کہ پہاڑ ان سے ٹل جائیں ۔۔پس اے نبی تم ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ اللہ کبھی اپنے رسولوں سے کیے ہوئے وعدے کے خلاف کرے گا۔ اللہ زبردست ہے اور انتقام لینے والا ہے۔ ڈراؤ انہیں اس دن سے جبکہ زمین و آسمان بدل کر کچھ سے کچھ کر دیئے جائیں گے اور سب کے سب اللہ واحد اور قہار کے سامنے بے نقاب حاضر ہو جائیں گے۔ اس دن تم مجرموں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں ان کے ہاتھ پاؤں جکڑے ہوں گے ' تارکول کے لباس پہنے ہوں گے اور آگ کے شعلے ان کے چہروں پر چھائے جا رہے ہوں گے"۔

ان سب آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی معرکہ ہے جو دنیا میں شروع ہوتا ہے اور آخرت کے میدان میں اس معرکے کا اختتام ہوتا ہے۔ یوں دنیا اور آخرت باہم مل جاتے ہیں اور ان میں کوئی فاصلہ اور جدائی نہیں رہتی۔

یہ امثال جو دنیا سے شروع ہو کر میدان آخرت میں جا کر اختتام پذیر ہوتی ہیں ' ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فریقین کے درمیان اس طویل معرکے کے خدوخال کیا ہیں ' اس کی نوعیت کیا ہے اور اس معرکے کے آخری نتائج کیا ہیں ' مثلاً کلمہ طیبہ ایک پاکیزہ درخت کی طرح ہے۔ یہ پاکیزہ درخت نبوت کا درخت ہے ' یہ ایمان کا درخت ہے۔ یہ سچائی اور بھلائی کا درخت ہے۔ بری بات ایک برے درخت کی طرح ہوتی ہے اور یہ برا درخت کیا ہے ' جاہلیت کا درخت ہے۔ باطل کا درخت ہے ' تکذیب ' شر اور سرکشی کا درخت ہے۔

---○○○---

دوسری حقیقت کا تعلق نعمتوں اور شکر کے ساتھ ہے ' بے بہا نعمتوں اور ان کی ناشکری اور سرکشی کے ساتھ ہے۔ یہ حقیقت بھی اس سورہ کی فضا پر چھائی ہوئی ہے۔ مختلف مقامات پر سیاق کلام میں جابجا بکھری ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام انسانوں پر اپنی نعمتیں گنواتے ہیں ' خواہ وہ مومن ہوں یا کافر ہوں ' صالح ہوں یا بدکار ہوں ' نیک ہوں یا فاجر ہوں اور مطیع فرمان ہوں یا نافرمان ہوں۔ یہ اللہ کی رحمت ' اس کی مہربانی اور اس کا فضل و کرم ہے کہ کافر ' فاسق اور فاجر کو بھی اس کرۂ ارض پر انعامات سے نوازا جائے۔ بعینہ اسی طرح جس طرح مومن ' نیک اور مطیع فرمان کے لیے

انعامات ہیں تاکہ وہ شکر ادا کریں۔ اس نعمت کو جب پیش کیا جاتا ہے اس کائنات کے نہایت ہی عظیم میدان میں پیش کیا جاتا ہے اور اس عظیم کائنات کے وسیع فریم ورک میں اسے رکھا جاتا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ (۳۲) وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ (۳۳) وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (۳۴) (۱۴: ۳۲ - ۳۴) "اللہ وہی تو ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے سے تمہارے رزق کے لیے طرح طرح کے پھل پیدا کیے۔ جس نے کشتی کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو تمہارے لیے مسخر کیا۔ اور اس نے سورج اور چاند کو تمہارے تابع کر دیا اور رات اور دن کو تمہارے لئے مسخر کر دیا۔ جس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو کر نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے"۔

اللہ نے رسولوں کو لوگوں کی ہدایت کے لیے روانہ کیا، یہ بھی ایک نعمت ہے جو مذکور بالا نعمت کے برابر ہے یا اس سے زیادہ ہے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴: ۱) "اے محمد، یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ"۔ اور روشنی اللہ کی نعمتوں میں سے بڑی نعمت ہے۔ یہاں جس نور کا تذکرہ ہو رہا ہے وہ بہت ہی بڑا نور ہے۔ یہ وہ نور ہے جس کے ذریعہ انسان کی پوری شخصیت منور ہو جاتی ہے۔ یہی تھا تمام رسولوں کا فریضہ ان اقوام میں جن کی طرف انہیں بھیجا گیا اور یہی تھا فریضہ حضرت موسیٰ کا اپنی قوم میں۔ پھر تمام رسولوں نے بھی اللہ کے انعام کا یوں ذکر کیا۔

يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ (۱۴: ۱۰) "وہ تمہیں بلاتا ہے تاکہ تمہارے گناہ بخش دے"۔ لوگوں کو خود بلانا اور ان کی غلطی معاف کرنا ایک بہت بڑی نعمت ہے جو نور کی نعمت کے برابر ہے۔ بلکہ اس کے قریب تر ہے۔ اللہ کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو اللہ کے انعامات کی یوں یاد دہانی فرمائی۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ

مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (١٤ : ٦) "یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا' اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا۔ اس نے تم کو فرعون والوں سے چھڑایا جو تم کو سخت تکلیفیں دیتے تھے' تمہارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ بچا رکھتے تھے۔ اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی"۔ اسی فضا میں رسولوں کے ساتھ اللہ کے وعدے کا ذکر کیا جاتا ہے۔

فَاَوْحٰي اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ (١٣) وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ (١٤) (١٤ : ١٣ - ١٤) "ہم نے ان کی طرف وحی کی کہ ہم ضرور ظالموں کو ہلاک کریں گے اور ان کے بعد یقیناً زمین میں تمہیں بسائیں گے۔ یہ ان لوگوں کے لیے وعید ہے جو مجھ سے ڈرتے ہیں اور میری وعید سے ڈرتے ہیں"۔ یہ بھی اللہ کی بڑی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

پھر کہا گیا کہ اگر تم شکر نعمت بجالاؤ گے تو اللہ کی نعمتوں میں اضافہ ہو گا۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ

(١٤ : ٧) "اور یاد رکھو جب تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفران نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے"۔

وَقَالَ مُوْسٰٓي اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ

(١٤ : ٨) "اور اگر تم کفر کرو اور زمین کے سارے رہنے والے بھی کافر ہو جائیں تو اللہ بے نیاز ہے اور اپنی ذات میں محمود ہے"۔ اس سورہ میں یہ بھی کہا گیا کہ انسان بالعموم اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (١٤ : ٣٤) "اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے"۔

جو لوگ آیات الٰہیہ پر تدبر کرتے ہیں تو ان کی بصیرت تیز ہو جاتی ہے وہ مصائب پر صبر کرتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (١٤ : ٥) "بے شک اس میں نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے شکر گزار کے لیے"۔

اس سورہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات کو صبر اور شکر کے ایک نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ اللہ کے سامنے عاجزی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بہت زاری کے ساتھ دعا کرتے ہیں جبکہ وہ مسجد الحرام کے پاس تعمیر بیت

اللہ کے بعد کھڑے ہیں ۔ اس وقت وہ پیکر حمد و ثنا ہیں اور صبر و شکر کا نمونہ ہیں ۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (۳۵) رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَ مَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۳۶) رَبَّنَا اِنِّيْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ اِلَيْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (۳۷) رَبَّنَا اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَ مَا نُعْلِنُ وَ مَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ (۳۸) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ (۳۹) رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ (۴۰) رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ (۴۱) (۱۴ : ۳۵ تا ۴۱) "یاد کرو وہ وقت جب ابراہیم نے دعا کی تھی کہ "پروردگار ' اس شہر کو امن کا شہر بنا اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا ۔ پروردگار ' ان بتوں نے بہتوں کو گمراہی میں ڈالا ہے ' لہٰذا جو میرے طریقے پر چلے وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقے پر چلے تو وہ یقیناً درگزر کرنے والا مہربان ہے ۔ پروردگار میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں ' اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے ۔ پروردگار ' یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں ' لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے ' شاید کہ یہ شکر گزار بنیں ۔ پروردگار ' تو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اور واقعی اللہ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے ' نہ زمین میں اور نہ آسمان میں ' شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق جیسے بیٹے دیئے ۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا رب ضرور دعا کو سنتا ہے ۔ اے میرے پروردگار مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد سے بھی ' پروردگار ' میری دعا قبول کر ' پرودگار ' مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کر دیجیو جبکہ حساب قائم ہو گا"۔

چونکہ نعمت اور اس کا شکر یا ناشکری اس سورہ کا بنیادی مضمون ہے اس لیے اس میں جابجا ایسی تعبیرات بکثرت آتی ہیں جو اس سورہ کے مضمون اور اس کے مباحث کی فضا سے مطابقت رکھتی ہیں ۔

وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (۱۴ : ۳۷) "ان کو پھلوں کا رزق دے شاید کہ وہ شکر بجالائیں"۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۱۴ : ۵) ”بے شک اس میں نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر کرنے والا اور شکر گزار ہے“۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (۱۴ : ۲۸) ”کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کی وجہ سے اللہ کی نعمت کو بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں جھونک دیا“۔

اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (۱۴ : ٦) ”اللہ کی جو نعمتیں تم پر کی گئی ہیں ان کو یاد کرو“۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ (۱۴ : ۳۹) ”شکر ہے اس خدا کے لیے جس نے بڑھاپے کے باوجود مجھے اسماعیل اور اسحاق عطا کیے“۔

جب انبیاء نے جھٹلانے والوں کے اعتراضات کو رد کیا تو یوں کہا:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (۱۴ : ۱۱) ”لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے“۔ یہاں اللہ کے احسانات کو بیان کیا جاتا ہے کیونکہ اس پوری سورہ میں مضمون اور فضا اللہ کی نعمتوں، احسانات اور ان پر اللہ کے شکر کی ہے یا ناشکری کی۔

یوں اس سورہ میں انداز تعبیر بھی سورہ کے مضامین کی مناسبت سے اختیار کیا گیا ہے اور یہ قرآن مجید کا انداز ہے کہ وہ الفاظ و معانی سورہ کے موضوع اور مضمون کی مناسبت سے لاتا ہے۔

---ooo---

یہ پوری سورہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں حقیقت رسالت، شخصیت رسول، دنیا و آخرت میں اہل حق اور اہل باطل کے درمیان معرکہ آرائی اور پھر حق و باطل کی مثال کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کے ساتھ۔

دوسرے حصے میں انسانوں پر اللہ کے انعامات، ان لوگوں کا انجام جنہوں نے ان انعامات کی تکفیر کی، اور سرکشی اختیار کی۔ اہل ایمان اور ان کی شکر گزاری اور اہل ایمان اور اہل اسلام کے سرخیل حضرت ابراہیم علیہ السلام، کافروں اور ظالموں کا انجام، اور قیامت کے مناظر سب سے خوفناک اور نہایت ہی اچھے مناظر جن میں حرکت اور زندگی بھرپور نظر آتی ہے اور دوسرے مضامین۔ غرض سورہ کا خاتمہ بھی آغاز کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۱۴ : ۵۲) ”یہ ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لیے اور یہ بھیجا گیا ہے اس لیے کہ ان کو اس کے ذریعے خبردار کر دیا جائے اور وہ جان لیں کہ حقیقت میں خدا بس ایک ہی ہے اور جو عقل رکھتے ہیں وہ ہوش میں آ جائیں“۔

اب پہلے سورہ کا حصہ اول۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۱۴ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۲۷

سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْمَ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ
اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۱ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ
وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۝۲ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا
عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ
بَعِيْدٍ ۝۳ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ فَيُضِلُّ
اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۴

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

ا۔ل۔ر۔ اے محمد ' یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ' ان کے رب کی توفیق سے' اس خدا کے راستے پر جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے اور زمین اور آسمانوں کی ساری موجودات کا مالک ہے۔ اور سخت تباہ کن سزا ہے قبول حق سے انکار کرنے والوں کے لیے جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں۔ جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روک رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ راستہ (ان کی خواہشات کے مطابق) ٹیڑھا ہو جائے۔ یہ لوگ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں۔

ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب بھی کوئی رسول بھیجا ہے اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ

وہ انہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔ پھر اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ' ہدایت بخشتا ہے ' وہ بالادست اور حکیم ہے"۔

الر کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ ( ۱۴ : ۱ ) "اے محمد یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے"۔ یہ کتاب الف ' لام اور میم اور ان جیسے دوسرے حروف کی ترکیب سے بنائی گئی ہے۔ یہ تمہاری طرف ہم نے نازل کی ہے 'کسی اور نے تمہاری طرف اسے نہیں اتارا۔ نہ تم نے خود اس کی تخلیق کی ہے۔ اور اسے کیوں اتارا گیا ہے۔

لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ( ۱۴ : ۱ ) "تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لاؤ"۔ تم پوری انسانیت کو ظلمات سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ۔ اوہام و خرافات کی تاریکیاں ' رسوم و تقالید کی تاریکیاں ' ارباب متفرقہ کی بندگی اور کشاکش اور حیرت کی تاریکیاں ' جاہلی اقدار اور پیمانوں اور جاہلی خیالات و تصورات کی تاریکیوں سے تم انسانیت نکالو اور قرآن کی روشنی میں داخل کر دو۔ ایسی روشنی جو فی الحقیقت ان تمام تاریکیوں کو دور کر دے۔ وہ عالم ضمیر کو روشن کر دے اور میدان فکر و نظر میں اجالا برپا کر دے۔ زندگی کی عملی راہوں میں اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور اعلیٰ افکار میں اجالا برپا کر دے۔

اللہ پر ایمان لانا ایک نور ہے جس سے دل روشن ہو جاتا ہے اور جس کا دل روشن ہو جائے اس کی پوری شخصیت اور اس کا بشری ڈھانچہ بھی منور ہو جاتا ہے اور انسانی شخصیت کے دونوں پہلو ' مٹی اور روح اللہ دونوں روشن ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب انسانی شخصیت اس روشنی سے خالی ہو جائے اور جس کے اندر سے یہ چراغ بجھ جائے تو پھر انسان تاریک مٹی کا ایک ڈھیر ہوتا ہے اور خون اور گوشت کی شکل میں ایک کیچڑ ہوتا ہے۔ کیونکہ گوشت اور خون پوری طرح زمین کے مادی عناصر پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اگر یہ نور نہ ہو جو روح اللہ سے پھوٹتا ہے اور اس کے اندر ایمان اپنی شفاف صیقل شدہ صورت میں موجود ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے یہ سیاہ مادہ شفاف اور چمکدار ہو جاتا ہے اور پھر یہ سیاہ کیچڑ ایک شفاف شیشہ ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان باللہ ایک ایسا نور ہے جس کے ساتھ نفس انسانی چمک اٹھتا ہے۔ اس کی روشنی میں انسان اپنی راہ متعین کر سکتا ہے۔ اسے اللہ کی طرف راہ بالکل واضح نظر آتی ہے۔ اس راہ میں نہ دھند ہوتی ہے اور نہ غبار۔ اوہام و خرافات کا غبار ' لالچ اور خواہشات کا غبار اور جب نفس انسانی راہ دیکھ لے اور صاف صاف نظر آنے لگے تو پھر ایسی راہ میں کوئی ٹھوکر اور کوئی اضطراب نہیں ہوتا اور نہ اس میں کوئی تردد ہوتا ہے اور نہ کوئی حیرانگی ہوتی ہے۔

پھر اللہ پر پختہ ایمان ایک ایسا نور ہے جس سے پوری زندگی چمک اٹھتی ہے۔ تمام لوگ اللہ کے مساوی بندے ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان ربط اور رشتہ خدائی رشتہ ہوتا ہے۔ وہ صرف اللہ کی اطاعت اور بندگی کرتے ہیں۔ اب ان میں آقا اور غلام کی تقسیم نہیں ہوتی۔ ان کو اس پوری کائنات کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور وہ اس پوری کائنات سے بھی جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ پوری کائنات ایک ناموس الٰہی اور قانون قدرت کے ساتھ چلتی ہے اس لیے وہ اس پوری کائنات ' اس کے اندر موجود پوری مخلوقات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اس لیے کہ سب کے سب اللہ کے مخلوق ہیں۔

پھر ایمان ایک نور ہے ' انصاف کی روشنی ہے ' آزادی کی روشنی ہے۔ علم و معرفت کی روشنی ہے ' اللہ کے لیے محبت

کی روشنی ہے ۔ اللہ کے عدل ' حکمت اور رحمت پر اعتماد کی روشنی ہے ۔ خواہ مشکلات ہوں یا مسرتیں ہوں یہ ایمان مشکلات میں صبر پر آمادہ کرتا ہے اور مسرتوں میں شکر رب کی تعلیم دیتا ہے اور آزمائش میں حکمت و تجربہ عطا کرتا ہے ۔

صرف اللہ پر ایمان کہ وہی الٰہ اور رب ہے ' یہ ایمان ایک نظام زندگی بھی ہے ۔ فقط عقیدہ ' تصور ہی نہیں ہے جو دل کو روشن کرتا ہے ۔ یہ نظام زندگی صرف اللہ کی بندگی کے اصول پر قائم ہے ۔ جس میں صرف اللہ کی ربوبیت کا عقیدہ ہوتا ہے ۔ اور تمام دوسری ربوبیتوں کا انکار ہوتا ہے ' جس کے اندر برتری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہوتی ہے ۔ وہی حاکم ہوتا ہے اور سب اس کے بندے ہوتے ہیں ۔

اس نظام زندگی میں انسانی فطرت کے ساتھ ہم آہنگی ہے ' اس میں انسان کی ضروری اور لابدی حاجات کا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ ایسی حاجات جو انسان کو سعادت سے ہمکنار کرتی ہیں ۔ اس کو نور اطمینان دیتی ہیں اور اسے خوشی اور مسرت عطا کرتی ہیں ۔ اس نظام میں قرار و ثبات بھی موجود ہے اور جو معاشرے اللہ کے سوا دوسرے انسانوں کی بندگی کرتے ہیں ۔ ان میں جو تغیرات ' انقلابات اور حیرانیاں اور پریشانیاں ہوتی ہیں ان سے اس میں انسان محفوظ ہوتا ہے ۔ اس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا حاکم نہیں ہوتا ۔ سیاست میں حکومت میں ' معاشیات میں اور سوسائٹی کے اجتماعی روابط میں اور رسم و رواج میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہیں ہوتا ۔ اس نظام میں انسانوں کی قوتیں اس کام میں صرف نہیں ہوتیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو غلام بنائیں اور نہ اس نظام میں کوئی شخص کسی طاغوتی قوت کا ظلی ہوتا ہے ۔

اس مختصر جملے لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴ : ۱) "کہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالو" کے پیچھے معانی و مفہومات کے جہاں پوشیدہ ہیں بڑے بڑے حقائق یہاں ہیں اور قلب و نظر کی گہری سوچ کے نتیجے میں وہ نظر آسکتے ہیں ۔ اسلامی نظام زندگی کے قیام کے بعد ہی وہ آفاق نظر آسکتے ہیں ۔ صرف انسانی الفاظ ان وسیع معانی کے بیان کے لیے کافی نہیں ہے ۔

لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ (۱۴ : ۱) "تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکال لاؤ ان کے رب کے حکم سے" ۔ اللہ کے حکم سے اور اذن ہی سے تم یہ کام کر سکتے ہو کیونکہ رسول کا کام تو صرف یہ ہے کہ وہ پیغام پہنچائے ۔ اس کی ڈیوٹی صرف بیان ہے ۔ رہا لوگوں کا تاریکیوں سے روشنی میں آنا تو یہ صرف اللہ کے فضل و کرم اور اس کے حکم اور اذن سے ہو سکتا ہے اور یہ کام اس سنت کے مطابق ہوتا ہے جو اللہ کی مشیت کے مطابق کام کرتی ہے ۔ رسول تو فقط رسول ہوتا ہے ۔

اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (۱۴ : ۱) "اس خدا کے راستے کی طرف جو زبردست اور اپنی ذات میں محمود ہے" ۔ نحو کے اعتبار سے صراط نور کا بدل ہے ' اور اللہ کی راہ اللہ کا طریقہ ہے ۔ اللہ کی سنت ہے ' اس کا وہ ناموس ہے جو اس پوری کائنات پر حکمران ہے ' اس کی راہ اس کی وہ شریعت ہے جو زندگی پر حاوی کرنے کے لیے بھیجی گئی ہے اور ایمان کی روشنی اور نور اسی شریعت کی طرف راہنمائی کرتا ہے ۔ بلکہ یہ نور بذات خود یہ صراط اور شریعت ہے ۔ انسانی نفس کے اندر جو ایمانی نور چمکتا ہے وہی نور اس پوری کائنات کے اندر بھی چمکتا ہے ۔ یہ سنت الٰہیہ ہے ' ناموس

فطرت ہے اور وہی شریعت ہے جو نفس اس نور سے منور ہو وہ ادراک اور تصور میں غلطی کا ارتکاب نہیں کرتا۔ طرز عمل اور طریقہ زندگی میں بھی وہ غلطی نہیں کرتا۔ یہی صراط مستقیم ہے۔ عزیز وحمید کی راہ یہی ہے اور یہ عزیز قوت قاہرہ کا مالک ہے' اور اپنی ذات میں محمود اور پوری کائنات پر قابض ہے۔

یہاں اللہ کی قوت کا اظہار اس لیے کیا گیا ہے کہ کفار سن کر ذرا خائف ہو جائیں اور حمید اس لیے کہا گیا کہ اہل شکر اس کی حمد و ثنا کر کے اس کا شکر ادا کریں۔ اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ وہ زمین و آسمان کا مالک اور حاکم بھی ہے۔ وہ لوگوں کا محتاج نہیں ہے وہ تو اس پوری کائنات کو اپنے قبضہ قدرت میں رکھتا ہے۔

اللّٰهُ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (١٤ : ٢) "اور زمین و آسمان کی ساری موجودات کا مالک ہے"۔ جو شخص اندھیروں سے نکل کر نور میں آگیا اور اس نے راہ ہدایت پالی تو اس کے بارے میں یہاں خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے۔ یہاں ان لوگوں کو دھمکی دی جاتی ہے جو روشنی میں آنے سے انکار کرتے ہیں۔ کافروں کو عذاب شدید سے ڈرایا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے اس نعمت سے استفادہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ نے رسول بھیجا' اسے ایک کتاب دی تاکہ وہ لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں داخل کرے۔ یہ اس قدر عظیم نعمت ہے کہ کوئی انسان اس نعمت عظمیٰ کا شکر ہی ادا نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر کوئی الٹا اس نعمت کی ناشکری کرے تو پھر کہا:

وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ (١٤ : ٢) "اور سخت تباہ کن سزا ہے قبول حق سے انکار کرنے والوں کے لیے"۔ یہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ صفت کیا ہے جس سے اس نعمت کی ناشکری اور کفر ہوتا ہے جو رسول کریم لے کر آئے ہیں۔ وہ صفت یہ ہے۔

الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا

عِوَجًا اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ (١٤ : ٣) "جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں' جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روک رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ راستہ (ان کی خواہشات کے مطابق) ٹیڑھا ہو جائے' یہ لوگ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں"۔ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی محبت ایمان کے تقاضوں کے ساتھ متصادم ہے اور صراط مستقیم پر استقامت کے خلاف ہے اور جب کوئی دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دے تو صورت یہ نہیں رہتی۔ آخرت کو ترجیح دینے سے دنیا میں بھی اعتدال پیدا ہوتا ہے اور دنیا میں خدا کا خوف پیدا ہوتا ہے۔ لہذا آخرت کی محبت اور ترجیح سے ترک دنیا لازم نہیں آتا۔

واقعہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے دل آخرت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کے میدان میں بھی خسارے میں نہیں ہوتے۔ یہ بات ان لوگوں کے ذہن میں آتی ہے جن کی فکر جادۂ اعتدال سے منحرف ہو۔ اسلام میں آخرت کو ترجیح دینے کا تصور بھی دراصل دنیا ہی کی اصلاح کے لیے ہے۔ ایمان باللہ کے تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ فریضہ خلافت ارضی کو بحسن و خوبی سرانجام دیا جائے۔ حق خلافت ارضی میں یہ بھی داخل ہے کہ زمین کی تعمیر و ترقی میں دلچسپی

کی جائے اور اس کے اندر موجود خزانوں سے استفادہ کیا جائے۔ اسلام میں یہ تصور نہیں ہے کہ آخرت کے فائدے کے لیے دنیا کے نظام کو معطل کر دیا جائے بلکہ سچائی، انصاف، راستی اور خدا کی رضامندی کی خاطر زندگی کی تعمیر و ترقی ہی دراصل تمہید ہے، آخرت کی ترقی کے لیے۔ یہ اسلام کی پالیسی ہے کہ دنیا میں بھی حسنہ ہو اور آخرت میں بھی حسنہ۔

پھر وہ لوگ کون ہیں جو دنیا کو آخرت کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نور ایمان کی روشنی میں اپنے مذموم مقاصد تک نہیں پہنچ سکتے، وہ زمین کے قدرتی وسائل پر تب ہی قبضہ کر سکتے ہیں، وہ حرام تب ہی کما سکتے ہیں، وہ لوگوں کا استحصال تب ہی کر سکتے ہیں اور لوگوں کی اجتماعی دولت کو تب ہی لوٹ سکتے ہیں جب وہ نور ایمان کے دائرے سے نکل جائیں اور اللہ کے دین کی طرف ہدایت اور اس پر استقامت سے محروم ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے دنیا پرست لوگوں کو بھی اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور خود بھی اللہ کے راستے پر نہیں چلتے بلکہ وہ اللہ کے دین اور شریعت کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی سعی کرتے ہیں۔ دین سے استقامت اور عدالت کو معیشت سے عدل کو نکالنا چاہتے ہیں۔ جب یہ لوگ اپنے آپ کو اور دوسرے عوام الناس کو اللہ کی راہ سے روک لینے میں، کامیاب ہو جاتے ہیں اور جب وہ اسلام کی عدالت اور استقامت سے دامن چھڑا لیتے ہیں، تب جا کر ایسے لوگ ظلم کر سکتے، سرکشی کر سکتے، دھوکہ دے سکتے، اور لوگوں کو فساد پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح وہ پھر زمین کے وسائل پر قابض ہو جاتے ہیں، حرام کماتے ہیں، ذلیل اور غیر اخلاقی ذرائع سے دولت جمع کرتے ہیں۔ پھر یہ زمین میں سرکشی اور علو فی الارض اختیار کرتے ہیں۔ لوگوں کو غلام بناتے ہیں اور لوگوں کو اس قدر کمزور کر دیتے ہیں کہ ان میں مقابلے یا احتجاج کی سکت بھی نہیں رہتی۔

یہ واقعہ ہے کہ ایمانی نظام زندگی ہی دراصل زندگی، حرمت اور معاشی انصاف کا ضامن ہے اور یہی اس بات کی بھی ضمانت ہے کہ اس میں ان لوگوں کا اثر و رسوخ ختم ہو گا جو وسائل ارضی پر قابض ہونا چاہتے ہیں یا وہ آخرت کے مقابلے میں دنیا پرستی کو رواج دینا چاہتے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (۱۴ : ۴) "اور ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے"۔ یہ انسانوں کے لیے ہر نبی کی نبوت میں ایک بڑی نعمت رہی ہے کہ رسول ان کی زبان ہی کا بھیجا ہے تاکہ وہ لوگوں کو اندھیروں سے نور کی طرف بڑی سہولت سے نکال سکے اور اس بات کی ضرورت بھی تھی کہ وہ اہل لسان ہو تاکہ وہ بیان کرے اور یہ سمجھیں اور مقصد پورا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی ان کی قوم کی زبان میں رسول بنا کر بھیجا گیا۔ اگرچہ آپ پوری انسانیت کے لیے رسول تھے کیونکہ آپ کی قوم کے ذمہ یہ فریضہ عائد کر دیا گیا تھا کہ اب پوری انسانیت تک عربوں کا فرض ہے کہ وہ اس پیغام کو پہنچائیں۔ رسول اللہ کی عمر تو محدود تھی۔ آپ کے ذمہ یہ فریضہ عائد کیا گیا کہ آپ سب سے پہلے جزیرۃ العرب کو جاہلیت سے پاک کر دیں اور اسلام کو وہاں غالب کر دیں تاکہ وہ مرکز اور سرچشمہ ہو اور آپ کی رسالت اور پیغام کو پھر امت کے لوگ دور دراز تک پہنچائیں اور عملاً ایسا ہی ہوا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جزیرۃ العرب میں اسلام کو غالب کر دیا تو اللہ نے آپ کو اس جہاں سے اٹھا لیا لیکن خود آپ نے جیش اسامہ کو جزیرۃ

العرب کے اطراف کے لیے تیار کر کے بھیج دیا تھا۔ یہ لشکر ابھی نکلا نہ تھا کہ حضورؐ وفات پا گئے۔ اس سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جزیرۃ العرب سے باہر دوسرے ممالک تک اپنے دعوتی خطوط ارسال کر دیے تھے۔ یہ خطوط آپ نے اس لیے بھیجے تھے کہ لوگ دیکھ لیں کہ آپ کی رسالت تمام انسانوں کے لیے ہے۔ لیکن اللہ نے رسول اللہ کے لیے صرف یہی فریضہ مقرر کیا تھا اور مختصر عمر انسانی میں ایک انسان صرف یہی کر سکتا ہے کہ آپ جزیرۃ العرب میں عربی زبان میں تبلیغ کا کام کریں اور اس کے بعد پوری دنیا تک تبلیغ رسالت کا کام بعد میں دعوت اسلامی کے حاملین کریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا لہٰذا اس بات میں کوئی تعارض نہیں ہے کہ رسول اللہ کی رسالت پوری انسانیت کے لیے تھی اور خود آپ نے اپنی قومی زبان میں کام کرنا تھا اور اپنی زندگی میں عملاً عربوں ہی میں کام کرنا تھا۔

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱۴ : ۴) "پھر اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے، وہ بالادست اور حکیم ہے"۔ ہر رسول اور نبی آخر الزمان کی رسالت کا فریضہ صرف یہی ہے کہ وہ اپنا پیغام پہنچا دے۔ رہی یہ بات کہ کوئی ہدایت کی راہ لیتا ہے یا نہیں، تو یہ کام تو کسی رسول کی قدرت میں نہیں ہے۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ کسی کو ہدایت دے یا گمراہ کر دے۔ خود رسول کی خواہش بھی اس سلسلے میں ضروری نہیں ہے کہ پوری ہو۔ یہ شان الٰہی ہے۔ اللہ نے اس کے لیے اس کائنات میں ایک سنت وضع کر رکھی ہے۔ یہ سنت اللہ کی مشیت کے مطابق چلتی ہے۔ جو شخص گمراہی کے مقدمات اختیار کرتا ہے اور گمراہی کی راہ لیتا ہے تو وہ گمراہ ہو جاتا ہے اور جو شخص ہدایت کے مقدمات اختیار کرتا ہے اور ہدایت کی راہیں اپناتا ہے تو وہ اہل ہدایت میں سے ہو جاتا ہے۔ یہ سب کام اللہ کی مشیت کے مطابق اور تابع ہوتے ہیں۔ اور انسان کے لیے یہی سنت اللہ نے وضع کی۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱۴ : ۴) "وہ بالادست اور حکیم ہے"۔ وہ اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ جس طرح اس کی مشیت ہو اس کے مطابق لوگوں کی زندگی پھر جائے اور وہ یہ تصرف اپنی حکمت اور اپنی تقدیر سے کرتا ہے۔ اللہ نے تمام معاملات اپنے کنٹرول میں لے رکھے ہیں۔ اس کی مملکت میں واقعات اتفاقاً، بغیر کسی سبب اور بغیر کسی تدبیر کے رونما نہیں ہوتے۔

اس طرح ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اپنی قوم کی زبان میں ارسال کیا تھا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ
الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ
شَكُوْرٍ ۝ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ
اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ

ع ۱۶ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝ۧ وَ اِذْ تَاَذَّنَ
۱۲ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَ لَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝ وَ قَالَ
مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ
حَمِيْدٌ ۝

"ہم اس سے قبل موسیٰؑ کو بھی اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیج چکے ہیں۔ اسے بھی ہم نے حکم دیا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لا اور انہیں تاریخ الہی کے سبق آموز واقعات سنا کر نصیحت کر۔ ان واقعات میں بڑی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔

یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا "اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ اس نے تم کو فرعون والوں سے چھڑایا جو تم کو سخت تکلیفیں دیتے تھے' تمہارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ بچا رکھتے تھے' اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔ اور یاد رکھو' تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفران نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے"۔ اور موسیٰ نے کہا کہ "اگر تم کفر کرو اور زمین کے سارے رہنے والے بھی کافر ہو جائیں تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے"۔

حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو جو حکم دیا گیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو حکم دیا گیا تھا دونوں کے الفاظ ایک ہی ہیں۔ اس سورہ میں یہی انداز کلام اختیار کیا گیا ہے۔ اس فقرے کے بارے میں ابھی ہم مفصل بات کر چکے ہیں' یہی تفسیر یہاں بھی ہے۔ حضرت محمدؐ کے لیے یہ حکم تھا۔

لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴ : ۱) "تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ"۔ اور یہی حکم موسیٰؑ کے لیے ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴ : ۵)
"یہ کہ اپنی قوم کو ظلمات سے نکال کر روشنی میں لاؤ"۔

حضورؐ کو حکم پوری انسانیت کے لیے ہے اور حضرت موسیٰؑ کو حکم صرف ان کی قوم کے لیے تھا۔ لیکن مقصد دونوں کا ایک ہی تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکالو۔

وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ (۱۴ : ۵) "اور انہیں تاریخ الہی کے سبق آموز واقعات سنا کر نصیحت کرو"۔ سب کے سب دن اللہ کے ہیں۔ لیکن یہاں ان تاریخی دنوں سے مقصد ہے جن میں اللہ کے انعامات یا اللہ کا عذاب واضح طور پر نظر آتا ہے تاکہ ان سے انسانیت یا انسانیت کی کوئی جماعت استفادہ کرے اور نصیحت حاصل کرے۔ بعد میں تفصیلات آ رہی ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کو ایام اللہ سے ڈرایا اور اقوام کے تاریخی واقعات' قوم نوح' قوم عاد'

قوم ثمود اور ان کے بعد آنے والی اقوام کے بارے میں یاد دہانی کرائی - یہ ہیں ایام اللہ -

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۱۴ : ۵) "ان واقعات میں بڑی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو" - ان ایام میں بعض آیات ' دلائل اور نشانات اقوام کی بدبختی کے ہیں تو اس سے صبر کی نصیحت حاصل ہوتی ہے اور بعض آیات اللہ کی نعمتوں کی ہوتی ہیں اور ان سے شکر کی نصیحت حاصل ہوتی ہے - جو شخص صبر کرنے والا اور شکر بجا لانے والا ہوتا ہے وہی ان نصیحتوں کا ادراک کر سکتا ہے اور ان کے اندر پائی جانے والی حکمت اور عبرت کو سمجھ سکتا ہے - نیز ان میں اس کے لیے تسلی اور یاد دہانی بھی ہوتی ہے -

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم میں نبوت کے فرائض سرانجام دیتے رہے اور قوم کو نصیحت کرتے رہے -

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰي لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (۱۴ : ۶) "یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا "اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا ہے - اس نے تم کو فرعون والوں سے چھڑایا جو تم کو سخت تکلیفیں دیتے تھے ' تمہارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ بچا رکھتے تھے ' اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی" -

حضرت موسیٰؑ ان کو اللہ کی نعمتیں یاد دلاتے ہیں - یہ نعمت کی اللہ نے ' ان کو سخت عذاب سے نجات دی - یہ عذاب ان کو آل فرعون کی طرف سے دیا جا رہا تھا اور یہ عذاب مسلسل ان پر ڈھایا جا رہا تھا - اس میں کوئی وقفہ یا کوئی چھٹی کا پیریڈ نہ تھا اور اس عذاب کی انتہا یہ تھی کہ وہ ان کے بچوں میں سے لڑکوں کو قتل کر دیتے تھے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے - یہ اس لیے کہ ان کے اندر قوت مدافعت باقی نہ رہے اور مردوں کی کمی کی وجہ سے جنگی اعتبار سے وہ ضعیف ہو جائیں تاکہ ان کو ذلیل کر کے رکھا جا سکے - اللہ نے ان کو غلامی اور ذلت کی اس حالت سے نکالا - چنانچہ یہاں ان کو حضرت موسیٰؑ یاد دلاتے ہیں تاکہ وہ شکر بجا لائیں -

وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (۱۴ : ۶) "اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی" - پہلے تو ان کو نعمت کے ساتھ نہیں بلکہ مصیبت میں آزمایا گیا تاکہ ان کے صبر ' برداشت اور قوت مدافعت اور عزم کو آزمایا جائے کہ وہ کس قدر مخلص ہیں اور کس قدر اللہ کے احکام بجا لانے والے ہیں - صبر کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ کوئی انسان ذلت کو برداشت کرتے کرتے اپنے آپ کو اس کا عادی بنا لے بلکہ صبر یہ ہے کہ انسان مصائب کو برداشت کرے لیکن اس کی استقامت میں کوئی تزلزل نہ آئے - وہ شکست برداشت نہ کرے ' روحانی طور پر ہمت نہ ہارے ' اپنے پروگرام پر چلنے کا عزم پورا رکھتا ہو اور اس کے اندر ظلم اور سرکشی کے مقابلے کے لیے تیاری کا عزم موجود ہو - اگر ایسا نہیں ہے تو صبر نہیں بلکہ خواری اور ذلت کو قبول کرنا ہے اور نجات میں بھی ان کے لیے آزمائش ہے کہ آیا وہ شکر کرتے ہیں یا نہیں - اللہ کی اس نعمت کا اعتراف کرتے ہیں یا نہیں - اور نجات کے بدلے اللہ کی راہ ہدایت کو

اپناتے ہیں یا نہیں۔
حضرت موسیٰ اب مزید بیان کرتے ہیں۔ ایام اللہ کے بیان کے بعد اب ان کو مستقبل کی ہدایات دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اب تمہیں چاہئے کہ صبر اور شکر کو اپنا وطیرہ بنالو اور اگر تم شکر کرو گے تو اس کا نتیجہ اچھا ہو گا اور اگر کفر کرو گے تو اللہ کا عذاب پھر تیار ہو گا۔

وَ اِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّکُمۡ لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ وَ لَئِنۡ کَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِیۡ لَشَدِیۡدٌ

"یاد رکھو' تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفران نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے"۔ (۱۴ : ۷)

یہ ایک عظیم حقیقت ہے' یہ حقیقت کہ شکر نعمت سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے اور کفران نعمت سے انسان اللہ کی شدید پکڑ میں آجاتا ہے۔ جب ہم ذرا اس حقیقت پر غور کرتے ہیں تو پہلی ہی سوچ میں ہمارے دل اس حقیقت پر مطمئن ہو جاتے ہیں کیونکہ ایک تو یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اس نے بہرحال پورا ہو کر رہنا ہے لیکن اگر ہم اس کے اسباب کو بھی معلوم کرنا چاہیں اور ایسے اسباب کی تلاش کریں جنہیں ہم سمجھ سکتے ہیں تو بھی ہمیں کچھ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

شکر نعمت سے معلوم ہوتا ہے کہ شکر کرنے والے کے نفس میں ایک صحیح معیار بیٹھا ہوا ہے۔ اللہ کی نعمت کا فطری تقاضا ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے۔ ہر فطرت سلیم' احسان کا فطری صلہ شکر کو سمجھتی ہے۔ ایک تو یہ سبب ہے' دوسرے یہ کہ جو شخص نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ ہی ان نعمتوں کا متصرف ہے۔ اس طرح یہ شخص سرکشی سے باز رہتا ہے' لوگوں پر اپنے آپ کو برتر نہیں سمجھتا اور اللہ کی نعمتوں کو مخلوق خدا کے اذیت دینے' شر کرنے' معاشرے میں فساد پھیلانے اور خصوصاً گندگی پھیلانے کے لیے استعمال نہیں کرے گا۔

ان امور سے انسان کے نفس کے اندر پاکی آجاتی ہے اور ایسا شخص عمل صالح کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ خدا کی دی ہوئی دولت میں اچھا تصرف کرتا ہے اور اس اچھے تصرف کی وجہ سے اس میں ترقی ہوتی ہے اور برکت آجاتی ہے۔ اس طرح ایسے شخص سے اس کے اردگرد کے لوگ بھی خوش ہوتے ہیں اور پھر اس خوشی کی وجہ سے وہ اس کی اور معاونت کرتے ہیں۔ اس طرح معیشت کی ترقی کے لیے مزید پرامن ماحول فراہم ہوتا ہے اور اس میں ترقی ہوتی ہے۔ اگرچہ ایک مومن کے لیے تو صرف یہی کافی ہے کہ اگر شکر کرو گے تو میں زیادہ دولت دوں گا چاہے وہ دوسرے اسباب کو سمجھ سکے یا نہ سمجھ سکے کیونکہ اللہ کا وعدہ ایک حق ہے اور اس نے بہرحال پورا ہونا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کفر دو طرح کا ہوتا ہے ایک تو اس طرح کہ نعمت کا شکر ادا نہ کیا جائے' دوسرے اس طرح کہ دولت مند شخص اس بات کا انکار کر دے کہ ان نعمتوں کا بخشنے والا اللہ ہے۔ وہ ان نعمتوں کو اپنے علم' اپنی مہارت اور اپنی ذاتی جدوجہد کا ثمرہ قرار دے۔ گویا وہ یہ سمجھتا ہے کہ علم' مہارت' جدوجہد کی قوت یہ اللہ کی نعمتیں نہیں ہیں۔ یہ اس کی خود پیدا کردہ ہیں۔ اور بھی کفران نعمت یوں ہوتا ہے کہ ان کی وجہ سے یہ شخص سرکشی اختیار کرتا ہے' تکبر کرتا ہے' اپنے آپ کو لوگوں کے مقابلے میں بڑی چیز سمجھتا ہے اور ان کے ذریعہ فساد پھیلاتا ہے اور عیش و عشرت کرتا ہے۔ یہ سب امور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری میں آتے ہیں۔ عذاب شدید کی بھی پھر مختلف شکلیں ہیں کبھی تو یہ یوں آتا ہے کہ اللہ کی نعمت کسی

سے سلب کر لی جاتی ہے اور وہ مشخص طور پر ان سے محروم ہو جاتا ہے یا انسانی شعور پر نعمتوں کا جو اثر ہوتا ہے وہ مٹ جاتا ہے۔ بعض اوقات کسی نعمت کو انسان کے لیے مصیبت بنا دیا جاتا ہے اور صاحب نعمت پر اس کی وجہ مصائب آ جاتے ہیں۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں وہ اس کے ساتھ حسد کرتے ہیں اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ اس دنیا میں اس پر ایک عرصے کے بعد عذاب آ جاتا ہے اور کبھی اس عذاب کو آخرت تک ملتوی کر دیا جاتا ہے۔ لیکن عذاب ملتا ضرور ہے کیونکہ کفران نعمت کا جرم بغیر سزا کے نہیں رہ سکتا۔

اگر کوئی شکر کرتا ہے تو اللہ کو اس کا کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اور اگر کوئی کفران نعمت کرتا ہے تو اللہ کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اللہ تو بذات خود غنی ہے اور دونوں جہانوں میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ وہ بذات خود محمود ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ صرف لوگوں کے شکر اور حمد کے ساتھ محمود ہو سکتا ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ

"اور موسیٰ نے کہا کہ اگر تم کفر کرو اور زمین کے سارے رہنے والے بھی کافر ہو جائیں تو اللہ بے نیاز ہے اور اپنی ذات میں محمود ہے"۔ (۱۴ : ۸) اگر تم شکر کرو گے تو اس سے تمہاری زندگی سدھرے گی۔ لوگوں کے نفوس اللہ کی طرف متوجہ ہوں گے اور پاکیزہ ہوں گے اور شکر کی وجہ سے وہ سدھر جائیں گے۔ وہ مطمئن ہو جائیں گے کہ اب یہ نعمت ان شاء اللہ جاری رہے گی اور اس کے بگڑنے اور ختم ہونے کا خطرہ نہ رہے گا۔ نیز بطور شکر نعمت جو خرچ کیا جائے گا اس پر کوئی نفس پریشان نہ ہو گا بلکہ خوش ہو گا۔ کیونکہ منعم موجود ہے اور بطور شکر جو حصہ جائے گا اس سے بقیہ حصہ پاک ہو گا اور اجر مزید ملے گا۔

حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے سامنے وعظ و نصیحت جاری رکھے ہوئے ہیں لیکن وہ پس منظر میں چلے گئے تاکہ منظر پر ایک عظیم معرکہ دکھایا جا سکے۔ جو تمام انبیاء کی امتوں اور ان کے بالمقابل جاہلیتوں میں برپا ہو گا۔ ان جاہلیتوں نے اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کی تھی۔ قرآن مجید کا یہ انوکھا اسلوب ہے کہ وہ کلام کا انداز یکلخت بدل کر اسے زندہ منظر میں بدل دیتا ہے۔ یہ منظر زندہ اور متحرک ہوتا ہے۔ اس میں افراد چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور ان کے تاثرات بھی صاف نظر آتے ہیں۔ زمان و مکان کو لپیٹ کر اب ایک عظیم منظر۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۭ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝ قَالَتْ رُسُلُهُمْ

اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یَدْعُوْكُمْ لِیَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ یُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝۱۰ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِیَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۱

"کیا تمہیں ان قوموں کے حالات نہیں پہنچے جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں؟ قوم نوح" عاد' ثمود اور ان کے بعد آنے والی بہت سی قومیں جن کا شمار اللہ ہی کو معلوم ہے؟ ان کے رسول جب ان کے پاس صاف صاف باتیں اور کھلی کھلی نشانیاں لیے ہوئے آئے تو انہوں نے اپنے منہ میں ہاتھ دبالیے اور کہا کہ "جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کی طرف سے ہم سخت خلجان آمیز شک میں پڑے ہوئے ہیں"۔ ان کے رسولوں نے کہا "کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔ وہ تمہیں بلا رہا ہے تاکہ تمہارے قصور معاف کرے اور تم کو ایک مدت مقرر تک مہلت دے۔ انہوں نے جواب دیا "تم کچھ نہیں ہو مگر ویسے ہی انسان جیسے ہم ہیں۔ تم ہمیں ان ہستیوں کی بندگی سے روکنا چاہتے ہو' جن کی بندگی ہمارے باپ دادا سے ہوتی چلی آرہی ہے۔ اچھا تو لاؤ کوئی صریح سند"۔ ان کے رسولوں نے ان سے کہا "واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر تم ہی جیسے انسان۔ لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے' نوازتا ہے۔ اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ تمہیں کوئی سند لا دیں۔ سند تو اللہ ہی کے اذن سے ہو سکتی ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے"۔

یہ نصیحت حضرت موسیٰؑ کے قول میں سے ہے لیکن سیاق کلام میں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر چھوڑ دیا گیا تاکہ منظر پر رسولوں اور ان کی دعوت کا حصہ لایا جائے۔ یعنی تمام رسولوں کا اپنی اپنی بالمقابل جاہلیتوں کے ساتھ مکان و زمان کے اختلاف کے باوجود جو رویہ رہا' اسے یکجا کر کے اس منظر میں لایا گیا۔ موسیٰ علیہ السلام گویا اس عظیم قصے کو پیش کرنے والے Compairor تھے۔ انہوں نے اس قصے کے بڑے کرداروں کو آمنے سامنے کر دیا۔ اب وہ خود منظر پر شریک گفتگو ہیں۔ قصص کو پیش کرنے کا یہ ایک مخصوص اسلوب ہے جو قرآن نے اختیار کیا ہے کہ وہ ایک حکایتی اور بیانیہ انداز کلام کو زندہ کرداروں کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سب رسول اور ان کی امم موجود ہیں اور تمام رسولوں کا مقابلہ جاہلیتوں کے ساتھ ہے۔ اقوام اور رسولوں کے درمیان زمان و مکان کے فاصلے مٹا دیئے جاتے ہیں اور واقعات کو زمان و مکان سے علیحدہ کر کے پیش کر دیا جاتا ہے' جب کہ زمان و مکان کے پردوں کے پیچھے وجود کی حقیقت ہے۔

اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَ الَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ (۱۴ : ۹) "کیا تمہیں ان قوموں کے حالات نہیں پہنچے جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں؟ قوم نوحؑ عاد' ثمود اور ان کے بعد آنے والی بہت سی قومیں جن کا شمار اللہ ہی کو معلوم ہے؟" یہ بہت سی اقوام ہیں - ان میں وہ لوگ بھی ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہوا - یعنی قوم موسیٰؑ اور اقوام ثمود کے درمیان - یہاں سیاق کلام کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان اقوام کی تفصیلات دی جائیں کیونکہ رسول بھی دراصل ایک زمرہ ہیں اور جن لوگوں کو تبلیغ کی جارہی تھی وہ بھی ایک زمرہ کے لوگ ہیں -

جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَیْدِیَهُمْ فِیْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَ قَالُوْٓا اِنَّا کَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِیْ شَکٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ (۱۴ : ۹) "تو انہوں نے اپنے منہ میں ہاتھ دبا لیے اور کہا کہ "جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کی طرف سے ہم سخت خلجان آمیز شک میں پڑے ہوئے ہیں"۔

فَرَدُّوْٓا اَیْدِیَهُمْ (۱۴ : ۹) کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح کوئی شخص اپنی آواز کو بلند کرنے کے لیے منہ کے سامنے ہاتھ رکھتا ہے تاکہ آواز بلند ہو اور دور تک سنی جاسکے - اس وقت لوگ اپنے منہ کے سامنے ہتھیلی ہلاتے ہیں تاکہ ہتھیلی کے آگے پیچھے ہونے سے آواز زیادہ بلند ہو - اس طرح آواز میں زیادہ موجیں پیدا ہوں اور اس تموج کی وجہ سے آواز دور تک جائے - یہاں ان کی اس حرکت کو اس لیے پیش کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ پرزور انداز میں تکذیب کرتے تھے - ببانگ دہل اور توہین آمیز طریقے سے نہایت ہی کرخت اور تہذیب و آداب سے خالی طریقوں سے انہوں نے پیغمبروں کی بات کا انکار کیا -

رسولوں کی دعوت کا بنیادی نکتہ ہی یہ ہوتا تھا کہ اللہ ایک ہے اور وہی وحدہ اللہ و رب ہے اور اپنے بندوں میں سے کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں ہے - اس حقیقت میں شک کرنا جس کا ادراک ہر فطرت سلیمہ کرتی ہے اور اس کائنات کے اندر پھیلے ہوئے شواہد بھی ظاہرو باہر ہیں تو ایسے حالات میں عقیدۂ توحید میں شک کرنا نہایت ہی مکروہ اور قبیح حرکت ہے - رسولوں نے اس شک کو بے حد مکروہ سمجھا کہ زمین و آسمان کا یہ نظام شاہد عادل ہے -

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۱۴ : ۱۰) "ان کے رسولوں نے کہا "کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے" - کیا اللہ کے بارے میں شک ہے حالانکہ زمین و آسمان کا یہ نظام بآواز بلند پکار رہا ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے یہ نظام بنایا ہے اور اسے چلایا ہے - رسولوں نے یہ بات اس لیے کی کہ زمین و آسمان نہایت ہی واضح اور کھلے دلائل و نشانات ہیں - ان کی طرف صرف اشارہ ہی کافی ہے - ان کے نظام کو ہر گمراہ دیکھ کر راہ ہدایت پر آسکتا ہے - رسولوں نے زمین و آسمان کی طرف فقط اشارے ہی کو کافی سمجھا - اس کے بعد رسولوں نے بندوں پر اللہ کی نعمتوں کو گنوانا شروع کر دیا کہ اللہ نے ان کو ایمان کی دعوت دی اور ایک

وقت تک مہلت بھی دی تاکہ وہ دعوت ہدایت پر سوچ سکیں۔

يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ (۱۴ : ۱۰) "وہ تمہیں بلا رہا ہے تاکہ تمہارے قصور معاف کرے"۔ حقیقی دعوت تو ایمان کی دعوت ہے جس کے نتیجے میں مغفرت نصیب ہوتی ہے۔ لیکن یہاں دعوت و مغفرت کو ایک ساتھ لایا گیا ہے تاکہ اللہ کا احسان اچھی طرح واضح ہو کہ ایمان لاتے ہی مغفرت ہو جاتی ہے اور پھر ان لوگوں کا رویہ اور سخت انکار مزید قابل تعجب اور قابل مذمت ہو جاتا ہے کہ مغفرت کی طرف دعوت دی جا رہی ہے اور یہ لوگ ہیں کہ منہ میں ہاتھ ڈال کر انکار کرتے ہیں۔

وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى (۱۴ : ۱۰) "اور تم کو ایک مدت مقررہ تک مہلت دے"۔ اللہ تعالیٰ ایمان و مغفرت کی دعوت دینے کے ساتھ ہی ان سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ فوراً قبول کریں اور نہ ان کی تکذیب کے بعد فوراً ان کو ہلاک کرتا ہے 'بلکہ مہلت دیتا ہے۔ یہ مہلت اس دنیا میں بھی ایک وقت تک ہوتی ہے یا اور قیامت تک بھی بڑھ سکتی ہے۔ اس عرصے میں تم اچھی طرح اس دعوت پر غور کر سکتے ہو اور اللہ کی عزت اور رسولوں کے بیان پر بھی غور کر سکتے ہو۔ یہ اللہ کی بہت بڑی رحمت اور مہربانی ہے اور یہ بھی اللہ کے انعامات میں سے ایک نعمت ہے۔ تو کیا ایسے انعامات الٰہیہ کا وہی جواب ہے جو تم دے رہے ہو۔ لیکن یہ لوگ بہت ہی جاہل ہیں اور وہ اسی پرانے جاہلانہ اعتراض کا سہارا لیتے ہیں۔

قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (۱۴ : ۱۰) "انہوں نے جواب دیا "تم کچھ نہیں ہو مگر ویسے ہی انسان جیسے ہم ہیں۔ تم ہمیں ان ہستیوں کی بندگی سے روکنا چاہتے ہو جن کی بندگی باپ دادا سے ہوتی چلی آ رہی ہے"۔ اللہ نے انسانوں میں سے ایک شخص کو رسول بنا کر بھیجا۔ یہ تو انسانوں کے لیے اعزاز تھا لیکن وہ نہ صرف یہ کہ اسے سمجھتے نہیں بلکہ اس کا انکار کرتے ہیں اور اس میں نہ صرف شک کرتے ہیں 'بلکہ وہ الٹا رسولوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے خلاف یہ سازش کی ہے کہ ہمیں اس راہ سے ہٹا دیں جس پر ہمارے باپ دادا چلے آئے ہیں۔ لیکن سوچتے نہیں کہ رسول کیوں نہیں اس راہ سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ تمام بت پرست ہمیشہ عقلی جمود میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان کے پاس یہی دلیل ہوتی ہے کہ ہمارے آباؤاجداد یہی کام کرتے رہے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ آباء کے مذہب کی حیثیت کیا ہے؟ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو ان الہوں کی حیثیت کیا ہے؟ بجائے اس کے کہ وہ کوئی عقل و فکر سے کام لیں اور اس جدید معقول دعوت کو قبول کر لیں یہ لوگ الٹا پیغمبروں سے ثبوت مانگتے ہیں۔

فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۱۴ : ۱۰) "اچھا تو لاؤ کوئی صریح سند"۔ رسول اپنی بشریت کا انکار نہیں بلکہ اقرار کرتے ہیں بلکہ وہ لوگوں کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ اللہ نے ان پر احسان کیا کہ انہیں بار رسالت کے اٹھانے کے اہل بنایا۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰي مَنْ يَّشَآءُ مِنْ

عِبَادِهٖ ( ١٤ : ١١ ) "ان کے رسولوں نے ان سے کہا "واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر تم ہی جیسے انسان لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے 'نوازتا ہے"۔ یہاں سیاق کلام میں اللہ کے احسان کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس پوری سورہ میں فضا اللہ کے احسانات کی ہے۔ ہر جگہ اللہ کے انعامات کا ذکر ہے۔ چنانچہ یہاں بھی لکھا گیا کہ اللہ کے احسانات ہیں جس پر ہو جائیں۔ یہ احسان صرف رسولوں کی ذات پر ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ پوری بشریت پر احسان ہے کہ اس میں سے بعض افراد کی یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ دوسروں کی ہدایت اور راہنمائی کا کام کریں۔ یہ ڈیوٹی ہے کیا؟ یہ کہ عالم بالا سے ان کا رابطہ ہو اور پھر لوگوں تک پیغام پہنچائیں اور پھر پوری انسانیت پر احسان ہے کہ یہ رسول لوگوں کی فطرت کو جگائیں اور اس کے اوپر سے زنگ دور کر دیں تاکہ فطرت انسانی میں وہ قوتیں تازہ ہو جائیں جو ہدایت کو قبول کریں اور جمود کی موت سے نکل کر قبولیت حق کی زندگی میں داخل ہوں۔ پھر انسانیت پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ یہ رسول لوگوں کو مختلف الہوں کی بندگی اور غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی بندگی میں داخل کریں اور ان کی عزت نفس ' اور ان کی قوتوں کو لوگوں کی غلامی میں صرف ہونے سے بچائیں۔ کیونکہ غلامی میں جب ایک انسان اپنے جیسے انسان کے سامنے جھکتا ہے تو اس کی عزت نفس ختم ہو جاتی ہے۔ انسانی قوت اپنے جیسے انسانوں کو الٰہ بنا کر بکھر جاتی ہے۔

رہی یہ بات کہ رسول کوئی واضح معجزہ پیش کریں یا کسی فوق الفطرت قوت کا مظاہرہ کریں تو تمام رسولوں نے اپنی اپنی قوم سے یہی کہا کہ معجزات کا صدور تو اللہ کے ہاتھ میں ہے تاکہ عوام الناس کے تاریک ذہنوں میں یہ بات بیٹھ جائے کہ ذات الٰہی اور ذات بشر میں فرق کیا ہے تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں توحید کا ایسا صاف تصور بیٹھ جائے کہ اللہ کی ذات اور صفات میں کوئی شریک نہ ہو۔ یہ وہ نکتہ ہے جس پر پہنچ کر تمام بت پرستوں نے راستہ گم کر دیا اور عیسائیوں نے بھی توحید کا راستہ اس وقت گم کر دیا جب انہوں نے اپنے دین کو یونانی ' رومی ' مصری اور ہندی فلسفوں کے ساتھ مکس کر لیا۔ عیسائیوں کی گمراہی کا آغاز ہی اس عقیدے سے ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر خوارق عادت معجزات کا صدور ہوا۔ چنانچہ خود عیسائیوں نے بعد میں ان کو اللہ مان لیا۔

وَ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ عَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

الْمُؤْمِنُوْنَ ( ١٤ : ١١ ) "اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ تمہیں کوئی سند لا دیں۔ سند تو اللہ ہی کے اذن سے ہو سکتی ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے"۔ رسولوں کا کہنا یہ تھا کہ ہم اللہ کی قوت کے سوا کسی اور قوت پر کبھی کوئی بھروسہ نہیں کرتے اور یہ ان کا دائمی اصول ہے۔ کیونکہ اہل ایمان کا بھروسہ صرف اللہ ہی پر ہوتا ہے۔ ایک مومن کا دل صرف اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے ' اور وہ اس کے اوپر بھروسہ کرتا ہے۔

رسولوں کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی طرف سے تمام زیادتیوں کا مقابلہ ایمان سے کرتے ہیں۔ اور ان کی اذیتوں کا مقابلہ ثابت قدمی سے کرتے ہیں۔ رسول سوالیہ انداز میں ان جاہلوں سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں۔

۲ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ۭ وَلَنَصْبِرَنَّ
عَلٰي مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ؀ ع ۶
۱۴

"اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جب کہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی ہے؟ جو اذیتیں تم لوگ ہمیں دے رہے ہیں ان پر ہم صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے والوں کا بھروسہ اللہ ہی پر ہونا چاہیے"۔

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا (۱۴ : ۱۲) "اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جب کہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی ہے؟" یہ اس شخص کی بات ہے جسے اپنے موقف اور اپنے طریقہ کار پر پختہ یقین ہو اور وہ اپنے منہاج پر مطمئن ہو۔ اس کا دامن اپنے حقیقی ولی اور ناصر کے اعتماد سے بھرا ہوا ہو' اور وہ یقین رکھتا کہ جو ذات ہدایت دیتی ہے وہ اس کی معین و مددگار ہوگی۔ اگر ایک راہ رو صحیح راہ پر جا رہا ہو تو اسے کیا پرواہ ہے کہ وہ منزل تک پہنچتا ہے یا نہیں۔ اصل فکر تو اس بات کی ہونا چاہئے کہ راہ رو جس راہ پر سفر کر رہا ہے وہ راہ دعوت ہے یا نہیں۔

جو شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ دست قدرت اس کی راہنمائی کر رہا ہے اور اپنے قدم بقدم چلا رہا ہے' تو وہ ایک ایسا شخص ہے جس کا شعور اللہ کے وجود اور اس کی قدرت قاہرہ کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایسے شخص کا دل اللہ تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ جس شخص کو یہ شعور حاصل ہو وہ اپنی راہ پر چلنے میں پھر کوئی تردد نہیں کرتا اگرچہ راستے میں مشکلات ہوں' اور اگرچہ راستے میں بڑی سے بڑی طاغوتی قوتیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں انبیاء علیہم السلام کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ یہ یقین رکھیں کہ اللہ ان کا ہادی و ناصر ہے اور وہ طاغوتی قوتوں کو خاطر نہیں نہ لا کر اپنی راہ پر بے دھڑک چلیں۔ اور اللہ پر بھروسہ کریں اور طاغوتی قوتوں کی دھمکیوں کو خاطر میں نہ لا کر آگے ہی بڑھیں۔

اس عظیم حقیقت تک صرف وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جو کسی موجود اور مستحکم مقتدر اعلیٰ طاغوتی نظام کے خلاف عملاً اسلامی تحریک کو لے کر اٹھتے ہیں۔ صرف ایسے عملی لوگوں کے دل میں یہ شعور پیدا ہوتا ہے کہ اللہ خود ان کی راہنمائی کر رہا ہے۔ وہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں اور ان کے دل ایمان و یقین سے بھر جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے دل محسوس کرتے ہیں کہ ان کے لیے روشنی کی کھڑکیاں کھل گئی ہیں اور ان کھڑکیوں اور روشن دانوں سے ان پر روشنی آتی ہے' جو ایمان کی روشنی ہوتی ہے۔ اس رابطے کے ذریعہ ایمان کی تازہ ہوا کے جھونکے بھی آتے رہتے ہیں اور ایسے دل اللہ کے ساتھ نہایت انس اور قرب محسوس کرتے ہیں۔ تحریک اسلامی کے جن کارکنوں کے دلوں میں یہ شعور پیدا ہوتا ہے وہ پھر اس زمین پر پائے جانے والی مقتدر طاغوتی قوتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ ان کو نہ کوئی دھوکہ دے سکتا ہے اور نہ کوئی دھمکا سکتا ہے۔ ایسے کارکن پھر ایسی طاغوتی قوت کی قوت اور اقتدار کو نہایت ہی حقارت سے دیکھتے ہیں اس لیے کہ ان کے قلوب اللہ تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں اور ان حقیر لوگوں کی سازشوں اور مظالم کو پھر وہ خاطر ہی میں نہیں لاتے۔

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰي مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا

"اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جب کہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی ہے؟" اور جو اذیتیں تم لوگ ہمیں دے رہے ہو ان پر ہم صبر کریں گے"۔ ہم صبر سے کام لیں گے اور انشاء اللہ ہمارے پاؤں ہرگز نہ ڈگمگائیں گے' ہم کمزوری نہ دکھائیں گے اور ہمارے قدم متزلزل نہ ہوں گے اور وھن ہمارے قریب نہ آئے گا اور نہ ہم الٹے پاؤں پھریں گے۔ ہم اس راہ سے ہرگز ادھر ادھر نہ ہوں گے۔ نہ جدوجہد میں کمی کریں گے اور نہ ہی ہم شک میں گرفتار ہوں گے۔ اور یہ اس لیے کہ

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (۱۴ : ۱۲) "اور بھروسہ کرنے والے' اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں"۔ اب سرکش طاغوتی قوتیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں' یہ قوتیں' مجادلہ اور مباحثہ ترک کر دیتی ہیں' غور و فکر چھوڑ دیتی ہیں کیونکہ یہ محسوس کرتی ہیں کہ یہ لوگ لوہے کے چنے ہیں۔ ان کو نہیں چبایا جاسکتا۔ نظریات کے مقابلے میں ان قوتوں کو شکست ہو جاتی ہے۔ اب یہ لوگ تشدد کے اوچھے ہتھیار لے کر سامنے آتے ہیں کیونکہ طاغوتی سرکش قوتوں کے پاس اس کے سوا ہوتا کیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ

"آخرکار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ "یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہو گا ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے"۔

اس مقام پر اسلام اور جاہلیت کے معرکے کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ دراصل کوئی جاہلی نظام اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ اسلام کا کوئی مستقل اقتدار اعلیٰ ہو' اور وہ جاہلیت کے انتداب سے باہر ہو۔ نہ جاہلیت اس بات کو برداشت کرتی ہے کہ اس کے مستحکم نظام سے باہر کوئی اسلامی نظام ہو' اگرچہ اسلام کی یہ مقتدر اعلیٰ قوت جاہلیت کے ساتھ پرامن بقائے باہمی کے اصول پر چلنے کے لیے راضی ہو۔ اس لیے کہ جاہلیت کو پتہ ہے کہ اسلام ایک مستقل متحرک سوسائٹی کی شکل اختیار کرتا ہے جس کی اپنی قیادت ہوتی ہے' جس کا اپنا دائرہ دوستاں ہوتا ہے' جبکہ یہی وہ بات ہے جسے کوئی نظام جاہلیت کبھی گوارا نہیں کرتا۔ چنانچہ یہاں جاہلیت رسولان کرام سے فقط یہ مطالبہ نہیں کرتی کہ وہ اپنی دعوتی سرگرمیاں بند کر دیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ تم ہماری ملت اور ہماری پارٹی میں واپس آجاؤ' اور ہماری جاہلی سوسائٹی میں مدغم ہو جاؤ' بلکہ ہماری کان میں پگھل جاؤ' اس طرح کہ تمہارا کوئی مستقل وجود نہ رہے۔ یہی تو وہ بات ہے جسے اسلامی نظام کا مزاج قبول ہی نہیں کرتا اور نہ اس بات سے رسول ۔۔۔۔۔ دستبردار ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ انکار کر دیتے ہیں اس لیے کہ ایک مسلم جو جاہلی سوسائٹی سے کٹ کر باہر آتا ہے کس طرح وہ دوبارہ اس سوسائٹی میں گھل مل سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر جاہلی سوسائٹی' ایسے عناصر سے مرکب ہوتی ہے جو اپنے طبعی مزاج کے اعتبار سے کسی اسلامی عنصر کو قبول ہی نہیں کرتی الا یہ کہ کوئی مسلمان اپنی پوری تحریکی اور عملی قوتیں اس جاہلی سوسائٹی کے استحکام ہی کے لیے خرچ کر رہا ہو' اور جاہلیت کی بنیادیں مضبوط کر رہا ہو۔ بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی لاحق ہے کہ وہ جاہلیت میں گھس کر اور جاہلیت کے نظام کے اندر پگھل کر اور اس کا کل پرزہ بن کر اسلام کی خدمت کر سکتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ دراصل

اسلامی سوسائٹی کے عضویاتی عناصر ترکیبی اور اس کے مزاج ہی سے واقف نہیں ہیں اور نہ جاہلی معاشرے کے مزاج سے یہ لوگ واقف ہیں۔ ہر معاشرہ دراصل اپنے اندر صرف انہی اجزاء کو قبول کرتا ہے جو اس معاشرے کے لیے کام کر رہے ہوں۔ اس کے مقام اور نظام کو مستحکم کر رہے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ رسولان کرام اعلانیہ انکار کر دیتے ہیں کہ ہم اب تمہاری ملت اور سوسائٹی میں واپس نہیں آ سکتے۔ اس مقام پر اللہ کی قوت قاہرہ پھر جاہلیت پر ضرب لگاتی ہے۔ یہ ایسی ضرب ہوتی ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی قوت نہیں ٹھہر سکتی کیونکہ یہ ضرب نہایت ہی عظیم قوت کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس ضرب کو پھر بڑے بڑے سرکش اور ڈکٹیٹر بھی نہیں سہہ سکتے۔

فَاَوْحٰۤی اِلَیْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَ خَافَ وَعِیْدِ ﴿۱۴﴾

”تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ”ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے۔ یہ انعام ہے اس کا جو میرے حضور جواب دہی کا خوف رکھتا ہو اور میری وعید سے ڈرتا ہو“۔

یہ بات جان لینا چاہئے کہ اللہ کی عظیم قوت تحریکی معاملات میں تب مداخلت کرتی ہے جب رسول اپنی قوم سے مکمل علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کا تصور یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے انہیں اس جاہلیت سے نجات دے دی ہے، اس لیے اب وہ دوبارہ اس نظام جاہلیت میں واپس نہیں جا سکتے۔ جب تک وہ اپنی امتیازی شان پر اصرار نہیں کرتے۔ جب تک وہ اپنے دینی نظریہ پر مصر نہیں ہوتے اور اپنی قیادت کی ماتحتی میں اپنی الگ سوسائٹی کی تشکیل نہیں کرتے۔ اور جب تک یہ تحریک اور قیادت نظریاتی بنیادوں پر اپنی قوم کو منقسم نہیں کر دیتی۔ غرض جب تک یہ صورت نہیں ہوتی کہ ایک قوم دو ملتوں کی شکل میں منقسم ہو جائے، جن کا نظریہ، جن کا طریق زندگی، جن کی سوسائٹی اور جن کی قیادت علیحدہ ہو جائے تو اس وقت تک اللہ کی عظیم قوت مداخلت نہیں کرتی۔ جب اسلامی تحریک یہ پوزیشن اختیار کر لیتی ہے تو پھر اللہ کی عظیم قوت جاہلیت پر فیصلہ کن ضرب لگاتی ہے۔ اب پھر کیا ہوتا ہے، وہ تمام طاغوتی قوتیں پاش پاش کر دی جاتی ہیں جو تحریک اسلامی کے لیے خطرہ ہوتی ہیں اور پھر ایسے لوگوں کو اللہ کی عظیم قوت زمین میں مستحکم کر کے بٹھا دیتی ہے اور تب جا کر اللہ کا وہ وعدہ سچا ہوتا ہے جو رسولوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور ان کے بعد داعیان حق کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ لیکن اگر تحریک اسلامی جاہلی سوسائٹی کا حصہ ہو۔ اس کے اندر پگھل چکی ہو، اور جاہلی سوسائٹی کے طور طریقوں کے اندر، جاہلی تنظیم کے اندر کام کر رہی ہو، اس سے علیحدہ، ممتاز اور جدا تحریک یا نظام نہ رکھتی ہو اور اس کی اپنی قیادت نہ ہو۔ اس وقت تک یہ مداخلت نہیں ہوتی اور نہ اللہ کی نصرت آتی ہے۔

فَاَوْحٰۤی اِلَیْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِیْنَ (۱۴:۱۳) ”تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے“۔ یہ نون تاکید اور عظمت کے لیے ہے۔ یہ دونوں معانی اس سخت موقعہ پر بہت اہمیت رکھتے ہیں، یعنی ہم ان جابر مشرکوں، ظالموں اور سرکشوں کو ہلاک کر دیں گے، ان کی ذاتی خرابیوں کی وجہ سے اور

اس سچائی کی خاطر جو عوام کے لیے بھیجی گئی اور اس خوف و ہراس کی وجہ سے جو انہوں نے عوام کے اندر پیدا کر دیا تھا۔

وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ (۱۴:۱۴) "اور اس کے بعد تمہیں زمین پر آباد کریں گے"۔ یہ کام کسی طرف داری یا مزاج کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی سنت جاریہ ہے اور اللہ کے ہاں فیصلے عدل کے مطابق ہوتے ہیں۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ (۱۴:۱۴) "یہ انعام ہے اس کا جو میرے حضور جواب دہی کا خوف رکھتا ہو اور میری وعید سے ڈرتا ہو"۔ یعنی ایک مقتدر کو ہٹا کر کسی اور کو اقتدار دینا' اور زمین کی خلافت دینا' اس لیے ہوتا ہے کہ سرکشوں کو ہٹا کر ان کی جگہ خدا کا خوف رکھنے والی قیادت لائی جائے۔ پھر وہ دست درازی نہ کرے' زمین میں غرور اور تکبر نہ کرے' جباری و قہاری سے حکمرانی نہ کرے' اللہ کے حدود سے ڈرے اور اللہ کے سامنے جوابدہ ہو اور فساد فی الارض سے بچے' زمین میں ظلم نہ کرے' اس لیے کہ اسے یہ اقتدار اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ اس کے لیے اہل سمجھی گئی ہے۔

جب اہل حق اور اہل باطل کے درمیان مکمل جدائی ہو جاتی ہے تو پھر سرکشوں اور ڈکٹیٹروں کی اس حقیر دنیاوی قوت کے مقابلے میں اللہ جبار و قہار اور مکمل گھیر لینے والے کی عظیم قوت سامنے آتی ہے۔ کیونکہ رسولوں کی تبلیغ کی مہم ختم ہو جاتی ہے' حق و باطل ایک دوسرے کے بالمقابل صف آراء ہو جاتے ہیں اور مومن جھوٹوں سے جدا ہو جاتے ہیں۔ اب صورت حالات یہ ہوتی ہے کہ ایک طرف ایک کیمپ میں دنیا کے سرکشوں کی قوت سامنے آتی ہے اور رسول اور داعیان حق دوسری طرف کھڑے ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ اللہ کی عظیم قوت ہوتی ہے۔ دونوں فتح و نصرت کے لیے دعا کرتے ہیں' اور انجام یوں ہوتا ہے۔

وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴿۱۵﴾ مِّن وَرَائِهِ جَهَنَّمُ وَيُسْقَىٰ مِن مَّاءٍ صَدِيدٍ ﴿۱۶﴾ يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۖ وَمِن وَرَائِهِ عَذَابٌ غَلِيظٌ ﴿۱۷﴾

"انہوں نے فیصلہ چاہا تھا (تو یوں ان کا فیصلہ ہوا) اور ہر جبار دشمن حق نے منہ کی کھائی' پھر اس کے بعد آگے اس کے لیے جہنم ہے۔ وہاں اسے کچ لہو کا سا پانی پینے کو دیا جائے گا۔ جسے وہ زبردستی حلق سے اتارنے کی کوشش کرے گا اور مشکل ہی سے اتار سکے گا۔ موت ہر طرف سے اس پر چھائی رہے گی مگر وہ مرنے نہ پائے گا اور آگے ایک سخت عذاب اس کی جان کا لاگو رہے گا"۔

یہ ایک عجیب منظر ہے' اس میں ہر سرکش ڈکٹیٹر تباہ حال ہوتا ہے' اس دنیا کے میدان جنگ میں یہ شکست کھاتا ہے'

لیکن یہ منظر اسے کھڑا کر کے ایک دوسرا تخیلاتی منظر اسکرین پر لاتا ہے۔اب یہ آخرت میں جہنم کے اندر ہے' اس جہنم میں یہ شدید پیاسا ہے اور اس کو انسانی زخموں سے بہنے والا سیال مادہ پلایا جا رہا ہے' یہ اسے نہیں پینا چاہتا مگر اسے یہ مشروب بجبر پلایا جاتا ہے۔یہ اس کے حلق سے نہیں اتر رہا کیونکہ یہ تو تلخ اور بدمزہ ہے۔گندہ اور مکروہ مشروب۔اس ڈکٹیٹر کی طرف سے اظہار کراہیت اور تکالیف الفاظ کی اسکرین پر صاف و شفاف نظر آتے ہیں۔صورت یہ ہے کہ ہر طرف سے اس پر آنے والا عذاب اس قدر شدید ہے کہ شاید ابھی مرجائے مگر اسے مرنے کی تو اجازت ہی نہیں ہے۔شدید عذاب پر عذاب اس پر آرہا ہے' اسی لیے تو نہیں مرتا۔

یہ ایک عجیب منظر ہے۔اس میں ایک شکست خوردہ جبار اور ڈکٹیٹر کی تصویر کشی کی گئی ہے اور اس تصویر کے پس منظر میں اس کا اخروی خوفناک انجام دکھایا گیا ہے اور اس پس منظر کی تخیلاتی تصویر میں لفظ "غلیظ" کا رنگ بھرا گیا ہے۔کیونکہ دنیا میں' اپنے دور اقتدار میں یہ ریاستی قوت کو داعیان حق کے خلاف اسی شدت (غلیظ) سے استعمال کرتا تھا حالانکہ ان کی دعوت یقیناً' اصلاح اور بھلائی کے لیے تھی۔

سرکشوں کے اس انجام کے پس منظر میں اب کفار کی تصویر کشی کے لیے ایک تمثیل آتی ہے جو مصور انداز میں ہے۔یہ تصویر آرٹ کا بہترین نمونہ ہے اور یہ اس جاری منظر سے پہلے آتی ہے جس میں بتایا جا رہا ہے کہ حق کو جھٹلانے والوں کو اللہ نیست و نابود کر دیتا ہے اور اس دنیا کو جدید لوگوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے جبکہ اس سے قبل اس زمین کے مناظر میں سے ان سرکشوں کی شکست کا منظر دکھایا جا چکا ہے۔کفار کے اعمال کی یہ تصویر ایک دوسرے پس منظر میں دکھائی جاتی ہے جس طرح کسی منظر کے درمیان میں تخیل آتا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿١٨﴾

"جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اڑا دیا ہو۔وہ اپنے کیے کا کچھ بھی پھل نہ پا سکیں گے۔یہی پرلے درجے کی گم گشتگی ہے"۔

یہ منظر کہ سخت طوفانی ہوا کے دن راکھ اڑ رہی ہے' پیش آتا رہتا ہے اور ہر کسی کے ذہن میں ہے۔یہاں اس منظر سے قرآن کریم یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ کوئی چیز کس طرح مجسم طور پر ضائع ہو جاتی ہے اور اس کا مالک اس کے یوں ضائع ہونے کو کسی طرح نہیں روک سکتا اور نہ ایسی ضائع شدہ چیز سے کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔اس طوفانی منظر میں اس مفہوم کو مجسم کر کے پیش کیا جاتا ہے اور یہ منظر انسانی شعور کو بہت زیادہ متاثر کرتا ہے' ضیاع اعمال کی تعبیر اگر مجرد ذہنی اور فلسفیانہ انداز میں کی گئی ہوتی تو اس کا اس قدر اثر ہرگز نہ ہوتا۔اس سے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ یہ اعمال پوری طرح اکارت گئے۔

یہ منظر کفار کے اعمال کی بساط لپیٹ کر رکھ دیتا ہے جو اعمال ایمان کی مضبوط بنیاد پر قائم نہیں ہوتے اور جو اپنے حقیقی اسباب کے ساتھ مضبوط رسی سے باندھے ہوئے نہیں اور جن کا باعث اور سبب تعلق باللہ نہیں ہوتا۔ وہ اسی طرح اڑ جاتے ہیں جس طرح سخت آندھی میں راکھ اڑ جاتی ہے اور ایسے اعمال نہ مضبوطی سے قائم ہو سکتے اور نہ منظم ہو سکتے ہیں' کیونکہ اصل بات عمل نہیں ہوتا بلکہ وہ داعیہ ہوتا ہے جس کی اساس پر عمل کا ظہور ہوتا ہے اس لیے کہ عمل ایک آلاتی حرکت ہے' جس طرح مشین حرکت کرتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عمل کے پیچھے محرک ہو اور اس عمل کا کوئی متعین مقصد ہو۔

اس منظر میں ایک گہری معنوی حقیقت اور ظاہری تصور کے درمیان مکمل مطابقت ہے اور یہ منظر اس مفہوم کو نہایت موثر' اشاراتی اور دلچسپ اسلوب میں ظاہر کرتا ہے اور پھر جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ اس مفہوم پر فٹ آتا ہے۔

ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ (۱۴:۱۸) "یہی پرلے درجے کی گم گشتگی ہے"۔ یہ نتیجہ جس قدر تاریک ہے وہ راکھ کی اڑان کی تاریکی کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے' کافر خود اپنے اعمال کے غبار میں گم گشتہ راہ نظر آتا ہے۔

پھر ایک دوسری جھلکی جو اگلی آیت میں آرہی ہے' وہ بھی اس منظر کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس میں سیاق کلام میں اہل قریش کو یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ اقوام سابقہ کے مکذبین والا انجام تمہارے انتظار میں ہے۔ اگر تم درست نہ ہوئے تو اللہ تمہیں مٹا کر کسی دوسری قوم کو میدان میں اتار دے گا۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿۱۹﴾ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ﴿۲۰﴾

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے آسمان و زمین کی تخلیق کو حق پر قائم کیا ہے؟ وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے اور ایک نئی خلقت تمہاری جگہ لے آئے۔ ایسا کرنا اس پر کچھ بھی دشوار نہیں ہے"۔

ایمان اور کفر کے موضوع سے اور رسولوں اور جاہلیتوں کے مقابلے کے مضمون سے اب بات زمین و آسمان کے مناظر کی طرف آجاتی ہے۔ قرآن کے اسلوب کے مطابق اس انداز میں روئے سخن کا پھر جانا ایک طبیعی امر ہے اور انسانی شعور میں بھی یہ تبدیلی یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ اسلامی نظام حیات اور قرآنی اسلوب ایک ایمانی اور خدائی اسلوب ہے اس لیے کہ فطرت انسانی اور روح کائنات کے درمیان ایک خاص زبان کے ذریعہ پیغامات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ انسانی فطرت' خلوت کائنات کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتی ہے' انسان جونہی اس کائنات کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ اس سے اثرات اور پیغامات وصول کرنا شروع کر دیتا ہے۔

وہ لوگ جو اس کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر بھی ان کی فطرت' فطرت کائنات کے اشارات اور پیغامات اخذ نہیں کرتی' ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کی فطرت کی مشین بگڑ گئی ہے اور اس مشین کا ریسیور خراب ہو گیا ہے' ان کے

باطنی حواس خراب ہو گئے ہیں۔اس طرح جس طرح آنکھ اندھی ہو جاتی ہے ' کان بہرے ہو جاتے ہیں ' زبان گونگی ہو جاتی ہے ' پرزے موجود ہیں مگر کام نہیں کرتے۔ایسے افراد جن کی فطرت کے اہم پرزے خراب ہو گئے ہوں وہ اس دنیا کی قیادت کے بہرحال لائق نہیں رہتے۔وہ تمام لوگ اس کیٹگری میں آتے ہیں جن کی سوچ پر مادیت چھا گئی ہے اگرچہ وہ اپنے آپ کو سائنس دان کہتے ہیں اور اپنے اوپر دانشوری کا غلط اطلاق کرتے ہوں۔اس لیے کہ علم و دانش انسانی فطرت کو معطل نہیں کرتے۔اور انسان کو روح کائنات سے کاٹتے نہیں بلکہ جوڑتے ہیں۔ایسے ہی لوگوں کو قرآن اندھا ' گونگا اور بہرہ کہتا ہے اور انسانی زندگی کی قیادت اگر اندھوں کے ہاتھ میں ہو تو وہ کبھی درست نہیں ہو سکتی۔

زمین و آسمان کی تخلیق میں عظیم قدرت اور مضبوط نظم کے اشارات ہیں۔سچائی اور حق نہایت مضبوط ہے۔اپنے مفہوم میں بھی اور لفظ "حق" کے تلفظ میں بھی قوت ہے۔یہ حق چٹان کی طرح ٹھوس نظر آتا ہے جس طرح طوفانی ہوا میں اڑنے والی باطل کی راکھ نظر آتی ہے۔جو دور تک صحراؤں میں اڑتی نظر آتی ہے اور ناپید ہو جاتی ہے۔

تحریک اسلامی کے معاندین کو اس فضا میں سخت دھمکی دی جاتی ہے۔

اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ ( ۱۴ : ۱۹ ) "وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے اور ایک نئی خلقت تمہاری جگہ لے آئے"۔اور جو ذات زمین و آسمان پیدا کر سکتی ہے وہ اس بات پر قدرت رکھتی ہے کہ انسانوں کے مقابلے میں کوئی دوسری ہی مخلوق لے آئے۔یا کسی ایک قوم کو زمین کی قیادت سے ہٹا کر کسی دوسری قوم کو لے آئے۔اقوام کا منصہ شہود سے یوں غائب ہوتے چلے جانے کے معانی اس منظر کے ساتھ پوری طرح متفق ہیں جس میں کفار کے اعمال راکھ کی طرح آندھی میں دوڑتے نظر آتے ہیں اور نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں۔

وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ ( ۱۴ : ۲۰ ) "ایسا کرنا اس اللہ پر کچھ بھی دشوار نہیں ہے" اور اس پر زمین و آسمان کی تخلیق شاہد ہے۔پھر انسانی تاریخ میں اقوام جس طرح مٹتی رہی ہیں اور ایک کا زوال اور دوسری کا عروج سامنے آتا رہا ہے۔یہ بھی اس پر گواہ ہے۔جس طرح ایک طوفان آسانی سے راکھ کو اڑا دیتا ہے ' یہ کام اس سے بھی اللہ کے لیے آسان ہے۔حقیقت یہ ہے کہ کیا ہی اعجاز ہے ' قرآن کریم کا جس میں مناظر اور تصاویر اور معانی ہم آہنگ ہیں اور کلام نہایت ہی متناسب ہے۔الفاظ ' معانی اور مناظر کے اعتبار سے۔

اب ہم فنی تصویر ' خوبصورت طرز ادا اور متناسب اسلوب اظہار کے ایک دوسرے افق کے سامنے آ جاتے ہیں۔ابھی کچھ دیر پہلے تو ہماری آنکھ جباروں اور ڈکٹیٹروں کی بربادی کا منظر دیکھ رہی تھی۔اس دنیا ہی میں ہر ڈکٹیٹر ذلیل ہو کر رہا۔اس کا منظر اسکرین پر تھا کہ اس کے پیچھے ایک خیال بھی منظر پر آ گیا جس میں قیامت میں اس کا حشر دکھایا گیا تھا۔حالانکہ وہ ابھی دنیا ہی میں ذلیل ہو رہا تھا۔اب ہمارے سامنے ان ڈکٹیٹروں کا حشر میدان حشر میں نظر آ رہا ہے۔ان کا یہ منظر اب انسانیت کی عظیم کہانی کے مناظر کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے آ رہا ہے۔یہ شاید آخری منظر ہے۔لیکن یہ منظر قیامت کے نہایت ہی عجیب اور دلچسپ مناظر میں سے ایک ہے ' جو تاثرات لوز حرکات سے بھرپور ہے۔اور جس کے اندر گمراہوں اور گمراہ کرنے والے بااثر لوگوں اور شیطان کے درمیان بھرپور مکالمے ہیں۔ذرا قرآن کے الفاظ میں دیکھئے :

وَبَرَزُوا لِلّٰهِ جَمِيعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوٓا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ
تَبَعًا فَهَلْ أَنتُم مُّغْنُونَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِن شَيْءٍ ۚ قَالُوا لَوْ هَدٰىنَا ۲
اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ۖ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ أَجَزِعْنَآ أَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِن مَّحِيصٍ ﴿٢١﴾ ع ۹
وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدتُّكُمْ ۱۵
فَأَخْلَفْتُكُمْ ۖ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُم مِّن سُلْطٰنٍ إِلَّآ أَن دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ
لِي ۖ فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوٓا أَنفُسَكُم ۖ مَّآ أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ أَنتُم بِمُصْرِخِيَّ ۖ
إِنِّي كَفَرْتُ بِمَآ أَشْرَكْتُمُونِ مِن قَبْلُ ۗ إِنَّ الظّٰلِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢٢﴾

"اور یہ لوگ جب اکٹھے اللہ کے سامنے بے نقاب ہوں گے تو اس وقت ان میں سے جو دنیا میں کمزور تھے' وہ ان لوگوں سے جو بڑے بنے ہوئے تھے' کہیں گے "دنیا میں ہم تمہارے تابع تھے' اب کیا تم اللہ کے عذاب سے ہم کو بچانے کے لیے بھی کچھ کر سکتے ہو؟" وہ جواب دیں گے "اگر اللہ نے ہمیں نجات کی کوئی راہ دکھائی ہوتی تو ہم ضرور تمہیں دکھا دیتے۔ اب تو یکساں ہے خواہ ہم جزع و فزع کریں یا صبر' بہرحال ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں"۔ اور جب فیصلہ چکا دیا جائے گا تو شیطان کہے گا "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کیے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کیے ان میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا۔ میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں' میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تم کو دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ اب مجھے ملامت نہ کرو' اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری۔ اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا' میں اس سے بری الذمہ ہوں' ایسے ظالموں کے لیے تو دردناک سزا یقینی ہے"۔

دعوت اسلامی اور داعیان حق کی یہ داستان' اور جھٹلانے والوں اور ڈکٹیٹروں کی یہ کہانی اب اس دنیا کے اسٹیج سے آخرت کے اسٹیج پر منتقل ہو گئی ہے اور نہایت ہی دلچسپ منظر ہے۔

وَبَرَزُوا لِلّٰهِ جَمِيعًا (۱۴ : ۲۱) "اور یہ لوگ جب اکٹھے اللہ کے سامنے بے نقاب ہوں گے"۔ یہ سرکش ڈکٹیٹر بھی کھڑے ہیں۔ اللہ کے سامنے اور ان کے کمزور کردار والے متبعین بھی کھڑے ہیں جنہوں نے ذلت اور کمزوری کا کردار پسند کر لیا تھا۔ شیطان بھی ایک طرف کھڑا ہے۔ دوسری جانب وہ لوگ بھی کھڑے ہیں جو رسولوں پر ایمان لائے تھے اور نیک کام کرتے تھے۔ یہ سب اب ایک میدان قیامت میں ہیں' کھلے میدان میں۔ اللہ کے لیے تو یہ پہلے بھی ظاہر و باہر تھے لیکن آج وہ خود اپنے احساس و شعور میں اپنے آپ کو ننگا اور بے حجاب محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ

میدان حشر میں کوئی پردہ اور اوٹ نہیں ہے - یہ میدان بھرا ہوا ہے ' پردہ اٹھتا ہے اور مکالمہ شروع ہوتا ہے -

فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ( ١٤ : ٢١ ) "اس وقت ان میں سے جو دنیا میں کمزور تھے ' وہ ان لوگوں سے جو بڑے بنے ہوئے تھے 'کہیں گے " دنیا میں ہم تمہارے تابع تھے 'اب کیا تم اللہ کے عذاب سے ہم کو بچانے کے لیے بھی کچھ کر سکتے ہو؟" بودے کردار کے کمزور لوگ بہرحال کمزور ہوتے ہیں - یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس اعلیٰ انسانی دولت سے دستبردار ہو جاتے ہیں جو اللہ نے ہر انسان کو دی ہے - وہ آزادی کی دولت ہے ' آزادی رائے ہے ' آزادی دین اور نظریہ اور حریت عمل ہے - ان لوگوں نے اپنی مرضی سے اپنی آزادی کو ترک کر کے غلامی اختیار کر لی ہے اور سرکشوں اور ڈکٹیٹروں کے غلام بن گئے ہیں - یہ غیراللہ کے بندے اور غلام بن گئے ہیں اور اللہ کی غلامی کی بجائے انہوں نے انسانوں کی غلامی اختیار کر لی ہے 'لیکن اسلام میں ضعیفی کوئی معقول عذر نہیں ہے بلکہ ضعیفی ایک جرم ہے ' اللہ کسی کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی کا غلام بن جائے وہ تو انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ باعزت زندگی اختیار کرو ' میری عزت کرو ' میری پناہ میں آ جاؤ - اللہ نے ہر انسان کو آزاد اور مکرم بنایا ہے اور اسے یہ اجازت نہیں ہے کہ اپنی آزادی کو بیچ دے 'یا کسی بڑی سے بڑی مادی قوت کے سامنے سپرانداز ہو جائے چاہے وہ بہت بڑی قوت کیوں نہ ہو - کسی بھی قوت کو اللہ یہ حق نہیں دیتا کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا غلام بنا کے رکھے - اسلام میں ہر انسان کی آزادی اور عزت کا احترام ہے - دنیا کی بڑی سے بڑی مادی قوت بھی صرف انسانی جان اور جسم کا تعلق ختم کر سکتی ہے - تشدد اور اذیت دے سکتی ہے لیکن کسی کی آزادی سلب نہیں کر سکتی - انسانی ضمیر' انسانی روح اور انسانی عقل پر کوئی ڈکٹیٹر حکومت نہیں کر سکتا ' نہ عقل ' روح اور ضمیر کو کوئی قید کر سکتا ہے ' ضمیر اور روح ' اور عقل اور حریت سے ایک انسان خود دستبردار ہوا کرتا ہے - پھر وہ ذلیل ہو کر مستضعفین میں داخل ہو جاتا ہے -

اپنے عقائد 'نظریات ' افکار اور طرز عمل میں کسی ضعیف سے ضعیف آدمی کو کوئی انسان سرکشوں اور ڈکٹیٹروں کے تابع نہیں بنا سکتا - کوئی شخص بھی کسی ضعیف سے ضعیف آدمی کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ کسی سرکش اور ڈکٹیٹر کا دین قبول کرے 'کیونکہ اللہ خالق و رازق موجود ہے جو سب کا کفیل و ذمہ دار ہے - صرف ضعیف لوگ خود اپنی خوشی سے یہ کام کرتے ہیں ' یہ خود ضعیف بن گئے ' ان کی قوت اور کسی سرکش اور ڈکٹیٹر کی قوت برابر ہے - جاہ و مرتبہ اور مال و منال کے اعتبار سے یہ مستضعفین ڈکٹیٹر کے برابر ہوتے ہیں - کسی ڈکٹیٹر کا مرتبہ اور منصب کسی کو ضعیف نہیں بنا سکتا بلکہ یہ ذہنی طور پر بودے کردار کے لوگ ہوتے ہیں ' اپنے ایمان اور روح کے اعتبار سے یہ کمزور لوگ ہوتے ہیں ' بے عزت اور آبرو باختہ لوگ ہوتے ہیں اور اپنی آزادی اور عزت کو معمولی مفادات کے لیے بیچ دینے والے لوگ ہوتے ہیں جو جھکتے ہیں حالانکہ عزت و آبرو اور آزادی انسان کا نہایت قیمتی اثاثہ ہوتا ہے -

ہم دیکھتے ہیں کہ ان بودے لوگوں کی ایک بھیڑ ہے اور سرکش اور ڈکٹیٹر چند ایک ہیں - آخر یہ بھیڑ کیوں چند لوگوں کی غلامی اختیار کرتی ہے ' دراصل ان عوام میں ہمت نہیں ہوتی ' یہ روحانی اعتبار سے شکست خوردہ ہوتے ہیں - ان کے اندر حمیت نہیں ہوتی ' عزت نفس نہیں ہوتی اور یہ روحانی اور داخلی طور پر ان ڈکٹیٹروں کے سامنے شکست

کھائے ہوئے ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی ڈکٹیٹر جمہور عوام کو صرف ان کی مرضی ہی سے ذلیل کرتا ہے۔ اگر عوام اٹھ کھڑے ہوں تو ان کے سامنے کوئی ڈکٹیٹر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہ صورت حال خود عوام کے کمزور ارادے کی وجہ سے ہے۔

کسی انسان پر ذلت تب ہی طاری ہوتی ہے' جب اس کے اندر ذلیل ہونے کی صلاحیت ہو' ڈکٹیٹر ہمیشہ عوام کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اب ذرا کمزوروں کی ذہنیت کو دیکھو کہ قیامت کے دن وہ کس انداز سے پیش آتا ہے' ان کی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت بودے کردار کے مالک تھے اور ہیں۔

انَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ (۱٤ : ۲۱) "دنیا میں ہم تمہارے تابع تھے' اب کیا تم اللہ کے عذاب سے ہم کو بچانے کے لیے بھی کچھ کر سکتے ہو؟" یہ تمہاری تابع داری ہی ہمیں اس انجام تک لے آئی ہے جو بہت ہی المناک انجام ہے۔ یا ان کا مقصد فقط یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کا عذاب تو دیکھ لیا ہے' اب یہ ان مستکبرین کی سرزنش کرنا چاہتے ہیں کہ تمہاری قیادت اور راہنمائی یہ رنگ لاتی ہے' اب آگے بڑھو اس عذاب کے لیے۔ بہرحال ان کا مطلب جو بھی ہو' ہر حال میں ان کی ذلت پر بھی دلالت کرتا ہے اور منکرین کا جواب۔

قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ

(۱٤ : ۲۱) "وہ جواب دیں گے' اگر اللہ نے ہمیں نجات کی کوئی راہ دکھائی ہوتی تو ہم ضرور تمہیں دکھا دیتے۔ اب تو یکساں ہے خواہ ہم جزع و فزع کریں یا صبر' بہرحال ہمارے لیے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے"۔

یہ بادل ناخواستہ ایک دو ٹوک جواب ہے: "اگر اللہ نے ہمیں نجات کی کوئی راہ دکھائی ہوتی تو ہم ضرور تمہیں دکھا دیتے"۔ اب ہمیں کیوں ملامت کرتے ہو' ہماری راہ بھی ایک ہے اور انجام بھی ایک ہے' آخر ہم کب راہ نجات پر چلے کہ تم کو گمراہ کر دیا۔ اگر ہمیں ہدایت نصیب ہوتی تو تم بھی ہمارے ساتھ راہ ہدایت پر ہوتے' جس طرح ہماری گمراہی نے تمہیں گمراہ کیا۔ اب قیامت میں یہ لوگ اپنی ہدایت اور ضلالت کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اب تو یہ اللہ کی کبریائی کو تسلیم کرتے ہیں اور اللہ پر ایمان لاتے ہیں حالانکہ دنیا میں یہ ان ضعفاء پر اس طرح دست درازیاں کرتے تھے کہ گویا ان سرکشوں سے کوئی پوچھنے والا جبار و قہار ہے ہی نہیں۔ اب یہاں وہ ہدایت و ضلالت کو اللہ کی طرف منسوب کر کے اس کی ذمہ داری سے بچنا چاہتے ہیں' حالانکہ اللہ نے تو ان کو یہ حکم نہ دیا تھا کہ تم گمراہ ہو جاؤ؟

انَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ "اللہ لوگوں کو فحاشی کا حکم نہیں دیتا"۔ لیکن درپردہ یہ ان کمزور فطرت لوگوں کو ملامت بھی کرتے ہیں' ان کا مطلب یہ ہے کہ اب جزع و فزع سے فائدہ نہیں' نہ صبر کرنے سے فائدہ ہے۔ عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے' صبر سے یا جزع و فزع سے یہ تو ٹلنے کا نہیں۔ اب توبہ کا دروازہ بند ہے۔ اگر یہ کھلا ہوتا تو گمراہ لوگ فریاد کر کے ہدایت پر آ سکتے تھے' اگر دنیا میں کوئی سختی ہوتی اور تم صبر کرتے تو بھی اللہ کی رحمت کی امید تھی۔ اب تو مہلت ختم

ہے اور عذاب سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

سَوَآءٌ عَلَیْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ (۱۴ : ۲۱) "اب تو یکساں ہے خواہ ہم جزع فزع کریں یا صبر' بہرحال ہمارے لیے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے"۔ اب تو آخری فیصلہ ہو چکا ہے' بات ہی ختم ہے' سوال و جواب ہو چکا ہے' اب اسٹیج پر ایک تعجب انگیز کردار آتا ہے۔ شیطان نمودار ہوتا ہے' جو گمراہی کا داعی اور سرکشی کا حدی خواں ہے۔ یہ اسٹیج پر زاہدوں کے جبے میں آتا ہے۔ کاہنوں کی طرح نمودار ہوتا ہے' اور دونوں فریقوں پر اپنے شیطانی غرور کا اظہار کرتا ہے اور ان کو ایسا چرکہ لگاتا ہے کہ یہ زبانی زخم شاید عذاب جہنم سے بھی کڑوا ہے۔

وَقَالَ الشَّیْطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِیَّ اِنِّیْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۱۴ : ۲۲) "اور شیطان کہے گا" حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کیے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کیے ان میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا۔ میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں' میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تم کو دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ اب مجھے ملامت نہ کرو' اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری۔ اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا میں اس سے بری الذمہ ہوں' ایسے ظالموں کے لیے تو دردناک سزا یقینی ہے"۔

خدا کی پناہ' حقیقت یہ ہے کہ شیطان درحقیقت شیطان ہے۔ اس منظر میں یہ مکمل فارم میں ہے جس طرح متکبرین ڈکٹیٹر اور مستضعفین بودے کردار کے لوگ اپنی صحیح فارم میں ہیں۔

یہ وہی شیطان ہے جو سینوں کے اندر وسوسہ اندازیاں کیا کرتا تھا' لوگوں کو بدکرداریوں اور گناہوں کے لیے دھوکے دیتا تھا' کفر کو لوگوں کے لیے مزین بناتا تھا۔ دعوت اسلامی کے سننے سے لوگوں کو روکتا تھا' آج وہ انہیں نہایت ہی نیش زنی اور طعنہ زنی اور دردناک مزاح سے کہتا ہے کہ تمہاری اپنی غلطی ہے۔ اب یہ بھی اس کے بیان کردہ حقائق کا کوئی جواب نہیں دے سکتے کیونکہ وہ جو کچھ کہتا ہے اس کے مطابق تو آخری فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب تو وہ سچی بات کہتا ہے لیکن بعد از وقت۔

اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ (۱۴ : ۲۲) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کیے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کیے ان میں سے کوئی پورا نہ کیا"۔ اس کے بعد شیطان ایک نیا طعنہ دے کر انہیں چرکا لگاتا ہے کہ کیوں تم نے میری دعوت پر لبیک کہا' مجھے تم پر کوئی اقتدار تو حاصل نہ تھا۔ صرف یہ بات تھی کہ تم لوگوں نے اپنی شخصیت کو بھلا دیا ہے میرے اور تمہارے درمیان جو دشمنی تھی اس کو

نظرانداز کر دیا۔ اور تم نے میری غلط دعوت کو قبول کر لیا۔ اور انبیاء کی سچی دعوت کو ترک کر دیا۔

وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ (۱۴ : ۲۲) "میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں، میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تم کو دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا"۔ اس کے بعد وہ انہیں مزید شرمندہ کرتا ہے اور کہتا ہے مجھے ملامت نہ کرو بلکہ تم خود قابل سرزنش ہو کہ تم نے میری اطاعت کی۔

فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۱۴ : ۲۲) "اب مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو"۔ اب وہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور ان سے دستکش ہو جاتا ہے، حالانکہ خود اس نے ان کے ساتھ وعدے کیے تھے اور ان کو امیدیں دلائی تھیں، اور ان کے دل میں وسوسے ڈالے تھے کہ تمہارا کچھ بھی نہ بگڑے گا۔ اب جبکہ وہ فریاد کر رہے ہیں تو ان کی کوئی مدد نہیں کر رہا ہے۔ اور اگر وہ ان سے فریاد کرے تو وہ بھی کوئی مدد اس شیطان کی نہیں کر سکتے۔

مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ (۱۴ : ۲۲) "یہاں نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں، نہ تم میری"۔ اب تو ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی تعلق اور کوئی دوستی نہیں ہے۔

اب وہ اس بات سے اپنی براءت کا اعلان کرتا ہے کہ تم نے مجھے اللہ کا شریک بنایا۔ صاف صاف انکار کرتا ہے کہ میں نے تو ایسا نہیں کہا۔

اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ (۱۴ : ۲۲) "اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا میں اس سے بری الذمہ ہوں"۔ شیطان اپنی تقریر ایک ایسی بات پر ختم کرتا ہے جو اس کے دوستوں کے لیے سخت حوصلہ شکن ہے۔

اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۴ : ۲۲) "ایسے ظالموں کے لیے تو دردناک سزا یقینی ہے"۔ یہ دیکھو شیطان کا کردار! یہی تو ہے جو ان کو گمراہی کی طرف بلا رہا تھا اور وہ اس کے کہنے پر گمراہ ہو گئے تھے۔ ان کو رسول خدا کی طرف بلا رہے تھے اور ان لوگوں نے رسولان کی ایک نہ مانی۔ انکار کر دیا۔

قبل اس کے کہ اس منظر پر پردہ گر جائے دوسری طرف سے ایک اہل ایمان کا گروپ نمودار ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آج قیامت کے دن سرخرو ہو گئے ہیں۔ ان کی نجات کا فیصلہ ہو گیا ہے۔

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۭ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

"بخلاف اس کے جو لوگ دنیا میں ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں وہ ایسے باغوں میں داخل کیے

جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہاں وہ اپنے رب کے اذن سے ہمیشہ رہیں گے' اور وہاں ان کا استقبال سلامتی کی مبارکباد سے ہو گا"۔اب پردہ گرتا ہے ...... کیا ہی خوبصورت منظر ہے۔ دعوت اسلامی اور داعیوں اور جھٹلانے والوں اور سرکش ڈکٹیٹروں کی یہ کیا ہی خوبصورت کہانی ہے۔

ذرا پیچھے اس کہانی کے تمام مناظر پر دوبارہ نگاہ ڈالیں اور اس فضا کو ذہن میں رکھیں۔پہلے منظر میں تحریک اسلامی اور جاہلیت کا مقابلہ اس کرۂ ارض پر دکھایا گیا۔رسولان کرام کا گروہ سرکشوں کے مقابلے میں کھڑا تھا۔

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (١٥) مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ (١٦) يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ (١٧) (١٤:١٥ تا ١٧) "انہوں نے فیصلہ چاہا تھا (تو یوں ان کا فیصلہ ہوا) اور ہر جبار دشمن حق نے منہ کی کھائی' پھر اس کے بعد آگے اس کے لیے جہنم ہے۔وہاں اسے کچ لہو کا سا پانی پینے کو دیا جائے گا جسے وہ زبردستی حلق سے اتارنے کی کوشش کرے گا اور مشکل ہی سے اتار سکے گا۔موت ہر طرف سے اس پر چھائی رہے گی مگر وہ مرنے نہ پائے گا اور آگے ایک سخت عذاب اس کی جان کا لاگو رہے گا"۔

پھر آخرت کے اسٹیج پر بھی ہم نے ابھی ابھی وہ انوکھا منظر دیکھ لیا ہے۔یہ سرکش ڈکٹیٹروں' جابر بنے ہوئے لوگوں اور خود شیطان کے عجیب مکالمے پر مشتمل تھا۔اس بہترین قصے کی فضا میں اور نیک لوگوں کے اچھے انجام اور برے لوگوں کے برے انجام کے ان مناظر کے بعد اب اللہ تعالیٰ اچھی باتوں اور صحیح نظریہ حیات اور بری باتوں اور برے فلسفوں کی مثال دیتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں نیک و بد اور طیب و خبیث کی کشمکش انسان کی پوری زندگی میں جاری رہتی ہے۔گویا ایک قصے کے خاتمے اور پردہ گر جانے کے بعد اب اس پوری کہانی پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ
اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِىْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ
وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ
كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۣاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾ يُثَبِّتُ اللّٰهُ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ ۴
الظّٰلِمِيْنَ ۙۗ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾ ع ۲
۱۶

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہیں ' ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے - یہ مثالیں اللہ اس لیے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں - اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بدذات درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے ' اس کے لیے کوئی استحکام نہیں ہے - ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قول ثابت کی بنیاد پر دنیا اور آخرت ' دونوں میں ثبات عطا کرتا ہے ' اور ظالموں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے - اللہ کو اختیار ہے جو چاہے کرے"۔

کلمہ طیبہ کی مثال اچھے درخت کی دی گئی ہے جو ہر وقت پھل دیتا ہے ' پھلتا پھولتا ہے ' اور کلمہ خبیثہ کی مثال بیکار جڑی بوٹیوں کی ہے ' جن کو کسان جہاں دیکھتا ہے بیکار اور مضر سمجھتے ہوئے اکھاڑ پھینکتا ہے - کسی جگہ اس کے لیے قرار نہیں ہے - یہ تمثیل اور تمثیلی منظر انبیاء اور سرکش اور ڈکٹیٹروں کے قصے سے لیا گیا ہے - اس قصے میں انبیاء اور داعیوں کا جو انجام بتایا گیا ہے اور جھٹلانے والے سرکشوں کا جو انجام بتایا گیا ہے یہ تمثیل اس پر مبنی ہے - سلسلہ انبیاء ایک شجرہ طیبہ ہے جس کی جڑ ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں - یہ درخت تاریخ کے مختلف موسموں میں اپنا پھل دیتا رہا ہے ' کسی نہ کسی دور میں کوئی نہ کوئی نبی آیا ہے اور وہ اصلاح ' دعوت اور ایمان کا پھل دیتا رہا ہے جس میں بھلائی اور اچھی زندگی کا سامان فراہم ہوتا رہا ہے -

لیکن یہ تمثیل اس سورہ کی فضا اور اس قصے کی فضا کے ساتھ متناسب ہونے کے ساتھ ساتھ مطالب و معانی کا نہایت وسیع آفاق رکھتی ہے اور اس کے اندر گہرے حقائق ہیں - کلمہ طیبہ سے مراد کلمہ حق ہے ' جو ایک مفید اور اصل دار درخت کی طرح ہوتا ہے ' یہ حق مستحکم ' ٹھوس اور مفید ہوتا ہے - زمانے گزر جاتے ہیں لیکن یہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے - باطل کی طوفانی ہوائیں اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتیں اور ظلم و سرکشی کے کدال اسے اکھاڑ نہیں پھینک سکتے - اگرچہ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ ظلم اور سرکشی کے سخت طوفان اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے - یہ درخت نہایت بلند ہوتے ہیں اور ان کی شاخیں فضاؤں میں بڑی دور تک جاتی ہیں - یہ سرکشی اور ظلم پر بڑی بلندی سے حقارت آمیز نظر ڈالتا ہے - اگرچہ بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ شر اس کا بلند فضاؤں میں بھی مقابلہ کر رہا ہے لیکن اس درخت کا پھل آتا ہی رہتا ہے ' پھر اس درخت کی تخم ریزی صالح انسانوں کے دلوں میں ہوتی اور اس کی پود لگتی ہی رہتی ہے اور یہ نسلاً بعد نسل بڑھتا ہی رہتا ہے -

باطل جو کلمہ خبیثہ ہوتا ہے - یہ بے کار جھاڑی اور بوٹی کی طرح ہوتا ہے - کبھی کبھی یہ جھاڑیاں بھی بہار دکھاتی ہیں اور گھنے جنگلات کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور بعض لوگ اس سے متاثر ہو جاتے ہیں - وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید باطل کا درخت حق سے بڑھ گیا ہے - لیکن اس کی جڑیں نہیں ہوتیں - معمولی طاقت صرف کرنے سے اسے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے - جس طرح فصل سے جڑی بوٹیوں کو اکھاڑ لیا جاتا ہے - دیکھتے ہی دیکھتے لوگ اسے اکھاڑ پھینکتے ہیں اس لیے وہ قرار و بقا سے محروم ہوتا ہے کیونکہ ہوتا ہی خبیث ہے -

یہ محض ایک مثال یا ضرب المثل ہی نہیں ہے ' نہ کوئی ایسی بات ہے جس کے ذریعہ نیک لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے ' بلکہ یہ تمثیل زندگی کی ایک حقیقت ہے - اگرچہ بعض اوقات اس حقیقت کے ظاہر ہونے میں دیر لگتی ہے - اصل بات یہ ہے کہ سچائی اور بھلائی کو کبھی بیخ و بن سے نہیں اکھاڑ کر پھینکا جا سکتا اور نہ یہ سچائی کبھی مرتی یا نابود ہوتی ہے اگرچہ

شر کی گرفت سخت ہو اور شر اس کی راہ روک رہا ہو - اسی طرح خالص شر بھی دنیا میں پھلتا پھولتا نہیں - دراصل وہ اپنے ساتھ خیر کا کوئی حصہ ملاتا ہے' اور جب اس شر کے ساتھ ملائے ہوئے خیر کے عناصر ختم ہو جاتے ہیں تو پھر شر اپنی موت آپ مرجاتا ہے - اگرچہ بظاہر وہ بڑی قوت اور عظیم طاقت نظر آتا ہو - بہرحال اصل حقیقت یہ ہے کہ خیر ہی خیریت سے ہوتا ہے اور شر ہمیشہ مشکلات سے دوچار ہوتا ہے -

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۱۴ : ۲۵) "یہ مثالیں اللہ اس لیے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں" - یہ ایسی مثالیں ہیں جو زمین پر حقیقت کی شکل میں موجود ہیں - لوگ ان پر نظر نہیں ڈالتے' قرآن صرف لوگوں کو متوجہ کرتا ہے - کیونکہ یہ تذکرہ ہے -

شجرۂ ثابتہ اور اس مستحکم درخت کی تعبیر میں حق کے ثبات کی تصویر کشی بھی ہے' یوں کہ حق کی جڑیں گہری ہوتی ہیں اور وہ آسمان تک بلند شاخیں رکھتا ہے اور نظر بھی آتا ہے کہ وہ بلند ہے - حق کھڑا رہتا ہے اور یہ جتلاتا ہے کہ وہ مضبوط اور ٹھوس ہے' اس کلمہ طیبہ اور شجرۂ طیبہ کے ذریعہ ایک تمثیل دے کر اللہ کیا چاہتا ہے؟

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ

(۱۴ : ۲۷) "ایمان والوں کو اللہ اس قول ثابت کی بنیاد پر' دنیا و آخرت دونوں میں ثبات عطا کرتا ہے" - اور اسی طرح کلمہ خبیثہ کی تمثیل دے کر کہ وہ شجرۂ خبیثہ کی طرح ہے اور اس کے لیے کوئی ثبات و قرار نہیں ہے -

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ (۱۴ : ۲۷) "اور ظالموں کو بھٹکا دیتا ہے" - چنانچہ انداز کلام اور اس سے مراد مفہوم کے درمیان مکمل ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے" - اللہ اہل ایمان کو اس زندگی میں ثبات و قرار عطا کرتا ہے اور یہاں ان کی بات پختہ ہوتی ہے آخرت میں انہیں مضبوط کرتا ہے' وہاں ان کا انجام پختہ ہوتا ہے کیونکہ ان کے دلوں کی دھرتی پر ایمان پختہ کھڑا ہوتا ہے - ان کی فطرت کا حصہ ہوتا ہے اور اس درخت سے ان کی زندگی سے اعمال صالحہ پھوٹتے رہتے ہیں - پے درپے یہ اعمال آتے ہیں - یہ درخت قرآن و سنت کی تعلیمات کے ذریعہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جاتا ہے - اس کے سامنے امید کی شمع ہوتی ہے - اور دنیا و آخرت کی کامیابی کا یقین ہوتا ہے' یہ سب باتیں با پھل حق ہیں اور ٹھوس ہیں - ایک ہی راہ ہے اور ایک ہی طریقہ ہے - اور جن لوگوں کے ضمیر کی دھرتی میں یہ درخت کھڑا ہوتا ہے اس سرزمین میں قلق' بے چینی' حیرت اور اضطراب نہیں ہوتا -

ظالموں کو اپنے ظلم اور شرک کی وجہ سے (قرآن میں ظلم کا اطلاق بالعموم شرک پر ہوتا ہے) نور اور روشنی سے دور کر دیا جاتا ہے - یہ لوگ اوہام و خرافات کی تنگ و تاریک وادیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں - یہ ہوائے نفس کی مختلف راہوں پر چلتے ہیں - اللہ کی ایک ہی راہ سے محروم ہوتے ہیں' تو اللہ اپنی سنت جاریہ کے مطابق پھر ان کو مزید گمراہ کرتا ہے - کیونکہ انہوں نے خود ظلم' تاریکی اور ہوائے نفس کی بندگی کی راہ کو اختیار کیا - تو یہ بھٹکتے رہے اور بدی کی راہوں میں ادھر ادھر بھاگتے رہے -

وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ (۱۴: ۲۷) "اللہ کو اختیار ہے جو چاہے کرے"۔ اس کا ارادہ بے قید ہے' ٹھیک ہے کہ وہ ایک ناموس فطرت جاری کرتا ہے لیکن وہ خود اپنے ناموس فطرت کا پابند نہیں ہے۔ البتہ اس کے قانون پر جو چلے وہ اس کو پسند کرتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنے جاری کیے ہوئے ناموس فطرت کو بدل بھی دیتا ہے کیونکہ اللہ کو روکنے والی کوئی قوت نہیں ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے' وہی ہوتا ہے۔

اس تبصرے سے رسولان کرام کے عظیم قصے اور کہانی کی بات کا خاتمہ ہوتا ہے۔ یہ دعوت اسلامی کی کہانی تھی۔ اس کا پہلا حصہ اس سورہ کے آغاز میں ایک بڑے حصے میں پھیلا ہوا تھا۔ یہاں حضرت ابراہیم ابوالانبیاء کی کہانی تھی۔ پھر چند دوسرے انبیاء کی کہانی تھی جس کی شاخیں تاریخ کے اندر دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور یہ کلمہ طیبہ کے درخت کے مالی تھے جو حق کی طرح پھلتا پھولتا تھا۔ یہ کلمہ طیبہ جو یہ سب پیغمبر لے کر آئے یہ شجرۂ طیبہ کی طرح تھا۔ یہ کلمہ توحید تھا' تمام انبیاء کا شجرۂ طیبہ ایک ہی تھا' ایک ہی پھل دیتا تھا' یہ کلمہ توحید تھا اور تمام انبیاء کے ہاں یہ کلمہ ایک رہا اور دعوت بھی ایک ہی رہی۔

یہ تھی اسلام اور جاہلیت کے درمیان طویل کشمکش۔ اس کی طرف ہم نے اس پوری سورہ میں جابجا سرسری اشارات کیے ہیں۔ میں اس بات کو ضروری سمجھتا ہوں کہ ان اشارات پر دوبارہ قدرے غور کیا جائے۔

چنانچہ اس قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں قافلہ ایمان ایک ہی قافلہ ہے۔ آدم علیہ السلام سے ادھر یہ قافلہ رواں دواں ہے اور رسولان کرام اس قافلے کے قائد ہیں۔ تمام انبیاء کی دعوت ایک ہی نظریہ و عقیدہ کی طرف تھی۔ ایک ہی آواز انہوں نے بلند کی اور ایک ہی طریق کار پر انہوں نے کام کیا۔ سب کی دعوت یہ تھی کہ الٰہ اور حاکم ایک ہی ہے' وہی رب ہے' اور اس کے ساتھ کوئی اور الٰہ اور رب اور حاکم نہیں ہے' اور اہل ایمان کو اس کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ نہ اللہ کے سوا کسی اور کی پناہ میں آنا چاہیے اور نہ اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا سہارا سمجھنا چاہیے۔

پس اللہ وحدہ کو ایک سمجھنے اور عقیدۂ توحید کی وہ تاریخ جسے آج کل علماء "تقابل ادیان" بتلاتے پھرتے ہیں' کہ پہلے لوگ متعدد الہوں کو مانتے تھے۔ پھر دو الہوں کو ماننے لگے یعنی "خیر و شر کے الٰہ" اس طرح لوگ پہلے شجر و حجر' سورج' چاند' ستاروں اور سیاروں کی پوجا کرتے تھے اور پھر آخر میں انہوں نے الٰہ واحد کی پوجا شروع کر دی۔ یوں ان کے نظریات میں ارتقاء ہوا اور انسانیت کا علم و فلسفہ ترقی کرتا رہا۔ اسی طرح ان کی سوسائٹی بھی ترقی کر کے' ایک بادشاہ کی بادشاہی کے قیام تک جا پہنچی۔

لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ جب سے انسانی تاریخ شروع ہوئی ہے تمام رسولوں نے عقیدۂ توحید کی تبلیغ کی ہے۔ تمام رسولوں کی رسالت اور دعوت میں یہی بنیادی عنصر تھا اور اس میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ جس قدر معروف سماوی دین ہیں' قرآن کریم کے مطابق ان کی دعوت یہی تھی۔

اگر تقابل ادیان کے علماء اپنی بات اس طرح کرتے کہ رسولوں نے جو عقیدۂ توحید آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک بیان کیا۔ اس کے بعد سمجھنے کے لیے انسانوں کے فہم و ادراک میں یوں ارتقاء ہوا کہ رسولان کرام کی مسلسل جدوجہد کی وجہ سے عوام الناس کے اذہان میں یہ روشنی پھیلتی چلی گئی اور آخر میں اس طویل جدوجہد کے لیے زیادہ لوگ اللہ کے دین' عقیدہ توحید کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئے تو ان علماء تقابل ادیان کی بات معقول نظر آتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس منہاج بحث و تحقیق سے متاثر ہیں جو یورپ میں مروج ہے۔ اس

منہاج کی تہ میں دراصل کنیسا کے خلاف عداوت دفن ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ دور جدید کے مسلم مفکرین نے بھی اس کا خیال نہیں رکھا۔ بہرحال تقابل ادیان دانستہ یا نادانستہ صحیح اسلامی اور دینی سوچ کے مخالف چلتے ہیں اور یہ انداز ثابت کرتے ہیں کہ ادیان کی بنیاد وحی پر نہیں ہے بلکہ دین بھی دراصل انسانی سوچ کا ارتقاء ہے۔ جس طرح دوسرے انسانی افکار' فلسفوں اور تجربوں میں ارتقاء ہوتا رہا ہے اسی طرح دینی فکر بھی ارتقاء پذیر رہی ہے۔ غرض اس قدیمی دشمنی اور اس سوچ ہی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے دور کے ماہرین علماء تقابل ادیان اس طرز پر بات کرتے ہیں اور اپنی اس سوچ اور فکر کو علمی اور تحقیقی سوچ کہتے ہیں۔

اگر کسی اور ملک و ملت کا کوئی فرد اس منہاج سے دھوکہ کھاتا ہے تو کھائے مگر ایک مسلمان اس منہاج سے ایک منٹ کے لیے بھی متاثر نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کے پاس اپنے دین کے حوالے سے ایک صحیح منہاج فکر موجود ہے اور ان کے پاس دین کے حوالے سے ان کے اپنے کچھ طے شدہ اصول ہیں' اور اپنا منہاج بحث موجود ہے۔

غرض تمام انبیاء انسانیت کے سامنے ایک ہی دعوت پیش کرتے رہے۔ ایک ہی نظریہ دیتے رہے۔ اور اسی منہاج کے مطابق انہوں نے اپنے اپنے دور میں جاہلیت کا مقابلہ کیا۔ قرآن کریم اس بات کو واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ تمام رسول یہ دعوت لے کر آئے' یہ ایک ہی نظریہ پیش کر کے' ہر دور میں ایک ہی طرح جاہلیت کا مقابلہ کرتے رہے۔ اور اس معاملے میں قرآن نے زمان و مکان کے حوالے سے کسی ارتقاء کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہمیں دعوت فکر دیتی ہے کہ اسلام' اسلام ہے اور جاہلیت' جاہلیت ہے۔ اسلام ہمیشہ اسلام رہا ہے اور جاہلیت ہمیشہ جاہلیت رہی ہے۔ تاریخ کے کسی دور میں ان کے درمیان کوئی اتحاد نہیں رہا ہے۔ جب اسلام کی بنیاد پر کوئی سوسائٹی بنی ہے' اس کے ایک ہی خدوخال رہے ہیں اور جب بھی جاہلیت کی اساس پر کوئی اکٹھ ہوا ہے وہ بھی ایک جیسا رہا ہے۔ مثلاً جاہلیت کی پہلی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں انسان' انسان کا غلام ہوتا ہے اور اس میں حاکم اللہ نہیں ہوتا بلکہ کوئی اور ہوتا ہے۔ پرورش کرنے والا بھی اور ہوتا ہے' چاہے کوئی متعدد الہوں کا قائل ہو یا اللہ ایک سمجھتا ہو مگر رب اور حاکم متعدد ہوں تو بھی یہ سوسائٹی ایک جاہلی سوسائٹی ہوگی اور اس سوسائٹی میں جاہلیت کے تمام اوصاف و علامات موجود ہوں گی۔

رسولوں کی دعوت کی بنیاد یہ رہی ہے کہ اللہ کو ایک سمجھا جائے اور تمام جھوٹے خداؤں کا انکار کر دیا جائے۔ دین صرف اللہ کا ہو' صرف اللہ کے دین و شریعت کی اطاعت ہو اور صرف اللہ کو حاکم اور قانون ساز تصور کیا جائے۔ یہ نظریہ براہ راست اس نظریہ کی ضد ہے جو جاہلیت کی اساس رہا ہے۔ جونہی کوئی شخص یہ اعلان کرتا ہے کہ حاکم بھی اللہ ہو گا' قانون بھی اللہ کا ہو گا تو ہر جاہلیت اسے اپنے لیے خطرہ سمجھتی ہے' خصوصاً جب لوگ اس نظریہ کے گرد جمع ہو کر ایک جماعتی زندگی اختیار کر لیں اور خصوصاً یہ افراد جاہلیت سے چھٹ چھٹ کر آ رہے ہوں اور ایک اکٹھ اختیار کر رہے ہوں' ایسی صورت میں نظریہ جاہلیہ اور حاکم جاہلیت ایسے افراد کے اجتماع کو اپنے خلاف ایک بغاوت سمجھتے ہیں۔ پھر ہر جاہلی حکومت یہ خیال کرتی ہے کہ ان لوگوں کا عقیدہ مشکوک ہے۔ حالانکہ یہ امور ایسے ہیں کہ ہر دور میں یہ تحریک اسلامی کے لیے لابدی ہیں کہ وہ اپنے نظریات کا کھل کر اعلان کرے۔ پھر ان کی اساس پر جمعیت تشکیل دے اور پھر یہ لوگ مل کر کام کریں۔ ہر دور میں یہ طریق کار ضروری ہے۔

ہر دور میں نظام جاہلیت کا ایک نظام ہوتا ہے اور اس کی عضویاتی تشکیل ہوتی ہے۔جب وہ نظام دیکھتا ہے کہ اس کے مقابلے میں ایک متضاد نظریاتی نظام آگیا ہے اور ایک نئی سوسائٹی بھی بن رہی ہے جو ان کی سوسائٹی کے بالکل متضاد عضویاتی تشکیل اور نظام رکھتی ہے۔کیونکہ جاہلی سوسائٹی کی تہ میں متعدد الٰہوں کا نظریہ ہوتا ہے۔حاکم اس میں متعدد ہوتے ہیں اور اس میں انسان انسانوں کے غلام اور تابع ہوتے ہیں جبکہ اسلامی سوسائٹی میں ایک اللہ اور حاکم کا نظریہ ہوتا ہے اور اس میں تمام لوگ اللہ کے بندے ہوتے ہیں۔کوئی کسی کا بندہ نہیں ہوتا تو پھر جاہلی سوسائٹی اس نئی سوسائٹی کو اپنے لیے خطرہ سمجھتی ہے۔

خطرے میں اضافہ اس بات سے بھی ہو جاتا ہے کہ یہ نو تشکیل شدہ اسلامی سوسائٹی روز بروز جاہلی سوسائٹی کے جسم کو کھاتی چلی جاتی ہے۔ابتداء میں جب اسلامی سوسائٹی بنتی ہے تو خطرہ کم ہوتا ہے لیکن جب وہ جاہلیت سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اقتدار ہمارے حوالے کرو تو یہ خطرہ حقیقت بن کر جاہلیت کے سامنے آجاتا ہے کیونکہ اسلامی تحریک پھر جاہلیت سے مطالبہ کرتی ہے کہ لوگوں کو اپنی غلامی سے نکالو اور تم سب اللہ کی غلامی میں داخل ہو جاؤ۔چونکہ آغاز رسل سے یہی طریق کار رہا ہے' دعوت اسلامی اور تحریک اسلامی کا اس لیے آغاز ہی سے ہر دور میں جاہلیت نے اسلامی تحریک کو اپنے وجود کے خلاف چیلنج سمجھا ہے۔یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے اور قدرتی معلوم ہوتی ہے۔یہ اسی طرح ہے جس طرح کوئی قائم وجود کسی حملہ آور کے مقابلے میں اپنی حفاظت کرتا ہے اور جس طرح ہر وہ شخص اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے جس نے عوام سے حاکمیت غصب کی ہوئی ہوتی ہے۔

جب جاہلیت محسوس کرتی ہے کہ تحریک اسلامی اس کے وجود کے لیے خطرہ بن گئی ہے تو وہ بھی اس مقابلے کو موت و حیات کا مسئلہ سمجھتی رہی ہے۔جاہلیت نے تحریک اسلامی کے ساتھ کبھی بھی نرمی' مصالحت اور امن و سلامتی کے اصول کو نہیں اپنایا۔کبھی بھی اس معرکے میں جاہلیت نے اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دیا۔نہ رسولان کرام نے اس معرکے میں کبھی اپنے آپ کو دھوکہ دیا ہے۔نہ ان کے بعد کسی مومن داعی نے اس سلسلے میں اپنے آپ کو دھوکہ دیا ہے۔جاہلیت کا اعلان یہ رہا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا (۱۴: ۱۳) "اور کفار نے ہمیشہ ان کے پاس آنے والے رسولوں کو یہ کہا کہ یا تو ہم تمہیں اپنی سرزمین سے نکال دیں گے یا تمہیں واپس ہماری ملت اور دائرہ اقتدار میں آنا ہوگا"۔یہ لوگ رسولوں اور مومنوں کا علیحدہ وجود تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ ان کا اپنا کوئی نظریہ ہو یا اپنی کوئی جماعت ہو۔ان کا مطالبہ یہ ہے کہ واپس ہماری پارٹی میں آجاؤ یا جلاوطن ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔واپس آجاؤ' ہماری سوسائٹی میں مدغم ہو جاؤ' پگھل جاؤ اور اپنی علیحدہ سوسائٹی اور اجتماعیت مت بناؤ۔

لیکن رسولان کرام نے بھی اس بات کو کبھی قبول نہیں کیا کہ وہ ملت جاہلیہ میں پگھل جائیں اور مدغم ہو جائیں۔اپنا وجود ختم کر دیں اور اپنی شخصیت کو ختم کر دیں۔اس لیے کہ ان کی سوسائٹی بالکل ایک نئے نظریہ' نئے آئین و دستور و منشور پر قائم ہوتی ہے جو جاہلیت کے نظریہ اور دستور و منشور سے متضاد ہوتا ہے۔رسولوں نے اس طرح کا جواب بھی نہیں دیا اور عمل بھی نہیں کیا جو ہمارے دور کے بعض جاہل لوگ کہتے ہیں کہ جاہلی سوسائٹی میں مدغم ہو جاؤ اور اندر اندر سے کام کرو' اندر جا کر اپنے عقیدے کو پھیلاؤ۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی جاہلی معاشرے میں اہل دعوت ایک نیا اسلامی نظریہ لے کر اٹھتے ہیں تو اس نظریہ کی اساس پر خود بخود ان کی سوسائٹی' ان کی قیادت اور ان کی وفاداریاں الگ ہو جاتی ہیں۔ یہ فطری بات ہے اس میں کسی کے ارادے کو دخل نہیں ہوتا۔ کسی بھی سوسائٹی کی تشکیل کے لیے فطری انداز ہے جو طبیعی ہے اور لازمی ہے۔ اس عمل سے اگر کسی جاہلی سوسائٹی کے اندر ردعمل ہوتا ہے کہ لوگوں کو صرف ایک خدا کی بندگی' حاکمیت اور قانون اور دستور و منشور پر جمع کیا جا رہا ہے تو یہ ردعمل بھی طبیعی ہوتا ہے۔ اس جاہلی نظام کے تمام کل پرزے پھر اسلام کے خلاف کام کرتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان اس جاہلی سوسائٹی کا کل پرزہ بنتا ہے تو یہ دراصل اس جاہلی سوسائٹی کا خادم ہو گا' اسلام کا نہ ہو گا جس طرح بعض احمق یہ سمجھتے ہیں کہ جاہلیت کا پرزہ بن کر اسلام کی خدمت کرو۔

اس کے بعد وہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جو کسی بھی دعوت کے لیے مقدر ہے' اور جو شخص دعوت اسلامی کا کام کرتا ہے خواہ کسی زمان و مکان میں ہو' وہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے دوستوں کے ساتھ جو نصرت کا وعدہ فرمایا ہے ضرور یہ کہا ہے کہ میری نصرت آئے گی اور انہیں زمین میں اقتدار ملے گا تو یہ وعدہ اس وقت تک حقیقت کا روپ اختیار نہ کرے گا جب تک وہ کسی جاہلی سوسائٹی سے ممتاز ہو کر علیحدہ نہ ہو جائیں' اور وہ اس دعوت کی بنیاد پر اپنی قوم سے الگ ہو کر اپنی سوسائٹی اور اپنی جمعیت تشکیل نہ دے لیں۔ اگر وہ کسی جاہلی سوسائٹی کا ہی حصہ رہیں اسی میں چلیں پھریں' اسی کے کل پرزے ہوں' تو اگرچہ وہ اسلام کے نظریہ حیات پر یقین رکھتے ہوں' اس کے لیے کام کرتے ہو' اللہ کی اس نصرت اور وعدے میں تاخیر ہو جائے گی۔ یہ وہ لازمی' عظیم اور بنیادی شرط ہے جس پر دعوت اسلامی کا کام کرنے والوں نے مکمل عمل کرنا ہے۔ اس بات کو انہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔

آخر میں ایک پہلو دوسرا بھی قابل غور ہے' قرآن کریم رسولان کرام کے اس قافلے کو کس خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ قافلہ پوری انسانی تاریخ میں جاہلیت کا نہایت ہی خوبصورتی اور ثابت قدمی سے مقابلہ کرتا چلا آ رہا ہے۔ یہ بیان اس لیے خوبصورت ہے کہ اس قافلے کے مسافر جس حق کے حامل ہیں وہ نہایت ہی سادہ' فطری اور خوبصورت ہے۔ یہ مسافر مطمئن ہیں' سنجیدہ اور اپنی راہ پر ہوئے چلے آ رہے ہیں۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰي مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

( ۱۴ : ۱۱ ) "ان کے رسولوں نے ان سے کہا" واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر تم ہی جیسے انسان۔ لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے' نوازتا ہے"۔ اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ تمہیں کوئی سند لا دیں۔ سند تو اللہ ہی کے اذن سے ہو سکتی ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے"۔

آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی یہ خوبصورتی' اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ یہ ایک متحدہ قافلہ ہے جو ہر زمان و مکان میں' متحدہ جاہلیت کا مقابلہ کرتا چلا آیا ہے' ہر دور میں اور ہر قوم میں۔

پھر یہ خوبصورتی ایک دوسرے پہلو سے بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ اس دعوت اور اس حق کا جس کے یہ

رسولان کرام حامل ہیں' اور اس حق کا جو اس کائنات میں پوشیدہ باہم گہرا رابطہ ہے کیونکہ رسول یہ کہتے ہیں۔

اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۱۴ : ۱۰) "کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمان اور زمین کا خالق ہے"۔ اور دوسری آیت میں ہے۔

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَي اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰنَا سُبُلَنَا (۱۴ : ۱۲) "اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جب کہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی ہے؟" اور دوسری جگہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ (۱۹) وَّمَا ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ (۲۰) (۱۴ : ۱۹ - ۲۰) "کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے آسمان و زمین کی تخلیق کو حق پر قائم کیا ہے؟ وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے اور ایک نئی خلقت تمہاری جگہ لے آئے۔ ایسا کرنا اس پر کچھ بھی دشوار نہیں ہے"۔

اس طرح اس کائناتی سچائی اور دعوت اسلامی کی سچائی کے درمیان گہرا رابطہ قائم ہوتا ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذات باری جو برحق ہے وہ ان دونوں سچائیوں کا سرچشمہ ہے اور یہ سچائیاں گہری استحکام اور دور تک اس کائنات میں جڑیں رکھتی ہیں۔

كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (۱۴ : ۲۴) "جس طرح ایک اچھی نسل کا درخت ہوتا ہے جس کی جڑیں زمین میں ہوتی ہیں اور شاخیں آسمان میں ہوتی ہیں"۔ اور اس حق کے سوا جو کچھ ہو وہ باطل ہے جس طرح

كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (۱۴ : ۲۶) "جس طرح ایک خبیث درخت ہوتا ہے جسے زمین کے اوپر سے اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے اور اسے زمین پر قرار نصیب نہیں ہوتا"۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۱۵ تشریح آیات

## ۲۸ --- تا --- ۵۲

سورۂ ابراہیم کا یہ دوسرا دور ہے۔ یہ بھی دور اول کے مضامین ہی کو لیے ہوئے ہے اور اس کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور اسی کا تسلسل ہے۔

پہلے حصے کا مضمون یہ تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں داخل کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اسی لیے بھیجا گیا تھا کہ آپ اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنیوں کی طرف نکال لائیں اور ان کو یہ نصیحت کریں کہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہوتا ہے۔ اللہ نے بنی اسرائیل پر بڑا فضل وکرم کیا ہے اور اعلان کر دیا ہے کہ اگر تم نے شکر کیا تو میں تمہارے اوپر انعامات میں اضافہ کر دوں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو میرا عذاب سخت ہے۔ اس کے بعد نبیوں کے حالات اور ان کی تکذیب کرنے والے سرکشوں کا انجام دیا گیا ہے۔ یہ قصہ شروع ہوا اور پھر سیاق سے غائب ہو گیا۔ اس کی مختلف کڑیاں آتی رہیں اور مختلف مناظر بھی آتے رہے۔ یہاں تک کہ کافر قیامت کے میدان تک پہنچ گئے اور وہاں انہوں نے شیطان کا وعظ سنا لیکن یہ بعد از وقت تھا۔ قیامت میں وعظ چہ معنی دارد۔

رسولان کرام کی یہ طویل کہانی اسٹیج کرنے کے بعد اب بات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی قوم تک آ پہنچتی ہے کہ اللہ کا بہت بڑا کرم ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا کہ لوگوں کو ظلمات سے نکال کر روشنیوں میں داخل کرے اور یہ اللہ کا بہت بڑا انعام تھا اور رسول اللہ تمہیں بلاتے ہیں کہ اللہ تمہیں بخش دے گا مگر تمہارا ردعمل بھی یہی ہے کہ تم اس نعمت کی ناشکری کرتے ہو اس دعوت کا انکار کرتے ہو اور کفر کو اختیار کرتے ہو اور تم رسولؐ اللہ اور اس کی دعوت پر کفر اور ناشکری کو ترجیح دیتے ہو۔

اس کے بعد پوری انسانیت پر اللہ کے انعامات و اکرامات گنوائے جاتے ہیں۔ اور اس پر کھلے کائناتی مناظر سے مثالیں دی جاتی ہیں اور اللہ کی نعمت کے شکر کے نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جنہوں نے لوگوں کو یہ دعوت دی کہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے نماز پڑھو۔ اللہ کے بندوں کے ساتھ نیکی کرو، قبل اس کے کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ مالی فوائد ہوں گے اور نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی یاری ہوگی۔

سوال یہ تھا کہ اللہ ان کافروں کو پکڑتا کیوں نہیں؟ اللہ نے ان کے معاملے کو نہ یونہی مہمل چھوڑ دیا ہے اور نہ اللہ غافل ہے بلکہ اللہ ان کے معاملے کو اسی لئے عذاب کے لیے مؤخر کر رہا ہے جس میں نظریں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ رہی یہ بات کہ اللہ نے رسولان کرام کے ساتھ جو وعدہ کیا ہے وہ پورا ہو کر رہنے والا ہے اگرچہ کفار مکر کریں اور اگرچہ ان کا مکر اس قدر عظیم

ہو کہ بڑے بڑے پہاڑوں کو ہلا مارنے والا ہو۔ یوں یہ دوسرا حصہ بھی پہلے حصے سے مربوط اور مسلسل ہو جاتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۗ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾

"تم نے دیکھا ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ کی نعمت پائی اور اسے کفران نعمت سے بدل ڈالا اور (اپنے ساتھ) اپنی قوم کو بھی ہلاکت کے گھر میں جھونک دیا یعنی جہنم' جس میں وہ جھلسے جائیں گے اور وہ بدترین جائے قرار ہے اور اللہ کے کچھ ہمسر تجویز کر لیے تاکہ وہ انہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں؟ ان سے کہو' اچھا مزے کر لو' آخر کار تمہیں پلٹ کر جانا دوزخ ہی میں ہے۔

کیا ہی عجیب صورت حال ہے' کہ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی صورت میں کسی قوم کو ایک عظیم نعمت سے نوازا ہے۔ یہ رسول ایک عظیم دعوت کا حامل ہے۔ یہ ایمان اور عمل صالح کی طرف دعوت ہے۔ اس کے نتیجے میں پوری قوم فلاح و مغفرت حاصل کر سکتی ہے اور جنت میں داخل ہو سکتی ہے' لیکن قوم ہے کہ اس نعمت کو ہاتھوں ہاتھ لینے کے بجائے کفر کو لے رہی ہے' اور اس قوم کے قائدین کے ہاتھ میں جاہل عوام کی باگ ڈور ہے وہ قوم کی قیادت جنت کے بجائے ہلاکت کے گڑھے کی طرف کر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر قوم کی حالت یہی ہوتی ہے۔ اس کے اٹھانے والے اور اس کے گرانے والے قائدین ہی ہوتے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی قوم کے قائدین بھی لوگوں کو جہنم کے دہانے تک پہنچانے کے بعد اس میں گرانے اور ٹھہرانے کا انتظام کر رہے ہیں جیسا کہ پہلے انبیاء کے مخالف جاہلیت زدہ قائدین نے اپنی قوم کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا۔ جس طرح ان لوگوں نے اپنی اقوام کا برا حشر کیا' اسی طرح اہل مکہ بھی یہی کر رہے ہیں۔

کسی قوم کے قائدین کا یہ عجیب فعل ہوتا ہے' حالانکہ انہوں نے زمانہ ماقبل کی اقوام کی تاریخ کو پڑھا اور دیکھا ہوتا ہے۔ اگر نہیں دیکھا تھا اور پڑھا تھا تو قرآن نے یہ انجام ان کے سامنے کس قدر موثر ڈرامائی انداز میں اسٹیج کیا ہے۔ ابھی ابھی اس کے مناظر نظروں سے گزرے ہیں' اور یہ مناظر اس قدر دلچسپ تھے کہ گویا (Living) تھے اور عنقریب وہ ان کو عملاً اسی طرح دیکھیں گے۔ کیونکہ نصوص قرآن وہی مناظر پیش کرتی ہیں جو ہونے والے ہیں۔ صرف یہ ہے کہ قرآن ان کو اس قدر موثر اور دلنشیں انداز میں پیش کرتا ہے کہ گویا واقع ہو گئے ہیں۔ غرض ان لوگوں کے طرز عمل میں تعجب انگیز پہلو یہ ہے کہ اس نعمت کے بدلے وہ کفر خرید رہے ہیں اور جس توحید کی دعوت ان کو دی جا رہی ہے اس کا انکار کر رہے ہیں۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ (۱۴ : ۳۰) "اور اللہ کے کچھ ہمسر تجویز کیے ہیں تاکہ وہ انہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں"۔ یعنی یہ اللہ کے ساتھ دوسری شخصیات کو برابر کرتے ہیں اور ان کی عبادت اسی

طرح کرتے ہیں جس طرح اللہ کی عبادت کی جاتی ہے - ان کی حاکمیت کو اسی طرح تسلیم کرتے ہیں جس طرح اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے - ان دوسری شخصیات میں اس طرح خصوصیات تسلیم کرتے ہیں جس طرح اللہ کی خصوصیات ہیں حالانکہ اللہ کا کوئی شریک اور مثل نہیں ہے - انہوں نے اللہ کے ساتھ یہ شریک اس لیے ٹھہرائے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ وحدہ اور صراط مستقیم سے بدراہ کر دیں 'کیونکہ اللہ کی راہ کے سوا وہ اور جن راہوں پر چلیں گے وہ شیطانی راہیں ہوں گی -

اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ قوم کے کبراء اور لیڈروں نے عمداً اس قوم کو اللہ کی راہ سے بدراہ کیا اور اللہ کو الٰہ واحد قرار دینے کے بجائے لوگوں کو دوسرے الہوں کی قیادت میں دے دیا - یہ کیوں؟ اس لیے کہ ان دوسرے الہوں کے روپ میں یہ لوگ اپنی قیادت اور سیادت بھی چکاتے تھے جبکہ عقیدۂ توحید ہر سرکش ڈکٹیٹر کی قیادت کے لیے اور اس کے مفادات کے لیے خطرہ ہوتا ہے - ہر زمانے اور ہر سوسائٹی میں طاغوتی قوتوں کا یہی رویہ ہوتا ہے جس طرح زمانہ سابقہ کی جاہلیتوں میں یہی صورت رہی اسی طرح دور جدید کی جاہلیت میں بھی یہی صورت ہے کہ لوگ کسی نہ کسی صورت میں عقیدۂ توحید کو چھوڑ کر اپنی قیادت کسی طاغوتی قوت کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں - دور جدید میں لوگ اپنی حریت اور آزادی ایسے ہی طاغوتی الہوں کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں - ان کی خواہشات کے مطابق چلتے ہیں' ان سے قانون اور شریعت اخذ کرتے ہیں' اور اللہ کے قانون کے بجائے ان کبراء سے قوانین اور ہدایات اخذ کرتے ہیں - اللہ کی توحید کے نظریہ کو جب اس مفہوم تک وسعت دی جاتی ہے کہ حاکم بھی اللہ ہے' اور قانون ساز بھی اللہ تو دور جدید کے لیڈر بھی جاہلیت اولیٰ کی طاغوتی قوتوں کی طرح تحریک اسلامی کے خلاف میدان میں آ جاتے ہیں - یہ تحریک اسلامی کو اپنی خدائی کے خلاف خطرہ سمجھتے ہیں اور اسے پھر ہر طریقے سے بجھانے کی سعی کرتے ہیں - حقیقت یہ ہے کہ جس طرح لوگ آج پارلیمنٹ یا آرڈیننس کے ذریعہ غیر اللہ سے قانون اخذ کرتے ہیں' جو اللہ کے احکام کے خلاف ہوتے ہیں' بلکہ اللہ کے حرام کو حلال کرتے ہیں اور اللہ کے حلال کردہ کو حرام کرتے ہیں تو یہ لوگ بھی دراصل شرک کرتے ہیں اور ایسے لیڈر اور قانون ساز اللہ کے شریک ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں - اور یوں لوگوں کو گمراہ کیا جاتا ہے -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ آپ بھی اپنی قوم کو صاف صاف کہہ دیں کہ مزے کر لو' تمہارے چند دن ہیں' جب یہ مہلت ختم ہو گی تو تم اور تمہاری ایسی قیادت سب واصل جہنم ہو گی -

اے پیغمبر ان کو اپنے اس حال پر چھوڑ دے اور اب میرے بندوں کو وعظ دیں جو ایمان لا چکے ہیں' جو اللہ کی اس نعمت کی قدر کرتے ہیں اور انکار نہیں کرتے - اللہ کی نعمت کو کفر کے بدلے نہیں بیچتے' کہ وہ میرا شکر ادا کریں' میری عبادت کریں اور اطاعت کریں - ان کفار کو چھوڑ کر آپ اپنی پوری توجہ اہل اسلام کو دیں -

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَ لَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

"اے نبی' میرے جو بندے ایمان لائے ہیں ان سے کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس

میں سے کھلے اور چھپے (راہ خیر میں) خرچ کریں قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوست نوازی ہو سکے گی"۔

میرے بندوں سے کہیں کہ میرا شکر اقامت صلوٰۃ کے ذریعہ ادا کریں۔ نماز شکر الٰہی ادا کرنے کا مخصوص ترین طریقہ ہے۔ پھر میرا شکر ادا کرنے کا اہم طریقہ انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ جو کچھ میں نے ان کو دیا ہے' اس سے اعلانیہ اور خفیہ خرچ کریں۔ خفیہ اس وقت جب لینے والوں کی عزت نفس کی حفاظت بھی مقصود ہو اور دینے والوں کی مروت بھی محفوظ ہو' کیونکہ جو لوگ تفاخر' ظاہرداری اور مقابلے کے لیے خرچ کرتے ہیں وہ انفاق فی سبیل اللہ نہیں ہوتا' اور اعلانیہ وہاں خرچ کریں جہاں صدقات واجبہ کا ادا کرنا مقصود ہو' اور جہاں انفاق کو مثالی بنانا مقصود ہو' دونوں طریقوں میں سے کسی طریقے کا انتخاب انفاق کرنے والے کے ضمیر پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اور ان کو یہ بھی کہہ دیں کہ انفاق کا بھی ایک وقت ہے' ایک مہلت ہے' جب مہلت ختم ہوگئی تو پھر نہ تجارت ہوگی' نہ مال بڑھے گا اور نہ دوستیاں ہوں گی اور نہ انفاق کے لیے ہاتھ میں کچھ ہوگا۔ وہاں تو اچھے اعمال ہی کام آئیں گے۔

مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خِلٰلٌ (۱۴ : ۳۱) "قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوست نوازی ہو سکے گی"۔ اب اللہ تعالیٰ اس کائنات کی عظیم کتاب کو کھول کر اپنے انعامات گنواتے ہیں۔ یہ عظیم اور ناقابل شمار انعامات ہیں۔ اس کتاب کے بڑے بڑے صفحات ہیں اور ان کے اندر تاحد نظر اقسام و الوان کے انعامات ہیں۔ دور تک پھیلے ہوئے آسمان' یہ زمین' شمس و قمر' رات اور دن کی گردش' آسمانوں سے نازل ہونے والا پانی' زمین سے اگنے والے انواع و اقسام کے نباتات' سمندر' سمندری مخلوق اور جہاز رانی' زمین کی ندیاں' نالے اور دریا' غرض وہ سب کچھ جو انسان رات اور دن دیکھ رہا ہے۔ لیکن لوگ اپنی جہالت اور جاہلیت کی وجہ سے ان صفحات کو نہیں پڑھتے۔ ان میں غور و فکر نہیں کرتے۔ بے شک انسان ظالم اور ناشکرا ہے۔ اللہ کی نعمتوں کو چھوڑ کر کفر اپناتا ہے۔ اللہ کے ساتھ شریک بناتا ہے حالانکہ اللہ وحدہ خالق و رازق ہے اور اس پوری کائنات کو اسی نے انسان کے لیے مسخر رکھا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً
فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ
بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ
لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۝ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۚ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ ۵
لَا تُحْصُوْهَا ۚ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝ ع

"اللہ وہی تو ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا' پھر اس کے ذریعہ سے تمہاری

رزق رسانی کے لیے طرح طرح کے پھل پیدا کیے ۔ جس نے کشتی کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو تمہارے لیے مسخر کیا۔ جس نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جا رہے ہیں اور رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کیا۔ جس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے ۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے"۔

یہ ایک زبردست تنقیدی حملہ ہے ' انسانی شعور پر کوڑے برسائے جا رہے ہیں۔ زمین و آسمان کے بڑے بڑے اجرام و پہاڑ 'شمس و قمر 'گردش لیل و نہار ' بارشیں اور پھل 'یہ سب کوڑے اور سنگ باری کا کام کر رہے ہیں ۔ ان میں اس ظالم انسان کے شعور کے لیے سخت کاٹ بھی ہے اور پر محبت اور پر سوز آواز بھی ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل فکر کے لیے اس کتاب کے معجزات میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ کتاب اس کائنات کے مناظر اور نفس انسانی کی الجھنوں کو عقیدۂ توحید کے ساتھ جوڑتی ہے ۔ یہ کتاب اس کائنات کے مناظر میں سے ہر منظر اور ہر چمک کو ایک اشاراتی رنگ دیتی ہے ۔ اسی طرح انسانی نفس کے تصورات اور اشراقات میں سے ہر اشراق سے اشارات اخذ کرنے کی دعوت دیتی ہے ۔ یوں یہ کتاب اس پوری کائنات کو اللہ کے نشانات اور دلائل کی نمائش گاہ بنا دیتی ہے 'جس میں دست قدرت کے عجائبات جگہ جگہ سجے ہوئے ہیں۔ ہر منظر اور ہر مثال پر قدرت الہیہ کے عجائبات کے طومار لگے ہوئے ہیں۔ ہر تصور اور ہر رنگ اور ہر سایہ میں قدرت ہی قدرت نظر آتی ہے ۔ قرآن کریم وجود باری کے مسئلہ پر منطقی مناظرہ نہیں شروع کرتا جس میں الہیات کے لاہوتی اور ناسوتی مباحث ہوں۔ فلسفیانہ 'مجرد' مردہ 'خشک مباحث 'جن میں قلب انسانی کے لیے کچھ تر و تازگی نہیں ہوتی بلکہ نفس انسانی پر یہ مباحث بوجھ ہوتی ہیں ۔ قرآن کریم اس مسئلہ کو نہایت موثر ' اشاراتی انداز دیتا ہے اور کائنات کے مناظر ' عجائبات 'فطری دلچسپ اور بدیہیات کے ذریعہ نہایت ہی خوبصورت انداز میں اور نہایت منطقی ترتیب سے اسے پیش کرتا ہے ۔

یہ عظیم اور بھرپور منظر ہے 'جس کے مناظر اس لائن پر چلتے ہیں جس میں ' اللہ کے بندوں پر اس کے انعامات و اکرامات دکھائے گئے ہیں ۔ دست قدرت کی کاریگری کے عجیب نمونے ہیں ۔ اس لائن پر پہلے زمین و آسمان کے وسیع فاصلے اور لاتعداد عجائبات آتے ہیں ۔ پھر بارشوں کے مناظر اور ان کے نتائج نباتات اور پھول پھل آتے ہیں ' اور یہ سب کچھ زمین پر پانی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے ' پھر اس راہ میں ہمارے سامنے سمندروں کے نظارے آتے ہیں جس میں کشتیاں اور جہاز چلتے ہیں جو لوگوں کی ضروریات اٹھائے ہوئے ہیں ' پھر ہمارے سامنے ایک نیا نظارہ آتا ہے جو شمس و قمر اور زمین سے متعلق ہے جس میں ان کی گردش اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی گردش لیل و نہار کے مناظر اور پھر ان تمام انعامات کی ایک مجموعی جھلک جس میں انسان کی ہر ضرورت اور خواہش اور ان کے پورے ہونے کی جھلک دکھائی گئی ہے ۔

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (۱۴ : ۳۴) "جس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے مانگا"۔ اب سوال یہ کیا جاتا ہے کہ ان چیزوں کے بعد بھی تم اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہو۔ تمہارا اندازہ اور فیصلہ کس قدر ظالمانہ ہے کہ تم اللہ کی مخلوقات میں سے زمین و آسمان کی ایک ادنیٰ مخلوق کو پوجتے ہو۔

وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (۱۴ : ۳۲) "اور جس نے آسمانوں سے پانی برسایا' پھر اس کے ذریعہ سے تمہاری رزق رسانی کے لیے طرح طرح کے پھل پیدا کیے"۔ زراعت تو انسانی رزق کا سب سے بڑا اور پہلا ذریعہ ہے' اور تمام ظاہری انعامات کا تعلق زراعت سے ہے۔ بارش اور اس کے نتیجے میں نباتات کا پیدا ہونا اس قانون فطرت کے تابع ہے جو اللہ نے اس کرۂ ارض پر جاری کیا ہے۔ یہ قانون قدرت بارشیں برساتا ہے' نباتات اگاتا ہے اور پھر اس سے مختلف قسم کے پھل تیار ہوتے ہیں اور یہ سب موافقات اور سہولیات انسان کے لیے ہیں۔ رزق کے ایک دانے کی تشکیل اور فراہمی کے اندر کس قدر عوامل کام کرتے ہیں' مثلاً زمین' پانی' سورج کی شعاعیں اور ہوا۔ لوگ لفظ رزق سن کر صرف مال و دولت کی آخری شکل کو ذہن میں لاتے ہیں حالانکہ انسانی رزق کے دائرے میں بہت سی چیزیں آتی ہیں اور رزق کا مکمل نظام بہت ہی گہرا ہے۔ اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی کے قیام کے لیے کم از کم جس چیز کی ضرورت ہے اس کی فراہمی کے لیے یہ کائنات بڑے بڑے اجرام فلکی کو حرکت دے رہی ہے۔ اس کے اندر ایک نہایت گہرا قانون قدرت کام کرتا ہے اور ہزارہا سہولیات اور موافقات فراہم ہوتے ہیں جو باہم ہمقدم ہو کر کام کرتے ہیں۔ تب جا کر انسان کی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے کم سے کم معیار پورا ہوتا ہے۔ اگر ان موافقات میں سے کوئی ایک بھی نہ ہو تو اس حضرت انسان کا زندہ رہنا ہی محال ہو جائے اور اس کا وجود ہی نہ ہو۔ اس آیت میں جن اجرام کی حرکت اور خدمت کا ذکر کیا گیا ہے کہ یہ انسان کے رزق کے اسباب فراہم کرتے ہیں' یہ کافی و شافی ہے اور یہ تمام کام دست قدرت کے ہیں۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ (۱۴ : ۳۲) "اور جس نے کشتی کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے"۔ کیونکہ اللہ ہی ہے جس نے عناصر میں یہ خواص رکھے جن کی وجہ سے کشتی پانیوں پر چلتی ہے اور انسان کو ایسے عقلی خواص دیے جس نے یہ باتیں معلوم کیں۔ یہ سب کام انسان اللہ کے امر سے کر سکتا ہے۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ (۱۴ : ۳۲) "اور دریاؤں کو تمہارے لیے مسخر کیا"۔ ان دریاؤں کو بہایا' ان کے نتیجے میں زندگی کے دریا بہنے لگے اور انسانوں کے لیے خیر کے سوتے پھوٹ پڑے۔ پھر ان دریاؤں میں مچھلیاں اور بھلائی کی دوسری اشیاء' یہ سب چیزیں اللہ نے انسان کے لیے پیدا کیں۔ پرندے ہیں یا چرندے ہیں' انسان ان سے استفادہ کرتا ہے۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ (۱۴ : ۳۳) "اور سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جا رہے ہیں"۔ انسان براہ راست شمس و قمر سے استفادہ تو نہیں کر سکتا جس طرح پانی' فصلوں اور پھلوں سے' سمندروں اور کشتیوں اور نہروں اور دریاؤں سے براہ راست کرتا ہے لیکن شمس و قمر کے آثار انسان کے لیے مفید ہیں۔ ان سے انسان زندگی کا مواد لیتا ہے اور قوت حاصل کرتا ہے کیونکہ ان کو اللہ نے ایسے قانون قدرت کا پابند کر دیا ہے کہ یہ مسلسل انسان کے لیے اس کی ضرورت فراہم کرتے رہتے ہیں۔ انسانی زندگی کی ضروریات اور جسم انسانی کے خلیے سورج کی ان شعاعوں سے ترکیب' تجدید اور تغیر پاتے ہیں۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ (۱۴: ۳۳) "اور رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کیا"۔ ان کو اللہ نے انسانی ضرورت کے مطابق بنایا گردش لیل و نہار کا موجودہ نظام اس کرۂ ارض پر حیات انسانی کے لیے اور اس کی سرگرمیوں کے لیے ازبس ضروری ہے۔ اگر یہاں ہمیشہ دن ہوتا یا ہمیشہ رات ہوتی تو انسان سرے سے زندہ ہی نہ رہ سکتا۔ زمین کا یہ ماحول اس کے لیے ناساز گار ہو جاتا' یہ زندگی' یہ ترقیات اور یہ پیداوار مشکل بن جاتی۔

اللہ تعالیٰ کے بے شمار انعامات کی تو یہ صرف آؤٹ لائن ہیں۔ ان خطوط کے اندر انعامات الٰہی کے جو نکات ہیں' اگر ایک ایک نکتے پر بحث کی جائے تو مستقل کتاب بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ ان کو اجمالاً سمیٹ لیتے ہیں۔ ایک اصولی بات۔

وَ اٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ "جس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے مانگا"۔ مال' اولاد' صحت' ساز و سامان وغیرہ وغیرہ۔

وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (۱۴: ۳۴) "اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے"۔ یہ اس قدر زیادہ ہیں کہ انسانوں کی ایک عظیم جماعت بھی انہیں گن نہیں سکتی۔ بلکہ تمام انسان لگ جائیں تو بھی نہیں گن سکتے۔ اس لیے کہ انسان زمان و مکان کے اندر محدود ہے' اس کا علم محدود ہے' اس کے علم کی ابتداء بھی ہے اور انتہا بھی ہے اور زمان و مکان کے درمیان محدود بھی ہے جبکہ اللہ کے انعامات اس قدر زیادہ ہیں کہ انسان کے دائرہ علم و ادراک سے وراء ہیں۔ ان سب حقائق کے بعد بھی' اے لوگو' تم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو' اور یہ سب کچھ جانتے ہوئے تم اللہ کے انعامات کا شکر ادا نہیں کرتے بلکہ شکر کے بجائے تم کفر کرتے ہو' حق ہے :

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (۱۴: ۳۴) "حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے"۔ جب انسانی ضمیر جاگ اٹھتا ہے اور اپنے اردگرد کائنات کو چشم بینا سے دیکھنے لگتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ یہ پوری کائنات اس کے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ یا تو براہ راست اس کے کنٹرول میں ہے یا اس طرح کہ اللہ کے جاری کردہ ناموس قدرت کی رو سے یہ انسان کے لیے کام کر رہی ہے اور انسان کی ضروریات فراہم کر رہی ہے۔ جب اس طرح انسان اپنے ماحول پر غور کرتا ہے تو وہ اس حقیقت کو پا لیتا ہے کہ اللہ کے رحم و کرم کی وجہ سے یہ پورا ماحول انسان کا دوست ہے' انسان کا مددگار ہے' اور اللہ نے اس کو انسان کے لیے نہایت ہی نرم اور مطیع فرمان بنا دیا ہے۔ پھر انسان کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ وہ سر اٹھا کر ذرا اپنے ماحول پر غور و فکر کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو وہ کانپنے لگتا ہے۔ اللہ کا خوف کھاتا ہے۔ سجدہ ریز ہو جاتا ہے اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ اور پھر وہ خضوع و خشوع میں اس رب منعم کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر وہ کسی مشکل میں ہو تو فراخی کی دعا کرتا ہے اور اگر وہ اللہ کی نعمتوں میں ڈوبا ہوا ہو تو یہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ ان نعمتوں کو محفوظ اور جاری رکھ۔

اور انسان ذاکر اور شاکر اور متدبر کا اعلیٰ نمونہ ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے' جن کے نام سے یہ سورہ معنون ہے اور یہی مناسبت ہے کہ اس سورہ کے مضامین اور فضا بھی شکر اور ناشکری اور کفران نعمت کے محور کے گرد

گھومتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے اعلیٰ کردار میں پیش کیا جاتا ہے جس میں وہ مجسمہ شکر ہیں۔ نہایت خشوع و خضوع کی حالت میں ہیں اور نہایت ہی نرم اور دھیمے زمزمہ میں دست بدعا ہیں۔ آپ کی دعاؤں اور شکر کا یہ زمزمہ آسمان کی طرف نہایت ہی نرم اور باادب موجوں کی شکل میں بلند ہوتا ہے اور دور تک اس کی گونج آسمانوں میں غائب ہو جاتی ہے۔

---

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ
أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ ﴿٣٥﴾ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ ۖ فَمَنْ تَبِعَنِي
فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٣٦﴾ رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي
بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ
أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ﴿٣٧﴾
رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي وَمَا نُعْلِنُ ۗ وَمَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ فِي
الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ﴿٣٨﴾ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ
وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ ﴿٣٩﴾ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ
ذُرِّيَّتِي ۚ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ ﴿٤٠﴾ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ ۶
ع ۷ يَقُومُ الْحِسَابُ ﴿٤١﴾

۱۸

"یاد کرو وہ وقت جب ابراہیمؑ نے دعا کی تھی کہ "پروردگار' اس شہر (یعنی مکہ) کو امن کا شہر بنا اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔ پروردگار' ان بتوں نے بہتوں کو گمراہی میں ڈالا ہے (ممکن ہے کہ میری اولاد کو بھی یہ گمراہ کریں' لہٰذا ان میں سے) جو میرے طریقے پر چلے وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو یقیناً تو درگزر کرنے والا مہربان ہے۔ پروردگار' میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار' یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں' لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے' شاید کہ یہ شکر گزار بنیں۔ پروردگار' تو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں"۔

اور واقعی اللہ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے ' نہ زمین میں نہ آسمانوں میں --- ''شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسماعیلؑ اور اسحاقؑ جیسے بیٹے دیئے ' حقیقت یہ ہے کہ میرا رب ضرور دعا سنتا ہے ۔ اے میرے پروردگار ' مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی (ایسے لوگ اٹھا جو یہ کام کریں) ۔ پروردگار ' میری دعا قبول کر ۔ پروردگار ' مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کر دیجیو جبکہ حساب قائم ہو گا'' ۔

اس منظر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کے پاس کھڑے نظر آتے ہیں ۔ بیت اللہ کی تعمیر انہوں نے کر دی ہے اور یہ وہی بیت اللہ ہے جس کی تولیت اب قریش تک آپہنچی ہے ۔ اور ذرا دیکھو ان کو یہ اللہ کے ساتھ کفر بیت اللہ میں کرتے ہیں ۔ اور یہ کفر وہ اس گھر میں کرتے ہیں جس کے بنانے والے نے اسے صرف اللہ کی بندگی کے لیے بنایا تھا ۔ قرآن کریم اس منظر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک عاجزی کرنے والا ' اللہ سے نہایت ڈرنے والا ' ذکر و شکر کرنے والا ظاہر کرتا ہے ۔ یہ اس لیے کہ قریش ذرا غور کریں اور اپنے انکار اور ہٹ دھرمی کو ترک کر کے دعوت اسلامی کا اعتراف کر لیں 'کفر کے بجائے شکر کریں 'غفلت کے بجائے نصیحت حاصل کریں اور ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے کے دعوئے کے ساتھ ساتھ وہ جو بدراہ و گمراہ ہو گئے ' واپس ان کی اصلی راہ پر آجائیں اور حضرت ابراہیمؑ کی پیروی کر کے راہ ہدایت پر آجائیں ۔

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا (۱۴ : ۳۵) ''پروردگار' اس شہر (یعنی مکہ) کو امن کا شہر بنا دے'' ۔ امن وہ نعمت ہے جو ہر انسان کی ضرورت ہے ۔ انسان کے احساسات پر امن بہت اثر کرتا ہے 'کیونکہ انسان کی زندگی جاری ہی امن سے رہ سکتی ہے ۔ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائے امن کو اس لیے لایا گیا ہے کہ اہل مکہ کو بتایا جائے کہ ذرا عقل کے ناخن لو اور اس شہر کے امن کو تباہ نہ کرو ' بڑی دعاؤں کے بعد یہ ملا ہے ۔ تم ایک طویل عرصہ ہوا اس سے فائدہ اٹھاتے رہے ہو اور خود اپنے ہاتھوں سے تباہ کرتے ہو اور شکر نہیں کرتے ۔ یہ امن اس شہر کو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں سے حاصل ہوا ہے ۔ افسوس صد افسوس کہ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقے اور دین کو چھوڑ چکے ہو ' اور یوں ناشکری کرتے ہو ۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ اس خانہ توحید میں تم نے اللہ کے شریکوں کے بت رکھ چھوڑے ہیں ' تم اس شہر میں حضرت ابراہیم کے دین اور اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہو ' حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے اس حصے پر تو غور کرو ۔

وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (۱۴ : ۳۵) ''اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا'' ۔ حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رب کے سامنے تسلیم و رضا کے پیکر ہیں ۔ اور دل کی گہرائیوں سے التجا کر رہے ہیں ۔ دعا یہ ہے کہ اے اللہ مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائیو ' آپ اپنی دعا میں مدد بھی طلب فرماتے ہیں اور راہنمائی بھی چاہتے ہیں ۔ اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس ہدایت کو اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے دل شرک اور بت پرستی کی تاریکیوں سے نکل آتا ہے اور جہالت کے بدلے علم اور تاریکی کے بدلے روشنی پاتا ہے ۔ یعنی ایمان باللہ اور توحید کی ہدایت اور روشنی ۔ توحید میں آخر انسان حیرت اور پریشانی کے تہ بہ تہ اندھیروں سے نکل جاتا ہے اور گمراہی اور بدکرداری سے بچ نکلتا ہے ۔ وہ روشن دماغ ' پرسکون اور برقرار ہوتا ہے اور مختلف الہوں اور خداؤں کی بندگی سے نکل کر اور ذلت اور غلامی سے نکل کر ' ایک خدا کی نہایت ہی باعزت بندگی

میں داخل ہوتا ہے اور ایک آزاد زندگی پاتا ہے۔ یہ وہ انعامات ہیں جو حضرت ابراہیم پر رب تعالیٰ نے کر رکھے تھے۔ اب وہ دعا کرتے ہیں کہ یہ انعامات برقرار رہیں۔ وہ بھی اور ان کی اولاد بھی بت پرستی کی لعنت سے دور رہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ دعا اس لیے کرتے ہیں کہ وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ماحول میں ان کی ہم عصر نسلوں میں سے اکثریت کو بت پرستی نے گمراہ کر رکھا ہے' سابقہ لوگ بھی اس میں مبتلائے ہوئے اور خلق کثیر کو ان بتوں نے گمراہ کیا۔

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ( ١٤ : ٣٦ ) "اے رب' ان بتوں نے بہتوں کو گمراہی میں ڈال دیا ہے"۔ اب یہ دعا اعلان کا رنگ اختیار کرتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اللہ جو شخص میرے طریقے کو اپنائے گا وہی میرا ہو گا' وہ میری طرف نسبت کر سکے گا' اور قیامت میں میرے ساتھیوں میں سے ہو گا۔ ایمان اور نظریہ کا رفیق ہو گا۔

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ( ١٤ : ٣٦ ) "لہٰذا ان میں سے جو میرے طریقے پر چلے وہ میرا ہے"۔ اور جو میرے طریقے کو چھوڑ دے تو اس کا انجام میں تیرے سپرد کرتا ہوں۔

وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ( ١٤ : ٣٦ ) "اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو' تو درگزر کرنے والا مہربان ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کس قدر مہربان' رحیم اور بردبار اور صبر کرنے والے تھے۔ اس لیے وہ ان لوگوں کی ہلاکت کا مطالبہ نہیں کرتے۔ جو لوگ حضرت ابراہیمؑ کے طریقوں کو نہیں اپناتے اور ادھر ادھر ہو جاتے ہیں' آپ ان کے لیے عذاب میں جلدی نہیں فرماتے بلکہ عذاب کا تذکرہ ہی نہیں کرتے۔ آپ ان لوگوں کو جو حضرت کے طریقوں سے ہٹ جاتے ہیں' اللہ کے رحم و کرم کے سپرد کرتے ہیں' عفو و درگزر کے حوالے کرتے ہیں۔ چنانچہ اس فضا پر رحمت اور مغفرت کے سائے پھیل جاتے ہیں اور رحمت و شفقت اور معرفت کے ان سایوں کے نتیجے میں معصیت کی فضا دب جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام معصیت کی فضا کو کھولتے نہیں' پس منظر میں لے جاتے ہیں۔

اب اس سے آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے سامنے یہ درخواست پیش فرماتے ہیں کہ اے اللہ تو دیکھ رہا ہے کہ میں نے اپنی اولاد میں سے بعض لوگوں کو اس بنجر وادی میں مستقلاً آباد کر دیا ہے۔ جو بیت اللہ کے قریب ہونے کے سوا بنجر اور پسماندہ ہے اور یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ ان لوگوں کو یہاں بسانے کا مقصد کیا ہے۔

رَبَّنَا اِنِّيْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ( ١٤ : ٣٧ ) "اے رب' میں نے اس بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے ساتھ لا بسایا ہے"۔ یہ کیوں؟

رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ( ١٤ : ٣٧ ) "پروردگار' یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز

قائم کریں"۔ فقط اقامت صلوۃ مقصد ہے اور صرف اس مقصد کے لیے اس بنجر اور خشک وادی میں ان کو بسایا ہے۔

فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ (۱۴:۳۷) "لہذا لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا"۔ دعا میں کس قدر رقت ہے اور فضا میں کس قدر سرور ہے' دل میں رقت پیدا ہوتی ہے اور مشتاقان دید اڑ اڑ کر اس شہر پر گرتے نظر آتے ہیں۔ اس وادی غیر ذی زرع اور خشک و بنجر کی طرف عاشقوں کے قافلے رواں دواں ہیں۔ غرض اس دعا کے اندر اس قدر تروتازگی ہے اور دعا کے اندر اس قدر رقت ہے کہ قریب ہے کہ پوری کائنات کے آنسو اس وادی کو تر کر دیں۔

وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ (۱۴:۳۷) "اور انہیں کھانے کو پھل دے"۔ اور یہ پھل ان کو ان لوگوں کے ذریعہ ملیں جو ہر طرف سے اس گھر اور ان لوگوں پر پروانوں کی طرح آگریں۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ وہ کھائیں پئیں اور مزے کریں' اور اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جیسے شکرگزار ہونے کی خواہش ظاہر ہے کہ یہی ہے۔

لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (۱۴:۳۷) "شاید یہ شکرگزار بنیں"۔ چنانچہ حضرت ابراہیم اپنی اولاد کو بیت اللہ کے پڑوس میں آباد کرتے ہیں اور سیاق کلام سے اس کا مقصد یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہاں رہ کر نمازوں کو قائم کریں جس طرح نماز کو قائم کرنے کا طریقہ ہوتا ہے۔ نیز حضرت ابراہیم کی اس دعا کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس خواہش کے پیچھے صرف یہ جذبہ ہے کہ لوگ اللہ کے شکرگزار ہوں۔ لوگوں کے دل بیت اللہ اور اہل بیت اللہ کی طرف کھنچ آئیں' پھر لوگوں کے اس اجتماع سے ان کے لیے پھلوں اور غلوں کی شکل میں خوراک فراہم ہو اور اس کے جواب میں یہ لوگ اللہ کا شکر ادا کریں۔

اس دعا کی روشنی میں قرآن کریم اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ قریش جس مقصد کے لیے بیت اللہ کے قریب بسائے گئے تھے انہوں نے وہ مقصد ترک کر دیا ہے۔ نہ وہ اللہ کے لیے نماز قائم کرتے ہیں اور نہ اللہ کے ان انعامات پر اس کا شکر ادا کرتے ہیں حالانکہ ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول ہو چکی ہے۔ بیت اللہ پر لوگوں کا اجتماع جاری ہے اور پھل اور فروٹ ہر طرف سے ان کے لیے وافر مقدار میں آ رہے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اس دعا پر' کہ اس نے اپنی اولاد کو یہاں بسایا ہے اور ان کو پھل اور دوسری ضروریات فراہم ہوں' تاکہ وہ نماز قائم کریں اور اللہ کا شکر ادا کریں' اب خود تبصرہ فرماتے ہیں کہ اللہ تو سب لوگوں کے دلوں کی خواہشات کو جانتا ہے خواہ ظاہری ہوں یا خفیہ ہوں۔ اگر کوئی خدا کے خوف سے نماز پڑھتا ہے اور شکر کرتا ہے تو اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی طرف توجہ میں مظاہر کی اہمیت نہیں ہے' جس طرح یہ لوگ بیت اللہ میں تالیاں بجاتے اور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ عبادت اور دعا تو اصل وہ ہوتی ہے جس میں کسی کا قلب و ضمیر اللہ کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ اللہ سے کسی کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ تو زمین و آسمان میں ظاہر و خفیہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ وَمَا يَخْفٰي عَلَي اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ (۱۴:۳۷) "پروردگار' تو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں" ۔اور واقعی اللہ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے ' نہ زمین میں نہ آسمانوں میں"۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کی سابقہ مہربانیوں کو یاد کر کے اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور حمد کرتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَي الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ (۱۴:۳۹) "شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسماعیل ؑ اور اسحاق ؑ جیسے بیٹے دیئے ' حقیقت یہ ہے کہ میرا رب ضرور دعا سنتا ہے"۔اگر کسی کو بڑھاپے میں اولاد دے دی جائے جبکہ اس سے قبل اس کی اولاد نہ ہو تو اس پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے کیونکہ اولاد دراصل انسانی زندگی کا تسلسل ہے ۔اگر انسان کی زندگی قریب الاختتام ہو اور اسے غیر متوقع طور پر اولاد مل جائے تو یہ نہایت ہی اطمینان کی بات ہوتی ہے کیونکہ انسانی نفس ہمیشہ یہ ضرورت محسوس کرتا ہے کہ اس کی اولاد ہو۔یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم حمد باری کرتے ہیں اور اللہ کی مزید رحمت کے امیدوار ہیں۔

اب اس شکر اور حمد کے بعد یہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ مجھے شکر ادا کرنے اور حمد باری تعالیٰ پر مداومت عطا فرما' کہ میں تیری عبادت کرتا رہوں ' اطاعت کرتا رہوں ۔یوں حضرت ابراہیم ؑ اپنے اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ شکر کرتے رہیں گے ' عبادت الٰہی کرتے رہیں گے اور یہ دعا اس ڈر سے کر رہے ہیں کہ کہیں اس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو جائے 'کوئی امر ان کو اس سے موڑ نہ دے ۔چنانچہ اپنے اس عزم کو بھی اب اللہ کی امداد سے جاری رکھنے کی دعا کرتے ہیں۔

رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ (۱۴:۴۰) "اے میرے پروردگار' مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد سے بھی (ایسے لوگ اٹھا جو یہ کام کریں)۔پروردگار' میری دعا قبول کر"۔ایک بار پھر ہمیں حضرت ابراہیم ؑ اور ان کی اولاد اہل قریش کے موقف میں مکمل تضاد نظر آتا ہے' ابراہیم علیہ السلام اللہ سے اس بات کے لیے مدد طلب کرتے ہیں کہ مجھے نماز قائم کرنے والا بنا دے اور اس کام میں مجھے اور میری اولاد کو توفیق دے مگر اس کی اولاد ہے کہ وہ نماز سے اعراض کر رہی ہے ۔اور حضرت ابراہیم ؑ کی اولاد ہی سے جو رسول ان کے پاس آیا اور جو انہیں نصیحت کرتا ہے' اور حضرت ابراہیم ؑ کی تعلیمات یاد دلاتا ہے یہ لوگ اس کی تکذیب پر تلے ہوئے ہیں' حالانکہ یہ خود ان میں سے ہے۔

حضرت ابراہیم ؑ اپنی اس خضوع و خشوع اور عاجزی سے بھری ہوئی دعا کو اپنے لیے اور اپنے والدین کے لیے اور تمام مومنین کے لیے طلب مغفرت پر ختم فرماتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں حساب کے دن بخش دیجئے ۔کیونکہ حساب کے دن تو ہر شخص کو صرف عمل ہی فائدہ دے گا یا پھر اللہ کی طرف سے مغفرت ہی اس کا کام کرے گی۔

رَبَّنَا اغْفِرْلِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ (۱۴:۴۱) "پروردگار'

مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کر دیجیو جبکہ حساب قائم ہو گا"۔ خشوع و خضوع سے بھرپور اس دعا کا منظر یہاں ختم ہوتا ہے جس میں اللہ کی بے بہا نعمتوں اور ان پر شکر کے مناظر دکھائے گئے' جس میں گفتگو کا ٹون نہایت ہی دھیمی موسیقی کا تھا' جس طرح ہلکی ہوائیں سطح آب پر ہلکی سی موجیں اٹھتی ہیں۔ اس منظر سے پورے ماحول پر ایک الوداعی اور لطیف جذباتی فضا طاری ہو جاتی ہے۔ انسانی دل اللہ کی پناہ میں آجاتے ہیں۔ اللہ کے انعامات کو یاد کرتے ہیں اور یہ منظر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک بندۂ ذاکر و شاکر کے طور پر تصور کرتا ہے' جس طرح اس دعا سے پہلے تمام بندگان خدا کو قرآن نے دعوت دی تھی کہ وہ اللہ کے بندگان ذاکر و شاکر بن جائیں۔

یہاں قارئین یہ بات نوٹ کرنا بھول نہ جائیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس پرسوز دعا میں "ربنا" اور "رب" اور "ربی" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ آپ نے اپنے لیے اور آپ کے بعد اپنی اولاد کے لیے اللہ کی صفت ربوبیت کو جان بوجھ کر استعمال کیا ہے اور اس میں گہری حکمت پوشیدہ ہے۔ آپ یہاں اللہ کی صفت الوہیت کو نہیں لاتے بلکہ صفت ربوبیت کو تکرار لاتے ہیں اس لیے کہ تمام جاہلیتوں خصوصاً عربی جاہلیت میں اللہ کی الوہیت مختلف فیہ نہیں رہی ہے۔ جس چیز میں ہمیشہ اختلاف واقع ہوتا ہے وہ اللہ کی صفت ربوبیت ہے۔ یعنی رب وہ ہوتا ہے جس کا تجویز کردہ نظام' دین اور شریعت اس زمین پر چلتا ہے۔ اور یہی اصل عملی مسئلہ ہوتا ہے جو لوگوں کی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے اسلام اور جاہلیت میں تمیز ہوتی ہے' توحید شرک سے جدا ہوتی ہے کیونکہ لوگ یا تو اللہ کے دین میں ہوں گے تو اللہ ان کا رب ہو گا یا وہ غیر اللہ کے نظام میں ہوں گے پھر یہ غیر اللہ ان کا رب ہو گا۔ اسلام اور جاہلیت اور توحید اور شرک میں یہی فرق ہے جو عملی زندگی میں اسلام کو جاہلیت اور توحید کو شرک سے جدا کرتا ہے۔ قرآن کریم یہاں قریش پر ان کے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں ربوبیت کے مسئلے کو اس لیے پیش کرتا ہے اور ربوبیت پر اسی لیے زور دیتا ہے کہ وہ عربوں اور قریش پر واضح کرنا چاہتا ہے کہ تم اپنے جد امجد کی وصیت اور دعاؤں کے خلاف جا رہے ہو۔

سیاق کلام میں اس حصے کا آغاز ان آیات پر کیا گیا تھا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (۱۴ : ۲۸) "وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی نعمت پائی اور اسے کفران نعمت سے بدل ڈالا اور اپنی قوم کو بھی ہلاکت کے گھر میں جھونک دیا"۔ یہ لوگ بدستور اپنی اس ظالمانہ چال پر قائم رہے' لیکن ان پر عذاب الٰہی بھی نہ آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ان سے یہ کہیں

قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِیْرَكُمْ اِلَی النَّارِ (۱۴ : ۳۰) "کہو' اچھا مزے کر لو' آخرکار تمہیں پلٹ کر دوزخ ہی میں جانا ہے"۔ اور حضور اکرم کو مزید حکم دیا گیا تھا کہ آپ اپنی دعوت کا رخ اہل ایمان کی طرف پھیر دیں' انہیں نماز اور کھلے طور پر اور خفیہ طور پر انفاق پر آمادہ کریں۔

مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خِلٰلٌ (۱۴ : ۳۱) "قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں

نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوست نوازی ہو سکے گی" اب اس حصے کی تکمیل اس پر ہوتی ہے کہ جو لوگ اللہ کی نعمتوں کا کفران کرتے ہیں۔ ان کے لیے اللہ نے کیا تیار کر رکھا ہے اور وہ اپنے اس انجام تک کب پہنچیں گے اور یہ بات قیامت کے مناظر کی شکل میں بتائی جاتی ہے۔ جو پے در پے آتے ہیں۔ جن میں مارے خوف کے انسانی قدم ڈگمگائے جاتے ہیں اور دل تھر تھر کانپتے ہیں۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴿۴۲﴾ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴿۴۳﴾

"اب یہ ظالم لوگ جو کچھ کر رہے ہیں' اللہ کو تم اس سے غافل نہ سمجھو۔ اللہ تو انہیں ٹال رہا ہے اس دن کے لیے جب حال یہ ہو گا کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں' سر اٹھائے بھاگے چلے جا رہے ہیں' نظریں اوپر جمی ہیں اور دل اڑے جاتے ہیں"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اللہ کو ظالموں کے اعمال سے غافل نہ سمجھتے تھے۔ لیکن بظاہر یہ بات نظر آتی تھی کہ لوگ دیکھتے تھے کہ ظالم عیش کر رہے ہیں۔ اللہ کی دھمکیاں سن رہے ہیں' دنیا کی زندگی گزر رہی ہے اور ان ظالموں کو اللہ کا کوئی عذاب اپنی گرفت میں نہیں لیتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ یہ انداز کلام اختیار کرتے ہیں تاکہ یہ یقین کر لیا جائے کہ یہ لوگ اپنے لیے متعین مہلت کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ آخر میں اللہ ایسے لوگوں کو وقت آنے پر پکڑتا ہے اور اس کی پکڑ ایسی ہوتی ہے کہ پھر اس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔ وہ ایسا سخت دن ہو گا جس میں ان کی نظریں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی اور وہ نہایت جزع و فزع کی حالت میں ہوں گے۔ آنکھیں کھلی ہوں گی لیکن ان کے حواس مبہوت ہو جائیں گے اور ان کو کچھ نظر نہ آئے گا۔ اس قدر خوف ہو گا کہ ان کی نظر جہاں جم گئی جم گئی اور پھر اس ہولناک دن میں پوری قوم کی حالت یوں ہو گی کہ وہ بھاگے بھاگے پھریں گے۔ کسی چیز کی طرف ان کا دھیان نہ ہو گا۔ کسی چیز کی طرف التفات نہ ہو گا۔ سر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ خوشی سے نہیں بلکہ مجبوراً ان کے سر اوپر کو اٹھے ہوئے ہوں گے۔ کسی بھی منظر پر جب ان کی نظر اٹھ کر جم جائے گی تو اس سے ہٹا نہ سکیں گے اور نظر وہیں کی وہیں ٹک جائے گی۔ ان کے دل ہوا ہوں گے 'اڑے اڑے پھر رہے ہوں۔ نہ کچھ یاد ہو گا' نہ کوئی حجت و دلیل ہو گی نہ کوئی تدبیر ہو گی۔

یہ ہے وہ دن جس کی طرف اللہ ان کو موخر کر رہا ہے۔ اس طرح یہ اس میدان میں کھڑے ہوں گے' نہایت خوفزدہ۔ آیت کے ان چار ٹکڑوں میں ان کی حالت یہ نظر آتی ہے جس طرح ایک طاقتور باشے (باز) کے پنجوں میں ایک نہایت ہی چھوٹا پرندہ پھنس جاتا ہے اور وہ اسے دبوچ لیتا ہے۔ ذرا دوبارہ پڑھیں:

اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ (۴۲) مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا

یرتد الیھم طرفھم و افئدتھم ھوآء (۴۳) (۱۴ : ۴۲ - ۴۳) اللہ تو انہیں ٹال رہا ہے۔ اس دن کے لیے جب حال یہ ہو گا کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں ' سر اٹھائے بھاگے چلے جارہے ہیں 'نظریں اوپر جمی ہیں اور دل اڑے جاتے ہیں"۔

سر اٹھائے تیز تیز بھاگنا' یوں کہ نظریں آسمانوں پر جمی ہوں اس طرح کہ ٹکٹکی بندھ گئی ہو' اور دل کی حالت یہ ہو کہ وہ ہوا کی طرح اڑ رہا ہے اور کچھ سمجھ میں نہ آرہا ہو' تو یہ ایسی حالت جس میں انتہائی خوف ظاہر کیا گیا ہے 'جس میں انسان کی نظر ایک جگہ ٹک جاتی ہے۔

یہ دن جس کی طرف اللہ ان کو لے جارہا ہے اور اس مہلت کے ختم ہونے کا وہاں ان کا انتظار ہو رہا ہے ' تو اے پیغمبر' ان لوگوں کو اس دن سے ڈراؤ جس میں کوئی عذر قبول نہ ہو گا اور کوئی صورت چھٹکارے کی نہ ہو گی۔ چنانچہ اس خوفناک دن کا ایک دوسرا منظر لایا جاتا ہے۔

وَأَنذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُوا رَبَّنَا أَخِّرْنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۗ أَوَلَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُم مِّن قَبْلُ مَا لَكُم مِّن زَوَالٍ ﴿٤٤﴾ وَسَكَنتُمْ فِي مَسَاكِنِ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْأَمْثَالَ ﴿٤٥﴾

"اے نبی ' اس دن سے تم انہیں ڈرا دو جبکہ عذاب انہیں آلے گا۔ اس وقت یہ ظالم کہیں گے کہ "اے ہمارے رب ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے ' ہم تیری دعوت کو لبیک کہیں گے ' اور رسولوں کی پیروی کریں گے"۔ (مگر انہیں صاف جواب دے دیا جائے گا کہ) "کیا تم وہی لوگ نہیں ہو جو اس سے پہلے قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ہم پر تو کبھی زوال آتا ہی نہیں ہے؟ حالانکہ تم ان قوموں کی بستیوں میں رہ بس چکے تھے جنہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا تھا اور دیکھ چکے تھے کہ ہم نے ان سے کیا سلوک کیا اور ان کی مثالیں دے دے کر ہم تمہیں سمجھا بھی چکے تھے"۔

اے پیغمبر ان لوگوں کو اس عذاب سے ڈرائیں جس کا نقشہ ابھی کھینچا گیا' اس دن یہ ظالم بڑے پر امید ہو کر اور برخوردار بن کر یہ سوال کریں گے "ربنا" (اے ہمارے رب) آج تو وہ بہت احترام سے ربنا کہتے ہیں جبکہ دنیا میں تو وہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے۔

اخرنآ الی اجل قریب نجب دعوتك و نتبع الرسل (۱۴ : ۴۴) "ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے ' ہم تیری دعوت پر لبیک کہیں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے"۔

اب یہاں حکایتی انداز کلام براہ راست خطاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے 'گویا وہ ہمارے سامنے کھڑے ہیں ' دیکھ رہے ہیں اور مطالبہ کر رہے ہیں ' دعا کر رہے ہیں اور ہم اب میدان حشر میں ہیں 'حیات دنیا کا دفتر لپیٹ دیا گیا ہے اور وہ

دیکھو عالم بالا سے ان کو براہ راست مخاطب کر کے سخت سرزنش اور سخت شرمندہ کیا جا رہا ہے اور ان کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھو و تم کیا کرتے رہے ہو۔

اولم تکونوا اقسمتم من قبل مالکم من زوال (۱۴ : ۴۴) "کیا تم لوگ وہی نہیں ہو جو اس سے پہلے قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ہم پر تو کبھی زوال آتا ہی نہیں ہے"۔ اب تمہاری کیا رائے ہے؟ تم زوال پذیر ہو گئے یا نہیں؟ تم تو ایسی باتیں کیا کرتے تھے جبکہ امم سابقہ کے آثار اور تاریخ تمہارے سامنے تھی۔ ظالموں اور سرکشوں کا انجام تو سامنے تھا۔

وسکنتم فی مسکن الذین ظلموا انفسھم وتبین لکم کیف فعلنا بھم وضربنا لکم الامثال (۱۴ : ۴۵) "حالانکہ تم ان قوموں کی بستیوں میں رہ بس چکے تھے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا اور دیکھ چکے تھے کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور ان کی مثالیں دے کر تمہیں سمجھا چکے تھے"۔ لیکن تمہارا رویہ بھی عجیب تھا کہ ان ظالموں کے کھنڈرات اور ان کے احوال کو دیکھ کر کہ وہ ان سے خالی پڑے ہیں اور ان کے شہروں میں اب تم بس رہے ہو اور پھر بھی تم قسمیں کھا رہے تھے۔ "تمہارے لیے کوئی زوال نہیں ہے"۔۔۔ یہاں اب یہ منظر ختم ہو جاتا ہے اور ہم جان لیتے ہیں کہ ان کی دعا اور اسے مسترد کرنے کے بعد اب ان کا انجام کیا ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری زندگی میں ایسی صورت حال رات اور دن پیش آتی رہتی ہے۔ کئی سرکش اور ڈکٹیٹر ان لوگوں کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں جو ان سے پہلے گزرے اور بعض اوقات تو یوں ہوتا ہے کہ ان برسر اقتدار سرکشوں کے ہاتھوں ہی وہ مغلوب ہو کر ٹھکانے لگائے گئے ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے یہ جانشینان پھر سرکشی اور جباری و قہاری شروع کر دیتے ہیں اور عین ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور ہلاکت کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے شعور و وجدان کے اندر اس سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کے عبرتناک واقعات کوئی ارتعاش پیدا نہیں کرتے حالانکہ ان کی تاریخ پکار رہی ہوتی ہے۔ یہی تمہاری تاریخ ہے۔ پھر جب اللہ کی پکڑ آتی ہے تو یہ بھی اپنے پیش روؤں کی طرح پکڑے جاتے ہیں اور یہ بھی ان کے ساتھ 'اسی انجام سے دوچار ہوتے ہوئے جا ملتے ہیں اور اللہ کی زمین ان ناپاک لوگوں سے خالی کر دی جاتی ہے۔

اب پردہ گرتا ہے 'قیامت کا منظر لپیٹ دیا جاتا ہے اور ان لوگوں کے موجودہ حالات پر بات شروع ہوتی ہے جو اس دنیا میں موجود تھے۔ یہ لوگ حضور اکرم اور مومنین کے خلاف رات اور دن سازشیں کر رہے تھے اور زندگی کے میدانوں کے ہر پہلو کے اعتبار سے اسلام کے خلاف فتنے برپا کرتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ تمہارا مکر و فریب اور پروپیگنڈا جس قدر بھی عظیم ہو تمہیں اللہ اقوام ماقبل ہی کی طرح پکڑے گا۔

وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ۗ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾

"انہوں نے اپنی ساری ہی چالیں چل دیکھیں 'مگر ان کی ہر چال کا توڑ اللہ کے پاس تھا اگرچہ ان کی چالیں ایسی

غضب کی تھیں کہ پہاڑ ان سے ٹل جائیں"۔

اللہ ان کو بھی گھیرے ہوئے ہے اور ان کی مکاری بھی اللہ کے دائرہ قدرت میں ہے اگرچہ ان کی تدابیر اس قدر سخت اور شدید ہوں کہ ان کے ذریعہ پہاڑوں کو بھی اپنی جگہ سے ہٹایا جاسکتا ہو۔ ظاہر ہے کہ کسی پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹانے کے لیے بہت بڑی قوت کی ضرورت ہے اور اس کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگرچہ یہ بہت بڑے بڑے مکر اور فریب کرتے ہیں لیکن ان کا کوئی فریب اللہ کے دائرہ قدرت سے باہر نہیں ہے بلکہ اللہ جس طرح چاہے وہ ان کی مکاریوں کو ختم کر سکتا ہے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝

"پس اے نبی ، تم ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ اللہ کبھی اپنے رسولوں سے کیے ہوئے وعدوں کے خلاف کرے گا۔ اللہ زبردست ہے اور انتقام لینے والا ہے"۔

یہ لوگ جو تدابیر کرتے ہیں یہ اللہ کے مقابلے میں موثر نہیں ہیں اور اللہ اپنے رسولوں اور اپنی تحریکات کی جب مدد کرنا چاہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ "وہ تو زبردست ہے اور انتقام لینے والا ہے"۔

اس سے کوئی ظالم بچ کر نہیں نکل سکتا اور کوئی مکار اس کے عذاب سے نجات نہیں پاسکتا۔ یہاں ظلم اور سرکشی اور عظیم مکاری کے بالمقابل لفظ انتقام لایا گیا ہے جو نہایت موزوں ہے کیونکہ ظالم اور مکار سے انتقام لینا مناسب ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف جب انتقام کی نسبت ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں ظلم و سرکشی کی مناسب جزاء و سزا اور اس میں بھی عادلانہ طریق کار۔ اور یہ عادلانہ جزاء و سزا تب واقعہ ہوگی۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ

"ذرا ڈراؤ انہیں اس دن سے جبکہ زمین اور آسمان بدل کر کچھ سے کچھ کر دیئے جائیں گے"۔ یہ کیونکر ہوگا، اس کی تفصیلات کا ہمیں علم نہیں ہے، نہ ہمیں معلوم ہے کہ اس دوسری زمین کی طبیعیات کیسی ہوں گی اور یہ ہوگی کہاں، البتہ قرآن کی یہ آیات ہمارے شعور کے اندر یہ تاثر بٹھاتی ہے کہ یہ لوگ کیا ہیں اور ان کی مکاریاں کیا ہیں، اللہ کی قدرت کا تو یہ عالم ہے کہ وہ زمین و آسمان کو بدل کر رکھ دے گا۔ ان کی کامیابیاں اللہ کے مقابلے میں حقیر اور معمولی ہیں۔ وہ دیکھو دوسرے منظر میں یہ زمین و آسمان تو قدرت نے بدل کر رکھ دیئے!!

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝

"اور سب کے سب اللہ واحد قہار کے سامنے بے نقاب حاضر ہو جائیں گے"۔ ان کو یہ احساس ہو جائے گا کہ وہ تو اللہ کے سامنے کھلے اور ننگے کھڑے ہیں۔ کوئی انہیں بچانے والا نہیں ہے۔ نہ اپنے گھروں میں چھپے ہیں! وہ تو قبروں میں بھی نہیں! وہ تو ایک کھلے میدان میں اللہ واحد و قہار کے سامنے کھڑے ہیں۔ یہاں "قہار" کا لفظ عمداً استعمال ہوا تاکہ سرکشوں اور ڈکٹیٹروں کو ذرا متنبہ کر دیا جائے کہ ان کی سرکشی اللہ کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔ اگرچہ یہ سرکشی اور مکاری اس قدر سخت ہو کہ اس سے پہاڑوں کو ہٹایا جاسکتا ہو۔

اب ہمارے سامنے مناظر عذاب قیامت میں سے ایک شدید اور سخت منظر پیش کیا جاتا ہے جو نہایت ذلیل کرنے والا ہے اور سرکشوں اور جابر مکاروں کے لیے موزوں ہے۔

وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ﴿٤٩﴾ سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ وَتَغْشَىٰ وُجُوهَهُمُ النَّارُ ﴿٥٠﴾

"اس روز تم مجرموں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ہوں گے' تارکول کے لباس پہنے ہوئے ہوں گے اور آگ کے شعلے ان کے چہروں پر چھائے جا رہے ہوں گے"۔

ان مجرموں کا منظر یوں ہے کہ دو دو زنجیروں میں بندھے ہوں گے۔ صف در صف جا رہے ہوں گے۔ اللہ قہار کی طرف سے یہ ان کی تذلیل ہو گی۔ مزید یہ کہ ان کا لباس ایک ایسے مواد سے بنا ہو گا جو سخت آتش گیر ہو گا اور اس کے ساتھ ساتھ سیاہ تارکول سے ہو گا۔ یہ ان کی مزید تذلیل ہو گی۔ مقصد یہ ہے کہ آگ کے قریب آتے ہی یہ لوگ شعلوں کے نذر ہوں گے۔

وَتَغْشَىٰ وُجُوهَهُمُ النَّارُ (۱۴ : ۵۰) "ان کے چہروں کو آگ ڈھانپ لے گی"۔ یہ ایک ذلیل عذاب ہو گا' اور ان کے مکر اور سرکشی اور استکبار کے لیے مناسب علاج۔

لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٥١﴾

"یہ اس لیے ہو گا کہ اللہ ہر متنفس کو اس کے کیے کا بدلہ دے۔ اللہ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی"۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ظلم اور مکاری کو اپنا کسب بنا لیا تھا' تو اللہ کی طرف سے ان پر قہر نازل ہو گا اور وہ ذلیل ہوں گے۔ اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے' ان کی مکاری اور گہری تدابیر کے لیے مناسب ہے کہ جلدی ان کا حساب لیا جائے کیونکہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ ان کی اس مکاری کو ظاہر نہ کرے گا اور کوئی قوت بھی ان پر غالب نہ آسکے گی چنانچہ اللہ بڑی سرعت سے اب ان سے حساب بھی لے گا اور نہایت ذلت کے ساتھ انہیں عذاب بھی دے گا۔

آخر میں سورت کا خاتمہ اسی مضمون پر ہوتا ہے جس سے اس کو شروع کیا گیا تھا لیکن یہ خاتمہ ایک اعلان عام کی شکل میں ہے جو ببانگ دہل کیا جاتا ہے تاکہ تمام لوگوں تک ہر جگہ یہ اعلان عام پہنچ جائے۔

هَٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنذَرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَلِيَذَّكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿٥٢﴾ ع

19

"یہ ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لیے' اور یہ بھیجا گیا ہے اس لیے کہ ان کو اس کے ذریعہ سے خبردار کر دیا جائے اور وہ جان لیں کہ حقیقت میں خدا بس ایک ہی ہے اور جو عقل رکھتے ہیں وہ ہوش میں آجائیں"۔ اس اعلان عام کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ لوگ جان لیں کہ اللہ ایک ہی الٰہ اور حاکم ہے۔ یہ وہ بنیادی اصول ہے جس کے اوپر اسلامی نظام قائم ہے۔

لیکن اس اعلان عام سے اصل غرض و غایت بجرد نہیں ہے بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ لوگ اپنی زندگی کا پورا نظام اس اصول پر قائم کریں اور اپنی پوری زندگی میں اللہ کی اطاعت اختیار کریں۔ اگر وہ اللہ کو واحد الٰہ اور حاکم سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اگر کسی کو الٰہ اور خالق و مالک سمجھا جاتا ہے تو وہی حاکم اور رب بھی ہو گا۔ وہی سربراہ 'متصرف فی الامور' ڈائریکٹر اور قانون ساز ہو گا۔ اس ایمان و اعلان پر اگر انسانی زندگی کو عملاً قائم کیا جائے تو وہ عملی نظام اس نظام کے سراسر متضاد ہو گا جو اس اصول اور اعلان پر قائم کیا جائے کہ کچھ لوگ اپنے جیسے کچھ لوگوں کے غلام ہوں گے۔ اور انسانوں میں سے کچھ حاکم ' قانون ساز اور ظالم ہوں گے۔ یہ ایک بنیادی اختلاف ہے 'جس کی وجہ سے عقائد و تصورات مختلف ہو جاتے ہیں۔ شعائر اور مراسم عبادت مختلف ہو جاتے ہیں۔ اخلاق اور طرز عمل مختلف ہو جاتے ہیں۔ حسن و قبح کی قدریں بدل جاتی ہیں 'اور سیاسی اور اقتصادی نظام بدل جاتے ہیں۔ غرض کسی سوسائٹی کو ان میں سے کسی قاعدے پر منظم کیا جائے تو اس کے انفرادی اور اجتماعی خدوخال ہی بدل جائیں گے۔

یہ نظریہ کہ اللہ ایک ہے اور وہی حاکم ہے اس کی بنیاد پر ایک مکمل نظام حیات تعمیر ہوتا ہے۔ یہ نظریہ صرف ذہنوں میں بیٹھے رہنے والا نظریہ نہیں ہے۔ اسلامی نظریہ حیات محض عقائد تک محدود نہیں ہے 'اس کی حدود بہت آگے چلی جاتی ہیں۔ یہ نظریہ انسان کی پوری عملی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اللہ کی حاکمیت کا نظریہ اسلامی عقائد کا ایک حصہ ہے۔ اسلامی اخلاق کا قیام بھی ہمارے عقائد کا حصہ ہے۔ اور یہ ایک ایسا عقیدہ اور نظریہ حیات ہے جس سے ایک مکمل نظام پھوٹ کر نکلتا ہے۔ نئی قدریں وجود میں آتی ہیں اور یہ دنیا میں نئے حالات اور نیا دستوری اور قانونی نظام پیش کرتا ہے۔

ہم اس وقت تک قرآنی 'مقاصد و اہداف کا ادراک نہیں کر سکتے 'جب تک ہم قرآنی عقائد و نظریات کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں اور جب تک ہم کلمہ شہادت کے مفہوم کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اصلی مفہوم کیا ہے اور جب تک ہم اس کے مفہوم کو اس کی وسعتوں کے ساتھ نہ سمجھ لیں۔ جب تک ہم یہ نہ سمجھ لیں کہ اسلام میں "عبادت" کا مفہوم کیا ہے۔ اور جب تک ہم عبادت کی تعریف میں یہ نہ شامل کر لیں کہ اس سے مراد پوری زندگی میں اللہ کی اطاعت و غلامی ہے۔ صرف نماز کے اوقات میں نہیں 'بلکہ زندگی کے تمام امور میں۔

عرب بت پرستی جس کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اور اپنی اولاد کے بارے میں دعا کی کہ اللہ ہمیں اس سے بچائیو 'یہ اس قدر سادہ نہ تھی جس طرح عرب حضور اکرم کے دور میں اس پر عامل تھے یا جس طرح دوسری جاہلیتوں میں مختلف انداز میں اس پر عمل ہوتا تھا کہ درختوں اور پتھروں کی پوجا ہو رہی ہے ' حیوانوں اور پرندوں کو پوجا جا رہا ہے ' ستاروں اور سیاروں کو پوجا جا رہا ہے ' ارواح اور اوہام کو پوجا جا رہا ہے۔ یہ سادہ شکلیں ہی شرک نہ تھا ' اور نہ بتوں کی عبادت کی فقط یہ سادہ شکلیں تھیں ' نہ شرک ان سادہ شکلوں میں محدود تھا۔ نہ اس بت پرستی کا یہی مفہوم تھا اور اس سے آگے ہم شرک کی دوسری شکلیں دریافت نہیں کر سکتے یا ہیں ہی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شرک کی لاتعداد صورتیں ہیں 'ہم اپنی فکر کو ان صورتوں تک محدود نہیں کر سکتے 'بلکہ جاہلیت جدیدہ میں شرک کی بے شمار جدید صورتیں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔

لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم شرک کو سمجھیں اور شرک کے ساتھ بت پرستی کے تعلق کو بھی سمجھیں ' نیز بتوں کی حقیقت پر بھی غور کرنا ضروری ہے ' اور دور جدید میں ' جاہلیت جدیدہ نے جو نئے اصنام گھڑ لیے ہیں ان کا بت پرستی کے ساتھ تعلق دریافت کرنا بھی ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ کے مخالف شرک کا دائرہ ہراس صورت حال تک وسیع ہوتا ہے جس میں زندگی کے معاملات میں سے کسی ایک حال میں اللہ وحدہ کی اطاعت نہ ہو' یہ حال بھی شرک کی تعریف میں آتا ہے کہ ایک انسان زندگی کے بعض معاملات میں اللہ کا مطیع فرمان ہوتے ہوئے بھی دوسرے معاملات میں غیراللہ کا مطیع ہو' شرک صرف مراسم عبودیت کے اندر محدود نہیں ہے' یہ تو شرک کی ایک مخصوص صورت ہوتی ہے۔جدید دور میں ہماری زندگیوں میں بعض ایسی واضح مثالیں موجود ہیں جو ہمیں بتاتی ہیں کہ یہ شرک صریح کی واضح مثالیں ہیں۔ایک شخص جو اللہ کو وحدہ لا شریک تسلیم کرتا ہے۔پھر وضو' طہارت' نماز' روزے' حج اور تمام دوسری عبادات میں اللہ کی طرف رخ رکھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اقتصادی معاملات اور اجتماعی قوانین میں' غیراللہ کی اطاعت کرتا ہے اور وہ اپنی اجتماعی قدروں میں ایسے تصورات ایسی اصطلاحات کا تابع ہے جو غیراللہ کی جاری کردہ ہیں اور اپنے اخلاق' اپنی عادات اور رسم و رواج میں' اپنے لباس میں' ایسے لوگوں کی اطاعت کرتا ہے' جو اللہ کے احکام کے بالمقابل اس پر یہ تصورات' اخلاق' عادات اور لباس مسلط کرتے ہیں اور یہ ایسے ہیں جو صراحتہ شریعت کے مخالف ہیں' اللہ کے احکام کے خلاف ہیں' اور حقیقتہً اسلام کے خلاف ہیں تو یہ عمل اس کلمہ شہادت کے خلاف ہے جو وہ شخص پڑھتا ہے' لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔یہ ہے وہ اصل بات جس سے ہمارے دور کے مسلمان غافل ہیں۔حالانکہ یہ شرک ہے' آج کے مسلمان نہایت بھونڈے انداز میں غیراللہ کی یہ اطاعت کرتے ہیں اور یہ محسوس ہی نہیں کرتے کہ یہ شرک ہے اور ہر دور کے مشرک یہی کام کرتے رہے ہیں۔

بت کیا ہیں' یہ ضروری نہیں ہے کہ بت ہی مجسمے ہوں جو پتھروں سے بنے ہوں۔یہ بت تو دراصل رموز ہیں طاغوت کے لیے' ان بتوں کے پیچھے اصل طاغوت ہوتا ہے جو ان بتوں کے نام اور عنوان سے لوگوں سے اپنی بندگی کراتا ہے۔اور ان بتوں کے نام سے اپنا اور اپنی بندگی کا نظام جاری کرتا ہے۔

بت تو نہ بات کرتے تھے' نہ سنتے تھے اور نہ دیکھتے تھے' دراصل مجاور' ۔۔۔۔۔۔اور حاکم وقت ان کی پشت پر ہوتے تھے۔ان میں سے کچھ لوگ ان کے نام سے تعویذ اور گنڈے کرتے تھے' دم درود کرتے تھے اور اس طرح وہ جمہور عوام کو اپنا غلام بنائے رکھتے تھے۔اب اگر کسی جگہ ایسے ہی شعار اٹھ کھڑے ہوں۔کچھ ادارے ہوں اور ان اداروں کے نام سے کچھ کاہن اور کچھ مہنت اور کچھ حکام اپنے تصورات' اپنے قوانین اور اپنے اعمال و تصرفات عوام پر مسلط کرتے ہوں تو اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ بھی شرک باللہ ہو گا۔

اگر قومیت کو ایک بت بنا لیا جائے۔اگر کسی وطن کو بت بنا لیا جائے' یا کسی مملکت کو بت بنا لیا جائے' یا کسی طبقے کو بت بنا لیا جائے اور لوگوں سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ اس بت کو پوجیں' اور اللہ کے علی الرغم پوجیں اور ان کی راہ میں جان' مال' اخلاق اور اپنی عزت سب کچھ قربان کر دیں' یوں کہ جب ان بتوں کے مطالبات اور شریعت کے مطالبات کے درمیان تعارض آ جائے تو اللہ کی شریعت اس کے قوانین اور اس کے مطالبات کو پس پشت ڈال دیا جائے اور ان نئے بتوں کے مطالبات' تقاضوں' قوانین اور اخلاق کو نافذ کر دیا جائے یا صحیح الفاظ میں ان مفادات اور جدید بتوں کی پشت پر موجود طاغوتی قوتوں کی اطاعت کی جائے تو یہ صریح شرک ہو گا اور ایسے لوگ بت پرست ہوں گے' مشرک ہوں کیونکہ بت کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ پتھر اور لکڑی کا بت ہو' ہر مذہب اور ہر شعار بت ہوتا ہے۔

اسلام صرف اس لیے نہیں آیا تھا کہ وہ لکڑیوں اور پتھروں کے بنے ہوئے بتوں کو توڑ دے اور یہ مسلسل مشقتیں جو رسولان کرام کے طویل سلسلہ نے برداشت کیں' اور اس سلسلے میں ناقابل برداشت اور ناقابل تصور تکالیف برداشت

کیں ' یہ محض پتھر اور لکڑی کے بتوں کے ختم کرنے کے لیے نہ تھیں بلکہ مقصد ہر قسم کی بت پرستی کو ختم کرنا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام آیا ہی اس لیے ہے کہ وہ زندگی کے تمام معاملات میں اللہ کی اطاعت کا نظام قائم کر دے۔ ہر شکل اور ہر صورت میں اور زندگی کے تمام معاملات میں ہے ' چاہے اس کی شکل و صورت جو بھی ہو ' غیر اللہ کی اطاعت کو ختم کر دے لہٰذا زندگی کے ہر طور طریقے اور نظام میں ہمیں معلوم کرنا چاہیے کہ اس کی کون سی صورت توحید ہے اور کون سی صورت شرک ہے ' اس میں اطاعت اور بندگی اللہ وحدہ کی ہے یا کسی اور طاغوتی قوت کی ہے ' کسی اور رب یا بت کی ہے۔

وہ لوگ جو محض اس لیے اپنے آپ کو اللہ کے دین میں سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی زبان سے کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ادا کرتے ہیں اور وہ بھی محض اس لیے کہ وہ طہارت ' مراسم عبودیت ' نماز ' روزہ ' حج اور نکاح و طلاق میں یا مسئلہ میراث میں اللہ کے قانون کو مانتے ہیں۔ جب کہ اس سے آگے ان کی پوری زندگی ان قوانین کے مطابق ہے جو اللہ کے قوانین کے خلاف ہیں اور ان قوانین کی اکثریت ایسی ہے جو قرآن و سنت کے صریح خلاف ہیں ' اور وہ ان قوانین اور اس نظام کے لیے اپنے نفس ' اپنے مال اور اپنے اخلاق اور کلچر کو قربان کرتے ہیں ' خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں ' اور یہ کام وہ اس لیے کرتے ہیں کہ یہ جدیدیت ان سے راضی ہوں ' اور صورت حالات یہ ہو کہ کسی مرحلے میں اللہ کے احکام اور قوانین کا ان بتوں کے احکام اور قوانین کے ساتھ تعارض ہو جائے تو یہ ان بتوں کے احکام کو نافذ کریں تو یہ صریح بت پرستی ہے۔

جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں اور اللہ کے دین میں سمجھتے ہیں اور ان کا حال وہ ہے جو ابھی بتایا گیا ' ان کو چاہئے کہ وہ اس شرک سے باز آ جائیں جس میں وہ ہیں۔ دین اسلام ایسا مزاح نہیں ہے جو یہ لوگ سمجھتے ہیں جو مشرق و مغرب میں اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ دین اسلام روز مرہ کی جزئیات حیات کو بھی اپنے دائرہ میں لیتا ہے اور یہ مطالبہ کرتا ہے کہ زندگی کی تمام جزئیات میں اللہ وحدہ کی اطاعت کی جائے ' اصول اور کلیات اور دستور و قانون تو بڑی بات ہے۔ یہ ہے وہ اسلام جس کے سوا خدا کسی "دین" کو قبول نہیں کرتا۔

شرک اس کے اندر محدود نہیں ہے کہ کوئی اللہ کو ایک نہ سمجھے بلکہ شرک کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ کوئی کسی غیر اللہ کو حاکم سمجھے۔ پتھروں اور لکڑیوں کے بنے ہوئے بتوں کو پوجنا بت پرستی کا بہت سادہ تصور ہے ' اصل بت پرستی خلاف اسلام اداروں کی پرستش ہے۔

سادہ ترین الفاظ میں ' میں یوں کہتا ہوں کہ لوگوں کو چاہئے کہ وہ اس بات پر غور کریں کہ ان کی زندگی میں اہم کون ہے؟ وہ کس کی مکمل اطاعت کرتے ہیں؟ وہ کس کی پیروی ' اتباع کرتے ہیں؟ کس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں؟ اگر وہ یہ سب کام اللہ کے لیے کرتے ہیں تو وہ مسلم ہیں ' اگر وہ یہ کام کسی اور کے لیے کرتے ہیں تو یہ ان کے دین پر ہیں۔ بت ہیں تو بتوں کے دین پر۔ طاغوت میں تو طاغوت کے دین ہو۔

یہ ہے پیغام! سب انسانوں کو اس سے ڈرایا جائے! ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ ان معنوں میں وحدہ لا شریک ہے! اگر عقل ہے تو ان باتوں کو سمجھو!

هذا بلاغ هذا بلاغ صدق الله العظيم

--- ○○○---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ----- ۱۴

## سورۃ الحجر - ۱۵

۱ --- تا --- ۹۹

## سورۃ النحل - ۱۶

۱ --- تا --- ۱۲۸

# درس نمبر ۱۱٦ ایک نظر میں

اس سورہ کا موضوع یہ ہے کہ کافروں اور جھٹلانے والوں کو اس خوفناک انجام سے خبردار کر دیا جائے جس کی طرف وہ غفلت میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس موضوع کو سمجھانے کے لیے مختلف انداز میں بار بار کوشش کی گئی ہے اور اس کے لیے 'بات کو ہیر پھیر کر مختلف اسالیب میں اور مختلف موضوعات کی صورت میں لایا گیا ہے لیکن مقصد ایک ہی ہے کہ لوگوں کو انجام بد سے ڈرایا جائے۔ قصص ' کائناتی مشاہد ' قیامت کے مناظر اور ان کے درمیان تبصرے اور ہدایات سب کے سب ایک ہی ہدف پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔

سورہ رعد کی فضا اور مضامین و موضوعات اگر سورہ انعام کی یاد دلاتے ہیں تو اس سورہ یعنی سورہ حجر کے مضامین اور گفتگو کا ماحول سورہ اعراف کے مماثل ہے۔ سورہ اعراف کا آغاز ڈراوے سے تھا' اس میں بھی بات خوفناک انداز میں آگے بڑھی ہے۔ انداز کلام ڈراوے ہی کا ہے اگرچہ جابجا دونوں سورتوں میں ذوق اور چاشنی مختلف بھی ہے۔

سورہ اعراف کے آغاز میں نہایت صراحت کے ساتھ ڈراوا تھا۔

كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰي لِلْمُؤْمِنِيْنَ

(۷ : ۲) "یہ ایک کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے' پس اے محمدؐ تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو' اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعہ سے ڈراؤ' اور ایمان لانے والے لوگوں کو یاد دہانی کراؤ"۔ اس سورہ کی چوتھی آیت یہ تھی۔

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ (۷ : ٤) "کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ ان پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت ٹوٹ پڑا' یا دن دہاڑے ایسے وقت آیا جبکہ وہ آرام کر رہے تھے"۔ اس کے بعد آدم و ابلیس کا قصہ آتا ہے۔ قصہ آدم و ابلیس کے بعد اس دنیا کے خاتمہ کا بیان آتا ہے اور سب لوگ اپنے رب کے سامنے کھڑے نظر آتے ہیں اور ان کو معلوم ہوتا ہے کہ ڈرانے والے کی دعوت کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کائنات کے بعض مناظر لائے جاتے ہیں۔ زمین و آسمان' رات اور دن' سورج اور چاند' ستارے اور سیارے فضاؤں میں مسخر' ہوائیں' بارش اور پانی اور اس کے نتیجے میں روئیدگی اور پھل پھول' پھر تاریخ کی جھلکیاں' قصہ نوح' ہود' صالح' لوط' شعیب اور موسیٰ علیہ السلام۔ ان سب قصص کا مقصد یہ ہے کہ ڈرانے والوں کی دعوت کے انکار کا انجام کیا ہوتا ہے۔

اب ذرا سورہ الحجر پر ایک نظر ڈالیں' اس کا آغاز بھی ڈراوے سے ہوتا ہے' یہ ڈراوا قدرے مجمل ہے۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ (٢) ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (٣) وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَعْلُومٌ (٤) مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ (٥) (١٥ : ٢ تا ٥) "بعید نہیں کہ ایک وقت وہ آجائے جب وہی لوگ جنہوں نے آج انکار کر دیا ہے پچھتا پچھتا کر کہیں گے کہ کاش ہم نے سر تسلیم خم کر دیا ہوتا۔ چھوڑو انہیں، کھائیں پئیں، مزے کریں اور بہلاوے میں ڈالے رکھے ان کو جھوٹی امید۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لیے ایک خاص مہلت عمل لکھی جا چکی تھی۔ کوئی قوم نہ اپنے وقت مقرر سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے، نہ اس کے بعد چھوٹ سکتی ہے"۔

اس کے بعد کائنات کے بعض اہم مناظر پیش کیے جاتے ہیں، آسمان اور اس کے اندر پائے جانے والے برج، زمین اور اس میں پھیلے ہوئے بلند پہاڑ، نباتات، متنوع و موزوں، پانی سے لدے بادل، زمین کی سیرابی اور موت و حیات اور حشر و نشر پھر قصہ آدم و ابلیس حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت صالح علیہم السلام کے قصص اور ان کے اندر مکذبین کا انجام۔ یہ ہیں دونوں سورتوں کے مضامین۔ غرض دونوں سورتوں کا محور اور موضوع ایک ہے۔ البتہ دونوں سورتوں کی شخصیت کے الگ الگ خدوخال بھی ہیں، اگرچہ ان کے اثرات ایک ہیں۔ قرآن کریم کا یہ مخصوص انداز ہے کہ وہ بالکل ایک جیسے مضامین کو جب دہراتا ہے تو وہ ایک دوسرے سے بالکل جدا اور مستقل نظر آتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ بات اور معانی وہی ہوتے ہیں جبکہ کہیں بھی تکرار کا احساس نہیں ہوتا۔

اس سورہ کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان پانچ ٹکڑوں میں سے ہر ایک کا پھر اپنا موضوع اور دائرہ کلام ہے۔ پہلا ٹکڑا سنت الٰہیہ کے بیان کے ساتھ مخصوص ہے۔ رسالت، اس پر ایمان اور اس کی تکذیب اس کا موضوع اساسی ہے لیکن انداز بیان ایسا ہے کہ اس کے اندر خوفناک ڈراوا پوشیدہ۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ (٢) ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (٣) (١٥ : ٢ – ٣) "بعید نہیں کہ ایک وقت وہ آجائے جب وہی لوگ جنہوں نے آج انکار کر دیا ہے پچھتا پچھتا کر کہیں گے کہ کاش ہم نے سر تسلیم خم کر دیا ہوتا۔ چھوڑو انہیں، کھائیں پئیں، مزے کریں اور بہلاوے میں ڈالے رکھے ان کو جھوٹی امید۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"۔

اس حصے کے آخر میں یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ تکذیب کرنے والے اس لیے تکذیب نہیں کرتے کہ دعوت میں کوئی کمی ہے یا دلائل موثر نہیں ہیں بلکہ یہ لوگ عناد محض کی وجہ سے تکذیب کرتے ہیں۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ (١٤) لَقَالُوا إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ (١٥) (١٥ : ١٤ – ١٥) "اگر ہم ان پر

آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے اور وہ دن دھاڑے اس میں چڑھنے بھی لگتے تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکہ ہو رہا ہے بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے"۔ غرض یہ سب لوگ ایک جیسے ہیں اور ایمان لانے والے نہیں۔

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ (۱۵:۱۳) "یہ لوگ اس پر ایمان نہیں لایا کرتے۔ قدیم سے اس قماش کے لوگوں کا یہی طریقہ چلا آ رہا ہے"۔

اس سورہ کے دوسرے حصے میں بعض تکوینی دلائل و شواہد پیش کیے گئے ہیں۔ یہ شواہد آسمانوں سے بھی ہیں، زمین سے بھی ہیں اور بلند فضاؤں اور خلاؤں سے بھی ہیں۔ یہ سب شواہد نہایت ہی حکیمانہ اور مدبرانہ ہیں کہ کائنات کی ساخت میں ہر چیز کی تعداد کو متعین کیا گیا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵:۲۱) "کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں ایک مقرر مقدار میں نازل کرتے ہیں"۔ ہر چیز کا مآل اور مرجع اللہ ہی ہے۔ ہاں ہر چیز کے لیے اللہ نے ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔

وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ (۲۴) وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۲۵)

(۱۵:۲۴ - ۲۵) "زندگی اور موت ہم دیتے ہیں اور ہم ہی سب کے وارث ہونے والے ہیں، پہلے جو لوگ تم میں سے ہو گزرے ہیں ان کو بھی ہم نے دیکھ رکھا ہے اور بعد میں آنے والے بھی ہماری نگاہ میں ہیں۔ یقیناً تمہارا رب ان سب کو اکٹھا کرے گا، وہ حکیم بھی ہے اور علیم بھی"۔

تیسرے حصے میں تخلیق انسانیت کی کہانی اور فلسفہ ہدایت و ضلالت بتایا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ ہدایت کے اسباب کیا ہیں مثلاً یہ کہ کن اسباب کی بنا پر کس کو گمراہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ گمراہوں کا انجام کیا ہوتا ہے اور اہل ہدایت کا انجام کیا ہوتا ہے۔ آدم کو سیاہ مٹی کے کیچڑ سے پیدا کیا گیا اور اس کیچڑ میں بھی اللہ نے اپنی روح یعنی حیات کو پھونکا۔ اس کے بعد ابلیس کے غرور اور انکبار کا واقعہ آتا ہے اور یہ اعلان ہوتا ہے کہ ابلیس تمام گمراہوں کی سرپرستی کرے گا۔

چوتھے حصے میں گزشتہ گمراہ اقوام کی ہلاکت کے واقعات ہیں۔ قوم لوط" قوم شعیب" قوم صالح" یہ حصہ یوں شروع ہوتا ہے۔

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۴۹) وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ (۵۰) (۱۵:۴۹ - ۵۰) "میرے بندوں کو آگاہ کر دو کہ میں ہی غفور و رحیم ہوں اور میرا عذاب بھی دردناک عذاب ہے"۔ اس کے بعد مسلسل قصص لائے گئے ہیں جن میں حضرت ابراہیم پر رحمت خداوندی

اور حضرت لوط کو مع اہل بچانا اور لوط شعیب اور صالح علیہم السلام کی اقوام کی ہلاکت کے واقعات ہیں۔

پانچویں حصے میں بتایا گیا ہے کہ اس کائنات میں حق پوشیدہ ہے اور یہ حق پر قائم ہے اور اس کائنات کی تخلیق اس بات کی متقاضی ہے کہ حشر و نشر قائم ہو اور اس میں لوگوں کو حقیقی جزا و سزا دی جائے اور یہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت ہے۔ دعوت اسلامی دراصل اس پوری کائنات میں ودیعت کردہ حق کا ایک پہلو ہے جس کے مطابق ہر چیز کا آغاز اور انجام ہوتا ہے۔

پہلے سبق میں پہلے تین حصے آگئے ہیں۔ اب تفصیلات ملاحظہ فرمائیں۔

---○○○---

# درس نمبر۱۱۶ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۴۸

سُوْرَةُ الْحِجْرِ مَكِّيَّةٌ — اٰيَاتُهَا ۹۹ — رُكُوْعَاتُهَا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱﴾
رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿۲﴾ ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَ يَتَمَتَّعُوْا
وَ يُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۳﴾ وَ مَاۤ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ
مَّعْلُوْمٌ ﴿۴﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۵﴾ وَ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ
نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۶﴾ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ
الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷﴾ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ مَا كَانُوْۤا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ﴿۸﴾ اِنَّا
نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ
الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۱﴾ كَذٰلِكَ
نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۲﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ قَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَ
لَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾ لَقَالُوْۤا اِنَّمَا سُكِّرَتْ
اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾ ع۱۵

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

ا-ل-ر- یہ آیات ہیں کتاب الٰہی اور قرآن مبین کی - بعید نہیں کہ ایک وقت وہ آ جائے جب وہی لوگ جنہوں نے آج انکار کر دیا ہے پچھتا پچھتا کر کہیں گے کہ کاش ہم نے سر تسلیم خم کر دیا ہوتا - چھوڑو انہیں 'کھائیں پئیں' مزے کریں اور بھلاوے میں ڈالے رکھے ان کو جھوٹی امید - عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا - ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لیے ایک خاص مہلت عمل لکھی جا چکی تھی - کوئی قوم نہ اپنے وقت مقرر سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے' نہ اس کے بعد چھوٹ سکتی ہے - یہ لوگ کہتے ہیں "اے وہ شخص جس پر یہ ذکر نازل ہوا ہے' تو یقیناً دیوانہ ہے - اگر تو سچا ہے تو ہمارے سامنے فرشتوں کو لے کیوں نہیں آتا؟" --- ہم فرشتوں کو یوں ہی نہیں اتار دیا کرتے - وہ جب اترتے ہیں تو حق کے ساتھ اترتے ہیں' اور پھر لوگوں کو مہلت نہیں دی جاتی - رہا یہ ذکر' تو اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں -

اے نبیؐ' ہم تم سے پہلے بہت سی گزری ہوئی قوموں میں رسول بھیج چکے ہیں - کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کے پاس کوئی رسول آیا ہو اور انہوں نے اس کا مذاق نہ اڑایا ہو - مجرمین کے دلوں میں تو ہم اس ذکر کو اسی طرح (سلاخ کے مانند) گزارتے ہیں - وہ اس پر ایمان نہیں لایا کرتے - قدیم سے اس قماش کے لوگوں کا یہی طریقہ چلا آ رہا ہے - اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے اور وہ دن دہاڑے اس میں چڑھنے بھی لگتے تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے' بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے"۔

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ (۱۵: ۱) "ا-ل-ر- یہ آیات ہیں کتاب الٰہی اور قرآن مبین کی"۔ یعنی یہ حروف اور ان جیسے دوسرے حروف ہی دراصل قرآن اور کتاب الٰہی ہیں اور یہ حروف سب انسانوں کی دسترس میں ہیں - لیکن یہی حروف قرآن کریم کی شکل میں عظیم آیات الٰہی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں - عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہو جاتے ہیں' ایسی ترکیبات اور جملوں کی شکل اختیار کرتے ہیں کہ کسی کے لیے ایسا کلام لانا ممکن نہیں ہوتا - ان حروف کا کوئی ذاتی مفہوم نہیں ہے لیکن یہی حروف قرآن مجید میں موضح' بیان کنندہ اور کشاف بن جاتے ہیں -

لوگوں میں سے بعض لوگ آج ان آیات و معجزات کی تکذیب کرتے ہیں اور قرآن مبین کو نہیں مانتے لیکن ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ وہ بڑی حسرت سے یہ کہیں گے کہ کاش وہ ایسا رویہ اختیار نہ کرتے بلکہ کاش کہ وہ ایمان لاتے اور استقامت اختیار کرتے -

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ (۱۵: ۲) "بعید نہیں کہ ایک وقت آ جائے جب وہی لوگ جنہوں نے آج (دعوت اسلام کو قبول کرنے سے) انکار کر دیا ہے' پچھتا پچھتا کر کہیں گے کہ کاش ہم نے سر تسلیم خم کر دیا ہوتا"۔

یہ وقت دور نہیں ہے' لیکن اس وقت ان کی یہ تمنائیں ان کو کوئی فائدہ نہ دیں گی - اس وقت چاہتوں کا فائدہ نہ ہو گا - اس انداز بیان میں نہایت ہی لطیف طور پر ان کا مذاق بھی اڑایا گیا ہے اور ان کو دھمکی بھی دی گئی ہے - یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دعوت اسلامی جو تمہارے سامنے پیش کی جا رہی ہے' اس کے قبول کرنے کے بعد مہلت بہت ہی محدود ہے'

اسے ضائع مت کرو 'بہت جلد ایسے حالات آنے والے ہیں کہ یہ لوگ تمنائیں کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے 'لیکن اس وقت ان کی یہ خواہشات مفید نہ ہوں گی۔

اس خفی دھمکی کو ذرا مزید وضاحت کے ساتھ لیکن ملفوف انداز میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَ يَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (۱۵:۳) "چھوڑ انہیں 'کھائیں پئیں اور مزے کریں اور بھلاوے میں ڈالے رکھے ان کو جھوٹی امید 'عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"۔ وہ جس حال میں ہیں 'انہیں اسی میں چھوڑ دے 'یہ تو محض حیوانوں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کھانا پینا اور عیش کرنا 'جس میں کوئی غوروفکر نہیں ہے۔ وہ حیوانیت سے آگے کچھ دیکھنا نہیں چاہتے 'لہٰذا انہیں رہنے دیجئے اپنے حال میں۔ انہوں نے جھوٹی امیدوں کے طویل و عریض منصوبے اس زندگی کے بارے میں بنا رکھے ہیں حالانکہ زندگی کی گھڑیاں تک تک کر کے ختم ہو رہی ہیں اور فرصت اور مواقع ختم ہوتے جا رہے ہیں لہٰذا ایسے لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ ان کا انجام خراب ہونے والا ہے۔ آپؐ ان کی سرگرمیوں میں حصہ دار نہ بنیں 'یہ لوگ تو دنیا کی بے وفا تمناؤں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ محض خواہشات کے سراب کے پیچھے دوڑ رہے ہیں 'یہ خواہشات ان کو یہ دھوکہ دیتی ہیں کہ ابھی زندگی کی فرصت طویل ہے اور یہ کہ اس زندگی میں یہ لوگ تمناؤں کے طویل و عریض منصوبے کو روبعمل لے آئیں گے اور ان کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ ہوگی 'کوئی بات ان کی تمناؤں کے علی الرغم نہ ہوگی الا یہ کہ ان سے کوئی بھی زندگی کا حساب و کتاب لینے والا نہیں ہے اور وہ جس طرح کھا پی رہے ہیں اس طرح آخرت میں یا زندگی کے آنے والے دنوں میں بھی وہ کامیاب رہیں گے۔

اور سراب کی طرح دھوکہ دینے والی امیدیں اور سراب کے پیچھے دشت پیمائی کی یہ تصویر درحقیقت ایک زندہ انسانی روپ کی تصویر ہے 'جو انسانی زندگی میں واضح طور پر نظر آتی ہے اور ہمیشہ انسان کو دھوکہ دیتی ہے۔ انسان ہمیشہ ان امیدوں کے سراب کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔ ان میں مگن رہتا ہے 'یہاں تک کہ وہ امن و عافیت کی حدود کو اچانک پار کر لیتا ہے اللہ سے غافل 'موت سے غافل اور قضا و قدر کے فیصلوں سے بے علم 'اپنے فرائض سے غافل 'حلال و حرام کی حدود کو پھلانگتے ہوئے 'یہاں تک کہ وہ خدا سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔ اسے موت اور حشر و نشر کا خیال ہی نہیں ہوتا کہ اچانک پکڑا جاتا ہے۔

یہ ہے ان کی بھلاوے کی حالت جس میں وہ مبتلا ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ آپؐ ان کو اس میں غرق چھوڑ دیں۔ عنقریب ان کو اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی 'لیکن اس وقت ان کا یہ علم ان کے لیے مفید نہ ہو گا کیونکہ وہ زائد المیعاد ہو گا۔ یہ ایک تہدید آمیز انداز گفتگو بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کو جگانے کے لیے ایک چٹکی بھی دی جاتی ہے 'شاید کہ وہ مدہوشی سے جاگ اٹھیں جس کی وجہ سے وہ نہایت ہی اٹل انجام بد سے غافل ہیں۔ اس کائنات کا نظام ایک مخصوص سنت الہیہ کے مطابق چل رہا ہے۔ اس سنت میں تخلف ممکن نہیں ہے۔ قوموں کا عروج و زوال بعینہٖ اس سنت کے مطابق ہوتا ہے۔ اقوام کا انجام اس رویے کے مطابق متعین ہوتا ہے جو وہ اس سنت الہیہ کے حوالے سے اختیار کرتی ہیں۔

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُومٌ (٤) مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ (٥) (١٥ : ٤ – ٥) "ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لیے ایک خاص مہلت عمل لکھی جا چکی تھی۔ کوئی قوم نہ اپنے وقت مقرر سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے' نہ اس کے بعد چھوٹ سکتی ہے"۔ لہٰذا اگر کسی کو قدرے مہلت مل گئی ہے اور عذاب ٹلا ہوا ہے تو اسے غافل نہ ہو جانا چاہئے۔ عذاب کا جلدی آنا یا دیر سے آنا سنت الٰہیہ کے مطابق ہوتا ہے لیکن جلد ہی انہیں معلوم ہو جائے گا۔

یہ مہلت اقوام و ملل کو کون دیتا ہے؟ یہ اللہ کے اختیار میں ہے اور مہلت یا عذاب کا تعین لوگوں کے طرز عمل کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر کوئی ایمان لے آئے' نیکی کی راہ اختیار کرے' اپنے رویے کو درست کر لے اور دنیا میں عدل و انصاف کا نظام رائج کر دے تو مہلت دراز ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ قوم فسق و فجور اور برے راستے اختیار کرتی ہے' اس میں بھلائی کی مقدار کم رہ جاتی ہے اور اس سے خیر کی توقع نہیں ہوتی۔ اب یہ امت اپنے مقررہ انجام تک پہنچ جاتی ہے اور اس دنیا سے اس کے وجود کو مٹا دیا جاتا ہے۔ یا تو وہ مکمل طور پر نیست و نابود کر دی جاتی ہے یا اس کو اس قدر ضعیف و ناتواں کر دیا جاتا ہے کہ اس کا وجود ہی کالعدم تصور ہوتا ہے۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ بعض اقوام نہ مومن ہیں' نہ نیک ہیں' نہ صالح ہیں اور نہ ان کے اندر عدل پایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ دنیا میں عروج پا رہی ہیں' پر قوت اور ذی شوکت ہیں اور بدستور زندہ رہ رہی ہیں۔ یہ سوال بظاہر قوی نظر آتا ہے مگر یہ درست نہیں ہے' اس لیے کہ جن اقوام کو دیکھ کر یہ سوال اٹھتا ہے ان میں خیر اور صلاح کے بعض پہلو لازماً موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً زمین کے اندر فریضہ خلافت خداوندی کو وہ اچھی طرح ادا کر رہی ہوتی ہیں اور دنیا کی آبادی اور تعمیر میں وہ اچھے کام کر رہی ہوتی ہیں' وہ جن علاقوں میں بستی ہیں ان میں وہ عدل کرتی ہیں اگرچہ ان کا نظریہ عدل محدود ہوتا ہے۔ مادی ترقی' مادی بہبود کا ایک معیار انہوں نے قائم کر رکھا ہے اگرچہ وہ محدود نقطہ نظر پر مبنی ہے۔ یہ اقوام یہ مہلت محض ان کی اس محدود خیر کی وجہ سے پا رہی ہیں۔ جب بھی یہ خیر ختم ہو جائے گا' یہ اقوام ختم ہو جائیں گی۔

حقیقت یہی ہے کہ سنت الٰہیہ میں تخلف ممکن نہیں ہے۔ ہر امت اور ہر قوم کے زوال کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور یہ اپنے وقت پر ہوتا ہے۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ (١٥ : ٥) "کوئی قوم نہ اپنے وقت سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے نہ اس کے بعد چھوٹ سکتی ہے"۔ کسی قوم کو اس بات پر مغرور نہیں ہونا چاہئے کہ ان کو اللہ کی گرفت نے ابھی تک اپنی لپیٹ میں نہیں لیا ہے۔ یہاں سیاق کلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ ان کے برے رویے کی ایک جھلک بھی دکھائی جاتی ہے' حالانکہ رسول نے ان کے سامنے ایک کتاب مبین رکھ دی ہے۔ یہ ان کو جگاتی ہے اور ان کو بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے۔ ان کو نئی روشنی دیتی ہے' لیکن وہ ہیں کہ استہزاء کرتے ہیں اور گمراہی میں حد سے گزر رہے ہیں۔

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ (٦) لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَائِكَةِ إِنْ كُنْتَ

مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۷) (۱۵ : ٦ - ۷) لوگ کہتے ہیں "اے وہ شخص جس پر یہ ذکر نازل ہوا ہے ' تو یقیناً دیوانہ ہے ۔ اگر تو سچا ہے تو ہمارے سامنے فرشتوں کو لے کیوں نہیں آتا؟" انہوں نے حضور اکرمؐ کے لیے یہ فقرہ جو کہا

يٰاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ "اے وہ شخص جس پر ذکر نازل ہوا ہے" بطور مذاق استعمال کیا ہے ' کیونکہ یہ لوگ درحقیقت وحی رسالت کے منکر تھے ۔ یہ فقرہ وہ بطور تحکم اور استہزا استعمال کر رہے تھے ۔ نیز ان کا رویہ حضور اکرمؐ کے بارے میں اس قدر گستاخانہ تھا کہ انہوں نے حضورؐ کے لیے اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ (۱۵ : ٦) "تم یقیناً دیوانہ ہو" کے الفاظ استعمال کیے اور وہ آپ کو مجنون اس لیے کہتے تھے کہ آپ ان کو مسلسل دعوت دے رہے تھے اور یہ لوگ حضور اکرمؐ سے فرشتوں کے نزول کا مطالبہ بھی غایت درجہ مذاق کے طور پر کرتے تھے ۔

لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۱۵ : ۷) "اگر تم سچے ہو تو ہمارے سامنے فرشتوں کو لے کیوں نہیں آتے" ۔ منکرین کی جانب سے نزول ملائکہ کا مطالبہ اس سورہ اور دوسری سورتوں میں بار بار دہرایا جاتا ہے ۔ آپ سے بھی اور دوسرے رسولوں سے بھی یہ مطالبہ ہوتا رہا ہے اور یہ مطالبہ جن لوگوں کی طرف سے ہوا ہے انہوں نے نہ انسان کو پہچانا ہے اور نہ ان کے دل میں اس کی اصل قدر وقیمت اجاگر ہے کہ اللہ نے مقام نبوت انسان کو عطا کیا ہے اور انسان میں سے برگزیدہ لوگوں کو بطور نبی مبعوث فرمایا ہے ۔

قرآن کریم اس سوال کا جواب یوں دیتا ہے کہ فرشتوں کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ رسولوں کی معاونت تبلیغ میں کریں ۔ فرشتے رسولوں کی معاونت میں اس وقت آتے ہیں جب تبلیغ کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور سنت الہیہ کے مطابق فیصلہ ہو جاتا ہے کہ اب مکذبین کو ہلاک کرنا ہے ۔ ان کی مہلت کا وقت ختم ہو گیا ہے ۔ اس وقت جب فرشتے آتے ہیں تو مہلت ختم ہو چکی ہوتی ہے ۔

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ (۱۵ : ۸) "اور ہم فرشتوں کو یوں نہیں اتار دیا کرتے ۔ وہ جب اترتے ہیں تو حق کے ساتھ اترتے ہیں اور پھر لوگوں کو مہلت نہیں دی جاتی" ۔ کیا یہ لوگ فرشتوں کا ایسا نزول چاہتے ہیں اور اسی کا مطالبہ کرتے ہیں؟

ان کے اس مطالبے کی خطرناکی کے بیان کے بعد ' ان کے سامنے ہدایت اور عقل و تدبر کا رویہ اختیار کرنے کی دعوت پیش کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ فرشتے سچائی کے ساتھ آتے ہیں اور وہ احقاق حق کر کے جاتے ہیں اور مکذبین اس بات کے مستحق ہوتے ہیں کہ انہیں نابود کر دیا جائے ۔ چنانچہ جب فرشتے نازل ہوتے ہیں تو وہ اس آخری سچے فیصلے کے نفاذ (Exfcution) کے لیے آتے ہیں ۔ ان پر جو فرشتے نازل نہیں ہو رہے تو اس میں ان کی خیر ہے لیکن وہ اپنی خیر کو نہیں سمجھ سکتے ۔ اللہ فرشتوں کے بجائے ان پر ذکر و فکر والی آیات نازل فرما رہے ہیں تاکہ وہ غور و فکر کریں ۔ تفکر و تدبر کام لیں اور اپنی ہلاکت کو دعوت نہ دیں ۔ ان کے لیے فرشتوں کا نازل نہ ہونا بہتر ہے ۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵ : ۹) "اس ذکر کو ہم نے نازل کیا ہے ' اور ہم ہی

اس کے نگہبان ہیں"۔ لہٰذا ان کے لیے اسی میں بہتری ہے کہ یہ قبول کر لیں۔ اب یہ آخری نصیحت تو محفوظ ہے اور ابدالآباد تک باقی رہنے والی ہے۔ اس میں حق ہے' باطل کا کوئی آمیزہ نہیں ہے۔ اس میں اب کوئی تحریف نہیں کی جا سکتی۔ اور یہ آخری نصیحت زندگی کے ہر معاملے میں ان کی راہنمائی کے لیے کافی ہے۔ بشرطیکہ وہ حق کے طالب ہوں اور ملائکہ کے نزول کا غلط مطالبہ نہ کریں۔ کیونکہ اللہ نے ابھی فرشتے بھیجنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ کیونکہ اللہ ابھی ان کی خیریت چاہتا ہے اس لیے انہیں ہلاک کرنے والے فرشتے بھیجنے کے بجائے اس نے قرآن محفوظ بھیجا۔

اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اپنی جگہ تسلی دی جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ پہلے رسول نہیں ہیں جس کا استقبال تکذیب اور استہزاء سے کیا گیا ہو' پہلی اقوام میں بھی رسول آتے رہے ہیں اور ان کو بھی آپ کی طرح جھٹلایا گیا اور ان کا بھی آپ ہی کی طرح مذاق اڑایا گیا۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْأَوَّلِينَ (١٠) وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (١١) (١٥: ١٠ - ١١) "اے محمدؐ ہم تم سے پہلے بہت سی گزری ہوئی قوموں میں رسول بھیج چکے ہیں' کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کبھی ان کے پاس کوئی رسول آیا ہو' اور انہوں نے اس کا مذاق نہ اڑایا ہو"۔ بتایا جاتا ہے کہ اے محمدؐ جس طرح انبیائے سابقین کی پیش کردہ دعوت کے ساتھ ان کے مخاطبین نے سلوک کیا بعینہٖ ایسا ہی سلوک آپ کی پیش کردہ دعوت کے ساتھ یہ مکذبین کر رہے ہیں اور اسی طرح ہم اس دعوت کو ان کے دلوں میں چلاتے ہیں جبکہ یہ دل نہ اس پر غور کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی قبولیت کے لیے تیار ہیں۔

كَذَٰلِكَ نَسْلُكُهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ (١٢) لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ ۖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ (١٣) (١٥: ١٢ - ١٣) "مجرمین کے دلوں میں تو ہم اس ذکر کو اسی طرح گزارتے ہیں وہ اس پر ایمان نہیں لایا کرتے۔ قدیم سے اس قماش کے لوگوں کا یہی طریقہ چلا آ رہا ہے"۔ یہ بات نہیں ہوتی ہے کہ ان لوگوں کے غور و فکر کے لیے رسولوں نے دلائل پیش نہیں کیے ہوتے بلکہ اصل بات یہ ہوتی ہے کہ وہ عناد اور مکابرہ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور ایمان کی مخالفت میں آگے بڑھ رہے ہوتے ہیں۔

یہاں ان کی ذلت آمیز ہٹ دھرمی کا ایک نمونہ بھی پیش کر دیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ وہ دعوت اسلامی کے خلاف حد درجہ بغض اور حسد میں مبتلا ہیں۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ (١٤) لَقَالُوا إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَسْحُورُونَ (١٥) (١٥: ١٤ - ١٥) "اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے اور وہ دن دھاڑے اس میں چڑھنے بھی لگتے تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکہ ہو رہا ہے بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے"۔ مجرد یہ تصور کہ انسان آسمانوں میں بلند ہو رہا ہے' یہ بھی ایک قسم کا دروازہ کھولنا ہے۔

لیکن اگر وہ اپنے اجسام کے ساتھ عملاً چڑھیں ' دیکھیں کہ آسمانوں کے دروازے ان کے سامنے مفتوح ہیں۔ وہ دیکھیں کہ وہ چڑھ رہے ہیں اور ان کے حواس مدرکہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ عمل ہو رہا ہے۔ اور وہ مشاہدہ کر رہے ہوں تو پھر بھی اپنی یہ ہٹ دھرمی چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوں گے اور کہیں گے 'نہیں نہیں' یہ حقیقت نہیں ہے بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے اور ہماری نظربندی کر دی گئی ہے۔ یہ جو ہم دیکھ رہے ہیں محض تخیل ہے۔ بلکہ ہم پر صریح جادو کر دیا گیا ہے۔ یہ جو کچھ ہم مشاہدہ کر رہے ہیں 'محسوس کر رہے ہیں' یہ سب کچھ جادوگری ہے۔

یوں قرآن مجید ان کی ہٹ دھرمی کی یہ نہایت ہی انتہائی تصویر کشی کرتا ہے 'جس سے ان کا گھٹیا مفاد ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ مجادلہ کرنا نہایت ہی لغو بات ہے۔ مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ ان کے پاس دلائل ایمان کی کمی نہیں اور یہ نہیں ہے کہ وہ نزول ملائکہ کا مطالبہ کر رہے ہیں اور وہ پورا نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ ایمان نہیں لاتے کیونکہ اگر نزول ملائکہ کے بجائے خود ان کے لیے آسمانوں میں پرواز کا انتظام کر دیا جائے ' تو بھی ان کا رویہ یہی ہو گا' یہ پرلے درجے کے ہٹ دھرم ہیں۔ لاپرواہ' بے حیا اور دیدہ دلیر ہیں۔ حق اگر روز روشن کی طرح بھی آ جائے تو بھی یہ مان کر دینے والے نہیں ہیں۔

یہاں قرآن مجید نے انسانوں میں ہٹ دھرمی کرنے والوں کی بہترین تصویر کشی کی ہے۔ اس قدر بری تصویر کشی کہ انسان کو اس سے گھن آنے لگتی ہے اور وہ ان لوگوں کے روپ کو نہایت ہی حقیر سمجھنے لگتا ہے۔

--- ○○○---

اب ہٹ دھرمی کے منظر سے ہم کائناتی دلائل و نشانات کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ تو صرف آسمانوں سے متعلق تھا' اب پوری کائنات ہمارے سامنے ہے۔ پہلے آسمانوں کو لیا جاتا ہے' پھر زمین کے بعض مظاہر سامنے لائے جاتے ہیں۔ ایسی ہواؤں کا منظر پیش کیا جاتا ہے جو بار آور بادلوں سے لدی ہوئی ہیں' پھر اس کرۂ ارض پر موت و حیات کی بوقلمونیاں پیش کی جاتی ہیں اور اس کے بعد حشر و نشر کے بعض مناظر۔ ان تمام نشانات و شواہد کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں کہ اگر ان کے سامنے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جائیں اور وہ ان سے اوپر چڑھ بھی جائیں تو بھی وہ اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے نہ مانیں گے اور یہ کہیں گے 'کہ ہماری آنکھوں کو دھوکہ دیا جا رہا ہے 'نظربندی کر دی گئی ہے 'ہم مسحور ہو گئے ہیں۔ اب ذرا ان تمام مناظر و مشاہد کو ایک ایک کر کے ملاحظہ فرمائیں۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ﴿١٦﴾ وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ ﴿١٧﴾ إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُبِينٌ ﴿١٨﴾

"یہ ہماری کارفرمائی ہے کہ آسمان میں ہم نے بہت سے مضبوط قلعے بنائے 'ان کو دیکھنے والوں کے لیے (ستاروں سے) آراستہ کیا' اور ہر شیطان مردود سے ان کو محفوظ کر دیا۔ کوئی شیطان ان میں راہ نہیں پا سکتا' الا یہ کہ کچھ سن گن لے لے اور جب وہ سن گن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک شعلہ روشن اس کا پیچھا کرتا ہے"۔

اس پھیلی ہوئی کائنات کی یہ پہلی لائن ہے۔ اس عجیب و غریب کائنات کے نقش و نگار کی یہ پہلی تصویر ہے۔ اس کائنات میں نزول ملائکہ سے بھی زیادہ عجائبات ہمارے سامنے ہیں۔ خود اس کائنات کی تشکیل اور طبیعی لحاظ سے اس کی کارکردگی اللہ کی قدرت و صنعت کی ایک واضح مثال ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسری دلیل کی سرے سے احتیاج ہی نہیں ہے۔

بروج کیا ہیں' یہی ستارے اور سیارے عظیم سے عظیم تر۔ ان سیاروں اور ستاروں کے مدار اور مقامات بھی برج ہو سکتے ہیں۔ جو بھی مراد ہو لیکن دونوں حالات میں ان کی کارکردگی ایک معجز دلیل ہے اور اللہ کی قدرت اور حکمت پر شاہد عادل ہے' کس قدر پیچیدہ' موثر ہے اور دیکھنے میں بھی خوبصورت منظر ہے۔

وَزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ (۱۵: ۱۶) "ہم نے اسے دیکھنے والوں کے لیے مزین کیا"۔ اس پوری کائنات اور خصوصاً سماء دنیا کے حسن و جمال کو تو دیکھیے۔ اس آیت سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اس کائنات میں حکمت و تقدیر کے علاوہ حسن و جمال کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے محض ضمامت اس کائنات میں مدنظر نہیں' محض وسعت مدنظر نہیں' محض اس کی پیچیدہ ساخت پر ہی توجہ نہیں دی گئی بلکہ اس کی ساخت میں ایک خاص خوبصورتی کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔

ایک خوبصورت رات میں کبھی آپ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا ہے؟ جس میں کواکب بکھرے پڑے ہوتے ہیں' ہر ایک ستارہ روشنی چھوڑ رہا ہوتا ہے گویا کہ ایک انگارہ ہے جو اپنی جگہ دہک رہا ہے' پھر اس حالت میں ہماری نظر ایک نہایت ہی بعید ستارے پر ہوتی ہے۔ پھر ایک دوسرا منظر آپ سامنے لائیں۔ ایک خوبصورت رات ہے اس میں چودھویں کا چاند بلندیوں پر ہے اور اس کے سامنے پوری کائنات خاموش کھڑی ہے۔

اس کائنات کی خوبصورتی کو محسوس کرنے کے لیے بغیر چاند کے شفاف رات اور چودھویں کے چاند کی ایک خوبصورت رات میں' ایک شاعرانہ نگاہ ہی کافی ہوتی ہے' کس قدر وسیع حسن و جمال ہے؟ اور کس قدر گہرا اثر ہے اس کا پردۂ احساس پر؟ کیا اس کے سوا کسی اور برہان کی ضرورت ہے؟

وَزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ (۱۵: ۱۶) "اسے دیکھنے والوں کے لیے ہم نے مزین کیا ہے"۔ جو دیکھنے والے نہیں ہیں۔ لیکن اس کائنات کو حسن و جمال سے بھر دینے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی محفوظ اور پاکیزہ بھی بنایا گیا ہے۔

وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ (۱۵: ۱۷) "اور ہر شیطان مردود سے اسے محفوظ کر دیا"۔ کوئی شیطانی قوت اسے خراب نہیں کر سکتی اور کوئی شیطانی قوت اس کی فضا کو آلودہ نہیں کر سکتی۔ اس کائنات کے نظام میں کوئی شیطانی قوت اپنا وائرس داخل کر کے اس کے نظم کو خراب نہیں کر سکتی۔ اسے گندہ نہیں کر سکتی' اور اس کی رفتار کا منہ موڑ کر اسے گمراہ نہیں کر سکتی' جس طرح شیطان انسان کے ساتھ اس کرۂ ارض پر یہ سب کام کرتا ہے اور اس کرۂ ارض پر اس کا یہ مشن ہے۔ اس کرۂ ارض پر تو شیطان اپنا مشن پورا کر سکتا ہے لیکن آسمانوں کے نظام میں اس کا کوئی عمل و دخل نہیں ہے۔ آسمانوں پر اور بلندیوں پر اس کی دسترس نہیں ہے۔ اس کی ناپاکیاں' گمراہیاں وہاں کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔ آسمانوں پر اس کے حملے رد کر دیئے جاتے ہیں۔ وہاں ان کے دفاع کا انتظام ہے۔

إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُّبِينٌ (۱۵ : ۱۸) "الا یہ کہ کچھ سن گن لے لے اور جب وہ سن گن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک شعلہ روشن اس کا پیچھا کرتا ہے"۔ شیطان کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ وہ آسمانوں سے کس طرح سن گن لیتا ہے' وہ کیا چیز چراتا ہے۔ ان سب امور کا تعلق عالم غیب سے ہے۔ ہم ان کا مفہوم صرف اسی قدر سمجھ سکتے ہیں جس قدر ان نصوص قرآنیہ میں پایا جاتا ہے۔ اس کے لیے مزید جستجو کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ہم اس شعبے میں کچھ مزید دریافت بھی کرلیں کہ شیطان کس طرح سن گن لیتا ہے تو اس کا ہمارے ایمان کی کمی بیشی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان معاملات میں تحقیق و تدقیق سے فائدے کے بجائے نقصان ہوتا ہے کہ انسان اس زندگی کے عملی معاملات سے دور ہو کر محض عقلی گھوڑے دوڑانے لگتا ہے اور وہ کوئی نئی حقیقت اور کوئی نیا علم بھی نہیں پا سکتا۔

ہم نے جس قدر جاننا ہے وہ یہی ہے کہ شیطان کا عمل و دخل آسمانوں میں نہیں ہے۔ اس وسیع کائنات کا یہ حسن و جمال اور حرکت و فعالیت شیطان کی دسترس سے محفوظ ہے۔ اس کائنات کے امور میں شیطانی قوتوں کی طرف سے جو دخل اندازی ہوتی ہے' یا دخل اندازی کی جو کوشش ہوتی ہے' اس موقع پر شیطانی قوتوں کو مار بھگایا جاتا ہے اور شہاب ثاقب کی وجہ سے ان کے عزائم رک جاتے ہیں۔

یہاں جس انداز میں بلند قلعوں اور برجوں کا ذکر ہوا ہے' جس طرح شیطانوں کے اوپر چڑھنے کی مساعی کا ذکر ہوا اور پھر جس انداز میں ان پر بمباری ہوتی ہے تصور اور تخیل اور مشاہدے کے اعتبار سے یہ منظر ایک نہایت ہی خوبصورت منظر ہے اور قرآن کریم کی فنی تصویر کشی کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔

کائنات کی اس وسیع پینگ کی دوسری لائن' وہ وسیع زمین ہے جس پر ہم بستے ہیں۔ ہماری نظروں سے یہ وسیع تر اور طویل و عریض ہے۔ ہماری سیر و سیاحت کے لیے یہ بہت کھلی ہے۔ اس کے اندر اونچے اونچے پہاڑ' قسم قسم کی روئیدگی اور پھل اور پھول ہیں۔ نیز انسانوں اور تمام دوسری زندہ مخلوق کے لیے رزق کا وافر سروسامان ہے۔

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْزُونٍ ﴿۱۹﴾ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ ﴿۲۰﴾

"اور ہم نے زمین کو پھیلایا' اس میں پہاڑ جمائے' اس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک ٹھیک نپی تلی مقدار کے ساتھ اگائی اور اس میں معیشت کے اسباب فراہم کیے تمہارے لیے اور ان بہت سی مخلوقات کے لیے بھی جن کے رازق تم نہیں ہو"۔

اس کائنات کی فضاؤں میں ایک قسم کی وسعت اور عظمت پائی جاتی ہے۔ آسمانوں میں بڑے بڑے قلعوں کا ذکر ہے۔ لفظ بروج کے تلفظ میں بھی ایک قسم کا زمزمہ اور عظمت ہے۔ "شہاب" کو لفظ مبین سے بیان کیا گیا۔ اس میں ایک عظمت کی طرف اشارہ ہے۔

زمین میں پہاڑوں کو رواسی کہا گیا اور ان پہاڑوں کے بھاری بھرکم ہونے کا اظہار لفظ القینا سے کیا گیا۔ پھر نباتات کو

موزون کی صفت سے موصوف کیا گیا۔ موزون لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے بھاری بھرکم ہے۔ اگرچہ یہاں مفہوم یہ ہے کہ اپنی پیچیدہ ساخت کے اعتبار سے وہ محکم اور متوازن ہے۔ پھر عظمت کی اس فضا میں معیشت کے بجائے معائش کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور اسے نکرہ کی صورت میں مجمل چھوڑا گیا ہے۔ پھر مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ (۱۵: ۲۰) میں بھی تمام زندہ مخلوقات کی طرف اشارہ کر دیا گیا جو اس کرۂ ارض پر پائی جاتی ہیں۔ غرض تعبیرات' الفاظ اور مفاہیم' ہر اعتبار سے اس منظر میں عظمت ہی عظمت پائی جاتی ہے۔ یہ تکوینی آیت ہے۔ یہ آفاق کائنات سے گزر کر انفس کو بھی لیتی ہے۔ یہ وسیع تر سرزمین جو دعوت نظارہ اور دعوت سیر دے رہی ہے' یہ عظیم الشان پہاڑ جو سینہ گیتی پر ابھرے ہوئے ہیں اور یہ قسم قسم کے نباتات جو اس میں اگے ہوئے ہیں اور پھر بات اس پہلو پر مرکوز ہوتی ہے کہ یہ سب کے سب انسانوں کے مفاد کے لیے ہیں۔ اس کرۂ ارض پر زندگی کا سروسامان اور نوع نوع کی خوراکیں' آیت میں ان کو مجمل چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ ان کی وسعت اور عظمت کی طرف اشارہ ہو' یہ سب کچھ اے انسان' تیرے لیے ہے اور پھر تمہارے لیے ایسی مخلوقات بھی پیدا کی گئی ہیں کہ جو تمہارے لیے مفید ہیں اور تم ان کو پالتے نہیں ہو۔ اللہ اور صرف اللہ ان کو پالتا ہے۔ تم اس طرح ایک امت اور مخلوق ہو' جس طرح دوسری مخلوقات ہیں جن کی تعداد اور انواع بھی کسی کو معلوم نہیں ہے۔ یہ نوع نوع کی مخلوق اللہ کے رزق خاص پر پلتی ہے۔ اور اللہ نے 'اے انسان انہیں مفت تمہاری خدمت میں لگایا ہے۔ پھر بعض صنف مخلوقات ایسی ہے کہ اللہ کے رزق پر پلتی ہے اور ان پر کوئی فرائض نہیں ہیں۔

یہ تمام انواع و اقسام کی مخلوقات اور ان کے لیے قسم قسم کا رزق' اللہ تعالیٰ نے پورا پورا' اس کائنات میں پیدا کر رکھا ہے اور یہ سب مخلوق اور ان کا سامان زیست اللہ کے دست قدرت اور تصرف ذاتی میں ہے اور اللہ اپنی سنت کے مطابق جس طرح چاہتا ہے تمام امور میں تصرف فرماتا ہے اور اپنے احکام اپنی مخلوقات کے اندر جاری فرماتا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ ۫ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾

"کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں ایک مقرر مقدار میں نازل کرتے ہیں"۔

لہٰذا مخلوقات میں سے کوئی نوع بھی کسی چیز کی مالک نہیں ہے' تمام خزانے اللہ کی حاکمیت میں ہیں' اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہیں۔ اللہ اپنی مخلوق کے لیے جو خزانے چاہتا ہے' ایک معلوم اور متعین مقدار کے مطابق اتارتا ہے' کوئی چیز بھی اٹکل پر نازل نہیں ہوتی اور نہ کوئی چیز اتفاقاً وقوع پذیر ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ جن چیزوں کو ایک معلوم مقدار کے مطابق بھیجتا ہے' ان میں سے ہوائیں اور بارشیں بھی ہیں۔

وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

"بار آور ہواؤں کو ہم ہی بھیجتے ہیں' پھر آسمانوں سے پانی برساتے ہیں اور اس پانی سے تمہیں سیراب کرتے ہیں۔ اس دولت کے خزانے دار تم نہیں ہو"۔

ہواؤں کے دوش پر کیا بار ہوتا ہے؟ پانی جس طرح اللہ ناقہ کو حاملہ کرتا ہے اور پھر بادل جو حامل ماء ہوتے ہیں آسمانوں سے برس پڑتے ہیں اور یوں ہم تمہیں پانی پلاتے ہیں۔ کیا بارش کے یہ خزانے تمہاری تحویل میں ہیں؟ کہ جب ضرورت ہو برسا لو' بلکہ یہ خزانے اللہ کی تحویل میں ہیں اور اللہ ایک معلوم مقدار کے مطابق برساتا ہے۔

یہ ہوائیں فضائی عوامل کے مطابق چلتی ہیں اور ان فضائی ضوابط کے مطابق ان میں پانی ہوتا ہے اور برستا ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ ان فضاؤں کو کس نے پیدا کیا اور ہواؤں اور بارشوں کے یہ عوامل اور ضوابط کس نے بنائے؟ یہ یقیناً خالق کائنات کا کام ہے لہٰذا یہ تمام عوامل و اسباب اللہ کے ناموس کلی اور سپر کمپیوٹر کے مطابق ہیں۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵ : ۲۱) "کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں ایک مقرر مقدار میں نازل کرتے ہیں"۔ اس آیت کا انداز تعبیر ذرا ملاحظہ فرمائیں۔ ہر حرکت یہاں تک کہ سیرابی کو بھی اللہ کی طرف منسوب کیا گیا۔

فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ (۱۵ : ۲۲) "ہم نے اسے تمہیں پلایا"۔ حالانکہ مفہوم یہ ہے کہ ہم نے تمہاری تخلیق یوں بنائی ہے کہ تم پانی کی طلب کرتے ہو' اور پانی کو یوں بنایا کہ وہ تمہاری طلب کو پورا کرتا ہے اور اس طلب اور رسد کو ہم نے متوازن بنایا۔ لیکن انداز تعبیر ایسا ہے جو موقع و مقام کلام کے مطابق ہے۔ ہر فعل اور ہر حرکت کی نسبت اللہ کی طرف ہے کیونکہ تصور یہ دینا مقصود ہے کہ اس کائنات کی ہر حرکت اور ہر واقعہ اللہ کے ارادے اور حکم سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ آسمانوں کے لیے اللہ کا جو تکوینی قانون ہے' وہی تمام مخلوقات کے لیے بھی ہے۔ پہلی آیت میں مکذبین کے بارے میں سنت الٰہیہ کا بیان تھا' اس دوسرے ٹکڑے میں آسمان و زمین اور کائنات کے بارے میں سنت الٰہیہ کا بیان ہے اور اس فضا میں ہواؤں اور پانیوں کا نظام بھی اسی سنت کے مطابق ہے۔ ان میں سے کوئی امر بھی سنت الٰہیہ کے سوا یا باہر وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ تمام امور اس ناموس اکبر کے مطابق چلتے ہیں جو اس کائنات میں جاری ہے اور جسے قرآن حق کہتا ہے: اب اس مضمون کا خاتمہ یوں ہوتا ہے کہ موت و حیات بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔ تمام چیزوں کو زندگی دینا' مارنا اور پھر سے اٹھانا اور حساب و کتاب اللہ کے اختیار میں ہے۔

وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ عَلِمْنَا

۲ الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ ﴿۲۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ یَحْشُرُهُمْ

ع۱۰ اِنَّهٗ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۵﴾

۲

"زندگی اور موت ہم دیتے ہیں' اور ہم ہی سب کے وارث ہونے والے ہیں' پہلے جو لوگ تم میں سے ہو گزرے ہیں ان کو بھی ہم نے دیکھ رکھا ہے اور بعد میں آنے والے بھی ہماری نگاہ میں ہیں۔ یقیناً تمہارا رب ان سب کو اکٹھا کرے گا وہ حکیم بھی ہے اور علیم بھی"۔

یہاں یہ دوسرا پیراگراف پہلے پیراگراف سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ پہلے میں یہ کہا گیا تھا۔

وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ (۲۳) وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ (۲٤) (۱۵: ۲۳ - ۲٤) "ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لیے ایک خاص مہلت عمل لکھی جا چکی تھی۔ کوئی قوم نہ اپنے وقت مقرر سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے' نہ اس کے بعد چھوٹ سکتی ہے"۔ جبکہ یہاں یہ فیصلہ دیا جاتا ہے کہ موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اللہ سب کا وارث ہے اور موت کے بعد اس کی طرف لوگ اٹھیں گے۔ اللہ جانتا ہے اور اس نے لکھ رکھا ہے کہ کوئی پہلے مار دیا جائے اور کس کو مہلت عمل دی جائے اور بعد میں وہ اس جہاں سے رخصت ہو' بہرحال موت کے بعد سب نے اٹھنا ہے' اور اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔

اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۱۵: ۲۵) "وہ حکیم و علیم ہے"۔ وہ اپنی حکمت کے مطابق اقوام و افراد کے لیے وقت مہلت طے کرتا ہے۔ اسے موت کا وقت معلوم ہے اور حشر کا وقت بھی اس نے مقرر و متعین کر رکھا ہے اور درمیانی عرصے کے امور بھی اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

اس پیراگراف اور سابق دونوں پیراگراف میں منظر کی حرکات ہم آہنگ ہیں۔ آسمانوں سے نزول ہدایت' فرشتوں کا اترنا' شیاطین پر ستاروں کی بمباری' ہواؤں کا چلنا اور بارشوں کا نزول' یہ سب مناظر دونوں میں ہیں۔ پھر اس دنیا اور کائنات کے بڑے بڑے واقعات آسمان' قلعے' ستارے اور سیارے' زمین' پہاڑ' ہوائیں' بارشیں اور نباتات بھی مشترکہ مناظر ہیں۔ ہٹ دھرمی کے اظہار کے لیے بھی ایسی ہی مثال دی گئی جو ان پیروں کے مضمون سے ہم آہنگ ہے کہ اگر آسمان میں ایک دروازہ کھول دیا جائے اور یہ لوگ اس میں چڑھ جائیں تو پھر بھی ان کے مکابرہ اور ہٹ دھرمی کا حال یہی ہو گا۔ غرض مضمون اور اس کی تصویر کشی قرآن عظیم کے انوکھے انداز تعبیر کو ظاہر کرتی ہے۔

---ooo---

اب یہاں تخلیق انسانیت کا قصہ عظیم پیش کیا جاتا ہے۔ آغاز انسانیت اور اس جہان میں ہدایت و ضلالت کی حکمت اور اس کے اسباب و عوامل' یعنی قصہ آدم۔ وہ کن عناصر سے کس طرح پیدا ہوئے؟ اور ان کی تخلیق کے وقت اور بعد کیا حالات ان کو پیش آئے۔

اس سے پہلے' اس تفسیر میں قصہ آدم کا مطالعہ ہم نے دو دفعہ کیا ہے یعنی سورہ بقرہ اور سورہ اعراف میں۔ دونوں مقامات پر یہ قصہ بعض مخصوص حالات میں' مخصوص مقاصد کے لیے بیان ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں مقامات پر اس قصے کی مختلف کڑیاں لائی گئیں اور طرز ادا بھی دونوں جگہ مختلف رہا۔ قصے کی فضا اور اس کے اثرات مختلف رہے اگرچہ دونوں مقامات پر بعض اثرات اور نتائج یکساں بھی تھے۔ یہ قصہ یہاں تیسری بار آ رہا ہے۔

تینوں مقامات پر اس قصے کے بعض تمہیدی بیانات یکساں ہیں۔ مثلاً سورہ بقرہ میں جہاں یہ قصہ آیا' وہاں اس سے قبل یہ کہا گیا۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۲ : ۲۹) "وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں' پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان استوار کیے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے"۔ اور سورہ اعراف (۱۱) میں جہاں یہ قصہ آیا اس سے پہلے کہا گیا۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ

(۷ : ۱۰) "ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لیے یہاں سامان زیست فراہم کیا' مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے"۔ اور یہاں سورہ حجر (۱۹) میں کہا گیا ہے :

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ

(۱۵ : ۱۹) "ہم نے زمین کو پھیلایا' اس میں پہاڑ جمائے۔ اس میں ہر قسم کی نباتات ٹھیک ٹھیک نپی تلی مقدار کے ساتھ اگائی۔ لیکن ان تینوں مقامات پر قصے کا انداز بیان مختلف ہے۔ اور اس سے غرض و غایت بھی مختلف ہے۔

سورہ بقرہ میں اس قصے سے غرض یہ تھی کہ تخلیق کائنات کے بعد اللہ نے اس کرۂ ارض پر حضرت آدم کو اپنا نائب و خلیفہ بنایا اور زمین کے اندر جو سہولیات موجود ہیں وہ سب بنی آدم کے لیے ہیں۔ چنانچہ بات کی ابتداء ہی یوں ہوئی۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (۲ : ۳۰) "اور اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا' میں زمین میں خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں"۔ اس لیے وہاں اس قصے میں آدم کے منصب خلافت ارضی کے اسرار و رموز بیان کیے گئے تھے جن پر فرشتوں کو تعجب ہوا' کیونکہ وہ اسرار و رموز ان کی نظروں سے اوجھل تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کو اپنے خلیفہ کا مقام ان پر ظاہر کرنا پڑا۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۳۱) قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (۳۲) قَالَ يَا آدَمُ أَنبِئْهُم بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنبَأَهُم بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ (۳۳)

۳۱ تا ۳۳)) "اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے' پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا "اگر تمہارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا) تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ"۔ انہوں نے عرض کیا: نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے' ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں' جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے والا اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں"۔ پھر اللہ نے آدم سے کہا' تم ان چیزوں کے نام بتاؤ"۔ جب اس نے ان سب کے نام بتا دیئے' تو اللہ نے فرمایا: "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں اور جو تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو' اسے بھی ہم جانتے ہیں"۔

اس کے بعد بقرہ میں ملائکہ کا سجدہ اور ابلیس کے انکار و استکبار کے واقعات بیان ہوئے۔ آدم اور ان کی اہلیہ کو جنت میں بسانے کی کہانی بیان کی گئی۔ پھر بتایا گیا کہ کس طرح شیطان نے آدم و حوا کو بہکایا اور یوں انہیں جنت سے خارج کرا دیا۔ اس کے بعد آدم و حوا کو زمین پر اتارا گیا اور یہاں ان کے ذمے فریضہ خلافت ارضی کی ذمہ داری لگائی گئی۔ لیکن جنت سے خارج کرنے سے قبل ان سے امتحان لے کر زمین میں رہنے کے لیے تیار کیا گیا۔ انہوں نے توبہ کی اور اللہ سے مغفرت طلب کی۔ سورہ بقرہ میں اس قصے کے بعد بنی اسرائیل کو یہ بات یاد دلائی گئی ہے کہ وہ میرے ان انعامات کو یاد کریں جو میں نے ان پر کیے۔ اور انہوں نے خدا کے ساتھ جو عہد کیے اس کو پورا کریں کیونکہ یہ فریضہ وہ ہے جو تمام انسانوں کے ابو الآباء حضرت آدم نے اپنے اوپر عائد کیا اور اسی عہد کی اساس پر ان کو خلافت ارضی نصیب ہوئی۔

سورہ اعراف میں بھی یہ قصہ آیا ہے۔ اس میں وہ طویل کہانی بیان کی گئی جو عروج فی الجنۃ اور وہاں سے پھر نکالے جانے سے متعلق ہے۔ اس قصے میں یہ سبق یاد دلایا گیا ہے کہ ابلیس آغاز کائنات سے انسان کا دشمن تھا اور آخر تک رہے گا۔ یہاں تک کہ آدم و ابلیس جس طرح پہلے دربار الٰہی میں تھے پھر وہاں پیش ہوں۔ اب ایک فریق تو ان لوگوں کا ہو گا جو جنت میں داخل ہوں گے' جہاں سے شیطان نے ان کے والدین کو نکالا تھا' کیونکہ ان لوگوں نے شیطان کو اپنا دشمن سمجھ کر اس کی مخالفت کی۔ ایک دوسرا فریق آگ میں گرایا جائے گا' کیونکہ انہوں نے شیطان مردود اور ہٹ دھرم کے قدموں کی پیروی کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں بھی ملائکہ کی جانب سے آدم کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا ذکر بھی ہوا۔ یہ تذکرہ بھی ہوا کہ ابلیس نے انکار اور استکبار کیا۔ اس نے اللہ سے مطالبہ کیا کہ قیامت تک اسے مہلت دی جائے تاکہ وہ ان بنی آدم کو گمراہ کر سکے جن کی وجہ سے وہ جنت سے بے آبرو کر کے نکالا گیا۔ اب آدم اور اس کی زوجہ کو جنت میں بسایا گیا اور حکم دیا گیا کہ وہ جو چاہیں وہاں کھائیں پئیں صرف ایک درخت کے قریب نہ جائیں۔ یہ ایک درخت کی ممانعت بھی دراصل علامتی ممانعت تھی۔ مقصد یہ تھا کہ آدم علیہ السلام کے جذبہ اطاعت امر اور ان کی قوت ارادی کو ٹیسٹ کیا جائے۔ اس کے بعد وہاں یہ تذکرہ آتا ہے کہ کس طرح شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسے ڈالے اور کس طرح انہوں نے اس درخت کا پھل چکھ لیا اور پھر کس طرح معجزانہ انداز میں ان کے جسم عریاں ہو گئے اور کس طرح اللہ کا عتاب حضرت آدم اور ان کی زوجہ پر نازل ہوا اور کس طرح ان کو 'سب کو' زمین میں اتار کر بسا دیا گیا کہ وہ اس کرہ ارض پر بھی حق و باطل کے معرکے میں شریک ہوں۔ فرمایا گیا:

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ

(۲٤) قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ (۲۵) (۷: ۲٤ –

۲۵)) "فرمایا اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو' اور تمہارے لیے ایک خاص مدت تک زمین ہی جائے قرار اور سامان زیست ہے"۔ اور فرمایا "وہیں تم کو جینا ہے اور وہیں مرنا ہے اور اسی سے تم کو آخر کار نکالا جائے گا"۔

انسانیت کی یہ کہانی سورہ اعراف میں اسی طرح چلتی ہے یہاں تک کہ سب لوگ دوبارہ میدان حشر میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ وہاں بڑی تفصیل کے ساتھ ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں اور ردو قدح اور حساب و کتاب کے بعد ایک فریق جنت میں اور ایک فریق دوزخ میں چلا جاتا ہے۔

وَ نَادٰٓي اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا

رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۷: ۵۰) "اور دوزخ کے لوگ جنت والوں کو پکاریں گے کہ کچھ تھوڑا سا پانی ہم پر بھی ڈال دو یا جو رزق اللہ نے تمہیں دیا ہے' اس میں سے کچھ پھینک دو۔ وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں منکرین حق پر حرام کر دی ہیں"۔ (۵۰) اور اس کے بعد اب اس منظر پر پردہ گر جاتا ہے۔

لیکن یہاں اس قصے کا مدعا کیا ہے؟ یہاں تخلیق انسان کے اسرار و رموز اور فلسفہ ہدایت و ضلالت زیر بحث ہیں اور انسان کی ذات میں ہدایت و ضلالت کے جو عوامل رکھ دیئے گئے ہیں ان سے بحث کی گئی ہے۔ چنانچہ یہاں بات کا آغاز اس امر سے کیا جاتا ہے کہ انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے پیدا کیا گیا اور اللہ نے پھر اس میں اپنی روشن روح پھونکی اور اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے جنوں کو آگ کی لپیٹ سے پیدا کر دیا تھا' یہاں پھر سجود ملائکہ' انکار ابلیس کے واقعات آتے ہیں۔ ابلیس کہتا ہے کہ کیا میں ایک ایسے انسان کے سامنے سربسجود ہو جاؤں جسے مٹی سے پیدا کیا گیا۔ پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ کس طرح شیطان کو ملعون قرار دے کر درگاہ الٰہی سے نکالا گیا۔ پھر اس کی طرف سے درخواست پیش ہوتی ہے کہ اسے قیامت تک کے لیے مہلت دی جائے۔ اس کی درخواست منظور ہوتی ہے۔ یہاں شیطان اعتراف کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرے گا لیکن اللہ کے جو مخلص بندے ہوں گے ان پر اسے کوئی قدرت حاصل نہ ہو سکے گی۔ وہ جن لوگوں کو گمراہ کرے گا وہ اس کی اطاعت اور اس کے طریقوں کو قبول کرنے کے لیے از خود تیار ہوں گے اور اللہ کے دین اور طریقے میں ان کو کوئی دلچسپی نہ ہو گی۔ دونوں فریقوں کا انجام مختصراً بیان کر دیا جاتا ہے بغیر تفصیل کے کیونکہ یہاں مقصد صرف تخلیق انسان اور فلسفہ ہدایت و ضلالت موضوع کلام ہے۔

ذرا اب اس قصے کے مناظر کو یہاں ہم تفصیل سے لیتے ہیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝۲۶ وَالْجَاۗنَّ خَلَقْنٰهُ

مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

"ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے بنایا اور اس سے پہلے جنوں کو ہم آگ کی لپیٹ سے پیدا کر چکے تھے"۔

قصے کے آغاز ہی میں یہ کہا جاتا ہے کہ انسان اور جنات یا شیطانوں کی فطرتوں میں یوم تخلیق کائنات سے ہی فرق و امتیاز ہے۔ انسان کو بجنے والی خشک مٹی سے پیدا کیا گیا جو سڑی ہوئی خمیری مٹی یعنی کیچڑ سے لی گئی تھی یعنی اس مٹی کو ٹھو کا جائے تو بجتی ہے اور شیطان کو نار سموم یا آگ کی لپیٹ یا شعلے سے بنایا گیا ہے۔ بعد میں معلوم ہو گا کہ انسان کے مزاج میں ایک جدید عنصر بھی داخل ہوا ہے یعنی انسان کے اندر اللہ نے اپنی روح پھونکی ہے۔ رہا شیطان تو وہ نار سموم ہی کی طبیعت پر قائم ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (۲۸) فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (۲۹) فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ (۳۰) اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ (۳۱) قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ (۳۲) قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (۳۳) قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ (۳۴) وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ (۳۵) (۱۵ : ۲۱ تا ۳۵) "پھر یاد کرو اس موقع کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ "میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔ جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا"۔ چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے کہ اس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دیا"۔ اس نے کہا" میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے پیدا کیا ہے"۔ رب نے فرمایا :"اچھا تو نکل جا یہاں سے کیونکہ تو مردود ہے اور اب روز جزاء تک تجھ پر لعنت ہے"۔

پھر یاد کرو اس موقع کو کہ جب اللہ فرشتوں کے ساتھ ہمکلام ہوا۔ یہ کب کی بات ہے؟ کہاں یہ واقعہ پیش آیا؟ اس کی تفصیلی کیفیت کیسی تھی؟ ان سوالات کا جواب ہم نے پارۂ اول میں سورۃ بقرہ میں دے دیا ہے۔ وہ یہ کہ ان سوالات کا شافی جواب ہی نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہ عالم بالا کی کہانی ہے اور ہمارے پاس کوئی نص صریح نہیں ہے کیونکہ عالم غیب سے متعلق کسی سوال کا جواب ہم صرف نص صریح ہی سے دے سکتے ہیں۔ جو لوگ ایسے سوالات کا جواب دینا چاہتے ہیں وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کی سعی لاحاصل کر رہے ہیں اور ان کی باتوں پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

رہی یہ بات کہ انسان کو ایسی مٹی سے کیسے بنایا گیا جو سڑی ہوئی تھی اور اس خمیری مٹی سے بنا کر اس کو کس طرح خشک کر دیا گیا تھا کہ وہ بجتی تھی۔ پھر یہ کہ اس کے اندر روح کس طرح ڈال دی گئی۔ ہم صاف صاف کہتے ہیں کہ ان امور کی تفصیلی کیفیات سے ہم بے خبر ہیں۔ کسی صورت میں بھی ہم از سر نو اس کیفیت کا سائنسی تجزیہ نہیں کر سکتے۔

اس سلسلے میں قرآن کریم کی جو آیات وارد ہیں۔ ان کو پیش نظر رکھتے ہیں' خصوصاً یہ آیت کہ۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (۲۳ : ۲) "ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا"۔ اور دوسری آیت میں ہے۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ "ہم نے انسان کو مٹی کی ست سے پیدا کیا جو حقیر پانی کی شکل میں ہے"۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی اصلیت اور زندگی کی حقیقت اس زمین کی مٹی سے ہے اور انسان کے اندر وہی اہم عناصر موجود ہیں جو اس زمین کے اہم عناصر ترکیبی ہیں۔ اسی طرح انسان اور تمام دوسرے زندوں کے اجسام انہی عناصر سے بنے ہوئے ہیں۔ لفظ سلالۃ ایک خاص انداز کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یہاں تک تو قرآن اشارہ کرتا ہے اور اس کے الفاظ سے یہ مفہوم نکلتا ہے' لیکن اس سے آگے جدید دور کے انکشافات سے جو کچھ معلوم ہوا اسے قرآن مجید سے اخذ کرنا ایک تکلف ہی ہے۔ موجودہ آیات ان مفاہیم کی متحمل نہیں ہیں۔ جہاں تک سائنسی تحقیقات کا تعلق ان کا اپنا ایک انداز ہے۔ سائنسی تحقیقات اپنے وسائل و ذرائع کے ساتھ جاری رہیں گی۔ اور سائنسی تحقیقات کے نتائج فرضی ہوتے ہیں۔ سائنسی تحقیقات اپنے وسائل ذرائع کے ساتھ جاری رہیں گی۔ اور سائنسی تحقیقات کے نتائج فرض ہوتے ہیں اور وہ حقائق نہیں بلکہ نظریات ہوتے ہیں۔ ان نظریات میں سے بعض حقائق کا روپ اختیار کر لیتے ہیں بشرطیکہ کسی حقیقت تک پہنچنے کی کوئی سبیل میسر ہو جائے اور ان نظریات میں سے جو حقائق کا روپ نہیں اختیار کرتے وہ بحث و تمحیص کے بعد بدل بھی جاتے ہیں لیکن ان سائنسی تحقیقات کا کوئی نتیجہ بھی ان اصولی حقائق سے متضاد نہیں ہوتا جو قرآن میں ثبت ہیں۔ قرآن کریم نے جو ابتدائی حقیقت دی ہے وہ صرف یہ ہے کہ "ابتداءً انسان کو مٹی کے ست سے تخلیق کیا گیا ہے اور اس کی تخلیق میں پانی کا ایک بڑا حصہ ہے۔ لہٰذا ابتدائی حقیقت جو قرآن کریم نے بیان کی ہے' اپنی جگہ باقی ہے' بعد میں آنے والے نظریات اس کی تفصیلات ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیچڑ اور اس کے اندر پائے جانے والے عناصر سے یہ زندہ انسان کی شکل کس طرح اختیار کی۔ کس طرح اعضا بنے اور کس طرح انسان کی شکل و صورت وجود میں آئی۔ یہ وہ راز ہے جس کے علل و اسباب معلوم کرنے سے انسان آج تک بے بس ہے۔ پہلے خلیے کو زندگی کس طرح ملی۔ انسان اور زندگی کی نشوونما پر کام کرنے والے سائنس دان آج تک اس راز سے آگاہ نہیں ہو سکے۔ رہی اعلیٰ درجے کی انسانی زندگی جس کے اندر فہم و فراست کی قوتیں موجود ہیں' اس کے اندر ایسی امتیازی قوتیں موجود ہیں جن کے ذریعے انسان نے پوری کائنات کو مسخر کر لیا ہے' تمام دوسرے درجے کے زندہ حیوانات کو قابو کر لیا ہے۔ اس حضرت انسان کو اس پوری دنیا پر فیصلہ کن برتری حاصل ہے۔ یہ تو وہ عظیم راز ہے جس کے بارے میں انسانی نظریات آج تک مخبوط الحواس ہیں۔ لیکن اس اہم راز کے بارے میں

قرآن کریم انسان کو نہایت ہی سادہ ، واضح اور اجمالی علم دیتا ہے ۔

سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي (۱۵ : ۲۹) (جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو) تو در حقیقت یہ اللہ کی پیدا کردہ روح ہے جو اس حقیر عضویاتی مخلوق کو ایک بلند انسانی مخلوق بنا دیتی ہے ۔ لیکن اہم سوال یہی ہے کہ یہ کیسے ہوا؟ اس کا جواب یہ حقیقت ہے کہ اس انسان کو اس قدر قوت مدرکہ دی کب گئی ہے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھ سکے ۔ چنانچہ مسلمانوں کا موقف یہ ہے کہ وہ اس راز کا ادراک ہی نہیں کر سکتے ۔ یہ موقف نہایت ہی ٹھوس ہے اور ہم اس پر بڑے اطمینان سے کھڑے ہیں ۔

اس سے قبل یعنی تخلیق انسان سے قبل اللہ نے شیطان کو آگ کی لپیٹ سے پیدا کیا تھا ۔ شیطان اور شیطانی قوت تخلیق آدم سے بھی پہلے موجود تھی ۔ یہ ہے وہ علمی اور یقینی اطلاع جو اللہ نے ہمیں دی ہے ۔ رہی یہ بات کہ ذات شیطانی کی کیفیت کیا ہے اور اس کی تخلیق کی تفصیلات کیا ہیں تو یہ ایک دوسری حقیقت ہے اور اللہ نے ہمارا یہ فرض قرار نہیں دیا کہ ہم ان لاحاصل چیزوں میں فضول بحثیں اور تحقیقات کریں ۔ ہاں ہم اس ناری مخلوق کی بعض صفات سے ضرور واقف ہیں اور آگ کی لپیٹ اور شعلوں کو بھی جانتے ہیں اور اس قوت کی ناری صفات انسانی ذات پر اثر انداز بھی ہوتی ہیں ۔ کیونکہ وہ آگ سے ہیں ۔ نیز ہمیں اس قدر معلوم ہے کہ جنات کی ذاتی صفات میں اذیت اور برق رفتاری شامل ہے کیونکہ ان کی تخلیق نار سموم سے ہے ۔ اس قصے کے درمیان میں سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ شیطان میں صفت غرور اور تکبر پایا جاتا ہے ۔ چونکہ شیطان جن تھا اس لئے غرور و استکبار اس کے مزاج کا خاصہ ہونا چاہئے کیونکہ نار کے ساتھ یہ صفات لگا کھاتی ہیں ۔

انسان کی تخلیق چونکہ سڑے ہوئے گارے سے ہوئی ، جو خشک ہو کر صلصال بن گیا تھا یعنی بجنے کی آواز اس سے نکلتی تھی ۔ پھر اس میں ذات باری کی طرف سے ایسی روح پھونکی گئی جس کی وجہ سے زندہ مخلوق کی یہ صنف دوسری مخلوقات سے ممتاز ہو گئی ۔ پھر اسے مخصوص انسانی صفات بھی عطا ہوئیں ۔ اور ان صفات میں سے اہم صفت انسان کی وہ علمی ترقی تھی جو وہ انسانیات کے شعبے میں کر رہا تھا ۔

یہ نفخ روح ، دراصل انسان کو عالم بالا سے مربوط کر دیتی ہے ۔ یہی صفت ہے جو انسان کو خدا رسیدگی کی قوت دیتی ہے اور یہی قوت انسان کو یہ صلاحیت دیتی ہے کہ وہ خدا سے ہدایت اخذ کر سکے ، یوں حضرت انسان جسمانی اور مادی اور حواس کی دنیا سے بلند ہو جائے اور اس عالم تجرید میں کام کرے ، جس میں دل و دماغ جولانی دکھاتے ہیں ۔ اس طرح انسان کو وہ راز عطا کیا جاتا ہے جس تک انسان ایسے حالات میں پہنچتا ہے کہ وہ زمان و مکان سے وراء ہوتا ہے اور دائرہ حواس سے آگے بڑھ کر غیر محدود تصورات کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے ۔

یہ اونچے درجات حاصل کرنے کے باوجود انسان کے ساتھ مادیت کی آلودگی بہر حال قائم رہتی ہے ۔ اس کا مزاج مادی ہی رہتا ہے اور وہ مادی ضروریات اور کمزوریوں کا شکار رہتا ہے ۔ وہ کھاتا ہے ، پیتا ہے ، لباس کا محتاج ہوتا ہے ۔ طبعی میلانات اور جنسی خواہشات رکھتا ہے ۔ کمزوریاں اور کوتاہیاں اس میں ہوتی ہیں اور اپنے جسمانی اور تصوراتی کمزوری کی وجہ سے پھر اس سے برے افعال بھی سرزد ہوتے ہیں ۔

اسلام کا منشا اور اعلیٰ نصب العین یہ ہے کہ انسان ' انسان مادی اور مٹی کے تقاضوں اور روحانی اور علوی تقاضوں کے درمیان ایک حسین توازن کے اعلیٰ اور ارفع مقام تک پہنچ جائے۔ یہ وہ ترقی یافتہ اور بلند مقام ہے جسے ہم کمال بشری سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسلام انسان سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ اپنے عناصر ترکیبی میں سے کسی ایک کو نظرانداز کر دے اور یا خالص روحانی بن جائے ' رہبان ہو یا ہندو 'جوگی ہو یا خالص مادہ پرست بن جائے اور مادی اقدار کے سوا تمام اعلیٰ اقدار کی نفی کر کے حیوان بن جائے۔ اگر انسان ان دونوں عناصر میں سے کسی ایک ہی کا انتخاب کرے گا تو وہ کبھی بھی کمال و ترقی کے منازل طے نہیں کر سکتا۔ جو قومیں صرف ایک عنصر کو پیش نظر رکھ کر انسان کو ترقی دیتی ہیں وہ ان مقاصد کے خلاف کام کر رہی ہیں جن کے لیے اس مخلوق کی تخلیق کی گئی ہے۔

جو لوگ انسان کی جسمانی قوتوں کو معطل کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہی ہیں جو انسان کی روحانی قوتوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں فریق انسان کے سیدھے فطری مزاج کے خلاف جا رہے ہیں۔ ایسے لوگ انسان سے وہ کام لینا چاہتے ہیں جس کے بارے میں خالق انسان کا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں کیونکہ یہ لوگ جسد انسانی کے ایک حصے کو کاٹ رہے ہیں ' لہٰذا وہ اس سلسلے میں خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گے کیونکہ وہ فطرت کے خلاف جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان لوگوں کو تنبیہ کی جو رہبانیت اختیار کرنے کا ارادہ ظاہر کرتے تھے۔ مثلاً یہ کہ بعض نے کہا کہ وہ کبھی عورت کے قریب نہ جائے گا۔ بعض نے کہا کہ وہ صائم الدہر ہو گا 'کبھی بھی افطار نہ کرے گا۔ کسی نے کہا کہ وہ ساری ساری رات عبادت کرے گا۔ ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوئے گا۔ حضورؐ نے ان کو سخت تنبیہ فرمائی۔ حدیث عائشہ کے آخر میں ہے : فمن رغب عن سنتي فليس مني "جو شخص میری سنت سے منہ موڑے گا وہ میری امت سے نہ ہو گا"۔

اسلام نے انسان کے لیے قوانین شریعت کی جو ضابطہ بندی کی ہے وہ اسی اصول پر کی ہے۔ اسلام نے اخلاق و قانون کا ایسا ضابطہ دیا ہے جو اسی اصول پر مبنی ہے اور اس میں انسان کی تمام فطری صلاحیتوں کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ اسلام انسان کی صلاحیتوں میں سے کسی صلاحیت کی بیخ کنی نہیں کرتا ' ہاں اسلام ان صلاحیتوں کے درمیان ایک قسم کا توازن ضرور قائم کرتا ہے تاکہ ان میں سے کوئی طاقت اور صلاحیت حد اعتدال سے تجاوز نہ کر جائے اور کوئی صلاحیت دوسری کو ختم نہ کر دے۔ کیونکہ توازن بگاڑنے سے بہرحال غیر متوازن صلاحیت ختم ہو گی اور انسان کی بعض خصوصیات کا وجود ہی باقی نہ رہے گا۔ اور یوں انسان ایک شرعی جرم کا مرتکب ہو گا کیونکہ اللہ کا یہ بھی حکم ہے کہ اپنی فطری قوتوں کو محفوظ رکھو اور ان کی نشوونما کرو۔ کیونکہ یہ اللہ کی عطا کردہ ہیں اور کسی مقصد کے لیے ہیں 'محض اضافی نہیں ہیں اور نہ بے مقصد ہیں۔

یہ تھیں وہ بعض باتیں اور کچھ خیالات جو انسان کی تخلیق کی حقیقت پر غور کرنے کے بعد دل میں اترے۔ قرآن کریم تخلیق انسان کے بارے میں یہی حقائق ذہن نشین کراتا ہے۔ اب مناسب ہے کہ ہم اس قصے کے مشاہد اور مناظر کی طرف آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا :

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ

مَّسۡنُوۡنٍ ﴿۲۸﴾ فَاِذَا سَوَّيۡتُهٗ وَنَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِىۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِيۡنَ ﴿۲۹﴾

"پھر یاد کرو اس موقع کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ "میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔ جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا"۔

چنانچہ فرشتوں نے ایسا ہی کیا جس طرح اللہ نے حکم دیا تھا۔ اور اللہ نے چونکہ انسان کی تخلیق کا ارادہ کر لیا تھا اس لیے انسان مطلوبہ ارادہ کرتے ہی تخلیق ہو گیا۔ سوال یہ ہے کہ اللہ کی روح جو اس فانی جسد خاکی میں پھونکی گئی اور جو لافانی چیز ہے وہ کس طرح اس جسد خاکی کے ساتھ آمیختہ ہو گئی' جو فانی چیز ہے۔ ایک مومن تو ایسے سوالات نہیں کرتا کیونکہ اس موضوع پر یہ مباحث و مذاکرہ ایک عبث کوشش ہے۔ بلکہ اس قسم کے مباحث میں جدل و جدال کرنا محض تضیع اوقات ہوتا ہے۔ ان موضوعات پر کلام کر کے ہم عقل کو ایک ایسے دائرے میں داخل کرتے ہیں جس میں اس کے اسباب اوراک اور اس کی قوت فیصلہ کام ہی نہیں کر سکتی۔ اس سلسلے میں جو بحثیں اس سے قبل ہوئی ہیں یا ہو رہی ہیں وہ اس جہل پر مبنی ہیں جس میں انسان خود عقل انسانی کی حقیقت کو سمجھنے کے حوالے سے مبتلا ہے۔ عقل انسانی کا یہ مقام ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی حدود سے آگے بڑھ کر ماوراء کے حدود میں دخل دے۔ کیونکہ عقل میں وہ طاقت ہی نہیں ہے کہ اپنے اسباب اوراک کی حدود اور صلاحیت سے آگے بڑھے کیونکہ خالق کائنات کی کیفیت عقل انسانی کی حدود سے باہر ہے۔ لہٰذا اس میدان میں عقل کو لگانا ہی حماقت ہے۔ تخلیق کائنات کے راز معلوم کرنے میں عقل انسانی کو کھپانا ہی بنیادی غلطی ہے۔ عقل اس بات میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی کہ ایک فانی چیز سے ایک خالد اور دائمی حقیقت کے ساتھ کس طرح وابستہ و آمیختہ ہو سکتی ہے۔ ایک چیز ازلی ہے اور دوسری حادث اور نہ اللہ نے عقل انسانی سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کرے اور اسے ثابت کرے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں صرف یہ بتایا ہے کہ ایسا ہوا لیکن کسی جگہ یہ نہیں بتایا کہ کیسے ہوا؟ کیونکر ایسا ہوا؟ یہ بات تو ثابت ہے کہ انسان مخلوق ہے اور ہمارے سامنے موجود ہے۔ عقل انسانی اس موجود حقیقت کا انکار تو نہیں کر سکتی۔ نہ عقل انسانی خود اس تخلیق کی کیفیت بتا سکتی ہے۔ عقل انسانی کے بس میں صرف یہ بات ہے کہ وہ قرآن کی خبر کی تصدیق کر دے۔ جہاں تک حقیقت تک رسائی کا تعلق ہے تو عقل انسانی ایسا نہیں کر سکتی۔ اور یہ بات بداہتہً ثابت ہے کہ خود انسان اور عقل انسانی ایک حادث اور مخلوق اور فانی حقائق ہیں اور یہ بھی ثابت ہے کہ کوئی فانی اور مخلوق چیز لافانی' ازلی اور ابدی حقائق پر کوئی حکم نہیں لگا سکتی۔ کسی شکل و صورت میں بھی نہیں لگا سکتی۔ اس سلسلے میں عقل کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ اس میدان میں جولانی دکھانے سے باز آ جائے اور ایسے میدانوں میں کام کرے جو اس کے لیے کھلے اور محفوظ ہیں۔ مثلاً عام سائنسی میدان۔

میں نے اپنی عادت کے برعکس اس عقلی مسئلے پر یہاں قدرے طویل بحث کر دی ہے حالانکہ ظلال القرآن میں ہمارا یہ طریقہ نہیں رہا ہے۔ یہ اس لیے کہ امور غیب کی نوعیت ایک جیسی ہے اور ان تمام امور غیبیہ کے مسئلے میں ہم ایک ایسا اصولی قاعدہ وضع کرنا چاہتے ہیں کہ انسانی دل و دماغ اور انسانی سوچ اور ایمان اس قاعدے پر مطمئن ہو جائیں۔ بہرحال اس کے بعد کیا ہوا؟

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾

"چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا' سوائے ابلیس کے کہ اس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا"۔

فرشتوں نے تو یہ سجدہ اس لیے کیا کہ ان کی فطرت ہی عبادت الٰہی اور تعمیل حکم ہے۔ بغیر چون و چرا کے اور ابلیس نے انکار اس لیے کیا کہ وہ ملائکہ میں سے نہ تھا۔ ملائکہ نوری مخلوق ہیں اور شیطان ناری۔ فرشتے ایسے ہیں کہ ان کو اللہ کی طرف سے جو حکم بھی ملے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے' انہیں جو حکم ملے وہ کر گزرتے ہیں اور ابلیس نے یہ حکم ملتے ہی انکار کیا اور استکبار کیا۔ اس لیے یقیناً وہ فرشتوں میں سے نہ تھا۔ یہاں استثناء متصل نہیں ہے' یہ اس طرح ہے جس طرح کہتے ہیں کہ فلاں کی اولاد تو سب آگئے مگر احمد نہیں آیا۔ جبکہ احمد فلاں کے بیٹوں میں سے نہیں ہوتا۔ صرف یہ کہ وہ ان کے ساتھ ہی رہنے والا ہوتا ہے یا ان کے آنے والے کے فعل کے ساتھ۔ اس کا بھی کچھ تعلق ہوتا ہے اس لیے اسے استثنائیہ جملے میں یکجا کر دیا جاتا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکم تو تھا ہی فرشتوں کو' پھر ابلیس اس حکم کے مدلول میں کس طرح شامل ہو گیا۔ تو جواب یہ ہے کہ سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس بھی اس حکم میں شامل تھا۔ سورہ اعراف میں تو صراحت کے ساتھ ابلیس کو شامل کیا گیا۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ "اس نے کہا کس چیز نے تجھے منع کیا کہ تو سجدہ کرے جبکہ میں نے تمہیں حکم دیا ہے"۔ قرآن کریم کا یہ انداز بیان ہے کہ وہ حالاتی مفہوم پر اکتفاء کرتا ہے۔ یہ اسلوب قرآن میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ آیت مذکورہ اس بات پر قطعی الدلالت ہے کہ اللہ کی طرف سے ابلیس کو بھی حکم دے دیا گیا تھا اور یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ حکم وہی ہو جو فرشتوں کو دیا گیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کے احکام میں ہی ابلیس کو شامل کر دیا گیا ہو کیونکہ وہ ان سے متعلق تھا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابلیس کو علیحدہ حکم دیا گیا ہو' لیکن یہاں اس کا تذکرہ اس لیے نہیں کیا گیا کہ یہاں اسے نظر انداز کرنا مطلوب تھا اور فرشتوں کو نمایاں کرنا مطلوب تھا۔ لیکن جس طرح ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا اور ہم بھی یہی موقف اختیار کرتے ہیں۔

فرشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ ابلیس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ غیبی امور ہیں اور مسلمات ایمانیہ میں سے ہیں۔ ہم ان پر اسی طرح ایمان لاتے ہیں جس طرح نصوص میں ان کا تذکرہ ہوا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر تشریح کی ہے عقل کے لیے ان حقائق تک رسائی ممکن نہیں ہے اس لیے وہ نصوص کے سوا کسی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس کا دائرہ کار نہایت ہی محدود ہے۔

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾

رب نے پوچھا "اے ابلیس، تجھے کیا ہوا کہ تو نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دیا؟" اس نے کہا "میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے پیدا کیا ہے"۔

یہ غرور و انکبار کا مزاج بول رہا ہے۔ نظر آتا ہے کہ گرم آگ سے پیدا ہونے والی یہ مخلوق کس قدر سرکش ہے۔ اسے خشک بجنے والا گارا نظر آتا ہے۔ اس سے بھی پہلے اس کی سڑی ہوئی حالت بھی نظر آتی ہے لیکن اسے وہ قدرتی روح نظر نہیں آتی جو عالم بالا سے اس جسد خاکی میں پھونکی گئی۔ یہ مغرور تکبر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کی عظمت، شان اور مرتبے سے یہ بات فروتر ہے کہ میں ایک ایسی مخلوق کو سجدہ کروں جسے گلی سڑی ہوئی مٹی کے ایسے گارے سے بنایا گیا ہے جو بج رہا ہے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ اسے راندۂ درگاہ کر دیا جائے اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ملعون قرار دے دیا جائے۔'

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ﴿٣٤﴾ وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ﴿٣٥﴾

رب نے فرمایا "اچھا تو نکل جا یہاں سے کیونکہ تو مردود ہے، اور اب روز جزا تک تجھ پر لعنت ہے"۔

اب اس کا حسد، بغض اور شرارت کا مزاج سامنے آتا ہے۔

قَالَ رَبِّ فَأَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿٣٦﴾ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿٣٧﴾ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿٣٨﴾

اس نے عرض کیا "میرے رب، یہ بات ہے تو پھر مجھے اس روز تک کے لیے مہلت دے جب کہ سب انسان دوبارہ اٹھائے جائیں گے"۔ فرمایا "اچھا، تجھے مہلت ہے اس دن تک جس کا وقت ہمیں معلوم ہے"۔

یہ دربار الٰہی ہے اور یہ حضرت ندامت اور معافی مانگنے کے بجائے مہلت مانگ رہے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ رجوع الی اللہ کریں، توبہ و استغفار کی کوئی سبیل نکالیں اور گناہ معاف کرالیں بلکہ وہ آدم اور آدم کی تمام نسل سے انتقام لینے کا اعلان کرتا ہے۔ اگرچہ وہ آدم کے حوالے سے خود اپنے کیے کی وجہ سے مردود ہوا مگر اپنی کوتاہی کو آدم کی طرف منسوب کرتا ہے اور اسے یہ نظر نہیں آتا کہ نافرمانی کا ارتکاب تو خود اس نے کیا ہے اور اپنے غرور اور انکبار کی وجہ سے کیا ہے۔

قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٣٩﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿٤٠﴾

وہ بولا "میرے رب، جیسا تو نے مجھے بہکایا اسی طرح اب میں زمین میں ان کے لیے دل فریبیاں پیدا کر کے ان سب کو بہکا دوں گا، سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے ان میں سے خالص کر لیا ہو"۔

یہاں ابلیس نے اپنا میدان جنگ خود ہی متعین کر دیا ہے' یہ کہ وہ زمین میں انسان کے خلاف جنگ کرے گا۔

لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ "میں زمین میں ان کے لیے اپنے دل فریبیاں پیدا کروں گا"۔ اسی طرح اس نے میدان جنگ میں استعمال ہونے والے اپنے ہتھیار کا بھی اعلان کر دیا۔ وہ یہ کہ میں غلط اور مضر اعمال کو ان کے لیے خوشنما بناؤں گا۔ برے کو بھلا قرار دوں گا۔ مصنوعی خوبصورتیوں کے ذریعے ان کو دام فریب میں گرفتار کروں گا۔ چنانچہ جو شخص بھی شر کا ارتکاب کرتا ہے وہ تب ہی کرتا ہے کہ شیطان اس کے لیے اسے خوشنما بنا دیتا ہے۔ شر کو وہ خیر کا لباس پہناتا ہے اور وہ شر کو ہرگز شر کی صورت میں پیش نہیں کرتا۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ وہ شیطانی حربے کو اچھی طرح سمجھ لے انسان کو ہر اس معاملے پر چوکنا ہو کر غور کرنا چاہئے۔ جس چیز کو خوشنما بنا دیا گیا ہو اور جس کی طرف نفس انسانی کا میلان زیادہ ہو' اس بات کا غالب امکان ہے کہ ایسے معاملات کے پیچھے شیطان کا ہاتھ ہو گا انسان شیطان کے ان خوشنما تصورات سے تب ہی بچ سکتا ہے کہ وہ تعلق باللہ کو ہر وقت مضبوط رکھے' اللہ کی بندگی کا حق ادا کرے کیونکہ شیطان خود اقرار کرتا ہے کہ اللہ کے مخلص بندوں کے مقابلے میں اس کے یہ ہتھیار کند ہوں گے۔ وہ کہتا ہے۔

وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۳۹) اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (۴۰) (۱۵: ۳۹ -

۴۰) "میں ان سب کو بہکا دوں گا سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے ان میں سے خالص کر لیا ہو"۔ اور ہر دور میں اللہ اپنے بعض بندوں کو خالص کر لیتا ہے۔ جبکہ اللہ کے وہ بندے اپنے آپ کو اللہ کے لیے خالص کر لیتے ہیں اور وہ اللہ کی بندگی اسی طرح کرتے ہیں جس طرح کہ گویا وہ اللہ کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر شیطان کے حربے کارگر نہیں ہوتے۔

شیطان نے یہ استثناء خود کر دیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کائنات میں سنت الٰہیہ کیا ہو گی؟ اور یہ کہ سنت الٰہیہ سے فرار ممکن نہیں ہے۔ سنت الٰہیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان بندوں کو اپنے لیے چن لے گا جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے لیے خالص کر دیا۔ ایسے بندے اللہ کی حمایت میں ہوں گے۔ اللہ کی زیر نگرانی ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے بھی صاف صاف جواب دے دیا:

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾

فرمایا "یہ راستہ ہے جو سیدھا مجھ تک پہنچتا ہے۔ بے شک جو میرے حقیقی بندے ہیں ان پر تیرا بس نہ چلے گا۔ تیرا بس تو صرف ان بہکے ہوئے لوگوں ہی پر چلے گا جو تیری پیروی کریں"۔

یہ سیدھی راہ ہے' یہ ناموس فطرت ہے' یہ سنت الٰہیہ ہے' ہدایت و ضلالت میں اللہ نے یہی سنت قرار دی ہے' یہ

کہ اللہ کے مخلص بندوں پر شیطانی چالیں کارگر نہ ہوں گی اور یہی قانون الٰہی ہے ' شیطان ان پر اثرات نہ ڈال سکے گا اور اس دنیا کو وہ ان کے لیے مزین نہ بنا سکے گا۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ نے شیطان کو یہ کام کرنے سے روک دیا ہے۔ وہ اللہ کی حمایت میں آ چکے ہیں ' ان بندوں تک شیطان کا داخلہ بند ہوتا ہے ' اس لیے کہ ان کی نظریں ہر وقت اللہ پر ہوتی ہیں اور یہ بندے ناموس فطرت کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ شیطانی چالیں صرف ان لوگوں پر چلتی ہیں جو گمراہ ہوں اور جو شیطان کی پیروی کرتے ہوں۔ یہ بھی استثناء منقطع ہے کیونکہ اللہ کے صالح بندے گمراہوں میں شمار ہی نہیں ہوتے۔ شیطان تو صرف ان لوگوں کو شکار کرتا ہے جو بھٹک چکے ہوں جیسا کہ بھیڑیا بھٹکی ہوئی بکری کو بسہولت شکار کر لیتا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے نفوس خالص ہیں اور اللہ کے لیے خالص ہو چکے ہیں تو ایسے لوگوں کو اللہ ضائع ہونے نہیں دیتا۔ اس کی رحمتیں وسیع ہوتی ہیں۔ اگر وہ ایک لمحہ کے لیے پیچھے بھی رہ جائیں تو بھی وہ راہ پا لیتے ہیں اور واپس آ جاتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو گمراہ ہو چکے ہیں تو ان کا انجام آغاز کائنات ہی سے معلوم ہے اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا ہے۔

وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٤٣﴾ لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِكُلِّ ۴
۱۹ع بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَقْسُومٌ ﴿٤٤﴾
۴

"اور ان سب کے لیے جہنم کی وعید ہے ۔ یہ جہنم (جس کی وعید پیروان ابلیس کے لیے کی گئی ہے) اس کے سات دروازے ہیں ' ہر دروازے کے لیے ان میں سے ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا ہے"۔

سات دروازے کا لفظ محض عدد کا اظہار ہے یا واقعی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے دونوں معنوں کے لینے سے حقیقت نفس الامری میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گمراہوں کی کئی اقسام اور درجات ہیں اور گمراہی کی بھی کئی شکلیں اور رنگ ہیں۔ لہٰذا ہر قسم کے لوگوں کے لیے ایک دروازہ مخصوص ہو گا ان کے مقام اور مرتبے کے لحاظ سے۔

یہ قصہ اب مقام عبرت اور غرض و غایت کے بیان کے مقام تک پہنچ گیا ہے۔ یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کی جا چکی ہے کہ انسان کی ذات میں اس کا مادی پہلو کس طرح انسان کے روحانی پہلو پر غالب آ جاتا ہے اور یہ کہ جو لوگ تعلق باللہ کو تازہ اور زندہ رکھتے ہیں ان پر شیطان کو دسترس حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ آخر میں گمراہوں کے انجام کے بالمقابل بتا دیا جاتا ہے کہ اہل حق کا انجام کس قدر خوبصورت ہو گا۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿٤٥﴾ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِينَ ﴿٤٦﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ ﴿٤٧﴾ لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ ﴿٤٨﴾

"بخلاف اس کے متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ داخل ہو جاؤ ان میں سلامتی کے ساتھ بے خوف و خطر۔ ان کے دلوں میں جو تھوڑی بہت کھوٹ کپٹ ہوگی اسے ہم نکال دیں گے' وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے۔ انہیں نہ وہاں کسی مشقت سے پالا پڑے گا اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے"۔

متقی کون ہیں؟ وہ جو خدا سے ڈرتے ہیں اور اس کے عذاب سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان اسباب سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں جو عذاب الٰہی کا باعث بنتے ہیں۔ جنتوں میں جن چشموں کا ذکر ہے وہ سات ابواب کے بالمقابل ہے۔ یہ لوگ جنتوں میں نہایت ہی امن و اطمینان سے اتریں گے اور وہ اس طرح خوفزدہ نہ ہوں گے جس طرح اہل جہنم تھے۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو کدورت ہوگی وہ بھی ہم نکال دیں گے۔ جبکہ ابلیس کے دل میں جو حسد اور کینہ ہوگا وہ اہل جہنم کے ساتھ ہمیشہ رہے گا اور وہ ایک دوسرے کو ملامت کرتے رہیں گے۔ جبکہ اہل جنت کے لیے کوئی مشقت نہ ہوگی اور نہ ان کے لیے وہاں سے نکلنے کا کوئی خطرہ ہوگا۔ یہ لوگ زمین میں خدا سے ڈرتے تھے' لیکن یہاں ان کے لیے کوئی خوف و خطر نہ ہوگا۔ رب کریم کے جوار رحمت میں خوش و خرم ہوں گے۔

---()()()---

# درس نمبر ۱۱۷ ایک نظر میں

اس سبق میں اللہ کی رحمت اور اللہ کے عذاب دونوں کی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی کبر سنی کے باوجود اولاد دی جاتی ہے اور اسے اولاد علیم کہا جاتا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کو نجات دی جاتی ہے اور اس رحمت سے صرف ان کی بیوی محروم ہوتی ہے کیونکہ اس کا تعلق ظالمین سے تھا۔ پھر یہاں اصحاب ایکہ اور اصحاب حجر کے برے دنوں کا تذکرہ بھی ہے۔

یہ تمام قصص اور مثالیں اس تمہید کے بعد آتی ہیں:

نَبِّئْ عِبَادِيْ اَنِّيْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۴۹) وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ (۵۰) (۱۵:۴۹ — ۵۰) "اے نبی میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت درگزر کرنے والا اور رحیم ہوں مگر اس کے ساتھ میرا عذاب بھی نہایت دردناک ہے"۔ چنانچہ ان امثلہ و قصص میں سے بعض تو اللہ کی رحمت کی مثالیں ہیں اور بعض اللہ کے عذاب کی۔ یہ قصص اس سورہ کے ابتدائی تبصرے کے بھی مناسب ہیں جس میں لوگوں کو متنبہ کرتے ہوئے یہ کہا گیا تھا:

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (۳) وَمَا اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ (۴) مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ (۵)

(۱۵:۳ تا ۵) "چھوڑ دو، انہیں کھائیں پئیں، مزے کریں اور بھلاوے میں ڈالے رکھے ان کو جھوٹی امید۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لیے ایک خاص مہلت عمل لکھی جا چکی تھی۔ کوئی قوم نہ تو اپنے وقت مقرر سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے نہ اس کے بعد چھوٹ سکتی ہے"۔ چنانچہ یہ قصص ان بستیوں کی مثالیں ہیں جو ہلاک کی گئیں اور جب ان کی مہلت عمل ختم ہو گئی تو ان پر عذاب نازل ہوا۔ نیز سورہ کے آغاز میں فرشتوں کے نزول کے بارے میں بھی بتایا گیا تھا کہ وہ حق کے ساتھ اترتے ہیں۔

وَقَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ (۶) لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰۤئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۷) مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰۤئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْۤا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ

٦ تا ٨ ) "یہ لوگ کہتے ہیں "اے وہ شخص جس پر یہ ذکر نازل ہوا ہے تو یقیناً دیوانہ ہے 'اگر تو سچا ہے تو ہمارے سامنے فرشتوں کو لے کر کیوں نہیں آتا؟ ہم فرشتوں کو یوں ہی نہیں اتار دیا کرتے۔ وہ جب اترتے ہیں تو حق کے ساتھ اترتے ہیں اور پھر ان لوگوں کو مہلت نہیں دی جاتی"۔ یوں یہ سورہ ایک متحد اور مربوط مضمون بن جاتی ہے جس کے تمام حصے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ اور ایک دوسرے کے موید نظر آتے ہیں 'یہ اس حقیقت کے باوجود کہ قرآن مجید کی سورتوں میں شاذونادر ہی ایسی سورتیں ہیں جو تمام کی تمام بیک وقت نازل ہوئی ہیں۔ ان کی آیات اس ترتیب سے نازل نہ ہوتی تھیں جس طرح ہم مصحف میں پاتے ہیں۔ ہاں یہ بات مسلم ہے کہ سورتوں کے اندر آیات کی ترتیب اللہ کی جانب سے ہے یعنی توقیفی ہے۔ لہٰذا اس خدائی ترتیب کے اندر حکمت اور ترتیب ضرور ملحوظ ہے۔ ان سورتوں کے مضامین کی ترتیب اور ہم آہنگی کے سلسلے میں اللہ نے بعض پہلو ہم پر منکشف کیے ہیں جن کا بیان ہم نے تمام سورتوں کے مقدمات میں کیا ہے۔ ہر سورہ کی ایک فضا اور اس کے خدوخال ہم نے بیان کیے ہیں 'حقیقی علم بہرحال اللہ کو ہے۔ ہم نے جو ترتیب 'ربط مضامین اور حکمت بیان کی ہے وہ اجتہادی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---()()()---

# درس نمبر۱۱۷ تشریح آیات

## ۴۹ --- تا --- ۸۴

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّىْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ۝

"اے نبیؐ، میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت درگزر کرنے والا اور رحیم ہوں مگر اس کے ساتھ میرا عذاب بھی نہایت دردناک عذاب ہے"۔

گمراہوں کے عذاب اور متقین کی جزاء کے ذکر کے متصلاً بعد حضور اکرمؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اس مضمون کا اعلان کر دیں۔ سیاق کلام میں اس کا ربط ظاہر ہے' یہاں اعلان رحمت اور مغفرت کو مقدم کیا گیا ہے اور اعلان سزا کا تذکرہ بعد میں کیا گیا ہے' کیونکہ اللہ کی رضا اس میں ہے کہ لوگوں کو اس کی رحمت و مغفرت نصیب ہو' کیونکہ اللہ نے رحمت و مغفرت کو اپنے اوپر فرض کر لیا ہے' ہاں کبھی کبھی مضمون اور مقام کے تقاضے کے مطابق صرف عذاب کا تذکرہ ہوتا ہے یا تذکرہ تو دونوں کا ہوتا ہے لیکن سیاق کلام میں کسی مخصوص حکمت کی وجہ سے عذاب الہی کا تذکرہ پہلے آجاتا ہے۔ اس کی تشریح ایسے مقامات پر بھی کی گئی ہے۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان فرشتوں کا قصہ آتا ہے جو قوم لوط کی بیخ کنی کے لیے بھیجے گئے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کا یہ قصہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے اور ہر جگہ اسے مختلف انداز میں لایا گیا ہے۔ ہر مقام کی مناسبت سے اس قصے کا ایک حصہ لیا گیا ہے۔ ہاں حضرت لوطؑ کا قصہ بعض مقامات پر علیحدہ بھی آیا ہے۔ سورہ اعراف میں قصہ لوط کا ایک حصہ گذر گیا ہے۔ پھر سورہ ہود میں بھی قصہ ابراہیمؑ اور لوطؑ کا تذکرہ ہوا ہے۔ سورہ اعراف میں حضرت لوطؑ کی جانب سے اپنی قوم کی فحاشی پر نکیر اور سرزنش کا ذکر تھا اور قوم کی طرف سے ان کی نکیر کا یہ جواب دیا گیا تھا:

اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ "نکالو ان کو اپنے گاؤں سے' یہ لوگ بہت پاکباز بنتے ہیں"۔ لیکن جب عذاب الہی آیا تو اللہ نے انہیں اور ان کے اہل و عیال کو نجات دے دی' ماسوائے ان کی ایک بیوی کے جو پیچھے رہنے والوں میں شامل ہو گئی۔ یہاں فرشتوں کی آمد اور ان کے بارے میں قوم کی سرگوشیوں کا ذکر نہ تھا۔

سورہ ہود میں یہ قصہ ذکر ملائکہ پر مشتمل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کی بات کی گئی ہے لیکن انداز گفتگو ہر جگہ مختلف ہے۔ وہاں بعض تفصیلات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مخصوص ہیں۔ آپ کی بیوی کھڑی تھی اور

فرشتوں کی جانب سے بشارت سن رہی تھی۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت لوط اور قوم لوط کے بارے میں فرشتوں سے تکرار شروع کر دی۔ ان کڑیوں کا تذکرہ یہاں چھوڑ دیا گیا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں واقعات کی ترتیب بھی مختلف ہے۔ سورہ ہود میں جو واقعات بیان ہوئے' ان میں فرشتوں کی حقیقت کو پوشیدہ رکھا گیا۔ ان کی حقیقت ان پر اس وقت کھلی جب لوگ لوط کے خوبصورت مہمانوں کا سن کر دوڑتے ہوئے چلے آرہے تھے اور حضرت لوط علیہ السلام ان کو بے عزتی سے بچانے کی خاطر ان کی منت سماجت کر رہے تھے اور وہ آپ کی ایک بھی نہ مان رہے تھے یہاں تک کہ ان کا دل بھر آیا اور وہ یہ اندوہناک بات کرنے پر بھی مجبور ہو گئے۔

لَوْ اَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ "اے کاش کہ میں تمہارے مقابلے میں قوت رکھتا یا کوئی مضبوط سہارا ہی ہوتا کہ میں اس کی پناہ لیتا"۔ یہاں قصے میں ابتداء ہی سے فرشتوں کی حقیقت بتا دی گئی ہے اور لوگوں کے مشورے اور برے ارادوں کی بات کو بعد میں لایا گیا ہے' کیونکہ یہاں یہ مقصود نہیں ہے کہ قصہ کے واقعات کی ترتیب کیا ہے بلکہ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ کا عذاب کس طرح آتا ہے اور یہ کہ جب فرشتے آتے ہیں تو پھر مہلت عمل ختم ہو جاتی ہے۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۚ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّاۗلُّوْنَ ﴿۵۶﴾

"اور انہیں ذرا ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا قصہ سناؤ۔ جب وہ آئے اس کے ہاں اور کہا "سلام ہو تم پر"۔ تو اس نے کہا "ہمیں تم سے ڈر لگتا ہے"۔ انہوں نے جواب دیا۔ "ڈرو نہیں' ہم تمہیں ایک بڑے سیانے لڑکے کی بشارت دیتے ہیں"۔ ابراہیم نے کہا "کیا تم اس بڑھاپے میں مجھے اولاد کی بشارت دیتے ہو؟ ذرا سوچو تو سہی کہ یہ کیسی بشارت تم مجھے دے رہے ہو؟" انہوں نے جواب دیا "ہم تمہیں برحق بشارت دے رہے ہیں' تم مایوس نہ ہو"۔ ابراہیم نے کہا "اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں"۔

جب فرشتے آئے تو انہوں نے کہا تم پر سلامتی ہو' اس کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا ہمیں تم سے ڈر لگتا ہے۔ یہاں آپ نے خوف کی کوئی وجہ نہیں بتائی اور یہ تذکرہ بھی نہیں ہے کہ آپ بھنا ہوا بچھڑا لائے اور انہوں نے ہاتھ نہ بڑھایا جیسا کہ سورہ ہود میں بیان یوں ہے :

فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً "مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے پر نہیں بڑھتے تو وہ ان سے مشتبہ ہو گیا اور دل میں ان سے خوف محسوس کرنے لگا"۔ یہاں یہ تفصیلات اس

لیے نہیں دی گئیں کہ وہاں مقصود قصہ یہ ہے کہ اللہ جب اپنے رسول کے ذریعے کسی قوم سے رحمتوں کا وعدہ کرتا ہے تو وہ رحمت آکر رہتی ہے۔ یہاں حضرت ابراہیم ؑ کے قصے کے واقعات بیان کرنا مطلوب نہیں ہے' اس لیے یہاں جلدی سے خوشخبری کا تذکرہ کر دیا جاتا ہے۔

قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ (۱۵:۵۳) "انہوں نے کہا ڈرو نہیں ہم تمہیں ایک سیانے لڑکے کی بشارت دینے آئے ہیں"۔ یوں یہ خوشخبری تیزی سے دی گئی' جیسا کہ ہمیشہ خوشخبری دینے والا تیزی کرتا ہے۔ قرآن کریم نے بھی سیاق کلام میں تفصیلات کو چھوڑ کر خوشخبری سنا دی۔

چنانچہ یہاں حضرت ابراہیم ؑ کا اپنے بارے میں جواب و استفسار و استعجاب کا ذکر ہوتا ہے اور حضرت کی بیوی کا کلام ترک کر دیا جاتا ہے۔

قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓي اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ (۱۵:۵۴) "فرمایا کیا تم اس بڑھاپے میں مجھے اولاد کی خوشخبری دیتے ہو؟ ذرا سوچو تو سہی کہ یہ کیسی بشارت تم نے مجھے دے رہے ہو؟" ابتداء میں حضرت ابراہیم ؑ نے اس بات کو مستبعد سمجھا کہ اس عمر میں ان کو اولاد نصیب ہو سکتی ہے۔ خصوصاً جبکہ دوسری جگہ تصریح آئی ہوئی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میری بیوی بوڑھی اور بانجھ ہے۔ فرشتوں نے جواب دیا:

قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ (۱۵:۵۵) "انہوں نے کہا ہم نے تمہیں برحق بشارت دی ہے' تم مایوس نہ ہو"۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فوراً اپنے موقف پر نظر ثانی فرمائی اور مایوسی کا انکار کر دیا۔

قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّاۗلُّوْنَ (۱۵:۵۶) "اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں' ابراہیم ؑ نے کہا"۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات میں قرآن کریم نے لفظ رحمت کو نقل کیا ہے' یہ سیاق کلام میں موضع و محل کے ساتھ گہری ہم آہنگی رکھتا ہے۔ ان کی بات ایک قاعدہ قرار پاتی ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے صراط مستقیم گم کر دیا ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے راستے سے ہٹ چکے ہوتے ہیں' ان پر رحمت خداوندی کی خوشگوار ہوا نہیں چلتی' ان کو یہ احساس نہیں رہتا کہ قدم قدم پر اللہ کی رحمتیں انسان پر نازل ہوتی ہیں' وہ سمجھ نہیں پاتے کہ ہر ہر لمحہ وہ اللہ کے رحم و کرم پر ہیں اور وہ ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل جو قلب رحمت خداوندی سے تروتازہ ہوتا ہے' جو رحمان سے جڑا ہوا ہوتا ہے وہ کبھی بھی مایوسی کا شکار نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہ مصائب و شدائد میں گھرا ہوا ہو' اگرچہ اس کے اردگرد مصائب کی تاریکیاں ہوں' اگرچہ مایوسیوں کے بادل اس کے سر پر منڈلا رہے ہوں اور اگرچہ منزل کا پتہ دور دور تک نہ ہو' اس لیے کہ رحمت خداوندی ہروقت قلوب مومنین سے قریب ہوتی ہے۔

اس مقام پر آکر حضرت ابراہیم علیہ السلام اس مخلوق یعنی فرشتوں کی طرف سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور انہوں نے جو خوشخبری دی اس پر ان کو دلی اطمینان اور مسرت حاصل ہوگئی ہے۔ اب وہ ان فرشتوں کی آمد کی اصل غرض

و غایت پوچھتے ہیں۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ
اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۴
قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾ ۱۶ ع

۴ پھر ابراہیمؑ نے پوچھا "اے فرستادگان الٰہی ' وہ مہم کیا ہے جس پر آپ حضرات تشریف لائے ہیں؟" وہ بولے "ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ صرف لوطؑ کے گھر والے مستثنیٰ ہیں ' ان سب کو ہم بچالیں گے ' سوائے اس کی بیوی کے جس کے لیے (اللہ فرماتا ہے کہ) ہم نے مقدر کر دیا ہے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں شامل رہے گی۔

یہاں سیاق کلام میں یہ نہیں بتایا گیا کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت لوطؑ کی قوم کے بارے میں فرشتوں سے اچھا خاصا تکرار کیا ' جیسا کہ سورہ ہود میں بتایا گیا ہے بلکہ یہاں فرشتے پوری کی پوری بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتا دیتے ہیں کیونکہ وہ حضرت لوط اور آل لوط پر رحمت خداوندی کی تصدیق کرتے ہیں۔ ہاں ان کی بیوی کے بارے میں فیصلہ ذرا مختلف ہے ' وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے (غابرین یعنی پیچھے قوم کے ساتھ رہ جانے والوں سے ہو گئی اور اس کا انجام قوم کے ساتھ ہوا۔ یہ لفظ غبرہ سے نکلا ہے ' جس کا اطلاق اس دودھ پر ہوتا ہے جو مویشی کو دوہنے کے بعد اس کے تھنوں میں رہ جاتا ہے) چنانچہ فرشتے قوم لوط کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾ۙ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾
قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾
فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ
وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَاۗءِ
مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾

"پھر جب یہ فرستادے لوطؑ کے ہاں پہنچے تو اس نے کہا "آپ لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہیں"۔ انہوں نے جواب دیا "نہیں ' بلکہ ہم وہی چیز لے کر آئے ہیں جس کے آنے میں یہ لوگ شک کر رہے تھے۔ ہم تم سے سچ کہتے ہیں کہ ہم حق کے ساتھ تمہارے پاس آئے ہیں۔ لہٰذا اب تم کچھ رات رہے اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جاؤ اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلو۔ تم میں سے کوئی پلٹ کر نہ دیکھے ۔ بس سیدھے چلے جاؤ جدھر جانے کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے"۔ اور اسے ہم نے اپنا

یہ فیصلہ پہنچا دیا کہ صبح ہوتے ہوتے ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی"۔

یہاں فرشتے جلدی سے لوط علیہ السلام کو بتا دیتے ہیں کہ وہ فرشتے ہیں 'وہ اس کام کے لیے آگئے ہیں جس میں ان کی قوم شک میں مبتلا تھی 'یعنی یہ کہ وہ جو بداعمالیاں کر رہے ہیں اس پر ان سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔ وہ اللہ کے عذاب کو بروئے کار لانے کے لیے آئے ہیں اور جب فرشتے آجاتے ہیں تو پھر اللہ کے عذاب کے نزول میں دیر نہیں ہوتی۔ وہ فوراً آتا ہے اس لیے یہاں بھی بات جلد ختم کی جا رہی ہے۔

قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ (۱۵: ۶۲) "آپ لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہیں"۔ یہ بات حضرت لوطؑ نے اس لیے کی کہ ان کو ان مہمانوں کے بارے میں پریشانی لاحق ہو گئی تھی 'وہ اپنی قوم کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ یہ قوم ان کے مہمانوں کے ساتھ برا سلوک کرے گی۔ نیز یہ کہ وہ اپنی قوم میں کمزور ہیں اور لوگ طاقتور اور فساق و فجار ہیں 'یعنی وہ کہہ رہے ہیں کہ تم عجیب لوگ ہو کہ اس گاؤں میں آگئے ہو حالانکہ یہ لوگ جس فسق و فجور میں مبتلا ہیں اور تم جیسے لوگوں کے ساتھ وہ جو سلوک کرتے ہیں وہ معروف و مشہور ہے لیکن فرشتوں نے وضاحت کر دی :

قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ (۶۳) وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (۶۴) (۱۵: ۶۳ - ۶۴) "انہوں نے جواب دیا نہیں بلکہ ہم وہی چیز لے کر آئے ہیں جس کے آنے میں یہ لوگ شک کر رہے تھے۔ ہم تم سے سچ کہتے ہیں کہ ہم حق کے ساتھ تمہارے پاس آئے ہیں۔ ان تاکیدات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام اس معاملے میں کس قدر بے بس ہو گئے تھے اور ان کی بے چینی کا عالم کیا تھا۔ وہ حیران تھے کہ ایک طرف سے وہ اپنے مہمانوں کے حوالے سے ذمہ دار ہیں اور دوسری جانب وہ قوم کے مقابلے میں بے بس ہیں۔ چنانچہ فرشتوں نے نہایت ہی تاکیدی الفاظ میں ان کو تسلی دی اور ان کو فائنل ہدایات دینے سے قبل ان کو اچھی طرح مطمئن کر دیا کہ اب ان لوگوں کا وقت ختم ہے۔

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ (۱۵: ۶۵) "لہٰذا اب تم کچھ رات رہے اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جاؤ اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلو۔ تم میں سے کوئی پلٹ کر نہ دیکھے۔ بس سیدھے چلے جاؤ جدھر جانے کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے"۔ سری' رات کے سفر کو کہتے ہیں۔ رات کا قطعہ یعنی اس کا ایک حصہ ' حضرت لوط علیہ السلام کو حکم تھا کہ اپنے اہل و عیال کو لے کر رات کے وقت نکل جائیں 'صبح سے پہلے پہلے ' حضرت خود ان کے پیچھے پیچھے جائیں۔ ان میں سے کوئی تذبذب نہ کرے ' پیچھے نہ دیکھے یعنی اپنے علاقے کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ انسان جب اپنا محبوب علاقہ چھوڑتا ہے تو وہ نکلنے میں سست روی اختیار کرتا ہے۔ بار بار پیچھے دیکھتا ہے اور یہاں چونکہ صبح کے وقت ہی عذاب آنے والا تھا اور وقت مقرر تھا اس لیے ان کو بروقت نکلنے کی سخت تاکید کی گئی۔

وَقَضَيْنَا إِلَيْهِ ذَٰلِكَ الْأَمْرَ أَنَّ دَابِرَ هَٰؤُلَاءِ مَقْطُوعٌ مُصْبِحِينَ (۱۵ : ۶۶) ”اور اسے ہم نے اپنا یہ فیصلہ پہنچا دیا کہ صبح ہوتے ہوتے ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی“۔ یہ عظیم فیصلہ تھا اور پیغمبر کو قبل از وقت اس سے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ صبح سے پہلے پہلے ان کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔ جب ان کی جڑ کٹ گئی تو شاخیں خود بخود کٹ گئیں۔ یہ انداز تعبیر ایسا ہے کہ اس سے ان کا مکمل استیصال ظاہر ہوتا ہے‘ لہٰذا اہل اسلام کو سختی سے ہدایت کی گئی کہ ان میں سے کوئی پیچھے نہ دیکھے۔ یہ نہ ہو کہ کفار کی طرح یہ بھی عذاب کی لپیٹ میں آ جائے۔ کیونکہ پیچھے رہنے والے عمومی عذاب سے کیسے بچ سکتے ہیں۔

یہاں سیاق کلام میں اس انجام کو دوسرے واقعات سے قبل ہی پیش کر دیا گیا کیونکہ سورہ کے موضوع اور محل کا تقاضا ہی یہ تھا۔ اس کے بعد وہ واقعات دے دیئے جو مہمانوں کی آمد کے موقع پر پیش آئے۔

انہوں نے جب سنا کہ حضرت لوط علیہ السلام کے گھر چاند جیسے چہروں والے نوجوان لڑکے آئے ہوئے ہیں‘ (بعض روایات میں آیا ہے کہ ان مہمانوں کے بارے میں اطلاع خود حضرت لوط کی بیوی نے ان اوباشوں کو دی تھی) تو یہ لوگ بہت خوش ہوئے کہ خوب شکار ملا ہے۔

وَجَاءَ أَهْلُ الْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿۶۷﴾

”اتنے میں شہر کے لوگ خوشی کے مارے بیتاب ہو کر لوط علیہ السلام کے گھر چڑھ آئے“۔ اس انداز تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ فسق و فجور اور فحاشی و بے حیائی کی حدیں پار کر گئے تھے اور یہ قوم سب کی سب اخلاقی مریض تھی۔ یہ منظر کس قدر عجیب و شرمناک ہے کہ یہ لوگ گروہ در گروہ آ رہے ہیں‘ خوشیاں منا رہے ہیں اور اعلانیہ کہہ رہے ہیں کہ آج خوب شکار ہاتھ آیا ہے۔ ایک تو برائی اور بے راہ روی ہے‘ دوسرے یہ کہ یہ اعلانیہ اور دیدہ دلیری سے کی جا رہی ہے۔ کوئی بھی صحت مند انسانی معاشرہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایک فرد تو یہ رویہ کبھی کبھار اختیار کر سکتا ہے لیکن وہ بھی اپنی بیماری کو چھپاتا ہے۔ وہ یہ بے راہ لذت خفیہ طور پر حاصل کر سکتا ہے اور اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے شرمندگی سے بچا سکتا ہے۔ لیکن ایک پورا معاشرہ اعلانیہ ایسا کرے اس لیے کہ اگر جنسی لذت سے کوئی سلیم الفطرت شخص جائز حدود کے اندر بھی لطف اندوز ہوتا ہے تو وہ بھی خفیہ طور پر ایسا کرتا ہے۔ بعض حیوانات بھی جنسی ملاپ کو چھپاتے ہیں لیکن ان لوگوں کو دیکھو کہ یہ لوگ میلے ٹھیلے کی طرح اعلانیہ اس فحاشی کے لیے جا رہے ہیں‘ اس کا اعلانیہ مطالبہ کرتے ہیں‘ ارادہ ظاہر کرتے ہیں اور اجتماعی شکل میں اس کام کے لیے آتے ہیں۔ یہ ایک ایسی حالت ہے کہ انسانی سوسائٹی کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔

ان حالات میں‘ نہایت بے بسی کے حالات میں‘ حضرت لوطؑ نہایت ہی کربناک اور اندوہناک حالت پریشانی میں کھڑے ہیں‘ وہ اپنے مہمانوں اور اپنی آبرو بچانے کی سعی کرتے ہیں‘ وہ انہیں انسانی شرافت اور انسانی قدروں کا واسطہ دے رہے ہیں‘ وہ ان کو خدا سے ڈراتے ہیں‘ وہ اللہ کا واسطہ دے رہے ہیں‘ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ان لوگوں کے دل خدا خوفی سے عاری ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان لوگوں میں نہ آدمیت کا احساس ہے‘ نہ انسانی شعور ہے‘ اور نہ ان کے

اندر خدا خوفی اور تقویٰ نام کی کوئی چیز ہے۔ لیکن وہ اس حالت پریشانی میں بھی بہرحال اپنی آخری کوشش کرتے ہیں اور انہیں انسانیت کا واسطہ دیتے ہیں کہ یہ لوگ تو مہمان ہیں اور خدا سے ڈراتے ہیں کہ تمہارے جو ارادے ہیں وہ خدا کے حکم کے خلاف ہیں، بہرحال وہ سعی کرتے ہیں۔

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِىْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾

لوط علیہ السلام نے کہا "بھائیو، یہ میرے مہمان ہیں، میری فضیحت نہ کرو، اللہ سے ڈرو، مجھے رسوا نہ کرو"۔

حضرت لوط علیہ السلام کی یہ دلدوز اپیل، بجائے اس کے کہ ان کے دلوں میں انسانی جذبات کو ابھارے اور یہ کہ وہ شرم محسوس کریں، اس کے جواب میں انہوں نے مزید دیدہ دلیری شروع کر دی۔ انہوں نے خود حضرت لوط علیہ السلام کو ڈانٹ پلانا شروع کر دی کہ وہ اس قسم کے لوگوں کو اپنا مہمان بناتے ہیں جو ہمارے کام کے ہیں۔ گویا مجرم وہ نہیں ہیں بلکہ اصل مجرم حضرت لوط علیہ السلام ہیں کہ وہ ان کے سامنے ایک ایسا شکار لاتے ہیں جس کے مقابلے میں وہ اپنے آپ پر کوئی ضبط نہیں کر سکتے۔

قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۰﴾

وہ بولے "کیا ہم بارہا تمہیں منع نہیں کر چکے کہ دنیا بھر کے ٹھیکے دار نہ بنو؟"

لیکن حضرت لوط علیہ السلام ان کو راہ فطرت سلیم بہرحال دکھاتے جا رہے ہیں۔ وہ ان کو متوجہ کرتے ہیں کہ خالق فطرت نے اس کام کے لیے عورت کو پیدا کیا ہے۔ مرد اور عورت کے جنسی ملاپ پر اس کائنات کی فطری بقا اور امتداد حیات کا انتظام کیا گیا ہے۔ بقائے نسل کے علاوہ یہ راہ دونوں جنسوں کے لیے مفید، فرحت بخش اور باعث سکون بھی ہے۔ قانون اور فطرت کے دائرے کے اندر۔ چنانچہ حضرت انہیں راہ راست پر لانے کی یوں سعی فرماتے ہیں:

قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِىْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۷۱﴾

"لوطؑ نے (عاجز ہو کر) کہا "اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں"۔

حضرت لوط علیہ السلام ایک نبی تھے، وہ اپنی حقیقی بیٹیاں ان اوباشوں کے سامنے پیش نہ کر رہے تھے تاکہ وہ ان کے ساتھ بدکاری کریں بلکہ وہ ان کو قوم کی خواتین کی طرف متوجہ کر رہے تھے کہ اللہ نے ان خواتین کو اس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ فطری اور صحت مند راہ ہے۔ خود حضرت بھی جانتے تھے کہ ان کا مطالبہ یہ نہ تھا کہ آپ کی بیٹیوں کے ساتھ بدکاری کریں بلکہ انہوں نے تو فطری راہ کو چھوڑ کر بے راہ روی اپنائی ہوئی تھی۔

یہ منظر پیش نظر تھا، قوم لوط اپنی مریضانہ ذہنیت کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی، اشاروں کنایوں میں برے ارادوں کا اظہار ہو رہا تھا، ادھر حضرت لوط علیہ السلام مہمانوں کے دفاع میں لگے ہوئے تھے، وہ ان کی غیرت خوابیدہ کو

جگا رہے تھے۔ وہ ان کے ضمیر اور وجدان کو جگا رہے تھے اور ان میں فطرت سلیمہ کے رجحان کو تلاش کر رہے تھے جبکہ وہ اپنے سفلی ارادہ میں آگے ہی بڑھ رہے تھے۔

یہ منظر یوں ہی اسکرین پر تھا کہ اچانک خالص عربوں کے انداز میں لوطؑ اور قوم لوط کی اس کشکش پر ایک تبصرہ آتا ہے اور خطاب قسم سے شروع ہوتا ہے:

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿٧٢﴾

"تیری جان کی قسم اے نبیؐ، اس وقت ان پر ایک نشہ سا چڑھا ہوا تھا جس میں وہ آپے سے باہر ہوئے جاتے تھے"۔ یہ تھی ان کی اصل تصویر اور اس حالت میں وہ ہمیشہ رہتے تھے، اس لیے حضرت لوط علیہ السلام کو سعی کے باوجود ان کے بارے میں یہ امید نہ تھی کہ وہ راہ راست پر آجائیں گے، نہ یہ امید تھی کہ ان میں شرافت اور غیرت کے جذبات جاگ اٹھیں گے یا وہ خدا سے ڈر کر راہ راست اور فطرت سلیمہ کی طرف لوٹ آئیں گے۔

اب ان کے خاتمے کا وقت قریب آتا جا رہا ہے اور اللہ کا کلمہ سچ ہو رہا ہے۔

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ (۱۵:۸) "اور ہم فرشتوں کو نہیں بھیجتے مگر حق کے ساتھ اور اس وقت پھر کسی کو مہلت نہیں دی جاتی"۔ اب ہمارے سامنے آخری منظر آتا ہے۔ یہ ہلاکت، تباہی اور زمین میں دھنس جانے کا منظر ہے۔ ایک ہمہ گیر تباہی ہے جو ہر طرف نظر آتی ہے۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿٧٣﴾ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿٧٤﴾

"آخرکار پو پھٹتے ہی ان کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا اور ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش برسا دی"۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بستیوں پر جو عذاب آیا وہ بظاہر شدید زلزلے اور آتش فشانی کے مشابہ ہے، جس میں گاؤں کے گاؤں دھنس جاتے ہیں، جس میں پتھروں کی بارش بھی ہوتی ہے اور جس میں خاک آلود پتھر بھی ہوتے ہیں اور ہمہ گیر تباہی ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے بحیرۂ لوط اس ہمہ گیر حادثے کے بعد نمودار ہوا، اس وقت جب سدوم کی پوری کی پوری آبادی زمین میں دھنس گئی، اور اس جگہ اس قدر بڑا گڑھا نمودار ہوا کہ وہاں پانی جمع ہو کر بحیرہ بن گیا۔

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی یہ بستیاں حجاز سے شام جاتے ہوئے شارع عام پر واقعہ تھیں اور ان کو دیکھ کر ہر عقل مند اور ذی بصیرت شخص عبرت حاصل کر سکتا ہے لیکن یہ تمام آیات و نشانات صرف ان دلوں کے لیے مفید ہوتے ہیں جن میں صلاحیت ہو اور جو ہدایت کے لیے کھلے ہوں اور جن میں حقیقی ایمانی نظریات موجود ہوں۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ ﴿٧٥﴾ وَإِنَّهَا لَبِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ ﴿٧٦﴾ إِنَّ
فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٧٧﴾

"اس واقعے میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو صاحب فراست ہیں۔ اور وہ علاقہ (جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا) گزر گاہ عام پر واقع ہے۔ اس میں سامان عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو صاحب ایمان ہیں"۔

یہ تھی تصدیق ایک سچے ڈرانے والے کی' فرشتوں کا نزول دراصل اعلان نزول عذاب الٰہی تھا اور جب یہ عذاب آتا ہے تو پھر وہ ٹلتا نہیں اور نہ اس میں تاخیر ممکن ہوتی ہے اور نہ پھر مہلت عمل ملتی ہے۔

---

یہی صورت حال اصحاب ایکہ کو پیش آئی جو حضرت شعیب علیہ اسلام کی قوم دعوت تھے۔ (ایکہ کا مفہوم گھنے جنگلات والے' حضرت شعیبؑ اصحاب ایکہ اور قوم مدین کی طرف بھیجے گئے تھے) یہی حالات قوم صالحؑ کے ساتھ پیش آئے جنہیں حجر والے بھی کہا جاتا ہے۔

وَإِن كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ ﴿٧٨﴾ فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ
۵
۱۹ع وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ ﴿٧٩﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ ﴿٨٠﴾ وَآتَيْنَاهُمْ
۵ آيَاتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿٨١﴾ وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ ﴿٨٢﴾
فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ ﴿٨٣﴾ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٨٤﴾

"اور ایکہ والے ظالم تھے' تو دیکھ لو ہم نے بھی ان سے انتقام لیا اور ان دونوں قوموں کے اجڑے ہوئے علاقے کھلے راستے پر واقع ہیں۔ حجر کے لوگ بھی رسولوں کی تکذیب کر چکے ہیں۔ ہم نے اپنی آیات ان کے پاس بھیجیں' اپنی نشانیاں ان کو دکھائیں' مگر وہ سب کو نظرانداز ہی کرتے رہے۔ وہ پہاڑ تراش تراش کر مکان بناتے تھے اور اپنی جگہ بالکل بے خوف اور مطمئن تھے۔ آخر کار ایک زبردست دھماکے نے ان کو صبح ہوتے آلیا اور ان کی کمائی ان کے کچھ کام نہ آئی"۔

قرآن کریم نے دوسری جگہ حضرت شعیبؑ اور قوم شعیب لقل مدین اور اصحاب ایکہ کا قصہ مفصل بیان کیا ہے۔ یہاں ان کے واقعہ ظلم اور ان کی ہلاکت کی طرف صرف اشارہ مطلوب ہے۔ ثابت یہی کرتا ہے کہ جب عذاب الٰہی کا اعلان ہو جائے تو وہ آکر رہتا ہے' جیسا کہ اس سورہ کے آغاز میں اس اصول کا ذکر ہوا کہ جب کسی قوم کی مہلت عمل ختم ہو جاتی ہے تو پھر اس پر عذاب آنا سنت الٰہیہ کے مطابق لازم ہو جاتا ہے۔ مدین اور ایکہ دونوں بستیاں علاقہ لوط کے قریب تھیں اور یہ بات اس اشارہ سے معلوم ہوتی ہے۔

وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۱۵:۷۹) "ان دونوں قوموں کے علاقے کھلے راستے پر موجود ہیں"۔ ان دونوں قوموں سے مراد مدین اور ایکہ والے ہیں کیونکہ ان دونوں بستیوں کے کھنڈرات شارع عام پر موجود ہیں اور ابھی تک ان کے آثار قائم ہیں۔ ان دونوں سے مراد قریہ لوط اور قریہ شعیب بھی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ بھی شارع عام پر موجود ہیں۔ ہلاکت سے دوچار ہونے والی اقوام کا شارع عام پر ہونا زیادہ عبرت آموز ہوتا ہے کیونکہ انسان صبح و شام وہاں سے گزرتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ یہ بستیاں بھی اسی طرح زندہ تھیں جس طرح آج ان کا ماحول زندہ ہے۔ ان کھنڈرات کے اردگرد زندگی سے بھرپور آبادیاں ہیں اور وہ سوئی پڑی ہیں۔

اصحاب الحجر کون تھے؟ یہ حضرت صالحؑ کی قوم تھے۔ حجر بھی شام اور حجاز کے درمیان وادی القریٰ میں واقع ہے۔ یہ وادی اور اس کے کھنڈرات آج تک موجود ہیں کیونکہ یہ بستیاں انہوں نے بڑی بڑی چٹانیں کاٹ کر بنائی تھیں جس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر ترقی یافتہ تھے اور ان کے ہاں ٹیکنالوجی کس قدر ترقی کر چکی تھی۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ (۱۵:۸۰) "حجر کے لوگ بھی اس سے قبل رسولوں کی تکذیب کر چکے ہیں"۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے صرف حضرت صالحؑ کی تکذیب کی تھی۔ لیکن صالح جماعت رسل کے نمائندہ تھے۔ لہٰذا ایک کی تکذیب سب کی تکذیب قرار پائی۔ جب انہوں نے ان کی تکذیب کی تو کہا گیا کہ انہوں نے تمام مرسلین کی تکذیب کی۔ کیونکہ رسول اور رسالت ایک ہی ادارہ ہیں۔ وہ ہر دور میں اور ہر زمانہ میں ایک ہی نظریہ پیش کرتے چلے آئے ہیں۔ زمان و مکان کے اختلاف کے باوجود وہ ایک ہی تھے۔

وَ اٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ (۱۵:۸۱) ہم نے اپنی آیات ان کے پاس بھیجیں، مگر وہ اعراض ہی کرتے رہے"۔ حضرت صالحؑ کی نشانی اور ان کا معجزہ تو ناقہ تھی لیکن نشانی کے بجائے نشانیاں اس لیے کہا گیا کہ ناقہ کے علاوہ اور نشانیاں بھی تو اس کائنات میں بکھری پڑی ہیں۔ خود انسان کی ذات میں بھی کئی نشانیاں ہیں۔ یہ سب نشانیاں ہمارے غور و فکر کو دعوت دے رہی ہیں، اگر انہوں نے حضرت صالحؑ کے ایک معجزے سے انکار کیا تو دراصل انہوں نے اس کائنات میں بکھرے ہوئے تمام معجزات کا انکار کر دیا۔ انہوں نے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی نشانیوں کو سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ انہوں نے اپنے ضمیر و شعور کے دروازے بند رکھے۔

وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ (۸۲) فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ (۸۳) فَمَا اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۸۴) (۱۵:۸۲ تا ۸۴) "وہ پہاڑ تراش تراش کر مکان بناتے تھے اور اپنی جگہ بالکل بے خوف اور مطمئن تھے۔ آخر کار ایک زبردست دھماکے نے ان کو صبح ہوتے ہی آ لیا اور ان کی کمائی ان کے کچھ کام نہ آئی"۔ یہ لمحہ ان کے لیے اچانک آیا، یہ لوگ پہاڑ کے تراشے ہوئے مکانات کے اندر محفوظ بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنی حفاظت کے لیے جو کچھ کمایا تھا، جو مضبوط عمارات تعمیر کی تھیں اور پہاڑوں کو کاٹ کر جس قدر مضبوط رہائش گاہیں بنائی تھیں ان میں سے کچھ بھی ان کے کام نہ آیا۔ ایک زبردست دھماکہ ہوا اور ان

بستیوں میں پھر کچھ بھی نہ تھا۔ یہ لمحہ انسانی شعور پر گہرے اثرات چھوڑتا ہے۔ پہاڑوں اور چٹانوں کو کاٹ کر جو لوگ اپنے لیے پناہ گاہیں بناتے ہیں ان سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پھر انسان رات گزار کر جب صبح میں داخل ہوتا ہے تو اس وقت وہ بڑے اطمینان سے رات کو بلا خوف و خطر الوداع کہتا ہے' لیکن صبح کے ان اطمینان بخش لمحات میں ان کو ایک زبردست دھماکہ پیش آتا ہے اور وہ اپنی قیمتی جانوں کے ساتھ سب کچھ کھو دیتے ہیں' ان کی تمام احتیاطی تدابیر ختم ہو جاتی ہیں' ان کے محفوظ قلعے ریت کا ڈھیر ثابت ہوتے ہیں۔ اس کڑک دار دھماکے کے پیچھے کچھ چیز بچ کر نہیں نکلتی۔ یہ تیز ہوا تھی' یا تیز دار تھی اور اس کے اثر سے یہ لوگ اپنے محفوظ ترین گھروں میں لاشوں کے ڈھیر بن گئے۔

یوں اس سورہ میں تاریخی قصص و واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالی جاتی ہے اور ان تمام قصص میں صرف یہ سبق دیا جاتا ہے کہ جب اللہ کی طرف سے مہلت عمل ختم ہو جاتی ہے' اقوام کی بربادی کا وقت آپہنچتا ہے تو پھر سنت الہیہ کے مطابق عذاب الہی آتا ہے اور فرشتے حق کے ساتھ نازل ہوتے ہیں اور پھر سنت الہیہ ایک لمحے کی مہلت نہیں دیتی۔ یہ سبق ان تمام قصص کا قدر مشترک ہے اور اس کی وجہ سے یہ سب واقعات آپس میں مربوط ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۱۸ ایک نظر میں

یہ ہیں وہ سنن الہیہ جن میں تخلف ممکن نہیں ہے ۔ یہ کائنات اللہ کے ان نوامیس اور سنن کے مطابق چلتی ہے ۔ یہی قوانین و نوامیس کائنات اور زندگی کو کنٹرول کرتے ہیں ۔ جماعتوں اور تحریکات کو بھی یہی کنٹرول کرتے ہیں ۔ ہدایت و ضلالت کے نتائج بھی ان نوامیس الہیہ کے مطابق بر آمد ہوتے ہیں ۔ اقوام کا انجام اور آخرت کا حساب و کتاب بھی انہی نوامیس فطرت کے مطابق ہوتا ہے ۔ اس سورہ کا ہر سبق انہی نوامیس فطرت اور سنت الہیہ کے مطابق اختتام پذیر ہوتا ہے اور مختلف اسالیب میں سنن الہیہ کو پیش کرتا ہے ۔ یہ نوامیس فطرت اللہ کی تمام مخلوقات کے اندر پائے جاتے ہیں اور یہی حق ہیں اور فطرت کائنات اسی حق پر قائم ہے ۔

چنانچہ اس سورہ کے خاتمے پر اس عظیم سچائی کو واضح کر کے بیان کیا جاتا ہے ۔ یہ سچائی زمین و آسمان اور ان کے درمیان پائے جانے والے تمام موجودات کی فطرت میں عیاں ہے ۔ یہ کہ قیامت برپا ہونے والی ہے ۔ یہ اس کائنات کا فطری انجام ہے اور اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے ' اور یہ کہ تمام رسولوں کی دعوت ایک تھی اور اس ناموس فطرت کے مطابق ہے ۔ تمام رسولوں کے درمیان قدرت مشترک یہ ہے کہ وہ ایک ہی عظیم حق کے حامل ہیں جو روشن ہے ۔ یہاں بتایا جاتا ہے کہ یہ سچائی تمام مخلوقات کے اندر موجود ہے ' اور اللہ ہی اس سچائی کا خالق ہے ۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ (۱۵ : ۸۶) "یقیناً تمہارا رب سب کا خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے"۔ لہٰذا اس سچائی کو آگے بڑھنا چاہئے اور اس سچائی پر جو اسلامی دعوت برپا ہے اسے چاہئے کہ وہ آگے بڑھے ۔ داعیان حق کسی کی پرواہ نہ کریں اور آگے بڑھیں ۔ اور دعوت کے مخالفین اور مذاق اڑانے والوں کی کوئی پرواہ نہ کریں ۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۵ : ۹۴) "آپ کو جو حکم دیا جاتا ہے اسے صاف صاف بتائیں اور مشرکین کو نظرانداز کر دیں"۔ اللہ کی سنت بھی اپنی راہ پر گامزن ہے ' وہ ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹی ۔ سنت الہیہ کی پشت پر جو سچائی ہے اور یہ سچائی دعوت اسلامی ' قیام قیامت اور تخلیق ارض سے وابستہ ہے ۔ یہ سچائی ان تمام چیزوں سے متعلق ہے جو زمین و آسمان میں موجود ہیں اور جو خلاق علیم کی پیدا کردہ ہیں ۔ یہ ایک یاددہانی اور تنبیہ ہے جس پر اس سورہ کا خاتمہ ہو رہا ہے اور یہ تنبیہ انسان کو اس عظیم سچائی کی طرف متوجہ کرتی ہے جس پر یہ وجود قائم ہے ۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۱۱۸ تشریح آیات

# ۸۵ --- تا --- ۹۹

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ
السَّاعَةَ لَاٰتِیَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ ﴿۸۵﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ﴿۸۶﴾

"ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان کی سب موجودات کو حق کے سوا کسی اور بنیاد پر خلق نہیں کیا ہے' اور فیصلے کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے' پس اے نبیؐ (ان لوگوں کی بیہودگیوں پر) شریفانہ درگذر سے کام لو۔ یقیناً تمہارا رب سب کا خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے"۔

یہ تبصرہ کہ آسمان و زمین کی تخلیق ایک سچائی کے ساتھ ہوئی ہے ایک عظیم اور اہم تبصرہ ہے یعنی یہ کہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان جو چیزیں بھی ہیں یہ سچائی کے ساتھ پیدا کر دہ ہیں۔ یہ انداز بیان بھی عجیب ہے کہ تمام موجودات حق کے سوا کسی اور ناموس پر پیدا نہیں کیے گئے۔ سوال یہ ہے کہ اس فقرے کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ (۱۵ : ۸۵) "ہم نے آسمان و زمین کو اور ان کی سب موجودات کو حق کے سوا کسی اور بنیاد پر خلق نہیں کیا"۔ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق میں سچائی کا گہرا دخل ہے۔ یہ سچائی کائنات کی گہرائیوں میں ہے۔ کائنات کی رفتار کے ضابطے میں سچائی موجود ہے۔ کائنات کا انجام اور خاتمہ بھی حق پر ہو گا۔

اس کائنات کے وجود میں سچائی ہے اور اس کی منصوبہ بندی اور اس کے نقشہ تخلیق میں سچائی ہے' یعنی یہ کہ یہ بطور کھیل تماشا پیدا نہیں کی گئی۔ نہ یہ کائنات اتفاقاً وجود میں آگئی ہے۔ اس کے اصل نقشے اور منصوبے میں نہ دھوکہ و فریب ہے' نہ کھوٹ ہے اور نہ یہ باطل مخلوق ہے۔ اس پر اگر بظاہر باطل چھایا ہوا نظر آتا بھی ہے تو وہ اوپرا ہوتا ہے' باطل اس کائنات کے حقیقی عناصر میں سے نہیں ہے۔

اس کائنات کی ساخت میں سچائی بہت گہری ہے۔ اس کے عناصر ترکیبی وہ ہیں جو حق کے عناصر ترکیبی ہیں۔ اس میں نہ واہمہ ہے' نہ فریب ہے۔ وہ قوانین جو عناصر کائنات کو جوڑے رکھتے ہیں' وہ سچائی پر مبنی ہیں اور ان قوانین میں کبھی بھی تخلف نہیں ہوتا۔ نہ ان میں تبدیلی آتی ہے اور نہ ان میں اضطراب ہوتا ہے۔ نہ ان میں کوئی التباس اور افراتفری ہوتی ہے۔

اس کائنات کی تدبیر اور کنٹرول نہایت ہی گہرے ضوابط پر ہے۔ اور اسے سچائی کے ساتھ چلایا جا رہا ہے۔ اس کائنات کے چلانے کے لیے جو نوامیس و ضوابط وضع کیے گئے ہیں وہ صحیح اور عادلانہ ہیں۔ وہ کسی مخصوص خواہش یا کسی مخصوص میلان کے نتیجے میں وضع نہیں ہوئے' صرف عدل اور سچائی پر یہ نوامیس وضع ہوئے ہیں۔

اس کائنات کے انجام میں بھی حق گہرائی تک رچا بسا ہے۔۔ نہایت ہی محکم قوانین کے مطابق اس کائنات کے تمام نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ زمین و آسمان اور ان کے درمیان اشیاء کے اندر جو تغیر و تبدل بھی وقوع پذیر ہوتا ہے وہ سچائی کے ساتھ ہوتا ہے اور سچائی کے لیے ہوتا ہے۔ اس کائنات میں جزاء و سزا کا ہر واقعہ اور ہر اصول سنت الٰہیہ کے مطابق ہے اور کوئی واقعہ سنت الٰہیہ کے برخلاف وقوع پذیر نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ قیامت جو یقیناً وقوع پذیر ہونے والی ہے' وہ اسی سچائی کا نتیجہ ہے' کیونکہ کائنات کی تخلیق حق کے ساتھ ہوئی ہے' لہٰذا قیامت نے ایک دن واقعہ ہونا ہے' یہ ٹل نہیں سکتی۔ کیونکہ جس ناموس کے مطابق یہ کائنات قائم و دائم ہے اور رواں دواں ہے' اسی حق کا تقاضا ہے کہ ایک دن قیامت آئے۔ یہ بذات خود حق ہے۔ جب قیامت حق ہے تو اس کا وقوع بھی حق ہے۔

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ (۱۵: ۸۵) "لہٰذا ان لوگوں کی بیہودگیوں پر شریفانہ درگذر سے کام لیں"۔ اور اپنے دل کو تنگ نہ کریں' اور کسی کے ساتھ بغض و عداوت نہ رکھیں کیونکہ سچائی بہرحال سچ ہو کر رہنے والی ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ (۱۵: ۸۶) "بے شک تمہارا رب سب کا خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے"۔ وہ پیدا کرنے والا ہے' وہ جانتا ہے کہ اس نے کیا پیدا کیا اور کیوں پیدا کیا؟ چونکہ اس نے سب کچھ پیدا کیا ہے لہٰذا ہر چیز کی ماہیت میں حق ودیعت شدہ ہے۔ لہٰذا جس طرح سچائی سے اس جہان کا آغاز ہوا اسی طرح سچائی پر اس کا اختتام ہو گا۔ کیونکہ سچائی اس کائنات کی اصل ماہیت ہے اور سچائی کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے' کھوٹ ہے' ختم ہونے والی ہے اور زندہ و تابندہ اور دائماً اس سچائی نے رہنا ہے جو قلب کائنات کے اندر ودیعت شدہ ہے۔

رسول جو پیغام لے کر آئے ہیں وہ بھی اس کائناتی سچائی ہی کا ایک حصہ ہے' اور اس کا ظہور بشکل قرآن ہے' جو حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دیا گیا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾

"ہم نے تم کو سات ایسی آیتیں دے رکھی ہیں جو بار بار دہرائی جانے کے لائق ہیں' اور تمہیں قرآن عظیم عطا کیا ہے"۔ یہ سبع مثانی کیا ہیں؟ راجح بات یہ ہے کہ یہ سورہ فاتحہ کی سات آیات ہیں۔ جیسا کہ روایات میں بھی وارد ہے' مثانی اس لیے کہا گیا کہ نماز میں ان کو بار بار دہرایا جاتا ہے یا ان کو مثانی اس لیے کہا گیا کہ ان میں اللہ کی ثنا بیان ہوتی ہے ۔۔۔ جبکہ قرآن عظیم سے مراد بقیہ قرآن ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں قرآن عظیم کو آیات تخلیق کائنات اور آیات وقوع قیامت کے ساتھ ایک

ہی لڑی میں لایا گیا ہے ۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تخلیق کائنات 'قیام قیامت اور نزول قرآن اسی ایک سچائی کی کڑیاں ہیں جو اس پوری کائنات کی روح ہے ۔ اس طرح قرآن کریم دلوں کو اس عظیم سچائی اور نوامیس قدرت کو سمجھنے کے لیے مائل کرتا ہے جو اس کائنات میں پوشیدہ ہیں ۔ نفس انسانی اور آفاق میں موجود ہیں ۔ انہی کے مطابق لوگوں کو ہدایت و ضلالت نصیب ہوتی ہے ۔ حق و باطل کا انجام 'خیر و شر کی اقدار' صلاح و فساد کا تعین اسی ناموس حق کے مطابق ہوتا ہے ۔
یہ قرآن کریم اس حقیقی سچائی کی دفعات اور اصولوں پر مشتمل ہے اور قرآن ہی کے ذریعے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ جس سچائی پر کائنات قائم ہے وہ کیا ہے ؟ گویا جس سچائی پر اس کائنات کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ قرآن کریم ہے ۔ اس سے نوامیس فطرت ثابت ہوتے ہیں' اور یہ ان نوامیس فطرت کے ساتھ مربوط اور مرتب ہے ۔ یہ قرآن کریم کوئی عارضی چیز نہیں ہے ' نہ مٹنے والی حقیقت ہے ۔ یہ حق ہے اور یہ ہمیشہ موثر رہے گا ۔ یہ زندگی کی راہنمائی کرتا رہے گا ۔ اگر چہ خندہ و استہزاء کرنے والے خندہ و استہزاء کرتے رہیں ۔ اگرچہ باطل پرست باطل کے جھنڈے اٹھائیں کیونکہ باطل زائل ہونے والا ہے اور ایک دن مٹنے والا ہے ۔

جن لوگوں کو سورہ فاتحہ دی گئی اور یہ قرآن عظیم دیا گیا' جو اس کائنات کی عظیم سچائی پر مشتمل ہے جس کا اس عظیم سچائی اور حق اکبر کے ساتھ گہرا تعلق ہے 'ان کی نظریں اس قدر بلند ہو جاتی ہیں کہ وہ پھر اس دنیا میں باطل چیزوں اور زائل ہونے والی چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں ۔ نہ ان کو باطل پرستوں کے ہاؤ ہو سے غرض ہوتی ہے ۔ وہ اس بات کو اہمیت ہی نہیں دیتے کہ وہ قلیل ہیں یا کثیر ہیں ۔ ان کی تعداد کم ہے یا زیادہ ہے بہرحال ایسے لوگ اپنی راہ پر چلتے رہتے ہیں کیونکہ حق ان کے ساتھ ہوتا ہے لہٰذا ہر حال میں ان کے حوصلے بلند ہوتے ہیں ۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٨٨﴾ وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ﴿٨٩﴾

"تم اس متاع دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے اور نہ ان کے حال پر اپنا دل کڑھاؤ ۔ انہیں چھوڑ کر ایمان لانے والوں کی طرف جھکو اور (نہ ماننے والوں سے) کہہ دو کہ "میں تو صاف صاف تنبیہ کرنے والا ہوں" ۔

آنکھیں لمبی نہیں ہوتیں ۔ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (۱۵ : ۸۸) "تم اس متاع دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو ۔ جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے" ۔ درحقیقت نظریں پھیلتی اور لمبی ہوتی ہیں لیکن للچائی نظروں کی تعبیر ان الفاظ میں کی گئی کہ گویا آنکھیں نکل کر لمبی ہو گئی ہیں ۔ تخیل کی یہ تعجب انگیز اور طرب آمیز تصویر کشی ہے ۔ مفہوم یہی ہے کہ اے رسول 'ان چیزوں کی طرف توجہ ہی نہ کرو ' ان کو اہمیت ہی نہ دو 'بعض مردوں اور عورتوں اور طبقوں کو جو یہ دولت دی گئی ہے اس کی اہمیت کچھ بھی نہیں ہے ۔
ان چیزوں کو زیادہ اہتمام سے نہ دیکھو ۔ ان کو خوبصورت نہ سمجھو ' ان کو دیکھ کر تمہاری نظریں خیرہ نہ ہو جائیں اور تم

ان کی تمنائیں نہ کرنے لگو۔ یہ تو زائل ہونے والی چیزیں ہیں ' یہ حق نہیں ہیں ' باطل ہیں جبکہ اے پیغمبر' آپ تو عظیم سچائی ' مثانی اور قرآن عظیم کے حامل ہیں۔

اس کا یہ مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ دنیا میں محروم طبقات کو حالت محرومیت ہی میں چھوڑ دیا جائے ' اور منعم اور عیش پرست لوگوں کو ان کے مال و منال میں غرق اور مست چھوڑ دیا جائے جبکہ اعلیٰ اقدار مٹ جائیں اور معاشی عدل ختم ہو جائے اور دنیا مستقلاً محرومین اور مترفین کے درمیان منقسم ہو جائے۔ اسلام جو سچائی پر قائم ہے اور جو یہ تعلیم دیتا ہے کہ حق اس کائنات کی روح ہے تو وہ کیسے اس قسم کی ظالمانہ اور غیر عادلانہ صورت حال کو جاری رکھنے کی اجازت دے سکتا ہے۔

یہاں اس کا ایک خاص مقامی مفہوم ہے۔ مقصد یہ ہے کہ آپ کو رشد و ہدایت کی جو دولت دی گئی ہے وہ ان لوگوں کی زرق و برق زندگی اور دولت سے زیادہ قیمتی ہے۔ لہٰذا آپ ان سرمایہ داروں کو نظرانداز کر دیں اور مخلص مومنین کی طرف متوجہ ہوں۔ کیونکہ یہ اہل ایمان جو دنیاوی اعتبار سے اگرچہ غریب ہوں گے لیکن یہ اس سچائی کے حاملین ہیں جس کے اوپر اس کائنات کی تخلیق کی گئی ہے اور ان تمام چیزوں کی تخلیق کی گئی ہے جو اس کائنات کے درمیان ہیں۔ دنیا دار لوگ تو باطل کے پیروکار ہیں جو عارضی چیز ہے اور اس کا اس کائنات کی اصل حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ (۱۵ : ۸۸) "اور ان کے حال پر اپنا دل نہ کڑھاؤ"۔ یہ فکر نہ کرو کہ ان لوگوں کا انجام نہایت ہی بھیانک ظاہر ہونے والا ہے۔ قیامت کے دن یہ برا انجام اس حق کا تقاضا ہے لہٰذا ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ (۱۵ : ۸۸) "اور ایمان لانے والوں کی طرف اپنے پر جھکاؤ"۔ یہاں نرمی ' محبت اور شفقت کی تعبیر اس طرح کی گئی ہے کہ جس طرح پرندہ اپنے بچوں کے سامنے پر بچھاتا ہے۔ یہ نہایت ہی مصورانہ انداز تعبیر ہے اور اسے قرآن کریم بہت زیادہ استعمال کرتا ہے۔ یہ قرآن مجید کا مخصوص فنی انداز ہے۔

وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ (۱۵ : ۸۹) "اور کہہ دو کہ میں تو صاف صاف تنبیہ کرنے والا ہوں"۔ دعوت کا موثر اور حقیقی طریقہ ہی یہ ہے کہ بات واضح طور پر کہو' یہاں موقعہ و محل چونکہ مکذبین اور مذاق کرنے والوں کا تھا۔ یہاں صرف ڈراوے کا ذکر کیا گیا ہے۔ بشارت کو ترک کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ خطاب ان لوگوں سے تھا جو دنیا پرست ہیں اور اس سچائی پر غور و فکر نہیں کرتے جو تخلیق کائنات کی بنیاد ہے جس کے اوپر قرآن آیا ہے اور جس کے مطابق قیامت برپا ہوگی۔

تخلیق کائنات کی عظیم سچائی اور فاتحہ اور قرآن عظیم کے ذکر کے موقعہ پر یہاں یہ بھی بتا دیا گیا کہ رسولان سابق کے بعض متبعین قرآن کریم پر غور نہیں کرتے۔ اس کی بعض باتوں کو تو مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ قرآن کریم کی جو باتیں ان کی کتابوں سے موافق ہیں ان کو تسلیم کرتے ہیں اور جو باتیں زیادہ ہیں ان کو نہیں مانتے حالانکہ قرآن کریم اللہ کی آخری اور مکمل کتاب ہے اور اس میں وہ تمام سچائیاں جمع کر دی گئی ہیں جن پر کتاب سابقہ مشتمل تھیں۔

كَمَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَى الۡمُقۡتَسِمِيۡنَۙ‏ ﴿90﴾ الَّذِيۡنَ جَعَلُوا الۡقُرۡاٰنَ عِضِيۡنَ‏ ﴿91﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَسۡـَٔـلَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَۙ‏ ﴿92﴾ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ‏ ﴿93﴾

"یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے جیسی ہم نے ان تفرقہ پردازوں کی طرف بھیجی تھی جنہوں نے اپنے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے۔ تو قسم ہے تیرے رب کی، ہم ضرور ان سب سے پوچھیں گے کہ تم کیا کرتے رہے ہو"۔

یعنی ہم نے آپ کو سبع مثانی اور قرآن عظیم دیا ہے۔ یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے جسے ہم نے ان تفرقہ پردازوں کی طرف بھیجی تھی۔ آپ اکیلے نبی نہ تھے جس کو کتاب دی گئی دوسرے انبیاء کو بھی دی گئی اور ان تمام کتابوں کی اصل الکتاب ہے۔ یہ واحد ہے اس کا مرجع ایک ہے کیونکہ سب کتب اللہ کی طرف سے نازل ہوئیں۔ اس لیے جن لوگوں پر اس سے قبل کتاب نازل ہو چکی ہے' ان کا تو حق نہیں ہے کہ وہ کسی کتاب کا انکار کریں کیونکہ کتاب نازل کرنے والا خالق حقیقی بہت ہی اچھی طرح جانتا ہے کہ کس دور میں لوگوں کو کس ضابطے کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ جنہوں نے قرآن کریم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور اس کو تقسیم کر لیا ہے' ایک حصے کو تو قبول کرتے ہیں اور دوسرے حصے کو رد کر دیتے ہیں۔ (عضین جمع عضی ہے یعنی جزء۔ عضي الشاة يعني فصل بين اعضائها ان لوگوں نے اس رویہ کی مخالفت کی جو ان سے اہل کتاب ہونے کے حوالے سے متوقع تھا۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۹۲) عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۹۳) (۱۵: ۹۲ -

۹۳) "تو قسم ہے تیرے رب کی ہم ضرور ان سے پوچھیں گے کہ تم کیا کرتے رہے ہو"۔ اور پوچھنے کا مقصد معلوم ہے یعنی سزا۔ جب بات یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو حضور اکرمؐ کو براہ راست خطاب کیا جاتا ہے کہ آپؐ اپنی راہ پر گامزن رہیں۔ جو حکم اللہ نے آپ کو دیا ہے اسے ببانگ دہل کہہ دیں۔ یہاں اس کے لیے صدع کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی چیرنے کے ہیں یعنی پوری قوت سے بات کریں۔ لوگوں کا شرک کرنا اور اس پر اصرار کرنا آپ کو اپنی جدوجہد سے نہ روک دے۔ کیونکہ مشرکین اور دشمنان اسلام اپنے انجام سے جلد ہی خبردار ہو جائیں گے۔ اسی طرح آج جو لوگ تحریک اسلامی سے استہزاء کرتے ہیں وہ بھی اپنے انجام تک پہنچ جائیں گے۔ ان کے مذاق کو دعوت اسلامی کی رفتار پر اثر انداز ہونے نہ دیں۔

فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ‏ ﴿94﴾ اِنَّا كَفَيۡنٰكَ الۡمُسۡتَهۡزِءِيۡنَۙ‏ ﴿95﴾ الَّذِيۡنَ يَجۡعَلُوۡنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ‌ۚ فَسَوۡفَ يَعۡلَمُوۡنَ‏ ﴿96﴾

"پس اے نبیؐ! جس چیز کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروانہ

کرو۔ تمہاری طرف سے ہم ان مذاق اڑانے والوں کی خبر لینے کے لیے کافی ہیں جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی خدا قرار دیتے ہیں۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"۔

اور رسول اللہ ﷺ بہرحال انسان اور بشر تھے' وہ جب دیکھتے کہ لوگ کفر و شرک پر اصرار کرتے ہیں' الٹا داعیان کے ساتھ مذاق کرتے ہیں' تو آپ کو سخت غصہ آتا تھا اور آپ نہایت ہی دل تنگ اور پریشان ہوتے تھے۔ اس پر آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ اللہ کی تعریف و تسبیح کرتے رہیں۔ اللہ کی بندگی کرتے رہیں اور تسبیح و تہلیل اور عبادات اور ذکر و فکر میں مشغول رہیں۔ لوگوں کی جانب سے جو بھی مذاق ہوتا اسے برداشت کریں اور پوری زندگی میں اللہ کو یاد کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ آپ کو حق الیقین آجائے یعنی موت آجائے اور آپ رب تعالیٰ کے جوار رحمت میں پہنچ جائیں۔

۶ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ
ع۲۰ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾
۶

"ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمہارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے (اس کا علاج یہ ہے کہ) اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو' اس کی جناب میں سجدہ بجا لاؤ' اور اس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو' جس کا آنا یقینی ہے"۔

یہ ہے اس سورہ کا خاتمہ یعنی کافروں کو نظر انداز کرنا اور رب تعالیٰ کی طرف واپس ہونا اور یہ کہ جلد ہی ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ یہ کافر خواہش رکھیں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے؟

--- ))٥(( ---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ------- ۱۴

## سورۃ النحل ـ ۱۶

۱ --- تا --- ۱۲۸

# درس نمبر ۱۱۹ ایک نظر میں

یہ سورہ نہایت ہی دھیمے انداز کی ہے۔اس کا زمزمہ معمول کے مطابق ہے' لیکن اس کے موضوعات مختلف اور بھرپور ہیں۔اس کا دائرہ کلام وسیع ہے اور اس کے اندر مختلف قطعات اور زاویئے ہیں جن سے بات کی گئی ہے اور نہایت ہی موثر انداز میں کی گئی ہے۔اس میں جو رنگا رنگ سائے ہیں ان کے خطوط نہایت ہی گہرے اور دیرپا ہیں۔

تمام دوسری مکی سورتوں کی طرح اس کا مرکزی مضمون بھی اسلام کا مرکزی عقیدہ 'عقیدۂ توحید ہے۔یعنی اللہ کی الوہیت اور اللہ کی حاکمیت 'وحی الہی 'بعث بعد الموت کا عقیدہ۔لیکن اس میں بعض دیگر موضوعات بھی زیر بحث آئے ہیں جو ان موضوعات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔اس سورہ میں عقیدۂ توحید پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ایک تو یہ اسلام کے اہم موضوعات میں سے ہے اور دوسرے یہ کہ دین محمدی اور دین ابراہیم علیہ السلام کے درمیان مسئلہ توحید کی وجہ سے ایک خاص نسبت بھی پائی جاتی ہے۔ایمان 'کفر اور ہدایت و ضلالت کے بارے میں اللہ کے ارادے اور انسانی ارادے کے دائرہ کار سے بھی اس سورہ میں بحث کی گئی ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ رسولوں کے فرائض کیا ہیں اور جو لوگ رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں 'ان کے بارے میں اللہ کی سنت کیا ہے؟ نیز اس سورہ میں حلال و حرام کے بعض قواعد بھی بتائے گئے ہیں اور بت پرستوں نے اس میدان میں جن اوہام و خرافات کو سینے سے لگا رکھا تھا اس پر بھی بحث کی گئی ہے۔پھر ہجرت فی سبیل اللہ اور دیار کفر میں مسلمانوں پر تشدد اور مظالم کا بھی ذکر ہے۔نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایمان کے بعد کفر اختیار کرنا کس قدر جرم ہے۔عقائد و نظریات کے مسائل سے آگے بڑھ کر معاملات پر بھی اس میں بحث موجود ہے۔عدل 'احسان 'انفاق فی سبیل اللہ 'وفائے عہد وغیرہ اسلامی اعمال اور اخلاقی رویوں کا بھی ذکر ہے جو اسلامی نظریہ حیات کے منطقی تقاضے ہیں۔وہ میدان اور دائرۂ کار جس میں یہ موضوعات چلتے ہیں وہ بہت وسیع ہے یعنی زمین اور آسمان' آسمانوں سے پانی کا آنا اور زمین میں روئیدگی کا نمودار ہونا 'رات اور دن 'سورج اور چاند' سمندر اور پہاڑ' زمین اور اس کے نشانات راہ اور راستے 'نہریں اور دریا وغیرہ مختلف النوع موضوعات ہیں جو اس سورہ کا حصہ ہیں۔پھر دنیا' اس میں ہونے والے واقعات اور ان کے نتائج' آخرت اور اس کی قدریں اور مشاہد قیامت' عالم غیب کے واقعات اور نفس انسانی اور اس کے میلانات اور انسان کے اردگرد پھیلے ہوئے آفاق۔

موضوعات کے اس طویل و عریض میدان میں آغاز کلام ایک ایسے انداز میں ہوتا ہے کہ گویا یہ ایک عظیم مہم ہے جس میں انسانی ضمیر اور انسانی عقل کو متاثر کر کے اسے ہدایت قبول کرنے کی سعی کی گئی۔انسان کو راہ ہدایت پر آنے کا جوش دلایا گیا ہے۔یہ مہم نہایت ہی دھیمے انداز میں شروع کی گئی ہے لیکن اس کا مضراب عقل و خرد کے مختلف تاروں کو چھیڑتا ہے۔نہایت ہی دھیمے ٹون میں' آواز میں گھن گرج نہیں' لیکن یہ دھیما ٹون ہمہ گیر ہے اور انسانی شخصیت کے تمام تاروں کو چھیڑتا ہے۔یہ مضراب عقل کے تاروں کو بھی چھیڑتا ہے اور انسان کے حساس وجدان کو بھی جگاتا ہے۔آنکھوں کو

بھی کھولا جاتا ہے کہ دیکھو 'کانوں کو چھیڑا جاتا ہے کہ سنو' انسانی شعور کو چھوا جاتا ہے کہ احساس کرو' انسانی وجدان کو خوراک دی جاتی ہے۔ عقل کو تدبر کی دعوت دی جاتی ہے کہ یہ کائنات تو علامات و نشانات سے بھری پڑی ہے۔ ذرا آسمان و زمین کو دیکھو' ذرا شمس و قمر پر غور کرو' ذرا رات اور دن کے نظام اور حرکت اجرام فلکی پر غور کرو' ذرا پہاڑوں اور دریاؤں پر غور کرو' ذرا دریاؤں اور نالوں کو دیکھو' ذرا درختوں اور ان کی چھاؤں پر غور کرو' نباتات اور پھلوں کو دیکھو' حیوانات اور پرندوں کو دیکھو' اور پھر ذرا آخرت اور اس کے مناظر اور خصوصاً اس کے ان مناظر کو دیکھو جو نظروں سے غائب ہیں۔ یہ تمام مضراب ہیں جو انسان کے حواس 'عقل' اعضاء اور قلب و نظر کو متاثر کر سکتے ہیں اور ان کو تازہ زمزمہ دے سکتے ہیں۔ غرض یہ بتایا جاتا ہے کہ ان تمام علامات و نشانات کے ہوتے ہوئے' اگر کسی کے رباب حیات کے تار زمزمہ پیدا نہیں کر سکتے تو سمجھ لیا جائے کہ اس کی عقل کے دروازے بند ہیں' اس کا دل مردہ ہو گیا ہے اور اس حس و شعور کے قوئ ناکارہ ہو چکے ہیں۔ یہ زمزمہ انسان کو ان نشانات کی طرف متوجہ کرتا ہے جو اللہ نے اس کائنات کے اندر بکھیر دیئے ہیں اور جن کے ذریعے اللہ نے انسانوں پر بے شمار احسانات فرمائے۔ ان میں مشاہد قیامت بھی ہیں اور ان میں اللہ کے سامنے پیشی کے مناظر اور مکذبین کی ہلاکت کے سین بھی ہیں۔ اس میں بعض وجدانی ٹچ ایسے ہیں جو انسانی نفسیات کے اسرار و رموز کو اجاگر کرتے ہیں اور خود حضرت انسان کے تناسل اور تخلیق کے مناظر بھی ہیں۔ انسان ایک وقت ماں کے پیٹ میں جنین ہوتا ہے' پھر یہ جوان ہوتا ہے اور پھر بوڑھا ہو جاتا ہے اور پھر ضعیف و ناتواں ہوتا ہے۔ اس پر اعلیٰ قوت اور اعلیٰ درجے کے ضعف کے حالات بھی آتے ہیں' کبھی وہ ناز و نعم میں پلتا ہے اور کبھی اس پر فاقے بھی آتے ہیں۔ یوں یہ سورہ ایک نمائش گاہ ہے جس میں مناظر اور مکالمے' قصے اور دلائل بطور اشیائے نمائش پیش کیے جاتے ہیں۔

لیکن اس پوری سورہ کو جو سائے نہایت ہی خوبصورت رنگ دیتے ہیں وہ دلائل کونیہ ہیں جن سے اس تخلیق کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ پھر وہ انسان کے لیے جس قدر مفید ہیں' ان سے انسان پر اللہ کے عظیم انعامات و احسانات ثابت ہوتے ہیں اور پھر ان میں جس قدر حکمت اور ٹیکنالوجی ہے اس سے علیم و حکیم کا تدبر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سب امور ایک ساتھ چلتے ہیں۔ یہ عظیم کائنات' اپنی عظمت اور نشان قدرت ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کے لیے نعمت بھی ہے۔ یہ کائنات نہ صرف یہ کہ انسان کی مادی ضروریات کو پورا کرتی ہے بلکہ یہ انسان کے ذوق جمال کے لیے سروسامان بھی فراہم کرتی ہے۔ انسان کی تمام ضروریات اس کے اندر موجود ہیں۔ اس میں انسان کے لیے زیب و زینت کے سامان ہیں۔ انسان کی جسمانی سہولیات کی وافر مقدار' انسان کے لیے روحانی سکون کا سامان بھی۔ یہ سب کچھ اس لیے کہ انسان اللہ کا شکر ادا کرے۔

چنانچہ اس سورہ کے صحراؤں میں اللہ کے انعامات و احسانات اور اس کے شکر کی گھنی چھاؤں موجود ہے' اس کے اندر انسان کی ہدایت کے لیے وسیع اشارات موجود ہیں اور سورہ کے تمام اسباق کے آخر میں ان سے نتائج اخذ کر کے انسان کی ہدایت کا سروسامان کیا گیا ہے۔ امثال کے ذریعے بھی مدعا کو ثابت کیا گیا ہے۔ ہر موضوع کے لیے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ اعلیٰ نمونہ حضرت ابراہیم کی زندگی کا نمونہ ہے جن کے بارے میں کہا گیا ہے۔

شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۱۶ : ۱۲۱) "اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا تھا۔ اللہ نے اسے منتخب کر لیا' اور اسے سیدھا راستہ دکھایا"۔ یہ تمام مضامین نہایت ہی مرتب انداز میں بیان

ہوئے ہیں۔ تصویر کشی اور تصاویر کے سایوں میں، عبادات اور ان کے اثرات میں، مسائل و موضوعات میں، مکمل ہم آہنگی ہے۔ ان شاء اللہ ہم تشریح آیات کے ضمن میں بعض نکات کی مزید تشریح کریں گے۔

پہلا سبق موضوع توحید کے بارے میں ہے اور اس کے اوپر جو دلائل دیئے گئے ہیں وہ اس کائنات کے تکوینی دلائل ہیں۔ پھر کائنات کے اندر انسان کے لیے فائدہ اور ضرورت کے لیے جو انعامات رکھے گئے ہیں ان کی طرف اشارے ہیں اور پھر اللہ کی وسعت علم کو سمجھایا گیا ہے جو ظاہر اور مفید اور دنیا و آخرت سب کو جانتا ہے۔ مناسب ہے کہ اس سبق کا آغاز تشریح آیات ہی سے کر دیا جائے۔

--- ooo---

# درس نمبر ۱۱۹ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۲۱

سُورَةُ النَّحْلِ مَكِّيَّةٌ (۷۰) آیاتها ۱۲۸ رکوعاتها ۱٦

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۱ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ
بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ
اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝۲

"آ گیا اللہ کا فیصلہ 'اب اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں ۔ وہ اس روح کو اپنے جس بندے پر چاہتا ہے اپنے حکم سے ملائکہ کے ذریعے نازل فرما دیتا ہے (اس ہدایت کے ساتھ کہ لوگوں کو) "آگاہ کر دو 'میرے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ہے 'لہٰذا تم مجھی سے ڈرو"۔

مشرکین مکہ اس معاملے میں جلدی کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح اقوام سابقہ کی ہلاکت کی بات کرتے ہیں 'ہم پر بھی دنیا یا آخرت کا عذاب لے آئیں ۔ مکہ میں آپ کی زندگی گزر رہی تھی اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے وہ اپنے اس مطالبے پر زیادہ زور دیتے ۔ بلکہ مذاق کرنے لگتے اور خندہ و استہزاء میں بہت ہی آگے بڑھ جاتے ۔ وہ اس تاثر کا اظہار کرتے کہ حضرت محمدؐ انہیں خواہ مخواہ ڈراتے ہیں 'جو ڈراوے وہ دیتے ہیں ان کا کوئی وجود نہیں ہے ۔ اس لیے وہ محض اوہام پر ایمان نہیں لا سکتے ہیں 'نہ ایسی چیز کے سامنے سرتسلیم خم کر سکتے ہیں جن کا وجود ہی نہ ہو ۔ اللہ ان کو جو مہلت دے رہا تھا اور مواقع فراہم کر رہا تھا اس میں گہری حکمت اور رحمت تھی اور وہ اسے سمجھ نہیں پا رہے تھے ۔ مزید یہ کہ قرآن کریم جو آیات کونیہ پیش کر رہا تھا اور خود قرآن جو عقلی دلائل پیش کر رہا تھا وہ اس پر غور و فکر نہ کرتے تھے ' حالانکہ یہ دلائل قلب و نظر پر جو اثرات چھوڑتے تھے 'وہ تخویف بذریعہ عذاب سے زیادہ کارگر ہو سکتے تھے ۔ انسان کو اللہ نے عقل و خرد سے نوازا ہے 'اس کے شایان شان تو یہ ہے کہ وہ ان دلائل پر غور کرے 'محض ڈراوے سے تسلیم کرنا تو ان لوگوں کے لیے ہے جو عقل و خرد کے پہلو سے کمزور ہوں ۔ ڈراوے سے حریت ارادہ پر بھی زد پڑتی ہے ۔

ایسے حالات میں فرمایا:

اَتٰی اَمْرُ اللّٰهِ (١٦ : ١) "اللہ کا فیصلہ آ گیا"۔ یعنی اللہ فیصلہ کر چکے ہیں' ان کا ارادہ متوجہ ہو گیا ہے جو وقت صدور اللہ نے مقرر کیا ہے اس میں ان اوامر و احکام اور فیصلوں کا صدور ہو جائے گا۔ لہٰذا

فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ (١٦ : ١) "جلدی نہ مچاؤ"۔ اللہ کے فیصلے اس کی مشیت کے مطابق ہوتے ہیں۔ تمہاری طرف سے شتابی کرنا اللہ کے فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ تمہاری طرف سے درازی مہلت کی امید بھی ان کو موخر نہیں کر سکتیں۔ عذاب آتا ہے یا قیامت برپا ہوتی ہے' اس کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ اس فیصلے کا وقوع اور نفاذ اپنے مقررہ وقت پر بہرحال ہو گا۔ اس میں تقدیم و تاخیر ممکن نہیں ہے۔

ایک شخص اپنی حالت پر جس قدر جمنے کی کوشش بھی کرے یہ فیصلہ کن انداز گفتگو اسے بہرحال متاثر کرتا ہے' چاہے وہ استکبار کی وجہ سے اپنے تاثر کو ظاہر نہ کرے۔ جس قدر انداز فیصلہ کن ہے اسی طرح یہ حقیقت بھی اٹل ہے کہ اللہ کا حکم جب آتا ہے تو وہ اٹل ہوتا ہے۔ بس صرف اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اللہ کا ارادہ کسی امر سے متعلق ہو جائے بس وہ امر واقع ہو جاتا ہے۔ چشم زدن میں وہ وجود میں آ جاتا ہے۔ لہٰذا یہ زوردار انداز کلام کسی شاعرانہ مبالغہ آرائی پر بھی مبنی نہیں ہے۔ جس طرح انداز کلام شعور کو متاثر کرتا اسی طرح اللہ کے فیصلے واقعی صورت حالات میں انقلاب برپا کر دیتے ہیں۔

رہے مشرکین مکہ کے اعمال شرکیہ اور عقائد شرکیہ اور ان کے وہ تمام تصورات جو اعمال شرکیہ اور عقائد شرکیہ پر مبنی ہیں تو اللہ کی ذات ان سے پاک ہے۔

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ (١٦ : ١) "پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں"۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے تمام ان شرکوں سے جن میں یہ لوگ مبتلا ہیں۔ یاد رہے کہ شرک میں کوئی انسان تب ہی مبتلا ہوتا ہے جب وہ فکری اعتبار سے گر اپڑا ہو اور اس کے تصورات کسی دلیل پر مبنی نہ ہوں۔

اللہ کے احکام و اوامر آ گئے' جو شرک سے پاک ہیں اور امر دینے والے باری تعالیٰ بھی شرک سے پاک ہیں اور اہل مکہ اللہ تعالیٰ کو جو مقام دیتے ہیں وہ اس سے بہت بلند ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے گمراہانہ خیالات میں ڈوبا ہوا نہیں چھوڑتے۔ اللہ تعالیٰ آسمانوں سے فرشتے بھیجتے ہیں اور یہ فرشتے ایسے پیغام کے حامل ہوتے ہیں جو انسانوں کی حیات نو اور نجات اخروی کے پروگرام پر مشتمل ہوتا ہے۔

یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ (١٦ : ٢) "وہ اس روح کو اپنے جس بندے پر چاہتا ہے اپنے حکم سے ملائکہ کے ذریعے نازل فرما دیتا ہے" اور یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ آسمانوں سے فقط بارش ہی نہیں برساتا جو ان کے جسم کے لیے سازو سامان فراہم کرتی ہے بلکہ وہ ملائکہ کو انسان کی روحانی غذا دے کر بھی بھیجتا ہے۔ قرآن کریم اور اسلام کو روح کہنا نہایت ہی معنی خیز ہے۔ پیغام قرآن ایک سوسائٹی کو اسی طرح

زندہ کرتا ہے جس طرح ایک انسان کے جسم میں روح ڈال کر زندہ کیا جاتا ہے۔ اس پیغام سے نفس و ضمیر زندہ ہوتا ہے۔ عقل و شعور کو جلا ملتی ہے اور سوسائٹی اس طرح زندہ اور صحت مند ہوتی ہے کہ اس سے ہر قسم کے فساد ختم ہو جاتے ہیں۔ لہذا آسمانوں سے انسانی زندگی کے لیے جو برکات و انعامات نازل ہوتے ہیں' یہ ان میں سے اعلیٰ و افضل ہے۔ یہ نعمت عظمیٰ وہ مخلوق لے کر آتی ہے جو پاک طینت ہے۔ جو اللہ کے بندوں میں سے برگزیدہ افراد پر نازل ہوتی ہے' جو افضل العباد ہوتے ہیں اور اس روح کائنات کا خلاصہ کیا ہے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ (۱۶ : ۲) "میرے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے لہذا تم مجھ ہی سے ڈرو"۔

اللہ وحدہ لاشریک حاکم و معبود ہیں۔ یہ تمام عقیدہ عقائد کی روح ہے' یہ نفس انسانی کی زندگی ہے' یہ وہ تصور ہے جس سے سوسائٹی زندہ و توانا ہوتی ہے اور اس کے سوا جو تصورات ہیں انسانی سوسائٹی کے لیے مہلک اور تباہ کن ہیں۔ جو شخص اللہ وحدہ کی ذات پر ایمان نہیں رکھتا وہ حیران و پریشان' تباہ و برباد ہوتا ہے۔ اسے ہر طرف سے ایک باطل عقیدہ اپنی طرف کھینچ رہا ہوتا ہے' اوہام پر مبنی باہم متناقض تصورات ہر طرف سے دامن گیر ہوتے ہیں اور اس کا نفس ہر وقت وساوس' ان جانے خوف اور وہم کی آماجگاہ بنا رہتا ہے اور وہ کبھی بھی کسی ایک سمت میں کسی متعین ہدف کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ افکار پریشان اور اعمال بے ترتیب کے اندر گھرا ہوتا ہے۔

اسلام کی تعبیر روح سے کرنا دراصل ان تمام مفہومات کا اظہار ہے اور سورہ کے آغاز میں جہاں اللہ تعالیٰ اپنے تمام انعامات کا ذکر فرماتے ہیں' اسلام کو روح حیات قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی نظریہ حیات دراصل وہ نعمت عظمیٰ ہے' جس کے بغیر انسان اللہ کی دوسری نعمتوں سے بھی کماحقہ مستفید نہیں ہو سکتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ نعمت کسی کو نہ دی گئی ہو تو اس کے لیے دوسرے انعامات بھی اپنی قدر و قیمت کھو دیتے ہیں کیونکہ یہ نعمت ہی دراصل انسان کو حیات جاوداں بخشتی ہے۔

اس آیت میں ڈراوے اور انذار کو وحی و رسالت کا اصل مشن قرار دیا گیا ہے اس لیے کہ اس سورہ کے پورے مضامین مکذبین' مشرکین اور اللہ کی نعمتوں کے منکر اور ناشکرے طبقات کے گرد گھومتے ہیں۔ نیز اس میں ان لوگوں پر بھی تنقید کی گئی ہے جو حلال کو حرام قرار دیتے ہیں جو بہت بڑا جرم ہے اور شرک ہے' نیز اللہ کے ساتھ عہد کر کے توڑنے والوں پر بھی اس سورہ میں تنقید ہے' نیز جہاں ان لوگوں سے بھی بحث کی گئی ہے جو اسلام کو قبول کرنے کے بعد مرتد ہو جاتے ہیں۔ لہذا آغاز سورہ میں یہ کہنا کہ لوگوں کو ان گھناؤنے جرائم سے ڈراؤ' ایک مناسب آغاز کلام ہے کہ لوگو احتیاط کرو' اللہ سے ڈرو' اور آخرت کا خوف کرو۔

--- ○○○---

اس تمہید کے بعد لوگوں کے سامنے وہ دلائل و شواہد پیش کئے جاتے ہیں جو اس پوری کائنات میں بکھرے پڑے ہیں' جو توحید باری تعالیٰ پر دلالت کرتے ہیں۔ پھر اللہ کے بعض انعامات کا ذکر ہے جو منعم حقیقی کے احسان پر دلالت کرتے ہیں۔ ان نشانات و انعامات کا ذکر بکثرت اور فوج در فوج ہے۔ آغاز تخلیق ارض و سما اور تخلیق حضرت انسان سے ہوتا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۳

خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ۝

"اس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے' وہ بہت بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ اس نے انسان کو ایک ذرا سی بوند سے پیدا کیا اور دیکھتے دیکھتے صریحاً وہ ایک جھگڑالو ہستی بن گیا"۔

وہی بات کہ تخلیق کائنات حق پر ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (۱۶: ۳) "اس نے زمین و آسمان کو برحق پیدا کیا ہے"۔ گویا اس کی تخلیق کا بنیادی عنصر حق ہے۔ اس کائنات کو حق کے مطابق چلایا جا رہا ہے اور اس کائنات کو چلانے اور اس کے اندر موجود تمام مخلوقات کو چلانے کا بنیادی عنصر اور بنیادی قوت حق اور سچائی ہے۔ اس کائنات کی کوئی چیز عبث' اتفاق اور بے مقصد نہیں ہے۔ یہ چیز سچائی پر قائم ہے۔ سچائی کے ساتھ وابستہ ہے' وہ سچائی کی طرف بڑھتی ہے اور اس کا انجام بھی سچائی کے مطابق ہو گا۔

تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ (۱۶: ۳) "وہ بہت بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ کرتے ہیں"۔ اللہ لوگوں کے شرک سے بہت بلند اور دور ہے' اللہ جو خالق سماوات والارض ہے' اس کے ساتھ خود اس کی مخلوق میں سے بعض چیزوں کو شریک کرنے کی تک کیا ہے؟ لہٰذا اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز اس کے شریک ہونے کے لائق ہی نہیں ہے' لہٰذا وہ واحد خالق لاشریک ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ (۱۶: ۴) "اس نے انسان کو ذرا سی بوند سے پیدا کیا اور دیکھتے دیکھتے وہ صریحاً جھگڑالو ہستی بن گیا"۔ اس کے آغاز کو دیکھو اور اس کی تکمیل کے بعد اس کے نخروں کو دیکھو کس قدر عظیم فرق ہے۔ اس حقیر اور سادہ بوند کو دیکھو اور پھر ایک مکمل جھگڑالو اور خالق کے مقابل میں آنے والے اس حضرت کو دیکھو کہ وہ خود خالق کے ساتھ مجادلہ کرتا ہے' خالق کے وجود تک کا منکر ہو جاتا ہے یا اس کی وحدانیت کا انکار کر کے اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتا ہے۔ اس کی حالت نطفہ اور حالت جدال کے درمیان زمان و مکان کا کوئی بہت بڑا فاصلہ بھی نہیں ہوتا۔ قرآن بھی ایسا انداز تعبیر اختیار کرتا ہے کہ یہ فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ انسان کے آغاز و انجام میں یہ فرق جس قدر عظیم اور واضح ہے اسی طرح اچانک ہے۔ چنانچہ ایک ہی لمحے میں انسان کے سامنے دو مختلف مناظر آ جاتے ہیں۔ ایک وہ منظر کہ انسان ایک حقیر بوند ہے اور دوسرا وہ منظر کہ وہ کامل ہو کر نازنخرے کرتا ہے اور خود خالق کے بالمقابل آکھڑا ہوتا ہے۔ تصویر کشی کا یہ اعجاز بھی ہے اور ایجاز بھی یعنی مختصر ترین الفاظ میں معجزانہ طرز ادا۔

اب ذرا منظر کائنات پر غور کریں' یہ ایک وسیع منظر ہے۔ زمین و آسمان کا وسیع دائرہ جس میں حضرت انسان کھڑا ہے۔ اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی یہ پوری کائنات انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ اس میں بحث کا آغاز ان جانوروں سے کیا جاتا ہے جو واضح طور پر خادم انسان ہیں۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿۵﴾ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ﴿۶﴾ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بٰلِغِيهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ۚ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۷﴾ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ۚ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۸﴾

"اس نے جانور پیدا کیے ہیں جن میں تمہارے لیے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی' اور طرح طرح کے دوسرے فائدے بھی۔ ان میں تمہارے لیے جمال ہے جب کہ صبح تم انہیں چرنے کے لیے بھیجتے ہو اور جب کہ شام انہیں واپس لاتے ہو۔ وہ تمہارے لیے بوجھ ڈھو کر ایسے ایسے مقامات تک لے جاتے ہیں جہاں تم سخت جانفشانی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے۔ اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور وہ تمہاری زندگی کی رونق بنیں۔ وہ اور بہت سی چیزیں (تمہارے فائدے کے لیے) پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم تک نہیں ہے"۔

جس معاشرے میں قرآن مجید نازل ہوا' مثلاً سب سے پہلے مکہ مکرمہ میں' اور اس قسم کے تمام معاشرے جو آج بھی موجود ہیں' خصوصاً وہ سوسائٹیاں جن کی معیشت زراعت پر مبنی ہے۔ ایسے معاشروں میں انسان کی زندگی کا تصور بھی ان جانوروں کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ جزیرۃ العرب میں متعارف جانور یہی تھے' اونٹ' گائے بھینس اور بھیڑ بکریاں کھانے پینے کے لیے اور گھوڑے اور خچر اور گدھے سواریوں اور زینت کے لیے۔ گھوڑوں کے بارے میں فقہی اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اس کا کھانا حرام سمجھتے ہیں کہ بعض احادیث میں اس سے منع کیا گیا ہے نیز قرآن نے اسے رکوب کے لیے بتایا ہے جبکہ دوسرے ائمہ جائز سمجھتے ہیں کیونکہ صحیح احادیث میں گھوڑوں کا گوشت کھانا جائز بتایا گیا ہے۔

قرآن کریم نے یہاں ان جانوروں کو بطور نعمت پیش کیا ہے' اس لیے کہ ان میں بعض کے ساتھ انسان کی مادی ضروریات وابستہ ہیں اور بعض انسان کے لیے زینت ہیں۔ نیز ان کی جلد سے انسان اپنے لیے لباس بناتا ہے' ان کی اون اور بالوں سے مختلف مصنوعات تیار ہوتی ہیں' ان کا دودھ' گوشت وغیرہ استعمال ہوتا ہے۔ گھی اور چربی اور ہڈیاں تک کام میں آتی ہیں۔ یہ جانور بار برداری کا کام کرتے ہیں کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک انسان خود بھی سامان پہنچا سکتا ہے مگر بہت بڑی مشقت کے ساتھ۔ نیز صبح جب تم مویشی نکالتے ہو چرنے کے لیے اور شام کو واپس لاتے ہو' تو یہ تمہارے لیے ایک جمال ہے۔ تم انہیں دیکھ کر خوش ہوتے ہو۔ جب وہ خوبصورت اور موٹے تازے تمہاری نگاہوں کے سامنے آتے ہیں' شام کے وقت جب خوب پھلے پھولے واپس آتے ہیں۔ دیہاتی لوگ ان آیات کا مفہوم' شہریوں کی نسبت زیادہ گہرائی تک سمجھتے ہیں۔ گھوڑے' خچر اور گدھے زیادہ تر بار برداری کے کام آتے ہیں۔ ان کو سواری کے طور پر بہت خوبصورت بھی بنایا جاتا ہے۔

لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً (۱۶ : ۸) "تاکہ ان پر سوار ہو اور تمہاری زندگی کی رونق بنیں"۔ لفظ زینہ یہاں

زیادہ توجہ کے قابل ہے۔ اس سے زندگی کے بارے میں اسلام اور قرآن کا نقطہ نظر سامنے آتا ہے۔ اسلامی زاویہ سے جمال اور حسن زندگی کا اصلی جزو ہے۔ نعمت کا مفہوم ضروریات زندگی' کھانے پینے اور سواری تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ انسانی شوق اور تفریح بھی ضروریات زندگی میں سے ہے۔ حسن و جمال کی حس تفریح اور مسرت کا شعور اور اعلیٰ انسانی ذوق' محض حیوانی ضروریات و حاجات سے' اسلام کی نظر میں زیادہ اہم ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۶ : ۷) "تمہارا رب بڑا شفیق و مہربان ہے"۔ یہ تعقیب اس حقیقت پر ہے کہ باربرداری کا کام اگر خود انسان کو کرنا پڑے تو یہ بہت ہی مشقت کا کام ہے۔ لہٰذا اللہ نے باربرداری کے لیے جو جانور پیدا کیے ہیں وہ اللہ کی رحمت بے پایاں ہے اور نعمت عظیم ہے۔

وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۶ : ۸) "اور وہ بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم نہیں"۔ یہ تعقیب ہے اس پر کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جانور پیدا کیے جنہیں تم کھاتے بھی ہو۔ باربرداری کا کام بھی ان سے لیتے ہو اور وہ تمہارے لیے زینت اور خوشی اور مسرت کا سامان بھی ہیں۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض ایسی چیزوں کی تخلیق بھی کرتا ہے جن کا تمہیں علم نہیں۔ لہٰذا ان مقاصد تک رسائی حاصل کرنے کے لیے انسانی سوچ کو کھلا رکھا گیا ہے کیونکہ دور جدید میں حمل و نقل کے نئے نئے ذرائع بھی تخلیقات الٰہیہ میں آتے ہیں' نیز زیب و زینت اور تفریح و مسرت کے نئے نئے ذرائع بھی تم پیدا کر سکتے ہو۔ لہٰذا اس تصور کو ابتدائی معاشرہ جس میں قرآن مجید نازل ہوا' اسی تک محدود نہیں کر دیا گیا۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات زمان و مکان میں مقید نہیں۔ ہر دور اور ہر زمان و مکان کے آگے مزید دور اور مزید زمان و مکان آتے ہیں اور ان میں ضرورت و مسرت کے جدید ذرائع ہو سکتے ہیں۔ لوگوں کو یہ امید رہی جاتی ہے کہ وہ مزید تخلیقات الٰہیہ کی توقع رکھیں۔ اگر توفیق الٰہی سے انسان کوئی جدید سہولت اور زینت ایجاد کرتا ہے تو وہ اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہوں' یہ نہ ہو کہ وہ اس کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوں۔ اور جدید انکشافات و ایجادات سے فائدہ نہ اٹھائیں اور یہ نہ کہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد تو مذکورہ بالا جانوروں ہی سے ضرورت پوری کرتے تھے۔ گھوڑے' خچر اور گدھوں ہی سے باربرداری کا کام لیتے تھے لہٰذا ہم جدید ذرائع حمل و نقل کو کام میں نہیں لاتے اور نہ ہی ان سے استفادہ کرتے ہیں اور یہ کہ چونکہ قرآن نے صرف مذکورہ بالا اقسام کی تصریح کر دی ہے لہٰذا ان کے سوا سہولیات' خوراک اور زیبائش حرام ہے اسی لیے کہا گیا کہ تخلیقات کا دائرہ وسیع ہے۔

اسلام ایک ایسا نظریہ ہے جو کھلا اور پھلدار ہے۔ وہ زندہ کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے استفادہ کرتا ہے اس لیے قرآن کریم مسلمانوں کے ذہن کو آنے والے ادوار کی قوتوں اور علوم کی فراہم کردہ سہولیات سے استفادے کے لیے تیار کرتا ہے۔ ایک مسلمان کا ذہن اس قدر کھلا ہوتا ہے کہ وہ مستقبل کے تمام انکشافات کو دینی ذہن کے ساتھ قبول کرتا ہے اور اسے از عجائبات تخلیق الٰہی اور عجائبات علوم میں سے سمجھتا ہے اور زندگی کا ایک حصہ سمجھتا ہے۔

دور جدید میں حمل' نقل اور سواری کے نئے نئے وسائل ایجاد ہو گئے ہیں۔ سہولیات کے ساتھ ساتھ یہ وسائل زیب و زینت کے بھی اعلیٰ ذرائع ہیں۔ نزول قرآن کے دور کے لوگ ان کے بارے میں تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ نیز آئندہ ایسے وسائل بھی ایجاد ہوں گے جن کے بارے میں ہمارے دور کے لوگ سوچ نہیں سکتے۔ ایسے ہی حالات کے

لیے قرآن کریم لوگوں کو فکری زاویہ سے تیار کرتا ہے کہ ان کا ذہن منجمد نہ ہو۔ یہی ہے مفہوم وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (١٦ : ٨) کا۔

یہاں بحث یہ تھی کہ اللہ نے انسان کے لیے ذرائع نقل و حمل پیدا کیے۔ ان ذرائع کو استعمال کر کے انسان بڑے بڑے فاصلے طے کرتا ہے۔ کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے' موضوع کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ روحانی راستے اور روحانی سفر اور ان کے ذرائع نقل و حمل کی طرف بھی اشارہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی طرف جانے کے بھی راستے ہیں۔ اللہ تک پہنچنے کا راستہ بالکل سیدھا راستہ ہے۔ دنیا میں اللہ تک پہنچانے کے لیے بعض ٹیڑھے راستے بھی ہیں' جو درحقیقت اللہ تک نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ تک پہنچنے کا راستہ خود اللہ ہی بتاتا ہے۔ اس راستے کو معلوم کرنے کے لیے اللہ نے اس کائنات میں نشانات رکھے ہوئے ہیں ان پر تدبر کیا جانا چاہیے اسی لیے خود انسانوں میں سے بعض افراد کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے کہ وہ بھی اس راستے کی نشاندہی کر دیں۔

٩ وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ ۚ وَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٩﴾

"اور اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا جب کہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہیں۔ اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا"۔ سیدھا راستہ یا سبیل قاصد صراط مستقیم ہے گویا وہ راستہ خود منزل مقصود کا قصد کرتا ہے۔ وہ منزل سے ادھر ادھر نہیں ہوتا اور سبیل جائر اس راستے کو کہتے ہیں جو منزل مقصود سے منحرف ہوتا ہے اور منزل مقصود تک نہیں پہنچتا یا منزل مقصود سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

وَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ (١٦ : ٩) "اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا"۔ لیکن اللہ کی مشیت کا تقاضا یوں ہوا کہ انسان کو اس نے ہدایت و ضلالت کی استعداد دے دی اور انسان ہدایت کی راہ اختیار کرتا ہے یا ضلالت کی راہ لیتا ہے یہ اللہ نے اس کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ انسانوں میں سے بعض تو سبیل قاصد پر چلتے ہیں اور بعض ٹیڑھی راہ کو اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ دونوں قسم کے لوگ اللہ کے دائرہ مشیت کے بہرحال اندر ہی رہتے ہیں کیونکہ انسان کے لیے آزادی اور اختیار کا تعین بہرحال اللہ ہی نے کیا تھا۔

اب آیات تخلیق اور انعامات کا دوسرا حصہ۔

هُوَ الَّذِي أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ۖ لَّكُم مِّنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ ﴿١٠﴾ يُنبِتُ لَكُم بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿١١﴾

"وہی ہے جس نے آسمان سے تمہارے لیے پانی برسایا جس سے تم خود بھی سیراب ہوتے ہو اور تمہارے جانوروں کے لیے بھی چارہ پیدا ہوتا ہے ۔ وہ اس پانی کے ذریعہ سے کھیتیاں اگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے ۔ اس میں ایک بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں"۔

یہ پانی آسمانوں سے اترتا ہے' ان قوانین کے مطابق جو قدرت نے اس کائنات کے لیے وضع کیے ہیں ۔ یہ قوانین اس کائنات کی حرکت کو کنٹرول کرتے ہیں ۔ ان حرکات کے نتائج خالق مدبر کے ارادے اور تدبیر کے مطابق بر آمد ہوتے ہیں ۔ یہ بارش جو آسمانوں سے برستی ہے اسے اللہ کے انعامات میں سے ایک انعام کہا گیا ہے ۔

مِّنْهُ شَرَابٌ (۱۶ : ۱۰) "تم اس سے پیتے ہو"۔ اس کی بڑی خصوصیت تو آبنوشی ہے ۔ اس کے بعد اس کی خصوصیت

وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ (۱۶ : ۱۰) "اس میں سے درخت پیدا ہوتے ہیں جو تمہارے جانوروں کے لیے چارہ بنتے ہیں"۔ تمام چراگاہیں اور درختوں کے پتے اس ذیل میں آتے ہیں ۔ چراگاہوں اور درختوں کا ذکر جانوروں کی مناسبت سے ہوا' جن سے جانوروں کے چارے کا انتظام کیا گیا ۔ پھر زرعی پیداوار کا ذکر ہوا جو انسان کے لیے خوراک کا کام دیتی ہے ۔ مزید انسان کی خوراک کے سلسلے میں زیتون' کھجور' انگور وغیرہ پھلوں کی انواع و اقسام وغیرہ کا ذکر ہوا ۔

اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۶ : ۱۱) "اس میں بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں"۔ کس امر میں غور و فکر؟ اس میں کہ اللہ اس کائنات کی تدبیر کس عظیم حکمت سے کر رہا ہے ۔ اس نے اس کے اندر کس قدر اٹل قوانین فطرت جاری کر دیئے ہیں جو بشر کے لیے مد حیات ہیں ۔ انسان اس کرۂ ارض یا ستارۂ کائنات موسومہ بہ زمین میں ہرگز زندہ نہ رہ سکتا' اگر اللہ اس کائنات میں ایسے قوانین فطرت وضع نہ کرتا جو اس کے لیے مد حیات ہیں اور اس کی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہیں ۔ اس کی فطری خواہشات کو پورا کرنے والے ہیں ۔ یہ محض حسن اتفاق نہیں ہے کہ اس کرۂ ارض پر انسان کو پیدا کر دیا گیا ہو اور اس کرۂ ارض کو دوسرے کرات سماوی کے ساتھ موجودہ نسبت میں رکھ دیا گیا ہو اور فضائی اور کلیاتی حرکات اس نظام کے مطابق محض اتفاقاً متعین ہوگئی ہوں جس طرح کہ آج ہیں اور یہ محض اتفاقاً انسان کے لیے مد حیات بن گئی ہوں جس طرح کہ ہم انہیں دیکھ رہے ہیں ۔

جو لوگ غور و فکر کی صلاحیت رکھتے ہیں' وہ اللہ کے حسن تدبیر اور حکمت تدبیر کو سمجھتے ہیں ۔ مدبرین کرۂ ارض کی خصوصیات روئیدگی' اس کے پھل پھول اور ہواؤں اور بارشوں کے نظام کو اللہ کے نوامیس فطرت کے ساتھ جوڑتے ہیں اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے کہ ایک خالق حکیم ہے جس نے یہ سب کچھ کیا ۔ وہ وحدہ لا شریک ہے ۔ اس کا ارادہ ایک ہی جیسا ہے' اور اس کے قوانین کے اثرات و ثمرات یکساں ہیں ۔ رہے غافل تو وہ ان چیزوں کو صبح و شام دیکھتے ہیں' گرمیوں اور سردیوں میں دیکھتے ہیں' لیکن ان کے مدارک فہم و ادراک سوئے رہتے ہیں ۔ ان کے قوائے اخذ و ادراک اور ان کا ضمیر و شعور اس حکیم کی تلاش میں نہیں نکلتا جس نے اس کائنات بوقلموں کو پیدا کیا ۔ وہ نہیں سوچتے کہ اس عجیب و

غریب نظام کا موجد کون ہے۔

اب آیات دلائل کائنات کا تیسرا گروپ۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ۙ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۲﴾

"اس نے تمہاری بھلائی کے لیے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے اور سب تارے بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔ اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں"۔

تدبیر مخلوقات اور انسان پر اس کے انعامات کا ایک مظہر گردش لیل و نہار ہے۔ شمس و قمر کی گردش اور سیاروں اور ستاروں کا یہ نظام بھی انسان کے لیے ممد حیات ہے۔ یہ تمام مظاہر انسانوں کی ڈیوٹی میں لگے ہوئے ہیں' اپنے یوم تخلیق سے یہ خدمت انسان پر مامور ہیں۔ گردش لیل و نہار تو حیات انسان میں فیصلہ کن اثر رکھتی ہے۔ زرا سوچو کہ اگر دن بھی قائم و دائم ہو جائے اور رات نہ آئے یا رات ہی قائم رہ جائے اور دن نہ آئے تو؟ پہلی صورت میں زمین جل جائے اور دوسری صورت میں زمین جم جائے۔

شمس و قمر اور اس کرۂ ارض پر نظام حیات سے اس کا تعلق بالکل واضح ہے۔ شمس و قمر کی گردش سے انسانی زندگی براہ راست متعلق ہے۔

وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِہٖ (۱۶ : ۱۲) "سب ستارے اس کے حکم سے مسخر ہیں"۔ یہ سب انسان اور غیر انسانی مخلوقات کے لیے مفید اور ممد حیات ہیں جن کی افادیت کا حقیقی علم صرف اللہ کو ہے"۔ یہ باتیں اللہ کی حکمت و تدبیر کا ایک حصہ ہیں اور اللہ کے تمام قوانین مدبرہ باہم ہم آہنگ ہیں' ان قوانین مدبرہ اور حکمت تدبیر کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مظاہر فطرت کے پیچھے ایک قوت مدبرہ کار فرما ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۱۶ : ۱۲) "اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں"۔

اب آیات و دلائل کائنات کا چوتھا گروپ

وَ مَا ذَرَاَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

"اور یہ جو بہت سی رنگ برنگ کی چیزیں اس نے تمہارے لیے زمین میں پیدا کر رکھی ہیں' ان میں بھی ضرور نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سبق حاصل کرنے والے ہیں"۔

اللہ نے زمین کو پیدا کیا اور اس کے اندر قسم قسم کی معدنیات پیدا کیں' رنگ برنگ کے پتھر اور دوسری چیزیں جن پر انسانوں کی زندگی موقوف ہے لیکن اللہ نے ان ضروریات حیات کے ایسے ذخیرے پیدا کیے ہیں جو نہ ختم ہونے والے ہیں۔ پھر نئی نئی دریافتیں جو انسان اس زمین میں کر رہا ہے اور زمین کے اندر پوشیدہ خزانے اور ذرائع قوت دریافت کر رہا ہے' جوں جوں اس کی حاجات و ضروریات بڑھتی ہیں وہ دریافتیں کرتا چلا جاتا ہے۔ایک خزانہ ختم ہوتا ہے تو قوت کے کئی اور خزانے دریافت ہوتے ہیں۔ یہ اللہ کا رزق ہے جو اس نے بندوں کے لیے ذخیرہ کر رکھا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (١٦: ١٣) "ان میں ضرور نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سبق حاصل کرتے ہیں"۔ایسے لوگ اس بات کو نہیں بھولتے کہ دست قدرت نے یہ خزانے ہمارے لیے ودیعت کیے ہیں۔

اب آیات دلائل کائنات کا پانچواں گروپ آتا ہے۔جو ان مخلوقات متنوعہ کے بارے میں ہے جن سے تلخ سمندر بھرا پڑا ہے۔ سمندر کا پانی پینے کے قابل تو نہیں ہے لیکن انسان کے لیے کئی پہلوؤں سے مفید ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾

"وہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس سے تر و تازہ گوشت لے کر کھاؤ اور اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو جنہیں تم پہنا کرتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہے۔یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو"۔

سمندروں کی متنوع حیات بھی انسانی زندگی کے لیے مفید و ممد ہے۔ سمندروں میں انسانی زندگی کی دلچسپیوں کے دوسرے سامان بھی موجود ہیں۔ مچھلیوں اور دوسرے حیوانات بحری انسان کے لیے بہترین غذا ہیں۔ نیز سمندر کے موتی' مونگے اور سیپ انسان کے لیے بطور زیور آج کے دور جدید میں بھی کام دیتے ہیں۔ یہاں کشتی کا فائدہ صرف سفر ہی نہیں بتایا گیا بلکہ سمندروں میں کشتیوں کے چلنے کے منظر کے حسن کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ (١٦: ١٤) "تم دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے چلتی ہے"۔ لفظ تری سے کشتی' پانی اور کشتی کی روانی کے خوبصورت منظر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ سمندری جہاز پانی

کو چیرتے ہوئے جا رہے ہوتے ہیں۔ اس فقرے سے ایک بار پھر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام اس جہان کے جمالیاتی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔ کائنات کی ہر چیز کو افادۂ حیات کے علاوہ انسان کے لیے حسین بھی بنایا گیا ہے۔

پھر قرآن مجید اس منظر سے انسان کو سبق سکھاتا ہے کہ یہ تمہارے لیے مفید بھی ہے 'تمہارے سفر و تجارت کا ذریعہ بھی' اور یہ منظر تمہاری آنکھوں کے لیے خوبصورت بھی ہے لیکن ان تمام چیزوں کا تقاضا یہ بھی ہے کہ تم اللہ کا شکر بجالاؤ۔

وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۱۶ : ۱۴) "یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو"۔

اب اس سبق میں آیات و دلائل کائنات کا آخری گروپ۔

وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

"اس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تاکہ زمین تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اس نے دریا جاری کیے اور قدرتی راستے بنائے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ اس نے زمین میں راستہ بتانے والی علامتیں رکھ دیں' اور تاروں سے بھی لوگ ہدایت پاتے ہیں"۔ پہاڑوں کو زمین میں میخ بنایا۔ جدید علم جغرافیہ اس کے اسباب سے بحث کرتا ہے 'لیکن علم جدید نے یہ نہیں بتایا کہ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو زمین ایک طرف ڈھلک جاتی۔

یہ حقیقت صرف قرآن مجید نے بیان کی ہے۔ جدید علم جغرافیہ پہاڑوں کے وجود کے متضاد اسباب بیان کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ زمین کا اندرون ایک گرم لاوا ہے۔ وہ جب ٹھنڈا ہوتا ہے تو سکڑ جاتا ہے اور اس کے اوپر زمین کی سطح بھی سکڑ کر ایک شکن کی صورت میں پہاڑ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یوں اونچے اونچے پہاڑ اور وادیاں وجود میں آجاتی ہیں۔ لیکن قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ یہ پہاڑ زمین کے اندر توازن رفتار پیدا کرتے ہیں۔ علم جدید نے شاید ابھی تک اس پہلو پر غور نہیں کیا۔

ان پہاڑوں کے بالمقابل بڑی بڑی وادیاں ہیں اور ان میں مختلف راستے اور ندیاں نالے ہیں۔ اس کی طرف بھی متوجہ کیا جاتا ہے۔ پہاڑوں کے ساتھ ندی نالے طبعی تعلق رکھتے ہیں۔ پہاڑوں سے دریا نکلتے ہیں۔ پہاڑوں کے اوپر برف پڑتی ہے اور بارش ہوتی ہے اور پھر اس سے دریاؤں اور ندی نالوں سے راستے نکلتے ہیں۔ پھر ان راستوں پر لوگ چلتے ہیں۔ سامان پہنچاتے اور بار برداری کا کام کرتے ہیں۔ پھر ان راستوں کے لیے نشانات راہ وضع ہوتے ہیں 'جس طرح یہ پہاڑ راستوں کا نشان ہوتے ہیں' اسی طرح صحراؤں اور سمندروں میں ستارے راہنمائی کا کام کرتے ہیں۔ غرض اللہ کی یہ پوری کائنات انسان کے لیے مفید ہے۔

آیات تخلیق اور نشانات انعامات باری اور حکمت تدبیر کائنات کے بیان کے بعد اب وہ بات واضح طور پر بیان کی جاتی ہے جس کے لیے یہ پورے دلائل و شواہد پیش کیے گئے۔ یہ تمام شواہد اس مقصد کے لیے لائے گئے تھے کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اور وہ ان باتوں سے منزہ ہے جو یہ لوگ اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿١٧﴾ وَ
اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٨﴾ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ
مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿١٩﴾ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ ۲
شَيْـــًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿٢٠﴾ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاۗءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٢١﴾ ع ۲

"پھر کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اور وہ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے' دونوں یکساں ہیں؟ کیا تم ہوش میں نہیں آتے؟ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے' حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی درگزر کرنے والا اور رحیم ہے' حالانکہ وہ تمہارے کھلے سے بھی واقف ہے اور چھپے سے بھی۔ ۸

اور وہ دوسری ہستیاں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں' وہ کسی چیز کی بھی خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں۔ مردہ ہیں نہ کہ زندہ۔ اور ان کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ انہیں کب (دوبارہ زندہ کر کے) اٹھایا جائے گا۔

یہ نتیجہ نہایت ہی موزوں وقت میں نکالا جاتا ہے' ایسے حالات میں کہ نفس انسانی اور عقل سلیم اس کے مضمون کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ (۱۶ : ۱۷) "پھر جو پیدا کرتا وہ اور وہ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے دونوں یکساں ہیں"۔ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔ کیا کوئی حساس اور غور و فکر کرنے والا انسان اس ذات والا صفات کو جس نے یہ عظیم الشان کائنات کی تخلیق کی ہے اس شخص کے برابر تصور کر سکتا ہے جس نے کوئی چیز بھی پیدا نہیں کی۔ نہ بڑی اور نہ چھوٹی۔

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۱۶ : ۱۷) "کیا تم ہوش میں نہیں آتے"۔ اس کے لیے تو محض یادداشت تازہ کرنے کی ضرورت ہے' یہ امر تو تمہاری فطرت کے اندر موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات کے کئی رنگ اور کئی پہلو بیان کرنے کے بعد یہ کہا

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (۱۶ : ۱۸) "اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے"۔ شکر ادا کرنا تو دور کی بات ہے اس لیے کہ نہ ان کا شمار ممکن ہے اور نہ شکر' بلکہ اللہ کے اکثر انعامات ایسے ہیں جن کے بارے میں ابھی تک انسان کو علم ہی حاصل نہیں ہو سکا۔ کیونکہ بعض امور کو انسان روٹین کے امور سمجھتا ہے۔ ان کا اسے شعور ہی نہیں ہوتا۔ اسے تب احساس ہوتا ہے جب کوئی نعمت چھن جاتی ہے۔ ذرا انسان کے جسم کی میکانکی ترکیب کو دیکھو! جسم کا ہر حصہ ایک فریضہ ادا کر رہا ہے اور انسان کو احساس اس وقت ہوتا ہے جب کوئی پرزہ جسم ناکارہ ہو جائے۔ پھر پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر عظیم نعمت سے محروم ہو گیا ہے۔ بس انسان پر تقصیر اور ضعیف کی مدد کو تو اللہ کی صفت رحمت اور صفت غفوریت پہنچتی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۱۶:۱۸) "بے شک اللہ بڑا ہی درگزر کرنے والا رحیم ہے"۔ وہ خالق ایسی ذات ہے جو ہمارے کھلے اور پوشیدہ تمام امور سے واقف ہے۔

وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ (۱۶:۱۹) "اور اللہ تمہارے کھلے سے بھی واقف ہے اور چھپے سے بھی"۔ لہٰذا یہ بات تعجب انگیز ہے کہ لوگ اللہ کی ذات کو ان اشخاص و اشیاء کے ساتھ برابر کرتے ہیں جو نہ کوئی حقیر سی شے بھی پیدا کر سکتے ہیں، نہ کوئی چیز جانتے ہیں بلکہ وہ تو مردہ ہیں، ان کے اندر زندگی داخل ہی نہیں ہو سکتی اور یہی وجہ ہے کہ وہ شعور نہیں رکھتے۔

وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّھُمْ یُخْلَقُوْنَ (۲۰) اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ (۲۱) (۱۶: ۲۰ - ۲۱) "اور وہ دوسری ہستیاں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کی بھی خالق نہیں ہیں، مردہ ہیں نہ کہ زندہ۔ اور ان کو کچھ معلوم نہیں کہ انہیں کب اٹھایا جائے گا"۔

یہاں جو بعث بعد الموت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے خالق تو وہ ہوتا ہے جسے بعث کا علم ہو کیونکہ تخلیق کی تکمیل تب ہوگی جب قیامت برپا ہوگی اور اس وقت تمام ذی عقل افراد کو ان کے کیے کی جزاء و سزا دی جائے گی۔ لہٰذا ایسے خدا جن کو بعث بعد الموت کا علم ہی نہیں ہے وہ خدا یا الہ ہونے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ یہ تو ایک مذاق ہے کہ ایک خالق کو نہ اپنی مخلوق کا پتہ ہو اور نہ یہ علم ہو کہ اس مخلوق کو کب اٹھایا جائے گا۔

---000---

# درس نمبر ۱۲۰ ایک نظر میں

درس سابق میں ہمیں بتایا گیا کہ خالق کائنات کی اس عظیم مخلوق میں بے شمار آیات و نشانات موجود ہیں۔ اس عظیم تخلیق میں حضرت انسان کے فائدے ہی فائدے ہیں اور یہ کہ خالق حقیقی انسان کے ظاہر و باطن کا علم رکھتا ہے۔ جبکہ جن ہستیوں اور اشیاء کو تم الٰہ سمجھتے ہو' ان کی کوئی تخلیق نہیں ہے۔ وہ خود مخلوق ہیں' وہ کسی چیز کا علم و شعور نہیں رکھتے' بلکہ وہ مردہ ہیں اور ان کو اب اس جہان میں زندگی حاصل نہیں ہو سکتی یا وہ حیات کے قابل ہی نہیں ہیں۔ نیز ان ہستیوں کو اس قدر بھی معلوم نہیں ہے کہ سزاء و جزاء کے لیے ان کو کب اٹھایا جائے گا۔ یہ تمام دلائل قطعاً اس بات کو ثابت کر دیتے ہیں کہ یہ ہستیاں عبادت کے لائق نہیں ہیں اور یہ کہ عقیدۂ شرک سرے سے باطل اور لغو ہے۔ اس سورہ میں عقیدۂ توحید کے بیان کا یہ پہلا دور تھا جس میں قیام قیامت کی طرف بھی اشارہ تھا۔

اس سبق میں بھی وہ مضمون ہے جو ہم نے پچھلے سبق میں چھوڑا۔ بیان توحید کا یہ دوسرا دور ہے' اس کا آغاز اس دعویٰ سے ہوتا ہے کہ تمہارا الٰہ بس ایک ہی اللہ ہے۔ اور جو لوگ صرف ایک ہی اللہ کو نہیں مانتے درحقیقت ان کے دل منکر ہیں۔ چونکہ انکار ان کے دلوں کے زند جاگزیں ہے اسی لیے اس کائنات کے شواہد و افرہ کے ہوتے ہوئے بھی وہ اقرار نہیں کرتے۔ دل میں انکار کی جاگزینی کے ساتھ ساتھ یہ لوگ غرور اور کبر کی بیماری میں مبتلا ہیں اور یہ کبر بھی انہیں حقیقت کو تسلیم کرنے سے روکتا ہے۔ یہ مضمون ایک موثر منظر پر یوں ختم ہوتا ہے کہ اس کائنات میں تمام سائے درحقیقت ذات کبریا کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ اس کائنات کے تمام جانور بھی اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ ملائکہ بھی اللہ الٰہ واحد کے سامنے جھکتے ہیں جن کی ذات استکبار سے خالی اور جن کے قلوب خوف سے پاک ہیں اور ہروقت بلا کسی چوں و چرا کے اللہ کے احکام بجا لاتے ہیں اور اطاعت امر کے یہ منظر مستکبرین کے استکبار کے بالمقابل بیان ہوئے جو اس سبق کے آغاز میں بیان ہوا۔

اس سبق کے آغاز اور اختتام کے درمیان قرآن مجید ان مستکبرین کے نقطہ نظر کو بھی قارئین کے سامنے رکھتا ہے کہ ان کا موقف کیا ہے؟ یہ کہ وحی اور قرآن کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ پرانے قصے ہیں اور یہ کہ وہ کیوں شرک کرتے ہیں؟ وہ ان چیزوں کو کیوں حرام قرار دیتے ہیں جن کو اللہ نے حرام قرار نہیں دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی مرضی ہے' اگر اللہ نہ چاہتا تو وہ کب ایسا کر سکتے۔ قیامت کے بارے میں ان کا موقف یہ ہے کہ وہ کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اللہ ہرگز مردوں کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا۔ ان کے ان تمام مزعومات کو اس سبق میں سختی سے رد کیا جاتا ہے اور رد کا انداز یہ ہے کہ جب قیامت کے روز یہ اٹھیں گے تو یہ بذات خود اپنے ان نظریات کا صاف صاف انکار کر دیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہلاک شدہ امتوں کے بعض واقعات بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں اور ان کو

ڈرایا جاتا ہے کہ تم پر بھی رات اور دن کی کسی گھڑی میں اسی طرح عذاب آسکتا ہے جبکہ آپ کو کوئی توقع نہ ہوگی اور بعض صورتیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں کہ تم کو عذاب کی توقع ہوگی اور تم انتظار کر رہے ہو گے۔ اس کے بالمقابل اس سبق میں مومنین کے موقف اور نظریات کی ایک جھلک بھی دکھائی جاتی ہے' خصوصاً جبکہ موت اور بعث بعد الموت کے وقت ان کا مکالمہ فرشتوں سے ہو گا۔ اس طرح یہ سبق ختم ہوتا ہے جس میں خشوع و خضوع اور اطاعت و امتثال امر الٰہی کے مناظر بھی ہیں اور انکار کے بھی اور یہ پوری کائنات' اس کے سائے' فرشتے اور گردش لیل و نہار اور ارض و سماء سب کے سب امتثال امر الٰہی کے نشانات ہیں۔

---○○○---

# درس نمبر ۱۲۰ تشریح آیات

## ۲۲--- تا --- ۵۰

---

إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُم مُّنكِرَةٌ وَهُم مُّسْتَكْبِرُونَ ﴿٢٢﴾ لَا جَرَمَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ ﴿٢٣﴾

"تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ان کے دلوں میں انکار بس کر رہ گیا ہے اور وہ گھمنڈ میں پڑ گئے ہیں۔ اللہ یقیناً ان کے سب کرتوت جانتا ہے' چھپے ہوئے بھی اور کھلے ہوئے بھی۔ وہ ان لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو غرور نفس میں مبتلا ہوں"۔

یہاں اللہ وحدہ پر ایمان اور یوم آخرت پر ایمان کو یکجا کیا گیا ہے بلکہ اللہ وحدہ پر ایمان کا لازمی نتیجہ آخرت پر ایمان کو قرار دیا گیا ہے کیونکہ اللہ وحدہ کی بندگی کا براہ راست تعلق عقیدۂ آخرت اور جزاء و سزا کے قیام سے ہے۔ صرف اسی صورت میں خالق حقیقی کی حکمت تخلیق کا اظہار اور مکمل انصاف ہو سکتا ہے۔

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (١٦ : ٢٢) "تمہارا خدا بس ایک خدا ہے"۔ اس سورہ میں تخلیق باری کے جو نشانات گنوائے گئے۔ اللہ کے جن جن انعامات کا ذکر ہوا' اور اللہ کے علم و حکمت کی جن باتوں کو بیان کیا گیا' وہ سب اس حقیقت عظیمہ کی متقاضی ہیں کہ اللہ ایک ہے' اس کے آثار اس کائنات کے قوانین قدرت اور نوامیس فطرت میں عیاں ہیں' اور ان کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور باہم تعاون اور توافق پایا جاتا ہے اور یہ تمام قوانین ہمقدم ہیں۔

لہٰذا جو لوگ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے وہ آخرت کو تسلیم نہیں کرتے۔ جو لوگ اللہ کی تخلیق' اس کی وحدانیت اور اس کی حکمت اور عدل پر ایمان لاتے ہیں' اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ پھر قیام قیامت پر ایمان لائیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو اس کا سبب دلائل و نشانات کی کمی نہیں ہے کہ وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ انکار کی علت خود ان کی ذات کے اندر

پوشیدہ ہے۔ان کے مزاج میں انکار ہے اور ان کے دل انکار کرنے والے ہیں۔ان کے دل و دماغ میں پہلے سے انکار بیٹھا ہوا ہے۔اس لیے وہ دلائل و براہین کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے اور دلائل و براہین کی طرف توجہ کیوں نہیں کرتے؟ اس لیے کہ وہ مستکبرین ہیں اور اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھتے ہیں۔وہ نہ دلائل کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت کو تسلیم کرتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ اللہ کی بندگی کرنا نہیں چاہتے۔لہذا انکار کرتے ہیں اور اس کا حقیقی سبب خود ان کے نفوس کے اندر ہے۔

اللہ جس نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے وہ اپنی مخلوق کے ہر کل پرزے سے واقف ہے' وہ ان امور سے بھی واقف ہے جو پوشیدہ ہیں اور ان سے بھی جو ظاہر ہیں وہ لاریب سب کچھ جانتا ہے اور ان کے اس رویے کو ناپسند بھی کرتا ہے۔

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ (۱۶ : ۲۳) "اور اللہ ان لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو غرور نفس میں مبتلا ہیں"۔ایک متکبر دل سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس کائنات کے دلائل و شواہد پر مطمئن ہو جائے اور سر تسلیم خم کر دے۔ چنانچہ وہ اللہ کی طرف سے ناپسندیدہ لوگ ہیں کیونکہ وہ غرور نفس میں مبتلا ہیں اور اللہ ان کے حالات اور حقیقت سے خوب واقف ہے اور ان کے ہر ظاہر و باطن سے بھی واقف ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾
لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ ۲
عِلْمٍ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۲۵﴾ ع ۴
۹

"اور جب کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ تمہارے رب نے یہ کیا چیز نازل کی ہے' تو کہتے ہیں "اجی وہ تو اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں"۔ یہ باتیں وہ اس لیے کرتے ہیں کہ قیامت کے روز اپنے بوجھ بھی پورے اٹھائیں اور ساتھ ساتھ کچھ ان لوگوں کے بوجھ بھی سمیٹیں جنہیں یہ بربنائے جہالت گمراہ کر رہے ہیں۔ دیکھو! کیسی سخت ذمہ داری ہے جو یہ اپنے سر لے رہے ہیں"۔

یہ مستکبرین اور منکر دل والوں سے جب پوچھا جاتا ہے کہ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ (۱۶ : ۲۴) "تمہارے رب نے یہ کیا چیز نازل کی ہے"۔یہ لوگ اس سوال کا صحیح جواب نہیں دیتے۔حالانکہ جواب سیدھا سادہ ہے۔یہ لوگ قرآن کریم کو پڑھ سکتے ہیں' اس کے مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں۔یہ اگر ایمان نہ بھی لائیں پھر بھی دیانت داری سے صحیح جواب تو دے سکتے تھے لیکن انہوں نے سیدھا جواب دینے کے بجائے یہ جواب دیا

اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۱۶ : ۲۴) "وہ تو اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں"۔ اساطیر ان کہانیوں کو کہا جاتا ہے جو وہم سے پر ہوں اور خرافات پر مشتمل ہوں۔یہ لوگ قرآن کے بارے میں ایسے ریمارکس پاس کرتے ہیں حالانکہ قرآن مجید انسانی عقل' انسانی نفسیات' انسانی طرز زندگی' لوگوں کے عمومی طرز عمل' سوسائٹی کے طبقات کے باہم تعلق اور

انسان کے ماضی، اس کے حال اور اس کے مستقبل پر نہایت ہی معقول تنقید و تبصرہ کرتا ہے اور حقیقی راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ قرآن نے امم ماضیہ کے واقعات بیان کیے ہیں، لہٰذا اس کے بارے میں ان کی یہ سطحی رائے ہے۔ یوں یہ لوگ خود اپنے گناہوں کا بوجھ بھی بڑھاتے ہیں اور اپنے متبعین کے گناہوں کا بھی ایک حصہ اپنے بوجھ میں ڈالتے ہیں۔ کیونکہ ان کی باتوں سے ان کے پیروکار گمراہ ہوتے ہیں اور اسلام اور ایمان سے رک جاتے ہیں۔ یہ متبعین چونکہ خود جاہل ہیں کوئی صحیح رائے وہ خود قائم نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم ان لوگوں کے گناہوں کی تعبیر ایک ایسے بوجھ سے کرتے ہیں جو کوئی مسافر اٹھاتا ہے۔ یہ بوجھ زیادہ ہوتا ہے لیکن یہ احمق مسافر اس کو اور زیادہ کرتا جاتا ہے۔ یہ بوجھ نفس انسانی کو اس قدر جھکا دیتا ہے، اس قدر مشقت میں ڈال دیتا ہے جس طرح بھاری بوجھ کمر کو دوہرا کر دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روحانی اور نفسیاتی بوجھ بھی انسان کے لیے اس طرح باعث درماندگی ہوتا ہے جس طرح جسمانی بوجھ جسم کے لیے تھکن کا موجب ہوتا ہے بلکہ نفسیاتی بوجھ جسم کو جسمانی بوجھ کے مقابلے میں زیادہ چور چور کر دیتا ہے۔

ابن ابو حاتم، سدی سے روایت کرتے ہیں کہ قریش نے ایک میٹنگ کی اور اس میں قرار دیا کہ حضرت محمدؐ شیریں زبان ہیں۔ جب وہ کسی سے بات کرتے ہیں تو اس کی عقل جاتی رہتی ہے۔ لہٰذا قریش میں سے چند ایسے افراد کا انتخاب کرو جو معروف ہوں اور ان کا نسب بھی معروف ہو۔ ان کو مکہ کی راہوں پر ایک دو رات کے لیے بٹھا دو تاکہ جو شخص بھی محمدؐ سے ملاقات کے لیے آئے وہ اسے واپس کر دیں۔ چنانچہ کچھ لوگ نکلے اور مکہ کے راستے پر بیٹھ گئے۔ جو شخص بھی اپنی قوم کی طرف سے محمدؐ کے حالات معلوم کرنے کے لیے مکہ آتا، تو ان میں سے جو شخص راستے پر بیٹھا ہوتا وہ کہتا میں فلاں ابن فلاں ہوں۔ تو یہ شخص اسے پہچان لیتا کیونکہ وہ مشہور شخص ہوتا۔ پھر وہ کہتا کہ میں تمہیں محمدؐ کے بارے بتاتا ہوں۔ وہ ایک بہت بڑا جھوٹا شخص ہے۔ اس معاملے میں اس کے متبعین یا تو بے وقوف لوگ ہیں یا غلام ہیں جن کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ رہے اس کی قوم کے اکابر اور شیوخ تو وہ سب کے سب اس کے خلاف ہیں۔ اس طرح وہ شخص معتبر دیسہ کی بات سن کر واپس ہو جاتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ مَّا ذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۱۶ : ۲۴) "اور جب ان سے پوچھا جاتا کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے تو وہ کہتے وہ تو پرانے زمانے کی کہانیاں ہیں"۔ اب اگر یہ شخص صاحب عزم صمیم ہوتا اور اس کے لیے ہدایت لکھی ہوئی ہوتی تو یہ لوگ جب اپنی بات کرتے تو وہ کہتا میں اپنی قوم کا کس قدر بے کار نمائندہ ہوں گا کہ میں دور کا سفر کر کے آیا اور ایک دن کا سفر رہ گیا اور اب میں اس شخص سے ملے بغیر واپس چلا جاؤں۔ یہ دیکھے بغیر کہ وہ کیا کہتا ہے اور قوم کے پاس کوئی مصدقہ بیان لے کر نہ جاؤں۔ تو ایسا شخص مکہ میں داخل ہوتا۔ وہ مومنین سے ملتا اور پوچھتا کہ حضرت محمدؐ کی تعلیمات کیا ہیں، تو وہ اس کو اچھی باتیں بتاتے"۔

قریش نے تحریک اسلامی کے خلاف ایک زبردست مخالفانہ پروپیگنڈے کی مہم شروع کر رکھی تھی۔ قریش کے بعد بھی ہر زمان و مکان میں مستکبرین پر تحریک اسلامی کے خلاف ایسی ہی مخالفانہ مہم چلاتے ہیں کیونکہ ان کا غرور اور استکبار ان کو دلیل اور سچائی کے اتباع سے روکتا ہے۔ پس قریش کے یہ مستکبرین، پہلے منکر اور معاند نہ تھے۔ قرآن کریم ان کے سامنے ان مستکبرین کا انجام واضح طور پر پیش کرتا ہے جس سے ان سے قبل کے مستکبرین دوچار ہوئے، خصوصاً

قیامت کے دن ان کا جو انجام ہونے والا ہے بلکہ یہ انجام ان کا قیامت سے بھی پہلے اس وقت شروع ہونے والا ہے جونہی ان کی روح جسد خاکی سے نکل جائے گی۔ قرآن کریم ان کے سامنے یہ مناظر نہایت ہی موثر انداز میں پیش کرتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کا اسلوب ہے۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ اَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَ يَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَ السُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۷﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۪ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۲۹﴾

"ان سے پہلے بھی بہت سے لوگ (حق کو نیچا دکھانے کے لیے) ایسے ہی مکاریاں کر چکے ہیں' تو دیکھ لو کہ اللہ نے ان کے مکر کی عمارت جڑ سے اکھاڑ پھینکی اور اس کی چھت اوپر سے ان کے سر پر آ رہی اور ایسے رخ سے ان پر عذاب آیا جدھر سے اس کے آنے کا ان کو گمان تک نہ تھا۔ پھر قیامت کے روز اللہ انہیں ذلیل و خوار کرے گا اور ان سے کہے گا" بتاؤ اب کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے لیے تم (اہل حق سے) جھگڑے کیا کرتے تھے؟" جن لوگوں کو دنیا میں علم حاصل تھا وہ کہیں گے "آج رسوائی اور بدبختی ہے کافروں کے لیے"۔ ہاں' انہی کافروں کے لیے جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہوئے جب ملائکہ کے ہاتھوں گرفتار ہوتے ہیں تو (سرکشی چھوڑ کر) فوراً ڈگیں ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں "ہم تو کوئی قصور نہیں کر رہے تھے"۔ ملائکہ جواب دیتے ہیں "کر کیسے نہیں رہے تھے! اللہ تمہارے کرتوتوں سے خوب واقف ہے۔ اب جاؤ' جہنم کے دروازوں میں گھس جاؤ۔ وہیں تم کو ہمیشہ رہنا ہے"۔ پس حقیقت یہ ہے کہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے متکبروں کے لیے"۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۱۶ : ۲۶) "ان سے پہلے بھی بہت سے لوگ (حق کو نیچا دکھانے کے لیے) ایسے ہی مکاریاں کر چکے ہیں"۔ قرآن کریم ان کے پروپیگنڈے کو ایک ایسی عمارت سے تعبیر کرتا ہے جس کی بنیادیں بھی ہیں اور ستون بھی اور چھت بھی ہے۔ اس میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ ان کا پروپیگنڈا بڑا گہرا' مضبوط' پختہ اور حکیم تھا لیکن اللہ کی قوت اور تدبیر کے مقابلے میں یہ کامیاب نہ ہوا۔

فَاَتَي اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ (۱۶:۲۶) "تو دیکھ لو کہ اللہ نے ان کے مکر کی عمارت جڑ سے اکھاڑ پھینکی اور اس کی چھت اوپر سے ان کے سر پر آرہی" - یہ ایک ایسا منظر اور ایسی تصویرکشی ہے جس سے مکمل تباہی کا منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے - یہ تباہی اوپر سے بھی آتی ہے اور نیچے سے بھی آتی ہے کیونکہ جن بنیادوں پر یہ عمارت کھڑی تھی وہی گر گئیں اور اوپر سے چھت ان پر اس طرح آگری کہ وہ دب گئے اور دفن ہو کر رہ گئے -

وَاَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ (۱۶:۲۶) "اور ایسے رخ سے ان پر عذاب آیا جدھر سے اس کے آنے کا ان کو گمان تک نہ تھا" - ہم کیا دیکھتے ہیں کہ جس عمارت کو انہوں نے نہایت ہی پختہ کر کے تعمیر کیا تھا اور ان کو پورا بھروسہ تھا کہ وہ اس میں پناہ لیں گے وہی ان کا مقبرہ بن گئی اور وہ ان پر ایسی ہلاکت لائی کہ اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی ان پر تباہی آئی - وہ عمارت انہوں نے اس قدر مضبوط بنائی تھی کہ اس کی کسی جہت سے بھی ان کو تباہی کا ڈر نہ تھا -

تباہی و بربادی کا یہ ایک مکمل منظر ہے - یہ مکر کرنے والوں کے مکر اور مخالفانہ تدابیر کرنے والوں کی تدابیر کے ساتھ معنی خیز مذاق ہے - جو لوگ تحریک اسلامی کی راہ روکنے کے لیے مکر کرتے ہیں یہ سوچتے ہیں کہ ان کے مکر کا کوئی توڑ نہ ہو گا اور یہ کہ ان کی تدابیر ناکام نہ ہوں گی حالانکہ اللہ ان کی تمام مکاریوں اور تدابیر کا احاطہ کیے ہوئے ہے -

یہ منظر قریش کے دور میں بھی دیکھا گیا - ان سے پہلے بھی تاریخ نے بھی بارہا دیکھا اور بعد کے ادوار میں بھی دیکھا گیا - دعوت اسلامی آج تک اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے - مکر کرنے والے جس قدر چاہیں تدابیر سوچیں 'جس قدر چاہیں مکاریاں کریں - تحریک اسلامی کے کارکن ان تاریخی مناظر کو بار بار پڑھ کر دیکھتے ہیں جس طرح قرآن کریم نے منظر کشی فرمائی -

فَاَتَي اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ (۱۶:۲۶) "تو دیکھ لو کہ اللہ نے ان کے مکر کی عمارت جڑ سے اکھاڑ پھینکی اور اس کی چھت اوپر سے ان کے سر پر آرہی اور ایسے رخ سے ان پر عذاب آیا جدھر سے اس کے آنے کا ان کو گمان تک نہ تھا" - یہ تو ان کا انجام ہوا اس دنیا میں اور اس کرۂ ارض پر - لیکن ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَاۗءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَاۗقُّوْنَ فِيْهِمْ (۱۶:۲۷) "پھر قیامت کے روز اللہ انہیں ذلیل و خوار کرے گا اور ان سے کہے گا اب بتاؤ کہاں ہیں وہ شریک جن کے لیے تم اہل حق سے جھگڑے کیا کرتے تھے" - قرآن کریم یہاں مشاہد قیامت سے ایک منظر تصویرکشی کر رہا ہے - یہ مکار مستکبرین اس منظر میں نہایت ہی شرمندگی کی حالت میں ہیں - ان کا تکبر کافور ہو چکا ہے اور ان کی مکاریوں کے دن لد گئے ہیں - اب وہ اس ذات کبریا کے دربار میں ہیں جو تخلیق کا بھی مالک ہے اور فیصلے بھی اب اسی کے چلتے ہیں - اللہ اب ان کو مزید شرمندہ اور خوار کرنے کے لیے سوال کرتے ہیں -

اَيْنَ شُرَكَاۗءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَاۗقُّوْنَ فِيْهِمْ (۱۶:۲۷) "کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے

بارے میں تم جھگڑتے رہتے تھے"۔ جن جعلی شریکوں کے متعلق تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان سے جھگڑتے تھے وہ کہاں ہیں۔ جو لوگ عقیدۂ توحید کے قائل تھے تم ان سے مناظرے کیا کرتے تھے۔

یہاں یہ لوگ گم سم کھڑے ہیں۔ شرمندگی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن فرشتے 'رسول' اہل علم اور اہل ایمان کو اب بولنے کی اجازت ہوگی کیونکہ یہ لوگ تو اب کامیاب ہو چکے ہوں گے لہٰذا بولنا اب ان کا حق ہو گا۔

قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ (۱۶:۲۷)

"جن لوگوں کو دنیا میں علم حاصل تھا وہ کہیں گے 'آج رسوائی اور بدبختی ہے کافروں کے لیے"۔ فی الواقعہ آج رسوائی اور بدبختی صرف کافروں کے لیے ہے۔

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (۱۶:۲۸) "انہی کافروں کے لیے جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہوئے جب ملائکہ کے ہاتھوں گرفتار ہوئے"۔ اب قرآن کریم ان لوگوں کو ایک قدم پیچھے لے جاتا ہے 'قیامت سے قبل ان لوگوں کی موت کا وقت قریب ہے 'ملائکہ ان کی روح قبض کرتے ہیں 'ان کے جسم سے ان کی روح کو نہایت ہی کرختگی کے ساتھ کھینچ کر نکالا جاتا ہے 'اس لیے کہ یہ لوگ ایمان و یقین سے محروم تھے۔ انہوں نے اپنی روح کو ہلاکت میں ڈال دیا تھا۔ پھر ان کی جانیں آگ اور دائمی عذاب کے حوالے ہو گئیں۔

جب ان لوگوں کی موت قریب آئی اور ابھی تو زمین میں یہ جھوٹ 'مکر اور فریب کا کاروبار کر رہے تھے تو دیکھو کہ یہ کس قدر ساؤ ہو گئے ہیں۔

فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ (۱۶:۲۸) "تو یہ لوگ فوراً ڈگیں ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں "ہم تو کوئی قصور نہیں کر رہے تھے"۔ یہ مستکبرین اب تو سلامتی کے پیغامبر بن گئے ہیں 'وہ تو اس سر تسلیم خم کرنے اور اطاعت کرنے کی پیشکش کر رہے ہیں۔ یہ بھی ان کا جھوٹ ہے اور یہ جھوٹ ان کے دنیاوی سلسلہ جھوٹ کا حصہ ہے۔ یہ نہایت ہی عاجزی سے کہتے ہیں۔

مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ (۱۶:۲۸) "ہم تو قصور نہیں کر رہے تھے"۔ یہ بھی نہایت ہی شرمساری اور ذلت کا منظر ہے۔ ان مستکبرین کو دیکھو اور ان کی اس حالت کو دیکھو۔

لیکن اللہ کی طرف سے جواب آئے گا "ہاں" اور یہ جواب علیم و خبیر کی طرف سے ہو گا۔

بَلٰٓي اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶:۲۸) "ہاں اللہ تمہارے کرتوتوں سے خوب واقف ہے"۔ لہٰذا اب یہاں جھوٹ 'مغالطہ اور ملمع کاری نہیں چل سکتی۔

اب ان کے فیصلے اور جزاء کا وقت آتا ہے۔ یہ متکبرین کی جزاء ہے۔

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ (۱۶:۲۹) "اب

جاؤ' جہنم کے دروازوں میں گھس جاؤ - وہیں تم کو ہمیشہ رہنا ہے"۔ پس حقیقت یہ ہے کہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے متکبروں کے لیے"۔ اب فریق بالمقابل' وہ لوگ ہیں جنھوں نے تقویٰ کی راہ اختیار کی - یہ لوگ متکبرین اور مستکبرین کے مدمقابل ہیں شروع سے انتہا تک -

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۰﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۱﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾

"دوسری طرف جب خدا ترس لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے جو تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے' تو وہ جواب دیتے ہیں کہ "بہترین چیز اتری ہے"۔ اس طرح کے نیکوکار لوگوں کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی ان کے حق میں بہتر ہے - بڑا اچھا گھر ہے متقیوں کا' دائمی قیام کی جنتیں' جن میں وہ داخل ہوں گے' نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی' اور سب کچھ وہاں عین ان کی خواہش کے مطابق ہو گا - یہ جزا دیتا ہے اللہ متقیوں کو - ان متقیوں کو جن کی روحیں پاکیزگی کی حالت میں جب ملائکہ قبض کرتے ہیں تو کہتے ہیں "سلام ہو تم پر' جاؤ جنت میں اپنے اعمال کے بدلے"۔

متقین اس بات کو سمجھتے ہیں کہ دعوت اسلامی کا بنیادی عنصر خیر ہے - اللہ نے جو کلام نازل کیا ہے' جو امر و نہی اور ہدایت و قانون پر مشتمل ہے' اس کی روح انسان کی بھلائی ہے - یہ لوگ پوری داستان کو ایک لفظ کے کوزے میں بند کر دیتے ہیں - ان سے جب پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے تو کہتے ہیں (خیرا) اور اس کے بعد وہ اس خیر کی تشریح اپنے علم و فضل کے مطابق کرتے ہیں -

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ (۱۶ : ۳۰) "اس طرح کے نیکوکاروں کے لیے اس دنیا میں بھلائی ہے"۔ بہترین زندگی' بہترین سازوسامان اور بہترین مقام و مرتبہ -

وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ (۱۶ : ۳۰) "اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی ان کے لیے بہتر ہے"۔ اس دنیا کی بہتری سے بھی اس کی بہتری برتر ہے -

وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ (۱۶ : ۳۰) "بڑا اچھا گھر ہے متقیوں کا"۔ یہ تو تھی اجمالی بات۔ اب اس اجمال کی تفصیلات یہ ہیں:-

جَنّٰتُ عَدْنٍ (۱۶ : ۳۱) "دائمی قیام کی جنتیں"۔ یہ ان کی اقامت گاہیں ہوں گی۔

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۱۶ : ۳۱) "جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی"۔ بہت سہولتیں ہوں گی۔

لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ (۱۶ : ۳۱) "اور سب کچھ وہاں عین ان کی خواہش کے مطابق ہو گا"۔ وہاں نہ کسی چیز سے محرومیت ہوگی اور نہ محنت ہوگی نہ رزق محدود ہو گا جس طرح اس دنیا میں ہے۔

كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ (۱۶ : ۳۱) "اس طرح جزا دیتا ہے اللہ متقیوں کو"۔

اب متقین کو بھی سیاق کلام ایک قدم پیچھے لے کر چلتا ہے۔ جس طرح اس سے قبل مستکبرین کو پیچھے کی طرف حالت نزع میں لے جایا گیا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں 'ان کی حالت نہایت ہی پر سکون ہے۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ طَيِّبِيْنَ (۱۶ : ۳۲) "وہ لوگ جن کی روحیں پاکیزگی کی حالت میں ملائکہ قبض کرتے ہیں"۔ ان کے نفوس پاکیزہ ہوتے ہیں کیونکہ وہ اللہ سے ملنے والے ہوتے ہیں۔ 'وہ سکرات الموت اور مشکلات نزع روح سے محفوظ ہوتے ہیں۔

يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ (۱۶ : ۳۲) "فرشتے کہتے کہ سلام ہو تم پر"۔ یہ سلام ان کو اطمینان دلانے کے لیے اور مرحبا اور خوش آمدید کہنے کے لیے ہو گا۔

ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶ : ۳۲) "جاؤ جنت میں اپنے اعمال کے بدلے"۔ گویا ان کو جنت کی خوشخبری دے دی جاتی ہے 'حالانکہ وہ ابھی تک آخرت کے دروازے پر ہی ہیں۔ یہ پوری پوری جزاء ہے ان کے اعمال کے بدلے۔

---(۱۱)---

موت کا منظر اور بعث بعد موت کا منظر فضا پر سایہ فگن ہے کہ اسکرین پر ایک سوال آتا ہے۔ یہ سوال اس فضا میں مشرکین قریش سے کیا جاتا ہے کہ وہ اب کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں۔ آیا وہ فرشتوں کا انتظار کرنا چاہتے ہیں کہ وہ آئیں اور مذکورہ بالا طریقے پر ان کی روح قبض کر لیں یا وہ اس بات کا انتظار کرنا چاہتے کہ اللہ قیامت برپا کر دے کیونکہ ان دونوں مراحل سے ان کو بہرحال گزرنا ہے۔ موت کے وقت بھی یہی منظر ہو گا اور بعث بعد الموت کے وقت وہی سزا ہو گی۔ کیا ان دونوں مناظر میں ان کے لیے کوئی عبرت و نصیحت کا مقام نہیں ہے؟

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ

كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۴﴾

"اے نبیؐ اب جو یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں تو اس کے سوا اب اور کیا باقی رہ گیا ہے کہ ملائکہ ہی آپہنچیں یا تیرے رب کا فیصلہ صادر ہو جائے؟ اسی طرح کی ڈھٹائی ان سے پہلے بہت سے لوگ کر چکے ہیں۔ پھر جو کچھ ان کے ساتھ ہوا وہ ان پر اللہ کا ظلم نہ تھا بلکہ ان کا اپنا ظلم تھا جو انہوں نے خود اپنے اوپر کیا۔ ان کے کرتوتوں کی خرابیاں آخر کار ان کی دامن گیر ہو گئیں اور وہی چیز ان پر مسلط ہو کر رہی جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے"۔

لوگ کس قدر عجیب ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ایک راستے پر ان کے پیش رو چلے اور وہ عذاب الٰہی سے دوچار ہوئے' تباہی و بربادی ان کے حصے میں آئی' پھر بھی وہ اسی راہ پر چلتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ ان لوگوں کا جو حشر ہوا وہ ان کا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سوچتے نہیں کہ سنت الٰہیہ ایک ہے اور اس کے نتائج ہمیشہ ایک جیسے ہی نکلتے ہیں۔ یہ کہ مکافات عمل ہمیشہ ایک جیسی ہوتی ہے' یہ کہ قانون قدرت اور سنن الٰہیہ اٹل ہیں اور وہ کسی سے رو رعایت نہیں کرتیں' نہ ان میں کسی کے لیے کوئی تخلف ہو سکتا ہے۔

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۱۶ : ۳۳) "پھر جو کچھ ان کے ساتھ ہوا وہ ان پر اللہ کا ظلم نہ تھا بلکہ ان کا اپنا ظلم تھا جو انہوں نے خود اپنے اوپر کیا"۔ اللہ نے تو ان کو تدبر' تفکر اور اختیار تمیزی کی آزادی دی تھی' ان پر انبیاء کے ذریعہ آفاقی دلائل اور ان کے نفوس کے اندر پائے جانے والے شواہد دکھائے تھے' ان کو برے انجام سے ڈرایا تھا' ان کو عمل کے لیے آزاد چھوڑ دیا تھا کہ اللہ کی سنت کے مطابق جو چاہیں روش اختیار کریں۔ چنانچہ ان پر ظلم و زیادتی ان کے برے اعمال نے کی کیونکہ جن نتائج سے وہ دوچار ہوئے وہ ان کے اعمال کے طبیعی نتائج تھے۔

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۱۶ : ۳۴) "پس ان کے کرتوتوں کی خرابیاں آخر کار ان کی دامن گیر ہو گئیں اور وہی چیز ان پر مسلط ہو کر رہی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے"۔ اس انداز تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو ان کے اعمال سے باہر کوئی سزا نہ ہوگی۔ سزا ان کے اعمال کا طبیعی نتیجہ ہے۔ اور ان کے ذاتی اعمال کے نتائج ہیں جو یہ بھگت رہے ہیں۔ وہ جو اعمال کر رہے ہیں ان کے مطابق وہ انسانیت کے نچلے سے نچلے درجے تک گر جاتے ہیں لہٰذا وہ توہین آمیز درجے کے عذاب ہی کے مستحق ہوں گے۔

اب مشرکین کے شرکیہ نظریات و افعال پر ان کی جانب سے پیش کردہ نئی دلیل۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَ

لَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَي الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿٣٥﴾ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۭ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٦﴾

"یہ مشرکین کہتے ہیں "اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اس کے سوا کسی اور کی عبادت کرتے اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہراتے"۔ ایسے ہی بہانے ان سے پہلے کے لوگ بھی بناتے رہے ہیں۔ تو کیا رسولوں پر صاف صاف بات پہنچا دینے کے سوا اور بھی کوئی ذمہ داری ہے؟ ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا' اور اس کے ذریعہ سے سب کو خبردار کر دیا کہ "اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو"۔ اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کسی پر ضلالت مسلط ہو گئی۔ پھر ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہو چکا ہے۔

ان لوگوں کی اس نئی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے شرک' بتوں کی بندگی اور اپنے آباؤ اجداد کی طرف سے شرک اور بتوں کی بندگی اور بعض حلال چیزوں کو حرام کرنے کے فعل کو اللہ کے ارادے اور مشیت کی طرف موڑتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا اور اس کا ارادہ نہ ہوتا تو نہ ہم یہ خلاف شریعت کام کرتے اور نہ ہمارے آباء کرتے۔ اگر اللہ نہ چاہتا تو یہ سب کام کب ہوتے؟

دراصل ان لوگوں نے مشیت کے مفہوم کو سمجھا ہی نہیں۔ یہ لوگ انسان سے انسان کی وہ اہم اختیاری خصوصیت چھین لینا چاہتے ہیں جو اللہ نے انسان کو بخشی ہے۔

اللہ اپنے بندوں سے یہ نہیں چاہتے کہ وہ شرک کریں' نہ اللہ کی یہ رضا ہے کہ اللہ کی حلال کردہ طیبات کو ناحق حرام کر دیا جائے۔ اللہ کی رضا تو تمام قوانین شریعت اور تمام نبیوں کی ہدایات میں ثبت شدہ ہے۔ تمام رسولوں نے اس کی تبلیغ کی ہے' اس کے لیے جدوجہد کی ہے اور انہوں نے پوری طرح فریضہ دعوت دین ادا کیا ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (١٦ : ٣٦) "ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعے خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو"۔ پس یہ ہے اللہ کا حکم اور یہ ہے اس کا ارادہ اپنی مخلوق کے بارے میں۔ اللہ بہرحال لوگوں کو ایسے کاموں سے نہیں روکتا جن کے بارے میں وہ ازروئے تخلیق رکنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ نہ اللہ نے لوگوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ اللہ کی مخالفت کریں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جب لوگ اللہ کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں تو اللہ ان کو پکڑتا ہے اور سزا دیتا ہے۔

فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (١٦ : ٣٦) "پھر ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا"۔ اللہ کی مشیت کا تقاضا یوں ہوا کہ وہ انسان کو ہدایت و ضلالت کی استعداد

کے ساتھ پیدا کرے اور انسان کو یہ اختیار ہو کہ وہ آزادانہ طور پر جو راہ چاہے اختیار کرے۔ پھر اللہ نے انسان کو عقل عطا کی تاکہ وہ عقل کو کام میں لا کر ان دونوں راستوں میں سے کوئی ایک راہ اپنے لیے منتخب کرے، خصوصاً عقل کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ایسے دلائل و شواہد بھی رکھے ہیں جو انسان کی آنکھ، کان اور عقل و شعور اور دل و دماغ کو دعوت غور و فکر دے رہے ہیں، اور وہ ان دلائل و شواہد کو رات دن دیکھ رہا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس پر اکتفاء نہ کیا کہ انسان صرف عقل و شعور کے بل بوتے پر ہی اپنے لیے صحیح راہ کا انتخاب کرے۔ اللہ نے ہر دور اور ہر امت کے لیے ایک رسول بھی بھیجا تاکہ اگر انسان کی عقل کے لیے کسی مشکل معاملے کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے تو رسول ایک شریعت کی صورت میں ایک معیار، نیک و بد بھی مفصل طور پر انسانوں کے سامنے پیش کر دے تاکہ انسان کی ذاتی خواہشات اور اس کے میلانات اسے گمراہ نہ کر سکیں۔ پھر اللہ نے ان رسولوں کو قہار و جبار نہیں بنایا کہ لوگوں کی گردنیں موڑ کر ان کو راہ ایمان پر ڈال دیں۔ ان کو بھی صرف مبلغ بنایا کہ وہ لوگوں کو صحیح راستے کی طرف تبلیغ و تلقین کے ذریعے موڑیں، وہ ان کو بتائیں کہ صرف اللہ کی بندگی کرو اور اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ نہ بتوں کی، نہ اپنی ہوا و ہوس کی اور نہ کسی بادشاہ کی۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (۱۶ : ۳۶)

"ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعے خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو"۔ چنانچہ ایک فریق نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔

فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللَّهُ (۱۶ : ۳۶) "اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی"۔ اور بعض نے گمراہی کی راہ لی۔

وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ (۱۶ : ۳۶) "اور کسی پر ضلالت مسلط ہو گئی"۔ یہ دونوں فریق اللہ کے دائرہ مشیت کے اندر ہی رہے۔ ان میں سے کسی فریق کو بھی اللہ نے ہدایت یا ضلالت پر مجبور نہیں کیا، اللہ نے ان کے لیے یہ راستہ وضع کیا کہ ان میں سے ہر فریق اپنے آزادانہ ارادے اور آزادانہ طرز عمل سے جو راہ چاہے اختیار کرے جبکہ اللہ نے ان کے لیے نشانات راہ اور علامات حق اس کائنات میں بھی اور ان کے نفوس میں بھی ودیعت کر دیے۔

اس طرح قرآن کریم اس تفصیل سے اس وہم کا قلع قمع کر دیتا ہے جس کی طرف مشرکین نے اپنے استدلال میں اشارہ کیا تھا۔ آج ہمارے دور میں بھی بہت سے نافرمان اور سرکش ایسا ہی استدلال کرتے ہیں حالانکہ اس سلسلے میں اسلامی عقائد و نظریات بالکل واضح ہیں۔ یوں کہ اللہ اپنے بندوں کو بھلائی کا حکم دیتا ہے، برائی سے منع کرتا ہے، برائی کرنے والوں کو کبھی کبھی اس دنیا میں بھی سزا دے دیتا ہے اور یہ سزا ایسی واضح ہوتی ہے جس سے اللہ کا غضب بالکل عیاں ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے بعد یہ استدلال کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ کوئی یہ کہے کہ اللہ کا ارادہ ہمیں برائیوں پر مجبور کرتا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کو واضح اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے لیے کوئی راستہ اختیار کریں اور یہ اختیار دینا ہی اللہ کا ارادہ ہے۔ اس معنی میں ان سے جو اچھائی یا بھلائی یا شر اور معصیت صادر ہوتی ہے، وہ اس مفہوم میں اللہ کی

مشیت اور ارادے کے مطابق ہوتی ہے 'جیسا کہ ہم نے واضح کر دیا ۔ یہی وجہ ہے کہ آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ہدایت و ضلالت کے بارے میں سنت الہیہ بتائی جاتی ہے ۔

إِن تَحْرِصْ عَلَىٰ هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَن يُضِلُّ ۖ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿٣٧﴾

"اے نبی 'تم چاہے ان کی ہدایت کے لیے کتنے ہی حریص ہو 'مگر اللہ جس کو بھٹکا دیتا ہے پھر اسے ہدایت نہیں دیا کرتا اور اس طرح کے لوگوں کی مدد کوئی نہیں کر سکتا"۔

ہدایت و ضلالت کا مدار اس پر نہیں ہے کہ رسول اللہ اس پر زیادہ حریص ہیں یا نہیں ہیں کیونکہ رسول کا کام تو صرف ابلاغ ہے ۔ رہی ہدایت و ضلالت تو وہ سنت الہیہ کے مطابق ملتی ہے اور یہ سنت ایسی ہے کہ اس کے نتائج کو روکا نہیں جا سکتا ۔ جس کو اللہ گمراہ کرتا ہے تو وہ اسے سنت الہیہ کے مطابق گمراہ کرتا ہے ۔ جو شخص سنت الہیہ کے مطابق گمراہ ہو جائے اسے اللہ ہدایت نہیں دیتا کیونکہ سنت الہیہ اپنے نتائج ظاہر کرتی رہتی ہے ۔ یہ سنت دائرہ مشیت الہیہ کے اندر ہے اور و اللّٰہُ فعّالٌ لما یشاءُ "اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے"۔ وَ مَا لَهُم مِّن نَّاصِرِینَ (۱۶ : ۳۷) "ان کے لیے کوئی مددگار نہ ہوگا"۔ یعنی اللہ کی مشیت کے مقابلے میں ۔

---

اب منکرین اور مستکبرین کی تیسری کٹ حجتی :-

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللَّهُ مَن يَمُوتُ ۚ بَلَىٰ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٨﴾ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَاذِبِينَ ﴿٣٩﴾ إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا ۵
أَرَدْنَاهُ أَن نَّقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٤٠﴾ ع ۶

۱۱ "یہ لوگ اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ "اللہ کسی مرنے والے کو پھر سے زندہ کر کے نہ اٹھائے گا"۔ ... اٹھائے گا کیوں نہیں؟ یہ تو ایک وعدہ ہے جسے پورا کرنا اس نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے 'مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں ۔ اور ایسا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ اللہ ان کے سامنے اس حقیقت کو کھول دے جس کے بارے میں یہ اختلاف کر رہے ہیں 'اور منکرین حق کو معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹے تھے ۔ (رہا اس کا امکان تو) ہمیں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے اس سے زیادہ کچھ کرنا نہیں ہوتا کہ اسے حکم دیں "ہو جا" اور بس وہ ہو جاتی ہے"۔

جب سے اللہ نے اپنے رسول بھیجے ہیں اور انہوں نے بعث بعد موت سے ڈرایا ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام شروع ہوا تو اکثر لوگ بعث بعد الموت کے عقیدے کے بارے میں خلجان میں مبتلا رہے ہیں۔ اہل قریش بھی اللہ کے نام کی سخت سے سخت قسمیں کھا کر یہ کہتے تھے کہ اللہ مرنے کے بعد کسی کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا۔ یہ لوگ اللہ کے وجود کے تو قائل تھے لیکن اس بات کے قائل نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو قبروں سے اپنی اصلی حالت میں دوبارہ اٹھائے گا۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ کام تو بہت ہی مشکل ہے کہ جب انسان گل سڑ کر ذرے ذرے ہو جائے تو پھر کس طرح جمع ہو گا۔

لیکن ان لوگوں نے اس بات پر غور نہ کیا کہ اللہ نے پہلی بار کس طرح ان ذرات کو حیات بخشی۔ یہ لوگ قدرت الٰہیہ کو بھی اچھی طرح نہ سمجھ سکے اور خدا کی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کیا۔ اللہ کے لیے کسی چیز کا ایجاد کرنا کچھ ممکن نہیں ہے۔ اللہ جب چاہتا ہے تو کسی چیز کو کہتا ہے کہ ہو جا' پھر وہ ہو جاتی ہے۔

نیز انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ بعث بعد الموت کی حکمت کیا ہے۔ بے شمار امور اس جہان میں ایسے ہیں جو اپنے قدرتی انجام تک نہیں پہنچتے۔ اس جہان میں حق و باطل کے بارے میں لوگوں کے درمیان سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہدایت و ضلالت کے بارے میں لوگوں کے تصورات مختلف ہیں۔ خیر و شر کا معیار مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان ان امور کا فیصلہ اس جہان میں ہی نہیں چکاتا کیونکہ مشیت کا تقاضا یہ تھا کہ لوگوں کو اس جہاں میں مہلت و امتیاز دیا جائے اور یہاں ہی سب کو جزاء و سزا نہ دے دی جائے۔ ان امور کا فیصلہ قیامت میں بعث بعد الموت کے وقت ہوتا ہے۔

قرآن کریم اس کافرانہ کٹ حجتی کو آغاز ہی میں رد کر دیتا ہے اور اس غلطی اور غلط سوچ کو اللہ تعالیٰ یوں دور کرتا ہے کہ بَلٰي وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا (۱۶ : ۳۸) "یہ تو ایک وعدہ ہے جس کا پورا کرنا اس نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے"۔ اور جب اللہ کسی بات کا وعدہ کر لے تو اس کی خلاف ورزی کسی حال میں بھی نہیں ہوتی۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۶ : ۳۸) "مگر اکثر لوگ جانتے نہیں" کہ اللہ کے عہد کی حقیقت کیا ہوتی ہے یعنی وہ اٹل ہوتا ہے۔

پھر اللہ کے اس فیصلے کے پیچھے ایک گہری حکمت بھی ہے۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ (۱۶ : ۳۹) "اور ایسا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ اللہ ان کے سامنے اس حقیقت کو کھول دے جس کے بارے میں یہ اختلاف کر رہے ہیں' اور منکرین حق کو معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹے تھے۔ کس بات میں؟ اس بات میں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔ اس بات میں کہ وہ رسول کو جھوٹا سمجھتے تھے' اس بات میں کہ ان کے نزدیک قیام قیامت ممکن نہیں ہے۔ نیز اپنے اعمال و اعتقادات وغیرہ ہیں۔

رہا اس کا عملاً قیام تو وہ کوئی مشکل نہیں۔

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ( ۱۶ : ۴۰ ) ”ہمیں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے اس سے زیادہ کچھ کرنا نہیں ہوتا کہ اسے حکم دیں کہ ہو جا اور بس وہ ہو جاتی ہے“۔ اور قیام قیامت بھی ایسے ہی حالات میں سے ایک حالت ہے جوں ہی ارادہ الٰہی اس طرف متوجہ ہوا وہ برپا ہو جائے گی۔

---

منکرین اور مکذبین کے بالمقابل ذرا مومنین صادقین کی ایک جھلک بھی دکھائی جاتی ہے جو نہ صرف اپنے نظریہ حیات پر پختہ ایمان رکھتے ہیں بلکہ اس کے لیے اپنا مال اور اپنا ملک چھوڑ کر ہجرت بھی کرتے ہیں اور یہ کام وہ صرف رضائے الٰہی کی خاطر کرتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ؕ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ۝

”اور جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش جان لیں وہ مظلوم جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں۔ (کہ کیسا اچھا انجام ان کا منتظر ہے)“۔

یہ لوگ جنہوں نے اپنے ملک و مال کو چھوڑ کر ہجرت کی، اپنی جائیداد اور محبوب آبائی وطن سے دستکش ہو گئے۔ انہوں نے ملک، رشتہ داروں اور اپنی محبوب یادوں کی قربانی دی۔ یہ لوگ دار آخرت میں عوضانہ کے مستحق ہیں۔ انہوں نے جو جو قربانیاں دیں اس کا اجر تو انہیں ملنا چاہئے۔ پھر یہ مال اور ملک انہوں نے خوشی سے نہیں چھوڑا بلکہ ظلم سے تنگ آ کر چھوڑا۔ اگر یہاں انہوں نے اپنی اچھی رہائش گاہیں چھوڑیں تو لازم ہے کہ دنیا میں بھی ان کو ان حالات سے اچھے حالات نصیب ہوں۔

لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ( ۱۶ : ۴۱ ) ”ان کو ہم دنیا میں بھی اچھا ٹھکانا دیں گے“۔ اور آخرت میں بھی ان کو ہم اچھے مقامات پر ٹھہرائیں گے۔ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ( ۱۶ : ۴۱ ) ”اور آخرت کا اجر بہرحال بڑا ہے“۔ اے کاش کہ لوگ اس بات کو جانتے۔

اَلَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ( ۱۶ : ۴۲ ) ”جنہوں نے صبر کیا اور جو اپنے رب کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں“۔ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے، اسی پر بھروسہ کرتے ہیں اور اسی کی طرف متوجہ ہیں۔ اگر قیامت نہ ہو تو ایسے لوگوں کا اجر کہاں ان کو ملے گا۔

---○○○---

اس سے قبل مشرکین کے عذرات کو رد کرتے وقت یہ کہا گیا کہ اللہ کی مرضی نہیں ہے کہ تم یا تمہارے آباء شرک کرو' ورنہ وہ رسول کیوں بھیجتا۔ جو ہدایت میں بھیجے گئے۔ یہاں اب رسولوں کے منصب کے فرائض ذرا تفصیل سے بیان کیے جاتے ہیں اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض کا بھی تعین کیا جاتا ہے' اور حکم دیا جاتا ہے کہ وہ جو دعوت دے رہے ہیں اگر تم نے اس کا انکار کیا تو اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾ بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ ؕ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾

"اے نبی' ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں' آدمی ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کیا کرتے تھے' اہل ذکر سے پوچھ لو' اگر تم لوگ خود نہیں جانتے۔ پچھلے رسولوں کو بھی ہم نے روشن نشانیاں اور کتابیں دے کر بھیجا تھا اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے اور تاکہ لوگ (خود بھی) غور و فکر کریں"۔

یعنی اس سے قبل ہم نے جو رسول بھیجے تھے وہ آدمی ہی تھے۔ فرشتے نہ تھے۔ نہ آدم اور فرشتوں کے علاوہ کوئی اور مخلوق تھے۔ البتہ یہ برگزیدہ لوگ تھے۔

نُوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ (۱۶: ۴۳) "جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے" جیسا کہ آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں۔ ان کے فرائض بھی یہی تھے کہ دعوت کو لوگوں تک پہنچاؤ۔ جس طرح آپ کا بھی یہی فریضہ ہے۔

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ (۱۶: ۴۳) "اہل ذکر سے پوچھ لو"۔ یعنی اہل کتاب سے پوچھ لو جن کے پاس بہت سے رسول آئے کہ یہ رسول آدمی تھے یا فرشتے یا کوئی اور مخلوق۔

اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۶: ۴۳) "اگر تم خود نہیں جانتے"۔ ان رسولوں کو کتابیں بھی دی گئیں اور دلائل بھی دیے گئے۔ عربی میں زبر کے معنی متفرق کتابوں کے ہوتے ہیں۔

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (۱۶: ۴۴) "اور ہم نے اب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے"۔ نبی آخر الزمان کا بیان ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو پہلے اہل کتاب تھے' جنہوں نے اپنی کتاب میں اختلاف کیا اور قرآن آیا اور

ان کے اختلافات کا فیصلہ کر دیا اور مسئلہ مختلفہ میں حق بات کہہ دی۔ ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو ان کے سوا آپ کے معاصر تھے 'جن کے سامنے قرآن مجید نازل ہوا تاکہ لوگ اللہ کی آیات اور قرآن کی آیات دونوں میں غور و فکر کریں۔

وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۱۶:۴۴) ''قرآن مجید ہروقت انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور انسانی شعور کو جگانے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ درس 'جس کا آغاز مستکبرین اور مکارین کی سمت ہوا تھا' اس کے آخر میں قارئین کو چند وجدانی احساس دلائے جاتے ہیں۔ پہلا احساس یہ دلایا جاتا ہے کہ انسان کو رات اور دن کے کسی بھی وقت اللہ کے عذاب اور اللہ کی جوابی تدبیر سے بے خوف نہیں ہونا چاہئے۔ دوسرا احساس یہ ہے کہ انسان کو ہروقت اللہ کو یاد رکھنا چاہئے اور اس کی تسبیح و تہلیل میں مشغول رہنا چاہئے۔ یہ انسان ہی ہے جو تکبر کرتے ہوئے غافل اور منکر ہو جاتا ورنہ اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات ہروقت تسبیح میں مشغول رہتی ہے۔

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ
الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۴۵﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ
بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۴۶﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۷﴾ اَوَلَمْ
يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا
لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ
دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ ۶
يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۩ ﴿۵۰﴾ ع ۱۰
۱۲

''پھر کیا وہ لوگ جو (دعوت پیغمبر کی مخالفت میں) بدتر سے بدتر چالیں چل رہے ہیں' اس بات سے بالکل ہی بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ ان کو زمین میں دھنسا دے' یا ایسے گوشے سے ان پر عذاب لے آئے جدھر سے اس کے آنے کا ان کو وہم و گمان تک نہ ہو' یا اچانک چلتے پھرتے ان کو پکڑ لے' یا ایسی حالت میں انہیں پکڑے جب کہ انہیں خود آنے والی مصیبت کا کھٹکا لگا ہوا ہو اور وہ اس سے بچنے کی فکر میں چوکنے ہوں؟ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہے یہ لوگ اس کو عاجز کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی نرم خو اور رحیم ہے۔

اور کیا یہ لوگ، اللہ کی پیدا کی ہوئی کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے کہ اس کا سایہ کس طرح اللہ کے حضور سجدہ کرتے ہوئے دائیں اور بائیں گرتا ہے؟ سب کے سب اسی طرح اظہار عجز کر رہے ہیں۔ زمین اور آسمانوں میں جس قدر جان دار

مخلوقات ہیں اور جتنے ملائکہ' سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں - وہ ہرگز سرکشی نہیں کرتے - اپنے رب سے جو ان کے اوپر ہے' ڈرتے ہیں اور جو کچھ حکم دیا جاتا ہے اسی کے مطابق کام کرتے ہیں"۔

یہ بات نہایت تعجب انگیز ہے کہ انسانی سوسائٹی کے اندر دست قدرت کام کرتا ہوا نظر آتا ہے - بعض لوگ اللہ کی سخت پکڑ میں آ جاتے ہیں - وہ مکاریاں اور تدابیر کرتے ہی رہتے ہیں لیکن جب اللہ کی پکڑ آتی ہے تو وہ ایک غالب اور صاحب قوت ہستی کی گرفت ہوتی ہے - پھر ان کی قوت' ان کا مال اور ان کا وسیع علم ان کو بچا نہیں سکتا - لیکن اس کے باوجود بقیہ مکار اپنی مکاریاں جاری رکھتے ہیں اور جو اللہ کے عذابوں سے بچ نکلتے ہیں وہ پھر اسی طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح گویا کچھ ہوا ہی نہیں - الا یہ کہ ان کے ساتھ یہ کچھ نہیں ہو سکتا - وہ ڈرتے نہیں کہ خدا ان کو بھی پکڑ سکتا ہے - ہر وقت وہ اللہ کی گرفت میں آ سکتے ہیں' چاہے سوتے میں یا جاگتے ہوئے' غفلت یا بیداری میں - قرآن کریم انسانی احساس اور انسانی وجدان کو بیدار کرتا ہے تاکہ لوگ متوقع عذاب سے ڈریں اور اللہ کے عذاب سے وہی لوگ غافل ہوتے ہیں جو خسارے میں ہوں۔

اَفَاَمِنَ الَّذِیْنَ مَکَرُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّخْسِفَ اللّٰہُ بِہِمُ الْاَرْضَ اَوْ یَاْتِیَہُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ (۱۶:۴۵) "پھر کیا وہ لوگ جو بدتر سے بدتر چالیں چل رہے ہیں اس بات سے بالکل ہی بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ ان کو زمین میں دھنسا دے یا ایسے گوشے سے ان پر عذاب لے آئے جس طرف سے اس کے آنے کا وہم و گمان تک نہ ہو" - یا یہ کہ ایسے لوگوں کو اللہ اس حال میں پکڑ لے کہ یہ لوگ شہر شہر' قریہ قریہ تجارت اور سیاحت کے لیے پھر رہے ہوں۔

فَمَا ہُمْ بِمُعْجِزِیْنَ (۱۶:۴۶) "یہ لوگ اللہ کو عاجز کرنے کی طاقت تو نہیں رکھتے" - ان لوگوں کا پکڑا جانا یا جائے گرفتاری کسی حال میں بھی اللہ سے بعید نہیں ہے۔

اَوْ یَاْخُذَہُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ (۱۶:۴۷) "یا ایسی حالت میں انہیں پکڑ لے کہ انہیں خود آنے والی مصیبت کا کھٹکا لگا ہوا ہو" - کیونکہ ان کا چوکنا ہونا اور عذاب کی توقع رکھنا بھی عذاب الٰہی کو کسی صورت میں رد نہیں کر سکتا - اللہ اس حال میں بھی پکڑ سکتا ہے جب وہ دفاع کے لیے تیار ہوں اور اس حال میں بھی جب وہ غافل ہوں - لیکن اللہ نہایت ہی مہربان اور رحیم ہے۔

یہ لوگ جو برائیوں کی تدابیر سوچتے رہتے ہیں کیا اللہ کے عذاب سے بے خوف ہو گئے ہیں؟ کیوں یہ اپنی مکاریوں میں سرگرداں ہیں؟ کیوں یہ لوگ اپنی بے راہ روی میں آگے ہی بڑھتے جاتے ہیں اور واپس نہیں آتے اور خدا سے نہیں ڈرتے! باوجود اس کے کہ ان کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات اپنے قوانین فطرت اور ضوابط قدرت کے ساتھ پکار رہی ہے کہ یہ ہے راہ ایمان - بلکہ یہ پوری کائنات ذات باری کی حمد خواہ اور ثناگو ہے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰہِ

وَهُمْ دٰخِرُوْنَ (۱٦ : ٤٨) "کیا یہ لوگ اللہ کی پیدا کی ہوئی کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے کہ اس کا سایہ کس طرح اللہ کے حضور سجدہ کرتا ہے' دائیں اور بائیں گرتا ہے۔ سب کے سب اس طرح اظہار عجز کر رہے ہیں۔

سایوں کی حرکات کا منظر! سایہ آگے بڑھتا ہے' واپس ہوتا ہے اور پھر ایک جگہ رک جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جو صرف اس آنکھ کو دعوت نظارہ دیتا ہے جو کھلی ہو' اس دل کو دعوت ربرت دیتا ہے جس کے دروازے کھلے ہوں' اس احساس کو شعور دیتا ہے جو جاگ رہا ہو اور ایسے شخص کو ہدایت دیتا ہے جس کے قوائے مدرکہ کائنات کے ساتھ ہمقدم ہوں۔

قرآن کریم یہاں قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کی اطاعت کو سجدہ ریز ہونے سے تعبیر کرتا ہے۔ سجدہ گزاری' خضوع و خشوع کی آخری تصویر ہوتی ہے۔ یہاں متوجہ کیا جاتا ہے کہ درختوں کے سائے بڑھتے ہیں اور پھر سکڑتے ہیں۔ سائے کی حرکت نہایت ہی خفیف ہوتی ہے اور انسانی شعور پر اس کا نہایت ہی گہرا اثر ہوتا ہے۔ پھر اس کائناتی مخلوق کے ساتھ فرشتوں کی فوج اشیاء' درخت' سائے' پرندے اور چرندے اور پھر فرشتے سب کے سب اللہ کے سامنے خشوع و خضوع کے ساتھ سجدہ ریز ہیں اور عبادت اور بندگی بجالا رہے ہیں! یہ سب اللہ کی بندگی سے نہ تکبر کرتے ہیں اور نہ سرمو انحراف کرتے ہیں۔ یہ اللہ کے احکام سے سرتابی نہیں کرتے۔ لیکن اے منکر از بنی نوع انسان تمہارا کتنا دل گردا ہے کہ تو تکبر بھی کرتا ہے اور سرتابی بھی۔ یہ تیری نہایت ہی تعجب انگیز حرکت ہے!

یہ سبق یہاں منکرین اور مستکبرین کی طرف اشارہ کر کے ختم ہو جاتا ہے تاکہ سبق کے آخر میں ان کو خصوصیت کے ساتھ متوجہ کر دے کہ تمہارا انکار و استکبار فطرت کائنات کے خلاف ہے۔

---ООО---

# درس نمبر ۱۲۱ ایک نظر میں

مسئلہ توحید کا یہ تیسرا دور ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس کائنات کا خدا صرف ایک خدا ہے۔ اس سبق کا آغاز اس مفہوم سے ہوتا ہے کہ اللہ ایک ہے جو وحدہ مالک اور منعم ہے۔ پہلی تین آیات میں یہی مفہوم بیان ہوا ہے۔ یہاں ایک بہترین تمثیل دی گئی ہے کہ ایک مالک ہے، رازق ہے اور دوسرا شخص غلام اور مملوک اور محتاج ہے۔ جس کا کوئی اختیار نہیں۔ اور جس کی ملکیت میں کچھ بھی نہیں ہے۔ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ تو پھر اللہ جو خالق مالک اور رازق ہے وہ اور تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریک کس طرح برابر ہو سکتے ہیں جو نہ مالک ہیں اور نہ رازق۔ کس طرح ہم دونوں کو کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی الہ ہے اور یہ بھی!

اس سبق میں لوگوں کا ایک نمونہ یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ جب وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو اللہ وحدہ کو پکارتے ہیں لیکن جب مصیبت دور ہو جاتی ہے تو وہ پھر شرک کرنے لگ جاتے ہیں۔

اس سبق میں بت پرستی کے اوہام و خرافات کی کئی صورتیں بھی دی گئی ہیں۔ یہ لوگ اپنے بنائے ہوئے الہوں کے لیے بعض جانوروں کو مخصوص کرتے ہیں۔ حالانکہ خود ان کی حالت یہ ہے کہ اپنے مملوکات میں سے کسی چیز کو وہ اپنے غلاموں کے دائرۂ اختیار میں دینے کے لیے تیار نہیں۔ نہ کوئی چیز ان کے ساتھ تقسیم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ خود تو لڑکیوں کو بے حد ناپسند کرتے ہیں لیکن فرشتوں کو اللہ کی لڑکیاں کہتے ہیں۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (۱۶ : ۵۸) "اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ نہایت ہی کبیدہ خاطر ہوتا ہے"۔ یہ لوگ اللہ کے لیے تو وہ چیز تجویز کرتے ہیں جسے یہ خود ناپسند کرتے ہیں لیکن ان کی زبانوں پر یہ دعویٰ ہر وقت رہتا ہے کہ ان کے لیے تو اچھائی ہی مقرر ہے اور یہ کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کا نتیجہ اچھا ہی رہے گا۔ یہ اوہام و خرافات ان کو اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو مبعوث ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ آپؐ ان کے سامنے ان کی حقیقت کھول کر بیان کر دیں۔ چنانچہ آپؐ اہل ایمان کے لیے صاحب ہدایت اور باعث رحمت ہیں۔

اس کے بعد حقیقی خدا کی پیدا کردہ بعض چیزوں کی نمونے دیئے جاتے ہیں اور اگر ان میں انسان ذرا بھی غور و فکر کرے تو وہ بہت کچھ نصیحت اور عبرت حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کی ایجاد پر صرف اللہ وحدہ قادر ہے اور یہ چیزیں اللہ کی خدائی اور آپ کی برتری کے دلائل ہیں۔ مثلاً یہ کہ اللہ نے آسمانوں سے بارشیں برسانے کا انتظام فرمایا جس کے ذریعے مردہ زمین تروتازہ ہو جاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے پانی کے علاوہ لوگوں کے پینے کے لیے نہایت ہی خوشگوار اور لذیذ دودھ پیدا کیا اور یہ دودھ جانور کے گوبر اور خون کے درمیان سے پیدا ہوتا ہے۔ پھر اللہ نے کھجور اور

انگور پیدا کیے جن سے تم لوگ نشہ آور چیز بھی بناتے ہو اور رزق حسن بھی - پھر اس نے شہد کی مکھی کو یہ وحی کی کہ پہاڑوں میں گھر بنا' درختوں میں گھر بنا' اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں گھر بنا اور اس میں سے شہد پیدا ہوتا کہ وہ لوگوں کے لیے شفا ہو - اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا - بعض کو وہ جلدی بلا لیتا ہے اور بعض دوسرے طویل عمر پاتے ہیں - وہ علم کو بھول جاتے ہیں اور اس قدر سادہ ہو جاتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں جانتے - پھر اللہ نے بعض لوگوں کو دوسروں پر رزق میں فضیلت دی - پھر بعض کو بیویاں اور لڑکے اور پوتے دیئے - ان حقائق کے باوجود بعض لوگ ایسے شرکاء کی بندگی کرتے ہیں جو زمین و آسمان میں لوگوں کو کسی قسم کا رزق دینے پر قدرت نہیں رکھتے اور اس کے ساتھ وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو مشابہ اور مماثل قرار دیتے ہیں -

احساس دلانے والے یہ دلائل جو نفس انسانی اور اس کے ماحول میں بکھرے ہوئے ہیں' اس کی طرف قرآن انسان کو متوجہ کرتا ہے تاکہ وہ اللہ کی قدرت کو پا سکیں جو ان کی ذات' ان کے رزق' ان کے کھانے' ان کے پینے اور ان کے ارد گرد ان کے افادے کی ہر چیز میں متحرک ہے - اس سبق کا خاتمہ پھر ان دو مثالوں پر ہوتا ہے جن کی طرف ہم نے اشارہ کر دیا ہے - یہ گویا انسانی عقل و وجدان کو احساس دلانے کی ایک مفید کوشش ہے' جس کے گہرے اثرات ہیں اور اس میں نفس انسانی کے رباب کے نہایت ہی حساس تاروں کو چھیڑا گیا ہے لہذا ممکن نہیں کہ نفس انسانی اس سے متاثر نہ ہو اور لبیک نہ کہے -

--- OOO ---

# درس نمبر ۱۲۱ تشریح آیات

## ۵۱ --- تا --- ۷۶

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ۝ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْــَٔــرُوْنَ ۝ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ۝ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝

"اللہ کا فرمان ہے کہ "دو خدا نہ بنالو' خدا تو بس ایک ہی ہے' لہٰذا تم مجھی سے ڈرو"۔ اسی کا ہے وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے' اور خالصتاً اسی کا دین (ساری کائنات میں) چل رہا ہے۔ پھر کیا اللہ کو چھوڑ کر تم کسی اور سے تقویٰ کرو گے؟ تم کو جو نعمت بھی حاصل ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ پھر جب کوئی سخت وقت تم پر آتا ہے تو تم لوگ خود اپنی فریادیں لے کر اسی کی طرف دوڑتے ہو۔ مگر جب اللہ اس وقت کو ٹال دیتا ہے تو یکایک تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو (اس مہربانی کے شکریے میں) شریک کرنے لگتا ہے' تاکہ اللہ کے احسان کی ناشکری کرے۔ اچھا' مزے کر لو' عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا"۔

اللہ کا یہ فرمان ہے کہ دو الہٰ نہ بناؤ۔ خدا تو بس ایک ہی ہے۔ اس بات کے لئے اسلوب نہایت ہی فیصلہ کن اور مثبت اختیار کیا گیا۔ اللہ کے بعد دو کا لفظ آیا ہے اور دوسرے فقرے میں نہایت تاکیدی مصرع کہ "اللہ تو بس ایک ہی ہے' اور ان دونوں فقروں کے بعد ایک دوسرا مصرع ہے "لہٰذا تم مجھی سے ڈرو"۔ اور میرے سوا کسی اور سے نہ ڈرو۔ کسی کے ساتھ ڈرنے کا ایسا طرز عمل اختیار نہ کرو جس طرح مجھ سے ڈرنا ہوتا ہے۔ فارھبون اس لیے کہا گیا کہ مجھ سے زیادہ سے زیادہ ڈرو۔ اسلامی نظریہ حیات میں عقیدۂ توحید ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ اسلامی نظریہ حیات قائم ہی عقیدۂ توحید پر ہے۔ جب تک توحید نہ ہو ایمان قائم ہی نہیں ہو سکتا اور ایمان کے بغیر اسلام کا نظریہ حیات قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ مسئلہ انسان کے ذہن و دماغ میں اس قدر واضح ہونا چاہئے کہ اس میں کوئی التباس نہ ہو اور کوئی پیچیدگی نہ ہو۔

اور جب خالق و مالک و الٰہ وہی ہے تو پھر اس زمین و آسمان اور کائنات کا مالک بھی وہی ہے ۔

وَلَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (۱۶ : ۵۲) "وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کا ہے"۔

وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا (۱۶ : ۵۲) "خالصتاً اسی کا دین چل رہا ہے"۔ یعنی جب سے یہ کائنات اور دین وجود میں آئے ہیں اسی کا دین مسلسل چل رہا ہے اور منعم بھی وہی اللہ ہے ۔

وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (۱۶ : ۵۳) "تم کو جو نعمت بھی حاصل ہے ' اللہ ہی کی طرف سے ہے"۔ یہ بات تمہاری فطرت کے اندر رکھی ہوئی ہے کہ جب کوئی مشکل وقت آتا ہے تو تمہاری فطرت پکار اٹھتی ہے کہ صرف اللہ کو پکارو۔ اس مشکل وقت میں پھر کوئی وہمی مددگار یا بت انسان کو یاد نہیں رہتا۔

ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ (۱۶ : ۵۳) "پھر جب کوئی سخت وقت تم پر آتا ہے تو تم لوگ خود اپنی فریادیں لے کر اسی کی طرف دوڑتے ہو"۔ اور تم اس وقت پھر چیخ چیخ کر پکارتے ہو کہ وہ تمہیں اس مشکل سے نجات دے ۔

یوں قرآن کریم اللہ تعالیٰ کو خدائی ' حاکمیت ' ملک ' قانون سازی ' نعمت اور ہدایت اور نظام زندگی دینے کا واحد سرچشمہ قرار دیتا ہے ۔ انسانی فطرت اس بات کی تصدیق یوں کرتی ہے کہ جب انسان کسی عظیم مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اس وقت انسان کی حقیقی فطرت تمام شرک کے تمام شائبوں اور آلائشوں سے پاک ہو جاتی ہے ۔ لیکن بعض لوگ پھر بھی ایسے کج دماغ ہوتے ہیں کہ جب یہ مہیب خطرہ ان سے ٹل جاتا ہے تو یہ لوگ اچانک شرک کرنے لگتے ہیں ۔ یوں وہ اللہ کے انعامات کی ناشکری کرتے ہیں اور اللہ کی ہدایات سے منہ پھیر لیتے ہیں ۔ لیکن دنیا کا یہ مختصر دور جلد ختم ہو گا اور ذرا انتظار کرو کہ آخرت میں ان کو مصیبت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۱۶ : ۵۵) "اچھا مزے کر لو عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا"۔ یہ نمونہ مخلوقات جس کے خدوخال قرآن مجید نے یہاں نقش کیے ۔

ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ إِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ (۱۶ : ۵۴) "پھر جب کوئی سخت وقت تم پر آتا ہے تو پھر تم لوگ خود اپنی فریادیں لے کر اسی کی طرف دوڑتے ہو۔ مگر جب اللہ اس وقت کو ٹال دیتا ہے تو یکایک تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے لگتا ہے ۔ اس طرز کے لوگ انسانوں میں ہمیشہ پائے جاتے ہیں ۔ مشکلات میں دل اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں کیونکہ انسان بمقتضائے فطرت اس بات کو جانتا ہے کہ اللہ کے سوا بچانے والا کوئی نہیں ہے ۔ عافیت کے

زمانے میں انسان عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اس لیے اس کا تعلق باللہ کمزور پڑ جاتا ہے ۔ اس میں کئی رنگ کی کج رویاں پائی جاتی ہیں ' ان میں سب سے بڑی کج روی اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے ' نیز انسان بعض رسوم اور اقدار کو بھی خدائی درجہ دے دیتا ہے ' اگرچہ ان کو وہ الٰہ نہیں کہتا ۔

بعض اوقات اس کا انحراف بہت ہی شدید ہو جاتا ہے اور فطرت پوری طرح بگڑ جاتی ہے کہ بعض لوگ نہایت ہی شدید حالات میں بھی اللہ کو نہیں پکارتے بلکہ وہ بعض دوسری ہستیوں کو بچاؤ ' نجات اور امداد کے لیے پکارتے ہیں ۔ ان کا بہانہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ہستیاں اللہ کے ہاں جاہ و منزلت رکھتی ہیں اور بعض اوقات بعض لوگ اس تصور کے سوا بھی دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں ۔ مثلاً بعض لوگ اولیاء اللہ کو مصیبتوں کے وقت پکارتے ہیں ۔ ان لوگوں کی یہ حرکت مشرکین جاہلیت کے شرک سے بھی بدتر ہے کیونکہ مشرکین جاہلیت کے بارے مین تو قرآن یہ کہتا ہے کہ سخت مشکلات میں یہ لوگ صرف اللہ کو پکارتے تھے ۔

## وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ

" یہ لوگ جن کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں ان کے حصے ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے مقرر کرتے ہیں " ۔

مثلاً یہ لوگ اپنے اوپر بعض جانوروں کو حرام قرار دیتے ہیں ۔ نہ ان پر سوار ہوتے ہیں اور نہ ان کا گوشت چکھتے ہیں یا بعض جانوروں کے گوشت کو مردوں کے لیے مخصوص کرتے ہیں اور عورتوں پر وہ حرام تصور ہوتے ہیں اور یہ کام وہ اپنے نام نہاد الہوں کے نام پہ کرتے ہیں ۔ ان کے ان مزعومات کی تفصیلات ہم نے سورہ انعام میں دے دی ہیں ۔ اور جن الہوں کے نام پر یہ لوگ شرک کرتے ہیں ان کے بارے میں ان لوگوں کو کوئی علم نہیں ہے ۔ یہ ان کے موروثی تصورات ہیں جو جاہلیت سے ان کے ہاں نقل ہوتے چلے آئے ہیں ۔ حالانکہ یہ نعمتیں ان کو اللہ نے دی ہیں جو وحدہ لا شریک ہے اور جن الہوں کی طرف یہ ان کو منسوب کرتے ہیں ان کے بارے میں خود ان کو کچھ علم نہیں ہے ۔ غرض یہ ان نام نہاد الہوں کے عطا کردہ انعامات نہیں ہیں بلکہ یہ انعامات اللہ وحدہ کے ہیں جس کے ساتھ یہ لوگ شریک کرتے ہیں ۔

یوں قرآن کے نظریہ حیات اور ان جاہلوں کے نظریات کے درمیان واضح فرق معلوم ہو جاتا ہے ۔ اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ رزق سب کا سب اللہ واحد کا عطا کردہ ہے ۔ اور اس کے نام سے استعمال ہونا چاہئے یہ لوگ بعض ارزاق کو ان الہوں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور ایسی ہستیوں کو الٰہ بناتے ہیں جن سے انہیں روکا گیا ہے ۔ دونوں نظریات میں یہ واضح فرق ہے ۔

لیکن آج قرآن کے ہوتے ہوئے اور عقیدۂ توحید کی وضاحت کے بعد بھی بعض لوگ اللہ کی عطا کردہ بعض اقسام رزق کو ایسی شخصیات کے نام سے منسوب کرتے ہیں جو جاہلیت کے الہوں کے مشابہ ہیں ۔ آج بھی بعض لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں کہ " یہ سید بدوی کا بکرا ہے " ۔ یہ بکرا جہاں چاہے چرے چگے کوئی اسے منع نہیں کرے گا ۔ کوئی شخص اس کو نہ کھائے گا ۔ وہ سید بدوی کے نام سے ذبح ہو گا اور اس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے گا ۔ بعض لوگ آج بھی بعض اولیاء کے نام جانوروں کی نذریں مانتے ہیں اور پھر یہ نذریں چڑھاتے ہیں ۔ یہ ان اولیائے کے نام پر ہوتی ہیں اور ان پر اللہ کا

نام ہی نہیں لیا جاتا۔ صرف مذکور ولی کا نام لیا جاتا ہے۔ اہل جاہلیت بھی اسی طرح بعض نامعلوم خداؤں کے نام پر ایسی نذریں چڑھاتے تھے۔ ایسے جانوروں کا گوشت کھانا حرام ہے اگرچہ ذبح کرتے وقت ان پر اللہ کا نام لیا جائے کیونکہ یہ اہل لغیر اللہ کے زمرے میں آتا ہے۔

تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۶﴾

"خدا کی قسم، ضرور تم سے پوچھا جائے گا کہ یہ جھوٹ تم نے کیسے گھڑ لیے تھے"۔ اللہ قسم کھا کر تاکید مزید سے یہ بات کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ ایک افتراء ہے اور اسلامی عقیدہ اور ایمان کو جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے۔ اس سے عقیدۂ توحید کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں اللہ ضرور پوچھے گا۔

---○○○---

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾

"یہ خدا کے لیے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔ سبحان اللہ! اور ان کے لیے وہ جو یہ خود چاہیں؟ جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دے؟ دیکھو کیسے برے حکم ہیں جو یہ خدا کے بارے میں لگاتے ہیں"۔

عقائد کے بارے میں انسان کا فکری انتشار اور فساد صرف عقائد کے حدود تک ہی محدود نہیں رہا کرتا بلکہ یہ زندگی کے پورے طور طریقوں اور رسم و رواج میں سرایت کر جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نظریہ زندگی کے لیے واحد محرک ہوتا ہے۔ چاہے یہ کسی کی زندگی میں یہ نظریہ بادی النظر میں محرک نظر آئے یا پس منظر میں ہو۔ دور جاہلیت کے عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ کی بیٹیاں ہیں یعنی فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ لیکن ان کی اپنی حالت یہ تھی کہ وہ اپنے گھر میں بیٹی کی ولادت کو بہت ہی برا خیال کرتے تھے۔ ان کے خیال میں بیٹیاں اللہ کے لیے ہیں اور وہ چونکہ بیٹوں کو پسند کرتے ہیں اس لیے بیٹے ان کے ہیں۔

ان کے اس نظریاتی فساد ہی کی وجہ سے ان کے ہاں یہ رسم بد پڑ گئی کہ وہ بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے یا اگر زندہ رکھ لیتے تو ان کو نہایت ہی ذلت، بدسلوکی اور کم تر درجے میں رکھتے اور ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکیوں کی وجہ سے ان کو خفت اٹھانی پڑے گی اور ان کی مالی حالت گر جائے گی کیونکہ عورتیں نہ جنگ کر سکتی ہیں اور

نہ بہت زیادہ کمائی کے لائق ہوتی ہیں۔ بعض اوقات لوٹ مار اور ڈاکے میں عورتوں کو باندیاں بنا کر لے جاتے تھے یا وہ خاندان پر بوجھ بن جاتی تھیں۔ یوں خاندان کی مالیات پر بوجھ ہوتیں' اس لیے وہ انہیں پسند نہ کرتے۔

جبکہ صحیح نظریات ان سب باتوں سے بہت دور ہیں۔ صحیح عقیدہ یہ ہے کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ سب کا رزاق ہے۔ ہر شخص کو وہی بات پیش آتی ہے جو اس کی تقدیر میں لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ انسان کو اللہ نے ذی شرف پیدا کیا ہے اور اس میں مرد عورت برابر ہیں' پھر عورت کے بغیر نہ انسانیت جاری رہ سکتی اور نہ مکمل ہو سکتی جیسا کہ اللہ کا حکم ہے۔

یہاں جاہلیت کے رسم و رواج کی خوب تصویر کشی کی جاتی ہے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (۱۶:۵۸) "جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ نہایت ہی کبیدہ خاطر ہوتا ہے"۔ یعنی حزن و ملال سے اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے غم کو چھپانے کی سعی لاحاصل کرتا ہے۔ وہ اس ولادت کو ایک مصیبت سمجھتا ہے لیکن درحقیقت وہ اللہ کا عطیہ ہوتی ہے جیسا کہ بیٹا ایک عطیہ ہوتا ہے کیونکہ انسان بذات خود رحم مادر میں نہ مرد بنا سکتا ہے اور نہ عورت پیدا کر سکتا ہے۔ نہ انسان خود جنین میں حیات پھونک سکتا ہے نہ انسان ایک سادہ نطفے سے انسان تیار کر سکتا ہے۔ اگر انسان صرف انسانی زندگی کی تخلیق پر ہی غور کرے کہ کس طرح نطفے سے لے کر ایک تندرست و توانا انسان تک وہ نشوونما پاتی ہے تو بچہ چاہے مرد ہو یا عورت ہو' وہ خوشی خوشی اس کا استقبال کرے۔ سوچنے والے انسان کے لیے تو ہر بچہ اللہ کا معجزہ ہے اور یہ معجزہ بار بار دہرایا جاتا ہے لیکن بار بار دہرائے جانے کے باوجود اس معجزے کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر انسان صحیح الفکر ہو تو وہ لڑکی کی پیدائش کی اطلاع پا کر نہ غمگین ہو اور نہ لوگوں سے چھپتا پھرے۔ اس لیے کہ لڑکی کی تخلیق میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ اس معاملے میں ایک باپ تو اس عظیم معجزہ کے صدور میں محض ایک پرزہ ہے اور بس۔

اب اللہ کی حکمت کو دیکھیں اور یہ کہ معجزۂ حیات کا صدور کس طرح ہوتا ہے؟ بادی النظر میں یہ بات نظر آتی ہے کہ انسان کو اللہ ایک مرد اور عورت کے ملاپ کے ساتھ پیدا کرتا ہے' حیات انسانی کے وجود میں آنے کے لیے جس طرح مرد ضروری ہے' اسی طرح عورت بھی ضروری ہے بلکہ مرد کے مقابلے میں عورت کی ضرورت زیادہ ہے کیونکہ بچے کی نشوونما کے لیے تو عورت زیادہ ضروری اور اہم ہے جبکہ مرد کے لیے بھی وہ جائے قرار ہے۔ تو پھر عورت کی پیدائش پر کسی کا چہرہ کیوں سیاہ ہو جاتا ہے اور پھر قوم سے کیوں بھاگتا پھرتا ہے جبکہ وہ جانتا ہے کہ حیات بشر کا تسلسل عورت کے بغیر ممکن نہیں ہے؟

ظاہر ہے کہ سوچ' نظریہ اور عقیدے کا انحراف اور فساد معاشرے کے اندر رسم و رواج اور لوگوں کے طرز عمل پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۱۶:۵۹) "دیکھو کیسے برے حکم ہیں جو یہ لگاتے ہیں"۔ اور ان کے یہ فیصلے اور اندازے کس قدر غلط ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی سوسائٹی کے اجتماعی تصورات اور سوسائٹی کی اجتماعی اخلاقیات کو درست کرنے کے لیے اسلامی نظریہ حیات کی اہمیت کیا ہے؟ نیز اسلام نے عورت کے بارے میں انسانی نقطہ نظر میں کس قدر عظیم انقلاب برپا کیا ہے اور عورت کو کس قدر شرف عطا کیا۔ نہ صرف عورت کو بلکہ پوری انسانیت کو شرف عطا کیا گیا ہے۔ کیونکہ دور جاہلیت میں نہ یہ کہ صرف عورت ذلیل تھی بلکہ انسانیت بذات خود ذلیل تھی۔ کیا یہ بات ظاہر نہیں ہے کہ عورت انسانیت کا اہم عنصر ہے اور اس کی توہین بذات خود انسانیت کی توہین ہے۔ اس کو زندہ درگور کرنا انسانیت کا دفن کرنا ہے۔ کیا یہ فعل زندگی کے ایک اہم حصے کو ضائع کرنا نہ تھا اور اللہ کی حکمت تخلیق کے ساتھ جنگ نہ تھی۔ اللہ کی حکمت تخلیق تو یہ ہے کہ نہ صرف انسان بلکہ ہر زندہ چیز کی تخلیق نر اور مادہ سے ہو۔

جب بھی انسانیت صحیح عقائد اور صحیح نظریہ حیات سے منحرف ہوئی ہے' اس کے اخلاق' اس کے رسم و رواج کسی نہ کسی جاہلیت میں ڈوب گئے۔ آج دور جدید میں بھی اعلیٰ ترقیات کے باوجود دنیا بیسویں صدی کی جاہلیت کا شکار ہوگئی ہے۔ آج بھی لڑکی کی پیدائش پر اس خوشی اور مسرت کا اظہار نہیں کیا جاتا' جس طرح لڑکے کی پیدائش پر خوشی اور مسرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ بھی جاہلیت کے تصورات و رسومات میں سے ایک رسم ہے۔ اور یہ اس لیے پائی جاتی ہے کہ اسلامی نظریہ حیات ہماری نظروں میں صاف اور ستھرا نہیں ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ آج کل جاہلیت جدیدہ کے پرستار اشاروں کنایوں میں اسلامی عقائد و نظریات پر انگلی اٹھاتے ہیں کہ اسلام میں عورت کو یہ مقام دیا گیا ہے اور یہ کہ اسے آزادی نہیں ہے۔ یہ لوگ جاہلیت جدیدہ سے متاثر ہو کر اسلام پر اعتراضات کرتے ہیں لیکن ان لوگوں کے پیش نظر وہ عظیم انقلاب نہیں ہے جو عورت کے بارے میں اسلامی نظریات نے آج سے صدیوں قبل برپا کیا۔ عورت کے بارے میں لوگوں کی سوچ بدل دی اور اسے بلند رتبہ دیا۔ عورت کے بارے میں اسلام نے یہ انقلابی فکر محض دنیاوی ضرورت یا اجتماعی تقاضے یا اقتصادی ضرورت کے تحت نہیں دی تھی بلکہ یہ فکر و نظر کی تبدیلی' اس اسلامی نظریہ حیات کی وجہ سے پیدا کی گئی جس نے پوری انسانیت کو شرف فضیلت بخشا۔ پوری انسانیت کی تکریم کی وجہ سے عورت کو بھی شرف ملا۔ یہ قرار دیا گیا کہ عورت حصہ حیات اور حصہ انسانیت ہے' لہٰذا البشریت کے دو حصوں مرد و عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

اسلامی نظریہ حیات اور جاہلی نظریہ حیات کے درمیان فرق کیا ہے؟ یہ فرق یوں ہے کہ اسلامی معاشرہ ایک ذمہ دار اور جوابدہ معاشرہ ہوتا ہے اور وہ آخرت کی جوابدہی پر ایمان رکھتا ہے جبکہ جاہلی معاشرہ وہ ہے جو آخرت پر یقین ہی نہیں رکھتا۔ وہ ہر چیز کی قدر و قیمت اسی دنیا کے حوالے سے طے کرتا ہے۔ لہٰذا اعلیٰ عقیدہ اور نظریہ کے مظاہر بھی اعلیٰ ہوتے ہیں۔

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ۶۰ ع

۱۳

"بری صفات سے متصف کیے جانے کے لائق تو وہ لوگ ہیں جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے۔ رہا اللہ تو اس کے لیے

سب سے برتر صفات ہیں' وہی تو سب پر غالب اور حکمت میں کامل ہے''۔

یہاں شرک کے مسئلے کو مسئلہ انکار آخرت سے ملا دیا جاتا ہے اس لیے کہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہے اور دونوں میں ایک ہی قسم کی گمراہی ہے۔ انسانی شعور میں شرک اور انکار آخرت باہم مخلوط ہوتے ہیں اور انسانی شخصیت اور انسانی معاشرے پر ان کے اثرات بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ جب ہم ان لوگوں کو بات سمجھائیں جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے تو وہ ہر پہلو کے اعتبار سے برے لوگ نظر آئیں گے۔ اپنے شعور' اپنے طرز عمل اور اپنے عقائد کے اعتبار سے' غرض وہ ہر پہلو سے برے ہوں گے۔ یہ لوگ زمین و آسمان میں ہر جگہ برے لوگ ہوں گے۔ للہ کی اگر ہم کوئی مثال دیں گے تو وہ ہر اعتبار سے ایک اعلیٰ مثال ہوگی۔ للہ کی ذات اور کسی دوسری شخصیت میں کوئی مماثلت ممکن ہی نہیں ہے لہٰذا چھوڑ دو ان لوگوں کو جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۱۶ : ۶۰) ''وہی تو سب پر غالب اور حکمت میں کامل ہے''۔ وہ نہایت ہی زبردست طاقت والا ہے۔ اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ وہی حکیم ہے' وہ ہر چیز کو اپنے مقام پر رکھتا ہے تاکہ ہر پرزہ اپنی صحیح جگہ پر اس کی حکمت' اور اس کے قانون کے مطابق صحیح انداز میں کام کر سکے۔

وہ تو اس قدر طاقتور ہے کہ اگر لوگوں کی بدعملی اور ان کے ظلم کی وجہ سے ان کو فوراً پکڑ لے تو ان کی پوری دنیا کو تہ و بالا کر دے۔ لیکن اس کی اسکیم کا تقاضا یہ تھا کہ ان کو قدرے مہلت دی جائے کیونکہ وہ عزیز و حکیم ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِم مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِن دَابَّةٍ وَلَٰكِن يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٦١﴾

''اگر کہیں اللہ لوگوں کو ان کی زیادتی پر فوراً ہی پکڑ لیا کرتا تو روئے زمین پر کسی متنفس کو نہ چھوڑتا۔ لیکن وہ سب کو ایک وقت مقرر تک مہلت دیتا ہے' پھر جب وہ وقت آجاتا ہے تو اس سے کوئی ایک گھڑی بھر بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا''۔

اللہ ہی ہے جس نے اس تمام مخلوق کو پیدا کیا ہے' خصوصاً انسانوں کو۔ پھر ان پر وسیع انعامات کیے' لیکن انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے کہ وہ ظلم بھی کرتا ہے اور فساد فی الارض کی مرتکب بھی ہوتا ہے اور اس کا سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ وہ عقیدۂ توحید سے انحراف کر کے شرک کرتا ہے۔ پھر دوسرا ظلم یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے پر بھی ظلم کرتے ہیں۔ پھر وہ دوسری مخلوقات کو بھی اذیت دیتے ہیں۔ لیکن ان تمام مظالم کے باوجود اللہ تعالیٰ صبر کرتا ہے' ان پر رحم کرتا ہے اور ان کو مہلت دیتا ہے۔ لیکن آخر کار ان کو یونہی چھوڑ نہ دیا جائے گا بلکہ ان سے اس مہلت کے اختتام پر اس سے حساب لیا جائے گا۔ اللہ کی قوت حکیمانہ ہے اور اس کی رحمت عادلانہ ہے لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ جب مہلت ملتی ہے تو وہ غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اللہ کی رحمت اور حکمت کو صحیح طرح نہیں سمجھتے۔ یہاں تک کہ اللہ کی قوت اور اس کی صفت عدل

ان کو گرفت میں لے لیتی ہے۔ اور یہ کام اس وقت ہوتا ہے جب مہلت عمل ختم ہو جاتی ہے۔ اللہ نے یہ مہلت کیوں دی؟ اس لیے کہ وہ رحیم ہے۔

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۱۶ : ۶۱) "پھر جب وہ وقت آ جاتا ہے تو پھر اس سے ایک گھڑی بھر بھی کوئی آگے پیچھے نہیں ہوتا"۔

لیکن ان لوگوں کی سوچ و طرز عمل کا تعجب انگیز پہلو یہ ہے کہ یہ اللہ کی طرف وہ بات منسوب کرتے ہیں جسے وہ خود اپنی طرف منسوب کرنا پسند نہیں کرتے۔ اور پھر بھی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کامیاب ہوں گے اور ان کے ساتھ اچھا اور بھلائی کا سلوک ہو گا اور یہ اچھا سلوک ان کی اس کج فکری اور کج روی پر ہو گا۔ لیکن قرآن کریم فیصلہ کن انداز میں بتا دیتا ہے کہ ان کا انجام کیا ہو گا؟ یقیناً اس سے مختلف ہو گا جو یہ لوگ سوچتے ہیں۔

## وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۚ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾

"آج یہ لوگ وہ چیزیں اللہ کے لیے تجویز کر رہے ہیں جو خود اپنے لیے انہیں ناپسند ہیں، اور جھوٹ کہتی ہیں ان کی زبانیں کہ ان کے لیے بھلا ہی بھلا ہے۔ ان کے لیے تو ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے دوزخ کی آگ۔ ضرور یہ سب سے پہلے اس میں پہنچائے جائیں گے"۔

انداز بیان یوں ہے کہ گویا ان کی زبانیں بذات خود مجسمہ کذب ہیں یا یہ جھوٹ کی تصویر ہیں۔ بذات خود ان کی زبان کے لوتھڑے سے جھوٹ ٹپکتا ہے۔ جیسا کہ ضرب المثل ہے "اس کا قد خوبصورتی کی تعریف کرتا ہے۔ اور اس کی آنکھ حور کی مدح خواں ہے"۔ گویا اس کا قد ہی مظہر ہے کہ وہ خوبصورت اور سمارٹ ہے اور اس کی آنکھ اسی طرح ہے جس طرح حور عین۔ اسی انداز بیان کے مطابق کہا گیا کہ "ان کی زبانیں جھوٹ کی تعریف کر رہی ہیں"۔ گویا وہ مجسمہ جھوٹ ہیں کیونکہ یہ زبانیں ہر وقت جھوٹ بولتی رہتی ہیں اس لیے وہ بذات خود جھوٹ ہیں۔

ان کا جھوٹ کیا ہے؟ یہ دعویٰ کہ ان کے لیے کوئی اچھا ہی انجام ہے لیکن عقیدہ یہ ہے کہ جو بات خود اپنے لیے پسند نہیں کرتے وہ خدائے کبریا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ البتہ وہ سچائی جس سے وہ دوچار ہونے والے ہیں۔ آیت کی تکمیل سے قبل ہی ان کو بتا دی جاتی ہے اور وہ لاریب اور بلاشبہ اس سے دوچار ہوں گے، وہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی سزا آگ ہے اور وہ بغیر کسی تاخیر کے سب سے پہلے اس میں ڈالے جائیں گے۔ مفرطون کے معنی ہیں معجلون، اور مفرط وہ شخص ہوتا ہے جسے سب سے پہلے بھیجا جائے بغیر کسی تاخیر کے۔

---()()()---

اے پیغمبر یہ لوگ پہلے ظالم اور تجاوز کرنے والے نہیں ہیں اور یہ سب سے پہلے ناشکرے نہیں ہیں۔ ان سے پہلے بھی تاریخ عالم میں بہت سے بے راہ رو اور ناشکرے گزرے ہیں۔ شیطان نے ان کو گمراہ کیا اور ان کے لیے ان کے

نظریات اور اعمال کو خوبصورت بنایا۔ شیطان ان کا نگران بن گیا' اور ان کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتا پھراتا رہا اور تم سے پہلے بھی اللہ نے ایسے لوگوں کو شیطانی چنگل سے چھڑانے کے لیے رسول بھیجے تاکہ وہ ان کو سچ اور حق بتا دیں اور ان اختلافات کو اچھی طرح حل کر دیں جن میں ان کے درمیان اختلاف واقع ہو گیا تھا تاکہ یہ حل ان کے لیے ہدایت و رحمت کا باعث ہو' خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو ایمان لے آئیں۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾ وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾

"خدا کی قسم' اے نبی' تم سے پہلے بھی بہت سی قوموں میں ہم رسول بھیج چکے ہیں (اور پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے کہ) شیطان نے ان کے برے کرتوت انہیں خوشنما بنا کر دکھائے (اور رسولوں کی بات انہوں نے مان کر نہ دی)۔ وہی شیطان آج ان لوگوں کا بھی سرپرست بنا ہوا ہے اور یہ دردناک سزا کے مستحق بن رہے ہیں۔ ہم نے یہ کتاب تم پر اس لیے نازل کی ہے کہ تم ان اختلافات کی حقیقت ان پر کھول دو جن میں یہ پڑے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب رہنمائی اور رحمت بن کر اتری ہے ان لوگوں کے لیے جو اسے مان لیں"۔

پس اس آخری رسول اور اس آخری کتاب کا کام یہ ہے کہ وہ ان تمام مسائل کا فیصلہ کر دے جن میں امم سابقہ اور کتب سابقہ کے ماننے والوں کے درمیان اختلافات واقع ہو گئے تھے اور وہ طائفہ طائفہ اور فرقہ فرقہ ہو گئے تھے کیونکہ اصل حقیقت تو عقیدۂ توحید ہے اور عقیدۂ توحید کے اوپر جو شبہات' شرک اور تشبیہات کے رنگ چڑھ گئے وہ سب باطل ہیں۔ قرآن کریم آیا ہی اس لیے ہے کہ وہ ان تمام باطل تصورات کو صاف کر کے رکھ دے اور ان لوگوں کے لیے باعث رحمت و ہدایت ہو جن کے قلوب ایمان و ایقان کے لیے کھلے ہوں اور وہ گوہر ایمان کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔

---ooo---

یہاں قرآن کریم نے اللہ کی الوہیت اور حاکمیت پر وہ دلائل دینے شروع کر دیے ہیں جو اس کائنات میں بالکل عیاں ہیں۔ پھر ان صفات اور صلاحیتوں کو بیان کیا گیا ہے جو اللہ نے انسان کی ذات کے اندر ودیعت کر رکھی ہیں اور پھر وہ انعامات و احسانات بیان کیے ہیں جو اللہ نے اس انسان پر کیے ہیں' وہ اس کے اردگرد موجود ہیں اور اللہ کے سوا یہ نعمتیں کوئی اور ذات نہ پیدا کر سکتی ہے' نہ فراہم کر سکتی ہے۔

اس سے قبل والی آیت میں کتاب الٰہی کے نزول کی بات ہوئی تھی اور یہ اللہ کی نازل کردہ کتابوں میں سے آخری کتاب ہے جو بھلائی پر مشتمل ہے اور اس میں انسان کی روحانی زندگی کا سامان ہے' چنانچہ اس مناسبت سے یہاں آسمانوں سے بارشیں برسانے کا ذکر کیا گیا جس میں انسانوں کی جسمانی زندگی کا سامان ہے۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿٦٥﴾

”(تم ہر برسات میں دیکھتے ہو کہ) اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور یکایک مردہ پڑی ہوئی زمین میں اس کی بدولت جان ڈال دی ۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے سننے والوں کے لیے“ ۔

پانی تو ہر چیز کی زندگی کا سامان ہے ۔ قرآن مجید اسے پورے کرۂ ارض کے لیے علی العموم سامان حیات قرار دیتا ہے ' جو چیز بھی اس کرۂ ارض کی پشت پر ہو اور اللہ جو ہر چیز کو حالت مردنی سے زندگی کی حالت میں لاتا ہے وہی ہے جو الٰہ ہونے کے لائق و سزاوار ہے ۔

ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ (۱۶ : ۶۵) ”یقیناً اس میں ایک نشانی ہے سننے والوں کے لیے“ تاکہ وہ جس چیز کو سنیں اس پر غور کریں اور سمجھیں ۔ یہی اصل مسئلہ ہے یہ کہ دلائل الوہیت اور دلائل حیات بعد الموت جس کا قرآن کریم بار بار تذکرہ کرتا ہے اور لوگوں کو اس طرف متوجہ کرتا ہے اس کائنات میں جابجا بکھرے پڑے ہیں ' لیکن یہ آیات و معجزات ان لوگوں کے لیے ہیں جو سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں اور پھر مزید غور و فکر کرتے ہیں ۔ مویشیوں اور جانوروں کے اندر بھی ایک نصیحت آموز چیز موجود ہے ۔ یہ خالق کائنات کی عجیب تخلیق ہے اور یہی ایک دلیل اللہ العالمین کی کبریائی کے لیے بس ہے ۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ
بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَاۗىِٕغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿٦٦﴾

”اور تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے ۔ ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں ' یعنی خالص دودھ ' جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے“ ۔

یہ دودھ ' جسے ہم حیوانات کے پستانوں سے نچوڑتے ہیں ' یہ کس چیز سے پیدا ہوتا ہے ؟ یہ گوبر اور خون کے بیچ میں سے نکلتا ہے ۔ فرث اس محصول کو کہتے ہیں جو ہضم کے بعد جگالی کرنے والے جانور کے اوجھ میں رہ جاتا ہے ۔ نیز ہضم کے بعد جو محلول رہ جاتا ہے اور اسے آنتیں خون کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہیں اسے بھی فرث کہا جاتا ہے ۔ یہ خون جسم کے ہر خلیے میں گردش کرتا ہے ۔ یہ خون جب جانور کی کھیری میں دودھ کے غدود میں جاتا ہے تو یہ دودھ کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ یہ قدرت کا عجوبہ ہے کہ یہ خون دودھ بن جاتا ہے ۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ محلول اور یہ خون کس طرح دودھ کی شکل اختیار کرتے ہیں ۔

پھر ہر قسم کی خوراک کا خلاصہ خون کی شکل کس طرح اختیار کر لیتا ہے ۔ پھر اس خون کی قوت میں سے جسم کے ہر

خلیے کو اس کی ضرورت کے مطابق غذا کا فراہم ہونا ایک ایسا عمل ہے جو نہایت ہی پیچیدہ اور تعجب انگیز ہے۔ یہ عمل جسم میں ہر سیکنڈ کے حساب سے تکمیل پاتا ہے۔ اس طرح جسم میں جلنے کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ ہر سیکنڈ میں' انسانی جسم کی اس پیچیدہ مشینری میں تخریب و تعمیر کا یہ عمل جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک جسم سے روح پرواز نہیں کر جاتی۔ کوئی انسان جس کا شعور زندہ ہو' وہ ان عجیب عملیات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا' جن میں جسم انسانی کی اس عجیب مشینری کا ہر ذرہ خالق کا ثناخواں نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسی عجیب مشینری ہے کہ انسان کی بنائی ہوئی پیچیدہ سے پیچیدہ مشینری اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ انسان کے لیے جسم انسانی کے لاتعداد خلیوں میں سے ایک خلیہ بھی بنانا ممکن نہیں۔

ہم نے جسم انسانی میں خوراک کے ہضم' اس کے خون کی شکل اختیار کرنے اور پھر جلنے اور ختم ہونے کے عمل کا ایک عام جائزہ لیا ہے۔ اس جسم کے اندر ایسے ایسے کام ہو رہے ہیں کہ اگر ان کا سائنسی مطالعہ اور ملاحظہ کیا جائے تو عقل دنگ رہ جائے۔ خود جسم انسانی کے خلیوں میں سے ایک خلیے کا مطالعہ اور اس پر غور و فکر بھی نہ ختم ہونے والی سوچ عطا کرتا ہے۔

ماضی قریب تک یہ تمام عجائبات راز ہی رہے' اور یہ حقیقت جس کا ذکر یہاں قرآن مجید کر رہا ہے کہ دودھ گوبر اور خون کے درمیان سے نکلتا ہے' انسان اس سے ماضی قریب تک واقف نہ تھا۔ ادوار سابقہ میں انسان نہ اس کا تصور کر سکتا تھا اور نہ ہمارے دور کی طرح اس کا دقیق سائنسی مطالعہ کرنے کے قابل تھا۔ اس بارے میں کوئی انسان نہ شک کر سکتا ہے اور نہ بحث کر سکتا ہے۔ اس قسم کے پیچیدہ سائنسی حقائق میں سے کسی ایک حقیقت کی طرف قرآن کریم کا واضح طور پر اشارہ کرنا ہی اس بات کے لیے کافی ثبوت ہے کہ قرآن کریم وحی الٰہی پر مشتمل ہے کیونکہ یہ وہ حقیقت ہے جس کا سائنٹیفک علم کسی انسان کو بھی اس دور میں نہ تھا۔

لیکن ان خالص سائنسی حقائق کو اگر ایک طرف بھی چھوڑ دیں تو بھی قرآن کریم میں ایسے دلائل و خصائص موجود ہیں جو اس کے وحی الٰہی ہونے کا اثبات کرتے ہیں۔ ہاں اس قسم کی سائنسی حقیقتوں میں سے ایک واضح حقیقت سامنے آ جانا مخالفین اور معاندین کے منہ کو بند کرنے کے لیے کافی ہے۔

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾

"(اسی طرح) کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں سے بھی ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں جسے تم نشہ آور بھی بنا لیتے ہو اور پاک رزق بھی۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے عقل سے کام لینے والوں کے لیے"۔

یہ پھل جو اس تروتازگی اور نباتاتی حیات سے پیدا ہوتے ہیں جو آسمانوں سے پانی برسنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے' ان سے تم شراب بناتے ہو (اس وقت تک شراب حرام نہ ہوئی تھی) اور رزق حسن بناتے ہو۔ اس آیت میں بہرحال

اشارہ کر دیا گیا ہے کہ رزق حسن شراب سے کوئی الگ چیز ہے اور یہ کہ شراب رزق حسن نہیں ہے۔ یہ دراصل تمہید تھی اس حکم کے لیے جو بعد میں تحریم شراب کے بارے میں نازل ہوا۔ اس آیت میں صرف واقعاتی تجزیہ ہے کہ کھجوروں اور انگور اللہ نے پیدا کیے اور تم اس سے یہ یہ مصنوعات تیار کرتے ہو' یہاں کسی چیز کی حلت اور حرمت سے بہرحال بحث نہیں ہے اگرچہ یہ حرمت کے لیے تمہید ضرور ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۱۶: ۶۷) "یقیناً اس میں ایک نشانی ہے عقل سے کام لینے والوں کے لیے"۔ لہذا عقل مند لوگ جب سمجھ لیتے ہیں تو وہ یہی فیصلہ کرتے ہیں کہ بندگی کا سزاوار وہی خالق ہے جو یہ چیزیں پیدا کرتا ہے۔

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾

"اور دیکھو' تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں' اور درختوں میں' اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں' اپنے چھتے بنا' اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس' اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ۔ اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں شفا ہے لوگوں کے لیے۔ یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں"۔

شہد کی مکھی اس الہام کے مطابق کام کرتی ہے جو خالق نے تخلیق کے وقت اس کی فطرت میں رکھ دیا ہے۔ یہ بھی وحی کی ایک قسم ہے اور یہ مکھی اس کے مطابق عمل پیرا ہے۔ یہ مکھیاں جس پیچیدہ انداز میں اپنا کام جاری رکھتی ہیں' اسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ کس انجینئرنگ سے اپنا چھتہ تیار کرتی ہیں۔ وہ باہم تقسیم کار کس طرح کرتی ہیں اور پھر وہ عسل مصفیٰ کو کس طرح علیحدہ کرتی ہیں؟

یہ اپنی فطرت کے مطابق گھر بناتی ہیں' پہاڑوں میں' درختوں کی شاخوں میں' لوگ دیواروں پر جو بوٹے چڑھاتے ہیں ان میں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ان کی فطرت کے مطابق زمین کے اندر راستے ہموار کیے ہیں کہ یہ عسل مصفیٰ شفاء للناس ہے۔ بعض ڈاکٹروں نے اس پر تحقیق کی ہے اور یہ تحقیق نہایت ہی فنی اندازکی ہے۔ لیکن ایک مسلم کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کریم کی اس آیت کی رو سے وہ شفاء للناس ہے۔ حضور اکرمؐ سے بعض احادیث میں بھی عسل مصفیٰ کی ان خصوصیات کی طرف اشارہ ہے۔

بخاری شریف نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کی ہے کہ ایک شخص رسول اللہؐ کے پاس آیا اور کہا' حضورؐ

میرے بھائی کو اسہال ہو رہے ہیں تو حضورؐ نے فرمایا' اسے شہد پلا دو۔ تو اس نے اسے شہد پلا دیا۔ اس کے بعد وہ پھر آیا اور کہا' حضورؐ میں نے اسے شہد پلایا مگر اس سے تو اس کے اسہال اور زیادہ ہوگئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا جاؤ اور اسے شہد پلاؤ۔ وہ گیا اور اس نے اور شہد پلایا۔ پھر آیا اور کہا' حضورؐ وہ تو اور بھی زیادہ ہو رہا ہے تو حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ نے تو سچ کہا ہے تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹ بول رہا ہے' لہٰذا جاؤ اور اسے مزید شہد پلاؤ۔ وہ شخص گیا اور اس نے بھائی کو مزید شہد پلایا اور وہ تندرست ہو گیا۔

اس حدیث شریف کو پڑھ کر انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے کہ ایک رسول ایمان و ایقان کے کس اعلیٰ مقام پر ہوتا ہے۔ مریض کا بھائی بار بار اطلاع کرتا ہے کہ مرض میں اضافہ ہی ہو رہا ہے لیکن حضور اکرمؐ وہی علاج تجویز کرتے ہیں کیونکہ قرآن نے اسے شفاء کہا ہے۔ آخر کار قرآن کی بات عملاً بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ان تمام مسائل میں جن کا فیصلہ قرآن نے کر دیا ہے اسی طرح کے ایمان و ایقان کا اظہار کریں۔ اگر چہ بظاہر صورت حالات قرآن کے حکم کے خلاف ہی کیوں نہ نظر آئے۔ کیونکہ ظاہری حالات کے مشاہدے میں غلطی ہو سکتی ہے لیکن قرآنی حقائق کبھی غلط نہیں ہو سکتے اور آخر کار قرآنی حقائق ہی سچے ثابت ہوتے ہیں۔

اب ذرا طرز کلام کی فصاحت و مناسبت پر غور کریں۔ آسمانوں سے پانی اترنے کی نعمت' گوبر اور خون کے درمیان سے بغیر دودھ کی پیدائش' کھجوروں اور انگوروں سے شکر و شراب کی پیدائش' شہد کی مکھی سے مختلف رنگوں کا شہد' یہ تمام مشروبات ہیں اور ان مشروبات کا اخراج ایسے اجسام سے ہو رہا ہے جو ان سے شکل و جنس میں بھی مختلف ہیں۔ چونکہ یہاں ذکر مشروبات کا تھا اس لیے جانوروں کے ضمن میں صرف دودھ کا ذکر کیا گیا کیونکہ وہ مشروب ہے تاکہ مضمون و مفہوم آپس میں متناسب ہو جائیں۔ آگے دوسرا سبق آ رہا ہے۔ اس میں انعام کے ضمن میں چمڑوں' بالوں اور اون کا بھی ذکر ہے کیونکہ وہاں خیموں اور گھروں کا مضمون ہے لہٰذا وہاں حیوانات کی ان چیزوں کا بھی ذکر کیا گیا جو اس مضمون اور منظر کے ساتھ متناسب تھیں۔ قرآن مجید کے اسلوب کلام کا یہ ایک بہت ہی اہم فنی پہلو ہے کہ وہ الفاظ کے ساتھ معنوی ہم آہنگی کا بھی خیال رکھتا ہے۔

---○○○---

اب روئے سخن جانوروں' درختوں' پھلوں' شہد کی مکھیوں' شہد کے انعامات کے مقابلے میں نفس انسانی کے قریب تر' انسانی شخصیت کی گہرائیوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے موضوع کی طرف مڑ جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف مراحل' انسان کی عمر' اس کا رزق' اس کا جوڑا' بچے اور پوتے وغیرہ جو انسانی دلچسپی کے مخصوص ترین موضوعات ہیں۔ انسان ایسی باتوں سے بہت ہی متاثر ہوتا ہے کیونکہ یہ اس کی سرگرمیوں اور دلچسپیوں کے میدان ہیں۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى
۹ اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ وَاللّٰهُ ع ۵
۱۵

فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ
عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۗ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَ اللّٰهُ
جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَ حَفَدَةً
وَّ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۗ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ
يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ
شَيْـًٔا وَّ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾

"اور دیکھو' اللہ نے تم کو پیدا کیا' پھر وہ تم کو موت دیتا ہے' اور تم میں سے کوئی بد ترین عمر کو پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے ۔ حق یہ ہے کہ اللہ ہی علم میں بھی کامل ہے اور قدرت میں بھی ۔

اور دیکھو اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت عطا کی ہے ۔ پھر جن لوگوں کو یہ فضیلت دی گئی ہے وہ ایسے نہیں کہ اپنا رزق اپنے غلاموں کی طرف پھیر دیا کرتے ہوں تاکہ دونوں اس رزق میں برابر کے حصہ دار بن جائیں ۔ تو کیا اللہ ہی کا احسان ماننے سے ان لوگوں کو انکار ہے؟"

اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے تمہاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور اسی نے ان بیویوں سے تمہیں بیٹے پوتے عطا کیے اور اچھی اچھی چیزیں تمہیں کھانے کو دیں ۔

پھر کیا یہ لوگ (یہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی) باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کے احسان کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر ان کو پوجتے ہیں جن کے ہاتھ میں نہ آسمانوں سے انہیں کچھ بھی رزق دینا ہے نہ زمین سے اور نہ یہ کام وہ کر ہی سکتے ہیں" ۔

ان حساس موضوعات میں سے پہلا موضوع انسانی زندگی' انسانی موت اور زندگی کے مراحل کے بارے میں ہے اور یہ تمام انسانوں کی دلچسپی کا محبوب موضوع ہے ۔ انسانی زندگی پر غور کرنے سے انسان یقیناً بعض اوقات سخت سے سخت دل انسان بھی نرمی کا احساس کر لیتے ہیں اور انسان سوچنے لگتا ہے کہ اس پر ہونے والے تمام انعامات تو صرف اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور جب انسان کے دل میں ان انعامات کے زوال کی بات ڈال دی جائے تو فطرت انسانی کے اندر ودیعت کردہ خدا خوفی کا احساس 'تقویٰ کا وجدان اور اس زندگی کے عطا کرنے والے کی طرف میلان پیدا ہو سکتا ہے ۔ خصوصاً بڑھاپے کی صورت حالات میں جب انسان ارذل العمر میں داخل ہوتا ہے وہ علوم کو بھولنا شروع کر دیتا ہے اور دوبارہ ایک بچے کی طرح سادہ' عاجز اور انجان ہو جاتا ہے ۔ جب انسان ایسے حالات پر سنجیدگی سے غور کرے تو وہ اپنی موجودہ جوانی' قوت' علم اور عزت و وقار پر سوچے تو وہ کافی حد تک راہ راست پر آسکتا ہے ۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ( ١٦ : ٧٠ ) "بے شک اللہ علیم و قدیر ہے"۔ یہ نتیجہ یہاں اس لیے بتایا گیا کہ انسان کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہئے کہ مکمل ازلی اور ابدی علم صرف اللہ کا ہے اور حقیقی ازلی اور ابدی قدرت بھی صرف اللہ کے پاس ہے۔ انسان کا علم بھی محدود ہے اور زوال پذیر بھی ہے۔ انسان کی قدرت بھی محدود ہے اور قابل زوال بھی ہے' اس کے علم اور اس کی قدرت میں بھی جزئی علم و قدرت۔

ان آیات میں دو سرا یخ انسان کے وسائل رزق سے متعلق ہے۔ رزق کے میدان میں ایک فرد اور دوسرے فرد کے درمیان تفاوت کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ قرآن کریم اس بات کی تصریح کرتا ہے کہ رزق کے معاملے میں لوگوں کے درمیان فرق ہے اور اللہ نے بعض کو بعض پر برتری دی ہے اور یہ برتری بھی سنت الٰہیہ کے تابع ہے۔ مراتب میں یہ تفاوت بھی محض اتفاقی نہیں ہے بلکہ اس میں بھی اللہ کی گہری حکمت پوشیدہ ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص بڑا عالم' مفکر اور عقلمند ہوتا ہے لیکن وسائل رزق اور ان میں ترقی کی صلاحیتیں اس میں محدود ہوتی ہیں کیونکہ دوسرے شعبوں میں اللہ نے ایسے لوگوں کو قیمتی صلاحیتیں دی ہوئی ہوتی ہیں۔

اس کے مقابلے میں ایک دوسرا انسان بہت ہی سادہ' باغی اور جاہل نظر آئے گا لیکن حصول رزق اور اس کی ترقی کے میدان میں یہ شخص بہت ہی ماہر ہو گا۔ پھر لوگوں کے درمیان صلاحیتوں میں تفاوت اور تنوع پایا جاتا ہے۔ بعض اوقات لوگ غور نہیں کرتے اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ رزق کو صلاحیتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے' حالانکہ حصول رزق بھی صلاحیتوں میں سے ایک صلاحیت ہوتی ہے۔ نیز بعض اوقات رزق کی فراوانی اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہوتی ہے جبکہ رزق کی تنگی میں بھی بعض اوقات کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے اور اس حکمت کی بنا پر اللہ بعض لوگوں کو آزماتا ہے۔ بہرحال رزق اور وسائل رزق میں تفاوت ایک ایسی حقیقت ہے جو موجود ہے اور اس کا مدار صلاحیتوں کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ تاہم رزق کا اختلاف صلاحیتوں کے مطابق تب ہو گا جب معاشرے میں مواقع حصول رزق پر ظالمانہ کنٹرول اور مصنوعی تفاوت نہ ہو جس طرح آج کل کے فساد زدہ معاشروں میں ہے۔ اس آیت میں اشارہ اس معاشرے کی طرف ہے جو حضورؐ کے وقت دور جاہلیت میں موجود تھا۔ اس صورت حال کو ایک مثال کے طور پر پیش کر کے اللہ تعالیٰ مشرکانہ افکار کے نظام عقائد میں سے ایک عقیدے کی تصحیح فرماتا ہے۔ مکہ کے بت پرستانہ معاشرے میں یہ رواج تھا' جس طرح ہم نے اس سے قبل اس کی تشریح کر دی ہے کہ یہ لوگ اللہ کے دیئے ہوئے اموال میں سے بعض چیزوں کو بتوں کے لیے مخصوص کر دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دیکھو' تمہارے بھی غلام ہیں' جس طرح تم اللہ کے غلام ہو' (یاد رہے کہ اس وقت کے جاہلی معاشرے میں غلامی کا ادارہ موجود تھا)۔ تم ہرگز اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ یہ غلام تمہاری کمائی میں تمہارے ساتھ برابر کے شریک ہو جائیں تو اللہ کس طرح یہ بات پسند کرے گا کہ اس کی مخلوقات و مملوکات میں سے بعض چیزیں ان لوگوں کی ہو جائیں جنہیں ناحق اللہ کی خدائی کے امور میں شریک کر دیا گیا ہے۔

اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ( ١٦ : ٧١ ) "کیا یہ اللہ کے انعامات و احسانات کا انکار کرتے ہیں"۔ اللہ نے تو ان پر انعامات کی بارش کر دی اور انہوں نے مقابلے میں دوسروں کو اللہ کا شریک ٹھہرا لیا۔ حالانکہ ان کی جانب سے شکر کا واحد طریقہ یہ تھا کہ وہ اللہ وحدہ کو الٰہ سمجھتے۔

یہ تیسری احساس جگانے والی تنبیہ نفس انسانی 'اس کے جوڑے 'بیٹوں' پوتوں اور دوسری اولاد کے بارے میں ہے ۔سب سے پہلے ذکر مخالف جنس پر مشتمل جوڑنے اور ان کے باہم زندہ تعلق کے بارے میں ہے ۔

جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا (۱۶ : ۷۲) "جس نے تمہارے لیے تمہاری ہی ہم جنس بیویاں بنائیں"۔ وہ تمہارے ہی نفس کا حصہ ہیں 'وہ تمہارا ہی حصہ ہیں 'یہ تم سے کوئی کم تر درجے کی مخلوق نہیں ہے کہ تمہیں عورتوں کی پیدائش سے شرم آتی ہے ۔

وَّ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَزْوَاجِکُمْ بَنِیْنَ وَحَفَدَۃً (۱۶ : ۷۲) "اور اسی نے ان بیویوں سے تمہیں بیٹے اور پوتے عطا کیے"۔ انسان فانی ہے لیکن وہ اپنی ذات کا تسلسل بذریعہ اولاد و احفاد چاہتا ہے ۔حیات انسانی کا یہ پہلو نہایت ہی حساس ہے اور اس تار کو معمولی طور پر چھونے ہی سے زمزمہ حیات گونجنے لگتا ہے ۔وسائل رزق کے مقابلے میں اولاد و احفاد کا یہاں ذکر کیا گیا بطور نعمت تاکہ انسانی شعور کے سامنے یہ سوال رکھا جائے ۔

اَفَبِالْبَاطِلِ یُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰہِ ھُمْ یَکْفُرُوْنَ (۱۶ : ۷۲) "تو اب بھی یہ لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں"۔ یوں کہ وہ اللہ کے شریک قرار دیتے ہیں اور اللہ کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں جبکہ یہ تمام انعامات اللہ کے عطا کردہ ہیں اور یہ نعمات اللہ کی الوہیت و حاکمیت پر گواہ بھی ہیں اور عملاً ان کی زندگی میں یہ نعمتیں موجود بھی ہیں اور ہروقت ان کے ساتھ رہتی ہیں ۔

کیا یہ لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کے سوا جو بھی ہے وہ باطل ہے ۔ اور یہ الہٰ جن کو یہ پکارتے ہیں لامحالہ باطل ہیں 'محض اوہام ہیں 'ان کا کوئی وجود نہیں ہے ۔ان کے بارے میں ایسی سوچ اور مرتبے کا کوئی حق و حقیقت نہیں ہے ۔ لہٰذا اس حرکت کا ارتکاب کر کے وہ انعامات الٰہیہ کا انکار کرتے ہیں ۔جبکہ اس حقیقت کو وہ خود بھی اپنی فطری صلاحیت سے محسوس بھی کرتے ہیں اور احساس ہوتے ہوئے انکار کرتے ہیں ۔

وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَمْلِکُ لَھُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَیْئًا وَّلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ (۱۶ : ۷۳) "اور اللہ کو چھوڑ کر ان کو پوجتے ہیں جن کے ہاتھ میں نہ آسمانوں سے انہیں کچھ بھی رزق دینا ہے نہ زمین سے اور نہ یہ کام وہ کر ہی سکتے ہیں"۔ یہ عجیب بات ہے کہ انسانی فطرت اس حد تک منحرف ہو جائے اور ایسی چیزوں کی بندگی کرے جن کے ہاتھ میں لوگوں کا رزق نہیں ہے اور نہ وہ ایک ہی دن کے لیے لوگوں کے رزق کا انتظام کرنے کے اہل ہیں ۔جبکہ یہ لوگ اللہ کو خالق 'رازق 'فریادرس مانتے بھی ہیں اور اس کا انکار نہیں کر سکتے لیکن اس کے باوجود اللہ کے مماثل اور اس جیسی شخصیات کے قائل ہیں ۔

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰہِ الْاَمْثَالَ ۭ اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾

"پس اللہ کے لیے مثالیں نہ گھڑو ' اللہ جانتا ہے ' تم نہیں جانتے"۔ اللہ کی نہ کوئی مثال ہے اور نہ اس کے کوئی مماثل ہے کہ تم اس کی مثالیں دو۔

اس کے بعد اللہ ان لوگوں کے سامنے دو مثالیں پیش کرتا ہے ' ایک شخص مالک رازق ہے اور دوسرا شخص مملوک غلام اور عاجز ہے۔ کسی چیز کا نہ مالک ہے اور نہ کسب کمائی پر قادر ہے۔ یہ مثال اس لیے دی جارہی ہے کہ جس عظیم حقیقت کو وہ بھول چکے ہیں وہ ان کے فہم کے قریب تر ہو جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ کی کوئی مثال نہیں ' اور یہ کہ اللہ کے ساتھ اس کی الوہیت و حاکمیت اور بندگی میں اس کی مخلوق میں سے کسی چیز کو بھی شریک نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مخلوق سب اس کی غلام اور بندہ ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ
مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّ جَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ
بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبْكَمُ لَا
يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ هُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ؕ هَلْ ١٠
يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَ مَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَ هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ع ٦
١٦

"اللہ ایک مثال دیتا ہے۔ ایک تو غلام ہے ' جو دوسرے کا مملوک ہے اور خود کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ دوسرا شخص ایسا ہے جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھا رزق عطا کیا ہے اور وہ اس میں سے کھلے اور چھپے خوب خرچ کرتا ہے۔ بتاؤ ' کیا یہ دونوں برابر ہیں؟ ۔۔۔ الحمد للہ ' مگر اکثر لوگ (اس سیدھی بات کو) نہیں جانتے۔

اللہ ایک اور مثال دیتا ہے۔ دو آدمی ہیں۔ ایک گونگا بہرا ہے ' کوئی کام نہیں کر سکتا ' اپنے آقا پر بوجھ بنا ہوا ہے ' جدھر بھی وہ اسے بھیجے کوئی بھلا کام اس سے بن نہ آئے۔ دوسرا شخص ایسا ہے کہ انصاف کا حکم دیتا ہے اور خود راہ راست پر قائم ہے۔ بتاؤ کیا یہ دونوں یکساں ہیں؟""

پہلی مثال تو ان کے اندر موجود صورت حالات سے لی گئی ہے۔ اس وقت عرب کے جاہلی معاشرے میں مملوکہ غلام موجود تھے ' یہ اس قدر بے بس مخلوق تھی کہ نہ وہ کسی چیز کے مالک ہوتے تھے اور نہ ان کو کوئی اختیار حاصل تھا۔ یہ لوگ بھی مالک مختار و متصرف اور عاجز غلام اور بے اختیار کے درمیان فرق مراتب سے اچھی طرح واقف تھے۔ لہٰذا ان سے کہا گیا کہ مالک حقیقی کو تم کس طرح اپنے غلاموں کے ساتھ برابر قرار دیتے ہو اور ان غلاموں کو مالک کا شریک قرار دیتے ہو ' کیونکہ تمام انسان اللہ کے غلام اور بندے ہیں۔

دوسری مثال ایسے شخص کی ہے جو گونگا ' بلید الذہن اور کم نوال ہے۔ وہ کسی کام کو نہیں جانتا ' مالک پر بوجھ ہے۔ جدھر بھی بھیجا جائے کوئی خیر کا کام اس سے نہ بن پائے۔ لیکن دوسرا شخص قوی الجسم ' سلیم العقل ہے ' خوب

بات کرتا ہے اور بات بھی عدل و انصاف کی کرتا ہے ' اور کردار کے اعتبار سے راہ راست پر قائم ہے۔ ان دونوں اشخاص میں کوئی سلیم العقل شخص مساوات قائم نہیں کر سکتا۔ بس ایک بت اور ایک پتھر اور اللہ سبحانہ قادر و علیم کے درمیان کس طرح شرکت و مساوات قائم ہو سکتی ہے ' جبکہ اللہ حکم دیتا ہے کہ معروف کا حکم دو اور منکر سے لوگوں کو روکو اور صراط مستقیم کی طرف آؤ۔

یہ سبق جو اللہ کے اس حکم سے شروع ہوا تھا کہ جدالیین کا نظریہ نہ رکھو ' ان دونوں مثالوں سے اس سبق کا خاتمہ ہوا جن سے ثابت ہوا کہ شرکیہ عقائد و نظریات تعجب انگیز ہیں۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۱۲۲ ایک نظر میں

اس سورہ کا محور و موضوع یعنی دلائل الوہیت اور حاکمیت رب العالمین ' اس سبق میں بھی بدستور جاری ہیں ۔ مثلاً اللہ کی تخلیق کی عظمت ' اللہ کے وسیع انعامات ' اللہ کا وسیع علم اور بعث بعد الموت کے دلائل ۔ اس سبق کا موضوع بعث بعد الموت ہے ۔ بعث بعد الموت کے بارے میں ہمیشہ اہم سوال یہ رہا ہے کہ قیامت کب آئے گی؟ تو اس کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کے ان مخصوص رازوں میں سے ہے جس کی اطلاع کسی کو نہیں دی گئی ۔

اس سبق کے موضوعات میں سے ایک اہم موضوع زمین و آسمان کے وہ اسرار ہیں جن کا علم کسی کو نہیں دیا گیا ۔ یہ اسرار نفس انسانی اور آفاق کائنات دونوں سے متعلق ہیں ۔ مثلاً قیام قیامت کے وقت کا غیب ' جس کا علم صرف اللہ کو ہے اور قیام قیامت پر اللہ پوری طرح قادر ہے ' بلکہ وہ اس کے لیے اس قدر آسان ہے جس طرح پلک جھپکنا ۔

وَمَا أَمْرُ السَّاعَةِ إِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ ( ١٦ : ٧٧ ) "اور قیامت برپا ہونے کا معاملہ کچھ دیر نہ لے گا مگر بس اتنی کہ جس میں آدمی کی پلک جھپک جائے" ۔ پھر رحم مادر میں بچے کا غیب ' صرف اللہ ہی کو ہے جو اس غیب سے جنین کو نکالتا ہے ' یہ جنین کچھ بھی نہیں جانتا ۔ پھر اللہ لوگوں کو سمع ' بصر اور سوچنے کی قوت دیتا ہے تاکہ وہ اس کا شکر ادا کریں ۔ مزید اسرار کائنات و مخلوقات کے غیب ' مثلاً پرندوں کا فضا میں مسخر کر دیا جانا کہ وہ فضا میں تیر رہے ہوتے ہیں ۔ یہ رحمٰن ہی ہے جو انہیں وہاں ٹھہراتا ہے ۔

اس کے بعد انسان کے لیے بعض مادی سہولتوں کا ذکر ہے ۔ یہ مادی سہولیات بھی فضائے کائنات کے رازوں کے ساتھ بہت اہم ہیں ۔ رہائش گاہیں برائے آرام ' سایوں میں ' تعمیر شدہ مکانات میں ' مویشیوں کے چمڑوں کے خیموں میں جو اقامت کی اور سفر کی دونوں حالتوں میں مفید ہیں ۔ اثاث البیت ، صوف ' اون اور بالوں سے تمہارے لیے لباس بنائے ' پھر سائے ' پہاڑوں کی پناہ گاہیں ' ایسی پوشاک جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہے ' ایسی پوشاک جو تمہیں جنگ میں بچاتی ہے ۔

كَذَٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُونَ ( ١٦ : ٨١ ) "اس طرح وہ تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرتا ہے ' شاید کہ تم فرماں بردار ہو" ۔ اس کے بعد قیام قیامت کی یہ تفصیلات کہ ایک منظر میں مشرکین اور ان کے ٹھہرائے ہوئے شرکاء جمع ہوں گے ' رسول اور شہداء جمع ہوں گے ۔ رسول اپنی اپنی قوم پر گواہی دیں گے وغیرہ وغیرہ اس طرح قیام قیامت کی یہ بحث اپنے اختتام کو پہنچتی ہے ۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۱۲۲ تشریح آیات

## ۷۷ --- تا --- ۸۹

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

"اور زمین و آسمان کے پوشیدہ حقائق کا علم تو اللہ ہی کو ہے اور قیامت کے برپا ہونے کا معاملہ کچھ دیر نہ لے گا مگر بس اتنی کہ جس میں آدمی کی پلک جھپک جائے 'بلکہ اس سے بھی کچھ کم ۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔ بعث بعد الموت کا مسئلہ وہ مسئلہ ہے جو ہر دور میں نہایت درجہ مختلف فیہ رہا ہے ۔ اس کے بارے میں لوگوں نے ہر رسول کے ساتھ مکالمہ 'مجادلہ اور مناظرہ کیا ہے ۔ اپنی اصل میں یہ وہ غیب ہے جو اللہ کے مخصوص ترین رازوں میں سے ہے ۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۶ : ۷۷) "زمین و آسمان کے پوشیدہ حقائق کا علم تو اللہ ہی کو ہے"۔ انسانوں کی حالت تو یہ ہے کہ وہ پردۂ غیب کے پیچھے پوشیدہ اسرار و رموز کے پانے سے عاجز و قاصر ہیں ۔ ان کا مادی علم جس قدر بھی آگے بڑھ جائے اور دنیا کی مادیات کے بارے میں ان پر جس قدر علوم کے خزانے بھی کھل جائیں ۔ وہ زمین کے اندر پوشیدہ خزانوں کی ایک بڑی مقدار کو دریافت کیوں نہ کر لیں وہ ان اسرار کائنات کو پا نہیں سکتے ۔ جبکہ اس کائنات میں علوم غیب کے بارے میں سب سے زیادہ جاننے والے برگزیدہ انسان کو بھی یہ معلوم نہیں کہ کل اس کی ذات کے ساتھ کیا ہونے والا ہے 'بلکہ یہ بھی معلوم نہیں کہ نکلنے والا سانس پھر لوٹے گا یا نہیں ۔ انسان کی خواہشات کی دنیا تو طویل و عریض ہے لیکن پردۂ غیب کے پیچھے سے تقدیر اس پر خندہ زن ہوتی ہے ۔ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اگلے لمحے اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے ۔ بعض اوقات اگلے ہی لمحے میں اسے مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ اس نے انسان کو اگلے لمحے آنے والے واقعات سے لاعلم رکھا ہے تاکہ وہ ہر وقت پر امید رہیں 'کام کرتے رہیں 'پیدا کرتے رہیں 'اور نشوونما دیتے رہیں اور جن کاموں کا انہوں نے آغاز کیا ہے انہیں پیچھے چھوڑ دیں تاکہ آنے والے ان کی تکمیل کریں ۔ یہاں تک کہ تقدیر وہ چہرہ نمودار کر دے جو پس پردہ ہے ۔

قیامت بھی ان پوشیدہ اور مستور غیبوں سے ہے ۔ اور اگر لوگوں کو قیام قیامت کی ساعت کا علم ہو جائے تو زندگی کی

گاڑی یکدم رک جائے یا اس کے اندر عظیم خلل پڑ جائے۔ زندگی کے شب و روز اس طرح نہ گزریں جس طرح کہ قانون قدرت نے ان کے لیے ضابطہ بندی کی ہوئی ہے بلکہ لوگ بیٹھ جاتے اور سال و ماہ اور دن اور گھنٹے گنتے کہ بس اب قیام قیامت کے اتنے دن رہ گئے۔

وَمَا أَمْرُ السَّاعَةِ إِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ (۱۶: ۷۷) "اور قیامت کے برپا ہونے کا معاملہ کچھ دیر نہ لے گا مگر بس اتنی کہ جس میں آدمی کی پلک جھپک جائے بلکہ اس سے بھی کچھ کم۔ یہ بہت ہی قریب ہے لیکن اس کے وقت کا حساب انسان کے ماہ و سال کے حساب سے مختلف پیمانوں کے ساتھ ہے۔ اس کے انتظامات کے لیے اللہ کو کسی وقت کی ضرورت نہیں ہے۔ پلک جھپکنے کی دیر کافی ہے' اس سے بھی کم وقت میں یہ تمہارے سامنے اپنے پورے مناظر کے ساتھ حاضر ہوگی۔

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۱۶: ۷۷) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ انسانوں اور مخلوقات کی یہ ان گنت تعداد کو حاضر کرنا' ان کا اٹھانا' جمع کرنا' حساب و کتاب لینا' جزاء و سزا دینا اس قدرت کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے جس نے صرف کن کہنا ہے اور سب کچھ ہو جاتا ہے۔ یہ معاملہ صرف ان لوگوں کے لیے خوفناک اور مشکل ہے جو انسانی پیمانوں سے معاملات کو سوچتے ہیں۔ انسانی نظروں سے دیکھتے ہیں اور انسانی اعداد میں حساب و کتاب کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی سوچ اور اندازے غلط ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس عظیم واقعہ کو انسانی زندگی کی بعض مثالوں سے انسان کے لیے قریب الفہم بناتے ہیں' کیونکہ اس عظیم اور ہولناک واقعہ کے حقیقی تصور سے انسان کی قوت ادراک اور قوت تصور عاجز ہے۔ یہ مثالیں انسانی زندگی میں دہرائی جاتی ہیں۔

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۷۸﴾

"اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اس نے تمہیں کان دیئے' آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیئے' اس لیے کہ تم شکرگزار بنو"۔

یہ بھی ایک عالم غیب ہے جو انسان کے بہت ہی قریب ہے' لیکن قریب ہونے کے ساتھ ساتھ وہ فہم و ادراک سے بہت بعید بھی ہے۔ یہ کہ اس عالم غیب بطن مادر میں جنین کس طرح تکمیل کے مراحل طے کرتا ہے۔ بعض اوقات لوگ جنین کے حالات ملاحظہ کرتے ہیں' لیکن ان کا علم محدود ہے اور وہ یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ کس طرح تکمیل اور نشو و نما کے مراحل طے کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی نشو و نما میں راز حیات اصل راز ہے' جس کا علم آج تک پوشیدہ ہے۔ وہ علم جس کا انسان دعویٰ کرتا ہے اور جس کے ساتھ انسان آگے بڑھتا ہے اور جس کے ذریعے وہ قیامت کے قیام کو بھی معلوم کرنا

جانتا ہے ' وہ ایک حادث علم ہے کیونکہ پہلے انسان کچھ بھی نہ جانتا تھا۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا (۱۶:۷۸) "اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے"۔ ہر عالم اور ہر محقق کی ولادت اور اس حال میں ماں کے پیٹ سے اس کا نکلنا کہ وہ کچھ نہیں جانتا ایک قریب العہد واقعہ ہے۔ اس کے بعد اس نے جو علم سیکھا وہ اللہ کا دین ہے اور یہ اللہ نے انسان کو اسی قدر دیا ہے جس قدر اس جہاں میں انسان کے لیے زندگی گزارنے کے لیے کافی ہو' یعنی اس پوری کائنات میں جو انسان کے اردگرد پھیلی ہوئی ہے۔

وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ (۱۶:۷۸) "اس نے تمہیں کان دیئے 'آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیئے"۔ قرآن کریم انسان کے قوائے مدرکہ کے مجموعے پر قلب اور فواد کا اطلاق کرتا ہے۔ اس میں عقل بھی آتی ہے اور اس میں وہ وجدانی اور الہامی قوتیں بھی آتی ہیں جن کی حقیقت سے انسان خبردار نہیں ہے۔ اور انسان کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ قوتیں کس طرح کام کرتی ہیں اور تمہیں کان 'آنکھیں اور دل دیئے۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۱۶:۷۸) "اس لیے کہ تم شکرگزار بنو"۔ جب تم غور کرو کہ یہ چیزیں انسان کو دے کر اللہ نے کس قدر کرم کیا ہے' نیز ان کے علاوہ اللہ کے انعامات کو ان آلات مدرکہ سے پاکر تم اللہ کا شکر ادا کرو' اور شکر کا پہلا مظہر یہ ہے کہ انسان اللہ وحدہ پر ایمان لائے۔

ایک دوسرا تعجب انگیز منظر جو رحمت الٰہیہ کے آثار میں سے ہے اور جو انسانوں کے پیش پا افتادہ ہے' انسان اسے دیکھتا ہے اور تدبر نہیں کرتا۔

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ۭ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۷۹

"کیا ان لوگوں نے کبھی پرندوں کو نہیں دیکھا کہ فضائے آسمانی میں کس طرح مسخر ہیں؟ اللہ کے سوا کس نے ان کو تھام رکھا ہے؟ اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں"۔

پرندے زمین و آسمان کی فضا میں مسخر ہیں۔ یہ اسی میں اڑتے پھرتے ہیں' ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔ یہ منظر ہم بار بار دیکھتے ہیں اور بار بار دیکھنے کی وجہ سے اس کے اندر جو عجوبہ ہے' وہ غیر محسوس ہوگیا ہے۔ اس کی طرف انسان کا دل و دماغ تب توجہ کرتا ہے جب وہ جاگنے والا ہو' اور اس کو شاعرانہ قوت مشاہدہ دی گئی ہو۔ ایک شاعرانہ ژرف نگاہی رکھنے والا شخص تو اس پر ایک نظم اور قصیدہ لکھ سکتا ہے اور وہ بے ساختہ اس قدیم' مالوف اور جدید شاعرانہ منظر کو دیکھ کر یہ کہہ سکتا ہے۔

مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ (۱۶:۷۹) "اللہ کے سوا کس نے انہیں تھام رکھا ہے"۔ یہ کس طرح پرندوں کی فطرت ہی ایسے اصولوں پر وضع کی گئی' اس کے ارد گرد فضائی حالات اللہ نے ایسے بنائے کہ اس میں وہ اڑ سکیں اور زمین پر کسی بھی وقت نہ گریں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۶:۷۹) "اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں"۔ ایک قلب مومن اس کائنات کی عجائبات پر اسی طرح نظر دوڑاتا ہے جس طرح شاعر کسی چیز کی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے اور اس کا شعور اور اس کا ضمیر ان مخلوقات کے حسن اور کمال کو محسوس کرتا ہے۔ پھر وہ اپنے احساس کی تعبیر نہایت ہی خوبصورتی سے کرتا ہے۔ ایمان کی شکل میں' اللہ کی بندگی کی شکل میں اور اللہ کی ثنا اور تسبیح کی شکل میں۔ اہل ایمان میں سے اللہ نے جن لوگوں کو قادر الکلامی دی ہے' وہ اللہ کی ان تخلیقات میں عجیب و غریب پہلو دیکھتے ہیں اور بیان کرتے ہیں۔ ایسے مومنین کی تخلیقات اس قدر گہری ہوتی ہیں کہ عام شاعری اس مقام تک رسائی ممکن نہیں ہوتی۔

---ooo---

اب مضمون' اللہ کی تخلیقات کے اسرار و رموز بیان کرتے ہوئے ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے۔ اللہ کی قدرت کے مزید نشانات اور اللہ کے انعامات کے کچھ مزید نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ لوگوں کے گھر اور ان کی مسرتیں' گھروں کا ماحول ساز و سامان اور پناہ گاہیں۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿٨٠﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿٨١﴾

"اللہ نے تمہارے لیے تمہارے گھروں کو جائے سکون بنایا۔ اس نے جانوروں کی کھالوں سے تمہارے لیے ایسے مکان پیدا کیے جنہیں تم سفر اور قیام' دونوں حالتوں میں ہلکا پاتے ہو۔ اس نے جانوروں کے صوف اور اون اور بالوں سے تمہارے لیے پہننے اور برتنے کی بہت سی چیزیں پیدا کر دیں جو زندگی کی مدت مقررہ تک تمہارے کام آتی ہیں۔ اس نے اپنی پیدا کی ہوئی بہت سی چیزوں سے تمہارے لیے سائے کا انتظام کیا' پہاڑوں میں تمہارے لیے پناہ گاہیں بنائیں' اور تمہیں ایسی پوشاکیں بخشیں جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہیں۔ اور کچھ دوسری پوشاکیں جو آپس کی جنگ میں تمہاری حفاظت کرتی ہیں۔ اس طرح وہ تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرتا ہے شاید کہ تم فرمانبردار بنو"۔

گھر اور پر سکون گھر کس قدر عظیم نعمت ہے' اس کی قدر وہ جانیں جو مہاجر ہیں' جو گھروں سے نکال دیئے گئے ہیں اور مارے مارے پھر رہے ہیں۔ نہ ان کا گھر ہے اور نہ سکون ہے۔ یہاں گھروں اور سایوں کا ذکر غیب کے ذکر کے بعد آتا ہے۔ ربط یوں ہے کہ ایک سایہ بھی کسی چیز کو ڈھانپ لیتا ہے اور غیب بھی ان امور کو ڈھانپ لیتا ہے جو غیب میں ہوتے ہیں۔ دونوں میں ستر اور پوشیدگی ہے۔ گھروں کی تعبیر جائے سکون سے کرنے سے ایک حساس شخص ہی لطف اندوز ہو سکتا ہے' غافل لوگ اس سے کماحقہ لطف نہیں لے سکتے۔ یہاں مناسب ہے کہ یہ بتا دیا جائے کہ گھر کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے۔ قرآن کریم نے گھر کی تعبیر یوں کی ہے۔

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا (۱۶ : ۸۰) "اللہ نے تمہارے لیے تمہارے گھروں کو جائے سکون بنایا ہے"۔ اسلام چاہتا ہے کہ ایک گھر نفسیاتی اطمینان' شعوری ٹھہراؤ اور جذباتی سکون کی جگہ ہو۔ یہ خوشی کی جگہ ہو' انسان وہاں آکر خوش ہوں۔ اور اس میں انسان کے لیے مادی اور روحانی سکون کا انتظام ہو۔ اس میں جو لوگ رہتے ہوں وہ ایک دوسرے کے لیے باعث اطمینان اور خوشی ہوں' اور ان میں سے ہر ایک شخص دوسرے کے لیے سامان سکون ہو۔ اسلام کسی بھی گھر کو نزاع' جھگڑے' بے اتفاقی اور مخاصمت کی جگہ بنانا نہیں چاہتا کیونکہ وہ اس کے نزدیک ٹھہرنے' سکون' امن اور اطمینان و سلامتی کی جگہ ہونا چاہئے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام گھر کے احترام کی ضمانت دیتا ہے تاکہ گھر کے امن و سکون اور سلامتی کی ضمانت دی جا سکے۔ مثلاً کسی شخص کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کے گھر میں بغیر اجازت کے داخل ہو۔ کسی کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کے گھر میں بس گھس جائے۔ بغیر حق کے اور بغیر اجازت کے۔ اسی طرح کسی کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ گھر والوں کی اجازت کے بغیر کسی بھی وجہ سے کسی کی پرائیویسی میں دخل انداز ہو' نہ کسی کو کسی گھر کے خلاف تجسس کی اجازت ہے اور نہ کسی کی غیبت کی اجازت ہے کیونکہ ان امور سے کسی بھی گھر کا امن و سکون اور خوشی اور اطمینان ختم ہو سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے ایک گھر کو جائے سکون قرار دیا ہے۔

یہ منظر چونکہ گھر' پناہ گاہ اور لباس سے متعلق تھا' اس لیے یہاں جانوروں کے بھی اس پہلو کا ذکر کیا گیا' جو ان مقاصد کے لیے مفید ہے یعنی مسکن و لباس کا پہلو۔

وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُیُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا یَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ یَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَاۤ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِیْنٍ (۱۶ : ۸۰) "اس نے جانوروں کی کھالوں سے تمہارے لیے ایسے مکان پیدا کیے جنہیں تم سفر اور قیام' دونوں حالتوں میں ہلکا پاتے ہو۔ اس نے جانوروں کے صوف اور اون اور بالوں سے تمہارے لیے پہننے اور برتنے کی بہت سی چیزیں پیدا کر دیں جو زندگی کی مدت مقررہ تک تمہارے کام آتی ہیں"۔ یہاں بھی جانوروں کے مفادات میں سے ضروریات کا ذکر کیا اور ان چیزوں کا ذکر بھی کیا جو حسن اور شوق کا سامان کرتی ہیں۔ متاع اور اثاث البیت میں یہی فرق ہے۔ متاع سے مراد فرش' قالین اور دوسرا سامان آرائش ہے لیکن اس میں وہ سب چیزیں شامل ہیں جو تمتع کی تعریف میں آتی ہیں اور فرحت بخش ہوتی ہیں۔

سکون' اطمینان کی فضا میں اب انداز تعبیر لطیف ہو جاتا ہے۔ سایوں' پناہ گاہوں' پہاڑوں اور گرمی سردی اور جنگی پوشاکوں کی بات چلتی ہے۔

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ (۱۶ : ۸۱) "اس نے اپنی پیدا کی ہوئی بہت سی چیزوں سے تمہارے لیے سائے کا انتظام کیا' پہاڑوں میں تمہارے لیے پناہ گاہیں بنائیں' اور تمہیں ایسی پوشاکیں بخشیں جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہیں۔ اور کچھ دوسری پوشاکیں جو آپس کی جنگ میں تمہاری حفاظت کرتی ہیں"۔ چھاؤں میں انسان کے لیے سکون ہے اور چھاؤں کے تصور میں بھی فرحت ہے۔ پہاڑی پناہ گاہوں میں انسان اطمینان اور امن محسوس کرتا ہے۔ پھر وہ پوشاکیں جو سردی 'گرمی میں اور جنگ کی حالت میں کام آتی ہیں انسان کی دلچسپی کا سامان ہیں اور انسان کی حفاظت کے لیے ضروری ہیں۔ پھر خوشی اور مسرت کا بھی ان میں سامان ہے اس لیے اس پر یہ نتیجہ سامنے آتا ہے۔

كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ (۱۶ : ۸۱) "اس طرح وہ تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرتا ہے شاید کہ تم فرمانبردار بن جاؤ"۔ اسلام کا مفہوم ہی سکون' سپردگی اور سلامتی ہے۔ اس طرح اس منظر کی تمام چیزوں کے درمیان معنوی ہم آہنگی پائی جاتی ہے جو قرآن کریم کے اسلوب کلام کا خاص انداز ہے۔

اب اگر وہ اسلام کو قبول کرتے ہیں تو بہتر' اور اگر وہ منہ موڑتے ہیں اور بھاگتے ہیں تو رسول کا فریضہ تو صرف ابلاغ ہے۔ اگر یہ انکار پر تل گئے ہیں تو انکار کر دیں لیکن جن نعمتوں کا ذکر ہوا ان کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ مان جائیں۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ
۱۱ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَ اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾ ع ۷

"اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو اے نبیؐ تم پر صاف صاف پیغام حق پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ اللہ کے احسان کو پہچانتے ہیں' پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں بیشتر لوگ ایسے ہیں جو حق ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں"۔

--- ○○○---

اب وہ بات سامنے لائی جاتی ہے جس کا آغاز کلام میں ذکر ہوا تھا' وہ یہ کہ جب قیامت آ جائے گی تو کافر کس حالت سے دوچار ہوں گے۔

وَ يَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا

وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ۝ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ِالسَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ۝

"(انہیں کچھ ہوش بھی ہے کہ اس روز کیا بنے گا) جب کہ ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے ' پھر کافروں کو نہ حجتیں پیش کرنے کا موقع دیا جائے گا ' نہ ان سے توبہ و استغفار ہی کا مطالبہ کیا جائے گا۔ ظالم لوگ جب ایک دفعہ عذاب دیکھ لیں گے تو اس کے بعد نہ ان کے عذاب میں کوئی تخفیف کی جائے گی اور نہ انہیں ایک لمحہ بھر مہلت دی جائے گی۔ اور جب وہ لوگ جنہوں نے دنیا میں شرک کیا تھا اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے "اے پروردگار ' یہی ہیں ہمارے وہ شریک جنہیں ہم تجھے چھوڑ کر پکارا کرتے تھے"۔ اس پر ان کے وہ معبود انہیں صاف جواب دیں گے کہ "تم جھوٹے ہو"۔ اس وقت یہ سب اللہ کے آگے جھک جائیں گے اور ان کی وہ ساری افتراء پردازیاں رفوچکر ہو جائیں گی جو یہ دنیا میں کرتے رہے تھے۔ جن لوگوں نے خود کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو اللہ کی راہ سے روکا انہیں ہم عذاب پر عذاب دیں گے۔ اس فساد کے بدلے جو وہ دنیا میں برپا کرتے رہے"۔

یہ قیامت کا منظر ہے۔ انبیاء کھڑے ہیں اور وہ تمام واقعات کے چشم دید گواہ ہیں۔ ان کے اور ان کی قوم کے درمیان جو کشمکش ہوئی وہ اسکرین پر چل رہی ہوگی۔ کفار دنگ کھڑے ہوں گے۔ اب ان کو حجت بازی کی اجازت نہ ہو گی۔ سفارشیں لانے کی اجازت نہ ہوگی۔ ان سے یہ مطالبہ بھی نہ کیا جائے گا کہ یہ یہ کام کر کے رب کو راضی کرو کیونکہ اب تو توبہ کا دروازہ بند اور عمل کا میدان ختم ہے۔ اب تو مکافات عمل کا میدان ہے۔

وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ (۱۶ : ۸۵)

"ظالم لوگ جب ایک دفعہ عذاب دیکھ لیں گے تو اس کے بعد نہ ان کے عذاب میں کوئی تخفیف کی جائے گی اور نہ انہیں ایک لمحہ بھر مہلت دی جائے گی"۔ اب میدان حشر میں وہ لوگ نمودار ہوں گے جن کو یہ کفار و مشرکین بزعم خود خدا کا شریک سمجھتے تھے اور اللہ کے سوا ان کو خدا سمجھ کر ان کی بندگی کرتے تھے۔ تو اب مہر سکوت ٹوٹ جائے گی اور مشرکین دوڑ کر پکاریں گے۔

رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ (۱۶ : ۸۶) "اے پروردگار یہی

ہیں ہمارے وہ شریک جنہیں ہم تجھے چھوڑ کر پکارا کرتے تھے"۔ اب تو وہ اقرار کرتے ہیں اور کہتے ہیں "اے ہمارے رب"۔ آج وہ نہیں کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے شرکاء ہیں 'بلکہ کہتے ہیں "یہ ہمارے شرکاء ہیں"۔ لیکن وہ تو خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس عظیم تہمت اور الزام کو سن کر فوراً بول اٹھیں گے کہ تم جھوٹ بولتے ہو 'تم بڑے جھوٹے ہو۔

فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۶ : ۸۶) "وہ دور ہی سے ان کی طرف جواب پھینکیں گے 'بے شک تم تو بہت بڑے جھوٹے ہو"۔ اور یہ شرکاء اور صلحاء اللہ کی طرف متوجہ ہوں گے نہایت ہی بندگی کی حالت میں '

وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ السَّلَمَ (۱۶ : ۸۷) "اور یہ سب اللہ کے سامنے جھک جائیں گے"۔ اور مشرکین کے ہاتھ ان کی افتراء پردازیوں میں سے کچھ بھی نہ آئے گا۔ وہ کسی دلیل پر اعتماد نہ کر سکیں گے اور ان کی تمام صحت بازیاں کافور ہو جائیں گی۔

وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۱۶ : ۸۷) "اور ان کی وہ سب افتراء پردازیاں ختم ہو جائیں گی"۔ اب فیصلہ یہ صادر ہوتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے کفر کی راہ لی اور دوسروں کے لیے بھی باعث گمراہی بنے 'ان کا عذاب دوگنا ہو گا کیونکہ انہوں نے دوسروں کو بھی راہ راست سے روکا۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا

يُفْسِدُوْنَ (۱۶ : ۸۸) "جن لوگوں نے خود کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو اللہ کی راہ سے روکا 'انہیں ہم عذاب پر عذاب دیں گے۔ اس فساد کے بدلے جو دنیا میں وہ برپا کرتے تھے۔ بے شک کفر بذات خود ایک فساد ہے 'دوسرے کو کافر بنانا بہت بڑا فساد ہے۔ انہوں نے اپنے کفر کے جرم کا بھی ارتکاب کیا اور دوسروں کو بھی ہدایت سے روکا۔ اس لیے ان کا عذاب دگنا کر دیا گیا۔ یہی ان کے جرم کا پورا بدلہ ہے۔

یہ معاملہ تمام اقوام کا ہو گا لیکن رسول اللہؐ اور آپؐ کی قوم کا معاملہ یوں ہو گا۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا
بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّ
۱۲ رَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾
ع ۶
۱۸ "(اے نبیؐ انہیں اس دن سے خبردار کر دو) جب کہ ہم ہر امت میں خود اسی کے اندر سے ایک گواہ اٹھا کھڑا کریں

گے جو اس کے مقابلہ میں شہادت دے گا' اور ان لوگوں کے مقابلے میں شہادت دینے کے لیے ہم تمہیں لائیں گے ۔ اور (یہ اسی شہادت کی تیاری ہے کہ) ہم نے یہ کتاب تم پر نازل کر دی ہے جو ہر چیز کی صاف صاف وضاحت کرنے والی ہے اور ہدایت و رحمت اور بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے سر تسلیم خم کر دیا ہے"۔

مشرکین کا منظر نظروں کے سامنے ہے ۔ بہت ہی سخت حالات ہیں ۔ شرکاء ان لوگوں کی تکذیب کر رہے ہیں جو انہیں شریک سمجھ رہے تھے اور وہ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر رہے اور اپنے دنیاوی متبعین کے الزامات سے براءت کا اظہار کر رہے ہیں ۔ ایسے ہی حالات میں رسول اللہؐ اور مشرکین مکہ اور منکرین قریش کے کیس کی بھی ایک جھلکی نظروں کے سامنے آتی ہے ۔ صرف ایک جھلکی:

وجئنابك شهيدا على هؤلاء (۱۶ : ۸۹) "اور ان لوگوں کے مقابلے میں شہادت دینے کے لیے ہم تمہیں لائیں گے"۔ اس کے بعد متصلاً یہ بات آتی ہے کہ اے رسول تم پر جو کتاب اتاری گئی ہے وہ ایک جامع کتاب ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ

(۱۶ : ۸۹) "اور ہدایت و رحمت اور خوشخبری ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے سر تسلیم خم کر دیا ہے"۔ لہٰذا جو شخص ہدایت و رحمت چاہتا ہے تو وہ قیام قیامت سے پہلے ہی اسلام قبول کرے 'کیونکہ اس دن پھر کافروں کو دوبارہ عمل کی نہ اجازت ہو گی اور نہ ان کو معذرت پیش کرنے کی اجازت ہو گی ۔ یوں قرآن مجید منظر کشی کے انداز میں اپنے مطالب بیان کرتا ہے خوبصورت ہم آہنگی کے ساتھ ۔

--- ()()() ---

# درس نمبر ۱۲۳ ایک نظر میں

سابقہ درس اس آیت پر ختم ہوا تھا۔

وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ

"اور اے نبی ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل کی ہے جس میں ہر شے کا بیان ہے اور ہدایت 'رحمت اور خوشخبری ہے 'مسلمانوں کے لیے"۔ (۱۶ : ۸۹) چنانچہ اس درس میں اس کی بعض تعلیمات بیان کی گئی ہیں یعنی وہ کیا تعلیمات ہیں جو ہدایت 'رحمت 'اور بشارت ہیں۔ یہ کہ اس میں عدل 'احسان 'رشتہ داروں پر خرچ کا حکم 'فحاشی کی ممانعت 'گناہ اور حد سے تجاوز کی ممانعت ہے اور نیز اس میں وعدے کے وفا کرنے کا حکم ہے اور قسموں کے توڑنے کی ممانعت ہے۔ یہ وہ اہم اور بنیادی تعلیمات ہیں کہ اس کتاب میں ان پر زور دیا گیا ہے۔

اس سبق میں نقض عہد کو جرم قرار دیا گیا ہے 'اسی طرح قسمیں کھا کر لوگوں کو گمراہ کرنا اور ان کو دھوکہ دینے کو بھی بہت بڑا جرم قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے لیے عذاب عظیم کی شدید وعید ہے۔ اس کے مقابلے میں جو لوگ صبر کرتے ہیں ان کے لیے خوشخبری ہے کہ ان کو ان کے اچھے اعمال کا صلہ ملے گا۔

اس کے بعد کتاب عظیم کے آداب تلاوت بیان ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ تلاوت سے قبل شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ مانگیں تاکہ یہ مردود مجلس تلاوت قرآن سے بھاگ جائے۔ نیز کتاب عظیم کے بارے میں مشرکین کی بعض خود ساختہ باتوں کا بھی ذکر ہے۔ مثلاً بعض مشرکین یہ کہتے تھے کہ نعوذ باللہ حضورؐ خود باتیں بنا کر ناحق خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ بعض یہ کہتے تھے کہ ایک عجمی غلام ہے جو حضورؐ کو یہ باتیں بتاتا ہے۔

اس سبق کے آخر میں ان لوگوں کی سزا کا ذکر ہے جو ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرتے ہیں۔ نیز ایسے لوگوں کا بھی ذکر ہے جنہیں کفر پر مجبور کر دیا جائے لیکن ان کا قلب ایمان سے مطمئن ہو۔ نیز ان برگزیدہ لوگوں کا ذکر ہے جن پر ایمان کی وجہ سے تشدد ہوا۔ اور انہوں نے ہجرت کی 'جہاد کیا اور صبر کیا۔ یہ سب باتیں اللہ کی طرف سے واضح ہدایات ہیں ' بہترین راہنمائی ہیں۔ اللہ کی رحمت ہیں اور اہل ایمان کے لیے خوشخبری ہیں۔

---000---

# درس نمبر ۱۲۳ تشریح آیات

## ۹۰ --- تا --- ۱۱۱

---

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ
عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (۹۰) وَأَوْفُوا بِعَهْدِ
اللَّهِ إِذَا عَاهَدتُّمْ وَلَا تَنقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ
اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا ۚ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ (۹۱) وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ
غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَن تَكُونَ أُمَّةٌ
هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ ۚ إِنَّمَا يَبْلُوكُمُ اللَّهُ بِهِ ۚ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا
كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (۹۲) وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن يُضِلُّ
مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَلَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۹۳)

" اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو۔ اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو' اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو جبکہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو۔ اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے۔ تمہاری حالت اس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے آپ ہی محنت سے سوت کاتا اور پھر آپ ہی اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ تم اپنی قسموں کو آپس کے معاملات میں مکر و فریب کا ہتھیار بناتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدے حاصل کرے۔ حالانکہ اللہ اس عہد و پیمان کے ذریعہ سے تم کو آزمائش میں ڈالتا ہے' اور ضرور وہ قیامت کے روز تمہارے تمام اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔ اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی (کہ تم میں کوئی اختلاف نہ ہو) تو وہ تم سب کو ایک ہی

امت بنا دیتا' مگر وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈالتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے' اور پھر ضرور تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس ہو کر رہے گی"۔

قرآن مجید کے نزول کا اصل مقصد یہ ہے اس نظریہ کے مطابق ایک امت کو میدان میں لایا جائے ایک ایسی سوسائٹی تشکیل دی جائے جو ان تعلیمات پر عمل پیرا ہو۔ ایک نیا جہاں پیدا کیا جائے اور ایک نیا نظام تشکیل دیا جائے۔ ایک ایسی عالمی دعوت اور تحریک برپا کی جائے جو کسی گروہ' قبیلے اور کسی نسل کی طرفدار نہ ہو۔ اس دعوت میں اجتماعی رابطے اور تعلق کی بنیاد کسی عصبیت اور قومیت پر نہ ہو۔

چنانچہ اس کتاب کی تعلیمات ان اصولوں پر مبنی ہیں جن کے اوپر سوسائٹی اور امت کی تشکیل ممکن ہے۔ ان تعلیمات اور اصولوں پر افراد' اقوام اور امم کو پورا اطمینان حاصل ہو' اور باہم معاملات و تعلقات' وعدوں اور معاہدوں پر پورا بھروسہ ہو۔

اس کتاب کی تعلیمات میں سے پہلی تعلیم عدل سے متعلق ہے۔ ایسا عادلانہ نظام جس میں ایک فرد' ایک جماعت' ایک قوم اور اقوام سب کے حقوق محفوظ ہوں۔ یہ عدل کسی کی خواہش سے متاثر نہ ہو۔ محبت اور بغض سے متاثر نہ ہو۔ رشتہ داری اور اقرباپروری کا اس میں نام و نشان نہ ہو۔ امیر و غریب کے لیے یکساں ہو' قوی اور ضعیف کے حقوق اس میں برابر ہوں۔ یہ عدل اپنی راہ پر سیدھا چلے اور اس میں سب کے لیے ایک ہی معیار اور ایک ہی پیمانہ ہو۔

اس عدل کے ساتھ ساتھ اس کتاب کی تعلیمات ایک دوسرے اہم اصول' احسان پر مبنی ہیں۔ جہاں تک عدل کا تعلق ہے' اس کی تلوار نہایت ہی تیز' مضبوط اور بے لچک ہوتی ہے اور سیدھا کاٹتی چلی جاتی ہے۔ لیکن اسلامی تعلیمات نے عدل کے ساتھ ساتھ دلوں کو جیتنے کے لیے احسان کا دروازہ بھی کھلا رکھا ہے۔ یہ لازم نہیں کیا کہ بے لچک عدل کے مطابق اپنے حقوق بہرحال لیے جائیں' اگر کوئی اپنے حقوق سے دست کش ہونا چاہے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ اس سے دلوں کی دشمنی دور ہو جاتی ہے اس سے زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔ نیز فضائل اخلاق اور کریمانہ طرز عمل کا اظہار ہوتا ہے۔

احسان کا مفہوم بہت ہی وسیع ہے۔ ہر اچھا کام احسان ہے۔ احسان کے حکم میں ہر عمل اور ہر معاملہ آتا ہے۔ انسان کا اپنے رب کے ساتھ تعلق' انسان کا اپنے خاندان کے ساتھ تعلق' انسان کا جماعت کے ساتھ تعلق اور انسان کا پوری انسانیت کے ساتھ تعلق۔

بعض مفسرین نے محض اس لیے کہ یہ آیت مکی ہے' عدل کو عبادات واجبہ اور احسان کو عبادات نفلی پر محمول کیا ہے کیونکہ مکہ میں اسلامی قوانین نازل نہ ہوئے تھے۔ لیکن عدل و احسان میں قانون کے علاوہ اخلاقی معاملات اور انفرادی طرز عمل بھی آتے ہیں اس لیے ان کو عبادات کے ساتھ مخصوص کرنا درست نہیں ہے۔

احسان کی ایک قسم رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی اور ان پر خرچ ہے اور اس کا خصوصی حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ اسلام میں اس کی بہت بڑی اہمیت اور عظمت ہے اور اس کی بہت بڑی تاکید ہے۔ اس میں پائے جانے والی بنیادی سوچ خاندان کی عصبیت نہیں ہے بلکہ اس سے غرض و غایت خاندانی نظام اور خاندانی نظام کے اوپر تعمیر کردہ اسلامی نظام تکافل اجتماعی ہے۔ اسلام نے اپنے اجتماعی نظام کا پہلا یونٹ خاندان کو قرار دیا ہے اور اس کے بعد وہ اسے بتدریج سوسائٹی تک عام کرتا ہے کیونکہ اجتماعی تکافل (Security) کے بارے میں اسلام کی اپنی سوچ ہے۔

وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (۱۶ : ۹۰) "اور بدی اور بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے"۔ فَحْشَآء ہر اس بات کو کہتے ہیں جو حد سے تجاوز کرے۔ یہ زیادہ تر اس تجاوز کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی کی ذاتی عزت کے خلاف ہو کیونکہ جنسی بے راہ روی بھی ایک ایسا فعل ہے جو اپنی حدود سے آگے بڑھ کر کیا جاتا ہے۔ اس میں بھی زیادتی اور حدود سے تجاوز پایا جاتا ہے۔ بالعموم یہ لفظ جنسی بے راہ روی کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے۔ المنکر وہ فعل ہے جس کا فطرت سلیمہ انکار کرے اور شریعت بھی اسے اسی وجہ سے منکر سمجھتی ہے کیونکہ اسلامی شریعت اور اسلامی نظام ایک فطری نظام ہے۔ شریعت اور قانون تو اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ اور فطرت انسانی بسا اوقات بگڑ جاتی ہے۔ فطرت کے بگاڑ کے وقت پھر شریعت معیار بن جاتی ہے۔ البغی سے مراد ظلم اور لوگوں کے حقوق پر دست درازی ہے۔

دنیا میں کوئی معاشرہ بھی فحاشی' منکرات اور ظلم پر قائم نہیں رہ سکتا۔ ایسا معاشرہ کبھی بھی قائم نہیں رہ سکتا جس میں فحاشی وسیع پیمانے پر رائج ہو' نیز ایسی سوسائٹی بھی کبھی پنپ نہیں سکتی' جس میں منکرات نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہو۔ ایسا کوئی ملکی نظام قائم نہیں رہ سکتا جس کی اساس ظلم پر ہو۔

کوئی بھی معاشرہ ایسے اجتماعی نظام کو بہت ہی کم عرصہ تک برداشت کرتا ہے' جلد ہی اس نظام کے خلاف لوگ احتجاج شروع کر دیتے ہیں۔ اگرچہ ایسا کوئی ظالمانہ اور جابرانہ معاشرہ پر قوت اور پر شوکت ہو۔ اگرچہ ایسے اجتماعی نظام کے بااختیار لوگ ایسے نظام کی حمایت اور بچاؤ کے لیے لا انتہاء وسائل استعمال کریں۔ انسانی تاریخ کا اگر تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو یہ تاریخ درحقیقت فحاشی' منکرات اور ظلم کے خلاف مسلسل احتجاج سے عبارت ہے لہٰذا اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ تاریخ میں کچھ عرصے تک کوئی اجتماعی نظام فحاشی' منکرات اور ظلم پر قائم رہا ہے۔ ایسے نظاموں کے خلاف چونکہ ہمیشہ احتجاج اور ردعمل ہوتا رہا ہے اس لیے تاریخ سے یہی سبق ملتا ہے۔ ایسے نظام میں اسلامی سوسائٹی کے جسم کے لیے فارن باڈی رہے ہیں اور انسانی سوسائٹی نے ہمیشہ ایسے نظاموں کو جھاڑ کر پھینک دیا ہے جس طرح ہر جسم اپنے اندر فارن باڈی کے آنے کے خلاف ردعمل کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ کی طرف سے عدل و احسان کا حکم دینا اور فحاشی' منکرات اور ظلم سے منع کرنا فطرت سلیمہ کے عین مطابق ہے۔ اسلام اس فطری ردعمل کو اسلامی جدوجہد قرار دے کر اسے قوت عطا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حکم پر سبق آموز تبصرہ یوں آتا ہے۔

يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۱۶ : ۹۰) "وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو"۔ یہ نصیحت اس لیے ہے کہ تم اپنی اصل فطرت کی طرف رجوع کرو اور اسے یاد کرو"۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ (۱۶ : ۹۱) "اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو' اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو۔ جبکہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو۔ اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے"۔

اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد میں مسلمانوں کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا ہوا عہد بھی شامل ہے' اور وہ عہد بھی شامل ہیں جن کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ نیز کسی بھی انسانی سوسائٹی میں تعلقات کا قیام صرف اسی وجہ سے ہے کہ لوگ عہد کا احترام کریں۔ اس کے بغیر تو کوئی معاشرہ قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ نہ انسانیت قائم رہ سکتی ہے۔ یہ آیت لوگوں کو اس بات پر ملامت کرتی ہے کہ وہ عہد کو پختہ باندھنے کے بعد اسے توڑیں' حالانکہ انہوں نے اس عہد کا گواہ اور ضامن صرف اللہ کو ٹھہرایا ہے اور اللہ کے نام سے یہ عہد ہوا' ذرا ہلکی سی تنبیہ بھی۔

اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ (١٦ : ٩١) "اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے"۔

اسلام نے وفائے عہد میں بہت ہی سختی کی ہے۔ اس میں کسی بھی وقت چشم پوشی کی اجازت نہیں دی۔ اس لیے کہ وفائے عہد وہ بنیاد ہے جس پر پورا اجتماعی نظام قائم ہوتا ہے' اس کے سوا اجتماعی نظام منہدم ہو جاتا ہے۔ اسلامی نصوص قرآن و سنت نے صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا کہ وفائے عہد کا حکم دے دیا جائے اور نقض عہد کے خلاف محض وعید کر دی جائے بلکہ اس کی بار بار تاکید کی ہے' اور نقض عہد کی قباحتیں بیان کی ہیں۔ ان تمام اسباب و وجوہات کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے جو کسی وقت نقض عہد کا باعث بنیں۔

قرآن کہتا ہے :

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ۭ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِىَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۭ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (١٦ : ٩٢) "تمہاری حالت اس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے آپ ہی محنت سے سوت کاتا اور پھر آپ ہی اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ تم اپنی قسموں کو آپس کے معاملات میں مکر و فریب کا ہتھیار بناتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدے حاصل کرے۔ حالانکہ اللہ اس عہد و پیمان کے ذریعہ سے تم کو آزمائش میں ڈالتا ہے' اور ضرور وہ قیامت کے روز تمہارے تمام اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا"۔

جو شخص عہد توڑتا ہے وہ اس بے وقوف عورت کی طرح ہے جو کمزور ہے اور ہر وقت رائے اور عزم بدل دینے والی ہے۔ بار بار سوت کاتتی ہے اور پھر اسے توڑ دیتی ہے اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھر اسے سوت بنا دیتی ہے۔ اس تمثیل کا ہر جز تعجب اور حقارت کا اظہار کرتا ہے۔ اور اس عورت کے فعل کو فعل شنیع اور قابل نفرت بناتا ہے۔ یہی اصل مقصود ہے اس تشبیہ سے۔ کوئی بھی شریف النفس انسان اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ وہ اس ضعیف الارادہ' احمق عورت کی طرح ہو جائے جو ایسا کام کرتی ہو جس میں اس کے لیے کوئی فائدہ نہ ہو۔

ان میں سے بعض لوگ حضور اکرمؐ کے ساتھ اپنے کیے ہوئے عہد کو اس لیے توڑنے کی سوچ رہے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جمعیت قلیل ہے اور وہ کمزور ہے جبکہ ان کے مقابلہ میں قریش کی جمعیت کثیر ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کو متنبہ کیا گیا کہ یہ ان کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں ہے کہ وہ ایسے قسمیہ معاہدوں کو دھوکہ اور بے ایمانی کا ذریعہ

بنائیں اور کسی بھی وقت گردن سے اتار پھینکیں۔

تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَکُمْ دَخَلًا بَیْنَکُمْ اَنْ تَکُوْنَ اُمَّۃٌ ھِیَ اَرْبٰی مِنْ اُمَّۃٍ (۱۶ : ۹۲) "تم اپنی قسموں کو آپس کے معاملات میں مکر و فریب کا ہتھیار نہ بناؤ اس لیے کہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر ہے" ۔ یعنی اس لیے کہ ایک قوم دوسری قوم سے تعداد میں زیادہ ہے اور تمہاری مصلحت زیادہ تعداد والی امت سے وابستہ ہے۔

اس آیت کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کوئی محض اس لیے عہد کو توڑے کہ کسی ملک کے مصالح اس کا تقاضا کرتا ہوں۔ مثلاً پہلے ایک حکومت دوسری حکومت کے ساتھ یا دوسری حکومتوں کے مجموعے کے ساتھ کوئی معاہدہ کرے اور پھر اس کو محض اس لیے توڑ دے کہ دوسری طرف اقوام کا بڑا جتھہ ہے اور اس حکومت کے مصالح اس دوسرے مجموعے کے ساتھ وابستہ ہوں۔ اسلام اس قسم کی مصلحتوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہر حالت میں عہد کو وفا کیا جائے اور کسی بھی عہد کو دھوکے اور مفاد کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ یہ شرط اس کے علاوہ ہے کہ کوئی عہد صرف نیکی اور خدا خوفی کی اساس پر ہو کسی غیر مستحسن اور خدا کی نافرمانی کے مقاصد کے لیے کوئی عہد سرے سے کیا ہی نہ جائے۔ اثم، فسوق اور نافرمانی کی بنیاد پر کوئی عہد نہ کیا جائے۔ یہ بات تو ناقابل تصور ہے کہ اقوام و ملل کو لوٹنے کے لیے کوئی عہد کیا جائے۔ یہ ہے وہ اصول جس پر اسلامی جماعت کی تشکیل ہوئی اور اسلامی مملکت کی یہی پالیسی رہی۔ اس کے نتیجے میں پوری دنیا اطمینان، اعتماد اور پاکیزگی کی دولت سے مالا مال ہو گئی۔ اسی پر مسلمان، افراد اور امم سے معاملہ کرتے رہے جب تک کہ مسلمان جہاں کے قائد تھے۔

قرآن کریم کی یہ آیت مسلمانوں کو متنبہ کرتی ہے کہ وہ اس قسم کی باتوں کو وجہ جواز بنا کر معاہدات کو پس پشت نہ ڈالیں اور یہ کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ کوئی شخص یا حکومت معاہدے کو توڑنے کے لیے مجبور ہو جائے۔

اَنْ تَکُوْنَ اُمَّۃٌ ھِیَ اَرْبٰی مِنْ اُمَّۃٍ (۱۶ : ۹۲) "اس لیے کہ ایک قوم دوسری قوم سے زیادہ ہے"۔ یہ ایک آزمائش ہے اور اللہ کی طرف سے امتحان ہے۔ اس طرح اللہ ان کی قوت ارادی، ان کے جذبہ وفائے عہد اور ان کی عزت نفس کی اس ذات کے احترام کرنے میں آزمائش کرتا ہے جس کے نام پر انہوں نے یہ عہد کیا تھا۔ یعنی اس پر انہوں نے اللہ کو شاہد و گواہ بنایا تھا۔

اِنَّمَا یَبْلُوْکُمُ اللّٰہُ بِہٖ (۱۶ : ۹۲) "بے شک اللہ تعالیٰ اس معاملے میں تمہیں آزماتا ہے"۔ افراد اور اقوام کے درمیان جو اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، ان کے پورے فیصلے یہاں ہی نہیں ہو جاتے، اللہ فرماتے ہیں کہ آخری فیصلہ اللہ نے قیامت کے دن کرنا ہے۔

وَلَیُبَیِّنَنَّ لَکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ مَا کُنْتُمْ فِیْہِ تَخْتَلِفُوْنَ (۱۶ : ۹۲) "اور اللہ ضرور قیامت کے دن تمہارے تمام اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا"۔ ان الفاظ کو بطور تمہید یہاں لایا گیا ہے، یہ اس امر کے لیے تمہید ہیں کہ رائے، نظریہ اور عقیدے کے خلاف لوگوں کے ساتھ بھی اگر عہد ہو تو اسے پورا کیا جائے یونکہ وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ

لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶ : ۹۳) "اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، مگر وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈالتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہ راست دکھاتا ہے اور ضرور تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس ہوگی"۔

اگر اللہ چاہتا تو لوگوں کو ایک ہی استعداد پر پیدا کرتا، لیکن اللہ نے ان کو بالکل مختلف صلاحیتیں دیں اور ان کو ایک ہی طباعت کے نسخے نہیں بنایا۔ مختلف طرز پر بنایا ہے۔ پھر ان کے لیے اس نے ہدایت پانے اور ضلالت پانے کے ضابطے بنا دیئے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا مسئول بنایا۔ لہٰذا اختلاف عقائد و مذاہب اس بات کا جواز نہیں ہے کہ تم اس سے نقض عہد کرو۔ اختلاف مذاہب کے اور اسباب ہیں جن کا تعلق اللہ کی مشیت سے ہے۔ رہا عہد تو اس کا وفا کرنا لازم ہے۔ اگرچہ عقائد کا اختلاف ہو۔ یہ ہے اسلام کا اولین اصول بین الملی معاملات اور مذہبی رواداری۔ اس اصول میں اسلام اپنے عروج پر ہے اور قرآن کریم کے زیر ہدایت اس اصول کو اس دنیا میں صرف مسلمانوں نے عملی شکل دی۔

---ooo---

مزید تفصیلات دی جاتی ہیں جن میں وفائے عہد کی تاکید کی گئی ہے اور اس بات کی مزید ممانعت کی گئی ہے کہ تم معاہدے کو دھوکہ دہی اور فساد پرستی کے لیے استعمال کرو۔ یہ دنیاوی مفاد پرستی اور دنیائے دنی کے وقتی مفادات تمہیں اطمینان کی وہ دولت نہیں دے سکتے۔ اس کے نتیجے میں انسان کی نفسیاتی اور اجتماعی زندگی کے تمام اصول ٹوٹ جائیں گے اور اجتماعی معاملات اور تعلقات میں ایک بھونچال پیدا ہو جائے گا۔ یہ تو تھا دنیا کا عذاب۔ رہی آخرت تو آخرت میں ایسے لوگوں کو سخت عذاب سے دوچار ہونا ہوگا۔ یہاں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اگر تم نے وفائے عہد کیا اور اس کے نتیجے میں تمہیں کوئی دنیاوی نقصان ہوگیا تو اس کی جزاء بھی اللہ دے گا۔ دنیا کے مفادات تو فنا ہونے والے ہیں اور آخرت کے مفادات باقی رہنے والے ہیں۔ اللہ کے خزانے وسیع ہیں اور اس کے پاس نہ ختم ہونے والی دولت ہے۔

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۵﴾ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۭ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

"(اور اے مسلمانو) تم اپنی قسموں کو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کا ذریعہ نہ بنا لینا، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدم جمنے کے بعد اکھڑ جائے اور تم اس جرم کی پاداش میں کہ تم نے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا، برا نتیجہ دیکھو اور سزا بھگتو۔ اللہ کے عہد کو تھوڑے سے فائدے کے بدلے نہ بیچ ڈالو، جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمہارے لیے زیادہ بہتر

ہے اگر تم جانو۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ للہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے۔ اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے"۔

قسموں کو دھوکے اور فریب کے لیے استعمال کرنے کے نتیجے میں انسانی ضمیر سے عقیدہ مرجاتا ہے اور دوسروں کے ضمیر میں اس کی صورت بگڑ جاتی ہے۔ جو شخص قسم اٹھاتا ہے اور یہ جانتے ہوئے اٹھاتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے' ایسے شخص کے دل میں کوئی عقیدہ قرار نہیں پکڑ سکتا۔ نہ ایسا شخص کسی راستے پر ثابت قدمی سے چل سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جن کے خلاف قسم اٹھاتا ہے ان کی نظروں میں بھی اپنے دین و ایمان کی شکل بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ دوسرا فریق جان لیتا ہے کہ اس کی یہ قسمیں دھوکے کے لیے تھیں۔ یوں یہ شخص ان لوگوں کو دین اسلام سے متنفر کر کے ان کی گمراہی کا سبب بنتا ہے کیونکہ یہ دوسرے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے ایک بری مثال قائم کرتا ہے۔

جب لوگوں نے دیکھا کہ اہل اسلام اپنے وعدے کے بہت پکے ہیں' عہد کے پابند ہیں' معاملات میں صاف ہیں اور ایمان میں مخلص ہیں تو کفار جماعتوں اور اقوام کی شکل میں اسلام میں داخل ہو گئے کیونکہ وفائے عہد اور ایفائے میثاق کے نتیجے میں ان کو جو خسارہ ہوتا تھا' اس سے فائدہ بہت زیادہ تھا۔

قرآن کریم اور سنت رسولؐ نے مسلمانوں کا کردار تعمیر کرتے ہوئے اس پہلو سے ان کی زندگیوں پر بہت ہی اچھے نقوش چھوڑے اور انہی نقوش کے مطابق مسلمان انفرادی طور پر اور حکومتی سطح پر لوگوں سے معاملات کرتے رہے۔ ان کا یہ طرز عمل نہایت ہی امتیازی تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت معاویہ اور شاہ روم کے درمیان معاہدۂ امن کا ایک وقت مقرر تھا۔ حضرت معاویہ نے اختتام اجل سے پہلے ہی شاہ شام کے خلاف لشکر کشی کر دی جبکہ ان کو معلوم ہی نہ تھا۔ اس موقعہ پر حضرت عمر ابن عتبہ نے فرمایا اللہ اکبر' یا معاویہ' وعدے کی وفا کرو' غداری مت کرو' میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے "جس شخص اور کسی قوم کے درمیان ایک میعاد امن مقرر ہو' تو وہ اپنے اس عہد کو ہرگز حلال نہ کرے جب تک وقت گزر نہ جائے۔ چنانچہ حضرت معاویہ لشکر لے کر واپس ہو گئے۔ اسلامی تاریخ ایسی روایات سے بھری پڑی ہے کہ مسلمانوں نے نقض عہد میں صریح فائدے کے باوجود عہد کا پاس رکھا اور ظاہری مصلحتوں کو چھوڑ دیا۔

قرآن کریم نے مسلمانوں کے دلوں پر یہی اسلامی رنگ چڑھا دیا تھا۔ قرآن نے وفائے عہد کی ترغیب دی' عہد شکنی سے ڈرایا۔ حضورؐ نے لوگوں کو ڈرایا اور یہ قرار دیا ہے کہ فریقین ہی معاہدے کے فریق نہیں ہوتے بلکہ اللہ بھی فریق ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے یہ قرار دیا کہ عہد شکنی کی صورت میں جو نفع ہوتا ہے وہ نہایت ہی معمولی اور حقیر ہوتا ہے اور اللہ وفائے عہد پر جو اجر اور انعام دے گا وہ بہت ہی بڑا انعام ہو گا۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۶ : ۹۵) "اللہ کے عہد کو تھوڑے سے فائدے کے بدلے بیچ نہ ڈالو' جو کچھ للہ کے پاس ہے وہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے' اگر تم جانو"۔ پھر قرآن کریم یاد دلاتا ہے کہ لوگوں کے پاس جو کچھ ہے' اگرچہ وہ ان کی ملکیت ہو' وہ زائل ہونے والا ہے اور اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (۱۶: ۹۶) "جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہی باقی رہنے والا ہے"۔ قرآن کریم وفائے عہد کے لیے لوگوں کے عزم کو قوت دیتا ہے اور وفائے عہد کی راہ میں تکالیف اٹھانے کی ترغیب دیتا ہے اور ان تکالیف پر صبر کرنے والوں کے ساتھ اجر حسن کا وعدہ کرتا ہے۔

وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۶: ۹۶) "اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے"۔ اور اس سلسلے میں ان سے جو غلطیاں سرزد ہوئیں ان کو معاف کر دیں گے۔ پس جزاء میں صرف اعمال کا اچھا پہلو ملحوظ رہے گا۔

--- ooo ---

عمل اور جزاء کی مناسبت سے یہاں عمومی ضابطہ بتا دیا جاتا ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

"جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے"۔

چنانچہ اس آیت سے درج ذیل اصول وضع ہوتے ہیں:۔

(۱) جزاء و سزا میں انسان کے دونوں جنس مرد اور عورت ایک ہی حکم رکھتے ہیں۔ دونوں اس معاملے میں بالکل مساوی ہیں اور دونوں کی سزا و جزاء برابر ہے۔ اللہ کے ہاں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ لفظ (مَن) اگرچہ مرد اور عورت دونوں کے لیے آتا ہے لیکن مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى (۱۶: ۹۷) کا لفظ زیادہ تاکید اور وضاحت کے لیے اضافہ کر دیا۔ اس سورہ میں اس لفظ کو بالخصوص اس لیے بھی لایا گیا کہ اس میں عورت کے بارے میں اہل جاہلیت کے برے خیالات کی تردید بھی کی گئی تھی۔ مثلاً یہ کہ عورتوں کے بارے میں اس سوسائٹی کی رائے اچھی نہ تھی اور جس شخص کو یہ خبر ملتی کہ اس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے تو وہ بدرنگ ہو جاتا اور لوگوں سے چھپتا پھرتا۔ پریشانی، شرمندگی اور عار میں مبتلا ہوتا۔

(۲) ہر عمل کے لیے کسی اساس کا ہونا ضروری ہے۔ اسلام میں اعمال کے لیے ایک ہی اساس ہے، وہ یہ کہ وَهُوَ مُؤْمِنٌ (۱۶: ۹۷) "بشرطیکہ وہ مومن ہو"۔ یہ ایمان کسی بھی اخلاقی عمارت کے لیے ایک پختہ اساس ہے، اس کے بغیر کوئی عمارت تعمیر نہیں ہو سکتی۔ اس کے بغیر اعمال یونہی ہوں گے جس طرح ریت کا ڈھیر کہ جب اسے کوئی سخت آندھی لے تو ہوا میں بکھر جائے۔ عقیدہ اور نظریہ وہ چیز ہے جس کے ساتھ اعمال کی تاریں جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر اعمال کے تار و پود ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جاتے ہیں۔ عقیدہ اعمال صالحہ کا سبب بنتا ہے اور ان کو مقصدیت عطا

کرتا ہے۔عقیدہ اور نظریہ اعمال خیریہ کو ایک ایسی اساس عطا کرتا ہے جس کی اوپر وہ سب ٹھہرے ہوتے ہیں 'مضبوط ہوتے ہیں۔ان میں عارضی پن اور تزلزل نہیں ہوتا اور نہ مفادات اور خواہشات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ اگر اعمال صالحہ ایمان کی اساس پر استوار ہوں تو نتائج یہ ہوں گے کہ ایسے لوگوں کو اس جہاں میں بھی حیات طیبہ عطا ہوگی۔یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ حیات عیاشی' خوشحالی اور دولتمندی کی زندگی ہو'کبھی یہ بھی ہو گا کہ ایک مومن کو یہ چیزیں بھی دستیاب ہوں گی۔اور کبھی نہ ہوں گی۔لیکن یاد رہے کہ بعض اوقات بقدر کفایت مال کے ساتھ بھی انسان کی زندگی نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ گزرتی ہے بشرطیکہ تعلق باللہ قائم ہو' اطمینان قلبی نصیب ہو اور اللہ پر بھروسہ اور اللہ کی رضا حاصل ہو۔انسان کو جسمانی صحت نصیب ہو' اس کی خواہشات میں ٹھہراؤ ہو اور اس کی ہرچیز میں برکت ہو۔گھر کا ماحول اچھا ہو' اور افراد خانہ کے دلوں میں محبت ہو۔ماحول ایسا ہو کہ اس میں اعمال صالحہ ہو رہے ہوں اور ان اعمال کی وجہ سے ہر طرف زندگی میں طمانیت اور ضمیر میں سکون ہو۔مال تو امن و سکون کا ایک معمولی عنصر ہے۔یہ بھی ضروری ہے کہ مال بقدر کفایت ہو ورنہ وبال بن جاتا ہے۔لیکن یہ مقام ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے کہ انسان کا دل پاکیزہ' برگزیدہ اور اعلیٰ مقاصد کے ساتھ لگا ہوا ہے جو اللہ کے ہاں قیمتی ہیں۔

یاد رہے کہ دنیا کی حیات طیبہ آخرت کے اجر میں کوئی کمی نہیں لاتی۔ آخرت کا اجر تو ان اچھے اعمال پر ہو گا جو اہل دین نے سرانجام دیئے اور بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۶:۹۷) سے ضمناً یہ بات نکلتی ہے کہ برے اعمال قلم زد ہو جائیں گے۔کیا اچھا سلوک ہے اور کس قدر کرم نوازی ہے ذات باری کی۔

---()()()---

جس کتاب کے ذریعہ مذکورہ بالا تعلیمات دی گئیں اب اس کتاب کے بارے میں چند کلمات اس کے 'آداب تلاوت اور اس کے بارے میں مشرکین کے تبصروں پر تنقید۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ اِنَّهٗ
لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ ۱۳
عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ۝ ۱۱ ع
۱۹

"پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان رجیم سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔اسے ان لوگوں پر تسلط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لاتے اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔اس کا زور تو انہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو اپنا سرپرست بناتے اور اس کے بہکانے سے شرک کرتے ہیں۔

تلاوت سے قبل اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پڑھنا اس لیے ضروری ہے کہ تلاوت قرآن مجید سے قبل ایسی فضا تیار ہو جس میں کوئی شیطانی وسوسہ نہ ہو' اور انسانی شعور سب کا سب اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے۔اس میں کوئی گندہ جذبہ کارفرما نہ ہو۔اور شیطانی شر اس سے دور ہو۔

شیطان سے اللہ کی پناہ مانگو۔

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۱۶:۹۹) "اسے ان لوگوں پر تسلط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لاتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں"۔ لہٰذا جو لوگ اللہ وحدہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ان کے دل اللہ کے لیے خالص ہو جاتے ہیں۔ شیطان ان پر غالب نہیں آ سکتا اگرچہ وہ ان پر ڈورے ڈالے کیونکہ ان کا تعلق خدا کے ساتھ ہوتا ہے اور اللہ ان کو اس ملعون کے دام سے بچاتا ہے۔ وہ اللہ کے ساتھ ساتھ ہوتے اور اللہ کے پیچھے چلنے والے ہوتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان سے کبھی غلطی سرزد ہوتی ہے لیکن وہ شیطان کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتے۔ لہٰذا وہ تعوذ کے ذریعے شیطان کو بھگاتے رہتے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹتے رہتے ہیں۔

اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ (۱۶:۱۰۰) "اس کا زور تو انہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو اپنا سرپرست بناتے ہیں"۔ وہ اس کو اپنا دوست بناتے ہیں' وہ اس کے سامنے جھکتے ہیں اور اس کی خواہشات و میلانات کو پورا کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ لوگ شرک کرتے ہیں۔ آج بھی بعض اقوام میں شیطان کی بندگی اور "اللہ شر" کی بندگی کا رواج موجود ہے۔ محض شیطان کا اتباع کرنا اور اس سے دوستی کرنا بھی ایک نوع کا شرک ہے۔

اب قرآن کے بارے میں مشرکین کے اقاویل اور جواب۔

وَاِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

"جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرتے ہیں ..... اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کرے --- تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم یہ قرآن خود گھڑتے ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے ناواقف ہیں۔ ان سے

کہو کہ اسے تو روح القدس نے ٹھیک ٹھیک میرے رب کی طرف سے بتدریج نازل کیا ہے تاکہ ایمان لانے والوں کے ایمان کو پختہ کرے اور فرماں برداروں کو زندگی کے معاملات میں سیدھی راہ بتائے اور انہیں فلاح و سعادت کی خوشخبری دے - ہمیں معلوم ہے یہ لوگ تمہارے متعلق کہتے ہیں کہ اس شخص کو ایک آدمی سکھاتا پڑھاتا ہے - حالانکہ ان کا اشارہ جس آدمی کی طرف ہے اس کی زبان عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے - حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کو نہیں مانتے' اللہ کبھی ان کو صحیح بات تک پہنچنے کی توفیق نہیں دیتا اور ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے - (جھوٹی باتیں نبی نہیں گھڑ تابلکہ) جھوٹ وہ لوگ گھڑ رہے ہیں جو اللہ کی آیات کو نہیں مانتے' وہی حقیقت میں جھوٹے ہیں"-

مشرکین کو معلوم نہیں ہے کہ اس کتاب کا فنکشن کیا ہے - حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اس لیے نازل کی گئی ہے کہ یہ ایک عالمی سوسائٹی وجود میں لائے یعنی امت مسلمہ اور اس بات سے وہ بے خبر ہیں - یہ امت ایسی ہو جو پوری دنیا کی قیادت کرے اور یہ کہ یہ آخری امت ہے - آئندہ دنیا میں سب کچھ اس نے کرنا ہے' آسمانوں سے اب کوئی نئی رسالت نہیں آنی ہے - پھر یہ کہ اللہ جس نے انسان کو پیدا کیا وہی جانتا ہے کہ انسان کی مصلحت اور ضرورت کیا ہے - جب کسی حکم کا مقصد پورا ہو جائے اور اس وقتی حکم کی میعاد پوری ہو جائے تو اللہ ایک جدید حکم لے آتا ہے کیونکہ جدید حالات میں اس جدید حکم کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور وہ زیادہ مناسب بھی ہوتا ہے - سابقہ وقتی حکم کے مقابلے میں اب یہ حکم دائمی اور ابد الدھر تک قائم رہنے کا اہل ہوتا ہے - اللہ ہی سب کچھ جانتا ہے اور آیات الٰہیہ کی مثال تو ایسی ہے کہ جس طرح مریض کو گھونٹ گھونٹ دوا پلائی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ شفایاب ہو جاتا ہے - اب دوائی کے بجائے اسے معمول کی غذائیں دی جاتی ہیں تاکہ وہ معمول کی زندگی بسر کرے -

لیکن مشرکین مکہ اس حکمت سے واقف نہ تھے' اس لیے وہ یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ ایک آیت کے بعد دوسری آیت کیوں آرہی ہے - خود حضور کی زندگی میں قوانین کیوں بدل رہے ہیں - انہوں نے اس بات کو اس پر محمول کیا کہ نعوذ باللہ حضورؐ اپنی طرف سے آیات بناتے ہیں' حالانکہ وہ جانتے تھے کہ حضورؐ تو صادق و امین ہیں اور وہ کبھی بھی جھوٹ نہیں بولتے' چہ جائیکہ وہ اللہ پر جھوٹ بولیں -

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (١٦ : ١٠١) "حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے"-

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (١٦ : ١٠٢) "کہہ دو اسے تو روح القدس نے ٹھیک ٹھیک تیرے رب کی طرف سے بتدریج مجھ پر نازل کیا ہے"- لہٰذا اس بات کا امکان ہی نہیں رہتا کہ یہ افتراء ہو - اسے روح القدس لے کر آئے ہیں' اللہ کی طرف سے لائے ہیں اور اس کی تعلیمات سچائی پر مشتمل ہیں - ان میں باطل کا شائبہ تک نہیں ہے اور یہ اس لیے آئی ہیں کہ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (١٦ : ١٠٢) "تاکہ ایمان لانے والوں کے ایمان کو پختہ کریں"- ان کے دل اللہ کے ساتھ جڑ جائیں اور وہ معلوم کرلیں کہ یہ تعلیمات اللہ کی طرف سے ہیں - وہ حق پر جم جائیں اور ان کی سچائی پر مطمئن ہو جائیں تاکہ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (١٦ : ١٠٢) "اور فرماں برداروں کو زندگی کے معاملات میں سیدھی راہ بتائے اور انہیں سعادت اور فلاح کی خوشخبری دے"- یہ خوشخبری خصوصاً نصرت اور تمکین فی الارض کے بارے میں ہے -

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَ

هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُبِينٌ (١٦ : ١٠٣) ”ہمیں معلوم ہے کہ یہ لوگ تمہارے متعلق کہتے ہیں کہ اس شخص کو ایک آدمی سکھاتا ہے حالانکہ ان کا اشارہ جس آدمی کی طرف ہے اس کی زبان عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے“۔

ان کی طرف سے دوسرا افتراء یہ تھا کہ شاید رسول اللہ ؐ کو کوئی آدمی یہ قرآن مجید سکھاتا ہے۔ انہوں نے اس کا نام بھی لیا تھا۔ البتہ اس کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ وہ ایک عجمی غلام کی طرف اشارہ کرتے تھے جو دراصل بعض قبائل قریش کا غلام تھا اور یہ حلفاء کے قریب تجارت کرتا تھا۔ اس کے پاس حضور اکرم ؐ بیٹھا کرتے تھے۔ یہ شخص عجمی تھا اور عربی زبان جانتا ہی نہ تھا۔ صرف عربی میں بقدر ضرورت شد بد رکھتا تھا۔

محمد ابن اسحاق کی روایت ہے کہ مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ حضور اکرم ؐ مروہ کے قریب ایک عیسائی غلام کے پاس بیٹھا کرتے تھے اس کا نام جبر تھا۔ یہ بنی الحضرمی شاخ کا غلام تھا۔ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَ

هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُبِينٌ (١٦ : ١٠٣) ”ہمیں معلوم ہے کہ یہ لوگ تمہارے متعلق کہتے ہیں کہ اس شخص کو ایک آدمی سکھاتا ہے حالانکہ ان کا اشارہ جس آدمی کی طرف ہے اس کی زبان عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے“۔

عبداللہ ابن کثیر نے کہا ہے اور عکرمہ اور قتادہ سے نقل کیا ہے کہ اس کا نام یعیش تھا ابن کثیر نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک غلام کو تعلیم دیتے تھے۔ یہ مکہ میں تھا اور اس کا نام بلعام تھا اور حضور اکرم ؐ اس کے پاس جایا کرتے تھے۔ مشرکین کو معلوم تھا کہ آپ ؐ اس کے پاس آتے جاتے ہیں تو انہوں نے یہ الزام لگایا کہ آپ ؐ کو یہ تعلیمات بلعام دے رہا ہے۔

بہرحال نام جو بھی ہو ' لیکن اللہ تعالیٰ نے اس الزام کی جو تردید کی ہے وہ سادہ اور لاجواب ہے۔ اور یہ کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ جس شخص کا تم کہتے ہو اس کی تو زبان عجمی ہے اور قرآن عربی مبین میں ہے۔

ان لوگوں نے حضور اکرم ؐ پر جو الزام لگایا تھا اسے ہم ہرگز سنجیدہ الزام نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ بھی ان کی جانب سے جھوٹے پروپیگنڈے کی سازش تھی۔ اس لیے کہ وہ قرآن مجید کی ادبی اور نظریاتی قدروقیمت اور اس کے اعجاز کو اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی عجمی حضور اکرم ؐ کو یہ کلام سکھا سکے۔ اگر کوئی عجمی اس قسم کا کلام لا سکتا تو وہ اسے بطور اپنے کلام کے کیوں پیش نہ کرتا۔

آج جبکہ انسان نے بہت زیادہ ترقی کر لی ہے اور انسانی قابلیت کے نتیجے میں تصنیف و تالیف کا فن بہت ہی آگے بڑھ گیا ہے۔ نیز قانون سازی اور نظم و نسق کے جدید ترین طریقے وجود میں آگئے ہیں۔ آج ایک معمولی علم رکھنے والا کوئی شخص اور اجتماعی نظاموں اور قانونی نظاموں سے واقف کوئی بھی شخص یہ تصور نہیں کر سکتا کہ یہ کتاب کسی ایک انسان کی

تصنیف ہو سکتی ہے۔

روس کے مادہ پرست اور ملحدوں کی رائے بھی یہ ہے کہ یہ قرآن کریم کسی ایک شخص کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک پوری جماعت کی تصنیف ہے بلکہ اس کے بعض حصے جزیرۃ العرب کی تصنیف بھی نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعض حصے ایسے ہیں کہ وہ یقیناً باہر سے لائے گئے ہیں۔ یہ نگارشات انہوں نے ۱۹۵۴ء میں اس کانفرنس کے نتیجے میں مرتب کیں جو قرآن کریم پر تنقید کے لیے انہوں نے منعقد کی تھی۔

روسیوں نے یہ تجویز اس لیے پیش کی کہ ایک شخص کے اندر اس قدر قابلیت نہیں ہو سکتی کہ وہ ایسی کتاب تصنیف کرے۔ اور نہ کسی ایک قوم کا یہ کام ہے لیکن روسیوں کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ سیدھی سادی بات تسلیم کر لیں کہ یہ کتاب انسانی تصنیف نہیں ہو سکتی لہٰذا یہ وحی رب العالمین ہے۔ لیکن وہ چونکہ مادہ پرست اور ملحد تھے' اور خدا' رسولوں اور رسالت کے وجود ہی کے منکر تھے اس لیے انہوں نے یہ سچائی تسلیم نہ کی۔

اگر بیسویں صدی کے مستشرقین کی سوچ یہ ہے کہ قرآن کریم کسی ایک انسان کی تصنیف نہیں ہو سکتا تو پھر جزیرۃ العرب کے ایک عجمی غلام کی تصنیف کس طرح ہو سکتا ہے۔

قرآن کریم ان کے ان اقوال کی وجہ یہ بتاتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۶ : ۱۰۴)

"حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کو نہیں مانتے' اللہ کبھی ان کو صحیح بات تک پہنچنے کی توفیق نہیں دیتا اور ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

یہ لوگ جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے' اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق نہیں دی کہ وہ اس کتاب کے بارے میں صحیح رائے قائم کریں۔ نہ وہ اصل حقیقت کی طرف راہ پا سکتے ہیں کیونکہ انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کفر کریں گے' منہ موڑیں گے اور کبھی بھی مان کر نہ دیں گے۔ اس لیے وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۶ : ۱۰۴) "ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

یہاں اب بتایا جاتا ہے کہ رسول امین کس طرح اللہ پر افترا باندھ سکتے ہیں۔ ایسا کام تو وہ لوگ کرتے ہیں جو بدقماش لوگ ہوں اور جو افتراء پردازی کرتے رہتے ہیں۔

اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (۱۶ : ۱۰۵) "(جھوٹی باتیں نبی نہیں گھڑتا بلکہ) جھوٹ وہ لوگ گھڑ رہے ہیں جو اللہ کی آیات کو نہیں مانتے' وہی حقیقت میں جھوٹے ہیں"۔

جھوٹ اس قدر گھناؤنا گناہ ہے کہ کوئی مومن کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ حضور اکرمؐ نے ایک حدیث میں صاف فرمایا ہے کہ کوئی مسلم جھوٹ نہیں بول سکتا اگرچہ مسلم سے دوسرے گناہ سرزد ہو سکتے ہیں۔

---ooo---

اب یہاں سے آگے ان لوگوں کے احکام بیان کیے جاتے ہیں جو ایمان کے بعد کفر اختیار کرتے ہیں۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

"جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے (وہ اگر) مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو (تب تو خیر) مگر جس نے دل کی رضامندی سے کفر کو قبول کر لیا اس پر اللہ کا غضب ہے اور ایسے سب لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا' اور اللہ کا قاعدہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو راہ نجات نہیں دکھاتا جو اس کی نعمت کا کفران کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے' یہ غفلت میں ڈوب چکے ہیں۔ ضرور ہے کہ آخرت میں یہی خسارے میں رہیں"

مکہ کے ابتدائی دور میں مسلمانوں پر اس قدر مظالم ڈھائے گئے اور وہ اس قدر مشکلات سے دوچار ہوئے کہ ان کا برداشت کرنا صرف اس شخص کے لیے ممکن تھا جس نے شہادت کی نیت کی ہوئی تھی اور اس نے اس دنیا کی زندگی کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دی ہوئی تھی اور وہ اسلام کے بعد کفر کی طرف لوٹنے کے مقابلے میں شدید سے شدید اذیت کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

یہاں بتایا جاتا ہے کہ ایمان لانے کے بعد کفر کو اختیار کرنا بڑا جرم ہے۔ کیونکہ ایمان کو جاننے اور اس کو برتنے کے بعد ارتداد اختیار کرنا اور آخرت کے مقابلے میں کفر اختیار کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہو گا' عذاب عظیم کے وہ مستحق ہوں گے اور ہدایت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائیں گے۔ ایسے لوگ غفلت میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے دلوں' کانوں اور آنکھوں پر مہر لگ جاتی ہے اور آخرت میں یہ لوگ بہت بڑے خسارے سے دوچار ہوں گے اس لیے کہ نظریہ کے بارے میں کوئی تحریک بھی سودا بازی نہیں کر سکتی اور نظریہ اور دعوت کے بارے میں سود و زیاں کا لحاظ بھی نہیں کیا جاتا۔ جب ایک شخص ایمان لا کر اسلامی نظریہ حیات کو قبول کر لیتا ہے تو پھر چاہئے کہ اس زمین اور اس دنیا کے موثرات میں سے کوئی موثر بھی اس انسان پر اثر انداز نہ ہو کیونکہ زمین کا اپنا حساب و کتاب اور قدر و قیمت ہوتی ہے اور نظریات کی اپنی قدر و قیمت ہوتی ہے۔ نظریہ کوئی مذاق نہیں ہوتا' نظریات کے بارے میں کوئی بھی سودا

بازی نہیں ہو سکتی کیونکہ نظریات سودے بازی سے بلند مقام رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس فعل کی سزا میں اس قدر سختی کی گئی ہے۔اس سخت حکم سے صرف ایک استثناء ہے۔وہ یہ کہ ایک آدمی کو اعلان کفر پر مجبور کر دیا گیا ہو لیکن اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو' یعنی کوئی شخص اعلان کفر اس حالت میں کر دے کہ اسے موت کا خطرہ ہو لیکن اس کا دل ایمان و یقین پر مطمئن ہو۔روایات میں آتا ہے کہ یہ آیت حضرت عمار ابن یاسر کے بارے میں نازل ہوئی۔

ابن جریر نے محمد ابن عمار ابن یاسر سے روایت کی ہے کہ مشرکوں نے عمار ابن یاسر کو پکڑا اور انہیں سخت تکلیف دی۔بہت تشدد کیا یہاں تک کہ وہ ان کی خواہش کے مطابق بات کرنے کے قریب ہو گیا۔اس نے اس بات کی شکایت حضورؐ سے کی کہ اس نے تشدد کی وجہ سے یہ یہ باتیں کیں تو حضورؐ نے فرمایا تم اپنے دل کو کیسا پا رہے ہو تو انہوں نے عرض کیا کہ میرا دل تو ایمان پر مطمئن ہے۔تو حضورؐ نے فرمایا کہ اگر انہوں نے پھر اس قدر تشدد کیا تو تم پھر ایسی بات کہہ دو۔چنانچہ ایسے مشکل حالات میں کلمات کفر کہنے کی اجازت اور رخصت دے دی گئی۔

بعض مسلمان ایسے بھی گزرے جنہوں نے محض زبان سے کلمہ کفر ادا کرنے کے مقابلے میں موت کو پسند کیا۔سمیہ ابن یاسر نے یہ مقام عزیمت حاصل کیا۔ان کے اندام نہانی میں تیر کا نشانہ لگا۔اسی طرح ابو یاسر نے بھی یہ مقام حاصل کیا۔دونوں شہید ہو گئے مگر کلمہ کفر نہ کہا۔

اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا گیا۔شدید گرمی میں ایک عظیم پتھر ان کے سینے پر رکھ دیا جاتا اور کہا جاتا کلمہ شرک کہو۔وہ انکار کرتے اور کہتے احد احد اور کہتے کاش اگر اس سے زیادہ سخت بات معلوم ہوتی تو میں وہ بھی کہتا۔

یہی حال حبیب ابن زید انصاری کا رہا۔ان سے مسیلمہ کذاب نے کہا: کیا تم یہ گواہی دیتے ہو کہ محمد رسول اللہؐ ہیں؟ تو وہ کہتے ہاں' پھر اس نے کہا' کیا تم گواہی دیتے ہو کہ میں رسول ہوں۔تو وہ کہتے میں نہیں سن رہا۔تو وہ ان کا ایک ایک عضو کاٹتے رہے۔یہاں تک کہ وہ اس حالت میں شہید ہو گئے۔

ابن عساکر نے عبداللہ ابن حذیفہ سہمی کی سوانح عمری میں لکھا ہے۔یہ صحابی تھے۔ان کو رومیوں نے گرفتار کر لیا۔انہوں نے اسے اپنے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔بادشاہ نے انہیں کہا کہ آپ نصرانی بن جائیں' میں آپ کو اپنے اقتدار میں بھی شریک کرتا ہوں اور اپنی لڑکی آپ کے نکاح میں دیتا ہوں۔انہوں نے کہا کہ اگر تو مجھے اپنی پوری مملکت دے دے اور تمام عربوں کی حکومت بھی عطا کر دے' اس کے عوض کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کو ترک کر دوں اور وہ بھی پلک جھپکنے جتنی دیر کے لیے تو بھی میں یہ کام نہ کروں گا۔اس نے کہا تو پھر میں تمہیں قتل کر دوں گا۔انہوں نے کہا تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو۔کہتے ہیں کہ اس نے حکم دیا اور انہیں سولی پر لٹکا دیا گیا۔پھر اس نے تیراندازوں کو حکم دیا کہ وہ اس کے پاؤں اور ہاتھوں کے قریب تیر ماریں۔چنانچہ وہ تیر مارتے رہے اور بادشاہ ان پر نصرانیت کا دین پیش کرتا رہا۔لیکن انہوں نے انکار کیا۔اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ انہیں سولی سے اتار دیں۔چنانچہ انہیں تختہ دار سے اتار دیا گیا۔اس کے بعد تانبے کی ایک (تیل کی) ہنڈیا یا دیگ لائی گئی۔اسے گرم کیا گیا۔اس کے بعد ایک مسلمان قیدی لایا گیا' اسے اس کے اندر پھینکا گیا۔دیکھتے ہی دیکھتے وہ چمکدار ہڈیاں بن کر رہ گیا۔اس کے بعد پھر اس نے ان پر اپنا دین پیش کیا اور انہوں نے انکار کر دیا۔اب اس نے حکم دیا کہ ان کو بھی اس میں پھینک دیا جائے۔انہیں لوہے کی چرخی پر چڑھایا گیا تاکہ اس کے اندر پھینک دیں۔اس وقت وہ رو دیئے۔اس پر اس بادشاہ کو یہ لالچ پیدا ہو گیا کہ شاید

اب مان جائیں تو انہوں نے اسے بلایا تو انہوں نے کہا کہ میں رویا اس لیے ہوں کہ میری جان ایک ہے اور یہ ابھی اس دیگ میں ڈال دی جائے گی اور ختم ہو جائے گی لیکن میری خواہش تو یہ ہے کہ میرے جسم کے ہر بال کے برابر جانیں عطا ہوتیں اور وہ اللہ کی راہ میں قربان ہوتیں۔

ایک روایت میں ہے کہ اس نے ان کو قید کر دیا اور کھانا بند کر دیا۔ ایک عرصے تک یہ پابندی تھی۔ اس کے بعد انہیں شراب اور خنزیر بھیجا تو انہوں نے ان کو ہاتھ نہ لگایا۔ تو انہوں نے بلا کر پوچھا کہ تم نے ان کو کیوں ہاتھ نہ لگایا۔ انہوں نے کہا کہ یہ چیزیں اس وقت تو میرے لیے حلال ہیں لیکن میں تمہیں خوش کرنا نہیں چاہتا۔ اس پر اس نے کہا چلو میرے سر ہی کو چوم لو' میں تمہیں رہا کر دوں گا۔ اس پر انہوں نے کہا کیا تم میرے ساتھ تمام مسلمان قیدیوں کو رہا کر دو گے؟ تو اس نے کہا ہاں۔ تو انہوں نے اس کے سر کو چوم لیا اور انہوں نے وہ تمام قیدی رہا کر دیئے جو ان کے ساتھ تھے۔ جب وہ لوٹے تو عمر ابن الخطاب ؓ نے فرمایا ہر مسلمان پر یہ حق ہے کہ وہ عبداللہ ابن حذافہ کا سر چومے اور میں اس کی ابتداء کرتا ہوں۔ وہ اٹھے اور انہوں نے ان کے سر کو چوما۔ اللہ دونوں سے راضی ہو۔

یہ اس لیے کہ عقیدہ اور نظریہ ایک عظیم دولت ہیں۔ نظریہ میں کمزوری نہیں دکھائی جاتی اور رخصتوں پر عمل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اگرچہ رخصت ہوتی ہے لیکن ایک مومن نفس اس کو ترجیح دیتا ہے کہ وہ عزیمت پر عمل کرے کیونکہ نظریہ ایک ایسی امانت ہے جس پر انسان کو پوری زندگی اور پورے دنیاوی مفادات کو قربان کرنا چاہیے۔

---

18 ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوا ثُمَّ جَاهَدُوا
ع ۱۰ وَصَبَرُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۱۰﴾ يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ
20 عَنْ نَفْسِهَا وَتُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۱۱۱﴾

"بخلاف اس کے جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب (ایمان لانے کی وجہ سے) وہ ستائے گئے تو انہوں نے گھر بار چھوڑ دیئے۔ ہجرت کی' راہ خدا میں سختیاں جھیلیں اور صبر سے کام لیا۔ ان کے لیے یقیناً تیرا رب غفور و رحیم ہے۔ (ان سب کا فیصلہ اس دن ہو گا) جب کہ ہر متنفس اپنے ہی بچاؤ کی فکر میں لگا ہوا ہو گا اور ہر ایک کو اس کے کیے کا بدلہ پورا پورا دیا جائے گا اور کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ ہونے پائے گا"۔

یہ لوگ عربوں میں ضعفاء میں سے تھے اور سرکش مشرکین نے ان کو ان کے دین اور نظریہ کی وجہ سے تکالیف دیں۔ لیکن جونہی ان کو موقعہ ملا انہوں نے ہجرت کی۔ اسلام میں پختگی حاصل کی۔ اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور دعوت اسلامی کی خاطر تکالیف اٹھاتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ان کو مغفرت کی بشارت دیتے ہیں۔

إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱۶ : ۱۱۰) "ان کے لیے یقیناً تیرا رب غفور و رحیم

ہے"۔

یہ وہ دن ہے جس میں ہر نفس اپنے معاملات میں گھرا ہو گا۔ کوئی کسی اور کی طرف متوجہ نہ ہو گا۔

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا (١٦ : ١١١) "ہر متنفس اپنے ہی بچاؤ کی فکر میں لگا ہوا ہو گا"۔ انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن ہر شخص سخت ہولناک حالت میں ہو گا' ہر شخص اپنے ہی بارے میں فکر کر رہا ہو گا' اپنا ہی کیس لڑ رہا ہو گا۔ لیکن کسی کا جھگڑا اسے کچھ فائدہ نہ دے گا۔ وہاں تو ہر کسی کو اس کی اپنی ہی کمائی ملے گی۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (١٦ : ١١١) "کسی پر کوئی ظلم نہ ہو گا"۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۲۴ ایک نظر میں

اس سے پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ اللہ نے اس سورہ میں دو مثالوں کے ذریعے اسلامی عقیدۂ توحید کو سمجھایا ہے۔ یہاں اب اہل مکہ اور مشرکین قریش اور مکہ کے حالات پر ایک مثال دی جاتی ہے۔ اہل مکہ پر اللہ نے اپنے انعامات کی بارش کر دی تھی لیکن انہوں نے اپنی نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا۔ اس مثال کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اہل مکہ کو اس انجام سے خبردار کرنا چاہتے ہیں جو مستقبل کے پردوں میں ان کا منتظر ہے۔

اس مثال میں جن نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ وافر رزق اور امن و اطمینان کی نعمت ہے جو مکہ میں موجود تھی، اس حوالے سے پھر ان کے سامنے یہ بات بھی رکھی جاتی ہے کہ انہوں نے بت پرستی کی وجہ سے اپنے اوپر بعض طیبات اور حلال چیزوں کو خواہ مخواہ حرام کر رکھا ہے حالانکہ اللہ نے ان چیزوں کو حلال قرار دیا ہے۔ اللہ نے حرام چیزوں کو بیان کر دیا ہے اور یہ چیزیں ان میں سے نہیں ہیں۔ یہ بھی ایک طرح سے انعامات الہیہ کی ناشکری ہے۔ اس طرح کی ناشکری کے نتیجہ میں بھی تم پر عذاب الیم نازل ہو سکتا ہے اور یہ اللہ پر بہت ہی بڑا افتراء ہے اور اللہ نے ان اشیاء کی حرمت کا کوئی حکم نہیں دیا ہے۔

پھر مسلمانوں پر جو ناپاک چیزیں حرام کی گئیں اس کے حوالے سے ان اشیاء کا بھی ذکر کیا جاتا ہے جو یہودیوں پر حرام کی گئیں۔ یہ چیزیں ان پر بطور سزا ان کے بعض جرائم کی وجہ سے حرام کی گئی تھیں۔ نیز یہ ان کے بعض مظالم کی وجہ سے بطور سزا حرام ہوئی تھیں۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے حرام نہ تھیں جو اپنی ذات میں ایک امت تھے اور اللہ کی طرف یکسو اور حنیف تھے۔ شرک نہ کرتے تھے اور اللہ نے ان کو ہدایت دی تھی۔ وہ برگزیدہ تھے اور صراط مستقیم پر تھے۔ یہ طیبات ان پر بھی حلال تھیں اور ان کی اولاد پر بھی۔ یہاں تک کہ بعد کے ادوار میں بنی اسرائیل پر بطور سزا حرام ہوئیں اور ان جہالتوں سے کوئی تائب نہ ہو جائے تو اللہ غفور و رحیم ہے۔

اس کے بعد دین ابراہیم کے تسلسل کے طور پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین آیا، اس میں وہ تمام طیبات از سر نو حلال کر دی گئیں جو دین ابراہیم میں حلال تھیں۔ اسی طرح یوم سبت میں یہودیوں کو شکار سے منع کیا گیا تھا، اسے بھی حلال کر دیا گیا تھا کیونکہ یہودیوں نے سبت کی پابندی کو بھی مشکوک بنا دیا تھا۔ بعض لوگ رک گئے اور بعض نے سبت کی پابندی کو توڑ دیا۔ اس لیے اللہ نے ان لوگوں کے چہرے مسخ کر دیئے اور ان کو انسانیت کے درجہ سے گرا دیا۔

اس مناسبت سے رسول اللہؐ کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ کی طرف نہایت ہی حکمت سے اور بہترین نصیحت سے دعوت دیتے رہیں اور ان کے ساتھ نہایت ہی بھلے انداز میں مکالمہ کریں۔ اگر آپ پر زیادتی ہو تو قصاص اس کی نسبت سے عادلانہ ہو' کسی صورت میں بھی حد سے تجاوز نہ کیا جائے۔ اگر مخالف کو معاف کر دیا جائے اور صبر سے کام لیا جائے تو یہ سب سے بہتر ہے۔ اس کے بعد یاد رکھو کہ اچھا انجام متقین اور محسنین ہی کا ہے کیونکہ اللہ اہل تقویٰ اور اہل احسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اللہ ان کی امداد کرتا ہے' ان کی نگرانی کرتا ہے اور صلاح و فلاح کی راہ کی طرف ان کو راہنمائی کرتا رہتا ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۲۴ تشریح آیات

## ۱۱۲--- تا --- ۱۲۸

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

”اللہ ایک بستی کی مثال دیتا ہے وہ امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہی تھی اور ہر طرف سے اس کو بفراغت رزق پہنچ رہا تھا کہ اس نے اللہ کی نعمتوں کا کفران شروع کر دیا۔ تب اللہ نے اس کے باشندوں کو ان کے کرتوتوں کا یہ مزا چکھایا کہ بھوک اور خوف کی مصیبتیں ان پر چھا گئیں۔ ان کے پاس ان کی اپنی قوم میں سے ایک رسول آیا مگر انہوں نے اس کو جھٹلا دیا۔ آخر کار عذاب نے ان کو آلیا جبکہ وہ ظالم ہو چکے تھے“۔

یہ مثال مکہ پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ اللہ نے اس بستی میں بیت اللہ بنایا۔ پھر اس کو حرمت دیتے ہوئے بلد حرام قرار دیا۔ جو شخص اس میں داخل ہو جائے وہ آمن اور مامون ہو گا۔ کسی کو اجازت نہ ہو گی کہ کوئی اس کی طرف ہاتھ بڑھائے اگرچہ وہ قاتل ہو۔ جب تک وہ بیت اللہ میں ہے کسی کو جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ جزیرۃ العرب کی حالت یہ ہوتی تھی کہ مکہ کے ارد گرد کے تمام علاقوں میں امن و امان نہ تھا اور لوگوں کو اچک لیا جاتا تھا۔ لیکن اہل مکہ ہر وقت امن و امان میں رہتے تھے اور نہایت ہی اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ نیز ان کا سامان زیست بھی ہر طرف سے چلا آ رہا تھا' حاجیوں کے ساتھ اور پر امن تجارتی قافلوں کے ساتھ' حالانکہ وہ وادی غیر ذی زرع میں بستے تھے۔ اس کے باوجود ہر چیز کا ثمرہ اور ہر قسم کا پھل ان تک پہنچتا تھا۔ یوں وہ امن کے مزے لیتے تھے اور خوشحالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا یہ حال اس وقت سے تھا جب سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے دعا کی تھی۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تشریف لائے تو یہ لوگ آپؐ سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہ آپؐ کو صادق و امین کہتے تھے۔ وہ آپؐ میں کوئی کمزوری نہ پاتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ آپؐ کو نبوت عطا کرتے ہیں تاکہ آپؐ ان کو اور ان

کے اردگرد پھیلی ہوئی پوری کائنات کی اصلاح کریں۔ اور آپ کا دین بھی دین ابراہیم ہے جنہوں نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی۔ جس کے جوار رحمت میں یہ لوگ امن و اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہیں اور نہایت ہی خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن یہ لوگ رسول اللہ کی تکذیب کرتے ہیں اور آپ پر طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں۔ آپ پر اور آپ کے پیروکاروں پر قسم قسم کی سختیاں کرتے ہیں اور ستم ڈھاتے ہیں۔

کسی قریہ کی یہ مثال جو اللہ اہل مکہ کے لیے بیان کرتے ہیں وہ خود ان کے حالات پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔ اس کا انجام ان کے انتظار میں ہے جس طرح اللہ نے اس گاؤں کی مثال دی جس کے باسی مطمئن اور پرامن تھے۔ ان کے لیے سامان زیست وافر مقدار میں ہر طرف سے آ رہا تھا لیکن انہوں نے اللہ کے انعامات کی ناشکری کی اور اللہ کے رسول کی تکذیب کی۔ پھر کیا ہوا۔

فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۱۶:۱۱۲) "تب اللہ نے اس کے باشندوں کو ان کے کرتوتوں کا مزہ چکھایا کہ بھوک اور خوف ان کا لباس ہو گیا"۔ ان پر دوسرے عذاب بھی آئے اس لیے کہ وہ ظالم تھے۔ یہاں اللہ تعالیٰ خوف اور بھوک کو لباس کی طرح مجسم کر کے پیش فرماتے ہیں۔ گویا وہ ہر وقت اس حالت میں رہتے ہیں اور بھوک و افلاس ان کا لباس ہے اور اس لباس کو وہ پہنتے نہیں چکھتے ہیں کیونکہ محض لباس پہننے سے چکھنا زیادہ موثر ہوتا ہے۔ انداز تعبیر ایسا ہے کہ اس میں قوت ذائقہ اور لامسہ بیک وقت کام کرتی ہے اور اس طرح بھوک اور خوف کا احساس دوچند ہو جاتا ہے اور بات نفس میں اچھی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ یہ نہایت ہی زوردار انداز بیان اس لیے اختیار کیا گیا ہے تاکہ وہ آنے والے انجام کے بارے میں اچھی طرح سوچ سکیں۔

اس مثال میں ایک طرف سے اللہ کی نعمتوں اور رزق کا تخیل دیا گیا ہے اور دوسری جانب ان سے محرومیت کا تصور دیا گیا ہے۔ اس مناسبت سے یہاں یہ حکم دیا گیا کہ ان کے لیے جو طیبات حلال کر دی گئی ہیں، ان کو کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ صرف اللہ کی بندگی اور اطاعت کرو۔ راہ ایمان پر سیدھے چلو اور شرک سے بچو جس کی وجہ سے ان کے نام نہاد الٰہوں نے ان پر بعض طیبات بے جواز حرام کر دیے ہیں۔

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿۱۱۴﴾

"پس اے لوگو، اللہ نے جو کچھ حلال اور پاک رزق تم کو بخشا ہے اسے کھاؤ اور اللہ کے احسان کا شکر ادا کرو اگر تم واقعی اسی کی بندگی کرنے والے ہو"۔ یہاں اللہ تعالیٰ محرمات کی حدبندی فرما دیتے ہیں۔ محرمات کا شمار کر دیا جاتا ہے کہ بس یہی ہیں اس کے سوا کوئی چیز حرام نہیں اور اس شمار میں وہ محرمات نہیں جو انہوں نے از خود اپنے اوپر حرام کر رکھے ہیں۔ مثلاً بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ ۖ

"اللہ نے جو کچھ تم پر حرام کیا ہے وہ ہے مردار، خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو"۔

یہ چیزیں مختلف وجوہات سے حرام کی گئی ہیں یا تو اس لیے کہ ان میں جسمانی مضرت ہے یا حسی مضرت ہے مثلاً مردار، خون اور لحم خنزیر میں یا نفسیاتی اور نظریاتی مضرت ہے مثلاً وہ ذبیحہ جن پر غیراللہ کا نام لیا گیا ہے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١١٥﴾

"البتہ بھوک سے مجبور اور بے قرار ہو کر اگر کوئی ان چیزوں کو کھالے، بغیر اس کے کہ وہ قانون الٰہی کی خلاف ورزی کا خواہش مند ہو یا حد ضرورت سے تجاوز کا مرتکب ہو، تو یقیناً اللہ معاف کرنے اور رحم فرمانے والا ہے"۔

اس لیے کہ دین اسلام ایک سہل دین ہے اور اس میں کسی پر غیر ضروری سختی نہیں ہے۔ جس شخص کو موت کا ڈر ہو، یا بھوک سے سخت بیماری کا اندیشہ ہو یا سخت پیاس کا اندیشہ ہو تو وہ بقدر ضرورت ان چیزوں کو استعمال کر سکتا ہے۔ اس بارے میں فقہی اختلافات ہیں جن کا تذکرہ پہلے ہم کر آئے ہیں۔ غیر باغ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اصول حرمت کو توڑنے والا نہ ہو اور غیر عاد کا مطلب یہ ہے کہ وہ قدر ضرورت سے آگے بڑھنے والا نہ ہو کیونکہ صرف بقدر ضرورت اجازت دی گئی ہے۔

یہ ہیں حدود حلال و حرام جو اللہ نے مطعومات میں وضع کیے ہیں۔ لہٰذا بت پرستانہ اوہام کے نتیجے میں حلال و حرام کے ان حدود سے تجاوز مت کرو اور نہ جھوٹ بولو، اس طرح کہ اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دو اور یہ کہو کہ یہ اللہ کا حکم ہے کیونکہ حلال و حرام کے حدود و قیود وضع کرنا صرف اللہ کے اختیارات میں ہے۔ اس کا تعلق قانون سازی سے ہے اور قانون سازی کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ جو شخص اللہ کے اذن کے سوا اور قرآن و سنت کی دلیل کے سوا قانون سازی کرے گا اور اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھے گا وہ جھوٹا ہے اور جھوٹے اللہ کے ہاں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴿١١٦﴾

"اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھو، جو لوگ اللہ پر جھوٹے افتراء باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے"۔

یہ تمہاری زبانیں جو جھوٹے طور پر بعض چیزوں کے بارے میں کہتی ہیں کہ یہ حرام ہے اور یہ حلال ہے ان کو حلال و حرام نہ سمجھو۔ یہ افتراء علی اللہ ہے۔ نیز تم جو ایسا کہتے ہو کہ یہ حرام ہے اور یہ حلال ہے بغیر دلیل شرعی کے جھوٹ بھی

ہے۔ ایسے لوگ ظاہر ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں ضرور عیش و عشرت کر لیں گے لیکن آخرت میں ان کے لیے عذاب ہے اور یہ لوگ سخت گھاٹے میں ہوں گے۔

ان آیات کے باوجود' بعض لوگ اسلامی ممالک میں قانون سازی کا کام کرتے ہیں اور ایسی قانون سازی کرتے ہیں جو قرآن و سنت کے صریح خلاف ہوتی ہے اور پھر بھی یہ امید رکھتے ہیں کہ انہیں دنیا و آخرت میں کامیابی ہوگی بلکہ عذاب عظیم کے مستحق ہوں گے۔

---○○○---

مَتَاعٌ قَلِيلٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١١٧﴾

"دنیا کا عیش چند روزہ ہے آخر کار ان کے لیے دردناک سزا ہے"۔

یہاں سورہ انعام کی ایک آیت کے مضمون کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ ان میں بعض مزید چیزیں بھی یہودیوں پر حرام کی گئی تھیں۔ایک یہ ہے۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (٦:١٤٦)

"اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے' ان پر ہم نے ہر ناخن والی چیز کو حرام کیا تھا اور گائے اور بھیڑ بکری سے ہم نے ان پر چربی حرام کر دی تھی ماسوائے اس کے جو ان کی پیٹھ پر یا آنتوں کے ساتھ یا ہڈیوں سے مخلوط ہو" تو بتایا جاتا ہے کہ یہ چیزیں ان پر بطور سزا حرام ہوئی تھیں۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۖ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١١٨﴾ ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ ۱۵
رَحِيمٌ ﴿١١٩﴾ ع ۹
۲۱

"وہ چیزیں ہم نے خاص طور پر یہودیوں کے لیے حرام کی تھیں جن کا ذکر اس سے پہلے ہم تم سے کر چکے ہیں۔ اور یہ ان پر ہمارا ظلم نہ تھا بلکہ ان کا اپنا ہی ظلم تھا جو وہ اپنے اوپر کر رہے تھے۔البتہ جن لوگوں نے جہالت کی بنا پر برا عمل کیا اور پھر توبہ کر کے اپنے عمل کی اصلاح کر لی تو یقیناً توبہ و اصلاح کے بعد تیرا رب ان کے لیے غفور اور رحیم ہے"۔

بنی اسرائیل پر یہ چیزیں اس لیے حرام کی گئی تھیں کہ وہ مسلسل نافرمانی اور حدود سے تجاوز کرتے تھے اور یہ ان کی جانب

سے خود اپنے آپ پر ظلم تھا۔ اب اگر کسی نے برے کام پر اصرار نہ کیا اور جہالت سے سچے دل سے تائب ہو گیا تو اللہ غفور الرحیم ہے ۔ اس کی رحمت کا دروازہ کھلا ہے ۔ یہ آیت عام ہے ' یہودیوں کے لیے بھی تھی اور ان کے بعد آج کے مسلمانوں کے لیے بھی ہے ۔ نیز آج یہودی اور غیر یہودی کافر اگر تائب ہو جائیں تو ان کے بھی تمام گناہ بخشے جائیں گے ۔

اس مناسبت سے کہ بعض چیزیں یہودیوں پر کیوں حرام کی گئیں اور یہ کہ اہل مکہ کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ دین ابراہیم پر ہیں اور جن چیزوں کو انہوں نے اپنے الہوں کے نام پر حرام قرار دیا ہے وہ احکام ان کو دین ابراہیم سے ملے ہیں ۔ یہاں روئے سخن ابراہیم علیہ السلام اور دین ابراہیم کی طرف مڑ جاتا ہے کہ آپ کیا تھے اور آپ کا دین کیا تھا اور یہ کہ حضرت محمدؐ حقیقی دین ابراہیم پر ہیں اور یہ کہ یہودیوں پر جو مخصوص چیزیں ان کے جرائم کی وجہ سے حرام ہوئیں وہ دین ابراہیم میں حرام نہ تھیں ۔

إِنَّ إِبْرٰهِيْمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۭ وَلَمْ يَكُ مِنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهٖ ۭ اِجْتَبٰهُ وَهَدٰىهُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَ
اٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَإِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ ثُمَّ
أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۳﴾
إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

" واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی ذات سے ایک پوری امت تھا ' اللہ کا مطیع فرمان اور یکسو ۔ وہ کبھی مشرک نہ تھا ۔ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا تھا ۔ اللہ نے اس کو منتخب کر لیا اور سیدھا راستہ دکھایا ۔ دنیا میں اس کو بھلائی دی اور آخرت میں وہ یقیناً صالحین میں سے ہو گا ۔ پھر ہم نے تمہاری طرف یہ وحی بھیجی کہ یکسو ہو کر ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر چلو اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا ۔ رہا سبت ' تو وہ ہم نے ان لوگوں پر مسلط کیا تھا جنہوں نے اس کے احکام میں اختلاف کیا اور یقیناً تمہارا رب قیامت کے روز ان سب باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں "۔

قرآن کریم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بطور نمونہ ہدایت 'مجسمہ انابت اور صبر و شکر کا پیکر اور مطیع اور عبادت گزار بنا کر پیش کرتا ہے ۔ یہاں کہا جاتا ہے کہ وہ امت تھے 'یعنی ان کے اندر جو اطاعت ' انابت اور شکر و برکت تھی وہ پوری امت کے برابر تھی ۔ یا اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ وہ امام ہدایت تھے ۔ ـــــــــ مفسرین سے دونوں مفہوم مروی ہیں ۔ اور دونوں مفہوم ایک دوسرے کے قریب ہیں ۔ کیونکہ جو امام ہدایت کی راہ دکھائے وہی امت کا قائد ہوتا ہے اور ایسے امام کو ان تمام لوگوں کے اعمال کا ثواب بھی ملے گا جن کو اس نے ہدایت کا راستہ دکھایا ۔ اس طرح یہ راہنما بذات

خود ایک امت بن جاتا ہے - وہ فرد واحد نہیں رہتا۔

قَانِتًا لِّلّٰهِ (۱۲۰:۱۶) کا مفہوم ہے اطاعت گزار، خشوع کرنے والا اور عبادت کرنے والا۔

حَنِيفًا (۱۲۰:۱۶) کا مفہوم ہے حق کی طرف متوجہ ہونے والا۔ سچائی کا قلبی میلان رکھنے والا۔

وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۲۰:۱۶) "وہ مشرکین میں سے نہ تھے"۔ لہٰذا مشرکین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنا تعلق ان سے ظاہر کریں۔ نہ اپنے آپ کو ان کے ذریعے متبرک بنائیں۔

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ (۱۲۱:۱۶) "وہ اللہ کی نعمتوں پر شکر گزار تھے"۔ قول کے ساتھ بھی اور عمل کے ساتھ بھی۔ جبکہ مشرکین مکہ زبانی طور پر بھی اللہ کے انعامات کی ناشکری کرتے ہیں اور عملاً بھی کفران نعمت کرتے ہیں۔ اس طرح کہ وہ اللہ کے انعامات میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔ اور محض اوہام و خرافات اور خواہشات کے نتیجے میں اللہ کی بعض نعمتوں کو اپنے اوپر حرام کرتے ہیں۔

اجْتَبٰهُ (۱۲۱:۱۶) "اللہ نے انہیں چن لیا"۔

وَهَدٰهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۲۱:۱۶) "اور اسے صراط مستقیم کی طرف ہدایت دی" اور صراط مستقیم خالص اور سیدھی توحید کی راہ ہے۔ یہ ہیں حضرت ابراہیم جن کے ساتھ یہودی بھی تعلق جوڑتے ہیں اور جن کے ساتھ مشرکین مکہ بھی اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں۔

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۲۳:۱۶) "اور پھر ہم نے تیری طرف وحی کی کہ یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقے پر چلو اور وہ مشرکین میں سے نہ تھا"۔ پس ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حقیقی رابطہ اس دین جدید کا ہے۔ رہا یہ سوال کہ سبت کی تحریم یعنی ہفتے کے دن دنیاوی کاموں کی ممانعت تو یہ صرف یہودیوں کے ساتھ مخصوص معاملہ تھا۔ اس میں بھی انہوں نے اختلافات کیے۔ سبت کی تحریم کا بھی دین ابراہیم سے تعلق نہیں ہے لہٰذا سبت کی تحریم دین محمد میں بھی نہیں ہے۔

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۱۲۴:۱۶) "رہا سبت تو وہ ہم نے ان لوگوں پر مسلط کیا تھا جنہوں نے اس کے احکام میں اختلاف کیا"۔ اور اس کا فیصلہ بھی اللہ کے حوالے ہے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۱۲۴:۱۶)
"اور یقیناً تیرا رب قیامت کے روز ان سب باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں"۔

---()()()---

یہاں تک تو دین جدید اور خالص عقیدۂ توحید اور دین ابراہیم اور ان کے عقیدۂ توحید کے باہم تعلق اور ان دونوں اور مشرکین و یہود کے منحرف عقائد کے درمیان فرق و امتیاز کی بات تھی۔ قرآن مجید کے مقاصد میں سے یہ ایک اہم مقصد بھی تھا۔ اب آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے رب کی راہ میں آگے بڑھتے رہیں اور بہترین نصیحت اور حکمت اور اعتدال کے ساتھ اپنی دعوت کو پھیلاتے رہیں۔ اگر مخالفین کے ساتھ مکالمہ کرنا پڑے تو یہ نہایت ہی احسن طریقے سے ہونا چاہئے۔ ہاں اگر مخالفین تحریک اسلامی پر دست درازی کریں تو انتقام میں حد سے نہ گزریں اور قصاص کی حد تک اپنی جوابی کارروائی محدود رکھیں۔ ہاں اگر آپ مخالفین کی بعض قابل معافی حرکات سے درگزر کریں تو زیادہ بہتر ہے۔ آپ اطمینان رکھیں کہ اچھا انجام یقیناً خدا سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے۔ آپ ان لوگوں کے لیے پریشان نہ ہوں۔ اگر وہ مان کر نہیں دیتے اور اگر وہ آپ کے خلاف اور مسلمانوں کے خلاف مکاریاں کرتے ہیں تو بھی آپ پرواہ نہ کریں۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے۔

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿١٢٥﴾ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ ۖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ ﴿١٢٦﴾ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ﴿١٢٧﴾ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا

۱۶ وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ﴿١٢٨﴾

ع ۹

۲۲. ”اے نبیؐ، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہ راست پر ہے۔ اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو۔ لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔ اے نبیؐ، صبر سے کام کیے جاؤ --- اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے --- ان لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چال بازیوں پر دل تنگ ہو۔ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں“۔

یہ ہیں دعوت اسلامی کی بنیادیں اور یہ ہیں تحریک اسلامی کے کام کے اصول و قواعد اور یہ طریقہ کار خود نبی کریم اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ نیز آپؐ کے بعد آنے والے تمام داعیان حق کے لیے یہی دستور العمل

ہے اور یہی منہاج دعوت ہے۔

سب سے پہلے یہ کہ یہ دعوت الی اللہ ہے۔ اللہ کے راستے اور اللہ کے نظام کی طرف دعوت کسی شخصیت یا کسی قوم کی طرف نہیں ہے۔ اس میں داعی کا کردار صرف یہ ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔ اس لیے دعوت دینا اس کا کوئی احسان نہیں ہے کہ وہ جتلاتا پھرے نہ دعوت اسلامی پر احسان ہے اور نہ ان لوگوں پر احسان ہے جو داعی کے پیرو کار ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس کا اجر بھی اللہ پر ہے۔

دعوت حکمت اور حسن تدبیر کے ساتھ جاری رہنی چاہیے۔ مخاطب کے ظروف و احوال کو اس میں مدنظر رکھنا چاہیے اور یہ متعین کرنا چاہیے کہ ایک وقت مخاطب کو کس قدر دعوت دینا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ لوگوں کو اس قدر احکام اور نواہی مختصر وقت میں سنا دیے جائیں اور وہ ذہناً ان کے لیے تیار نہ ہوں۔ یوں وہ اسے بوجھ اور ناقابل برداشت بوجھ سمجھ لیں۔ طریقہ دعوت مناسب ہو۔ ظروف و احوال کے مطابق ہو اور اس میں تبدیلی ہوتی رہے۔ داعی جوش و خروش میں آکر سختی نہ کرے نہ حکمت سے زیادہ جوش و غیرت پیدا کرے۔ ہر معاملے میں اعتدال سے کام لے۔

اس کا انداز وعظ نرم اور نہایت ہی دلکش ہو۔ بات اس انداز میں ہو کہ دل و دماغ میں بیٹھ جائے۔ صرف کوسنے اور شرمندہ کرنے کے انداز ہی کو نہ اپنائیں۔ تیز داعی لوگوں کی ان غلطیوں کو نہ کھولے جو جہالت اور نادانی کی وجہ سے کسی سے سرزد ہو جائیں۔ بعض اوقات ایسی غلطیاں نیک نیتی سے ہو جاتی ہیں۔ وعظ میں نرمی سے بعض اوقات نہایت ہی سرکش اور اخلاق سے گرے ہوئے لوگ بھی ہدایت پا لیتے ہیں۔ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر' لیکن زجر و توبیخ اور لعنت و ملامت کا اثر بعض اوقات الٹا ہوتا ہے۔

ان کے ساتھ اگر مجادلہ کا موقعہ پیش آئے تو وہ بھی احسن طریق سے ہو۔ یہ مناسب نہ ہو گا کہ مخالف پر داعی حملہ آور ہو جائے اور اس کو ذلیل کرے یا اس کی قباحتیں بیان کرے۔ دعوت میں مباحثہ کا انداز یہ ہو کہ مخاطب کو یقین ہو جائے کہ دعوت دینے والا محض غلبہ اور کلام میں برتری کا حصول نہیں چاہتا بلکہ داعی محض ایک حقیقت ذہن نشین کرانا چاہتا ہے۔ ہر انسان کے اندر کچھ نہ کچھ عناد کا مادہ ہوتا ہے اور ہر شخص کی عزت نفس ہوتی ہے۔ وہ آخر دم تک اپنی رائے کی مدافعت چاہتا ہے تاکہ وہ ہزیمت اور شکست سے بچے۔ اعتقاد و نظریہ دراصل رائے ہوتی ہے اور لوگ رائے کی قدر و قیمت اس قدر بڑھا دیتے ہیں کہ اگر کسی کو رائے بدلنے کا کہا جائے تو سمجھتے ہیں کہ ان کے رعب' ان کے احترام اور ان کی شخصیت میں فرق آجائے گا۔ اگر داعی اچھے انداز میں مباحثہ اور مکالمہ کرے تو اس سے کسی شخص کے ذاتی احساس کو ٹھیس نہ پہنچے گی اور مخاطب یہ سمجھے گا کہ اس کی عزت نفس' اس کی شخصیت اور عزت و کرامت محفوظ ہے اور داعی صرف دعوت پہنچانا چاہتا ہے۔ محض اللہ کے لیے اسے ایک اچھی راہ کی طرف بلا رہا ہے۔ اس کام سے اس کی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں ہے' نہ وہ اپنی فتح اور مخاطب کی شکست چاہتا ہے۔

داعی کے زیادہ جوش اور جذبے کو ذرا کم کرنے کی خاطر نص قرآنی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ دراصل اللہ ہی زیادہ علیم ہے وہی جانتا ہے کہ کون گمراہ ہے اور کون ہدایت پانے والا ہے۔ لہٰذا بحث و مباحثے کے اندر بہت زیادہ جوش اور جدال کی ضرورت نہیں ہے بلکہ شستہ انداز میں دعوت دے دی جائے اور اس کے بعد اس کے نتائج اللہ پر چھوڑ دیے جائیں۔

جب تک دعوت اسلامی میں کارکردگی صرف لسانی دعوت اور دلیل کے ساتھ بحث و مباحثے تک محدود ہے' دعوت

اسلامی کا اسلامی دستور العمل یہی ہے۔ لیکن اگر مخالف دست درازی پر اتر آئے تو پھر یہ پالیسی نہ رہے گی کیونکہ دست درازی ایک محسوس اور مادی فعل ہے۔ سچائی کی عزت اور سچائی کے مقام کو بحال رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ باطل کی طرف سے دست درازی کا مناسب جواب دیا جائے۔ یہ نہ ہو کہ باطل ماحول پر پوری طرح غالب آ جائے۔ ہاں باطل کی دست درازی کا جواب بھی حدود و قیود کے اندر ہو۔ یہ نہ ہو کہ مخالف کو ذلیل کر کے عبرت آموز سزا دی جائے۔ کیونکہ اسلام ایک عادلانہ دین ہے۔ یہ امن و سلامتی کو بہت پسند کرتا ہے۔ اسلام صرف اپنی ذات اور اہل اسلام کا دفاع چاہتا ہے۔ وہ کسی صورت میں بھی زیادتی اور دست درازی کا قائل نہیں ہے۔

وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (۱۲۶:۱۶) "اگر تم بدلہ لو تو اسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی"۔ یہ دعوت اسلامی کے طریقہ کار سے باہر کی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے اندر داخل ہے۔ دعوت اسلامی کا دفاع کرنا اور اس معاملے میں اعتدال کا رویہ اپنانا، یہ تحریک اسلامی کے وقار اور عزت کا باعث ہو گا۔ لوگوں کے دلوں میں یہ کوئی بے وقعت دعوت نہ ہو گی۔ کوئی ایسی دعوت جس کا وقار نہ ہو، لوگ اسے ہرگز قبول نہیں کرتے۔ نہ لوگوں کو یہ یقین آتا ہے کہ یہ دعوت دین ہے۔ نیز اللہ کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ دعوت اسلامی کو یوں بے وقار اور لاچار چھوڑ دے جو اپنے عزت و وقار کا دفاع نہ کر سکتی ہو۔ اس لیے اہل ایمان جب تک کہ وہ اللہ کے دین کے داعی ہوں، ذلت ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔ نیز داعی کا منصب یہ ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر سچائی کا امین ہے۔ اس نے لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنا ہے، اور اس نے ہی انسانیت کی قیادت راہ راست کی طرف کرنی ہے۔ وہ یہ کام ہرگز نہیں کر سکتے اگر ان کو سزا دی جائے اور وہ بدلہ نہ لے سکیں اور وہ دست درازی کرنے والے کی مناسب سرزنش نہ کر سکیں۔

اس سلسلے میں مناسب جواب اور سرزنش کا اصول، اصول قصاص ہو گا۔ قرآن کا اصل منشا تو یہ ہے کہ انسان عفو و درگزر سے کام لے۔ لیکن عفو و درگزر اس وقت ہوتا ہے جب انسان انتقام اور بدلہ لینے پر قدرت رکھتا ہو اور ایسے حالات میں عفو و درگزر کا بہت ہی اچھا اثر ہوتا ہے اور دعوت کو بہت فائدہ بھی ہوتا ہے۔ اگر بعض افراد پر دست درازی ہو لیکن دعوت کو فائدہ ہو تو اشخاص پر تعدی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ لیکن اگر عفو و درگزر سے دعوت الی اللہ کی توہین ہوتی ہو اور اس کے وقار پر حرف آتا ہو تو اس صورت میں قصاص کا اصول ہی بہتر ہے۔ چونکہ صبر اور درگزر کرنے سے داعی اپنے جذبات اور جذبہ انتقام پر کنٹرول کرنا سیکھتا ہے اس لیے قرآن کریم اس فعل اور اس کے اجر کو اللہ اور آخرت سے وابستہ کرتا ہے۔

وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ (۱۲۶) وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ (۱۲۷)

(۱۲۶:۱۶ - ۱۲۷) "لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے اور صبر کرو، تمہارا صبر اللہ ہی کے لیے ہے"۔ یہ اللہ ہی ہے جو صبر اور ضبط نفس کی توفیق دیتا ہے اور اس میں انسان کا مددگار ہوتا ہے اور یہ جذبہ للہیت ہی ہے جو انسان کو ذاتی انتقام اور قصاص اور بدلہ لینے کے مقابلے میں صبر پر آمادہ کرتا ہے۔

قرآن کریم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نصیحت کے انداز میں یہ اصول وضع کر رہا ہے اور آپ کے ہر دعوت دین دینے والے کے لیے یہی ضابطہ عمل ہے کہ اگر لوگ ہدایت کی راہ پر نہیں آتے تو وہ پریشان نہ ہو۔ اس کا فرض وہی ہے جو وہ ادا کر رہا ہے۔ ہدایت و ضلالت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہدایت و ضلالت سنت الہیہ کے مطابق ہے اور سنت الہیہ وہ استعداد ہے جو ہدایت و ضلالت کے لیے اللہ نے نفوس انسانیہ کے اندر ودیعت کر دی ہے۔ نیز یہ کہ مخالفین کی مکاریوں کی وجہ سے داعی دل تنگ نہ ہو۔ کیونکہ وہ تو داعی ہے۔ اللہ اس کا محافظ ہے۔ وہی مخالفین کی مکاریوں اور ریشہ دوانیوں کا جواب دے گا۔ اللہ کسی داعی کو اس کے مخالفین کے حوالے نہیں کرتا بشرطیکہ وہ دعوت میں مخلص ہے' اللہ کے لیے کام کر رہا ہے اور اس کے پیش نظر کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے۔

یہ جو اس کو اذیت دی جا رہی ہے یہ اس کے صبر کا امتحان ہے۔ اللہ کی نصرت آنے میں دیر اس لیے ہو رہی ہے کہ اللہ پر اس کے بھروسے اور یقین کو آزمایا جا رہا ہے لیکن اچھا انجام یقینی ہے اور فتح اس کے قدم چومنے والی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّالَّذِينَ هُمْ مُّحْسِنُونَ (۱۶ : ۱۲۸) "بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں"۔ جس کے ساتھ اللہ ہو' تو اسے کوئی ڈر نہیں ہے۔ جو چاہے اس کے خلاف سازش کرے اور اس کے خلاف تدبیر کرے' اللہ بہرحال اپنے نیک بندوں کو تنہا نہیں چھوڑتا۔

یہ ہے دعوت اسلامی کا دستور العمل اور اسے خود باری تعالیٰ نے وضع کیا ہے۔ اگر داعی اس پر چلے تو کامیابی یقینی ہے۔ یہ اللہ کا فرمان ہے اور اللہ سے زیادہ سچی بات کون کر سکتا ہے۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ----- ۱۵

سورۃ بنی اسرائیل - ۱۷

۱ --- تا --- ۱۱۱

سورۃ الکھف - ۱۸

۱ --- تا --- ۸۲

# سورۃ بنی اسرائیل ایک نظر میں

یہ مکی سورت ہے' اس کا آغاز تسبیح الہی سے ہوتا ہے اور اختتام بھی اللہ کی حمد پر ہوتا ہے ۔ اس میں مختلف موضوعات پر کلام کیا گیا ہے اور سب سے بڑا موضوع اسلامی نظریہ حیات اور عقیدۂ توحید ہے ۔ بعض موضوعات 'کا تعلق اسلامی نظریہ حیات پر مبنی اخلاقیات سے ہے' فردی اخلاقیات سے بھی اور اجتماعی اور سوشل اخلاقیات سے بھی ۔ کچھ واقعات بنی اسرائیل کی تاریخ سے بھی متعلق ہیں ۔ یعنی مسجد اقصیٰ اور حضور اکرمؐ کے سفر معراج کے حوالے سے ۔ اس سورت میں آدم و ابلیس کے قصے 'کا ایک حصہ بھی بیان ہوا ہے جس کا مقصد تکریم انسانیت ہے ۔

لیکن اس پوری سورت کی تعبیر جس مواد سے ہوئی ہے اس کا حقیقی تعلق رسول اللہ کی ذات سے ہے' اس زاویہ سے کہ آپؐ کے متعلق اہل مکہ نے کیا موقف اختیار کیا ۔ پھر ایک اہم موضوع خود یہ قرآن کریم ہے کہ اس کی تعلیمات کیا ہیں؟ اس کی تعلیمات کی نوعیت کیا ہے' اور اہل مکہ نے اسے سن کر کیا موقف اختیار کیا ۔ اس مناسبت سے بھی رسولوں کے منصب اور رسالت کی حقیقت پر بھی بات کی گئی ہے اور پھر یہ بتایا گیا کہ سابق رسولوں کی امتوں کو حسی معجزات دکھائے گئے اور نہ ماننے والون کو ہلاک کیا گیا لیکن رسالت محمدیہ کا اعجاز دوسری نوعیت کا ہے یہ کہ ہدایت و ضلالت کے میدان میں ہر شخص اپنے نظریات کا ذمہ دار ہے جبکہ معاشرے میں عملی ذمہ داری اجتماعی بھی ہے اور یہ تمام امور اللہ نے اپنی کتاب میں نہایت ہی تفصیل سے اپنے رسولوں کے ذریعہ بیان فرمائے تاکہ لوگوں پر حجت تمام ہو جائے اور کل وہ معذرت نہ پیش کر سکیں ۔

وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا (۱۷ : ۱۲) "اور ہر چیز کو ہم نے نہایت ہی مفصل بیان کیا ہے" ۔ اس سورت میں اللہ کی حمد' اس کی تسبیح و تعریف اور اس کے انعامات پر اس کے شکر کے مضامین بار بار آتے ہیں ۔ سورت کے آغاز ہی میں فرمایا گیا ۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰي بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ

الْاَقْصَا (۱۷ : ۱) "پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے" ۔ اور اس سورت میں جب بنی اسرائیل کو توحید کی تعلیم دی جاتی ہے تو ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ وہ ان مومنین کی اولاد سے ہیں جن کو نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا گیا اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا (۱۷ : ۳) "اور وہ ایک شکر گزار بندہ تھا" ۔ اور جب مشرکین کے باطل دعوؤں کا ذکر ہوتا ہے جو وہ اپنے خود ساختہ الہوں کے بارے میں کرتے تھے تو فرمایا جاتا ہے :

سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا (٤٣) تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (٤٤) (١٧: ٤٣ — ٤٤) "پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں۔ اس کی پاکی تو ساتوں آسمانوں اور زمین اور ساری چیزیں بیان کر رہی ہیں جو آسمان و زمین میں ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کر رہی ہو مگر تم اس کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو"۔ اور جب بعض اہل کتاب پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ یوں تبصرہ کرتے ہیں :

وَّ يَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا (١٧: ١٠٨) "پاک ہے ہمارا رب 'بے شک اس کا وعدہ پورا ہونے والا ہے"۔ اور سورت کا خاتمہ یوں ہے :

وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (١٧: ١١١) "اور کہو تعریف ہے اس خدا کے لیے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا' نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک ہے اور نہ وہ عاجز ہے کہ کوئی اس کا پشتیبان ہو اور اس کی بڑائی بیان کرو' کمال درجے کی بڑائی"۔ غرض اس سورت کے لیے ہم نے جو محور بیان کیا ہے یہ متنوع موضوعات اسی کے گرد گھومتے ہیں اور اس سورت کے مضامین دائروں کی شکل میں ہیں۔

پہلا دائرہ واقعہ اسراکی طرف ایک مختصر اشارے سے شروع ہوتا ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ (١٧: ١) "پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے"۔ اور اس میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اسراکی غرض و غایت کیا ہے۔

لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا (١٧: ١) "تاکہ ہم اسے اپنی آیات دکھا دیں"۔ اور اسی مناسبت سے پھر حضرت موسیٰ کی کتاب توریت کا ذکر ہوا اور اس میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے اہم واقعات کا ذکر ہوا' جس میں ان کے عروج و زوال کے اہم واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ ان پر یہ زوال ان کی سرکشی اور بداعمالی کی وجہ سے آیا۔ ان کو متنبہ کیا گیا کہ اگر تم باز نہ آئے تو دوبارہ تم پر تیسری اور چوتھی بار بھی زوال آئے گا۔

وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا (١٧: ٨) "اگر تم دوبارہ سرکشی کی طرف لوٹے تو ہم بھی لوٹیں گے"۔ حضرت موسیٰ کی کتاب کی مناسبت سے قرآن کریم کے بارے میں بھی یہاں تبصرہ آتا ہے کہ یہ کتاب ایک مضبوط راہ بتاتی ہے لیکن

انسان بہت ہی جلد باز ہے' وہ اپنے میلانات پر کنٹرول نہیں کر سکتا۔ اور پھر آخر میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ ہر انسان اپنے کیے کا ذمہ دار ہے' ہدایت و ضلالت میں ذمہ داری انفرادی ہے اور عمل اور سلوک میں ذمہ داری اجتماعی ہے۔

دوسرے دائرے میں اسلامی نظریہ حیات اور عقیدۂ توحید کا ذکر ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ تمام اجتماعی آداب اور اقدار' اس کی اساس پر تعمیر ہوں گے۔ اسلامی معاشرے کی ہر بات میں عقیدۂ توحید کا رنگ ہو گا۔

تیسرے دائرے میں بت پرستی کے موضوع کو لیا گیا ہے خدا کی طرف لڑکیوں کی نسبت اور خدا کے لیے شرکاء ٹھہرانا اور بعث بعد الموت کے بارے میں ان کے غلط خیالات اور رسول اللہ پر ان کی افتراء پردازیاں۔ نیز آخر میں اہل ایمان کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ احسن انداز میں گفتگو اور مکالمے کے ذریعے دعوت پھیلائیں۔

اور چوتھے سرکل میں یہ بتایا جاتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے معجزات کا نزول کیوں نہیں ہوا جو سابقہ انبیاء پر ہوا؟ اس لیے کہ امم سابقہ نے ان معجزات کو بھی مان کر نہ دیا تھا' اس لیے وہ ہلاک ہوئے اور یہ سنت الہیہ ہے' اس میں رسول اللہ کے خواب کے بارے میں ان کے موقف پر ان کو ڈرایا گیا ہے کہ وہ تکذیب سے باز آجائیں اور حد سے نہ گزریں۔ اس میں قصہ آدم و ابلیس کا بھی تھوڑا سا ذکر ہے جس میں ابلیس اعلان کرتا ہے کہ وہ ذریت آدم کے خلاف جنگ جاری رکھے گا۔ اور اہل مکہ جو اس وقت سرکشی اور تکذیب پر تلے ہوئے ہیں وہ شیطان کے بہکاوے میں آگئے ہیں۔ ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ انسان ایک مکرم اور برتر مخلوق ہے۔ وہ ایک جواب دہ مخلوق ہے اور بتایا جاتا ہے کہ قیامت میں جب سب لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ اٹھایا جائے گا تو اس وقت نافرمانوں کا انجام کیا ہو گا اور فرماں برداروں کا انجام کیا ہو گا۔

فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (۷۱) وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (۷۲) (۱۷:۷۱ - ۷۲)

"اس وقت جن لوگوں کو اعمال نامہ سیدھے ہاتھ میں دیا گیا وہ اپنا کارنامہ پڑھیں گے اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہ ہو گا اور جو اس وقت دنیا میں اندھا بن کر رہا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا بلکہ راستہ پانے میں اندھے سے زیادہ ناکام"۔ آخری حصے میں کفار مکہ کی ان سازشوں کا ذکر ہے' جو وہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کر رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ آپ ان تعلیمات میں سے بعض کو ترک کر دیں جو آپ پر نازل ہوئیں مثلاً یہ کہ آپ کو مکہ سے نکال دیا جائے۔ اگرچہ اس سلسلے میں آپ پر سختی کرنا پڑے۔ اور یہ بتایا گیا اگر اللہ آپ کو یہاں سے ہجرت کا حکم نہ دیتا تو مشرکین مکہ پر بھی وہی ہلاکت آجاتی جو ان سے قبل کی اقوام پر آئی۔ حضور کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اپنی راہ پر سیدھے چلتے رہیں' قرآن پڑھیں' نماز پڑھیں اور بہتر سے بہتر انداز میں دعوت پھیلاتے رہیں اور اگر آپ کو نکلنا پڑے تو اچھے طریقے سے نکلیں اور پریشان نہ ہوں کیونکہ اسلامی انقلاب آنے والا ہے' حق آیا ہی چاہتا ہے اور باطل کی رخصت ہی رخصت ہے۔ آخر میں بتایا جاتا ہے کہ جس دعوت اور جس قرآن کے خلاف یہ سازشیں کرتے ہیں وہ تو ان کے تمام مسائل کا حل ہے۔ لیکن افسوس کہ انسان جانتا نہیں۔

وَ مَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۷ : ۸۵) ”اور تمہیں بہت ہی کم علم دیا گیا ہے“۔ اب بات قرآن مجید کے اعجاز کی آجاتی ہے۔ یہ لوگ تو معجزات طلب کرتے ہیں' فرشتوں کے نزول کو دیکھنا چاہتے ہیں' یہ کہتے ہیں کہ رسول کے پاس ایک ایسی کوٹھی ہو جو قیمتی اثاث البیت پر حاوی ہو' اس کا ایک عظیم باغ ہو جس میں ہر قسم کے میوہ جات ہوں اور اس کے اندر نہریں بہتی ہوں' یا اس کے باغ میں ابلتے چشمے ہوں یا اور نہ ہو تو وہ سیدھا آسمان پر چڑھے اور وہاں سے موسیٰ کی طرح ایک کتاب لے کر آجائے اور ہم اسے لے کر پڑھیں اور یہ اور اس قسم کی دوسری تجاویز و مطالبات وہ پیش کرتے تھے جو محض مکابرہ کے لیے تھے۔ وہ ماننا نہیں چاہتے تھے۔ ان سب مطالبات کو یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ یہ چیزیں حضورؐ کے فرائض منصبی میں داخل نہیں ہیں اور ان لوگوں کو جواب میں مزید کہا جاتا ہے کہ خود تو تم اس قدر بخیل ہو کہ اگر اللہ کے خزانے' رحمتوں کے خزانے تمہارے اختیار میں دے دیئے جائیں تو تم کسی کو کوڑی نہ دو' اس لیے کہ کہیں خزانے ختم نہ ہو جائیں۔ کیا ان کے لیے یہ بات کم معجزہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی مطیع فرمان ہے اور یہ کائنات ایک ضابطے کے مطابق چل رہی ہے اور یہ کہ حضرت موسیٰ کے عظیم معجزات کو کیا سب نے مان لیا تھا۔ کیا تم وہی صورت حالات پیدا کرنا چاہتے ہو جو فرعون کو درپیش ہوئی کیونکہ ماننا تو تم نے بہرحال نہیں ہے۔

آخر میں بتایا جاتا ہے کہ یہ قرآن حقیقی حق اور سچائی پر مشتمل ہے۔ اور یہ کہ یہ متفرق طور پر حسب ضرورت' وقت کے تقاضوں کے مطابق نازل ہوتا رہا ہے تاکہ وہ اس پر عمل کرتے رہیں' اس کے تقاضوں کو وقت کے مطابق پورے کرتے رہیں اور یہ تو اس قدر قیمتی تعلیمات پر مشتمل ہے کہ جو لوگ جانتے ہیں اور اس کی قدر و قیمت کو سمجھتے ہیں وہ تو خوشی کے جذبات سے روتے ہیں اور سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ سورت کا خاتمہ جن کلمات پر ہوتا ہے وہ بہت اہم ہیں۔ یہ کہ حمد و ثنا اسی کو سزاوار ہے جس نے کوئی بیٹا نہیں پیدا کیا' نہ اس کا کوئی شریک ہے کیونکہ وہ کسی کام کا خود کرنے سے عاجز نہیں ہے۔ تو سورت کا آغاز بھی حمد سے اور اختتام بھی حمد سے۔ یہاں مناسب ہے کہ معراج کے مشہور قصے پر ایک نوٹ دے دیا جائے۔

قصہ اسراء یعنی رات کا سفر اور قصہ معراج اگر ایک ہی رات میں واقع ہوئے تو ان کی تفصیلات یہ ہیں کہ اسراء یعنی رات کا سفر مکہ کی مسجد حرام سے بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ تک ہے اور معراج کا سفر بیت المقدس سے آسمانی بلندیوں اور سدرۃ المنتہیٰ تک ہوا' یہ ایک غیبی سفر تھا اور اس کی اصل حقیقت تک پہنچنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ اس واقعے کے بارے میں بے شمار روایات آئی ہیں اور پھر ان کے بارے میں طویل مباحث ہوئے اور آج تک چل رہے ہیں۔

اسرا کا واقعہ کہاں پیش آیا' اس میں بھی اختلاف ہے' بعض نے کہا ہے کہ یہ واقعہ مسجد حرام میں پیش آیا۔ اور عام روایات سے یہی بات بظاہر معلوم ہوتی ہے۔ حضورؐ سے روایت ہے کہ ”میں مسجد میں تھا' بیت اللہ کے پاس حجر میں' نہ سو رہا تھا نہ جاگ رہا تھا کہ جبرئیل علیہ السلام براق لے کر آئے“۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ ام ہانی بنت ابو طالب کے گھر میں تھے۔ مسجد حرام سے مراد حرم شریف ہے' کیونکہ حرم شریف مسجد کو گھیرے ہوئے ہے اور مسجد کے ساتھ اس کا تلبس ہے اور حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ تمام حرم مسجد ہے۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ نماز عشاء کے بعد ام ہانی کے گھر سو رہے تھے کہ اسرا کا واقعہ پیش آیا اور آپ نے یہ واقعہ ام ہانی کے سامنے بیان فرمایا اور پھر کہا: ”تمام نبی میرے سامنے عالم مثال میں پیش کیے گئے اور میں نے ان

کے ساتھ نماز ادا کی"۔ اس کے بعد آپ اٹھے تاکہ مسجد حرام میں جاکر نماز پڑھیں تو ام ہانی نے آپ کو کپڑوں سے پکڑ لیا تو آپ نے ان سے پوچھا تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تو انہوں نے کہا" مجھے ڈر ہے کہ تمہاری قوم تمہاری تکذیب کر دے گی۔ اگر تم نے ان کو اس واقعہ کی اطلاع دے دی"۔ تو آپ نے فرمایا" چاہے وہ میری تکذیب کریں؟" پھر آپ نکلے اور ابوجہل کے پاس بیٹھے تو آپ نے اسے اسرا کا پورا واقعہ بتا دیا۔ ابوجہل نے کہا: اے اہل قریش' اے اہل کعب ابن لوی ادھر آؤ۔ پھر اس نے ان کے سامنے یہ پورا واقعہ بیان کیا۔ بعض لوگوں نے تالیاں بجائیں' بعض نے تعجب کی وجہ سے سر پر ہاتھ رکھ لیے اور بعض نے انکار کر دیا۔ بعض ضعیف الایمان مرتد ہو گئے۔ بعض لوگ ابوبکرؓ کے پاس دوڑے اور یہ اطلاع دی۔ تو انہوں نے کہا کیا یہ درست ہے کہ آپؐ نے ایسا کہا؟ انہوں نے کہا بالکل درست ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ اگر انہوں نے ایسا کہا ہے تو میں شہادت دیتا ہوں کہ آپؐ نے سچ کہا ہے۔ انہوں نے کہا" کیا تم اس کی یہ بات بھی مان رہے ہو کہ وہ ایک ہی رات میں شام چلا جائے اور صبح ہونے سے قبل ہی مکہ واپس آجائے تو صدیقؓ نے کہا اگر وہ اس سے دور کا بھی دعویٰ کرے تو میں پھر بھی تصدیق کروں گا۔ میں آسمانوں کی خبروں کے بارے میں بھی اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ اس واقعہ کے بعد آپ کا نام صدیقؓ رکھ دیا گیا۔ اہل مکہ میں سے بعض لوگ بیت المقدس گئے ہوئے تھے' انہوں نے بیت المقدس کی مسجد کی ساخت کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ اللہ نے مسجد آپ کے سامنے کھڑی کر دی۔ آپ اس کی طرف دیکھتے اور ان کے سوالوں کے مطابق اس کی ساخت بتاتے۔ انہوں نے کہا جہاں تک مسجد کی ساخت کا تعلق ہے اس نے سوالات کا جواب صحیح صحیح دیا ہے۔ اس پر انہوں نے حضورؐ سے پوچھا تو پھر آپ ہمارے قافلے کے بارے میں بتائیں تو آپ نے بتایا کہ قافلے میں اس قدر اونٹ ہیں اور ان حالات میں قافلہ آرہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ قافلہ فلانے دن طلوع شمس کے وقت مکہ پہنچے گا اور سب سے پہلے ایک خاکستری رنگ کا اونٹ ہو گا۔ یہ لوگ پہاڑی موڑ کی طرف گئے اور بے چینی سے اس دن کا انتظار کرنے لگے۔ چنانچہ اس دن ان میں سے ایک چلایا کہ یہ ہے سورج نکلنے والا اور دوسرا چلایا یہ ہے خدا کی قسم قافلہ۔ اور اس میں سب سے آگے خاکستری رنگ کا اونٹ ہے جیسا کہ محمدؐ نے کہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ایمان نہ لائے اور اسی رات حضورؐ کو بیت المقدس سے آسمانوں کی سیر کرائی گئی۔

اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ واقعہ اسرا سونے کی حالت میں ہوا یا بیداری کی حالت میں۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا" خدا کی قسم! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسد اپنی جگہ سے غائب نہیں ہوا۔ آپؐ کی روح کو بلندیوں پر لے جایا گیا۔ حسن سے روایت ہے کہ آپؐ کو خواب میں سیر کرائی گئی۔ دوسری روایات میں آتا ہے کہ واقعہ معراج روح و جسم دونوں کے ساتھ ہوا۔ البتہ وقفہ اس قدر قلیل تھا کہ آپؐ کا بستر ابھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا کہ آپؐ واپس آگئے۔

مجموعہ روایات سے جو بات راجح طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضورؐ نے ام ہانی کے گھر اپنے بستر کو چھوڑا اور آپؐ حرم میں چلے گئے۔ آپؐ حجر میں تھے اور ایسی حالت میں تھے کہ نہ سو رہے تھے اور نہ جاگ رہے تھے کہ یہ اسراء کا واقعہ پیش ہوا۔ اس کے بعد آپؐ اپنے بستر پر لوٹ آئے قبل اس کے کہ وہ ٹھنڈا ہو۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس واقعہ کے بارے میں قدماء اور جدید دور کے محققین نے جو بحثیں کی ہیں وہ سب بے محل ہیں۔ یہ واقعہ تواتر سے ثابت ہے اور جسمانی اسرا ہو یا روحانی اسرا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان میں سے کوئی بھی بعید

لاامکان نہیں ہے - اصل واقعہ پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا - اس کا مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اس کائنات کے دور دراز مقامات کی سیر کرائی جائے اور یہ سیر ایک قصیر لحظہ میں کرائی جائے - جن لوگوں کے ذہن میں قدرت الہیہ کا معمولی تصور بھی ہو' اور جو نبوت کی نوعیت کو سمجھتے ہوں' ان کو اس واقعہ کے جسمانی وقوع میں کوئی بات عجیب نظر نہیں آتی - اس جہاں میں مشکل اور آسان یا ممکن الواقع اور ناممکن الوقوع امور انسانی قوت کے زاویہ سے نظر آتے ہیں' جہاں تک قدرت الہیہ کا تعلق ہے' اس کی نسبت سے تمام امور ایک جیسے ہیں' اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے -

رہی منصب رسالت کی حقیقت و نوعیت تو وہ انسانی سوچ اور تصور سے ایک مختلف چیز ہے - ایک نبی دوسرے انسانوں سے ایک مختلف حقیقت رکھتا ہے - لہٰذا ایک نبی کو اگر دور دراز کائنات کی سیر معتاد طریقوں کے مطابق کرائی جائے یا غیر معمولی اور نامعلوم طریقوں کے مطابق کرائی جائے اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے - بعض لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سامنے اس واقعہ کو عجیب و غریب سمجھتے ہوئے سوالات کیے تو آپ نے فرمایا میں تو اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب چیزوں کو مانتا ہوں کہ حضور اکرم اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم آسمانوں کی خبر دیتے ہیں -

اس واقعہ کے ضمن میں یہ بات بھی آتی ہے کہ اس واقعہ کے سچ ہونے پر لوگوں نے آپ سے کسی مادی دلیل کا مطالبہ کیا اور آپ نے اس سلسلے میں قافلے کی آمد کی تفصیلات ان کو بتائیں - اس سے بھی اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ سچا تھا - پھر یہ کہ ام ہانی نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ اس واقعہ کو عوام میں بیان نہ کریں' اس لیے کہ لوگ آپ کی تکذیب کریں گے - لیکن آپ کو اس قدر یقین تھا کہ آپ نے ان کے مشورے پر کان نہ دھرا اور یہ فرمایا کہ جو بھی سچائی ان پر اتری وہ بلاجھجک اس کا اظہار کریں گے چاہے کوئی مانے یا نہ مانے - اس واقعہ کے بعد بعض عملاً مرتد بھی ہو گئے - بعض نے مذاق کیا اور بعض نے شک کا اظہار کیا لیکن ان تمام امور کے باوجود حضورؐ حق بات کہتے رہے کیونکہ آپ کو پختہ یقین تھا - یہی انداز داعیان حق کا ہونا چاہیے' چاہے کوئی ان کی بات مانے یا نہ مانے - داعیان حق کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ لوگ راضی ہوں گے یا ناراض ہوں گے' انہیں چاہیے کہ حق بات صاف صاف کہہ دیں - سچائی کے مقابلے میں جو بھی آئے اسے رد کر دیں -

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے اس واقعہ کو اپنی رسالت پر معجزانہ دلیل کے طور پر نہیں پیش فرمایا حالانکہ اہل مکہ رات دن خوارق عادت معجزات طلب کرتے رہتے تھے - حالانکہ وقوع معراج پر حضورؐ نے ان کے سامنے معجزانہ طور پر ثبوت بھی پیش کر دیا تھا' اس لیے کہ دعوت اسلامی کی سچائی کا ثبوت خود اس کے اندر ہے' آفتاب آمد دلیل آفتاب - دعوت اسلامی کا منہاج ہی فطرت سلیمہ کے مطابق ہے اور عقل انسانی اس کی تصدیق و توثیق کرتی ہے - اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے واقعہ معراج کا بیان اس لیے نہ کیا کہ یہ واقعہ آپ کی رسالت کے لیے دلیل تھا بلکہ اس نے کیا کہ یہ ایک حقیقی واقعہ تھا - اور ایک حقیقت تھی -

اب ہم چاہتے ہیں کہ آیات کی تشریح کی طرف آئیں -

---ooo---

# درس نمبر ۱۲۵ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۲۱

سُوْرَۃُ بَنِیْ اِسْرَآءِیْل مَکِّیَّۃٌ
اٰیَاتُهَا ۱۱۱ رُکُوْعَاتُهَا ۱۲
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

**سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝۱**

"پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے تاکہ اسے کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ حقیقت میں وہی ہے سب کچھ سننے اور دیکھنے والا"۔

سورت کا آغاز تسبیح سے ہوتا ہے 'چونکہ مقام ایسا ہے جہاں بندے اور رب کی ملاقات ہو رہی ہے' اس لیے ایسی فضا اور ایسے حالات میں تسبیح و تہلیل ایک مناسب فعل ہے اور حضرت محمد اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی صفت عبدیت کو یہاں خصوصیت کے ساتھ اس لیے بیان کیا گیا کہ اس قدر عروج اور بلندی درجات کے باوجود حضور اکرمؐ اللہ کے بندے ہی ہیں۔ دوسرے غلط مذاہب کی طرح مقام عبودیت اور مقام الوہیت کو ایک کرنے کے بجائے اس کو ممتاز رکھنا چاہیے۔ ان دونوں کا امتزاج ممکن نہیں۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آپ کی ذات میں الوہیت کو جمع کیا گیا۔ یہ محض اس لیے کیا گیا کہ آپ کی ولادت معجزانہ تھی' آپ سے معجزات کا صدور ہوا اور پھر آپ کو اس دنیا سے معجزانہ طور پر اٹھایا گیا۔ ان وجوہات کی بنا پر بعض لوگوں نے ذات عیسیٰ میں مقام الوہیت و عبودیت کا امتزاج کر دیا۔ لیکن اسلامی عقیدے کو اس معاملے میں سادہ' صاف اور خالص رکھا گیا اور اسلام نے ذات باری کے ساتھ ہر قسم کی شرک کی نفی کی خواہ قریب ہو یا بعید۔

اسراء سریٰ سے مشتق ہے' جس کے معنی رات کے وقت چلنے کے ہیں۔ اس سے اسریٰ کے مفہوم ہی میں رات کا وقت داخل ہے۔ لہٰذا اسریٰ کے بعد رات کی صراحت ضروری نہیں ہے لیکن سیاق کلام میں رات کی صراحت

بھی کر دی گئی ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰي بِعَبْدِهٖ لَيْلًا (۱۷ : ۱) "پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو رات کو"۔ یہ اس لیے کہ اس سفر کی تصویر کشی کرتے ہوئے یہ دکھایا جائے کہ اس سفر پر رات کے سائے تھے' نہایت ہی پر سکون ماحول تھا۔ اور یہ قرآن کریم کا خصوصی اسلوب ہے کہ وہ ہر واقعہ کے ماحول کو بھی نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتا ہے' جن حالات میں واقعہ ہوتا ہے۔ ویسی ہی فضا انسان کی قوت مدرکہ اور اس کے نفس پر سایہ فگن ہو جاتی ہے اور وہ واقعہ کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

یہ سفر مبارک مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اللہ نے کرایا اور اللہ لطیف و خبیر ہے۔ اس سفر کی غرض و غایت یہ بتانا تھی کہ تمام توحیدی ادیان سماوی کا سرچشمہ اور تاریخ ایک ہے' یہ ادیان ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام سے چلے ہیں اور ان کا خاتمہ حضرت محمد خاتم النبیین پر ہوا ہے۔ ان ادیان کے مقامات مقدسہ بھی یکساں طور پر قابل احترام ہیں۔ لہٰذا خاتم النبیین' تمام انبیاء اور ان کے مقامات مقدسہ کے وارث اور امین ہیں۔ گویا یہ سفر زمان و مکان کے حدود کے اندر مقید نہیں ہے' یہ کوئی مخصوص واقعہ نہیں ہے بلکہ ایک آفاقی سفر ہے اور بادی النظر میں اس سے جو مقصد و مفہوم نکلتا ہے اس سے کہیں آگے اس کی غرض و غایت زیادہ وسیع ہے اور اس کے اندر گہری حکمت ہے۔

یہاں مسجد اقصیٰ کی تعریف میں یہ کہا گیا ہے۔

الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ (۱۷ : ۱) "جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسجد پر ہر وقت برکات الٰہیہ کا فیضان ہوتا رہتا ہے اور وہ اس میں ڈوبی ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جاتا کہ ہم نے اسے بابرکت بنایا ہے یا یہ کہا جاتا کہ اس میں برکات ہیں تو مفہوم میں اس قدر وسعت نہ ہوتی جس طرح ان الفاظ میں ہے کہ ہم نے اس کے ماحول کو بابرکت بنایا ہے۔

یہ سفر بذات خود بھی ایک معجزہ تھا' لیکن اس کے اندر آپ کو مزید معجزات اور آیات کی سیر بھی کرائی گئی۔

لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا (۱۷ : ۱) "تاکہ ہم اسے کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائیں"۔ سب سے پہلے تو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا سفر ہی ایک معجزہ ہے کہ اس قدر قلیل وقت میں یہ سفر اختتام کو پہنچا کہ حضورؐ کا بستر بھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا' چاہے اس سفر کی کیفیت جو بھی ہو' بہرحال یہ ایک معجزہ تھا' مقصد یہ تھا کہ حضورؐ کو وسیع تر کائنات کی سیر کرائی جائے اور یہ بتایا جائے کہ اس انسانی مخلوق کی ذات میں بڑے بڑے کمالات پوشیدہ ہیں' نیز اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ حضرت خاتم النبیین کو ان حقائق کے ادراک کے لیے تیار کیا جائے جو انبیاء کی ذات پر القاء ہوتے ہیں' اور جن کے اخذ کی استعداد صرف ان مخصوص بندوں کو دی جاتی ہے جن کو اللہ تعالیٰ رسالت کا اعزاز بخشنے کے لیے منتخب کیا ہے اور یہ انبیاء اسی نوع بشر سے ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے خلق کثیر پر فضیلت دی ہوتی ہے اور جس کے اندر اللہ نہایت ہی لطیف اسرار رکھے ہوتے ہیں۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (۱۷ : ۱) "وہ سنتا ہے اور دیکھتا ہے" ۔ وہ ہر لطیف اور باریک چیز کو نگاہ میں رکھتا ہے ۔ ایسی آواز بھی سنتا ہے جو بہت ہی دھیمی ہو یعنی وہ تمام لطائف اور تمام اسرار سے واقف ہے ۔

سیاق کلام میں آغاز اللہ کی تسبیح سے ہوتا ہے ۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰي بِعَبْدِهٖ لَيْلًا (۱۷ : ۱) اور تسبیح اللہ کی تعریف ہے ۔ اس کے بعد مقصد سفر بتایا جاتا ہے جو اثباتی اور قطعی پہلو رکھتا ہے ۔

لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا (۱۷ : ۱) اور اس کے بعد پھر اللہ کی تعریف کی طرف بات منتقل ہو جاتی ہے ۔ یہ سب مطالب و مفہومات اپنے اندر ایک گہرا توازن رکھتے ہیں ۔ تسبیح توصفت باری تعالیٰ ہے جو انسان کی طرف سے اللہ کے لیے ہے ۔ مقصد اللہ کی طرف سے ایک فیصلہ ہے اور سمیع و بصیر اللہ ہی کی صفت دائمہ قائمہ ہے جو خبر کے انداز میں بیان ہوئی ہے ۔ غرض ایک ہی آیت میں یہ سب معانی بڑی خوبصورتی کے ساتھ جمع ہو گئے ہیں اور جو اپنا مفہوم نہایت ہی باریکی سے ادا کرتے ہیں ۔

--- ○○○---

حضورؐ کو رات کا یہ سفر کرانا ایک معجزہ ہے ۔ جس طرح دوسرے معجزات اللہ تعالیٰ صادر فرماتا رہا ہے ۔ معجزہ یوں ہے کہ انسان سفر کے سلسلے میں جس انداز کا عادی ہے یہ اس سے ذرا ہٹ کر ہے ۔ مسجد اقصیٰ اس سفر میں ایک مرحلہ رہا ہے ۔ مسجد اقصیٰ اس علاقے کا قلب ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بسایا اور پھر وہاں سے ان کو نکالا ۔ درج ذیل آیات کے ضمن میں بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ کے واقعات آئیں گے ۔

وَ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ
وَكِيْلًا ۝۲ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝۳ وَ قَضَيْنَآ
اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا
كَبِيْرًا ۝۴ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ
فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَ كَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝۵ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ
عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝۶ اِنْ اَحْسَنْتُمْ
اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا

وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا
تَتْبِيرًا ﴿٧﴾ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يَرْحَمَكُمْ ۚ وَإِنْ عُدتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ
لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا ﴿٨﴾

"ہم نے اس سے پہلے موسیٰؑ کو کتاب دی تھی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ذریعہ ہدایت بنایا تھا اس تاکید کے ساتھ کہ میرے سوا کسی کو اپنا وکیل نہ بنانا۔ تم ان لوگوں کی اولاد ہو جنہیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی پر سوار کیا' اور نوحؑ ایک شکرگزار بندہ تھا۔ پھر ہم نے اپنی کتاب میں بنی اسرائیل کو اس بات پر بھی متنبہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد عظیم برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ آخر کار جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقعہ پیش آیا' تو اے بنی اسرائیل' ہم نے تمہارے مقابلے پر اپنے ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے اور وہ تمہارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا۔ اس کے بعد ہم نے تمہیں ان پر غلبے کا موقعہ دے دیا اور تمہیں مال اور اولاد سے مدد دی' اور تمہاری تعداد پہلے سے بڑھا دی۔ دیکھو! تم نے بھلائی کی تو وہ تمہارے اپنے ہی لیے بھلائی تھی' اور برائی کی تو وہ تمہاری اپنی ذات کے لیے برائی ثابت ہوئی۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کیا تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اسے تباہ کر کے رکھ دیں۔ ہو سکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے' لیکن اگر تم نے پھر اپنی سابق روش کا اعادہ کیا تو ہم بھی پھر اپنی سزا کا اعادہ کریں گے' اور کافر نعمت لوگوں کے لیے ہم نے جہنم کو قید خانہ بنا رکھا ہے"۔

بنی اسرائیل کی سیرت اور تاریخ کا یہ حصہ قرآن کریم کی صرف اسی سورت میں بیان ہوا ہے اس میں بنی اسرائیل کے اس انجام کا ذکر ہے جس پر وہ پہنچے اور جس کے نتیجے میں ان کی عزت و شوکت' زوال و نکبت سے بدل گئی۔ اس تاریخی تبصرہ کے ذریعے انسانوں کو یہ سمجھایا گیا کہ اقوام کے عروج و زوال میں اصلاح و فساد کا کتنا گہرا دخل ہوا کرتا ہے۔ بعد کی آیات میں' اسی سورت میں قرآن کریم بتاتا ہے کہ یہ سنت الٰہیہ ہے کہ اللہ جس قوم کو ہلاک کرنا چاہتا ہے وہ اس قوم کے مترفین کے اندر فساد پیدا کرتا ہے' وہ بگاڑ میں ڈوب جاتے ہیں اور ہلاک کر دیئے جاتے اور اس طرح نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

یہاں ان کو بتایا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کو تورات دی گئی۔ اس میں ان کے لیے ہدایات تھیں' پھر ان کے جد امجد حضرت نوح علیہ السلام جو عبد' شکور اور صالح تھے اور وہ آباء و اجداد جو ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے۔ یہ سب لوگ صالح اور مومن تھے کیونکہ انہوں نے اپنے ساتھ کشتی میں صالحین مومنین کو بٹھایا تھا۔

وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ أَلَّا تَتَّخِذُوا مِن دُونِي

وَكِيلًا (۲) ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا (۳) (۱۷: ۲ - ۳)
”ہم نے اس سے پہلے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ذریعہ ہدایت بنایا تھا۔ اس تاکید کے ساتھ کہ میرے سوا کسی کو اپنا وکیل نہ بنانا۔ تم ان لوگوں کی اولاد ہو جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا اور نوحؑ ایک شکر گزار بندہ تھا“۔

بنی اسرائیل کو کتاب کے ذریعہ یاد دہانی اور ڈراوا اس لیے دیا گیا کہ اللہ کا یہ اصول ہے کہ وہ کسی قوم کو اس وقت تک ہلاک نہیں کرتا یا عذاب نہیں دیتا جب تک ان پر رسولوں کے ذریعہ حجت تمام نہ ہو جائے۔ جس کا تذکرہ بھی بصراحت جلد ہی آئے گا۔

حضرت موسیٰ کے ذریعہ بنی اسرائیل کو کتاب دینے کا پہلا مقصد یہ بتایا گیا۔

هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ أَلَّا تَتَّخِذُوا مِن دُونِي وَكِيلًا (۱۷: ۲) ”اسے بنی اسرائیل کے لیے ذریعہ ہدایت بنایا اور یہ تاکید کہ میرے سوا کسی کو وکیل نہ بنانا“۔ یعنی صرف اللہ پر بھروسہ کرو، صرف اللہ ہی کی طرف متوجہ ہو جاؤ، یہی ہدایت ہے اور یہی اصل ایمان ہے۔ کیونکہ جو شخص اللہ کے سوا کسی اور کو وکیل بناتا ہے وہ نہ ہدایت پر ہے اور نہ مومن ہے۔

ان کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ تم ان لوگوں کی اولاد ہو جن کو ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا اور اس جہاں کے عہد اول میں یہی لوگ خلاصہ انسانیت تھے۔ کیونکہ وہ حضرت نوح کے یعنی ایک عبد شکور کے ساتھی اور رفقاء تھے اور صالح لوگ تھے، اس طرح اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک مومن کا حقیقی شجرۂ نسب اس کا ایمانی شجرۂ نسب ہوتا ہے۔

یہاں حضرت نوح علیہ السلام کی صفت عبودیت کا ذکر ہوا ہے کیونکہ یہی انسانیت کی اصل غایت ہے، لیکن اس کے علاوہ یہ حکمت بھی ہے کہ یہاں چونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت عبدہ کا ذکر ہو گیا تھا اس لیے رسولوں میں سے ایک دوسرے ممتاز رسول، حضرت نوح علیہ السلام کی صفت عبودیت کا بھی تذکرہ کر دیا گیا اور یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز بیان ہے کہ وہ ہر صورت میں ایک مخصوص انداز بیان بھی اپناتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب دی تھی اس میں بنی اسرائیل کو صاف صاف بتایا تھا کہ تمہارے فساد کی وجہ سے تمہیں ہلاک کر دیا جائے گا۔ تم دو مرتبہ فساد اور بگاڑ میں مبتلا ہو گئے اور دو مرتبہ تمہیں ہلاک کیا جائے گا۔ کیونکہ ہلاکت و بربادی کے اسباب تم دو مرتبہ فراہم کرو گے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت اٹل ہوتی ہے۔ جو قوم بھی فساد و بگاڑ میں مبتلا ہو وہ ہلاک کر دی جاتی ہے۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا (۱۷: ٤) ”پھر ہم نے اپنی کتاب میں بنی اسرائیل کو اس بات پر بھی متنبہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد عظیم برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے“۔ یہ تنبیہ ان کو دراصل اس بات کی پیشگی اطلاع تھی کہ تمہارے ساتھ

یہ یہ ہونے والا ہے۔کیونکہ اللہ ان کے ہونے والے انجام سے پیشگی باخبر تھا۔یہ اطلاع محض پیشگی علم کی وجہ سے تھی۔ اس میں ان کے لیے جبر کا کوئی پہلو نہ تھا۔یا یہ کہ ان کے اندر جو فساد بعد میں پیدا ہوا' وہ محض اس پیشگی اطلاع کی وجہ سے پیدا ہوا کیونکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ کسی کو فساد پر مجبور کرے۔

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ "کہہ دو' اللہ فحاشی پھیلانے کا حکم نہیں دیتا"۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ جانتا ہے کہ وہ کیا کرنے والے تھے۔ اللہ کے علم میں جو بات ہوتی ہے' اگرچہ بشر کو اس کا علم نہیں ہوتا اور پردہ تب اٹھتا ہے جو بشر اس کام کو کر بیٹھتا ہے۔

اللہ کا فیصلہ یہ تھا اور حضرت موسیٰ کو کتاب میں بتا بھی دیا تھا کہ بنی اسرائیل اپنی تاریخ میں دو مرتبہ فساد برپا کریں گے۔ اور اس طرح وہ زمین میں سرکشی اختیار کرلیں گے۔بیت المقدس پر ان کا غلبہ ہو گا۔لیکن اپنے اس غلبے کو وہ ذریعہ فساد بنائیں گے۔جن لوگوں پر ان کو برتری حاصل ہوگی ان کی جان اور آبرو ان کے نزدیک مباح ہو جائے گی اور یہ لوگوں کو تباہ کر دیں گے۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا (۱۷:۵) "آخر کار جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقع پیش آیا' تو اے بنی اسرائیل 'ہم نے تمہارے مقابلے پر اپنے ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے اور وہ تمہارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا"۔یہ ان کی پہلی سرکشی تھی۔ان لوگوں نے بیت المقدس میں بڑی ترقی اور سربلندی حاصل کی۔ان کے پاس حکومت اور قوت جمع ہو گئی 'جس پر انہوں نے فساد شروع کر دیا۔اللہ نے ان پر ایک دوسری زور آور اور صاحب قوت قوم کو مسلط کر دیا۔ان لوگوں کی گرفت مضبوط تھی۔انہوں نے تمام علاقوں کو اپنے لیے حلال قرار دے دیا اور صبح و شام حملہ آور ہوتے رہے اور جو کچھ ان کے سامنے آتا اسے تاخت و تاراج کرتے رہے۔اور وہ کسی کام کے کر گزرنے میں کوئی باک اور ڈر محسوس ہی نہ کرتے تھے۔

وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا (۱۷:۵) "یہ اللہ کا ایسا وعدہ تھا جس نے پورا ہو کر ہی رہنا تھا"۔کیونکہ اللہ کے وعدے اور فیصلے میں نہ تخلف ممکن ہے اور نہ اللہ کا کوئی فیصلہ جھوٹا ہو سکتا ہے۔

جب بنی اسرائیل نے مغلوبیت' ذلت اور غلامی کا مزہ چکھا' تو انہوں نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور انہوں نے اپنے حالات کو درست کیا' تو ان پر جو عذاب مسلط کیا گیا تھا اس سے ان کی گلوخلاصی ہوئی' کیونکہ فاتحوں کے اندر بھی اسی طرح کا فساد پیدا ہو گیا۔ان کو بھی اپنی قوت پر گھمنڈ ہو گیا' انہوں نے بھی زمین میں فساد پیدا کر دیا تو اللہ نے اپنی سنت کے مطابق ان مغلوبین کو منظم کر کے ان حملہ آوروں پر غالب کر دیا اور اب بنی اسرائیل کے مستضعفین دوبارہ غالب آگئے۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ

نَفِيْرًا (۱۷ : ٦) "اس کے بعد ہم نے تمہیں ان پر غلبے کا موقعہ دلایا اور تمہیں مال اور اولاد سے مدد دی اور تمہاری تعداد پہلے سے بڑھا دی"۔ اس کے بعد یہی عمل از سرنو دہرایا جاتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ اس پیش گوئی کا دوسرا حصہ روبعمل آئے اور جو وعدہ کیا گیا تھا وہ پورا ہو' اللہ تعالیٰ یہاں ایک نہایت ہی اہم اساسی قانون مکافات عمل بیان کر دیتا ہے۔

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (۱۷ : ۷) "دیکھو تم نے بھلائی کی تو وہ تمہارے اپنے ہی لیے بھلائی تھی اور برائی کی تو وہ تمہاری اپنی ذات کے لیے ہی برائی ثابت ہوئی"۔ مکافات عمل کا یہ وہ اساسی قاعدہ ہے جو دنیا و آخرت میں یکساں لاگو ہے۔ یہ کہ انسان اپنے اعمال کا خود حقدار و ذمہ دار ہے۔ اس کے تمام پھل اور نتائج اس کے لیے ہیں۔ عمل اور جزائے عمل لازم و ملزوم ہیں۔ نتیجہ عمل سے پیدا ہوتا ہے' اس لیے انسان ایک مسئول اور ذمہ دار ہستی ہے' اگر چاہے تو اپنے ساتھ اچھا کرے یا برا کرے' اگر اسے اچھے عمل یا برے عمل کا ثمرہ ملے تو اسے گلہ نہیں کرنا چاہیے۔

مکافات عمل کا یہ قاعدہ بیان کرنے کے بعد اب دوبارہ روئے سخن اس پیش گوئی کی طرف مڑ جاتا ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ

اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا (۱۷ : ۷) "پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے دشمنوں کو تم پر مسلط کیا تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اسے تباہ کر کے رکھ دیں"۔ یہاں سیاق کلام میں بنی اسرائیل کے دوسرے فساد کی تفصیلات نہیں دی گئیں۔ کیونکہ پہلے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ "تم دو بار زمین میں فساد برپا کرو گے"۔ اور دوسری بار ان پر جیسے لوگوں کو مسلط کیا گیا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے دوسری بار بھی بگاڑ کی راہ اختیار کی تھی۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا (۱۷ : ۷)) "پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے دشمنوں کو تم پر مسلط کیا تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں"۔ یعنی انہوں نے ان سے اس قدر انتقام لیا کہ ان کی شخصیت اس کے اثرات سے بدل گئی۔ یہاں تک کہ یہ ذلت و نکبت ان کے چہروں پر ظاہر ہو گئی۔ انہوں نے تمام مقدسات کی بے حرمتی کی اور ہر چیز کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۱۷ : ۷) "وہ بھی اسی طرح مسجد میں داخل ہوئے جس طرح پہلے دشمن داخل ہوئے تھے"۔ جس جس چیز پر ان کا غلبہ ہوتا تھا' اسے تاخت و تاراج کرتے اور ہر چیز کو تباہ کرتے جاتے۔

وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا (۱۷ : ۷) "تاکہ جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے تباہ کر دیں"۔ یعنی انہوں نے

بیت المقدس کو پوری طرح تباہ کر دیا اور ان لوگوں کو ملک بدر کر کے علاقے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

چنانچہ یہ پیشن گوئی سچی ثابت ہوئی۔ اللہ کا وعدہ پورا ہوا اور بنی اسرائیل پر ایسے ہی لوگ مسلط ہو گئے۔ پھر دوبارہ ان پر دشمن مسلط کیے گئے اور انہوں نے ان کو ملک بدر کر کے ملک کو تباہ کیا۔

قرآن کریم نے اس بات کی تصریح نہیں کی کہ یہ لوگ کون تھے کیونکہ بنی اسرائیل کی دو بار کی تباہی کے بیان سے جو مقصد تھا وہ اسی قدر بیان سے پورا ہو گیا۔ اگر بتا دیا جاتا کہ فلاں فلاں اقوام کو ان پر مسلط کیا گیا تو اس سے کسی مفہوم میں اضافہ نہیں ہو جاتا۔ یہاں مقصد اس سنت الٰہی کا بیان تھا جس کا تعلق اقوام کے عروج و زوال سے ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ ایسی تباہیاں کیوں لاتا ہے؟ تو بتایا جاتا ہے کہ بعض اوقات کسی قوم کی تباہی ہی اس کے لیے باعث رحمت ہوتی ہے۔

عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ (۱۷ : ۸) "ہو سکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے"۔ اگر تم اپنی تاریخ سے عبرت حاصل کرو۔

لیکن یاد رکھو اگر تم نے سرکشی کا یہ عمل پھر دہرایا تو اس کے نتائج پھر ظاہر ہوں گے۔ اللہ کی سنت جاری و ساری ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا (۱۷ : ۸) "لیکن اگر تم نے پھر اپنی سابق روش کا اعادہ کیا تو ہم بھی پھر اپنی سزا کا اعادہ کریں گے"۔ ہاں انہوں نے پھر فساد کیا اللہ نے ان پر مسلمانوں کو مسلط کر دیا اور ان کو جزیرۃ العرب سے خارج البلد کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے پوری دنیا میں فساد کیا تو اللہ نے ان پر اپنے اور بندوں کو مسلط کر دیا ور ہٹلر نے ان کی گوشمالی کی۔ اور دور حاضر میں انہوں نے پھر فساد اور سرکشی شروع کر دی ہے۔ اسرائیل کی شکل میں منظم ہو کر انہوں نے پورے شرق اوسط کو مصائب میں مبتلا کر دیا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان پر اللہ کسی ایسی قوم کو مسلط کرے جو ان کو ان کی سرکشی کی پوری سزا دے۔ تاکہ اللہ کا وعدہ پورا ہو اور اللہ کا وعدہ ہمیشہ پورا ہوتا ہے۔ یہ وہ دھمکی ہے کہ اگر تم نے پھر ایسا کیا تو ہم بھی ایسا کریں گے۔ اور وہ وقت دور نہیں کہ بنی اسرائیل اپنے کیے کا مزہ چکھ لیں۔

---()()()---

اب یہاں سیاق کلام اہل کفر کے اخروی انجام کی طرف ہو جاتا ہے یوں آخرت اور دنیا کے مناظر بیان ہوتے ہیں یہ ان کے درمیان یک رنگی ہوتی ہے۔

وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا (۱۷ : ۸) "اور کافروں کے لیے ہم نے جہنم کو قید خانہ بنا دیا ہے"۔ یہ جہنم اس طرح ان کو گھیرے گی کہ ان میں سے کوئی اس سے بچ کر نہ نکل سکے گا۔ یہ جہنم اس قدر وسیع ہوگی کہ سب اس میں سما جائیں گے۔

---()()()---

سبق کے اس حصے میں تاریخ بنی اسرائیل کا یہ پہلو بیان ہوا کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو کتاب عطا کی تھی کہ یہ لوگ

اس سے ہدایت لیں - لیکن انہوں نے ہدایت نہ لی بلکہ گمراہ ہوئے اور اللہ کی ہلاکت نے ان کو آلیا - اب سیاق کلام قرآن کریم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ اس طرح یہ قرآن بھی نہایت ہی ٹھوس تعلیمات پیش کر رہا ہے -

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ﴿٩﴾ وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٠﴾

”حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے - جو لوگ اسے مان کر بھلے کام کرنے لگیں انہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے اور جو لوگ آخرت کو نہ مانیں انہیں یہ خبر دیتا ہے کہ ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے“ -

یہ قرآن راہ راست دکھاتا ہے - یہ ہر قسم کی ہدایت کا سرچشمہ ہے اور ہر کسی کے لیے منبع ہدایت ہے - بغیر کسی حدود و قیود کے - انسانوں کی راہنمائی کے لیے جس ہدایت 'جس نظام کی ضرورت ہے وہ اس میں موجود ہے - ہر دور اور ہر قسم کے معاشرے میں -

انسانی ضمیر و شعور کو یہ ایک واضح عقیدہ اور صاف و سادہ خیالات عطا کرتا ہے 'ایسے عقائد و تصورات جن میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہے - یہ خیالات انسانی شعور کو وہم و گمان 'اوہام و خرافات سے پاک کر کے اس کی سوچ کو قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہیں -

پھر یہ قرآن انسان کے ظاہر و باطن کو باہم مربوط کرتا ہے - انسانی سوچ اور عمل کو باہم یکساں کرتا ہے اور انسانی نظریات اور اعمال کے اندر ہم آہنگی پیدا کرتا ہے - گویا انسان کی شخصیت کے تمام پہلو ایک ہی رسی میں بندھ جاتے ہیں 'زمین پر انسان کے اعمال و خیالات عالم بالا کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں 'انسان اس دنیا میں جو جدوجہد کرتا ہے 'وہ عبادت بن جاتی ہے -

عبادات میں بھی اس کی پالیسی اور ہدایت نہایت ہی متوازن ہے - وہ صرف اس قدر عبادت اور بندگی کا حکم دیتا ہے جس قدر انسان کے بس میں ہو - ایسے احکام نہیں دیتا کہ انسان کے اندر ان کی تعمیل کی طاقت ہی نہ ہو - یہ انسان کو سستی اور عیش پرستی کے حوالے بھی نہیں کرتا کہ انسان عیش پرست ہو جائے بلکہ ہر میدان میں اس کی ہدایات توازن و اعتدال پر مبنی ہیں -

اس میں انسانوں کے باہمی تعلقات کے بارے میں بھی نہایت ہی مستحکم ہدایات دی گئی ہیں - ایک فرد اور فرد کے تعلقات کے بارے میں 'میاں اور بیوی کے بارے میں 'حاکم و محکوم کے بارے میں 'اقوام اور حکومتوں کے بارے میں - یہ کتاب اس قسم کے تمام روابط کو نہایت ہی مستحکم بنیادوں پر قائم کرتی ہے 'ایسی مستحکم بنیادیں جو آراء اور خواہشات سے متاثر نہیں ہوتیں - دوستی اور دشمنی سے بھی ان اصولوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا - اغراض و مفادات بھی ان روابط کو متاثر نہیں کرتے - کیونکہ یہ اصول ایک علیم و خبیر نے وضع کیے ہیں 'وہ خوب جانتا ہے کہ اس کی مخلوقات کی حقیقی ضرورت کیا ہے 'اسے یہ بھی معلوم ہے کہ ہر قسم کی سرزمین اور ہر علاقے کے لیے جامع ہدایت کیا ہے 'اس طرح اس نے اس کتاب

میں ایک ایسا جامع نظام مرتب کر دیا جو دنیا کے تمام انسانوں کی قانونی' معاشی' اجتماعی اور اخلاقی ضروریات کے لیے مستحکم ہدایات دیتا ہے بلکہ اس نے بہترین بین الاقوامی ہدایات بھی دی ہیں۔

اس نے تمام ادیان سماوی کے بارے میں بھی بہترین ہدایات دی ہیں' تمام ادیان کے مقامات مقدسہ کا احترام سکھایا ہے۔ چنانچہ جب انسان اس کتاب سے ہدایات اخذ کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں تمام انسانوں کے درمیان ایک بھائی چارہ قائم ہو جاتا ہے اور انسان نہایت ہی امن و امان سے رہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سیدھی اور مستحکم ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا (۹) وَّ اَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۱۰) (۱۷: ۹ - ۱۰) "جو لوگ اسے مان کر بھلے کام کرنے لگیں انہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے اور جو لوگ آخرت کو نہ مانیں انہیں یہ خبر دیتا ہے کہ ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے"۔ عمل اور جزائے عمل کا یہ بنیادی اصول ہے کہ ایمان اور عمل صالح کے نتائج مرتب ہوں گے۔ ایمان اور عمل صالح دونوں ضروری ہیں۔ بغیر ایمان کے عمل مفید نہیں ہے اور بغیر عمل کے صرف ایمان معتبر نہیں ہے۔ اگر ایمان کے ساتھ عمل نہ ہو تو وہ ناتمام مسلمانی ہے۔ اور عمل بلا ایمان بھی بے بنیاد ہے۔ ایمان اور عمل دونوں ہوں تو زندگی راہ راست پر چلتی ہے اور ایمان اور عمل دونوں ہوں تو انسان ہدایت اخذ کر سکتا ہے۔

جو لوگ قرآن کریم کی راہ نہیں لیتے وہ انسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور انسان بہت ہی جلد باز ہے۔ وہ اپنے نفع میں بھی جلدی کرتا ہے اور نقصان میں بھی۔ وہ اس قدر جلدی سے آگے بڑھنا چاہتا ہے کہ اپنے جذبات پر اسے کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ وہ آگے ہی بڑھنا چاہتا ہے اگرچہ اس کے سامنے شر ہو۔

وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾

"اور انسان شر اس طرح مانگتا ہے جس طرح خیر مانگنی چاہئے۔ انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے"۔

یہ اس لیے کہ وہ معاملات کے انجام سے بالکل بے خبر ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ کسی کام کو اچھا سمجھ کر کرتا ہے اور درحقیقت وہ شر ہوتا ہے اور اس کے کر گزرنے میں وہ بہت جلدی کرتا ہے' بعض اوقات وہ کسی کام کو شر سمجھ کر کرتا ہے لیکن وہ خیر ہوتا ہے۔ غرض انسان کسی بھی کام کے عواقب و نتائج کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔ جبکہ قرآن کریم جو ہدایت دیتا ہے وہ نہایت ہی سیدھی' نہایت ہی دھیمی اور پر وقار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی راہنمائی والی راہ جدا ہے اور انسان کی خود طے کردہ راہ جدا ہے۔ اور ان دونوں کے اندر بہت بڑا فرق ہے۔

--- ○○○---

سابقہ آیات میں چند معجزانہ اشارات تھے - حضور اکرم اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے واقعہ معراج اور اس کے اندر پائے جانے والے معجزات 'حضرت نوح علیہ السلام کا معجزانہ طور پر طوفان سے بچنا اور ان لوگوں کی طرف اشارہ جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے - تاریخ بنی اسرائیل کے مدوجزر اور ان میں اللہ کے معجزانہ فیصلے اور اقوام کے عروج و زوال کے اصول کی طرف اشارہ 'اور انسانی زندگی میں مکافات عمل اور قرآن کریم کی کتاب ہدایت اور منہاج عمل ہونے کی طرف اشارہ۔

ان تمام معجزانہ امور کے بعد اب روئے سخن معجزات کائنات کی طرف پھر جاتا ہے 'ان سابقہ معجزات کا صدور تو پیغمبروں کے ذریعہ ہوا۔ لیکن یہ معجزات ایسے ہیں کہ ہر کسی کو دعوت نظارہ دیتے ہیں - ان کائناتی معجزات کے ساتھ انسانی زندگی کی جدوجہد اور انسانی اعمال بھی وابستہ ہیں - انسانی اعمال اور جدوجہد کا نتیجہ ان قوانین قدرت کے ساتھ جڑا ہوا ہے - چنانچہ جس طرح انسانی عمل اور مکافات عمل کا اصول کائنات میں رواں دواں ہے 'اسی طرح نوامیس فطرت کے اصول بھی انسانی زندگی کے ساتھ مربوط ہیں 'جس طرح انسانی عمران کچھ قواعد پر مبنی ہے 'اسی طرح یہ کائنات بھی بعض قواعد پر مبنی ہے - اور اس کے اندر کوئی تخلف نہیں ہوتا - رات و دن کا یہ نظام جس طرح نہایت ہی اٹل قواعد پر مبنی ہے اسی طرح سنت الٰہیہ بھی اس کائنات میں جاری و ساری ہے اور اس کے اصول بھی اٹل ہیں - اور وہ بھی اسی ذات باری کے ارادے سے چل رہے ہیں جس کے ارادے سے رات و دن چل رہے ہیں -

وَ جَعَلْنَا الَّيْلَ وَ النَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَ جَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ وَ كُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿۱۲﴾ وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿۱۴﴾ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾ وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا

بَصِيْرًا﴿۱۷﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ
ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا﴿۱۸﴾ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ
سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ
هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا﴿۲۰﴾ اُنْظُرْ
كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا﴿۲۱﴾

"دیکھو' ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا ہے۔ رات کی نشانی کو ہم نے بے نور بنایا اور دن کی نشانی کو روشن کر دیا تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کر سکو اور ماہ و سال کا حساب معلوم کر سکو۔ اسی طرح ہم نے ہر چیز کو الگ الگ ممیز کر کے رکھا ہے۔

ہر انسان کا شگون ہم نے اس کے اپنے گلے میں لٹکا رکھا ہے' اور قیامت کے روز ہم ایک نوشتہ اس کے لیے نکالیں گے جسے وہ کھلی کتاب کی طرح پائے گا پڑھ اپنا نامہ اعمال' آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے۔ جو کوئی راہ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے' اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ (لوگوں کو حق و باطل کا فرق سمجھانے کے لیے) ایک پیغام بر نہ بھیج دیں۔

جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں' تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ دیکھ لو کتنی ہی نسلیں ہیں جو نوحؑ کے بعد ہمارے حکم سے ہلاک ہوئیں۔ تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے پوری طرح باخبر ہے اور سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

جو کوئی (اس دنیا میں) جلدی حاصل ہونے والے فائدوں کا خواہش مند ہو' اسے یہیں ہم دے دیتے ہیں جو کچھ بھی جسے دینا چاہیں' پھر اس کے مقسوم میں جہنم لکھ دیتے ہیں جسے وہ تاپے گا' ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر۔ اور جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے' اور ہو وہ مومن' تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہو گی۔ ان کو بھی اور ان کو بھی' دونوں فریقوں کو ہم (دنیا میں) سامان زیست دیے جا رہے ہیں' یہ تیرے رب کا عطیہ ہے' اور تیرے رب کی عطا کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ مگر دیکھ لو' دنیا ہی میں ہم نے ایک گروہ کو دوسرے پر کیسی فضیلت دے رکھی ہے۔ اور آخرت میں اس کے درجے اور بھی زیادہ ہوں گے' اور اس کی فضیلت اور بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر ہو گی"۔

وہ قوانین قدرت جو رات و دن کو کنٹرول کرتے ہیں' انہی کے ساتھ انسان کے کسب اور جدوجہد کا تعلق بھی ہے۔ رات اور دن کی بنیاد پر سالوں کا حساب ہوتا ہے' انہی کے ساتھ انسانی کسب و عمل بھی منسلک ہے۔ وہ اچھائی کرے یا برائی

کرے اس پر جزاء و سزا مرتب ہو گی - اسی کے ساتھ ہدایت و ضلالت بھی مربوط ہے - اور تمام امور میں انفرادی ذمہ داری کا اصول کارفرما ہے 'کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا - اسی پر یہ اصول بھی طے ہوا ہے کہ اللہ کسی کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک رسول نہ بھیج دے - اور اسی سے یہ اصول بھی مربوط ہے کہ جب اللہ کسی بستی کو ہلاک کرتا ہے تو تب کرتا ہے کہ اس کے مترفین اس بستی میں فسق و فجور اور دنگا فساد برپا کر دیتے ہیں - اسی پر یہ اصول بھی مبنی ہے کہ بعض لوگ صرف دنیا کو طلب کرتے ہیں اور بعض آخرت کے طلبگار ہوتے ہیں 'تو اہل دنیا کو اللہ دنیا دیتا ہے اور اہل آخرت کو اللہ آخرت دیتا ہے - یہ تمام امور خواہ دینی اور عمرانی ہوں یا تکوینی دونوں ایک ہی ناموس الہی کے مطابق چلتے ہیں جو اللہ نے اس کائنات میں جاری کر رکھا ہے - اور یہ ناموس الہی اور یہ سنت الہیہ اٹل ہے - اس کے اصولوں کے اندر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی - اس میں کوئی چیز بھی محض اتفاقی نہیں ہے -

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ايَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ ايَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ ايَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا (۱۷:

۱۲) "دیکھو 'ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا ہے - رات کی نشانی کو ہم نے بے نور بنایا اور دن کی نشانی کو روشن کر دیا تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کر سکو اور ماہ و سال کا حساب معلوم کر سکو - اسی طرح ہم نے ہر چیز کو الگ الگ ممیز کر کے رکھا۔

رات اور دن اس کائنات کی نہایت ہی بڑی نشانیاں ہیں اور رات اور دن کے نظام کا اصول نہایت ہی دقیق اور باریک اصول پر مبنی ہے - یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں کبھی کوئی خلل واقع نہیں ہوا 'اس میں کبھی بھی تعطیل واقع نہیں ہوئی 'یہ رات اور دن دائما چل رہے ہیں - سوال یہ ہے کہ (فمحونا) سے مراد کیا ہے - تو (فمحونا) کا مفہوم یہی معلوم ہوتا ہے کہ رات کو روشنی نہیں ہوتی - اس میں اس کائنات کی حرکات اور نظارے اچھی طرح نظر نہیں آتے - ظاہر ہے کہ دن کی سرگرمیوں اور رنگارنگیوں کے مقابلے میں رات کو محو اور بے نور کہہ سکتے ہیں - دن کھلا ہے جس میں سب کچھ نظر آتا ہے اور رات ذرا محو ہے کہ اس میں دن کی طرح سب کچھ نظر نہیں آتا - رات کو محو 'اس لیے رکھا گیا اور دن کو کھلا اس لیے رکھا گیا ہے کہ

لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ (۱۷: ۱۲) "تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کر سکو اور ماہ و سال کا حساب معلوم کر سکو" - رات آرام 'سکون اور ملاپ کا وقت ہوتا ہے اور دن جدوجہد 'کسب و کمائی اور قیام و سفر کے لیے ہوتا ہے اور رات اور دن کے آگے پیچھے آنے کی وجہ سے ماہ و سال کا حساب مکمل ہوتا ہے - وعدے کے وقت کا حساب 'موسم اور فصل کا حساب غرض تمام معاملات کا حساب رات اور دن کے نظام سے قائم ہے -

وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا (۱۷: ۱۲) "اور ہم نے ہر چیز کو الگ ممیز کر کے رکھ دیا ہے" - یعنی

اس کائنات میں کوئی چیز' کوئی اہم اور غیر اہم بات ہم نے محض بخت و اتفاق کے حوالے نہیں کی بلکہ وہ ہمارے ناموس قدرت کے مطابق ہے۔ یا قانون قدرت پوری طرح مفصل اور جامع اور دقیق ہے مثلاً رات اور دن کی گردش ہی کو دیکھئے۔اس سے اس کائنات کے مدبر کی گہری تدبیر کا ثبوت ملتا ہے۔

جس طرح کائنات میں ایک مکمل ضابطہ کارفرما ہے۔اسی طرح جزاء و عمل اور قانون مکافات عمل بھی ایک نہایت ہی گہرا اور اٹل ضابطہ ہے۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا (۱۳) اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۴) (۱۷: ۱۳ - ۱۴) "ہر انسان کا شگون ہم نے اس کے اپنے گلے میں لٹکا رکھا ہے' اور قیامت کے روز ہم ایک نوشتہ اس کے لیے نکالیں گے جسے وہ کھلی کتاب کی طرح پائے گا پڑھ اپنا نامہ اعمال' آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے"۔ انسان کا شگون اس کا عمل ہے' جو اس کی قسمت میں لکھا ہے۔اس سے مراد خود انسان کا کسب و عمل ہے اور اس کے گلے میں لٹکانے سے مراد یہ ہے کہ انسان سے اس کا شگون یعنی اعمال بھی جدا نہیں ہوتے۔یہ قرآن کریم کا انداز ہے کہ قرآن کریم معانی و مفاہیم کو بھی ایک مجسم شکل میں پیش کرتا ہے' مطلب یہ ہے کہ ہر انسان اپنے اعمال کے ثمرہ کا ذمہ دار ہے اور وہ ان اعمال کے اثرات سے بھاگ نہیں سکتا۔اسی طرح قیامت کے دن کتاب منشور سے بھی مراد اس کے اعمال کا ظہور ہے۔یعنی اعمال کھلے ہوں گے۔کوئی چھپا نہ سکے گا۔یا کوئی عمل حساب سے رہ نہ جائے گا۔لیکن قرآن اسے کھلی کتاب کی مجسم شکل میں پیش کرتا ہے جس سے مخاطب پر زیادہ اثر ہوتا ہے اور بات انسانی احساس کا حصہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ انسانی خیال یکدم پرندے اور کتاب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔اور وہ اس سخت دن کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔جس کے تمام راز کھل جائیں گے۔ایک کھلی کتاب ہوگی اور اس دن کسی محاسب کی ضرورت نہ ہوگی۔

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۷: ۱۴) "پڑھ اپنا نامہ اعمال' آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے"۔

اسی اٹل قانون قدرت کے ساتھ عمل اور مکافات عمل کا قانون وابستہ ہے۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۱۷: ۱۵) "جو کوئی راہ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے' اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے"۔چنانچہ عمل کی ذمہ داری انفرادی ہے اور اس کی وجہ سے ہر انسان اپنے نفس کے ساتھ منسلک ہے۔اگر ہدایت اختیار کرتا ہے تو بھی اپنے لیے کرتا ہے' اگر گمراہ ہوتا ہے تو وہ خود ہی ذمہ دار ہے۔کوئی بھی دوسرے کے کیے کا ذمہ دار نہ ہوگا۔اور کوئی بھی کسی کے بوجھ میں کمی نہ کر سکے گا۔ ہر انسان سے خود اس

کے اعمال کی بازپرس ہوگی اور صرف ان کے اعمال حسنہ کی جزا دی جائے گی اور کوئی دوست بھی کسی دوست کا ذمہ دار نہ ہو گا۔

اللہ تعالیٰ نے نہایت مہربانی کرتے ہوئے انسان کو صرف اس اصول پر مسئول اور ذمہ دار نہیں بنایا جو اس کائنات فطرت میں موجود ہے اور نہ اس کو صرف عہد الست کی بنا پر مسئول بنایا جو اللہ نے تمام انسانوں سے اس وقت لیا تھا جب وہ آدم کی پشت میں تھے بلکہ اللہ نے نہایت مہربانی کرتے ہوئے سلسلہ رسل جاری فرمایا' جو لوگوں کو ناموس شریعت کی یاد دہانی کراتے رہے' انجام بد سے لوگوں کو ڈراتے رہے۔ اور یہ اصول مقرر فرمایا۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا (۱۷:۱۵) "اور ہم اس وقت تک سزا دینے والے نہیں جب تک رسول نہ بھیج دیں یہ اللہ کی بہت بڑی مہربانی ہے کہ وہ عذاب دینے سے قبل لوگوں پر حجت تمام کرتا ہے۔ اور کوئی عذر رہنے نہیں دیتا۔

یہ سنت الٰہیہ اس دنیا میں لوگوں پر عذاب نازل کرنے کے سلسلے میں بھی ہے۔ یہ عذاب بھی اللہ کے اس ناموس قدرت کے مطابق ہی نازل ہوتا ہے جس کے مطابق نظام لیل و نہار جاری و ساری ہے۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا (۱۷:۱٦) "جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں' تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں"۔

یہ مترفین کون لوگ ہوتے ہیں؟ یہ کبراء کا وہ طبقہ ہے جو مالدار اور کھاتے پیتے لوگ ہوتے ہیں۔ نوکر ان کے آگے پیچھے ہوتے ہیں۔ آرام طلب ہوتے ہیں اور خوشحالی' عزت اور قیادت ان کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ لوگ ڈھیلے ڈھالے' گندے اور فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ لوگ اعلیٰ اقدار' مذہبی مقدسات اور شرف و وقار کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور عیاشی اور فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جب ایسے لوگ دیکھتے ہیں کہ ان کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں ہے تو وہ زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ پھر وہ پوری امت میں فحاشی اور بے راہ روی پھیلاتے ہیں۔ اور جن اعلیٰ اقدار کی وجہ سے دنیا میں اقوام بنتی ہیں اور عروج حاصل کرتی ہیں ان کو ایسے لوگ سرعام پامال کرتے ہیں۔ یوں امت کا اجتماعی نظام ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اور اس میں سے زندگی' قوت اور ترقی کے عناصر ختم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یوں وہ امت آخر کار تباہ ہو کر نیست و نابود ہو جاتی ہے۔

اس آیت میں اللہ کی اسی سنت پر بحث کی گئی ہے جب اللہ کسی امت کی ہلاکت کا فیصلہ کر دیتا ہے' اس لیے کہ اس نے اپنی بربادی کے تمام اسباب خود مکمل کر دیئے ہوتے ہیں تو اس میں اس قسم کے مترفین زیادہ ہو جاتے ہیں۔ پھر اللہ کے ایسے لوگوں کی رسی ڈھیلی کر دیتا ہے' کوئی شخص کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہوتا۔ یہ مترفین امت کے قائدین بن جاتے ہیں' فسق و فجور عام ہو جاتا ہے' یوں امت کا اجتماعی نظام ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اس میں سستی آ جاتی ہے' اس کی ہلاکت کا

فیصلہ ہو جاتا ہے' اور اچانک وہ ہلاک اور برباد ہو جاتی ہے۔ اس ہلاکت کی ذمہ داری پھر پوری امت پر ہوتی ہے کیونکہ امت کے افراد میں سے کسی نے' جماعتوں میں سے کسی نے مترفین کے ہاتھ نہیں پکڑے۔ نظام کی اصلاح کے لیے اجتماعی سعی اور جدوجہد نہیں کی۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ قوم کے اندر مترفین کو پیدا نہ ہونے دیا جائے۔ ان کا وجود ہی اس بات کی علامت ہے کہ قوم پر ہلاکت آنے والی ہے۔ اگر کسی امت کا اجتماعی نظام ایسے لوگوں کی راہ روک دے اور ان کو پیدا ہونے ہی نہ دے تو امت ہلاکت سے بچ سکتی ہے۔ کیونکہ ہلاکت کا سبب صرف یہ مترفین اور ان کا فسق و فجور ہوتا ہے۔ یہی لوگ کسی امت اور سوسائٹی کو ہلاکت کی طرف لے جاتے ہیں۔

اللہ نے انسانیت کے لیے ایسے فطری قوانین مقرر کیے ہیں' جو اٹل ہیں اور ان میں کبھی بھی تخلف یا استثناء نہیں ہوتی۔ یہ ناقابل تبدل سنن الٰہیہ ہیں۔ ان نوامیس اور سنن کے مطابق جب کسی واقعہ کے لیے اسباب فراہم ہو جاتے ہیں تو وہ واقعہ ہو جاتا۔ یوں اللہ کا ارادہ پورا ہو جاتا ہے اور اللہ کا وعدہ سچا ہوتا ہے اور اس کی بات پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن اللہ کسی کو فسق و فجور کا حکم نہیں دیتا۔ وہ فاشی کا حکم کبھی نہیں دیتا۔ اس لیے اگر کسی سوسائٹی میں طبقہ مترفین پایا جاتا ہے تو اس کا وجود ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس سوسائٹی نے اپنی ہلاکت کے اسباب پیدا کرنا شروع کر دیے ہیں۔ اس کی چولیں ڈھیلی ہو چکی ہیں اور یہ تتر بتر ہونے والی ہے۔ اور وہ تقدیر الٰہی کے مطابق اپنے قدرتی انجام تک پہنچنے والی ہے۔ وہ یہ کہ سنت الٰہیہ کے فیصلے کے مطابق وہ ان مترفین کی وجہ سے نیست و نابود ہو گئی۔ کیونکہ اس نے خود اپنے اندر اس طبقہ مترفین کو پیدا ہونے دیا۔

اب یہاں ارادۂ الٰہیہ سے مراد کیا ہے؟ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ پکڑ پکڑ کر مترفین کو پیدا کرتا ہے اور وہ پھر مجبور ہو کر فسق و فجور کرتے ہیں اور اللہ زبردستی کر کے کسی سے اس کی ہلاکت کے اسباب پیدا کراتا ہے۔ بلکہ دراصل اسباب وہ سوسائٹی خود فراہم کرتی ہے اور سنن الٰہیہ کے مطابق نتیجہ بعد میں مرتب ہوتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ یہ قانون فطرت اور سنت الٰہیہ اللہ کی جاری کردہ ہے۔ لیکن ہلاکت کا حقیقی سبب وجود مترفین اور فسق و فجور ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوسائٹی پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہاں نظام اجتماعی میں پائے جانے والے خلل کو دور کر دے اور مترفین کو فسق و فجور کرنے سے روکا جائے تاکہ سنن الٰہیہ کے مطابق پوری سوسائٹی پر ہلاکت اور بربادی کا عذاب نہ آجائے۔

قرون اولیٰ سے حضرت نوح علیہ السلام کے بعد یہ سنت جاری و ساری ہے۔ زمانوں کے بعد زمانے گزر گئے اور یہی ہوتا رہا ہے۔ جب بھی کسی امت میں فسق و فجور عام ہوا وہ ہلاک ہوئی۔ اور اللہ اپنے بندوں کی بداعمالیوں سے اچھی طرح خبردار ہے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ بَعْدِ نُوْحٍ وَكَفٰي بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا

بَصِيْرًا (۱۷:۱۷) "دیکھ لو' کتنی ہی نسلیں ہیں جو نوحؑ کے بعد ہمارے حکم سے ہلاک ہوئیں۔ تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے پوری طرح باخبر ہے اور سب کچھ دیکھ رہا ہے"۔

---()()()---

اب آخر میں بتایا جاتا ہے بعض لوگ صرف دنیا ہی کے لیے زندہ رہتے ہیں۔ صرف اس دنیا کے لیے۔ وہ اس زمین سے اوپر کی طرف نظریں نہیں اٹھاتے' ایسے لوگوں کو اللہ صرف اس دنیا کے سامان فراہم کرتا ہے' اور آخرت میں ایسے لوگوں کے حصے میں صرف جہنم آتی ہے' اور جو لوگ صرف اس دنیا ہی کے لیے زندہ ہوتے ہیں اور ان کی نظریں اس سے آگے کسی منظر کی تلاش میں نہیں اٹھتیں' وہ اسی دنیا میں ڈوب جاتے ہیں۔ وہ اس زمین کے کیچڑ میں لت پت ہوتے ہیں' کیڑوں کی طرح گندی نالیوں میں پڑے رہتے ہیں' اور ہر قسم کی گندی لذت کوشی میں ڈوبے ہوئے ہوتے اور شہوت اور جذبات کے غلام ہوتے ہیں اور دنیاوی لذت کے حصول میں ایسے ایسے کاموں کا ارتکاب کرتے ہیں جو ان کو جہنم رسید کر دیتے ہیں۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا (۱۷: ۱۸) "جو کوئی (اس دنیا میں) جلدی حاصل ہونے والے فائدوں کا خواہش مند ہو' اسے یہیں ہم دے دیتے ہیں جو کچھ بھی جسے دینا چاہیں' پھر اس کے مقسوم میں جہنم لکھ دیتے ہیں جسے وہ تاپے گا' ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر"۔ مذموم اور ملامت زدہ اس لیے کہ اس نے یہی کمائی کی اور رحمت سے محروم یوں کہ وہ عذاب میں مبتلا ہو گیا۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا (۱۷: ۱۹) "اور جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے' اور ہو وہ مومن' تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی"۔ پس جو لوگ آخرت چاہتے ہیں ضروری ہے کہ اس کے لیے سعی بھی کریں۔ اس کی ذمہ داریاں ادا کریں۔ اور اس کے تقاضے پورے کریں اور یہ تمام جدوجہد ایمان کے بعد ہو' ظاہر ہے کہ ایمان محض خواہش اور تمنا کا نام نہیں ہے' بلکہ ایمان یہ ہے کہ وہ دل میں بیٹھ جائے اور عمل صالح اس کی تصدیق کرے۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ آخرت کے لیے سعی کرنے کے نتیجے میں انسان دنیا کے مفاد اور سہولتوں اور لذتوں سے یکدم محروم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس دنیا میں رہتے ہوئے وہ آخرت کو مدنظر رکھتا ہے' یہ نہیں ہوتا کہ دنیا ہی اس کا منتہائے مقصود ہو' آخرت بھی پیش نظر ہوتی ہے اور جب آخرت انسان کے پیش نظر ہو تو پھر دنیا کا رہن سہن انسان کے لیے مضر نہیں ہوتا۔

اور جو شخص صرف دنیا چاہتا ہے وہ جہنم میں ملامت زدہ اور رحمت سے محروم پھینک دیا جائے گا' اور جو شخص آخرت کے لیے ساعی ہے تو اس کا استقبال ملاء اعلیٰ میں نہایت ہی عزت اور تکریم سے ہو گا' کیونکہ اس نے دنیا کو چھوڑ کر آخرت کے لیے کام کیا اور قریب کو چھوڑ کر اس نے بعید اور بلند آفاق کی طرف نظریں اٹھائیں۔

دنیا کی زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ وہ لوگ اس کی حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں جو کیڑوں مکوڑوں' حشرات الارض' حیوانات اور وحوش کی زندگی کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ دنیا کی انسانی زندگی اور دنیا میں مذکورہ بالا حشرات الارض کی زندگی میں کوئی بنیادی امتیاز نہیں ہے۔ انسان کی انسانیت کے ساتھ لائق زندگی تو آخرت کی زندگی ہے' یہ اللہ کے جوار میں

دائمی زندگی ہے۔ کیونکہ انسان کو اللہ نے ایک خاص انداز سے پیدا کیا اور اس کو برابر کیا۔ اس کے اندر اپنی خاص روح پھونکی اور اسے زمین کے اوپر آباد کیا اور یہاں اسے مستحکم کر کے علم سے نوازا اور فرشتوں پر برتری عطا کی۔

جو شخص دنیا کے لیے جدوجہد کرے اس کے سامنے بھی میدان کھلا ہے اور جو آخرت کے لیے جدوجہد کرے اس کے لیے بھی میدان کھلا ہے۔ دونوں کو اللہ ان کے مطلوبہ مقاصد اور مطالب اور اہداف تک پہنچاتا ہے۔ کوئی دنیا چاہے یا آخرت۔ اللہ کسی کی راہ نہیں روکتا جہاں کوئی چاہے اللہ کی مشیت اسے لے جاتی ہے۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۱۷ : ۲۰) "ان کو بھی اور ان کو بھی 'دونوں فریقوں کو ہم (دنیا میں) سامان زیست دیے جا رہے ہیں' یہ تیرے رب کا عطیہ ہے' اور تیرے رب کی عطا کو روکنے والا کوئی نہیں ہے"۔

لیکن زمین کے اندر' اس دنیا میں بھی لوگوں کے درمیان حسب درجات' حسب وسائل اور حسب اسباب اور حسب میلانات و رجحانات اور مطابق سعی وجہد فرق مراتب ملحوظ ہے۔ کیونکہ دنیا کا دائرہ بھی محدود ہے' اور یہ کرۂ ارض بھی محدود ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں آخرت کا میدان وسیع ہے۔ وہاں کی وسعتیں لامحدود ہیں۔ عالم آخرت! اس کے کیا کہنے' اس کے مقابلے میں یہ پوری دنیا ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا (۱۷ : ۲۱) "مگر دیکھ لو' دنیا ہی میں ہم نے ایک گروہ کو دوسرے پر کیسی فضیلت دے رکھی ہے۔ اور آخرت میں اس کے درجے اور بھی زیادہ ہوں گے' اور اس کی فضیلت اور بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر ہو گی"۔ اس لیے اگر کوئی حقیقی طور پر بلند مرتبہ چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ اس عظیم اور اونچی تفاوت و امتیاز کے لیے جدوجہد کرے جو آخرت میں ہو گی' جس کا میدان وسیع اور جہاں کسی جگہ کوئی تنگی اور کمی نہیں ہے۔ اور وہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کی حدود سے صرف اللہ ہی خبردار ہے اور جو لوگ مقام امتیاز میں باہم مقابلہ کرنا چاہتے ہیں انہیں چاہئے کہ وہ مقام آخرت کے لیے مقابلہ کریں۔ دنیائے دنی کے حقیر اور قلیل ساز و سامان کے لیے کیا بھاگنا!

---ooo---

# درس نمبر ۱۲۶ ایک نظر میں

اس سورت کے پہلے سبق میں عمل و مکافات عمل کے اصولوں اور ہدایت و ضلالت کے قوانین اور کسب اور حساب کی ذمہ داریوں کو کائناتی اصولوں اور طبیعی قوانین اور گردش لیل و نہار سے مربوط کیا گیا تھا۔ اس سبق میں انسانی طرز عمل ' اخلاق و آداب اور انفرادی اخلاق اور اجتماعی طرز عمل اور قوانین کو اسلامی نظریہ حیات کے اساسی اصول و عقائد یعنی توحید الٰہی کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔ چنانچہ تمام انفرادی اور اجتماعی روابط کی اساس یہی عقیدہ توحید ہے ' جو ایک مضبوط رسی ہے۔ اور یہی ایک خاندان اور ایک سوسائٹی کی اجتماعی زندگی کی اساس اور رابطہ ہے۔

درس سابق میں کہا گیا تھا کہ یہ قرآن بالکل ایک سیدھی راہ کی طرف ہدایت اور راہنمائی کرتا ہے۔ اور اس کے اندر اس راہنمائی کی تمام تفصیلات درج ہیں۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا (۹) وَّ اَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۱۰) وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاۗءَهٗ بِالْخَيْرِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (۱۱) وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا (۱۲) (۱۷: ۹ - ۱۲) "جو لوگ اسے مان کر بھلے کام کرنے لگیں انہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے اور جو لوگ آخرت کو نہ مانیں انہیں یہ خبر دیتا ہے کہ ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے"۔ "انسان شر اس طرح مانگتا ہے جس طرح خیر مانگنی چاہئے۔ انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے"۔ "دیکھو ' ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا ہے۔ رات کی نشانی کو ہم نے بے نور بنایا اور دن کی نشانی کو روشن کر دیا تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کر سکو اور ماہ و سال کا حساب معلوم کر سکو۔ اسی طرح ہم نے ہر چیز کو الگ الگ ممیز کر کے رکھا ہے"۔

جبکہ اس سبق میں قرآن کریم کے احکامات میں سے بعض احکام ' منہیات میں سے بعض مناہی کی تفصیلات دی گئی ہیں اور یہ انسانی زندگی کے عملی معاملات سے متعلق ہیں۔

چنانچہ درس کا آغاز شرک کی ممانعت سے ہوتا ہے ' اور یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ صرف اللہ وحدہ لا شریک مستحق عبادت ہے ۔ اس کے بعد احکام شروع ہوتے ہیں ۔ پہلا حکم والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں ہے ۔ پھر رشتہ داروں ' مساکین اور مسافروں کے ساتھ حسن سلوک ' پھر اعطاء اور خرچ میں اعتدال اور حفاظت ' وفائے عہد ' ناپ تول برابر رکھنے کا حکم ' سچائی پر قائم رہنے کا حکم ' تکبر سے اجتناب اور آخر میں پھر شرک سے اجتناب ۔ چنانچہ تمام اخلاقی اور قانونی احکام کو عقیدۂ توحید کے اندر باندھ دیا گیا ہے ۔ کیونکہ اسلامی نظام پورے کا پورا اسلامی نظریہ حیات پر قائم ہے اور اسلامی نظریہ حیات کلمہ طیبہ پر قائم ہے ۔

---000---

# درس نمبر ۱۲۶ تشریح آیات

## ۲۲--- تا --- ۳۹

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ۲ ع ۱۲

"تو اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا ورنہ ملامت زدہ اور بے یارومددگار بیٹھا رہ جائے گا"۔ اس آیت میں شرک سے ممانعت اور اس کے انجام بد سے ڈرایا گیا ہے۔ امر تو عام ہے لیکن اُسے صیغہ مفرد کی شکل میں لاکر ایک فرد کو مخاطب کیا گیا تاکہ ہر فرد یہ سمجھے کہ یہ حکم اسی کے لیے ہے' اور مخصوص طور پر ہر فرد کے لیے صادر ہوا ہے۔ کیونکہ عقیدہ ایک شخصی معاملہ ہے اور اس کے بارے میں ایک شخص ہی انفرادی طور پر مسئول ہے اور انجام یہ ہے کہ جو شخص بھی شرک کا ارتکاب کرے گا' وہ مذموم ہو گا کیونکہ اس نے قابل مذمت فعل کا ارتکاب کیا ہے اور پھر دوسرا انجام یہ ہے کہ وہ شرمندہ اور بے یارو مددگار رہ جائے گا' اگرچہ اس کے خیال میں اس کے مددگار بہت ہوں اور جو شخص مذموم ہو جائے اور اس کی امداد کے لیے کوئی نہ آئے تو وہ بھی علیحدہ ہو کر شرمندگی کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے۔ کیونکہ انسان ضعیفی کی حالت میں اکثر بیٹھ جاتا ہے۔ کوئی حرکت نہیں کر سکتا اس لئے لفظ قعود (بیٹھنا) ایسے شخص کے لیے اس جگہ نہایت ہی بامعنی ہے۔ ۲

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ

"تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ: تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی"۔ شرک کے بعد اب یہ حکم بھی دے دیا کہ بندگی بھی صرف اللہ کی کرو' اور یہ حکم فیصلے کی صورت میں دیا گیا ہے۔ یعنی جس طرح فیصلہ ایک حتمی امر ہوتا ہے اور اس کی تعمیل ضروری ہوتی ہے' اسی طرح اس حکم کی تعمیل بھی ضروری ہے۔ لفظ قضی سے حکم کو مزید تاکیدی کر دیا گیا' اس کے علاوہ نفی اور استثنی بذات خود ایک تاکیدی اور حصری انداز ہے کہ یہی کچھ ہو اور اس کے سوا کچھ نہ ہو۔ چنانچہ انداز بیان کے اندر تاکید مزید کا طریقہ اختیار کیا گیا کیونکہ توحید فی العقیدہ اور توحید فی العبادۃ نہایت ہی اساسی مسائل ہیں۔

اور جب یہ قاعدہ اور بنیاد اور اساس رکھ دی گئی تو اب انفرادی احکام صادر ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور اجتماعی احکام اور قوانین وضع ہونے لگتے ہیں۔ اس سے قبل ذہنوں میں عقیدۂ توحید بٹھا دیا گیا ہے۔ اس عقیدے کے ذریعے اعمال اور فرائض و قوانین کا داعیہ بھی نفوس کے اندر پیدا ہو چکا ہے۔

انسان کے لیے سب سے پہلا رابطہ رابطہ عقیدہ ہے۔ عقیدے اور نظریات ہی انسانوں کو متحد رکھ سکتے ہیں۔ عقائد و

نظریات کے بعد انسانیت کے لیے پہلا یونٹ خاندان کا یونٹ ہے اور خاندان کی تشکیل والدین سے ہوتی ہے' اس لئے پہلا حکم یہ دیا جاتا ہے کہ اللہ وحدہ کی بندگی کے بعد پہلا حکم یہ ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو اور اسلام میں اس کی بہت اہمیت ہے' یہ پہلی قدر ہے۔

وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا۝۲۳ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا۝۲۴

"والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو' اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک' یا دونوں' بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو' نہ انہیں جھڑک کر جواب دو' بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو' اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو' اور دعا کیا کرو کہ "پروردگار' ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا"۔

نہایت ہی خوبصورت انداز کلام اور نہایت ہی نرم اور پرسوز الفاظ کے ساتھ قرآن کریم اولاد کے دلوں میں والدین کے حق میں عزت و احترام پیدا کرتا ہے اور ان کے وجدان اور ان کے دل میں جذبات عطوفت کو موجزن کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب زندگی اپنی راہوں پر رواں دواں ہوتی ہے تو تمام لوگوں کی نظریں' جذبات اور اہتمام اور توجہ آگے کی طرف ہوتی ہے۔ ہر انسان پیچھے والدین کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے آگے اپنی اولاد کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اگلی نسل کی فکر سب کو ہوتی ہے' کم لوگ ہوتے ہیں جو پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں۔ والد والدہ اور گزرنے والوں کی طرف توجہ کم لوگوں کی ہوتی ہے' چنانچہ قرآن کریم نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ والدین اور جانے والی نسل کی بابت اولاد کے وجدان اور شعور کو جگایا جائے تاکہ وہ پیچھے دیکھ کر والدین کے ساتھ حسن سلوک کریں۔

تمام والدین کے اندر فطری داعیہ ہوتا ہے کہ وہ اولاد کا غم کھائیں' والدین تو بچوں کے لیے اپنی جان تک دے دیتے ہیں' جس طرح ایک دانہ خاک میں مل کر ایک پودے کی شکل اختیار کرتا ہے اور خود گم ہو جاتا ہے اور انڈے کے اندر جو کچھ ہوتا ہے وہ سب کچھ بچے کی شکل اختیار کر لیتا ہے' اس طرح بچے اپنے والدین سے تمام رس' تمام قوت' تمام اہتمام اور تمام طاقت نچوڑ لیتے ہیں اور والدین ناتواں اور بوڑھے ہو جاتے ہیں' بسا اوقات موت اپنی مہلت دے دیتی ہے' اور وہ نہایت ہی بے بسی کی زندگی گزارتے ہیں۔ جہاں تک بچوں کا تعلق ہے تو وہ بہت جلد یہ سب کچھ بھول جاتے ہیں اور وہ آگے کو دیکھتے ہیں اور خود اپنے فرائض منصبی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ان کی توجہ اپنی بیوی بچوں کی طرف ہوتی ہے اور یوں زندگی کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ والد اور والدہ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنی اولاد کا خیال رکھیں بلکہ اولاد کو اس تلقین

کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے ضعیف والدین کا خیال رکھیں اور اس سلسلے میں ان کے شعور و وجدان کو جگانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اس نسل کی بہبود کا بھی خیال رکھیں جس نے اپنے خون کا آخری قطرہ خشک کر کے ان کو پروان چڑھایا۔ یہاں تک کہ وہ خود خشک اور ضعیف ہو گئے۔

والدین کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کا حکم اللہ نے قضا اور فیصلہ کی شکل میں دیا۔ یعنی یہ اللہ کا فیصلہ ہے' اور ہر حاکم اپنے فیصلہ کو نافذ کراتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ حکم نہایت ہی تاکیدی ہے جو ڈگری کی شکل میں ہے۔ جس طرح اس سے قبل یہ کہا گیا تھا کہ اللہ نے فیصلہ دیا ہے کہ صرف اس کی بندگی کرو۔

اس کے بعد والدین کے بارے میں نہایت ہی رحیمانہ و کریمانہ اور شفیقانہ انداز گفتگو ہے۔ نہایت ہی جذباتی انداز میں ایام طفولیت میں والدین کی مشقتوں کا ذکر کیا جاتا ہے اور یہ بتلایا جاتا ہے کہ بچے کے ساتھ کس قدر پیار و محبت کا سلوک انہوں نے کیا تھا۔

امَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا (۱۷ : ۲۳) "اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک' یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں"۔ بڑھاپے کا خود اپنا وقار ہوتا ہے لیکن بڑھاپے میں جو ضعف ہوتا ہے وہ بھی لفظ (کبر) میں شامل ہے۔ اور عندک سے یہ اشارہ ہے کہ بڑھاپے میں والدین بچوں کے ہاں پناہ بھی لیتے ہیں اور حالت ناتوانی میں حمایت کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا (۱۷ : ۲۳) "تو انہیں اف تک نہ کہو اور نہ انہیں جھڑک کر جواب دو"۔ والدین کے احترام اور ادب کا یہ پہلا مرحلہ ہے کہ اولاد کی طرف سے والدین کے حق میں کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کیا جائے جس میں تنقید' زجر' توبیخ اور جھڑکی آتی ہو' یا اس میں کوئی چیز توہین آمیز اور سوئے ادب کے زمرے میں آتی ہو۔

وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (۱۷ : ۲۳) "بلکہ ان کے ساتھ احترام کے ساتھ بات کرو"۔ بات کی حد تک یہ نہایت ہی اعلیٰ مقام ہے کہ والدین کے ساتھ نہایت ہی احترام کا سلوک کیا جائے۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (۱۷ : ۲۴) "اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو"۔ یہاں نہایت ہی ترنم اور شفاف انداز بیان اختیار کیا گیا ہے' انداز بیان کے اندر اطاعت اور بندگی اور وفا شعاری کو مجسم کر دیا گیا ہے' یعنی اس طرح بچھ جاؤ اور اس قدر برخورداری اختیار کرو کہ گویا "جھکنا" ایک مجسم پرندے کی شکل میں کھڑا ہے اور اس کے پر ہیں اور اس نے اپنے پر بھی بچھا رکھے ہیں۔

وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (۱۷ : ۲۴) "اور دعا کیا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا"۔ یہ خوشگوار یادیں ہیں۔ محبت کی یادیں بچپن کی یادیں اور ماں اور باپ کی محبت کی یادیں۔ لیکن اس یاد سے انہیں سمجھایا جا رہا ہے کہ آج یہ مشفق والدین اسی طرح تمہاری شفقت کے محتاج و لاچار ہیں جس طرح تم تھے۔ اور دعا اس لیے کی گئی کہ انسانی شفقت و رحمت کے مقابلے

میں اللہ کی رحمت و شفقت زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ اللہ کی رحمت و شفقت کا دائرہ نہایت ہی وسیع ہے اور انہوں نے اپنی اولاد کے ساتھ جو محنت و مشقت کی ہے اس کا اجر صرف اللہ ہی دے سکتا ہے۔ اولاد کے لیے یہ ممکن ہے کہ والدین کو وہ رحم اور شفقت دے سکیں جس کے وہ حق دار ہیں۔

حافظ ابوبکر نے اپنی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ انہوں نے حضرت بریدہ سے انہوں نے اپنے والد سے کہ ایک شخص طواف میں تھا اور وہ اپنی والدہ کو اٹھا کر طواف کرا رہا تھا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا میں نے اسی طرح اپنی والدہ کا حق ادا کر دیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: "نہیں"۔ بلکہ ایک سانس کے برابر بھی نہیں۔

---()()()---

انسان کے تمام تاثرات اور حرکات چونکہ انسانی نظریہ کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں 'اور نظریہ کی اساس پر وجود میں آتے ہیں اس لیے ان تمام احکام کے آخر میں تمام امور کو اللہ کی طرف لوٹایا جاتا ہے 'جو نیتوں کو جانتا ہے اور احوال اور افعال کے پیچھے جو نیت ہے 'اس سے بھی واقف ہے۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾

"تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں کے لیے درگزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں"۔

اس سے قبل کہ مزید احکام و ہدایات دی جائیں اور اخلاق و قوانین بنائے جائیں یہ بتایا جاتا ہے کہ انسان کے ہر قول اور ہر فعل سے اللہ خبردار ہے۔ اور اس کا دروازہ کھلا ہے۔ ہر گناہ گار کسی بھی وقت توبہ کر کے واپس آسکتا ہے۔ جب تک کسی انسان میں اصلاح کا مادہ موجود ہے 'وہ توبہ کر کے واپس آسکتا ہے۔ "اوّاب" اس شخص کو کہتے ہیں کہ جب اس سے کوئی قصور سرزد ہو جائے تو وہ جلدی اللہ کی طرف لوٹ آئے اور توبہ و استغفار کرے۔

---()()()---

والدین کے بعد اب قریبی رشتہ داروں کے بارے میں ہدایات دی جاتی ہیں اور رشتہ داروں کے ساتھ مساکین اور مسافر بھی شامل کر دیئے جاتے ہیں۔ قریبی رشتہ داروں کے علاوہ انسانی روابط کے زمرے میں مساکین اور مسافر سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ یوں حسن سلوک اور کفالت اجتماعی کے دائرے کو پوری انسانیت تک وسیع کر دیا گیا ہے۔

وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ وَ كَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾ وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا

فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾

"رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق۔ فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں' اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ اگر ان سے (یعنی حاجت مند رشتہ داروں' مسکینوں اور مسافروں سے) تمہیں کترانا ہو' اس بنا پر کہ ابھی تم اللہ کی اس رحمت کو جس کے تم امیدوار ہو' تلاش کر رہے ہو' تو انہیں نرم جواب دے دو"۔

اسلام نے اقرباء' مساکین اور مسافروں کے لیے لوگوں کے ذمہ ایک حق مقرر کیا ہے اور یہ حق ان مدات میں انفاق کے ذریعہ ہی پورا کیا جاسکتا ہے۔ نیز ان مدات پر خرچ محض خیرات اور مہربانی ہی نہیں ہے بلکہ یہ ان کا حق ہے جو ہر مسلمان کی گردن پر لازم ہے۔ اور اس حق کو فریضہ قرار دینے کے بعد اسے اسلامی عقیدہ توحید اور اسلامی عبادت اور بندگی کے ساتھ منسلک کر کے اسے عبادت قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایسا حق اور فریضہ ہے جس سے مکلف صرف ادائیگی کے بعد ہی بری الذمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس مد میں خرچ کرنے والا تو اپنا فریضہ ادا کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن دوسری جانب سے اس کے اور مستفید کے درمیان محبت بھی پیدا ہوگی۔

اس کے بعد قرآن کریم تبذیر کی ممانعت کرتا ہے۔ تبذیر کیا ہے؟ ابن مسعود اور ابن عباسؓ اس کی تعریف یوں کرتے تھے کہ ایسی مد میں خرچ کرنا جس میں خرچ کرنے کا حق نہ ہو' تبذیر ہے۔ اور مجاہد کہتے ہیں اگر سچائی کی راہ پر کوئی انسان اپنا پورا مال خرچ کر دے تو وہ تبذیر نہ ہوگا اور اگر کوئی دو کلو بھی بغیر حق کے خرچ کرے تو وہ تبذیر ہے۔

لہذا تبذیر کا تعلق انفاق کی مقدار سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق اس مد سے ہے جس میں خرچ کیا جاتا ہے۔ مبذرین کو شیطان کا بھائی اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ باطل اور شر اور معصیت میں خرچ کرتے ہیں۔ اور یہ شیطان کے ساتھی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ وہ رب کے انعامات کا شکر ادا نہیں کرتا۔ اور شیطان کے بھائی بھی اللہ کے انعامات کا شکر ادا نہیں کرتے۔ اللہ کی نعمتوں کا حق یہ ہے کہ ان کو اپنی جگہ خرچ کیا جائے۔

اگر کسی کے پاس اس قدر مال نہ ہو کہ وہ رشتہ داروں' مساکین' مسافروں کا حق ادا کرے اور وہ ان کا سامنا کرنے میں شرم محسوس کرتا ہو' تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ سے سوال کرے کہ اللہ اسے بھی رزق وافر دے اور ان کو بھی رزق وافر دے۔ اور ان حقداروں کے ساتھ وعدہ کر لے کہ جب حالات درست ہوں گے اور وہ کچھ کرنے کے قابل ہوا تو کرے گا وہ وعدہ کرے اور اچھی نرم بات ان کے ساتھ کرے۔ دل تنگی اور تھڑ دلی کا مظاہرہ نہ کرے۔ اور خاموشی بھی اختیار نہ کرے۔ مبادا کہ وہ دل میں تنگی محسوس کریں اور اس کی خاموشی کو دوسرے معنی پہنائیں۔ کیونکہ اچھی طرح بات کرنے سے اور نرمی سے سمجھانے کے نتیجے میں ان کو تسلی ہوگی۔

پچھلی آیت میں چونکہ تبذیر اور فضول خرچی کی ممانعت کی گئی۔ اس کی مناسبت سے یہاں خرچ میں میانہ روی کا حکم دے دیا گیا۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ

الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا۝۲۹

”نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ“۔

اسلامی نظام زندگی میں توازن بنیادی اصول ہے تفریط کی طرح غلو بھی توازن میں خلل انداز ہوتا ہے ۔ لیکن توازن کے بیان میں بھی تصویر کشی کا انداز اختیار کیا گیا ہے ۔ بخیل کی تصویر یوں کھینچی گئی ہے کہ وہ ایک شخص ہے جس نے اپنے ہاتھ گردن کے ساتھ باندھ رکھے ہیں اور مسرف اور مبذر کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ایک شخص ہے جس نے اپنے دونوں ہاتھ اور بازو کھول رکھے ہیں ۔ اور وہ کسی چیز کو اپنی گرفت میں نہیں لیتا ۔ اور بخیل اور مسرف دونوں کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے کہ ایک شخص ہے جو ہر طرف سے مسترد شدہ ملامت کردہ ہے ۔ اور عاجز و ناتواں اور لاچار ہے ۔ محسور حسیر سے ہے اور حسیر اس سواری کو کہتے ہیں جو ضعف و ناتوانی کی وجہ سے بیٹھ جائے اور اس میں چلنے کی سکت ہی نہ رہے ۔ بخیل ملامت زدہ ہوتا ہے اور مبذر عاجز ہو جاتا ہے اور دونوں ملامت زدہ ہوتے ہیں ۔ جبکہ شریعت کا حکم ہے ۔

خَيْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا (میانہ روی بہترین طریق کار ہے ) یہ حکم دینے کے بعد کہ میانہ روی اختیار کی جائے ' یہ بتایا جاتا ہے کہ حقیقی رزاق اللہ ہے ' وہی ہے جو کسی کو رزق فراواں دیتا ہے اور کسی پر رزق کے سلسلے میں تنگی کرتا ہے چونکہ رزاق وہی ہے اس لیے وہ میانہ روی کا حکم دیتا ہے ۔

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ ۳
ع ۸ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا۝۳۰ ۳

”تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے ۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے“۔

وہ اچھی طرح دیکھ کر کسی کو رزق میں فراوانی دیتا ہے ' اور اچھی طرح دیکھ کر اور جان کر کسی کو رزق میں تنگ کرتا ہے ۔ وہ میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے اور بخل و اسراف کی ممانعت کرتا ہے اس لیے کہ وہ تمام حالات میں لوگوں کے بارے خبیر و بصیر ہے اور سب کچھ جانتا ہے اس لیے وہ اپنے علم کے مطابق حکم دیتا ہے ۔ اور اس نے یہ قرآن نازل ہی اس لیے کیا ہے کہ تمام حالات میں یہ اچھی اور سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے ۔

--- ()()() ---

اہل جاہلیت اپنی لڑکیوں کو قتل کر دیتے تھے ' اس ڈر سے کہ وہ ان پر بوجھ بن کر ان کو معاشی لحاظ سے کمزور کر دیں گی اور ان کے لیے ان کا سنبھالنا مشکل ہو گا ۔ سابقہ آیت میں چونکہ یہ حقیقت بتا دی گئی تھی کہ رزق کی فراوانی اور تنگی صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔ اس لیے یہاں صاف صاف کہہ دیا کہ اب تم لوگ اولاد کو معاشی زاویہ سے نہ دیکھو ۔ کثرت

اولاد یا لڑکیوں کی وجہ سے کوئی غریب نہیں ہو گا۔ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لہذا کثرت نسل یا کثرت اقسام نسل کے نتیجے میں معاشی تنگی نہیں ہوگی اور نہ افراد خانہ کم ہونے کی وجہ سے کوئی معاشی لحاظ سے خوشحال ہو گا۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾

"اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ نظریاتی گمراہی کے نتیجے میں کسی بھی سوسائٹی کے اندر عملی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ نظریاتی بے راہ روی کی وجہ سے صرف نظریہ ہی خراب نہیں ہوتا یا اس کے نتیجے میں محض مذہبی مراسم میں کمزوری نہیں آتی بلکہ سوسائٹی کا اجتماعی نظام بھی خراب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کا نظریہ درست ہو تو صرف اس کی عبادات ہی درست نہیں ہو جاتیں بلکہ اس سوسائٹی کا عملی نظام ' اس کے اجتماعی ادارے بھی صحیح و سلامت ہو جاتے ہیں اور درست سمت میں کام کرتے ہیں۔ اور لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے کی یہ رسم محض غلط عقیدے پر قائم کی تھی کہ لڑکیوں کی وجہ سے غربت آتی ہے ' جب یہ عقیدہ پیدا ہوا کہ رزاق صرف اللہ ہے تو اس کے بعد قتل اولاد خود بخود موقوف ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی نظریہ زندگی پر عملاً اثر انداز ہوتا ہے۔ نظریہ محض خلا میں نہیں ہوتا یا محض کسی شخص کے دماغ تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ وہ عمل کی دنیا تک اترتا ہے۔

اب ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کے انداز تعبیر کی ایک نہایت ہی گہری مثال پر قدرے غور کریں۔ یہ عجیب لطیف مثال ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اولاد کے رزق کو آباء کے رزق پر مقدم رکھا۔

نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (۱۷ : ۳۱) "ہم تمہاری اولاد کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی"۔ لیکن سورت انعام میں اولاد کے رزق پر آبا کے رزق کو مقدم رکھا گیا ' وہاں کہا گیا۔

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶ : ۱۵۱) "ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی"۔ کیونکہ دونوں آیات کے مفہوم میں ایک دوسرا اختلاف ہے۔ پوری آیات یوں ہیں :

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (۱۷ : ۳۱) اور انعام میں یوں تھی :

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶ : ۱۵۱) یہاں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اولاد کو اس لیے قتل نہ کرو کہ تم غریب ہو جاؤ گے۔

خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ (۱۷ : ۳۱) اس لیے اللہ نے فرمایا کہ اولاد کا رزق ہم پر ہے۔ اور انعام یہ تھا من املاق یعنی فقر اور تنگی رزق پہلے سے موجود تھے' اس لیے والدین کے رزق کو پہلے لایا گیا۔ یہ ایک لطیف فرق ہے اور اسی وجہ سے تقدیم و تاخیر کا یہ عمل ہوا۔

قتل اولاد کی ممانعت کی نسبت ہی سے ممانعت زنا کا حکم آتا ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝

"اور زنا کے قریب نہ پھٹکو' وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ"۔ اس لیے کہ قتل اولاد اور زنا کے درمیان تعلق موجود ہے' نیز اس کے بعد قتل نفس کا مضمون آتا ہے۔ قتل اولاد' زنا اور قتل نفس کے درمیان مخصوص تعلق موجود ہے۔ قتل اولاد تو بعینہ قتل نفس ہے' لیکن زنا بھی مختلف پہلوؤں سے دراصل قتل نفس ہی ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے زانی حیات کو بے محل گراتا ہے' اگر زنا کے نتیجے میں کوئی اولاد پیدا ہو جائے تو اس سے فرار حاصل کیا جاتا ہے۔ پہلے جنین ہی کو قتل کر دیا جاتا ہے' ورنہ بچہ پیدا ہونے کے بعد بالعموم قتل کر دیا جاتا ہے۔ پیدائش سے پہلے یا بعد وہ اگر زندہ رہ بھی جائے تو یا وہ مادر پدر آزاد ہوتا ہے یا پھر معاشرے میں ذلیل و خوار ہو کر رہتا ہے۔ بہرحال اگر قتل نہ ہو اور زندہ بچ بھی جائے تو کسی نہ کسی طرح وہ ایک کم تر درجے کی زندگی ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک گونہ وہ بھی قتل ہے۔ پھر زنا دراصل پوری سوسائٹی کے لیے قتل کا سبب ہے۔ کیونکہ اس میں نسب مل جاتے ہیں اور خون خالص نہیں رہتے اور بچوں کے بارے میں یقینی صورت نہیں رہتی۔ یہ دراصل ایک سوسائٹی کی موت ہوتی ہے۔

ایک طرح زنا قتل کے برابر اس طرح بھی ہوتا ہے کہ جس سوسائٹی میں زنا عام ہوتا ہے اس میں ازدواجی زندگی کی ضرورت نہیں رہتی۔ یوں بھی سوسائٹی سے خاندانی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ خاندان ایک بچے کے لیے بہترین جائے پرورش ہوتا ہے۔ خاندان کے بغیر کسی بچے کی فطرت سلیمہ اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتی۔ اور اس کی تربیت میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور رہ جاتا ہے۔

پھر تاریخ گواہ ہے کہ جس سوسائٹی میں زنا عام ہوا ہے' وہ تباہی و بربادی اور زوال کی طرف سفر شروع کر دیتی ہے۔ تاریخ قدیم اور عصر جدید دونوں کا عمرانی مطالعہ یہی نتیجہ دیتا ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ امریکہ اور یورپ میں زنا عام ہے حالانکہ وہ اس وقت مادی ترقی کے قائدین ہیں لیکن ان میں سے فرانس جیسی قوم کے زوال کے آثار تو ابھی سے نمودار ہو چکے ہیں جس طرح ایک فرد جوانی کے ایام میں تروتازہ رہتا ہے اور اس کی اخلاقی بے راہ روی اس پر اثر انداز نہیں ہوتی اور بڑھاپے میں پھر وہ یکدم گر جاتا ہے' اسی طرح اخلاقی بے راہ روی میں مبتلا اقوام یکلخت زوال کا شکار نہیں ہو جایا کرتیں' جب ان پر زوال آتا ہے تو یکدم گر جاتی ہیں۔

اسلام زنا کے قریب جانے سے بھی روکتا ہے' یعنی مقدمات زنا کے حالات سے بھی دور رہنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ زنا کی ممانعت کی سخت تاکید ہے۔ کیونکہ اگر کوئی ایسے حالات سے نہیں بچتا جن کے نتیجے میں زنا واقع ہو جاتا ہے تو پھر اس سے بچنے کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

یہی وجہ ہے اسلام سدباب ذریعہ پر عمل کرتا ہے تاکہ اس فحاشی میں مبتلا ہونے کا کوئی راستہ ہی نہ رہے۔ اسلام غیر ضروری اختلاط مرد و زن کی ممانعت کرتا ہے' غیر مرد اور عورت کی ایک جگہ تنہائی کی ممانعت کرتا ہے' اسلام نوجوانوں کی شادی کی تلقین کرتا ہے۔ ایسی باتوں کو روکتا ہے جن کے نتیجے میں شادی ممنوع ہو جائے مثلاً جہیز اور زیادہ مہر۔ اور اس خوف کا بھی قلع قمع کرتا ہے کہ شادی کی وجہ سے تنگ دستی نہ آ جائے اور جو لوگ شادی کی تلاش میں ہوں ان کو حکم دیتا ہے کہ وہ پاک دامنی کی راہ اختیار کریں اور پھر بھی اگر کوئی اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اسلام اسے سخت سزا دیتا ہے نیز زنا کے الزام کو بھی قابل حد جرم قرار دیتا ہے اور اس مقصد کے لیے تمام ذرائع و اسباب اختیار کرتا ہے کہ سوسائٹی زنا کے ارتکاب سے بچ جائے۔ اور اس طرح وہ تباہی اور ہلاکت سے بچ جائے۔ چنانچہ قتل اولاد اور زنا کی ممانعت کے ساتھ ہی حکم آتا ہے ناحق کسی زندہ انسان کی جان لینا بھی اسلام میں ایک عظیم جرم ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّہٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾

"قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے' پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے' اس کی مدد کی جائے گی۔"

اسلام سلامتی کا دین ہے۔ اسلام میں شرک باللہ کے بعد سب سے بڑا جرم قتل ناحق ہے۔ زندگی دینے والا اللہ ہے' اللہ کے سوا کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی سے اللہ کا یہ عطیہ سلب کرے' الا یہ کہ اللہ کے طے کردہ قوانین کے مطابق کسی کی زندگی لی جا سکتی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بھی چند محدود جرائم پر انسانی جان لینے کی اجازت دی ہے۔ اور ان حدود میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ یہ طے شدہ حدود کسی کی ذاتی رائے یا خواہش پر نہیں چھوڑ دیے گئے۔ صحیحین میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا "کوئی مسلمان جو کلمہ شہادت ادا کرتا ہے اور شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اس کا قتل جائز نہیں ہے۔ مگر صرف تین صورتوں میں' یہ کہ اس نے ناحق قتل کیا ہو' وہ محصن ہو اور زنا کا ارتکاب کیا ہو' یہ کہ وہ تارک دین ہو اور جماعت مسلمہ کو اس نے چھوڑ دیا ہو"۔

اسلام میں قتل نفس کی گنجائش کی پہلی صورت ہے کہ کسی نے قتل کا ارتکاب کیا ہو اور اس کے خلاف عدالت مجاز سے منصفانہ فیصلہ قصاص صادر ہو چکا ہو۔ اس کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے:

وَلَکُمْ فِي الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ "تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے"۔ اس طرح کہ نفاذ قصاص سے مجرموں کے ہاتھ پکڑے جاتے ہیں اور وہ پھر کسی زندہ شخص کی جان لینے سے باز رہتے ہیں۔ جب نظام قصاص موثر طور پر نافذ ہوتا ہے تو یہ دوسرے لوگوں کو اس قسم کے جرم کے ارتکاب سے روکتا ہے۔ نیز اس طرح یہ بھی زندگی ہے کہ

قاتل کے ورثاء ایک شخص کو قتل کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں اور وہ ایک قتل کے بدلے کئی لوگوں کا خون نہیں بہاتے - نہ وہ اس سلسلے کو جاری رکھتے ہیں - بعض اوقات لوگ سلسلہ قتل کو جاری رکھتے ہیں اور جانبین سے کئی قتل ہو جاتے ہیں - نیز نظام قصاص کے اجراء میں اس طرح بھی زندگی ہے کہ ہر شخص کی جان اپنی جگہ محفوظ ہو جاتی ہے اور اسے عدالت پر اعتماد ہوتا ہے - یوں پوری امت اور سوسائٹی مطمئن ہوتی اور امن وچین سے زندگی گزارتی ہے -

قتل کی دوسری صورت مرتد کی ہے - یہ دراصل روحانی فساد اور طوائف الملوکی کے رفع کے لیے ضروری ہے - جب ایک شخص اپنی خوشی سے بغیر کسی جبر کے اسلام قبول کرتا ہے 'اسلامی جماعت میں داخل ہوتا ہے اور امت کا حصہ بن جاتا ہے اور امت اس کی ذات میں داخل ہو جاتی ہے 'وہ امت اسلامیہ کے رازوں اور بھیدوں سے واقف ہو جاتا ہے ' اور پھر وہ اگر امت کو چھوڑ کر مرتد ہوتا ہے تو وہ اپنے اندر پائی جانے والی امت کو قتل کرتا ہے - اگر یہ شخص پہلے ہی اسلام میں داخل نہ ہوتا تو اسے کس نے مجبور کیا تھا - اگر وہ اہل کتاب میں سے تھا تو اسلام نے اس کی جان کی حفاظت کی ذمہ داری لی تھی اور اگر وہ مشرک تھا تو اسلام اسے پناہ دیتا تھا اور اسے اس کی جائے پناہ تک پہنچانے کی ذمہ داری لیتا تھا 'اس لیے اگر وہ اپنی خوشی سے اسلام میں داخل ہوا ہے تو اب اسے لازماً اسلام میں رہنا ہو گا ورنہ قتل مرتد کی سزا پائے گا -

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ (۱۷ : ۳۳) "اور جس نفس کا قتل اللہ نے حرام قرار دیا ہے اسے قتل نہ کرو مگر حق کے ساتھ" - اور قتل مرتد بھی ایک حق ہے -

تیسری قسم کا قتل یہ ہے کہ کوئی محصن زنا کا ارتکاب کرے - یہ فحاشی کی اشاعت ہے اور اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا -

یہ تین اسباب ایسے ہیں جن کی وجہ سے اسلام میں سزائے موت دی جا سکتی ہے - ان تین اسباب کے بغیر ناحق کوئی کسی شخص کو قتل کرے گا تو پھر مقتول کے ورثاء کو اختیار ہو گا کہ قاتل کو بعد از ثبوت جرم قتل کر دیں - پھر بھی اگر وہ چاہیں تو قتل کرا دیں 'اگر چاہیں تو دیت لے کر معاف کر دیں ' چاہیں تو بغیر دیت کے معاف کر دیں - یہ اختیار مقتول کے ورثاء کا ہے کہ وہ جس طرح چاہیں فیصلہ کریں -

لیکن ورثاء کو بھی قتل کا اختیار دینے کے ساتھ ساتھ ان پر بھی پابندی لگا دی گئی ہے کہ وہ اس اختیار سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں - قتل میں اسراف نہ کریں - اسراف یہ ہے کہ مقتول کے علاوہ اوروں کو قتل نہ کریں جیسا کہ زمانہ جاہلیت کے انتقام میں ہوتا تھا کہ قاتل کے بہن بھائی اور دوسرے رشتہ داروں کو بھی ناحق قتل کر دیا جاتا - حالانکہ ان کا کوئی قصور نہیں ہوتا - ان کا قصور صرف یہ ہوتا کہ وہ قاتل کے افراد خاندان یا افراد قبیلہ ہیں - اس طرح مثلہ کرنے اور قتل میں ناجائز آلات استعمال کرنے کے سلسلے میں ممانعت کی گئی ہے - اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسراف فی القتل کی تمام شکلوں کی ممانعت کی ہے -

فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا (۱۷ : ۳۳) "پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے بے شک اس کی مدد کی جائے گی" - اس کے بارے میں اللہ نے فیصلہ کر دیا - دین اسلام اور اسلامی قانون اس کے حق کا موید ہے - اور حاکم وقت کا بھی فرض ہے کہ وہ مقتول کے ورثاء کی نصرت کرے - لہذا اسے چاہئے کہ وہ

قصاص لینے میں بھی انصاف کرے' اس لیے کہ تمام اسلامی ادارے اس کے حامی و ناصر ہیں۔

یہ کیوں کہا گیا کہ قصاص لینے کا اختیار مقتول کے ورثاء کو دے دیا گیا؟ جبکہ حکومت ' حکومتی اداروں اور تمام سوسائٹی کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ ورثائے مقتول کی نصرت کریں - یہ ایک نہایت ہی فطری عمل ہے' اس طرح انسان کا جذبہ انتقام سرد پڑ جاتا ہے اور مقتول کے ورثاء کے دلوں میں جذبہ انتقام کی موجوں میں ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ انتقام بعض اوقات اس قدر شدید ہوتا ہے کہ لوگ اس سے مغلوب ہو کر دائیں بائیں جو بھی سامنے آتا ہے اسے گاجر اور مولی کی طرح کاٹ دیتے ہیں لیکن جب ورثاء یہ محسوس کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قاتل کی زندگی ان کے اختیار میں دے دی ہے اور یہ کہ حاکم بھی ان کی امداد پر کمربستہ ہے۔ اور عدالت ان کی پشت پر ہے تو اس طرح اس کا جوش انتقام سرد پڑ جاتا ہے اور وہ عدالت کے منصفانہ فیصلہ کا انتظار کرتا ہے اور قصاص پر اکتفاء کرتا ہے۔

انسان بہرحال انسان ہے اور اس کی فطرت کے اندر قصاص کا داعیہ موجود ہے۔ اور اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے وہ انسان کی اس فطری خواہش کو پورا کرتا ہے اور محفوظ اور مامون حدود کے اندر اسے بدست خود انتقام لینے کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام عفو و درگزر کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ وہ لوگوں کو اس پر آمادہ کرتا ہے کہ عفو و درگزر سے کام لیں اور اس پر اجر بھی دیتا ہے لیکن یہ سب کچھ حق قصاص عطا کرنے کے بعد۔ جب فیصلہ دے دیا جائے تو پھر یہ وارث یا وارثان مقتول کا حق ہے کہ قصاص لیں' دیت لیں یا بالکل عفو و درگزر سے کام لیں۔ ہاں اگر ان کے اندر یہ احساس ہو کہ انہیں عفو و درگزر پر مجبور کیا گیا ہے تو اس صورت میں وہ پھر جذبات انتقام سے مغلوب ہو سکتے ہیں اور زیادتی کر سکتے ہیں۔

---()()()---

جان اور عزت کی حفاظت کے بعد اب روئے سخن مال یتیم اور عہد کی حفاظت کی طرف آتا ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۝

"مال یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقے سے' یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو پہنچ جائے۔ عہد کی پابندی کرو' بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی"۔

اسلام ہر مسلمان کی جان' مال اور آبرو کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:
"تمام مسلمان مسلمانوں پر حرام ہیں' ان کی جان' ان کی آبرو اور ان کا مال"۔ لیکن قرآن کریم اور سنت دونوں نے مال یتیم کے بارے میں بالخصوص سخت تشدید سے ممانعت کی ہے۔ طریق احسن کو چھوڑ کر کسی اور صورت میں بھی اس کے قریب تک جانے سے منع کیا ہے۔ یہ اس لیے کہ یتیم کمزور ہوتا ہے وہ اپنے مال کی حفاظت اور تدبیر کرنے سے قاصر ہوتا ہے اور وہ اپنے مال کی مدافعت بھی نہیں کر سکتا۔ لہذا اسلامی نظام زندگی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مال یتیم کی حفاظت اور تدبیر کرے۔ اور یہ اس وقت تک جاری رہے جب تک وہ سن رشد کو پہنچ نہیں جاتا اور جب تک وہ اس بات کے اہل

نہیں ہو جاتا کہ وہ اپنے مال میں مناسب تصرفات کر سکے۔

ان احکام اور اوامر و نواہی کے اندر یہ لطیف نکتہ پایا جاتا ہے کہ جن احکام کا تعلق ایک فرد سے ہے ان کے بارے میں مفرد صیغہ استعمال ہوا ہے اور جن کا تعلق سوسائٹی یا حکومت اور اجتماعی نظام سے ہے ان کو جمع کے صیغے میں لایا گیا ہے۔ مثلاً والدین کے ساتھ حسن سلوک 'اقرباء' مساکین اور مسافروں کی مالی امداد 'فضول خرچی کی ممانعت' خرچ کرنے میں بخل اور اسراف کے درمیان معتدل راہ اپنانے کا حکم' حق پر ثابت قدمی اور کبر و غرور کی ممانعت کے احکام اور امر و نہی میں صیغہ مفرد استعمال ہوا ہے' اور قتل اولاد کی ممانعت کے احکام' حرمت زنا' قتل نفس' مال یتیم کی حفاظت' وفائے عہد کے احکام' ناپ و تول پورا کرنے کے حکم یا نہی میں جمع کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مال یتیم کے قریب نہ جانے کی ممانعت صیغہ جمع کی صورت میں آئی ہے تاکہ پوری اسلامی سوسائٹی حفاظت مال یتیم کی ذمہ داری میں برابر کی شریک ہو' کیونکہ یہ ایک اجتماعی نوعیت کی ذمہ داری ہے۔

مال یتیم کی حفاظت چونکہ پوری سوسائٹی کی ذمہ داری ہے' اس کے ساتھ وفائے عہد کے احکام بھی دیئے گئے۔ کیونکہ اجتماعی ذمہ داریوں کے سلسلے میں بالعموم عہد لیا اور دیا جاتا ہے۔ لہٰذا وفائے عہد کا ایک عمومی حکم یہاں دے دیا گیا۔

وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (۱۷ : ۳٤) "اور وعدہ کو پورا کرو' بے شک عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا"۔ وفائے عہد کے بارے میں اللہ تعالیٰ خود سوال کرے گا اور جو لوگ وفائے عہد نہیں کرتے' ان سے قیامت کے دن اس سلسلے میں باز پرس ہوگی۔

اسلام نے وفائے عہد کے سلسلے میں تاکید شدید کی ہے۔ کیونکہ ایک فرد اور جماعت کے کردار میں وفائے عہد اصل معیار ہے کہ کون شخص ٹھوس اور ثابت قدم ہے' کون ضمیر کے اعتبار سے پاکیزہ ہے۔ قرآن و حدیث میں بار بار اور مختلف طریقوں سے وفائے عہد کی تاکید کی گئی ہے۔ چاہے یہ عہد اللہ کی طرف سے ہو' لوگوں کی طرف سے ہو' فرد کی طرف سے ہو' کسی جماعت یا سوسائٹی کی طرف سے ہو' رعایا کی طرف سے ہو یا حکومت کی طرف سے ہو' حاکم کی طرف سے ہو یا محکوم کی طرف سے' نیز بین الاقوامی تعلقات میں اسلام نے عہد کی پابندی کی وہ مثالیں قائم کیں کہ انسانی تاریخ میں ایسی مثالیں صرف اس حصے میں ملتی ہیں جن میں مسلمان دنیا کے حکمران تھے' یا دنیا کے حکمرانوں میں سے معتبر حکمران تھے (دیکھئے کتاب "عالمی امن")۔

--- ○○○---

ناپ تول کا پورا کرنا بھی دراصل وفائے عہد کے زمرے میں آتا ہے' کہا گیا:

وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَ زِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝

"پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو' اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظ انجام بھی یہی بہتر

ہے"۔ وفائے عہد اور ناپ اور تول پورا پورا اور ٹھیک ٹھیک کرنے اور وفائے عہد کے درمیان لفظی اور معنوی مناسبت تو بالکل ظاہر ہے۔ لہٰذا وفائے عہد کے حکم کے بعد ناپ اور تول پورے کرنے کے احکام کی طرف آنا موضوع کی مناسبت سے درست ہے۔

ناپ اور تول پورا کرنا معاملات میں دیانت و امانت کا حصہ ہے۔ اس سے تاجر کو قلبی طہارت بھی حاصل ہوتی ہے اور سوسائٹی کی نشوونما صحت مند بنیادوں پر ہوتی ہے۔ لوگوں کے درمیان معاملات میں اعتماد پیدا ہوتا ہے اور اس سے برکت پیدا ہوتی ہے۔

ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (۱۷ : ۳۵) "یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظ انجام بھی بہتر ہے"۔ یعنی دنیا میں بھی بہتر ہے اور آخرت میں بھی بہتر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں "جو شخص بھی حرام پر قدرت رکھتا ہو اور پھر حرام سے اجتناب کرے اور یہ کام وہ محض رضائے الٰہی کے لیے کرے ' تو اللہ آخرت سے قبل خود اس دنیا میں اسے اس سے بہتر دیتا ہے"۔

جو لوگ ناپ اور تول میں کمی کرتے ہیں وہ دراصل نہایت ہی گندہ کام کرتے ہیں ' یہ نفسیاتی گراوٹ ہے اور معاملے میں دھوکہ اور خیانت ہے۔ اس سے مارکیٹ میں اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں کساد بازاری بھی پیدا ہوتی ہے اور پوری سوسائٹی سے برکت ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس سے تمام تر افراد جماعت کو نقصان ہوتا ہے حالانکہ وہ بظاہر سمجھتے ہیں کہ اس خیانت کے ذریعے وہ کما رہے ہیں 'لیکن وہ محض ظاہری اور وقتی کمائی ہوتی ہے لیکن مآل کار میں نقصان ہوتا ہے۔ کیونکہ جب کساد بازاری آتی ہے تو نقصان اس خیانت کار کو بھی ہوتا ہے۔

جو لوگ تجارتی دنیا میں دور کی نظر رکھتے ہیں انہوں نے اپنے ذاتی تجربے سے اس حقیقت کو پا لیا ہے۔ حالانکہ انہوں نے کسی اخلاقی یا دینی جذبے سے یہ کام نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے سائنٹیفک سٹڈی سے اس حقیقت تک رسائی حاصل کی۔

سوال یہ ہے کہ پھر دونوں میں فرق کیا ہے؟ جو شخص محض تجارتی مقاصد کے لیے دیانت داری کرتا ہے اور جو شخص دینی جذبے سے دیانت داری کرتا ہے دونوں میں کیا فرق ہے ' جو شخص اخلاقی اور دینی عقیدے اور جذبے سے یہ کام کرتا ہے اس کا نقطہ نظر اور اس کی ذہنی سطح زیادہ اعلیٰ ' ارفع اور بلند ہے ' اور دل کی زیادہ تطہیر اس سے ہوتی ہے۔ اور اس کی زندگی میں زیادہ سکون و اطمینان ہوتا ہے۔ اس طرح اسلام عملی زندگی میں بھی ہمیشہ وسیع اور ارفع اور روشن مستقبل کی طرف بڑھتا ہے اور دور تک انسانوں کی مادی اور روحانی راہنمائی کرتا ہے۔

---ooo---

اسلامی نظریہ حیات کا یہ کمال ہے کہ وہ نظریہ 'عقیدہ اور تصورات میں بہت زیادہ صفائی ' وضاحت اور حقیقت پسندی کا قائل ہے اسلام کسی معاملے میں پیچیدگی ' وہم و شبہات کی اجازت نہیں دیتا۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝۳۶

"کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو ' یقیناً آنکھ ' کان اور دل سب ہی کی بازپرس ہونی ہے"۔

ان چند الفاظ میں انسانی دل و دماغ کے لیے ایک بہترین منہاج عمل اور طریق کار وضع کر دیا گیا ہے اور یہ ایک سائنسی انداز ہے جسے دوسرے لوگوں نے حال ہی میں معلوم کیا ہے۔ اسلام نے اس میں قلب کی درستی ' خدا ترسی اور سائنس میں حکمت خداوندی پر غور کا جوڑ لگا کر ایک خشک علم کے مقابلے میں اسے مزید مقدس اور بامعنی بنا دیا ہے۔ یہ اسلام اور قرآن کی خصوصیت ہے۔

قرآن کریم یہ حکم دیتا ہے کہ ہر معاملے میں کوئی فیصلہ کرنے سے قبل پوری تحقیق کرو ' معاملے کو پایہ ثبوت تک پہنچاؤ ' یہ اسلام کا نہایت ہی باریک طریق کار ہے۔ جب دل و دماغ اس منہاج پر گامزن ہو جائیں۔ تو پھر وہم و گمان کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی اور معاملات ' فیصلوں میں یقین پر حکم ہوتا ہے ' لہٰذا کوئی بات محض فرض کرنے ' وہم یا شبہات کی بنیاد پر تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ بحث و تحقیق کے میدان میں ' فیصلوں کا مدار تحقیق اور ثبوت پر ہوتا ہے ' مفروضوں پر نہیں۔ انسانیت کو یہ علمی اور سائنسی انداز سب سے پہلے قرآن نے دیا ہے۔

وہ علمی امانت جس کے ساتھ دور جدید کے لوگ مسلح ہیں ' اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اس علمی امانت کا ایک حصہ ہے۔ جس کی تلقین قرآن کرتا ہے یعنی قلب و نظر کی وہ امانت جسے عقل کہتے ہیں اور جس کے استعمال اور کام میں لانے کی قرآن کریم بار بار تلقین کرتا ہے اور یہ قرار دیتا ہے کہ انسان سمع اور بصر اور قلب و نظر کی قوتوں کو کام میں لانے کا ذمہ دار ہے اور یہ ذمہ داری اس ذات کے سامنے ہے جس نے یہ قوتیں انسان کو عطا کی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے تمام اعضاء اور جوارح ' اس کے حواس اور اس کی عقل یہ سب اللہ کی امانتیں ہیں اور ان امانتوں کا مالک اللہ ہے ' وہ انسان سے پوچھے گا کہ اس نے یہ قوتیں کام میں لائی تھیں یا نہیں۔ جب انسان ایک لفظ بولتا ہے تو اس کے مفہوم پر غور کرتے ہوئے انسان معلوم کر لیتا ہے کہ عقل اور فکر و نظر اور سمع و احساس کس قدر عظیم قوتیں ہیں۔ خصوصاً جب ایک انسان کوئی کہانی یا روایت بیان کرتا ہے ' یا کوئی فیصلہ کرتا ہے ' کسی کے خلاف ' کسی حادثے کے بارے میں ' یا کسی اور معاملے میں۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ (۱۷ : ۳۶) "کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو"۔

یعنی اس بات میں نہ پڑو ' جس کا تمہیں یقینی علم نہ ہو ' جب تک اس کی صحت کے بارے میں تمہیں وثوق حاصل نہ ہو ' خواہ بات ہو یا کوئی روایت ہو ' کسی منظر کی تشریح ہو یا کسی واقعہ کے اسباب پر بحث ہو ' کوئی شرعی اور قانونی مسئلہ ہو یا کوئی اعتقادی اور نظریاتی مسئلہ ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے :

ایاکم و الظن فان الظن اکذب الحدیث "بدگمانی سے دور رہو ' کیونکہ محض ظن و تخمین کی بات جھوٹی بات ہوتی ہے"۔ سنن ابوداؤد میں ہے۔ بئس مطیة الرجل زعموا "کسی شخص کی یہ بہت بری سواری ہے کہ وہ کہے "لوگ یہ سمجھتے ہیں"۔ اور ایک دوسری حدیث میں ہے۔

ان افری الفری ان یری الرجل عیینه ما لم تریا "سب سے بڑی افتراء یہ ہے کہ ایک شخص اپنی آنکھوں کو وہ چیز دکھائے جو انہوں نے نہیں دیکھی"۔

یوں آیات و احادیث و روایات کا ایک بڑا ذخیرہ اس بات کی توثیق و تائید کرتا ہے کہ اسلام میں عقل و خرد اور ثبوت احکام کے لیے نہایت ہی مستحکم اور معقول طریق کار اپنایا گیا ہے ۔ تمام اسلامی احکام کے ثبوت میں پوری طرح چھان بین کا طریقہ اپنایا گیا ہے ۔ چنانچہ ایک مسلمان اپنی سوچ ' اپنے تصور ' اپنے شعور ' اپنے فیصلوں میں پختہ ثبوت اور یقین کا قائل ہوتا ہے ' وہ کوئی بات ' کوئی روایت ' کوئی حکم ' اور کوئی فیصلہ بغیر شہادت اور ثبوت کے نہیں مانتا ۔ جب تک اس کے تمام اجزاء پایہ ثبوت و یقین تک پہنچ نہ جائیں ۔ اور یہ ثبوت معقول حالات کے اندر نہ ہو ' اور جس میں کوئی شک و شبہ نہ رہا ہو ۔ بے شک قرآن نے بہت ہی صحیح کہا ہے ۔

انَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (۱۷ : ۹) " بے شک یہ قرآن ایک صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے " ۔ صدق اللہ العظیم ۔

--- ○○○ ---

یہ احکام ' اوامر و نواہی جو عقیدۂ توحید پر مبنی ہیں ' یہاں ان کا خاتمہ ایک نہایت ہی اہم اخلاقی تعلیم پر کیا جاتا ہے ' وہ یہ کہ انسان اپنی بے بضاعتی کو بھی پیش نظر رکھے اور اپنے آپ کو بڑی چیز نہ سمجھے ۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝

" زمین میں اکڑ کر نہ چلو ' تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو ' نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو " ۔

انسان جب صاحب مال و جمال بن جاتا ہے اور اسے دنیا میں قوت اور سلطنت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ اپنے دل و دماغ سے خدا کا تصور نکال دیتا ہے ' جو اس پوری کائنات کا خالق و مالک ہے ' تو اس نظریاتی بے راہ روی کی وجہ سے وہ کبر و غرور میں مبتلا ہوتا ہے ۔ اگر انسان اس بات کو سمجھ لے کہ اس کے پاس جو قوت اور مال ہے وہ اللہ کی جانب سے ہے ۔ اور یہ کہ اللہ کی قوت کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے ۔ تو اس کے دل و دماغ پر کبر و غرور کا غبار کبھی نہ چھائے ۔ اور وہ اکڑ کر نہ چلے اور زمین کے اوپر نہایت ہی شریفانہ چال چلے ۔ اس میں کوئی اکڑ نہ ہو ۔

قرآن کریم اس قسم کے متکبر ' مغرور انسان کے سامنے اس کی کمزوریاں رکھتا ہے کہ دیکھو ۔

انَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا (۱۷ : ۳۷) " تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو " ۔ انسان جسمانی اعتبار سے بہت ہی نحیف و نزار ہے ۔ جسمانی اعتبار سے یہ اللہ کی دوسری مخلوقات کا مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ انسان کے اندر جو قوت ہے وہ خدائی قوت ہے ' اس کو غلبہ صرف اللہ کے دین کی وجہ سے حاصل ہے ' اور یہ جو اس کائنات میں معزز ہے تو اس لیے کہ اللہ نے اپنی روح پھونک کر اسے معزز بنایا ہے ۔ تاکہ وہ اللہ سے اپنا رشتہ ہر وقت جوڑے رکھے اور اسے بھلائے نہیں ۔

یہ عاجزی اور یہ تواضع جس کی طرف قرآن بلاتا ہے تکبر غرور اور خیالاتی برتری کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتی ہے - یوں انسان درگاہ باری تعالیٰ میں بھی باادب رہتا ہے - لوگوں کے ساتھ اس کا معاملہ بھی شریفانہ ہوتا ہے اور خیالات و تصورات میں سنجیدہ اور سوشل لائف میں متوازن ہوتا ہے - اسلامی تعلیمات کے بعد اگر کوئی غرور و تکبر کرتا ہے تو وہ کم عقل ' بے وقوف اور گھٹیا انسان ہوتا ہے - ایسے افراد کو اللہ پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ غرور میں مبتلا ہے اور عوام الناس بھی ایسے شخص کو ناپسند کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے آپ کو یوں بڑا سمجھتا ہے اور بے جا پھولا ہوا ہوتا ہے -

حدیث شریف میں آتا ہے :من تو اضع لله رفعه فهو في نفسه حقير وعند الناس كبير ، ومن استكبر وضعه الله فهو في نفسه كبير وعند الناس حقير - حتي لهوا بغض اليهم من الكلب و الخنزير "جو شخص تواضع کرے محض رضائے الٰہی کے لیے ' تو اسے اللہ اٹھائے گا ' وہ تو اپنے خیال میں حقیر ہو گا لیکن لوگوں کی نظروں میں بڑا ہو گا ' جو تکبر کرے ' اللہ اسے گرا دیتا ہے ' وہ تو اپنے خیال میں بڑا آدمی ہوتا ہے ' مگر لوگوں کے نزدیک حقیر ہوتا ہے - یہاں تک کہ لوگ اس سے اس قدر نفرت کرنے لگتے ہیں جس طرح کتے اور خنزیر سے" (ابن کثیر)-

اب یہ بحث یہاں ایک اصولی بات پر ختم ہوتی ہے 'جس قدر امور سے اس فہرست میں مطلع کیا گیا ہے وہ افعال مذمومہ ہیں 'اب عموماً کہا جاتا ہے کہ اللہ تمام برے اعمال اور افعال اور صفات کو پسند نہیں کرتا۔

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ

"ان امور میں سے ہر ایک کا برا پہلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے - یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہیں"-

یہاں تمام احکام اور منہیات کا سبب بتا دیا گیا کہ ان امور کی ممانعت ان کے برے پہلو کی وجہ سے ہے - ان میں کوئی اچھا پہلو بھی ہو سکتا ہے لیکن ان کی ممانعت اس لیے کی گئی ہے کہ ان میں برائی کا پہلو غالب ہے -

یہ تمام احکام اور اخلاقی تعلیمات کو اب عقیدۂ توحید اور اسلامی نظریہ حیات کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے اور یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ اسلامی نظریہ حیات کے تقاضے ہیں - لہذا شرک سے بچو اور قرآن کی تعلیمات حکمت کی یہ خاص خاص باتیں ہیں 'یہ حکمت قرآن کا ایک حصہ ہیں -

وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾

"اور دیکھ' اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا بیٹھ ورنہ تو جہنم میں ڈال دیا جائے گا ملامت زدہ اور ہر بھلائی سے محروم ہو کر"۔

اس سبق کا یہ خاتمہ' اس کے آغاز کے ساتھ مماثل ہے۔گویا اس کے دونوں سرے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور یوں نظر آتا ہے کہ تمام سبق اس عظیم قاعدے اور اصول پر قائم ہے۔جس پر اسلامی نظام حیات کی بنیاد اٹھائی گئی ہے یعنی عقیدۂ توحید اور صرف اللہ وحدہ کی بندگی اور اطاعت اور اللہ کے سوا تمام طاغوتوں کی بندگی اور اطاعت سے انکار۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۲۷ ایک نظر میں

دوسرے سبق کا آغاز و انجام عقیدۂ توحید کے بیان اور رد شرک کے مضمون کے ساتھ ہوا' اور اس آغاز و انجام کے درمیان بے شمار احکام امر و نہی اور بے شمار آداب و اخلاق بیان ہوئے جو سب کے سب عقیدۂ توحید کے ساتھ مربوط تھے اور اسلامی نظریہ حیات کے تقاضے تھے۔ اس سبق کا آغاز و انجام بھی شرک کی ایک مخصوص قسم کے رد کے ساتھ ہوتا ہے' یعنی یہ کہ اللہ کا کوئی بیٹا اور شریک نہیں ہے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ اللہ کے لیے بیٹا ہونا ایک ایسا نظریہ ہے جس کی کمزوری اور لچرپن بالکل واضح ہے۔ کیونکہ یہ پوری کائنات اللہ وحدہ کی مخلوق ہے اور سب چیزیں اس کی ثناخواں اور تسبیح گویا ہیں۔

وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ (۱۷ : ٤٤) "جو چیز بھی ہے وہ اس کی تعریف کے ساتھ اس کی ثناخواں ہے"۔ اور تمام اشیاء کا انجام ایک ہے اور سب نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے اور جو چیزیں بھی زمین و آسمان میں ہیں وہ سب اللہ کے علم میں ہیں۔ اور اللہ وحدہ اپنی مخلوقات کے اندر جو تصرفات بھی کرتا ہے' کوئی اس کے معاملات میں اس سے بازپرس نہیں کر سکتا۔

اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْکُمْ اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْکُمْ (۱۷ : ٥٤) "اگر چاہے تو تم پر رحم کر دے اور چاہے تو تمہیں عذاب دے دے"۔

اس سبق کے درمیان بتایا جاتا ہے کہ شرکیہ عقائد کمزور اور غیر معقول ہیں اور ذات باری تعالیٰ وحدہ' حاکم' مطاع' صاحب قدرت' متصرف اور تمام معاملات کائنات میں خود مختار ہے۔ اور اس سے کوئی بھی بازپرس کرنے والا نہیں ہے۔ دنیاوی امور بھی اس کے ہاتھ میں ہیں' اخروی بھی اس کے ہاتھ میں ہیں' ظاہری بھی اور خفیہ بھی۔ اور یہ پوری کائنات اللہ کی مطیع فرمان ہے' اس کی طرف متوجہ ہے اور اس کی تعریف اور تسبیح کرتی ہے۔ اور اس کام میں انسان' حیوان' چرند پرند اور تمام اشیاء شامل ہیں۔

---000---

# درس نمبر ۱۲۷ تشریح آیات

## ۴۰ --- تا --- ۵۷

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ۭ
۴۰ع اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ۝

”کیسی عجیب بات ہے کہ تمہارے رب نے تمہیں تو بیٹوں سے نوازا اور خود اپنے لیے ملائکہ کو بیٹیاں بنا لیا؟ بڑی جھوٹی بات ہے جو تم لوگ زبانوں سے نکالتے ہو“۔

یہ استفہام انکاری ہے 'اور یہ انداز اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب مخاطب کو یہ بتانا مقصود ہو کہ تمہاری یہ حرکت بہت ہی بری ہے۔ تم یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ حالانکہ اللہ بیوی 'اولاد 'مثل اور مثال سے پاک ہے۔ اور اس کا کوئی شبیہ اور کوئی شریک نہیں ہے۔ اور مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے لیے تو لڑکیوں کو معیوب سمجھتے ہیں اور اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور خود رزق کے خوف اور عار لاحق ہونے کی وجہ سے بیٹیوں کو قتل کرتے ہیں اور اس کے باوجود فرشتوں کو لڑکیاں قرار دیتے ہیں اور انہیں اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ تو اگر لڑکے اور لڑکیاں دینے والا اللہ ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دوسروں کو لڑکے دے اور اپنے لیے لڑکیاں رکھے جو درجے میں لڑکوں سے کم ہیں۔

یہ استدلال محض اس کے رواج کے مطابق کیا گیا 'کیونکہ ان کے ہاں لڑکیوں کو برا سمجھا جاتا تھا اور لڑکوں کو اچھا تاکہ یہ بتایا جائے کہ خود ان کے تصورات کے مطابق بھی۔ ان کا قول کمزور ہے۔ ورنہ بات درحقیقت اپنی اصل ہی سے غلط تھی۔

اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا (۱۷ : ۴۰) ”بڑی جھوٹی بات ہے جو تم لوگ زبان سے نکالتے ہو“۔ یہ برائی کے اعتبار سے بہت ہی بری بات ہے اور یہ اللہ کی شان میں بری جسارت ہے اور نہایت ہی گندی بات ہے اور یہ بہت بڑا جھوٹ ہے اور اسلامی عقائد 'قرآنی آیات اور حقائق کے ساتھ متصادم ہے اور ناقابل یقین و تصدیق ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ۭ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۝

"ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے لوگوں کو سمجھایا کہ ہوش میں آئیں 'مگر وہ حق سے اور زیادہ دور ہی بھاگے جا رہے ہیں"۔

قرآن کریم عقیدۂ توحید لے کر آیا۔ اس عقیدے کو قرآن نے مختلف اسالیب سے بیان کیا اور اس پر بے شمار دلائل دیئے۔ اور کئی طریقے اختیار کیے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں اور فطری دلائل اور فطری اور منطقی طرز استدلال کو سمجھیں اور توحید کا فطری عقیدہ قبول کرلیں اور اس کائنات میں اللہ وحدہ لاشریک کی ذات پر جو آثار و دلائل موجود ہیں ان پر غور کریں مگر ان لوگوں نے اس کے سوا کچھ نہ کیا کہ انہوں نے قرآن سے نفرت کی۔ کیونکہ انہیں ڈر یہ تھا کہ اگر انہوں نے قرآن کو سنا اور پڑھا تو وہ ان عقائد باطلہ پر قائم نہ رہ سکیں گے 'جن کو وہ مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہتے ہیں 'کیونکہ ان کے عقائد شرکیہ ' اوہام اور خرافات پر مبنی تھے اور قرآن کے فطری اور منطقی استدلال کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتے تھے۔

جس طرح اس سے قبل لڑکیوں کی نسبت الی اللہ کے معاملے میں قرآن کریم نے ان کے خیالات کے مطابق بات کی تھی کہ خود اپنے لئے تو لڑکیوں کو پسند نہیں کرتے مگر اللہ کے لیے ثابت کرتے ہیں 'اب یہاں ان کے عقیدۂ شرکیہ کو فرض کر کے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی دوسرے خدا بھی ہوتے تو وہ اللہ کی ذات تک پہنچنے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکالتے۔ وہ اللہ کا قرب حاصل کرتے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾

"اے نبیؐ ان سے کہو اگر اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہوتے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں 'تو وہ مالک عرش کے مقام کو پہنچنے کی ضرور کوشش کرتے"۔

جیسا کہ نحویوں نے کہا ہے لَوْ حرف امتناع ہے اور یہ استعمال ہی قضیہ ممتنعہ پر ہوتا ہے 'لہٰذا اللہ کے سوا الٰہوں کا وجود ہی ناممکن ہے۔ اور جن ہستیوں کو یہ الٰہ بناتے ہیں وہ خود اللہ کی مخلوقات ہیں۔ چاہے وہ ستارے ہوں 'سیارے ہوں 'انسان ہوں یا حیوان ہوں 'نباتات ہوں یا جمادات ہوں۔ اور یہ تمام مخلوقات قانون قدرت کے مطابق سب کی سب اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہیں اور یہ سب مخلوقات ارادۂ باری تعالیٰ کی مطیع فرمان ہیں۔ اور ہر چیز اللہ کی طرف رواں دواں ہے۔

اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا (۱۷ : ۴۲) "تو وہ مالک عرش کے مقام کو پہنچنے کی ضرور کوشش کرتے"۔ یہاں عرش سے مراد مطلق بلندی اور ان مخلوقات سے برتری ہے جن کو یہ لوگ الٰہ سمجھتے ہیں۔ یہ تمام مخلوق اللہ کے عرش کے تحت ہیں اور اللہ کی حکمرانی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾

"پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں"۔
اب ایک ایسا منظر پیش کیا جاتا ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ کی ثناخواں اور اس کی مطیع فرماں ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﮀ

"اس کی پاکی تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں بیان کر رہی ہیں جو آسمان و زمین میں ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو، مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی بردبار اور درگزر کرنے والا ہے"۔

اس کائنات کا ذرہ ذرہ اس حقیقت کا اظہار کر رہا ہے 'اللہ کی تسبیح و تہلیل کر رہا ہے' یہ پوری کائنات ایک زندہ کائنات ہے اور اللہ کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔

یہ ایک منفرد کائناتی منظر ہے 'جب انسان سوچتا ہے کہ ہر شجر و حجر' ہر بیج اور ہر پتہ' ہر پھل اور پھول' ہر پودا اور ہر درخت' ہر چرند اور ہر پرند' ہر انسان اور ہر حیوان' ہر دوڑنے والا اور ہر رینگنے والا' ہر اڑنے والا اور ہر تیرنے والا' زمین کا ہر مکیں اور ہوا کا ہر باسی' پتیوں میں رہنے والا یا بلندیوں پر بسیرا رکھنے والا' سب کے سب اللہ کے سامنے جھکے ہوئے ہیں اور ثناخوان ہیں۔

جب انسان ان تمام چیزوں کی حقیقت اور ماہیت پر غور کرتا ہے تو اس کے شعور کے اندر ایک ارتعاش پیدا ہوتا ہے' اسے اپنے اردگرد تمام مخلوق حرکت کرتی ہوئی اور زندہ نظر آتی ہے اور وہ اسے محسوس کرتا ہے' وہ جس چیز کو بھی ہاتھ سے چھوتا ہے یا پاؤں سے روندتا ہے' وہ اسے ثناخوان الہی نظر آتی ہے اور زندہ و تابندہ دکھائی دیتی ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (۱۷ : ۴۴) "کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو"۔ اور اس کی تسبیح کا انداز مخصوص ہے۔

وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (۱۷ : ۴۴) "مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو"۔ تم اس لیے نہیں سمجھتے کہ مادیت نے تمہاری روح کو چھپا رکھا ہے' تمہارے دل ان کی آواز کو نہیں سنتے' اور اس کائنات کے اسرار و رموز پر تم نے غور نہیں کیا۔ اس کائنات کے ان قوانین قدرت پر تم نے غور نہیں کیا جو اس کے اندر جاری و ساری ہیں۔ حالانکہ درحقیقت اس کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے رب کی طرف رواں دواں ہے۔ قوانین قدرت کے مطابق اس کائنات کے ہر ہر کا حدی خواں ہے۔

یاد رکھو ' کہ جب روح شفاف ہو جاتی ہے اور انسان روحانی صفائی کے مدارج طے کر لیتا ہے تو وہ سب چیزوں کی تسبیح سنتا ہے ' ہر متحرک اور ہر ساکن مخلوق کی آواز وہ سنتا ہے ۔ اسے ہر چیز کی نبض چلتی نظر آتی ہے اور ہر چیز کی تسبیح سنائی دیتی ہے ۔ اس کا رابطہ عالم بالا سے ہو جاتا ہے اور وہ اس کائنات کے ان اسرار و رموز کو دیکھتا ہے جس سے غافل لوگ بے خبر ہوتے ہیں کیونکہ مادیت کے پردہ نے ان غافلوں کی روح کو دبا رکھا ہوتا ہے ' حالانکہ روح کائنات ہر ساکن و جامد میں بھی متحرک ہے ۔ ہر چیز میں ' ہر شجرو حجر میں ۔

اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (۱۷ : ۴۴) "حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی بردبار اور درگزر کرنے والا ہے " ۔ حلم اور مغفرت کا ذکر یہاں اسی لیے کیا گیا کہ انسان ہر معاملے میں پر تقصیر ہے ۔ خصوصاً وہ اس حقیقت کے ادراک سے قاصر ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی ثناخواں ہے ۔ نہ صرف یہ کہ وہ نبات و جماد کے اقرار و تسبیح سے جاہل بلکہ یہ انسان انسان ہوتے ہوئے بھی باری تعالیٰ کا منکر بن جاتا ہے ۔ کوئی شرک کرتا ہے 'کوئی اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرتا ہے 'کوئی بلکہ اکثریت کائنات کی تسبیح سے بے خبر ہے ' حالانکہ شجرو حجر کے مقابلے میں بشر پر زیادہ ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ کا مطیع ہو اور ثناخواں ہو ' اور ذات باری کی معرفت کا حامل ہو ۔ اگر اللہ کی درگزر نہ ہوتی ' وہ مہلت نہ دیتا ' مغفرت نہ کرتا ' تو کب کے وہ تباہ ہو چکے ہوتے لیکن وہ حلیم و غفور ہے ۔ بار بار نصیحت کرتا ہے ' ڈراتا ہے اور نصیحت کرتا ہے ۔

---ooo---

کبراء قریش چپکے چپکے قرآن سنا کرتے تھے 'لیکن وہ ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کرتے تھے کہ ان کے دلوں پر قرآن کا اثر نہ ہو جائے ' وہ زبردستی اپنے اوپر مرتب ہونے والے اثرات کو جھڑک دیتے تھے ۔ انہوں نے اپنے اور رسولؐ کے درمیان پردے حائل کر رکھے تھے ۔ وہ اپنے آپ کو غافل رکھتے تھے ۔ کانوں میں انگلیاں ڈالتے تھے ' چنانچہ اللہ نے بھی انہیں ان کی اس روش پر چلنے دیا ۔ ان کے اور قرآن کے درمیان پردے حائل ہو گئے ۔ ان کے دلوں پر تالے لگ گئے اور کانوں میں بھاری پن آگیا ۔

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝ وَّ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ۝ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝

"جب تم قرآن پڑھتے ہو تو ہم تمہارے اور آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیتے ہیں' اور ان کے دلوں پر ایسا غلاف چڑھا دیتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں سمجھتے' اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اور جب تم قرآن میں اپنے ایک ہی رب کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ جب وہ کان لگا کر تمہاری بات سنتے ہیں تو دراصل کیا سنتے ہیں' اور جب بیٹھ کر باہم سرگوشیاں کرتے ہیں تو کیا کہتے ہیں۔ یہ ظالم آپس میں کہتے ہیں کہ یہ تو ایک سحر زدہ آدمی ہے جس کے پیچھے تم لوگ جا رہے ہو۔۔۔ دیکھو' کیسی باتیں ہیں جو یہ لوگ تم پر چھانٹتے ہیں' یہ بھٹک گئے ہیں' انہیں راستہ نہیں ملتا"۔

ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں نقل کیا ہے۔ (محمد ابن شہاب' زہری سے) کہ ابوسفیان ابن حرب' ابوجہل' اور اخنس ابن شریق ابن عمرو ابن وھب ثقفی ایک رات کو اپنے اپنے طور پر نکلے' تاکہ حضورؐ سے قرآن سنیں۔ آپؐ رات کو اپنے گھر میں جہرا نماز میں قرآن پڑھتے تھے۔ ہر شخص نے اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر کلام الٰہی سنا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی دوسرے کے متعلق نہ جانتا تھا۔ رات کو وہ سنتے رہے' یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ صبح واپس ہوتے وقت راستے میں ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا: "دوبارہ یہ کام نہ کرنا اگر نادان لوگوں نے تمہیں دیکھ لیا تو وہ اچھا تاثر نہ لیں گے"۔ پھر چلے گئے۔ دوسرے دن یوں ہوا کہ دوبارہ یہ تینوں اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے۔ رات گئے تک سنتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو پھر راستے میں انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔ پھر انہوں نے وہی بات کی جو پہلے دن کی تھی پھر چلے گئے۔ جب تیسری رات ہوئی تو پھر سب کے سب اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے اور سنتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو پھر اتفاقاً ایک دوسرے کو مل گئے۔ اب کے انہوں نے کہا کہ جب تک ہم معاہدہ نہ کرلیں واپس نہ ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے باقاعدہ معاہدہ کیا کہ اب ہرگز یہ کلام نہ سنیں گے۔ جب صبح ہوئی تو اخنس ابن شریق نے اپنی لاٹھی لی' ابوسفیان ابن حرب کے پاس آیا خود اس کے گھر میں۔ تو ان سے کہا ابو حنظلہ' براہ کرم تم نے محمدؐ سے جو کلام سنا اس کے بارے میں بتایئے۔ تمہاری حقیقی رائے کیا ہے؟ اس نے کہا ابوثعلبہ' خدا کی قسم کہ میں نے بعض چیزیں ایسی سنی ہیں جنہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں اور ان کا مطلب بھی سمجھتا ہوں۔ ہاں بعض چیزوں کا مطلب میں نہیں سمجھتا۔ اس پر اخنس نے کہا اور میری بھی یہی رائے ہے۔ اس خدا کی قسم جس کے ساتھ تم نے قسم کھائی۔ اس کے بعد وہ وہاں سے چلا اور ابوجہل کے پاس آیا۔ یہ اس سے بھی اس کے گھر پر ملا۔ اور یہی سوال کیا کہ ابوالحکم براہ کرم محمدؐ سے جو کچھ تو نے سنا اس کے بارے میں تمہاری حقیقی رائے کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے کیا سنا؟ ہمارے اور بنو عبد مناف کا عزت و شرف کے بارے میں مقابلہ تھا۔ انہوں نے لوگوں کو کھانا کھلایا' ہم نے بھی کھلایا' انہوں نے لوگوں کو سواریاں دیں' ہم نے بھی دیں۔ انہوں نے عطیے دیئے' ہم نے بھی دیئے' یہاں تک کہ ہم گھٹنے سے گھٹنا ملا کر چلے اور ہم مقابلے کے گھوڑوں کی طرح دوڑے۔ اب انہوں نے یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ ہم میں ایک نبی آیا ہے جس پر وحی آتی ہے۔ تو ہم اسے کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں؟ ہم اس پر نہ ایمان لائیں گے نہ اس کی تصدیق کریں گے۔ اس پر اخنس ابن شریق اسے چھوڑ کر اٹھ گیا....."

یہ تھے ان لوگوں کے حالات۔ یہ قرآن سے متاثر ہوتے تھے لیکن وہ زبردستی اس تاثر کو دور کرنے کی سعی کرتے۔ ان کے دل اس کی طرف کھنچتے تھے مگر وہ زبردستی اس سے دور کرتے۔ چنانچہ ان کے اس رویے کی وجہ سے اللہ نے ان کے اور قرآن کے درمیان ایسے خفیہ پردے حائل کر دیئے جو بظاہر نظر نہ آتے تھے مگر دبیز پردے تھے۔ وہ قرآن سے

فائدہ نہ اٹھاتے تھے اور وہ قرآن سنتے تھے مگر ہدایت نہ لیتے تھے۔ وہ جب سنتے تو مبہوت و مسحور ہو جاتے 'لیکن واپس ہو کر پھر خفیہ مشورے کرتے۔ سازشیں کرتے اور پختہ عہد کرتے کہ اب کے بعد پھر سرے سے سنیں گے ہی نہیں تاکہ ان کے دلوں پر قرآنی اثرات نہ پڑ جائیں۔ ان کا دماغ متاثر نہ ہو جائے۔ کیونکہ قرآن مجید کی تعلیمات جس نظریہ حیات اور جس عقیدۂ توحید پر مبنی تھیں اس کے نتیجے میں قائم ہونے والا نظام اور معاشرہ ان کی خود ساختہ برتری اور امتیازات کو ختم کر دیتا تھا اور یہ بات ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا (۱۷:۴۶)

"اور جب تم قرآن میں اپنے ایک ہی رب کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت سے منہ موڑ لیتے ہیں"۔ یہ نفرت ان کو لفظ وحدہ سے تھی۔ کیونکہ عقیدہ توحید ان کے اجتماعی نظام کو ختم کر رہا تھا۔ ان کا اجتماعی نظام بت پرستی اور جاہلیت کے رسم و رواج پر قائم تھا' جس میں قریش کی امتیازی حیثیت تھی' ورنہ وہ خود جانتے تھے کہ ان کے عقائد میں کس قدر جھول ہے اور اسلام کے نظریات کس قدر پختہ ہیں۔ نیز وہ یہ بھی جانتے تھے کہ قرآن ایک نہایت ہی بلند پایہ پیغام و کلام ہے۔ اور اس کی ایک امتیازی شان ہے۔ اور قرآن کے اثرات کا یہ عالم تھا کہ وہ اس کی طرف کھنچے چلے جاتے تھے حالانکہ وہ اس سے اپنے آپ کو بچانے کی سعی بھی کرتے تھے اور اس کے اثرات کو زائل کرنے میں جدوجہد بھی کرتے تھے۔

ان کا ضمیر اور ان کی فطرت ان کو اس بات پر مجبور کر رہی تھی کہ وہ بات سنیں' متاثر ہوں' لیکن غرور کی وجہ سے وہ تسلیم کرنے اور یقین کرنے سے باز رہتے تھے۔ اپنی ہٹ دھرمی اور مکابرہ کو وہ یوں چھپاتے تھے کہ رسول اللہ پر مختلف قسم کے الزامات عائد کرتے تھے۔ مثلاً یہ کہ آپ جادوگر ہیں۔

اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (۱۷:۴۷) "یہ ظالم آپس میں کہتے تھے کہ یہ تو ایک سحر زدہ آدمی ہے"۔ لیکن خود ان کے اس الزام کے اندر ان کی کمزوری ظاہر ہے' اس الزام ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ قرآن سے بے حد متاثر تھے۔ کیونکہ وہ اندر اندر سے یہ اعتراف کرتے تھے کہ یہ کلام کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا' اس کے اندر غیر بشری رنگ ہے' یہ نہایت ہی خفیہ انداز میں غیر محسوس طور پر اپنے شعور اور وجدان میں اس بات کو پاتے تھے کہ یہ کوئی فوق البشر کلام ہے' اس لیے کبھی اسے جادوگری کہتے' کبھی کچھ اور کہتے' کیونکہ وہ خود سمجھتے تھے کہ یہ کوئی معمولی کلام نہیں ہے۔ اس کی ترتیب اور اس کی ساخت میں ایک فوقیت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ بات وہ تسلیم کرتے تھے کہ یہ کلام خود حضرت محمدؐ کا نہیں ہے بلکہ کسی جادو کا کرشمہ ہے۔ انسانی قوت کا کرشمہ نہیں بلکہ جادوگری ہے' لیکن ان کو حقیقت کے اعتراف کی توفیق نہ ہوتی ورنہ وہ کہتے کہ یہ کلام الٰہی ہے کیونکہ انسان' کوئی بھی انسان ایسا کلام پیش نہیں کر سکتا' نہ انسان کے علاوہ کوئی اور مخلوق ایسا کلام بنا سکتی ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا (۱۷:۴۸) دیکھو کیسی باتیں ہیں جو یہ لوگ تم پر چھانٹتے ہیں' یہ بھٹک گئے ہیں' انہیں راستہ نہیں ملتا"۔ یہ آپؐ کو جادوگر اور جادو زدہ کہتے ہیں' حالانکہ آپؐ تو رسول ہیں۔ یہ خود گمراہ ہو گئے' راہ ہدایت نہیں پا رہے' یہ اس قدر حیران ہو گئے کہ انہیں کوئی راہ

نہیں سوجھتی۔ نہ وہ راہ راست پر آتے ہیں اور نہ ہی اپنے غلط موقف پر کوئی صحیح استدلال کر سکتے ہیں۔

---ooo---

یہ تھے ان کے اقوال اور ان کی آراء قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں۔ قرآن کے فلسفہ کائنات کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ وہ قیامت اور بعث بعد الموت کے قائل نہ تھے اور اسے مستبعد سمجھتے تھے۔

وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾ قُلْ كُوْنُوْا
حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ؕ
قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى
هُوَ ؕ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَ
۵ ۱۲ ع تَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾

۵ وہ کہتے ہیں "جب ہم صرف ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟" ... ان سے کہو "تم پتھر یا لوہا بھی ہو جاؤ' یا اس سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز جو تمہارے ذہن میں قبول حیات سے بعید تر ہو" (پھر بھی تم اٹھ کر رہو گے)۔ وہ ضرور پوچھیں گے "کون ہے وہ جو ہمیں پھر زندگی کی طرف پلٹا کر لائے گا؟" جواب میں کہو: "وہی جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا"۔ وہ سر ہلا ہلا کر پوچھیں گے: "اچھا' تو یہ ہو گا کب؟" تم کہو: "کیا عجب کہ وہ وقت قریب ہی آ لگا ہو۔ جس روز وہ تمہیں پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کی پکار کے جواب میں نکل آؤ گے اور تمہارا گمان اس وقت یہ ہو گا کہ ہم بس تھوڑی دیر ہی اس حالت میں پڑے رہے ہیں"۔

بعث بعد الموت کا مسئلہ رسول اللہ اور مشرکین مکہ کے درمیان بار بار زیر بحث آتا تھا۔ قرآن کریم نے بکثرت ان مباحث کو نقل کیا ہے' حالانکہ اس کائنات اور موت و حیات کی حقیقت پر غور و فکر کرنے والا ہر آدمی بڑی آسانی کے ساتھ اسے سمجھ سکتا ہے۔ حشر و نشر کی نوعیت کو بسہولت سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم نے اس پر بار بار روشنی ڈالی ہے۔ لیکن جس سادگی اور سلاست اور جس وضاحت کے ساتھ قرآن نے اس مسئلہ کو سمجھایا' یہ لوگ اسے نہ سمجھ سکے۔ لہذا وہ یہی کہتے رہے کہ مرنے کے بعد وہ کیسے دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔

وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (۱۷ : ۴۹) "وہ کہتے ہیں کہ جب ہم صرف ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟" وہ یہ باتیں اس لیے کرتے تھے کہ وہ حیات کی اصل حقیقت کے بارے میں سوچتے ہی نہ تھے کہ وہ ایک وقت بالکل نہ تھے اور اللہ انہیں وجود میں لایا۔ اور یہ کہ ابتدائی تخلیق مشکل ہوتی ہے جبکہ دوبارہ تخلیق کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ پھر یہ بھی وہ نہیں سوچتے کہ اللہ کی قدرت لامحدود ہے' اس کے سامنے مشکل نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اللہ کی تخلیق کا آلہ اور سبب

فقط کن فیکون ہے ' لہٰذا کوئی چیز سہل یا دشوار انسانوں کے نقطہ نظر سے تو ہو سکتی ہے لیکن اللہ کے نقطہ نظر سے نہیں - وہاں تو صرف ارادے کی ضرورت ہوتی ہے -

ان کے اس تعجب کو یوں رد کر دیا گیا -

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا (٥٠) اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ (٥١)

(۱۷ : ۵۰ - ۵۱) "ان سے کہو "تم پتھر یا لوہا بھی ہو جاؤ ' یا اس سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز جو تمہارے ذہن میں قبول حیات سے بعید تر ہو" - جہاں تک ہڈیوں اور مٹی کا تعلق ہے ان کے ساتھ تو پھر بھی زندگی کی یادیں وابستہ ہیں اور پتھر اور لوہا تو زندگی سے بہت دور ہیں کہ تم پتھر ہو جاؤ ' لوہا ہو جاؤ یا اور کوئی سخت چیز ہو جاؤ جو تمہارے خیال میں آثار حیات کو قبول کرنے سے بہت ہی دور ہو ' جس میں زندگی کی روح نہ پھونکی جا سکتی ہو تو بھی جب اللہ چاہے گا تمہیں زندہ کر دے گا -

یہ لوگ نہ پتھر بن سکتے تھے اور نہ لوہا ' لیکن یہ ان کو بطور چیلنج کہا جا رہا ہے ' اس چیلنج میں ایک طرح کی زجر و توبیخ بھی پوشیدہ ہے - پتھروں اور لوہے میں کوئی احساس نہیں ہوتا ' لہٰذا ایک بعید اشارہ اس طرف ہے کہ تمہاری سوچ پتھر اور لوہے کی طرح بے لچک ہے -

فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا (۱۷ : ۵۱) "وہ ضرور پوچھیں گے کون ہے وہ جو ہمیں پھر زندگی کی طرف پلٹا لائے گا؟" یعنی جب ہم مٹی ہو گئے ' بوسیدہ ہڈیاں ہو گئیں ' تو کون ہے وہ جو ہمیں دوبارہ حیات دے گا - یا جب ہم پتھر اور لوہا بن گئے تو پھر کون حیات دے گا؟

قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۱۷ : ۵۱) "کہہ دو ' وہی جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا" - ان کے سوال کا یہ نہایت ہی سادہ اور صاف اور دل لگتا جواب ہے - کیونکہ جس ذات نے پہلی مرتبہ ان کو زندگی دی وہ دوبارہ بھی دے سکتا ہے ' لیکن وہ اس سادہ جواب سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور نہ اطمینان ان کو ہوتا ہے -

فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ (۱۷ : ۵۱) "وہ سر ہلا کر پوچھیں گے" - یعنی سر کو اوپر نیچے کر کے سوالیہ انداز اختیار کریں گے ' یہ حرکت وہ اس لیے کریں گے کہ وہ اس بات کو بعید از امکان سمجھتے ہیں یا غرور کے طور پر سر ہلائیں گے -

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ (۱۷ : ۵۱) "اچھا تو یہ ہو گا کب؟" یہ بھی وہ نہایت ہی لاپرواہی سے وقوع قیامت کو بعید از امکان سمجھتے ہوئے کہیں گے -

قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا (۱۷ : ۵۱) "آپ جواب دیں ' کیا عجب کہ وہ وقت قریب ہی آ لگا

ہو"۔ وقوع قیامت کے وقت کا علم تو رسول اللہ کو بھی نہیں دیا گیا لیکن شاید یہ وقت ان لوگوں کے گمان اور ظن و تخمین سے قریب تر ہو۔ مناسب تو یہی ہے کہ وہ اس کے وقوع سے ڈریں کیونکہ یہ اس حال میں واقع ہو گا کہ لوگ غفلت میں ہوں گے۔ تکذیب کر رہے ہوں گے' مذاق کر رہے ہوں گے اور قیامت برپا ہو جائے گی۔

اور قرآن اپنے مخصوص انداز کے مطابق اچانک قیامت کے مناظر کا بیان شروع کر دیتا ہے۔

يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ وَتَظُنُّونَ إِنْ لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا (۱۷: ۵۲)

"جس روز تمہیں پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس پکار کے جواب میں نکل آؤ گے"۔ یہ ان لوگوں کا منظر ہے جو وقوع قیامت کے منکر تھے۔ آج وہ لبیک کہتے ہوئے میدان حشر میں چلے آ رہے ہیں۔ ان کی زبانوں پر بے ساختہ حمد و ثنا جاری ہے' اور اس کے سوا ان کے ساتھ کوئی سوال و جواب نہیں ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے سوالات کا یہ عجیب جواب دیا ہے' یہ لوگ تو اس بات کا انکار کر رہے کہ قیامت ہو گی۔ لیکن آج وہ الحمد للہ' الحمد للہ کہتے ہوئے دوڑے آ رہے ہیں۔ آج پوری زندگی کی اسکرین اس طرح لپیٹ دی جائے گی جس طرح سایہ سمٹ آتا ہے۔

وَتَظُنُّونَ إِنْ لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا (۱۷: ۵۲) "اور تمہارا گمان اس وقت یہ ہو گا کہ ہم بس تھوڑی دیر ہی اس حالت میں پڑے رہے ہیں"۔ دنیا میں زندگی کے طویل ایام کی چادر کو اور پھر برزخ میں صدیوں کے عرصے کو یوں لپیٹ کر رکھ دیا جاتا ہے کہ یہ دنیا' اس کی زندگی اور عالم برزخ میں صدیاں کس قدر مختصر عرصہ ہیں' یہ سب کچھ چند لمحات ہیں۔ طویل زندگی کے لمحات اور تاثرات انسانی احساس میں نہایت ہی مختصر ہوتے ہیں۔ یہ ایک وقت ہوتا ہے جو گزر جائے۔ ایک زمانہ ہوتا ہے جو بیت جائے اور ایک سایہ ہوتا ہے جو لپیٹ لیا جائے اور ساز و سامان دنیا ہوتا ہے جو فنا ہو جائے۔

---ooo---

اب وقوع قیامت کا انکار کرنے والوں' اللہ کے اس پختہ عہد کو جھٹلانے والوں اور اس کے ساتھ مذاق کرنے والوں' سر ہلانے والوں اور مذاق مذاق میں اعتراض کرنے والوں کو چھوڑ کر' اللہ کے مومن بندوں کے ساتھ مکالمہ شروع ہوتا ہے۔

حضور اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کہا جاتا ہے کہ میرے بندوں سے یہ کہو کہ وہ ہمیشہ اچھی بات کریں۔

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا

"اور اے نبیؐ میرے بندوں (یعنی مومن بندوں) سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہترین ہو۔ دراصل یہ شیطان ہے جو انسانوں کے درمیان فساد ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے"۔

میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہ منہ سے وہی بات نکالا کریں جو بہتر ہو۔ بہر حال میں بہترین بات سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ کیونکہ بری بات سے لوگوں کا دل دکھتا ہے اور شیطان کا مسلمانوں کے خلاف سب سے بڑا حربہ یہ ہے کہ وہ اہل ایمان کے درمیان رخنہ ڈال دے۔ اور اس سے وہ صرف اس صورت میں بچ سکتے ہیں کہ وہ اچھی بات کریں۔ اگر کوئی بری بات منہ سے نکل جائے تو جواب بھی برا ہو گا۔ یوں نزاع شروع ہو جائے گا اور محبت اور آشتی کی فضا نہ رہے گی۔ سختی پیدا ہو گی' پھر دشمنی ہو جائے گی۔ جبکہ اچھی بات سے دلوں کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں اور دلوں کو خشکی اور سختی میں لچک پیدا ہوتی ہے۔ اور آخر کار اچھے کلمات سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

اِنَّ الشَّیۡطٰنَ کَانَ لِلۡاِنۡسَانِ عَدُوًّا مُّبِیۡنًا (۱۷ : ۵۳) "حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے"۔ شیطان تاک میں رہتا ہے کہ کسی کے منہ سے بری بات نکلے' اس کی زبان لغزش کرے اور یوں اسے بغض و عداوت کی آگ بھڑکانے کا موقعہ مل جائے اور بھائی بھائی کا دشمن ہو جائے' جبکہ بھلی بات سے رخنے بھر جاتے ہیں' شیطان کی راہ بند ہو جاتی ہے اور اسلامی اخوت شیطان کی وسوسہ اندازیوں اور رخنہ پردازیوں سے مامون ہو جاتی ہے۔

---000---

اس کے بعد روئے سخن اب انسانوں کے انجام کی طرف مڑ جاتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ کی ایک آواز پر یہ لوگ جمع ہو جائیں گے۔ اس دن ان کا نظام خالص اللہ کے ہاتھ میں ہو گا۔ اس دن کوئی شریک نہ ہو گا۔ اللہ چاہے گا تو رحم کرے گا' چاہے گا تو سزا دے گا' اب لوگوں کا انجام اللہ ہی کے فیصلے پر ہو گا۔ اب تو رسول بھی ان کے لیے وکیل نہ ہو گا۔ وہ تو رسول تھا۔

رَبُّکُمۡ اَعۡلَمُ بِکُمۡ ؕ اِنۡ یَّشَاۡ یَرۡحَمۡکُمۡ اَوۡ اِنۡ یَّشَاۡ یُعَذِّبۡکُمۡ ؕ وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ وَکِیۡلًا ﴿۵۴﴾ وَ رَبُّکَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ

"تمہارا رب تمہارے حال سے خوب واقف ہے۔ وہ چاہے تو تم پر رحم کرے اور چاہے تو تمہیں عذاب دے۔ اور اے نبیؐ ہم نے تم کو لوگوں پر حوالہ دار بنا کر نہیں بھیجا ہے۔ تیرا رب زمین اور آسمانوں کی مخلوقات کو زیادہ جانتا ہے"۔

بے قید علم اللہ ہی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے جامع علم کی بنا پر لوگوں کے ساتھ رحیمانہ سلوک کرے گا یا عذاب دے گا۔ جہاں تک رسول کا تعلق ہے تو لوگوں تک پیغام پہنچانے کے بعد اس کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے۔

اللہ کا جامع علم آسمان اور زمینوں کے درمیان موجود تمام مخلوقات کے ساتھ وابستہ ہے' خواہ ملائکہ ہوں' جن ہوں' انس ہوں یا دوسری مخلوقات جن کو اللہ کے سوا ابھی تک کوئی نہیں جانتا۔ نہ اس مخلوق کی مقدار سے لوگ باخبر ہیں نہ اس کی ماہیت سے بے خبر ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا علم اپنی مخلوقات کے بارے میں مکمل ہے' اس لیے اس نے اپنے علم ہی کی بنا پر بعض انبیاء پر بعض کو فضیلت دی ہے۔

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّنَ عَلَىٰ بَعْضٍ

""ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض سے بڑھ کر مرتبے دیئے""۔ یہ فضیلت وہ ہے جس کی حقیقت اور سبب صرف اللہ کے علم میں ہے۔ اس فضیلت کے مظاہر پر ہم نے پارۂ سوئم میں بحث کی ہے یعنی آیت۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ کے ضمن میں۔ لہٰذا تفصیلات وہاں ہی ملاحظہ کریں۔

وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ﴿٥٥﴾

""اور ہم نے ہی داؤد کو زبور دی تھی""۔ یہ فضیلت کا ایک خاص نمونہ ہے۔ یعنی حضرت داؤد کو جو کمالات دیئے گئے وہ دوسرے انبیاء میں نہ تھے' زبور کا ذکر اس لیے کیا کہ کتاب دوسرے معجزات کے مقابلے میں بڑا معجزہ ہوتا ہے' خصوصاً بعض مخصوص اور متعین ادوار میں۔

---ooo---

اس سبق کا خاتمہ بھی اسی مضمون پر ہوتا ہے جس سے آغاز ہوا تھا یعنی اللہ کی بیٹیوں کی نفی اور شریکوں کی نفی اور یہ کہ دعاء و پکار میں صرف اللہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور یہ کہ لوگوں کو نفع و نقصان دینے میں صرف اللہ ہی کارساز ہے۔ یہاں ان لوگوں کو چیلنج دیا جاتا ہے جو شرک کے قائل ہیں کہ وہ اپنے شریکوں کو ذرا پکاریں اور دیکھیں کہ وہ انہیں کیا فائدہ دے سکتے ہیں؟ یا ان پر آنے والی کس مصیبت کا منہ موڑ سکتے ہیں؟

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا ﴿٥٦﴾

""ان سے کہو' پکار دیکھو ان معبودوں کو' جن کو تم خدا کے سوا (اپنا کارساز) سمجھتے ہو' وہ کسی تکلیف کو تم سے نہ ہٹا سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں""۔

اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں ہے جو مصیبت کو ٹال سکے یا اس کا منہ موڑ سکے۔ یہ کام صرف اللہ وحدہ کر سکتا ہے۔ صرف اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی قسمتوں کا مالک ہے۔

اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں مثلاً فرشتے' جن اور انس وہ سب کے سب اللہ کے بندے ہیں۔ اللہ کی مخلوق ہیں۔ وہ خود اللہ تک رسائی کے طریقے تلاش کرتے ہیں اور اللہ کی رضا کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔ اور وہ خود اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ فی الحقیقت ذات باری کو جانتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ﴿٥٧﴾

"جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ خود اپنے رب کے حضور رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ تلاش کر رہے ہیں کہ کون اس سے قریب تر ہو جائے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرے رب کا عذاب ہے ہی ڈرنے کے لائق"۔

بعض لوگ حضرت عزیر کو ابن اللہ کہتے تھے اور یہ لوگ حضرت عزیر کی بندگی بھی کرتے تھے۔ بعض لوگ ایسے تھے جو حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے اور ان کی بندگی کرتے تھے۔ بعض لوگ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے اور بعض لوگوں نے ان کے سوا اور معبود اور خدا بنا رکھے تھے۔ اللہ ان سب لوگوں کے بارے میں کہتا ہے کہ جن لوگوں کو تم پکارتے ہو' وہ خود اللہ کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کے لیے وسیلے تلاش کرتے ہیں اور عبادات کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ اور اللہ کی رحمت کے امیدوار اور اللہ کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں' تو تمہارے مناسب حال بھی یہ بات ہے کہ تم بھی اللہ کا تقرب حاصل کرو جیسا کہ یہ معبود اللہ کا تقرب حاصل کرتے ہیں' حالانکہ یہ معبود نہیں ہیں' یہ تو اللہ کے بندے ہیں۔ اور اللہ کی رضامندی کی تلاش میں رہتے ہیں۔

یوں اس سبق کا آغاز اور انجام رد شرک سے ہوتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ شرک کی تمام صورتیں باطل ہیں' صرف اللہ وحدہ الٰہ ہے' قابل عبادت ہے اور اس بات کے لائق ہے کہ ہم اسے پکاریں۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۲۸ ایک نظر میں

درس سابق کا خاتمہ یوں ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک اپنے بندوں کے معاملات میں متصرف ہے چاہے تو ان پر رحم کر دے اور چاہے تو انہیں سزا دے دے۔ اور لوگ جن الٰہوں کی بندگی کرتے ہیں وہ نہ ان سے کوئی مصیبت ٹال سکتے ہیں اور نہ کسی مصیبت کا منہ دوسروں کی طرف موڑ سکتے ہیں۔

اب یہاں یہ بتایا جاتا ہے تمام انسانوں کا آخری انجام کیا ہو گا۔ کیونکہ اللہ نے اپنے علم کے مطابق جو فیصلے کیے ہیں' وہ اٹل ہیں۔ اور یہ آخری انجام یوں ہو گا کہ قیامت سے قبل اللہ تمام بستیوں کو ہلاک کر دے گا۔ اگر ان بستیوں میں سے کوئی بستی ایسے جرائم کا ارتکاب کرے جسے دنیا میں ہی سزا دینا لازمی ہو تو یہاں ہی اسے عذاب دے دیا جاتا ہے۔ لہٰذا تمام زندہ انسان دو طرح کے انجام سے لازماً دوچار ہوں گے یا تو اپنی موت مریں گے یا عذاب الٰہی کے نتیجے میں ہلاک ہوں گے۔

عذاب الٰہی کے ذکر کی مناسبت سے یہاں ان معجزات کا ذکر کر دیا جاتا ہے جن کا ظہور انبیائے سابق کے ہاتھوں پر ہوا۔ یعنی رسالت محمدیہ سے پہلے رسولوں پر۔ ایسے خوارق عادت معجزات کا ظہور رسالت محمدیہ کے ہاتھوں اس لیے نہیں کیا گیا کہ امت محمدیہ کے لیے وہ عذاب مقدر نہیں جو ان اقوام پر آیا کیونکہ اللہ کی یہ سنت ہے کہ جب کوئی معجزہ ظاہر ہوتا ہے اور پھر بھی امت تسلیم نہیں کرتی تو پھر اس پر عذاب الٰہی آتا ہے۔ اور امت محمدیہ کے لیے چونکہ ہلاکت مقدر نہیں اس لیے ایسے معجزات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں دیے گئے۔ اور امم سابقہ کے انبیاء کو یہ معجزات ڈرانے کی خاطر دیے گئے لیکن جب معجزات دیکھ کر وہ نہ ڈرے تو ہلاک ہوئے۔

اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک لوگوں کی رسائی کے راستے بند کر دیے۔ چنانچہ وہ آپ کو کوئی دکھ نہ پہنچا سکے۔ اور اللہ نے آپ کو جو سیر کرائی اور جو کچھ دکھانا تھا' دکھایا تاکہ یہ واقعہ لوگوں کے لیے آزمائش ہو اور اسے دوسرے معجزات کی طرح خارق عادت معجزہ نہ بنایا اور اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو شجرۂ ملعونہ سے ڈرایا مگر وہ مزید سرکشی کرتے رہے۔ شجرۂ ملعونہ سے مراد زقوم ہے جس کی روئیدگی جہنم کی تہ میں ہوتی ہے' اس تخویف کا لوگوں کے رویہ پر کوئی اثر نہ ہوا لہٰذا معجزات کا صدور بھی ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔

اس مضمون کے دوران قصہ آدم و ابلیس بھی بیان ہوا ہے۔ اللہ نے ابلیس کو یہ اجازت دی کہ وہ ابن آدم میں سے جس کو چاہے گمراہ کرے مگر میرے صالح بندوں پر تیری دسترس نہ ہو گی۔ کیونکہ میں نے ان کو برے اثر سے محفوظ کر دیا ہے۔ چنانچہ اس قصے کے ذریعہ گمراہی کے اصل اسباب لوگوں کو بتا دیے گئے' جو لوگوں کو کفر اور سرکشی پر آمادہ کرتے ہیں اور وہ اللہ کی بات پر تدبر نہیں کرتے۔

یہاں سیاق کلام انسان کو یہ تاثر دیتا ہے کہ اللہ کی جانب سے اس پر کس قدر فضل و کرم ہے لیکن اس فضل و کرم کے مقابلے میں انسان ہے کہ اللہ کا انکار کرتا ہے اور سرکشی اختیار کرتا ہے۔ اور انسان کو اللہ صرف اس وقت یاد آتا ہے جب وہ نہایت ہی اضطرابی حالت میں ہو 'اگر سمندر میں کوئی مشکلات پیش آجائیں تو انسان پھر اللہ کی پناہ میں آجاتا ہے لیکن جونہی اللہ نجات دیتا ہے تو لوگ پھر شرک کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تو انہیں سمندر اور خشکی دونوں میں پکڑ سکتا ہے۔ حالانکہ انسان کو اللہ اپنی مخلوقات کے ایک بڑے حصے پر فضیلت بخشی ہے 'لیکن انسان ہے کہ شکر نہیں کرتا اور اللہ کو یاد نہیں کرتا۔

یہ سبق قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر پر ختم ہوتا ہے 'جب یہ لوگ وہ سب کچھ پالیں گے جو انہوں نے کمایا تھا لہذا نجات صرف اس صورت میں ہے کہ انسان اگلے جہاں کے لیے کچھ کمائی کرے۔

---0 0 0---

# درس نمبر ۱۲۸ تشریح آیات

## ۵۸ --- تا --- ۷۲

وَإِن مِّن قَرْيَةٍ إِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ أَوْ مُعَذِّبُوهَا عَذَابًا شَدِيدًا ۚ كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا ﴿٥٨﴾

"اور کوئی بستی ایسی نہیں جسے ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا سخت عذاب نہ دیں ' یہ نوشتہ الٰہی میں لکھا ہوا ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ جب قیامت آئے تو اس کرۂ ارض کی چھاتی پر حیات کا نام و نشان نہ ہو' لہٰذا قیامت سے قبل اس کرۂ ارض کی تمام زندہ چیزیں ختم ہونے والی ہیں۔ اسی طرح اس کرۂ ارض پر واقع بعض بستیوں کے لیے تباہی مقدر ہے اس لیے کہ وہ جرائم کا ارتکاب کرتی ہیں اور ان جرائم کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ یہ تقدیر اللہ کے علم میں ہوتی ہے کہ ایسا ہونا ہے کیونکہ جو ہو چکا یا جو ہونے والا ہے اللہ کے علم میں دونوں برابر ہیں۔

تمام رسولوں کو معجزات دیئے گئے تھے اور یہ معجزات رسولوں کی حقانیت کی تصدیق کرتے تھے اور ان معجزات کے ذریعے لوگوں کو اس بات سے ڈرایا جاتا تھا کہ اگر انہوں نے تکذیب کی تو ان پر ہلاکت آ جائے گی لیکن ان خوارق عادت معجزات کو دیکھ کر صرف ان لوگوں کو ایمان نصیب ہوا جن کے دل ایمان کے لیے تیار تھے۔ رہے وہ لوگ جن کو کفر پر اصرار تھا تو انہوں نے انکار ہی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی آخر الزمان کو ایسے خارق عادت معجزات نہ دیئے گئے۔

وَمَا مَنَعَنَا أَن نُّرْسِلَ بِالْآيَاتِ إِلَّا أَن كَذَّبَ بِهَا الْأَوَّلُونَ ۚ وَآتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوا بِهَا ۚ وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلَّا تَخْوِيفًا ﴿٥٩﴾

"اور ہم کو نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ ان سے پہلے لوگ ان کو جھٹلا چکے ہیں (چنانچہ دیکھ لو) ثمود کو ہم نے علانیہ اونٹنی لاکر دی اور انہوں نے اس پر ظلم کیا۔ ہم نشانیاں اسی لیے تو بھیجتے ہیں کہ لوگ انہیں دیکھ کر ڈریں"۔

اسلام کا معجزہ فقط یہ قرآن ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو زندگی کا ایک مکمل نظام عطا کرتی ہے۔ یہ کتاب انسان کے دل و دماغ اور عقل و خرد کو اپیل کرتی ہے۔ انسان کی فطرت سلیمہ کو اپیل کرتی ہے۔ پھر یہ ایک زندۂ جاوید اور مسلسل معجزہ ہے' قیامت تک لوگ اسے پڑھیں گے اور ایمان لاتے رہیں گے۔ رہے خارق عادت معجزات تو وہ صرف مخصوص نسل کو اپیل کرتے ہیں' جنہوں نے انہیں دیکھا۔ بعد میں آنے والوں کے لیے وہ ایک تاریخی واقعہ بن جاتے ہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے انبیائے سابقین کے ان معجزات کو دیکھا ان میں سے اکثریت نے ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ اللہ نے بطور نمونہ قوم ثمود کے معجزۂ ناقہ کا ذکر کیا۔ انہوں نے ایک واضح معجزے کا مطالبہ کیا تھا اور یہ ناقہ ان کے طلب کردہ معجزے کے طور پر آئی تھی لیکن انہوں نے اس کے باوجود اس کے ساتھ بے انصافی کی اور اسے ہلاک کر دیا۔ اسی طرح اللہ نے یہ پوری قوم ہلاک کر دی اور معجزات کا صدور ہی اس لیے ہوتا ہے کہ اگر ان کے بعد بھی کوئی تسلیم نہیں کرتا تو اسے ہلاک کر دیا جائے۔

ان انسانی تجربات کا تقاضا یہ تھا کہ آخری رسالت کو خوارق عادت معجزات کی تائید کی ضرورت نہ ہو کیونکہ یہ آخری کتاب اور یہ آخری رسالت ان تمام نسلوں کے لیے ہے جو تاقیامت تک اس دنیا میں آئیں گی۔ یہ صرف ان نسلوں تک محدود نہیں ہے جن کے سامنے حضور اکرمؐ بذات خود موجود تھے کیونکہ یہ آخری رسالت عقل انسانی کے بلوغ کی رسالت ہے اور اب یہ تمام آنے والی نسلوں کی عقل و دانش سے مخاطب ہے۔ اور یہ رسالت انسان کے فہم اور ادراک کی قوتوں کا احترام کرتی ہے کیونکہ اپنے فہم و ادراک ہی کی وجہ سے انسان کو دوسری مخلوقات پر فضیلت دی گئی ہے۔

رہے وہ معجزات جن کا صدور حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ہاتھ پر ہوا' ان میں سے ایک معجزہ واقعہ اسرا اور معراج ہے' تو یہ معجزہ برائے تصدیق رسالت نہ تھا۔ یہ تو لوگوں کی فہم و فراست کی ایک آزمائش تھی۔

وَ اِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْۤ
۶ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَ الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ وَ نُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا
ع ۸ يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا۠ ۝۶۰
۶

"یاد کرو اے نبیؐ' ہم نے تم سے کہہ دیا تھا کہ تیرے رب نے ان لوگوں کو گھیر رکھا ہے اور یہ جو کچھ ابھی ہم نے تمہیں دکھایا ہے' اس کو اور اس درخت کو جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے' ہم نے ان لوگوں کے لیے بس ایک فتنہ بنا کر رکھ دیا۔ ہم انہیں تنبیہ پر تنبیہ کیے جا رہے ہیں مگر ہر تنبیہ ان کی سرکشی میں اضافہ کیے جاتی ہے"۔

واقعہ اسرا کے بعد بعض وہ لوگ جو حضور اکرمؐ پر ایمان لا چکے تھے' مرتد ہو گئے اور دوسرے اہل ایمان اس واقعہ کو سن کر مزید ثابت قدم ہو گئے اور ان کے یقین میں اضافہ ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس رات اللہ نے اپنے بندے کو جو کچھ دکھایا' وہ لوگوں کے لیے فتنے کا موجب بنا اور یہ اہل ایمان کے لیے آزمائش تھی۔ "اللہ نے لوگوں کا احاطہ کر رکھا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ اللہ کا یہ وعدہ تھا کہ لوگ آپؐ کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے

اور ان کی رسائی آپ تک نہ ہو سکے گی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مسلمانوں کو بتا دیا تھا کہ ان کی رسائی ان تک نہیں ہو سکتی کیونکہ آپ کو سچے خواب میں یہ بات من عند اللہ بتا دی گئی تھی اور سفر اسرا میں حضور اکرمؐ کو جو باتیں بتائی گئیں ان میں سے ایک درخت زقوم کے بارے میں تھی کہ یہ جہنمیوں کی خوراک ہوگی اور ابوجہل اور دوسرے مشرکین نے اس کی بھی تکذیب کی اور ابوجہل نے مذاق کے طور پر کہا مجھے کچھ اور مکھن دے دو' جب دیا گیا تو وہ کھجور کے ساتھ مکھن ملا کر کھاتا اور کہتا جاتا۔ کھاؤ اس زقوم کو کہ میں اس کے سوا کسی اور زقوم کو نہیں جانتا"

اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خارق عادت معجزات بھی دے دیئے جاتے تو بھی وہ اس قوم پر اثرانداز نہ ہوتے' جس طرح انبیائے سابقین کے حق میں آنے والے معجزات اور آیات لوگوں کے لیے موجب ہدایت نہ ہوئے۔ جس طرح معجزۂ اسراو معراج اور زقوم کے درخت سے ڈراوے نے ان کو ہدایت نہ بخشی اور وہ مزید سرکشی اختیار کرتے رہے اسی طرح دوسرے معجزات اگر صادر بھی ہو جاتے تو لوگوں پر ان کا کوئی اثر نہ ہوتا۔

اللہ نے عذاب الٰہی کے ذریعہ امت محمدیہ کی ہلاکت لکھی ہوئی نہ تھی' اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان کو ایسا خارق عادت معجزہ نہیں دیا' کیونکہ اللہ کا اصول یہ تھا کہ اگر پھر بھی کوئی تکذیب کرے تو اسے ہلاک کر دیا جائے۔ رہے قریش تو ان کو اللہ نے مہلت دی اور ان کو قوم نوح' قوم ہود' قوم صالح' قوم لوط اور قوم شعیب علیہم السلام کی طرح جڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینکا' کیونکہ قریش کے مکذبین میں سے بیشتر لوگ بعد میں ایمان لائے اور وہ اسلام کے نامور سپاہی بنے۔ اور ان ہی میں سے بعض لوگ نہایت ہی سچے مسلمانوں میں شمار ہوئے اور قرآن کریم 'ایک کھلی کتاب کے طور پر محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے ایک معجزہ ہے۔ اور آج بھی اس پر بے شمار ایسے لوگ ایمان لاتے ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا عہد دیکھا ہی نہیں۔ ہزارہا افراد حلقہ بگوش اسلام ہوئے جنہوں نے قرآن مجید کو پڑھا یا ایسے لوگوں کے شاگرد اور ساتھی اور رفیق بنے جنہوں نے قرآن مجید پڑھا اور سمجھا۔ آنے والی نسلوں کے لیے بھی 'قیامت تک' یہ ایک کھلی کتاب ہو گا اور مستقبل کے پردۂ غیب کے پیچھے ہزارہا لوگ ایسے ہیں جو اس کو پڑھ کر ہدایت لیں گے اور ان میں ایسے لوگ بھی آئیں گے جو نہایت ہی پختہ مومن' نہایت ہی صالح' اسلام کے لیے نہایت ہی مفید اور متقی ہوں گے۔

---ooo---

وہ سچا خواب جو رسول اللہؐ کو دکھایا گیا اور اس خواب کے ذریعے رسول اللہؐ کو جو علوم عطا ہوئے اور جو ملعون درخت رسول اللہؐ کو دکھایا گیا جو شیاطین کے متبعین کی خوراک ہو گا۔ اس کے بعد اسی مناسبت سے ابلیس ملعون کی بحث آتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس شیطان نے بنی آدم کو کس طرح چیلنج دیا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ﴿۶۱﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۫ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ

تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُورًا ﴿٦٣﴾ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ﴿٦٤﴾ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ ۚ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا ﴿٦٥﴾

"اور یاد کرو جبکہ ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو' تو سب نے سجدہ کیا' مگر ابلیس نے نہ کیا۔ اس نے کہا: "کیا میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے؟" پھر بولا: "دیکھ تو سہی' کیا یہ اس قابل تھا کہ تو نے اسے مجھ پر فضیلت دی؟ اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں اس کی پوری نسل کی بیخ کنی کر ڈالوں' بس تھوڑے ہی لوگ مجھ سے بچ سکیں گے"۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اچھا تو جا' ان میں سے جو بھی تیری پیروی کریں' تجھ سمیت ان سب کے لیے جہنم ہی بھرپور جزا ہے۔ تو جس جس کو اپنی دعوت سے پھسلا سکتا ہے پھسلا لے' ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا' مال اور اولاد میں ان کے ساتھ ساجھا لگا' اور ان کو وعدوں کے جال میں پھانس --- اور شیطان کے وعدے ایک دھوکے کے سوا اور کچھ بھی نہیں --- یقیناً میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہو گا۔ اور توکل کے لیے تیرا رب کافی ہے"۔

یہاں بتایا جاتا ہے کہ گمراہ لوگوں کی گمراہی کا اصل سبب کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ قصہ آدم و ابلیس کا یہ منظر یہاں پیش کیا جاتا ہے' تاکہ وہ لوگ جو گمراہی کے اصل اسباب معلوم کرنا چاہتے ہیں ان کو معلوم ہو جائے کہ یہ اسباب کیا ہیں اور یہ کہ شیطان ان کا بنیادی دشمن ہے۔ یہ ان کے جد امجد کا بھی دشمن تھا' یوں انسانوں کے ابو الاباء کا رشتہ بتا کر انہیں ڈرایا جاتا ہے کہ شیطان ان کا جدی دشمن ہے۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا (۱۷:۶۱) "اور یاد کرو جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو' تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا۔ اس نے کہا: "میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے"۔ یہ کبر کی وجہ سے شیطان کے حسد کا ظہور ہے کہ وہ مٹی کو تو دیکھتا ہے' لیکن یہ نہیں دیکھتا کہ اس مٹی میں اللہ نے اپنی روح پھونکی ہوئی ہے۔ یہاں ابلیس بنی آدم کی کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ مٹی سے تخلیق کردہ یہ مخلوق بڑی آسانی سے گمراہ کی جا سکتی ہے۔ وہ بڑے غرور سے کہتا ہے:

قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ (۱۷:۶۲) "ذرا دیکھ تو سہی کیا یہ اس قابل تھا کہ

تو نے اسے مجھ پر فضیلت دی"۔ اس پر نظر تو ڈالو! کیا اس کو تو نے مجھ سے برتر قرار دیا' اور لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ کہا۔

لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۷ : ۶۲) "اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے دے تو میں اس کی پوری نسل کی بیخ کنی کر ڈالوں' بس تھوڑے ہی لوگ مجھ سے بچ سکیں گے"۔ میں ان پر حاوی ہو جاؤں گا اور ان کو اپنی گرفت میں لے لوں گا' ان کی لگام میرے ہاتھ میں ہو گی' بلکہ یہ میری مٹھی میں ہوں گے اور جس طرح چاہوں گا ان کے معاملات میں تصرف کروں گا۔

شیطان کے ذہن میں چیلنج دیتے وقت یہ حقیقت نہ تھی کہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے جس طرح گمراہی کی استعداد رکھی ہے' اس کے ساتھ ساتھ ہدایت اور قبولیت خیر کی استعداد بھی رکھی ہے۔ جب انسان ایسے حالات میں ہو کہ اس کا تعلق باللہ قائم ہو تو وہ بلند ہو گا اور اعلیٰ مدارج کی طرف اٹھنے والا ہو گا اور ایسے حالات میں وہ شر اور گمراہی سے بچ جائے گا' شیطان کو معلوم نہ تھا کہ یہ بلا ارادہ چلنے والے حیوانات کی طرح نہیں ہے بلکہ انسان کو قوت ارادی دی گئی ہے جو اسے دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ ارادہ اور پختہ ارادہ ہی اس مخلوق کی بڑی امتیازی خصوصیت ہے اور اس کے اندر اس مخلوق کا راز پنہاں ہے۔ اللہ کا یہ ارادہ ہو گیا کہ شر و گمراہی کے اس پیغامبر کو کھلا میدان دے دیا جائے اور جس طرح چاہے انسان کو گمراہ کرنے کی سعی کرے۔

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا (۱۷ : ۶۳)

"اللہ نے فرمایا' اچھا تو جا' ان میں سے جو بھی تیری پیروی کریں تجھ سمیت ان کے لیے جہنم ہی بھرپور جزاء ہے"۔

جاؤ جو کرنا چاہتے ہو کرو تمہیں اجازت ہے جس قدر لوگوں کو گمراہ کر سکتے ہو کرو' اس نے ان کو بھی عقل و ارادے کا ہتھیار دے دیا ہے۔ ان کو بھی یہ قوت و اختیار حاصل ہے کہ وہ تیرے مطیع فرمان ہو جائیں یا تم سے اعراض کریں۔

فَمَنْ تَبِعَكَ (۱۷ : ۶۳) "ان میں سے جو تیری پیروی کرے گا"۔ یعنی اپنی ذات کے اندر گمراہی کی استعداد کو زیادہ کرتے ہوئے اور ہدایت کی استعداد کو کمزور کرتے ہوئے' اللہ کی پکار سے اعراض کرتے ہوئے اور شیطان کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے' اس کائنات میں موجود اللہ کی تکوینی آیات و دلائل سے منہ موڑتے ہوئے اور پھر رسولوں کی دی ہوئی آیات اور معجزات سے منہ پھیرتے ہوئے۔

فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا (۱۷ : ۶۳) "تو پھر جہنم تم سب کے لیے بھرپور جزاء ہے۔

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ (۱۷ : ۶۴) "تو جس جس کو اپنی دعوت سے پھسلا سکتا ہے پھسلا دے' ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا"۔ یہاں شیطان کے وسائل گمراہی اور ضلالت کو مجسم طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ کس طرح شیطان انسانوں کے دل' ان کے شعور اور ان کی عقل پر تسلط اختیار کر لیتا ہے۔ گویا آدم و ابلیس کے درمیان کھلی جنگ ہے۔ ہمہ گیر جنگ ہے۔ اس

میں آواز گھوڑے اور ٹینک پیادے اور تمام دوسرے وسائل شیطان استعمال کرتا ہے جیسا کہ تمام روایتی جنگوں کے درمیان ہر قسم کے ہتھیار استعمال ہوتے ہیں۔ آوازیں بھی دی جاتیں اور آوازوں اور مبارزت کی وجہ سے دشمن کو خوفزدہ کیا جاتا ہے۔ استدراج اور کیموفلاج سے کام لیا جاتا ہے۔ جنگی چالیں چلی جاتی ہیں' پہلے کسی دشمن کو کھلے میدان میں لایا جاتا ہے' پھر اس پر وار کیا جاتا ہے یا گھیر لیا جاتا ہے۔

وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ (۱۷: ۶۴) "مال اور اولاد میں ان کے ساتھ ساجھا لگا"۔ جاہلانہ بت پرستی کے اندر یہ شرکت پائی جاتی ہے۔ مثلاً اپنے بنائے ہوئے بتوں اور الہوں کے لیے اہل جاہلیت اپنے اموال میں سے حصے مقرر کرتے تھے۔ یہ تمام حصے گویا شیطان کے تھے۔ اولاد میں شیطان کی حصہ داری یوں تھی کہ اولاد میں سے بعض کو وہ ان الہوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیتے تھے جو درحقیقت شیطان کے ہو جاتے تھے۔ مثلاً عبداللات اور عبدمناۃ اور بعض اوقات وہ براہ راست شیطان کا حصہ کرتے تھے مثلاً عبدالحارث یعنی شیطان کا بندہ۔

اسی طرح وہ تمام دولت جو حرام ذرائع سے آتی تھی یا جو حرام طریقوں میں صرف ہوتی تھی' بدکاریوں اور گناہ گاریوں کی راہ میں جو لٹائی جاتی تھی۔ حرام اولاد بھی شرکت شیطان کا ایک نمونہ ہے۔ یہاں مراد عمومی شرکت ہے۔ ذکر صرف مال اور اولاد کا ہوا ہے اس لیے کہ مال اور اولاد معیشت کے بنیادی فیکٹر ہیں۔

ابلیس کو بنی آدم کے گمراہ کرنے میں ہر قسم کے وسائل استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ یعنی ایسے وعدے جو پورے نہ کیے جا سکیں۔

وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ إِلَّا غُرُورًا (۱۷: ۶۴) "اور ان کو وعدوں کے جال میں پھنسا دے اور شیطان کے وعدے ایک دھوکے کے سوا کچھ نہیں"۔ مثلاً یہ کہ اگر تم نے میری راہ اپنائی تو تم پر کوئی عذاب نہ ہو گا' تم سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا اور یہ کہ حرام ذرائع سے ہر قسم کا مال تمہارے پاس جمع ہو گا۔ تم دنیا میں غالب اور کامیاب رہو گے اور ناپاک ذرائع آمدنی اور نجس طرز معیشت کے تمام دروازے تمہارے لیے کھلے ہوں گے۔

شیطان کا سب سے بڑا جھوٹا وعدہ یہ ہوتا ہے کہ گناہوں اور خطاکاریوں کے بعد تمہیں معاف کر دیا جائے گا۔ یہ وہ سوراخ ہے' جس کے ذریعے شیطان ہر دل میں داخل ہو جاتا ہے خصوصاً ایسے کمزور لوگوں کے دلوں میں جو گناہوں اور خطاکاریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے یا ایسے لوگوں کے دلوں میں جو ارتکاب معصیت میں بے باک ہوتے ہیں اور انہیں قابل فخر و عزت سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ وہ یوں چاپلوسی اختیار کرتا ہے کہ بھائی اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے اور اللہ غفور و رحیم ہے۔ اسے اس بات میں دلچسپی نہیں ہے کہ خواہ مخواہ لوگوں کو سزا دے۔

شیطان! تم جاؤ تمہیں اجازت ہے کہ جو لوگ تمہاری طرف میلان رکھتے ہیں ان کو پھانسو لیکن میرے بعض بندے ایسے بھی ہوں گے جن پر تمہارے داؤ نہیں چلیں گے کیونکہ وہ ایسے قلعوں میں محفوظ ہوں گے جو تمہارے اور تمہاری افواج کی دسترس سے دور ہوں گے۔

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيلًا (۱۷: ۶۵) "یقیناً میرے

بندوں پر تجھے کوئی اقتدار نہ ہوگا اور توکل کے لیے تیرا رب کافی ہے"۔ جب دل اللہ کے ساتھ جڑ جائیں گے' اللہ کی بندگی میں مشغول ہوں گے' جب انسان ایسی رسی تھام لیں گے جو مضبوط ہوگی اور جو ٹوٹنے والی نہ ہوگی۔ جب عالم بالا کی روح ان میں سرایت کر جائے گی تو اس وقت شیطان کی قوت کچھ کام نہ کرے گی۔ یہ دل محفوظ ہوں گے۔ ایسی روحیں اللہ کے نور سے منور ہوں گی اور ایسے لوگوں کا وکیل تمہارا رب ہوگا اور توکل اور بھروسے کے لیے وہ قابل اعتماد ذریعہ ہے۔ وہ بڑا ناصر اور مددگار ہے اور شیطان سے وہی بچانے والا ہے۔

یوں شیطان اپنے وعدے اور اپنے چیلنج کو پورا کرنے میں لگ گیا' بندوں کو ذلیل اور گمراہ کرنا شروع کر دیا۔ لیکن اللہ کے بندوں اور عباد الرحمٰن کے قریب بھی وہ نہ بھٹک سکا' کیونکہ ان پر اس کی ایک نہیں چلتی۔

--- ○○○---

یہ ہے وہ شیطانی منصوبہ جو اس نے انسانوں کے لیے علی الاعلان تیار کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بعض لوگ اس قدر سادہ لوح ہیں کہ شیطان کی اطاعت اختیار کرتے ہیں۔ اس کی باتوں پر کان دھرتے ہیں۔ اللہ کی آواز اور پیغمبروں کی پکار پر کان نہیں دھرتے۔ حالانکہ اللہ ان کے لیے کریم و رحیم ہے۔ اور ان کو صحیح راہ بتلاتا ہے۔ ان کے لیے معیشت کے وسائل اللہ نے پیدا کیے ہیں۔ اللہ ہی ہے جو مشکلات اور کربناک حالات میں ان کی مدد کو پہنچتا ہے۔ اور ایسے حالات میں جب کہ انسان کسی دنیاوی مدد سے مایوس ہوتا ہے' اللہ ان کی مدد کو پہنچتا ہے۔

رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿٦٦﴾ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ ۖ فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ ۚ وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا ﴿٦٧﴾

"تمہارا (حقیقی) رب تو وہ ہے جو سمندر میں تمہاری کشتی چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہارے حال پر نہایت مہربان ہے۔ جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اس ایک کے سوا دوسرے جن جن کو تم پکارا کرتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں' مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اس سے منہ موڑ جاتے ہو۔ انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے"۔

یہاں قرآن کریم ایک عجیب منظر کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ ایک کشتی ہے جو گہرے سمندروں میں چلتی ہے۔ اس سفر میں بعض نہایت ہی کربناک مناظر آتے رہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک منظر ہمارے سامنے ہے۔ سمندر کی گہرائیوں اور تلاطم میں انسان کے اندر کسی فوق الفطرت ہستی کا شعور بہت ہی پیدا ہوتا ہے۔ سمندر کی تاریکیوں اور پہنائیوں میں جہاز لکڑی کا یا دھات کا ہو ایک چھوٹا سا نکتہ ہوتا ہے۔ جو سمندر کی پہاڑ جیسی لہروں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ موجیں اور طوفان اسے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر دھکیلتے چلے جاتے ہیں۔ لوگ مارے خوف کے اس نکتے جیسے چھوٹے سے جہاز سے چمٹے ہوتے ہیں۔

یہ وہ منظر ہے جس کا گہرا احساس ہر اس شخص کو ہوتا ہے جس نے کبھی بحری سفر کیا ہو اور اسے ایسے لمحات پیش آئے ہوں۔ دل خشک اور سانس رکی ہوئی ہوتی ہے اور ہر جھٹکے اور ہر زیروبم سے دل بیٹھتے جاتے ہیں۔ چھوٹا جہاز ہو یا بڑا سب میں ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے۔ نہایت ہی بڑے بڑے بحری جہاز بھی بعض اوقات یوں نظر آتے ہیں جس طرح ایک نہایت ہی سخت طوفان بادوباراں میں ایک پرندے کا پر۔

اس منظر کی تعبیر نہایت ہی حساس انداز سے کی گئی ہے۔ دلوں پر اس کا گہرا اثر ہوتا ہے اور انسان کو یہ شعور ملتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اس کشتی کو چلاتا ہے اور اسے رفتار دیتا ہے تاکہ وہ جہانوں میں چلیں اور اللہ کا فضل و کرم تلاش کریں۔

اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا (۱۷ : ۶۶) "بے شک وہ تمہارے حال پر بہت ہی مہربان ہے"۔ کیونکہ سمندروں میں اللہ کا رحم و کرم سب کا مطلوب ہوتا ہے اور ہر سوار رحمت ربی کا طلبگار ہوتا ہے اور اس کا شعور اپنے اندر پاتا ہے۔

آپ اس کشتی رانی اور خوشگوار سفر کے دوران اچانک مشکلات اور اضطرابات سے دوچار ہوتے ہیں کشتی موجوں کے تھپیڑوں میں گھری ہوتی ہے۔ وہ اس قدر ہچکولے کھاتی ہے کہ اس کے سواروں کو اب اللہ کے سوا تمام باطل الہ بھول جاتے ہیں۔ اب اس ہمہ گیر خطرے میں وہ صرف اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اللہ کے سامنے دست بدعا ہوتے ہیں اور صرف اللہ کو پکارتے ہیں۔

ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِیَّاهُ (۱۷ : ۶۷) "تو اس کے سوا تم جن جن کو پکارتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں"۔

لیکن انسان بہرحال انسان تو ہے ہی۔ جونہی یہ طوفان بیٹھتا ہے' جونہی اس کے قدم خشکی پر پڑتے ہیں' تو یہ کرب اور خوف کے وہ لمحات فوراً بھول جاتا ہے' پھر وہ اللہ کو بھی بھول جاتا ہے۔ اب وہ ہوا و ہوس اور خواہشات اور چاہتوں کی موجوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اور سمندر کے خطرات میں اس کی حقیقی فطرت پر سے جو پردے ہٹ گئے تھے اور جو غبار چھٹ گئی تھی وہ دوبارہ آجاتی ہے۔

فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (۱۷ : ۶۷) "مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اس سے منہ موڑ جاتے ہو۔ انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے"۔ مگر صرف وہ لوگ جن کے دل اللہ سے ملے ہوئے ہوں اور وہ نور ربانی سے منور ہوں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نہایت ہی موثر انداز میں ان کے شعور اور وجدان کو بیدار کرتا ہے کہ سمندر کے جن خطرات سے تم باہر نکل آئے ہو' وہ تو دوسری شکلوں میں خشکی میں بھی تمہارا پیچھا کر رہے ہیں۔ نیز تم لوگ دوبارہ سمندر کے سفر پر بھی تو جا سکتے ہو' مقصد یہ ہے کہ روحانی امن و سکون صرف اللہ کے ساتھ رابطے اور ذکر الٰہی ہی میں ملتا ہے۔ صرف اللہ کے جوار رحمت ہی میں سکون ملتا ہے' حقیقی سکون۔ نہ سمندر میں اور نہ خشکی میں' نہ خوشگوار سمندری سفر میں اور نہ ناقابل کنٹرول بحری امواج میں۔ نہ حصن حصین میں اور نہ محلات اور کوٹھیوں میں۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ یُرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا

ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ﴿٦٨﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ﴿٦٩﴾

"اچھا، تو کیا تم اس بات سے بالکل بے خوف ہو کہ خدا کبھی خشکی پر ہی تم کو زمین میں دھنسا دے، یا تم پر پتھراؤ کرنے والی آندھی بھیج دے اور تم اس سے بچانے والا کوئی حامی نہ پاؤ؟ اور کیا تمہیں اس کا اندیشہ نہیں کہ خدا پھر کسی وقت سمندر میں تم کو لے جائے اور تمہاری ناشکری کے بدلے تم پر سخت طوفانی ہوا بھیج کر تمہیں غرق کر دے اور تم کو ایسا کوئی نہ ملے جو اس سے تمہارے اس انجام کی پوچھ گچھ کر سکے؟"

انسان جہاں ہو اور جس دور میں ہو، جس لمحے میں ہو، وہ اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ جس طرح خشکی میں وہ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں، اسی طرح سمندر میں بھی وہ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہوں۔ تو وہ کس طرح امن میں ہوں گے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کسی زلزلے میں، زمین دھنس میں جائیں، کوئی آتش فشاں پھٹ پڑے یا دوسری کوئی آفت سماوی ان پر ٹوٹ پڑے۔ اگر کوئی آتش فشاں پھٹ پڑے تو ان پر گرم لاوے، گرم پانی، کیچڑ اور پتھروں کا سیلاب آ جائے، اور وہ اس طرح ہلاکت کا شکار ہو جائیں کہ اللہ کے سوا کوئی ان کے لیے ناصر و مددگار نہ رہے۔ کوئی ان کی حمایت نہ کر سکے اور کوئی انہیں بچا نہ سکے۔

پھر کیا گارنٹی ہے کہ وہ دوبارہ سفر پر نہ جائیں یا اللہ انہیں نہ بھیج دے۔ اور دوبارہ ان کو ناقابل کنٹرول موجوں کے حوالے کر دے۔ یا ایسی ہوائیں ان پر آ جائیں کہ کشتیوں اور جہازوں کو توڑ پھوڑ دیں اور ان کو ان کے کفر اور ناشکری کی وجہ سے غرق کر دے اور اگر اللہ ایسا کر دے تو اس سے پھر کون ہے پوچھنے والا۔ کیا یہ لوگ کوئی دادرسی کی جگہ پاتے ہیں؟

خبردار، یہ صریح غفلت ہے کہ لوگ اپنے رب سے منہ پھیر لیں اور پھر مامون ہو کر بیٹھ جائیں کہ ان پر کوئی عذاب نہ آئے گا۔ حالانکہ شدید ترین مصائب میں وہ بتقاضائے فطرت رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لیکن نارمل حالات میں وہ دوبارہ غفلت کے اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں۔ گویا جو شدت اور تکلیف گزری وہ آخری تھی اور دوبارہ کوئی تکلیف ان پر آنے والی نہیں ہے۔ اور پھر خدا کا کوئی عذاب آنے والا نہیں ہے۔

---○○○---

انسان کے یہ لچھن اس حقیقت کے ہوتے ہوئے ہیں کہ اسے اللہ نے اپنی مخلوق کے ایک بڑے حصے پر فضیلت دی ہے۔ سب سے پہلے تو اس کی تخلیق ایک بہترین ہیئت پر کی گئی۔ اس کا بڑا خمیر مٹی سے تیار کیا گیا اور اس کے اندر اللہ نے اپنی روح حیات پھونک دی۔ یوں اس مخلوق کے اندر مادی اور روحانی قوتیں، زمینی اور آسمانی قوتیں جمع ہو گئیں یعنی حضرت انسان کے اس ہیکل میں۔

پھر اللہ نے اس کے اندر عجیب عجیب فطری قوتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ اور ان قوتوں ہی کی وجہ سے وہ خلافت فی الارض کے منصب کا اہل قرار پایا۔ وہ اس زمین میں تبدیلیاں کرتا ہے، اس میں تصرفات کرتا ہے، اس کو نشوونما دیتا ہے اور نئی نئی ایجادات کرتا ہے۔ اس میں وہی ترکیب کرتا ہے اور مرکبات کا تجزیہ کرتا ہے اور زندگی کی نشوونما کو کمال تک

پہنچانے کی سعی کرتا ہے۔

پھر اس پوری کائنات نے 'اس انسان کا استقبال جس انداز میں کیا' وہ بھی اس کی تکریم خاص ہے۔ تمام ملائکہ کو حکم دیا گیا کہ وہ اسے سجدہ کریں۔ یوں ایک کائناتی محفل اور سماوی تقریب میں اسے یہ اعزاز عملاً بخشا گیا رسمی طور پر۔

پھر اس انسان کی تکریم اور عزت افزائی کا اعلان اللہ نے اپنی اس آخری کتاب میں کیا جو اللہ کی آخری کتاب ہے اور ابد الاباد تک رہنے والی ہے 'یعنی قرآن کریم میں۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ
ع ۱۰ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا

"یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی"۔

وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (۱۷ : ۷۰) "اور انہیں خشکی اور تری میں سواریاں عطا کیں"۔ خشکی اور تری میں انسانی ٹرانسپورٹ کا مہیا ہونا صرف اسی وجہ سے ممکن ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پوری کائنات کو ایک ایسی فطرت دی ہے اور ایسا نظام فطرت دیا ہے کہ وہ انسانی زندگی اور اس کی سہولیات کے لیے ممد و معاون ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کے نظام اور خصوصاً زمین و آسمان کی گردش اور ساخت کو انسانی حیات کے موافق نہ بناتا تو اس کے لیے یہاں زندگی گزارنا یا زندہ رہنا ہی مشکل ہوتا۔ نظام فطرت کی قوائے طبیعیہ کو دیکھا جائے تو یہ نسبت انسان کے وہ بہت 'سرکش اور پرقوت ہیں اور انسان کے لیے بحروبر میں یہ حکمرانی ممکن نہ ہوتی۔ لیکن انسان کو اللہ نے وہ قوت دی جس کی وجہ سے اس نے اس کائنات کو مسخر کر لیا اور پھر اسے مسخر کرنے کے بعد اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا اور یہ سب کچھ محض اللہ کے فضل و کرم سے ہوا۔

وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ (۱۷ : ۷۰) "اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا"۔ انسان چونکہ اپنی پوری زندگی' آغاز انسانیت سے یہاں گزار رہا ہے۔ اور دنیا کا ایک طویل عرصہ اور تاریخ گزر چکی ہے۔ اس لیے وہ روئے زمین میں اللہ کی عطا کردہ بے شمار پاکیزہ نعمتوں کو سرے سے شمار ہی نہیں کرتا۔ ان میں سے کسی نعمت کا احساس اسے تب ہوتا ہے جب وہ اس نعمت سے محروم ہوتا ہے۔ جب وہ محروم ہو جاتا ہے تب اسے احساس ہوتا ہے کہ اللہ کی کس قدر نعمت تھی جس سے وہ محروم ہو گیا اور وہ کس قدر مزے لیتا رہا ہے۔ لیکن جب یہ محرومیت دور ہو جاتی ہے تو پھر وہ بھول جاتا ہے۔ یہ سورج' ہوا' پانی' یہ صحت' یہ چلنے پھرنے کی قوت' یہ حواس' یہ عقل' یہ کھانے پینے کی چیزیں' یہ طویل و عریض کائنات جس میں وہ خلیفۃ اللہ ہے اور اس میں۔

لاتعد ولا تحصی طیبات جن سے وہ لطف اندوز ہو رہا ہے۔

وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (۱۷ : ۷۰) "اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فضیلت دی"۔ پہلی فضیلت تو یہ دی کہ اس عظیم کائنات کا خلیفہ اسے بنایا۔ پھر انسان کو ایسی خصوصیات بخشیں کہ وہ پوری مخلوق میں ایک ممتاز مخلوق بن گیا۔ اللہ کی تمام مخلوق میں۔

انسان کی سب سے بڑی تکریم یہ ہے کہ انسان خود اپنا ناظم اور کنٹرولر ہو۔ وہ ذمہ دار ہو اور اپنے افعال و اعمال کے نتائج بھگتے۔ کیونکہ یہی وہ بڑی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے انسان انسان کہلایا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ آزاد ہے جو چاہے کرے اور جو بھی کرے اس کے نتائج و عواقب کا ذمہ دار ہو اور جو بوئے اسے کاٹے۔

یہی وجہ ہے کہ اس دار العمل میں وہ اللہ کا خلیفہ قرار پایا ہے۔ لہٰذا عدل و انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ دار الحساب اور یوم الحساب میں وہ اپنے کئے کا ذمہ دار ہو اور اس نے جو بویا ہو' اسے کاٹے۔

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ وَ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝

"پھر خیال کرو اس دن کا جب کہ ہم ہر انسانی گروہ کو اس کے پیشوا کے ساتھ بلائیں گے۔ اس وقت جن لوگوں کو ان کا نامہ اعمال سیدھے ہاتھ میں دیا گیا۔ وہ اپنا کارنامہ پڑھیں گے اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہ ہو گا اور جو اس دنیا میں اندھا بن کر رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا بلکہ راستہ پانے میں اندھے سے بھی زیادہ ناکام"۔

یہ ایک نیا منظر ہے' مناظر قیامت میں سے۔ تمام لوگ میدان حشر میں ہوں گے۔ ہر جماعت کو اس کے نام و عنوان اور اس کے امام کے ساتھ پکارا جائے گا۔ اگر کسی کا کوئی نبی ہو گا تو وہ ان کا امام ہو گا۔ یا دنیا میں اگر ان کا کوئی پیشوا اور مقتداء ہو گا تو اس کے ساتھ۔ امام کے سامنے ان کو ان کا نامہ اعمال تھمایا جائے گا۔ دائیں ہاتھ' جن کو اعمال نامے دیئے جا رہے ہیں وہ ان کو خوشی خوشی سے پڑھ رہے ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے اعمال کا پورا پورا اجر ان کو مل رہا ہے۔ ایک فتیل (وہ دھاگہ جو گٹھلی کے درمیان ہوتا ہے) کے برابر بھی ان پر ظلم نہ ہو گا۔ جس شخص نے اس دنیا میں دلائل ہدایت کے دیکھنے میں اندھے پن کا ثبوت دیا' وہ وہاں بھی اندھا ہو گا اور اپنے اعمال نامے میں کوئی خیر و ہدایت نہ دیکھ سکے گا۔ اور جزاء پھر معلوم ہے کیا ہو گی؟ سیاق کلام کے اس منظر کو اس طرح بتاتا ہے کہ جس طرح وہ شخص قیامت میں اندھا ہو گا۔ ادھر ادھر ٹاک ٹوئیاں مار رہا ہو گا۔ کوئی ہاتھ پکڑ کر اسے راہ راست پر لے جانے والا نہ ہو گا۔ نہ کوئی ایسا ذریعہ ہو گا۔ جس کی وجہ سے وہ راہ معلوم کر سکے۔ بس اس شخص کو اس منظر میں یوں ہی چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ ادھر ادھر پھر رہا ہے۔ آگے قاری پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ خود سوچ لے کہ ایسے شخص کا انجام کیا ہوا یا ہو گا؟

---ooo---

# درس نمبر ۱۲۹ ایک نظر میں

سورہ اسرا کا یہ آخری سبق بھی اس سورت کے بنیادی محور کے ارد گرد گھوم رہا ہے ۔ یعنی رسول اللہ کی ذات اور ان کی قوم کا ان کے بارے میں موقف ۔ قرآن اور اس کی خصوصیات ۔ یہ اس سورت کا بھی اور اس سبق کا بھی اہم موضوع ہے ۔

اس سبق کا آغاز ان مساعی پر تبصرے سے ہوتا جو مشرکین نبی اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو آپؐ کے عقائد و اعمال میں بعض سے ہٹانے کے سلسلے میں کر رہے تھے ۔ پھر یہ کہ وہ آپ کو مکہ سے نکالنے کے سلسلے میں جو منصوبے بنا رہے تھے اور آپؐ کو کمزور کر کے اور آپؐ کے حامیوں کو کم کر کے وہ جو مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن اللہ نے ان کو ان کے ان ارادوں میں ناکام کر دیا ۔ اور اللہ نے آپؐ کو ان کے فتنوں سے بچالیا ۔ کیونکہ اللہ کے علم میں یہ بات تحریر تھی کہ اہل مکہ کے لیے ابھی تک مہلت موجود ہے ۔ اور ان کے لیے اللہ کے فیصلے میں ایسی تباہی نہ تھی جیسی امم سابقہ کے لیے لکھی گئی تھی ۔ اگر وہ رسول اللہ کو نکالتے یا ایسا اللہ نے مقدر کیا ہوتا تو پھر ان پر بھی وہ عذاب نازل ہوتا جو امم سابقہ پر ہوا کیونکہ اللہ کی سنت نبیوں اور ان کی امتوں کے سلسلے میں ایک ہی ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپؐ اپنی راہ پر چلتے رہیں ' نماز پڑھیں ' قرآن کی تلاوت فرمائیں ۔ اور دعا کریں کہ اللہ آپ کو جہاں بھی لے جائے سچائی کے ساتھ لے جائے اور جہاں سے بھی نکالے سچائی کے ساتھ نکالے اور آپ کے لیے ایک ایسی حکومتی قوت فراہم کرے جو حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مقصد کے حصول کے لیے آپؐ کی نصرت کرے ۔ اور وہ حکومت یہ اعلان کر دے کہ حق آگیا اور باطل چلا گیا اور زائل ہو گیا اور مغلوب ہو گیا ۔ پس یہ ہے اللہ کے ساتھ رابطہ اور یہ ہے وہ زبردست ہتھیار جو آپؐ کو فتنوں سے بچا سکتا ہے اور جو آپؐ کے لیے ایسی قوت بن سکتا ہے جو آپؐ کی نصرت کرے ۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا کہ قرآن ایک شفا ہے اور ان لوگوں کے لیے رحمت کا باعث ہے جو اس پر ایمان لاتے ہیں ۔ اور جو اس کی تکذیب کرتے ہیں وہ ان کے لیے باعث عذاب اور مصیبت ہے ۔ دنیا میں بھی وہ اس کی وجہ سے مصیبت میں رہیں گے اور اس سے روگردانی کی وجہ سے آخرت میں بھی واصل جہنم ہوں گے ۔

اسی مضمون کی مناسبت سے یہ بتایا جاتا ہے کہ رحمت کی حالت میں اور عذاب کی حالت میں انسان کے شب و روز کیسے ہوتے ہیں ۔ جب اس پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے تو وہ متکبر اور حق سے منہ موڑنے والا بن جاتا ہے اور جب وہ گرفتار مصیبت ہوتا ہے تو نہایت ہی مایوس اور شکستہ دل ہوتا ہے اور اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ ہر انسان اپنے طریق کار کے مطابق زندگی اختیار کرتا ہے لیکن اسے معلوم ہونا چاہیے کہ آخرت میں جزاء و سزا بھی اس کے رویہ کے مطابق ہو گی لہٰذا اسے اپنے رویے کا تعین سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے ۔

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ اپنے علمی کمال اور خصوصیت کے باوجود انسان کا علم بہت ہی قلیل ہے۔ یہ اس لیے کہ وہ روح کے بارے میں سوالات کرتے تھے' حالانکہ روح اللہ کے غیوب میں سے ایک غیب ہے' انسانی قوائے مدرکہ میں ابھی اس کے ادراک کی قوت نہیں ہے۔ یقینی علم وہی ہے جو اللہ نے رسول اللہؐ پر نازل کیا ہے۔ یہ اللہ کا رسول اللہ پر بہت ہی بڑا فضل ہے اور اگر اللہ اپنے اس فضل کو واپس لے لے تو اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ لیکن یہ اللہ کا رحم و کرم ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ اعزاز بخشا۔

پھر کہا جاتا ہے کہ یہ قرآن ایک کتاب معجز ہے۔ جنوں اور انسانوں میں سے کوئی بھی ایسی کتاب پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اگرچہ وہ سب جمع ہو جائیں' اور ایک دوسرے کی امداد کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں دلائل ہدایت کو مختلف اسالیب سے پھیر پھیر کر بیان کیا ہے تاکہ ہر معیار علم و دانش کے لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔ لیکن تعجب ہے کہ کفار قریش نے اسے کافی نہ سمجھا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مادی معجزات طلب کرنے لگے مثلاً زمین سے چشمے نکالنا' یا یہ کہ آپ ؐ کے لیے کوئی بہت ہی قیمتی مکان ہو' پھر ان کی ہٹ دھرمی اس حد تک آگے بڑھ گئی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ایسے مطالبات کرنا شروع کر دیئے جو انسانی خصائص کے خلاف تھے' مثلاً یہ کہ آپؐ آسمان میں چڑھ جائیں۔ اور یہ واقعہ ان لوگوں کے سامنے ہو' اس کے بعد آپ ایک لکھی ہوئی تحریر لے کر آئیں جسے وہ پڑھ سکیں یا یہ کہ آسمان کا ایک ٹکڑا ان پر گرا دیں بلکہ اس سے بڑھ کر انہوں نے کفر و ہٹ دھرمی کی حدیں پار کرتے ہوئے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ آپؐ فرشتوں اور خدا تعالیٰ کو سیدھے ان کے سامنے لے کر آ جائیں۔

ہٹ دھرمی پر مبنی ان کے مطالبات کا مذاق اڑایا جاتا ہے کہ اگر یہ لوگ اللہ کی رحمتوں کے خزانوں کے مالک بنا دیئے گئے ہوتے تو بھی یہ انسانی تھڑدلے پن اور کنجوسی کا شکار ہو جاتے اور ان کو یہ خوف لاحق ہو جاتا کہ کہیں خزائن رحمت ربی ختم ہی نہ ہو جائیں' لیکن یہ لوگ جو مطالبات کرتے ہیں اس میدان میں یہ بہت ہی سخی ہیں' کسی حد تک رکتے ہی نہیں اور ایک سے ایک بڑا مطالبہ کر رہے ہیں۔

ان کے ان بے جا مطالبات کی بحث ہی کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے کیسے کیسے خارق عادت معجزات دیئے تھے لیکن اس کے باوجود بھی فرعون اور اس کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو قبول نہ کیا۔ تو اللہ نے فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کر دیا۔ جس طرح اللہ کی سنت ہے کہ وہ مکذبین کو ہلاک فرماتا ہے۔

رہا قرآن مجید تو وہ تو باقی رہنے والا اور برحق معجزہ ہے۔ اس کا نزول متفرق طور پر ہوا ہے۔ امت کی ضرورت اور حاجت کے مطابق یہ وقتاً فوقتاً نازل ہوا ہے۔ امم سابقہ کے اہل علم بھی جانتے ہیں کہ یہ کتاب کتاب حق ہے۔ وہ اس پر یقین کرتے ہیں اور بہت ہی ڈرتے ہیں اور ایمان لا کر سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

سورت کا خاتمہ اس مضمون اور ہدایت پر ہوتا ہے کہ رسول اللہ اللہ کی بندگی کریں۔ صرف اللہ کی بندگی اور اللہ کی حمد و ثنا کریں۔ جس طرح سورت کا آغاز بھی اسی مضمون سے ہوا تھا یعنی اللہ کی پاکی اور تسبیح کے ساتھ۔

---○○○---

# درس نمبر ۱۲۹ تشریح آیات

## ۷۳ --- تا --- ۱۱۱

وَ اِنْ كَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا
غَیْرَهٗ ۖۗ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِیْلًا۝ وَ لَوْ لَاۤ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ
اِلَیْهِمْ شَیْــًٔا قَلِیْلًا ۗۙ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَیٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا
تَجِدُ لَكَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا۝ وَ اِنْ كَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِیُخْرِجُوْكَ
۸ مِنْهَا وَ اِذًا لَّا یَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِیْلًا۝ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ
ع ۷ رُّسُلِنَا وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِیْلًا۝ۧ
۸

"اے نبی" ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو۔ اگر تم ایسا کرتے تو وہ ضرور تمہیں اپنا دوست بنا لیتے۔ اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔ لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا' پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔ اور یہ لوگ اس بات پر بھی تلے رہے ہیں کہ تمہارے قدم اس سرزمین سے اکھاڑ دیں اور تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں۔ لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمہارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے۔ یہ ہمارا مستقل طریق کار ہے جو ان سب رسولوں کے معاملے میں ہم نے برتا ہے جنہیں تم سے پہلے ہم نے بھیجا تھا اور ہمارے طریق کار میں تم کوئی تغیر نہ پاؤ گے"۔

یہاں اللہ تعالیٰ ان کوششوں کا ذکر فرماتے ہیں جو مشرکین مکہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اپنے موقف سے ہٹانے کے سلسلے میں کرتے تھے۔ ان کی پہلی کوشش یہ تھی کہ حضورؐ قرآن میں کچھ تبدیلیاں کر دیں اور ان کے خیال میں جو بعض بہت سخت باتیں تھیں' ان کو بدل کر دوسری باتیں لے آئیں' اگر آپ ایسا کرتے تو یہ اللہ پر افتراء ہوتی' لیکن ایسا کیسے ممکن

تھا' کیونکہ آپ صادق و امین تھے۔

یہ کوشش انہوں نے مختلف تجاویز دے کر کی مثلاً ایک تجویز انہوں نے یہ دی کہ وہ حضور اکرمؐ کے اللہ کی بندگی کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ حضورؐ ان کے الہوں پر تنقید چھوڑ دیں۔ نیز ان کے آباء و اجداد جو کچھ کرتے رہے' ان کو بھی برا بھلا نہ کہیں' بعض لوگوں نے یہ کہا کہ وہ اس بات کے لیے تب تیار ہوں گے کہ جب وہ ان کے علاقے کو بھی اسی طرح حرام قرار دے دیں جس طرح بیت اللہ حرام ہے۔ بعض اکابرین مکہ کا مطالبہ یہ تھا کہ ہم ایمان لانے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ آپؐ ہمارے لیے ایک خاص مجلس مقرر کر دیں اور فقراء کے لیے ایک الگ مجلس وغیرہ وغیرہ۔

اس آیت میں ان کوششوں کی طرف ایک اجمالی اشارہ کیا گیا ہے۔ تفصیلات نہیں دی گئیں۔ مقصد یہ بتانا ہے کہ اے محمدؐ تم پر یہ اللہ کا فضل و کرم تھا کہ تمہیں راہ حق پر ثابت قدم رکھا اور تمہیں مشرکین کے فتنوں سے بچایا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اس ثابت قدمی کو واپس لے لیتا اور جو عظمت آپ کو دی ہوئی تھی' وہ کھینچ لیتا تو آپؐ ان مطالبات کو مان کر ان کی طرف جھک جاتے اور اس طرح یہ کفار آپؐ کو دوست بنا لیتے اور پھر آپ کے اس جھکنے کی سزا آپ کو ملتی۔ اور پھر یہ عذاب دوسرے عام لوگوں کے مقابلے میں اس زندگی اور قیامت دونوں میں دوچند ہوتا اور پھر یہ لوگ آپ کی کوئی نصرت اور مدد بھی نہ کر سکتے۔

یہ کوششیں اور سازشیں' جن سے اللہ نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بچایا' ہر دور کے کبراء' داعیان حق کو پھسلانے کی خاطر کرتے رہے۔ مثلاً وہ داعیان حق کو اپنے موقف سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ دعوت اسلامی کی سختی میں قدرے نرمی کر دی جائے اور اس سیدھے راستے میں ٹیڑھ پن پیدا کر دی جائے۔

کبرائے وقت ہمیشہ درمیانی درجے کی راہ تلاش کرتے رہے ہیں اور اہل حق کو معاونت کی نیز بڑے بڑے مفادات کی پیشکشیں کرتے رہے ہیں اور راہ حق سے بھٹکانے کی سعی کرتے رہے ہیں۔ بعض داعیان حق معاملے کو معمولی سمجھتے ہوئے اپنی دعوت میں تبدیلی کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کبراء اور اہالیان حکومت ایسے داعیان حق سے یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ وہ اپنی دعوت کو بالکل چھوڑ دیں۔ البتہ وہ اس قدر غیر محسوس اور معمولی تبدیلیوں کا مطالبہ کرتے ہیں جن کے نتیجے میں دونوں فریق ایک دوسرے کے ساتھ گزارہ کر سکیں۔ شیطان بعض داعیان حق کو اس نکتے پر پھسلا دیتا ہے اور داعیان حق یہ سمجھتے ہیں کہ دعوت اسلامی کا مفاد بھی اسی میں ہے کہ کوئی بر سر اقتدار بڑا آدمی دعوت اسلامی کا حامی بن جائے۔ اگرچہ اس سلسلے میں انہیں اپنے موقف میں بعض تبدیلیاں لانی کیوں نہ پڑیں۔

لیکن نکتہ آغاز سے جب راہ حق سے ایک معمولی سے انحراف کا آغاز کیا جائے تو راستے کی انتہا میں جا کر وہ انحراف بہت بعید پیدا کر دیتا ہے۔ جب کوئی شخص آغاز دعوت میں اس کے کسی معمولی سے جزء میں بھی کمزوری دکھاتا ہے اگرچہ یہ بہت ہی معمولی جزء کیوں ہو یا کسی نہایت ہی جزئی مسئلے سے غفلت برتی جائے اور چشم پوشی کی جائے تو پھر داعی کے بس میں یہ بات نہیں رہتی کہ وہ کسی حد پر جا کر رکے کیونکہ جب ایک آدمی ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار ہو جائے تو پھر وہ ہتھیار ڈالتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور وہ ایک کے بعد دوسری پسپائی اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے پوری دعوت کو قبول کیا ہے۔ اور مکمل اسلامی نظام کے قیام کی دعوت ہماری دعوت ہے۔ اس لیے جو شخص بھی اسلامی نظام کے کسی جزء کو نظر انداز کرتا ہے اگرچہ وہ بہت ہی چھوٹا اور جزئی مسئلہ کیوں نہ ہو' اور جو

شخص دعوت اسلامی کے کسی بھی چھوٹے مسئلہ کے بارے میں خاموشی اختیار کرتا ہے وہ دعوت اسلامی پر درحقیقت مومن نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایک مومن کی نظر میں دعوت اسلامی کا ہر جزء اہم ہوتا ہے۔ اسلامی نظام کے اجزاء میں سے کوئی جزء فاضل و مفضول نہیں ہے۔ اس میں ضروری اور غیر ضروری کچھ بھی نہیں۔ اس میں کوئی ایک جزء بھی ایسا نہیں ہے جس سے انسان بری الذمہ قرار دیا جا سکے۔ اسلامی نظام ایک کل ہے' اگر اس میں سے ایک جزء بھی غائب کر دیا جائے تو تمام اجزاء بے مقصد ہو جاتے ہیں۔ جس طرح کوئی دوائی ترکیب' کسی نسخے اور فارمولے سے ایک جزء غائب ہو جانے تو تمام دوسرے اجزاء کے خواص کام نہیں کرتے۔

اہل اقتدار کا طریقہ واردات یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلامی نظام کے اجزاء کو ایک ایک کر کے' داعیان نظام اسلامی سے ترک کراتے ہیں۔ جب اہل حق کسی ایک جزء پر مسالمت اور صلح کرتے ہیں تو ان کی پوزیشن ختم ہو جاتی ہے۔ اور اہل اقتدار اور ڈکٹیٹر پھر ایک ایک بات پر سودا بازی کی کوشش کرتے ہیں اور آخر کار وہ اپنی تمام شرائط منوالیتے ہیں اور دعوت اسلامی کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔

یہ کہ بر سر اقتدار (اور بااثر) لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اپنی دعوت کے کسی معمولی جزء سے چشم پوشی کرنا' درحقیقت شکست خوردگی ہے۔ روحانی اور اخلاقی شکست کو تسلیم کرنا ہے۔ اور یہ بر سر اقتدار اور بااثر لوگوں پر اعتماد کرنا ہے کہ وہ دعوت اسلامی کی حمایت کریں گے۔ حالانکہ ایک سچا مومن اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں صرف اللہ پر اعتماد کرتا ہے' صرف اللہ پر بھروسہ کرتا ہے۔ لیکن جب داعیوں کے قلب و نظر میں شکست نے راہ پالی تو پھر یہ شکست شکست ہی ہوگی اور کسی صورت میں بھی اسے فتح سے نہ بدلا جا سکے گا۔

اللہ کا یہ رسول اللہ پر بہت بڑا احسان تھا کہ اللہ نے حضورؐ کو اسلامی نظام حیات اور ان تمام امور پر ثابت قدم کر دیا تھا جو آپؐ کی طرف وحی ہوتے تھے۔ اور مشرکین نیز مشرکانہ معاشرے کے تمام فتنوں سے اللہ نے آپؐ کو بچا لیا تھا۔ اور آپؐ کو اس قدر ثابت قدمی عطا کر دی تھی کہ آپؐ کسی دینی معاملے میں ان کی طرف نہ جھکتے تھے۔ اگرچہ وہ معمولی سا کیوں نہ ہوتا اور دین کے معاملے میں مداہنت کے عذاب سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ نے بچا لیا' جو دنیا میں بھی ہوتا ہے اور آخرت میں بھی اس سے دوچند ہوتا ہے اور دنیا میں یوں کہ ایسے داعیوں کو اللہ کی معاونت اور نصرت حاصل نہیں رہتی۔

جب مشرکین اس کوشش میں ناکام ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' بعض قرآنی ہدایات کو چھوڑ دیں یا بدل دیں اور ان کی یہ سازش کامیاب نہ ہوئی تو انہوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ سے نکال دیں لیکن وہ آپؐ کو نکالنے میں بھی کامیاب نہ ہوئے تو اللہ نے بذریعہ وحی حضورؐ کو حکم دیا کہ آپؐ خود مہاجر الی اللہ بن کر مدینے چلے جائیں کیونکہ اللہ کا فیصلہ یہ تھا کہ اہل قریش کو ہلاک نہ کیا جائے۔ اور اگر وہ زبردستی رسول اللہؐ کو نکال دیتے یا آپ کو نکلنے پر مجبور کر دیتے تو ان پر تباہی ایک عذاب کی صورت میں نازل ہو جاتی۔ اور وہ نیست و نابود ہو جاتے'

وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۷ : ۷۶) "اگر وہ ایسا کریں گے تو تمہارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے"۔ کیونکہ یہ اللہ کی جاری و ساری سنت ہے۔

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا (۱۷:۷۷) "یہ ہمارا مستقل طریق کار ہے جو ان سب رسولوں کے معاملے میں ہم نے برتا ہے جنہیں تم سے پہلے ہم نے بھیجا تھا اور ہمارے طریق کار میں تم کوئی تغیر نہ پاؤ گے"۔

اللہ تعالیٰ نے یہ اٹل قانون بنایا ہے کہ جو قوم رسول کو ملک بدر کر دیتی ہے اللہ اسے نیست و نابود کر دیتا ہے۔ کیونکہ رسولوں کا ملک بدر کرنا اس قدر بڑا جرم ہے کہ اسے سرزنش کے بغیر نہیں چھوڑا جاتا۔ اللہ کی اس کائنات کو اس کے اٹل قوانین اور سنن چلا رہے ہیں اور لوگوں کے انفرادی اعمال کا اس میں کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ یہ کائنات محض اتفاقات کے مطابق نہیں چل رہی ہے کہ کچھ واقعات ہو جائیں اور گزر جائیں اور یہ کائنات یونہی چل رہی ہو۔ بلکہ اس کائنات کو اللہ کے اٹل قوانین کنٹرول کرتے ہیں۔ چونکہ عالم بالا میں' بعض حکمتوں کی بنا پر یہ طے تھا کہ قریش کو ہلاک اور نیست و نابود نہیں کرنا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام کو طبیعی خوارق عادت معجزات نہیں دیے اور نہ قریش کو ہمت دی کہ وہ رسول اللہ کو زبردستی یا حالات سے مجبور کر کے مکہ سے نکال دیں بلکہ بذریعہ وحی حکم دیا کہ آپ اس آبادی کو خود ہی چھوڑ دیں۔ یوں اللہ کی سنت جاری و ساری رہی۔

---()()()---

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اللہ سے لو لگائے رکھیں' اللہ سے نصرت اور معاونت طلب کرتے رہیں اور جس راہ کو آپ نے اپنایا ہے اس پر چلتے رہیں۔ حق کا بول بالا ہو گا اور باطل مغلوب اور زائل ہو گا۔ ان شاء اللہ۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾ وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖۗ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾ وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۸۰﴾ وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾ وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَ لَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

"نماز قائم کرو غروب آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو کیونکہ قرآن فجر

مشہود ہوتا ہے اور رات کو تہجد پڑھو یہ تمہارے لیے نفل ہے 'بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر فائز کر دے ۔ اور دعا کرو کہ پروردگار 'مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے ۔ اور اعلان کر دو کہ "حق آگیا اور باطل مٹ گیا' باطل تو مٹنے ہی والا ہے"۔ ہم اس قرآن کے سلسلہ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لیے تو شفا اور رحمت ہے 'مگر ظالموں کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا"۔

دُلُوكِ الشَّمْسِ سے مراد ہے سورج کا غروب کی طرف مائل ہونا یعنی غروب آفتاب سے لے کر اندھیرے تک ۔ یہ حکم خاص نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ہے ۔ جہاں تک پانچ فرض نمازوں کا تعلق ہے تو ان کے اپنے اوقات ہیں اور تواتر سے احادیث رسول کے ذریعہ ثابت ہیں ۔ نیز آپ کی عملی سنت بھی متواتر ہے ۔ بعض نے دلوک الشمس سے مراد زوال آفتاب لیا ہے یعنی آسمان کے درمیان سے آفتاب کا گزر جانا اور غسق اللیل کی تفسیر بعض لوگوں نے اول لیل سے کی ہے ۔ اور قرآن الفجر سے مراد صبح کی نماز کی گئی ہے ۔ اور یوں اس آیت سے زوال آفتاب سے رات کے اندھیروں تک ۔ دُلُوكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ (۱۷:۷۸) سے ظہر 'عصر 'مغرب اور عشاء کی نمازیں لی گئی ہیں اور تہجد کا حکم حضور اکرمؐ کے لیے مخصوص کیا گیا ہے اور یہ آپؐ کے لیے نفل یعنی زائد حکم ہے ۔ لیکن ہماری رائے پہلی تفسیر ہی کی طرف جاتی ہے ۔ یعنی اس آیت کے تمام احکام رسول اللہ کے ساتھ مختص ہیں اور پانچ نمازوں کے اوقات احادیث متواترہ اور سنت عملیہ متواترہ سے ثابت ہیں ۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ (۱۷:۷۸) "یعنی نماز قائم کرو جب سورج غروب کی طرف جھکنے لگے اور رات آنے لگے اور تاریکیاں چھانے لگیں"۔ اور صبح کے وقت کا قرآن پڑھو ۔

اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (۱۷:۷۸) "اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو کیونکہ قرآن فجر مشہود ہوتا ہے"۔ ان دونوں اوقات کی اپنی خصوصیات بھی ہیں ۔ دن کا جانا اور شب کا آنا یا رات کا جانا اور دن کا آنا' نفس انسانی پر دونوں اوقات گہری تاثیر چھوڑتے ہیں ۔ جب رات آتی ہے تو اس میں تاریکیاں آگے بڑھتی ہیں اور جب دن نمودار ہوتا ہے تو روشنیاں آگے بڑھتی ہیں ۔ دونوں اوقات میں قلب اور فکر و نظر پر مخصوص اثرات ہوتے ہیں ۔ دونوں اوقات میں انسانی دماغ اس کائناتی نظام پر غور و فکر کرنے کے لیے مائل ہوتا ہے ۔ انسان اس ناموس فطرت کے بارے میں سوچتا ہے کہ یہ ناموس چل رہا ہے اور اٹل ہے ۔ نماز کی طرح صبح کے وقت قرآن کے مطالعے کا بھی نفس انسانی پر گہرا اثر پڑتا ہے ۔ ذہن میں تازگی آجاتی ہے ۔ نہایت سکون اور ٹھنڈے دل سے انسان سوچتا ہے اور سمجھتا ہے ۔ روشنی آرہی ہوتی ہے 'زندگی کی نبض متحرک ہو جاتی ہے اور زندگی بھرپور طور پر حرکت میں آجاتی ہے ۔

وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (۱۷:۷۹) "اور رات کو قرآن کے ساتھ تہجد پڑھو یہ تمہارے لیے نفل ہے"۔ تہجد سے مراد پچھلی رات کی وہ نماز ہے جو رات کے اول حصے میں سونے کے بعد اٹھ کر پڑھی جاتی ہے اور بہ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے یعنی رات کو قرآن کے ساتھ تہجد پڑھو کیونکہ قرآن مجید نماز کی روح ہے اور نماز کا بنیادی عنصر ہے ۔

عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (۱۷ : ۷۹) "بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر فائز کر دے"۔ یعنی نماز کی پابندی' قرآن فجر کی تلاوت اور تہجد گزاری اور اللہ کے ساتھ اس پختہ اور دائمی تعلق کی وجہ سے۔ کیونکہ مقام محمود تک پہنچنے کا یہی راستہ ہے۔ جب مقام محمود تک پہنچنے کے لیے اللہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور برگزیدہ رسول کو حکم دیتا ہے کہ وہ نماز پڑھیں' قرآن کی تلاوت کریں اور تہجد پر عمل پیرا رہیں تو دوسرے لوگ ان عبادات کے زیادہ محتاج ہیں اور وہ اپنے لیے مقرر مراتب تک تب ہی پہنچ سکتے ہیں جب وہ ان عبادات پر اچھی طرح عمل پیرا ہوں۔ یہی صحیح راستہ اور یہی تحریک اسلامی کے کارکنوں کا زاد راہ ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (۱۷ : ۸۰) "اور دعا کرو' کہ پروردگار مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے"۔ یہ دعا ہے جو اللہ اپنے نبی ؐ کو سکھاتا ہے تاکہ وہ ان الفاظ میں اللہ کو پکارے۔ اور آپ ؐ کے بعد آپ کی امت کو بھی معلوم ہو کہ وہ کس طرح اللہ کو پکارے اور کن معاملات میں اللہ کی طرف متوجہ ہو' سچائی کے ساتھ دخول اور سچائی کے ساتھ خروج کی دعا کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ میرا اول اور آخر' اور اولیٰ اور آخری کے مابین تمام مراحل میں مجھے سچائی پر قائم رکھ۔ اور یہاں سچائی کی دعا کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ جس مرحلے میں یہ آیات آئیں اس وقت کفار یہ مطالبہ کرتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی بعض سخت باتیں بدل کر اپنی طرف سے نرم باتیں اس میں داخل کر دیں اور ظاہر ہے کہ یہ اللہ پر افتراء ہوتا۔ نیز سچائی کا اپنا پرتو اور رنگ ہوتا ہے' مثلاً ثابت قدمی' اطمینان' پاکیزگی معاملات' اخلاص وغیرہ سب کے سب سچائی کے رنگ ہیں۔

وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (۱۷ : ۸۰) "اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے"۔ ایک قوت' ہیبت مجھے حاصل ہو جائے' جس کی وجہ میں زمین کے اقتدار پر قابض ہو جاؤں اور مشرکین کی قوت کو مغلوب کر لوں۔

مِنْ لَّدُنْكَ (۱۷ : ۸۰) یعنی (اپنی طرف سے) میں یہ رنگ ہے کہ اللہ کے ساتھ حضور اکرم ؐ کا گہرا قرب ہے۔ اور آپ ؐ صرف اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں اور صرف اس سے مدد کے طلبگار ہیں اور اللہ ہی حمایت و حفاظت میں اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔

کوئی بھی داعی صرف اللہ ہی سے اقتدار کا طالب ہوتا ہے اور ایک داعی سے لوگ صرف اس صورت میں خوف کھاتے ہیں کہ وہ الٰہی قوت سے مسلح ہو۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی حاکم اور صاحب اقتدار نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یا کسی داعی کی حمایت پر کمربستہ ہو جائے بلکہ کسی دنیاوی قوت سے پہلے داعی کو الٰہی قوت سے لیس ہونا ضروری ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی تحریک اور دعوت بعض اوقات اہل اقتدار اور صاحب قوت لوگوں کے دلوں کو فتح کر

لیتی ہے' اور وہ دعوت کے سپاہی بن جاتے ہیں اور دعوت کی خدمت کرتے ہیں اور فلاح پاتے ہیں۔ لیکن اگر دعوت اور تحریک کسی بادشاہ یا صاحب اقتدار کے تابع ہو اور اس کی سپاہ گری کا کام کرے اور کسی شخص کی خدمت گار ہو تو وہ دعوت کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ دعوت اسلامی تو امر الہی ہے' اور اسے اعلیٰ و ارفع ہونا چاہیے۔ اور اہل اقتدار اور ذی جاہ لوگوں کو اس کا خادم ہونا چاہیے۔

وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱۷ : ۸۱) "اور اعلان کر دو کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا' باطل تو مٹنے ہی والا ہے"۔ یعنی اللہ کی جانب سے جو اقتدار نبی اور داعیوں کو ملتا ہے اس کی بدولت۔ اے نبیؐ اعلان کر دو کہ یہ اقتدار اب آ ہی گیا اور اس کی وجہ سے باطل گویا مٹ ہی گیا کیونکہ حق اپنے اندر قوت' سچائی اور ثبات رکھتا ہے۔ اور باطل کے مزاج میں کمزوری اور مٹنا ہے۔ سچائی کا مزاج یہ ہے کہ وہ زندہ رہے' پھلے پھولے اور قائم و دائم رہے اور باطل کا مزاج ہی یہ ہے کہ وہ مٹ جائے' ختم ہو جائے اور اس کا نام و نشان تک نہ رہے۔

"باطل مٹنے والا ہے"۔ یہ ایک الہی حقیقت ہے اور اللہ اسے نہایت ہی تاکیدی الفاظ میں بیان فرماتا ہے۔ اگرچہ بظاہر باطل رائج نظر آئے' اس کی حکومت ہو اور اس کا رعب ہو' کیونکہ باطل پھلا اور پھولا نظر آتا ہے لیکن اس کا موٹاپا بیماری کا موٹاپا ہوتا ہے۔ وہ چونکہ بے حقیقت ہوتا ہے اس لیے اس کے غبارے سے جلد ہی ہوا نکل جاتی ہے۔ اور اس پر کبھی کسی قوم کو اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن باطل ایسے ذرائع اختیار کرتا ہے کہ لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر کے ان کو مرعوب کر دے اور ایسے ذرائع اختیار کرتا ہے کہ وہ مستقل اور پختہ اور ایک عظیم نظام نظر آئے لیکن اس کی مثال ایسی خود رو گھاس کی ہوتی ہے جو جلد ہی خشک ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ کسی خشک گھاس اور پھوس کو آگ لگ جائے تو یکدم شعلے آسمانوں تک پھیل جاتے ہیں لیکن جلد ہی وہ شعلے بیٹھ جاتے ہیں اور راکھ کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ جبکہ ایک مضبوط انگارہ دھکتا رہتا ہے اور اس کی چنگاریاں دیر تک راکھ میں بھی دبی رہتی ہیں یا اس طرح کہ وہ جھاگ کی طرح ہوتا ہے۔ یکدم پھول جاتا ہے لیکن جلدی بیٹھ جاتا ہے اور پانی جو ایک حقیقت رکھتا ہے اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱۷ : ۸۱) "بے شک باطل مٹنے ہی والا ہے"۔ کیونکہ باطل کے اندر باقی رہنے والے عناصر ہی نہیں ہوتے۔ بعض خارجی عوامل ہوتے ہیں جن سے وہ وقتی طور پر فائدہ لیتا ہے۔ اس کا وجود غیر طبیعی ہوتا ہے۔ جب یہ خارجی عوامل ختم ہوتے ہیں اور یہ خارجی سہارے دور ہوتے ہیں یا کمزور پڑتے ہیں تو یہ دھڑام سے گرتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں تک حق اور سچائی کا تعلق ہے اس کی ذات کے اندر اس کے دوام کا سامان ہوتا ہے۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ لوگوں کی خواہشات نفس سچائی کے خلاف ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ماحول سچائی کے خلاف ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات وقت کے اہل اقتدار سچائی کے خلاف ہوتے ہیں۔ لیکن حق کا ثبات اس کا سکون و اطمینان آخر کار اسے فتح سے ہمکنار کرتا ہے اور اس کے بقاء کا ضامن ہوتا ہے اس لیے کہ یہ حق اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور اللہ کا نام ہی حق ہے اور اللہ چونکہ زندہ باقی اور لازوال ہے اس لیے سچائی اور حق بھی لازوال ہے۔

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱۷ : ۸۱) "بے شک باطل مٹنے والا ہے"۔ اس کے پیچھے بعض اوقات

بڑی قوت ہوتی ہے اور وقت کا اقتدار بھی اس کا حامی ہوتا ہے لیکن اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ کی قوت اور سلطنت اور اقتدار بزرگ و برتر ہے۔ جن اہل ایمان نے ایمان کا حقیقی ذائقہ چکھ لیا ہوتا ہے وہ اللہ کے وعدے کی مٹھاس اور اللہ کے اس وعدے کی سچائی کو محسوس کرتے ہیں۔کون ہے جو اللہ سے زیادہ عہد کو پورا کرنے والا ہے اور کون ہے جو اللہ سے زیادہ سچی بات کرنے والا ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۷ : ۸۲) "ہم اس قرآن کے سلسلہ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لیے تو شفا اور رحمت ہے"۔ یقیناً قرآن میں شفاء ہے۔ یقیناً قرآن میں رحمت الٰہی کے خزانے ہیں۔لیکن ان لوگوں کے لیے جن کے دلوں میں ایمان کی تازگی داخل ہو چکی ہو' ان کے دل روشن ہو چکے ہوں اور وہ قبولیت حق کے لیے کھل گئے ہوں اور وہ روح قرآن کو اپنے اندر جذب کر رہے ہوں اور ان کے دلوں میں سکون اور سکینت اور طمانیت داخل ہو چکی ہو۔

قرآن کریم تمام وسوسوں' تمام حیرانیوں' اور تمام بے چینیوں کی دوا ہے اور اس میں ان روحانی بیماریوں کی شفاء ہے۔ یہ بندے کے دل کو اللہ سے جوڑتا ہے۔یوں اسے سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے اور اسے یہ شعور ملتا ہے کہ وہ اللہ کی حمایت میں ہے اور حالت امن و سلامتی میں ہے۔اس طرح وہ اللہ سے راضی ہو کر راضی رہتا ہے' زندگی خوشی سے گزارتا ہے اور زندگی کے جو حالات بھی ہوں ان میں راضی رہتا ہے۔بے چینی بھی ایک قسم کا مرض ہے' حیرانی بھی ایک مرض ہے۔وسوسہ بھی ایک بیماری ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اہل ایمان کے لیے رحمت ہے۔

اسی طرح قرآن مجید 'ہوائے نفس' گندگی' لالچ' حسد اور شیطان کی وسوسہ اندازیوں کے مقابلے میں بھی شفاء ہے۔ یہ قلبی اور روحانی بیماریاں ہیں جن کے نتیجے میں دلی بیماریاں ضعف اور تکان پیدا ہوتی ہے۔اور انسانی روح اور دل بوسیدہ ہو کر ٹوٹ جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مومنین کے لیے شفاء و رحمت ہے۔

قرآن کریم میں شعور اور فکر کی بے لگامی کا بھی علاج ہے۔عقل و فکر کے انتشار سے انسان محفوظ رہتا ہے۔قرآن انسان کو بے فائدہ کاموں میں اپنی جسم و عقل کی قوتوں کے خرچ کرنے سے روکتا ہے۔اور مفید اور ترقی کے کاموں میں اپنی قوتیں صرف کرنے کے لیے آزاد چھوڑتا ہے۔وہ انسان کے لیے ایک صحت مند اور مضبوط منہاج زندگی تجویز کرتا ہے۔انسانی سرگرمیاں فائدہ مند اور محفوظ ہوتی ہیں اور لغزشوں اور بے راہ رویوں سے قرآن انسان کو بچاتا ہے۔جسمانی میدان میں بھی قرآن انسان کو اعتدال کی راہ دکھاتا ہے۔وہ حکم دیتا ہے کہ اپنی قوتوں کو اعتدال کے ساتھ صحت مند میدانوں میں خرچ کرو' نہ جسمانی قوتوں پر غیر ضروری پابندی ہے اور نہ ان کے استعمال میں بے راہ روی کی اجازت دی گئی ہے۔لہٰذا جسمانی قوت کی بھی حفاظت کی جاتی ہے' تاکہ وہ صحت مند میدانوں میں صرف ہو۔لہٰذا یہ اہل ایمان کے لیے ایک قسم کی رحمت ہے۔

پھر قرآن شریف میں ان اجتماعی بیماریوں کا بھی علاج ہے جن سے کسی سوسائٹی کے اجتماعی نظام میں خلل اور بیماری پیدا ہوتی ہے' جن سے سوسائٹی کا امن اور سلامتی تباہ ہو جاتی ہے۔اور افراد معاشرہ کے درمیان کوئی اطمینان نہیں رہتا۔ قرآنی ہدایات پر عمل کے بعد اسلامی سوسائٹی اسلام کے اجتماعی عدل اور اجتماعی سلامتی اور امن کے زیر سایہ' نہایت ہی

اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے' لہٰذا اس مفہوم میں بھی قرآن رحمت اور شفاء ہے۔

وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا (۱۷ : ۸۲) "مگر ظالموں کے لیے خسارے کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا"۔ کیونکہ ظالم اس نسخہ و شفاء سے استفادہ نہیں کرتے' جو اس قرآن کے اندر موجود ہے۔ پھر ظالم یوں بھی خسارے میں ہوتے ہیں کہ وہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان قرآن کے ذریعہ سربلندی حاصل کرتے چلے جاتے ہیں' وہ دل ہی دل میں کڑھتے ہیں اور ان کو زبردست غصہ آتا ہے' مگر بے بس ہوتے ہیں اور جہاں ان کا بس چلتا ہے وہ وہاں ظلم و ستم کا ریکارڈ قائم کر دیتے ہیں۔ پھر وہ دنیا میں مسلمانوں کے مقابلے میں مغلوب ہو جاتے ہیں لہٰذا وہ خسارے میں ہیں اور آخرت میں ان کے کفر کی وجہ سے ان کو عذاب ہو گا نیز وہ جن سرکشیوں میں غرق تھے اور ان پر اصرار کرتے تھے ان کی وجہ سے انہیں سخت سزا ہو گی۔ لہٰذا اس سے بڑا اور کیا خسارہ ان کو ہو سکتا ہے۔ اور اللہ کا فیصلہ ہے کہ ظالموں کے لیے خسارے کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ نہ ہو گا۔

--- ○○○---

اور جب انسان اللہ کی رحمت اور شفاء سے محروم کر دیا جائے اور جب اسے اس کی خواہشات نفس اور سفلی جذبات اور میلانات کے حوالے کر دیا جائے۔ اگر وہ مالی لحاظ سے خوشحال ہو تو وہ مغرور' متکبر اور سرکش ہو جاتا ہے۔ اور اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا' اللہ کو یاد نہیں کرتا' اور اگر اس پر کوئی مصیبت یا بدحالی آ جائے تو وہ اللہ کی رحمت سے مایوس اور قنوطی ہو جاتا ہے اور اس کے سامنے زندگی تاریک ہی تاریک نظر آتی ہے۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ۝

"انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اس کو نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ اینٹھتا اور پیٹھ موڑ لیتا ہے' اور جب ذرا مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو مایوس ہونے لگتا ہے"۔

زیادہ دولت مندی انسان کو سرکش اور مغرور بنا دیتی ہے۔ الا یہ کہ کوئی دولت مند یہ یقین رکھتا ہو کہ اس دولت کا عطا کرنے والا اللہ ہے اور وہ اللہ کا شکر بھی ادا کرتا ہو۔ لیکن اگر بدحالی آ جائے تو انسان مایوس ہو جاتا ہے اور اس پر قنوطیت چھا جاتی ہے۔ الا یہ کہ کسی کا تعلق باللہ مضبوط ہو' وہ امید کرتا ہے کہ اللہ اس کی مشکلات دور کر دے گا تو ایسا شخص اللہ کے رحم و فضل سے مایوس نہیں ہوتا۔ وہ ہر وقت اللہ کے فضل و کرم کا امیدوار اور خوش اور شاکر رہتا ہے۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی کیا اہمیت ہے۔ غرض مشکلات اور خوشحالی دونوں میں ایمان اللہ کی رحمت اور شفاء ہے۔

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ دنیا میں ہر فریق اپنی طرز زندگی پر جما ہوا ہے' اب اپنی خواہشات و روایات کے مطابق ہر شخص چلتا ہے اور ہر شخص کے طرز عمل کے بارے میں فیصلہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔

ع ۹ قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾
۹

"اے نبیؐ ان لوگوں سے کہہ دو کہ "ہر ایک اپنے طریقے پر عمل کر رہا ہے' اب یہ تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ سیدھی راہ پر کون ہے"۔

یہاں نہایت ہی نرم الفاظ میں تنبیہ کی گئی ہے اور ہر شخص کو ارایا گیا ہے کہ وہ اپنے رجحان' طرز عمل اور نظام زندگی کے بارے میں اچھی طرح غور کر لے' احتیاط کرے اور یہ تسلی کر لے کہ اس کا طرز عمل' نظام فکر اور نظام زندگی اسلامی ہدایات کے مطابق ہے یا نہیں۔اگر نہیں ہے تو اسے اللہ کے راستے کی طرف لوٹ آنا چاہیے۔

---()()()---

بعض لوگ رسول اللہؐ سے پوچھتے تھے کہ روح کی حقیقت کیا ہے؟ لیکن قرآن کریم کا طرز عمل یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جن کی ان کو ضرورت ہوتی ہے۔اور انسانی عقل اور قوت مدرکہ ان ہدایات یا ان موضوعات کو سمجھ سکے اور سہولت کے ساتھ اپنی گرفت میں لے سکے۔لہٰذا اسلام اور قرآن فکری قوت کو ان موضوعات پر ضائع نہیں کرتا جن کا انسان کو کوئی فائدہ نہیں' کوئی ضرورت نہیں یا جن موضوعات پر عقل کو رسائی حاصل نہیں ہے جب ان لوگوں نے روح کے بارے میں پوچھا تو اللہ نے سیدھا سادا جواب دیا کہ روح امرالہٰی ہے اور اس سلسلے میں تمہیں بہت کم علم دیا گیا ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾

"یہ لوگ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں' کہو یہ روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے' مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے"۔

اس آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ عقل انسانی پر روح کا انکشاف بند کر دیا گیا ہے اور اسے روح کے میدان میں کام نہیں کرنا چاہئے۔البتہ یہاں عقل کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے دائرہ کار اور اس حد تک محدود رہے جس تک وہ ادراک کر سکتا ہے' کیونکہ بغیر حقیقی علم و ادراک کے بے تکی باتیں کرنے سے حقیقت تک نہیں پہنچا جا سکتا۔پھر عقل کی قوت کو ایسے کام میں کھپانا جس کا ادراک عقل کے لیے ممکن ہی نہ ہو' ایک بے مقصد کام ہے۔روح درحقیقت اللہ کے غیوب میں سے ایک غیب ہے۔اللہ کے سوا اس کی حقیقت سے کوئی واقف نہیں ہے۔نہ اس کا ادراک کوئی کر سکتا ہے۔اور نہ وہ وسائل انسان کو دیئے گئے ہیں بلکہ یہ ایک لاہوتی راز ہے' جو اس بشری ڈھانچے میں رکھا گیا ہے۔اور بعض دوسری مخلوقات کو بھی دیا گیا ہے' جس کی حقیقت کو ہم نہیں جانتے۔پھر انسان کا علم قادر مطلق کے علم کے مقابلے میں بہت ہی محدود ہے۔اس کائنات کے اسرار و رموز اس قدر گہرے ہیں کہ انسانی عقل کے دائرہ ادراک سے ماوراء ہیں۔انسان اس کائنات کا مدبر نہیں ہے کیونکہ انسانی قوت اور طاقت اس کائنات پر حاوی نہیں ہے انسان کو تو صرف اس قدر

قوت اور حکمت دی گئی ہے جس کے ساتھ وہ اس کرۂ ارض پر خلافت فی الارض کا وظیفہ پورا کر سکے ۔ اور یہاں وہ کام کر سکے جس کے بارے میں اللہ کی مرضی ہے کہ وہ کرے اور وہ اپنا کام اپنے محدود علم کے مطابق کرے ۔

انسان نے اس کرۂ ارض پر بے شمار ایجادات کی ہیں لیکن وہ آج تک روح کی حقیقت معلوم کرنے سے صاف عاجز ہے ۔ وہ نہیں جانتا کہ روح کیا ہے؟ کس طرح یہ روح انسانی ڈھانچے میں ڈالی جاتی ہے ۔ کس طرح یہ نکل جاتی ہے یہ پہلے کہاں تھی نکل کر کہاں جاتی ہے ۔ الا یہ کہ علیم و خبیر نے اس سلسلے میں بذریعہ وحی جو علم دیا ہے وہ انسان کا ماخذ علم ہے ۔

قرآن کریم میں جو کچھ نازل ہوتا ہے وہ یقینی علم ہے کیونکہ وہ علیم و خبیر کے یقینی ذریعے سے آیا ہے 'اگر اللہ چاہتا تو انسانیت کو اس سے محروم رکھتا اور وہ پیغام ہی انسانوں کے پاس نہ بھیجتا جو اس نے بھیجا لیکن یہ اللہ کا رحم و کرم تھا کہ اس نے وحی الہی کے نزول کا سلسلہ شروع کیا ۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۝

"اور اے نبیؐ ہم چاہیں تو وہ سب کچھ تم سے چھین لیں جو ہم نے وحی کے ذریعے سے تم کو عطا کیا ہے 'پھر تم ہمارے مقابلے میں کوئی حامی نہ پاؤ گے جو اسے واپس دلا سکے ۔ یہ تو جو کچھ تمہیں ملا ہے تمہارے رب کی رحمت سے ملا ہے ' حقیقت یہ ہے کہ اس کا فضل تم پر بہت بڑا ہے"۔

اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر اپنا احسان جتلاتا ہے کہ اس نے ازراہ کرم تم پر وحی نازل کی ۔ اور پھر قرآن کریم کو محفوظ رکھا ۔ رسول اللہ سے زیادہ یہ احسان انسانوں پر ہے کیونکہ انسانیت پوری کی پوری اس قرآن کی بدولت رحمت اور ہدایت سے سرفراز ہے ۔ اور نسلاً بعد نسل یہ سرچشمہ نور و ہدایت ضوفشاں ہے ۔ جس طرح روح اللہ کے اسرار میں سے ہے اور کوئی انسان اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا 'اس طرح یہ قرآن بھی اللہ کی معجزانہ صفت ہے اور کوئی انسان بلکہ تمام مخلوق بھی جمع ہو جائے تو اس کی نقل نہیں اتار سکتی ۔ اور انس و جن جو ظاہری اور خفیہ مخلوقات ہیں دونوں جمع ہو کر بھی اگر سعی کریں تو قرآن جیسی کتاب ان کے لیے لانا ممکن نہیں ہے ۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کے سچے معاون کیوں نہ بن جائیں ۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝

"کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے '

چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں"۔

یہ قرآن محض عبارتوں، تراکیب اور الفاظ کا نام نہیں ہے کہ جن و انس اس کی نقل کر لیں گے۔ بلکہ یہ قرآن اللہ کی دوسری مخلوقات اور عجائب کی طرح ہے جن کی نقل کوئی انسان نہیں کر سکتا۔ یہ روح کی طرح ایک امرالٰہی ہے نہ انسان روح کے اسرار و رموز اور حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ انسان صرف روح کے اوصاف اور آثار کو جانتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کے معانی، نظریات اور اسرار کو پوری طرح انسان نہیں سمجھ سکتے کہ اس جیسی کتاب لے آئیں۔

پھر قرآن ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ ایک ایسا نظام جس میں انسانی فطرت کے تمام قوانین اور تمام طور طریقوں کو مدنظر رکھ کر یہ حکم تجویز کیا گیا ہے اور یہ نظام ایسا ہے کہ ہر انسانی سوسائٹی کو ہر طرح کے حالات میں راہنمائی فراہم کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس میں ایک فرد کے لیے بھی ہدایت ہے، ایک مختلف النوع سوسائٹی کے لیے بھی ہدایات ہیں۔ اس میں ایسے قوانین وضع کیے گئے ہیں جو زندگی کے تمام نشیب و فراز اور زندگی کے مختلف النوع مسائل کے مکمل اور تشفی بخش حل تجویز کرتے ہیں اور ہر حل پوری طرح مکمل اور ہمہ گیر ہے۔ ان قوانین کے اندر ایسی جامعیت ہے کہ یہ مختلف النوع اور بدلتی ہوئی زندگی کے مختلف حالات میں سے ہر حال پر، اس کے قوانین منطبق ہوتے ہیں۔ خواہ یہ حالات انفرادی زندگی سے متعلق ہوں یا اجتماعی زندگی سے۔ کیونکہ ان قوانین کا مقنن وہ ذات ہے جو اس انسان کے فطری تقاضوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ اور انسان کی مختلف النوع ضروریات سے واقف ہے کیونکہ وہ خود انسان کا خالق ہے۔

رہے وہ قوانین اور طرز ہائے زندگی اور تنظیمات جو انسان نے وضع کیے ہیں تو ان کے اندر انسانی کمزوری کی چھاپ اس وقت بھی موجود ہوتی ہے جس وقت کوئی اسمبلی ان قوانین کو وضع کرتی ہے۔ لہٰذا یہ قوانین وقتی ہوتے ہیں بلکہ وقتی ضروریات کے لیے بھی ناکافی ہوتے ہیں اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بوسیدہ ہو جاتے ہیں اور انہیں فرسودہ کہا جاتا ہے۔ جب حالات بدلتے ہیں تو پھر ان قوانین کے بدلنے کے لیے واویلا کیا جاتا ہے تاکہ وہ جدید تقاضوں کو پورا کر سکیں۔

قرآن کریم کے اعجاز کا مفہوم صرف " قرآن، فصیح و بلیغ عبارات اور معانی کے حسن ادا تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ جن و انس اس جیسی کتاب لانے سے جو عاجز رہے ہیں اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جن و انس نے آج ایسا نظام حیات تجویز نہیں کیا جو قرآن نے پیش کیا ہے جو ایک مکمل نظام زندگی ہے اور زندگی کے پورے معاملات پر محیط ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ فَأَبَىٰ أَكْثَرُ النَّاسِ
إِلَّا كُفُورًا ﴿٨٩﴾ وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا ﴿٩٠﴾
أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ﴿٩١﴾ أَوْ
تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ﴿٩٢﴾ أَوْ
يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ

۱۰

ع ۹ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝۹۳

۱۰

"ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر اکثر لوگ انکار ہی پر جمے رہے اور انہوں نے کہا "ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے۔ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے۔ یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے۔ یا خدا اور فرشتوں کو رو در رو ہمارے سامنے لے آئے۔ یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے' اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں۔ اے نبی' ان سے کہو" پاک ہے میرا پروردگار" کیا میں پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں"۔

ذرا دیکھیے' یہ لوگ قرآن کریم کی اس معجزانہ شان کو نہ سمجھ سکے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسے مادی معجزات اور خوارق عادت امور کے وقوع کا مطالبہ کرتے رہے۔ معمولی غور سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے مطالبات کس قدر طفلانہ ہیں۔ یہ لوگ ذات باری تعالیٰ کے حق میں بھی توہین آمیز رویہ اختیار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ مطالبہ کرتے وقت انہیں شرم نہیں آتی کہ اللہ خود ہمارے سامنے حاضر ہو جائے۔ حالانکہ قرآن مجید نے جو تعلیمات پیش کی ہیں' وہ نہایت ہی معقول انداز میں اور پھیر پھیر کر مختلف اسالیب میں اور مختلف مثالوں کی مدد سے ہر درجہ عقل و فکر کے لوگوں کے لیے سہل انداز میں پیش کی ہیں' اور یہ تعلیمات اور یہ انداز کلام ابد الآباد کے لیے مفید ہے لیکن

فَاَبٰىٓ اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (۱۷ : ۸۹) "مگر اکثر لوگ انکار پر ہی جمے رہے"۔ اور انہوں نے رسول اللہؐ پر ایمان لانے کو اس شرط سے مشروط کر دیا کہ آپ ہمارے لیے زمین سے چشمے نکال دیں۔ یا آسمان کا کوئی ٹکڑا ان پر عذاب بن کر گرے جس طرح آپ ہمیں ڈراتے ہیں کہ قیامت کے دن آسمان پھٹ جائے گا یا یہ کہ اللہ اور ملائکہ ہمارے سامنے آکر حاضر ہو جائیں اور اللہ اور فرشتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں ایسی مدافعت کریں۔ جیسی مدافعت قبائل ایک دوسرے کے لیے کرتے ہیں۔ یا یہ کہ نہایت ہی قیمتی دھاتوں سے ان کے لیے ایک محل بنے یا یہ کہ حضورؐ ان کے سامنے آسمانوں پر چڑھ جائیں اور وہ دیکھ رہے ہوں اور اس طرح واپس آئیں کہ آپؐ کے ہاتھ میں ایک کتاب ہو جسے وہ پڑھ سکیں۔ یہ تھے ان کے مطالبات۔

ان کے تصور اور قوت مدرکہ کی ناپختگی کا اظہار ان مطالبات سے ظاہر ہے۔ نیز ان مطالبات سے ان کی ہٹ دھرمی بھی اچھی طرح معلوم ہوتی ہے۔ وہ ایک طرف یہ مطالبہ کرتے ہیں آپ کے پاس قیمتی دھاتوں کا بنا ہوا مکان ہونا چاہیے اور دوسری طرف سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ زمین سے آسمان کی طرف چڑھ جائیں۔ ایک طرف زمین سے چشمے نکالنے کا مطالبہ اور دوسری طرف سے فرشتوں اور خدا تعالیٰ سے یہ مطالبہ کہ وہ ان کے سامنے چلے آئیں۔ ان کے ذہن میں ان تمام باتوں کے درمیان مشترک چیز یہ ہے کہ یہ سب خارق عادت امور ہیں۔ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان شرائط کو پورا کر دیں تب وہ ایمان لانے پر غور کر سکتے ہیں اور آپ کی تصدیق کر سکتے ہیں۔

لیکن ان لوگوں کی کند ذہنی کا حال یہ ہے کہ ان کو قرآن کی شکل میں آنے والا معجزہ نظر نہیں آتا۔ بار بار کے چیلنج کے باوجود وہ نہ لفظ میں' نہ نظم و ترکیب میں' نہ اسلوب میں اور نہ معانی میں اور نہ نظام زندگی کے اعتبار سے اس جیسی کتاب لا سکے ہیں۔ان کے حواس اور قوائے مدرکہ اس اعجاز کا ادراک تو نہیں کر سکتیں البتہ ایسے معجزات کے یہ لوگ طلبگار ہیں جن کو ان کی حواس دیکھ سکیں۔

معجزات جن کا صدور پیغمبروں کے ہاتھوں ہوا کرتا ہے وہ کسی پیغمبر کی کارستانی نہیں ہوتی نہ پیغمبر کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ معجزات دکھاتا پھرے۔یہ کام تو خداوند کریم کا ہے۔وہ اپنی حکمت اور اسکیم کے مطابق معجزات بھی ظاہر کرتا ہے۔نیز کسی رسول کو یہ حق بھی نہیں ہے کہ وہ ان معجزات کا مطالبہ کرے۔اگر اللہ ان کا صدور نہ چاہتا ہو' اس کائنات کی تدبیر میں اللہ کی جو حکمتیں کارفرما ہوتی ہیں ان کو جانتے ہوئے اور بارگاہ تعالیٰ میں ادب و احترام کا لحاظ کرتے ہوئے' رسولوں کی عادت اور آداب یہ ہوتے ہیں کہ وہ کسی قسم کے معجزے کا مطالبہ نہیں کیا کرتے۔

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا (۹۳) "اے نبی' ان سے کہو "پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟" یہ ہے ادب رسول' جو اپنی بشریت کی حدود پر جا کر رک جاتے ہیں' رسول اپنے مقررہ فرائض منصبی کے مطابق کام کرتے ہیں۔وہ اللہ سے مطالبات نہیں کرتے۔اور اپنے فرائض کے حدود سے آگے بڑھ کر بھی کام نہیں کرتے۔

---000---

وہ بڑا شبہ جو مختلف اقوام و ملل کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل لاحق ہوا اور آپ کی بعثت کے بعد بھی کئی ملتوں کو لاحق ہوا اور جس کی وجہ سے ان اقوام نے رسولوں کی تصدیق نہ کی اور ان ہدایات کو تسلیم نہ کیا جو رسول لے کر آئے تھے وہ یہ تھا کہ یہ لوگ اس بات کو مستبعد سمجھتے تھے کہ کوئی رسول بشر بھی ہو سکتا ہے اور یہ کہ رسول فرشتہ نہیں ہوتا۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا (۹۴)

"لوگوں کے سامنے جب بھی ہدایت آئی' تو اس پر ایمان لانے سے ان کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر ان کے اسی قول نے کہ "کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا"۔

لوگوں کے درمیان یہ وہم اس لیے پھیلا کہ انہوں نے یہ نہ سمجھا کہ اللہ کے ہاں انسان کی انسانیت اور بشریت کی کیا قدر ہے۔اس لیے انہوں نے اس بات کو مناسب نہ سمجھا کہ کوئی بشر اللہ کا رسول بن جائے۔نیز انہوں نے اس کائنات کے مزاج اور فرشتوں کے مزاج اور نوعیت کے سمجھنے میں بھی غلطی کی۔کیونکہ فرشتوں کو اللہ نے اس لیے پیدا ہی نہیں کیا کہ وہ کرۂ ارض پر بسیں اور یہاں لوگ انہیں جانیں اور پہچانیں اور وہ فرشتوں کی شکل میں ہوں۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾

"ان سے کہو' اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے کسی فرشتے ہی کو ان کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجتے"۔

اگر اللہ نے یہ فیصلہ کیا ہوتا کہ زمین میں فرشتے بسیں تو وہ آدمیوں کی شکل و صورت میں ہوتے کیونکہ آدمی کی شکل و صورت ایسی ہے جو اس کرۂ ارض پر سکونت کے لیے مناسب ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ کہا گیا ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا (۶ : ۹) "اگر ہم پیغمبر کو فرشتہ بناتے تو بھی وہ ایک آدمی ہی ہوتا"۔
اور اللہ تو سب چیزوں پر قدرت رکھتا ہے۔ لیکن اللہ نے اس کرۂ ارض کے لیے نوامیس قدرت بنائے ہیں اور ان نوامیس قدرت کے مطابق انسان کی تخلیق کی ہے۔ اسی طرح دوسری مخلوقات کو بھی ان کے مطابق بنایا ہے۔ اور یہ طے کیا ہے کہ یہ قوانین قدرت جاری و ساری رہیں گے اور یہ کائنات ان کے مطابق چلتی رہے گی تاکہ اس کی حکمت خلق وتکوین پوری ہو لیکن افسوس ہے کہ لوگ اللہ کی حکمت تخلیق کائنات اور انسان کو نہیں سمجھتے۔

چونکہ اللہ کی حکمت یہ ہے' تو اللہ اپنے نبی کو حکم دیتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ جدل و جدال نہ کریں۔ اور تمام امور کو اللہ کے حوالے کر دیں۔ وہ دیکھ رہا ہے ان لوگوں کے معاملات میں تصرف چھوڑ دیں۔ اللہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے۔ اور ان کے اعمال سے بھی خبردار ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ﴿۹۶﴾

"اے نبیؐ ان سے کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان بس ایک اللہ کی گواہی کافی ہے' وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور سب کچھ دیکھ رہا ہے"۔

اس بات میں ایک قسم کی جھڑکی اور تہدید کا رنگ ہے۔ اللہ تو گواہ ہے لیکن اس گواہی کا انجام کیا ہوگا تو قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر دیکھئے :

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿۹۷﴾ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ

كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۚ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾

"جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے' اور جسے وہ گمراہی میں ڈال دے تو اس کے سوا ایسے لوگوں کے لیے تو کوئی حامی و ناصر نہیں پا سکتا۔ ان لوگوں کو ہم قیامت کے روز اوندھے منہ کھینچ لائیں گے' اندھے 'گونگے اور بہرے۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ جب کبھی اس کی آگ دھیمی ہونے لگے گی ہم اسے اور بھڑکا دیں گے۔ یہ بدلہ ہے ان کی اس حرکت کا کہ انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا "کیا ہم صرف ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو نئے سرے سے ہم کو پیدا کر کے اٹھا کر کھڑا کیا جائے گا؟" کیا ان کو یہ نہ سوجھا کہ جس خدا نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے وہ ان جیسوں کو پیدا کرنے کی ضرور قدرت رکھتا ہے؟ اس نے ان کے حشر کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے جس کا آنا یقینی ہے 'مگر ظالموں کو اصرار ہے کہ وہ اس کا انکار ہی کریں گے"۔

اللہ نے ہدایت و ضلالت کے کچھ قوانین بنائے ہیں اور لوگوں کو ان قوانین کے مطابق طرز عمل اختیار کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اور ان قوانین کے مطابق وہ نفع و نقصان کے ذمہ دار ہوں گے۔ ان قوانین میں سے ایک یہ قانون بھی ہے کہ انسان ہدایت و ضلالت دونوں کی استعداد رکھتا ہے۔ اب یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ ہدایت کے رولز کے مطابق راہ اختیار کرتا ہے یا ضلالت کے رولز اپناتا ہے۔ جو ہدایت کے اصول اور سنن اپناتا ہے وہ ہدایت کا مستحق ہو جاتا ہے اور جو ضلالت کے اصول اور سنن اپناتا ہے وہ ضلالت کا مستحق ہو جاتا ہے کہ اس نے گمراہی کو اپنایا اور ہدایت کے اصولوں سے اعراض کیا۔ ایسے لوگوں کو اللہ کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ (۱۷ : ۹۷) "اللہ کے سوا ایسے لوگوں کے لیے کوئی حامی و ناصر نہ ہو گا"۔ اور ایسے لوگوں کو اللہ قیامت کے دن نہایت ہی توہین آمیز اور خوفناک صورت میں اٹھائے گا۔

عَلٰى وُجُوْهِهِمْ (۱۷ : ۹۷) "اوندھے منہ"۔ یہ ہاتھوں کے سہارے چل رہے ہوں گے '

عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا (۱۷ : ۹۷) "اندھے 'گونگے اور بہرے"۔ ان کے وہ تمام اعضاء جو اس اژدھام میں ان کے لیے مفید ہو سکتے تھے سب کے سب بے کار ہو چکے ہوں گے اور یہ اس لیے کیا جائے گا کہ دنیا میں ان کو یہ اعضا اس لیے دیئے گئے تھے کہ یہ لوگ ان کو صحیح کام میں لائیں اور ہدایت کے دلائل کو سمجھنے کی سعی کریں مگر انہوں نے ان اعضاء و جوارح کو بری راہوں میں استعمال کیا۔

مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ (۱۷ : ۹۷) "ان کا ٹھکانا جہنم ہے"۔ ایسی آگ جو کبھی بجھتی نہیں اور نہ سرد پڑتی ہے۔

كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا (۱۷ : ۹۷) "جب کبھی اس کی آگ دھیمی ہونے لگے گی ہم اسے

بجز کا رہیں گے"۔

یہ نہایت ہی خوفناک انجام ہے اور یہ نہایت ہی ازلی سزا ہے لیکن یہ لوگ اس کے مستحق اس لیے ہو گئے ہیں کہ انہوں نے آیات الہیہ کا کفر کیا۔

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا (۱۷ : ۹۸) "یہ بدلہ ہے ان کی اس حرکت کا کہ انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا"۔ انہوں نے بعث بعد الموت کا انکار کیا۔ اور وقوع قیامت کو مستبعد سمجھا۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (۱۷ : ۹۸) "اور کہا کیا جب ہم صرف ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو نئے سرے سے ہم کو پیدا کر کے اٹھا کر کھڑا کیا جائے گا"۔

سیاق کلام میں اس منظر کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے گویا وہ آج موجود ہے۔ اور وہ دنیا جس میں وہ رہ رہے تھے اسے گویا لپیٹ لیا گیا ہے اور وہ ماضی بعید بن گئی ہے۔ یہ قرآن کا مخصوص انداز بیان ہے کہ وہ مستقبل کے واقعات کو نہایت ہی مجسم شکل میں پیش کرتا ہے اور منظر یوں نظر آتا ہے کہ گویا وہ ایک زندہ واقعہ ہے اس طرح واقعات کا اثر دلوں پر بہت ہی گہرا ہوتا ہے۔ اور انسانی شعور پر یہ واقعات اپنا پورا اثر ڈالتے ہیں۔

اب قرآن مجید حقیقی صورت حال ان کے سامنے رکھتا ہے اور انداز سخن بھی واقعی بن جاتا ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ تم اس حقیقت کو دیکھ رہے ہو مگر غفلت سے کام لے رہے ہو۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓي اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ

(۱۷ : ۹۹) "کیا ان کو یہ نہ سوجھا کہ جس خدا نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے وہ ان جیسوں کو پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے"۔ لہٰذا بعث بعد الموت میں کیا انہونی بات ہے' اللہ اس عظیم کائنات کا خالق ہے۔ وہ ان جیسے آسمان و زمین کو پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ ان کو ختم کر کے دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔

وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ (۱۷ : ۹۹) "اس نے ان کے حشر کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے جس کا آنا یقینی ہے"۔ میں ان کو مہلت دے رہا ہوں اور ان کا وقت مقرر ہے۔

فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا (۱۷ : ۹۹) "مگر ظالموں کو اصرار ہے کہ وہ اس کا انکار ہی کریں گے"۔ لہٰذا ان ظالموں کو جو سزا ہوگی وہ دلائل و مشاہدات اور آیات کی وضاحت کے اعتبار سے معقول ہوگی۔

---(۰)---

یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان معجزات کا مطالبہ کرتے تھے اور یہ مطالبات نہایت ہی نامعقول تھے مثلاً یہ کہ قیمتی دھاتوں کا مکان' کھجوروں اور انگوروں کا باغ اور زمین سے پھاڑ کر چشمے نکالنا' مگر تم لوگ خود اس قدر بخیل ہو کہ اگر اللہ کی رحمت کے خزانوں کی کنجیاں تمہیں دے دی جائیں تو تم ان میں سے کچھ بھی خرچ نہ کرتے اور

ہاتھ روک لیتے کہ کہیں یہ خزانے ختم نہ ہو جائیں حالانکہ اللہ کی رحمت کے خزانے ختم ہونے والے نہیں ہوتے۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْۤ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ
الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۝ ع ۱۱

"اے نبیؐ ان سے کہو' اگر کہیں میرے رب کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضے میں ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے اندیشے سے ضرور ان کو روک رکھتے۔ واقعی انسان بڑا تنگ دل واقع ہوا ہے"۔

بخل اور کنجوسی کی یہ حد ہے۔ کیونکہ اللہ کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ اس نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور اس کے ختم ہونے کا کوئی خطرہ بھی نہیں ہے۔ نہ اس میں کوئی کمی واقع ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ اس قدر بخیل ہیں کہ اگر سمندر پر بھی بیٹھے ہوں تو ان کو پانی کی کمی نظر آتی ہے۔ اس طرح ان کو اللہ کی رحمت میں بھی کمی نظر آتی ہے۔

بہرحال اگر ان کے سامنے وہ معجزات کثرت سے بھی لائے جائیں جن کا وہ مطالبہ کرتے ہیں' ان کے دل چونکہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں اس لیے یہ نہ مانیں گے۔ دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو۔ ۹ بڑے معجزات دیے گئے' مگر فرعون اور اس کے سرداروں نے مان کر نہ دیا۔ اس لیے اس پر تباہی آئی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ۝ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝ فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ۝ لا وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ۝

"ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نشانیاں عطا کی تھیں جو صریح طور پر دکھائی دے رہی تھیں۔ اب یہ تم خود بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ جب موسیٰ علیہ السلام ان کے ہاں آئے تو فرعون نے یہی کہا تھا نا کہ "اے موسیٰ میں سمجھتا ہوں کہ تو ضرور ایک سحر زدہ آدمی ہے"۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں کہا "تو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت افروز نشانیاں زمین اور آسمانوں کے رب کے سوا کسی نے نازل نہیں کی ہیں' اور میرا خیال یہ ہے کہ اے فرعون تو ضرور ایک شامت زدہ

آدمی ہے"۔ آخر کار فرعون نے ارادہ کیا کہ موسیٰ اور بنی اسرائیل کو زمین سے اکھاڑ پھینکے مگر ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو اکٹھا غرق کر دیا اور اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تم زمین میں بسو 'پھر جب آخرت کے وعدے کا وقت آن پورا ہو گا' تو ہم تم سب کو ایک ساتھ لا حاضر کریں گے"۔

قصہ بنی اسرائیل کو یہاں اس لیے لایا گیا ہے کہ سورت کے مضمون کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے۔ مسجد اقصیٰ اور بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک حصہ یہاں دیا گیا ہے۔ اس قصے کے آخر میں بھی آخرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور فرعون اور اس کی قوم کے ملے آنے کا تذکرہ ہے۔ یہ ان مناظر قیامت کی مناسبت سے ہے جو ابھی سورت میں گزرے تھے اور جن میں بتایا گیا تھا کہ مکذبین کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزات جن کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا وہ ید بیضا' عصا' فرعون اور اس کی قوم پر خشک سالی' ہر قسم کی پیداوار کی کمی' طوفان' ٹڈی دل' قمل' مینڈک اور خون تھے۔

فَسْئَلْ بَنِيٓ اِسْرَآئِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ (۱۷ : ۱۰۱) "بنی اسرائیل سے پوچھو' جب موسیٰ ان کے پاس آئے"۔ کیونکہ بنی اسرائیل موسیٰ اور فرعون کی کشمکش کے شاہد تھے اور ان کے پاس ریکارڈ موجود تھا۔

فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰي مَسْحُوْرًا (۱۷ : ۱۰۱) "فرعون نے اس سے کہا اے موسیٰ میں سمجھتا ہوں تو ضرور سحر زدہ آدمی ہے"۔ سچی بات 'عقیدۂ توحید' ظلم و سرکشی کا ترک کرنا اور لوگوں کو ایذا نہ دینے کی دعوت دینا' ایک باغی اور سرکش شخص کے نزدیک ایک سحر زدہ شخص کا کام ہے۔ کوئی معقول آدمی یہ کام نہیں کر سکتا۔ کیونکہ فرعون کی طرح کے سرکش اور مغرور ڈکٹیٹر ان باتوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ ان کے سامنے تو کوئی شخص سر اٹھا کے نہیں چل سکتا۔ چہ جائیکہ وہ ایسی باتیں کرے۔ ان کے خیال میں کوئی معقول فرد ایسی باتیں نہیں کر سکتا۔ سر پھرے ہی ایسی باتیں کرتے ہیں۔

موسیٰ تو ایک بہادر آدمی تھے اور ان کا دل سچائی کے نور اور خدائی روشنی سے بھرا ہوا تھا۔ وہ مطمئن تھے کہ اللہ کی امداد اور سرپرستی انہیں حاصل ہے۔ تو انہوں نے کہا۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآئِرَ وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا (۱۷ : ۱۰۲) "انہوں نے کہا' تو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت افروز نشانیاں زمین اور آسمانوں کے رب کے سوا کسی نے نازل نہیں کی ہیں' اور میرا خیال یہ ہے کہ اے فرعون تو ضرور ایک شامت زدہ آدمی ہے"۔ تو ہلاک ہونے والا اور تہس نہس ہونے والا ہے۔ کیونکہ تو آیات الہیہ کی تکذیب کر رہا ہے۔ تو جانتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور ان خارق عادت معجزات کا صدور و ظہور نہیں کر سکتا۔ یہ نہایت ہی واضح اور بصیرت افروز نشانیاں ہیں۔ گویا یہ نشانیاں خود آنکھیں ہیں جن کی وجہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اب یہ سرکش آدمی اپنی مادی قوت کا سہارا لیتا ہے۔ اور یہ عزم کرتا ہے کہ وہ موسیٰ کو زمین سے نکال کر ان کی قوم کو تباہ و برباد کر دے گا۔

فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (۱۷ : ۱۰۳) "آخر کار فرعون نے ارادہ کیا کہ موسیٰ اور بنی اسرائیل کو زمین سے اکھاڑ پھینکے"۔ تمام ڈکٹیٹر اور سرکش لوگ کلمہ حق کے بارے میں یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ ان کے پاس کلمہ حق کا یہی جواب ہوتا ہے۔

اس مقام پر آکر ایسے سرکشوں پر اللہ کا کلمہ اور اللہ کی سنت کا اطلاق برحق ہو جاتا ہے اور پھر اللہ کی اٹل سنت کے مطابق' ظالموں کو ہلاک کر دیا جاتا ہے اور زمین کے اندر جو کمزور اہل ایمان اور صبر کرنے والے طبقات ہوتے ہیں' ان کو زمین کا وارث بنا دیا جاتا ہے۔

فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا (۱۰۳) وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا

الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا (۱۰۴) (۱۷ : ۱۰۳ - ۱۰۴)

"پھر ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو اکٹھا غرق کر دیا اور اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تم زمین میں بسو' پھر جب آخرت کے وعدے کا وقت آن پورا ہو گا' تو ہم تم سب کو ایک ساتھ لا حاضر کریں گے"۔

یہ تھا انجام آیات الٰہی کے جھٹلانے کا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے زمین کے اقتدار کا وارث ان لوگوں کو بنایا' جو زمین میں پسے ہوئے تھے۔ اور اب ان کو کہا گیا کہ تمہارے مستقبل کا دارومدار تمہارے اعمال و افعال پر ہو گا۔ اس سورت کے آغاز میں بتا دیا گیا ہے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا تھا؟ یہاں صرف یہ کہا جاتا ہے کہ تم اور تمہارے دشمن اب قیامت کے سپرد ہیں اور جب قیامت برپا ہوگی تو تم سب کو لپیٹ کر اللہ لے آئے گا۔

---

یہ تھی مثال اس پیغمبر کی جو نو خوارق عادت معجزات لے کر آئے اور ان کا استقبال جھٹلانے والوں نے اس طرح کیا۔ اور اللہ کی اٹل سنت نے پھر اپنا کام یوں کیا۔ رہا یہ قرآن تو یہ تو ایک ابدی سچائی لے کر آیا ہے۔ اور اسے تھوڑا تھوڑا کر کے وقفے وقفے کے بعد نازل کیا گیا ہے تاکہ آپ اسے لوگوں کو پڑھ کر مہلت بعد مہلت کے ساتھ سنائیں۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ
نَذِيْرًا ۞ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۞

"اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے' اور اے ہمارے نبی' تمہیں ہم نے اس کے سوا اور کسی کام کے لیے نہیں بھیجا کہ (جو مان لے اسے) بشارت دے دو اور (جو نہ مانے اسے) متنبہ کر دو۔ اور اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم ٹھہر ٹھہر کر اسے لوگوں کو سناؤ اور اسے ہم نے (موقع موقع سے) بتدریج اتارا ہے"

نزول قرآن کا مقصد ایک امت کی تشکیل و تربیت تھا۔ پھر اس امت کے لیے ایک نظام حیات کی تشکیل قرآن کے

پیش نظر تھی تاکہ یہ امت قرآن اور اس نظام کو لے کر اکناف عالم میں پھیل جائے۔ اور تمام انسانیت کو اس مکمل اور خود کفیل نظام حیات کی تعلیم دے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب متفرق طور پر مختلف اوقات میں اس امت کی واقعی ضرورت کے مطابق اترتی رہی۔ اور ان حالات کے مطابق اس کا نزول ہوتا رہا۔ جن حالات میں اس امت کی دور اول میں تربیت ہو رہی تھی۔ چونکہ مقصد ایک امت کی تربیت تھا۔ اس لیے نزول قرآن بھی متفرق طور پر ایک طویل عرصے تک ہوتا رہا کیونکہ کسی جماعت کی تربیت کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ یہ تربیت عملی تجربات کی شکل میں ایک طویل عرصہ تک ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ یہ قرآن آیا اور اس نے اپنے ایک ایک جزئی حکم کو عملی مرحلے میں نافذ کیا اور وہ ایک نظام کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ نظام محض نظریاتی قانون سازی کی شکل میں نہیں آیا۔ نہ یہ مجرد فکر اور نظریہ کی شکل میں پیش ہوا' کیونکہ نظریاتی بحثیں محض ذہنی عیاشی اور محض پڑھنے پڑھانے کے لیے ہوتی ہیں۔

یہ تھی قرآن مجید کے متفرق نزول کی حکمت۔ اور یہی وجہ تھی کہ قرآن مجید کو یکبار ایک کتاب کی شکل میں نہیں اتارا گیا۔ قرآن کریم مسلمانوں کی پہلی نسل نے خدا و رسول سے اس طرح اخذ کیا کہ یہ ان کے لیے ان کی زندگی کے مختلف مراحل میں عملی ہدایات تھیں۔ جب بھی کوئی امر آیا یا نہی وارد ہوئی' جب بھی کوئی اخلاقی ادب سکھایا گیا یا کوئی فریضہ نازل ہوا تو یہ عمل کے لیے تھا۔ مسلمانوں نے قرآن مجید کو محض پڑھنے پڑھانے اور ذہنی اور نظریاتی اور نفسیاتی عیاشی کے طور پر نہیں لیا۔ جیسا کہ وہ شعر و ادب کو لیتے تھے۔ نہ وہ لہو و لعب کے طور پر اسے لیتے تھے جس طرح وہ قصے کہانیوں کو بطور لہو و لعب استعمال کرتے تھے۔ جب بھی قرآن نازل ہوا انہوں نے اس کی کیفیات کو اپنے اوپر طاری کر دیا۔ اپنی روز مرہ کی زندگی میں اسے عملی شکل دے دی۔ ان کا شعور اور ان کا ضمیر اس رنگ میں رنگا گیا۔ قرآن ان کے طرز عمل اور ان کی سرگرمیوں پر چھا گیا۔ ان کے گھروں' ان کے بازاروں میں قرآن کا دور دورہ ہو گیا اور وہ ان کے لیے ایک نظام زندگی بن گیا اور انہوں نے قرآن کے علاوہ ہر طور طریق کو ترک کر دیا۔ جو طور طریقے ان کو وراثت میں جاہلیت سے ملے تھے' یا جن کو وہ جانتے تھے یا جن کے مطابق وہ نزول قرآن سے قبل چل رہے تھے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص دس آیات پڑھ لیتا تھا تو وہ آگے نہ بڑھتا تھا جب تک وہ ان کا مفہوم نہ جان لیتا اور ان پر عمل نہ کر لیتا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن مجید حق پر قائم ہوتے ہوئے اتارا ہے۔

وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ (۱۷ : ۱۰۵) "اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے"۔ یہ اس لیے نازل ہوا کہ زمین پر سچائی کو مستقل ٹھہرا دے اور اس کی بنیادیں مضبوط کر دے۔

وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ (۱۷ : ۱۰۵) "اور یہ قرآن بھی حق کے ساتھ اترا"۔ گویا اس کا مواد بھی سچائی پر مشتمل ہے اور اس کی غرض و غایت بھی سچائی ہے۔

اس کا بنیادی عنصر ہی سچائی ہے اور اس کی اہم تعلیمات بھی سچائی پر مبنی ہیں۔ وہ حق اور سچائی جو اس کائنات میں کارفرما ناموس قدرت کی شکل میں رواں ہے اور جس حق و سچائی کی قوت پر یہ کائنات قائم ہے' اور جس سچائی کے ساتھ یہ کائنات اور ارض و سما پیوستہ ہیں اسی کے ساتھ یہ قرآن بھی مربوط ہے۔ یہاں قرآن اسی نظام کائنات (حق) کی طرف اشارہ کر رہا

ہے - یہی سمجھاتا ہے کہ یہ قرآن بھی اس عظیم تکوینی سچائی کا ذریعہ ہے - پس حق قرآن مجید کا جسم و جان ہے اور حق ہی اس کا بنیادی عنصر اور اس کا مقصود ہے اور رسول مبشر 'نذیر اور مبلغ ہے اس عظیم سچائی کا' جسے وہ لے کر آیا ہے -

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اس حق کے ذریعے اپنی قوم کا مقابلہ کریں - اور انہیں چھوڑ دیں کہ وہ جو راہ اختیار کرنا چاہیں اختیار کریں - اگر چاہیں تو قرآن پر ایمان لائیں 'اگر چاہیں تو نہ لائیں - لیکن وہ جو راہ بھی اختیار کریں گے اس راہ کے نتائج و عواقب کے وہ ذمہ دار ہوں گے اور ان لوگوں کے سامنے بطور مثال ان اہل کتاب کو پیش کر دیں 'یہود و نصاریٰ کو ان میں سے جنہوں نے قرآن مجید پر ایمان لایا ہے - شاید کہ وہ ان کے لیے اچھی مثال کا کام کریں - کیونکہ قریش تو امی ہیں - ان کے پاس نہ تو تعلیم ہے - اور نہ ان کو اس سے قبل کوئی کتاب دی گئی ہے -

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ﴿۱۰۷﴾ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾ السجدة

"اے نبی" ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم اسے مانو یا نہ مانو 'جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے 'انہیں جب یہ سنایا جاتا ہے تو وہ منہ کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں "پاک ہے ہمارا رب 'اس کا وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا" - اور وہ منہ کے بل روتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اسے سن کر ان کا خشوع اور بڑھ جاتا ہے" -

یہ نہایت ہی پرتاثیر منظر ہے - ان لوگوں کا منظر جنہیں اس سے قبل علم دیا گیا تھا - وہ قرآن سنتے ہیں - ان پر خوف کی حالت طاری ہو جاتی ہے -

یخرّون للاذقان (۱۷:۱۰۷) "اور وہ منہ کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں" - یہ سجدہ نہایت ہی بے ساختہ ہوتا ہے - وہ سجدے میں نہیں گرتے بلکہ ان کی تھوڑیاں سجدہ کرتی ہیں - پھر ان کے احساسات کے اندر جو چیز ان کو چبھتی ہے وہ اس کا اظہار کرتے ہیں - وہ اللہ کی عظمت اور اللہ کے وعدوں کے سچا ہونے کے احساس کا اظہار کرتے ہیں -

سُبحٰن ربّنآ ان کان وعد ربّنا لمفعولا (۱۷:۱۰۸) "پاک ہے ہمارا رب اس کا وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا" - وہ اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ ان کے تاثرات کو الفاظ میں قلم بند نہیں کیا جا سکتا - ان کے دل جوش میں آتے ہیں اور ان کے تاثرات آنسوؤں کی شکل میں باہر آ جاتے ہیں -

ویخرّون للاذقان یبکون (۱۷:۱۰۹) "اور وہ منہ کے بل روتے ہوئے گر جاتے ہیں" -

ویزیدھم خشوعا (۱۷:۱۰۹) "اور قرآن کو سن کر ان کا خشوع اور بڑھ جاتا ہے" - جبکہ اس

سے قبل وہ نہایت ہی خشوع اور عاجزی سے اس کا استقبال کر چکے تھے۔

یہ ایک ایسا منظر ہے جو نہایت ہی گہرے شعوری تاثرات کو ظاہر کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ جو لوگ فیوض قرآن سے مستفید ہونے کے لیے اپنے دلوں کو کھول دیتے ہیں' جو قرآن مجید کی حقیقت' اس کی قدر و قیمت اور اس کی تعلیمات کو جانتے ہیں اور جو لوگ قرآن سے قبل کتب الہیہ کے علوم سے واقف ہوتے ہیں ایسے لوگ قرآن کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں' اس لیے کہ حقیقی علم وہی ہے جو کتب سماوی نے دیا ہے اور جو اللہ کی طرف سے آیا ہے۔ یہ منظر یہاں ایسے حالات میں پیش کیا گیا کہ اہل مکہ نہایت ہی خلجان اور حیرت میں تھے کہ وہ اس علم کو قبول کریں یا نہ کریں جو قرآن دیتا ہے۔ ایسے حالات میں علمائے اہل کتاب کا یہ منظر پیش کرنے کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کی ذات کو کوئی جس نام سے پکارے' پکار سکتا ہے۔ اس کے لیے کئی اسمائے حسنیٰ ہیں۔ جاہلیت میں یہ لوگ اللہ کے لیے رحمٰن کا لفظ استعمال نہ کرتے تھے۔ وہ رحمٰن کو اللہ کا نام نہ سمجھتے تھے اس لیے کہا گیا کہ اللہ کے اسمائے صفات بے شمار ہیں جن سے چاہو' اسے پکارو۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ

"اے نبیؐ ان سے کہو "اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر' جس نام سے بھی پکارو' اس کے لیے سب اچھے ہی نام ہیں"۔

یہ تو اوہام جاہلیت ہیں اور بت پرستی کی واہی باتیں ہیں کہ اللہ کے لیے رحمٰن کا لفظ استعمال نہ کرو' ایسی باتوں کے جواب کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

اب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ نماز میں جہر اور خفا میں میانہ روی اختیار کریں' کیونکہ وہ لوگ حضورؐ کو نماز پڑھتے دیکھ کر مذاق اور ٹھٹھے کرتے تھے۔ اور اس طرح کرنا اللہ کے حضور حاضر ہوتے وقت زیادہ مناسب بھی ہے۔

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝۱۱۰

"اور اپنی نماز نہ بہت زیادہ بلند آواز سے پڑھو اور نہ بہت پست آواز سے' ان دونوں کے درمیان اوسط درجے کا لہجہ اختیار کرو"۔ جس طرح سورت کے مضامین کا آغاز یوں ہوا تھا کہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اور اس کا کوئی شریک اور بیٹا نہیں ہے۔ اور اس کو ولی اور مددگار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ علی و کبیر ہے' تو اسی مضمون پر اس سورت کا خاتمہ بھی ہو رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کے مضامین کا محور یہی ہے۔ انہی مضامین سے اس کا آغاز ہوا اور انہی پر اس کا اختتام ہوا۔

۱۲ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ
۱۱ع شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۝۱۱۱

۱۲ "اور کہو "تعریف ہے اس خدا کے لیے جس نے کسی کو بیٹا بنایا' نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک ہے' اور نہ وہ عاجز ہے کہ کوئی اس کا پشتیبان ہو"۔ اور اس کی بڑائی بیان کرو' کمال درجے کی بڑائی"۔

--- ○○○ ---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ---- ۱۵

## سورۃ الکہف - ۱۸

۱ -- تا -- ۸۲

# سورۃ الکھف ایک نظر میں

اس سورت کا بیشتر حصہ قصص پر مشتمل ہے۔ آغاز میں قصہ اصحاب کہف ہے۔ اس کے بعد دو باغوں کا قصہ ہے۔ اس کے بعد آدم و ابلیس کے قصے کی طرف اشارہ ہے۔ درمیان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ایک صالح بندے کی کہانی ہے۔ اور اس کے آخر میں ذوالقرنین کا قصہ ہے۔ اس سورت کی آیات کا زیادہ تر حصہ 'ان قصص میں چلا گیا ہے' یعنی ۱۱۰ آیات میں سے ۷۱ آیات میں یہ قصص ہیں'۷۱ آیات کے علاوہ جو آیات ہیں ان کا بڑا حصہ بھی انہی قصص پر تبصرہ ہے۔ ان قصص کے ضمن میں مشاہد قیامت میں سے بعض مناظر بھی دیئے گئے ہیں اور خود انسانی زندگی کے بعض وہ مناظر بھی دیئے گئے ہیں جو فکر انگیز ہیں یا جن کی کسی طرح افادیت ہے اور ان سب مضامین کو قرآن کریم کے مصورانہ انداز بیان میں دیا گیا ہے۔

لیکن اس پوری سورت کا موضوع اور محور جس کے ارد گرد اس کے مضامین و قصص چلتے ہیں وہ اسلامی نظریہ حیات' اسلامی عقیدہ اور اسلامی فکر و نظر کی درستگی ہے۔ نیز اسلامی عقائد' اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام کی جو اعلیٰ قدریں ہیں ان کو بھی اس میں صاف صاف بیان کیا گیا ہے۔

اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی تصور زندگی اور اسلامی عقائد سورت کے آغاز اور انجام میں دونوں جگہ تفصیل کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ سورت کا آغاز یوں ہے :

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا (۱) قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا (۲) مّٰكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا (۳) وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا (۴) مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا (۵) (۱۸ : ۱ – ۵) "تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل کی اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہ رکھی۔ ٹھیک ٹھیک سیدھی بات کہنے والی کتاب' تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کر دے' اور ایمان لا کر نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے' اور ان لوگوں کو ڈرا دے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ اس بات کا نہ انہیں کوئی علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو تھا۔ بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے' وہ محض جھوٹ بکتے ہیں"۔

اور سورت کا اختتام یوں ہے :

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓي اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّه فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ( ۱۸ : ۱۱۰ ) "اے محمدؐ کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا ' میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے 'پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو' اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے"۔

یوں سورت کا آغاز اور انجام دونوں ہم آہنگ ہو جاتے ہیں ' دونوں جگہ اللہ کی وحدانیت اور رد شرک ایک ہی جگہ بیان کیا گیا ہے۔ دونوں جگہ وحی کا اثبات کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ذات باری تعالیٰ اور تمام مخلوقات و حوادث میں مکمل فرق ہے۔

یہ موضوع اس سورت کے مختلف مقامات پر دیا گیا ہے اور اسے اس میں بار بار دہرایا گیا ہے اور مختلف انداز میں لایا گیا ہے۔ مثلاً قصہ اصحاب الکہف میں مومن نوجوان یوں گویا ہوتے ہیں :

رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ( ۱۸ : ۱۴ ) "ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمان و زمین کا رب ہے۔ ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بے جا بات کریں گے"۔

اور اس قصے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا گیا :

مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ( ۱۸ : ۲۶ ) "زمین و آسمان کی مخلوقات کا کوئی خبرگیر اس کے سوا نہیں 'اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا"۔

اور دو باغوں کے قصے میں رجل مومن اپنے ساتھی کے ساتھ بات کرتے ہوئے یہ کہتا ہے :

اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ( ۳۷ ) لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ( ۳۸ ) ( ۱۸ : ۳۷ - ۳۸ ) "کیا تو کفر کرتا ہے اس ذات سے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور تجھے ایک پورا آدمی بنا کر کھڑا کیا' رہا میں تو میرا رب تو وہی اللہ ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا"۔

اور اس قصے پر تبصرہ میں یہ مضمون یوں آیا ہے :

وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ( ۴۳ ) هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ

لِلّٰهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا (٤٤) (١٨ : ٤٣ – ٤٤) "نہ ہوا اللہ کو چھوڑ کر اس کے پاس کوئی جتھا کہ اس کی مدد کرتے اور نہ کر سکا تھا وہ آپ ہی اس آفت کا مقابلہ - اس وقت معلوم ہوا کہ کارسازی کا اختیار خدائے برحق ہی کے لیے ہے' انعام وہی بہتر ہے' جو وہ بخشے اور انجام وہی بخیر ہے جو وہ دکھائے )۔

قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں یہ مضمون یوں آتا ہے :

) وَ يَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا (١٨ : ٥٢) "پھر کیا کریں گے یہ لوگ اس روز جبکہ ان کا رب ان سے کہے گا پکارو اب ان ہستیوں کو جنہیں تم میرا شریک سمجھتے تھے - یہ ان کو پکاریں گے مگر وہ ان کی مدد کو نہ آئیں گے اور ہم ان کے درمیان ایک ہی ہلاکت کا گڑھا مشترک کر دیں گے"۔

اور اس منظر پر تبصرے میں یہ مضمون یوں لایا گیا ہے - ۔

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْ اَوْلِيَآءَ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا (١٨ : ١٠٢) "کیا یہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے' یہ خیال رکھتے ہیں کہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا کارساز بنائیں ؟ ہم نے ایسے کافروں کی ضیافت کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے"۔

--- ))) ---

اس سورت میں انسان کے فکر و نظر اور عقل و ادراک کے مناہج کو بھی درست کیا گیا ہے' مثلاً اس میں مشرکین کے ان دعوؤں اور مزعومات پر سخت گرفت کی گئی ہے - جو وہ ان باتوں اور موضوعات کے بارے کرتے تھے - جو انسانی عقل و ادراک کے دائرے سے ماوراء تھیں - اور جن کے بارے میں انسان کوئی دلیل و برہان سرے سے پیش ہی نہیں کر سکتا - چنانچہ اس نکتے کو سامنے رکھ کر انسان کو یہ ہدایت کی گئی کہ اسے چاہیے کہ ان باتوں کے درپے نہ ہو جن کے بارے میں اسے علم نہیں' اپنے دائرۂ علم کے اندر رہ کر بات کرے - جن امور کے بارے میں انسان کو علم نہیں ان کو اللہ پر چھوڑ دے -

اس سورت کے آغاز ہی میں کہا گیا :

وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا (٤) مَالَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّ لَا لِاٰبَآئِهِمْ (٥) (١٨ : ٤ – ٥) "تاکہ وہ ان لوگوں ڈراوے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے - اس بات کا نہ انہیں کوئی علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو تھا"۔

دوسری جگہ اصحاب کہف نوجوان یوں کہتے ہیں -

هٰؤُلَاۤءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍ بَيِّنٍ (۱۸ : ۱۵)
"یہ لوگ ہماری قوم ہیں جنہوں نے اللہ کے سوا الہٰ بنا رکھے ہیں۔ کیوں نہیں لاتے یہ ان پر کوئی دلیل بین"۔ اور جب خود ان سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ کتنا عرصہ غار میں رہے تو وہ یہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔

قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ (۱۸ : ۱۹) "انہوں نے کہا تمہارا رب زیادہ اچھا جاننے والا ہے کہ تم نے کتنا عرصہ گزارا؟"۔

پھر اس قصے کے درمیان 'اصحاب کہف کی تعداد کے بارے ان کے اندازوں کے متعلق کہا گیا کہ یہ سب بے تکی ہانکتے ہیں۔

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا (۱۸ : ۲۲) "کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور کچھ دوسرے کہہ دیں گے کہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب بے تکی ہانکتے ہیں۔ کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ کہو' میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں۔ پس سرسری بات سے بڑھ کر ان کی تعداد کے معاملے میں لوگوں سے بحث نہ کرو' اور نہ ان کے متعلق کسی سے کچھ پوچھو"۔

حضرت موسیٰ اور بندۂ صالح کے قصے میں جب وہ بندۂ صالح اپنے تصرفات کی تفسیر بیان کرتے ہیں تو بتا دیتے ہیں کہ حقیقت تو اللہ جانتا ہے۔ اس نے فقط حکم الٰہی کی تعمیل کی۔ حضرت موسیٰ نے ان کے ان تصرفات پر تنقید کی تھی۔ وہ کہتے ہیں :

رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ (۱۸ : ۸۲) "یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا۔ میں نے کچھ اپنے اختیار سے نہیں کر دیا ہے"۔ وہ حقیقت حال اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔

---ooo---

چونکہ اعلیٰ اجتماعی قدروں کا قبلہ اسلامی نظریہ حیات کے پیمانے سے درست کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کا اظہار متعدد مقامات پر ہوتا ہے جبکہ ایمان اور عمل صالح پر مبنی اقدار سامنے آتی ہیں اور ان کے علاوہ تمام دنیاوی قدریں نظروں سے گر جاتی ہیں جو دنیاوی اعتبار سے اور دنیا پرستوں کی نظر میں بہت اہم ہیں۔ اور نظروں کو چکاچوند کرنے والی ہیں۔

مثلاً یہ کہ زمین پر جو سامان زیب و زینت ہے وہ ایک آزمائش اور ابتلا ہے اور اس کا انجام زوال اور فنا ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۷) وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا (۸) (۱۸ : ۷ - ۸) "واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ سروسامان بھی زمین پر ہے' اس

کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ آخر کار اس سب کو ہم ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں"۔

ایمانی اقدار میں سے اہم قدر یہ ہے کہ اللہ کی پناہ سب سے بڑی اور سب سے وسیع ہے۔ اگرچہ انسان ایک پتھریلے غار میں کیوں نہ ہو، اصحاب کہف کے نوجوان مومن جب اپنی قوم کو چھوڑ کر غار میں پناہ لیتے ہیں تو وہ یوں فیصلہ کرتے ہیں :

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا (۱۸ : ۱۶) "اب جبکہ تم ان سے اور ان کے معبودان غیراللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو، تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمہارے کام کے لیے سروسامان مہیا کر دے گا"۔

اس میں خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت دی گئی کہ آپ اہل ایمان کو ساتھی بنا کر اپنے مشن پر جم جائیں۔ اور دنیا پرستوں اور حصول دنیا میں ڈوبے ہوئے غافلوں کی پرواہ نہ کریں۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۲۸) وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۲۹) (۱۸ : ۲۸ - ۲۹) "اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں، اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو؟ کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو، جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط وتفریط پر مبنی ہے۔ صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے"۔

دو باغوں کی کہانی یہ بتاتی ہے کہ ایک مومن کو اپنے ایمان پر فخر ہوتا ہے اور وہ ایمان کے مقابلے میں مال و دولت اور زندگی کے سازوسامان کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اور ایک مومن ایک بر خود غلط، مغرور اور سرکش و بے دین پر کس طرح تنقید کرتا ہے اور اسے متنبہ کرتا ہے کہ اس نے مالک حقیقی کو بھلا دیا ہے۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا (۳۷) لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا (۳۸) وَلَوْلَآ

اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا (۳۹) فَعَسٰي رَبِّيْ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَ يُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا (۴۰) اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا (۴۱) (۱۸: ۳۷ - ۴۱) "اس کے ہمسائے نے گفتگو کرتے ہوئے اس سے کہا 'کیا تو کفر کرتا ہے اس ذات سے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور پھر تجھے ایک پورا آدمی بنا کھڑا کیا؟ رہا میں 'تو میرا رب وہی اللہ ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا اور جب تو اپنی جنت میں بھی داخل ہو رہا تھا تو اس وقت تیری زبان سے یہ کیوں نہ نکلا کہ ماشاء اللہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ' اگر تو مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کم تر پا رہا ہے تو بعید نہیں ہے کہ میرا رب مجھے تیری جنت سے بہتر عطا فرما دے اور تیری جنت پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس سے وہ صاف میدان بن کر رہ جائے یا اس کا پانی زمین میں اتر جائے اور پھر تو اسے کسی طرح نہ نکال سکے"۔

اس قصے کے بعد یہ مثال دی جاتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں جس طرح جلد ترو تازگی پیدا ہوتی ہے 'اسی طرح جلد اس پر زوال بھی آجاتا ہے جس طرح ایک فصل آتی ہے 'لہلاتی ہے 'اور پھر بھوسے کی شکل میں ہواؤں کے ساتھ اڑتی پھرتی ہے۔

وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا

(۱۸: ۴۵) "اے نبی انہیں حیات دنیا کی حقیقت اس مثال سے سمجھاؤ کہ ہم نے آسمان سے پانی برسایا تو زمین کی پود خوب گھنی ہو گئی اور کل وہی نباتات بھس بن کر رہ گئی ہے جسے ہوائیں اڑائے لیے پھرتی ہیں 'اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

اور اس پر ایک تبصرہ آتا ہے کہ زائل ہونے والی قدریں کون سی ہیں اور باقی رہنے والی قدریں کون سی ہوتی ہیں :

اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا (۱۸: ۴۶) "یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انہی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں"۔

ذوالقرنین کا ذکر اس لیے نہیں کیا جاتا کہ وہ ایک بادشاہ تھا بلکہ وہ اپنے اعمال صالحہ کی وجہ سے یاد رکھا جاتا ہے۔ جب ذوالقرنین کے سامنے یہ تجویز رکھی جاتی ہے کہ وہ ان کے لیے ایک دیوار بنا دے جو ان کو یاجوج و ماجوج سے بچائے۔ اور اس کے اخراجات وہ ادا کرنے کے لیے تیار ہیں تو وہ ان کی جانب سے قیمت کی ادائیگی کو رد کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ نے مجھے اس زمین پر جو تمکن دیا ہے وہ اس مال سے بہتر ہے جو تم مجھے دینا چاہتے ہو۔

قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ (۱۸: ۹۵) "جو کچھ میرے رب نے مجھے دے رکھا ہے وہ بہت ہے"۔ لیکن جب بند تیار ہوتا ہے تو وہ اسے اپنے رب کی طرف منسوب کرتا ہے' اپنی قوت کی طرف نہیں۔

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّي فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا (۱۸: ۹۸) "یہ میرے رب کی رحمت ہے مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوند خاک کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ حق ہے"۔

سورت کے آخر میں یہ فیصلہ دیا جاتا ہے کہ اعمال کے اعتبار سے کون لوگ بڑے خسارے میں ہوں گے۔ وہی لوگ جو قیامت کے منکر ہیں۔ تو ایسے لوگوں کے اعمال کا کوئی وزن نہ ہو گا' نہ ان کی کوئی قیمت ہو گی۔ اگرچہ بظاہر وہ سمجھتے ہوں گے کہ ان کے اعمال وزن دار ہیں۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا (۱۰۳) الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا (۱۰۴) أُولٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (۱۰۵) (۱۸: ۱۰۳ تا ۱۰۵) "اے محمدؐ ان سے کہو کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد راہ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ ہیں لوگ جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ اس لیے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے۔ قیامت کے دن ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے"۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اس سورت کا محور و موضوع عقائد کی درستگی' فکر و نظر کی درستگی اور اسلامی فکر کے مطابق اعلیٰ قدروں کی اہمیت ہے۔

--- ۰۰۰ ---

اس پوری سورت کا مضمون ان موضوعات کے گرد گھومتا ہے۔ آغاز اللہ کی حمد و ثنا سے ہوتا ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری جس کا مقصد لوگوں کو خبردار کرنا ہے۔ مومنین کو بشارت دینا اور ان لوگوں کو ڈرانا جن کے عقائد یہ ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ پھر یہ کہا گیا ہے کہ زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ زینت ہے اور دنیا میں انسان ایک امتحان اور آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہے اور آخری انجام اس دنیا کا زوال ہے اور یہ دنیا فانی ہے۔ اس کے بعد قصہ اصحاب کہف جس کی غرض و غایت یہ ہے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی اور عیش و عشرت پر ایمان کو فوقیت دی اور ایمان پر آرام اور عیش و عشرت کو قربان کر دیا۔ ایک غار میں جا کر اللہ کی پناہ لے لی اور اپنے عقیدے اور نظریہ حیات کو بچا لیا۔

اس سورت کے دوسرے حصے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ اپنے آپ کو ان لوگوں کے

ساتھ وابستہ رکھیں جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور صرف رضائے الٰہی چاہتے ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے ذکر سے غافل ہیں ان کو نظرانداز کر دیں۔ اس کے بعد دو باغوں کا قصہ آتا ہے جس میں ایک مومن دنیا کی قدروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور یہ حصہ اس بات پر ختم ہو جاتا ہے کہ اعلیٰ قدریں وہ ہیں جو اللہ کے نزدیک قابل اجر ہوں۔

اس سورت کا تیسرا حصہ کئی مناظر پر مشتمل ہے۔ قیامت کا منظر، بیچ میں قصہ آدم و ابلیس ہے اور آخر میں اللہ کی اس سنت کا ذکر ہے کہ وہ ظالموں کو کس طرح ہلاک فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ کی یہ رحمت ہے کہ وہ گناہ گاروں کو بھی ایک وقت تک مہلت دیتا ہے۔

آخری دو قصوں میں حضرت موسیٰ اور عبد صالح کا قصہ ہے۔ ذوالقرنین کا قصہ ہے اور سورت کا خاتمہ اسی طرح ہوتا ہے جس طرح آغاز ہوا یعنی مومنین کو خوشخبری اور کافروں کو انجام بد سے ڈراوا۔ وحی کا ثبوت اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے شرک کی نفی۔

اب ہم پہلے حصے کی تفصیلات دیتے ہیں۔

---○○○---

# درس نمبر ۱۳۰ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۲۷

---

سُورَةُ الْكَهْفِ مَكِّيَّةٌ (۶۹) (۱۸) اٰیاتُها ۱۱۰ رکوعاتُها ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۜ قَيِّمًا
لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ
اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۙ مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۙ وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ
اللّٰهُ وَلَدًا ۗ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ۭ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ
اَفْوَاهِهِمْ ۭ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ
يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ
اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝

"تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل کی اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہ رکھی ۔ ٹھیک ٹھیک سیدھی بات کہنے والی کتاب 'تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کر دے ' اور ایمان لا کر نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے جس میں ہمیشہ رہیں گے ' اور ان لوگوں کو ڈرا دے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے ۔ اس بات کا نہ انہیں کوئی علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو تھا ۔ بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے ' وہ محض جھوٹ بکتے ہیں ۔

اچھا، تو اے نبیؐ، شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو، اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ سروسامان بھی زمین پر ہے۔ اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں۔ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ آخر کار اس سب کو ہم ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں"۔

اس سورت کا آغاز نہایت ہی پر اعتماد اور فیصلہ کن انداز میں ہو رہا ہے۔ اللہ کی تعریف اس بات پر کی جا رہی ہے کہ اس نے اپنے بندے پر یہ کتاب اتاری۔ یہ ایک سیدھی کتاب ہے، اس کی تعلیمات سیدھی ہیں اور سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتی ہیں۔ ان میں کوئی ٹیڑھ پن اور ہیر پھیر نہیں ہے، اس میں لاگ لپیٹ کے بغیر بات کی جا رہی ہے۔ یہ کیوں؟

لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ (۱۸ : ۲) "تاکہ لوگوں کو خدا کی طرف سے آنے والے سخت عذاب سے ڈراوے"۔ پہلی ہی آیت سے نشان منزل آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کتاب کا نظریہ کیا ہے، بغیر کسی التباس اور بغیر کسی پیچیدگی کے۔ اللہ نے یہ کتاب نازل کی ہے اور اللہ قابل حمد و ثنا ہے کہ اس نے یہ احسان کیا۔ محمد اللہ کے بندے ہیں جیسا کہ تمام لوگ اللہ کے بندے ہیں۔ اللہ کا نہ کوئی بیٹا ہے اور نہ کوئی شریک۔

اور یہ کتاب کیسی ہے؟ اس میں کوئی ٹیڑھ پن نہیں ہے۔ یہ قیم ہے۔ اس کی تعلیمات کے سیدھے پن کا اظہار ایک دفعہ یوں کیا جاتا ہے کہ اس کے اندر کوئی ٹیڑھ پن نہیں اور دوسری مرتبہ یوں کہا جاتا ہے کہ یہ قیم ہے یعنی سیدھی۔ یعنی اس کتاب اور اسلام کے صراط مستقیم ہونے کی تاکید شدید۔

اور یہ کتاب کیوں نازل کی گئی؟

لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا (۱۸ : ۲) "تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کر دے، اور ایمان لا کر نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے"۔

اس پوری سورت میں سخت اور قطعی الفاظ میں ڈراوا بھی ہے۔ ڈراوے کا آغاز تو اجمالی اور اصولی طور پر ہوتا ہے۔

لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ (۱۸ : ۲) "تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کر دے"۔ اور اس کے بعد پھر مخصوص طور پر مشرکین کو ڈرایا جاتا ہے۔

وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا (۱۸ : ۴) "اور ان لوگوں کو ڈرائے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے"۔ لیکن انذار اور ڈراوے کے ساتھ ساتھ مومنین کے لیے تبشیر بھی ہے۔ ان لوگوں کے لیے خوشخبری ہے جو عمل صالح کرتے ہیں۔ یہاں ایمان کے بعد عمل صالح کی قید لگائی گئی ہے۔

الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ (۱۸ : ۲) یہ اس لیے لگائی گئی ہے کہ عمل صالح ایمان کی دلیل ہوتا ہے اور ظاہری عمل کی بنا پر کوئی کسی کے بارے میں فیصلہ کر سکتا ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کی غلط سوچ اور غلط انداز فکر کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس کائنات کے سب سے بڑے اور سب سے مشکل اور نازک مسئلے کے بارے کس قدر غلط سوچ رکھتے ہیں یعنی اس کائنات کے بارے میں اور اس کے خالق کے بارے میں عقائد کے مسئلے کے متعلق۔

مَالَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ (۱۸ : ۵) "اس بات کا نہ انہیں کوئی علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو تھا"۔ لہٰذا بغیر علم کے اس موضوع پر کلام کرنا ان کے لیے مناسب نہیں ہے۔ بلکہ اس طرح بے تکی باتیں کرنا ان کے لیے انجام کار شرمندگی کا باعث ہو گا۔

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا (۱۸ : ۵) "بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے، وہ محض جھوٹ بکتے ہیں"۔ قرآن کریم نے ان کے کلام اور ان کے عقیدے کے لیے جو الفاظ چنے ہیں وہ تعبیر مفہوم اور الفاظ کی آواز دونوں کے اعتبار سے ان کے کلمہ اور ان کی بات کے قابل مذمت ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ پہلا لفظ ہے (کبرت) تاکہ سننے والے کو معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ جو بات کرتے ہیں وہ غایت درجے کی قابل مذمت اور بہت بڑی بات ہے باعتبار نتائج۔ كَلِمَةً تو ضمیر جملہ سے تمیز کے طور پر لایا گیا۔ یعنی كَبُرَتْ کے اندر موجود ضمیر سے۔

یہ زیادہ متوجہ کرنے کے لیے کہ ان کے منہ سے یہ عظیم بات بڑی لاپرواہی اور بے تکے انداز میں نکل رہی ہے۔ اور بغیر کسی احتیاط اور جھجک کے بس نکلی چلی آرہی ہے۔

تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ (۱۸ : ۵) "ان کے منہ سے نکلتی ہے"۔ افواھم کا تلفظ بھی بڑا برا ہے اور مفہوم کے اعتبار سے بھی اس لفظ سے ان کی بات زیادہ قابل مذمت معلوم ہوتی ہے اور لفظی اعتبار سے بھی ایک شخص اس لفظ کو منہ کھول کر افوا ادا کرتا ہے۔ اور اس کے بعد باہم متصل دو ھاء کی ادائیگی سے اس کا منہ بھر جاتا ہے اور ہم تک پہنچتے پہنچتے اس کا منہ پھول جاتا ہے۔ لہٰذا مفہوم اور ترکیب اور تلفظ تینوں اعتبار سے اس بات اور کلمہ کی شناعت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد تاکید منفی بھی آجاتی ہے۔ یعنی :

اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا (۱۸ : ۵) (نہیں کہتے وہ مگر جھوٹ"۔ پھر یہاں مَا يَقُوْلُوْنَ نہیں کہا ہے۔ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ کہا ہے کیونکہ لفظ ان میں نون ساکن ہونے کی وجہ سے سختی اور فیصلہ کن انداز پایا جاتا ہے اور ما میں مد الف ہے جو نرم بات کو ظاہر کرتی ہے۔ اور یہ سب لفظی اور معنوی سختی محض تاکید کے لیے کہی گئی ہے کہ یہ کلمہ یا یہ بات جو یہ لوگ کہتے ہیں 'نہایت ہی عظیم بات ہے اور اس کے نتائج ان کے لیے بہت ہی سنگین ہیں"۔

ان کی اس بات پر گرفت شدید کے ساتھ ساتھ اس طرح کی ایک تنبیہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی کی جاتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات پر بہت ہی پریشان تھے کہ آپ کی قوم آپ کی تکذیب کر رہی ہے اور ایسے طریقے اختیار کر رہی ہے جن کا انجام ہلاکت کے سوا کچھ نہیں' تو حضور اکرمؐ کو بھی ذرا سخت الفاظ میں کہا جاتا ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (۱۸ : ٦)
"اچھا تو اے نبیؐ شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو' اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے"۔ یعنی تم رنج و ملال کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاک کر دینا چاہتے ہو کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ حالانکہ ان لوگوں کا رویہ تو یہ ہے کہ آپ ان کے بارے میں کوئی رنج اور غم اپنے اوپر طاری نہ کریں۔ اب ان کو چھوڑ دیں۔ یہ اس دنیا میں گم ہیں اور اس دنیا میں جو سروسامان ہم نے پیدا کیا ہے' وہ محض زیب و زینت کا سامان ہے۔ مال اور اولاد اور یہ ان لوگوں کے لیے امتحان اور آزمائش ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس دنیا میں کون اچھے اعمال کرتا ہے اور کون برے اعمال کرتا ہے۔ کون اس دنیا کی متاع کے لیے اپنے آپ کو مستحق ثابت کرتا ہے اور کون آخرت کے ساز و سامان کا خیال کرتا ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۱۸ : ۷) "واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ بھی سروسامان زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے" اللہ کو تو خوب معلوم ہے لیکن مقصد یہ ہے کہ عملاً ان باتوں کا صدور ان سے ہو جائے اور ظاہر ہو جائے کہ زندگی میں کون ہے جو احسن رویہ اختیار کرتا ہے۔ یہاں برے اعمال کرنے والوں کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ ان کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی ہے کیونکہ انداز کلام سے ان کے بارے میں مفہوم واضح ہے۔

اور دنیا کی اس زیب و زینت کا انجام بھی معلوم ہے۔ ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ اس دنیا کی یہ سب رنگینیاں ختم ہو جائیں گی اور دنیا ایک چٹیل میدان ہو گی اور اس پر جو کچھ ہے سب نیست و نابود ہو گا' انسان حیوانات و نباتات سب ختم ہوں گے۔ یہ دنیا خشک اور چٹیل میدان ہو گی۔

وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا (۱۸ : ۸) "آخر کار اس سب کو ہم ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں"۔

تعبیر فیصلہ کن انداز کی ہے۔ منظر بھی سخت ہے' (جُرُزًا) کا کلمہ لفظاً اور معنیً خشکی اور بے آب و گیاہ میدان کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح لفظ (صَعِيْدًا) بھی میدان' ہمواری اور سختی کو لفظاً اور معنیً ظاہر کرتا ہے۔

---ooo---

اب قصہ اصحاب کہف آتا ہے۔ یہ ایسے لوگوں کا ایک نمونہ پیش کرتا ہے جن کے دلوں میں ایمان بیٹھ جاتا ہے اور جب ایمان دلوں میں اتر جاتا ہے تو وہ اطمینان اور سکون سے اس طرح بھر جاتے ہیں جس طرح اصحاب کہف تھے۔ پھر یہ دل زمین کی آرائش اور زیب و زینت کو کچھ نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ غار میں پناہ لیتے ہیں' غار میں کیا چیز لے جا کر چھپاتے ہیں؟ ایمان اور صرف دولت ایمان۔ یہ لوگ اس وقت غار میں جاتے ہیں جب وہ ایمان کی حفاظت کرتے ہوئے لوگوں میں نہیں رہ سکتے۔ اب دیکھئے کہ اللہ ایسے لوگوں کو کس طرح بچاتا ہے۔ ان کو فتنوں سے محفوظ کرتا ہے اور اپنی رحمت سے ڈھانپ لیتا ہے۔

اس قصے کے بارے میں بے شمار روایات ہیں۔ اور بہت سی آراء ہیں اور قصے کہانیوں کی بعض پرانی کتابوں میں ان کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ بہتر طریق کار یہ ہے کہ ہم قرآن کی حد تک اپنے آپ کو محدود کرتے ہیں کیونکہ

قرآن ہی واحد یقینی مصدر علم ہے۔ روایات اور قصوں کو ہم انکی جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ روایات ہمارے تفسیری ذخیرے میں راہ پاگئی ہیں۔ بغیر سند اور صحت کی جانچ پڑتال کیے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ قرآن نے اس بات سے منع کیا ہے کہ اس سلسلے میں غیر قرآنی مصادر کی طرف ہرگز رجوع نہ کیا جائے اور اس میں محض تیر تکے نہ چلائے جائیں۔

اس قصے اور ذوالقرنین کے قصے کے نزول کے سلسلے میں ایسی روایات وارد ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے اہل مکہ کو سوالات دے کر ابھارا کہ یہ سوالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیے جائیں۔ ان دو قصوں کے بارے میں اور روح کے بارے میں یا اہل مکہ نے یہودیوں سے امداد طلب کرتے ہوئے یہ کہا کہ ہمیں کچھ ایسے سوالات بتاؤ تاکہ ہم ان کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے امتحان لیں۔ یہ دونوں باتیں صحیح ہو سکتی ہیں کیونکہ ذوالقرنین کے قصے کی ابتدا یوں ہے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا (۱۸ : ۸۳) "وہ تم سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہ دو میں اس کے بارے میں تمہیں بتاؤں گا"۔ لیکن قصہ اصحاب کہف کے بارے میں اس قسم کی بات نہیں آئی۔ اس لیے ہم اس قصے کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ قصہ بذات خود سورت کے محور اور موضوع کلام سے واضح طور پر مربوط ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے یہ بات کہہ دی ہے۔

فنی اعتبار سے اس قصے کو پیش کرنے کے لیے قرآن میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ وہ پہلے اجمالی تلخیص کا ہے اور پھر اس کی تفصیلات پر بحث کا ہے۔ یہ قصہ کئی مناظر کی شکل میں پیش کیا گیا ہے لیکن مختلف مناظر کے درمیان خلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ مضمون اور سیاق کلام سے یہ خلا خود بخود ذہن میں آجاتے ہیں۔ اس قصے کا آغاز یوں ہے :

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا
عَجَبًا ﴿٩﴾ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ
لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ﴿١٠﴾ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ﴿١١﴾ ثُمَّ
۱
ع ۱۲ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ﴿١٢﴾

۱۳ "کیا تم سمجھتے ہو کہ غار اور کتبے والے ہماری کوئی بڑی عجیب نشانیوں میں سے تھے؟ جب وہ چند نوجوان غار میں پناہ گزیں ہوئے اور انہوں نے کہا کہ "اے پروردگار، ہم کو اپنی رحمت خاص سے نواز اور ہمارا معاملہ درست کر دے"، تو ہم نے انہیں اسی غار میں تھپک کر سالہا سال کے لیے گہری نیند سلا دیا، پھر ہم نے انہیں اٹھایا تاکہ دیکھیں ان کے دو گروہوں میں سے کون اپنی مدت قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے"۔

یہ اس قصے کی تلخیص ہے اور اس کی روٹ لائن اس میں دی گئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک گروہ تھا۔ تعداد معلوم نہیں ہے۔ یہ اہل ایمان تھے۔ انہوں نے غار میں پناہ لی تھی۔ ان کے کانوں پر مہر لگا دی گئی تھی یعنی سو گئے

تھے ،کئی سال تک - سالوں کی تعداد معلوم نہیں - اس طویل نیند سے وہ اٹھائے گئے - ان کی میعاد کہف کے بارے ان میں دو گروہ ہو گئے تھے تاکہ معلوم ہو کہ کس کا اندازہ زیادہ درست ہے - اور یہ کہ یہ قصہ عجیب و غریب ہونے کے باوجود عجیب نہیں ہے - اس کائنات میں اس سے بھی زیادہ عجوبے ہیں اور اصحاب کہف اور اصحاب رقیم سے زیادہ عجیب تر -

یہ پرکشش تلخیص دینے کے بعد اب اس قصے کی تفصیلات دی جا رہی ہیں - تفصیلات سے پہلے بتایا جاتا ہے کہ ان کے بارے میں چونکہ تاریخی روایات میں بے حد اضطراب پایا جاتا ہے - اس لیے قرآن کریم میں ہم جو کچھ بتا رہے ہیں وہ فیصلہ کن امر ہے اور یہی حق الیقین ہے -

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا
بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى ۝۱۳ وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ۝۱۴
هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْ لَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ ؕ
فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝۱۵ وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ
اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ
اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ۝۱۶

"ہم ان کا اصل قصہ تمہیں سناتے ہیں' وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی - ہم نے ان کے دل اس وقت مضبوط کر دیئے جب وہ اٹھے اور انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ "ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے - ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے - اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بے جا بات کریں گے" - (پھر انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا) "یہ ہماری قوم تو رب کائنات کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا بیٹھی ہے - یہ لوگ ان کے معبود ہونے پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ آخر اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟ اب جبکہ تم ان سے اور ان کے معبودان غیراللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو - تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمہارے کام کے لیے سروسامان مہیا کر دے گا" -

اس قصے کے مناظر میں سے یہ پہلا منظر ہے -

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ (۱۸ : ۱۳) "وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے"۔ اور مزید یہ کہ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى (۱۸ : ۱۳) "اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی"۔ یعنی ان کو یہ الہام کر دیا تھا کہ وہ اپنے معاملات میں کس طرح تدابیر اختیار کریں اور پھر وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (۱۸ : ۱۴) "اور ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیئے"۔ چنانچہ یہ لوگ اپنے ایمان پر ثابت قدم ہو گئے۔ راسخ العقیدہ ہو گئے اور جس سچائی کو انہوں نے اختیار کیا تھا اور جان لیا تھا اس پر استقامت اختیار کر لی تھی اور جو ایمان انہوں نے اپنایا تھا وہ انہیں بہت ہی عزیز تھا۔

اِذْ قَامُوْا (۱۸ : ۱۴) یعنی وہ اٹھے اور انہوں نے ایمان کی تحریک برپا کر دی اور وہ عزم و ثبات کا پیکر بن گئے۔

فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۱۸ : ۱۴) "انہوں نے کہا ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے"۔ وہ رب کائنات ہے۔ سب کی سب کا۔

لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا (۱۸ : ۱۴) "ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے"۔ کیونکہ وہ واحد ہے اور بلا شریک ہے۔

لَقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا (۱۸ : ۱۴) "اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بے جا بات کریں گے"۔ حق سے تجاوز کریں گے اور صحیح راستے سے ایک طرف ہو جائیں گے۔

اس کے بعد وہ اس امر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس پر ان کی قوم عمل پیرا تھی' وہ ان کے عقائد پر تنقید کرتے ہیں اور اس منہاج پر اعتراض کرتے ہیں جس کے مطابق ان کی قوم زندگی بسر کر رہی تھی'

هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَوْ لَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ (۱۸ : ۱۵) "یہ ہماری قوم تو رب کائنات کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا بیٹھی ہے' یہ لوگ ان کے معبود ہونے پر کوئی بین دلیل کیوں نہیں لاتے"۔

اسلامی نظریہ حیات میں یہ بات عقیدے کا حصہ ہے کہ انسان جو موقف اختیار کرے اس پر اس کے پاس دلیل بین ہو۔ ایسی دلیل ہو جو دل کو لگتی ہو' اور عقل اسے تسلیم کرتی ہو' اگر ایسا نہیں ہے تو وہ کذب اور افتراء ہے اور یہ چونکہ کذب علی اللہ ہے' اس لیے یہ زیادہ گھناؤنا جھوٹ ہے۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (۱۸ : ۱۵) "آخر اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے"۔

یہاں تک تو اس قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان نوجوانوں کا موقف واضح' صریح اور دو ٹوک ہے' اس میں کوئی تردد یا کوئی توقف نہیں ہے۔ یہ نوجوان ہیں' جسمانی لحاظ سے بھی قوی ہیں' ایمان میں بھی شدید ہیں اور قوم جس غلط راہ پر چل رہی ہے' اس سے بھی انہیں سخت نفرت ہے۔

دو گروہوں کی راہیں مختلف ہو چکی ہیں' ان کی زندگی کے طریقے ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں' اب دونوں کے باہم ملنے کے لیے کوئی موقف نہیں ہے۔ ان دونوں کی زندگیاں ایک جگہ نہیں گزر سکتیں۔ لہذا صرف ایک راہ رہ جاتی ہے وہ یہ کہ یہ نوجوان اپنے نظریات کو لے کر ہجرت کر جائیں' یہ اپنی قوم کی طرف رسول بنا کر نہ بھیجے گئے تھے تاکہ وہ اپنی قوم کا مقابلہ کریں۔ اپنے نظریات پر جم جائیں' غلط نظریات کے مقابلے میں صحیح نظریات پیش کریں۔ ان کو دعوت دیں اور اس انجام تک پہنچیں جس تک رسول پہنچتے ہیں بلکہ وہ کچھ نوجوان تھے' کافرانہ ماحول میں ان کو ایمان کی روشنی مل گئی تھی۔ اگر وہ ایسے ماحول میں اپنے عقائد کا اظہار کرتے ہیں تو اس معاشرے میں ان کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ صورت حال یہ تھی کہ وہ اپنی قوم کے ساتھ مقابلہ بھی نہ کر سکتے تھے' خود قوم کی راہ پر بھی نہ جا سکتے تھے' قوم کو اپنی راہ پر نہ لا سکتے تھے' نہ وہ تقیہ کر کے ان کے غلط الہوں کی عبادت کر سکتے تھے اور نہ اپنی عبادت کو چھپا سکتے تھے بلکہ راجح بات یہ ہے کہ ان کے عقائد و نظریات کے بارے میں کافروں کو علم ہو چکا تھا۔ اس لیے ان کے لیے صرف ایک ہی راہ رہ گئی تھی کہ وہ اپنے دین اور نظریات کو لے کر بھاگ نکلیں۔ اور شہر میں پر آسائش زندگی بسر کرنے کے بجائے کسی غار میں جا چھپیں۔ انہوں نے باہم مشورہ کیا اور یہ فیصلہ کیا :

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا (۱۸ : ۱۶) "اب جبکہ تم ان سے اور ان کے معبودان غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو' تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمہارے کام کے لیے سروسامان مہیا کرے گا"۔

یہاں حقیقی مومن دلوں کی اصل حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ یہ نوجوان اپنی قوم کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے ہیں۔ یہ اپنے علاقے کو چھوڑ رہے ہیں۔ اپنے اہل و عیال کو چھوڑ رہے ہیں' گھروں اور کاروبار اور کرۂ ارض اور اس دنیا کی زیب و زینت کو چھوڑ رہے ہیں۔ اور یہ لوگ کہاں پناہ لے رہے ہیں؟ ایک کرخت' پتھریلی جگہ اور تاریک غار میں۔ لیکن یہاں رحمت خداوندی ہے اور اس رحمت میں وہ خوش ہیں۔ اس تاریک غار میں انہیں اللہ کی رحمت سے رضامندی نہایت وسیع نظر آتی ہے۔

يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ (۱۸ : ۱۶) "تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن پھیلا دے گا"۔

ینشر کا لفظ کشادگی' وسعت اور خوشی اور مسرت کا اظہار کر رہا ہے۔ یہ تاریک غار ان کے لیے ایک کھلا میدان ہے اور کھلی فضا ہے۔ طویل و عریض میدان ہے اور اس میں رحمت خداوندی کی چھاؤں ہے اور یہاں وہ نہایت ہی خوشحالی' آرام اور سکون محسوس کرتے ہیں۔ جب اللہ کی رحمت ہو تو نہایت ہی تنگ جگہ ایک وسیع میدان نظر آتی ہے۔ اور ان کی اونچی اونچی دیواریں گر جاتی ہیں' اور تنہائی اور وحشت کے غبار چھٹ جاتے ہیں۔ رحمت خداوندی' شفقت اور خوشی اور سہولت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

یہ امر قابل غور ہے کہ اس ظاہری دنیا کی قدر و قیمت کیا ہے؟ اور دنیاوی زندگی کی ان اقدار کی کیا قیمت جن سے

لوگ اس زندگی میں متعارف ہو چکے ہیں؟ اور ان کے عادی ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان کی دنیا ایک دوسری دنیا ہے۔ اس دنیا کے سازو سامان کچھ اور ہیں۔ اس دنیا میں ایک مومن رحمٰن کے ساتھ 'انس و محبت کے ساتھ' اللہ کے سایہ میں 'اللہ کی رضامندی' محبت اور اطمینان کے وسیع سائے میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اب اس منظر سے پردہ گرتا ہے اور جب پردہ اٹھتا ہے تو ایک دوسرا منظر ہمارے سامنے ہے۔ یہ نوجوان ہیں۔ یہ اس غار میں نہایت ہی اطمینان سے گہری نیند میں ڈوبے ہوئے آرام کر رہے ہیں۔

وَ تَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾ وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ ۖۗ وَّ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖۗ وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿۱۸﴾

"تم انہیں غار میں دیکھتے تو تمہیں یوں نظر آتا کہ سورج جب نکلتا ہے تو ان کے غار کو چھوڑ کر دائیں جانب چڑھ جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو ان سے بچ کر بائیں جانب اتر جاتا ہے اور وہ ہیں کہ غار کے اندر ایک وسیع جگہ میں پڑے ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے' جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے اللہ بھٹکا دے اس کے لیے تم کوئی ولی مرشد نہیں پا سکتے۔ تم انہیں دیکھ کر یہ سمجھتے کہ وہ جاگ رہے ہیں' حالانکہ وہ سو رہے تھے۔ ہم انہیں دائیں بائیں کروٹ دلواتے رہتے تھے۔ اور ان کا کتا غار کے دہانے پر ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔ اگر تم کہیں جھانک کر انہیں دیکھتے تو الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور تم پر ان کے نظارے سے دہشت بیٹھ جاتی"۔

یہ عجیب مصورانہ منظر ہے' غار کے اندر پڑے ہوئے نوجوانوں کی ہوبہو تصویر کشی کی گئی ہے۔ الفاظ کے ذریعے ایسی تصویر کشی جس طرح فلم چل رہی ہے' اور ہم دیکھ رہے ہیں۔ سورج طلوع ہوتا ہے اور وہ ایک طرف ہو کر گزر جاتا ہے گویا وہ عمداً ایسا کر رہا ہے تزاور' کا لفظ سورج کے طلوع کے عمل کے ساتھ ساتھ سورج کے ارادے کا اظہار بھی کرتا ہے۔ یعنی وہ ان کو چھوڑ کر دائیں طرف نکل جاتا ہے اور جب وہ غروب ہوتا ہے کہ وہ شمال کی طرف ہو کر گزر جاتا ہے اور یہ لوگ غار کے اندر ایک وسیع جگہ میں پڑے ہیں۔

اس منظر کی تکمیل سے پہلے درمیان میں ایک قرآنی تبصرہ بھی آجاتا ہے۔ قرآن کا یہ مخصوص اسلوب کلام ہے کہ قصے کے درمیان مناسب جگہ پر انسانی دلوں کو اللہ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ (۱۸ : ۱۷) "یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے"۔ ان کو غار میں یوں رکھنا' سورج کی شعاعوں سے ان کو محفوظ رکھنا' اور سورج کی روشنی ان کو فراہم کرنا' اور غار کے اندر ان کو اس حال میں رکھنا کہ نہ مرتے ہیں اور نہ حرکت کرتے ہیں۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا (۱۸ : ۱۷) "جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے اللہ بھٹکا دے اس کے لیے تم کوئی ولی مرشد نہیں پا سکتے"۔ ہدایت اور ضلالت کے لیے ایک قانون قدرت اور ایک سنت الٰہیہ ہے جو شخص آیات الٰہیہ کو دیکھ کر ہدایت کی راہ لے' اس کے ناموس قدرت کے تحت' تو وہ حقیقی ہدایت یافتہ ہو گا۔ اور جس نے ہدایت کے اسباب ہی فراہم نہ کیے وہ گمراہ ہوا اور اس کی گمراہی بھی سنت الٰہیہ کے مطابق اور ناموس قدرت کے تحت ہوتی ہے۔ اور اسے یوں اللہ ہی گمراہ کر دیتا ہے۔ اور پھر اس کا کوئی ولی مرشد نہیں ہوتا۔

اس درمیانی نوٹ کے بعد یہ منظر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ لوگ سوتے میں کروٹیں لے رہے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ سو رہے ہیں۔ اور ان کا کتا' کتوں کی عادت کے مطابق اپنے بازو غار کے دہانے پر پھیلائے سو رہا ہے۔ گویا وہ ان کی حفاظت کر رہا ہے۔ ایسے حالات میں جو بھی ان کو دیکھے مرعوب ہو کر بھاگ اٹھے۔ کیونکہ وہ اس طرح سو رہے ہیں کہ جاگتے نظر آتے ہیں' کروٹ بدل رہے ہیں اور جاگتے نہیں۔ یہ تھی اللہ کی تدبیر ان کے بارے میں تاکہ وہ اپنے مقررہ وقت تک یوں ہی رہیں۔

---()()()---

اچانک یہ لوگ جاگ اٹھتے ہیں۔ ان میں زندگی کی حرکت دوڑ رہی ہے دیکھو اور سنو اس نئے منظر کو"۔

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾

"اور اسی عجیب کرشمے سے ہم نے انہیں اٹھا بٹھایا تاکہ ذرا آپس میں پوچھ گچھ کریں۔ ان میں سے ایک نے پوچھا "کہو' کتنی دیر اس حال میں رہے؟" دوسروں نے کہا "شاید دن بھر یا اس سے کچھ کم رہے ہوں گے"۔ پھر وہ بولے "اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارا کتنا وقت اس حالت میں گزرا۔ چلو' اب اپنے میں سے کسی کو چاندی کا یہ سکہ دے کر شہر بھیجیں اور

وہ دیکھے کہ سب سے اچھا کھانا کہاں ملتا ہے۔ وہاں سے وہ کچھ کھانے کے لیے لائے اور چاہیے کہ ذرا ہوشیاری سے کام کرے' ایسا نہ ہو کہ وہ کسی کو ہمارے یہاں ہونے سے خبردار کر بیٹھے۔ اگر کہیں ان لوگوں کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو بس سنگسار ہی کر ڈالیں گے' یا پھر زبردستی ہمیں اپنی ملت میں واپس لے جائیں گے' اور ایسا ہوا تو ہم کبھی فلاح نہ پاسکیں گے"۔

اس قصے کے بیان میں سرپرائز کا عمل جاری ہے۔ اچانک جب یہ منظر سامنے آتا ہے تو نوجوان اب جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ یہ اندازہ صحیح اندازہ نہیں کر سکتے کہ انہوں نے اس غار میں کتنا وقت گزارا۔ اور کتنی دیر تک سوتے رہے۔ یہ آنکھیں ملتے ہیں' ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ پوچھتے ہیں بھائی کتنی دیر ہوگئی۔ طویل نیند سے جاگ کر ہر شخص پہلا سوال یہی کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ایک طویل نیند کے کچھ آثار بھی پا رہے تھے۔ تو انہوں نے یہی اندازہ لگایا۔

لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (۱۸ : ۱۹) "شاید ایک دن یا اس سے کچھ کم"۔ اس کے بعد انہوں نے یہ موضوع سخن ترک کر دیا' جس پر بحث کا کوئی عملی فائدہ نہ تھا۔ اور اس مسئلے کو اللہ کے علم کے حوالے کر کے انہوں نے عملی کام میں مشغول ہونا مناسب سمجھا۔ یہ اہل ایمان کی شان اور عادت ہوتی ہے کہ وہ ان معاملات میں طویل دلچسپی نہیں لیتے' جن میں ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ بھوکے تھے اور ان کے پاس چاندی کے روپے تھے جنہیں وہ شہر سے لے کر نکلے تھے۔

قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ (۱۸ : ۱۹) "پھر وہ بولے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارا کتنا وقت اس حالت میں گزرا' چلو اب اپنے میں سے کسی کو چاندی کا یہ سکہ دے کر شہر بھیجیں اور وہ دیکھے کہ سب سے اچھا کھانا کہاں ملتا ہے' وہاں سے وہ کچھ کھانے کے لیے لائے"۔ یعنی وہ پاکیزہ اور اچھا کھانا شہر میں تلاش کرے اور اس میں سے کچھ خرید کر لے آئے۔

وہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ ان کی جائے پناہ کسی کو معلوم نہ ہو جائے اور انہیں شہر کے حکمران پکڑ نہ لیں اور اس طرح ان کو سنگسار کر کے قتل نہ کر دیں۔ کیونکہ ان حکمرانوں کے خیال میں وہ مروجہ دین سے خارج ہو گئے تھے۔ اس لئے کہ ایک مشرک گاؤں میں وہ ایک خدا کو پوجتے تھے یا انہیں اس کا ڈر تھا کہ انہیں ان کے عقائد کی وجہ سے سزا دے کر فتنے میں نہ ڈال دیں۔ یہی وہ بات تھی جس سے وہ ڈرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ اس شخص کو جو شہر جا رہا تھا' سخت احتیاط کرنے کی تاکید کر رہے تھے۔

وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا (۱۹) اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا (۲۰) (۱۸ : ۱۹ — ۲۰) "اور چاہیے کہ ذرا ہوشیاری سے کام کرے' ایسا نہ ہو کہ وہ کسی کو ہمارے یہاں ہونے سے خبردار کر بیٹھے۔ اگر کہیں ان لوگوں کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو بس سنگسار ہی کر ڈالیں گے' یا پھر زبردستی ہمیں اپنی ملت میں واپس لے جائیں گے' اور ایسا ہوا تو ہم کبھی فلاح نہ پاسکیں

گے"۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ایمان کی راہ چھوڑ کر شرک کی راہ اختیار کرے وہ کب فلاح پا سکتا ہے۔ یہ تو عظیم خسارہ ہے۔

ہم اس منظر میں دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ اس طرح ہم کلام ہیں' ڈر رہے ہیں' پکڑے جانے کا خوف ہے اور سہمے ہوئے ہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ زمانہ گزر گیا۔ سال و ماہ ایک عرصہ تک گردش کر چکے ہیں۔ صدیوں کے بعد نئے لوگ پیدا ہو گئے ہیں اور نیا زمانہ ہے۔ وہ شہر جس کے وہ باشندے تھے اس کے در و دیوار بدل گئے ہیں اور جن حکمرانوں سے وہ ڈر رہے ہیں ان کا دور ہی چلا گیا ہے اور وہ قصہ کہ اس طرح فلاح صدی میں فلاں حکمران کے ظلم سے تنگ آ کر نوجوانوں کا ایک گروہ شہر چھوڑ گیا تھا۔ وہ باپ دادا سے لوگوں میں نقل ہوتا چلا آ رہا تھا۔ اور لوگوں کے درمیان ان کے بارے میں اختلاف رائے بھی نقل در نقل ہوتا ہوتا چلا آ رہا تھا۔ ان کی تعداد' ان کے عقائد کے بارے میں اور یہ کہ کتنا عرصہ ہوا ہے ان کا اس شہر کو چھوڑنے کا اور یہ کہ کب سے وہ لوگ روپوش ہیں۔

یہاں آ کر پردہ گر جاتا ہے' غار کے اندر ان کی گفتگو ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں سیاق کلام میں پھر ایک خلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ذہن انسانی خود اسے بھر دیتا ہے۔ اور ایک دوسرا منظر سامنے آ جاتا ہے۔

اب معلوم ہو جاتا ہے کہ اہل شہر اب سب کے سب مومن ہو چکے ہیں۔ اور اہل شہر کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص اصحاب کیف میں سے ہے جو مدت دراز ہوئی ایمانی جذبے سے شہر چھوڑ کر چلے گئے تھے تو وہ ان لوگوں کا غایت درجہ احترام کرتے ہیں لیکن ہم یہاں سوچ سکتے ہیں کہ جب اس شخص کو معلوم ہو گا کہ وہ جب شہر چھوڑ کر گئے ہیں تو صدیوں کا عرصہ گزر گیا ہے۔ نیز اس شخص نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ شہر بدل گیا ہے۔ جب سے انہوں نے چھوڑا ہے' بہت ہی طویل عرصہ گزر گیا ہے۔ ان کے ارد گرد کی دنیا بالکل بدل گئی ہے۔ اس لیے ان کے لیے ہر چیز ایک عجوبہ ہے۔ وہ جب اپنے آپ کو دیکھ رہے تھے تو وہ زمانہ قدیم کے لوگ نظر آتے تھے۔ بلکہ لوگوں کے احساس اور ان کی نظر میں وہ عجوبہ تھے۔ اس لیے لوگوں نے بھی ان کے ساتھ عام انسانوں جیسا سلوک نہ کیا ہو گا۔ اور ان کے اپنے دور میں جو رابطے' رشتہ داریاں' رسم و رواج کے عادات و اطوار سب کے سب بدل گئے ہیں گویا وہ زمانہ قدیم کی ایک زندہ یادگار ہیں۔ جو واقعی زندہ اس معاشرے میں لا کر کھڑے کر دیئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں پر اللہ کا مزید کرم یہی ہو سکتا ہے کہ ان کو فوراً اس دنیا سے اٹھا لے۔ چنانچہ یہ لوگ فی الفور فوت ہو جاتے ہیں۔

یہ ہمارا کام ہے کہ ہم یہ سب واقعات تصور کر لیں۔ کیونکہ قرآن ان واقعات کو چھوڑ کر اب آخری منظر پیش کرتا ہے۔ یہ لوگ فوت ہو گئے ہیں اور لوگ اس غار کے باہر جمع ہیں اور ان کے بارے میں باہم گفتگو اور تکرار کر رہے ہیں۔ لوگوں کا تنازعہ یہ تھا کہ یہ لوگ کس دین پر تھے۔ اب ان کو کس طرح دوام بخشا جائے اور کیا ذرائع اختیار کیے جائیں کہ ان کا ذکر واشگاف کیا جائے اور اگلی نسلیں بھی انہیں یاد رکھیں تاکہ ان کے اس عجیب واقعہ سے اگلی نسلیں بھی عبرت لیں۔ اور اصحاب کہف سب کے لیے مشعل راہ ہوں۔

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ

مَّسۡجِدًا ﴿۲۱﴾

"اس طرح ہم نے اہل شہر کو ان کے حال پر مطلع کیا تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت کی گھڑی بے شک آکر رہے گی (مگر ذرا خیال کرو کہ جب سوچنے کی اصل بات یہ تھی) اس وقت وہ آپس میں اس بات پر جھگڑ رہے تھے کہ ان (اصحاب کہف) کے ساتھ کیا کیا جائے۔ کچھ لوگوں نے کہا "ان پر ایک دیوار چن دو، ان کا رب ہی ان کے معاملہ کو بہتر جانتا ہے"۔ مگر جو لوگ ان کے معاملات پر غالب تھے انہوں نے کہا "ہم تو ان پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے"۔

اس واقعہ سے قرآن مجید کے پیش نظر کیا نتیجہ نکالنا مقصود ہے؟ یہ کہ بعث بعد الموت کے لیے یہ واقعہ ایک قریب الفہم اور محسوس نمونہ ہے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ موجودہ انسانی ڈھانچے کو بھی صدیوں تک زندہ رکھ سکتا ہے اور دوبارہ بھی اٹھا سکتا ہے اور قیام قیامت اور بعث بعد الموت حق ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ یوں اللہ نے ان نوجوانوں کو ان کی نیند سے جگایا اور ان کی قوم کو بتایا کہ صدیوں تک یہ لوگ یونہی پڑے تھے۔

اب بعض لوگوں نے کہا

فَقَالُوا ابۡنُوا عَلَيۡهِمۡ بُنۡيَانًا (۱۸: ۲۱) "بعض لوگوں نے کہا ان پر ایک دیوار چن دو"۔ کیونکہ ان کے عقائد کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں ہے۔

رَبُّهُمۡ اَعۡلَمُ بِهِمۡ (۱۸: ۲۱) "ان کا رب ان کے معاملے کو بہتر جانتا ہے"۔ یعنی ان کے عقائد اور ان کی پوزیشن کے بارے میں۔ لیکن اس وقت اصحاب حل و عقد نے کہا

لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيۡهِمۡ مَّسۡجِدًا (۱۸: ۲۱) "ہم تو ان پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے"۔ مسجد سے مقصد یہاں عبادت گاہ ہے۔ یہ یہود و نصاریٰ کا طریقہ تھا کہ وہ انبیاء اور اولیاء کی قبروں کے قریب عبادت گاہ بنا دیتے تھے۔ جس طرح آج مسلمانوں میں سے جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ کار کو چھوڑ کر، صلحاء کی قبروں کے ساتھ مساجد اور گنبد بناتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا لعن اللہ الیهود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیاءهم وصالحیهم مساجد "اللہ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر جنہوں نے اپنے نبیوں اور صالحین کی قبروں سے عبادت گاہ بنا دی"۔

اب اس منظر پر بھی پردہ گرتا ہے اور جب پردہ اٹھتا ہے تو اصحاب کہف کے بارے میں اب تاریخی مباحث شروع ہیں، جیسا کہ لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔ لوگ تاریخی خبریں اور روایات نقل کرتے رہتے ہیں۔ بعض واقعات کو حذف کر دیتے ہیں، بعض میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ اور نسلاً بعد نسل ان واقعات میں اپنے خیالات بھرتے رہتے ہیں۔ اب قصے پھیلتے جاتے ہیں، اصل قصہ الگ رہ جاتا ہے، کچھ اور واقعات اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک ایک بات کے بارے میں اقوال و اختلاف سامنے آتے ہیں اور قیل و قال میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جوں جوں وقت گزرتا ہے، اختلافات بڑھتے جاتے ہیں۔

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ
كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۗ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ
۳ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا
۵ ع تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

۱۵ "کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور کچھ دوسرے کہہ دیں گے کہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب بے تکی ہانکتے ہیں۔ کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ کہو' میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں۔ پس سرسری بات سے بڑھ کر ان کی تعداد کے معاملے میں لوگوں سے بحث نہ کرو' اور نہ ان کے متعلق کسی سے کچھ پوچھو"۔

اب ان لوگوں کی تعداد کے بارے میں بحث لاحاصل ہے۔ اس لیے کہ اگر ان کی تعداد تین ہو یا چار ہو' پانچ ہو یا زیادہ تو اس سے اصل واقعہ اور اس سے جو عبرت سکھانا تھا اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ کتنے تھے' یہ بات اللہ ہی جانتا ہے۔ یا وہ قلیل لوگ جانتے تھے جن کے سامنے یہ واقعہ ہوا۔ یا جن تک صحیح روایات پہنچیں۔ لہٰذا ان کی تعداد کے بارے میں مباحثہ کرنا بے فائدہ بات ہے۔ ان کی تعداد کم ہو یا زیادہ ان کے واقعہ سے جو نصیحت اور عبرت حاصل ہوتی ہے' اس پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے قرآن مجید حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ ہدایت کرتا ہے کہ آپ کسی سے ان کی تعداد کے بارے میں نہ الجھیں اور نہ ان کے بارے ان اہل کتاب سے پوچھیں کیونکہ ان کا علم خود مضطرب ہے۔ اس لیے کہ اسلام اور قرآن کی ہدایت یہ ہے کہ انسان کو عقل و خرد کی قوتوں کو ایسے کاموں میں نہیں کھپانا چاہیے جس سے کوئی فائدہ نہ ہو۔ نیز ایک مسلم کو اس موضوع پر بحث نہیں کرنا چاہئے جس میں اسے پورا پورا علم حاصل نہ ہو۔ یہ واقعہ ایک قدیم تاریخی واقعہ ہے۔ اصل حقائق سے صرف اللہ خبردار ہے۔ لہٰذا اسے علم الٰہی کے لیے چھوڑ دینا چاہئے۔

ماضی کے غیوبات کے بارے میں بحث سے منع کیا گیا تو اس موقعہ پر اس سے بھی منع کر دیا گیا کہ مستقبل کے غیوبات کے بارے میں فضول پیشین گوئیوں میں بھی نہ الجھا جائے' کہ کل کیا ہو گا؟ جب انسان مستقبل کے بارے میں کوئی بات جانتا نہیں تو وہ اس کے بارے میں کیا قطعی رائے دے سکتا ہے؟

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَا۟يْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ
اللّٰهُ ۡ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ
هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

"اور دیکھو' کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کرو کہ میں کل یہ کام کر دوں گا (تم کچھ نہیں کر سکتے) الا یہ کہ اللہ چاہے۔ اگر بھولے سے ایسی بات زبان سے نکل جائے تو فوراً اپنے رب کو یاد کرو' اور کہو "امید ہے کہ میرا رب اس معاملے میں رشد سے قریب تر بات کی طرف میری رہنمائی فرما دے گا"۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر حرکت اور ہر سکون بلکہ زندہ انسانوں کے سانسوں میں سے ہر سانس اللہ کے ارادے کی مرہون منت ہے۔ عالم غیب لمحہ حاضرہ کے پردے کے پیچھے مستور ہے' اور انسانی آنکھ اس پردے کے پیچھے نہیں دیکھ سکتی۔ انسان چاہے بہت ہی عقلمند ہو' مستقبل کے بارے میں اس کی عقل کند ہے اور کچھ جاننے سے قاصر ہے۔ لہٰذا کسی انسان کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں کل یہ کروں گا۔ جبکہ کل پردۂ غیب کے پیچھے ہے اور کل کے نتائج کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ انسان بیٹھ جائے اور مستقبل کے امور کے بارے میں کوئی غور و فکر نہ کرے۔ اور وہ اپنی زندگی کے بارے میں صرف ایک دن ہی کی منصوبہ بندی کرے یا لحہ بہ لحہ زندگی کے بارے میں نئی نئی سوچ سامنے لائے اور اپنی سابقہ زندگی کو حال اور مستقبل کے ساتھ مربوط نہ کرے۔ ایسا مفہوم اس آیت کا ہرگز نہیں ہے بلکہ مفہوم یہ ہے کہ وہ مستقبل کے بارے میں غیبی اور ناگہانی واقعات اور اللہ کی مشیت کا بھی خیال رکھے۔ وہ جو عزم چاہے کرے' جو منصوبہ چاہے بنائے' لیکن اس کے بارے میں اللہ کی مدد کا طلب گار ہو' یہ بات ذہن میں رکھے کہ ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ اگر کام اس کے منصوبے کے مطابق ہو گیا تو بہتر ورنہ اگر اللہ کی مشیت نے اس کے خلاف کوئی اور تدبیر کر دی تو اسے بھی وہ مستبعد نہ سمجھے' کیونکہ اللہ کا حکم بہرحال برتر رہتا ہے۔

انسان کو چاہئے کہ وہ سوچ' تدبیر کرے۔ لیکن اسے یہ شعور زندہ رکھنا چاہئے کہ وہ جو سوچتا ہے' وہ توفیق الٰہی اور اللہ کی فراہم کردہ آسانیوں کے نتیجے ہی میں کر سکتا ہے۔ اس کی وہی سوچ اور وہی تدبیر کامیاب ہو سکتی ہے جس کے ساتھ اللہ کی مدد شامل حال ہو۔ یاد رہے کہ یہ کاہلی' سستی' ضعف اور بے تدبیری کا جواز فراہم نہ کرے بلکہ چاہئے کہ اس سے قوت' اعتماد' اطمینان اور عزم مضبوط ہو۔ اور اگر کام اس کی تدابیر کے خلاف ہو جائے تو بس وہ یہی کہہ دے کہ اللہ کا حکم اور فیصلہ ایسا ہی ہو گا۔ ہم اللہ کے فیصلے پر راضی ہیں' مطمئن ہیں اور سر تسلیم خم کرتے ہیں کیونکہ ہونا وہی تھا جو ہوا' البتہ ہمیں وہ معلوم نہ تھا وہ پردۂ غیب کے پیچھے مستور تھا۔

یہ ہے وہ طریقہ کار جس پر اسلام ایک مومن کو ڈالنا چاہتا ہے لہٰذا ایک مومن تنہائی اور وحشت محسوس نہیں کرتا۔ بلکہ ہر وقت فکر و تدبیر کرتا رہتا ہے اور اگر وہ کامیاب ہوتا ہے تو وہ غرور اور سرکشی اختیار نہیں کرتا۔ نہ وہ قنوطیت اور مایوسی کا شکار ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی منصوبے میں ناکام ہو جائے' بلکہ کامیابی اور ناکامی دونوں میں وہ اللہ سے جڑا رہتا ہے۔ اس کا اللہ پر پورا پورا بھروسہ ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ کی توفیق پر راضی ہوتا ہے۔ اس کے فیصلوں پر راضی برضا ہوتا ہے۔ نہ وہ متکبر ہوتا ہے اور نہ قنوطی ہوتا ہے۔

وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ (۱۸ : ۲۴) "اور جب تم بھول جاؤ تو اللہ کو یاد کرو"۔ اگر کسی وقت تم اللہ کی طرف متوجہ ہونا' بھول جاؤ تو فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور کہہ دو

وَقُلْ عَسَىٰ أَنْ يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا رَشَدًا (۱۸ : ۲۴) ''اور کہو' امید ہے کہ میرا رب اس معاملے میں رشد سے قریب تر بات کی طرف میری رہنمائی فرمائے گا''۔ اس نہج کے مطابق انسانی دل ہمیشہ اللہ سے جڑا ہوتا ہے' اپنے اہم امور میں بھی اور اپنے تمام منصوبوں میں بھی۔

یہاں لفظ عسي (امید ہے) اور لفظ لأقرب (یعنی قریب تر بات) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس لیے کہ یہ مقام بلند پانا عام لوگوں کے لیے بہت ہی مشکل ہے اور ہر انسان کو چاہئے کہ وہ ایسے مقام پر قائم رہنے کے لیے ہر وقت کوشاں رہے۔

اس قصے سے یہاں تک ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ لوگ غار میں کتنا عرصہ رہے۔ اب ہمیں یقینی طور پر معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کتنا عرصہ رہے ہیں۔

وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَٰثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا ﴿۲۵﴾ قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا ۖ لَهُ غَيْبُ السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ أَبْصِرْ بِهِ وَأَسْمِعْ ۚ

''اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے' اور (کچھ لوگ مدت کے شمار میں) ۹ سال اور بڑھ گئے ہیں۔ تم کہو' اللہ ان کے قیام کی مدت زیادہ جانتا ہے' آسمانوں اور زمین کے سب پوشیدہ احوال اسی کو معلوم ہیں' کیا خوب ہے' وہ دیکھنے والا اور سننے والا''۔

یہ ہے ان کے بارے میں فیصلہ کن بات۔ اللہ جو عالم ہے غیوب السموات والارض کا' اس نے یہ اطلاع دے دی۔ وہی ہے جو بہترین سننے والا ہے اور وہی ہے جو بہترین دیکھنے والا ہے۔ اس اعلان کے بعد کسی کے لیے کوئی بحث وجدال کی گنجائش نہیں ہے۔

اس قصے پر اب یہ تبصرہ سامنے آتا ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک ولی ہے اور اس کے حکم اور اس کے قانون میں بھی کوئی شریک نہیں ہے۔

مَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ﴿۲۶﴾

''زمین و آسمان کی مخلوقات کا کوئی خبرگیر اس کے سوا نہیں' اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ جو وحی آپؐ پر نازل ہوئی آپؐ اس کی تلاوت کریں۔ اسی میں دو ٹوک فیصلے ہیں۔ اس کے تمام فیصلے عین سچائی ہیں' اس میں باطل کی آمیزش نہیں ہو سکتی۔ ہمیں صرف اللہ کو پکارنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ کی پناہ کے سوا کوئی اور پناہ نہیں ہے۔ دیکھئے اصحاب کہف اللہ کی طرف بھاگے تو اللہ نے ان پر رحمت کی۔

وَاتۡلُ مَاۤ اُوۡحِىَ اِلَيۡكَ مِنۡ كِتَابِ رَبِّكَ‌ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ‌ۚ وَلَنۡ تَجِدَ مِنۡ دُوۡنِهٖ مُلۡتَحَدًا ۝۲۷

"اے نبیؐ، تمہارے رب کی کتاب میں سے جو کچھ تم پر وحی کیا گیا ہے اسے (جوں کا توں) سنا دو، کوئی اس کے فرمودات کو بدل دینے کا مجاز نہیں ہے (اور اگر تم کسی کی خاطر اس میں ردو بدل کرو گے تو) اس سے بچ کر بھاگنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہ پاؤ گے"۔

یوں یہ قصہ اپنی انتہا کو پہنچتا ہے، اس کے آغاز میں، اس کے درمیان میں اور اس کی انتہا میں جابجا وہ ہدایات ہیں جن کی وجہ سے اس قصے کو قرآن میں جگہ دی گئی ہے۔ دینی اور نظریاتی ہدایات کے ساتھ ساتھ قصے کا فنی انداز بیان بھی نہایت اعلیٰ ہے۔

---0-0-0---

# درس نمبر۱۳۱ ایک نظر میں

یہ سبق سب کا سب اسلامی نظریہ حیات کی قدروں کے تعین کے موضوع کے ساتھ منسلک ہے۔اسلامی نظریہ حیات کی رو سے اعلیٰ قدریں صرف مال و دولت منصب و مرتبہ اور اقتدار و اختیارات ہی نہیں ہیں' نیز اسلامی نظریہ حیات کی رو سے اعلیٰ قدریں صرف زندگی کا سازوسامان یا عیش و عشرت ہی نہیں ہیں۔یہ تو سب کھوٹی اور زائل ہونے والی چیزیں ہیں۔ان چیزوں سے جو حلال و طیب ہیں اسلام ان کے خلاف نہیں ہے۔لیکن اسلام ان چیزوں کو انسانی زندگی کا مقصد اعلیٰ بھی قرار نہیں دیتا۔اگر کوئی ان چیزوں سے زندگی میں فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو وہ بے شک اٹھائے لیکن وہ اس ذات باری کا بھی شکریہ ادا کرے جس نے انسان کے لیے یہ یہ نعمتیں پیدا کی ہیں۔اور یہ شکر عمل صالح کے ذریعہ ادا کرے۔کیونکہ اعمال صالحہ اللہ کے ہاں باقی رہنے والے ہیں اور ان کے نتائج انسانوں کے لیے عقبیٰ میں اچھے ہیں۔

اس سبق کا آغاز حضرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس ہدایت سے ہوتا ہے کہ آپؐ ان لوگوں کے ساتھ جم جائیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں اور جن لوگوں نے اللہ کو بھلا دیا' ان کو بھلا دیں۔اس کے بعد فریقین کو ایک مثال سے واضح کیا جاتا ہے کہ ایک شخص اپنے مال 'عزت اور سازوسامان پر اتراتا ہے اور دوسرا ایمان خالص پر فخر کرتا ہے اور یہ امید رکھتا ہے کہ اللہ کے ہاں جو اجر ہے وہ سب سے بہتر ہے۔اس کے بعد حیات دنیا کی فنا اور زوال کو ایک تمثیل سے واضح کیا جاتا ہے۔جس طرح دنیا میں شادابی پیدا ہوتی ہے اور پھر یہ چیزیں بھس بن جاتی ہے اور ان کو ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں اور آخر میں یہ ثابت شدہ حقیقت بیان کی جاتی ہے۔

اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا ( ۱۸ : ٤٦ ) "یہ مال اور یہ اولاد محض دنیاوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے۔اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انہی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں"۔

---000---

# درس نمبر ۱۳۱ تشریح آیات

# ۲۸ --- تا --- ۴۶

وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۝ وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ

"اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں 'اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو؟ کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو 'جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے 'اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کا افراط و تفریط پر مبنی ہے۔ صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے 'اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے"۔

روایات میں آتا ہے کہ یہ آیات اشراف قریش کے بارے میں نازل ہوئیں جن کا مطالبہ یہ تھا کہ آپ اپنی مجلس سے غرباء 'اہل ایمان مثلاً بلال 'عمار 'خباب اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم کو نکال دیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خواہش تھی کہ اکابر قریش اگر ایمان لے آئیں تو اسلام کو ترقی نصیب ہو جائے۔ نیز آپ یہ بھی خواہش رکھتے تھے کہ ان کے لیے عام مسلمانوں سے علیحدہ ایک مجلس کا انتظام کریں 'کیونکہ ان غرباء کے بدن پر ایسے جبے تھے جن سے پسینے کی بو آتی تھی 'اور کبرائے قریش کو یہ بات اذیت دیتی تھی۔

روایات میں آتا ہے کہ حضور اکرم ان کے ایمان کے معاملے میں دلچسپی رکھتے تھے 'اس لیے آپ نے دل میں اہل قریش کے اس مطالبے پر غور شروع کیا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ (۱۸ : ۲۸) "اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں"۔ یہ آیت نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے ایک حقیقی قدر قائم کر دی اور حق و باطل کی جدائی کے لیے ایک ایسا ترازو قائم کر دیا جس میں کوئی

غلطی نہیں ہو سکتی اور اس کے بعد پھر یہ اصول آتا ہے ۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸ : ۲۹) ”جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے“۔ اسلام کسی کی چاپلوسی نہیں کرتا۔ اور نہ وہ جاہلیت کے پیمانوں سے لوگوں کو ناپتا ہے' نہ اسلام کسی بھی جاہلیت کے پیمانوں کو قبول کرتا ہے جو اسلام کے پیمانوں سے علیحدہ ہیں۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ ”اپنے دل کو مطمئن کر دو“۔ نہ پریشان ہو اور نہ جلدی کرو۔

مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (۱۸ : ۲۸) ”ان لوگوں کے ساتھ جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں“۔ ان کا مطلوب اللہ ہوتا ہے وہ صبح و شام اللہ کی ہی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ اللہ سے منہ نہیں پھیرتے۔ صرف اس کی رضامندی کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ اور یہ لوگ جس چیز کی تلاش میں ہیں وہ اس سے بہت زیادہ قیمتی ہے۔ جس کی تلاش میں یہ طالبان دنیا ہوتے ہیں۔

وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱۸ : ۲۸) ”اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو' کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو“۔ یعنی آپ کی نظروں میں دنیا کی زیب و زینت کی اہمیت زیادہ نہ ہو جائے' جس کا اہتمام' یہ اہل دنیا بہت کرتے ہیں کیونکہ یہ تو دنیا کی زندگی کی زیب و زینت ہے اور جو لوگ صبح و شام اللہ کی رضامندی کی تلاش میں ہیں ان کی نظریں جس افق پر ہیں وہ بہت بلند ہے۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۱۸ : ۲۸) ”کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو' جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے' اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے“۔ یعنی ان کا جو مطالبہ ہے کہ امرائے قریش اور ان کے درمیان امتیازی سلوک کرو' اس معاملے میں ان کی پیروی نہ کرو' اگر یہ لوگ اللہ کا ذکر کرتے تو ان کے کبرو غرور میں کچھ کمی آ جاتی اور ان کے سر ذرا جھک جاتے۔ اس غلو میں وہ کمی کر دیتے' اور غرور کی جن بلند چوٹیوں پر وہ بیٹھے ہیں ان سے ذرا نیچے اتر آتے۔ اور اللہ کی بزرگی اور بلندی کا شعور انہیں حاصل ہوتا۔ جس کے نتیجے میں ان کے نزدیک تمام انسان مساوی ہو جاتے۔ یہ لوگ اسلامی اخوت کے رابطے کو سمجھ جاتے۔ جس کے اندر تمام انسان بھائی بھائی ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں یعنی جاہلی خواہشات کی۔ یہ بے وقوف ہیں' ان کی خواہشات احمقانہ ہیں' انہوں نے اللہ کو بھلا دیا ہے۔ لہٰذا اس کا صلہ ان کو یہ ملنا چاہیے کہ ان کو بھی بھلا دیا جائے۔

اسلام کا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اللہ کے سامنے تمام انسانوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ اللہ کے ہاں کسی کو مال' نسب' مرتبے کے زاویہ سے کوئی فضیلت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ قدریں تو زائل ہونے والی کھوٹی قدریں ہیں۔ اللہ کے نزدیک درجات کی بلندی و پستی صرف اس لحاظ سے ہے کہ اللہ کے ہاں مرتبہ کس کا بلند ہے۔ اور اللہ کے ہاں درجات کی بلندی کی پیمائش اس طرح ہوتی ہے کہ کون اللہ کی طرف زیادہ متوجہ ہے' کون کس قدر اللہ کی طرف خالص ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ ہوائے نفس ہے' حماقت ہے اور باطل اور زوال پذیر ہے۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا (۱۸ : ۲۸) "کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو' جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے" ۔ اس کا دل غافل ہوا کہ وہ اپنی ذات' اپنے مال اور اپنی اولاد کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گیا' اس کی توجہات کا مرکز دنیا کا سازوسامان' دنیا کی لذات' اور خواہشات نفس بن گئے ۔ اس کے دل میں اللہ کے لیے کوئی جگہ نہ رہی ۔ یاد رہے کہ جو دل بھی ان مشاغل میں مشغول ہو جائیں اور ان کو اپنا مقصود اور مطلوب بنالیں' وہ ذکر الٰہی سے غافل ہو جاتے ہیں ۔ اللہ ان کی غفلت میں اور اضافہ کرتا ہے اور جس حال میں وہ ہوتے ہیں اس میں ان کو مہلت دیتا ہے ۔ ان لوگوں کی زندگی ایسے ہی گزر جاتی ہے اور ایسے لوگوں کے لیے اللہ نے جو انجام تیار کیا ہوتا ہے' اس تک وہ پہنچ جاتے ہیں ۔ یہ لوگ خود اپنے اوپر بھی ظلم کرتے ہیں اور دوسروں کے اوپر بھی ظلم کرتے ہیں ۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸ : ۲۹) "صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے' اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے" ۔ نہایت عزت کے ساتھ' نہایت صاف گوئی کے ساتھ' نہایت ہی فیصلہ کن انداز میں ہے یہ اعلان ۔ حق کسی کے سامنے جھکتا نہیں ۔ کسی کے سامنے ٹیڑھ نہیں اختیار کرتا ۔ وہ بڑی قوت کے ساتھ آتا ہے ۔ نہایت صراحت کے ساتھ سامنے آتا ہے ۔ اس میں کوئی رورعایت نہیں ہوتی ۔ جو چاہے اسے مان لے' جو چاہے اس کا انکار کر دے ۔ اگر کسی کو سچائی پسند نہ ہو تو اپنی راہ لے ۔ اگر کسی شخص کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ اس کی خواہشات اللہ کی ہدایات کے تابع ہوں گی تو پھر نظریہ کے معاملے میں کسی کے ساتھ کوئی سودا بازی نہیں ہو سکتی ۔ اگر کسی کی کھوپڑی اللہ کی بلندی کے مقابلے میں نہیں جھکتی اور وہ اپنے غرور کے بلند محلات سے نیچے نہیں اترتا تو اسلامی نظریہ حیات کو بھی اس کی ضرورت نہیں ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظریہ حیات کسی شخص کی ملکیت نہیں ہے کہ وہ اس میں رورعایت کر دے' سودا بازی کر دے' یہ تو اللہ کی ملکیت ہے ۔ اللہ تمام جہانوں سے غنی ہے ۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے' جہاں تک اسلامی نظریہ حیات کا تعلق ہے ۔ وہ کسی شخص پر فخر نہیں کرتا اور نہ کسی ایسے شخص سے نظریاتی امداد طلب کرتا ہے جو شخص اسے خالص طور پر قبول نہیں کرتا یا جو شخص اس نظریے کو پوری طرح قبول نہیں کرتا' جس طرح کہ وہ ہے' بغیر کسی تغیر و تبدل کے ۔ اور جو شخص اپنے آپ کو ان لوگوں سے بلند کوئی مخلوق سمجھتا ہے جو اپنے آپ کو رات اور دن رب کی پکار میں مصروف رکھتے ہیں اور صرف اللہ کی رضامندی کے طلبگار ہیں' ایسے شخص سے کسی خیر کی توقع نہیں ہے' نہ اسلام کے لیے اور نہ مسلمانوں کے لیے ۔

--- ()()() ---

اس کے بعد قرآن کریم قیامت کے مناظر میں سے وہ چیزیں دکھاتا ہے جو اللہ نے مسلمانوں کے لیے تیار کی ہیں اور جو کفار کے لیے تیار کی ہیں ۔

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۭ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۭ بِئْسَ الشَّرَابُ ۭ وَسَاۗءَتْ مُرْتَفَقًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۝ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ
ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَاۗىِٕكِ ۭ نِعْمَ الثَّوَابُ ۭ
وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۝ ع ۹ ن
۱۶

”ہم نے (انکار کرنے والے) ظالموں کے لیے ایک آگ تیار کر رکھی ہے جس کی لپیٹیں انہیں گھیرے میں لے چکی ہیں۔ وہاں اگر وہ پانی مانگیں گے تو ایسے پانی سے ان کی تواضع کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہو گا اور ان کا منہ بھون ڈالے گا' بدترین پینے کی چیز اور بہت بری آرام گاہ! رہے وہ لوگ جو مان لیں اور نیک عمل کریں' تو یقیناً ہم نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے۔ ان کے لیے سدا بہار جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی' وہاں وہ سونے کے کنگنوں سے آراستہ کیے جائیں گے' باریک ریشم اور اطلس و دیبا کے سبز کپڑے پہنیں گے' اور اونچی مسندوں پر تکیے لگا کر بیٹھیں گے۔ بہترین اجر اور اعلیٰ درجے کی جائے قیام!“

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ (۱۸ : ۲۹) ”ہم نے (انکار کرنے والے) ظالموں کے لیے ایک آگ تیار کر رکھی ہے“۔ یہ آگ تیار ہے اور حاضر و موجود ہے۔ اسے جلانے کے لیے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہے' نہ اس کے جلانے کے لیے اور تیار کرنے پر کوئی وقت لگتا ہے۔ باوجود اس کے کہ اللہ کی جانب سے کسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے صرف کن کی ضرورت ہوتی ہے یعنی جب اللہ کا ارادہ ہو جائے تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں آگ کے لیے لفظ ”اعتدنا“ استعمال کیا گیا ہے یعنی ہم نے اسے تیار کیا ہے یعنی بڑی سرعت سے اس کو تیار کیا گیا ہے' یعنی ان کے لئے پکڑ لیا جائے گا اور جلدی سے اس تیار شدہ آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

یہ آگ ایسی ہوگی کہ اس کی خیمے جیسی لپیٹیں ظالموں کو گھیر لیں گی۔ یہ اس سے بھاگ نہ سکیں گے۔ نہ ان کو اس سے چھوٹنے اور نجات پانے کی کوئی امید ہے۔ نہ ان کو یہ امید ہے کہ کس طرف سے ان کو کوئی ٹھنڈی ہوا ملے گی۔ نہ یہ امید ہے کہ اس میں ان کے لئے آرام کا وقفہ ہو گا۔

اگر وہ وہاں گرمی' پیاس اور شدت سے فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی کی جائے گی۔ اور ان کو ایسا پانی دیا جائے گا جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہو گا اور ایک قول کے مطابق گرم پیپ جیسا ہو گا۔ یہ منہ کو بھون ڈالے گا۔ جب یہ منہ کو بھون ڈالے گا تو ان کے گلوں اور ان کے پیٹ کا اس سے کیا حال ہو جائے گا۔

بِئْسَ الشَّرَابُ (۱۸ : ۲۹) ”بدترین پینے کی چیز“۔ یعنی یہ بدترین تواضع ہوگی جو گرمی سے جلے ہوئے ان پیاسے لوگوں کی کی جائے گی۔ کیا بری آگ ہوگی اور پھر اس آگ کے وہ خیمے کس قدر برے ہوں گے' جو ان کے ٹھہرنے اور آرام کے لیے ان کو مہیا کیے جائیں گے۔ ان کو رہنے کے لیے جو سہولیات دی جا رہی ہیں ان میں بھی ان کے ساتھ ایک نہایت ہی سخت مذاق ہو گا۔ کیونکہ وہاں ان کو سہولیات تو نہیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ یہاں تو ان کو بھون ڈالنے کا انتظام ہو

گا۔ البتہ یہاں آگ کے خیموں کا ذکر اس لیے ہے کہ ان لوگوں کی سہولیات کے ساتھ ان لوگوں کی سہولیات کا مقابلہ ہو جائے جو ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیا۔ لیکن دونوں کی سہولیات میں زمین و آسمان کا فرق ہو گا۔

یہ تو رہے حالات ان لوگوں کے جنھوں نے کفر اختیار کیا۔ اب رہے وہ لوگ جنھوں نے دعوت حق کو قبول کیا اور نیک عمل کیے تو ان کے لیے سدا بہار باغات ہوں گے۔ اور یہ ان باغات میں رہیں گے۔ ان کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یہ ان کو سیراب کریں گی' سرسبز منظر ہو گا اور ہوا میں اعتدال ہو گا۔ اور وہاں وہ ان سہولتوں کے حقدار ہوں گے۔

مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ "اونچی مسندوں پر تکیے لگا کر بیٹھے ہوں گے"۔ اور ریشم کے قسم قسم کے کپڑوں میں ملبوس ہوں گے۔ نرم ریشم کے اور اطلس کے نرم اور موٹے کپڑوں میں۔ اور زیب و زینت کے لیے انہیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔

نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا (۱۸ : ۳۱) "بہترین اجر اور اعلیٰ درجے کا جائے قیام!" اب جس کی مرضی ہو وہ اس راہ کو اختیار کرے' جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے' جو چاہے فقراء اہل ایمان کی مجلس میں بیٹھے جبکہ ان کے جبوں اور لباس سے پسینہ کی بو آرہی ہے اور جو چاہے ان سے نفرت کرے۔ جن لوگوں کو ان غریب حضرات کے لباس سے پسینے کی بو پسند نہیں' جن کے دل پاک ہیں اور ذکر الٰہی سے معطر ہیں تو پھر ان کو چاہیے کہ وہ جہنم کی آگ سے بنائے ہوئے محلات اور خیموں کی سہولیات حاصل کر لیں۔ اور پھر تیار ہو جائیں' تیل کی تلچھٹ یا پیپ کا شربت پینے کے لیے' جس سے اہل جہنم کے منہ جھلس جائیں گے۔

---000---

اس کے بعد باقی رہنے والی اسلامی اقدار اور فنا ہونے والی کافرانہ اقدار کو سمجھانے کے لیے دو آدمیوں اور دو باغوں کا قصہ سنایا جاتا ہے۔ دو کردار پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک کردار ان لوگوں کا ہے جو زوال پذیر اقدار کے حامل کا نمونہ ہے اور دوسرا کردار ان لوگوں کا ہے جو لازوال اقدار کے حاملین ہیں۔ یہ دونوں نمونے نہایت ہی واضح طور پر پیش کیے جاتے ہیں' تاکہ ان نفوس کے لیے نمونہ ہو' جو اس دنیا کی زندگی کی فانی اقدار کے دلدادہ ہیں اور ان لوگوں کے لیے بھی نمونہ ہو جو اللہ کی رضا اور اخروی اقدار کے دلدادہ ہیں۔ اور یہ کردار دونوں قسم کے لیے ایک انسانی نمونہ ہیں۔ جو شخص دو باغوں کا مالک ہے وہ دنیا داروں کا نمونہ ہے' جسے دولت اور ثروت مدہوش کر دیتی ہے اور سازوسامان دنیا اسے سرکش کر دیتا ہے اور وہ اس قوت قاہرہ کو بھلا دیتا ہے' جو لوگوں اور ان کی تقدیر کی مالک ہے۔ ایسے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی یہ دنیا داری دائمی ہے اور اس کے لیے کوئی فنا نہیں ہے اور اس شخص کا ساتھی اہل ایمان کے لیے ایک نمونہ ہے' ان لوگوں کے لیے جن کو اپنے ایمان پر فخر ہوتا ہے' جو ہر وقت اپنے رب کو یاد کرتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ان نعمتوں کا بھی کوئی خالق ہے۔ اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی حمد و شکر بجا لائیں' اس کی ناشکری نہ کریں اور انکار بھی نہ کریں۔

قصے کا آغاز دو باغوں کے بیان سے ہوتا ہے کہ وہ کس قدر قیمتی اور سرسبز باغ ہیں۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ

مِنْ اَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۞ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۞ وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ

"اے نبیؐ' ان کے سامنے ایک مثال پیش کر دو۔ دو شخص تھے۔ ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیئے اور ان کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑھ لگائی اور ان کے درمیان کاشت کی زمین رکھی۔ دونوں باغ خوب پھلے پھولے اور بار آور ہونے میں انہوں نے ذرا سی کسر بھی نہ چھوڑی۔ ان باغوں کے اندر ہم نے ایک نہر جاری کر دی اور اسے خوب نفع حاصل ہوا"۔

یہ دو باغ انگوروں سے بھرے ہوئے تھے اور ان کے اردگرد کھجوروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی اور ان کے درمیان زرعی زمین بھی تھی اور ان کے درمیان پانی کی ایک نہر تھی۔ یہ ایک خوبصورت منظر تھا اور اس میں بھرپور زندگی تھی اور سامان زندگی تھا۔

كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا (۱۸ : ۳۳) "دونوں باغ خوب پھلے پھولے اور بار آور ہونے میں انہوں نے ذرا سی کسر بھی نہ چھوڑی"۔ یہاں قرآن کریم نقص اور کمی کے لئے لفظ "ظلم" استعمال کرتا ہے تاکہ ان دونوں باغوں اور ان کے مالک کے کردار کے درمیان تقابل پیدا کیا جا سکے۔ کیونکہ باغات نے تو اپنا حق ادا کر دیا جبکہ باغات کے مالک نے تکبر کیا' سرکشی اختیار کی اور کبر و غرور کی وجہ سے اللہ کا شکر ادا نہ کیا اور ظلم کیا۔

اب ذرا ان دو باغوں کے اس مالک کو ملاحظہ کریں کہ اس کا پیمانہ بھر جاتا ہے اور وہ ان کو دیکھ کر اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتا ہے۔ فخر و مباہات سے اس کا سر غرور میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کا پیمانہ مرغی کے پیمانے کی طرح ہے' جلدی بھر جاتا ہے' اور پھر یہ طاؤس کی طرح فخر سے ناچنے لگتا ہے اور اپنے فقیر ساتھی اور ہمسائے پر بوجہ کبر' اپنے آپ کو بلند سمجھتا ہے اور یوں گویا ہوتا ہے :

فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ۞

"یہ کچھ پا کر ایک دن وہ اپنے ہمسائے سے بات کرتے ہوئے بولا "میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقتور نفری رکھتا ہوں"۔

پھر وہ اپنے اس رفیق کو لے کر ایک باغ میں پھرتا ہے۔ اس کا دل خوشی سے جوش میں آتا ہے۔ اب یہ سخت غرور کی حالت میں داخل ہوتا ہے' اللہ کو اس نے پوری طرح بھلا دیا۔ اس کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں ہے کہ ان نعمتوں پر اللہ کا شکر بجالانا بھی ضروری ہے۔ اور اس کے دل میں یہ خیال آگیا کہ یہ باغات کبھی بھی نیست و نابود نہ ہوں گے۔ اس نے قیام قیامت کو بالکل بھلا دیا اور اس کا صاف صاف انکار کر دیا۔ پھر اس نے قیام قیامت کا سرے سے انکار کر دیا۔ چلو اگر قیامت قائم بھی ہو جائے تو وہاں بھی اس کے ساتھ ترجیحی سلوک اور عزت کا معاملہ ہو گا۔ کیا اس دنیا میں ۰۰ باغات کا

مالک نہیں ہے ' لہٰذا لازمی ہے کہ وہاں بھی اسے یہ سہولتیں بہرحال حاصل ہوں ۔

وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۝ وَّ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىِٕمَةً ۙ وَّ لَىِٕنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝

"پھر وہ اپنی جنت میں داخل ہوا اور اپنے نفس کے حق میں ظالم بن کر کہنے لگا "میں نہیں سمجھتا کہ یہ دولت کبھی فنا ہو جائے گی ' اور مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی کب آئے گی ۔ تاہم اگر کبھی مجھے اپنے رب کے حضور پلٹایا بھی گیا تو ضرور اس سے بھی زیادہ شاندار جگہ پاؤں گا"۔

ہمیشہ اصحاب جاہ و مال اور اہل ثروت اور اہل اقتدار کے دلوں میں یہی سودا سمایا ہوتا ہے کہ اس فانی دنیا میں ان کی قدر و منزلت ہے ' اسی طرح آخرت میں بھی انہیں یہی اعزاز ملے گا ۔ عالم بالا میں بھی وہ کرسی نشین ہوں گے ۔ اگر اہل دنیا کے ہاں ان کا یہ مرتبہ ہے تو اہل سماء میں کیوں نہ ہو گا ۔

اب ذرا اس کے اس ساتھی کو دیکھئے جو فقیر ہے اور اس کے پاس کوئی دولت نہیں ہے ۔ نہ اس کے پاس باغ ہے اور نہ اس کے پھل ہیں ۔ کیونکہ اس کے نزدیک ان باغات کے مقابلے میں ایک اور چیز لئی ہے جو زیادہ قیمتی ہے ۔ اسے اپنے عقیدے اور ایمان پر فخر ہے ۔ اسے اپنے اس رب پر بھی فخر ہے جس کے سامنے بڑے بڑے سر جھک جاتے ہیں ۔ یہ شخص اپنے اس مغرور سرپھرے اور منکر حق متکبر ساتھی کو بڑے اعتماد سے مخاطب کرتا ہے ۔ اور اسے یاد دلاتا ہے کہ تم اپنے آپ کو کوئی بہت بڑی چیز سمجھتے ہو ' لیکن ذرا اپنی پیدائش کو تو دیکھو کہ تمہیں ایک ناپاک پانی سے پیدا کیا ہے ' پھر کیچڑ سے ۔ وہ اسے یاد دلاتا ہے کہ منعم حقیقی کا شکر ادا کرنا لازم ہے ۔ اور کبر و غرور کا انجام اچھا نہیں ہوتا ۔ یہ رجل صالح اسے کہتا ہے کہ تمہارے باغ و راغ کی بہ نسبت مجھے عند اللہ بہتر اجر ملے گا ۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ۝ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَ لَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ۝ وَ لَوْ لَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا ۝ فَعَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَ يُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ۝ اَوْ

يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا۝

"اس کے ہمسائے نے گفتگو کرتے ہوئے اس سے کہا "کیا تو کفر کرتا ہے اس ذات سے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور تجھے ایک پورا آدمی بنا کر کھڑا کیا؟ رہا میں 'تو میرا رب تو وہی اللہ ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اور جب تو اپنی جنت میں داخل ہو رہا تھا تو اس وقت تیری زبان سے یہ کیوں نہ نکلا کہ ماشاء اللہ 'لا قوۃ الا باللہ؟ اگر تو مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کمتر پا رہا ہے تو بعید نہیں کہ میرا رب مجھے تیری جنت سے بہتر عطا فرما دے اور تیری جنت پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس سے وہ صاف میدان بن کر رہ جائے 'یا اس کا پانی زمین میں اتر جائے اور پھر تو اسے کسی طرح نہ نکال سکے"۔

ایک نفس مومن کے اندر ایمانی عزت نفس اس طرح جاگ اٹھتی ہے۔ اس لیے اسے کسی کے مال اور دولت کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی وہ کسی کی دولت اور اس کی گردن فرازی سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ سچائی کی بات صاف صاف کرتا ہے اور حق کے معاملے میں کسی کے ساتھ کوئی نرمی نہیں کرتا۔ ایک سچے مومن کے دل میں یہ شعور ہوتا ہے کہ وہ جاہ و مال کے مقابلے میں غالب اور بھاری ہے۔ اور یہ کہ اس دنیا کے سازو سامان کے مقابلے میں اس کے لیے قیامت میں جو اجر ہے وہ زیادہ قیمتی ہے۔ یہ کہ وہ اللہ کا فضل چاہتا ہے اور اللہ کا فضل عظیم ہے اور یہ کہ اللہ کا انتقام بڑا سخت ہوتا ہے۔ اور وہ کسی بھی وقت ایسے غافلوں کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔

اچانک سرسبزی اور شادابی کے ان مناظر سے نکل کر ہم لوگ تباہی اور بربادی کے مناظر میں داخل ہوتے ہیں۔ تکبر اور استکبار کے منظر کے بجائے اب ندامت اور اللہ سے مغفرت طلب کرنے کا منظر آجاتا ہے۔ وہ بات اب سامنے آجاتی ہے جس کی توقع یہ رجل مومن رکھتا تھا۔

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا۝

"آخر کار ہوا یہ کہ اس کا سارا ثمرہ مارا گیا اور وہ اپنے انگوروں کے باغ کو ٹٹیوں پر الٹا پڑا دیکھ کر اپنی لگائی ہوئی لاگت پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور کہنے لگا کہ "کاش! میں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہوتا"۔

یہ ایک مکمل نظر آنے والا 'مجسم منظر ہے۔ اس باغ کا تمام کا تمام پھل تباہ ہو گیا ہے۔ گویا اس پر ہر جانب سے حملہ ہوا اور اس میں سے ایک دانہ بھی نہ بچا۔ اور اس کے تمام درخت اور بوٹے اپنے تنوں اور ٹٹیوں پر پڑے تھے اور اس کے درخت اور بیلیں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بھس بن گئیں۔ مالک نے جب یہ منظر دیکھا کہ اس کا باغ تو مکمل طور پر تباہ ہو گیا ہے 'تو وہ اپنے اس عظیم مالی بربادی پر ہاتھ ملنے لگا۔ اس کی پوری کی پوری محنت آج چلی گئی۔ اب تو وہ اس پر بھی نادم ہے کہ اس نے اللہ کے ساتھ اوروں کو شریک کیا۔ اب وہ اللہ کی ربوبیت اور وحدانیت کو پوری طرح تسلیم کر رہا

ہے۔ اگرچہ اس سے قبل اس نے کسی شرکیہ عقیدے کا اظہار نہیں کیا لیکن اس نے اس زمین کی فانی اقدار کو عالم بالا کی لافانی اقدار پر ترجیح دی تھی۔ یہ اس کی جانب سے ایک قسم کا شرک تھا۔ اور اب وہ اس سے بھی تائب ہو رہا ہے۔ لیکن اب وقت اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ وحدہ ہی والی ہے اور وہی قادر مطلق ہے۔ نہیں کوئی قوت مگر اس کی قدرت۔ نہیں کوئی نصرت مگر اس کی نصرت۔ اس کا ثواب اچھا ثواب ہے۔ اور اگر کسی انسان کی کوئی بچت اللہ کے ہاں باقی ہے تو وہ سب سے زیادہ اچھی بچت ہے۔

۵ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ۝
ع ۱۳ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ۝
۱۷

"نہ ہوا اللہ کو چھوڑ کر اس کے پاس کوئی جتھا کہ اس کی مدد کرتا' اور نہ کر سکا وہ آپ ہی اس آفت کا مقابلہ اس وقت معلوم ہوا کہ کارسازی کا اختیار خدائے برحق ہی کے لیے ہے' انعام وہی بہتر ہے جو وہ بخشے اور انجام وہی بخیر ہے جو وہ دکھائے"۔

اب پردہ گرتا ہے اور یہ منظر بھی اوجھل ہو جاتا ہے جس میں باغ مکمل تباہی کا منظر پیش کر رہا تھا وہ اپنی تنیوں پر پڑا تھا' مالک ہاتھ مل رہا تھا اور شرمندگی سے سرنگوں تھا۔ اللہ کا جلال اس منظر پر سایہ فگن تھا۔ جس کے سامنے انسانی قوت اور انسانی طاقت نیست و نابود ہوتی ہے۔

---000---

اس منظر کے بعد اب حیات دنیا کو ایک تمثیل سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ دیکھو حیات دنیا اس باغ کی طرح ہی ہے' یہ بہت ہی ناپختہ' مختصر اور بے قرار ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝

"اور اے نبیؐ' انہیں حیات دنیا کی حقیقت اس مثال سے سمجھاؤ کہ آج ہم نے آسمان سے پانی برسا دیا تو زمین کی پود خوب گھنی ہو گئی' اور کل وہی نباتات بھس بن کر رہ گئی جسے ہوائیں اڑائے لیے پھرتی ہیں۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

یہ منظر درحقیقت ایک مختصر جھلکی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو بتایا جائے کہ یہ دنیا فانی ہے۔ آسمانوں سے پانی

برستا ہے 'یہ پانی نہ بہتا ہے اور نہ سیلاب کی شکل اختیار کرتا ہے بلکہ یہ براہ راست نباتات کے ساتھ مختلط ہو جاتا ہے۔ اور یہ نباتات ابھی پوری طرح نشوونما نہیں پاتے اور پکتے ہی نہیں کہ یہ ایک بھوسے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور وہ دیکھو ہوا اس بھوسے کو اڑائے پھرتی ہے۔ غرض تین مختصر ترین جملوں میں زندگی کی کہانی کہہ دی جاتی ہے۔

یہاں تین فقروں کے اندر مختصر ترین انداز میں پوری زندگی کی کہانی کہہ دی اور پھر یہ کہا کہ زندگی بہت ہی مختصر ہے۔ کس قدر مختصر اور کس قدر آسان بس

كَمَاءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ (۱۸ : ۴۵) "اس پانی کی طرح جسے ہم نے آسمان سے برسا دیا تو زمین کی پود خوب گھنی ہو گئی" اس دنیائے فانی کی زندگی کی یہ مختصر جھلکی دکھانے کے بعد' اب قرآن مجید زندگی کی دائمی قدریں بتاتا ہے' جن کو لوگ مستبعد سمجھتے ہیں لیکن وہ باقی رہنے والی قدریں ہیں اور جن کو اہمیت دی جانی چاہئے۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ۝

"یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انہی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں"۔

مال اور اولاد اس زندگی کی زینت ہے اور اسلام جائز حدود کے اندر دنیا کی زینت سے نہیں روکتا۔ لیکن اسلام زینت دنیا کو اسی قدر اہمیت دیتا ہے اور اسی قدر قیمت دیتا ہے جس کی وہ مستحق ہیں۔ یعنی فنا اور دوام کے اعتبار سے۔ ضرورت سے زیادہ قیمت ان چیزوں کو نہیں دیتا۔

مال اور اولاد زینت ہیں لیکن ان کی قدر و قیمت یہ نہیں ہے کہ وہ معیار اور میزان بن جائیں اور لوگوں کو دنیا میں ان کے سہارے تولا جائے۔ اصل قیمت باقیات صالحات کی ہے۔ وہ اعمال' وہ اقوال اور وہ عبادات' جن کا اجر قیامت میں ملنے والا ہے۔

اگرچہ لوگ عموماً مال اور اولاد سے دلچسپیاں وابستہ کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ان کے دل مال اور اولاد ہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ لیکن باقیات صالحات زیادہ بہتر ہیں اور ہمیں چاہئے کہ ہم باقیات صالحات سے امیدیں وابستہ کریں جن کی جزاء قیامت میں ملنے والی ہوتی ہے۔

--- ooo ---

# درس نمبر ۱۳۲ ایک نظر میں

درس سابقہ کا خاتمہ باقیات صالحات پر ہوا تھا۔ اس سبق کا آغاز ہی یوم قیامت کے بیان سے ہوتا ہے جس میں باقیات صالحات کا وزن ہو گا اور ان کا حساب و کتاب ہو گا۔ قیامت کا بیان بھی حسب معمول مناظر قیامت میں سے ایک منظر کی صورت میں ہے۔ اس کے بعد پھر ابلیس کے اس طرز عمل کو پیش کیا جاتا ہے۔ جو اس نے اس وقت اختیار کیا جب اللہ نے اسے حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کرے' اس نے امر ربی کی تعمیل سے انکار کیا۔ انسانوں پر تعجب ہے کہ وہ پھر شیطان کو اپنا دوست بناتے ہیں' حالانکہ ان کو معلوم ہے کہ تمام شیاطین انسانوں کے دشمن ہیں۔ اور اس دوستی کے نتیجے میں وہ قیامت کے روز عذاب جہنم تک پہنچنے والے ہیں۔ پھر یہ شرکاء جو قیامت کے دن ان لوگوں کی پکار کا جواب ہی نہ دیں گے جو ان شرکاء کی بندگی کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بار بار مثالیں دیں اور لوگوں کو سمجھایا کہ وہ اس دن کے حساب و کتاب سے اپنے آپ کو بچائیں۔ لیکن لوگ ہیں کہ ایمان نہیں لاتے۔ بلکہ الٹا امم سابقہ کی ہلاکت کی طرح کے عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اور باطل انداز میں اہل ایمان کے ساتھ مجادلہ کرتے ہیں تاکہ حق کا مقابلہ کریں۔ اللہ کی آیات اور اللہ کے رسولوں کے ساتھ مذاق کریں۔ اگر اللہ کی رحمت نہ ہوتی تو ان پر یہ عذاب آہی جاتا۔

قیامت کا یہ منظر اور امم سابقہ کے عذاب کا ذکر اس سورت کے مرکزی مضمون سے ہم آہنگ ہیں کہ لوگوں کے ذہن میں اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی قدریں بٹھائی جائیں تاکہ وہ ہدایت پکڑیں۔

--- ooo---

# درس نمبر ۱۳۲ تشریح آیات

## ۴۷ --- تا --- ۵۹

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ
فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا ﴿٤٧﴾ وَعُرِضُوا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ۗ لَقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ
أَوَّلَ مَرَّةٍ ۢ بَلْ زَعَمْتُمْ أَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿٤٨﴾ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى
الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ
صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصٰهَا ۚ وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ ۶
رَبُّكَ أَحَدًا ﴿٤٩﴾ ع ۵
۱۸

"فکر اس دن کی ہونی چاہیے جب کہ ہم پہاڑوں کو چلائیں گے' اور تم زمین کو بالکل برہنہ پاؤ گے' اور ہم تمام انسانوں کو اس طرح گھیر کر جمع کریں گے کہ (اگلوں پچھلوں میں سے) ایک بھی نہ چھوٹے گا' اور سب کے سب تمہارے رب کے حضور صف در صف پیش کیے جائیں گے ---- لو دیکھ لو' آگئے نا تم ہمارے پاس اسی طرح جیسا ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔ تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ ہم نے تمہارے لیے کوئی وعدے کا وقت مقرر ہی نہیں کیا ہے اور نامہ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اس وقت تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اپنی کتاب زندگی کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے۔ اور کہہ رہے ہوں گے کہ "ہائے ہماری کم بختی' یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی بڑی حرکت ایسی نہیں رہی جو اس میں درج نہ ہوگئی ہو"۔ جو کچھ انہوں نے کیا تھا' وہ سب اپنے سامنے حاضر پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ذرا ظلم نہ کرے گا"۔

یہ ایک ایسا منظر ہے جس میں اس کائنات کا طبیعی ماحول' اور اس کائنات اور انسانی دلوں پر خوف و ہراس کے نقوش واضح نظر آتے ہیں۔ اس منظر کے کردار بڑے بڑے پہاڑ ہیں جو دیکھتے دیکھتے دھواں بن جاتے ہیں اور یہ نہایت تیزی سے چلتے ہیں' دلوں پر خوف طاری ہے' زمین اچانک چٹیل میدان بن جاتی ہے۔ نہ اس میں سرسبزی اور شادابی' نہ پہاڑ ہیں اور نہ خوبصورت وادیاں۔ بلکہ دلوں کے حال بھی اس منظر میں سامنے آجاتے ہیں اور کوئی بات خفیہ نہیں رہتی۔

یہ ہموار اور چٹیل میدان زمین، جو کسی چیز کو نہیں چھپا سکتی اور نہ اس پر کسی کے چھپنے کی کوئی جگہ ہے، اسی زمین سے یکدم تمام مخلوقات اُگ آئے گی۔

وَّ حَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ( ۱۸ : ۴۷ ) "انسانوں کو اس طرح گھیر کر جمع کریں گے کہ ایک بھی نہ چھوٹے گا"۔ اس جامع حشر کے بعد اگلا منظر پھر اللہ کے سامنے حاضری کا ہے۔

وَ عُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ( ۱۸ : ۴۸ ) "سب کے سب تمہارے رب کے حضور صف در صف پیش کئے جائیں گے"۔ یہ تمام مخلوق جس کی تعداد معلوم نہیں ہے۔ اس وقت سے لے کر جب سے انسانیت کو یہاں بسایا گیا اور جب تک اس زمین پر انسانیت کو آہستہ آہستہ مٹایا گیا۔ یہ سب مخلوق اٹھائی جا چکی ہے، سب جمع ہو گئی ہے، حلقوں کی شکل میں کھڑی ہے، کوئی ایک آدمی بھی غیر حاضر نہیں ہے، کیونکہ سب زمین ایک میدان ہے۔ اس میں چھپنے کی کوئی جگہ ہی نہیں۔

اب بات کا انداز ایک بیانیہ منظر سے، خطاب کی شکل اختیار کرتا ہے۔ گویا منظر سامنے موجود ہے۔ اور ہم اسے دیکھ رہے ہیں اور اس میں جو مکالمہ ہو رہا ہے گویا ہم اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے ہیں اور کانوں سے سن رہے ہیں۔ وہ لوگ جو اس منظر کے وجود میں آنے کے منکر تھے، ان کے چہروں پر شرمندگی بالکل عیاں ہے۔

لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۭ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا

( ۱۸ : ۴۸ ) "دیکھ لو آ گئے نا تم ہمارے پاس جیسے ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔ تم نے یہ سمجھا تھا کہ ہم نے تمہارے لیے کوئی وعدے کا وقت مقرر ہی نہیں کیا تھا"۔

اس بیانیہ انداز خطاب میں یکلخت تبدیلی کر کے اسے خطابی انداز میں لانے سے منظر میں ایک طرح کی زندگی پیدا کر دی جاتی ہے۔ کردار زندہ و متحرک نظر آتے ہیں۔ اور منظر ہمارے سامنے مجسم ہو جاتا ہے۔ گویا یہ مستقبل میں آنے والا قیام قیامت کا کوئی منظر نہیں ہے۔ بلکہ موجودہ دور کا منظر ہے۔

جو لوگ قیامت کی تکذیب کرتے تھے ان کے چہروں پر شرمندگی صاف صاف نظر آتی ہے اور باری تعالیٰ کی ڈانٹ ان لوگوں کی سرزنش یوں کر رہی ہے۔

لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ( ۱۸ : ۴۸ ) "آ گئے نا تم ہمارے سامنے اس طرح جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا"۔ اور تم یہ سمجھتے تھے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔

بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ( ۱۸ : ۴۸ ) "تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ ہم نے تمہارے لیے کوئی وعدے کا وقت مقرر ہی نہیں کیا تھا"۔

بیانیہ انداز کلام سے خطاب کی طرف آنے کے بعد پھر قیامت کے واقعات کا بیان شروع ہوتا ہے۔

وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ (۱۸ : ۴۹) "اور نامہ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اس وقت تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اپنی کتاب زندگی کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے"۔ یہ ہے ان کے اعمال کا پورا رجسٹر' ان کے سامنے رکھ دیا جائے گا' وہ اسے پڑھ رہے ہوں گے' بار بار ورق گردانی کر رہے ہوں گے' وہ حیران ہوں گے کہ وہ نہایت ہی جامع ریکارڈ ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی یہاں درج ہیں۔ یہ اپنے انجام سے ڈر رہے ہوں گے۔ دل ان کے غم کے مارے پھٹ رہے ہوں کہ اس کتاب کی وجہ سے جو ذرہ ذرہ ریکارڈ کر رہی ہوگی۔ نہ کوئی چھوٹی چیز اس سے چھوٹی ہوئی ہے اور نہ بڑی۔

وَ يَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّآ

اَحْصٰهَا (۱۸ : ۴۹) "کہہ رہے ہوں گے' ہائے ہماری کم بختی' یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی بڑی حرکت ایسی نہیں رہی جو اس میں درج نہ ہوگئی ہو"۔ یہ ایک ایسے شخص کا کلام ہے جو سخت گھاٹے میں آگیا ہے' سخت پریشان ہے' سخت خوفزدہ ہے' کیونکہ جلد ہی وہ نہایت بھیانک انجام سے دوچار ہونے والا ہے۔ اور وہ اس قدر مضبوط بندھا ہوا ہے کہ اس کے بھاگنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ نہ وہ کوئی مغالطہ دے سکتا ہے اور نہ کوئی بہانہ اور تاویل کر سکتا ہے۔

وَ وَجَدُوْا مَاعَمِلُوْا حَاضِرًا (۱۸ : ۴۹) "جو جو انہوں نے کیا تھا وہ سب حاضر پائیں گے"۔ اور ان کو اپنے کئے کی سزا ملے گی۔

وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (۱۸ : ۴۹) "اور تیرا رب کسی پر ذرا ظلم نہیں کرتا"۔

---000---

یہ مجرمین جن کا میدان حشر میں یہ حال ہو رہا ہے۔ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ شیطان ان کا دشمن ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس شیطان کے ساتھ دوستی کی اور اس نے ان کو اس مقام بد تک پہنچایا' لہٰذا کیا ان کی یہ حرکت تعجب انگیز نہیں ہے کہ یہ لوگ ابلیس اور اس کی ذریت کو' دوست رکھیں حالانکہ ابلیس کے اس واقعہ کے بعد انسانوں سے اس کی دشمنی کا اعلان ہو چکا تھا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۞

"یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا۔ وہ جنوں میں سے تھا اس لیے اپنے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا۔ اب کیا تم مجھے چھوڑ کر اس کو اور اس کی ذریت کو اپنا سرپرست بناتے ہو' حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟ بڑا ہی برا بدل ہے جسے ظالم لوگ اختیار کر رہے ہیں"۔

آدم و ابلیس کے اس قدیمی قصے کی طرف یہاں ایک اشارہ سا کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی بطور تعجب کے کہ ابن آدم پھر بھی ابلیس اور اس کی ذریت کو دوست بناتے ہیں حالانکہ ابلیس ابن آدم کا قدیمی دشمن ہے۔ اور یہ تکریم آدم کی وجہ سے دشمن ہوا ہے اور پھر بھی ہم اللہ کو چھوڑ کر اپنے دشمن سے دوستی کرتے ہیں۔ اور ابلیس کی دوستی یہ ہے کہ ہم اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں اور اللہ کی اطاعت نہیں کرتے جو اللہ کا دوست ہوتا ہے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔

یہ لوگ اپنے ان دشمنوں کے ساتھ کیوں دوستی رکھتے ہیں حالانکہ ان لوگوں کے پاس نہ علم ہے اور نہ قوت ہے۔ اور نہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے وقت ان لوگوں کو بلایا تھا اور نہ خود ان کی تخلیق کے وقت ان کو بلایا تھا' بلکہ وہ تھے ہی نہیں۔ اس لیے یہ لوگ اللہ کے غیوب سے کس طرح واقف ہو سکتے ہیں۔ نیز اللہ نے ان کو اپنے مددگار بھی نہیں پیدا کیا کہ ان کے پاس کوئی قوت ہو۔ اس لیے اس دوستی کا کوئی جواز نہیں ہے۔

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۖ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾

"میں نے آسمان و زمین پیدا کرتے وقت ان کو نہیں بلایا تھا اور نہ خود ان کی اپنی تخلیق میں انہیں شریک کیا تھا۔ میرا کام یہ نہیں ہے کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار بنایا کروں"۔

اللہ تو بے نیاز ہے۔ وہ ذو القوۃ المتین ہے' اس کو کسی مددگار کی ضرورت نہیں ہے' خواہ وہ مضل ہو یا غیر مضل یہاں یہ جو کہا گیا کہ اللہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار نہیں بناتا تو یہ دراصل مشرکین کے اوہام کی بیخ کنی کے لیے یہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے کہ اللہ نے کیا ایسے لوگوں کو اپنا شریک بنا لیا ہے جو ہدایت کی بجائے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ جو لوگ شیطان کو اللہ کا شریک سمجھتے تھے وہ یہ حرکت اس لیے کرتے تھے کہ شیطان کے پاس کوئی خفیہ علم ہے اور کوئی فوق الفطری قوت ہے۔ اس لیے لوگ شیطان کے ساتھ دوستی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ یہاں ان لوگوں کی اس حماقت کو اس طرح رد فرماتا ہے کہ اگر بطور فرض محال میں نے کسی کو اپنا مددگار بنانا ہی تھا تو کیا ایسے ضال اور مضل کو بنانا تھا۔ یہ ایک الزامی انداز تعبیر ہے۔

چنانچہ قیامت کا ایک منظر پیش کیا جاتا ہے کہ لوگ دیکھ لیں کہ ان شریکوں اور شریک کرنے والے مجرمین کی حالت وہاں کیا ہوگی۔

وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ

يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا۝ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ
مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا۝ ع

۱۹

"پھر کیا کریں گے یہ لوگ اس روز جب کہ ان کا رب ان سے کہے گا کہ پکارو اب ان ہستیوں کو جنھیں تم میرا شریک سمجھ بیٹھے تھے۔ یہ ان کو پکاریں گے مگر وہ ان کی مدد کو نہ آئیں گے۔ اور ہم ان کے درمیان ایک ہی ہلاکت کا گڑھا مشترک کر دیں گے۔ سارے مجرم اس روز آگ دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ اب انہیں اس میں گرنا ہے۔ اور وہ اس سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہ پائیں گے"۔

یہ لوگ اب ایک ایسی عدالت میں کھڑے ہوں گے جس میں کوئی دعویٰ بغیر دلیل کے مسموع نہیں ہے۔ اللہ ان سے مطالبہ کرے گا کہ لائیے وہ شرکاء جو تم میرے ساتھ قرار دیتے تھے۔ حکم ہو گا جاؤ ان کو بلا کر لاؤ۔ یہ لوگ اپنی حماقت میں اور مدہوشی میں پکارنے لگیں گے لیکن ان کے شرکاء ظاہر ہے کہ کوئی جواب نہ دیں گے۔ وہ خود مخلوق ہوں گے اور قیامت کے میدان میں نہ اپنی کسی چیز اور نہ دوسروں کے لیے کسی چیز کے مالک ہوں گے۔ خود خوفزدہ ہوں گے۔ اللہ ان شریک کرنے والوں اور ان کے شریکوں کے درمیان ایک ہلاکت کا گڑھا پیدا کر دیں گے جس کو کوئی بھی پار نہیں کر سکے گا اور یہ گڑھا آگ کا ہو گا۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا (۱۸ : ۵۲) "ہم ان کے درمیان ایک ہی ہلاکت کا گڑھا مشترک کر دیں گے"۔
یہ مجرم اب اگلے مرحلے کو دیکھیں گے۔ یہ خوف و ہراس میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ان کو آگ نظر آئے گی اور ان کو ہر لحظہ اس میں پڑنے کا خطرہ ہو گا۔ عذاب کا یہ انتظار کس قدر شدید ہوتا ہے۔ جب کوئی یہ توقع کرے کہ ابھی آنے والا ہے۔ اور اب انہیں اس سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا

(۱۸ : ۵۳) "مجرم اس روز آگ دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ اب انہیں اس میں گرنا ہے اور وہ اس سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہ پائیں گے"۔

---ooo---

ان کے لیے اس سے رہائی کا راستہ تو تھا۔ اے کاش کہ وہ اس سے قبل دنیا میں اپنے دلوں کو قرآن کی طرف پھیرتے۔ اور قرآن جس سچائی کو لے کر آیا تھا اس کے مقابلے میں نہ اتر آتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں امثال کے ذریعے بات کو بار بار پھیر کر سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اور ہر حال ان کو سمجھایا تھا۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ط وَكَانَ

الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿٥٤﴾

"ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے"۔

قرآن مجید نے یہاں انسان کو ایک چیز کہا ہے۔ اور یہ کہ وہ بڑی جھگڑالو چیز ہے۔ چیز سے تعبیر اس لیے کیا گیا تا کہ انسان اپنے کبر و غرور سے ذرا نیچے اترے۔ اور یہ سمجھے کہ وہ بھی اللہ کی بے شمار مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے۔ اور انسان تمام مخلوقات سے زیادہ جھگڑالو ہے۔ اس کے باوجود کہ اللہ نے اس قرآن میں انسان کو مختلف طریقوں سے سمجھانے کی سعی کی۔ اور مثالوں سے اسے سمجھایا۔

اب یہ بتایا جاتا ہے کہ اکثر لوگ کیوں ایمان نہ لائے؟ وہ کیا شبہ تھا جو رکاوٹ بنا؟ مختلف رسولوں کے زمانے میں اکثر لوگ ایمان سے محروم رہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ وَيَسْتَغْفِرُوا رَبَّهُمْ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿٥٥﴾

"ان کے سامنے جب ہدایت آئی تو اسے ماننے اور اپنے رب کے حضور معافی چاہنے سے آخر ان کو کس چیز نے روک دیا؟ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ منتظر ہیں کہ ان کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو جو پچھلی قوموں کے ساتھ ہو چکا ہے' یا یہ کہ وہ عذاب کو سامنے آتے دیکھ لیں!؟"

حالانکہ ان لوگوں کے پاس اس قدر راہنمائی آچکی تھی جو اس کے لیے کافی تھی کہ وہ راہ ہدایت پر آجائیں۔ لیکن انہوں نے راہ ہدایت کو اس لیے قبول نہ کیا کہ وہ اس قسم کے عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے۔ جیسا کہ ان سے پہلے مکذبین پر آیا۔ پھر سوال یہ ہے کہ وہ کیوں ایسا خوفناک مطالبہ کرتے تھے یا ان کا مطالبہ یہ تھا کہ آپ عذاب لے آئیں وہ دیکھ لیں اور اس وقت وہ ایمان لائیں گے۔

لیکن یہ دونوں کام رسولوں کی ڈیوٹی میں شامل نہیں ہیں۔ کیونکہ مکذبین کے سامنے معجزے پیش کرنا' پھر انکار کی وجہ سے ان کو ہلاک کرنا بھی رسولوں کے اختیار میں نہیں ہے جیسا کہ سابقہ رسولوں کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ یا معجزات کے علاوہ عذاب کا آجانا یہ بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔ رسولوں کی ڈیوٹی تو صرف یہ ہے کہ وہ خوشخبری دیں اور ڈرائیں۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ ۖ وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَمَا أُنْذِرُوا هُزُوًا ﴿٥٦﴾

”رسولوں کو ہم اس کام کے سوا اور کسی غرض کے لیے نہیں بھیجتے کہ وہ بشارت اور تنبیہ کی خدمت انجام دے دیں ۔ مگر کافروں کا یہ حال ہے کہ وہ باطل کے ہتھیار لے کر حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور انھوں نے میری آیات کو اور ان تنبیہات کو جو انہیں کی گئیں ' مذاق بنالیا ہے“ ۔

حق واضح ہے ' لیکن اہل کفر باطل ہتھیاروں سے حق کو مغلوب کرنا چاہتے ہیں اور حق کو باطل ثابت کرنا چاہتے ہیں ۔ یہ اہل باطل جو خارق عادت معجزات طلب کرتے ہیں یا یہ لوگ عذاب کے مطالبے میں جلدی کرتے ہیں ۔ یہ اس لیے نہیں کرتے کہ ان کو اطمینان ہو جائے بلکہ یہ لوگ اللہ کی آیات کے ساتھ مذاق کرتے ہیں اور رسولوں کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں ۔

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَ نَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْۤا اِذًا اَبَدًا ۝

”اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہے جسے اس کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جائے اور وہ ان سے منہ پھیرے اور اس برے انجام کو بھول جائے جس کا سروسامان اس نے اپنے لیے خود اپنے ہاتھوں کیا ہے ؟ (جن لوگوں نے یہ روش اختیار کی ہے ) ان کے دلوں پر ہم نے غلاف چڑھا دیے ہیں جو انہیں قرآن کی بات نہیں سمجھنے دیتے اور ان کے کانوں میں ہم نے گرانی پیدا کر دی ہے ۔ تم انہیں ہدایت کی طرف کتنا ہی بلاؤ ' وہ اس حالت میں کبھی ہدایت نہ پائیں گے“ ۔

یہ لوگ دراصل اللہ کی آیات اور اللہ کے رسولوں کے ساتھ مذاق کرتے ہیں ۔ اس لیے ان سے یہ توقع نہ کی جائے کہ یہ لوگ قرآن کو سمجھ لیں گے ۔ نہ ان سے یہ توقع رکھی جائے کہ یہ لوگ اس کی تعلیمات سے نفع اٹھائیں گے ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس روش کی وجہ سے ان دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں ' اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے ۔ لہٰذا یہ نہ سن سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں ۔ اور ان کی اس روش مذاق اور استہزاء کی وجہ سے ان کے لیے ضلالت لکھ دی گئی ہے ۔ لہٰذا اب ان کو کبھی بھی ہدایت نہیں ملے گی کیونکہ ہدایت ان لوگوں کو ملتی ہے جو کھلے دل و دماغ سے بات کو سنتے ہیں ۔

وَ رَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ

”تیرا رب بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے ۔ وہ ان کے کرتوتوں پر انہیں پکڑنا چاہتا تو جلدی ہی عذاب بھیج دیتا“ ۔

لیکن اللہ ان لوگوں کو خالص اپنی رحمت کی وجہ سے مہلت دیتا ہے ۔ اور ان پر وہ ہلاکت نہیں لاتا جس کے لیے وہ جلدی کر رہے لیکن اس مہلت کی بھی ایک حد مقرر ہے ۔

بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ﴿۵۸﴾

"مگر ان کے لیے وعدے کا ایک وقت مقرر ہے اور اس سے بچ کر بھاگ نکلنے کی یہ کوئی راہ نہ پائیں گے"۔

یعنی دنیا میں بھی ان پر عذاب الٰہی کے نزول کے لیے وقت مقرر ہے اور پھر آخرت میں ان کے لئے ایک وقت مقرر ہے جس میں انہیں سخت سزا دی جائے گی۔

انہوں نے چونکہ ظلم کیا ہے اس لیے یہ لوگ بھی امم سابقہ کی طرح ہلاکت کے مستحق قرار پا چکے ہیں۔ لیکن اللہ نے اپنی حکمت اور تدبیر کے مطابق چونکہ ان کے لیے ایک مہلت مقرر کر رکھی ہے اس لیے اللہ ان کو اس طرح ہلاکت سے دوچار نہیں کر رہا ہے جس طرح اللہ نے ظالم امم سابقہ کو ہلاک کیا۔ ہاں ان کے لیے علیحدہ میعاد مقرر ہے۔

۸

وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾ ع ۶

۲۰

"یہ عذاب رسیدہ بستیاں تمہارے سامنے موجود ہیں۔ انہوں نے جب ظلم کیا تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا' اور ان میں سے ہر ایک کی ہلاکت کے لیے ہم نے وقت مقرر کر رکھا تھا"۔

لہٰذا ان لوگوں کو چاہئے کہ اس مہلت سے دھوکہ نہ کھائیں۔ ان کی مہلت بھی ختم ہونے ہی والی ہے۔ اللہ کی سنت اپنا کام کر رہی ہے وہ اٹل ہے اور اللہ جو میعاد مقرر کرتا ہے وہ آکر رہتی ہے۔

---000---

# درس نمبر ۱۳۳ ایک نظر میں

اس سبق میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت کا جو گوشہ بیان ہوا ہے وہ صرف اسی سورت کے اسی مقام پر مذکور ہے۔ قرآن میں کسی دوسری جگہ اس کا ذکر نہیں ہے۔ قرآن کریم نے اس مقام کا بھی تعین نہیں فرمایا صرف یہ کہا ہے کہ وہ مجمع البحرین ہے۔ نیز اس واقعہ کی تاریخ بھی متعین نہیں ہے کہ آیا یہ اس دور میں ہوا جب حضرت موسیٰ مصر میں تھے یا یہ واقعہ خروج بنی اسرائیل کے بعد پیش آیا۔ اگر خروج کے بعد آیا تو کہاں اور کس وقت پیش آیا؟ بیت المقدس پر حملے کے وقت سے پہلے آیا یا بعد میں۔ جب موسیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ وہ بیت المقدس میں داخل ہوں تو انہوں نے داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ وہاں جبار قوم بستی ہے اور قابض ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ واقعہ اس دور میں پیش آیا جب یہ صحرانوردی کر رہے تھے۔

قرآن کریم نے اس بندۂ صالح کے بارے میں بھی تفصیلات نہیں دی ہیں جن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام ملنے گئے تھے۔ یہ کون تھے؟ ان کا نام کیا تھا؟ یہ نبی تھے؟ رسول تھے؟ کوئی عالم دین تھے؟ یا کوئی ولی تھے؟

اس قصے کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ اور ان کے علاوہ دوسرے حضرات سے بہت سی روایات وارد ہیں لیکن ہم صرف قرآن مجید کے بیان تک اپنے آپ کو محدود رکھیں گے تاکہ ہم قرآن ہی کے سایہ میں رہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ جس انداز میں اس قصے کو قرآن نے دیا ہے اس میں اس کی تاریخ بھی نہیں دی' نام بھی نہیں دیئے' جگہ کا تعین بھی نہیں کیا' اس میں کوئی خاص حکمت ہوگی۔ لہٰذا ہم بھی اس قدر معلومات پر اکتفاء کرتے ہیں جس قدر قرآن نے دے دی ہے۔ (۱)

---ooo---

(۱) بخاری میں ہے۔ سعید ابن جبیرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ نوف بکالی کا خیال ہے کہ جو موسیٰؑ خضرؑ سے ملے وہ موسائے بنی اسرائیل نہ تھے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا وہ جھوٹ بولتا ہے۔ ہمیں ابی بن کعب نے حضورؐ سے سن کر بتایا کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے سامنے خطبہ دے رہے تھے تو ان سے پوچھا گیا کہ کون زیادہ علم رکھتا ہے تو موسیٰؑ نے کہا' میں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کو غصہ آیا کیونکہ موسیٰ نے اپنے علم کو اللہ کی طرف منسوب نہ کیا۔ تو اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی بتایا کہ مجمع البحرین میں ہمارا ایک بندہ ہے جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے سوال کیا کہ اے اللہ میں اس سے کیسے مل سکتا ہوں۔ اللہ نے فرمایا تم اپنے پاس ایک مچھلی کو تھیلے میں رکھ لو' جہاں تم نے مچھلی کو گم کر دیا بس وہ جگہ ہوگی اس بندۂ صالح کی۔

# درس نمبر ۱۳۳ تشریح آیات

## ۶۰---تا---۸۲

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾

”(ذرا ان کو وہ قصہ سناؤ جو موسیٰ کو پیش آیا تھا) جبکہ موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ ”میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں، ورنہ میں ایک زمانہ دراز تک چلتا ہی رہوں گا“۔

مجمع البحرین سے کون سی جگہ مراد ہے، غالب یہ ہے کہ شاید بحر روم اور بحر قلزم کے درمیان کوئی جگہ یا بحر اسود یا بحر احمر کے درمیان کوئی جگہ ہے۔ ان کا مقام التقاء بحیرہ مرہ یا بحیرہ تمساح ہو سکتا ہے یا خلیج عقبہ اور خلیج سویس کے اجتماع کی جگہ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بحر احمر کی دو شاخیں ہیں۔ کیونکہ یہی وہ جگہ تھی جہاں خروج کے بعد بنی اسرائیل چلتے پھرتے رہے۔ بہرحال قرآن کریم نے اس بات کو مجمل چھوڑ دیا ہے۔ ہم بھی فقط یہی اشارہ کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔ (۱)

قصے کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا ایک خاص ہدف تھا۔ جہاں تک انہوں نے پہنچنے کا عزم کر رکھا تھا۔ آپ کے پیش نظر کوئی خاص مطلب تھا۔ کیونکہ آپ فرماتے ہیں کہ آپ مجمع البحرین تک ضرور پہنچیں گے چاہے اس سفر میں زیادہ مشقت درپیش ہو اور چاہے اس میں زیادہ عرصہ لگ جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس تعبیر اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا (۱۸: ۶۰) ”ورنہ میں زمانہ دراز تک چلتا رہوں گا“۔ حقب کے معنی ایک سال کے ہیں یا بعض اقوال کے مطابق ۸۰ سال کے ہیں۔ بہرحال مقصد یہ ہے کہ وہ بہرحال مجمع البحرین تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ کوئی متعین زمانہ مراد نہیں ہے۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿۶۱﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۡ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾ قَالَ

(۱) قتادہ وغیرہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد بحر فارس ہے جو شرق کی جانب ہے اور بحر روم ہے جو مغرب کی جانب سے قریب ہے۔ محمد ابن کعب قرظی نے کہا ہے کہ مجمع البحرین بلاد مغرب میں طنجہ کے قریب ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اقوال مستبعد ہیں۔

أَرَءَيْتَ إِذْ أَوَيْنَآ إِلَى ٱلصَّخْرَةِ فَإِنِّى نَسِيتُ ٱلْحُوتَ وَمَآ أَنسَىٰنِيهُ إِلَّا ٱلشَّيْطَٰنُ أَنْ أَذْكُرَهُۥ ۚ وَٱتَّخَذَ سَبِيلَهُۥ فِى ٱلْبَحْرِ عَجَبًا ﴿٦٣﴾

"پس جب وہ ان کے سنگم پر پہنچے تو اپنی مچھلی سے غافل ہو گئے اور وہ نکل کر اس طرح دریا میں چلی گئی جیسے کہ کوئی سرنگ لگی ہو۔ آگے جا کر موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے کہا "لاؤ ہمارا ناشتہ' آج کے سفر میں تو ہم بری طرح تھک گئے ہیں"۔ خادم نے کہا "آپ نے دیکھا' یہ کیا ہوا؟ جب ہم اس چٹان کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے اس وقت مجھے مچھلی کا خیال نہ رہا' اور شیطان نے مجھ کو ایسا غافل کر دیا کہ میں اس کا ذکر (آپ سے کرنا) بھول گیا۔ مچھلی تو عجیب طریقے سے نکل کر دریا میں چلی گئی"۔

راجح بات یہ ہے کہ یہ مچھلی بھونی ہوئی تھی۔ اور اس کا زندہ رہنا اور پھر اس کا سمندر کے اندر عجیب انداز میں گم ہو جانا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ایک نشانی تھی۔ اس کے ذریعے اللہ نے ان کو بتانا تھا کہ عبد صالح کا مقام یہی ہے۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے نوکر نے جو بیان کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مچھلی نے قابل تعجب انداز میں سمندر میں اپنی راہ لی تھی۔ یہ بات کہ زندہ مچھلی اس کے ہاتھ سے گر گئی اور وہ سمندر میں چلی گئی تو اس میں تعجب کیا بات ہے۔ سبب ترجیح یہ ہے کہ یہ سفر سب کا سب غیبی معجزات پر مشتمل ہے۔ یہ بھی ان میں سے ایک معجزہ تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہو گیا کہ عبد صالح کے مقام سے وہ آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس سے ملاقات اس پتھر کے پاس ہو گی۔ چنانچہ وہ واپس ہوئے اور وہاں ان کو عبد صالح انتظار کرتے ہوئے ملے۔

قَالَ ذَٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۚ فَٱرْتَدَّا عَلَىٰٓ ءَاثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿٦٤﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ ءَاتَيْنَٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَعَلَّمْنَٰهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾

موسیٰ علیہ السلام نے کہا "اسی کی تو ہمیں تلاش تھی"۔ چنانچہ وہ دونوں اپنے نقش قدم پر پھر واپس ہوئے اور وہاں انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا کیا تھا"۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے رب کے درمیان ایک خفیہ راز تھا۔ اور اس راز سے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی نوجوان بھی باخبر نہ تھے۔ ملاقات تک اسے خبر نہ تھی اور بعد کے مناظر میں بھی اب نوجوان حضرت موسیٰ اور عبد صالح کے ساتھ نظر نہیں آتے۔

قَالَ لَهُۥ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰٓ أَن تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿٦٦﴾

"موسیٰ نے اس سے کہا "کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ آپ مجھے بھی اس دانش کی تعلیم دیں جو آپ کو

سکھائی گئی ہے؟"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نہایت ہی احترام سے ان سے دریافت کرتے ہیں کہ آیا آپ ہمیں کچھ سکھائیں گے؟ یعنی آپ کو اللہ نے جو علم دیا ہے اس میں سے کوئی راہنمائی اور دانش مندی ہمیں بھی سکھائیں گے۔ لیکن اس شخص کا علم وہ علم نہ تھا جو انسانوں کو سکھایا گیا ہے اور جس کے اسباب و نتائج معلوم اور قریب الفہم ہوتے ہیں بلکہ اس کے علم کا تعلق علم لدنی اور اس کائنات کے تکوینی انتظام کے ساتھ تھا۔ یہ اللہ کے غیبی امور کا ایک حصہ تھا۔ جو اس عبد صالح کو اللہ نے اپنی مخصوص مصلحتوں اور حکمت کے تحت سکھایا ہوا تھا۔ اس لیے عبد صالح کو معلوم تھا کہ حضرت موسیٰ اس کے تصرفات کو برداشت نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ آپ تو رسول اور نبی ہیں۔ خلاف شریعت کسی بات کو برداشت نہ کریں گے۔ کیونکہ یہ تصرفات بظاہر شریعت کے بھی خلاف ہوں گے اور عقلی طرز عمل کے بھی خلاف ہوں گے اور اس بات کی ضرورت ہوگی کہ ان کی تہ میں جو تکوینی حکمت پوشیدہ تھی وہ بھی ان کو بتائی جائے۔ اگر اصل حقیقت نہ بتائی جائے تو یہ قابل اعتراض ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ عبد صالح اس اندیشے کا اظہار کرتے ہیں کہ تم صبر نہ کر سکو گے۔

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٦٧﴾ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿٦٨﴾

اس نے جواب دیا "آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے' اور جس چیز کی آپ کو خبر نہ ہو' آخر آپ اس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام صبر اور اطاعت کے عزم کا اظہار کرتے ہیں' اس سلسلے میں اللہ کی مدد کی بھی امید کرتے ہیں اور اللہ کی مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿٦٩﴾

موسیٰ نے کہا "ان شاء اللہ' آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملہ میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا"۔

عبد صالح اب بطور تاکید دوبارہ صبر کی تلقین کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے ساتھ رہنے کی شرط یہ ہے کہ میرے تصرفات کی بابت آپ کوئی سوال نہ کریں گے' یہاں تک کہ میں خود ان تصرفات کی حقیقت بیان نہ کر دوں۔

۹

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿٧٠﴾ ۱۱ ع

اس نے کہا "اچھا' اگر آپ میرے ساتھ چلتے ہیں تو مجھ سے کوئی بات نہ پوچھیں جب تک کہ میں خود اس کا آپ ۲۱
سے ذکر نہ کروں"۔ حضرت موسیٰ یہ شرط قبول کرتے ہیں۔ اب پہلا تصرف اور اس کا منظر۔

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ؕ

"اب وہ دونوں روانہ ہوئے، یہاں تک کہ وہ ایک کشتی میں سوار ہو گئے تو اس شخص نے کشتی میں شگاف ڈال دیا"۔ یہ کشتی ان دونوں کو بھی لے جا رہی اور ساتھ ہی اور سوار بھی اس پر موجود ہیں۔ یہ سب لوگ سمندر کے درمیان موجوں میں سفر کر رہے ہیں۔ عبد صالح اس میں شگاف ڈال دیتے ہیں۔ بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ اس شگاف کی وجہ سے یہ کشتی غرق ہو سکتی ہے۔ اور مالکوں اور سواروں کے لیے مصیبت کا باعث ہو سکتی ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ عبد صالح نے یہ حرکت کیوں کی؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذہن سے شرائط سفر محو ہو گئیں۔ وہ اس غیر معقول حرکت کو برداشت نہ کر سکے۔ جو عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے۔ انسان بعض اوقات محض تصور کی حد تک بہت کچھ کہتا ہے۔ لیکن جب وہ کسی عملی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے تمام نظریاتی جائزے اور توقعات دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ عملی میدان میں اس کا ردعمل محض نظری میدان سے مختلف ہوتا ہے۔ عملی تجربات اور ہوتے ہیں اور نظری تصورات اور۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نظری طور پر متنبہ بھی کر دیا گیا تھا کہ تم ان امور پر صبر نہ کر سکو گے جن کے بارے میں تمہیں علم نہ ہو گا۔ وہ اللہ کے فضل و کرم سے صبر کرنے کا عزم بھی کرتے ہیں، وعدہ بھی کرتے ہیں، شرط قبول بھی کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ عملاً ایک منظر کو دیکھتے ہیں تو سب کچھ بھول کر اعتراض کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ کی طبیعت بھی انفعالی اور جذباتی تھی۔ اس لیے وہ صبر نہ کر سکے۔ وہ وعدے کا ایفا نہ کر سکے۔ وہ اس فعل کے انوکھے پن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی پوری زندگی میں کبھی بھی برائی کو برداشت نہ کیا۔ مثلاً مصر میں جب ایک قبطی ایک بنی اسرائیلی سے لڑ رہا تھا تو آپ نے غصے میں اسے مکا رسید کیا اور وہ مر گیا۔ پھر انہوں نے اس فعل پر اللہ سے معافی مانگی۔ پھر دوسرے دن جب وہی بنی اسرائیلی پھر ایک مصری سے لڑ رہا تھا تو آپ پھر غصہ ہوئے۔

بہرحال حضرت موسیٰ اپنی افتاد طبع کے مطابق یہاں بھی برداشت نہ کر سکے۔ واقعہ عجیب و غریب تھا۔ عقل و نقل کے خلاف تھا۔ اور اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کیا تھا اور شرط بھی قبول کر لی تھی لیکن نظریات اور ہوتے ہیں اور عملی صورت حالات اور ہوتی ہے۔ چنانچہ جب عملاً موسیٰ علیہ السلام کے سامنے یہ صورت حالات پیش ہوئی تو آپ نے بے ساختہ اعتراض کر دیا۔

قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا ﴿۷۱﴾

موسیٰ علیہ السلام نے کہا "آپ نے اس میں شگاف ڈال دیا تاکہ سب کشتی والوں کو ڈبو دیں؟ یہ تو آپ نے ایک سخت حرکت کر ڈالی"۔ یہ عبد صالح نہایت بردباری سے اور نہایت ہی سنجیدگی سے یاد دلاتے ہیں کہ ہمارے درمیان معاہدہ کیا طے ہوا تھا؟

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۲﴾

اس نے کہا "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے"۔ اب حضرت موسیٰ معذرت کرتے ہیں کہ وہ تو بھول گئے اور درخواست کرتے ہیں کہ آپ میرے عذر کو قبول کر لیں، بھول ہو گئی اور یہ کہ اس معاملے میں آپ میرے ساتھ سختی نہ کریں۔

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ﴿۷۳﴾

موسیٰ نے کہا "بھول چوک پر مجھے نہ پکڑیے۔ میرے معاملے میں آپ ذرا سختی سے کام نہ لیں"۔
عبد صالح بھی یہ عذر و معذرت قبول کر لیتے ہیں اور ہم اب دوسرے منظر کے سامنے ہیں۔

فَانْطَلَقَا ٘ حَتّٰىٓ اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ

"پھر وہ دونوں چلے، یہاں تک کہ ان کو ایک لڑکا ملا اور اس شخص نے اسے قتل کر دیا"۔
پہلے تو کشتی میں شگاف ڈالا تھا اور لوگوں کی ہلاکت کا محض احتمال تھا لیکن اب تو واضح طور پر انہوں نے ایک شخص کو قتل کر دیا۔ یہ قتل عمد تھا۔ محض احتمال قتل نہ تھا۔ اور یہ گناہ کبیرہ تھا۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام صبر نہ کر سکتے تھے۔ اگرچہ انہوں نے عہد کیا تھا اور انہیں یہ عہد یاد بھی تھا۔

قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾

موسیٰ علیہ السلام نے کہا "آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی حالانکہ اس نے کسی کا خون نہ کیا تھا؟ یہ کام تو آپ نے بہت ہی برا کیا"۔
اس دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ بھولے تھے اور نہ غافل تھے۔ اب انہوں نے بالارادہ اعتراض کر دیا۔ کیونکہ وہ اس گناہ کبیرہ پر اعتراض کیے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ نہ وہ اس کی کوئی تاویل کر سکتے تھے۔ ان کے خیال میں یہ لڑکا بے گناہ تھا۔ اس نے ایسا کوئی فعل نہ کیا جس کے نتیجے میں اس کا قتل جائز ہو۔ بلکہ وہ تھا بھی نابالغ اس پر تو حد جاری ہی نہ ہو سکتی تھی۔
عبد صالح دوبارہ ان سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارے درمیان ایک معاہدہ ہو چکا ہے اور وہ انہیں پھر یاد دلاتے ہیں اور یہ کہ تجربے کے بعد تجربہ بتلاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام برداشت نہیں کر سکتے۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾

اس نے کہا "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے"۔ موسیٰ علیہ السلام کا غصہ اب ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ وہ اب سمجھتے ہیں کہ انہوں نے دو مرتبہ وعدہ خلافی کر لی۔ اور ان کی یاد دہانی کے بعد پھر وہ بھول گئے۔ چنانچہ وہ آگے بڑھ کر خود ہی اپنے لیے آخری بار مقرر فرماتے ہیں کہ اگر اب کے میں نے خلاف ورزی کی تو آپ مجھے علیحدہ کر دیں۔

قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَیْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِیْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّیْ عُذْرًا ﴿۷۶﴾

موسیٰ علیہ السلام نے کہا "اس کے بعد اگر میں آپ سے کچھ پوچھوں تو آپ مجھے ساتھ نہ رکھیں۔ لیجئے 'اب تو میری طرف سے آپ کو عذر مل گیا"۔ اب ہم ذرا آگے بڑھتے ہیں اور تیسرے منظر کے سامنے کھڑے ہیں۔

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَیَاۤ اَهْلَ قَرْیَةِ ِۨاسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِیْهَا جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ

"پھر وہ آگے چلے یہاں تک کہ ایک بستی میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں سے کھانا مانگا تو انہوں نے ان دونوں کی ضیافت سے انکار کر دیا۔ وہاں انہوں نے ایک دیوار دیکھی 'جو گرا چاہتی تھی۔ اس شخص نے اس دیوار کو پھر قائم کر دیا"۔

یہ دونوں بھوکے تھے۔ لیکن وہ دونوں ایسے گاؤں میں تھے جس کے باشندے بخیل تھے۔ وہ کسی بھوکے کو کھانا نہ کھلاتے تھے نہ کسی مہمان کی مہمان نوازی کرتے تھے۔ اچانک یہ شخص دیکھتا ہے کہ ایک دیوار گرا چاہتی ہے۔ یہاں بھی انداز ایسا ہے کہ دیوار گویا زندہ ہے اور وہ بالارادہ گرنا چاہتی ہے۔

یُرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ (۱۸:۷۷) "وہ ارادہ کرتی ہے کہ گر جائے"۔ یہ بندۂ خدا بس دیکھتے ہی بغیر کسی معاوضہ کے دیوار کو از سر نو کھڑا کرنے میں لگ گیا۔

یہاں موسیٰ علیہ السلام سہ بارہ محسوس کرتے ہیں کہ اس شخص کے طرز عمل میں کھلا تضاد ہے۔ آخر وہ کیا وجہ ہے کہ یہ شخص مشقت برداشت کرتا ہے اور اس گاؤں میں یہ نیکی کا کام کرتا ہے جبکہ ہم بھوکے ہیں اور ان لوگوں نے ہمیں کھانا کھلانے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ کیا کم از کم یہ بات معقول نہ تھی کہ وہ اس دیوار کو درست کرنے پر معاوضہ طلب کرتے اور اس کے عوض کھانا کھا لیتے۔

قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَیْهِ اَجْرًا ﴿۷۷﴾

"موسیٰ علیہ السلام نے کہا - اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اجرت لے سکتے تھے"۔ پس اب اس سے دونوں کے درمیان جدائی ہوگئی۔ اب موسیٰ علیہ السلام کے لیے کوئی عذر نہ تھا۔ نہ اب دونوں کے درمیان مزید رفاقت کی کوئی گنجائش رہ گئی تھی ۔

قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَ بَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿٧٨﴾

"اس نے کہا - بس میرا تمہارا ساتھ ختم ہوا۔ اب میں تمہیں ان باتوں کی حقیقت بتاتا ہوں جن پر تم صبر نہ کر سکے"۔

یہاں تک حضرت موسیٰ اور ہم جو قرآن پڑھتے ہیں' یہ حیران کن واقعات دیکھتے چلے آئے ہیں۔ یہ عجیب واقعات ہیں۔ ہم ان کے راز کو نہیں جانتے۔ لیکن ان کے بارے میں ہر قاری قرآن کی رائے وہی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے بلکہ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ شخص ہے کون جو اس قسم کے عجیب اقدامات کر رہا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے ہمیں اس کا نام بھی نہیں بتایا۔ نام تو قرآن نے اس لیے نہیں بتایا کہ اس عجیب اور حیرت انگیز قصے کی فضا مزید حیران کن ہو جائے بلکہ نام کے اظہار کی یہاں اہمیت ہی نہیں ہے بلکہ اصل اہمیت اس کی ہے کہ اس کائنات میں ان واقعات کی پشت پر جو حکمت ہے وہ معلوم ہو جائے۔ اور بظاہر جو تصرفات عجیب نظر آتے ہیں وہ معقول نظر آئیں۔ اور ان کے دور رس اسباب معلوم ہوں۔ نام معلوم ہو کہ نہ ہو' بلکہ ان کی پر اسرار شخصیت کے ساتھ موزوں یہی ہے کہ وہ نامعلوم رہیں۔ کیونکہ پوری سورت اور اس قصے میں غیبی قوتیں کام کر رہی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام اس بندۂ خدا سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنا سفر طے کر رہے ہیں لیکن پتھر کے پاس حضرت موسیٰ کے غلام کھانا بھول جاتے ہیں۔ بھول بھی اس لیے جاتے ہیں کہ واپس اس چٹان تک لوٹ آئیں۔ وہاں یہ شخص غائبانہ انداز میں موجود ہو جاتا ہے۔ اگر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی غذا نہ بھولتے تو وہ ان سے نہ مل سکتے اور آگے ہی چلے جاتے۔ لیکن دست قدرت نے انہیں دوبارہ پتھر تک لوٹایا۔ غرض قصے کی تمام فضا پر اسرار ہے اور ایک کردار کا نام تک معلوم نہیں ہے۔ لیکن اب ان پر اسرار واقعات کا راز کھلتا ہے۔

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿٧٩﴾

"اس کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں' کیونکہ آگے ایک ایسے بادشاہ کا علاقہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا"۔

اور اس عیب کی وجہ سے یہ کشتی بیگار میں پکڑے جانے سے بچ گئی۔ اور یہ عیب ایک چھوٹا نقصان تھا اور ایک بڑے

نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹا نقصان برداشت کیا جاسکتا ہے۔ اگر کشتی کو یہ تھوڑا سا نقصان نہ پہنچایا جاتا تو اس کو شدید نقصان اٹھانا پڑتا۔

وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَاۤ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًاۚ۝ فَاَرَدْنَاۤ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا۝

"رہا وہ لڑکا، تو اس کے والدین مومن تھے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ لڑکا اپنی سرکشی اور کفر سے ان کو تنگ کرے گا۔ اس لیے ہم نے چاہا کہ ان کا رب اس کے بدلے ان کو ایسی اولاد دے جو اخلاق میں بھی اس سے بہتر ہو اور جس سے صلہ رحمی بھی زیادہ متوقع ہو"۔

یہ لڑکا بظاہر تو قتل کے مستحق نہ تھا۔ نہ واجب القتل تھا، لیکن مستقبل میں وہ بہت ہی خطرناک بن رہا تھا۔ سخت کافر اور حد سے تجاوز کرنے والا ہو رہا تھا۔ اس کے نفس کے اندر ان برائیوں کے بیج موجود اور بعد میں ظاہر ہونے والے تھے۔ اگر یہ زندہ رہتا تو اپنے کفر اور سرکشی کی وجہ سے والدین کی نافرمانی کرتا اور یہ والدین اس کی محبت کی وجہ سے اس کی راہ پر چلتے۔ اس لیے اللہ نے اس بندۂ صالح کو حکم دیا کہ اس لڑکے کو قتل کر دے اور اللہ اس کے والدین کو اس کے بدلے نہایت ہی صالح اولاد دے گا جو والدین کے ساتھ زیادہ حسن سلوک کرنے والی ہوگی۔

اگر ان امور کو انسان کے ظاہری علم ہی پر چھوڑ دیا جاتا تو انسان اس لڑکے کے بارے میں ظاہری فیصلہ ہی کرتا اور اس لڑکے کو قانوناً کچھ بھی نہ کہا جاسکتا تھا۔ کیونکہ اس نے شریعت کے مطابق ایسا کوئی جرم نہ کیا تھا کہ اسے قتل کر دیا جاتا۔ نیز اللہ کے سوا اگر کوئی غیب بھی جانتا ہو تو بھی کسی فرد کو کوئی اس طرح قتل نہیں کر سکتا۔ کوئی جج بھی اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کر سکتا۔ فیصلہ قانون کے مطابق ہی ہوگا۔ لیکن یہاں عبد صالح نے فیصلہ اللہ کے حکم کے مطابق کیا اور یہ حکم مستقبل کے اعمال کے ساتھ وابستہ علم الہی کی وجہ سے کیا گیا۔

وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَ
كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًاۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا
وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَاۖۗ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَۚ وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْؕ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ ۱۰
۱۲ع مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا۝

۱ "اور اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں۔ اس دیوار کے نیچے ان بچوں کے لیے ایک خزانہ مدفون ہے اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا اس لیے تمہارے رب نے چاہا کہ یہ دونوں بچے بالغ

ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔ یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا ہے' میں نے کچھ اپنے اختیار سے نہیں کر دیا ہے۔ یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے"۔

یہ دیوار جسے از سرنو کھڑا کرنے میں اس شخص نے اپنے آپ کو تھکایا اور گاؤں والوں سے اس پر کوئی اجر بھی طلب نہ کیا۔ جبکہ دونوں بھوکے بھی تھے اور گاؤں والوں نے ان کی مہمان نوازی کرنے سے انکار بھی کر دیا تھا۔ اس کے نیچے خزانہ تھا۔ اور یہ خزانہ گاؤں کے دو ضعیف یتیموں کی ملکیت تھا۔ اگر یہ دیوار گر جاتی' خزانہ ظاہر ہو جاتا تو لوگ اسے اڑا لیتے اور یہ یتیم کوئی مدافعت نہ کر سکتے چونکہ ان کا باپ صالح تھا اس لیے باپ کی نیکی نے ان بچوں کو فائدہ دیا۔ ان کی ذاتی کمزوریوں پر بھی اللہ کو رحم آیا۔ اس لیے اللہ کے حکم سے یہ دیوار تعمیر ہوئی کہ وہ ذرا مضبوط ہو جائیں اور اپنا خزانہ نکالیں اور اسے بچا بھی سکیں۔

اس کے بعد یہ عبد صالح اس کارنامے سے اپنے ہاتھ جھاڑ دیتا ہے۔ یہ تو اللہ کی رحمت تھی جس نے یہ سب تصرفات کیے۔ اللہ کا حکم تھا' اپنی مرضی سے اس نے کچھ نہ کیا۔ ان تمام امور میں اللہ نے عبد صالح کو غیب کی اطلاع کر دی اور حکم دیا کہ یہ تصرفات کرو'

رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ اَمْرِيْ (۸۲:۱۸) "یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا۔ میں نے کچھ اپنے اختیار سے نہیں کر دیا"۔

اب ان تصرفات کا پس منظر سامنے آگیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اللہ کا غیبی نظام کیا ہے اور اللہ اپنے غیب اسی کو بتاتا ہے جس کے بارے میں اس کی رضا ہو۔

جب اس راز کا انکشاف ہوتا ہے تو دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں اور عبد صالح منظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ جس طرح وہ اچانک نمودار ہوا تھا۔ اس طرح اچانک پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ اس قصے میں اس عظیم حکمت اور تدبر کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔ جس کے مطابق اس کائنات کا نظام چلتا ہے۔ اور یہ سب حکمت پس پردہ غیب سے اپنا کام کرتی ہے۔

اب یہاں دیکھیے کہ قصہ موسیٰ اور قصہ اصحاب کہف میں بھی غائبانہ حکمت الہیہ ایک قدر مشترک ہے۔ یہ کائنات اللہ کے وسیع علم کے مطابق چل رہی ہے۔ انسان کے لیے اس پر حاوی ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ کیونکہ انسان پردۂ غیب سے ادھر کھڑا ہے۔ پردۂ غیب کے اسرار و رموز سے واقف اللہ ہی ہے۔

(منصورہ ۱۸ دسمبر ۱۹۹۳ء)

--- ○○○---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ------ ۱۶

### سورۃ الکھف - ۱۸

۸۳ --- تا --- ۱۱۰

### سورۃ مریم - ۱۹

۱ --- تا --- ۹۸

### سورۃ طٰہٰ - ۲۰

۱ --- تا --- ۱۳۵

# درس نمبر ۱۳۴ ایک نظر میں

یہ سورہ کہف کا آخری سبق ہے۔ اس سبق کا بڑا حصہ ذوالقرنین کے قصے کے بارے میں ہے۔ اس میں ذوالقرنین کے تین سفروں کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ سفر مشرق' سفر مغرب اور سفر وسط۔ نیز اس میں یاجوج اور ماجوج کے مقابلے میں ان کی جانب سے دیوار کھڑی کرنے کا خصوصی ذکر ہے۔

قرآن کریم نے اس قصے میں ذوالقرنین کا ایک قول نقل کیا ہے۔ تعمیر سد کے بعد وہ کہتا ہے۔

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا (۱۸ : ۹۸) "ذوالقرنین نے کہا' یہ میرے رب کی رحمت ہے' مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوند خاک کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے"۔ اس کے بعد نفخ صور اور قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر آتا ہے اور اس سبق اور اس سورہ دونوں کا خاتمہ تین مختصر قطعات پر ہوتا ہے۔ جن پر بات ختم کی جاتی ہے اور ہر ایک مقطعہ کا آغاز لفظ قل کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان قطعات کے ذریعہ پوری سورہ کے مضامین کا خلاصہ دیا جاتا ہے اور سورہ کا عام فکری رجحان بتا دیا جاتا ہے۔ گویا یہ خلاصہ کلام قاری کے دل و دماغ کی تاروں پر آخری ضربات ہیں لیکن ذرا زیادہ قوت کے ساتھ ہیں۔

---OOO---

# درس نمبر ۱۳۴ تشریح آیات

## آیت ۸۳--- تا--- ۱۱۰

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝

"اور اے نبیؐ یہ لوگ تم سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان سے کہو' اس کا کچھ حال میں تم کو سناتا ہوں"۔ محمد ابن اسحاق نے اس سورہ کے شان نزول کے سلسلے میں یہ روایت نقل کی ہے۔ "مجھے ہمارے شہر کے ایک شیخ نے بتایا' جس نے ہمارے ہاں چالیس سال سے اوپر قیام کیا۔ انہوں نے عکرمہ' عن ابن عباس کی سند سے روایت کی۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ قریش نے نضر ابن حارث اور عقبہ ابن ابی معیط کو مدینہ میں یہود کے علماء کے پاس بھیجا' قریش نے ان سے کہا کہ ان علماء سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں دریافت کرو' ان کا پورا تعارف کراؤ' ان کی باتوں کے بارے میں ان کو پوری طرح آگاہ کرو' یہ لوگ پہلے اہل کتاب ہیں' ان کے پاس انبیاء کے بارے میں ہمارے مقابلے میں زیادہ علم ہے۔ یہ لوگ اس سفر پر نکلے یہاں تک کہ یہ مدینہ آئے' انہوں نے یہودی علماء سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں سوالات کیے۔ انہوں نے حضرت محمدؐ کا پورا تعارف کرایا اور آپؐ کے بعض اقوال و نظریات ان کو بتائے' ان دونوں نے یہ گزارش کی کہ تم لوگ حاملین تورات ہو' ہم تمہارے پاس اس لیے آئے ہیں کہ تم ہمیں ہمارے اس شخص کے بارے میں صحیح معلومات دو اور اپنی رائے بھی دو۔ کہتے ہیں کہ ان علماء نے اس وفد کو مشورہ دیا کہ ہم تمہیں تین سوالات بتاتے ہیں' تم یہ سوالات ان سے پوچھو۔ اگر اس نے ان تینوں کے جوابات تمہیں دے دیئے تو وہ بے شک نبی مرسل ہیں' اللہ کے سچے نبی ہیں۔ اگر انہوں نے ان سوالات کے جوابات نہ دیئے تو پھر یہ شخص باتیں بنانے والا ہے۔ تم جانو اور وہ۔ پہلا سوال یہ ہے کہ وہ نوجوان کون تھے جو پہلے زمانے میں دین کی خاطر گھر بار چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان کا معاملہ کیا تھا؟ کیونکہ ان کا قصہ بڑا عجیب ہے۔ ان سے دوسرا سوال یہ کرو کہ وہ مہم جو شخص کون تھا جس نے کرۂ ارض کے مشرق و مغرب کا سفر کیا۔ اس کے متعلق واقعات و خبریں۔ تیسرا سوال یہ کہ ان سے پوچھیں کہ روح کیا ہے۔ اگر اس نے ان تین سوالات کے جوابات دے دیئے تو وہ سچا نبیؐ ہے۔ تمہیں چاہئے کہ اس کی اطاعت کرو' اور اگر اس نے ان سوالات کا جواب نہ دیا تو وہ اپنی طرف سے باتیں بنانے والا شخص ہے' اس کے بارے میں تم جو چاہو کرو۔ نضر اور عقبہ واپس قریش کے پاس آئے۔ انہوں نے رپورٹ دی کہ ہم تمہارے اور محمدؐ کے

درمیان ایک فیصلہ کن بات لے کر آئے ہیں۔ ہمیں یہودی علماء نے یہ مشورہ دیا کہ اس سے کچھ باتیں پوچھو۔ انہوں نے قریش کو یہ سوالات بتائے۔ پھر یہ لوگ رسول اللہ کے پاس آئے اور کہا' محمد ہمیں ان سوالات کے بارے میں صحیح بتاؤ۔ انہوں نے وہ سوالات آپؐ کے سامنے رکھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا' میں تمہیں تمہارے سوالات کا جواب کل دوں گا لیکن آپؐ نے اس موقع پر لفظ ان شاء اللہ نہ کہا۔ یہ لوگ چلے گئے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پندرہ شب و روز جبرئیل کا انتظار کرتے رہے لیکن وحی نہ آئی نہ جبرئیل آئے۔ اہل مکہ مارے خوشی کے ناچنے لگے۔ وہ کہتے ہمارے ساتھ محمدؐ کا وعدہ کل کا تھا لیکن آج پندرہواں دن ہے اور محمدؐ ہمیں سوالات کا جواب نہیں دے سکا۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بے حد رنج ہوا۔ کیونکہ ایک تو وحی بند ہو گئی' دوسرے اہل مکہ بغلیں بجانے لگے۔ اس کے بعد حضرت جبرئیل سورہ کہف لے کر نازل ہوئے۔ اس سورہ میں آپؐ کو تنبیہ کی گئی کہ آپؐ ان لوگوں کی باتوں سے پریشان کیوں ہوئے؟ اس سورہ میں نوجوانوں کا قصہ شرق و غرب تک پہنچنے والے شخص کا قصہ اور روح کے بارے میں جواب نازل ہوا۔

یہ تو تھی ایک روایت' اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آیت روح کے نزول کے سلسلے میں ایک دوسری روایت بھی مروی ہے ------ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ یہ کہ یہودیوں نے حضورؐ سے سوال کیا کہ روح کی حقیقت کیا ہے؟ جسم میں جو روح ہے اسے کس طرح سزا دی جاتی ہے جبکہ روح من جانب اللہ ہے؟ اس بارے میں آپؐ پر کوئی آیت نازل نہ ہوئی تھی اس لئے آپؐ نے ان کو کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر یہ آیت ازل ہوئی۔

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۷ : ۸۵) "کہہ دو' روح اللہ کے امر میں سے ایک امر ہے اور تمہیں بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے"۔

چونکہ اسباب نزول میں روایات متعدد ہیں لہٰذا ہم اسی مفہوم پر اکتفاء کرتے ہیں جو قرآن کی نص قطعی سے ثابت ہے۔ اس آیت میں صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کے بارے میں اس وقت سوال کیا گیا تھا لیکن یقینی طور پر معلوم نہیں ہے کہ یہ سوال کس نے کیا تھا۔ نیز اگر معلوم بھی ہو جائے کہ یہ سوال کس نے کن حالات میں کیا تھا تو اس سے اس قصے کے اصل حقائق اور عبرت آموزی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لہٰذا ہمیں چاہئے کہ تفسیر میں اسی حد تک اپنے آپ کو محدود رکھیں جس حد تک نص سے بات معلوم ہوتی ہے۔ اس پر حاشیہ آرائی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ماہر فلکیات ابوریحان البیرونی نے اپنی کتاب (الآثار لباقیة عن القرون الخالیه) میں لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جس ذوالقرنین کا ذکر ہے وہ ملوک حمیر میں سے تھا۔ انہوں نے محض اس کے نام ذوالقرنین سے یہ قیاس کیا ہے کیونکہ ملوک حمیر اپنے نام کے ساتھ (ذو) کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ مثلاً ذونواس' اس کا نام دراصل ابوبکر بن افریقس تھا۔ یہ اپنی فوجیں لے کر بحر متوسط کے ساحل کے ساتھ ساتھ آخر تک گیا۔ تونس اور مراکش اس نے فتح کیا۔ اس نے شہر افریقہ بنایا' بعد کے زمانوں میں پورے براعظم کا نام افریقہ پڑ گیا اور ذوالقرنین اس کو اس لیے کہا گیا کہ یہ سورج کے دونوں سینگوں تک پہنچ گیا۔ (یعنی مشرق و مغرب تک)۔

البیرونی کی یہ بات صحیح بھی ہو سکتی ہے لیکن ہمارے پاس ایسے ذرائع نہیں ہیں کہ ہم بالجزم کوئی بات کہہ سکیں یا اس

شخص کی حقیقت کے بارے میں چھان بین کر سکیں اس لیے کہ انسانی تاریخ میں اس شخص کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ہے جس کی تاریخ کے ایک حصے کے بارے میں ہمیں قرآن کریم بتاتا ہے۔ اس قصے کی نوعیت بھی ایسی ہے جس طرح قصص القرآن کے دوسرے حصوں کی ہے۔ مثلاً قصہ قوم نوح' قوم ہود' قوم صالح وغیرہ۔ کیونکہ ان قصص کا تعلق جس دور سے ہے وہ ماقبل التاریخ دور ہے۔ تاریخ تو دور جدید کی ایک مولود چیز ہے جبکہ انسانوں کا زمانہ اس سے بہت پہلے کا ہے۔ زمانہ "تاریخ مدون" سے قبل ایسے واقعات گزرے ہیں جن کے بارے میں انسان کو کوئی علم نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی ایسا تاریخی ریکارڈ نہیں ہے' جہاں سے ہم کوئی یقینی بات اخذ کر سکیں۔

اگر تورات تحریف اور اضافوں سے پاک ہوتی تو وہ ان قدیم واقعات کے بارے میں ایک قابل اعتماد ریکارڈ ہوتی۔ لیکن تورات ایسے قصے کہانیوں سے بھری پڑی ہے جن کے بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کا حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ نیز اس میں ایسی باتیں کثرت سے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصل وحی پر اضافہ ہیں۔ تورات میں جو تاریخی قصے ہیں' وہ تاریخ کا مستند ماخذ نہیں ہو سکتے۔ اب قرآن ہی وہ ماخذ رہ جاتا ہے جو حذف و اضافہ اور تحریف سے پاک ہے اور اس کے اندر جو بھی تاریخی مواد ہے وہ درست ہے۔

ایک نہایت ہی مسلمہ حقیقت یہ ہے کہ اب ہم قرآن کریم کو تاریخ کی روشنی میں نہیں پڑھ سکتے۔ اس کی دو واضح وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ تاریخ بالکل دور جدید کی لکھی ہوئی چیز ہے اور ہے بھی نامکمل۔ انسانی تاریخ کے کئی واقعات بلکہ بے شمار اہم واقعات تاریخ میں ریکارڈ ہونے سے بالکل رہ گئے ہیں۔ ان کے بارے میں انسانوں کو اب کوئی علم نہیں ہے۔ قرآن کریم ان واقعات میں سے بعض واقعات کو پیش کرتا ہے جن کے بارے میں تاریخ تہی دامن ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ تاریخ نے اگرچہ بعض واقعات کو سمجھا اور قلم بند کیا ہے لیکن یہ کام بہرحال دوسرے انسانی اعمال کی طرح قصور اور غلطی سے مبرا نہیں ہے۔ اس میں غلطی اور تحریف کا ہر جگہ امکان موجود ہے۔ ہم خود اپنے زمانے میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ ذرائع مواصلات ترقی کر گئے ہیں اور تحقیقات کے لئے بے شمار ذرائع میسر ہیں لیکن ایک ہی واقعہ کے بارے میں رپورٹروں کی رپورٹ مختلف ہوتی ہے۔ لوگ مختلف زاویوں سے اسے بیان کرتے ہیں اور متضاد تجزیہ کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ خام مواد جس سے انسانوں کی تاریخ کو مرتب کیا گیا ہے۔ کوئی جس قدر چاہے تحقیق و تفتیش کا دعویٰ کیوں نہ کرے تاریخی ریکارڈ بہرحال مشکوک ہوتا ہے۔

یہ بات کرنا تو موجودہ دور کے مرتب کردہ اصول تاریخ کے بھی خلاف ہے کہ قرآن مجید جن واقعات کا ذکر کرتا ہے ان کو ہم تاریخ کی کسوٹی پر پرکھیں' جبکہ اسلامی عقیدہ اور اسلامی نظریہ حیات تو اس کی سرے سے اجازت ہی نہیں دیتا کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید ایک قول فیصل ہے۔ اس انداز کی بات نہ تو وہ شخص کر سکتا ہے جو ایک سچا مومن ہے اور نہ وہ شخص کر سکتا ہے جو دور جدید کے انداز تحقیق و تفتیش کو جانتا ہے۔ قرآن کریم کی صحت کو تاریخ سے معلوم کرنا محض بے عقلی ہے۔

پوچھنے والوں نے ذوالقرنین کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ سوالات پوچھے۔ آپ کی سیرت کے مصدقہ ذرائع اور مصادر بتاتے ہیں کہ آپ پر اللہ نے وحی بھیجی اور وہ قرآن میں قلم بند کر دی گئی۔ قرآن کے سوا اس دور کی تاریخ کے بارے میں اور کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے لہٰذا ہم بغیر علم کے اس کے بارے عقلی گھوڑے نہیں

دوڑا سکتے۔

تفاسیر میں بے شمار اقوال وارد ہیں لیکن ہماری تفسیروں کے بے شمار اقوال بھی قابل یقین نہیں ہیں۔ ہم ان تفاسیر کے اقوال میں سے جو قول بھی لیں ہمیں چاہئے کہ اس کی اچھی طرح جانچ پڑتال کریں کیونکہ ہماری قدیم تفاسیر میں اسرائیلیات اور قصے کہانیاں بھی راہ پا گئی ہیں۔

قرآن مجید کے سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین نے تین سفر کیے۔ ایک سفر مشرق' ایک سفر مغرب اور تیسرا سفر (بین السدین) دو بندوں والی جگہ کا سفر۔ ہمیں چاہئے کہ ہم قرآن کریم کے مطابق انہی تین سفروں کو یہاں لیں۔

قرآن کریم ذوالقرنین کی بات یوں شروع کرتا ہے۔

إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِن كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿٨٤﴾

"ہم نے اس کو زمین میں اقتدار عطا کر رکھا تھا اور اسے ہر قسم کے اسباب و وسائل بخشے"۔

اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو زمین میں اقتدار دیا تھا اور ایک مضبوط سلطنت دی تھی اور اسے ہر چیز کے وسائل و اسباب عطا کیے تھے۔ اس وجہ سے وہ علاقوں کے علاقے فتح کرتا چلا گیا۔ اس نے دنیا میں تعمیر اور ترقی کے کام شروع کر دیئے۔ یہ شخص قوت اور سازو سامان کے اعتبار سے اس وقت کے تمام وسائل پر دسترس رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی قوت اور وسائل کو سب سے پہلے مغرب کی طرف متوجہ کیا۔

فَأَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٥﴾ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَوَجَدَ عِندَهَا قَوْمًا ۗ قُلْنَا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّا أَن تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَن تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ﴿٨٦﴾ قَالَ أَمَّا مَن ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿٨٧﴾ وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءً الْحُسْنَىٰ ۖ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ﴿٨٨﴾

"اس نے (پہلے مغرب کی طرف ایک مہم کا) سرو سامان کیا حتیٰ کہ جب وہ غروب آفتاب کی حد تک پہنچ گیا تو اس نے سورج کو ایک کالے پانی میں ڈوبتے دیکھا۔ وہاں اسے ایک قوم ملی۔ ہم نے کہا' ذوالقرنین' تجھے یہ مقدرت بھی حاصل ہے کہ ان کو تکلیف پہنچائے اور یہ بھی کہ ان کے ساتھ نیک رویہ اختیار کرے"۔ اس نے کہا "جو ان میں سے ظلم کرے گا ہم اس کو سزا دیں گے' پھر وہ اپنے رب کی طرف بلایا جائے گا اور وہ اسے اور زیادہ سخت عذاب دے گا۔ اور جو ان میں سے ایمان لائے گا' اور نیک عمل کرے گا' اس کے لیے اچھی جزا ہے اور ہم اس کو نرم احکام دیں گے"۔

مغرب الشمس وہ جگہ ہے جہاں دیکھنے والے کو سورج غروب ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ مختلف مقامات میں سورج کی جائے غروب مختلف ہوتی ہے' بعض مقامات پر یوں نظر آتا ہے کہ سورج پہاڑ کے پیچھے غروب ہو رہا ہے۔ بعض مقامات پر یوں نظر آتا ہے کہ سورج پانیوں میں غروب ہوتا ہے جس طرح بڑے بڑے سمندروں میں ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر یوں نظر آتا ہے کہ سورج صحراؤں اور ریگستانوں میں غروب ہو رہا ہے۔ مثلاً جہاں نظر کے سامنے صحرا اور ریگستان ہوں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین بحراوقیانوس کے ساحل تک پہنچ گیا تھا۔ اسے بحر ظلمات بھی کہتے ہیں اور اس وقت یہ گمان کیا جاتا تھا کہ خشکی اس سمندر کے ساحل پر ختم ہو جاتی ہے اس لیے اس نے دیکھا کہ سورج کالے پانیوں میں ڈوبنے لگا ہے۔

راجح بات یہ ہے کہ یہ شخص جاتے جاتے ایک ایسے ساحل پر پہنچ گیا جہاں کوئی دریا آکر سمندر میں گرتا تھا۔ ایسے مقامات پر گھاس اور کیچڑ اور سیاہ دلدل جمع ہو جاتی ہے۔ ایسے مقامات پر تالاب بھی نظر آتے ہیں جو چشموں کے مانند ہوتے ہیں۔ یہاں سورج کی جائے غروب کے بارے میں قرآن مجید نے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں وہ یہ ہیں: وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ (۱۸: ۸۶) "اس نے سورج کو ایک کالے پانی میں ڈوبتے دیکھا"۔ قرآن کی اس نشاندہی کے باوجود ہم اس جگہ کی نشاندہی نہیں کر سکتے کیونکہ قرآن میں کسی جگہ کی تخصیص نہیں کی' ایسی جگہ یا جگہیں کئی ہو سکتی ہیں۔ قرآن کے علاوہ اور کوئی مرجع و ماخذ بھی ایسا نہیں ہے' جس پر ہم اس مقام کے تعین کے سلسلے میں اعتماد کر سکتے ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی شخص جو تفسیر بھی کرے گا اس میں غلطی کا امکان ہو گا کیونکہ وہ تفسیر کسی مستند ذریعہ علم کی طرف منسوب نہ ہو گی۔

بہرحال اس سیاہ چشمے یا سیاہ دلدل کے پاس ذوالقرنین کو ایک قوم ملی۔

قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا (۱۸: ۸۶) "ہم نے کہا اے ذوالقرنین' تجھے یہ مقدرت بھی حاصل ہے کہ ان کو تکلیف پہنچائے اور یہ بھی کہ ان کے ساتھ نیک رویہ اختیار کرے"۔ یہ بات اللہ نے ذوالقرنین کو کس انداز میں کہی۔ یہ ان پر وحی تھی یا اس صورت حالات کی حکایت تھی کیونکہ اللہ نے ذوالقرنین کو ان پر مسلط کر دیا تھا۔ ان کے تمام معاملات اس کے اختیار میں دے دیئے تھے گویا لسان حال سے اس کو کہہ دیا کہ اب تم جانو اور وہ جانیں۔ تم حکمران ہو اور وہ رعایا۔ حکمران رعایا پر یا ظلم کرتا ہے یا احسان' یہ دونوں انداز تعبیر عربی میں درست ہیں اور یہاں دونوں ممکن ہیں۔ آیت کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے اور وہ بھی۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ ذوالقرنین نے اپنے ممالک مفتوحہ کے بارے میں اپنی پالیسی کا یہ اعلان کر دیا تھا۔ چاہے لوگ خود اس کے تابع فرمان ہوئے ہوں یا اس نے فتح کیے ہوں' بہرحال اس کا دستور یہ تھا۔

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا (۸۷) وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ الْحُسْنٰى وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا (۸۸)

اس نے کہا ''جو ان میں سے ظلم کرے گا ہم اس کو سزا دیں گے' پھر وہ اپنے رب کی طرف بلایا جائے گا اور وہ اسے اور زیادہ سخت عذاب دے گا۔ اور جو ان میں سے ایمان لائے گا' اور نیک عمل کرے گا' اس کے لیے اچھی جزا ہے اور ہم اس کو نرم احکام دیں گے''۔ (۱۸: ۸۷ - ۸۸)

اس نے اعلان کیا کہ ظالموں کو وہ سخت سزا دے گا اور پھر ان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے گا اور اللہ ان کو مزید سخت عذاب دے گا۔ (نکرا) کا مفہوم یہ ہے کہ ایسا سخت عذاب دے گا جس کی کوئی مثال نہ ہوگی۔ رہے صالح مسلمان تو ان کے لیے جزائے حسن ہے۔ ان کے ساتھ بہتر سلوک ہو گا' ان کی تکریم ہوگی' ان کی معاونت ہوگی اور ان کے لیے آسانیاں ہوں گی۔

یہ ہے ایک صالح حکومت کا منشور۔ اسلامی حکومت میں' حکومتی پالیسی میں مومن صالح کی عزت اور حوصلہ افزائی ہونا چاہیے۔ اس کے لیے سہولتیں اور جزائے حسن کا انتظام ہونا چاہیے' ظالموں اور حد سے تجاوز کرنے والوں پر سختی ہونا چاہئے اور ان کی پکڑ دھکڑ اور سزا جاری رہنا چاہئے۔ جب کسی معاشرے میں صالح عنصر کی تکریم اور اس کے احسان کا بدلہ احسان سے ملے اور اس کی حوصلہ افزائی ہو اور عزت و منزلت ہو اور مجرمین اور ظالموں کی بے عزتی' سزا اور ان کے اوپر سختی ہو تو عام لوگوں کا میلان اصلاح کی طرف ہو جاتا ہے۔ لیکن جب حکومت کا دستور یوں بدل جائے کہ ظالم' چور اور ڈاکو دربار حکومت میں راہ پالیں' ان کی عزت ہو اور وہ حکام کے مقرب ہوں اور نیک اور صالح لوگوں کے خلاف حکومت کا اعلان جنگ ہو' ان کی بیخ کنی کی جا رہی ہو تو سمجھئے کہ اب حکومت عذاب الٰہی بن کر عوام پر مسلط ہو گئی ہے اور یہ حکومت وسیلہ اصلاح نہیں ہے بلکہ ذریعہ فساد ہے۔ ایسے حالات میں بالعموم سوسائٹی میں فساد اور طوائف الملوکی پھیل جاتی ہے اور برائی نیکی پر غالب آجاتی ہے۔

اب ذوالقرنین کا سفر مشرق شروع ہوتا ہے' جہاں تک وہ مشرق کی طرف بڑھ سکتا ہے اور اسباب جہاں تک اسے میسر ہیں۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿۹۰﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَ قَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾

''پھر اس نے (ایک دوسری مہم کی) تیاری کی' یہاں تک کہ وہ طلوع آفتاب کی حد تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایک ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے جس کے لیے دھوپ سے بچنے کا کوئی سامان ہم نے نہیں کیا ہے۔ یہ حال تھا ان کا' اور ذوالقرنین کے پاس جو کچھ تھا اسے ہم جانتے تھے''۔

مغرب الشمس کے بارے میں جو تفسیر کی گئی وہی مشرق کے بارے میں بھی درست ہے۔ یعنی وہ جگہ جہاں دیکھنے والا دیکھتا ہے کہ وہاں سے سورج طلوع ہو رہا ہے۔ قرآن حکیم نے اس مقام کا بھی تعین نہیں کیا' لیکن قرآن نے اس کے

کو اُلف اور وہاں کے لوگوں کے وہ حالات قلم بند کیے ہیں' جن میں ذوالقرنین نے لوگوں کو وہاں پایا۔

حَتّٰی اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰی قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا

سِتْرًا (۱۸ : ۹۰) "یہاں تک کہ طلوع آفتاب کی حد تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایک ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے جس کے لیے دھوپ سے بچنے کا کوئی سامان ہم نے نہیں کیا ہے"۔ یعنی یہ ایک کھلی سرزمین تھی' سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ یہ صفت صحراؤں اور کھلے میدانوں پر صادق آتی ہے۔ اس میں بھی کسی خاص مقام کا تعین نہیں کیا گیا۔ ہمارے خیال میں مشرق بعید کی کوئی جگہ تھی' جہاں دیکھنے والا یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ سورج ایک ہموار اور کھلی زمین پر چمک رہا ہے۔ یہ مشرقی افریقہ کی کوئی جگہ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ آیت لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا (۱۸ : ۹۰) "ہم نے اس کی دھوپ سے بچنے کے لیے ان کے لیے کوئی سامان نہ بنایا تھا"۔ اس سے مراد ایک ایسی قوم ہو سکتی ہے جس کے جسم پر کوئی لباس نہ ہو اور وہ ننگے جسم والے تھے اور ان کے جسم پر سورج کی دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی لباس نہ تھا۔

اس سے قبل ذوالقرنین اپنی حکومت کا دستور و منشور پیش کر چکا تھا' اس لیے یہاں اس مشرقی قوم کے لیے اس نے دوبارہ اپنے دستور کا اعلان نہیں کیا کیونکہ اس کا پروگرام معلوم تھا۔ اللہ کو معلوم تھا کہ اس کی زندگی کے مقاصد اور نصب العین کیا ہے۔

یہاں قرآن مجید کی ایک خاص فنی خصوصیت کا ملاحظہ ضروری ہے۔ اس لیے یہاں قدرے وقفہ کرتے ہوئے طرز ادا کے پہلو سے قرآن کریم کی فنی ہم آہنگی پر بات کریں گے۔ یہاں سفر شرقی میں جو منظر ہے وہ یہ ہے کہ ایک قوم چٹیل میدان میں رہتی ہے اور سورج کی گرمی سے سر چھپانے کے لیے اس کے پاس کوئی سامان نہیں ہے۔ اسی طرح ذوالقرنین کا دل بھی اللہ کے علم کے سامنے کھلا ہے۔ کوئی بات اللہ سے چھپائی نہیں جا سکتی۔ اللہ فرماتے ہیں "ذوالقرنین کے پاس جو کچھ تھا' اسے ہم جانتے تھے"۔ یوں مضمون کا ظاہری اور باطنی انداز یکساں ہو جاتا ہے۔ یہ قرآن کا نہایت ہی خاص انداز ہے کہ وہ گفتگو کے ظاہری ماحول اور معنوی تصورات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ بَیْنَ السَّدَّیْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝ قَالُوْا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِنَّ یَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤی اَنْ تَجْعَلَ بَیْنَنَا وَ بَیْنَهُمْ سَدًّا ۝ قَالَ مَا مَكَّنِّیْ فِیْهِ رَبِّیْ خَیْرٌ فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَهُمْ رَدْمًا ۝ اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ

انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِیْۤ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا ﴿۹۶﴾ فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا ﴿۹۸﴾

"پھر اس نے (ایک اور مہم کا) سامان کیا یہاں تک کہ جب وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو اسے ان کے پاس ایک قوم ملی جو مشکل ہی سے کوئی بات سمجھتی تھی۔ ان لوگوں نے کہا کہ لے ذوالقرنین 'یاجوج اور ماجوج اس سرزمین میں فساد پھیلاتے ہیں' ہم اگر تجھے کوئی ٹیکس اس کام کے لیے دیں تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک بند تعمیر کر دے؟" اس نے کہا "جو کچھ میرے رب نے مجھے دے رکھا ہے وہ بہت ہے۔ تم بس قوت سے میری مدد کرو"۔ میں تمہارے اور ان کے درمیان بند بنائے دیتا ہوں۔ مجھے لوہے کی چادریں لا دو۔ آخر جب دونوں پہاڑوں کے درمیانی خلا کو اس نے پاٹ دیا تو لوگوں سے کہا کہ اب آگ دہکاؤ حتیٰ کہ (یہ آہنی دیوار) بالکل آگ کی طرح سرخ کر دی تو اس نے کہا "لاؤ' اب میں اس پر پگھلا ہوا تانبا انڈیلوں گا"۔ (یہ بند ایسا تھا کہ) یاجوج و ماجوج اس پر چڑھ کر بھی نہ آ سکتے تھے اور اس میں نقب لگانا ان کے لیے اور بھی مشکل تھا۔ ذوالقرنین نے کہا "یہ میرے رب کی رحمت ہے مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوند خاک کر دے گا' اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے"۔

اب ذوالقرنین نے تیسری مہم شروع کی۔ وہ دو پہاڑوں یا دو بندوں کے درمیان پہنچا۔ ہم اس مقام کا تعین بھی نہیں کر سکتے۔ نہ ہم ان دو بندوں کا تعین کر سکتے ہیں کہ یہ بند کہاں تھے۔ مفہوم یہی ہو سکتا ہے "قدرتی پہاڑوں کی شکل میں بند یا رکاوٹیں تھیں یا دو مصنوعی رکاوٹیں تھیں اور ان کے درمیان ایک کھلی جگہ تھی جو گزر گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ یہاں کوئی نہایت ہی پہاڑی پسماندہ قوم آباد تھی۔ یہ لوگ ایسے تھے کہ لَّا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ قَوْلًا (۱۸:۹۳) "جو مشکل ہی سے کوئی بات سمجھتے تھے"۔

اس قوم نے جب دیکھا کہ ذوالقرنین ایک بڑا فاتح ہے اور قوت اور ٹیکنالوجی سے واقف ہے تو انہوں نے اس کے سامنے درخواست پیش کی کہ قوم یاجوج و ماجوج سے بچانے کے لیے وہ ان کے لیے ایک سد تعمیر کر دے کیونکہ یاجوج و ماجوج اس راہ سے ان پر حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کے علاقے میں فساد پھیلاتے ہیں۔ وہ خود نہ یہ دیوار بنا سکتے ہیں اور نہ ان کے فساد کا دفاع کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ کام وہ ایک خاص ٹیکس کے بدلے کریں جو وہ اس کے لیے جمع کریں گے۔

ذوالقرنین ایک صالح حکمران تھے۔ انہوں نے اپنی حکومت کے مقاصد کا اعلان اس سے قبل کر دیا ہے کہ وہ زمین میں سے ظلم و فساد کو جڑ سے اکھاڑ کر ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے ان کی جانب سے ٹیکس یا مالی معاوضے کی پیشکش کو مسترد کر دیا اور یہ بند ان کو بلامعاوضہ بنا کر دینا منظور کیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس شر و فساد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس گزر گاہ ہی کو ختم کر دیا جائے اور دونوں طرف کی قدرتی رکاوٹوں کے درمیان ایک سد تعمیر کر دیا جائے۔ ذوالقرنین نے اس پسماندہ قوم سے صرف افرادی قوت کا مطالبہ کیا اور کہا:

فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ رَدْمًا (۹۵) اٰتُوْنِيْ زُبَرَ

الْحَدِيْدِ (۹۶) (۱۸: ۹۵ - ۹۶) "تم بس محنت سے میری مدد کرو، میں تمہارے اور ان کے درمیان بند بنائے دیتا ہوں۔ مجھے لوہے کی چادریں لا کر دو"۔ چنانچہ انہوں نے لوہے کے ٹکڑے جمع کیے اور دونوں قدرتی رکاوٹوں کے درمیان دیوار بنا دی اور جب یہ دیوار ان پہاڑوں کے برابر ہوگئی تو انہوں نے حکم دیا کہ اس لوہے کو گرم کرنے کے لیے اسے ہوا دو، یہ لوہا اس قدر گرم ہوگیا کہ آگ نظر آنے لگی۔ پھر انہوں نے کہا اچھا اس پر میں اب پگھلا ہوا تانبا ڈالوں گا۔ یہ پگھلا ہوا تانبا لوہے سے مل جائے گا اور یہ لوہے کی دیوار اور مضبوط ہو جائے گی۔

دور جدید میں اس طریقے کو لوہے کی قوت اور مضبوطی میں اضافہ کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ کیونکہ لوہے کے اندر ایک خاص مقدار سے تانبا ملانے سے لوہے کی قوت اور مضبوطی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ ٹیکنالوجی اللہ نے سب سے پہلے ذوالقرنین کو سکھائی تھی اور پھر اسے اپنی لازوال کتاب میں بھی قلم بند کر دیا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ تمہارے علم سے پہلے بھی اللہ نے ایسے بندوں کو بعض راز دیئے، کس قدر پہلے؟ یعنی زمانہ ماقبل تاریخ میں۔

غرض یوں یہ دو قدرتی رکاوٹیں آپس میں مل گئیں اور یاجوج و ماجوج کی راہ مسدود ہوگئی۔ اپنی لازوال کتاب میں بھی قلم بند کر دیا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ تمہارے علم سے پہلے بھی اللہ نے اپنے بندوں کو بعض راز دیئے، کس قدر پہلے؟ یعنی زمانہ ماقبل تاریخ میں۔

غرض یوں یہ دو قدرتی رکاوٹیں آپس میں مل گئیں اور یاجوج و ماجوج کی راہ مسدود ہوگئی۔

فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ (۱۸: ۹۷) "یہ اس پر غالب بھی نہ آسکتے تھے"۔ اس کے اوپر بھی نہ چڑھ سکتے تھے اور وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا (۱۸: ۹۷) "اور اس میں نقب لگانا بھی ان کے لیے مشکل تھا"۔ اس لیے وہ اس بند سے آگے بڑھ ہی نہ سکتے تھے۔ چنانچہ ان کے لیے اس ضعیف اور پسماندہ قوم پر حملہ آور ہونا ممکن ہی نہ رہا اس لیے وہ امن میں ہوگئے اور اطمینان سے رہنے لگے۔

اب ذوالقرنین دیکھ رہا تھا کہ اس نے کس قدر عظیم مفید عوامی منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچا دیا ہے۔ تاہم اس پر اس نے کبر و غرور نہ کیا۔ علم اور ٹیکنالوجی کی قوت نے اسے مدہوش نہ کیا بلکہ اس نے اللہ کو یاد کیا اور وہ شکر بجالایا۔ اللہ نے اسے جس عمل صالح کی توفیق دی تھی اسے اس نے اللہ ہی کی طرف لوٹا دیا اور اپنی قوت سے دستبردار ہو کر اللہ کی قوت کے دائرے میں پناہ طلب کی۔ اپنے امور اللہ کے سپرد کر دیئے اور اس نے اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا کہ پہاڑ، رکاوٹیں اور بند سب کے سب قیامت سے قبل ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے اور یہ زمین ایک چٹیل ہموار میدان کی شکل اختیار کر لے گی۔

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّيْ

حَقًّا (۱۸: ۹۸) "یہ میرے رب کی رحمت ہے مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اسے پیوند خاک کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے"۔ یوں سیرت ذوالقرنین کا یہ حلقہ ختم ہوتا ہے۔ ذوالقرنین ایک

اچھے حکمران کا نمونہ تھے جسے اللہ نے تمکین فی الارض عطا کی۔ ترقی اور قوت کے اسباب فراہم کیے۔ اس نے زمین کے شرق و غرب کو روند ڈالا۔ لیکن اس نے کبرو غرور کو اپنے قریب آنے نہ دیا' نہ اس نے سرکشی اور نافرمانی کی۔ نہ اس نے اپنے مفتوحہ علاقوں کے اندر لوٹ مار مچائی۔ نہ افراد' نہ علاقوں اور ملکوں کا استحصال کیا۔ اپنے مفتوحہ علاقوں کو غلام بھی نہ بنایا۔ نہ اس نے علاقوں کو اپنے مفادات کے لیے فتح کیا۔ بلکہ یہ حکمران جہاں جاتا ہے وہاں عدل و انصاف کا سایہ پھیلاتا ہے۔ پسماندہ لوگوں کی امداد کرتا ہے اور بغیر ٹیکس لیے لوگوں پر ظلم کرنے والوں کا ہاتھ روکتا ہے۔ سائنسی قوت اور ٹیکنالوجی جو اللہ نے اسے دی' اسے وہ انسانیت کی اصلاح اور تعمیر کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ظلم کو روک کر حق حقدار تک پہنچاتا ہے اور یہ سارے کام کر کے پھر وہ ان کا کریڈٹ اللہ کو دیتا ہے کہ یہ تو اللہ کی توفیق اور رحمت ہے۔ اپنی اس قوت' جبروت اور جلال کے باوجود وہ اس حقیقت کو یاد رکھتا ہے کہ ایک دن سب قوتیں' ریزہ ریزہ ہو جائیں گی اور لوگ اللہ کے ہاں حاضر ہوں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج کون ہیں؟ اور اب یہ لوگ کہاں ہیں؟ ان کا واقعہ کیا تھا اور کیا ہو گا؟ واقعہ یہ ہے کہ ان تمام سوالات کا علی وجہ الیقین جواب دینا بہت ہی دشوار ہے کیونکہ یاجوج و ماجوج کے بارے میں تاریخ خاموش ہے اور صرف قرآن نے بھی ان کے بارے میں یہ مختصر واقعہ دیا ہے۔ بعض صحیح احادیث میں بھی ان کے بارے میں مختصر سی معلومات ہیں۔

اس موقعہ پر قرآن کریم ذوالقرنین کی زبانی یہ بات کہتا ہے :

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا (۱۸:۹۸) "مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اسے پیوند خاک کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے"۔ یہ نص کسی مخصوص وقت کا تعین نہیں کرتی کہ اللہ کا وعدہ کب آئے گا۔ اللہ کے وعدے سے مراد یہاں وہ میعاد ہے کہ جب یہ بند ٹوٹ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ کا وعدہ گزر چکا ہو اور وہ بند ٹوٹ چکا ہو۔ جب تاتاریوں نے عالم اسلام پر بلا بولا تھا تو انہوں نے تمام مہذب ممالک میں پھیل کر ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔(۱)

سورہ انبیاء کی ایک آیت میں ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ (۹۶) وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ (۹۷) (۲۱:۹۶ - ۹۷) "یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دیئے

(۱) پندرہویں صدی میں یہ معلوم ہوا ہے کہ ترمذ شہر کے قریب ایک لوہے کے دروازے کی دریافت ہوئی ہے۔ ایک جرمن سیاح سیلڈ برجر نے اسے دیکھا اور اپنی کتاب میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک ہسپانوی مورخ کلاتیجو نے ۱۴۰۳ء میں اس کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ سمرقند سے انڈیا کی طرف جاتے ہوئے راستے میں لوہے کا ایک دروازہ واقع ہے' ہو سکتا ہے کہ یہ ذوالقرنین کا بنایا ہوا ہو۔

جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے نکل پڑیں گے اور وعدۂ برحق کے آنے کا وقت قریب آلگے گا"۔

اس آیت میں بھی خروج یاجوج و ماجوج کا زمانہ متعین نہیں ہے۔ وعدۂ برحق کے قریب آنے کا مطلب یہ ہے کہ قیامت قریب آجائے گی۔ قیامت کا قریب آجانا واقعہ ہو چکا ہے' جب سے رسول اللہؐ مبعوث ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ ہے : اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ "قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا"۔ اب قریب کا مطلب اس زمانے کے لحاظ سے نہیں ہے جس کا شمار ہم کرتے ہیں' اللہ کے حساب میں قرب اور دوری کا اور مفہوم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ قیامت کے قریب آنے اور وقوع قیامت کے درمیان بھی کئی ملین سال گزر جائیں یا صدیاں گزر جائیں جنہیں انسان اپنے حساب میں ایک طویل عرصہ سمجھتا ہے جبکہ اللہ کے نزدیک وہ بہت ہی مختصر عرصہ ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ تفسیر بھی جائز ہے کہ حضورؐ کی رسالت کے زمانے کے بعد اور ہمارے اس دور سے قبل ہی یہ بند کھل گیا ہو اور مغلوں اور تاتاریوں کا خروج خروج یاجوج و ماجوج ہو۔

ایک صحیح حدیث جسے امام احمد نے سفیان عن عروہ کے واسطہ سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے زینب بنت ابو سلمہ' حبیبہ بنت ام حبیبہ بنت ابو سفیان سے۔ اس نے اپنی ماں حبیبہ سے۔ انہوں نے زینب بنت جحش ام المومنین سے۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک دن رسول اللہؐ خواب سے بیدار ہوئے تو آپ کا چہرۂ مبارک سرخ تھا اور آپ فرما رہے تھے "ہلاکت ہے عربوں کے لیے اس شر سے جو قریب ہو گئی ہے۔ آج یاجوج اور ماجوج کے بند میں اس قدر شگاف پڑ گیا ہے اور آپ نے اپنے انگوٹھے اور اشارہ کی انگلی کے درمیان فاصلہ کر کے بتایا کہ اس قدر شگاف پڑ گیا ہے۔ میں نے دریافت کیا رسول خداؐ کیا ہمیں ہلاک کر دیا جائے گا حالانکہ ہمارے درمیان صالح لوگ بھی موجود ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ہاں جب برا عنصر زیادہ ہو جائے۔

اس پیشین گوئی کو چودہ سو سال ہو گئے ہیں۔ تاتاریوں کی تاخت و تاراج اس کے بعد واقعہ ہوئی۔ انہوں نے عربوں کی حکومت کو' خلافت عباسیہ کے زمانے میں' معتصم کی خلافت کے دور میں' جو عباسی خلفاء میں سے آخری خلیفہ تھا' ختم کر دیا۔ یہ حضور اکرمؐ کے خواب کی تعبیر ہو سکتی ہے۔ حقیقی علم اللہ ہی کے پاس ہے۔ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ کوئی یقینی بات نہیں ہے بلکہ ہماری ترجیح ہے۔

--- ○○○---

اب ہم دوبارہ سیاق قرآن کی طرف آتے ہیں۔ ذوالقرنین کے تذکرہ کے بعد بطور تعقیب مناظر قیامت میں سے ایک منظر سامنے لایا جاتا ہے۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ
فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا ﴿٩٩﴾ وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكَافِرِينَ عَرْضًا ﴿١٠٠﴾ الَّذِينَ 11
كَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غِطَاءٍ عَن ذِكْرِي وَكَانُوا لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا ﴿١٠١﴾ ع19
2

"اور اس روز ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے کہ (سمندر کی موجوں کی طرح) ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں اور صور پھونکا جائے گا اور ہم سب انسانوں کو ایک ساتھ جمع کریں گے۔ اور وہ دن ہو گا جب ہم جہنم کو کافروں کے سامنے لائیں گے' ان کافروں کے سامنے جو میری نصیحت کی طرف سے اندھے بنے ہوئے تھے اور کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہ تھے"۔

یہ ایک ایسا منظر ہے جو مختلف انسانی گروہوں کی عکاسی کر رہا ہے' جس میں مختلف گروپ نظر آ رہے ہیں جو مختلف رنگوں' مختلف علاقوں اور مختلف زمانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سب لوگ ایک وسیع میدان میں اٹھائے گئے ہیں اور یہ لوگ بغیر کسی نظام اور ترتیب کے ایک دوسرے کے خلاف گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کیوں ادھر سے ادھر بھاگ رہا ہے۔ یہ لوگ دریا کی موجوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتے ہیں اور باہم مل جاتے ہیں بغیر کسی انتظام کے۔ پھر ایک صور پھونکا جائے گا۔

وَّ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا (۱۸ : ۹۹) "پھر صور پھونکا جائے گا اور ہم سب انسانوں کو ایک ساتھ جمع کریں گے"۔ اب وہ ایک صف میں منظم طریقے سے کھڑے ہیں۔

پھر وہ کافر جنہوں نے اللہ کی یاد سے منہ موڑا اور جو اس طرح نظر آ رہے تھے کہ شاید ان کی آنکھوں پر پردے ہیں اور شاید ان کے کانوں میں سننے کی قوت ہی نہیں ہے۔ ان پر جہنم پیش ہو گی۔ اب یہ لوگ جہنم سے اس طرح منہ نہ موڑ سکیں گے جس طرح یہ دنیا میں ہدایت سے منہ موڑ رہے تھے۔ اب ان میں منہ موڑنے کی طاقت ہی نہ ہو گی۔ اب ان کی آنکھوں کے اوپر سے پردے ہٹ جائیں گے۔ اب وہ سرکشی اور اعراض کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے یعنی جزاء پوری کی پوری جزاء۔

قرآن کریم نے یہاں اس منظر کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کے اعراض کی تصویر کو اور ان کے لیے جہنم کی تپش کو ایک دوسرے کے بالمقابل پیش کیا ہے۔ دونوں چیزیں عملاً حرکت کرتے ہوئے منظر کی صورت میں پیش کی گئی ہیں اور یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز کلام ہے۔ اور اس تقابلی منظر کشی پر پھر تبصرہ' نہایت ہی تلخ اور حقارت آمیز تبصرہ یوں کیا جاتا ہے!

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾

"تو کیا یہ لوگ' جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے' یہ خیال رکھتے ہیں کہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا کارساز بنا لیں؟ ہم نے ایسے کافروں کی ضیافت کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے۔

کیا لوگوں نے میرے اپنے پیدا کردہ بندوں کو اپنا مددگار بنا رکھا ہے؟ کیا یہ لوگ اللہ کے مقابلے میں ان کی مدد کریں گے؟ اور اللہ کی حکومت کی گرفت سے انہیں بچائیں گے؟ اگر انہوں نے ایسا کوئی گمان باندھ رکھا ہے تو انہیں چاہئے کہ اپنے اس گمان کے انجام سے دوچار ہونے کی تیاری بھی کر لیں۔

اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا (۱۸ : ۱۰۲) "ہم نے ایسے کافروں کی ضیافت کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے"۔ اللہ بچائے! کیا ہی خوفناک استقبال ہے۔ اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے نہ ان کو کوئی جدوجہد کرنی پڑے گی اور نہ کوئی انتظار کرنا ہو گا۔ یہ سب کچھ ان کے لیے تیار ہے۔ صرف مہمانوں کے پہنچنے کی دیر ہے؟

--- ○○○---

اب فکر و شعور کی تاروں پر آخری ضربیں لگائی جاتی ہیں۔ تمام خطوط کو یہاں جمع کر کے اب ان پر آخری تبصرے کیے جاتے ہیں۔

پہلا تبصرہ اسلامی قدروں اور حسن و قبح کے پیمانوں کے بارے میں ہے۔ وہ اقدار اور پیمانے جو گمراہوں اور خسارے سے دوچار ہونے والوں کے ہاں مقبول عام ہیں اور یقینی نتائج کے حامل ہیں۔ اعمال و اشخاص سے متعلق ان کے افکار کی روشنی میں۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝

"اے نبیؐ، ان سے کہو، کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد کون لوگ ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد راہ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ اس لیے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے، قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے"۔

اے نبیؐ لوگوں کو یہ بات سمجھاؤ کہ ناکام اور نامراد لوگ کون ہیں؟ ایسے نامراد کہ ان سے بڑا نامراد اور خسارے میں پڑنے والا اور کوئی نہیں ہے۔ وہ لوگ جن کی سعی اور جدوجہد اس دنیا میں بھٹکی رہتی ہے۔ ان کی یہ جدوجہد ان کو راہ راست پر نہ لا سکی اور اس پوری سعی کا کوئی ثمرہ اور نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (۱۸ : ۱۰۴) "اور وہ یہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں"۔ وہ اس قدر غفلت میں پڑے ہیں کہ سمجھ ہی نہیں پا رہے کہ ان کی یہ جدوجہد ضائع جا رہی ہے۔ اپنی جدوجہد میں غلط سمت پر بہت دور نکلے جا رہے ہیں اور اپنی پوری زندگی کو اس میں کھپا کر ضائع کر رہے ہیں۔

ایسے لوگوں کے بارے میں یہ خوفناک سوال کر کے کہ بتاؤں تمہیں؟ اور جب سامعین کا شوق بڑھ جاتا ہے اور وہ بے تاب ہو جاتے ہیں کہ پردہ گرے اور وہ حقیقت کو دیکھیں تو انہیں بتا دیا جاتا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ (۱۸ : ۱۰۵) "یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا' اس لیے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے"۔

حبوط کا اصلی اور لغوی مفہوم' جانور کا پیٹ پھولنا ہے' جب وہ کوئی زہریلی گھاس کھالے۔ ضائع ہونے والے انسانی اعمال کی حقیقت بتانے کے لیے حبوط سے کوئی موزوں لفظ نہیں ہے۔ یہ جانور پھول جاتا ہے' نادان مالک جانتا ہے کہ یہ جانور توانا اور مضبوط ہو گیا ہے اور اب وہ کامیاب اور نفع بخش ہو گا لیکن اس کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (۱۸ : ۱۰۵) "یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا' اس لیے ان کے سب اعمال ضائع ہو گئے۔ قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے" کیونکہ یہ بے کار اور مہمل ہو گئے تھے۔ نہ ان کی قیمت ہے اور نہ وزن۔ اللہ کے صحیح پیمانوں کے مطابق ان کا وزن نہ ہو گا' تو اب کیا ہو گا ان لوگوں کا؟

ذَٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾

"ان کی جزا جہنم ہے اس کفر کے بدلے جو انہوں نے کیا اور اس مذاق کی پاداش میں جو وہ میری آیات اور میرے رسولوں کے ساتھ کرتے رہے"۔ لیکن منظر مکمل تب ہوتا ہے جب اس میں اہل ایمان کا انجام بھی سامنے لایا جائے۔ ان کے پیمانوں اور اقدار کا انجام بھی بتا دیا جائے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾

"البتہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے' ان کی میزبانی کے لیے فردوس کے باغ ہوں گے۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور کبھی اس جگہ سے نکل کر کہیں جانے کو ان کا جی نہ چاہے گا"۔ ان لوگوں کی جنت الفردوس میں مہمانی مقابل ہے کفار کی مہمانی کے جو جہنم میں ہو رہی ہے۔ کتنا ہی بڑا فرق ہے دونوں میں۔

یہاں نہایت ہی لطیف انداز میں انسانی نفس اور اس کے احساسات اور مسرتوں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا (۱۸ : ۱۰۸) "کہ کبھی اس جگہ سے نکل جانے کو ان کا جی نہ چاہے گا"۔

اس انسانی نفسیاتی اشارے میں جو گہرائی ہے' اس پر ہمیں چاہئے کہ قدرے غور کریں۔

یہ لوگ جنت الفردوس میں ہمیشہ رہیں گے لیکن نفس انسانی ہمیشہ تغیر طلب ہے۔ کسی کام کا تسلسل اسے ملول کر دیتا ہے۔ کسی ایک جگہ ہمیشہ رہتے رہتے اور کسی ایک ہی حال میں ہوتے ہوئے وہ تنگ آ جاتا ہے اور جب انسان نعمتوں میں ڈوبا ہوتا ہے اور اسے یہ خطرہ نہیں رہتا کہ اس نعمت کا زوال بھی ہو گا تو اس کے دل میں کوئی حرص اور لالچ نہیں رہتی۔ اور جب انسان ایک ہی ڈگر پر چلتا رہتا ہے تو وہ اکتا جاتا ہے بلکہ یہ اکتاہٹ دل کی تنگی میں بدل جاتی ہے اور انسان پھر چاہتا ہے کہ اس سے کسی طرح جان چھوٹ جائے۔ ذائقہ بدل جائے۔

یہ ایک حکمت ہے' نہایت ہی گہری حکمت' جس پر اللہ نے انسان کی جبلت تیار کی ہے اور یہ گہری فطرت و جبلت اللہ نے انسان کے اندر اس لیے پیدا کی ہے کہ یہ انسان کے فریضہ خلافت ارضی کی انجام دہی کے لیے لابدی تھی۔ اس سلسلے میں انسان کو جو کردار سپرد کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہروقت زندگی کے شب و روز کو بدلتا رہے اور بہتر سے بہتر بنا کر اسے ترقی دیتا رہے۔ یہاں تک کہ وہ اس معیار پر پہنچ جائے جو تقدیر الٰہی میں مقدر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان فطرتاً تغیر پسند ہے۔ وہ نئے نئے انکشافات اور نئی نئی اطلاعات کا دلدادہ ہے۔ ہر حال سے دوسرے حال میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا اس کا من پسند مشغلہ ہے۔ ایک منظر سے دوسرے منظر' ایک نظام سے دوسرا نظام وغیرہ تاکہ انسان یہ سفر کرتے کرتے اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے زندگی کے اندر حقیقی تبدیلی لاتا رہے اور زمین کے اندر پوشیدہ رازوں تک آئے دن پہنچتا رہے۔ زمین کی مادی شکل اور نظام کی نئی نئی شکلیں وضع کرے۔ ان انکشافات' ان ایجادات اور علم کی اس ترقی کے نتیجے میں' زندگی بھی بدلتی رہے اور یوں آہستہ آہستہ یہ اس کمال تک پہنچ جائے جو اللہ نے اس کے لیے مقدر کیا ہوا ہے۔

اور پھر فطرت کا ایک دوسرا رنگ بھی ہے۔ ہم بعض اوقات قدیم سے بھی محبت کرتے ہیں۔ پرانی روایات کو بھی سینے سے لگاتے ہیں۔ بعض اوقات اپنی عادت کو بدلنا بھی نہیں چاہتے جبکہ ہماری یہ عادات بعض اوقات ہمیں جامد بھی بنا دیتی ہیں۔ شوق تغیر کے ساتھ ساتھ عادات و تقالید کا یہ جمود دراصل جوش تغیر کے اندر ایک توازن پیدا کر دیتا ہے۔ جب بھی یہ توازن ختم ہوتا ہے تو جمود ڈیرے ڈال دیتا ہے۔ جب جمود حد سے بڑھتا ہے تو ردعمل میں انقلاب آتا ہے اور یہ انقلاب زندگی کی گاڑی کو کبھی کبھار اس قدر تیز کر دیتا ہے کہ توازن قائم نہیں رہتا۔ انسانی زندگی کا بہترین دور وہ ہوتا ہے کہ جب تغیر و ثبات اور ترقی اور جمود اور حرکت و قیام کی قوتوں کے درمیان توازن ہو۔

یاد رکھئے کہ جب کسی سوسائٹی پر جمود طاری ہو جاتا ہے تو زندگی کی وہ قوتیں جو اسے آگے بڑھانے والی ہوتی ہیں وہ محدود ہو کر رک جاتی ہیں' اور سوسائٹی پر موت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے افراد بھی مردہ تصور ہوتے ہیں۔

یہ ہے انسانی فطرت جس کو اس کے فریضہ خلافت ارضی کے لیے موزوں بنایا گیا ہے۔ رہی جنت تو وہ ترقی کا منتہائے کمال ہے۔ وہاں تغیر کی تو ضرورت نہ ہو گی' بلکہ اس سے اونچا کوئی معیار ہی نہیں ہے۔ اس سے آگے کوئی منزل نہیں ہے۔ اگر وہاں بھی انسان کو زمین کی فطرت پر قائم رکھا گیا اور صورت یہ ہو گئی کہ جنت تو نعیم مقیم ہے' اس کے ختم ہونے کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ وہاں تغیر کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی واقعہ نہ ہو گی اور حالات جوں کے توں رہیں گے جبکہ انسان جنت میں بھی سیماب فطرت ہے تو پھر یہ جنت اس کے لیے جہنم بن جائے گی۔ تھوڑے ہی عرصہ کے

بعد یہ انسان اکتا جائے گا بلکہ جنت کو قید خانہ سمجھے گا۔ اور یہ انسان کوشش کرے گا کہ اسے اس جنت کو چھوڑنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ وہ ایک تھوڑے عرصے کے لیے باہر جانا چاہتا ہے اگرچہ باہر جہنم ہی کیوں نہ ہو تاکہ وہ اپنے جذبہ تغیر اور تبدیلی کو تسکین دے سکے۔ لیکن جس انسان کو اللہ نے اس جہان میں پیدا کر کے بھیجا ہے وہ اس کے بارے میں خوب جانتا ہے۔ وہ وہاں انسان کے ان دنیاوی جذبات کو بدل دے گا۔ انسان وہاں تغیر اور تبدیلی کی چاہت ہی نہ رکھے گا۔ یہ اس لیے کہ وہاں انسانی فطرت حالات خلود کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے گی کیونکہ اس نے وہاں ہمیشہ رہنا ہے۔

اب ذرا انسانی شعور و آگاہی کی تاروں پر ایک دوسری ضرب لگائی جاتی ہے۔ اس سے انسانی شعور کو یہ آگاہی دینا مقصود ہے کہ انسانی علم محدود ہے۔ اس کی فہم و ادراک کی قوت اور دائرہ محدود ہے۔ لیکن اس معنوی مفہوم کو قرآن کریم نہایت ہی محسوس اور عام فہم انداز میں پیش کرتا ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾

"اے نبیؐ کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے روشنائی بن جائے تو وہ ختم ہو جائے مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں، بلکہ اگر اتنی ہی روشنائی ہم اور لے آئیں تو وہ بھی کفایت نہ کرے"۔

انسانی معلومات کی حد تک سب سے بڑا ذخیرہ آب سمندر ہے۔ انسان جو علوم لکھتے ہیں وہ سیاہی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اپنے علم کو وہ روشنائی کی شکل میں کاغذ پر لاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان کا علم بہت ہی وسیع ہے۔

قرآن مجید یہاں ان کو یہ سمجھاتا ہے کہ اگر ان وسیع اور گہرے سمندروں کو روشنائی بنا دیا جائے اور اللہ کے علم کو لکھنا شروع کیا جائے، تو یہ سمندر تو خشک ہو جائیں گے مگر اللہ کے علوم ختم نہیں ہو سکتے۔ ذرا آگے سوچو کہ اس سمندر جتنا اور سمندر لے آئے ہم۔ دوسرا سمندر بھی ختم ہو گیا، مگر اللہ کے کلمات و علوم ختم نہ ہوئے۔

اس محسوس تصور، اور اس مجسم حرکت کے ذریعے انسانی محدود تصور اور ناپختہ شعور اور قاصر قوت مدرکہ کے قریب حقیقت لائی گئی کہ اللہ کا علم بہت وسیع ہے۔ اگرچہ اللہ کے علم کی وسعت کی حقیقت اب بھی ہمارے ادراک کی حدود سے وراء ہے۔

یہ ہے وہ مقصد، یعنی تقریب الی الافہام، جس کے لیے قرآن کریم امثال لاتا ہے اور نہایت ہی گہرے اور ناقابل فہم معانی کو ایک مشاہدے اور تصویر کی شکل میں انسانی فہم و ادراک کے قریب لایا جاتا ہے۔

اس مثال میں، بحر کو چونکہ انسان بہت ہی وسیع سمجھتا ہے اور اپنے علم کو بھی سمندر کی طرح بہت ہی وسیع سمجھتا ہے، اس لیے قرآن بتاتا ہے کہ وسیع اور گہرا ہونے کے باوجود یہ سمندر بھی محدود ہے اور کلمات جو علم الٰہی کو ظاہر کرتے ہیں، لامحدود ہیں۔ انسان ان کی انتہا تک نہیں پہنچ سکتا۔ انسان علم الٰہی کا نہ ادراک کر سکتا ہے، نہ اسے قلم بند کر سکتا ہے اور نہ اس کی نقل کر سکتا ہے۔

انسان اپنے انفس و آفاق کی دنیا میں جو معمولی سی پیش رفت کر لیتا ہے' وہ اس پر بھی اترانا شروع کر دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شاید اسے بہت بڑی علمی فتح حاصل ہو گئی ہے۔ بعض کو تو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ وہ سب کچھ جان گئے ہیں یا جلد ہی سب کچھ جان لیں گے۔

لیکن عالم مجہول انسان کے سامنے ایسے آفاق رکھتا ہے جن کو سر کرنا اور جن تک انسان کا پہنچ جانا نہایت ہی دور کی بات ہے۔ انسان جب بھی اپنے حقیقی علم کا جائزہ لے گا کہ وہ سمجھے گا کہ وہ تو ابھی تک ساحل ہی پر کھڑا ہے۔

انسان آج تک اللہ کے جن علوم کو دائرہ علم اور دائرہ تحریر میں لا سکا ہے وہ علم الٰہی کا ایک نہایت ہی محدود اور قلیل حصہ ہیں کیونکہ محدود اور لامحدود کے درمیان ہم کوئی نسبت قائم نہیں کر سکتے اور نہ ان کے درمیان کوئی نسبت ہے۔ چہ نسبت خاک را باعالم پاک۔

غرض انسان جس قدر علوم چاہے سیکھے اور اس کرۂ ارض کے بارے جو انکشافات چاہے کرے۔ لیکن اسے چاہئے کہ غرور علمی کو ذرا تھوک دے۔ اس کے علم کی انتہا اگر یہ ہو کہ "سمندر روشنائی بن کر خشک ہو جائے تو بھی علم الٰہی کی تحریر و تسوید ختم نہ ہو گی اگر چہ اس جیسا کوئی اور سمندر بھی لے آیا جائے' کلمات الٰہیہ کا اختتام نہ ہو سکے گا۔

--- ○○○---

علم انسانی کی محدودیت کو ثابت کرنے کے لیے آپ انسانی شعور کی تاروں کو تیسری مرتبہ چھیڑا جاتا ہے۔ یہاں انسان کے مرتبہ و کمال کی تصویر کشی کی جاتی ہے اور رسالت آخیرہ کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے کہ نبی آخر الزمان کا علم بھی ذات باری کے لامحدود علم کے مقابلے میں بہت ہی محدود ہے۔ انسانی فکر و نظر اس کے لامحدود علم کے مقابلے میں قاصر ہی رہے گا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ ۱۲
۹ ع يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾
۳

"اے نبیؐ' کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا' میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے' پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو' اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے"۔

یہ ہے مقام الوہیت کا افق بعید' افق بلند۔ اس کے مقابلے میں انسانی علم کا افق بہت ہی نیچے ہے۔ کیونکہ علم نبوی ہو' بہرحال نبی بشر ہی تو ہوتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (۱۸: ۱۱۰) "اے نبیؐ کہو میں تو ایک انسان ہی ہوں تم ہی جیسا' میری طرف وحی کی جاتی"۔ بس یہی فرق ہے میرے اور تمہارے درمیان کہ میں باری تعالیٰ کے بلند آفاق علم سے کچھ حاصل کرتا رہتا ہوں۔ اس دائمی سرچشمے سے میں علم حاصل کرتا ہوں۔ میں ان ہدایات سے سر مو

انحراف نہیں کر سکتا جو مجھے عالم بالا سے ملتی ہیں۔ میں انسان ہوں' پہلے خود سیکھتا ہوں' پھر سکھاتا ہوں لہٰذا جو شخص ان بلند علوم کو حاصل کرنا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ وہ ان علوم سے فائدہ اٹھائے جو اس سرچشمے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکھائے۔ انسانوں کو چاہئے کہ وہ حصول علوم کے لیے سرچشمہ نبوت سے سیراب ہوں اور اس کے سوا تمام سرچشموں کو چھوڑ دیں۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا

(۱۸ : ۱۱۰) "پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو' اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے"۔

بارگاہ الٰہی کی بلند مملکت میں داخل ہونے کے لیے علوم نبوت ویزا ہیں۔ اس سورہ کا آغاز بھی مضمون وحی اور توحید سے ہوا تھا۔ خاتمہ بھی علوم الٰہیہ کے سلسلے میں ان اہم ہدایات سے ہوا اور انسانی شعور و آگہی کے تاروں کو یوں چھیڑا گیا کہ ان سے وہ نغمات حقیقت بلند ہونے لگے جو اس کائنات کے راز کو ظاہر کرتے ہیں۔ عظیم راز یعنی وحی الٰہی و توحید مطلق کے راز۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ------ ۱۶

## سورۃ مریم - ۱۹

## آیات ۱--- تا--- ۹۸

# سورہ مریم ایک نظر میں

سورہ مریم کا محور عقیدہ توحید ہے اور نفی اولاد اور نفی شرک ہے۔ عقیدۂ توحید کا لازمی تقاضا عقیدہ بعث بعد الموت ہے' لہذا مناظر قیامت بھی اس سورہ کا بنیادی مضمون ہیں۔ چنانچہ دوسری مکی سورتوں کی طرح اس سورہ کا اساسی مضمون بھی یہی ہے۔

اس سورہ کے مواد میں زیادہ تر قصص ہیں۔ آغاز قصہ حضرت زکریا سے ہوتا ہے۔ حضرت یحییٰ کا قصہ آتا ہے۔ مریم اور ولادت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات ہیں۔ حضرت ابراہیم اور ان کے باپ کی ایک جھلک ہے۔ اس کے بعد تمام نبیوں کی طرف اشارات ہیں۔ حضرت اسحاق و یعقوب' حضرت موسیٰ و ہارون' حضرت اسماعیل و ادریس اور حضرت آدم و نوح وغیرہ۔ اس سورہ کا دو تہائی حصہ ان قصص پر مشتمل ہے۔ تمام قصص کے لانے سے مقصود عقیدۂ توحید ہے۔ عقیدہ بعث بعد الموت کا ثبوت' رد شرک اور نفی اولاد۔ مزید یہ بتایا گیا ہے کہ ان نبیوں کے متبعین کے خدوخال کیا رہے اور گمراہوں کا طرز عمل کیا رہا۔

اس میں منکرین قیامت کے لیے بعض مناظر قیامت دکھائے گئے ہیں اور شرک اور دعوائے ابنیت عیسیٰ کی مذمت اور رد بھی اس میں ہے۔ مشرکین اور رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر عذاب الٰہی کے مناظر بھی ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور یہ سب مناظر اس سورہ میں پائے جانے والے قصص کے رخ کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہیں اور سورہ کے اصلی اور حقیقی محور اور موضوع کے ساتھ منسلک بھی۔ پھر اس سورہ کی ایک خاص فضا ہے جو اس پوری سورہ میں قائم رہتی ہے اور اس کے تمام موضوعات میں وہ فضا پائی جاتی ہے۔

اس سورہ کا انداز کلام گہرے تاثرات اور گہرے شعور پر مشتمل ہے۔ نفس انسانی کے تاثرات' اس کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کا گہرا شعور! کائنات کا شعور! ہاں اس کائنات کو ہم جمادات کا حصہ شمار کرتے ہیں جو احساس سے محروم ہے لیکن یہ سورہ بتاتی ہے کہ حقیقت کبریٰ کا شعور و احساس اس جامد کائنات کو بھی ہے۔ یہ کائنات بھی اس شعور میں شریک ہے۔ یہ سورہ بتاتی ہے کہ عقائد شرکیہ کے اظہار پر اس کائنات کو بھی غصہ آتا ہے اور خوف بھی آتا ہے اور اس غصے اور خوف کے مارے قریب ہے کہ یہ پہاڑ پھٹ جائیں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ کیوں؟

اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (۹۱) وَ مَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا

(۹۲) (۱۹:۹۱ - ۹۲) "اس بات پر کہ لوگوں نے رحمٰن کے لیے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اللہ کے لئے سزاوار نہیں کہ اسکی اولاد ہو"۔

انسانی نفس کے تاثرات تو اس سورہ کے آغاز ہی سے شروع ہوتے ہیں اور اس کے اختتام تک جاری رہتے ہیں۔ اس سورہ کے اہم قصص میں بھی یہ نفسیاتی تاثرات قائم ہیں۔ خصوصاً قصص کے پریشان کن مواقع میں۔ مثلاً قصہ مریم کے مختلف مراحل میں۔

اس سورہ کی غالب فضا رحمت، رضامندی اور اللہ کے ساتھ اتصال کی فضا ہے۔ اس کا آغاز حضرت زکریا اور اللہ تعالیٰ کی مناجات سے ہوتا ہے۔

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكَرِيَّا (۱۹ : ۲) "ذکر ہے اس رحمت کا جو تیرے رب نے اپنے بندے زکریا پر کی تھی"۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ اپنے رب کے بہت ہی قریب تھے اور ان کے درمیان مناجات ہو رہی تھی۔

اِذْ نَادٰي رَبَّهُ نِدَآءً خَفِيًّا (۱۹ : ۳) "جبکہ اس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا"۔ اس سورہ میں لفظ رحمت کا بار بار تکرار ہوتا ہے اور رحمت خداوندی کی فضا بھی اس پوری سورہ پر چھائی ہوئی ہے۔ اس سورہ میں اللہ کے لیے رحمٰن کا لفظ بھی بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اس سورہ میں اس نعمت کا بھی ذکر ہے جسے اہل ایمان باہم ودگر محبت کی شکل میں پاتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (۱۹ : ۹۶)

"یقیناً جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کر رہے ہیں، عنقریب رحمٰن ان کے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا"۔ اللہ تعالیٰ حضرت یحییٰ پر اپنی رحمت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کو حنان (محبت کرنے والا) بنایا گیا۔

وَّ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَكٰوةً وَ كَانَ تَقِيًّا (۱۹ : ۱۳) "اور اپنی طرف سے اس کو نرم دلی اور پاکیزگی عطا کی اور وہ بڑا پرہیزگار تھا"۔ اور حضرت عیسیٰ پر اللہ کی رحمت کا ایک رنگ یہ تھا کہ وہ اپنی والدہ کے ساتھ بہت ہی نرمی کرنے والے تھے اور والدہ کے حق شناس بنائے گئے تھے۔

وَّ بَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَ لَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا (۱۹ : ۱٤) "اور اللہ نے مجھے اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا"۔

آپ جب اس سورہ کو غور سے پڑھیں تو آپ اس میں نہایت ہی مہربانی، محبت اور رحمت و شفقت کے لطیف کلمات و عبارات اور نہایت ہی گہری چھاؤں محسوس کریں گے۔ جس طرح آپ محسوس کریں گے کہ شرک اور ابنیت کے عقیدے کو سن کر یہ کائنات بھی مارے خوف کے کانپ اٹھتی ہے اور فطرت کائنات کے لیے بھی یہ قول ناقابل برداشت ہے۔

پھر اس سورہ میں ایک خاص موسیقی اور ترنم ہے۔ اس کے الفاظ میں بھی اور اس کے فواصل میں بھی نہایت ہی گہرا ترنم ہے۔ مثلاً دیکھئے رضیا، خفیا، سریا، نجیا۔۔۔ لیکن جہاں مقام شدت اور سختی کا ہے تو اس میں لفظ بھی سخت ہیں مثلاً مشدد دال ہے۔ مثلاً مدا، ضدا، ھدا یا مشدد زاء ہے عزا، ازا وغیرہ۔

اس سورہ میں فواصل اور قافیہ کا تنوع بھی واضح طور پر پایا جاتا ہے اور ان کے تنوع کے ساتھ ترنم اور موسیقی میں بھی تنوع اور زیر و بم پایا جاتا ہے۔ حصہ اول کا آغاز حضرت زکریا اور یحییٰ کے ذکر سے ہوتا ہے تو فواصل اور قافیے یوں ہیں۔

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكَرِيَّا (۲) اِذْ نَادٰي رَبَّهُ نِدَآءً خَفِيًّا (۳) (۱۹ : ۲ - ۳) اور اس کے بعد جب حضرت مریم و عیسیٰ کا قصہ شروع ہوتا ہے تو فواصل و قوافی یوں بدل جاتے ہیں۔

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا (۱۶) فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۷) (۱۹ : ۱۶ - ۱۷) یوں یہ قوافی چلتے ہیں۔

اس طرح قصص ختم ہوتے ہیں اور پھر ان پر تبصرہ آتا ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰ کی حقیقت کا تعین کیا جاتا ہے' ان کی نبوت کے بارے میں قول فیصل آتا ہے۔ اور قوافی و فواصل کا نظام بدل جاتا ہے۔ آیات کا فاصلہ طویل ہو جاتا ہے اور میم اور نون کا قافیہ ختم ہوتا ہے جو وقت پر برقرار رہتا ہے اور ساکن ہوتا ہے اور یائے ممدودہ کے فواصل بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ (۳۴) مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهُ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ (۳۵) (۱۹ : ۳۴ - ۳۵) پھر جب بات کی سختی ختم ہوتی ہے اور بات فیصلہ کن انداز کی ہو جاتی ہے تو پھر وہی مد والا قافیہ آ جاتا ہے اور بات میں وہی نرمی آ جاتی ہے جو اس سورہ کا خاص رنگ ہے۔

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهُ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (۴۱) اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا (۴۲) (۱۹ : ۴۱ - ۴۲) لیکن جب اس قصے میں جھٹلانے والوں کا ذکر آتا ہے' جس میں جھٹلانے والوں کے لیے عذاب اور ان سے خدائی انتقام کا ذکر ہے تو آیات کا ترنم اور قافیہ کی صوتی صورت حالات بدل بھی جاتی ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا حَتّٰى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَةَ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضْعَفُ جُنْدًا (۱۹ : ۷۵) پھر سرزنش اور تہدید کے موقع پر یہ صنوی ترنم اور موسیقی مشدد رول کی شکل میں آتی ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا (۸۸) لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا (۸۹) تَكَادُ السَّمٰوٰتُ

يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا (۹۰) (۱۹: ۸۸ تا ۹۰) یوں اس سورت میں موسیقی اور الفاظ کی سختی اور نرمی مفہوم 'فضا اور موقعہ کے اعتبار سے نرم اور سخت ہو جاتی ہے - یوں پوری سورہ کے درمیان صوتی اثرات اور لہجہ موقعہ و محل کے مطابق نرم و سخت ہوتا رہتا ہے - جوں ہی سیاق کلام اور مفہوم ایک فضا سے دوسری فضا میں داخل ہوتا ہے الفاظ اور صوتی انداز بھی بدل جاتا ہے -

یہ سورہ اپنے موضوع کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے -

(۱) پہلے حصے میں حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ کا قصہ ہے - پھر حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کا قصہ ہے - اس پر پھر تفصیلی تبصرہ کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے مسئلے کو نہایت ہی حقیقت پسندانہ انداز میں حل کر دیا گیا ہے - کیونکہ ان کے بارے میں یہود و نصاریٰ کے درمیان نہایت بنیادی اختلاف تھا اور دونوں گروہ دو انتہاؤں پر تھے -

(۲) حصہ دوئم میں حضرت ابراہیم کے قصے کا ایک حصہ 'حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے باپ اور ان کی قوم کے درمیان کشمکش کی کہانی - ان کا ان لوگوں سے الگ ہونا اور پھر ان کو بہترین اولاد دینا اور پھر ان کو امت قرار دینا - پھر دوسرے نبیوں کے قصص اور ان لوگوں کا ذکر جنہوں نے ہدایت حاصل کی اور ان لوگوں کا ذکر جو گمراہ ہوئے اور دونوں کا انجام 'اس حصے کا اختتام بھی عقیدۂ توحید کے بیان پر ہوتا ہے - اللہ کی بندگی بلا شائبہ شرک -

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَ اصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ

سَمِيًّا (۱۹: ۶۵) "وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا جو زمین و آسمان کے درمیان ہیں - بس تم اس کی بندگی پر ثابت قدم رہو - کیا ہے کوئی ہستی تمہارے علم میں اس کے ہم پایہ؟"

(۳) تیسرا حصہ بعث بعد الموت پر کلام سے شروع ہوتا ہے - قیامت کے کچھ مناظر اس میں بیان ہوتے ہیں - یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ پوری کائنات عقیدہ شرکیہ کا انکار کرتی ہے اور پھر قرون اولیٰ کی بے شمار منکر حق اقوام کی ہلاکت کا ایک موثر منظر بھی دکھایا گیا ہے -

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا

(۱۹: ۹۸) "ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں 'پھر آج کہیں تم ان کا نشان پاتے ہو یا ان کی بھنک بھی کہیں سنائی دیتی ہے؟"

اب ہم درس اول کی طرف آتے ہیں -

--- ○○○ ---

# درس نمبر ۱۳۵ تشریح آیات

## ۱--- تا--- ۴۰

سُورَةُ مَرْيَمَ (۱۹) مَكِّيَّةٌ (۴۴) اٰيَاتُهَا ۹۸ رُكُوْعَاتُهَا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كٓهٰيٰعٓصٓ ﴿۱﴾

"ک 'ہ 'ی 'ع 'ص" - یہ حروف مقطعات جن سے اس سورہ کا آغاز ہو رہا ہے ان کی تفسیر میں ہماری یہی رائے ہے کہ یہ وہی حروف ہیں جن سے قرآن کریم بنا ہے - ان ہی سے یہ معجز کتاب بنی ہے اور انسانیت اس کتاب جیسی کتاب لانے سے عاجز ہے - حالانکہ یہ حروف اور ان سے بنے ہوئے کلمات انسانوں کی دسترس میں ہیں 'لیکن وہ اس موجود مواد سے کوئی ایسی کتاب تیار کرنے کی قدرت نہیں رکھتے -

ان حروف کے تذکرے کے بعد حضرت زکریا اور یحییٰ کا قصہ شروع ہو جاتا ہے - اس قصے کا بیشتر مواد رحمت الٰہی پر مبنی ہے - پورے ماحول پر رحمت خداوندی سایہ فگن ہے - چنانچہ آغاز ہی لفظ رحمت سے ہوتا ہے 'ذکر رحمت سے ہوتا ہے.....

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ﴿۲﴾

"ذکر ہے اس رحمت کا جو تیرے رب نے اپنے بندے زکریا پر کی تھی" -

اصل قصے کا آغاز ایک دعا کے منظر سے ہوتا ہے - یہ دعا حضرت زکریا کرتے ہیں اور نہایت عاجزی اور خضوع و خشوع کے ساتھ کرتے ہیں -

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴿۳﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَ اشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّ لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿۴﴾ وَ اِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَ كَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ﴿۵﴾ يَّرِثُنِيْ وَ يَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَ اجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ﴿۶﴾

"جبکہ اس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا - اس نے عرض کیا: "اے پروردگار' میری ہڈیاں تک گھل گئی ہیں اور سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا ہے اے پروردگار' میں کبھی تجھ سے دعا مانگ کر نامراد نہیں رہا - مجھے اپنے پیچھے اپنے بھائی

بندوں کی برائیوں کا خوف ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔ تو مجھے اپنے فضل خاص سے ایک وارث عطا کر دے جو میرا وارث بھی ہو اور آل یعقوب کی میراث بھی پائے اور اے پرودگار' اس کو ایک پسندیدہ انسان بنا"۔

وہ اپنے رب کے ساتھ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو کر مناجات کرتے ہیں۔ نہ کوئی دیکھتا ہے' نہ کوئی سنتا ہے۔ گوشہ تنہائی میں نہایت خلوص کے ساتھ رب کو پکارتے ہیں اور اپنا سینہ کھول کر اپنے رب کے سامنے رکھتے ہیں (جو خوب جانتا ہے)۔ وہ اپنا بوجھ' پریشانی' اللہ کے سامنے رکھتے ہیں۔ نہایت قرب و اتصال کی حالت میں وہ رب کو پکارتے ہیں۔ (رب)- وہ یہاں حرف ندا یا کو بھی بیچ میں نہیں لاتے۔ اللہ تو بغیر دعا کے بھی سنتا ہے اور دیکھتا ہے' اسے کسی پکارنے والے کی پکار کی ضرورت نہیں' لیکن یہ ایک غمزدہ شخص کی ضرورت ہے کہ وہ پکارے' وہ شکوہ کرے' اور اللہ رحیم و کریم ہے۔ اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ پکارنے' رونے اور شکوہ کرنے سے بھی اس مخلوق کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اللہ نے حکم دیا ہے کہ دعا کرو' گڑگڑاؤ' جس چیز سے تمہارے دل پر بوجھ پڑتا ہے اسے باہر نکالو'

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ "اور تمہارے رب نے کہا مجھے پکارو' میں تمہاری پکار کو سنتا ہوں اور قبول کرتا ہوں"۔ تاکہ تمہارے اعصاب پر سے قدرے بوجھ اتر جائے۔ تمہارے دلوں کو یہ اطمینان تو ہو جائے کہ ہم نے ایک قوی تر ہستی کے پاس رپورٹ کر دی ہے۔ وہ بڑی قوت والا قادر مطلق ہے تاکہ تمہیں یہ شعور مل جائے کہ تمہارا رابطہ اس ذات سے ہے جس کے ہاں کوئی سوالی مایوس نہیں ہوتا۔ اور اس پر جو بھروسہ کرے وہ کبھی بھی ناکام نہیں ہوتا۔

حضرت زکریا رب کے سامنے یہ شکایت کرتے ہیں کہ ان کی ہڈیاں ڈھیلی پڑ گئی ہیں اور جب ہڈیاں ڈھیلی پڑ جائیں تو جسم سارا کا سارا ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ کیونکہ ہڈیاں ہی تو جسم کا مضبوط ترین حصہ ہیں۔ جسم کا بنیادی ڈھانچہ ہی ہڈیوں سے کھڑا ہوتا ہے۔ پھر وہ بالوں کی سفیدی کی شکایت کرتے ہیں۔ انداز تعبیر کو دیکھئے کہ گویا سفیدی ایک آگ ہے جو سر کے بالوں کو لگی ہوئی ہے۔ سر اس میں تیزی سے جل رہا ہے اور جلد ہی اس میں کوئی سیاہ بال نہ رہے گا۔

ہڈیوں کا ڈھیلا پڑنا اور سر کے بالوں کا سفید ہونا دونوں کنایہ ہے' بڑھاپے سے۔ اور اس ضعف و کمزوری سے جس سے وہ دوچار ہیں اور اللہ کی رحمت سے بھی وہ ناامید نہیں ہیں۔ عرض پیش کرتے ہیں۔

اور وہ ساتھ ساتھ قبولیت دعا سے پہلے اپنا تبصرہ بھی کرتے ہیں۔

وَلَمْ أَكُنْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا (۱۹ : ٤) "اور اے پرودگار میں کبھی تجھ سے دعا مانگ کر نامراد نہیں ہوا"۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے بارے میں رب تعالیٰ کی یہ عادت رہی ہے کہ جب بھی انہوں نے دعا کی ہے رب تعالیٰ نے منظور فرمائی ہے۔ جب وہ اپنے زمانہ جوانی اور قوت میں دعا میں نامراد نہیں رہے تو اب حالت ضعیفی میں تو وہ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ اللہ انہیں نامراد نہ کرے اور ان کی دعا کو قبول کرلے۔

یہ تھی حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا اپنے رب کے جناب میں' نہایت ہی خفیہ انداز میں اور عاجزی اور تضرع کے ساتھ' الفاظ' معانی' ماحول اور اثرات پر اعتبار سے اس میں نرمی پائی جاتی ہے' اور منظر پر نہایت ہی ادب اور شائستگی چھائی ہوئی ہے۔

اب جواب دعاء ملاحظہ ہو اور اس موقعہ پر مکالمات :-

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِۨ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ
سَمِيًّا ﴿۷﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ
الْكِبَرِ عِتِيًّا ﴿۸﴾ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ
لَمْ تَكُ شَيْـًٔا ﴿۹﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ
ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴿۱۰﴾ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ
سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۱۱﴾ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ
صَبِيًّا ﴿۱۲﴾ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ﴿۱۳﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ
يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿۱۴﴾ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ ا
حَيًّا ﴿۱۵﴾ ع۱۵
۴

(جواب دیا گیا) "اے زکریا ' ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحیٰ ہو گا۔ ہم نے اس نام کا کوئی آدمی اس سے پہلے پیدا نہیں کیا"۔ عرض کیا "پروردگار ' بھلا میرے ہاں کیسے بیٹا ہو گا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو کر سوکھ چکا ہوں؟" جواب ملا "ایسا ہی ہو گا۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ تو میرے لیے ایک ذرا سی بات ہے ' آخر اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں جب کہ تو کوئی چیز نہ تھا"۔ زکریا نے کہا "پروردگار ' میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دے"۔ فرمایا "تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو پیہم تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے گا"۔ چنانچہ وہ محراب سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آیا اور اس نے اشارے سے ان کو ہدایت کی کہ صبح و شام تسبیح کرو۔

"اے یحیٰ 'کتاب الٰہی کو مضبوط تھام لے"۔

ہم نے اسے بچپن ہی میں "حکم" سے نوازا اور اپنی طرف سے اس کو نرم دلی اور پاکیزگی عطا کی اور وہ بڑا پرہیزگار اور اپنے والدین کا حق شناس تھا۔ وہ جبار نہ تھا اور نہ نافرمان۔ سلام اس پر جس روز کہ وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ مرے اور جس روز وہ زندہ کر کے اٹھایا جائے"۔

قبولیت دعا کے اس لمحے کی تصویر کشی نہایت ہی مہربانی 'محبت اور رضا کی فضا میں ہے۔ عالم بالا سے ربِ ذوالجلال

خود اپنے بندے کو پکارتے ہیں یٰزَکَرِیَّآ (اے زکریا) اور پکارتے ہی اسے خوشخبری دے دی جاتی ہے۔ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ (۱۹:۷) "ہم تجھے ایک لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں"۔ اب اللہ ان پر مہربانی کی انتہا کر دیتے ہیں کہ لڑکے کا نام بھی عالم بالا سے تجویز ہوتا ہے۔ اسْمُہٗ یَحْيٰ (۱۹:۷) "جس کا نام یحیٰ ہو گا"۔ اور پھر یہ کہ اس سے قبل یہ نام کسی فرد بشر کا نہیں رکھا گیا۔ لَمْ نَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا (۱۹:۷) "اس نام کا کوئی آدمی اس سے پہلے پیدا نہیں کیا۔

یہ اللہ کے کرم کا فیض اور بارش ہے' اسے اللہ اپنے اس بندے پر نچھاور کر رہا ہے جس نے اسے نہایت ہی عاجزی سے پکارا۔ تنہائی میں پکارا' اپنا سینہ کھول کر رب کے سامنے رکھ دیا کہ اسے ڈر کیا ہے۔ اپنا مسئلہ اللہ کے سامنے رکھا۔ اس دعا پر ان کو جس چیز نے مجبور کیا تھا وہ یہ تھی کہ انہیں اپنے عزیزوں اور ساتھیوں سے خطرہ لاحق تھا کہ وہ اسلامی نظریہ حیات کی امانت اور مالی انتظام اچھی طرح نہ کر سکیں گے۔ اللہ نے ان پر فضل کیا اور ان کی خواہش پوری کر دی اور ان کو راضی کر دیا۔

ان کی دعا چونکہ فوری طور پر منظور ہو گئی' ان کی خواہش اولاد کا جوش فوراً ٹھنڈا ہو گیا' امید کی حرارت یقین میں بدل گئی۔ وہ اچانک ایک واقعی صورت حال سے دوچار ہو گئے کہ عملاً اب یہ کام کس طرح ہو گا۔ وہ تو سوکھا بوڑھا ہے' ہڈیاں ڈھیلی پڑ گئی ہیں' سر سفید ہے۔ پھر بیوی بانجھ ہے' جوانی میں اس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی' اب کس طرح وہ بچہ دے گی۔ اس لئے مزید طلب اطمینان قدرتی ہے۔ لہٰذا وہ معلوم کرتے ہیں کہ اس بچے کا ذریعہ کون اور کیا ہو گا؟

قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ کَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ عِتِیًّا

(۱۹:۸) "عرض کیا' پروردگار! بھلا میرے ہاں کیسے بیٹا ہو گا' جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو کر سوکھ چکا ہوں"۔ چونکہ ان کو ایک عملی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ پھر اللہ کا وعدہ بھی ہے اور اٹل ہے۔ ان کو پورا پورا یقین ہے کہ یہ عمل ہونے والا ہے لیکن وہ اس کی کیفیت معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ موجودہ حالات میں یہ وعدہ کس طرح حقیقت کا روپ اختیار کرے گا تاکہ ان کا دل مطمئن ہو۔ یہ ایک قدرتی اور طبیعی نفسیاتی حالت ہوتی ہے۔ حضرت زکریا نبی صالح ہیں مگر ایک بشر ہیں اور ایک وقعیت پسند انسان۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ واقعی حقیقی صورت حالات کو اللہ کس طرح بدل دے گا؟

اللہ کے ہاں سے اس کا بھی جواب آ جاتا ہے۔ اے بندے یہ کام کوئی مشکل نہیں ہے۔ ذرا اپنے نفس کو تو دیکھو' کہ تم کیسے وجود میں آ گئے جبکہ تم سرے سے تھے ہی نہیں۔ ہر زندہ ذات کی یہی مثال ہے۔ اس کائنات کی ہر زندہ چیز نہ تھی اور ہو گئی'

قَالَ کَذٰلِکَ قَالَ رَبُّکَ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُکَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَکُ

شَیْئًا (۱۹:۹) "جواب ملا' ایسا ہی ہو گا' تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ تو میرے لئے ایک ذرا سی بات ہے۔ اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں جب کہ تو کوئی چیز نہ تھا"۔

اپنی مخلوقات کی پیدائش میں اللہ کے لئے کوئی چیز مشکل نہیں ہے ۔ چھوٹی اور بڑی چیز ' حقیر اور عظیم چیز سب کا سبب صرف کن ہے ۔ جب اللہ کا حکم ہوتا ہے تو ہو جاتا ہے ۔

یہ اللہ ہی ہے جس نے بانجھ عورت کو ایسا بنایا ہے کہ اس کی اولاد نہ ہو اور بوڑھوں کو ایسا بنایا ہے کہ اس سے سلسلہ تناسل کا چلنا ختم ہو جائے ۔ وہ بانجھ کو درست بھی کر سکتا ہے اور بانجھ پن کو دور کر سکتا ہے اور ایک بوڑھے مرد میں از سر نو قوت تولید پیدا کر سکتا ہے ۔ اور یہ کام بہ نسبت اس کے 'کہ اللہ نے انسان کو اس حال میں پیدا کیا کہ وہ کچھ نہ تھا ' آسان ہے ۔ اگرچہ اللہ کے لئے یہ کوئی مشکل نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو ابتداءً پیدا کرے یا اس کا اعادہ کرتا چلا جائے ۔

ان سب حقائق کے باوجود حضرت زکریا مکمل اطمینان کے لئے اس قدر بے تاب ہیں کہ وہ اس ناقابل توقع عمل کے لئے علامت اور نشانی طلب فرماتے ہیں کہ جب یہ خوشخبری عملاً ظہور پذیر ہوگی تو اس کی علامت کیا ہوگی ۔ تو اللہ نے اس خوشخبری کے لئے ایک ایسی علامت مقرر کی جو اس فضا کے ساتھ ہم آہنگ ہے جس میں حضرت نے یہ دعا ابتداءً کی تھی اور قبول ہوئی تھی تاکہ زکریا اس علامت کے ذریعہ رب تعالیٰ کا شکر بھی ادا کریں کہ اللہ نے انہیں اس بڑھاپے میں ایک بچہ دیا ۔ وہ لوگوں کی دنیا سے کٹ جائیں اور تین دن صرف اللہ کے ساتھ مشغول ہوں ۔ ان دنوں میں اس کی زبان صرف تسبیح الٰہی میں گویا ہو سکے گی اور اگر وہ لوگوں سے بات کرنا چاہیں گے تو زبان بند ہو جائے گی ۔ حالانکہ ان کے اعضاء درست ہوں گے ۔ ان کی زبان کو بھی کوئی معاملہ لاحق نہ ہو گا ۔

قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا (۱۹ : ۱۰) "فرمایا تیرے لئے نشانی یہ ہے کہ تو پیہم تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے گا" ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا

(۱۹ : ۱۱) "چنانچہ وہ محراب سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آیا اور اس نے اشارے سے ان کو ہدایت کی کہ صبح و شام تسبیح کرو" ۔ تاکہ وہ بھی اس فضا اور اس حالت میں داخل ہو جائیں جس میں وہ داخل ہو چکے ہیں اور وہ بھی ان کے ساتھ اللہ کا شکر ادا کریں کہ اللہ نے اس پر اور ان پر احسان کیا کیونکہ یہ لڑکا ان کے بعد ان کا امام اور راہنما ہو گا ۔

یہاں قرآن مجید زکریا کو حالت خاموشی میں چھوڑ دیتا ہے ' پردہ گرتا ہے ' اور اس منظر کا صفحہ لپیٹ لیا جاتا ہے اور جب دوسرا منظر سامنے آتا ہے تو اس میں خود حضرت یحییٰ چلے آرہے ہیں اور ان کو عالم بالا سے رب کی ندا آتی ہے ۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ (۱۹ : ۱۲) "اے یحییٰ کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھام لے" ۔ حضرت یحییٰ پیدا بھی ہوئے ' بچپنا گزرا ' جوان ہوئے اور یہ سب کچھ ان دو مناظر کے درمیان گیپ میں ہو گیا ۔ یہ قرآن کریم کا مخصوص فنی انداز بیان ہے ۔ وہ قصے کے اہم حلقوں کو پیش کر دیتا ہے جن میں بھرپور زندگی اور ہماہمی ہوتی ہے ۔ غیر اہم حلقے ذہن انسانی کے لئے چھوڑ دیئے جاتے ہیں ۔

حضرت یحییٰ کو کلمہ ندا کے ساتھ پکارا جاتا ہے اور بعد میں ان سے بات ہوتی ہے کیونکہ آواز دے کر کسی کو پکارنے کا منظر نہایت ہی دلکش منظر ہوتا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم بالا میں حضرت یحییٰ کا مقام کیا ہے ' پھر یہ کہ حضرت

زکریا کی دعا کی قبولیت کس قدر اہم واقعہ تھا۔ ان کی دعا ہی یہ تھی کہ ان کا ولی وارث ہونا چاہئے 'جو ان کے بعد ان کا خلیفہ ہو اور منصب خلافت کو اچھی طرح چلائے 'نظریاتی حوالے سے بھی اور خاندانی ذمہ داریوں کے حوالے سے بھی۔ چنانچہ حضرت یحیٰی کو یہ چارج دیا جا رہا ہے تاکہ وہ حسب دعا اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں۔

يَيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ (۱۹ : ۱۲) "اے یحیٰی کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھام لے"۔ اس کتاب سے مراد تورات ہے 'جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کی کتاب تھی۔ اور انبیائے بنی اسرائیل اسی کتاب کو لے کر چلتے تھے 'اسی پر عمل پیرا ہوتے تھے اور اسی کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ حضرت یحیٰی اپنے والد زکریا کے وارث تھے 'اس لئے ان کو آواز دی گئی کہ وہ اب اس بوجھ کو اٹھائیں اور قوت اور عزم سے اس امانت کو لے کر اٹھیں اور اس کام میں سستی نہ کریں اور نہ کوئی کمزوری دکھائیں اور اس وراثت کی ذمہ داریوں سے پیچھے نہ ہٹیں۔

اس پکار کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اللہ نے یحیٰی کو کیسی شخصیت عطا کی تھی تاکہ وہ منصب خلافت کی ذمہ داریاں ادا کرے۔

وَ اٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا (۱۲) وَّ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَكٰوةً وَ كَانَ تَقِيًّا (۱۳)

(۱۹ : ۱۲ - ۱۳) "ہم نے اسے بچپن ہی میں حکم سے نوازا اور اپنی طرف سے اسے نرم دلی اور پاکیزگی عطا کی اور وہ بڑا پرہیز گار تھا"۔ یہ تھی وہ قابلیت جس سے اللہ نے ان کو نوازا تھا اور اس طرح منصب خلافت زکریا کی ذمہ داریاں نبھانے میں ان کی مدد کی گئی۔

اسے بچپن ہی میں حکم اور حکمت عطا کر دی گئی تھی 'لہٰذا وہ اہلیت میں بھی یکتا کر دیئے گئے جس طرح وہ اپنے نام اور اپنی ولادت میں ممتاز تھے۔ حکمت جو کسی بھی شخص میں بڑے تجربے کے بعد آتی ہے حضرت یحیٰی کو زمانہ طفولیت ہی میں 'عطا کر دی گئی تھی۔

نیز آپ کو پیدائشی طور پر نرم دلی عطا کر دی گئی تھی 'اس لئے ان کو اس کے اظہار کے لئے کوئی تکلیف نہ کرنا پڑی اور نہ اس کی ٹریننگ کرنی پڑی' اس رویہ کو عادت ثانیہ بنانے کی ضرورت تھی۔ بلکہ وقت پیدائش وہ ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ نرم دلی ہر ذمہ دار کے لئے خصوصاً نبی کے لئے ایک بنیادی صفت ہے تاکہ وہ مختلف لوگوں کو اپنے ارد گرد جمع کر سکے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی گہری محبت پیدا ہو جائے اور وہ کھچے چلے آئیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو طہارت 'عفت اور قلبی صفائی عطا کر دی تھی۔ اس کے ذریعہ وہ دلوں کی کدورت 'اور دلوں کی میل کو صاف کرتے تھے اور عوام کے اندر پاکیزگی اور اخلاقی تطہیر کا کام کرتے تھے۔

وَ كَانَ تَقِيًّا (۱۳) "وہ بڑے پرہیز گار تھے"۔ موصول باللہ تھے 'اللہ سے ڈرنے والے تھے 'اللہ کو ہر وقت پیش نظر رکھنے والے تھے 'اس سے ڈرنے والے تھے اور اللہ کی نگرانی کا خیال رکھنے والے تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اللہ ظاہر و باطن کو دیکھ رہا ہے۔ یہ تھا وہ زاد راہ جو اللہ نے بچپن ہی میں حضرت یحیٰی کو دے دیا تھا 'تاکہ وہ اپنے باپ کا خلیفہ ہو 'جس کے لئے زکریا نے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر اور گڑگڑا کر دعا کی تھی اور رب نے اس دعا کو قبول کر لیا تھا اور یہ پاکیزہ بچہ ان کو عطا کیا تھا۔

یہاں آکر یحییٰ بھی منظر سے اچانک اوجھل ہو جاتے ہیں' پردہ گرتا ہے' جس طرح اس سے قبل زکریا علیہ السلام اچانک پس منظر میں چلے گئے تھے' لیکن چند جھلکیوں میں ان کی زندگی کے خطوط کھینچ دیئے گئے' ان کے رجحانات اور طرز زندگی کی جھلکیاں دکھا دی گئیں۔ پوری کہانی کا مقصد دو مناظر تھے' حضرت زکریا کی دعا اور خدا کی جانب سے اعلان قبولیت اور یہ مقصد چند الفاظ میں عالم بالا سے حضرت یحییٰ کو آواز دے کر پکارنے اور ان کی اہلیت اور قابلیت کے ذکر کے اندر پورا کر دیا گیا۔ لہٰذا تفصیلات دینے اور ایک ایک واقعہ قلم بند کرنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اگر ان مناظر کے بعد کوئی حضرت یحییٰ کی زندگی کے بہت سے واقعات بھی دے دے تو مقصد قصہ میں کوئی اضافہ نہ کر سکے گا۔

اب قرآن کریم حضرت یحییٰ کی پیدائش سے بھی زیادہ عجیب ولادت کی طرف آتا ہے۔ یہ قصہ ولادت عیسیٰ علیہ السلام ہے۔ سیاق کلام بڑھاپے میں ایک بانجھ عورت اور ایک کھوسٹ بوڑھے سے بچے کی ولادت کا عجیب منظر پیش کر کے اب بتدریج قارئین کو ایک نہایت ہی مختلف فیہ عجیب تر واقعہ کی طرف لے جاتا ہے۔ اس دوسرے واقعہ میں زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ایک کنواری سے بن باپ بچہ پیدا ہو گیا۔

اگر ہم خود حضرت انسان اور آدم علیہ السلام کی تخلیق کو نظرانداز کر دیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت تاریخ انسانیت میں ایک بہت بڑا اعجوبہ ہے۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ اس کی کوئی مثال نہیں ہے' نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ماقبل تاریخ میں اور نہ آپ کے بعد کی تاریخ میں۔

حضرت عیسیٰ کی ولادت سے بھی بڑا اعجوبہ خود آدم کی تخلیق ہے' لیکن اس وقت انسانیت موجود ہی نہ تھی کہ اللہ نے انسان اول کو کس طرح بغیر باپ اور ماں کے پیدا کیا۔ انسان بعد میں پیدا ہوئے اور انہوں نے تخلیق آدم کا مشاہدہ نہ کیا تھا۔ مشیت خداوندی نے یہ چاہا کہ یہ دوسرا اعجوبہ خود لوگوں کے سامنے واقع ہو۔ حضرت عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا ہو جائیں اور جب سے انسان کو اس کرۂ ارض پر آباد کیا گیا ہے اور جس سنت کے مطابق انسان کا سلسلہ توالد و تناسل جاری ہے اس سے ہٹ کر ایک واقعہ ایسا ہو جائے کہ لوگ بچشم سر اسے دیکھ لیں۔ اور یہ واقعہ اس قدر مشہور ممتاز اور ناقابل فراموش ہو کہ صدیوں تک آنے والی نسلیں اس سے عبرت لیں کیونکہ پہلا معجزہ اور اعجوبہ وجود انسان سے قبل ہوا تھا۔

اللہ نے اپنی تمام مخلوقات کے لئے ایک سنت جاری فرما دی ہے کہ تمام انواع و اقسام کے جاندار ایک مخصوص سنت توالد و تناسل کے مطابق چلتے رہیں اور یہ سلسلہ مرد و عورت سے جاری ہو گا۔ یہاں تک کہ جن چیزوں میں مرد اور عورت نہیں ہے' ان میں بھی فرد واحد میں مذکر و مونث کے خلیے رکھ دیئے گئے ہیں۔ یہ سنت قرون سے چلتی آ رہی ہے اور ذہن انسانی میں یہ پوری طرح بیٹھ گئی ہے۔ انسان یہ سوچنے لگا ہے کہ شاید تخلیق کا یہی واحد طریقہ ممکن ہے۔ تخلیق آدم کو وہ بھلا بیٹھا کہ کس طرح پہلا انسان وجود میں آیا۔ انسانی سوچ اور مشاہدے سے یہ بات ذرا باہر بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کی بن باپ تخلیق کر کے یہ بتایا کہ اللہ اپنی جاری کی ہوئی سنت کا خود پابند نہیں ہے۔ اللہ کا ارادہ آزاد ہے' اس کی قدرت بے قید ہے اور اس کا ارادہ کسی شکل اور طریقہ کا پابند نہیں ہے۔ نالہ پابند نے نہیں ہے۔ لیکن حضرت عیسیٰ جیسا واقعہ جاری نہ رہا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے لئے جو سنت جاری کر رکھی تھی اسے جاری رکھنا تھا۔ حضرت عیسیٰ کے واقعہ سے توالد و تناسل انسانیت کی سنت جاریہ کو بدلنا مقصود نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت' مشیت اور ارادے کی آزادی کے ثبوت کے لئے بس یہ ایک مثال ہی کافی تھی کہ اللہ خود اپنے جاری کردہ قوانین کا پابند نہیں ہے۔

وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِّلنَّاسِ "تاکہ ہم اسے لوگوں کے لئے نشانی بنائیں"۔

یہ واقعہ چونکہ سنت الٰہیہ سے ہٹ کر عجیب و غریب تھا اس لئے بعض فرقے اسے صحیح طرح نہ سمجھ سکے اور اس واقعہ کو ظاہر کرنے کی حکمت بھی وہ نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ ابن مریم کی طرف الوہیت کی صفات کی نسبت شروع کر دی اور آپ کی ولادت کے بارے میں اوہام و خرافات کا تانا بانا بننا شروع کر دیا۔ انہوں نے ان کی اس تخلیق سے اللہ کا جو اصل مقصد تھا اسے سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ ہدایت کے بجائے الٹا گمراہی کی طرف چلے گئے۔ یعنی بجائے اس کے کہ وہ کہتے کہ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت الٰہیہ بے قید ہے انہوں نے خود حضرت عیسیٰ کو الٰہ بنا لیا اور ان کے عقائد خراب ہو گئے۔

اس سورہ میں قرآن کریم اس واقعہ کو ذرا تفصیل سے نقل کرتا ہے' اس واقعہ کا حقیقی مقصد بتاتا ہے اور خرافات اور قصے کہانیوں کی تردید کرتا ہے۔ انداز بیان نہایت ہی پر تاثیر مناظر کی شکل میں ہے' جو جذباتی مناظر اور انسانی تاثرات سے بھرپور ہیں۔ جو شخص ان مناظر کو غور سے پڑھتا ہے اور چشم تصور سے دیکھتا ہے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ کانپ اٹھتا ہے' ذرا غور سے پڑھیں۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿١٦﴾
فَاتَّخَذَتْ مِن دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٧﴾
قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا ﴿١٨﴾ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ
لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ﴿١٩﴾ قَالَتْ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَ
لَمْ أَكُ بَغِيًّا ﴿٢٠﴾ قَالَ كَذَٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِّلنَّاسِ وَ
رَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿٢١﴾

"اور اے نبیؐ' اس کتاب میں مریم کا حال بیان کرو' جبکہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر شرقی جانب گوشہ نشین ہو گئی تھی اور پردہ ڈال کر ان سے چھپ بیٹھی تھی۔ اس حالت میں ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو (یعنی فرشتے کو) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ مریم یکایک بول اٹھی کہ "اگر تو کوئی خدا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے خدائے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں"۔ اس نے کہا "میں تو تیرے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں"۔ مریم نے کہا "میرے ہاں کیسے لڑکا ہو گا جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں ہے اور میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں"۔ فرشتے نے کہا "ایسا ہی ہو گا' تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے بہت آسان ہے اور ہم یہ اس لئے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لئے ایک نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے ایک رحمت۔ اور یہ

کام ہو کر رہنا ہے"۔

یہ پہلا منظر ہے۔ایک کنواری نوجوان عورت ہے' نہایت ہی پاکباز ہے' اس کی ماں نے اسے اس وقت عبادت خانے کی خدمت کے لئے نذر کر دیا تھا جب وہ ابھی ماں کے پیٹ میں تھی۔اس کے بارے میں سب کے سب یہی جانتے تھے کہ وہ نہایت ہی پاکباز عورت ہے' عفت مآب ہے۔وہ ہارون کی طرف نسبت رکھتی ہے جو اسرائیلی معبد کے متولی اور پاکباز شخص تھے۔ان کے خاندان کی شہرت بھی یہ تھی کہ وہ نہایت ہی پاکباز لوگوں کا خاندان ہے اور زمانہ قدیم سے یہ لوگ پاک سیرت چلے آرہے ہیں۔

یہ عورت اپنے اہل و عیال اور اپنے اس پاکیزہ خاندان سے چھپتی پھرتی ہے' اس کے حالات ایسے ہیں کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو رہی ہے۔سیاق کلام میں اس حقیقت کی صراحت نہیں کی جارہی ہے کیونکہ یہ کنواریوں کے مخصوص پوشیدہ امور کے ساتھ متعلق ہے۔

یہ اپنی اس خلوت میں ہے' اپنی زندگی سے مطمئن ہے' لیکن وہ کیا دیکھتی ہے کہ ایک نوجوان اس کے کمرے میں کھڑا ہے' ایک مکمل نوجوان۔

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹:۱۷) "اس حالت میں ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو (یعنی فرشتے کو) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی شکل میں نمودار ہوا۔یہ اب کسی بھی کنواری عورت کی طرح گھبرا اٹھتی ہے' جس کے کمرے میں اچانک ایک پورا نوجوان مرد داخل ہو جائے۔وہ اللہ کی پناہ میں آتی ہے۔اللہ سے پناہ طلب کرتی ہے' اس شخص کو اللہ اور تقویٰ و طہارت کا واسطہ دیتی ہے۔اللہ کے خوف کا واسطہ دیتی ہے' وہ کہتی ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے' یہ جگہ خالی نہیں ہے۔اللہ موجود ہے۔

قَالَتْ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا (۱۹:۱۸) "مریم یکایک بول اٹھی کہ اگر تو کوئی خدا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں"۔کسی بھی متقی آدمی کے سامنے اگر خدا کا ذکر کیا جائے تو اس کا شعور تقویٰ بیدار ہوتا ہے اور وہ شیطانی وسوسہ اور شہوت کی اکساہٹ سے باز آجاتا ہے۔

یہ پاک فطرت دوشیزہ' نہایت ہی اچھی تربیت یافتہ' نہایت ہی پاک ماحول میں رہنے والی' جس کی کفالت کی ذمہ داری زکریا جیسے پاکباز شخص کے ذمہ ہے۔جب وہ جنین کی حالت میں تھی تو اسے اس معبد کے لئے نذر کر دیا گیا تھا۔ اس کے لئے یہ پہلا جھٹکا تھا۔ذرا سوچئے کہ یہ فرشتہ یا یہ نوجوان اسے یوں جواب دیتا ہے :

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (۱۹:۱۹) "اس نے کہا میں تو تمہارے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں"۔

اس اعلان سے سوچا جا سکتا ہے کہ اس دوشیزہ پر کس قدر خوف طاری ہو گیا ہو گا' اسے کس قدر شرمندگی لاحق ہو گئی ہو گی۔اسے تو ابھی یہ یقین ہی نہیں ہے کہ یہ نوجوان اللہ کا فرستادہ ہے۔ہو سکتا ہے کہ وہ اس رنگ میں اسے دھوکہ دے رہا ہو' جبکہ وہ اس شرمیلی پاکیزہ فطرت خاتون کو صراحت کے ساتھ پکار رہا ہے کہ میں تمہیں ایک پاکیزہ بچہ دینے آیا ہوں' یہ اس خاتون کے لئے دوسرا دھچکا ہے۔

جب بھی کسی خاتون کی عزت و ناموس خطرے میں ہو اس کے اندر قدرتی طور پر شجاعت پیدا ہو جاتی ہے - چنانچہ حضرت مریم جرأت کے ساتھ پوچھتی ہیں -

قَالَتْ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِیًّا (۱۹ : ۲۰) مریم نے کہا میرے ہاں کیسے لڑکا ہو گا' جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں اور میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں" - یوں وہ صراحت کے ساتھ بات کرتی ہیں 'کھلے الفاظ میں' وہ اور یہ شخص دونوں تنہائی میں ہیں - اچانک اس شخص کے در آنے کی غرض و غایت بھی ظاہر ہو گئی ہے - وہ جاننا چاہتی ہے کہ وہ اسے کس طرح بچہ دینا چاہتا ہے - ہاں جب اس نے کہا کہ میں تمہارے رب کا فرستادہ ہوں تو اس کے خوف میں اس سے بھی کمی نہیں آتی کہ وہ اسے ایک ایسا بچہ دینے والے ہیں جو پاک ہو گا' جس کی ولادت ناجائز ذرائع سے نہ ہو گی' اس کی سیرت بھی بری نہ ہو گی - اس لئے وہ اسی موقعہ پر کھل کر بات کرتی ہیں اور یہی مناسب بھی ہے کہ معلوم کیا جائے کہ کس طرح یہ بچہ پیدا ہو سکتا ہے جبکہ مجھے تو کسی انسان نے چھوا تک نہیں اور میں کوئی عصمت فروش عورت بھی نہیں ہوں کہ لوگ میرے بچے کو قبول کر لیں کہ یہ فاحشہ کا بچہ ہے -

یہاں تک کے سوال و جواب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مریم مرد اور عورت کے ملاپ سے پیدائش کے سوا کوئی اور صورت پیدائش پر یقین نہ رکھتی تھی اور ایک عام انسان کے لئے یہی قدرتی سوچ ہے -

قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا

(۱۹ : ۲۱) "فرشتے نے کہا ایسا ہی ہو گا تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے بہت آسان ہے اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لئے نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے رحمت" -

یہ خارق عادت طریقہ ولادت جس کے بارے میں مریم بھی نہیں سوچ سکتی اللہ کے لئے بہت آسان ہے - کیونکہ اللہ جب کسی چیز کو وجود میں لانا چاہتے ہیں تو وہ صرف کن کہتے ہیں اور وہ ہو جاتی ہے - اللہ کے لئے سب کچھ آسان ہے چاہے مروجہ سنت الہیہ کے مطابق قدرتی طریقوں سے ہو یا غیر معمولی طریقوں سے ہو - فرشتہ اب صاف صاف بتا دیتا ہے کہ خدا کا یہی فرمان ہے کہ ایسا ہی ہو گا اور میرے لئے یہ آسان ہے - اللہ تعالیٰ اس اعجوبے کو لوگوں کے لئے ایک نشانی بنانا چاہتے ہیں - اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ کی قدرت اور اللہ کا ارادہ اور اس کی مشیت بے قید ہیں' یہ واقعہ سب سے پہلے بنی اسرائیل کے لئے رحمت ہو گا پھر تمام انسانوں کے لئے رحمت ہو گا - اس واقعہ کے ظہور سے لوگوں کو معرفت الہی حاصل ہو گی' وہ اللہ کی بندگی کریں گے' اور اللہ کی رضامندی کے متلاشی ہوں گے -

روح الامین اور کنواری مریم کے درمیان اب یہ مکالمہ یہاں ختم ہو جاتا ہے - اس مکالمے کے بعد کیا ہوا' اب یہاں اس کا تذکرہ نہیں کیا جاتا - اب یہاں قصے کے درمیان ایک خلا ہے' یہ مناظر قصہ پیش کرنے کے درمیان ایک فنی خلا ہے - البتہ فرشتہ اس قدر ضرور کہہ دیتا ہے کہ یہ بچہ یونہی ایک کنواری سے پیدا ہو گا' کنواری کو کسی نے چھوا تک نہ ہو گا' یہ بچہ لوگوں کے لئے معجزہ ہو گا' اللہ کی طرف سے رحمت ہو گا - اور اس کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ اور ایسا ہی ہو گا -

وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّا (۱۹ : ۲۱) "اور یہ کام ہو کر رہنا ہے" -

اب اس قصے کا ایک دوسرا منظر سامنے آتا ہے' ہماری پاک دامن کنواری کو ایک دوسری حیران کن اور پریشان کن حالت میں پیش کیا جاتا ہے۔ منظر پہلے منظر سے بھی زیادہ خوفناک ہے' اس کے لیے۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿٢٢﴾ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿٢٣﴾

"مریم کو اس بچے کا حمل رہ گیا اور وہ اس حمل کو لئے ایک دور کے مقام پر چلی گئی' پھر زچگی کی تکلیف نے اسے ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا۔ وہ کہنے لگی "کاش میں اس سے پہلے ہی مرجاتی اور میرا نام و نشان نہ رہتا"۔

یہ اس پاک دامن دوشیزہ کے لئے تیسرا دھچکا ہے۔ سیاق کلام میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ یہ حمل کیسے ٹھہرا' کتنا عرصہ رہا' یا یہ کوئی عادی حمل تھا جس طرح عورتوں کو ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی جانب سے ایک پھونک تھی اور عورت کے رحم میں بیضے کے اندر حرکت پیدا ہوگئی۔ یہ خون کا لوتھڑا بن گیا' اس کے اندر ہڈیاں بن گئیں' ہڈیوں پر گوشت بننا شروع ہو گیا اور جنین نے حمل کا مقررہ وقت پورا کیا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ عورت کے بیضے میں مرد کا جرثومہ ملنے کے بعد اس میں نشوونما شروع ہوتی ہے اور ۹ قمری مہینوں تک حمل ٹھہرا رہتا ہے۔ نفخ الٰہی نے بس اس بیضے میں حرکت پیدا کی اور اس نے اپنا طبیعی عمل شروع کر دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس غیر معمولی واقعہ میں بیضے نے اپنا عادی کورس پورا نہ کیا ہو' یہ تمام مراحل اعجوبے کی طرح جلدی جلدی طے ہوگئے ہوں اور رحم مادر میں بچہ جلدی جلدی تکمیل کے مراحل طے کر گیا ہو۔ یہاں آیت میں تو کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ دونوں طریقوں اور امکانیات میں سے کون سا عمل ہوا۔ لہٰذا ہم بھی اس بحث میں نہیں پڑتے جس کے بارے میں تحقیق کے لئے ہمارے پاس کوئی مستند مواد نہیں ہے۔ ہمیں جو بات یہاں جتائی اور دکھائی جاتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ حمل ٹھہرا اور مریم اپنی فیملی سے دور ایک تنہا مقام میں چلی گئی ہیں۔ یہ صورت حالات ان کے لئے سابقہ حالات سے زیادہ خوفناک ہے۔ پہلے موقف میں تو ان کو صرف اپنے کنوارے پن' تربیت اور اخلاق کی فکر تھی' یہ صرف ان کا خفیہ مسئلہ تھا۔ خفیہ رہ سکتا تھا' لیکن یہاں یہ مسئلہ اب سوسائٹی کے سامنے آنے والا ہے۔ نفسیاتی تکالیف کے ساتھ اب وہ جسمانی تکالیف سے بھی دوچار ہیں۔ درد زہ کی تکلیف انہیں کھجور کے ایک تنے کے پاس لاتی ہے۔ وہ مجبوراً اس درخت کا سہارا لیتی ہے۔ یہاں یہ یکہ و تنہا ہے۔ کنوارے پن کی پہلی ولادت میں زچگی کی تکالیف بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ کچھ تجربہ نہیں رکھتیں' کوئی معاون و مددگار بھی نہیں ہے' اچانک اس کے منہ سے یہ کلمات نکلتے ہیں۔

يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا (۱۹:۲۳) "کاش میں اس سے پہلے ہی مرجاتی اور میرا نام و نشان ہی نہ رہتا"۔ قرآن نے اس بات کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے گویا ہم اس کے چہرے کے خدوخال دیکھ رہے ہیں' اس کے دلی اضطراب کو گویا ہم محسوس کر سکتا ہے۔ رنج و الم جو ان کو ہے ہر شخص اسے حقیقی طور پر محسوس کرتا ہے۔ ایسے مواقع پر یہ تمنا جائز ہے کہ اس کا نام و نشان مٹ جائے۔ مَّنْسِيًّا وہ کپڑا جسے حیض کے خون کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے بعد پھینک دیا جاتا ہے اور بھلا دیا جاتا ہے (ایسی جگہ پھینک دیا جاتا

ہے کہ کوئی دیکھ بھی نہ سکے )

اس شدت رنج والم میں اچانک ایک عظیم سرپرائز دیا جاتا ہے۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿٢٤﴾

وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ

وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ

صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿٢٦﴾

"بچے نے نیچے سے اس کو پکار کر کہا "غم نہ کر تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے اور تو ذرا اس درخت کے تنے کو ہلا' تیرے اوپر تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی۔ پس تو کھا اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔ پھر اگر کوئی آدمی تجھے نظر آئے تو اس سے کہہ دے کہ میں نے رحمٰن کے لئے روزے کی نذر مانی ہے' اس لئے آج میں کسی سے نہ بولوں گی"۔

یا اللہ' یہ کیسا بچہ ہے' ابھی تو پیدا ہوا ہے' زمین پر پڑا ہے اور وہ باتیں کر رہا ہے۔ اب مریم کو خوشی کے ساتھ سکون حاصل ہو گیا۔ اب وہ اپنے رب سے واصل ہیں۔ ان کے کھانے اور پینے کا بندوبست بھی کر دیا گیا ہے' عجیب انداز میں اور ان کو اس معجزانہ ولادت کی دلیل اور جواز بھی سمجھا دیا گیا ہے۔

اے ماں تو پریشان نہ ہو۔ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا (۱۹ : ۲۴) "تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے"۔ وہ تمہیں بھولا نہیں اور نہ تمہیں بے سہارا چھوڑ دیا ہے' بلکہ اس نے تمہارے لئے تمہارے قدموں کے نیچے ایک چشمہ جاری نکال دیا ہے۔ راجح بات یہ ہے کہ ایک لحظہ میں یہ چشمہ معجزانہ طور پر پھوٹ پڑا۔ زمین سے یا پانی کی کسی گزرگاہ سے۔ جس کھجور کا تم نے سہارا لے رکھا ہے اسے ذرا حرکت دو' تیرے اوپر تروتازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی۔ چنانچہ یہ تیری خوراک ہے اور وہ شراب طہور ہے۔ نفاس اور زچگی کی مریضہ کے لئے میٹھا کھانا بہت مفید ہوتا ہے' کھجوریں تازہ اور خشک زچگی کی مریض خواتین کا بہترین طعام ہے۔

فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا (۱۹ : ۲۶) "تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر"۔ یہ خوشگوار طعام و شراب استعمال کرو اور بچے کو دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈا کرو اور اگر کوئی سوال کرے تو اشاروں سے یہ کہہ دو کہ میں روزے سے ہوں' میں نے روزے کی نذر مانی ہے' عبادت اور ذکر الہی کے لئے کٹ گئی ہوں' آج میں کسی سے بات نہ کروں گی کسی کو اس کے سوال کا جواب نہ دوں گی۔

ہمارا خیال ہے کھجور کے اس درخت کو ہلانے سے قبل وہ بے حد خوفزدہ ہو گئی ہو گی' نہایت ہی پریشانی کا وقت اس پر گزرا ہو گا' لیکن جب درخت کے ہلاتے ہی اس پر تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں تو وہ سمجھ گئی ہو گی کہ اللہ اس کے ساتھ ہے۔ اسے اللہ نے نہیں چھوڑا اور یہ کہ حجت الہیہ اس کے پاس ہے۔ یہ بچہ جو ولادت ہوتے ہی باتیں کرتا ہے' یہ حجت الہیہ ہے

اس لئے یہ باتیں اس معجزے کی تفسیر کر دیں گی 'جو اس بچے کی ولادت کے سلسلے میں ظہور پذیر ہوا۔
اب اگلا نہایت ہی موثر منظر دیکھئے :

---

فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ قَالُوا يَـٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ﴿٢٧﴾
يَـٰٓأُخْتَ هَـٰرُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ ٱمْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا ﴿٢٨﴾
فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَن كَانَ فِى ٱلْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿٢٩﴾

"پھر وہ اس بچے کو لئے ہوئے اپنی قوم میں آئی۔ لوگ کہنے لگے "اے مریم' یہ تو تو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔ اے ہارون کی بہن' نہ تیرا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی"۔ مریم نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا "ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے"۔

جب یہ آتی ہے تو پوری قوم کے چہرے سیاہ نظر آتے ہیں' یہ لوگ اس کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی شریف' پاکدامن اور ہیکل کو بخشی ہوئی متبرک بیٹی' عبادت گزار اور اچھی شہرت والی راہبہ' ایک بچے کو اٹھائے چلی آ رہی ہے۔ وہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے تھے۔

قَالُوا يَـٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا (۲۷) يَـٰٓأُخْتَ هَـٰرُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ ٱمْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا (۲۸) (۱۹: ۲۷ - ۲۸) لوگ کہنے لگے "اے مریم' یہ تو تو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔ اے ہارون کی بہن' نہ تیرا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی"۔ ان کی زبانوں کی کاٹ تیز ہے کہ تو نے تو بہت ہی مکروہ کام کر ڈالا۔ طعنے دینے لگے اور تو تو ہارون کی بہن ہے' جو نبی ہیں' جو اس ہیکل کے متولی رہے ہیں اور اس کے بعد ان کی اولاد اس ہیکل کی وارث رہی ہے۔ تمہاری نسبت اس طرف ہے کہ تو اس ہیکل کی راہبہ ہے اور یہاں عبادت کے لئے وقف ہے۔ کیا اس نسبت' اس مقام' اس حیثیت اور اس مکروہ فعل کے درمیان کوئی نسبت ہے۔ تمہارا باپ بھی ایسا نہ تھا' تمہاری ماں بدکار نہ تھی۔ یہ جو کام تو نے کیا ہے یہ تو بدکار لوگوں کی بہن بیٹیاں کرتی ہیں۔ عصمت فروش طبقات کے ہاں ایسے بچے پیدا ہوتے ہیں۔

مریم وہی کرتی ہیں جس کا اس معجزانہ بچے نے ان کو بوقت پیدائش مشورہ دے دیا تھا۔

فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ (۱۹: ۲۹) "مریم نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا"۔ اس عجیب صورت حال کے بارے میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ تعجب اور غیظ و غضب اور شرمندگی میں یہ لوگ مریم کے درپے ہوئے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ ان کی بیٹی ان کے سامنے برملا ایک بچہ اٹھائے چلی آ رہی ہے۔ وہ ان لوگوں کے غیض و غضب کو اہمیت نہیں دیتی' خاموش ہو جاتی ہے اور بچے کی طرف اشارہ کر دیتی ہے کہ پوچھو اس سے سارے واقعہ کا راز' اور وہ جل بھن کر کہتے ہیں :

قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا (۱۹ : ۲۹) ”ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے“۔

اب ایک دوسرا معجزہ رونما ہوتا ہے :

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۗ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝ وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۝ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ ۫ وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ۝ وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ یَوْمَ اَمُوْتُ وَ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ۝

”بچہ بول اٹھا“ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی، اور نبی بنایا، اور بابرکت کیا جہاں بھی میں رہوں، اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں، اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا، اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا۔ سلام ہے مجھ پر جبکہ میں پیدا ہوا اور جبکہ میں مروں اور جبکہ زندہ کر کے اٹھایا جاؤں“۔

یوں حضرت عیسیٰ یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے بندے ہیں، وہ خدا کے بیٹے نہیں ہیں، جس طرح بعض عیسائی فرقے دعویٰ کرتے ہیں۔ نہ وہ بذات خود الٰہ ہیں جس طرح بعض دوسرے فرقے عقیدہ رکھتے ہیں۔ نہ یہ بات ہے کہ وہ تینوں کا ایک ہیں اور تین الٰہ واحد ہیں جیسا کہ ایک دوسرا فرقہ یہ عقیدہ رکھتا ہے۔ وہ اعلان کرتے ہیں کہ اللہ نے مجھے نبی بنایا ہے۔ نہ بیٹا بنایا ہے اور نہ شریک۔ مجھ میں برکت ڈالی ہے، اور یہ حکم دیا ہے کہ پوری زندگی میں نماز ادا کروں اور زکوٰۃ پر عمل کروں۔ والدہ کے ساتھ حسن سلوک کروں اور فیملی کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھوں۔ خود میری زندگی محدود ہے۔ موت کے لئے ایک دن مقرر ہے۔ مروں گا، پھر اٹھایا جاؤں گا۔ اللہ نے میرے لئے سلامتی، امن، اطمینان کا پورا پورا سامان کر دیا ہے، ولادت کے وقت بھی، موت کے وقت بھی اور بعث بعد موت کے وقت بھی۔

یہ آیت حضرت عیسیٰ کی موت اور بعث بعد موت پر نص صریح ہے۔ اس میں کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی اور نہ اس میں بحث کی کوئی گنجائش ہے۔

--- ooo ---

قرآن مجید یہ منظر پیش کر کے اس پر کسی اور بات کا اضافہ نہیں کرتا۔ یہ تفصیلات نہیں دی جاتیں کہ اس معجزے کے بعد قوم کا ردعمل کیا ہوا۔ اس کے بعد مریم اور ان کے اس ذی شان بچے کا کیا بنا۔ جس نبوت کی طرف انہوں نے اپنے کلام میں اشارہ کیا تھا وہ انہیں کب ملی کیونکہ انہوں نے کہا تھا۔

اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا (۱۹ : ۳۰) ”مجھے اس نے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے“۔ کیونکہ اس جگہ قرآن کا مقصود یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خارق عادت معجزہ پیش کر دیا جائے اور جب بات اس حیران کن اور معجزانہ کلام تک پہنچتی ہے تو پردہ گرتا ہے تاکہ اس کے بعد وہ اصل بات نہایت ہی مثبت، فیصلہ کن انداز میں کی

جائے کیونکہ یہ بہتر موقعہ ہے کہ اس مقام پر نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں اصل بات کہہ دی جائے۔

ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ۝ مَا كَانَ لِلَّهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ ۖ سُبْحَانَهُ ۚ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝

"یہ ہے عیسیٰ ابن مریم اور یہ ہے اس کے بارے میں وہ سچی بات جس میں لوگ شک کر رہے ہیں۔ اللہ کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ وہ پاک ذات ہے وہ جب کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا' اور بس وہ ہو جاتی ہے۔ (اور عیسیٰ نے کہا تھا کہ) "اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی' پس تم اسی کی بندگی کرو' یہی سیدھی راہ ہے"۔

یہ ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل حقیقت' نہ ان لوگوں کی بات درست ہے جو ان کو اللہ بناتے ہیں۔ نہ ان لوگوں کی بات درست ہے جو ان کی ولادت کے بارے میں ان کی والدہ محترمہ کو متہم کرتے ہیں۔ ان کی ولادت' ان کی نشوونما اور مرتبہ و مقام کی یہی حقیقت ہے۔ یہی قول حق ہے جس میں لوگ شک کرتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں۔ وہ زبانی طور پر اس کی تصدیق کرتے ہیں اور حالات قصہ بھی یہی بتاتے ہیں۔

مَا كَانَ لِلَّهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ (۱۹ : ۳۵) "اللہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے"۔ وہ اس سے بہت بلند ہے۔ اس کا یہ کام نہیں ہے اور نہ اس کو اس کی ضرورت ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ بیٹا تو ان لوگوں کی ضرورت ہے جو فنا ہونے والے ہیں۔ وہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے کسی کو اپنا بیٹا بناتے ہیں' پھر ایک ضعیف والد کو آخری عمر میں مدد کے لئے بیٹے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ باقی اور لازوال ہے' وہ قادر مطلق ہے' کسی کا محتاج نہیں ہے اور تمام کائنات اس کے کلمہ کن سے بنتی ہے۔ وہ جو چاہتا ہے ہو جاتا' محض اس کا ارادہ اس طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے' لہٰذا اسے نہ اولاد اور نہ شریک کی ضرورت ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی بات اس پر ختم ہوتی ہے کہ اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے' لہٰذا صرف اسی خدائے واحد کی عبادت کرو۔

وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ (۱۹ : ۳۶) "اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی' بس تم اسی کی بندگی کرو' یہی سیدھی راہ ہے"۔ لہٰذا حضرت عیسیٰ کی شہادت اور ان کے قصے کی اس شہادت کے بعد اب اوہام اور اساطیر اور قصے کہانیوں کی اب کوئی گنجائش نہیں۔ یہ تبصرہ مشیت اور قرارداد کی صورت میں کیا گیا ہے۔

اس تقریر اور قرارداد کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مختلف پارٹیوں کے اختلافات پر تبصرہ کیا جاتا ہے کہ اس حقیقت کے آنے کے بعد اب ان اختلافات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْ بَیْنِھِمْ (۱۹: ۳۷) "مگر پھر مختلف گروہ باہم اختلاف کرنے لگے"۔
قیصر روم آ منطین نے پادریوں کی ایک مجلس منعقد کی تھی جس میں دو ہزار ایک سو ستر (۲۱۷۰) پادری شریک ہوئے تھے۔ یہ مجلس ان کی تین مجالس میں سے ایک تھی۔ اس میں حضرت عیسیٰ کے بارے میں ان کے درمیان شدید اختلاف ہو گیا۔ ہر فرقے نے اپنا موقف بیان کیا۔ بعض نے کہا کہ وہ خدا ہے جو زمین پر اترا' جس کو چاہا زندہ کیا' جس کو چاہا مارا اور پھر وہ آسمانوں پر چلا گیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ وہ ابن اللہ ہے' بعض نے کہا کہ وہ اقانیم ثلاثہ میں سے ایک ہیں' باپ بیٹا اور روح القدس۔ بعض نے کہا کہ وہ تینوں میں سے ایک ہیں' یعنی اللہ بھی الٰہ ہے وہ بھی الٰہ ہیں اور والدہ بھی الٰہ ہیں۔ بعض نے کہا کہ وہ اللہ کے بندے' اس کی روح اور اس کا کلمہ ہیں۔ ان بڑے اقوال کے علاوہ اور فرقوں نے بھی کئی اقوال پیش کئے۔ کسی عقیدے پر تین صد اسی افراد سے زیادہ کا اتفاق نہ ہوا۔ یہ تعداد ایک قول پر جمع ہو گئی۔ قیصر روم اس کی طرف مائل ہو گیا اور اس قول کے ماننے والوں کی امداد کی اور دوسروں کو ختم کر دیا' خصوصاً اہل توحید کو نیست و نابود کر دیا۔

حضرت عیسیٰ کے بارے میں غلط عقائد کا تعین چونکہ مذہبی پیشواؤں کی مجالس نے کیا تھا' اس لیے یہاں سیاق کلام ان لوگوں کو ڈراتا ہے جنہوں نے توحید کے علاوہ دوسرے عقائد اختیار کئے۔ ان کو ڈرایا جاتا ہے' اس دن سے' جس میں ان مجالس کے مقابلے میں زیادہ لوگ جمع ہوں گے اور یہ لوگ دیکھیں گے کہ کافروں کا انجام کس قدر عبرت ناک ہو گا۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَیْنِهِمْ ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۳۷﴾ اَسْمِعْ بِهِمْ وَ اَبْصِرْ ۙ یَوْمَ یَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْیَوْمَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۸﴾ وَ اَنْذِرْهُمْ یَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِیَ الْاَمْرُ ۘ وَ هُمْ فِیْ غَفْلَةٍ وَّ هُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۹﴾

"مگر پھر مختلف گروہ باہم اختلاف کرنے لگے۔ سو جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لئے وہ وقت بڑی تباہی کا ہو گا جب کہ وہ ایک بڑا دن دیکھیں گے۔ جب وہ ہمارے سامنے حاضر ہوں گے اس روز تو ان کے کان بھی خوب سن رہے ہوں گے اور ان کی آنکھیں بھی خوب دیکھتی ہوں گی' مگر آج یہ ظالم کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ اے نبی' اس حالت میں جب کہ یہ لوگ غافل ہیں اور ایمان نہیں لا رہے ہیں' انہیں اس دن سے ڈرا دو جبکہ فیصلہ کر دیا جائے گا اور پچھتاوے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو گا"۔

ان لوگوں کے لئے اس دن بہت بڑی ہلاکت ہو گی' بہت بڑا خوفناک منظر ہو گا' وہ عظیم اور خوفناک منظر جن و انس سب دیکھ رہے ہوں گے' ملائکہ بھی حاضر ہوں گے۔ اس اللہ کے سامنے سب لوگ کھڑے ہوں' جس کے ساتھ ان احزاب نے شرک کیا۔

یہاں اللہ تعالیٰ بتاتے ہیں کہ ان لوگوں کی حالت دیدنی ہو گی کہ یہ لوگ یہاں اس دنیا میں دلائل ہدایت سے منہ موڑ رہے تھے' لیکن وہاں تو ان کے کان بھی اچھی طرح سن رہے ہوں گے اور آنکھیں بھی اچھی طرح دیکھ رہی ہوں گی۔

أَسْمِعْ بِهِمْ وَ أَبْصِرْ يَوْمَ يَأْتُونَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُونَ الْيَوْمَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ (۱۹:۳۸) "جب وہ ہمارے سامنے حاضر ہوں گے اس روز تو ان کے کان بھی خوب سن رہے ہوں گے ' اور ان کی آنکھیں بھی خوب دیکھ رہی ہوں گی مگر آج یہ ظالم کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں"۔ آج ان کی حالت یہ ہے کہ نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں جبکہ آج سننا اور دیکھنا ہدایت کا سبب بن سکتا ہے۔ لیکن جس دن سننا اور دیکھنا شرمندگی کا باعث ہو گا اس دن یہ خوب سن اور دیکھ رہے ہوں گے۔ اس دن یہ ایسی چیزیں دیکھیں گے جو دیکھنے کے قابل نہ ہوں گی اور ایسی چیزیں سنیں گے جسے سننا نہ چاہیں گے۔ یہ ہو گا مشہد عظیم کا دن۔

وَ أَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ (۱۹:۳۹) "اور ان کو پچھتاوے کے دن سے ڈراؤ"۔ اس قدر حسرتیں ہوں گی کہ قیامت کا دن ہی حسرتوں کا دن ہو گا۔ حسرت کے سوا وہاں کچھ نہ ہو گا۔ میدان میں ہر طرف حسرت ہی حسرت ہو گی لیکن اس دن حسرت کرنا مفید مطلب نہ ہو گا۔

إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَ هُمْ فِي غَفْلَةٍ وَّ هُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۱۹:۳۹) "جب فیصلہ کر دیا جائے اور یہ لوگ غفلت میں ہیں اور ایمان نہیں لا رہے"۔ یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے لیکن قیامت کا دن ان کے کفر کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ جس غفلت میں یہ ڈوبے ہوئے ہیں اس کے ساتھ قیامت جڑی ہوئی ہے۔

ان کو اس دن سے ڈراؤ جس میں شک نہیں ہے۔ کیونکہ زمین کے اوپر جو چیز اور جو انسان بھی ہیں وہ سب کے سب اللہ کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اللہ ہی سب کا وارث ہے۔

۲
ع۲۵ إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴿٤٠﴾
۵

"آخر کار ہم ہی زمین اور اس کی ساری چیزوں کے وارث ہوں گے اور سب ہماری طرف پلٹائے جائیں گے"۔

--- ○○○ ---

# درس نمبر ۱۳۶ ایک نظر میں

پہلے سبق کے آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی حقیقت بیان کی گئی' اور بتایا گیا کہ جو لوگ ان کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں' وہ محض وہم و گمان اور قصے کہانیوں پر یقین رکھتے ہیں۔ بڑی گمراہی میں مبتلا ہیں اور ان کہانیوں سے بعض گمراہ اہل کتاب استدلال کرتے ہیں۔اس کے بعد یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے کا ایک حصہ دیا جاتا ہے جس میں عقائد شرکیہ کی گمراہی اور بطلان کو واضح کیا گیا ہے۔عرب اور مشرکین مکہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔مشرکین مکہ کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ اس گھر کے متولی ہیں جس کی تعمیر حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے فرمائی تھی۔

حضرت ابراہیم اپنے اس قصے کی اس کڑی میں نہایت ہی حلیم الطبع کردار والے نظر آتے ہیں اور اللہ کی مشیت پر راضی ہونے والے شخص ہیں۔ان کی شخصیت کے یہ خدوخال ان کے الفاظ' ان کے انداز کلام سے بھی اچھی طرح معلوم ہوتے ہیں جن کی حکایت قرآن کریم نے عربی میں بیان کی ہے۔نیز ان کے اقدامات سے اور والد کی جہالت کے مقابلہ کے سلسلے میں ان کے رویہ سے بھی ان کی شخصیت واضح ہو رہی ہے۔لیکن اللہ کی طرف سے ان کے اس کردار اور ان کے ان اوصاف کا صلہ بھی ان کو خوب ملا۔ان کے مشرک باپ اور مشرک فیملی کی جگہ اللہ نے ان کو ایسی صالح اولاد دی جن سے ایک بڑی امت پیدا ہوئی۔اس امت میں بڑے بڑے انبیاء و صالحین پیدا ہوئے لیکن ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے نمازوں کو ضائع کر دیا۔اور خواہشات نفسانیہ کی پیروی کرنے لگے اور اس راہ سے وہ منحرف ہو گئے' جو ان کے لئے ان کے باپ ابراہیم نے تجویز کیا تھا۔اور انہوں نے حضرت ابراہیم کا دین تک ترک کر دیا اور مشرکین مکہ انہی لوگوں کے سرخیل تھے۔

اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو صدیق اور نبی کہا۔صدیق سے یہ بھی مفہوم کہ وہ بہت ہی سچے تھے اور یہ بھی نکلتا ہے کہ وہ بہت تصدیق کرنے والے تھے۔دونوں معنی حضرت ابراہیم کی شخصیت کے ساتھ مناسب ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۳۶ تشریح آیات

## ۴۱ --- تا --- ۶۵

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۝ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝

"اور اس کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان کرو، بے شک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا (انہیں ذرا اس موقع کی یاد دلاؤ) جبکہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ "ابا جان، آپ کیوں ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں؟ ابا جان، میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا، آپ میرے پیچھے چلیں، میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔ ابا جان، آپ شیطان کی بندگی نہ کریں، شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ابا جان، مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں"۔

وہ نہایت ہی ادب اور تہذیب کے ساتھ اپنے باپ سے ہمکلام ہیں۔ وہ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اللہ نے جو ہدایت ان کو دی ہے، اس سے ان کے والد بھی مستفید ہو جائیں۔ جو علم اللہ نے ان کو دیا ہے وہ اپنے باپ کو بھی سکھا دیں۔ وہ نہایت ہی محبت کے انداز میں باپ سے مخاطب ہیں۔ ابا جان، نہایت ہی نرم الفاظ ہیں۔

لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا (۱۹ : ۴۲) "آپ کیوں ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں؟" عبادت کا اصول تو یہ ہے کہ انسان اس ذات کے آگے سرنگوں ہو جو انسان سے اعلیٰ و ارفع ہو۔ زیادہ علم والا اور زیادہ قوت والا ہو اور وہ ذات انسان کو مقام انسانیت سے بھی بلند کر دے اور مزید اونچا مرتبہ دے دے۔ ایک انسان ان چیزوں کی عبادت اور بندگی کیسے کر سکتا ہے جو اس سے کم تر ہوں! بلکہ وہ دوسرے حیوانات سے بھی کم تر ہوں، نہ سنتی ہوں، نہ دیکھتی ہوں اور نہ

کسی کے نفع و نقصان کی مالک ہوں۔ یہ تقریر انہوں نے اس لئے کی کہ ان کے والد اور ان کی قوم بتوں کی پوجا کرتے تھے جس طرح اہل قریش بتوں کی پوجا کرتے تھے جن کے ساتھ اسلام کا مقابلہ تھا۔

یہ تو تھی پہلی جھلک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت توحید کی جو انہوں نے اپنے والد کے سامنے پیش کی۔ اس کے بعد انہوں نے مزید تشریح کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ یہ بات وہ خود اپنی جانب سے نہیں کہہ رہے بلکہ دراصل یہ وہ علم ہے جو ان کے پاس اللہ کی طرف سے آیا ہے۔ اللہ نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں آپ کو یہ دعوت دوں اگرچہ میں عمر میں آپ سے کم ہوں اور میرا تجربہ بھی آپ سے کم ہے لیکن عالم بالا کی امداد سے میں حقیقت تک پہنچ گیا ہوں۔ وہ اپنے والد کو دردمندی کے ساتھ نصیحت کرتے ہیں کہ آپ کو اس علم کا پتہ نہیں ہے لہٰذا آپ کو چاہئے کہ آپ میری اطاعت کریں۔ میں آپ کو راہ راست دکھا سکتا ہوں۔

يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَاۗءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا (۱۹ : ۴۳) "ابا جان، میرے پاس ایک ایسا علم ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا، آپ میرے پیچھے چلیں، میں آپ کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا"۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ایک والد اپنے ہدایت یافتہ بیٹے کے پیچھے چلے، اگر ایک بیٹا نبی ہو اور اس کا اعلیٰ ذریعہ علم سے رابطہ ہو۔ اس صورت میں والد بیٹے کی نہیں بلکہ اس اعلیٰ سرچشمے کی اطاعت کر رہا ہوتا ہے اور ہدایت یافتہ ہو جاتا ہے۔

اس وضاحت کے بعد کہ بتوں کی بندگی کرنا ایک منکر فعل ہے اور یہ کہ میری دعوت کا سرچشمہ ذات باری ہے جبکہ والد جس موقف کو اپنائے ہوئے ہیں اس کا سرچشمہ کچھ اور ہے۔ اب حضرت ابراہیم صراحت کے ساتھ بتاتے ہیں کہ والد صاحب، آپ جس راہ پر چل رہے ہیں وہ شیطان کی راہ ہے، جبکہ میں جس راہ کی طرف آپ کو بلا رہا ہوں وہ رحمٰن کی راہ ہے۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ اے باپ، آپ پر اللہ کا غضب نازل نہ ہو جائے اور آپ ہمیشہ کے لئے شیطان کے پیروکاروں میں شامل ہو جائیں۔

يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا (۴۴) يٰٓاَبَتِ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا (۴۵)(۱۹ : ۴۴ - ۴۵)

"ابا جان، آپ شیطان کی بندگی نہ کریں، شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ابا جان، مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں"۔

یہ شیطان ہی ہے جو اللہ کے سوا بتوں کی بندگی پر لوگوں کو آمادہ کرتا ہے جو لوگ بتوں کی بندگی کرتے ہیں گویا وہ شیطان کی بندگی کرتے ہیں۔ اور شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے۔ حضرت ابراہیم اپنے والد کو ڈراتے ہیں کہ ان پر کہیں اللہ کا غضب نہ آ جائے اور اس طرح اللہ کہیں انہیں شیطان کا دوست ہی نہ بنا دے اور وہ مستقلاً شیطان کے تابع نہ ہو جائیں۔ اللہ جب بندے کو اپنی عبادت کی توفیق دیتا ہے تو یہ اس کا انعام ہوتا ہے اور جب اللہ اپنی سنت کے مطابق کسی

کے بارے میں فیصلہ کر دے کہ وہ شیطان کا دوست ہوگا تو یہ اللہ کا غضب ہوتا ہے اور اس غضب کے نتیجے ہی میں پھر یہ شخص سخت عذاب اور بڑے خسارے سے دوچار ہو جاتا ہے یعنی قیامت میں۔

لیکن نہایت ہی نرم و نازک الفاظ میں یہ پرتاثیر دعوت ایک کٹر مشرک کے دل پر کوئی اثر نہیں کرتی۔ کیونکہ یہ دل پتھر کی طرح سخت ہو گیا ہے۔ جواب میں والد ابراہیم سخت غصے میں آکر دھمکی پر اتر آتے ہیں۔

قَالَ أَرَاغِبٌ أَنتَ عَنْ آلِهَتِي يَا إِبْرَاهِيمُ ۖ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ ۖ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا ﴿٤٦﴾

"باپ نے کہا" ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔ بس تو ہمیشہ کے لئے مجھ سے الگ ہو جا؟"

جواب میں والد صاحب نے کہا کہ ابراہیم تو میرے معبودوں سے نفرت کرتے ہو' اور اس نفرت کی وجہ سے تم ان کی عبادت سے پھر گئے ہو' یا تمہیں اس قدر جرأت ہو گئی ہے' میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ اگر تو نے اپنے اس مکروہ موقف پر نظرثانی نہ کی تو میں تمہیں رجم کر دوں گا۔

لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ (۱۹ : ۴۶) "اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا"۔ میرے سامنے سے ہٹو اور ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلے جاؤ۔ اسی میں تمہاری خیر ہے ورنہ یہاں زندہ نہ بچو گے۔

وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا (۱۹ : ۴۶) "ہمیشہ کے لئے مجھ سے دور ہو جاؤ"۔

یہ شخص ہدایت کی دعوت کا جواب اس سختی سے دیتا ہے اور نہایت ہی باادب خطاب اور درخواست کو بھی سختی سے رد کر دیتا ہے۔ یہ ہے ایمان اور کفر کے درمیان فرق۔ ملاحظہ کیجئے کہ جس دل کو اسلام نے مہذب بنا دیا وہ کیسا ہے اور جس دل کو کفر نے برباد کر دیا وہ کیسا ہے؟ حضرت ابراہیم طیش میں بھی نہ آئے' انہوں نے بھلائی' محبت اور ادب کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور یوں گویا ہوئے:

قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ ۖ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي ۖ إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا ﴿٤٧﴾ وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَأَدْعُو رَبِّي عَسَىٰ أَلَّا أَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا ﴿٤٨﴾

"ابراہیم نے کہا" سلام ہے آپ پر۔ میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے' میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور ان ہستیوں کو بھی جنہیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا' امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہ رہوں گا"۔

تم پر خدا کی سلامتی ہو' نہ جھگڑا ہے' نہ تردید ہے' نہ دھمکی اور نہ ارادۂ قتل کے جواب میں ردعمل ہے۔ بلکہ جواب

یہ ہے کہ میں تمہارے بارے میں اپنے رب سے دعا کرتا رہوں گا کہ وہ آپ کو اس گمراہی سے اور شیطان کی دوستی سے کسی طرح نکال لائے ۔ آپ پر رحم فرمائے اور آپ کو ہدایت نصیب کرے ۔ میرے ساتھ میرے رب کا معاملہ یہ ہے کہ میں نے جب بھی دعا کی ہے میرے رب نے مجھے نامراد نہیں لوٹایا اور اگر میرا آپ کے پاس رہنا اور آپ کی نظروں کے سامنے پھرنا آپ کو پسند نہیں تو اے اباجان ' میں آپ کو اور آپ کی قوم کو چھوڑ دوں گا۔ آپ جانیں اور آپ کے معبود جانیں ۔ میں تو اپنے رب وحدہ ہی کی بندگی کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ میرا رب میری اس دعا کو مسترد نہیں کرے گا۔

حضرت ابراہیم جس بات کی امید کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ میرا رب مجھے شقی نہیں بنائے گا۔ ان کی یہ بات بھی نہایت کسر نفسی ' ادب اور تقویٰ پر مبنی ہے ۔ وہ اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھتے ۔ صرف یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ اللہ مجھے شقاوت اور بدبختی سے بچائے گا۔

یوں حضرت ابراہیم نے اپنے باپ ' اپنی قوم ' اپنے اہل اور رشتہ داروں اور ان کی بت پرستیوں کو چھوڑ کر علاقے کو خیرباد کہہ دیا۔ اللہ نے بھی انہیں تنہا نہ چھوڑا۔ اللہ نے بھی انہیں اولاد دی اور مقام عالی عطا کیا۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۙ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحٰقَ وَ
يَعْقُوبَ ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿۴۹﴾ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِنْ رَحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ
لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾ ع ۱۰ ۶

"پس جب وہ ان لوگوں سے اور ان کے معبودان غیراللہ سے جدا ہو گیا تو ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو نبی بنایا اور ان کو اپنی رحمت سے نوازا اور ان کو سچی ناموری عطا کی" ۔

حضرت اسحاق ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے ہیں ۔ یہ سارہ سے پیدا ہوئے ' جو پہلے بانجھ تھیں اور یعقوب حضرت اسحاق کے بیٹے ہیں ' لیکن یعقوب علیہ السلام کو بھی ابراہیم علیہ السلام کا بیٹا سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ دادا کی زندگی میں پیدا ہوئے تھے اور دادا کے زیر تربیت رہے تھے ۔ گویا وہ براہ راست ان کے بیٹے تھے ۔ انہوں نے براہ راست حضرت ابراہیم سے دین سیکھا اور پھر اپنی اولاد کو سکھایا۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح نبی تھے ۔

وَ وَهَبْنَا لَهُمْ مِنْ رَحْمَتِنَا (۱۹ : ۵۰) "اور ان کو اپنی رحمت سے نوازا"۔ یعنی حضرت ابراہیم ' حضرت اسحاق ' حضرت یعقوب اور ان کی نسل کو ۔ یہاں ان حضرات کے مقام اعلیٰ کو رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ اس لئے کہ اس پوری سورہ پر رحمت کے سائے چھائے ہوئے ہیں اور رحمت وہ رفیق ہمدم ہے جو حضرت ابراہیم کو اپنی قوم اور علاقے کے چھوڑنے کے عوض دی گئی تاکہ ان کی تنہائیوں میں رحمت ان کے ساتھ رہے ۔

وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا (۱۹ : ۵۰) "اور ان کو ہم نے سچی ناموری عطا کی" ۔ یعنی وہ اپنی

دعوت میں سچے تھے 'لوگ ان کی بات کو سچا مانتے تھے' عوام الناس میں ان کا احترام تھا اور لوگ ان کی اطاعت کرتے تھے ۔
اب حضرت ابراہیم کی اولاد ہی کی بات ذرا آگے بڑھتی ہے ۔ پہلے حضرت اسحاق کی اولاد حضرت موسیٰ اور ہارون ؑ کو لیا جاتا ہے ۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾

"اور ذکر کرو اس کتاب میں موسیٰؑ کا ۔ وہ ایک چیدہ شخص تھا اور رسول نبی تھا ۔ ہم نے اس کو طور کے داہنی جانب سے پکارا اور راز کی گفتگو سے اس کو تقرب عطا کیا' اور اپنی مہربانی سے اس کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر اسے (مددگار کے طور پر) دیا" ۔

حضرت موسیٰؑ کی صفت اخلاص کا ذکر ہے 'اللہ نے ان کو اپنے لئے خالص کر لیا تھا' دعوت اسلامی کے لیے وہ وقف تھے ۔ وہ رسول اور نبی تھے 'رسول وہ ہوتا ہے کہ جن کے لئے یہ حکم ہوتا ہے کہ وہ اس دعوت کو دوسروں تک پہنچائیں ۔ جبکہ نبی کی ذمہ داری یہ نہیں ہوتی کہ وہ لوگوں تک دعوت پہنچائیں' ان کا منصب یہ ہوتا ہے کہ وہ براہ راست اللہ سے ہدایت اور نظریہ لیتے ہیں ۔ بنی اسرائیل میں بہت سے نبی گزرے ہیں' ان کی دعوت یہ تھی کہ وہ حضرت موسیٰؑ کی دعوت اور دین کو قائم کریں ۔ تورات کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کریں' جو اللہ کی جانب سے آیا ہوا قانون ہے ۔

يحكم بها النبيون الذين اسلموا للذين هادوا والربانيون والاحبار بما

استحفظوا من كتٰب الله وكانوا عليه شهداء یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت یوں دی جاتی ہے کہ طور ایمن کی جانب سے اللہ نے ان سے کلام کیا ۔ ایمن یعنی دائیں جانب' سے 'یہ حضرت موسیٰؑ کے موقف کے اعتبار سے دایاں کہا ۔ حضرت موسیٰؑ اللہ کے اس قدر مقرب بندے تھے کہ انہوں نے قریب سے اللہ کے ساتھ کلام کیا اور یہ کلام مناجات کی صورت میں تھا ۔ ہمیں اس کلام کی کیفیت کا علم نہیں ہے' نہ ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ اس کلام کا ادراک حضرت موسیٰؑ نے کیسے کیا ۔ یہ کوئی آواز تھی جسے کان سن رہے تھے' یا یہ کوئی ایسی چیز تھی جو پورے جسد موسیٰؑ میں ڈال دی جاتی تھی ۔ یہ بھی ہم نہیں جانتے کہ حضرت موسیٰؑ کی شخصیت کو اس ازلی کلام کی وصولی کے لئے کس طرح تیار کیا گیا ۔ ہمارا ایمان فقط یہ ہے کہ ایسا ہوا ۔ اللہ کے لئے ہر چیز آسان ہے اور یہ بھی کوئی مشکل نہیں ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے ساتھ کسی نہ کسی طرح ڈائریکٹ رابطہ کرے ۔ انسان اپنی بشریت پر قائم ہو' اور اللہ کا کلام علوی اپنی علویت پر قائم ہو اور رابطہ ہو جائے ۔ آخر اس سے قبل بھی انسان اللہ کی جانب سے روح پھونکنے ہی سے انسان بنا ۔

پھر اللہ حضرت موسیٰ پر اپنی اس رحمت کا بھی ذکر فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان کو ان کے مطالبے پر ایک معاون اور مددگار کے طور پر ہارون دیا۔

وَ اَخِيْ هَارُوْنَ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْ اِنِّيْ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنَ (۲۸ : ۳۴) "اے اللہ ' میرے بھائی ہارون کو جو مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے 'بھی میرے ساتھ معاون بنا کر بھیج دے ' وہ میری تصدیق کرے گا 'کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ وہ میری تکذیب کر دیں گے"۔ اور ہارون کو اللہ کی رحمت نے ان کا ساتھی بنا دیا۔ اس پوری سورۃ میں رحمت ہی رحمت ہے۔

اب اولاد ابراہیم کی دوسری شاخ کو لیا جاتا ہے یعنی عربوں کے باپ اسماعیل کو۔

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ز اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ وَ كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ ص وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾

"اور اس کتاب میں اسماعیل کا ذکر کرو۔ وہ وعدے کا سچا تھا اور رسول نبی تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک ایک پسندیدہ انسان تھا"۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے صادق الوعد کی صفت لائی گئی ہے۔ ہر نبی اور صالح شخص کو صادق الوعد ہونا چاہئے اور ہوتا ہے۔ لیکن حضرت اسماعیل میں یہ صفت بہت ہی نمایاں تھی اس لئے ان کی خصوصی صفات میں سے یہاں اس صفت کو بیان کر دیا گیا۔

ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ "رسول نبی" تھے ' لہٰذا ان کی مخصوص دعوت ہو گئی۔ عرب میں حضور کے زمانے تک بعض موحدین پائے جاتے تھے۔ یہ انہی کی دعوت کے آثار باقیہ تھے۔ ان کے دین اور دعوت کے ارکان بھی یہاں گنوائے گئے ہیں ' زکوٰۃ اور صلوٰۃ اور تطہیر اہل خانہ ان کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں وہ پسندیدہ انسان تھے۔ رضائے خداوندی بھی اس سورۃ کی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ رحمت و رضامندی قریب قریب کی صفات ہیں۔

اس سبق کا خاتمہ ذکر ادریس علیہ السلام پر ہوتا ہے :

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ز اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾

"اور کتاب میں ادریس کا ذکر کرو ' وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھے اور اسے ہم نے بلند مقام پر اٹھایا تھا"۔

حضرت ادریس کے زمانے کے بارے میں صحیح معلومات نہیں ہیں۔ راجح بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے گزرے ہیں اور انبیائے بنی اسرائیل میں سے نہیں ہیں۔ اس لئے بنی اسرائیل کی کتابوں میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ قرآن کریم ان کو صدیق اور نبی کہتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ ایک عالی مقام شخص تھے ان کا ذکر دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔

بعض لوگوں کی رائے (ہم نہ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ انکار) یہ ہے کہ مصر کے ماہرین آثار قدیمہ نے یہ لکھا ہے کہ ادریس دراصل "اوزریس" کے لفظ کا عربی تلفظ ہے اور یہ قدیم مصری زبان کا لفظ ہے جس طرح یحیٰی یوحنا کا عربی تلفظ ہے اور الیسع الیشع کا عربی تلفظ ہے۔ ان کے بارے میں بہت سے قصے مشہور ہیں۔ یہ کہ وہ آسمانوں پر چلے گئے اور وہاں ان کے لئے ایک بڑا تخت بنایا گیا۔ یہ کہ جس شخص کی نیکیاں گناہوں پر بھاری ہوگئیں تو وہ دیوتا "اوزریس" کے پاس چلا جائے گا۔ یہ کہ "اوزریس" نے آسمانوں پر چڑھنے سے قبل لوگوں کو بہت سے علوم و معارف سکھائے۔ یہ بات دل کو لگتی ہے۔

بہرحال وہ جو بھی ہیں ہمارے لئے ان کے بارے میں قرآن مجید کی دی ہوئی معلومات کافی ہیں اور یہ بنی اسرائیل کے انبیاء سے پہلے گزرے ہیں۔

یہاں سیاق کلام میں ان انبیاء کا تذکرہ اس لئے کیا گیا ہے تاکہ یہ بتایا جائے کہ صحیح مومن 'اتقیاء اور انبیاء کیسے تھے اور وہ لوگ کیسے ہیں جو ان کی اولاد اور جانشیں ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں 'مثلاً عرب اور مشرکین بنی اسرائیل۔ دونوں کے درمیان بہت فاصلے اور دوریاں ہیں۔ دونوں کے درمیان نشیب و فراز بہت گہرے ہیں اور ان اسلاف اور ان اخلاف کے درمیان اب کوئی بھی چیز مابہ الاشتراک نہیں ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ۩ ﴿٥٨﴾ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ ۖ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾

"یہ وہ پیغمبر ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا 'آدم کی اولاد میں سے 'اور ان لوگوں کی نسل میں سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا 'اور ابراہیم کی نسل میں سے اور اسرائیل کی نسل میں سے اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور برگزیدہ کیا۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب رحمٰن کی آیات ان کو سنائی جاتیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے تھے۔ پھر ان کے بعد وہ ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات نفس کی پیروی کی 'پس قریب ہے کہ وہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں"۔

انسانی تاریخ کے باب نبوت میں 'قرآن کریم نے یہاں ممتاز ترین لوگوں پر اکتفاء کیا ہے۔ یہ مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ (۱۹ : ۵۸) "اولاد آدم سے" ہیں۔ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ (۱۹ : ۵۸) "اور ان لوگوں میں سے ہیں

جن کو ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا تھا"۔ اور وَمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْرَآءِيْلَ (۱۹:۵۸) "اور ابراہیم اور یعقوب کی اولاد میں سے"۔ آدم تو سب کے جد امجد ہیں 'نوح بھی آدم ثانی ہیں اور ابراہیم علیہ السلام نبوت کی دو مشہور شاخوں کے باپ ہیں اور یعقوب بنی اسرائیل کے جد امجد ہیں جن میں بے شمار رسول اور نبی آئے اور اسماعیل کی طرف عربوں کی نسبت ہے جن کی اولاد میں نبی آخر الزمان مبعوث ہیں۔ یہ نبی اور ان کا اتباع کرنے والے صالح اور برگزیدہ لوگ اور ان کی اولاد 'یہ کون لوگ ہیں؟ ان کی ممتاز صفت یہ ہے۔

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا (۱۹:۵۸ السجدۃ) "جب رحمن کی آیات ان کو سنائی جاتیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے تھے"۔ یہ ایسے پرہیزگار لوگ تھے جو ذات باری کے بارے میں بہت ہی حساس تھے۔ جب اللہ کی آیات ان کے سامنے تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کے وجدان میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ ان پر اس قدر اثر ہوتا ہے کہ اس کے اظہار کے لئے ان کو موزوں کلمات نہیں ملتے جن کے ذریعے وہ اپنے احساسات کا اظہار کر سکیں۔ ان احساسات کا اظہار وہ آنسوؤں سے کرتے ہیں اور معاً سجدے میں گر کر اور رو کر وہ اپنے جذبات اندرونی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان حساس 'متقی آیات الٰہی سن کر رونے والوں کے بعد پھر کون آیا؟ ان کے بعد ایسے اخلاف آئے جو اللہ سے دور ہو گئے۔

اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ (۱۹:۵۹) "جنہوں نے نمازوں کو ضائع کر دیا"۔ نمازوں کو چھوڑ دیا اور ان کا انکار ہی کر دیا۔

وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ (۱۹:۵۹) "انہوں نے خواہشات نفس کی پیروی شروع کر دی"۔ پیروی خواہشات میں غرق ہو گئے۔ ذرا غور کیجئے کہ اسلاف اور اخلاف کے درمیان کس قدر فرق ہو گیا ہے اور ان کے درمیان مشابہت کے عام خدوخال مٹ گئے۔

ایسے لوگوں کو قرآن کریم تہدید آمیز تنبیہ کرتا ہے کہ وہ گمراہ ہو گئے ہیں' انہوں نے اپنے صالح آباء کی پاک سیرتوں کو چھوڑ دیا ہے اس لیے فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۱۹:۵۹) "پس قریب ہے کہ وہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں"۔ غی کا مفہوم ہے گمراہی یعنی وہ گمراہ ہو جائیں گے اور بے راہ روی کا شکار ہو جائیں گے اور انجام یہ ہو گا کہ وہ تباہ ہو جائیں گے۔

لیکن ان اندوہناک اور تباہ کن حالات کے باوجود قرآن توبہ کا دروازہ کھول دیتا ہے جہاں سے باد رحمت کے تازہ جھونکے آتے ہیں اور اللہ کی مہربانی اور نعمتوں کے راستے کھلے نظر آتے ہیں۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ
وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۝ جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّهٗ
كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ۝ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا

بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿٦٢﴾ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿٦٣﴾

"البتہ جو توبہ کریں اور ایمان لے آئیں اور نیک عملی اختیار کرلیں ' وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہوگی۔ ان کے لئے ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں سے درپردہ وعدہ کر رکھا ہے اور یقیناً یہ وعدہ پورا ہو کر رہنا ہے۔ وہاں وہ کوئی بیہودہ بات نہ سنیں گے ' جو کچھ بھی سنیں گے ' ٹھیک ہی سنیں گے اور ان کا رزق انہیں پیہم صبح و شام ملتا رہے گا۔ یہ ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اس کو بنائیں گے جو پرہیزگار رہا ہے"۔

وہ توبہ جو ایمان اور عمل صالح پیدا کر دیتی ہے ' وہی صحیح معنوں میں توبہ ہوتی ہے اور وہی برے انجام سے انسان کو بچاتی ہے۔ ایسے حقیقی تائب برے انجام تک پہنچنے سے بچ جاتے ہیں۔ وہ تو جنت میں جاتے ہیں اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہیں ہوتا۔ جنت میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے داخل ہوتے ہیں۔ وہ جنت جس کا وعدہ اللہ نے اپنے بندوں سے کر رکھا ہے۔ وہ اس پر ایمان لائے اور دیکھنے سے قبل ہی اس پر یقین کیا۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کا وعدہ کبھی ضائع نہیں ہوتا۔

اہل جنت اور جنت کی تصویر کیا ہوگی؟

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا (۱۹ : ۶۲) "وہاں وہ کوئی بیہودہ بات نہ سنیں گے ' جو بات بھی سنیں گے صحیح سنیں گے"۔ کوئی فضول بات وہاں نہ ہوگی ' نہ شور و شغب ہو گا۔ وہاں ہر طرف سے سلامتی ہی سلامتی ہو گی۔ اس جنت میں ضروریات اور رزق ہر وقت مطابق خواہش دستیاب ہو گا۔ کسی نفس کو کوئی قلق نہ ہو گا ' کوئی خوف نہ ہو گا۔ کسی چیز کی کمی کا خطرہ نہ ہو گا۔

وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (۱۹ : ۶۲) "اور ان کا رزق انہیں صبح و شام پیہم ملتا رہے گا"۔ مطابق خواہش --- غرض نہایت ہی خوشگوار ماحول ہو گا اور اللہ کی نعمتوں کا ہر سو اعلان ہو گا۔

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا (۱۹ : ۶۳) "یہ ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اس کو بنائیں گے جو پرہیزگار رہا ہے"۔ جو شخص جنت کی وراثت چاہتا ہے ' اسے اللہ نے راہ بتا دی ہے۔ یعنی توبہ ' ایمان ' عمل صالح۔ نسبی وراثت کو یہاں ذریعہ استحقاق نہیں بنایا ہے۔ نسبی لحاظ سے ایک قوم نے ان برگزیدہ صالحین کی وراثت پائی تھی مگر انہوں نے نماز اور زکوٰۃ کو ضائع کر دیا اور شہوات نفسانیہ کے پیچھے پڑ گئے۔ ان کو نسبی وراثت نے کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ ایسے لوگ جلد ہی فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۱۹ : ۵۹) "برے انجام تک پہنچ جائیں گے"۔

اس سبق کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اللہ رب مطلق ہے۔ اس کی عبادت اور بندگی کرو اور اس راہ کی مشکلات پر صبر کرو اور اس کی شبیہ اور نظیر کا انکار کرو۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ

ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ
وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۚ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾ ع ۱۵

"اے نبیؐ! ہم تمہارے رب کے حکم کے بغیر نہیں اترا کرتے۔ جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے' ہر چیز کا مالک وہی ہے اور تمہارا رب بھولنے والا نہیں ہے۔ وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا جو آسمانوں اور زمین کے درمیان ہیں' پس تم اس کی بندگی کرو اور اسی کی بندگی پر ثابت قدم رہو۔ کیا ہے کوئی اور ہستی تمہارے علم میں اس کی ہم پایہ؟"

اس بارے میں کافی روایات ہیں کہ

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ (۱۹: ۶۴) "اے محمدؐ! ہم تمہارے رب کے حکم کے بغیر نہیں اترا کرتے"۔ اللہ کے حکم کے مطابق جبرائیل نے یہ بات اپنی زبان میں کہی کیونکہ کسی موقع پر جب وحی نہ آئی تو آپ کو وحشت اور پریشانی لاحق ہو گئی اور آپ کا شوق بڑھ گیا کہ کیوں اس قدر طویل عرصہ عالم بالا سے رابطہ نہیں ہوا۔ چنانچہ اللہ نے جبرائیل کو حکم دیا کہ تم یہ پیغام دے دو اور کہہ دو کہ ہم تو اللہ کے حکم کے مطابق نازل ہوتے ہیں اور حکم دینا اللہ کا کام ہے۔

لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ (۱۹: ۶۴) "جو کچھ ہمارے آگے ہے' جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے ہر چیز کا مالک وہی ہے"۔ وہ کسی چیز کو بھلاتا نہیں۔ وحی تب ہی نازل ہوتی ہے جب اللہ کی حکمت کا تقاضا ہو کہ نازل ہو جائے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا (۱۹: ۶۴) "اور تمہارا رب بھولنے والا نہیں ہے"۔ اس کے بعد شاید یہی تھا کہ آپ کو صبر کرنے کی تلقین کی جائے اور یہ حکم دیا جائے کہ آپ اللہ کی بندگی پر جم جائیں' صرف اللہ کو اپنا رب سمجھیں۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (۱۹: ۶۵) "وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان کے درمیان ساری چیزوں کا"۔ اس کے سوا کوئی رب نہیں' اس عظیم کائنات میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ (۱۹: ۶۵) "اسی کی بندگی پر ثابت قدم رہو"۔ اسلام میں عبادت صرف مراسم پرستش کا نام نہیں ہے۔ ہر تصور' ہر ارادہ' ہر حرکت اور ہر سرگرمی عبادت کے دائرے میں آتی ہے اور یہ نہایت ہی مشکل کام ہے کہ انسان زندگی کے پورے معاملات میں صرف اللہ کی بندگی کرتا ہے' اس لیے اس کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے اور بڑے صبر اور ثابت قدمی کی ضرورت ہے اس لئے ضروری ہے اس زمین کی تمام

سرگرمیوں میں انسان آسمان کی طرف متوجہ رہے۔ زمین کی آلودگیوں میں 'مادی ضروریات کی کشاکش میں' خواہشات نفس کے دباؤ میں اور زندگی کے گوناگوں نشیب و فراز میں۔

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ انسان کو اس کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ اسے اپنے اندر یہ شعور پیدا کرتا ہے کہ ہر چھوٹے بڑے معاملے میں وہ درحقیقت اللہ کی اطاعت کر کے عبادت کر رہا ہے۔ اس طرح اس کی پوری زندگی اور اس کی ہر حرکت، ہر روش عالم بالا سے مل کر طاہر اور پاکیزہ ہو جاتی ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو بہت بڑے صبر، بہت بڑی جدوجہد اور بہت بڑی محنت کا طلبگار ہے۔

"اللہ کی بندگی کرو' اس کی بندگی پر جم جاؤ کیونکہ اللہ ہی وہ واحد ذات ہے جو اس لائق ہے کہ دل و دماغ اس کی طرف متوجہ ہوں' کیونکہ کوئی اس کا ہمسر' کوئی اس کا ہم نام نہیں اور کوئی اس کا ہم پایہ نہیں ہے۔ کیا اللہ کی کوئی نظیر ہے؟ ہرگز نہیں' وہ نظیر اور شبیہ سے پاک ہے۔ صدق اللہ العظیم!

---ooo---

# درس نمبر ۱۳۷ ایک نظر میں

اس سورہ میں حضرت زکریاؑ کا قصہ گزر گیا ہے اور حضرت یحییٰؑ کی ولادت کی بات بھی گزر گئی ہے۔ حضرت مریمؑ کا قصہ اور حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا واقعہ بھی گزر گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی جانب سے باپ اور قوم کو چھوڑ دینے کا قصہ اور ان حضرات کے بعد آنے والے اہل ہدایت اور اہل ضلالت کا ذکر بھی گزرا ہے۔ ان سب قصوں کے بعد یہ ذکر آیا کہ اس کائنات کا رب وحدہ لاشریک ہے اور وہی بلا شریک عبادت کا مستحق ہے۔ یہ تمام قصص صرف اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ اللہ وحدہ ہی قابل عبادت و بندگی ہے۔

اس مضمون کے بعد اب یہ پورا سبق عقیدۂ توحید اور عقیدۂ بعث بعد الموت کے بارے میں ہے۔ ان عقائد کو مناظر قیامت کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور یہ مناظر تاثرات اور زندگی کی ہماہمی سے بھرپور ہیں، پھر پوری کائنات بھی ان مناظر میں شریک محفل ہے۔ تمام انسان اور پوری زمین، تمام انسان اور تمام جن، مومنین بھی اور کافر بھی ان مناظر میں اسٹیج کے کردار ہیں۔

پھر یہ مناظر اس دنیا سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور قیامت کی طرف بھی نکل جاتے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ گویا ایک ہی اسٹیج پر دنیا و آخرت دونوں کے مناظر دکھائے جا رہے ہیں۔ آغاز اس دنیا سے ہوتا ہے اور انجام آخرت میں جاکر نہایت ہی موثر انداز میں دکھایا جاتا ہے۔ دنیا و آخرت میں بس چند آیات و چند کلمات کا فاصلہ رہ جاتا ہے جس سے پردہ شعور انسانی پر یہ احساس ابھر آتا ہے کہ یہ دنیا اور وہ جہاں دونوں ایک اسٹیج اور منظر کے دو حصے ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۳۷ تشریح آیات

## ٦٦ -- تا -- ۹۸

وَ يَقُولُ الْإِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ يَكُ شَيْئًا ﴿٦٧﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَ الشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ أَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾ وَ إِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧١﴾ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿٧٢﴾

”انسان کہتا ہے کیا واقعی جب میں مرچکوں گا تو پھر زندہ کر کے نکال لایا جاؤں گا؟ کیا انسان کو یاد نہیں آتا کہ ہم پہلے اس کو پیدا کر چکے ہیں جبکہ وہ کچھ بھی نہ تھا؟ تیرے رب کی قسم ہم ضرور ان سب کو اور ان کے ساتھ شیاطین کو بھی گھیر لائیں گے ۔ پھر جہنم کے گرد لاکر انہیں گھٹنوں کے بل گرا دیں گے ' پھر ہر گروہ میں سے ہر اس شخص کو چھانٹ لیں گے جو رحمٰن کے مقابلے میں زیادہ سرکش بنا ہوا تھا ' پھر یہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے کون سب سے بڑھ کر جہنم میں جھونکے جانے کا مستحق ہے ۔ تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو جہنم پر وارد نہ ہو ' یہ تو ایک طے شدہ بات ہے جسے پورا کرنا تیرے رب کے ذمے ہے ۔ پھر ہم ان لوگوں کو بچالیں گے جو (دنیا میں) متقی تھے اور ظالموں کو اسی میں گرا ہوا چھوڑ دیں گے“ ۔

پہلے انسان اسٹیج پر آتا ہے اور وہ بعث بعد الموت کے بارے میں اپنا موقف بیان کرتا ہے ۔ وہ ایک ایسی بات کرتا ہے جسے آج تک کئی انسان دہراتے چلے آئے ہیں ۔ مختلف زمانوں میں انسانوں نے یہی بات کہی ہے ۔ گویا یہ ایک عالمی انسانی شبہ ہے اور تمام قوموں اور تمام نسلوں کو اس سوال نے ستایا ہے ۔

وَ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَ اِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا (۱۹ : ٦٦) ”انسان کہتا ہے کیا واقعی جب میں مرچکوں گا تو پھر زندہ کر کے نکال لایا جاؤں گا؟“ یہ سوال انسان کے دل میں محض اس کی غفلت کی وجہ

سے پیدا ہوا ہے۔ اس نے غور نہیں کیا کہ وہ موجود ہے اور اسے بہرحال پیدا کیا گیا ہے' تو وہ موجود ہے۔ یہ کہاں تھا؟ کیسے تھا؟ یقیناً یہ نہ تھا پھر ہوا۔ اگر انسان ذرا بھی غور کرتا تو وہ سمجھ جاتا کہ پہلی بار کی پیدائش کے مقابلے میں دوبارہ اٹھانا تو بہت آسان کام ہے۔

اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا (۱۹: ۶۷) "کیا انسان کو یاد نہیں آتا کہ ہم نے پہلے اس کو پیدا کر چکے ہیں جبکہ وہ کچھ بھی نہ تھا؟"

آگے جا کر اس انکار اور زبردستی کے انکار پر ذرا تہدید آمیز لہجے میں بات کی جاتی ہے۔ اللہ اپنی ذات کی قسم اٹھاتے ہیں اور ذات باری کی قسم ایک عظیم قسم ہے کہ لازماً ان لوگوں کو اور تمام لوگوں کو اٹھایا جائے گا۔ ان کو اٹھا کر میدان حشر میں لایا جائے گا اور یہ ایک فیصلہ شدہ اور طے شدہ امر ہے۔

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ (۱۹: ۶۸) "تیرے رب کی قسم ہم ضرور ان سب کو اٹھائیں گے"۔ اور یہ اکیلے ہی نہ ہوں گے۔ ان کے ساتھ شیاطین کو بھی اٹھائیں گے۔ کیونکہ یہ اور شیاطین ایک ہی قماش کے لوگ ہیں۔ یہ شیاطین ہی تو ہیں جو ان کے دلوں میں ایسے شبہات پیدا کرتے ہیں۔ یہ تو تابع ہیں اور شیاطین ان کے لیڈر ہیں۔ ان کے درمیان تابع اور متبوع کا رشتہ ہے۔

اب اگلے مرحلے میں یہ سب گھٹنوں کے بل آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ ان کی نہایت ہی برے حال کی حسی تصویر ہے۔ سخت شرمندگی اور توہین آمیز حالت میں ہیں یہ لوگ۔

ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا (۱۹: ۶۸) "پھر جہنم کے گرد لا کر انہیں گھٹنوں کے بل گرا دیں گے"۔ یہ ایک مجسم منظر ہے' بے حد و حساب لوگ جمع کیے گئے ہیں' جہنم کی طرف ان کو اہانت آمیز انداز میں گھٹنوں کے بل لایا جا رہا ہے۔ یہ لاچاری میں اسے دیکھ رہے ہیں اور اس کے شعلوں کی لپٹوں کو محسوس کرتے ہیں۔ ہر وقت وہ اس خوف میں ہیں کہ ابھی پکڑے گئے اور اس میں پھینکے گئے۔ جزع و فزع میں وہ گھٹنوں کے بل چلے اور اوندھے گرا دیئے گئے۔

دنیا کے جباروں اور قہاروں کے لئے یہ بہت ہی توہین آمیز منظر ہے۔ اس منظر میں ان منکرین کی صفوں سے ان لوگوں کو چھانٹا جا رہا ہے جو اوروں کے مقابلے میں زیادہ سرکش تھے۔ کھینچ کھینچ کر ان کو باہر صفوں سے نکالا جا رہا ہے۔

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا (۱۹: ۶۹) "پھر چھانٹ کر نکالیں گے ہم ہر گروہ سے ان لوگوں کو جو اللہ کے شدید نافرمان تھے"۔ چھانٹ لینے کے لئے نہایت ہی تاکیدی مشدد لفظ استعمال ہوا ہے' تاکہ لفظ کی سختی' تشدید اور معنوی مبالغہ چھانٹ لینے کے عمل کو مزید خوفناک بنا دے' جس کے بعد پھر ان لوگوں کو جہنم میں پھینکنے کا عمل آتا ہے۔ خیال ان تمام حرکات کو عملی شکل دیتا ہے۔

اللہ اس بات کو خوب جانتا ہے کہ ان میں سے کوئی جہنم میں پھینکے جانے کا مستحق ہے۔ اس لئے وہ ان لاتعداد اور ان گنت انسانوں کے سیلاب میں سے ان کو چن کر باہر نکال لائے گا۔

ثُمَّ لَنَحۡنُ اَعۡلَمُ بِالَّذِیۡنَ هُمۡ اَوۡلٰی بِهَا صِلِیًّا (۱۹ : ۷۰) "پھر ہم یہ جانتے ہیں کہ ان میں سے کون سب سے بڑھ کر جہنم میں جھونکے جانے کا مستحق ہے"۔ ان کو وہ نکال لائے گا اور وہ جہنم میں ڈالے جانے والوں کا ہراول دستہ ہوں گے۔ اس منظر کو اہل ایمان دیکھ رہے ہوں گے۔

وَ اِنۡ مِّنۡکُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ کَانَ عَلٰی رَبِّکَ حَتۡمًا مَّقۡضِیًّا (۱۹ : ۷۱) "اور تم میں سے کوئی ایسا نہیں جو جہنم پر وارد نہ ہو' یہ تو ایک طے شدہ بات ہے' جسے پورا کرنا تیرے رب کے ذمہ ہے"۔ تمام لوگ جہنم کے قریب کئے جائیں گے اور جب وہ جہنم کو دیکھیں گی تو اس کی آگ کے شعلے بلند ہوں گے' جوش میں ہوں گے اور پھٹ رہے ہوں گے۔ وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ نافرمان بندے لوگوں میں سے نکالے جائیں گے اور اس میں گرائے جائیں گے۔

ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا (۱۹ : ۷۲) "پھر ہم ان لوگوں کو بچالیں گے جو دنیا میں متقی تھے"۔ یہ دوزخ ان سے دور ہو جائے گی اور وہ اس میں ڈالے جانے سے بچالئے جائیں گے اور

وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِیۡنَ فِیۡهَا جِثِیًّا (۱۹ : ۷۲) "اور ظالموں کو اس میں گرا ہوا چھوڑ دیں گے"۔
اب روئے سخن اس ڈراؤنے منظر سے پھر جاتا ہے جس میں نافرمان نہایت ہی اہانت کے ساتھ گھٹنوں کے بل چلائے جا رہے ہیں' جس میں متقی لوگ نجات پا جاتے ہیں اور ظالموں کو اوندھے منہ جہنم میں گرا ہوا چھوڑا جا رہا ہے۔ یکایک ہم پھر دنیا میں آ جاتے ہیں' یہاں اہل کفر اہل ایمان کے مقابلے میں اپنی بڑائی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کو ان کی بدحالی پر طعنے دیتے ہیں۔ اپنی دولت مندی پر' ظاہری شان پر اور دنیاوی قدروں پر فخر کرتے ہیں حالانکہ یہ دار فنا کی چیزیں ہیں' ختم ہونے والی قدریں ہیں۔

وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا ۙ اَیُّ الۡفَرِیۡقَیۡنِ خَیۡرٌ مَّقَامًا وَّ اَحۡسَنُ نَدِیًّا ﴿۷۳﴾

"ان لوگوں کو جب ہماری کھلی کھلی آیات سنائی جاتی ہیں تو انکار کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں" بتاؤ ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالت میں ہے اور کس کی مجلسیں زیادہ شاندار ہیں"۔
بڑی بڑی مجلسیں اور عیش و طرب کی محفلیں اور وہ قدریں جن پر کبراء اور مترفین زمانہ اخلاقی فساد میں عمل پیرا ہوا کرتے ہیں اور ان کے مقابلے میں بظاہر نچلے درجے کی سوسائٹیاں اور غربت و افلاس والوں کی محفلیں جن میں ایمان کے سوا اور کوئی ساز و سامان کم ہی ہوتا ہے۔ نیز ان میں زیب و زینت اور شان و شوکت کم ہوتی ہے۔ نہ قیمتی لباس ہوتے ہیں اور نہ قیمتی جائے قیام۔ اس دنیا میں لوگ ان ہی چیزوں میں باہم مقابلہ کرتے ہیں اور ان ہی کی بنیاد پر طبقاتی امتیازات قائم ہوتے ہیں۔
اس مقابلے اور نمائش گاہ میں' پہلے طبقے کے اسٹال پر بڑا بڑا دنیاوی ساز و سامان' مال و جمال' قوت اور مرتبہ'

بڑے بڑے مفادات ' بڑی بڑی آمدنیاں 'کھانے پینے کے لذیذ سازوسامان ہوتے ہیں اور دوسرے طبقے کے اسٹال پر فقرو تواضع ہے - ایسا سازوسامان جو کبرا کے ہاں قیمتی ہے ' ان کی نظروں میں حقیر ہے ' جاہ و مرتبہ ان کے ہاں پرکاہ کے برابر ہے - یہ دوسرا اسٹال عیش طرب کے لئے نہیں - مفادات کے لئے نہیں ' حکام کے ہاں اثر و رسوخ کے لئے نہیں ' اقتدار ہر فقر کے لئے نہیں بلکہ محض نظریاتی متاع گراں بہا کی طرف بلاتا ہے ' اس اسٹال پر کوئی قیمتی دنیاوی مال و متاع نہیں ہے ' کوئی آرائش و زیبائش نہیں ہے لیکن وہاں اللہ کے کلمے کی سربلندی کا داعی ہے ' صرف کلمہ حق کی سربلندی کی طرف یہ دوسرا فریق بلاتا ' نہ صرف یہ کہ یہاں مذکور دنیاوی چیزیں نہیں بلکہ مشقت ' جدوجہد اور قربانیاں ہیں - ان تمام مشقتوں کا عوض بھی اس دنیا میں نہیں ہے - یہاں انہیں صرف اللہ کا قرب حاصل ہو گا ' جہاں تک اجر اور جزاء کا تعلق ہے وہ آخرت میں ہے -

یہ قریش جن کو حضور اکرمؐ کے دور میں آیات الہیہ سنائی جا رہی تھی ' وہ اہل ایمان فقراء کو دیکھ کر یہ کہتے تھے :

اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا (۱۹ : ۷۳) "بتاؤ ' ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالات میں ہے اور کس کی مجلسیں زیادہ شاندار ہیں" - وہ کبرا بہتر ہیں جو محمدؐ پر ایمان نہیں لاتے یا وہ فقراء بہتر ہیں جو اس کے ارد گرد جمع ہیں ' ان میں سے کن کے حالات دنیاوی اعتبار سے بہتر ہیں اور کس کی سوسائٹی شاندار ہے - ایک طرف نضیر ابن حارث ' عمرو ابن ہشام ' ولید بن مغیرہ اور ان کے بھائی اور دوسرے سردار ہیں اور دوسری جانب بلال ' عمار ' خباب اور ان کے دوسرے بھائی ہیں جن کے پاس ایک کوڑی نہیں ہے - اگر محمدؐ جن باتوں کی طرف بلاتے ہیں وہ اچھی ہوتیں تو ان کے ساتھی یہ لوگ جن کی قریش کی سوسائٹی میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے اور نہ ان کا کوئی رعب ہے - یہ لوگ سب کے سب ایک مسکین خباب کے گھر جمع ہوتے ہیں جو غریب اور بے روزگار ہے - اور محمدؐ کے مخالف بڑی بڑی شاندار مجالس میں بیٹھتے ہیں اور سوسائٹی میں ان کا اونچا مرتبہ ہے -

یہ ہے دنیا پرستوں کی منطق اور ان کی سوچ - ہر زمان و مکان میں دنیا پرستوں اور کوتاہ بینوں کی یہی انداز فکر ہوتی ہے - اللہ کی حکمت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ دعوت اسلامی اور اس کے حاملین دنیاوی زیب و زینت سے خالی ہوں ' زیب و زینت اور مصنوعی رنگ و روغن ان کی اصل حقیقت کو نہ چھپا سکے - ان کی کسی چیز میں کوئی کلاکاری نہ ہو - اس دعوت کو ان داعیوں کی قیادت کو قبول کرنا چاہے وہ خالص اللہ کے لئے قبول کریں ' اس دعوت کو قبول کریں - اس میں دنیا اور دنیا پرستوں کا کوئی کردار نہ ہو - ان میں کوئی نمائش اور طمع کاری نہ ہوتا کہ جو لوگ دنیا کے مفادات چاہتے ہیں ' دنیا کا نفع چاہتے ہیں وہ اس طرف نہ آئیں جو دنیا کی زیب و زینت چاہتے ہیں ' شان و شوکت چاہتے ہیں اور مال و متاع چاہتے ہیں وہ دور رہیں -

ان پر خود غلط گمراہوں اور کافروں کی منطق ' شان و شوکت اور زیب و زینت کی نمائش کرنے والوں کی اس طرز فکر کو ایک وجدانی چٹکی سے ذرا تاریخ انسانیت کی طرف موڑ دیا جاتا ہے کہ تاریخ انسانی میں کئی اقوام ' اس قسم کا ٹھاٹھ ہر شاندار مقام عزت رکھتی تھیں ' دنیا کے مال و متاع اور نعمتوں میں مست تھیں لیکن ذرا دیکھو ' ان کا کیا انجام ہوا؟

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّ رِءْيًا ۝

"حالانکہ ان سے پہلے ہم کتنی ہی ایسی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو ان سے زیادہ سروسامان رکھتی تھیں اور ظاہری شان و شوکت میں ان سے بڑھی ہوئی تھیں"۔

ہوا یہ کہ ان کی اس شان و شوکت نے ان کو کوئی فائدہ نہ دیا۔ ان کے زیب و زینت نے ان کو عذاب الہی سے نہ بچایا۔ جب ان پر ہلاکت آئی تو یہ سب ظاہرداریاں مٹ گئیں۔

یاد رکھو' انسان بہت جلد بھول جاتا ہے۔ اگر وہ ذرا بھی تاریخ کے اسباق یاد کرتا اور ذرا بھی غور کرتا تو وہ ان ظاہر داریوں پر کبھی غرور نہ کرتا حالانکہ انسانی تاریخ میں جو اقوام ہلاک ہوئیں' ان کی ہلاکتوں اور بربادیوں میں بہت بڑا سامان عبرت ہے۔ تاریخ انسانی انسان کے دامن کو پکڑ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتی ہے کہ ذرا دیکھو' خدا کے عذاب سے ڈرو' اللہ کی پکڑ سے خوف کھاؤ۔ لیکن انسان ہے کہ سرنیچے کئے ہوئے اپنی غلط روش پر چل رہا ہے۔ وہ پیچھے کی طرف نہیں دیکھتا کہ آگے جاتے ہوئے ٹھوکروں سے بچے' حالانکہ اقوام ماضی میں سے جن لوگوں کو ٹھوکر لگی وہ ان سے زیادہ صاحب قوت تھیں' زیادہ دولت مند تھیں' زیادہ آبادی والی تھیں۔

لیکن اس اچٹتی نظر کے بعد قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ ان لوگوں کے لئے یہ وجدانی اشارہ کافی نہیں ہے۔ ان کو چیلنج کے انداز میں کہو کہ اچھا جو گروہ گمراہی میں اور غلط راستے پر ہے' اللہ اسے مزید گمراہ کرے اور وہ پہنچے اس انجام تک جو گمراہوں کا قدرتی انجام ہوتا ہے خواہ اس جہاں میں یا آخرت میں۔

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ۝ وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ۝

ان سے کہو' جو شخص گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے اسے رحمٰن ڈھیل دیتا ہے یہاں تک کہ جب ایسے لوگ وہ چیز دیکھ لیتے ہیں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے--- خواہ وہ عذاب الہی ہو یا قیامت کی گھڑی--- تب انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کا حال خراب ہے اور کس کا جتھا کمزور! اس کے برعکس جو لوگ راہ راست اختیار کرتے ہیں اللہ ان کو راست روی میں ترقی عطا فرماتا ہے اور باقی رہ جانے والی نیکیاں تیرے رب کے نزدیک جزاء اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہیں"۔

ان لوگوں کا زعم یہ ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے متبعین سے زیادہ صحیح راستے پر ہیں محض اس لیے کہ وہ دولت مند ہیں' شان و شوکت والے ہیں۔ اچھا ان کی دولت اور شان میں اور اضافہ ہو' اور اے محمدؐ تم ان کو یہ بددعا دو کہ گمراہی میں یہ اور دور نکل جائیں۔ اللہ ان کی رسی اور دراز کر دے۔ اہل ہدایت کو مزید ہدایت دے تاکہ یہ لوگ اپنے انجام تک پہنچ جائیں اور ان کا انجام یہی ہو سکتا ہے کہ یا دنیا میں ان کو مسلمانوں کے ہاتھوں سزا دی جائے اور یا آخرت میں ان کو سزا دی جائے۔ اس وقت پھر ان کو صحیح صورت حالات کا علم ہو جائے گا' کہ کس کا مقام و مرتبہ اچھا ہے

اور کون کمزور اور ناتواں اور بے بس ہے۔ اس وقت مسلمان بہت خوش ہوں گے اور عزت پائیں گے۔

وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ مَّرَدًّا (۱۹:۷۶) "اور باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک جزا اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہیں"۔ ان تمام چیزوں سے بہتر ہیں جن پر اہل دنیا فخر کرتے ہیں اور گمراہ ہوتے ہیں۔

اب کافروں کے فخر و مباہات کا ایک دوسرا نمونہ ملاحظہ ہو۔ ان کی ایک دوسری بات جس پر تعجب کر کے سخت نکیر کی جاتی ہے۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ﴿۷۷﴾ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾ كَلَّا سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَ نَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾ وَّ نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَ يَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾

"کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جو ہماری آیات کو ماننے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تو مال اور اولاد سے نوازا ہی جاتا رہوں گا؟ کیا اسے غیب کا پتہ چل گیا ہے یا اس نے رحمٰن سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟ ہرگز نہیں، جو کچھ یہ بکتا ہے اسے ہم لکھ لیں گے اور اس کے لئے سزا میں اور زیادہ اضافہ کریں گے۔ جس سروسامان اور لاؤلشکر کا یہ ذکر کر رہا ہے وہ سب ہمارے پاس رہ جائے گا اور یہ اکیلا ہمارے سامنے حاضر ہو گا"۔

اس آیت کے شان نزول میں حضرت خباب ابن الارت کی یہ روایت آئی ہے: "میں ایک لوہار تھا۔ عاص ابن وائل پر میرا قرض تھا۔ میں اس کے پاس آیا اور اس سے اپنے قرضے کا تقاضا کیا تو اس نے کہا خدا کی قسم میں تجھے ہرگز تمہارا قرض نہ دوں گا جب تک تم محمدؐ پر ایمان لانے سے انکار نہ کر دو۔ تو میں نے کہا خدا کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں حضرت محمدؐ کی نبوت کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ تم ایک بار مر کر دوبارہ زندہ نہ ہو جاؤ۔ اس نے کہا اچھا پھر جب میں مر گیا اور دوبارہ زندہ ہو گیا تو وہاں میرے پاس بہت مال ہو گا، میری اولاد ہو گی، وہاں آنا میرے پاس میں آپ کو قرض دے دوں گا۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا (۱۹:۷۷) "تو نے دیکھا اس شخص کو، جو ہماری آیات کے ماننے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تو مال اور اولاد سے نوازا ہی جاتا رہوں گا"۔

عاص ابن وائل کی یہ بات کفار قریش کے اس مذاق کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے جو وہ بعث بعد الموت کے نظریہ کے ساتھ کرتے تھے۔ قرآن کریم ایسے لوگوں کی سوچ پر تعجب سے یہ تبصرہ اور گرفت کرتا ہے۔

اَطَّلَعَ الْغَيْبَ (۱۹:۷۸) "کیا اسے غیب کا پتہ چل گیا ہے"۔ کیا اسے قبل از وقت معلوم ہے کہ وہاں کیا ہو گا۔

اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (۱۹ : ۷۸) "یا اس نے رحمٰن سے کوئی عہد لے رکھا ہے" اور اسے یقین ہے کہ اللہ اپنے عہد کا پابند ہے۔ اس کے بعد کہا جاتا ہے۔

کَلَّا "ہرگز نہیں"۔ کلا نفی اور زجر کا لفظ ہے۔ نہ اسے غیب کا علم ہے اور نہ اس نے اللہ سے کوئی وعدہ لے رکھا ہے بلکہ یہ کفر پر تل گیا ہے اور محض مذاق کرتا ہے۔ ایسے مقامات پر ایسے کافروں کے لائق یہی ہے کہ انہیں تہدید آمیز تنبیہ کر دی جائے۔

کَلَّا سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَ نَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا (۱۹ : ۷۹) "ہرگز نہیں، جو کچھ یہ بکتا ہے اسے ہم لکھ لیں گے اور اس کے لئے سزا میں اور اضافہ کریں گے"۔ یعنی وہ جو کچھ کہتا ہے اسے لکھیں گے کہ یوم الحساب کے لئے حسب معمول اس کا ریکارڈ تیار ہو تاکہ نہ وہ بھولے اور نہ مغالطہ ہو، یہ تہدید اور ڈراوے کی نہایت ہی بہترین تصویر کشی ہے۔ حالانکہ مغالطہ تو وہاں ہو نہیں سکتا۔ اللہ کا علم تو نہ صغیرہ کو چھوڑتا ہے اور نہ کبیرہ کو۔ یعنی ہم اس کے عذاب کو طویل و عریض کرتے چلے جائیں گے۔ اس میں کوئی کمی اور کوئی انقطاع نہ ہو گا۔ مزید ڈراوا تصویر کشی کے انداز میں ملاحظہ ہو۔

وَّ نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ (۱۹ : ۸۰) "جس سرو سامان اور لاؤ لشکر کا یہ ذکر کر رہا ہے وہ سب ہمارے پاس رہ جائے گا" یہ جو مال و اولاد چھوڑے گا اسے ہم اس طرح لے لیں گے جس طرح وارث اپنی موروثہ اشیاء کو لے لیتا ہے۔

وَ يَاْتِيْنَا فَرْدًا (۱۹ : ۸۰) "یہ اکیلا ہمارے سامنے حاضر ہو گا"۔ اس کے پاس نہ مال ہو گا، نہ اولاد ہو گی اور نہ کوئی مددگار ہو گا، نہ کوئی سند و ثبوت ہو گا۔ یہ اکیلا، ضعیف و ناتواں ہمارے سامنے ہو گا۔ تو کیا تو نے ایسے شخص کو دیکھا ہے کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتا ہے، وہ اس دن کے ساتھ مذاق کرتا ہے جس دن یہ تہی دست ہو گا۔ اس دنیا میں اس کے تمام مملوکات اس کے ہاتھ سے چلے جائیں گے۔ یہ شخص ہے نمونہ کفر اور مثال کفار، انکار، ادعا اور گمراہی کی مثال۔ اب یہاں بتایا جاتا ہے کہ کفر اور شرک کی علامات کیا ہیں۔

وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَ يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۳﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿۸۴﴾ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۵﴾ وَّ نَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۶﴾ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ

عَهْدًا ﴿٨٧﴾

"ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے کچھ خدا بنا رکھے ہیں کہ وہ ان کے پشتیبان ہوں گے ۔ کوئی پشتیبان نہ ہو گا ۔ وہ سب ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور الٹے ان کے مخالف بن جائیں گے ۔

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ ہم نے منکرین حق پر شیاطین چھوڑ رکھے ہیں جو انہیں خوب خوب (مخالفت حق پر) اکسا رہے ہیں؟ اچھا' تو اب ان پر نزول عذاب کے لئے بے تاب نہ ہو ۔ ہم ان کے دن گن رہے ہیں وہ دن آنے والا ہے ۔ جب متقی لوگوں کو ہم مہمانوں کی طرح رحمن کے حضور پیش کریں گے' اور مجرموں کو پیاسے جانوروں کی طرح جہنم کی طرف ہانک لے جائیں گے ۔ اس وقت لوگ کوئی سفارش لانے پر قادر نہ ہوں گے بجز اس کے جس نے رحمن کے حضور سے پروانہ حاصل کر لیا ہو" ۔

یہ لوگ جو آیات الہیہ کا انکار کرتے ہیں' وہ اللہ کے سوا دوسروں کو الٰہ بناتے ہیں اور ان کے ہاں اپنی عزت بناتے ہیں اور انہی سے غلبہ اور نصرت مانگتے ہیں اور ان میں سے بعض لوگ تو ملائکہ کی بندگی کرتے ہیں ۔ بعض ایسے ہیں جو جنوں کی پرستش کرتے ہیں' ان سے نصرت طلب کرتے ہیں لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا' عنقریب وہ سب معبود ان سب کی عبادت' بندگی اور پکارنے کا انکار کریں گے ۔ ان کے اس فعل سے نفرت کریں گے اور اللہ کے سامنے ان سے اپنی براءت کا اظہار کریں گے ۔

وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا (۱۹ : ۸۲) "اور یہ الٹے ان کے مخالف بن جائیں گے" ۔ یعنی ان سے بری الذمہ ہو جائیں گے اور ان کے خلاف شہادت دیں گے" ۔ جو شیاطین ان کو اس کام پر اکسا رہے ہیں' یہ ہم نے ان پر مسلط کیے ہیں ۔ ان کو اللہ نے اجازت دے رکھی ہے کہ وہ ان لوگوں کو ورغلا سکتے ہیں اور یہ اس وقت سے ماذون ہیں جب سے ابلیس نے اللہ سے اجازت چاہی کہ مجھے مہلت دیں ۔

فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ (۱۹ : ۸۴) "آپ ان پر نزول عذاب کے لئے عجلت نہ کریں" ۔ اپنے دل کو بھی تنگ نہ کریں' پریشان نہ ہوں' ان لوگوں کو تھوڑی سی مہلت دے دی گئی ہے ۔ ان کے اعمال گنے جا رہے ہیں ۔ ان کا حساب رکھا جا رہا ہے ۔ انداز بیان یہ ظاہر کر رہا ہے کہ ان کے اعمال کا حساب نہایت ہی باریکی سے رکھا جا رہا ہے ۔

اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا (۱۹ : ۸۴) "ہم ان کے دن گن رہے ہیں" ۔ کس قدر خوفناک دھمکی ہے یہ! وہ شخص ہلاک ہوا جس کے گناہوں' جس کے اعمال' جس کی ہر سانس کا حساب اللہ خود رکھ رہا ہے' اور نہایت باریکی سے اس کا حساب ریکارڈ کیا جا رہا ہے' تاکہ سختی سے اس کی گرفت ہو سکے ۔ جو شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کرۂ ارض کی زندگی میں اس کا افسر اس کے اعمال کی نگرانی کر رہا ہے اور اس کی غلطیاں نوٹ کی جا رہی ہیں' وہ ڈر جاتا ہے ۔ اسے ہر وقت خوف رہتا ہے' کھٹکا لگا رہتا ہے کہ شاید اس سے کسی وقت کوئی غلطی سرزد ہو کر نوٹ نہ ہو جائے ۔ لیکن جس شخص کی غلطیاں اللہ بذات خود نوٹ کر رہا ہو تو.....

قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں اس تحقیق اور حساب کا انجام دکھایا جاتا ہے۔ اہل ایمان کی حالت یہ ہے کہ وہ اللہ کے دربار میں معزز وفود کی شکل میں آرہے ہیں 'نہایت عزت اور احترام کے ساتھ۔

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَٰنِ وَفْدًا (۱۹:۸۵) "وہ دن آنے والا ہے جب متقی لوگوں کو ہم مہمانوں کی طرح رحمٰن کے حضور پیش کریں گے" اور مجرموں کو جہنم کی طرف ہانک کرلے جائیں گے۔

وَنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وِرْدًا (۱۹:۸۶) "اور مجرموں کو پیاسے جانوروں کی طرح جہنم میں ہانک لے جائیں گے"۔ اس دن کسی کی کوئی سفارش نہ ہوگی 'ماسوائے اس شخص کے جس نے کوئی اچھا عمل کیا۔ یہ عمل صالح اس کا سفارشی ہوگا اور اللہ اپنے عہد کو پورا کرے گا۔ اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے کہ جو ایمان لائے اور عمل صالح کرے اس کو پوری جزا دے گا اور اللہ عہد کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

ایک بار پھر روئے سخن مشرکین کے عقیدۂ منکرہ کی طرف مڑ جاتا ہے۔ بعض مشرکین عرب کا یہ قول تھا کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ یہودیوں کا ایک مشرک طبقہ حضرت عزیر کو ابن اللہ کہتا تھا 'نصاریٰ کے مشرکین کہتے تھے مسیح ابن اللہ ہیں ' ان مشرکانہ اقوال کی وجہ سے پوری کائنات کانپنے لگتی ہے۔ فطرت کائنات اس کا انکار کرتی ہے اور اس کا ضمیر اس سے ابا کرتا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا ۞ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ۞ تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۞ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدًا ۞ وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمَٰنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ۞

"وہ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے کسی کو بیٹا بنایا ہے--- سخت بے ہودہ بات ہے جو تم لوگ گھڑ لائے ہو۔ قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں ' زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں ' اس بات پر کہ لوگوں نے رحمٰن کے لئے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا! رحمٰن کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے"۔

اس منظر میں فضا غضب ' غیرت اور ردعمل کی ہے۔ اس فضا کو الفاظ کی گونج اور گرج اور عبارات اور فقروں کی ضربات مزید تیز کر دیتی ہیں۔ کائنات کے ضمیر میں ایک اشتعال ہے۔ نفس کائنات کی تمام نفرت کرنے والی قوتوں کے اندر بھونچال آیا ہوا ہے۔ تمام تکوینی قوتوں کے اندر ' ذات باری کی شان میں اس قدر سخت گستاخی کرنے کی وجہ سے 'سخت اشتعال ہے۔ جب کسی انسان کی ذات یا اس کے محبوب شخص کی توہین کر دی جائے اور اس کی عزت خطرے میں ہو تو اس کے تمام اعضاء یکدم ردعمل میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ پوری کائنات اس منظر میں نہایت ہی ردعمل میں ہے کیونکہ اس کے مالک کی شان میں گستاخی ہو رہی ہے۔

اس کلمہ کفر اور شان باری کی توہین کے ردعمل میں پوری کائنات ' زمین ' آسمان ' درخت اور پہاڑ سب ردعمل میں ہیں ۔ اور اس کے اظہار کے لئے جو الفاظ قرآن نے چنے ہیں وہ بذات خود زلزلہ انگیز ہیں ۔ ذرا غور کیجئے کہ اس کلمہ کفر کا اظہار ہوتے ہی کہ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا (۱۹ : ۸۸) "وہ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے کسی کو بیٹا بنایا ہے"۔

فوراً ہی ردعمل سامنے آتا ہے اور اس کی سخت مذمت کی جاتی ہے اور فوراً تردید آ جاتی ہے ۔

لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا (۱۹ : ۸۹) "سخت بیہودہ بات ہے جو تم لوگ گھڑ لائے ہو"۔ اس کی تردید کے ساتھ ہی تمام ماحول بھڑک اٹھتا ہے ' ہر چیز میں حرکت آ جاتی ہے ۔ پوری کائنات رب کی توہین کے ردعمل میں غضبناک ہو جاتی ہے ۔ ہر چیز یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کلمہ کفر سے اس کے وجود ' اس کی ذات ' اس کی فطرت کی توہین کی گئی ہے ' چونکہ ہر چیز کے ضمیر اور اس کی شخصیت کا ردعمل باہر آ جاتا ہے ' اور وہ بنیادیں ہی ہل جاتی ہیں جن پر اس کلمہ کفر سے قبل کائنات کی ہر چیز میں سکون اور ٹھہراؤ تھا ۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا (۹۰) أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (۹۱) (۱۹ : ۹۰ - ۹۱) "قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں ' زمین شق ہو جائے ' اور پہاڑ گر جائیں ' اس بات پر کہ لوگوں نے رحمٰن کے لئے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا ۔ رحمٰن کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے"۔ اس خوفناک ماحول میں یہ قرارداد پیش کر دی جاتی ہے ۔

إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿٩٣﴾ لَقَدْ أَحْصٰهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿٩٤﴾ وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا

"زمین و آسمان کے سب لوگ اس کے حضور بندوں کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں ۔ سب پر وہ محیط ہے اور اس نے ان کو شمار کر رکھا ہے ۔ سب قیامت کے روز فرداً فرداً اس کے سامنے حاضر ہوں گے"۔

زمین و آسمان میں جو چیز بھی ہے وہ اپنے رب معبود کے سامنے ایک مطیع فرمان عبادت گزار کی طرح جھکتی ہے ۔ لہٰذا اسے ولد اور شریک کی کیا ضرورت ہے ۔ یہ سب تو مخلوق اور بندے ہیں ۔ یہ پوری کائنات کے حقیقی مفہوم پر غور کرتا ہے ۔

لَقَدْ أَحْصٰهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا (۱۹ : ۹۴) "سب پر وہ محیط ہے اور اس نے ان کو شمار کر رکھا ہے"۔ لہٰذا نہ کوئی اس سے بھاگ سکتا ہے ' نہ وہ کسی کو بھول سکتا ہے ۔

وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا (۱۹ : ۹۵) "سب قیامت کے روز فرداً فرداً اس کے سامنے حاضر ہوں گے"۔ تمام افراد اللہ کی نظروں میں ہیں ۔ پھر یہ تمام اللہ کے سامنے فرداً فرداً آئیں گے ۔ کوئی جتھا نہ ہو گا ' کوئی

مونس و مددگار نہ ہو گا۔ وہاں ان سے اجتماعیت کی روح اور اجتماعیت کا شعور ہی نکال دیا جائے گا۔ ہر شخص اللہ کے سامنے وحید و فرید ہو گا یکہ و تنہا۔

اس تنہائی' اکیلے پن' وحشت اور ڈر کے ماحول میں اچانک اہل ایمان کا گروہ نمودار ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی رحمت سے تروتازہ اور اس کے سایہ عاطفت میں ہے' نہایت ہی خوش و خرم' رحمٰن کی محبتوں میں ڈوبا ہوا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾

"یقیناً جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور عمل صالح کر رہے ہیں' عنقریب رحمٰن ان کے لئے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا"۔ یہاں محبتوں کے تحفے فضا کو معطر بنا دیتے ہیں۔ اللہ کی رضامندی کی روح انسانی نفوس کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ عالم بالا میں اس روح کا دور دورہ ہوتا ہے۔ پھر یہ روح زمین پر اترتی ہے اور لوگوں میں پھیل جاتی ہے۔ تمام فضا' پوری سوسائٹی اور پوری زمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرائیل علیہ السلام کو بلاتا ہے اور کہتا ہے جبرئیل! میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں' پس تم بھی اس سے محبت رکھو۔ فرمایا تو جبرائیل اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ پھر آسمان والوں میں منادی کی جاتی ہے کہ سنو' اللہ فلاں سے محبت کرتا ہے' اس سے محبت رکھو' تو اہل سماء اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد اس شخصیت کو زمین پر قبول عام حاصل ہو جاتا ہے اور جب اللہ کسی بندے سے نفرت کرتا ہے تو جبرائیل کو بلا کر کہہ دیتا ہے کہ میں فلاں سے نفرت کرتا ہوں تم بھی اس سے بغض رکھو' تو جبرائیل اس سے بغض رکھتے ہیں' پھر آسمان والوں میں منادی کر دی جاتی ہے کہ اللہ فلاں سے بغض رکھتا ہے' تم بھی اس سے دشمنی کرو' پس تمام اہل آسمان اس سے دشمنی کرتے ہیں۔ اس کے بعد پوری زمین میں اس کے ساتھ نفرت رکھ دی جاتی ہے۔

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ مومنین و متقین کے لئے یہ قرآن خوشخبری اور منکرین اور مخاصمت کرنے والوں کے لئے یہ ڈراوا ہے اور یہ خوشخبری اور ڈراوا قرآن کریم کے اولین مقاصد میں سے ہے۔ اللہ نے عربوں کے سامنے پیش کرنے کے لئے قرآن کریم کو عربی میں نازل کیا تاکہ وہ اسے پڑھیں اور رسول انہیں پڑھ کر سنائیں اور ان کو ڈرائیں۔

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا ﴿٩٧﴾

"پس' اے نبیؐ' اس کلام کو ہم نے آسان کر کے تمہاری زبان میں اس لئے نازل کیا ہے کہ تم پرہیزگاروں کو خوشخبری دے دو اور ہٹ دھرم لوگوں کو ڈرا دو"۔ یہ سورہ ایک ایسے منظر پر ختم ہوتی ہے جس کو دیکھ کر ہر انسان ایک طویل وقفے کے لئے غور کرتا ہے اور انسانی شعور و وجدان کے اندر ایک طویل تاثر قائم رہتا ہے اور ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ انسان سوچتا ہی رہ جاتا ہے اور دیر تک غور کرتا رہتا ہے۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُم مِّنْ أَحَدٍ أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿٩٨﴾ ع ۱۶

"ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں' پھر آج کہیں تم ان کا نشان پاتے ہو یا ان کی بھنک بھی کہیں سنائی دیتی ہے؟"

یہ ایک سخت جھٹکا ہے۔ اس کے بعد ایک مہیب سکوت اور خاموشی۔ گویا ہم تباہی اور ہلاکت کی وادی میں ہیں اور ان تمام وادیوں کو ایک ایک کر کے دیکھ رہے ہیں جن کو صدیوں سے ہلاک و برباد کیا جاتا رہا۔ ہلاکتوں کا یہ ایک طویل سلسلہ ہمارے پیش نظر ہے۔ ہمارا خیال ان اقوام کی زندگیوں' ان کی ترقیوں اور رنگا رنگ سرگرمیوں کے ساتھ چلتا ہے۔ بڑے بڑے شہر اور ان میں آبادیاں اور پھر زندگی کی حرکت اور دوڑ دھوپ نظر آتی ہے اور پھر جب ان آبادیوں پر' اللہ کی ہلاکت آتی ہے تو وہاں الو بولتا نظر آتا ہے۔ زندگی یکدم خاموش ہو جاتی ہے۔ ہر طرف موت ہی موت نظر آتی ہے۔ ہر طرف انسانی لاشیں ہیں' ہڈیاں ہیں اور پھر سیاہ مٹی ہے' نہ زندگی ہے' نہ احساس ہے' نہ حرکت ہے' نہ آواز ہے'

هَلْ تُحِسُّ مِنْهُم مِّنْ أَحَدٍ (۱۹ : ۹۸) "ان میں سے کیا کسی کا احساس تم پاتے ہو"۔ کوئی نام و نشان ہے؟ ذرا خوب دیکھو ان تہذیبوں کو'

أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا (۱۹ : ۹۸) "یا ان کی بھنک بھی کہیں سنائی دیتی ہے"۔ ذرا کان لگا کر سننے کی کوشش کرو' یہ خوفناک خاموشی' یہ مہیب سناٹا' ذرا دیکھو' یہاں اللہ وحدہ' حی لا یموت اور قہار و جبار کے سوا کوئی اور ہے؟

---o0o---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ----- ۱۶

## سورۃ طٰہٰ ـ ۲۰

۱--- تا--- ۱۳۵

# سورۃ طٰہٰ ایک نظر میں

اس سورہ کا آغاز اور اختتام دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطاب سے ہوتا ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ آپ کے فرائض منصبی کیا ہیں؟ یہ کوئی مصیبت نہیں ہے جس میں آپ کو مبتلا کر دیا گیا ہے' نہ کوئی مشقت ہے ہے جس سے آپ کو عذاب دینا مقصود ہے۔یہ تو ایک دعوت اور یاد دہانی ہے۔لوگوں کو ڈرانا اور خوشخبری سنانا ہے۔اس کے بعد لوگوں کو چھوڑ دینا اور ان کو اللہ وحدہ کے سپرد کر دینا ہے کہ وہ جو چاہے ان کی تقدیر کا فیصلہ کرے۔وہ اس کائنات کے ظاہر و باطن پر محیط ہے۔وہ ظاہر و باطن دونوں کو اچھی طرح جاننے والا ہے۔بڑے بڑے گردن فراز اس کے سامنے جھکتے ہیں اور سب لوگ اس کی طرف لوٹنے والے ہیں۔خواہ مطیع فرمان ہوں یا نافرمان اور باغی ہوں۔اگر کوئی تکذیب کرتا ہے یا کفر کرتا ہے تو رسول پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔اگر لوگ کفر کرتے ہیں اور آپ کو جھٹلاتے ہیں تو اس سے آپ پریشان نہ ہوں۔

اس سورہ کے آغاز اور انجام کے درمیان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کی دو کڑیاں ہیں۔یعنی وہ حصہ جہاں سے آپ کی رسالت کا آغاز ہوتا ہے اور بنی اسرائیل مصر سے ہجرت کرتے ہیں اور پھر وہ بچھڑے کو خدا بناتے ہیں۔لیکن یہ قصہ یہاں قدرے طوالت اور تفصیل کے ساتھ دیا گیا ہے۔اللہ اور کلیم اللہ کے درمیان ہمکلامی کے حصے کو زیادہ تفصیل سے دیا گیا ہے۔اسی طرح موسیٰ و فرعون کے درمیان مکالمے اور مجادلے کو بھی زیادہ جگہ دی گئی ہے۔موسیٰ اور جادوگروں کے مقابلے کو بھی تفصیل سے دیا گیا ہے۔اس قصے کے درمیان نظر آتا ہے کہ اللہ کریم موسیٰ علیہ السلام کی مسلسل نگرانی کر رہے ہیں' خصوصاً آپ کے بچاؤ کی خصوصی تدابیر کی جارہی ہیں۔حضرت موسیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ آپ کی تخلیق بھی تو خدا نے براہ راست اپنی نگرانی میں کی۔ان کی تربیت بھی اپنی نگرانی میں دشمن سے کرائی اور ان کو اور ان کے بھائی کو صراحت سے کہا۔

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰي (۲۰ : ۴۶) "دونوں بالکل خوف نہ کھاؤ' بے شک میں تم دونوں کے ساتھ ہوں' سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں"۔اس سورہ میں قصہ آدم و ابلیس پر بھی ایک اچٹتی نظر ڈالی جاتی ہے۔اس میں اللہ تعالیٰ آدم کی غلطی کے بعد ان پر اپنی رحمت کرتے ہیں۔آدم کو ہدایت دی جاتی ہے اور اس ہدایت کی استعداد و دیعت کرنے کے بعد کہا جاتا ہے کہ ابن آدم کو چھوڑ دو کہ وہ اپنی آزادی سے ہدایت و ضلالت میں سے جو راہ چاہے' اختیار کرے۔البتہ دعوت و تذکیر اور ڈراوا اور تخویف ضروری ہے۔

اس قصے کے ارد گرد قیامت کے مناظر بھی دکھائے گئے ہیں۔گویا یہ مناظر اس قصے کا تکملہ ہیں کیونکہ آدم کو دنیا میں خلیفہ بنانے کی اسکیم میں یہ طے ہوا تھا کہ انسانوں میں سے راہ راست اپنانے والے جنت میں جائیں گے اور گمراہ جہنم میں

جائیں گے اور حضرت آدم کو زمین پر اتارتے ہوئے یہ پوری اسکیم ان کو بتا دی گئی تھی ـ

چنانچہ سیاق کلام اور بیان اس سورہ میں دو حصوں میں بٹ جاتا ہے ـ پہلا حصہ حضورؐ کو یہ مخاطب کر کے شروع کیا جاتا ہے ـ

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓي (۲) اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰي (۳)(۲:۲۰ ـ ۳) "ہم نے یہ قرآن تم پر اس لئے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ ـ یہ تو ایک یاد دہانی ہے ہر اس شخص کے لئے 'جو ڈرے" ـ اور اس کے بعد متصلاً بطور مثال قصہ موسیٰ و فرعون شروع ہو جاتا ہے 'جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ داعی بنا کر بھیجتا ہے 'وہ اللہ کے زیر نگرانی کام کرتا ہے 'اللہ اس کا محافظ ہوتا ہے اور ان کو مصیبتوں سے بچاتا ہے ـ

دوسرے حصے میں قیامت کے مناظر اور قصہ آدم و ابلیس ہے ـ یہ بھی سورہ کے ابتدائیہ اور قصہ موسیٰ کی لائن پر ہے ـ اور اس کے بعد سورہ کا خاتمہ بھی خطاب رسول کے ساتھ ہے اور یہ خاتمہ سورہ کے آغاز کے ساتھ ہم آہنگ ہے ـ

اس سورہ کا ایک خاص رنگ ہے 'جو پوری سورہ پر نظر آتا ہے ـ عالم بالا کا گہرا سایہ اس پوری سورہ پر چھایا ہوا ہے ـ اس کو پڑھ کر قلب کے اندر میں خوف خدا اور خشوع پیدا ہوتا ہے ـ دل میں سکون اور طمانیت پیدا ہوتی ہے ـ گردن فرازی کو چھوڑ کر گردنیں جھک جاتی ہیں ـ یہ علوی سایہ سب سے پہلے وادی مقدس طویٰ پر نظر آتا ہے ـ جہاں عبد و معبود ہمکلام ہیں ـ اس طویل مناجات کے ساتھ پوری کائنات ہم آہنگ اور ہم رنگ ہے اور ہمقدم ہے ـ یہی سایہ علوفت پھر میدان حشر میں بھی نظر آتا ہے ـ

وَ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا (۲۰ : ۱۰۸) "اور آوازیں رحمٰن کے آگے دب جائیں گی ایک سرسراہٹ کے سوا تم کچھ نہ سنو گے" ـ

وَ عَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ (۲۰ : ۱۱۱) "اور لوگوں کے چہرے اس حی و قیوم کے سامنے جھک جائیں گے" ـ

اس قسم کی فضا سورہ کے آغاز سے اختتام تک چھائی ہوئی ہے ـ الفاظ کا صوتی ترنم نہایت ہی نرم 'نہایت دلدوز اور نہایت تروتازہ اور فواصل و قوافی میں الف مقصورہ کو مسلسل استعمال کیا گیا ہے 'جو سورہ کے واقعات 'فضا اور مضمون کے ساتھ نہایت ہی ہم آہنگ ہے ـ

--- ooo---

# درس نمبر ۱۳۸ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۹۸

آیاتہا ۱۳۵ سُورَةُ طٰهٰ مَكِّيَّةٌ (۴۵) رکوعاتہا ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰهٰ ﴿۱﴾ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ﴿۲﴾ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۳﴾ تَنْزِيْلًا
مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَ السَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ﴿۴﴾ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴿۵﴾ لَهٗ مَا
فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ مَا تَحْتَ الثَّرٰى ﴿۶﴾ وَ اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ
فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَ اَخْفٰى ﴿۷﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ﴿۸﴾

"طٰہٰ' ہم نے یہ قرآن تم پر اس لئے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہ تو ایک یاد دہانی ہے ہر اس شخص کے لئے جو ڈرے۔ نازل کیا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جس نے پیدا کیا ہے زمین کو اور بلند آسمانوں کو۔ وہ رحمٰن (کائنات کے) تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہے۔ مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور جو زمین و آسمان کے درمیان ہیں اور جو مٹی کے نیچے ہیں۔ تم چاہے اپنی بات پکار کر کہو' وہ تو چپکے سے کہی ہوئی بات بلکہ اس سے مخفی تر بات بھی جانتا ہے۔ وہ اللہ ہے' اس کے سوا کوئی خدا نہیں' اس کے لئے بہترین نام ہیں"۔

نہایت ہی نرم و نازک اور تر و تازہ آغاز ہے' حروف مقطعات طا۔ہا۔ اشارہ یہی ہے کہ یہ پوری سورہ ایسے ہی حروف مقطعات سے مرکب ہے۔ جس طرح یہ قرآن ایسے ہی حروف سے مرکب ہے جیسا کہ دوسری سورتوں کے آغاز میں بھی یہی اشارہ ان حروف کے ذریعہ دیا گیا ہے۔ یہاں جو دو حروف چنے گئے ہیں ان میں ایک مزید یہ اشارہ بھی پیش نظر ہے کہ ان کے تلفظ کے آخر میں الف مقصورہ آتا ہے جس طرح اس پوری سورہ میں فواصل الف مقصورہ پر ختم ہوتے ہیں۔ حروف مقطعات کے بعد قرآن کریم کا ذکر آتا ہے' جس طرح پورے قرآن میں جس سورہ کا آغاز حروف

مقطعات سے ہوتا ہے' ان کے بعد متصلاً قرآن کریم کا ذکر ہوتا ہے ۔ یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خطاب کی شکل میں تبصرہ ہے قرآن مجید اور اس کی دعوت پر کہ یہ مصیبت نہیں ہے ۔

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓي ( ۲۰ : ۲ ) "ہم نے یہ قرآن آپ پر اس لئے نازل نہیں کیا کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ"۔ یعنی یہ قرآن آپ پر نازل ہوا کہ آپ اس کی تبلیغ کریں' اس کی وجہ سے تم پر کوئی مصیبت نہ آئے گی ۔ یہ نہیں کہ اس کی تلاوت میں آپ کو تکلیف ہو' یہ نہیں کہ اس پر عمل میں آپ کو کوئی مشقت ہو' یہ تو یاد دہانی اور نصیحت آموزی کے لئے آسان کر دیا گیا ہے ۔ اس کے اندر جو احکام دیئے گئے ہیں وہ انسانی طاقت کی حدود کے اندر اندر ہیں ۔ یہ نعمت خداوندی ہے مصیبت و عذاب خداوندی نہیں ہے ۔ اس کے ذریعہ تو عالم بالا سے انسان کا رابطہ ہوتا ہے اور انسان کو عالم بالا کی تائید حاصل ہوتی ہے اور وہ قوت و اطمینان حاصل کرتا ہے ۔ اللہ کی رضامندی کا شعور' اللہ کے ساتھ انس و محبت کا شعور' اور اللہ کے ساتھ ملنے اور رابطے کا شعور اس سے حاصل ہوتا ہے ۔

یہ قرآن اس لئے بھی نازل نہیں ہوا کہ اگر لوگ اسے نہیں مانتے تو آپ پریشان ہوں کیونکہ یہ آپ کے فرائض میں نہیں ہے کہ آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کریں ۔ نہ اس لئے نازل ہوا ہے کہ آپ ان لوگوں کے عدم ایمان کی وجہ سے دل کو حسرتوں کا خزانہ بنا دیں ۔ یہ تو صرف اس لیے ہے کہ آپ نصیحت کرتے چلے جائیں اور لوگوں کو انجام بد سے ڈراتے چلے جائیں ۔

اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰي ( ۲۰ : ۳ ) "یہ تو ایک یاد دہانی ہے' ہر اس شخص کے لئے جو ڈرے"۔ جو شخص ڈرتا ہے' جب اسے نصیحت کی جائے تو وہ اثر قبول کرتا ہے' اللہ سے ڈرتا ہے اور اللہ سے معافی طلب کرتا ہے بس یہاں تک رسول اور داعی کے فرائض پورے ہو جاتے ہیں ۔ رسولوں اور داعیوں کا یہ فریضہ نہیں ہے کہ وہ دلوں کو لگے ہوئے تالے کھول دیں یا لوگوں کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوں ۔ یہ کام تو اللہ کا ہے جس نے قرآن مجید نازل کیا ہے ۔ یہ اللہ ہی ہے جو اس پوری کائنات کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے' اس پر محیط ہے اور اس کو دلوں کے خفیہ ارادے اور راز تک معلوم ہیں ۔

تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَ السَّمٰوٰتِ الْعُلٰي ( ٤ ) اَلرَّحْمٰنُ عَلَي الْعَرْشِ اسْتَوٰي ( ٥ ) لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰي

( ٦ ) ( ۲۰ : ٤ تا ٦ ) "نازل کیا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جس نے پیدا کیا ہے زمین کو اور بلند آسمانوں کو ۔ وہ رحمٰن (کائنات کے ) تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہے ۔ مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور جو زمین و آسمان کے درمیان ہیں اور جو مٹی کے نیچے ہیں"۔ کیونکہ جس نے اس قرآن کو نازل کیا ہے وہی ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے' ان بلند ترین آسمانوں کو' کیونکہ یہ قرآن بھی اسی طرح ایک تکوینی مظہر ہے جس طرح زمین و آسمان مظاہر کونیہ ہیں ۔ یہ بھی عالم بالا سے اترا ہے ۔ یہاں قرآن مجید ان قوانین قدرت کو جو اس کائنات میں کار فرما ہیں

اور ان قوانین کو جو اس قرآن میں ضبط کیے گئے ہیں یکجا کر کے بیان کرتا ہے۔ آسمانوں کا پرتو زمین پر پڑتا ہے اور اس طرح قرآن بھی ملاء اعلیٰ سے زمین کی طرف آتا ہے۔

جس ذات نے ملا اعلیٰ کی طرف سے یہ قرآن نازل کیا ہے اور جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا ہے وہ کون ہے؟ رحمٰن ہے اور رحمٰن جو نہایت ہی مہربان ہوتا ہے' اس کی جانب سے اترا ہوا قرآن کبھی بھی باعث مشقت اور مصیبت نہیں ہو سکتا۔ قرآن اور رحمٰن دونوں میں صفت رحمت قدر مشترک ہے۔ اور یہ رحمت ہی ہے جس نے اس پوری کائنات کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی (۲۰:۵) "رحمٰن کائنات کے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہے"۔
استوائے عرش کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا اس کائنات پر پوری طرح کنٹرول ہے اور یہ اس کی مکمل گرفت میں ہے۔ لہٰذا لوگوں کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے' رسول کا کام صرف یہ ہے کہ جو ڈرتا ہے اسے ڈرائے۔

اس کائنات پر مکمل کنٹرول اور گرفت کے ساتھ ساتھ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰی (۲۰:۶) "وہ مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمان و زمین میں ہیں اور جو مٹی کے نیچے ہیں"۔ یہ کائناتی مناظر یہاں اس لئے دیے گئے کہ اللہ کی ملکیت اور اس کی قدرت کو اس طرح پیش کیا جائے کہ یہ انسانی تصور کے قریب تر ہو جائیں جبکہ اللہ کی ملکیت اور اس کی ضرورت کا تصور اس سے عظیم تر ہے۔ زمین اور آسمانوں اور مٹی کے نیچے کا ذکر محض اس لئے کیا گیا ہے کہ عوام اس بات کو اچھی طرح سمجھ جائیں کہ اللہ کی گرفت میں جو کائنات ہے اس کی وسعت کا ادراک آہستہ آہستہ وسیع ہو رہا ہے اور بہت بڑا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خطاب اس لیے کیا جا رہا ہے کہ آپ کا دل مطمئن ہو جائے اور وہ یہ سمجھ لیں کہ رب ان کے ساتھ ہے۔ رب تعالیٰ ان کو اکیلا نہیں چھوڑتا کہ وہ تکالیف منصب نبوت کی وجہ سے مشقت میں پڑ جائیں۔ کافروں کا مقابلہ آپ بلاسند نہیں کر رہے' اگر آپ اللہ کو جہراً پکاریں تو بھی حرج نہیں لیکن اللہ سرّاً اور جہراً دونوں پکارنے والوں کو جانتا ہے۔ انسانی دل و دماغ اور شعور میں جب یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ اللہ اس کے قریب ہے' اور اس کی دلی دنیا سے بھی واقف ہے تو انسان مطمئن ہو جاتا ہے اور راضی برضا ہوتا ہے۔ پھر وہ اس قرآن کو پڑھ کر مطمئن ہو جاتا ہے اور وہ جھٹلانے والے مخالفوں کے درمیان تنہائی محسوس نہیں کرتا اور وہ مخالفین کے درمیان اپنے آپ کو یکہ و تنہا بھی محسوس نہیں کرتا۔

یہ ابتدائی آیات' جو تمہیدی بھی ہیں' اس اعلان پر ختم ہوتی ہیں کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اور کائنات اس کے کنٹرول میں ہے۔ وہ اس کائنات کا مالک ہے اور اس کائنات کے بارے میں پوری پوری خبرداری اسے حاصل ہے۔

--- ooo ---

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ شروع ہوتا ہے۔ یہ قصہ نمونہ ہے اس بات کا کہ اللہ اپنے داعیوں کی حفاظت اور حمایت کس طرح کرتا ہے۔ نبیوں اور رسولوں کے جو قصص قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں' فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ان سب کے مقابلے میں قرآن مجید کے اندر زیادہ جگہ لیتا ہے۔ اس قصے کی مختلف کڑیاں قرآن مجید کی

مختلف سورتوں میں آتی ہیں۔ان کڑیوں کا انتخاب ہر سورہ کے مضمون اور موضوع کی مناسبت سے کیا جاتا ہے اور اس کا انداز بیان بھی اسی رنگ میں ہوتا ہے جس رنگ میں پوری سورہ کا انداز بیان ہوتا ہے۔ اس سے قبل اس قصے کی کچھ کڑیاں، سورہ بقرہ، سورہ مائدہ، سورہ اعراف، سورہ یونس، سورہ اسراء، سورہ کہف میں آچکی ہیں اور دوسری سورتوں میں بھی اس قصے کی طرف اشارات موجود ہیں۔

مائدہ میں جو کچھ آیا وہ صرف ایک کڑی ہے یعنی یہ کڑی کہ بنی اسرائیل جب بیت المقدس میں آئے تو یہ لوگ شہر کے باہر کھڑے ہوگئے اور شہر کے اندر داخل ہونے سے رک گئے، اس لئے کہ اس شہر میں ایک جبار قوم رہتی ہے۔ سورہ کہف میں بھی اس کی ایک ہی کڑی ہے، یعنی حضرت موسیٰ اور عبد صالح کے ساتھ ان کی ملاقات اور مختصر صحبت۔

بقرہ، اعراف، یونس اور طٰہٰ میں قصہ موسیٰ و فرعون کی کئی کڑیاں آئی ہیں لیکن ان میں سے بھی مختلف سورتوں میں آنے والی کڑیاں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔جس طرح اس قصے کی کڑیاں مختلف ہیں۔اسی طرح مختلف سورتوں میں ان کڑیوں کے مختلف پہلو موقع و مناسبت سے مختلف دیئے گئے ہیں اور انداز بیان بھی مختلف ہے۔

سورہ بقرہ میں جب یہ قصہ آیا تو اس سے قبل قصہ آدم و ابلیس تھا اور اس میں آدم علیہ السلام کو عالم بالا میں اعزاز بخشا گیا تھا۔ آدم علیہ السلام کو خلافت ارضی سپرد کی گئی تھی اور آدم کو معاف کر کے ان پر رحمت خداوندی کا نزول ہوا تھا۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے واقعات بیان ہوئے، یہ یاد دلانے کے لئے کہ اے بنی اسرائیل ذرا غور کرو تم پر اللہ نے کیسی کیسی مہربانیاں کیں۔تمہارے ساتھ عہد کیا تمہیں فرعون اور اس کی قوم سے نجات دی۔ تمہیں صحرا میں پانی پلایا اور تمہارے لئے پتھروں سے چشمے نکالے تمہیں صحرا میں من و سلویٰ کی شکل میں کھانا فراہم کیا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کی ہمارے ساتھ ملاقات اور ہم کلامی کا وقت آیا اور پیچھے سے تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی لیکن اللہ نے تمہیں پھر بھی معاف کر دیا۔ پہاڑ کے نیچے تم سے عہد لیا۔پھر سبت کے معاملے میں تم نے حد سے تجاوز کیا۔ اور پھر گائے کے ذبح کرنے کا قصہ تو عجیب تر ہے۔

اعراف میں اس قصے سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ مکذبین پر اللہ کا عذاب حضرت موسیٰ سے قبل کیسے کیسے آیا۔اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کا قصہ آیا۔پہلے موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کی تقریب ہے۔اس کے بعد معجزات عصا، ید بیضا، طوفان، ٹڈی دل، جوئیں اور مینڈک اور خون، اور اس کے بعد جادوگروں کے ساتھ مقابلہ، اور فرعون کا بھی اسی طرح خاتمہ جس طرح پہلے کے مکذبین کا ہوا تھا۔اس کے بعد وہ واقعہ کہ موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں انہوں نے بچھڑے کو خدا بنا لیا۔اس کے بعد اس قصے کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اللہ کی رحمت کی وراثت ان لوگوں کے لئے ہے جو نبی امی پر ایمان لے آئیں۔

سورہ یونس میں جہاں یہ قصہ آیا ہے، اس میں اس سے قبل ان اقوام کا ذکر ہے جو ہلاک کی گئیں۔ یہاں حضرت موسیٰؑ کی رسالت کی کڑی، جادوگروں کے ساتھ مقابلے کی کڑی اور فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت کی کڑی بالتفصیل لائی گئی ہے۔

ہاں سورہ طٰہٰ میں سورہ کا آغاز ہی اس بات سے ہوتا ہے کہ اللہ جن لوگوں کو رسول بنا کر بھیجتا ہے ان پر اس کی رحمت ہوتی ہے۔اور وہ اللہ کی پناہ میں ہوتے ہیں اور ان پر رحمتوں کی بارش ہوتی ہے۔چنانچہ قصے کا آغاز اس منظر سے ہوتا جس میں حضرت موسیٰ طور پر رب ذوالجلال سے ہم کلام ہیں، اس کے بعد اس میں وہ مناظر آتے ہیں جن میں صاف

نظر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ اللہ کی پناہ میں ہیں اور تائید ایزدی ان کی پشت پر ہے۔ بچپن میں ہی یہ رحمت ان کے شامل حال رہی اور ان کی پرورش اور نگرانی ہوتی رہی۔

وَ اَلْقَیْتُ عَلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ وَ لِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ (۲۰ : ۳۹) ”اور میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت طاری کر دی اور ایسا انتظام کیا کہ تو میری نگرانی میں پالا جائے“۔

وَ هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ مُوْسٰىۘ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى

”اور تمہیں کچھ موسیٰ کی خبر بھی پہنچی ہے؟ جب کہ اس نے ایک آگ دیکھی اور اپنے گھر والوں سے کہا کہ ”ذرا ٹھہرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ شاید کہ تمہارے لئے ایک آدھ انگارا لے آؤں، یا اس آگ پر مجھے (راستے کے متعلق) کوئی رہنمائی مل جائے؟“

کیا تمہیں موسیٰ کی کہانی معلوم ہے۔ اس کہانی سے یہ بات پوری طرح عیاں ہے کہ اللہ جن لوگوں کو منصب رسالت عطا کرتا ہے وہ ان لوگوں کو اپنی خاص پناہ میں رکھتا ہے اور ان کو بروقت ہدایت دیتا رہتا ہے۔

وَ هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ مُوْسٰى (۲۰ : ۹) ”کیا موسیٰ کا قصہ تمہیں معلوم ہے“۔ اگر نہیں تو سنئے، حضرت موسیٰ مدین سے واپسی پر مصر جا رہے تھے۔ وہ طور کے دامن میں سفر کر رہے تھے، ان کے ساتھ ان کی اہلیہ بھی تھی اور ان کے اور اللہ کے نبی شعیب علیہ السلام کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا وہ پورا ہو گیا تھا۔ معاہدہ یہ تھا کہ حضرت شعیب اپنی بیٹیوں میں سے ایک کو ان کے نکاح میں دے دے گا اگر وہ ان کی آٹھ سال تک خدمت کرتا رہے یا دس سال تک۔ میعاد پوری کرنے کے بعد حضرت موسیٰ عازم مصر ہوئے تا کہ وہاں وہ اپنی بیوی کے ساتھ مستقلاً زندگی گزاریں۔ مصر میں جہاں ان کی ولادت ہوئی اور جہاں ان کی قوم کے لوگ بنی اسرائیل آباد ہیں، فرعون کے ظلم و ستم سہ رہے ہیں اور غلامانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

یہ کیوں واپس ہو رہے ہیں جبکہ مصر سے تو وہ خارج البلد ہو گئے تھے۔ مفرور ہو گئے تھے، جب ایک بار انہوں نے دیکھا کہ ایک قبطی ان کے ہم قوم بنی اسرائیلی سے لڑ رہا ہے، اس جھگڑے میں قبطی ان کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ حضرت موسیٰ مصر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے جبکہ بنی اسرائیل پر انواع و الوان کے مصائب کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ مدین میں اللہ کے نبی شعیب علیہ السلام کے ہاں ان کو پناہ مل گئی جہاں انہوں نے دامادی اختیار کر لی اور ان کی ایک بیٹی سے ان کا نکاح ہو گیا۔

دست قدرت نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے ایک اہم رول تجویز کر رکھا تھا لیکن بظاہر وطن کی محبت اور اہل و عیال اور قوم کی کشش ان کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ مدین سے مصر کی طرف واپس ہو جائیں۔ اس دنیا میں بطور انسان ہم لوگ

اسی طرح ادھر ادھر گھوتے رہتے ہیں' جذبات' میلانات اور محبتیں ہمیں ادھر ادھر گھماتی رہتی ہیں' جدوجہد اور منافع' مصائب اور امیدیں' یہ باتیں ہمیں ادھر ادھر حرکت دیتی رہتی ہیں' لیکن یہ محض ظاہری چیزیں ہیں' دراصل محرک ایک خفیہ دست قدرت ہے جسے ہماری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں - یہ دست قدرت پوشیدہ مقاصد کے لئے ہمیں حرکت دے رہا ہے - یہ مدبر کائنات' اور عزیز اور جبار کا دست قدرت ہے جس کے پاس ہماری ڈاری ہے -

غرض دست قدرت نے موسیٰؑ کو مدین سے اٹھایا - صحرائے سینا میں وہ راہ گم کر بیٹھے' ان کی بیوی ان کے ساتھ ہے' ممکن ہے کوئی خادم بھی ساتھ ہو' رات کا وقت ہے' اندھیری رات ہے' اور صحرا وسیع ہے - یہ صورت حال اس آیت سے معلوم ہوتی ہے انہوں نے اہلیہ سے کہا:

اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَي النَّارِ هُدًي (۲۰:۱۰)

"ذرا ٹھہرو' میں نے ایک آگ دیکھی ہے' شاید میں تمہارے لئے ایک آدھ انگارا لے آؤں یا اس آگ پر مجھے کوئی راہنمائی مل جائے - کیونکہ دیہاتی لوگ اونچی جگہ آگ جلایا کرتے ہیں تاکہ صحرا میں چلنے والے گم کردہ راہ لوگ اسے دیکھ لیں اور ان کو راستہ معلوم ہو جائے یا ان کو کھانے پینے کا سامان مل جائے یا ایسا شخص مل جائے جو انہیں سیدھی راہ بتلا دے -

موسیٰ علیہ السلام نے ایک ٹیلے پر آگ دیکھی تو خوش ہوئے' اس طرف چل دیئے تاکہ وہاں سے کوئی انگارہ لے آئیں اور اس سے آگ جلا کر رات کے وقت یہ لوگ تاپیں - رات سرد ہے اور صحراؤں کی راتیں تو بہت سرد ہوتی ہیں یا کوئی راہنما مل جائے یا اس آگ کی روشنی میں راستہ دیکھا جا سکے -

وہ گئے تو اس لئے کہ آگ کا انگارہ لے آئیں یا صحرا میں کوئی راہنمائی کرنے والا مل جائے لیکن وہاں وہ اچانک ایک عظیم الشان واقعہ سے دوچار ہوگئے - یہاں انہیں ایسی آگ ملی جو جسم کے تاپنے کے کام نہ آتی تھی بلکہ روح کو تپانے کے لیے کارگر تھی - یہ آگ صرف صحرا میں رہنمائی کے لئے مفید مطلب نہ تھی بلکہ یہ آگ زندگی کے عظیم سفر کے لئے راہ دکھانے والی تھی -

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝۱۲ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝۱۳ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝۱۴ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ۝۱۵ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ۝۱۶

"وہاں پہنچا تو پکارا گیا" اے موسیٰ! میں ہی تیرا رب ہوں' جوتیاں اتار دے' تو وادی مقدس طویٰ میں ہے اور میں

نے تجھ کو چن لیا ہے' سن جو کچھ وحی کیا جاتا ہے ۔ میں ہی اللہ ہوں' میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے' پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لئے نماز قائم کر ۔ قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے ۔ میں اس کا وقت مخفی رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر شخص اپنی سعی کے مطابق بدلہ پائے ۔ پس کوئی ایسا شخص جو اس پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہش نفس کا بندہ بن گیا ہے تجھ کو اس گھڑی کی فکر سے نہ روک دے' ورنہ تو ہلاکت میں پڑ جائے گا"۔

انسان کا خون خشک ہو جاتا ہے اور جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کپکپی طاری ہو جاتی ہے ۔ محض اس منظر کے تصور سے' ایک غیر آباد پہاڑی پر موسیٰ اکیلے کھڑے ہیں ۔ تاریک اور سیاہ رات ہے ۔ ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا' مہیب اور خوفناک خاموشی ہے' طور کے دامن سے انہوں نے آگ دیکھی تھی' وہ اس کی تلاش میں نکلے تھے' لیکن ان کو ہر طرف سے پوری کائنات کی طرف سے یہ ندا آ رہی ہے :

إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (۱۲) وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَى (۱۳) (۲۰: ۱۲ - ۱۳) "اے موسیٰ میں تیرا رب ہوں' جوتیاں اتار دے' تو وادی مقدس طویٰ میں ہے اور میں نے تجھ کو چن لیا ہے"۔

یہ چھوٹا سا ذرۂ ناچیز' یہ محدود بشر لامحدود رب ذوالجلال کے سامنے کھڑا ہے' جسے آنکھ نہیں دیکھ سکتی ۔ وہ عظمت و جلال جس کے مقابلے میں یہ نظر آنے والی کائنات زمین و آسمان سب حقیر ہیں یہ ذرۂ ضعیف' انسانی قوائے مدرکہ کے ساتھ' ایک لامحدود ذات کے ساتھ مربوط ہو گیا' اس کی آواز سن رہا ہے' کس طرح؟ اللہ کی خاص رحمت سے' ورنہ کیسے ممکن ہے ۔ محدود اور لامحدود کا اتصال؟

پوری انسانیت اب موسیٰ علیہ السلام کی شکل میں اٹھائی جا رہی ہے' سربلند کی جا رہی ہے کہ ایک لمحے کے لئے وہ بشری شخصیت کو لئے ہوئے یہ لامحدود فیض وصول کر رہی ہے ۔ اس انسانیت کے لئے کیا یہ کوئی کم شرف ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کا اتصال اور رابطہ' اس انداز میں' رب ذوالجلال کے ساتھ ہو گیا' لیکن ہم نہیں جانتے کہ کیونکر ہو گیا یہ؟ کیونکہ انسانی قوائے مدرکہ اس حقیقت کا نہ ادراک کر سکتی ہیں اور نہ اس بارے میں کوئی فیصلہ دے سکتی ہیں ۔ انسان کی قوائے مدرکہ کا بس یہ کام ہے کہ وہ حیران رہ کر اپنے قصور کا اعتراف کریں' ایمان لائیں اور شہادت دیں کہ یہ حق ہے ۔

فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ يَا مُوسَى (۱۱) إِنِّي أَنَا رَبُّكَ (۱۲) (۲۰: ۱۱ - ۱۲) "جب وہاں پہنچا تو پکارا گیا اے موسیٰ' میں ہی تیرا رب ہوں"۔ پکارا گیا' ماضی مجہول کا صیغہ استعمال ہوا ۔ کیونکہ آواز کے مصدر اور جہت کا تعین ممکن نہیں ہے ۔ نہ آواز کی صورت اور کیفیت کا تعین ممکن ہے ۔ نہ اس بات کا تعین ممکن ہے کہ کس طرح سنا اور کس طرح سمجھے ۔ پکارا گیا جس طرح پکارا گیا اور انہوں نے سمجھا جس طرح سمجھا ۔ کیونکہ یہ اتصال ان امور میں سے ہے جن پر ہم ایمان لاتے ہیں کہ ایسا ہوا مگر اس کی کیفیت کے بارے میں نہیں پوچھتے کیونکہ یہ کیفیت انسانی قوت مدرکہ اور انسانی دائرہ تصور سے وراء ہے ۔

اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًي (۲۰: ۱۲) "اے موسیٰ میں ہی تیرا رب ہوں' جوتیاں اتار دے تو وادی مقدس طوی میں ہے"۔ تم بارگاہ رب العزت میں ہو' اس لئے پاؤں سے جوتے اتار دو تاکہ تم ننگے پاؤں آؤ' ایک ایسی وادی میں جس پر پاکیزہ انوار کا نزول ہو رہا ہے۔ اس لئے اس وادی کو اپنے جوتوں سے نہ روندو۔

وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ (۱۳) "اور میں نے تجھ کو چن لیا"۔ ماشاء اللہ کیا اکرام ہے! اللہ بذات خود انتخاب فرما رہے ہیں۔ اپنے بندوں میں سے ایک بندے کو' انسانوں کے ہزارہا گروہوں میں سے صرف ایک فرد کو' یہ فرد اللہ کے پیدا کردہ ستاروں میں سے ایک ستارے پر رہتا ہے' جو بہ نسبت پوری کائنات کے ایک ذرہ ہے۔ وہ کائنات جو صرف کن کے حکم کے نتیجے میں وجود میں آگئی لیکن یہ اس ذات باری کی ذرہ نوازی ہی تو ہے۔

اس اعزاز اور انتخاب کے بعد اور جوتے اتار کر بارگاہ رب العزت میں حاضری اور اخذ وحی کی تیاری و استعداد کے بعد حکم آتا ہے کہ اب سنو' باران رحمت کا نزول ہو رہا ہے۔

فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰي (۱۳) "سن جو کچھ وحی کیا جاتا ہے"۔ جو پیغام دیا جا رہا ہے' وہ تین مربوط امور پر مشتمل ہے۔ عقیدۂ توحید' توجہ سے اللہ کی بندگی اور آخرت کی جوابدہی کا احساس اور اس کی تیاری۔ یہ نکات تمام رسالتوں کا نصب العین رہے ہیں جو ایک ہی نوعیت رکھتی ہیں۔

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (۱۴) اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰي كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰي (۱۵) فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰي (۲۰: ۱۶) (۲۰: ۱۴ – ۱۶) "میں ہی اللہ ہوں' میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لئے نماز قائم کر۔ قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے۔ میں اس کا وقت مخفی رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر متنفس اپنی سعی کے مطابق بدلہ پائے' پس کوئی ایسا شخص جو اس پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہش نفس کا بندہ بن گیا' تجھ کو اس گھڑی کی فکر سے نہ روک دے ورنہ تو ہلاکت میں پڑ جائے گا"۔

یہ کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اسلامی نظریہ حیات کا بنیادی عنصر ہے اور اللہ تعالیٰ نے خود پکار کر موسیٰ علیہ السلام کو جو پیغام دیا' اس میں اس کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ بہ جہت تاکید۔

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ میں لفظ ان تاکید ی' پھر انا تاکید ی' مبتدا و خبر کی حصر تاکید ی' پھر نفی و اثبات کی تاکید ی حصر

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا (۱۴) جس میں اللہ کی الوہیت کا اثبات اور تمام غیراللہ کی الوہیت کی نفی ثابت کی گئی ہے۔ پھر الوہیت کے ثبوت کے بعد اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور بندگی کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی کی تمام سرگرمیوں میں صرف

اللہ کی طرف توجہ کی جائے لیکن عبادات میں سے نماز کو یہاں خصوصی طور پر لیا گیا ہے ۔

وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (۱۴) "میری یاد کے لئے نماز قائم کر" ۔ نماز دراصل عبادت کی ایک مکمل صورت ہے اور ذکر الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے ۔ کیونکہ اس کا فنکشن ہی اللہ کی یاد کو تازہ رکھنا ہے ۔ اس میں انسان یاد الٰہی کے سوا تمام باتوں سے کٹ جاتا ہے ۔ صرف یاد الٰہی پیش نظر رہ جاتی ہے اور کچھ دیر کے لئے انسان اللہ سے مربوط ہو جاتا ہے ۔

رہی قیامت تو وہ پوری زندگی کی جو ابدہی کا ایک عادلانہ وقت حساب و محاسبہ ہے ۔ لوگ آخرت کی طرف جب متوجہ ہوتے ہیں تو وہ اپنی زندگی کے ہر موڑ پر اس کا خیال رکھتے ہیں اور زندگی کی پر پیچ راہوں میں 'ٹھوکروں اور پھسلن سے بچتے ہیں ۔ قیام قیامت کی قرآن کریم میں بار بار تاکید کی گئی ہے ۔ بار بار کہا گیا ہے ۔

اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ (۱۵) "قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے" ۔ اللہ نے اس کے قیام کے وقت اور تاریخ کو مخفی رکھا ہے ۔ لہٰذا اس کے قیام کے بارے میں ہمارا علم اسی قدر ہے جس قدر اللہ نے ہمیں دیا ہے ۔ اللہ نے اس کے بارے وہی کچھ علم دیا ہے جو اس کی حکمت کے مطابق ہے ۔ بعض چیزوں سے لاعلمی انسانی زندگی کو مناسب طریقے سے چلانے کے لئے بہت ہی اہم ہے لہٰذا اللہ نے بعض چیزوں کو جان بوجھ کر انسانوں سے مجہول رکھا تاکہ وہ حصول علم کے لئے تگ و دو کرتے رہیں ۔ اگر تمام امور کے بارے میں اللہ انسان کو قبل از وقت علم دے دیتا اور انسان ایسے ہی ہوتے جس طرح کہ ان کی فطرت اس وقت ہے 'تو ان کی زندگی کی گاڑی رک جاتی اور زندگی جمود کا شکار ہو جاتی کیونکہ انسان کی جدوجہد ایک مجہول اور نامعلوم مستقبل کے لئے ہے ۔ وہ احتیاط کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں 'امید رکھتے ہیں 'تجربے کرتے ہیں' نئی نئی معلومات حاصل کرتے ہیں ۔ اپنی خفیہ قوتوں کو کام میں لاتے ہیں ۔ ان کے ارد گرد کائنات میں پھیلی ہوئی قوتوں کے بارے میں وہ ہر وقت کھوج لگاتے ہیں اور اپنے نفسوں اور اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات میں وہ نشانات الٰہیہ کو دریافت کرتے ہیں ۔ وہ زمین میں اللہ کی مشیت کے مطابق نئی نئی ایجادات کرتے ہیں اور ان کے دل قیام قیامت کے ساتھ لٹکے ہوتے ہیں 'جس کے قیام کا وقت انہیں معلوم نہیں ہے ۔ یہ تصور ان کو بے راہ روی سے بچاتا ہے ۔ وہ نہیں جانتے کہ قیامت کب آئے گی 'اس لیے ہر لمحہ وہ اس کے قیام کی توقع کرتے ہیں اور ڈرتے رہتے ہیں ۔ یہ تو ان لوگوں کی بات ہے جو صحیح الفطرت ہوں 'ان کی فطرت مستقیم ہو 'رہے وہ لوگ جن کی فطرت میں بگاڑ ہو 'جو خواہشات نفس کے بندے ہوں 'تو وہ غافل اور جاہل ہو جاتے ہیں 'ایسے لوگ زندگی کی پر پیچ راہوں میں کسی گڑھے میں گر جاتے ہیں اور ہلاک ہو جاتے ہیں ۔

فَلَا یَصُدَّنَّکَ عَنْھَا مَنْ لَّا یُؤْمِنُ بِھَا وَ اتَّبَعَ ھَوٰہُ فَتَرْدٰی (۲۰ : ۱۶) "پس کوئی ایسا شخص جو اس پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہش نفس کا بندہ بن گیا ہو تجھ کو اس گھڑی کی فکر سے نہ روک دے" ۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی خواہشات نفس کے بندے ہوتے ہیں 'وہ قیامت کا انکار کرتے ہیں ۔ ایک صحیح الفطرت انسان تو یہی سوچتا ہے کہ اس دنیاوی زندگی میں انسان کمال تک نہیں پہنچ سکتا ۔ اس میں مکمل عدل کا قیام ممکن نہیں ۔ اس لئے اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ضروری ہے جس میں مطلوبہ کمال حاصل کیا جا سکے ۔ جس میں ہر انسان کو اس کے اعمال

کے مطابق پوری پوری جزاء و سزا دی جاسکے۔

یہ تو تھی اس آسمانی پکار کی پہلی اہم بات' جس کی تائید میں موسیٰؑ کے ارد گرد پھیلی ہوئی پوری کائنات ان کے ہمرکاب تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عقیدہ توحید کی بنیادیں سکھائیں۔ حضرت موسیٰؑ کو اچانک جس صورت حال سے دوچار ہونا پڑا' ظاہر ہے کہ وہ اس موقع پر اپنی ذات اور وادی طویٰ میں آنے کی غرض و غایت اور اپنے پسماندگان سب کو وہ بھول گئے ہوں گے۔ وہ ہمہ تن اس نئی صورت حال کی طرف ہی متوجہ ہوں گے۔ گھبراہٹ اور خوف میں مزید کچھ سننے کے منتظر ہوں گے۔ وہ اس سوچ ہی میں گم تھے اور ان کے جسم کا ذرہ ذرہ عالم بالا کی طرف متوجہ تھا کہ اچانک ان پر ایک سوال ہوتا ہے۔ ایک بہت آسان وال جس کے جواب کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى ﴿۱۷﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرٰى ﴿۱۸﴾

"اور اے موسیٰ' یہ تیرے ہاتھ میں کیا؟" موسیٰ نے جواب دیا "یہ میری لاٹھی ہے' اس پر ٹیک لگا کر چلتا ہوں' اس سے اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں' اور بھی بہت سے کام ہیں جو میں اس سے لیتا ہوں"۔

سوال ہوتا ہے کہ تمہارے ہاتھ میں کیا؟ حضرت موسیٰؑ تو اپنے حال میں نہ تھے۔ دیکھ کر بتایا کہ عصا ہے۔ سوال میں یہ نہ تھا کہ عصا کے فوائد کیا ہیں؟ صرف یہ تھا کہ ہاتھ میں کیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے یہ سمجھا کہ جو ہاتھ میں ہے' اس کی ماہیت تو نہیں پوچھی جاتی' ماہیت تو واضح ہے' بلکہ عصا کے فوائد پوچھے جا رہے ہیں' اس لئے انہوں نے فوائد گنوا دیئے' جو فوائد حضرت موسیٰ جانتے تھے' وہ بتا دیئے کہ وہ اس کا سہارا لیتے ہیں' اس کے ذریعہ درختوں کے پتے جھاڑتے ہیں تا کہ بکریاں کھالیں۔ آپ حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چراتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ واپسی کے وقت حضرت موسیٰ کے ساتھ بکریوں کا ایک گلہ بھی تھا' جو ان کے حصے میں آئی تھیں' الا یہ کہ یہ عصا اس قسم کے دوسرے مقاصد میں بھی استعمال ہوتا ہے' ان کا ذکر انہوں نے اجمالاً کر دیا کہ اس میں اور بھی فوائد ہیں۔

لیکن ذرا آگے دیکھو کہ قدرت خداوندی اس عصا سے وہ کچھ کام لینا چاہتی ہے جس کا کبھی موسیٰؑ نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ یہ تجربہ ان کو اس لئے کرایا جاتا ہے کہ وہ فرعون کے دربار میں بے دھڑک ہو کر جائیں۔

قَالَ أَلْقِهَا يٰمُوسٰى ﴿۱۹﴾ فَأَلْقٰهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۖ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولٰى ﴿۲۱﴾

"فرمایا پھینک دے اس کو موسیٰ"۔ اس نے پھینک دیا اور یکایک وہ ایک سانپ تھی جو دوڑ رہا تھا۔ فرمایا "پکڑ لے

اس کو اور ڈر نہیں' ہم اسے پھر ویسا ہی کر دیں گے جیسی یہ تھی"۔

یہ خارق عادت معجزہ ظہور پذیر ہو گیا' یہ معجزہ اس کائنات میں ہر لمحہ ہر طرف ظاہر ہوتا رہتا ہے' لیکن لوگوں کی سوچ اس طرف نہیں جاتی۔ یعنی "زندگی" کا معجزہ۔ ایک عصا سانپ بن گئی۔ اس دنیا میں ہر سیکنڈ میں عصا کی طرح اربوں مردہ ذرے زندگی پاتے ہیں اور زندہ خلیوں کی شکل اختیار کرتے ہیں لیکن انسان انہیں اس طرح نہیں دیکھ سکتا جس طرح وہ ایک بڑی عصا کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے اس لیے کہ انسان اپنے حواس کا بندہ اور اپنے تجربات کا قیدی ہے۔ وہ اپنے تصورات میں حواس کے دائرے سے آگے جانے کی تکلیف نہیں کرتا۔ ایک عصا کا زندہ ہو کر سانپ بن جانا اور پھر چلنا انسانی احساس کو شدت سے اپنی طرف متوجہ کرتا ہے' لیکن وہ خلیے جو زندگی کے پہلے معجزے کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں اور وہ مظاہر جو ہر لمحہ اربوں ذرات کے زندہ خلیوں کی شکل اختیار کرنے میں پیش آتے ہیں۔ یہ خفیہ یا باریک ہیں۔ اور انسان ان کی طرف ملتفت نہیں ہوتے۔ پھر جو لوگ ان کا ملاحظہ بھی کرتے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ دیکھتے دیکھتے وہ ان مناظر کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ پھر وہ ان سے متاثر ہی نہیں ہوتے اور غفلت کے ساتھ ان مناظر پر سے گزر جاتے ہیں۔

یہ معجزہ جب رونما ہوا تو موسیٰ ششدر رہ گئے' بلکہ ڈر گئے اور اللہ کو کہنا پڑا خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ (۲۰: ۲۱) "پکڑ لے اس کو اور ڈرو نہیں' ہم اسے پھر ویسا ہی کر دیں گے"۔ یعنی عصا..... یہاں قرآن مجید نے ایک بات کا ذکر نہیں کیا جو دوسری جگہ کیا کہ موسیٰ علیہ السلام بھاگ کھڑے ہوئے اور پیچھے نہ دیکھا۔ یہاں صرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ نہ ڈرو' یہ اس لیے کہ اس سورۃ کی فضا اور مناظر میں امن' اطمینان' سکون اور وقار چھایا ہوا ہے لہٰذا اس میں یہ مناسب نہیں ہے کہ اسٹیج پر جزع و فزع دکھایا جائے اور کوئی بھاگ کھڑا ہو۔

حضرت موسیٰ مطمئن ہو گئے' عصا کو لیا تو سانپ پھر عصا تھا۔ یہ معجزہ اب دوسری شکل میں ظاہر ہو گیا۔ ایک زندہ چیز کو مردہ بنایا گیا۔ اچانک زندہ رینگنے والی چیز مردہ اور عصا کی شکل میں آگئی۔ جس طرح کہ پہلے معجزے سے قبل تھی۔ ایک بار پھر موسیٰ کو عالم بالا سے حکم ملتا ہے۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَىٰ ﴿٢٢﴾

"اور ذرا اپنا ہاتھ اپنی بغل میں دبا' چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے' یہ دوسری نشانی ہے"۔

موسیٰ نے ہاتھ اپنی بغلوں میں دبائے۔ یہاں قرآن کریم نے ہاتھ اور بغل کے لئے پر کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ پروں میں خوبصورتی اور حرکت ہے' ہلکا پن ہے اور یہ مقام ایسا ہے کہ اس میں انسانیت زمین کی بوجھل فضا سے ہلکی ہو کر عالم بالا کی طرف پرواز کر رہی ہے اور یہ ہاتھ سفید ہو کر نکلے' مرض کی بیماری کی وجہ سے نہیں بلکہ معجزانہ سفید بغیر بیماری کے سفید ہو گا۔ اور عصا کے بعد یہ دوسری نشانی ہو گی آپ کی نبوت کی سچائی پر۔

لِنُرِيَكَ مِنْ آيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿٢٣﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٢٤﴾ ع ۲۳

"اس لئے کہ ہم تجھے اپنی بڑی نشانیاں دکھانے والے ہیں ۔ اب تو فرعون کے پاس جا ' وہ سرکش ہو گیا ہے " ۔

یہ نشانیاں اور معجزات جس کا حسن اظہار ہو رہا ہے اے موسیٰ ! پہلے آپ کو دکھائی جا رہی ہیں تاکہ تم مطمئن ہو کر اور ان سے مسلح ہو کر فرعون کے پاس جاؤ یہاں تک کہ حضرت موسیٰؑ کو معلوم نہ تھا کہ وہ اس عظیم مہم اور اس عظیم منصب کے لئے چن لئے گئے ہیں ۔ وہ جانتے تھے کہ فرعون کون ہے کیونکہ وہ تو پہلے ہی اس کے گھر میں تھے ' اس کی سرکشی اور سخت دار و گیر سے وہ واقف تھے ۔ وہ بنی اسرائیل پر جو مظالم ڈھا رہا تھا اس سے بھی وہ واقف تھے ' وہ اس وقت چونکہ بارگاہ رب العزت میں پہنچے ہوئے ہیں ' سمجھتے ہیں کہ ان کو بڑا اعزاز مل چکا ہے اور وہ ایک بہت ہی معزز بندے ہیں لہٰذا ان کے دل میں یہ بات آگئی کہ یہ موزوں وقت ہے کہ وہ اس مہم کے لئے ضروری ساز و سامان اسی وقت طلب کر لیں تاکہ وہ پوری طرح لیس ہو کر فرعون کے پاس جائیں ۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿٣١﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٣٢﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٣﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٤﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿٣٥﴾

"موسیٰ نے عرض کیا : " پروردگار ' میرا سینہ کھول دے ' اور میرے کام کو میرے لئے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں اور میرے لئے میرے اپنے کنبے سے ایک وزیر مقرر کر دے ۔ ہارون ' جو میرا بھائی ہے ۔ اس کے ذریعہ سے میرا ہاتھ مضبوط کر اور اس کو میرے کام میں شریک کر دے ' تاکہ ہم خوب تیری پاکی بیان کریں اور خوب تیرا چرچا کریں ۔ تو ہمیشہ ہمارے حال پر نگراں رہا ہے " ۔

اس نازک موقعہ پر حضرت موسیٰ نے یہ درخواست کی کہ اے اللہ ' میرے سینے کو اس کام کے لئے کھول دے ۔ جب انسان کو شرح صدر حاصل ہو جائے تو مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے ۔ اس میں انسان کو لذت حاصل ہوتی ہے ۔ اس سے انسان کی زندگی ہلکی ہو جاتی ہے ۔ اس پر کوئی بوجھ نہیں رہتا اور انسان سبک رفتاری سے زندگی بسر کرتا ہے ۔

انہوں نے یہ درخواست بھی کی کہ اللہ میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ میری بات کو اچھی طرح سمجھ جائیں ۔ روایات میں آتا ہے کہ آپ کی زبان میں لکنت تھی ' راجح بات یہ ہے کہ ان کا سوال اس لکنت کو دور کرنے کے بارے میں تھا ۔ دوسری سورہ میں اس کے بارے میں یوں آیا ہے

وَاَخِيْ هَارُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا "اور میرے بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں " ۔

اس سے قبل وہ ایک عمومی دعا کر چکے تھے کہ اللہ مجھے شرح صدر عطا کر اور میرے کام کو میرے لئے آسان کر دے ۔ اس عمومی دعا اور مطالبہ کے بعد یہ خصوصی درخواست تھی تاکہ اس کام کے سلسلے میں آپ کو تمام سہولتیں حاصل ہو جائیں ۔

پھر آپ نے یہ درخواست کی کہ میرے خاندان میں سے میرا ایک معاون اور مددگار بھی مجھے عطا کر دے ' ہارون میرے بھائی' وہ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان 'مضبوط دل والے اور مضبوط اعصاب کے مالک ہیں 'جبکہ حضرت موسیٰ ؑ زیادہ جذباتی 'تیز مزاج اور جلد متاثر ہونے والے تھے ۔ چنانچہ انہوں نے یہ درخواست کی کہ ان کو یہ معاون دے دیں تاکہ ان کی قوت اور فعالیت میں اضافہ ہو 'وہ ان کے لئے قوت کا باعث ہوں 'مشیر ہوں کیونکہ یہ مہم بہت ہی عظیم ہے ۔

یہ مہم جسکے لئے وہ بھیجے جا رہے ہیں وہ ذکر کثیر اور تسبیح و ثنا کثیر کی محتاج ہے 'اس میں اللہ کے ساتھ مضبوط رابطہ ضروری ہے ۔ اس لئے انہوں نے شرح صدر تیسیر امر 'زبان کی گرہ کھولنے ' معاون اور بھائی کو وزیر مقرر کرنے کے مطالبے کیے ۔ یہ سب درخواستیں ایسی نہ تھیں کہ وہ براہ راست اس مہم کو آگے بڑھائیں ۔بلکہ یہ چیزیں اس مہم کی تیاری کے مرحلے کے لئے ضروری تھیں ۔ یہ چیزیں انہیں اور ان کے بھائی کو اس کام کے لئے تیار کر رہی تھیں ۔ تسبیح کثیر' ذکر کثیر'علم کثیر' اور زبان کی صفائی اور اللہ سے علوم کا اخذ ' یہ سب تیاری کے مراحل ہیں ۔

اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ( ۲۰ : ۳۵ ) "تو ہمیشہ ہمارے حال پر نگران ہے" ۔ آپ کو ہمارا حال اچھی طرح معلوم ہے ہم ضعف و قصور رکھتے ہیں اور آپ کو ہماری ضروریات کا اچھی طرح علم ہے ۔

حضرت موسیٰ ؑ نے بہت ہی طویل سوال کیا اور اپنی ضروریات بتائیں ۔ اپنی کمزوری کا اظہار کیا' مدد' سہولیات اور مسلسل رابطے کی ضرورت کا ذکر کیا ۔ رب تعالیٰ تو سنتا ہے اور جانتا ہے ۔ آپ کے سامنے موسیٰ ضعیف ہیں ۔ مانگتے ہیں اور بات کرتے جاتے ہیں ۔ تو رب ذوالجلال اپنے مہمان کو شرمندہ نہیں فرماتے 'کوئی سوال رد نہیں کرتے 'منظوری میں دیر بھی نہیں کرتے ۔

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿۳۶﴾

"فرمایا" دیا گیا جو تو نے مانگا اے موسیٰ!" ۔ ایک ہی فقرہ میں تمام سوالات منظور' ایک ہی اجمالی آرڈر کر دیا گیا ۔ تفصیلات دینے کی ضرورت ہی نہیں ۔ وعدہ بھی نہیں بلکہ فائنل منظوری بلکہ دستی تعمیل ۔ جو مانگا وہی دے دیا گیا ۔ نہ دیر اور نہ بار بار کا مطالبہ ۔ درخواست کی منظوری کے ساتھ ساتھ لطف و کرم کا اظہار بھی ہے ' تعظیم و تکریم بھی ہے 'پھر محبت کا اظہار یوں نام لے کر (اے موسیٰ) اس سے بڑھ کر تکریم اور کیا ہو سکتی ہے ۔ کہ پوری کائنات کی مجلس میں اللہ ایک بندے کا نام لے کر اس کے مطالبے منظور کرے ۔

یہاں تک آپ نے دیکھا کہ اللہ کے فضل و کرم کی تکمیل کس قدر ہو چکی ہے 'محبت اور بے تکلفی کی باتیں ہو چکیں ۔ طویل عرصے تک تجلی قائم رہی 'مناجات ہوتی رہی ' تمام درخواستیں منظور اور فوراً تعمیل ہو گئی 'لیکن ان کے فضل پر کوئی داروغہ نہیں ہے ۔ اور اللہ کی رحمتوں پر کوئی کنٹرول کرنے والا نہیں ہے ۔ اللہ اس بندے پر مزید فضل کرنا چاہتے ہیں 'اپنی رضامندی کا یہ فیض ان پر طویل تر کرتے جاتے ہیں ۔ اس دربار میں ان کی حاضری کا وقت مزید بڑھا دیا جاتا ہے ۔ اللہ

اب موسیٰؑ پر اپنی سابقہ مہربانیاں گنوا کر ان کے ساتھ مزید ہمکلام ہونا چاہتے ہیں کہ ان کو مزید اطمینان ہو' وہ مزید بے تکلف ہو جائیں' اللہ اپنی رحمتوں اور قدیم مہربانیوں کا ذکر شروع کر دیتے ہیں ۔ اس دربار عالیہ میں ان کے لقاء کے وقت میں جس قدر اضافہ ہوتا ہے وہ ان کے لئے سرمایہ زندگی ہے اور باعث افتخار ہے ۔ وہ ایک نہایت ہی روشن اور مقدس مقام پر کھڑے ہیں ۔ سنئے :

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰٓ ﴿٣٧﴾ إِذْ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰٓ ﴿٣٨﴾ أَنِ ٱقْذِفِيهِ فِى ٱلتَّابُوتِ فَٱقْذِفِيهِ فِى ٱلْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ ٱلْيَمُّ بِٱلسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّى وَعَدُوٌّ لَّهُۥ ۚ وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّى وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِىٓ ﴿٣٩﴾ إِذْ تَمْشِىٓ أُخْتُكَ فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ مَن يَكْفُلُهُۥ ۖ فَرَجَعْنَٰكَ إِلَىٰٓ أُمِّكَ كَىْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۚ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنَٰكَ مِنَ ٱلْغَمِّ وَفَتَنَّٰكَ فُتُونًا ۚ فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِىٓ أَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَٰمُوسَىٰ ﴿٤٠﴾ وَٱصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِى ﴿٤١﴾

"ہم نے پھر ایک مرتبہ تجھ پر احسان کیا ۔ یاد کر وہ وقت جبکہ ہم نے تیری ماں کو اشارہ کیا' ایسا اشارہ جو وحی کے ذریعہ سے ہی کیا جاتا ہے کہ اس بچے کو صندوق میں رکھ دے اور صندوق کو دریا میں چھوڑ دے ۔ دریا اسے ساحل پر پھینک دے گا اور اسے میرا دشمن اور اس بچے کا دشمن اٹھا لے گا ۔ میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت طاری کر دی اور ایسا انتظام کیا کہ تو میری نگرانی میں پالا جائے ۔ یاد کر جبکہ تیری بہن چل رہی تھی' پھر جا کر کہتی ہے' میں تمہیں اس کا پتہ دوں جو اس بچے کی پرورش اچھی طرح کرے؟ اس طرح ہم نے تجھے پھر تیری ماں کے پاس پہنچا دیا تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی رہے اور وہ رنجیدہ نہ ہو ۔ اور (یہ بھی یاد کر کہ) تو نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا' ہم نے تجھے اس پھندے سے نکالا اور تجھے مختلف آزمائشوں سے گزارا اور تو مدین کے لوگوں میں کئی سال ٹھہرا رہا ۔ پھر اب ٹھیک اپنے وقت پر تو آگیا ہے اے موسیٰ میں نے تجھ کو اپنے کا کام بنا لیا ہے"۔

حضرت موسیٰؑ ایک ایسے بادشاہ کے دربار میں پیغام حق پہنچانے کے لئے جا رہے ہیں جو اس وقت اس کرۂ ارض پر نہایت ہی سرکش' ظالم اور داراگیر بادشاہ تھا ۔ وہ کفر و ایمان کے معرکہ میں داخل ہو رہے تھے' وہ پہلی بار فرعون کے دربار میں جا رہے تھے ۔ وہاں ان کے لئے مسائل' واقعات اور مشکلات کے پہاڑ کھڑے تھے ۔ پھر ان کی قوم کی حالت یہ تھی کہ ایک طویل عرصہ ذلت اور غلامی کی زندگی گزارتے گزارتے وہ اس کے خوگر ہو گئے تھے ۔ ان کی فطرت ہی بدل گئی

موسیٰ اگر اپنی مہم میں کامیاب ہوئے بھی تو ان کی قوم اس آزادی کے لئے نہ موزوں ہے نہ تیار ۔ ان کے رب ان کو بتاتے ہیں کہ تمہیں تیاری کے بعد بھیجا جا رہا ہے اور وہ کسی بھی رسول کو جب بھیجتے ہیں تو تب بھیجتے ہیں کہ اس کے ارسال کے لئے اسٹیج تیار ہوتا ہے ۔ یہ کہ اے موسیٰ تمہاری تربیت بھی ہم ایک عرصہ سے اپنی نگرانی میں کر رہے ہیں ۔ جب تم دودھ پیتے بچے تھے تب سے ہم نے تمہیں تربیت دینا شروع کی ہے ۔ اس ضعف و ناتوانی کی حالت میں اللہ کا فضل تمہارے شامل حال رہا ہے ۔ تم فرعون کے ہاتھ میں تھے ۔ تمہارے پاس کوئی قوت نہ تھی لیکن یہ اللہ ہی کی حکمت تھی جس نے فرعون کی دست درازیوں سے تمہیں بچایا ۔ یہ دست قدرت تھا جو تمہاری مدد کر رہا تھا ۔ اللہ کی نظروں میں تم تھے ۔ قدم قدم پر تمہاری نگرانی اور نگہبانی ہو رہی تھی ۔ لہٰذا آج بھی فرعون تمہارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا ۔ آج تو تم جوان ہو ۔ رب تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا ہو گیا ہے اور تم اس کی بارگاہ میں ہو ۔ اور میں نے تمہیں خود اپنے مشن کے لئے پیدا کیا ہے اور تربیت دی ہے اور چنا ہے ۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرٰي ( ۲۰ : ۳۷ ) "ہم نے پھر ایک مرتبہ تجھ پر احسان کیا" ۔ تم پر تو زمانہ قدیم سے مسلسل مہربانیاں ہو رہی ہیں ۔ ایک عرصے سے اللہ کی مہربانی اور فضل تمہارے شامل حال ہے اور اس مشن کی سپردگی کے بعد تو یہ مسلسل جاری رہے گا ۔

دیکھو' تم پر یہ احسان کیا کم تھا کہ فرعون بچوں کو قتل کر رہا تھا اور ہم نے تیری ماں کو یہ الہام کیا کہ

اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ ( ۲۰ : ۳۹ ) "ہم نے تیری ماں کو اشارہ دیا' ایسا اشارہ جو وحی کے ذریعے ہی کیا جاتا ہے کہ "اس بچے کو صندوق میں رکھ دے اور صندوق کو دریا میں چھوڑ دے' دریا اسے ساحل پر پھینک دے گا" ۔ یہ ایسے افعال ہیں جن میں سختی پائی جاتی ہے' بچے کو تابوت میں گرانا' تابوت کو نذر سمندر کرنا' سمندر کی طرف سے اسے ساحل پر پھینک دینا اور پھر کیا؟ یہ تابوت اب کہاں جائے گا' اس میں بچہ پھینکا گیا ہے' تابوت سمندر کی لہروں کے کرم پر ہے ۔ لہریں اسے ساحل پر پھینک دیتی ہیں ۔ کون اب اسے لے گا؟

عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ( ۲۰ : ۳۹ ) "اسے میرا دشمن اور اس بچے کا دشمن اٹھالے گا" ۔

ان خطرات کے ہجوم میں اور ان صدمات کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اس ضعیف' ناتوان اور بے بس بچے کو جو تابوت میں قید ہے' کیا پیش آتا ہے؟ کون اسے بچاتا ہے ۔

وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ وَلِتُصْنَعَ عَلٰي عَيْنِيْ ( ۲۰ : ۳۹ ) "میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت طاری کر دی اور ایسا انتظام کیا کہ تو میری نگرانی میں پالا جائے" ۔ اے قادر مطلق تیری قدرت کے کیا کرشمے ہیں کہ تو اس ناتواں پر محبت کا پردہ ڈال دیتا ہے' نرم و نازک محبت اس کے لئے دفاع بن جاتی ہے ۔ تمام ضربات کو یہ سہہ لیتی ہے اور ڈھال بن جاتی ہے' موجوں کے تھپیڑے آکر رک جاتے ہیں ۔ شر اور سرکشی کی تمام قوتیں دیکھتے ہی موم ہو

جاتی ہیں ۔ اور کوئی اسے بری نظروں سے دیکھتا ہی نہیں ہے ۔ اگرچہ وہ ایک طفلک ناتواں ہے ۔ دودھ پینے والا' نہ چل پھر سکتا ہے' نہ اپنا دفاع و بچاؤ کر سکتا ہے بلکہ وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔

اس منظر کی تصویر میں نمایاں طور پر دو باہم متضاد رنگ ہیں ۔ ایک طرف ایک قہار و جبار اور سرکش قوت ہے جو اس بچے کے قتل کے درپے ہے ۔ ماحول اس قدر کشیدہ اور سخت ہے کہ ہر طرف درشتگی 'ظلم 'تابوت 'امواج اور سمندر ہے' دوسری طرف محبت کی حسین چادر ہے جو اس بچے کے اوپر بچھ گئی ہے ۔ محبت کی چادر' اللہ کے لطف و کرم کی یہ چادر! یہ اسے ہر خطرے سے بچاتی چلی جاتی ہے ۔ سمندر 'تابوت 'اور موجوں کی سختی سے اور حکمرانوں کی گرفت سے بھی ۔ موسیٰ کے پاس کوئی لاؤ لشکر نہیں ہے بلکہ اس بچے کے چہرے پر قدرتی کشش ہے ۔

وَلِتُصْنَعَ عَلٰي عَيْنِيْ (۲۰ : ۳۹) "کہ تو میری نگرانی میں پالا جائے"۔ اس گہرے سایہ عاطفت اور اس دست قدرت کے کرشموں کی کیا تشریح کوئی کرے ۔ قرآن کی یہ تعبیر کہ "تم میری آنکھوں میں پلو" ۔ یہ ایک نہایت ہی معجزانہ انداز تعبیر ہے ۔ ایک انسان اللہ تعالیٰ کی آنکھوں میں پل رہا ہے ۔ انسان اس تعبیر کے پیچھے جو معانی ہیں ان کا تصور کرنے سے قاصر ہے ۔ یہ ایک اونچا مقام ہے 'اعزاز و تکریم ہے کہ کوئی انسان ایک لمحہ کے لئے یہ نظر کرم پالے 'لیکن اس شخص کی خوش نصیبی دیکھئے کہ وہ کسی کی زیر نگرانی میں پل رہا ہے ۔ یہ وہ کرم تھا جس کی وجہ سے موسیٰ کے اندر یہ قوت پیدا ہوئی وہ تجلیات کا تحمل ہو سکے اور اللہ سے ہمکلام ہو کر اس لامحدود ذات سے ہدایات اخذ کر سکے ۔

تاکہ تم میری نگرانی میں پلو ۔ ہم دونوں کے دشمن فرعون کی نظروں میں پلو' بغیر کسی چوکیدار اور محافظ کے عین دشمن کے دونوں ہاتھوں کے اندر پلو' دشمن کی آنکھ تمہاری طرف میلی نہیں ہوتی کیونکہ تم اس کی آنکھ کا تارا بن گئے ہو ۔ اس کا ہاتھ برے ارادے سے آگے نہیں بڑھتا' کیوں؟ اللہ کی نظر ہے ۔

دیکھو میں نے یہ بھی نہیں کیا کہ فرعون کے گھر تم مزے سے رہو اور تمہاری ماں گھر میں بے تاب ہو اور ہر وقت خوف اور قلق میں مبتلا ہو ۔ میں نے تم دونوں کو باہم ملا دیا۔

اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰي مَنْ يَّكْفُلُهٗ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓي اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ (۲۰ : ۴۰) "یاد کرو جب تمہاری بہن چل رہی تھی' پھر جا کر کہتی ہے "میں تمہیں اس کا پتہ دوں جو اس بچے کی پرورش اچھی طرح کرے ۔ اس طرح ہم نے تجھے پھر اپنی ماں کے پاس پہنچا دیا تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی رہے اور وہ رنجیدہ نہ ہو" ۔ اس سلسلے میں اللہ کی تدبیر یوں تھی کہ بچہ کسی دودھ پلانے والی کا پستان منہ میں نہ لیتا تھا ۔ فرعون اور اس کی بیوی نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا ۔ کسی ایسی عورت کی تلاش میں تھے جو اس بچے کی پرورش کرے' جس کو دریا نے ساحل پر پھینک دیا تھا ۔ لوگ اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور موسیٰ کی بہن ماں کی طرف سے اشارہ پاکر کہتی ہے کہ میں تمہیں بتاؤں جو اس کی پرورش اچھی طرح کرے ۔ یوں اس کی ماں وہاں پہنچ جاتی ہے اور وہ اس کے پستان کو منہ میں لے لیتے ہیں ۔ یوں اللہ کی تدبیر اپنے انجام تک پہنچی ہے کہ ماں جس نے الہامی اشارہ پاکر بچے کو صندوق میں بند کر کے سمندر کے اندر بہا دیا تھا اور سمندر کی لہروں نے اسے ساحل پر پھینک دیا تھا' بچہ پھر اس ماں کی جھولی میں

ہے۔ اللہ اس کے بچے کو دشمن سے لے کر ماں کے حوالے کر دیتا ہے۔ یوں اس کی پرورش کا محفوظ انتظام کر دیا جاتا ہے۔ اور اسے فرعون کے خطرے سے بھی بچا لیا جاتا ہے، جو بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کرتا تھا اور لڑکیوں کو زندہ رکھتا تھا۔ دشمن خود اسے بچا رہا تھا۔ایک دوسرا احسان وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰي (٤٠) وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ (٤١) (٢٠: ٤٠ ـ ٤١)

"اور تو نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، ہم نے تجھے اس پھندے سے نکالا اور تجھے مختلف آزمائشوں سے نکالا اور تو مدین کے لوگوں میں کئی سال ٹھہرا رہا۔ پھر ایک ٹھیک وقت پر تو آ گیا ہے، اے موسیٰ۔ میں نے تجھے اپنے کام کا بنا لیا ہے"۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب قصر فرعون میں موسیٰ جوان ہو گئے۔ایک دن وہ شہر میں تھے کہ ایک مصری اور ایک اسرائیلی کی باہم تکرار ہو گئی۔ اسرائیلی نے موسیٰ سے مدد چاہی اور حضرت موسیٰ نے جلدی میں مصری کو ایک مکہ رسید کر دیا۔ آپ قتل کرنا نہیں چاہتے تھے، صرف اسے دور کرنا چاہتے تھے۔اس فعل پر آپ بہت رنجیدہ ہو گئے کیونکہ وہ اللہ کی تربیت میں چل رہے تھے، ان کے ضمیر نے ان کو ملامت کی کہ تم نے گناہ کر دیا ہے۔ہو سکتا ہے کہ اس وقت اللہ نے حضرت موسیٰ کو استغفار سکھایا ہو اور ان کے دل سے یہ کدورت دور ہو گئی ہو، لیکن اس کے باوجود اللہ نے موسیٰ کو بغیر آزمائش اور ابتلا کے نہیں چھوڑا کیونکہ اللہ نے حضرت موسیٰ سے اونچا کام لینا تھا۔اس لیے خوف، اور ملک چھوڑنے اور قصاص سے بچنے کی مشقت میں ڈالا۔ مسافری، اہل و عیال سے دوری، وطن سے دوری کی مشقتوں میں ڈالا۔ پھر ملازمت اور بھیڑیں چرانے کا مشکل کام لیا۔ اور یہ اس شخص سے لیا گیا جو فرعون کے شاہی محل میں پلا ہے، جو اپنے دور کا شہنشاہ اعظم تھا۔ اور اس کے دربار میں بہت بڑے عیش اور اس کے گھر میں تمام سہولیات تھیں جن کا تصور بھی عام لوگ نہ کر سکتے تھے۔

پھر ایک مقررہ وقت پر، جب ان کی تربیت ہو گئی، وہ پختہ ہو گئے۔ ان ابتلاؤں میں انہوں نے صبر سیکھ لیا۔ امتحان میں پاس ہو گئے، مصر میں حالات ان کے لئے سازگار ہو گئے۔ بنی اسرائیل پر مظالم انتہا کو پہنچ گئے۔ اس مقررہ وقت پر اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو مدین سے واپس بلایا حالانکہ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ وہ خود آ رہے ہیں۔

فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰي (٢٠: ٤٠) "تو مدین کے لوگوں میں کئی سال ٹھہرا رہا، پھر ایک ٹھیک وقت پر تو آ گیا ہے اے موسیٰ"۔ یعنی ایسے وقت میں جو میں نے تیرے لیے مقرر کیا تھا۔ تجھے اپنی نگرانی میں پالا تھا۔ خالص اپنے لئے، اپنے مشن کے لئے اور دعوت کے لئے۔ اس لئے تیری زندگی میں کوئی چیز نہ اس دنیا سے ہے اور نہ اس دنیا کے لئے ہے۔ تیرا سب کچھ میری طرف سے ہے اور اب تو میرے مشن کے لئے ہے۔ تیری حفاظت، تیری تربیت اور اب تیرا مشن بھی میرا مشن ہے۔ اس لئے تیرے نفس میں نہ تیرا حصہ ہے، نہ کسی اور کا کوئی حصہ ہے، نہ تیرے اہل و عیال اور رشتہ داروں کا کوئی حصہ ہے۔ لہٰذا جس چیز کے لئے میں نے تمہیں تربیت دی ہے، جس مشن کے لئے میں نے تمہیں تیار کیا ہے، آپ اس کے لئے اب چل پڑیں۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۝ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝

"جا' تو اور تیرا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ ۔ اور دیکھو 'تم میری یاد میں تقصیر نہ کرنا ۔ جاؤ' تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے ۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے"۔

تم اور تمہارے بھائی دونوں میرے معجزات کے ساتھ مسلح ہو کر جاؤ' ان میں سے معجزۂ عصا اور ید بیضا کا مشاہدہ تو کرایا جا چکا ہے ۔ تم میرے ذکر میں سستی نہ کرنا کیونکہ یہ اس میدان میں تمہارے لئے اہم سازو سامان ہے 'یہ تمہارا بڑا اسلحہ اور سہارا ہے اور مشکلات کے وقت یہی تمہارے لیے جائے پناہ ہو گی ۔ جاؤ تم فرعون کے پاس ۔ اس سے قبل میں نے تم کو فرعون کے شر سے محفوظ کیا ہے جبکہ تم ایک بچے تھے ۔ جسے تابوت میں بند کر کے سمندر کی نذر کر دیا گیا تھا اور سمندر نے اسے ساحل پر پھینک دیا تھا تو ان مشکلات نے تمہیں کوئی نقصان نہ دیا ۔ ان خوفناک حالات میں تمہیں کوئی اذیت نہ دی گئی ۔ اب تو تم تیاریوں کے ساتھ اس دربار میں جا رہے ہو' تمہارے ساتھ تمہارے بھائی بھی ہیں ۔ اس لیے پرواہ مت کرو ۔ جبکہ ایسے مشکل حالات میں بھی ہم نے تمہیں نجات دی ہے ۔

فرعون کے پاس رسالت لے کر جاؤ' وہ بڑا سرکش 'جبار اور سرپھرا ہے ۔

فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا ( ۲۰ : ۴۴ ) "اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا"۔ اس لیے کہ نرم بات کے ردعمل میں کوئی شخص اپنی بے عزتی سمجھ کر ضد میں نہیں آتا ۔ اور سرکش جس جھوٹی کبریائی کے ماحول میں رہتے ہیں' اس کی وجہ سے وہ طیش میں نہیں آتے ۔ نرم بات کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ دلوں کو بیدار کر دیتی ہے' اور ایک سرکش بھی نرم بات کی وجہ سے اپنے موقف پر غور کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے ۔

تم فرعون کے پاس جاؤ اور اس بات سے مایوس نہ ہو جانا کہ وہ راہ ہدایت پر کب آ سکتا ہے ۔ امید رکھنا کہ وہ نصیحت سے فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے اور اس کے دل میں خدا کا خوف بھی پیدا ہو سکتا ہے' کیونکہ ایک داعی اگر ذہن میں یہ بات بسا لے کہ جس کے پاس وہ جا رہا ہے وہ تو راہ ہدایت پر آ ہی نہیں سکتا تو وہ پرجوش طریقے سے اسے دعوت نہیں دے سکتا ۔ اور اگر وہ انکار کر دے تو یہ ثابت قدمی کے ساتھ دعوت کا مشن جاری نہیں رکھ سکتا ۔

اللہ کو تو معلوم تھا کہ فرعون کیا جواب دینے والا ہے ۔ لیکن دعوت دینا اور اس کے لئے تمام طریقوں سے جدوجہد اختیار کرنا ضروری ہے ۔ اللہ کسی شخص کے بارے میں عملی فیصلہ تب ہی کرتا ہے' جب اس سے خیر و شر عملاً صادر ہو جائے ۔ اگرچہ اللہ کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ نتیجہ خیر ہے یا شر ۔ اللہ کا علم حادثات مستقبل کے بارے میں ایسا ہی ہے جیسا کہ حاضر کے واقعات کے بارے میں اللہ کا علم ہے یا ماضی کے واقعات کے بارے میں اللہ کا علم ہوتا ہے ۔

--- ○ ○ ○ ---

یہاں تک خطاب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تھا اور یہ منظر وادی طویٰ میں بندۂ و معبود کے درمیان مناجات کا منظر تھا ۔ اب یہاں سیاق کلام میں درمیان کے واقعات کو لپیٹ لیا جاتا ہے ۔ زمان و مکان کے فاصلے مٹ جاتے ہیں ۔ اب موسیٰ اور ہارون دونوں ہیں ۔ یہ دونوں دربار میں جانے سے قبل اپنے خدشات کا اظہار پھر کرتے ہیں کہ دربار فرعون میں انہیں مشکلات پیش آ سکتی ہیں ۔ ممکن ہے کہ ان کی بات سنتے ہی وہ کوئی غلط فیصلہ کر بیٹھے اور جب ان کی بات اسے بری لگے تو وہ سرکشی اختیار کر لے ۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿۴۵﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰى ﴿۴۶﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿۴۷﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ﴿۴۸﴾

”دونوں نے عرض کیا ”پروردگار‘ ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا‘ یا پل پڑے گا“۔ فرمایا :”ڈرو مت ‘میں تمہارے ساتھ ہوں‘ سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں‘ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لئے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے اور سلامتی ہے اس کے لیے جو راہ راست کی پیروی کرے۔ ہم کو وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اس کے لئے جو جھٹلائے اور منہ موڑے“۔

اس سے قبل جو طویل بحث ہوئی تھی اور جس میں حضرت موسیٰ رب تعالیٰ کے ساتھ وادی طویٰ میں ہم کلام تھے‘ اس میں حضرت ہارون موجود نہ تھے۔ وہ ایک طویل مناجات تھی اور وسیع سوال و جواب اس میں ہوتے رہے۔ اس لیے حضرت موسیٰ اور ہارون دونوں کا یہ جواب

اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰي (۲۰ : ۴۵) ”دونوں نے عرض کیا پروردگار‘ ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا پل پڑے گا“۔ وادی طویٰ میں مناجات کی جگہ میں نہ تھا۔ قرآن کریم کا قصص کے بارے میں یہ طریقہ ہے کہ وہ قصص کے غیر ضروری حصے درمیان میں سے کاٹ دیتا ہے اور قصص کے جو مناظر وہ دکھاتا ہے ان کے درمیان ایک واضح خلا (Gap) چھوڑ دیتا ہے۔ یہ خلا عقل انسانی خود پر کر دیتی ہے اور سیاق کلام یا منظر آگے بڑھ کر زیادہ موثر اور زیادہ مفید‘ زندہ اور متحرک مناظر پیش کرنا شروع کر دیتا ہے جن کا انسان کے وجدان پر اثر ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ طور سے واپسی پر‘ موسیٰ علیہ السلام مصر پہنچے‘ اللہ نے حضرت ہارون کو بھی یہ منصب دے دیا اور ان کو بھی یہ حکم دے دیا گیا کہ تم حضرت موسیٰ کے معاون پیغمبر ہو۔ اور تمہیں بھی بھائی کے ساتھ فرعون کو دعوت دینے کے لئے جانا ہے۔ اب جب وہ تیاریاں کر کے جانے لگتے ہیں تو پھر اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہیں۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰي (۲۰ : ۴۵) ”دونوں عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب‘ ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا پل پڑے گا“۔

فرط کا لغوی مفہوم یہ ہے کہ کوئی جلدی سے کسی کو اذیت دے ۔ فوراً بات کرتے ہیں اور طغیان کا مفہوم فرط اور اذیت سے زیادہ جامع ہے اور فرعون ان دنوں ایک ایسا جبار حکمران تھا جس سے سب کچھ متوقع تھا۔

یہاں اب ان کو فیصلہ کن تسلی دے دی جاتی ہے جس کے بعد نہ کوئی خوف رہتا ہے اور نہ خدشہ ۔

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰي ( ۲۰ : ۴۶ ) "فرمایا ڈرو مت 'میں تمہارے ساتھ ہوں ۔ سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں" ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں 'اگر وہ قوی ہے ' بڑا ہے اور سرکش ہے تو اللہ تو اپنے تمام بندوں کے اوپر کنٹرول کرنے والا ہے ۔

هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وہ تمام کائنات 'تمام انسانوں 'تمام حیوانات اور تمام اشیاء کو صرف کن سے پیدا کرتا ہے ۔ کن سے زیادہ اسے کچھ نہیں کہنا پڑتا ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں بس یہ اجمالی تسلی کافی ہے ۔ لیکن اللہ ان کے اندر مزید طمانیت اور احساس جگانے کے لئے فرماتے ہیں :

اَسْمَعُ وَ اَرٰي ( ۲۰ : ۴۶ ) "میں سنتا بھی ہوں اور دیکھتا بھی ہوں" ۔ فرعون کیا ہوتا ہے ؟ اس کی ملکیت میں کیا ہے ؟ وہ کیونکر زیادتی اور سرکشی کر سکتا ہے ؟ اللہ تمہارے ساتھ ہے ۔

یہ اطمینان دلانے کے بعد ان کو انداز دعوت بھی سکھایا جاتا ہے اور مختصر دعوت بھی ۔

فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ لَا تُعَذِّبْهُمْ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَ السَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰي (۴۷) اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰي (۴۸) ( ۲۰ : ۴۷ – ۴۸ ) "جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں 'بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لئے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے ۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے اور سلامتی ہے اس کے لیے جو راہ راست کی پیروی کرے ۔ ہم کو وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اس کے لئے جو جھٹلائے اور منہ موڑے" ۔

اللہ نے آغاز ہی میں بتا دیا کہ ان کی رسالت کی دعوت کیا ہے ۔

اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ (۴۷ ) "ہم تیرے رب کے دو فرستادے ہیں" ۔ پہلی آواز میں اس کو یہ بتا دیا جائے کہ تمہارے ساتھ اور ایک ذات تیرا رب ہے 'لوگوں کا بھی رب ہے 'یہ صرف موسیٰ اور ہارون کا خدا اور رب نہیں ۔ نہ وہ صرف بنی اسرائیل کا رب ہے ۔ جیسا کہ اس وقت کی بت پرستانہ خرافات میں یہ عقیدہ ہوتا تھا کہ ہر قوم کا ایک رب ہوتا ہے اور ہر قبیلے کا اپنا خدا یا دیوتا ہوتا ہے ۔ ایک یا زیادہ 'خود مصر کی تاریخ میں یہ تصور موجود رہا ہے کہ فرعون بھی رب تھا کیونکہ وہ دیوتاؤں کی نسل سے تھا۔

اس کے بعد ان کی رسالت کے اصل موضوع اور مضمون کی وضاحت کی جاتی ہے۔

فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْ اِسْرَآءِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ (۲۰: ۴۷) "بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لئے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے"۔ فرعون سے ان کا اصل مطالبہ یہ تھا کہ تم بنی اسرائیل کو رہائی دو' وہ عقیدۂ توحید کی طرف واپس آ جائیں' اس سرزمین کی طرف واپس آ جائیں جو اللہ نے ان کے لیے لکھی ہے کہ وہ یہاں رہیں گے یہاں تک کہ وہ اس میں فساد برپا کر دیں اور مکمل طور پر تباہ کر دیے جائیں۔

اس کے بعد ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہاری رسالت کی سچائی پر شہادت یہ ہوگی۔

قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ (۲۰: ۴۷) "ہم تیرے پاس رب کی نشانی لے کر آئے ہیں"۔ یہ نشانی' یہ معجزہ ہماری سچائی پر دلیلِ صادق ہے۔ اللہ کے حکم سے آنا تمہاری سچائی کی دلیل ہے۔

اس کے بعد اسے ترغیب دی جاتی ہے اور دعوت قبول کرنے کی طرف اسے مائل کیا جاتا ہے۔

وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰي (۲۰: ۴۷) "اور سلامتی ہے اس کے لئے جو راہ راست کی پیروی کرے"۔ شاید کہ وہ راہ ہدایت پالے اور ان سے اسلام کی دعوت سیکھ لے۔

اس کے بعد نہایت ہی عمدہ اور بالواسطہ طرز کلام میں اس کو کہا جاتا ہے تاکہ اسے غصہ نہ آجائے اور اس کو اپنے غرور کی وجہ سے بات بری نہ لگے۔

اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰي (۲۰: ۴۸) "ہم کو وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اس کے لئے جو جھٹلائے اور منہ موڑے"۔ ہو سکتا ہے کہ تم ان میں سے نہ ہو اور یہ بات ہم نہیں کہتے' ہم پر وحی آئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ و ہارون کو دولت اطمینان سے مالا مال کر کے' دعوت کا طریق کار سمجھا کر بھیجا تاکہ وہ پوری طرح تیار ہو کر اپنا مشن اچھی طرح جانتے ہوئے جائیں۔ اب پردہ گر جاتا ہے' اگلا منظر فرعون کا دربار ہے۔

--- ○○○---

اب وہ فرعون کے دربار میں ہیں' قرآن اس بات کا تذکرہ نہیں کرتا کہ وہ کس طرح پہنچے' بہرحال وہ پہنچ گئے۔ ان کا رب ان کے ساتھ ہے۔ اور دیکھ رہا ہے۔ موسیٰ اور ہارونؑ نے نہایت ہی قوت اور اعتماد سے بات کرتے ہوئے دعوت پہنچائی۔ فرعون جو چاہے ہو' وہ اسے ملے۔ انہوں نے' جس طرح اللہ نے بتایا تھا اسے دعوت دی۔ یہ دوسرا منظر اب اس گفتگو سے شروع ہوتا ہے جو ان دونوں اور فرعون کے درمیان ہوئی:

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝

"فرعون نے کہا اچھا پھر تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ؟ موسیٰ نے کہا' ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی۔ پھر اس کو راستہ بتایا"۔ یہ شخص یہ اعتراف نہیں کرتا کہ موسیٰ و ہارون کا رب ہی اس کا رب ہے' جس طرح انہوں نے کہہ دیا کہ ہم دونوں اللہ تمہارے رب کے رسول ہیں۔ یہ شخص موسیٰ سے مخاطب ہوتا ہے کیونکہ اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ اصل صاحب دعوت موسیٰ ہی ہیں۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى (۲۰: ۴۹) "تم دونوں کا وہ رب کون ہے جس کے نام سے تم بات کرتے ہو اور بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کرتے ہو"۔ موسیٰ علیہ السلام اس کے سامنے اللہ کی جس صفت کا ذکر کرتے ہیں وہ اللہ کی صفت تخلیق اور صفت تدبیر ہے۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (۲۰: ۵۰) "موسیٰ نے کہا' ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی۔ پھر اس کو راستہ بتایا"۔ رب وہ ہے جس نے ہر موجود کو وجود بخشا اور ایک مناسب صورت اور فطرت بھی عطا کی۔ اس کے بعد اس کو وہ طریقہ بتایا جس کے مطابق وہ اپنا فریضہ منصبی پوری طرح ادا کر سکے جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا اور اسے وہ تمام سہولیات بھی عطا کر دیں جو اس کے فریضہ منصبی کی ادائیگی کے لئے ضروری تھیں۔ یہاں لفظ ثم (تراخی زمانی) کے لئے نہیں ہے یعنی مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلے پیدا کیا' بعد میں عقلاً اسے ہدایت دی بلکہ پیدائش کے ساتھ ہی وہ فطری صلاحیت بھی عطا کر دی۔ خلق و ہدایت میں فرق صرف مرتبہ و اہمیت کے اعتبار سے ہے یعنی تخلیق زیادہ اہم ہے اور ہدایت اور فرائض منصبی کی صلاحیت اور اسباب فراہم کرنا اس کے تابع ہے۔ عقلاً یہ خلق کے بعد ثانوی چیز ہے۔

یہ صفت جس کا ذکر قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی کیا' یہ خدا کی تخلیق کے اعلیٰ ترین آثار کا خلاصہ ہے۔ یعنی کسی چیز کی تخلیق اور اسے اپنا فریضہ تخلیق ادا کرنے کے لئے فطری ہدایت اور سہولیات کی فراہمی' انسان جب اس کائنات وسیع و عریض میں اپنی بصارت اور بصیرت دونوں کو کام میں لا کر غور کرتا ہے' اپنے علم و مشاہدے کی حد تک' تو ہر چھوٹی بڑی چیز کے اندر اسے قدرت کی یہ خالقیت اور تدبیر واضح طور پر نظر آتی ہے۔ کائنات کے چھوٹے سے چھوٹے جسم ذرہ اور بڑے سے بڑے زندہ جسم میں' مساوی طور پر ابتدائی خلیے میں بھی اور انسان جیسے پیچیدہ مخلوق میں بھی یہ سب صفات اور قدرت کے یہ کرشمے نظر آتے ہیں۔

کائنات کا یہ عظیم وجود جس میں لاتعداد ذرے' خلیے' مخلوقات' زندہ اور غیر زندہ' اس کا ہر خلیہ ایک خاص زندگی کا مالک ہے اور متحرک ہے۔ اس کی ہر زندہ چیز متحرک ہے۔ اس کا ہر موجود دوسرے کے ساتھ منسلک ہے' ان میں سے ہر چیز انفرادی طور پر بھی اور دوسروں کے ساتھ مل کر بھی' قوانین قدرت کے مطابق' بغیر کسی ٹکراؤ کے وظیفہ فطرت اور غرض تخلیق پورا کر رہی ہے اور ایک سیکنڈ کے لئے بھی اس وسیع کائنات کے پیچیدہ نظام میں کوئی خلل نہیں ڈالتی۔

اگر ہم کسی ایک مخلوق و موجود کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہ اپنی ذات میں ایک کائنات ہے۔ وہ اپنے اندر اپنے ذرات' اپنے خلیوں' اپنے اعضاء اور اپنے اعصاب کے مطابق تقاضائے فطرت پورے کر رہا ہے۔ دوسری طرف وہ اس پوری کائنات کے نظام فطرت کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے اور یہ سب کچھ نہایت ہی باریک انتظام اور توافق کے ساتھ چلتا ہے۔

اس پوری کائنات کو تو ایک طرف رہنے دیں' کائنات کی کسی ایک مخلوق کو آپ لے لیں' اس کے بارے میں

معلومات حاصل کرنے ' اس کی حقیقت معلوم کرنے 'صحت اور بیماری معلوم کرنے میں انسان اپنی وسیع کوششوں کے باوجود اور وسعت علم کے باوجود قاصر ہے ۔ کسی ایک چیز کے ماله و ماعلیه کا علم وہ تمام نہیں کر سکا چہ جائیکہ وہ تحقیق کر سکے یا فطرت دے سکے اور ہدایت دے سکے یا اسے ہیئت و شکل دے سکے ۔ تمام اشیاء میں سے کسی ایک چیز کو بھی ..... واقعہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ واحد کا کام ہے ' وہی ہمارا رب ہے جس نے ہر چیز کو وجود بخشا اور ہدایت دی ۔

اب فرعون نے ایک نیا سوال پیش کیا ۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۱﴾

''فرعون بولا ''اور پہلے جو نسلیں گزر چکی ہیں ان کی پھر کیا حالت تھی؟'' یعنی جو لوگ تمہاری دعوت سے پہلے گزر گئے ہیں ان کا کیا ہو گا ۔ وہ کدھر گئے ۔ ان کا رب کون تھا؟ اور وہ تو اس اللہ کے تصور کے بغیر چلے گئے جس کے بارے میں تم بات کرتے ہو'' ۔

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾

''موسیٰ نے کہا ''اس کا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتے میں محفوظ ہے میرا رب نہ چوکتا ہے ' نہ بھولتا ہے'' ۔

فرعون کے اس دوسرے سوال کو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ پر چھوڑ دیا کیونکہ اس کا تعلق زمانہ ماقبل سے تھا ۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے بارے میں اللہ خوب جانتا ہے ' وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور وہ کبھی بھولتا بھی نہیں ۔ وہی ہے جو تمام زمانوں کی بات جانتا ہے ' ماضی ہو یا مستقبل ہو ' غیب بھی اللہ جانتا ہے اور اپنے بندوں کے بارے میں احکام بھی اللہ صادر کرے گا ۔

ان سوالات کے جوابات کے بعد حضرت موسیٰ فرعون کے سامنے اللہ کا مزید تعارف کراتے ہیں کہ وہ اس کائنات کا مدبر ہے ' تمام انسانوں پر اس کی نعمتیں کیا کیا ہیں ' چنانچہ کائنات اور مصری ماحول کے بعض اہم شواہد پیش کئے جاتے ہیں ' کیونکہ مصری سرزمین ایک سرسبز و شاداب زمین تھی ۔ پانی وہاں وافر تھا اور فصل اور مویشی بکثرت تھے ۔

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّ

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾ كُلُوْا ۲

وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۵۴﴾ ع ۳

''وہی جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمہارے چلنے کو راستے بنائے ' اور اوپر سے پانی برسایا '

پھر اس کے ذریعہ سے مختلف اقسام کی پیداوار نکالی۔ کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کے لئے"۔

تمام علاقوں میں اور تمام زمانوں میں زمین انسانوں کے لئے ایک گہوارہ رہی ہے۔ ایسا ہی گہوارا جس طرح بچے کا گہوارہ ہوتا ہے' انسانوں کی حیثیت زمین پر اسی طرح ہے کہ جس طرح ماں کے بچے ہوتے ہیں۔ زمین تمام انسانوں کے لیے ماں ہے۔ زمین کا دامن انہیں پناہ دیتا ہے اور زمین کے پستان سے وہ رزق کھاتے ہیں۔ نیز یہ ان کے لئے برائے آرام' برائے سیر' برائے زراعت اور زندگی کی تمام سرگرمیوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ جب سے اللہ نے ہر چیز کو لباس تخلیق پہنایا ہے۔ اس دن سے اس نے اسے ایسا بنایا ہے' زمین کو بھی اس نے یہ شکل و ہیئت دی ہے تاکہ وہ انسانوں کی زندگی کے لئے صالح ہو۔ کیونکہ اللہ کی اسکیم میں انسان نے یہیں رہنا تھا۔ پھر جب انسان کو پیدا کیا تو اسے بھی ایسا ہی بنایا کہ وہ اس کرۂ ارض پر تخلیق کے لئے تیار ہو' کیونکہ اللہ نے زمین کو بھی انسانوں کے لئے تیار کیا تھا اور گہوارہ بنایا تھا۔ دونوں مفہوم مہد یعنی تیار کیا اور مہد یعنی گہوارہ متقارب ہیں۔

زمین کا تیار شدہ ہونا یا گہوارہ ہونا جس طرح مصر میں ظاہر ہے دنیا کے کسی دوسرے خطے میں ظاہر نہیں ہے۔ یہ نہایت ہی سرسبز اور زرخیز وادی ہے۔ یہاں کے لوگ ہر کام میں کم محنت کر کے بہت کچھ پاتے ہیں' زراعت میں باغات وغیرہ ہیں۔ گویا اطفال انسانیت کے لئے یہ نرم اور آرام دہ گہوارہ ہے۔

خالق کائنات جس نے زمین کو گہوارہ بنایا' اس میں اس نے انسانوں کے لیے راستے بھی بنائے' آسمانوں سے بارشوں کا انتظام کیا' بارشوں کے پانیوں سے نہریں اور دریا چلے' ان میں سے ایک دریائے نیل تھا جو فرعون کے قریب تھا' اور مصریوں کے لیے بہت اہم۔ پھر نباتات بھی جوڑوں کی شکل میں بنائی۔ اور سرزمین مصر بہترین نمونہ ہے فصلوں کی پیداوار اور مویشیوں کے چرانے کے لئے۔

اللہ کی گہری مشیت کو دیکھیے کہ اللہ نے نباتات میں بھی انسانوں کی طرح نر اور مادہ پیدا کیے جس طرح تمام حیوانات نر و مادہ ہیں۔ تمام زندہ چیزوں میں نر و مادہ کا نظام تو بالکل واضح ہے' لیکن نباتات میں بھی یہ نظام ہے۔ اکثر اوقات نباتات میں ایک ہی درخت میں نر اور مادہ کے خلیے ہوتے ہیں اور بعض اوقات نر پودا اور ہوتا ہے اور مادہ پودا اور۔ یوں قوانین قدرت میں ایک ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰي ( ۲۰ : ۵۴ ) "یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کے لیے"۔ اس کائنات کا نظام اس قدر سبق آموز ہے کہ جو شخص ذرا بھی معقولیت کے ساتھ اس کا مطالعہ کرے اس میں اسے بے شمار دلائل و نشانات نظر آئیں گے۔

حضرت موسیٰ نے اس بات کی تکمیل کے لیے اب اللہ کا یہ فرمان آجاتا ہے:

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾ وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ﴿۵۶﴾

"اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے ' اسی میں ہم تمہیں واپس لے جائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے ۔ ہم نے فرعون کو اپنی سب ہی نشانیاں دکھائیں مگر وہ جھٹلائے چلا گیا اور نہ مانا" ۔

اس زمین سے تمہیں پیدا کیا ہے جو تمہارے لئے گہوارہ ہے ۔ جس میں تمہارے لئے راستے بنائے ۔ جس پر ہم نے بارشیں برسائیں اور مختلف قسم کے نباتات پیدا کیے ' کھانے کے لیے اور چارے کے طور پر ۔ اس زمین سے تم پیدا کیے گئے ہو ' اس میں تم دفنائے جاؤ گے اور اسی سے ہم تمہیں دوبارہ نکال کر زندہ کر دیں گے ۔

انسان اس زمین کے مادے سے تخلیق کیا گیا ہے ۔ زمین کے اکثر عناصر اس کے جسم میں موجود ہیں ۔ اس کی فصل اور پیداوار اس کی خوراک ہے ۔ اس کا پانی وہ پیتا ہے ' اسی کی ہوا میں سانس لیتا ہے ۔ یہ اسی کا بیٹا ہے اور یہ اس کے لئے گہوارہ ہے اور جب یہ اس میں دفن کیا جاتا ہے تو اس کا جسم گل سڑ کے خاک ہو جاتا ہے ' گیس بن کر ہوا میں شامل ہو جاتا ہے ' اس زمین سے اسے پھر نکال کر حیات جدید دی جائے گی جیسا کہ پہلے اسے زندگی دی گئی ۔

فرعون کے ساتھ گفتگو میں زمین کا تذکرہ بہت ہی مناسب ہے ' یہ بہت ہی متکبر تھا ' یہ اپنے آپ کو رب مخلوق سمجھتا تھا ' حالانکہ وہ اس زمین کا بچہ تھا ' اور اس زمین میں اسے جانا تھا ' وہ اس زمین میں تخلیق کردہ اشیاء میں سے ایک شے تھا ' اور زمین اور اس کی ہر چیز کا ایک فرض منصبی مقرر ہے لیکن

وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى (۲۰ : ۵۶) "ہم نے فرعون کو اپنی سب نشانیاں دکھائیں مگر وہ جھٹلائے چلا گیا" ۔ اس کے ماحول سے حضرت موسیٰؑ نے اسے جو آیات دکھائیں ان کی بھی اس نے تکذیب کی ۔ اس کو عصا اور ید بیضا کی نشانیاں بھی دکھائیں ' جو آیات تکوینی کا ایک حصہ ہی ہیں مگر اس نے انکار ہی کیا ' اور آیات تکوینی اور آیات خارق عادت میں قرآن کے نزدیک کوئی زیادہ فرق نہیں ہے ' اس لیے قرآن نے یہاں دونوں کا ذکر مشترکہ طور پر کر دیا ۔ قرآن نے صرف اس بات کا ذکر کیا کہ فرعون نے ان تمام آیات و معجزات کو رد کر دیا جادو کہہ کر ۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۵۷﴾ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾

"کہنے لگا "اے موسیٰ ' کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال باہر کرے ؟ اچھا ہم بھی تیرے مقابلے میں ویسا ہی جادو لاتے ہیں ۔ طے کر لے کب اور کہاں مقابلہ کرنا ہے ۔ نہ ہم اس قرارداد سے پھریں گے نہ تو پھریو ۔ کھلے میدان میں سامنے آجا" ۔ موسیٰ نے کہا "جشن کا دن طے ہوا اور دن

چڑھے لوگ جمع ہوں"۔

فرعون نے کوئی مناظرہ نہ کیا' دلیل کا جواب دلیل سے نہ دیا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے دلائل قوی تھے 'موسیٰ علیہ السلام کے دلائل کا تعلق اس کائنات کی نشانیوں سے بھی تھا۔ان دونوں خارق العادات معجزات سے بھی تھا جو موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے تھے اس نے بس ہارے ہوئے آدمی کی طرح جھوٹے الزام کا سہارا لیا کہ موسیٰ نے عصا کو سانپ بنا کر پیش کیا ہے 'یہ ان کی کھلی جادوگری ہے۔نیز وہ ہاتھ کو جادوگری سے سفید کر دیتا ہے۔اس وقت چونکہ مصر میں جادوگری عروج پر تھی اس لیے فرعون نے بھی یہی الزام لگایا۔یہ دونوں معجزات بھی ایسے تھے کہ سحر شکن تھے حالانکہ سحر تو ایک نظربندی اور تخیل ہوتا ہے۔زیادہ سے زیادہ یہ کہ دیکھنے اور سننے والوں کے حواس کو متاثر کر کے دھوکہ دے دیا جاتا ہے اور ایسے آثار نظر آتے ہیں جیسے کہ چیزوں کی حقیقت بھی بدل گئی ہے جیسا کہ بعض اوقات انسان ایسی چیزوں کو دیکھتا ہے جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔یا انسان کو بعض اوقات چیزوں کی وہ صورت نظر نہیں آتی جو فی الحقیقت ہوتی ہے۔ایک جادو زدہ شخص پر بھی بعض اوقات ایسے اثرات ہوتے ہیں کہ جسمانی اور اعصابی طور پر تغیر نظر آتا ہے لیکن حقیقت نہیں بدلتی جبکہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ایسے تھے کہ حقیقت بدل جاتی تھی۔وقتی طور پر مکمل حقیقت بدل جاتی تھی۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰي (۲۰:۵۷) "کہنے لگا اے موسیٰ تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال دے"۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں بنی اسرائیل کو سیاسی عمل کے طور پر غلام بنایا گیا تھا۔اس لیے کہ وہ بڑی کثرت سے تھے 'ان کی آبادی میں اضافہ ہو رہا تھا۔جب اقتدار کا سوال آتا ہے تو سرکش حکمران عوام کو شدید سے شدید تر عذاب دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔وہ انسانوں کو ایسی تکلیفیں دیتے ہیں جن کا جواز انسانوں کے کسی تصور میں نہیں ہوتا۔اور وہ تشدد انسانی ضمیر' انسانی شرافت اور انسانی حقوق کے خلاف ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ فرعون بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرتا تھا' لڑکیوں کو زندہ رکھتا تھا اور ان سے مزدوری لیتا تھا اور بیگار اور مزدوری بھی وہ جو سخت سے سخت ہو۔جب موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے یہ مطالبہ کیا کہ

اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ "ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دو اور انہیں تکلیف نہ دو"۔تو جواب میں اس نے یہ الزام لگایا۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰي (۲۰:۵۷) "موسیٰ' تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہمیں اپنی سرزمین سے اپنے جادو کے زور سے نکال دو"۔کیونکہ بنی اسرائیل کی آزادی اور ہجرت کے یہ معنی ہیں کہ وہ حملہ کر کے مصر پر قابض بھی ہو سکتے ہیں۔

جب اس کے خیال میں موسیٰ علیہ السلام محض جادو کے زور سے بنی اسرائیل کو آزاد کرانا چاہتے ہیں تو قدرتی طور پر جواب یہی ہے کہ ہم بھی ایسا ہی جادو لے آئیں گے۔

فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ (۲۰ : ۵۸) "ہم تمہارے پاس ایسا ہی جادو لے آئیں گے"۔ ہمیشہ سرکشوں اور بے دین لیڈروں نے یہی سمجھا ہے کہ دعوت حق دینے والے دراصل ملک کے اندر اقتدار اعلیٰ کے طالب ہوتے ہیں۔ ان کی دعوت دراصل ایک پردہ ہے جس کے پیچھے وہ انقلابی کام کرتے ہیں۔ اس کے بعد جب وہ دیکھتے ہیں کہ داعی کے پاس دلائل و شواہد ہیں یا تو معجزات ہیں جیسے حضرت موسیٰ کے معجزات یا ان کے پاس ایسے دلائل ہیں جو جادو کی طرح دل میں اتر جاتے ہیں۔ چنانچہ سرکش ڈکٹیٹر حکمران پھر اپنے لیے ایسے ہی دلائل فراہم کرتے ہیں۔ سحر کے مقابلے میں سحر' کلام کے مقابلے میں کلام' اصلاح کے مقابلے میں اصلاح' اچھے اعمال کے مقابلے میں اچھے اعمال' لیکن وہ جانتے نہیں کہ اہل حق کے پاس ایمان ہوتا ہے اور ایمان کے مقابلے میں ان کے پاس ایمان نہیں ہوتا۔ اہل حق کو اللہ کی مدد حاصل ہوتی ہے اور ان سرکشوں کو اللہ کی مدد حاصل نہیں ہوتی۔

چنانچہ فرعون نے موسیٰ کے ساتھ مقابلے کا وقت مقرر کر لیا۔ موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ تم جس وقت چاہو' مقابلہ کر لو' لیکن وقت مقررہ پر دونوں فریق حسب وعدہ ضرور آئیں گے اور چیلنج کو زوردار بنانے کے لئے اس نے یہ شرط لگائی کہ کوئی بھی وقت مقررہ سے پیچھے نہیں ہٹے گا اور مقابلہ بھی کھلے میدان میں عوام الناس کے سامنے ہونا چاہئے۔

مَكَانًا سُوًى (۲۰ : ۵۸) "یعنی کھلا میدان"۔ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے فرعون نے چیلنج دیا' اور مقابلے کا دن جشن کا مشہور دن مقرر ہوا۔ جشن کے دن لوگ خوشیاں مناتے ہیں اور خوب زیب و زینت سے آتے ہیں۔ کھلے میدانوں میں جمع ہوتے ہیں۔

قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ (۲۰ : ۵۹) "موسیٰ نے کہا جشن کا دن طے ہوا"۔ اور یہ بھی کہا کہ سورج نکلتے ہی لوگ جمع ہوں تاکہ جگہ کھلی ہو' وقت لوگوں کے اجتماع کا ہو' صبح کا وقت اس لیے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ آسکیں' نہ گرمی ہو' نہ رات کا اندھیرا ہو۔ بہت سویرے بھی نہ ہو کہ لوگ گھروں سے نکلنے کے لیے ابھی فارغ ہی نہ ہوئے ہوں۔ دوپہر بھی نہ ہو کہ بہت گرمی ہوتی ہے' شام بھی نہ ہو کہ اندھیرا ہو جاتا ہے۔ لوگ جمع بھی نہیں ہوتے۔ اور پھر روشنی کا بھی مسئلہ ہوتا ہے۔ الضحى یعنی دن چڑھنے کا وقت سب سے موزوں ہے۔

اب یہ منظر موسیٰ و ہارون اور فرعون کے ساتھ ان کی پہلی ملاقات کا منظر یہاں ختم ہوتا ہے۔ ایک طرف ایک مومن داعی ہے اور دوسری طرف ایک متکبر اور سرکش مقتدر اعلیٰ ... پردہ گرتا ہے اور آئندہ ملاقات مقابلے کے میدان میں ہوگی۔

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ۝۶۰

"فرعون نے پلٹ کر اپنے سارے ہتھکنڈے جمع کیے اور مقابلے میں آگیا۔ یہاں اب ہم میدان مقابلہ میں ہیں"۔
قرآن مجید نے فرعون کی ہدایات' فرعون کے سرداروں کے مشورے اور پھر اس کے اور جادوگروں کے درمیان جو مکالمہ ہوا' ان سب امور کو مجمل چھوڑ دیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے باہم جو مشورے ہوئے' جو تیاریاں کی گئیں' جادوگروں سے جو وعدے ہوئے اور ان کی جو حوصلہ افزائی کی گئی یہ سب امور یہاں ترک کر دیئے گئے ہیں۔ صرف ایک

مختصر جملہ کہا کہ "فرعون نے پلٹ کر اپنے سارے ہتھکنڈے جمع کر لیے اور مقابلے میں آگیا" ۔ یہ مختصر اور چھوٹی سی آیت مسلسل تین اقدامات اور حرکات کو ظاہر کرتی ہے 'فرعون گیا' تمام تدابیر اختیار کیں اور مقابلے پر آگیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سوچا کہ مقابلے میں آنے سے قبل ان لوگوں کو نصیحت کرنا ایک بنیادی فریضہ ہے یہ کہ حق کے مقابلے میں وہ جو افترا باندھ رہے ہیں وہ نہایت ہی خطرناک فعل ہے' اس لیے کہ ہو سکتا ہے وہ باز آجائیں' جادو کے ذریعہ سچائی کے مقابلے میں آنے کا ارادہ ترک کر دیں' یہاں جادو کو افتراء کہا گیا ہے۔

قَالَ لَهُمْ مُّوسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾

"موسیٰ نے (عین موقع پر گروہ مقابل کو مخاطب کر کے) کہا "شامت کے مارو' نہ جھوٹی تہمتیں باندھو اللہ پر' ورنہ وہ ایک سخت عذاب سے تمہارا ستیاناس کر دے گا۔ جھوٹ جس نے بھی گھڑا وہ نامراد ہوا"۔

دل سے جو بات نکلتی ہے' اثر رکھتی ہے۔ نظر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس بات کا اثر بعض جادوگروں پر ہوا تھا۔ کیونکہ حضرت موسیٰ نے یہ الفاظ نہایت ہی اخلاص اور دلسوزی سے ادا کیے تھے' اس کا ان پر اثر یہ ہوا کہ وہ اپنے اس اقدام پر نظر ثانی کے لیے تیار ہو گئے لیکن جو لوگ اس مقابلے پر اصرار کر رہے تھے انہوں نے دوسروں کے ساتھ جھگڑنا شروع کر دیا لیکن سرگوشی کی شکل میں تاکہ موسیٰ نہ سن سکے۔

فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿٦٣﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿٦٤﴾

"یہ سن کر ان کے درمیان اختلاف رائے ہو گیا اور وہ چپکے چپکے باہم مشورہ کرنے لگے۔ آخر کار کچھ لوگوں نے کہا کہ "یہ دونوں تو محض جادوگر ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہاری زمین سے بے دخل کر دیں اور تمہارے مثالی طریق زندگی کا خاتمہ کر دیں۔ اپنی ساری تدبیریں آج اکٹھی کر لو اور ایکا کر کے میدان میں آجاؤ۔ بس یہ سمجھ لو کہ آج جو غالب رہا وہی جیت گیا"۔

جب اصرار کرنے والوں نے دیکھا کہ موسیٰؑ کی نصیحت کا بعض لوگوں پر اثر ہو گیا ہے تو انہوں نے ایک دوسرے کے حوصلے بلند کرنے کے لئے دلائل دینا شروع کیے کہ موسیٰ اور ہارون بہت خطرناک ہیں' یہ مصر پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں'

لوگوں کے نظریات بدلنا چاہتے ہیں' لہٰذا ان کا مقابلہ متحد ہو کر کرنا چاہئے۔ اس میں تردد اور نزاع کے بجائے یکسوئی ہونی چاہئے۔ اور آج کا مقابلہ بہت ہی اہم ہے۔ اس میں جو بھی کامیاب ہوا مستقبل اس کا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف ایک بات کی' لیکن یہ بات چونکہ پختہ یقین اور سچائی پر مشتمل تھی اس لیے وہ مخالف کیمپ میں گولے کی طرح گری اور اس نے سب کچھ ہلا کر رکھ دیا۔ ان کے اندر افراتفری پیدا ہو گئی' ان کو اپنے اوپر اعتماد نہ رہا۔ اپنے عقائد و نظریات پر وہ شک کرنے لگے۔ دعوت حق ہمیشہ ایسی ہوتی ہے اور داعیان حق کو ہمیشہ نہایت ہی زوردار طریقے سے بات کرنا چاہئے۔ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام صرف دو آدمی تھے۔ جادوگر بہت تھے' ان کی پشت پر فرعون' اس کی پوری حکومت' اس کی فوج اور اس کا حکومتی رعب اور اس کے مالی وسائل تھے۔ جبکہ موسیٰ و ہارون کے ساتھ ان کا رب تھا اور یہ عقیدہ محکم تھا کہ وہ ان کے ساتھ ہے' سن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے۔

یہی وہ راز ہے جس سے فرعون جیسے قاہر و جابر کے یہ اقدامات اس کی پریشانی اور جادوگروں کی یہ دوڑ دھوپ' اور پوری حکومتی مشینری کا حرکت میں آنا سمجھ میں آ جاتا ہے' کیونکہ موسیٰ اور ہارون گویا تھے کہ فرعون جیسی قوت ان کو چیلنج دیتی ہے' اور ان کے چیلنج کو قبول کرتی ہے۔ پھر یہ حکومت مکمل تیاری کرتی ہے اور میدان میں آتی ہے' تمام جادوگر جمع کرتی ہے' لوگ جمع کیے جاتے ہیں' خود فرعون اور اس کے سردار اس مقابلے کا مشاہدہ کرتے ہیں نیز فرعون نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام دو افراد کے ساتھ مقابلہ و مباحثہ کرنا قبول کس طرح کیا حالانکہ وہ بنی اسرائیل میں سے تھے اور بنی اسرائیل مصریوں کے غلام تھے۔ نہایت ذلت کے ساتھ وہاں زندگی گزار رہے تھے۔ یہ اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کے اوپر سچائی کی ہیبت ناک چادر ڈال دی تھی اور اللہ ان کے ساتھ کھڑا تھا' سن رہا تھا اور دیکھ رہا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا ایک ہی جملہ ان کی صفوں میں زلزلہ برپا کر دیتا ہے' وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ خفیہ مشورے کریں' اس خطرے کو محسوس کریں' ایک دوسرے کی ہمت بندھائیں اور ایک دوسرے کو اتحاد و اتفاق کی دعوت دیں اور اس مقابلے میں ثابت قدمی اختیار کریں۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَ اِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿٦٥﴾

"جادوگر بولے "موسیٰ تم پھینکتے ہو یا پہلے ہم پھینکیں"۔ یہ ان کی جانب سے میدان میں دعوت مقابلہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جادوگر بہت پر اعتماد ہیں اور چیلنج اور اصول کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔

قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ

"موسیٰ نے کہا "نہیں تم ہی پھینکو"۔ موسیٰ علیہ السلام نے چیلنج قبول کرتے ہوئے ان کو موقع دیا کہ پہلے پھینکیں اور اپنے لیے آخری وار پسند کیا۔ لیکن بظاہر وہ ایک خوفناک اور عظیم جادو لے کر آئے ہیں۔ اچانک جب انہوں نے جادو شروع کیا تو میدان یوں لگتا تھا کہ سانپوں کی موجیں حرکت میں آ گئی ہوں' خود حضرت موسیٰ خوفزدہ ہو گئے۔

فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿۶۶﴾ فَاَوْجَسَ فِىْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿۶۷﴾

"یکایک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں ان کے جادو کے زور سے موسیٰ کو دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں، موسیٰ اپنے دل میں ڈر گیا"۔

قرآن کریم کا انداز تعبیر بتاتا ہے کہ یہ جادو اس قدر عظیم تھا کہ حضرت موسیٰ بھی دل میں ڈر گئے۔ جبکہ اس کے ساتھ اس کے رب بھی کھڑے تھے اور سب کچھ سن رہے تھے اور جان رہے تھے۔ موسیٰ تب ہی دل میں خائف ہو سکتے تھے کہ یہ سحر اس قدر خوفناک تھا کہ ایک لمحے کے لیے وہ یہ بھی بھول گئے کہ وہ زیادہ قوی ہیں اور ان کے ساتھ رب عظیم کی عظیم قوت ہے چنانچہ اللہ ان کو یاد دلاتے ہیں :

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿۶۸﴾ وَاَلْقِ مَا فِىْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ؕ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿۶۹﴾

"ہم نے کہا "مت ڈر' تو ہی غالب رہے گا' پھینک جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے' ابھی ان کی ساری بناوٹی چیزوں کو نگلے جاتا ہے۔ یہ جو کچھ بنا کر لائے ہیں۔ یہ تو جادوگر کا فریب ہے' اور جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا' خواہ کسی شان سے وہ آئے"۔

موسیٰ تم نہ ڈرو۔ تم ہی یقیناً غالب رہو گے۔ تمہارے ساتھ سچائی ہے' ان کے پاس باطل ہے۔ تمہارے پاس ایک نظریہ' ایک عقیدہ ہے اور ان کے پاس خرافات ہیں' تمہارے پاس دولت ایمان ہے جو اس موقف کی تصدیق کرتی ہے جس پر تم ہو' جبکہ ان کے پاس اس کے مقابلے کی فیس ہے اور کچھ دوسری سہولیات ہیں جو اس دنیا سے متعلق ہیں' تمہارا رابطہ اس کائنات کی عظیم قوت اور سچائی کے ساتھ ہے اور وہ ایک حقیر بشر اور انسان کے خدمت گار ہیں۔ یہ بشر جس قدر قہار و جبار بھی ہو' مگر فانی ہے۔

نہ ڈرو وَ اَلْقِ مَا فِي يَمِينِكَ (۲۰:۶۹) "پھینک جو تیرے ہاتھ میں ہے"۔ جو تیرے ہاتھ میں ہے' عصا کا نام نہ لینے میں اس کی عظمت کا اظہار ہے (تفخیم کے لیے)

تَلْقَفْ مَا صَنَعُوا (۲۰:۶۹) "ابھی ان کی ساری بناوٹی چیزوں کو نگل جاتا ہے"۔ کیونکہ انہوں نے جو کچھ دکھایا ہے وہ تو ایک جادو ہے' جادوگروں کی کارستانی ہے اور جادوگر جہاں بھی جائے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا' چاہے وہ جو طریقہ بھی اپنائے کیونکہ وہ محض تخیل کے تابع ہوتا ہے۔ وہ تخیل پیدا کرتا ہے' اور تخیل یا تخییل اور توہم حقیقت کو نہیں بدلتے۔ ان کا انجام وہی ہوتا ہے جو ایک سچے کے مقابلے میں جھوٹے اور باطل پرست کا ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کا باطل بظاہر بڑا اور پھولا ہوا نظر آتا ہے اور صرف اس شخص کو ڈرا سکتا ہے جو غافل اور جاہل ہو اور حقیقت سے بے خبر ہو اور

جسے حق کی قوت کا اندازہ نہیں ہوتا جو پوشیدہ ہوتی ہے' جو خوفناک ہوتی ہے' جو تکبر' مبالغہ اور ظاہر مستی سے خالی ہوتی ہے مگر وہ حقیقی قوت ہوتی ہے اور باطل کا آخر کار سر پھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ باطل اچانک مٹ جاتا ہے۔ حق کی قوت باطل کو نگل جاتی ہے۔ چنانچہ باطل اپنی بساط لپیٹ کر غائب ہو جاتا ہے۔

غرض موسیٰ نے عصا پھینکا اور اس عظیم معجزے کا ظہور ہو گیا۔ یہاں قرآن مجید اس عظیم معجزے کے صرف وہ اثرات قلم بند کرتا ہے جو جادوگروں پر ہوئے' کیونکہ مقابلہ وہ کر رہے تھے اس لیے انہی کی کوششیں زیادہ تھیں کہ وہ کامیاب ہوں' اس سے قبل آ گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حوصلے بھی بڑھا رہے تھے اور مقابلے کے لیے ایک دوسرے کو اکسا رہے تھے۔ یہ لوگ اس قدر عظیم ماہر فن تھے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو خوفزدہ کر دیا تھا۔

موسیٰ علیہ السلام پیغمبر تھے لیکن انہیں یوں نظر آ رہا تھا کہ ان کے عصا اور رسیاں زندہ سانپ ہیں اور پورا میدان ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ قرآن یہاں ان کی اچانک مکمل تبدیلی کی تصویر پیش کرتا ہے۔ ان کا شعور' ان کا وجدان' ان کی اندرونی دنیا یکسر بدل گئی ہے۔ اس تبدیلی کو صرف اسٹیج پر عملی ایکشن ہی سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ میں اس کا عکس نہیں دکھایا جا سکتا' چنانچہ ایکشن ہوتا ہے۔

فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى ﴿۷۰﴾

"آخر کو یہی ہوا کہ سارے جادوگر سجدے میں گرا دیئے گئے اور وہ پکار اٹھے "مان لیا ہم نے ہارون اور موسیٰ کے رب کو"۔ حساس اعصاب والے افراد پر بعض اوقات بجلی جیسا اثر ہوتا ہے' بٹن دبایا اور روشنی چمک اٹھی' اندھیرا ختم ہوا۔ ان کے دل کا سوئچ آن ہو گیا اور ایک لحظہ میں ان کی دنیا بدل گئی۔ دل کافر' اب دل مومن تھا۔

لیکن اقتدار کے نشے میں بدمست لوگوں پر اس کا کیا اثر ہوتا۔ مردناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر ہوتا ہے۔ ان کو کیا پتہ کہ اللہ مقلب القلوب ہے' دلوں میں انقلاب کس طرح آتا ہے۔ اقتدار کے نشے میں بدمست ڈکٹیٹر چونکہ طویل عرصے تک سرکشی اور نافرمانی کی حالت میں رہتے ہیں اس لیے وہ نہیں سمجھتے' پھر ان کے اقتدار کی وجہ سے دنیا ان کے اشاروں پر چلتی ہے اس لیے وہ حق کو بھی مطیع فرمان دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کو کیا پتہ کہ جب دل نور ایمان سے مالا مال ہو جاتے ہیں اور اللہ سے جڑ جاتے ہیں تو ان پر اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہوتی۔ اب منظر پر ایک جابر حکمران آتا ہے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۫ وَ لَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى ﴿۷۱﴾

"فرعون نے کہا "تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اس کی اجازت دیتا؟ معلوم ہو گیا کہ یہ تمہارا

گرو ہے جس نے تمہیں جادوگری سکھائی تھی۔ اچھا' اب میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواتا ہوں اور کھجور کے تنوں پر تم کو سولی دیتا ہوں۔ پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم دونوں میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے"۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ (۲۰: ۷۱) "تم اس پر ایمان لائے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا"۔ یہ ایک سرکش حکمران کی سوچ ہے۔ وہ اس قدر بھی نہیں جانتا کہ یہ بیچارے خود بھی اب اپنے نفوس و قلوب کے مالک نہیں رہے۔ ان کے دلوں پر ایمان چھا گیا ہے۔ یہ خود بھی ایمان کو اب دل سے نکال نہیں سکتے۔ دل تو رحمٰن کی دو انگلیوں میں ہوتا ہے وہ جس طرح چاہتا ہے اسے پھیر دیتا ہے۔

اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ (۲۰: ۷۱) "معلوم ہو گیا کہ یہ تمہارا گرو ہے جس نے تمہیں جادوگری سکھائی تھی"۔ اس شخص کی نظروں میں شکست تسلیم کرنے کی اصل وجہ یہ ہے۔ یہ وجہ نہیں ہے کہ ان کے دلوں میں ایمان اس راستے سے داخل ہو گیا جس کا وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ یہ وجہ بھی نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے قلب و نظر پر پڑے ہوئے پردے ہٹا دیئے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقی وجوہات ہیں۔

سرکشوں اور ڈکٹیٹروں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخالفین کو سخت ترین تشدد کی دھمکی دیتے ہیں اور جب وہ لوگوں کے دلوں کو نہیں بدل سکتے تو وہ لوگوں کے جسم اور بدن کو اذیت دیتے ہیں۔ ان کا آخری حربہ یہی ہوتا ہے۔

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ (۲۰: ۷۱) "اچھا' اب میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواتا ہوں اور کھجور کے تنوں پر تم کو سولی دیتا ہوں"۔

ڈکٹیٹر کا ہتھیار اندھی قوت کا استعمال ہے۔ جانوروں اور درندوں کی قوت جو جنگل کے قانون کے نام سے مشہور ہوتی ہے۔ وہ قوت جو کسی کمزور کو چیر پھاڑ کر کھا جاتی ہے۔ اس کے خیال میں انسان کے درمیان جو دلیل سے بات کرتا ہے اور اس حیوان کے درمیان جو پنجے سے بات کرتا ہے' کوئی فرق نہیں ہوتا۔

وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى (۲۰: ۷۱) "پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم دونوں میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے"۔

لیکن اب وقت اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ایمان کے احساس نے اس نہایت ہی حقیر ذرے کو ایک عظیم قوت سے ملا دیا تھا۔ یہ ذرہ اب عظیم قوت کا سرچشمہ تھا۔ اس کے سامنے اب فرعون جیسی عظیم قوت بھی ہیچ ہے۔ اب ان جادوگروں کے سامنے دنیا کی اس مختصر زندگی کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ان کے دلوں کے سامنے نہایت ہی روشن اور کھلی دنیا کے آفاق کھل گئے تھے۔ اب ان کے سامنے اس دنیا اور اس کے انعام و اکرام کی حقیقت ہی کیا رہ گئی تھی۔ دنیا کا مال و متاع ان کی نظروں میں اب بے وقعت تھا۔

----------

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الَّذِيْ فَطَرَنَا
فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ؕ﴿۷۲﴾ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا
لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۷۳﴾

"ولیعنی میں تمہیں زیادہ سخت سزا دے سکتا ہوں یا موسیٰ۔ جادوگروں نے جواب دیا" قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا ہے' یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم روشن نشانیاں سامنے آنے کے بعد بھی (صداقت پر) تجھے ترجیح دیں۔ تو جو کچھ کرنا چاہے کر لے۔ تو زیادہ سے زیادہ بس اسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے' تا کہ وہ ہماری خطائیں معاف کر دے اور اس جادوگری سے' جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا' درگزر فرمائے۔ اللہ ہی اچھا ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے"۔

یہ ہے ایمان کا احساس' ان دلوں کے اندر جو چند لمحات قبل فرعون کی پوجا کرتے تھے اور فرعون کے قرب کے لیے وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھتے تھے۔ لیکن اچانک ان کے دلوں میں قوت کا ایک نیا سرچشمہ پھوٹ پڑا۔ اب وہ فرعون کی مملکت' اس کی قوت' اس کے مرتبے اور اس کے اقتدار کو چیلنج کر رہے ہیں۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الَّذِيْ فَطَرَنَا (۲۰ : ۷۲) "جادوگروں نے جواب دیا قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا' یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم روشن نشانیاں سامنے آجانے کے بعد بھی تجھے ترجیح دیں"۔ یہ بات ہمارے لیے بہت ہی مشکل ہے کیونکہ اللہ جل شانہ بہت بڑا اور بہت بلند ہے۔

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (۲۰ : ۷۲) "تو جو کچھ کرنا چاہے کر لے"۔ تمہارے پاس جو قوت ہے اسے استعمال کر لو۔

اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (۲۰ : ۷۲) "تو زیادہ سے زیادہ بس اس دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے"۔ کیونکہ تیری حکومت اسی دنیا میں ہے۔ اس دنیا سے آگے تمہاری حکومت نہ ہوگی۔ اس دنیا کی زندگی تو بہت ہی مختصر ہے۔ بہت ہی معمولی ہے' تمہارے پاس جو سزا ہے وہ ان دلوں کے لیے بہت آسان ہے جن کا رابطہ اللہ سے ہو جائے' جن کی امیدیں ابدی زندگی کی بہتری کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہیں۔

اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ (۲۰ : ۷۳) "ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے تاکہ وہ ہماری خطائیں معاف کر دے اور اس جادوگری سے جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا ہے' درگزر فرمائے"۔ تم نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم جادوگری کریں اور ہم تیرے حکم سے سرتابی نہ کر سکتے تھے۔ امید ہے کہ اس ایمان لانے کی وجہ سے اللہ ہمارے گناہ معاف کر دے۔

وَ اللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى (۲۰ : ۷۳) "اللہ ہی اچھا ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے"۔ اللہ نے جادوگروں

کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اس سرکش ڈکٹیٹر کے سامنے تم معلم اور مبلغ کا انداز اختیار کر لو"۔

----------

إِنَّهُۥ مَن يَأْتِ رَبَّهُۥ مُجْرِمًا فَإِنَّ لَهُۥ جَهَنَّمَ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا
يَحْيَىٰ ﴿٧٤﴾ وَمَن يَأْتِهِۦ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّٰلِحَٰتِ فَأُولَٰٓئِكَ لَهُمُ
الدَّرَجَٰتُ الْعُلَىٰ ﴿٧٥﴾ جَنَّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ ۳
فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَآءُ مَن تَزَكَّىٰ ﴿٧٦﴾ ع ۲۲
۱۲

"یہ ہے کہ جو مجرم بن کر اپنے رب کے حضور حاضر ہو گا اس کے لیے جہنم ہے جس میں وہ نہ جیسے گا نہ مرے گا اور جو اس کے حضور مومن کی حیثیت سے حاضر ہو گا جس نے نیک عمل کیے ہوں گے' ایسے سب لوگوں کے لیے بلند درجے ہیں' سدا بہار باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی' ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے ۔ یہ جزا ہے اس شخص کی جو پاکیزگی اختیار کرے"۔

اس نے ان کو دھمکی دی تھی کہ کون سخت ہے اور کس کا اقتدار دائمی ہے تو وہ پیش کرتے ہیں کہ جو شخص اللہ کے سامنے مجرم بن کر آئے تو اس کو شدید عذاب ملتا ہے اور وہ عذاب دوزخ ہوتا ہے کیونکہ

فَاِنَّ لَهُ جَهَنَّمَ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰي (۲۰ : ۷۴) "اس کے لیے جہنم ہے جس میں وہ نہ مرے گا اور نہ جیسے گا"۔ نہ وہ مر کر آرام کرے گا اور نہ زندہ رہ کر آرام میں ہو گا۔ وہ ایسا عذاب ہو گا کہ اس کے نتیجے میں موت بھی واقع نہ ہو گی' نہ آرام کی زندگی ملے گی جبکہ دوسری جانب بلند درجے ہیں۔ ایسے باغات ہیں اور ان میں ایسے بالاخانے ہیں' جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔

وَ ذٰلِكَ جَزٰؤُا مَنْ تَزَكّٰي (۲۰ : ۷۶) "اور یہ جزاء ہے اس شخص کی جو پاکیزگی اختیار کرے"۔ اور گناہوں سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ ایک سرکش اور تشدد پسند مقتدر اعلیٰ کی دھمکی جس نے اہل ایمان کے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا' لیکن جواب میں انہوں نے بھی قوت ایمانی کے ساتھ جواب دیا۔ ایمان کی سربلندی کا ثبوت دیا اور اس سرکش کو انجام بد سے ڈرایا اور اسے گہرے ایمان کی چمک دکھائی۔

یہ منظر اب آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے لیکن اس نے ثابت کر دیا کہ جن لوگوں کے دلوں میں ایمان داخل ہو جاتا ہے تو وہ اس دنیا کے حدود و قیود کو پار کر کے' اپنی آزادی اور حریت کا اعلان کر دیتے ہیں۔ ان دلوں میں پھر طمع و لالچ نہیں رہتا' ان کے سامنے زمین کا اقتدار ہیچ ہوتا ہے۔ اہل اقتدار کے ڈر سے وہ بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ کوئی بھی انسان اور قلب انسانی آزادی کا یہ اعلان صرف ایمانی قوت کے بل بوتے پر کر سکتا ہے۔ اب پردہ گرتا ہے' تاکہ اس قصے کی ایک

جدید کڑی کو اسٹیج پر لایا جائے۔

یہ وہ منظر ہے جس میں ایک پچی جماعت کو اس کرۂ ارض پر بھی کامیابی نصیب ہوتی ہے لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب وہ نظریات اور ایمان کی دنیا میں اخلاقی فتح حاصل کر لیتی ہے۔ سیاق کلام میں عصا کو جادوگری پر فتح حاصل ہو چکی ہے۔ جادوگروں کے ایمان کو فرعون پر اخلاقی فتح حاصل ہو چکی ہے۔ ایمان کے بعد ان کو تمام دنیاوی خوف و خطر پر فتح حاصل ہو چکی ہے۔ وہ اب دھمکی اور دھونس سے نہیں ڈرتے۔ اب حق باطل پر' ایمان ضلالت پر' حق سرکشی پر عالم واقعہ میں فتح حاصل کرتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ آخری فتح مشروط ہے ایمانی اور نظریاتی فتح کے ساتھ۔ واقعہ اور میدان جنگ میں فتح تب ہوتی ہے جب ضمیر کے اندر کوئی گروہ فاتح ہو۔ اہل حق کو ظاہری فتح' ان کے باطن کی فتح کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایمان اور نظریات اپنے اندر ایک حقیقت رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت جب انسان کے شعور اور اس کی سوچ میں مجسم ہوتی ہے تو پھر یہ باہر نکلتی ہے اور لوگ اسے واقعی صورت میں زمین پر دیکھتے ہیں۔ اگر ایمان دلوں کے اندر مجسم شکل میں موجود نہ ہو' اور سچائی ایک شعاع اور عمل کی شکل میں دلوں سے بہہ کر نہ نکلتی ہو تو ایسے حالات میں سرکش اہل باطل ہی غالب ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایک ایسی مادی قوت کے مالک ہوتے ہیں جس کے مقابلے کے لئے ایمانی قوت بھی اہل حق کے ساتھ نہیں ہوتی اور قوت کا توازن نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ قلب اور دل میں ایمان ایک حقیقی قوت کی شکل میں موجود ہو۔ یہ ایمانی قوت اگر کسی کے اندر موجود ہو تو وہ بڑی سے بڑی مادی قوت کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا یہی موقف تھا جو انہوں نے جادوگروں' فرعون اور سرداران فرعون کے مقابلے میں اختیار کیا۔ وہ ایمانی اور نظریاتی اور اخلاقی کامیابی کے بعد اس سرزمین پر بھی کامیاب ہوئے۔ ذرا اس منظر کو دیکھئے۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ۝ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ۝

''ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ اب راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ' اور ان کے لیے سمندر میں سے سوکھی سڑک بنالے' تجھے کسی کے تعاقب کا ذرا خوف نہ ہو اور نہ (سمندر کے بیچ سے گزرتے ہوئے) ڈر لگے۔ پیچھے سے فرعون اپنے لشکر لے کر پہنچا' اور پھر سمندر ان پر چھا گیا جیسا کہ چھا جانے کا حق تھا۔ فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ ہی کیا تھا' کوئی صحیح رہنمائی نہیں کی تھی''۔

یہاں قرآن مجید نے وہ تمام واقعات حذف کر دیے ہیں جو جادوگروں کے ساتھ مقابلے کے بعد پیش آئے۔ فرعون نے جادوگروں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ جبکہ وہ اپنی قوت ایمانی کے ساتھ فرعون کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ وہ اس کی دھمکیوں سے نہ ڈرے' انہوں نے حیات دنیا کے بارے میں اپنا جدید نظریہ فرعون کے سامنے بڑی بے باکی سے پیش کیا۔ ان سب واقعات کو چھوڑ کر یہاں اب فتح ظاہری کا یہ منظر دکھایا جاتا ہے' تاکہ قلبی اور نظریاتی فتح کے بعد اب میدانی فتح کو

دکھایا جائے اور اللہ کی نصرت اور مدد اہل ایمان کو بچشم سر نظر آجائے۔ مکمل اور فیصلہ کن فتح۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اس منظر سے قبل بنی اسرائیل کے منظر خروج اور سمندر کے سامنے ان کے کھڑے ہونے کے مناظر کو طول نہیں دیا گیا' جس طرح ان مناظر کو دوسری سورتوں میں مفصل دکھایا گیا۔ بلکہ چند جھلکیوں کے بعد مکمل فتح ہمارے سامنے ہے کیونکہ یہ تمام حذف شدہ مناظر ذہن انسانی خود سوچ سکتا ہے۔ اس لیے یہ تخیل پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ میرے بندوں کو لے کر رات کو نکل جائیں۔ سمندر میں ان کو خشک راہ مل جائے گی اور فرعون کے لشکر ان کو نہ پکڑ سکیں گے۔ سمندر میں بننے والے خشک راستوں میں بھی خوف نہ کھاؤ' اللہ نے سمندر میں پانی کو جس قانون کے مطابق رکھا ہوا ہے وہ اسے کچھ دیر کے لیے اپنی طبیعی ڈگر سے ہٹا بھی سکتا ہے۔ ان ہدایات پر عمل کرتے ہوئے جب موسیٰ نکلے تو:

فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ (۷۸) وَ اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَ مَا هَدٰي (۷۹) (۲۰: ۷۸ ـ ۷۹) "پیچھے سے فرعون اپنے لشکر لے کر پہنچا' اور پھر سمندر ان پر چھا گیا جیسا کہ چھا جانے کا حق تھا۔ فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ ہی کیا تھا' کوئی صحیح رہنمائی نہیں کی تھی"۔

قرآن مجید یہاں فرعون کی غرقابی کا بھی مجملاً ذکر کرتا ہے۔ تفصیلات نہیں دی جاتیں تاکہ یہ واقعہ مجمل ہی رہے۔ فرعون نے زندگی بھر اپنی قوم کی قیادت فسق و فجور اور ضلالت میں کی اور اب تباہی اور بربادی کے وقت بھی سمندر میں اس نے اپنی قوم کی قیادت کی۔ جس طرح اس واقعہ کی اس کڑی کو یہاں قرآن مجید نے خاص حکمت کے تحت مجمل چھوڑا ہے ہم بھی اسے مجمل ہی رہنے دیتے ہیں۔ مناسب ہے کہ اس منظر سے ہمیں جو سبق حاصل ہوتا ہے اور اس منظر میں واقعات کا جو اثر دلوں پر ہوتا ہے اس کے حوالے سے بحث کی جائے۔

اس قصے میں پہلی عبرت یہ ہے کہ دست قدرت نے ایمان اور سرکشی کو آمنے سامنے لاکھڑا کیا ہے اور ان کے درمیان معرکہ برپا کیا گیا ہے' اس معرکہ میں اہل ایمان سے صرف یہ مطالبہ کیا گیا کہ بس وہ فقط احکام کی اطاعت کرتے چلے جائیں۔ حکم ہوا کہ تم رات کو نکل پڑو' اس لیے کہ دونوں محاذوں کے درمیان جنگی قوت کا توازن نہ تھا۔ حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو ان دو قوتوں کے درمیان کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم ضعیف ہیں۔ ان کے پاس کوئی مادی قوت نہیں ہے۔ جبکہ فرعون اور اس کی افواج ہر قسم کی قوت رکھتی ہیں۔ لہٰذا ان کے درمیان کسی مادی جنگ کا کوئی موقع ہی نہیں ہے اس لیے یہ جنگ دست قدرت نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ لیکن جب اہل ایمان کے دلوں میں ایمانی قوت مضبوط ہو گئی' ایمان ان کے دلوں میں اچھی طرح داخل ہو گیا اور اس کے سوا ان کے پاس اور کوئی مادی قوت نہ تھی تو قوت ایمانی نے ایک سرکش مقتدر اعلیٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی۔ اس کی دھمکیوں سے نہ ڈری اور اہل اقتدار کے پاس جو دولت اور عزت تھی اسے خاطر میں نہ لائی۔ سرکش ڈکٹیٹر نے کہا

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ

۷۱) "میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالوں گا اور کھجور کے تنوں پر تمہیں سولی دوں گا"۔ تو جواب میں انہوں نے کہا

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (۲۰: ۷۲) "تو جو کچھ کرنا چاہے کر لے تو زیادہ سے زیادہ بس اس دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے"۔ جب دلوں کے میدان میں نظریاتی اور ایمانی قوت اور سرکشی اور اقتدار کی قوت کے درمیان معرکہ یہاں تک پہنچ گیا تو اب دست قدرت نے ایمان کا جھنڈا اٹھا لیا تاکہ اسے بلند کر دے اور اہل باطل کا جھنڈا سرنگوں کر دیا گیا بغیر اس کے کہ اہل حق اس کے لیے کوئی مادی جدوجہد کریں۔

دوسری عبرت یہ ہے کہ جب تک بنی اسرائیل ذلت اور غلامی کا ٹیکس فرعون کو ادا کرتے رہے ان کے بیٹے قتل ہوتے رہے اور ان کی بیٹیاں زندہ چھوڑی جاتی رہیں تو دست قدرت ان کی امداد کے لیے بلند نہ ہوا اور یہ معرکہ آرائی نہ کرائی گئی۔ کیونکہ وہ یہ ٹیکس محض ذلت، غلامی اور خوف کی وجہ سے ادا کرتے رہے لیکن جب ان لوگوں کے دلوں میں ایمان سربلند ہو گیا اور انہوں نے ایمان کی راہ میں مشکلات اور تشدد برداشت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب انہوں نے سر اٹھا کے چلنے کی رسم ڈال لی۔ کلمہ حق بلند کرنا شروع کر دیا اور فرعون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا شروع کر دیا اور یہ کام انہوں نے ہر قسم کا خطرہ انگیز کرتے ہوئے کیا تو پھر دست قدرت ان کی مدد کے لیے بلند ہوا۔ یہ معرکہ شروع ہوا، اس وقت جبکہ میدانی فتح سے قبل اہل ایمان دل کی دنیا میں فتح پا چکے تھے۔

اس اجمال کے ذریعہ یہاں قرآن کریم یہی عبرت اور سبق دینا چاہتا ہے اور ان مناظر میں تفصیلات یعنی جزوی تفصیلات نہیں دی گئی تاکہ دعوت اسلامی کے حاملین کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کی طرف سے ان کی نصرت کب ہو گی اور باغیوں اور سرکشوں کے مقابلے میں فتح کب نصیب ہو گی۔

---ooo---

جب بنی اسرائیل فتح و نصرت کے جھنڈے اٹھاتے ہوئے ایک آزاد فضا میں قدم رکھ رہے تھے تو اب ان کو نصیحت کی جاتی ہے، سچائی کا سبق یاد کرایا جاتا ہے اور انجام بد سے انہیں ڈرایا جاتا ہے تاکہ وہ اس سبق کو بھول نہ جائیں جو فرعون و موسیٰ کی کشمکش سے حاصل ہوتا ہے۔ اب آزادی اور اقتدار کی فضائیں ان کو کبر و غرور میں مبتلا نہ کر دے اور وہ اس سازوسامان کو نظرانداز نہ کر دیں جس کی وجہ سے انہیں طاقت کے عدم توازن کے باوجود، فتح نصیب ہوئی کیونکہ یہ اصل قوت، قوت ایمانی ہی ہر میدان میں فتح کی ضامن ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَ وٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ۝ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَ مَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝ وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا

ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾

"اے بنی اسرائیل ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دی اور طور کے دائیں جانب تمہاری حاضری کے لئے وقت مقرر کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارا۔۔۔کھاؤ ہمارا دیا ہوا پاک رزق اور اسے کھا کر سرکشی نہ کرو ورنہ تم پر میرا غضب ٹوٹ پڑے گا۔ اور جس پر میرا غضب ٹوٹا وہ پھر گر کر ہی رہا۔ البتہ جو توبہ کر لے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے پھر سیدھا چلتا رہے اس کے لیے میں بہت درگزر کرنے والا ہوں"۔

اب تو خطرے کا علاقہ گزر گیا۔ بنی اسرائیل کامیابی سے طور کی طرف سینائی کے میدان میں آگئے۔ فرعون اور اس کی افواج سمندر میں غرق ہو گئیں۔ بنی اسرائیل کی اس نجات پر ابھی تک زیادہ عرصہ نہیں گزرا یہ ان کے حافظے میں تازہ واقعہ ہے لیکن اس تازہ ترین نعمت کی طرف بھی باری تعالیٰ ان کی توجہ مبذول کراتے ہیں کہ تم اس واقعہ کو کہیں بھول نہ جاؤ۔ غور کرو اور شکر کرو۔

یہاں بنی اسرائیل کے ساتھ طور ایمن کے جس وعدے کا ذکر ہے یہ واقعہ ہو چکا ہے۔ مصر سے اخراج کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے طور پر بلایا تھا تاکہ وہ اللہ کے ساتھ ملاقات کے لئے تربیت حاصل کریں گی اور اللہ وہ تعلیمات سنیں جو الواح میں انہیں دی جاتی تھیں۔ جن کا تعلق دین اور شریعت سے تھا اور بنی اسرائیل اس عالمی کردار کے لئے تیار اور منظم ہوں جو انھوں نے ارض مقدس میں سرانجام دینا تھا۔

پھر ان کے لیے من نازل کرنا من ایک ایسا میٹھا مادہ تھا جو درختوں کے پتوں پر جمع ہو جاتا تھا اور سلویٰ ایک پرندہ تھا جو وہاں بکثرت ان کے لیے صحرا میں جمع ہو جاتا تھا جسے بسہولت پکڑا اور کھایا جا سکتا تھا۔ یہ دونوں چیزیں ان کے لیے اس چٹیل میدان اور غیر آباد صحرا میں خصوصی انعام تھیں۔ یہ چیزیں ان کو روزمرہ کے کھانے میں فراہم ہو جاتی تھیں اور بڑی سہولت سے فراہم ہو جاتی تھیں۔

اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو یہ انعامات یاد دلا کر یہ نصیحت کرتا ہے کہ ان کو کھاؤ لیکن سرکشی مت کرو اور عیش و عشرت میں گم ہو کر ان مقاصد اور اس نصب العین کو نہ بھول جاؤ جس کے لیے تم مصر سے نکلے ہو اور جس بات سے یہاں خصوصاً انہیں منع کیا جا رہا ہے وہ سرکشی ہے۔ سرکشی کو تو وہ مصر میں دیکھ چکے تھے۔ اس کے تحت وہ مظالم سہ چکے تھے اور اس کا انجام بھی دیکھ چکے تھے۔

وَ لَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ وَ مَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ

هَوٰي (۲۰ : ۸۱) "سرکشی نہ کرو ورنہ تم پر میرا غضب ٹوٹ پڑے گا اور جن پر میرا غضب ٹوٹا وہ پھر گر کر ہی رہا"۔ حال ہی میں وہ دیکھ چکے تھے کہ فرعون کس طرح گرا۔ وہ تخت سے بھی گرا اور پھر سمندر میں بھی گرا۔ گرنا جس طرح اوپر سے نیچے کے عمل کو دکھاتا ہے اسی طرح سرکشی اور تکبر نیچے سے اوپر کی طرف جانے کے عمل کو ظاہر کرتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کو قرآن کریم اپنے مخصوص انداز بیان کے مطابق باہم مربوط کر کے پیش کرتا ہے جس میں مفہومات باہم متقابل ہوتے ہیں۔

یہ تنبیہ اور ڈراوا اس قوم کے لیے ہے جو حال ہی میں ایک مخصوص مقصد کے لیے مصر سے نکلی ہے تاکہ آزادی اور عیش پرستی ان کو گمراہ نہ کر دے۔ وہ عیش پرستی اختیار کر کے کمزور نہ ہو جائیں۔ لیکن اس تنبیہ اور ڈراوے کے ساتھ ساتھ توبہ کا دروازہ بھی کھلا رہتا ہے تاکہ اگر کسی سے غلطی ہو تو وہ واپس آ سکے۔

وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰي (۲۰ : ۸۲) "البتہ جو توبہ کرے اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے، پھر سیدھا چلے، اس کے لیے میں بہت درگزر کرنے والا ہوں"۔ یہ یاد رہے کہ توبہ صرف لفظ کا نام نہیں ہے کہ کوئی اسے گائے بلکہ یہ تو قلبی عزم کا نام ہے۔ اس کے مفہوم کا تعین ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ ہی ہوتا ہے اور اس کا ظہور عالم واقعہ میں انسانی طرز عمل سے ہوتا ہے۔ اگر توبہ کر لی، ایمان درست رہا اور عمل نے اس کی تصدیق کی تو تب انسان کو ہدایت یافتہ انسان کہا جا سکتا ہے، انسانی ہدایت اور عمل صالح کی ضمانت غرض جب توبہ کے بعد ہدایت نہ ہو یعنی عملی تبدیلی نہ ہو تو توبہ کا کوئی مفہوم نہیں رہتا۔

یہاں تک ہم بنی اسرائیل کی کامیابی اور اس پر تبصرہ و نصیحت کا منظر دیکھ رہے تھے، اب پردہ گرتا ہے اور اس کے بعد دوسرے منظر میں حضرت موسیٰ طور ایمن پر اللہ تعالیٰ سے ہمکلام نظر آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ طور پر چالیس روز گزاریں اور اس کے بعد اللہ سے ہمکلام ہو کر اس سے احکام لیں۔ یعنی شکست کے بعد فتح حاصل کرنے کے احکام۔ فتح حاصل کرنا کچھ تقاضے بھی رکھتا ہے۔ ہر نظریہ کے کچھ تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ نیز احکام لینے کے لیے نفسیاتی تیاری اور اپنے اندر استعداد پیدا کرنا بھی ضروری تھا۔ حضرت موسیٰ پہاڑ پر چڑھ گئے اور قوم کو نیچے چھوڑ دیا اور حضرت ہارون کو ان میں اپنا نائب مقرر کیا۔

موسیٰ علیہ السلام کو اس ملاقات کا بے حد شوق تھا، اللہ کے سامنے حاضری دینا بڑا اعزاز تھا، وہ اس کے لیے بے تاب تھے۔ اس سے قبل وہ اللہ کے ساتھ ہمکلامی کی مٹھاس چکھ چکے تھے۔ اس لیے وہ بے حد شوق سے جلدی میں طور پر پہنچ گئے۔ اللہ کے سامنے کھڑے ہو گئے، لیکن ان کو معلوم نہیں تھا کہ ان کی قوم نے ان کے بعد کیا گل کھلائے ہیں کیونکہ وہ ان کو پہاڑ کے نیچے چھوڑ آئے تھے۔

یہاں موسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ بتا دیتے ہیں کہ تمہارے بعد بنی اسرائیل نے کیا حرکت کی ہے۔ ذرا منظر کو دیکھیں اور گفتگو سنیں:

وَ مَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۸۳﴾ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَ عَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿۸۴﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾

"اور کیا چیز تمہیں اپنی قوم سے پہلے لے آئی اے موسیٰ؟ اس نے عرض کیا "وہ بس میرے پیچھے آ ہی رہے ہیں۔

میں جلدی کر کے تیرے حضور آ گیا ہوں' اے میرے رب' تا کہ تو مجھ سے خوش ہو جائے' فرمایا "اچھا تو سنو' ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے انہیں گمراہ کر ڈالا"۔

موسیٰ علیہ السلام یہ سن کر حیران رہ گئے۔ وہ رب تعالیٰ کی ملاقات کے لیے بے تاب تھے۔ انہوں نے چالیس دن کا وقت بھی گزار لیا تھا اور ملاقات کی تیاری بھی کر لی تھی تا کہ وہ بنی اسرائیل کے لیے نیا نظام زندگی حاصل کر لیں کیونکہ ابھی ابھی وہ آپ کی قیادت میں فرعون کی غلامی سے رہا ہوئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل ایک ایسی امت ہو جس کے پاس ایک پیغام ہو اور اس کے کچھ فرائض ہوں۔

لیکن بنی اسرائیل کی حالت یہ تھی کہ ایک طویل ذلت کی زندگی اور بت پرستانہ فرعونیت کی غلامی نے ان کا ضمیر بدل دیا تھا۔ وہ مشقت برداشت کرنے کے قابل نہ تھے۔ نہ مشکلات میں صبر کر سکتے تھے اور نہ کسی قول و قرار پر ثابت قدم رہ سکتے تھے۔ ان کے شعور میں غلامی تقلید اور سہل پسندی رچ بس گئی تھی۔ جونہی موسیٰ ان کو حضرت ہارون کی نگرانی میں چھوڑ کر ان سے ذرا دور ہوئے ان کے عقائد بدل گئے اور پہلی ہی آزمائش میں وہ چار شانے چت ہو گئے۔ ان کے لیے تو مسلسل امتحان ضروری تھا اور مسلسل مشکلات اور آزمائشوں میں ان کو بار بار ڈالنا ضروری تھا تا کہ ان کی نفسیاتی تربیت ہو۔ گو سالہ پرستی ان کی پہلی آزمائش تھی' یہ ایک مصنوعی بچھڑا تھا جو سامری نے ان کے لیے تیار کیا تھا۔

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ (۲۰: ۸۵) "فرمایا اچھا تو سنو' کہ ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا' اور سامری نے انہیں گمراہ کر ڈالا"۔ موسیٰ علیہ السلام کو اس ابتلاء کا پتہ نہ تھا۔ اللہ کے ساتھ ملاقات میں پہلی بار ان کو پتہ چلا۔ حضرت موسیٰ نے یہ تختیاں لیں۔ ان میں ہدایت تھی۔ اس میں بنی اسرائیل کی زندگی کی تعمیر کے لیے ایک ایسا دستور تھا جو انہیں اس مقصد کے لیے تیار کر کے دیا گیا تھا جس کے لیے انہیں اٹھایا گیا تھا۔

یہاں کوہ طور موسیٰ علیہ السلام کی مناجات کا منظر جلدی سے لپیٹ دیا جاتا ہے تا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان تاثرات کو قلم بند کیا جائے جو ان پر قوم کی گمراہی کی خبر سن کر طاری ہوئے۔ واپسی کے لیے ان کی جلدی بھی منظر پر آئے اور یہ دکھایا جائے کہ وہ کس قدر غیظ و غضب میں ہیں۔ اس قوم کو تو انہوں نے حال ہی میں فرعون کی غلامی سے چھڑایا تھا اور بت پرستی کی ذلت سے نجات دلائی تھی۔ پھر اللہ نے صحرا میں ان کے لیے کھانے پینے کی سہولتیں مہیا کیں اور صاف صاف ہدایات بھی دیں کہ گمراہی سے بچنا اور گمراہی کے عواقب اور نتائج بھی بتا دیئے۔ لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ وہ پہلی ہی پکار پر بت پرست بن گئے اور پھر مصنوعی گو سالہ کی پرستش میں لگ گئے۔

یہاں قرآن مجید صراحت کے ساتھ یہ نہیں بتاتا کہ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی ضلالت کی تفصیلات بتا دی تھی یا نہیں لیکن واپسی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غیظ و غضب کا اظہار کرنا' نہایت ہی ناراض ہونا' بھائی پر غصہ ہونا اور قوم کو ملامت کرنا' یہ سب امور یہ بتلاتے ہیں کہ اللہ نے ان کو سب کچھ بتلا دیا تھا اور وہ جان گئے تھے کہ بنی اسرائیل نے کسی نہایت ہی بری حرکت کا ارتکاب کیا ہے۔

فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ
رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۗ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ
غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ۝٨٦ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ
بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى
السَّامِرِيُّ ۙ۝٨٧ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ
وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۥ فَنَسِيَ ۝٨٨ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۥ وَّلَا يَمْلِكُ
۴ ۱۳ ع لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۝٨٩ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ
۱۳ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ۝٩٠
قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۝٩١

---

"موسیٰ سخت غصے اور رنج کی حالت میں اپنی قوم کی طرف پلٹا۔ جا کر اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو' کیا تمہارے رب نے تم سے اچھے وعدے نہیں کیے تھے؟ کیا تمہیں دن لگ گئے ہیں؟ یا تم اپنے رب کا غضب ہی اپنے اوپر لانا چاہتے تھے کہ تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی؟ انہوں نے جواب دیا "ہم نے آپ سے وعدہ خلافی کچھ اپنے اختیار سے نہیں کی' معاملہ یہ ہوا کہ لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے ہم لد گئے تھے اور ہم نے بس ان کو پھینک دیا تھا"... پھر اسی طرح سامری نے بھی کچھ ڈالا اور ان کے لیے ایک بچھڑے کی مورت بنا کر نکال لایا جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ لوگ پکار اٹھے "یہی ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا' موسیٰ اسے بھول گیا"۔ کیا وہ دیکھتے نہ تھے کہ نہ وہ ان کی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ ان کے نفع و نقصان کا کچھ اختیار رکھتا ہے؟ ہارون (موسیٰ کے آنے سے) پہلے ہی ان سے کہہ چکا تھا کہ "لوگو' تم اس کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے ہو' تمہارا رب تو رحمٰن ہے' پس تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو"۔ مگر انہوں نے اس سے کہہ دیا کہ "ہم تو اسی کی پرستش کرتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ ہمارے پاس واپس نہ آ جائے"۔

یہ ہے وہ فتنہ جس کے ذریعہ بنی اسرائیل گمراہ ہوئے' لیکن قرآن اس کا تذکرہ اس وقت کرتا ہے جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے سامنے آ کر تحقیق کرتے ہیں۔ اس سے قبل اللہ کے ساتھ مناجات کے موقعہ پر قرآن نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ ان تفصیلات کو خفیہ رکھا تاکہ ان کو اس وقت ظاہر کیا جائے جب موسیٰ علیہ السلام خود تحقیقات کر لیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی قوم ایک ایسے مصنوعی بچھڑے کی پوجا کر رہی جو آواز نکالتا ہے۔ یہ بچھڑا سونے سے بنا ہوا ہے۔ مزید یہ کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ہے تمہارا رب اور یہی ہے موسیٰ کا رب۔ موسیٰ غلطی سے طور پر چلے گئے 'رب سے ملاقات کے لیے حالانکہ رب تو یہ ہے حاضر تمہارے سامنے !!

جب موسیٰ علیہ السلام آئے تو نہایت ہی طیش کی حالت میں ان سے پوچھنے لگے۔

يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا (۲۰ : ۸۶) "اے میری قوم کے لوگو' کیا تمہارے رب نے تم سے اچھے وعدے نہیں کیے تھے"۔ اللہ نے ان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر تم عقیدۂ توحید پر جمے رہے تو تم ارض مقدس میں داخل ہو گے اور تمہیں نصرت ملے گی۔ اس عہد اور اس کے آثار کے ظہور پر کوئی زیادہ طویل عرصہ تو نہ گزر گیا تھا۔ وہ ان کی سخت گو شمالی کرتے ہیں۔

اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۲۰ : ۸۶) "کیا تمہیں دن لگ گئے تھے یا تم اپنے رب کا غضب ہی اپنے اوپر لانا چاہتے تھے"۔ کیونکہ تمہارا یہ عمل تو ایسا ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم اللہ کے غضب کے طلبگار ہو' تم نے گویا عمداً یہ حرکت کی ہے اور قصداً تم اللہ کا غضب چاہتے ہو۔ کیا کوئی بہت ہی طویل عرصہ گزر گیا تھا۔

فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ (۲۰ : ۸۶) "تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی"۔ تم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ میرے آنے تک تم میرے عہد پر قائم رہو گے۔ تم اپنے نظریات و عمل میں کوئی تبدیلی نہ کرو گے بغیر میری اجازت کے۔

اب ذرا ان کی معذرت کو دیکھو' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طویل ترین غلامی نے ان کے قلب و نظر کو فاسد کر دیا تھا اور ان کا دماغ بھی صحیح طرح کام نہ کر رہا تھا۔

مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا (۲۰ : ۸۷) "ہم نے آپ سے وعدہ خلافی کچھ اپنے اختیار سے نہیں کی"۔ بات اتنی بڑی تھی کہ ہمارے بس میں نہ تھا کہ ہم اس سے باز رہتے۔

وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا (۲۰ : ۸۷) "معاملہ یہ ہوا کہ لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے ہم لد گئے اور ہم نے بس ان کو پھینک دیا"۔ ان کے پاس مصری عورتوں کے زیورات تھے جو وہ ساتھ لے آئے تھے۔ اس بوجھ کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں۔ ہم نے ان زیورات کو بوجھ اتارنے کے لیے پھینک دیا تھا کیونکہ یہ ہمارے پاس تھے اور تھے حرام۔ سامری نے ان کو چن لیا اور ان سے یہ بچھڑا بنا دیا۔ سامری مصر کا باشندہ تھا جو ان کا ساتھی بن گیا تھا۔ یا یہ بنی اسرائیل ہی میں سے ایک شخص تھا' جس نے یہ لقب اختیار کر لیا تھا۔ اس نے اس بچھڑے میں ایسے سوراخ بنائے تھے کہ جب ان سے ہوا نکلتی تو بچھڑے جیسی آواز نکلتی تھی۔ اس بچھڑے میں نہ زندگی تھی اور نہ روح تھی۔ کیونکہ وہ تو ایک مردہ جسم تھا جو اس جسم کو کہا جاتا ہے جس میں زندگی نہ ہو۔ جونہی انہوں نے اس بچھڑے کو

آواز کرتے پایا۔ انہوں نے اس خدا کو بھلا دیا جس نے انہیں مصر سے نجات دی تھی یعنی ذلت کی سرزمین سے۔ چنانچہ انہوں نے سونے کے اس بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ اپنی کم عقلی اور حماقت کی وجہ سے یہ کہنے لگے :

هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى (۲۰ : ۸۸) "یہی ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا"۔ موسیٰ اسے پہاڑ پر ڈھونڈ رہا ہے۔ اور وہ یہ ہے ہمارے پاس ' اور موسیٰ نے رب کا راستہ ہی بھلا دیا۔

یہ ایک ایسی بات ہے جس سے ان کی بے شعوری اور کم عقلی بھی ظاہر ہوتی ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ کس قدر آسانی سے اپنے اس نبی پر تہمت لگا رہے ہیں جس کے زیر قیادت ابھی ابھی اللہ کی زیر نگرانی اور زیر نظر انہوں نے نجات پائی اور عین اللہ کی ہدایات کے مطابق ان کو یہ آزادی حاصل ہوئی۔ ایسے حالات میں ان کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ الزام لگانا کہ وہ اپنے رب سے کوئی رابطہ نہیں رکھتے ' انہوں نے راستہ ہی خطا کر دیا اور وہ رب تک پہنچ ہی نہ پائے۔ یہ ایک بہت بڑی جسارت ہے ان کی طرف سے لیکن وہ بنی اسرائیل تھے۔

یہ بات وہ بظاہر تو بطور عذر کر رہے ہیں لیکن دراصل یہ ان کی جانب سے واضح دھوکہ ہے۔

اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا (۲۰ : ۸۹) "کیا وہ دیکھتے نہ تھے کہ نہ وہ ان کی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ ان کے نفع و نقصان کا کچھ اختیار رکھتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ وہ تو زندہ بچھڑا بھی نہ تھا کہ وہ ان کی بات سن سکتا اور نہ اس قدر جواب دے سکتا تھا جس قدر ایک زندہ بچھڑا دے سکتا ہے۔ چونکہ یہ بچھڑا تو حیوانیت کے درجے سے بھی نیچے ہے ' لہٰذا وہ ان کے نفع و نقصان کا مالک بھی نہیں ہے۔ یہ نہایت ہی سادہ حقیقت ہے کہ وہ نہ ہل چلاتا ہے نہ کنویں سے پانی نکال سکتا ہے نہ آٹے کی چکی چلا سکتا ہے۔

ان سب امور کو ایک طرف رہنے دیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام موجود تھے۔ وہ ان کے نبی بھی تھے اور اس نبی کے نائب تھے جو ان کا نجات دہندہ تھا۔ اس وقت انہوں نے ان کو متنبہ بھی کیا جب ان پر یہ آزمائش آئی۔ انہوں نے کہا تھا:

يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ (۲۰ : ۹۰) "لوگو ' تم اس کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے ہو ' تمہارا رب تو رحمٰن ہے"۔ ان کو انہوں نے نصیحت کی کہ لوگو ' میری اطاعت کرو ' تم نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ عہد بھی کر رکھا ہے اور وہ پہاڑ پر اپنے رب کے بلاوے پر گئے ہوئے ہیں۔ واپس آنے والے ہیں ' لیکن انہوں نے نصیحت ماننے کے بجائے منہ پھیر لیا اور اس عہد سے پھر گئے جو انہوں نے موسیٰ سے کیا کہ میرے بعد تم ہارون کی اطاعت کرو گے۔ چنانچہ انہوں نے کہا:

لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى (۲۰ : ۹۱) "مگر انہوں نے اس سے کہہ دیا کہ ہم تو اس کی پرستش کرتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ واپس نہ آئے"۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کے پاس نہایت ہی غصے اور رنج کی حالت میں لوٹے۔ انہوں نے ان کی یہ دلیل سن کر ہی معلوم کر لیا کہ کس قدر تھوڑے عرصے

میں ان کے عقیدے میں کس قدر عظیم خلل پڑ گیا ہے۔ ان کی فکر میں کس قدر بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ نہایت ہی غصے کی حالت میں اپنے بھائی کی طرف متوجہ ہوئے' ان کو ان کے سر کے بالوں سے پکڑا اور داڑھی سے پکڑا اور کھینچا۔ سخت اشتعال میں تھے حضرت موسیٰ ۔

قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۝ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۝

"موسیٰ (قوم کو ڈانٹنے کے بعد ہارون کی طرف پلٹے اور) بولے "ہارون' تم نے جب کہا تھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا کہ میرے طریقے پر عمل نہ کرو؟ کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی؟"

موسیٰ نے ہارون سے کہا' اے ہارون' جب تم نے دیکھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تمہارا ہاتھ پکڑا کہ میرے طریقے پر عمل نہ کرو' کیا تو نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی۔ سرزنش اس بات پر ہو رہی ہے کہ کیوں آپ نے ان کو اس پرستش پر رہنے دیا کیوں نہ تم نے اس کی ممانعت کی۔ میرے صریح احکام کے مطابق کہ میرے بعد کوئی نئی بات پیدا نہ کرنا۔ نہ کسی کو کوئی نئی رسم ایجاد کرنے کی اجازت دینا۔ حضرت موسیٰ ان کا مواخذہ کرتے ہیں کہ تم نے میرے احکام نافذ کیوں نہ کیے؟ کیا تم نے بھی میری نافرمانی کی؟

اس سے قبل قرآن نے فیصلہ دے دیا ہے کہ حضرت ہارون کا موقف کیا تھا۔ وہ بھائی کو حقیقی صورت حالات بتاتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ ذرا غصہ فرو کیجئے۔ وہ بھائی چارے کا واسطہ دے کر کہتے ہیں۔

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّىْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ۝

"ہارون نے جواب دیا "اے میری ماں کے بیٹے' میری داڑھی نہ پکڑ' نہ میرے سر کے بال کھینچ' مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تو آ کر کہے گا کہ تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا"۔

نظر آتا ہے کہ حضرت ہارون ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے اور حضرت موسیٰ کے مقابلے میں اپنے جذبات پر قابو رکھتے تھے۔ وہ حضرت موسیٰ کے شعور میں ایک حساس پوئنٹ تلاش کرتے ہیں۔ برادری ایک حساس رشتہ ہے۔ اپنے خیال کے مطابق وہ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اگر میں آپ کی ہدایات کے مطابق کام کرتا تو بنی اسرائیل کے اندر فرقہ بندی ہو جاتی۔ ایک گروہ بچھڑے کی حمایت میں اٹھ جاتا دوسرا میرے ساتھ ہو جاتا حالانکہ آپ کا حکم یہ تھا کہ بنی اسرائیل کی حفاظت اور نگرانی رکھ اور ان میں کوئی نئی بات پیدا ہونے نہ دو' تو ان کو انتشار سے بچانا بھی اطاعت امر ہے۔

حضرت موسیٰ کے غضب اور غصے کا رخ سامری کی طرف مڑ جاتا ہے جس نے اس فتنے کو ایجاد کیا تھا۔ اس سے پہلے حضرت موسیٰ اس کی طرف اس لیے متوجہ نہیں ہوتے کہ لوگوں کا بھی یہ فریضہ تھا کہ وہ ہر کس و ناکس کی اطاعت

نہ کریں۔ پھر حضرت ہارون کی ذمہ داری آتی ہے کیونکہ وہ بھی ذمہ دار تھے کہ بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کی راہ روکتے۔ رہے سامری تو ان کی ذمہ داری سب سے آخر میں آتی ہے کیونکہ اس نے ان کو زبردستی بچھڑے کی عبادت کرنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ نہ اس نے ان کی عقل پر تالا لگا دیا تھا۔ اس نے ان کو گمراہ کیا اور یہ گمراہ ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کے بس میں یہ بات تھی کہ وہ اپنے پہلے نبی کی اطاعت کرتے' پھر ان کا یہ فریضہ تھا کہ دوسرے نبی کی نصیحت پر عمل کرتے۔ لہٰذا اصل ذمہ داری پہلے قوم کی ہے' پھر ان کے نگراں کی' اور اس کے بعد اس شخص کی ہے جس نے یہ فتنہ پیدا کیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ سب سے آخر میں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾

"موسیٰ نے کہا "اور سامری' تیرا کیا معاملہ ہے؟" سامری تم بتاؤ تم نے کیا کیا اور کیوں کیا؟ یہ لفظ بتاتا ہے کہ سامری نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہے۔

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۶﴾

"اس نے جواب دیا "میں نے وہ چیز دیکھی جو ان لوگوں کو نظر نہ آئی' پس میں نے رسول کے نقش قدم سے ایک مٹھی اٹھالی اور اس کو ڈال دیا۔ میرے نفس نے مجھے کچھ ایسا ہی سجھایا"۔

سامری کے اس جواب کی تفسیر میں کئی اقوال و روایات وارد ہیں۔ اس نے کیا چیز دیکھ لی جو اوروں نے نہ دیکھی؟ وہ رسول کون تھے جس کے نقش قدم سے انہوں نے مٹھی لی اور پھینک دی؟ پھر اس فعل کا بچھڑا سازی سے کیا تعلق ہے؟ بچھڑے میں اس مٹی نے کیا اثرات کیے؟

ان روایات میں سے بیشتر میں یہ بات ہے کہ سامری نے جبرئیل علیہ السلام کو اس شکل میں دیکھا جس میں وہ زمین پر اترتے ہیں ان کے قدموں کے نیچے سے اس نے خاک اٹھالی۔ یا اس کے گھوڑے کے قدموں کے نیچے سے خاک اٹھالی اور اسے سونے سے بنائے ہوئے بچھڑے پر ڈالا اور اس سے آواز آنے لگی۔ یا اس مٹی نے سونے کے ڈھیر سے بچھڑا بنا دیا۔

قرآن کریم نے یہاں اس حقیقت واقعہ کی وضاحت نہیں کی۔ قرآن کریم نے صرف سامری کا قول نقل کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں یہ سامری کی طرف سے عذر لنگ تھا' اس نے یہ عذر گھڑا تاکہ اپنی اس حرکت کے نتائج سے بچ جائے۔ بچھڑا تو اس سونے سے بنایا تھا جو بنی اسرائیل مصر سے ساتھ لے آئے تھے اور پھر پھینک دیا تھا۔ سامری نے اس انداز سے بنایا کہ ہوا اس سے ایسی آواز نکالتی تھی جیسا کہ ایک بچھڑے کی آواز آتی ہے۔ اس کے بعد اس نے رسول کے آثار کی مٹی کا ذکر کیا۔ اس لیے کہ اپنی اس حرکت کو تقدس کا رنگ دے اور اس معاملے کا جوڑ رسول کے نقش قدم سے لگا دے۔

بہرحال حقیقت جو بھی ہو' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے جماعت بنی اسرائیل سے نکال دیا۔ پوری عمر کے لیے اسے ملک بدر کر دیا اور آخرت میں اس کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس مصنوعی الٰہ کے معاملے میں سامری کے ساتھ سخت برتاؤ کیا اور اس الٰہ کے بارے میں بھی ایسا رویہ اختیار کیا تاکہ لوگ دیکھیں کہ اس الٰہ نے اپنے بنانے والے کو بھی کوئی مدد نہ پہنچائی۔

قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ ۖ وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَنْ تُخْلَفَهُ ۖ وَانْظُرْ إِلَىٰ إِلٰهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۖ لَنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿٩٧﴾

''موسیٰ نے کہا ''اچھا تو جا' اب زندگی بھر تجھے یہی پکارتے رہنا ہے کہ مجھے نہ چھونا۔ اور تیرے لیے باز پرس کا ایک وقت مقرر ہے جو تجھ سے ہرگز نہ ٹلے گا۔ اور دیکھ اپنے اس خدا کو جس پر تو ریجھا ہوا تھا' اب ہم اسے جلا ڈالیں گے اور ریزہ ریزہ کر کے دریا میں بہا دیں گے''۔

جاؤ تم ملک بدر ہو' تمہیں کوئی شخص بھی ہاتھ نہ لگائے گا' نہ اچھائی سے اور نہ برائی کے ساتھ اور نہ تم کسی کے ساتھ ہاتھ لگاؤ گے۔ موسیٰ علیہ السلام کے دین میں یہ سزاؤں میں سے ایک سزا تھی۔ یہ اچھوت بنانے کی سزا تھی اور مجرم کو گندا قرار دیا جاتا تھا کہ نہ وہ کسی کو ہاتھ لگائے' نہ اس کے ساتھ کوئی ہاتھ لگائے۔ یہ کہ تمہارے لیے باز پرس کا ایک وقت مقرر ہے' تو اس سے مراد قیامت کا وقت جزاء و سزا ہے جس سے اگر کوئی بچنا چاہے بھی تو نہیں بچ سکتا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ نے بڑی سختی اور غصے میں یہ احکام دیئے کہ اس بچھڑے کو لے جا کر جلاؤ اور اس کی آنکھ کو پانی میں بکھیر دو۔ سختی اور غصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مزاج کا حصہ ہے۔ یہاں ان کی یہ سختی اور غصہ صرف اللہ کے لیے ہے اور اللہ کے دین کے معاملے میں غصہ معیوب نہیں ہوتا۔ دین کے معاملے میں شدت مستحسن سمجھی جاتی ہے۔

جب سامری کا یہ الٰہ جلتا ہوا نظر آتا تھا' تو اس منظر کے سامنے حضرت موسیٰ نے مناسب سمجھا کہ اسلامی عقیدے اور اللہ کے بارے میں حقیقت لوگوں کو بتا دی جائے۔

إِنَّمَا إِلٰهُكُمُ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿٩٨﴾

''لوگو' تمہارا خدا تو بس ایک ہی اللہ ہے' جس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے' ہر چیز پر اس کا علم حاوی ہے''۔

اسلامی عقیدے کے بارے میں اس وضاحت کے ساتھ ہی اس سورہ میں قصہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ حصہ اب ختم ہوتا ہے۔ اس قصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ حاملین دعوت اسلامی پر اللہ کی رحمتوں کی بارش ہر طرف سے ہوتی ہے۔ اگرچہ

ابتداء میں ان سے کوئی غلطی بھی ہو جائے۔اس کے بعد اس قصے کے دوسرے مراحل کو یہاں ترک کر دیا جاتا ہے۔اس کے بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ بنی اسرائیل نافرمانیاں کرتے ہیں' اور ان پر ایک کے بعد ایک عذاب آتا ہے۔ چونکہ یہاں رحمت اور مہربانی اور نوازشات کا موضوع ہے اور یہ رحمتیں اللہ کے نیک بندوں پر ہوتی ہیں' اس لیے اس قصے کی وہ کڑیاں جن میں بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کا تذکرہ آتا ہے' ان کا ذکر چونکہ موضوع و مضمون اور سورہ کی فضا کے خلاف ہے اس لیے ان کو یہاں حذف کر کے اس قصہ کو یہاں ختم کر دیا گیا ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۳۹ ایک نظر میں

سورہ کے آغاز میں موضوع بحث قرآن مجید تھا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر اس لیے نازل نہیں ہوا کہ اس کی وجہ سے ان کو مصیبت میں ڈالا جائے۔ اس کے بعد پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کو لے کر یہ ثابت کیا گیا کہ اللہ اپنے بندوں اور رسولوں کے ساتھ کس قدر رعایت کرتا ہے اور ان پر کس قدر مہربانیاں ہوتی ہیں جس طرح حضرت موسیٰ' ان کے بھائی اور ان کی قوم پر ہوئی تھیں۔

اس طویل قصے پر اب یہاں تبصرہ کیا جاتا ہے اور موضوع سخن پھر قرآن مجید ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ قرآن کے نزول کا مقصد کیا ہے؟ جو لوگ اس سے منہ پھیریں گے' ان کا انجام کیا ہو گا؟ یہ انجام قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کو پیش کر کے بتایا گیا ہے کہ دنیا کے شب و روز سکڑ جائیں گے' زمین کے اوپر سے پہاڑ اڑ جائیں گے اور یہ تنگی رہ جائے گی ''بس ایک چٹیل میدان ہو گا' لوگ میدان حشر میں سہمے کھڑے ہوں گے اور تمام چہرے حی و قیوم کے سامنے جھکے ہوئے اور سرنگوں ہوں گے۔ یہ منظر اور قرآن مجید کے تمام وہ مناظر جن میں لوگوں کو ڈرایا گیا ہے' ان سے غرض و غایت صرف یہ ہے کہ لوگوں کے اندر خدا کا خوف پیدا کیا جائے۔ قرآن مجید کی بحث کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ تسلی بھی دی جاتی ہے کہ آپ قرآن مجید کو نہ بھولیں گے۔ بھول کے خوف سے اس کے دہرانے میں جلدی نہ کیجئے۔ اس کی وجہ سے اپنے اوپر مصیبت نہ لائیے' اللہ اسے آپ کے لیے آسان کر دے گا اور آپ کو حفظ کرا دیا جائے گا۔ آپ بس یہ دعا کرتے رہیں کہ اے میرے رب' میرے علم میں اضافہ کر۔

جب وحی نازل ہونے لگتی تو نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم وحی ختم ہونے سے پہلے ہی قرآن کی عبارت کو دہرانا شروع فرما دیتے تھے' اس خوف سے کہ کہیں بھول نہ جائیں۔ اس بارے میں ان کو تسلی دی گئی لیکن موضوع کی مناسبت سے بتایا گیا کہ آدم علیہ السلام اپنے عہد کو بھول گئے تھے۔ ابلیس نے انہیں بھلا دیا تھا اس لیے آدم اور ابلیس کے درمیان جدی دشمنی چلی آرہی ہے۔ اولاد آدم میں سے بعض لوگ اپنے عہد کو بھلاتے ہیں اور بعض اس کو یاد رکھتے ہیں اور اس انجام کو بھی قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں پیش کیا جاتا ہے۔ گویا یہ اس سفر کا انجام ہے جو عالم بالا سے شروع ہوا اور اس کا خاتمہ بھی عالم بالا پر جا کر ہوا۔

سورہ کا خاتمہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اے رسول آپ ان لوگوں کے لیے پریشان نہ ہوں جو دعوت کی تکذیب کرتے ہیں یا اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اس دنیا میں ایک محدود وقت دیا گیا ہے۔ اس محدود وقت میں ان کو جو ساز و سامان اور متاع دنیا کی وافر مقدار دی گئی ہے' یہ ان کے لیے کوئی بہتری نہیں ہے۔ یہ تو ان کے لیے فتنہ اور آزمائش ہے۔ آپ کو یہ مشورہ بھی دیا جاتا ہے کہ آپ اللہ کی بندگی اور اس کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جائیں' یوں آپ کو

کسی دولت مند کی دولت سے زیادہ اطمینان حاصل ہو گا اور آپ اپنی حالت پر راضی ہوں گے۔ اس سے قبل اللہ نے بہت سی اقوام کو اسی طرح آزمائش میں ڈال کر ہلاک کیا ہے۔ اللہ نے لوگوں کی طرف نبی آخر الزمان اور آخری رسول کو بھیج کر ان پر حجت تمام کر دی ہے۔ اب لوگوں کے پاس کیا جواز ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ لہذا آپ ان کے انجام کے معاملے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیں اور اس کو اللہ پر چھوڑ دیں اور کہہ دیں۔

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوا فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ أَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى (۲۰:۱۳۵) "اے محمد، ان سے کہو، ہر ایک انجام کار کے انتظار میں ہے، بس اب منتظر رہو، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون سیدھی راہ پر چلنے والے ہیں، اور کون ہدایت یافتہ"۔

---ختم---

# درس نمبر ۱۳۹ تشریح آیات

## ۹۹ --- تا --- ۱۳۵

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ
لَّدُنَّا ذِكْرًا ۖ ﴿۹۹﴾ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾
خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۗ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِى الصُّوْرِ
وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا
عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ
۵ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾ ۱۵ع

۱۴

"اے نبیؐ ' اس طرح ہم پچھلے گزرے ہوئے حالات کی خبریں تم کو سناتے ہیں ' اور ہم نے خاص اپنے ہاں سے تم کو ایک "ذکر" (درس نصیحت ) عطا کیا ہے جو کوئی اس سے منہ موڑے گا وہ قیامت کے روز سخت بار گناہ اٹھائے گا اور ایسے سب لوگ ہمیشہ اس کے وبال میں گرفتار رہیں گے ' اور قیامت کے دن ان کے لیے (اس جرم کی ذمہ داری کا بوجھ ) بڑا تکلیف دہ بوجھ ہو گا ۔ اس دن جبکہ صور پھونکا جائے گا اور ہم مجرموں کو اس حال میں گھیر لائیں گے کہ ان کی آنکھیں (دہشت کے مارے ) پتھرائی ہوئی ہوں گی ۔ آپس میں چپکے چپکے کہیں گے کہ "دنیا میں مشکل ہی سے تم نے کوئی دس دن گزارے ہوں گے"..... ہمیں خوب معلوم ہے کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہوں گے ۔ (ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ) اس وقت ان میں سے جو زیادہ سے زیادہ محتاط اندازہ لگانے والا ہو گا وہ کہے گا کہ نہیں ' تمہاری دنیا کی زندگی بس ایک دن کی زندگی تھی" ۔

آپ پر جو قصص نازل کیے جا رہے ہیں ' یہ ماضی کے واقعات ہیں ۔ قرآن میں ان کو بیان کیا جا رہا ہے ۔ قرآن کو اسی لحاظ سے ذکر کیا گیا ہے ۔ یہ قصص بھی دراصل ذکر الٰہی ہیں اور آیات الٰہی ہیں اور قرون اولیٰ میں جو آیات الٰہی ظاہر ہوئیں یہ ان کا بھی ذکر ہے ۔

جو لوگ اس ذکر سے منہ موڑتے ہیں' ان کو یہاں مجرمین کے نام سے پکارا گیا ہے۔ یہاں ان کا ایک منظر پیش کیا جاتا ہے۔ انہوں نے بڑے بڑے بوجھ اٹھا رکھے ہیں' جس طرح مسافر اپنا بوجھ اٹھا رہا ہوتا ہے۔ لیکن ان کے اس بوجھ میں ان کے لیے کوئی مفید چیز نہیں ہے۔ جب صور پھونکا جائے گا تو اس دن مجرمین کے چہرے نیلے ہو جائیں گے' یعنی خوف کی وجہ سے اور بے حد غم کی وجہ سے ان کے چہرے نیلے نظر آئیں۔ وہ چپکے چپکے ایک دوسرے سے بات کر رہے ہوں گے۔ ماحول میں چھائے ہوئے خوف اور قیامت کے ہول کی وجہ سے وہ اونچی بات نہ کریں گے۔ وہ کیا بات کر رہے ہوں گے۔ وہ ان دنوں کے بارے میں ہوگی جو انہوں نے زمین پر گزارے ہوں گے۔ ان کی حس اور شعور میں دنیا کا پورا زمانہ اس قدر سکڑا ہوا اور مختصر ہو گا کہ پوری زندگی یا زمین پر پورا انسانی دور انہیں چند ایام پر مشتمل نظر آئے گا۔

اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا (۲۰: ۱۰۳) "تم نے کوئی دس دن گزارے ہوں گے"۔ ان میں سے جو شخص زیادہ صائب الرائے ہو گا وہ اس سے بھی کم اندازہ لگائے گا کہ صرف ایک دن کی زندگی تھی۔

اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا یَوْمًا (۲۰: ۱۰۴) "تم نے صرف ایک دن زندگی بسر کی"۔ یوں دنیا کی یہ طویل زندگیاں انہیں نہایت ہی مختصر نظر آئیں گی۔ یہاں زندگی میں لوگوں نے جو عیاشیاں کی تھیں' وہ زندگی کے غم نظر آئیں گے اور ایک نہایت ہی مختصر زمانہ نظر آئے گا۔ قدر و قیمت کے اعتبار سے بھی حقیر زمانہ۔ کیونکہ دس راتوں کی کیا قیمت ہے اگرچہ حد درجہ عیش و عشرت ہو' اور ایک رات کی قدر و قیمت کیا ہے اگرچہ اس کا ایک ایک منٹ خوش بختی سے بھرا پڑا ہو۔ ان دونوں کی قدر و قیمت بمقابلہ زمانہ لامحدود اور ایام خلود کیا قیمت ہو سکتی ہے' جس میں یہ لوگ اب حساب و کتاب کے بعد جانے والے ہیں یعنی جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

اس ہولناک منظر قیامت سے ہمیں پھر یہاں دنیا میں لایا جاتا ہے' یہ سوال پیش ہوتا ہے کہ قیامت میں ان پہاڑوں کا کیا ہو گا۔ ان کو تو بس یہ پہاڑ ہی بڑے نظر آتے ہیں۔ جواب میں اس وقت بھی نہایت ہی خوفناک اور ہولناک تصویر کشی کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے تم پہاڑوں کا غم مت کرو خود اپنی فکر کرو کہ تم پر کیا گزرے گی۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾ يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ۭ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ

وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا۝

"یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر اس دن یہ پہاڑ کہاں چلے جائیں گے؟ کہو کہ میرا رب ان کو دھول بنا کر اڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں تم کوئی بل اور سلوٹ نہ دیکھو گے ۔ اس روز سب لوگ منادی کی پکار پر سیدھے چلے آئیں گے 'کوئی ذرا اکڑ نہ دکھا سکے گا اور آوازیں رحمٰن کے آگے دب جائیں گی 'ایک سرسراہٹ کے سوا تم کچھ نہ سنو گے ۔ اس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی ' الا یہ کہ کسی کو رحمٰن اس کی اجازت دے اور اس کی بات سننا پسند کرے --- وہ لوگوں کا اگلا پچھلا سب حال جانتا ہے اور دوسروں کو اس کا پورا علم نہیں ہے --- لوگوں کے سر اس حی و قیوم کے آگے جھک جائیں گے ۔ نامراد ہو گا جو اس وقت کسی ظلم کا بار گناہ اٹھائے ہوئے ہو گا ۔ اور کسی ظلم یا حق تلفی کا خطرہ نہ ہو گا اس شخص کو جو نیک عمل کرے اور اس کے ساتھ وہ مومن بھی ہو"۔

یہ نہایت ہی خوفناک منظر ہے ۔ یہ اونچے اونچے پہاڑ ریزہ ریزہ کر کے اور گرد و غبار بنا کر اڑا دیے جائیں گے ۔ اب بلندیوں کی جگہ ایک سیدھا میدان ہو گا ۔ ایسا میدان جس میں کوئی نشیب و فراز نہ ہو گا ۔ زمین بالکل ہموار ہو گی ۔ یعنی تیز ہوا پہاڑوں کو دھوئیں کی طرح اڑا کر زمین کو بالکل میدان کر دے گی ۔ تمام اگلے پچھلے لوگ اس چٹیل میدان میں کھڑے ہوں گے ۔ لوگوں کی بات اور ان کی حرکت نہایت ہی خاموش اور بے آواز ہو گی ۔ جب بھی کوئی منادی پکارنے والا ان کو کسی طرف بلائے گا تو بھیڑوں کے گلے کی طرح اس کے پیچھے نہایت اطاعت کے ساتھ چل پڑیں گے ۔

يَتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ (۲۰ : ۱۰۸) "منادی کی پکار پر سیدھے چلے آئیں گے"۔ یعنی جس طرح زمین ہموار ہو گی اس طرح ان کے دل بھی ہموار ہوں گے ' فوراً حکم کی تعمیل کریں گے ۔

اس فضا میں پوری طرح خاموشی ہو گی ' نہایت ہی خوفناک خاموشی

وَ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا (۲۰ : ۱۰۸) "اور آوازیں رحمٰن کے آگے دب جائیں گی 'ایک سرسراہٹ کے سوا تم کچھ نہ سنو گے"۔

وَ عَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ (۲۰ : ۱۱۱) "لوگوں کے سر اس حی و قیوم کے آگے جھک جائیں گے"۔ جلال خداوندی کا خوف لوگوں پر چھایا ہوا ہو گا ۔ یہ میدان جو حد نظر سے آگے پھیلا ہوا ہو گا اس پر خوف ' خاموشی چھائی ہوئی ہو گی اور لوگ اس میں سہمے کھڑے ہوں گے ۔ بات دھیمی ہو گی ' سوال سرگوشی میں ' حالت سہمی ہوئی ' چہرے جھکے ہوئے ' اور اللہ ذوالجلال کا ڈر ' ماحول پر چھایا ہوا ہو گا ۔ کوئی اس میدان میں سفارش نہ کر سکے گا مگر وہ جس کی بات اللہ کو پسند ہو ۔ علم سب کا سب اللہ کو ہو گا 'کوئی دوسرا جانتا نہیں 'ظالم اپنے ظلم کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں گے اور ان کو شرمساری سے دوچار ہونا پڑے گا ۔ ان لوگوں میں اہل ایمان بھی کھڑے ہوں گے ۔ ان کو نہ یہ خوف ہو گا کہ ان پر حساب و کتاب میں ظلم ہو گا اور نہ یہ ڈر ہو گا کہ ان کے اعمال میں سے کوئی عمل رہ جائے اور اس کی حق تلفی ہو جائے ۔

وَكَذٰلِكَ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفۡنَا فِيۡهِ مِنَ الۡوَعِيۡدِ لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ اَوۡ يُحۡدِثُ لَهُمۡ ذِكۡرًا ﴿۱۱۳﴾

"اور اے نبیؐ اسی طرح ہم نے اسے قرآن عربی بنا کر نازل کیا ہے اور اس میں طرح طرح سے تنبیہات ہیں' شاید کہ یہ لوگ کج روی سے بچیں یا ان میں کچھ ہوش کے آثار اس کی بدولت پیدا ہوں"۔

یعنی ہم نے نہایت ہی موثر انداز میں' شاہد قیامت' مناظر عذاب' اور عبرت آموز کہانیاں بار بار پیش کی ہیں تاکہ لوگوں کے اندر نیکی کے لیے جوش پیدا ہو اور جھٹلانے والے ڈر جائیں اور جان لیں کہ قیامت میں ان کا انجام کس قدر ہولناک ہو گا۔ یہی مضمون سورہ کے آغاز میں بھی تھا۔

مَآ اَنزَلنَا عَلَيكَ القُراٰنَ لِتَشقٰٓي (۲) اِلَّا تَذكِرَةً لِّمَن يَّخشٰي (۲۰ : ۲ – ۳) "یہ قرآن ہم نے تجھ پر اس لیے نازل نہیں کیا کہ تم مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ بلکہ یہ تو اس شخص کے لیے یاد دہانی ہے جو ڈرے"۔

---ooo---

جب جبرائیل وحی لے کر آتے تھے تو ابھی وہ پوری وحی نہ سنا چکتے کہ حضور دہرانا شروع کر دیتے' اس خوف سے کہ کہیں کوئی لفظ چھوٹ نہ جائے۔ ہر نئی وحی کا یاد کرنا آپ کے لیے شاق ہوتا تھا۔ چنانچہ اللہ نے آپ کو یہ اطمینان دلا دیا کہ آپ پریشان نہ ہوں' اللہ اس کا ضامن ہے کہ آپ نہ بھولیں گے۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الۡمَلِكُ الۡحَـقُّ‌ۚ وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يُّقۡضٰۤى اِلَيۡكَ وَحۡيُهٗ‌ وَقُلْ رَّبِّ زِدۡنِىۡ عِلۡمًا ﴿۱۱۴﴾

"پس بالا و برتر ہے اللہ' پادشاہ حقیقی۔ اور دیکھو' قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کرو' جب تک کہ تمہاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے اور دعا کرو کہ اے پروردگار مجھے مزید علم عطا کر"۔

وہ اللہ تو بہت بلند ہے جس کے سامنے چہرے جھک جاتے ہیں' اس کی جناب میں مایوسی تو ظالموں کو ہوتی ہے' اور مومنین صالحین کے لیے تو وہاں اطمینان ہی اطمینان ہے۔ وہ بلندیوں سے اس قرآن کو بھیجتا ہے۔ آپ اس کے دہرانے میں جلدی نہ کریں۔ قرآن کے نزول میں گہری حکمت ہے۔ اس حکمت اور مقصد کو لازماً پورا کیا جائے گا۔ پس آپ رب تعالیٰ سے زیادتی علم کی دعا کرتے رہیں اور جو کچھ آپ کو دیا جا رہا ہے اس کے بارے میں مطمئن ہو جائیں۔ اس کے بارے میں یہ پریشانی نہ دکھائیں کہ وہ تجھ سے چلا جائے گا۔ علم تو وہی ہے جو اللہ کے علم میں ہے۔ وہ باقی ہے' وہ ہمیشہ نفع دیتا رہے گا' قائم رہے گا' پھلتا پھولتا رہے گا اور کبھی ضائع نہ ہو گا۔

اسی مناسبت سے یعنی علم و نسیان علم کے مضمون کی مناسبت سے، یہاں قصہ آدم آتا ہے۔ آدم سے کہا گیا تھا کہ جنت میں رہو اور ایک درخت کے قریب نہ جاؤ۔ وہ شیطان کے اس دھوکے میں آگئے کہ یہ تو شجرۃ الخلد ہے۔ اس لیے انہوں نے اسے چکھ لیا۔ خلافت فی الارض عطا ہونے سے قبل یہ رب تعالیٰ کی طرف سے ان کی آزمائش تھی اور یہ تجربہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اس لیے کرایا کہ بعد میں آنے والے انسانوں کے لیے عبرت ہو۔ جب یہ آزمائش ہوگئی تو اللہ کی رحمت آگئی، آدم کو اٹھالیا گیا اور ان کو راہ راست دکھا دی گئی۔

قرآنی قصص جہاں جہاں بھی آتے ہیں، سیاق کلام میں ان کے لانے کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے۔ یہ قصہ یہاں اس واقعہ کے بعد آتا ہے کہ جب رسول اللہؐ وحی الٰہی کے اخذ میں نسیان کے خوف کی وجہ سے جلدی کرتے تھے۔ یہاں قصہ آدم میں بھی یہ کہا جاتا ہے کہ آدم سے یہ غلطی بھول کی وجہ سے ہوئی۔ نیز سورہ کا پورا مضمون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن بندوں کو دعوت اسلامی کے لیے منتخب کرتا ہے ان پر اس کی خصوصی نظر ہوتی ہے اور ان پر رحم و کرم کی بارشیں ہوتی ہیں۔ یوں یہ بتایا جاتا ہے کہ آدم سے بھول ہوگئی تو اللہ نے ان پر رحمت کی اور ہدایت دی۔ اس کے بعد قیامت کے مناظر میں سے ایک جھلکی آتی ہے کہ جس میں اطاعت شعاروں کا حال بتایا جاتا ہے۔ نیز نافرمانوں کا حال بھی یعنی آدم زمین پر اترتے ہیں اور قیام کے بعد پھر اصل مقام پر جاکر حساب و کتاب پیش کرتے ہیں۔

اس قصے کا آغاز یوں ہوتا ہے:

٦

وَ لَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ ١١ع

١٥

"ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک حکم دیا تھا، مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا"۔ آدم علیہ السلام کو حکم یہ تھا کہ وہ جنت کا ہر پھل کھائیں مگر ایک خاص درخت کا پھل نہ کھائیں۔ انسان کی تربیت اور اس کی قوت ارادی کو جانچنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے بعض چیزوں کی ممانعت کر دی جائے تاکہ اس کی شخصیت پختہ ہو۔ یہ انسانی خواہشات اور مادی میلانات پر وہ کنٹرول کر سکے تاکہ وہ جب روحانی ترقی کے لیے اپنی ضروریات مادی کو کم کرنا چاہے تو کم کر سکے۔ وہ مرغوبات اور خواہشات کا غلام بن کر نہ رہ جائے۔ یہ وہ معیار ہے جو انسانی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ دنیا میں جن اقوام نے بھی ترقی کی ہے وہ ایسی رہی ہیں کہ انہوں نے اپنے نفس پر ضبط کیا ہے۔ ان کے مرغوبات کے استعمال میں اعتدال ہوتا ہے اور خواہشات سے وہ بلند رہے ہیں۔ انسانی تاریخ میں جب کوئی قوم بندۂ مرغوبات اور دلدادۂ لذات بنی ہے، وہ روحانی اعتبار سے گر کر حیوانی درجہ تک جا پہنچی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ اللہ نے انسان اول کو اس آزمائش میں ڈالا کیونکہ اس کو منصب خلافت ارضی کے لیے تیار کرنا تھا کیونکہ یہاں انہی انسانوں نے کامیاب زندگی بسر کرنی تھی جو مضبوط قوت ارادی کے مالک ہوں۔ وہ لوگ جو شیطانی چمک دمک اور شیطانی وساوس اور مرغوبات کے حصول اور فراوانی کے مقابلے میں ضبط نفس کر سکتے ہیں۔ یہ تھا انسان کا، پہلے انسان کا پہلا تجربہ۔ اب نتیجے کا اعلان ہوتا ہے۔

فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (٢٠: ١١٥) "وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا"۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾

"یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ وہ تو سب سجدہ کر گئے مگر ایک ابلیس تھا کہ انکار کر بیٹھا"۔

جہاں یہ قصہ اجمالاً بیان ہوتا ہے۔ دوسری جگہ اس کی تفصیلات ہیں کیونکہ یہاں اس قصے کا صرف وہ پہلو دکھانا ہے جو انبیاء پر انعامات کا ہے۔ لہٰذا انعام کا پہلو جلدی بیان کرنے کے لیے یہ اجمال و اختصار ہے۔

فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾

"اس پر ہم نے آدم سے کہا کہ دیکھو' یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکلوا دے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہاں تو تمہیں یہ آسائشیں حاصل ہیں کہ نہ بھوکے ننگے رہتے ہو' نہ پیاس اور دھوپ تمہیں ستاتی ہے"۔

اللہ کی مہربانیوں اور عنایات میں سے ایک عنایت یہ تھی کہ اللہ نے حضرت آدم کو قبل از وقت بتا دیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے۔ کیونکہ اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ اس سجدے کا حکم اللہ نے خود اس کو دیا تھا۔ اشارتاً پہلے ہی تخلیق آدم کا منصوبہ بھی بتا دیا تھا۔

فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (۲۰ : ۱۱۷) "ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکلوا دے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ"۔ کیونکہ جنت سے نکل کر انسان کو مشقت' جدوجہد' بدعملی' گمراہی' پریشانیوں' حیرانیوں' شوق اور انتظار' رنج اور محرومی سے دوچار ہونا پڑا۔ اس سے بڑی مصیبت اور کیا ہوگی' یہ سب چیزیں جنت سے باہر انسان کے انتظار میں تھیں۔ جب تک آدم جنت میں تھے ان مشقتوں اور مصیبتوں سے محفوظ تھے۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى (۱۱۸) وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى (۲۰ : ۱۱۸ - ۱۱۹) "نہ بھوکے اور نہ ننگے رہو' نہ پیاس اور دھوپ تمہیں ستائے"۔ جب تک تم جنت میں ہو گے یہ سب سہولتیں تمہیں حاصل ہوں گی۔ بھوک اور لباس کی نایابی' پیاس اور دھوپ کے بالمقابل ہیں لفظاً اور معناً۔ یہ وہ مجموعہ ضروریات ہے جو ہر انسان کو اس زمین پر مشقت میں ڈالتا ہے۔

لیکن آدم' جنت میں زندگی کی ٹھوکروں سے دوچار نہ ہوئے تھے' تجربات نہ تھے۔ انسانی کمزوری ساتھ تھی' بقائے

دوام کی خواہش انسان کی بڑی کمزوری ہے ـ پھر بقائے دوام کے ساتھ اقتدار مستحکم ـ اس کے سوا انسان کو اور کیا چاہیے ـ چنانچہ شیطان اس دروازے سے اس کے اندر آتا ہے ـ

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾

"لیکن شیطان نے اس کو پھسلایا" کہنے لگا، آدم، بتاؤں تمہیں وہ درخت جس سے ابدی زندگی اور لازوال سلطنت حاصل ہوتی ہے"ـ

شیطان نے انسان کی نہایت ہی حساس رگ پر ہاتھ رکھا ـ انسانی عمر بہرحال محدود ہے ـ انسانی قوت بہرحال محدود ہے ـ انسان طویل زندگی اور طویل اقتدار کا بے حد دلدادہ رہا ہے ـ ان دونوں راستوں سے شیطان اس پر حملہ آور ہوتا ہے ـ آدم بہرحال انسان تھے ـ آدم انسانی فطرت اور انسانی کمزوری کے حامل تھے ـ پھر اس تجربے کے ساتھ دنیا کے منصوبے اور نظام تقدیر کا بھی تعلق تھا ـ چنانچہ آدم بھول گیا اور اس نے ممنوعہ علاقے میں قدم رکھ لیا ـ

فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾

"آخر کار دونوں (میاں بیوی) اس درخت کا پھل کھا گئے ـ نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً ہی ان کے ستر ایک دوسرے کے آگے کھل گئے اور لگے دونوں اپنے آپ کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے ـ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہ راست سے بھٹک گیا"ـ

بظاہر مفہوم یہ ہے کہ انسان کی مخصوص شرمگاہیں مراد ہیں جو ان سے پوشیدہ تھیں ـ دونوں کے جسم میں عفت کے مقامات ـ چنانچہ انہوں نے اپنے فطری شرم و حیا کی وجہ سے ان مقامات کو چھپانا شروع کیا اور ان پر جنت کے پتے لپیٹنے لگے ـ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس درخت کے پھل کھانے کے نتیجے میں ان کے اندر جنسی احساس پیدا ہو گیا ہو کیونکہ جب تک کسی انسان میں جنسی احساس پیدا نہ ہو انسان کو شرم و حیا کا احساس نہیں ہوتا ـ انسان کو ان چیزوں کی طرف توجہ تب ہوتی ہے جب جنسی خواہش پیدا ہو ـ

ہو سکتا ہے کہ اللہ نے آدم و حوا پر اس مخصوص درخت کا پھل کھانا اس لیے منع کر دیا ہو کہ اس کے نتیجے میں انسان کی جسمانی خواہشات نے پیدا ہونا تھا اور اللہ نے اپنے منصوبے کے مطابق ان کو موخر کیا ہوا تھا ـ آدم سے نسیان کا صدور اس لیے بھی ہو گیا کہ اس کے تعلق باللہ میں کمی آگئی اور ان پر جسمانی خواہشات کے غلبے کی وجہ سے جنسی نظام

بیدار ہو گیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا جذبہ خلود جنسی خواہشات کی شکل میں اس درخت کی وجہ سے نمودار ہو گیا ہو کہ اگرچہ اس میں ایک فرد تو خلود نہیں پاتا لیکن نوع انسانی کی بقا تو اسی میں موجود ہے۔ یہ سب تشریحات اس حقیقت کے ہوتے ہوئے معقول نظر آتی ہیں کہ اس پھل کے کھانے سے ان کی شرمگاہیں کھل گئیں۔ یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ

فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا (۲۰:۱۲۱) "ان کی شرمگاہیں کھل گئیں"۔ بلکہ یہ کہا ہے۔

فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا (۲۰:۱۲۱) "ان پر ان کی شرمگاہیں کھل گئیں"۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو ان کا احساس ہی نہ تھا۔ یہ پھل کھاتے ہی ان کو اس انسانی داعیہ کا احساس ہو گیا۔ دوسری جگہ قرآن مجید نے اس حقیقت کی تعبیریوں کی ہے۔

لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُوْرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا "تاکہ ظاہر کر دے ان پر وہ چیز جو ان کی شرمگاہوں سے ہم نے خود ان سے چھپا رکھی تھی"۔ اور دوسری جگہ ہے۔

يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا "ان سے ان کے ستر اتار دیئے تاکہ وہ دکھائے ان کو ان کی شرمگاہیں"۔ یہ مفہوم لیا جا سکتا ہے کہ وہ ان کے عدم شعور کی وجہ سے ستر تھا۔ لباس سے مراد پاکدامنی' طہارت اور اللہ کے ساتھ تعلق کا لباس بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال یہ مختلف تفسیری مفروضے ہیں' ہم ان میں کسی ایک پر زور نہیں دیتے اور نہ کسی ایک کو ترجیح دیتے ہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ انسان کی زندگی کے اس پہلے انسانی تجربے کی صحیح صورت کا تعین کیا جائے۔

اس کے بعد آدم علیہ السلام اور آپ کی اہلیہ کو اس لغزش کے بعد اللہ کی رحمت نے ڈھانپ لیا کیونکہ یہ انسانیت کا پہلا تجربہ تھا۔

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾

"پھر اس کے رب نے اسے برگزیدہ کیا اور اس کی توبہ قبول کر لی اور ہدایت بخشی"۔ اور یہ اس وقت ہوا جب آدم نے اللہ سے مغفرت طلب کی' ندامت کا اظہار کیا اور عذر پیش کیا۔ اور ان باتوں کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا تاکہ یہاں صرف رحمت خداوندی ہی نظر آئے۔

اس کے بعد اب دونوں فریقوں آدم و ابلیس کو حکم ہوا کہ زمین پر اترو' تم ایک دوسرے کے سخت دشمن ہو' تمہارے درمیان اب ایک طویل معرکہ ہو گا۔ یہ تو تمہارے معرکہ کی پہلی باری تھی۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ

"اور فرمایا تم دونوں (فریق 'یعنی انسان اور شیطان) یہاں سے اتر جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے"۔
یوں مخلوق خداوندی کے ان دو گروہوں کے درمیان عداوت ہو گئی اس لیے اب اولاد آدم یہ عذر پیش نہیں کر سکتی کہ مجھے تو خبر نہ تھی کہ شیطان ہمارا دشمن ہے۔ میں تو بے خبری میں مارا گیا۔ اسی لیے انسان کو 'قبل از وقت پوری طرح خبردار کر دیا گیا اور پوری کائنات میں اعلان کر دیا گیا کہ :۔

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲۰ : ۱۲۳) "تم دونوں فریق ایک دوسرے کے دشمن ہو"۔ یہ اعلان جس سے پوری کائنات گونج اٹھی جس پر تمام فرشتے گواہ ٹھہرے 'اللہ کی رحمت کا تقاضا پھر ہوا کہ انسان کی ہدایت اور اسے یاد دہانی کرانے کے لیے وقتاً فوقتاً رسول بھیجے جائیں۔ چنانچہ دشمن کا اعلان ہوا۔ اور پھر فرمایا کہ رسول بھی آئیں گے۔ اور اس کے بعد تمہیں آزادی ہو گی کہ تم کون سی راہ اختیار کرتے ہو۔

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ ﴿١٢٣﴾ وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ ﴿١٢٤﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنتُ بَصِيرًا ﴿١٢٥﴾ قَالَ كَذَٰلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا ۖ وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنسَىٰ ﴿١٢٦﴾ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي مَنْ أَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِن بِآيَاتِ رَبِّهِ ۚ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَىٰ ﴿١٢٧﴾

"اب اگر میری طرف سے تمہیں کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ بھٹکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہو گا اور جو میرے "ذکر" (درس نصیحت) سے منہ موڑے گا اس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہو گی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے"۔ وہ کہے گا "پروردگار' دنیا میں تو میں آنکھوں والا تھا' یہاں مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟" اللہ تعالیٰ فرمائے گا "ہاں اسی طرح تو ہماری آیات کو' جبکہ وہ تیرے پاس آئی تھیں 'تو نے بھلا دیا تھا۔ اسی طرح آج تو بھلایا جا رہا ہے"۔۔۔ اس طرح ہم حد سے گزرنے والے اور اپنے رب کی آیات نہ ماننے والے کو (دنیا میں) بدلہ دیتے ہیں اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے"۔
یہ منظر اس قصے کے بعد آتا ہے' یوں کہ شاید یہ اس قصے کا حصہ ہے۔ درحقیقت اس کا اعلان بھی عالم بالا میں واقعہ آدم و ابلیس کے بعد ہوا۔ لہٰذا یہ اس پوری کائنات کے لیے زمانہ قدیم سے طے شدہ اصول ہے۔ یہ نہ واپس لیا جا سکتا ہے اور نہ اس میں کوئی ترمیم ہو سکتی ہے۔

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ (۲۰ : ۱۲۳) "تو جو کوئی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ بھٹکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہو گا"۔ وہ گمراہی اور معصیت سے محفوظ ہو گا' میری ہدایت کی پیروی کی وجہ سے۔

گمراہی اور معیبت جنت کے دروازے کے باہر بڑی بے تابی سے تمہارے انتظار میں ہیں لیکن جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ ان سے بچا رہے گا۔ اور معیبت دراصل گمراہی کا پھل ہے۔ اگرچہ گمراہ شخص دنیادی سازوسامان میں غرق ہو' یہ سازوسامان بھی ایک گمراہ کے لئے بڑی معیبت ہوتا ہے۔ دنیا میں بھی معیبت اور آخرت میں بھی معیبت۔ دنیا میں حرام کی روزی جس قدر بھی وافر ہو' اس کے نتیجے میں انسان کی زندگی میں تلخیاں اور مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ انسان جونہی اللہ کی رہنمائی سے نکلتا ہے وہ اندھیروں میں داخل ہو جاتا ہے' ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارتا ہے' قلق اور پریشانی اس کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہے۔ کبھی ادھر بھاگتا ہے' کبھی ادھر بھاگتا ہے' اس کی زندگی واضح طور پر غیر متوازن ہو جاتی ہے۔ غرض معیبت ایک گمراہ شخص کے ساتھ ہوتی ہے' اگرچہ وہ عیش و عشرت میں ہو۔ اس کے لیے بہت بڑی بدبختی دار آخرت میں انتظار کرتی رہتی ہے اور جو شخص اللہ کی ہدایت پر چلتا ہے وہ دنیا میں بھی گمراہی اور معیبت سے مکمل طور پر نجات پاتا ہے اور آخرت میں تو وہ جنت الفردوس میں ہو گا۔ صرف یوم موعود آنے کی دیر ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (۲۰: ۱۲۴) "اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا' اس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی"۔ وہ زندگی جس میں اللہ سے رابطہ نہ ہو اور جس پر اللہ کی رحمت نہ ہو' وہ تنگ ہوگی' اگرچہ بظاہر وہ بہت ہی وسیع ہو۔ یہ تنگ اس لیے ہوگی کہ اس کا رابطہ اللہ کی طرف سے کٹا ہو گا اور اللہ کی رحمت کے میدان کی طرف وہ راہ نہ پائے گی۔ اس میں حیرانی' پریشانی اور بے یقینی کی تنگی ہوگی۔ اس میں حرص اور خوف کی تنگی ہوگی۔ ڈر اس بات پر کہ جو ہے وہ چلا نہ جائے۔ غرض اس بات پر کہ ھل من مزید یوں تنگی ہوگی کہ جہاں سے نفع کی معمولی امید ہو انسان اس کے پیچھے بھاگتا رہے گا اور اگر ایک کوڑی بھی کہیں نقصان ہو جائے' مرجائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کو اطمینان و قرار صرف اللہ کے ہاں ملتا ہے۔ اسے سکون و اعتماد تب ہی ملے گا جب اس نے مضبوط رسی پکڑی ہوگی جس کے ٹوٹنے کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان اطمینان کو طویل و عریض' گہرا اور اونچا بنا دیتا ہے۔ ہمہ جہت وسعتیں ہوتی ہیں۔ اور جو اس سے محروم ہو جائے اسے ہمہ جہت معیبت کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

غرض خلاصہ یہ ہے کہ جو میرے اس ذکر اور نصیحت سے منہ موڑے گا تو اس کے لیے اس دنیا میں تنگ زندگی ہو گی۔ (اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں)۔

وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰: ۱۲۴) قیامت کے دن اندھا ہونا بھی دنیا کے اندھے پن کی طرح ایک گمراہی ہے۔ یہ اس لیے ہو گا کہ اس نے دنیا میں ہدایت کے مقابلے میں اندھے پن کا اظہار کیا تھا اور وہ وہاں پوچھے گا۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا (۲۰: ۱۲۵) "پروردگار دنیا میں تو میں آنکھوں والا تھا' یہاں مجھے اندھا کیوں اٹھایا"۔ تو جواب آئے گا۔

كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى (۱۲۶) وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ

اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى (۱۲۷) (۲۰: ۱۲۶ ـ ۱۲۷)

"ہاں اسی طرح تو ہماری آیات کو جبکہ وہ تمہارے پاس آئی تھیں تو نے بھلا دیا تھا اسی طرح تو آج بھلایا جا رہا ہے ـ اسی طرح ہم حد سے گزرنے والے اور اپنے رب کی آیات نہ ماننے والے کو دنیا میں بدلہ دیتے ہیں اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے"۔ جو شخص اللہ کی آیات سے منہ موڑتا ہے وہ اسراف کرتا ہے کیونکہ ہدایت اس کے قبضے میں ہوتی ہے اور وہ قیمتی دولت ہے اور یہ اسے پرے پھینک دیتا ہے ـ نیز وہ اپنی نظر کو غلط کاموں میں صرف کرتا ہے اور اس سے ان آیات کو نہیں دیکھتا جو اللہ تعالیٰ نے بھیجی ہیں' لہٰذا اس کی معیشت بھی تنگ ہوگی اور قیامت میں وہ اندھا بھی ہوگا۔

یہاں تعبیر اور تصویر کشی میں مکمل ہم آہنگی ہے ـ جنت سے اترنا اور بدبختی اور گمراہی میں پڑنا اس کے مقابلے میں جنت کی طرف واپسی اور گمراہی اور مصیبت سے نجات ـ دنیا میں کشادگی رزق اور اس کے مقابلے میں تنگ معیشت ـ ہدایت کے مقابلے میں اندھا ہونا اور راہ نہ پانا ـ یہ تمام باہم مفہوم قصہ آدم و قصہ بشریت کے ضمن میں ہیں جو پوری بشریت کی کہانی ہے ـ چنانچہ اس منظر کا آغاز بھی جنت ہے اور اختتام بھی جنت میں ہوتا ہے اور یہی انداز تعبیر سورہ اعراف میں بھی ہے ـ مگر تعبیرات میں تصویر کشی کا انداز' موقعہ و محل کے اعتبار سے دونوں سورتوں میں مختلف ہے ـ

یہ تو تھا جنت کا ایک منظر اب اس دنیا میں زمانہ ماضی قریب کی ہلاک شدہ اقوام کے واقعات کی طرف اشارہ ـ یہ وہ واقعات ہیں جن کو آنکھیں دیکھ سکتی ہیں' اور جن کے آثار اب تک موجود ہیں' جبکہ جنت کے مناظر نظروں سے اوجھل عالم غیب میں تھے ـ نظریں ان کے آثار کو نہیں دیکھ سکتیں ـ

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ
مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ ع ۱۳
رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾ ۱۶

"پھر کیا ان لوگوں کو (تاریخ کے اس سبق سے) کوئی ہدایت نہ ملی کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کی (برباد شدہ) بستیوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں؟ درحقیقت اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سلیم رکھنے والے ہیں ـ اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ایک بات طے نہ کر دی گئی ہوتی اور مہلت کی ایک مدت مقرر نہ کی جا چکی ہوتی تو ضرور ان کا بھی فیصلہ چکا دیا جاتا"۔

جب انسان اپنے دل و دماغ کو زمانہ ماضی کی ہلاک شدہ اقوام کی تاریخ پر مرکوز کرتا ہے اور ان کے کھنڈرات کو' وادیوں اور پہاڑیوں میں دیکھتا ہے تو اگرچہ یہ لوگ کب کے ہلاک ہوگئے ہیں لیکن ان کی بڑی بڑی شخصیات' ان کی بھاگتی ہوئی شکلیں' ان کی حرکات و سکنات' ان کی امنگیں اور آرزوئیں' ان کی پریشانیاں اور ان کے منصوبے' انسان کے ذہن کو بھر دیتے ہیں اور انسان جب تک آنکھیں بند کر کے محض تصور ہی کرے تو یہ پوری دنیا ہمارے ذہن کی اسکرین پر بھی

نظر آتی ہے اور جب انسان اچانک آنکھ کھولے تو نظر آتا ہے کہ ماضی کی عقوبت نے ان سب بستیوں کو ہڑپ کر لیا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ دست قدرت نے کس طرح ان لوگوں کو اور ان تہذیبوں کو نیست و نابود کر دیا ہے۔ اس طرح زمانہ حال کے ان غافلوں کو بھی دست قدرت نابود کر سکتا ہے۔ یوں اس طرز تصور سے اس آیت کا مفہوم اور قرآن کا انداز بیان اور عبرت آموزی اچھی طرح انسان کے ذہن میں آ جاتی ہے۔ تعجب ہے کہ لوگ کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے حالانکہ ان کھنڈرات میں تو عبرت کے بہت بڑے سامان ہیں بشرطیکہ عقل سلیم ہو۔

اگر اللہ نے پہلے سے فیصلہ نہ کر دیا ہوتا اور یہ بات اللہ کی خاص حکمت کے تحت طے نہ ہو گئی ہوتی تو اللہ اہل قریش کو بھی بعینہٖ اسی طرح نیست و نابود کر دیتا اور یہ بھی نمونہ عبرت بن جاتے لیکن ان کو ایک مقررہ وقت تک مہلت مل چکی ہے۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّي (۲۰: ۱۲۹) "اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ایک بات طے نہ کر دی گئی ہوتی اور مہلت کی ایک مدت مقرر نہ کی جا چکی ہوتی تو ضرور ان کا بھی فیصلہ چکا دیا گیا ہوتا"۔ اگرچہ یہ لوگ ایک وقت مقررہ تک مہلت پا چکے ہیں لیکن ان کو یونہی نہیں چھوڑ دیا گیا۔ ان کو جو شان و شوکت اور جو زیب و زینت دی گئی ہے آپ اس کے ذمہ دار نہیں۔ یہ ان کے لیے سخت آزمائش ہے اور یہ ان کے لیے بہت بڑا فتنہ ہے۔ اللہ نے جو کچھ تجھے بطور انعام دیا ہے۔ وہ ان کے اس فتنے کے طور پر دیئے ہونے سے بہتر ہے۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ۝ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ڏ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۭ لَا نَسْــَٔــلُكَ رِزْقًا ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ۝

"پس اے نبیؐ، جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی، شاید کہ تم راضی ہو جاؤ۔ نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو دنیوی زندگی کی اس شان و شوکت کو جو ہم نے ان میں مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے۔ وہ تو ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے دی ہے اور تیرے رب کا دیا ہوا رزق حلال ہی بہتر اور پائندہ تر ہے۔ اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو۔ ہم تم سے کوئی رزق نہیں چاہتے۔ رزق تو ہم ہی تمہیں دے رہے ہیں اور انجام کی بھلائی تقویٰ ہی کے لیے ہے"۔

یہ لوگ کفر اور مذاق اور سرکشی اور اعراض کرتے ہوئے جو کچھ بھی کہتے ہیں اس پر آپ پریشان نہ ہوں اور نہ اپنی جان

ان کے لیے کھپائیں' پس اب ان پر حجت تمام ہے کہ آپ صبح و شام رب کی عبادت کریں ۔ صبح کے پر سکون وقت میں خدا کی یاد اور غروب آفتاب کے وقت کے سکون میں خدا کی یاد جس وقت' یہ پوری کائنات آنکھیں بند کرتی ہے اور رات اور دن کے دو پر سکون اطراف میں خدا کی یاد' دلوں کو بہت سکون فراہم کرتی ہے اور اللہ کی رضامندی کا باعث ہوتی ہے ۔

اللہ کی تسبیح و ثنا سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور اللہ کے قرب سے اطمینان حاصل ہوتا ہے ۔ انسان اپنے آپ کو نہایت ہی اطمینان بخش اور فرحت بخش ذات کی رفاقت میں محسوس کرتا ہے ۔ اور اس کے دامن رحمت میں مامون ہوتا ہے ۔ تسبیح و عبادت کا پھل تو رضائے الہی ہے لیکن اس سے قلب مومن میں اندر سے سکون و اطمینان آتا ہے اور طمانیت کے سوتے پھوٹتے ہیں ۔ یہ اس فعل کا نوری انعام ہے ۔ اے محمدؐ عبادت کرتے ہوئے اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور ۔ وَلَاتَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (۲۰ : ۱۳۱) "اور نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو' دنیوی زندگی کی اس شان و شوکت کو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے"۔ دنیا کا ساز و سامان' سامان آرائش و زیبائش' مال و متاع' جاہ و مرتبہ ۔ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۲۰ : ۱۳۱) "حیات دنیا کا پھول" یہ زندگی اس طرح نمودار ہوتی ہے جس طرح کسی پودے پر نرم و نازک پھول' چمکدار اور دلکش' لیکن پھول سریع الزوال شام تک مرجھا جانے والا' اگرچہ بہت ہی دلکش ۔ ہم ان کو زندگی کا یہ سریع الزوال پھول دے کر آزماتے ہیں' دیکھتے ہیں کہ اس پھول کے ساتھ یہ لوگ کیا سلوک کرتے ہیں ۔

وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (۲۰ : ۱۳۱) "اور تیرے رب کا دیا ہوا رزق ہی اچھا اور پائندہ ہے"۔ اللہ کا دیا ہوا رزق ایک نعمت ہوتی ہے' آزمائش نہیں ۔ رزق حلال اچھا ہوتا ہے اور باقی رہتا ہے ۔ وہ دھوکہ بھی نہیں دیتا اور فتنہ بھی پیدا نہیں کرتا ۔

یہ حیات دنیا کو چھوڑ دینے کی دعوت نہیں ہے لیکن اس میں یہ پیغام ضرور ہے کہ حقیقی اور پائیدار اقدار کو اہمیت دو' اور یہ پائیدار اقدار تعلق باللہ اور اللہ کی رضامندی میں ہیں ۔ لوگوں کو دنیا کے ساز و سامان کے آگے گر نہیں جانا چاہئے ۔ ہم کہیں اعلیٰ اقدار پر فخر کرنے کی صفت کو گم ہی نہ کر دیں ۔ دنیا کا وہ ساز و سامان جو نظروں کو چکاچوند کر دیتا ہے ۔ یہ کہیں تمہاری نظر بلند کو پست نہ کر دے ۔ اس کے مقابلے میں سربلند رہنا ۔

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ (۲۰ : ۱۳۲) "اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو"۔ ایک مسلمان کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے گھر کو ایک مسلمان کا گھر بنائے ۔ اپنے اہل و عیال کو وہ فریضہ ادا کرنے پر ابھارے جو اسے اللہ سے مربوط کرتا ہے تاکہ اس کے گھر میں یکجہتی پیدا ہو اور کیا ہی خوش نصیب ہوگا وہ گھر جس کے اندر پوری یکجہتی ہو ۔

وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (۲۰ : ۱۳۲) "اور خود بھی اس کے پابند رہو"۔ نماز کو پوری طرح قائم کرو ۔ اس کے آثار اپنے اندر پیدا کرو' بے شک نماز فحاشی اور منکرات سے بچاتی ہے ۔ یہ ہیں نماز کے صحیح آثار ۔ جب کوئی گھرانا نماز پر جم جاتا ہے تو اس سے پھر یہ آثار پیدا ہوتے ہیں' اس کے شعور میں اور اس کے ہر طرز عمل میں ۔ اگر نماز کے آثار پیدا نہیں ہوتے تو قائم شدہ نماز نہیں ہے ۔ یہ محض حرکات و کلمات ہیں ۔

یہ نماز ' یہ عبادت ' یہ للہ سے رابطہ اور یہ فرائض اللہ کے لیے مفید نہیں ' اللہ تو ان سے غنی ہے ' ان کا للہ کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔

لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ (۲۰ : ۱۳۲) "ہم تم سے کوئی رزق نہیں چاہتے ' رزق تو ہم ہی تمہیں دے رہے ہیں"۔ یہ عبادات تو اس لیے ہیں کہ تمہارے دل میں خدا کا خوف پیدا ہو۔

وَ الْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰي (۲۰ : ۱۳۲) "اور انجام کی بھلائی تقویٰ ہی کے لیے ہے"۔ انسان ان عبادات سے دنیا میں بھی مفاد اٹھاتا ہے اور آخرت میں بھی۔ وہ عبادت کرتا ہے تو خود بھی خوش ہوتا ہے ' مطمئن ہوتا ہے ' سکون حاصل کرتا ہے اور آخرت میں ان عبادات کا اجر بھی اسے ہی ملتا ہے۔

اب آخر میں ان اہل ثروت اور بااثر لوگوں پر ایک تبصرہ آتا ہے جو حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ آپ کوئی خارق عادت معجزہ پیش کریں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ کیا یہ قرآن تمہارے لیے کافی نہیں۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝

"وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی (معجزہ) کیوں نہیں لاتا؟ اور کیا ان کے پاس اگلے صحیفوں کی تمام تعلیمات کا بیان واضح نہیں آگیا"۔

یہ تو ہٹ دھرمی اور مکابرہ ہے۔ محض سوال کرنے کی خاطر یہ سوال کیا گیا ' ورنہ قرآن کا معجزہ کیا کافی معجزہ نہیں ہے۔ قرآن موجودہ رسالت کا جوڑ زمانہ ماقبل کی رسالتوں سے لگاتا ہے۔ وہی تعلیمات پیش کرتا ہے ' جو پہلے رسولوں نے پیش کی ہیں بلکہ جن باتوں کا وہاں اجمال تھا یہاں ان کی تفصیل دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان کو تو بطور اتمام حجت بھیجا ہے۔

وَلَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰى ۝

"اگر ہم اس کے آنے سے پہلے ان کو کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو پھر یہی لوگ کہتے کہ اے پروردگار ' تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے ہی ہم تیری آیات کی پیروی اختیار کر لیتے"۔

یہ لوگ اس وقت ذلیل اور رسوا نہیں ہوئے تھے جب ان پر قرآن کی یہ آیات پڑھی جا رہی تھیں بلکہ یہ تو ان کے

فیصلہ شدہ انجام کی ایک تصویر کشی ہے جس میں وہ لازماً رہیں گے۔ یہ آیات ان پر بطور اتمام حجت آگئیں تاکہ وہ قیامت کے دن ایسا نہ کہہ سکیں اور ان کے لیے کوئی عذر و معذرت باقی ہی نہ رہے کہ ہمارے لیے کوئی پیغام نہیں آیا۔

جب بات یہاں تک پہنچ گئی کہ ان کا حتمی انجام یہ ہے کہ یہ ذلیل اور رسوا ہونے والے ہیں تو قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو' ان کا فیصلہ تو ہو چکا ہے۔

حف القلم بما ھو کائن پریشان نہ ہوں کہ یہ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ اعلان کر دیں کہ تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوا ۚ فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ أَصْحَابُ الصِّرَاطِ

۸ ع ۷ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدَىٰ ﴿١٣٥﴾

۱۷

"اے نبیؐ' ان سے کہو' ہر ایک انجام کار کے انتظار میں ہے' پس اب منتظر رہو' عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون سیدھی راہ چلنے والے ہیں اور کون ہدایت یافتہ ہیں"۔

یوں اس سورہ کا خاتمہ ہوتا ہے جس کا آغاز اس فقرے سے ہوا تھا کہ اے نبی آپ پر یہ قرآن اس لیے نازل نہیں کیا گیا کہ آپ کسی مصیبت میں گھر جائیں بلکہ یہ ان لوگوں کے لیے نصیحت ہے جن کے دل میں خدا کا خوف ہو۔ چنانچہ سورہ کا یہ خاتمہ بھی آغاز سے ہم آہنگ ہے کہ یہ ادنیٰ تذکرہ ہے۔ اس شخص کے لیے جسے کوئی تذکرہ فائدہ دیتا ہو۔ جب یہ تذکرہ تم تک پہنچ گیا تو اب انتظار نتیجہ کے سوا کیا بات رہ جاتی ہے اور نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ------ ۱۷

## سورۃ الانبیاء - ۲۱

آیات ۱--- تا--- ۱۱۲

## سورۃ الحج - ۲۲

آیات ۱--- تا--- ۷۸

# سورۃ الانبیاء ایک نظر میں

یہ مکی سورہ ہے اور اس کا موضوع سخن بھی مکی سورتوں کا موضوع ہے یعنی اسلامی نظریہ حیات - یہ اس کے بڑے بڑے موضوعات کو لیتی ہے یعنی عقیدۂ توحید' عقیدۂ رسالت اور عقیدۂ بعث بعد الموت - لیکن اس سورہ نے ان موضوعات کے بیان کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اس کائنات میں جاری قوانین قدرت کو بیان کر کے اسلامی نظریہ حیات کو ان کے ساتھ جوڑا جائے' یہ اس لیے کہ اسلامی نظریہ حیات بھی اس کائنات ہی کا ایک حصہ ہے اور یہ نظریہ قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کے مطابق اپنا کام کرتا ہے - اسلامی نظریہ حیات بھی دراصل اس "حق" پر قائم ہے جس پر یہ پوری کائنات قائم ہے اور ارض و سما اس پر قائم ہیں - یہی وجہ ہی کہ یہ کائنات عبث نہیں اور نہ باطل ہے اور نہ اس کے اندر پیدا شدہ مخلوق عبث اور باطل ہے -

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۲۱ : ۱۶) "ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ بھی ان میں ہے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا" - یہی وجہ ہے کہ یہ سورہ انسان کو اور اس کے فکر و نظر کو اس پوری کائنات کی سیر کراتی ہے - زمین و آسمان' دشت و جبل' روز و شب اور شمس و قمر کا مشاہدہ کراتی ہے - ان کو متوجہ کرتی ہے کہ جو قوانین قدرت اور نوامیس فطرت اس پوری کائنات کو چلا رہے ہیں' وہ بتاتے ہیں کہ ان کے اندر ایک وحدت ہے اور یہ وحدت دلالت کرتی ہے' وحدت خالق اور وحدت مدبر پر - ایک ایسے مقتدر اعلیٰ پر جس کے ساتھ اس تدبیر میں کوئی شریک نہیں ہے' لہٰذا جس طرح خلق میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے اسی طرح امر میں بھی اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ہونا چاہئے -

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (۲۱ : ۲۲) "اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا کوئی دوسرا خدا بھی ہوتا تو دونوں کا نظام بگڑ جاتا" - پھر یہ سورہ انسانی قوت مدرکہ کو اس طرف متوجہ کرتی ہے کہ اس کائنات کے اندر "حیات" جن قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کے مطابق چل رہی ہے اور اس حیات کے جو مصادر ہیں وہ اس ارشاد خداوندی کے مطابق ہیں -

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱ : ۳۰) "اور پانی سے ہم نے ہر زندہ چیز پیدا کی" - اور تمام زندہ چیزیں اسی قانون فطرت کے مطابق ایک متعین انجام کی طرف جا رہی ہیں -

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (۲۱ : ۳۵) "ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے" - اور ان کے لوٹنے کی

جگہ بھی ایک ہے۔

اَلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ ( ۲۱ : ۳۵ ) "آخر کار تمہیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے"۔
یہ کہ اسلامی نظریہ حیات ان قوانین قدرت کے ساتھ گہرا ربط رکھتا ہے کیونکہ طویل ترین انسانی تاریخ اور متعدد انبیاء و رسل اور مختلف اقوام و زمان کے باوجود یہ عقیدہ ایک ہی رہا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ( ۲۱ : ۲۵ ) "ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو" اور اللہ کی مشیت یہ بھی رہی ہے کہ تمام رسول بشر رہے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ ( ۲۱ : ۲۵ ) "ہم نے آپ سے قبل جن کو بھیجا وہ بھی بشر ہی تھے جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے"۔ اسلامی نظریہ حیات اگرچہ ان قوانین فطرت سے منسلک ہے جن کے مطابق یہ عظیم کائنات چلتی ہے، لیکن اس نظریہ کا عملی ظہور اس کرۂ ارض پر انسانوں کی عملی زندگی میں ہی ہو گا۔ کیونکہ اس عقیدے کے بارے میں سنت الٰہیہ یہ ہے کہ یہ حق ہے اور جس طرح اس کائنات پر یہ حق غالب ہے اس کرۂ ارض پر بھی اسی کو غالب ہونا ہے کیونکہ یہ سچ ہے۔ اس پر پوری کائنات قائم ہے، لہٰذا حق کا غلبہ سنت الٰہیہ میں بھی ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ( ۲۱ : ۱۸ ) "مگر ہم باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے"۔ یعنی ظالم جھٹلانے والے ہلاک ہوں گے اور رسل اور مومنین فلاح پائیں گے"۔

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ( ۲۱ : ۹ ) "پھر دیکھ کہ آخر کار ہم نے ان کے ساتھ اپنے وعدے پورے کیے اور انہیں اور جس جس کو ہم نے چاہا بچا لیا اور حد سے گزر جانے والوں کو ہلاک کر دیا"۔ مطلب یہ ہوا کہ میرے صالح بندے ہی زمین کے اقتدار اعلیٰ کے وارث ہوں گے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ

( ۲۱ : ۱۰۵ ) "اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے"۔
یہی وجہ ہے کہ یہ سورہ رسولوں کے گروہ پر ایک سرسری نظر ڈالتی ہے، یوں کہ یہ ایک ہی گروہ ہے اور ان کی رسالت بھی ایک ہے۔ بعض کے بارے میں بحث ذرا طویل ہے مثلاً ابراہیم علیہ السلام اور داؤد علیہ السلام اور باقی رسولوں نوح، موسیٰ، ہارون، لوط، اسماعیل، ادریس، ذی الکفل، ذوالنون، زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نہایت اختصار سے تبصرہ ہوا۔ ان تمام قصص میں رسولوں اور داعیوں کی زندگی کے واقعات کی شکل میں، دعوت کے اصول عامہ کی شکل

میں اور اس کائنات کے قوانین قدرت کی شکل میں وہ تمام معانی اور حقائق واضح طور پر نظر آتے ہیں جو اس سورہ کا موضوع ہیں۔

اس سورہ میں بھی قیامت کے بعض مناظر پیش کیے گئے ہیں اور یہ معانی اور مضامین اور اصول' واقعات قیامت کی روشنی میں واضح ہیں۔

ان تمام واقعات کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اور سورہ میں فکر و نظر کی تاروں کو جس طرح چھیڑا گیا ہے' اس کے پیش نظر صرف ایک ہی ہدف ہے کہ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین اور نظریہ حیات کو اپنی قوت مدرکہ اور اپنے فہم کے مطابق اپنی گرفت میں لے لیں اور ان معانی ' مضامین اور حقائق پر سے ایک غافل اور لاپرواہ شخص کی طرح نہ گزر جائیں جس طرح آغاز سورہ میں اشارہ کیا گیا۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ (۲۱ : ۱) مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ (۲۱ : ۲) لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ (۲۱ : ۳)

"قریب آگیا ہے لوگوں کے حساب کا وقت اور وہ ہیں کہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس جو تازہ نصیحت بھی ان کے رب کی طرف سے آتی ہے اس کو بتکلف سنتے ہیں اور کھیل میں پڑے رہتے ہیں۔ دل ان کے دوسری ہی فکر میں منہمک ہیں"۔ رسالت تمام رسولوں کی رسالت 'ایک عظیم سچائی ہے اور موجود ہے 'جس طرح یہ کائنات ایک عظیم سچائی ہے اور موجود ہے۔ لہٰذا اس عظیم سچائی کو کھیل کے طور پر نہیں لینا چاہئے' یہاں پیغمبر سے معجزے طلب کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ یہ پوری کائنات اور اس کے قوانین قدرت اور نوامیس فطرت پکار رہے ہیں کہ اس کا ایک واحد قادر مطلق خالق ہے اور تمام انبیاء کا پیغام بھی ایک واحد حق پیغام ہے۔

سورہ انبیاء میں الفاظ کی شوکت اور ان کا صوتی ترنم بھی قابل توجہ ہے۔ انداز بیانیہ ہے جو موضوع سخن کے ساتھ مناسب ہے اور سورہ کی فضا اور موضوعات اور مضامین کے ساتھ لگا کھاتا ہے۔ اس سورہ کے انداز بیان اور موضوع سخن کو سورہ مریم اور طٰہٰ کے ساتھ مقابلہ کر کے فرق کو اچھی طرح سمجھایا جا سکتا ہے۔ ان دونوں سورتوں میں موضوع سخن اور فضا' نرم و لطیف 'رحمت و محبت کی تھی۔ تو الفاظ بھی نرم و نازک اور دھیمی ترنم والے تھے۔ لیکن یہاں قدرے ٹھوس انداز ہے جو سورہ کے موضوعات سے جوڑ کھاتا ہے۔

اگر دونوں جگہ قصہ ابراہیم علیہ السلام کا باہم موازنہ کیا جائے تو ہماری بات اچھی طرح سمجھ میں آ جائے گی۔ سورہ مریم میں اس قصے کی جو کڑی لی گئی ہے اور یہاں جو کڑی لی گئی ہے ان میں فرق ہے۔ وہاں ابراہیم علیہ السلام کی اپنے والد کے ساتھ احترام و محبت سے بھرپور گفتگو ہے' نرم و نازک الفاظ میں۔ لیکن یہاں اس قصے میں بت شکنی اور کلہاڑا لیا گیا ہے' پھر ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکنے کا خوفناک قصہ' لہٰذا اس کے لیے ٹھوس دو ٹوک اور قدرے سخت الفاظ کی ضرورت تھی تاکہ انداز کلام موضوع سخن اور حالات اور فضا کے مطابق ہو جائے۔

اس سورہ کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

۱۔ پہلا حصہ آغاز ہی سے جھنجوڑنے والا ہے۔ اس میں فکر و نظر کی تاروں پر سخت ضربات لگائی گئی ہیں اور لوگوں کو

قریب آنے والے خطرات سے آگاہ کیا گیا ہے ۔لوگو! بیدار ہو جاؤ غفلت چہ معنی دارد؟

اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ -- (۲۱:۱) "قریب آگیا ہے لوگوں کے حساب کا وقت اور وہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں"۔پھر تاریخ انسانی کے غافل لوگوں کی ہلاکتوں کی طرف اشارہ کر کے' دوبارہ لوگوں کو متوجہ کیا گیا ہے کہ ظلم وستم اور عیش و طرب کے بھیانک انجام کی طرف بھی توجہ کرو۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِن قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ (۲۱:۱۱) فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا إِذَا هُم مِّنْهَا يَرْكُضُونَ (۲۱:۱۲) لَا تَرْكُضُوا وَارْجِعُوا إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسَاكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ (۲۱:۱۳) قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ (۲۱:۱۴) فَمَا زَالَت تِّلْكَ دَعْوَاهُمْ حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ (۲۱:۱۵)

(۲۱ : ۱۱ تا ۱۵) "کتنی ہی ظالم بستیاں ہیں جن کو ہم نے پیس کر رکھ دیا اور ان کے بعد دوسری کسی قوم کو اٹھایا۔ جب ان کو ہمارا عذاب محسوس ہوا تو لگے وہاں سے بھاگنے' "بھاگو نہیں' جاؤ اپنے انہی گھروں اور عیش کے سامانوں میں جن کے اندر تم چین کر رہے تھے' شاید کہ تم سے پوچھا جائے گا"۔کہنے لگے ہائے ہماری کم بختی' بے شک ہم خطاوار تھے"۔وہ یہی پکارتے رہے یہاں تک کہ ہم نے ان کو کھلیان کر دیا۔زندگی کا ایک شرارہ بھی ان میں نہ رہا"۔

اس کے بعد دعوت اسلامی کی ٹھوس سچائی' اور نظام کائنات میں موجود ٹھوس سچائی کو باہم جوڑا گیا ہے۔ عالم نظریات میں عقیدۂ توحید اور قوانین قدرت کی توحید' خالق مدبر کی وحدت تدبیر اور تمام رسولوں کی وحدت رسالت کی توحید کے درمیان ربط پیدا کر کے بتایا گیا ہے کہ زندگی کا سرچشمہ بھی اللہ ہے اور اس کی انتہا بھی اللہ کی طرف ہے اور اسی کی طرف رجوع ہے۔

۲۔ دوسرے حصے میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اس عظیم رسول اور عظیم رسالت کے پیغام کے ساتھ مذاق کرتے ہیں اور اسے ہلکا لیتے ہیں' حالانکہ یہ تو ٹھوس اور بھاری حق ہے۔ ان کا ماحول اور دنیا کے حالات تقاضا کرتے ہیں کہ انسان بیدار ہو۔ یہ لوگ غافل ہیں اور عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں حالانکہ وہ ان کی دہلیز پر ہے۔ اس موقعہ پر قیامت کا ایک نہایت ہی موثر منظر پیش کر دیا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ رسولوں کے ساتھ مذاق کرنے والوں کا انجام تاریخ میں کیا ہوا ہے۔ اللہ کے سوا پھر ان کو بچانے والا تو کوئی ہوتا نہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ان کے اردگرد ان کے پاؤں تلے سے زمین نکلی جا رہی ہے لیکن یہ اپنی دولت کے نشے میں مست ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کے مذاق کو نظرانداز کرتے ہوئے آپ اپنا کام کریں اور کہہ دیں۔

إِنَّمَا أُنذِرُكُم بِالْوَحْيِ (۲۱:۴۵) "میں تو تمہیں وحی سے ڈراتا ہوں"۔ تم غفلت میں ہو اور خطرہ

تمہارے سروں پر منڈلا رہا ہے لیکن تمہاری حالت یہ ہے :

وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ (۲۱ : ۴۵) "مگر بہرے پکار نہیں سنا کرتے جبکہ انہیں خبردار کیا جائے"۔ یہ لوگ ایسے ہی حالات میں ہوں گے کہ میزان نصب ہو جائے گی۔

۳۔ تیسرے حصے میں نبیوں کے گروہ پر ایک نظر ہے ثابت یہ کرنا مقصود ہے کہ ان کی رسالت اور نظریہ حیات ایک ہی رہا ہے ۔ اللہ کا رویہ اپنے بندوں سے بھی ہمیشہ ایک جیسا رہا ہے ۔ یہ کہ وہ ہمیشہ مکذبین کو پکڑتا رہا ہے ۔

۴۔ چوتھے حصے میں انجام اور نتائج بتائے گئے ہیں اور یہ انجام اور نتائج قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کی صورت میں 'نہایت ہی موثر ہیں جبکہ سورہ کا خاتمہ بھی آغاز کی طرح کا ہے ۔ انسانی سوچ کی تاروں پر ایک جھنجھوڑنے والی ضرب لگائی گئی ہے ۔ صاف صاف الفاظ میں ڈراوا اور فریضہ رسالت کی ادائیگی کے بعد لوگوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے کہ اب جو انجام چاہو 'منتخب کر لو۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۴۰ تشریح آیات

## آیت ۱--- تا --- ۳۵

سُوْرَةُ الْاَنْبِيَاۗءِ (۲۱) مَكِّيَّةٌ (۷۳)
اٰيَاتُهَا ۱۱۲ رُكُوْعَاتُهَا ۷
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِىْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝١ مَا يَاْتِيْهِمْ
مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝٢ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ
وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ
السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝٣ قٰلَ رَبِّىْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِى السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ
وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝٤ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ
شَاعِرٌ ۚ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝٥ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ
اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝٦ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ
فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝٧ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا
يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝٨ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ
وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۝٩

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

''قریب آگیا ہے لوگوں کے حساب کا وقت' اور وہ ہیں کہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں' ان کے پاس جو تازہ

نصیحت بھی ان کے رب کی طرف سے آتی ہے اس کو بتکلف سنتے ہیں اور کھیل میں پڑے رہتے ہیں' دل ان کے (دوسری ہی فکروں میں) منہمک ہیں ـ اور ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص آخر تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے' پھر کیا تم آنکھوں دیکھتے جادو کے پھندے میں پھنس جاؤ گے؟" رسولؐ نے کہا میرا رب ہر اس بات کو جانتا ہے جو آسمان اور زمین میں کی جائے' وہ سمیع اور علیم ہے ـ

وہ کہتے ہیں "بلکہ یہ پراگندہ خواب ہیں' بلکہ یہ اس کی من گھڑت بات ہے' بلکہ یہ شخص شاعر ہے' ورنہ یہ لائے کوئی نشانی جس طرح پرانے زمانے کے رسول نشانیوں کے ساتھ بھیجے گئے تھے ـ حالانکہ ان سے پہلے کوئی بستی بھی' جسے ہم نے ہلاک کیا' ایمان نہ لائی ـ اب کیا یہ ایمان لائیں گے؟

اور اے نبیؐ تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے ـ تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو ـ ان رسولوں کو ہم نے کوئی ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھاتے نہ ہوں اور نہ وہ سدا جینے والے تھے ـ پھر دیکھ لو کہ آخر کار ہم نے ان کے ساتھ اپنے وعدے پورے کیے اور انہیں اور جس جس کو ہم نے چاہا' بچالیا اور حد سے گزر جانے والوں کو ہلاک کر دیا"ـ

یہ نہایت ہی زوردار آغاز ہے' کسی بھی غافل شخص کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے کہ حساب سر پر ہے اور لوگ غفلت اور لاپروائی میں بیٹھے ہیں ـ بڑی بے تابی سے رسول ان کے سامنے آیات الٰہیہ پیش کر رہے ہیں اور وہ منہ موڑ کر دوسری جانب جا رہے ہیں ـ فوراً چوکنا ہونے کی ضرورت ہے اور یہ لوگ ہیں کہ خطرے کا شعور بھی نہیں رکھتے بلکہ جب بھی ان کو متنبہ کرنے کی نئی کوشش کی جاتی ہے یہ مذاق کرتے ہیں اور دعوت کو غیر اہم سمجھ کر کھیل میں لگ جاتے ہیں ـ

لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ (۲۱ : ۳) "ان کے دل غافل ہیں"ـ ان کے دل و دماغ اور شعور و وجدان کے تار بالکل خاموش ہیں ـ ان کے اندر کوئی نغمہ نہیں ہے ـ یہ ان شخصیات کی تصویر کشی ہے جو غایت درجہ لاابالی ہیں اور سنجیدگی ان میں مفقود ہے' جو نہایت ہی خطرناک مقامات پر بھی غیر سنجیدہ رہتے ہیں' جو نہایت محتاط رہنے کے مقام پر بھی گپ لگاتے ہیں' نہایت ہی مقدس موقف اور مقدس مقام میں بھی گندگی گراتے ہیں ـ یہ قرآن جو ان کو سنایا جا رہا ہے' یہ تو رب ذوالجلال کی طرف سے ایک پیغام ہے اور یہ اس سے لاپرواہ ہیں ـ کوئی وقار' کوئی پاکیزگی ان میں نہیں ہے ـ جن لوگوں میں سنجیدگی' وقار' پاکیزگی' جدت نظر نہیں ہوتی وہ آخر کار اس قدر ہلکے' خشک ہو جاتے ہیں اور اس طرح ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں کہ وہ کسی اونچے مشن یا اہم فرائض کی ادائیگی اور بھاری بوجھ اٹھانے کے قابل ہی نہیں رہتے ـ ان کی زندگی ڈھیلی' ان کے اخلاق گرے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کی اقدار ارزاں ہوتی ہیں ـ ایسے لوگوں میں ایک قسم کی بے باکی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ مقدس سے مقدس قدر کو بھی ہلکا سمجھتے ہیں ـ یہ شتر بے مہار ہوتے ہیں' کسی دستور اور ضابطے کے پابند نہیں ہوتے ـ اور ان کو خیر و شر کا شعور ہی نہیں رہتا ـ

اس قسم کے لوگ اس قرآن مجید کو سنجیدگی سے نہ لیتے تھے حالانکہ یہ قرآن مجید تو دستور حیات' نظام زندگی' نظام عمل' نظام معاملہ تھا ـ اس کو سنجیدگی سے دیکھنا چاہئے تھا لیکن ان لوگوں نے اسے نہایت ہی لاابالی پن سے ایک شتر بے مہار شخص کی طرح غفلت سے لیا اور مذاق کرنے لگے ـ ایسے لوگ ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں ـ جب روح انسان اس

اس طہارت اور اقدار کے اس تقدس کو خیر باد کہہ دے تو پھر معاشرہ مریض انسان پیدا کرتا ہے ' شتر بے مہار انسان پیدا کرتا ہے ' لاابالی انسان پیدا کرتا ہے ' جن کا نہ کوئی مقصد ہوتا ہے اور نہ وہ کسی چیز کو سنجیدگی سے لیتے ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان نے اس سورہ کو اس سنجیدگی ' اور اس اہمیت سے لیا کہ ان کے دل دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گئے ۔ ترجمہ آمدی میں عامر ابن ربیعہ کا یہ واقعہ آیا ہے کہ ان کے پاس عرب کا ایک آدمی آیا ۔ اس نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور عزت سے ٹھہرایا ۔ اس کے بعد وہ شخص دوبارہ عامر کے پاس آیا ۔ اس وقت اسے زمین الاٹ ہو چکی تھی اور کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سرزمین عرب کی ایک پوری وادی بطور جاگیر الاٹ کرائی ہے ' میں چاہتا ہوں کہ اس میں سے ایک ٹکڑا تمہیں دے دوں تاکہ وہ تمہیں اور تمہارے بعد تمہاری اولاد کے کام آئے ۔ اس پر عامر نے کہا ' مجھے تمہاری اس جاگیر میں کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے ۔ آج ایک سورہ نازل ہوئی ہے ' اس نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا ہے ۔ اب دنیا میں ہماری کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے ۔

اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ ( ۲۱ : ۱ ) " قریب آگیا ہے ' لوگوں کے حساب کا وقت اور وہ ہیں کہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں " ۔

یہ ہے فرق دلوں میں ۔ ایک طرف ہیں زندہ ' قبول کنندہ اور اثر گیرندہ دل اور دوسری جانب ہیں مردہ ' بجھے ہوئے اور ایسے دل جن میں فکر و شعور کے داخلے کی تمام کھڑکیاں بند ہیں ۔ ان مردہ دلوں پر لہو و لعب کے کفن ہیں اور ان کو بے مہاری کے لاابالی پن کے قبرستان میں دفنا دیا گیا ہے ۔ قرآن کا ان پر اثر نہیں ہوتا کیونکہ ان کے دل بجھ گئے ہیں اور وہ اس طرح ہو گئے ہیں کہ ان میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں ہے ۔

وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا ( ۲۱ : ۳ ) " اور ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں " ۔ اہل مکہ ہر وقت رسول اللہؐ اور آپ کی تحریک کے بارے میں سرگوشیاں کرتے تھے ۔ پھر یہ سرگوشیاں ان کی سازشوں کی شکل اختیار کرتی تھیں اور پھر یوں تبصرے کرتے تھے ۔

هَلْ هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ ( ۲۱ : ۳ ) " یہ شخص آخر تم جیسا بشر ہی تو ہے تو کیا پھر تم آنکھوں دیکھتے ( بجھتے بوجھتے ) جادو کے پھندے میں پھنس جاؤ گے " ۔ یہ لوگ تو درحقیقت مر چکے ہیں اور ان کے جسم میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں ہے اس لیے یہ قرآن سے خود تو متاثر ہوتے نہیں تھے لیکن جن دوسرے لوگوں پر قرآن کے اثرات ہوتے تھے ان کو یہ لوگ یوں بدراہ کرتے تھے کہ لوگو دیکھو ' یہ محمد تو ہم جیسا انسان ہے ' تو اس پر کیوں ایمان لاتے ہو ۔ اس کلام کا تم پر جو اثر ہوتا ہے تو وہ ایک جادو ہے ۔ تم دیکھتے ہوئے اور سمجھتے ہوئے اس جادو کا اثر لیتے ہو ۔

جب وہ ایسے اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے تو رسول اللہ کو حکم ہوتا ہے کہ اپنا اور ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیں ۔ یہ جو مشورے کر رہے ہیں اور قرآن کے اثرات سے بچنے کے لیے جو بہانے اور پروپیگنڈے کرتے ہیں ان کا کوئی اثر نہ ہو گا ۔

قُلْ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۲۱ : ۴)
"رسول نے کہا میرا رب ہر اس بات کو جانتا ہے جو آسمان اور زمین میں کی جائے اور وہ سمیع و علیم ہے"۔ زمین کے جس حصے میں بھی تحریک اسلامی کے خلاف کوئی سرگوشی ہو اللہ تعالیٰ سنتا اور جانتا ہے کیونکہ اللہ تو وہ ہے جو زمین و آسمان میں بولے جانے والے تمام اقوال کو جانتا ہے اور اس کے ہاں وہ ریکارڈ ہوتے ہیں اور وہ جو سازشیں بھی پکائیں اللہ اپنے رسول کو پہلے سے بتا دیتا ہے کہ وہ سمیع و علیم ہے۔

انہوں نے بہت سوچا کہ قرآن کے اثرات کو کس پروپیگنڈے سے روکیں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سحر ہے۔ یہ ایک مخلوط قسم کی سوچ اور منتشر افکار ہیں، جن کو محمد جمع کر کے پیش کرتا ہے، کبھی شعر کبھی کہانت کیا کہا۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ (۲۱ : ۵) "وہ کہتے ہیں بلکہ یہ پراگندہ خواب ہیں بلکہ یہ اس کی من گھڑت بات ہے بلکہ یہ شخص شاعر ہے"۔ یہ بلکہ بلکہ ہی کرتے رہیں گے کسی ایک بات پر بھی جم نہیں سکتے، نہ ان کی ایک رائے ہے، اصل بلکہ یہ ہے کہ دراصل یہ لوگ مختلف تدابیر اختیار کرتے ہیں کہ قرآن کے ان ولولہ انگیز اثرات کو کس طرح روکیں، جو لوگوں پر اثر کر رہے ہیں اور یہ لوگ دعوے پر دعویٰ کرتے چلے آ رہے ہیں، ایک سبب کے بعد دوسرا سبب لاتے ہیں۔ لیکن سخت حیران ہیں کسی ایک بات پر جمتے نہیں، اس لیے تمام حرکتوں اور اقوال کو چھوڑ کر آؤ اس طرف آتے ہیں کہ کوئی ایسا معجزہ دکھا دیا جائے جو گزرے ہوئے رسولوں نے دکھائے تھے۔

فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ (۲۱ : ۵) "ورنہ یہ لائے کوئی ایسی نشانی جس طرح پرانے زمانے کے رسول نشانیوں کے ساتھ بھیجے گئے تھے"۔ ہاں اس سے قبل رسولوں نے خارق عادت معجزات دکھائے تھے لیکن کیا جن کے سامنے یہ معجزے پیش ہوئے تھے وہ سب ایمان لائے تھے۔ نہیں وہ تو ایمان نہ لائے اسی لیے تو ہلاک ہوئے اور یہ سنت الٰہیہ ہے۔ اٹل سنت الٰہیہ کہ جب کوئی خارق عادت معجزہ پیش ہو جائے اور پھر بھی لوگ نہ مانیں تو ان کو تباہ کرنا لازم ہے۔

مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا (۲۱ : ۶) "حالانکہ ان سے پہلے کوئی بستی بھی جسے ہم نے ہلاک کیا، ایمان نہ لائی"۔ یہ اس وجہ سے کہ جب کوئی قوم بغض و عناد کے اس مرتبے تک پہنچ جائے کہ وہ ایک محسوس خارق عادت معجزے کے بعد بھی ایمان نہ لائے تو پھر تو اسے ہلاک کیا جانا ہی ٹھہرتا ہے۔

بار بار معجزات آئے، بار بار اقوام نے تکذیب کی اور بار بار ان مکذبین کو تاریخ میں ہلاک کیا جاتا رہا۔ تو اگر ان لوگوں کو ویسا ہی معجزہ دکھا دیا جائے اور یہ بھی اسی طرح ایمان نہ لائیں تو پھر ہلاکت کے سوا اور کیا انجام ہو گا۔

اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ (۲۱ : ۶) "کیا یہ ایمان لائیں گے"۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا

تَعْلَمُوْنَ (۲۱:۷) وَ مَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ مَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ

(۲۱:۸) (۲۱:۷ - ۸) "اور اے نبیؐ تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے۔ تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔ ان رسولوں کو ہم نے کوئی ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھاتے نہ ہوں اور نہ وہ سدا جینے والے تھے"۔ اللہ کی حکمت کا تقاضا یہی تھا کہ رسول انسان ہوں' وہ اللہ سے وحی اخذ کریں اور لوگوں تک اسے پہنچائیں۔ اس سے قبل جس قدر رسول گزرے وہ جسم و جان رکھتے تھے اور جسم و جان رکھنے کے بعد وہ کھانا بھی کھاتے تھے' کیونکہ کھانا جسم کا لازمی تقاضا ہے اور بشریت کے اعتبار سے اور جسمانیت کے اعتبار سے وہ دائمی زندگی والے بھی نہ تھے۔ اگر تم اس بات کو نہیں جانتے تو رسولوں کی جسدیت' کھانے پینے کے بارے میں اہل کتاب سے معلومات حاصل کر لو کیونکہ اہل کتاب عربوں کے مقابلے میں علوم انبیاء سے زیادہ علم رکھتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ تمام رسول بشر تھے۔ انسانوں کی طرح زندہ رہتے تھے۔ تاکہ ان کی عملی زندگی شریعت کی صورت اختیار کرلے۔ ان کا عملی ماڈل لوگوں کے لیے اعلیٰ زندگی کا ماڈل ہو' کیونکہ جو دعوت زندہ ہو اور زندگی کی عملی شکل میں ماڈل اور نمونہ ہو وہی موثر بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ لوگ دیکھتے ہیں کہ یہ دعوت عملاً مجسم شکل میں قائم ہے اور اس کو عملی شکل دے دی گئی ہے۔

اگر رسول غیر بشر ہوتے نہ کھاتے پیتے' نہ بازاروں میں پھرتے' عورتوں کے ساتھ ان کی معاشرت نہ ہوتی' ان کے دلوں میں انسانی جذبات و میلانات نہ ہوتے تو ان کے اور لوگوں کے درمیان گہرا تعلق قائم نہ ہو سکتا۔ نہ وہ ان میلانات کو سمجھ سکتے جو انسان رکھتے ہیں اور نہ انسان ان کو اچھی طرح سمجھ سکتے اور نہ ان کی پیروی کرتے کیونکہ ان کی زندگی میں انسانوں کی پیروی کے لئے کوئی ماڈل ہی نہ ہوتا۔

اگر داعی جن لوگوں کو دعوت دیتا ہے ان کے رجحانات کو نہیں سمجھتا' ان کے شعور' جذبات اور خواہشات کو نہیں سمجھتا' اور لوگوں کے اندر نہیں جاتا ان سے دور دور رہتا ہے' وہ لوگوں کے ساتھ نہیں چلتا اور لوگ اس کے ساتھ نہیں چلتے وہ لوگوں کے سامنے جس قدر چلا چلا کر تقریریں کرے تو لوگ اس کی تقریروں سے ہرگز متاثر نہ ہوں گے کیونکہ ان کے درمیان احساس و شعور کے فاصلے ہیں۔

ہر وہ داعی جس کا عمل اس کی بات کی تصدیق نہ کرے' اس کے الفاظ لوگوں کے کانوں سے ٹکرا کر واپس ہوں گے۔ دلوں کے اندر نہ اتر سکیں گے اگرچہ اس کے الفاظ زوردار ہوں اور اس کا کلام بلیغ ہو' وہ سادہ بات جس کی پشت پر عمل ہوتا ہے جس سے کہنے والا خود متاثر ہوتا ہے' وہی مفید ہو سکتی ہے اور لوگوں کے اندر حرکت پیدا کر سکتی ہے۔

جو لوگ یہ تجویز کرتے تھے کہ رسول کو ایک فرشتہ ہونا چاہئے' جس طرح آج کل کے بعض لوگ رسول کو انسانی خواص سے عاری قرار دیتے ہیں' یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ فرشتے اپنی تخلیقی ساخت اور اپنی فطرت کے اعتبار سے انسانوں جیسی زندگی گزار ہی نہیں سکتے کیونکہ وہ جسم اور اس کے تقاضوں کے مطابق انسان کے احساس و شعور کو سمجھنے کے اہل نہیں ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے ان کے لیے انسانوں جیسی زندگی گزارنا ممکن ہی نہیں ہے۔ رسول کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان انسانی احساسات اور تقاضوں کو سمجھتا ہو اور اپنی عملی زندگی میں ان احساسات اور ان تقاضوں پر عمل بھی کرتا ہوتا

کہ وہ لوگوں کے لیے عملی دستور حیات بن سکے۔

یہ باتیں تو اپنی جگہ پر ہیں لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر رسول فرشتہ ہوتا اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے جنس بشری کو جو عظیم اعزاز دیا' بشریت اس سے محروم ہو جاتی۔ یہ نہ ہوتا کہ انسانوں میں سے ایک انسان عالم بالا سے رابطہ قائم کرے یا اللہ سے ہمکلام ہو۔

بہرحال رسولوں کے انتخاب میں یہ اللہ کی سنت ہے کہ رسول بشر ہو اور یہ بھی سنت ہے کہ اللہ ان کو نجات دے اور مسرفین اور مکذبین کو ہلاک کر دے۔

**ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَ مَنْ نَّشَآءُ وَ اَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ (۲۱ : ۹) "پھر دیکھ لو کہ آخر کار ان کے ساتھ ہم نے اپنے وعدے پورے کیے اور انہیں جس کسی کو ہم نے چاہا' بچا لیا اور مسرفین کو ہلاک کر دیا"۔** تو رسولوں کے انتخاب کے لیے جو سنت ہے' اسی طرح مکذبین کے لیے بھی یہ سنت ہے اور اللہ نے ان کو اور ان کے ساتھ فی الحقیقت ایمان لانے والوں کو بھی ہلاک کر دیا۔ ایسے ایمان لانے والے جن کا عمل ان کے ایمان کی تصدیق نہ کرتا ہو۔ اللہ ان لوگوں کو ہلاک کرتا ہے جو حد سے گزرتے ہیں۔

مشرکین جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور آپ کے ساتھی مسلمانوں کو ایذا دیتے تھے اور ان کی تکذیب کرنے میں حد سے گزر گئے تھے' ان کو اللہ اس سنت سے ڈراتا ہے اور ان کو سمجھاتا ہے کہ یہ ان پر اللہ کی بہت بڑی مہربانی ہے کہ اللہ نے کوئی مادی خارق عادت معجزہ نہیں بھیجا جس کو اگر یہ جھٹلا دیتے جس طرح اقوام سابقہ نے جھٹلایا تھا تو یہ بھی ہلاک کر دیئے جاتے۔ اس خارق عادت معجزے کے بجائے اللہ تعالیٰ نے تمہیں قرآن کا معجزہ دیا ہے اور یہ کتاب تمہارے لیے باعث عز و شرف ہے کہ یہ تمہاری زبان میں ہے' تمہاری زندگی کو استوار کرتی ہے اور یہ تمہاری تعمیر و تربیت اس طرح کرتی ہے کہ تمہیں وہ ایک قابل ذکر امت بنا دے۔ یہ کتاب لوگوں کے سامنے کھلی پڑی ہے' چاہئے کہ وہ اس پر غور کریں اور اس کے ذریعہ انسانیت کے ارتقاء کی سیڑھی پر چڑھتے چلے جائیں۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰ ع ۱

"لوگو' ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے' کیا تم سمجھتے نہیں"۔

قرآن ایک **ایسا معجزہ** ہے کہ یہ تمام نسلوں کے لیے کھلا معجزہ ہے۔ یہ ایسا معجزہ نہیں ہے کہ ایک ہی نسل میں اس کا مظاہرہ ہو' لوگ اس سے متاثر ہوں اور وہ ختم ہو جائے۔ یہ ایک دائم و قائم معجزہ ہے۔

قرآن کریم کے ذریعہ عربوں کو بھی بڑی شہرت ملی جب وہ قرآن کے پیغام کو لے کر مشرق و مغرب تک جا پہنچے۔ اس سے پہلے وہ کوئی قابل ذکر لوگ نہ تھے۔ نہ ان کے پاس انسانیت کو دینے کے لیے کوئی قابل ذکر چیز تھی۔ جب تک عربوں نے اس کتاب کو مضبوطی سے پکڑے رکھا انہوں نے اس کے ذریعہ پوری انسانیت کی راہنمائی کی' تو وہ بھی کامیاب رہے اور اس کی وجہ سے پوری انسانیت کو بھی کامیابی اور خوشحالی نصیب ہوئی' جب عربوں نے اس کتاب کو چھوڑا تو انسانیت نے بھی انہیں چھوڑ دیا اور لوگوں کے اندر عربوں کا ذکر ختم ہونے لگا۔ یہ لوگ قافلہ انسانیت کے دم چھلا بن گئے اور

انسانوں میں سے جو چاہے 'انہیں اچک لیتا ہے لیکن جب یہ کتاب انہوں نے مضبوطی سے تھام رکھی تھی تو لوگ ان کے ماحول میں اچک لیے جاتے تھے اور یہ محفوظ تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ عرب قرآن کے سوا انسانیت کو کیا تحفہ دے سکتے ہیں؟ قرآن کے سوا ان کے پاس اور ہے کیا؟ ان کے پاس قرآنی فکر کے سوا انسانیت کے سامنے پیش کرنے کے لیے کوئی اور فکر نہیں ہے۔ اگر وہ انسانیت کے سامنے یہ کتاب پیش کریں گے تو انسانیت ان کو پہچان لے گی۔ ان کا ذکر کرے گی اور ان کو سروں پر اٹھائے گی کیونکہ اسے عربوں سے ایک نفع بخش پیغام ملے گا۔ لیکن اگر وہ انسانوں کے سامنے محض عربوں کو بحیثیت ایک قوم پیش کریں گے تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان کی حیثیت کیا ہے اور وہ کیا ہیں؟ اس کتاب کے سوا ان کے اس نسب نامے کی کیا وقعت ہے۔ انسانیت نے عربوں کو اس کتاب کے ذریعے 'اسلامی نظریہ حیات کے ذریعے اور اس کتاب سے اخذ کردہ نظام حیات کے ذریعے پہچانا تھا۔ انسانیت میں ان کو جو مقام حاصل ہوا تھا وہ اس لیے نہ تھا کہ وہ عرب ہیں۔ کیونکہ صرف عرب ہونا تاریخ انسانیت میں کوئی چیز نہیں ہے اور تہذیب کی ڈکشنری میں لفظ عرب کا کوئی مقام نہیں ہے۔ عربوں کی پہچان اسلامی تہذیب و تمدن سے تھی اور ہے۔ اسلامی تہذیب اور اسلامی فکر 'اسلامی فلسفہ اور اسلامی تمدن کے تو تمدن کی ڈکشنری میں نام ملیں گے لیکن عرب کا اس میں کوئی نام نہیں ہے۔

اسی حقیقت کی طرف قرآن کریم یہاں اشارہ کر رہا ہے۔ مشرکین کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب تمہاری پہچان ہے۔ لیکن تم اس کتاب میں آنے والی نئی تعلیمات کا استقبال غفلت 'اعراض اور تکذیب اور مذاق کے ساتھ کرتے تھے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲۱ : ۱۰) "لوگو ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے 'کیا تم سمجھتے نہیں ہو"۔

عرب مشرکین پر اللہ کا کرم تھا کہ ان کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ذریعہ کوئی خارق عادت معجزہ پیش نہ کیا گیا' ورنہ وہ انکار کرتے اور ان کی بیخ کنی اسی طرح سنت الٰہیہ کے مطابق ہو جاتی جس طرح تاریخ میں کئی اقوام اور کئی بستیوں کی ہوئی۔ یہاں اللہ تعالیٰ ایک زندہ منظر کی شکل میں ایسی اقوام کے استیصال اور تباہی و بربادی کو دکھاتے ہیں۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۱۱﴾ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ﴿۱۲﴾ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴﴾ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴿۱۵﴾

"کتنی ہی ظالم بستیاں ہیں جن کو ہم نے پیس کر رکھ دیا اور ان کے بعد دوسری کسی قوم کو اٹھایا۔ جب ان کو ہمارا

عذاب محسوس ہوا تو لگے وہاں سے بھاگنے - (کہا گیا) "بھاگو نہیں 'جاؤ اپنے انہی گھروں اور عیش کے سامانوں میں جن کے اندر تم چین کر رہے تھے 'شاید کہ تم سے پوچھا جائے" - کہنے لگے "ہائے ہماری کم بختی 'بے شک ہم خطاوار تھے اور وہ یہی پکارتے رہے 'یہاں تک کہ ہم نے ان کو کھلیان کر دیا 'زندگی کا ایک شرارہ تک ان میں نہ رہا" -

قصم کا مفہوم ہے شدت سے کاٹنا 'اس لفظ کی آواز کی شدت بھی اس کے مفہوم کو ظاہر کرتی ہے - اس لفظ کے تلفظ ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ظالم بستیوں کو بڑی شدت اور سختی سے اس طرح توڑا پھوڑا گیا کہ ان کا وجود ہی ختم کر دیا گیا اور ان کی حالت یہ ہوگئی کہ ان کو پیس کر رکھ دیا گیا -

وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (۲۱ : ۱۱) "اور ان کے بعد دوسری کسی قوم کو اٹھایا" - یہاں قصم کا فعل بستیوں پر وارد ہوتا ہے اور بستیوں اور ان کے باشندوں سب کو پیس کر رکھ دیا جاتا ہے لیکن انشا کا فعل صرف قوم پر وارد ہوتا ہے 'پہلے قوم پیدا ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد وہ بستیاں آباد کرتی ہے - یہ تو ہے حقیقت واقعہ کہ تباہی بستیوں پر آتی ہے اور اس میں آبادی بھی ہلاک ہو جاتی ہے - اور جب اٹھایا جاتا ہے تو پہلے اقوام کو اٹھایا جاتا ہے اور وہ پھر بستیاں آباد کرتی ہیں لیکن جس انداز میں 'ایک منظر کی شکل میں ہلاکت و بربادی کو پیش کیا گیا ہے 'یہ قرآن کریم کا مخصوص فنی اسلوب ہے -

جب یہ تباہی آتی ہے تو اس میں لوگوں کا منظر بھی بڑا عجیب ہے - ان کی حالت یوں ہوتی ہے جس طرح پنجرے میں چوہے بند ہو جاتے ہیں 'جب تک وہ ہلاک نہ کر دیئے جائیں 'وہ پنجرے کے اندر ادھر ادھر بھاگتے ہی رہتے ہیں -

فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ (۲۱ : ۱۲) "جب ان کو ہمارا عذاب محسوس ہوا تو لگے وہاں سے بھاگنے" - یعنی گاؤں سے ادھر ادھر بھاگنے لگے - ان کو معلوم ہو گیا کہ عذاب الہی آگیا 'گویا یہ بھاگ دوڑ ان کو عذاب الہی سے بچالے گی - گویا وہ اس قدر تیز بھاگ سکتے ہیں کہ عذاب الہی ان سے پیچھے رہ جائے گا 'لیکن ان کی یہ بھگدڑ ایسی ہی ہے جس طرح چوہا پنجرے میں دوڑتا ہے - وہ بغیر سوچ اور بغیر کسی شعور کے دوڑتا ہے -

لَا تَرْكُضُوْا وَ ارْجِعُوْٓا اِلٰي مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ

(۲۱ : ۱۳) "بھاگو نہیں 'جاؤ اپنے انہی گھروں اور عیش کے سامانوں میں جن کے اندر تم چین کر رہے تھے 'شاید کہ تم سے پوچھا جائے گا" - یہ تو تمہارا گاؤں ہے اس سے مت بھاگو - اس کے اندر وہ سب سازو سامان ہے اور اس کے اندر تمہارے وہ مسکن ہیں 'جن میں تم عیش پرستیاں کرتے تھے - واپس ہو جاؤ شاید کہ تم سے پوچھا جائے کہ تم نے یہ دولت کن امور میں خرچ کی - اس سوال کا وہ جواب کیا دیں؟ یہ تو ان کے ساتھ ایک سنجیدہ مذاق تھا -

اب ذرا جھکتے ہیں تو اب ان کو سمجھ آتی ہے کہ عذاب الہی نے تو انہیں گھیر لیا ہے اور اب یہ بھگدڑ انہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی - یہ دوڑ انہیں دائرہ عذاب سے باہر نہیں نکال سکتی تو اب وہ بدل جاتے ہیں 'جرم کا اعتراف کرتے ہیں 'توبہ و استغفار کرتے ہیں -

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۲۱ : ۱۴) "ہائے ہماری کم بختی' بے شک ہم خطاکار تھے"۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے' اب تو مہلت کی گھڑی ختم ہو چکی ہے۔ اب تو وہ جو چاہیں کہتے رہیں۔ اب یہ لوگ مرنے تک اقرار جرم کرتے رہیں' توبہ کرتے رہیں۔ کوئی فائدہ نہ ہو گا۔

فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (۲۱ : ۱۵) "وہ یہی پکارتے رہے یہاں تک کہ ہم نے انہیں کھلیان کر دیا' زندگی کا ایک شرارہ ان میں نہ رہا"۔ یہ آدمیوں کا کھلیان تھا جس میں نہ حرکت تھی نہ حرارت۔ ابھی تک تو وہ ایک ایسا قریہ تھا کہ جس میں ہر طرف زندگی دوڑتی نظر آتی تھی اور یہ گاؤں نہایت خوبصورت تھا۔

یہاں اب قرآن مجید اس نظریہ حیات' جس پر کلام ہوا۔ اور اللہ کی اس تکوینی سنت جس کے مطابق یہ کائنات چلتی ہے' کے درمیان ربط قائم فرماتے ہیں۔ یہ تکوینی سنت ہے جس نے اس کی فصل کو کاٹ کر پھینک ڈالا۔ کیونکہ انہوں نے رب تعالیٰ کی تشریعی سنت کی پیروی نہ کی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ جس حق پر یہ کائنات قائم ہے اور جس حق پر پیغمبروں کی دعوت قائم ہے وہ ایک ہے' اور اس کائنات اور زمین و آسمان کا ان دونوں سچائیوں سے رابطہ ہے۔

مشرکین کے پاس دعوت اسلامی کی جو جدید ہدایات آئیں وہ ان کا استقبال مذاق اور استہزاء سے کرتے اور لہو میں مشغول ہو کر منہ موڑ لیتے۔ وہ اس بات سے غافل رہے کہ یہ کس قدر اہم اور سچی دعوت ہے۔ یوم حساب قریب ہے اور وہ اس سے بھی غافل ہیں بلکہ مذاق کرتے ہیں تو اللہ کی تکوینی سنت بھی اپنا کام جاری رکھتی ہے اور وہ بھی مشرکین کے اس انکار اور اعراض کا نوٹس لیتی ہے کیونکہ حق ایک ہے وہ شریعت میں ہو یا کائنات میں۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۱۶﴾ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

"ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے' کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے۔ مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے اور تمہارے لیے تباہی ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو"۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو ایک حکمت اور اسکیم کے مطابق پیدا کیا ہے' اس کا ایک مقصد ہے۔ یہ کائنات محض کھیل تماشے کے طور پر نہیں پیدا کی گئی۔ یہ ایک حکیمانہ فعل ہے' محض اتفاقی عمل نہیں ہے۔ جس سنجیدگی' سچائی اور مقصدیت کے ساتھ زمین و آسمان کو پیدا کیا گیا ہے' اسی کے ساتھ رسولوں کو بھی بھیجا گیا ہے۔ کتابیں نازل کی گئی ہیں' فرائض منصبی مقرر ہوئے اور شریعت اور قانون بنائے گئے ہیں۔ لہٰذا مقصدیت اور سنجیدگی اس کائنات کی اساس ہے۔ اس

کے چلانے کا بھی ایک مقصد ہے۔ اس میں انسانوں کو ایک نظریہ دینے میں بھی ایک مقصد ہے اور موت کے بعد حساب و کتاب میں بھی مقصدیت اور سنجیدگی ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ کوئی کھلونا بنانا چاہتا تو اپنے ہاں بنا لیتا۔ ایک ذاتی کھیل ہوتا اور اللہ کی دوسری مخلوقات سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوتا۔ یہ محض الزامی اور جدلی فرض ہے۔ "اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے پاس ہی سے کر لیتے"۔ جس طرح نحوی لوگ کہتے ہیں کہ یہ صرف امتناع برائے امتناع ہے۔ یعنی "لو" کے بعد ایک فقرہ شرط ہوتا ہے اور دوسرا جواب شرط۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں فقروں کا واقع ہونا ناممکن اور ممتنع ہے۔ چونکہ اللہ نے ارادہ ہی نہیں کیا اس لیے لہو و لعب ہوا ہی نہیں ہے۔ نہ اللہ کے ہاں کوئی لہو ہوا اور نہ خارج میں کسی معاملے میں ہوا۔

اور یہ لہو و لعب ممکن ہی نہیں اس لیے کہ اس کی طرف اللہ کا ارادہ متوجہ ہی نہیں ہوا۔

اِنْ کُنَّا فٰعِلِیْنَ (۲۱ : ۱۷) کے معنی ہیں مَا کُنَّا فٰعِلِیْنَ یعنی ہم نے ایسا کرنا ہی نہ تھا' ایسا کرنے والے ہی نہ تھے۔ تو یہ ایک فرض ہے برائے مباحثہ اور اس سے یہ حقیقت ثابت کرنا ہے کہ اللہ کی ذات سے متعلق جو امور بھی ہیں وہ اللہ کی ذات کی طرح قدیم ہیں۔ دائمی ہیں' فانی نہیں ہیں۔ اگر اللہ لہو کا ارادہ کرتا تو یہ لہو ایک نیا معاملہ نہ ہوتا۔ یہ بھی ذات باری کی طرح قدیم ہوتا۔ ازلی ہوتا اور ابدی ہوتا کیونکہ اس کا تعلق ذات ازلی اور باقی سے ہوتا۔ اسی لیے "من لدنا" کا لفظ استعمال ہوا "اپنے ہی پاس"۔ لیکن اللہ کا طے شدہ قانون تو یہ ہے کہ کوئی معاملہ کھیل کے طور پر نہ ہو' بلکہ ہر معاملہ سنجیدگی اور سچائی کے ساتھ ہو۔ اور وہ حق ہو۔ یوں حق باطل پر غالب آتا ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱ : ۱۸) "مگر ہم باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے"۔ نحو میں لفظ بل اضراب کے لیے آتا ہے یعنی ایک بات کو چھوڑ کر متکلم دوسری بات لیتا ہے۔ یعنی لہو کی بات چھوڑ کر بتایا جاتا ہے کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہاں حق و باطل کی کشمکش ہے اور سنت الہیہ یہ ہے کہ اس کشمکش میں حق کو غلبہ نصیب ہو۔

اس منظر کا انداز تعبیر نہایت ہی حسی' محسوس ہونے والا' زندگی سے بھرپور اور حرکت سے بھرپور ہے۔ نقشہ کچھ یوں ہے کہ سچائی ایک گولہ ہے جو دست قدرت میں ہے' قدرت اسے پھینکتی ہے' یہ باطل کے سر پر لگتا ہے اور اس کے دماغ کو پھوڑ کر رکھ دیتا ہے اور باطل صفحہ ہستی سے مٹ جاتا ہے آناً فاناً۔

یہ ایک طے شدہ سنت ہے' اور سچائی اس کائنات کے اندر اصل ہے۔ کائنات کے وجود میں اس کا گہرا دخل ہے۔ باطل تو دائرہ کائنات سے خارج البلد ہے۔ اگر کہیں نظر آتا ہے تو یہ عارضی ہوتا ہے' اس کی قوت گہری نہیں ہو سکتی' اللہ اس باطل کو بھگاتا رہتا ہے۔ سچائی سے خود اللہ باطل پر بمباری کرتا رہتا ہے اور اس کا سر توڑتا رہتا ہے۔ لہذا جس چیز پر اللہ کی بمباری ہو' جس چیز کو دست قدرت فنا کرتا ہو' اس کے لیے بقا نہیں ہے۔ ہرگز نہیں ہے!

بعض سطحی لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اس وقت عملی صورت حالات اس کرۂ ارض پر اس کے خلاف ہے' جو اللہ علیم و خبیر فرما رہا ہے۔ بظاہر حالات اس کے برعکس ہیں۔ یہ سوال ان تاریخی وقفوں میں پیدا ہوتا رہتا ہے جن میں کبھی کبھار باطل پھولا ہوا نظر آتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ گویا اس کی حکمرانی رہے گی۔ اور ان وقفوں میں حق اور اہل حق اس قدر

بدحال ' افسردہ اور غبار آلودہ ہوتے ہیں کہ وہ مغلوب نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں بعض مختصر وقفوں میں یوں ہوتا رہتا ہے۔ ان وقفوں کو اللہ تعالیٰ بعض اوقات ذرا طویل بھی کر دیتا ہے مگر یہ اہل حق کی آزمائش کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے بعد سنت الہیہ کا دست غیب بمباری شروع کرتا ہے۔ یہ سنت الہیہ ہے اور اسی سنت پر ارض و سما کا نظام قائم ہے اور اسی پر اسلامی دعوتوں کا بھی نظام قائم ہے۔

جن لوگوں کا ایمان پختہ ہے ان کے دل میں تو ذرا شک بھی پیدا نہیں ہو سکتا کہ اس کائنات کی بنیاد سچائی پر ہے۔ وہ یہ شک نہیں کر سکتے کہ اللہ داعیان حق کی نصرت کرتے ہوئے باطل پر گولہ پھینکتا ہے اور اس کا بھیجا نکالا دیتا ہے۔ اہل حق کو اگر اللہ کچھ عرصہ کے لیے آزمائے تو ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ ان کی آزمائش ہے۔ ان کو راہ حق میں جم جانا چاہئے۔ اور اس آزمائش میں پورا اترنا چاہئے۔ ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ ان میں کچھ کمزوریاں ہیں اور اللہ چاہتا ہے کہ وہ دور ہوں اور وہ اس حق کے غلبے کے لیے تیار ہوں۔ وہ دست قدرت کا کام کریں ' اپنی کمزوریاں دور کریں ' اپنے اندر کمال پیدا کریں جس قدر وہ جلدی تیاریاں مکمل کریں گے ' ان کی آزمائش کا عرصہ اسی قدر جلدی ختم ہو گا اور پھر اللہ باطل پر جو گولہ باری کرے گا تو انہی کے ہاتھوں سے ہوگی۔ اہل حق کے غلبے کے لیے تیار ہوں۔ وہ دست قدرت کا کام کریں ' اپنی کمزوریاں دور کریں ' اپنے اندر کمال پیدا کریں جس قدر وہ جلدی تیاریاں مکمل کریں گے ' ان کی آزمائش کا عرصہ اسی قدر جلدی ختم ہو گا اور پھر اللہ باطل پر جو گولہ باری کرے گا تو انہی کے ہاتھوں سے یہ ہوگی۔ (وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى) کا منظر ہو گا ' اچانک باطل اس دنیا سے نیست و نابود ہو جائے گا۔ یاد رکھئے کہ باطل کا انجام مقرر ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱ : ۱۸) "مگر ہم باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے"۔ اور اللہ جو چاہتا ہے ' وہ کرتا ہے۔

(روس میں دست قدرت نے یہ کام کر دکھایا ہے۔ مترجم)

--- ○○○---

قرآن کریم یہ حقیقت مشرکین مکہ کے ذہن نشین کر رہا ہے جو قرآن مجید کے بارے میں اس قسم کی باتیں کرتے تھے کہ یہ سحر ہے ' یہ شعر ہے ' یہ افتراء ہے۔ حالانکہ یہ برحق ہے اور قرآن کریم باطل پر حملہ آور ہے ' اس کا سر پھوڑ رہا ہے اور جلد ہی باطل اور شرک (جزیرۃ العرب سے) مٹنے والا ہے۔ ان کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ تم قرآن مجید یا تحریک اسلامی کے بارے میں جو باتیں بناتے ہو ' وہ تمہارے لیے سامان ہلاکت ہیں۔ (وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ) اس کے بعد ان کے سامنے ان کی نافرمانی اور روگردانی کے مقابلے میں اطاعت کیش مخلوق کی اطاعت شعاری کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ نمونہ ان لوگوں کی زندگی سے پیش کیا جاتا ہے جو ان کے مقابلے میں خدا تعالیٰ سے زیادہ قریب ہیں ' لیکن اس قربت کے باوجود وہ رات اور دن اس کی بندگی میں لگے ہوئے ہیں اور بندگی کرتے کرتے تھکتے بھی نہیں۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۝ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا

يَفْتُرُوْنَ ۝۲۰

"زمین اور آسمانوں میں جو مخلوق بھی ہے اللہ کی ہے اور جو (فرشتے) اس کے پاس ہیں وہ نہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اس کی بندگی سے سرتابی کرتے ہیں اور نہ ملول ہوتے ہیں۔ شب و روز اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں' دم نہیں لیتے"۔

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کے سوا اس کا پورا علم کسی کو نہیں ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو ہر چیز کا احاطہ کر سکتا ہے۔ علیم و بشیر ہی صرف انسان کے بارے میں یقین سے جانتا ہے۔ اہل ایمان جن اور ملائکہ کے وجود پر بھی ایمان لاتے ہیں کیونکہ ان کا ذکر قرآن مجید میں ہے لیکن ان دو مخلوقوں کے بارے میں بھی ہم صرف اسی قدر جانتے ہیں جس قدر ہمیں خالق نے علم دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے علاوہ کوکب میں اور ذی عقل مخلوق بھی ہو اور اس کی شکل و صورت اس سیارے کے ماحول اور طبیعی حالات کے مطابق ہو' لیکن یہ علم بھی اللہ ہی کے پاس ہے۔

وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۱: ۱۹) "اور زمین و آسمان میں جو مخلوق بھی ہے' اللہ کی ہے"۔ تو ہمیں جس جس مخلوق کے بارے میں علم ہے اسے ہم مانتے ہیں اور جس کے بارے میں علم نہیں ہے اسے خالق کائنات پر چھوڑ دیتے ہیں۔

وَمَنْ عِنْدَهُ "اور جو اس کے پاس ہیں۔ اس کا قریبی مفہوم تو یہی ہے کہ مراد فرشتے ہیں' لیکن ہم اس کے مفہوم میں تخصیص کیوں کریں۔ اس میں ملائکہ اور دوسری مخلوقات شامل ہیں۔ اس کے "پاس" یا "عندہ" مفہوم اللہ کے حوالے سے مکانیت کا اظہار نہیں کرتا بلکہ اس سے قرب معلوم ہوتا ہے۔

وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ (۲۱: ۱۹) "اور جو اللہ کے پاس ہیں وہ نہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اس کی عبادت سے سرتابی کرتے ہیں اور نہ ملول ہوتے ہیں"۔ جس طرح مشرکین مکہ محض تکبر کی وجہ سے اللہ کی بندگی سے منہ موڑتے ہیں اور نہ تھکتے ہیں یعنی رات اور دن وہ مسلسل اللہ کی بندگی اور تسبیح و تہلیل کرتے ہیں۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے اس کی پوری زندگی عبادت بن سکتی ہے اور وہ اپنے آپ کو فرشتوں کی طرح مسلسل عبادت کی حالت میں رکھ سکتا اگر وہ اپنی پوری زندگی میں اللہ کی بندگی اور اطاعت کرے اگرچہ اس کے بعض افعال ذاتی نوعیت کے ہوں' مثلاً اس کا کھانا پینا۔

یہ کہ اللہ کی تعدد ولا تحصی مخلوق رات اور دن اللہ کی عبادت میں مصروف ہے' جو بھی زمین اور آسمانوں میں ہے' لیکن مشرکین اللہ وحدہ کی بندگی سے سرتابی کر کے دوسرے الہوں کی بندگی کرتے ہیں اور انہیں پکارتے ہیں۔ ان کی یہ حرکت بہت ہی بری ہے۔ حالانکہ رات اور دن کا نظام اور اس پوری کائنات میں چلنے والا ناموس فطرت اس بات پر دلیل بین ہے کہ مدبر کائنات اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ نیز نقلی استدلال بھی اگر مانگتے ہیں تو قرآن اور تمام کتب سماوی اس پر متفق ہیں کہ اللہ الٰہ واحد ہے اور یہی تمام رسولوں اور کتابوں کی دعوت ہے۔

أَمِ اتَّخَذُوٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿٢١﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ
اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٢٢﴾ لَا يُسْـَٔلُ
عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿٢٣﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ قُلْ هَاتُوْا
بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ
الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ
اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿٢٥﴾

"کیا ان لوگوں کے بنائے ہوئے ارضی خدا ایسے ہیں کہ (بے جان کو جان بخش کر) اٹھا کھڑا کرتے ہوں؟ اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو (زمین اور آسمان) دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔ پس پاک ہے اللہ رب العرش ان باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔ وہ اپنے کاموں کے لیے (کسی کے آگے) جواب دہ نہیں ہے اور سب جواب دہ ہیں۔

کیا اسے چھوڑ کر انہوں نے دوسرے خدا بنا لیے ہیں؟ اے نبیؐ ' ان سے کہو کہ "لاؤ اپنی دلیل ' یہ کتاب بھی موجود ہے جس میں میرے دور کے لوگوں کے لیے نصیحت ہے اور وہ کتابیں بھی موجود ہیں جن میں مجھ سے پہلے لوگوں کے لیے نصیحت تھی"۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں ' اس لیے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے ' پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو"۔

ان لوگوں کے بارے میں پوچھنا کہ انہوں نے اللہ کے سوا اللہ پکڑ رکھے ہیں ' استفہام انکاری ہے اور پھر ان الہوں کی یہ صفت بیان کرنا کہ وہ لوگوں کو مارتے ہیں اور پھر زندہ کریں گے۔ یہ ان کے الہوں کے ساتھ مذاق ہے ' کیونکہ کسی الہ کا سچا تصور ہی یہ ہے کہ وہ موت کے بعد لوگوں کو زندہ کر کے حساب و کتاب لے۔ مذاق کے طور پر پوچھا جاتا ہے کہ بتاؤ ان کے یہ الہ حشر و نشر کا کام کرتے رہتے ہیں؟ اگر نہیں ' اور مشرکین خود بھی مانتے ہیں کہ نہیں ' تو پھر کیوں ان کو الہ مانتے ہیں ' جبکہ وہ اپنے اندر الہ ہونے کی صفت اول ہی نہیں رکھتے۔

یہ عملی استدلال اور عملی منطق ہے۔ اب ایک دوسری حقیقت پسندانہ عملی دلیل ملاحظہ ؟

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (۲۱ : ۲۲) "اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو دونوں کا نظام بگڑ جاتا"۔ یہ کائنات ایک ایسے قانون قدرت کے اوپر قائم ہے جو اس کے تمام اجزاء کے درمیان ایک مکمل ربط قائم کرتا ہے اور اس کے تمام اجزاء باہم مربوط ہیں۔ ایک ایک جزء کی حرکت کائنات کے کل کی حرکت کے ساتھ مربوط ہے۔ یہ قانون واحد ایک واحد مقنن کے حکم اور ارادے کا مرہون منت ہے۔ اگر کائنات کی مدبر ہستیاں متعدد ہوتیں تو ارادے بھی متعدد ہوتے اور قوانین بھی متعدد ہوتے۔ ارادہ کرنے والی ذات کا مظہر اور ہوتا ہے اور کوئی قانون اور ضابطہ نافذ کرنے والی ذات کے ارادے کا مظہر اور ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کائنات کا یہ

مکمل نظام کب کا باہم ٹکرا جاتا اور اس میں ہم آہنگی نہ رہتی اور اس کائنات میں آئے دن عظیم اضطرابات ہوتے رہتے کائنات کے اندر یہ ربط، تنظیم اور ہم آہنگی اس قدر محسوس اور مشاہد ہے کہ ملد سے ملد شخص بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ دنیا میں جن لوگوں کی فطرت سلیم ہے وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ اس پوری کائنات میں ایک ہی قانون کارفرما ہے اور یہ ناموس ایک اہم شہادت ہے کہ پوری کائنات میں ایک ہی ادارہ کام کرتا ہے اور اس کا ایک ہی خالق اور مدبر ہے، اس لیے اس کی ساخت اور رفتار میں کوئی فساد نہیں ہے۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۲۱: ۲۲) "پس پاک ہے اللہ رب العرش ان باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔ وہ یہ باتیں بناتے ہیں کہ اللہ کے شریک ہیں حالانکہ وہ ان باتوں سے منزہ ہے۔ وہ عرش کا رب ہے۔ عرش اللہ کے اقتدار اعلیٰ، اللہ کے قبضے اور احاطے اور اللہ کی بلندی کا رمز اور اشارہ ہے۔ اللہ ان کی بنائی ہوئی باتوں سے پاک ہے اور جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں اسی کائنات کی سلامت روی، تنظیم اور ہم آہنگی اور یک رنگی ان کی باتوں کی تکذیب کرتی ہے۔

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ (۲۱: ۲۳) "وہ اپنے کاموں کے لیے جواب دہ نہیں ہے اور دوسرے سب جواب دہ ہیں"۔ جو ذات پوری کائنات کو کنٹرول کر رہی ہو، اسے کب کوئی پوچھ سکتا ہے اور کون ہے جو پوچھ سکتا ہے۔ وہ تو خود اپنے بندوں پر پوری طرح حاوی ہے۔ اس کا ارادہ آزاد ہے۔ اس کے اوپر کوئی قید وبند نہیں ہے اور نہ کوئی دوسرا ارادہ آڑے آ سکتا ہے۔ اس کے ارادے کے سامنے وہ قانون قدرت بھی رکاوٹ نہیں بن سکتا جو اس نے خود جاری کیا ہے۔ سوال اور محاسبہ تو کسی معیار اور کسی پیمانے اور حدود کے مطابق ہوتا ہے جو وضع کیے گئے ہوں اور اللہ تو خود واضع حدود ہے اور معیار اور پیمانے مقرر کرنے والا ہے۔ وہ خود اپنے مقرر کردہ حدود اور معیار و مقیاس کا پابند نہیں ہے۔ لوگوں کے لئے چونکہ اللہ کے مقرر کردہ حدود کی پابندی ضروری ہے اس لیے وہ سب اس کے سامنے مسئول ہیں۔

بعض انسانوں کو غرور اس قدر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ وہ عجیب احمقانہ سوالات کرتے رہتے ہیں۔ اللہ نے یہ کام کیوں کیا؟ یہ چیز کیوں بنائی؟ اس کی کیا حکمت ہے، ان کی منشا یہ ہے کہ وہ اس حکمت کو سمجھ نہیں پا رہے۔ ایسے لوگ اس میدان میں خالق کائنات کے بارے میں نہایت بے ادبی کا رویہ بھی اختیار کرتے ہیں، جس طرح وہ انسانی فہم وادراک کی حدود سے بھی آگے جا رہے ہیں کیونکہ انسان کے محدود قوائے مدرکہ ہر چیز کا سبب اور علت معلوم نہیں کر سکتے۔

اللہ وہ ذات ہے جو ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ تمام کائنات کی ہر چیز کی تدبیر اس کے ہاتھ میں ہے۔ تمام چیزوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہی ہے جو قادر مطلق، مدبر اور حاکم اور حکیم ہے۔

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ (۲۱: ۲۳) "وہ اپنے کاموں کے لیے جواب دہ نہیں ہے، اور دوسرے سب جواب دہ ہیں"۔ اب اس تکوینی دلیل کے ساتھ ساتھ اللہ ان سے نقلی دلیل کا بھی مطالبہ کرتے ہیں، کہ وہ کیا نقلی دلیل ہے جس کی بنا پر یہ لوگ شرک کرتے ہیں حالانکہ شرک پر تو کوئی دلیل نہیں ہوتی۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ (۲۱ : ۲۴) ''کیا اسے چھوڑ کر انہوں نے دوسرے خدا بنا لیے ہیں؟ اے نبیؐ' ان سے کہو کہ ''لاؤ اپنی دلیل' یہ کتاب بھی موجود ہے جس میں میرے دور کے لوگوں کے لیے نصیحت تھی''۔ یہ قرآن کریم موجود ہے اور اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کے لوگوں کے لیے نصیحت ہے۔ سابقہ رسولوں کی کتابیں بھی موجود ہیں ان میں بھی کم از کم اللہ کے شریکوں کے بارے میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ یہ سب ادیان عقیدۂ توحید پر قائم ہیں۔ لہٰذا مشرک جو شرک کرتے ہیں' اس کا ماخذ کیا ہے' یہ تو اس کائنات کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف ہے اور نقل کے بھی خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۲۱ : ۲۴) ''مگر ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں' اس لیے منہ موڑے ہوئے ہیں''۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (۲۱ : ۲۵) ''ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے' پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو''۔ اللہ نے جب سے لوگوں کی ہدایات کے لیے رسول بھیجے ہیں ان کی دعوت اور تعلیمات کا قاعدہ اساسی عقیدہ توحید رہا ہے۔ آج تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یعنی الٰہ اور معبود ایک ہی ہے۔ وہی رب ہے' الوہیت اور ربوبیت کے درمیان جدائی ممکن نہیں ہے جو الٰہ ہے وہی رب ہے۔ لہٰذا ان تعلیمات میں الوہیت حاکمیت اور بندگی میں کوئی شرک نہیں اور یہ عقیدہ اسی طرح مستحکم ہے جس طرح اس کائنات کا نظام مستحکم ہے۔ یاد رہے کہ رسولوں کی تعلیمات بھی دراصل اس کائنات کے قوانین فطرت کا ایک حصہ ہیں۔

---ooo---

اب روئے سخن ایک دوسرے شرکیہ عقیدے کی طرف مڑ جاتا ہے۔ عقائد جاہلیت میں سے ایک عقیدہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے لیے اولاد پیدا کر رکھی ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ
بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ
وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَمَنْ
يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي ۲
۱۹ ع الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾

"یہ کہتے ہیں "رحمٰن اولاد رکھتا ہے"۔سبحان اللہ' وہ (یعنی فرشتے) تو بندے ہیں جنہیں عزت دی گئی ہے۔اس کے حضور بڑھ کر نہیں بولتے۔اور بس اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں جو کچھ ان کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے' اس سے بھی وہ باخبر ہے۔وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اس کے جس کے حق میں سفارش سننے پر اللہ راضی ہو' اور وہ اس کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں اور جو ان میں سے کوئی کہہ دے کہ اللہ کے سوا میں بھی ایک خدا ہوں' تو اسے ہم جہنم کی سزا دیں' ہمارے ہاں ظالموں کا یہی بدلہ ہے"۔

اللہ کے لیے بیٹا ہونے کا تصور زمانہ جاہلیت میں مختلف لوگوں کے درمیان مختلف تھا۔مشرکین عرب خیال کرتے تھے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔مشرکین یہود کہتے تھے کہ عزیر ابن اللہ ہیں اور مشرکین نصاریٰ کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔یہ سب شرکیہ عقائد ہیں اور دوسری اقوام مشرک کے ہاں اور طرح کے ہیں۔

یہاں اشارہ عربوں کے عقیدہ کی طرف ہے جو ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔یہاں ان کے عقیدے کی تردید فرشتوں کی نوعیت اور حقیقت کے بیان سے کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی بیٹیاں نہیں' جس طرح ان لوگوں کا زعم ہے بلکہ یہ اللہ کے ہاں مکرم بندے ہیں۔یہ ایسی مخلوق ہے کہ اللہ کے سامنے جذبہ اطاعت' ادب اور خوف خدا کی وجہ سے بات ہی نہیں کرتے۔پس جو ان کو حکم دیا جاتا ہے' بے چون و چرا اس پر عمل کرتے ہیں۔اللہ کا علم پوری طرح ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔یہ لوگ کسی کی سفارش بھی نہیں کرتے الا یہ کہ اللہ کسی کی سفارش پر راضی ہو جائے۔وہ مزاجاً اللہ سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے خوف سے بھی ڈرتے ہیں حالانکہ وہ اللہ کے قریب تر ہیں' پاکباز ہیں' پوری طرح مطیع فرمان ہیں اور ان کے اندر کوئی انحراف نہیں ہے۔پھر ان کا یہ دعویٰ بھی نہیں ہے کہ وہ الٰہ ہیں۔اور اگر وہ ایسا کوئی دعویٰ کر بھی بیٹھیں' بفرض محال' تو وہ بھی ایسی ہی سزا کے مستحق ہوں گے جس کا اعلان دوسروں کے لیے ہے' یعنی جہنم اور یہ سب ظالم مشرکین کے لیے ہے۔یہ اس لیے کہ الوہیت کا حق صرف اللہ کا ہے۔۔۔اس طرح مشرکین عرب کا یہ دعویٰ غلط' خلاف عقل اور مکروہ ہے' کوئی بھی ایسا دعویٰ نہیں کرتا اور اگر کرے گا تو مقررہ سزا پائے گا۔جو بھی ہو یہ مدعی.....یہاں فرشتوں کی اطاعت شعاری کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے خوف میں ڈوبے رہتے ہیں جبکہ مشرکین مکہ جسارت کرتے ہیں۔

یہاں تک انسان کے سامنے توحید کے تکوینی دلائل رکھے گئے' نیز تمام شرائع کے نقلی دلائل کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ سب کی تعلیم توحید ہے اور بعض وجدانی دلائل بھی دیئے گئے جو دلوں میں قدرتاً اتر جاتے ہیں۔اب قرآن مجید انسان کو اس عظیم کائنات کی سیر کراتا ہے' وہ کائنات جسے اللہ کا دست قدرت نہایت ہی حکیمانہ انداز میں چلاتا ہے۔اس کے باوجود بھی یہ لوگ اس کائنات میں پھیلے ہوئے آیات و معجزات پر غور نہیں کرتے۔

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا أَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۖ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَىْءٍ حَىٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٠﴾ وَجَعَلْنَا فِى الْأَرْضِ رَوٰسِىَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ﴿٣١﴾ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا ۖ وَهُمْ عَنْ ءَايٰتِهَا مُعْرِضُونَ ﴿٣٢﴾

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴿٣٣﴾

"کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبی کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے' غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے' پھر ہم نے انہیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی؟ کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟ اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیئے تاکہ وہ انہیں لے کر ڈھلک نہ جائے اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں' شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں۔ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا مگر یہ ہیں کہ کائنات کی نشانیوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔ اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں"۔

یہ اس نظر آنے والی کائنات کی سیر ہے' جبکہ انسانوں کے دل و دماغ اس میں موجود دلائل و شواہد سے بالکل غافل ہیں۔ اگر کھلے دل و دماغ سے اس پر غور کیا جائے تو اس میں ایسے شواہد ہیں جو عقل و خرد کے دامن گیر ہو جاتے ہیں' صرف چشم بینا چاہئے۔

یہ بات کہ زمین و آسمان پہلے ملے ہوئے تھے اور ہم نے ان کو بعد میں جدا کر دیا' قابل غور ہے۔ فلکیات کے شعبے میں انسانی علم جس قدر آگے بڑھتا ہے وہ قرآن کے اس فرمان کی توثیق کرتا ہے جو قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے کی۔ آج تک انسانوں نے جو نظریات قائم کیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ سورج کی کہکشاں جس میں سورج' چاند' زمین اور ان کے تابع دوسرے سیارے ہیں وہ پہلے ایک "سدیم" تھے بعد میں جدا ہو کر ان اجرام نے موجودہ شکل اختیار کر لی۔ اور یہ کہ زمین سورج ہی کا ایک حصہ تھی جس سے وہ جدا ہوئی اور ٹھنڈی ہو گئی۔

لیکن یہ تو فلکی نظریات میں سے ایک نظریہ ہے۔ آج یہ قائم ہے' کل پھر اڑ جائے گا اور اس کی جگہ ایک دوسرا زیادہ مضبوط نظریہ لے لے گا۔ مسلمانوں کا طریقہ کار یہ نہیں ہے کہ وہ یقینی آیت پر ماہرین فلکیات کا کوئی غیر یقینی نظریہ تھوپ دیں اور پھر اس کی تفسیر اس کے مطابق کریں۔ آج ہم اسے قبول کریں اور کل مسترد کر دیں۔ اس لیے قرآن مجید کی اس تفسیر میں ہم نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا کہ ہم قرآن کریم اور جدید سائنسی نظریات کے درمیان تطبیق کریں۔ لیکن سائنسی نظریات اور چیز ہیں اور سائنسی حقائق اور چیز۔ سائنسی حقائق وہ ہوتے ہیں جو تجربے سے ثابت ہوں مثلاً یہ سائنسی حقیقت ہے کہ مادہ گرمی سے بڑھ جاتا ہے اور پانی گرم ہونے سے بخارات میں بدل جاتا ہے اور برودت سے پانی جم جاتا ہے۔ اس طرح کے دوسرے تجربات دراصل سائنسی حقائق ہوتے ہیں۔ یہ سائنسی حقائق علمی اور فلکی نظریات سے مختلف چیز ہے۔

قرآن کریم علمی نظریات کی کتاب نہیں ہے۔ نہ قرآن کریم اس لیے نازل ہوا ہے کہ سائنس کی طرح اس کے تجربے کیے جائیں۔ دراصل قرآن زندگی کا ایک پورا نظام ہے' نیز اسلام عقل کے لیے بھی حدود متعین کرتا ہے تاکہ وہ اپنی حدود میں رہ کر کام کرے۔ اسلام معاشرے کے لیے بھی ایک ضابطہ مقرر کرتا ہے تاکہ وہ عقل کو کام کرنے کی آزادی دے۔ لیکن اسلام سائنسی جزئیات میں مداخلت نہیں کرتا۔ نہ جزئیات میں جاتا ہے۔ عقل کی سمت درست کر کے اسلام ان باتوں کو عقل پر چھوڑ دیتا ہے۔

قرآن کریم کبھی کبھار کائناتی حقائق کی طرف اشارہ کرتا ہے مثلاً أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا

(۲۱ : ۳۰) "آسمان و زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان دونوں کو جدا کیا"۔ ہم اس حقیقت پر محض اس لیے یقین کرتے ہیں کہ یہ قرآن میں مذکور ہے' اگرچہ تفصیلات کا ہمیں علم نہیں ہے کہ یہ کیونکر ہوا؟ زمین آسمان سے کیسے جدا ہوئی یا آسمان زمین سے کیسے جدا ہوئے۔ ہم ان سائنسی نظریات کو بھی اس مجمل حد تک قبول کرتے ہیں جو حقیقت مذکورہ در قرآن کے خلاف نہ ہوں۔ لیکن ہم یہ نہیں کرتے کہ فلکیاتی نظریات کو سامنے رکھ کر آیات قرآنیہ کو ان کے پیچھے دوڑائیں اور قرآن کی صداقت کا سرٹیفکیٹ ان نظریات سے لیں کیونکہ یقینی حقیقت قرآن ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کے فلکیاتی نظریات اس آیت کے اس مجمل مضمون کے خلاف نہیں ہیں جو آیت میں آج سے صدیوں پہلے بیان کر دیا گیا تھا۔

اب ہم اس آیت کے دوسرے حصے کی طرف آتے ہیں جس میں کہا گیا ہے۔

وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱ : ۳۰) "اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی"۔ یہ آیت بھی نہایت ہی اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سائنس دان اس کے انکشاف اور ثبوت کو ایک عظیم بات خیال کرتے ہیں اور ڈارون کی اس بات پر تعریف کرتے ہیں جس نے کہ یہ دریافت کیا کہ پانی حیات کا بنیادی گہوارہ ہے اور اس حقیقت کو تجربے سے ثابت کیا۔

اس میں شک نہیں کہ سائنس دان جب اس حقیقت تک پہنچے تو یہ بہت بڑا انکشاف تھا لیکن قرآن مجید میں جو بات آئی ہے یہ ہمارے لیے کوئی نیا انکشاف نہیں ہے اور نہ سائنس دانوں کے انکشاف اور تجربے سے قرآن پر ایک مسلمان کے عقیدے میں اضافہ ہوتا ہے۔ قرآن پر ہمارے اعتقاد کی بنیاد یہ ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ بنیاد نہیں ہے کہ جدید سائنسی نظریات قرآن کریم میں دیئے گئے حقائق کو ثابت کرتے ہیں۔ ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈارون کا نظریہ ارتقاء اور نشوونما اس حد تک درست اور ثابت شدہ حقیقت ہے کہ کس حد تک وہ زندگی کے لیے پانی کو ضروری خیال کرتا ہے۔

قرآن کریم نے تو آج سے چودہ سو سال قبل کفار کو اس طرف متوجہ کیا تھا کہ ذرا اس کائنات پر غور کرو' اس کے عجائبات کو دیکھو' قرآن نے تو ان کی جانب سے کائنات کا مشاہدہ نہ کرنے پر سخت تنقید کی تھی اور یہ کہا تھا۔

اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ (۲۱ : ۳۰) "کیا یہ لوگ ایمان نہیں لاتے"۔ حالانکہ ان کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات یہ پکار رہی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ۔

اور ذرا مزید کائناتی مناظر: وَ جَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَبِهِمْ "اور زمین پر پہاڑ جما دیئے تاکہ وہ انہیں لے کر ڈھلک نہ جائے"۔ یہاں جو بات ثابت کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ زمین پر بڑے بڑے پہاڑ جما دیئے تاکہ وہ انسانوں کو لے کر ایک طرف ڈھلک نہ جائے اور اس کے اندر اضطراب نہ ہو۔ توازن مختلف صورتوں میں پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً بعض اوقات داخلی دباؤ جو زمین کے اندر ہوتا ہے' توازن پیدا کرتا ہے اور بعض اوقات خارجی دباؤ توازن پیدا کرتا ہے اور یہ دباؤ مختلف علاقوں میں مختلف ہوتا ہے۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ ایک جگہ پہاڑ بلند ہوں' دوسری جگہ زمین میں

گہرے کھدے کے ساتھ متوازن ہوتا ہے۔ جو بھی ہو' بہرحال اس آیت سے اجمالاً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زمین کے توازن کا پہاڑوں کے ساتھ تعلق ہے اس لیے ہم عقلی علوم اور تجربات کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ قرآن نے ایک حقیقت کے بارے حقیقت ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ آپ اسے ثابت کریں' سائنسی تجربات سے اور یہ ہے عقل انسانی اور سائنسی موضوع کے لیے کام کرنے کا اصل میدان۔ ہمیں قرآن کریم کے اس اعلان پر وجدانی یقین رکھنا چاہئے اور اس کے ثبوت کے لئے اس کائنات میں مزید تحقیقات کرنا چاہئیں۔

وَ جَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (٢١ : ٣١) "اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کریں"۔ پہاڑوں کے درمیان کشادہ راہیں اور وادیاں ہیں تاکہ لوگ ان میں اپنے راستے متعین کریں۔ یہاں وادیوں اور شاہراہوں کا پہلا مفہوم تو یہ ہے کہ لوگ اس میں چلنے پھرنے کے راستے معلوم کریں لیکن اس میں ایک خفیہ سا اشارہ اس طرف بھی ہے کہ ان ظاہری راستوں سے وہ راہ ہدایت بھی معلوم کریں کیونکہ یہ پوری کائنات انسان کے لیے راہ ہدایت فراہم کرتی ہے۔

وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (٢١ : ٣٢) "اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا"۔ آسمان سے مراد ہر وہ چیز ہے جو اوپر نظر آئے۔ ہم جب سر کی سمت دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنے اوپر نیلی چھت نظر آتی ہے۔ قرآن کریم اسے سقف محفوظ کہتا ہے۔ یہ سقف اس کائنات کے نہایت ہی حساس نظام کی حفاظت کر رہا ہے اور یہ سقف ان ناپاکیوں سے بھی محفوظ ہے اور ان کمزوریوں سے بھی محفوظ ہے جو زمین میں ہیں۔ اوپر کا نظام اس طرح محفوظ ہے کہ آیات قرآنی نہایت ہی حفاظت سے اترتی ہیں۔

وَّ هُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ (٢١ : ٣٢) "مگر یہ لوگ کائنات کی نشانیوں کی طرف توجہ نہیں دیتے"۔ حالانکہ عقل کے لیے یہ ایک وسیع میدان ہے کہ کائنات میں آیات الٰہیہ تلاش کرے۔

وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ

(٢١ : ٣٣) "وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا' سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں"۔ رات اور دن اس کائنات کے دو اہم رنگ ہیں اور شمس و قمر دو بڑے اجرام ہیں۔ ان دونوں کا اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے' بلکہ نفس حیات سے ان کا گہرا تعلق ہے' پھر گردش لیل و نہار اور حرکت شمس و قمر کو اگر غور سے دیکھا جائے تو زمانہ دراز سے یہ نہایت ہی دقیق ٹائم کے مطابق چل رہے ہیں۔ کبھی بھی اس ٹائم ٹیبل میں خلل نہیں پڑا اور مسلسل حرکت ہے بلا کسی معمولی وقفے کے۔ یہ امور اس قابل ہیں کہ انسان ان پر غور کرے اور معلوم کرے کہ اس کائنات کے لیے ایک ہی ضابطہ' ایک مدبر اور ضابطے نے مقرر کیا ہے اور وہی اللہ خالق ہے اور وہی مدبر کائنات ہے۔

--- ○○○ ---

اب اس سبق کے آخر میں قرآن کریم ان قوانین اور ضوابط کو جو خالق نے اس کائنات میں جاری کر رکھے ہیں اور

جن کے مطابق خالق اس کائنات میں تصرفات کرتا ہے' ان اخلاقی اور شرعی اور دینی ضوابط سے مربوط کر دیتا جو انسانی زندگی کے اختیاری حصے میں جاری کیے جا رہے ہیں۔یہ ضوابط تمہارے لیے آزمائش ہیں جس طرح تمہاری طبعی زندگی کا ایک انجام ہے' اسی طرح تمہاری اخلاقی زندگی کا بھی ایک انجام ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿٣٤﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۖ وَإِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿٣٥﴾

"اور اے نبی"' ہیشگی تو ہم نے تم سے پہلے بھی کسی انسان کے لیے نہیں رکھی ہے' اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ جیتے رہیں گے؟ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے' اور ہم اچھے اور برے حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کر رہے ہیں۔آخر کار تمہیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے"۔

تم سے پہلے بھی ہم نے کسی بھی بشر کے لیے دائمی زندگی نہیں رکھی۔ ہر پیدا ہونے والا فنا ہو گا۔ ہر آغاز کے لیے انجام ہے' اگر رسول کو مرنا ہے تو کیا یہ لوگ لافانی ہیں۔اگر یہ لوگ مرنے والے ہیں تو پھر کیوں ایسے شخص کا رویہ نہیں اپناتے جو مرتا ہے۔کیا یہ دیکھتے نہیں' غور نہیں کرتے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (۲۱ : ۳۵) "ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے"۔یہ قانون قدرت اس کرۂ ارض پر حیات پر لاگو ہے اور اس قاعدے میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ لہذا تمام زندوں کو' تمام عقلمند زندوں کو اس مذاق کا خیال رکھنا چاہئے۔

موت ہر زندہ چیز کا انجام ہے۔زمین میں انسان کا ایک مختصر سفر ہے۔سب نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔یہاں سفر کے دوران انسان کو جو حالات پیش آتے ہیں یہ تو اس کے لیے آزمائش ہے' ایک امتحان ہے۔

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (۲۱ : ۳۵) "اور ہم اچھے اور برے حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کر رہے ہیں"۔ شر میں مبتلا کر کے آزمائش سمجھ میں آتی ہے کہ معلوم ہو جائے کہ کون کس قدر صبر کرتا ہے' کس قدر اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اور اسے کس قدر رحمت خداوندی پر یقین ہے لیکن بھلائی اور خیر میں آزمائش کیسی؟ اس کی تشریح کی ضرورت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ بھلائی اور خیر میں آزمائش زیادہ سخت ہوتی ہے۔اگرچہ لوگ اسے شر کی آزمائش سے کم تر سمجھتے ہیں۔اکثر لوگ شر میں آزمائش کا مقابلہ تو کر لیتے ہیں لیکن خیر میں ان سے آزمائش کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ بیماری اور ضعف میں لوگ شر کا مقابلہ کرتے ہیں لیکن صحت اور عافیت میں کم لوگ آزمائش کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ان کے پاس اشتہات کی اندھی قوت ہوتی ہے یا جسمانی اندھی قوت ہوتی ہے۔اس کے استعمال میں وہ فیل ہو جاتے ہیں۔ بے شمار لوگ ایسے ہوں گے جو فقر و فاقہ برداشت کریں گے اور ان کے نفوس کبھی بھی ان کو ذلت اور برے طریقوں پر رزق

حرام پر آمادہ نہ کر سکیں گے لیکن کم ہیں جو دولتمندی کی آزمائش میں پورے اتریں - دولت کا حق ادا کریں کبرو غرور نہ کریں اور عیش و عشرت سے بچیں -

بہت لوگ ہوں گے جو تشدد کو برداشت کریں گے اور ڈراوے اور دھمکیوں کی کوئی پرواہ نہ کریں گے لیکن کم لوگ ہوں گے جو امن و عافیت کے دور میں مرغوبات' مناصب اور سازو سامان کی کشش کا مقابلہ کر سکیں -

بہت لوگ ایسے ملیں گے جو مار پیٹ اور جسمانی اذیت اور زخموں کا مقابلہ کریں گے لیکن کم ایسے ہوں گے جو عیش و عشرت سے صبر کر سکیں یا طمع و لالچ کے مقابلے میں سیدھے کھڑے ہو سکیں کیونکہ دنیا کا لالچ بڑے بڑوں کی گردنیں جھکا دیتا ہے اور لوگ اس قدر ست پڑ جاتے ہیں کہ ان کی ہمتیں ٹوٹ جاتی ہیں اور روحانی طور پر وہ ذلت اختیار کر لیتے ہیں -

تشدد اور جسمانی تعذیب کے نتیجے میں انسان کی خودی بیدار ہو جاتی ہے - اس کے اعصاب میں قوت برداشت پیدا ہو جاتی ہے اور جسم کی تمام قوتیں تشدد و برداشت کرنے کے لیے صف آرا ہو جاتی ہیں - لیکن خوشحالی! یہ بہت ہی خطرناک ابتلاء ہے - اس سے اعصاب ڈھیلے ہو جاتے ہیں - جسمانی قوائے مدافعت پر غنودگی طاری ہو جاتی ہے اور بیداری اور جدوجہد کی قوت ختم ہو جاتی ہے - ہم نے بہت سے ایسے تجربے کئے ہیں کہ تشدد اور جسمانی تعذیب میں ایک کارکن بہت ہی کامیاب رہا' مقابلہ کرتا رہا لیکن جب خوشحالی آگئی' تو خوشحالی اور فراوانی کی آزمائش میں وہ فیل ہو گیا -

یہ ہے انسان کی کہانی - الا وہ لوگ جنہیں اللہ بچالے اور جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے :" مومن کی شان بھی عجیب ہے کہ اس کا کام ہر حال میں کامیابی ہے - اور یہ سہولت صرف اہل ایمان کو حاصل ہے اور کسی کو نہیں - اگر اسے خوشحالی مل جائے تو وہ اس پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے' تو وہ اس کے لیے خیر ہو جاتی ہے' اگر اس پر مشکل دن آ جاتے ہیں تو وہ صبر کرتا ہے' تو یہ برے دن بھی اس کے لیے اچھے ہو جاتے ہیں" - لیکن ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں -

لہذا انسان کو عموماً اور تحریک اسلامی کے کارکن کو خصوصاً برے دنوں کے مقابلے میں اچھے دنوں میں زیادہ چوکنا رہنا چاہئے البتہ دونوں حالات میں رب تعالیٰ کے ساتھ حقیقی تعلق ہی کامیابی کی اصل ضمانت ہے -

--- ooo---

# درس نمبر ۱۴۱ ایک نظر میں

اس سے قبل کے سبق میں ہم نے دور تک اس کائنات کا سفر کیا۔ اس کائنات میں قوانین قدرت کا مطالعہ کیا' انسانیت کا انجام تاریخی واقعات کی روشنی میں دیکھا۔ اس سبق میں روئے سخن اسی مضمون کی طرف مڑ جاتا ہے جس کا سورہ کے آغاز میں ہم نے مطالعہ کر لیا ہے کہ مشرکین نے حضورؐ کا اور آپؐ پر آنے والی وحی کا استقبال مذاق سے کیا اور شرک پر اصرار کرتے رہے۔

ں کے بعد اس سبق میں انسان کی فطرت کی عجلت پسندی اور سیمابیت کا ذکر ہوا ہے یہاں تک کہ یہ لوگ عذاب الہی کے آنے میں بھی بہت جلدی کرتے ہیں۔ ان کو ان کی اس حرکت پر متنبہ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضور اکرمؐ کے ساتھ مذاق کرنے کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔ ان کو اس سبق میں یہاں بااثر' غالب اور اقتدار پر قبضہ کرنے والوں کے سایہ اقتدار کے سکڑنے کا ایک منظر بھی دکھایا جاتا ہے اور عذاب آخرت کا ایک منظر بھی دکھایا جاتا ہے۔

سبق کا خاتمہ اس مضمون پر ہوتا ہے کہ یوم آخرت میں مجرمین سے سخت حساب لیا جائے گا۔ چنانچہ آخر میں حساب آخرت' قوانین فطرت' انسان کی فطرت اور انسان کی زندگی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت اور داعیان اسلام کے بارے میں سنت الہیہ کے مضامین کو باہم ملایا جاتا ہے۔

---000---

# درس نمبر ۱۴۱ تشریح آیات

## ۳۶ --- تا --- ۴۷

وَ إِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۶﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

یہ منکرین حق جب تمہیں دیکھتے ہیں تو تمہارا مذاق بنا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں "کیا یہ ہے وہ شخص جو تمہارے خداؤں کا ذکر کرتا ہے؟" اور ان کا اپنا حال یہ ہے کہ وہ رحمٰن کے ذکر سے منکر ہیں"۔

یہ کفار خود تو رحمٰن کے وجود ہی کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ اس کائنات کا خالق اور مدبر ہے اور رسول اللہ کی جانب ان کے الہوں اور بتوں پر جو معقول تبصرہ کیا جاتا ہے اسے یہ پسند نہیں کرتے لیکن وہ خود جب رحمٰن کا انکار کرتے ہیں تو اس میں کوئی ہرج محسوس نہیں کرتے حالانکہ وہ رحمٰن کے بندے ہیں اور پھر قرآنی تعلیمات کا انکار کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی فطرت میں بے حد بگاڑ پیدا ہو چکا ہے اور وہ جس پیمانے سے دیتے ہیں اس سے لیتے نہیں، اور حقائق کا فیصلہ غلط کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو جس عذاب الٰہی سے ڈراتے ہیں، اس کے بارے میں یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ جلدی کیوں نہیں آتا حالانکہ حضورؐ ان کو اس سے ڈراتے ہیں۔ یہ جلدی وہ اس لیے کرتے ہیں کہ انسان کی فطرت میں جلد بازی ہے۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۳۷﴾ وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾

"انسان جلد باز مخلوق ہے۔ ابھی میں تم کو اپنی نشانیاں دکھائے دیتا ہوں، مجھ سے جلدی نہ مچاؤ۔ یہ لوگ کہتے ہیں "آخر یہ دھمکی پوری کب ہوگی اگر تم سچے ہو"۔

انسان پیدا ہی جلد بازی سے کیا گیا ہے۔ عجلت اس کے مزاج اور اس کی تخلیق میں رکھی گئی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی نظریں اس پر لگائے رکھتا ہے کہ مستقبل کے پردے کے پیچھے سے کیا نمودار ہوتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ مستقبل کے راز بھی یہ ہاتھ میں لے لے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے تمام تاثرات حقیقت کا روپ اختیار کر لیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ جو وعدے ہوتے ہیں وہ اس کے سامنے آجائیں اگرچہ ان میں اس کو تکلیف ہی ملے۔ یہ صورت حال تب بدلتی ہے جب انسان کا رابطہ اللہ کے ساتھ قائم ہو جائے۔ اس صورت میں اس کی زندگی میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور اپنے معاملات اللہ کے سپرد کر دیتا ہے' پھر جلد بازی نہیں کرتا۔ ایمان نام ہی یقین' صبر اور اطمینان کا ہے۔

یہ مشرکین جو عذاب کے آنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جلدی کیوں نہیں آتا' یہ بھی پوچھتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی یعنی عذاب آخرت کب ہو گا اور عذاب دنیا کب آئے گا جس سے تم ڈراتے ہو۔ اس موقع پر صرف عذاب آخرت کا ایک منظر ان کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے اور ڈرایا جاتا ہے کہ تم سے قبل بھی کئی لوگوں نے اس قسم کا مذاق کیا تھا' لیکن جب عذاب آیا تو وہ سامان عبرت بن گئے۔

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَ
لَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۝ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا
يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ۝ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ ٣
فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۝ ع ١٢

٣

"کاش ان کافروں کو اس وقت کا کچھ علم ہوتا جبکہ یہ نہ اپنے منہ آگ سے بچا سکیں گے نہ اپنی پیٹھیں' اور نہ ان کو کہیں سے مدد پہنچے گی۔ وہ بلا اچانک آئے گی اور انہیں اس طرح یک لخت دبوچ لے گی کہ یہ نہ اس کو دفع کر سکیں گے اور نہ ان کو لمحہ بھر کی مہلت ہی مل سکے گی۔ مذاق تم سے پہلے بھی رسولوں کا اڑایا جا چکا ہے' مگر ان کا مذاق اڑانے والے اسی چیز کے پھیر میں آکر رہے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے"۔

اگر ان کو علم ہو جائے کہ ان کی حالت کیا ہو گی' تو ان کا رویہ یہ نہ ہوتا' جواب ہے۔ یہ عذاب میں نہ جلدی کا مطالبہ کرتے اور نہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مذاق کرتے۔ ان کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس وقت ہو گا کیا۔ وہاں ان کی حالت یہ ہو گی کہ ہر طرف سے آگ کے شعلے انہیں نوچ رہے ہوں گے' جھلسا رہے ہوں گے اور یہ اپنے آپ کو بچانے کی ناکام کوششیں کر رہے ہوں گے' قرآن اس کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے کہ چہروں پر شعلے حملہ کریں گے' پیٹھوں پر کریں گے اور یہ کسی طرح کا دفاع نہ کر سکیں گے بلکہ یہ آگ ہمہ جہت ان پر شعلہ بار ہو گی اور یہ کسی شعلے کو رد نہ کر سکیں گے' نہ موخر کر سکیں اور نہ ان کو اس عذاب سے ذرا سی مہلت ملے گی۔

یہ آگ اچانک ان پر آئے گی' اس لیے کہ یہ لوگ بہت جلدی کرتے تھے۔ ان لوگوں کا تو تکیہ کلام ہی یہ تھا۔

مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۱: ۳۸) "یہ وعدہ کب پورا ہو گا اگر تم سچے ہو"۔ اس کا جواب تو یہ ہوا کہ اچانک ان پر ہر طرف سے شعلہ باری ہو گی۔ وہ حیران ہو جائیں گے اور ان کی عقل اب کچھ نہ کر سکے گی۔ نہ سوچ سکیں اور نہ کوئی دفاع کر سکیں گے اور نہ دفاعی منصوبہ بندی کے لیے کوئی مہلت ملے گی۔

یہ تو ہو گا آخرت کا عذاب۔ رہا دنیا کا عذاب تو وہ اس قسم کے مذاق کرنے والوں پر تاریخ میں بار بار آیا ہے۔ مشرکین مکہ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اگرچہ اللہ نے ان کے لیے سرے سے مٹانے کا عذاب مقدر نہیں کیا لیکن قتل' قید اور مغلوبیت کا عذاب تو تم پر آسکتا ہے۔ لہٰذا اس کم درجے کے عذاب سے بھی یہ مذاق کرنے والے محفوظ نہیں ہیں۔ ورنہ رسولوں کے ساتھ مذاق کرنے والوں کا انجام تو تاریخ نے بار بار ریکارڈ کیا ہے۔ جب یہ سنت الٰہیہ کے مطابق آتا ہے تو پھر ٹلتا نہیں ہے اور اس کے نظارے ان لوگوں کی تاریخ میں کئی ہیں جو رسولوں کے ساتھ مذاق کرتے رہے ہیں۔

آیا رحمٰن کے سوا اور کوئی ہے جو رات اور دن انہیں بے شمار مصیبتوں سے بچاتا ہے۔ کیا دنیا کے عذاب یا آخرت کے عذاب سے' اللہ کے سوا انہیں کوئی اور بچانے والا ہے کہ یہ اس قدر شتابی کرتے ہیں؟

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ۭ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ۭ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ۝

"اے نبیؐ' ان سے کہو "کون ہے جو رات کو یا دن کو تمہیں رحمٰن سے بچا سکتا ہو؟" مگر یہ اپنے رب کی نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں۔ کیا یہ کچھ ایسے خدا رکھتے ہیں جو ہمارے مقابلے میں ان کی حمایت کریں؟ وہ تو نہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہماری ہی تائید ان کو حاصل ہے۔

اللہ رات دن ہر ذی روح کو مختلف مضرتوں سے بچانے والا ہے۔ یہ صفت رحمٰن ہے یعنی بہت زیادہ مہربان۔ اللہ کے سوا اور کوئی ذات بچانے والی یا مددگار نہیں ہے۔ اے پیغمبر' ان سے پوچھو کہ اللہ کے سوا ہے کوئی اور تمہارا حامی اور محافظ؟ یہ سوال دراصل سرزنش اور توبیخ کے لیے کیا گیا ہے اور استفہام انکاری ہے یعنی کوئی نہیں ہے۔ تم بہت بڑی غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔ یہ تو اللہ ہی ہے جو رات اور دن تمہیں بچاتا ہے اور اس کے سوا کوئی بھی بچانے والا یا حفاظت کرنے والا نہیں ہے۔

بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ (۲۱: ۴۲) "مگر یہ اپنے رب کی نصیحت سے منہ موڑتے ہیں"۔ اسی سوال کو ایک دوسری صورت میں ان سے پوچھا جاتا ہے۔

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا (۲۱: ۴۳) "کیا یہ کوئی ایسے خدا رکھتے ہیں جو ہمارے مقابلے

میں ان کی حمایت کریں"۔ تاکہ یہی الہ دوسرے معاملات میں ان کی حمایت و حفاظت کریں' ہرگز نہیں۔ ان کے جو الہ ہیں ان کی حالت یہ ہے۔

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ (۲۱ : ۴۳) "وہ تو خود اپنی مدد نہیں کر سکتے"۔ جب وہ اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے تو دوسروں کی کیا مدد کریں گے۔

وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ (۲۱ : ۴۳) "اور نہ ہماری تائید ان کو حاصل ہے"۔ اور ان کو نہ ہماری تائید حاصل ہے اور نہ دوستی کہ ایک صاحب قوت سے کوئی قوت حاصل کر لیں۔ جیسا کہ ہارون اور موسیٰ علیہم السلام نے اللہ سے تائید حاصل کی جب اللہ نے کہا جاؤ فرعون کی طرف۔

اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰي "میں تمہارے ساتھ ہوں' سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں"۔ یہ الہ تو بذات خود کسی قسم کی قوت نہیں رکھتے۔ نہ ان کو اللہ کی تائید حاصل ہے لہٰذا وہ کسی کی مدد نہیں کر سکتے۔

مشرکین کے اعتقادات کی اس کمزوری کی نشاندہی کے بعد اور ان کے ساتھ یہ مذاق کرنے کے بعد اور یہ دیکھنے کے بعد کہ ان کا استدلال دلیل سے خالی ہے سیاق کلام ان کے ساتھ بحث ختم کر کے اس موضوع پر بحث کرتا ہے کہ وہ اس انداز سے کیوں الجھتے ہیں۔ اس کے بعد ان کو احساس دلایا جاتا ہے کہ کچھ تو غور کرو' دست قدرت کو دیکھو کہ وہ کس طرح ان کبراء کے اثر و رسوخ کو کم کر کے ان کے پیروں تلے سے زمین نکال رہا ہے۔ ان کے اثر و رسوخ کا دائرہ تنگ ہو رہا ہے' حالانکہ وہ وسیع علاقے میں بااثر تھے۔ ان کو قوت حاصل تھی اور بڑا اقتدار تھا ان کا۔

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝۴۴

"اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو اور ان کے آباؤ اجداد کو ہم زندگی کا سروسامان دیئے چلے گئے یہاں تک کہ ان کو دن لگ گئے مگر کیا انہیں نظر نہیں آتا کہ ہم زمین کو مختلف سمتوں سے گھٹاتے چلے آرہے ہیں؟ پھر کیا یہ غالب آجائیں گے"۔ درحقیقت ہم نے ان کو اور ان کے آباؤ اجداد کو موروثی طور پر خوشحال بنایا تھا' اس دولتمندی نے ان کی فطرت کو بگاڑ دیا تھا۔ ان کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ اور ان کے احساسات اور میلانات بدل گئے تھے۔ خدا کے ساتھ ان کا تعلق کمزور پڑ گیا تھا اور اس کائنات میں ذات باری پر دلالت کرنے والے جس قدر دلائل تھے ان پر یہ غور نہ کرتے تھے۔ یہ تھی ان کی آزمائش مگر یہ آزمائش خوشحالی کے ساتھ کی گئی اور خوشحالی میں اگر اللہ کسی کا امتحان لے تو وہ سخت ہوتا ہے حالانکہ دولتمندی میں یاد الٰہی اور اللہ کے ساتھ تعلق کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

چنانچہ قرآن مجید ان لوگوں کے احساس کو ایک دوسرا منظر پیش کر کے جگانا چاہتا ہے۔ یہ منظر بھی ہر وقت اس کرۂ

ارض پر حقیقی واقعات کی شکل میں دہرایا جاتا ہے کہ ایک بڑی مملکت ٹکڑے ٹکڑے ہوکر سکڑ جاتی ہے ایک عظیم مملکت سے چھوٹی چھوٹی ریاستیں بن جاتی ہیں۔ایک بڑی قوت ہونے اور دنیا پر غالب ہونے کے بعد یہ مغلوب ریاستیں بن جاتی ہے۔ اور ایک نہایت ہی بڑی ریاست چھوٹی ریاست بن جاتی ہے۔ بڑی تعداد کم تعداد ہو جاتی ہے اور مالدار مملکت کے بجائے ایک غریب مملکت بن جاتی ہے۔

انداز کلام یوں ہے کہ دست قدرت ان بڑی بڑی مملکتوں کو سکیڑ دیتا ہے۔جب تخیل اپنا کام کرتا ہے تو نہایت خوں انگیز منظر سامنے آتا ہے۔اقوام کے مدوجزر کی دھیمی حرکت نہایت ہی خوفناک نتائج پیدا کرتی ہے۔

اَفَھُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۲۱ : ۴۴) "کیا یہی غالب ہوں گے"۔ کیا ان کے ساتھ وہی کچھ نہ ہو گا جو دوسری اقوام کے ساتھ رات اور دن ہو رہا ہے۔اقوام کے مدوجزر کے اس خوفناک منظر کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ ان کو ایک آخری ڈراوا اور وارننگ دے دیں۔

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾

"ان سے کہہ دو کہ "میں تو وحی کی بنا پر تمہیں متنبہ کر رہا ہوں"۔ مگر بہرے پکار کو نہیں سنا کرتے جبکہ انہیں خبردار کیا جائے"۔ "لوگو خیال کرو، کہیں تم بہرے تو نہیں ہو۔ تم کیوں نہیں سنتے۔ورنہ تمہارے پیروں تلے سے زمین سرک جائے گی اور دست قدرت تمہیں سکیڑ کر رکھ دے گا۔ان کو دولت کے گھمنڈ اور مالداری کی مستی سے ڈرایا جاتا ہے۔

سیاق کلام اپنی موثر بات مزید بڑھاتا ہے اور عذاب کے وقت خود ان کی تصویری حالت ان کو بتاتا ہے۔

وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾

"اور اگر تیرے رب کا عذاب ذرا سا انہیں چھو جائے تو ابھی چیخ اٹھیں کہ ہائے ہماری کم بختی، بے شک ہم خطاوار تھے"۔ لفظ نفح کا اطلاق خیر اور رحمت کے مفہوم میں ہوتا ہے یعنی جھونکا۔یہاں مراد ہے عذاب الٰہی یعنی عذاب الٰہی کا ایک ہلکا جھونکا بھی انہیں چھو جائے تو یہ اعتراف گناہ کرلیں گے لیکن اس وقت پھر اعتراف کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔اس سے قبل اس سورہ میں بستیوں والوں کی یہ پکار گزر گئی ہے کہ جب ان پر عذاب آیا تو انہوں نے اعتراف کر لیا۔

يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۱۴) فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰھُمْ حَتّٰي جَعَلْنٰھُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (۱۵)(۲۱: ۱۴ ـ ۱۵) "ہائے ہماری کم بختی، بے شک ہم خطاوار تھے اور یہی پکارتے رہے یہاں تک کہ ہم نے ان کو کھلیان کر دیا، زندگی کا ایک شرارہ تک ان میں نہ رہا"۔ لیکن یہ اعتراف بعد از وقت تھا۔ لہٰذا ان کے لیے بہتر ہے کہ اس تنبیہ کو قبل از وقت قبول کرلیں قبل اس کے کہ عذاب الٰہی کا ایک جھونکا ان پر آ جائے۔

یہ سبق قیامت کے حساب و کتاب کے ایک آخری منظر پر ختم ہوتا ہے ۔

وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾

"قیامت کے روز ہم ٹھیک ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے 'پھر کسی شخص پر ذرہ برابر ظلم نہ ہو گا ۔جس کا رائی کے دانے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہو گا وہ ہم سامنے لے آئیں گے اور حساب لگانے کے لیے ہم کافی ہیں" ۔

رائی کے دانے سے مراد چھوٹی سے چھوٹی چیز ہے جو ترازو میں بہت ہی ہلکی ہو ۔یوم حساب میں اسے بھی نظرانداز نہ کیا جا سکے گا اور اس قدر حساس میزان ہو گا کہ حبہ خردلی سے بھی ترازو اوپر نیچے ہو گا ۔

لہذا ہر نفس کو کل کے لیے زیادہ سے زیادہ بچت کرنا چاہئے ۔ دلوں کو چاہئے کہ وہ ڈرانے والے کی طرف کان لگا کر سنیں ۔ غافلوں 'منہ موڑنے والوں اور مذاق کرنے والوں کو چاہئے کہ اس سے پہلے سنبھل جائیں کہ دنیا کے عذاب کا کوئی جھونکا انہیں آلے یا آخرت کے عذاب کا کوئی کوڑا ان کی پشت پر چسپاں ہو چکا ہو ۔اگر دنیا کے عذاب سے وہ بچ بھی جائیں تو عذاب آخرت تو ان کے لیے تیار ہے جس کے میزان میں کوئی ظلم نہ ہو گا 'رائی کے دانے کے برابر بھی ۔

اس طرح آخرت کے نہایت ہی حساس میزان کو اس کائنات کے نہایت ہی حساس قوانین فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا گیا ہے اسی طرح دعوت کے احوال اور انسانوں کی فطرت کو باہم مربوط کر دیا گیا ہے 'ان سب امور کو دست قدرت کے تصرفات قرار دے کر ان سے ارادہ واحد ثابت کیا جو اس کائنات کی پشت پر کام کرتا ہے اور یہی دلیل ہے عقیدہ توحید پر ۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۱۴۲ ایک نظر میں

اس سورہ کا یہ تیسرا سبق تمام رسولوں کے گروہ پر ایک سرسری نظر ہے۔ اس میں تمام رسولوں کا احاطہ تو نہیں کیا گیا لیکن بڑے بڑے رسولوں کا ذکر ہے۔ بعض کی طرف اس میں نہایت ہی مختصر اشارہ ہے اور بعض کے بارے میں ذرا تفصیلی ذکر ہے اور بعض کا مختصر ذکر ہے۔

ان تمام اشارات اور مفصل اور مختصر تذکروں میں یہ بات نظر آتی ہے کہ اللہ نے اپنے رسولوں پر کیا کیا رحمتیں کیں اور جن لوگوں نے تنبیہات اور معجزات دیکھ کر بھی ان کی تکذیب کی ان کا انجام کیا ہوا۔ نیز ان میں رسولوں کی آزمائش کے بھی واقعات ہیں۔ بعض اوقات انہیں خیر میں آزمایا گیا اور بعض اوقات شر میں اور یہ کہ وہ ان امتحانوں میں کس طرح کامیاب رہے۔

پھر اس میں یہ بھی بتایا گیا کہ اللہ نے ہمیشہ انسانوں میں سے رسول بھیجے اور ان کا نظریہ بھی ایک ہی رہا۔ عقیدے کے ساتھ ساتھ فریضہ رسالت کی ادائیگی میں ان کا طریقہ کار بھی ایک رہا اور زمان و مکان کے اختلاف کے باوجود یوں نظر آتا ہے کہ وہ ایک ہی امت اور گروہ ہیں۔

رسولوں کا ایک نظریہ اور ایک امت ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ ایک ہے' اس لیے رسولوں کا عقیدہ ایک عقیدہ دینے والا ایک' اس کائنات کے اندر قوانین فطرت پیدا کرنے والا ایک اور ان تمام رسولوں کو' انسانوں کو' کائنات کو ایک ہی جہت میں ایک ہی خدا کے ساتھ مربوط کرنا بھی اس سبق سے معلوم ہوتا ہے۔ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنَ "میں تمہارا رب ہوں لہٰذا میری اطاعت کرو"۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۱۴۲ تشریح آیات

## ۴۸ --- تا --- ۹۲

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٨﴾
الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿٤٩﴾ وَهٰذَا
ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ۚ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿٥٠﴾ ع ۹

"پہلے ہم موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو فرقان اور روشنی اور "ذکر" عطا کر چکے ہیں' ان متقی لوگوں کی بھلائی کے لیے جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈریں اور جن کو (حساب کی) اس گھڑی کا کھٹکا لگا ہوا ہو اور اب یہ بابرکت "ذکر" ہم نے (تمہارے لیے) نازل کیا ہے۔ پھر کیا تم اس کو قبول کرنے سے انکاری ہو"۔

اس سورہ میں یہ بات آئی تھی کہ مشرکین نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مذاق کرتے تھے کہ آپ رسالت کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ آپ ہم جیسے بشر ہیں' پھر وہ قرآن مجید کو وحی ماننے کے بجائے یہ کہتے تھے کہ یہ سحر ہے' یا شعر ہے یا افتراء پردازی ہے۔ چنانچہ اس پورے سبق میں ان کے اس الزام کا جواب ہے کہ رسول اس سے قبل بھی بھیجے گئے اور یہ سنت الہیہ ہے کہ تمام رسول بشر تھے اور کتاب بھیجنا بھی کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی رسولوں کو کتابیں دی گئی ہیں۔ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو کتاب دی گئی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب دی گئی تھی وہ بھی فرقان تھی۔ فرقان قرآن کی بھی صفت ہے۔ گویا تمام رسولوں کا سلسلہ بھی ایک ہے' کتابیں بھی ایک ہیں' اور ان کی صفات بھی ایک ہیں' کیونکہ اللہ کی نازل کردہ تمام کتب حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی تھیں' اس لیے ان کو فرقان کہا گیا۔ یہ ہدایت و ضلالت کے درمیان تمیز کرتی تھیں۔ یہ اسلامی نظام حیات اور جاہلی نظام کے درمیان فرق کرتی تھیں۔ یہ اسلامی رجحانات اور غیر اسلامی رجحانات میں فرق کرتی تھیں اس لیے ان کو عمومی طور پر فرقان کہا گیا اور تورات اور قرآن کو صراحت کے ساتھ کہا گیا کہ وہ فرقان ہیں۔

تورات کو یہاں روشنی بھی کہا گیا' اس لیے کہ وہ نظریات و افکار کی ظلمتوں کو روشن کرنے والی تھی' باطل کے اندھیروں کو دور کرنے والی تھی' اور یہ ایسے اندھیرے ہوتے ہیں جن میں عقل و خرد' ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرتے ہیں اور

انسان کی دلی دنیا پر اس وقت تک سورج طلوع نہیں ہوتا جب تک اس کے اندر شعلہ ایمان روشن نہ ہو اور وہ اپنے ماحول کو روشن نہ کرے۔ اس کو زندگی کا منہاج نہ دے دے اور زندگی کے اقدامات کی سمت متعین نہ کر دے تاکہ اقدار' منصوبوں اور مطالب کے درمیان اختلا پیدا نہ ہو۔

تورات بھی قرآن کی طرح متقین کے لیے ذکر اور ہدایت تھی۔ یعنی تورات کے ذریعہ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کا ذکر آج تک ہے جبکہ تورات سے قبل بنی اسرائیل کی کیا تاریخی حیثیت تھی؟ پہلے وہ فرعون کے غلام تھے۔ جو ان کے بیٹوں کو ذبح کرتا اور بیٹیوں کو زندہ رکھتا تھا۔ اور ان کو ذلت کے ساتھ اور تشدد کے تحت رکھتا۔ یہاں متقین کے ساتھ یہ صفت بھی لگائی گئی کہ وہ لوگ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔

الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ ( ۲۱ : ۴۹ ) "جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈریں"۔ اس لیے کہ جو لوگ اللہ سے ڈریں اور انہوں نے اللہ کو دیکھا ہی نہ ہو اور

وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ( ۲۱ : ۴۹ ) "اور ان کو اس گھڑی کا کھٹکا لگا ہوا ہو"۔ اور اس کے لیے تیاری اور عمل کرتے ہوں تو ایسے ہی لوگ اس روشنی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور راہ ہدایت اختیار کرتے ہیں اس لیے ایسے لوگوں کے لیے کتاب نصیحت بن جاتی۔ یہ ان کو اللہ کی طرف مڑنے کی یاد دہانی کراتی رہتی ہے۔ اس کے ذریعے لوگوں کے اندر ان کا تذکرہ ہوتا ہے گویا وہ ان کی پہچان بن جاتی ہے۔

یہ تھی حضرت موسیٰ اور ہارون کی شان وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ ( ۲۱ : ۵۰ ) "اب یہ بابرکت ذکر ہم نے نازل کیا ہے"۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے 'کوئی عجیب چیز نہیں ہے۔ یہ تو ایک ایسا واقعہ ہے جو پہلے ہوتا رہا ہے۔ یہ اللہ کی معلوم و معروف سنت ہے۔

اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ( ۲۱ : ۵۰ ) "پھر کیا تم اسے قبول کرنے سے انکاری ہو"۔ آخر اس میں تمہیں کیا چیز انوکھی لگ رہی ہے۔ کیا اس سے قبل اللہ کے رسول نہیں آتے رہے۔

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کے قصے پر ایک نہایت ہی سرسری نظر ڈالنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے کی ایک مکمل کڑی یہاں دی جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام عربوں کے جد اکبر ہیں۔ خانہ کعبہ کے بانی ہیں' جس کو قریش نے بتوں سے بھر رکھا تھا اور رات اور دن ان کی بندگی اور پرستش کرتے تھے حالانکہ حضرت ابراہیم تو مشہور ہی اس لیے تھے کہ انہوں نے بت توڑے تھے۔ یہاں ان کے قصے کو پیش کرنے کا مطلب بھی یہ ہے کہ تم بتوں کی پرستش کرتے ہو' جبکہ وہ بت شکن تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات زندگی کی یہ کڑی بہت ہی مشہور ہے۔ اس کے کئی مناظر یہاں پیش کیے گئے ہیں۔ ان مناظر کے درمیان بے شک چھوٹے چھوٹے گیپ بھی ہیں۔ آغاز اس سے ہوتا ہے کہ ابراہیم کو اللہ تعالیٰ نے رسالت اور ہدایت عطا کر دی تھی اور وہ عقیدہ توحید پر قائم تھے۔ "رشدہ" سے مراد ہی عقیدہ توحید ہے کیونکہ اس فضا

میں سب سے بڑی ہدایت تھی ہی عقیدۂ توحید کی طرف ہدایت۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾

"اس سے بھی پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کی ہوشمندی بخشی تھی اور ہم اس کو خوب جانتے تھے"۔

ہم نے ان کو ہوشمندی عطا کی تھی' ان کے حالات سے ہم اچھی طرح واقف تھے اور ان کی وہ صلاحیتیں بھی ہماری نظر میں تھیں جو حاملین رسالت کے لیے ضروری ہیں۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾

"یاد کرو وہ موقع جبکہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ "یہ مورتیں کیسی ہیں جن کے تم لوگ گرویدہ ہو رہے ہو؟"

ان کی یہ بات ہی ان کے رشد و ہدایت کی دلیل ہے۔ آپ نے ان پتھروں اور لکڑیوں اور دوسرے مواد کے لیے بڑا صحیح لفظ استعمال کیا یعنی مورتیاں' تماثیل۔ ان کو انہوں نے اللہ نہ کہا اور اس بات پر سخت گرفت کی کہ تم لوگ بڑی چاہت سے ان کی پرستش کرتے ہو' عاکف کے مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مسلسل ان کے ساتھ جھکے ہوئے رہتے تھے' حالانکہ وہ دوسرے کام بھی کرتے ہوں گے لیکن ان کے دل ان بتوں ہی کے ساتھ تھے۔ اس لیے معنوی طور پر گویا وہ ان کے آگے مسلسل جھکے ہوئے تھے۔ اس لیے تعبیر ان الفاظ میں کی گئی کہ تم رات دن ان کے آگے جھکے ہوئے ہو۔

ان کا جواب اور دلیل صرف یہ تھی۔

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

انہوں نے جواب دیا "ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے"۔ اس جواب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم باپ دادا کی تقلید کرتی ہے تو اس کی سوچ اور اس کی عقل کی قوتیں منجمد ہو جاتی ہیں جبکہ ایمان انسان کو آزادی' فکر و نظر کی وسعت' اور ہر چیز اور ہر صورت حال کا حقیقی جائزہ لینے کی تعلیم دیتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ ہر بات پر غور کر کے اس کا حقیقی وزن کرو۔ لہٰذا اللہ پر پختہ ایمان کا یہ پہلو بھی بہت اہم ہے۔ یعنی عقیدۂ توحید اور شرک کا کہ انسان اوہام' جامد تقلید اور وہی تصورات و عقائد سے چھوٹ جاتا ہے۔ وہ موروثی رواج جن کی پشت پر نہ احادیث ہیں اور نہ دلیل ان کو بسہولت ترک کر دیتا ہے۔

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾

اس نے کہا "تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے"۔

محض آباؤاجداد کی جانب سے بتوں کی پوجا ہونا' ان کی اصل حقیقت اور قدر و قیمت کو نہیں بدل سکتا۔ نہ ان کو وہ تقدس دے سکتا ہے جو دراصل ان کو حاصل نہ ہو۔ کیونکہ قدریں محض آباؤاجداد کے عمل سے وجود میں نہیں آتیں 'بلکہ سچائی اور افادیت سے بنتی ہیں اور آزادانہ سوچ سے ان کے بارے میں فیصلہ ہوتا ہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہایت بے باکی سے یہ باتیں کیں اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیا اور دو ٹوک بات کی تو ان کے عقائد کی دنیا میں زلزلہ آگیا اور پوچھنے لگے =

قَالُوٓا أَجِئۡتَنَا بِٱلۡحَقِّ أَمۡ أَنتَ مِنَ ٱللَّٰعِبِينَ ۝٥٥

انہوں نے کہا "کیا تو ہمارے سامنے اپنے اصلی خیالات پیش کر رہا ہے یا مذاق کرتا ہے"۔

یہ سوال ایک ایسے شخص کا سوال نظر آتا ہے جسے خود اپنے فکر و عمل پر پورا اطمینان نہ ہو۔ کیونکہ وہ جو عقیدہ رکھتا ہے' جو عمل کرتا ہے اس پر اس نے کبھی سوچا نہیں۔ تحقیق نہیں کی۔ یہ کام وہ محض وہم اور تقلید اور بے سوچے سمجھے کر رہا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ حق کیا ہے حالانکہ عقائد و عبادات وہ چیز ہے جو مستند دلائل پر مبنی ہوتی ہے۔ جو افراد و اقوام عقیدہ توحید کے صاف ستھرے تصور سے محروم ہوں وہ اسی طرح کے اوہام کا شکار ہو جاتی ہیں اور ان کے افکار بھی صاف ستھرے اور واضح نہیں ہوتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ذرا دیکھیے کہ وہ کس قدر اعتماد و یقین سے بات کرتے ہیں۔ ان کو رب کی صحیح معرفت حاصل ہے۔ وہ ایک مومن کی طرح ٹھوس بات کرتے ہیں۔

قَالَ بَل رَّبُّكُمۡ رَبُّ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ ٱلَّذِي فَطَرَهُنَّ وَأَنَا۠ عَلَىٰ ذَٰلِكُم مِّنَ ٱلشَّٰهِدِينَ ۝٥٦

اس نے جواب دیا "نہیں 'بلکہ فی الواقع تمہارا رب وہی ہے جو زمین اور آسمانوں کا رب ہے اور ان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس پر میں تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں"۔

اللہ تو رب واحد ہے۔ وہی آسمانوں اور زمین کا رب ہے' اور وہ اس لیے رب ہے کہ وہ ان کا پیدا کرنے والا ہے یعنی وہ اللہ واحد ہے۔ دو صفات کی وجہ سے اور ان میں جدائی ممکن نہیں ہے۔ ایک یہ کہ وہ زمین و آسمان کا رب ہے۔ ان کو چلانے والا ہے اور دوسری صفت یہ ہے کہ ان کو پیدا بھی اس نے کیا۔ یہ تو درست عقیدہ ہے لیکن مشرکین عرب کا عقیدہ نہایت ہی غیر معقول ہے کہ وہ اپنے بتوں کو رب تو مانتے تھے لیکن خالق نہ مانتے تھے۔ خالق وہ بھی صرف اللہ کو مانتے تھے۔ لیکن یہ جانتے ہوئے کہ دوسرے الہوں نے کسی چیز کی تخلیق نہیں کی پھر بھی ان کی پوجا کرتے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک ایسے گواہ کی طرح گواہی دیتے ہیں جسے کوئی شک نہیں ہوتا۔

وَ اَنَا عَلٰی ذٰلِکُمْ مِّنَ الشّٰھِدِیْنَ (۲۱:۵۶) "اس پر میں تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں"۔
زمین و آسمان کی تخلیق کے وقت حضرت ابراہیم موجود نہ تھے۔ نہ وہ اپنے نفس اور اپنی قوم کی تخلیق پر چشم دید گواہ تھے۔ لیکن یہ معاملہ اس قدر واضح، ثابت شدہ ہے کہ ایک مومن اس پر چشم دید گواہ کی طرح گواہی دے سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز وحدت خالق پر ناطق ہے۔ انسانی شخصیت کے جو جو کمالات ہیں، جسمانی و ذہنی وہ سب کے سب برہان ناطق ہیں کہ خالق ایک ہے اور وہی مدبر ہے۔ وہ قانون قدرت بھی ایک ہی ہے جو اس پوری کائنات کو مع انسان کے چلا رہا ہے اور اس میں متصرف ہے جس طرح چاہے۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم سے جو شخص یہ گفتگو کر رہا تھا، اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہہ دیا کہ ان کے بتوں کے بارے میں میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ اس پر ضرور عمل ہو گا۔

وَ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾

"اور خدا کی قسم میں تمہاری غیر موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کی خبر لوں گا"۔
انہوں نے ان بتوں کے بارے میں کیا فیصلہ کیا۔ اسے انہوں نے مبہم چھوڑ دیا، اور اس کا ذکر نہ کیا۔ سیاق کلام میں یہ وضاحت بھی نہیں ہے کہ انہوں نے آپ کو جواب کیا دیا۔ شاید وہ مطمئن ہوں کہ یہ ہمارے بتوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ اس لیے انہوں نے اسے نظر انداز کر دیا۔

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾

"چنانچہ اس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور صرف ان کے بڑے کو چھوڑ دیا تاکہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں"۔ ہوا کیا؟ تمام بتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے پتھروں کا ڈھیر بنا دیے گئے اور جو لکڑی کے تھے وہ ٹوٹی ہوئی لکڑیوں کی شکل میں رہ گئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے سب سے بڑے بت کو رہنے دیا۔

لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ (۲۱:۵۸) "شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں"۔ اور اس سے پوچھیں کہ یہ واقعہ کس طرح رونما ہوا اور وہ کیوں ان چھوٹے بتوں کی مدافعت کے لیے نہ اٹھا۔ شاید اس طرح وہ اس پورے مسئلے پر از سر نو غور کرنے کے لیے تیار ہو جائیں اور راہ راست پر آجائیں۔ انہیں معلوم ہو جائے کہ بتوں کی پرستش ایک لغو امر ہے۔
جب لوگ آئے، انہوں نے دیکھا کہ ان کے بت ریزہ ریزہ زمین پر پڑے ہیں۔ صرف بڑا بت بت کی طرح کھڑا ہے لیکن انہوں نے اس سے کچھ نہ پوچھا۔ خود بھی انہوں نے غور نہ کیا کہ اگر یہ خدا تھے تو ان کے ساتھ ایسا سلوک کیسے ہو گیا اور یہ جو کھڑا ہے اگر بڑا خدا ہے تو اس نے ان چھوٹے خداؤں کی مدافعت کیوں نہ کی؟ انہوں نے اپنے ذہنوں میں یہ سوال

پیدا ہونے نہ دیا یا پیدا ہی نہ ہوا کیونکہ جب عقل میں خرافات بیٹھ جائیں تو عقل معطل ہو جاتی ہے اور وہ اپنا اصل کام چھوڑ دیتی ہے۔ جب لوگ جامد تقلید کرنے لگیں تو بھی ان کی عقلوں پر تالے پڑ جاتے ہیں اور وہ کسی معاملے پر غور و فکر اور تامل و تدبر نہیں کرتے۔

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾

"(انہوں نے آکر بتوں کا یہ حال دیکھا تو) کہنے لگے "ہمارے خداؤں کا یہ حال کس نے کر دیا؟ وہ بڑا ہی کوئی ظالم تھا وہ"۔ اب ان لوگوں کو بات یاد آئی کہ ابراہیم علیہ السلام نے ان بتوں کے بارے میں اپنے باپ سے بھی جھگڑا کیا ہے۔ باپ کے سوا دوسرے لوگوں سے بھی انہوں نے کہا ہے کہ ان مورتیوں کی پرستش تم کیوں کرتے ہو اور پھر انہوں نے بتایا کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ جب لوگ چلے جائیں گے تو میں ان کی خبر لوں گا۔

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۰﴾

(بعض لوگ) بولے "ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا جس کا نام ابراہیم ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام جواں سال تھے۔ ان کو اللہ نے جوانی ہی میں ہدایت دے دی تھی۔ اس لیے انہوں نے ان بتوں کی عبادت کو ایک قبیح فعل سمجھتے ہوئے ان کے بت توڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس وقت ان کو اس بات کا حکم بذریعہ رسالت اور وحی دے دیا گیا تھا یا نہیں؟ یا یہ کہ یہ ان پر قبل رسالت الہام ہوا تھا۔ اس نے اس الہام کی بنا پر اپنے باپ اور دوسرے لوگوں کو دعوت حق دینا شروع کر دی تھی۔ یہ تو راجح بات ہے البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے ان کے لیے سَمِعْنَا فَتًى (۲۱ : ۶۰) کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے۔ ایک تو ان کی تحقیر کرنے کے لیے استعمال کیا۔ دوسرے یہ کہ وہ ان کے بارے میں زیادہ معلومات نہ رکھتے تھے۔

يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ (۲۱ : ۶۰) "جسے ابراہیم کہتے ہیں"۔ اور یہ تصغیر اور مجہول کا صیغہ وہ اس لیے استعمال کر رہے تھے کہ گویا یہ کوئی اہم آدمی نہیں ہے نہ اس سے کوئی خطرہ ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں پہلی رائے ہی قابل ترجیح ہے کہ حضرت ابراہیم جواں سال تھے۔

قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓي اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

انہوں نے کہا "تو پکڑ لاؤ اسے سب کے سامنے تاکہ دیکھ لیں اس کی کیسی خبر لی جاتی ہے"۔ اور سب کے سامنے کھلی عدالت میں ان کا مقدمہ پیش ہو۔

قَالُوٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٢﴾

انہوں نے پوچھا "کیوں ابراہیم 'آیا تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے"؟ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ان کے یہ بت ریزہ ریزہ تھے لیکن پھر بھی ان کو اصرار تھا کہ یہ ہمارے الٰہ ہیں۔ جب ابراہیم ان کے ساتھ یہ مذاق کر رہے تھے وہ اکیلے تھے اور یہ لوگ بہت زیادہ تھے۔ لیکن وہ کھلے دل و دماغ کے ساتھ معاملات کو دیکھتے تھے۔ اس لیے وہ ان بے عقلوں کے سامنے مذاق ہی کر سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ان کو ایسا جواب دیا جو ان جیسے لوگوں کے مناسب حال تھا۔

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٣﴾

اس نے جواب دیا "بلکہ یہ سب کچھ ان کے اس سردار نے کیا ہے 'ان ہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس جواب میں چبھتا ہوا مذاق تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سنجیدہ مذاق کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے یہ جھوٹی بات کی۔ مفسرین نے اس فقرے کے اسباب اور توجیہات میں جو طویل کلام کیا ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ معاملہ تو بہت ہی سادہ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام چاہتے تھے کہ لوگوں کو بتائیں کہ یہ مورتیاں اتنا بھی نہیں جانتیں کہ ان کو توڑا کس نے ہے؟ میں نے توڑا ہے یا اس بڑے بت نے توڑا ہے؟ جو کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ تو محض جمادات ہیں اور ان کے اندر تو قوت مدرکہ ہے ہی نہیں۔ تم آدمی ہوتے ہوئے بھی ایسے ہو کہ تمہاری قوائے مدرکہ جامد ہو چکی ہیں۔ تم کسی ممکن الوقوع اور جائز کام میں اور ایک ایسے امر میں فرق نہیں کر سکتے جو ناممکن الوقوع ہے۔ تم یہ انکوائری اس لیے کر رہے ہو کہ میں نے ان کو توڑا ہے یا اس بڑے بت نے تو پھر ان سے پوچھو اگر یہ بات کر سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس عجیب مذاق نے ان کو ایک لمحے کے لیے تو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ وہ سوچنے لگے 'کچھ غور کرنے لگے۔

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾

"یہ سن کر وہ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور (اپنے دلوں میں) کہنے لگے "واقعی تم خود ہی ظالم ہو"۔ یہ ان کے اندر ایک اچھی سوچ کا آغاز تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے موقف میں بنیادی کمزوری ہے۔ وہ جو بتوں اور مورتیوں کی پوجا کر رہے ہیں یہ دراصل ظلم ہے۔ پہلی مرتبہ یوں لگتا ہے کہ ان کی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ جس راہ پر وہ بغیر سوچے سمجھے چل رہے ہیں وہ بہت ہی غلط ہے۔

لیکن یہ ان کے فکر و نظر کی دنیا میں ایک چمک ہی تھی۔ اندھیرا حسب سابق پھر غالب آگیا۔ ان کے مردہ دلوں کے اندر ایک دھڑکن سی پیدا ہوئی مگر جلد ہی وہ پھر خاموش ہو کر جمود کا شکار ہو گئے۔

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٥﴾

”مگر پھر ان کی مت پلٹ گئی اور بولے ”تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں“۔ واقعی پہلے فقرے میں وہ اپنے دلوں اور دماغوں کی طرف لوٹ آئے تھے اور دوسرے فقرے میں جو ہے کہ وہ اپنے سروں کو چھوڑ کر الٹے پھرے تو گویا الٹے پاؤں پھرے اور اپنے سروں سے سوچ کا کام لینا بھی انہوں نے چھوڑ دیا۔ پہلی حرکت اپنے ضمیر کی طرف تھی کہ سوچیں اور تدبیر کریں اور دوسری حرکت واپسی کی تھی اور سوچ اور تدبر کو ترک کر کے پھر واپس ہوئے اور ان کے منہ سے جو بے عقلی کی بات نکلی وہی ان کے خلاف حجت تھی۔ حضرت ابراہیم کی دلیل ہی یہ تھی کہ دیکھو یہ بات بھی نہیں کر سکتے۔

جب وہ یہاں تک آگئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسا حلیم الطبع شخص بھی ان پر قدرے غصہ کرتا ہے کیونکہ ان کی یہ کم عقلی اس قدر واضح ہے کہ اس پر آدمی کے لیے صبر کرنا مشکل ہے۔

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾

اس نے کہا ”پھر کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کو پوج رہے ہو جو نہ تمہیں نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ نقصان۔ تف ہے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کر رہے ہو۔ کیا تم کچھ بھی عقل نہیں رکھتے“۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات سے ان کی دل تنگی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ قدرے غصے میں نظر آتے ہیں اور ان کو سخت تعجب ہے کہ یہ لوگ اس قدر پوچ اور غیر معقول فکر و عمل میں پڑے ہوئے ہیں۔

اب ان لوگوں کا ردعمل بھی سامنے آتا ہے۔ ان کی ہٹ دھرمی اب انہیں سخت موقف اختیار کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ان کا حال اس شخص جیسا ہو گیا جس کے پاس دلیل کچھ نہ ہو' اور دلیل کی کمزوری اور کمی وہ تشدد کے ذریعہ پوری کر رہا ہو۔ چنانچہ یہ لوگ بھی اب تشدد پر اتر آئے اور یہ فیصلہ کیا۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۶۸﴾

”انہوں نے کہا ”جلا ڈالو اس کو اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی اگر تمہیں کچھ کرنا ہے“۔

کیا ہی زبردست خدا ہیں کہ بچاروں کی نصرت ان کے پجاری کر رہے ہیں' وہ خود اپنے نفع و نقصان کے مالک ہی نہیں۔ نہ اپنی مدد کر سکتے ہیں' نہ اپنے بندوں کی۔ انہوں نے تو یہ حکم دیا کہ اسے جلا دو لیکن دوسری جانب سے بھی ایک حکم صادر ہوا' یہ اصل حاکم مطلق کا حکم تھا' اس نے پہلے حکم کو باطل کر دیا۔

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾

”ہم نے کہا ”اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم پر“۔

چنانچہ ان کا جلایا ہوا الاؤ ابراہیم کے لیے ٹھنڈا بھی ہو گیا اور ان کے لیے سلامتی کا موجب بنا' یہ کیسے؟ یہ سوال صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام والے الاؤ کے بارے میں کیوں پیدا ہو رہا ہے؟ لفظ کن اور کوئی سے یہ کائنات وجود میں آگئی' بڑے بڑے جہاں پیدا ہو گئے۔

اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (۳۶ : ۸۲) "اس کا حکم یہ ہے کہ اس نے جب کسی چیز کا ارادہ کیا تو صرف یہ کہتا ہے کن تو ہو جاتی ہے"۔ اس لیے ہم یہ سوال کرتے ہی نہیں کہ آگ نے کس طرح نہ جلایا' حالانکہ مشہور اور معروف اور زیر مشاہدہ طریقہ تو یہ ہے کہ آگ زندہ جسموں کو جلا دیتی ہے۔ جب ذات باری نے آگ سے کہا کہ جلاؤ تو وہ جلانے لگی۔ اس ذات نے اسے کہا کہ نہ جلاؤ اور سرد ہو جاؤ تو وہ ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو گئی۔ دونوں کلمات کا فرق صرف یہ ہے کہ ایک نتیجے کے ہم عادی ہیں اور دوسرے نتیجے کے ہم عادی نہیں۔

جو لوگ اللہ کے افعال کو انسانی افعال پر قیاس کرتے ہیں ایسے ہی لوگوں کے سامنے یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ کیسے ہو گیا؟ اور کیسے ممکن ہوا؟ لیکن جو لوگ اس فرق کو سمجھتے ہیں کہ اللہ میں اور انسانوں میں فرق ہے' تو ان کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ وہ ایسے واقعات کی علتیں تلاش نہیں کرتے۔ خواہ یہ علت سائنسی ہو یا غیر سائنسی ہو۔ کیونکہ یہ مسئلہ امرالٰہی کا ہے علت اور اسباب کا نہیں ہے' خصوصاً انسانی پیمانوں کے مطابق سبب و مسبب کی تلاش کا نہیں ہے۔ معجزات کے سلسلے میں جو لوگ قرآن مجید کی تفسیر سائنسی پیمانوں یعنی علت و معلول (Cause and Effect) کے زاویہ سے کرتے ہیں وہ غلط لائن پر جاتے ہیں۔ معجزات کی تفسیر یہی ہے کہ ان کو امرالٰہی کے حوالے کرنا چاہئے کیونکہ اللہ کے افعال کو ان پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا جن سے ہم انسانی پیمانوں کو ناپتے ہیں۔

ہمیں چاہئے اور یہ ہمارا فرض بھی ہے کہ ہم ان واقعات پر ایمان لائیں' کیونکہ اللہ خالق اور صانع ہے اور ایک صانع اپنی مصنوعات کو جس طرح چاہے بنا سکتا ہے۔ یہ کیونکر ہوا کہ آگ سرد ہو گئی اور اس کے اندر حضرت ابراہیم صحیح و سلامت رہ گئے۔ قرآن کریم نے اس کی کوئی تشریح و تعلیل نہیں کی ہے کیونکہ ہم اپنے انسانی قوائے مدرکہ کے ساتھ اس چیز کا ادراک ہی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا نص قرآن کے سوا ہمارے لیے نہ کوئی دلیل ہے اور نہ ہمیں مطالبہ کرنا چاہئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کو ٹھنڈا کر دیا گیا اس کی مثالیں اس دنیا میں بھی واقعہ ہوتی رہتی ہیں لیکن ان کا ہم نوٹس نہیں لیتے جس طرح اس اہم واقعہ کا نوٹس تاریخ نے لے لیا۔ تاریخ انسانی میں افراد پر اور جماعتوں پر اس سے بھی بڑے بڑے مظالم ہوتے رہے ہیں۔ اتنے ہولناک اور خوفناک مظالم کہ ان سے زندہ بچنے اور صحیح سلامت باہر آنے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی لوگ نکل آتے ہیں۔ مظالم اور تشدد کے بڑے بڑے الاؤ جلائے جاتے ہیں اور ان میں ان لوگوں کو ڈالا جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ زندہ بچ نکلتے ہیں اور مظالم اور تشدد کا یہ الاؤ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ یہ الاؤ بظاہر تو بہت بڑا شر ہوتا ہے لیکن ان مظلوموں کے لیے وہ بہت بڑا خیر بن جاتا ہے۔

یہ معجزہ ہے کہ "اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم کے لیے"۔ افراد' جماعتوں اور قوموں کی زندگی میں بار بار دہرایا جاتا ہے' خصوصاً افکار' عقائد اور تحریکات کے زاویہ سے جب امرالٰہی آتا ہے تو انسانی اقوال باطل ہو جاتے ہیں۔ تمام سازشیں ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ امرالٰہی برتر حکم ہے۔

وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَیْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِیْنَ ﴿۷۰﴾

"وہ چاہتے تھے کہ ابراہیم کے ساتھ برائی کریں مگر ہم نے ان کو بری طرح ناکام کر دیا"۔

روایات میں آتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے معاصر بادشاہ کا نام نمرود تھا۔ وہ عراق کے آرامیوں کا بادشاہ تھا۔ وہ اور اس کے سردار عذاب الہی سے ہلاک کر دیئے گئے تھے۔ اس کی تفصیلات میں روایات کا اختلاف ہے اور ہمارے پاس بھی کوئی دلیل نہیں ہے جس سے ہم حقیقت کو پاسکیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو اس سازش سے بچالیا جو انہوں نے ان کے خلاف تیار کی تھی اور سازش کرنے والے خسارے میں رہے۔ ان کو کیا خسارہ ہوا اس کا ذکر یہاں نہیں ہے۔

وَ نَجَّیْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۱﴾

"اور ہم اسے اور لوط علیہ السلام کو بچاکر اس سرزمین کی طرف نکال لے گئے جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں"۔

یہ شام کی سرزمین ہے جس کی طرف آپ اور آپ کے بھتیجے لوط نے ہجرت کی۔ چنانچہ یہ سرزمین ایک عرصے تک وحی کے نزول کا علاقہ بنی رہی۔ اور ابراہیم علیہ السلام کی نسل کے کئی رسول اس علاقے میں مبعوث ہوتے رہے۔ اس علاقے میں ارض مقدسہ اور مسلمانوں کا دوسرا حرم ہے۔ اور یہی علاقہ ہے جو سرسبز و شاداب علاقہ ہے اور اس میں بڑی برکات ہیں یعنی اس علاقے میں روحانی اور مادی برکات نسلاً بعد نسل موجود رہیں۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَ یَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَ كُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِیْنَ ﴿۷۲﴾ وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِیْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ ﴿۷۳﴾

"اور ہم نے اسے اسحاق عطا کیا اور یعقوب اس پر مزید' اور ہر ایک کو صالح بنایا اور ہم نے ان کو امام بنا دیا جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے انہیں وحی کے ذریعے نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے اور زکوۃ دینے کی ہدایت کی اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وطن' اہل وطن اور قوم کو چھوڑا تو اللہ تعالی نے انہیں ارض مبارکہ بطور وطن عنایت فرمائی' جو ان کے وطن سے زیادہ بہتر تھی' اور ان کو حضرت اسحاق جیسا بیٹا اور حضرت یعقوب جیسا پوتا دیا جو بہترین اہل و عیال ثابت ہوئے۔ اور پھر ان کی اولاد سے ایک نسل کثرت سے بڑھی کہ وہ دنیا میں ایک مستقل امت بن گئی

تو یہ قوم چھوڑنے کا صلہ تھا اور پھر آپ کی نسل میں بڑے بڑے ائمہ پیدا ہوئے جو اللہ کے حکم سے لوگوں کو ہدایت دیتے تھے اور اللہ نے ان کی طرف وحی کی کہ وہ بھلائی کے مختلف کام کریں۔ نماز قائم کریں' زکوٰۃ دیں اور اللہ کی اطاعت اور بندگی کریں۔ چنانچہ اللہ نے ان کو اس کا بہترین معاوضہ دیا اور اس کے ساتھ بہترین انعام دیا۔ ان کا خاتمہ بھی بہت اچھا ہوا کہ اللہ نے ان کو آزمایا اور انہوں نے صبر کیا اور اللہ نے ان کو صبر جمیل کا اجر دیا۔

وَ لُوْطًا اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا وَّ نَجَّیْنٰهُ مِنَ الْقَرْیَةِ

۵ الَّتِیْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِیْنَ ۙ وَ اَدْخَلْنٰهُ

۲۵ ع فِیْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۠

"اور لوط کو ہم نے حکم اور علم بخشا اور اسے اس بستی سے بچا کر نکال دیا جو بدکاریاں کرتی تھی ۔ در حقیقت وہ بڑی ہی بری فاسق قوم تھی۔ اور لوط کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا' وہ صالح لوگوں میں سے تھا"۔

حضرت لوط علیہ السلام کا قصہ اس سے پہلے مفصل گزر چکا ہے۔ یہاں اس کی طرف بالکل مجمل اشارہ ہوا ہے۔ عراق سے شام تک حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام دونوں ایک ساتھ آئے۔ انہوں نے سدوم شہر میں رہائش اختیار کی۔ اہل سدوم خلاف فطرت فعل کا ارتکاب کرتے تھے۔ مرد مردوں کے ساتھ اعلانیہ جنسی تعلقات قائم رکھتے تھے اور اس میں کوئی حرج نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہ گاؤں پوری آبادی سمیت ہلاک کر دیا گیا۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِیْنَ (۲۱ : ۷۴) "در حقیقت یہ بہت ہی بری فاسق قوم تھی"۔ لوط علیہ السلام اور آپ کی پوری فیملی ماسوائے ان کی بیوی کے 'بچالئے گئے۔

وَ اَدْخَلْنٰهُ فِیْ رَحْمَتِنَا اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ (۲۱ : ۷۵) "اور اسے ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا۔ وہ صالح لوگوں میں سے تھا۔ اللہ کی رحمت وہ خوشگوار پناہ گاہ ہے جس میں اللہ اسی شخص کو داخل کرتا ہے جسے وہ خصوصی طور پر چاہتا ہے۔ جو داخل ہوا وہ عیش و عشرت اور رحم و کرم میں داخل ہوا۔

اسی طرح یہاں حضرت نوح کی طرف بھی ایک سرسری اشارہ کر دیا جاتا ہے۔

وَ نُوْحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ

مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ۚ وَ نَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ

كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِیْنَ

"اور یہی نعمت ہم نے نوح کو دی - یاد کرو جبکہ ان سب سے پہلے اس نے ہمیں پکارا تھا۔ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے اور اس کے گھر والوں کو کرب عظیم سے نجات دی - اور اس قوم کے مقابلے میں اس کی مدد کی جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔ وہ بڑے برے لوگ تھے 'پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا"۔

حضرت نوح علیہ السلام کی طرف بھی یہ مختصر اشارہ ہے 'جس میں کوئی تفصیل نہیں ہے - نوح علیہ السلام نے رب کو پکارا اور رب نے ان کی دعا کو قبول کیا یہاں "من قبل"۔ کا لفظ آیا ہے یعنی "سب سے پہلے" اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور لوط علیہما السلام سے ان کا دور پہلے گزرا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ان کے اہل و عیال کو بچالیا اور ان کی پوری قوم نذر طوفان ہوگئی کرب عظیم سے مراد وہ مشکلات ہیں جو ان کو پیش آئیں - سورہ ہود میں تفصیلات موجود ہیں -

وَ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْكُمٰنِ فِی الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِیْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِیْنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ ۚ وَ كُلًّا اٰتَیْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ۫ وَّ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَ الطَّیْرَ ؕ وَ كُنَّا فٰعِلِیْنَ ﴿۷۹﴾ وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَ لِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ عَاصِفَةً تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا ؕ وَ كُنَّا بِكُلِّ شَیْءٍ عٰلِمِیْنَ ﴿۸۱﴾ وَ مِنَ الشَّیٰطِیْنِ مَنْ یَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَ یَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ كُنَّا لَهُمْ حٰفِظِیْنَ ﴿۸۲﴾

"اور اسی نعمت سے ہم نے داؤد و سلیمان کو سرفراز کیا۔ یاد کرو وہ موقع جبکہ وہ دونوں ایک کھیت کے مقدمے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں رات کے وقت دوسرے لوگوں کی بکریاں پھیل گئی تھیں 'اور ہم ان کی عدالت خود دیکھ رہے تھے۔ اس وقت ہم نے صحیح فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا' حالانکہ حکم اور علم ہم نے دونوں ہی کو عطا کیا تھا۔ داؤد کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو تسبیح کرتے تھے 'اس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے اور ہم نے اس کو تمہارے فائدے کے لیے زرہ بنانے کی صنعت سکھا دی تھی 'تاکہ تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے 'پھر کیا تم شکر گزار ہو؟ اور سلیمان کے لیے ہم نے تیز ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں 'ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے تھے اور شیاطین میں سے ہم نے ایسے بہت سوں کو اس کا تابع بنا دیا تھا جو اس کے لیے غوطے لگاتے اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے 'ان سب کے نگران ہم ہی تھے"۔

کھیت کا وہ کیا قصہ تھا جس کے بارے میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام نے فیصلہ کیا۔ راوی کہتے ہیں

کہ دو آدمی حضرت داؤد کے پاس آئے ۔ ایک کھیت کا مالک تھا یعنی فصل کا اور انگور کے باغ کا اور دوسرا بکریوں کا۔ کھیت کے مالک نے کہا کہ اس شخص کی بکریاں رات کے وقت میرے کھیت میں پھیل گئیں اور انہوں نے سب کچھ کھا لیا اور کھیت میں کچھ نہ رہا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے فیصلہ دیا کہ وہ باغ کے بدلے اس شخص کی بکریاں لے لے ۔ بکریوں والے صاحب حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس گئے اور ان کے سامنے قصہ دہرایا اور انہیں بتایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے تو یہ فیصلہ دے دیا ہے ۔ حضرت سلیمان علیہ السلام والد کے پاس گئے ۔ انہوں نے کہا اے اللہ کے نبی فیصلہ وہ نہیں ہے جو آپ نے کیا ہے ۔ انہوں نے کہا وہ کیسے؟ انہوں نے کہا آپ یہ بکریاں کھیت یا باغ والے شخص کے حوالے کر دیں تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھائے اور کھیت بکریوں کے مالک کو دے دیں تاکہ وہ کھیت میں کام کرے اور اسی حالت میں لے آئے جس طرح تھا۔ اس کے بعد ہر شخص وہ چیز دوسرے کو دے دے جو اس کے پاس ہے ۔ کھیت والا کھیت لے لے اور بکریوں والا بکریاں لے لے ۔ تو حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا ' ٹھیک فیصلہ وہی ہے جو آپ نے کیا۔ انہوں نے سلیمان علیہ السلام کے فیصلے کو نافذ کر دیا۔

یاد رہے کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام نے جج کے طور پر اجتہادی فیصلہ کیا تھا۔ اللہ بھی ان کے فیصلے کو دیکھ رہا تھا۔ اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو زیادہ مناسب اور مضبوط فیصلہ الہام کر دیا اور سلیمان اسے جس طرح سمجھے وہ زیادہ اچھا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے نقصان کا محض تاوان ادا کرنے کی طرف خیال کیا ۔ یہ تھا فقط انصاف ۔ لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے عدل کے ساتھ تعمیر و ترقی کا بھی خیال رکھا اور عدل کے نتیجے میں فریقین کو تعمیر و ترقی کے کام پر لگا دیا۔ عدل کی یہ دوسری صورت زیادہ مثبت 'مفید اور تعمیری ہے اور یہ اللہ کی توفیق اور الہام ہے کہ وہ جسے چاہے دے دے ۔

حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام دونوں کو حکم 'علم اور فیصلے کے اختیارات تھے ۔

وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ( ۲۱ : ۷۹ ) "حکم اور علم ہم نے دونوں کو عطا کیا تھا"۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلے میں کوئی غلطی نہ تھی لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ زیادہ اچھا تھا کیونکہ وہ الہام کے نتیجے میں ہوا تھا۔

اس کے بعد قرآن مجید ان مخصوص امور کا ذکر کرتا ہے جو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو علیحدہ علیحدہ دیے گئے تھے 'پہلے حضرت داؤد علیہ السلام۔

وَّ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَ الطَّيْرَ وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ( ۲۱ : ۷۹ ) وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ( ۲۱ : ۸۰ ) "اور داؤد کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو تسبیح کرتے تھے 'اس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے اور ہم نے اس کو تمہارے فائدے کے لیے زرہ بنانے کی صنعت سکھا دی تھی ' تاکہ تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے ' پھر کیا تم شکر گزار ہو؟"

حضرت داؤد علیہ السلام کے مزامیر مشہور ہیں ۔ یہ اللہ کی حمد تھی جو وہ نہایت ہی خوش الحانی سے پڑھتے تھے ۔ ان کی

آواز کی گونج سے ان کا ماحول بھر جاتا تھا اور ان کے ساتھ پہاڑ اور پرندے بھی اسے دہراتے تھے۔

جب کسی بندے کا دل اپنے رب سے جڑ جاتا ہے تو وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ اس پوری کائنات کے ساتھ یکجا ہو گیا ہے اور اس پوری کائنات کا دل میرے ساتھ دھڑکتا ہے اور وہ تمام رکاوٹیں اور پردے ہٹ جاتے ہیں جو اللہ کی مخلوقات کے مختلف انواع و اجناس کے درمیان دوئی اور امتیاز کے شعور کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور اس طرح کائنات کے مختلف انواع اجناس کے درمیان اس دوئی کے شعور کی وجہ سے فاصلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جب انسان اس مقام پر پہنچ جائے تو ان تمام انواع کے ضمیر اس کائنات کے ضمیر کے ساتھ مل جاتے ہیں۔

بعض لحات میں ایک ایسی روشنی سامنے آتی ہے کہ روح یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ اس کائنات کے ساتھ ایک ہے۔ اس کے اندر سب کچھ آگیا ہے' ایسے لحات میں روح یہ نہیں محسوس کرتی کہ اس سے باہر بھی کچھ ہے۔ وہ یہ بھی محسوس نہیں کرتی کہ وہ اپنے ماحول سے علیحدہ ہے۔ پورا ماحول روح انسانی میں گم اور انسان اپنے ماحول میں گم ہو جاتا ہے۔

نص قرآنی سے ہماری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام خوش الحانی سے حمد پڑھتے تھے تو وہ اپنے متمیز' منفصل اور مخصوص مقام میں موجود نفس کو بھول جاتے تھے۔ ان کی روح اس سایہ ربی میں چلی جاتی تھی جو اس کائنات پر سایہ فگن ہے۔ اس پوری کائنات پر خواہ وہ جامد مخلوق ہو یا زندہ' اس طرح حضرت داؤد محسوس کرتے تھے کہ ان کے ساتھ یہ پوری کائنات حمد خواں ہے۔ اور جس طرح وہ ثناخواں ہیں اس طرح وہ بھی ثناخواں ہے۔ پھر یوں محسوس ہوتا ہے کہ پوری کائنات ایک کورس کی شکل میں 'ایک گروپ کی طرح اللہ کی حمد و ثنا اور تسبیح و تہلیل گا رہی ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ "جو چیز بھی ہے وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہے لیکن تم اس کی تسبیح کو نہیں سمجھتے"۔ اور اس تسبیح کو وہی شخص سمجھتا ہے جس کے سامنے سے پردے ہٹ جائیں' فاصلے مٹ جائیں اور وہ روح کائنات اور ارواح کون و مکان کے ساتھ چلتا ہو' جو سب کی سب اللہ کی سمت میں رخ کیے ہوئے ہیں۔

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ (۲۱: ۷۹) "اور ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا جو تسبیح کرتے تھے اور اس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے"۔ اللہ کے لیے مشکل ہی کیا ہے؟ یا کیا کوئی چیز اللہ کے حکم سے سرتابی کر سکتی ہے جب اللہ چاہے۔ چاہے وہ لوگوں کے ہاں ہوا کرتی ہے یا نہیں ہوا کرتی۔

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ

(۲۱: ۸۰) "اور ہم نے اس کو تمہارے فائدے کے لیے زرہ بنانے کی صنعت سکھا دی تھی' تاکہ تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے۔ پھر کیا تم شکرگزار ہو؟" یہ زرہ کی صنعت ہے جس کے حلقے ایک دوسرے سے گزرتے ہیں۔ جبکہ اس سے قبل وہ ایک جامد چادر کی صورت میں بنائی جاتی تھیں۔ کڑیوں کا ایک دوسرے میں داخل کر کے زرہ بنانا زیادہ

نرم اور استعمال میں زیادہ آسان ہو جاتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ زرہ کی یہ ترقی یافتہ قسم سب سے پہلے اللہ کی تعلیم سے حضرت داؤد علیہ السلام نے ایجاد کی ۔ لہٰذا فرماتا ہے کہ اس نے داؤد علیہ السلام کو یہ صنعت سکھا کر تم پر بڑا احسان کیا کہ تم جنگ کے دوران ایک دوسرے کی مار سے بچ جاتے ہو ۔

لِتُحْصِنَكُم مِّنۢ بَأْسِكُمْ (۲۱ : ۸۰) ”تاکہ تمہیں بچائے ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کے وقت“ ۔ یہ احسان جتلا کر اللہ تعالیٰ پھر پوچھتے ہیں کیا تم شکر کرو گے ۔ یہ سوال بجھانے اور شکر پر ابھارنے کے لیے ہے ۔

اسلامی تہذیب و تمدن نے ایک ایک قدم کر کے ترقی کی ہے ۔ ایک جست میں انسان یکدم مہذب اور ترقی یافتہ نہیں ہوا ۔ دنیا کی ترقی کا فریضہ خلافت ارضی سے تعلق رکھتا ہے اور یہ انسان پر عائد کیا گیا ہے ۔ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ قوت رکھی تھی کہ وہ ہر دن ایک قدم آگے بڑھتا رہے اور ہر دن کی ترقی کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالتا رہے ۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ انسان کے مزاج کے یہ بات خلاف ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی کو نظام جدید کے مطابق ڈھال لے کیونکہ اس طرح یکدم تبدیلی سے اس کی عادات اور مروج طریق کار بدل جاتا ہے اور بالکل نیا نظام یکدم دینے سے انسان کو معمول کی زندگی از سر نو شروع کرنے میں کافی وقت لگتا ہے ۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ارادہ یہ ہوا کہ زندگی کے نظام میں ہر بڑی تبدیلی کے بعد انسان کو اگلی تبدیلی کے لیے مناسب وقت دیا جائے بعض اوقات یہ وقت تھوڑا ہوتا ہے اور بعض اوقات زیادہ لمبا عرصہ ہوتا ہے ۔

آج دنیا کے اعصاب پر جو ناقابل برداشت تناؤ ہے اور انسان کے اندر جو بے چینی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سائنسی انکشافات اور سوسائٹی کے نظام میں سرعت کے ساتھ بار بار کی تبدیلیوں کی وجہ سے ' انسانیت کو سانس لینے ' ستانے کا موقعہ ہی نہیں ملتا کہ وہ ایک عرصہ تک جدید نظام کی برکات سے متمتع ہو ۔ انقلاب پر انقلاب چلا آ رہا ہے ۔

یہ تو تھا معاملہ داؤد علیہ السلام کا ' رہے سلیمان علیہ السلام تو ان کو بھی زیادہ معجزات دیئے گئے تھے ۔

وَلِسُلَيْمَٰنَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِۦٓ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَٰرَكْنَا فِيهَا ۚ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عَٰلِمِينَ (۲۱ : ۸۱) وَمِنَ الشَّيَٰطِينِ مَن يَغُوصُونَ لَهُۥ وَيَعْمَلُونَ عَمَلًا دُونَ ذَٰلِكَ ۖ وَكُنَّا لَهُمْ حَٰفِظِينَ (۲۱ : ۸۲) ”اور سلیمان کے لیے ہم نے تیز ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں ' ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے تھے اور شیاطین میں سے ہم نے ایسے بہت سوں کو اس کا تابع بنا دیا تھا جو اس کے لیے غوطے لگاتے اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے ' ان سب کے نگران ہم ہی تھے“ ۔

سلیمان علیہ السلام کے بارے میں بہت سی باتیں ' بہت سی روایات اور بہت سی کہانیاں مشہور ہیں ۔ ان میں سے اکثر یا تو اسرائیلیات سے لی گئی ہیں یا اوہام و تخیلات کا نتیجہ ہیں ۔ لیکن روایات کے اس صحرا میں ہم اپنے آپ کو بے راہ نہیں کرنا چاہتے ۔ ہم چاہتے ہیں کہ حدود قرآنیہ تک اپنے آپ کو محدود کر دیں ۔ قرآن کریم کے علاوہ سلیمان علیہ السلام کے

بارے میں کوئی مستند روایت نہیں ہے۔

قرآن کریم میں صرف اس حد تک بیان ہوا ہے کہ ہوا کو ان کے لیے مسخر کر دیا گیا تھا۔یعنی تیز رفتار ہوا کو۔ یہ ہوا ارض متبرک کی طرف چلتی تھی۔ برکت والی سرزمین سے مراد موجودہ شام کی سرزمین ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔اب سوال یہ ہے کہ ان کے لیے اس ہوا کو کیونکر مسخر کر دیا گیا تھا۔

ایک قصہ ہوا کے تخت یا ہوا کی چادر کا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور آپ کے حاشیہ نشین اس پر بیٹھتے تھے اور اڑ جاتے تھے اور شام کی طرف چلے جاتے تھے اور چشم زدن میں وہ شام میں ہوتے تھے۔ یہ اس قدر سفر تھا کہ اونٹوں پر ایک ماہ میں طے ہوتا تھا اور اسی طرح وہ واپس آ جاتے تھے۔اس روایت کو سورہ سبا کی اس آیت سے ثابت کیا جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے۔

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ (۳۴ : ۱۲) "اور سلیمان علیہ السلام کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا تھا، صبح کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک اور شام کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک"۔

لیکن قرآن کریم نے ہوا کی اس چادر کا ذکر کہیں نہیں کیا۔اس کا ذکر کسی صحیح حدیث میں بھی نہیں ہوا۔ لہٰذا اس قسم کی روایات کے بارے میں ہمیں کوئی مستند ثبوت نہیں ملا۔

زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہم تسخیر ہوا کا مفہوم یہ لیں کہ یہ ہوا اللہ کے حکم کے مطابق یوں چلتی تھی کہ ایک طرف سے ایک ماہ کا سفر وہ صبح و شام طے کرتی تھی۔یہ سفر کیسے ہو جاتا تھا؟ تو یہ قدرت الٰہی کے کارنامے ہیں۔اس کے بارے میں ہم نہیں پوچھ سکتے کہ یہ کیسے چلتی تھی۔قوانین قدرت کی تخلیق اللہ نے کی ہے۔وہ جس طرف چاہے ان قوائے قدرت کا رخ پھیر سکتا ہے۔اس کائنات میں قدرت کے اصولوں میں سے ابھی انسان کو کم ہی کا پتہ چلا ہے۔ہو سکتا ہے کہ اللہ کے کچھ خفیہ طبیعی قوانین ایسے ہوں جن کا ابھی تک ہمیں علم نہ ہو اور ان اصولوں کا ظہور اور انکشاف اس وقت ہو جب انسان اس کو برداشت کرنے کے لائق ہوں اور اللہ کا حکم ہو۔

وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِينَ (۲۱ : ۸۱) "اور ہم ہر چیز کو جاننے تھے"۔مطلق اور بے قید علم ہمارے قبضے میں ہے۔رہا انسان کا علم تو وہ محدود ہے۔

یہی معاملہ تسخیر جنات کا ہے جو بحر و بر میں ان کے لیے غوطے لگاتے تھے اور سلیمان علیہ السلام کے لیے زمین کے خزانے نکالتے تھے یا وہ ان کے لیے دوسری خدمات سرانجام دیتے تھے۔جن ہر اس مخلوق کو کہتے ہیں جو مخفی ہو۔ قرآن مجید کی صریح آیات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک مخلوق ایسی ہے جسے جن کہتے ہیں، جسے ہم دیکھ نہیں سکتے۔اس مخلوق میں سے کچھ لوگوں کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کر دیا گیا تھا جو ان کے لیے غوطے لگاتے تھے اور دوسرے کام کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے کنٹرول میں دے دیا تھا کہ نہ وہ بھاگ سکتے تھے، نہ فساد کر سکتے تھے۔ وہ نہ ان کی فرماں برداری کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر پوری طرح کنٹرول کر سکتا ہے اور اپنی مخلوق کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔

بس فی ظلال میں ہم اس حد تک جاتے ہیں اور یہی وہ حد ہے جس میں غلطی کا احتمال کم ہے۔ اس لیے ہمیں اسرا ئیلیات میں تیرنے کی ضرورت نہیں۔

اللہ نے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو خوشحالی میں آزمایا تھا۔ انعامات میں آزمایا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو فیصلے میں آزمایا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو گھوڑوں کے بارے میں آزمایا تھا (تفصیلات سورہ ص میں آرہی ہیں لہٰذا ہم یہ مباحث یہاں نہیں چھیڑتے)۔ اپنی جگہ یہ سب بحثیں ہوں گی۔ یہاں نتیجے کا ذکر ضروری ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی صبر کیا' حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی صبر کیا اور آزمائشوں کے بعد اللہ سے معافی اور مغفرت طلب کی اور امتحان و آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزر گئے۔ چنانچہ وہ اللہ کے انعامات پر شکر خداوندی بجالانے والے تھے۔

اب ذرا مصائب میں مبتلا کر کے آزمانے کا واقعہ آتا ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ۔

وَ اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ﴿۸۳﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَیْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰی لِلْعٰبِدِیْنَ ﴿۸۴﴾

"اور یہی (ہوشمندی اور حلم و علم کی نعمت) ہم نے ایوب کو دی تھی۔ یاد کرو' جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ "مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے"۔ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور جو تکلیف اسے تھی اس کو دور کر دیا' اور صرف اس کے اہل و عیال ہی اس کو نہیں دیئے بلکہ ان کے ساتھ اتنے ہی اور بھی دیئے' اپنی خاص رحمت کے طور پر' اور اس لیے کہ یہ ایک سبق ہے عبادت گزاروں کے لیے"۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا قصہ قرآن مجید کے ابتلاء کے قصوں میں سے ایک نہایت ہی خوبصورت قصہ ہے۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ قصہ آیا ہے۔ یہ مجمل شکل میں آیا ہے۔ تفصیلات نہیں دی گئیں۔ اس جگہ یہاں حضرت ایوب کی دعا اور قبولیت دعا کا ذکر ہے کیونکہ اس سورہ میں موضوع اور مضمون ہی اپنے بندوں پر رحمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک اور آزمائش میں ان کی امداد ہے خواہ یہ آزمائش قوم کی طرف سے تکذیب کی صورت میں ہو' مثلاً قصہ ابراہیم' لوط اور نوح علیہم السلام میں یا اللہ کی جانب سے انعامات میں آزمائش ہو جس طرح داؤد و سلیمان علیہما السلام یا مرض وغیرہ کی آزمائش ہو جس طرح حضرت ایوب علیہ السلام کے قصے میں ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے یہاں جو دعا کی ہے تو اس میں انہوں نے صرف یہ بتایا ہے کہ اللہ میرا یہ حال ہے اور رب تعالیٰ کی یہ صفت بیان کی ہے:

اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (۲۱: ۸۳) اس کے بعد انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میرے حالات کو بدل دے' یہ اس لیے کہ وہ مصیبتوں پر صبر کرنے والے تھے' وہ اللہ کے سامنے کوئی تجویز یا مطالبہ نہ کرتے تھے۔ یہ ان کی

جانب سے بارگاہ رب العزت میں ادب اور احترام کا رویہ تھا۔ حضرت ایوب علیہ السلام ایک ایسے صابر و شاکر شخصیت تھے کہ سخت سے سخت حالات میں وہ صبر کرتے تھے۔ کوئی فریاد نہ کرتے تھے۔ آپ کا صبر اس قدر مشہور ہوا کہ ہمیشہ ان کی مثال دی جاتی ہے۔ آپ اس قدر صابر اور شاکر تھے کہ آپ نے اس مصیبت کے رفع ہونے کی دعا بھی نہیں فرمائی۔ پورا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو سب کچھ معلوم تھا۔ اس لیے سوال کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

جب حضرت ایوب علیہ السلام اپنے رب کی طرف اس اعتماد کے ساتھ اور اس مؤدبانہ طریقے سے متوجہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فوراً ان کی دعا کو قبول کیا' آزمائش ختم ہوگئی اور رحمت خداوندی آن پہنچی۔ نہ صرف یہ کہ ان کی تکلیف دور ہوئی بلکہ ان کے اہل و عیال بھی ان کو دے دیئے اور اسی قدر مزید بھی دیئے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَيْنٰهُ اَهْلَهُ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ (۲۱: ۸۴) "ہم نے ان کی دعا قبول کر لی اور جو تکلیف اسے تھی اس کو دور کر دیا اور صرف اس کے اہل و عیال ہی اس کو نہیں دیئے بلکہ اس کے ساتھ اتنے ہی اور بھی دیئے"۔

ان کے جسم کو جو مرض لاحق تھا' وہ دور ہو گیا اور آپ فوراً تندرست ہو گئے۔ ان کے اہل و عیال جن سے وہ محروم ہو گئے تھے اللہ نے ان کو دے دیئے اور ان جیسے اور دے دیئے۔ کہا گیا ہے کہ بیٹوں کے بدلے بیٹے دے دیئے یا بیٹے اور پوتے دے دیئے۔

رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا (۲۱: ۸۴) "اللہ کی ہر رحمت اللہ کا احسان ہے۔ صرف احسان' ورنہ ہم تو مستحق نہیں ہیں۔

وَ ذِكْرٰي لِلْعٰبِدِيْنَ (۲۱: ۸۴) "اور اس لیے کہ یہ ایک سبق ہو عبادت گزاروں کے لیے"۔

آزمائش کے حوالے سے اس کا مطلب بہت اہم ہے' عبادت گزاروں پر آزمائش آتی رہتی ہے۔ مثلاً عبادت کی مشکلات' نظریاتی مشکلات اور ایمان کے تقاضے۔ یہ نہایت ہی سنجیدہ معاملہ ہے' مذاق نہیں ہے۔ اسلامی نظریہ حیات ایک عظیم امانت ہے اور یہ امانت صرف ان لوگوں کو دی جاتی ہے جو اس کا بوجھ اٹھا سکیں اور جو اس کے تقاضے اور فرائض پورے کر سکیں۔ محض زبان سے کہنا ہی نہیں ہے یا محض دعویٰ ہی نہیں ہے لہٰذا صبر ضروری ہے تاکہ عبادت گزار آزمائش میں پورے اتریں۔

--- ○○○---

اس کے بعد قرآن مجید حضرت اسماعیل' حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل کی طرف صرف اشارہ کرتا ہے۔

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۸۵ وَ اَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۸۶

"اور یہی نعمت اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل علیہم السلام کو دی کہ یہ سب صابر لوگ تھے اور ان کو ہم نے اپنی

رحمت میں داخل کیا کہ وہ صالحوں میں سے تھے"۔

ان انبیاء کے حالات زندگی میں صبر کا عنصر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں حکم دیا کہ انہیں ذبح کر دیا جائے۔ جب ان کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ یہ صبر کا مثالی نمونہ تھا۔

يَا اَبَتِ افْعَلْ مَاتُؤمَرُ سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ "اے باپ، آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اس پر عمل کریں۔ ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے"۔

حضرت ادریس کے بارے میں اس سے قبل یہ بات آگئی ہے کہ ان کا زمان و مکان مجہول ہے۔ ان کے بارے میں بعض لوگوں نے یہ رائے دی ہے کہ وہ اور ادریس ہیں جن کی وفات کے بعد مصریوں نے ان کی پرستش شروع کر دی تھی اور ان کے ساتھ کئی قصے اور کہانیاں وابستہ کر دی تھیں مثلاً یہ کہ وہ انسانوں کے معلم اول ہیں، جنہوں نے انسانوں کو زراعت سکھائی۔ صنعت کی تعلیم دی لیکن اس بات پر کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔ ہمیں اس کا یقین ہے کہ انہوں نے بھی کسی مشکل میں مثالی صبر کا مظاہرہ کیا جس کا ذکر اللہ کی آخری کتاب میں ضروری سمجھا گیا۔

حضرت ذوالکفل کے زمان و مکان کے بارے میں بھی معلومات نہیں ہیں۔ راجح بات یہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے تھے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ صالحین بنی اسرائیل میں سے تھے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے کسی نبی کی کفالت اور خدمت کی اور انہوں نے ان کو اپنی خلافت تین شرائط کی ضمانت دینے پر، ان کے حوالے کی کہ پوری رات عبادت کریں گے، ہر دن روزے سے ہوں گے اور فیصلہ کرتے وقت کسی پر غصہ نہ کریں گے۔ انہوں نے ان ضمانتوں کو پورا کیا اس لیے ان کو ذوالکفل کہا گیا لیکن یہ بھی ایک قول ہے اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ قرآن کریم یہاں صرف یہ تصریح کرتا ہے کہ یہ صبر کرنے والے تھے۔

وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (۲۱: ۸۶) "ان کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا کہ وہ صالحوں میں سے تھے"۔

اب قصہ یونس علیہ السلام۔ آپ کو ذوالنون بھی کہتے ہیں۔

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

"اور مچھلی والے کو بھی ہم نے نوازا۔ یاد کرو جب کہ وہ بگڑ کر چلا گیا تھا اور سمجھا تھا کہ ہم اس پر تنگی نہ کریں گے۔ آخر کو اس نے تاریکیوں میں پکارا "نہیں ہے کوئی خدا مگر تو، پاک ہے تیری ذات، بے شک میں نے قصور کیا"۔ تب ہم نے اس کی دعا قبول کی اور غم سے اس کو نجات بخشی، اور اسی طرح ہم مومنوں کو بچا لیا کرتے ہیں"۔

حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ بھی یہاں ایک سرسری اشارے کی شکل میں ہے' جیسا کہ اس سورہ کا انداز ہے اور سورہ الصافات میں اس کی تفصیلات ہیں لیکن ضروری ہے کہ یہاں ہم بعض ضروری تفصیلات دے دیں تاکہ یہاں کے اشارات اچھی طرح سمجھ میں آ جائیں۔ ان کو مچھلی والے (ذوالنون) اس لیے کہا جاتا ہے کہ جب ان کو کشتی سے پھینکا گیا تو مچھلی نے ان کو نگل لیا۔ قصہ یہ تھا کہ ان کو ایک گاؤں میں دعوت اسلامی پھیلانے کے لیے بھیجا گیا۔ گاؤں والوں نے ان کی ایک نہ مانی' ان کو اس پر بہت غصہ آیا۔ اسی غصے کی وجہ سے ناراض ہو کر وہاں سے چلے گئے اور ان میں رہ کر دعوت اسلامی کی مشکلات کو برداشت کرتے ہوئے صبر اور مصابرت سے کام نہ لیا۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ ملک خدا تنگ نیست پائے مرا لنگ نیست۔ اللہ کی مخلوقات سے اور گاؤں بھرے پڑے ہیں' اگر یہ لوگ دعوت کو قبول نہیں کرتے تو اللہ انہیں دوسروں کی طرف متوجہ کر دے گا۔ یہ ہے مفہوم فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ (۲۱:۸۷) کا "اس نے گمان کیا کہ ہم اس پر تنگی نہ کریں گے" یعنی "لن نقدر" کا مفہوم ہے "لم نضیق علیہ" - ان کے غصے اور تنگ دلی نے ان کو گاؤں سے نکلنے پر آمادہ کر دیا۔ وہ سمندر کے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں ایک کشتی تیار تھی۔ اس میں سوار ہو گئے۔ کشتی کو امواج بحری نے گھیر لیا۔ ملاح نے کہا کہ اگر اسے ہلکا نہ کیا گیا تو سب لوگ ڈوب جائیں گے۔ اس پر انہوں نے قرعہ اندازی کی۔ قرعہ حضرت یونس کا نکل گیا۔ لوگوں نے انہیں سمندر میں پھینک دیا یا خود کود پڑے۔ ان کو مچھلی نے نگل لیا۔ اور وہ مزید تنگ جگہ تک جا پہنچے۔ اس وقت اندھیروں میں تھے۔ ایک اندھیرا مچھلی کے پیٹ کا' دوسرا اندھیرا سمندر کا اور تیسرا اندھیرا رات کا۔ انہوں نے اپنے رب کو یوں پکارا

لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۲۱:۸۷) "نہیں ہے کوئی الٰہ مگر تو' پاک ہے ذات تیری' بے شک میں ہی ظالموں میں سے تھا"۔ اللہ نے ان کی دعا قبول کر لی۔ اس پریشانی سے انہیں نجات دی جس میں وہ تھے۔ مچھلی نے انہیں ساحل پر پھینک دیا۔ اس کے بعد کے ان کے واقعات سورہ الصافات میں مفصل ہیں۔ یہاں اسی قدر ضروری تھا۔

حضرت یونس علیہ السلام کے قصے کے اس حصے میں عبرت اور غور طلب نکات ہیں لہٰذا یہاں قدرے توقف ضروری ہے۔ یہ کہ حضرت یونس علیہ السلام نے دعوت اسلامی کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات پر صبر نہ کیا۔ ان کا دل بھر آیا' انہوں نے دعوت کی ذمہ داریاں چھوڑ دیں اور غصے میں اس گاؤں سے چل پڑے۔ جب وہ چلے تو سخت پریشانی اور غصے میں تھے۔ اللہ نے ان کو ان مشکلات سے دوچار کر دیا جن کے مقابلے میں تکذیب کرنے والوں کی جانب سے آنے والی مشکلات کم تھیں۔ اگر وہ توبہ نہ کرتے اور اپنے نفس پر' دعوت اسلامی پر اور اپنے فرائض پر ظلم کا اعتراف نہ کرتے تو اللہ ان کو اس مصیبت سے نہ نکالتا لیکن قدرت نے ان کی توبہ قبول کر کے ان کی حفاظت کی اور ان کو اس غم سے نجات دی۔

دعوت اسلامی کے حاملین کے لیے ضروری ہے کہ وہ دعوت کے فرائض اور مشکلات کو برداشت کریں۔ اگر لوگ تکذیب کرتے ہیں تو وہ ان پر صبر کریں۔ اگر ایذا دیتے ہیں تو صبر کریں' حقیقت یہ ہے کہ ایک سچے آدمی کو جھوٹا کہنے کا اثر اس کے نفس پر بہت ہی کڑوا ہوتا ہے۔ لیکن رسالت کی ذمہ داریوں کا یہ قصہ ہے کہ لوگ مانیں یا نہ مانیں دعوت اسلامی کے حاملین کو چاہئے کہ وہ اپنے اندر برداشت پیدا کریں' صبر کریں اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں۔ ضروری ہے کہ وہ از سر نو دعوت کا کام شروع کریں۔ دعوت کا آغاز از سر نو کریں اور پروگرام کو پھر سے شروع کریں۔

ان کا فرض ہے کہ وہ دعوت کے کام سے مایوس نہ ہوں' دلوں میں از سر نو اصلاح کا جذبہ پیدا کیا جاسکتا ہے اور لوگوں کی اصلاح کا کام کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ قوم بار بار انکار کر دے اور تکذیب کر دے۔ سرکشی کرے اور دعوت کو رد کر دے۔ اگر سو بار کی دعوت دلوں پر اثر نہ کرے تو ہو سکتا ہے کہ ایک سو ایک بار کی دعوت دلوں میں اتر جائے۔ بعض اوقات انسان ایک ہزار ایک بار سعی کرنے پر کامیاب ہوتا ہے۔ اگر داعی صبر کرے 'کوشش کرے اور مایوس نہ ہو تو ہزار ہا کوششوں کے بعد وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

دعوت اسلامی کا کام آسان اور سہل نہیں ہے۔ لوگوں کے دلوں کو کسی دعوت کے لیے برانگیختہ کرنا بہت ہی دشوار کام ہے۔ دلوں کا جیتنا جوئے شیر لانے سے بھی مشکل ہے۔ باطل 'رسم و رواج اور عادات اور رسوم کا ایک ستہ بستہ نظام ہے جس نے دعوت کے کام کو روک لیا ہوتا ہے۔ پھر ہر سوسائٹی اپنی موجودہ تنظیم اور اداروں کو بچانا چاہتی ہے۔ دلوں کے اوپر موجودہ عادات اور طرز زندگی زنگ کی طرح جما ہوتا ہے لہذا دلوں کو از سر نو زندہ کرنے کے لیے سب کو کرنا ہوتا ہے تمام حساس مراکز تحریک کو چھونا ہوتا ہے۔ اور بڑی مشکل سے اس رگ کو پکڑا جاتا ہے جس کے ذریعے پیغام پہنچ جاتا ہے۔ ایک ایک بیج کے لیے بڑے صبر' بڑی برداشت اور بڑی جدوجہد کرنی ہوتی ہے لیکن بعض اوقات صرف ایک سرسری کوشش سے اور جب انسانی سوسائٹی کی دکھتی رگ کو پکڑ لیا جاتا ہے تو پھر بڑی آسانی کے ساتھ انسان منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے اور سوسائٹی میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔

اس بات کو ایک عام مثال سے سمجھایا جاسکتا ہے۔ آپ ریڈیو کے ریسیور کی سوئی کو گھماتے رہتے ہیں لیکن مطلوبہ اسٹیشن نہیں لگتا۔ بار بار گھمانے کے بعد اچانک اسٹیشن لگ جاتا ہے بار بار کی کوششوں سے بعض اوقات اسٹیشن نہیں لگتا لیکن بعض اوقات سوئی کو محض لاپرواہی سے گھمانے کے نتیجے میں اسٹیشن لگ جاتا ہے اور پروگرام آنے شروع ہو جاتے ہیں۔

انسانی دل ریڈیو کے ریسیور کے مانند ہے اور داعی کو چاہئے کہ وہ مایوس نہ ہو اور ریسیور کو گھماتا رہے۔ دلوں کو ٹٹولتا رہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت لوگوں کے دل اسے قبول کرنے کے لیے اچانک آمادہ ہو جائیں اور لوگ افق سے ذرا بلند دیکھنے لگ جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ انسان کی ہزار کوششیں ناکام رہیں اور ایک ہزار ایک نمبر پر کی جانے والی کوشش میں ہم منزل مقصود کو پالیں۔

یہ تو بہت آسان ہے کہ ایک داعی غضب میں آجائے' برہم ہو جائے کہ لوگ میری بات کو قبول کیوں نہیں کرتے۔ وہ لوگوں کو چھوڑ دے' آرام سے بیٹھ جائے' ٹھیک ہے اس کی برہمی دور ہو جائے گی۔ اس کے اعصاب ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ لیکن دعوت اور پھر دعوت اسلامی کا کیا ہو گا؟ کون واپس آئے گا اور جھٹلانے والی اور چھوڑی ہوئی قوم کو دعوت کون دے گا؟

اصل بات دعوت ہے۔ داعی کی شخصیت اصل مقصود نہیں ہے۔ اگر داعی برہم ہوتا ہے یا اس کا سینہ دق ہوتا ہے تو اسے صبر کرنا چاہئے اور اپنی راہ کو نہ چھوڑنا چاہئے۔ اس کی ذات کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ صبر کرے اور لوگوں کی باتوں پر دل کو تنگ نہ کرے۔ بے صبری کا مظاہرہ نہ کرے اور پھر لوگوں کی تکذیب اور لوگوں کی باتوں کی وجہ سے تو ایسا ہرگز نہ کرے۔

رہی داعی کی ذات تو اس کی حقیقت ہی کیا ہے۔ یہ تو دست قدرت کا ایک ہتھیار ہے۔ دعوت کا اصل کام اللہ خود

کرتا ہے۔وہی دعوت کا محافظ ہے۔داعی کو چاہئے کہ وہ ہر قسم کے حالات میں اپنے فریضہ کو پورا کرے۔ ہر فضا میں کام کے لیے راہیں نکالے۔انجام اللہ پر چھوڑ دے۔ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت ذوالنون کے قصے میں داعیان حق کے لیے ایک بہت بڑا سبق ہے۔ان کا فرض ہے کہ وہ اس سبق کو غور سے حاصل کریں۔ حضرت ذوالنون علیہ السلام نے جب توبہ کی' اپنے موقف پر نظر ثانی کی اور اپنے کام پر لوٹ آئے تو اس میں دعوت اسلامی کے کارکنوں کے لیے بہت بڑی عبرت ہے۔کیا مناسب نہیں ہے کہ داعیان حق اس پر تدبر کریں۔پھر حضرت یونس علیہ السلام کی دعا' اندھیروں کے اندر ان کی دعا اور اللہ کی طرف سے اس کی قبولیت میں داعیان حق کے لیے بھی ایک خوشخبری ہے۔کیا یہ نہیں کہا گیا۔

كَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۱ : ۸۸) "اور اسی طرح ہم مومنوں کو بچالیا کرتے ہیں"۔

اب حضرت زکریا اور یحییٰ علیہما السلام کے قصے کی طرف سرسری اشارہ اور حضرت زکریا کی دعا کی قبولیت :

وَ زَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَ وَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ؕ وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿۹۰﴾

"اور زکریا کو' جبکہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ "اے پروردگار' مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور بہترین وارث تو تو ہی ہے"۔ پس ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے یحییٰ عطا کیا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے درست کر دیا۔یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے' اور ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے"۔

حضرت یحییٰ کی پیدائش کا قصہ سورہ مریم اور سورہ آل عمران میں گزر چکا ہے' بڑی تفصیلات کے ساتھ۔یہاں دوسرے قصص کی طرح فقط اشارات ہی ہیں۔اس کا آغاز حضرت زکریا کی اس دعا سے ہوتا ہے۔

رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا (۲۱ : ۸۹) "پروردگار' مجھے اکیلا نہ چھوڑ"۔ کہ میرا کوئی وارث نہ ہو' جو میرے بعد ہیکل کے معاملات کا نگراں ہو۔ حضرت زکریا بنی اسرائیل کے ہیکل (عبادت گاہ) کے نگراں تھے۔یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے کا واقعہ ہے۔حضرت زکریا علیہ السلام یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ عبادات' مقامات عبادات اور تمام لوگوں کے اموال کا آخری وارث تو اللہ ہی ہے۔اسی لیے انہوں نے کہہ دیا۔

وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ (۲۱ : ۸۹) "اور بہترین وارث تو تو ہی ہے"۔لیکن ان کا اصل مدعا یہ تھا کہ ان کے بعد ان کے اہل و عیال کے لیے' ان کے دین کے لیے' اور ان کے مال کے لیے' ان کو اچھا جانشین ملے کیونکہ خلافت ارضی میں انسان ہی دست قدرت کا کام کرتا ہے۔

قبولیت دعا بھی فوراً ہی ہوتی ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَ وَهَبْنَا لَهُ يَحْيٰي وَ اَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ (۲۱ : ۹۰) "پس ہم نے اس کی دعا قبول کر لی۔اسے یحیٰ عطا کیا' اور اس کی بیوی کو اس کے لیے درست کر دیا"۔وہ بانجھ تھی ولادت کے قابل ہی نہ تھی لیکن یہاں دوسرے قصص کی طرح سیاق کلام میں اختصار کر کے قاری کو انجام یعنی استجابت دعا تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ (۲۱ : ۹۰) "یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے تھے"۔تو اللہ نے قبولیت دعا میں جلدی فرمائی۔

وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا (۲۱ : ۹۰) "اور ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے"۔رغبت اس لیے کہ اللہ راضی ہو جائے اور ڈر اس کا کہ اللہ ناراض نہ ہو جائے۔ان کے دل اللہ کے ساتھ پختہ رابطہ رکھتے تھے۔ اللہ کی رحمت کے وہ ہروقت امیدوار رہتے تھے۔

وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ (۲۱ : ۹۰) "اور وہ ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے"۔نہ تکبر کرتے تھے اور نہ ہمارے مقابلے میں زور آور تھے۔یہ تھیں وہ صفات جن کی وجہ سے حضرت زکریا' بیگم زکریا علیہ السلام اس بات کے مستحق ہوئے کہ انہیں غیر معمولی طور پر یحیٰ جیسا غیر معمولی لڑکا دیا جائے۔یوں یہ ایک مبارک خاندان تھا' اللہ کی رحمت و رضا کا مستحق۔

سب سے آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے ان کی والدہ حضرت مریمؑ کا ذکر بھی آتا ہے' اسی اختصار کے ساتھ۔

وَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَ جَعَلْنٰهَا وَ ابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴿۹۱﴾

"اور وہ خاتون جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی۔ہم نے اس کے اندر اپنی روح سے پھونکا اور اسے اور اس کے بیٹے کو دنیا بھر کے لیے نشانی بنا دیا"۔

یہاں مریم کے نام کو بھی حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ انبیاء کے تذکرے کے سلسلے میں ان کے بیٹے کا ذکر اصل مقصود تھا۔آپ کا تذکرہ ان کے حالات کے ذیل میں آ گیا اور آپ کی صرف اس صفت کو یہاں دہرایا گیا جس کا تعلق آپ کے بیٹے کے ساتھ ہے۔

وَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (۲۱ : ۹۱) "جس نے اپنی عفت کی حفاظت کی"۔یعنی اس نے اسے

کسی قسم کی مباشرت سے بچایا۔ احصان اپنے قانونی استعمال میں نکاح کے لیے استعمال ہوتا ہے کیونکہ شادی شدہ ہونا دراصل فحاشی سے بچنے اور پاکدامنی اختیار کرنے کی بہترین صورت ہے۔ یہاں یہ لفظ اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی اپنے آپ کو ہر قسم کی مباشرت سے بچانا خواہ قانونی یا غیر قانونی ہو۔ یہ اس لیے کہ یہودیوں نے حضرت مریم پر بدکاری کا الزام لگایا اور انہیں یوسف نجار کے ساتھ متہم کیا تھا جو ہیکل کا ایک خدمتگار تھا۔ متداولہ انجیلیں اس بارے میں یہ کہتی ہیں کہ یوسف نجار نے مریم کے ساتھ نکاح کر لیا تھا لیکن ابھی رخصتی نہ ہوئی تھی اور وہ ان کے قریب نہ گیا تھا۔

جب اس نے پاکدامنی اور عفت اختیار کی فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا (۲۱ : ۹۱) "ہم نے اس کے اندر اپنی روح پھونک دی"۔ نفخ روح یہاں بھی عام ہے' اس کا تعین نہیں ہے۔ جس طرح سورہ تحریم میں آرہا ہے۔ سورہ مریم میں ہم اس کی تفصیلات دے چکے ہیں۔ فی ظلال القرآن میں ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم آیات الٰہی تک اپنی بات کو محدود رکھتے ہیں۔ اس لیے یہاں بھی ہم تفصیلات میں نہیں جاتے۔ آیات کے ساتھ ساتھ ہی ہم آخر تک جاتے ہیں۔

وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ (۲۱ : ۹۱) "اور اسے اور اس کے بیٹے کو دنیا بھر کے لیے نشانی بنا دیا"۔ یہ ایک ایسا معجزہ اور ایسی نشانی تھی کہ نہ اس سے پہلے ایسا واقعہ ہوا نہ بعد میں ہو گا۔ پوری انسانی تاریخ میں یہ واحد مثال ہے۔ یہ واقعہ اپنی مثال آپ' اس لیے بنا دیا گیا کہ پوری انسانیت کے غور و فکر کے لیے یہ ایک واقعہ ہی کافی ہے۔ دست قدرت اپنے بنائے ہوئے قوانین قدرت کے مطابق کام کرتا ہے مگر اللہ اپنے بنائے ہوئے قوانین کا خود پابند نہیں ہے۔

رسولوں کے اس سلسلے کے بیان کے آخر میں' جس میں رسولوں کی مثالیں' ان کی آزمائشوں کی مثالیں' ان پر اللہ کی رحمتوں کی مثالیں دی گئیں' اب قرآن مجید ایک جامع بات بطور خلاصہ کلام بیان کرتا ہے۔

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ﴿٩٢﴾

"یہ تمہاری امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں' پس تم میری عبادت کرو"۔

انبیاء کا گروہ ایک ہی امت اور ایک ہی جماعت ہے۔ اس کا نظریہ بھی ایک ہے اور وہ سب ایک ہی نظام زندگی کی طرف دعوت دیتے رہے ہیں۔ ان سب کا رخ اللہ ہی کی طرف ہے۔ زمین پر وہ ایک امت ہیں اور آسمانوں پر ان سب کا خدا ایک ہے۔ ان سب کا شعار صرف یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اس طرح اس سورہ کے ساتھ سبق کا یہ آخری تبصرہ بھی ہم آہنگ ہو جاتا ہے یہ کہ تمام پیغمبر کلمہ توحید کی طرف دعوت دیتے رہے ہیں اور اس پوری کائنات کا نظام اس پر شاہد عادل ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۴۳ ایک نظر میں

یہ اس سورہ کا آخری سبق ہے ' پہلے اسباق میں اس کائنات کے اندر جاری تکوینی قوانین قدرت کا ذکر تھا ' جو اس بات کے لیے نشانی تھے کہ اس کائنات کا خالق ایک ہے ۔ جن قوانین کے مطابق اللہ تعالیٰ رسولوں کو بھیجتا ہے ' وہ بھی ایک ہیں اور بتاتے ہیں کہ تمام رسولوں کا عقیدہ ایک ہی تھا ۔ اس سبق میں مناظر قیامت اور اس کی علامات کا ذکر ہے ۔ اس منظر میں مشرکین اور اللہ کے ساتھ ٹھہرائے ہوئے شرکاء کا انجام بتایا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ وحدہ متصرف اور متدبر ہے جو پوری کائنات کو چلا رہا ہے ۔

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر اقتدار اعلیٰ عطا کرنے کے لیے بھی قوانین اور سنن الٰہیہ جاری کر رکھے ہیں اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا بھیجا جانا ' اس دنیا پر درحقیقت اللہ کی رحمت ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ وہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں اور ان سے دست بردار ہو جائیں تاکہ یہ لوگ اپنے اللہ کے مقرر کردہ قدرتی انجام تک پہنچ جائیں ۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ ان کے کفر ' تکذیب اور استہزاء پر اللہ سے معاونت طلب کریں ۔ انہیں چھوڑ دیں کہ یہ کھیل کود میں مصروف رہیں ۔ یوم الحساب تو دور نہیں ہے ۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۴۳ تشریح آیات

## ۹۳ --- تا --- ۱۱۲

وَتَقَطَّعُوٓا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ ۖ كُلٌّ إِلَيْنَا رَٰجِعُونَ ﴿٩٣﴾ فَمَن يَعْمَلْ ۱۸ع
مِنَ ٱلصَّٰلِحَٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِۦ وَإِنَّا لَهُۥ كَٰتِبُونَ ﴿٩٤﴾ وَ
حَرَٰمٌ عَلَىٰ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَٰهَآ أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿٩٥﴾

"مگر (یہ لوگوں کی کارستانی ہے کہ) انھوں نے آپس میں اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ سب کو ہماری طرف پلٹنا ہے۔ پھر جو نیک عمل کرے گا' اس حال میں کہ وہ مومن ہو' تو اس کے کام کی ناقدری نہ ہوگی' اور اسے ہم لکھ رہے ہیں۔ اور ممکن نہیں ہے کہ جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا ہو وہ پھر پلٹ نہ آئے"۔

رسولوں کا ایک گروہ ہے۔ یہ ایک ہی نظریہ پر قائم ہے اور ان کی امت بھی ایک ہی امت ہے۔ اس امت کی بنیاد کلمہ طیبہ اور توحید پر ہے۔ اس کی شہادت اس پوری کائنات میں جاری و ساری قوانین قدرت بھی دیتے ہیں۔ یہی وہ بنیادی کلمہ ہے جس کی طرف ابتداء سے لے کر انتہاء تک تمام رسولوں نے لوگوں کو بلایا ہے۔ اسلام کا یہ اصل کبیر ہے۔ ہاں مختلف رسولوں کے ہاں قائم ہونے والا مفصل نظام زندگی اور نظام قانون بہرحال مختلف ادوار میں مختلف رہا ہے۔ مختلف ادوار میں نظام قانونی اقوام کی استعداد اور ان کے درجہ ترقی کی مناسبت سے تشکیل پایا ہے۔ اس میں ان اقوام کے تجربات اور ان کی ذہنی ترقی اور قوت ادراک کو مدنظر رکھا جاتا رہا ہے۔ حیات' وسائل زندگی اور لوگوں کے باہم ارتباط کے طور طریقوں' سب کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

باوجود اس کے کہ رسول ایک تھے' ان کا نظریہ حیات اور عقیدہ ایک تھا' بعد میں آنے والے ان کے متبعین نے اس ایک ہی دین' نظریہ اور نظام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ہر گروہ دین کا ایک ایک ٹکڑا لے کر علیحدہ ہو گیا اور اس کے بعد ان گروہوں کے درمیان اختلافات زیادہ ہو گئے' عداوت شروع ہو گئی' دشمنی اس قدر بڑھی کہ جنگ و جدال شروع ہو گئی اور لوگ دینی عقائد کی وجہ سے ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے حالانکہ عقائد ایک تھے' کیونکہ امت ہی ایک تھی۔

انھوں نے دنیا میں تو اپنے ایک دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے لیکن ان کو یہ خیال نہیں ہے کہ یہ سب کے سب

قیامت کی طرف بڑی جلدی سے بڑھ رہے ہیں۔

كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ (۲۱:۹۳) "سب کو ہماری طرف پلٹنا ہے"۔ کیونکہ لوٹنے کی جگہ تو اللہ کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں۔ اللہ ہی ان سے حساب و کتاب لینے والا ہے' اور اس کو علم ہے کہ ان میں حق پر کون ہے اور باطل پر کون ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَ اِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ

(۲۱:۹۴) "پھر جو نیک عمل کرے گا اس حال میں کہ وہ مومن ہو' تو اس کے کام کی ناقدری نہ ہوگی اور اسے ہم لکھ رہے ہیں"۔ یہ ہے قانون عمل اور جزائے عمل۔ عمل صالح اگر قاعدہ ایمان کے اوپر مبنی ہو تو نہ اس کا انکار ہوگا اور نہ اس کی ناقدری ہوگی۔ وہ اللہ کے ہاں لکھا جا چکا ہوگا اور اس میں سے کوئی چیز لکھنے سے چھوٹ نہیں سکتی۔

اور ایمان پر مبنی ہونا اس لیے ضروری ہے کہ ایمان اور عمل کی قدر و قیمت ہو' اگر ایمان نہ ہو تو عمل صالح ایمان موجود ہی نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ عمل صالح ایمان کا ثمرہ ہو بلکہ وہ ایمان کا ثبوت ہو۔ ایمان زندگی کی بنیاد ہے کیونکہ ایمان دراصل انسان اور اس کائنات کے درمیان حقیقی رابطہ ہے۔ ایسا رابطہ جو اس کائنات کو اور اس کے اندر تمام موجودات کو خالق واحد کے ساتھ مربوط کر دیتا ہے۔ پھر یہ سب کچھ اس ناموس قدرت کی طرف پھر جاتا ہے جس کے مطابق پوری کائنات چل رہی ہے۔ اور جب تک پختہ اساس نہ ہوگی اس وقت تک اس کے اوپر عمارت کھڑی ہی نہیں ہو سکتی۔ عمل صالح کی مثال اونچی بلڈنگ کی ہے۔ اگر یہ اونچی عمارت کسی مضبوط اساس پر نہ اٹھائی جائے تو وہ کسی بھی وقت دھڑام سے گر جاتی ہے۔

پھر عمل صالح ہمیشہ اس ایمان کا ثمر ہوتا ہے جو اگرچہ دلوں میں ہو لیکن زندہ ایمان ہو۔ اسلام کس چیز کا نام ہے؟ یہ ایک متحرک عقیدہ ہے۔ جس وقت یہ متحرک عقیدہ ضمیر میں اچھی طرح بیٹھ جاتا ہے تو پھر وہ جسم انسانی سے عمل صالح کی شکل میں نمودار ہوتا ہے بلکہ عمل صالح دراصل ایمان کا ایک پختہ پھل ہوتا ہے۔ یہ پھل لگتا ہی تب ہے اور پختہ بھی تب ہی ہوتا ہے جب درخت زمین کے اندر گہرائی میں جانے والی جڑوں پر کھڑا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم جب عمل اور جزاء کا ذکر کرتا ہے تو وہ ایمان اور عمل کو ایک ساتھ لاتا ہے لہٰذا ایسے ایمان پر کوئی جزاء نہیں ہے جو منجمد ہو' بالکل بجھا ہوا ہو اور اس کے ساتھ بالکل کوئی پھل نہ لگتا ہو۔ اسی طرح اس عمل پر جزاء نہیں ہے جو ایمان سے کٹا ہوا ہو۔

بعض اوقات بغیر ایمان کے بھی ایک اچھا عمل دیکھا جاتا ہے' لیکن یہ ایک عارضی اتفاق ہوتا ہے' کیونکہ یہ عمل ایک مکمل نقشے کے مطابق نہیں ہوتا۔ نہ کسی قاعدے اور قانون پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ دراصل بعض اوقات ایک عارضی جذبے یا عارضی خواہش کے مطابق ظاہر ہو جاتا ہے اور اس کی پشت پر کوئی حقیقی باعث یا سبب نہیں ہوتا جو اس کائنات کے اندر کوئی حقیقت رکھتا ہو۔ مضبوط حقیقت یہ ہے کہ عمل صالح خدائے ذوالجلال کی رضامندی کے لیے کیا جائے۔ ایسا ہی عمل دراصل تعمیری عمل ہوتا ہے۔ ایسا ہی عمل اس کمال اور ترقی کا سبب بنتا ہے جو اللہ نے اس دنیا کی زندگی کی ترقی کے لیے

طے کیا ہے۔ پس عمل صالح وہ بامقصد تحریک ہے جو اس زندگی کے مقصد کے ساتھ منسلک ہوتی ہے۔ محض عارضی جذبہ یا محض اتفاقی اثر اس کا باعث نہیں ہوتا بلکہ وہ بامقصد عمل ہوتا ہے۔ پھر یہ عمل ایسا ہو کہ جس طرح یہ پوری کائنات خالق کائنات کے قانون قدرت کے مطابق چل رہی ہے اسی طرح وہ عمل بھی خالق کائنات کے قانون انسانی اور قانون فطرت کے مطابق ہو۔ دونوں کے درمیان مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہو۔

عمل کی مکمل جزاء تو آخرت میں ملتی ہے اگرچہ اس کا ایک حصہ اس دنیا میں بھی مل جائے۔ جن بستیوں کو دنیا میں ہلاک کیا گیا ان کو ان کی بداعمالیوں کی سزا آخرت میں بھی ملے گی۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ان کو میدان حشر میں نہ اٹھایا جائے۔ لازماً حشر کے میدان میں یہ سب لوگ اٹھائے جائیں گے۔

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (۲۱: ۹۵) "اور ممکن نہیں ہے کہ جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا وہ پلٹ کر نہ آئے گی"۔

یہاں ہلاک شدہ بستیوں کا ذکر فرمایا جاتا ہے' خصوصیت کے ساتھ' اس لیے کہ اس سے قبل کہا گیا تھا کہ

كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ (۲۱: ۹۳) "سب ہماری طرف پلٹ کر آنے والے ہیں"۔ بعض اوقات ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ جن بستیوں کو دنیا میں ہلاک کر دیا گیا ہے شاید وہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئیں اور وہ پلٹ کر نہ آئیں گی اور ان کا حساب و کتاب ختم ہو گیا اس لیے یہاں دوبارہ تاکید کی جاتی ہے کہ یہ بستیاں ضرور واپس لوٹ کر قیامت میں آئیں گی اور نہ ان کا آنا حرام ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ہلاک شدہ بستیاں نہ آئیں۔ یہ انداز کلام ذرا عجیب و غریب ہے۔ اس لیے بعض مفسرین نے یہ تاویل کی ہے کہ "لا" یہاں زائد ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ جب ان بستیوں کو نابود کر دیا گیا تو پھر وہ واپس نہیں آسکتیں۔ بعض نے یہ تاویل کی ہے کہ اس ہلاکت کے بعد ان کا رجوع ہدایت کی طرف نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں تاویلوں کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ نص قرآنی کی وہی تفسیر بہتر ہے جو اس کی ظاہری ترکیب کے مطابق ہو اور سیاق کلام میں اس مفہوم کے لیے قرینہ بھی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔

اس کے بعد مناظر قیامت میں سے ایک منظر کو یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ اس منظر کا آغاز اس علامت سے کیا جاتا ہے کہ جس کا ظہور قرب قیامت کے زمانے میں ہو گا۔ وہ ہے یاجوج اور ماجوج کا کھل کر ٹوٹ پڑنا۔

حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۹۷﴾ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ

وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿١٠٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿١٠١﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٢﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿١٠٣﴾ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاۗءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۭ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿١٠٤﴾

"یہاں تک کہ جب یاجوج و ماجوج کھول دیے جائیں گے اور ہر بلندی سے وہ نکل پڑیں گے اور وعدۂ برحق کے پورا ہونے کا وقت قریب آ لگے گا تو یکایک ان لوگوں کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ جائیں گے جنہوں نے کفر کیا تھا۔ کہیں گے "ہائے ہماری کم بختی' ہم اس چیز کی طرف سے غفلت میں پڑے ہوئے تھے' بلکہ ہم خطاکار تھے"۔ بے شک تم اور تمہارے وہ معبود جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے ہو' جہنم کا ایندھن ہیں' وہیں تم کو جانا ہے۔ اگر یہ واقعی خدا ہوتے تو وہاں نہ جاتے۔ اب سب کو ہمیشہ اسی میں رہنا ہے۔ وہاں وہ پھنکارے ماریں گے اور حال یہ ہو گا کہ اس میں کان پڑی آواز نہ سنائی دے گی۔ رہے وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے بھلائی کا پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہو گا' تو وہ یقیناً اس سے دور رکھے جائیں گے' اس کی سرسراہٹ تک نہ سنیں گے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اپنی من بھاتی چیزوں کے درمیان رہیں گے' وہ انتہائی گھبراہٹ کا وقت ان کو ذرا پریشان نہ کرے گا اور ملائکہ بڑھ کر ان کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ "یہ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

وہ دن جب کہ آسمان کو ہم یوں لپیٹ کر رکھ دیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیے جاتے ہیں۔ جس طرح پہلے ہم نے تخلیق کی ابتداء کی تھی اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ایک وعدہ ہے ہمارے ذمے' اور یہ کام ہمیں بہرحال کرنا ہے"۔

سورہ کہف میں قصہ ذوالقرنین کے بیان میں ہم نے یہ کہا تھا "یاجوج اور ماجوج کے کھلنے کے ساتھ قرب قیامت کے وقت کا جو ذکر آتا ہے' ہو سکتا ہے کہ قرب قیامت تاتاریوں کے نکلنے سے واقع ہو گیا ہو' تاتاری نکلے اور آناً فاناً شرق و غرب پر چھا گئے اور انہوں نے تمام ممالک اور بادشاہوں کو روند ڈالا اس لیے کہ قرآن نے حضور اکرمؐ کے زمانے ہی میں کہہ دیا تھا کہ وَ اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ "قیامت قریب آگئی"۔ نیز قیامت کے قریب ہونے سے بھی "قریب" کا تعین نہیں ہوتا کیونکہ زمانے کا حساب انسانوں کے نزدیک اور اللہ کے نزدیک بالکل مختلف ہے۔ اللہ کے ہاں ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے"۔

یہاں اس دن کے مناظر بتائے جا رہے ہیں جب وہ آ جائے گا اور اس دن کے آنے سے قبل زمین کے اندر جو واقعات ہوں گے وہ یہ کہ یاجوج اور ماجوج ہر طرف سے پھوٹ پڑیں گے اور ہر بلندی سے وہ ٹوٹ پڑیں گے۔ قرآن کریم کا یہ خاص انداز ہے کہ وہ زمین کے مالوف مناظر کو پیش کر کے انسان کو اخروی مناظر کی طرف لے جاتا ہے۔

یہاں قیامت کا جو منظر پیش کیا جارہا ہے اس میں سرپرائز دینے کا ایک عنصر ہے۔اس منظر کو اچانک دیکھ کر لوگ مبہوت رہ جائیں گے۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔

فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۲۱ : ۹۷) "یکایک ان لوگوں کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ جائیں گے جنہوں نے کفر کیا تھا"۔ یہ منظر اس قدر اچانک ہو گا کہ اس کے خوف کی وجہ سے لوگوں کو کچھ نظر ہی نہ آئے گا۔ یہاں قرآن کریم نے ابصار سے پہلے شاخصہ کا لفظ رکھا ہے تاکہ اس منظر کو اچھی طرح ذہن نشین کر دے۔اب ان کے حالات اور ان کی حالت کو چھوڑ کر قرآن ان کے مکالمے کو نقل کرتا ہے۔اس طرح یہ منظر اسکرین پر واضح ہو کر آتا ہے۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۲۱ : ۹۷) "کہیں گے ہائے! ہماری کم بختی، ہم اس چیز کی طرف سے غفلت میں پڑے ہوئے تھے بلکہ ہم خطاکار تھے"۔ یہ ہے فریاد اس شخص کی جس پر غیر متوقع طور پر کوئی مصیبت آجائے۔ایک خطرناک حقیقت اچانک اس پر کھل جائے۔وہ دہشت زدہ ہو جائے۔دیدے پھٹے کے پھٹے رہ جائیں۔دیکھے مگر نظر نہ آئے۔آخر کار چیخ اٹھے کہ مارے گئے۔اعتراف گناہ کرلے۔نادم ہو جائے مگر بعد از وقت۔

جب اچانک پکڑے جائے، دہشت زدہ ہونے، اور حواس بحال ہونے کے بعد اعتراف ہوتا ہے تو حکم الٰہی فی الفور صادر ہوتا ہے۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ (۲۱ : ۹۸)
"بے شک تم اور تمہارے وہ معبود جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، جہنم کا ایندھن ہو، وہیں تم کو جانا ہے"۔ اچانک یہ لوگ اب میدان حشر میں پہنچا دیئے جاتے ہیں۔یہ جہنم کے دھانے پر کھڑے ہیں۔بڑی بے دردی کے ساتھ فرشتے ان کو اور ان کے معبودوں کو پکڑتے ہیں اور جہنم میں پھینکتے ہیں۔وہاں پھینکے جاتے ہیں اور ایندھن کے ساتھ ایندھن ہو کر جلتے جاتے ہیں۔صرف اس منظر سے ان کے خلاف استدلال، وجدانی استدلال کیا جاتا ہے کہ اگر یہ الٰہ ہوتے تو وہ جہنم کا ایندھن نہ بنتے۔یہ ہے واقعی وجدانی دلیل۔

لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا (۲۱ : ۹۹) "اگر یہ واقعی خدا ہوتے تو وہاں نہ جاتے"۔ یہ منظر ان کے سامنے تو قرآن اس دنیا میں پیش کر رہا ہے، لیکن اس طرح کہ گویا یہ منظر ہو کر گزر گیا ہے۔وہ عملاً جہنم کے دھانے تک پہنچ گئے اور وہاں ڈال دیئے گئے تو اب جہنم میں ان کا جو حال ہے، وہ پیش کر دیا جاتا ہے۔اس طرح کہ جس طرح کوئی عملاً ایسے حالات میں پڑا ہو۔

وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۱ : ۹۹) لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ

(۲۱ : ۱۰۰) "اب سب کو ہمیشہ اسی میں رہنا ہے۔وہاں وہ پھنکارے ماریں گے اور حال یہ ہو گا کہ اس میں کان پڑی آواز نہ سنائی دے گی"۔ اب ذرا ان کو یہاں ہی چھوڑیئے اور آیئے دیکھیں مومنین کا حال کیسا ہے۔ان کے

حق میں تو فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ کامیابی اور نجات ان کا مقدر ہو چکی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ (۲۱:۱۰۱) لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنْفُسُهُمْ خَالِدُونَ (۲۱:۱۰۲) "رہے وہ لوگ جن کے بارے میں ہماری طرف سے بھلائی کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے تو وہ یقیناً اس سے دور رکھے جائیں گے۔ اس کی سرسراہٹ تک نہ سنیں گے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ من بھاتی چیزوں میں رہیں گے"۔ لفظ حَسِيسَهَا ان الفاظ میں سے ہے جو اپنے صوتی ترنم سے اپنے مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ لفظ آگ کی اس آواز کو ظاہر کرتا ہے جو جلتی ہے اور جلاتی ہے اور سرسری آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ ایسی آواز ہے کہ اس کے تصور سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس پر اس کے بارے میں سوچتے ہی کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان جن کے بارے میں اچھا فیصلہ صادر ہو چکا ہے اس آواز کو بھی نہ سنیں گے۔ دیکھیں گے بھی نہیں کیونکہ وہ اس دن کے عظیم جزع و فزع سے نجات پا چکے ہیں۔ وہ ایسے باغات میں ہوں گے جن میں ان کو تمام مرغوبات فراہم ہوں گی۔ ملائکہ انہیں ہر طرف سے اچھا کہیں گے اور ان کے ساتھ رہیں گے تاکہ یہ لوگ اس دن کے خوف و ہراس سے متاثر نہ ہوں۔

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ هَٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ (۲۱:۱۰۳) "وہ انتہائی گھبراہٹ کا وقت ان کو پریشان نہ کرے گا۔ اور ملائکہ بڑھ کر ان کو ہاتھوں میں لیں گے کہ یہ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا"۔

اس منظر کو اس کائنات کے خاتمے کے منظر پر ختم کیا جاتا ہے' یہ کائنات اس دن کی طرف لوٹتی ہے۔ اس دن کے خوفناک منظر میں جس طرح تمام لوگوں کے دل اس خوف کی گرفت میں ہیں اس طرح پوری کائنات بھی اس خوف و ہراس کی گرفت میں ہے۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (۲۱:۱۰۴) "وہ دن جب آسمان کو ہم یوں لپیٹ کر رکھ دیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیئے جاتے ہیں۔ آسمان اس طرح لپیٹ دیا جائے گا جس طرح ریکارڈ کیپر ریکارڈ کو لپیٹ کر رکھ دیتا ہے۔ اب یہ منظر ختم ہوتا ہے اور یہ کائنات اس طرح لپیٹ دی جاتی ہے جس طرح ہمارے کاغذات۔ اب کیا ہے ایک نئی دنیا اور ایک نئی کائنات اور نیا جہاں۔

كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ (۲۱:۱۰۴) "جس طرح ہم نے پہلے تخلیق کی ابتداء کی اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ایک وعدہ ہے ہمارے ذمے اور یہ کام ہمیں بہرحال کرنا ہے"۔

--- ○○○ ---

کائنات کے خاتمہ کے اس خوبصورت منظر کو پیش کرنے کے بعد اور آخرت میں دوبارہ جہان کو پیدا کرنے کے لیے ' روئے سخن پھر اس زمین کی طرف مڑ جاتا ہے ۔ اللہ کی اٹل سنت بیان کی جاتی ہے کہ اس دنیا کے اقتدار اعلیٰ کی وراثت کا حق میرے صالح بندوں کا ہے اور یہ حق ان کو اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کی بندگی کر کے اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کر چکے ہیں ۔ ان دونوں مناظر کے درمیان پورا ربط ہے ۔ آخرت بھی نیک بندوں کی اور دنیا بھی نیک بندوں کی ۔

وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ۝

"اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے" ۔

زبور ایک الہامی کتاب تھی جو داؤد علیہ السلام کو دی گئی تھی ۔ اس سورہ میں ذکر سے مراد تورات ہوگی ۔ جو زبور سے پہلے نازل ہوئی ۔ یہ کتاب کی صفت ہے یعنی کتاب کا ایک ٹکڑا ۔ اصل کتاب کا حصہ بمعنی لوح محفوظ ' جو ایک مکمل نظام ہے ' جو ایک مکمل مرجع ہے اور اس کائنات کے ساتھ متعلق تمام قوانین اس کے اندر محفوظ ہیں ۔ اس کا حصہ ہیں ۔

بہرحال اصل زیر غور مسئلہ یہ ہے کہ اس سے مراد کیا ہے ۔

وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ

(۲۱ : ۱۰۵) "اور زبور میں نصیحت کے بعد ہم نے لکھ دیا کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے" ۔

وراثت کیا ہے ' اس سے مراد یہ ہے کہ اس زمین کی وراثت اور اقتدار اعلیٰ کے بارے میں سنت الہیہ کیا ہے ؟ یہ کہ یہاں اقتدار میرے صالح بندوں کو ملے گا ۔ اب سوال یہ ہے کہ صالح بندے کون ہیں ؟

اللہ نے زمین پر آدم کو خلیفہ بنایا تاکہ وہ اس زمین کی تعمیر کرے اور اس کی اصلاح کرے ۔ اس کو ترقی دے اور اس کے اندر جو خزانے ودیعت کیے ہوئے ہیں ' ان سے استفادہ کرے ' اس کے اندر جو طبیعی قوتیں ہیں ان کو کام میں لائے اور اس ترقی کو اپنی انتہا تک پہنچائے جہاں تک اللہ چاہے ۔

اس خلافت فی الارض کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک منہاج بھی انسان کو دے دیا ' جس کے مطابق انسان نے زمین پر کام کرنا ہے ۔ یہ منہاج نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی آخری رسالت میں مکمل و مفصل کر دیا ہے اور اس کے لیے قوانین اور ضوابط مقرر کر دیئے ہیں ۔ اس کے لیے ان قوانین میں مکمل ضمانت ہے ۔

اس نظام کے مقاصد میں صرف یہ بات ہی شامل نہیں ہے کہ انسان زمین کے اندر موجود ذخائر کو کام میں لا کر مادی ترقی پر زور دیتا رہے بلکہ انسانی عقل اور انسانی ضمیر اور اس کی روح کو بھی ترقی دے ۔ تاکہ اس دنیا میں انسان نے جس قدر مادی اور روحانی ترقی کرنی ہے وہ اس کے آخر تک پہنچ جائے ۔ یہ نہ ہو کہ دنیا میں مادی ترقی کرتے کرتے وہ خود محض حیوان بن کر تنزل کا شکار نہ ہو جائے ۔ مادی ترقیات تو آسمانوں کو چھو رہی ہوں اور انسان کی انسانیت پستیوں کی آخری حدوں پر ( --------) میں ہو ۔

جب انسان اسلامی نظام زندگی کے مطابق منصب خلافت کے فرائض ادا کرتے ہوئے راہ ترقی پر گامزن ہو ' تو اس

راہ میں مادی ترقی اور روحانی ترقی کا توازن کبھی کبھی بگڑ بھی جاتا ہے ۔ کبھی ایک پلڑا بھاری ہو جاتا ہے اور کبھی دوسرا ۔ اور توازن باقی نہیں رہتا ۔ بعض اوقات اقتدار کے سرچشموں پر ڈکٹیٹر ' ظالم اور سرکش لوگ قابض ہو جاتے ہیں ۔ کبھی ان مناصب پر حت جاہل ' اجڈ اور مہم جو قابض ہو جاتے ہیں 'کبھی ان مناصب پر کفار اور فجار خالص ہو جاتے ہیں جو پوری دنیا کا مادی اور اخلاقی استحصال کرتے ہیں لیکن یہ صرف راستے کے تجربے ہوتے ہیں ۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ زمین کے مناصب کی وراثت اللہ کے صالح بندوں کے لیے ہے ۔ جن کا ایمان بھی مکمل ہو اور عمل بھی درست ہو ۔ ان کی زندگی میں ایمان اور عمل صالح دونوں بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے ہوں ۔

امت میں جب بھی ایمان اور عمل اسلامی معیار کے مطابق جمع ہوئے ہیں 'تاریخ کے کسی بھی موڑ میں 'تو زمین صالح بندوں کی وراثت بنی ہے لیکن جب ایمان و عمل میں جدائی ہوئی ہے یعنی ایمان نہیں رہا یا عمل نہیں رہا 'تو یہ وراثت ان کے ہاتھ سے چلی گئی ہے ۔ بعض اوقات ایسے لوگوں کو غلبہ مل جاتا ہے جو محض مادی وسائل پر تکیہ کرتے ہیں ۔ جو لوگ محض زبانی کلامی مومن ہوتے ہیں وہ پیچھے رہ جاتے ہیں ۔ نیز بعض اوقات اہل ایمان کے اندر رسمی ایمان تو ہوتا مگر وہ صحیح ایمان نہیں ہوتا جو انسان کو صحیح عمل پر آمادہ کرے اور دنیاوی ترقی کرے تو ایسی صورت میں بھی محض مادی ترقی کرنے والے لوگ زمین کے اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں ۔ اس لیے کہ اہل ایمان ' ایمان کے ان تقاضوں کو پورا نہیں کر رہے ہوتے جو خلافت فی الارض کے اونچے مقام کے لیے اسلامی نظام کی شکل میں اللہ نے اہل ایمان کے لیے وضع کیے ہیں ۔

تحریک اسلامی کے کارکنوں پر اس وقت ایک ہی فرض ہے ' وہ یہ کہ وہ اپنے دلوں میں ایمان کا حقیقی مفہوم پیدا کریں ۔ ایمان کا حقیقی مفہوم عمل صالح ہے ۔ پھر خلافت فی الارض کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے ۔ اس کے بعد پھر اللہ کی سنت اپنے ظہور میں ایک لمحہ بھی دیر نہیں کرتی ۔

انّ الْارض یرثُها عبادی الصّٰلحُوْنَ (۲۱:۱۰۵) "زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے "۔ اب آخر میں عقل و خرد کی تاروں پر اسی مضراب کی ضربات لگتی ہیں جن کے نغمات سورہ کے آغاز میں سنے گئے تھے ۔

إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ ﴿١٠٦﴾ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴿١٠٧﴾
قُلْ إِنَّمَا يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴿١٠٨﴾ فَإِن
تَوَلَّوْا فَقُلْ آذَنتُكُمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۖ وَإِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ أَم بَعِيدٌ مَّا
تُوعَدُونَ ﴿١٠٩﴾ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ ﴿١١٠﴾ وَإِنْ
أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿١١١﴾ قَالَ رَبِّ احْكُم بِالْحَقِّ ۗ وَ
رَبُّنَا الرَّحْمَٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿١١٢﴾ ع ۱۹

"اس میں ایک بڑی خبر ہے عبادت گزار لوگوں کے لیے ۔ اے نبیؐ" ہم نے تو تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے ۔ ان سے کہو "میرے پاس جو وحی آتی ہے وہ یہ ہے کہ تمہارا خدا صرف ایک خدا ہے ' پھر کیا تم سر اطاعت جھکاتے ہو؟" اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دو کہ "میں نے علی الاعلان تم کو خبردار کر دیا ہے ۔ اب یہ میں نہیں جانتا کہ وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے قریب ہے یا دور ۔ اللہ وہ باتیں بھی جانتا ہے جو با آواز بلند کی جاتی ہیں اور وہ بھی جو تم چھپا کر کرتے ہو ۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید یہ (دیر) تمہارے لیے ایک فتنہ ہے اور تمہیں ایک وقت خاص تک کے لیے مزے کرنے کا موقع دیا جا رہا ہے" ۔ (آخر کار) رسولؐ نے کہا کہ "اے میرے رب ' حق کے ساتھ فیصلہ کر دے اور لوگو ' تم جو باتیں بناتے ہو ' ان کے مقابلے میں ہمارا رب رحمٰن ہی ہمارے لیے مدد کا سہارا ہے" ۔

إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ (۲۱ : ۱۰۶) "اس میں ایک بڑی خبر ہے عبادت گزار لوگوں کے لیے" ۔ یعنی قرآن کی تعلیمات میں اس پوری کائنات اور انسانی زندگی کے لیے جو اصول وضع کیے گئے ہیں اور پھر لوگوں کے لیے دنیا (آیت ۱۰۵) اور آخرت میں جو فطری انجام بتائے گئے ہیں ' جو اصول عمل اور مکافات عمل رکھے گئے ہیں ان سب میں ان لوگوں کے لیے بڑی خوشخبری ہے ۔ صرف ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی ہدایات کے مطابق کام کرنے کے لیے تیار ہوں ۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ نے لفظ "عابدین" استعمال کیا ہے کیونکہ عبادت کرنے والا ' بندگی کرنے والا شخص ہر بھلائی کو قبول کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہوتا ہے اور تدبر کر کے اس سے نفع اٹھا سکتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انسانیت کے لیے ایک ہادی بنا کر بھیجا ہے تاکہ وہ لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اللہ کی راہ کی طرف لے آئیں ۔ لیکن ہدایت تو وہی پاتے ہیں جو ہدایت پانے کے لیے تیار ہوں ' ارادہ کریں ' اگرچہ اللہ کی رحمت مومنین اور غیر مومنین دونوں کے لیے عام ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جو نظام اور جو منہاج لے کر آئے ہیں وہ اس دنیا میں بھی پوری انسانیت کے لیے سعادت مندی کا باعث ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت اس دور میں آئی جس دور میں انسانیت سن رشد اور بلوغ کو پہنچ گئی تھی ۔ یہ رسالت ایک کھلی کتاب کی صورت مین آئی اور یہ کتاب اور یہ رسالت تمام آنے والی نسلوں کے لیے ایک ایسا نظام زندگی پیش کرتی ہے جس میں کسی تبدیلی کی آئندہ بھی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ نظام انسان کی ان تمام ضروریات کو پورا کرتا ہے جو قیامت تک اسے پیش آسکتی ہیں ۔ یہ نظام اس خالق کا ارسال کردہ ہے ' جو انسانوں کی ضروریات کو خود انسانوں سے زیادہ جانتا ہے ' کیونکہ وہ لطیف و خبیر ہے ۔

اللہ نے قرآن مجید کے اندر ایسے اصول وضع کیے ہیں جو قیامت تک آنے والی انسانی زندگی کی نئی نئی ضروریات کو بھی پورا کرتے ہیں ۔ فروع اور جزئیات خود انسان پر چھوڑ دی ہیں کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں قیامت تک آنے والی انسان کی ترقی یافتہ زندگی کی ضروریات کے لیے خود قانون وضع کریں ۔ ہر دور کے ظروف واحوال کے مطابق جزوی مسائل کو اجتہاد کر کے اس کے لیے قانون بنائیں بشرطیکہ وہ قوانین قرآن کے اصولوں سے متصادم نہ ہوں جو دائمی ہیں ۔

قرآن انسان کو عقل اور سوچ کی پوری آزادی دیتا ہے وہ ایک ایسا معاشرہ اٹھاتا ہے جس میں لوگوں کے دماغوں پر

تالے نہ پڑے ہوں۔ لیکن آزادی فکر و عمل اس دائرے کے اندر ہے جو اسلامی منہاج نے کھینچ دیا ہے تاکہ انسان اس دنیا کی زندگی میں نشوونما پائے' ترقی کے عمل کو جاری رکھے اور اسے دائرہ کمال تک پہنچائے۔

آج تک کے انسانی تجربات یہ بتاتے ہیں کہ اسلام نے جو نظام زندگی وضع کیا ہے وہ تمام انسانیت کے فکر و عمل کے نظاموں سے آگے ہے۔ وہ اس قابل ہے کہ اس کی روشنی میں انسان مسلسل ترقی کر سکے۔ یہ نظام انسان کو ہر لمحہ آگے ہی بڑھاتا ہے' نہ اسے جامد کرتا ہے اور نہ اسے پیچھے کی طرف لے جاتا ہے' کیونکہ یہ ایک ایسا نظام ہے جس کا مقصد ہی خلافت فی الارض ہے۔ اس دنیا کو ترقی دیتا ہے' ہمیشہ آگے ہی بڑھتا ہے اور اس کے قدم آگے ہی جاتے ہیں۔

یہ نظام انسان کے داعیہ ترقی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے' اور اس کے آگے بڑھنے کے شوق کو پورا کرتا ہے۔ کسی انسان کی انفرادی یا اجتماعی صلاحیتوں پر کوئی قدغن نہیں لگاتا۔ نہ یہ نظام انسان کو اس کی جدوجہد کے ثمرات سے فائدہ اٹھانے سے محروم کرتا ہے اور نہ یہ پابندی لگاتا ہے کہ وہ زندگی کی پاک چیزوں سے استفادہ نہ کرے۔

اس نظام کا مقام یہ ہے کہ یہ متوازن اور ہم آہنگ ہے۔ یہ جسم کو اس لیے نہیں کچلتا کہ روح کو بالیدگی نصیب ہو اور روح کو اس لیے نہیں دباتا کہ جسم موٹا ہو۔ انسان کی صحت مند جسمانی ضروریات اور خواہشات کو پورا کرتا ہے' اس طرح کہ وہ انفرادی اور اجتماعی ترجیحات کے مطابق ہوں۔ فرد کو اپنی ذاتی خواہشات کو اس قدر بڑھانے' اس قدر آزاد' اور بے لگام چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا جن سے سوسائٹی کے حقوق متاثر ہوں' یا کسی فرد یا افراد کے مفاد میں سوسائٹی کے مفادات کو قربان کیا جائے۔

یہ نظام انسان پر جو فرائض اور ذمہ داریاں عائد کرتا ہے ان میں یہ بات پیش نظر ہوتی ہے کہ انسان ان کو برداشت کر سکتا ہے۔ یہ اس کی وسعت اور طاقت کے حدود میں ہیں' اس کے مفاد میں ہیں اور اس کے اندر ان فرائض کو ادا کرنے کی استعداد موجود ہے۔ پھر یہ فرائض ایسے ہوتے ہیں کہ یہ فرد ان کی ادائیگی پر آمادہ ہو' بلکہ یہ ایسے فرائض ہیں کہ لوگ نہ صرف یہ کہ دل و جان سے انہیں قبول کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں بلکہ لوگ ان کے لیے جان دینے کو تیار ہوتے ہیں کیونکہ یہ فرائض ان کی خواہشات کے مطابق ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت تمام انسانوں کے لیے ایک رحمت ہے۔ یہ رسالت جن اصولوں کو لے کر آئی تھی ابتداء میں لوگوں نے اسے عجیب و غریب سمجھا اور یہ اصول لوگوں کے لیے بوجھ سمجھے گئے کیونکہ ابتداء میں اسلامی اصولوں اور لوگوں کی روحانی اور عملی زندگی کے درمیان بہت بعد تھا۔ لیکن اسلام کے آنے کے بعد انسانیت پوری کی پوری روز بروز اسلامی نظام کے قریب آتی گئی۔ انسانیت اسلامی نظام سے مانوس ہو گئی اور پھر ان اصولوں کو انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے ہاں رائج کیا مگر دوسرے عنوانات سے' اسلامی عنوان سے نہیں۔

اس آخری رسالت نے انسانیت کے راستے میں حائل' لسانی' قومی اور جغرافیائی حدود کو مٹا دیا تاکہ تمام لوگ ایک ہی عقیدے' ایک ہی نظام میں' خالص انسانی نظام میں ایک ہو جائیں۔ اس وقت لوگوں کے لیے یہ ایک عجیب و غریب دعوت تھی۔ اس دور میں اشراف اور بڑے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ان کو اس مٹی سے نہیں پیدا کیا گیا جس سے غرباء کو پیدا کیا گیا ہے لیکن آج سے چودہ سو سال قبل اسلام نے جو انسانی اصول وضع کیے تھے ان کی طرف انسانیت آج بھی آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔ اگرچہ اس عرصہ میں انسانیت نے بہت بڑی ٹھوکریں کھائیں اس لیے کہ وہ نور اسلام سے محروم

تھی ' آج اسے اسلامی اصولوں میں روشنی نظر آتی ہے اور کم ازکم زبانی طور پر وہ اسلام کے انسانی اصولوں کی بات بہرحال کرتی ہے اگرچہ یورپ و امریکہ اب بھی قومی 'لسانی اور جغرافیائی لعنتوں میں گرفتار ہیں۔

اسلام جب آیا تو اس نے تمام انسانوں کو قانون اور عدالت کے سامنے مساوی درجہ دیا۔ اس وقت دنیا کی صورت حالات یہ تھی کہ انسانیت کو طبقات میں بانٹ دیا گیا تھا اور ہر طبقے کے لیے جدا قانون تھا۔ بلکہ غلامی 'اور جاگیرداری کے دور میں تو مالک کا ارادہ ہی قانون ہوا کرتا تھا۔ اس لیے اس دور میں لوگوں کو یہ بات عجیب و غریب لگی کہ اسلام میں بندہ و آقا' امیر و غریب سب ایک ہی قانون اور ایک ہی عدالت کے ماتحت ہیں۔ لیکن اسلام نے قانونی مساوات اور عدالتی چارہ جوئی کی مساوات کا جو اصول آج سے چودہ سو سال پہلے دیا' انسانیت آج بھی اسی اصول کی طرف بوجھل قدموں کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔

ان باتوں کے علاوہ بھی بے شمار اجتماعی اور سماجی امور ایسے ہیں جن میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت لوگوں کے لیے ایک عظیم رحمت ثابت ہوئی ہے۔ آپ انسانیت کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں چاہے کوئی آپ پر ایمان لایا ہو یا نہ لایا ہو کیونکہ جو نظام آپ لے کر آئے تھے تمام انسان اس سے متاثر ہوئے چاہے خوشی سے چاہے مجبور ہو کر ' دانستہ طور پر یا نادانستہ طور پر۔ اس رحمت کا سایہ اب بھی پھیلا ہوا ہے ' جو چاہے اس کے نیچے آکر ستائے۔ اس میں سماوی باد نسیم کے خوشگوار جھونکے ہیں۔ اس کے شجر طیبہ کی گہری چھاؤں ہے جبکہ اس کے اردگرد کی دنیا اس طرح ہے جس طرح سخت گرمی کے موسم میں کوئی چٹیل میدان میں سرگرداں ہو اور گرمی سے جھلس رہا ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانیت جس طرح آج رحمت اسلام کی محتاج ہے اس طرح کبھی نہ تھی۔ وہ اذیت ناک قلق میں مبتلا ہے۔ وہ مادیت کے بے آب و گیاہ میدان میں سرگرداں و پریشان ہے۔ وہ اسلحہ کے ڈھیروں اور جنگل کے قانون جنگ میں گرفتار ہے اور مادیت نے لوگوں کے دلوں کو خشک کر دیا ہے۔ لوگوں کی روح خوفناک حد تک اذیت میں ہے اور ان کے دل پریشان ہیں۔

چنانچہ یہ بتانے کے بعد کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت تمام انسانیت کے لیے رحمت ہے۔ حضور کو بتایا جاتا ہے کہ آپ مذاق کرنے والوں اور تکذیب کرنے والوں کو بتا دیں کہ آپ کی رسالت کے رحمت ہونے کا خلاصہ کیا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲۱:۱۰۸)

"ان سے کہو' میرے پاس جو وحی آتی ہے وہ یہ ہے کہ تمہارا خدا صرف ایک خدا ہے' پھر کیا تم سر اطاعت جھکاتے ہو؟"

اس رسالت میں رحمت ہونے کا حقیقی عنصر ہی یہ کلمہ ہے۔ عقیدۂ توحید' جو انسانیت کو جاہلیت کے اوہام' بت پرستی کے بوجھ اور خرافات اور رسومات کے بوجھ سے نجات دلاتا ہے۔ اس رسالت میں پوری زندگی کو اس مضبوط عقیدے کی بنیاد پر استوار کیا جاتا ہے۔ یوں یہ زندگی اس پوری کائنات سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ انسانیت اپنی زندگی انہی فطری قوانین پر استوار کرتی ہے جو ایک طرف اس کائنات میں جاری و ساری ہیں اور دوسری طرف اسلامی نظام اور رسالت رحمت میں جاری ہیں۔ اس نظام کی روشنی میں ہر انسان کے لیے یہ موقع ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر سر اٹھا کے چلے۔ اگر اس کا سر جھکے تو صرف خدائے واحد قہار و جبار کے آگے۔ نہ دنیا کے کسی قہار کے آگے۔ یہی ہے صحیح طریق زندگی۔

فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ (۲۱:۱۰۸) "کیا تم سر تسلیم خم کرتے ہو"۔
یہی ایک سوال ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مذاق کرنے والے مکذبین سے کرنا ہے۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ آذَنْتُكُمْ عَلَى سَوَآءٍ (۲۱:۱۰۹) "اگر وہ منہ پھیریں تو پھر کہو کہ میں نے علی الاعلان تم کو خبردار کر دیا ہے"۔ یعنی میں نے اپنا مدعا پورا پورا تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب میں اور تم برابر ہیں۔ "ایذان" تو دراصل اس اعلان اور الٹی میٹم کو کہتے ہیں جو امن کا زمانہ ختم ہونے کے وقت کیا جاتا ہے اور فریق دوم سے کہا جاتا ہے کہ اب دونوں فریقوں کے درمیان جنگ ہے۔ یہ سورہ مکی ہے 'اس وقت قتال فرض نہ ہوا تھا' تو یہاں اعلان کا مطلب یہ ہے کہ میں نے جو کچھ کہنا تھا' کہہ دیا ہے۔ اب تم جانو اور تمہارا انجام۔ یعنی اب یہ آخری اعلان آگیا ہے اور آئندہ تمہارے لیے عذر و معذرت کا کوئی جواز نہ ہوگا۔ اگر وہ جانتے بوجھتے اپنے راستے پر چلتے رہیں تو اس کا وبال بھی ان پر ہوگا کیونکہ ان کو علم ہے۔

وَإِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ أَمْ بَعِيدٌ مَا تُوعَدُونَ (۲۱:۱۰۹) "اب میں نہیں جانتا کہ وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے قریب ہے یا دور"۔ میں نے تمہیں اعلانیہ کہہ دیا ہے۔ لیکن میرے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ جس عذاب کے تم مستحق ہو وہ کب آئے گا۔ کیونکہ یہ تو اللہ کے مخفی علوم میں سے ایک غیبی علم ہے۔ اس کے بارے میں صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ صرف اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ تمہیں دنیا میں پکڑتا ہے یا آخرت میں۔ وہ تمہارے راز سے بھی واقف ہے اور کھلی باتوں سے بھی۔ تمہاری کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔

إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ (۲۱:۱۱۰) "اللہ وہ باتیں بھی جانتا ہے جو باآواز بلند کہی جاتی ہیں اور وہ بھی جو تم چھپا کر کرتے ہو"۔ تمہارے سب معاملات اس کے سامنے کھلے ہیں۔ وہ اگر تمہیں سزا دے گا تو اس لیے دے گا کہ تمہارے ظاہری اور خفیہ سب معاملات سے وہ باخبر ہے۔ اور اگر وہ عذاب کو مؤخر کرتا ہے تو پھر بھی کوئی حکمت اس کے پیش نظر ہوگی۔

وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ (۲۱:۱۱۱) "میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید یہ تمہارے لیے ایک فتنہ ہے اور تمہیں ایک وقت تک کے لیے مزے کرنے کا موقعہ دیا جا رہا ہے"۔ یعنی تمہاری سزا میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟ یہ میرے علم کے مطابق تمہارے لیے مزید آزمائش ہے۔ تمہیں مزید مہلت دی جا رہی ہے اور اس کے بعد تمہیں بڑی سختی سے پکڑا جائے گا۔

وقت عذاب کے عدم تعین میں بھی ان کے لیے احساس کرنے کا ایک موقع ہے۔ جب کسی وقت کا تعین نہ ہو تو اس امر کے واقع ہونے کا احتمال ہر وقت رہتا ہے اور ایک عقلمند اس سے ڈر سکتا ہے کہ کہیں اچانک ہی سر پر نہ آجائے۔ یہ بھی امکان ہے کہ ان کے دل غفلت کے پردوں سے باہر نکل آئیں اور یہ سمجھ لیں کہ اس آزمائش اور مہلت کے بعد کہیں مصیبت نہ آجائے۔ اگر کسی مصیبت کو آنا ہو اور وقت معلوم نہ ہو تو ایک سمجھدار انسان کو ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہے کہ ابھی

پردہ کرتا ہے اور یہ مصیبت سامنے آتی ہے۔

بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان ان امور سے غافل ہوتا ہے جو پردۂ غیب کے پیچھے سے اس کے انتظار میں ہوتے ہیں اور دنیا کا سازو سامان و عیش و طرب انسان کو مزید دھوکہ دیتا ہے۔ انسان ان امور کو بھول جاتا ہے جو پردے کے پیچھے ہوتے ہیں' لہٰذا وہ عدم علم کی وجہ سے غافل ہو جاتا ہے اس لیے اللہ نے لوگوں کو اور ایسے غافلوں کو متنبہ کرنا ضروری سمجھا ہے تاکہ وہ وقت آنے سے پہلے ہی خبردار ہو جائیں اور اپنے لیے کوئی بندوبست کریں۔

حضور نے امانت پہنچا دی' پیغام لوگوں کو دے دیا اور علی الاعلان دے دیا۔ ان کو اچانک عذاب الٰہی سے بھی خبردار کر دیا۔ اب آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اللہ سے یہ درخواست کریں کہ وہ سچا فیصلہ کر دے اور ان لوگوں کی سازشوں' ان کی تکذیب اور ان کے مذاق کا صلہ خود ان کو دیں۔

قَالَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ وَ رَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰي مَا تَصِفُوْنَ (۲۱: ۱۱۲)

"آخر کار رسول نے کہا کہ اے رب حق کے ساتھ فیصلہ کر دے اور لوگو! تم جو باتیں بناتے ہو' ان کے مقابلے میں ہمارا رب رحمٰن ہی ہمارے لیے مدد کا سہارا ہے"۔ آخر میں صفت رحمت کا ذکر خاص قابل توجہ ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا۔ لیکن لوگوں نے آپ کی تکذیب کی' مذاق کیا' اس لیے اللہ ہی رسول پر رحم کر سکتا ہے اور رحم و کرم کا ضامن ہے۔ اس طرح سورہ کا آغاز اور انجام دونوں ایک ہی مضمون سے مملو ہو جاتے ہیں' نہایت ہی موثر انداز میں۔

---000---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ------ ۱۷

## سورۃ الحج - ۲۲

### آیات ۱--- تا--- ۷۸

# سورۃ الحج ایک نظر میں

یہ سورہ مکی بھی ہے اور مدنی بھی ـ اس کی بعض آیات کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ مدنی ہے ـ خصوصاً اس آیت سے جس میں قتال کی اجازت دی گئی ہے ـ (۳۸ تا ۴۱) ـ اور پھر ان آیات سے جن میں بدلہ لینے (۶۰) کی اجازت دی گئی ہے ـ ان آیات سے یہ قطعی طور پر مدنی معلوم ہوتی ہے ـ اس لیے کہ مسلمانوں کو جنگ اور قصاص کی اجازت صرف ہجرت کے بعد دی گئی تھی جب مدینہ میں ایک اسلامی مملکت قائم ہو گئی تھی ـ اس سے قبل ان باتوں کی اجازت نہ تھی ـ جب اہل یثرب نے آپ کی بیعت کی تو بیعت کے بعد انہوں نے یہ اجازت چاہی کہ ابھی ہم منیٰ میں کفار مکہ پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور انہیں ختم کر کے رکھ دیتے ہیں' تو آپ نے فرمایا مجھے تو ابھی اس کی اجازت یا حکم نہیں دیا گیا' لیکن جب مدینہ دار الاسلام بن گیا تو اللہ نے قتال کی اجازت دے دی تاکہ مسلمانوں کو کافر جو اذیتیں دیتے تھے اس سے ان کو بچایا جائے' ملک کے اندر آزادی رائے کا حق قائم کیا جائے اور اہل ایمان آزادانہ اللہ کی بندگی کر سکیں ـ

موضوعات کے اعتبار سے یہ سورہ ایسی ہے کہ اس کے موضوعات مکی ہیں اور فضا بھی ایسی ہے جیسے مکی سورتوں کی عمومی فضا ہوتی ہے ـ توحید' آخرت کا خوف' بعث بعد الموت کا اثبات' شرک کی تردید' قیامت کے مناظر اور اس کائنات میں پھیلے ہوئے نشانات اور آیات الٰہیہ جیسے موضوعات واضح طور پر اس سورہ پر چھائے ہوئے ہیں ـ جبکہ مدنی موضوعات بھی اس میں موجود ہیں مثلاً مشرکین سے لڑنے کی اجازت' اسلامی شعائر کے بچانے کا حکم اور ایسے لوگوں کے ساتھ خدا کی نصرت کا وعدہ جن پر ظلم کیا گیا ہو اور وہ اس ظلم کی مدافعت کر رہے ہوں اور جہاد فی سبیل اللہ کا حکم' یہ مدنی موضوعات ہیں ـ

اس سورہ پر قوت' شدت' سختی' ڈراوے' ترہیب' تقویٰ کے شعور کی بیداری' خدا کا خوف اور اس کے آگے سر تسلیم خم کرنا عموماً سایہ فگن ہے ـ یہ پرتو اور یہ فضا مناظر اور امثال کی صورت میں ہیں ـ مثلاً بعث بعد الموت کا منظر نہایت ہی خوفناک اور زلزلہ خیز ہے ـ

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ (۱) يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَي النَّاسَ سُكٰرٰي وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰي وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ (۲) (۲۲ : ۱ ـ ۲) "لوگو' اپنے رب کے غضب سے بچو' حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے ـ جس روز تم اسے دیکھو گے' حال یہ ہو گا کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے سے غافل ہو جائے گی' ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا' اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے' حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے' بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہو گا"ـ

عذاب آخرت کا منظر یوں ہے :

فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ (۱۹) يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَ الْجُلُوْدُ (۲۰) وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ (۲۱) كُلَّمَآ اَرَادُوْآ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ (۲۲) (۲۲: ۱۹ – ۲۲) "وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کے لباس کاٹے جا چکے ہیں' ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا جس سے ان کی کھالیں ہی نہیں پیٹ کے اندر کے حصے تک گل جائیں گے' اور ان کی خبر لینے کے لیے لوہے کے گرز ہوں گے۔ جب کبھی وہ گھبرا کر جہنم سے نکلنے کی کوشش کریں گے پھر اسی میں دھکیل دیئے جائیں گے کہ چکھو اب جلنے کی سزا کا مزہ"۔

اور مشرکین کی مثال وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (۲۲: ۳۱) "اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے گا تو گویا وہ آسمان سے گر گیا۔ اب یا تو اسے پرندے اچک لے جائیں گے یا ہوا اسے ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اس کے چیتھڑے اڑ جائیں گے"۔

اور جو شخص اللہ کی نصرت سے مایوس ہو اس کا حال یوں ہو گا۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ (۲۲: ۱۵) "جو شخص یہ گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی کوئی مدد نہ کرے گا' اسے چاہیے کہ ایک رسی کے ذریعے آسمان تک پہنچ کر شگاف لگائے پھر دیکھ لے کہ آیا اس کی تدبیر کسی ایسی چیز کو رد کر سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے"۔

اور ایسے شہروں کا نقشہ یوں ہے جنہیں ظلم کی وجہ سے ہلاک کیا گیا۔

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ (۲۲: ۴۵) "کتنی ہی خطا کار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کیا ہے اور آج وہ اپنی چھتوں پر الٹی پڑی ہیں کتنے ہی کنوئیں بے کار اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہوئے ہیں"۔

ان سخت اور خوفناک مناظر کے نتیجے میں احکام اور فرائض نازل ہوتے ہیں اور اس بات کی اجازت دی جاتی ہے کہ ظلم کی مدافعت قوت سے بھی کی جا سکتی ہے اور ایسے حالات میں اللہ کی نصرت تمہارے ساتھ ہو گی۔ یہ اس طرح کہ کافر

جن الہوں کے لیے لڑ رہے ہیں وہ کمزور ہیں اور تم جس خدا کی راہ میں لڑ رہے ہو وہ اس پوری کائنات کو چلا رہا ہے۔
احکام و فرائض کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ (۳۹) الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (۴۰) الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (۴۱) (۲۲: ۳۹ - ۴۱) "اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے، صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے۔ اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کثرت سے یاد کیا جاتا ہے سب مسمار کر ڈالی جائیں اور اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں، نیکی کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے"۔

اور دوسرے مسئلے میں کہ مشرکین کے الٰہ کچھ بھی طاقت نہیں رکھتے کہا جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَن يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ ۖ وَإِن يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنقِذُوهُ مِنْهُ ۚ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ (۷۳) مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (۷۴) (۲۲: ۷۳ - ۷۴) "لوگو، ایک مثال دی جاتی ہے، غور سے سنو۔ جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔ ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ پہچانی جیسا کہ اس کی قدر پہچاننے کا حق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوت اور عزت والا تو اللہ ہی ہے"۔

ان دو باتوں کے علاوہ یہ دعوت دی جاتی ہے کہ خدا کا خوف اختیار کرو، ہر وقت اس سے ڈرتے رہو اور اللہ کے سامنے جھک کر سر تسلیم خم کرو۔

ایسے ہی موضوعات سے سورہ کا آغاز ہوتا ہے اور اس کے درمیان میں بھی تقویٰ اور خدا خوفی کے مضامین جا بجا لائے جاتے ہیں۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ (۲۲ : ۱) "لوگو اپنے رب کے غضب سے بچو حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی چیز ہے"۔ اور دوسری جگہ فرمایا ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (۲۲ : ۳۲) (۴۲) "یہ ہے اصل معاملہ، اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے"۔ اور دوسری جگہ فرمایا فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗ اَسْلِمُوْا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ (۳۴) الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (۲۲ : ۳۵) (۲۲ : ۳۴ - ۳۵) (۴۴) "پس تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے پس اس کے مطیع فرمان بنو، اور اے نبی بشارت دے دو عاجزانہ روش اختیار کرنے والوں کو جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کا ذکر سنتے ہیں تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں"۔ اور دوسری جگہ ہے۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ "نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون مگر اسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے"۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کائنات کے مناظر بھی پیش کئے جاتے ہیں اور قیامت کے مشاہد بھی۔ ان لوگوں کے کھنڈرات بھی جو ہلاک کیے گئے اور عبرت کی تاریخی مثالیں بھی اور ایسی تصویر کشی جس کے ذریعے غور و فکر، ایمان و تقویٰ کا شعور، عاجزانہ روش اور اللہ کے حکم کے آگے جھک جانے کی روش بیدار کی جاتی ہے۔ یہ چیزیں اس سورہ کے عمومی مقاصد ہیں اور یہی فضا سورہ کے زیادہ تر مضامین کی ہے۔

اس سورہ کے چار حصے کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔ پہلے حصے میں ایک عام پکار ہے کہ لوگو، خدا کا خوف اختیار کرو، قیامت کا زلزلہ ایک عظیم اور خوفناک چیز ہے اور اس کے اندر پائے جانے والے خوف و ہراس کی تصویر کشی کی گئی ہے اور متعجبانہ کہا گیا ہے کہ جو خدا اس قدر ہولناک مناظر پیدا کرے گا اس کے بارے میں لوگ بغیر علم کے مباحثے کرتے ہیں اور شیطان کی پیروی کرتے ہیں جو حتماً مردود ہے۔ پھر بتایا جاتا ہے کہ انسان کی تخلیق ایک جنین سے کہاں تک ہوئی اور نباتات میں کیا کیا کرشمے ہیں، لوگوں کے درمیان سوشل زندگی اور اخوت اور محبت یہ سب باتیں اس حقیقت پر دلیل ہیں کہ اللہ حق ہے، مردوں کو زندہ کرے گا اور کر سکتا ہے بلکہ سب کچھ کر سکتا ہے، بعث بعد الموت حق ہے اور قیامت آنے والی ہے اور اگر اس کائنات میں جاری نوامیس فطرت پر غور کیا جائے تو یہ سب امور راز خود ثابت شدہ معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ اللہ اور اللہ کی ہدایات کے بارے میں لوگ بغیر علم کے بات کرتے ہیں۔ اگر وہ صرف اس کائنات کی تہ تک ہی پہنچ جائیں تو ان کو اللہ کی قدرت معلوم ہو جائے۔ یہ لوگ حقیقت کو نظریہ افادیت اور نفع و خسارہ کے پیمانوں سے معلوم کرتے ہیں جو غلط ہے۔ پھر جو لوگ مصیبت میں غیر اللہ کو پکارتے ہیں اور اللہ کی نصرت پر ان کو یقین نہیں، حالانکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کا فیصلہ وہ جلد ہی میدان حشر میں کر دے گا اور پھر وہاں کافروں کا منظر خوفناک اور مومنین کا انجام ان کے اعمال صالحہ کے مطابق دل خوش کن ہو گا۔

۲۔ دوسرے حصے کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ کفار اب لوگوں کو مسجد حرام سے روکنے لگے ہیں حالانکہ اللہ نے اسے سب کے لیے دار امن بنایا ہے۔ یہ جگہ مقیم لوگوں کے لیے بھی ہے اور باہر سے آنے والوں کے لیے بھی ہے۔ اس کی تعمیر کا قصہ یہ ہے کہ ابراہیم نے تو اسے دار توحید بنایا تھا۔ لیکن تم نے اس میں بت رکھ کر بت پرستی کرتے ہو۔ بات شعائر حج اور تقویٰ پیدا کرنے تک جا نکلتی ہے۔ جو اس گھر کے بنانے کا اصل مقصد ہے۔ اس حصے کے آخر میں مسلمانوں کو اجازت دی جاتی ہے کہ اب وہ ہتھیار اٹھائیں کہ کفار خانہ کعبہ پر بھی پابندی لگاتے ہیں اور لوگوں کو محض اس لیے گھروں سے نکال رہے ہیں کہ وہ اللہ کو ایک مانتے ہیں۔

۳۔ تیسرے حصے میں مکذبین کے بھیجنے کے نمونے اور تاریخ میں مکذبین اور ظالمین کی ہلاکتوں کے مناظر و واقعات پیش کیے گئے ہیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ ظالموں کی نسبت اللہ کا قانون کیا ہے۔ تکذیب کی وجہ سے حضورؐ کو جو دکھ ہوتا تھا اس پر تسلی، مسلمانوں کو تسلی کہ ان کا انجام اچھا ہونے والا ہے۔ ہر دور میں دعوت اسلامی کے خلاف شیطان کی تدابیر ہوتی رہی ہیں لیکن اللہ کی دعوت کی مضبوطی اور اللہ کے دلائل کی مضبوطی کی وجہ سے اہل ایمان پختہ یقین کرتے ہیں اور ضعیف یقین والے متکبرین کی آزمائش ہوتی ہے۔

۴۔ آخری حصے میں اللہ کا یہ وعدہ کہ مظلوم جب اپنی مدافعت کرتا ہے تو اللہ کی مدد اس کے ساتھ ہوتی ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کی قدرت کے کرشمے اس کائنات میں نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اہل ایمان اس خدا کے بندے ہیں اور اس کے مقابلے میں مشرکین جن خداؤں کے لیے لڑتے ہیں ان کی حالت بہت ہی پتلی ہے۔ لہٰذا اہل ایمان کو چاہئے کہ وہ صرف اللہ کی بندگی کریں، اللہ کے لیے جہاد کریں، اللہ پر اعتماد کریں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقتوں سے جو عقیدہ توحید لے کر وہ چلے ہیں اس کی ذمہ داریاں پوری کریں۔

یوں اس سورہ کے تمام مضامین ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۱۴۴ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۲۴

سُورَةُ الحَجِّ (۲۲) مَدَنِيَّةٌ (۱۰۳)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ﴿۱﴾ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ﴿۲﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"لوگو' اپنے رب کے غضب سے بچو' حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے۔ جس روز تم اسے دیکھو گے' حال یہ ہو گا کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے سے غافل ہو جائے گی' ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا' اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے' حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے' بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہو گا"۔

الفاظ کی شوکت کے ساتھ یہ ایک خوفناک آغاز کلام ہے' انسان اس قدر خوفزدہ ہو جاتا ہے کہ دل کانپنے لگتا ہے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے زور دار آواز میں کہا جاتا ہے۔ "لوگو" !! يَاَيُّهَا النَّاسُ "اللہ سے ڈرو' اللہ سے ڈرو"۔ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ – "اس دن سے تمہیں ہم ڈراتے ہیں"۔ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ (۲۲ : ۱) "قیامت کا زلزلہ بڑا ہی ہولناک ہے"۔ اس زلزلے اور اس عظیم اور ہولناک چیز کی تفصیلات یہاں نہیں دی جاتیں' اس سے اس کی خوفناکی اور بڑھ جاتی ہے۔ زلزلہ ہے! عظیم ہے! خوفناک ہے! اسے الفاظ میں بیان ہی نہیں جا سکتا۔ بس اس سے ڈرو "جس طرح ایک شخص پہلے بھاگو بھاگو کہنے کے بعد وجہ بتاتا ہے"۔

اور بعد میں جو تفصیلات مختصر سی بتائی جاتی ہیں تو ان سے اس زلزلے کی خوفناکی میں شدید اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا منظر جس میں دودھ پلانے والیاں بچوں کو چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگتی پھر رہی ہیں اور انہیں نہ کچھ نظر آتا ہے اور نہ سوجھتا ہے' دوڑ ہی دوڑ ہے۔ اس خوفناکی اور دوڑ میں تمام حاملہ عورتوں کے حمل گر جاتے ہیں' کوئی ادھر پڑی ہے کوئی ادھر اور

لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ مدہوش نظر آتے ہیں لیکن دراصل وہ نشے میں نہیں ہوں گے۔ ان کی خوابیدہ نظریں اور ڈگمگاتے قدم نشہ بتاتے ہیں لیکن ہیں وہ پریشان۔ یہ منظر حرکت اور افرتفری سے بھرا ہوا ہے۔ لوگوں کی موجیں ادھر سے ادھر بھاگ رہی ہیں لیکن پتہ نہیں کہ کیوں انسانوں کا سیلاب ہے۔ انسانی سوچ قرآنی اندازبیان کے اس منظر سے پیچھے رہ جاتی ہے اور تخیل کی آنکھ انسانوں کے اس متلاطم سیلاب کے آخری حصے تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ اس قدر ہولناک منظر ہے کہ اس کے حجم اور ضخامت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایک عورت آگ میں بھی اپنے بچے کو سینے سے لگائے رکھتی ہے لیکن یہ کیا عظیم ہولناک منظر ہوگا کہ عورتیں بچوں کو سینے سے اٹھاکر پرے پھینک دیں گی اور تمام حاملہ عورتیں حمل گرا دیں گی اور لوگ مدہوشی کی حالت میں ہوں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ

وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ (۲۲ : ۲) "اور لیکن اللہ کا عذاب بہت سخت ہوگا"۔ اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جبکہ وہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں --- یہ ہے آغاز سورہ زلزلہ انگیز اور خوفناک!

ایسے مناظر کے ہوتے ہوئے بھی بعض لوگ ایسے سنگدل ہیں کہ وہ اللہ کے بارے میں بے تکی باتیں کرتے ہیں اور اللہ کا خوف ان کے دل میں نہیں ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ يَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۝ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَ يَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝

"بعض لوگ ایسے ہیں جو علم کے بغیر اللہ کے بارے میں بحثیں کرتے ہیں اور ہر شیطان سرکش کی پیروی کرنے لگتے ہیں، حالانکہ اس کے تو نصیب ہی میں یہ لکھا ہے کہ جو اس کو دوست بنائے گا اسے وہ گمراہ کر کے چھوڑے گا اور عذاب جہنم کا راستہ دکھائے گا"۔

اللہ کے بارے میں بحث! خواہ اللہ کے وجود کے بارے میں ہو، اللہ کی وحدانیت کے بارے میں ہو، اللہ کی قدرت کے بارے میں ہو، اللہ کے علم کے بارے میں ہو، اللہ کی صفات میں سے کسی صفت کے بارے میں ہو، اور یہ دیکھتے ہوئے کہ انسان نے کن خوفناک مناظر سے دوچار ہونا ہے اور کن ہولناک مقامات سے گزرنا ہے، کسی عقلمند آدمی کی جانب سے یہ بحث عجیب اور جسورانہ نظر آتی ہے، یہ منظر ایک خاطی اور پرتقصیرات بندے کو ہلاکر رکھ دیتا ہے۔

کاش کہ اللہ کے بارے میں بات کرنے والے علم معرفت اور یقین کی بات کرتے اور علی وجہ البصیرت کرتے، لیکن وہ تو بغیر علم کے اپنے حدود سے بڑھ رہے ہیں اور یہ بحث و جدال شیطان مردود کی اطاعت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ انسانوں میں ہر وقت ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں اور وہ اپنی خواہشات نفس کے اتباع میں ایسی باتیں کرتے ہیں۔

وَ يَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ (۲۲ : ۳) "اور وہ ہر شیطان سرکش کی پیروی کرنے لگتے ہیں"۔ جو نافرمان ' مخالف حق اور متکبر ہے۔

كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَ يَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ (۲۲ : ۴) "حالانکہ اس کے تو نصیب میں لکھا ہے کہ جو اسے دوست بنائے گا اسے گمراہ کر کے چھوڑے گا اور عذاب جہنم کا راستہ دکھائے گا"۔ تو اس کی دوستی کا حتمی نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ اپنے دوست کو جہنم رسید کر دے گا۔ آخر کوئی عقلمند شخص دیکھتے اور بوجھتے ہوئے ایسے شخص سے دوستی کیوں کرتا ہے اور اس سے ہدایات کیوں لیتا ہے؟

لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ بعث بعد الموت کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور پھر قیامت کے زلزلے میں بھی انہیں شک ہے۔ اگر ان کو انسان کے دوبارہ زندہ کیے جانے میں شک ہے تو انسان کی موجودہ زندگی اور خود اپنی زندگی کی نشوونما کے نظام ہی کو دیکھ لیں۔ اور اپنے آپ کو اور اپنے ارد گرد کے ماحول کو دیکھیں۔ ان کو بے شمار دلائل قیامت ملیں گے۔ لیکن لوگوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ ان دلائل پر سے غفلت کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَ نُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَ تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ ۝۵

"لوگو' اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے' پھر نطفے سے' پھر علقہ سے' پھر خون کے لوتھڑے سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں' پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے

اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے 'پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی"۔

بعث بعد موت کی حقیقت کیا ہے۔ جسم کے اجزاء میں دوبارہ زندگی ڈالنا اور بس ۔ تو انسانی سوچ کے مطابق بھی یہ چیز ابتدائی تخلیق سے آسان ہے 'لیکن اگر انسان اسے مشکل سمجھے تو اللہ کی نسبت سے تو یہ بہت ہی آسان ہے۔ کوئی مشکل چیز نہیں ہے۔ دوبارہ پیدا کرنے میں بھی اللہ کو ایسا ہی ارادہ کرنا ہو گا کہ (کن) یعنی ہو جا کہے تو وہ چیز ہو جائے گی۔

اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ "اس کا کام یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہتا ہے "ہو جا" تو وہ ہو جاتی ہے"۔ قرآن کریم کا انداز کلام یہ ہے کہ وہ انسانوں کی سوچ 'اور قیاس کے مطابق ہی بات کرتا ہے۔ لوگوں کے طرز استدلال اور ان کی قوت ادراک کے مطابق بات کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید ان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنے سامنے پھیلی ہوئی اور نظر آنے والی کائنات پر غور کریں۔ یہ ہر وقت ان مشہور اور نظر آنے والے واقعات کو دیکھتے رہیں جو ہر وقت ان کی نظروں کے سامنے سے گزرتے رہتے ہیں۔ اگر ان نظروں کے سامنے سے روز و شب گزرنے والے واقعات پر گہرا غور و فکر کیا جائے تو وہ سب واقعات انسان کو ایک معجزہ نظر آنے لگیں۔ بشرطیکہ وہ کھلے دل اور چشم بینا کے ساتھ ان کا گہرا مطالعہ کریں لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ ان واقعات اور مناظر پر سے گونگے اور بہرے ہو کر گزرتے ہیں یا یہ واقعات اور مناظر لوگوں کے پاس سے ہو کر گزر جاتے ہیں اور لوگوں کو کوئی انتباہ نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے اور سب سے بڑا سوال کہ خود انسان کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کس طرح آیا ہے اور وہ کن کن ادوار سے گزرا ہے۔

فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ (۲۲ : ۵) "ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا"۔ انسان اس مٹی کا بیٹا ہے۔ اسی مٹی سے وہ بنا ہے 'اس کا یہ جسم اسی مٹی سے ڈھالا گیا ہے 'مٹی ہی سے اس کی زندگی کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس کے جسم میں جس قدر عناصر ہیں وہ زمین کے اندر موجود ہیں۔ صرف وہ ایک عنصر مٹی میں نہیں ہے یعنی "حیات" یعنی روح۔ یہ امر ربی سے ہے اور اس کے بارے میں ہمارا علم ابھی تک قلیل ہے۔ اس روح ہی کی وجہ سے یہ مٹی سے جدا ہو گیا ہے لیکن اصلاً یہ تو مٹی ہی ہے۔ اس کی جسمانی ساخت 'اس کی غذا اور تمام اجزائے جسم مٹی ہی سے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مٹی میں اور انسان میں پھر یہ فرق کس طرح ہو گیا۔ مٹی کہاں اور انسان کہاں؟ مٹی تو سادہ ذرات ہیں لیکن انسان تو تخلیق کے بعد (فسوّاها) بھی ہے۔ یہ انسان فاعل بھی ہے اور فعالیت کا اثر بھی لیتا ہے۔ مؤثر بھی ہے اور متاثر بھی ہے۔ اس کے قدم زمین پر ہیں اور اس کی اڑان آسمانوں کی طرف ہے۔ وہ اپنی فکر سے مادہ سے آگے تخلیقات کرتا ہے۔ مادہ کے اندر بھی اس کی تخلیقات ہیں۔

کیا یہ ایک عظیم معجزہ اور عظیم انقلاب نہیں ہے کہ اللہ نے مٹی سے انسان بنا دیا۔ اسی انسانی مادے کو دوبارہ جمع کرنا اس کے لئے کیا مشکل ہے۔ عجیب مخلوق مادہ سے پیدا کردہ۔

ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا

نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (۲۲ : ۵) "پھر نطفے سے 'پھر علقہ سے 'پھر خون کے لوتھڑے سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں 'پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں"۔

اب ذرا مٹی کے ان سادہ عناصر کو دیکھئے۔ پھر نطفے کو دیکھیے جو زندہ مٹی کے خلیوں کی شکل میں ہوتا ہے۔ کس قدر تبدیلی آگئی۔ اسی کے اندر وہ عظیم راز مضمر ہے یعنی زندگی کا راز۔ وہ راز جس کے بارے میں آج تک انسان کوئی قابل ذکر معلومات حاصل نہیں کر سکا۔ اربوں سال گزر گئے ہیں۔ انسان یہ معلوم کرنے کی سعی میں ہے کہ روح کیا ہے؟ حیات کیا ہے؟ ان اربوں سالوں کے دوران ہر نطفے میں اربوں زندہ خلیے بنتے ہیں لیکن ان خلیوں کے ملاحظے سے بھی ہم عاجز ہیں چہ جائیکہ ہم ان کی تخلیق کو سمجھ سکیں اگرچہ انسان نظر کو بلند کرے اور محالات کے دامن کو پکڑ لے۔

پھر یہ نطفہ علقہ کس طرح بن جاتا ہے' یہ خون کے لوتھڑے کی شکل کس طرح اختیار کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ خون بوٹی کی شکل میں کس طرح آتا ہے اور یہ بوٹی انسان کی شکل کس طرح اختیار کرتی ہے۔ نطفہ کیا ہے' مرد کا پانی۔ ایک نطفے میں ہزارہا مادہ منویہ کے حیوانات ہوتے ہیں۔ ان ہزاروں لاکھوں حیوانات میں سے صرف ایک حیوان عورت کے انڈے میں داخل ہوتا ہے جو رحم مادر میں ہوتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ متحد ہوتا ہے اور رحم کی دیوار کے ساتھ لٹک جاتا ہے۔ اس بیضہ میں جو نہایت ہی باریک نکتے کے برابر ہوتا ہے اور جو رحم مادر کی دیواروں کے ساتھ پیوست ہوتا ہے۔ مادہ منویہ میں دوڑنے والا یہ باریک حیوان پیوست ہو جاتا ہے بلکہ اس بیضہ کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ یہ کام ایک خودکار نظام کے مطابق ہوتا ہے۔ ان دونوں چیزوں میں قبولیت اللہ نے رکھی ہے۔ اس نکتے میں اللہ نے تمام انسانی خصائل اور عادات ودیعت کیے ہوئے ہیں۔ آنے والے انسان کی تمام خصوصیات کہ اس کا وزن کیا ہو گا' لمبا کتنا ہو گا' جسامت کتنی ہو گی' موٹا پا کتنا ہو گا' خوبصورت ہو گا یا بدصورت' صحت مند ہو گا یا بیمار۔ اسی کے اندر انسان کی اعصابی خصوصیات' عقلی صلاحیتیں اور نفسیاتی حالات ودیعت کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کے میلانات' جذبات' رجحان' اچھائی کی طرف یا برائی کی طرف اس چھوٹے سے حیوان کے اندر ہی موجود ہوتا ہے۔

کون یہ تصور کر سکتا ہے کہ رحم مادر کے اندر معلق بیضے اور اس چھوٹے سے حیوان کے ملاپ کے اندر یہ سب کچھ موجود ہے۔ اور یہی نکتہ جو خوردبین سے نظر آتا ہے اس کے اندر پورا انسان موجود ہے جس کے جسم کی ساخت ہی پیچیدہ ہے۔ اس قدر کہ دنیا میں کوئی ایک انسان بھی دوسرے کا مکمل ہم شکل نہیں ہوتا۔ اور آدم سے لے کر آج تک کوئی بھی دو انسان مکمل طور پر ہم شکل نہیں ہوتے۔

اب یہ نکتہ علقہ سے مضغہ بن جاتا ہے۔ یہ گاڑھے خون کا ایک لوتھڑا ہوتا ہے' اس کی کوئی شکل و صورت نہیں ہوتی۔ اس کے بعد یہ مضغہ پھر شکل اختیار کرتا ہے' اور یہ ہڈیوں کے ہیکل کی شکل میں ہو جاتا ہے جس کے اوپر بھی گوشت چڑھتا ہے۔ اگر اس نے پیدا ہونا ہو ورنہ رحم مادر اسے باہر پھینک دیتا ہے۔ اگر اللہ نے اس کے لیے بحیثیت انسان دنیا میں آنا مقرر نہ کیا ہو۔

لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ "تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں"۔ مضغہ اور طفل کے درمیان قرآن مجید جملہ معترضہ کہتا ہے تاکہ ہم تمہیں بتائیں کہ خون کے اس لوتھڑے کے اندر قدرت الٰہیہ نے کیا کیا کمالات رکھے ہیں۔ یہ ہے قرآن مجید کا نہایت ہی مؤثر انداز بیان۔ اس کے بعد پھر رحم مادر میں جنین کے حالات۔ وَ نُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰي اَجَلٍ مُّسَمًّى (۲۲ : ۵) "ہم جس نطفے کو چاہتے ہیں ایک خاص مدت تک رحموں میں ٹھہراتے ہیں"۔ جن جنینوں کو اللہ تمام کر دینا چاہتے ہیں وہ رحم مادر میں رہتے ہیں اپنے وقت وضع حمل تک۔ ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (۲۲ : ۵) "پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں"۔ ذرا آپ نطفہ معلقہ کو دیکھیں اور طفل مولود کو دیکھیں دونوں کے درمیان کس قدر فرق ہے"۔

اگر اس زمانے کو دیکھا جائے تو بہت ہی تھوڑا ہے صرف ۹ ماہ عموماً اور اگر نطفہ معلقہ کو دیکھا جائے اور طفل مولود کو دیکھا جائے تو دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ نطفہ تو خوردبین کے بغیر نظر ہی نہیں آتا جبکہ بچہ ایک نہایت ہی پیچیدہ مکمل مخلوق کی شکل میں ہے جس کے اعضاء و جوارح ہیں۔ جس کے اپنے خدوخال ہیں' اپنی صفات اور صلاحیتیں ہیں اور جذبات و میلانات ہیں۔ یہ اس قدر بڑا فرق ہے کہ کوئی سمجھ دار' ذی عقل اور مفکر انسان اس پر بار بار غور کیے بغیر اور قدرت الٰہیہ کو تسلیم کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔

اس کے بعد قرآن مجید اس طفل مولود کے حالات کے ساتھ ذرا آگے جاتا ہے۔ یہ بچہ روشنی دیکھتا ہے اور اس پوشیدہ مقام کو چھوڑ دیتا ہے جس کے اندر اس نے یہ معجزانہ سفر طے کیا اور جہاں یہ نظروں سے اوجھل رہا۔

ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ (۲۲ : ۵) "پھر تمہاری پرورش کرتے ہیں تاکہ تم جوانی کو پہنچو"۔ اور اپنی جسمانی ساخت کو مکمل کرو' اپنی عقل بلوغت تک جا پہنچو' اور نفسیاتی طور پر ترقی یافتہ انسان ہو۔ اس مقام پر یہ بات غور طلب ہے کہ ایک نو لود بچے اور ایک مکمل نوجوان اور مضبوط انسان کے درمیان کس قدر درجات ہیں۔ ان کے درمیان کتنا عظیم فاصلہ ہے۔ زمانوں کے فاصلے سے بہت بعید۔ لیکن دست قدرت نے یہ تمام فاصلے طے کرا دیے۔ اس بچے کو دست قدرت نے تمام انسانی خواص عطا کر دیے اور رحم مادر کے ساتھ معلق نطفہ جو ایک بے قدر پانی پر مشتمل تھا' اب ایک مکمل انسان ہے۔ اس کے بعد پھر

وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰي وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰي اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا (۲۲ : ۵) "اور تم میں سے کوئی پہلے بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے"۔ جو بلا لیا جاتا ہے یعنی جلدی مرجاتا ہے تو وہ اپنے اس انجام تک جا پہنچتا ہے جو ہر زندہ کا آخری انجام ہے۔ کسی کو نہایت ہی بدترین عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے تو یہ ہمارے لیے قابل غور و فکر ہے کہ علم اور دانش مندی اور فہم و فراست اور کمال کے بعد وہ پھر ایک بچہ بن جاتا ہے۔ اس کے جذبات' تاثرات اور حافظہ بچوں کی طرح ہوتا ہے' وہ کوئی چیز ہاتھ میں نہیں پکڑ سکتا۔ حافظہ ختم ہو جاتا ہے' اسے کوئی چیز یاد ہی نہیں رہتی۔ یوں بھی بچہ ہوتا ہے کہ وہ

ہر حادثہ کو ایک اکیلا واقعہ سمجھتا اور دیکھتا ہے - دو واقعات کے درمیان کوئی ربط نہیں دیکھ سکتا - پھر وہ ہر بات کے بارے میں بار بار پوچھتا رہتا ہے - کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا - کیونکہ جب آخری واقعہ دیکھتا ہے اس کی ابتدائی کڑیاں وہ بھول چکا ہوتا ہے -

لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ( ۲۲ : ۵ ) "تاکہ اسے جاننے کے بعد کچھ نہ جانے" - اس کی گرفت سے وہ علوم بھی نکل جائیں جن کا وہ بہت ہی ماہر فن تھا اور کسی وقت تو وہ اللہ کی ذات و صفات میں بھی بحث کرتا تھا -

اس کے بعد انسانوں کی تخلیق اور ان کی تربیت سے ذرا آگے بڑھ کر زمین کے اندر حیوانوں اور نباتات کے تخلیقی عمل پر بحث کی جاتی ہے -

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَآ أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنۢبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيجٍ ( ۲۲ : ۵ ) "اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے 'پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی" -

ہمود موت و حیات کے درمیان ایک درجہ ہے - زمین بارش یا پانی ملنے سے قبل حالت ہمود میں ہوتی ہے - پانی حیوانات اور نباتات میں ایک بڑا عنصر ہے 'جب یہ نازل ہوتا ہے تو یہ زمین اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ( ۲۲ : ۵ ) حرکت کرتی ہے - یہ عجیب حرکت ہے جسے قرآن نے قلم بند کر دیا ہے - قبل اس کے کہ سائنسی آلات کے ذریعہ اس کا ملاحظہ کیا جائے - جب خشک زمین کو پانی ملے تو یہ حرکت کرتی ہے 'اٹھتی ہے 'پانی پیتی ہے 'پھول جاتی ہے - اس کے بعد اس میں سے نباتات پھوٹ کر نکلتے ہیں - مِن كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيجٍ ( ۲۲ : ۵ ) "اس نے ہر قسم کے خوش منظر نباتات کے جوڑے اگلنا شروع کیے" - اس سے زیادہ اور کوئی سین خوش منظر نہیں ہوتا کہ زمین جمود اور مردہ حالت سے ایک بار پھر زندگی سے بھرپور ہو جائے اور لہلہانے لگے -

قرآن مجید تمام زندہ چیزوں 'انسان 'حیوانات اور نباتات کے درمیان ایک ہی آیت میں ایک ربط پیدا کر دیتا ہے - وہ لوگوں کے فکر و نظر کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ ان چیزوں کے درمیان ایک گہرا تعلق ہے اور وہ کیا ہے؟ یہ قرابت اس بات کی دلیل ہے کہ زندگی کا حقیقی سبب ایک ہے 'وہ ایک ارادہ جو اسے جگہ جگہ نمودار کرتا ہے - زمین نباتات اور حیوانات اور انسان سب کے بارے میں یہ آیت :

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَأَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَّأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا ۙ وَأَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَن فِي الْقُبُورِ ۝

"یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے' اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے' اور یہ (اس بات کی دلیل ہے) کہ قیامت کی گھڑی آکر رہے گی' اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں' اور اللہ ضرور ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں جا چکے ہیں"۔

یہ بات یعنی انسان کو مٹی سے پیدا کرنا' پھر جنین کو مذکورہ بالا مختلف مراحل سے گزارنا' پھر بچے کا مختلف مراحل حیات طے کرنا' پھر خشک اور مردہ زمین کو بارش کے بعد زندہ کرنا' ان سب امور سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ حق ہے۔ اس لیے کہ ان باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خالق کائنات نے جو قانون قدرت اس دنیا کے لیے وضع کیا ہے' وہ حق ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اور زندگی کا یوں ترتیب کے ساتھ مرحلہ وار ترقی کرتے چلے جانا اس بات کی دلیل ہے کہ ایک واحد خالق اور مدبر کا ارادہ اس کائنات میں کام کر رہا ہے۔ یعنی زندگی اور اس پوری کائنات کے اندر جاری وساری قوانین فطرت میں اور اللہ کی سچائی میں گہرا ربط ہے۔

أَنَّهُ يُحْيِ الْمَوْتَى (۲۲ : ۶) "اور یہ کہ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے"۔ مردوں کو زندہ کرتا ہے یعنی جس طرح پہلے اس نے زمین سے انسان کو پیدا کیا اسی طرح دوبارہ اسی مٹی کو زندگی دینا اس کے لئے مشکل نہیں ہے۔

وَ اَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ (۲۲ : ۷) "اور یہ کہ اللہ ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں"۔ تاکہ وہ اس انجام تک پہنچیں جس کے وہ مستحق ہیں۔ کیونکہ اس کائنات کی حکمت تدبیر اور حکمت تخلیق کا تقاضا یہ ہے کہ مردوں کو اٹھایا جائے۔

یہ مختلف مراحل جن سے جنین گزرتا ہے' پھر جن سے ایک بچہ گزرتا ہے' جب وہ آنکھ کھولتا ہے یہ تمام مراحل یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ جو ارادہ مدبرہ یہ سب کام کرتا ہے وہ اس انسان کو موجودہ حالت سے نکال کر لازماً دارالکمال تک پہنچائے گا۔ حیات ارضی میں انسان کمال تک نہیں پہنچتا کیونکہ وہ ایک مقام تک پہنچ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر وہ زوال کی طرف آتا ہے۔

لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا "تاکہ وہ جاننے کے بعد کچھ نہ جانے"۔ اس کی روشنی میں ایک اور جہاں اور ایک اور جنم انسان کے لیے ضروری ہے جس میں وہ کمال حاصل کرے۔

تخلیق انسان اور حیوانات ونباتات اور ان کے یہ مدارج اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کو پیدا کرنے والا ان کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ دوسرے یہ کہ عملاً ان کو اٹھا کر وہ دوسرے جہاں تک لے جائے گا تاکہ وہ وہاں درجہ کمال تک پہنچ جائیں۔ اس طرح تخلیق کا اصول اور بعث بعد الموت کا ضابطہ باہم مل جاتے ہیں اور پھر آخرت میں حساب و کتاب بھی ان کا ایک طبعی انجام قرار پاتا ہے۔ اور ان تمام امور سے خالق مدبر کا ثبوت بھی ملتا ہے جس کا ہاتھ ان تمام امور میں کام کرتا ہے۔

ان بے شمار دلائل کے باوجود بعض لوگ پھر بھی اللہ کے بارے میں کلام کرتے ہیں۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى
وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ﴿۸﴾ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا
خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۹﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ
يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۰﴾ ع ۱ ۸

"بعض اور لوگ ایسے ہیں جو کسی علم اور ہدایت اور روشنی بخشنے والی کتاب کے بغیر گردن اکڑائے ہوئے' خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں تاکہ لوگوں کو راہ خدا سے بھٹکا دیں۔ ایسے شخص کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور قیامت کے روز اس کو ہم آگ کے عذاب کا مزا چکھائیں گے --- یہ ہے تیرا وہ مستقبل جو تیرے اپنے ہاتھوں نے تیرے لیے تیار کیا ہے ورنہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے"۔

ان دلائل کی موجودگی کے بعد بھی اللہ کے بارے میں کلام کرنا عجیب و غریب لگتا ہے اور نہایت ہی برا فعل ہے۔ نیز یہ جھگڑا جو لوگ کرتے ہیں وہ اہل علم ہی نہیں ہیں۔ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ نہ اس میدان میں انہیں کوئی خصوصی معرفت ہے۔ نہ وہ ایسی کسی کتاب سے دلیل لائے ہیں جو عقل کو روشن کر دیتی ہو۔ حق کی وضاحت کرتی ہو اور یقینی راہ بتلاتی ہو۔

یہاں ایسے لوگوں کی مخصوص تصویر کشی بھی کی جاتی ہے جنہوں نے غرور کی وجہ سے گردن اکڑائی ہوئی ہے۔

ثَانِيَ عِطْفِهٖ (۲۲ : ۹) "گردن اکڑائے ہوئے"۔ اور اس کی بات دلیل کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ وہ اکڑ کر بات کرتا ہے۔ بدرجہ متکبر ہوتا ہے۔

لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۲۲ : ۹) "تاکہ لوگوں کو خدا کی راہ سے بھٹکا دے"۔ ایسے لوگ صرف اس پر اکتفا نہیں کرتے کہ وہ خود گمراہ ہوں بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

لہٰذا ایسا غرور اور ایسی کرخت بڑائی اور گردن فرازی کا توڑنا ضروری ہے اس طرح کہ وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔

لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ (۲۲ : ۹) "ایسے شخص کے لیے دنیا میں رسوائی ہے"۔ رسوائی اور شرمندگی کبر اور غرور کے عین متضاد حالت ہے۔ اللہ کا یہ قانون ہے کہ وہ ان متکبرین' گردن فرازوں اور اکڑ والوں اور گمراہ ہونے والوں اور ایک دوسرے کو گمراہ کرنے والوں کی اس اکڑ کو توڑ کر رکھ دیتا ہے' اگرچہ ایک زمانے کے بعد۔ ہاں ایسے لوگوں کو اللہ مہلت دیتا ہے تاکہ جب زوال آئے تو وہ بہت زیادہ شرمندہ اور ذلیل ہوں اور اس تذلیل کا ان پر زیادہ اثر ہو۔ رہا آخرت کا عذاب تو وہ بہت ہی سخت اور بہت ہی دردناک ہے۔

وَنُذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيقِ (۲۲ : ۹) "اور قیامت کے دن ہم اسے جلنے کا عذاب چکھائیں گے"۔ چند لمحے بھی نہیں گزرتے کہ یہ دھمکی حقیقت کا روپ اختیار کر لیتی ہے یوں کہ دوران کلام انداز کلام کو اچانک حکایتی انداز سے خطاب میں بدل دیا جاتا ہے۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۲۲ : ۱۰) "یہ ہے تیرا یہ مستقبل جو تیرے اپنے ہاتھوں نے تیرے لیے تیار کیا ہے ورنہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے"۔ گویا ایک ہی لمحے میں اس کی سرزنش بھی ہو گئی اور وہ عذاب میں بھی جا گرا۔

---

اب قرآن کریم لوگوں میں سے بعض دوسری قسم کے لوگوں کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ اگرچہ اس قسم کے لوگ اس وقت دعوت اسلامی کے مقابلے پر تھے، لیکن ایسے نمونے ہر دور میں موجود رہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو یہودی مزاج رکھتے ہیں اور نظریہ کو بھی تاجرانہ انداز میں لیتے ہیں اور شہر مارکیٹ میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۱﴾ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾

"اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی بندگی کرتا ہے، اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا اور جو کوئی مصیبت آ گئی تو الٹا پھر گیا۔ اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔ یہ ہے صریح خسارہ۔ پھر وہ اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارتا ہے جو نہ اس کو نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ فائدہ۔ یہ ہے گمراہی کی انتہا۔ وہ ان کو پکارتا ہے جن کا نقصان ان کے نفع سے قریب تر ہے، بدترین ہے اس کا مولیٰ اور بدترین ہے اس کا رفیق"۔

عقیدہ اور نظریہ ایک مومن کی زندگی کا سرمایہ ہوتا ہے اور اسی پر مومن کی زندگی قائم ہوتی ہے۔ ایک مومن کے ماحول میں زندگی کے سمندر میں اضطرابات اور تلاطم آتے اور جاتے رہتے ہیں اور تیز طوفانی ہوائیں چلتی رہتی ہیں لیکن مومن ہے کہ وہ سمندر کے بیچ میں ایک چٹان کو مضبوطی سے پکڑ کر جم جاتا ہے۔ اس کے ماحول کے ارد گرد سے ایک ایک سہارا گرتا جاتا ہے لیکن وہ ہے کہ اس نے ایک مضبوط سہارا پکڑ رکھا ہوتا ہے اور اس کے پاؤں کو کوئی تزلزل نہیں ہوتا۔

ایک سچے مومن کی زندگی میں نظریہ کی یہ قدر و قیمت ہوتی ہے لہٰذا اسے اس پر جم جانا چاہئے۔ ضروری ہے کہ وہ

اسے مضبوطی سے پکڑ لے۔ اسے اس پر یقین ہونا چاہئے کہ یہ عقیدہ سچا عقیدہ ہے۔ اس کے بارے میں اس کے اندر کوئی تذبذب نہ ہو' اور اس پر وہ کسی عطا اور جزاء کا طلبگار بھی نہ ہو کیونکہ مومن کے لیے اس کا نظریہ اس کا حاصل ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ اور نظریہ ہی اس کی پناہ گاہ ہوتا ہے' یہی اس کا سہارا ہوتا ہے۔ یہ اس کا صلہ ہوتا ہے اس لیے کہ اس کی وجہ سے اس کے دل کو نور ملا ہے اور وہ راہ ہدایت پر آگیا ہے اور یہ اس پر مطمئن ہو گیا ہے۔ ایک مومن جب اسلامی نظریہ حیات کی پناہ گاہ میں ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس کے اردگرد اس کے ماحول میں لوگ مارے مارے پھر رہے ہیں' درخت کے گرے ہوئے پتوں کی طرح باد خزاں کبھی انہیں ادھر لے جاتی ہے اور کبھی ادھر۔ طوفانی ہواؤں کے بگولے انہیں اڑاتے پھرتے ہیں اور وہ سخت قلق اور بے چینی کا شکار ہیں جبکہ یہ اپنے نظریہ پر قائم و دائم اور مطمئن ہیں۔ وہ ثابت قدم ہیں' ان کی حرکات میں سکون اور ٹھہراؤ ہے اور وہ رضائے الٰہی کے لیے رات اور دن کام کرتے ہیں۔

جن لوگوں کے بارے میں یہاں بات ہو رہی ہے' وہ ایسے لوگ ہیں جو نظریات کی تجارت کرتے ہیں' ایمان و ضمیر کو لے کر بازار میں پھرتے ہیں۔

فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اطْمَاَنَّ بِهٖ (۲۲ : ۱۱) "اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا"۔ اور یہ کہا کہ بس ایمان میں تو خیر ہی خیر ہے۔ اب یہ شخص اس نظریہ سے منافع کماتا ہے۔ تھنوں سے دودھ نکالتا ہے۔ فصل بوتا ہے اور کاٹتا ہے اور اس کی تجارت بازار میں ہوتی ہے اور وہ اس کو جاری رکھتا ہے۔

وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ عَلٰي وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ (۲۲ : ۱۱) "اور اگر کوئی مصیبت آگئی تو الٹا پھر گیا۔ اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی"۔ دنیا تو اس طرح گئی کہ اس پر معمولی مصیبت آئی اور وہ اسے انگیز نہ کر سکا۔ اپنے مقام پر ثابت قدم نہ رہ سکا۔ اس نے برے حالات میں اللہ کی طرف رجوع نہ کیا اور آخرت یوں گئی کہ اس نے پہلے ایمان اور نظریہ کو چھوڑ دیا اور راہ ہدایت کے بجائے راہ ضلالت کو اختیار کر لیا۔

یہاں قرآن مجید ایسے لوگوں کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی بندگی ایک طرف ہو کر کرتے ہیں۔ یہ اسلامی نظریہ حیات کو مضبوطی سے نہیں پکڑتے' دعوت کے کاموں میں ثابت قدم نہیں ہوتے' ان کی پوزیشن کو اس طرح بتایا جاتا ہے کہ وہ نظریاتی موقف میں ایسی جگہ کھڑے ہوتے ہیں کہ ایک معمولی سے جھٹکے سے گر جائیں۔ بس ذرا سی مشکلات آئیں اور یہ بھاگ نکلے۔ ان کا کنارہ پر کھڑا ہونا ہی اس مقصد کے لیے تھا کہ بھاگنا آسان ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ نفع و نقصان سے چیزوں کا ناپنا تجارتی کاروبار میں ہوا کرتا ہے۔ نظریات میں دنیوی سود و زیاں کا معیار نہیں چلتا۔ نظریات میں تو یہ دیکھنا چاہئے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ حق کا ساتھ دینا چاہئے کہ نظریات میں حق وہ ہے جس پر ایک کارکن اپنی تحریکی بصیرت سے مطمئن ہو۔ اس کا نفع یہی ہوتا ہے کہ انسان کو حق مل جائے۔ انسان دل سے اس پر مطمئن ہو اور اس میں اسے قلبی سکون اور راحت مل جائے۔ بس یہی منزل مقصود ہوتی ہے ایک مومن کی۔ اس پر ایک سچا مومن کوئی خارجی جزاء نہیں چاہتا۔

سچا مومن اپنے رب کی عبادت اس لیے کرتا ہے کہ اس نے اسے ہدایت بخشی ہے۔ اس لیے کرتا ہے کہ اس کے لیے ایمان محبوب بنا دیا گیا ہے اور وہ ایمان اور نظریہ کے ساتھ محبت کرتا ہے۔ اگر اس پر کوئی دنیاوی فائدہ بھی مل جائے

تو یہ جزاء خیر ہے۔ یہ مومن کے لیے بندگی اور ایمان پر صلہ ہو گا۔

ایک سچا مومن اپنے خدا کو سود و زیاں کے زاویہ سے نہیں آزماتا۔ وہ تو جب اسلام کو قبول کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی ہر آزمائش کو بھی قبول کرتا ہے۔ وہ راضی ہوتا ہے کہ رب اسے جس طرح چاہے آزمائے وہ تیار ہے۔ خواہ اس پر خوشحالی ہو اور رب اسے آزمائے' چاہے اس پر بدحالی ہو اور رب اسے اس میں آزمائے' وہ ہر حال میں راضی ہو۔ یہ سودا بازار کے بائع اور مشتری کا سودا نہیں ہوتا کہ اس میں ہر وقت وہ سود و زیاں کا حساب کرتا رہے' بلکہ یہاں تو خالق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ اللہ کا اختیار ہے کہ جو چاہے کرے' کیونکہ اللہ ہی ہے جس نے مومن کو بنایا ہے۔

جو شخص اپنے ایمان اور نظریہ سے دست بردار ہو کر الٹا چلا جاتا ہے وہ ایسے خسارے میں پڑ جاتا ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے۔

ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (۲۲: ۱۱) "اور یہ صریح خسارہ ہے"۔ اس کی زندگی کا اطمینان جاتا رہا' اعتماد جاتا رہا' سکون جاتا رہا اور رضائے الٰہی سے بھی محروم ہو گیا۔ صحت' مال اور اولاد کے خسارے کے ساتھ ساتھ آخرت کا خسارہ تو بہت بڑا خسارہ ہے۔ دنیا کے اس خسارے کے ساتھ ساتھ اللہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔ ان کے اعتماد' ان کے بھروسے سے' ان کے صبر' ان کے اخلاص' اور ان کے اس حوصلے کو آزماتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی تقدیر کے فیصلے ماننے کے لیے تیار ہیں یا نہیں۔ اور آخرت کا خسارہ تو بہت بڑا خسارہ ہے کہ وہ آخرت کی دائمی نعمتوں سے محروم ہو گیا۔ اللہ کی رضامندی اور اللہ کے قرب سے محروم ہو گیا ہے۔ یہ ہے خسران مبین۔

لیکن یہ شخص جو اللہ کو ایک طرف ہو کر پوجتا ہے' یہ جائے گا کہاں؟ اللہ سے دور ہو کر یہ کہاں جائے گا؟

يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَ مَا لَا يَنْفَعُهٗ (۲۲: ۱۲) "پھر وہ اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارتا ہے جو اس کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ فائدہ"۔ یہ بتوں کی پرستش کرے گا' یا کسی شخصیت کی پرستش کرے گا جیسا کہ جاہلیت اولیٰ میں رواج تھا۔ دور جدید میں یہ کسی پارٹی یا کسی اکٹیٹر یا کسی مفاد کے پیچھے دوڑے گا جس طرح جدید جاہلیت کی صورت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب بھی لوگوں نے اللہ وحدہ کو پکارنا ترک کیا اور اللہ کی رضا اور اس کے نظام زندگی پر چلنا ترک کیا۔ تو ان کا انجام کیا ہوتا ہے؟ ایسے لوگ یکسوئی اور یک جہتی سے محروم ہو کر منتشر ہو جاتے ہیں۔

ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ (۲۲: ۱۲) "یہ ہوتی ہے گمراہی کی انتہا"۔ یعنی ایسے لوگ ہدایت کی راہ سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔

يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ (۲۲: ۱۳) "وہ ان کو پکارتا ہے جن کا نقصان ان کے نفع سے قریب تر ہے"۔ یعنی بت یا شیطان' یا آستانے۔ ان سب چیزوں کی معضرت زیادہ قریب ہے اور نفع بعید ہے۔ معضرت تو یہ ہے کہ انسانی دل و دماغ میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ وہم ذلت اور پسماندگی اس کے نصیب میں آتی ہے اور آخرت کا نقصان تو بہت ہی عظیم ہے۔

لَبِئْسَ الْمَوْلٰى (۲۲ : ۱۳) "ایسا آقا بہت ہی برا ہوتا ہے" - یعنی ایسا جو نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان -

وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ (۲۲ : ۱۳) "بدترین ہے اس کا رفیق" - یعنی یہ ساتھی جس سے یہ نقصان اٹھایا جا رہا ہے اس میں بت بھی شامل ہیں اور انسان بھی شامل ہیں - کیونکہ بعض لوگ انسانوں کو بھی الٰہ یا شبہ الٰہ بناتے رہتے ہیں - ہر دور میں ایسے انسان الٰہ ہوا کرتے ہیں اور مومنین کے لیے جو انعامات ہیں وہ بہت ہی عظیم ہیں، قیمتی ہیں - اگر دنیا میں کوئی مسلمان سب کچھ داؤ پر لگا دے تو بھی ان کے لیے جو اجر رکھا گیا ہے وہ پھر بھی زیادہ عظیم اور قیمتی ہے -

إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾

"(اس کے برعکس) اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے، یقیناً ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی - اللہ کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے" -

اس لیے اگر فتنوں میں سے کسی فتنے میں کوئی مومن مبتلا ہو جائے یا آزمائشوں میں سے کوئی آزمائش اس پر آجائے تو اسے چاہئے کہ وہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کرے اور اس کے اندر کوئی تزلزل پیدا نہ ہو - امید رکھے کہ اللہ ضرور اس کی امداد کرے گا اور اللہ اس بات پر قادر ہے کہ اس کی اس مصیبت اور آزمائش کو دور کرے اور اس کو جزائے خیر دے -

جو شخص یہ بھروسہ نہ رکھتا ہو کہ دنیا و آخرت میں اللہ اس کی مدد کرے گا، اور وہ مشکلات میں اللہ کی امداد سے مایوس ہو جائے - اگرچہ یہ سختیاں حد سے بڑھ جائیں، تو ایسا شخص اپنے بارے میں جو چاہے کرے - جس طرف چاہے اپنے نفس کو لے کر نکل جائے وہ جو جتن بھی کرے، اس کی مشکلات کو اللہ کے سوا کوئی دوسرا دور نہ کر سکے گا -

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَاۗءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾

"جو شخص یہ گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی کوئی مدد نہ کرے گا، اسے چاہیے کہ ایک رسی کے ذریعے آسمان تک پہنچ کر شگاف لگائے پھر دیکھ لے کہ آیا اس کی تدبیر کسی ایسی چیز کو رد کر سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے" -

یہ ایک نہایت ہی متحرک منظر ہے جس میں انسان کے نفسیاتی غیظ و غضب کو ظاہر کیا گیا ہے - اور اس کے ساتھ ایسے حالات میں ہونے والی حرکتوں کو بھی ظاہر کیا گیا ہے - ایسے حالات کو مجسم کر کے پیش کیا جاتا ہے جن میں انسان کا غصہ اور بے چینی اپنی انتہا پر ہو - ایک ایسا شخص جس پر مشکلات آ رہی ہوں اور اس کا تعلق رب تعالیٰ سے نہ ہو، یہ وہ شخص ہے جو مصیبت کے وقت ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے - اسے کسی طرف کوئی امید کی کرن نظر نہیں آتی، کسی طرف

سے باد نسیم کے کسی جھونکے کے لیے کوئی کھڑکی نظر نہیں آتی - یہ شخص ضیق نفس اور دلی درد سے ناقابل برداشت حد تک تنگ آجاتا ہے اور مایوسی کی اس حالت میں اسے رنج و الم اور پریشانی اور بے اطمینانی مزید تکلیف دیتی ہے - چنانچہ ایسے شخص کو قرآن کہتا ہے کہ اگر وہ بہت تنگ ہے تو کسی رسی کے ذریعے آسمانوں تک پہنچے' اس رسی کے ساتھ یہ لٹک جائے یا تو یہ خودکشی کر لے گا اور یا ہر گر جائے گا' یا اس کے ذریعہ اس کی جان نکل جائے گی - پھر وہ دیکھ لے کہ آیا ایسی تدابیر سے وہ اپنے آپ کو اس بری حالت سے نکال سکتا ہے -

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مسلسل مصائب صرف ایک ہی صورت میں برداشت کیے جا سکتے ہیں کہ انسان کو رحمت خداوندی کی امید ہو - مصائب و مشکلات صرف اس صورت میں دور ہو سکتی ہیں کہ انسان اللہ کی طرف توجہ کرے - مصیبتوں اور مشکلات پر قابو پانے اور ان سے نکلنے کی واحد صورت یہی ہے کہ انسان صرف اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرے' کسی مایوس شخص کی ہر حرکت زیادہ مایوسی اور زیادہ مصیبتوں کا باعث ہوتی ہے اور مصیبت زدہ شخص جب مایوس ہوتا ہے تو اسے مصیبت زیادہ تنگ کرنے لگتی ہے - لہٰذا میں ان تمام لوگوں کو دعوت دیتا ہوں جو مصائب اور تکالیف کی چکی میں پس رہے ہیں کہ وہ اللہ سے امداد طلب کریں - صرف یہی راستہ ہے جس سے وہ اطمینان پا سکتے ہیں اور اللہ کی رحمت کی باد نسیم ان پر چل سکتی ہے -

--- ○○○---

ہدایت و ضلالت کے حالات اور ہدایت و ضلالت کی مثالوں کے ایسے ہی بیانات کی خاطر اللہ نے یہ قرآن نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس قرآن کے لیے اپنے دل کھول دیں اور اللہ ان کو ہدایت نصیب کرے -

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾

"ایسی ہی کھلی کھلی باتوں کے ساتھ ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے' ہدایت دیتا ہے" -

اللہ نے ہدایت اور ضلالت کا فیصلہ پہلے ہی کر دیا ہے' جو ہدایت طلب کرے گا' تو اللہ کا ارادہ اس کی ہدایت کی شکل میں حقیقت کا روپ اختیار کر لے گا - یہ اللہ کی سنت کے مطابق ہو گا' اور جس نے ضلالت طلب کی تو اسے ضلالت ملے گی - یہاں اللہ نے صرف ہدایت ہی کا ذکر فرمایا ہے - کیونکہ ان آیات میں مضمون ہدایت ہی کا ہے کہ وہ ایک صحت مند دل میں کس طرح داخل ہوتی ہے -

رہے وہ فرقے اور مذاہب جو ایک دوسرے کے ساتھ الجھے ہوئے ہیں' ان میں سے حق پر کون ہے؟ تو اس کا فیصلہ اس دنیا میں ہونا تو مشکل ہے' قیامت کے دن اللہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا - اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کے عقائد میں حق کہاں ہے اور باطل کیا ہے؟

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ

شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ﴿۱۷﴾

"جو لوگ ایمان لائے ' اور جو یہودی ہوئے اور صابئی اور نصاریٰ ' اور مجوس اور جن لوگوں نے شرک کیا ' ان سب کے درمیان اللہ قیامت کے روز فیصلہ کر دے گا ' ہر چیز اللہ کی نظر میں ہے"۔

ان فرقوں کا تعارف اور تعریف پہلے گزر چکی ہے۔ یہاں ان کا ذکر اس اصول کے حوالے سے ہے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے ' ہدایت دیتا ہے اور اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہدایت پر کون ہیں اور ضلالت پر کون ہیں؟ آخرت میں اللہ ہی سب کا حساب و کتاب کرنے والا ہے۔ آخری فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے اور ہر چیز پر اللہ گواہ ہے۔

لوگ اگر اپنی فکر ' اپنی خواہشات اور اپنے ذاتی میلانات کے پیچھے دوڑ رہے ہیں تو دوڑتے رہیں۔ یہ پوری کائنات اپنی فطرت کے ساتھ اللہ کے قوانین قدرت کی مطیع ہے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ نافرمان اگر کوئی ہے تو انسان ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسۡجُدُ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ الشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ وَ النُّجُوۡمُ وَ الۡجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ کَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ کَثِیۡرٌ حَقَّ عَلَیۡہِ الۡعَذَابُ ؕ وَ مَنۡ یُّہِنِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ مُّکۡرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ ﴿ؕ۱۸﴾ السجدۃ

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کے آگے سربسجود ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں ' سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان اور بہت سے وہ لوگ بھی جو عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں؟ اور جسے اللہ ذلیل و خوار کر دے اسے پھر کوئی عزت دینے والا نہیں ہے ' اللہ کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے"۔

جب انسان اس آیت پر غور کرتا ہے تو ایک کثیر التعداد مخلوق خدا ' جو نظر آتی ' جو نظر نہیں آتی ' آسمانوں میں اور اجرام فلکی میں ' وہ چیزیں جو نظر آتی ہیں اور جو نظر نہیں آتی ہیں ' پھر جو نہایت ہی حساس آلات کی مدد سے نظر آتی ہیں ' لاتعداد پہاڑ ' درخت ' زمین پر چلنے والے حیوانات ' اور پرندے چرندے ' غرض مخلوقات الٰہی کا یہ سیلاب اللہ کے سامنے سربسجود ہے۔ صرف اللہ کی طرف متوجہ ہے۔ نہایت ہی اتحاد اور یک جہتی کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہے لیکن اگر اس مخلوق میں کوئی نافرمان ہے تو وہ انسان ہے۔ یہ واحد مخلوق ہے جو جسورانہ انداز میں نافرمانی کرتی ہے۔

وَ کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَ کَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْہِ الْعَذَابُ ( ۲۲ : ۱۸ ) "بہت سے انسان اور بہت سے وہ لوگ بھی عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں"۔ یعنی اللہ کی طرف جھکنے والی اور سجدہ ریز ہونے والی اس مخلوق میں انسان ہی ایک عجیب چیز نظر آتا ہے۔

چنانچہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ جس پر میرا عذاب حق ہو گیا یعنی وہ اس کا مستحق ہو گیا تو وہ ذلیل ہو گیا۔

وَ مَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ (۲۲ : ۱۸) "اور اللہ جسے ذلیل و خوار کر دے اسے پھر کوئی عزت دینے والا نہیں ہے" ۔ لہٰذا عزت وہی ہے جو اللہ دے ۔ طاقت وہی ہے جو اللہ نے دی ہو ۔ جو اللہ کے سوا کسی کے سامنے بھی جھکا وہ ذلیل و خوار ہوا۔

اب قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر جس میں اللہ کا اکرام اور اللہ کی تذلیل صاف صاف یوں نظر آتی ہے جیسا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے اسکرین پر یہ سب کچھ موجود ہے ' ذرا اسکرین پر دیکھئے ۔

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ؗ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ
لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿۱۹﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا
فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَ الْجُلُوْدُ ﴿۲۰﴾ وَ لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿۲۱﴾ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ ۲
يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۲۲﴾ اِنَّ اللّٰهَ ا ۲
يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا ۹
الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ؕ وَ لِبَاسُهُمْ
فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۲۳﴾

"یہ دو فریق ہیں جن کے درمیان اپنے رب کے معاملے میں جھگڑا ہے ۔ ان میں سے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کے لباس کاٹے جا چکے ہیں ' ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا جس سے ان کی کھالیں ہی نہیں پیٹ کے اندر کے حصے تک گل جائیں گے ۔ اور ان کی خبر لینے کے لیے لوہے کے گرز ہوں گے ۔ جب کبھی وہ گھبرا کر جہنم سے نکلنے کی کوشش کریں گے پھر اسی میں دھکیل دیے جائیں گے کہ چکھو اب جلنے کی سزا کا مزہ ۔ (دوسری طرف) جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان کو اللہ ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی ۔ وہاں وہ سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیے جائیں گے اور ان کے لباس ریشم کے ہوں گے" ۔

یہ ایک عجیب ' خوفناک اور چیخ و پکار سے بھرپور منظر ہے ۔ حرکت سے بھرپور ۔ قرآن کریم کا بہترین طرز تعبیر ذہن کے اندر یہ طویل تخیلاتی منظر اس طرح پیدا کر دیتا ہے کہ اسکرین پر واضح نظر آتا ہے ۔ یہ منظر بار بار دامن خیال کو پکڑتا ہے اور خیال اس سے دامن نہیں چھڑا سکتا۔

آگ کے لباس کاٹے جا رہے ہیں ' جدا جدا ہر شخص کے لیے ۔ دوزخیوں کے سروں پر سخت گرم پانی ڈالا جا رہا ہے ۔ پانی ڈالتے ہی ان کے چمڑے بلکہ جسم کے اندر کے حصے بھی گل سڑ جاتے ہیں ۔ لوہے کے کوڑے ہیں اور آگ میں گرم ہو رہے

ہیں۔ عذاب سخت سے سخت ہو رہا ہے۔ حد برداشت سے بڑھ جاتا ہے۔ لوگ گھبرا رہے ہیں' دوڑتے ہیں اور جہنم سے نکلنے کی سعی لاحاصل کر رہے ہیں لیکن سختی سے ان کو پھر اندر دھکیل دیا جاتا ہے۔ سختی سے ان کو ملامت کی جاتی ہے۔

وَ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ (۲۲:۲۲) "چکھو جلنے کا مزہ"۔ ان تمام مناظر کو خیال بار بار دہراتا ہے۔ یہاں تک کہ بھاگنے کی کوشش اور سختی کے ساتھ وہ لوگوں کا جہنم میں دہکیل دیا جانا' کی خیال ذہن میں دوڑتا ہے کہ اچانک ایک دوسرا منظر آ جاتا ہے' وہ ہے دو فریقوں میں سے دوسرے فریق کا منظر۔ ایک فریق کی حالت تو ابھی دیکھ چکے۔ اب اسکرین پر لقل جنت کا نقشہ آتا ہے۔ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ ان کے لباس آگ سے نہیں بلکہ ریشم سے سیے جا رہے ہیں۔ اس لباس کے ساتھ ساتھ ان کے جسم کو خوبصورت بنانے کے لیے زیورات بھی ہیں۔ سونے کے اور موتیوں کے۔ پھر لباس پر لباس اور وہ شیریں کلام ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے صراط مستقیم پر ہیں۔ نہ ان کی بات سخت ہے اور نہ ان کی راہ پر مشقت ہے۔ گویا شیریں کلامی اور حق گوئی اور راہ راست پر ہونا جنت کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ یہ اطمینان' یسر اور توفیق ربانی کی نعمت ہے۔

وَ هُدُوٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَ هُدُوٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴿۲۴﴾

"ان کو پاکیزہ بات قبول کرنے کی ہدایت بخشی گئی اور انہیں خدائے ستودہ صفات کا راستہ دکھایا گیا"۔ اللہ کی ذات کے بارے میں دو فریق وجود میں آ گئے۔ ایک گروہ ایسا ہے' جو بغیر ہدایت کے' بغیر دلیل کے اور بغیر کتاب منیر کے اللہ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور دوسرا گروہ جن کو آیات و ہدایات میں سے کوئی بات نظر نہیں آتی دونوں فریق اپنے انجام کو دیکھ لیں۔ جو لوگ اللہ کے بارے میں بغیر علم اور بغیر کتاب منیر کے بات کرتے ہیں وہ اپنا انجام دیکھ لیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۴۵ ایک نظر میں

پچھلے سبق کا خاتمہ اس پر ہوا تھا کہ ذات باری کے بارے میں لوگوں کے دو گروہ ہیں ۔ کافروں کا انجام قیامت میں کیا ہو گا اور اہل ایمان کے حالات کیسے ہوں گے ۔ اسی حوالے سے کفار کے اس طرز عمل پر بحث کی جاتی ہے جو انہوں نے اس دنیا میں اختیار کر رکھا ہے کہ وہ لوگوں کو مسجد حرام کی زیارت سے اب روکنے لگے ہیں ۔ مکہ میں تو انہوں نے دعوت اسلامی کی راہ روکنے کی بے حد جدوجہد کی' مگر جب یہ تحریک مدینہ منتقل ہوئی تو انہوں نے مسلمانوں کو زیارت حرم سے روک دیا۔

اس حوالے سے بتایا جاتا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے اس حرم کو تعمیر کیا تھا تو ان کے پیش نظر کیا مقاصد تھے ۔ انہوں نے کن مقاصد کے لیے اس کی تعمیر کے بعد لوگوں میں اعلان کیا تھا کہ وہ اس حرم کی زیارت کے لیے آزادانہ آئیں ۔ اس گھر کی تعمیر ہی عقیدۂ توحید پر ہوئی تھی ۔ یہ توحید کا گھر تھا ۔ اس میں شرک کرنے کا تو جواز ہی نہیں ہے ۔ پھر یہ گھر تمام انسانوں کے لیے تھا ۔ خواہ اس میں کوئی مقیم ہو یا باہر سے آئے ۔ یہ سب کی مشترکہ جگہ ہے ۔ کوئی وہاں کسی کو روک نہیں سکتا ۔ کوئی اس کا مالک نہیں ہو سکتا ۔ یہاں بعض شعائر زیارت و حج بھی بیان کر دیئے جاتے ہیں اور یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ ان کے پیچھے خدا خوفی اور خدا کے ساتھ تعلق کا کیا جذبہ ہے ۔ آخر میں بتایا جاتا ہے کہ حرم کے اندر کسی کو اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی پر کوئی بھی زیادتی کرے ۔ خصوصاً وہ لوگ جو حرم کو ان مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں جن کے لیے وہ بنا نہیں ہے ۔ ان کو تو کوئی حق ہی نہیں ہے کہ وہ اس کے متولی ہوں ۔ اس حرم کو آزاد کرنے کے لیے جو بھی اٹھے گا اور اس مشن کے تقاضے پورے کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی نصرت اس کے شامل حال ہو گی ۔ یہ جارحیت نہ ہو گی بلکہ مقاصد حرم پر دست درازی کرنے والوں کے مقابلے میں مدافعت ہو گی ۔

--- ooo---

# درس نمبر ۱۴۵ تشریح آیات

## ۲۵ --- تا --- ۴۱

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَٰهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَ الْبَادِ ۚ وَمَنْ
۳ يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢٥﴾ ع۳
۱۰

”جن لوگوں نے کفر کیا اور جو (آج) اللہ کے راستے سے روک رہے ہیں اور اس مسجد حرام کی زیارت میں مانع ہیں جسے ہم نے سب لوگوں کے لیے بنایا ہے 'جس میں مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق برابر ہیں (ان کی روش یقیناً سزا کی مستحق ہے)۔ اس (مسجد حرام) میں جو بھی راستی سے ہٹ کر ظلم کا طریقہ اختیار کرے گا اسے ہم دردناک عذاب کا مزا چکھائیں گے“۔

یہ مشرکین قریش کی کارروائی تھی کہ لوگوں کو وہ اللہ کے دین سے اور مسجد حرام سے روکتے تھے 'حالانکہ مسجد حرام ہی تو لوگوں کے لیے تھی چاہے وہ اس میں بسنے والے ہوں یا باہر سے زیارت کے لیے آنے والے ہوں۔ دین الٰہی وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعہ انسان اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔ پھر لوگوں کے لیے یہ ایک نظام زندگی ہے جس کے مطابق انہوں نے زندگی بسر کرنی ہے کیونکہ یہ ان کی زندگی کا منہاج ہے۔ قریش لوگوں کو دین اسلام سے بھی روکتے تھے اور مسجد حرام سے بھی روکتے تھے۔ حج و عمرہ سے بھی مسلمانوں کو روکتے تھے حالانکہ مسجد حرام کو اللہ نے دار امن و امان قرار دیا تھا جس میں مکہ کے باشندے اور باہر کے لوگ سب مساوی تھے۔ یہاں کسی کو کوئی امتیازی پوزیشن حاصل نہ تھی۔ نہ اس میں کوئی مالک بن سکتا تھا اور نہ امتیازی حقوق حاصل کر سکتا تھا۔

یہ وہ مقام احترام تھا جسے اللہ تعالیٰ نے ایک پرامن خطہ قرار دینے کے لیے سب سے پہلے مکہ مکرمہ کو منتخب کیا۔ اس خطے میں لوگ اسلحہ پھینکتے تھے 'باہم سخت عداوت رکھنے والے دو شخص بھی یہاں امن سے رہتے تھے۔ یہاں ہر قسم کی خونریزی ممنوع تھی۔ یہ کسی کی جانب سے کوئی مہربانی نہ تھی بلکہ تمام انسانوں کا یہ حق تھا اور اس حق میں سب برابر تھے۔ فقہاء کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ مکہ کے وہ گھر جن میں ان کے مالک رہائش نہیں رکھتے 'آیا ان کا

کوئی مالک ہو سکتا ہے یا نہیں ۔ اور اگر ملکیت کا جواز بھی ثابت ہو تو آیا ان مکانات کا کرایہ لیا جا سکتا ہے یا نہیں ۔ امام شافعیؒ اس طرف گئے ہیں کہ ملکیت بھی جائز ہے 'وراثت بھی جائز ہے 'کرایہ پر دینا بھی جائز ہے ۔ وہ حضرت عمر ابن الخطابؓ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ انہوں نے صفوان ابن امیہ سے ایک مکان مکہ میں چار ہزار درہم کے عوض خریدا تھا اور اس سے انہوں نے جیل خانہ بنایا تھا ۔ اسحاق ابن راہویہ اس طرف گئے ہیں کہ نہ ان کا کوئی وارث ہو سکتا ہے اور نہ ہی کرایہ پر دیئے جا سکتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم 'حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فوت ہوئے اس حال میں کہ مکہ کے میدان شاملات کہلاتے تھے 'جس کو ضرورت ہوتی وہ اس میں رہتا اور جس کی ضرورت سے زیادہ ہوتے وہ دوسرے کو اس میں بسا دیتا ۔ عبدالرزاق نے مجاہد 'اس کے باپ سے 'عبداللہ ابن عمر سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ مکہ کے مکانات کا بیچنا جائز نہیں ہے اور نہ ان کا کرایہ لینا جائز ہے ۔ انہوں نے ابن جریج سے بھی نقل کیا ہے کہ عطاء حرم میں مکانات کو کرایہ پر دینے سے منع کرتے تھے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ حضرت عمر ابن الخطابؓ مکہ کے مکانات کے دروازے لگانے سے منع کرتے تھے تاکہ حجاج ان کے صحنوں میں ٹھہر سکیں ۔ سب سے پہلے سہیل ابن عمرو نے دروازہ لگایا ۔ حضرت عمر ابن الخطابؓ نے اس معاملے میں اسے لکھا ۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ امیر المومنین میں ایک تاجر آدمی ہوں اس لیے میں نے دو دروازے لگائے ہیں تاکہ میں اپنی سواریاں یہاں بند کروں ۔ تو اس پر انہوں نے کہا کہ تمہیں اس کی اجازت ہے ۔ مجاہد کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اہل مکہ سے کہا 'اپنے گھروں کے سامنے گیٹ نہ لگاؤ تاکہ حج کو آنے والا جہاں چاہے اتر جائے ۔ امام احمد بن حنبلؒ نے ایک متوسط مذہب اختیار کیا ہے کہ ملکیت اور وراثت تو ان میں چلے گی مگر کرایہ پر دینا جائز نہ ہو گا ۔ یوں انہوں نے دلائل میں تطبیق کر دی ہے ۔

یوں اسلام نے تمام مذاہب کے مقابلے میں سب سے پہلے ایک خطے کو دارالامن قرار دیا ۔ بلکہ اسے تمام انسانوں کا شہر قرار دیا اور اس میں ملکیت اور دوسری حدبندیوں کو ناجائز قرار دیا ۔ چنانچہ اس صاف ستھرے اور سیدھے طریقے میں جو شخص ٹیڑھ پیدا کرتا ہے اس کو قرآن کریم دھمکی دیتا ہے کہ اسے سخت سزا دی جائے گی ۔

وَمَنْ يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ (۲۲ : ۲۵) "اس میں جو بھی راستی سے ہٹ کر ظلم کا طریقہ اختیار کرے گا اسے ہم دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے" ۔ یہ سزا تو اس شخص کے لیے ہے جو ارادہ کرے اور جو ارادہ کر کے ظلم کا ارتکاب بھی کرے تو اس کی سزا پھر بہت زیادہ ہو گی ۔ صرف ارادے پر سزا کا اعلان بہت زیادہ تاکید کی خاطر ہے ۔ یہ قرآن مجید کی نہایت ہی دقیق تعبیر ہے ۔

پھر قرآن مجید کے گہرے تاکیدی انداز کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ اس جملہ میں لفظ ان کی خبر کا ذکر نہیں کیا گیا ۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۲۲ : ۲۵)
یہاں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ ان کفار کے بارے میں حکم کیا ہے ؟ ان کا کیا انجام ہو گا ؟ ان کو کیا سزا ملے گی ؟ کفر کے ذکر ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی جزاء کیا ہے جبکہ وہ یہاں سے لوگوں کو روک رہے ہیں اور اسلام کی راہ بھی روک رہے ہیں ۔

--- ○○○---

اب روئے سخن اس گھر کی تعمیر اور تاریخ کی طرف، جس پر مشرکین کا قبضہ ہے۔ اس میں یہ لوگ بتوں کو پوجتے ہیں اور اہل توحید کو حق زیارت سے بھی محروم کر رہے ہیں محض اس لیے کہ وہ شرک سے پاک ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ رب تعالیٰ کی ہدایات اور احکام کے مطابق یہ کعبہ کس طرح وجود میں آیا یہ کہ یہ بنایا ہی اس لیے گیا تھا کہ یہ توحید کی بنیاد ہو گا۔ اور اس کا استعمال یہ ہو گا کہ اس میں اللہ وحدہ کی پرستش کی جائے گی اور یہ کہ وہ یہاں کے مقیم لوگوں اور زائرین دونوں کے لیے مخصوص ہو گا۔

وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْقَآئِمِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾ وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿۲۷﴾ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْۤ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿۲۸﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَ لْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَ لْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۲۹﴾

"یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو، اور لوگوں کو حج کے لیے اذن عام دے دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں، تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں، اور چند مقرر دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں بخشے ہیں، خود بھی کھائیں اور تنگ دست محتاج کو بھی دیں، پھر اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں، اور اس قدیم گھر کا طواف کریں"۔

پہلے دن سے یہ گھر توحید کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے اس کی جگہ کی نشاندہی کی اور ان کو اس بات کا اختیار دیا کہ وہ اس بنیاد پر اس کی تعمیر کریں۔

اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا (۲۲ : ۲۶) "میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو"۔ کیونکہ یہ صرف اللہ کا گھر ہے۔ اللہ کے سوا اس میں کسی کا حصہ نہیں۔ اور اسے پاک رکھو حاجیوں اور نماز قائم کرنے والوں کے لیے۔

وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْقَآئِمِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (۲۲ : ۲۶) "اور میرے گھر کو

طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع اور سجود کرنے والوں کے پاک رکھو"۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے بیت اللہ بنایا گیا ہے ۔ مشرکین کے لیے نہیں بنایا گیا جو اللہ کے سوا اوروں کی عبادت کرتے ہیں ۔

اس کے بعد اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام بانی بیت اللہ کو حکم دیا کہ ان مقاصد کے لیے اس گھر کو تعمیر کرنے کے بعد لوگوں میں اعلان کر دیں کہ وہ حج کے لیے آئیں اور اللہ نے وعدہ کیا کہ لوگ اس اعلان کو قبول کریں گے ۔ لہذا وہ قطار در قطار اونٹوں پر اور پیدل دور دراز مقامات سے آئیں گے ۔اتنی دور سے کہ ان کے اونٹ دوری سفر کی وجہ سے دبلے ہو جائیں گے ۔

اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو وعدہ کیا تھا وہ آج بھی پورا ہو رہا ہے اور کل بھی ہو گا۔ آج تک لوگوں کے دل خانہ کعبہ کے ساتھ اٹکے ہوئے ہیں ۔بیت اللہ کو دیکھنے اور طواف کے لیے لوگوں کے دل دھڑکتے ہیں ۔ جو غنی ہے ' زاد سفر پر قدرت رکھتا ہے سواری کی سہولت رکھتا ہے وہ سواری پر 'جدید ترین سواری پر ' اور جس کے پاس صرف پاؤں ہیں وہ اپنے پاؤں پر چل کر اس گھر کی زیارت کو آتے ہیں ۔لاکھوں افراد دور دراز علاقوں سے 'فج عمیق سے 'بلکہ فضائے بلند سے قطار اندر قطار ہر سال ٹوٹ پڑتے ہیں ' ہزارہا سال گزر گئے ہیں اور حضرت ابراہیم کا اعلان اور اللہ کا وعدہ پورا ہو رہا ہے ۔

یہاں حج کے بعض شعائر اور بعض مقاصد بھی بتا دیے جاتے ہیں :

لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَاۗىِٕسَ الْفَقِيْرَ (۲۸) ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (۲۹) (۲۲ : ۲۸ - ۲۹) "تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں ' اور چند مقرر دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں بخشے ہیں ' خود بھی کھائیں اور تنگ دست محتاج کو بھی دیں ' پھر اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں ' اور اس قدیم گھر کا طواف کریں"۔

وہ منافع کیا ہیں جو حجاج دیکھتے ہیں؟ حج دراصل ایک عالمی اجتماع اور میلہ ہے ' یہ تجارت کا موسم اور عبادت کا موسم ہے ۔ یہ ایک ایسا عالمی اجتماع ہے 'جس میں تمام دنیا کے مسلمان ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں ۔تمام مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں اور ان کے درمیان یک جہتی پیدا ہوتی ہے ۔

یہ ایک ایسی عبادت ہے جس میں دنیا اور آخرت دونوں جمع ہوتی ہیں اور یہ دراصل اسلامی نظریہ حیات کے آثار قدیمہ کی زیارت بھی ہے ۔ سامان زیارت اور مصنوعات والے لوگوں کے لیے یہ ایک بہترین منڈی ہے ۔ آپ دیکھیں کہ دنیا کے سامان خوردونوش اور دنیا کے پھل اس گھر کی طرف 'اطراف زمین سے آتے ہیں اور لائے جاتے ہیں ۔ تمام علاقوں سے حجاج کھنچے چلے آتے ہیں اور ان کے ساتھ ان کے علاقوں کی بھلائیاں اور حسن اخلاق بھی آتے ہیں اور پھر یہ خوشبو پورے عالم اسلام میں بکھرتی ہے ۔ یہ تمام لوگ بیت الحرام میں مختلف موسموں میں جمع ہوتے ہیں اور ایک موسم

میں بھی جمع ہوتے ہیں گویا یہ ایک تجارتی منڈی ہے اور تجارتی میلہ بھی۔

پھر حج عبادات کا ایک عالمی اجتماع ہے' جس میں روحانی صفائی کی جاتی ہے۔ انسان کی روح یہ محسوس کرتی ہے کہ اللہ کے اس محترم گھر میں وہ اللہ کے زیادہ قریب ہو گئی ہے۔ یہ روح خانہ کعبہ کی طرف مشتاق ہوتی ہے اور خانہ کعبہ کے ساتھ جو روحانی یادیں وابستہ ہیں' جن برگزیدہ ہستیوں کی ذات اس سے وابستہ ہے ان کی روحیں اسے یہاں گھومتی محسوس ہوتی ہیں' زمانہ قریب کی روحیں اور زمانہ بعید کی روحیں۔

دیکھئے یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی روح ہے' وہ بیت اللہ میں اپنے جگر گوشہ اسماعیل اور ان کی والدہ کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ وہ اپنے ڈرنے والے اور دھڑکنے والے دل کے ساتھ رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

رَبَّنَا اِنِّيْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (١٤ : ٣٧) پروردگار' میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار' یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں' لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے' شاید کہ یہ شکرگزار بنیں۔

پھر حضرت ہاجرہ کی تصویر پردہ خیال پر آتی ہے' وہ اپنے لیے اور اپنے شیرخوار بچے کے لیے پانی کی تلاش میں' جھلسا دینے والی گرمی میں' بیت اللہ کے گرد گھوم رہی ہیں۔ پھر صفا اور مروہ کے درمیان دوڑتی نظر آتی ہیں' وہ پیاس سے نڈھال ہیں' تھک کر چور چور ہو گئی ہیں اور ان کو اپنے بچے کی جان کا خطرہ ہے۔ وہ جب ساتویں بار واپس آتی ہیں تو مایوسی کی وجہ سے ٹوٹ چکی ہیں۔ کیا دیکھتی ہیں کہ اس خوبصورت بچے کے سامنے شفاف پانی کا ایک چشمہ ابل رہا ہے۔ یہ ہے چشمہ زم زم۔ خشکی اور مایوسی کے صحرا میں چشمہ رحمت الٰہی ہے۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تصور پردۂ خیال پر نمودار ہوتا ہے۔ آپ خواب دیکھ رہے ہیں کہ آپ حضرت اسماعیل کو ذبح کر رہے ہیں۔ آپ فوراً اپنے لخت جگر کو ذبح کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ لمحہ بھر کے لیے بھی تردد نہیں کرتے اور مومنانہ اطاعت شعاری کا بلند مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْ اَرٰي فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰي "اس نے کہا' اے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں' تمہارا کیا خیال ہے؟" حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی بڑی فرمانبرداری سے جواب دیتے ہیں:

يٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ "ابا جان' آپ کو جو حکم دیا گیا ہے' اسے کر گزریں ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے"۔ جب وہ دونوں تیار ہو جاتے ہیں تو اللہ کی رحمت جوش میں آتی ہے اور اس قربانی کے بدلے فدیہ قبول کر لیا جاتا ہے۔

وَنَادَيْنَهُ اَنْ يَّا اِبْرَاهِيْمُ (١٠٤) قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (١٠٥) اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰؤُا الْمُبِيْنُ (١٠٦) وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (١٠٧) (٣٧: ١٠٤ تا ١٠٧)

اور ہم نے ندا دی کہ "اے ابراہیم" تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی"۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا۔

اور پھر حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہ السلام دونوں خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نہایت عاجزی اور خضوع و خشوع کے ساتھ دعا کر رہے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (١٢٧) رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (١٢٨)

"اے ہمارے رب ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے تو سب کچھ سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا، جو تیری مسلم ہو، ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔

یہ خیالی تصویر اور شخصیات پردۂ خیال پر آگے پیچھے آ رہی ہیں اور یہ یادیں سامنے آتی ہیں اور جاتی ہیں کہ اچانک حضرت عبدالمطلب سامنے آتے ہیں۔ وہ یہ نذر مانتے ہیں کہ اے اللہ اگر تو نے مجھے دس بیٹے عطا کیے تو میں دسویں بیٹے کو تیرے لیے نذر کر دوں گا۔ دسواں بیٹا عبداللہ ہے۔ عبدالمطلب نذر پوری کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان کی قوم ان کے اردگرد جمع ہے۔ اور وہ تجویز دے رہے ہیں کہ آپ فدیہ دے دیں۔ وہ خانہ کعبہ کے گرد وہ تیر نکالتے ہیں اور ہر بار تیر عبداللہ کے ذبح کرنے کا نکلتا ہے۔ وہ فدیہ بڑھاتے جاتے ہیں یہاں تک کہ فدیہ کے اونٹ سو تک پہنچ جاتے ہیں حالانکہ فدیہ کا ابتدائی نصاب دس اونٹنیاں تھیں۔ آخر کار فدیہ کا تیر نکلا۔ انہوں نے سو اونٹ ذبح کیے اور عبداللہ کی جاں بخشی ہوئی۔ یہ اللہ کی منشاء تھی کیونکہ اللہ نے ان کی پشت اور رحم آمنہ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جیسے جلیل القدر پیغمبر کو پیدا کرنا تھا۔ گویا یہ فدیہ عظیم فدیہ اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خاطر دلایا۔

اس کے بعد بھی اس گھر کے ساتھ بہت سی یادیں وابستہ ہیں اور تخیل کے پردے پر بار بار نئی شخصیات ابھر رہی ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مدارج طفولیت طے کر رہے ہیں، بیت اللہ کے اردگرد وہ گھوم رہے ہیں۔ دیکھئے، آپ حجر اسود کو اپنے پاک ہاتھوں سے اٹھا رہے ہیں اور اپنی جگہ پر رکھ رہے ہیں تاکہ اس فتنے کو فرو کر دیں جس کی وجہ سے خیال کے اندر جنگ چھڑنے کا خطرہ تھا۔ آپ نماز پڑھتے نظر آتے ہیں، طواف کرتے نظر آتے ہیں، خطبہ دیتے نظر آتے ہیں، اعتکاف کرتے نظر آتے ہیں۔ آپ کے قدم پردۂ خیال پر ہیں۔ آپ کی صورت ضمیروں پر زندہ ہے۔ قریب ہے کہ ایک حاجی آپ کو آنکھوں سے دیکھ لے جبکہ وہ ان یادوں کی سوچ میں گم اور مستغرق ہوتا ہے۔ پھر ہمارے سامنے آپ کے صحابہ کرام غول کے غول آتے ہیں اور اس مٹی پر گھومتے ہیں۔ بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں۔ یہ نقشے ایسے ہیں کہ قریب ہے کہ کان سنیں اور نظریں دیکھیں۔

اور پھر ان یادوں اور تصورات کے علاوہ حج مسلمانوں کا ایک جامع عالمی اجتماع ہے۔ اس میں ان کو اپنی اس اصلیت اور جڑ کا پتہ چلتا ہے جو دور تک تاریخ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام تک چلی گئی ہے۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا "اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر۔ اس نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس میں بھی"۔ یہ مسلمانوں کا محور ہے جس کے ارد گرد وہ گھومتے ہیں' جس نے انہیں متحد کر رکھا ہے۔ یہ ان کے لیے ایک شعار اور ایک جھنڈا ہے۔ اس کے نیچے سب جمع ہوتے ہیں' یہ ایک ایسا نظریاتی شعار اور نظریاتی جھنڈا ہے جس کے سائے میں تمام اقوام کے افراد' تمام نسلوں اور تمام رنگوں اور تمام زبانوں کے لوگ آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ تمام امتیازات مٹ جاتے ہیں۔ یہاں آکر مسلمان اپنی اس قوت کو ایک محدود وقت کے لیے محسوس کرنے لگتے ہیں۔ عقیدۂ توحید کی قوت' ایک ملت ہونے کی قوت اور اربوں مسلمانوں کے باہم اتحاد و اتفاق کی قوت۔ اس اجتماع میں وہ اپنی بھلائی ہوئی قوت کو ایک محدود وقت کے لیے ہی محسوس کرتے ہیں اور اس طرح محسوس کرتے ہیں کہ اگر یہ ایک ہو جائیں تو ان کے سامنے دنیا کی کوئی قوت نہیں ٹھہر سکتی بشرطیکہ یہ سب لوگ عقیدۂ توحید پر ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔

اللہ جو فرماتے ہیں لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (۲۲ : ۲۸) "تاکہ وہ اپنے ان مفادات کو دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں"۔ ہر نسل اپنے ظروف و احوال کے مطابق' اپنی حاجت اور ضرورت کے مطابق' اپنے تجربے اور اپنے تقاضوں کے مطابق اس اجتماع سے مفادات حاصل کر سکتی ہے۔ یہ بات اس وقت سے اللہ نے اس اجتماع کے مقاصد میں رکھی ہے جب سے اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ لوگوں کو اس گھر کی زیارت کے لیے بلاؤ۔

قرآن مجید اس اجتماع کے لئے بعض مناسک اور بعض بنیادی شعائر دیتا ہے اور سب میں سب کا بھلا ہے۔

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ

(۲۲ : ۲۸) "اور چند مقرر دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں بخشے ہیں"۔ اس آیت میں اشارہ ہے قربانی کی طرف جو عید کے دن اور ایام تشریق میں کی جاتی ہے اور قربانی کے مختلف جانور ذبح کیے جاتے ہیں۔ قرآن کریم قربانی کے ذکر میں سب سے پہلے یہ حکم دیتا ہے کہ اس پر اللہ کا نام لیا جائے کیونکہ مقصد اللہ کی بندگی اور اللہ کی رضامندی کا حصول ہے۔ یہاں قربانی کے عمل میں سب سے زیادہ امتیاز کے ساتھ جس عمل کا ذکر ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اس پر اللہ کا نام لیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ صرف جانور ذبح کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اصل مقصد اس پر اللہ کا نام لینا ہے۔ (احناف کا فتویٰ اس پر ہے کہ یوم نحر کے بعد صرف دو دنوں میں قربانی جائز ہے)۔

یہ قربانی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح عظیم کی یادگار ہے۔ اللہ کے معجزات میں سے ایک معجزے اور اللہ کی اطاعتوں میں سے ایک عظیم تعمیل حکم کی بھی یادگار ہے۔ جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے یادگار کے طور پر چھوڑی۔ اس یادگار میں فائدہ یہ ہے کہ فقراء اور مساکین کے لیے کھانے کا انتظام ہو جاتا ہے۔ قربانی کے جانور اونٹ' گائے' بھینس اور بھیڑ بکری ہے۔ (گائے اور بھینس دونوں کے لیے عربی میں بقر کا لفظ آتا ہے)

فَكُلُوا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ (۲۲ : ۲۸) "اس سے خود بھی کھائیں اور تنگ دست محتاج کو بھی دیں"۔ قربانی کے گوشت کے استعمال کے لیے جو حکم قربانی کرنے والے کو ہے یہ استحبابی ہے لیکن فقیروں کو دینے کے لیے جو حکم ہے وہ وجوبی ہے۔ خود کھانے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ فقراء محسوس کریں کہ یہ پاک صاف اور طیب گوشت ہے۔

قربانی کرتے ہی حاجی کے لیے وہ باتیں جائز ہو جاتی ہیں جو اس کے لیے دوران حج ممنوع تھیں۔ مثلاً بال منڈوانا' کاٹنا' ناخن کاٹنا' بغلوں کے بال کاٹنا اور غسل وغیرہ جو کام بھی احرام کے دوران منع تھے وہ جائز ہو جاتے ہیں' اس کے بارے میں کہا گیا۔

ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَ لْيُوفُوا نُذُوْرَهُمْ (۲۲ : ۲۹) "پھر اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں"۔ جو نذریں انہوں نے مانی ہوں یعنی حج کی قربانی کے علاوہ جو نذریں انہوں نے مانی ہوں۔

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (۲۲ : ۲۹) "اور قدیم گھر کا طواف کریں"۔ اس سے مراد طواف افاضہ یا طواف زیارت (جو نام بھی دیں) ہے۔ طواف افاضہ طواف وداع سے علیحدہ ہے۔

بیت عتیق سے مراد مسجد حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کسی بھی جبار کی حکمرانی سے بچایا ہے اور اسی طرح اسے گرنے اور نشانات کے مٹ جانے سے بھی بچایا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے آباد کرنے سے یہ ہمیشہ آباد رہا ہے اور رہے گا۔

یہ تھا قصہ بیت الحرام کی تعمیر کا۔ اور یہ ہے وہ بنیادی عقیدہ جس پر اس کی تعمیر ہوئی' یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے حکم دیا کہ اسے توحید کے گھر کے طور پر تعمیر کریں۔ اور اسے شرک و بت پرستی سے پاک رکھیں اور حکم دیا کہ عامۃ الناس کو حکم دیں کہ وہ اس کی زیارت کو آئیں۔ قربانی کے جانوروں پر اللہ کا نام لیں' اس کے سوا کسی دوسرے الہ کا نام نہ لیں۔ قربانی کے گوشت کو خود بھی کھائیں اور تنگ دست اور فقیر کو بھی کھلائیں۔ یہ بیت الحرام ہے اور اس میں اللہ کی حرمتیں محفوظ ہیں۔ ان پر عمل ہو گا اور اللہ کی حرمتوں میں سے پہلی چیز اسلامی نظریہ حیات اور عقیدۂ توحید ہے۔ اس گھر کے دروازے تمام لوگوں کے لیے کھلے ہوں اور یہاں سب لوگوں کی جان و مال محفوظ ہوں' یہاں تمام عہد پورے کیے جائیں اور امن و سلامتی کا احترام کیا جائے۔

ذٰلِكَ ۗ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ وَ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۙ﴿۳۰﴾ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿۳۱﴾

"یہ تھا (تعمیر کعبہ کا مقصد) اور جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کا احترام کرے تو یہ اس کے رب کے نزدیک خود اسی کے لیے بہتر ہے۔ اور تمہارے لیے مویشی جانور حلال کیے گئے' ماسوا ان چیزوں کے جو تمہیں بتائی جا چکی ہیں۔ بس

بتوں کی گندگی سے بچو' جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو' یکسو ہو کر اللہ کے بندے بنو' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شریک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر گیا' اب یا تو اسے پرندے اچک لے جائیں گے یا ہوا اس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اس کے چیتھڑے اڑ جائیں گے"۔

اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو ہاتھ بھی نہ لگایا جائے۔ یہ اللہ کے ہاں بہت بڑی نیکی اور خیر ہے۔ انسانی شعور اور انسانی ضمیر کی دنیا میں بھی خیر کثیر ہے۔ واقعی اور عملی زندگی میں بھی یہ خیر ہے' کیونکہ جو ضمیر حرمتوں کا شعور رکھتے ہوئے بچنے کی کوشش کرے گا وہی پاک ہو گا۔ جس زندگی میں اللہ کی حرمتوں کا احترام ہو گا۔ وہی زندگی امن و امان اور سلامتی کی نعمت سے مالا مال ہو سکتی ہے۔ اور اس میں کسی پر کوئی ظلم و زیادتی نہیں ہو سکتی۔ ایسی ہی زندگی میں امن کے مقامات اور اطمینان کے گھر مل سکتے ہیں۔

مشرکین بھی بعض جانوروں کا احترام کرتے تھے۔ مثلاً بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام۔ ان کے نزدیک یہ جانور محترم تھے اور ان کو ہاتھ لگانا بھی جرم تھا۔ لیکن یہ مشرکین کی خود ساختہ حرمتیں تھیں۔ اللہ کی طرف سے ان کے بارے میں کوئی حکم نہ تھا۔ تو یہاں کہہ دیا کہ اللہ نے کھانے کے جانوروں میں سے جو حرام قرار دیئے ہیں ان کا ذکر ہو چکا ہے مثلاً مردار' خون' خنزیر۔ اور وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کی نذر ہو۔

وَ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ (۲۲: ۳۰) "تمہارے لیے مویشی حلال کیے گئے ہیں ماسوائے ان چیزوں کے جو تمہیں بتائی جا چکی ہیں"۔ یہ اس لیے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی مقرر کردہ کوئی حرمت نہ ہو۔ اللہ کے سوا کسی کو حلال و حرام قرار دینے کی اجازت نہیں اور اللہ کی شریعت کے سوا کسی اور شریعت کے مطابق احکام جاری نہ ہوں۔

حلت اور حرمت کی بحث ہی کی مناسبت سے بتوں کی گندگی سے بچنے کی بھی تاکید کر دی گئی۔ مشرکین بتوں پر جانور ذبح کرتے تھے حالانکہ یہ ناپاکی تھی۔ رجس اس ناپاکی کو کہتے ہیں جس کا تعلق انسان کے نفس' ضمیر اور دماغ سے ہو' شرک اسی قسم کی معنوی ناپاکی ہے۔ شرک قلب و ضمیر کو اسی طرح ناپاک کر دیتا ہے جس طرح گندگی کپڑے کو ناپاک کر دیتی ہے۔

پھر شرک اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے اور سفید جھوٹ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ اس بڑے جھوٹ کے ساتھ ساتھ تمام جھوٹوں سے بچو۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (۲۲: ۳۰) "بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو"۔ قرآن مجید نے جھوٹ کو شرک کے ساتھ جوڑ کر اس کے گناہ کو اور بھیانک بنا دیا ہے۔ امام احمد روایت کرتے ہیں کہ فاتک اسدی نے حضور سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھی اور منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔

عدلت شهادة الزور الا شراك بالله عز وجل "اور جھوٹی شہادت کو شرک کے برابر کر دیا گیا ہے"۔ اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔

اللہ تعالیٰ کی خواہش یہ ہے کہ لوگ ہر قسم کے شرک کو چھوڑ دیں اور ہر قسم کے جھوٹ کو چھوڑ دیں اور خالص عقیدۂ توحید پر جم جائیں۔

حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ (۲۲ : ۳۱) "یکسو ہو کر اللہ کے بندے ہو جاؤ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو"۔ اس کے بعد آیت میں ایک خوفناک منظر ایک مثال کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے کہ جو شخص توحید کے بلند افق سے گرا تو اس کا حال کیا ہوتا ہے۔ وہ شرک کی پستیوں میں جا گرتا ہے اور وہ اس طرح ختم ہو جاتا ہے کہ اس کا نام ونشان ہی نہیں رہتا۔ گویا وہ تھا ہی نہیں۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (۲۲ : ۳۱) "اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر گیا۔ اب یا تو اسے پرندے اچک لے جائیں گے یا ہوا اسے ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اس کے چیتھڑے اڑ جائیں گے"۔

یہ منظر ایسے شخص کا ہے جو بہت ہی بلند جگہ سے گر جائے جیسا کہ آسمان سے زمین پر گر کر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے اور اسے پرندے اچک لے جائیں یا ہوا اسے نظروں سے دور پھینک دے۔ یا ہوا اسے ایسی جگہ پھینک دے ایسے گڑھے میں جہاں اسے کوئی قرار نصیب نہ ہو۔ یعنی اس منظر میں تمام مراحل بڑی تیزی سے سرانجام پاتے ہیں۔ سخت تیزی اور پھر اقدامات لگاتار ہیں اور ہر مرحلے کے ۔۔۔۔ کا استعمال ہے۔ جو ترتیب واقعات بغیر فاصلہ وقت پر دلالت کرتی ہے یعنی یہ شخص بڑی تیزی سے منظر سے غائب ہوتا ہے۔ یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز ہے تصویر کشی کا۔

پھر جس طرح قرآن کریم نے شرک کرنے والے کی تصویر کشی کی ہے فی الواقعہ بھی اس کی حالت کچھ ایسی ہی ہوتی ہے کیونکہ وہ توحید اور ایمان کے بلند مقام سے گر جاتا ہے اور اس کی شخصیت منتشر ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے پاس وہ مضبوط اساس یعنی عقیدۂ توحید ہی نہ رہا جس پر وہ کھڑا ہو سکے۔ اب اس کے لیے کوئی جائے قرار ہی باقی نہیں ہے۔ پرندے اس کو اچک لیں گے یعنی خواہشات نفسانیہ اور اوہام و خرافات ہر طرف سے اسے اپنی طرف کھینچیں گے۔ چونکہ اس کے ہاتھ میں مضبوط رسی نہ ہوگی اس لیے وہ ہر طرف کھنچتا چلا جائے گا۔ کبھی ایک طرف گرے گا اور کبھی دوسری طرف کیونکہ اس کے پاؤں کے نیچے مضبوط بنیاد نہ ہوگی۔

اب بات آگے بڑھتی ہے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کی حرمتوں کا احترام کرو اور ان سے تعرض نہ کرو۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کے شعائر کی تعظیم کرو' شعائر اللہ کیا ہیں۔ وہ جانور جو حج کے موقع پر ذبح ہوں گے' ان کی تعظیم میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ موٹے تازے ہوں اور قیمتی ہوں۔

ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾ ۴

۸ ع لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾ ۱۱

"یہ ہے اصل معاملہ (اسے سمجھ لو)' اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔ تمہیں ایک وقت مقرر تک ان (ہدی کے جانوروں) سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے 'پھر ان (کے قربان کرنے) کی جگہ اسی قدیم گھر کے پاس ہے"۔

یہاں حاجیوں کی قربانیوں اور دلوں کے تقویٰ کے درمیان تعلق بتایا گیا ہے کہ حج کے تمام شعائر' تمام مناسک اور تمام حرکات سے بڑا مقصد دلوں کے اندر خدا کا خوف پیدا کرنا ہے۔ بذات خود یہ مناسک اور شعائر کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز وہ غرض و غایت ہے جو ان سے حاصل کرنا مطلوب ہے اور وہ یہ ہے کہ انسانوں کا تعلق اللہ تعالیٰ سے پیدا کیا جائے۔ ان شعائر اور مناسک کے اندر وہ یادیں ہیں جن کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے بعد کے زمانے سے ہے اور ان کا اصل مقصد اطاعت الٰہی ہے 'توجہ الی اللہ ہے۔ اور جب سے یہ امت پیدا کی گئی اس میں اللہ کی طرف متوجہ ہونے کے دو ہی راستے ہیں : ایک دعا' اور دوسرا نماز۔

یہ مویشی جن کے احترام کی بات ہو رہی ہے' ان کو ایام احرام کے آخر میں ذبح کیا جاتا ہے' اس عرصہ میں ان کے مالک کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ ان سے نفع اٹھائے۔ اگر اس کو ضرورت ہو تو وہ ان پر سوار بھی ہو سکتا ہے اور اگر ان کے دودھ کی ضرورت ہو تو دودھ بھی استعمال کر سکتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے محل تک پہنچ جائیں۔ اور ان کا مقام بیت عتیق ہے یعنی خانہ کعبہ۔ یہاں پھر ان کو ذبح کیا جائے گا تاکہ لوگ خود بھی کھائیں اور محتاجوں اور فقیروں کو بھی دیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دور میں مسلمان قربانی کے جانور اچھے سے اچھا تلاش کرتے تھے۔ موٹا تازہ اور قیمتی' اس کو وہ تعظیم شعائر اللہ کا حصہ سمجھتے تھے اور خدا خوفی کی وجہ سے وہ ایسا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک بہترین اونٹنی کو قربانی کے لیے خریدا اور تین سو درہم قیمت ادا کی۔ اس نے کہا حضورؐ نے ہدی کی خاطر ایک اونٹنی تین صد روپے میں خریدی ہے تو کیا مجھے اجازت ہے کہ میں اسے فروخت کر کے اس کی جگہ اور اونٹنیاں خریدوں؟ حضورؐ نے فرمایا نہیں اسی کو ذبح کرو۔ حضرت عمرؓ زیادہ قیمتی اونٹنی کو فروخت کر کے رقم جیب میں رکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ اسے فروخت کر دیں اور اس کی جگہ اس رقم سے زیادہ جانور خرید کر ذبح کر دیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس بات کو پسند کیا کہ آپ اسی نفیس اور قیمتی اونٹنی کو قربانی کر دیں۔ اور اس کو فروخت کر کے زیادہ اونٹنیاں یا گائے نہ خریدیں۔ اگرچہ اس صورت میں گوشت زیادہ ہو جاتا لیکن شعوری زاویہ سے اور خدا کی راہ میں اچھا مال دینے کے لحاظ سے یہ زیادہ بھاری تھا اور شعوری قیمت کی زیادہ اہمیت ہے۔

فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَي الْقُلُوْب (۲۲ : ۳۲) "کیونکہ اس کا تعلق دلوں کے خوف سے ہے"۔ یہ تھا مفہوم اسی بات کا جو حضورؐ نے حضرت عمرؓ سے کہی کہ اسے تبدیل نہ کرو اور اسی کو ذبح کرو۔

یہ مناسک اور شعائر جن کے احترام کا حکم دیا جاتا ہے' قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ تمام اقوام کے ہاں رائج ہیں لیکن اسلام جن شعائر کی قدر کرتا ہے' انہیں بحال رکھتا ہے اور ان کے احترام کا حکم دیتا ہے ان کا رخ اسلام نے خدا کی طرف موڑ دیا ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ﴿٣٤﴾ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلَاةِ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿٣٥﴾

"ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے تاکہ (اس امت کے) لوگ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔ (ان مختلف طریقوں کے اندر مقصد ایک ہی ہے) پس تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے اور اسی کے تم مطیع فرمان بنو۔ اور اے نبی، بشارت دے دو عاجزانہ روش اختیار کرنے والوں کو، جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کا ذکر سنتے ہیں تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں، جو مصیبت بھی ان پر آتی ہے اس پر صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں"۔

اسلامی نظام زندگی کی پالیسی یہ ہے کہ وہ انسان کے احساسات اور اس کے رجحانات کو اللہ کی ذات کے ساتھ وابستہ کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی اسکیم یہ ہے کہ شعور، عمل، سرگرمی، عبادت، ہر حرکت اور ہر عادت کو ایک نئی سمت دی جائے اور ہر چیز کو اسلامی نظریہ حیات کے رنگ میں رنگ دیا جائے۔ اس نقطہ نظر سے اسلام نے ان مذبوحہ جانوروں کو حرام قرار دے دیا ہے جن پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو اور یہ لازم کر دیا کہ ذبیحوں پر اللہ کا نام لیا جائے بلکہ عین ذبح کے وقت اونچی آواز سے اللہ اکبر کہا جائے گویا جانور ذبح ہی اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس طرح اللہ کا نام لیا جائے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ

(۲۲ : ۳۴) "ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے تاکہ اس امت کے لوگ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں"۔

اس کے بعد عقیدہ توحید کی تصریح آتی ہے۔

فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ (۲۲ : ۳۴) "(مقصد صرف یہ ہے) کہ تمہارا ایک ہی خدا ہے"۔ جب خدا ایک ہے تو ہر معاملہ میں اطاعت بھی اسی ایک کی ہونی چاہیے۔

فَلَهُ أَسْلِمُوا (۲۲ : ۳۴) "پس اس کے مطیع فرمان بنو"۔ یہ اطاعت جبر کی اطاعت نہیں ہے اور نہ اسلام میں کوئی جبر ہے، بلکہ دل کی آمادگی سے سر تسلیم خم کرنا مقصود ہے۔

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ (۲۲ : ۳۴) الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ (۲۲ : ۳۵)

"اے نبی، بشارت دے دو عاجزانہ روش اختیار کرنے والوں کو، جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کا ذکر سنتے ہیں تو ان کے دل کانپ

اٹھتے ہیں"۔ محض للہ کا نام سنتے ہی ان کے شعور اور ان کے ضمیر میں اللہ کا خوف پیدا ہو جاتا ہے اور وہ کانپ اٹھتے ہیں۔

وَ الصّٰبِرِيْنَ عَلٰي مَآ اَصَابَهُمْ (۲۲: ۳۵) "جو مصیبت بھی ان پر آتی ہے اس پر صبر کرتے ہیں"۔ لہٰذا اللہ ان کے بارے میں جو فیصلہ کرے ان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

وَ الْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ (۲۲: ۳۵) "اور نماز قائم کرتے ہیں"۔ اور اللہ کی عبادت اس طرح کرتے ہیں جس طرح عبادت کرنے کا حق ہوتا ہے۔

وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۲۲: ۳۵) "اور جو کچھ رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں"۔ وہ اپنے مال میں للہ کے مقابلے میں بخل نہیں کرتے۔

یوں عقیدے 'نظریات اور دین کے بنیادی شعائر کے اندر ربط پیدا کر کے ذات باری کو ہر چیز کا محور بنا دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح اسلامی نظام کا یہ جزء خصوصاً عبادات اس کے عقائد و نظریات کا مظہر اور رمز بن جاتی ہیں۔ اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کی پوری زندگی میں اس کے عقیدے کا رنگ ہو' اس طرح ان کی قوت عمل اور ان کی سمت کے درمیان کوئی تضاد نہ ہو اور نفس انسانی شعور انسانی اور عمل انسانی کے درمیان کوئی تضاد اور کوئی کشمکش نہ ہو۔

اب سیاق کلام ذرا مزید آگے جاتا ہے۔ اور اس مفہوم کو مزید تاکیدی انداز میں یوں پیش کیا جاتا ہے کہ محض کھانے پینے کے لیے ذبح کیے جانے والے جانوروں کے اس شعار اور عمل میں بھی اصل روح وہی ہے۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَا دِمَآؤُهَا وَ لٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾

اور (قربانی کے) اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے شعائر للہ میں شامل کیا ہے' تمہارے لیے ان میں بھلائی ہے' پس انہیں کھڑا کر کے ان پر للہ کا نام لو اور جب (قربانی کے بعد) ان کی پیٹھیں زمین پر ٹک جائیں تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور ان کو بھی کھلاؤ جو قناعت کیے بیٹھے ہیں اور ان کو بھی جو اپنی حاجت پیش کریں۔ ان جانوروں کو ہم نے اس طرح تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ تم شکریہ ادا کرو۔ نہ ان کے گوشت للہ کو پہنچتے ہیں نہ خون مگر اسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اس نے ان کو تمہارے لیے اس طرح مسخر کیا ہے تاکہ اس کی بخشی ہوئی ہدایت پر تم اس کی تکبیر کرو۔ اور اے نبیؐ بشارت

دے دے نیکوکار لوگوں کو"۔

یہاں قربانی کے جانوروں میں سے صرف اونٹ کا ذکر کیا جاتا ہے' اس لیے کہ یہ سب سے بڑا ہوتا ہے۔ اس کا قربانی میں ذبح کیا جانا تمہارے لیے مفید ہے۔ جب زندہ ہو تب بھی مفید ہے کہ تم اس پر سوار ہوتے ہو اور اس کا دودھ دوہتے ہو اور جب ذبح کر دیا جائے تو بھی تم گوشت کھاتے ہو' لہٰذا اس "خیر" کو ذبح کرتے وقت تمہارا فرض بنتا ہے کہ اس پر اللہ کا نام لو۔ جب اسے ذبح کے لیے تیار کیا جا رہا ہو تو بھی اس پر اللہ کا نام لو' جب وہ صف کی شکل میں کھڑے ہوں۔

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ (۲۲:۳۶) "پس ان پر اللہ کا نام لو جب وہ صف میں ہوں"۔ اونٹوں کو اس طرح ذبح کیا جاتا ہے کہ وہ تین پاؤں پر کھڑے ہوں اور ایک پاؤں باندھا ہوا ہو۔ اور جب وہ ذبح کے بعد گر جائیں اور ان کی پیٹھ زمین پر ٹک جائے تو پھر تم ان سے کھانا چاہو تو کھاؤ اور ان کا گوشت اس فقیر کو بھی کھلاؤ جو سوال نہیں کرتا اور اس کو بھی کھلاؤ جو سوال کرتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے ان کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ لوگ اس "خیر" پر خدا کا شکر ادا کریں جو ان میں لوگوں کے لیے ہے۔ زندگی میں بھی اور ذبح ہونے کے بعد بھی۔

كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲۲:۳۶) "ان جانوروں کو ہم نے اس طرح تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو"۔

تمہیں جو حکم دیا جاتا ہے کہ ان کو اللہ کا نام لے کر ذبح کرو تو اس کا مقصد ہے لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا (۲۲:۳۷) "نہ ان کا گوشت اللہ کو پہنچتا ہے نہ خون"۔ خون اور گوشت تو اللہ تک نہیں پہنچتا' نہ اللہ کو ضرورت ہے' اللہ کو مطلوب جذبہ خدا خوفی ہے۔ اس لیے مشرکین مکہ کی یہ حرکت کہ وہ جانوروں کو ذبح کر کے خون لے جا کر بتوں پر ملتے تھے محض ایک سوقیانہ حرکت ہے۔ اللہ اس سے بے نیاز ہے۔

كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ (۲۲:۳۷) "اس نے ان کو تمہارے لیے اس طرح مسخر کیا ہے تاکہ اس کی بخشی ہوئی ہدایت پر اس کی تکبیر کرو"۔ اس نے تمہیں عقیدہ توحید کی ہدایت کی ہے۔ اس کی طرف متوجہ ہونے کی ہدایت کی ہے' اللہ اور بندے کے درمیان حقیقی تعلق کے قیام کی ہدایت کی ہے اور اپنے اعمال کو صحیح سمت دینے کی ہدایت کی ہے۔

وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ (۲۲:۳۷) "اور بشارت دے نیکوکاروں کو"۔ جن کا تصور بھی حسین ہے جن کا شعور بھی حسین ہے' جن کی عبادت بھی پر احسان ہے اور اللہ کے ساتھ جن کا ربط بھی خدا خوفی کا ہے۔

یوں ایک مسلم کا ہر قدم' اس کی ہر حرکت اور اس کی ہر سوچ ایسی ہوتی ہے کہ وہ اس میں ذات باری کو پیش نظر رکھتا ہے اس میں اس کا دل خوف خدا سے لبالب ہوتا ہے اور وہ ہر کام میں رضائے الٰہی کا طلبگار ہوتا ہے۔ غرض اس کی پوری زندگی اس مقصد کو پورا کر رہی ہوتی ہے جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے اور دنیا میں بھی اس کی زندگی صحت مند اور مفید اور اس کی غایت کی شاخیں آسمانوں پر ہوتی ہیں۔

اسلام کے یہ شعائر اور مناسک مقرر ہیں۔ عبادات اور عبادات کے مقامات متعین کیے گئے ہیں اور ان کا احترام ضروری قرار دیا گیا ہے' اس لیے ایک ایسی قوت کی ضرورت ہے جو ان شعائر کا احترام قائم کرے' آزادی فکر و نظر کے حق کو قائم کرے اور ہر شخص کے لیے ایسے مواقع پیدا کرے کہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق اللہ کی پرستش کر سکے۔ نیز مقامات عبادات کے تقدس کو بھی قائم رکھ سکے۔ نیز یہ ممکن بنایا جا سکے کہ مومنین' عابدین اور عمل صالح کرنے والے نیک لوگ اپنے نظریہ حیات کے مطابق نظام زندگی قائم کر سکیں جس کا ایک طرف سے رابطہ اللہ تعالیٰ سے ہو اور دوسری جانب سے وہ نظام اس دنیا کے تمام انسانوں کے لیے موجب خیر و برکت ہو۔ غرض دنیا و آخرت کی بھلائی کا ضامن ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ہجرت کے بعد مسلمانوں کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ اب اللہ کی راہ میں ہتھیار اٹھا سکتے ہیں تاکہ وہ اپنی ملت کی مدافعت کر سکیں' اپنے نظریہ اور عقیدہ کی مدافعت کر سکیں' اگر کوئی دشمن ان کے علاقے پر حملہ آور ہو تو اس کا دفاع کر سکیں' کیونکہ مسلمانوں پر ظلم و ستم اپنی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ اس قتال کا مقصد وحید صرف یہ ہے کہ لوگوں کے لیے بشمول اہل اسلام عقائد و نظریات کی آزادی قائم ہو سکے۔ اللہ کے دین کے نظام کے اندر' اللہ کی نصرت کا وعدہ حقیقت کا روپ اختیار کر سکے اور وہ دین اسلام اور نظام اسلام کے وہ فرائض ادا کر سکیں جن کا ذکر ذیل کی آیات میں آیا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ
۵ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ ﴿٣٨﴾ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ ع ۵
نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن ۱۲
يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ
وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ
مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٤٠﴾ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا
الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ
الْأُمُورِ ﴿٤١﴾

"یقیناً اللہ مدافعت کرتا ہے ان لوگوں کی طرف سے جو ایمان لائے ہیں۔ یقیناً اللہ کسی خائن کافر نعمت کو پسند نہیں کرتا۔ اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے' کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے"۔ اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجے اور معبد اور مسجدیں' جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے' سب مسمار کر ڈالی جائیں۔ اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔

اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے 'نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے"۔

اس کرۂ ارض پر شر کی قوتیں ہر وقت کام کرتی ہیں۔ خیر و شر اور ہدایت وضلالت کے درمیان معرکہ ہر وقت برپا رہتا ہے۔ اور یہ معرکہ اس وقت سے قائم ہے جب سے اللہ نے اس کرۂ ارض پر انسان کو پیدا کر کے بھیجا ہے۔

شر ہمیشہ سرکش ہوتا ہے اور باطل ہمیشہ قوت اور اسلحہ سے لیس ہوتا ہے۔ شر کی گرفت بے رحمانہ ہوتی ہے اور اس کی مار بے ترسی سے ہوتی ہے۔ اگر اللہ کے کچھ بندوں کو راہ ہدایت معلوم ہو جائے تو وہ ان کی راہ روکتا ہے اور ان کو حق سے دور ہٹاتا ہے 'اگر کسی کا دل حق کے لیے کھل جائے۔ لہذا ضروری ہے کہ ایمان 'حق اور بھلائی کی پشت پر بھی قوت ہو 'تاکہ باطل کی پکڑ' سرکشی' فتنے اور زیادتی سے اسے روکا جاسکے۔ اور حق کو دشمنوں اور سختیوں سے بچایا جائے۔

اللہ کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ ایمان 'بھلائی اور سچائی کو اس طرح کمزور چھوڑ دیا جائے کہ وہ میدان میں باطل کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس سلسلہ میں اہل حق کے دلوں میں پائی جانے والی قوت ایمانی پر زیادہ سے زیادہ بھروسہ کیا جاتا ہے اور انسانی فطرت اور انسانی ضمیر میں حق کے ولولہ سے کام لیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر باطل قوتوں کے مقابلے میں حق کی کوئی قوت نہ ہو تو اہل حق اس سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ ان کے قدم ڈگمگا سکتے ہیں۔ اہل حق کی فطرت کو بھی بگاڑا جاسکتا ہے۔ کیونکہ صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور مصائب برداشت کرنے کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے اور ایک حد پر جاکر انسانی قوتیں جواب دے دیتی ہیں۔ اللہ لوگوں کے قلوب و نفوس کو اچھی طرح جانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے یہ نہیں چاہا کہ اہل ایمان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزمائش میں ڈال دیا جائے۔ ہاں اس حد تک قوت کے استعمال سے روکا جاسکتا ہے کہ جب وہ مقابلے کی تیاری کر رہے ہوں۔ دفاع کی تیاریاں ہو رہی ہوں اور وسائل جہاد جمع کیے جا رہے ہوں جب وہ یہ کام کر چکیں تو پھر ان کو قتال کی اجازت ہے تاکہ وہ اہل کفر کی دست درازیوں کا روک کر سکیں۔

اذن قتال دینے سے قبل اللہ تعالیٰ اعلان فرماتے ہیں کہ وہ خود اہل ایمان کی طرف سے دفاع کرتے ہیں اور یہ کہ اللہ ان کی نصرت اور تعاون پر قدرت رکھتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۲۲ : ۳۸) "یقیناً اللہ مدافعت کرتا ہے ان لوگوں کی طرف سے جو ایمان لائے ہیں"۔ اللہ اہل ایمان کے دشمنوں کو پسند نہیں کرتا کیونکہ انہوں نے حق کا انکار کیا ہے اور وہ خائن بھی ہیں۔ لہذا یقیناً اللہ ان کو رسوا کر کے رہے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ (۲۲:۳۸) "بے شک اللہ کسی خائن اور کفران نعمت کرنے والے کو پسند نہیں کرتا"۔ اللہ نے یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ اہل ایمان کو اپنے دفاع کا پورا پورا حق پہنچتا ہے 'ان کا موقف درست ہے 'آداب جنگ کے اعتبار سے بھی کیونکہ وہ مظلوم ہیں' وہ جارحیت کے مرتکب ہرگز نہیں ہوئے اور نہ ہی وہ سرکشی کرنے والے ہیں۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (۲۲ : ۳۹) "اجازت دے دی گئی ہے ان لوگوں کو جن کے

خلاف جنگ کی جارہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں" ۔ان کو چاہئے کہ وہ اللہ کی اس حمایت پر مطمئن ہو جائیں ۔ اللہ ضرور ان کی مدد کرے گا۔

وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ (۲۲ : ۳۹) "اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے" ۔ ان کو اس معرکہ آرائی کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ وہ پوری انسانیت کے لیے اس عظیم مہم میں کود رہے ہیں ' اس مہم کے نتائج صرف انہی کے لیے مفید نہ ہوں گے ' بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے مفید ہوں گے کیونکہ اس کے نتیجے میں ایمان اور نظریات کی آزادی کے بنیادی حقوق قائم ہوں گے ۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی جواز فراہم کرتی ہے کہ ان کو اپنے گھروں اور اپنے ملک سے بغیر کسی جواز کے نکالا گیا ہے ۔

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (۲۲ : ۴۰) "یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے" ۔ حالانکہ یہ بہت ہی سچی بات تھی جو کبھی کہی جاسکتی ہے ۔ یہ اس بات کی نہایت ہی مستحق تھی کہ اسے بار بار دہرایا جائے ۔ جب اس بات کی وجہ سے ان لوگوں کا اخراج عمل میں آیا تو یہ کھلی سرکشی اور ظلم تھا اور اس میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ جبکہ مظلوموں کی جانب سے کوئی ذاتی دشمنی کسی کے ساتھ نہ تھی 'محض ان کا نظریہ ہی تھا جس کی وجہ سے ان کو نکال دیا گیا ۔ اس کشمکش میں اس دنیا کے مفادات میں سے بھی کسی مفاد کا دخل نہ تھا کہ کوئی مفادات ' خواہشات یا کسی طمع و لالچ کا بہانہ کر سکے ۔ یا ہمدردیوں اور کسی اور ذاتی پسند و ناپسند کا بہانہ بنایا جاسکے ۔ یہ صرف نظریاتی جنگ تھی ۔

پھر یہ بھی ایک عمومی اصول ہے کہ کسی بھی نظریہ کے لیے قوت مدافعت کی بے حد ضرورت ہوتی ہے ۔

وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (۲۲ : ۴۰) "اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجے اور معبد اور مسجدیں ' جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے ' سب مسمار کر ڈالی جائیں" ۔ صومعہ عبادت کی اس جگہ کو کہا جاتا ہے 'جہاں راہب عبادت کرتے ہیں ۔ بیع نصاریٰ کی عبادت گاہ ہے ۔ یہ صومعہ سے زیادہ وسیع ہوتی ہے ۔ صلوت یہودیوں کی عبادت گاہ کو کہتے ہیں ۔ مساجد مسلمانوں کی عبادت گاہیں ہوتی ہیں ۔

اگرچہ یہ مقامات اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص اور مقدس ہیں لیکن یہ سب مسمار ہو سکتے ہیں اگر ان کی پشت پر قوت مدافعت نہ ہو ۔ اہل باطل کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ان مقامات پر اللہ کا نام لیا جاتا ہے بلکہ ان مقامات کی حمایت اور ان کا بچاؤ تب ہی ہو سکتا ہے کہ کسی عقیدے کے حامی اس کی پشت پر ہوں اور ان کے اندر قوت مدافعت بھی ہو ۔ اور وہ اپنے عقیدہ کے احترام کو بزور قوت دشمن سے منوا بھی سکتے ہوں ۔ باطل تو سرکش ہوتا ہے وہ تب ہی رکتا ہے جب اس جیسی قوت اس کے مقابل کے پاس بھی ہو جس پر باطل حملہ آور ہو رہا ہے ۔ محض اس لیے کہ حق 'حق ہے ۔ باطل حملہ آور ہونے سے نہ رکے گا ۔ لہٰذا حق کی پشت پر بھی ایک مساوی بلکہ برتر قوت ہونی چاہئے جو اس کا دفاع کر

سکے۔ یہ ایک کلی قاعدہ ہے جب تک انسان ہے ایسا ہی ہو گا۔

یہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ان نصوص قرآنیہ پر غور کریں جن کے الفاظ تو بہت کم ہیں لیکن ان کے معانی بہت ہی وسیع ہیں۔ یہ نصوص انسانی نفس انسانی' زندگی اور انسانی زندگی کے واقعات کے اہم رازوں پر مشتمل ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو قتال کی اجازت دے رہے ہیں جن کے ساتھ مشرکین نے جنگ کی اور ان پر دست درازیاں کیں۔ یہ اس لیے کہ اللہ اہل ایمان سے مدافعت کی ذمہ داری لیتا ہے اور اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ خیانت گر اہل کفر اہل اسلام پر دست درازیاں کریں۔

اِنَّ اللّٰہَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ (۲۲:۳۸)

"اللہ مدافعت کرتا ہے ان لوگوں کی طرف سے جو ایمان لاتے ہیں یقیناً اللہ کسی خائن کافر نعمت کو پسند نہیں کرتا"۔ اللہ نے مسلمانوں کو یہ ضمانت دے دی کہ وہ ان کی جانب سے مدافعت کرے گا اور جس کی مدافعت اللہ کرے تو یہ بات یقینی ہے کہ دشمن اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا۔ وہ اپنے دشمن پر غالب ہو گا' تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ پھر ان کو قتال کی اجازت کیوں دیتا ہے؟ پھر جہاد کیوں فرض کیا گیا ہے؟ پھر وہ کیوں لڑتے ہیں جس میں وہ قتل بھی ہوتے ہیں' زخمی بھی ہوتے ہیں اور ان کو جدوجہد اور مشقتیں بھی کرنی ہوتی ہیں اور مشکلات برداشت کرنی پڑتی ہیں اور قربانیاں بھی دینی ہوتی ہیں اور نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ غالب ہوتے ہیں حالانکہ اللہ بغیر ان کی جدوجہد کے بھی اور بغیر کسی مشقت اور قربانی کے بھی اور بغیر کسی قتل و قتال کے بھی ان کی جانب سے مدافعت کر سکتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کی حکمت اس باب میں بہت ہی گہری اور بہت ہی دور رس ہے۔ اللہ کی حجت اصل مقام تک پہنچنے والی ہے اور بہت ہی اونچی ہوتی ہے لیکن ہم جس قدر سمجھ سکے ہیں اور جس قدر ہماری عقلوں میں سمجھنے کی صلاحیت ہے اور جس قدر ہمارے تجربات ہیں' ان کے مطابق جو بات سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ میری دعوت کے حاملین سست اور کاہل رہیں اور وہ نہایت ہی سستی سے بیٹھے رہیں۔ اور ان پر اللہ کی نصرت آجائے اور وہ شہزادوں کی طرح بیٹھے ہوں۔ محض اس لیے کہ وہ قرآن پڑھتے ہیں' نماز پڑھتے ہیں اور ہر حال میں اللہ کے سامنے دست بدعا ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ کام جو سب کے سب ضروری ہیں ان کو اس قابل نہیں بناتے کہ یہ لوگ دعوت اسلامی کی حمایت کریں اور اس کی جانب سے دفاع کریں۔ نماز' عبادت' اور دعاء تو ایک سپاہی کے لیے زاد راہ ہیں اور جنگ میں یہ اخلاقی قوت کا کام دیتے ہیں' اہل ایمان کے پاس یہ مزید اسلحہ ہے جو دشمن کے پاس نہیں ہے۔ دشمن کے پاس جو روایتی اسلحہ ہے وہ مسلمان کے پاس بھی ہے اور تقویٰ ہے اور اتصال باللہ اس پر مزید ہے۔

اللہ کی مشیت یہ ہے کہ مسلمانوں اور اہل ایمان کا دفاع وہ خود مسلمانوں اور اہل ایمان کے ذریعہ سے کرے تاکہ معرکہ آرائی کے دوران مسلمان پختہ ہو جائیں۔ اس لیے کہ انسانی شخصیت کے اندر موجود خفیہ قوتیں تب ہی بیدار ہوتی ہیں' جب انسان کو خطرہ درپیش ہو' اور انسان اپنی مدافعت کر رہا ہو۔ مقابلے اور جنگ میں انسان اپنی پوری قوت لے کر دشمن کے مقابلے میں نکل آتا ہے۔ ایسے حالات میں انسانی قوت کا ہر ہر خلیہ متحرک اور تیار ہو جاتا ہے کہ وہ اپنا کردار ادا کرے۔ دوسرے خلیوں کے ساتھ تعاون کرے اور مشترکہ کارروائیاں کرے۔ جس قدر قوت کی فراہمی اس سے ممکن ہو' وہ فراہم

کرے۔ غرض وہ اپنی قوت کا آخری ذرہ بھی نکال دے اور انسان اس مقام تک پہنچ جائے جو اس کے لیے مقدر رہتا ہے۔

جو جماعت دعوت اسلامی کو لے کر اٹھتی ہے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی قوت کا ہر خلیہ اپنی قوت کا پورا ذخیرہ' اپنی صلاحیتوں کا پورا جوہر' اپنی تمام طاقتوں کو جمع کرتے ہوئے اس راہ پر لگا دے تاکہ خود اس کی تربیت اور ترقی مکمل ہو سکے' وہ پختہ ہو سکے' اور اس طرح وہ اس امانت کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار ہو سکے جو اس پر ڈالا گیا ہے۔

وہ نصرت اور کامرانی جس میں فتح یاب ہونے والے نے کوئی تکلیف نہ اٹھائی ہو' اور جو کامیابی بڑی آسانی اور بغیر کانٹا چبھے حاصل ہو جائے' اس کے نتیجے میں خود انسانی کارکنوں کی یہ حقیر صلاحیتیں نہیں ابھرتیں کیونکہ ان کے ظہور کے لیے کوئی محرک نہیں ہوتا' مقابلہ اصل محرک ہوتا ہے۔

نیز جو کامیابی بڑے آرام سے اور بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہے' وہ اسی طرح آسانی سے ناکامی میں بدل جاتی ہے اور ضائع ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہ مفت میں ہوتی ہے اور کامیاب ہونے والے نے اس کی کوئی قیمت ادا نہیں کی ہوتی' اس لیے اس کی نظروں میں اس کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ پھر جن لوگوں کو یہ بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہے ان صلاحیتوں کو اس کے دماغ کا تجربہ نہیں ہوتا کیونکہ ان کی خفیہ قوتیں جب اس کے حصول کے لیے بیدار نہیں ہوتیں تو اس کے دفاع کے لیے کیسے بیدار ہوں گی۔ لہٰذا ان کے لیے دفاع ممکن ہی نہیں رہتا۔

یہ عملی اور یہ وجدانی تربیت انسان کو تب حاصل ہوتی ہے کہ اسے فتح بھی ہوئی ہو اور ہزیمت بھی اٹھانی پڑی ہو۔ اس نے کر و فر بھی دیکھا ہو' قوت اور ضعف بھی دیکھا ہو' اقدام اور پسپائی دونوں دیکھی ہوں اور دونوں کی خوشی اور کڑوا پن چکھا ہو۔ امید و بیم' خوشی اور غم' اطمینان اور قلق' ضعف کا احساس اور قوت کا شعور یہ سب کچھ اس نے میدان جنگ میں دیکھا ہو۔

نیز اس نے نظریات کا اتحاد اور نظریاتی انتشار بھی دیکھا ہو۔ مختلف رجحانات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کا تجربہ وہ کرتا ہو۔ جماعت کے اندر قوت کے مراکز اور ضعف کے مقامات سے وہ باخبر ہو اور ہر قسم کے حالات میں معاملات کی تدبیر کو وہ جانتا ہو۔ یہ تمام مراحل اس جماعت اور گروہ کے لیے ضروری ہیں جس نے دعوت اسلامی کو لے کر چلنا ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کوئی عملاً معرکے میں نہ اترے۔

اس وجہ سے اور اس کے علاوہ مزید خفیہ حکمتوں کی وجہ سے جنہیں صرف اللہ ہی جانتا ہے' اللہ نے یہ طے کیا کہ وہ مسلمانوں کا دفاع خود مسلمانوں کے ذریعے کرے اور ایسا نہیں فرمایا کہ یہ ایک لقمہ تر ہو گا جو ان کے لیے آسمانوں سے پکا پکایا اتر جائے۔

بعض اوقات ایسے مظلوموں پر نصرت کا نزول دیر کر دیتا ہے جن کو اپنے گھروں سے نکال دیا جاتا ہے اور ان پر ظلم محض اس لیے کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے رب کو ایک سمجھتے ہیں۔ صرف اللہ کو رب سمجھتے ہیں لیکن اس میں اللہ کی گہری حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔

بعض اوقات نصرت لیٹ ہو جاتی ہے کیونکہ دعوت اسلامی کے حاملین ابھی پختہ نہیں ہوئے ہوتے اور ان میں کمزوریاں ہوتی ہیں۔ ان کی قوتیں مجتمع نہیں ہوتیں۔ اسلامی عناصر نے اپنی قوتوں کے تمام ذخائر کو میدان میں نہیں اتارا ہوا ہوتا ہے۔ اگر ایسی نا پختگی کی حالت میں اللہ کی نصرت آ جائے تو وہ جلد ہی اسے کھو دیں گی۔

بعض اوقات نصرت اس لیے بھی دیر کر دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوتی ہے کہ مومن اپنی پوری قوت اس راہ میں جھونک دیں۔ اپنا آخری سرمایہ اور قوت نچوڑ کر ختم کر دیں اور کوئی چیز ذخیرہ کر کے نہ رکھیں اور اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیں۔ جب تک انہوں نے ایسا نہیں کیا ہوتا' نصرت نہیں آتی۔

بعض اوقات اس لیے بھی نصرت نہیں آتی کہ اللہ اہل ایمان کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ اپنے تمام حربے آزمالیں اور ان کو معلوم ہو جائے کہ یہ نصرت صرف ان کی قوتوں کی وجہ ہی سے نہیں آتی بلکہ اللہ کی نصرت تب آتی ہے جب اہل ایمان اپنی قوت ' اپنی دولت اور اپنی صلاحیتوں کا آخری ذخیرہ بھی ختم کر دیں اور ان کے سامنے صرف اللہ کی مدد کا ذخیرہ رہ جائے تب مدد آپہنچتی ہے۔

بعض اوقات اللہ کی نصرت اس لیے بھی مؤخر ہو جاتی ہے کہ امت مومنہ کا تعلق باللہ معیار مطلوب تک پہنچ جائے ' اسے مشکلات پیش آئیں اور وہ برداشت کرے ' اسے المناک نتائج سے دوچار ہونا پڑے اور وہ صبر کرے اور اسے اپنی پوری قوتیں صرف کرنے کا موقع ملے۔ اور حالت یہ ہو جائے کہ اللہ کے سوا کوئی اور سہارا نہ رہے اور اللہ کے سوا توجہات مرکوز کرنے کا اور کوئی نکتہ نہ رہے۔ یہی تعلق باللہ پھر اس بات کی بھی ضمانت ہوتا ہے کہ نصرت آنے اور فتح ملنے کے بعد امت سیدھی راہ پر گامزن رہتی ہے۔ وہ پھر اپنی راہ نہیں چھوڑتی۔ وہ سچائی ' عدل اور بھلائی کا راستہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتی جس کی وجہ سے اسے فتح نصیب ہوتی ہے۔

بعض اوقات اللہ کی نصرت اس لیے بھی نہیں آتی کہ امت اپنی جدوجہد ' اپنے انفاق اور اپنی قربانیوں میں خالص رضائے الٰہی کے لیے کام نہیں کرتی۔ اس کی جنگ مفادات کے لیے ہوتی ہے ' یا وہ ذاتی رنجش کی وجہ سے لڑتی ہے ' یا اس کی جدوجہد میں دکھاوا ہوتا ہے ' حالانکہ اللہ کا منشا یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی راہ میں جدوجہد صرف اللہ کے لیے ہو ' صرف اللہ کے راستے میں ہو۔ اس کے ساتھ کوئی اور سوچ وابستہ نہ ہو ' کارکنوں کے شعور اور لاشعور میں رضائے الٰہی کے سوا کوئی اور مقصد نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص کسی حمیت کی وجہ سے لڑتا ہے یا شجاعت کی وجہ سے لڑتا ہے یا شخصیت کے اظہار کے لئے لڑتا ہے تو ان میں سے کون سی جنگ فی سبیل اللہ ہے تو حضور ؐ نے فرمایا۔

من قاتل لتکون کلمة الله هي العلیا ''جس نے اس لیے جنگ کی کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو تو صرف یہ فی سبیل اللہ ہے''۔ بعض اوقات اسلامی عناصر کو اس لیے بھی کامیابی نہیں ہوتی کہ جس شر کے مقابلے میں امت کام کر رہی ہوتی اس میں خیر کا کوئی پہلو ہوتا ہے۔ اللہ اس شر کو مہلت دیئے جاتا ہے تاکہ شر کو اس خیر سے تہی دامن کر دے تاکہ اگر ہلاکت آئے تو خالص شر پر آئے اور اس میں خیر کا کوئی پہلو نہ ہو اور ایسا نہ ہو کہ شر کے ساتھ خیر کا ایک ذرہ بھی ضائع ہو جائے۔

بعض اوقات اللہ کی نصرت اس لیے بھی نہیں آتی کہ جس باطل کے خلاف امت مسلمہ اور جماعت مومنہ برسرپیکار ہوتی ہے اس کا کھوٹ عوام الناس کی نظروں میں آشکار اور پوری طرح واضح نہیں ہوا ہوتا۔ ایسے حالات میں اگر شر کو شکست دے دی جائے تو شر کو بھی معاشرے میں سے بعض ایسے لوگ حامی و مددگار مل جائیں گے جنہوں نے ابھی تک شر کے کھوٹ کو سمجھا نہیں ہوتا۔ اور وہ اس کے فساد ' زوال کو سمجھے ہی نہیں ہوتے اور اس پر مطمئن نہیں ہوتے لہٰذا اس شر کی

بعض جرائم تک لوگوں کے ذہنوں میں بھی ہوتی ہیں' جو حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اس لیے اللہ باطل کو ایک عرصہ تک بر سراقتدار رکھتا ہے تاکہ تمام لوگوں کے ذہن صاف ہو جائیں اور جب وہ نیست و نابود ہو جائے تو اس پر رونے والی ایک آنکھ بھی معاشرے میں موجود نہ ہو۔

بعض اوقات نصرت میں دیر اس لیے بھی ہوتی ہے کہ معاشرہ ابھی تک قبول حق کے لیے ہی تیار نہیں ہوتا اور سچائی کو اٹھانے کے اہل بھی نہیں ہوتا۔ جس کی حامل اور داعی جماعت مومنہ ہوتی ہے۔ اگر ایسے حالات میں حق کو نصرت بھی مل جائے تو بھی اسے قرار نصیب نہیں ہوتا اور خود معاشرہ کے اندر سے ردعمل شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اللہ کی مشیت ہوتی ہے کہ کچھ مزید عرصے کے لیے حق و باطل کی کشمکش جاری رہے تاکہ معاشرہ سچائی کے استقبال کے لیے تیار ہو جائے۔

یہ وجوہات ہو سکتی ہیں اور ان کے علاوہ اور وجوہات بھی ہو سکتی ہیں جن کو صرف اللہ جانتا ہے۔ کبھی کبھار 'نصرت الٰہی میں دیر لگ جاتی ہے۔ کارکنوں کو زیادہ قربانیاں دینی پڑتی ہیں' ان پر مصائب بڑھ جاتے ہیں 'لیکن آخر کار فتح و نصرت جماعت مومنہ کے لیے ہوتی ہے اور جدوجہد کے زمانے میں اللہ کی ضمانت دفاع بہرحال اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حصول نصرت کی کچھ شرائط ہیں۔ کچھ تقاضے ہیں جو پورے کرنے پڑتے ہیں۔ اس کی ایک قیمت ہے جو ادا کرنی ہوتی ہے۔ اس کے کچھ اسباب ہوتے ہیں جو فراہم کرنے پڑتے ہیں اور اس کے لیے ایک مخصوص فضا ہوتی ہے جو پیدا کرنا پڑتی ہے (یاد رہے کہ یہ محض من اور سلویٰ نہیں ہے)۔

وَ لَيَنصُرَنَّ اللّٰهُ مَن يَّنصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (٤٠) اَلَّذِينَ اِن مَّكَّنّٰهُم فِي الْاَرضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوا بِالمَعرُوفِ وَ نَهَوا عَنِ المُنكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُورِ (۲۲ : ٤١) "اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے' اللہ بڑا طاقتور ہے اور زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں' زکوٰۃ دیں' نیکی کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

اللہ کا تاکیدی وعدہ ہے' نہایت ہی باوثوق وعدہ ہے' اٹل قاعدہ ہے کہ جو اس کی نصرت کرے گا تو اللہ اس کی مدد ضرور کرے گا لیکن یہ سوالیہ نشان اپنی جگہ ضرور ہے کہ اللہ کن لوگوں کی نصرت کرتا ہے' تاکہ ان کو نصرت کا مستحق سمجھا جائے۔ کیونکہ اللہ تو قوی ہے' عزیز ہے' اس کے متوالے تو کبھی شکست نہیں کھاتے تو وہ کون ہیں؟ وہ یہ ہیں؟

اَلَّذِينَ اِن مَّكَّنّٰهُم فِي الْاَرضِ (۲۲ : ٤١) "یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم اقتدار بخشیں"۔ نصرت آجائے اور ان کا اقتدار اعلیٰ قائم ہو جائے تو اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۲۲ : ٤١) "نماز قائم کریں گے"۔ اللہ کی بندگی کریں گے اور اللہ کی طرف نہایت ہی مطیع فرمان ہو کر' عاجز ہو کر' سر تسلیم خم کرتے ہوئے رجوع کریں گے'

وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ (۲۲ : ٤١) "زکوٰۃ دیں گے"۔ مال کا حق ادا کریں گے۔ نفس کی فطری کنجوسی پر قابو پائیں گے۔ اسے حرص و آز سے پاک کریں گے' شیطان کے وسوسوں پر غلبہ پائیں گے' جماعت اور سوسائٹی کے اندر

پائے جانے والے رخنے دور کریں گے ۔ ضعیفوں اور محتاجوں کا حق ادا کریں گے ' ان کو ایک زندہ جسم کے حقوق دیں گے جیسا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا "مومن باہم محبت ' باہم رحم و کرم میں جسد واحد کی طرح ہوتے ہیں ' اگر جسم کے کسی ایک عضو میں تکلیف ہو تو پورا جسم بے چین ہوتا ہے اور تمام جسم بے خوابی کا شکار ہوتا ہے ۔

وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ (۲۲ : ۴۱) "نیکی کا حکم دیں گے"۔ وہ نیکی اور اصلاح کے داعی بھی ہوں گے ۔ لوگوں کو زبردستی بھی نیکی پر آمادہ کریں گے ۔

وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۲ : ۴۱) "اور وہ برائی سے منع کریں گے"۔ شر و فساد کا مقابلہ کریں گے ۔ وہ امت مسلمہ کا یہ نشان بحال کریں گے کہ وہ منکر کو برداشت نہیں کرتی اور اگر وہ اسے دفع کر سکتی ہو تو دفع کرتی ہے اور اگر وہ معروف قائم کر سکتی ہے تو قائم کرے گی ۔

ایسے لوگ اللہ کی نصرت کے مستحق ہوتے ہیں جو اسلامی نظام زندگی کے قیام کے لیے پوری جدوجہد کریں ۔ صرف اللہ پر بھروسہ کرتے ہوں ' کسی اور پر نہیں ۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کی مدد ہو گی ۔

لہٰذا اللہ کی نصرت کا وعدہ قائم ہے اسباب نصرت پر ۔ نصرت کے تقاضے پورے کرنے پر ۔ اس کے فرائض اور ذمہ داریاں پوری کرنے پر ' اس کے بعد بھی بات اللہ کی مرضی پر ہے ۔ وہ اپنی مخلوق کے اندر جس طرح چاہتا ہے ' تصرفات کرتا ہے ۔ بعض اوقات وہ شکست کو فتح میں بدل دیتا ہے اور بعض اوقات فتح کو ہزیمت میں بدل دیتا ہے ۔ خصوصاً جب نصرت کے بنیادی عناصر ہیں ' خلل آ جائے اور لوگ ذمہ داریاں اور تقاضے پورے نہ کریں ۔

وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲ : ۴۱) "اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے"۔ اللہ کی نصرت وہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ اسلامی نظام زندگی قائم ہو ' حق ' انصاف ' آزادی اور خیر و اصلاح کا دور دورہ ہو ۔ پیش نظر اعلیٰ مقاصد ہوں نہ کہ کچھ افراد ۔ اشخاص ' شخصیات اور ان کے ذاتی مقاصد کو پس پشت ڈال کر بلند اصولوں کو سامنے رکھنا ہو گا تب نصرت الٰہی حاصل ہو گی ۔

بہرحال نصرت الٰہی کے اسباب ہوتے ہیں ۔ اس کی قیمت پیشگی ادا کرنا ہوتی ہے ۔ اس کے تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں ۔ بعض شرائط لازمی ہوتی ہیں ۔ یہ نصرت کسی کو مفت میں نہیں ملتی نہ اللہ کو کسی کے ساتھ محبت ہوتی ہے اور نصرت اس شخص کو نہیں ملتی نہ اس جماعت کو ملتی ہے جو اس کے مقاصد اور تقاضے پورے نہ کرتی ہو ۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۴٦ ایک نظر میں

اس سے پہلے سبق کا خاتمہ اس پر ہوا تھا کہ نظریات 'عقائد اور ملت کے شعار کی مدافعت کے لیے جنگ کی اجازت ہے۔ جو لوگ اسلامی نظریہ حیات کے تقاضے پورے کریں گے ان کو اللہ کی طرف سے پوری پوری نصرت بھی حاصل ہو گی۔ بشرطیکہ انہوں نے خود اپنی جماعت کے اندر اسلامی نظام حیات قائم کر رکھا ہو۔

جب یہ بتا دیا گیا کہ اللہ کی نصرت کے استحقاق کے لیے شرائط و فرائض کیا ہیں تو اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ دست قدرت نے آپ ؐ کی اور آپ ؐ کے ساتھیوں کی حمایت میں کام شروع کر دیا ہے جس طرح آپ سے قبل آپ کے بھائی رسولوں کے حق میں دست قدرت نے کیا اور ہر دور میں مکذبین کو بڑی سختی سے پکڑا۔ نیز مکذبین اور مشرکین کو بھی اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ اگر ان کا دل و دماغ کام کرتا ہے تو وہ غور و فکر کریں کیونکہ آنکھوں کا اندھا دراصل اندھا نہیں ہوتا' بلکہ حقیقی اندھا وہ ہوتا ہے جس کے سینے میں دھڑکنے والا دل اندھا ہو۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ اطمینان دلایا جاتا ہے کہ اللہ اپنے رسولوں کو شیطان کی سازشوں سے بچاتا ہے۔ اس طرح وہ جھٹلانے والوں کی سازشوں سے بھی بچاتا ہے۔ نیز وہ شیطان کی مکاریوں کو باطل کر کے 'اپنی آیات کو سلیم الطبع لوگوں کے ذہن نشین کرا رہا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے دل مریض ہیں 'یا جن کے دل کافر ہیں تو وہ اسی طرح شک میں گرفتار رہیں گے یہاں تک کہ وہ اپنے برے انجام کو دیکھ لیں۔

یہ پورا سبق دست قدرت کے آثار اور کرشموں پر مشتمل ہے۔ اللہ کا ہاتھ دعوت اسلامی کو آگے بڑھانے کے لیے متحرک ہو گیا ہے لیکن نتائج سامنے تب آئیں گے جب کہ اصحاب دعوت اپنے فرائض کو بطرز احسن پورا کریں اور وہ تقاضے پورے کریں جن کے بارے میں پہلے وضاحت کر دی گئی ہے یعنی اس سے پہلے سبق میں۔

---○○○---

# درس نمبر ۱۴٦ تشریح آیات

## ۴۲--- تا--- ۵۷

وَ اِنۡ یُّکَذِّبُوۡکَ فَقَدۡ کَذَّبَتۡ قَبۡلَھُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ وَّ عَادٌ وَّ ثَمُوۡدُ ﴿۴۲﴾
وَ قَوۡمُ اِبۡرٰھِیۡمَ وَ قَوۡمُ لُوۡطٍ ﴿۴۳﴾ وَّ اَصۡحٰبُ مَدۡیَنَ ۚ وَ کُذِّبَ مُوۡسٰی فَاَمۡلَیۡتُ
لِلۡکٰفِرِیۡنَ ثُمَّ اَخَذۡتُھُمۡ ۚ فَکَیۡفَ کَانَ نَکِیۡرِ ﴿۴۴﴾

"اے نبی' اگر وہ (یعنی کفار) تمہیں جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے قوم نوح اور عاد اور ثمود اور قوم ابراہیم اور قوم لوط اور اہل مدین بھی جھٹلا چکے ہیں اور موسیٰ بھی جھٹلائے جا چکے ہیں۔ان سب منکرین حق کو میں نے پہلے مہلت دی پھر پکڑ لیا۔اب دیکھ لو کہ میری عقوبت کیسی تھی"۔

تمام رسولوں کے بارے میں یہ اللہ کی اٹل سنت ہے کہ رسول معجزات لے کر آئے اور ان کی قوموں نے ان کو جھٹلایا۔اس لیے مشرکین مکہ کی طرف سے رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن تمام جھٹلانے والوں کا انجام بھی تو معلوم ہے۔انجام کے لیے بھی مشرکین مکہ تیار ہو جائیں'

فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُودُ (٤٢) وَقَوْمُ اِبْرٰهِيمَ وَقَوْمُ لُوطٍ (۲۲ : ٤٣) "اس سے پہلے قوم نوح' اور عاد و ثمود اور قوم ابراہیم اور قوم لوط نے جھٹلایا ہے"۔اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے علیحدہ فقرہ وکذب موسیٰ (اور موسیٰ جھٹلائے جا چکے ہیں) اس لیے کہ اس کی قوم نے انہیں نہیں جھٹلایا تھا بلکہ فرعون اور اس کے سرداروں نے جھٹلایا تھا۔دوسرے اس لیے کہ جو معجزات حضرت موسیٰ لے کر آئے تھے وہ بہت ہی واضح تھے۔نیز موسیٰ علیہ السلام کو بہت ہی بڑے واقعات پیش آئے۔ان تمام پیغمبروں کے واقعات میں اللہ نے کافروں کو ایک وقت تک مہلت دی۔جیسا کہ اب قریش کو مہلت دی جارہی ہے اور اس کے بعد اللہ نے بڑی سختی سے ان کو پکڑا۔یہاں سوالیہ انداز مزید ڈرانے اور اظہار تعجب کے لیے ہے۔

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ (۲۲:۴۴) "اب دیکھ لو کہ میری عقوبت کیسی تھی"۔ نکیر کا مفہوم ہے ایسا سخت انکار جس میں تبدیلی کا شائبہ ہو۔ اس سوال کا جواب معلوم ہے کہ خوفناک عذاب تھا۔ طوفان' خسف مدمیر' ہلاکت' زلزلے' تباہی طوفان اور کڑک کی وجہ سے خوف میں جتلا کر کے ہلاک کرنا۔

گزشتہ ہلاک شدہ اقوام پر ایک نہایت سرسری نظر ڈالنے کے بعد اب گزشتہ ہلاک شدہ اقوام پر جامع تبصرہ۔

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ۝

"کتنی ہی خطاکار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کیا ہے اور آج وہ اپنی چھتوں پر الٹی پڑی ہیں' کتنے ہی کنوئیں بیکار اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہوئے ہیں"۔

ایسی ہلاک شدہ بستیاں بے شمار ہیں۔ انداز کلام ان اقوام کی ہلاکتوں کے مناظر کو ایک منظر کی صورت میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ انسان کہتا ہے کہ وہ ہیں ہلاک شدہ بستیوں کے کھنڈرات۔ بڑے بڑے محل چھتوں کے اوپر پڑے ہیں۔ حالانکہ وہ دیواروں پر استوار تھے۔ جب گرے تو چھتیں نیچے اور تمام عمارتی ڈھانچہ ان کے اوپر۔ اس طرح یہ منظر نہایت ہی وحشتناک' دلدوز اور پرتاثیر بن جاتا ہے۔ یہ کہ یہ منظر اس کا مستحق ہے کہ اس کی سابق اور موجودہ صورت حال پر غور کیا جائے۔ کھنڈرات میں جب انسان پھرتا ہے تو وہ بہت ہی وحشتناک نظر آتے ہیں اور ان سے اگر کوئی عبرت حاصل کرنا چاہے تو عبرت حاصل کر سکتا ہے۔ اور انسان میں خوف خدا پیدا ہو سکتا ہے۔

ان بڑے بڑے گاؤں کے آثار ہمارے سامنے ہیں' ان کی چھتوں پر ان کی بلڈنگیں گری ہوئی ہیں اور ان کے کنوئیں خالی پڑے ہیں۔ نہ ان پر کوئی آنے والا نظر آتا ہے اور نہ جانے والا۔ کسی وقت تو ان پر عوام کا بے حد اژدحام تھا۔ بڑی بڑی عمارات کھڑی ہیں' لیکن کوئی انسان نہیں' کوئی زندہ چیز بھی نہیں ہے' تخیل کے پردے پر صورتیں ابھرتی ہیں کہ کسی وقت تو یہاں گہماگہمی ہوگی!

ان مناظر کو دکھانے کے بعد قرآن کریم سخت تنبیہ کے ساتھ پوچھتا ہے کہ آیا مشرکین نے کبھی ان کھنڈرات پر غور نہیں کیا؟

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ۝

"کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے یا ان کے کان سننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں"۔

گزشتہ زمانے کی ہلاک شدہ اقوام کے کھنڈرات کا تصور ہی مفید اور عبرت آموز ہوتا ہے۔ انسان ان کو پھٹی پھٹی نظروں سے حیرانی کے ساتھ دیکھتا ہے اور یہ کھنڈرات انسان کو خاموشی کی زبان سے بہت کچھ بتاتے ہیں۔

اَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْاَرْضِ (۲۲: ٤٦) "کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں"؟ کہ دیکھیں اور انہیں معلوم ہو کہ کیا کیا لوگ یہاں رہ گئے ہیں۔ یہ کھنڈر ان کو خاموشی کی زبان میں بہت کچھ بتا دیں گے اور کہہ دیں گے کہ دیکھو کہ ہم دیکھنے والوں کے لیے عبرت ہیں۔

فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا (۲۲: ٤٦) "کہ ان کے دل و دماغ سمجھنے والے ہوتے"۔ تاکہ وہ سمجھیں کہ ان مٹے ہوئے کھنڈرات کی پشت پر تاریخ کیا ہے۔ یہ اللہ کی کس سنت کا پتہ دے رہے ہیں، جو کبھی بدلتی نہیں ہے۔

اَوْ اٰذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا (۲۲: ٤٦) "یا ان کے کان سننے والے ہوتے"۔ تاکہ وہ ان کھنڈرات سے پوچھتے کہ ان کے باسی کہاں گئے، یہ کنویں کیوں خالی پڑے ہیں اور یہ محل کیوں برباد ہوئے۔

کیا ان لوگوں کے پاس عقل نہیں ہے؟ یہ دیکھتے ہیں لیکن کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ سنتے ہیں لیکن کوئی عبرت نہیں لیتے۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (۲۲: ٤٦)

"حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں"۔ یہاں دلوں کی جگہ کا بھی تعین کر دیا جاتا ہے مزید تاکید کی خاطر کہ وہ سینوں میں ہیں، اور ان کے سینوں میں جو دل ہیں وہ اندھے ہیں، اگر یہ دل اندھے نہ ہوتے تو وہ نصیحت آموزی میں بڑے پرجوش ہوتے، وہ عبرت لیتے اور ان لوگوں جیسے انجام سے ڈر کر ایمان کی طرف مائل ہوتے کیونکہ اس قسم کے کھنڈرات ان کے ارد گرد کئی مقامات پر ہیں۔

لیکن ان لوگوں کا رویہ بالکل الٹا ہے۔ عبرت لینے، ایمان لانے، عذاب الٰہی سے ڈرنے کے بجائے یہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں کہ یہ عذاب ہم پر جلدی آجائے حالانکہ اللہ نے کسی حکمت کی وجہ سے اسے مؤخر کر دیا ہے۔

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۴۷﴾

"یہ لوگ عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔ اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے"۔ ہر زمانے میں ظالموں کا یہی انداز ہوتا ہے۔ وہ زمانہ ماضی

کے ظالموں کے کھنڈرات اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ان کی تاریخ پڑھتے ہیں اور ان کے انجام ان کے سامنے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ اسی راہ پر چلتے ہیں ' جس کا انجام وہ دیکھتے ہیں۔جب ان کو اس طرف متوجہ کیا جائے کہ دیکھو تمہارے آباؤاجداد اس انجام سے دوچار ہوئے تھے ' یہی تمہارا بھی ہو سکتا ہے تو یہ لوگ اسے مستبعد سمجھتے ہیں۔اس کے بعد اللہ نے جو انہیں مہلت کی ایک گھڑی دے رکھی ہے تو یہ کبرو غرور میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور سرکشی کی آخری حد پر پہنچ جاتے ہیں۔ جس بات سے انہیں ڈرایا جاتا ہے اس کے ساتھ مذاق کرتے ہیں اور مذاق میں بھی اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ مطالبہ کرتے ہیں کہ لاؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔

وَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ (۲۲ : ۴۷) "اللہ ہرگز وعدے کے خلاف نہ کرے گا"۔ عذاب ضرور اپنے وقت پر آئے گا' اس کی حکمت اور اس کی تقدیر اور منصوبے کے مطابق۔لوگوں کی طرف سے تاولی کا مظاہرہ ہو رہا ہے لیکن اللہ اسے اپنے وقت پر لائے گا۔لوگوں کا وقت کا حساب اور ہے اور اللہ کا اور ہے۔

وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۲۲ : ۴۷) "مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے"۔ یہ کھنڈرات اور ان میں ہلاک شدہ اقوام کو بھی اللہ نے مہلت دی تھی لیکن ان کے لیے بھی یہ مہلت مفید نہ رہی کیونکہ اللہ کی سنت کے مطابق ان کی بربادی کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ ۶
وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۴۸﴾ ۱۰ع
۱۳

"کتنی ہی بستیاں ہیں جو ظالم تھیں ' میں نے ان کو پہلے مہلت دی ' پھر پکڑ لیا اور سب کو واپس تو میرے ہی پاس آنا ہے"۔ تعجب ہے کہ مشرکین مکہ عذاب طلب کرتے ہیں اور اللہ کے ڈراوے کے ساتھ مذاق کرتے ہیں ' محض اس لیے کہ ان کو اللہ نے مہلت دے دی ہے۔

--- ○○○ ---

یہاں تک تو اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا بیان تھا جو اس نے تکذیب کرنے والوں کے لیے اس کائنات میں جاری کر رکھی ہے اور اسی کے مطابق امم سابقہ کو ہلاک کیا گیا۔اب خطاب کا رخ رسول اللہ ﷺ کی طرف جاتا ہے کہ آپ لوگوں کو بہرحال قیامت کے انجام بد سے ڈراتے ہی رہیں۔اور صاف صاف کہہ دیں کہ میں تو نذیر مبین ہوں۔

قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۹﴾ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۵۰﴾ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ

اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ﴿۵۱﴾

"اے نبیؐ' کہہ دو کہ "لوگو' میں تو تمہارے لیے صرف وہ شخص ہوں جو (برا وقت آنے سے پہلے) صاف صاف خبردار کر دینے والا ہو' پھر جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے ان کے لیے مغفرت ہے اور عزت کی روزی' اور جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کی کوشش کریں گے وہ دوزخ کے یار ہیں"۔

یہاں قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فریضے کو صرف خبردار کرنے تک محدود کر دیتا ہے۔

اِنَّمَآ اَنَا لَکُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۲۲ : ۴۹) "میں تو صرف وہ شخص ہوں جو وقت سے پہلے خبردار کر دینے والا ہو"۔ کیونکہ حالات ایسے تھے کہ لوگ تکذیب کر رہے تھے۔ مذاق کر رہے تھے اور یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ جس عذاب سے آپ ڈراتے ہیں اسے جلدی ہی لے آئیں! اس لیے بتایا گیا کہ میں تو صرف ڈرانے والا ہوں اور جو لوگ میری بات کو مان لیں گے اور پھر ایمان کے تقاضے بھی پورے کریں یعنی وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۲۲ : ۵۰) "نیک عمل کریں" تو ان کی جزاء یہ ہوگی کہ اللہ ان کے سابقہ گناہ معاف کر دے گا اور رِزْقٌ کَرِیْمٌ (۲۲ : ۵۰)۔

رزق کریم "عزت کی روزی"۔ یعنی ان کے رزق کا ایسا ذریعہ ہو گا جو باعزت ہو گا اور ذریعہ بھی صاف ہو گا۔

رہے وہ لوگ جو اللہ کی آیات کو لوگوں کے دلوں تک پہنچنے سے روکتے ہیں اور عوام کو ان پر عمل پیرا ہونے سے بھی روکتے ہیں۔ اللہ کی آیات سے مراد سچائی کے دلائل اور اللہ کی شریعت ہے' تو ایسے لوگوں کو اللہ نے جہنم کا مالک بنا دیا ہے۔ یہی ملکیت اللہ نے ان کو دی ہے۔ یعنی اہل ایمان کے لیے تو رزق کریم ہے اور ان کے لیے جہنم کے مالکانہ حقوق ہیں۔

اللہ تعالیٰ دعوت اسلامی کو جھٹلانے والوں کی تکذیب سے بچاتے ہیں اور اس کی راہ میں روڑے اٹکانے والوں کی رکاوٹوں کو دور کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ دعوت اسلامی کو شیطان کی سازشوں سے بھی بچاتے ہیں۔ رسول بہرحال بشر ہوتے ہیں اور انسانوں کی کچھ آرزوئیں ہوتی ہیں۔ شیطان دعوت اسلامی کے حاملین تک ان آرزوؤں اور خواہشات کی راہ سے پہنچتا ہے۔ رسول اگرچہ معصوم ہوتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں چونکہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی دعوت جلدی پھیلے' اس کو کامیابی حاصل ہو' اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور ہوں' شیطان ایک داعی کی ان معصومانہ خواہشات کی راہ سے حملہ آور ہوتا ہے اور دعوت کو اس کے اصول اور اس کی اقدار و روایات سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنے رسولوں کے کام پر نظر رکھے ہوئے ہوتا ہے اس لئے وہ ان شیطانی چالوں کو باطل کر دیتا ہے' رسولوں کو بتا دیتا ہے کہ دعوت اسلامی کے اصول یہ ہیں' اس کے پیمانے یہ ہیں۔ اس طرح اللہ دعوت کے دلائل کو محکم کر دیتا ہے اور دعوت کے سلسلے میں تمام شبہات کو دور کر دیتا ہے اور اس کی قدریں اور ذرائع متعین کر دیے جاتے ہیں۔

---ooo---

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِهٖ ۚ فَیَنْسَخُ اللّٰهُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ

عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ ۗ وَإِنَّ الظّٰلِمِينَ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ ۗ وَإِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِينَ اٰمَنُوا إِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝

"اور اے نبیؐ، تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول ایسا بھیجا ہے نہ نبی (جس کے ساتھ یہ معاملہ نہ پیش آیا ہو کہ) جب اس نے تمنا کی، شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ اس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے، اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے، اللہ علیم ہے اور حکیم۔ (وہ اس لیے ایسا ہونے دیتا ہے) تاکہ شیطان کی ڈالی ہوئی خرابی کو فتنہ بنا دے ان لوگوں کے لیے جن کے دلوں کو (نفاق کا) روگ لگا ہوا ہے اور جن کے دل کھوٹے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ عناد میں بہت دور نکل گئے ہیں اور علم سے بہرہ مند لوگ جان لیں کہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے اور وہ اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل اس کے آگے جھک جائیں، یقیناً اللہ ایمان لانے والوں کو ہمیشہ سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔"

اس آیت کے نزول کے بارے میں بہت سی روایات وارد ہیں اور ان کو بے شمار مفسرین نے نقل کیا ہے۔ ابن کثیر نے کہا ہے کہ یہ سب روایات مرسل ہیں اور ان میں سے کسی کی سند صحیح نہیں ہے۔ واللہ اعلم!

ان روایات میں سے جو زیادہ مفصل ہے (ابن ابو حاتم کی ہے اس نے موسیٰ، ابو موسیٰ کوفی، محمد ابن اسحاق شعبی، محمد ابن فلیح، موسیٰ، عقبہ، ابن شہاب کی سند سے نقل کیا ہے۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ جس زمانے میں سورہ نجم نازل ہوئی تو مشرکین کہتے تھے کہ اگر یہ شخص ہمارے الٰہوں کا ذکر اچھے الفاظ میں کرے تو ہم اس کی باتوں کا اقرار کر لیتے اور اس کے ساتھیوں کو بھی مان لیتے۔ لیکن یہ یہود و نصاریٰ پر اس طرح تنقید نہیں کرتا جس طرح ہمارے الٰہوں کو گالیاں دیتا ہے اور شر سے ذکر کرتا ہے۔ اس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ بات شاق گزرتی تھی کہ مشرکین مکہ آپ کو جھٹلاتے تھے اور آپ کے پیروکاروں کو اذیتیں دیتے تھے۔ ان لوگوں کی ضلالت پر آپ بہت ہی دل گرفتہ تھے۔ آپ کے دل میں بڑی خواہش تھی کہ یہ لوگ ہدایت قبول کر لیں۔ جب سورہ نجم نازل ہوئی تو آپ نے تلاوت کی۔

أَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰي (۱۹) وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرٰي (۲۰) أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنْثٰي (۲۱) (۵۳ : ۱۹ – ۲۱) تو عین اس وقت شیطان نے ان بتوں کے ذکر کے ساتھ ہی اپنی طرف سے چند کلمات ادا کیے۔ اس نے کہا:

انهن لهن الغرانيق العلي وان شفاعتهن لهي التي ترتجي یہ الفاظ شیطان نے اپنی طرف سے بطور فتنہ ملا دیے۔ یہ الفاظ مکہ کے ہر مشرک کے دل میں بیٹھ گئے۔ چنانچہ انہوں نے ان کو نقل کرنا شروع کر دیا اور ایک

دوسرے کو خوشخبریاں دینے لگے۔ انہوں نے کہا کہ محمدؐ نے اپنا دین چھوڑ دیا ہے اور اپنے پہلے دین اور اپنی قوم کے دین پر آگیا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سورہ نجم کی تلاوت کر کے آخر میں پہنچے تو آپ نے سجدہ کیا اور جو مسلم اس کو سن رہے تھے انہوں نے بھی سجدہ کیا اور جو مشرک سن رہے تھے انہوں نے بھی سجدہ کیا۔ ولید ابن مغیرہ ایک بڑا آدمی تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں مٹی لی اور اس پر سجدہ کر لیا۔ دونوں گروہوں کو تعجب ہوا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سجدے کے ساتھ سجدہ کر لیا۔ مسلمانوں کا تعجب تو اس بات پر تھا کہ مشرکین ان کے ساتھ سجدہ ریز ہو گئے بغیر ایمان لانے اور یقین کرنے کے۔ یہ اس لیے کہ شیطان نے جو الفاظ ادا کیے تھے وہ مسلمانوں نے نہیں سنے تھے۔ صرف مشرکین نے سنے تھے۔ اس لیے مشرکین مطمئن ہو گئے کیونکہ شیطان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی امنیہ (قرات) میں اپنے فقرے ملا دیئے اور مشرکین کو تسلی دی کہ یہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سورہ میں تلاوت کیے ہیں تو انہوں نے اپنے الہوں کی تعظیم میں سجدہ کر لیا۔ یہ بات لوگوں میں پھیل گئی۔ اس بات کو شیطان نے بہت ہی پھیلایا یہاں تک کہ یہ خبر حبشہ میں پہنچ گئی اور وہاں جو مسلمان تھے انہوں نے سنی۔ وہاں مسلمان عثمان ابن مظعون کی قیادت میں تھے۔ ان کو یہ بات پہنچی کہ اہل مکہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ یکجا نماز پڑھی ہے اور ان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ولید ابن مغیرہ نے اپنی ہتھیلی پر مٹی اٹھا کر اس پر سجدہ کیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اب مسلمان مکہ میں امن و چین سے ہیں۔ چنانچہ یہ مہاجرین بڑی جلدی سے وہاں سے لوٹے۔ اللہ نے شیطان کے الفاظ کو منسوخ کر دیا' اپنی آیات کو مستحکم کر دیا اور اس افتراء سے قرآن کو محفوظ کر دیا۔ اس موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی :

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۲۲ : ۵۲) لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ (۲۲ : ۵۳) "اور اے نبیؐ' تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول ایسا بھیجا ہے نہ نبی (جس کے ساتھ یہ معاملہ نہ پیش آیا ہو کہ) جب اس نے تمنا کی' شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ اس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے' اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے' اللہ علیم ہے اور حکیم۔ (وہ اس لیے ایسا ہونے دیتا ہے) تاکہ شیطان کی ڈالی ہوئی خرابی کو فتنہ بنا دے ان لوگوں کے لیے جن کے دلوں کو (نفاق کا) روگ لگا ہوا ہے اور جن کے دل کھوٹے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ عناد میں بہت دور نکل گئے ہیں"۔ جب اللہ نے اپنا فیصلہ بتا دیا اور شیطان نے جو شوشہ چھوڑا تھا اس سے براءت کر دی تو مشرکین الٹے پاؤں پھر گئے اور گمراہی اختیار کر کے مسلمانوں کے ساتھ عداوت شروع کر دی بلکہ اور سختی شروع کر دی۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ بغوی نے اپنی تفسیر میں ابن عباس کے کلام کی پوری روایات جمع کی ہیں اور محمد ابن کعب قرظی

نے بھی اسی طرح جمع کی ہیں اور پھر یہاں انہوں نے سوال کیا ہے کہ یہ واقعہ اس طرح کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ اللہ نے اس معاملے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو عصمت کی ضمانت دی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے مختلف لوگوں کے جوابات نقل کیے ہیں۔ سب سے گہرا جواب یہ ہے کہ شیطان نے مشرکین کے کانوں میں یہ فقرے ڈال دیئے تھے۔ مشرکین نے یہ سمجھا کہ شاید یہ فقرے بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے تلاوت کیے ہیں حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ حضرت شیطان نے ادا کیے اور رسول اللہؐ نے یہ نہیں ادا کیے۔ امام بخاری کہتے ہیں کہ ابن عباس نے کہا ہے۔

فِيْ اُمْنِيَّتِه کا معنی یہ ہے کہ شیطان نے آپ کی باتوں میں یہ فقرے ڈال دیئے۔ اللہ نے ان کو باطل کر دیا اور اپنی آیات کو محکم کر دیا۔

مجاہد کہتے ہیں اذا تَمَنّٰي کے معنی ہیں اذا قَالَ لہٰذا کہا جاتا ہے امنية قرائه یعنی اس کا پڑھنا۔

بغوی کہتا ہے کہ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ تمنی کے معنی میں تلا یعنی تلاوت کی اور اللہ کی کتاب پڑھی۔

اَلْقَي الشَّيْطٰنُ فِيْ اُمْنِيَّتِه کے معنی ہیں "شیطان نے ان کی تلاوت میں ڈال دیا"۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ تمنی کے معنی ہیں (تلا) یعنی تلاوت کی اور کلام کے مفہوم کو بیان کرنے کے لیے یہ بات زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

یہ ہے خلاصہ کلام روایات اور ان احادیث کا جن کو حدیث "غرانیق" کہتے ہیں۔ یہ حدیث سند کے اعتبار سے کوئی بنیاد نہیں رکھتی۔ علمائے حدیث کہتے ہیں۔ اہل صحاح نے اس حدیث کو نہیں لیا۔ نہ اس کی کوئی سند صحیح و متصل ہے ثقہ راویوں سے۔ ابوبکر بزار کہتے ہیں۔ یہ حدیث ہمارے علم میں نہیں کہ کسی جگہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے قابل ذکر اسناد متصل سے نقل کی گئی ہو۔ اور موضوع کے اعتبار سے تو یہ اسلام کے بنیادی اصول سے ٹکراتی ہے۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں عقیدہ عصمت سے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ تبلیغ رسالت کے کام میں شیطان دخیل ہو سکتا ہے۔

مستشرقین اور اسلام پر تنقید کرنے والوں نے اس حدیث میں بڑی دلچسپی لی ہے۔ اس کی انہوں نے بڑی اشاعت کی ہے اور اس کے ارد گرد انہوں نے مزید مخالفانہ اقوال جمع کیے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے کوئی قابل حجت بات نہیں کی بلکہ اس موضوع پر بات کرنا بھی فضول معلوم ہوتا ہے۔

خود ان آیات کے اندر ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسی بات ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ یا ایسا کوئی انفرادی واقعہ ہوا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ پیش آیا ہو۔ آیات کا خلاصہ تو یہ ہے کہ اس میں جو بات کی گئی ہے وہ تمام رسولوں کو پیش آتی رہی ہے۔ "اے نبی تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول ایسا بھیجا ہے اور نہ نبی کہ جب اس نے تمنا کی تو شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ اس طرح شیطان جو کچھ خلل اندازیاں کرتا ہے' اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے"۔ لہٰذا اس آیت میں جس بات کا ذکر ہوا ہے وہ تمام انبیاء و رسل کے درمیان صفت مشترکہ ہے۔ اور اس کا تعلق ان کی صفت بشریت سے ہے اور یہ بات اس عصمت کے خلاف نہیں ہے جو رسولوں کے لیے مقرر ہے۔

یہی وہ بات ہے جس کے بیان کی ہم یہاں کوشش کریں گے انشاء اللہ۔ اصل مراد تو اللہ ہی جانتا ہے ہم جو تفسیر بیان کرتے ہیں اپنے انسانی قوائے مدرکہ کی حد تک ہی کرتے ہیں۔ جب رسولوں کو یہ ڈیوٹی سپرد کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کے

پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں - ان کے نزدیک محبوب ترین شے یہ ہوتی ہے کہ لوگ ان کی دعوت پر جمع ہو جائیں اور اس بھلائی کا ادراک کر لیں جو وہ اللہ کی طرف سے لے کر آئے ہیں اور ان کے تابع ہو جائیں - لیکن دعوت کے مقابلے میں بہت سی مشکلات اٹھ کھڑی ہوتی ہیں - رسول انسان ہوتے ہیں اور انسانوں کی زندگی محدود ہوتی ہے اور اس حقیقت کو وہ اچھی طرح جانتے ہیں - ان کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو برق رفتاری سے اپنی دعوت کی طرف کھینچ لائیں - مثلاً ان کے دلوں میں یہ بات آتی ہے کہ اگر وہ لوگوں کے ساتھ مصالحت کریں اور جو باتیں ان کے لیے چھوڑنا مشکل ہیں' مثلاً ان کی عادات' رسومات' موروثی شعائر' ان پر وہ خاموش ہو جائیں - وقتی طور پر' اور شاید اس طرح لوگ دعوت کی طرف آ جائیں - اور جب وہ دعوت کو قبول کر لیں تو ان کے لیے ممکن ہو گا کہ وہ یہ موروثی عادات چھوڑ دیں' جو اب ان کے لیے بہت عزیز ہیں - مثلاً معمولی معمولی باتوں پر وہ ان کے ساتھ نرمی کریں اور کسی انگل سے ان کو دعوت کے اندر لے آئیں - اس امید پر کہ اندر لا کر پھر ان کی تربیت کر دی جائے گی - اور اس طرح ان کی خلاف اسلام عادات چھوٹ جائیں گی -

غرض رسول اور نبی اس قسم کی بہت سی تمنائیں کرتے رہے ہیں جن کا تعلق ان کی دعوت کی نشرواشاعت سے ہوتا ہے جبکہ اللہ کی مرضی یہ تھی کہ دعوت کے حاملین دعوت کو اس کے پورے اصولوں پر جم کر چلائیں - دعوت اسلامی کے باریک اقدار کے مطابق' اور اس پیمانے کے مطابق کہ مَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ "جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے" - کیونکہ اللہ کی تقدیر میں دعوت اسلامی کی کارکردگی یہ ہے کہ وہ خالص اصولی انداز کی ہو اور اس میں انسانوں کی کسی تدبیر اور خواہش کی آمیزش نہ ہو کہ دعوت حقیقی اصول پر' الہی پیمانوں کے مطابق چلے' اگرچہ اس طریقے کے مطابق آغاز میں تعداد کا خسارہ ہو گا - کیونکہ دعوت اگر اپنے اصول پر سختی سے جمی رہے اور فیصلہ کن بات کرتی رہے تو آخر کار یہ اشخاص بھی دعوت کو قبول کر لیں گے - بلکہ ان اشخاص سے بھی زیادہ بااثر اور اچھے لوگ دعوت کو قبول کریں گے اور دعوت بھی خالص اور صحیح و سالم رہے گی' اپنی راہ پر سیدھی ہو گی اور اس کے اندر کوئی کجی پیدا نہ ہو گی - نہ اس میں کسی طرح کوئی جھکاؤ ہو گا -

انسان کی ان خواہشات اور ان خواہشات کے اظہار کے لیے رسول جو کلمات استعمال کرتا ہے یا خواہش کا اظہار کرتا ہے اس میں شیطان کو موقعہ مل جاتا ہے کہ وہ سازش کر کے دعوت کو اپنی اصلی راہ سے ہٹا دے - اس طرح شیطان دعوت کے پھیلانے کے اجتہادی معاملات میں شبہات پیدا کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ شیطان کی کارستانیوں کا دفعیہ کر دیتا ہے اور ایسے معاملات میں اللہ کی طرف سے حکم محکم آ جاتا ہے اور رسولوں کو کہا جاتا ہے کہ وہ اس محکم فیصلے کو عوام تک پہنچا دیں اور رسولوں اور نبیوں کے دلوں میں اجتہادی امور میں جس کا تعلق دعوت کے پھیلانے سے ہوتا تھا جو لغزش ہو گئی تھی اللہ کی طرف سے اس کا بیان آ جاتا ہے' جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعض تصرفات میں بیان آیا ہے -

یہ شیطان کی سازش ہوتی ہے اور اللہ اس کو باطل کر دیتا ہے اور حکم محکم آ جاتا ہے اور شبہ نہیں رہتا' اجتہادی حکم کی جگہ محکم آیت آ جاتی ہے - اللہ علیم و حکیم ہے - جن لوگوں کے دلوں میں نفاق اور انحراف کی بیماری ہے یا جن کے دل پتھر بن گئے ہیں یعنی کفار اور معاندین' وہ ایسے معاملات میں بحث و سوال کا موقعہ پا لیتے ہیں -

إِنَّ الظَّٰلِمِينَ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ (۲۲ : ۵۳) "حقیقت یہ ہے کہ ظالم لوگ عناد میں دور نکل گئے

ہیں"۔ رہے وہ لوگ جن کو علم و معرفت دی گئی ہے تو ان کے دل اس بیان اور حکم فیصل پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور وہ اللہ کے حکم کی حکمت کو پا لیتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۲ : ۵۴) "یقیناً اللہ ایمان لانے والوں کو ہمیشہ سیدھا راستہ دکھاتا ہے"۔ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زندگی میں اور دعوت اسلامی کی تاریخ میں ہم ایسی مثالیں پاتے ہیں۔ ان کی روشنی میں ہمیں اس تاویل کی ضرورت نہیں پڑتی ہے جس طرف ابن جریر نے اشارہ کیا ہے۔

قصہ ابن ام مکتوم میں یہ بات نظر آتی ہے۔ وہ ایک اندھے اور فقیر تھے۔ وہ رسول اللہؐ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسول مجھے پڑھائیں اور وہ علم سکھائیں جو آپ کو اللہ نے سکھایا ہے۔ وہ بار بار اس بات کو دہراتے رہے۔ اس وقت رسول اللہؐ ولید ابن مغیرہ کے ساتھ گفتگو فرما رہے تھے اور وہ قریش کے ممتاز اکابرین میں سے تھے اور آپ کی خواہش یہ تھی کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ ابن ام مکتوم کو معلوم نہ تھا کہ حضورؐ ایسے اہم معاملے میں مشغول ہیں۔ رسول اللہؐ نے اس موقعہ پر ان کی بار بار کی مداخلت کو ناپسند کیا اور ان سے منہ موڑ لیا۔ چنانچہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورہ نازل کی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ذرا سخت بات کی گئی۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓي (۱) اَنْ جَاۗءَهُ الْاَعْمٰى (۲) وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓي (۳) اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰي اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى (۵) فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى (۶) وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى (۷) وَاَمَّا مَنْ جَاۗءَكَ يَسْعٰى (۸) وَهُوَ يَخْشٰى (۹) فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى (۱۰) كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ (۱۱) فَمَنْ شَاۗءَ ذَكَرَهٗ (۱۲) (۸۰ : ۱ تا ۱۲)

"ترش رو ہوا اور بے رخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ تمہیں کیا خبر شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو، جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تم توجہ کرتے ہو حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ ڈر کر رہا ہوتا ہے۔ اس سے تم بے رخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں۔ یہ تو ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے قبول کرے"۔

یوں اللہ تعالیٰ نے دعوت اسلامی کو اپنے صحیح اور نہایت ہی دقیق اقدار اور پیمانوں کی طرف لوٹا دیا اور یوں رسول اللہؐ کے اس طرز عمل کی تصحیح کر دی جو آپ نے اکابرین قریش کی بابت محض اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہ اسلام لے آئیں اور ان کے ساتھ عوام کی ایک بڑی تعداد اسلام قبول کر لے۔ اللہ نے اس پر دعوت کا جو صحیح اصول اور طریقہ بتایا وہ یہ تھا کہ اکابر قریش کے اسلام قبول کرنے کے مقابلے میں یہ بات اہم ہے کہ دعوت اسلامی اپنے صحیح خطوط پر کام کرے۔ اس طرح شیطان کے اس وسوسے کو باطل کر دیا جو اس نے رسول اللہؐ کی اس خواہش کے راستے سے ڈال دیا تھا کہ اکابر قریش اگر اسلام قبول کر لیں تو دعوت جلدی پھیل جائے گی۔ اللہ نے اپنی آیات محکمہ نازل کر کے اس رویہ کو درست کر دیا اور اہل ایمان کے دل اس پر مطمئن ہو گئے۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ابن ام مکتوم کی بہت قدر کرتے تھے۔ جب بھی اس کو دیکھتے 'یہ فرماتے یہ شخص ہے جس کی وجہ سے اللہ نے مجھے جھڑکا ہے۔ آپ سے حضورؐ ہمیشہ پوچھتے تمہیں کچھ ضرورت ہے۔ دو دفعہ آپ نے اپنی عدم موجودگی میں انہیں مدینہ میں اپنا خلیفہ بنایا۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے۔ بواسطہ ابوبکر' ابن ابوشیبہ' محمد ابن عبداللہ اسدی' اسرائیل' ہندم ابن شرع۔ اس کے والد' سعد ابن ابو وقاص سے وہ کہتے ہیں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ تھے' چھ آدمی تھے۔ مشرکین نے کہا ان کو ذرا ہٹا دو یہ ہم سے آگے بڑھتے ہیں۔ کہتے ہیں اس وقت میں تھا' ابن سعود تھے' ہذیل کا ایک شخص تھا۔ بلال تھے اور دو دوسرے لوگ تھے جن کا نام میں بھول گیا۔ اس پر حضورؐ کے دل میں کوئی بات آئی۔ اللہ جانتا ہے کہ کیا بات آئی۔ حضورؐ نے دل میں کوئی بات کی۔ تو اللہ نے یہ آیت نازل کی۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ "اور ان لوگوں کو نہ بھگاؤ' جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں اور صرف اللہ کی رضامندی چاہتے ہیں"۔ یہاں بھی اللہ نے دعوت اسلامی کے نہایت ہی باریک ناپ و تول کرنے والے پیمانے واپس کر دیئے اور شیطان نے اس نکتے پر جو وسوسہ اندازی کی تھی' اس کے اظہار سے قبل اللہ نے اس کی تصحیح کر دی۔ شاید حضورؐ نے یہ سوچا کہ آئندہ اکابرین قریش کے ساتھ یہ غریب لوگ مجلس میں نہ بیٹھیں جب کہ اللہ کے نزدیک دعوت اسلامی کی اقدار کی افادیت ان اکابر قریش کے مقابلے میں زیادہ اچھی تھی۔ نیز دعوت کی اقدار اور پیمانوں کی اہمیت ان ہزار لوگوں کے اسلام سے بھی زیادہ تھی جو ان اکابرین قریش کی بیعت میں تحریک کا ساتھ دیتے اور جن کی تمنا رسول اللہؐ کرتے تھے۔ اللہ تحریک کے لیے حقیقی قوت کے مراکز کو خوب جانتے تھے۔ تحریک کے لیے اصل قوت یہ تھی کہ وہ اپنی راہ پر استقامت کے ساتھ چلے اور کسی شخصیت یا کسی رسم و رواج کی کوئی پرواہ نہ کرے۔

زینب بنت جحش کے واقعہ میں بھی یہی پیش آیا۔ یہ آپ کی پھوپھی زاد بہن تھیں' رسول اللہؐ نے ان کو زید بن حارثہ کی زوجیت میں دے دیا تھا۔ زید حضورؐ کے متبنیٰ تھے اور زید ابن محمد کے نام سے مشہور تھے۔ زینب کے ساتھ نکاح کے بعد ان کی ازدواجی زندگی کامیاب نہ ہوئی۔ جاہلیت کا رواج یہ تھا کہ اگر متبنیٰ فوت ہو جائے یا اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو اس کے ساتھ اس کا منہ بولا باپ نکاح نہ کرتا تھا۔ اس کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اس رسم کو ختم کر دیا جائے۔ جس طرح بیٹے کی نسبت والد کے بغیر کسی دوسرے کی طرف کرنے کی رسم کو ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا تھا کہ اگر زید اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو آپ اس کے ساتھ نکاح کر لیں تاکہ اس رسم کا ابطال ہو جائے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس بات کو اپنے دل میں خفیہ رکھا اور کسی کو نہ بتایا۔ زید جب بھی اپنی بیوی کی شکایت کرتے رسول اللہؐ ان کو یہی مشورہ دیتے کہ "تم اپنی بیوی کو رکھو"۔ حضورؐ کا مطلب یہ تھا کہ اگر زید طلاق دیتے ہیں تو مجھے اس سے نکاح کرنا ہو گا اور اس بات کو مطابق رواج عرب پسند نہیں کرتے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس بات کو اس طرح مخفی رکھا یہاں تک کہ زید نے تنگ آکر زینب کو طلاق دے دی۔ اللہ نے اس کے بارے میں قرآن نازل فرمایا اور اس میں اس بات کی وضاحت کر دی جو حضور اکرم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل میں تھی اور متبنٰی کے سلسلہ میں اسلامی شریعت کا جو منشا تھا وہ پورا کر دیا گیا۔ چنانچہ اللہ نے فرمایا:

وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (۳۳ : ۳۷) "اے نبیؐ ' یاد کرو وہ موقع جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا کہ " اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر" اس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا' تم لوگوں سے ڈر رہے تھے ' حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ پھر جب زیدؓ اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس (مطلقہ خاتون) کا تم سے نکاح کر دیا تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ رہے جبکہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں۔ اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہیے تھا"۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اوپر نازل ہونے والے کلام میں سے کسی چیز کو چھپاتے تو وہ اس آیت کو چھپاتے۔

وَ تُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ (۳۳ : ۳۷) "اس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا' تم لوگوں سے ڈر رہے تھے ' حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔"

اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت اور اس کے احکام کو نافذ کر دیا اور اس بات کو بھی کھول کر رکھ دیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل میں خلجان برپا کر رہی تھی کہ لوگ متبنّٰی کی بیوی سے نکاح کو برا خیال کرتے ہیں۔ اللہ نے یہاں بھی شیطان کی راہ کو بند کر دیا اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری تھی 'یا جن کے دل دعوت اسلامی کے لیے سخت تھے وہ اس واقعہ کو بھی سامان فتنہ بناتے رہے۔ اور آج تک اسلام کے دشمن اسے سامان فتنہ بنا رہے ہیں۔

یہ ہے وہ بات جس پر اس آیت کی تفسیر میں ہمارا دل مطمئن ہو گیا ہے۔ اللہ ہی صحیح راستہ بتانے والا ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد دعوت اسلامی کی لیڈرشپ بھی بعض اوقات یہ کوشش کرتی ہے کہ انتہائی بااثر لوگوں کو دعوت اسلامی کی طرف مائل کیا جائے 'اور ابتداء میں دعوت کے تقاضوں میں سے بعض امور میں چشم پوشی کی جائے۔ یہ کام وہ اس جذبے کے تحت کرتے ہیں کہ دعوت اسلامی کو فروغ حاصل ہو اور وہ جلدی غلبہ حاصل کرے۔ اس لیڈرشپ کا خیال یہ ہوتا ہے کہ یہ امور دعوت کے بنیادی امور نہیں ہوتے۔ یہ لوگ ان بااثر لوگوں کے ساتھ ان امور میں نرمی کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ

دعوت سے متنفر نہ ہو جائیں اور اس کی مخاصمت اختیار نہ کریں۔

یہ لوگ بعض ایسے وسائل اور ذرائع بھی اپناتے ہیں جو دعوت اسلامی کے باریک پیمانوں اور اقدار کے ساتھ بے جوڑ ہوتے ہیں نہ یہ امور دعوت اسلامی کے سیدھے سادے طریقے سے لگا کھاتے ہیں یہ کام وہ اس لیے کرتے ہیں کہ دعوت جلدی پھیل جائے اور کامیاب ہو جائے۔ یہ لوگ ان امور کو اپنانے کے لیے دعوت کی مصلحت کے تحت بطور اجتہاد یہ کام کرتے ہیں حالانکہ دعوت اسلامی کی مصلحت تو اس میں ہے کہ اس کے حقیقی منہاج سے ذرہ برابر انحراف نہ کیا جائے نہ کم اور نہ زیادہ کسی بات میں بھی۔ رہے نتائج تو وہ تو امر غیبی ہیں۔ ان کے بارے میں صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ لہٰذا کسی حامل دعوت کو نتائج کا حساب و کتاب اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہئے۔ حاملین دعوت کا فریضہ صرف یہ ہے کہ وہ دعوت اسلامی کو لے کر سیدھے چل پڑیں۔ دعوت اسلامی کے حقیقی راستے پر چلنے میں ہی کامیابی ہے۔

قرآن کریم صراحت سے کہتا ہے کہ قرآن مجید حاملین دعوت اسلامی پر ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کے راستے سے داخل ہوتا ہے تاکہ اس طرح وہ دعوت اسلامی کی صفوں کے اندر داخل ہو جائے۔ جہاں تک انبیاء کا تعلق ہے تو ان کی عصمت کی ضمانت تو اللہ نے دے دی تھی۔ شیطان کے لیے ممکن نہ رہا کہ وہ انبیاء کی فطری تمناؤں کی راہ سے دخل اندازی کر سکے۔ لیکن بعد میں آنے والی لیڈر شپ کو یہ بات معلوم نہیں ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ بہت زیادہ چوکنی رہے اور بہت احتیاط سے کام لے۔ یہ نہ ہو کہ وہ اپنے خیال میں کوئی کام اسلام کی بہتری' دعوت کے پھیلنے اور کامیاب ہونے کے لیے کر رہے ہوں اور اس میں دعوت کی مصلحت سمجھتے ہوں اور دراصل وہ شیطانی مداخلت ہو۔ داعیان کو چاہیے کہ دعوت کی مصلحت کا لفظ ہی اپنی ڈکشنریوں سے نکال دیں کیونکہ یہ لغزش کا مقام ہے' اس مقام سے شیطان حملہ آور ہوتا ہے۔ جب شیطان افراد کی مصلحتوں کی راہ سے اندر نہیں آسکتا تو پھر وہ دعوت کی مصلحت کی راہ سے حملہ کرتا ہے۔ دعوت کی مصلحت اب ایک بت بن گیا ہے۔ آج کل داعیان حق اس کو بہت پوجتے ہیں' لیکن اس لباس میں وہ دعوت کے اصل منہاج سے جی چراتے ہیں۔ لہٰذا دعوت اسلامی کی لیڈر شپ کو چاہئے کہ وہ دعوت کے اصل منہاج کو نہ بھولیں اور اس منہاج پر خوب غور کریں اور خصوصاً اس بات کی طرف توجہ نہ کریں کہ فلاں فلاں کام نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس میں دعوت کے لیے خطرہ ہے' یا کارکنوں کے لیے خطرہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اصل خطرہ یہی ہے کہ دعوت اسلامی کے حاملین دعوت کا حقیقی منہاج چھوڑ دیں' کسی بھی وجہ سے' اور صحیح راستے سے انحراف کریں خواہ یہ انحراف قلیل ہو یا کثیر ہو۔ اللہ اپنی دعوت کی مصلحت کو ہم سے زیادہ جانتا ہے اور پھر دعوت کے بچانے اور کامیاب کرانے کے ہم ذمہ دار اور مکلف ہی نہیں۔ ہمارا فریضہ صرف ایک ہے کہ ہم اپنے منہاج سے انحراف نہ کریں اور اپنے صراط مستقیم سے بالکل ادھر ادھر نہ ہوں۔

---ooo---

آخر میں یہ تنبیہ آتی ہے کہ تم دعوت اسلامی کو شیطانی وسوسوں سے بچانے کی سعی کرو۔ یہ تمہاری ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ مانیں یا دعوت کامیاب ہو جائے۔ اگر کفار اس کو نہیں مانتے تو وہ دراصل اس کے بارے میں شک میں ہیں اور ان کے انتظار میں دردناک اور توہین آمیز عذاب ہے۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ

السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ۝ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۭ
يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ وَ ۷
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ ع ۹

"انکار کرنے والے تو اس کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہیں گے یہاں تک کہ یا تو ان پر قیامت کی گھڑی اچانک ۱۳ آ جائے ' یا ایک منحوس دن کا عذاب نازل ہو جائے ـ اس روز بادشاہی اللہ کی ہو گی ' اور وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا ـ جو ایمان رکھنے والے اور عمل صالح کرنے والے ہوں گے وہ نعمت بھری جنتوں میں جائیں گے ' اور جنہوں نے کفر کیا ہو گا اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہو گا ان کے لیے رسوا کن عذاب ہو گا" ـ

یہ ان لوگوں کا انجام ہے جو اس قرآن کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہیں ـ قرآن کریم نے اس مضمون کا ذکر اس تصریح کے بعد کیا ہے کہ انبیاء و رسل دعوت کے سلسلے میں نہایت شوق اور تمنا رکھتے ہیں اور شیطان ان کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتا ہے کیونکہ لوگ جن کے بارے میں انبیاء تمنا کرتے ہیں ' ان کے دلوں میں شک رہتا ہے اس لیے کہ ان کے دلوں کے اندر دعوت اسلامی اچھی طرح بیٹھ نہیں سکی ـ یہ اسی طرح شک میں رہیں گے یہاں تک کہ اچانک قیامت آ جائے یا ان پر کوئی منحوس دن آ جائے ـ یعنی قیامت کے بعد کا عذاب ـ قیامت کے دن کے لیے یوم عظیم استعمال ہوا ' کیونکہ اس کے بعد کوئی دوسرا دن نہ ہو گا ـ

اس دن میں تمام اختیارات اللہ وحدہ کے پاس ہوں گے یہاں کسی کی بادشاہت نہ ہو گی ـ دنیا کی ظاہری بادشاہت بھی کسی کے پاس نہ ہو گی ـ صرف اللہ کا حکم چلے گا ـ اس دن تمام لوگوں کے فیصلے ان کی مقررہ جزاء عمل کے مطابق اللہ کرے گا ـ

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ( ۲۲ : ۵٦ ) "جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے وہ جنات نعیم (نعمتوں والی جنتوں) میں ہوں گے" ـ

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ( ۲۲ : ۵۷ ) "اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہو گا ' ان کے لیے رسوا کن عذاب ہو گا" ـ

--- ○○○---

# درس نمبر ۱۴۷ ایک نظر میں

اس سے پہلے سبق کا خاتمہ اس مضمون پر ہوا تھا کہ آخرت میں مومنین اور مکذبین کا خاتمہ کیا ہو گا' جہاں بادشاہت صرف اللہ وحدہ کی ہوگی۔ مضمون یہ چل رہا تھا کہ اللہ ہمیشہ اپنے رسولوں کی نصرت کرتا ہے' اپنی دعوت کو خود بچاتا ہے اور جو ایمان لاتا اسے اجر دیتا ہے جو کفر کرتا ہے اسے سزا دیتا ہے۔

اس سبق کا آغاز ہجرت سے ہوتا ہے' اس سے قبل مہاجرین و انصار کو جہاد کی اجازت دے دی گئی ہے' کیونکہ اسلامی نظریہ حیات کا دفاع بغیر جہاد کے ممکن نہیں۔ جب تک وہ جہاد نہ کریں گے نہ وہ اللہ کی بندگی کر سکتے ہیں' نہ عبادات' نہ اپنی جان کی حفاظت کر سکتے ہیں نہ اپنے دین کی۔ کیا وہ دیکھتے نہیں کہ انہیں اپنے شہر سے بغیر کسی جرم کے نکال دیا گیا ہے۔ ہاں انہوں نے یہ "جرم" ضرور کیا تھا کہ وہ صرف اللہ کو رب مانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو تسلی دیتے ہیں کہ انہوں نے اپنا شہر چھوڑا اور مال و جائیداد کو چھوڑا تو اللہ ہی اس کام کا اجر انہیں دے گا۔

اسی حوالے سے ایک عام اصول کے طور پر بتا دیا جاتا ہے کہ جس پر کوئی ظلم ہو تو وہ اس کے بدلے اسی قدر ظلم کر سکتا ہے۔ اس صورت میں' اگر ظالم مزید ظلم پر اتر آئے اور پھر ظلم کرے تو اللہ مظلوموں کے ساتھ ہو گا۔ اس وعدے پر اللہ تعالیٰ دلائل بھی دیتا ہے کہ اللہ مدد کر سکتا ہے کیونکہ اللہ ہی اس پوری کائنات کو چلا رہا ہے اور جس سنت اور ناموس کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے اس کا ایک حصہ اور تقاضا یہ بھی ہے کہ مظلوم کی امداد کی جائے۔

اس کے بعد خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ہے کہ ہر امت کا ایک منہاج ہے' اس کو اس پر چلنے کا حکم دیا گیا ہے اور اسے اس کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ رسول اللہؐ سے کہا جاتا ہے کہ مشرکین کو یہ صاف صاف بتا دیں اور ان کو موقع نہ دیں کہ وہ آپ کے ساتھ کوئی تنازعہ کریں۔ اگر وہ پھر بھی مجادلہ پر اتر آئیں تو معاملے کو خدا پر چھوڑ دیں۔ وہ قیامت کے دن فیصلہ کرے گا کیونکہ اصل علم تو اس کے پاس ہے جو آسمان و زمین کی ہر چیز کو جانتا ہے۔ یہ لوگ جن بتوں کی عبادت کرتے ہیں' اس پر ان کے پاس کیا ثبوت ہے' یہ بغیر ثبوت کے اپنے موقف پر اس لیے ڈٹے ہوئے ہیں کہ ان کو کلمہ حق کے سننے ہی سے نفرت ہے اور یہ نفرت ان پر اس قدر غالب ہے کہ جو لوگ ان کو آیات سناتے ہیں خطرہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ان پر حملہ نہ کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو تنبیہ کرتے ہیں کہ جلدی نہ کرو' تمہارے لیے آگ تیار ہے اور وقت جلدی ہی آنے والا ہے۔

اس کے بعد ان الہوں کے ضعف کو بیان کیا گیا ہے جو اللہ کے سوا پکارے جاتے ہیں اور یہ تمام انسانوں کے نام ایک پیغام عام کے انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ ان الہوں کی بیچارگی کو بڑے توہین آمیز انداز میں بیان کیا جاتا ہے کہ یہ اللہ کمھی کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔ یہ سبق اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کو اپنے فرائض ادا کرنے چاہئیں۔ فرائض ہیں کیا؟ یہ کہ وہ پوری انسانیت کی نگران ہے۔ اس کے لیے اخلاقی تیاری رکوع' سجود اور فعل خیرات ہے۔ اور نماز کا نظام قائم کرنا اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرنا اور اللہ پر بھروسہ کرنا۔ اس کے ساتھ یہ سورہ بھی ختم ہوتی ہے۔

# درس نمبر ۱۴۷ تشریح آیات

## ۵۸ --- تا --- ۷۸

وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْۤا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝

"اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی' پھر قتل کر دیے گئے یا مر گئے' اللہ ان کو اچھا رزق دے گا۔ اور یقیناً اللہ ہی بہترین رازق ہے۔ وہ انہیں ایسی جگہ پہنچائے گا جس سے وہ خوش ہو جائیں گے بے شک اللہ علیم اور حلیم ہے"۔

اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان ان تمام باتوں کو ترک کر دے' جن کو نفس انسانی چاہتا ہے' جن کو وہ بے حد عزیز سمجھتا ہے اور جن پر وہ بے حد حریص ہوتا ہے۔ فیملی' شہر' وطن' ماضی کی یادیں' مال اور زندگی کا سازو سامان۔ ان سب باتوں کو اپنے نظریہ پر قربان کرنا اور اللہ کی رضامندی حاصل کرنا اور اللہ کے ہاں جو کچھ اجر ہے اس کی طرف دیکھنا' یہ ایسا کام ہے کہ یہ دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی ہے۔

ہجرت کا حکم فتح مکہ سے قبل تھا اور اس وقت شروع ہوا تھا جب اسلامی حکومت مدینہ میں قائم ہو گئی تھی۔ فتح مکہ کے بعد اگر کوئی دوسرے علاقوں کو چھوڑ کر مدینہ آتا تو اسے ہجرت نہ سمجھا جاتا تھا۔ البتہ اسے جہاد اور نیک عمل ضرور سمجھا جاتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ فتح مکہ کے بعد اگر کوئی جہاد کرے تو اسے اچھا عمل سمجھا جائے گا اور ثواب ہو گا۔

وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْۤا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا

(۲۲ : ۵۸) "جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر قتل کر دیئے گئے یا مر گئے' اللہ ان کو اچھا رزق دے گا"۔ خواہ وہ شہید ہوئے یا اپنی موت آپ مر گئے۔ کیونکہ انہوں نے اپنا ملک اور مال و دولت چھوڑ دیا اور اس انجام کے لیے تیار ہو کر نکل آئے۔ انہوں نے شہادت کو ترجیح دی اور دنیا کے تمام عزیز ترین مال و دولت اور ملک کو قربان کر دیا۔

اس لیے اللہ نے بھی ہر حال میں ان کے لیے عظیم اجر کا فیصلہ کر دیا۔

وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ( ۲۲ : ۵۸ ) ”اللہ ان کو اچھا رزق دے گا بے شک اللہ اچھا رزق دینے والوں میں سے ہے“۔ اور یہ اللہ نے ان کے لیے جس رزق کا اعلان کیا ہے وہ اس سے بہت زیادہ اچھا ہے جو انہوں نے چھوڑا ہے۔

لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ( ۲۲ : ۵۹ ) ”اور انہیں ایسی جگہ پہنچائے گا جس سے وہ خوش ہوں گے“۔ وہ اس جگہ کی طرف نکلے جس پر اللہ راضی تھا لہذا ان کو ایسی جگہ داخل کرے گا جہاں وہ راضی ہوں گے۔ یہ بات ان کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے کہ اللہ ان کے لیے ان کی مرضی کی جگہ تیار کرے گا' حالانکہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور وہ خالق ہے۔

وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ( ۲۲ : ۵۹ ) ”بے شک اللہ علیم و حلیم ہے“۔ اللہ کے علم میں ہیں وہ مظالم جو ان پر ہوتے رہے۔ اللہ کے علم میں یہ بھی ہے جو وہ چاہتے ہیں۔ اور حلیم اس طرح کہ وہ سب کو مہلت دیتا ہے اور پھر وہ ظالم اور مظلوم دونوں کو پوری پوری جزاء دے گا۔

انسانوں کا معاملہ یہ ہے کہ جن پر مظالم ڈھائے جائیں تو وہ کبھی صبر کرتے ہیں اور کبھی صبر نہیں کرتے۔ جب صبر نہیں کرتے تو وہ ظلم کا جواب دیتے ہیں۔ وہ بھی ان اذیتوں کے مقابلے میں دشمنوں کو ویسی ہی اذیتیں دیتے ہیں۔ اگر ظالم پھر بھی باز نہیں آتے تو اللہ یہ ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتا ہے کہ وہ مظلوموں کی نصرت کرے گا۔

ذٰلِكَ ۚ وَ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝

”یہ تو ہے ان کا انجام' اور جو کوئی بدلہ لے' ویسا ہی جیسا اس کے ساتھ کیا گیا' اور پھر اس پر زیادتی بھی کی گئی ہو' تو اللہ اس کی مدد ضرور کرے گا۔ اللہ معاف کرنے والا اور درگزر کرنے والا ہے“۔

اس نصرت کی شرط یہ ہے کہ سزا بطور قصاص دی گئی ہو' اس میں زیادتی نہ ہو اور نہ ہی سرکشی کر کے سزا کو ظلم سے بدل دیا گیا ہو۔ سزا میں غلو نہ کیا گیا ہو۔

اس سزا کے جواز کے بعد یہ جملہ آیا ہے کہ اللہ غفور و رحیم ہے۔ اللہ ہر جرم کو معاف بھی کر سکتا ہے لیکن انسانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ بعض اوقات کسی قیمت پر جرم کو معاف نہیں کرتے اور قصاص اور سزا کے نفاذ کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن اللہ نے ان کو یہ حق دیا ہے۔ معاف نہ کرنا انسان کی بشری کمزوری ہے۔

ایک شخص پر ظلم ہو' وہ اس کے بدلے متوازن قصاص لے' لیکن ظالم اگر پھر ظلم پر اتر آئے تو اللہ کی نصرت کا وعدہ

اس شخص کے ساتھ ہے جس نے قصاص لیا۔ ظالم اور باغی کے ساتھ نہیں ہے لیکن اس وعدے کو اللہ تعالیٰ اس کائنات کے تکوینی نوامیس قدرت کے ساتھ مربوط کرتے ہیں' یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ کائناتی قوانین قدرت اس بات پر گواہ ہیں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور وہ نصرت کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جس طرح یہ قوانین قدرت اٹل ہیں اور نہایت باریکی سے اپنے فرائض کو پورا کر رہے ہیں اسی طرح اللہ کی نصرت بھی ایک کائناتی حقیقت ہے۔ اس میں یہ ممکن ہی نہیں کہ ایسا نہ ہو۔

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ يُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ أَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌۢ بَصِيرٌ۝

"یہ اس لیے کہ رات سے دن اور دن سے رات نکالنے والا اللہ ہی ہے اور وہ سمیع و بصیر ہے"۔

یہ ایک طبیعی کائناتی منظر ہے اور رات دن ہماری نظروں کے سامنے سے گزرتا ہے۔ گرمیوں اور سردیوں کی صورت میں ہم اس کے آثار دیکھتے ہیں۔ سورج کے غروب کے وقت رات دن میں داخل ہو جاتی ہے اور سورج کے طلوع کے وقت دن رات میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح رات دن میں داخل ہوتی ہے اور سردیوں میں دن کے حدود کو چھوٹا کر دیتی ہے۔ اور دن رات میں داخل ہوتا ہے گرمیوں میں اور رات کی حدود کو چھوٹا کر دیتا ہے۔ انسان ان مناظر کو رات اور دن دیکھتا رہتا ہے کہ دن رات میں اور رات دن میں داخل ہو رہے ہیں لیکن بہت زیادہ انس کی وجہ سے اور بہت زیادہ تکرار کی وجہ سے یہ عجیب و غریب مناظر ہمارے لیے دلکش نہیں رہے اور ہم اس نظام پر غور نہیں کرتے کہ یہ نظام کس قدر باریکی سے چل رہا ہے۔ اس میں ایک منٹ کے لیے بھی خلل نہیں پڑتا۔ کبھی یہ نظام موقوف نہیں ہوتا۔ یہ امر شہادت ہے قادر مطلق کی قدرت پر جس نے یہ نظام جاری کیا ہے۔

قرآن کریم اس منظر کی طرف ہمیں متوجہ کرتا ہے کہ تم ایسے مناظر کو بہت غفلت سے کیوں دیکھ کر گزر جاتے ہو' تاکہ وہ بتا سکے کہ اللہ کی قدرت کا کیا عالم ہے۔ ایک طرف سے وہ ان کی بساط لپیٹ لیتا ہے' رات کو بچھا دیتا ہے اور دوسری طرف سے وہ تاریکی کو دور کر کے دن کا اجالا پھیلا دیتا ہے۔ یہ نظام اس قدر باریک ہے کہ اس میں کوئی خلل نہیں پڑتا' صدیاں گزر گئیں۔ یہی حال اس نصرت کا ہے جس کا اعلان مظلوموں کی حمایت میں ہوا ہے۔ یہ اس طرح یقینی ہے جس طرح رات اور دن کا یہ نظام یقینی ہے۔ اس طرح اللہ جباروں کی سلطنت کے نظام کو اب لپیٹ رہا ہے اور دنیا میں صالح اور عادل لوگوں کا نظام زندگی نافذ کر رہا ہے۔ یہ سیاسی انقلاب بھی انقلاب روز و شب کی طرح یقینی اور اٹل ہے اور ایک تکوینی سنت ہے۔ یہ سنت بھی رات اور دن جاری و ساری ہے لیکن لوگ اس سے غافل ہیں۔ جس طرح وہ اس کائنات میں دلائل کونیہ سے غافل ہیں حالانکہ یہ دلائل ایک کھلی کتاب کی شکل میں ہر لحہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ أَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهٖ هُوَ

الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۶۲﴾

"یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور وہ سب باطل ہیں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں اور اللہ ہی بالادست اور بزرگ ہے"۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ حق ہے اور حق اس نظام کائنات کو کنٹرول کرتا ہے۔اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے۔باطل میں خلل پڑتا رہتا ہے اور حق قائم و دائم رہتا ہے لہٰذا یہ اہل حق کی مدد کے لیے کافی دلیل ہے اور یہی بات اس نصرت کی ضمانت ہے۔یہ باطل اور ظلم کے خلاف اللہ کی نصرت پر دلیل بھی ہے اور یہ اس بات پر بھی دلیل ہے کہ اللہ کے تکوینی فیصلے جس طرح اٹل ہوتے ہیں اسی طرح اللہ کی نصرت کا یہ وعدہ بھی اٹل ہے۔یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ وعدہ پورا نہ ہو کیونکہ اللہ ان سرکشوں سے بڑا بادشاہ ہے اور وہ ان جباروں سے بہت بڑا ہے۔

وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (۲۲ : ۶۲) "اور اللہ ہی بالادست اور بزرگ ہے"۔لہٰذا وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ ظلم بلند رہے اور طویل عرصے تک عوام پر ظلم ہوتا رہے۔

--- ooo ---

یہ مضمون کہ دلائل کائنات اللہ کی لامحدود قدرت پر شاہد عادل ہیں' ذرا آگے بھی جاری رہتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿۶۳﴾

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور اس کی بدولت زمین سرسبز ہو جاتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ لطیف و خبیر ہے"۔

آسمانوں سے بارش برسنا' زمین کا سرسبز اور شاداب ہونا' صبح و شام ایسے مناظر کا دہرایا جانا' یہ ایک ایسا عمل ہے جو ہمارے سامنے بار بار دہرایا جاتا ہے اور ہم اس سے اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں' لیکن اگر ہم اپنے شعور کو ایک شاعر کی طرح بیدار کر لیں تو یہ منظر دلوں اور دماغوں کے اندر بے شمار احساسات پیدا کر دیتا ہے۔انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ چھوٹا سا پودا جو زمین کو پھاڑ کر سر باہر نکالتا ہے' مٹی اور کیچڑ سے باہر آتا ہے' یہ ایک چھوٹا سا بچہ ہے اور اس دنیا کی طرف نکل کر ہنستا ہے اور اس کے منہ پر فرحت بخش تبسم ہوتا ہے۔نظر آتا ہے کہ یہ چھوٹا سا پودا اپنی اس خوشی میں کہیں اڑ نہ جائے۔

جو لوگ ایسا شعور رکھتے ہیں وہی اس آیت کو سمجھ سکتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ (۲۲ : ۶۳) "اللہ لطیف و خبیر ہے"۔لطیف کے معنی ہیں کہ نہایت ہی

باریکی کو بھی دیکھتا ہے اور اس سے خبردار ہے۔ وہ اس منظر کو نہایت ہی لطف اور گہرائی سے دیکھتا ہے اور ان مناظر کی حقیقت اور مزاج کا خالق ہے اور واقف ہے۔ یہ اللہ کا لطف و کرم ہے کہ یہ چھوٹا سا پودا زمین سے باہر آتا ہے حالانکہ یہ نہایت ہی ضعیف اور بے طاقت ہوتا ہے۔ لیکن دست قدرت اسے ہوا میں بلند کرتا جاتا ہے اور زمین کی جاذبیت اور کشش ثقل کے باوجود اس کے اندر اٹھنے اور پھیلنے کا شوق ہوتا ہے۔ یہ قدرت الٰہیہ کا لطف و کرم ہے کہ عین وقت پر بارش ہوتی ہے' مناسب مقدار میں ہوتی ہے اور یہ پانی نہایت ہی میکانکی طریقے سے مٹی سے ملتا ہے اور نباتی عمل شروع ہوتا ہے اور پھر زندہ نباتی خلیے روشنی کی طرف سفر شروع کرتے ہیں۔

یہ پانی اللہ کے آسمان سے اللہ کی زمین پر نازل ہوتا ہے۔ اللہ ہی اس میں زندگی پیدا کرتا ہے۔ اللہ ہی اس میں غذا اور ثروت پیدا کرتا ہے۔ اللہ ہی زمین و آسمان اور مافیہا کا مالک ہے۔ وہ زمین و آسمان اور مافیہا سے غنی ہے۔ یہ زندہ چیزوں کو پانی اور نباتات کا رزق دیتا ہے لیکن وہ خود رزق اور مرزوق دونوں سے غنی ہے۔

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ۗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ﴿۶۴﴾ ع ۸ / ۱۵

"اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے' بے شک وہی غنی و حمید ہے"۔ اسے زمین و آسمان کی کسی مخلوق کی حاجت نہیں ہے۔ وہ تو غنی ہے' حمید ہے' محمود ہے' اور تمام مخلوق پر اس کا کرم ہے۔

مزید بات اس مضمون پر آگے بڑھتی ہے کہ لوگوں کے لیے اس کائنات میں سوچنے کی کی چیزیں ہیں جو ان کی نظروں کے سامنے بڑی ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۗ وَیُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۗ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۶۵﴾

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اس نے وہ سب کچھ تمہارے لیے مسخر کر رکھا ہے جو زمین میں ہے' اور اسی نے کشتی کو قاعدے کا پابند بنایا ہے۔ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے' اور وہی آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر نہیں گر سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ لوگوں کے حق میں بڑا شفیق اور رحیم ہے"۔

اس زمین میں کس قدر قوت ہے' کس قدر ثروت ہے' اور ان قوتوں اور ذخائر کو اللہ نے انسانوں کے لیے مسخر کر دیا ہے لیکن انسان اللہ کے ان انعامات سے غافل ہے۔ یہ ان انعامات میں رات اور دن ڈوبا ہوا ہے' لیکن غافل پڑا ہے۔

اللہ نے زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو انسان کے لیے مفید بنایا ہے اور مسخر کر دیا ہے۔ اس کائنات کے طبیعی قوانین کو انسانی فطرت کے مطابق اور موافق بنایا ہے۔ اگر اللہ نے اس زمین کے طبیعی حالات کو انسان کے طبیعی حالات کے

خلاف بنایا ہوتا تو انسان کے لیے یہاں زندہ رہنا مشکل ہوتا چہ جائیکہ وہ یہاں اس کائنات کے ذخیروں سے کوئی فائدہ اٹھا سکتا۔ اگر انسان کی جسمانی تربیت اس سے مختلف ہوتی اور اس کرۂ ارض پر وہ چل نہ سکتی' ہوا نہ کھینچ سکتی' غذا نہ لے سکتی' پانی نہ پی سکتی تو انسان یہاں ایک لمحے کے لیے بھی زندہ نہ رہ سکتا۔ اگر انسان کا وزن اس طرح موزوں نہ ہوتا جس طرح کہ ہے تو اس کے قدم زمین پر نہ ٹکتے یا ہوا میں اڑ جاتا یا زمین میں دھنس جاتا۔ اگر زمین پر ہوا نہ ہوتی یا اس موجودہ حالت سے ذرا بھی کثیف ہوتی تو اس کا گلا گھٹ جاتا' اور فوراً مرجاتا۔ لہٰذا یہ امر الٰہی ہی ہے اور اس لطیف و خبیر کا کارنامہ ہی ہے کہ اس نے ان فطری قوتوں کو انسان کے موافق بنایا اور انسان کو ان کے موافق۔

اللہ نے ایک طرف تو ان کو ایسی طاقت دی کہ وہ اس کرۂ ارض کو مسخر کر سکے اور دوسری طرف کرۂ ارض اور اس کے اندر پوشیدہ قوتوں کو ایسا بنایا کہ وہ انسان کے کنٹرول میں آسکیں۔ پھر زمین کے اندر ظاہری اور پوشیدہ بے شمار قوتوں کو یہ انسان ایک ایک کر کے دریافت کرتا اور ان کو کنٹرول کرتا چلا گیا۔ جب بھی اسے کسی جدید قوت کی ضرورت پیش آئی ہے اس نے وہ جدید قوت ڈھونڈ نکالی ہے۔ جب اس کو خطرہ ہوا کہ زمین کی قوتوں میں سے کوئی ذخیرہ ختم ہونے والا ہے' اس نے جدید ذخیرہ تلاش کر لیا۔ ابھی پٹرول کے ذخائر ختم نہ ہوئے تھے کہ اس نے ایٹمی قوت دریافت کر لی اور ابھی اس پر پورا کنٹرول نہ ہوا تھا کہ ہائیڈروجن قوت دریافت کر لی۔ اگرچہ انسان کی مثال ابھی تک بچے کی سی ہے کہ جس کے ہاتھ میں آگ آ جائے تو وہ خود بھی جلتا ہے اور دوسروں کو بھی جلاتا ہے۔ انسان اس وقت معتدل رہ سکتا ہے جب وہ اسلامی نظام زندگی کے سایہ میں زندگی بسر کرے۔ صرف اس صورت میں وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو تعمیری کاموں میں صرف کر سکتا ہے اور منصب خلافت فی الارض کا فریضہ اچھی طرح ادا کر سکتا ہے۔

وَالْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ (۲۲ : ۶۵) "اور اس نے کشتی کو قاعدے کا پابند بنایا ہے وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے"۔ کیونکہ یہ قوانین قدرت اسی نے بنائے ہیں جن کے مطابق کشتی سمندر میں چلتی ہے اور انسان کو معلوم ہوا کہ اللہ نے یہ قوانین اس کائنات میں جاری کر دیے ہیں۔ چنانچہ انسان نے کشتی کو اپنے مفادات کے مطابق چلانا شروع کر دیا۔ اگر سمندر کا کوئی ضابطہ یا کشتی کا مزاج اس کے خلاف ہوتا تو ہم کشتی نہ چلا سکتے یا اگر انسان کی قوائے مدرکہ ایسی نہ ہوتیں جیسی ہیں تو ہمیں پتہ بھی نہ ہوتا کہ سمندروں میں اس طرح بڑے بڑے جہاز چلائے جا سکتے ہیں۔

وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (۲۲ : ۶۵) "اور وہی آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر نہیں گر سکتا"۔ کیونکہ اس نے اس کائنات کو بنایا اس طرح ہے کہ آسمان جس طرح کہ وہ ہے' قائم رہے اور تمام کرات ساوی ایک دوسرے سے دور اپنی اپنی جگہ قائم رہیں۔ نہ وہ گریں اور نہ ان کے درمیان ٹکراؤ ہو۔

علم فلکیات میں جس قدر ترقی ہوئی ہے اس سے صرف اس بات میں اضافہ ہوا ہے کہ یہ پیچیدہ نظام کائنات جس کے مطابق یہ پوری کائنات کھڑی ہے' خالق کائنات اللہ جل شانہ کا جاری کردہ ہے۔ اگرچہ بعض نادان انسان یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنی تحقیقات کے ذریعے نظام فلکی کی جو تفسیر اور تعبیر کرتے ہیں اس سے دست قدرت کی نفی ہوتی ہے' یہ بہرحال ان کا وہم اور سوچ کی کمی اور غور و فکر کی کجی ہے۔ پہلے تو یہ بات ہے کہ جس قدر فلکیاتی نظریات آج تک پیش

ہوئے ہیں یہ محض مفروضے ہیں لیکن اگر ہم ان کو حقیقت بھی مان لیں تو ان میں سے کوئی مفروضہ بھی یہ ثابت نہیں کرتا کہ اس قانون کو کسی نے وضع نہیں کیا ہے یا یہ کہ ان قوانین کے جاری و ساری رہنے میں کسی مدبر کے دست قدرت کا دخل نہیں ہے۔

وَیُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ (۲۲:۶۵) ''وہی آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے ہے کہ وہ زمین پر نہیں گرتا''۔ یعنی اس قانون کے عمل سے جو اس کائنات میں جاری کر دیا گیا ہے یہی اس کی صنعت کاری ہے۔ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ''مگر اس کے حکم کے سوا''۔ یعنی جب اس کا حکم ہوا کہ جو قانون اللہ نے جاری کیا ہے وہ معطل ہو جائے تو پھر یہ قانون قدرت معطل ہو جائے گا اور یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

---()()()---

اب قرآن مجید اس کائنات کے دلائل تکوینی بیان کرتے ہوئے' اس کائنات سے نفس انسانی کی طرف آتا ہے جو اس کائنات کا حصہ ہے۔ اب عالم انسانی کے اندر موت و حیات کے عجیب قوانین قدرت بیان کیے جاتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ۡ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ۝۶۶

''وہی ہے جس نے تمہیں زندگی بخشی ہے' وہی تم کو موت دیتا ہے اور وہی پھر تم کو زندہ کرے گا۔ سچ یہ ہے کہ انسان بڑا ہی منکر حق ہے''۔ انسان کے ڈھانچے میں زندگی ڈالنا یعنی پہلے انسانی ڈھانچے میں تو ایک عظیم معجزہ ہے' اور رات اور دن جن چیزوں میں اللہ تعالیٰ زندگی ڈالتا ہے اس سے اس معجزے کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔ یہ ''حیات'' کیا چیز ہے۔ ابھی تک یہ امور غیبیہ سے ہے اور عقل اس کے بارے میں حیراں ہے۔ اس میں بہرحال تامل و تدبر اور سائنسی تحقیق کے لیے بڑی گنجائش ہے۔

پھر موت بھی ایک دوسرا معجزہ ہے کہ انسان اس کی حقیقت سے آج تک عاجز ہے۔ موت نہایت ہی مختصر ٹائم میں واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن زندگی اور موت کے آثار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ انسان کے لیے اس میں غور و فکر کے وسیع امکانات ہیں۔

اب تیسرا مرحلہ کہ موت کے بعد زندگی کیسے ہوگی۔ یہ بھی اللہ کے پوشیدہ علوم میں سے ایک غیب ہے۔ لیکن اس پر دلیل بہت آسان ہے کہ جب ایک چیز کو پہلے پیدا کر دیا گیا' تو دوسری بار اس کی پیدائش میں کیا مشکلات ہو سکتی ہیں۔ اس میں بھی انسان غور و فکر کر سکتا ہے۔ لیکن انسان کی حالت یہ ہے کہ وہ غور و فکر ان موضوعات پر نہیں کرتا اور اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا'

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ (۲۲:۶۶) ''بے شک انسان ناشکرا ہے''۔ بڑا منکر حق ہے۔ قرآن مجید نے یہ تمام دلائل اس موضوع کے گرد پیش کیے ہیں کہ جن لوگوں پر ظلم ہو گا' اللہ ان کی مدد کرے گا۔ اور لوگوں کو چاہئے کہ وہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے خلاف ہونے والی جارحیت کا جواب دیں۔ یہ طرز استدلال قرآن کریم کے اس

اسلوب کے مطابق ہے کہ قرآن اس کائنات کے قوانین فطرت اور مظاہر قدرت کو دلوں میں ولولہ پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے کیونکہ نظام اسلامی کے اندر موجود قوانین عدل کو پوری کائنات کے اندر موجود قوانین فطرت کی تائید حاصل ہے۔

---ooo---

اس کائنات کے مظاہر فطرت اور قوانین قدرت کے بیان کے اس فیصلہ کن موڑ پر پہنچ کر اب قرآن مجید نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت کرتا ہے کہ آپ مشرکین کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی راہ پر چلیں۔ مشرکین کے نزاع اور جدال کی پرواہ نہ کریں۔ اللہ مشرکین کو یہ طاقت نہیں دیتا کہ وہ آپ کو اپنی راہ سے روک سکیں۔ یہ راہ آپ کے لیے اللہ نے چنی ہے اور اس راہ میں آپ صرف دعوت پہنچانے تک محدود رہیں۔ اصل فیصلہ تو اللہ خود قیامت میں کرے گا۔

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ﴿٦٧﴾ وَإِن جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٦٨﴾ اللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٦٩﴾ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّ ذَٰلِكَ فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿٧٠﴾

" ہر امت کے لیے ہم نے ایک طریق عبادت مقرر کیا ہے جس کی وہ پیروی کرتی ہے ' پس اے نبی ' وہ اس معاملہ میں تم سے جھگڑا نہ کریں۔ تم اپنے رب کی طرف دعوت دو۔ یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو۔ اور اگر وہ تم سے جھگڑیں تو کہہ دو کہ " جو کچھ تم کر رہے ہو ' اللہ کو خوب معلوم ہے ' اللہ قیامت کے روز تمہارے درمیان ان سب باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں تم اختلاف کرتے ہو "۔ کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ کے علم میں ہے؟ سب کچھ ایک کتاب میں درج ہے۔ اللہ کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہیں ہے "۔

ہر قوم اور ہر امت کا ایک منہاج فکر ' منہاج عقیدہ اور ایک منہاج عمل اور ایک نظام زندگی ہوتا ہے۔ یہ نظام ان قوانین کے تابع ہوتا ہے جو اللہ نے انسانوں کے اندر جاری کیے ہیں جن کے مطابق انسان ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور بعض چیزوں کو قبول کر لیتا ہے۔ یہ قوانین تخلیقی قوانین ہیں اور اللہ نے پیدائش کے وقت سے انسان کے اندر ان کا داعیہ رکھا ہے۔ جو امت دل کھول کر ان قوانین فطرت کو سمجھتی ہے اور ان کے مطابق اس کائنات اور نفس انسانی کے اندر دلائل ہدایت تلاش کرتی ہے ' وہ امت ہدایت یافتہ امت ہے کیونکہ وہ اس کائنات سے وہ قوانین دریافت کر لیتی ہے جس کے مطابق وہ اللہ کی معرفت اور اس کی اطاعت کے مقام تک پہنچ جاتی ہے۔ جو امت ان قوانین فطرت اور قوانین نفس سے آنکھیں بند کر لیتی ہے اور اسے ان میں خدا تک پہنچنے کی راہ نظر نہیں آتی ' وہ امت امت ضلالہ ہے اور اس نے خود

اعراض کیا ہے اور سرکشی کی راہ اپنائی ہے۔

اس طرح اللہ نے ہر امت کے لیے کچھ مناسک رکھے ہیں' جن پر وہ عمل کرتی ہے' ایک منہاج رکھا ہے جس پر وہ چلتی ہے۔ لہٰذا مشرکین کے ساتھ مجادلہ میں اب وقت ضائع نہ کیا جائے' کیونکہ وہ خود اپنے آپ کو راہ ہدایت اختیار کرنے سے روک رہے ہیں۔ وہ منہاج ضلالت میں دور تک چلے گئے ہیں لہٰذا اللہ بھی یہ نہیں چاہتے کہ ان لوگوں کو اسلام کے خلاف مجادلے اور مباحثے کا موقع ملے۔ وہ تو چاہتے ہی یہ ہیں' اے پیغمبرؐ آپ اپنی راہ پر آگے بڑھیں۔ آپ کی راہ سیدھی ہے اور نظام مستقیم ہے۔

وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيمٍ (۲۲ : ۶۷) "تم اپنے رب کی طرف دعوت دو' یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو"۔ آپ اپنے منہاج پر مطمئن ہو جائیں اور استقامت کے ساتھ اس پر گامزن رہیں۔ اگر کوئی آپ سے مجادلہ کرے تو بات مختصر کریں اور جہاد کا وقت آیات کلامی پر بحثوں میں ضائع نہ کریں۔

وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۲۲ : ۶۸) "اگر وہ تم سے جھگڑیں تو کہہ دو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو' اللہ کو خوب معلوم ہے"۔ بحث و مباحثہ تب فائدہ مند ہوتا ہے کہ مخاطب ماننے کے لیے تیار ہو' اور وہ حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہو۔ ایسے افراد کے ساتھ مباحثہ مفید نہیں ہوتا جو اپنی بات پر مصر ہوں۔ اور وہ اس کائنات میں پائے جانے والے تمام دلائل کو جو انفس و آفاق میں موجود ہیں اور قرآن ان کی طرف بار بار متوجہ کرتا ہے' یکسر رد کر کے مکابرہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ کے حوالے کر دو' یہ اللہ ہی ہے جو تمام امتوں کے طریقوں کا فیصلہ قیامت میں کرے گا۔

اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (۲۲ : ۶۹) "اللہ قیامت کے روز تمہارے درمیان سب باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو"۔ اللہ وہ جج ہے جس کے فیصلے پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ قیامت کے فیصلے کے خلاف تو کوئی اپیل نہ ہوگی۔ یہ تو سپریم فیصلہ ہوگا۔

اللہ علم کامل کے ساتھ فیصلہ کرے گا۔ اس کی کوئی سبب یا کوئی دلیل جھوٹ نہیں ہو سکتی۔ عمل و شعور میں سے کوئی بات اس سے مخفی نہیں رہ سکتی۔ وہ تو آسمانوں و زمین میں سب کچھ جانتا ہے اس میں لوگوں کے اعمال اور نیات سب شامل ہیں۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۲۲ : ۷۰) "کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ کے علم میں ہے؟ سب کچھ ایک کتاب میں درج ہے۔ اللہ کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہیں ہے"۔ اللہ کا علم نہایت کامل اور نہایت ہی باریک ہے اور اس پر اس کائنات کی کوئی شے مخفی نہیں ہے۔ وہ ایسی چیز سے متاثر نہیں ہوتا' جس کی وجہ سے کوئی چیز محو ہو جاتی ہے یا بھول جاتی ہے۔ یہ سب کچھ تو ایک کتاب میں قلم بند ہے اور یہ ریکارڈ رکھنا اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔

انسانی عقل تو تھک جاتی ہے۔ خصوصاً اس کلیاتی نظام پر غور کرتے ہوئے بھی عقل تھک جاتی ہے۔ پھر جب ہم اس

پوری کائنات کے بارے میں اللہ کے علم کی جامعیت پر غور کرتے ہیں اور اسے حافظہ تصور میں لاتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ بے شمار اشیاء ' اشخاص ' اعمال ' نیات ' خیالات اور حرکات ' عالم منظور میں اور عالم مخفی میں ہیں تو ہمارے تصور کا دامن تار تار ہو جاتا ہے 'لیکن اللہ کے علم و قدرت کے حوالے سے یہ تو شے یسیر ہے۔

اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ( ۲۲ : ۷۰ ) "یہ اللہ کے لیے مشکل نہیں ہے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ ہدایت دینے کے بعد کہ آپ مشرکین کو بحث و جدال کا کوئی موقع ہی نہ دیں کہ وہ آپ کی راہ مستقیم پر بحث کریں۔ اب حضور اکرم کو سمجھایا جاتا ہے کہ خود ان کی جو راہ ہے اور جو منہاج ہے اس میں تو بحث کی گنجائش ہے اور اس میں تو نیز ہ 'ضعف ' جہالت 'ظلم اور دوسرے تمام نقائص موجود ہیں اور یہ کہ یہ لوگ باطل پرست ہونے کی وجہ سے اللہ کی نصرت اور معاونت سے بھی محروم ہیں۔ کوئی مددگار ان کا نہیں ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ۝

"یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کر رہے ہیں جن کے لیے نہ تو اس نے کوئی سند نازل کی ہے اور نہ یہ خود ان کے بارے میں کوئی علم رکھتے ہیں۔ ان ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جس صورت حال یا قانون یا معاشرے کو اللہ کی طرف سے کوئی سند حاصل نہ ہو اس میں کوئی قوت نہیں ہوتی۔ جس چیز کی پشت پر اللہ کی قوت نہ ہو وہ کمزور ہے۔ اس کے اندر قوت کا بنیادی عنصر ہی موجود نہیں ہے جو سلطان الہی ہے۔

یہ لوگ بت پرست ' انسان پرست یا شیطان پرست ہیں۔ ان سب چیزوں پر خدائی ہاتھ موجود نہیں ہے اس لیے ایسے لوگ حقیقی قوت سے محروم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ مذکورہ بالا چیزوں کی بندگی کسی دلیل 'کسی علم اور کسی یقین کی اساس پر نہیں کرتے۔ محض وہم اور خرافات کی بنیاد پر ان چیزوں کو مانتے ہیں۔ جب یہ اللہ کی نصرت اور مدد سے محروم ہو گئے تو اب دنیا و آخرت میں ان کا کوئی نصیر و مددگار نہیں ہے۔

تعجب انگیز بات یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جس پر اللہ کی طرف سے کوئی سند جواز نہیں ہے ' نہ علم ہے ان کو 'پھر یہ دعوت حق بھی سننے کے لیے تیار نہیں ' نہ اسے قبول کرتے ہیں 'بلکہ یہ لوگ ضد میں آکر گناہ کے کام پر آمادہ ہوئے ہیں اور اس قدر ضد اور عناد میں آگئے ہیں کہ یوں نظر آتا ہے کہ ان کے سامنے کلام الہی پیش کرنے والے پر یہ لوگ ٹوٹ پڑیں اور اس کو چبا کر کھا جائیں۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا

الْمُنْكَرَ ۭ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۭ

” اور جب ان کو ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو تم دیکھتے ہو کہ منکرین حق کے چہرے بگڑنے لگتے ہیں ' اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی وہ ان لوگوں پر ٹوٹ پڑیں گے جو انہیں ہماری آیات سناتے ہیں “ ۔

یہ لوگ دلیل کا جواب دلیل سے نہیں دیتے ۔ نہ دلیل کو دلیل سے رد کرتے ہیں بلکہ یہ دلیل کے مقابلے میں غصہ کر کے مخالف کو کھا جانا چاہتے ہیں اور یہ دلیل نہ ہونے کی علامت ہے ۔ اور سرکشوں کی آخری دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ لڑ پڑتے ہیں اور تشدد کرتے ہیں ۔ وہ حق کا کلمہ سننا ہی نہیں چاہتے ۔ ڈنڈے کی دلیل سے بات کرتے ہیں کیونکہ ان کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس ڈنڈے کے سوا اور کچھ نہیں ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ان کو یہ جواب دیتا ہے :

قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ اَلنَّارُ ۭ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ ۹
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ ۸ ع
۱۶

” ان سے کہو میں بتاؤں تمہیں کہ اس سے بدتر چیز کیا ہے؟ آگ ' اللہ نے اسی کا وعدہ ان لوگوں کے حق میں کر رکھا ہے جو قبول حق سے انکار کریں ' اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے “ ۔

یہ کہ تم دلیل کا جواب ڈنڈے سے دیتے ہو تو پھر قوت کے مقابلے میں ایک بڑی قوت ہے ۔ اس کا سامنا کرو اور انکار کرو انجام کا ۔ لیکن یاد رکھو کہ وہ بہت ہی برا انجام ہے ۔

---ooo---

اب اس سورہ کا اعلان عام ' تمام لوگوں کے لیے قرارداد ' جہراً ' باآواز بلند کہ لوگو ذرا اپنے معبودوں پر غور تو کرو ۔ اللہ کے سوا جو شخص جس قسم کا الٰہ پوجتا ہے اس سے مدد طلب کرتا ہے جس شکل و صورت میں ہو وہ پکارے جانے والا ۔ اللہ ان کے ضعف اور کمزوری کو ایک واضح مثال سے ظاہر کرتا ہے جسے دیکھا اور سنا جا سکتا ہے ۔ مثال کیا ہے ایک چلتے پھرتے متحرک منظر کی تصویر کشی ہے ۔ اس منظر کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اور دل خوش ہوتا ہے ۔ ذرا اس منظر میں ان خداؤں کی بیچارگی کا نظارہ کرو ۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَـيْـــًٔـا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝۷۳

"لوگو' ایک مثال دی جاتی ہے' غور سے سنو جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے ۔ بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے ۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور"۔

یہ عام پکار ہے' بلند آواز سے اعلان عام ہے ۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ (۲۲ : ۷۳) اے لوگو' جب لوگ جمع ہو گئے تو ان کے سامنے ایک مثال ہے ۔ ایک عجیب منظر کی شکل میں ۔ یہ کوئی مخصوص مجلس نہیں ہے' نہ کوئی اتفاقی بات ہے بلکہ لوگوں کو بلایا گیا ہے ۔

ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ (۲۲ : ۷۳) "مثال دی جاتی ہے غور سے سنو' اس کو"۔ یہ مثال ایک قاعدہ اور اصول مقرر کرتی ہے اور حقیقت بتاتی ہے ۔

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ (۲۲ : ۷۳)

"جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے"۔ یعنی اللہ کے سوا تم جن بتوں کو پوجتے ہو' یا جن اشخاص کی بندگی کرتے ہو' یا رسومات اور تقالید کی بندگی کرتے ہو' جن سے تم نصرت طلب کرتے ہو' جن سے تم امداد طلب کرتے ہو اور جن سے تم عزت طلب کرتے ہو' یہ سب کے سب اگر مل جائیں تو ایک مکھی کی تخلیق بھی نہیں کر سکتے ۔ مکھی اللہ کی مخلوقات میں سے بہت ہی صغیر و حقیر مخلوق ہے لیکن جن کو یہ الٰہ اور خدا کہتے ہیں وہ اس پر بھی قادر نہیں ۔ اگرچہ وہ سب کے سب ایک دوسرے کی مدد پر جمع ہو جائیں تو اللہ کی مخلوقات میں سے اس نہایت ہی معمولی چیز کو وہ نہیں پیدا کر سکتے ۔

جہاں تک مکھی کی تخلیق کا تعلق ہے وہ تو اونٹ اور ہاتھی جیسے بڑے حیوانات کی طرح مشکل اور محال ہے ۔ کیونکہ مکھی کے اندر بھی وہی راز حیات ہے جو اونٹ اور ہاتھی کے اندر ہے لہذا محض محال ہونے میں تو چھوٹی بڑی مخلوق برابر ہے ۔ لیکن قرآن کے معجزانہ انداز بیان نے یہاں مکھی جیسی صغیر و حقیر چیز کو مثال کے لیے منتخب کیا ہے کیونکہ اگر کوئی مکھی کی تخلیق سے عاجز ہے تو اس کی عاجزی بمقابلہ اونٹ یا ہاتھی زیادہ سہولت سے سمجھ میں آتی ہے' یہ محض تعبیری انداز ہے ورنہ حقیقت تو دونوں کی ایک ہے ۔ قرآن کریم کا یہ نہایت انوکھا اسلوب ہے ۔

اب ذرا ان معبودوں کی کمزوری کی سمت میں ایک قدم اور آگے جائیے ۔

وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ (۲۲ : ۷۳) "بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے"۔ ان معبودوں کی حالت تو یہ ہے کہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو یہ اسے نہیں چھڑا سکتے ۔ چاہے بت ہوں' چاہے اشخاص اور اولیاء ہوں ۔ بلکہ بڑے بڑے فرعونوں سے مکھی اگر کوئی چیز اٹھا کر لے جائے تو وہ اسے پکڑ نہیں سکتے ۔ یہاں بھی مکھی کو اختیار کیا گیا تاکہ اس صغیر و حقیر چیز کا سایہ ان بتوں پر پڑے اور ان کی بیچارگی اچھی طرح واضح ہو جائے ۔ جبکہ اس کے اندر خطرناک بیماری ہوتی ہے اور وہ ہم سے نفیس

چیزیں اڑا کر لے جاتی ہے۔ یہ کبھی ہم سے آنکھیں لے لیتی ہے' کبھی اس کی وجہ کوئی عضو شل ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار تو آدمی اس بیماری سے جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ یہ سل 'ٹائیفائیڈ' ڈاسینٹری اور ہیضے کے جراثیم کی حامل ہے' لیکن ہم سے وہ چیزیں لے جاتی ہے جو ہم اس سے واپس نہیں لے سکتے۔

قرآن کا معجزانہ انداز کلام اس قسم کے ایک لفظ اور مفہوم کا انتخاب کر کے اس طرح کی فضا پیدا کر دیتا ہے۔ اگر قرآن مجید یہ کہتا کہ اگر درندے ان سے کوئی چیز لے جائیں تو یہ چھڑا نہیں سکتے تو اس سے ضعف کے مقابلے میں قوت کا تصور آتا' حالانکہ درندے مکھی سے زیادہ قیمتی شے نہیں چھین سکتے لیکن مکھی کے لفظ سے ان کی بیچارگی اور حقارت کا تصور زیادہ گہرا ہوتا ہے۔

مثال کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے۔

ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ (۲۲: ۷۳) "مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور"۔ تاکہ مکھی کے لفظ سے جو ضعیفی کی فضا بنی ہے وہ ثابت بھی ہو جائے۔ اب فضا تیار ہے' انسانی سوچ اور فکر میں ان الہوں کی حقارت اور بیچارگی بیٹھ گئی ہے' ایسی فضا میں قرآن اللہ کی قوت کا اعلان کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی افسوس کی بات ہے کہ انسان نے اللہ کی اس عظیم قوت کا اندازہ نہیں لگایا۔

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝

"ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ پہچانی' جیسا کہ اس کے پہچاننے کا حق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوت اور عزت والا تو اللہ ہی ہے"۔

○ لوگوں نے اللہ کی قدر نہیں کی کہ وہ اللہ کے ساتھ ایسے عاجز' حقیر اور بیچارہ چیزوں کو شریک کرتے ہیں' جو اگر سب کے سب بھی جمع ہوں تو مکھی پیدا نہیں کر سکتے۔

○ انہوں نے اللہ کی کوئی قدر نہ پہچانی۔ حالانکہ وہ اللہ کے آثار قدرت دیکھتے ہیں' اس کی عجیب و غریب مخلوق کی طرف دیکھتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ ایسے الہوں کو شریک کرتے ہیں جو مکھی کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔

○ انہوں نے اللہ کی قدر نہیں پہچانی کہ وہ مدد طلب کرتے ہیں تو ان سے جن میں مدد دینے کی قوت ہی نہیں ہے بلکہ اگر ان سے مکھی کوئی چیز لے کر بھاگے تو وہ اسے بھی نہیں چھڑا سکتے۔

یہ ایسے حالات میں ایک سخت تنبیہ ہے کہ جہاں سامع خشوع و خضوع کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ لوہا گرم ہے اور ضرب لگا دی گئی ہے۔ ایسے حالات میں خدا کے اختیارات کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ اللہ ملائکہ میں سے پیغام لانے والے مقرر کرتا ہے اور انسانوں سے پیغام دینے والے مقرر کرتا ہے۔ اور یہ انتخاب اپنے علم اور قدرت کی وجہ سے کرتا ہے۔

اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ

بَصِيْرٌ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ (اپنے فرامین کی ترسیل کے لیے) ملائکہ میں سے بھی پیغام رساں منتخب کرتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔ وہ سمیع اور بصیر ہے' جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے اور سارے معاملات اسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں"۔

ملائکہ اور رسولوں کو جو اختیارات دیئے گئے ہیں وہ صاحب قوت بادشاہ کے دربار سے ملے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس عزیز و جبار کے نمائندے ہیں۔ ان کے پاس بادشاہ کے اختیارات ہیں۔ ان کے مقابلے میں ان لوگوں کی کیا حیثیت ہے جو ان بیچارہ بتوں کے آگے جھکتے ہیں۔ اللہ تو سمیع و بصیر ہے' سنتا ہے اور دیکھتا ہے۔ جو لوگوں کے سامنے ہو وہ بھی جو ان کے پیچھے ہو' یا ان سے خفیہ ہو اس کو بھی۔ اس کا علم کامل و شامل ہے۔ اس سے کوئی قریب و بعید کی چیز غائب نہیں ہو سکتی۔ تمام باتوں اور مقدموں کا رجوع اور آخری فیصلے کا اختیار اللہ ہی کا ہے۔

ہر قوم کے مناسک ہوتے ہیں اور مشرکین کے یہ مناسک ہیں جو مکھی سے بھی فروتر ہیں اور ان کی بندگی کی رسمیں کس قدر پوچ ہیں۔ امت مسلمہ کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ تم تو ایک اعلیٰ اور برتر پیغام کے حامل ہو' اس پیغام کو اور اس دعوت کو غالب کرنے کے لیے عبادات کرو اور جہاد کرو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَ
افْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَ جَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ
وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ
مِنْ قَبْلُ وَ فِىْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ
ع فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ۝

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' رکوع اور سجدہ کرو' اپنے رب کی بندگی کرو' اور نیک کام کرو' اسی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ تم کو فلاح نصیب ہو' اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام "مسلم" رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے) تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔ پس نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔ وہ ہے تمہارا مولیٰ' بہت ہی اچھا ہے وہ مولیٰ اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار"۔

ان دو آیات میں ایک پورا منہاج امت مسلمہ کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ وہ فرائض اور تقاضے بھی رکھ دیئے جو اس منہاج اور نظام کے ساتھ لازمی شرط کے طور پر لگے ہوئے ہیں۔ اس کی اہمیت کیا ہے؟ اور ماضی اور حال میں اس کی

جڑیں کہاں تک پھیلتی ہیں' جب اس منہاج اور نظام کو اللہ کی خواہش کے مطابق قائم کر دیا گیا' یہ منہاج کیا ہے؟

○ اہل ایمان کو سب سے پہلے رکوع و سجود کا حکم دیا جاتا ہے۔ رکوع و سجود اسلام کے ممتاز بنیادی ارکان ہیں۔ قرآن کریم نماز کی تعبیر اکثر رکوع و سجود سے کرتا ہے کیونکہ یہ نماز کے اہم اجزاء اور نماز کا منظر پیش کرتے وقت ظاہری افعال ہیں جن کا تعلق منظر کشی سے ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کا اسلوب اظہار مناظر کی شکل میں ہے جو ایک دلنشیں انداز ہے۔ شعور پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔

○ ممتاز ترین عبادت کے ممتاز ترین ارکان کے بعد ایک عام حکم جو پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ بندگی جو نماز سے زیادہ جامع ہے۔ کیونکہ عبادت میں فرائض بھی شامل ہیں اور ہر وہ عمل بھی شامل ہے جس کے بارے میں اللہ کا کوئی حکم ہے اور اللہ کی رضامندی کے لیے اس کی تعمیل ہو۔ اسی طرح انسانی زندگی کی تمام حرکات کو عبادت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے اگر یہ حرکات اللہ کی رضامندی کی نیت سے کی جائیں یہاں تک کہ زندگی کے وہ امور جن کا تعلق لذت سے ہے وہ بھی عبادت بن سکتے ہیں اگر ان پر اللہ کا ذکر کیا جائے' اللہ کا شکر ادا کیا جائے۔ اور یہ نیت کی جائے کہ یہ نعمتیں استعمال کر کے ہم مزید عبادت اور جہاد کریں گے۔ محض نیت سے ہر چیز عبادت بن سکتی ہے اور محض نیت سے خالص عبادت مکمل بن سکتی ہے۔

○ یہ کہ اسلام خیر ہی خیر ہے' تمام اچھائی کے کام اسلامی نظام زندگی ہے۔ نماز' بندگی اور خیر خلاصہ ہے اسلامی نظام کا۔

اب اس اسلام کو عملی دنیا میں نافذ کرنا ہے اور اس میں تم کامیاب اس طرح ہو سکتے ہو کہ خیر کے کام کرو۔ اللہ کی بندگی اور عبادت سے تمہارا تعلق باللہ مضبوط ہو گا اور اچھے کام کرنے سے تمہاری عملی زندگی درست ہو گی۔ اس سے تمہاری اجتماعی زندگی کا رخ ایمان کی راہ پر پڑ جائے گا۔ جب امت کی تربیت یوں ہو گی کہ اس کا تعلق باللہ عبادت کے ذریعہ پختہ ہو گیا۔ اس کی عملی زندگی اللہ کی اطاعت اور عمل خیر کے ذریعے استوار ہو گئی تو تب امت یا امت میں سے کوئی جماعت اس ذمہ داری کے سرانجام دینے کے لیے تیار ہو گی جو اسلامی نظام کے قیام کا واحد طریقہ ہے اور وہ کیا ہے؟

وَ جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (۲۲ : ۷۸) "اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے"۔ یہ نہایت ہی جامع تعبیر ہے' جہاد کا حق ادا کرو' اس سے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ ذمہ داری بہت ہی بڑی ہے۔ اس کے لیے بہت بڑی تیاری کی ضرورت ہے اور اس کے بہت بڑے تقاضے ہیں۔ اللہ کے راستے میں جہاد کرو جس طرح جہاد کرنے کا حق ہے' اللہ کے دشمنوں سے جہاد کرو خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرو' شر و فساد اور ہر برائی کے خلاف جہاد کرو۔ اللہ کی راہ میں جہاد کا حق ادا کرو' تمہیں تو تیار ہی جہاد کے لیے' اس عظیم ڈیوٹی کے لیے کیا گیا ہے۔ تمام انسانوں میں سے تمہارا انتخاب ہوا ہے۔

هُوَ اجْتَبٰىكُمْ (۲۲ : ۷۸) "اس نے تمہیں چنا ہے"۔ پھر اللہ نے جو تمہیں چن لیا ہے تو تمہاری ذمہ داری دوسروں کے مقابلے میں بڑھ گئی ہے۔ اب اتعلی اور فرار کی تو کوئی راہ باقی نہیں رہی۔ یہ تو اس امت اور جماعت کے لیے اللہ کی طرف سے اکرام ہے اور چاہئے کہ ہم اللہ کا شکر ادا کریں اور اس کام کو اچھی طرح انجام دیں۔

پھر اللہ کی رحمت بھی اس کے ساتھ شامل ہے۔ کام بھی آسان ہے۔

وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (۲۲ : ۷۸) "دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی گئی" ۔ یہ دین اور اس کے فرائض اس کی عبادات' اس کے قوانین اور اس کے اخلاق میں انسانی فطرت کو مدنظر رکھا گیا ہے اور انسان کی فطری قوتوں کو تعمیری کاموں میں لگایا گیا ہے ۔ ان کو اس طرح بند نہیں کیا گیا جس طرح گیس کو بند کیا جاتا ہے اور نہ ان قوتوں کو حیوانات کی طرح آزاد چھوڑا گیا ہے ۔ پھر یہ دین ایک ایسا منہاج ہے کہ اس کی جڑیں ماضی کی تاریخ میں بھی دور تک موجود ہیں ۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ (۲۲ : ۷۸) "قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر" ۔

یہ دین تو توحید کا سرچشمہ ہے اور اس کا سرا حضرت ابراہیم سے ملتا ہے ۔ لہذا ایسا نہیں ہے کہ اس کی جڑیں زمین پر نہ ہوں اور اس کی تاریخ کے اندر بھی کوئی بڑا خلا (GAP) نہیں ہے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کی رسالتوں میں تھا ۔ اور نام بھی اس کا تاریخی ہے کہ حضرت ابراہیم نے تمہیں مسلمان کا نام دیا ہے اور اس ملت کا نام ملت اسلامیہ رکھا ہے ۔

اسلام کا مفہوم ہی یہ ہے کہ چہرے' نیت اور اعمال سب کو خدا کی طرف موڑ دو ۔ لہذا امت مسلمہ کا روز اول سے ایک ہی نظریہ' ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی قبلہ ہے ۔ حضرت ابراہیم سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تک ایک ہی سلسلہ' ایک ہی نظام اور ایک ہی پیغام ہے ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو سب سے آخر میں یہ امانت دی گئی اور حکم دیا گیا کہ یہ پیغام تمام انسانیت تک پہنچانا ہے ۔

لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (۲۲ : ۷۸) "تا کہ رسولؐ تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو" ۔ تو رسولؐ امت پر گواہ ہے یعنی وہ اس کے لیے نظام وضع کرے گا' صحیح و غلط اور نیک و بد کی تمیز سکھائے گا' اور یہی فریضہ یہ امت دوسرے لوگوں کے حوالے سے ادا کرے گی ۔ یہ امت گویا پوری انسانیت کی نگران ہے ۔ اس امت کی شرعی قدریں اس کا تقاضا کرتی ہیں کہ اس کی تربیت اور اس کی سوچ بھی اس لائن پر ہے ۔ یہ امت' امت مسلمہ نہ ہوگی اگر وہ تمام انسانیت کی نگرانی نہ کرے اور اپنا اصلی فریضہ نہ ادا کرے ۔

امت مسلمہ نے جب تک اسلامی نظام زندگی کو اپنے ہاں اپنی زندگیوں میں نافذ کیے رکھا' وہ پوری دنیا کی نگران رہی ۔ جب اس امت نے شریعت کے نظام سے انحراف کیا اور اپنے فرائض ادا کرنے ترک کر دیئے تو اللہ تعالیٰ نے اسے مقام قیادت سے ہٹا کر دوسروں کا دم چھلا بنا دیا اور اب وہ ہمیشہ ایسے ہی رہے گی جب تک وہ اسلامی نظام کی حامل نہیں ہوتی ۔

یہ فریضہ وہ تب تک ادا نہیں کر سکتی جب تک اس کے لیے تیاری نہ کرے اور تیاری کا نسخہ اللہ بتاتے ہیں ۔ یہ کہ نماز پڑھو' یہ کہ زکوٰۃ دو اور یہ کہ اللہ پر مکمل بھروسہ کرو ۔

فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ (۲۲ : ۷۸) "پس نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ ۔ وہ ہے تمہارا مولیٰ' بہت ہی اچھا ہے

سو وہ مولیٰ اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار"۔

○ نماز ایک فانی اور کمزور انسان کا رابطہ اس ذات کے ساتھ استوار کرتی ہے جو قوی ہے اور مقتدر قوت ہے۔

○ زکوٰۃ امت مسلمہ اور جماعت مسلمہ کے افراد کے درمیان صلہ رحمی کا قیام ہے۔ حاجات اور ضروریات میں افراد جماعت کی کفالت کا انتظام ہے تاکہ فساد پیدا نہ ہو۔

○ اور اللہ پر بھروسہ وہ مضبوط رسی ہے جس کو کبھی ہاتھ نہ چھوڑنا چاہئے۔

یہ ہیں وہ سامان جنگ جن کے ذریعہ یہ امت وہ فریضہ شہادت علی الناس ادا کر سکتی ہے۔ جس کے لیے اسے اٹھایا گیا تھا اور ان اخلاقی اسلحہ کے علاوہ امت کے لیے عمومی ہدایت ہے کہ وہ حد استطاعت تک روایتی زمینی اسلحہ بھی جمع کر سکتی ہے۔ قرآن اس سے غافل نہیں رہا ہے۔ لیکن یہاں اللہ تعالیٰ اس قوت' اس فوجی تربیت اور اس سازوسامان کے جمع کرنے پر زور دیتا ہے جو امت مسلمہ کا واحد اسلحہ ہے اور کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ یعنی اللہ کے ساتھ رابطہ' صلاح اور اصلاح اور نظر بلند اور سربلندی۔

اسلامی نظام کے پیش نظر اصل مقصد یہ ہے کہ انسانیت کو اس کمال تک پہنچایا جائے جو اس زمین میں حاصل کرنا ممکن ہو۔ اسلام یہاں محض جانوروں کی طرح حیوانی ترقی پر زور نہیں دیتا بلکہ روحانی ترقی پر بھی زور دیتا ہے۔

انسانیت کی بلند اقدار انسان کی مادی ضروریات کو بھی پیش نظر رکھتی ہیں لیکن وہ اپنی سرگرمیوں کو صرف مادی ضروریات تک محدود نہیں رکھتیں اور یہی اسلام کا مطالبہ ہے امت مسلمہ سے' کہ دنیا کی قیادت اسلام کے جامع نظام کی روشنی میں کی جائے۔ صدق اللہ العظیم

--- ○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- چہارم

## پارہ ------ ۱۸

### سورۃ المؤمنون - ۲۳

۱--- تا--- ۱۱۸

### سورۃ النور - ۲۴

۱--- تا--- ۶۴

### سورۃ الفرقان - ۲۵

۱--- تا--- ۲۰

# سورۃ المومنون ایک نظر میں

یہ سورہ المومنون ہے' اس کا نام ہی اس کے موضوع اور مضمون کو متعین کر دیتا ہے ۔ مضمون کا آغاز ہی مومنین کی صفات سے ہوتا ہے اور اس کے بعد نفس انسانی سے اور اس کائنات کی وسعتوں سے دلائل ایمان دیئے جاتے ہیں ۔ ایمان کی حقیقت بیان کی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء اسی ایمان کی طرف دعوت دیتے چلے آئے ہیں ۔ بتایا گیا ہے کہ تمام انبیاء کی اقوام کے لوگوں نے اس ایمان کی بابت کیا کیا شبہات بیان کیے' کیا کیا اعتراضات کیے' اس دعوت ایمانی کی راہ کس کس طرح روکتے رہے اور انھوں نے کن وجوہات کی بنا پر رسولوں کی تکذیب کی' رسولوں نے کس طرح اللہ تعالیٰ سے نصرت طلب کی اور اللہ ہمیشہ کس طرح مومنین کو نجات دیتا رہا اور مکذبین کو ہلاک کرتا رہا۔ نیز یہ بھی بیان ہوا ہے کہ جب بھی رسول آئے' انھوں نے لوگوں کے دلوں میں ایمان بٹھایا اور تمام رسولوں نے اسی ایک حقیقت کی طرف دعوت دی لیکن جب رسول اس دنیا سے اٹھ گیا تو اس کے بعد لوگوں نے اپنے ایمان کے اندر اختلافات شروع کر دیئے ۔ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت جو موقف اختیار کیا وہ بعینہ وہی ہے جو تمام قوموں نے اپنے رسولوں کے خلاف اختیار کیا۔ یہ موقف نہایت ہی مکروہ موقف ہے اور اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ آخر میں مناظر قیامت میں سے ایک منظر پیش کیا جاتا ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انبیاء کی تکذیب کا انجام کیا ہوتا ہے ۔ یوں کفار کو ملامت کی جاتی ہے کہ ان کا یہ موقف مکروہ اور مشکوک ہے اور اس کا انجام اچھا نہ ہو گا۔ آخر میں اس بات کی توثیق کی جاتی ہے اور اہل اسلام کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی رحمت اور مغفرت کے طلبگار ہوں۔ غرض سورہ المومنون میں' ایمان کے مسائل' ایمان کے دلائل اور ایمان کی صفات بیان کی گئی ہیں اور یہی اس سورہ کا موضوع ہے اور اسی وجہ سے اسے یہ نام دیا گیا ہے ۔

اس سورہ کے بھی کئی دائرے ہیں ۔ پہلا دائرہ یوں شروع ہوتا ہے کہ اہل ایمان یقیناً فلاح پائیں گے ۔ اس کے بعد مومنین کی صفات کا بیان شروع ہوتا ہے جن کی کامیابی کا اعلان یہاں کیا جا رہا ہے ۔ اس کے بعد بیان کا یہ سلسلہ انفس اور آفاق میں پائے جانے والے دلائل ایمان کے موضوع میں داخل ہو جاتا ہے' چنانچہ سب سے پہلے تخلیق انسان کے عمل میں جنین کے مختلف حالات غور کے لیے پیش کیے جاتے ہیں' اور پوری انسانی زندگی کا آغاز اور اس کا انجام مجملاً زیر بحث لایا جاتا ہے ۔ زندگی کے دوسرے مراحل کے مقابلے میں جنین کے مختلف مراحل کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور آخر میں انسانی زندگی کا یہ سلسلہ یوم آخرت کی طرف چلا جاتا ہے کہ اسی طرح آخرت میں دوبارہ تمہاری تخلیق ہو گی ۔

اس کے بعد بیان کا رخ آفاقی دلائل کی طرف پھر جاتا ہے کہ ذرا آسمانوں کی تخلیق پر غور کرو' آسمانوں سے پانی برسنے کے نظام پر غور کرو' پھر ان پانیوں سے مختلف قسم کی زرعی پیداوار اور پھلوں کی پیداوار پر غور کرو' پھر مختلف قسم کے جانوروں پر غور کرو' اور خصوصاً ان جانوروں پر غور کرو جن کو تم سواری کے لیے استعمال کرتے ہو اور کشتیوں پر غور کرو

جن میں تم بحری سفر کرتے ہو۔

دوسرے دور میں انفس اور آفاق میں دلائل ایمان سے روئے سخن حقیقت ایمان کی طرف پھر جاتا ہے کہ وہ حقیقت کیا ہے جس کی طرف تمام انبیاء بلا استثناء دعوت دیتے چلے آئے ہیں وہ یہ ہے۔

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ "اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارے لیے کوئی اور حاکم نہیں ہے"۔ یہی کلمہ اور یہی دعوت حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کے سامنے پیش کی۔ آپ کے بعد آنے والے تمام رسولوں نے بھی یہ دعوت اپنی اپنی اقوام کے سامنے پیش کی۔ اور یہی دعوت آخر کار خاتم النبین نے پیش کی اور اس دعوت پر تمام زمانوں میں تکذیب کرنے والوں نے یہی ایک اعتراض کیا۔

مَا هٰذَا اِلَّا رَجُلٌ مِّنْكُمْ "یہ کچھ بھی نہیں ہے مگر تم ہی میں سے ایک شخص"۔ اور یہ اعتراض کہ

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً (۲۳:۲۴) "اگر اللہ چاہتا تو وہ اپنے فرشتے نازل کر دیتا"۔ اور پھر تمام لوگوں کا اعتراض یہ تھا۔

اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ (۲۳:۳۵) "یہ تمہیں اطلاع دیتا ہے کہ جب تم مر کر مٹی ہو جاؤ گے اور ہڈیوں کا پنجر رہ جاؤ گے' اس وقت تم نکالے جاؤ گے"۔ تمام رسولوں نے آخر کار اللہ کی بارگاہ میں پناہ لی اور اللہ کی نصرت طلب کی۔ اللہ نے ہمیشہ رسولوں کی دعا کو قبول کیا اور مکذبین کو ہلاک کر دیا۔ یہ دور رسولوں کی پکار پر اس ربانی ہدایت پر ختم ہوتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (۵۱)

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (۲۳:۵۲) "اے پیغمبرو' کھاؤ پاک چیزیں اور عمل کرو صالح' تم جو کچھ بھی کرتے ہو' میں اسے خوب جانتا ہوں اور یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے' اور میں تمہارا رب ہوں' پس مجھ ہی سے ڈرو"۔

تیسرے دور میں یہ کہا گیا ہے کہ رسولوں کے بعد پھر لوگوں کے اندر کس طرح تفریق پیدا ہو گئی اور کس طرح فرقہ واریت اور تنازعات پیدا ہو گئے۔ حالانکہ امت ایک تھی اور ایمان کی حقیقت بھی ایک تھی۔

فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۲۳:۵۳) "مگر بعد میں لوگوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے"۔ وہ اپنی غفلت میں مگن ہیں۔ اللہ نے اہل ثروت کو جو انعامات دیئے وہ ان میں مگن ہیں اور کفار دنیا کے سازوسامان میں مگن ہیں۔ ان کے مقابلے میں جن لوگوں کو دولت ایمان دی گئی ہے وہ اپنے رب کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔ وہ اللہ کی بندگی

کرتے اور اللہ کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہیں کرتے۔ ہروقت وہ خوف خدا اور خشیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ (۲۳ : ۶۰) "اور ان کے دل اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے"۔ یہاں اللہ تعالیٰ ان غافلوں، مغروروں اور منکرین کا اس وقت کا منظر پیش کرتا ہے جب ان کو اللہ کی پکڑ آلیتی ہے اور وہ فریاد کرنے لگتے ہیں۔ اس منظر میں ان کو دکھاتے ہوئے سخت تنبیہ اور توبیخ کی جاتی ہے۔

قَدْ كَانَتْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ تَنكِصُونَ (۶۶) مُسْتَكْبِرِينَ بِهِ سَامِرًا تَهْجُرُونَ (۲۳ : ۶۷) "میری آیات سنائی جاتی تھیں تو تم الٹے پاؤں بھاگ نکلتے تھے، اپنے گھمنڈ میں اس کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے۔ اپنی چوپالوں میں اس پر باتیں چھانٹتے تھے اور بکواس کیا کرتے تھے۔ رسول امین کے بارے میں ان لوگوں نے جو موقف اختیار کیا ہوا تھا اس پر سخت گرفت کی جاتی ہے۔ حالانکہ رسول امین ان کے لیے کوئی نئی شخصیت نہ تھے، وہ انہیں اچھی طرح جانتے تھے۔ آپ تو ان کے پاس ایک سچی دعوت لے کر آئے تھے، پھر آپ اس پر ان سے کوئی اجر بھی نہ طلب فرماتے تھے تو ان لوگوں کو آپ کی دعوت میں سے کس چیز پر اعتراض تھا؟ وہ تسلیم کرتے تھے کہ زمین و آسمانوں کا مالک صرف اللہ ہے، وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ صرف اللہ ہی رب ہے زمین و آسمانوں کا خالق ہے اور صرف اللہ ہی ہے جس نے اس پوری کائنات کو تھام رکھا ہے۔ ان امور کو تسلیم کرنے کے بعد وہ جس چیز کا انکار کرتے تھے وہ یہ تھی کہ مرنے کے بعد دوبارہ کس طرح ہم زندہ ہوسکتے ہیں، نیز وہ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ اللہ کی اولاد ہے اور اس کے سوابھی وہ اللہ کے ساتھ دوسرے الہوں کو شریک ٹھہراتے تھے۔

فَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ (۲۳ : ۹۲) "اللہ بلند ہے ان الہوں سے، جن کو وہ اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں"۔ آخری دور میں ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر روئے سخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے اور یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ برائی کو اس طریقے سے دفع کریں جو بہترین ہو اور شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ مانگیں۔ غصہ نہ کریں اور نہ اپنے آپ کو پریشان کریں۔ وہ لوگ جو کچھ بکتے ہیں بکتے رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قیامت کے ایک منظر کی جھلک دکھا دی جاتی ہے جس میں ان کے لیے ایک خوفناک عذاب انتظار میں ہے، جہاں ان کے ساتھ نہایت ہی توہین آمیز سلوک ہوگا اور ان کی سخت سرزنش کی جائے گی۔ یہ سبق اللہ کی پاکی کے بیان پر ختم ہوتا ہے۔

فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ (۲۳ : ۱۱۶) "پس بالا تر ہے اللہ بادشاہ حقیقی، کوئی حاکم اس کے سوا نہیں ہے وہ مالک ہے عرش بزرگ کا"۔ سورہ کے آخر میں اس بات کی نفی کر دی جاتی ہے کہ کفار کو کوئی کامیابی ہوگی جس طرح اس سورہ کے آغاز میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ اہل ایمان کو کامیابی ہو گی۔

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ (۲۳:۱۱۷) "اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود پکارے گا جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ ایسے کافر کبھی فلاح نہیں پا سکتے"۔ اور یہ حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کی طرف متوجہ ہو کر اس کی رحمت اور مغفرت کی طلب کرو۔

وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ (۲۳:۱۱۸) "اور اے نبی کہو میرے رب درگزر فرما اور رحم کر تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے"۔ سورہ کا انداز بیان اور اس کی فضا ایسی ہے کہ اس میں فکر و ضمیر کو بیدار کیا جاتا ہے' وجدانی طرز استدلال کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور حقائق کو فیصلہ کن تقریری اور قرارداد کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ پوری سورہ پر ایمان کی فضا چھائی ہوئی ہے کیونکہ ایمان ہی سورہ کا اہم موضوع ہے۔ آغاز سورہ میں مومنین کی یہ صفت آتی ہے۔

الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ (۲۳:۲) "وہ لوگ جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں"۔ سورہ کے درمیان میں مومنین کی یہ صفت بیان ہوئی ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ (۲۳:۶۰)
"وہ لوگ جو دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل ان کے اس خیال سے کانپتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے"۔ اور وجدانی لچ یوں دیا جاتا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ

(۲۳:۷۸) "وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں سننے اور دیکھنے کی قوتیں دیں اور سوچنے کو دل دیئے مگر تم کم ہی شکر گزار ہوتے ہو"۔ غرض یہ تمام سورہ ایک لطیف ایمان کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۴۸ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۲۲

سُورَةُ الْمُؤْمِنُونَ (۲۳) مَكِّيَّةٌ (۷۴)
آیاتها ۱۱۸　　رکوعاتها ۶
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۱﴾ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ﴿۲﴾ وَالَّذِينَ
هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ﴿۳﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ﴿۴﴾ وَالَّذِينَ هُمْ
لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ﴿۵﴾ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ
غَيْرُ مَلُومِينَ ﴿۶﴾ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ﴿۷﴾ وَالَّذِينَ
هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ﴿۸﴾ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿۹﴾
أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ﴿۱۰﴾ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۱۱﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں' لغویات سے دور رہتے ہیں' زکوۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں' اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کی ملک یمین میں ہوں کہ ان پر محفوظ نہ رکھنے میں وہ قابل ملامت نہیں ہیں البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں' اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں' اور اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔ یہی

لوگ وہ وارث ہیں جو میراث میں فردوس پائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

یہ ایک پختہ وعدہ ہے بلکہ یہ عالم بالا کی ایک دو ٹوک قرار داد ہے کہ مومنین لازماً فلاح پائیں گے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ تو کبھی اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ پھر یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اللہ کے فیصلے کو کوئی رد نہیں کر سکتا کہ مومنین دنیا میں بھی فلاح پائیں گے اور آخرت میں بھی فلاح پائیں گے۔ ایک مومن انفرادی طور پر فلاح پائے گا اور اہل ایمان کی جماعت بھی فلاح پائے گی۔ ایسی کامیابی جسے ایک مومن اپنے دل اور اپنی حقیقی زندگی میں محسوس کرتے ہوں اور اس کے اندر فلاح کے وہ تمام مفہوم پائے جاتے ہوں جن سے دنیا باخبر ہے اور وہ مفاہیم بھی پائے جاتے ہوں جن سے اہل ایمان باخبر بھی نہ ہوں اور اللہ نے مستقبل میں ان کے لیے اس کا فیصلہ کر رکھا ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ مومنین کون ہیں جن کے ساتھ اللہ نے اس قدر پختہ وعدہ کر لیا ہے اور پیشگی ان کی فلاح اور کامیابی کا اعلان کر دیا ہے۔

یہ کون لوگ ہیں جن کے لیے بھلائی' نصرت' سعادت' توفیق اور دنیا کا سازوسامان لکھ دیا گیا ہے' اور جن کے لیے آخرت کا اجر' کامیابی اور نجات لکھ دی گئی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے رب نے ان سے راضی ہونے کا اعلان کر دیا ہے اور ان کے لیے اللہ نے اس جہان اور اس جہاں کی فلاح لکھ دی ہے اور وہ کچھ لکھ دیا ہے جس کے بارے میں انسانوں کو علم ہی نہیں ہے۔

یہ کون لوگ ہیں جو جنت کے وارث ہونے والے ہیں اور جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ لوگ وہ ہیں جن کے بارے میں سیاق کلام یہ تفصیلات دیتا ہے۔

- جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔
- جو لغویات سے دور رہتے ہیں۔
- جو زکوٰۃ کے طریقے پر عامل رہتے ہیں۔
- جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے' اور ان عورتوں کے جو ان کے ملک یمین میں ہوں۔
- جو اپنی امانتوں اور عہد وپیمان کا پاس رکھتے ہیں۔
- جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان صفات کی قدر و قیمت کیا ہے؟

یہ صفات ایک مسلمان کی شخصیت کے مختلف رنگ ہیں۔ ان کے ساتھ ایک مسلم انسانیت کے افق پر تمام انسانوں کے مقابلے میں بلند نظر آتا ہے۔ وہ افق جس کا معیار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمایا ہے 'کیونکہ آپ تمام مخلوقات سے برتر اخلاق کے مالک تھے۔ آپ کی تربیت اللہ نے فرمائی تھی اور بہترین تربیت فرمائی تھی اور اس امر کی شہادت اپنی کتاب میں دی۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ "اے محمدؐ آپ خلق عظیم کے مالک ہیں"۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

جب آپ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن "آپ کا اخلاق قرآن تھا"۔اور اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے سورہ المومنون کی یہ (۱۱) آیات تلاوت فرمائیں اور فرمایا ایسے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ (۲۳ : ۲) "وہ جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں"۔ جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو ان کے دلوں میں یہ خوف بیٹھا ہوتا ہے کہ وہ رب ذوالجلال کے سامنے کھڑے ہیں' نہایت سکون اور نہایت ہی دھیمے پن کے ساتھ۔ان کی حرکات 'ان کے انداز قیام 'ان کے انداز سجود سے خوف خدا اور خشوع عیاں ہوتا ہے ان کی روح اللہ کی عظمت اور جلال سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔اس لیے ان کے ذہن سے تمام دوسرے مشاغل غائب ہو جاتے ہیں اور اللہ کے ہاں حضوری کے سوا تمام تصورات اوجھل ہو جاتے ہیں۔ان کے پردۂ احساس سے ان کا پورا ماحول اور ان کے تمام دوسرے حالات اور تعلقات ان کے جسم و خیال سے محو ہو جاتے ہیں۔وہ صرف اللہ کا احساس رکھتے ہیں اور صرف ذات باری کی معرفت کو محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔ان لوگوں کا وجدان تمام کثافتوں سے پاک ہو جاتا ہے۔وہ تمام دنیاوی روابط کو کچھ دیر کے لیے جھٹک دیتے ہیں۔غرض نماز کے وقت اللہ کے جلال کے سوا ان کی نظروں میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔یوں یہ حقیر ذرہ اپنے حقیقی مصدر سے مل جاتا ہے۔ایک حیران روح کو طاقت پرواز مل جاتی ہے۔ایک پریشان دل کو جائے قرار مل جاتی ہے۔اس مقام پر تمام چیزیں' تمام دنیاوی قدریں اور تمام افراد و اشخاص نظروں سے گر جاتے ہیں اور ان چیزوں کا وہی پہلو نظروں میں ہوتا ہے جس کا تعلق اللہ سے ہو۔

وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (۲۳ : ۳) "جو لغویات سے دور رہتے ہیں"۔ایسی باتوں سے دور رہتے ہیں جو لغو ہوں۔ایسے افعال سے دور رہتے ہیں جو لغو ہوں'ایسی ترجیحات سے دور رہتے ہوں جو لغو ہوں' ایسے خیالات سے دور رہتے ہیں جو لغو ہوں۔ایک مومن کے دل میں وہ چیز ہوتی ہے جو اسے لہو و لعب اور لغو باتوں سے دور رکھتی ہے۔یعنی وہ ذکر الٰہی میں مشغول رہتا ہے۔اللہ کی جلالت قدر کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔وہ نفس انسانی اور آفاق کائنات میں موجود آیات الٰہیہ کے تدبر میں مصروف رہتا ہے۔اس کائنات کے مناظر میں سے ہر منظر اس کے دماغ کو مصروف رکھے ہوئے ہوتا ہے۔اس کی فکر ہر وقت ان مناظر میں غور کرتی رہتی ہے اور اس کا وجدان ہر وقت متحرک رہتا ہے۔ ہر وقت اپنے قلب و نظر کی تطہیر میں لگا رہتا ہے'تزکیہ نفس کرتا رہتا ہے اور ضمیر کو پاک کرتا رہتا ہے۔نیز ایک مومن نے اپنے طرز عمل میں جو تبدیلی لانی ہوتی ہے وہ رات اور دن اسی میں مصروف رہتا ہے۔پھر ایمان کی راہ میں اسے جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ ان کے دور کرنے میں مصروف رہتا ہے۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض کی ادائیگی اسے کرنی ہوتی ہے۔پھر اس نے اپنی جماعت کی صف بندی بھی کرنی ہوتی ہے اور اسے فتنہ و فساد سے بچانا ہوتا ہے۔ایک مسلم کو جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ اسلامی سوسائٹی کی نصرت اور حمایت کرنی ہوتی ہے اور اسلامی سوسائٹی کے مخالفین اور معاندین سے اسے بچانا ہوتا ہے۔یہ وہ فرائض ہیں جو ایک مسلمان کے لیے ہر حال میں واجب الاداء ہیں۔یہ تمام کام فرض عین ہیں یا فرض کفایہ ہیں۔یہ وہ فرائض ہیں کہ اگر ان کو صحیح طرح سرانجام دیا جائے تو انسان کی پوری

زندگی کی تمام سعی وجہد کے لیے یہ کام کفایت کرتے ہیں کیونکہ انسان کی عمر محدود ہے اور اس کی طاقت بھی محدود ہے۔ اس طاقت کو کوئی شخص یا تو مذکورہ بالا کاموں میں صرف کر کے انسانی زندگی کی نشوونما' ترقی اور اصلاح میں کھپائے گا یا اس محدود قوت کو لہو ولعب میں اور فضولیات میں خرچ کرے گا۔ جبکہ اسلام کی جانب سے ایک مسلم کا یہ فریضہ ہے کہ اپنی قوتوں کو تعمیر و ترقی' نشوونما اور اصلاحی کاموں میں خرچ کرے گا۔ یاد رہے کہ یہ تمام فرائض اور شریعت کی تمام ہدایات کسی مسلمان کو وقتاً فوقتاً جائز تفریح سے نہیں روکتے۔ کیونکہ جائز تفریح اور لہو ولعب اور زندگی کو بالکل بے معنی بنانے کے درمیان بہت فرق ہے۔

وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (۲۳ : ۴) "وہ لوگ جو زکوۃ کے طریقے پر عمل پیرا رہتے ہیں"۔ اللہ کی طرف متوجہ ہونے اور لہو ولعب اور بے معنی زندگی سے دور ہونے کے بعد وہ زکوۃ پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ زکوۃ انسانی دل اور انسانی دولت دونوں کے لیے پاکیزگی کا باعث ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے انسان کا دل کنجوسی سے پاک ہوتا ہے اور انسان ذاتی مفاد کو قربان کر دیتا ہے اور شیطان کی اس وسوسہ اندازی کا بھی مقابلہ کرتا ہے کہ تم غریب ہو جاؤ گے نیز زکوۃ کی وجہ سے سوسائٹی کا یہ روگ بھی دور ہو جاتا ہے کہ اس میں کچھ لوگ تو مالدار ہوں اور کچھ ایسے ہوں جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ گویا یہ ایک لحاظ سے سوشل سیکورٹی کا ایک نظام ہے اور غریبوں کے لیے اجتماعی کفالت کا ذریعہ۔ اس کے ذریعے تمام لوگوں اور پوری سوسائٹی کے درمیان امن و اطمینان اور اتحاد و اتفاق کا سامان کیا جا سکتا ہے اور طبقاتی کشمکش کو دور کیا جا سکتا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (۲۳ : ۵) "وہ لوگ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں"۔ یہ روح کی پاکیزگی ہے' یہ ایک خاندان کی پاکیزگی ہے۔ اور پھر پوری سوسائٹی کی طہارت ہے۔ اس کے ذریعے ایک نفس' ایک خاندان اور ایک معاشرے کو گندگی سے بچانا مقصود ہے۔ انسان کی شرمگاہ کو غیر حلال اور ناجائز مباشرت سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ انسانی دل حرام کاری سے محفوظ رہتا ہے اور سوسائٹی سے جنسی بے راہ روی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ لوگوں کے خاندان اور ان کا نسب خراب ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جنسی تسکین کے لیے ایک سخت ضابطہ تجویز کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جن سوسائٹیوں میں آزاد شہوت رانی کا رواج ہوتا ہے ان کا نظام ڈھیلا پڑ جاتا ہے اور ایسی سوسائٹیاں فساد کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کسی بھی ایسی سوسائٹی میں خاندانی نظام میں خلل واقع ہو جاتا ہے اور خاندان کا کوئی احترام نہیں رہتا۔ جبکہ فیملی کسی بھی سوسائٹی کے لیے پہلی وحدت اور پہلا یونٹ ہوتی ہے کیونکہ یہ وہ نرسری ہوتی ہے۔ جس میں انسانی پود پروان چڑھتی ہے اور درجہ بدرجہ بڑھتی ہے۔ لہٰذا خاندان کے ماحول میں امن و سکون اور پاکیزگی کا دور دورہ ہونا ضروری ہے تاکہ یہ نرسری تدریج کے ساتھ نشوونما پائے اور والدین ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے نئی انسانی پود کی پرورش کریں۔ خصوصاً نہایت ہی چھوٹے بچوں کی پرورش اور خاندانی نظام کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔

پھر جس سوسائٹی کے اندر آزاد شہوت رانی بے حد و حساب اور بے روک ٹوک ہو وہ ایک گندی اور غلیظ سوسائٹی ہوتی ہے۔ اس کے افراد گرے ہوئے اور بے ہمت ہوتے ہیں کیونکہ وہ معیار جس میں انسانی ترقی میں کوئی غلطی نہیں ہوتی

یہ ہے کہ انسان کی قوت ارادی اس کے تمام امور اور تمام میلانات پر حاوی ہو۔ انسان کے تمام فطری تقاضے اس طرح منظم ہوں کہ وہ پاک و صاف ہوں اور اس سوسائٹی کے اندر انسانی پود کی جو نرسری تشکیل پائے وہ شرمندہ طریقوں کے مطابق نہ ہو۔ اور بچے اس دنیا میں ایسے پاک طریقے کے مطابق آئیں کہ ہر بچے کو اپنا باپ معلوم ہو۔ اور یہ نہ ہو کہ اس میں ایک مادہ حیوان کسی بھی نر حیوان سے نطفہ لے اور اس کے بعد پیدا ہونے والے حیوان کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کس طرح آیا ہے اور کون اسے لایا ہے۔

یہاں قرآن کریم متعین طور پر بتا دیتا ہے کہ انھوں نے اس نرسری کے لیے بیج کس طرح بونا ہے اور زندگی کی یہ تخم ریزی کہاں کرنی ہے۔

اِلَّا عَلٰۤی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَاِنَّھُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ (۲۳ : ۶) ”سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کے ملک یمین میں ہوں۔ جہاں تک بیویوں کا تعلق ہے اس کی تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ اس میں کوئی قیل و قال ہے۔ یہ تو ایک معروف اور قانونی نظام ہے لیکن ملک یمین کے مسئلے کی تشریح ضروری ہے۔ غلامی کے مسئلے پر ہم 'فی ظلال القرآن' کی جلد دوئم میں مفصل بحث کر آئے ہیں جس میں یہ کہا گیا تھا کہ جب اسلامی نظام آیا تو غلامی ایک عالمی نظام کے طور پر رائج تھی۔ اسی طرح جنگی قیدیوں کو غلام بنانا بھی ایک عالمی مسئلہ تھا۔ اسلام اور کفر کی کشمکش میں دشمنان اسلام اپنی پوری مادی قوت لے کر میدان میں اترے ہوئے تھے' اس لیے اسلام کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس نظام کو یکطرفہ طور پر ختم کر دے اور صورت حال یہ ہو جائے کہ مسلمان تو قیدی بن کر کفار کے غلام بن جائیں اور کفار قیدی ہو کر آئیں تو وہ اس قانون کی رو سے آزاد ہو جائیں۔ اسلامی نظام نے بامر مجبوری جنگی قیدیوں کی غلامی کا قانون تو بحال رکھا جبکہ غلامی کے دوسرے سرچشمے بند کر دیئے۔ اور یہ بھی اس وقت تک کہ قانون بین الاقوام میں غلامی کے خلاف کوئی قانون پاس نہیں ہو جاتا۔

چنانچہ اس قانون کے مطابق اسلامی کیمپ میں بعض قیدی عورتیں آ جاتی تھیں جو غلام ہوتی تھیں اور اس غلامی کی وجہ سے ان کا درجہ ایک آزاد منکوحہ عورت کے برابر نہیں ہوتا تھا لیکن اسلام نے ان کے ساتھ مباشرت کی اجازت صرف اس شخص کو دے دی جو ان کا مالک ہوتا۔ یہاں تک کہ ان کو ان طریقوں کے مطابق آزادی مل جائے جو اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لیے وضع کیے اور یہ طریقے متعدد تھے۔

اسلام نے ملک یمین میں مباشرت کی جو آزادی دی ہے' اس میں خود اسیر عورتوں کی فطری ضروریات کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے تاکہ یہ نہ ہو کہ یہ قیدی عورتیں اسلامی معاشرے میں آزاد شہوت رانی کرتی پھریں۔ جس طرح آج ہمارے دور میں جنگی قیدی عورتوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ خصوصاً اس دور کے بعد جبکہ جنگی قیدیوں کو غلام نہ بنانے کا بین الاقوامی معاہدہ ہو گیا۔ اسلام نے یہ قانون اس لیے جاری رکھا ہے کہ اسلام آزاد شہوت رانی اور جنسی بے راہ روی کے خلاف ہے۔ یہ ایک عارضی نظام تھا اور اس وقت تک کے لیے تھا جب تک اللہ کی طرف سے ان کی آزادی کا انتظام نہیں کر دیا جاتا۔ اور یہ غلام عورتیں آزادی کے مقام تک نہیں پہنچ جاتیں۔ اسلام نے ایسے قوانین بنائے کہ کوئی غلام عورت بہت سے ذرائع استعمال کر کے آزادی حاصل کر سکتی ہے۔ مثلاً اگر اس کے مالک سے اس کا لڑکا یا لڑکی پیدا ہو جائے اور یہ مالک فوت ہو جائے تو یہ غلام

عورت آزاد ہو جائے گی یا یہ مالک خود اسے آزاد کر دے یا کسی کفارہ میں وہ آزاد ہو جائے ۔ نیز مکاتبت کے ذریعے بھی غلام عورت آزاد ہو سکتی ہے ۔ مکاتبت وہ تحریری معاہدہ ہوتا ہے جس میں ایک غلام اپنی آزادی کے لیے اپنے مالک کے ساتھ معاہدہ کرتا ہے ۔ (مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمایئے میری کتاب شبہات حول الاسلام)

بہرحال غلامی ایک عارضی جنگی ضرورت تھی اور یہ اس طرح تھی کہ بین الاقوامی سطح پر جنگی قوانین مثل بالمثل ہوتے ہیں ۔ یعنی جس طرح دشمن قوم جنگی قیدیوں سے سلوک کرے گی' اسلام بھی ویسا ہی سلوک کرے گا ۔ غرض آزاد لوگوں کو غلام بنانا اسلامی نظام کا کوئی مستقل اصول نہ تھا کیونکہ یہ ایک بین الاقوامی ضرورت تھی ۔

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (۲۳ : ۷) "البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں" ۔ یعنی جو شخص اپنی منکوحہ بیویوں اور مملوکہ لونڈیوں کے علاوہ دوسرے کسی طریقے سے بھی شہوت رانی کرے گا وہ جائز دائرہ سے تجاوز کرنے والا ہو گا ۔ وہ حرام میں پڑ جائے گا ۔ تعدی یوں ہو گی کہ نکاح اور جماع کے بغیر وہ دوسرے طریقے سے شہوت رانی کر رہا ہے ۔ یوں اس کا ضمیر بھی اسے ملامت کرے گا کیونکہ وہ ایک ایسی چراگاہ میں چر رہا ہے جو اس کے لیے جائز نہیں ہے ۔ پھر اس حرام کاری کے نتیجے میں جو نرسری ہو گی وہ بھی شتر بے مہار ہو گی اور اس کی وجہ سے پوری سوسائٹی فساد کا شکار ہو جائے گی ۔ اس سوسائٹی کے بھیڑیے آزاد ہو جائیں گے اور جہاں سے چاہیں گے گوشت نوچ لیں گے ۔ یہ تمام ایسی صورتیں ہیں جنہیں اسلام ناپسند کرتا ہے ۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (۲۳ : ۸) "جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کا خیال رکھتے ہیں" ۔ یعنی انفرادی طور پر بھی وہ اپنے عہد و پیمان کے محافظ ہوتے ہیں اور اجتماعی طور پر بھی اور بین الاقوامی سطح پر بھی وہ عہد و پیمان کی حفاظت کرنے والے ہوتے ہیں ۔

امانتوں میں وہ تمام ذمہ داریاں آتی ہیں جو کسی فرد یا جماعت کے ذمہ لازم ہوتی ہیں ۔ پہلی امانت تو فطرت انسانی ہے ۔ فطرت انسانی کو اللہ نے نہایت ہی سیدھا بنایا ہے اور فطرت انسانی ناموس کائنات کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے ۔ اور یہ دونوں پھر اللہ کی وحدانیت اور اس کی تخلیق پر شاہد عادل ہیں کیونکہ اس پوری کائنات میں ایک ہی قانون قدرت کام کر رہا ہے جس میں خود ذات انسانی بھی شامل ہے اور یہ وحدت ناموس فطرت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک ہی ارادہ مدبرہ کام کر رہا ہے ۔ اہل ایمان کا یہ فریضہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ کائنات کی اس فطرت کو تبدیل نہ ہونے دیں ۔ کیونکہ یہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور ذات باری پر یہ شاہد عادل بھی ہے اور اس کے بعد پھر تمام دوسری امانتوں کا یہی حکم ہے ۔

عہد کی رعایت کا مطلب بھی یہ ہے کہ سب سے پہلے اس عہد کی رعایت کی جائے جو ازروئے فطرت انسان پر عائد ہے ۔ انسان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اللہ وحدہ کو ازروئے فطرت پہچانے کہ وہ موجود ہے اور واحد ہے ۔ پھر اس عہد کے بعد تمام عہد و پیمان آتے ہیں ۔ ان عقود کی رعایت اس لیے ضروری ہے کہ ایک مومن اپنے عہد پر اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہے ۔ اور ہر عہد کا وفا کرنا ایک شرعی فریضہ ہے ۔ اور اس کا تعلق تقویٰ اور عبادت سے ہے ۔

اسلامی سوسائٹی اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ ان امور کو سرانجام دے جو اس کی امانت عامہ کے دائرے میں آتے

ہیں' کیونکہ یہ اس کی جانب سے اللہ کے ساتھ عہد و پیمان ہے۔ اس امانت عامہ کے عہد کے نتیجے میں جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اسلامی سوسائٹی کے لیے ان کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اس آیت نے امانت اور عہد کو مجمل رکھا ہے تاکہ اس کے دائرے کے اندر تمام عہد وپیمان آ جائیں۔ صرف یہ کہا گیا ہے کہ اہل ایمان وہ ہوتے ہیں جو اپنے عہد و پیمان کی رعایت کرتے ہیں۔ گویا یہ اہل ایمان کی صفت دائمہ اور قائمہ ہے اور کسی بھی سوسائٹی کا نظم ونسق اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کے افراد امانتوں میں استقامت نہ اختیار کریں۔ اپنے عہد و پیمان کا خیال نہ رکھیں اور اس مشترکہ نظام زندگی پر اس سوسائٹی کے تمام افراد مطمئن نہ ہو جائیں تاکہ تمام لوگوں کو امن و اطمینان حاصل ہو اور وہ اعتماد سے زندگی بسر کریں۔

وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (۲۳:۹) "جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں"۔ وہ اپنی نماز ہرگز قضا نہیں کرتے' نہ وہ انہیں ضائع کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ اپنی نمازوں کی کیفیت میں کمی نہیں کرتے۔ وہ ان نمازوں کے فرائض' سنن اور مستحبات کو پوری طرح ادا کرتے ہیں۔ پورے ارکان اور آداب کے ساتھ نمازیں پڑھتے ہیں۔ ان کی نمازیں زندہ نمازیں ہوتی ہیں اور پوری توجہ سے وہ ان میں غرق ہوتے ہیں' ان کی روح اور ان کا وجدان نمازوں سے اچھا تاثر لیتا ہے۔ نماز دراصل بندے اور رب کے درمیان ایک رابطہ ہوتی ہے۔ جو شخص نماز کی حفاظت نہیں کرتا وہ درحقیقت اپنے اور اپنے رب کے درمیان اس رابطے کو کاٹ دیتا ہے۔ اور ایسا شخص پھر دوسرے بنی نوع انسان کے ساتھ بھی اچھے روابط نہیں رکھتا۔ بیان صفات اہل ایمان کا آغاز بھی نماز کے ذکر سے ہوا اور اختتام بھی نماز کے ذکر سے ہوا۔ مقصد یہ بتلانا ہے کہ اسلام اور ایمان کے بعد نماز سب سے اہم فریضہ ہے۔ یہاں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ نماز کو اپنی پوری صفات کے ساتھ ادا کیا جائے اور اس میں اپنی پوری توجہ اللہ کی طرف مبذول کر دی جائے کہ اسلام میں اول بھی نماز ہے اور آخر بھی نماز ہے۔

یہ ان اہل ایمان کی صفات ہیں جن کے لیے اللہ نے فلاح لکھ دی ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو یہ طے کرتی ہیں کہ اہل ایمان کی زندگی کے خدوخال کیا ہوتے ہیں اور اہل ایمان کو کیسی زندگی بسر کرنا چاہئے۔ یعنی ایسی زندگی جو ایک ایسے انسان کے ساتھ لائق ہے جسے پوری مخلوق پر کرامت اور شرف عطا کیا گیا ہے۔ اور جس کے بارے میں اللہ کی پسند یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو مزید ترقی دے اور محض حیوانات کی طرح زندگی بسر نہ کرے۔ نہ زندگی سے اس طرح لطف اندوز ہو جس طرح حیوانات ہوتے ہیں اور نہ اس طرح کھاتا پیتا ہو جس طرح حیوانات کھاتے پیتے ہیں۔

لیکن دنیا کی اس ہمہ گیر ترقی کے باوجود وہ ترقی اور کمال اس دنیا میں حاصل نہیں کیا جاسکتا جو اہل ایمان کے لائق ہے اس لیے اللہ نے انسان کو راہ ترقی پر مزید آگے بڑھاتے ہوئے' کمال اور ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج تک یعنی جنت الفردوس میں پہنچایا۔ ترقی و کمال کے ان اعلیٰ مدارج پر' پھر اہل ایمان ہمیشہ فائز رہیں گے۔ یہاں ان کے لیے کوئی خوف و خطر نہ ہو گا اور وہاں وہ بلا زوال قرار و سکون میں رہیں گے۔

أُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ (۱۰) الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

"یہی لوگ وہ وارث ہیں جو میراث میں فردوس پائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے" - یہ وہ آخری مطلوب ہے جو اہل ایمان کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس کے سوا ایک مومن کا کوئی نصب العین نہیں ہے اور نہ اس کے حصول کے بعد اس کا کوئی اور نصب العین رہتا ہے جس کی وہ آرزو کرے۔

--- ○○○---

اہل ایمان کی صفات میں سے ایک اہم صفت یہ ہے کہ وہ خود اپنے نفوس کے اندر پائے جانے والے دلائل ایمان پر غور کریں۔ سب سے پہلے وہ ذرا اپنے وجود اور اس کی نشوونما کی حقیقت پر غور کریں کہ اس کی شخصیت کا آغاز کس چھوٹے سے جرثومے سے ہوا اور پھر بعث بعد الموت اور آخرت کی زندگی کا حال کیا ہو گا۔ ان دونوں زندگیوں کی دنیادی اور اخروی کیفیت کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۚ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝

"ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا' پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا' پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی' پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا' پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں' پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا' پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ' سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔ پھر اس کے بعد تم کو ضرور مرنا ہے' پھر قیامت کے روز یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے"۔

یہ انداز تخلیق' یہ منظم انداز نشوونما اور اس کے اندر پایا جانے والا یہ تسلسل۔ سب سے پہلے تو یہ بتاتا ہے کہ اس پورے نظام کا ایک خالق ہے اور پھر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پورا عمل اس کے ارادۂ مدبرہ کے مطابق ہے۔ یہ نہایت ہی پیچیدہ عمل محض اتفاق سے یونہی نہیں ہو جاتا اور نہ یہ پورا عمل بغیر کسی ارادے اور تدبیر کے یونہی اتفاقاً ہوتا ہے۔ خصوصاً اس کا یہ پہلو کہ اس پورے نظام واقعات میں کبھی بھی یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔ انسان کا یہ نظام تخلیق عقلاً کئی دوسرے طریقوں سے ممکن ہے لیکن کبھی یہ طریق کار تبدیلی کو قبول نہیں کرتا۔ یہ پہلو خصوصاً اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ ایک مخصوص ارادہ ہے جو اس نظام کی پشت پر ہے۔

حیات انسانی کی یہ تدریجی نشوونما اپنے اس تسلسل کے ساتھ بظاہر ایک اعجوبہ ہے اور اسے صرف اس صورت میں حل کیا جا سکتا ہے کہ اس سورہ کے پہلے پیراگراف کے مطابق ایک انسان سیدھی طرح اللہ کی ذات پر ایمان لے آئے۔ بس یہی ایک طریقہ ہے جس سے اس تخلیق اور اس نشوونما کو اپنے کمال تک پہنچانے کا تصور دیا جا سکتا ہے۔ صرف ایمان باللہ ہی کی صورت میں دنیا و آخرت کی زندگی' بامعنی اور بامقصد ہو سکتی ہے۔ صفات مومنین کے بعد یہاں زندگی کی اس

عجیب نشوونما کے مدارج کو کیوں لایا گیا ہے؟

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (۲۳ : ۱۲) "ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا' پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا"۔ یہ آیت انسانی زندگی کی نشوونما کے انداز کو نہایت ہی تعین کے ساتھ بتاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان موجودہ انسانی شکل تک کئی مراحل طے کر کے پہنچا ہے۔ یوں وہ پہلے مٹی سے انسان تک پہنچا' کیچڑ گویا انسان کی تخلیق درجہ اول ہے۔ اور انسان اپنی موجودہ شکل میں اس عمل تخلیق کا فائنل مرحلہ ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی قرآن کریم صراحت کرتا ہے۔ ہم انسان کے اس عمل تخلیق کی تصدیق ان سائنسی مشاہدات سے کرنا نہیں چاہتے جنہوں نے اس عمل تخلیق کا بڑی باریکی سے مشاہدہ کیا ہے کہ انسانی زندگی کس طرح نشوونما پاتی ہے۔

قرآن کریم نے تخلیق انسان کے مدارج کو صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ انسان غور و فکر کرے کہ اللہ کا عمل تخلیق کس قدر پیچیدہ ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ کیچڑ سے انسان کی تخلیق تک کس قدر عظیم تبدیلی ہے۔ قرآن کریم نے اس سے زیادہ تفصیلات نہیں دی ہیں کیونکہ قرآن کریم کا مقصد ان موٹے موٹے مدارج تخلیق کے ذکر ہی سے پورا ہو جاتا ہے۔ رہے موجودہ سائنسی مشاہدات تو ان کے پیش نظر نشوونما کے نہایت ہی مفصل مدارج کا بیان ہوتا ہے تاکہ وہ کیچڑ سے مکمل انسان کی تخلیق تک مدارج کو تفصیل سے لیں۔ سائنس دانوں کے مشاہدات درست بھی ہو سکتے ہیں اور بعض اوقات وہ غلط مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔ آج وہ زیادہ مدارج بتاتے ہیں اور کل ان میں کمی کر دیتے ہیں کیونکہ آلات مشاہدہ میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

قرآن کریم کبھی تو ان مدارج کو اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہے اور کبھی ان کی تفصیلات دیتا ہے۔ بعض اوقات صرف یہ فقرہ ہوتا ہے۔

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (۳۲ : ۷) "انسان کی ابتدائی تخلیق مٹی سے کی گئی"۔ اب اس میں مراحل کا ذکر بالکل نہیں ہے اور جس آیت میں تفصیلات دی گئی ہیں اس میں کہا ہے۔

مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (۲۳ : ۱۲) "مٹی کے ست سے"۔ دوسری آیت میں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ رہی یہ بات کہ انسان مٹی سے کس طرح تسلسل کے ساتھ اپنی موجودہ کامل حالت تک پہنچا' تو قرآن کریم نے اس کی تفصیلات نہیں دی ہیں اور جیسا کہ ہم نے دوسری جگہ تفصیلات دے دی ہیں یہ امور قرآن کریم کے مقاصد میں شامل ہی نہیں ہیں۔ قرآن کریم نے جو مدارج حیات بیان کیے ہیں وہ سائنسی مشاہدات کے مطابق بھی ہو سکتے ہیں اور خلاف بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عمل کسی نامعلوم ذریعہ سے ہوا ہو اور ابھی انسان نے اسے دریافت نہ کیا ہو یا کچھ ایسے فیکٹر ہوں جو ابھی انسان کے علم سے باہر ہوں۔ لیکن قرآن انسان کو جس نظر سے دیکھتا ہے اور یہ دوسرے سائنسی نظریات اسے جن مقاصد کے لیے مشاہدہ کرتے ہیں ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قرآن کریم انسان کو ایک نہایت ہی مکرم اور برگزیدہ مخلوق قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس ذات کے اندر اللہ کی روح پھونکی گئی ہے اور اس روح ہی نے اسے مٹی سے انسان بنا دیا اور اسے وہ خصوصیات عطا کیں جن کی وجہ سے وہ انسان کہلایا اور حیوان سے ممتاز قرار پایا۔ یوں قرآن کا

نقطہ نظر انسان کے بارے میں مادہ پرستوں کے نقطہ نظر سے بالکل جدا ہے اور اللہ کا قول تمام لوگوں سے زیادہ سچا ہے۔ (دیکھئے الانسان بین المادیۃ والاسلام محمد قطب) یہ ہے جنس انسانی کی اصل تخلیق 'مٹی کے ست سے۔ رہا بعد کا سلسلہ نسل انسانی تو اس کا طریق کار بالکل جدا ہے اور ایک معروف اور مشاہدہ کیا ہوا طریقہ ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِيْنٍ (۲۳:۱۳) "پھر ہم نے اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کر دیا"۔ اللہ نے جنس انسانی (آدم) کو تو مٹی کے ست سے بنایا۔ رہا سلسلہ تناسل تو اس سلسلے کو اللہ تعالیٰ نے پانی کے ایک قطرے سے چلایا۔ پانی کا یہ قطرہ مرد کی صلب سے نکلتا ہے۔ یہ قطرہ رحم مادر میں ٹھہرتا ہے۔ یہ پانی کا نہایت ہی چھوٹا نکتہ ہوتا ہے بلکہ یہ ہزارہا خلیوں میں سے ایک خلیہ ہوتا ہے اور پانی کے اس قطرے میں یہ خلیے ہزارہا کی تعداد میں ہوتے ہیں۔

فِي قَرَارٍ مَّكِيْنٍ (۲۳:۱۳) "محفوظ جگہ میں"۔ یہ نقطہ رحم میں جا کر رحم کی ہڈیوں کے درمیان ایسی محفوظ جگہ میں ہوتا ہے کہ اس پر جسم کی حرکات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ جگہ ایسی ہوتی ہے کہ انسان کی پیٹھ اور پیٹ کو جو جھٹکے اور لوریاں اور چوٹیں اور حرکات اور تاثرات پہنچتے ہیں یہ جگہ ان سے محفوظ ہوتی ہے۔

قرآن کریم اس نقطے کو انسان کی تخلیق کا ایک مرحلہ قرار دیتا ہے اس نقطے سے بڑھ کر انسان ایک مکمل انسان بنتا ہے۔ یہ ایک سائنسی حقیقت ہے لیکن یہ عجیب اور قابل غور حقیقت ہے۔ جب اس عظیم الجثہ انسان کو ہم ملخص کر کے اس نقطے تک لے جاتے ہیں اور اس نقطے کے اندر وہ تمام انسانی خصائص پائے جاتے ہیں تو پھر ایک کامل انسان کے اندر سے اس قسم کے اور جنین تخلیص ہوتے رہتے ہیں۔ سلسلہ تخلیق کا یہ ایک عجیب نظام ہے۔

اس نقطے سے انسان پھر علقه بن جاتا ہے یعنی خون کا ایک لوتھڑا۔ اس مرحلے میں مرد کا جرثومہ عورت کے انڈے کے ساتھ مکس ہو جاتا ہے اور ابتداء میں رحم مادر کے ساتھ معلق یہ ایک باریک نقطہ ہی ہوتا ہے۔ یہ نقطہ رحم مادر کے خون سے غذا پاتا ہے۔ علقه سے پھر یہ الْمُضْغَةَ "خون کی بوٹی" کی شکل میں آ جاتا ہے۔ بوٹی کی شکل میں اب یہ نقطہ قدرے بڑا ہو جاتا ہے۔ اب یہ گوشت کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ یہ خون کا ایک موٹا ٹکڑا ہوتا ہے۔

یہ چھوٹی سی مخلوق اپنی اس راہ پر چلتی ہے۔ یہ اپنی ڈگر تبدیل نہیں کرتی۔ نہ اپنی راہ سے ادھر ادھر جاتی ہے۔ اس کی حرکت منظم اور مرتب ہوتی ہے اور یہ اس ناموس کے مطابق ہوتی ہے جو پہلے سے اللہ نے مقرر کر دیا ہے۔ یعنی اللہ کی تدبیر و تقدیر کے مطابق۔ اس کے بعد ہڈیوں کا مرحلہ آتا ہے۔

فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا (۲۳:۱۴) "پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں"۔ اور اس کے بعد یہ مرحلہ آیا کہ ہڈیوں پر گوشت چڑھ آیا۔

فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا (۲۳:۱۴) "پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا"۔ ان مراحل کو پڑھ کر اور پھر دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ قرآن کریم نے جنین کے ان مراحل کو جس تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے وہ سائنس دانوں

کے مشاہدہ میں بہت بعد میں آئی ہے۔ سائنس دانوں نے بعد میں یہ بات معلوم کی کہ ہڈیوں کے خلیے اور ہیں۔ اور گوشت کے خلیے اور ہیں۔ اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ جنین کے اندر ہڈیوں کے خلیے پہلے چڑھتے ہیں اور بعد میں ان پر گوشت کے خلیے چڑھتے ہیں اور جب تک ہڈیوں کے خلیے مکمل نہیں ہوتے اس وقت تک گوشت کے خلیے ناپید ہوتے ہیں اور بعد میں جنین کا ڈھانچہ بنتا ہے۔ یہ وہ حیران کن حقیقت ہے جسے قرآن کریم یوں ریکارڈ کرتا ہے۔

فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا (۲۳ : ۱۴) "پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں اور پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا"۔ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (۲۳ : ۱۴) "پھر اسے ایک دوسری مخلوق بنا کھڑا کیا"۔ اور یہ مخلوق انسان ہے۔ یہ امتیازی خصوصیات کا حامل ہے۔ ابتداء میں انسان کا جنین اور حیوان کا جنین جسمانی ساخت کے اعتبار سے ایک جیسے نظر آتے ہیں لیکن آخر میں جاکر انسان کا جنین ایک دوسری مخلوق کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ایک مکرم اور صاحب امتیاز مخلوق ہوتی ہے اور یہ ارتقاء اور ترقی کی بے پناہ استعداد اپنے اندر رکھتی ہے۔ حیوان کا جنین حیوان ہی کے درجے میں رہ جاتا ہے۔ وہ انسانی خصائص کو اخذ نہیں کر سکتا۔ اور ان کمالات تک نہیں پہنچ پاتا جن تک انسان پہنچتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانی جنین کو متعین اور مخصوص خصوصیات دی گئی ہیں اور یہی خصوصیات ہیں جو بعد کے زمانے میں انسان کو انسانیت کی راہ پر ڈالتی ہیں۔ اس طرح انسان "ایک دوسری" مخلوق بن جاتا ہے۔ اور یہ اس وقت ہی بن جاتا ہے جب یہ جنین اپنے آخری دور نشوونما میں ہوتا ہے۔ حیوان اپنے آخری دور میں انسان سے پیچھے رہ جاتا ہے اس لیے کہ اس کو انسانی خصوصیات نہیں دی گئیں۔ چنانچہ کسی حیوان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے حیوانی مقام سے آگے بڑھ پائے اور اس طرح آگے بڑھتے بڑھتے حیوان سے انسان بن جائے جیسا کہ مادی نظریہ کے قائلین اس پر یقین کرتے ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان اور تمام حیوانات مختلف انواع کی مخلوق ہیں اور جب اللہ نے ان کو مٹی کے ست سے بنایا اور ان میں اللہ نے اپنی روح پھونکی تو اس وقت ہی سے ہر ایک نوع کو علیحدہ خصائص دیئے گئے۔ اگرچہ انسان اور حیوانات اپنے تخلیقی مدارج میں ایک ہی انداز نشوونما رکھتے ہیں لیکن انسان اپنی انسانی خصوصیات کے اعتبار سے ایک مقام پر جاکر رک جاتا ہے اور انسان "خلق آخر" بن جاتا ہے اور ان ذمہ داریوں کے اٹھانے کے قابل بن جاتا ہے جو اس نے اس کرۂ ارض پر ادا کرنی ہیں۔ یہ فرق ان امتیازی خصوصیات کی وجہ سے ہے جو اللہ نے انسان کو دی ہیں۔ اس معاملے میں یہ نظریہ بالکل غلط ہے کہ حیوانات نے ترقی کرتے کرتے درجہ انسانی تک بلندی حاصل کی ہے۔ (۱)

(۱) نظریہ ارتقاء اسلام کے نظریہ سے متضاد تصور پر قائم ہے۔ یہ نظریہ فرض کرتا ہے کہ موجودہ انسان حیوانی ارتقاء کا ایک درجہ ہے' اور یہ کہ حیوان بھی ترقی کر کے انسان بن سکتا ہے لیکن واقعی صورت حالات یہ ہے کہ واضح طور پر یہ نظریہ محض مفروضہ اور جھوٹ نظر آتا ہے۔ حیوان کبھی بھی انسانی خصوصیات کا حامل نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمیشہ ہی اپنی حدود میں رہتا ہے ان سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ کسی نوع کے اندر شکلی اعتبار سے کوئی نوع حیوان ترقی کر لے جس طرح ڈارون کہتا ہے۔ لیکن ہر نوع اپنے نوعی حدود کے اندر ہی رہتی ہے۔ وہ نوعی خصوصیات کو بدل نہیں سکتی۔ کیونکہ ہر نوع حیوانی کی خصوصیات علیحدہ ہوتی ہیں اور کسی خارجی قوت نے اسے دی ہوتی ہیں جبکہ نوع انسانی بالکل ایک علیحدہ نوعیت اور خصوصیات کی حامل ہے اور یہ خصوصیات اسے بعض مخصوص مقاصد کے لیے اللہ کی قوت نے دی ہیں۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (۲۳ : ۱۴) "بس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ 'سب کاریگروں سے اچھا کاریگر"۔ جس نے انسان کے جنین کے اندر یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ اس انداز نشو و نما کے مطابق ایک خود کار نظام کے مطابق آگے بڑھتا ہے۔ ایک نہایت ہی پیچیدہ سنت الہیہ کے مطابق جس کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور نہ اس کے مراحل میں سے کوئی مرحلہ حذف ہوتا ہے یہاں تک کہ انسان ترقی و کمال کے مقررہ درجہ کمال تک پہنچ جاتا ہے۔

لوگ سائنس کے انکشافات کو معجزہ قرار دیتے ہیں اور ان کو سن سن کر تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔ خصوصاً جب انسان ایک ایسا آلہ یا مشین تیار کرتا ہے جو خود کار طریقے کے مطابق چلتا ہے اور انسان کی مداخلت کے بغیر کام کرتا ہے۔ کیا یہ لوگ اس جنین کو نہیں دیکھتے کہ یہ نہایت ہی خود کار طریقے کے مطابق اپنے مختلف مراحل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ بظاہر ان مراحل سے گزرنے میں اسے گزارنے والا نظر نہیں آتا۔ جب وہ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں داخل ہوتا ہے تو اس کی ماہیت میں بھی مکمل تبدیلی آجاتی ہے۔ پھر نظر آتا ہے کہ ان دونوں مراحل میں اس کے اندر ایک عظیم تبدیلی آگئی ہے۔ لوگ رات دن ان تغیرات اور واقعات کو دیکھتے ہیں لیکن اپنی آنکھیں بند کر کے چلے جاتے ہیں' ان کے دل و دماغ اس عظیم خود کار نظام پر غور نہیں کرتے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ ہم اس نظام کے عادی ہو گئے ہیں حالانکہ یہ اپنی جگہ حیرت انگیز نظام ہے۔ محض انسان کی اس پیچیدہ تخلیق پر غور و فکر ہی انسان کی ہدایت کے لیے کافی ہے جس کی تمام خصوصیات' تمام خدوخال' اس چھوٹے سے نکتے کے اندر موجود ہوتے ہیں جو اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ انسان خوردبین کے بغیر اسے دیکھ بھی نہیں سکتا۔ یہ تمام خصوصیات اور تمام خدوخال آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں اور اپنے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے پھر ہماری نظروں میں آجاتے ہیں۔ جب انسان بچے کی صورت میں ہوتا ہے تو انسان کے انسانی خصائص نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر ہر بچہ عام انسانی خصائص کے ساتھ ساتھ اپنے والدین کی مخصوص خصوصیات کو بھی وراثت میں پاتا ہے اور یہ دونوں قسم کی خصوصیات اس چھوٹے سے نکتے کے اندر مرکوز ہوتی ہیں۔ غرض یہ عمل جو رات اور دن ہمارے درمیان اور ہمارے سامنے قدرت دہراتی ہے' انسان کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے اور انسانی غور و فکر کے لیے اس میں عظیم مواد موجود ہے۔

اب سیاق کلام ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے تاکہ زندگی کے اس سفر کو انتہا تک پہنچا دے۔ اب زندگی کے ایک نئے مرحلے کا ذکر ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ زندگی جس کی تخلیق اس مٹی سے کی گئی ہے اس دنیا ہی میں ختم نہیں ہو جاتی' کیونکہ یہ صرف مٹی نہیں ہے بلکہ اس میں روح کا آمیزہ کیا گیا ہے' لہٰذا اس کو اس سے بھی آگے بڑھنا ہے۔ اس زندگی میں چونکہ عالم بالا کی طرف سے روح پھونکی گئی ہے اس لیے اس کی آخری منزل یہی جسمانی منزل نہیں ہے۔ خون اور گوشت کی اس قریبی منزل سے آگے اور جہان بھی ہیں۔ چنانچہ زندگی کا آخری مرحلہ سامنے آتا ہے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ (۲۳ : ۱۵) ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ

(۲۳ : ۱۶) "پھر اس کے بعد تم کو ضرور مرنا ہے' پھر قیامت کے روز یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے"۔ یہ موت دنیا کی زندگی کا اختتام ہے اور دنیا کی زندگی اور آخرت کی زندگی کے درمیان بھی ایک مرحلہ ہے۔ لہٰذا برزخ کی زندگی بھی حیات انسانی کی ترقی کا ایک مرحلہ ہے۔ اور برزخ انسانی زندگی کا اختتام نہیں ہے۔

اس کے بعد انسان نے حکم الٰہی کے مطابق دوبارہ اٹھنا ہے۔ یہ بھی زندگی کا ایک دور ہو گا' ایک مرحلہ ہو گا لیکن یہ ایک کامل زندگی ہوگی۔ اس زندگی میں کوئی نقص نہ ہو گا' اس میں خون اور گوشت کی زندگی کی ضروریات درکار نہ ہوں گی۔ نہ اس میں خوف اور بے چینی ہوگی' نہ اس میں کوئی تبدیلی ہو گی اور نہ نشیب و فراز ہوں گے بلکہ یہ انسان کے لیے ایک آخری آرام گاہ ہو گی لیکن یہ کامل زندگی اس شخص کے لیے ہو گی جو ترقی و کمال کی راہوں پر چلنے والا ہو۔ وہ زندگی کہ اس سورہ کی ابتدائی آیات میں جس کے خدوخال طے کر دیئے گئے ہیں یعنی ایمان والوں کی زندگی' لیکن جس نے اپنی زندگی کے دنیاوی مرحلے کو ترقی نہ دی بلکہ اسے تنزل سے دوچار کر کے اسے حیوانی زندگی جیسا بنا دیا وہ آخرت میں بھی اسی طرح ترقی معکوس کرے گا۔ وہاں اس کی انسانیت جمادات کا کام کرے گی۔ وہ جہنم کا ایندھن ہو گا۔ جبکہ جہنم کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے تو اس قسم کے لوگ نباتات سے بھی نیچے پتھر ہو جائیں گے۔

--- ○○○---

اب سیاق کلام نفس انسانی کے اندرونی دلائل ایمان سے آفاق کائنات میں موجود دلائل ایمان کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ لوگ ان آفاقی دلائل کو رات اور دن دیکھتے رہتے ہیں۔ ان کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہیں لیکن پھر بھی غافل ہو کر گزر جاتے ہیں۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَ مَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷﴾
وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَ اِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ
بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ
فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَ شَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ
تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ
نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۱﴾
وَ عَلَيْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ ع ۲۲

"اور تمہارے اوپر ہم نے سات راستے بنائے' تخلیق کے کام سے ہم کچھ نابلد نہ تھے اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اتارا اور اس کو زمین میں ٹھہرا دیا' ہم اسے جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں۔ پھر اس پانی کے ذریعہ سے ہم نے تمہارے لیے کھجور اور انگور کے باغ پیدا کر دیئے' تمہارے لیے ان باغوں میں بہت سے لذیذ پھل ہیں اور ان سے تم روزی حاصل کرتے ہو۔ اور وہ درخت بھی ہم نے پیدا کیا جو طور سینا سے نکلتا ہے'

حمل بھی لیے ہوئے آتا ہے اور کھانے والوں کے لیے سالن بھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے۔ ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے اسی میں سے ایک چیز (یعنی دودھ) ہم تمہیں پلاتے ہیں' اور تمہارے لیے ان میں بہت سے دوسرے فائدے بھی ہیں۔ ان کو تم کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر سوار بھی کیے جاتے ہو"۔

سیاق کلام ان دلائل کو پیش کرتا ہے اور ان تمام دلائل کو باہم مربوط کرتا ہے کہ یہ تمام دلائل قدرت الٰہیہ کے نشانات ہیں۔ پھر یہ سب نشانات یہ بھی دکھاتے ہیں کہ اس کائنات کو کس شان اور سدبیر کے ساتھ چلایا جاتا ہے۔ قدرت کے یہ تمام مظاہر ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں ان نشانات کے کام اور فرائض منصبی بھی باہم مربوط ہیں اور جس سمت کی یہ نشاندہی کرتے ہیں وہ بھی ایک ہے یعنی ایک خالق۔ سب کے سب ایک ہی ناموس فطرت کے مطیع ہیں' اپنے فرائض تکوینی میں باہم متعاون ہیں اور ان کی خدمات سب کی سب اس حضرت انسان کے لیے ہیں جسے اللہ نے معزز اور مکرم بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں تخلیق انسان اور دوسرے مظاہر فطرت کو یکجا کیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ (۲۳:۱۷) "اور تمہارے اوپر ہم نے سات راستے بنائے' تخلیق کے کام سے ہم کچھ نابلد نہ تھے"۔ یہ سات راستے طرائق کیا ہیں' یہ دراصل طبقات ہیں' بعض' بعض کے اوپر ہیں یا بعض دوسرے کی نسبت بہت دور ہیں۔ سبع طرائق سے مراد سات اہم فلکی مدار بھی ہو سکتے ہیں۔ اور اسی طرح ان سے مراد وہ سات کہکشاں بھی ہو سکتے ہیں جس طرح ہم سورج کی کہکشاں میں بستے ہیں' یا ان سے سات سدم بھی مراد ہو سکتے اور سدم سے مراد فلکیات والوں کے نزدیک ستاروں کے مجموعے (Nebula) ہیں۔ غرض مراد جو بھی ہو' یہ سات فلکی مخلوق ہے اور یہ انسانوں کے اوپر ہے' بہرحال یہ سبع طرائق زمین سے بلندی پر ہیں اور اسی فضائے کائنات میں ہیں۔ اللہ نے اپنی شان حکیمانہ سے ان کو پیدا کیا ہے اور وہ اللہ اپنی تخلیق سے غافل نہیں ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰي ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ

(۲۳:۱۸) "اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اتارا اور اس کو زمین میں ٹھہرا دیا' ہم اسے جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں"۔ یہاں یہ سات راستے زمین کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں۔ پانی آسمان سے اترتا ہے۔ ان سات افلاک کے ساتھ پانی کا تعلق ہے۔ کیونکہ اس کائنات کا اس انداز پر پیدا کیا جانا ہی اس بات کا ضامن ہے کہ وہ آسمانوں سے پانی اتارتا ہے' پھر یہ پانی زمین کے اوپر ٹھہرتا ہے۔

یہ نظریہ کہ زمین کے اندر جو پانی ہے وہ بارشوں ہی کا پانی ہے۔ یہ پانی مختلف راہوں سے زمین کے اندر جذب ہو جاتا ہے۔ یہ نظریہ بالکل ایک جدید نظریہ ہے۔ ماضی قریب تک لوگ یہ سوچتے تھے کہ بارش کے پانی اور زمین کے اندر کے پانی کا باہم کوئی تعلق نہیں ہے لیکن قرآن نے آج سے تقریباً تیرہ سو سال پہلے اس حقیقت کو بیان کر دیا تھا۔

پھر اللہ نے اس پانی کو ٹھیک ٹھیک حساب کے مطابق اتارا' نہ زیادہ اتارا کہ طوفان کی شکل میں سب کچھ غرق کر دے اور نہ ضرورت سے کم اتارا کہ ملکوں کے اندر خشک سالی ہو جائے اور تروتازگی اور شادابی ختم ہو جائے۔ نہ بے موسم اتارا کہ پانی ضائع چلا جائے۔

فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ (۲۳ : ۱۸) "اور اس کو زمین میں ٹھہرا دیا"۔ تو یہ پانی بھی زمین میں ٹھہرا ہوا ہے اور انسان کا نطفہ بھی قرار مکین میں ٹھہرا ہوا ہے اور ان دونوں کے درمیان بہترین مشابہت اور تقابل ہے۔ دونوں اللہ کی تدبیر سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک زمین میں اور ایک رحم میں۔

وَ اِنَّا عَلٰي ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ (۲۳ : ۱۸) "اور ہم اسے جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں"۔ یوں کہ وہ زمین کے اندر دور تک گہرائیوں میں چلا جائے' اور جن محفوظ مقامات کے اندر یہ پانی محفوظ رہتا ہے' ان میں شگاف پڑ جائیں اور پانی گہرائیوں میں سے نکل کر غائب ہو جائے یا کسی اور طریقے سے ناپید ہو جائے۔ کیونکہ جس خدا نے اپنی قدرت سے پانی کو زمین میں ٹھہرایا ہے وہ اپنی قدرت سے اسے غائب بھی کر سکتا ہے۔ یہ تو اللہ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اسے روک رکھا ہے۔

اور یہ زندگی کی بوقلمونیاں تو قائم ہی پانی سے ہیں۔

فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۲۳ : ۱۹) "پھر اس پانی کے ذریعے سے ہم نے تمہارے لیے کھجور اور انگور کے باغ پیدا کر دیے۔ تمہارے لیے ان باغوں میں بہت سے لذیذ پھل ہیں اور ان سے تم روزی حاصل کرتے ہو"۔ کھجور اور انگور دو نمونے ہیں ان نباتاتی اشیاء کے جو پانی سے پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ انسان اور حیوان نطفے کے پانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ دونوں نمونے ایسے ہیں جو لوگوں کے ذہنوں میں اسی دور میں رچے بسے تھے جبکہ دوسرے تمام قسم کے فواکہ اور حیوانات بھی پانی ہی سے پیدا ہوئے ہیں۔

دوسری تمام پیداوار میں زیتون کے درخت کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ (۲۳ : ۲۰) "اور وہ درخت بھی ہم نے پیدا کیا جو طور سینا سے نکلتا ہے' تیل بھی لیے ہوئے نکلتا ہے اور کھانے والوں کے لیے سالن بھی"۔ یہ اکثر درختوں سے زیادہ مفید ہے' اس کا تیل' اس کا پھل اور اس کی لکڑی سب ہی مفید ہیں۔ اور عربستان کے قریب ترین مقامات جہاں یہ اگتا ہے' طور سینا ہے۔ یہ اس وادی مقدس کے قریب ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی۔ لہٰذا اس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا۔ یہ درخت بھی وہاں اس پانی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو زمین کے اندر محفوظ ہے۔

اب نباتات سے آگے عالم حیوانات پر ایک نظر

وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۲۱) وَ عَلَيْهَا وَ عَلَي الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ (۲۳ : ۲۲) "اور حقیقت یہ ہے کہ

تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے۔ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے اسی میں سے ایک چیز (یعنی دودھ) ہم تمہیں پلاتے ہیں' اور تمہارے لیے ان میں بہت سے دوسرے فائدے بھی ہیں۔ان کو تم کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر سوار بھی کیے جاتے ہو"۔یہ تمام مخلوقات انسان کے لیے اللہ کی قدرت نے مسخر کر دی ہے اور اس کائنات میں یہ مخلوق مختلف قسم کے مقاصد پورے کر رہی ہے۔ان چیزوں میں عبرت ہے' اس شخص کے لیے جو چشم بصیرت کے ساتھ ان کو دیکھے اور پھر عقل کے ساتھ ان چیزوں کو دیکھے اور ان پر غور کرے۔انسان دیکھتا ہے کہ وہ جو خوشگوار دودھ پیتا ہے وہ ان جانوروں کے پیٹ سے نکلتا ہے۔یہ ہے خلاصہ اس غذا کا جو یہ جانور ہضم کرتے ہیں۔اور پھر دودھ کے غدودات اس پاک و صاف سفید سیال مادے کی شکل میں نکالتے ہیں جو نہایت ہی خوشگوار اور لطیف غذا ہے۔

وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ (۲۳:۲۱) "اور تمہارے لیے ان میں بہت سے دوسرے فائدے ہیں"۔یہاں تمام فوائد کا ذکر اجمالاً کر دیا گیا اور اس کے بعد بعض مخصوص و ممتاز فائدے گنوا دیے۔

وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ (۲۱) وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ (۲۳:۲۲) "ان کو تم کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر سوار ہوتے ہو"۔اللہ نے انسانوں کے لیے مویشیوں کا کھانا حلال قرار دیا۔مثلاً اونٹ' گائے اور بھیڑ بکری۔لیکن اللہ نے ان کو عذاب دینا اور مثلہ بنانے کی اجازت نہیں دی کیونکہ کھانے سے تو ایک ضرورت پوری ہوتی ہے لیکن ان کو عذاب دینا' تکلیف پہنچانا اور مثلہ بنانا بے فائدہ تعذیب ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے قلب و نظر میں فساد ہے اور اس کی فطرت فطرت سلیمہ نہیں رہی ہے جبکہ اس فعل سے زندگی کو کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچتا۔

یہاں مویشیوں پر سواری کی مناسبت سے کشتیوں کی سواری کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔کشتی بھی ایک کائناتی نظام کے تحت انسان کے لیے مسخر بنا دی گئی ہے اور اس نظام یعنی بحری سفر کے نظام میں بھی انسانوں کا مفاد ہے۔پانی کو بھی انسان کے لیے مفید بنایا۔پھر کشتی کو اس قابل بنایا کہ وہ پانی کے اوپر تیر رہی ہے اور ہواؤں کو اس طرح چلایا کہ وہ کشتیوں کو منزل مقصود تک لے جا رہی ہیں۔اگر ان امور میں سے کوئی امر بھی نہ ہو یعنی پانی' کشتی اور ہوا تو بحری سفر مشکل ہو جائے۔آج بھی بحری سفر انہی سہولیات پر مبنی ہے۔

یہ تمام امور دلائل ایمان کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں' بشرطیکہ کوئی فہم و ادراک اور تفکر و تدبر کر کے ان پر غور کرے اور ان سب امور کا تعلق اس سورہ کے پہلے اور دوسرے پیراگراف کے ساتھ ہے۔ان امور سے تمام پیراگراف مربوط اور ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

---ООО---

# درس نمبر ۱۴۹ تشریح آیات

## ۲۳ --- تا --- ۵۲

اس سبق کا مضمون اب دلائل انفس و آفاق سے براہ راست عقیدہ توحید کی طرف آ جاتا ہے جو تمام انبیاء کا مدار دعوت رہا ہے اور تمام رسول اسی کی طرف دعوت دیتے رہے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ تمام رسولوں نے تمام زمانوں میں لوگوں کو اسی عقیدے کی طرف بلایا اور تمام رسولوں کا استقبال ان کی امتوں نے کس طرح کیا۔ اس دعوت کے مقابلے میں ان کا ردعمل کیسا رہا۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر آخر تک تمام رسولوں نے کلمہ توحید کی طرف دعوت دی جس کا مفہوم عربی زبان میں یوں رہا کہ تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے کیونکہ تمام رسول دعوت اپنی قوم کی زبان ہی میں دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی وہی بات کی جو آپ کے بعد دوسرے رسولوں نے اپنی اپنی اقوام کے سامنے کی اور تمام امتوں نے ایک ہی جواب دیا۔ حالانکہ ان امم کے درمیان زمان و مکان کے طویل فاصلے تھے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا
لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٢٣﴾ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن
قَوْمِهِ مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَن يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ
شَاءَ اللَّهُ لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ﴿٢٤﴾ إِنْ هُوَ
إِلَّا رَجُلٌ بِهِ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوا بِهِ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٢٥﴾

”ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا ”اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارے لیے کوئی معبود نہیں ہے، کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟“ اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا وہ کہنے لگے کہ ”یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے۔ اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتے بھیجتا۔ یہ بات تو ہم نے کبھی اپنے باپ دادا کے وقتوں میں سنی ہی نہیں (کہ بشر رسول بن کر آئے)۔ کچھ نہیں، بس اس آدمی کو ذرا جنون لاحق ہو گیا ہے۔ کچھ مدت اور دیکھ لو (شاید افاقہ ہو جائے)۔

یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۲۳:۲۳) "اے میری قوم کے لوگو' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارے لیے کوئی معبود نہیں ہے"۔ یہ وہ کلمہ ہے جو تمام رسولوں کی دعوت ہے' اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ پوری کائنات اس کلمے پر قائم ہے۔ یہ پوری کائنات اس کے لیے شاہد ہے۔

اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۲۳:۲۳) "کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟" یعنی تم اس انکار کے انجام بد سے نہیں ڈرتے جو تم اس عظیم حقیقت کے حوالے سے کرتے ہو۔ حالانکہ تمام دوسرے حقائق اس حقیقت کا نتیجہ ہیں اور تمہارا انکار اس عظیم حقیقت پر دست درازی ہے اور جو قوم اس حقیقت کا انکار کرے' وہ لازماً عظیم عذاب کی مستحق بن جاتی ہے۔

لیکن حضرت نوح کی قوم کے یہ کبراء اور بااثر لوگ اس کلمے کے سچ ہونے میں شک و شبے کا اظہار نہیں کرتے نہ وہ اس کلمے کے بارے میں کسی ثبوت کا مطالبہ کرتے ہیں' نہ اس پر غور و فکر کرتے ہیں۔ وہ دراصل اپنی شخصیات کی تنگ نظری میں گرفتار ہیں اور اس سے وہ اپنے آپ کو نہیں چھڑا سکتے۔ ان کی سوچ داعی کی شخصیت تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ان کو یہ توفیق نہیں ہے کہ ذرا اس محدود سوچ سے بلند ہو کر اس عظیم حقیقت پر غور کریں جسے حضرت نوح علیہ اسلام پیش فرماتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت نوح کی اصولی اور عظیم دعوت کے بارے میں کچھ کہنے کے بجائے حضرت نوح کی شخصیت پر اظہار خیال شروع کر دیا حالانکہ یہ پوری کائنات حضرت نوح کے نظریہ اور دعوت پر شاہد عادل ہے اور دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص کہتا کیا ہے۔ یہ بات اہمیت نہیں رکھتی کہ کہتا کون ہے۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ (۲۳:۲٤) "اس کی قوم کے سرداروں نے ماننے سے انکار کیا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا' اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے"۔ حضرت نوح کی قوم نے ان کے معاملے کو اور اس عظیم دعوت کو نہایت ہی تنگ نظری اور کوتاہ بینی سے دیکھا چنانچہ اپنی اس تنگ نظری اور کوتاہ بینی کی وجہ سے وہ اس قابل ہی نہ تھے کہ اس دعوت کی حقیقت کو سمجھ سکتے یا اس کے نتائج کا ادراک کر سکتے۔ ان کی معتبر اور جھوٹی شخصیات نے اس دعوت کی حقیقت اور اس کے جوہر کو ان کی نظروں سے اوجھل رکھا۔ وہ اندھے بنے رہے اور ان کے اور اس دعوت کے درمیان ان کے اس اندھے پن کی وجہ سے پردے حائل ہو گئے۔ ان کا نقطہ نظر داعی کی شخصیت کے دائرے سے نہ نکل سکا۔ بس وہ یہ سمجھ سکے کہ اگر ہم اس دعوت کو قبول کریں تو نوح جیسا عام شخص ایک عظیم شخص بن جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ایمان لاتے ہی وہ ہمارا پیشوا اور بڑا آدمی بن جائے گا۔

ان لوگوں نے اپنی تنگ نظری کی وجہ سے یہ سمجھا کہ حضرت نوح صرف اپنی شخصیت کے لیے کام کر رہے ہیں اور انہوں نے اسی لیے نبوت کا دعویٰ بھی کیا ہے لیکن اپنی اس کوتاہ بینی کی وجہ سے وہ صرف حضرت نوح کی فضیلت ہی کا انکار نہیں کر دیتے بلکہ دراصل لوگ انسانیت کو ملنے والی ایک عظیم فضیلت کا بھی انکار کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو جنس بشر کو یہ عزت اس لیے دی تھی کہ وہ اس نے ایک سوچنے والی مخلوق پیدا کی تھی۔ ان لوگوں کی سوچ یہ تھی کہ اگر اللہ کسی کو نبی بنا کر بھیجتا تو لازماً اس شخص کو ملائکہ میں سے ہونا چاہئے تھا۔ گویا یہ لوگ انسانیت کو اس شرف سے محروم رکھنا چاہتے تھے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً (۲۳ : ۲۴) "اللہ کو اگر رسول بھیجنا ہوتا تو فرشتے بھیجتا"۔ یہ بات وہ اس لیے کہتے ہیں کہ ان کی روح میں وہ قوت نہیں ہے جو انہیں عالم بالا سے مربوط کرے تاکہ وہ اس بات پر یقین کر سکیں کہ انسانوں میں سے مختار لوگ عالم بالا سے فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ اپنے دوسرے بھائیوں کو ہدایت دے سکتے ہیں اور انہیں اللہ سے جوڑ سکتے ہیں۔

یہ لوگ اس اہم معاملے کو اب اپنے آباؤ اجداد سے مالوف افکار کی روشنی میں سوچتے ہیں۔

مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ (۲۳ : ۲۴) "یہ بات تو ہم نے کبھی اپنے باپ دادا کے وقتوں میں نہیں سنی"۔ جب تقلید انسان کے قلب و نظر کی روشنی کو بجھا دیتی ہے جس طرح آگ بجھ جاتی ہے اور جب انسانی سوچ اپنا کام چھوڑ دیتی ہے تو لوگ انسانیت کو درپیش مسائل کے بارے میں سوچنا بند کر دیتے ہیں اور وہ اپنے مسائل کا کوئی معقول حل تلاش نہیں کر سکتے۔ بلکہ وہ اپنی تاریخی روایات کے زاویے سے تمام امور کو سوچتے ہیں۔ اگر ان کو اپنی جاہلی روایات میں کوئی بات نہ ملے تو وہ اس بات کو ماننے سے ہی انکار کر دیتے ہیں۔ بس یہ لوگ پیچھے ہی کی طرف دیکھتے ہیں۔

ان جامد اور بجھی ہوئی سوسائٹیوں کا طرز عمل یہ ہوتا ہے اور ان کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ جو بات ایک بار ہو جائے تو وہ دوبارہ ہو سکتی ہے اور جو بات کبھی وقوع پذیر نہیں ہوئی اس کا وقوع ممکن نہیں ہے۔ یوں ان کی زندگی میں جمود آجاتا ہے۔ زندگی متحرک نہیں رہتی اور لوگ صرف ان اقدامات کے تنگ دائرے تک محدود ہو جاتے ہیں جو ان کے آباء و اجداد میں کبھی ہوئے تھے۔

اے کاش کہ اس قسم کے لوگ یہ سوچ سکتے کہ وہ جامد اور مقلد ہیں اور وہ الٹے ان لوگوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں جو حریت فکر اور سوچ کی دعوت دیتے ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ وجود کائنات میں پائے جانے والے دلائل ایمان پر غور و فکر کریں۔ لیکن یہ لوگ حریت فکر کی اس دعوت کا جواب نہایت ہی مذاق اور الزام تراشیوں سے دیتے ہیں۔

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ (۲۳ : ۲۵) "کچھ نہیں بس اس آدمی کو ذرا جنون لاحق ہو گیا ہے"۔ کچھ مدت دیکھو تو یعنی ذرا انتظار کر لو کہ یہ مر جائے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔ اس سے بھی اور اس کی دعوت سے بھی۔ اور تمہیں اس کی دعوت کا جواب دینے کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔

ان لوگوں کا انکار اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام ان کے دلوں تک دعوت اسلامی کو پہنچانے کے لیے کوئی راہ نہیں پاتے اور ان کی جانب سے مذاق اور ایذا رسانی سے بھی ان کو کوئی جائے پناہ نہیں مل رہی ہے۔ اب وہ اپنے رب کی طرف ہی متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے رب سے اپنی مشکلات پر نصرت کے طلبگار ہیں۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿٢٦﴾

نوح نے کہا "پروردگار' ان لوگوں نے جو میری تکذیب کی ہے' اس پر اب تو ہی میری نصرت فرما"۔

جب زندہ انسان اس طرح پتھروں کی طرح جمود اختیار کر لیں۔ زندگی آگے بڑھنا رک جائے اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے ترقی و کمال کے جو مدارج مقرر کر رکھے ہیں۔ انسان اس کی طرف بڑھنا چھوڑ دیں تو ایسے انسان انسانی ترقی کی راہ میں روڑہ بن جاتے ہیں۔ اب دو ہی صورتیں ہوتی ہیں یا تو زندگی کو اس جگہ پر جامد چھوڑ دیا جائے اور یا پھر اس پتھر کو پاش پاش کر دیا جائے جس نے زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھنے سے روک دیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بارے میں یہی فیصلہ ہوا کہ اسے انسانیت کی راہ سے برطرف کر دیا جائے۔ کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام کا دور آغاز انسانیت کا دور ہے۔ اس لیے اللہ نے انسانیت کی راہ میں اس بھاری پتھر کو ایک طرف پھینک دیا۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۷﴾

”ہم نے اس پر وحی کی کہ ”ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق کشتی تیار کر۔ پھر جب ہمارا حکم آ جائے اور وہ تنور ابل پڑے تو ہر قسم کے جانوروں میں سے ایک ایک جوڑا لے کر اس میں سوار ہو جا‘ اور اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے ‘سوائے ان کے جن کے خلاف پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہے‘ اور ظالموں کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ کہنا‘ یہ اب غرق ہونے والے ہیں۔

یوں سنت الہیہ نے زندگی کی ترقی اور نشوونما کی راہ سے یہ روڑا‘ قوم نوح کا روڑا دور کیا۔ تاکہ انسانی زندگی شاہراہ ترقی پر آگے بڑھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں انسانیت کی نشوونما کا آغاز ہوا تھا‘ اور آغاز کے ساتھ ہی اس میں ٹھہراؤ اور جمود پیدا ہو گیا جس طرح کسی نازک پودے کو زمین سے نکلتے ہی آفات سماوی یا اور کوئی مشکلات درپیش ہو جائیں تو وہ مرجھا جائے اور خشک ہو جائے جبکہ وہ ناتواں ہو۔ ان مشکلات کو دور کرنے کے لیے طوفان ایک بہترین علاج تھا۔ یاد رہے کہ طوفان زمین کو دھو ڈالتا ہے اور طوفان کے بعد اس زمین میں خوب فصل اگتی ہے۔ اسی طرح زمین کو قوم نوح کی گندگی سے پاک کر دیا گیا تاکہ اس کرۂ ارض پر درست زندگی کا آغاز از سرنو کیا جائے اور انسانی زندگی بحسن و خوبی شاہراہ ترقی پر گامزن ہو سکے۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا (۲۳ : ۲۷) ”ہم نے اس پر وحی کی کہ ہماری نگرانی اور ہماری وحی کے مطابق کشتی تیار کر“۔ یہ کشتی طوفان سے نجات کا ذریعہ تھی اور پھر ان لوگوں کے بچنے کی تدبیر بھی تھی جو ایمان لا چکے تھے تاکہ آئندہ کے لیے انسانی نسل کی بقا کا سامان ہو جس طرح کسی چیز کا بیج محفوظ کر کے بویا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ حضرت نوح یہ کشتی اپنے ہاتھ سے تیار کریں۔ اس میں یہ سبق تھا کہ انسان نے اس زمین پر

زندگی اسباب و وسائل کے مطابق گزارنی ہے اور زندگی بسر کرنے کے لیے ہر انسان نے پوری پوری جدوجہد کرنی ہے تا کہ وہ اپنے رب کی طرف سے امداد کا مستحق ہو جائے کیونکہ اللہ کی امداد صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جو ان تھک جدوجہد کرتے ہیں' ان کو نہیں ملتی جو ہروقت عیش و عشرت میں مگن رہتے ہیں اور آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو صرف دوسروں کا انتظار کرتے ہیں اور اس کے سوا کسی اور چیز کے لیے جدوجہد نہیں کرتے۔ حضرت نوح کے بارے میں اللہ کی اسکیم یہ تھی کہ وہ انسانوں کے آدم ثانی ہوں۔ اس لیے آپ کو یہ سبق دیا گیا کہ آپ اپنی زندگی کے لیے اسباب و وسائل خود اختیار کریں۔ اللہ کی نگرانی تمہارے شامل حال رہے گی۔ اللہ آپ کو وسائل اختیار کرنے کی تعلیم بہرحال دے رہا ہے۔ یہ کشتی تیار کریں تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کی مشیت پوری ہو۔ اس کرۂ ارض کی صفائی کے اس عمل کے آغاز کے لیے اللہ نے نوح ؑ کے لیے ایک علامت مقرر فرما دی تھی۔

وَ وَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ (۲۳ : ۲۷) "پھر جب ہمارا حکم آجائے اور وہ تنور ابل پڑے"۔ یعنی تنور سے پانی ابل پڑے تو یہ ہوگی طوفان آنے کی علامت اور تب حضرت نوح کا فرض ہو گا کہ وہ جلدی سے کشتی پر سوار ہوں اور اپنے ساتھ کشتی میں زندگی کا تخم بھی سوار کر لیں۔

فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ (۲۳ : ۲۷) "تو ہر قسم کے جانوروں میں سے ایک ایک جوڑا لے کر اس میں سوار ہو جاؤ"۔ یعنی تمام حیوانات' تمام پرندوں' تمام نباتات وغیرہ سے جو اس وقت انسان کو معلوم تھے اور جن سے بنی نوع انسان استفادہ کرتا تھا۔

وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ (۲۳ : ۲۷) "اور اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے سوائے ان کے جن کے خلاف پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہے"۔ اور یہ فیصلہ ان لوگوں کے بارے میں تھا جنہوں نے کفر کیا تھا اور حضرت نوح کی تکذیب کی تھی۔ اور ان کے بارے میں فیصلہ ہو چکا تھا کہ ان کو ہلاک کر دیا جائے کیونکہ انہوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی تھی اور مکذبین کے بارے میں یہ اللہ کی سنت ہے کہ انہیں ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کو آخری حکم دیا گیا کہ وہ اب ان لوگوں کے ساتھ کوئی مباحثہ اور مجادلہ نہ کریں اور نہ کسی کو بچانے کی کوشش کریں اگرچہ ان میں سے کوئی قریبی رشتہ دار ہو کیونکہ اللہ نے سب کافروں کی ہلاکت کا فیصلہ کر لیا ہے۔

وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ (۲۳ : ۲۷) "اور ظالموں کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ کہنا' یہ اب غرق ہونے والے ہیں"۔ کیونکہ اللہ کی سنت کسی دوست یا رشتہ دار کی رورعایت نہیں کرتی۔ اس کی راہ بالکل سیدھی ہے۔ اس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیلات یہاں نہیں دی جاتیں کیونکہ یہ کہہ دیا گیا کہ یہ سب کے سب غرق ہونے والے ہیں۔ اب حضرت نوح کو بتایا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے انعامات پر شکر کس طرح ادا کریں گے' کس طرح اللہ کی حمد پڑھیں گے اور کس طرح اللہ سے ہدایت کے طلبگار ہوں گے۔

فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ
لِلّٰهِ الَّذِي نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِينَ ۝ وَقُلْ رَّبِّ أَنْزِلْنِي مُنْزَلًا
مُّبٰرَكًا وَّأَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ ۝

"پھر جب تو اپنے ساتھیوں سمیت کشتی پر سوار ہو جائے تو کہہ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے نجات دی اور کہہ 'پروردگار' مجھ کو برکت والی جگہ اتار اور تو بہترین جگہ دینے والا ہے"۔

اس طرح آپ اللہ کی حمد کریں' اللہ کی طرف متوجہ ہوں' اللہ کی صفات بیان کریں اور نشانات الٰہیہ کا اعتراف سیکھیں اور سکھائیں۔ یہ ہے اللہ کی تعلیم اپنے بندوں کے لیے۔ اللہ پہلے نبیوں کو سکھاتا ہے اور وہ عوام الناس کو تعلیم دیتے ہیں اور یہ نبی ہمیشہ عوام کے لیے ایک نمونہ بن جاتے ہیں۔

اب اس پورے قصے پر ایک تبصرہ کیا جاتا ہے تاکہ اس قصے کے مختلف مراحل میں جو سبق ہے اور جو حکمتیں ہیں انسان ان پر غور کریں۔

إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّإِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِينَ ۝

"اس قصے میں بڑی نشانیاں ہیں' اور آزمائش تو ہم کر کے ہی رہتے ہیں"۔

ابتلاء کی بہت سی قسمیں ہیں' بعض آزمائشیں صبر کے لیے ہوتی ہیں' بعض آزمائش شکر کے لیے ہوتی ہیں۔ بعض آزمائشیں اجر کے لیے ہوتی ہے۔ قصہ نوح میں آنے والوں کے لیے ہر قسم کی آزمائش اور نصیحت ہے۔

---ooo---

اب ایک دوسری رسالت کا منظر اور تکذیب کے نتائج جبکہ دعوت بھی ایک ہے اور رسالت بھی وہی ہے۔

ثُمَّ أَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِينَ ۝ فَأَرْسَلْنَا
فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهُ ۚ أَفَلَا ۲
تَتَّقُونَ ۝ وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْاٰخِرَةِ ع ۱۰
وَأَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ ۲
مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ۝ وَلَئِنْ أَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا

تُخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾ اَیَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾
هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا
وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ٱفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا
نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۳۹﴾ قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ
لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ فَبُعْدًا
لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

"ان کے بعد ہم نے ایک دوسرے دور کی قوم اٹھائی۔ پھر ان میں خود انہی کی قوم کا ایک رسول بھیجا (جس نے انہیں دعوت دی) کہ اللہ کی بندگی کرو' تمہارے لیے اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے' کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا' جن کو ہم نے دنیا کی زندگی میں آسودہ کر رکھا تھا' وہ کہنے لگے "یہ شخص کچھ نہیں ہے' مگر ایک بشر تم ہی جیسا' جو کچھ تم کھاتے ہو' وہی یہ بھی کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو' وہی یہ بھی پیتا ہے۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت قبول کر لی تو تم گھاٹے ہی میں رہے۔ یہ تمہیں اطلاع دیتا ہے کہ جب تم مر کر مٹی ہو جاؤ گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جاؤ گے اس وقت تم (قبروں سے) نکالے جاؤ گے؟ بعید' بالکل بعید ہے یہ وعدہ جو تم سے کیا جا رہا ہے' زندگی کچھ نہیں ہے مگر بس یہی دنیا کی زندگی۔ یہیں ہم کو مرنا اور جینا ہے اور ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔ یہ شخص خدا کے نام پر محض جھوٹ گھڑ رہا ہے اور ہم کبھی اس کی ماننے والے نہیں ہیں"۔ رسولؑ نے کہا "پروردگار' ان لوگوں نے جو میری تکذیب کی ہے' اس پر اب تو ہی میری نصرت فرما"۔ جواب میں ارشاد ہوا "قریب ہے وہ وقت جب یہ اپنے کیے پر پچھتائیں گے"۔ آخر کار ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ایک ہنگامہ عظیم نے ان کو آ لیا اور ہم نے ان کو کچرا بنا کر پھینک دیا --- دور ہو ظالم قوم!"

اس سورہ میں قصص نہ محض قصہ گوئی کے لیے لائے گئے ہیں اور نہ ان کی تفصیلات دی گئی ہیں' بلکہ یہاں مقصد یہ بتانا ہے کہ تمام پیغمبروں نے ایک ہی دعوت پیش کی اور تمام رسولوں کی اقوام نے ان کے ساتھ ایک ہی جیسا سلوک کیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بات کی ابتداء حضرت نوح علیہ السلام کے قصے سے کی گئی اور انجام حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر ہوا۔ جبکہ خطاب رسول آخر الزمان کو تھا۔ رسولوں کے طویل سلسلے کے نام یہاں نہیں دیئے گئے کیونکہ تمام رسولوں کا معاملہ دراصل ایک ہی جیسا تھا' مقصد یہ تھا کہ ان کا کلمہ ایک ہی تھا' ان کی دعوت ایک تھی اور اس کے ساتھ عوام کا سلوک بھی ایک ہی تھا' یہی تھا اس سورہ کا مقصد۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ (۲۳ : ۳۱) "اس کے بعد ہم نے دوسرے دور کی قوم

اٹھائی"۔ یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ قوم کون تھی۔ راجح قول یہ ہے کہ یہ حضرت ہود علیہ السلام کی قوم تھی۔

فَاَرْسَلْنَا فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ

(۲۳ : ۳۲) "پھر ان میں خود انہی کی قوم کا ایک رسول بھیجا (جس نے انہیں دعوت دی) کہ صرف اللہ کی بندگی کرو تمہارے لیے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟" یہ بھی وہی دعوت ہے جو حضرت نوحؑ نے پیش کی تھی اور الفاظ بھی ایک ہی ہیں۔ حالانکہ حضرت نوحؑ کی زبان اور تھی اور زیر بحث رسول کی زبان اور تھی کیونکہ ان دونوں رسولوں کے درمیان "قرون" کا فرق تھا۔

اس قوم کا جواب کیا تھا؟ وہی جواب یعنی انکار وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَیَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ (۲۳ : ۳۳) وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (۲۳ : ۳۴) "اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا' جن کو ہم نے دنیا کی زندگی میں آسودہ کر رکھا تھا' وہ کہنے لگے "یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا' جو کچھ تم کھاتے ہو' وہی یہ کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو' وہی یہ پیتا ہے۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت قبول کر لی تو تم گھاٹے ہی میں رہے"۔

یہ وہی اعتراض ہے جو تمام امتوں نے پیش کیا کہ یہ رسول تو تم جیسا بشر ہے۔ یہ اعتراض اس لیے پیدا ہوا کہ کسی بھی معاشرے کے کھانے پیتے لوگوں کا تعلق خدا سے نہیں رہتا' اس لیے وہ نہیں سمجھ سکتے کہ ایک انسان کا تعلق خدا سے کیسے قائم ہو سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ معاشی خوشحالی انسان کی فطرت کو بگاڑ دیتی ہے دماغ موٹا کر دیتی ہے۔ دل کے دروازے بند کر دیتی ہے۔ اور عیاش لوگوں کے دل پتھر بن جاتے ہیں۔ ان کے اندر احساس نہیں رہتا۔ اس لیے وہ کسی بات سے متاثر ہوتے ہیں اور نہ مان کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خوشحال لوگ ہمیشہ تحریک اسلامی کی مخالفت کرتے ہیں اور اس لیے اسلام عیاشی کی مخالفت کرتا ہے اور اپنا اجتماعی نظام اس طرح تشکیل دیتا ہے جس میں مترفین کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی' کیونکہ یہ لوگ معاشرے کی سڑاند ہوتے ہیں' پورے ماحول کو متعفن کر دیتے ہیں اور معاشرے کو اس قدر گندا کر دیتے ہیں کہ اس کے اندر گندے کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں اور ایسے معاشرے کو بالآخر یہ گندے کیڑے چاٹ جاتے ہیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ وہ بعث بعد الموت کے قائل نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ موت کے بعد اور مٹی ہو جانے کے بعد انسانوں کو کس طرح اٹھایا جائے گا۔ یہ تو بعید از امکان ہے اور جس بات کی اطلاع یہ رسول دے رہا ہے' یہ عجیب ہے۔

اَیَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ (۲۳ : ۳۵)

هَیْهَاتَ هَیْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ (۲۳ : ۳۶) اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا

مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ (۲۳ : ۳۷) "یہ تمہیں اطلاع دیتا ہے کہ جب تم مر کر مٹی ہو جاؤ گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جاؤ گے اس وقت تم (قبروں سے) نکالے جاؤ گے؟ بعید ' بالکل بعید ہے یہ وعدہ جو تم سے کیا جا رہا ہے ' زندگی کچھ نہیں ہے مگر بس یہی دنیا کی زندگی۔ یہیں ہم کو مرنا اور جینا ہے اور ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔ یہ شخص خدا کے نام پر محض جھوٹ گھڑ رہا ہے اور ہم کبھی اس کی ماننے والے نہیں ہیں"۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی سوچ رکھنے والے لوگ آخرت کی زندگی کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ زندگی کے گہرے حقائق پر نہ انہوں نے غور کیا ہے اور نہ اس کے پیچیدہ نظام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور نہ یہ لوگ ایک اعلیٰ اور ارفع زندگی کی ترجیحات کو سمجھتے ہیں۔ زندگی کے یہ اعلیٰ مقاصد ظاہر ہے کہ اس دنیا میں پورے نہیں ہو سکتے۔ اس دنیا میں نہ بھلائی کو اس کی پوری جزا ملتی ہے اور نہ شر کو اس کی پوری سزا ملتی ہے۔ یہ جزاو سزا آخرت میں مکمل طور پر ملیں گی۔ آخرت میں اہل ایمان اعلیٰ ترین معیاری زندگی تک پہنچیں گے جہاں نہ خوف ہو گا اور نہ تھکاوٹ ہو گی۔ اسی طرح اہل کفر اور پسماندگی اختیار کرنے والے بھی نہایت ہی ذلیل ترین زندگی تک پہنچیں گے جس میں ان کی انسانیت تباہ ہو گی اور وہ وہاں لکڑیوں کی طرح جلتے اور جلائے جاتے رہیں گے۔ نہ ان کے لیے اس سزا میں کمی ہو گی اور نہ اہل ایمان کے لیے جزاء میں کمی ہو گی۔

اس قسم کے منحرفین ان اعلیٰ مقاصد اور ایسے گہرے معانی کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ تعجب ہے کہ یہ لوگ خود اپنی اس موجودہ زندگی کے مختلف ادوار اور مراحل پر غور نہیں کرتے جو ابھی ابھی اسی سورہ میں ان کے سامنے رکھے گئے ہیں۔ یہ اس عجیب و غریب خودکار نظام تخلیق سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔ اسی نظام جیسے ایک خودکار نظام کے ذریعے اللہ مٹی اور ہڈیوں کے پنجر کو پھر زندہ کر دے گا۔ اس لیے ان کو اس رسول کی اس اطلاع پر تعجب ہوتا ہے کہ ان کو قبروں سے نکالا جائے گا۔ اب وہ نہایت ہی کبرو غرور سے اپنی حکمت و دانائی کا اظہار کرتے ہیں کہ یہی زندگی اور یہی موت ہے۔ ایک نسل مرتی ہے اور دوسری نسل زندہ رہتی ہے۔ جو مر گئے اور مٹی بن گئے اور ہڈیاں رہ گئے تو یہ بات بعید از امکان ہے کہ وہ دوبارہ واپس ہو جائیں گے۔ یہ اطلاع جو یہ رسول دے رہا ہے اور ہم سے دوبارہ اٹھائے جانے کا وعدہ کر رہا ہے بعید از امکان ہے۔

یہ لوگ اپنی اس جہالت پر ہی نہیں رکتے کہ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ موت کے بعد دوبارہ اٹھایا جائے گا بلکہ یہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنے رسول پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ رسول اپنی جانب سے اللہ پر افتراء باندھتا ہے حالانکہ وہ اللہ کو جانتے ہی نہیں۔ وہ صرف اس وقت اللہ کا نام لے رہے ہیں اور یہ نام بھی اس لیے لے رہے ہیں کہ رسول پر الزام لگائیں۔

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُنِ افْتَرٰي عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ (۲۳ : ۳۸) "یہ شخص خدا کے نام پر جھوٹ گھڑ رہا ہے اور ہم کبھی اس کی بات ماننے والے نہیں ہیں"۔ ایسے حالات میں یہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہے کہ وہ اپنے رب سے نصرت طلب کرے جس طرح اس سے قبل حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے نصرت طلب کی تھی۔ حضرت نوح کی دعائے نصرت بھی یہی تھی۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ (۲۳ : ۳۹) رسول نے کہا پروردگار ان لوگوں نے میری جو تکذیب کی ہے اس پر اب تو میری نصرت فرما"۔ اللہ کی طرف سے دعا قبول ہوتی ہے۔ اس قوم کی مہلت ختم ہو جاتی ہے

کیونکہ اس میں کوئی بھلائی باقی نہیں رہی ہے یہ لوگ غفلت ' تکذیب اور عناد میں مبتلا ہیں -

قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نَدِمِينَ (۲۳ : ۴۰) "جواب میں ارشاد ہوا' قریب ہے وہ وقت جب یہ اپنے کیے پر پچھتائیں گے" - لیکن اس وقت ان کی یہ ندامت ان کو کوئی فائدہ نہ دے گی -

فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَهُمْ غُثَاءً (۲۳ : ۴۱) "آخر ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ایک ہنگامہ عظیم نے ان کو آلیا اور ہم نے ان کو کچرا بنا کر پھینک دیا" - غثاء اس کوڑے کرکٹ کو کہتے ہیں جسے سیلاب بہا کر پھینک دیتا ہے اور اس میں کوئی چیز کام کی نہیں ہوتی - یہ کچرا کسی کام کا نہیں ہوتا اور ہر قسم کی گندی اور بیکار چیزوں کا ڈھیر ہوتا ہے - یہ لوگ چونکہ ان انسانی اوصاف سے دستبردار ہو گئے تھے جن کی وجہ سے وہ انسان مکرم تھے ' وہ اپنے وجود دنیاوی اور وجود اخروی کی حکمت کو نہیں پا رہے تھے اور انہوں نے اپنے خالق کے ساتھ تمام روابط کاٹ دیئے تھے اس لیے ان میں کوئی ایسی بات باقی نہیں تھی جن کی وجہ سے ان کی تکریم ہوتی اور اس دنیا میں وہ باقی رہتے - لہذا وہ سیلاب کے کوڑے کرکٹ کی طرح بہا دیئے گئے - اس طرح کر دیئے گئے کہ کوئی ان کو پوچھنے والا نہ تھا - یہ قرآن کا منفرد انداز کلام ہے جو کسی حقیقت کا اظہار نہایت ہی دقت کے ساتھ کرتا ہے -

ان لوگوں کی مزید توہین کے لیے اللہ کی جانب سے ان کی ملک بدری کا حال بتانے کے لئے یہ فقرہ کافی ہے کہ یہ اللہ کی رحمت سے دور کر دیئے گئے -

فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّلِمِينَ (۲۳ : ۴۱) "دور ہو ظالم قوم!" زندگی سے بھی دور ' ذکر خیر سے بھی دور ' عالم واقعہ سے بھی دور اور عالم ضمیر سے بھی دور -

--- ooo ---

اس کے بعد سیاق کلام مضمون کو آگے بڑھاتا ہے - منظر پر اقوام آتی ہیں اور جاتی ہیں -

ثُمَّ أَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قُرُونًا ءَاخَرِينَ ﴿٤٢﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَـْٔخِرُونَ ﴿٤٣﴾ ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۖ كُلَّ مَا جَآءَ أُمَّةً رَّسُولُهَا كَذَّبُوهُ ۚ فَأَتْبَعْنَا بَعْضَهُم بَعْضًا وَجَعَلْنَـٰهُمْ أَحَادِيثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٤٤﴾

"پھر ہم نے ان کے بعد دوسری قومیں اٹھائیں - کوئی قوم نہ اپنے وقت سے پہلے ختم ہوئی اور نہ اس کے بعد ٹھہر سکی - پھر ہم نے پے درپے اپنے رسول بھیجے - جس قوم کے پاس بھی اس کا رسول آیا ' اس نے اسے جھٹلایا ' اور ہم ایک کے بعد ایک قوم کو ہلاک کرتے چلے گئے ' حتیٰ کہ ان کو بس افسانہ ہی بنا کر چھوڑا - - پھٹکار ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے !"

یلغار، دعوت اسلامی کی پوری تاریخ کا خلاصہ بیان کر دیا جاتا ہے اور اس خلاصے میں اللہ کی اس سنت کو بھی بیان کر دیا جاتا ہے جو اس کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اس تاریخ کا آغاز قوم نوح اور قوم ہود "عاد" سے ہوا اور اختتام حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہوا۔ درمیان کے قرون کا یہ خلاصہ تھا اور سنت الہیہ یہ ہے :

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ (۲۳ : ۴۳) "کوئی قوم نہ اپنے وقت سے پہلے ختم ہوئی اور نہ اس کے بعد ٹھہر سکی"۔ تمام اقوام نے رسولوں کی تکذیب کی۔

كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ (۲۳ : ۴۴) "جس قوم کے پاس بھی اس کا رسول آیا اس نے اسے جھٹلایا"۔ اور جب بھی اقوام نے رسولوں کو جھٹلایا اللہ نے ان اقوام کو پکڑا۔ یہی اللہ کی سنت پوری انسانی تاریخ میں جاری رہی ہے۔

فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا (۲۳ : ۴۴) "ہم ایک کے بعد ایک قوم کو ہلاک کرتے چلے گئے"۔ اور ان کی ہلاکتوں کے بعد صرف عبرت ہی باقی رہی اور کچھ بھی نہ رہا۔

وَّ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ (۲۳ : ۴۴) "حتیٰ کہ بس ان کو افسانہ بنا کر رکھ چھوڑا"۔ لوگوں کے اندر ان کی عبرت انگیز کہانیاں ہی رہ گئیں۔ یہ تلخیص بھی ایک توہین آمیز ملک بدری اور پھٹکار پر ختم ہوتی ہے کہ دور ہو جائیں ایسے نالائق۔

فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (۲۳ : ۴۴) "پھٹکار ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے"۔

--- ○○○---

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کی ایک تلخیص دی جاتی ہے اور یہ روئیداد بھی اسی ہدف کی طرف اسی انداز میں یوں بڑھتی ہے۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَ اَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ۬ بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۵﴾
اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۠ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَقَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ
مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾

"پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور کھلی سند کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کی طرف بھیجا مگر انہوں نے تکبر کیا اور بڑی دون کی لی۔ کہنے لگے "کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں؟

اور آدمی بھی وہ جن کی قوم ہماری غلام ہے"۔ پس انہوں نے دونوں کو جھٹلا دیا اور ہلاک ہونے والوں میں جا ملے"۔
اس خلاصہ میں بھی ان کا یہ اعتراض نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے کہ یہ رسول ہم جیسے انسان اور بشر کیوں ہیں۔

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (۲۳ : ۴۷) "کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں اور ان کی قوم ہماری غلام ہے"۔ یعنی ایک تو وہ انسان ہیں اور دوسرے یہ کہ انسان بھی غلام قوم سے تعلق رکھنے والے۔ وہ ہمارے پابند ہیں اور مطیع فرمان ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے لیے یہ بات توہین آمیز تھی کہ وہ اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں پر حضرت موسیٰ اور ہارون کی پیش کردہ آیات اور عظیم معجزات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ اس لیے کہ ان کے دلوں پر مہریں لگ چکی تھیں۔ یہ لوگ اس کرۂ ارض کے حالات اور کروفر میں غرق تھے حالانکہ یہ پوری دنیا اور اس کا کروفر ایک بے حقیقت چیز ہے اور ایمان کے مقابلے میں پرکاہ کی قیمت نہیں رکھتا۔

--- ○○○---

اب ایک مجمل اشارہ حضرت عیسیٰ ابن مریم کی طرف بھی آتا ہے۔ وہ تو بذات خود ایک معجزہ تھے۔ ان کی بھی اسی طرح تکذیب کی گئی جس طرح حضرت موسیٰ کی آیات کی تکذیب کی گئی تھی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ۝۴۹ وَجَعَلْنَا ابْنَ ۳
۱۸ع مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ۝۵۰
۴

"اور موسیٰ کو ہم نے کتاب عطا فرمائی تاکہ لوگ اس سے رہنمائی حاصل کریں اور ابن مریم اور اس کی ماں کو ہم نے ایک نشانی بنایا اور ان کو ایک سطح مرتفع پر رکھا جو اطمینان کی جگہ تھی اور چشمے اس میں جاری تھے"۔

اس آیت میں جس ربوہ کا ذکر ہے اس کے بارے میں روایات مختلف ہیں کہ یہ کہاں ہے۔ آیا یہ مصر میں یا دمشق میں تھا یا بیت المقدس میں تھا۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں حضرت مریم اپنے بچے کو لے کر گئی تھیں' حضرت عیسیٰ کے بچپن میں۔ عیسائیوں کی کتابوں میں مفصل تذکرے موجود ہیں۔ یہاں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ یہ ربوہ کہاں تھا۔ مقصود یہ تھا کہ مریم اور ابن مریم کو اللہ نے اس پورے عرصہ میں نہایت ہی پاکیزہ مقام پر رکھا۔ یہ مقام سرسبز تھا۔ پانی عام تھا اور وہ یہاں بہت ہی خوشی اور آرام سے رہتے تھے۔

--- ○○○---

بات یہاں تک آپہنچی ہے تو تمام رسولوں کی اس امت اور جماعت سے اللہ یوں مخاطب ہوتے ہیں کہ گویا وہ پوری جماعت ایک ہی میدان اور ایک ہی جلسہ گاہ میں موجود ہے اور ان کے درمیان سے زمان و مکان کے فاصلے مٹا دیے گئے ہیں۔ کیونکہ اپنے مشن اور دعوت کے اعتبار سے وہ ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا

نَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ ۝ وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمۡ فَاتَّقُوۡنِ ۝

"اے پیغمبرو' کھاؤ پاک چیزیں اور عمل کرو صالح' تم جو کچھ بھی کرتے ہو' میں اس کو خوب جانتا ہوں۔ اور یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں' پس مجھی سے تم ڈرو"۔

یہاں رسولوں کے خطاب میں رسولوں کی بشریت کو نمایاں کیا جاتا ہے کیونکہ رسولوں کی قوموں کو اعتراض اس پر تھا کہ رسول بشر کیوں ہیں؟۔

كُلُوۡا مِنَ الطَّيِّبٰتِ (۲۳: ۵۱) "پاک چیزیں کھاؤ"۔ کیونکہ کھانا خاصہ بشریت ہے لیکن یہاں طیبات کی قید لگا کر بتایا گیا کہ رسولوں کی بشریت ارفع ہوتی ہے اور وہ تمام انسانیت کو ارفع بناتے ہیں اور تمام انسانوں کو پاک کرتے ہیں اور ان کو عالم بالا سے جوڑتے ہیں۔

پھر اس نداء میں کہا جاتا ہے کہ اچھے اعمال کرو' یعنی اس زمین کی اصلاح کرو' لہٰذا کام بھی بشریت ہی کا تقاضا ہے لیکن لوگ اچھے کام بھی کرتے ہیں اور برے کام بھی کرتے ہیں جبکہ رسول لوگوں کو اچھے کاموں پر آمادہ کرتے ہیں۔ رسول لوگوں کے اعمال کے لیے ضابطہ متعین کرتے ہیں' اعمال کے مقاصد متعین کرتے ہیں اور اپنے اعمال کے ذریعہ وہ عالم بالا سے مربوط ہو جاتے ہیں۔

رسولوں کا یہ کام نہیں ہوتا کہ وہ بشریت سے پاک ہو جائیں بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ بشریت کو سربلند کر دیں۔ اس کے لیے بلند افق اور بلند مقاصد مقرر کر دیں۔ اللہ کی یہی خواہش ہے کہ دنیا میں انسان صالح' پاک اور برگزیدہ ہوں اور رسول ان کے قائد ہوں اور انسانوں کو بلندیوں تک پہنچائیں اور آخرت میں اللہ ہی ہے جو اپنے نہایت ہی باریک پیمانے سے ان کے اعمال کی قدر و قیمت مقرر کرے گا۔

اِنِّيۡ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ (۲۳: ۵۱) "تم جو کچھ بھی کرتے ہو' میں اسے خوب جانتا ہوں"۔ یہاں زمانے کی دوریوں کو مٹا دیا جاتا ہے اور مسافت کی دوریاں ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ پیغام ایک ہے جسے یہ رسول لے کر آئے۔ ان کا مزاج ایک ہے اور وہ دوسرے لوگوں سے ممتاز ہیں اور تمام رسولوں کا رخ ایک ہی طرف ہے۔

وَاِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمۡ فَاتَّقُوۡنِ (۲۳: ۵۲) "اور یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں بس مجھ ہی سے ڈرو"۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۵۰ ایک نظر میں

یہ اس سورہ کا تیسرا سبق ہے۔ رسولوں کے حالات بیان کرنے کے بعد اب اس میں لوگوں کے حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ جب رسول آخر الزمان تشریف لائے تو لوگوں کے یہ حالات تھے۔ لوگوں کے درمیان شدید مذہبی اختلافات تھے۔ عقیدہ توحید جسے تمام رسول بالاتفاق بیان کرتے آئے تھے اس میں بھی اختلافات تھے۔

رسول خاتم النبیین جس حق کو لے کر آئے ہیں اس کے ساتھ بھی لوگوں نے ایسا غفلت کا سلوک کیا حالانکہ انہیں چاہئے تھا کہ وہ اس نئی دعوت اور اس کے ماننے والوں پر غور کرتے۔ اہل ایمان کا کردار ان کے سامنے تھا۔ وہ اللہ کی بندگی کرتے تھے، نیک کام کرتے تھے، خوف آخرت رکھتے تھے۔ اس تصور آخرت سے ان کے دل کانپتے رہتے تھے کہ ایک دن انہوں نے اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ یہ دو کردار ہیں دو قسم کے، ان لوگوں کے درمیان مکمل تقابل ہے۔ اہل ایمان جاگتے ہیں اور ڈرتے ہیں اور اہل کفر غافل اور مدہوش ہیں۔ اس سورہ کے اس سبق میں ان کے موقف پر تنقید کی گئی ہے۔ ان کے شبہات کا جواب دیا گیا ہے۔ ان کے وجدان کو جگایا گیا ہے کہ وہ انفس و آفاق میں موجود دلائل ایمان پر غور کریں۔ پھر ان کے ہاں مسلمہ عقائد کو لیا گیا ہے اور انہی سے ان کے خلاف حجت قائم کی گئی ہے۔ آخر میں یہ کہہ دیا گیا ہے کہ چھوڑو انہیں ان کے حال پر کہ یہ اپنے مقررہ انجام تک پہنچ جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا گیا ہے کہ آپ اپنی راہ پر گامزن رہیں اور ان کے اس عناد اور ہٹ دھرمی سے دل گرفتہ و پریشان نہ ہوں بلکہ ان کے برے رویے کے مقابلے میں اچھا رویہ اختیار کریں اور شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ طلب کریں جو ان لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔

---()()()---

# درس نمبر ۱۵۰ تشریح آیات

## ۵۳--- تا--- ۹۸

---

فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَذَرْهُمْ فِىْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۵۴﴾ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۵۵﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِى الْخَيْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

"مگر بعد میں لوگوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے۔ اچھا' تو چھوڑو انہیں' ڈوبے رہیں اپنی غفلت میں ایک وقت خاص تک۔ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو انہیں مال و اولاد سے مدد دیئے جا رہے ہیں تو گویا انہیں بھلائیاں دینے میں سرگرم ہیں؟ نہیں' اصل معاملے کا انہیں شعور نہیں ہے"۔

رسولوں کے بیان میں یہ کہا گیا کہ وہ ایک ہی امت تھے۔ اور ان کا کلمہ بھی ایک تھا اور ان کی دعوت بھی ایک تھی۔ ان کی بندگی اور عبادت بھی ایک اللہ کے لیے تھی۔ ان کی نظریاتی سمت بھی ایک تھی۔ لیکن رسولوں کے بعد لوگ گروہوں اور فرقوں میں بٹ گئے تھے اگر وہ گروہ بن گئے تھے اور وہ کسی ایک منہاج پر متفق نہ رہے۔

لوگوں کے اس افتراق کی تصویر کشی قرآن مجید نہایت عجیب حسی انداز میں کرتا ہے۔ انہوں نے آپس میں اپنے دین کو پھاڑ پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ ہر ایک نے ایک ایک ٹکڑا لے لیا۔ ہر فرقہ اور ہر جماعت کے ہاتھ جو ٹکڑا آیا وہ اس کو لے کر بھاگ گئی۔ بس وہ خوش تھی کہ اصل ٹکڑا اسی کے ہاتھ میں ہے اور یوں اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ہر گروہ اپنی جگہ اس ٹکڑے کو لے کر بیٹھ گیا اور دوسرے امور کے بارے میں سوچنا بھی بند کر دیا مبادا اس طرح ان کے دماغ تک کوئی بات یا کوئی دلیل یا کوئی روشنی پہنچ جائے۔ بس اپنے ہاں جو کچھ تھا اس میں مست ہو گئے اور ہر قسم کی روشنی اور ہدایت سے اپنے آپ کو محروم کر لیا۔ تحزب اور فرقہ بندی کی یہ کیا خوب تصویر کشی ہے۔

یہ تصویر کھینچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں خطاب کیا جاتا ہے۔

فَذَرْهُمْ فِي غَمْرَتِهِمْ حَتّٰي حِيْنٍ (۲۳ : ۵۴) "تو چھوڑو انہیں' ڈوبے رہیں اپنی غفلت میں ایک وقت تک"۔ یعنی ان کو چھوڑ دیں کہ جن حالات میں وہ مگن ہیں ان میں ڈوبے رہیں اور ان کا جو انجام ہونے والا ہے وہ

اچانک ان کو آلے ۔کیونکہ مہلت کے بعد یہ انجام حتمی ہے ۔

یہاں قرآن ان کی غفلت اور جمود پر بطور مذاق یہ کہتا ہے کہ ان لوگوں کو جو مہلت دی جا رہی ہے اور مال و دولت اور آل و اولاد سے جو نوازا جا رہا ہے تو اس کے بارے میں یہ کیا سمجھ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے بہت خوش ہے اور انہیں نواز رہا ہے اور یہ مقبول بندے ہیں کہ ان پر عطا کی بارش ہو رہی ہے ۔

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ (۲۳:۵۵) نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ (۲۳:۵۶) "کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو انہیں مال و اولاد سے مدد دیئے جا رہے ہیں تو گویا انہیں بھلائیاں دینے میں سرگرم ہیں" ۔بلکہ یہ تو ان کے لیے آزمائش ہیں ۔

بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (۲۳:۵۶) "اصل معاملے کا انہیں شعور نہیں ہے" ۔یعنی وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اس مال اور اولاد کے بعد ان پر کیا مصیبت آنے والی ہے اور یہ مصیبت کس قدر عام اور ہمہ گیر ہوگی وہ" ۔

---

ایک طرف یہ لوگ ہیں جو غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور گمراہ ہیں' ان کے مقابلے میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ہر وقت بیدار ہیں اور رب کے معاملے میں بہت محتاط ہیں ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَ الَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿۶۰﴾ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾

"حقیقت میں جو لوگ اپنے رب کے خوف سے ڈرنے والے ہوتے ہیں' جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں' جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے' اور جن کا حال یہ ہے کہ دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل ان کے اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے' وہی بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے اور سبقت کر کے انہیں پالینے والے ہیں" ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی دل پر ایمان کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں ۔ اس کا احساس تیز ہو جاتا ہے ۔ انتہائی خوف اور حد درجہ احتیاط اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے اور اس دنیا میں انسان کمال اور بلندیوں کے بارے میں سوچتا ہے ۔ آخرت کی فکر کرتا ہے اگرچہ وہ اس دنیا میں خدا تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ فرائض و واجبات پر عمل پیرا ہوتا ہے یعنی یہاں رہبانیت اختیار نہیں کرتا ۔

ذرا ملاحظہ کیجئے ۔یہ مومن اللہ کے خوف کے مارے میں کانپ رہے ہیں ۔نہایت احتیاط سے زندگی بسر کر رہے ہیں ۔

اللہ کی آیات پر ایمان لائے ہوئے ہیں - اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کر رہے - اللہ کی طرف سے عائد شدہ فرائض اور واجبات ادا کرتے چلے جاتے ہیں - دیگر تمام عبادات میں حد استطاعت تک مشغول ہیں - لیکن ان سب کاموں کے باوجود - وَ الَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ (۲۳: ۶۰) "دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل ان کے اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے" - ان کو احساس ہوتا ہے کہ اللہ کے معاملے میں ان سے ضرور کوئی نہ کوئی کوتاہی ہوئی ہوگی - حالانکہ وہ مقدور بھر بندگی کرتے رہے ہیں مگر ان کی نظروں میں ان کا عمل قلیل ہوتا ہے -

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے کہا: اے رسول اللہ' وَ الَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ (۲۳: ۶۰) "وہ لوگ جو دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل ان کے کانپ رہے ہوتے ہیں" سے کیا وہ شخص مراد ہے جو چوری کرتا ہے' زنا کرتا ہے اور شراب پیتا ہے لیکن پھر وہ اللہ سے ڈرتا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا نہیں صدیق کی بیٹی' بلکہ مراد وہ شخص ہے جو نماز پڑھتا ہے' جو روزے رکھتا ہے' جو اپنا مال خرچ کرتا ہے اور پھر بھی اللہ سے ڈرتا ہے - (ترمذی)

ایک مومن کا دل یہ شعور رکھتا ہے کہ اللہ کا ہاتھ اس کے اوپر ہے - وہ محسوس کرتا ہے کہ ہر سانس میں اللہ کی نعمتیں اس پر بارش کی طرح برس رہی ہیں - صرف دل کی حرکت پر ہی غور کر لو کہ کس قدر عظیم رحمت ہے اس لیے مومن اپنی بندگی و طاعت کو کم سمجھتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اللہ کے رحم و کرم کے مقابلے میں اس کی جانب سے بندگی کچھ بھی نہیں ہے - وہ اپنے وجود کے ذرے ذرے میں اللہ کے جلال اور عظمت کو پاتا ہے - اس کے شعور میں یہ بات اچھی طرح بیٹھی ہوئی ہوتی ہے کہ ہر چیز میں اللہ کا ہاتھ ہے اور اسی لیے وہ ہر وقت خائف رہتا ہے' کانپتا رہتا ہے - اسے یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ اچانک وہ اللہ کے سامنے پیش ہو اور اس کی تقصیرات کی گٹھڑی پیش ہو - اور اس کے سامنے کھلے اور نتیجہ یہ سامنے آئے کہ اس نے عبادت کا حق ادا نہ کیا ہو اور اللہ کے انعامات و اکرامات کا شکر اس نے ادا نہ کیا ہو تو اس کا پھر کیا حال ہو گا اور کیا جواب ہو گا؟

ایسے لوگ ہی دراصل بھلائی کے کاموں میں آگے بڑھتے ہیں اور ایسے ہی لوگ بھلائی میں سب سے آگے ہوتے ہیں اور ایسے ہی لوگ اسلام کے ہراول دستے کا کام کرتے ہیں - بیدار مغز' فعال اور آگے بڑھنے والے' مطیع فرمان - ان کے مقابلے میں وہ لوگ کسی کام کے نہیں ہوتے جو عیش و طرب میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں - جو سخت غفلت میں ہوتے ہیں' جو اس غرے میں ہوتے ہیں کہ وہ تو اللہ کی طرف سے بالارادہ مراعات یافتہ ہیں - ان کے لیے بھلائی ہی بھلائی ہے - اس طرح غافل ہیں کہ جس طرح شکار اپنی غفلت میں چر رہا ہوتا ہے لیکن دراصل وہ اپنے پھندے کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے - وہ سمجھتا ہے کہ اس کو غذا مل گئی مگر اچانک پھندے میں گرفتار ہو جاتا ہے - لوگوں کے اندر بے شمار لوگ ہیں جو ایسے پھندے میں گرفتار ہیں' خوشحالی ان کو غافل کر دیتی ہے - اللہ کی نعمتیں ان کو برے کاموں میں مشغول کر دیتی ہیں - مالداری ان کو سرکشی پر آمادہ کرتی ہے' غرور ان کو آپے سے باہر کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے برے انجام کا شکار ہو جاتے ہیں -

یہ ہے وہ بیداری جو اسلام ہر زندہ دل انسان میں پیدا کرتا ہے اور جب ایمان دلوں میں بیٹھ جاتا ہے تو وہ دلوں میں بیداری اور تقویٰ کو ابھارتا رہتا ہے - یہ کوئی ایسا مقام نہیں ہے جسے حاصل نہ کیا جا سکتا ہو - یہ کوئی ایسی حالت نہیں ہے

جس میں عام سے عام آدمی نہ داخل ہو سکتا ہو۔ بس صرف یہ احساس و شعور پیدا کرنا ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے' ہم اس کے ساتھ مربوط ہیں۔ ہمارے ظاہر و باطن سے وہ اچھی طرح خبردار ہے۔ یہ احساس اور شعور پیدا کرنا' انسان کے حد استطاعت میں ہے بشرطیکہ ایمان کا چراغ قلب میں روشن ہو جائے۔

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾

"ہم کسی شخص کو اس کی مقدرت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے' اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے' جو (ہر ایک کا حال) ٹھیک ٹھیک بتا دینے والی ہے' اور لوگوں پر ظلم بہرحال نہیں کیا جائے گا"۔

اللہ نے انسان پر کچھ فرائض عائد کیے ہیں' لیکن اللہ نے یہ فرائض اور تکالیف انسانی استعداد کے مطابق عائد کی ہیں۔ اور یہ بات اللہ خوب جانتا ہے کہ انسان اس کی مخلوق ہے اور حساب بھی اللہ اس عمل کا لے گا جو ان کے حد استطاعت میں ہو۔ اللہ انسانوں پر یہ ظلم نہیں کرتا کہ ان پر اس قدر بوجھ لاد دے جس کو وہ اٹھا نہیں سکتے۔ نہ اللہ ان کے اعمال میں سے کسی بھی چیز کو چھوڑ دے گا یا ساقط کر دے گا۔ جو بھی وہ کریں گے اس کا حساب درج ہو گا۔

يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ (۲۳ : ۶۲) "ٹھیک ٹھیک بتا دے گی"۔ ہر چیز کو وہ کھول کر رکھ دے گی۔ اللہ بہترین حساب کرنے والا ہے۔ پھر لوگ غفلت کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ ان کے دل حقیقت سے بے خبر ہیں۔ ان میں وہ روشنی داخل ہی نہیں ہوئی جو دلوں کو زندہ کر دیتی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اس روشنی کو چھوڑ کر دوسرے کاموں میں مشغول ہوگئے ہیں اور اپنی ان مشغولیات میں بہت ہی آگے جا چکے ہیں جس وقت انہیں ہوش آئے گا تو ان کے سامنے عذاب الیم ہو گا اور اس عذاب کے ساتھ توبیخ اور سرزنش بھی ہوگی اور ان کو ایک حقارت انگیز سلوک کا سامنا کرنا ہو گا۔

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْــَٔرُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَا تَجْــَٔرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿۶۶﴾ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿۶۷﴾

"مگر یہ لوگ اس معاملے سے بے خبر ہیں اور ان کے اعمال بھی اس طریقے سے (جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) مختلف

ہیں - (وہ اپنے یہ کرتوت کیے چلے جائیں گے) یہاں تک کہ جب ہم ان کے عیاشوں کو عذاب میں پکڑ لیں گے تو پھر وہ ڈکرانا شروع کر دیں گے اب بند کرو اپنی فریاد و فغان 'ہماری طرف سے اب کوئی مدد تمہیں نہیں ملتی - میری آیات سنائی جاتی تھیں تو تم (رسول کی آواز سنتے ہی) الٹے پاؤں بھاگ نکلتے تھے 'اپنے گھمنڈ میں اس کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے 'اپنی چوپالوں میں اس پر باتیں چھانٹتے اور بکواس کیا کرتے تھے"۔

یعنی یہ لوگ جن حالات میں مشغول ہیں ان میں وہ اس لیے غرق نہیں ہیں کہ پیغمبر ان کو ان کی طاقت سے زیادہ احکام دیتے ہیں بلکہ اصل سبب یہ ہے کہ یہ لوگ غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اس سچائی کی طرف متوجہ ہی نہیں ہیں جسے قرآن کریم پیش کرتا ہے بلکہ وہ ان دوسری راہوں پر بہتے چلے جاتے ہیں - اور یہ راہیں اسلام سے متضاد راہیں ہیں -

وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ (۲۳:۶۳) "اور ان کے اعمال اس طریقے سے مختلف ہیں اور یہ لوگ وہ اعمال کرتے چلے جاتے ہیں" - اب اس منظر کو پیش کیا جاتا ہے کہ جب اللہ کا عذاب ان کو آلیتا ہے - یہ عذاب بہت ہی تباہ کن ہے 'اچانک ہے دفعتہ ان کو گھیر لیتا ہے -

حَتّٰى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْئَرُوْنَ (۲۳:۶۴) "یہاں تک کہ جب ہم ان کے عیاشوں کو عذاب میں پکڑ لیں گے تو پھر وہ ڈکرانا شروع کر دیں گے" - مالدار لوگوں کی روش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ بسا اوقات عیاشیوں 'مدہوشیوں اور خرمستیوں میں بہت زیادہ غرق ہوتے ہیں اور یہ لوگ ان خرمستیوں کے انجام کی کوئی پرواہ نہیں کرتے - اب ذرا ان کی حالت کو دیکھ لو کہ ان کو اچانک خدا کا عذاب آلیتا ہے اور وہ چیخنے چلانے لگ جاتے ہیں - اب وہ فریاد کرتے ہیں اور رحم کے طلبگار ہوتے ہیں - ان کی یہ حالت اس لیے ہوتی ہے کہ عیاشی میں بدمست 'غافل اور متکبر اور مغرور تھے - اب اس شور و فغاں اور فریاد پر کچھ نرمی کرنے اور رحم کرنے کے بجائے ان کی تواضع زجر و توبیخ اور ڈانٹ ڈپٹ سے کی جاتی ہے -

لَا تَجْئَرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ (۲۳:۶۵) "اب بند کرو 'اپنی فریاد و فغاں 'ہماری طرف سے اب کوئی مدد تمہیں نہیں ملتی" - یہ منظر سامنے ہے - ان مجرموں کو ڈانٹ پلائی جا رہی ہے 'ان کو کسی قسم کی امداد اور نرمی سے مایوس کن جواب دیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ان کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ وہ کس طرح غفلت میں غرق تھے اور دعوت اسلامی کے بارے میں ان کا ردعمل کیا تھا -

قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ (۲۳:۶۶) "میری آیات سنائی جاتی تھیں تو تم الٹے پاؤں بھاگتے تھے" - یعنی الٹے پاؤں ہٹ کر تم بھاگ جاتے تھے گویا جو کچھ پڑھ کر تمہیں سنایا جا رہا تھا وہ کوئی خطرناک بات تھی یا نہایت ہی مکروہ امر تھا جس سے علیحدہ ہونا ضروری تھا - حق پر ایمان لانے سے وہ اپنے آپ کو بہت ہی برا سمجھتے تھے - نہ صرف یہ کہ وہ الٹے پاؤں پھر کر بھاگ جاتے تھے بلکہ وہ اپنی چوپالوں میں رات کو جو مجالس منعقد کرتے تھے ان میں دعوت اسلامی کے بارے میں سخت نازیبا الفاظ استعمال کرتے تھے اور یہ ان کے لیے مذاق کا ایک موضوع تھا -

یہ لوگ اپنی مجالس میں اسلام کے بارے میں نہایت ہی گھٹیا زبان استعمال کرتے تھے - یہ مجالس وہ خانہ کعبہ میں اپنے بتوں کے ارد گرد بیٹھ کر منعقد کیا کرتے تھے - قرآن کریم ان کی مشغولیتوں کی بہت ہی خوبصورت تصویر کشی کرتا ہے ' جبکہ اب عذاب آنے کے بعد وہ سخت فریاد کرتے ہیں اور مدد طلب کرتے ہیں - قرآن ان کو یاد دلاتا ہے کہ ذرا ان مجالس کو تو یاد کرو - یہ تصویر کشی اس انداز میں کی جاتی ہے گویا یہ واقعہ ابھی ہو رہا ہے اور وہ اسے دیکھ رہے ہیں اور ان ہی حالات میں زندہ ہیں - قیامت کے مناظر کی ایسی تصویر کشی قرآن کا مخصوص اسلوب ہے - (دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن) -

مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر اپنی مجلسوں میں اعتراضات کرتے تھے اور ایام جاہلیت کے اخلاق کے مطابق اپنے اس رویہ پر فخر کرتے تھے ' وہ اس قابل ہی نہ تھے کہ وہ قرآن کی سچائی کو سمجھتے کیونکہ وہ بصیرت کے اندھے تھے - حق قبول کرنا تو کجا وہ تو قرآن کے ساتھ مذاق کرتے تھے - نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر الزامات لگاتے تھے - یہی بات ہر زمانے میں ہوتی رہتی ہے - ہر جاہلیت میں یہی ہوتا ہے اور یاد رہے کہ عرب جاہلیت بھی دوسری جاہلیتوں میں سے ایک جاہلیت تھی اور نزول قرآن تک کئی جاہلیتیں آتی رہیں اور اس کے بعد بھی آتی رہیں گی -

---

قیامت کے اس منظر سے قرآن کریم ان لوگوں کو دنیا کی طرف منتقل کرتا ہے - یہ از سر نو اب دنیا میں ہیں - اس منظر میں خود ان سے پوچھا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ عجیب و غریب اور غیر معقول موقف کیوں اختیار کیا اور یہ کہ وہ کیا معقول وجہ ہے کہ یہ لوگ رسول امین ؐ پر ایمان نہیں لاتے - آخر وہ کیا شبہات ہیں جو ان کے دلوں میں خلجان پیدا کرتے ہیں - اور ان کو راہ ہدایت سے روکتے ہیں،وہ کیا دلائل ہیں جن کی وجہ سے وہ اعراض کرتے ہیں اور اپنی مجالس میں بکواس کرتے ہیں حالانکہ دین اسلام ایک سیدھا سادھا دین حق اور صراط مستقیم ہے -

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦٨﴾ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ۭ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٧١﴾ اَمْ تَسْـَٔــلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ڰ وَّ هُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿٧٢﴾ وَ اِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٧٣﴾ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿٧٤﴾

”تو کیا ان لوگوں نے کبھی اس کلام پر غور نہیں کیا؟ یا وہ کوئی ایسی بات لایا ہے جو کبھی ان کے اسلاف کے پاس نہ آئی تھی؟ یا یہ اپنے رسول سے کبھی واقف نہ تھے کہ (ان جانا پہچانا آدمی ہونے کے باعث) اس سے بدکتے ہیں؟ یا یہ اس بات کے قائل ہیں کہ وہ مجنون ہے؟ نہیں 'بلکہ وہ حق لایا ہے اور حق ہی ان کی اکثریت کو ناگوار ہے۔ اور حق اگر کہیں ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین اور آسمان اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ نہیں 'بلکہ ہم ان کا اپنا ہی ذکر ان کے پاس لائے ہیں اور وہ اپنے ذکر سے منہ موڑ رہے ہیں۔ کیا تو ان سے کچھ مانگ رہا ہے؟ تیرے لیے تو تیرے رب کا دیا ہی بہتر ہے اور وہ بہترین رازق ہے۔ تو تو ان کو سیدھے راستے کی طرف بلا رہا ہے۔ مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ راہ راست سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں“۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیمات پیش کی ہیں اگر ان پر کوئی ذرا بھی غور کرے تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ان سے منہ پھیرے کیونکہ اس کلام میں بہت ہی خوبصورتی 'بہت ہی کمال 'بہت ہی جاذبیت ہے۔ اس کی تعلیمات نہایت ہی فطری اور انسانی عقل و وجدان کے مطابق ہیں۔ اس میں دل و دماغ کی غذا موجود ہے 'ان کا رجحان بہت ہی تعمیری ہے۔ یہ جو نظام و قانون پیش کرتی ہیں وہ نہایت ہی مستحکم ہے۔ ان پوری تعلیمات کو دیکھ کر انسانی فطرت ان کو تسلیم کرتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ منکرین نے اس کلام پر تدبر ہی نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس سے منہ موڑتے ہیں۔

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ (۲۳ : ۶۸) ”تو کیا انہوں نے کبھی اس کلام پر غور نہیں کیا“۔

اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ (۲۳ : ۶۸) ”یا وہ کوئی ایسی بات لایا ہے جو کبھی ان کے اسلاف کے پاس نہ آئی تھی“۔ یا یہ بات کہ پیغمبر کا بھیجنا ان کے اور ان کے آباء کی روایات میں کوئی مانوس بات نہیں ہے۔ ان کی روایات میں یہ بات نہیں ہے کہ کوئی رسول آئے یا ان کے سامنے کوئی کلمہ توحید جیسے افکار و نظریات پیش کرے۔ رسولوں کی تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ رسول پے در پے آتے رہے ہیں اور تمام رسولوں نے یہی تعلیم دی ہے جو نبی آخر الزمان دے رہے ہیں اور ان رسولوں میں سے کئی کے بارے میں وہ معلومات بھی رکھتے ہیں۔

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (۲۳ : ۶۹) ”یا یہ اپنے رسول سے کبھی واقف نہ تھے اور اب یہ اس سے بدکتے ہیں“۔ یعنی ان کے اعراض کا یہ سبب بھی نہیں ہو سکتا ہے کہ جو رسول آیا ہے اس سے ان کی جان پہچان نہیں ہے۔ وہ تو اس رسول کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس کی شخصیت کو جانتے ہیں۔ اس کے نسب کو جانتے ہیں 'وہ اس کی ذات و صفات سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ وہ یقین سے جانتے ہیں کہ وہ صادق و امین ہیں اور رسالت سے پہلے ہی خود انہوں نے ان کو صادق و امین کے لقب سے نوازا تھا۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ (۲۳ : ۷۰) ”یا یہ اس بات کے قائل ہیں کہ وہ مجنوں ہے“۔ ان میں سے بعض بے وقوف آپ پر یہ الزام لگاتے بھی تھے لیکن یہ محض الزام تھا 'دل سے تو وہ بھی جانتے تھے کہ وہ عاقل اور کامل ہے کیونکہ پوری زندگی میں انہوں نے اس کے حوالے سے کسی لغزش کا نہ سنا تھا۔

مذکورہ بالا شبہات میں سے کسی شبہ کی کوئی گنجائش تو نہ تھی تو پھر کیا وجہ ہے کہ یہ حق کو تسلیم نہیں کرتے ۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ سچائی کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ جو سچائی آپ لائے تھے وہ ان سے وہ باطل اقدار چھین رہی تھی جن میں وہ زندگی بسر کرتے تھے جن کو وہ مقدس سمجھتے تھے اور یہ سچائی ان کی خواہشات نفس اور ان کی زندگیوں میں رچی بسی اور جمی ہوئی عادات کے خلاف تھی ۔

بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ (۲۳ : ۷۰) "بلکہ وہ حق لایا ہے اور حق ہی ان کی اکثریت کو ناگوار ہے" ۔ سچائی تو سچائی ہوتی ہے ۔ وہ ان کی خواہشات کے ساتھ بدل نہیں سکتی ۔ سچائی پر تو زمین و آسمان کا قیام ہے ۔ اس کائنات پر نافذ ہونے والا ناموس دراصل حق ہے ۔ اسی ناموس اور اسی حق کے مطابق یہ کائنات اور اس کے اندر پائے جانے والی تمام موجودات چل رہی ہیں ۔

وَ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ (۲۳ : ۷۱) "اور حق اگر ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین اور آسمان اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا" ۔ حق ایک ہے اور ثابت ہے ۔ خواہشات تو ہر انسان کی جدا جدا ہوتی ہیں ' بدلتی رہتی ہیں ۔ یہ پوری کائنات حق پر چلتی ہے اور اس کی چال ایک ہے ۔ اس کا اصول اور ناموس نہیں بدلتا ۔ اور نہ کسی عارضی خواہش کے مطابق اس ناموس میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے ۔ اگر کائنات کا یہ نظام لوگوں کی تمناؤں اور بدلتی ہوئی خواہشات کے تابع ہو جائے اور لوگوں کی عارضی خواہشات کے پیچھے چلنے لگے تو دنیا کا یہ پورا نظام فساد پذیر ہو جائے ۔ لوگوں کے حالات اور طریقے بگڑ جائیں ۔ اقدار حیات اور حسن و قبح کے پیمانے بدل جائیں ۔ اگر کوئی خوش ہوتا ہے تو اقدار و پیمانے اور ہوتے ہیں اور اگر کوئی خفا ہوتا تو اقدار و پیمانے اور ہوتے ۔ اسی طرح لوگوں کے پیمانے ان کی پسند و ناپسند ' رغبت اور خوف ' خوشی اور غم کے مختلف حالات میں بھی بدلتے رہتے ہیں کیونکہ انسانی مزاج ایک حال میں نہیں رہتا ۔ اس پر عوارض آتے رہتے ہیں جبکہ حق اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور یہ نظام کائنات اور اس کے مقاصد یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ان کے نظام میں ثبات ' یکجہتی اور تسلسل قائم رہے اور نہایت ہی پختہ اور ناقابل تغیر ضوابط کے مطابق یہ کائنات چلے اور تغیرات اور بے یقینی سے اس کا نظام پاک ہو ۔

اس کائنات کا نظام چونکہ حق پر ہے اور اس کو حق کے مطابق ہی چلایا جا رہا ہے ۔ چنانچہ انسانی زندگی کو چلانے کے لیے بھی اللہ نے ایک سچائی پر مشتمل ضابطہ مقرر کر دیا گیا ہے ۔ یہ ضابطہ بھی اس ذات نے مقرر کیا ہے جو اس پوری کائنات کو چلا رہی ہے ۔ جس طرح کائنات کا ضابطہ اٹل ہے اسی طرح یہ انسانی ضابطہ بھی اٹل ہے کیونکہ انسان بھی کائنات کا ایک جزء ہے تاکہ انسانی طرز عمل اور اس کائنات کی رفتار کے درمیان ہم آہنگی ہو ۔ اس لیے حق کا تقاضا یہ ہے کہ اس کائنات کا شارع ہی انسانی ضابطہ حیات کا شارع اور مصنف ہو تاکہ انسان کی چلت کائنات کی چلت کے ساتھ ہم آہنگ ہو ۔ اگر انسانوں کی زندگی کی ضابطہ بندی ان کی خواہشات پر چھوڑ دی جائے تو انسانوں کی زندگی کا نظام فساد پذیر ہو جائے گا اور اس میں خلل واقع ہو جائے گا ۔

وَ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ (۲۳ : ۷۱) "اور حق کہیں ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین و آسمان اور ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا" - لہذا یہ نظام کلی طور پر حق کے تابع ہے ' حق کا مطیع فرمان ہے اور مدبر کائنات کی مشیت کے مطابق چل رہا ہے -

یہ امت جس کے پاس یہ حق آیا ہے' اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ وہ اس کی مطیع ہو جائے - ایک تو یہ کہ یہ ایک حق بات ہے' دوسرے یہ کہ اس امت کے لیے یہ بہت ہی بڑا اعزاز بھی ہے - پھر یہ سچائی اس امت کی شناخت بھی ہے - حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلام نہ ہوتا تو اقوام عالم میں عربوں کی اور کیا شناخت ہوتی اور اسلام نہ ہوتا تو مسلمان ہوتے کہاں؟

اسلام سے قبل تاریخ اقوام میں عربوں کا کوئی ذکر نہ تھا اور نہ ان کا کوئی کردار تھا - پھر جب تک عرب قرآن کا دامن تھامے رہے ان کی آواز پوری کائنات میں گونج رہی تھی اور جب عربوں نے قرآن کو چھوڑا تو تاریخ امم میں ان کا کردار بھی گھٹتا گیا اور مٹتا گیا حتیٰ کہ وہ قابل ذکر ہی نہ رہے اور نہ آئندہ کبھی وہ کوئی مقام حاصل کر سکتے ہیں الا یہ کہ وہ اپنے اصل عنوان کو اختیار کرلیں اور اپنی اصل شناخت کو اختیار کرلیں -

چونکہ ان لوگوں کو دعوت حق دی گئی اور انہوں نے اس کا انکار کیا اور الٹا داعی حق پر الزام لگانا شروع کر دیا اور غلط موقف اختیار کیا تو اس مضمون کی مناسبت سے اب روئے سخن ان کے اس غلط موقف کی طرف پھر جاتا ہے - ان کے اس غلط رویے کی مذمت کی جاتی ہے اور وہ رسول امین پر جو الزامات لگاتے تھے ان کی تردید کی جاتی ہے -

اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا (۲۳ : ۷۲) "کیا تو ان سے کچھ مانگ رہا ہے" ؟ کیا اس ہدایت و تعلیم کی کوئی بھاری فیس تم مانگ رہے ہو اور وہ اس کی ادائیگی کی استطاعت نہیں رکھتے اور اس سے بھاگ رہے ہیں - تم تو ان سے کچھ بھی طلب نہیں کرتے ہو کیونکہ تمہارا اجر تو اللہ پر ہے -

فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ هُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۲۳ : ۷۲) "تیرے لیے تو رب کا دیا بہتر ہے اور وہ بہترین رازق ہے" - کوئی نبی لوگوں سے کسی معاوضے کا طلبگار نہیں ہوتا جبکہ انسان بہت ہی ضعیف 'فقیر اور محتاج ہوتے ہیں - نبی تو اللہ سے متصل اور مربوط ہوتا ہے جس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہے بلکہ نبی کے متبعین بھی اس دنیا کے مفادات میں سے کسی مفاد کے طلبگار نہیں ہوتے کیونکہ ان کی نظریں بھی اس اجر پر ہوتی ہیں جو اللہ کے ہاں ان کے لیے تیار ہے اور دنیا میں تو قلیل ہو یا کثیر ہو' وہ اس پر راضی ہوتے ہیں - واقعہ یہ ہے کہ جب انسان کی روح اللہ سے مل جائے تو اس کے لیے پھر یہ پوری کائنات اور مافیہا پر کاہ کے برابر نہیں رہتی - بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ تو ان لوگوں کی راہنمائی اس نظام زندگی کی طرف کر رہے ہیں جو نہایت ہی مستحکم ہے -

وَ اِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۳ : ۷۳) "اور تو' تو ان کو سیدھے راستے کی طرف بلا رہا ہے" - آپ ان کو اس ناموس فطرت کی طرف بلا رہے ہیں جو اس کائنات اور خود ان کی فطرت پر حاکم ہے - ان کو اس پوری کائنات کی طرف بلا رہے ہیں اور ان کو اس قافلہ وجود کے ساتھ ہم آہنگ کر رہے ہیں اور سیدھا خالق کائنات

کی طرف لے جارہے ہیں۔

ان لوگوں کی حالت بھی ایسی ہے جس طرح ان تمام لوگوں کی ہوتی ہے جو ایمان نہیں لاتے اور راہ راست سے بھٹک جاتے ہیں۔

وَ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ (۲۳:۷۴) "مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ راہ راست سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں"۔ اگر یہ ہدایت پر ہوتے تو وہ اپنے دل و دماغ سے اس زندگی پر غور کرتے، جس کے نتیجے میں انسان حتمی طور پر آخرت پر ایمان لاتا ہے۔ ایک ایسے جہان کا وہ ضرور قائل ہو جاتا ہے جس میں یہ زندگی اپنی نہایت ہی مکمل حالت میں ہوگی اور جس کے اندر لوگوں کے ساتھ مکمل انصاف ہوگا کیونکہ آخرت ناموس کائنات کا ایک آخری حلقہ ہے جس میں اللہ کی تدبیر کائنات اپنے اختتام کو پہنچے گی۔

---()()()---

یہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے، جو راہ راست سے ہٹے ہوئے ہیں، اگر ان کو بہت دولت دی جائے اور آزمایا جائے تو بھی وہ راہ راست پر نہیں آتے اور اگر ان کو مشکلات سے دوچار کر کے آزمایا جائے تو بھی راہ راست پر نہیں آتے۔ اگر ان کو نعمت سے نوازا جائے تو کہتے ہیں۔

اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِیْنَ (۵۵) نُسَارِعُ لَهُمْ فِی الْخَیْرٰتِ (۲۳:۵۶)

"یہ جو ہم نے انہیں مال اور اولاد دے کر امداد دی ہے وہ اس لیے کہ ہم ان کے لیے بھلائی میں جلدی کرنے والے ہیں"۔ اور اگر ان پر عذاب آجائے تو بھی ان کے دل نرم نہیں ہوتے، ان کے ضمیر نہیں جاگتے اور اس مصیبت کو دور کرنے کے لیے اللہ کے سامنے عاجزی نہیں کرتے کہ وہ ان کی اس مصیبت کو دور کرے۔ یہ اسی طرح رہیں گے یہاں تک کہ قیامت کے دن ان کو عذاب الٰہی آلے اور وہاں مایوس اور حیران رہ جائیں۔

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ۝ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا یَتَضَرَّعُوْنَ ۝ حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِیْدٍ اِذَا هُمْ فِیْهِ مُبْلِسُوْنَ ۝ ۲۷ ع

"اگر ہم ان پر رحم کریں اور وہ تکلیف جس میں آج کل یہ مبتلا ہیں، دور کر دیں تو یہ اپنی سرکشی میں بالکل ہی بہک جائیں گے۔ ان کا حال تو یہ ہے کہ ہم نے انہیں تکلیف میں مبتلا کیا، پھر بھی یہ اپنے رب کے آگے نہ جھکے اور نہ عاجزی اختیار کرتے ہیں۔ البتہ جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی کہ ہم ان پر سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے تو یکایک تم دیکھو گے کہ اس حالت میں وہ ہر خیر سے مایوس ہیں"۔

یہ ہے بعض لوگوں کا مستقل رویہ ۔ یہ سخت دل لوگ ہوتے ہیں ۔ اللہ سے غافل ہوتے ہیں ' آخرت کی تکذیب کرتے ہیں ۔ مشرکین مکہ ایسے ہی لوگوں میں سے تھے جن سے حضور اکرمؐ کو سابقہ تھا ۔

اگر کسی پر مصیبت آجائے اور وہ اللہ کے سامنے عاجزی اور تضرع کرنے لگے تو یہ رجوع الی اللہ کی دلیل ہوتا ہے ۔ یہ اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے دل میں خدا کا شعور ہے اور یہ تصور بھی ہے کہ آخری سہارا اللہ ہے ۔ جو دل اس طرح اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ نرم ہوتا ہے ' بیدار ہوتا ہے اور نصیحت اس کو فائدہ دیتی ہے ۔ یہی احساس انسان کو غفلت اور لغزش سے بچاتا ہے ۔ ایسے ہی لوگ مصائب اور مشکلات سے فائدہ اور نصیحت حاصل کرتے ہیں ۔ لیکن جب کوئی اپنی گمراہی اور سرکشی میں بہت ہی آگے چلا جائے اور اندھا ہو جائے تو اس شخص سے مایوس ہو جانا چاہئے ۔ اس کی اصلاح کی پھر کوئی امید نہیں رہتی ۔ اسے چھوڑ دیا جائے کہ وہ عذاب آخرت کا شکار ہو اور یہ آخرت بہت ہی اچانک ہو گی ۔ اچانک ہر کسی کے سامنے آجائے گی اور تمام لوگ اس وقت حیران و پریشان ہوں گے اور اس بات سے مایوس ہوں گے کہ اب کوئی خلاصی ممکن ہے ۔

---

ایک بار پھر ان کے شعور اور وجدان کو جگانے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ انفس و آفاق میں دلائل ایمان کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے ۔ ایسے امور کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو پیش پا افتادہ ہیں ۔

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ وَ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ وَ هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

"وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں سننے اور دیکھنے کی قوتیں دیں اور سوچنے کو دل دیئے مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو ۔ وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا ' اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے ۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے ۔ گردش لیل و نہار اسی کے قبضہ قدرت میں ہے ۔ کیا تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ؟"

انسان اگر اپنی تخلیق اور اپنی شکل و صورت ہی پر غور کرے ' اور اپنے اعضاء و جوارح پر غور کرے ' اپنے حواس اور اپنی عقل پر غور کرے اور اللہ نے انسان کو جو دوسری بے شمار صلاحیتیں دی ہیں صرف ان پر غور کرے تو اس کے لیے ہدایت تک پہنچنا کوئی مشکل امر نہیں ہے ۔ ان عجیب امور پر غور کر کے وہ خالق کائنات کی معرفت حاصل کر سکتا ہے کیونکہ اللہ کے علاوہ کون ہے جس نے یہ معجزے دکھائے ہیں ۔ اس کائنات میں بے شمار اعجوبے ہیں ' چھوٹے بھی ہیں اور بڑے بھی ۔

ذرا انسان صرف اپنی قوت سماعت ہی پر غور کرے ۔ یہ قوت کس طرح کام کرتی ہے ۔ کس طرح یہ آوازوں کو وصول کرتی ہے اور آوازوں سے معانی اخذ کرتی ہے ۔ ذرا قوت باصرہ پر غور کرے ۔ انسان کس طرح دیکھتا ہے ۔ کس طرح آنکھ روشنی کو لیتی ہے اور تصاویر دیکھتی ہے ۔ پھر انسان کا دماغ اور اس کا ادراک ' اشیاء اور شکلوں کی قدر و قیمت

کا تعین کرتا ہے۔ مفہوم 'اقدار اور پیمانوں کا تعین کرتا ہے۔ غرض تمام مشاعر و مدرکات اور محسوسات پر اگر غور کیا جائے تو ہر ایک ایک اعجوبہ ہے۔

صرف حواس خمسہ اور ان کے کام کرنے کے طریقے پر ہی اگر غور کیا جائے تو عالم بشریت کے اندر یہ ایک عظیم معجزہ ہے۔ رہی ان قوتوں کی تخلیق اور پھر موجودہ انداز اور شکل و صورت پر ان کی ساخت اور پھر اس پوری کائنات کے ساتھ ان کی ہم آہنگی' کہ اگر اس کائنات کی قوتوں اور انسانی قوتوں میں جو نسبتیں پائی جاتی ہیں' ان میں سے ایک نسبت بھی اگر غائب ہو جائے تو پورا نظام ہی بگڑ جائے 'کان سن نہ سکے' آنکھ دیکھ نہ سکے' لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت مدبرہ نے ان کو ایسا بنایا ہے کہ یہ قوتیں اس کائنات میں کام کر سکتی ہیں اور کائنات کی قوتوں کو انسانی قوتوں کے ساتھ ہم آہنگ بنایا ہے لیکن انسان ایسا ناشکرا ہے کہ وہ اللہ کے ان انعامات پر غور ہی نہیں کرتے۔

قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۲۳ : ۷۸) "تم میں سے کم لوگ ایسے ہیں جو شکر کرتے ہیں"۔ شکر تب ہی ہو سکتا ہے کہ انسان کسی نعمت کے بخشنے والے کے بارے میں جانتا ہو۔ اس کی ذات و صفات کو جانتا ہو۔ پھر وہ اللہ وحدہ کی عبادت اور بندگی بھی کرتا ہو اور پھر وہ یہ بات بھی جانتا ہو کہ یہ قوتیں انسان کو اسی ذات و الاصفات نے دی ہیں جن کے ذریعے وہ اس کرۂ ارض پر عیش و عشرت سے ہمکنار ہے اور ہر چیز سے استفادہ کر رہا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۳ : ۷۹) "وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا اور اس زمین پر اپنی طرف سے خلیفہ اور مختار بنایا۔ اور پھر تمہیں اس نے دیکھنے اور سننے کی قوت وہی' سوچنے کی قوت دی اور تمام دوسری صلاحیتیں دیں جو یہاں فریضہ خلافت ارضی کی ادائیگی کے لیے ضروری تھیں۔

وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۲۳ : ۷۹) "اور اسی کی طرف سمیٹے جاؤ گے"۔ پھر وہاں وہ تم سے حساب و کتاب لے گا کہ تم نے زمین پر فریضہ خلافت اللہ کی ہدایات کے مطابق ادا کیا یا نہیں۔ اچھے کام کیے یا برے کام کیے۔ ہدایت پر رہے یا ضلالت کی راہ اختیار کی۔ کیونکہ تم کو عبث پیدا نہیں کیا گیا۔ اور نہ ہی اس زمین پر تمہیں شتر بے مہار پیدا کر کے چھوڑ دیا گیا ہے۔ بلکہ تمہاری تخلیق ایک حکمت اور تدبیر کے تحت ہوئی ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ (۲۳ : ۸۰) "وہی ہے جو زندگی دیتا اور موت دیتا ہے"۔ موت اور حیات ایسے واقعات ہیں جو رات اور دن نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ موت و حیات کا مالک صرف اللہ ہے۔ انسان جو زیادہ ترقی یافتہ حیوان ہے اس بات پر قدرت نہیں رکھتا کہ زندگی کا ایک خلیہ پیدا کر سکے اور انسان کسی زندہ مخلوق سے زندگی چھین بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ جو ذات حیات عطا کرتی ہے وہی اس کی حقیقت کو جانتی ہے۔ یہ اسی ذات کی قدرت میں ہے کہ وہ زندگی بخشے اور زندگی واپس لے۔ انسان کبھی اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ کسی سے زندگی چھن جائے لیکن درحقیقت انسان کسی سے اس کی زندگی چھین نہیں سکتا۔ حقیقت میں حیات و ممات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی حیات و ممات کا واکدار "مختار" نہیں ہے۔

وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲۳ : ۸۰) "گردش لیل و نہار اسی کے قبضہ

قدرت میں ہے"۔ وہی اس کا مالک ہے اور وہی اس میں متصرف ہے' جس طرح موت و حیات کا مالک وہی ہے۔ گردش لیل و نہار بھی ایک کائناتی سنت الہیہ ہے جس طرح موت و حیات کی کارکردگی اللہ کی سنت کے مطابق ہے۔ یہ نفس انسانی اور جسم انسانی' یہ کائنات اور یہ افلاک سب کے سب اسی سنت کے مطابق چل رہے ہیں۔ اگر اللہ کسی کے جسم سے حیات نکال دے تو اس کا جسم ٹھنڈا رہ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر اللہ زمین سے روشنی واپس لے لے تو یہ تاریک رہ جائے گی۔ یہاں اللہ نے زندگی پیدا کی اور روشنی پیدا کی اور ان دونوں سے زندگی کی گاڑی رواں دواں ہے۔ اور یہ اس وقت تک چلتی رہے گی جب تک اللہ چاہے گا۔

اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (۲۳ : ۸۰) "کیا تم عقل نہیں رکھتے"۔ کہ تم ان چیزوں کی حقیقت کو سمجھ سکو۔ یہ سب چیزیں تو وجود باری اور صنعت باری کے شواہد ہیں کہ وہ خالق و مدبر ہے اور وہ اس پوری کائنات کو چلا رہا ہے۔

---

اب ان کے ساتھ سلسلہ کلام ختم کر کے اس پر ایک مثبت تبصرہ کیا جاتا ہے کہ بعث بعد الموت اور حساب و کتاب کے بارے میں ان لوگوں کے جو اقوال ہیں ایسے ہی مقولات سابقہ لوگوں کے بھی رہے ہیں۔

بَلۡ قَالُوۡا مِثۡلَ مَا قَالَ الۡاَوَّلُوۡنَ ﴿۸۱﴾ قَالُوۡۤا ءَاِذَا مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ﴿۸۲﴾ لَقَدۡ وُعِدۡنَا نَحۡنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۸۳﴾

"مگر یہ لوگ وہی کچھ کہتے ہیں جو ان کے پیش رو کہہ چکے ہیں۔ یہ کہتے ہیں "کیا جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جائیں گے تو ہم کو پھر زندہ کر کے اٹھایا جائے گا؟ ہم نے بھی یہ وعدے بہت سنے ہیں اور ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا بھی سنتے رہے ہیں۔ یہ محض افسانہ ہائے پارینہ ہیں"۔

بادی النظر میں یہ بات نہایت مکروہ ہے' اس لیے کہ ان آیات بینات اور ان دلائل انفس اور دلائل کائنات کے باوجود لوگ جو ایسی باتیں کرتے ہیں وہ مکروہ باتیں ہیں۔ خود انسانی قوتیں' انسان کی قوت سماعت' اس کی قوت بینائی اور اس کی قوت غور و فکر۔ اے اس لیے دی گئی ہیں کہ وہ ایک ذمہ دار اور مسئول ہستی ہے۔ وہ اپنے اعمال و افکار کے بارے میں ذمہ دار ہے۔ اگر وہ اچھے کام کرے گا تو اس کی جزاء کا مستحق ہو گا اور اگر برے کام کرے گا تو سزا کا مستحق ہو گا۔ دنیا میں صاف نظر آتا ہے کہ بعض اوقات انسان کو وہ جزاء نہیں ملتی جس کا وہ مستحق ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ سزا نہیں ملتی جس کا وہ سزاوار ہوتا ہے لہذا آخرت کا برپا ہونا عقلاً بھی لابدی ہے۔

اللہ ہر وقت مارتا بھی رہتا ہے اور زندگی بھی عطا کرتا رہتا ہے۔ اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے کہ وہ دوبارہ کس طرح اٹھائے گا جبکہ اللہ ہر وقت مختلف چیزوں کو حیات دیتا رہتا ہے اور زندگی کا سلسلہ رواں اس زمین پر جاری ہے۔

رہے اہل کفر تو نہ صرف یہ کہ ان کے قوائے مدرکہ بعث بعد الموت کا ادراک نہیں کر سکے اور اس میں پائے جانے والی اللہ کی حکمت کو سمجھ نہیں سکے بلکہ وہ اس عقیدے کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے آباء و اجداد کو بھی قیام قیامت سے ڈرایا جاتا رہا ہے لیکن ابھی تک تو یہ قیامت آئی نہیں ہے۔

لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۲۳: ۸۳)

"ہم نے بھی یہ وعدے بہت سنے ہیں اور ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا بھی سنتے رہے ہیں۔ یہ محض افسانہ ہائے پارینہ ہیں"۔ لیکن بعث بعد الموت کے لیے تو ایک وقت مقرر ہے۔ یہ اللہ نے اپنی تدبیر اور اپنی حکمت سے مقرر کیا ہے۔ اس میں کوئی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔ یہ گھڑی وقت سے قبل نہیں آسکتی الا یہ کہ اللہ چاہے' اگرچہ تمام مخلوق اس کا مطالبہ کرے یا غافلین کا کوئی گروہ اس نظریہ سے مذاق ہی کرتا رہے۔

---

مشرکین عرب کے عقائد میں بڑا ہی اضطراب تھا۔ وہ اللہ کے وجود کا انکار نہ کرتے تھے۔ وہ اس بات کا انکار بھی نہ کرتے تھے کہ اللہ مالک سماوات والارض ہے۔ وہ مدبر سماوات ہے اور زمین اور آسمانوں کو تھامنے والا وہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ دوسرے الہوں کو اللہ کے ساتھ شریک کرتے تھے۔ اور ان کا نظریہ یہ تھا کہ دوسرے الہوں کی بندگی وہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ انہیں اللہ کے قریب کرتے ہیں۔ پھر وہ اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرتے تھے حالانکہ اللہ ان باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ اللہ کی طرف نسبت کرتے تھے۔

یہاں اللہ تعالیٰ ان کے مسلمہ عقائد کا ذکر کر کے ان پر گرفت کرتے ہیں تاکہ ان کے عقائد کے اندر جو اضطراب پایا جاتا ہے' اسے دور کر دیا جائے اور انہیں اس عقیدۂ توحید کی طرف لایا جائے جس کی طرف ان کے مسلمہ عقائد بھی راہنمائی کرتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی فطرت پر قائم ہوں اور انحراف نہ کریں۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ
قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ
الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ
شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوْلُوْنَ
لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾

"ان سے کہو' بتاؤ' اگر تم جانتے ہو کہ یہ زمین اور اس کی ساری آبادی کس کی ہے؟ یہ ضرور کہیں گے اللہ کی۔ کہو' پھر تم ہوش میں کیوں نہیں آتے؟ ان سے پوچھو' ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟ وہ ضرور کہیں گے

اللہ ۔ کہو پھر تم ڈرتے کیوں نہیں؟ ان سے کہو، بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ ہر چیز پر اقتدار کس کا ہے؟ اور کون ہے وہ جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟ یہ ضرور کہیں گے کہ یہ بات تو اللہ ہی کے لیے ہے ۔ کہو، پھر کہاں سے تم کو دھوکہ لگتا ہے"۔

ان کے عقائد کے اندر جو اضطراب تھا وہ کسی عقلی دلیل پر مبنی نہ تھا نہ کسی منطق کا تقاضا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جزیرۃ العرب کے اندر مشرکین کے عقائد اور افکار کس قدر بگڑ گئے تھے حالانکہ وہ دین ابراہیم پر ہونے کا دعویٰ کرتے تھے ۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۳ : ۸٤) "ان سے کہو، اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ یہ زمین اور اس کی ساری آبادی کس کی ہے؟" یعنی زمین کا مالک کون ہے اور زمین کے اندر موجود آبادی کا مالک کون ہے؟

سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ (۲۳ : ۸۵) "یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ مالک ہے"۔ لیکن اپنے عمل میں وہ اس حقیقت کو ملحوظ نہیں رکھتے اور پھر بھی بندگی غیر اللہ کی کرتے ہیں۔ لہٰذا ان سے کہو۔

قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۲۳ : ۸۵) "پھر تم ہوش میں کیوں نہیں آتے"۔ اس حقیقت کو اپنے طرز عمل میں کیوں نہیں لاتے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۲۳ : ۸٦) "ان سے پوچھو ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا مالک کون ہے"۔ یہ سوال اس کائنات کی ربوبیت کے بارے میں ہے کہ آسمانوں اور عرش عظیم کا متصرف کون ہے۔ سات آسمانوں سے مراد سات افلاک بھی ہو سکتے ہیں یا سات ستاروں کے مجموعے بھی ہو سکتے ہیں۔ یا سات آسمان بھی ہو سکتے ہیں اور سات جہان بھی ہو سکتے ہیں یا کوئی سات فلکی مخلوق بھی ہو سکتی ہے۔ غرض دراصل یہ رمز ہے قبضے اور کنٹرول اور اقتدار اعلیٰ کے مفہوم کی طرف۔ یعنی کون ہے جو سات آسمانوں اور عرش عظیم کا کنٹرولر ہے؟

سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ (۲۳ : ۸۷) "یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ"۔ لیکن اس اقرار کے باوجود یہ لوگ رب عرش عظیم سے ڈرتے نہیں۔ نہ رب سماوات سے ڈرتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ پھر دوسروں کو شریک بھی کرتے ہیں۔ ایسے بتوں کو جو زمین پر گرے ہوئے ہیں۔

قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۲۳ : ۸۷) "تو پھر تم ڈرتے کیوں نہیں"۔

قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ يُجِيْرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

(۲۳ : ۸۸) "ان سے کہو بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ ہر چیز پر اقتدار کس کا ہے اور کون ہے جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟" یہ سوال قبضے، اقتدار اعلیٰ اور بادشاہت کے بارے میں ہے، کہ کون ہے مقتدر

اس؟ کون ہے جو سب چیزوں کا مالک ہے اور سب پر اس کا قبضہ و اقتدار ہے۔ کون ہے جو ہر کسی کو پناہ دے سکتا ہے اور اس کے خلاف کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔ وہ جس کو پناہ دے اس پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا اور جس کو وہ پکڑنا چاہے کوئی نہیں ہے جو اسے اللہ کی پکڑ سے بچا سکے۔

سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ (۲۳ : ۸۹) "تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ ہی ہے"۔ اگر تم یہ باتیں تسلیم کرتے ہو تو پھر راہ ہدایت سے کیوں پھرے جا رہے ہو۔ کیا جواز ہے پھر اس گمراہی کا؟

فَأَنّٰى تُسْحَرُونَ (۲۳ : ۸۹) "پھر کہاں سے تم کو دھوکہ لگتا ہے؟" حالانکہ اگر تم ان مذکورہ حقائق کو جانتے ہو تو تمہیں دھوکہ نہیں لگنا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے عقائد میں اضطراب ہے اور یہ لوگ خبط میں مبتلا ہیں۔

---

اب مناسب وقت آگیا ہے کہ ان کے شرکیہ عقائد کی تردید کر دی جائے اور اللہ کی ذات سے اولاد کی نفی کر دی جائے اور یہ فیصلہ سنا دیا جائے کہ حقیقی عقائد وہی ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کرتے ہیں۔

بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۹۰﴾ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ
وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى
بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۹۱﴾ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا ۵
يُشْرِكُوْنَ ﴿۹۲﴾ ع ۱۵

۵ "جو امر حق ہے وہ ہم ان کے سامنے لے آئے ہیں، اور کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا ہے، اور کوئی دوسرا خدا اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی خلق کو لے کر الگ ہو جاتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔ پاک ہے اللہ ان باتوں سے جو یہ لوگ بناتے ہیں۔ کھلے اور چھپے کا جاننے والا، وہ بالاتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ تجویز کر رہے ہیں۔

یہ فیصلہ مختلف اسالیب میں آتا ہے۔ ان کے ساتھ اس مباحثے کو ختم کر دیا جاتا ہے اور یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔

بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۲۳ : ۹۰) "جو امر حق ہے وہ ہم ان کے سامنے لے آئے ہیں اور کوئی شک نہیں ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں"۔ اس کے بعد ان کے جھوٹ کی تفصیل دی جاتی ہے۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ (۲۳ : ۹۰) "اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا ہے اور کوئی دوسرا خدا اس کے ساتھ نہیں"۔ اور اس کے بعد پھر ان کے دعوے کے رد میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ان

کے عقیدۂ شرک میں کس قدر کمزوری ہے۔

اذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ (۲۳ : ۹۰) "تو ہر خدا اپنی خلق کو لے کر الگ ہو جاتا"۔ وہ اپنی مخلوقات میں ایک مستقل خدا ہوتا اور وہ اپنی مخلوقات میں اپنے مخصوص قانون قدرت کے مطابق تصرفات کرتا۔ اس طرح مختلف کائناتوں میں مختلف قوانین قدرت نظر آتے اور وہ دوسرے خدا کے قوانین اور نوامیس سے علیحدہ نظر آتے۔ پھر تضاد کی صورت میں

وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۲۳ : ۹۰) "پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے"۔ تضاد کی صورت میں بعض خدا بعض پر غالب ہوتے۔ یوں آخر کار ایک ہی خدا متصرف اور مقتدر اعلیٰ رہتا اور دنیا میں آخر کار ایک ہی نظام چلتا کیونکہ ایک ملک میں دو مقتدر اعلیٰ تو ہو نہیں سکتے۔

چونکہ کائنات میں اس قسم کا تضاد نہیں ہے' اس کی وحدت ساخت' اور اس کی حرکت کی یگانگت اور اس کے ناموس اور قانون قدرت کی وحدت اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مقتدر اعلیٰ ایک ہے کیونکہ اس کائنات کے اندر اور اس کے اجزاء کے اندر کوئی تصادم نظر نہیں آتا۔ یہ کامل ہم آہنگی کے ساتھ چل رہی ہے اس لیے اس کا رب اور متصرف بھی ایک ہے۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۲۳ : ۹۰) "وہ بالاتر ہے ان باتوں سے جو یہ بناتے ہیں"۔ وہ عالم الغیب ہے اور عالم شہادت ہے۔ اس کے سوا کسی اور کی کوئی مخلوق نہیں ہے اس لیے اللہ پاک ہے اس شرک سے جو یہ لوگ تجویز کرتے ہیں۔

---()()()---

اب یہاں سے روئے سخن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ اے محمدؐ اس بات سے اللہ کی پناہ طلب کریں کہ ایسے لوگوں کے ساتھ آپؐ شامل ہو جائیں اگرچہ اللہ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ ان لوگوں کو جو سزا ملنے والی ہے وہ اللہ آپ کو دکھائے گا۔ بہرحال آپ شیطان کے وسوسوں سے پناہ مانگیں اور یہ لوگ جو باتیں بناتے ہیں ان پر صبر کریں۔

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ
فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَ اِنَّا عَلٰۤى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ
هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَ قُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ
هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾

"اے نبیؐ دعا کرو کہ "پروردگار' جس عذاب کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے وہ اگر میری موجودگی میں تو لائے' تو

اے میرے رب ' مجھے ان ظالموں میں شامل نہ کیجیو " - اور حقیقت یہ ہے کہ ہم تمہاری آنکھوں کے سامنے ہی وہ چیز لے آنے کی پوری قدرت رکھتے ہیں جس کی دھمکی ہم انہیں دے رہے ہیں - اے نبیؐ برائی کو اس طریقہ سے دفع کرو جو بہترین ہو - جو کچھ باتیں وہ تم پر بناتے ہیں وہ ہمیں خوب معلوم ہیں - اور دعا کرو کہ " پروردگار ' میں شیاطین کی اکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں ' بلکہ اے میرے رب ' میں تو اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں " -

جب ان لوگوں کو وہ عذاب دیا جائے گا جس کی دھمکی ان کو دی جا رہی ہے تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اس سے نجات پائیں گے لیکن پھر بھی حکم دیا جاتا ہے کہ اپنے آپ کو مزید محفوظ کرنے کے لیے دعا کرتے رہیں اور بعد کے آنے والے اہل ایمان کو بھی یہ ایک قسم کی تعلیم ہے کہ وہ اللہ کے عذاب اور شیطان کی چالوں سے مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں - ہر وقت بیدار رہیں اور اللہ سے پناہ مانگتے رہیں -

کہا جاتا ہے کہ اللہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ حیات محمدؐ کے دوران ہی ان پر عذاب لے آئے -

وَ اِنَّا عَلٰٓی اَنْ نُّرِیَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ (۲۳ : ۹۵) " اور یہ کہ ہم تمہاری آنکھوں کے سامنے وہ چیز لانے کی قدرت رکھتے ہیں جس کی دھمکی انہیں دے رہے ہیں " - اور غزوۂ بدر میں اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی ایک جھلک دکھا بھی دی - اس کے بعد فتح مکہ میں بھی ایک رنگ دکھایا گیا -

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ (۲۳ : ۹۶) " اے نبیؐ ' برائی کو اس طریقے سے دفع کرو جو بہترین ہو ' جو کچھ باتیں وہ تم پر بناتے ہیں وہ ہمیں خوب معلوم ہیں " - اس سورہ کے نزول کے وقت مکہ مکرمہ میں دعوت اسلامی کے لیے یہ منہاج اختیار کیا گیا تھا کہ برائی کا دفعیہ بھلائی کے ساتھ کیا جائے - اللہ کا حکم آنے تک صبر کیا جائے اور تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دیئے جائیں -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے یہ دعا کہ اے رب میں تجھ سے شیطان کی اکساہٹوں سے پناہ مانگتا ہوں ' جب کہ آپ خدا کی طرف سے حفاظت میں تھے اور معصوم تھے ' یہ بات زیادہ احتیاط اور زیادہ تقویٰ کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ التجاء اور امت کو تعلیم دینے کی خاطر ہے ' کیونکہ حضور ہی اپنی امت کے لیے اسوہ ہیں - یہ دراصل امت کو تعلیم ہے کہ شیطان کی اکساہٹوں اور وسوسوں سے اللہ کی پناہ ہر وقت مانگتے رہو - بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپؐ شیطان کے قرب سے بھی پناہ طلب کریں - چنانچہ کہا جاتا ہے -

وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ (۲۳ : ۹۸) " بلکہ میں تو اے رب ' اس سے بھی پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے قریب آئیں " - یہ بھی احتمال ہے کہ وفات کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے پناہ مانگتے ہوں کہ شیطان اس وقت آ موجود ہو - اس آیت کے بعد اگلی آیت جو اگلے سبق میں ہے اس طرف اشارہ بھی کرتی ہے -

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ (۲۳ : ۹۹) " یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آ جائے " - یہ قرآن کا انداز کلام ہے کہ ایک مفہوم سے دوسرا مفہوم بڑی ہم آہنگی سے نکلتا چلا جاتا ہے -

# درس نمبر ۱۵۱ تشریح آیات

## ۹۹ --- تا --- ۱۱۸

---

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآىٕلُهَا ؕ وَ مِنْ وَّرَآىٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

"(یہ لوگ اپنی کرنی سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آجائے گی تو کہنا شروع کرے گا کہ "اے میرے رب، مجھے اسی دنیا میں واپس بھیج دیجئے جسے میں چھوڑ آیا ہوں؟ امید ہے کہ اب میں نیک عمل کروں گا۔ ہرگز نہیں، یہ تو بس ایک بات ہے جو وہ بک رہا ہے۔ اب ان سب (مرنے والوں) کے پیچھے ایک برزخ حائل ہے دوسری زندگی کے دن تک"۔

اس آخری سبق میں بھی مشرکین کے برے انجام کی بات آگے بڑھ رہی ہے۔ اب یہ لوگ قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں ہیں۔ اس میں آغاز دنیا میں روح قبض کرنے کے وقت سے ہوتا ہے اور نفخ صور پر ختم ہوتا ہے۔ آخر میں سورہ کے اختتام پر اصل مضمون کی طرف آتے ہوئے اس بات سے ڈرایا جاتا ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو کیونکہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ سورہ کا خاتمہ اس ہدایت پر ہوتا ہے کہ خود حضورؐ اللہ کی مغفرت طلب فرمائیں۔

حَتّٰى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنَ (۲۳:۹۹) لَعَلِّیْ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ (۲۳:۱۰۰) "(یہ لوگ اپنی کرنی سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آجائے گی تو کہنا شروع کرے گا کہ "اے میرے رب، مجھے اسی دنیا میں واپس بھیج دیجئے جسے میں چھوڑ آیا ہوں؟ امید ہے کہ اب میں نیک عمل کروں گا"۔

یہ منظر حالت نزع کا ہے۔ جب موت آتی ہے تو ہر شخص توبہ کرتا ہے۔ رجوع الی اللہ کرتا ہے، یہ درخواست کرتا ہے کہ اے اللہ ایک موقعہ اور دیجئے۔ ایک بار اور زندگی دیجئے تاکہ ہم ان کوتاہیوں کی تلافی کر لیں اور جو اہل و عیال اور

مال و دولت ہم نے چھوڑے ہیں ان میں تیری مرضی کا تصرف کریں۔ یہ ایک منظر ہے جسے سب دیکھ رہے ہیں اور مرنے والا یہ درخواست کر رہا ہے اور جواب بھی اطلاعیہ آجاتا ہے۔

كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا (۲۳ : ۱۰۰) "ہرگز نہیں' یہ تو بس ایک بات ہے جو وہ بک رہا ہے"۔ یہ ایک بات ہے جو وہ کر رہا ہے۔ اس کا کوئی مصداق وجود میں آنے والا نہیں ہے۔ یہ لفظ اور اس کا قائل قابل توجہ نہیں ہیں۔ یہ تو حالت خوف کی ایک چیخ ہے جو منہ سے نکل رہی ہے۔ یہ کسی اخلاص پر مبنی نہیں ہے۔ نہ حقیقی توبہ ہے۔ مشکلات میں ہر کوئی یہ بات کرتا ہے۔ دل میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی نہ ارادہ ہوتا ہے۔

اب حالت نزع کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ بات کہنے والے اور دنیا کے درمیان پردہ حائل ہو جاتا ہے۔ معاملہ ختم ہو گیا۔ تعلقات ختم ہو گئے۔ دروازے بند ہو گئے اور پردے گر گئے۔

وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ (۲۳ : ۱۰۰) "اب ان سب (مرنے والوں) کے پیچھے ایک برزخ حائل ہے دوسری زندگی کے دن تک"۔ برزخ یعنی پردہ حائل ہے۔ نہ وہ اہل دنیا سے ہوتے ہیں اور نہ اہل آخرت سے ہوتے ہیں۔ یہ اس برزخ کے عالم میں ہیں اور قیام قیامت تک یہ لوگ یہاں رہیں گے۔ اب سیاق کلام قیامت میں داخل ہو جاتا ہے جب کہ صور پھونکا جاتا ہے۔

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ ﴿١٠١﴾

"پھر جونہی کہ صور پھونک دیا گیا' ان کے درمیان پھر کوئی رشتہ نہ رہے گا اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے"۔ تمام رابطے کٹ جائیں گے۔ وہ اقدار ختم ہو جائیں گی جن کے مطابق وہ دنیا میں زندگی بسر کرتے تھے۔

فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ (۲۳ : ۱۰۱) "اس دن ان کے درمیان کوئی رشتہ نہ رہے گا"۔ اس قدر خوف چھا جائے گا کہ سب خاموش ہوں گے۔ چپ کھڑے ہوں گے' کوئی بات ہی نہ کرے گا۔ اب یہاں نہایت سرعت اور اختصار کے ساتھ حساب و کتاب کا میزان پیش کیا جاتا ہے۔

فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٢﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ﴿١٠٣﴾ تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ ﴿١٠٤﴾

"اس وقت جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی لوگ ہوں

گے جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈال لیا۔وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے ۔ آگ ان کے چہروں کی کھال چاٹ جائے گی اور ان کے جبڑے باہر نکل آئیں گے"۔یہ کہ تمام اعمال کو ترازو میں تولا جائے گا' یہ بھی قرآن مجید کا ایک مخصوص انداز کلام ہے کہ وہ کسی بھی مفہوم کو حسی انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ نہایت ہی مجرد معانی کو ہر شخص سمجھ جائے۔

نیز ان اعمال کے ساتھ ذرا دیکھیے کہ ان کے چہروں پر سے آگ گوشت کو چاٹ جائے گی اور وہ اس طرح نظر آرہے ہونگے جس طرح کسی مردے کے منہ کی ہڈیاں نظر آتی ہیں' دانت نکلے ہوئے۔

یہ لوگ ہیں جن کا میزان اعمال ہلکا ہو گیا ہے۔یہ ہار گئے ہیں سب کچھ' اپنے نفسوں کو بھی ہار گئے ہیں۔جب کوئی شخص اپنی جان ہی ہار جائے تو پھر وہ کس چیز کا مالک رہ جاتا ہے۔اس کی ملکیت میں کیا چیز رہ جاتی ہے۔وہ اپنے نفس کو ہار گیا۔اس کی ذات چلی گئی ہے۔گویا اس کا وجود ہی باقی نہیں رہا۔

اب حکایتی انداز کلام اچانک بدل جاتا ہے اور خطاب شروع ہو جاتا ہے۔ان کی سرزنش کی جاتی ہے۔جسمانی عذاب اس قدر دردناک نہیں جس قدر یہ سرزنش اذیت ناک ہے۔اب گویا ہم پھر ایک منظر میں دیکھ رہے ہیں کہ ان کی سرزنش کی جارہی ہے اور ان کو ملامت کی جارہی ہے۔

أَلَمْ تَكُنْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿١٠٥﴾

"کیا تم وہی لوگ نہیں ہو کہ میری آیات تمہیں سنائی جاتی تھیں تو تم انہیں جھٹلاتے تھے"۔جب انہوں نے یہ سوال سنا تو ان کو یہ خیال آیا کہ شاید ان کو بات کرنے کی اجازت ہے اور وہ جواب دے سکتے ہیں اور شاید اپنے گناہوں کا اعتراف انہیں کوئی فائدہ دے دے۔

قَالُوا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّينَ ﴿١٠٦﴾ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَالِمُونَ ﴿١٠٧﴾

"وہ کہیں گے "اے ہمارے رب 'ہماری بدبختی ہم پر چھا گئی تھی۔ہم واقعی گمراہ لوگ تھے۔اے پروردگار' اب ہمیں یہاں سے نکال دے۔پھر ہم ایسا قصور کریں تو ظالم ہوں گے؟" یہ نہایت ہی تلخ اعتراف ہے اور ان کی بدبختی اس میں عیاں نظر آتی ہے۔انہوں نے حدود سے تجاوز کیا اور سوئے ادب کا ارتکاب کیا کیونکہ ان کو صرف سوال کا جواب دینے کی اجازت تھی۔بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سوال ہی محض ذلیل کرنے کے لیے ہو۔جواب مطلوب ہی نہ ہو۔اس لیے ان کی اس درخواست کا جواب سختی سے دیا جاتا ہے کیونکہ درخواست ان سے طلب ہی نہ کی گئی تھی۔

قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ﴿١٠٨﴾

"اللہ تعالیٰ جواب دے گا "دور ہو میرے سامنے سے 'پڑے رہو اسی میں اور مجھ سے بات نہ کرو"۔ خاموش ہو جاؤ' ایک ذلیل شخص کی طرح خاموشی اختیار کرو۔ جس عذاب میں تم لوگ پڑے ہوئے 'تم اس کے پوری طرح مستحق ہو۔ یہی توہین آمیز پوزیشن تمہارے لیے بہتر ہے۔

إِنَّهُ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْ عِبَادِي يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ ﴿١٠٩﴾ فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سِخْرِيًّا حَتَّىٰ أَنسَوْكُمْ ذِكْرِي وَكُنتُم مِّنْهُمْ تَضْحَكُونَ ﴿١١٠﴾

"تم وہی لوگ تو ہو کہ میرے کچھ بندے جب کہتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار' ہم ایمان لائے' ہمیں معاف کر دے' ہم پر رحم کر' تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے' تو تم نے ان کا مذاق بنالیا۔ یہاں تک کہ ان کی ضد نے تمہیں یہ بھی بھلا دیا کہ میں بھی کوئی ہوں' اور تم ان پر ہنستے رہے"۔ تمہارا جرم صرف یہی نہیں ہے کہ تم نے کفر کیا اور خود اپنی ذات کو کفر میں رکھا۔ اگرچہ یہ بھی جرم عظیم تھا مگر تم نے اس سے بھی عظیم تر جرم کیا ہے۔ وہ یہ کہ تم نے ایمان لانے والوں کے ساتھ مزاح کیا۔ جو ایمان لائے تھے اور رحمت رب کے طلبگار تھے تم ان کا مذاق اڑاتے تھے اور اس طرح اپنے آپ کو ذکر الٰہی اور نصیحت آموزی سے محروم کرتے تھے حالانکہ اس کائنات میں دلائل ایمان موجود تھے۔ آج دیکھو' تمہارا مقام کیا ہے اور ان لوگوں کا مقام و مرتبہ کیا ہے جن سے تم مذاق کرتے تھے۔

إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿١١١﴾

"آج ان کے اس صبر کا میں نے یہ پھل دیا ہے کہ وہی کامیاب ہیں"۔ اس سخت اور توہین آمیز جواب کے بعد ایک نئے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جبکہ اس سوال و جواب میں ان کے ساتھ نہایت ہی توہین آمیز سلوک کیا گیا اور ان کو لاجواب کر دیا گیا ہے۔ اب نیا سوال یہ آتا ہے۔

قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ﴿١١٢﴾

"پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا' بتاؤ زمین میں تم کتنے سال رہے"۔ اللہ کو تو خوب معلوم ہے کہ انہوں نے کتنا عرصہ دنیا میں گزارا ہے لیکن مقصد یہ بتانا ہے کہ دنیا کی یہ زندگی کس قدر مختصر ہے' کس قدر حقیر ہے اور دنیا کے دن کس قدر چھوٹے ہیں۔ انہوں نے دنیا کی اس مختصر زندگی کے لیے آخرت کی دائمی زندگی کو خراب کیا۔ وہ تو آج محسوس کرتے ہیں کہ یہ دنیا کس قدر مختصر ہے۔ کس قدر معتبر ہے لیکن وہ مایوس ہیں اور ان کے سینے تنگ ہیں۔ اب ان کو کیا پڑی ہے

کہ حساب کریں۔

قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾

"وہ کہیں گے "ایک دن یا دن کا بھی کچھ حصہ ہم ٹھہرے' شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجئے"۔ یہ اس شخص کا جواب ہے جو حد درجہ پریشان' مایوس اور تنگ دل ہو۔

لیکن جواب نہایت ہی حقیقت پسندانہ ہے یہ کہ تم نے بہت ہی کم وقت گزارا ہے بہ نسبت اس کے جواب تم جہنم میں گزارو گے۔ اے کاش کہ دنیا میں تم صحیح اندازہ کر سکتے۔

قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

"ارشاد ہو گا تھوڑی ہی دیر ٹھہرے ہوتا' کاش تم نے یہ اس وقت جانا ہوتا"۔ اب دوبارہ ان کی سرزنش کی جاتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ بعث بعد الموت کی حکمت کیا ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے؟" معلوم ہونا چاہئے۔ حکمت تخلیق کا لازمی تقاضا ہے کہ بعث بعد الموت ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا قیام مقدر کر دیا ہے۔ اس کے مقاصد تدبیر کائنات کا حصہ ہیں۔ قیامت تخلیق کا منطقی نتیجہ ہے۔ بعث کے ساتھ تخلیق کائنات اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے اور مقصد تخلیق پورا ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت سے وہی لوگ غفلت کر سکتے ہیں جن کے دلوں پر پردے آگئے ہوں اور جن کی فطرت مسخ ہو چکی ہو' جو حکمت الٰہیہ پر کبھی غور و فکر کرنے کی تکلیف ہی نہیں کرتے حالانکہ یہ حکمت اس کائنات کے اندر بکھری پڑی ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

سورہ کا خاتمہ عقیدہ توحید کے اعلان پر ہوتا ہے اور اعلان کر دیا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے شرک کیا وہ عظیم خسارے میں پڑ گئے جبکہ اہل توحید فلاح پائیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپ اللہ سے مغفرت طلب کریں اور اللہ کی رحمت کے طلبگار ہوں۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۚ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَ قُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَ

۶
ارْحَمْ وَ اَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ۝ ع۲۶
۶

"پس بالا و برتر ہے اللہ ' پادشاہ حقیقی 'کوئی خدا اس کے سوا نہیں ' مالک ہے عرش بزرگ کا۔ اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے 'جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں 'تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ ایسے کافر کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ اے نبیؐ 'کہو ' میرے رب درگزر فرما اور رحم کر 'تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے"۔ اس سے پہلے قیامت کا منظر گزر چکا ہے۔ اس پر یہ تبصرہ ہوتا ہے 'نیز اس سے قبل کے مناظر میں بحث و مباحثہ اور دلائل و بینات کا مفصل ذکر ہو چکا تھا۔ یہ تبصرہ اس پوری سورہ کا منطقی نتیجہ ہے کہ اللہ شرک سے پاک ہے۔ وہ مالک حق ہے اور وہی مقتدر اعلیٰ ہے اور اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ بادشاہت اس کی ہے اور وہی بلندی کا مستحق ہے۔ وہ رب عرش عظیم ہے۔

اب جو لوگ اللہ کے سوا کسی اور شخصیت کی الوہیت اور حاکمیت کو مانتے ہیں ان کے پاس اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ نہ اس کائنات میں اس کا کوئی ثبوت ہے 'نہ انسانی فطرت اس کو مانتی ہے اور نہ انسانی عقل اس پر آمادہ ہوتی ہے۔ جو لوگ ایسا دعویٰ کریں گے ان کو اپنے رب کے سامنے حساب دینا ہو گا اور حساب کا نتیجہ یہی ہے کہ کافر کبھی فلاح نہیں پاتے۔ یہ اللہ کی سنت ہے اور یہ اٹل ہے۔ اس کے بالمقابل اہل ایمان فلاح پائیں گے اور یہ تقاضائے فطرت و تقاضائے ناموس کائنات ہے۔

اب کافروں کے پاس جو انعامات ہیں ' دنیا کا ساز و سامان ہے اور دنیا کا اقتدار ہے جو بعض اوقات قائم ہوتا رہتا ہے تو یہ ان کی کامیابی نہیں ہے۔ یہ ان کے لیے فتنہ اور آزمائش ہے۔ اگر ان میں سے بعض اس دنیا میں بلا حساب چلے جائیں تو آخرت میں حساب ان کے لیے تیار ہے ' وہاں ان کو پورا پورا حساب دینا ہو گا۔ آخرت کا حساب اس تخلیق کا آخری منظر ہو گا۔ اللہ کی تخلیق کے نظام میں آخرت اس دنیا سے علیحدہ اور دور نہیں ہے۔ یہ اس دنیا کا آخری صفحہ ہے اور اس کا حصہ ہے۔

---ooo---

سورہ مومنون کی آخری آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپؐ اللہ کی مغفرت اور اللہ کی رحمت کی طلب کرتے رہیں۔

وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَ ارْحَمْ وَ اَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ (۲۳:۱۱۸) "اور اے نبیؐ 'کہو ' میرے رب درگزر فرما اور رحم کر 'تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے"۔ دیکھیے سورہ کا آغاز اور انجام ایک ہی مضمون پر ہوتا ہے۔ آغاز بھی اس مضمون سے ہے کہ مومنین کامیاب ہوئے اور کافرین خسارے میں پڑ گئے۔ آغاز میں بھی یہ مضمون تھا کہ نماز میں خشوع و خضوع اختیار کیا جائے اور یہاں بھی اللہ کے سامنے دعاء اور طلب رحمت ہے۔ یوں سورہ کا آغاز اور انجام یکساں ہو جاتے ہیں۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ------ ۱۸

## سورۃ النور - ۲۴

۱--- تا --- ۶۴

# سورۃ النور ایک نظر میں

یہ سورۃ نور ہے' اس میں لفظ نور آیت اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲۴:۳۵) میں ذکر ہوا ہے۔ پھر اس سورہ میں جو مضامین ہیں وہ قلب و نظر اور ضمیر و اخلاق کے لیے نور ہیں اور ان کے نتیجے میں انسانوں میں نورانی آداب پیدا ہوتے ہیں۔ اس سورہ میں جو نفسیاتی اخلاق' عائلی ضوابط اور اجتماعی قوانین وضع کیے گئے ہیں وہ نور ہی نور ہیں اور یہ نور پھر ایک کائناتی نور سے مربوط ہے اور وہ نور روح کا نور ہے' دلوں کی روشنی ہے اور ضمیر کے لیے صیقل ہے۔ یہ سب کچھ اس عظیم نور کا پرتو ہے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲۴:۳۵) اس سورہ کا آغاز ایک زوردار اعلان شاہی سے ہوتا ہے کہ اس سورہ کو ہم نے فرض قرار دیا ہے۔ اس کے اندر جو فرائض و حدود ہیں اور جو آداب و اخلاق ہیں اور جو احکام و قوانین ہیں وہ قدرتی ہیں۔

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَ فَرَضْنٰهَا وَ اَنْزَلْنَا فِيْهَاۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۲۴:۱) "یہ ایک سورہ ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے اور اسے ہم نے فرض کیا ہے اور اس میں ہم نے صاف صاف ہدایات نازل کی ہیں' شاید کہ تم سبق لو"۔ اس آغاز سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم انسانی زندگی میں اخلاق و آداب کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ نیز اسلامی نظریہ حیات میں اور اسلامی کلچر میں اعلیٰ اخلاق اور اچھے اور صاف طرز عمل کو کس قدر بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔

اس سورہ کا محور مومنین کی اخلاقی تربیت ہے اور ان اخلاقی احکام کو تعزیری قوانین جیسی اہمیت دی گئی ہے۔ پھر یہ اخلاقی تعلیمات محض اخلاق اور قانون سے بلند ہو جاتی ہیں اور روحانی انداز اختیار کر کے اعلیٰ وجدانی طرز عمل اختیار کر لیتی ہیں کہ انسانی زندگی اور یہ پوری کائنات اللہ کے نور سے جا ملتی ہے۔ ان تعلیمات میں شدت بھی ہے اور نرمی بھی ہے۔ مگر شدت اور نرمی دونوں سے نفس انسانی اور شعور انسانی کی تربیت مقصود ہے۔ اخلاقی معیاروں کو اس قدر بلند کرنا مطلوب ہے کہ وہ شفاف بن کر اللہ کے نور کا حصہ بن جائیں۔ انسان کے انفرادی اعمال اور افکار گھرانوں کے اخلاق و آداب اور معاشرے' سوسائٹی اور قیادت کے اخلاق و آداب سب کے سب ایک ہی سرچشمے یعنی نور ربی سے ماخوذ ہیں جو نور سماوات والارض ہے۔ اور جس کی وجہ سے یہ پوری کائنات روشن ہے۔ آسمان روشن' زمین روشن' انسانی نفس' انسانی روح اور اخلاق روشن۔

اپنے محور اور موضوع کے گرد اس سورہ کے پانچ اور اسباق ہیں :

پہلے دور میں ایک ایسا دو ٹوک اعلان ہے جس سے سورہ کا آغاز ہوتا ہے' متصلاً حد زنا کے قانون کا اعلان ہے اور یہ

بتایا گیا ہے کہ چغلی نہایت ہی مکروہ فعل ہے ۔ زانی اسلامی معاشرے کا حصہ نہیں ہو سکتے ۔ اس کے بعد حد قذف اور اس کے لیے سخت قانون سازی کا بیان ہے ۔ اور زوجین کو حد قذف سے مستثنیٰ کیا گیا ہے ۔ البتہ ان کے لیے لعان کا قانون پاس کر کے ان کے درمیان جدائی کی گئی ہے ۔ اس کے بعد افک کی کہانی آتی ہے اور یہ سبق ختم ہوتا ہے ۔ پھر بتایا گیا ہے کہ خبیث لوگوں کے ساتھ خبیث ملتے ہیں اور نیک اور پاک لوگوں کے ساتھ نیک اور پاک لوگ ملتے ہیں ۔ ایسے ہی لوگوں کو باہم رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا چاہئے ۔

دوسرے سبق میں ان انسدادی ذرائع کا ذکر ہے جو اس جرم سے بچاتے ہیں اور ان تدابیر کا ذکر ہے جن کے ذریعہ اسلام انسان کو ان برائیوں میں پڑنے سے بچاتا ہے ۔ مثلاً دوسروں کے گھروں میں بغیر اذن و اجازت داخل نہ ہونا ۔ مثلاً غض بصر کے احکام ' غیر محارم کے سامنے زیب و زینت کا اظہار نہ کرنا ' نوجوان عورتوں کا جلدی سے نکاح کر دینا ' عورتوں اور لونڈیوں کو حرام کاری سے منع کرنا ۔ غرض وہ تمام ذرائع اختیار کرنا جن سے قلب و نظر اور ضمیر و شعور میں پاکیزگی پیدا ہو اور ان چیزوں سے بچنا جن کی وجہ سے حیوانی خواہشات ان میں پیدا ہوتی ہیں اور جن کا کسی پاکیزہ شخص کے طرز عمل پر اثر ہوتا ہے ۔ جبکہ وہ ہر قسم کے دامن گیر موثرات سے دامن بچائے پھرتے ہیں ۔

تیسرا دور اللہ کے نور سے متعلق ہے جو ان آداب کے درمیان میں آتا ہے جو اس سورہ کا خاص موضوع ہیں ۔ اس طرح ان آداب کو اللہ کے نور سے مربوط کر دیا جاتا ہے ۔ اللہ کے پاک گھروں میں ذکر کرنے والے پاک لوگوں کا ذکر اس سبق میں ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ ذکر الٰہی کرنے والے یہ لوگ اس نور الٰہی سے ہدایت یافتہ ہیں جبکہ اہل کفر کی مثال یوں ہے کہ وہ سراب کو حقیقت سمجھتے ہیں یا وہ ظلمتوں کے تہ بہ تہ اندھیروں میں ہیں ۔ اللہ کے اس نور سے آفاق کائنات بھرے ہوئے ہیں اور تمام مخلوق اللہ کی تسبیح کرتی ہے ۔ اس فضائے کائنات میں اللہ بادلوں کو چلاتا ہے ۔ رات اور دن کی گردش کا ذکر ' پانی سے تمام قسم کے جانوروں کی تخلیق کا ذکر جن کی شکلیں اور کام مختلف ہیں ۔ یہ سب چشم بینا کے لیے بصیرت افروز امور ہیں ۔

پانچویں سبق میں یہ بتایا گیا کہ منافقین کے دلوں میں رسول اللہ ؐ کا احترام نہیں ہے ۔ وہ رسول ؐ اطاعت نہیں کرتے ' اپنے فیصلے رسول ؐ اللہ سے نہیں کراتے جبکہ اہل ایمان مطیع فرمان ہیں اور اسی راہ پر چل کر وہ اس کرۂ ارض پر بطور مقتدر اعلیٰ فائز ہوں گے اور دین کو غلبہ اور کافروں کے مقابلے میں ان کو نصرت حاصل ہوگی ۔

پانچویں سبق میں کسی دوسرے شخص کے گھر میں داخل ہونے کے آداب ' اقارب کے درمیاں ضیافت کے آداب اور پھر یہ کہ اہل ایمان ایک ہی خاندان ہیں اور ان کے سربراہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اہل ایمان کی سوسائٹی ایک ہی فیملی ہے ۔

خاتمہ کلام اس پر ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمانوں کے مقتدر اعلیٰ ہیں ۔ وہ لوگوں کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہیں ۔ خفیہ حالات ہوں یا ظاہری ' ایک دن آنے والا ہے کہ لوگ اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے ۔ وہ ان سے حساب و کتاب لے گا اور اللہ علیم و خبیر ہے ۔

---○○○---

# درس نمبر ۱۵۲ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۲٦

---

سُوْرَةُ النُّوْرِ (۲۴) مَدَنِيَّةٌ (۱۰۲)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَ فَرَضْنٰهَا وَ اَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۱

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"یہ ایک سورہ ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے، اور اسے ہم نے فرض کیا ہے اور اس میں ہم نے صاف صاف ہدایات نازل کی ہیں شاید کہ تم سبق لو"۔

یہ پورے قرآن مجید میں اپنی نوعیت کا واحد مطلع کلام ہے۔ اس میں جو نیا لفظ ہے وہ فَرَضْنٰهَا کا ہے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سورہ میں جو کچھ ہے اس کا اخذ کرنا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یعنی اس کے اندر مذکور آداب پر عمل کرنا بھی اسی طرح فرض ہے جس طرح حدود پر عمل کرنا لازمی ہے۔ یہ اخلاق و عادات نہایت ہی فطری ہیں۔ ان آداب اور اخلاق کو لوگ بعض ایسے عارضی حالات کی وجہ سے بھول جاتے ہیں جو انسان کو دھوکہ دے کر بدراہ کر دیتے ہیں، یہ آیات ایسے لوگوں کو یاد دہانی کرا کے راہ راست دکھاتی ہیں اور پھر ان کو راہ فطرت پر واپس لاتی ہیں جو بالکل واضح ہے۔

--- ○○○ ---

اس دو ٹوک تمہید کے بعد قانون حد زنا کا بیان شروع ہوتا ہے۔ اس فعل کو نہایت ہی قبیح گردانتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ زانی اور اسلامی سوسائٹی کے درمیان کوئی رابطہ نہیں رہتا۔

اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ
بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ
عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۫

وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾

”زانیہ عورت اور زانی مرد' دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ اور ان کو سزا دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔ زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرکہ کے ساتھ اور زانیہ کے ساتھ نکاح نہ کرے مگر زانی یا مشرک اور یہ حرام کر دیا گیا ہے اہل ایمان پر“۔

اسلام کے ابتدائی ایام میں حد زنا وہ تھی جو جس کا تذکرہ سورہ نساء کی آیت میں ہوا۔

وَالّٰتِي يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰي يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا (۴: ۱۵)

”اور وہ تمہاری عورتیں جنہوں نے فحش کا ارتکاب کر لیا تو ان پر چار گواہ گزارو' اگر چار گواہ شہادت دے دیں تو انہیں گھروں میں روک رکھو' یہاں تک کہ انہیں موت آ لے یا ان کے لیے اللہ کوئی راستہ نکال دے“۔ عورت کے لیے سزا یہ تھی کہ اسے گھر میں بند کر دیا جائے اور ملامت کر کے اذیت دی جائے۔ اور مرد کو بھی لعنت و ملامت کی جاتی تھی۔

اس کے بعد پھر سورہ نور میں حکم آ گیا اور یہ تھا وہ راستہ جو زنا کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے نکال دیا گیا جس کے بارے میں اللہ نے سورہ نساء میں اشارہ فرمایا تھا۔

کوڑوں کی یہ سزا ان مردوں اور عورتوں کے لیے ہے جو شادی شدہ نہ ہوں یعنی شادی کے ذریعے ارتکاب جرم سے محفوظ نہ کر دیئے گئے ہوں۔ اور یہ سزا تب نافذ ہو گی جب مجرم مسلم' بالغ اور آزاد ہو۔ رہا وہ شخص جو محصن ہے یعنی جس نے شادی کر لی ہے اور شادی کے نتیجے میں وہ اپنی بیوی کے ساتھ مجامعت کر چکا ہو۔ مسلم ہو بالغ ہو اور آزاد اور نکاح بھی شرعاً نکاح صحیح ہو تو اس کی حد' حد رجم ہے۔

حد رجم سنت سے ثابت ہے جبکہ کوڑوں کی حد قرآن کریم سے ثابت ہے۔ قرآن کی یہ آیت عام تھی اور مجمل تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محصن زانیوں کو رجم کی سزا دیتے تھے اس لیے ثابت ہو گیا کہ کوڑوں کی سزا غیر محصن کے لیے ہے۔

یہاں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا محصن کو رجم سے قبل کوڑوں کی سزا بھی دی جائے گی یا نہیں۔ جمہور علماء اس طرف گئے ہیں کہ دونوں سزاؤں کو جمع نہیں کیا جا سکتا۔ نیز اس میں بھی اختلاف ہے کہ جب غیر محصن زانی کو کوڑوں کی سزا دی جائے گی تو پھر اسے بموجب حدیث جلاوطن بھی کیا جائے گا یا نہیں۔ اسی طرح غلام زانی کی حد میں بھی اختلاف ہے۔ یہ اختلافات بہت طویل مباحث چاہتے ہیں۔ مناسب ہے کہ قارئین ان کے بارے میں معلومات کتب فقہ سے حاصل کریں۔ ہم یہاں صرف اس قانون کی تہ میں موجود فلسفہ اور حکمت سے بات کریں گے۔ آپ نے پڑھا کہ کنواروں کی سزا کوڑوں تک محدود ہے اور شادی شدہ محصنین کی سزا رجم ہے۔ یہ اس لیے کہ جس شخص نے مسلم' بالغ اور حر ہوتے ہوئے نکاح صحیح میں عورت کے ساتھ مجامعت کر لی اس کو توضیح پاک اور شریفانہ طریقہ معلوم اور میسر ہو گیا ہے۔

ایسا شخص اگر جنسی بے راہ روی اختیار کرتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر فطری بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ شخص راہ فطرت اور راہ اسلام سے منحرف ہے لہٰذا اسے سخت سے سخت سزا ملنی چاہئے۔ رہا غیر شادی شدہ غیر محصن تو ان سے غلطی کے وقوع کا امکان زیادہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات وہ جذبات کی شدت سے مغلوب ہو سکتا ہے جبکہ اس پر ابھی نادانی کا دور ہے۔ پھر یہاں نفس جرم میں بھی فرق ہے محصن چونکہ اس کام میں سابق تجربہ رکھتا ہے اس لیے وہ اس فعل سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے بہ نسبت کنوارے کنواروں کے جو زیادہ تجربہ کار نہیں ہوتے۔

قرآن کریم یہاں صرف غیر محصن یعنی کنواروں کی سزا کا ذکر کرتا ہے جیسا کہ ہم نے اس کی تصریح کر دی ہے اور یہاں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ اس معاملے میں کسی کے ساتھ کوئی نرمی نہ کی جائے۔

اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۴ : ۲) "زانیہ عورت اور زانی مرد' دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔ اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو اور ان کو سزا دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود رہے"۔

حکم یہ ہے کہ اسلامی حدود کا نفاذ سختی سے کیا جائے اور اس معاملے میں کسی قسم کی رعایت یا نرمی اور رحمدلی کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ معاملہ اللہ کے دین کے ساتھ متعلق ہے۔ اور دین کے معاملے میں نرمی ناقابل برداشت ہے۔ نیز نفاذ سزا کے وقت مومنین کی ایک تعداد کو حاضر ہونا چاہئے تاکہ سزا کا اثر مجرم پر زیادہ ہو۔ روحانی لحاظ سے بھی اسے اذیت پہنچے اور دیکھنے والوں کے لیے بھی عبرت انگیز ہو۔

اس کے بعد اس فعل کی کراہت اور ناپسندیدگی کو ظاہر کرنے کے لیے اس فعل کے مرتکبین کو اسلامی معاشرت سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے یعنی یہ فعل اس قدر شنیع ہے کہ کوئی شخص ایسے مجرموں کے ساتھ نکاح نہ کرے۔

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّ الزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَ حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۴ : ۳) "زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرکہ کے ساتھ اور زانیہ کے ساتھ نکاح نہ کرے مگر زانی یا مشرک۔ اور یہ حرام کر دیا گیا ہے اہل ایمان پر"۔ تو معلوم ہوا کہ اس فعل بد کا ارتکاب جب کوئی کرتا ہے تو وہ اس وقت نہیں کرتا جب وہ مومن ہو۔ اس جرم کا ارتکاب کرنے والے ایسی نفسیاتی حالت میں ہوتے ہیں کہ اس وقت ان کے شعور اور دل سے ایمان دور ہو جاتا ہے اور اس فعل کے ارتکاب کے بعد کسی نفس مومن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ایسے شخص کے ساتھ نکاح کرے۔ جو اس فعل شنیع کی وجہ سے دائرہ ایمان سے نکل گیا ہے۔ ایک مومن ایسے رابطے سے نفرت کرتا ہے اور اس کا ضمیر اس سے ابا کرتا ہے یہاں تک کہ امام احمد رحمتہ اللہ علیہ زانی اور عفیفہ کے درمیان نکاح کو حرام سمجھتے ہیں۔ اسی طرح عفیف اور زانیہ کے درمیان بھی وہ نکاح کو حرام

سمجھتے ہیں۔ الا یہ کہ دونوں کے درمیان توبہ کے ذریعے صفائی ہو جائے اور یہ گندگی دور ہو جائے۔ بہرحال ایک پاکباز مومنہ ایک زانی سے نکاح کرنے سے ابا کرتی ہے اور اسی طرح ایک پاکباز مومن بھی ایک زانیہ سے نکاح کو قابل نفرت سمجھتا ہے۔ اس قسم کے نکاح کے لیے چونکہ حرام کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس لیے شریعت اور دینی مزاج اس کو بہرحال مستبعد سمجھتا ہے۔

وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۴ : ۳) "اور اسے مومنین کے لیے حرام کر دیا گیا ہے"۔ یوں اسلامی سوسائٹی سے ناپاک اور گندے لوگوں کو علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔

اس آیت کی شان نزول میں روایت ہے کہ ایک شخص مرثد ابن ابو مرثد مکہ سے ضعیف اسیروں کو اٹھا کر مدینہ لانے کا کام کرتا تھا۔ "وہ لوگ جن کو اہل مکہ نے مدینہ ہجرت کر کے جانے سے روک دیا تھا"۔ مکہ میں ایک بدکار عورت تھی جس کا نام عناق تھا' جو مرثد کی دوست تھی۔ مرثد نے مکہ کے نظربندوں میں سے ایک شخص کے ساتھ وقت مقرر کر رکھا تھا کہ وہ اسے رات کو اٹھا کر لے جائے گا کہتے ہیں کہ چاندنی رات تھی اور میں مکہ کے ایک گھر کی دیوار کے سایہ میں تھا۔ عناق آگئی اور اس نے دیوار کے ساتھ لگا ہوا سایہ دیکھ لیا۔ جب وہ میرے پاس آئی تو اس نے مجھے پہچان لیا اور بولی "مرثد ہو"۔ میں نے کہا "مرثد ہوں"۔ تو اس نے کہا مرحبا اهلاً وسهلاً۔ پھر اس نے کہا آؤ اور ہمارے ساتھ آج رات رہو۔ تو میں نے اس سے کہا عناق! اللہ نے تو زنا کو حرام قرار دے دیا ہے۔ اس نے علاقے میں شور کر دیا کہ دیکھو مرثد تمہارے نظربندوں کو لے جا رہا ہے۔ چنانچہ میں باغ میں داخل ہو گیا اور آٹھ افراد مرے پیچھے نکل پڑے۔ میں ایک غار یا کیف میں پہنچ گیا اور اندر داخل ہو گیا۔ وہ لوگ آئے اور انہوں نے میرے سر پر کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔ ان کا پیشاب میرے سر پر گر رہا تھا لیکن اللہ نے ان کو ایسا اندھا کر دیا تھا کہ انہوں نے مجھے نہ دیکھا۔ مرثد کہتے ہیں کہ یہ لوگ واپس ہو گئے اور میں نے بھی واپس آکر اپنے آدمی کو لیا۔ یہ بہت عیار شخص تھا۔ "اذخر" تک میں پہنچا۔ میں نے اس شخص کی رسیاں کھولیں۔ میں اس کو اٹھاتا اور وہ بھی میری مدد کرتا۔ یہاں تک کہ ہم مدینہ پہنچ گئے۔ میں رسول اللہؐ کے پاس آیا اور میں نے آپؐ سے درخواست کی حضورؐ میں عناق کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے دو بار حضورؐ سے یہ سوال کیا اور حضورؐ نے مجھے کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

الزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّ الزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۴ : ۳) "زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرک کے ساتھ اور زانیہ کے ساتھ نکاح نہ کرے مگر زانی یا مشرک۔ اور یہ حرام کر دیا گیا ہے اہل ایمان پر"۔

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے مرثد زانی نکاح نہیں کرتا مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرک کے ساتھ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ اس کے ساتھ نکاح نہ کرو"۔ (ابوداؤد' نسائی' ترمذی)۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زانیہ کے ساتھ مومن کا نکاح اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک توبہ نہ کرے۔ اس طرح کوئی مومنہ بھی زانی سے نکاح نہیں کر سکتی الا یہ کہ وہ توبہ کرے۔ یہ امام احمد کی رائے ہے۔ دوسرے

فقہاء نے دوسری آراء کو لیا ہے ۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے تفصیلات کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہیں ۔ بہرحال زنا ایک ایسا فعل ہے کہ اس کا مرتکب اسلامی سوسائٹی میں رہنے کا اہل نہیں رہتا۔ اسلامی سوسائٹی سے اسے دور ہونا چاہئے اور دور کر دیا جانا چاہئے ۔ یہ بھی ایسے مجرموں کے لیے ایک قسم کی سزا ہے جس طرح کوڑوں کی سزا ایک سزا ہے ۔

اسلام نے اس مکروہ اور شنیع فعل پر اس قدر سخت اور دو ٹوک سزا تجویز کی ہے ' یہ اس لیے نہیں ہے کہ اسلام انسان کے فطری تقاضوں کے خلاف کوئی جنگ لڑنا چاہتا ہے ۔ اسلام تو اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ انسان کے لیے اس کے فطری میلانات اور فطری تقاضوں کو پورا کرنے کا انتظام ہونا چاہئے ۔ اسلام اس امر میں انسانیت کی بھلائی نہیں دیکھتا کہ انسان کے فطری میلانات کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے ۔ نہ اسلام انسان کے ان فطری دواعی کے خلاف ہے جو خالق کائنات نے انسان کی فطرت کے اندر ودیعت کر رکھے ہیں اور یہ اس کائنات کی عظیم زندگی کے قواعد کا ایک حصہ ہیں ۔ انہی فطری میلانات کے نتیجے میں سلسلہ حیات کا تسلسل قائم ہے اور زمین کی تعمیر و ترقی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے ۔ جو فریضہ خلافت ارضی کا ایک حصہ ہے بلکہ اسلامی نظام حیات کی جنگ دراصل حیوانیت کے خلاف جنگ ہے ۔ ایک حیوان کے نزدیک ایک جسم اور دوسرے جسم کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ نہ حیوانات کی کوئی فیملی ہوتی ہے ۔ نہ ان کے درمیان مشترکہ جائے رہائش ہوتی ہے اور نہ مشترکہ زندگی ہوتی ہے ۔ بس چند لمحوں کا جسمانی ملاپ ہوتا ہے فقط ۔ اسلام انسانی زندگی کو اس قدر عارضی میلانات پر استوار کرنا نہیں چاہتا بلکہ اسلام جنسی تعلق کو ترقی یافتہ انسانی شعور کی بنیاد پر استوار کرتا ہے کہ دو پاک اور نفیس جسم ایک دوسرے کے ساتھ ملیں ۔ دو دل اور دو روحیں اکٹھی ہو جائیں ۔ دو انسان مل جائیں ۔ ان کے درمیان ایک مشترکہ زندگی کی تعمیر ہو ۔ ان کے درمیان مشترکہ امیدیں ہوں 'ان کا دکھ درد مشترک ہو ۔ ان کا مستقبل مشترک ہو ۔ اور دونوں کی آنے والی اولاد ہو ۔ ان کی خوشیوں اور ان کی ذمہ داریوں میں وہ شریک ہوں اور یہ جدید آنے والی نسل ایک ہی مشترکہ جائے رہائش میں پروان چڑھے اور دونوں والدین اس نرسری کی حفاظت اور نشوونما کے لیے کھڑے ہوں ۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے زنا کی سزا میں اس قدر شدت اختیار کی ہے کیونکہ جنسی تعلقات میں زنا حیوانیت کی سطح تک گرنے کے مترادف ہے ۔ اس سے ان تمام اعلیٰ قدروں کی نفی ہو جاتی ہے جو اسلام کے پیش نظر ہیں اور وہ تمام معاشرتی مقاصد فوت ہو جاتے ہیں جن کو اسلام بروئے کار لانا چاہتا ہے ۔ اس سے انسان محض حیوانیت کے مقام تک گر جاتا ہے ۔ کیونکہ اگر عورت اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہ ہو اور مرد اور مرد کے درمیان فرق نہ کیا جائے تو یہ حیوانی سطح ہے ۔ آزاد شہوات رانی کے نظام میں انسانیت اس قدر مسخ ہو جاتی ہے کہ لوگ گوشت اور خون کی ایک لحاتی بھوک پر سب کچھ قربان کر دیتے ہیں ۔ اور اس وقتی اور حیوانی جنسی ملاپ کے نتیجے میں ' زندگی کی تعمیر کا جذبہ نہیں ہوتا' اس کرہ ارض کی تعمیر کا کوئی منصوبہ نہیں ہوتا۔ نہ اس ملاپ سے اولاد کے حصول کا کوئی جذبہ ہوتا ہے بلکہ اس کی پشت پر کوئی حقیقی اور بلند جذبہ ہوتا ہی نہیں ۔ کیونکہ محبت اور میلان کے اندر بھی ایک قسم کا دوام ہونا چاہئے جبکہ زنا کے پیچھے جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ سب کا سب وقتی ہوتا ہے ۔ بعض معاشروں میں اگرچہ دوستی اور محبت کے طویل تعلقات ہوتے ہیں لیکن ان کی پشت پر اعلیٰ انسانی اقدار نہیں ہوتیں ۔ ان کی پشت پر محض حیوانیت ہی ہوتی ہے ۔

جہاں تک اسلام کا تعلق وہ نہ فطری میلانات اور خواہشات کو دباتا ہے اور نہ ان کو کوئی ناپاک چیز سمجھتا ہے ۔ اسلام

ان کو منظم اور منضبط کر کے پاکیزگی عطا کرتا ہے اور حیوانی مقام سے بلند کر کے اسے ایک ادارہ اور محور بنا دیتا ہے جس کے ارد گرد بے شمار نفسیاتی اور اجتماعی آداب جمع ہو جاتے ہیں ـ رہا زنا اور خصوصاً عصمت فروشی تو اس سے یہ فطری جذبات پاکیزگی اور روحانیت اور اعلیٰ خواہشات سے عاری ہو جاتے ہیں ـ نیز نسل انسانی کی تاریخ میں اس ادارے سے ہمیشہ جو آداب و اقدار وابستہ رہی ہیں وہ اس ادارے سے چھن جاتی ہیں اور یہ محض حیوانی لذتیت تک گر جاتا ہے بلکہ حیوان سے بھی زیادہ غلیظ گندا اور گرا ہوا ہوتا ہے اس لیے کہ بے شمار حیوانات اور پرندے ایسے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اور ان کی منظم ازدواجی زندگی ہوتی ہے ـ اور اس زندگی میں جنسی تعلق میں طوائف الملوکی نہیں ہوتی ـ جیسا کہ دو انسان زناکاروں کے درمیان ہوتی ہے خصوصاً جسم فروش عورتوں کے معاملے میں تو فریقین حیوانوں سے بھی نیچے ہوتے ہیں ـ

اسلام چونکہ انسانی معاشرے سے اس گراوٹ کو دور کرنا چاہتا ہے اس لیے اس نے زنا کی سزا میں اس قدر سختی برتی ہے ـ زنا کے جرم کے خلاف علماء نے بعض دوسرے اسباب بھی گنوائے ہیں اور ان میں سے ہر ایک سبب بھی ایک پورا جواز فراہم کرتا ہے کہ زنا کے جرم پر اس قسم کی سخت سزا دی جائے ' مثلاً یہ کہ اس سے نسب میں اختلاط پیدا ہوتا ہے ـ لوگوں کے درمیان بغض اور کینہ اور دشمنی پیدا ہوتی ہے اور یہ کہ مطمئن گھرانوں کے اطمینان کے اندر فرق پڑتا ہے وغیرہ وغیرہ ـ لیکن میرے خیال میں اس سزا کا اصل اور جامع سبب یہی ہے کہ انسان کو حیوانی جنسی ملاپ کی گراوٹ سے بلند کیا جائے اور ان اقدار و آداب کو محفوظ کیا جائے جو جنسی ملاپ کے انسانی ادارے سے ہمیشہ وابستہ رہے ہیں ـ نیز یہ کہ اس ادارے کو دوام بخشا جائے اور زوجین اعلیٰ اقدار اور اعلیٰ مقاصد کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ مشترکہ زندگی بسر کریں ـ یہ سب سے اہم اور جامع وجہ ہے جو جامع الوجوہ والاسباب ہے ـ

پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ اسلام اس جرم کی سزا میں تشدد اس وقت کرتا جب اس جرم کے وقوع کے خلاف تمام احتیاطی اور امتناعی تدابیر اختیار کر لی جائیں ـ اسلام زندگی کا ایک مکمل نظام ہے اور جب قائم ہوتا ہے تو اس میں سوسائٹی ایسے خطوط پر منظم ہو چکی ہوتی ہے کہ پاکیزہ زندگی گزارنے کے مواقع عام ہوتے ہیں اور گندی اور غلیظ زندگی گزارنے کے مواقع محدود ہوتے ہیں ـ تب اسلام ان لوگوں پر یہ سزا نافذ کرتا ہے جو پاکیزہ طریقوں کو چھوڑ کر گندے طریقے اپناتے ہیں ـ اور اس صورت میں کئی ایسے نمونے اور مثالیں موجود ہیں جن سے ہماری اس بات کی تصدیق ہوگی ـ

نیز اگر یہ جرم واقع بھی ہو جائے تو بھی اسلام نے اس کے ثبوت کے لیے اس قدر مشکل طریق کار رکھا ہے کہ کسی نہ کسی صورت میں شبہ پیدا ہو ہی جاتا ہے اور اسلام کے قانون جرائم کے سلسلے میں یہ اہم اصول وضع کیا گیا ہے کہ شبہات کے ذریعہ الزام جرم ساقط کر دیا جاتا ہے ـ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں پر سے حدود کو ساقط کر دو جہاں تک تم سے ہو سکتا ہے ـ اگر ملزم کے چھوڑے جانے کی کوئی سبیل اور راستہ ہو تو اسے نکلنے دو کیونکہ قاضی اگر معاف کرنے میں غلطی کر جائے تو اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کرے ـ یہی وجہ ہے کہ اسلام چار گواہ طلب کرتا ہے جو عادل بھی ہوں اور جو یہ شہادت دیں کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے فعل ہوتے دیکھا ہے یا یہ کہ ملزم کی طرف سے ایسا اعتراف ہو جس میں کوئی شبہ نہ ہو ـ

بعض اوقات یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ پھر اسلام نے چار آدمیوں کی شہادت کی جو شرط لگائی ہے تو یہ سزا پھر خیالی سزا ہو گی اور اس سزا کے نفاذ کا کوئی امکان نہیں رہے گا ـ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا اسلام اسلامی سوسائٹی سے جرم زنا کو

صرف سزا کے ذریعے نہیں مٹاتا بلکہ اسلامی نظام دوسرے انسدادی اسباب بھی اختیار کرتا ہے جن کی وجہ سے یہ جرم واقع ہی کم ہوتا ہے۔ اسلام انسان کی تہذیب و تربیت پر زور دیتا ہے۔ انسانوں کے ضمیر کو پاک کرتا ہے۔ اسلام لوگوں کے اندر یہ ڈر پیدا کرتا ہے کہ جو شخص اس جرم کا ارتکاب کرے اگر اس کا یہ جرم افشا ہو گیا تو وہ اس سوسائٹی کا ایک بدکردار شخص مشہور ہو گا' کوئی اسے اپنی بیٹی نہ دے گا یا کوئی اس کی بیٹی کو بہو نہ بنائیگا۔ اسلامی سوسائٹی سے وہ کٹ جائے گا۔ اسلام سزا صرف ان لوگوں کو دیتا ہے جو اس جرم کا ارتکاب اس قدر دلیری سے کریں کہ انہیں چار افراد دیکھ لیں یا ایسے لوگوں پر یہ سزا نافذ کرتا ہے جو خدا سے ڈرنے والے ہوں اور جو اپنے آپ کو سزا کے ذریعے سے پاک کرنا چاہتے ہوں اور وہ اقرار جرم کر لیں جیسا کہ حضرت ماعز اور غامدیہ کے ساتھ ہوا۔ یہ دونوں خود حضورؐ کے پاس آئے اور کہا کہ حضورؐ ہمیں پاک کر دیں۔ انہوں نے اس بات پر اصرار کیا حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے میں چار مرتبہ اعراض فرمایا اور چار مرتبہ اقرار و اصرار کرنے کے بعد آپ نے حکم دیا کہ اب حد قائم کر دی جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "آپس میں حدود کو معاف کر دیا کرو' اگر حدود کا کوئی معاملہ مجھ تک پہنچ گیا تو پھر اس کا نفاذ واجب ہو جائے گا" (ابو داؤد)۔

لیکن جب ارتکاب جرم کا یقین ہو گیا اور معاملہ حکام مجاز تک پہنچ گیا تو پھر اس میں کسی نرمی کی اجازت نہیں ہے۔ پھر حدود کا نفاذ واجب ہو جاتا ہے اور پھر یہ دین کا معاملہ بن جاتا ہے اور اس میں رحم کرنا جائز نہیں ہے۔ ثبوت جرم کے بعد رحمدلی کے معنی یہ ہیں کہ مجرم پر رحمدلی کی جائے اور سوسائٹی کے ساتھ سنگدلی کی جائے اور انسانی آداب اور انسانی ضمیر پر ظلم کیا جائے۔ یہ دراصل ایک مصنوعی رحمدلی ہوگی۔ ہمارے مقابلے میں اللہ اپنے بندوں پر زیادہ رحمدل ہے اور اللہ نے یہ سزا تجویز کی ہے اور کسی مومن اور مومنہ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے میں کوئی فیصلہ کر دیں تو انہیں ان کے لیے اس میں کوئی اپنا اختیار ہو۔ اللہ اپنے بندوں کی مصلحتوں سے خوب واقف ہے۔ نیز اللہ بندوں کے مزاجوں سے بھی ہم سے زیادہ واقف ہے اس لیے کسی بکنے والے کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی سزا کے بارے میں یہ کہے کہ یہ سخت ہے۔ ہم کہتے ہیں سوسائٹی میں اس گھناؤنے جرم کے پھیلانے کے مقابلے میں یہ بہت ہی نرم سزا ہے۔ کیونکہ اس جرم کے پھیلنے سے سوسائٹی زوال' پسماندگی اور فساد فطرت اور بے غیرتی جیسے مصائب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

صرف زنا کی سزا میں تشدد سے ہی اسلامی سوسائٹی کو بچانا مقصود نہیں ہے۔ نہ اسلامی نظام اسلامی معاشرے کو پاک و صاف رکھنے میں صرف سزاؤں پر اعتماد کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے اسلام سوسائٹی کو اس جرم سے بچانے کے لیے دوسرے اقدامات بھی کرتا ہے۔ اسلام ان تمام کاموں سے منع کرتا ہے جن سے اس جرم کی بو بھی آتی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ زانیوں کو امت مسلمہ کے جسم سے دور کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا قدم یہ اٹھایا جاتا ہے کہ پاک دامن عورتوں پر زنا کے الزام لگانے کو بھی جرم قرار دیا گیا ہے الا یہ کہ کوئی چار گواہ پیش کر دے۔ یہ اس لیے کہ اس گھناؤنے جرم کا الزام لگانے میں لوگ بے باک نہ ہوں۔

وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ

فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

"اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو اسی (۸۰) کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو، اور وہ خود ہی فاسق ہیں"۔

زبانوں کو کھلا چھوڑ دینا کہ وہ پاک دامن عورتوں (محصنات) پر تہمتیں لگاتے پھریں۔ محصنات وہ کنواری اور شادی شدہ عورتیں ہوتی ہیں جن پر زنا کے جرم کے ارتکاب کا الزام لگایا جائے لیکن اس الزام کی پشت پر کوئی دلیل قاطع نہ ہو۔ اس طرح کہ بغیر کسی ثبوت کے کوئی کسی بے گناہ مرد یا عورت پر اس گھناؤنے جرم کا الزام لگاتا پھرے اور اس پر اسے کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ یوں صبح و شام معاشرے میں لوگوں کی عزتوں پر حملہ ہوتا رہے، معاشرہ بدنام ہوتا رہے اور ہر شخص پر الزام لگنے کے مواقع عام ہوں۔ یا مرد اپنی بیوی پر شک کرے۔ ہر شخص کو اپنے اصل و نسل کے بارے میں شک ہو جائے۔ ہر خاندان کے ٹوٹ جانے کا خطرہ ہو۔ تہمت، الزام اور شک کے یہ وہ حالات ہوں گے جن میں کسی شخص کو کوئی اطمینان نہ ہو گا۔

پھر اگر زناکاری کے الزامات اس طرح لگائے جاتے رہیں تو عام لوگوں کو اس جرم کے ارتکاب کی جراءت ہو گی۔ لوگ کہیں گے کہ سوسائٹی میں ہر طرف اس جرم کا چرچا ہے۔ اس طرح جو شخص اس سے بچنا بھی چاہتا ہو گا، وہ بھی اس میں ملوث ہو جائے گا۔ کم از کم بار بار کے الزامات کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں اس کا ارتکاب اس قدر گھناؤنا نہ رہے گا۔ ایک عام آدمی کا تاثر بھی یہ ہو گا کہ عام لوگ اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

اگر الزام زنا بلاثبوت کو جرم نہ قرار دیا جائے تو پھر زنا کی اس شدید سزا کا بھی کوئی فائدہ نہ ہو گا اور پوری سوسائٹی کی فضا اس جرم میں ملوث ہو گی اور فحاشی کے ارتکاب میں اضافہ ہو گا۔

ان وجوہات کی بناء پر، لوگوں کو ناجائز تہمتوں سے بچانے کی خاطر، اور اس الزام کی وجہ سے لوگوں کی عزت کو بچانے کی خاطر قرآن کریم نے حد قذف کی سزا میں سختی کی ہے۔ اس قدر سختی کہ اس کی سزا کو ارتکاب جرم کی سزا کے قریب قریب قرار دیا ہے۔ یعنی ۸۰ کوڑے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ ایسا شخص فاسق قرار پائے گا اور آئندہ کبھی بھی اس کی شہادت قبول نہ ہو گی۔ پہلی سزا یعنی ۸۰ کوڑے تو جسمانی سزا ہے اور دوسری سزا تادیبی سزا ہے کہ سوسائٹی کے اندر زنا کا الزام لگانے والے کی بات بے وقعت ہو جائے کہ آئندہ اس کی کسی بات پر کوئی اعتبار نہ ہو گا۔ تیسری سزا دینی سزا بھی ہے کہ وہ اسلام کی سیدھی راہ سے پھر گیا ہے الا یہ کہ وہ چار گواہ لائے یا تین گواہ اپنے ساتھ لائے اگر اس نے خود دیکھا ہو۔ اس وقت اس کی بات درست سمجھی جائے گی اور ملزم پر پھر حد زنا نافذ ہو گی۔

جہاں تک اسلامی سوسائٹی کی ترجیحات کا تعلق ہے اگر اس میں ایسے الزام کو دبا دیا جائے جس کی پشت پر کوئی ثبوت نہ ہو، تو اس صورت میں کوئی نقصان نہ ہو گا جس طرح کا نقصان اس صورت میں ہو گا کہ فحاشی کا چرچا ہو جائے اور اس پر کوئی ثبوت نہ ہو۔ کیونکہ اس صورت میں کئی لوگ اس گندے جرم کے ارتکاب پر آمادہ ہو سکتے ہیں، جبکہ عام طور پر

وہ اس سے بچتے تھے ' اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ نہایت ہی مکروہ فعل ہے اور اس کا ارتکاب نادرست ہے رہی یہ بات کہ پاک دامن عورتوں پر اس الزام کی وجہ سے کیا گزرتی ہے اور اس سے معاشرے کے اندر جو بے اطمینانی پھیلتی ہے اور جس طرح گھرانے تباہ ہوتے ہیں یہ ایک عام بات ہے اور اسے ہر شریف آدمی اچھی طرح سمجھتا ہے۔ غرض الزام لگانے والے (قاذف) کے سر پر سزاؤں کی تلوار ہر وقت سونتی رہتی ہے۔ الا یہ کہ :

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ

"سوائے ان لوگوں کے جو اس حرکت کے بعد تائب ہو جائیں اور اصلاح کر لیں تو اللہ ضرور (ان کے حق میں) غفور و رحیم ہے"۔

فقہاء کے درمیان اس استثناء کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا اس کا تعلق صرف آخرت کی سزا سے ہے یعنی اس شخص سے صفت فسق دور ہو جائے گی اور شہادت کے لیے وہ بدستور نااہل رہے گا یا یہ کہ اس کی شہادت بھی توبہ کے بعد قبول ہو گی۔ امام احمد ' امام شافعی اس طرف گئے ہیں کہ اگر تائب ہو جائے تو اس کی شہادت قبول ہو گی کیونکہ فسق کا حکم اٹھ چکا ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ یہ استثناء صرف آخری جملے میں ہے یعنی فسق اٹھ جائے گا لیکن یہ شخص بدستور شہادت کے لیے نااہل ہو گا۔ شعبی اور ضحاک نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے کہ اس کی شہادت قبول نہ کی جائے گی اگرچہ توبہ کرے ' اس وقت تک جب تک وہ اپنے خلاف یہ اعتراف نہ کر لے کہ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ اس کے بعد اس کی شہادت قبول ہو گی۔

میرے خیال میں ضحاک اور شعبی کا مذہب زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس صورت میں جس شخص پر الزام لگایا گیا تھا وہ معاشرتی طور پر اس الزام سے براہ راست بری الذمہ قرار پائے گا۔ اس طرح قذف کے تمام آثار ختم ہو جائیں گے۔ پھر کوئی یہ نہ کہے گا کہ قاذف پر حد اس وجہ سے لگ گئی کہ اس نے شہادت پیش نہ کی اور نہ کسی کے دل میں یہ برا خیال آئے گا کہ ہو سکتا ہے الزام درست ہو لیکن قاذف کو شہادت دستیاب نہ ہو سکی۔ اس طرح مقذوف کی عزت بھی بحال ہو جائے گی اور قاذف کا معاشرتی اعتبار بھی بوجہ توبہ بحال ہو جائے گا۔ یوں اس سابقہ مقدمہ کے تمام آثار ختم ہو جائیں گے۔ اب اس بات کا کوئی جواز باقی نہ رہے گا کہ توبہ کے بعد بھی قاذف کی شہادت مقبول نہ ہو جبکہ اس نے بہتان طرازی کا اعتراف بھی کر لیا ہو اور توبہ کے ذریعہ اصلاح بھی کر لی ہو۔

یہ تو تھا عام الزام زنا کا معاملہ۔ رہا الزام مابین زوجین یعنی کوئی مرد اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگا دے تو یہ الگ صورت ہو گی۔ اس مرد سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ چار گواہ لائے یہ بہت بڑی سختی ہو گی لہذا شریعت میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ کوئی مرد اپنی بیوی پر جھوٹا الزام نہیں لگا سکتا۔ کیونکہ اس میں خود اس کی اپنی عزت اور اپنی شرافت خطرے میں ہوتی ہے۔ لہذا شریعت میں اس قسم کے الزام کے لیے ایک خاص قانون لعان تجویز کیا گیا ہے۔

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنْفُسُهُمْ

فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ ۙ إِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٦﴾ وَ
الْخَامِسَةُ أَنَّ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَيْهِ إِن كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿٧﴾ وَيَدْرَؤُا
عَنْهَا الْعَذَابَ أَن تَشْهَدَ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ ۙ إِنَّهُ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿٨﴾ وَ
الْخَامِسَةَ أَنَّ غَضَبَ اللَّهِ عَلَيْهَا إِن كَانَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٩﴾ وَلَوْلَا ١
فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَأَنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ حَكِيمٌ ﴿١٠﴾ ۱۰ع

۷

"اور جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگائیں اور ان کے پاس خود ان کے اپنے سوا دوسرے کوئی گواہ نہ ہوں تو ان میں سے ایک شخص کی شہادت (یہ ہے کہ وہ) چار مرتبہ اللہ کی قسم کھاکر گواہی دے کہ وہ (اپنے الزام) میں سچا ہے اور پانچویں بار کہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ (اپنے الزام میں) جھوٹا ہو اور عورت سے سزا اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھاکر شہادت دے کہ یہ شخص (اپنے الزام میں) جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اس بندے پر اللہ کا غضب ٹوٹے اگر وہ (اپنے الزام میں) سچا ہو۔ تم لوگوں پر اللہ کا فضل اور اس کا رحم نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا التفات فرمانے والا اور حکیم ہے تو (بیویوں پر الزام کا معاملہ تمہیں بڑی پیچیدگی میں ڈال دیتا)"۔

ان آیات میں حد قذف کے قانون میں میاں بیوی کے لیے قدرے سہولت پیدا کی گئی ہے اور یہ سہولت میاں بیوی کے نازک تعلقات کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ اگر خاوند کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی بیوی نے زنا کا ارتکاب کیا ہے اور اس بات پر گواہ صرف وہ خود ہو تو اس صورت میں طریق کار یہ ہو گا کہ وہ چار بار قسم اٹھا کر یہ کہے گا کہ اس کا دعویٰ درست ہے یعنی الزام زنا اور پانچویں مرتبہ یہ کہے گا کہ مجھ پر اللہ کی لعنت ہو اگر میں جھوٹا ہوں۔ اور اس شہادت کو شہادات اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ ایک ہی گواہ کی زیادہ شہادتیں ہیں۔ اگر خاوند نے ایسا کیا تو وہ سزا ادا کرے گا اور عورت پر طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔ اور اس پر حد زنا یعنی رجم جاری ہوگی۔ ہاں اگر عورت اپنے اوپر سے اس سزا کو معاف کرانا چاہتی ہے تو وہ سابقہ شہادت کے بالمقابل چار مرتبہ حلف اٹھا کر کہے کہ الزام لگانے والا کاذب ہے اور پانچویں مرتبہ وہ حلف اٹھا کر کہے کہ مجھ پر اللہ کا غضب ہو اگر میں جھوٹ بولوں۔ اس طرح اس پر سے حد ساقط ہو جائے گی۔ اور لعان کے ذریعے وہ اپنے خاوند سے جدا ہو جائے گی۔ اس کے بیٹے کا نسب والد کے ساتھ لاحق نہ ہو گا اگر وہ حاملہ ہو بلکہ بیٹے کی نسبت ماں کی طرف ہوگی اور اس قسم کے بیٹے پر ولد الزنا کا الزام موجب حد قذف ہو گا۔

اس پر یہ تعقیب اور تبصرہ آتا ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَأَنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ حَكِيمٌ (۲۴: ۱۰) "تم پر اللہ کا فضل اور رحم نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا التفات فرمانے والا اور حکیم ہے تو (بیویوں پر الزام کا معاملہ تمہیں بڑی پیچیدگی میں ڈال دیتا)۔ یہاں اللہ نے بیان نہیں فرمایا کہ اگر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ اللہ نے مجمل اس لیے

چھوڑ دیا کہ لوگ اس سے ڈرتے رہیں۔ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بڑا ہی شر ہوتا لیکن اللہ نے اسے دفع کر دیا۔

اس سلسلے میں بعض صحیح احادیث میں اس قانون سازی کا شان نزول وارد ہے۔ امام احمد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت فرمائی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمٰنِينَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا (۲۴ : ٤) "اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو اسی (۸۰) کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو۔

تو سعد ابن عبادہ رضی اللہ عنہ جو انصار کے سردار تھے، نے کہا کیا یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی ہے؟ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اے گروہ انصار، تم نہیں سنتے تمہارا سردار کیا کہہ رہا ہے؟ تو انہوں نے کہا، اے رسول خدا اس شخص کو ملامت نہ کریں۔ یہ نہایت ہی غیور آدمی ہے۔ اس نے کبھی بھی کنواری عورت کے سوا کسی عورت سے نکاح نہیں کیا۔ اور اس نے جب کسی عورت کو طلاق دی تو کسی شخص کو جرأت نہیں ہوئی کہ اس کے ساتھ نکاح کر لے کیونکہ وہ اس کی غیرت سے ڈرتا۔ اس پر سعدؓ نے کہا اے رسول خدا واقعہ یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ یہ حق ہے اور یہ اللہ کی جانب سے ہے لیکن مجھے تعجب اس پر ہے کہ میری بیوی کی ران پر ایک شخص ران رکھ دے اور مجھے اجازت نہ ہو کہ میں اسے چھیڑوں اور نہ میں اسے اپنی جگہ سے ہلاؤں یہاں تک کہ جب تک کہ میں چار گواہ تلاش کر کے نہ لاؤں۔ خدا کی قسم جب تک میں چار گواہ لاؤں گا تو وہ اپنا کام کر کے چلا گیا ہو گا۔ کہتے ہیں کہ تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ ہلال ابن امیہ آ گیا۔ یہ اپنی اراضی سے کام کر کے عشاء کے وقت لوٹا۔ اس نے اپنی اہلیہ کے پاس ایک شخص کو دیکھا۔ اپنی آنکھوں سے اس نے دیکھا اور اپنے کانوں سے اس نے سنا تو اس نے اس شخص کو نہ چھیڑا۔ صبح ہوتے ہی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا حضور میں رات کو عشاء کے وقت اپنے گھر آیا۔ میں نے اپنی اہلیہ کے پاس ایک شخص کو دیکھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں کے ساتھ سنا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی اس اطلاع کو بہت ہی ناپسند فرمایا۔ آپ پر یہ بات بہت ناگوار گزری لیکن انصار اس پر جمع ہو گئے اور انہوں نے کہا: سعد ابن عبادہ نے جو کچھ کہا ہے وہ ہمارے لیے بڑی آزمائش تھی۔ اب نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہلال ابن امیہ کو کوڑے لگائیں اور لوگوں کے اندر ان کی شہادت ہمیشہ کے لیے غیر مقبول ہو جائے۔ اس پر ہلال ابن امیہ نے کہا: خدا کی قسم مجھے امید ہے کہ اللہ اس سے نکلنے کی کوئی راہ ضرور نکالے گا۔ ہلال نے حضور اکرمؐ سے کہا کہ رسول خدا میں جانتا ہوں کہ میری اس بات سے آپؐ پر کس قدر ناگواری کی حالت آ گئی ہے لیکن اللہ جانتا ہے کہ میں سچا ہوں۔ خدا کی قسم رسول خدا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ہلال ابن امیہ پر حد قذف نافذ کرنے کا حکم دیں کہ اچانک وحی آ گئی۔ اور جب آپؐ پر وحی آتی تھی تو صحابہ کرام فوراً سمجھ لیتے تھے کہ نزول وحی شروع ہے۔ تمام صحابہؓ آپؐ سے علیحدہ ہو جاتے تھے یہاں تک کہ نزول وحی کا عمل مکمل ہو جاتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ الَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ إِلَّآ أَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ

رُبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰہ ( ٢٤ : ٦ ) "اور جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگائیں اور ان کے پاس خود ان کے اپنے سوا دوسرے کوئی گواہ نہ ہوں تو ان میں سے ایک شخص کی شہادت (یہ ہے کہ وہ) چار مرتبہ اللہ کی قسم کھاکر گواہی دے کہ وہ (اپنے الزام) میں سچا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سے حالت وحی دور ہوگئی تو آپ ؐ نے فرمایا بلال! مبارک ہو۔ اللہ نے تیرے لیے آسانی پیدا کر دی ہے اور اس مشکل سے نکلنے کی راہ نکالی ہے۔ تو ہلال نے کہا میں امید کر رہا تھا کہ اللہ میرے لیے کوئی راہ نکالے گا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس عورت کو بلایا جائے۔ وہ آگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات دونوں کو پڑھ کر سنائیں۔ ان کو نصیحت کی اور ان کو بتایا کہ دنیا کا عذاب آخرت کی سزا سے بہت ہی تھوڑا ہے تو ہلال نے کہا رسول خدا اللہ کی قسم میں نے اس کے بارے میں سچ کہا ہے اور اس عورت نے جواب میں کہا۔ یہ جھوٹ کہتا ہے۔ اس پر حضور ؐ نے فرمایا ان دونوں کے درمیان لعان کرادو۔ تو ہلال کو کہا گیا تم چار بار شہادت دو کہ تم سچ کہتے ہو۔ جب پانچویں بار شہادت دینے لگا تو اسے کہا گیا: اللہ سے ڈرو' دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے ہلکا ہے۔ اور یہ شہادت جو فریق مخالف پر سزا واجب کرنے والی ہے' تیرے لیے موجب عذاب ہوگی۔ تو ہلال نے کہا خدا کی قسم اس کے بارے میں مجھے اللہ ہرگز عذاب نہیں دے گا۔ جس طرح اس نے مجھے کوڑوں کی سزا نہیں دی تو پانچویں مرتبہ ہلال نے شہادت دی کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ اس کے بعد عورت سے کہا گیا کہ تم چار شہادتیں دو کہ وہ جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ اس سے کہا گیا خدا سے ڈرو اور دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے بہت ہی ہلکا ہے اور یہ پانچویں بار عذاب کو واجب کرنے والی ہے اور یہ تم پر عذاب کو واجب کر دے گی۔ وہ کچھ دیر کے لیے ہچکچائی اور ارادہ کر لیا کہ اعتراف کر لے۔ اس کے بعد اس نے کہا میں اپنی قوم کو شرمندہ نہیں کروں گی۔ چنانچہ اس نے پانچویں مرتبہ شہادت دی کہ اس پر اللہ کا غضب ہو گا۔ اگر وہ سچا ہو۔ رسول اللہ نے دونوں کے درمیان تفریق کر دی اور یہ فیصلہ کیا کہ اس کے بچے کو باپ کی طرف منسوب نہ کیا جائے گا۔ نہ اس کے بچے پر تہمت لگائی جائے گی۔ جس نے اس کے بچے کو ولد الزنا کہا' اس پر حد جاری ہوگی۔ یہ بھی حکم دیا کہ اس عورت کے لیے خاوند کے ذمہ رہائش کی جگہ فراہم کرنا لازم نہ ہو گا نہ خوراک لازم ہوگی۔ کیونکہ ان دونوں کے درمیان بغیر طلاق کے تفریق کر دی گئی ہے۔ اور حضور ؐ نے فرمایا کہ اگر اس کا بچہ قدرے سرخ بالوں والا' دبلے چوتڑ والا اور پتلی ٹانگوں والا ہوا تو وہ ہلال کا بچہ ہو گا اور اگر گندم گوں رنگ 'پیچدار بالوں والا' موٹے اعضا والا' موٹی پنڈلیوں والا ہوا' بھرے ہوئے چوتڑ والا ہوا تو پھر یہ اس شخص کا بیٹا ہو گا جس کے ساتھ وہ بدنام ہوئی۔ تو جب اس کا بچہ پیدا ہوا تو وہ گدرے 'پیچدار بالوں والا' موٹے اعضا والا اور موٹی ٹانگوں والا اور بھرے ہوئے چوتڑ والا تھا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر ایمان نہ ہوتا تو میں اس عورت کے ساتھ دیکھ لیتا"۔

یہ قانون لعان تھا اور یہ ایک عملی ضرورت کے تحت نازل ہوا۔ اس نے مسلمانوں کے لیے درپیش ایک مشکل مسئلے کو حل کر دیا۔ یہ مسئلہ اس قدر مشکل تھا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا کوئی حل نظر نہ آتا تھا۔ جیسا کہ روایت بخاری میں آتا ہے۔ آپ ؐ نے ہلال ابن امیہ سے کہا کہ یا تو گواہ لاؤ اور یا تمہاری پیٹھ پر حد جاری ہوگی۔ اور ہلال یہی کہتے رہے کہ حضور ؐ ایک شخص دیکھے کہ اس کی بیوی پر ایک شخص چڑھا ہوا ہے کیا وہ جائے گا کہ گواہ تلاش کرے۔

یہاں سوال کرنے والا یہ سوال کر سکتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کو علم نہ تھا کہ حد قذف کے عام قانون کے بعد اس قسم کا

مسئلہ پیدا ہو گا تو یہ استثناء اللہ نے پہلے کیوں نہ نازل کر دی اور کیوں اللہ تعالیٰ نے ایسی مشکل پیدا ہونے دی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے تشریع کے لیے یہ حکمت وضع کی تھی کہ قانون اس وقت نازل ہو جب لوگوں کے اندر اس کی ضرورت کا احساس پیدا ہو جائے تاکہ لوگ اسے نہایت ہی بے تابی کے ساتھ قبول کریں۔ اور ان کو اس قانون کے اندر پائے جانے والی حکمت کا اچھی طرح علم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد یہ تبصرہ آیا۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ (۲۴ : ۱۰) ''اگر اللہ کا فضل و رحمت نہ ہوتی اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بہت ہی التفات کرنے والا اور رحیم ہے تو....'' اب ذرا اس واقعہ پر غور کیجئے۔ دیکھئے کہ اسلام کس طرح کام کر رہا تھا اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کس طرح کام کر رہی تھی اور کس قدر مؤثر تھی اور اس قرآن کے ذریعے کس طرح ایک بالکل نئی سوسائٹی کو تعمیر کیا جا رہا تھا۔ اسلام نے عربوں جیسی غیور قوم کی کس طرح تربیت کر دی تھی۔ کس طرح ان کو بدل کر رکھ دیا۔ یہ لوگ اس قدر غیور اور جذباتی تھے کہ قانون حد قذف نازل ہو گیا۔ ان جذباتی لوگوں کے لیے یہ نہایت ہی مشکل قانون ہے وہ تو مشتعل ہوتے ہی عظیم سے عظیم کام کر گزرنے والے تھے۔ ان پر یہ نہایت ہی شاق گزرتا ہے۔ اس قدر شاق کہ حضرت سعد ابن عبادہ رسول اللہؐ سے پوچھتے ہیں کہ آیا فی الواقع یہ قانون اسی طرح نازل ہوا ہے۔ وہ سوال کرتے ہیں لیکن ان کو معلوم ہے کہ قانون تو نازل ہو گیا ہے۔ اس سوال سے دراصل وہ اس مشکل کا احساس کرتے ہیں کہ اگر یہ صورت حالات ان کے اپنے گھر میں پیش آ جائے تو وہ اسے کس طرح برداشت کریں گے۔ وہ اس تلخ حقیقت کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ رسول خدا میں جانتا ہوں کہ یہ حق ہے اور یہ اللہ کی جانب سے ہے لیکن مجھے اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ اگر میں ایک شخص کو دیکھوں کہ اس نے (مکاع) کی ران کے ساتھ ران ملا دی ہے اور مجھے یہ اجازت نہ ہو کہ اسے پریشان کروں یا اسے اپنی جگہ سے ہٹاؤں جب تک میں چار گواہ نہ لاؤں۔ خدا کی قسم میں چار گواہ لاؤں گا مگر اس نے اپنا کام پورا کر لیا ہو گا۔

یہ تو تھا سعد ابن عبادہ کا نظریاتی خیال اور سوچ۔ لیکن ایک متعین شخص اپنے کانوں اور اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ رہا ہے کہ اس کی بیوی کے ساتھ یہ بدکاری ہو رہی ہے اور وہ رک گیا ہے بلکہ قرآن نے اسے روک دیا ہے۔ یہ شخص اپنے جذبات 'جذبہ انتقام' سخت عربی غیرت اور خون کے اندر پیدا ہونے والے فوری جوش اور اعصاب کی ناقابل کنٹرول حرکت کو قابو میں لاتا ہے۔ اپنے اوپر ناقابل شکست کنٹرول کرتا ہے جس کا کوئی عربی معاشرے میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ بے بس ہو کر آتا ہے اور رسول اللہؐ کے حکم کا انتظار کرتا ہے۔ اگرچہ اس کے لیے یہ مسئلہ نہایت ہی شاق گزر رہا ہے لیکن قرآن کریم نے ان لوگوں کی ایسی تربیت کر دی ہے کہ یہ شخص جذبات کے اس طوفان کو پوری طرح کنٹرول کرتا ہے تاکہ حکم وہی ہو جو اللہ کی طرف سے آئے۔ اس کے نفس میں اور اس کی ذات کے تمام معاملات میں۔

یہ تربیت کیسے ممکن ہوئی؟ یہ اس طرح ہوئی کہ ان کو یہ پورا یقین تھا کہ اللہ ان کے ساتھ ہے اور یہ کہ وہ لوگ اللہ کی نگرانی اور حفاظت میں ہیں۔ اللہ ان کی رعایت کرتا ہے اور ان کو ایسی مصیبت میں نہیں ڈالتا جسے وہ برداشت نہ کر سکیں اور یہ کہ اللہ ان کو ایسی مشکلات میں نہیں چھوڑتا کہ وہ ان کے لیے ناقابل برداشت ہوں۔ اللہ کبھی بھی انسانوں پر ظلم

نہیں کرتا۔ یہ لوگ ہمیشہ اللہ کے زیر سایہ رہتے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم کی فضا میں سانس لے رہے تھے۔ وہ ہر وقت اللہ کی طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جس طرح ایک بچہ اپنے رحیم و کریم باپ کی طرف دیکھتا ہے۔ ہلال ابن امیہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور کانوں سے سن رہا ہے۔ یہ اکیلا ہے وہ رسول اللہؐ سے شکایت کرتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قانون میں کوئی صورت ماسوائے نفاذ حد قذف کے اور نہیں پاتے۔ حضورؐ اعلان بھی کر دیتے ہیں کہ شہادت یا حد ہے اور تمہاری پیٹھ پر ہے لیکن ہلال ابن امیہ کو یقین ہے کہ اللہ اسے ایسے حالات میں بے سہارا نہیں چھوڑے گا جبکہ وہ ہے بھی سچا۔ چنانچہ اللہ کی طرف سے یہ استثناء آجاتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہلال ابن امیہ کو خوشخبری دیتے ہیں اور وہ اپنے اس اطمینان کو پھر دہراتے ہیں کہ مجھے رب عزوجل سے یہی امید تھی۔ ان لوگوں کو پورا پورا اطمینان تھا کہ وہ اللہ کی نگرانی میں ہیں اور اللہ دیکھ رہا ہے اور یہ کہ وہ خود اپنے اختیار میں چھوڑ نہیں دیئے گئے کہ معاملات کو خود طے کریں۔ وہ تو اللہ کے سامنے اس کے دربار میں ہیں۔ یہ ہے حقیقی ایمان 'اطاعت اور تسلیم و رضا۔ جو اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تھی۔

---()()()---

اب سیاق کلام حد قذف کے قانون کے درمیان سے آگے بڑھتا ہے اور جرم قذف کے گھناؤنے پن کی ایک اور جھلک دکھائی جاتی ہے۔ اس کا تعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے سے ہے۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت اس میں داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ حضور اکرمؐ اللہ کے مکرم ترین بندے ہیں۔ پھر اس واقعہ میں حضرت صدیقؓ کی عزت بھی داؤ پر لگی ہوئی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں سے مکرم ترین انسان ہیں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک دوسرے ساتھی صفوان ابن المعطلؓ کی عزت کا بھی مسئلہ ہے۔ حضور اکرمؐ خود شہادت دیتے ہیں کہ صفوان کے بارے میں آپ بھلائی کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ یہ واقعہ ایسا ہے جس میں مدینہ کے اہل اسلام ایک ماہ تک بے حد پریشانی میں مبتلا رہے۔

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم ۖ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١١﴾ لَّوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ ﴿١٢﴾ لَّوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ ۚ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿١٣﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِي مَا أَفَضْتُمْ فِيهِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٤﴾ إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُم مَّا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمٌ ﴿١٥﴾ وَلَوْ

لَوْلَآ إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُونُ لَنَآ أَن نَّتَكَلَّمَ بِهَٰذَا سُبْحَٰنَكَ هَٰذَا بُهْتَٰنٌ
عَظِيمٌ ﴿١٦﴾ يَعِظُكُمُ ٱللَّهُ أَن تَعُودُوا لِمِثْلِهِۦٓ أَبَدًا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٧﴾ وَيُبَيِّنُ
ٱللَّهُ لَكُمُ ٱلْءَايَٰتِ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٨﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ ٱلْفَٰحِشَةُ
۲ فِى ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِى ٱلدُّنْيَا وَٱلْءَاخِرَةِ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ
ع ۱۰ لَا تَعْلَمُونَ ﴿١٩﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ وَأَنَّ ٱللَّهَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٠﴾
۸ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا لَا تَتَّبِعُوا خُطُوَٰتِ ٱلشَّيْطَٰنِ وَمَن يَتَّبِعْ خُطُوَٰتِ ٱلشَّيْطَٰنِ فَإِنَّهُۥ
يَأْمُرُ بِٱلْفَحْشَآءِ وَٱلْمُنكَرِ وَلَوْلَا فَضْلُ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ مَا زَكَىٰ مِنكُم
مِّنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ يُزَكِّى مَن يَشَآءُ وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢١﴾ وَلَا
يَأْتَلِ أُولُوا ٱلْفَضْلِ مِنكُمْ وَٱلسَّعَةِ أَن يُؤْتُوٓا أُولِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينَ
وَٱلْمُهَٰجِرِينَ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوٓا أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ
ٱللَّهُ لَكُمْ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٢﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ يَرْمُونَ ٱلْمُحْصَنَٰتِ ٱلْغَٰفِلَٰتِ
ٱلْمُؤْمِنَٰتِ لُعِنُوا فِى ٱلدُّنْيَا وَٱلْءَاخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٢٣﴾ يَوْمَ تَشْهَدُ
عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٢٤﴾ يَوْمَئِذٍ
يُوَفِّيهِمُ ٱللَّهُ دِينَهُمُ ٱلْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ ٱللَّهَ هُوَ ٱلْحَقُّ ٱلْمُبِينُ ﴿٢٥﴾
ٱلْخَبِيثَٰتُ لِلْخَبِيثِينَ وَٱلْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَٰتِ وَٱلطَّيِّبَٰتُ لِلطَّيِّبِينَ وَٱلطَّيِّبُونَ
۳
ع ۲ لِلطَّيِّبَٰتِ أُولَٰٓئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٢٦﴾

۹ ”جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولہ ہیں۔ اس واقعے کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو بلکہ یہ
بھی تمہارے لیے خیر ہی ہے جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا
بڑا حصہ اپنے سر لیا اس کے لیے تو عذاب عظیم ہے۔ جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا اسی وقت کیوں نہ مومن مردوں
اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے؟ وہ لوگ (اپنے الزام کے

ثبوت میں) چار گواہ کیوں نہ لائے؟ اب کہ وہ گواہ نہیں لائے ہیں' اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور رحم و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمہیں آلیتا۔ (ذرا غور تو کرو' اس وقت تم کیسی سخت غلطی کر رہے تھے) جبکہ تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی چلی جا رہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے' حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی۔

کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ "ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا' سبحان اللہ' یہ تو ایک بہتان عظیم ہے۔ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا اگر تم مومن ہو۔ اللہ تمہیں صاف صاف ہدایات دیتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں' اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا شفیق و رحیم ہے' (تو یہ چیز جو ابھی تمہارے اندر پھیلائی گئی تھی' بدترین نتائج دکھا دیتی)۔

اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ اس کی پیروی کوئی کرے گا تو وہ تو اسے فحش اور بدی ہی کا حکم دے گا اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی شخص پاک نہ ہو سکتا مگر اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور صاحب مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار' مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے۔ انہیں معاف کر دینا چاہئے اور درگزر کرنا چاہئے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے۔

جو لوگ پاک دامن' بے خبر' مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ وہ اس دن کو بھول نہ جائیں جبکہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے اس دن اللہ وہ بدلہ انہیں بھرپور دے گا جس کے وہ مستحق ہیں اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہی حق ہے سچ کو سچ کر دکھانے والا۔ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے۔ پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔ ان کا دامن پاک ہے ان باتوں سے جو بنانے والے بناتے ہیں' ان کے لیے مغفرت ہے اور رزق کریم۔

یہ افک کا واقعہ ہے۔ اس واقعہ نے تاریخ انسانی کے پاکیزہ ترین لوگوں کو انتہائی درجہ کی تکلیف دہ اور اذیت دہ صورت حال سے دوچار کیا بلکہ پوری ملت اسلامیہ کو سخت ترین امتحان میں ڈال دیا۔ پورے ایک ماہ تک حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم' آپ کی محبوب ترین اہلیہ حضرت عائشہؓ' ان کے والد حضرت ابوصدیقؓ جیسے ایک مومن مخلص کے دلوں کو ہوا میں معلق رکھا۔ یہ پاکیزہ دل ایک مہینے تک درد و رنج میں مبتلا رہے۔

مناسب یہ ہے کہ ہم اس پورے قصے کو خود حضرت عائشہؓ کی زبانی سنیں۔ حضرت عروہ ابن زبیر ان سے یوں روایت کرتے ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ جب آپ سفر پر جانے لگتے تو قرعہ ڈال کر فیصلہ فرماتے کہ آپ کی بیویوں میں سے کون آپ کے ساتھ جائے۔ غزوہ بنی المصطلق کے موقعہ پر قرعہ میرے نام نکلا اور میں آپؐ کے

ساتھ گئی - واپسی پر جب مدینے کے قریب تھے تو ایک منزل پر رات کے وقت رسول اللہؐ نے پڑاؤ کیا اور ابھی رات کا کچھ حصہ باقی تھا کہ کوچ کی تیاری شروع ہو گئی - میں اٹھ کر رفع حاجت کے لیے گئی اور جب پلٹنے لگی تو قیام گاہ کے قریب پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ میرے گلے کا ہار کہیں ٹوٹ کر گر پڑا ہے - میں اسے تلاش کرنے میں لگ گئی اور اتنے میں قافلہ روانہ ہو گیا - قاعدہ یہ تھا کہ میں کوچ کے وقت اپنے ہودج میں بیٹھ جاتی تھی اور چار آدمی اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے تھے - ہم عورتیں اس وقت غذا کی کمی کے سبب بہت ہلکی پھلکی تھیں - میرا ہودہ اٹھاتے وقت لوگوں کو یہ محسوس ہی نہ ہوا کہ میں اس میں نہیں ہوں - وہ بے خبری میں خالی ہودہ اونٹ پر اٹھا کر روانہ ہو گئے - میں جب ہار لے کر پلٹی تو وہاں کوئی نہ تھا - آخر اپنی چادر اوڑھ کر وہاں ہی لیٹ گئی اور دل میں سوچ لیا کہ آگے جا کر جب یہ لوگ مجھے نہ پائیں گے تو خود ہی ڈھونڈتے ہوئے آ جائیں گے - اس حالت میں مجھے نیند آ گئی - صبح کے وقت صفوان ابن معطل سلمی اس جگہ سے گزرے جہاں میں سو رہی تھی - وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے کیونکہ پردے کا حکم آنے سے پہلے وہ مجھے بارہا دیکھ چکے تھے - (یہ شخص بدری صحابیوں میں سے تھے اور انہیں صبح دیر تک سونے کی عادت تھی اس لیے یہ بھی لشکر گاہ میں کہیں پڑے سوئے رہ گئے اور اٹھ کر مدینے چلے جا رہے تھے) مجھے دیکھ کر انہوں نے اونٹ روک لیا اور بے ساختہ زبان سے نکلا انا للہ وانا الیہ راجعون - رسول اللہ کی بیوی یہیں رہ گئیں - اس آواز سے میری آنکھ کھلی - میں نے اٹھ کر فوراً اپنے منہ پر چادر ڈال لی - انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہ کی - لا کر اپنا اونٹ میرے سامنے بٹھا دیا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے - میں اونٹ پر سوار ہو گئی اور وہ نکیل پکڑ کر روانہ ہو گئے - دوپہر کے قریب ہم نے لشکر کو جا لیا کہ جب وہ اپنی جگہ پر جا کر ٹھہرا ہی تھا اور لشکر والوں کو ابھی یہ پتہ نہ چلا تھا کہ میں پیچھے چھوٹ گئی ہوں - اس پر بہتان اٹھانے والوں نے بہتان اٹھا دیئے اور ان سب میں پیش پیش عبداللہ ابن ابی تھا - مگر میں اس سے بے خبر تھی کہ مجھ پر کیا باتیں بن رہی ہیں - مدینہ پہنچ کر میں بیمار ہو گئی اور ایک مہینے کے قریب پلنگ پر پڑی رہی - شہر میں اس بہتان کی خبریں اڑ رہی تھیں - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں تک یہ بات پہنچ چکی تھی - مجھے کچھ پتہ نہ تھا - البتہ جو چیز مجھے کھٹکتی تھی وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ توجہ میری طرف نہ تھی جو بیماری کے زمانے میں ہوا کرتی - آپ گھر میں آتے تو گھر والوں سے یہ پوچھ کر رہ جاتے کہ

كَيْفَ تِيكُم "کیسی ہیں یہ" - خود مجھ سے کوئی کلام نہ کرتے - اس سے مجھے شبہ ہوتا کہ کوئی بات ہے ضرور - آخر آپ سے اجازت لے کر میں ماں کے گھر چلی گئی تاکہ وہ میری تیمارداری اچھی طرح کر سکیں -

ایک روز رات کے وقت حاجت کے لیے میں مدینے سے باہر گئی - اس وقت تک ہمارے گھروں میں بیت الخلاء نہیں ہوتے تھے - اور ہم لوگ جنگل میں جایا کرتے تھے - میرے ساتھ مسطح ابن اثاثہ کی ماں تھیں جو میرے والد کی خالہ زاد بہن تھیں - راستے میں اسے ٹھوکر لگی - بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا غارت ہو مسطح - میں نے کہا اچھی ماں ہو جو بیٹے کو کوستی ہو اور بیٹا بھی وہ جس نے بدر میں حصہ لیا ہو - انہوں نے کہا "بیٹی تجھے کیا معلوم کہ وہ کیا باتیں کرتا ہے - پھر انہوں نے سارا واقعہ سنایا کہ افتراء پرداز لوگ میرے متعلق کیا باتیں اڑا رہے ہیں - میں گھر گئی اور رات بھر رو کر کاٹی - میرے پیچھے رسول اللہؐ نے حضرت علی اور اسامہ ابن زید کو بلایا اور ان سے مشورہ طلب کیا - اسامہ نے میرے حق میں کلمہ خیر کہا اور عرض کیا' یا رسول اللہ بھلائی کے سوا آپ کی بیوی میں کوئی چیز ہم نے نہیں دیکھی - یہ سب کچھ کذب اور باطل ہے

جو اڑایا جا رہا ہے ۔ رہے حضرت علیؓ تو انہوں نے کہا یارسول اللہؐ عورتوں کی کمی نہیں ہے ۔ آپؐ اس کی جگہ دوسری بیوی کر سکتے ہیں اور تحقیق کرنا چاہیں تو خدمت گزار لونڈی کو بلا کر حالات دریافت کر لیں ۔ چنانچہ خدمتگار کو بلایا گیا اور پوچھ گچھ کی گئی ۔ اس نے کہا اس خدا کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے 'میں نے ان میں کوئی برائی نہیں دیکھی جس پر حرف رکھا جا سکے ۔ بس اتنا عیب ہے کہ میں آٹا گوندکر کسی کام کو جاتی ہوں اور کہہ جاتی ہوں کہ بی بی ذرا آٹے کا خیال رکھنا مگر وہ سو جاتی ہیں اور بکری آکر آٹا کھا جاتی ہے ۔ اسی روز رسول اللہؐ نے خطبہ فرمایا "مسلمانو! کون ہے جو اس شخص کے حملوں سے میری عزت بچائے جس نے میرے گھر والوں پر الزام لگا کر مجھے اذیت پہنچانے کی حد کر دی ہے ۔ بخدا نہ تو میں نے اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھی ہے اور نہ اس شخص میں جس کے متعلق تہمت لگائی جا رہی ہے ۔ وہ تو کبھی میری غیر موجودگی میں میرے گھر آیا بھی نہیں ۔ اس پر اسید ابن حضیر (بعض روایات میں سعد ابن معاذ) نے اٹھ کر کہا "یارسول اللہؐ اگر وہ ہمارے قبیلے کا آدمی ہے تو ہم اس کی گردن مار دیں گے اور اگر ہمارے بھائی خزرجیوں میں سے ہے تو بھی آپ حکم دیں ہم تعمیل کے لیے حاضر ہیں" ۔ یہ سنتے ہی سعد ابن عبادہ رئیس خزرج اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے "جھوٹ کہتے ہو تم ہرگز اسے نہیں مار سکتے ۔ تم اس کی گردن مارنے کا نام اس لیے لے رہے ہو کہ وہ خزرج میں سے ہے ۔ اگر وہ تمہارے قبیلے کا آدمی ہوتا تو تم کبھی نہ کہتے "کہ ہم اس کی گردن مار دیں گے" ۔ اسید ابن حضیر نے جواب میں کہا "تم منافق ہو اس لیے منافقوں کی حمایت کرتے ہو" ۔ اس پر مسجد نبویؐ میں ہنگامہ برپا ہو گیا حالانکہ رسول اللہؐ ممبر پر تشریف رکھتے تھے ۔ قریب تھا کہ اوس اور خزرج مسجد میں ہی لڑ پڑیں مگر رسول اللہؐ نے ان کو ٹھنڈا کیا اور پھر ممبر سے اتر آئے ۔

اس بہتان کی افواہیں کم و بیش ایک مہینے تک شہر میں اڑتی رہیں ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سخت اذیت میں مبتلا تھے ۔ میں روتی رہتی ۔ میرے والدین انتہائی پریشان اور رنج و غم میں مبتلا تھے ۔ آخر کار ایک روز حضورؐ تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھے ۔ اس پوری مدت میں وہ کبھی میرے پاس نہ بیٹھے تھے ۔ حضرت ابوبکر اور ام رومان نے محسوس کیا کہ آج کوئی فیصلہ کن بات ہونے والی ہے اس لیے وہ دونوں بھی میرے پاس آکر بیٹھ گئے ۔ حضورؐ نے فرمایا عائشہؓ مجھے تمہارے متعلق یہ خبر پہنچی ہے ۔ اگر تم بے گناہ ہو تو امید ہے کہ اللہ تمہاری برات ظاہر کر دے گا اور اگر واقعی تم گناہ میں مبتلا ہوئی ہو تو اللہ سے توبہ کرو اور معافی مانگو ۔ بندہ جب اپنے گناہ کا معترف ہو کر توبہ کرتا ہے تو اللہ معاف کر دیتا ہے ۔ یہ باتیں سن کر میرے آنسو خشک ہو گئے ۔ میں نے اپنے والد سے عرض کیا کہ آپ رسول اللہؐ کو جواب دیں ۔ انہوں نے فرمایا بیٹی میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں ۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ آپ ہی کچھ کہیں ۔ انہوں نے بھی کہا میں حیران ہوں کہ کیا کہوں ۔ اس پر میں بولی کہ آپ لوگوں کے کانوں میں ایک بات پڑ گئی ہے اور دلوں میں بیٹھ چکی ہے ۔ اب اگر میں کہوں کہ میں بے گناہ ہوں اور اللہ گواہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں تو آپ لوگ نہ مانیں گے ۔ اور اگر خواہ مخواہ ایسی بات کا اعتراف کروں جو میں نے نہیں کی اور اللہ جانتا ہے کہ نہیں کی تو آپ لوگ مان لیں گے ۔ میں نے اس وقت حضرت یعقوب کا نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر یاد نہ آیا ۔ آخر میں نے کہا 'اس حالت میں میرے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ میں وہی بات کہوں جو حضرت یوسف کے والد نے کہی تھی فَصَبْرٌ جَمِيلٌ یہ کہہ کر میں لیٹ گئی اور دوسری طرف کروٹ لے لی ۔ میں اس وقت اپنے دل میں کہہ رہی تھی کہ اللہ میری بے گناہی سے واقف ہے وہ ضرور حقیقت کھول دے گا ۔ اگرچہ یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میرے حق میں وحی نازل ہو گی جو قیامت تک پڑھی جائے

میں اپنی ہستی کو اس سے کم تر سمجھتی تھی کہ اللہ خود میری طرف سے بولے مگر میرا یہ گمان تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب دیکھیں گے کہ جس میں اللہ میری برات ظاہر کر دے گا۔ اتنے میں یکایک حضورؐ پر وہ کیفیت طاری ہوگئی جو وحی نازل ہوتے وقت ہوا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ سخت جاڑے کے زمانے میں موتی کی طرح آپؐ کے چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکتے تھے۔ ہم سب خاموش ہوگئے۔ میں تو بالکل بے خوف تھی مگر میرے والدین کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ ڈر رہے تھے کہ دیکھیں اللہ کیا حقیقت کھولتا ہے۔ جب وہ کیفیت دور ہوئی تو حضور بے حد خوش تھے۔ آپؐ نے ہنستے ہوئے جو پہلی بات فرمائی وہ یہ تھی۔ مبارک ہو عائشہؓ۔ اللہ نے تمہاری براءت نازل فرما دی۔ اس کے بعد حضورؐ نے دس آیتیں سنائیں۔ میری والدہ نے کہا اٹھو اور رسول اللہؐ کا شکریہ ادا کرو۔ میں نے کہا نہ ان کا شکریہ ادا کروں گی نہ آپ دونوں کا' بلکہ اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں جس نے میری براءت نازل فرمائی۔ آپ لوگوں نے تو بہتان کا انکار تک نہ کیا۔

جب یہ آیات نازل ہوئیں تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قسم اٹھائی کہ وہ اب کبھی مسطح پر کچھ خرچ نہ کریں گے۔ یہ غریب آدمی تھا اور حضرت صدیقؓ کا رشتہ دار تھا' آپ ان کی کفالت کرتے تھے۔ اس نے بھی حضرت عائشہ پر الزام لگانے میں حصہ لیا تھا۔ اس کے بعد یہ آیات نازل ہوئیں۔

وَ لَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰي وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لْيَعْفُوْا وَ لْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۴ : ۲۲) تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور صاحب مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار' مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے۔ انہیں معاف کر دینا چاہئے اور درگزر کرنا چاہئے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے۔

تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا' ہاں میں چاہتا ہوں اور پسند کرتا ہوں کہ اللہ میرے گناہ بخش دے۔ پھر انہوں نے مسطح کا وہ وظیفہ جاری کر دیا جو وہ انہیں دیا کرتے تھے اور حضرت ابوبکرؓ نے کہا میں اس امداد کو کبھی بھی بند نہ کروں گا۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب بن جحش سے بھی میرے بارے میں پوچھا۔ حضورؐ نے فرمایا "زینب تم کیا جانتی ہو اور تم نے کیا دیکھا ہے؟ اس نے کہا' یا رسول اللہ میں اپنی آنکھوں اور کانوں کو بچاتی ہوں۔ خدا کی قسم' میں نے اس کے بارے میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں جانا۔ یہ زینب بن جحش ہی تھی جو ازواج مطہرات میں سے میرے مدمقابل تھی۔ اللہ نے اس کو اس کی خدا خوفی کی وجہ سے بچایا۔ لیکن اس کی بہن حمنہ بنت جحش اس کے لیے لڑ رہی تھی' تو وہ ہلاک ہوئی ان لوگوں کے ساتھ' جو افک کے معاملے میں ہلاک ہوئے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ دن رسول اللہؐ نے کس طرح گزارے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے خاندان نے یہ دن کس طرح گزارے۔ اور حضرت صفوان ابن معطل بیچارے پر کیا گزری ہوگی اور تمام مسلمانوں پر یہ دن ایسے گزرے کہ ان کی سانس گھٹ رہی تھی اور ہر شخص شدید مصیبت میں تھا۔ یہ حالات تھے جن میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

اس پریشان کن صورت حالات کے سامنے انسان نڈھال ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ایک المناک واقعہ تھا۔ آپ دیکھ رہے تھے کہ آپ کی زوجہ محترمہ کے لیے یہ صورت حالات کاٹ کھانے والی ہے جبکہ وہ نہایت ہی جواں سال اور کم عمر ہے ۔ ان کی عمر کا غالباً سولہواں سال تھا۔ یہ نہایت ہی حساس عمر ہوتی ہے اور زوجین کے درمیان نہایت ہی گہری محبت کا دور ہوتا ہے ۔

یہ کم عمر لڑکی بے گناہ ہے ۔ اس کا ضمیر صاف ہے ۔ اس کے خیالات پاکیزہ ہیں لیکن اس پر یہ الزام نازک ترین اور حساس ترین معاملے میں لگایا جا رہا ہے ۔ اس کی شرافت داؤ پر لگی ہوئی ہے ۔ یہ صدیق کی بیٹی ہے اور وہ نہایت ہی پاکیزہ اور ارفع مقام پر زندگی بسر کر رہی ہے ۔ اس کی امانت کو چیلنج کیا جا رہا ہے ۔ وہ حضرت محمد ابن عبداللہ سردار بنی ہاشم کی بیوی ہے اور اس کی وفاداری کو مشکوک بنایا جا رہا ہے یہ ایک عظیم پیغمبر کی محبوب ترین بیوی ہے لیکن اس بیچاری کے اس رشتہ محبت کے ٹوٹنے کا خطرہ ہے بلکہ اس کے ایمان کو خطرہ لاحق ہے ۔ جبکہ اس نے پرورش ہی ایمان کے مرکز میں پائی ہے ۔ جب سے اس کی آنکھ کھلی ہے اس نے ایمان ہی ایمان دیکھا ہے اور پھر وہ نبی آخر الزماںؐ کی زوجہ ہے ۔

اس پر الزام لگایا گیا ہے ۔ کس قدر عظیم الزام جس سے وہ بری الذمہ اور بے خبر ہے ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کرے اور کیا شہادت لائے کہ وہ پاک دامن ہے ۔ بس صرف اللہ سے امید ہے ۔ وہ امید کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت کو خواب میں دیکھ لیں گے کہ وہ اس الزام سے بالکل بری الذمہ ہے ۔ لیکن خواب ہے کہ نہیں آتا اور وحی ہے کہ بند ہو گئی ہے ۔ اس میں بھی اللہ کی حکمت تھی ۔ پورا ایک ماہ گزر گیا ہے اور یہ بیچاری اس عذاب عظیم میں غوطے کھا رہی ہے ۔

اس کی حالت اس وقت دگرگوں ہو جاتی ہے جب وہ ام مسطح سے پورے حالات سن لیتی ہے ۔ وہ بیماری میں مبتلا ہے اور اس کی جان خطرے میں ہے ' وہ نہایت ہی کرب سے ماں کو کہتی ہے سبحان اللہ 'کیا لوگ یہ باتیں کر رہے ہیں؟ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ وہ نہایت ہی کرب سے پوچھتی ہیں کہ میرے باپ کو بھی اس کا علم ہو گیا ہے تو ماں کہتی ہیں ہاں؟ تو وہ پوچھتی ہیں کہ کیا رسول اللہ کو بھی اس کا علم ہو گیا ہے؟ تو ماں کہتی ہیں 'ہاں ۔ اور پھر اس پر وہ وقت آتا ہے کہ اللہ کا نبی جس پر وہ ایمان لائی ہے اور جو آپ کا خاوند ہے 'جس کے ساتھ اسے شدید محبت ہے ۔ رسول اللہؐ خود اس سے یوں مخاطب ہوتے ہیں ۔ امابعد 'مجھ تک تمہارے بارے میں یہ یہ باتیں پہنچی ہیں ۔ اگر تم پاک دامن ہو تو خود اللہ جلد ہی تمہاری پاکی بیان کر دے گا ۔ اور اگر تم سے کوئی گناہ ہو گیا ہے تو اللہ سے توبہ کرو اور مغفرت طلب کرو کیونکہ بندہ جب اپنے گناہ کا اعتراف کر لیتا ہے 'اور پھر توبہ کر لیتا ہے تو اللہ اسے معاف کر دیتا ہے" ۔ اس کلام سے وہ اچھی طرح جان لیتی ہے کہ حضور اکرمؐ بھی اس کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں ۔ ان کو یقین نہیں ہے کہ آپ بے گناہ ہیں ۔ آپ پر جو الزام لگ چکا ہے اس کے بارے میں آپ فیصلہ بھی نہیں فرماتے ۔ رب کریم کی طرف سے بھی وحی بند ہے ۔ اللہ کی طرف سے بھی براءت نہیں آ رہی ہے جس کا اسے خوب یقین ہے کہ وہ بری الذمہ ہے ۔ لیکن بیچاری کے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ پیش کرے ۔ رات اور دن ایسے ہی گزر رہے ہیں اور اس عظیم قلب میں بھی وہ ملزمہ ہے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے جگری محبت ہے ۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپؐ کے وفادار ساتھی 'نہایت ہی حساس اور پاک نفس 'ایسی حالت میں ہیں کہ یہ غم ہر

وقت انہیں کاٹ کھا رہا ہے ان کی عزت پر حملہ ہو چکا ہے۔ ان کی محبوب بیٹی اور پھر رسول اللہؐ کی بیوی۔ یاد رہے کہ حضرت محمدؐ آپ کے وہ ساتھی ہیں جن پر انہیں پورا یقین و اطمینان ہے۔ دوست کے ساتھ ساتھ وہ اس کے نبی ہیں ' جن پر وہ ایمان لائے ہیں۔ وہ آپ کی ہر بات کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ وہ تو آپ کے بارے میں کسی خارجی دلیل کے طلبگار ہی نہیں ہیں۔ ان کی باتوں ہی سے ان کے دل کا درد ظاہر ہے لیکن وہ صبر کرتے ہیں۔ درد پر قابو پاتے ہیں اور اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں خدا کی قسم دور جاہلیت میں بھی ہم پر یہ الزام نہیں لگا۔ کیا اسلام میں ہم اس پر راضی ہوں گے۔ یہ وہ بات ہے جس میں سخت تلخی چھپی ہوئی ہے یہاں تک کہ ان کی بیٹی جو بیمار بھی ہے سخت عذاب میں گرفتار ہے۔ وہ درخواست کرتی ہے کہ آپ رسول اللہؐ کی بات کا جواب دیں تو صدیق کہتے ہیں خدا کی قسم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

ام رومان زوجہ صدیقؓ وہ اپنی زخم خوردہ بیٹی کو ہر قسم کی تسلی دیتی ہے۔ اس کی بیمار بیٹی اس قدر روتی ہے کہ شاید اس کا کلیجہ نکل آئے۔ وہ کہتی ہے بیٹی ذرا اپنے اوپر رحم کرو۔ خدا کی قسم جب بھی کوئی خوبصورت عورت کسی مرد کو محبوب ہوئی ہے اور اس کی سوکنیں ہوتی ہیں تو انہوں نے اس پر طرح طرح کے الزام لگائے ہیں۔ لیکن ان کی یہ تسلیاں اس وقت کافور ہو جاتی ہیں جب عائشہؓ والدہ سے کہتی ہیں کہ تم میری طرف سے رسول اللہؐ کو جواب دو۔ تو وہ بھی یہی کہتی ہیں جو اس کے خاوند نے کہا تھا کہ خدا کی قسم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا بات کر سکتی ہوں۔

اور وہ مسلم ' پاکباز اور مجاہد فی سبیل اللہ بھی عجیب پوزیشن میں ہے۔ اس پر اپنے نبی کی بیوی کے ساتھ برائی کا الزام ہے؟ اسلام کے ہوتے ہوئے یہ عظیم الزام۔ اس کی دیانت و امانت ' اس کا شرف اور اس کی حمیت داؤ پر لگی ہے۔ بلکہ اس کا اسلام خطرے میں ہے۔ جب وہ اس الزام کے بارے میں سنتا ہے تو بے ساختہ کہتا ہے کہ خدا کی قسم میں نے تو کسی عورت کے کاندھے کو بھی ننگا نہیں کیا۔ وہ تو اس گناہ کے تصور سے بھی پاک ہے۔ پھر وہ سنتا ہے کہ حسان ابن ثابت اس کے بارے میں نازیبا الفاظ کہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا سر اڑا دے مگر وہ رک جاتا ہے کیونکہ وہ مسلمان اور ایک مومن ہے اور مومن پر تلوار اٹھانا حرام ہے۔ اس پر جو گزر رہی ہے وہ اس کی برداشت سے زیادہ ہے وہ تو بے قابو ہوا چاہتا ہے۔

پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ' جو اللہ کے رسول ہیں۔ آپ بنی ہاشم کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے گھرانے پر حملہ ہوا ہے۔ گھرانے میں سے بھی عائشہؓ پر؟ آپ کے گھر پر اور آپ کی محبوب ترین بیوی پر۔ کوئی غیور عرب اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک ماہ گزر گیا ہے۔ مدینہ کے لوگ چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ لیکن آپ برداشت کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی سب کچھ دیکھ رہا ہے لیکن اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ ایک ماہ گزر جائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو انسان ہیں۔ ان کو بھی ایک انسان کی طرح درد اور دکھ محسوس ہوتا ہے۔ ان کا دل بھی دکھا ہوا ہے۔ آپ بھی وحشت محسوس کرتے ہیں کیونکہ اللہ کا نور جو ہر معاملے میں آپ کے دل کو ہمیشہ روشن کر دیتا ہے اور راستہ صاف کر دیتا ہے اس میں دیر ہو رہی ہے۔ اگرچہ آپ کی بیوی کی براءت کے قرائن موجود تھے۔ مگر انسان کا دل بہرحال شک کا محل ہوتا ہے۔ صرف قرائن سے مکمل اطمینان نصیب نہیں ہوتا جبکہ مدینہ کی پوری بستی اس آگ میں جل رہی ہے۔ آپ کے دل میں بھی اپنی محبوب بیوی کے بارے میں شک گزرتا ہے۔ آپ اس شک کو دل سے دور نہیں کر سکتے۔ بہرحال آپ بھی انسان

اور بشر ہیں - انسانوں کی طرح آپ بھی متاثر ہوتے ہیں - آپ خاوند ہیں لیکن بیوی کے پاس نہیں جا سکتے اور جب کسی انسان کے دل میں شک کا بیج بو دیا جاتا ہے اور وہ مستقلاً دل میں بیٹھ جاتا ہے تو یہ شک پھر دلیل قطعی اور فیصلہ کن واقعہ ہی سے نکل سکتا ہے -

آپ ؐ کے دل پر یہ بوجھ طاری ہو جاتا ہے - آپ ؐ اپنے محبوب اسامہ ابن زید جو آپ ؐ کو بہت محبوب اور آپ ؐ کے دل کے قریب تھے - آپ اپنے داماد اور چچازاد علیؓ ابن ابی طالب کو بھی بلاتے ہیں - ان کے ساتھ بھی آپ ؐ مشورہ کرتے ہیں - جہاں تک حضرت علیؓ کا تعلق ہے آپ تو حضور ؐ کے عصبات میں سے ہیں - اس وجہ سے بھی ان کے جذبات بہت تیز ہیں - پھر حضور اکرم ؐ جس کرب اور رنج اور اذیت کو جھیل رہے ہیں وہ بھی حضرت علیؓ پر بارگراں ہے - کیونکہ آپ چچازاد ہیں - آپ مشورہ دیتے ہیں کہ اللہ نے آپ ؐ پر کوئی تنگی نہیں کی ہے لیکن حضور ؐ کے دلی اطمینان کے لیے یہ بھی فرماتے ہیں کہ آپ حضرت عائشہؓ کے بارے میں لڑکی سے پوچھیں 'خدمتگار لڑکی سے -

جہاں تک اسامہ کا تعلق ہے وہ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ان کی بیوی کی کس قدر محبت ہے اور آپ ایک عرصہ سے اپنی اہلیہ سے جدا ہیں تو وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ ام المومنین پاک وصاف ہیں اور جو لوگ الزام لگاتے ہیں وہ جھوٹے ہیں -

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اس انسانی پریشانی اور اس انسانی قلق میں حضرت اسامہ اور لڑکی کی باتوں اور شہادت سے حوصلہ پاتے ہیں - اور آپ لوگوں کو مسجد میں بلا کر ان کے سامنے یہ معاملہ رکھ دیتے ہیں - اس موقع پر آپ نے فرمایا :"کون ہے جو ان لوگوں سے پوچھے جنہوں نے ان کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے - ان کی بیوی پر الزام لگایا ہے اور مسلمین میں سے ایک فاضل اور شریف شخص پر الزام لگایا ہے - ایسا شخص جس کے بارے میں کوئی بری بات نہیں جانتا" - اس موقعہ پر اوس اور خزرج کے درمیان کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے حالانکہ وہ مسجد رسول ؐ میں تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود موجود تھے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عجیب و غریب وقت میں مسلمانوں پر کیسے خوفناک سائے منڈلا رہے تھے اور مدینہ کی فضا کیسی تھی - خود قیادت کا تقدس داؤ پر لگا ہوا تھا - اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں بھی چبھن تھی اور جو روشنی (وحی) ایسے حالات میں راستہ دکھاتی رہتی تھی وہ بھی بند تھی - ایسے حالات میں حضور ؐ عائشہؓ کے پاس جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ لوگ کیا کہتے ہیں اور آپ سے بیان لیتے ہیں - مفصل بیان -

جب یہ مصائب اس طرح اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ رسول اللہ ؐ پر اور مسلمانوں پر رحم فرماتے ہیں - قرآن مجید نازل ہوتا ہے اور عائشہ صدیقہ کی براءت کا اعلان ہوتا ہے - نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کی صفائی میں کلام الٰہی آ جاتا ہے اور ان منافقین کا پول کھل جاتا ہے جنہوں نے اس فتنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا - پھر اسلامی سوسائٹی کو ایسے حالات میں مستقلاً ہدایات دے دی گئیں اور قانون سازی اور اخلاقی ضابطہ بندی کر دی گئی -

قرآن کریم کی ان آیات کے بارے میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں - میں تو جانتی تھی کہ میں بے گناہ ہوں اور اللہ تعالیٰ میری بے گناہی کی شہادت دے دے گا - لیکن میرا خیال یہ نہ تھا کہ میرے اور میری بے گناہی کے بارے میں قرآن کریم نازل ہو گا اور پھر یہ قرآن قیامت تک پڑھا جائے گا - میرے خیال میں ' میں اس قابل نہ تھی کہ میرے بارے میں اللہ تعالیٰ کلام کرے گا اور وہ کلام پڑھا جائے گا - ہاں یہ بات میں جانتی تھی اور امید کرتی تھی کہ شاید رسول اللہ ؐ کوئی

خواب دیکھ لیں اور اس میں میری براءت ہو جائے"۔

اس تفصیلی بیان سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ معاملہ صرف حضرت عائشہؓ کی ذات کا معاملہ نہ تھا۔ بلکہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی متعلق تھا۔ اس واقعہ نے امت مسلمہ کی قیادت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا بلکہ اس کی زد رسول اللہؐ اور ذات باری کے تعلق پر پڑ رہی تھی۔ یہ صرف حضرت عائشہؓ کی ذات پر الزام نہ تھا بلکہ یہ اسلامی نظریہ حیات ' اسلام کے نبی اور اسلام کے بانی پر الزام تھا اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں خود اپنا فیصلہ نازل کیا تاکہ اس سازش کے تار و پود بکھیر دیئے جائیں۔ اور اسلام اور رسولؐ اسلام کے خلاف جو سازش منافقین نے تیار کی تھی اسے ختم کر دیا جائے اور اس کے پیچھے جو راز اور حکمت تھی ' اللہ اسے ظاہر کر دے کیونکہ اس کا علم صرف اللہ کو تھا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُ وْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ لِكُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ وَ الَّذِیْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ

(۲۴ : ۱۱) "جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولہ ہیں۔ اس واقعے کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو بلکہ یہ بھی تمہارے لیے خیر ہی ہے جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا اس کے لیے تو عذاب عظیم ہے"۔

یہ چند لوگ نہ تھے بلکہ ایک ٹولہ تھا۔ یہ لوگ آپس میں ملے ہوئے تھے اور ان سب کا ایک ہی ہدف تھا۔ صرف عبداللہ ابن ابی ابن السلول واحد شخص نہ تھا جس نے یہ جھوٹ پھیلایا۔ ہاں یہ شخص اس کے بڑے حصے کا ذمہ دار تھا۔ یہ گروہ کون تھا۔ یہ یہودیوں اور منافقین کا گروہ تھا۔ یہ لوگ میدان جنگ میں اسلام کے مقابلے پر شکست کھا گئے تھے اور اب پس پردہ رہ کر اسلام کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ افک کا یہ واقعہ ان کی سازشوں میں سے ایک سازش تھی اس معاملہ میں بعض مومنین بھی شامل ہو گئے تھے۔ مثلاً حمنہ بنت جحش ' حضرت حسان ابن ثابت ' مسطح ابن اثاثہ۔ لیکن اصل سازش اس گروہ نے تیار کی تھی۔ اور اس گروہ کا سرغنہ عبداللہ ابن ابی ابن السلول تھا۔ یہ اس قدر مکار تھا کہ وہ اس مہم میں خود ظاہر ہو کر نہ آیا تھا۔ بظاہر اس نے کوئی بات نہ کی تھی کہ اسے پکڑا جا سکے اور اس پر حد جاری کی جا سکے۔ یہ ان لوگوں کے ساتھ کانا پھوسی کرتا تھا جو اس کے معتمد علیہ تھے اور اس کے خلاف شہادت دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ یہ مہم اس قدر مہارت سے چلا رہا تھا کہ پورا مدینہ ایک ماہ تک آتش فشاں اور زلزلہ خیز فضا میں جلتا رہا۔ لوگ اس دنیا کے پاکیزہ ترین گھر کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ یہاں آیات میں آغاز کلام ہی میں اس اصل موضوع کے بارے میں کہا جاتا ہے تاکہ اس کی اہمیت واضح ہو۔ اور لوگوں کو معلوم ہو کہ اس کی پشت پر ایک گروہ ہے جو اسلام کے خلاف اس قدر گہری سازش تیار کر رہا ہے اور یہ ایک عظیم حملہ تھا اسلام اور اہل ایمان اور ذات نبی کے خلاف۔

اس کے بعد جلدی سے مطمئن کر دیا جاتا ہے۔

لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ (۲۴ : ۱۱) "اس واقعہ کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو بلکہ

یہ تمہارے لیے خیر ہی ہے"۔ یہ تمہارے لیے خیر ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کے اہل بیت کے عنوان سے یہ دراصل اسلام کے دشمن ہیں جنہوں نے افک کی سازش کو تیار کیا۔ اس واقعہ سے اس بات کی ضرورت کو بھی تسلیم کر لیا گیا کہ حد قذف اسلامی نقطہ نظر سے کس قدر ضروری ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر زبانوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کے نتیجے میں پاک دامن عورتوں پر کس قدر زبانیں اٹھیں گی اور اسلامی جماعت اور نئی اسلامی سوسائٹی کے لیے کس قدر خطرات پیدا ہو جائیں گے۔ یہ الزامات رسول کے گھر تک بھی پہنچ سکتے ہیں اور اعلیٰ گھرانوں کو بھی تباہ کر سکتے ہیں جس کے نتیجے میں سوسائٹی کے اندر شرم و حیا اور احتیاط اور پاکیزگی اور احترام آدمیت ختم ہو سکتے ہیں۔

نیز اس سے اسلامی سوسائٹی کو یہ سبق بھی سکھایا گیا کہ اس نے اس قسم کے جذباتی اور اشتعال انگیز امور سے کس طرح نمٹنا ہے اور جذباتی معاملات میں بھی وقار اور سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا۔

رہے وہ آلام اور اذیتیں جو رسول اللہ' ان کے گھرانے' اور تمام مومنین نے برداشت کیے تو وہ ایسے تجربات کی قیمت ہوتے ہیں جو ان آزمائشوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ آزمائش میں اس قسم کی قربانی دینا پڑتی ہے اور فرائض کی ادائیگی میں ایسے مراحل بھی آتے ہیں۔

وہ لوگ جو اس افک کے معاملے میں سرگرم رہے ان میں سے ہر ایک نے اپنے جرم کے مطابق اس میں سے حصہ پایا۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ (۲۴ : ۱۱) "جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا"۔ اسے اپنے جرم کے مطابق قیامت میں سزا ملے گی۔ انہوں نے جو کچھ کمایا وہ ان کے لیے اچھا نہیں ہے کیونکہ یہ ایک ایسا جرم ہے جس پر ان کو دنیا کی زندگی میں بھی سزا ملے گی اور آخرت میں بھی سزا ملے گی۔

وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۲۴ : ۱۱) "اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا اس کے لیے عذاب عظیم ہے"۔ وہ شخص جس نے اس گناہ کے بڑے حصے کو اپنے سر لیا' جس نے اس حملے کی قیادت کی' اس مہم کو چلاتا رہا اور اس نے اس مہم کو گرمایا وہ عبداللہ بن ابی ابن السلول تھا۔ یہ رئیس المنافقین کے لقب سے مشہور تھا اور ہے۔ اس نے اس سازش کے جھنڈے اٹھا رکھے تھے۔ یہ شخص خوب جانتا تھا کہ وہ کس جگہ میدان جنگ گرمائے۔ اگر اللہ تمام امور پر محیط نہ ہوتا۔ اللہ نے اپنے دین کی حفاظت کا ذمہ نہ لیا ہوتا' اور اپنے رسول کے لیے بچاؤ کا انتظام نہ کرتا تو یہ شخص کیا کچھ بنا دیتا۔ روایات میں آتا ہے کہ جب صفوان ابن معطل ام المومنین کے کجاوے کو لے کر کیمپ میں پہنچے تو ابن السلول اپنے کچھ لوگوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ تو اس نے پوچھا کہ یہ عورت کون ہے تو لوگوں نے کہا یہ عائشہؓ ہے تو اس نے کہا خدا کی قسم یہ اس سے نہ بچ سکی ہوگی اور نہ وہ اس سے بچ سکا ہوگا۔ اور پھر کہا دیکھو تمہارے نبی کی بیوی' وہ رات ایک مرد کے ساتھ رہی۔ صبح تک اور وہ ہے کہ اب اسے لے کر آ رہا ہے۔

یہ باتیں وہ رات اور دن اپنے اعتمادی لوگوں کے درمیان پھیلاتا رہا اور گہری منافقانہ چالیں چلتا رہا۔ اس کی چالیں اس قدر کامیاب رہیں کہ مدینہ میں یہ ناقابل تصدیق افتراء جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔ حالانکہ قرائن سب کے سب اس کے خلاف تھے۔ یہاں تک کہ غیر محتاط دیندار مسلمانوں نے بھی باتیں شروع کر دیں اور پورے ایک ماہ تک

مدینہ میں یہی بات موضوع سخن رہی حالانکہ یہ اس قدر سطحی قسم کا افتراء تھا کہ اس کو سنتے ہی رد کیا جا سکتا تھا۔

انسان آج بھی اس بات پر یقین نہیں کر سکتا اور حیران رہ جاتا ہے کہ اس قسم کا گھٹیا الزام کس طرح مدینہ کے اندر پھیل گیا اور پھر جماعت مسلمہ کے اندر بھی بعض غیر محتاط لوگوں نے اس میں کلام کرنا شروع کر دیا۔ یوں ان بلند ترین پاکیزہ ہستیوں کو ایسی افتراء سے اس قدر اذیت جھیلنا پڑی۔ خصوصاً سرور کونین کو۔

یہ ایک عظیم اعصابی جنگ تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی بے جگری سے یہ جنگ لڑی۔ جماعت مسلمہ نے یہ جنگ لڑی اور پورے اسلام نے یہ جنگ لڑی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلام اور کفر کے معرکوں میں سے یہ سخت معرکہ تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان اس معرکے سے سرخرو ہو کر نکلے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وقار کا دامن تھامے رکھا۔ صبر جمیل کا دامن تھامے رکھا اور یہ ثابت کر دیا کہ آپؐ عظیم انسان ہیں۔ اس پورے عرصے میں کوئی ایک روایت بھی ایسی نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ آپ نے کسی بھی مرحلے میں بے صبری کا مظاہرہ کیا ہو۔ جس طرح کا درد اور دکھ اور چبھن آپ محسوس کر رہے تھے وہ پوری زندگی میں آپ نے کبھی نہ جھیلے تھے۔ لیکن آپ نے سب کچھ چھپائے رکھا۔ اسلام بھی کبھی اس قسم کے فتنے سے دوچار نہ ہوا تھا۔ اس طرح اس اعصابی جنگ اور پروپیگنڈے کی جنگ کی وجہ سے امت مسلمہ کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

حالانکہ اگر کوئی اپنے دل میں ذرا بھی غور کرتا تو وہ صحیح نتیجے تک پہنچ سکتا تھا۔ اگر کوئی دل سے فتویٰ پوچھتا تو دل اس کو فتویٰ دے دیتا۔ اگر فطری انداز کوئی اختیار کرتا تو فطرت کا استدلال اس کی سمجھ میں آ جاتا۔ قرآن کریم کی تعلیم تو یہی تھی کہ تم لوگ حالات کا تجزیہ کرو، غور و فکر کرو اور قاضی عقل کے سامنے بھی اپنے معاملات کو پیش کرو۔

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّ قَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ (۲۴ : ۱۲) "جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا اسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے؟" ہاں یہ درست ہے کہ اہل ایمان سنتے ہی یہ کہہ دیتے۔ وہ اپنے بھائیوں کے بارے میں حسن ظن سے کام لیتے تو یہ ان کے لیے اچھا ہوتا۔ اور یہ فرض کر لیتے کہ ایک مسلمان اس قدر گندے کام میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کے نبی کی پاک بیوی اور ان کے بھائی مسلم۔ یہ تو خود ان میں سے تھے۔ نہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حریم اور نہ اس صحابی کے ساتھ یہ بات لائق تھی جو انہوں نے سنی۔ ان کو حسن ظن کا معاملہ رکھنا چاہئے تھا جیسا کہ ابو ایوب خالد ابن زید انصاری اور ان کی بیوی نے ایسا ہی کیا۔ امام ابن اسحاق نے روایت کی ہے۔ ابو ایوب کو اس کی بیوی ام ایوب نے کہا تم سنتے نہیں ہو کہ لوگ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ اس نے کہا ہاں میں بھی سنتا ہوں لیکن یہ جھوٹ ہے۔ ام ایوب کیا تم ایسا کرتیں ہو؟ تو اس نے کہا نہیں خدا کی قسم میں تو ہرگز ایسا نہ کرتی۔ تو پھر عائشہ تو تم سے بہتر ہیں۔ امام محمود ابن عمر زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں نقل کیا ہے۔ کہ ابو ایوب نے ام ایوب سے یہ کہا کہ تم دیکھتی ہو لوگ کیا کہتے ہیں تو اس نے کہا اگر تم صفوان کی جگہ ہوتے تو کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کے بارے میں سوچ سکتے تھے۔ تو اس نے کہا ہرگز نہیں۔ اگر میں عائشہ کی جگہ ہوتی تو میں رسول اللہؐ کے ساتھ خیانت نہ کرتی۔ عائشہؓ مجھ سے اچھی ہیں اور صفوان تم سے اچھے ہیں۔

یہ دونوں روایات یہ بتاتی ہیں کہ بعض مسلمانوں نے اس مسئلے پر اپنے ہاں غور کیا تھا۔ اپنے دل سے استفتاء کیا تھا اور ان کے عقول نے ان کو یہ باور کرا دیا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ اور یہ بات غلط ہے کہ مسلمانوں میں سے کسی کی طرف اس قسم کی گراوٹ کو منسوب کیا جائے اور وہ بھی محض شبہے کی بناء پر محض بدظنی کی بناء پر۔

یہ تو پہلی راہ ہے جس کی نشاندہی قرآن مجید کرتا ہے کہ کسی بھی معاملے میں ذرا گہرے غور اور قیاس کے بعد کوئی رائے قائم کرو۔ اپنے نفس سے پوچھو' اپنے وجدان سے پوچھو' اور دوسری جگہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ کسی بھی معاملے میں تمہارے پاس دلیل ہونا چاہئے۔ بغیر دلیل و برہان کے ایسے نازک معاملات میں فیصلہ نہیں ہونا چاہئے۔

لَوْ لَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (۲۴ : ۱۳) "یہ افتراء جس نے زیادہ بلند مقامات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے' پاک ترین لوگوں کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اسے تو اس قدر آسان اور سہل نہ سمجھنا چاہئے تھا۔ بغیر ثبوت کے اس کی اشاعت کیوں ہوئی اور کیوں اس قدر چرچا ہوا۔ کیوں یہ نقل در نقل ہوتی رہی بغیر شہادت کے۔ اس الزام کے حق میں تو کوئی شہادت نہ تھی لہٰذا سمجھ لینا چاہئے تھا کہ یہ جھوٹ بکا جا رہا ہے۔ یہ اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں۔ حقیقت واقعہ کے مطابق جھوٹے ہیں اور اللہ کا فیصلہ اور اللہ کا حکم تو بدلتا نہیں۔ اس لیے یہ ان لوگوں کی اب دائمی صفت ہے جنہوں نے افتراء میں حصہ لیا اور یہ کبھی اس کے نتائج سے بچ کر نکل نہیں سکتے۔

یہ ہیں دو طریقے۔ ایک یہ کہ کسی بھی معاملے کو سب سے پہلے عقل و قیاس کے مفتی کے سامنے پیش کر دو۔ خود اپنے قلب و ضمیر میں اس کا فیصلہ کرو۔ اور دوسرا طریقہ ہے قانون ثبوت کا۔ حادثہ افک میں عام لوگوں نے یہ دونوں طریقے استعمال نہ کیے اور منافقین کی چال میں سب لوگ آ گئے۔ پھر بعض اہل ایمان بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف چلائی ہوئی اس مہم میں شریک ہو گئے۔ جبکہ یہ ایک عظیم معاملہ تھا۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو ڈراتے ہیں کہ وہ آئندہ محتاط رہیں۔ دوبارہ یہ حرکت نہ کریں۔

وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۲۴ : ۱۴) "اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور رحم و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمہیں آ لیتا"۔ اللہ تعالیٰ نے نئی تشکیل پانے والی جماعت مسلمہ کے لیے یہ واقعہ بطور آزمائش رونما کرایا تو اللہ نے اس کو اپنے فضل اور رحم و کرم کے ذریعہ یوں خوش اسلوبی سے حل کرا دیا۔ اس عظیم غلطی پر کسی کو سزا نہ دی ورنہ یہ فعل تو سخت سزا کا مستحق تھا کیونکہ اس واقعہ کے ذریعہ اہل مدینہ نے محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت اذیت دی تھی۔ لہٰذا مناسب تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سخت سزا دیتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اس واقعہ میں آپ کے صدیق ساتھی' آپ کی محبوب اہلیہ اور ایک صادق اور پاکباز مسلمان کو اذیت دی گئی۔ پھر اس عظیم شرکی وجہ سے اسلام کے تمام مقدسات کو ہلا کر رکھ دیا گیا۔ منافقین نے یہ سازش اس قدر گہرائی

سے تیار کی تھی کہ وہ اسلامی نظریہ حیات کی بنیادوں ہی کو ختم کرنا چاہتے تھے ۔ اگر نبی پر اہل ایمان کا اعتماد ہی نہ رہے اور نبی کے خاندان پر نہ رہے اور پھر وحی الٰہی پر نہ رہے تو ظاہر ہے کہ اسلام ختم ہی سمجھا جائے گا اور ایسے حالات کا تقاضا یہ تھا کہ اس فتنے کے حاملین کو سخت سزا دی جاتی اور ان پر اللہ کا عذاب بھی آتا مگر اللہ نے فضل و کرم کیا کہ اس آزمائش میں مسلمان کامیاب رہے ۔

اس پورے مہینے میں مدینہ کی جو صورت حالات تھی اس کا اظہار قرآن کریم کے ان الفاظ سے اچھی طرح ہو جاتا ہے کہ مدینہ میں کس قدر فکری انتشار تھا۔ لوگوں کے معیار کس قدر بدل گئے تھے ۔ان کی اقدار اور پیمانے کس طرح بدل گئے تھے ۔اس وقت وہ کیسی غلطی کر رہے تھے ۔

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَ تَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّ هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ( ۲۴ : ۱۵ ) ”جبکہ تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی چلی جا رہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے ' حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی“۔ یعنی لوگوں کی حالت یہ تھی کہ وہ نہایت ہی اہم اور حساس موضوع پر نہایت ہی لاابالی پن سے گفتگو کر رہے تھے اور بالکل غیر محتاط ہو گئے تھے ۔

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ ( ۲۴ : ۱۵ ) ”جب تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی چلی جا رہی تھی“۔ بغیر کسی تدبر' بغیر کسی غور و فکر' بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے ایک بات تھی جو لوگ کہتے چلے جاتے تھے ۔ گویا یہ بات کانوں کے ذریعے دل و دماغ تک غور کے لیے پہنچ نہ پاتی تھی کہ اسے دوسری زبان اچک لیتی تھی ۔

وَ تَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ( ۲۴ : ۱۵ ) ”اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہتے تھے جس کا تمہیں علم نہ تھا“۔ منہ سے کہتے تھے مگر اس کا تمہیں یقینی علم نہ تھا۔ تمہارے دل و دماغ اسے حقیقت کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے ۔ یہ الفاظ تھے جو زبانوں پر جاری ہو گئے ۔ کسی علم و ادراک سے یہ باتیں ثابت نہ تھیں ۔ پھر وَ تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّ هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ( ۲۴ : ۱۵ ) ”تم اسے معمولی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ اللہ کے نزدیک وہ بڑی بات تھی“۔ یعنی تم رسول اللہؐ کی حریم پر الزام لگا رہے تھے ۔ تم رسول اللہؐ اور ان کی اہلیہ کے لیے وہ درد پیدا کر رہے تھے جس سے ان کا خون خشک ہو رہا تھا۔ پھر تم حضرت صدیق اکبرؓ کے گھر پر الزام لگا رہے تھے جن پر جاہلیت کے دور میں بھی کوئی الزام نہ لگا تھا۔ تم رسول اللہؐ کے ایک مجاہد صحابی پر یہ الزام لگا رہے تھے جبکہ وہ پاک تھا ۔ پھر ان الزامات سے رسول اللہؐ کی رسالت کی توہین ہو رہی تھی ۔ یہ تمام باتیں اللہ کے نزدیک اس قدر عظیم تھیں کہ قریب تھا کہ پہاڑ ٹل جائیں اور آسمان تم پر ٹوٹ پڑے اور تمہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا جائے ۔

مناسب تو یہ تھا کہ یہ بات سنتے ہی مسلمانوں کے دل اس سے بدک جاتے ۔ اس بات کو زبان پر نہ لایا جاتا اور اس کو موضوع بحث بنانے سے گریز کیا جاتا۔ اس معاملے کو اللہ اور اس کے رسول پر چھوڑ دیا جاتا اور اس جھوٹی سازش کو

مدینہ کی پاک اسلامی فضا سے گند کی طرح دور پھینک دیا جاتا۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (۲۴:۱۶) "کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا' سبحان اللہ یہ تو بہتان عظیم ہے۔ جب یہ بات مسلمانوں کے دلوں میں اتار دی جاتی ہے کہ لوگوں سے کس قدر عظیم کوتاہی ہوئی ہے اور دلوں کو اچھی طرح جھنجھوڑ دیا جاتا ہے۔ لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ ان سے کس قدر عظیم کوتاہی ہوئی ہے تو پھر لوگوں کو ڈرایا جاتا ہے کہ دیکھو آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔ یہ تم نے بہت ہی عظیم جرم کیا ہے۔

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖ (۲۴:۱۷) "اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا اگر تم مومن ہو"۔

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ "اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے"۔ مؤثر تربیتی انداز میں بات ہو رہی ہے۔ ایسے حالات میں کہ غلطی کے بعد لوگوں کو احساس ہو گیا کہ تم نے کس قدر عظیم غلطی کی ہے۔ ایسے حالات میں جبکہ لوگ سمع و اطاعت اور اعتبار کے لیے تیار ہیں۔ ان کو سخت الفاظ میں تنبیہ بھی کر دی جاتی ہے کہ اس حرکت کا اعادہ نہ کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارا ایمان خطرے میں ہو گا کیونکہ مومن نصیحت قبول کرتے ہیں اور جب ان کو کھول کر بتا دیا گیا ہے کہ انہوں نے کس قدر برا کام کیا ہے تو اب ان کا فرض ہے کہ اگر وہ مومن ہیں تو اس کا اعادہ نہ کریں۔

وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۲۴:۱۸) "اللہ تمہیں صاف صاف ہدایات دیتا ہے وہ علیم و حکیم ہے"۔ جیسا کہ افک کے معاملے میں اس نے تمہیں ہدایات دیں' اس کی تہ میں پوشیدہ مقاصد کو واضح کیا اور خود اہل اسلام سے جو کوتاہیاں ہوئیں اور اللہ چونکہ علیم ہے اس لیے وہ تمام لوگوں کی نیتوں کو بھی جانتا ہے۔ ہر شخص نے اس معاملے میں جو حصہ لیا اور اس کے پیش نظر جو مقصد تھا اس کو اللہ جانتا ہے کیونکہ وہ دلوں کے خفیہ بھیدوں کو جانتا ہے اور اس معاملے میں اللہ نے جو جوابی تدابیر اختیار کیں وہ حکمت پر مبنی ہیں۔ نیز وہ جو قانون وضع کرتا ہے وہ گہری حکمت پر مبنی ہوتے ہیں اور ان میں لوگوں کی اصلاح و فلاح ہوتی ہے۔

---ooo---

اس کے بعد اب واقعہ افک پر ایک تبصرہ آتا ہے۔ اس واقعہ کے جو آثار اور اثرات معاشرے کے اندر رہ گئے تھے ان کو بالکلیہ مٹانے اور نفوس مسلمہ کو اس سے پاک کرنے کے لیے مکرر طور پر مسلمانوں کو ڈرایا جاتا ہے کہ ایسا سانحہ دوبارہ واقع نہ ہونا چاہئے۔ اس بار تو اللہ نے فضل و کرم کر دیا لیکن آئندہ جو لوگ بے خبر پاک دامن عورتوں پر اس قسم کے الزامات عائد کریں گے دنیا و آخرت دونوں میں وہ عذاب الٰہی سے بچ نہ سکیں گے۔ یہ وعید اس لیے لائی گئی کہ دنیاوی تعلقات اور دنیاوی موجوں سے بلند ہو کر ان کی صفوں میں از سر نو تطہیر اور روشنی آ جائے۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ اور ان کے ایک قریبی رشتہ دار مسطح ابن اثاثہ کے درمیان تعلقات کی تطہیر ہوئی۔ یہ شخص بھی ان دنوں اس بحران میں بہت

ہی سرگرم ہو گیا تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (۲۴ : ۱۹) "جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"۔ وہ لوگ جنہوں نے پاک دامن عورتوں پر الزامات عائد کیے خصوصاً وہ لوگ جنہوں نے حریم نبوی پر بے بنیاد الزام لگانے کی جرأت کی ان لوگوں کی اصل خواہش یہ ہے کہ یہ جماعت مسلمہ کے اندر سے بھلائی اور عفت اور پاکیزگی کے اعتماد کو متزلزل کر دیں اور فحاشی کا اس قدر جھوٹا ڈھنڈورا کریں کہ لوگ اس کے بارے میں دلیر ہو جائیں۔ لوگ یہ کہیں کہ یہ بے حیائی تو بڑے لوگوں میں عام ہے۔ اس طرح وہ جھوٹے قصوں سے فحاشی کی مجالس گرم کر کے اس کو عام کر دیں۔

یہ ہے ان جھوٹے الزاموں کا اثر۔ قرآن کریم یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ جھوٹے الزامات کی وجہ سے فحاشی پھیلتی ہے اس لیے ایسے لوگوں کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں عذاب الیم تجویز کیا گیا ہے۔

قرآن کے انداز تربیت کا یہ ایک انداز ہے اور بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ قانون اور سزا اجتماعی تدابیر میں سے ایک تدبیر ہے اور یہ تدابیر اللہ ہی اختیار کر سکتا ہے جو انسانی نفسیات کا خالق ہے اور وہی اچھی طرح جانتا ہے کہ انسانی شعور کو ان کیفیات میں رنگا جا سکتا ہے اور اس کے رخ کو کس انداز سے اچھی سمت دی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ فرماتے ہیں۔

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (۲۴ : ۱۹) "اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو"۔ انسانی نفسیات کو اس ذات سے زیادہ کون جانتا ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور انسانی طرز عمل کو اچھے انداز میں کون چلا سکتا ہے ماسوائے اس کے جس نے اس کو وجود بخشا ہے۔ کون ہے جو ظاہر اور باطن سے واقف ہے اور اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے وہی تو علیم و خبیر ہے۔

اللہ تعالیٰ دوبارہ مسلمانوں کو اپنے فضل و کرم کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَأَنَّ اللَّهَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (۲۴ : ۲۰) "اور اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ شفیق و رحیم ہے تو....." تو یہ حادثہ بڑا ہی عظیم تھا اور جو غلطی تم سے ہو گئی وہ کوئی معمولی غلطی نہ تھی۔ اور اس کے اندر جو شرارت پوشیدہ تھی وہ تمہیں خوب نقصان پہنچا دیتی۔ لیکن یہ اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تھا اور اس کی مہربانی اور اس کی نگرانی تھی کہ اس نے اس امر عظیم کے برے نتائج کو کنٹرول کر لیا۔ یہ بات اللہ بار بار ذکر فرماتا ہے۔ اس واقعہ کو اللہ ذریعہ تربیت بنا رہا ہے کیونکہ اس کے اثرات مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر پڑ رہے تھے۔

جب یہ باور کرا دیا گیا کہ یہ عظیم فتنہ قریب تھا کہ تحریک اسلامی کے اجتماعی نظام کو تہس نہس کر دے اگر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو اب بتایا جاتا ہے کہ ذرا سوچو تو سہی کہ تم تو شیطانی نقوش قدم پر چل پڑے تھے جو تمہارا ابدی دشمن ہے۔

تمہیں شیطان کے قدموں پر نہیں چلنا چاہیے۔ آئندہ کے لیے اس قسم کی شیطانی حرکات سے باز رہو جن کے نتیجے میں پوری سوسائٹی ایسے شر کا شکار ہو جائے جس طرح جنگل میں آگ لگ جاتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ وَ مَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ مَا زَكٰي مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۴ : ۲۱) "اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ اس کی پیروی کوئی کرے گا تو وہ تو اسے فحش اور بدی ہی کا حکم دے گا اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی شخص پاک نہ ہو سکتا۔ مگر اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔

کیا یہ کوئی اچھا منظر ہو گا کہ شیطان قدم رکھتا جائے اور اس کے نقوش قدم پر ایک مومن قدم رکھتا جائے حالانکہ تمام انسانوں کے مقابلے میں مومن اس کا زیادہ مستحق ہے کہ وہ شیطان سے نفرت کرے اور شیطان کی مقرر کردہ راہ سے دور جا کر سیدھی راہ پر چلے۔ یہ تو ایک مکروہ صورت ہے جس سے ایک مومن نفرت کرتا ہے۔ اس کا وجدان اور شعور ہی اس منظر سے کانپ اٹھتا ہے۔ اس کا خیال کرتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اتباع شیطان کی یہ تصویر کشی ایک مومن کو چوکنا کر دیتی ہے اور وہ شیطان کی راہ پر چلنے سے حساس ہو جاتا ہے۔

وَ مَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ (۲۴ : ۲۱) "شیطان کی پیروی کوئی کرے گا تو وہ اسے فحش اور منکر ہی کا حکم دے گا"۔ اور واقعہ افک اس کا بہت ہی خوبصورت نمونہ ہے کہ اس میں اس نے پورے اہل مدینہ کو ملوث کر دیا۔ شیطان کے کارناموں میں سے یہ ایک مکروہ کارنامہ ہے۔

انسان بہت ہی ضعیف ہے۔ یہ شیطانی اکساہٹ کا شکار ہو سکتا ہے اور پھر گناہ میں ملوث بھی ہو سکتا ہے۔ صرف اللہ کا فضل و کرم ہی اسے بچا سکتا ہے لیکن اللہ کا فضل و کرم بھی اسے تب بچائے گا کہ یہ اللہ کے فضل و کرم کی طرف متوجہ تو ہو اور اللہ کے منہاج پر چلنے کی سعی تو کرے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ مَا زَكٰي مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ (۲۴ : ۲۱) "اگر اللہ کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی شخص بھی پاک نہ ہو سکتا"۔ اس لیے کہ یہ نور ربانی ہی ہوتا ہے جو قلب میں روشنی پیدا کرتا ہے اور اسے پاک و صاف کر دیتا ہے۔ اگر اللہ کا فضل و کرم اور یہ نور نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی پاک و صاف نہ رہ سکتا۔ اللہ سمیع و علیم ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے، پاک کر دیتا ہے بشرطیکہ اس کے اندر بھلائی کی استعداد ہو۔

اس تزکیہ اور طہارت کی تلقین کے بعد اب اہل ایمان کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ اس شر کے نتیجے میں جو تلخیاں پیدا ہو گئی

ہیں ان کو دور کر دو' جس طرح تم اللہ سے معافی کے امیدوار ہو۔اسی طرح آپس میں بھی ایک دوسرے کو معاف کر دو۔

وَ لَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰي وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ( ٢٤ : ٢٢ ) "تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور صاحب مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار' مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے۔ انہیں معاف کر دینا چاہئے اور درگزر کرنا چاہئے۔کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے"۔

یہ آیت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس وقت عائشہ صدیقہؓ کی براءت کا اعلان ہو چکا تھا۔یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ مسطح ابن اثاثہ ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے افک کے معاملے میں باتیں کیں۔ یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے قریبی رشتہ دار تھے اور فقرائے مہاجرین میں سے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ ان پر خرچ کیا کرتے تھے۔ حضرت نے قسم اٹھائی کہ وہ آئندہ مسطح کو کوئی فائدہ نہ دیں گے۔

یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ اور مومنین کو یاد دہانی کرائی گئی کہ وہ خود جب غلطیاں کرتے ہیں تو یہ امید رکھتے ہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دیں گے تو خود بھی ان میں بعض اگر بعض لوگوں کے بارے میں غلطی کریں تو ان کو معاف کرنا چاہئے۔اور وہ جو بھلائی بھی کسی کے ساتھ کرتے تھے اسے نہ روکیں اگرچہ اس معاملے میں اس شخص سے غلطی ہوئی ہو۔

یہاں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ پاک دل لوگ کس قدر اونچی سطح کے لوگ تھے۔ان کے دلوں کو نور ربانی نے پاک کر دیا تھا۔حضرت صدیقؓ کا نفس کس قدر بلند اخلاقی کا نمونہ پیش کرتا ہے کہ اس واقعہ کے متاثرین میں سے وہ نہایت ہی گہرائی کے ساتھ متاثر ہوئے تھے۔انہوں نے اس بہتان کی تلخیوں کو بہت ہی زیادہ جھیلا تھا۔جب وہ اپنے رب کی نصیحت سنتے ہیں۔جب یہ سوال ان کے پردۂ وجدان کے ساتھ ٹکراتا ہے۔

اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ( ٢٤ : ٢٢ ) "کیا تم پسند نہیں کرتے ہو کہ اللہ تمہاری مغفرت کرے" تو ان کی تمام رنجشیں ختم ہو جاتی ہیں۔اب قبائلی اور خاندانی سوچ ختم ہو جاتی ہے یہاں تک کہ ان کی روح شفاف اور صاف ہو جاتی ہے۔ ان کے دل کی دنیا روشن ہو جاتی ہے۔وہ پکار اٹھتے ہیں ہاں میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ میرے گناہوں کو بخش دے۔وہ مسطح کی امداد بحال کر دیتے ہیں اور قسم اٹھاتے ہیں کہ جب تک وہ زندہ ہے اسے یہ امداد ملتی رہے گی۔یہ فیصلہ اس قسم کے بدلے میں ہے کہ میں کبھی اسے کوئی نفع نہ پہنچاؤں گا۔

یوں اللہ تعالیٰ اپنے رحم سے ان رنجیدہ دلوں کو جوڑتے ہیں اور اس معرکے کی وجہ سے ان کے اندر جو کدورتیں پیدا ہو گئی تھیں ان کو دھو ڈالتے ہیں تاکہ یہ معاشرہ جس طرح پاک اور روشن تھا دوبارہ اسی طرح پاک اور روشن ہو جائے۔

---ooo---

یہ مغفرت جس کا ذکر کیا گیا ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے غلطی کی اور پھر توبہ کر لی اور آئندہ کے لیے وہ کسی پر

الزام لگانے سے رک گئے۔ فحاشی کے پھیلانے کا کام انہوں نے چھوڑ دیا۔ رہے وہ لوگ جو اپنی خباثت کی وجہ سے پاک دامن عورتوں پر الزام لگاتے ہیں۔ پھر اس پر اصرار کرتے ہیں مثلاً عبداللہ بن ابی ابن السلول اور اس جیسے دوسرے منافق تو ان کے ساتھ کوئی نرمی نہ ہوگی اور نہ انہیں معاف کیا جائے گا۔ اگر وہ اس دنیا میں قانون حد قذف سے بچ نکلے۔ اس وجہ سے کہ ان کے خلاف اسلامی حکومت کے پاس گواہی نہیں ہے۔ آخرت کا عذاب تو ان کے انتظار میں ہے۔ وہاں تو گواہیوں کی ضرورت نہ ہوگی۔

إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۲۳) يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲٤) يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ (۲٤ : ۲۵) "جو لوگ پاک دامن، بے خبر، مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ وہ اس دن کو بھول نہ جائیں جبکہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔ اس دن اللہ وہ بدلہ انہیں بھرپور دے دے گا جس کے وہ مستحق ہیں اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہی حق ہے سچ کو سچ کر دکھانے والا"۔

اللہ یہاں ان لوگوں کے جرم کو اس طرح پیش کر رہا ہے کہ کوئی عورت بے خبر اپنے کسی کام میں مشغول ہو اور اچانک اس پر تیروں کی بارش شروع کر دی جائے جس کی اسے توقع نہ ہو اور نہ اس نے اس کا کوئی دفاع سوچا ہو۔ اس طرح موجودہ مقدمہ میں ایک مطمئن بے گناہ عورت پر تیروں کی بارش شروع کر دی گئی جبکہ اسے اس طرح کی کسی بات کی توقع ہی نہ تھی۔ یہ اس قسم کا جرم ہے جو نہایت ناپسندیدہ، منکر اور ظالمانہ حملہ تھا۔ اس وجہ سے ایسی پلاننگ کرنے والوں کی سزا کا آغاز اللہ کی لعنت سے ہوگا۔ ان پر اللہ کی لعنت ہوگی اور دنیا اور آخرت دونوں میں وہ رحمت خداوندی سے محروم ہوں گے۔ پھر قیامت میں ان کا یہ حال ہوگا۔

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ (۲٤ : ۲٤) "وہ اس دن کو بھول نہ جائیں جبکہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے"۔ ان میں سے بعض بعض پر الزامات عائد کر دیں گے کہ تم لوگ پاک دامن، بے خبر مومن عورتوں پر بہتان تراشی کرتے تھے۔ یہ اس منظر میں ایک نہایت ہی موثر تقابل ہے کہ جس طرح وہ جھوٹے الزامات لگاتے ہیں، اسی طرح ان کے خلاف سچے الزام ہوں گے۔

يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ (۲٤ : ۲۵) "اس دن اللہ وہ بدلہ انہیں بھرپور دے گا جس کے وہ مستحق ہیں"۔ اور اس دن اللہ ان کو شرمندہ کرے گا، اور یہ ان کی مناسب سزا ہوگی کیونکہ انہوں نے بے گناہوں کو شرمندہ کیا تھا۔ ان کا پورا پورا حساب ان کو دیا جائے گا اور اس دن ان کو پھر ان باتوں کا یقین آ جائے گا جن کا انہیں یقین نہ آ رہا تھا۔

وَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ”اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ حق ہے سچ کو سچ کر دکھانے والا“۔
واقعہ افک کے اس سلسلہ کلام کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو اختیار دیا ہے اور جو لوگوں کی عملی زندگی میں موجود ہے اس کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ ایک خبیث نفس کا جوڑ خبیث نفس سے ہوتا ہے اور ایک طیب اور پاک نفس کا جوڑ پاک نفس سے ہوتا ہے اس اصول کے مطابق یہی ممکن ہے کہ حضرت عائشہؓ کا جوڑ پاک ترین نفس سے ہو جائے' لہٰذا ان لوگوں کا یہ الزام اس لحاظ سے بھی غلط ہے کہ قدرت کی تقسیم میں عائشہ صدیقہؓ حضرت محمدؐ کے حصے میں آئیں اس لیے وہ طیبہ ہیں۔

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَ الطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَ الطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ

اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ (۲۴:۲۶) ”خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے۔ پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔ ان کا دامن پاک ہے ان باتوں سے جو بنانے والے بناتے ہیں' ان کے لیے مغفرت ہے اور رزق کریم“۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہؓ سے بے حد محبت تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے نبی کے لیے کس طرح چن سکتا تھا اگر وہ پاک نہ ہوتیں۔ یہ پاک لوگ اپنی فطرت کے اعتبار سے ان باتوں سے پاک ہیں اور ان کی طرف جن گندی باتوں کی نسبت کی جاتی ہے' وہ ان سے مبراء ہیں۔

ان کے لیے رزق کریم ہے قیامت میں اور گناہوں سے مغفرت ہے یعنی ان کی چھوٹی موٹی کوتاہیاں اللہ کے ہاں معاف ہو جاتی ہیں۔ ان آیات پر افک کے واقعات اب اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ ان واقعات کی وجہ سے امت مسلمہ نہایت ہی مصیبت میں گھر گئی تھی۔ اس واقعہ کے نتیجے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے گھر کی طہارت اور عزت کا مسئلہ درپیش تھا۔ اور بڑی بڑی جنگوں کی آزمائشوں کے ساتھ ساتھ' داخلی محاذ کو مضبوط بنانے کے لیے یہ بھی اللہ کی طرف سے ایک آزمائش تھی جس میں سے ابتدائی اسلامی جماعت کو گزارا گیا۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۵۳ ایک نظر میں

جیسا کہ ہم نے اس سے قبل کہا ہے کہ اسلام ایک پاکیزہ معاشرہ تشکیل دینے میں صرف سخت سزاؤں پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اسلام سب سے پہلے جرائم کے لیے انسدادی اور احتیاطی تدابیر اختیار کرتا ہے۔ نیز اسلام انسان کی فطری خواہشات کو نہ دباتا ہے اور نہ ان کی بیخ کنی کرتا ہے بلکہ وہ انسان کی فطری خواہشات کے لیے بھی ایک نہایت ہی پاکیزہ اور نارمل ماحول فراہم کرتا ہے جس میں کوئی جعلی اکساہٹ نہ ہو۔

اس سلسلے میں اسلام کے نظام تربیت کا بنیادی اصول سدباب کا ذریعہ ہے۔ اسلام بدراہ ہونے کے دروازے ہی بند کر دیتا ہے اور ان اسباب کو ختم کرتا ہے جو انسان کو بدراہ کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں یا فتنے کے اسباب فراہم کرتے ہیں یا جن کی وجہ سے انسان کے جذبات میں اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ دوسری طرف اسلام لوگوں کو فطری تشفی کے اسباب بھی فراہم کرتا ہے' قانون کے دائرے کے اندر اندر۔

اسلام فیملی اور گھروں کی چار دیواری کا بے حد احترام کرتا ہے۔ چنانچہ پہلا اصول یہ طے کیا جاتا ہے کہ کسی کے گھر کے اندر اہل خانہ کی اجازت کے بغیر کوئی داخل نہ ہو۔ یہ محض اس لیے کہ آنے والے کی آنکھیں کوئی ایسا منظر نہ دیکھ لیں جس کو اہل خانہ خفیہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اچانک داخل ہوتا ہے اور اہل خانہ غافل ہیں تو وہ اس منظر کو پسند نہ کریں گے۔ نیز اسلام یہ حکم بھی دیتا ہے کہ تمام مرد اور عورتیں نظریں نیچی رکھیں اور زیب و زینت کے ساتھ عورتیں باہر نہ نکلیں۔

اس کے ساتھ اسلام فقراء اور مساکین کو شادی کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے کیونکہ فحاشی کے خلاف بہترین ہتھیار یہ ہے کہ تمام لوگوں کو شادی کے محفوظ قلعے کے اندر داخل کر دیا جائے۔ نیز یہ بھی حکم دیا جاتا ہے کہ لونڈیوں کو بھی بدکاری پر مجبور نہ کرو کیونکہ لونڈیوں کے ذریعہ فحاشی کو بڑی آسانی کے ساتھ پھیلایا جا سکتا ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۵۳ تشریح آیات

## ۲۷ --- تا --- ۳۴

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿27﴾ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿28﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿29﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں کی رضا نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو' یہ طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ توقع ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے۔ پھر اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ گے تو داخل نہ ہو جب تک کہ تم کو اجازت نہ دے دی جائے' اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ' یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ البتہ تمہارے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ایسے گھروں میں داخل ہو جاؤ جو کسی کے رہنے کی جگہ نہ ہوں اور جن میں تمہارے فائدے (یا کام) کی کوئی چیز ہو۔ تم جو کچھ ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو' سب کی اللہ کو خبر ہے"۔

گھروں کو اللہ نے انسانوں کے لیے جائے سکون بنایا ہے' لوگ کام کاج کر کے ان کی طرف لوٹتے ہیں۔ ان کی روح کو وہاں سکون ملتا ہے اور ان کے نفوس کو وہاں آرام ملتا ہے۔ یہاں وہ اپنے خفیہ اور پوشیدہ امور کے بارے میں مطمئن ہوتے ہیں' ان کی عزت یہاں محفوظ ہوتی ہے اور یہاں وہ آرام کر کے اپنے اعصاب کو تسکین پہنچاتے ہیں۔

ایک گھر میں اس قسم کا آرام اور سکون تب ہی مل سکتا ہے جب کوئی غیر شخص چار دیواری کی حرمت پر ہاتھ نہ ڈالے اور اہل خانہ نہایت امن و سکون سے رہیں' الا یہ کہ باہر کا کوئی شخص ان کی اجازت سے گھر کے اندر داخل ہو۔

اور اس وقت داخل ہو جس وقت وہ چاہیں اور ایسے حالات میں داخل ہو جن میں اہل خانہ اجازت دیں۔

اب اگر کسی کو کسی کے گھر میں داخلے کی اجازت دے دی جائے اور اس کی نظریں کسی ایسے منظر کو دیکھ لیں جو دونوں کے لیے فتنہ ہو اور اچانک داخلہ اس شخص کے لیے اس فتنہ کا باعث بن جائے تو اس طرح معاشرے میں فحاشی پھیلنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسی نظروں کا تکرار پھر ابتلاء بن جاتا ہے۔ اگرچہ پہلی نظر میں ملاقات بعض اوقات بلاقصد و ارادہ ہوتی ہے لیکن بعد میں فتنہ بن جاتی ہے۔ جب فریقین ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں تو اس کے نتیجے میں فساد اور فحاشی اور بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے۔

جاہلیت کے دور میں دوسرے کے گھر لوگ اچانک داخل ہو جاتے تھے۔ پہلے آنے والا آ جاتا اور پھر کہتا میں آ گیا ہوں۔ بعض اوقات یوں ہوتا کہ صاحب خانہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ ایسی حالت میں ہوتا کہ ایسے حالات میں باہر سے داخل ہونا معیوب ہوتا لیکن وہ پروانہ کرتے۔ بعض اوقات یوں ہوتا کہ گھر میں عورت ننگی ہے یا اس کے ستر کے مقامات ننگے ہیں۔ یا مرد اس طرح ہے۔ اس سے صاحب خانہ کو اذیت پہنچتی اور دوسرے کے گھر کا امن و سکون تباہ ہو جاتا۔ جبکہ بعض اوقات ایسا بے ہنگم واقعہ فتنے کا باعث بن جاتا جب آنکھ ایسا منظر دیکھ لیتی جس سے فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا۔

ان تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن کریم نے مسلمانوں کو ان آداب کا پابند کر دیا کہ کسی کے گھر کے اندر بغیر اجازت کے داخل ہونا ممنوع ہے۔ مناسب ہے کہ باہر سے سلام کیا جائے تاکہ ان کو پتہ چل جائے کہ فلاں صاحب آنا چاہتے ہیں۔ نیز اس انداز سے ایک قسم کی مانوسیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰٓي اَهْلِهَا ( ٢٤ : ٢٧ ) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں کی رضا نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو"۔ یہاں اذن و اجازت کے لفظ کی تعبیر لفظ "انس" سے کی گئی ہے۔ اس انداز تعبیر سے اجازت کے مہذب ترین طریقے کی طرف اشارہ ہے۔ نیز اس طرف اشارہ ہے کہ آنے والے کو نہایت ہی مہذب انداز میں آنا چاہئے۔ لوگوں کے ساتھ وہ نہایت انس و محبت سے اور مہذب طریقے سے بات کرے تاکہ وہ اس کے استقبال کے لیے تیار ہوں۔ یہ ایک نہایت ہی لطیف اور دقیق اخلاقی اصول ہے لوگوں کی سہولت کے لیے اور ان کے گھروں میں ان کی عزت و وقار کو بحال کرنے کے لیے اور اس لیے کہ رات دن اہل خانہ آنے جانے والوں سے تنگ ہی نہ ہو جائیں کہ ایک آ رہا ہے اور دوسرا جا رہا ہے اور وہ بھی بلا اجازت۔

اجازت کے نتیجے میں اب صورت حالات یہ ہو گی کہ یا تو اس میں کوئی گھر میں ہو گا اور اجازت دے دے گا تو یہ شخص گھر کے اندر چلا جائے گا اور اگر کوئی نہیں ہو گا تو پھر اس شخص کے لیے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ( ٢٤ : ٢٨ ) "اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو جب تک کہ تم کو اجازت نہ دی جائے"۔

اگر اندر اہل خانہ میں سے کوئی موجود ہو تو صرف اجازت طلب کرنے ہی سے داخلے کی اجازت نہیں ہو جاتی جب

تک کوئی صریح اجازت نہ دے ۔ اگر اندر والے اجازت نہ دیں تو بغیر کسی جھجک کے واپس ہو جانا چاہئے ۔ اور انتظار نہیں کرنا چاہئے ۔

وَ اِنْ قِیْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰی لَكُمْ (۲۴ : ۲۸) "اگر تم سے کہا جائے کہ واپس ہو جاؤ تو واپس ہو جاؤ ۔ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے"۔ یعنی واپس ہو جاؤ بغیر کسی تلخی کے ۔ بغیر اس تاثر کے کہ اہل خانہ نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے ' یا تم سے کوئی نفرت کی ہے کیونکہ اہل خانہ کے اپنے اسرار اور اعذار ہوتے ہیں ۔ اس لیے یہ حق ان کو دینا ضروری ہے کہ اس وقت وہ مہمان کا استقبال کر سکتے ہیں یا نہیں ۔

وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ (۲۴ : ۲۸) "اور جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ خوب جانتا ہے"۔ اللہ تو دلوں کے خفیہ بھیدوں کو جاننے والا ہے ' یا یہ کہ دلوں میں جو جذبات و خیالات ہیں ان سے بھی وہ باخبر ہے ۔

رہے وہ مقامات جو مقامات عامہ ہیں مثلاً ہوٹل ' سرائے اور ضیافت کے گھر ہاسٹل وغیرہ جو پرائیویٹ رہائش گاہوں سے علیحدہ ہوں تو ان میں بغیر اجازت کے داخل ہونا جائز ہے جب اجازت کا کوئی سبب موجود نہ ہو ۔

لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِیْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ (۲۴ : ۲۹) "البتہ تمہارے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ایسے گھروں میں داخل ہو جاؤ جو کسی کے رہنے کی جگہ نہ ہوں اور جن میں تمہارے فائدے کی کوئی چیز ہو"۔

وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ (۲۴ : ۲۹) "تم جو کچھ ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو ' سب کی اللہ کو خبر ہے"۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تمہارے ظاہر و باطن کو جانتا ہے اور وہ تمہارا نگران ہے ۔ تمہارے دلی خیالات سے وہ باخبر ہے کہ تمہارے دلی ارادے کیا ہیں ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں تمہارے لیے ایک نہایت ہی مہذب انداز زندگی تجویز کرتا ہے ۔ اس کا وہ نگراں بھی ہے اس کا مطالبہ یہ ہے کہ تم قلبی اطاعت کرو ۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم ایک مکمل نظام حیات ہے اس لیے وہ انسانی زندگی کے ایک نہایت ہی جزئی مسئلے کو اس قدر تفصیل سے لیتا ہے ۔ کیونکہ اس نظام کا موضوع انسانی زندگی کا **طرز عمل** ہے خواہ وہ جزئی ہو یا تفصیلی ۔ اس طرح اسلامی نظام کے اصول و فروع کے درمیان ایک توازن قائم کر دیا جاتا ہے ۔ استیذان کا قانون گھروں کو امن و سکون کی جگہ بنانے کی ایک تدبیر ہے ۔ یہ تدبیر کرنا مقصود ہے کہ کسی گھر کے باشندے کو اچانک کسی ناپسندیدہ صورت حال سے دوچار ہونا نہ پڑے کیونکہ جب اچانک کوئی در آئے تو معلوم نہیں ہوتا کہ اندر کے لوگ کس حال میں ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کا سر کھلا ہو یا کسی کا ستر کھلا ہو ۔ "عورات" کے لفظ سے وسیع تر مفہوم مراد ہے ۔ اس سے صرف بدنی برہنگی ہی مراد نہیں ہے ۔ اس سے کھانے پینے کے انتظامات ' لباس ' ساز و سامان نشست و برخاست کے مقامات و اثاث البیت بھی مراد ہے جس کے بارے میں اہل بیت یہ نہیں چاہتے کہ جگہ اور حالات کی تیاری کے بغیر کوئی اندر آ جائے اور اندر کی کیفیت کو وہ کم تر نفسیاتی حالات میں پائے ۔ مثلاً کم لوگ اس بات کو پسند کریں گے کہ کوئی اندر آئے اور اندر کوئی رو رہا

ہو یا کوئی اندر آئے اور گھر والا غصے میں ہو۔یا وہ کسی ایسے درد اور دکھ میں مبتلا ہو جسے وہ عوام سے خفیہ رکھنا چاہتا ہو۔یہ سب عورات ہیں۔

اس ایک ''ادب'' کے ذریعے قرآن مجید بے شمار فوائد کو سمیٹ لیتا ہے۔بعض کو ہم جانتے ہیں اور بعض کو جانتے بھی نہیں ہیں۔پھر اہم بات یہ کہ اچانک نظربازی سے بھی انسان بچ سکتا ہے جس کے نتیجے میں ناجائز خواہشات کے ابھرنے کے مواقع ہوتے ہیں اور بعد میں پھر یہ تعلقات برے تعلقات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔غرض نظروں کے بہکنے اور دلوں کی اچانک کشش کو قابو میں رکھنے کے لیے ادب قرآنی نہایت ہی مفید اور اہم ذریعہ اصلاح ہے۔

اس کی حقیقت اور اہمیت صرف وہ لوگ جانتے ہیں جن کے اندر سب سے پہلے یہ ادب اترا اور اس کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے کیا۔

امام ابو داؤد اور نسائی نے ابو عمر اوزاعی کی حدیث نقل کی ہے۔وہ قیس ابن سعد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری رہائش گاہ پر تشریف لائے اور باہر سے کہا ''السلام علیکم'' تو سعد نے نرمی سے وعلیکم السلام کہا۔ قیس کہتے ہیں :میں نے سعد سے کہا کیا تم رسول اللہ ؐ کو اجازت دینا نہیں چاہتے ہو۔تو اس نے کہا چھوڑو ہم پر زیادہ سے زیادہ سلام کہہ دیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بار کہا ''السلام علیکم ورحمتہ اللہ'' تو سعد نے پھر چپکے سے کہا وعلیکم السلام۔اس کے بعد پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''السلام علیکم ورحمتہ اللہ'' اور پھر آپ لوٹ گئے۔ سعد گھر سے نکلے اور آواز دی حضورؐ میں سن رہا تھا اور سلام کا جواب بھی آہستگی سے دے رہا تھا۔مقصد یہ تھا کہ آپ کثرت سے ہم پر سلام کہہ دیں۔کہتے ہیں حضور اکرمؐ آپ کے ساتھ لوٹ آئے۔سعد نے حکم دیا کہ حضور اکرمؐ کے لیے غسل کا پانی تیار کرو۔آپؐ نے غسل کیا۔اس کے بعد سعد نے اون کا ایک پھولدار کپڑا حضورؐ کو پیش کیا۔یہ زعفران یا ورس گھاس سے رنگا ہوا تھا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اوڑھا۔پھر حضورؐ نے ہاتھ اٹھائے اور یہ دعا کی۔

اللھم اجعل صلاتك و رحمتك علي آل سعد ابن عبادة . . . . ''اے اللہ 'اپنا کرم اور رحمت ڈال دے آل سعد ابن عبادہ پر''۔ابو داؤد نے عبداللہ ابن بشریٰ حدیث نقل کی ہے۔کہتے ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی قوم کے دروازے پر آتے تو دروازے کے سامنے منہ کر کے نہ کھڑے ہوتے یا اس کے دائیں طرف یا بائیں طرف کھڑے ہوتے اور فرماتے السلام علیکم .... السلام علیکم۔ان دنوں گھروں میں پردے نہ ہوتے تھے۔

ابو داؤد نے حضرت ہذیل سے روایت کی ہے کہ ایک آدمی آیا (عثمان کہتے ہیں سعد تھا) تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر کھڑا ہو گیا اور داخلہ کی اجازت چاہنے لگا۔تو وہ دروازے کے سامنے منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔(عثمان نے کہا دروازے کے سامنے)۔اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے طریقہ بتایا اور کہا اس طرح کھڑے ہو جاؤ۔کیونکہ اجازت طلب کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ تم اندر کچھ دیکھ نہ سکو۔

صحیحین میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اگر تمہارے گھر کے اندر کوئی شخص بغیر اجازت کے اندر آ جائے اور تم ان پر ایک پتھر پھینکتے ہو اور اس سے اس کی آنکھ پھوٹ جاتی ہے تو تم پر کوئی جرم عائد نہ ہو گا۔

ابو داؤد نے حضرت ربعی سے روایت نقل کی ہے کہ بنی عامر کے ایک شخص نے رسول اللہ ؐ سے اندر آنے کی اجازت

چاہی - جبکہ حضورؐ اپنے گھر میں تھے - تو اس نے کہا کیا میں "گھس جاؤں"۔ تو حضورؐ نے اپنے خادم سے کہا نکلو اور اس شخص کو اندر آنے کی اجازت طلب کرنے کا طریقہ سکھاؤ۔ اس سے کہو کہ تم یوں کہو "السلام علیکم"۔ کیا میں داخل ہو جاؤں۔ حضورؐ کی اس بات کو اس شخص نے سن لیا تو کہا "السلام علیکم 'کیا میں داخل ہو جاؤں"۔ تو اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی اور وہ اندر آیا۔

ہیثم نے کہا ہے کہ مغیرہ نے کہا اور مغیرہ نے کہا مجاہد نے کہا' عمر ایک ضرورت سے آئے اور اسے گرمی نے تنگ کر رکھا تھا وہ قریش کی ایک عورت کے خیموں کے سامنے گئے اور کہا "السلام علیکم 'کیا میں اندر آ جاؤں"۔ تو اس نے کہا "سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ"۔ حضرت عمرؓ نے پھر اجازت چاہی۔ اس نے بھی پھر یہی جواب دیا حالانکہ وہ اس کے قدموں کے پاس کھڑا تھا۔ پھر حضرت عمرؓ نے کہا تم اس طرح کہو "ادخل" داخل ہو جاؤ۔ اس پر اس عورت نے کہا "داخل ہو جاؤ" تو بعد میں وہ اندر آئے۔

عطا ابن ابی رباح نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں میں نے کہا' کیا میں اپنی یتیم بہنوں سے بھی اجازت طلب کروں جو میرے ہی گھر میں میری نگرانی میں ہیں۔ تو آپ نے فرمایا' ہاں۔ میں نے پھر اس پر یہ سوال کیا تا کہ مجھے اس میں رخصت دے دی جائے۔ اس پر اس نے کہا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ اسے ننگی حالت میں دیکھو۔ تو میں نے کہا' نہیں۔ تو اس نے کہا پھر اجازت طلب کرو۔ تو میں نے پھر اس سے بحث کی تو انہوں نے کہا کہ کیا تم اللہ کے حکم کی اطاعت چاہتے ہو یا نہیں۔ میں نے کہا ہاں۔ "تو پھر اجازت چاہو" انہوں نے کہا۔

اور حدیث صحیح میں آتا ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کوئی اپنے گھر بھی رات کے وقت اچانک نہ جائے۔ بعض روایات میں آتا ہے۔ لیلا یتخونھم اور ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دن کے وقت مدینہ پہنچ گئے تو مدینہ کے سامنے آپ نے اونٹوں کو بٹھا دیا۔ آپ نے فرمایا انتظار کرو عشاء تک یعنی دن کے آخری حصے تک تا کہ ایسی عورت جس کے بال بکھیرے ہوں وہ بال سنوار لے۔ اور ایسی عورت جس کے بال صاف نہ ہوں وہ صاف کر لے۔

اسلام نے نہایت ہی مہذب طریقے مسلمانوں کو سکھائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر ان سے تجربہ کرایا۔ یہ آداب بلند ان کو دیئے جو نہایت ہی روشن اور نور ربی سے منور تھے۔

آج ہم بھی مسلمان ہیں لیکن ایسے معاملات کے بارے میں ہمارا احساس غلیظ ہے۔ ہم اجڈ ہو گئے ہیں۔ ایک شخص اپنے بھائی کے گھر جاتا ہے اور تیر کی طرح اندر گھس جاتا ہے اور رات اور دن کے کسی بھی وقت اس کا جی چاہے گھس جاتا ہے۔ وہ بار بار گھنٹیاں بجاتا ہے۔ اور تب چھوڑتا ہے کہ کوئی بادل نخواستہ اٹھے اور اس کے لیے دروازے کھولے۔ بعض اوقات گھر میں ٹیلیفون بھی ہوتا ہے۔ یہ بڑی سہولت سے آنے کی اجازت طلب کر سکتا ہے' وقت مقرر کر سکتا ہے۔ لیکن ہم نے اسلام کے نظام استئذان کو ترک کر دیا ہے اور وقت بے وقت ہم دوسرے کے ہاں وارد ہو جاتے ہیں اور اب تو ہم نے بغیر ملاقات چلے جانے کو معیوب سمجھ لیا ہے۔ اگرچہ اہل بیت نہ چاہتے ہوں۔ ہمارا رویہ یہ ہوتا ہے کہ جب ہم آ گئے تو ہمیں گھس جانا ہی ہے۔ بغیر کسی باک اور انتظار کے۔

ہم مسلمان ہیں لیکن ہم اس وقت اپنے بھائیوں کو ڈسٹرب کر دیتے ہیں جب وہ کھانا کھانے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اب اگر وہ بھائی کھانا پیش نہیں کرتا تو ہم خفا ہو جاتے ہیں۔ ہم رات دیر تک ملنے چلے جاتے ہیں۔ اگر وہ اپنے ہاں رات گزارنے

کی دعوت نہیں پیش کرتا تو ہم خفا ہو جاتے ہیں اور ہم اس معاملے میں کسی کا کوئی عذر سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہ محض اس لیے ہوتا ہے کہ ہم اسلامی آداب کے رنگ میں رنگے ہوئے نہیں ہیں۔ ہم اپنی خواہشات کو اس ضابطے کے تابع کرنا نہیں چاہتے جو رسول اللہ ؐ لائے ہیں۔ اور ہم دراصل ایک غلط جاہلی رواج کے غلام بن گئے ہیں جس پر اللہ کی جانب سے کوئی دلیل نہیں ہے۔

پھر زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ہم ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ وہ بعض ایسے آداب پر عمل پیرا ہیں جو ہمارے دین جیسے ہیں۔ اور وہ ایسے ہی آداب ہیں جو ہمارے دین نے ہمیں سکھائے ہیں۔ ہم ان غیر مسلموں کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ انھوں نے ہمارے دین کے آداب اپنا رکھے ہیں اور ہمیں اپنے دین کا پتہ نہیں ہے۔ الٹے ہم ان سے متاثر ہو جاتے ہیں اور ان کو نادر آداب سمجھتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر بھی ہم اپنے دین کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور مطمئن ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔

--- ○○○---

گھروں میں داخل ہونے کی اجازت کے آداب کے بعد جس کے ذریعے امتناعی اور احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی ہیں کہ کوئی نظر کے فتنے میں نہ پڑ جائے اور اس کے برے نتائج برآمد ہوں۔ اب اہل ایمان کو عمومی تلقین کی جاتی ہے کہ وہ اپنی نظروں کی حفاظت کریں کیونکہ نظربازی ہی انسان کو گمراہی اور بے راہ روی تک لے جاتی ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ
ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ
مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ
مِنْهَا وَ لْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۪ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ
اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ
اَوْ بَنِيْۤ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ
التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى
عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَ لَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ
وَ تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾

"اے نبی ؐ مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں ' یہ ان کے لیے

زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے' جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے - اور اے نبی" مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں' اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں' اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں - بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے' اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں - وہ اپنا بناؤ سنگھار ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے : شوہر' باپ' شوہروں کے باپ' اپنے بیٹے' شوہروں کے بیٹے' بھائی' بھائیوں کے بیٹے' بہنوں کے بیٹے' اپنے میل جول کی عورتیں' اپنے لونڈی غلام' وہ زیردست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں' اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں - وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہو' اس کا لوگوں کو علم ہو جائے - اے مومنو' تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو' توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے"۔

ان آیات کا نصب العین یہ ہے کہ ایک نہایت ہی پاک و صاف سوسائٹی قائم کی جائے جس کی حالت یہ نہ ہو کہ ہر جگہ اور ہر وقت شہوت ہی کا ہیجان ہو اور ہر وقت گوشت و پوست کی لذت اندوزی کے سامان ہوں' کیونکہ ایسے اقدامات جن سے ہر وقت جنسی ہیجان پیدا کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس قدر جنسی پیاس پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ پھر کبھی بجھتی نہیں - ایک نظر یا فتنہ انگیز ادا یا زیب و زینت کی نمائش اور عریانی جسم کی نمائش دوسروں کے جذبات میں آگ لگا سکتی ہے اور انسان کی خوابیدہ حیوانیت کو نہ صرف جگا دیا جاتا ہے بلکہ دوسرے کے اندر بے چینی پیدا کر دی جاتی ہے - دوسرے فریق کو پھر اپنے اوپر قابو نہیں رہتا - یا تو پھر انسان بے قید شہوت رانی کا شکار ہوتا ہے اور یا پھر اس کے اعصاب اور نفسیات کے اندر ہیجانی امراض پیدا ہو جاتی ہیں اور اس طرح ایک انسان عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے -

اسلام جو پاک اور صاف ستھری سوسائٹی تعمیر کرنا چاہتا ہے اس کے قیام کے لیے وہ پہلی تدبیر یہ اختیار کرتا ہے کہ جذبات کو ہیجان سے بچایا جائے - وہ فریقین کے اندر پائے جانے والے فطری میلان کو اپنی جگہ باقی رکھتا ہے اور اپنے فطری انداز کے مطابق اس فطری جذبہ کو محفوظ اور تعمیری انداز دیتا ہے -

انسانیت پر ایک دور ایسا بھی آیا کہ نظریہ اباحیت پھیل گیا - جنسین کے درمیان آزادانہ گفتگو' آزادانہ اختلاط گپ شپ کو عام کر دیا گیا' یہاں تک کہ بچوں کو جنسی تعلیم دی جانے لگی اور خفیہ ترین باتوں سے پردہ اٹھا دیا گیا - یہ باتیں اور اقدامات اسی نظریہ کے تحت کیے گئے کہ یہ امور جنسی میلان اور جنسی جذبات کو دبانے کے نقصانات سے بچاتے ہیں اور لوگوں کو یہ مواقع ملتے ہیں کہ وہ آزادانہ طور پر جو چاہیں جنسی معاہدے کریں - یہ اجازت ان نظریات نے اس لیے دی کہ لوگ جنسی میدان میں تشدد اور دوسری غلط کاریاں نہ کریں -

یہ جنسی آزادی اس وقت رائج ہوئی جب انسان کے بارے میں خالص مادی نظریات رائج ہوئے اور انسان کو محض حیوان قرار دیا گیا - خصوصاً فرائیڈ کے جنسی خیالات کی ترویج کے بعد - لیکن میں نے خود ان نظریات کو ایک ایسے ملک میں دیکھا جس میں مکمل اباحیت تھی اور جس میں مذہبی' اخلاقی اور انسانی قیود میں سے کوئی قید نہ تھی لیکن میں نے مشاہدہ کیا کہ یہ تمام نظریات محض مفروضے ہیں اور ایسے ممالک کے حالات ان کی پوری پوری تکذیب کرتے ہیں -

ایسے ممالک کا ہم نے ملاحظہ کیا ہے جن میں جسمانی ملاپ' عریانی اور جنسی بے راہ روی پر کوئی قید و بند نہیں ہے - وہاں اس کی تمام ممکن شکلیں جائز ہیں لیکن ان ممالک میں جنسی تعلقات نہ مہذب ہو سکے' نہ ان کے اندر کوئی باقاعدگی پیدا ہوئی بلکہ جنسی پیاس جنون کی حد تک بڑھ گئی اور اس قدر بڑھی کہ تسکین کا نام و نشان ختم ہو گیا - ان ممالک میں

جنسی اور نفسیاتی بیماریوں کا طوفان لڈ آیا اور ایسے مسائل دیکھنے میں آئے جو جنسی محرومی سے پیدا ہوتے ہیں ۔یہ مسائل ان معاشروں میں بکثرت پائے جاتے ہیں جن میں جنسی انارکی پر کوئی قید نہیں ہے ۔یہ مسائل محض اس لیے پیدا ہوئے کہ ایسے ممالک میں کوئی جنسی قید اور ضابطہ نہ تھا۔جنسی دوستیاں بغیر کسی رکاوٹ کے آزاد تھیں اور جنسی تعلقات اور ملاپ مویشیوں کی طرح راستوں میں دیکھا جاتا تھا۔جنسی حرکات اور نظربازیاں تو بالکل معمولی چیز تھیں ۔ ان ممالک کے تفصیلی واقعات اور تفصیلی حرکات پر بحث کا یہاں موقع نہیں ہے ۔تفصیلات کے لیے دیکھئے محمد قطب کی کتاب (الانسان بین المادیہ و الاسلام) باب مسائل جنس ۔مزید تفصیلات میری زیر طبع کتاب (امریکا التی رایت) میں دیکھئے ۔

مرد اور عورت کے اندر ایک دوسرے کے لیے کشش ایک فطری امر ہے اور یہ انسان کے اندر تخلیقی طور پر ودیعت کی گئی ہے کیونکہ اس کرۂ ارض پر زندگی کے تسلسل کا دارومدار اسی پر ہے ۔انسان نے اس زمین پر منصب خلافت ارضی کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے ۔اس ذمہ داری کا بڑا اور اہم حصہ یہاں زندگی کے تسلسل کو قائم رکھنا ہے ۔اس لیے یہ کشش ایک دائمی کشش ہے ۔بعض اوقات یہ کشش سو جاتی ہے ۔پھر جاگ اٹھتی ہے ۔جونہی یہ جاگتی ہے تو یہ فرو تب ہوتی ہے جب جنسین کے درمیان ملاپ ہو کر تسکین ہو جائے ۔اگر یہ جسمانی تسکین نہ ہو تو اس کا اثر انسانی اعصاب پر پڑتا ہے اور ایسے حالات میں انسان پھر شدید گھٹن محسوس کرتا ہے ۔پھر انسان کو ایک نظر بھی اکساتی ہے' ایک حرکت بھی اکساتی ہے ۔ایک معمولی سی ہنسی بھی ابھارتی ہے ۔محض گپ شپ کے نتیجے میں انسان بے قابو ہو جاتا ہے اور ایک خوبصورت آواز بھی تڑپا دیتی ہے لہٰذا محفوظ طریقہ یہ ہے کہ سوسائٹی کے اندر انسان کو ایسے مواقع سے محفوظ رکھا جائے تاکہ اس کا جنسی میلان طبعی حدود کے اندر رہے اور جائز اور قدرتی ذرائع سے اس کی تسکین کے مواقع فراہم کیے جائیں ۔اسلام یہی منہاج اختیار کرتا ہے ۔اس کے ساتھ ساتھ اسلام انسان کی قوتوں کو دوسری تعمیری سمتوں کی طرف بھی موڑ دیتا ہے ۔زندگی کے دوسرے کام ایسے ہوتے ہیں جو جسم و جان اور خون اور پوست کے اس ملاپ سے زیادہ اہم ہوتے ہیں' لہٰذا انسان کے سامنے صرف شہوانی تسکین ہی واحد مقصد نہیں رہتا۔زیر تفسیر آیات میں اسلام کی ایسی ہی پالیسیوں کو جاری کیا گیا ہے یعنی ایسے مواقع کم کیے جائیں جن میں ہیجان پیدا ہوتا ہو ۔لوگوں کو اعلیٰ مقاصد میں مصروف کیا جائے اور پھر فریقین کے لیے جائز تسکین کے موقع پیدا کیے جائیں ۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (۲۴ : ۳۰) "اے نبی مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں' یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے' جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے"۔

مردوں کی طرف سے غض بصر ایک نفسیاتی ادب اور تہذیب ہے اور دوسرے انسانوں کے اندر فطری محاسن اور جسمانی محاسن اور چہرے کے محاسن کی تلاش ہر انسان کے اندر ایک فطری داعیہ ہوتا ہے ۔اس طرح ایک مومن اپنے اس داعیہ پر قابو پاتا ہے ۔نیز یہ غلط روی کے پہلے دریچے کی بندش کا اقدام ہے ۔اگر غض بصر سے کام نہ لیا جائے تو انسانی نظر انسان کو فتنے میں ڈال سکتی ہے ۔گویا زہریلے تیر سے بچنے کی یہ پہلی کوشش ہے ۔

جب انسان اپنی نظروں پر قابو پالے تو اس کے نتیجے میں اس کی شرمگاہ خود بخود زیر کنٹرول ہوگی ۔غض بصر کے نتیجے

میں بے راہ روی کے اس دوسرے مرحلے میں داخل ہونے ہی سے انسان بچ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غض بصر اور حفظ فروج کو ایک ہی آیت میں لایا گیا ہے۔ کیونکہ غض بصر سبب ہے اور حفظ فرج مسبب ہے۔ بلکہ عالم ضمیر اور عالم واقعہ دونوں میں یہ پہلا اور دوسرا قدم ہیں اور ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ "یہ ان کے لیے پاکیزہ طریقہ ہے"۔ یہ ان کے جذبات کے لیے پاکیزہ طریقہ ہے' اس طریقے سے وہ برائی میں مبتلا ہونے سے بچ جائیں گے اور ان کا میلان اپنے جائز راہ تک محدود ہو گا۔ اللہ ہی ہے جو تمہیں یہ احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ فطری اور نفسیاتی تعلیم و تربیت ہے۔ اللہ تمہاری تمام حرکات سے واقف ہے اور وہ علیم و خبیر ہے۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (۲۴ : ۳۱) "اور اے نبیؐ مومن عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں"۔ وہ اپنی بھوکی نظروں کو آزاد نہ چھوڑیں نہ وہ دریدہ نگاہوں سے مردوں کو دیکھیں۔ نہ اچانک ان پر نگاہ ڈالیں اس طرح کہ مردوں کے خوابیدہ میلانات کے اندر اشتعال پیدا ہو جائے اور وہ اپنی شرمگاہوں اور غیر قانونی اور غیر جائز مردوں کے لیے مباح نہ کر دیں۔ اپنے فطری میلانات کو جائز طریقے سے استعمال کر کے حلال بچے پیدا کریں اور یہ نہ ہو کہ حرام بچے پیدا ہوں اور معاشرے کے لیے وہ شرم کا باعث ہوں اور معاشرہ ان کے لیے شرمسار کنندہ ہو۔

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (۲۴ : ۳۱) "اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو ظاہر ہو"۔ زینت اور بناؤ اور میک اپ عورتوں کے لیے جائز ہے کیونکہ یہ ان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ ہر عورت کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ بہت ہی خوبصورت نظر آئے۔ ہر زمانے میں زینت کے معیار بھی بدل جاتے ہیں لیکن زینت کا داعیہ فطرت کے اندر موجود ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ عورت اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت بنائے۔

اسلام عورت کی اس فطرت کو بھی جڑ سے اکھاڑ کر نہیں پھینکتا۔ وہ اسے تسلیم کرتا ہے لیکن اسلام اس کی تنظیم اور ضابطہ بندی ضرور کرتا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ یہ زیب و زینت صرف ایک مرد یعنی اپنے خاوند اور شریک حیات کے لیے مخصوص ہو جائے اور اس زینت کو صرف وہ دیکھے۔ اس میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو۔ ہاں بعض محارم بھی اس زینت میں شریک ہو سکتے ہیں جن کا ذکر بعد میں آتا ہے اور جن سے یہ توقع نہیں ہوتی کہ عورت ان کے لیے شہوت انگیز ہو گی۔

ہی وہ زینت جو چہرے پر ہے یا جو ہاتھوں پر ہے تو اس کا ظہور جائز ہے۔ کیونکہ چہرے اور ہاتھوں کا کھولنا عورتوں کے لیے مباح ہے۔ حضورؐ نے اسماء بنت ابوبکر سے یہ فرمایا "اسماء عورت جب حیض کی حد تک پہنچ جائے تو یہ جائز نہیں ہے کہ اس کے "ان" مقامات کے سوا کوئی جگہ کھلی ہو۔ آپ نے اس وقت چہرے اور ہاتھوں کی طرف اشارہ فرمایا۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ (۲۴ : ۳۱) "اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل

ڈالے رکھیں"۔ جیب اس شگاف کو کہتے ہیں جو قمیض میں سینے پر ہوتا ہے۔ اور "خمار" اس چادر کو کہتے ہیں جو سر پر اوڑھی جاتی ہے تاکہ اس سے سینہ چھپ جائے اور وہ بھوکی نظروں سے اوجھل رہے اور اچانک نظر سے بھی یہ مقامات بچ جائیں۔ متقی لوگ تو اس اچٹتی نظر کو طول نہیں دیتے نہ دوبارہ نظر ڈالتے ہیں لیکن اس نظر سے بھی بعض اوقات بڑے فتنے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر ان مقامات کو کھلا رکھا جائے جن سے جنسی میلان کا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اس معاملے میں کسی انسان کو آزمانا نہیں چاہتا کیونکہ اللہ کو معلوم ہے کہ انسان کے لیے یہ ایک عظیم فتنہ ہے۔

اور وہ مومن عورتیں جو اللہ کی طرف سے یہ ہدایت پا رہی تھیں اور ان کے دل اللہ کے نور سے منور تھے انہوں نے ان احکام کی تعمیل میں ذرہ برابر بھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا۔ اگرچہ ان کی فطری رغبت اور خواہش یہی تھی کہ وہ ایسے جمال و کمال کا اظہار کریں جس طرح ہر عورت کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے۔ جاہلیت میں یہ رواج تھا جس طرح آج کی جدید جاہلیت کا رواج ہے کہ عورتیں مردوں کے درمیان سینہ تان کر پھرتی تھیں اور ان کے سینہ پر کچھ نہ ہوتا تھا۔ بعض اوقات تو اس کی گردن اور بالوں کی لٹیں بھی کھلی ہوتی تھیں اور کان کی بالیاں بھی کھلی ہوتی تھیں۔ جب اللہ کی طرف سے یہ حکم آیا کہ وہ اپنے سینوں پر اوڑھنیاں لٹکائیں اور اپنی زینت کے صرف ان حصوں کو ظاہر کریں جو ظاہر ہوں تو انہوں نے اس حکم کی تعمیل میں مطلق تامل نہ کیا۔ اس کے بارے میں حضرت عائشہؓ کا قول خوب وضاحت کرتا ہے کہ اللہ دور اول کی مہاجر عورتوں پر رحم فرمائے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَى جُيُوبِهِنَّ (٢٤ : ٣١) "اور اپنے سینوں پر اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں" تو انہوں نے اپنی ریشمی چادریں پھاڑ دیں اور ان کو اوڑھ لیا"۔ صفیہ بنت شیبہ سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس بیٹھی تھی تو انہوں نے قریش کی عورتوں کا ذکر کیا اور ان کے فضائل بیان کیے تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ قریش کی عورتوں کو فضیلت حاصل ہے لیکن خدا کی قسم میں نے انصار کی عورتوں سے زیادہ تصدیق کرنے والی عورتیں نہیں دیکھیں اور نہ ان سے زیادہ عاقل عورتیں دیکھی ہیں۔ جب سورہ نور کی یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَى جُيُوبِهِنَّ (٢٤ : ٣١) "اور اپنے سینوں پر اوڑھنیوں کے آنچلے ڈالے رہیں"۔ تو جب ان کے مرد عورتوں کے پاس گئے اور انہوں نے ان پر یہ آیت تلاوت کی تو ایک انقلاب آگیا۔ ایک شخص اپنی بیوی، بہن اور لڑکی کے سامنے یہ تلاوت کرتا یا دوسری قریبی رشتہ دار عورت کے سامنے، تو ان عورتوں نے اپنی نقش و نگار والی ریشمی چادروں کو پھاڑا اور سر پر اوڑھ لیا۔ یہ انہوں نے ایمان اور تصدیق کے جذبہ سے کیا۔ (یعنی اللہ کا جو حکم آیا انہوں نے اس پر عمل کیا)۔ اور وہ عورتیں رسول اللہؐ کے پیچھے صفوں میں یوں کھڑی نظر آتی تھیں کہ گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔

اسلام نے اسلامی معاشرے کا ذوق ہی بدل دیا اور اس معاشرے میں لوگوں کے جمالی احساسات ہی بدل گئے۔ اب جمال اور حسن کی حیوانی ادائیں مطلوب اور مستحسن نہ رہیں بلکہ حسن و جمال کا ایک انسانی اور مہذب رنگ ڈھنگ اور معیار قائم ہو گیا جس میں عریانی معیار حسن نہ رہی۔ جہاں تک عریانی کا تعلق ہے یہ حسن و جمال کا حیوانی معیار ہے۔ انسان اس کی طرف تب مائل ہوتا ہے جب اس کے احساسات حیوانی بن جائیں۔ اگرچہ یہ عریاں جمال بہت ہی اعلیٰ درجے کا حسن

پیش کرتا ہو۔ سنجیدگی اور وقار کا جمال تو وہی پاکیزہ جمال ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ اس سے ذوق ترقی پاتا ہے اور وہ انسان کے لائق ہوتا ہے۔ یہ ظاہری بھی ہوتا ہے، اور تصوراتی بھی ہوتا ہے۔

آج بھی اسلام یہی مومنہ عورتوں کی تربیت اسی انداز سے کرتا ہے اگرچہ آج کا ماحول بہت ہی بدل گیا ہے۔ عموی طور پر لوگوں کا ذوق گر گیا ہے اور اس میں حیوانی رنگ کا غلبہ ہے۔ آج کے جمالیاتی مظاہر میں عریانی اور حیوانی رنگ ڈھنگ اپنے عروج پر ہے لیکن ہماری مومنہ عورتیں آج بھی اپنے مقامات کشش اور مقامات فتنہ کو چھپاتی ہیں۔ وہ یہ جہاد ایسے ماحول میں کر رہی ہیں جہاں عریانی ہی عریانی ہے۔ عورتوں کی حالت یہ ہے کہ وہ مردوں کو دعوت نظارہ دے رہی ہیں اور اس طرح پکار رہی ہیں اور دعوت دے رہی ہیں جس طرح حیوان حیوان کو پکارتا ہے۔ یہ پردہ سنجیدگی اسلامی فرد اور ایک معتدل اسلامی سوسائٹی کے لیے بے حیائی سے بچاؤ کی واحد تدبیر ہے۔ لیکن جہاں فتنے اور فحاشی اور بے راہ روی کا ڈر نہ ہو وہاں اسلام کشف و ظہور، زینت کی ممانعت نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ مرد جن کا میلان بالعموم محرم عورتوں کی طرف نہیں ہوتا، ان کے سامنے اظہار زینت کی ممانعت نہیں ہے۔

آباء، ابناء، سسر، خاوند کے بیٹے، بھائی، بھتیجے، بھانجے اور مومن عورتیں ان احکام سے مستثنیٰ ہیں۔

اَوْ نِسَآئِهِنَّ (۲۴ : ۳۱) "ان کی عورتیں" یعنی مومن عورتیں۔ رہیں غیر مومن عورتیں تو وہ مستثنیٰ نہیں ہیں۔ یہ اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ غیر مسلم عورتیں اپنے خاوندوں کے سامنے یا بھائیوں کے سامنے یا لڑکوں کے سامنے مسلمان عورتوں کی خفیہ زیب و زینت کی داستانیں سنائیں۔ صحیحین میں ہے

لا تباشر المراة المراة تنقها لزوجها كانه يراها "کوئی عورت دوسری عورت کے سامنے ننگی نہ ہو کہ وہ اس کا بیان اپنے خاوند سے اس طرح کرے کہ گویا وہ اسے ننگا دیکھ رہا ہے"۔ لیکن مسلمان عورتیں اس سے اس لیے مستثنیٰ ہیں کہ وہ امین ہیں۔ ان کا دین اور ان کا اخلاص ان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ایک مسلم عورت کی جسمانی ساخت اور زیب و زینت کا بیان اپنے خاوندوں کے سامنے کریں۔ اور اس سے وہ بھی مستثنیٰ ہیں۔

اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ (۲۴ : ۳۱) "وہ جو تمہارے مملوک غلام ہیں"۔ ان کے بارے میں دو اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد صرف لونڈیاں ہیں دوسرا یہ کہ غلام اور لونڈیاں دونوں اس حکم میں شامل ہیں کیونکہ ایک غلام بالعموم اپنی مالکہ کی طرف شہوانی نظروں سے نہیں دیکھتا۔ لیکن پہلی رائے درست ہے کیونکہ غلام بھی بہرحال انسان ہے اور سیدہ کی زیب و زینت کے مقامات دیکھ کر اس کے اندر بھی شہوانی ہیجان پیدا ہو سکتا ہے۔ اگرچہ وہ معاشرتی اعتبار سے ایک فروتر مقام رکھتا ہو اور اس سے وہ زیردست مرد بھی مستثنیٰ ہیں جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں۔ یعنی

اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ (۲۴ : ۳۱) "اور وہ زیردست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں"۔ یا وہ کسی سبب سے عورتوں کی خواہش ہی نہ رکھتے ہوں مثلاً وہ نامرد ہوں، یا احمق ہوں یا مجنون ہوں یا اور کوئی ایسی وجہ ہو جس کی بنا پر وہ عورت کو نہ چاہتے ہوں اور کسی فتنہ اور بے راہ روی کا کوئی خطرہ نہ ہو۔

اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰي عَوْرٰتِ النِّسَآءِ (۲۴ : ۳۱) "اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں"۔ وہ بچے کہ اگر وہ عورت کو ننگا دیکھ لیں تو اس کے اندر جسمانی خواہش پیدا نہ ہو۔ اگر ان کے اندر جنسی شعور پیدا ہو گیا ہو' اگرچہ وہ بالغ نہ ہوئے ہوں تو ان سے پردہ ضروری ہے اور وہ اس استثناء میں داخل نہیں ہیں۔

یہ سب خاوندوں کے علاوہ ہیں۔ ان کے لیے یہ اجازت ہے کہ یہ اگر عورت کے ناف کے نیچے اور گھٹنے کے اوپر کے حصے' کے ماسوا کسی جگہ کو دیکھ لیں' جب کہ ان لوگوں سے ایسا کوئی ڈر نہ ہو کہ یہ کسی فتنے میں مبتلا ہوں گے۔ رہا خاوند تو اس کے لیے اجازت ہے کہ وہ اپنی بیوی کے جسم کا ہر حصہ دیکھ سکے۔

پردہ کے ان احکام سے مراد اور مقصود یہ تھا کہ کوئی بے راہ روی اور فحاشی میں مبتلا نہ ہو۔ اس لیے اب یہاں ایسی حرکات کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے جس سے کوئی فتنے میں پڑ سکتا ہے' جن کی وجہ سے شہوت کا ہیجان پیدا ہو سکتا ہے اور جن کی وجہ سے خفیہ جذبات بھڑک سکتے ہیں اگرچہ عملاً وہ عورتیں پردے میں ہوں۔

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ (۲۴ : ۳۱) "اور وہ اپنے پاؤں کو زمین پر مارتی ہوئی نہ چلیں کہ اپنی زینت جو انہوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے"۔ یہ آیت نفس انسانی کی تشکیل' اس کے تاثر اور انفعال اور جنسی معاملات میں اس کے ردعمل کی گہرائی تک اتر جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی سوچ اور تصور بعض اوقات ایک منظر کے دیکھنے سے بھی زیادہ متاثر کر دیتی ہے۔ کئی لوگ ایسے حساس ہوتے ہیں کہ عورت کے جسم کو دیکھنے کے مقابلے میں اس کے جوتوں' اس کے کپڑوں اور اس کے زیورات کو دیکھ کر ہی متاثر ہوتے ہیں۔ نیز بعض افراد کو عورت کا خیال زیادہ متاثر کرتا ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ ان کے سامنے ہو۔ امراض نفسی کے علماء کے ہاں ان امور کے بارے میں بڑی ہی معلومات ہیں۔ اس طرح دور سے گھنگروؤں کی آواز اور عطر کی خوشبو بھی انسانی حواس کے اندر ہیجان پیدا کر دیتی ہے اور ان کے اعصاب پر اس کے اثرات ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہ اثرات اس قدر شدید ہوتے ہیں کہ انسان کا اپنے اوپر قابو نہیں رہتا۔ قرآن کریم ان تمام تاثرات کے راستے بند کرتا ہے کیونکہ قرآن کا نازل کرنے والا وہی ہے جو انسان کا خالق ہے۔ وہی ہے جو اپنی مخلوقات کے بارے میں سب سے اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ نہایت ہی گہرائی کے ساتھ خبردار ہے۔

اور آخر کار تمام نیکیوں کا سرچشمہ آتا ہے' کہ لوگوں کا تعلق باللہ مضبوط ہونا چاہئے اور توبہ و استغفار کا دروازہ بھی ان کے لیے کھلا چھوڑا جاتا ہے۔ یعنی وہ گناہ اللہ معاف کر دے گا جو نزول قرآن سے قبل تم لوگوں سے صادر ہوتے رہے ہیں۔

وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۲۴ : ۳۱) "اے مومنو' تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو' توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے"۔ چنانچہ اس فقرے کے ذریعے اللہ کی نگرانی کا احساس دلایا جاتا ہے اور اللہ کی عظمت' اس کی مہربانی کی اہمیت بتائی جاتی ہے کیونکہ شیطان کی اس کشمکش کے مقابلے میں وہی مددگار ہے اور اس کا خوف اور اس کی نگرانی کا شعور ہی انسان کو ان خرابیوں سے بچا سکتا ہے۔

یہاں تک اس مسئلے کا انسدادی علاج کیا گیا تھا لیکن انسان کی جنسی خواہش درا صل ایک حقیقی خواہش ہے جو

انسان کے اندر رکھی گئی ہے۔ اس لیے جنسی تشفی کے حقیقی علاج یعنی مثبت علاج کی بھی ضرورت ہے۔ یہ مثبت علاج یوں ہو گا کہ معاشرے میں شادی کو آسان کر دیا جائے اور اس معاملے میں معاونت کی جائے اور شادی اور جائز تعلق کے مقابلے میں تمام دوسرے ذرائع اور تعلقات کے معاملے میں سختی کی جائے۔

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ ۭ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾ وَ لْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَ الَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ڰ وَّ اٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ۭ وَ لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَ مَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾

"تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں' ان کے نکاح کر دو۔ اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا' اللہ بڑی وسعت والا اور علیم ہے اور جو نکاح کا موقع نہ پائیں انہیں چاہئے کہ عفت مآبی اختیار کریں' یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے۔

اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں ان سے مکاتبت کر لو اگر تمہیں معلوم ہو کہ ان کے اندر بھلائی ہے اور ان کو اس مال میں سے دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔ اور اپنی لونڈیوں کو اپنے دنیوی فائدوں کی خاطر قحبہ گری پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ خود پاک دامن رہنا چاہتی ہوں اور جو کوئی ان کو مجبور کرے تو اس جبر کے بعد اللہ ان کے لیے غفور و رحیم ہے"۔

جنسی میلان کی تسکین کا بہترین طریقہ شادی ہے۔ اس گہری خواہش کے اندر فطرت اور قدرت کا یہی راز ہے کہ لوگ نسل انسانی کے تسلسل کے مشکل کام کو خوشی خوشی سرانجام دیں۔ لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ہم شادی کی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹیں دور کر دیں تاکہ زندگی فطری انداز کے مطابق سادگی سے چلتی رہے۔ کسی خاندان کی تشکیل کے لیے پہلی رکاوٹ مالی رکاوٹ ہے اس طرح لوگ محفوظ اور قلعہ بند نہیں ہو سکتے۔ اسلام چونکہ ایک مکمل نظام زندگی ہے اس لیے وہ عفت اور پاکیزگی کو تب ہی لازم کرتا ہے جب اس کے لیے اسباب بھی فراہم کر دے اور سوسائٹی کے تمام افراد کو فراہم کر دے تاکہ جو لوگ معتدل اور فطری راستے سے انحراف کرتے ہیں وہ اس کے لیے مجبور نہ ہوں بلکہ ان کے سامنے

جنسی تسکین کا صحیح راستہ موجود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام حکم دیتا ہے کہ ایسے نوجوانوں کے لیے شادی کی راہ ہموار کی جائے جو شادی شدہ نہ ہوں۔

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲۴ : ۳۲) "تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں' ان کے نکاح کر دو۔ اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا' اللہ بڑی وسعت والا اور علیم ہے"۔ اور ایامیٰ وہ لوگ ہیں جن کا جوڑ نہ ہو یعنی عورت کا خاوند نہ ہو اور مرد کی بیوی نہ ہو' وہ مجرد ہوں۔ یہاں مراد وہ لوگ ہیں جو آزاد ہیں۔ اس کے بعد غلاموں کا ذکر خصوصیت سے کر دیا گیا ہے۔

وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ (۲۴ : ۳۲) "اور تمہارے لونڈی اور غلاموں میں سے جو صالح ہوں"۔ لیکن یہ لوگ ایسے ہیں جن کی مالی حالت اچھی نہیں ہوتی۔

اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ (۲۴ : ۳۲) "یہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا"۔ یہ حکم اسلامی سوسائٹی کے لیے ہے کہ وہ شادی کا انتظام کر دے اور جمہور علماء اس طرف گئے ہیں کہ یہ مستحب امر ہے۔ کیونکہ حضورؐ کے دور میں ایسے مجرد لوگ تھے جنھوں نے شادی نہ کی تھی۔ اگر یہ حکم فرض ہوتا تو حضور اکرمؐ ضرور ان کی شادی کا انتظام فرماتے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ حکم واجبی ہے' اس معنی میں نہیں کہ کسی مجرد کو شادی پر مجبور کیا جائے بلکہ اس معنی میں کہ اسلامی سوسائٹی کے لیے واجب ہے کہ جو لوگ شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی اس معاملے میں اعانت کی جائے تاکہ وہ شادی کے قلعے میں محفوظ ہو سکیں۔ فحاشی اور بدکاری میں مبتلا ہونے سے یہ عملی بچاؤ ہے اور صرف اس صورت میں معاشرے کو بدعملیوں سے بچایا جا سکتا ہے۔ اگر معاشرے کو بدعملی سے بچانا فرض ہے تو اس فرض کے لیے ضروری تدابیر اختیار کرنا بھی فرض ہو گا۔

اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اسلام چونکہ ایک مکمل اور مربوط نظام زندگی ہے اس لیے وہ ایک ایسا اقتصادی نظام زندگی وضع کرتا ہے کہ اس میں ہر شخص کے لیے معاشی جدوجہد کرنے کے مساوی مواقع موجود ہوں تاکہ کسی شخص کو اپنی ضرورت کے لیے بیت المال کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ بعض استثنائی حالات میں بیت المال کو بھی امداد کے لیے تیار رہنا چاہئے۔ اسلامی اقتصادی نظام میں بنیادی اصول تو یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کسب سے کھائے۔ سوسائٹی پر جو فریضہ عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ سب کے لیے کام کے مواقع فراہم کرے۔ رہی یہ بات کہ لوگوں کو بیت المال سے امداد دی جائے تو یہ محض استثنائی صورتوں میں ہوتا ہے۔

اگر لوگ اسلامی نظام کے مطابق سعی کرتے ہیں اور زندگی گزارتے ہیں اور پھر بھی ایسے حالات آ جائیں کہ اسلامی معاشرے میں محض معاشی مجبوری کی وجہ سے مجرد نوجوان' مرد اور عورتیں پائی جاتی ہوں تو پھر اسلامی سوسائٹی اور اسلامی

حکومت پر فرض ہے کہ ایسے لوگوں کو مالی امداد دے۔ یہی حکم غلام مردوں اور لونڈیوں کا بھی ہے کہ ان کے مالکان کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کی شادی کا انتظام کریں اگر وہ ایسا کر سکتے ہوں۔

اسلامی سوسائٹی کا یہ بھی فرض ہے کہ دیکھے کہ اگر لوگ شادی کرنا چاہتے ہیں ' مرد ہوں یا عورتیں ہوں لیکن ان کی راہ میں غربت رکاوٹ بنی ہوئی ہے تو سوسائٹی ان رکاوٹوں کو دور کرے کیونکہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ ان کو غنی کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ عفت کا طریقہ اختیار کریں۔

اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِه (۲۴ : ۳۲) "اگر وہ غریب ہیں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :"تین افراد ایسے ہیں کہ اللہ پر ان کا حق ہے کہ اللہ ان کی مدد کرے۔ مجاہد فی سبیل اللہ کی اللہ مدد کرتا ہے۔ وہ غلام جو اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لیے مالی ادائیگی کا معاہدہ کرتا ہے اور وہ شادی کرنے والا جو اپنے آپ کو بری راہوں سے بچانے والا ہو"۔ (ترمذی و نسائی)

اور جب تک مجرد لوگوں کے حالات درست نہیں ہوتے اور اسلامی سوسائٹی ان کے لیے کوئی انتظام نہیں کرتی' اللہ ان کو حکم دیتا ہے کہ وہ عفت اور پاکیزگی کا دامن تھامے رکھیں۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِه (۲۴ : ۳۳)
"اور جو لوگ نکاح کا موقعہ نہ پائیں انہیں چاہئے کہ عفت مآبی اختیار کریں یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے"۔ اللہ تعالیٰ کسی ایسے شخص پر تنگی نہیں کرتا کیونکہ اللہ تو وسیع علم رکھتا ہے۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ "اللہ بڑی وسعت والا اور علیم ہے"۔ یوں اسلام اس مسئلے کا نہایت ہی عملی حل تلاش کرتا ہے۔ ہر شخص جو شادی کر سکتا ہے اس کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ شادی کرے۔ اگرچہ وہ مالی لحاظ سے کمزور ہو کیونکہ مالی مسئلہ حل کرنے والا اللہ ہے"۔

اس وقت اسلامی نظام میں مجبوراً غلامی کا ادارہ موجود تھا اور غلاموں کے اندر چونکہ اخلاقی قدریں کمزور ہوتی ہیں اس لیے اسلامی معاشرے کے اندر موجود غلام معاشرے کے اندر اعلیٰ اخلاقی معیار کے قیام میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ غلامی کا ادارہ اسلام نے ابتداء میں اس لیے قائم رکھا ہوا تھا کہ اہل کفر کے ہاں غلام موجود تھے اور جو مسلمان ان کے ہاتھ آجاتے تھے وہ بھی غلام بنا لیے جاتے تھے۔ موجودہ پوزیشن کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام نے جنسی مسئلہ کو حل کرنے کی سعی کی یعنی یہ کہ غلاموں کی شادیاں کی جائیں۔ خود غلامی کو اپنے طور پر ختم کرنے کے لیے مکاتبت کا طریقہ نکالا یوں کہ اگر کوئی غلام مالی معاوضہ ادا کرنے کی پیشکش کرے تو مالک پر اسے قبول کرنا لازم ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا (۲۴ : ۳۳) "اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں' ان سے مکاتبت کر لو' اگر تمہیں معلوم ہو کہ ان کے اندر بھلائی ہے"۔ اس کے بارے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں کہ آیا یہ واجب ہے یا نہیں۔

یعنی اگر غلام پیشکش کرے تو مکاتبت کرنا لازم ہے یا مالک کے اختیار میں ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ واجب ہے کیونکہ وجوب کا قول ہی اسلام کی مجموعی پالیسی کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔ اسلام انسان کو ایک مکرم مخلوق سمجھتا ہے اور غلامی کا وجود شرافت انسانی کے خلاف ہے ۔ معاہدہ کرنے کے بعد غلام جو کمائے گا وہ مالک کا ہو گا تاکہ معاوضہ معاہدہ کی رقم کی ادائیگی ہو سکے اور اسی طرح زکوٰۃ کی مد سے بھی ایسے غلام کی امداد ضروری ہو جاتی ہے تاکہ جلد از جلد یہ غلام آزادی حاصل کر سکے ۔

وَّ اٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ( ۲۴ : ۳۳ ) "اور اس کو اس مال میں سے دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے"۔ اس شرط پر کہ مالک یہ سمجھے کہ اس میں بھلائی ہے ۔ خیر سب سے پہلے اسلام ہے ۔ اس کے بعد خیر یہ ہے کہ غلام کمانے کی صلاحیت رکھتا ہو ۔ یہ نہ ہو کہ آزادی کے بعد وہ لوگوں سے بھیک مانگتا پھرے ۔ بعض اوقات وہ اخلاق سے گرے ہوئے ذرائع معیشت بھی اختیار کر سکتا ہے جن سے وہ صرف اس قدر کما سکتا ہو جس سے اس کی زندگی قائم رہ سکے ۔ اسلام چونکہ ایک مکمل اور ہم آہنگ نظام ہے اس لیے وہ حقیقی صورت حال کو بھی پیش نظر رکھتا ہے اس کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ یہ شعور ہو جائے کہ ایک غلام آزاد ہو گیا ۔ محض عنوان اور نام اسلام میں اہمیت نہیں رکھتا ۔ اسلام حقیقتہً قضیہ کو دیکھتا ہے کہ آیا فی الواقع یہ غلام آزادی کے بعد معاشرے کے اندر کوئی تعمیری کردار ادا کر سکے گا یا نہیں ۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب یہ شخص کچھ کما سکے ۔ لوگوں پر بوجھ نہ بن جائے اور نہ گندے وسائل رزق اختیار کرے ۔ وہ ایسی چیزیں فروخت کرنا شروع کر دے جو آزادی سے بھی زیادہ قیمتی ہیں ۔ (مثلاً عصمت فروشی) جبکہ اسے آزاد اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اس سے معاشرہ پاک ہو نہ یہ کہ اس کے ذریعہ معاشرہ گندہ ہو اور اس کا یہ فعل معاشرے کے لیے زیادہ سخت مصیبت ہو ۔ (دور جدید میں بین الاقوامی معاہدات کی وجہ سے چونکہ غلامی ختم ہو گئی ہے اس لیے اب عملاً اسلام میں بھی غلامی نہیں رہے گی) ۔

اسلامی معاشرے میں غلامی سے بھی خطرناک بیماری اس بات کو سمجھا جاتا ہے کہ غلاموں کو عصمت فروشی کے لیے استعمال کیا جائے ۔ اہل جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ جس کی کوئی لونڈی ہوتی وہ اسے یہ پیشہ کرنے دیتا اور اس پر ٹیکس عائد کر دیتا اور یہ پیشہ آج تک دنیا میں رائج ہے ۔ اسلام نے چونکہ اسلامی سوسائٹی کو ہر قسم کے زنا سے پاک کرنے کا حکم دیا تھا اس لیے اس قسم کے زنا کا ذکر قرآن نے خصوصیت کے ساتھ کیا ۔

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَي الْبِغَاۗءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَنْ يُّكْرِھْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ( ۲۴ : ۳۳ ) "اور اپنی لونڈیوں کو اپنے دنیوی فائدوں کی خاطر قحبہ گری پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ خود پاکدامن رہنا چاہتی ہوں ۔ اور جو کوئی ان کو مجبور کرے تو اس جبر کے بعد اللہ ان کے لیے غفور و رحیم ہے"۔ اس آیت کے ذریعے ان لوگوں کو منع کر دیا گیا جو اپنی لونڈیوں کو اس پیشہ پر مجبور کرتے تھے اور ان کو تنبیہ کر دی گئی کہ وہ اس قسم کے خبیث ذریعوں سے دنیا کی دولت جمع نہ کریں ۔ جن لونڈیوں کو اس طرح مجبور کر دیا گیا ہو ان کے ساتھ وعدہ کیا کہ ان کے گناہ بخش دیے جائیں گے کیونکہ اس صورت میں

وہ مجبور تھیں ۔ سدی کہتے ہیں کہ یہ آیت عبداللہ ابن ابی ابن السلول کے بارے میں نازل ہوئی ۔ یہ منافقین کا رئیس تھا ۔ اس کی ایک لونڈی تھی جس کا نام "معاذہ" تھا ۔ اس کا قاعدہ یہ تھا کہ اس کا کوئی مہمان آتا تو یہ اس لونڈی کو اس کے پاس بھیج دیتا' جس میں اس کے دو مطلب ہوتے ۔ ایک یہ کہ وہ شخص کوئی انعام دے اور دوسرا یہ کہ اس طرح وہ مہمان کا اکرام کرتا تھا ۔ یہ لونڈی حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئی اور اس نے اس بات کی شکایت کی ۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس لونڈی کو اپنے قبضہ میں لے لیا ۔ اس پر عبداللہ ابن ابی ابن السلول نے اپنی قوم کو پکارا کہ کون ہے جو ہمیں محمدؐ سے چھڑائے ۔ اب اس نے ہماری مملوکات پر ہاتھ ڈالنا شروع کر دیا ہے ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔

یہ اقدام کہ لونڈیوں کو بدکاری کے لیے استعمال نہ کیا جائے اسلامی نظام کے ان اقدامات میں سے ایک ہے' جن کے ذریعے اسلامی معاشرے کو بدکاری سے پاک کیا گیا تھا اور جنسی تسکین کے تمام غیر فطری اور گندے راستوں کو بند کر دیا گیا تھا اس لیے کہ بدکاری کا پیشہ اگر موجود ہو تو کئی لوگ اس کی سہولت کی وجہ سے اس میں مبتلا ہو سکتے ہیں ۔ اگر یہ نہ ہو گا تو لوگ پھر شادی کر کے پاک زندگی گزارنا چاہیں گے ۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس پیشے کی موجودگی شرفاء کے گھروں میں امن و امان کی ضمانت ہے ۔ کیونکہ اگر نکاح مشکل ہو جائے تو پھر انسان اس گندے راہ ہی سے اپنی فطری ضرورت پوری کر سکتا ہے ۔ اگر یہ راستہ جائز نہ رکھا جائے تو پھر بھیڑیئے شریف لوگوں کی عزت سے کھیلنے لگیں گے ۔

جو لوگ اس لائن پر سوچتے ہیں وہ دراصل سبب اور مسبب کے تعلق کو الٹ رہے ہیں ۔ ہونا یہ چاہئے کہ لوگوں کے جنسی میلانات کو پاک رکھا جائے اور انہیں اس طرح منظم کیا جائے کہ وہ سلسلہ حیات کے تسلسل کا سبب بنیں ۔ یہ فریضہ ہر سوسائٹی کا ہو کہ وہ اپنے اندر ایسا معاشی نظام جاری کرے جس کے ذریعہ سے ہر شخص اس قابل ہو کہ وہ شادی کے بندھن میں باندھا جا سکے ۔ اگر پھر بھی کسی کے لیے نکاح میں مشکلات ہوں تو ایسے واقعات کا خصوصی علاج کیا جا سکتا ہے ۔ اس طرح کوئی بھی اس گندے پیشے پر مجبور نہ ہو گا اور صورت حال یہ نہ ہو گی کہ ہر جگہ گندگی پائی جائے' گلی گندگی کا ایک ڈھیر ہو اور اس پر سے جو کوئی گزرے وہاں گندگی ڈال دے اور سوسائٹی اسے دیکھ رہی ہو ۔

کسی ملک کا اقتصادی نظام ہی ایسی گندگیوں کو ختم کر سکتا ہے اس طرح کہ ایسی گندگی کسی جگہ جمع نہ ہو ۔ یہ صورت نہ ہو کہ محض اقتصادی وجوہات سے اس گندگی کے لیے جواز فراہم ہو ۔ انسانوں کے لیے غلاظت کے ڈھیر فراہم ہوں ۔

یہ ہے وہ پالیسی جو اسلام معاشرے کی تطہیر کے لیے استعمال کرتا ہے ۔ جس کی وجہ سے کسی بھی معاشرے میں ایک عظیم انقلاب برپا ہو جاتا ہے ۔ زمین آسمان میں بدل جاتی ہے اور تمام انسانوں کی نظر بلند مقاصد کے لیے بلند افق پر ہوتی ہے ۔ وہ اللہ کے نور سے دیکھتے ہیں اور اس سے ان کے آفاق روشن ہوتے ہیں ۔

اس سبق پر اب یہ آخری تبصرہ آتا ہے جو اس کے موضوع کے ساتھ خوب متناسب ہے ۔

وَلَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ آيَاتٍ مُّبَيِّنَاتٍ وَمَثَلًا مِّنَ الَّذِينَ خَلَوْا ۴
مِن قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۝ ع ۸
۱۰

"ہم نے صاف صاف ہدایت دینے والی آیات تمہارے پاس بھیج دی ہیں' اور ان قوموں کی عبرتناک مثالیں بھی ہم تمہارے سامنے پیش کر چکے ہیں جو تم سے پہلے ہو گزری ہیں اور وہ نصیحتیں ہم نے کر دی ہیں جو ڈرنے والوں کے لیے ہوتی ہیں"۔

یہ آیات ایسی ہیں جو بات کو کھول کھول کر بتاتی ہیں۔ان کے اندر کوئی پیچیدگی اور مشکل نہیں ہے کہ ان کو سمجھا نہ جا سکے۔یا ان کے اندر جو مستحکم نظام زندگی تجویز ہوا ہے وہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔یہ نظام ایسا ہے کہ اس کی صحت پر گزری ہوئی اقوام کے تجربات بھی شہادت دیتے ہیں اور قرآن کریم نے ایسی اقوام کی تاریخ بیان بھی کی ہے۔پھر دنیا میں ہر انسان یہ خواہش رکھتا ہے کہ ایک اعلیٰ ترقی یافتہ اور پاک وصاف سوسائٹی قائم ہو جو خدا خوفی پر مبنی ہو۔اسلام ایسا ہی نظام زندگی ہے۔

اس پورے سبق میں جو فیصلے اور جو احکام وارد ہوئے ہیں وہ اس تعقیب اور تبصرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کے دلوں کے اندر خدا کا خوف اور خدا سے تعلق پیدا کیا جائے۔

---000---

# درس نمبر ۱۵۴ایک نظر میں

اس سورہ کے دونوں سابق اسباق میں انسان کی ان مادی خواہشات کا علاج کیا گیا تھا جو انسانی شخصیت کی طبیعی خواہشات ہیں اور انسانی شخصیت پر ان کی گہری گرفت ہے۔مقصد یہ تھا کہ ان خواہشات کو پاک و صاف کیا جائے اور ان کو نورانی افق تک بلند کیا جائے۔گوشت و پوست کی شہوتوں' آنکھوں اور شرمگاہوں کی خواہشات۔ان باتوں کی تشہیر اور تنقید۔اس سلسلے میں پیدا ہونے والے غضب' اشتعال اور دشمنی کے مسائل کو حل کیا گیا تھا اور ہدایات دی گئی تھیں۔

یہ حکم دیا گیا تھا کہ اسلامی معاشرے میں فحاشی کے پھیلانے سے اجتناب کیا جائے۔عملی زندگی اور انسان کے اقوال میں فحاشی کی ممانعت کی گئی۔ان امور کے انسداد کے سلسلے میں سزاؤں میں بھی سخت تشدید کی گئی۔حد زنا اور حد قذف کے تحت قوانین بنائے گئے۔پھر بے خبر اور پاکدامن شادی شدہ عورتوں پر الزام اور بہتان کا نمونہ پیش کر کے سمجھایا گیا۔ان امور کے لیے انسدادی قوانین بھی بنائے گئے اور اخلاقی ہدایات بھی دی گئیں۔غض بصر اور استیذان کے قواعد نافذ کیے گئے۔تمام ایسے امور سے منع کیا گیا جن سے فتنے میں پڑنے کے امکانات ہو سکتے تھے یا شہوت کے اندر ہیجان پیدا ہونے کا امکان تھا۔پھر شادی کرنے کی ترغیب' جسم فروشی کی ممانعت' غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب یہ سب امور اس بات سے تعلق رکھتے ہیں کہ گوشت اور خون کے ہیجانات کو فرو کیا جائے اور لوگوں کے اندر پاکیزگی کا شعور' ضبط نفس اور صفائی اور نورانیت اور روحانیت کی طرف بڑھنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔

افک کے واقعہ کے بعد سوسائٹی کے اندر غیظ و غضب' دشمنی اور کدورت کے جو آثار رہ گئے تھے ان سب کو مٹانے کی کوشش کی گئی اور نفوس مومنین کے اندر جو قلق اور بے چینی پیدا ہو گئی تھی اور جس کی وجہ سے اعلیٰ انسانی پیمانے متزلزل ہو گئے تھے ان کا علاج کیا گیا۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری طرح اطمینان ہو گیا اور ان کی بے چینی دور ہو گئی۔حضرت عائشہؓ نہ صرف راضی اور مطمئن ہو گئیں بلکہ خوش ہو گئیں۔حضرت ابوبکرؓ بھی مطمئن اور پر سکون ہو گئے۔صفوان ابن معطل ایک عظیم بوجھ کے نیچے سے نکل آئے۔تمام اہل اسلام کے شبہات دور ہو گئے اور جن لوگوں نے اس واقعہ میں غلط باتیں کی تھیں انہوں نے رجوع کر کے توبہ کر لی۔سب لوگوں کے شبہات دور ہو گئے اور اللہ کے فضل و کرم اور ہدایت و رحمت کی بارش سب پر ہو گئی۔اس تعلیم و تہذیب اور اس ہدایت و رہنمائی کے ذریعے نفس انسانی کو پاک و صاف کر کے منور کر دیا گیا۔اب اس کی نظریں اس نئی روشنی کی سمت میں بلند افق پر لگ گئیں اور زمین و آسمان میں ہر سو اہل ایمان کو نور ربی نظر آنے لگا۔اللہ نے اہل اسلام کو یہ استعداد دی کہ وہ آفاق کائنات میں سے اس نورانیت کو اخذ کر سکیں۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲۴:۳۵) "اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے"۔یہ عجیب آیت مسلسل روشنی بکھیر رہی ہے۔یہ اپنی خوشگوار روشنی سے پوری کائنات کو روشن کر رہی ہے۔انسان کے اعضاء اور

جوارح اور انسان کی سوچ اور شعور اور انسان کا دل اور اس کا اندرون' روشن روشن ہوتے ہیں یہاں تک کہ یہ پوری کائنات پرنور اور چمکدار ہو جاتی ہے ۔ انسان کی نظریں اور اس کے نظریات اس نور سے منور ہوتے ہیں ۔ تمام پردے سرک جاتے ہیں ' دل دھڑکتے ہیں اور روح پھڑپھڑاتی ہے ۔ ہرچیز نور کے سمندر میں تیرتی نظر آتی ہے اور ہرچیز نور کے فیض میں ڈوبی ہوئی ہے ۔ ہرچیز سے اس کی کثافت دور ہو جاتی ہے اور وہ ہلکی ہلکی محسوس ہوتی ہے ۔ انسان آزاد ہو جاتا ہے اور اڑتا ہے ۔ وہ اللہ کی معرفت اور ملاقات میں ڈوب جاتا ہے ۔ وہ عالم بالا سے امتزاج اور الفت رکھتا ہے اور خوشی اور سرور میں ڈوب جاتا ہے ۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ پوری کائنات کل کی کل نور مطلق ہے ۔ اس ہمہ گیر نور کے لیے کوئی حدود قیود نہیں ہیں ۔ آسمان ' زندہ مخلوق اور جمادات سب کے سب باہم ایک ہو جاتے ہیں ۔ قرب اور بعد کی مسافتیں ختم ہو جاتی ہیں ۔ نشیب و فراز مٹ جاتے ہیں ' ظاہر و باطن کے فرق مٹ جاتے ہیں اور حواس اور عقل ایک ہو جاتے ہیں ۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (٢٤ : ٣٥) "اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے"۔ اس نور ہی سے اس کائنات کا قوام اور نظام ہے ۔ کائنات کا جو ہر وجود اسی نور سے ہے ۔ یہی نور اس کائنات میں اس اٹل ناموس کی تخلیق کرنے والا ہے ۔ انسانوں نے تو اس عظیم حقیقت نورانی کے ایک محدود حصہ کا ادراک حال ہی میں کیا ہے ۔ انسان نے جب ماضی قریب میں اس چیز کو توڑا جسے وہ مادہ کہتے تھے تو اس توڑ پھوڑ کی وجہ سے یہ مادہ ناقابل کنٹرول نوری شعاعوں کی شکل اختیار کر گیا اور یہ شعاعیں کیا تھیں نور ہی نور ' ان شعاعوں کا مادہ اور قوام ہی نور نکلا ۔ ایک ذرہ یعنی مادے کا آخری یونٹ ذرہ کیا ہے؟ یہ کہرباء اور الیکٹرون ہیں جو ایٹم کے ٹوٹنے کے وقت محض روشنی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ۔ رہا انسانی دل تو وہ سائنس دانوں کے ان انکشافات سے بہت پہلے ' صدیوں پہلے یہ جانتا تھا کہ جب اس قلب کو دنیاوی کثافتوں سے پاک کر دیا جائے اور وہ شفاف ہو جائے اور اس کائنات کے نورانی آفاق میں داخل ہو جائے تو وہ نور کو پالیتا ہے ۔ قلب محمدؐ نے بھی اس کائناتی نور کو پا لیا تھا ۔ اس وقت پالیا تھا جب آپؐ طائف سے نامراد لوٹ رہے تھے ۔ انہوں نے لوگوں سے اپنے ہاتھ جھٹک کر اس نور کے ہاں پناہ لی اور کہا اعوذ بنور وجھك الذي اشرقت به الظلمت وصلح علیه امر الدنیا و الاخرة "میں تیرے چہرے کے نور میں پناہ مانگتا ہوں جس کی وجہ سے تمام ظلمتیں دور ہو جاتی ہیں اور جس کی وجہ سے دنیا اور آخرت کی اصلاح ہو جاتی ہے"۔ اور اسی نور سے آپ شب معراج کے سفر میں بھی فیض یاب ہوئے ۔ جب حضرت عائشہؓ نے پوچھا۔ ھل رأیت ربك "کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے"۔ تو آپ نے فرمایا۔ نور انی اراہ "وہ نور ہے میں اسے کس طرح دیکھ سکتا ہوں"۔ لیکن انسانی شخصیت ہمیشہ اس نور کے پانے کی طاقت نہیں رکھتی اور وہ ہروقت اس کائنات کے آفاق میں اس نور تک نہیں پہنچ سکتی ۔ اس آیت میں قرآن نے انسانی ذہنوں کے قریب لانے کے لیے اس نور کا بیان یوں کیا ہے کہ وہ انسانی قلب و نظر اور محدود انسانی مشاہدے کے قریب ہو جائے اور انسان اس نور قریب کو محسوس کرے ۔

---()()()---

# درس نمبر ۱۵۴ تشریح آیات

## ۳۵ --- تا --- ۴۵

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّ لَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو' چراغ ایک فانوس میں ہو' فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا' اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی' جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو۔ چاہے آگ اس کو نہ لگے' (اس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں)۔

یہ ایک ایسی مثال ہے جو انسان کے محدود ادراک کے لیے ایک غیر محدود ذات کے تصور کو قریب کرتی ہے اور ایک نہایت ہی چھوٹے نور کی مثال کو پیش کیا جاتا ہے جس کو انسانی تصور سمجھ سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اصل نور کا ادراک انسانی تصور کے لیے ممکن نہیں۔ نور کی ایک چھوٹی سی مثال پیش کی جاتی ہے جبکہ انسانی ادراک نور کے ان آفاق کا احاطہ نہیں کر سکتا جو اس کی حدود سے وراء ہیں۔

اس پوری کائنات کی وسعتوں سے ہم اب ایک طاق کی طرف آتے ہیں' جو ایک دیوار میں ہے جہاں چراغ رکھا جاتا ہے' اس طرح اس کی روشنی پورے کمرے کو روشن کرتی ہے۔ چراغ طاق میں' چراغ ایک فانوس میں' یہ شیشہ اس چراغ کو ہوا سے بچاتا ہے' اس طرح اس کا نور صاف ہو جاتا ہے اور نورانیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ فانوس ایسا ہے جس طرح چمکتا ہوا تارہ ہوتا ہے۔ یہ فانوس بذات خود بھی صاف و شفاف و چمکدار پارے کی طرح ہے۔ یہاں مثال اور حقیقت کے درمیان ربط قائم ہوتا ہے۔ اصل اور نمونے کا فرق معلوم ہو جاتا ہے۔ تصور کو ایک چھوٹے سے فانوس سے ایک بڑے ستارے کی طرف لے جاتا ہے تاکہ انسانی سوچ کہیں اس چھوٹے سے نمونے تک ہی محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ اس چھوٹے سے چراغ کی مثال تو اس حقیقت کی طرف اشارے کے لیے اختیار کی گئی ہے' کَوْكَبٌ دُرِّيٌّ کی طرف

اشارہ کر کے اب بیان پھر اسی چھوٹی سی مثال کی تشریح کی طرف آتا ہے۔

يُوقَدُ مِن شَجَرَةٍ مُّبَٰرَكَةٍ زَيْتُونَةٍ (٢٤: ٣٥) "اور یہ چراغ زیتون کے ایک مبارک درخت سے روشن کیا جاتا ہے"۔ اس دور تک زیتون کے تیل کی روشنی تمام روشنیوں سے صاف ترین روشنی تھی۔ لیکن یہ مثال صرف اس لیے نہیں دی گئی کہ زیتون کے تیل کی روشنی سب سے زیادہ صاف ہوتی ہے۔ بلکہ زیتون کے درخت کو جو اپنا تقدس حاصل ہے اس کی طرف اشارہ مطلوب ہے کہ یہ درخت وادی مقدس طویٰ میں پیدا ہوتا ہے۔ عربوں کے اندر جو زیتون آتا تھا وہ طور کی وادی مقدس سے آتا تھا۔ قرآن مجید میں اس درخت کی طرف اشارہ موجود ہے۔

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِن طُورِ سَيْنَآءَ تَنۢبُتُ بِٱلدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْءَاكِلِينَ "اور وہ درخت جو طور سینا پر پیدا ہوتا ہے' جو تیل پیدا کرتا ہے جو کھانے والوں کے لیے اچھا سالن ہے"۔ یہ نہایت ہی طویل العمر درخت ہوتا ہے اور اس درخت کے تمام حصے انسانوں کے لیے مفید ہوتے ہیں۔ اس کا تیل' اس کی لکڑیاں' اور اس کے پتے اور اس کے پھل سب کے سب مفید ہیں۔ اب بیان پھر اس چھوٹی سی مثال سے ذرا بلند ہوتا ہے اور اصل کی طرف ذہن کو موڑا جاتا ہے۔ یہ کوئی مخصوص درخت نہیں ہے۔ "نہ شرقی ہے اور نہ غربی ہے"۔ اور نہ یہ محدود اور مشخص تیل ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا کوئی اور ہی تیل ہے۔

يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ (٢٤: ٣٥) "اس کا تیل خود بخود بھڑک اٹھتا ہے' اگر چہ اس کو آگ نہ لگائی گئی ہو"۔ یعنی اس کے اندر نورانیت کوٹ کوٹ بھری ہوئی ہے۔ نور علیٰ نور ہے۔ لفظ نور علیٰ نور سے ہم ذات باری کے اعلیٰ نورانیت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

یہ وہ خدائی نور ہے جس سے اس پوری کائنات کی ظلمتیں دور ہو جاتی ہیں۔ یہ وہ نور ہے جس کی حقیقت تک انسانی دماغ نہیں پہنچ سکتا۔ بس یہ ایک کوشش ہے کہ دل اس کے ساتھ متعلق ہوں اور اس کے ادراک کے لیے سعی کریں اور اس کے دیکھنے کی امید رکھیں۔

يَهْدِى ٱللَّهُ لِنُورِهِۦ مَن يَشَآءُ ۚ وَيَضْرِبُ ٱللَّهُ ٱلْأَمْثَٰلَ لِلنَّاسِ ۗ
وَٱللَّهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيمٌ ﴿٣٥﴾

"اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے' رہنمائی فرماتا ہے' وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے' وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے"۔

اللہ تعالیٰ اپنے نور کی طرف راہنمائی فرماتا ہے لیکن صرف اس شخص کو جو اپنے دل و دماغ کو اس نور کو قبول کرنے کے لیے کھولتا ہے۔ یہ نور تو زمین و آسمان میں عام ہے۔ زمین و آسمان میں اس کے فیوض و برکات موجود ہیں۔ اور ہر

وقت موجود رہتے ہیں۔ یہ نور کبھی ختم نہیں ہوتا' مدھم نہیں پڑتا اور بند نہیں ہوتا۔ انسان جب بھی اس کی طرف متوجہ ہو' اسے دیکھتا ہے اور بے راہ شخص جب بھی اس کی طرف رخ کرے وہ اس کی راہنمائی کرتا ہے۔ اور جب بھی کوئی اس نور سے رابطہ قائم کرے وہ اسے ہدایت دیتا ہے۔

اللہ کے نور کی اس آیت میں جو مثال دی گئی ہے یہ لوگوں کو سمجھانے کے لیے ہے۔ "وہ لوگوں کو مثالوں سے سمجھاتا ہے"۔ اس لیے کہ وہ علیم ہے اور انسانی قوت مدرکہ کی حدود کو اچھی طرح جانتا ہے۔ ان مثالوں میں جو نور سمجھایا گیا ہے وہ مطلق نور ہے۔ آسمانوں اور زمینوں میں عام ہے۔ آسمانوں اور زمین پر اس کا فیضان ہے اور یہ نور ان گھروں میں روشن اور چمکتا ہوا نظر آتا ہے جن میں لوگوں کے دل اللہ کے ساتھ لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ جن میں اللہ کا ذکر جاری رہتا ہے۔ جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں اور جن گھروں کے باشندے اللہ والے ہوتے ہیں اور جن کے دلوں میں دنیا کی ہر چیز سے اس نور سماوات کو ترجیح دی جاتی ہے۔

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَ یُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ ۙ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ۟ۙ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِیْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۪ۙ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ ۟ۙ لِیَجْزِیَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ یَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۟

"اس کے نور کی طرف (ہدایت پانے والے) ان گھروں میں پائے جاتے ہیں جنہیں بلند کرنے کا' اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے اذن دیا ہے۔ ان میں ایسے لوگ صبح و شام اس کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامت نماز و ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی۔ وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آ جائے گی' (اور وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں) تاکہ اللہ ان کے بہترین اعمال کی جزا ان کو دے اور مزید اپنے فضل سے نوازے' اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے"۔

یہاں اللہ کے نور کی تمثیل اور ان گھروں کی تمثیل میں ایک خاص تعلق ہے اور یہ قرآن کریم کے انداز بیان کا فنی کمال ہے۔ طاق کے اندر چراغ روشن ہے اور گھروں کے اندر دل مومن روشن ہے۔ اس طرح دونوں کے درمیان مشاکلت ہے۔

یہ گھر ایسے ہیں کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کی دیواروں کو بلند کیا جائے اور ان کی تعمیر کی جائے۔ ان کو بلند کرنے کے اذن سے مراد ان کو تعمیر کرنے کا حکم دینا ہے کہ وہ اس حکم پر عمل کریں۔ چنانچہ یہ گھر قائم کر دیئے گئے ہیں' بلند ہیں اور پاک اور ستھرے ہیں۔ ان کا منظر اس کائنات کے منظر سے مشابہ ہے جہاں نور ربی پھیلا ہوا ہے۔ ان گھروں کی بلندی

اس لیے ہے کہ یہاں اللہ کا نام لیا جائے ۔

وَ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ (٢٤ : ٣٦) "اس میں اللہ کا نام یاد کیا جائے"۔ اور یہ پاک دل اللہ کے ساتھ وابستہ ہوں' اللہ کی تسبیح کرتے ہوں ۔ اللہ سے ڈرنے والے ہوں ۔ نماز بھی پڑھنے والے ہوں ۔ اللہ کی راہ میں دینے والے بھی ہوں ۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ (٢٤ : ٣٧) "ان میں ایسے لوگ صبح و شام اس کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامت صلوٰۃ سے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کر دیتی"۔ تجارت اور خرید و فروخت کمانے اور دولت جمع کرنے کے ذرائع ہیں ۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کاموں میں مشغول رہنے کے باوجود اللہ کے حقوق یعنی نماز اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی یعنی زکوٰۃ سے غافل نہیں ہوتے ۔

يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَ الْاَبْصَارُ (٢٤ : ٣٧) "وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹنے اور دیدے پتھرانے کی نوبت آ جائے گی"۔ دل الٹے ہوں گے یعنی ان کے اندر خوف و ہراس کی وجہ سے کوئی قرار نہ ہو گا' اور یہ دل چونکہ اللہ سے ڈرنے والے ہیں اس لیے تجارت اور خرید و فروخت انہیں اللہ کے ذکر سے روک نہیں سکتے ۔

لیکن اس خوف کے ساتھ امید بھی وابستہ ہے ۔ وہ مایوس نہیں ہوتے ۔ وہ اللہ سے امیدیں باندھے ہوئے ہوتے ہیں ۔

لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ (٢٤ : ٣٨) "تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے بہترین اعمال کی جزا ان کو دے اور مزید فضل سے نوازے"۔ ان کی امید ناکام بھی نہیں رہتی ۔ اس لیے کہ

وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (٢٤ : ٣٨) "اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے" کیونکہ اللہ کے فضل کے کوئی حدود و قیود نہیں ہیں ۔

--- ooo ---

آسمانوں اور زمین کے اندر روشن ہونے والے اس نور کے بالمقابل' اللہ کے ان گھروں میں پائے جانے والے اس نور کے بالمقابل اہل ایمان کے دلوں میں روشن نور کے بالمقابل' یہاں قرآن مجید ظلمات اور تاریکیوں کے ایک جہان کو بھی پیش کرتا ہے ۔ اس جہان میں کوئی روشنی نہیں ہے ۔ اس جہان میں کوئی امن و سکون نہیں ہے ۔ ہر طرف خوف کے سائے چھائے ہوئے ہیں ۔ اس میں ہر طرف بربادی ہی بربادی ہے ۔ کوئی خیر نہیں ہے ۔ یہ اہل کفر کا جہان ہے اور ایک کافری دنیا ہے ۔ اس کے خد و خال اور رنگ ڈھنگ کچھ یوں ہیں ۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا
جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ
الْحِسَابِ ۝۳۹ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰـىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ
فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ ۵
وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝۴۰ ع ۶

"(اس کے برعکس) جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشت بے آب میں سراب کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ہوئے تھا' مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا' بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا' جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا' اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی۔ یا پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا' کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے' اس پر ایک اور موج' اور اس کے اوپر بادل' تاریکی پر تاریکی مسلط ہے' آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے جسے اللہ نور نہ بخشے اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں"۔ ۱۱

یہاں قرآن کریم نے اہل کفر کی زندگی اور ان کے نظریات اور سرگرمیوں کی تصویر کشی دو طرح کی ہے۔ یہ دو مشاہد ہیں جو بطور تمثیل دیئے گئے ہیں۔

پہلی تمثیل ہے ان کے اعمال کی۔ یہ اعمال ایسے نظر آتے ہیں جس طرح چٹیل وسیع ریگستان میں سراب نظر آتا ہے۔ یہ سراب نیلے پانی کی طرح دکھائی دیتا ہے' پیاسا اس کے پیچھے بھاگتا ہے۔ وہ توقع تو یہ کرتا ہے کہ سراب تک پہنچ کر پانی پئے گا لیکن وہ اس بات سے غافل ہوتا ہے کہ وہاں تک پہنچ کر وہ وہاں کیا پانے والا ہوتا ہے۔ یہاں منظر میں اچانک تبدیلی آجاتی ہے۔ یہ شخص جو سراب کے پیچھے بھاگ رہا ہے' پیاسا ہے' پانی کی تلاش میں ہے۔ اور غافل ہے اس معاملے سے جو اسے پیش آنے والا ہے۔ یہ جب منزل تک پہنچتا ہے تو وہاں اسے پانی نہیں ملتا۔ وہاں اسے وہ چیز ملتی ہے جس کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اب یہ اس نئی حقیقت سے دوچار ہو کر خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ امیدیں کٹ جاتی ہیں۔

وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ (۲۴ : ۳۹) "وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا"۔ وہ اللہ موجود ہے جس کا وہ منکر تھا اور یہ شخص اللہ وحدہ کا دشمن تھا۔ اس سراب میں اس کا منتظر اللہ تھا۔ اگر اس سراب میں یہ شخص اپنے کسی دنیاوی دشمن کو پائے تو پھر یہ سخت خوفزدہ ہو جائے لیکن یہ وہاں خالق کائنات کو پا رہا ہے جو جبار ہے۔ بڑی قوت والا ہے اور سخت انتقام لینے والا بھی ہے۔ وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ پانی کے بجائے اس کا وہاں حساب و کتاب شروع ہو جاتا ہے۔

فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۲۴ : ۳۹) "جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا اور اللہ کو حساب لینے میں دیر نہیں لگتی"۔ یہ منظر سرعت اور شتابی کے ساتھ اچانک سرپرائز کو پیش کرتا ہے اور سرعت اور سراب کے ساتھ' جلدی سے حساب چکانا اور اچانک خوف میں مبتلا ہونا' فنی ہم آہنگی ہے۔

دوسرا منظر یہ ہے کہ اس میں جھوٹی روشنی کے بعد اندھیرے چھا جاتے ہیں' یوں کہ ایک انسان سمندری جہاز میں ہے' یہ جہاز سمندر کی ظالم لہروں میں گھرا ہوا ہے' خوفناک موج کے اوپر موج اٹھ رہی ہے' ان کے اوپر سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ایسا خوفناک اندھیرا ہو گیا ہے کہ کوئی شخص اگر اپنے ہاتھ کو دیکھنا چاہتا ہے تو وہ دیکھ نہیں سکتا' شدت خوف اور شدت تاریکی کی وجہ سے۔

کفر کیا ہے' یہ دراصل امواج زندگی میں ایک گھمبیر اندھیرا ہے۔ یہ اندھیرا اللہ کے نور کو نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ یہ اس قدر گہری گمراہی ہے کہ اس میں انسان کو ہاتھ کی طرح قریبی دلائل بھی نظر نہیں آتے۔کفر اس قدر خوفناک صورت حال کا نام ہے کہ اس میں انسان کے لیے سکون و قرار نہیں ہوتا۔

وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (۲۴: ۴۰) "جسے اللہ نور نہ بخشے اس کے لیے کوئی نور نہیں ہے"۔ اللہ کا نور کیا ہے' وہ ہدایت جو اللہ دل مومن میں ڈال دیتا ہے وہ اللہ کا نور ہے۔ یہ ہدایت انسان کے دل کو کھول دیتی ہے اور انسان کی فطرت نوامیس قدرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ یوں انسانی قلب میں موجود نور الہی اس کائنات میں موجود نور الہی کے ساتھ یکجا ہو جاتا ہے' اور جس شخص کا اتصال اس نور کائنات سے نہ ہو سکا تو وہ اندھیروں میں ہے اسے کچھ نظر نہ آئے گا۔یہ ہمیشہ خوفناک حالات میں ہو گا جن میں کوئی امن نہ ہو گا۔ یہ شخص ایسی گمراہی میں پڑ جائے گا جس سے اس کا نکلنا مشکل ہو گا اور اس کے اعمال کا انجام سراب ہو گا اور سراب کے پیچھے بھاگنے والا ظاہر ہے کہ ہلاک ہو جائے گا۔کیونکہ کفار کے اعمال کے پیچھے کوئی نظریہ اور کوئی نور نہیں ہوتا۔نور ایمان کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا اس لیے کوئی اصلاحی کام بغیر ایمان کے نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی ہدایت ہی نور ہے اور اللہ کا دین نور ہے۔

---()()()---

یہ تھے مناظر کفر و ضلالت اور مناظر تاریکی۔ اس کے بعد پھر اس کائنات میں ایمان اور نور کے مناظر آتے ہیں۔ یہاں پوری کائنات میں نور ہی کا عالم ہے۔ تمام موجودات اس نور میں تسبیح پڑھ رہی ہیں اور عالم نماز میں ہیں۔ انس ہوں' جن ہوں' زمین ہو یا افلاک ہوں۔ زندہ ہوں یا جمادات ہوں' تمام کائنات تسبیح پڑھ رہی ہے اور تمام موجودات اس زمزمے میں ہمقدم ہیں' یوں کہ ایک دانا کا وجدان اس سے ارتعاش میں آ جاتا ہے اور دل معرفت سے بھر جاتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ۭ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝۴۱

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں' وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اڑ رہے ہیں؟ ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے' اور یہ سب جو کچھ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے"۔

اس وسیع کائنات میں انسان صرف منفرد نہیں ہے۔ اس کا ایک ماحول ہے جس میں وہ رہتا ہے۔ بڑا ہی وسیع ماحول ہے۔ اس کے دائیں اور بائیں ہر طرف اللہ کی بندگی ہو رہی ہے۔ اس کے آگے اور پیچھے اور اوپر اور نیچے جہاں

جہاں تک نظر جاسکتی ہے ۔ پھر نظر کی حدود سے آگے جہاں جہاں تک خیال جاسکتا ہے' اس وسیع کائنات میں انسان کے بھائی بند موجود ہیں ۔ یہ مختلف شکلیں اور مختلف طبیعتیں رکھتے ہیں ۔ لیکن ایک بات میں سب ایک ہیں ۔ یہ کہ یہ سب اللہ کی مخلوقات ہیں ۔ یہ سب اللہ کے مطیع فرمان ہیں اور اللہ کی حمد اور تسبیح میں رطب اللسان ہیں ۔

وَ اللّٰہُ عَلِیْمٌ بِمَا یَفْعَلُوْنَ (۲۴ : ۴۱) "اور یہ سب جو کچھ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے"۔ قرآن کریم کا یہ مخصوص انداز استدلال ہے کہ وہ انسان کو اپنے ماحول کی طرف متوجہ کرتا ہے ۔ انسان کے ماحول میں' ان سماوات میں جو اللہ کی تخلیق ہے یہ سب کی سب اللہ کی ثناخواں ہے ۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اس کائنات کے مشاہد میں غور کرے کیونکہ انسان اپنے ماحول کو روز دیکھتا ہے ۔ اور طول الفت کی وجہ سے اس کا دل و دماغ اس ماحول سے متاثر نہیں ہوتے ۔ ذرا دیکھو کہ بعض پرندے اس ہوا میں اڑتے ہیں اور ان کی اڑان صفوں کی شکل میں ہوتی ہے ۔ یہ اپنی اس صف بندی اور منظم پرواز میں دراصل اللہ کی حمد بیان کر رہے ہوتے ہیں اور نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں ۔

کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَ تَسْبِیْحَہٗ (۲۴ : ۴۱) "ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے"۔ لیکن انسان ہے کہ اس عقل و بینش کے ساتھ بھی اللہ کی تسبیح سے غافل ہے ۔ حالانکہ وہ تمام مخلوقات سے زیادہ اس بات کا مکلف ہے کہ ہر وقت تسبیح اور نماز میں مصروف ہو ۔

اس منظر میں پوری کائنات نہایت ہی خشوع سے سجدہ ریز نظر آتی ہے اپنے خالق کے آگے ۔ تسبیح اور نماز میں کھڑی ہے ۔ یہ بات تو فطرت کائنات ہے کہ وہ ایسا کرے اور اللہ کے نوامیس فطرت کی اطاعت کرتے ہوئے چلے ۔ انسانی وجدان جب صاف اور شفاف ہو جاتا ہے اور جیسے وہ صبح و شام چڑیوں کو چہچہاتے سنتا ہے تو وہ یہ منظر دیکھ سکتا ہے کہ یہ کائنات پوری کی پوری حمد خواں ہے اور انسان اپنے کانوں سے اس کائنات کی آواز اور تسبیح سن سکتا ہے ۔ اگر انسان کو معرفت کردگار حاصل ہو جائے تو وہ پھر اس پوری کائنات کے ساتھ اس محفل اور مجلس صلوٰۃ و تسبیح میں ہم رنگ اور ہم آہنگ اور نغمہ سرا ہو جاتا ہے ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاؤں کے نیچے جب کنکریوں کی تسبیح سنی' اور حضرت داؤد جب زبور کے ساتھ زمزمہ سرا ہوتے تھے تو یہ پوری کائنات ان کے ساتھ روحانی نغمے گاتی تھی ۔ وہ سنتے تھے اور ان کے ساتھ وحوش و طیور سب گاتے تھے ۔

## وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝

"آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے"۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی تمام تر توجہات اس کی طرف کر دیں ۔ اس کے سوا اور کوئی جائے پناہ نہیں ہے ۔ اس سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ہے ۔ اس کے عذاب سے بچنے کی کوئی جگہ نہیں ہے ۔ اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں ہے اور سب نے اسی کی طرف جانا ہے ۔

---

اب اس کائنات کے مناظر میں سے ایک دوسرا منظر ۔ لوگ رات اور دن اس منظر کو دیکھتے ہیں اور غفلت کے ساتھ

گزر جاتے ہیں ' حالانکہ یہ منظر دامن نظر کو پکڑ پکڑ کر کھینچتا ہے کہ ذرا دیکھو تو سہی ' دل میں سوچو تو سہی ' اللہ کی نشانیوں اور اس کی تخلیقات میں غور تو کرو ۔ دلائل نور اور دلائل ہدایت پر غور تو کرو ۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُزْجِي سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَصْرِفُهُ عَنْ مَنْ يَشَاءُ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے ' پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے ' پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے ' پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹپکتے چلے آتے ہیں اور وہ آسمان سے ' ان پہاڑوں کی بدولت جو اس میں بلند ہیں اولے برساتا ہے ' پھر جسے چاہتا ہے ان کا نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان سے بچا لیتا ہے ۔ اس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے "۔

یہ منظر نہایت ہی آرام سے اور طوالت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے ۔ دعوت دی جاتی ہے کہ اس منظر کے ہر جزء پر غور کرو ۔ اس منظر کے اجزاء پھر جمع ہوتے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ اس پر گہرے مشاہدے اور غور و فکر کی وجہ سے انسانی احساس کو جگایا جائے اور اس گہری صنعت کاری کے اندر جو گہری بصیرت ہے اس کے بارے میں انسانی احساس کو تیز کیا جاتا ہے تاکہ انسان عبرت آموز نگاہوں سے اس منظر کو دیکھے ۔

اللہ بادلوں کو چلاتے ہیں ' ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف ۔ یہ بادل آسمان میں ٹکڑیوں کی شکل میں ہوتے ہیں ۔ پھر یہ جمع ہوتے ہیں ۔ اچانک ہم دیکھتے ہیں کہ تہوں کے اوپر تہیں جم جاتی ہیں ۔ جب یہ اچھی طرح بوجھل ہو جاتے ہیں تو ان میں سے پانی نکلنا شروع ہو جاتا ہے ۔ بارش کے موٹے موٹے قطرے تم گرتے دیکھتے ہو ۔ یہ بادل بڑے بڑے پہاڑوں کی شکل میں آسمانوں میں نظر آتے ہیں ۔ جب یہ بہت اوپر چلے جاتے ہیں تو ان میں برف جم جاتی ہے ۔ یہ بادل پہاڑوں کی طرح خوب نظر آتے ہیں ۔ جب طیارہ ان سے اوپر چلا جاتا ہے اس وقت فی الواقعہ یہ بادل پہاڑ نظر آتے ہیں ۔ بڑے بڑے پہاڑ اور ان کے اندر بڑے بڑے نشیب و فراز ہوتے ہیں ۔ یہ انداز تعبیر ایسا ہے کہ انسان نے اس کو اچھی طرح اس وقت سمجھا جب وہ طیارے پر سوار ہو کر بادلوں سے اوپر چلا گیا ۔

بادلوں کے یہ پہاڑ ' اللہ کے احکام میں ' اللہ کے نظام میں بندھے ہوئے ہیں ۔ یہ اس کے کائناتی ناموس کے مطابق کام کرتے ہیں ۔ اللہ جس کو چاہتا ہے ان کے ذریعے پانی دے دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ' اس سے ان کا رخ پھیر دیتا ہے ۔ اس منظر کا تکملہ یوں آتا ہے ۔

يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ (۲۴ : ۴۳) "اس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی

ہے"۔ یہ منظر اس لیے لایا گیا ہے کہ کائنات کے نور اعظم کے ساتھ بجلی کا نور ایک ہو جائے۔ یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز بیان ہے کہ وہ ہم جنس معانی کو ایک جگہ لاتا ہے کیونکہ یہ سورہ 'سورۂ نور ہے۔

---ooo---

اب تیسرا کائناتی منظر گردش لیل و نہار کا منظر ہمارے سامنے ہے۔

يُقَلِّبُ اللَّهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ﴿٤٤﴾

"رات اور دن کا الٹ پھیر وہی کر رہا ہے۔ اس میں ایک سبق ہے آنکھوں والوں کے لیے"۔

گردش لیل و نہار کے نظام پر غور و فکر قرآن مجید کا ایک اہم موضوع ہے۔ رات اور دن کے بدلنے کا یہ نظام مسلسل چل رہا ہے اور اس کے اندر ایک لمحے کا تغیر و تبدل نہیں ہے۔ اس سے وہ ناموس کائنات اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے جو اس کائنات میں متصرف ہے۔ اس ناموس پر غور و فکر سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ نے کس باریکی کے ساتھ اس نظام کو چلا رہا ہے۔ قرآن کریم اپنے موثر انداز بیان کے ساتھ ان مناظر کے ان اثرات کو تازہ کر دیتا ہے جو بالعموم مانوس ہونے کی وجہ سے مٹ گئے ہوتے ہیں۔ انسان پھر ان مناظر کو ایک نئے احساس کے ساتھ دیکھتا ہے اور ہر بار اس سے بالکل نیا تاثر لیتا ہے۔ یہ سوچتا یوں ہے کہ اگر انسان گردش لیل و نہار کے اس نظام کو پہلی مرتبہ دیکھے تو اس کا تاثر کیا ہو۔ اس نظام میں صدیاں گزر جانے کے بعد بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ تبدیلی اگر ہے تو صرف انسان کی نگاہ میں ہے۔ انسانی احساس اور ادراک گردش لیل و نہار کے مناظر کو دیکھتے دیکھتے بجھ سا گیا ہے جبکہ رات اور دن کے اس نظام نے اپنی خوبصورتی اور انوکھے پن میں سے کسی چیز میں کمی نہیں کی ہے۔ جب انسان اس کائنات پر سے غافلوں کی طرح گزر جاتا ہے تو وہ زندگی کی ایک بڑی مسرت کو گنوا دیتا ہے بلکہ اس کائنات کی حقیقی خوبصورتی اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ وہ مناظر جو انسان کے سامنے اگر از سر نو پیش ہوں تو بہت ہی اثر انگیز ہوں اور حسین نظر آئیں۔

قرآن کریم کا کمال یہ ہے کہ وہ ہماری بجھی ہوئی حس کو تازہ کر دیتا ہے اور ہمارے چھپے ہوئے شعور اور خوابیدہ احساسات کو تجدید بخشتا ہے۔ ہمارا ٹھنڈا دل گرم ہو جاتا ہے اور ہمارا کند وجدان تیز ہو جاتا ہے۔ پھر ہم اس کائنات کو یوں دیکھنے لگتے ہیں کہ گویا ہم نے اس کائنات کو پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ ہم پھر اس کائنات کے مظاہر پر غور کرتے ہیں اور اس کے سربستہ اور پوشیدہ کمالات کو معلوم کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر ہمیں نظر آتا ہے کہ دست قدرت ہر جگہ کام کر رہا ہے۔ ہمارے ماحول کی ہر چیز میں اس کی صنعت کاری ہے اور اس کائنات کی ہر چیز میں اس کے نشانات ہیں اور ہمارے لیے عبرتیں ہی عبرتیں ہیں۔

اللہ ہم پر احسان کرتا رہتا ہے کہ جب بھی ہم اس کائنات کے مناظر میں سے کسی منظر پر غور کرتے ہیں تو ہمیں ایک حیات تازہ مل جاتی ہے۔ ہمیں اس کائنات کی ہر چیز کے بارے میں ایک نیا احساس ملتا ہے اور یوں مسرت ملتی ہے کہ گویا ہم اس منظر کو پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ گویا اس احساس کے ساتھ ہم اس کائنات کو کئی مرتبہ اور بے شمار مرتبہ دریافت کرتے ہیں اور خوشی پاتے ہیں۔ اگر حساس نگاہوں سے دیکھا جائے تو یہ کائنات بہت ہی خوبصورت ہے اور ہماری فطرت '

فطرت کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ہماری فطرت اس سرچشمے سے پھوٹی ہوئی ہے جس سے اس کائنات نے وجود اور فطرت اور ناموس فطرت اخذ کیا ہے۔جب ہم اس کائنات کی روح کے ساتھ پیوستہ ہو جاتے ہیں تو ہمیں ایک عجیب اطمینان و سکون مل جاتا ہے' نہایت ہی گہرا رابطہ اور خوشی ملتی ہے۔انس اور طمانیت ملتی ہے۔یوں جس طرح ایک شخص اپنے محبوب کو بلاواسطہ مل جاتا ہے۔

اس کائنات کی گہری معرفت کے نتیجے میں اس میں ہمیں اللہ کا نور نظر آتا ہے اور یہ ہے مفہوم اللہ کے نور سماوات والارض کا۔جب ہم اپنے وجود' اپنے نفس اور اس کائنات کا گہرا مشاہدہ کرتے ہیں تو اس میں اللہ کا نور نظر آتا ہے اور ہم اس وقت اصل حقیقت سے مل چکے ہوتے ہیں اور ہمیں نظر آتا ہے کہ تدبیر کائنات کی حقیقت کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم بار بار ہمیں متوجہ کرتا ہے کہ ہم اس کائنات کے روز مرہ کے مناظر کو ذرا گہرے غور و فکر کے ساتھ دیکھیں۔ہمارے احساس اور ہمارے تدبر کے لیے قرآن کریم بار بار اور مختلف قسم کے مناظر و مظاہر پیش کرتا ہے جو نہایت ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔قرآن دعوت دیتا ہے کہ ان مظاہر و مناظر پر سے غافل لوگوں کی طرح نہ گزر جاؤ' آنکھیں بند کر کے کیونکہ اس دنیا میں تمہارا یہ سفر نہایت ہی بامقصد ہے۔یہاں سے کچھ لے کر جاؤ لیکن انسان ہیں کہ خالی ہاتھ جا رہے ہیں۔

--- ○○○---

مزید مشاہد قدرت پیش کئے جاتے ہیں اور ہمارے احساس کو مزید تیز کیا جاتا ہے کہ یہاں ایک ہی اصول پر یہ زندگی قائم ہے۔اس کا ایک ہی مزاج ہے۔اس کی ایک جیسی تخلیق کے بعد پھر زندگی کے بھی کئی مشاہد اور مظاہر ہیں اور اس میں تنوع ہے۔

وَ اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰۤى اَرْبَعٍ ؕ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۵﴾

"اور اللہ نے ہر جاندار ایک طرح کے پانی سے پیدا کیا۔کوئی پیٹ کے بل چل رہا ہے تو کوئی دو ٹانگوں پر اور کوئی چار ٹانگوں پر۔جو کچھ وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے' وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

یہ ایک عظیم حقیقت ہے جس کو قرآن کریم نہایت ہی سادے الفاظ میں بیان کر رہا ہے۔یہ حقیقت کہ ہر زندہ مخلوق کو پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔یہ بتاتی ہے کہ حیات کے بنیادی عناصر ایک ہی ہیں اور یہ کہ زندگی کے قیام کا بنیادی عنصر پانی ہے۔جدید سائنس بھی اس بات کی طرف جا رہی ہے کہ زندگی کی اصل تخلیق پانی میں ہوئی۔یعنی سمندر میں۔یعنی ابتدائی حالت میں زندگی پانی میں تھی۔اس کے بعد زندگی کے اندر رنگا رنگی پیدا ہوئی۔یہ تو ہے سائنس دانوں کی سوچ۔

ہماری سوچ مختلف ہے۔ہم قرآنی حقائق کو سائنس کی خراد پر نہیں چڑھاتے۔کیونکہ سائنس کے اصول اور معیار

بدل جاتے ہیں جبکہ قرآن ناقابل تغیر اور آخری حقائق بتاتا ہے۔ ہم بس یہی کہتے ہیں کہ حیات کا اصل پانی ہے۔ اس لیے کہ قرآن یہ کہتا ہے۔ اگرچہ حیات کی شکلیں مختلف نظر آتی ہیں لیکن اس کا اصلی مادہ پانی ہی ہے۔ پانی ہی سے حیوان زمین پر چلنے لگا ہے۔

يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ (٢٤ : ٤٥) " اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے"۔ مختلف ہیئت اور مختلف شکل کے جانور پیدا کرتا ہے اور یہ اللہ کی مشیت ہے کہ وہ کیا پیدا کرتا ہے اور کس شکل میں پیدا کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (٢٤ : ٤٥) "بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ اگر ہم تمام زندہ چیزوں پر غور کریں تو دیکھیں گے کہ حیات کی اصل تو ایک ہے لیکن اس ایک ہی مادے سے اللہ نے کیا کیا چیزیں، کس کس شکل پر بنائی ہیں۔ مختلف حجم والی مختلف رنگوں والی، مختلف شکل و صورت والی۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک خالق اور مدبر ہے جو یہ رنگارنگی پیدا کر رہا ہے اور جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اس گہرے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کی کوئی چیز محض اتفاق سے بلاارادہ اس طرح پیدا نہیں ہوگئی ہے بلکہ ایک تدبیر اور ارادے سے ایسا ہوا ہے۔ اگر تدبیر اور ارادۂ خالق کو تسلیم نہ کیا جائے تو وہ کیا اتفاق ہے جس نے اسے پیدا کیا۔ پھر یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہر چیز کے اندر خود بخود ایک تدبیر اور تقدیر پیدا ہوگئی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو اس کی تخلیق بخشی اور ہر چیز کو ہدایت، وجدان اور شعور بخشا ہے کہ اس کا فرض منصبی کیا ہے۔

---000---

# درس نمبر ۱۵۵ ایک نظر میں

سابق عظیم دور اور طویل سبق نور کے موضوع پر تھا اور یہ نور اس کائنات کے مظاہر میں سے بھی تھا۔ اب کلام کا رخ پھر اپنے اصل موضوع کی طرف آجاتا ہے' یعنی وہ آداب جن پر قرآن کریم اسلامی سوسائٹی کی تعمیر چاہتا ہے۔ اور جن کے مطابق مسلمانوں کے ظاہر و باطن کو پاک کرنا مطلوب ہے۔ اور اسلامی سوسائٹی کو اس نور سے منور کرنا مطلوب ہے جس نور سے یہ پوری کائنات منور ہے (گویا اسلامی نظام بھی ایک نور ہے کیونکہ اس کا نازل کرنے والا بھی ایک نور ہے)۔

جو لوگ اللہ کے نور سے منور ہوں وہ کیسے ہوتے ہیں' درس سابق میں اس کی ایک جھلک دکھائی گئی کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کر سکتے اور وہ دنیاوی کاموں کی وجہ سے اقامت صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں ہوتے اور جو لوگ اس نور کائنات سے محروم تھے وہاں ان کی بھی ایک جھلک دکھائی گئی تھی کہ وہ جن دنیاوی مقاصد کے پیچھے رات اور دن بھاگ رہے ہیں وہ تو سراب ہے۔ حقیقت کچھ بھی نہیں۔ اور ان کی زندگی اس طرح ہے جس طرح موجوں میں گھری ہوئی کشتی جس کے اوپر گہرے بادل ہوں اور کچھ نظر نہ آرہا ہو۔

اب یہاں ان منافقین کا ذکر ہے جو اللہ کی روشن نشانیوں سے کوئی سبق لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ اسلام کو ظاہر کرتے ہیں لیکن وہ آداب مومنین کو نہیں اپناتے۔ مومنین تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے لیے ہر وقت تیار ہوں' اور نہایت ہی اطمینان' سنجیدگی اور رضامندی سے مطیع فرمان ہوں۔ یہاں ان کے اور مومنین صادقین کے ایمان کے درمیان موازانہ کیا جاتا ہے۔ اہل ایمان کے ساتھ اللہ نے یہ وعدہ کیا ہے کہ انہیں زمین کی خلافت دی جائے گی اور ان کا اقتدار اس زمین پر مستحکم کر دیا جائے گا۔ یہ انعام ان کو اس لیے دیا جائے گا کہ وہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہایت ہی ادب اور اطاعت کا تعلق رکھتے ہیں اور اللہ اور رسول اللہ کا احترام کرتے ہیں۔ اللہ اور رسول اللہ کے ساتھ ان کا یہ تعلق اس حقیقت کے باوجود ہے کہ کافر اللہ اور رسول اللہ کے دشمن ہیں اور یہ کہ اہل کفر اللہ اور رسول اللہ کو اس کرۂ ارض پر عاجز نہیں کر سکتے۔ کفار کا تو خود اپنا انجام برا ہونے والا ہے۔

---000---

# درس نمبر ۱۵۵ تشریح آیات

# ۴۶ --- تا --- ۵۷

لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ ؕ وَ اللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۝

''ہم نے صاف صاف حقیقت بتانے والی آیات نازل کر دی ہیں۔ آگے صراط مستقیم کی طرف ہدایت اللہ ہی جسے چاہتا ہے' دیتا ہے''۔

اللہ کی بات صاف صاف حقیقت بتلانے والی ہے۔ ان سے اللہ کا نور معلوم ہوتا ہے۔ یہ ہدایت کے سرچشمے بتانے والی ہیں۔ ان آیات میں بتلایا گیا ہے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے۔ طیب کیا ہے اور خبیث کیا ہے۔ یہ آیات اسلامی نظام زندگی کو نہایت ہی مفصل طریقے سے کھول کھول کر بتاتی ہیں۔ یہ آیات زمین پر رائج کیے جانے والے احکام و قوانین کو بالکل ظاہر کر کے بتاتی ہیں کہ جب بھی لوگ اپنے فیصلے کرنا چاہیں تو احکام اور قوانین واضح ہوں۔ ان قوانین میں کسی فریق کی کوئی حق تلفی نہیں ہے۔ نہ ان میں حق و باطل کے درمیان کوئی التباس ہے۔ نہ حلال و حرام کا التباس ہے۔ ہر چیز واضح اور مفصل ہے۔

وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَشَآءُ اِلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۴:۴۶) ''اور اللہ جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف ہدایت دے دیتا ہے''۔ اللہ کی مشیت بے قید ہے' اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہاں اللہ نے ہدایت کے لیے ایک ضابطہ مقرر کیا ہوا ہے جو شخص اپنے نفس کو اس طریق ہدایت کی طرف متوجہ کر دے وہ راہ ہدایت کو پالیتا ہے یعنی ہدایت کی راہوں پر چل نکلتا ہے۔ تو وہ اللہ کی مشیت کے مطابق ہدایت پالیتا ہے اور جو شخص منہ موڑ لیتا ہے اور اس روشنی میں راہ نہیں ڈھونڈتا جو اس کائنات میں اللہ نے بکھیر رکھی ہے وہ ضلالت کے طریق پر چل نکلتا ہے۔ یہ ضلالت بھی اللہ کی مشیت کے مطابق ہی ہوتی ہے۔

اگلی آیات میں ایک ایسے فریق کا ذکر ہے جو مدینہ میں بہت ہی متحرک تھا۔ یہ فریق منافقین تھے جو بظاہر مسلمان تھے اور اسلامی طریقوں کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے لیکن اندر تاریک تر تھا۔

وَ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالرَّسُوْلِ وَ اَطَعْنَا ثُمَّ یَتَوَلّٰى فَرِیْقٌ

مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَاِنْ يَّكُنْ
لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْۤا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ۝ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْۤا اَمْ
يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ ٦
الظّٰلِمُوْنَ ۝ الثلثة ١٠ ع
١٢

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور رسولؐ پر اور ہم نے اطاعت کی' مگر اس کے بعد ان میں سے ایک گروہ (اطاعت سے) منہ موڑ جاتا ہے ـ ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ اور رسولؐ کی طرف' تاکہ رسولؐ ان کے آپس کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق کترا جاتا ہے ـ البتہ اگر حق ان کی موافقت میں ہو تو رسولؐ کے پاس بڑے اطاعت کیش بن کر آجاتے ہیں ـ کیا ان کے دلوں کو (منافقت کا) روگ لگا ہوا ہے؟ یا یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں؟ یا ان کو یہ خوف ہے کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ان پر ظلم کرے گا؟ اصل بات یہ ہے کہ ظالم تو یہ لوگ خود ہیں"۔

جب صحیح ایمان دل میں بیٹھ جاتا ہے تو اس کے آثار عمل کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں ـ اسلام تو ایک متحرک نظریہ ہے اس کا کوئی منفی پہلو نہیں ہے ـ یہ ایک ایسا نظریہ ہے کہ جب کسی انسان کے شعور میں یہ بیٹھ جائے تو یہ خود بخود حرکت پذیر ہوتا ہے اور خارج میں اس کے آثار نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں ـ اسلام خود بخود اپنی ترجمانی اسلامی اعمال کے ذریعے کرنا شروع کر دیتا ہے ـ خود اسلامی نظام زندگی کا طریق کار بھی یہی ہے کہ وہ ایک عملی نظام ہے' وہ عمل اور تحریک کے ذریعے وجود میں آتا ہے یعنی اسلام ایک شعور ہے جو اپنے آپ کو عمل اور سلوک کے ذریعے ظاہر کرتا ہے ـ اور پھر درس پر مستقل دستور اور قانون کی شکل اختیار کر کے تہذیب کی شکل اختیار کرتا ہے ـ اس کی زندگی اس کے شعور اول پر موقوف ہے ـ اس شعور اور ایمان کو زندہ اور متحرک رکھنا ضروری ہے ـ

لیکن جس مخلوق کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے وہ کیسی مخلوق تھی وہ کہتے تو تھے

اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا (۴۷ : ۲۴) "یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور رسولؐ پر اور ہم نے اطاعت قبول کی"۔ یہ بات وہ اپنے منہ سے کہتے تھے لیکن ان کے طرز عمل میں اس کے آثار نظر نہ آتے تھے ـ چنانچہ وہ الٹے پاؤں پھر جاتے تھے جو بات وہ زبان سے کہتے تھے ان کے اعمال اس کی تکذیب کرتے تھے ـ

وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ (۴۷ : ۲۴) "ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں"۔ مومن تو وہ ہوتے ہیں جن کے اعمال ان کے اقوال کی تصدیق کرتے ہیں ـ ایمان کوئی کھیل تو نہیں ہے کہ ایک شخص بس ایمان کا اقرار کر لے اور

اس کے بعد اس کی کوئی ذمہ داری نہ ہو۔ ایمان کے بعد اس کا نفس بھی ایمانی کیفیات میں رنگ جانا چاہئے۔ اس کا دل دماغ اور سوچ بھی ایمانی بن جائے۔ اور اس کے بعد پھر لازم ہے کہ اس شخص کے اعمال بھی ایمانی ہوں اور جب ایمان کسی کے ضمیر میں بیٹھ جائے تو پھر اس کے لیے ایمانی راہ سے پلٹنا ممکن ہی نہیں رہتا۔

یہ لوگ ایمان کا دعویٰ تو کرتے تھے لیکن عملاً یہ لوگ ایمان کے مفہوم اور مدلول کے خلاف ہوتے تھے جب ان سے کہا جاتا تھا کہ آؤ اپنا فیصلہ اللہ اور رسولؐ کے قانون کے مطابق کریں اور اس شریعت کے مطابق جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تو وہ منہ موڑ لیتے ہیں۔

وَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۲۴:۴۸) وَ اِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ (۲۴:۴۹) "جب ان لوگوں کو بلایا جائے اللہ اور رسول کی طرف تاکہ رسول ان کے آپس کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق کترا جاتا ہے۔ البتہ اگر حق ان کی موافقت میں ہو تو رسولؐ کے پاس بڑے اطاعت کیش بن کر آتے ہیں"۔ کیونکہ ان کو معلوم ہوتا تھا کہ اللہ اور رسول اللہؐ کا حکم حق سے دور نہ تھا اور ہوائے نفس کے لیے رسولؐ کے ہاں کوئی دخل نہ ہوتا تھا اور اگر دشمنی بھی ہوتی تو رسول اللہ حق پر فیصلہ کرتے۔ اس لیے یہ لوگ جب جانتے تھے کہ ان کا موقف حق کے خلاف ہے تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے سے دور بھاگتے تھے اور آپ کے سامنے آنے سے انکار کرتے تھے اور اگر وہ حقدار ہوتے تو بھاگ کر رسول اللہؐ کے پاس بڑے برخوردار بن کر آتے تھے۔ خوشی خوشی سے کیونکہ ان کو یقین تھا کہ حضورؐ حق سے ادھر ادھر نہیں جاتے۔ اور شریعت کی عدالت میں کسی کی حق تلفی نہیں ہوتی۔

یہ لوگ جو ایمان کا دعویٰ کرتے تھے اور پھر بھی یہ دو رخی اختیار کرتے تھے ' ہر دور میں اہل نفاق کو معلوم کرنے کے لیے ایک اعلیٰ نمونہ اور معیار ہیں۔ یہ لوگ اس قدر جرأت نہیں رکھتے کہ جہراً اپنے کفر کا اعلان کر سکیں بظاہر یہ لوگ مسلمان ہوتے ہیں ' لیکن وہ یہ بات پسند نہیں کرتے کہ معاشرے کے اندر اسلامی رنگ پیدا ہو اور اسلامی قوانین کے مطابق عدالتی نظام قائم ہو۔ جب ایسے لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ شریعت کے مطابق فیصلے کے لیے آ جائیں تو وہ اس سے اعراض کرتے ہیں اور عذرات پیش کرتے ہیں۔

وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ (۲۴:۴۷) "یہ لوگ مومن نہیں ہیں"۔ اس لیے کہ ایمان اور اسلامی شریعت پر فیصلے کرنے سے انکار ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے الا یہ کہ اسلامی شریعت پر فیصلہ کرانا ان منافقین کے مفاد میں ہو ' تو یہ دوڑ کر آتے ہیں۔

اللہ اور رسول اللہؐ کے فیصلوں کے مطابق زندگی گزارنا ایمان کی علامت ہے۔ یہی وہ علامت ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ایمان کی حقیقت دلوں میں بیٹھ گئی ہے اور اللہ اور رسول اللہؐ کے حوالے سے مسلمانوں کے لیے یہ رویہ اختیار کرنا لازمی ہے۔ اللہ اور رسول اللہؐ کے حکم کو وہی شخص رد کر سکتا ہے جو بے حد گستاخ اور نافرمان ہو۔ جن کی کوئی اسلامی تربیت نہ ہوئی ہو اور جس کا دل نور ایمان سے منور نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے اس فعل کے نتیجے میں ایسے سوالات کیے جاتے ہیں جن سے ان کے دلوں کی یہ بیماری ظاہر ہو جاتی ہے۔ان سوالات میں تعجب کیا جاتا ہے کہ وہ کیوں شک میں پڑے ہوئے ہیں اور ان کا طرز عمل کیوں غلط اور قابل نفرت ہے۔

اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ یَخَافُوْنَ اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَ رَسُوْلُهٗ

( ٢٤ : ٥٠ ) "کیا ان کے دلوں کو (منافقت کا) روگ لگا ہوا ہے؟ یا یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں؟ یا ان کو یہ خوف ہے کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ان پر ظلم کرے گا؟" پہلا سوال تو اثبات کے لیے ہے یعنی درحقیقت یہ منافق ہیں اور یہ نفاق ہی کا اثر ہے۔کوئی سلیم الفطرت شخص یہ نفاق نہیں کر سکتا کیونکہ یہ فطری فرائض ہیں اور ان کی فطرت صحت مند نہیں رہی ہے۔درحقیقت انہوں نے ایمان کی حقیقت کو نہیں دیکھا اور یہ لوگ ابہام کی شاہراہ پر گامزن ہیں ۔

دوسرا سوال تعجب کے لیے ہے۔تعجب یہ ہے کہ دعوائے ایمان کرتے ہوئے بھی ان کو اللہ کے فیصلوں میں شک ہے۔کیا ان کو اس امر میں شک ہے کہ یہ احکام اللہ کی طرف سے آتے ہیں۔یا ان کو اس معاملے میں شک ہے کہ اسلام عدل کا نظام قائم کر سکتا ہے یا نہیں۔یہ دونوں باتیں مومنین کے طریقوں کے خلاف ہیں۔

تیسرا سوال اظہار نفرت اور اظہار تعجب دونوں کے لیے ہے۔تعجب اور نفرت اس بات پر ہے کہ یہ لوگ شک کرتے ہیں کہ شاید اللہ اور رسول اللہؐ ان پر ظلم کریں گے۔یہ عجیب بات ہے کہ کوئی انسان اس بارے میں شک کرے یا یہ خوف کرے کہ اللہ انصاف نہ کرے گا۔اللہ ہی تو ہے جو سب کا خالق اور سب کا رب ہے۔لہٰذا وہ اپنی مخلوق کے درمیان فرق و امتیاز کس طرح کر سکتا ہے۔

اللہ کا حکم ایک ہوتا ہے اس کی تہ میں کسی ظلم و زیادتی کا شائبہ تک نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تو وہ منصف ہے جو کسی پر کسی طرح ظلم نہیں کرتا۔اس کی تمام مخلوق اس کے سامنے برابر ہے لہٰذا وہ کسی ایک بندے کی مصلحت کے لیے کسی دوسرے بندے پر ظلم نہیں کرتا۔اللہ کے سوا تمام دوسرے افراد اور اداروں کے احکام کے بارے میں یہ شک ہو سکتا ہے کہ وہ ظالمانہ ہوں کیونکہ اگر انسان خود اپنے لیے قانون سازی کر رہا ہو تو اس سے یہ شک ہو سکتا ہے کہ قانون سازی کرنے والا انسان خود اپنے مفادات کا خیال رکھے۔قانون سازی کرنے والا انسان ایک فرد ہو یا ایک ادارہ ہو' یہ بدگمانی ہو سکتی ہے۔

جب ایک انسان اور فرد واحد حکمران ہو تو اس کے بارے میں یہ بات واضح ہے کہ وہ اپنے حق میں اور اپنی مصلحت کے لیے قانون سازی کرے گا۔نیز اگر ایک حکومت دوسروں کے لیے قانون سازی کرے یا ایک طبقہ دوسروں کے لیے قانون سازی کرے یا ایک بلاک دوسرے بلاکوں کے لیے قانون سازی کرے تو قانون سازی کرنے والا اپنے مفادات کا خیال کر سکتا ہے۔لیکن جب اللہ قانون سازی کرے تو اس میں کسی فرد' کسی گروہ' کسی طبقے ........ یا کسی بلاک کی حمایت کی کوئی بات نہیں ہوتی۔یہ مطلق انصاف ہوتا ہے اور یہ خصوصیت یعنی بے قید عدل کی خصوصیت صرف اللہ کی قانون سازی میں ممکن ہے۔اللہ کے فیصلے کے سوا کوئی دوسرا فیصلہ اس خصوصیت کا حامل نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اللہ اور رسول اللہؐ کے حکم پر راضی نہیں ہوتے' وہی ظالم ہیں۔یہ لوگ زمین پر عدل مطلق کو جمنے نہیں دینا چاہتے۔یہ لوگ سچائی کا اقتدار نہیں چاہتے۔یہ لوگ اس بات میں یہ شک کرتے ہوئے نہیں ڈرتے کہ

اللہ کے حکم میں کوئی ظلم ہو گا یہ کہ نہ ان کو اللہ کی عدالت میں شک ہے ۔

بلْ اُولٰئكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ( ٢٤ : ٥٠ ) "بلکہ یہ لوگ دراصل ظالم ہیں"۔ اس لیے عدل نہیں چاہتے ۔ رہے وہ لوگ جو حقیقی مسلمان ہیں تو اللہ اور رسول اللہ کے حکم سے ان کا رویہ بالکل مختلف ہے ۔ جب ان کو بلایا جائے کہ آؤ اللہ اور رسول اللہ کے حکم کے مطابق فیصلے کرائیں تو وہ بالکل مختلف بات کرتے ہیں ۔ یہ قول مومنین کے لائق ہے اور یہ قول بتاتا ہے کہ ان کے دل ایمان سے روشن ہیں اور وہ چمک رہے ہیں ۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ؀

"ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول ؐ کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ؐ ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی ۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔

ان لوگوں کا رویہ یہ ہے کہ بلاچون وچرا اور بغیر کسی ذرہ بھر انحراف کے وہ سمع و اطاعت کرتے ہیں ۔ یہ سمع و اطاعت وہ اس لیے کرتے ہیں کہ انہیں پورا اعتماد و پورا یقین ہے کہ اللہ اور رسول اللہ ؐ کا فیصلہ ہی حقیقی فیصلہ ہے اور اس میں مطلق عدل و انصاف ہے ۔ اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ خواہشات نفسانیہ پر مبنی ہے ۔ یہ سمع و اطاعت وہ اس لیے کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کے سامنے جھکا دیا ہے ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہی اللہ زندگی بخشنے والا ہے ' یہی اللہ اس کائنات میں متصرف ہے اور ان کو اس بات پر اطمینان حاصل ہے کہ اللہ لوگوں کے لیے جو چاہتے ہیں وہی بہتر ہے بہ نسبت اس کے ' جو لوگ خود اپنے لیے چاہتے ہیں کیونکہ وہ ذات جس نے پیدا کیا وہ اپنی مخلوق کے بارے میں بہتر جانتی ہے ۔

وَ اُولٰئكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ( ٢٤ : ٥١ ) "ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔ یہ فلاح پانے والے اس لیے ہیں کہ ان کے امور کی تدبیر خالق کائنات ہی کرتا ہے اور ان کے باہم تعلق کو وہی منظم کرتا ہے ۔ اپنے علم اور عدل کے ساتھ وہ ان کے درمیان وہی فیصلے کرتا ہے ۔ اس لیے ان کو ان لوگوں سے بہتر ہونا چاہئے جو اپنے امور کے فیصلے خود کرتے ہیں یا ان جیسے افراد کرتے ہیں ۔ یہ لوگ اور خود ان کے بھائی دوسرے بشر وہ علم و حکمت نہیں رکھتے جو اللہ رکھتا ہے ۔ پھر وہ اس لیے بھی کامیاب ہوں گے کہ وہ ایک ہی منہاج پر چل رہے ہیں جس میں کوئی ٹیڑھ اور سقم نہیں ہے ۔ وہ اپنے اس منہاج پر مطمئن ہیں ۔ وہ اس منہاج کے مطابق سیدھے چل رہے ہیں ۔ ادھر ادھر نہیں بھٹکتے ۔ لہٰذا ان کی قوتیں منتشر نہیں ہوتیں ' ان کی خواہشات کے اندر کوئی تضاد نہیں ہے ۔ خواہشات اور مفادات کے ہاتھ میں ان کی نکیل نہیں ہوتی بلکہ ان کی نکیل اسلامی منہاج کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور وہ ان کے آگے ہوتا ہے اور یہ اس کے پیچھے چلتے ہیں ۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ

اَلۡفَآئِزُوۡنَ ﴿۵۲﴾ ”اور کامیاب وہی ہیں جو اللہ اور رسولؐ کی فرماں برداری کریں اور اللہ سے ڈریں اور اس کی نافرمانی سے بچیں۔یہی لوگ کامیاب ہیں۔“

آیت سابقہ میں موضوع سخن یہ تھا کہ اہل ایمان اللہ اور رسول اللہؐ کے فیصلوں میں مطیع فرمان ہوتے ہیں۔اب یہاں کہا جاتا ہے کہ اہل ایمان کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قانونی فیصلوں کے علاوہ بھی اللہ کے احکام و نواہی کی پابندی کرتے ہیں اور یہ اطاعت وہ قانونی گرفت کے خوف سے نہیں کرتے بلکہ اللہ کی گرفت کے خوف سے وہ یہ اطاعت کرتے ہیں۔تقویٰ خشیت سے ذرا عام لفظ ہے کیونکہ خشیت اور خوف سے ذرا آگے بڑھ کر تقویٰ میں چھوٹے اور بڑے معاملات میں احتیاط کا شعور انسان کے اندر پیدا ہو جاتا ہے جبکہ خشیت میں خوف اور ڈر کا پہلو ہوتا ہے۔جو شخص اللہ اور رسول اللہؐ سے ڈرتا ہے اور اطاعت کرتا ہے تو وہی کامیاب ہوتا ہے۔یہ شخص دنیا اور آخرت میں نجات پالیتا ہے۔یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کی مخالفت نہیں کرتا۔اور ایسے لوگ یقیناً کامیابی کے اہل بھی قرار پاتے ہیں اور ایسے لوگوں کی زندگی کے اندر ایسے اسباب ہوتے ہیں جو ان کی کامیابی کا سبب بنتے ہیں کیونکہ جو شخص اللہ اور رسول اللہؐ کی اطاعت کرتا ہے وہ دراصل اللہ کے طے کردہ سیدھے منہاج پر چل رہا ہوتا ہے۔یہ منہاج اس لیے کامیاب ہوتا ہے کہ یہ خود اللہ نے علم و حکمت کی بنیاد پر طے کیا ہوتا ہے۔اس منہاج کا مزاج اور اس کی فطرت کے اندر یہ کامیابی مضمر ہوتی ہے۔دنیا کی کامیابی بھی اور آخرت کی بھی۔پھر اس نظام میں اللہ کا خوف اور تقویٰ وہ چوکیدار ہوتے ہیں جو اس نظام پر انسانوں کو چلاتے ہیں اور یہ نظام درست رہتا ہے۔یہ جس جادۂ مستقیم پر چل رہے ہوتے ہیں اس پر ہر جگہ دھوکہ دینے والی چیزیں ان کے لیے دامن گیر ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ لوگ اپنی راہ سے انحراف نہیں کرتے۔

یہ آداب کہ انسان اللہ اور رسول اللہؐ کی اطاعت 'خدا خوفی' تقویٰ اور خشیت کے ساتھ کرے نہایت ہی بلند آداب زندگی ہیں۔ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے انسانوں کے دل نور ربانی سے روشن ہیں۔یہ دل اللہ سے ملے ہوئے ہیں اور ان کے شعور میں خوف خدا بسا ہوا ہے اور ان آداب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دل نہایت ہی معزز اور سربلند ہیں۔کیونکہ کوئی شریف آدمی یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ اپنے جیسے انسانوں کے سامنے ذلیل و خوار ہو اس لیے ایک مومن کا ضمیر اس سے ابا کرتا ہے۔حقیقی اطاعت تو ہے ہی وہی جس میں اطاعت کرنے والا اس نظر سے اطاعت کرے کہ وہ ذات کبریا کی اطاعت کر رہا ہے کیونکہ ایک سچا مومن صرف اللہ کے سامنے اپنے سر کو جھکا سکتا ہے۔

اہل ایمان کے ان اچھے آداب اور اہل نفاق کے ان برے آداب کے درمیان اس تقابل کے بعد کہ مومنین وہ ہوتے ہیں جو صرف اللہ کے سامنے جھکتے ہیں اور منافقین وہ ہوتے ہیں جو دعوائے ایمان تو کرتے ہیں لیکن مومن نہیں ہوتے 'اب منافقین کے بارے میں بقیہ بات مکمل کی جاتی ہے۔

وَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰہِ جَہۡدَ اَیۡمَانِہِمۡ لَئِنۡ اَمَرۡتَہُمۡ لَیَخۡرُجُنَّ ؕ قُلۡ لَّا تُقۡسِمُوۡا ۚ طَاعَۃٌ مَّعۡرُوۡفَۃٌ ؕ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۵۳﴾ قُلۡ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَیۡہِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَیۡکُمۡ مَّا حُمِّلۡتُمۡ ؕ وَ اِنۡ

تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا ۚ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِينُ ۝

"یہ (منافق) اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھاکر کہتے ہیں کہ "آپ حکم دیں تو ہم گھروں سے نکل کھڑے ہوں"۔ ان سے کہو "قسمیں نہ کھاؤ' تمہاری اطاعت کا حال معلوم ہے۔ تمہارے کرتوتوں سے اللہ بے خبر نہیں ہے"۔ کہو "اللہ کے مطیع بنو اور رسولؐ کے تابع فرمان بن کر رہو۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ رسولؐ پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اس کا ذمہ دار وہ ہے اور تم پر جس فرض کا بار ڈالا گیا ہے اس کے ذمہ دار تم۔ اس کی اطاعت کروگے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے ورنہ رسولؐ کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے"۔

منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر قسمیں کھاتے تھے کہ اگر آپ ہمیں لڑنے کے لیے حکم دیں تو ہم ضرور نکلیں گے۔ حالانکہ اللہ خوب جانتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس یقین دہانی کو نہایت ہی حقارت سے رد فرماتا ہے۔

قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ (۲۴ : ۵۳) "ان سے کہو' قسمیں نہ کھاؤ، تمہاری اطاعت کا حال معلوم ہے"۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ تم کیسی اطاعت کرتے ہو۔ اور اس اطاعت پر قسمیں اٹھانے کی اب ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات ایسے شخص سے کہی جاتی ہے کہ جس کا جھوٹ معلوم ہو اور وہ مشہور جھوٹا ہو۔ کہا جاتا ہے جی بس قسم نہ اٹھاؤ تم تو معروف و مشہور سچے ہو۔ قسم کی ضرورت ہی کیا ہے۔

اس مذاقیہ انداز کے بعد یہ بھی کہا جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۲۴ : ۵۳) "اللہ تمہارے تمام اعمال سے خبردار ہے"۔ لہٰذا تمہیں قسموں اور تاکیدات کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کو تو علم ہے کہ اگر حکم دیا گیا تو نہ تم نکلو گے اور نہ لڑو گے"۔

چنانچہ دوبارہ ان کو اطاعت کا حکم سنجیدگی سے دیا جاتا ہے۔ یعنی کہا جاتا ہے کہ حقیقی اطاعت کرو۔ وہ اطاعت نہ کرو جو تمہارے بارے میں معروف ہے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (۲۴ : ۵۴) "ان سے کہو اللہ کے مطیع بنو اور رسولؐ کے تابع فرمان ہوکر رہو"۔ اگر تم منہ موڑتے ہو اور اللہ و رسولؐ کے احکام کی مخالفت کرتے ہو اور ان کو نافذ نہیں کرتے تو

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ (۲۴ : ۵۴) "تو رسول پر جو فرض عائد ہے وہ اس کا ذمہ دار ہے"۔ یعنی اس کے ذمہ پیغام رسالت کی تبلیغ کرنا ہے اور یہ فرض اس نے بحسن و خوبی ادا کر دیا ہے۔

وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ (۲۴ : ۵۴) "اور تم پر جو فرض عائد کیا گیا ہے اس کے ذمہ دار تم ہو"۔ اور تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ تم اطاعت کرو اور خلوص کے ساتھ ایمان لاؤ۔ تم نے اس سے منہ موڑ لیا ہے اور تم نے یہ ذمہ داری پوری ادا نہیں کی ہے۔

وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا (۲۴ : ۵۴) "اس کی اطاعت کرو گے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے"۔ راہ راست پر آجاؤ گے اور ایک صحیح نظام کے تحت زندگی بسر کر کے دنیا و آخرت میں فلاح پاؤ گے۔

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۲۴ : ۵۴) "رسول کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ صاف صاف حکم پہنچا دے"۔ رسولؐ سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم ایمان لائے تھے یا 'اگر تم منہ پھیرلو تو اس فعل کی وجہ سے رسول کو مجرم نہ گردانا جائے گا۔ تم مجرم ہو گے اور تمہیں ہی اس پر سزا دی جائے گی۔ تم پر یہ فرد جرم عائد ہوگی کہ تم نے اللہ اور رسول اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کی ہے۔

---ooo---

منافقین کے معاملے کی تشریح کے بعد 'اب سیاق کلام ان کو ایک طرف چھوڑ دیتا ہے۔ اور اب کلام کا رخ اطاعت کیش مومنین کی طرف پھر جاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی اس اطاعت کی جزاء کیا ہوگی یعنی قیامت کے انعامات و اکرامات سے ادھر اس جہان میں ان کا صلہ کیا ہو گا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

"اس نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے 'ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے 'اور ان کی (موجودہ) حالت خوف کو امن سے بدل دے گا 'بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں"۔

یہ وعدہ ہے امت محمدیہ کے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح کیا۔ وعدہ یہ ہے کہ ان کو اس زمین پر اقتدار اعلیٰ دیا جائے گا اور جس دین اسلام کو اللہ نے ان کے لیے پسند کیا ہے اس کو غلبہ نصیب ہو گا۔ ان کی حالت خوف کو حالات امن و سکون سے بدل دے گا۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کا وعدہ ہمیشہ سچ ہوتا ہے اللہ کا وعدہ ہمیشہ واقع ہوتا ہے اور اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کس قسم کے مومن ہیں جن کے ساتھ اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین پر اقتدار دیا جائے گا۔

اس ایمان کی حقیقت جس کے نتیجے میں اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ مومنین کو زمین کا اقتدار اعلیٰ عطا کیا جائے گا 'ایک عظیم حقیقت ہے اور وہ حقیقت پوری انسانی زندگی کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ یہ حقیقت جب کسی انسان کے دل میں

جیفہ جاتی ہے تو اس کا ظہور اور اعلان عملی شکل میں ہوتا ہے ۔ اس شخص کی تمام سرگرمیاں اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں ۔ یہ مرد مومن رضائے الٰہی کے لیے کام شروع کر دیتا ہے ۔ اللہ کی اطاعت اور اس کے احکام و قوانین کے سامنے 'چھوٹے اور بڑے معاملات میں سرتسلیم خم کر دیتا ہے ۔ پھر کسی معاملے میں اس کے نفس کی کوئی خواہش باقی نہیں رہتی ۔ نہ اس کے دل میں کوئی شہوت ہوتی ہے نہ اس کی فطرت میں کوئی کجی رہتی ہے اور یہ مومن ان تمام باتوں میں اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت شروع کر دیتا ہے ۔

یہ ایمان ایسا ہوتا ہے کہ جس کے اندر انسان پوری طرح غرق ہو جاتا ہے ۔ اس کے خیالات اس ایمان میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں 'اس کے دل کی دھڑکن ایمان ہوتی ہے ۔ اس کی روح کی دلچسپیاں ایمانی معاملات میں ہوتی ہیں ۔ اس کی فطرت کے میلانات اور اس کے جسم کی حرکات اور اس کے اعضا کی گردشیں 'اس کا اپنے رب کے ساتھ سلوک اور اس کا عوام الناس کے ساتھ برتاؤ سب کے سب اللہ کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں اور یہ باتیں سب کی سب آیت استخلاف میں موجود ہیں ۔ اللہ تعالیٰ خود بیان کرتے ہیں کہ اس اقتدار اعلیٰ کی اعطاء کب ہوگی ۔

یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا (٢٤ : ٥٥) "وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں"۔ شرک کی کئی اقسام ہیں ۔ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف عقائد میں 'عمل میں 'شعور میں متوجہ ہونا بھی شرک ہے ۔

معلوم ہوا کہ ایمان ایک مکمل نظام زندگی کا نام ہے ۔ اس میں اللہ کے تمام احکام و اوامر شامل ہیں ۔ اور جب یہ تمام احکام انسانی زندگی میں عملاً قائم ہوں تو اقتدار اعلیٰ کے تمام اسباب فراہم ہو جاتے ہیں ۔ تیاری مکمل ہو جاتی ہے ' وسائل فراہم ہو جاتے ہیں اور انسان پھر امانت کبریٰ اور اقتدار اعلیٰ کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے یعنی زمین پر اللہ کے خلیفہ ہونے کی امانت اس کے سپرد ہو جاتی ہے ۔

استخلاف فی الارض یا زمین کے اقتدار اعلیٰ کا مفہوم کیا ہے ؟ اس سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ کسی قوم کو حکومت ' اقتدار اور آرڈر نافذ کرنے کے اختیارات مل جائیں بلکہ اللہ کا خلیفہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ ان قوتوں کو کوئی اصلاح 'تعمیر اور ترقی کے لیے استعمال کرے ۔ اس کے ذریعے اس نظام زندگی کی راہ ہموار کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لیے بھیجا ہے تاکہ تمام انسانیت اس راہ پر چل نکلے اور انسان اس کرۂ ارض پر وہ کمال حاصل کرے جو اللہ نے اس کے لیے مقدر کیا ہے اور جس کی وجہ سے انسان مکرم ہوا ہے ۔

اللہ کا خلیفہ وہ نہیں ہے جو دنیا میں فساد اور تخریب کا کام کرے بلکہ وہ ہوتا ہے جو اس دنیا کی اصلاح 'تعمیر اور ترقی میں حصہ لے اور دنیا کو انصاف اور عدل دے ۔ یہ نہ ہو کہ وہ انسانوں پر ظلم کرے اور انسانیت کے معیار کو بلند کرنے کے بجائے گرائے ۔ وہ انسانوں کے اندر پائے جانے والے نظام کی اصلاح کرنے کے بجائے ظلم کرے ۔ وہ یہ نہ کرے کہ اچھے انسانوں کو مقام حیوانیت تک گرائے بلکہ جو انسان حیوانیت تک گر گئے ہیں ان کو اٹھائے ۔

یہ اقتدار ' اقتدار اعلیٰ ہے جس کا وعدہ اللہ اہل ایمان سے کرتے ہیں کہ اللہ ان کو زمین میں اس قسم کا اقتدار دیتا رہا ہے تاکہ اس کرۂ ارض پر اللہ کی منشا کو پورا کریں اور اللہ کی منشا کیا ہے ؟ یہ کہ وہ یہاں انسانیت کو کمال انسانیت تک پہنچائیں 'جس کمال تک پہنچنا اللہ نے یوم تخلیق ہی سے اس کے لیے مقدر کر دیا تھا ۔ مگر وہ لوگ جو زمین میں اقتدار پر

آتے ہیں اور اس کی وجہ سے فساد پھیلاتے ہیں' زمین میں سرکشی اور ظلم کو رائج کرتے ہیں اور انسانیت کو حیوانیت کے درجے تک گراتے ہیں تو یہ لوگ اللہ کی طرف سے اس زمین پر خلفاء نہیں ہیں بلکہ وہ شیطان کے پیروکار ہیں۔ ان کو یہ مقام بطور آزمائش دیا گیا ہے اور لوگوں پر ان کو بطور سزا مسلط کیا گیا ہے۔

ہم نے اس استخلاف کا جو مفہوم سمجھا ہے اس کی طرف خود اس آیت کے اندر اشارہ موجود ہے۔ کہا گیا ہے۔

وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ (۲۴ : ۵۵) "ان کے لیے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے"۔ اور دین تب متمکن ہو سکتا ہے کہ جب یہ مومنین کے دلوں کے اندر بیٹھ جائے۔ جب ان کی زندگی کے ہر عمل میں وہ مضبوطی سے نافذ ہو جائے۔ جب ان کی زندگیوں میں اور ان کے قلوب میں ایمان اچھی طرح بیٹھ جائے گا تو انہیں استخلاف فی الارض نصیب ہو گا۔ اللہ نے ان کے لیے جو دین پسند کیا ہے وہ زمین پر غالب ہو جائے اور ان کا دین جن باتوں کا حکم دیتا ہے ان میں اصلاح' عدل اور انسانی خواہشات پر کنٹرول شامل ہیں۔ نیز زمین کی تعمیر و ترقی اور زمین کے اندر جس قدر سہولیات اللہ نے رکھی ہیں ان سے استفادہ بھی دین کا حصہ ہے۔ نیز زمین کے اندر جس قدر نعمتیں رکھی ہیں اس سے استفادہ اور ان کی تلاش بھی اس میں شامل ہے بشرطیکہ ان تمام سرگرمیوں میں انسان کی سمت اور قبلہ اللہ ہی ہو۔

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا (۲۴ : ۵۵) "اور ان کی موجودہ حالت خوف کو امن سے بدل دے گا"۔ مسلمان مکہ میں خائف تھے۔ امن و امان کی حالت نہایت مشکوک تھی۔ وہ ہروقت مسلح رہتے تھے اور کسی وقت بھی ان کو اسلحہ رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ یہاں تک کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی ہجرت کے بعد بھی وہ اسلحہ بند رہتے تھے۔ ربیع ابن انس نے اس آیت کے بارے میں ابو العالیہ سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی مکہ میں دس سال سے زیادہ عرصہ صرف ایک خدا کی طرف دعوت دیتے رہے' صرف اللہ وحدہ کی عبادت کی طرف بلاتے رہے اور ہر قسم کے شرک سے ممانعت کرتے رہے۔ یہ دعوت وہ چھپ کر دیتے تھے ان کو ہر وقت خوف لاحق رہتا تھا۔ مسلمانوں کو جنگ کرنے کی ممانعت تھی۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں ان کو لڑنے کی اجازت دی گئی تو مدینہ میں بھی وہ اکثر حالت خوف میں رہتے تھے۔ وہ صبح و شام اسلحہ بند رہتے تھے۔ اس قسم کی زندگی پر انہوں نے طویل عرصہ تک صبر کیا۔ صحابہ کرام میں سے ایک شخص نے کہا' اے رسول اللہ ؐ کیا ہم ہمیشہ اسی طرح خائف رہیں گے؟ کیا ایسا دور نہ آئے گا کہ ہم اس میں اپنے اسلحہ کو رکھ دیں اور امن و امان سے رہیں تو رسول اللہ ؐ نے فرمایا" ذرا تھوڑا سا اور صبر کرو' تم میں سے ایک شخص ایک عظیم مجمع میں ہو گا اور کسی کے پاس ایک چھوٹا سا لوہا بھی نہ ہو گا"۔ اس موقعہ پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جزیرۃ العرب پر غلبہ نصیب ہوا تو وہ ایمان لائے اور اسلحہ رکھ دیا۔ اس کے بعد اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھا لیا تو مسلمان حضرت ابوبکرؓ' حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان کی امارت میں امن سے رہے۔ اس کے بعد وہ ان واقعات میں پڑ گئے جن میں پڑ گئے تو اللہ نے پھر ان کو خوف میں مبتلا کر دیا تو انہوں نے پہرے' شرطے وغیرہ اپنا لیے۔ وہ بدل گئے تو اللہ نے بھی ان کو بدل دیا۔

وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۲۴: ۵۵) ''اور اس کے بعد جو کفر کرے تو ایسے لوگ ہی فاسق ہیں''۔ یہ لوگ اللہ کی شرائط کے ترک کرنے والے ہیں اور اللہ سے کیے ہوئے عہد و پیمان کو توڑنے والے ہیں۔ اللہ کا وعدہ ایک بار پورا ہو گیا اور یہ قائم رہا' اس وقت تک جب مسلمان اللہ کی شرائط کو پورا کرتے رہے یعنی

يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (۲۴: ۵۵) ''وہ میری بندگی کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے''۔ نہ ان کی خواہشات نفسانیہ ان کے لیے الٰہ ہوں گی۔ وہ شرک نہ کریں گے اور اللہ کی بندگی پر قائم رہیں گے۔ اللہ کا یہ وعدہ اب بھی ہر گروہ مومن کے لیے قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔ کسی بھی وقت جب گروہ مومن اللہ کا خلیفہ نہیں ہوتا' متمکن فی الارض نہیں ہوتا اور امن سے نہیں ہوتا تو وہ اس لیے کہ وہ اس وعدے اور اس پیمان کی وسیع تر شرائط کو پورا نہیں کر رہا ہوتا۔ ایمان اور عہد الٰہی کے تقاضے وہ پورے نہیں کر رہا ہوتا۔ لیکن جب امت آزمائش میں کامیاب ہو جاتی ہے اور امتحان پاس کر لیتی ہے یا خوف میں مبتلا ہوتی ہے تو اللہ سے امن طلب کرتی ہے۔ وہ ذلیل ہوتی ہے تو اللہ سے عزت طلب کرتی ہے۔ وہ پسماندہ رہ جاتی ہے تو خلافت فی الارض کی طلبگار ہوتی ہے۔ یہ کام وہ ان وسائل کے ساتھ کرتی ہے' جو اللہ نے تجویز کیے ہیں اور ان شرائط کے ساتھ کرتی ہے جو اللہ نے مقرر کی ہیں تو پھر اس وقت اللہ کا وہ وعدہ متحقق ہوتا ہے جو نازل ہوتا ہے۔ پھر امت مسلمہ کی راہ میں دنیا کی کوئی قوت نہیں ٹھہر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس وعدے کے بعد حکم دیا جاتا ہے۔ نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو اور اللہ اور رسول اللہؐ کی اطاعت کرو۔ اور مومن اور رسول اللہؐ ان کفار سے ہرگز مرعوب نہ ہوں جو اللہ' رسول اللہ اور دین اسلام کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٥٦﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۖ وَلَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿٥٧﴾ ع

۱۳

''نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو اور رسولؐ کی اطاعت کرو' امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ جو لوگ کفر کر رہے ہیں ان کے متعلق اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ وہ زمین میں اللہ کو عاجز کر دیں گے۔ ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے''۔

اللہ کی جانب تیاری کی یہ ہیں نہایت ہی مختصر شرائط۔ اتصال باللہ' تعلق باللہ اور نماز کے ذریعہ دل کو درست کرنا اور ایتائے زکوٰۃ کے ذریعہ بخل اور دولت پرستی کے جذبات پر قابو پانا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنا' نہایت ہی خوشدلی کے ساتھ۔ چھوٹے اور بڑے معاملات میں اللہ کے احکام کو نافذ کرنا اور زندگی کا وہ منہج اختیار کرنا جو اللہ نے زندگی گزارنے کے لیے تجویز کیا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (۲۴: ۵۶) ''امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا''۔ یعنی زمین میں تمہیں فساد'

خوف ' بے چینی اور گمراہی سے بچائے گا۔ اور آخرت میں غضب الہی 'عذاب الہی اور اللہ کے انتقام سے تمہیں بچائے گا۔

جب تم اپنے آپ کو اس طریقہ کار پر درست کر لو' تو پھر تمہارے لیے کفار کی قوت سے ڈرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کی زمین پر اللہ اور اللہ والوں کو عاجز نہیں کر سکتے۔ ان کی ظاہری قوت تمہاری راہ نہیں روک سکتی کیونکہ تمہارا ایمان قوی ہو گا۔ تمہارا نظام اور منہاج قوی ہو گا۔ تمہاری تیاری قوی ہو گی تمہاری قوت صرف مادی قوت تک محدود نہ ہو گی بلکہ تمہارے ساتھ روحانی قوت بھی ہو گی۔ جب تم ایک مومن کی طرح کفر سے ٹکراؤ گے تو تم عجیب و غریب خارق عادت معجزات صادر کرو گے۔

ان آیات میں اللہ نے جو وعدہ کیا ہے جو لوگ اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو ان کو چاہئے کہ وہ عظیم ایمانی حقیقت اپنے اندر پیدا کر لیں۔ تاریخ انسانی میں اس وعدے کی ایک تعبیر تو ضروری ہے بشرطیکہ جو شخص اس کی تعبیر چاہتا ہے وہ اس وعدے کی شرائط پر عمل پیرا ہو۔ جب بھی ان شرائط کو مکمل کیا جائے گا بغیر کسی شک ' بغیر کسی دیر کے' یہ وعدہ پورا ہو جائے گا۔

جب بھی امت مسلمہ نے اللہ کی راہ اور اللہ کے منہاج پر چلنا شروع کیا ہے یا کرے گی ' اور جب بھی اس نے اسلامی نظام حیات کو اپنی زندگی کا حکمران تصور کیا ہے اور کرے گی اور جب بھی امت اس دین پر راضی ہوئی ہے اور ہو گی ' کہ اس کے تمام معاملات اسلامی نظام کے مطابق ہوں تو اللہ کا وعدہ متحقق ہو گیا ہے اور ہو گا۔ اس کو اقتدار اعلیٰ نصیب ہوا ہے اور ہو گا۔ جب بھی امت نے ان شرائط کی مخالفت کی ہے اور کرے گی تو وہ ذلیل ہوئی ہے اور ہو گی۔ وہ دوسری اقوام کی دم چھلا بنی ہے اور بنی رہے گی۔ ذلیل ہوئی ہے اور ہو گی۔ دنیا کی اقوام کے مقام قیادت سے اسے گرایا گیا ہے اور گرائی جائے گی۔ اس پر خوف طاری ہوا ہے اور ہو گا۔ دشمنوں نے اسے اچک لیا ہے اور اچک لیا جائے گا۔

خبردار! یاد رکھو اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اس کی شرائط معروف و معلوم ہیں۔ جو بھی چاہے شرائط پوری کر کے آزما لے اور جو اللہ کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کو پورا کرے گا تو اللہ سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا اور کوئی نہیں ہے۔

--- ○○○---

# درس نمبر۱۵۶ ایک نظر میں

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ وہ انسانی زندگی کے مختلف طور طریقوں کو منظم کرتا ہے۔ تمام تعلقات ' تمام رابطوں ' تمام حرکات و سکنات ' اور تمام مسائل میں انسانی زندگی کی تنظیم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام روز مرہ کے انسانی آداب بھی سکھاتا ہے جس طرح وہ عمومی فرائض اور بڑے بڑے معاملات کی تعلیم دیتا ہے وہ ان تمام امور کے اندر نظم اور یکجہتی پیدا کرتا ہے اور زندگی کے تمام امور کو اللہ کی سمت موڑ دیتا ہے۔

یہ سورہ اس امر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس سورہ میں ایک طرف تو اسلام کے قوانین و حدود بتائے گئے ہیں اور دوسری طرف ایک جگہ بسنے والے انسانوں کے باہم ملاقات کے آداب سکھائے گئے ہیں یعنی قانون استیذان۔ اس کے ساتھ ساتھ اس پوری کائنات پر غور و فکر کے خالص فلسفیانہ اور سائنسی مضامین بھی لائے گئے ہیں۔ پھر اس میں اسلامی انقلاب کو روبعمل لانے کا دائمی منہاج بھی دیا گیا ہے کہ جب بھی تم اس پر عمل کرو گے زمین کا اقتدار اعلیٰ تمہیں مل جائے گا۔ اس سبق میں یہ آداب بھی سکھائے جاتے ہیں کہ جب تم کسی کے گھر ملنے کے لیے جاؤ تو اجازت طلب کرنے کے آداب یہ ہیں۔ پھر مجلس رسول ؐ کے آداب یہ ہیں۔ پھر یہ کہ ملاقات اور کھانے پینے اور ضیافت کرنے اور اس سے استفادہ کرنے کے آداب یہ ہیں۔ پھر باہم خطاب اور ہم کلام ہونے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمکلام ہونے کے آداب یہ ہیں۔ یہ تمام آداب اور ہدایات ایسی ہیں جن کا تعلق اسلامی سوسائٹی کی تنظیم اور تربیت سے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم اسلامی سوسائٹی کو چھوٹے بڑے تمام معاملات میں ترتیب دیتا ہے۔

---()()()---

# درس نمبر ۱۵۶ تشریح آیات

## ۵۸ --- تا --- ۶۴

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۫ؕ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۸﴾ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' لازم ہے کہ تمہارے لونڈی غلام اور تمہارے وہ بچے جو ابھی عقل کی حد کو نہیں پہنچے ہیں' تین اوقات میں اجازت لے کر تمہارے پاس آیا کریں: صبح کی نماز سے پہلے اور دوپہر کو جب کہ تم کپڑے اتار کر رکھ دیتے ہو' اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین وقت تمہارے لیے پردے کے وقت ہیں۔ ان کے بعد وہ بلا اجازت آئیں تو نہ تم پر کوئی گناہ ہے' نہ ان پر۔ تمہیں ایک دوسرے کے پاس بار بار آنا ہی ہوتا ہے' اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنے ارشادات کی توضیح کرتا ہے' اور وہ علیم و حکیم ہے۔ اور جب تمہارے بچے عقل کی حد کو پہنچ جائیں تو چاہیے کہ اسی طرح اجازت لے کر آیا کریں جس طرح ان کے بڑے اجازت لیتے رہے ہیں' اس طرح اللہ اپنی آیات تمہارے سامنے کھولتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے"۔

اس سورہ میں گھروں میں داخلہ کے طریق کار پر اس سے قبل بحث ہو چکی ہے۔ ذہن گھر میں داخلے سے قبل طلب اجازت

یہاں اب گھروں میں اندر آنے یا ان لوگوں کا ذکر ہے جن سے گھروں کے اندر پردہ لازمی نہیں ہے جبکہ داخل ہونے کے احکام استیذان ان پر بھی لازمی ہیں۔

مثلاً خدام ' غلام ' وہ لڑکے جو عورتوں کے معاملات سے ابھی تک اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ بلا روک ٹوک گھروں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ الا یہ کہ تین اوقات میں یہ بھی نہیں آسکتے جن میں لوگ کپڑے اتار کر آرام کرتے ہیں۔ ان مخصوص اوقات میں ان لوگوں کو بھی اجازت سے اندر آنا چاہئے۔ وہ اوقات یہ ہیں ' یعنی نماز فجر سے پہلے جب لوگ عموماً سونے کے کپڑوں میں ہوتے ہیں یا انھوں نے یہ کپڑے تبدیل نہیں کیے ہوتے اور باہر نکلنے کے کپڑے نہیں پہنے ہوتے اور دوپہر کے وقت جب لوگ قیلولہ کرتے ہیں اور عادی لباس اتار کر آرام کرتے ہیں اور نماز عشاء کے بعد کے وقت جب سب لوگ آرام کرتے ہیں اور گھروں کے لباس میں ہوتے ہیں۔

یہ اوقات "اوقات عورات" ہیں یعنی ان اوقات میں لوگ کپڑے اتار دیتے ہیں۔ ان اوقات میں خانگی نوکروں کے لیے لازم ہے کہ وہ گھر کے اندر اجازت لے کر جائیں اور ان نوعمر لڑکوں کے لیے بھی اجازت ضروری ہے جو اگرچہ بالغ نہ ہوئے ہوں لیکن سیانے ہو گئے ہوں۔ یہ اس لیے کہ ان کی نظریں اہل خانہ کے ننگے اجسام پر نہ پڑ جائیں۔ یہ وہ آداب ہیں جن کے سلسلے میں آج کے دور جدید میں بھی خانگی زندگی میں عمل نہیں کیا جاتا اور یہ پابندیاں نہ کرنے کے نفسیاتی ' اعصابی اور اخلاقی اثرات کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ نوکروں کی نظریں مالکان خانہ پر نہیں پڑتیں اور یہ کہ قبل از بلوغ مراہق لڑکے ایسی باتوں سے بے خبر ہوتے ہیں حالانکہ ماہرین نفسیات یہ کہتے ہیں کہ بچپن میں بچوں کی نظریں جن مناظر پر پڑتی ہیں بعد کے زمانے میں ان کا اثر بھی بچے کی زندگی پر پڑتا ہے اور ان کی وجہ سے وہ ایسی نفسیاتی اور اعصابی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جن کا علاج ہی نہیں ہوتا۔ یاد رہے کہ ہمارے دور میں علم النفس نے خوب ترقی کر لی ہے۔ اللہ علیم و خبیر ہے۔ اس نے اہل ایمان کو اس قسم کے بلند آداب سکھائے کیونکہ وہ ایک ایسی امت پیدا کرنا چاہتا تھا جس کے اعصاب صحیح و سلامت ہوں ' جس کا سینہ صحیح ہو ' جس کا شعور پاکیزہ ہو ' جس کے دل پاک ہوں اور جس کے تصورات صاف اور ستھرے ہوں۔

ان تین اوقات کو اس لیے مخصوص کیا گیا ہے کہ ان میں بالعموم لوگ لاپرواہی کی حالت میں ہوتے ہیں اور اس گمان پر کہ ان اوقات میں باہر کا کوئی آدمی اندر نہیں آتا ' لوگ تن ڈھانپنے کی پرواہ نہیں کرتے۔ اگر تمام اوقات میں ملازمین خانہ اور چھوٹے لڑکوں کے لیے اجازت لینے کو لازم کر دیا جاتا تو اس پر عمل کرنے میں بڑی دقت ہوتی کیونکہ ملازم اور چھوٹے بچے ہروقت آتے جاتے رہتے ہیں۔

طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰي بَعْضٍ ( ٢٤ : ٥٨ ) "تمھیں ایک دوسرے کے پاس آنا جانا رہتا ہے"۔ یوں اللہ تعالیٰ نے پردہ داری کا بھی انتظام کر دیا ' مشکل کو بھی دور کر دیا اور مشقت اور حرج کو بھی دور کر دیا۔ اگر دوسرے اجنبی بالغوں کی طرح ہروقت ان کے لیے بھی اجازت لینا لازم کر دیا گیا ہوتا تو اس میں تمھارے لیے مشکلات ہوتیں۔

چھوٹے لڑکے جب سن بلوغ کو پہنچ جائیں تو وہ بھی اجنبی لوگوں کے حکم میں آ جائیں گے اور وہ اسی حکم میں آ جائیں گے جو عام حالت استیذان میں لوگوں کے لیے مقرر ہے۔

آخر میں کہا جاتا ہے۔

وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ( ۲۴ : ۵۸ ) "اور اللہ علیم و حکیم ہے"۔ کیونکہ قانون سازی اور اخلاقی رویہ کے اثرات کے بارے میں انسانوں کے مزاج کو اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کے لیے کیا مفید ہے اور کیا مفید نہیں ہے۔

--- ○○○---

اس سے پہلے یہ حکم آیا تھا کہ عورتیں اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں تاکہ اسلامی معاشرے کے اندر کوئی جنسی فتنہ نہ آئے۔ یہاں ایسی بوڑھی عورتوں کو اس سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے جن کے اندر مردوں کے ساتھ معاشرت کی کوئی رغبت باقی نہیں رہتی ہے اور ان کے اجسام کے اندر بھی ایسی کوئی فتنہ سامانی نہیں ہے۔

وَ الْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ ؕ وَ اَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝

"اور جو عورتیں جوانی سے گزری بیٹھی ہوں، نکاح کی امیدوار نہ ہوں، وہ اگر اپنی چادریں اتار کر رکھ دیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں۔ تاہم وہ بھی حیاداری ہی برتیں تو ان کے حق میں اچھا ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔

یہ عورتیں جو جوانی گزار بیٹھی ہیں، یہ اگر اپنے خارجی کپڑے اتار دیں تو ان کے لیے کوئی حرج نہیں ہے۔ ہاں ان پر بھی لازمی ہے کہ وہ اپنی عورات کو ظاہر نہ کریں اور نہ اپنی زینت کو ظاہر کریں۔ تاہم ان کے لیے بھی بہتر یہی ہے کہ وہ ڈھکی چھپی رہیں اور اپنے کشادہ کپڑے اوڑھے رہیں۔ اس کو زیادہ عفت مآبی سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی عفت اور پاکیزگی کے لیے زیادہ قابل ترجیح امر ہے۔ کیونکہ تبرج اور اظہار زینت اور جنسی فتنے کے درمیان گہرا تعلق ہے اور حجاب اور پردے اور عفت و پاکیزگی کے درمیان گہرا تعلق ہے۔ یہ ہے اسلامی نظریہ پاکیزگی اور عفت۔ خلاصہ یہ کہ اسلام ان امور کو پردے میں رکھتا ہے جو دیکھنے والے کے لیے شہوت انگیز ہوں۔

وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ( ۲۴ : ۶۰ ) "اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے"۔ وہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔ اسے وہ باتیں بھی معلوم ہیں جو زبان سے ادا ہوتی ہیں اور وہ بھی معلوم ہیں جو دلوں میں گزرتی ہیں۔ اسلامی احکام کا دارو مدار نیت اور ضمیر کے احساس پر ہوتا ہے۔

--- ○○○---

اب قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کے احکام۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى
الْمَرِيضِ حَرَجٌ وَلَا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَن تَأْكُلُوا مِن بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ
آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ
أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ عَمَّاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخْوَالِكُمْ أَوْ بُيُوتِ خَالَاتِكُمْ أَوْ مَا
مَلَكْتُم مَّفَاتِحَهُ أَوْ صَدِيقِكُمْ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ
أَشْتَاتًا ۚ فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِندِ اللَّهِ
مُبَارَكَةً طَيِّبَةً ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٦١﴾ ع ۴ ۸
۱۴

"کوئی حرج نہیں اگر کوئی اندھا' یا لنگڑا' یا مریض (کسی کے گھر سے کھالے) اور نہ تمہارے اوپر اس میں کوئی مضائقہ ہے کہ اپنے گھروں سے کھاؤ یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے' یا اپنی ماں نانی کے گھروں سے' یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے' یا اپنی بہنوں کے گھروں سے' یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے' یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے' یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے' یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے' یا ان گھروں سے جن کی کنجیاں تمہاری سپردگی میں ہوں' یا اپنے دوستوں کے گھروں سے۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ تم لوگ مل کر کھاؤ یا الگ الگ۔ البتہ جب گھروں میں داخل ہوا کرو تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو' دعائے خیر' اللہ کی طرف سے مقرر فرمائی ہوئی' بڑی بابرکت اور پاکیزہ۔ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے آیات بیان کرتا ہے' توقع ہے کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لوگے"۔

روایات میں آتا ہے کہ لوگ ان مذکورہ گھروں سے کھانا کھایا کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے وہ اجازت نہ لیا کرتے تھے۔ اپنے ساتھ وہ فقراء اندھوں' لنگڑوں اور مریضوں کو بھی کھانا کھلاتے تھے۔ اب لوگوں نے یہ خیال کیا کہ مذکورہ بالا گھروں کے مالکوں سے بھی اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ خیال مسلمانوں کے دلوں میں اس وقت پیدا ہوا جب یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ "اور آپس میں اپنے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ"۔ اہل ایمان اس قدر حساس تھے کہ وہ ہر وقت سوچتے رہتے تھے کہ کہیں ان سے قرآن کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرماکر ان کو اجازت دے دی کہ ان گھروں سے وہ کھانا کھا سکتے ہیں۔ اس طرح اندھے' لنگڑے اور مریض فقراء کو بھی مالکان سے کھانے کی حد تک اجازت لینے سے مستثنیٰ کر دیا گیا اور قریبی رشتہ داروں کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اکیلے یا ان غرباء کے ساتھ اپنے رشتہ دار کے ہاں کھانا کھالیں۔ یہ ایسے حالات ہیں کہ اہل خانہ بالعموم ایسے

لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور لوگوں کا عام رویہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ اس طرح کے گھروں سے کھانا کھاتے اور کھلاتے ہیں لیکن اس میں اسلامی معاشرے کے عمومی قواعد کا لحاظ رکھا جائے گا۔یعنی

لا ضرر و لا ضرار "نہ نقصان دیتا ہے اور نہ نقصان اٹھاتا ہے"۔ اور لا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفس "حلال نہیں کسی مسلمان کا مال مگر اس کے دل کی خوشی کے ساتھ"۔ یہ آیت چونکہ ایک قانونی آیت ہے۔ اس لیے ہم اس کے طرز ادا پر قدرے بحث کریں گے۔ فقروں کی ترتیب اور تشکیل ایسی ہے کہ مفہوم شیشہ کی طرف صاف صاف ذہن میں آ جاتا ہے۔ نیز رشتہ داریوں کی ترتیب کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔ آغاز میں بیٹوں اور خاوند اور بیوی کے گھروں کا ذکر نہیں کیا گیا لیکن ان سے مضمون کا آغاز کیا گیا اور ان کو بُيُوتِكُمْ "تمہارے گھروں" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ بیٹوں کے گھر اپنے گھر ہوتے ہیں اور بیوی کے لیے خاوند کا گھر اور خاوند کے لیے بیوی کا گھر اپنا گھر ہوتا ہے۔ اس کے بعد آباء و اجداد کے گھر کا ذکر ہے۔ اس کے بعد ماں اور نانی کے گھروں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد بھائیوں کے گھروں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد بہنوں کے گھروں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد چچاؤں کے گھروں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد پھوپھیوں کے گھروں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد ماموں کے گھروں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد خالاؤں کے گھروں کا ذکر ہے اور اس کے بعد اس شخص کے حق کا ذکر ہے جو اموال پر خازن اور نگران ہے۔ اس کے لیے جائز ہے کہ وہ بقدر ضرورت مال زیر نگرانی سے کھائے۔ اس کے ساتھ دوستوں کے گھر کا بھی ذکر ہے کہ ایک دوست ' دوست کے گھر سے کھانا کھا سکتا ہے بشرطیکہ وہ دوست کے لیے اذیت اور ضرر کا باعث نہ بنے کیونکہ بسا اوقات دوست ' دوست کے گھر بغیر اجازت کے کھا پی سکتے ہیں۔

اب ان گھروں کے بیان کے بعد جن میں کھانا جائز ہے ' یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کھانا کس حال میں کھایا جائے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا (٢٤ : ٦١) "اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم لوگ مل کر کھاؤ یا الگ الگ"۔ عربوں میں سے بعض لوگوں کا ایام جاہلیت میں رواج تھا کہ ان میں سے کوئی شخص بھی کسی ساتھی کے بغیر کھانا نہ کھاتا تھا۔ اگر کوئی مہمان یا ساتھی نہ ملتا تو وہ کھانا ہی نہ کھاتے تھے۔ اس رسم کو اللہ نے ختم کر دیا کیونکہ بعض اوقات اس سے مشکلات پیدا ہوتی تھیں۔ معاملے کو آسان کر دیا کہ کوئی اکیلے کھاتا ہے یا دوسروں کے ساتھ کھاتا ہے دونوں صورتیں مناسب ہیں۔

گھروں اور حالت طعام کے بیان کے بعد اب یہاں ان گھروں میں داخل ہونے کا طریقہ بتایا جاتا ہے جن میں کھانا کھانے کی اجازت دی گئی ہے۔

فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً

(٢٤ : ٦١) "البتہ جب تم گھروں میں داخل ہوا کرو تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو ' دعائے خیر اللہ کی طرف سے مقرر فرمائی ہوئی ' بڑی بابرکت اور پاکیزہ"۔ یہ ایک نہایت ہی لطیف تعبیر ہے اس قوی رابطے کی جو مذکورہ بالا رشتوں کے اندر

پایا جاتا ہے ۔ یعنی اپنے نفسوں پر سلام کرو کیونکہ جو شخص اپنے رشتہ داروں یا دوستوں پر سلام کرتا ہے وہ دراصل اپنے اوپر سلامتی بھیجتا ہے اور جو سلام وہ کرتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے ۔ سلام کے اندر اللہ کی طرف سے ایک روحانی پھونک ہے اور دونوں فریقوں کے درمیان دین کا مضبوط رشتہ ہے' قریبی رشتہ جو سلام کی وجہ سے قائم ہوتا ہے ۔ یہ نہایت ہی اٹوٹ رشتہ ہے ۔

یوں اہل ایمان کو اپنے رب کے ساتھ مربوط کیا جاتا ہے ۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (٢٤ : ٦١) "اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے آیات بیان کرتا ہے توقع ہے کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو گے"۔ تمہیں یہ بات معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کے طے کردہ نظام زندگی میں کس قدر حکمت پیش نظر رکھی گئی ہے اور کس قدر موزوں اور مقدس نظام ہے ۔

---()()()---

اب روئے کلام رشتہ داروں کے درمیان تعلقات کے موضوع سے آگے بڑھ کر' اس عظیم خاندان کی شیرازہ بندی میں داخل ہوتا ہے جسے امت مسلمہ کہتے ہیں ۔ اس خاندان کے سربراہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ۔ مسلمانوں کے سربراہ اور قائد ہیں ۔ آپ کی مجلس کے بعض آداب کی تعلیم یہ ہے :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا
مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ
اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ
لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾ لَا تَجْعَلُوْا دُعَاۗءَ
الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاۗءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۭ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ
فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ۭ وَيَوْمَ 9
۲ع يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾

۱۵ "مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسول کے ساتھ ہوں ۔ تو اس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں ۔ اے نبی' جو لوگ تم سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور رسول کے ماننے والے ہیں' پس جب وہ اپنے کسی کام سے اجازت مانگیں تو جسے تم چاہو' اجازت دے دیا کرو ۔ اور ایسے لوگوں

کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کیا کرو' اللہ یقیناً غفور و رحیم ہے۔ مسلمانو' اپنے درمیان رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کا سا بلانا نہ سمجھ بیٹھو۔ اللہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے سٹک جاتے ہیں۔ رسول ؐ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہئے کہ وہ کسی فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آ جائے۔ خبردار رہو' آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ تم جس روش پر بھی ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔ جس روز لوگ اس کی طرف پلٹائے جائیں گے وہ انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔

ابن اسحاق نے اس آیت کی شان نزول میں یہ روایت نقل کی ہے کہ جنگ احزاب کے موقع پر جب قریش تمام اقوام کو جمع کر کے مدینہ پر چڑھا لائے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے دفاع میں مدینہ کے گرد خندق کھودنے کا حکم دیا۔ خندق کھودنے میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کام شروع کیا تاکہ اہل ایمان جوش و خروش سے کام کریں۔ خندق کھودنے کے کام میں مسلمانوں نے خوب جوش و خروش سے کام کیا۔ آپ نے بھی ایک نمونہ اور مثال قائم کی اور انہوں نے بھی مثال قائم کر دی۔ بعض منافقین نے اس کام میں رسول اللہ ؐ اور مسلمانوں سے پیچھے رہنے اور سست روی اختیار کرنے کا مظاہرہ کیا۔ وہ چھوٹے بڑے کاموں کا بہانہ بنا کر نکل جاتے اور بعض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لیے بغیر کھسک جاتے تھے جبکہ مسلمانوں کا عمل یہ تھا کہ جب ان کو کوئی ضروری کام پیش آتا تو وہ رسول اللہ ؐ سے ذکر کرتے۔ آپ ؐ اجازت دیتے اور وہ شخص کام کر کے جلدی واپس کام پر آ جاتا۔ اور یہ رویہ مسلمان زیادہ ثواب کمانے کی غرض سے اختیار کرتے۔ اس موقع پر اللہ نے یہ آیات نازل کیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ سے آخر تک سبب نزول جو بھی ہو' بہرحال ان آیات کے اندر جماعت مسلمہ کے تنظیمی قواعد و آداب کا ذکر کیا گیا ہے اور مسلمانوں کے قائد کے احکام کے سلسلے میں آداب بتائے گئے ہیں۔ اور جب تک کوئی جماعت اپنے امیر کے ساتھ ایسے ہی اصولوں کی گہرے جذبات اور ضمیر کی گہرائیوں سے پابندی نہ کرے گی اس وقت تک جماعت کا نظم و نسق درست نہیں ہو سکتا۔ ان آداب کو جماعت مسلمہ کے اندر ایک پختہ روایت' ایک معمول بہا عادت اور سخت قانون کی طرح جاری ہونا چاہئے۔ اگر ایسا نہ ہو گا تو وہ جماعت نہ ہو گی بلکہ منتشر افراد کا ایک انبوہ ہو گا۔

وَ اِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ (۲۴: ۶۲) "اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسول ؐ کے ساتھ ہوں تو اس کی اجازت کے بغیر نہ جائیں"۔ امر جامع سے مراد وہ امر ہے' جس میں تمام جماعت مسلمہ کا اشتراک ضروری ہو۔ کسی مشاورت کا موقع ہو یا جنگ کا موقع ہو۔ یا عام اجتماعی کاموں کا موقع ہو۔ ایسے مواقع پر اہل ایمان کا فرض ہے کہ رسول اللہ ؐ سے اجازت لے کر جائیں۔ آپ کے بعد اپنے امام اور اپنے انچارج سے اجازت لے کر جائیں تاکہ مسلمانوں کی زندگی اور ان کے ادارے منظم طریقے سے چل سکیں اور ان میں طوائف الملوکی نہ ہو اور کوئی بھی کام پورے نظم اور وقار کے ساتھ ہو۔

یہ لوگ جو اس قسم کا ایمان لاتے ہیں' پھر اس قسم کے آداب پر عمل کرتے ہیں اور تحریک کی ڈیوٹی سے صرف اس وقت رخصت مانگتے ہیں جب وہ مجبور ہوں۔ اپنے ایمان اور اپنی تربیت کی وجہ سے وہ ڈیوٹی چھوڑ کر نہیں بھاگتے جبکہ

امت اور جماعت کو اجتماعی جدوجہد کی سخت ضرورت ہو لیکن قرآن مجید اجازت دینے اور نہ دینے کے فیصلے کا اختیار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتا ہے۔ آپ کے بعد یہ اختیار اب جماعت کے سربراہ کو حاصل ہے کہ وہ اجتماعی کاموں سے کسی کو مستثنیٰ کرتا ہے یا نہیں۔

فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ (۲۴ : ۶۲) "پس جب وہ اپنے کسی کام سے اجازت مانگیں تو جسے تم چاہو اجازت دے دیا کرو"۔ اس سے قبل اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تنبیہ فرمائی تھی کہ کیوں آپ نے ان منافقین کو اجازت دی۔

عَفَي اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰي يَتَبَيَّنَ لَكَ الْخَبِيْثُ مِنَ الطَّيِّبِ "اللہ نے تمہیں معاف کر دیا کہ کیوں تم نے ان کو اجازت دی تاکہ تم پر یہ امر واضح ہو جاتا کہ خبیث کون ہے اور پاک کون ہے"۔ یہاں یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دی گئی ہے کہ آپ کسی کو اختیار دیں یا نہ دیں۔ اس طرح مسلمانوں کے لیے ایک اور آسانی پیدا کر دی گئی کیونکہ بعض اوقات نہایت ہی اہم ضروریات لاحق ہو جاتی ہیں اس لیے جماعت کی قیادت کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ موازنہ کرے کہ کسی کے لیے درپیش مہم میں جانا ضروری ہے یا کسی خصوصی ضرورت کے لئے پیچھے رہنا ضروری ہے۔ آخری اختیار قائد کو دے دیا گیا تاکہ وہ حالات کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرے۔

یہاں بہرحال اس طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ انفرادی ضرورتوں پر قابو پایا جائے، مسائل کا حل نکالا جائے اور اجتماعی مہم کو ترجیح دی جائے۔ تاہم اگر کوئی شخص اپنی کسی جائز ضرورت کے لیے بھی پیچھے رہتا ہے تو یہ امر جائز ہونے کے باوجود بھی ایک قصور ہے اور اس پر اللہ سے مغفرت طلب کرنا ضروری ہے۔

وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۴ : ۶۲) "اور ایسے لوگوں کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کیا کرو، اللہ یقیناً غفور و رحیم ہے"۔ یوں ایک مومن کے ضمیر پر پابندی لگائی جاتی ہے کہ وہ اجازت طلب نہ کرے، اگر کوئی بھی صورت نکلے تو وہ اپنے آپ کو عذر طلب کرنے سے بچانے کی کوشش کرے۔

نیز یہاں یہ بھی بتا دیا گیا کہ جو لوگ اجازت طلب کرتے ہیں وہ درخواست استیذان نہایت ہی مؤدبانہ الفاظ میں پیش کریں اور عوام الناس کی طرح (یا محمد) یا (ابو القاسم) یا اور عوامی طریقے سے خطاب نہ کریں بلکہ مودبانہ الفاظ یا رسول اللہ، یا نبی اللہ کے الفاظ سے مخاطب کریں۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا (۲۴ : ۶۳) "مسلمانو، اپنے درمیان رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کا بلانا نہ سمجھ بیٹھو"۔ چاہئے کہ تمہارے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے بھرے ہوئے ہوں۔ لہٰذا رسول اللہ کے احترام میں مناسب ترین الفاظ کا انتخاب کرو۔ یہ قیادت کے لیے ایک نہایت ہی ضروری اصول ہے اس لیے کہ کسی مربی، کسی استاد، کسی قائد کا مناسب احترام لازم ہے اور کارکنوں کے شعور اور سلوک میں قائد کے احترام اور محبت ہو۔ ایک کارکن اپنے قائد کے ساتھ ضرورت سے زیادہ بے تکلف نہ ہو۔

اس کے بعد منافقین کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر کھسک جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی لوٹ لے کر بھاگ جاتے ہیں۔ اگر وہ مسلمانوں اور رسول اللہ کی نظروں سے اپنے آپ کو چھپاتے ہیں تو اللہ کی نظروں سے تو وہ چھپ نہیں سکتے۔

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا (٢٤ : ٦٣) "اللہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں سے ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی آڑ لیے ہوئے چپکے سے کھسک جاتے ہیں"۔ یہ اس شخص کی عجیب تصویر کشی ہے جو مجلس کی نظروں سے چھپ چھپا کر کھسک جاتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مطلوب ہے کہ یہ شخص سامنے آکر اجازت لے کر نہیں جاتا بلکہ چور کی طرح چھپ کر نکلتا ہے اور اس کی یہ حرکت شعور کے اندر اس شخص کے لیے حقارت پیدا کر دیتی ہے۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

(٢٤ : ٦٣) "رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہئے کہ وہ کسی فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آجائے"۔ یہ ایک سخت تہدید آمیز تنبیہ اور مرعوب کن ڈراوا ہے۔ ان لوگوں کو ڈرنا چاہئے جو امر رسول کی مخالفت کرتے ہیں، جو رسول اللہ کے طریقوں سے مخالف طریقوں پر چلتے ہیں اور ذاتی کاموں اور ذاتی مفادات کے لیے اجتماعی ٹیموں کی صف سے چپکے سے نکل جاتے ہیں۔ ان کو اس بات سے ڈرنا چاہئے کہ ان کے اندر اختلافات پیدا ہو کر وہ فتنہ عظیم میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ ان کی اقدار ہی نہ بدل جائیں، حق و باطل میں تمیز نہ رہے اور ان کا نظام متزلزل نہ ہو جائے۔ ان کے اندر پاک لوگوں اور خبیث لوگوں کا امتزاج ہو جائے، جماعتی معاملات میں فتور پڑ جائے اور جماعتی زندگی کی چولیں ڈھیلی ہو جائیں۔ اس طرح کہ کوئی شخص اپنے نفس کے بارے میں مطمئن نہ ہو۔ کوئی کسی حد پر نہ رکتا ہو۔ اور جماعت کے اندر سے خیر و شر کا معیار مٹ جائے۔ ایسے حالات تمام افراد جماعت کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔

اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (٢٤ : ٦٣) "یا ان پر دردناک عذاب آجائے"۔ چاہے یہ عذاب دنیا میں آجائے یا آخرت میں آئے۔ یہ عذاب اس لیے آئے گا کہ ان لوگوں نے حکم الٰہی کی مخالفت کی اور اس نظام کو ترک کر دیا جسے اللہ نے ان کے لیے پسند فرمایا تھا۔

یہ تنبیہ اور شدید ڈراوا یہاں ختم ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ سورہ نور بھی ختم ہوتی ہے اور خاتمہ کلام پر لوگوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ اللہ تمہارے تمام کرتوتوں سے واقف ہے۔ جو اچھے کام کرتے ہیں ان کو بھی جانتا ہے اور جو انحراف کی راہوں پر چل نکلے ہیں ان کو بھی جانتا ہے اور ایک دن وہ تمہارے سامنے تمہارا مکمل نامہ اعمال پیش کر دے گا۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (٢٤ : ٦٤) "خبردار رہو، آسمان و زمین میں جو کچھ ہے

اللہ کا ہے ـ تم جس روش پر بھی ہو اللہ اس کو جانتا ہے ـ جس روز لوگ اس کی طرف پلٹائے جائیں گے وہ انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں ـ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔

یوں اس سورہ کا خاتمہ اس مضمون پر ہوتا ہے کہ اہل ایمان کی نظریں اللہ سے متعلق ہو جاتی ہیں اور ان کو اللہ کے خوف اور خشیت سے ڈرایا جاتا ہے کیونکہ صرف خدا اور خشیت الٰہی اور تقویٰ انسان کو درست رکھنے کی آخری گارنٹی ہے ـ اللہ نے جو احکام اور نواہی دیئے ہیں ان پر عمل کرانے کا یہ آخری نگران ہے جو ہر مومن کے دل میں بیٹھا ہوتا ہے ـ اس سورہ میں جو اخلاق ' جو آداب اور جو قوانین وضع کیے گئے ہیں اور سب کو اسلامی نظام کا برابر حصہ بنایا گیا ہے ان کا محافظ تقویٰ اور خدا خوفی کو قرار دیا گیا ہے ـ

ڈیفنس کراچی ' جنوری ۱۹۹۴ء

---()()()---

# فی ظلال القرآن

## جلد ---- چہارم

## پارہ ----- ۱۸

## سورۃ الفرقان - ۲۵

۱--- تا--- ۲۰

# سورۃ الفرقان ایک نظر میں

یہ سورت پوری کی پوری بظاہر مکی نظر آتی ہے۔ اس پوری سورت میں 'مشرکین مکہ کی اسلام دشمنی' عناد' ہٹ دھرمی اور آپ کے خلاف مسلسل دست درازیوں' کج بحثیوں اور اسلام کی راہ کو مسلسل روکنے کی مخالفانہ کارروائیوں پر آپ کو تسلی دی گئی ہے۔ اور اطمینان دلایا گیا کہ اس مقابلے اور کشمکش میں آپ کو کامیابی ہوگی۔ بعض لمحات ایسے بھی آتے ہیں کہ نظروں آرہا ہے کہ گویا حضور اکرم ؐ کے زخموں پر مرہم لگائی جارہی ہے۔ آپ کے درد اور دکھ کا درماں کیا جارہا ہے۔ آپ کے سر پر قدرت کا دست شفقت ہے۔ آپ کو تسلی دی جارہی ہے اور آپ کے کاسہ دل کو اعتماد و اطمینان کے شراب طہور سے بھرا جارہا ہے اور اللہ کی نگرانی' رعایت و شفقت اور لطف و کرم کی باد نسیم کے خوشگوار جھونکے آپ ؐ کے چہرۂ مبارک کو چھو رہے ہیں۔

پھر یہ سورت' اس شدید جنگ کی تصویر کشی بھی کر رہی ہے' جو اللہ کے یہ بندے اور رسول ایک منکر حق انسانیت کے ساتھ برپا کیے ہوئے ہیں۔ یہ انسانیت اللہ و رسول کی دشمنی پر اتر آتی ہے' اسلام کے خلاف سخت مجادلہ کر رہی ہے' اہل ایمان کو گھروں سے نکال رہی ہے نہایت ہی مکروہ انداز میں' مسلمانوں پر دست درازی کر رہی ہے اور سخت سرکشی اور عناد میں مبتلا ہے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جو واضح' ناطق اور بین دلائل کے ساتھ راہ حق اور صراط مستقیم کی طرف بلا رہے ہیں وہ اس راہ سے دور جارہی ہے۔

جس سوسائٹی کے سامنے حضور محترم ؐ ان مشکل ترین حالات میں دعوت اسلامی پیش کر رہے ہیں اس عظیم دعوت کے بارے میں اس سوسائٹی کا تبصرہ یہ ہے۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ٍۨافْتَرٰهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ (۲۵ : ۴) "جن لوگوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے' وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے"۔ یا ان کا تبصرہ یوں ہے :

اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (۲۵ : ۵) "یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ صبح و شام املا کرائی جاتی ہیں"۔ اور خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تبصرہ کچھ یوں ہے۔

اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا "تم تو ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو"۔ اور رسول تو رسول ہیں ایک بشر ہیں۔ یہ لوگ خود اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ بات کرنے کی جرات کرتے ہیں۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا (۲۵ : ۶۰) "ان لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ رحمن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمان کیا ہوتا ہے کیا جسے تو کہہ دے اسے ہم سجدہ کرتے پھریں۔ یہ دعوت ان کی نفرت میں اور اضافہ کر دیتی ہے"۔ اور ان کی ہٹ دھرمی کو یہ سورت یوں ریکارڈ کرتی ہے۔

لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰي رَبَّنَا (۲۵ : ۲۱) "کیوں نہ فرشتے ہمارے پاس بھیجے گئے یا کیوں نہ یوں ہوا کہ ہم اپنے رب کو دیکھیں"۔ یہ تھا اس سوسائٹی کا دعوت اسلامی کے بارے ردعمل۔

لیکن انسانیت کا یہ طرز عمل کوئی نیا نہیں ہے۔ نوح علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزمان تک انسانوں نے تمام رسولوں کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ ہمیشہ ہر رسول کی بشریت ہی پر اعتراض ہوا اور اب رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت پر بھی وہی اعتراض ہے۔

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا (۲۵ : ۷) "یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے' اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو) دھمکاتا"۔ انہوں نے یہ اعتراض بھی کیا کہ اس رسول کے پاس وافر مقدار میں مال بھی نہیں۔

اَوْ يُلْقٰٓي اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا (۲۵ : ۸) "یا اس لیے کوئی خزانہ ہی اتار دیا جاتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ روزی حاصل کرتا"۔ اور انہوں نے قرآن کے طریقہ نزول پر بھی اعتراض کیا۔

لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (۲۵ : ۳۲) "اس شخص پر پورا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا"۔ اس تکذیب' استہزاء' افتراء اور بے حیائی کا مقابلہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔ یہ مقابلہ آپ اکیلے کر رہے تھے۔ ایسے حالات میں کر رہے تھے کہ نہ آپ کے پاس کوئی مال تھا اور نہ جاہ و مرتبہ تھا۔ اور آپ ان حالات پر راضی برضا تھے اور رب ذوالجلال سے کوئی شکوہ و شکایت نہ کرتے تھے۔ آپ اللہ کی طرف متوجہ تھے' صرف اس کی رضا اور خوشنودی کے طلبگار تھے اور اس کے سوا آپ کا کوئی مقصد و مطلوب نہ تھا۔ طائف سے واپس ہوتے ہوئے نہایت مشکلات میں آپ اپنے رب سے یوں ہمکلام ہوئے "اے رب اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو پھر مجھے کسی کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ تجھے اس وقت تک آزمانے کا حق ہے جب تک تو راضی نہ ہو جائے"۔

ان مشکل حالات کے مقابلے میں' اس سورت سے یوں نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی پناہ میں لے رہا ہے۔ اللہ حضور اکرم کی مشکلات اور تکالیف پر آپ کو تسلی دیتا ہے۔ آپ کے ساتھ ہمدردی اور شفقت کا اظہار کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی مشکلات' آپ کی پریشانیوں کو کم کیا جاتا ہے۔ آپ کو ہمت دی جاتی ہے کہ آپ اپنی

قوم کی ہٹ دھرمی، بے ادبی، گستاخی اور دست درازی کو برداشت کریں۔ یہ کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ دراصل اپنے خالق اور رازق کے ساتھ گستاخی اور دست درازی کر رہے ہیں جبکہ ان کا خالق اس پوری کائنات کا مدبر اور خالق بھی ہے اور وہ اس پوری کائنات کو چلا رہا ہے تو یہ لوگ اگر اپنے رب کے ساتھ یہ رویہ اختیار کرتے ہیں تو رسول اللہ کو چاہئے کہ وہ ان کی ان حرکات کی کوئی پرواہ نہ کریں۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰي رَبِّهٖ ظَهِيْرًا (۲۵: ۵۵) "اور اس خدا کو چھوڑ کر لوگ ان کو پوج رہے ہیں جو نہ ان کو نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ نقصان اور مزید یہ کہ کافر اپنے رب کے مقابلے میں ہر باغی کا مددگار بنا ہوا ہے"۔ اور دوسری جگہ ہے۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا (۲۵: ۳) "لوگوں نے اسے چھوڑ کر ایسے معبود بنالیے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں جو خود اپنے لیے کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، جو نہ مارتے ہیں اور نہ جلا سکتے ہیں اور نہ مرے ہوئے کو پھر اٹھا سکتے ہیں"۔ اور دوسری جگہ ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ (۲۵: ۶) "ان لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں رحمٰن کیا ہوتا ہے"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سورت میں ایک دوسرے انداز سے بھی تسلی دی جاتی ہے وہ یہ کہ کفار جس قدر گرے ہوئے ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ قابل نفرت ہے۔ یعنی آپ اعلیٰ زندگی اور اعلیٰ ماحول کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا (۴۳) اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۲۵: ۴۴)
"کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو، کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے"۔

کفار آپ کے ساتھ جو مجادلہ اور مباحثہ اور کٹ حجتی کرتے تھے۔ اللہ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کے ان پوچ سوالات کا تسلی بخش جواب دیا جائے گا۔

وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا (۲۵: ۳۳) "اور جب کبھی وہ تمہارے سامنے کوئی نرالی بات لے کر آئے اس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے تمہیں دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی"۔ آپ کی جدوجہد سے قبل بھی نبیوں نے یہ کام کیا، ان کی تکذیب کی گئی اور اللہ نے مکذبین کو ٹھکانے لگایا۔

قوم موسیٰ 'قوم نوح 'قوم عاد 'قوم ثمود ' اصحاب الرس 'اور ان پیغمبروں کے زمانوں کے درمیان اور پیغمبروں کی اقوام کے حالات کو ذرا پڑھیے۔

اور قیامت! ذرا یہ بھی دیکھ لو کہ وہاں ان کا حشر کیا ہو گا۔

اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰي وُجُوْهِهِمْ اِلٰي جَهَنَّمَ اُولٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ سَبِيْلًا

( ۲۵ : ۳٤ ) "جو لوگ اوندھے منہ جہنم کی طرف دھکیلے جانے والے ہیں ان کا موقف بہت برا ہے اور ان کی راہ حد درجہ غلط ہے"۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ وَ اَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ( ۱۱ ) اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّ زَفِيْرًا ( ۱۲ ) وَ اِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ( ۱۳ ) لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّ ادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا

( ۲۵ : ۱٤ ) "اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ اس گھڑی کو جھٹلا چکے ہیں اور جو اس گھڑی کو جھٹلائے اس کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے جب وہ دور سے ان کو دیکھے گی تو یہ اس کے غضب اور جوش کی آواز سن لیں گے اور جب یہ دست و پابستہ اس میں ایک تنگ جگہ ٹھونسے جائیں گے تو اپنی موت کو پکارنے لگیں گے۔ آج ایک موت کو نہیں بہت سی موتوں کو پکارو"۔

وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰي يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ( ۲۷ ) يٰوَيْلَتٰي لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ( ۲۵ : ۲۸ ) "اور منکرین حق کے لیے بڑا سخت دن ہو گا ظالم انسان اپنے ہاتھ چبائے گا اور کہے گا کاش میں نے رسول ؐ کا ساتھ دیا ہوتا' ہائے میری کم بختی' کاش میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا"۔

پھر آپ ؐ کو یوں بھی تسلی دی جاتی ہے کہ آپ کو جن مشکلات سے سابقہ درپیش ہے۔ یہ تمام حالات رسولان سابقہ کو بھی پیش آئے۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ يَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ( ۲۵ : ۲۰ ) "اے نبی ؐ ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجے تھے وہ سب بھی کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرنے والے لوگ تھے"۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ وَ كَفٰي بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّ نَصِيْرًا

"اے نبی' ہم نے تو اسی طرح مجرموں کو ہر نبی کا دشمن بنایا اور تمہارے لیے تمہارا رب ہی رہنمائی اور مدد کو کافی ہے"۔
ہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ صبر کریں اور اپنے پیروکاروں کو بھی صبر کرنے کی تلقین فرمائیں اور کافروں کے ساتھ قرآنی دلائل و براہین کے ذریعہ جہاد کریں۔ کیونکہ قرآن کے دلائل واضح' قوی اور وجدان کو گہرائی تک متاثر کرنے والے ہیں۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (۲۵ : ۵۲) "پس اے نبی کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو"۔ اور آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ راہ جہاد میں مشکلات کو برداشت کرتے چلے جائیں اور اپنے رب اور مولیٰ پر توکل فرمائیں۔

وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ۚ وَ كَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا (۲۵ : ۵۸) "اے نبی اس خدا پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اپنے بندوں کے گناہوں سے بس اس کا باخبر ہونا کافی ہے"۔

یوں اس سورت کے مضامین چلتے ہیں۔ ایک لمحے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی' تشفی' اطمینان اور اللہ کی طرف سے پناہ دی جاتی ہے۔ اگلے ہی لمحے میں مشرکین کی طرف سے اذیت رسانی' اور مشکلات آ جاتی ہیں۔ پھر مکذبین کی ہلاکت و تباہی آ جاتی ہے۔ یوں یہ سورت اپنے خاتمے کے قریب آ پہنچتی ہے۔ اس میں خوشگوار باد نسیم کے جھونکے بھی ہیں۔ نرمی' خوشی اور مسرت کے لمحات بھی ہیں۔ اطمینان و سلامتی کے اوقات بھی ہیں۔ یوں یہ سورت آ پہنچتی ہے۔ عباد الرحمٰن کی تصویر کشی کی پینٹنگ پر۔

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۲۵ : ۶۳) "رحمٰن کے اصلی بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام"۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو اس گمراہ سرکش اور کینہ پرور انسانیت کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے پاک و صاف ہوگئے ہیں اور وہ گویا انسانیت کے شجرۂ طیبہ کے پکے ہوئے پھل ہیں۔ جو بہت ہی میٹھا اور بہت ہی مفید اور موجب خیر و برکت ہے۔

سورت کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اللہ کی نظروں میں یہ پوری انسانیت پرکاہ کے برابر بھی نہیں ہے اگر اس بشریت میں یہ پاک لوگ اور موجب خیر و برکت افراد ہر وقت دست بدعا نہ ہوتے تو اللہ کبھی کا انسانیت کو نیست و نابود کر دیتا۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا (۲۵ : ۷۷) "اے نبی' لوگوں سے کہو میرے رب کو تمہاری کیا حاجت پڑی ہے۔ اگر تم اس کو نہ پکارو' اب کہ تم نے جھٹلا دیا ہے۔ عنقریب وہ سزا پاؤ گے کہ جان چھڑانی محال ہوگی۔

---()()()---

یہ تھے اس سورت کے سائے اور موضوعات - یہی اس سورت کے محور تھے اور یہی اس کے موضوعات ہیں جس پر یہ بحث کرتی ہے - یہ سب مضامین و موضوعات باہم مربوط ہیں - اور ان کو منقسم نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کے باوجود سورت کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جن میں مذکورہ بالا موضوعات لیے گئے ہیں -

کلام کا آغاز حمد باری سے ہوتا ہے کہ جس نے ازراہ کرم اپنے برگزیدہ بندے پر قرآن کریم نازل کیا ہے تاکہ یہ قرآن جہان والوں کے لیے ڈراوے کا سامان ہو - اور ان کو عقیدۂ توحید کی تعلیم دی جائے کہ اللہ وحدہ زمین و آسمانوں کا مالک و خالق ہے - اور وہ اپنی حکمت اور تدبیر سے اس کائنات کو چلا رہا ہے - اس کا کوئی بیٹا نہیں ہے - اور نہ اس کی بادشاہت میں اس کا کوئی شریک ہے لیکن ان حقائق کے باوجود لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ ایسی مخلوقات کو الٰہ بناتے ہیں جو اللہ کی پیدا کردہ ہیں اور ان میں قوت تخلیق نہیں ہے - یہ نظریاتی قرارداد ان الزامات و اتہامات کے بعد لائی گئی ہے جو انہوں نے حضور اکرمؐ پر عائد کیے اور جو بے حد اذیت ناک تھے - یہ کہ حضور اکرمؐ افتراء باندھتے ہیں' یہ کہ یہ پرانی کہانیاں ہیں جو کہیں سے نقل کرتے ہیں اور یہ کہ آپ تو ایک انسان ہیں جو بازاروں میں چلتے پھرتے اور کھانا کھاتے ہیں' پھر یہ کہ کیوں نہ ان کے ساتھ ایک فرشتہ نازل ہوا اور کیوں نہ ان پر بھاری خزانہ نازل ہوا' یا کیوں ان کے پاس باغات نہیں ہیں جن سے وہ کھاتے پیتے اور پھر انتہائی بے حیائی کے ساتھ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام بھی عائد کیا کہ آپ پاگل ہیں - یہاں اللہ کے بارے میں ان کی گستاخیاں پہلے لائی گئی ہیں - اور رسول اللہؐ کے بارے میں ان کی یہ گستاخیاں بعد میں تاکہ رسول اللہؐ کے لیے یہ بات باعث تسلی ہو کہ یہ تو اللہ کے بارے میں بھی یہ کچھ کہتے ہیں - ان وجوہات کی بنا پر اعلان کر دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ گمراہ ہیں اور قیامت کے منکر ہیں - اور یہ اس عذاب کے مستحق ہیں جو ان کے لیے تیار کیا گیا ہے - یعنی جہنم کا عذاب جس کی نہایت تنگ جگہ میں ان کو باندھ کر گرایا جائے گا - اس کے بالمقابل مومنین کی حالت بتائی جاتی ہے جو کھلے اور وسیع باغات میں ہوں گے اور وہاں ان کے لیے وہ کچھ ہو گا جو وہ چاہیں گے - پھر قیامت کے دن ان لوگوں کے سامنے ان کے وہ معبود بھی پیش ہوں گے - وہ ان تمام باتوں کی تردید و تکذیب کر دیں گے جو یہ کرتے تھے اور جو غلط عقائد و نظریات یہ رکھتے تھے اور سب سے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور منکرین کو جواب دیتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ تمام رسول کھانا کھاتے رہے ہیں اور بازاروں میں اپنی ضروریات کے لیے جاتے رہے ہیں -

دوسرے سبق میں مکذبین کی اس دست درازی اور سرکشی کو لیا جاتا ہے کہ رسول اللہ پر فرشتے کیوں نازل نہیں ہوئے یا یہ کہ ہم کو رب تعالیٰ دکھایا کیوں نہیں جاتا - اس کے بعد ان کے سامنے قیامت کا وہ منظر پیش کیا جاتا ہے جس میں فرشتوں کو دیکھ لیں گے لیکن ان کافروں پر وہ دن بہت ہی سخت ہو گا - اس دن کو ظالم اپنے ہاتھ کاٹیں گے - مارے حسرت کے اور یہ تمنائیں کریں گے کہ کاش وہ رسولؐ کے ساتھ راہ ہدایت لیتے اور یہ منظر بھی رسول اللہؐ کو تسلی دینے کے لیے لایا گیا' کہ آپ پریشان نہ ہوں' نہ ماننے والے قرآن کو چھوڑ کر خود اپنا نقصان کر رہے ہیں' وہ قرآن کے طریقہ نزول پر اعتراض کرتے ہیں کہ اللہ نے پورے قرآن کریم کو ایک بار کیوں نہیں اتارا؟ ان کے سوال کے جواب میں قیامت کا ایک منظر پیش کیا جاتا ہے جس میں ان مکذبین کو منہ کے بل جہنم میں گرایا جاتا ہے - اور ان سے قبل قوم موسیٰ' قوم نوح' اقوام

عاد و ثمود ' اصحاب الرس اور دوسری اقوام کا انجام بھی بتایا جاتا ہے ۔ اور بڑے تعجب سے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ قوم لوط کے کھنڈرات پر سے گزرتے ہیں لیکن عبرت نہیں پکڑتے ۔ ان باتوں سے حضورؐ کو تسلی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ انتہائی تحقیر کے ساتھ کہتے تھے ۔

اَھٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰہُ رَسُوْلًا (۲۵ : ۴۱) "کیا یہ شخص اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے" ۔ اللہ ان کے اس توہین آمیز ریمارکس کے بدلے ان کی تعریف یوں فرماتا ہے کہ یہ لوگ حیوان ہیں بلکہ حیوانوں سے بھی بد تر ہیں ۔

اِنْ ھُمْ اِلَّا کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ سَبِیْلًا (۲۵ : ۴۴) "یہ نہیں ہیں مگر مویشیوں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ" ۔ چوتھا سبق مظاہر کائنات کو لیتا ہے کہ کس طرح سایہ اپنا کام کرتا ہے ۔ گردش لیل و نہار کا نظام ' خوشگوار ہوائیں ' بادلوں کو اٹھاتی ہوئی اور بارش برساتی ہوئی ۔ پھر پانی سے انسان اور دوسری مخلوقات کی تخلیق کا عمل اور پھر ایسے احسن الخالقین کو چھوڑ کر لوگوں کی طرف سے ایسے معبودوں کی بندگی کرنا جو نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان ۔ پھر منکرین کس طرح اس کے ساتھ شریک ٹھہرا کر سرکشی کرتے ہیں اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ رحمٰن کی بندگی کرو تو نہایت ہی بے حیائی کے ساتھ یہ کہنے کی جسارت کرتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہوتا ہے ۔ حالانکہ رحمٰن تو یہ ہوتا ہے ۔

تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِیْھَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا (۲۵ : ۶۱) وَ ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَ النَّھَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّکَّرَ اَوْ اَرَادَ شُکُوْرًا

(۲۵ : ۶۲) "بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور چمکتا ہوا چاند روشن کیا ۔ وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا ' ہر اس شخص کے لیے جو سبق لینا چاہے یا شکر گزار ہونا چاہے" ۔ اور آخری سبق میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے صحیح بندے کیسے ہوتے ہیں ' جو اس کی بندگی کرتے ہیں ' سجدے کرتے ہیں اور وہ تمام صفات بتائی جاتی ہیں جو ان بندوں میں پائی جاتی ہیں اور لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ وہ گناہوں سے توبہ کر کے عباد اللہ اور عباد الرحمٰن کی راہ اپنا سکتے ہیں ۔ اور یہ مقام پا سکتے ہیں ۔ اور اس جزاء کے مستحق ہو سکتے ہیں ۔

اُولٰٓئِکَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ یُلَقَّوْنَ فِیْھَا تَحِیَّةً وَّ سَلٰمًا (۲۵ : ۷۵)

"یہ لوگ ہیں جو اپنے صبر کا پھل منزل بلند کی شکل میں پائیں گے ۔ آداب و تسلیمات سے ان کا استقبال ہوگا" ۔ آخر میں کہا جاتا ہے کہ اس دنیا میں اگر اللہ کے برگزیدہ بندے نہ ہوتے تو اللہ ان گمراہ انسانوں کی کوئی پرواہ ہی نہ کرتا ۔ جو انکار اور تکذیب کرتے ہیں ۔

ان لوگوں کی اس حقارت اور ناقابل التفات ہونے کو بھی یہاں اس لیے لایا گیا ہے کہ حضورؐ کو تسلی ہو کہ یہ لوگ اگر نہیں مانتے تو یہ ہیں ہی ایسے ۔ اس سورت کی فضا اور حضورؐ کو تسلی دینے کے لیے یہ آخری ریمارکس سورت کے مضامین کے ساتھ نہایت ہی موزوں اور ہم آہنگ ہے ۔ (یعنی اے پیغمبر ' نہ اللہ ان کو اہمیت دیتا ہے اور نہ آپ دیں)

# درس نمبر ۱۵۷ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۲۰

---

سُورَةُ الفُرقَان (۲۵) مَكِّيَّة (۴۲) آیاتها ۷۷ رکوعاتها ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرَا ۙ﴿۱﴾ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا ﴿۲﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّهُمْ یُخْلَقُوْنَ وَلَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا یَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ سارے جہان والوں کے لیے خبردار کر دینے والا ہو وہ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے' جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے' جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے' جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔ لوگوں نے اسے چھوڑ کر ایسے معبود بنا لیے جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں' جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے' جو نہ مار سکتے ہیں' نہ جلا سکتے ہیں' نہ مرے ہوئے کو پھر اٹھا سکتے ہیں"۔

یہ آغاز ہی صاف صاف ظاہر کر دیتا ہے کہ اس سورت کا بڑا محور اور موضوع کیا ہے؟ یہ کہ یہ کتاب من جانب اللہ نازل شدہ ہے اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تمام انسانوں کے لیے ہے۔ یہ کہ اس دعوت کا

بنیادی پیغام یہ ہے کہ اللہ وحدہ لا شریک ہے' اس کا نہ کوئی بیٹا ہے اور نہ کوئی شریک ہے' وہ وحدہ اس پوری کائنات کا مالک ہے' وحدہ مدبر ہے اور اپنی حکمت و تدبیر کے ساتھ اسے چلا رہا ہے۔ ان حقائق کے باوجود شرک کرنے والے شرک کرتے ہیں۔ افتراء پردازی کرنے والے افتراء باندھتے ہیں اور جھگڑنے والے جھگڑتے ہیں اور حد سے بڑھنے والے حدود پار کرتے رہتے ہیں۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰي عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (۲۵ : ۱) "نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان' اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ سارے جہاں والوں کے لیے خبردار کر دینے والا ہو"۔ تبارک' برکت سے باب مفاعلہ ہے یعنی نہایت متبرک ہے۔ یعنی وہ بہت زیادہ فیوض و برکات والا ہے۔ یہاں اللہ جل شانہ' کا نام لینے کے بجائے اسم موصول سے ذات باری کو الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ (۲۵ : ۱) لایا گیا ہے' کیونکہ یہاں سورت میں مباحث "صداقت و رسالت" پر ہے۔ اور اس کے ساتھ ذات باری کا گہرا تعلق ہے نیز نزول قرآن کے ساتھ بھی ذات باری کا تعلق ہے کہ یہ ذات ہی نازل کرنے والی ہے۔

یہاں قرآن مجید کو فرقان اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں جو تعلیمات دی گئی ہیں وہ حق و باطل اور ہدایت و ضلالت کے درمیان بہت ہی واضح فرق کر دیتی ہیں بلکہ اس کے ذریعہ اسلامی نظام زندگی اور غیر اسلامی نظام زندگی کے درمیان اور عہد جاہلیت اور عہد اسلام کے درمیان واضح فرق و امتیاز دکھایا گیا ہے اس لیے کہ اسلام انسانی شعور اور انسانی ضمیر کے اندر ایک واضح طریق زندگی بٹھاتا ہے۔ پھر اس طریق زندگی کو انسانی زندگی کے اندر عملاً قائم کرتا ہے۔ اس طرح اس نظام کو اس کتاب و فرقان نے دنیا کے تمام نظاموں سے علیحدہ اور ممتاز کر کے رکھ دیا ہے۔ گویا قرآن فرقان باین معنی ہے کہ یہ انسانیت کے لیے ایک عہد جدید ہے۔ تصورات و خیالات کے اعتبار سے بھی اور عملی زندگی کے اعتبار سے بھی یہ عہد جدید' عہد قدیم سے جدا اور ممتاز ہے۔ قرآن کریم اس وسیع مفہوم میں بھی فرقان ہے۔ یہ ایک نکتہ افتراق ہے کہ جہاں سے آگے اب انسانیت نے بلوغ حاصل کر لیا ہے اور اس کا زمانہ طفولیت اب ختم ہے۔ اب وہ دور ختم ہو گیا ہے کہ لوگوں کو مادی معجزات دکھائے جاتے تھے اور حق و باطل کا فرق سمجھایا جاتا تھا۔ اب تو قاضی عقل کے ذریعہ یہ فرق سمجھایا جائے گا۔ پھر اس سے قبل رسالتوں کا دائرہ محدود اور مقامی ہوتا تھا اور اب یہ رسالت عمومی رنگ اختیار کر گئی ہے۔ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (۲۵ : ۱) "تاکہ تمام جہاں والوں کے لیے ڈرانے والا ہو"۔ غرض ان تمام معنوں اور دائروں میں یہ کتاب فرقان ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکریم اور تعظیم کے مقام پر ان کے لیے عبدہ' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس کا بندہ' عبدہ کے لفظ کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور تکریم اسراء اور معراج کے موقعہ پر بھی کی گئی تھی۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْ اَسْرٰي بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَي الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰي

(۱۷ : ۱) "پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک"۔ اور سورت جن میں جب آپ کو رب کریم کے سامنے کھڑے ہو کر دعا اور مناجات کی حالت میں دکھایا گیا ہے وہاں بھی آپ کے لیے

لفظ عبداللہ استعمال ہوا ہے اور جس طرح یہاں آپ کے لیے تنزیل قرآن کے وقت عبدہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح سورت کہف میں بھی استعمال ہوا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ''تعریف ہے اس ذات کے لیے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی اور اس میں کوئی کجی نہ چھوڑی''۔ ان مقامات پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بندے کا لفظ استعمال کرنا رفعت شان ہے۔ اور آپ کی بہت بڑی تکریم ہے۔ انسان کے لیے اعلیٰ ترین مقام یہ ہے کہ وہ اللہ کا بندہ بن جائے۔ اس لیے یہاں آپ کے لیے بندے کا لفظ استعمال ہوا۔ اس سے آگے مقام الوہیت ہے جو اللہ وحدہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور اللہ کے ساتھ نہ کوئی شریک ہے اور نہ اللہ کے ساتھ مشارکت کا کوئی شبہ ہو سکتا ہے چاہے نزول قرآن کا مقام ہو' چاہے انسان کو آسمانوں پر لے جایا گیا ہو' چاہے ایک بشر اپنے اعلیٰ مقام معرفت و مناجات میں ہو' ایسے مقامات ہی بعض متبعین انبیائے سابقہ کے لیے مغالطے کا سبب بنے ہیں۔ ایسے ہی مقامات پھسل کر عقیدت مندوں نے بعض انبیاء کو خدا کا بیٹا قرار دینے کے افسانوی عقائد گھڑے یا انہوں نے بندے اور خدا کے درمیان بندگی اور خدائی کے تعلق کے سوا کسی اور قسم کے رابطے کا تصور اپنایا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انبیاء کی تکریم اور اعزاز کا مقام آتا ہے تو قرآن کریم میں ان کے لیے بندے کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ تصور یہ دلانا مقصود ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ اور بلند مقام ہے جس تک کوئی بشر ترقی کر سکتا ہے۔

یہاں بتایا جاتا ہے کہ اپنے اس برگزیدہ بندے پر قرآن نازل کرنے کا مقصد لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (۲۵ : ۱) ''تاکہ وہ سارے جہان کے لیے خبردار کر دینے والا ہو''۔ یہ آیات مکی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتداء ہی سے پوری دنیا کے لیے رسول مقرر کر دیا گیا تھا۔ بعض مستشرقین نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ دعوت اسلامی ابتداء میں ایک مقامی دعوت تھی لیکن بعد میں جب اسے عالمی فتوحات حاصل ہوگئیں تو اس نے ایک عالمی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ ان لوگوں کی یہ رائے غلط تھی' یہ دعوت ابتداء ہی سے عالمی تھی۔ اگر قرآن کی تعلیمات پر پوری طرح غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مزاج ہی عالمی ہے۔ اس دعوت کو پھیلانے کے لئے اسلام نے جو طریق کار اور جو وسائل اختیار کیے وہ سب کے سب عالمی تھے۔ اور ان تعلیمات کا مقصد ہی یہ تھا کہ پوری انسانیت کو ایک دور سے نکال کر دوسرے دور میں داخل کیا جائے۔ اس کے اندر سے ایک نظام کو ختم کر کے اسے ایک دوسرا نظام دیا جائے اور یہ کام اس کتاب فرقان کے ذریعے کیا جائے جو اللہ نے تمام جہاں کے لوگوں کو انجام بد سے خبردار کرنے کے لیے نازل کی ہے۔ اور اپنے بندے پر نازل کرے تاکہ وہ تمام لوگوں کے لیے خبردار کرنے والے کا کام کرے۔ یہ دعوت تو عالمی تھی لیکن رسول اللہؐ چونکہ مکہ میں رہنے والے تھے اس لیے ان کا پہلا مقابلہ اہل مکہ ہی سے ہونا تھا۔ اس لیے اس دعوت کا انکار اور مقابلہ اہل مکہ نے کیا تھا۔

غرض وہ ذات بڑی متبرک ہے جس نے اپنے اس عظیم بندے پر یہ کتاب نازل کی جو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے اور جو ایک معیار حق ہے۔

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ

فِي الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (۲۵ : ۲) "وہ جو زمین و آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے' جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا' جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے' جس نے ہر چیز کو پیدا کیا' پھر اس کی تقدیر مقرر کی"۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے اسم ذات کے استعمال کے بجائے اسم موصول کا استعمال ہوا یعنی الذی مقصد یہ ہے کہ جن صفات کا ذکر کیا جا رہا ہے ان کے ساتھ اللہ کا دائمی اور مسلسل تعلق ہے۔

الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲۵ : ۲) "وہ جو زمین و آسمان کا مالک ہے"۔ زمین و آسمان پر اس کا مکمل کنٹرول ہے۔ یہ اس کے قبضہ میں ہیں۔ وہ ان کے اندر پوری طرح متصرف ہے اور زمین و آسمان کے اندر تمام تغیرات اس کی مرضی اور حکم سے رونما ہوتے ہیں۔

وَ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا (۲۵ : ۲) "اس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا"۔ تناسل تو وہ قدرتی قانون ہے جسے اللہ نے اپنی مخلوق کے اندر جاری کیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ "زندگی" کا تسلسل قائم رہے۔ جہاں تک ذات باری کا تعلق ہے تو وہ جب ہمیشہ باقی ہے اور لازوال ہے تو وہ سلسلہ تناسل کی محتاج ہی نہیں ہے۔

وَ لَمْ يَكُنْ لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ (۲۵ : ۲) "جس کی بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے"۔ زمین و آسمان کے اندر جس قدر مخلوق ہے اگر اس کا مشاہدہ اور تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس کا نقشہ کسی ایک ہی خالق نے تخلیق کیا ہے۔ ہر چیز کے اندر ایک ہی ناموس قدرت ہے اور تمام مخلوق کے اندر تصرف اور تغیر بھی ایک ہی ذات کا نظر آتا ہے۔

وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (۲۵ : ۲) "جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔ اس کا ایک حجم اور اس کی ایک شکل مقرر کی۔ اس کے لیے ایک کام اور فرض منصبی متعین کیا۔ اس کا زمان و مکان متعین کیا۔ اور اس کو اس کائنات کے عظیم وجود کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔

اس کائنات کے وجود اور انداز کے انداز تخلیق و ترکیب پر جن علماء نے غور کیا ہے اور جو انسان بھی اس پر کبھی غور کرے گا وہ حیران رہ جائے گا۔ جوں جوں تخلیق کائنات کے رازہائے نہفتہ واشگفتہ ہوں گے اس کو یقین ہوتا جائے گا کہ یہ کائنات از خود بطور اتفاق وجود میں نہیں آگئی ہے۔ اس کی ترکیب اس قدر دقیق اور باریک ہے کہ انسان اس کے مظاہر اور اثرات ہی کو معلوم کرنے سے عاجز ہے جبکہ ہم نے ابھی تک اس کائنات کا ایک حقیر پہلو ہی مشاہدہ کیا ہے۔ لیکن جوں جوں ہماری دریافت آگے بڑھتی ہے۔ ہمیں اس کائنات کے اندر نہایت ہی حکیمانہ ضوابط کارفرما نظر آتے ہیں۔ یہ ضوابط اس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ ہمارا علم جس قدر آگے بڑھتا ہے ہمیں یہ آیت اچھی طرح سمجھ آجاتی ہے۔

وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (۲۵ : ۲) "اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک مکمل تقدیر مقرر کی"۔ مسٹر اے کریسی مورسن' صدر سائنس اکیڈمی نیویارک' اپنی کتاب "انسان اکیلا نہیں کھڑا ہے" میں لکھتے ہیں :

"اس حقیقت کو دیکھ کر انسان حیرت سے دہشت زدہ ہو جاتا جب وہ اس کائنات کی موجودہ شکل میں منظم کیے جانے پر غور کرتا ہے۔ یہ نہایت ہی حکیمانہ تنظیم ہے۔ اگر زمین کا چھلکا اپنی موجودہ مقدار کے مقابلے میں چند قدم اور زیادہ دبیز

ہوتا تو اور نباتات کا وجود ہی ختم ہو جاتا"۔

"اگر ہوا اپنے موجودہ مقام سے ذرا زیادہ اونچی ہوتی تو آج جو لاکھوں شہاب ثاقب بالائی فضا میں جل جاتے ہیں' ان کی زد اس کرۂ ارضی پر پڑتی کیونکہ ان شہابوں کی رفتار ۶ تا ۴۰ میل فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ اس طرح یہ جہاں گرتے ' وہاں پر اس چیز کو جلا دیتے جو جلنے کے قابل ہوتی اور اگر ان کی رفتار کم ہو کر بندوق کی گولی کی مقدار پر آ جائے تو یہ سب زمین پر آ کر چپک جاتے اور اس کے خوفناک نتائج نکلتے۔ رہا انسان تو اس کے پاس سے اگر ایک چھوٹا سا شہاب ثاقب گزر جائے جس کی رفتار بندوق کی گولی سے نوے گنا زیادہ ہوتی ہے تو صرف اس کے گزرنے کی رفتار کی گرمی سے وہ چھوٹے چھوٹے ذروں میں بدل جائے"۔

"اللہ نے اس ہوا کو ایک خاص مقدار کے مطابق کثیف بنایا ہے اور اس کی اس کثافت سے وہ شعاعیں گزر سکتی ہیں جو فصلوں پر دی اثرات ڈالتی ہیں' جو جراثیم کو قتل کرتی ہیں اور وٹامن پیدا کرتی ہیں' لیکن یہ شعاعیں انسان کو نقصان نہیں پہنچاتیں الا یہ کہ انسان ان کے اندر ضرورت سے زیادہ رہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ زمین سے ہر وقت زہریلی گیس نکلتی رہتی ہیں لیکن ہوا ان گیسوں سے متاثر ہو کر اس مسلسل آلودگی کی وجہ سے بھی اس کی وہ نسبت نہیں بدلتی جو صحت انسانی کے لیے ضروری ہے۔ اور اس توازن کو یہ وسیع سمندر قائم رکھتے ہیں جن کی وجہ سے ہر قسم کی زندگی 'غذا' بارش 'معتدل جائے رہائش اور نباتات کو زندگی حاصل ہوتی ہے اور خود انسان کی زندگی قائم ہے"۔

"اس ہوا میں اس وقت آکسیجن ۲۱ فیصد ہے' اگر یہ بڑھ کر ۵۰ فیصد ہو جائے تو وہ تمام مواد جو اس وقت جلنے کے قابل ہے سب کا سب آگ پکڑ لے۔ ایک چنگاری جنگلات کو آگ لگا دے اور تمام جنگلات ایک دھماکے سے اڑ جائیں اور اگر ہوا کے اندر آکسیجن کی مقدار ۱۰ فیصد ہو جائے یا اور کم ہو جائے تو انسانی زندگی شاید صدیوں بعد اپنے آپ کو اس نسبت کے ساتھ ساتھ ہم آہنگ تو کر ہی دے لیکن انسانی تمدن موجودہ بے شمار چیزوں سے محروم ہو جائے 'مثلاً آگ اور دیگر ازجیزات"۔

"ان مخلوقات کی ضابطہ بندی اور ان کے اندر قدرتی توازن بھی نہایت ہی عجیب ہے کہ کوئی حیوان ' خواہ وہ جس قدر عظیم الجثہ اور ہوشیار کیوں نہ ہو' اس کے لیے اس جہاں پر غلبہ حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔

ہاں انسان نے یہ کام کیا کہ اس نے نباتات اور حیوانات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر کے قدرت کے پیدا کردہ اس توازن کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اور انسان کو اس کی اس حرکت کی سخت سزا بھی ملی اس طرح کہ اس توازن کو خراب کرنے کی وجہ سے حیوانات 'حشرات اور نباتات کو مختلف بیماریوں کو سامنا کرنا پڑا"۔

"وجود انسان کے حوالے سے اس توازن کی جو اہمیت ہے اس کی حقیقت درج ذیل واقعہ سے اچھی طرح معلوم ہو سکتی ہے۔ کئی سال ہوئے آسٹریلیا میں ایک قسم کے خار دار خربوزے کی کاشت کی گئی۔ یہ کاشت بطور حفاظتی باڑ کی گئی لیکن یہ فصل اس قدر پھیل گئی کہ اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں اس قدر رقبے کو گھیر لیا جو انگلینڈ کے برابر تھا۔ اس نے شہروں کے شہر اجاڑ دیئے اور لوگوں کی فصل تباہ ہو گئی' یہاں تک کہ لوگوں کے لیے فصل بونا مشکل ہو گئی۔ لوگوں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اس کے پھیلاؤ پر کنٹرول کیا جائے مگر ممکن ہی نہ ہوا۔ پورے آسٹریلیا کے لیے یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اس پر خار دار خربوزے کی یہ فصل قابض ہو جائے 'کوئی چیز اس کے لیے رکاوٹ نہ تھی"۔

"علماء حشرات للارض پوری دنیا میں پھیل گئے' تحقیقات شروع کر دی یہاں تک کہ انہوں نے ایک کیڑا دریافت کر لیا جس کی خوراک صرف یہ خربوزہ تھا۔ یہ کیڑا بھی اسی تیزی سے پھیل رہا تھا جس تیزی سے یہ خاردار خربوزہ پھیلتا تھا۔ آسٹریلیا میں اس کیڑے کے سامنے بھی کوئی طبعی رکاوٹ نہ تھی' یہ کیڑا اس قدر پھیلا کہ اس نے خاردار خربوزے کو ختم کر کے رکھ دیا۔ جونہی یہ خربوزہ ختم ہوا اس کیڑے نے بھی ختم ہونا شروع کر دیا۔ اس کی نہایت ہی قلیل مقدار باقی رہ گئی۔ یہ گویا قدرت نے اس خربوزے کے پھیلاؤ کے خلاف باقی رکھی۔ یوں قدرت نے ضابطے اور توازن کو قائم رکھنے کا یہ انتظام کیا"۔

"سوال یہ ہے کہ ملیریا کے مچھر نے کیوں نہ اس پوری دنیا پر غلبہ پایا کہ ہمارے آباء و اجداد اس سے مر جاتے۔ یا اس سے بچاؤ کی کوئی تدبیر وہ حاصل کر لیتے۔ اسی طرح زرد بخار کے مچھر کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے' ایک موسم میں تو اس نے اس قدر پیش قدمی کی کہ نیویارک تک پہنچ گیا۔ بحر منجمد میں بھی کئی قسم کے مچھر پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح ................... کا زیادہ پھیلاؤ کن اسباب کی وجہ سے نہ ہوا۔ اور یہ اپنے گرم منطقوں تک ہی محدود رہی اور اس طرح اس کی افواج کی زد سے انسان بچ سکا ورنہ کرۂ ارض پر سے انسان کا وجود ہی ختم ہو جاتا۔ انسان طاعون' دوسری مہلک وباؤں' مہلک جراثیم کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے کہ خود انسان کے پاس ان چیزوں سے بچنے کی دوائیں تو کل تک نہ تھیں پھر کیسے بچا۔ پھر کل تک تو انسان حفظان صحت کے بنیادی اصولوں سے بھی نابلد تھا۔ کیا ایسے حالات میں نوع انسان کا باقی رہنا ایک معجزہ نہیں ہے"۔

"پھر دیکھئے کہ حشرات الارض کے اس طرح کے پھیپھڑے نہیں ہیں جس طرح کہ انسان کے ہیں۔ یہ حشرات بعض نالیوں کے ذریعے سانس لیتے ہیں جو ان کے جسم میں ہیں۔ جب یہ حشرات ایک حد تک بڑے ہو جاتے ہیں تو ان نالیوں سے اس قدر آکسیجن داخل نہیں ہو سکتی جو ان کے جسم کے لیے کافی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کیڑا چند انچ سے زیادہ بڑا نہیں ہوتا۔ اسی طرح ان حشرات کے پر بھی زیادہ طویل نہیں ہوتے۔ ان کیڑے مکوڑوں کی تخلیق اور تشکیل کے نظام کی رو ہی سے وہ ایک مقدار سے زیادہ بڑے نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ قدرت کے نظام نے ان کے پھیلاؤ کو روک دیا ہے۔ اس طرح اس دنیا کو ان کی زد سے بچا لیا گیا۔ اگر حشرات الارض کے لیے تحدید کا یہ اصول نہ رکھا گیا ہوتا تو اس کرۂ ارض پر انسان کا زندہ رہنا ہی ممکن نہ تھا۔ ذرا فطری انسان کے بارے میں سوچیں کہ اس کے مقابلے میں شیر کے جسم کے برابر سرخ مکھی یا اس کے مقابلے میں شیر کے جسم کے برابر مکڑی آ جائے تو کیا انسان ایسی چیزوں کا مقابلہ کر سکتا ہے؟"

"حیوانات کی جسمانی طبیعی ساخت میں بعض دوسرے معجزات بھی ہیں کہ اگر حیوانات کے لیے یہ قدرتی انتظامات نہ ہوتے تو کوئی حیوان بلکہ کوئی پودا اس جہاں میں موجود ہی نہ ہوتا"۔

آئے دن انسانوں پر ایسے انکشافات ہو رہے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی اس مخلوق کے اندر نہایت دقیق اور لطیف توازن رکھا ہوا ہے اور کائنات کی تمام مخلوقات کے لیے ایک متعین مقدار اور وزن مقرر ہے۔ جوں جوں انسانی علم آگے بڑھتا ہے انسان اس آیت کے مفہوم کو سمجھنے لگتا ہے۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (۲:۲۵) "اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی"۔ لیکن یہ بے حد افسوسناک بات ہے کہ مشرکین اس حقیقت کو پا نہیں رہے۔

وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖۤ اٰلِھَۃً لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّ ھُمْ یُخْلَقُوْنَ وَ لَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِھِمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا وَّ لَا یَمْلِکُوْنَ مَوْتًا وَّ لَا حَیٰوۃً وَّ لَا نُشُوْرًا (۲۵ : ۳) "لوگوں نے اسے چھوڑ کر ایسے معبود بنا لیے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں جو خود اپنے لیے کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے' جو نہ مارتے ہیں اور نہ جلا سکتے ہیں اور نہ مرے ہوئے کو پھر اٹھا سکتے ہیں"۔

یوں اللہ تعالیٰ ان کے خود ساختہ خداؤں کو' خدائی کے تمام خصائص سے عاری کر دیتا ہے۔

لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا (۲۵ : ۳) "وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے"۔ جبکہ رب تعالیٰ نے تمام مخلوق کو پیدا کیا ہے۔

وَّ ھُمْ یُخْلَقُوْنَ (۲۵ : ۳) "وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں"۔ یعنی ان کو خود اللہ نے پیدا کیا ہے' اور ان کو وجود بخشا ہے۔ سب کا خالق اللہ ہے' چاہے وہ ملائکہ ہوں' جن ہوں' بشر ہوں' درخت ہوں یا پتھر ہوں۔

وَ لَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِھِمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا (۲۵ : ۳) "وہ خود اپنے لیے بھی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے"۔ ان کی بندگی کرنے والوں کا نفع و نقصان تو دور کی بات ہے۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ کوئی اپنے لیے نفع کا اختیار نہیں رکھتا مگر نقصان تو دے سکتا ہے مگر یہ الہ ایسے ہیں کہ اپنے لیے کسی نقصان کا اختیار بھی نہیں رکھتے۔ اس لیے اس کو نفع سے بھی پہلے لایا گیا ہے۔ یعنی اپنے آپ کو نقصان پہنچانا تو بہت ہی آسان کام ہے لیکن یہ لوگ وہ بھی نہیں پہنچا سکتے۔ اس کے بعد ان خصائص کا ذکر کیا جاتا ہے جو صرف اللہ کی خصوصیات میں سے ہیں۔

لَا یَمْلِکُوْنَ مَوْتًا وَّ لَا حَیٰوۃً وَّ لَا نُشُوْرًا (۲۵ : ۳) "جو نہ مار سکتے ہیں' نہ جلا سکتے ہیں اور نہ مارے ہوؤں کو پھر اٹھا سکتے ہیں"۔ نہ وہ زندہ کو مار سکتے ہیں' نہ زندگی کو پیدا کر سکتے ہیں' اور نہ مردے کو دوبارہ زندگی دے سکتے ہیں۔ اگر وہ یہ کام نہیں کر سکتے تو پھر وہ کس چیز کے خدا ہیں۔ اور وہ کیا بات ہے جس کی وجہ سے مشرکین نے ان کو خدا بنا رکھا ہے۔

یہ کھلی گمراہی ہے اور اس کے بعد ان سے وہ باتیں بعید نہیں جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کہتے ہیں۔ کیونکہ جب وہ اللہ کے بارے میں یہ باتیں کرتے ہیں تو رسول اللہؐ کے بارے میں وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ ان سے مستبعد نہیں ہے۔ کسی انسان کی کیا اس سے بھی کوئی بات قبیح ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ پر الزام لگائے' حالانکہ اللہ مالک خالق اور مدبر اور مقدر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا گناہ سب سے گھناؤنا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ کہ تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے حالانکہ اس نے تمہاری تخلیق کی ہے"۔ ان تجعل للہ ندا وھو خلقک (متفق علیہ)۔

---()()()---

مقام الوہیت پر ان کی گستاخی کے ذکر کے بعد اب مقام رسالت پر ان کی دست درازی کا ذکر کیا جاتا ہے اور اس پر

ایسی تنقید کی جاتی ہے۔ جس سے ان کے اس اعتراض کا جھوٹا اور پوچ ہونا اچھی طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ ۖ فَقَدْ جَاءُوا ظُلْمًا وَزُورًا ﴿٤﴾ وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٥﴾ قُلْ أَنْزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿٦﴾

"جن لوگوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ "یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے"۔ بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں "یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں"۔ اے نبی' ان سے کہو کہ اسے نازل کیا ہے' اس نے جو زمین اور آسمانوں کا بھید جانتا ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا غفور و رحیم ہے"۔

یہ تھا وہ جھوٹ جو اہل قریش نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر باندھتے تھے۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ بہت ہی بڑا افتراء ہے۔ کیونکہ قریش کے کبراء عوام کو جن باتوں کی تعلیم دیتے تھے' ان سے یہ بات کس طرح مخفی رہ سکتی تھی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس قرآن کی تلاوت فرما رہے ہیں وہ بشری اسالیب کلام سے بالکل ایک مختلف کلام ہے۔ وہ اس بات کو اپنے دل میں اچھی طرح محسوس کرتے تھے کیونکہ وہ انسانی اسالیب کلام سے اچھی طرح واقف تھے۔ جب وہ قرآن سنتے تھے تو وہ خود بھی اس سے بے حد متاثر ہو جاتے تھے۔ پھر بعثت سے قبل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کو پورا پورا یقین تھا کہ حضرت محمدؐ صادق اور امین ہیں۔ وہ نہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ نہ خیانت کرنے والے تھے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اللہ پر جھوٹ باندھیں۔ ایک بات اللہ نے نہیں کی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔

وہ ایک تو عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ الزام لگاتے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کو دوسرے عرب کے مقابلے میں مکہ میں ایک قسم کی دینی سیادت حاصل تھی اور اس کی وجہ سے عربوں میں ان کا ممتاز مقام تھا' اس وجہ سے وہ عام عربوں میں یہ الزام پھیلاتے تھے کیونکہ عام عرب اسالیب کلام سے واقف نہ تھے۔ اور نہ وہ قرآن اور عام کلام میں فرق کر سکتے تھے۔ اس لیے وہ کہتے۔

إِنْ هَٰذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ (۲۵ : ۴) "یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے اور اس پر اسے خود گھڑ لیا ہے اور اس پر کچھ دوسرے لوگوں نے اس کی مدد کی ہے"۔ روایات میں تین یا زیادہ عجمی غلاموں کے نام لیے گئے ہیں کہ قَوْمٌ آخَرُونَ (۲۵ : ۴) میں یہ لوگ اس طرف اشارہ کرتے تھے۔ یہ بات کس قدر بے تکی تھی۔ یہ اس قابل ہی نہ تھی کہ اس پر کوئی بحث کی جائے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس قسم کا کلام چند عجمی

غلاموں کی امداد سے بنایا جا سکتا تھا تو آخر انہوں نے اس کے جواب میں کیوں ایسا کلام نہ بنایا۔ اس طرح تو وہ بڑی آسانی کے ساتھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کو باطل کر سکتے تھے جبکہ قرآن کریم نے ان کو بار بار چیلنج بھی کیا اور وہ بار بار ایسا کلام لانے میں ناکام بھی رہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے یہاں ان کی اس بات کا کوئی جواب ہی نہیں دیا بلکہ اس کی واضح تردید کر دی۔

فَقَدْ جَآءُ وْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا (۲۵ : ۴) "بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آئے ہیں"۔ یہ سچائی پر ظلم کرتے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم کرتے ہیں' اپنے نفوس پر ظلم کرتے ہیں' ان کا جھوٹ واضح ہے اور بادی النظر میں باطل ہے۔ جس کی تردید کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

مزید الزامات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور قرآن مجید کے متعلق

وَقَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اکْتَتَبَهَا فَهِیَ تُمْلٰی عَلَیْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا (۲۵ : ۵) "کہتے ہیں کہ یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں"۔ قرآن کریم نے اقوام سابقہ کے قصص نقل کیے ہیں۔ یہ عبرت' نصیحت' تربیت اور ہدایت کی خاطر۔ ان سچے قصوں کے بارے میں وہ کہتے ہیں۔

اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۲۵ : ۵) کہ یہ پرانے لوگوں کی کہانیاں ہیں اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے کہا کہ یہ اس کے لیے نوٹ کر لی جائیں تاکہ اس پر صبح و شام پڑھی جائیں کیونکہ حضورؐ خود تو امی تھے' لکھ پڑھ نہ سکتے تھے اور خود حضور اکرمؐ ان کہانیوں کو پھر خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ ان کے اس دعوے کے اندر ہی شکست پوشیدہ ہے کیونکہ ان کا دعویٰ ہی بے بنیاد ہے۔ اس قدر پوچ کہ اس پر بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ قرآن کریم نے قصص کو جس انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ جس مقصد کے لیے لائے جاتے ہیں۔ ان سے جو استدلال کیا جاتا ہے اور جس طرح نفاست کے ساتھ وہ اپنے مقصد کو پورا کرتے ہیں اور ان سے جس گہرائی کے ساتھ مقاصد عالیہ ثابت ہوتے ہیں' ان میں اور پرانے قصے کہانیوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کیونکہ پرانے قصوں میں کوئی فکر اور کوئی نظریہ نہیں ہوتا' نہ ان قصوں کے پیش نظر کچھ مقاصد ہوتے ہیں۔ یہ قصے محض تفریح کے لیے اور فارغ اوقات میں اپنے آپ کو مصروف کرنے کے لیے' لکھے اور پڑھے جاتے ہیں فقط۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے "التصویر الفنی فی القرآن" کا فصل "القصہ")۔

انہوں نے قرآن کریم کو اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۲۵ : ۵) کہا ہے' اشارہ اس طرف ہے کہ یہ قصے بہت ہی پرانے زمانے کے ہیں۔ لہٰذا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر لازماً وہ لوگ پڑھتے ہوں گے۔ ان کا علم حاصل کرتے چلے آتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ان کے اس الزام کا رد یوں کرتا ہے کہ بے شک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کا نزول اس ذات کی طرف سے ہو رہا ہے جو ہر علم والے سے زیادہ علیم ہے۔ وہ تمام اسرار و رموز کا جاننے والا ہے یعنی اللہ اور اللہ پر اولین اور آخرین کا کوئی علم پوشیدہ نہیں ہے۔

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲۵ : ۶) "اے نبیؐ ان سے کہو کہ اسے نازل کیا ہے اس نے جو زمین و آسمان کا بھید جانتا ہے"۔ قصص گویان دنیا کہاں اور وہ علیم و خبیر کہاں۔ انسان کا محدود علم اور ارض و سما کے وسیع علم رکھنے والے اللہ کے علم کامل و شامل کا مقابلہ ہی کیا ہے۔ ایک حقیر قطرے اور ایک بحر ناپید کنار کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ بڑی غلطی کر رہے ہیں جو رسول اللہؐ پر یہ بوگس اور پوچ الزام عائد کرتے ہیں جبکہ وہ اللہ کے ساتھ شرک کے قائل ہیں حالانکہ اللہ نے ان کی تخلیق کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود توبہ کا دروازہ کھلا ہے اور اس عظیم گناہ سے وہ باز آ سکتے ہیں۔ اللہ جو زمین و آسمانوں کے بھیدوں کا واقف ہے۔ وہ ان کی افتراپردازیوں اور ان کی سازشوں سے خوب خبردار ہے لیکن اس کے باوجود وہ غفور و رحیم ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۲۵ : ۶)

--- ()()() ---

اسی موضوع پر بات مزید آگے بڑھتی ہے۔ رسول اللہؐ کے بارے میں ان کے مزید اعتراضات کہ آپ بشر کیوں ہیں اور دوسرے لغو مطالبات کو یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ
اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ﴿۷﴾ اَوْ يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ
يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَ قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۸﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ ۱
ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹﴾ تَبٰرَكَ الَّذِيْۤ اِنْ شَآءَ ع ۹
جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَ يَجْعَلْ لَّكَ ۱۶
قُصُوْرًا ﴿۱۰﴾

"وہ کہتے ہیں "یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو) دھمکاتا؟ یا اور کچھ نہیں تو اس کے لیے کوئی خزانہ ہی اتار دیا جاتا' یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ (اطمینان کی) روزی حاصل کرتا' اور یہ ظالم کہتے ہیں "تم لوگ تو ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو"۔ دیکھو' کیسی کیسی حجتیں یہ لوگ تمہارے آگے پیش کر رہے ہیں' ایسے بہکے ہیں کہ کوئی ٹھکانے کی بات ان کو نہیں سوجھتی۔ بڑا بابرکت ہے وہ جو اگر چاہے تو ان کی تجویز کردہ چیزوں سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر تم کو دے سکتا ہے' (ایک نہیں) بہت سے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں' اور بڑے بڑے محل"۔

یہ کیسا رسول ہے جو کھاتا پیتا' چلتا پھرتا انسان ہے اور تمام تصرفات و حرکات انسانوں جیسے کرتا ہے۔ یہ وہی گھسا پٹا

اعتراض ہے جو لوگ ہمیشہ رسولوں پر کرتے چلے آئے ہیں کہ فلاں شخص نے رسول ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے۔ دیکھو بھائی فلاں کا بیٹا بھی اب رسول بن گیا۔ یہ تو ہم جیسا انسان ہے جس طرح ہم کھاتے پیتے ہیں اور چلتے پھرتے ہیں۔ یہ بھی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ رسول اللہ ہو اور اللہ کی طرف سے اس پر وحی آ رہی ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کا اتصال اور رابطہ عالم بالا سے ہو جائے۔ اور یہ عالم بالا سے ہدایات لے رہا ہو۔ جبکہ وہ ہمارے جیسا گوشت و پوست کا بنا ہوا انسان ہے۔ آخر ہماری طرف وحی کیوں نہیں آتی۔ اور وہ جس علم کا دعویٰ کرتا ہے وہ ہمارے پاس کیوں نہیں آتا۔ جبکہ ہمارے اور اس رسول کے درمیان کوئی بات ایسی نہیں ہے جو امتیازی ہو۔

اس لحاظ سے یہ بات واقعی انوکھی معلوم ہوتی ہے اور مستبعد نظر آتی۔ لیکن دوسرے لحاظ سے طبعی اور معقول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اپنی روح پھونکی ہے اور اسی روح کی وجہ سے انسان' انسان بنا ہے اور اسی وجہ سے اللہ نے اسے خلافت ارضی سپرد کی ہے حالانکہ انسان ایک محدود علم رکھتا ہے۔ اس کا تجربہ محدود ہے اور اس کے پاس بہت کم وسائل ہیں اس لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ انسان کو یہ عظیم فریضہ ادا کرنے کے لیے بے آسرا اور بغیر معاونت کے چھوڑ دے اور بغیر ہدایت اور راہنمائی کے یوں ہی چھوڑ دے۔ جبکہ اس کے اندر اللہ نے یہ صلاحیت بھی رکھی کہ وہ عالم بالا سے تعلق بھی قائم کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے کسی ایک انسان کو اس مقصد کے لیے چن لے کہ وہ عالم بالا کی ہدایات اخذ کرے اور لوگوں تک پہنچائے۔ اور اس شخص کو اللہ اس مقصد کے لیے خصوصی استعداد بھی دے تاکہ جب بھی ان پر کوئی مسئلہ مشتبہ ہو تو یہ شخص اللہ کی ہدایت کی روشنی میں اسے حل کر دے اور جب بھی راہ ہدایت کے اختیار کرنے میں ان کو ضرورت ہو وہ ان کی معاونت کرے۔

یہ تو انسان کے لیے' اس پہلو سے' اور اس شکل میں ایک بہت بڑا اعزاز ہے لیکن بعض لوگ ایسے ہیں جو اس اعزاز کو سمجھتے نہیں ہیں۔ نہ وہ انسان کے اس اعزاز اور تکریم کی قدر کرتے ہیں۔ اس لیے جن لوگوں کے ذہن میں یہ بات نہیں بیٹھتی۔ وہ اس اعزاز کا انکار کرتے ہیں کہ انسانوں میں سے کوئی شخص کس طرح رسول ہو سکتا ہے۔ انسانوں کے مقابلے میں اس مقصد کے لیے فرشتہ زیادہ موزوں تھا۔

لَوْ لَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا (۲۵ : ۷) "کیوں نہ اس کے پاس ایک فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ ساتھ چلتا اور نہ ماننے والوں کو دھمکاتا"۔ جبکہ اللہ نے تمام فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ وہ انسان کو سجدہ کریں کیونکہ اللہ نے انسان کو اس کی بعض خصوصیات کی وجہ سے مکرم بنایا تھا اور یہ خصائص خود انسان کے اندر عالم بالا کی طرف سے پھونکی ہوئی روحانیت کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔

پھر ایک انسان کو انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجنے کی ایک اور حکمت بھی ہے۔ ایک انسان انسانوں جیسے احساسات رکھتا ہے وہ انسان جیسا ذوق رکھتا ہے۔ پھر اس کے تجربات بھی ایسے ہوتے ہیں جو دوسرے انسانوں جیسے ہوتے ہیں۔ وہ ان کے دکھ درد اور ان کی خواہشات کو انسان ہونے کے ناطے سمجھ سکتا ہے۔ وہ ان کے جذبات اور میلانات کو بھی سمجھ سکتا ہے۔ وہ انسانوں کی ضروریات اور ان کی ذمہ داریوں سے بھی واقف ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ان کی کمزوریوں اور نقائص کا خیال کرتا ہے' وہ ان کی قوت اور ان کی استعداد سے پرامید بھی ہوتا ہے۔ اور ان کو لے کر قدم بقدم آگے چلتا ہے' وہ ان

کے تاثرات اور ان کے ردعمل سے اچھی طرح باخبر ہوتا ہے ۔کیونکہ وہ بھی انہی میں سے ایک ہے ۔ اور انہی کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے مبعوث ہوا ہے اور اللہ کی ہدایت اور امداد سے ان کی راہنمائی کر رہا ہے ۔

پھر ان لوگوں کے لیے بھی ممکن ہے کہ وہ حضرت رسول اکرمؐ کی پیروی کریں کیونکہ وہ انہی جیسا انسان ہے ۔ وہ ان انسانوں کو لے کر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے ۔ وہ ان کے اندر رہ کر ایک اخلاقی نمونہ پیش کرتا ہے ۔ اور ان کو عملاً ان اخلاق و فرائض کی تعلیم دیتا ہے جو اللہ نے ان پر فرض کیے ہیں اور جن کا اللہ ان سے مطالبہ فرماتا ہے ۔ گویا وہ اس نظریہ اور عمل کا ایک نمونہ ہوتا ہے جسے وہ لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے ۔ اس کی زندگی' اس کے اعمال اور اس کی تمام حرکات ایک کھلی کتاب ہوتی ہے' جسے وہ ان کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ اس کتاب کی ایک ایک سطر کو نقل کرتے ہیں اور اس کتاب کے ایک ایک لفظ کو حقیقت کا روپ عطا کرتے ہیں اور وہ دیکھتے ہیں کہ ان کا رسول ہر بات کو عملاً پیش کرتا ہے تو وہ بھی اس کی تقلید کرتے ہیں کیونکہ یہ نظریہ اور ہدایت ایک شخص کی زندگی میں عملاً نظر آتی ہے ۔ اگر رسول کوئی فرشتہ ہوتا تو لوگ نہ اس کے عمل دیکھ سکتے اور نہ اس کی تقلید کے بارے میں سوچ سکتے ۔کیونکہ ان کے اندر آغاز ہی سے یہ بات آجاتی کہ وہ تو ایک فرشتہ ہے ۔ اس کا مزاج ہی ایسا ہے اور ہم ضعیف انسان ہیں ۔ ہم اس جیسا طرز عمل کب اختیار کر سکتے ہیں ۔ یا ہم اس کی تقلید کس طرح کر سکتے ہیں یا اس جیسا نمونہ وہ کس طرح پیش کر سکتے ہیں ۔

یہ تھی اللہ کی حکمت جس نے ہر چیز کی تخلیق کی اور اسے پوری پوری طرح برابر کیا ۔ یہ اس کی حکمت تھی کہ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے ایک انسان کو رسول بنا کر بھیجا تاکہ وہ ان کی قیادت کر سکے اور رسول کے بشر ہونے پر اعتراض دراصل اس حکمت سے جہالت کی وجہ سے کیا جاتا ہے ۔ پھر اس میں اللہ کی طرف سے انسان کی عزت افزائی بھی ہے اور جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں وہ انسان کی تکریم کی نفی کرتے ہیں ۔

ان کا دوسرا اعتراض اس سے بھی زیادہ سادگی اور جہالت پر مبنی تھا کہ یہ رسول بازاروں میں پھرتا ہے اور اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کرتا ہے اور محنت کرتا ہے تو کیوں اللہ نے اسے اس قدر دولت نہ دی کہ وہ اپنی ضروریات کی طرف سے بے غم ہو جائے ۔ اور بغیر محنت کے اسے ضروریات ملتی رہیں ۔

اَوْ یُلْقٰٓی اِلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ یَّاْكُلُ مِنْهَا (۲۵ : ۸) "یا اس کے لیے کوئی خزانہ ہوتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ روزی حاصل کرتا" ۔ اللہ نے یہ نہ چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی خزانہ ہوتا یا آپؐ کسی بڑے باغ کے مالک ہوتے 'کیونکہ اللہ تعالیٰ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے لیے ایک نمونہ بنا رہا تھا تاکہ آپؐ رسالت کے منصب کے فرائض کو اٹھائیں اور ان فرائض کے ساتھ ساتھ آپؐ اپنی امت کے دوسرے انسانوں کی طرح بطور انسان اپنی ذمہ داریاں خود اٹھائیں ۔ اپنے رزق کے لیے خود سعی کریں تاکہ امت میں سے کوئی شخص یہ اعتراض نہ کر سکے کہ یہ شخص کوئی کاروبار کر رہا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم 'قناعت اختیار کرنے والے تھے ۔ اس لیے آپ کو ضروریات زندگی کے لیے بہت زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑتی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ تبلیغ رسالت کے فرائض کی ادائیگی کے لیے فارغ ہو گئے تھے ۔ لہٰذا اس سلسلے میں آپؐ کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں آئی ۔ چنانچہ آپ اپنی ضروریات کے لیے بھی بقدر ضرورت جدوجہد فرماتے تھے ۔ اور رسالت کے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے

تاکہ آپؐ کو نمونہ بناکر آپ کی امت کا ہر فرد تبلیغ رسالت کے فرائض کا کچھ حصہ اپنے ذمہ لے اور اپنی ضروریات کے لیے بھی جدوجہد کرے۔ بعد کے ادوار میں دولت کا ایک سیلاب آپؐ کے قدموں میں جاری ہو گیا۔ اور اللہ نے رسول کی زندگی کو اس پہلو سے بھی آزمایا تاکہ لوگوں کے لیے یہ پہلو بھی نمونہ ہو۔ چنانچہ آپ نے کبھی دولت کے اس سیلاب کی طرف توجہ نہیں دی۔ آپؐ ہوا کے طوفان کی طرح سخی تھے۔ چنانچہ آپؐ نے دولت مندی کے فتنے پر بھی قابو پایا۔ یوں لوگوں کے دلوں سے دولت مندی کی ہوس کو بھی نکال دیا۔ تاکہ لوگ یہ اعتراض نہ کریں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیغام لے کر نکلے 'ایک غریب آدمی تھے' آپ کی کوئی مالی سرگرمی نہ تھی' نہ مالی حیثیت تھی اور اب آپ لاکھوں اربوں میں کھیل رہے ہیں۔ ہر طرف سے آپ پر مال و دولت کی بارش ہے لیکن حضورؐ نے دولت کے اس سیلاب کو بھی اپنے آپ سے دور رکھا اور دعوت اسلامی کے کام میں اسی طرح مشغول ہو گئے جس طرح کہ وہ زمانہ فقر میں مشغول تھے۔

مال کیا چیز ہے' خزانوں کی حقیقت کیا ہے؟ باغات کی کیا حیثیت ہے۔ جب ایک ضعیف اور فانی انسان خدا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو پھر اس کے لئے اس پورے کرۂ ارض اور مافیہا کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے نزدیک اس پوری کائنات میں بسنے والی اس پوری مخلوقات کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ لیکن اس کی یہ حالت تب ہوتی ہے کہ جب اس نے خالق کائنات تک رسائی حاصل کر لی جو قلیل و کثیر کا بخشنے والا ہے لیکن اس وقت لوگ اس حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر تھے۔

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (۲۵ : ۸) "اور یہ ظالم کہتے ہیں تم تو ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے"۔ یہ وہ ظالمانہ بات ہے جو اللہ نے ان لوگوں کی زبان سے نقل کیا ہے۔ سورت اسرا میں بھی ان لوگوں کا یہ الزام لفظاً اللہ نے نقل فرمایا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ جواب دیا۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا (۲۵ : ۹) "دیکھئے' یہ لوگ آپ کے بارے میں کیسی باتیں کرتے ہیں' یہ گمراہ ہو چکے ہیں' اب ان کی استطاعت ہی میں یہ بات نہیں رہی کہ یہ راہ راست پالیں"۔ اس سورت اور سورہ اسرا کا مضمون و موضوع ایک ہی جیسا ہے اور یہ دونوں سورتوں کی بات ایک ہی ماحول میں ہو رہی ہے۔ دونوں جگہ ان لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے' انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر حملہ کیا ہے اور ذاتی نقص نکالا ہے یعنی وہ لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ اس شخص کی عقل ماری گئی ہے کیونکہ یہ عجیب و غریب باتیں کرتا ہے' ایک عام نارمل شخص ایسی باتیں نہیں کیا کرتا۔ لیکن اس اعتراض سے ان کے لاشعور سے یہ بات خود بخود باہر رہ گئی کہ رسول اللہ جو باتیں فرماتے ہیں وہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ عام طور پر بڑے سے بڑا عقلمند شخص بھی ایسی باتیں نہیں کرتا۔ یہ باتیں انسانی طاقت سے بالا باتیں ہیں۔ اس لیے ان پر رد کرتے وقت بھی اللہ نے ان کے اس رویے پر صرف تعجب کا اظہار کرنے پر اکتفاء کیا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ (۲۵ : ۹) "دیکھو' یہ تمہارے بارے میں کیا حجتیں کرتے ہیں"۔ آپؐ کو سحر زدہ لوگوں کے ساتھ مشابہ قرار دیتے ہیں' کبھی کہتے ہیں کہ آپؐ اپنی طرف سے باتیں بناتے ہیں' کبھی کہتے ہیں کہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں جو آپ لکھواتے ہیں۔ یہ سب گمراہی کی باتیں ہیں۔ اور سچائی سے دور کی باتیں ہیں۔ یہ

سچائی کے تمام راستوں سے بے راہ ہو گئے ہیں۔ اور اب ان کے اندر ہدایت کی راہ پانے کی استطاعت ہی نہیں رہی۔

فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا (۲۵ : ۹) اب یہ بحث یوں ختم کی جاتی ہے کہ یہ لوگ جو تجاویز دیتے ہیں وہ احمقانہ ہیں۔ ان کے تصورات دنیا پرستی کے محدود دائرے میں محدود ہیں۔ یہ کنوئیں کے مینڈک کی طرح اپنی دنیا ہی میں مگن ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ رسالت کے مقابلے میں چند ٹکوں کی قیمت زیادہ ہے لہٰذا رسول کے پاس ٹکے ہونے چاہئیں۔ اس پر ہدایت الٰہی کے بجائے خزانہ عامرہ نازل ہونا چاہئے تھا' یا اس کے مقابلے میں ایک باغ اس کے پاس ہونا چاہئے تھا جس میں وہ صبح و شام کھاتا۔ یہ تھی ان کی سوچ' لیکن اگر اللہ چاہتا اور اس کی اسکیم یہ ہوتی تو وہ اپنے رسول کو اس سے بھی زیادہ دیتا جس کا یہ کہتے ہیں۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ يَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا (۲۵ : ۱۰) "بڑا بابرکت ہے وہ جو اگر چاہے تو ان کی تجویز کردہ چیزوں سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر تم کو دے سکتا ہے۔ بہت سے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں اور بڑے بڑے محل"۔ لیکن اللہ کی مشیت یہ تھی کہ آپ کو ایسے باغات و محلات سے بھی زیادہ قیمتی دولت دے۔ یعنی باغات اور محلات دینے والے کے ساتھ تعلق اور دوستی۔ یہ شعور کہ محمد اس کی نگرانی میں ہیں۔ اس کے قبضے میں ہیں اس کی ہدایت اور توفیق کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ اور آپ اس مٹھاس کو ہروقت چکھتے رہتے ہیں۔ یہ روحانی غذا آپ کو ہروقت دی جاتی ہے اور اس کے مقابلے میں جسمانی غذا کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دنیا کا مال و منال خواہ کم ہو یا زیادہ' اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اے کاش کہ وہ اس فرق کو سمجھتے کہ آپ کو جو دولت دی گئی ہے وہ کس قدر قیمتی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں دنیا کے باغ و راغ کچھ بھی نہیں۔

---000---

یہاں تک تو قرآن نے خدا اور رسول اللہ پر ان کے اعتراضات کو نقل فرمایا' اب بات ان کے فکر و نظر کے فساد کے ایک دوسرے میدان میں داخل ہوتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ ضلال بعید میں مبتلا ہیں اور یہ تو قیام قیامت کے منکر ہیں۔ یہ چونکہ قیامت کی جوابدہی کے منکر ہیں اس لیے یہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ باتیں کرتے ہیں۔ ظلم کرتے ہیں افتراء باندھتے ہیں کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق ان کو قیامت کی جوابدہی کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ اگر ان کے دل میں اللہ کے سامنے حاضر ہونے اور حساب دینے کا ڈر ہوتا تو وہ یہ افتراء پردازیاں ہرگز نہ کرتے۔ یہاں اب قیامت کے مناظر میں سے ایک ایسا منظر لایا جاتا ہے جو سخت سے سخت دل کو بھی ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ جس کو دیکھ کر پوری طرح بجھے ہوئے دلوں میں بھی آگ لگ جاتی ہے۔ اور وہ بھی اس دن کی ہولناکی سے کانپ اٹھتے ہیں۔ ان کافروں کے لیے یہ ہولناکی اور اہل ایمان کے لیے یہ حسن انجام۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۣ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ۝۱۱

إِذَا رَأَتْهُم مِّن مَّكَانٍ بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَزَفِيرًا ﴿۱۲﴾ وَإِذَا أُلْقُوا مِنْهَا
مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِينَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُورًا ﴿۱۳﴾ لَّا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُورًا وَاحِدًا
وَادْعُوا ثُبُورًا كَثِيرًا ﴿۱۴﴾ قُلْ أَذَٰلِكَ خَيْرٌ أَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۚ
كَانَتْ لَهُمْ جَزَاءً وَمَصِيرًا ﴿۱۵﴾ لَّهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ خَالِدِينَ ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ
وَعْدًا مَّسْئُولًا ﴿۱۶﴾

"اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ "اس گھڑی" کو جھٹلا چکے ہیں --- اور جو اس گھڑی کو جھٹلائے اس کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔ وہ جب دور سے ان کو دیکھے گی تو یہ اس کے غضب اور جوش کی آواز سن لیں گے اور جب یہ دست و پابستہ اس میں ایک تنگ جگہ ٹھونسے جائیں گے تو اپنی موت کو پکارنے لگیں گے' (اس وقت ان سے کہا جائے گا) آج ایک موت کو نہیں بہت سی موتوں کو پکارو"۔ ان سے پوچھو یہ انجام اچھا ہے یا وہ ابدی جنت جس کا وعدہ خدا ترس پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے' جو ان کے عمل کی جزا اور ان کے سفر کی آخری منزل ہوگی' جس میں ان کی ہر خواہش پوری ہوگی' جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے' جس کا عطا کرنا تمہارے رب کے ذمے ایک واجب الادا وعدہ ہے"۔

یعنی وہ کفر اور ضلالت کی حدوں کو پار کر کے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ وہ قیامت کا انکار کر رہے ہیں۔ قرآن کا انداز تعبیر "بل" کا لفظ استعمال کر کے' ان کی گمراہی یوں مجسم کرتا ہے کہ وہ اس راہ پر بہت دور چلے گئے ہیں یعنی پہلی باتوں کو چھوڑو' انہوں نے تو قیامت کا انکار کر دیا ہے۔ اس کے بعد یہ انکشاف کیا جاتا ہے کہ ان فتنہ پردازوں کے لیے کس قدر خوفناک عذاب تیار کیا گیا ہے۔ یہ آگ ہے جو حاضر ہے' دہکائی ہوئی ہے۔

وَأَعْتَدْنَا لِمَن كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيرًا (۲۵ : ۱۱) "اور جو اس گھڑی کو جھٹلائے' اس کے لیے ہم نے بڑھکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے"۔ یہاں قرآن کریم مجسم اور مشخص انداز میں آگ کو پیش کرتا ہے۔ تجسیم اور تشخیص قرآن مجید کا وہ انداز ہے جس میں ایسی اشیاء' ایسے معانی اور ایسے مفہومات کو زندہ شخص کے انداز میں پیش کرتا ہے جن کے لیے زندہ ہونا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن مجید مفاہیم و مناظر کو زندہ اشخاص کی شکل میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ کلام کے اندر اعلیٰ درجے کا اعجاز پیدا ہو جاتا ہے۔

ذرا سوچئے۔ ہم دہکتی ہوئی آگ کے سامنے کھڑے ہیں۔ یہ آگ ہمارے سامنے ایک زندہ غضبناک شخص کا روپ اختیار کرتی ہے کہ یہ دور سے ان مکذبین کو دیکھتی ہے۔ دیکھتے ہی یہ آگ غیظ و غضب میں مبتلا ہو جاتی ہے اور یہ لوگ دور سے اس کے اظہار غضب اور سخت کلامی کو پالیتے ہیں گویا وہ دور ہی سے ان پر حملہ آور ہونے کے لیے جوش دکھاتی ہے۔ اور جوش انتقام میں آپے سے باہر ہو رہی ہے حالانکہ یہ لوگ ابھی تک راستے میں ہوتے ہیں' پہنچے نہیں ہوتے۔ غرض یہ ایک نہایت ہی جھنجھوڑنے والا منظر ہے جسے دیکھنے والوں کی ٹانگوں پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

دیکھیے اب یہ پہنچ گئی اپنی منزل تک۔ اب یہ لوگ کھلے نہیں چھوڑے جاتے کہ ہاتھ پاؤں سے یہ آگ کے ساتھ مقابلہ کریں اور آگ انہیں شکست دے دے۔ یہ اس سے بچنے کی کوشش کریں۔ اور وہ انہیں پکڑ لے۔ بلکہ انہیں پکڑ کر اس میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اس حال میں کہ ان کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان کو آگ کے کھلے ہال میں بھی نہیں پھینک دیا جاتا بلکہ دوزخ کی آگ کے ایک نہایت ہی تنگ مقام پر ان کو اندر کر دیا جاتا ہے۔ جس میں یہ بمشکل سماتے ہیں' اس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اب یہ لوگ اس آگ سے رہائی پانے کے بارے میں بے حد مایوس ہوگئے ہیں۔ نہایت ہی کرب میں ہیں۔ اب مایوس ہوکر یہ صرف ہلاکت اور موت کی دعا کرتے ہیں۔

وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا (۲۵ : ۱۳) "اور جب یہ اس میں تنگ جگہ ٹھونسے جائیں گے تو اپنی موت کو پکارنے لگیں گے"۔ لیکن اب جہنم میں موت تو نہ پوری ہونے والی آرزو ہے۔ جبکہ یہ لوگ اس عذاب سے صرف موت کے ذریعہ ہی خلاصی پا سکتے ہیں کیونکہ یہ درد و کرب ناقابل برداشت ہے لیکن ان کو ان کی اس درخواست اور اس تمنا کا جواب بھی استہزاء اور مذاق کے ساتھ دیا جاتا ہے۔ جس طرح وہ رسولوں کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔ یہ ایک تلخ مذاق ہے۔

لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا (۲۵ : ۱۴) "آج ایک موت کو نہیں بہت سی موتوں کو پکارو"۔ کیونکہ ایک بار کی ہلاکت تو تمہیں کوئی فائدہ نہ دے گی۔ نہ ایک بار کی موت تمہارے لیے کافی ہے۔ تم بار بار مرو گے اور بار بار زندہ ہو گے۔

ان کے اس حال کو پیش کرنے کے بعد اب ان کے بالمقابل متقین مومنین کے انجام کی ایک جھلک بھی دکھائی جاتی ہے' جو اللہ سے ڈرتے تھے جو اللہ کے سامنے حاضر ہونے کی امید رکھتے تھے اور قیامت پر ان کا پختہ ایمان تھا۔ یہ انجام بھی ان کفار کو خطاب کرتے ہوئے نہایت ہی ہلکے انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا

لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا (۲۵ : ۱۵)

(۲۵ : ۱۶) "ان سے پوچھو یہ انجام اچھا ہے یا وہ ابدی جنت جس کا وعدہ خدا ترس پرہیز گاروں سے کیا گیا ہے' جو ان کے عمل کی جزا اور ان کے سفر کی آخری منزل ہوگی' جس میں ان کی ہر خواہش پوری ہوگی' جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے' جس کا عطا کرنا تمہارے رب کے ذمے ایک واجب الادا وعدہ ہے"۔ یہ شرمسار کنندہ عذاب بہتر ہے یا وہ باغات دائمی بہتر ہیں جو اللہ نے متقین کے لیے تیار کر رکھے ہیں۔ اللہ نے متقین کو یہ حق دیا ہے کہ یہ اس کا مطالبہ کریں۔ اور یہ طلب کریں کہ اے اللہ اپنا وعدہ پورا کیجئے اور اللہ وعدہ خلافی کرنے والا تو ہے نہیں۔ پھر یہ بھی ان کو اختیار دیا گیا ہے کہ جو چاہیں وہاں طلب کریں۔ کیا ان دونوں مقامات کے درمیان موازنہ کرنے کی بھی کوئی بات ہے کہ ان سے موازنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔ دراصل یہ ان کے ساتھ نہایت ہی تلخ مذاق ہے اور یہ ان کے اس مذاق کا جواب

ہے جو وہ یہاں اس رسول مقبول سے کرتے تھے۔

اب آخرت کا ایک دوسرا منظر جس کی تکذیب کرنے والے تکذیب کرتے تھے۔ یہ مشرکین کا اجتماع ہے ان کے ساتھ ان کے شرکاء بھی موجود ہیں جن کو یہ لوگ الٰہ اور شفیع سمجھتے تھے۔ یہ سب اللہ کے سامنے کھڑے اپنی اپنی جوابدہی کر رہے ہیں۔ سوال ہو رہے ہیں اور وہ جواب دے رہے ہیں۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَقُولُ ءَأَنْتُمْ أَضْلَلْتُمْ عِبَادِي هَٰؤُلَاءِ أَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ ﴿١٧﴾ قَالُوا سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنْبَغِي لَنَا أَنْ نَتَّخِذَ مِنْ دُونِكَ مِنْ أَوْلِيَاءَ وَلَٰكِنْ مَتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ نَسُوا الذِّكْرَ وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا ﴿١٨﴾ فَقَدْ كَذَّبُوكُمْ بِمَا تَقُولُونَ فَمَا تَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا وَلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَظْلِمْ مِنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيرًا ﴿١٩﴾

"اور وہی دن ہو گا جب کہ (تمہارا رب) ان لوگوں کو بھی گھیر لائے گا اور ان کے ان معبودوں کو بھی بلا لے گا جنہیں آج یہ اللہ کو چھوڑ کر پوج رہے ہیں' پھر وہ ان سے پوچھے گا "کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا؟ یا یہ خود راہ راست سے بھٹک گئے تھے؟" وہ عرض کریں گے "پاک ہے آپ کی ذات' ہماری تو یہ بھی مجال نہ تھی کہ آپ کے سوا کسی کو اپنا مولیٰ بنائیں۔ مگر آپ نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو خوب سامان زندگی دیا حتیٰ کہ یہ سبق بھول گئے اور شامت زدہ ہو کر رہے"۔ یوں جھٹلا دیں گے وہ (تمہارے معبود) تمہاری ان باتوں کو جو آج تم کہہ رہے ہو' پھر تم نہ اپنی شامت کو ٹال سکو گے نہ کہیں سے مدد پا سکو گے اور جو بھی تم میں سے ظلم کرے اسے ہم سخت عذاب کا مزا چکھائیں گے"۔

جن لوگوں کی مشرکین بندگی کرتے تھے بعض اوقات تو وہ بت ہوتے تھے' کبھی وہ ملائکہ اور جن ہوتے تھے اور کبھی دوسرے معبود ہوتے تھے۔ جن کو اللہ خوب جانتا ہے' لیکن اس کھلے میدان میں ان سے یہ سوال کرنا جواب طلب کرنا جب کہ سب کو اس مقصد کے لیے جمع کیا گیا ہو گا' زیادہ تشہیر اور شرمندہ کرنے کے لیے ہو گا۔ تشہیر جرم اور شرمندہ کرنا بھی دراصل ایک قسم کی سزا ہے اور جواب جو آ رہا ہے وہ ان تمام نسا (الہوں) کی طرف سے اللہ کے سامنے مکمل طور پر جھکنا ثابت کرتا ہے۔ اب یہ اللہ قہار اور مالک الملک کے سامنے مطیع فرمان کھڑے ہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ وہ اپنی الوہیت کا انکار کرتے ہیں بلکہ وہ اس بات سے بھی انکار کرتے ہیں کہ ان بے وقوفوں سے ان کی کوئی دوستی یا تعلق تھا۔ اس سے زیادہ مشرکین کے لیے اور شرمندگی کیا ہو گی کہ جن کو وہ الٰہ سمجھتے ہیں وہ ان کے اس تعلق سے بھی منکر ہوں گے۔

قَالُوا سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنْبَغِي لَنَا أَنْ نَتَّخِذَ مِنْ دُونِكَ مِنْ أَوْلِيَاءَ وَلَٰكِنْ مَتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ نَسُوا الذِّكْرَ وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا (۲۵:۱۸) "وہ عرض کریں گے "پاک

ہے آپ کی ذات ' ہماری تو یہ بھی مجال نہ تھی کہ آپ کے سوا کسی کو اپنا مولیٰ بنائیں - مگر آپ نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو خوب سامان زندگی دیا حتیٰ کہ یہ سبق بھول گئے اور شامت زدہ ہو کر رہے"۔ تو زندگی کا یہ مال و متاع جو مسلسل ان لوگوں کو حاصل رہا' جبکہ ان کو یہ معرفت بھی نہ تھی کہ یہ انعامات دینے والا بھی کوئی ہے اور نہ وہ دینے والے کا کوئی شکر ادا کرتے تھے تو اس غفلت نے ان کے دلوں سے ان انعامات کا احساس ہی دور کر دیا۔ یہ لوگ سب کچھ بھول گئے۔ چنانچہ ان کے دل اس طرح خشک اور غیر آباد ہو گئے جس طرح خشک سالی کے نتیجے میں زمین غیر آباد ہو کر بے آب و گیاہ ہو جاتی ہے۔ یہاں لفظ بوار استعمال ہوا ہے جو ہلاکت کے معنی میں آتا ہے۔ لیکن ہلاکت کے ساتھ اس کے مفہوم میں خشک سالی اور بے آب و گیاہ ہونا بھی داخل ہے یعنی دلوں کی خشکی اور زندگی کا خلا۔

چنانچہ یہاں اس مقام پر انہیں توہین آمیز خطاب کے ذریعہ شرمسار کیا جاتا ہے :

فَقَدْ كَذَّبُوكُمْ بِمَا تَقُولُونَ فَمَا تَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا (۲۵ : ۱۹) "یوں جھٹلا دیں گے وہ (تمہارے معبود) تمہاری ان باتوں کو جو آج تم کہہ رہے ہو' پھر تم نہ اپنی شامت کو ٹال سکو گے نہ کہیں سے مدد پا سکو گے"۔ یعنی نہ اس مصیبت کا منہ کسی اور طرف موڑ سکو گے اور نہ کسی جانب سے تمہیں کوئی امداد مل سکے گی۔

یہ منظر تو آخرت کا چل رہا ہے اور حشر کا میدان ہے لیکن بیچ میں ایک جھلک دنیا کی بھی دکھا دی جاتی ہے۔ یہ مکذبین اب زمین پر اس دنیا ہی میں نظر آتے ہیں۔ اور ان سے کہا جاتا ہے۔

وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيرًا (۲۵ : ۱۹) "اور جو تم میں سے ظلم کرے اسے ہم سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے"۔ اور قرآن کریم کا ایک مخصوص اسلوب ہے کہ وہ دلوں کو اس وقت چھوتا ہے جب وہ قبولیت کے لیے تیار ہوتے ہیں اور قیامت کا خوفناک منظر دیکھ کر وہ بات ماننے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔

--- ○○○ ---

اب جبکہ انہوں نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ لیا کہ ان لوگوں نے افتراء' تکذیب اور استہزاء کی انتہا کر دی ہے اور یہاں تک انہوں نے رسول اللہ کی بشریت' اس کی بازاروں میں چلت پھرت اور کھانے پینے پر بھی اعتراض کر دیا ہے' تو حضور اکرمؐ کی طرف روئے سخن پھر جاتا ہے اور آپ کو تسلی دی جاتی ہے اور آپ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ صرف آپؐ ہی کو رسول ایسا نہیں بنایا گیا کہ ان لوگوں کو تعجب ہو رہا ہے بلکہ تمام رسول ایسے ہی تھے جس طرح آپؐ ہیں اور ان کے حالات بھی ایسے تھے جس طرح آپؐ کے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِى الْاَسْوَاقِ ؕ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَ ۲
كَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿۲۰﴾ ع ۱۱ع

۱۷

"اے نبی، تم سے پہلے جو رسول بھی ہم نے بھیجے تھے وہ سب بھی کھانا کھانے والے اور بازاروں میں چلنے پھرنے والے لوگ ہی تھے - دراصل ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کے لیے آزمائش کا ذریعہ بنا دیا ہے - کیا تم صبر کرتے ہو؟ تمہارا رب سب کچھ دیکھتا ہے"۔

اگر یہ لوگ اعتراضات کر رہے ہیں تو یہ آپ کی ذات پر معترض نہیں ہیں - یہ تو ان کی ایک سنت اور اللہ کے ایک مستقل طریقہ کار پر یہ لوگ معترض ہیں - یہ طریق کار طے شدہ ہے - مقرر اور متعین ہے - اور اس کا ایک متعین انجام ہے -

وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً (۲۵ : ۲۰) "دراصل ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کے لیے آزمائش کا ذریعہ بنا دیا ہے"۔ تاکہ جو لوگ اللہ کی حکمت اور تدبیر کو نہیں جانتے - وہ اعتراض کرتے رہیں اور جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں اور اس کی حکمت اور اس کے تصرفات کو جانتے ہیں وہ صبر کرتے رہیں اور دعوت اسلامی غالب ہو اور غلبے کا مقابلہ کرنے اور اس مقابلے اور کشمکش میں انسانی وسائل استعمال کرتے ہوئے آگے بڑھے - اس کشمکش میں جو شخص ثابت قدم رہے وہ کامیاب ہوئے -

اَتَصْبِرُوْنَ (۲۵ : ۲۰) "کیا تم صبر کرتے ہو؟" یعنی کیا تم مشکلات پر صبر کرو گے - تو

وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا (۲۵ : ۲۰) "تمہارا رب سب کچھ دیکھتا ہے"۔ وہ تمام لوگوں کے مزاج کو دیکھ رہا ہے - تمام دلوں کو دیکھ رہا ہے، اور تمام لوگوں کے حالات اور انجام کا اسے علم ہے - تمہارا پورا اجر ملے گا۔

وَكَانَ رَبُّكَ (۲۵ : ۲۰) میں اللہ نے اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب کہہ کر پکارا ہے - اس انداز بیان سے دل پر خوب اثر ہوتا ہے - دل تر و تازہ ہو جاتا ہے - اسے تسلی ہوتی ہے اور سکون ملتا ہے - اور وہ از سر نو جدوجہد کے لیے تیار ہوتا ہے - یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اے محمدؐ ہم دیکھ رہے ہیں، تمہارے ساتھ ہیں، فکر مت کرو، نہ صرف یہ کہ ظاہری حالات ہماری نظر میں ہیں بلکہ نہایت خفیہ اور دلوں کی بات بھی ہماری نظر میں ہے - اس انداز بیان سے اللہ اپنے آپ کو اپنے بندوں کے قریب بتاتا ہے -

--- ○○○ ---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ---- ۱۹

## سورۃ الفرقان – ۲۵

۲۱-- تا-- ۷۷

## سورۃ الشعراء – ۲۶

۱-- تا-- ۲۲۷

## سورۃ النمل – ۲۷

۱-- تا-- ۱۵۹

# درس نمبر ۱۵۸ ایک نظر میں

اس سبق کا آغاز بھی اسی انداز سے ہوتا ہے جس سے درس سابق کا ہوا تھا اور مضمون بھی اسی انداز سے چلتا ہے ' البتہ یہاں مشرکین کے اعتراضات کا رخ رب تعالیٰ کی طرف ہے ۔ یہاں وہ اللہ پر اعتراضات کرتے ہیں اور اللہ کو اپنا لائحہ عمل دیتے ہیں ۔ گویا اس سبق میں وہ اپنی سرکشی میں ترقی کرتے ہوئے رسول اللہ ؐ پر اعتراضات کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور خدا پر اعتراضات کرتے ہیں ۔ یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور دل جوئی کا ایک انداز ہے کہ یہ لوگ صرف آپ ہی پر اعتراضات نہیں کرتے بلکہ ان کی گستاخی اللہ کے جناب میں بھی ہے ۔ البتہ یہاں جواب دینے کے بجائے نہایت ہی شتابی سے ان کو قیامت کے مناظر میں سے بعض مناظر کی جھلکیاں دکھا دی جاتی ہیں ۔ اور یہی ان کی گستاخی کا مناسب جواب ہے ۔ ان کی گستاخی یہ تھی ۔

لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا (۲۵ : ۲۱) "کیوں نہ فرشتے ہمارے پاس بھیجے جائیں یا ہم اپنے رب کو دیکھیں" ۔ اس کے بعد ان کا یہ اعتراض نقل کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم ٹکڑوں کی شکل میں کیوں اترا ہے ۔ اس کا جواب دیا جاتا ہے اور یہ بیان کر دیا جاتا ہے کہ کیوں قرآن مجید مسلسل ٹکڑوں کی شکل میں اترا ۔ رسول اللہ ؐ کو تسلی دی جاتی ہے کہ جب بھی وہ مباحثہ کر کے کوئی بات لاتے ہیں ' ہم بھی نئی تاویل آپ کو دے دیتے ہیں اور بہترین تفسیر اور تشریح کر دیتے ہیں ۔ اس کے بعد حضور ؐ اور آپ ؐ کے مخاطبین کے غور کے لیے بعض مکذبین کی ہلاکت کے وقت کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے کہ یہ اقوام کس طرح ہلاک کی گئیں ۔ ذرا قوم لوط کے کھنڈرات پر تو غور کرو ۔ تم رات دن ان پر سے گزرتے ہو ۔ قرآن کریم ان پر سخت گرفت کرتا ہے کہ جب یہ رات دن ان کھنڈرات کو دیکھتے ہیں تو ان کے دلوں پر کچھ اثر نہیں ہوتا ۔ یہ سب باتیں اس لیے لائی گئی ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر جو اعتراضات کرتے تھے ' اس کا ایک بیان یہاں دے دیا جائے ۔ یہ واقعات دے کر ان پر ایک زوردار تبصرہ کیا جاتا ہے ۔ اس میں ان کا نہایت ہی حقارت آمیز نقشہ کھینچا جاتا ہے اور نہایت ہی حقیقت پسندانہ '

اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (۲۵ : ۴۴) "یہ تو بس حیوانوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں" ۔

--- ○○○ ---

# درس نمبر ۱۵۸ تشریح آیات

## ۲۱ --- تا --- ۴۴

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى
رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿٢١﴾ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ
لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿٢٢﴾ وَقَدِمْنَآ اِلٰى
مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿٢٣﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ
مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿٢٤﴾ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ
تَنْزِيْلًا ﴿٢٥﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِۨالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۭ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿٢٦﴾
وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰي يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿٢٧﴾
يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿٢٨﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ
جَآءَنِيْ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿٢٩﴾

"جو لوگ ہمارے حضور پیش ہونے کا اندیشہ نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں "کیوں نہ فرشتے ہمارے پاس بھیجے جائیں؟ یا پھر ہم اپنے رب کو دیکھیں"۔ بڑا گھمنڈ لے بیٹھے یہ اپنے نفس میں اور حد سے گزر گئے اپنی سرکشی میں۔ جس روز یہ فرشتوں کو دیکھیں گے وہ مجرموں کے لیے کسی بشارت کا دن نہ ہو گا۔ چیخ اٹھیں گے کہ پناہ بخدا' اور جو کچھ بھی ان کا کیا دھرا ہے اسے لے کر ہم غبار کی طرح اڑا دیں گے بس وہی لوگ جو جنت کے مستحق ہیں اس دن اچھی جگہ ٹھہریں گے اور دوپہر گزارنے کو عمدہ مقام پائیں گے۔ آسمان کو چیرتا ہوا ایک بادل اس روز نمودار ہو گا اور فرشتوں کے پرے کے پرے اتار دیئے جائیں گے۔ اس روز حقیقی بادشاہی صرف رحمٰن کی ہو گی اور وہ منکرین کے لیے بڑا سخت دن ہو گا۔ ظالم انسان اپنے ہاتھ چبائے گا اور کہے گا "کاش میں نے رسول کا ساتھ دیا ہوتا۔ ہائے میری کم بختی' کاش میں نے فلاں شخص کو

دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس کے بہکائے میں آکر میں نے وہ نصیحت نہ مانی جو میرے پاس آئی تھی' شیطان انسان کے حق میں بڑا ہی بے وفا نکلا"۔

مشرکین کو ہماری ملاقات کی امید نہیں ہے اور نہ وہ اس کا انتظار کرتے ہیں اور نہ وہ اس کو کوئی اہمیت دیتے ہیں نہ اپنی زندگی اور اس کی سرگرمیوں کو وہ اس نظریہ کے مطابق قائم کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے دلوں میں نہ اللہ کا خوف ہے' نہ اللہ کی محبت اور وقار ہے۔ اس لیے اللہ کے حوالے سے بھی ان کی زبان سے ایسے کلمات نکلتے ہیں جو کبھی بھی ایسے شخص کی زبان سے نہیں نکل سکتے جسے خدا کا خوف ہو۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰي رَبَّنَا

(۲۵ : ۲۱) "جو لوگ ہمارے حضور پیش ہونے کا اندیشہ نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں "کیوں نہ فرشتے ہمارے پاس بھیجے جائیں؟ یا پھر ہم اپنے رب کو دیکھیں"۔ یہ لوگ اس بات کو مستبعد سمجھتے تھے کہ کوئی رسول بشر بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ مطالبہ کرتے تھے کہ جس عقیدے کی طرف ہمیں دعوت دی جا رہی ہے' کوئی فرشتہ اترے اور وہ اس پر شہادت دے۔ یا یہ کہ وہ خود باری تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اس کی تصدیق کریں۔ یہ دراصل اللہ کے مقام اور مرتبہ پر دست درازی ہے اور اس جاہل اور سرکش کا مطالبہ ہے جو مقام رب العالمین کا کوئی احساس نہیں رکھتا اور وہ اللہ تعالیٰ کی قدر اس طرح نہیں کرتا جس طرح حق تعالیٰ کی قدر ہونا چاہئے۔ یہ گستاخی کرنے والے کون ہوتے ہیں اور ان کی اللہ کے مقابلے میں حیثیت ہی کیا ہے جو برگزیدہ' جبار اور کبیر ہے۔ یہ اللہ کی عظیم مملکت اور اللہ کی اس عظیم کائنات میں حیثیت ہی کیا رکھتے ہیں۔ ایک حقیر ذرے کی حیثیت تو ان کی ہے۔ انسان کی اس کائنات میں کوئی حیثیت اگر بنتی بھی ہے تو تب بنتی ہے کہ وہ اپنا تعلق اللہ سے جوڑ کر اور اپنا وزن ایمان کے ذریعہ بڑھا کر اپنی کچھ حیثیت پیدا کرے۔ چنانچہ اس آیت کے اندر بات ختم کرنے سے قبل ہی اللہ تعالیٰ بتا دیتا ہے کہ اس گستاخی کا سبب کیا ہے۔

لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا (۲۵ : ۲۱) "بڑا گھمنڈ لیے بیٹھے ہیں یہ اپنے نفسوں میں اور حد سے گزر گئے ہیں یہ اپنی سرکشی میں"۔ وہ اپنے خیال میں بہت بڑی شے ہیں۔ چنانچہ وہ گھمنڈ میں مبتلا ہیں اور اس گھمنڈ کی وجہ سے بہت ہی بڑی سرکشی میں مبتلا ہیں۔ یہ اپنے اندر اس قدر مست ہیں کہ حقیقی قدروں کا صحیح وزن نہیں کر سکتے۔ اب ان لوگوں کی عادت یہ ہے کہ یہ لوگ صرف اپنے نفس کا احساس کرتے ہیں۔ ان کا نفس ان کی نظروں میں اس قدر بڑی چیز ہے کہ اس کائنات میں وہ اپنے نفس ہی کو بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ اس قدر بڑی چیز کہ اللہ جل شانہ کو بھی اس کے سامنے ظاہر ہونا چاہئے تاکہ وہ اسے دیکھ کر اس کی تصدیق کریں اور اس پر ایمان لائیں۔

ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اللہ بطور مذاق اور استہزاء ان کے سامنے ان کی بدحالی اور لاچاری کا ایک نقشہ پیش کرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب قیامت کے دن یہ لوگ فرشتوں کو دیکھیں گے (ملائکہ کا دیکھنا بھی ان کے مطالبات میں سے ایک مطالبہ تھا) تو اس دن ان پر برا دن ہو گا۔ ان کا حال یہ ہو گا کہ ان کے سامنے وہ عذاب موجود ہو گا جو ٹلنے والا نہ ہو گا' اس سے نجات کی ان کو کوئی صورت نظر ہی نہ آئے گی اور یہ عذاب اور جزاء کا دن ہو گا۔

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰي يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا

(۲۲:۲۵) وَقَدِمْنَآ اِلٰي مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (۲۵:۲۳) "جس روز یہ فرشتوں کو دیکھیں گے وہ مجرموں کے لیے کسی بشارت کا دن ہو نہ گا۔ چیخ اٹھیں گے کہ پناہ بخدا' اور جو کچھ بھی ان کا کیا دھرا ہے اسے لے کر ہم غبار کی طرح اڑا دیں گے"۔ جس دن ان کے اس مطالبے پر عمل ہو گا اور فرشتے سامنے آ جائیں گے۔ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ یہ ان فرشتوں کو دیکھ لیں گے۔ لیکن اس دن ان کے لیے کوئی خوشخبری نہ ہو گی بلکہ ان کے لیے عذاب کی خبر ہو گی۔ تو ان کا مطالبہ عجیب انداز میں پورا ہو گا۔ اس دن تو وہ یوں گویا ہوں گے۔ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا (۲۵:۲۲) "خدا کی پناہ"۔ حرام اور ممنوع۔ یہ جملہ وہ شر سے بچنے کے لیے کہتے تھے۔ دشمنوں کو کہتے تھے۔ یہ وہ دشمنوں کے ہلاک ہونے اور ان کے شر سے محفوظ ہونے کے لیے کہتے تھے۔ یہ فقرہ قیامت میں ان کی زبان سے نکل پڑے گا۔ جس طرح یہ فقرہ وہ دنیا میں شر سے پناہ مانگنے کے لیے بول دیتے تھے۔ آج ان کو خدا کی پناہ نصیب کب ہو سکتی ہے۔ آج وہ لاکھ مرتبہ خدا کی پناہ مانگیں' ان کو کوئی فائدہ نہ ہو گا۔

وَقَدِمْنَآ اِلٰي مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (۲۵:۲۳) "اور وہ جو انہوں نے کیا دھرا ہے اسے لے کر ہم غبار کی طرح اڑا دیں گے"۔ یہ عمل ایک لحظہ میں مکمل ہو جائے گا۔ ان کے تمام اعمال غبار کی شکل میں اڑا دیئے جائیں گے۔ انداز تعبیر کو ذرا دیکھئے۔ ہمارا خیال اس طرح دیکھتا ہے کہ ایک صاحب جسم ذات آتی ہے اور ان کے اعمال کو لے کر غبار کی طرح اڑا دیتی ہے۔ یہ ہے قرآن کریم کا انداز تجسیم اور تخییل۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے دنیا میں اعمال صالحہ کی شکل میں جو کچھ جمع کیا تھا وہ غبار کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ اس لیے کہ ان کے یہ اعمال ایمان پر مبنی نہ تھے۔ ایمان کے ذریعہ ہی انسان اللہ تک پہنچتا ہے۔ ایمان اعمال صالحہ کو ایک منہاج اور ایک پختگی اور دوام بخشتا ہے اور یہ اعمال ایک مقصد اور ایک سمت رکھتے ہیں۔ نہ یہ کسی وقتی جذبے کے تحت صادر ہوتے ہیں اور نہ کسی ایسے شخص کی دوڑ دھوپ ہوتی ہے جس کو صحیح راہ اور سمت معلوم ہی نہیں ویسے ہی ادھر ادھر بھاگتا ہے۔ یا محض بے مقصد دوڑ دھوپ ہے۔ اسلام میں کسی ایسے عمل صالح کی کوئی قیمت نہیں ہے جس کی کوئی سمت' کوئی مقصد اور کوئی روح متعین نہ ہو۔ کیونکہ ایسے اعمال کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہوتا۔

اس کائنات میں انسان کا وجود' اس کے اعمال' اس کی زندگی کی دوڑ دھوپ دراصل اس کائنات کی حقیقت سے مربوط ہیں۔ یہ انسان بھی ناموس فطرت کا ایک پرزہ ہے۔ اور یہ پوری کائنات ذات باری سے مربوط ہے۔ اس میں انسان اور اس کی تمام سرگرمیاں شامل ہیں۔ اگر انسان کی تگ و دو اور اس کی حرکت اور دوڑ دھوپ اس اصلی نور سے کٹ جائے تو وہ بے مقصد ہو جاتی ہے۔ وہ ضائع ہو جاتی ہے اور اس کا کوئی وزن اور قدر و قیمت عند اللہ نہیں ہوتی۔ اس کے اعمال کا نہ کوئی حساب ہو گا اور نہ ہی اس کی کوئی قدر و قیمت ہو گی بلکہ اسلامی نظر میں اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ وہ محض ہوا اور غبار ہے۔

ایمان انسان کو رب تک پہنچاتا ہے۔ اس طرح پھر اللہ رب العالمین کے ہاں اس کے اعمال کا بھی وزن ہوتا ہے۔ اور اس کائنات کے حساب میں اس کا حساب رکھا جاتا ہے اور اس کے اعمال اس کائنات کی تعمیر و ترقی میں دکھائے جاتے

ہیں۔ ان مشرکوں کا چونکہ ایمان نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کے اعمال کو کالعدم کر دیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے نہایت ہی مجسم اور حسی انداز تعبیر اختیار کیا ہے۔

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (۲۵: ۲۳) "اور ہم ان اعمال کی طرف بڑھے جو انہوں نے کیے تھے تو ان اعمال کو غبار کی طرح اڑا دیا"۔

اور مومنین کا حال کیا ہو گا۔ تقابل کے لیے وہ بھی ملاحظہ ہو۔ یہ اصحاب جنت ہیں۔

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِيْلًا (۲۵: ۲۴) "پس وہی لوگ جو جنت کے مستحق ہیں اس دن اچھی جگہ ٹھہریں گے اور وہ دوپہر گزارنے کو عمدہ مقام پائیں گے"۔ وہ نہایت آرام، خوشی اور استقلال کے ساتھ گھنے سایوں میں رہیں گے۔ اور یہاں مستقر کا لفظ کافروں کے اعمال کی ناپختگی اور ہوا میں غبار کی طرح اڑ جانے کے بالمقابل لایا گیا ہے اور دوپہر کا آرام اور سکون مقابل ہے۔ اہل کفر کے جزع و فزع کا، کہ وہ بے اختیار ہو کر اب خدا کی پناہ مانگتے ہیں اور کہتے ہیں حِجْرًا مَّحْجُوْرًا (۲۵: ۲۲) کفار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ اللہ ان کے سامنے بادلوں کے سایہ میں آئے اور فرشتے آپؐ کے ساتھ ہوں۔ یہ مطالبے وہ بنی اسرائیل کی کہانیاں سن کر کرتے تھے کہ ان کے مطابق اللہ تعالیٰ بادلوں کے سائے میں اتر رہا ہے۔ یا ایک آگ کے عمودی شعلے کی شکل میں۔ چنانچہ قرآن کریم ایک دوسرے انداز میں قیامت کے دن ان کے مطالبے کے پورا ہونے کا ایک منظر پیش کرتا ہے جس دن فرشتے اتریں گے۔

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا (۲۵: ۲۵) اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا (۲۵: ۲۶) "اس روز ایک بادل آسمان کو چیرتا ہوا نمودار ہو گا اور فرشتوں کے پرے کے پرے اتار دیئے جائیں گے۔ اس روز حقیقی بادشاہی صرف رحمٰن کی ہو گی۔ اور وہ منکرین کے لیے سخت دن ہو گا"۔ یہ آیت اور قرآن کریم کی بے شمار دوسری آیات یہ بتلاتی ہیں کہ اس دن نہایت ہی بڑے فلکیاتی واقعات و حادثات ہوں گے۔ اور تمام ایسی آیات کا اشارہ اس طرف ہے کہ یہ کائنات جو ہمیں نظر آتی ہے اور اس کا یہ نظام جو ہمیں نظر آتا ہے، یہ سب کا سب درہم برہم ہو جائے گا۔ اس کے تمام افلاک، کواکب اور ستارے باہم ٹکرا جائیں گے۔ اس کائنات کے نظام، اشیاء کے باہم روابط، اور ہر چیز کی موجودہ شکل بدل جائے گی اور یہ حادثہ اس دنیا کا اختتام ہو گا۔ یہ کائناتی انقلاب صرف زمین تک محدود نہ ہو گا۔ اس کی زد میں تمام ستارے، تمام آسمان اور تمام کواکب آئیں گے۔ یہاں مناسب ہے کہ یہاں اس انقلاب کے بعض مناظر پیش کر دیئے جائیں جو متعدد سورتوں میں آئے ہیں۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (۱) وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ (۲) وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (۳) ------ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (٦) (۸۱: ۱ تا ۳ و ٦) "جب

سورج لپیٹ دیا جائے گا جب تارے بکھر جائیں گے' جب پہاڑ چلائے جائیں گے ------ اور جب سمندر بھڑکائے جائیں گے"۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (۱) وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (۲) وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ (۳) وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ (٤) (۸۲ : ۱ تا ٤) "جب آسمان پھٹ جائے گا' جب تارے بکھر جائیں گے اور سمندر پھاڑ دیے جائیں گے اور جب قبریں کھول دی جائیں گی"۔

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (۱) وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (۲) وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ (۳) وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ (٤) وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (٥) (٨٤ : ۱ تا ٥) "جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے گا اور اس کے لیے حق یہی ہے اور جب زمین پھیلا دی جائے گی اور جو کچھ اس کے اندر ہے' اسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کے لیے حق یہی ہے (کہ اس کی تعمیل کرے)

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا (٤) وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (٥) فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا (٦) (٥٦ : ٤ تا ٦) "جب زمین یکبارگی ہلا ڈالی جائے گی اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے کہ پراگندہ بن کر رہ جائیں گے"۔

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ (۱۳) وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً (١٤) فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (١٥) وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ (١٦) (٦٩ : ١٣ تا ١٦) "پھر جب ایک دفعہ صور میں پھونک مار دی جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔ اس روز وہ ہونے والا واقعہ پیش آ جائے گا"۔

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ (٨) وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ (٩) (٧٠ : ٨ - ٩) "جس دن آسمان پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنے ہوئے اون جیسے ہو جائیں گے"۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (١) وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (٢) (٩٩ : ١ - ٢) "جب زمین اپنی پوری قوت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے اندر کے بوجھ باہر نکال دے گی"۔

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ (٤) وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ (٥) (١٠١ : ٤ — ٥) "وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون کی طرح ہوں گے"۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ (١٠) يَّغْشَي النَّاسَ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (١١) (٤٤ : ١٠ — ١١) "اچھا انتظار کرو جب آسمان صریح دھواں لائے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا۔یہ ہے دردناک سزا"۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا (٧٣ : ١٤)
"جب زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے اور پہاڑوں کا ایسا ہو جائے گا جیسے ریت کے ڈھیر ہیں جو بکھرے جا رہے ہیں"۔

السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِه (٧٣ : ١٨) "آسمان پھٹا جا رہا ہو گا اس دن"۔

كَلَّا اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا (٨٩ : ٢١) "ہرگز نہیں جب زمین پے در پے کوٹ کوٹ کر ریگ زار بنا دی جائے گی"۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ (٧) وَخَسَفَ الْقَمَرُ (٧) وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (٩) (٧٥ : ٧ تا ٩) "پھر جب دیدے پتھرا جائیں گے اور چاند بے نور ہو جائے گا اور چاند اور سورج ملا کر ایک کر دیئے جائیں گے"۔

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ (٨) وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ (٩) وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ (١٠) (٧٧ : ٨ تا ١٠) "پھر جب ستارے ماند پڑ جائیں گے اور آسمان پھاڑ دیا جائے گا اور پہاڑ دھنک ڈالے جائیں گے"۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا (١٠٥) فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا (١٠٦) لَّا تَرٰي فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا (١٠٧) (٢٠ : ١٠٥ تا ١٠٧) "یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اس دن پہاڑ کہاں چلے جائیں گے۔کہو میرا رب ان کو دھول بنا کر اڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں کوئی بل اور سلوٹ نہ دیکھو گے"۔

وَتَرَي الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ —— (٢٧ : ٨٨)

"آج تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوب ہوئے ہیں مگر اس وقت یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے"۔

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً (۱۸ : ۴۷) "جب ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور تم زمین کو بالکل برہنہ پاؤ گے"۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (۱۴ : ۴۸) "اس روز جبکہ زمین و آسمان بدل کر کچھ سے کچھ کر دیئے جائیں گے"۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (۲۱ : ۱۰۴) "وہ دن جبکہ آسمان کو ہم یوں لپیٹ کر رکھ دیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیئے جاتے ہیں"۔ یہ تمام آیات بتاتی ہیں کہ ہماری اس دنیا کا انجام نہایت ہی خوفناک ہو گا۔ اس میں اس زمین کو ہلا مارا جائے گا اور اجسام عظیمہ ایک دوسرے کے ساتھ دھماکے سے ٹکرا جائیں گے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر اڑ جائیں گے۔ سمندر پھٹ جائیں گے یعنی کرۂ ارض کے اضطرابات کی وجہ سے یا سمندروں کے ذرات پھٹ جائیں گے اور تابکاری سے پانیوں میں آگ لگ جائے گی۔ چکمدار ستارے بے نور ہو جائیں گے۔ آسمان پھٹ جائے گا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گا۔ کواکب ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو کر منتشر ہو جائیں گے۔ تمام آسمانی دوریاں ختم ہو جائیں گی۔ شمس و قمر ایک ہو جائیں گے۔ آسمان کبھی سیاہ دھوئیں کی طرح ہو گا اور کبھی آگ کے شعلے کی طرح ہو گا۔ غرض یہ ایک ہولناک گھڑی ہوگی اور اس میں انسان سخت خوفزدہ ہو گا۔

غرض ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ مشرکین کو اس بات سے ڈراتا ہے ہیں کہ اس روز آسمان کو چیرتا ایک بادل نمودار ہوں گے اور اس دن فرشتوں کے پرے کافرین پر نازل ہوں گے، جیسا کہ ان کا مطالبہ تھا۔ یہ مطالبہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے لیے نہ کرتے تھے یہ فرشتے اللہ کے حکم سے اللہ کا عذاب لے کر آئیں گے۔

وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا (۲۵ : ۲۶) "اور منکرین کے لیے یہ بڑا سخت دن ہو گا"۔ کیونکہ اس دن میں سخت عذاب سامنے ہو گا اس لیے وہ ایک ہولناک دن ہو گا۔ یہ لوگ کم علمی سے نزول ملائکہ کا مطالبہ کرتے ہیں حالانکہ ملائکہ عذاب لے کر آتے ہیں۔

اس کے بعد قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر لایا جاتا ہے۔ اس میں یہ گمراہ اور ظالم بہت زیادہ شرمندہ ہوں گے۔ یہ منظر بہت ہی طویل ہے۔ اس قدر طویل کہ ناظرین یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ منظر چلتا ہی رہے گا۔ یہ ظالم نہایت ندامت اور حسرت کی وجہ سے ہاتھ کاٹ رہا ہے، خود اپنے ہاتھ۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا

(۲۵ : ۲۷) يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِي لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا (۲۵ : ۲۸) لَقَدْ اَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ

اِذْ جَآءَنِيْ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا (۲۵: ۲۹) "ظالم انسان اپنے ہاتھ چبائے گا اور کہے گا" کاش میں نے رسول کا ساتھ دیا ہوتا۔ ہائے میری کم بختی 'کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس کے بہکائے میں آکر میں نے وہ نصیحت نہ مانی جو میرے پاس آئی تھی' شیطان انسان کے حق میں بڑا ہی بے وفا نکلا"۔ یہ شخص اس گہرے تاسف کا اظہار کر رہا ہے اور اس کے ماحول پر سناٹا چھایا ہوا ہے۔ یہ شخص اپنی حسرتناک آواز کو بلند کرتے چلا جاتا ہے۔ اس کی چیخیں اس قدر دلدوز ہیں اور ان کا اثر اس قدر طویل ہے کہ یہ تخیل طویل ہوتی جا رہی ہے۔ اثرات عمیق ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں تک آج بھی ان آیات کا پڑھنے والا گہرا تاسف لے لیتا ہے۔ منظر کو دیکھنے والے شریک غم ہو جاتے ہیں۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰي يَدَيْهِ (۲۵: ۲۷) "اس دن یہ ظالم اپنے ہاتھ چبائے گا"۔ یہ صرف ایک ہاتھ کو نہ چبائے گا بلکہ دونوں ہاتھوں کو چبائے گا۔ کبھی اس کو کبھی اس کو۔ یہ شدت غم کی وجہ سے اپنے ہاتھوں پر اپنا غصہ اتارے گا۔ ہاتھوں کو چبانا اشارہ اس طرف ہے کہ اس دن ظالم کی نفسیاتی حالت کیا ہو گی۔ اس کے غم اور اندوہ کو نہایت ہی مجسم فعل اور حرکت کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے یعنی غم کو یہ برداشت نہ کر سکے گا۔

يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا (۲۵: ۲۷) "کہے گا کاش میں نے رسول اللہؐ کا ساتھ دیا ہوتا"۔ رسول کے طریقے پر چلا ہوتا۔ رسول سے علیحدہ نہ ہوا ہوتا۔ گمراہ نہ ہوا ہوتا۔ وہ رسول جس کی رسالت کا وہ منکر تھا' اس لیے کہ یہ رسول بشرکیوں ہے۔

يٰوَيْلَتٰي لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا (۲۵: ۲۸) "میری کم بختی! کاش میں فلاں کو اپنا دوست نہ بناتا"۔ فلاں کو عام کر دیا ہے۔ کسی کا نام نہیں لیا تاکہ اس میں تمام گمراہ کنندگان شامل ہو جائیں۔ تمام دوست جو دوستوں کو گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں لیکن روایات میں آتا ہے کہ ان آیات کا سبب نزول عقبہ ابن ابی معیط ہے۔ یہ شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت ہی بیٹھتا اٹھتا تھا۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ضیافت کے لیے بلایا تو حضورؐ نے فرمایا کہ میں تمہاری دعوت اس وقت تک قبول نہ کروں گا جب تک تم دو باتوں کی شہادت نہ دو۔ چنانچہ اس نے ایسا کیا۔ ابی ابن خلف بھی اس کا دوست تھا۔ اس نے اسے بہت ہی شرمندہ کیا۔ اور کہا تو بے دین ہو گیا ہے۔ تو اس نے جواب دیا کہ خدا کی قسم میں نے محمدؐ کے دین کو قبول نہیں کیا۔ لیکن اس نے کہا کہ میں تمہاری دعوت اس وقت تک قبول نہ کروں گا جب تم کلمہ شہادت ادا نہ کرو۔ حالانکہ وہ میرے گھر میں تھے اور میرا کھانا نہ کھاتے تھے۔ مجھے اس سے بڑی شرم آئی کہ وہ میرا کھانا نہ کھائے۔ اس لیے میں نے کلمہ شہادت پڑھ لیا۔ تو ابی ابن خلف نے کہا خدا کی قسم میں تم سے تب راضی ہوں گا کہ تم اس کی گردن دبا کر اس کے منہ پر تھوکو۔ حضورؐ اسے دار الندوہ میں سجدہ کرتے ہوئے مل گئے۔ اور اس (بدبخت) نے ایسا ہی کیا۔ اسے حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ مکہ سے باہر تم جب بھی مجھے ملو گے میں تمہارا سر اڑا دوں گا۔ یہ شخص بدر کے دن گرفتار ہوا۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ اس کی گردن اڑا دو۔

لَقَدْ اَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِي (۲۵: ۲۹) "اس کے بہکاوے میں آکر میں نے وہ نصیحت نہ مانی جو میرے پاس آئی تھی"۔ یہ دراصل شیطان تھا جو گمراہ کر رہا تھا یا شیطان کا مددگار تھا۔

وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا (۲۵: ۲۹) "اور شیطان انسان کے حق میں بڑا ہی بے وفا نکلا"۔ وہ انسان کو شرمندگی کے انجام تک پہنچاتا ہے۔ اور جب سچائی کا وقت آتا ہے کہ ہمیشہ شیطان بھاگ جایا کرتے ہیں۔ خصوصاً ہولناک اور کربناک مناظر و مواقع میں۔

یوں قرآن کریم نے ان لوگوں کے دلوں کو جھنجھوڑا۔ ان کے سامنے ان کے انجام کو کپکپا دینے والے مناظر کی شکل میں پیش کیا۔ اس طرح کہ گویا وہ ایک واقعہ ہے جسے دیکھا جا رہا ہے۔ حالانکہ وہ لوگ ابھی اس زمین پر ہی ہیں جو اللہ کی تکذیب کر رہے ہیں اور اللہ کے سامنے پیش ہونے کا بڑی حقارت کے ساتھ انکار کر رہے ہیں اور ایسے مطالبات کر رہے ہیں جو بیہودہ ہیں۔ حالانکہ وہاں نہایت ہی خوفناک صورت حال سے دوچار ہونے والے ہیں اور نہایت ہی شرمساری اور ندامت سے دوچار ہوں گے لیکن اس وقت ندامت کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اب روئے سخن مناظر قیامت سے اس دنیا کی طرف آ جاتا ہے۔ رسول اللہؐ کے حوالے سے انہوں نے جو موقف اختیار کر رکھا ہے اس پر بات ہوتی ہے۔ اب ان کا اعتراض یہ ہے کہ قرآن مجید سب کا سب ایک ہی مرتبہ کیوں نازل نہیں ہو گیا۔ موجودہ انداز نزول قرآن قابل اعتراض ہے۔ اس سوال و جواب کا خاتمہ بھی قیامت کے منظر پر ہوتا ہے کہ جس طرح ان کا اعتراض الٹا ہے' اسی طرح وہ جہنم میں الٹے ڈالے جائیں گے۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا
وَّنَصِيْرًا ﴿۳۱﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً
وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾ وَلَا يَاْتُوْنَكَ
بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿۳۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى
وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۳۴﴾ ع ۱۴

"اور رسول کہے گا کہ اے میرے رب' میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانہ تضحیک بنا لیا تھا۔ اے نبیؐ' ہم نے تو اسی طرح مجرموں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے اور تمہارے لیے تمہارا رب ہی رہنمائی اور مدد کو کافی ہے۔ منکرین کہتے ہیں اس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا؟" ہاں ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کو اچھی طرح

ہم تمہارے ذہن نشین کرتے ہیں اور (اسی غرض کے لیے) ہم نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزاء کی شکل دی ہے اور (اس میں یہ مصلحت بھی ہے کہ جب بھی وہ تمہارے سامنے کوئی نرالی بات (یا عجیب سوال) لے کر آئے 'اس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے تمہیں دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی۔ جو لوگ اوندھے منہ جہنم کی طرف دھکیلے جانے والے ہیں 'ان کا موقف بہت برا ہے اور ان کی راہ حد درجہ غلط"۔

انہوں نے اس قرآن کو چھوڑ دیا جو اللہ نے اپنے بندے پر نازل کیا تھا تاکہ ان کو ڈرائے۔ اور ان کو بصیرت عطا کرے۔ انہوں نے قرآن کو اس طرح چھوڑا کہ اسے سننے سے بھی دور بھاگے 'مارے اس خوف کے کہ اگر انہوں نے سن لیا تو وہ اپنی بے پناہ تاثیر سے ان کو متاثر کرے گا۔ اور وہ اس کے اثرات کو مسترد نہ کر سکیں گے۔ انہوں نے اگر سنا بھی تو اس کے مضامین پر غور و فکر نہ کیا تاکہ وہ سچائی کو پا سکیں اور اس کی راہ پر چلیں۔ انہوں نے اسے اس طرح چھوڑا کہ اسے اپنا دستور حیات نہ بنایا۔ حالانکہ وہ نازل اسی لیے کیا گیا تھا کہ وہ اسے نظام حیات بتائیں۔

وَ قَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵ : ۳۰) "اور رسول کہے گا اے میرے رب' میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانہ تضحیک بنا لیا تھا"۔ اور رب تعالیٰ تو جانتا تھا کہ ایسا ہوا ہے لیکن یہ فریاد اور انابت الی اللہ کے طور پر دعا ہے اور اللہ کو بھی معلوم ہے اور اللہ اس کی شہادت دے رہا ہے کہ رسولؐ نے اس سلسلے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے لیکن یہ قوم کا قصور ہے کہ اس نے اس قرآن کو نہ سنا اور نہ اس پر غور کیا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتا ہے کہ یہ تو تمام نبیوں کو پیش آنے والا ایک عام طرز عمل ہے۔ یہ سنت جاریہ ہے اور تمام رسولوں نے ایسی ہی صورت حالات کا مقابلہ کیا۔ تمام انبیاء کو ایسے حالات پیش آئے کہ ان کی اقوام نے قرآن کریم اور ان کی دعوت کے ساتھ مذاق کیا اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکا لیکن اللہ کی مدد اپنے رسولوں کے ساتھ شامل رہی اور اللہ نے اپنے رسولوں کو ایسے راستے بتائے کہ وہ اپنے دشمنوں پر غالب ہو کر رہے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِیْنَ وَ كَفٰی بِرَبِّكَ هَادِیًا وَّ نَصِیْرًا

(۲۵ : ۳۱) "اے نبیؐ' ہم نے تو اسی طرح مجرموں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے اور تمہارے لیے تمہارا رب ہی راہنمائی اور مدد کے لیے کافی ہے"۔ اللہ کی حکمت اچھے انجام تک پہنچنے والی ہے۔ کسی اسلامی تحریک کے مقابلے میں جب مجرم اٹھ کھڑے ہوں اور مخالفت پر کمربستہ ہو جائیں تو اس سے تحریک کے اندر قوت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس طرح تحریک سنجیدہ ہو جاتی ہے۔ ایک سچی دعوت اور جھوٹی دعوت کے درمیان فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ سچی دعوت کے مقابلے میں لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک سچی دعوت کے حاملین کو مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اور یہ کشمکش ہی دعوت حق کو باطل دعوتوں سے ممیز کرتی ہے۔ اس کشمکش کے نتیجے میں سچے پیروکار چمٹ کر جم جاتے ہیں اور باطل کے حاملین بھاگ جاتے ہیں۔ دعوت کی پشت پر وہی لوگ رہ جاتے ہیں جو خالص اور مخلص ہوں جو مفادات کے بندے نہیں ہوتے۔ صرف اور صرف دعوت اسلامی ہی ان کا نصب العین ہوتی ہے۔ اور وہ صرف رضائے الٰہی چاہنے والے ہوتے ہیں۔

اگر دعوت اسلامی کا کام آسان ہوتا اور اس کے سامنے ردعمل واہ واہ کا ہوتا اور داعی کی راہ پر پھول بچھائے جاتے

اور کوئی دشمن اور ناقد نہ ہوتا تو ہر کہ ومہ دعوت اسلامی کا حامل ہو جاتا۔ کیونکہ نہ کوئی عناد کرنے والا ہوتا اور نہ کوئی جھٹلانے والا اور پھر دعوت حق اور دعوت باطل کے درمیان کوئی فرق بھی نہ ہوتا اور دنیا میں انتشار اور فتنہ برپا ہو جاتا۔ لیکن ہر سچی دعوت کے مقابلے میں اللہ نے دشمن اور مدعی پیدا کر دیئے اور اللہ نے داعیوں کے لیے جدوجہد کرنا اور مقابلہ کرنا ضروری قرار دیا اور راہ حق میں قربانی دینا اور مشکلات برداشت کرنا زاد راہ قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی راہ میں جدوجہد وہی کرتا ہے جو سچا ہو۔ مشکلات اور قربانیوں کو وہی شخص برداشت کرتا ہے جو سچا مومن ہو۔ ایسے لوگ جو اپنے آرام اور عیش و عشرت کو دعوت حق کی راہ میں قربان کرتے ہیں۔ اور حیات دنیا کی لذتوں کو خیر باد کہتے ہیں بلکہ وہ اس راہ میں جان تک دے دیتے ہیں اگر دعوت کا تقاضا ہو کہ اب جان دینے کا وقت آگیا ہے۔ اس عظیم جدوجہد کے لیے وہی لوگ تیار ہوتے ہیں جو مضبوط اور ثابت قدم ہوں جو پکے مومن ہوں۔ پختہ ایمان رکھتے ہوں۔ وہ اس اجر کے زیادہ مشتاق ہوں جو اللہ کے ہاں ہے بجائے اس اجر کے جو لوگوں کے پاس ہے۔ جب یہ صورت حالات پیش آجائے تو پھر سچی دعوت اور جھوٹی دعوت کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں دعوت اسلامی کی صفوں کی تطہیر ہو جاتی ہے اور مضبوط قوی اور ثابت قدم لوگ چھٹ کر جدا ہو جاتے ہیں اور کمزور لوگ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ پھر دعوت اسلامی ان لوگوں کو لے کر آگے بڑھتی ہے جنہوں نے ثابت قدمی کا امتحان پاس کر لیا ہوتا ہے۔ اور وہی لوگ پھر اس دعوت کے امین اور لیڈر ہوتے ہیں اور یہی اس کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔ یہ لوگ بھاری قیمت ادا کر کے اس مقام تک پہنچتے ہیں۔ یہ لوگ سچائی کے ساتھ اس دعوت کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔ پختہ ایمان کے ساتھ' تجربے اور آزمائشوں نے ان کو بتا دیا ہوتا ہے کہ اس دعوت کو مشکل حالات میں انہوں نے کس طرح لے کر چلنا ہے۔ شدائد اور مشکلات نے ان کی پوری قوت کو حساس بنا لیا ہوتا ہے اور ان کی قوت کا سرچشمہ اور طاقت کا ذخیرہ بڑھ جاتا ہے اور وہ مشکل سے مشکل صورت حالات میں دعوت کے جھنڈے اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس دنیا میں عموماً یوں ہوتا ہے کہ دعوت اسلامی کے حاملین اور ان کے مخالفین کے درمیان جو کشمکش برپا ہوتی ہے۔ لوگوں کی ایک عظیم تعداد اس میں غیر جانبدار ہو کر تماشا دیکھتی ہے۔ یہ تماشا بین آبادی جب دیکھتی ہے کہ دعوت اسلامی کے حاملین اپنے نظریہ اور مقصد کی خاطر عظیم قربانیاں دے رہے ہیں اور بے حد و حساب مشکلات برداشت کر رہے ہیں اور بڑی ثابت قدمی اور یکسوئی کے ساتھ اپنی راہ پر جا رہے ہیں تو پھر یہ تماشا بین عوام الناس سوچنے لگتے ہیں کہ دعوت اسلامی کے حاملین آخر کیوں اس قدر قربانیاں دے رہے ہیں اور مشکلات برداشت کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقاصد بہت ہی مفید' بہت ہی قیمتی ہوں گے اور وہ جان و مال اور عزت و آبرو کی قربانی دے رہے ہیں شاید ان چیزوں سے وہ مقاصد زیادہ قیمتی ہوں۔ اب یہ لوگ دعوت اسلامی کی اصل قدر و قیمت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب بات عامۃ الناس کی سمجھ میں آجاتی ہے تو وہ پھر فوج در فوج دعوت اسلامی میں داخل ہوتے ہیں اور وہ تماشا دیکھنے کے بجائے اب خود تماشا بن جاتے ہیں۔

یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے اللہ نے ہر نبی کے لیے مجرمین میں سے ایک دشمن پیدا کیا۔ یہ مجرمین دعوت اسلامی کی راہ روکنے کی سعی کرتے ہیں۔ پھر نبی اور ان کے بعد ہر حامل حق ان مجرمین کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ان کو مشکلات درپیش آتی ہیں اور وہ اپنی راہ میں چلتے ہی جاتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کے لیے کامیابی مقدر ہوتی ہے۔ اور ان کو اچھی طرح علم ہوتا

ہے کہ آخر کار وہ اس انجام تک پہنچیں گے - آخر میں ان کو ہدایت اور نصرت مل جاتی ہے -

وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا (۲۵ : ۳۱) "اور تمہارے لیے تمہارا رب ہی راہنمائی اور مدد کو کافی ہے" - انبیاء کے راستے میں مجرمین کا نمودار ہونا ایک طبیعی امر ہے - اس لیے کہ دعوت حق ہمیشہ اپنے مناسب اور مقرر وقت پر نمودار ہوتی ہے جبکہ کوئی مخصوص سوسائٹی فساد پذیر ہو جاتی ہے یا پوری انسانیت فساد کا شکار ہو جاتی ہے - لوگوں کے قلب و نظر فساد کا شکار ہو جاتے ہیں - دنیا کا نظام بگڑ جاتا ہے - لوگوں کے باہم روابط بگڑ جاتے ہیں - اس فساد اور بگاڑ کی پشت پر مجرم لوگ ہوتے ہیں' جو ایک طرف فساد کرتے ہیں پھر وہ اس فساد اور بگاڑ سے فائدہ اٹھاتے ہیں - وہ اس فساد کے ہم مسلک اور ہم مشرب ہوتے ہیں - ان کی خواہشات اسی فساد زدہ معاشرے میں پوری ہوتی ہیں - اور ان کے وجود میں جو فساد اور بگاڑ ہوتا ہے اس کے لیے وجہ جواز وہ معاشرے سے نکالتے ہیں کہ بس معاشرہ ہی ایسا ہے - اس لیے یہ بالکل طبیعی بات ہے کہ ایسے لوگ انبیاء کی راہ روک کر کھڑے ہو جائیں اور انبیاء کے دور کے بعد ان لوگوں کی راہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں جو انبیاء کی دعوت کو لے کر رکھتے ہیں کیونکہ یہ مجرم دراصل ان کے بگڑے ہوئے وجود کا دفاع ہوتا ہے' اس لیے کہ حشرات میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو پاک و صاف اور خوشبودار اور شفاف ماحول میں زندہ ہی نہیں رہتے' فوراً مرجاتے ہیں اس لئے کہ یہ گندے ماحول میں رہنے کے عادی ہوتے ہیں - بعض کیڑے ایسے ہوتے ہیں جو صاف پانی میں مرجاتے ہیں کیونکہ وہ صرف گندے اور سڑے ہوئے پانی ہی میں زندہ رہ سکتے ہیں - یہی حال ان مجرموں کا ہوتا ہے لہٰذا یہ طبیعی امر ہے کہ وہ دعوت حق کے دشمن ہوں اور اس کے مقابلے میں جان دینے کے لیے تیار ہوں اور یہ بھی بالکل طبیعی امر ہے کہ آخر میں دعوت اسلامی کو کامیابی ہو کیونکہ دعوت اسلامی زندگی کی ترقی پذیر لائنوں پر چلنے والی ہوتی ہے - اور اس طرح دعوت اسلامی کو وہ عروج نصیب ہوتا ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر فرمایا ہوتا ہے -

وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا (۲۵ : ۳۱) "اور تمہارے لیے تمہارا رب ہی راہنمائی اور مدد کو کافی ہے" - اس کے بعد اب کفار کے اعتراضات بابت طریقہ نزول قرآن نقل کیے جاتے ہیں اور ان کی تردید کی جاتی ہے -

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا (۲۵ : ۳۲) "منکرین کہتے ہیں اس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا؟" --- ہاں ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کو اچھی طرح ہم تمہارے ذہن نشین کرتے ہیں اور (اسی غرض کے لیے) ہم نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزاء کی شکل دی ہے" -

قرآن کریم نازل ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ اس کے ذریعے ایک امت کی تربیت کی جائے - ایک نیا معاشرہ وجود میں لایا جائے - اس معاشرے میں ایک نیا نظام وجود میں لایا جائے - اور تربیت اس بات کی محتاج ہے کہ انسان کو بار بار تلقین کی جائے اور وہ متاثر ہوتا جائے - اور یہ تاثیر اور تاثر ایک مسلسل حرکت کے ذریعہ جاری رہے کیونکہ انقلاب انسانوں کے اندر پیدا کرنا مطلوب ہوتا ہے اور انسان ایک ایسی ذات ہے کہ اسے صرف ایک شب و روز میں تربیت نہیں دی جا سکتی کہ

بس اس کے ہاتھ میں ایک نئے نظام پر مشتمل ایک کتاب پکڑا دی جائے۔ اور اس میں جدید معاشرے کے مکمل خدوخال ہوں بلکہ انسانوں کی تربیت یوں ہوتی ہے کہ اسے تدریج کے ساتھ ایک طویل عرصے کے بعد بدلا جاتا ہے۔ اور یہ تبدیلی اس کے اندر آہستہ آہستہ آتی رہتی ہے۔ ہر دن کی غذا کے بعد دوسرے دن وہ زیادہ غذا کے لیے تیار ہوتا ہے اور دوسرے دن کی خوراک وہ پھر بڑی خوشی سے لیتا ہے اور بڑے مزے سے قبول کرتا ہے۔

قرآن کریم زندگی کا ایک مکمل نظام لے کر آیا ہے اور قرآن کریم نے انسانوں کی تربیت کے لیے بھی ایک فطری منہاج اختیار کیا۔ یہ منہاج اس ذات کی طرف سے تھا جس نے انسان کو پیدا کیا تھا اس لیے قرآن کریم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نازل کیا گیا تاکہ وہ جماعت مسلمہ کی حقیقی اور زندہ موجود ضروریات کو پورا کرتا چلا جائے۔ کیونکہ یہ جماعت آہستہ آہستہ تعمیر ہو رہی تھی۔ وہ اپنی استعداد کے مطابق' اپنی قوت کے مطابق ایک ایک قدم آگے بڑھ رہی تھی۔ ٹھیک ٹھیک اللہ کے حقیقی منہاج تربیت کے مطابق۔ چنانچہ قرآن مجید کو بیک وقت منہاج تربیت اور نظام زندگی کی تشکیل کے لیے اتارا گیا۔ اس لیے اس کا متفرق نزول لازمی تھا۔ یہ محض کوئی علمی ثقافتی اور ادبی کتاب نہ تھی کہ مکمل شکل میں اسے تصنیف کر کے لوگوں کے ہاتھوں میں تھما دیا جاتا۔ اور لوگ اسے پڑھتے رہتے اور مزے لیتے رہتے۔ اور بس اس پر عمل کی ضرورت نہ ہوتی۔ بلکہ یہ تو حرف حرف' کلمہ اور ایک ایک حکم کے طور پر آیا۔ اس کی ہر آیت حکم الیوم (آرڈر آف دی ڈے) کے طور پر آئی۔ مسلمان حکم پاتے اور ان پر عمل کرتے۔ جیسا کہ ایک فوجی احکام لیتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ وہ اس حکم کو لیتا ہے' سمجھتا ہے اور نافذ کر دیتا ہے۔ خود بھی اس کی کیفیت میں ڈوب جاتا ہے اور معاشرے کو اس میں غرق کر دیتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ قرآن متفرق طور پر نازل ہوا ہے' تاکہ رسول کے قلب کے اندر اچھی طرح جاگزیں ہو۔ حضورؐ سے پہلے خود اس پر ثابت قدم ہو جائیں اور ایک ایک جز کے بعد اس کا دوسرا جز آئے اور اس پر عمل ہوتا رہے۔

كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا (۲۵ : ۳۲) "ہاں ایسا ہی کیا گیا تاکہ ہم اس کو اچھی طرح تمہارے ذہن نشین کرتے رہیں اور ہم نے اسے ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزاء کی شکل دی"۔ ترتیل کا مفہوم یہاں اللہ کی حکمت کے مطابق آگے پیچھے نازل کرنا ہے' اللہ کے علم کے مطابق اور لوگوں کی ضرورت کے مطابق اور اللہ کی اس حکمت کے مطابق جس کی رو سے اللہ جانتے تھے کہ لوگوں کے اندر کس قدر احکام و ہدایات قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو گئی ہے۔

قرآن کریم نے اپنے پے درپے منہاج نزول کے ذریعہ ان لوگوں کی تربیت کے میدان میں معجزات دکھائے۔ لوگ اس کے نزول سے دن بدن تاثرات لیتے رہے۔ اور ان کے اخلاق کی تشکیل آہستہ آہستہ ہوتی رہی۔ جب مسلمانوں نے قرآن مجید کا منہاج تربیت فراموش کر دیا اور قرآن مجید کو انہوں نے محض علم و ثقافت کے طور پر پڑھنا شروع کر دیا اور قرآن کو ایک ایسی کتاب تصور کر لیا جسے فقط پڑھا جاتا ہے' اس کے مطابق معاشرے کو ڈھالنا ضروری نہیں ہے' اس کی کیفیات میں ڈوبنا ضروری نہیں ہے اور نہ اس کے مطابق نظام زندگی قائم کرنا ضروری ہے تو مسلمانوں نے اس قرآن سے نفع لینا ترک کر دیا اور قرآن نے ان کو نفع دینا چھوڑ دیا کیونکہ مسلمانوں نے وہ منہاج تربیت ہی ترک کر دیا جو ان کے

لیے علیم و خبیر نے قرآن میں منضبط کیا تھا۔یعنی یہ کہ اسے ایک ایک کر کے عمل میں لایا جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین جو نکتہ اعتراض اٹھاتے تھے۔جو نئے نئے اعتراضات کرتے تھے جو مطالبات کرتے تھے۔یہ قرآن اپنے منہاج نزول متفرق کے ذریعے ایک ایک کا تشفی بخش جواب دے دیتا تھا۔

وَ لَا یَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اَحْسَنَ تَفْسِیْرًا ( ۲۵ : ۳۳ ) "اور جب بھی وہ تمہارے سامنے کوئی نرالی بات لے کر آئے اس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے تمہیں دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی"۔یہ لوگ باطل طریقے سے مجادلہ کرتے تھے اور اللہ ان کے جواب میں حق اتارتا تھا جو باطل کا سر کچل کر رکھ دیتا تھا۔کیونکہ قرآن مجید کی غرض و غایت ہی یہ تھی کہ دنیا میں حق جم جائے۔محض بحث و مباحثے میں کامیابی مقصود نہ تھی بلکہ حق کو دنیا میں قوت دینا' واضح کرنا اور غالب کرنا مقصود تھا۔

اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وعدہ فرماتا ہے کہ وہ آپؐ کے اور آپؐ کی قوم کے درمیان ہر قسم کے مجادلے میں آپؐ کی مدد کرے گا۔کیونکہ آپؐ حق پر ہیں اور حق کے ساتھ اللہ آپؐ کی امداد کرتا ہے اور باطل کو مٹاتا ہے۔تو اللہ کی بتائی ہوئی حجت بالغہ کے مقابلے میں ان کا مجادلہ اور مباحثہ کس طرح ٹھہر سکتا تھا کیونکہ آپؐ کے پاس رب تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی سچائی تھی جو ایک گولے کی طرح باطل کے سر پر لگتی تھی اور اسے کچل کر رکھ دیتی تھی۔

یہ بات اب اس مضمون پر ختم ہوتی ہے کہ کس طرح وہ قیامت کے دن جہنم رسید کیے جائیں گے۔کیونکہ وہ حق کا انکار کرتے تھے اور اسلام کے خلاف مجادلے میں اور مقابلے میں وہ الٹی منطق استعمال کرتے تھے' اس لیے قیامت میں بھی انہیں منہ کے بل الٹا گرایا جائے گا۔

اَلَّذِیْنَ یُحْشَرُوْنَ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ اِلٰی جَهَنَّمَ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ سَبِیْلًا

( ۲۵ : ۳۴ ) "جو لوگ اوندھے منہ جہنم کی طرف دھکیلے جانے والے ہیں' ان کا موقف بہت برا ہے اور ان کی راہ حد درجہ غلط"۔حشر کے دن ان کی حالت کو ذرا دیکھئے' منہ کے بل اٹھیں گے نہایت ہی توہین آمیز انداز میں۔اس لیے کہ دنیا میں یہ تکبر کی وجہ سے منہ پھیرتے تھے۔ان کا یہ منظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا جاتا ہے' تاکہ آپؐ کو تسلی ہو کہ یہ لوگ اس وقت آپؐ کو اذیت دیتے ہیں لیکن ان کا انجام بہت ہی برا ہونے والا ہے۔اور اس کا ایک منظر آپؐ کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔مجرد یہ منظر ہی ان کی اکڑ کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے۔اور یہ لوگ ایسے مناظر سے ڈر کر متاثر بھی ہوتے تھے مگر پھر بھی حجت کر کے اپنے اوپر اس برے انجام کو لازم کرتے تھے اور اس عناد کی وجہ سے وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔

---ooo---

اب روئے سخن ان سابق اقوام کی طرف پھر جاتا ہے جنہوں نے تکذیب کی اور ہلاک کر دیئے گئے۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِیْرًا ﴿۳۵﴾

فَقُلْنَا اذْهَبَا إِلَى الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَدَمَّرْنَاهُمْ تَدْمِيرًا ﴿٣٦﴾ وَقَوْمَ نُوحٍ
لَمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ أَغْرَقْنَاهُمْ وَجَعَلْنَاهُمْ لِلنَّاسِ آيَةً ۖ وَأَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ
عَذَابًا أَلِيمًا ﴿٣٧﴾ وَعَادًا وَثَمُودَا وَأَصْحَابَ الرَّسِّ وَقُرُونًا بَيْنَ ذَٰلِكَ كَثِيرًا ﴿٣٨﴾
وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْأَمْثَالَ ۖ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيرًا ﴿٣٩﴾ وَلَقَدْ أَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِي
أُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۚ أَفَلَمْ يَكُونُوا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ نُشُورًا ﴿٤٠﴾

"ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے ساتھ اس کے بھائی ہارون کو مددگار کے طور پر لگایا اور ان سے کہا کہ جاؤ اس قوم کی طرف جس نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا ہے۔ آخرکار ان لوگوں کو ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا۔ یہی حال قوم نوح کا ہوا۔ جب انہوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔ ہم نے ان کو غرق کر دیا اور دنیا بھر کے لوگوں کے لیے ایک نشان عبرت بنا دیا اور ان ظالموں کے لیے ایک دردناک عذاب ہم نے مہیا کر رکھا ہے۔ اسی طرح عاد اور ثمود اور اصحاب الرس اور بیچ کی صدیوں کے بہت سے لوگ تباہ کیے گئے ان میں سے ہر ایک کو ہم نے (پہلے تباہ ہونے والوں کی) مثالیں دے دے کر سمجھایا اور آخرکار ہر ایک کو غارت کر دیا اور اس بستی پر تو ان کا گزر ہو چکا ہے جس پر بدترین بارش برسائی گئی تھی۔ کیا انہوں نے اس کا حال دیکھا نہ ہو گا؟ مگر یہ موت کے بعد دوسری زندگی کی توقع ہی نہیں رکھتے"۔

یہ چند مثالیں سرسری مثالیں ہیں جن میں مکذبین کا انجام دکھایا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی جاتی ہے ان کے بھائی ہارون کو ان کا وزیر اور لہٰذا وہ رسول بنایا جاتا ہے اور ان کو اس قوم کے مقابلے میں بھیجا جاتا ہے جس نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا۔

الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا (۲۵ : ۳۶) یہ تھے فرعون اور اس کے سردار جو اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے تھے۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ آیات الٰہیہ کا انکار حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو منصب رسالت عطا کیے جانے سے پہلے بھی کرتے تھے۔ کیونکہ اللہ کی آیات تو قائم و دائم ہیں۔ اس کائنات میں بھی ہیں اور انفس میں بھی ہیں، رسولوں کا کام صرف یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ابھی دوسری آیت ختم نہیں ہوئی کہ بڑی سختی سے انجام بتا دیا جاتا ہے۔

فَدَمَّرْنَاهُمْ تَدْمِيرًا (۲۵ : ۳۶) "آخرکار ان لوگوں کو ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا ہے"۔

اس کے بعد قوم نوح کا حال

كَذَّبُوا الرُّسُلَ أَغْرَقْنَاهُمْ (۲۵ : ۳۷) "انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو غرق کر دیا"۔

قوم نوح نے تو صرف ایک رسول حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلایا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت نوح نے جو عقیدہ ان

کے سامنے پیش کیا تھا وہ تمام نبیوں کا عقیدہ تھا۔ جب انہوں نے حضرت نوح کو جھٹلایا تو گویا تمام رسولوں کو جھٹلا دیا۔

وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً (۲۵ : ۳۷) "اور ان کو دنیا بھر کے لوگوں کے لیے نشان عبرت بنا دیا"۔ کیونکہ طوفان کا معجزہ کبھی بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ جو شخص بھی طوفان کے اس واقعہ پر غور کرے گا اسے عبرت حاصل ہوگی۔

وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا (۲۵ : ۳۷) "اور ان ظالموں کے لیے ایک دردناک عذاب ہم نے تیار کر رکھا ہے"۔ یہ عذاب حاضر و موجود ہے۔ کسی تیاری کی ضرورت نہ ہوگی۔ ظالمین کا لفظ ضمیر کی جگہ استعمال کیا گیا تاکہ یہ ان کا دائمی لقب ہو اور یہ بھی بتا دیا جائے کہ یہ عذاب ان کو ان کے ظلم کی وجہ سے دیا جائے گا۔ پھر عاد ثمود اور اصحاب الرس (وہ لوگ جن کے کنویں کی دیواریں نہ اٹھائی گئی تھیں' یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ یمامہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے اور انہوں نے اپنے نبی کو قتل کر دیا تھا۔ ابن جریر نے تو کہا ہے کہ یہ اصحاب للاخدود ہیں جنہوں نے مومنین کو جلا دیا تھا۔ جس کا ذکر سورہ بروج میں آیا ہے)۔ اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ جو بعد کے ادوار میں آتے رہے سب کو اللہ نے ہلاک کر کے نشان عبرت بنایا۔ انہوں نے پیغمبروں کی دعوت پر غور نہ کیا اور ہلاکت سے نہ بچ سکے۔

یہ تمام مثالیں' قوم موسیٰ' نوح' عاد' ثمود' اصحاب الرس' درمیان زمانوں کی اقوام اور وہ قوم (لوط) جس پر بری بارش کی گئی۔ یہ سب اقوام ایک ہی راہ اور ایک ہی انجام تک پہنچیں۔ اور سب کو اللہ نے نشانہ عبرت بنایا۔

وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا (۲۵ : ۴۰) "سب کو ہم نے ہلاک کر دیا بے دردی سے"۔ کیونکہ انہوں نے نبیوں کی تکذیب کی اور جو اقوام نبیوں کی تکذیب کرتی ہیں وہ ٹوٹ پھوٹ اور ہلاکت کے انجام سے دوچار ہوتی ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ ان ساری اقوام کے المناک انجام پر نہایت ہی سرسری نظر ڈالتا ہے اور یہ سریع الحرکت بیان آکر حضرت لوط کی قوم کے بیان پر ختم ہوتا ہے جو ان کے اسفار شتاء و صیف میں شاہراہ عام پر ان کو خوب نظر آتا ہے۔ اللہ نے اس قوم کو آتش فشانی کے عمل کے ذریعہ ہلاک کیا۔ ان پر پتھروں کی بارش کر دی گئی۔ اور اس طرح ان کو پوری طرح ہلاک کر دیا گیا۔ تعجب ہے کہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے اور سنتے ہوئے یہ لوگ پھر بھی مکذبین کے انجام سے کوئی عبرت نہیں لیتے۔ یہ قیامت کا خوف اپنے دل میں نہیں رکھتے۔ اللہ کے سامنے پیشی سے نہیں ڈرتے۔ یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ان کے دل پتھر بن گئے ہیں مسخ ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں انہوں نے کینہ' عناد' استکبار اور مذاق کا رویہ اختیار کیا ہے اور قرآن پر یہ طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔

---

اقوام مکذبہ پر اس سرسری نظر کے بعد روئے سخن اب ان لوگوں کے مزاحیہ انداز کی طرف پھر جاتا ہے۔ اس سے قبل انہوں نے اللہ کی شان میں بھی ایسی ہی گستاخی کی تھی۔ اور کہا تھا کہ یہ قرآن موجودہ انداز سے کیوں نازل ہو رہا ہے۔

تعجب ہے کہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے اور سنتے ہوئے یہ لوگ پھر بھی مکذبین کے انجام سے کوئی عبرت نہیں لیتے۔ یہ قیامت کا خوف اپنے دل میں نہیں رکھتے۔ اللہ کے سامنے پیشی سے نہیں ڈرتے۔ یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ان کے دل پتھر بن گئے ہیں مسخ ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں انہوں نے کینہ' عناد' استکبار اور

وَاِذَا رَاَوۡكَ اِنۡ يَّتَّخِذُوۡنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِىۡ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوۡلًا ۝ اِنۡ كَادَ
لَيُضِلُّنَا عَنۡ اٰلِهَتِنَا لَوۡلَاۤ اَنۡ صَبَرۡنَا عَلَيۡهَا ؕ وَسَوۡفَ يَعۡلَمُوۡنَ حِيۡنَ يَرَوۡنَ
الۡعَذَابَ مَنۡ اَضَلُّ سَبِيۡلًا ۝ اَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰٮهُ ؕ اَفَاَنۡتَ تَكُوۡنُ
عَلَيۡهِ وَكِيۡلًا ۝ اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَكۡثَرَهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ اَوۡ يَعۡقِلُوۡنَ ؕ اِنۡ هُمۡ اِلَّا كَالۡاَنۡعَامِ
بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ سَبِيۡلًا ۝ ع ۱۰ ۳

۴ "یہ لوگ جب تمہیں دیکھتے ہیں تو تمہارا مذاق بنا لیتے ہیں (کہتے ہیں) "کیا یہ شخص ہے جسے خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ اس نے تو ہمیں گمراہ کر کے اپنے معبودوں سے برگشتہ ہی کر دیا ہوتا۔ اگر ہم ان کی عقیدت پر جم نہ گئے ہوتے"۔ اچھا' وہ وقت دور نہیں ہے جب عذاب دیکھ کر انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کون گمراہی میں دور نکل گیا تھا۔ کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو۔ کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں' بلکہ ان سے بھی گئے گزرے"۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم میں دیکھے بھالے ہوئے تھے۔ قبل بعثت آپ ان کے ہاں اک نہایت معتبر شخص تھے۔ آپ بنی ہاشم کے ایک چوٹی کے فرد تھے جو قریش کے چوٹی کے لوگ تھے۔ اپنے اخلاق کی وجہ سے بھی آپ بڑے مرتبے اور مقام کی شخصیت تھے اور بعثت سے قبل صادق اور امین مشہور تھے۔ جب تعمیر خانہ کعبہ کے وقت حجر اسود رکھنے کے مسئلے پر قریش کے اندر اختلافات پیدا ہو گئے تو تمام لوگ اس بات پر تیار ہو گئے کہ آپ اس پتھر کو نصب کر دیں اور جب آپ نے ان کو صفا پر بلایا اور ان سے پوچھا کہ اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کے اس طرف ایک فوج آپ لوگوں پر حملہ آور ہو رہی ہے تو کیا آپ میری بات کو تسلیم کریں گے تو سب نے کہا' ہاں آپ ہمارے ہاں متہم نہیں ہیں۔

لیکن بعثت کے بعد قرآنی دعوت پیش کرنے کے بعد وہی تھے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔

اَهٰذَا الَّذِي بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا (۲۵ : ۴۱) "کیا یہ شخص ہے جسے خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے"۔ یہ فقرہ وہ بطور مذاق کہتے تھے۔ کیا یہ بات تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے وہ مذاق کرنا چاہتے تھے یا قرآن کریم میں کوئی ایسی بات تھی جس کے ساتھ مذاق کیا جا سکتا تھا۔ نہیں' یہ دونوں باتیں نہ تھیں بلکہ یہ بات وہ کبرائے قریش کے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہتے تھے۔ اس طرح وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم شخصیت کی کردارکشی کرنا چاہتے تھے۔ اور اس طرح وہ قرآن کریم کے بے پناہ اثرات کو کنٹرول کرنا چاہتے تھے۔ یہ انہوں نے اس جدید دعوت کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک تدبیر اختیار کی تھی کیونکہ سابقہ معاشرے میں ان کو جو مقام اور مرتبہ

حاصل تھا' اس کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ نیز ان کے بعض اقتصادی مفادات سابقہ نظام جاہلیت سے وابستہ تھے۔ یہ منصبی اور اقتصادی حیثیت ان کو ان نظریاتی خرافات کی وجہ سے حاصل تھی جو عربی معاشرے پر چھائے ہوئے تھے اور قرآن ان خرافات لایعنی کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک رہا تھا۔

یہ لوگ جدید دعوت کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑی بڑی مجلسیں کرتے تھے۔ ان مجالس میں یہ لوگ اس قسم کے غلط پروپیگنڈے اور جھوٹے کردار کشی کے فیصلے کرتے تھے۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ یہ سب کچھ جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ ابن اسحاق نے روایت کی ہے کہ ایک بار ولید ابن مغیرہ کے پاس قریش کے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ بڑا معمر اور دانشور شخص تھا۔ موسم حج قریب تھا۔ اس نے ان قریشیوں سے کہا کہ موسم حج آنے والا ہے۔ تمام عالم عرب سے وفود مکہ آئیں گے۔ انہوں نے تمہارے اس آدمی کے بارے میں تو سن رکھا ہے۔ لہٰذا مناسب ہے کہ اس کے بارے میں تم اپنی رائے ایک کر لو۔ یہ نہ ہو کہ تم مختلف باتیں کرو۔ اور ایک دوسرے کی تکذیب کرتے پھرو۔ انہوں نے کہا عبدالشمس کے باپ بس تم ہی بتا دو تم ایک رائے قائم کر کے ہمیں کہو ہم سب وہی بات کریں گے' یہ سنکر اس نے کہا کہ پہلے تم بتاؤ کہ تم کیا کہو گے۔ میں دیکھوں کہ تم کیا کہتے ہو۔ انہوں نے کہا ہم اس کے بارے میں کہیں گے کہ یہ ایک کاہن ہے۔ اس نے کہا' خدا کی قسم یہ بات غلط ہے۔ یہ کاہن نہیں ہے۔ ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے۔ یہ نہ ان کی طرح گنگناتا ہے اور نہ ان کی طرح سجع بندی کے ذریعے بات کرتا ہے۔ انہوں نے کہا: تو پھر ہم کہیں گے کہ یہ مجنوں ہے۔ تو اس نے کہا کہ یہ مجنوں بھی نہیں ہے۔ ہم مجنونوں کو اچھی طرح دیکھتے اور جانتے ہیں۔ نہ مجنوں کی طرح اس کا گلا گھٹتا ہے نہ اسے کوئی خلجان ہے اور نہ کوئی وسوسہ ہے۔ تو انہوں نے کہا تو پھر ہم کہیں گے یہ ایک شاعر ہے۔ تو اس نے کہا وہ تو شاعر نہیں ہے۔ شعر کی اقسام اور اوزان 'رجز' ہزج' قریض' مقبوض اور مبسوط کو ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا تو ہم پھر کہیں گے کہ یہ جادوگر ہے تو اس نے کہا وہ تو جادوگر نہیں ہے۔ ہم نے جادوگروں کے جادو کو دیکھا ہے۔ نہ وہ ان کی طرح پھونکتا ہے' نہ گرہیں ڈالتا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ عبدالشمس کے باپ تم ہی بتاؤ کہ پھر ہم کیا کہیں؟ اس نے کہا خدا کی قسم اس' کا کلام بہت میٹھا ہے۔ اس کی اساس ایک موٹے تنے پر ہے اور اس کی شاخیں تازہ پھول کی طرح ہیں۔ ان باتوں میں سے تم جو بات بھی کہو گے لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ غلط بات کہی جا رہی ہے۔ بہرحال سب سے مناسب بات جو تم کہہ سکتے ہو وہ یہ ہے کہ وہ ساحر ہے اور اس کا کلام اس قدر جادو بھرا ہے کہ ایک شخص اور اس کے باپ' اس کے بھائی' اس کی بیوی اور اس کے خاندان کے درمیان جدائی ڈال دیتا ہے۔ چنانچہ یہ بات لے کر وہ اس کے پاس سے چلے گئے۔ جب حج کا موسم آتا تو یہ لوگ راستوں میں بیٹھ جاتے' جو شخص بھی ان پر سے گزرتا اسے ڈراتے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بتاتے رہتے۔

یہ ہے مثال ان کی گہری سازش اور تدبیر کی جو وہ حضورؐ کے خلاف کرتے تھے اور یہ سازش وہ جانتے ہوئے کرتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں۔ اس لیے یہ جو وہ کہتے تھے: "کیا اس شخص کو اللہ کا رسول بنا کر بھیجا ہے" یہ بطور تمسخر نہ کہتے تھے' بلکہ یہ وہ گہری سازش کے تحت محض کردار کشی کے لیے کہتے تھے حالانکہ ان کا شعور گواہ تھا کہ وہ حضورؐ کو حق پر سمجھتے تھے۔ یہ باتیں کہہ کر وہ عوام کی نظروں میں حضورؐ کی شان گراتے تھے تاکہ سابقہ نظام میں ان کو جو عزت اور مرتبہ کا مقام حاصل تھا وہ باقی رہے اور جو مالی مفادات ان کو حاصل ہوتے تھے وہ ان کو حاصل ہوتے رہیں۔

قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو رویہ اختیار کیا' ہر زمان و مکان میں دعوت حق کے ساتھ مفاد پرست لوگ یہی سلوک کرتے ہیں۔

زبانی طور پر تو وہ مذاق کے انداز میں پروپیگنڈے کرتے تھے اور آپ کی کردار کشی کرتے تھے لیکن خود ان کی باتوں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی تھی کہ یہ لوگ حضور اکرمؐ کی دعوت سے کس قدر گھبرائے ہوئے تھے۔ وہ قرآن کریم کے اٹل دلائل کے بارے میں یہ تبصرہ بھی کرتے تھے۔

اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا (۲۵:۴۲) "اس نے ہمیں گمراہ کر کے اپنے معبودوں سے برگشتہ کر ہی دیا ہوتا اگر ہم ان کی عقیدت پر جم نہ گئے ہوتے"۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ذہنی دنیا میں ایک قسم کا بھونچال آگیا تھا۔ قریب تھا کہ وہ اپنے الہوں کو چھوڑ کر بھاگ جائیں لیکن وہ بڑی استقامت سے اپنے الہوں پر جم گئے۔ اپنے دین اور اس کے ساتھ وابستہ مناصب و مفادات کو بچاتے رہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے یعنی مقابلہ کر کے صبر اور مصابرت سے کام نہ لیتے تو وہ بھی اپنے الہوں کو ترک کر چکے ہوتے۔ تعجب یہ ہے کہ اپنی ہٹ دھرمی اور مفادات کی وجہ سے یہ لوگ ہدایت کو ضلالت کہتے۔ یہی تو ان کی ضلالت تھی کہ خرد کا نام جنوں رکھ رہے تھے لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت نے ان کے ایوانوں میں جو زلزلہ برپا کر دیا تھا اس کو وہ چھپا نہ سکے۔ اگرچہ غایت درجہ ہٹ دھرمی اور اصرار کی وجہ سے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور قرآن پر حرف گیری کرتے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ بھی انہیں خبردار فرماتا ہے کہ بہت جلد وہ اپنے انجام تک پہنچ جائیں گے۔

وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۲۵:۴۲) "وہ وقت دور نہیں ہے جب عذاب دیکھ کر انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کون گمراہی میں دور نکل گیا ہے"۔ ان کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ حضرت محمدؐ جو دعوت لے کر آئے تھے وہ تو ہدایت تھی اور جس پر وہ قائم تھے وہ ضلالت تھی۔ لیکن جب وقت چلا جاتا ہے تو پھر علم کا کوئی فائدہ نہیں رہتا۔ اس وقت تو وہ عذاب دیکھ لیں گے۔ خواہ یہ عذاب دنیا کا ہو' جس طرح بدر کے دن انہوں نے خوب چکھا' یا آخرت کا ہو جسے وہ یوم الحساب میں دیکھیں گے' جائیں گے اور چکھیں گے۔

اب روئے سخن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے۔ آپ کو ان کے عناد ہٹ دھرمی اور استہزاء پر تسلی دی جاتی ہے کہ آپ نے تو دعوت پہنچانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ آپ نے پورے پورے دلائل سنا دیئے اور مناسب نہ تھا کہ ان کا ردعمل وہ ہوتا جو ہوا ہے۔ قصور صرف ان کا ہے۔ انہوں نے دراصل اپنی خواہشات نفسانیہ کو اپنا الٰہ بنا رکھا ہے۔ اور وہ کسی حجت اور برہان کی طرف توجہ کرنے والے نہیں ہیں۔ اگر لوگ نہیں مانتے تو رسول کیا کر سکتا ہے۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا (۲۵:۴۳) "کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا' کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لے آنے کا ذمہ لے سکتے ہو"۔ یہ عجیب انداز بیان ہے۔ اس سے ان کی عجیب نفسیاتی حالت کا اظہار ہوتا ہے کہ کسی شخص کا نفس تمام طے شدہ معیار' تمام مسلمہ استدلال' تمام طے شدہ اقدار کو چھوڑ کر صرف اپنی خواہش نفس' اپنی پسند اور اپنی ضد کی بندگی شروع کر دے۔ کسی استدلال' کسی برہان' کسی منطق اور کسی سنجیدہ بات پر کان نہ دھرے۔ بس صرف اپنی

خواہش کو الٰہ بنا کر پوجے۔

اللہ جل شانہ اپنے بندے کو نہایت ہی نرمی، محبت، انس اور گہرے تعلق کے انداز میں پکارتا ہے۔ ارءیت کیا کبھی تم نے غور کیا ہے، کیا تمہیں معلوم ہے۔ ایسے شخص کی تصویر کشی کی جارہی ہے جس کے سامنے کوئی معقول بات پیش کرنا فضول ہے۔ وہ حجت، حقیقت اور غور و فکر کو جانتا ہی نہیں ہے۔ ان چیزوں کی اس کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ایسا شخص ہدایت کے قابل ہی نہیں ہے۔ لہذا آپ کے ذمہ ایسے شخص کی ہدایت نہیں لگائی جاسکتی اور نہ آپ ایسے شخص کے وکیل ہو سکتے ہیں۔ اور نہ ایسے لوگ ہدایت تک پہنچ سکتے ہیں۔

اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا (۲۵:۴۳) "کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو؟" یہ لوگ جنہوں نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود اور اللہ بنا رکھا ہے، ان کی اصل حیثیت اور ان کا اصل مقام بھی یہاں بتا دیا جاتا ہے کہ یہ بہت ہی حقیر لوگ ہیں۔ یہ محض اپنی خواہشات اور مفادات کے بندے ہیں۔ یہ حجت اور حقیقت کے آگے جھکنے والے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ خواہشات اور مفادات کے آگے سجدہ ریز ہونے والے ہیں۔ بلکہ ان کو اس سے بھی زیادہ گرا ہوا مقام دیا جاتا ہے کہ مقام انسانیت سے گر کر مقام حیوانیت خالصہ میں داخل ہوگئے ہیں بلکہ اس سے بھی نیچے۔

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۲۵:۴۴) "کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے"۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے نہایت ہی محتاط انداز کلام اختیار فرمایا ہے۔ یہ کہا ہے اَكْثَرَهُمْ سب نہیں بلکہ ان کی اکثریت ایسی ہے۔ کیونکہ اہل مکہ کی ایک قلیل تعداد تو ابتداء ہی میں حلقہ بگوش اسلام ہوگئی تھی۔ یا ان میں سے اکثر اس پر غور کرتے تھے۔ البتہ اکثریت ایسی تھی جو محض خواہش نفسی اور مفادات کی خاطر نہ مانتی تھی۔ ان کے کانوں پر دلائل پڑتے تھے۔ ان کی عقل اسے مانتی تھی لیکن پھر بھی ضد کرتے تھے۔ یہ گویا جانور محض تھے۔ انسان اور جانور میں فرق ہی یہ ہے کہ انسان غور و فکر کرتا ہے اور پھر انسان اپنے غور و فکر کے مطابق اچھا طرز عمل بھی اختیار کرتا ہے۔ بصیرت اور قصد و ارادے سے حقائق کو اپناتا ہے۔ حجت اور دلیل سے بات کرتا ہے اور سنتا ہے۔ اور اگر انسان اپنے ان خصائص کو چھوڑ دے تو وہ بہائم سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بہائم کو اللہ نے جو شعور دیا ہے وہ تو اس سے استفادہ کرتے ہیں اور انسان کو جو عقل و دانش دی گئی ہے وہ اس سے استفادہ نہیں کرتا۔ حیوانات اپنے فرائض منصبی صحیح طرح ادا کرتے ہیں لیکن انسان ادا نہیں کرتا۔ حیوانات اپنے شعور سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہ اپنے تدبر سے کام نہیں لیتا۔

اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۲۵:۴۴) "یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے گمراہ"۔ یہ ہے جواب ان کے استہزاء کا۔ یعنی تم انسان ہی نہیں ہو، حیوانوں سے بدتر ہو۔ اس لیے تم سرور کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مذاق کرتے ہو۔ یوں اس سبق کا خاتمہ، جواب آں غزل پر ہوتا ہے۔

--- ○○○ ---

# درس نمبر ۱۵۹ ایک نظر میں

اس سبق میں مشرکین کے اعتراضات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے بحث و جدل کے موضوع کو چھوڑ کر اس کائنات کے مشاہد و مناظر کی سیر کرائی جاتی ہے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل اور آپ کے احساسات کو اس کائنات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے ۔ مشرکین کے لایعنی اعتراضات کی وجہ سے پیدا ہونے والے غبار خاطر کو دور کرنے کے لیے' مناظر کائنات کے ساتھ یہ اتصال اور ان کی طرف یہ توجہ کافی ہے ۔ کائنات کی وسعتوں کی یہ سیر آپ کے دل کے سکون اور شرح صدر کے لیے ایک وسیع میدان ہے جس کے مقابلے میں سازشیں کرنے والوں کی چھوٹی چھوٹی سازشیں اور دشمنی کرنے والوں کی بے مقصد دشمنیاں نہایت ہی حقیر نظر آتی ہیں ۔

قرآن کریم انسانوں کے دل و دماغ کو ہمیشہ اس کائنات کے مشاہد و حقائق پر غور کرنے کی طرف متوجہ کرتا ہے ۔ انسانی سوچ اور انسانی تدبر اور مشاہدات قدرت کے درمیان ربط پیدا کیا جاتا ہے ۔ اور انسان کے ذرائع شعور و ادراک کو جگا کر اس بات کے لیے تیار کرتا ہے کہ وہ ان کے مشاہد اور مناظر کو بالکل ایک جدید احساس کے ساتھ دیکھیں ۔ اور مشاہد قدرت اور فطرت کے عجوبوں کی پکار کو سنیں اور ان کی پکار پر لبیک کہیں ۔ قرآن انسان کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس کائنات کی سیر کرے اور اس کے اندر بکھرے ہوئے دلائل قدرت اور آیات فطرت کو اخذ کر لے ۔ کیونکہ یہ کائنات دراصل ایک کھلی کتاب ہے اور اس کے صفحات میں صانع کائنات کی کاریگریاں اور صنعت کاریاں ہمارے تدبر کے لیے چشم براہ ہیں ۔ قرآن کریم انسان کو حکم دیتا ہے کہ وہ دست قدرت کے ان آثار کو پانے کی کوشش کرے ۔ اسے چاہئے کہ وہ اپنی آنکھ کو بینا' احساس کو تیز اور کانوں کو کھلا رکھے اور اپنے ان ذرائع ادراک کے ذریعے غور و تدبر کے موضوعات تلاش کرے ۔ اس طرح وہ اتصال باللہ حاصل کرے یعنی اللہ کی صنعت کاریوں کے ذریعے اللہ کی ذات کی معرفت حاصل کرے ۔

جب انسان اس کائنات میں کھلے دل اور کھلی آنکھوں سے زندگی بسر کرے' اس کی روح اور اس کا احساس جاگ رہا ہو ۔ اس کی فکر اور اس کی سوچ مربوط ہو' تو اس پر دنیا کی معمولی وابستگیوں سے ذرا بلند ہو جاتی ہے ۔ اور اس کا تصور حیات بلند ہو جاتا ہے اور اس کا احساس بہت تیز ہو جاتا ہے ۔ پھر وہ سوچنے لگتا ہے کہ اس محدود دنیا کے مقابلے میں کائنات کے آفاق بہت ہی وسیع ہیں ۔ پھر اس کائنات میں جو کچھ بھی موجود ہے' یہ فقط ایک ہی ارادے کے نتیجے میں موجود ہے ۔ یہ تمام چیزیں ایک ہی ناموس حیات کے اندر بندھی ہوئی ہیں ۔ پھر اپنی حرکت میں یہ تمام چیزیں ایک ہی خالق کی طرف متوجہ ہیں ۔ اور خود انسان بھی اس کائنات کی مخلوقات میں سے ایک ہے اور یہ بھی دست قدرت کے ساتھ وابستہ ہے ۔ اور اس کا پورا ماحول دست قدرت میں جکڑا ہوا ہے ۔ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے اور جو کچھ چھو رہا ہے وہ قدرت کی صنعت کاریاں ہیں ۔

اس تصور سے انسان کے پردۂ احساس پر شعور تقویٰ' شعور محبت اور شعور اعتماد کی ایک امتزاجی کیفیت نمودار ہوتی

ہے۔جس سے انسان کی روح سرشار ہوتی ہے اور اس کی دنیا معنویت سے بھر جاتی ہے اور انسان کو ایک خاص اندرونی تطہیر' اطمینان اور انس و محبت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ اس روح' اس مفہوم اور اس تصور کے ساتھ انسان اس کرۂ ارض پر چلتا پھرتا ہے اور آخر کار وہ اللہ کے ساتھ مل جاتا ہے۔اس طرح انسان کی یہ زندگی نہایت ہی خوشگوار تفریحی سفر بن جاتی ہے۔وہ اللہ کی صنعت کاریوں کی ایک نمائش اور ایک میلے میں گم ہوتا ہے اور وہ ہروقت اللہ کی اس خوبصورت کائنات کے ایسے دسترخوان پر ہوتا ہے جس پر طرح طرح کی نعمتیں چنی ہوئی ہیں۔

اس سبق کا آغاز سایہ کی تصویرکشی سے ہوتا ہے۔ دست قدرت اس سائے کو طویل تر کر دیتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اسے سکڑا جاتا ہے۔قبض و بسط کا یہ عمل نہایت ہی نرمی اور لطف اور غیرمحسوس طریقے سے ہوتا ہے۔پھر ہم رات کے اندھیرے میں اپنی اپنی آرام گاہ کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ پوری کائنات پر سکون اور خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔پھر ہم دن میں داخل ہوتے ہیں اور نہایت ہی ترتیب سے زندگی کی تگ و دو شروع ہو جاتی ہے۔پھر رحمت کی ہوائیں چلتی ہیں' بادل لاتی ہیں اور بارش برساتی ہیں۔پھر ہم سمندر میں ہیں' ساتھ ساتھ میٹھے پانی اور کھارے پانی باہم ملے ہوئے ہیں اور ان دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جو دست قدرت کی صنعت کاری ہے۔یہ دونوں سمندر اور دونوں پانی آپس میں مل نہیں پاتے۔پھر عام پانیوں سے ہم مرد کے ساغرحیات کی طرف آجاتے ہیں۔یہ نطفے کی ایک بوند ہوتی ہے۔اچانک یہ ایک زندہ انسان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔پھر ایک منظر پر ہم دیکھتے ہیں کہ پوری زمین و آسمان کی تخلیق چھ دنوں میں ہے۔زمین و آسمان کے اندر بروج ہیں۔ سراج منیر اور قمر منیر ہیں۔پھر رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے آ رہے ہیں اور زمانے گزر جاتے ہیں۔

کائنات کی اس سیر کے اندر ہمارا دل زندہ ہو جاتا ہے اور ہماری سوچ مدبر کائنات کی صنعت کاریوں میں گم ہو جاتی ہے۔اور انسان کے دل میں اللہ کی قدرت اور تدبیر کے نظارے میں تازہ ہوجاتے ہیں۔پھر انسان سوچتا ہے کہ مشرکین کس قدر احمق ہیں کہ وہ اس رب کے ساتھ کسی کو شریک کرتے ہیں اور ایسے چیزوں کی بندگی کرتے جو ان کو نہ نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ ضرر دے سکتی ہیں۔انسان سوچتا ہے کہ رب تعالیٰ کے بارے میں یہ لوگ کس قدر جاہل ہیں اور اللہ کی ذات پر کس قدر جرات کرتے ہیں اور کفر و انکار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔اس کائنات کے اندر موجود دلائل اور آیات اور شواہد و نشانات کے ان عجوبوں کے ہوتے ہوئے مشرکین کا رویہ نہایت ہی عجیب لگتا ہے۔اس کائنات کے یہ مناظر اور اللہ کی تخلیق کے یہ نمونے انسانی ہدایت کے لیے کافی و شافی ہیں۔

آیئے زرا دست قدرت کی ان صنعت کاریوں کی سیر کریں جس کا ہرپہلو ہمیں واصل باللہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ اور جس کی صرف ایک وادی کی سیر ہی ہماری پوری زندگی کے لیے کافی ہے۔

---000---

# درس نمبر ۱۵۹ تشریح آیات

## ۴۵ --- تا --- ۶۲

أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيلًا ﴿٤٥﴾ ثُمَّ قَبَضْنَاهُ إِلَيْنَا قَبْضًا يَسِيرًا ﴿٤٦﴾

"تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو اسے دائمی سایہ بنا دیتا۔ ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا' پھر (جیسے جیسے سورج اٹھتا جاتا ہے) ہم اس سائے کو رفتہ رفتہ اپنی طرف سمیٹتے چلے جاتے ہیں"۔

کشادہ اور لطیف سائے کا تصور ہی لیک کبیدہ خاطر اور تھکے ہوئے انسان کے لیے فرحت بخش ہوتا ہے۔ ایسے سائے میں انسان اپنے آپ کو نہایت ہی پر سکون تصور کرتا ہے۔ انسان کو یوں لگتا ہے کہ ایک نہایت ہی رحیم و کریم دست شفقت انسان کی روح اور جسم کو چھو رہا ہے اور زندگی کے آرام اور زخموں پر نہایت ہی آرام دہ مرہم پٹی ہو رہی ہے۔ تھکے ہارے دلوں کو قدرت کا یہ ماحول دست شفقت فراہم کرتا ہے۔ کیا اللہ یہی چاہتا کہ اس کے بندے پر طرح طرح کے الزام لگا کر' اس کے ساتھ مذاق کر کے' اس کے دل کو دکھایا گیا ہے' لہٰذا اسے قدرتی شفقت کا یہ ماحول فراہم کیا جائے۔ اسے تھوڑی دیر کے لیے اس جاں گسل کشاکش کے ماحول سے نکال کر قدرتی سکون کا ماحول فراہم کیا جائے اور اس زبردست معرکہ آرائی میں آپ کے دکھے ہوئے دل کو سکون فراہم کیا جائے۔ یاد رہے کہ یہ مکی دور ہے اور آپ کو مشرکین مکہ کے جحود و انکار' کبر و عناد اور مکر و فریب کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک طویل زمانہ گزر گیا ہے۔ آپ کے ساتھی کم ہیں' مشرکین ہر طرف سے پھیلے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ اور اہل ایمان کو اس اذیت استہزاء اور دست درازیوں کا جواب دینے کی اجازت نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایسے مشکل حالات میں آپ کے دل پر قرآن کریم کا جو ٹکڑا نازل ہوتا تھا وہ بہت ہی آرام دہ مرہم کا کام دیتا تھا۔ یہ دراصل تھکے ماندے مسافر کے لیے وسیع اور گہرا سایہ ہوتا تھا۔ اور کفر و جحود اور عناد اور عصبیت کی گرم لو میں ٹھنڈی اور خوشگوار چھاؤں ہوتی تھی۔ سایہ خصوصاً لیک تپتے ہوئے صحراء میں' اس سورت کی روح' موضوع' مضمون اور جدل و جدال کے گرم ماحول میں امن و سکون اور ملجا و ماویٰ فراہم کرتا ہے۔

قرآن کریم اس سایہ کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے کہ دست قدرت اسے لمبا کرتا جاتا ہے۔ یہ آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر لمبا ہوتا جاتا ہے۔ پھر نہایت ہی نرمی اور غیر محسوس طور پر اسے لپیٹا جاتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ (۲۵:۴۵) "تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے"۔ اور

ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا (۲۵:۴۶) "پھر ہم اس سائے کو رفتہ رفتہ اپنی طرف لپیٹتے چلے جاتے ہیں"۔ سایہ کیا چیز ہے۔ کوئی جسم جب سورج کی شعاعوں کے سامنے حائل ہوتا ہے تو وہ ایک خفیف قسم کا اندھیرا پیدا کرتا ہے۔ جوں جوں زمین سورج کے سامنے حرکت کرتی ہے۔ یہ سایہ بھی حرکت کرتا رہتا ہے۔ اس کی وضع اور اس کی شکل بدلتی رہتی ہے۔ اس کی شکل و صورت کو سورج کی شعاعیں روشنی اور حرارت سے متعین کرتی ہیں۔ جن کی وجہ سے یہ سکڑتا اور پھیلتا ہے۔ اس وجہ سے انسان کو خوشی اور تازگی حاصل ہوتی ہے۔ اس کی روح کے اندر لطیف و شفاف بیداری پیدا ہوتی ہے اور نفس انسانی دست قدرت کی لطیف صنعت کاری کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہے۔ سورج اور سائے کا یہ منظر جب غائب ہونے پر آتا ہے تو یہ سایہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب یہ طوالت کی آخری حد تک پہنچتا ہے تو یہ سایہ سورج کے غروب کے ساتھ ہی غائب ہو جاتا ہے۔ یہ کہاں چلا گیا یکایک۔ یہ دست قدرت ہے جس نے اسے لپیٹ اور سمیٹ لیا۔ ایک ہمہ گیر سایہ چھا گیا اور اس کے اندر آہستہ آہستہ اب رات کی تاریکی نمودار ہونا شروع ہو گئی۔ یہ ہے صنعت دست قدرت کی۔ انسان ہے کہ قدرت کے ان آثار و علامات کے اندر ڈوبا ہوا ہے۔ اس کے ارد گرد قدرت کے شواہد پھیلے ہوئے ہیں لیکن اس کی کند عقل ان آثار کو نہیں پا رہی ہے۔

وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاکِنًا (۲۵:۴۵) "اگر اللہ چاہتا تو اسے دائمی سایہ بنا دیتا"۔ لیکن اللہ نے ایسا نہ چاہا۔ کیونکہ اس کائنات کی تنظیم ہی اس طرح کی گئی ہے۔ اس نظم و نسق کا تقاضا ہے کہ ہم روز اس سائے کو یوں دیکھتے رہیں کہ اس کا مد و جزر یوں ہی جاری رہے۔ اگر اس کے اندر ذرا بھی تبدیلی کر دی جائے اور اس سایہ کو ساکن بنا دیا جائے تو اس پوری کائنات کے آثار ہی بدل جائیں۔ اگر زمین ایک جگہ رکی ہوئی ہوتی تو یہ سایہ بھی رکا ہوتا۔ اس کا مد و جزر تو ختم ہو جاتا۔ اگر زمین کی یہ حرکت نرم ہوتی تو اس سائے کے آثار بھی سست رفتار ہوتے اور اگر زمین کی حرکت تیز ہوتی تو سایوں کا مد و جزر بھی تیز ہو جاتا۔ یہ زمین کی ایک متعین حرکت ہے جو سایوں کو یہ مظاہر عطا کرتی ہے جو ہم دیکھتے ہیں اور وہ آثار پیدا کرتی ہے جو ہمارے لیے مفید ہیں۔ اور جن کے خواص کو ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

یہ گردش زمین اور گردش ظلال اور ان کا مد و جزر تو ہم رات دن دیکھتے ہیں اور غفلت میں گزر جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں از سر نو اس طرف متوجہ فرماتا ہے۔ یہ قرآن کریم کے انداز بیان کا ایک مخصوص طریقہ ہے کہ وہ انسانی ضمیر کے اندر ایک مردہ تاثر کو زندہ کر دیتا ہے۔ ہمارے اندر انفعالیت جگاتا ہے۔ اور ہمیں اپنے ماحول کے ساتھ مربوط کرتا ہے۔ ہمارے احساسات کو جگاتا ہے' ہمارے شعور کو تیز کرتا ہے تاکہ ہم ان مشاہد اور آیات بینات کی تہ پر غور کریں۔ یوں ہمارے دل اس کائنات میں تدبر کے عادی ہو جائیں کیونکہ یہ کائنات بہت ہی عظیم اور عجیب ہے۔

سائے کا یہ منظر رات پر آکر ختم ہوتا ہے۔ جب سائے طویل ہوتے ہیں تو رات چھا جاتی ہے۔ رات کے پس پردہ انسانیت آرام و سکون حاصل کرتی ہے اور پھر دن جس میں لوگ زندگی کی تگ و دو میں داخل ہوتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾

"اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات کو تمہارے لیے لباس 'اور نیند کو سکون موت 'اور دن کو جی اٹھنے کا وقت بنایا"۔

رات تمام چیزوں اور تمام زندہ مخلوق کو ڈھانپ لیتی ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ ہر چیز نے رات کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ لوگ رات کے پردے میں چھپ جاتے ہیں۔ یوں رات ان کے لیے لباس ہو جاتی ہے۔ رات میں مکمل سکون ہوتا ہے۔ ہر چیز کی حرکت رک جاتی ہے۔ انسان حیوانات اور پرندے تک سو جاتے ہیں۔ پھر مزید یہ کہ سونے کے بعد اس دنیا کے ساتھ انسان کا وہ احساس قائم نہیں رہتا جو جاگتے میں ہوتا ہے۔ اس لیے یہ اسے سبات یعنی موت جیسے سکون سے تعبیر کیا۔ اس کے بعد صبح نمودار ہوتی ہے اور زمین کے اوپر پھر حرکت شروع ہوتی ہے۔ اس طرح گویا مرنے کے بعد ہر چیز دوبارہ جی اٹھتی ہے۔ اس لیے اسے نشوراً سے تعبیر کیا گیا۔ گویا چوبیں گھنٹے کے اس زمنی دورے میں انسان موت وحیات کا ایک مختصر نمونہ پیش کرتا ہے اور جب سے اللہ نے زمین 'آسمان کو پیدا کیا ہے' زمین کا یہ دور اپنے محور کے گرد جاری ہے۔ اس میں ایک سیکنڈ کا فرق بھی نہیں آیا۔ یہ زمین انسانوں کو لے کر چلتی ہی رہتی ہے 'لیکن انسان ہیں کہ غافل ہیں اور وہ زمین کی اس حرکت کے بارے میں سوچتے ہی نہیں جبکہ اللہ کی جو شان اس زمین کو چلاتی ہے وہ ایک لحظہ کے لیے غافل نہیں ہو سکتی۔ اور نہ اللہ کو نیند آتی ہے۔

اب ذرا دوسرا منظر۔ یہ ہوائیں جو بارش کی خوشخبری لے کر آتی ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾ لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿۴۹﴾

"اور وہی ہے جو اپنی رحمت کے آگے آگے ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے۔ پھر آسمان سے پاک پانی نازل کرتا ہے تا کہ ایک مردہ علاقے کو اس کے ذریعے زندگی بخشے اور اپنی مخلوق میں سے بہت سے جانوروں اور انسانوں کو سیراب کرے"۔

اس دنیا کی ہر زندگی پانی پر قائم ہے یا بارش کا پانی ہے اور یا دریاؤں اور ندی نالوں پر نہریں قائم کر کے سطح زمین کو پانی دیا جاتا ہے۔ پھر ان پانیوں میں سے جو زمین کے پیٹ میں چلا جاتا ہے۔ وہ چشموں کی صورت میں نکلتا ہے یا کنوؤں کی صورت میں نکالا جاتا ہے۔ لیکن ہے یہ بھی بارش کا پانی۔ لیکن جن لوگوں کی سیرابی کا تعلق صرف بارش ہی پر ہے۔ وہ اللہ کی اس رحمت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جو بارش کی شکل میں برستی ہے۔ وہ تو رات اور دن بارش پر آس لگائے ہوتے ہیں کیونکہ ان کی زندگی بارش پر قائم ہوتی ہے۔ وہ ان ہواؤں کے انتظار میں ہوتے ہیں جو رحمت بھرے بادل چلا کر لاتی ہیں۔ جب یہ ہوائیں آتی ہیں تو ان کے لیے یہ بشارت ہوتی ہیں۔ ان کو احساس ہوتا ہے کہ یہ بارشیں اللہ کی رحمت ہیں۔ ایسے لوگوں کا دل اگر اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہوتا ہے تو وہ اللہ کی اس رحمت کا بہت زیادہ احساس کرتے ہیں۔

یہاں پانی کے ساتھ طہارت اور طہور کے مفہوم کو نمایاں کیا گیا ہے۔

وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا (۲۵ : ۴۸) "پھر ہم نے آسمانوں سے پاک پانی نازل کیا"۔ اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کے اندر راز حیات ہے۔

لِّنُحْيِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّ نُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِيَّ كَثِيْرًا (۲۵ : ۴۹) "تاکہ ایک مردہ علاقے کو اس کے ذریعہ زندگی بخشے اور اپنی مخلوق میں سے بہت سے جانوروں اور انسانوں کو سیراب کرے"۔ یہاں زندگی پر طہارت کا ایک پرتو پڑتا ہے۔کیونکہ اللہ کی منشا ہی یہ ہے کہ انسانی زندگی پاک و صاف ہو' اور پھر یہ بارش زمین کے چہرے کو بھی دھلا کر صاف کر دیتی ہے اور اسی ماء طہور سے زندگی پیدا ہوتی ہے اور انسانوں' حیوانوں اور تمام زندہ چیزوں کی حیات قائم ہے۔

---000---

نزول ماء کے ساتھ نزول قرآن پر بھی ایک تبصرہ۔پانی کے نزول سے زمین کے چہرہ کی صفائی مطلوب ہے اور قرآن کے نزول سے انسانی روح کی صفائی اور کمال مطلوب ہے۔تعجب تو یہ ہے کہ جسم و جان کے تعلق کو مضبوط کرنے کے لیے تو یہ لوگ نزول بارش کا انکار کرتے ہیں لیکن روحانی تطہیر کے لیے نزول قرآن کو یہ برداشت نہیں کرتے۔اور اس کے لیے وہ ایک دوسرے کو بشارت نہیں دیتے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴿۵۱﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾

"قرآن کو ہم بار بار ان کے سامنے لاتے ہیں تاکہ وہ کچھ سبق لیں مگر اکثر لوگ کفر اور ناشکری کے سوا کوئی دوسرا رویہ اختیار کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔اگر ہم چاہتے تو ایک ایک بستی میں ایک ایک خبردار کرنے والا اٹھا کھڑا کرتے۔ پس اے نبیؐ" کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو"۔

وَ لَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا (۲۵ : ۵۰) "اس قرآن کو ہم پھیر پھیر کر ان کے سامنے لاتے ہیں تاکہ وہ سبق لیں"۔مختلف صورتوں کی شکل میں۔متعدد اور متنوع اسالیب بیان میں۔متعدد قطعات کی شکل میں اور اسی کے ذریعہ ہم نے ان کے شعور اور ان کی قوت مدرکہ کو مخاطب کیا۔ان کی روح اور ان کے اذہان کو مخاطب کیا۔اور ان کے نفوس کے اندر اسے ہر طرح داخل کرنے کی کوشش کی۔اس کے لیے ابلاغ کا ہر حربہ استعمال کیا تاکہ یہ لوگ نصیحت قبول کر لیں۔یہاں تو صرف یاد دہانی کی ضرورت ہے۔وہ حقیقت اور سچائی کا شعور تو خود ان کے نفوس اور ان کی فطرت کے اندر موجود ہے۔اور انہوں نے حقیقت کے اس شعور کو اس لیے دبا دیا ہے کہ خواہشات نفسانیہ کو انہوں نے

اللہ بنا دیا ہے۔ اس لیے اب ان کا رویہ یہ ہو گیا ہے۔

فَاَبٰى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (۲۵ : ۵۰) "مگر اکثر لوگ کفر اور ناشکری کے سوا کوئی دوسرا رویہ اختیار کرنے سے انکار کر دیتے ہیں"۔ حضور اکرمؐ کی ذمہ داری تو ایک بھاری ذمہ داری ہے آپؐ نے پوری انسانیت کو درست کرنا ہے جبکہ انسانوں کی اکثریت ذاتی خواہشات کی بندہ بن گئی ہے۔ اور باوجود اس کے کہ دلائل ایمان ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔ اس نے کفر کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِىْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا (۲۵ : ۵۱) "اگر ہم چاہتے تو ایک ایک بستی میں ایک ایک خبردار کرنے والا اٹھا کھڑا کرتے"۔ اس طرح مشقت بٹ جاتی۔ ذمہ داریاں کم ہو جائیں لیکن اللہ نے تمام کائنات کی ہدایت کے لیے ایک ہی بندے کو بھیجا۔ آپؐ خاتم الرسل ہیں اور آپؐ کے ذمہ یہ کام لگایا گیا ہے کہ آپؐ تمام لوگوں اور تمام بستیوں کو خبردار کریں۔ اور ان کو اللہ کی آخری رسالت کی طرف متوجہ کریں اور یوں اللہ نے یہ چاہا کہ تمام انسانیت اس آخری رسالت پر جمع ہو جائے۔ اور لوگ مختلف رسولوں کی باتیں سن کر اختلاف کا شکار نہ ہو جائیں اور اس کے بعد نبی آخر الزمان کو قرآن دیا تاکہ وہ لوگوں کی ہدایت کے لیے جدوجہد کریں۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (۲۵ : ۵۲) "پس اے نبیؐ، تم کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو"۔ اس قرآن کے اندر بڑی قوت اور گرفت ہے۔ گہری تاثیر ہے۔ اس قدر جاذبیت ہے کہ جس کا کوئی سننے والا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کی یہ کشش دلوں کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔ انسانی روح اور شعور کے اندر زلزلہ برپا ہو جاتا ہے۔ لوگ قرآن کریم کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے تمام تدابیر اختیار کرتے ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتے۔

قریش کے سردار عوام الناس کو کہتے تھے۔

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ "اس قرآن کو نہ سنو اور جہاں یہ پڑھا جا رہا ہو وہاں شور مچاؤ شاید کہ اس طرح تم غالب ہو جاؤ"۔ ان کے اس قول سے قریش اور ان کے متبعین کی بوکھلاہٹ کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ قرآن کریم کی اثر آفرینیوں سے بہت پریشان تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ ان کے متبعین صبح و شام قرآن کریم سے سحر زدہ ہو جاتے تھے۔ ایک ایک آیت، دو دو آیات یا دو دو سورتیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے۔ لوگوں کے دل ان کی طرف کھنچ جاتے تھے اور ان کا دماغ مسحور ہو جاتا تھا۔

رؤساء قریش جو اپنے متبعین کو یہ حکم دیتے تھے کیا وہ خود قرآن کی تاثیر سے محفوظ تھے۔ اگر خود انہوں نے قرآن مجید کی بے پناہ تاثیر کو محسوس نہ کیا ہوتا تو وہ ایسا ہرگز نہ کہتے اور نہ وہ اپنی صفوں میں اس قدر خوف پھیلاتے۔ ان کی اس ہدایت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی تاثیر کا کیا عالم تھا۔

ابن اسحاق، محمد ابن مسلم ابن شہاب زہری سے روایت کرتے ہیں کہ ان تک یہ روایت پہنچی ہے کہ ابوسفیان ابن

ابوجہل ابن ہشام اور اخنس ابن شریق ' ابن عمر ابن وھب ثقفی بنی زہرہ کے حلیف ایک رات نکلے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سنیں ۔ حضور اکرمؐ رات کے وقت اپنے گھر پر نماز پڑھا کرتے تھے ۔ ان میں سے ہر شخص اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گیا ۔ اور قرآن کریم سنتا رہا ۔ ہر شخص دوسرے کے بارے میں نہ جانتا تھا ۔ وہ رات گئے تک قرآن کریم سنتے رہے ۔ جب صبح طلوع ہوئی تو یہ لوگ لوٹنے لگے ۔ راستے میں ایک دوسرے سے ملاقات ہو گئی ۔ انہوں نے ایک دوسرے کو ملامت کیا ۔ اور ایک دوسرے سے کہا ۔ یہ حرکت دوبارہ نہ کرو ۔ اگر تمہیں تمہارے نادانوں نے دیکھ لیا تو تم خود ان کے دلوں میں بات ڈال دو گے ۔ پھر یہ لوگ چلے گئے جب دوسری رات آئی تو ان میں سے ہر شخص پھر اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا ۔ پھر یہ لوگ رات کو کلام الہٰی سنتے رہے ۔ صبح فجر نمودار ہوئی تو پھر بکھر گئے ۔ راستے میں پھر انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا ۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کو وہی کہا جو اگلی رات انہوں نے کہا تھا ۔ اس کے بعد اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے ۔ جب تیسری رات ہوئی تو پھر تینوں اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے ۔ ساری رات سنتے رہے ۔ جب فجر نمودار ہوئی تو پھر یہ لوگ بکھر گئے لیکن راستے میں پھر ان کی ملاقات ہو گئی ۔ اب انہوں نے ایک دوسرے سے کہا اب تو پختہ عہد کرنا ہو گا کہ پھر ہم یہ حرکت نہ کریں گے ۔ چنانچہ عہد کے بعد یہ لوگ جدا ہوئے ۔ دوسرے دن صبح اخنس ابن شریق نے اپنی عصا لی ۔ وہ سب سے پہلے ابوسفیان کو اس کے گھر میں ملا ۔ اس نے اسے کہا ابوحنظلہ بتاؤ ' تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کلام سنا اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے ۔ اس نے کہا ابوثعلبہ ! خدا کی قسم میں نے بھی ان سے بعض ایسی چیزیں سنیں ہیں جن کو میں جانتا ہوں اور ان کا مطلب بھی سمجھتا ہوں ۔ بعض ایسی باتیں بھی سنیں ہیں جن کا مفہوم میں نہیں سمجھتا اور نہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کا مقصد کیا ہے ۔ اخنس نے کہا میری رائے بھی وہی ہے جس پر تم نے حلف اٹھایا ہے ۔ وہاں سے نکل کر یہ شخص ابوجہل کے پاس آیا ۔ اس کے گھر میں داخل ہوا ۔ اور کہا ابوالحکم بتاؤ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تم نے جو کچھ سنا ' اس کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے ۔ ابوجہل نے کہا میں نے کیا سنا ہے ؟ بات یہ ہے کہ ہمارا اور بنی عبد مناف کے درمیان عزت اور شرف پر جھگڑا رہا ۔ انہوں نے لوگوں کو کھانا کھلایا تو ہم نے بھی مقابلے میں دستر خوان بچھائے ۔ انہوں نے لوگوں کو تحفے دیئے اور ہم نے بار شتر تحفے دیے ۔ انہوں نے داد و دہش کی تو ہم نے بھی داد و دہش کی ۔ یہاں تک ہم ایک دوسرے کے ساتھ کاندھے ملا کر یوں چلے کہ جس طرح دو مقابل کے گھوڑے ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں ۔ اب انہوں نے یہ کہہ دیا ہے کہ ہم سے نبی آگیا ہے ۔ اس پر آسمان سے وحی آتی ہے ' ان کے مقابلے میں ہم نبی کہاں سے لائیں ۔ خدا کی قسم ' ہم اس پر کبھی بھی ایمان نہ لائیں گے ۔ اور ہرگز ہم اس کی تصدیق نہ کریں گے ۔ اس پر اخنس ابن شریق اسے چھوڑ کر چلے گئے ۔

یہ تھا عالم قرآن کریم کے اثرات کا ۔ یہ لوگ ان اثرات کا مقابلہ کر رہے تھے ۔ ایک دوسرے کے ساتھ پختہ عہد کرتے تھے کہ آئندہ مت سنو ورنہ لیڈرشپ کو خطرہ ہے ۔ اگر عوام کو پتہ چل گیا کہ ہم لوگ کلام الہٰی سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو لوگ ٹوٹ پڑیں گے ان پر تو جادو جیسا اثر ہوتا ہے ۔

قرآن کریم در حقیقت نہایت ہی سادہ فطری حقائق بیان کر رہا تھا ۔ یہ سچائی تیر کی طرح دل میں اترتی تھی ۔ جب انسانی دل و دماغ اس اصلی سرچشمے تک پہنچ جاتے تھے تو اس سرچشمے کا جوش پھر تھمتا نہ تھا ۔ اثرات کے فوارے چھوٹ جاتے تھے اس میں قیامت کے مناظر ' عبرت آموز قصص ' اس کائنات کے مشاہد ' ہلاک شدہ اقوام کی عبرت آموز

داستانیں اور ان کے کھنڈرات کے مناظر' قرآن کے تشخص مفہومات اور تمثیل واقعات اور دلائل و آیات تھے' ان سے دل دہل جاتے تھے۔ بعض اوقات صرف ایک سورت پڑھنے سے انسانی شخصیت کے اندر تزلزل پیدا ہو جاتا۔ اور ایسے انسانی نفوس اس سے مفتوح ہوتے چلے جاتے تھے جو چٹان کی طرح مضبوط ہوتے تھے۔ اگر قرآن کے سوالشکر جرار بھی ایسے نفوس کو فتح کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔

اس لیے یہ بات کوئی تعجب انگیز نہیں ہے کہ اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حکم دے کہ آپ کافروں کی اطاعت نہ کریں اور دعوت اسلامی کے حوالے سے آپ کے قدم نہ ڈگمگائیں اور اس قرآن کو لے کر کفار کے مقابلے میں عظیم جدوجہد کریں۔ کیونکہ آپ کے پاس قرآن کریم کی وہ قوت ہے جس کے مقابلے میں طاقتور سے طاقتور انسان نہیں ٹھہر سکتا۔ جس کے خلاف کوئی مجادلہ کارگر نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے خلاف کوئی قوت کارگر ہو سکتی ہے۔

---○○○---

اس کے بعد روئے سخن اس کائنات کے مناظر کی طرف پھر جاتا ہے۔ چنانچہ ہواؤں کے منظر' پاک و صاف پانی کے منظر' سمندروں میں میٹھے اور کھارے پانی اور ان کے درمیان پائے جانے والے قدرتی پردے کے مناظر بیان کیے جاتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا ﴿٥٣﴾

"اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے۔ ایک لذیذ و شیریں' دوسرا تلخ و شور۔ اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ ایک رکاوٹ ہے جو انہیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے"۔

یعنی وہ ذات جس نے دو سمندروں کو چلا رکھا ہے' ایک میٹھا ہے اور دوسرا نمکین اور کھارا ہے' دونوں ایک جگہ باہم ملے ہوئے ہیں لیکن وہ باہم مخلوط نہیں ہوتے۔ ان کے درمیان قدرت نے ایک پردہ قائل کر دیا ہے۔ دونوں کی فطرت ایسی بنا دی ہے کہ وہ باہم مل ہی نہیں سکتے۔ کڑوے سمندروں کے اوپر میٹھے پانی کی نہریں ہیں۔ میٹھے پانی کی ایک نہر سطح سمندر کے اوپر چلتی ہے۔ اس کے برعکس کم ہی ہوتا ہے۔ یعنی میٹھے سمندر پر کڑوے پانی کی نہر نہیں بہتی۔ اس دقیق انتظام کی وجہ سے سمندر کا کڑوا پانی صاف اور میٹھے پانی کے اوپر نہیں آتا۔ حالانکہ کڑوا سمندر بہت بڑا اور گہرا ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں میٹھی نہر چھوٹی ہوتی ہے لیکن اس میٹھی نہر سے انسانوں' جانوروں اور نباتات کی زندگی قائم ہوتی ہے۔ میٹھے اور کڑوے پانیوں کی یہ جولانی محض اتفاق سے نہیں ہوتی بلکہ خالق کائنات نے بوقت تخلیق ان کو اس طرح پیدا کیا اور اس سے خالق کے پیش نظر کچھ مقاصد تھے۔ اللہ نے قوانین قدرت میں یہ بات رکھ دی ہے کہ کڑوے پانی' ان نہروں کی راہ نہ روکیں اور نہ یہ سمندر خشکی پر چڑھ آئیں۔ یہاں تک کہ سمندر کے حالات مدوجزر میں بھی یہ میٹھا پانی اور کڑوے سمندر ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں حالانکہ مدوجزر میں سمندر کا پانی بہت ہی اونچا ہو جاتا ہے۔

کتاب "سائنس دعوت ایمان دیتی ہے" کے مصنف کہتے ہیں: "چاند ہم سے دو صد چالیس ہزار میل دور ہے۔ مد

جو دو مرتبہ پیدا ہوتا ہے ہمیں چاند کے وجود کا لطیف احساس دلاتا ہے ۔مد کی وجہ سے بعض مقامات پر سطح سمندر ساٹھ قدم بلند ہو جاتی ہے بلکہ زمین کی بالائی سطح بھی دو مرتبہ باہر کی طرف چاند کی اس کشش کی وجہ سے کئی انچ باہر نکلتی ہے لیکن ہمیں تمام چیزیں ایسی منظم نظر آتی ہیں کہ ہمیں اس قوت کا ادراک ہی نہیں ہوتا۔جس نے اس عظیم سمندر کو کئی قدم بلند کر دیا ہے اور زمین کی سطح جو ہمیں بہت مضبوط نظر آتی تو اسے بھی کئی انچ ابھار کر دیا ہے"۔

"سیارہ مریخ کا ایک اپنا چاند ہے ۔یہ چھوٹا چاند ہے ۔یہ مریخ سے چھ ہزار میل دور ہے ۔اگر ہمارا یہ چاند ہم سے پچاس ہزار میل دور ہوتا بمقابلہ اس بعید دوری کے جو اس وقت ہم سے ہے 'تو مدوجزر کا عمل اس قدر شدید ہوتا کہ سمندر کے نیچے جو زمین ہے وہ دن میں دو مرتبہ اس مدوجزر کے عمل سے دو چار ہو کر اپنے تمام پہاڑوں کو اپنی جگہ سے زائل کر دیتی ۔یہ عمل اسی طرح جاری رہنے سے دنیا میں سے تمام خشکی ختم ہو جاتی اور زمیں پر ایک عظیم اضطراب ہمیشہ رہتا ۔نیز ہوا کے اندر مدوجزر کے عمل کے نتیجے میں سخت آندھیاں آتی رہتیں ۔اور اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ پانی کا یہ مدوجزر خشکی کو دھوڑے گیا ہے تو پھر ہمیں یہ فرض کرنا ہو گا کہ اب پوری زمین کے اوپر پانی ڈیڑھ میل تک چڑھ گیا ہے ۔اس صورت میں زندگی کا اگر کوئی امکان ہوتا تو وہ سمندر کی گہرائیوں میں ہوتا اور یہ بھی محض وجود حیات کا احتمال ہے"۔

لیکن اس کائنات کو ایک مدبر کائنات نے اس طرح بنایا ہے کہ سمندر کے اندر بھی میٹھا اور کھارا پانی ایک دوسرے پر دست درازی نہیں کر سکتے ۔اور ان کے طبعی مزاج اور ان کی ساخت کے اندر یہ بات رکھ دی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ نہ ملیں ۔یہ ہے کام صانع حکیم کا جس نے اس کائنات کو منظم کیا ہے 'ایک خاص قانون قدرت کے مطابق چلایا ہے ۔

--- ○○○---

اب سمندر اور نہروں کے پانیوں سے روئے سخن ماء حیات کی طرف ۔ذرا اس نطفے کا مطالعہ کرو جس سے انسان پیدا ہوتا ہے ۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ۗ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ﴿٥٤﴾

"اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا 'پھر اس سے نسب اور سسرال کے دو الگ سلسلے چلائے ۔تیرا رب بڑا ہی قدرت والا ہے"۔

اس پانی ہی سے جنین پیدا ہوتے ہیں ۔اگر جنین مرد ہوں تو وہ نسب ہوں گے اور اگر مادہ ہوں تو سسرال ہوں گے ۔ مادہ کو صہر اس لیے کہا گیا کہ قرابت کی جگہ عورت ہوتی ہے (یعنی عورت کے ذریعہ قرابت داری پیدا ہوتی ہے ) آسمان کے پانی سے جو مخلوقات پیدا ہوتی ہے اس کے مقابلے میں یہ انسانی مخلوق بہت ہی عجیب ہے ۔کیونکہ مرد کے پانی کے ایک قطرے کے اندر جو ہزارہا خلیے ہوتے ہیں ان میں سے ایک کے ساتھ رحم مادر کے اندر پایا جانے والا چھوٹا سا انڈا متحد ہو جاتا ہے اور اس سے پھر یہ پیچیدہ مخلوق پیدا ہوتی ہے جس کا نام انسان ہے ۔جس قدر زندہ کائنات اور مخلوقات ہے ان میں سے یہ مخلوق عجیب ترین مخلوق ہے ۔

یہ انڈے اور یہ خلیے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں لیکن پھر عجیب طریقے سے یہ نر اور مادہ بن جاتے ہیں ۔اس کا راز

بھی انسان ابھی تک معلوم نہیں کر سکا۔ نہ آج تک ہمارا علم اس کو پا سکا ہے کہ نر اور مادہ بننے کے اسباب کیا ہیں کیونکہ ہزار ہا خلیوں کے درمیان کسی ایسے خلیے کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکا اور نہ اس میں ایسی خصوصیات دریافت کی جا سکی ہیں کہ وہ مرد ہو گا یا عورت ہو گی۔ اور نہ عورت کے انڈے کے اندر کوئی ایسی خصوصیات دریافت کی جا سکی ہیں کہ فلاں خصوصیات ہوں تو مرد ہو گا۔ اور فلاں خصوصیات ہوں تو عورت پیدا ہو گی۔

وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا (۲۵ : ۵۴) "اور تیرا رب بڑا ہی قدرت والا ہے"۔ یہ ہے اللہ کی قدرت جس کے بعض پہلوؤں کا انکشاف دور جدید میں ہو چکا ہے جس سے مزید عجائبات آشکار ہوتے ہیں۔

اگر انسان اس پانی کے بارے میں تحقیقات کرتا چلا گیا جس سے انسان کی تخلیق ہوئی تو اس کا سر چکرا جائے گا۔ جب وہ دیکھے گا کہ اس پانی کے اندر پائے جانے والے یہ جرثومے جو نہایت درجہ چھوٹے اور باریک ہیں۔ یہ ہر جنس کی مکمل ترین خصوصیات اپنے اندر لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کے اندر والدین اور ان کے خاندان کے قریبی لوگوں کے خواص بھی پوری طرح موجود ہوتے ہیں۔ اور یہ خصوصیات مذکر جنین اور مونث جنین کی طرف اس طرح خود بخود منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں جس طرح دست قدرت نے ان کے لیے منصوبہ بندی کر لی ہوتی ہی۔ تخلیقی اعتبار سے بھی 'اپنے رجحان کے اعتبار سے بھی اور اپنی طرز زندگی کے اعتبار سے بھی۔ کتاب "یہ انسان اکیلا نہیں کھڑا ہے" کا تھوڑی دیر کے لیے مطالعہ کیجئے۔ مصنف ان نہایت ہی چھوٹے ذروں کے اندر پائے جانے والے موروثی جینز کے بارے میں لکھتے ہیں :

"ہر خلیہ خواہ مذکر ہو یا مونث' وہ کروموزومز اور جینز پر مشتمل ہوتا ہے۔ کروموزوم عضوی مادے کا ابتدائی یونٹ ہوتا ہے اور یہ جینز کو منتقل کرنے کا کام کرتا ہے جبکہ جینز موروثی خصوصیات ہوتی ہیں۔ یہ کروموزم ایک گٹھلی ہوتے ہیں' جس کے اندر تمام جینز موجود ہوتے ہیں۔ جینز ہی وہ فیکٹر ہیں جو وجود میں آنے والے اس انسان کے مستقبل کا فیصلہ کرتے ہیں۔ سیٹوپلازم وہ عجیب کیمیادی مرکب ہے جو ان دونوں پر چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ سیٹوپلازم پروٹوپلازم مادہ ہوتا ہے جو خلیے کی گٹھلی کے اوپر چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ جینز اس قدر باریک اور اس قدر جامع ہوتے ہیں کہ ان کے اندر تمام انسانوں کے انفرادی خصائص 'نفسیاتی حالات' ان کے رنگ اور ان کی جنس کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ یہ اس قدر باریک ہوتی ہیں کہ اگر تمام دنیا کے انسانوں کے جینز کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے اور اسے ایک جگہ رکھ دیا جائے تو حجم میں ایک "انگشتانہ" کے برابر ہو گا"۔

"مائیکروسکوپ میں نظر آنے والے یہ نہایت ہی باریک جینز ہی دراصل تمام انسانوں' حیوانوں اور نباتات کی کنجی ہیں اور ان کو کنٹرول کرتے ہیں۔ انگشتانہ جس کے اندر کئی بلین افراد کے جینز سماتے ہیں یقیناً ایک مختصر جگہ ہے لیکن یہ طے شدہ حقیقت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے"۔

ایک جنین 'اپنے تغیر و تبدل کی مختلف صورتوں میں سے گزر کر جب نطفے سے کسی ایک جنس کی مشابہ شکل اختیار کرتا ہے تو اس کے اندر ایک طویل تاریخ کی کہانی پنہاں ہوتی ہے۔ یہ کہانی جینز 'سیٹوپلازم کے ذرات کے ملاحظے سے قلم بند ہو چکی ہے۔

"سائنس دانوں کے ہاں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جینز وہ چھوٹے سے چھوٹے ذرات ہیں جو مائیکروسکوپ کے ذریعے دیکھے جا سکتے ہیں اور یہ تمام زندہ مخلوقات کے خلیوں کے اندر موجود ہوتے ہیں' ان کے اندر اس مخلوق کی تصویر' اس کا ڈھانچہ' اور سب خصوصیات درج ہوتی ہیں۔ مثلاً کسی پودے کے خلیے کے اندر اس کی جڑیں' اس کا تنا' اس کے

پتے ' اس کے تمام پھول ' اس کے تمام پھل سب کے سب موجود ہوتے ہیں ۔ ہر حیوان کی شکل 'کھال ' بال اور پر سب شامل ہوتے ہیں اور اس میں انسان بھی شامل ہے"۔

میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے عجائبات کے بارے میں اسی قدر جاننا بھی کافی ہے کہ خالق کائنات نے کس قدر خصوصیات ودیعت فرمائی ہیں ۔

وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا (۲۵ : ۵۴) "اور تیرا رب بڑی قدرت والا ہے"۔

---000---

اس فضائے تخلیق اور تخلیق کے اندر پھر تقدیر اور اس منظر کے سامنے کہ آسمانوں سے پانی برستا ہے اور اس سے اور پھر انسانی نطفے کے پانی سے کیا کچھ پیدا ہوتا ہے اور کیا کیا خصوصیات کن کن جینز میں رکھی گئی ہیں کہ ایک خلیے سے ایک مرد تشکیل پاتا ہے اپنے تمام موروثی خصائص کے ساتھ ' اور پھر ایسے ہی ایک خلیے سے ایک عورت پیدا ہوتی ہے اپنے تمام خصائص کے ساتھ ۔ ایسے قادر مطلق کی قدرت کی بوقلمونیوں کو دیکھتے ہوئے بھی جو لوگ غیر اللہ کی بندگی کرتے ہیں وہ نہایت ہی عجیب و غریب ہیں ۔فطرت سلیمہ اس بات سے اباء کرتی ہے کہ ایسا فعل کوئی معقول انسان کر سکتا ہے ۔ چنانچہ اس مسئلے کو یہاں لیا جاتا ہے ۔

وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلَىٰ رَبِّهِ ظَهِيرًا ﴿٥٥﴾

"اس خدا کو چھوڑ کر لوگ ان کو پوج رہے ہیں جو نہ ان کو نفع پہنچا سکتے ہیں ' نہ نقصان اور اس سے مزید یہ کہ کافر اپنے رب کے مقابلے میں ہر باغی کا مددگار بنا ہوا ہے"۔

"یہ کہ کافر اپنے رب کے مقابلے میں ' ہر باغی کا مددگار بنا ہوا ہے"۔یعنی تمام کافر جن میں مشرکین مکہ بھی شامل ہیں ' وہ اپنے اس رب کے خلاف محاذ میں شامل ہو کر برسرپیکار ہیں جبکہ اللہ نے ان کو اور تمام دوسرے کافروں کو پیدا کیا ہے ۔یہ کس طرح اللہ کے خلاف ' محاذ میں شامل ہو کر اللہ کے ساتھ جنگ کر سکتے ہیں؟ انسان ' یہ کمزور مخلوق خالق کائنات کے خلاف کس طرح جنگ کر سکتا ہے؟ یا اللہ کے خلاف محاذ آرائی کس طرح کر سکتا ہے؟مقصد یہ ہے کہ یہ کافر اللہ کے دین کے خلاف برسرپیکار ہیں ۔ اللہ نے جو منہاج حیات دیا ہے وہ اس کے خلاف برسرجنگ ہیں ۔ البتہ انداز بیاں یوں اختیار کیا ہے کہ ان کافروں کی یہ جنگ اور محاذ آرائی نہایت ہی مکروہ نظر آئے ۔ یوں کہ دیکھو فلاں اپنے مالک آقا اور خالق کے خلاف لڑ رہا ہے ۔

اور وہ جب اللہ کے رسول ' آپ کی رسالت کا انکار کرتے ہیں ' تو وہ گویا اللہ کا انکار کرتے ہیں ۔ لہٰذا ان کی جنگ بھی اللہ کے خلاف ہے ۔یوں اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو مطمئن فرماتا ہے اور ان کے بار خاطر کو کم کرتا ہے ' غبار خاطر کو دور کرتا ہے اور حضور اکرم کو یہ احساس اور شعور دلاتا ہے کہ آپ فقط تبلیغ رسالت کے سلسلے میں اپنا فریضہ ادا کر دیں اور اس

سلسلے میں کافر جو دشمنی اور جو عناد کرتے ہیں 'اس کی کوئی پرواہ نہ کریں - اللہ پر توکل کریں 'اللہ خود ان کفار سے نمٹ لے گا۔یہ دراصل اللہ کے دشمن ہیں اور اللہ اپنے بندوں کے جرائم سے اچھی طرح واقف ہے -

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ۭ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرَا ۝ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ۝

"اے نبیؐ 'تم کو تو ہم نے بس ایک بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے 'ان سے کہہ دو کہ "میں اس کام پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا 'میری اجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔اے نبیؐ 'اس خدا پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں۔اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔اپنے بندوں کے گناہوں سے بس اسی کا باخبر ہونا کافی ہے۔وہ جس نے چھ دنوں میں زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو بنا کر رکھ دیا جو آسمانوں اور زمین کے درمیان ہیں 'پھر آپ ہی "عرش" پر جلوہ فرما ہوا۔رحمٰن ہے وہ۔اس سے پوچھو کہ وہ جاننے والا ہے"۔

یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فریضہ کی حدود کا تعین کر دیا جاتا ہے - یہ کہ آپؐ خوشخبری سنانے والے اور انجام بد سے ڈرانے والے ہیں فقط - اور مکہ میں آپؐ کو یہ حکم نہ دیا گیا تھا کہ آپ لوگوں کے ساتھ جنگ کریں 'کیونکہ مکہ میں تبلیغ دین کی پوری آزادی تھی لیکن بعد میں جب مسلمان مدینہ کو منتقل ہوئے تو اللہ نے قتال کا حکم دے دیا۔مکہ میں اللہ نے حکم نہ دیا اور مدینہ میں قتال کا حکم دیا۔اس کی حقیقی حکمت اللہ ہی جانتا ہے - جو کچھ ہم سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں ان لوگوں کو تربیت دی جا رہی تھی 'جن پر اس نظریہ حیات کا دارومدار تھا 'جن کے دلوں میں یہ عقیدہ اچھی طرح بیٹھ گیا تھا اور جن کی زندگی اس عقیدے کی ترجمان تھی - یہ عقیدہ ان کے طرز عمل اور ان کی طرز زندگی کے اندر بیٹھ گیا تھا تاکہ اس تربیت کے بعد آئندہ جس معاشرے پر اسلامی حکومت قائم ہو یہ لوگ اس معاشرے کے لیے ریڑھ کی ہڈی بن جائیں اور دوسرا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر مکہ میں جنگ شروع کر دی جاتی تو ان خونی دشمنیوں کی وجہ سے قریش ہمیشہ کے لیے اس عقیدے سے محروم ہو جاتے - اور ان کے اور اسلام کے درمیان ایک مستقل خلیج واقع ہو جاتی - جبکہ حکمت الٰہی اور تقدیر الٰہی میں مقدر یہ تھا کہ ہجرت کے بعد اور پھر فتح مکہ کے بعد سب کے سب قریش کو اسلام میں داخل ہونا تھا اور پھر ان میں سے جو لوگ نکلنے تھے 'انہیں بعد کے ادوار میں پورے عالم میں اسلام کے پھیلاؤ کے لیے بنیاد کا کام سرانجام دینا تھا۔

لیکن مدینہ میں آغاز جہاد کے باوجود رسالت کی اصل ماہیت اور اس کا خلاصہ یہی تھا کہ رسول نے "انذار و تبشیر" کا کام کرنا تھا۔ جہاں تک قتال کا تعلق ہے وہ تو اس لیے جائز رکھا گیا ہے کہ دعوت اسلامی اور انذار اور تبشیر کی راہ میں اگر دنیا کے کسی خطے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کر دی گئی ہے تو اسے دور کر دیا جائے۔ اسلام میں جنگ محض اس لیے کی جاتی ہے کہ دعوت و تبلیغ کی راہ مین اگر کوئی رکاوٹ ہے تو اسے دور کر دیا جائے۔ لہٰذا یہ آیت کہ

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا (۲۵ : ۵۶) "اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر صرف مبشر اور نذیر کے طور پر"۔ جس طرح مکہ میں درست ہے اسی طرح مدینہ کے حالات پر بھی منطبق ہے۔

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۲۵ : ۵۷)

"ان سے کہہ دو کہ "میں اس کام پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا، میری اجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کرلے"۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر سے کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہے کہ لوگ اسلام قبول کرلیں۔ نہ وہ کسی سے فیس کے طلبگار ہیں، نہ نذر و نیاز اور قربانیوں کی آمدن کے رسول طلبگار ہوتے ہیں۔ اسلام میں داخلہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی فیس مقرر نہ کر رکھی تھی۔ بس چند کلمات ایک شخص ادا کرتا اور دل سے ان پر یقین کرتا۔ یہی اسلام تھا کیونکہ اسلام میں کوئی کاہن نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کو مقدس کرنے کی کوئی فیس لیتا ہو۔ نہ وہ اللہ اور لوگوں کے درمیان کوئی دلال ہوتا ہے جو اپنی دلالی کا کمیشن لیتا ہو۔ اسلام میں دخول کے لیے کوئی رسم ہے، نہ کوئی راز ہے۔ اور نہ دخول کے وقت کسی کو کوئی خاص رسم ادا کرنی ہوتی ہے۔ اسی سے معلوم ہوا کہ دین اسلام کس قدر سادہ، قدرتی اور فطری دین ہے۔ بس ایک عقیدہ ہے جو دل میں داخل ہو جائے۔ انسانی دل اور عقیدۂ اسلام کے درمیان کوئی رسمی واسطہ نہیں ہے۔ نہ کوئی کاہن، نہ کوئی پیر و فقیر۔ رسول کا اجر بس یہی ہے کہ دین حق کسی کے دل میں داخل ہو جائے اور کوئی بندہ اپنے حقیقی رب کے قریب ہو جائے۔

اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۲۵ : ۵۷) "بس یہی اجر ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کرلے"۔ صرف یہی اجر ہے رسول کا۔ رسول کا پاک دل اور رسول کا پاک شعور صرف اسی اجر پر راضی ہوتا ہے کہ ایک بندۂ گم کردہ راہ، اپنے رب کی طرف راہ پالے۔ رب راضی ہو جائے اور وہ رب کے طریقے پر چل پڑے اور پوری زندگی میں اپنے مولیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ (۲۵ : ۵۸) "اور اے نبی اس خدا پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں، اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو"۔ اللہ کے سوا جتنی بھی مخلوق ہے وہ مرنے والی ہے کیونکہ یہ تمام مخلوق رات دن موت کی طرف رواں ہے۔ باقی رہنے والا صرف اللہ ہے وہ ایسا زندہ ہے جو کبھی مرنے والا نہیں ہے۔ اور کسی ایسے زندہ شخص پر بھروسہ کرنا جس نے ایک دن مرنا ہے طویل عمر کے بعد یا قصیر کے بعد، ایک ایسی ذات پر بھروسہ کرنا ہے جس نے ایک دن گرنا ہے۔ ایک ایسے سایہ کے نیچے آنا ہے جس نے کسی

وقت زوال پاتا ہے۔ توکل تو اس حی اور زندہ پر کرنا چاہئے جس نے کبھی نہیں مرنا۔ اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح اور پاکی بیان کرو۔ حمد اور تعریف بھی صرف اللہ کی کرنا چاہیے جو منعم حقیقی اور وہاب حقیقی ہے اور اے پیغمبر آپ ان کفار کی پرواہ نہ کریں جن پر انذار اور تبشیر کا اثر نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتا ہے۔

وَكَفَىٰ بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا (۲۵ : ۵۸) "اپنے بندوں کے گناہوں سے بس اسی کا باخبر ہونا کافی ہے"۔ وہ اللہ اپنے بندوں کے حالات سے خوب باخبر ہے اس لیے جزاء و سزا دے سکتا ہے اور وہ اس کی طاقت بھی رکھتا ہے کہ اس نے زمین آسمان کو پیدا کیا ہے اور وہ مسلسل بادشاہت کی کرسی عرش پر متمکن ہے۔

الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ الرَّحْمَٰنُ فَاسْأَلْ بِهِ خَبِيرًا (۲۵ : ۵۹) "وہ جس نے چھ دنوں میں زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو بنا کر رکھ دیا جو آسمانوں اور زمین کے درمیان ہیں، پھر آپ ہی "عرش" پر جلوہ فرما ہوا۔ رحمٰن ہے وہ۔ اس سے پوچھو کہ وہ جاننے والا ہے"۔ وہ ایام جن میں اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا، وہ ہمارے زمینی دنوں سے مختلف تھے کیونکہ یہ دن تو نظام شمسی کی تشکیل کے بعد شروع ہوئے۔ یعنی زمین و آسمانوں کی پیدائش کے بعد جب اللہ نے زمین کا سورج کے ارد گرد چکر مقرر کیا اور خود زمین کا اپنے محور کے ارد گرد چکر شروع ہوا تو اس کے نتیجے میں ہمارے ایام شروع ہوئے۔ اللہ کی تخلیق تو صرف لفظ کن سے ہوتی ہے یعنی اللہ کا حکم ہو جائے تو ہر چیز ہو جاتی ہے۔ رہے یہ چھ دن تو ان کی حقیقت اور مقدار صرف اللہ جانتا ہے۔ یہ بہت ہی طویل دن ہوں گے اور ان دنوں میں زمین و آسمان مختلف ادوار اور اطوار سے گزر کر موجودہ شکل میں آ گئے ہوں گے۔ رہی یہ بات کہ اللہ عرش پر کیسے متمکن ہوا تو اس سے مراد صرف یہ ہے کہ اس کائنات پر اللہ کی حکومت اور اقتدار ہے۔ یہاں لفظ (ثُمَّ) سے مراد زمانی ترتیب نہیں ہے۔ یعنی یہ کہ پہلے تخلیق ہوئی اور بعد میں تمکین علی العرش ہوئی۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ ثم یہاں علوشان اور مرتبہ بلند کے معنی میں ہے۔

اللہ کی اس علوشان اور اقتدار عظیم الشان کے بعد پھر اللہ الرحمٰن بھی ہے اور تم نے جو کچھ پوچھنا ہے اس سے پوچھو، جب تم اس سے پوچھو گے تو ایک نہایت ہی خبردار سے پوچھو گے کہ وہ زمین و آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْجُدُوا لِلرَّحْمَٰنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمَٰنُ أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُورًا ۩ (۶۰)

"ان لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ اس رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں "رحمٰن کیا ہوتا ہے؟ کیا بس جسے تو کہہ دے اسی کو ہم سجدہ کرتے پھریں؟" یہ دعوت ان کی نفرت میں الٹا اور اضافہ کر دیتی ہے"۔

یہ بر خود غلط لوگوں کو جب رحمٰن کی بندگی کی طرف بلایا جاتا ہے تو یہ لوگ نہایت ہی حقارت، جھنجلاہٹ کے ساتھ

پوچھتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہے؟

یہ کفر و سرکشی کی بدترین اور مکروہ ترین تصویر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کس قدر جری اور گستاخ ہو گئے تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضد میں اپنے رب کی توہین کے لیے بھی تیار تھے۔ اللہ کے بارے میں بھی وہ یہ انداز گفتگو اختیار کرتے تھے۔ لہٰذا یہ لوگ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں برے الفاظ استعمال کرتے تھے تو ان سے کوئی بعید نہ تھا۔ وہ اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم کا یوں انکار کرتے تھے۔ یوں ظاہر کرتے تھے کہ وہ تو رحمٰن کو نہیں جانتے۔ وہ کون ہوتا ہے۔

وَمَا الرَّحْمٰنُ (۲۵ : ۶۰) "رحمٰن کیا ہوتا ہے"۔ وہ نہایت بے باکی سے کہتے کہ رحمٰن کو ہم اس کے سوا نہیں جانتے جو یمامہ میں ہے۔ وہ مسیلمہ کذاب کی طرف اشارہ کرتے تھے۔

ان کی اس بے باکی کا جواب اس انداز میں دیا جاتا ہے کہ اللہ وہ بابرکت ذات ہے کہ اس کی بڑائی، اس کی برکات اور اس کی عظمتوں پر تو یہ کائنات گواہ ہے۔ اس عظیم کائنات کے ایک ہی منظر پر ذرا غور کرو۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا ﴿۶۱﴾ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾

"بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔ وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا ہر اس شخص کے لیے جو سبق لینا چاہے، یا شکر گزار ہونا چاہئے"۔

بروج کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ اس سے سیاروں کے مدار مراد ہیں۔ وہ عظیم فلکیاتی مدار جو بہت ہی دوررس اثرات اور دوررس اعمال کا مظہر ہیں۔ کائنات کا یہ عظیم ترین منظر اللہ تعالیٰ نے کفار کے اس فقرے کے جواب میں پیش فرمایا ہے کہ (رحمٰن کیا ہوتا ہے) ان کو بتایا جاتا ہے کہ تم رحمٰن کو کیا سمجھتے ہو۔ ذرا رحمٰن کی اس مخلوق کو سمجھنے کی کوشش کرو تو تمہارا سر چکرا جائے۔ جو فی الحقیقت عظیم ہے۔ انہی بروج کے اندر شمس بھی سرگرداں ہے جو ایک چراغ ہے کیونکہ اسی کی روشنی سے زمین منور ہے۔ اور اسی کی روشنی سے قمر بھی منیر ہے۔ جس کی روشنی لطیف اور خوشگوار ہے۔

یہاں گردش لیل و نہار کے تسلسل کو انسانی مشاہدے کے لیے پیش کیا جاتا ہے کیونکہ یہ دو ایسے مظہر اور معجزات ہیں جو مسلسل ہمارے سامنے دہرائے جا رہے ہیں اور صرف انہی پر اگر انسان غور کرے تو اس کی ہدایت کے لیے یہ کافی و شافی ہیں۔

لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا (۲۵ : ۶۲) "اس شخص کے لیے جو سبق لینا چاہے یا شکر گزار ہونا چاہے"۔ اگر گردش لیل و نہار کا یہ نظام اس طرح آگے پیچھے نہ ہوتا تو اس کرۂ ارض پر حیات انسانی کی بقا ممکن ہی نہ ہوتی۔ نہ انسان ہوتے، نہ حیوانات ہوتے اور نہ نباتات ہوتے۔ اگر رات اور دن کی موجودہ چوبیس گھنٹے کی

مدت میں بھی طوالت کر دی جائے تو پھر بھی زندگی گزارنا مشکل ہو جائے۔

کتاب "سائنس دعوت ایمان دے رہا ہے" میں ہے:

"یہ کرۂ ارض یعنی زمین اپنے محور کے ارد گرد چوبیس گھنٹوں میں گھومتی ہے۔ اس کی رفتار ایک ہزار میل فی گھنٹہ ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ صرف سو میل فی گھنٹہ کے حساب سے گردش کرے گی تو ہمارے دن اور رات کا وقت دس گنا زیادہ ہو جائے گا۔ اس حالت میں جس حصے پر سورج چمک رہا ہو گا۔ سورج سب کچھ جلا کر رکھ دے گا۔ اور رات کے وقت زمین پر جو کچھ ہو گا وہ جم کر رہ جائے گا"۔

لہٰذا بڑی برکت والی ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کو صحیح اندازے کے مطابق بنایا۔ اور بڑی برکت والی ہے وہ ذات جس نے آسمانوں میں بروج بنائے اور ایک چراغ اور قمر منیر بنایا۔ اور جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا۔ اس میں عبرت ہے اس شخص کے لیے جو نصیحت پکڑنا یا شکر ادا کرنا چاہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۶۰ ایک نظر میں

اس سورت کے اس درس چہارم میں عباد الرحمٰن کو ان کے امتیازی اوصاف کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ ان کے کردار کے بنیادی فیچر کیا ہوتے ہیں۔ گو وہ انسانیت کا خلاصہ ہیں اور زمین کا نمک ہیں۔ اور تمام قافلہ رسل کی کشمکش حق و باطل اور انسانی تاریخ کا منتہائے مقصود ہیں۔ گویا وہ باغ انسانیت کا پکا ہوا پھل ہیں۔ کفر' ناشکری اور اعراض و نافرمانی کے خلاف اہل ہدایت کی طویل جدوجہد کا وہ حاصل ہیں۔

درس سابق کے آخر میں اہل کفر نے رحمٰن کو پہچاننے سے انکار کیا تھا۔ تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کیا تھا تو یہاں بتایا جاتا ہے کہ تم تو رحمٰن کو نہیں مانتے مگر رحمٰن کے بندوں کو تم دیکھ رہے ہو۔ یہ ہیں وہ لوگ جو رحمٰن کو پہچانتے ہیں۔ یہ ہیں اس ٹائیٹل کے مستحق کہ ان کو رحمٰن کا بندہ کہا جا سکے۔ ملاحظہ کرو ذرا ان کی صفات' دیکھو ان کا کردار' ان کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے' اسے پڑھو۔ یہ زندہ مثال کی شکل میں عملاً تمہارے سامنے موجود ہیں۔ ایسی جماعت اور ایسی ہی سوسائٹی' اسلام وجود میں لانا چاہتا ہے۔ ایسے ہی نفوس اسلام اپنے منہاج تربیت کے ذریعے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اور یہی لوگ ہیں جن کو اس کرۂ ارض پر اللہ تعالیٰ اہمیت دیتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں پر اللہ کی عنایات ہوتی ہیں۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اللہ کو تمام انسانوں کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ یہ تو ایسے ہی لوگوں کی دعاؤں کی برکت ہے جس سے یہ کائنات قائم ہے۔

---()()---

# درس نمبر ۱۶۰ تشریح آیات

## ۶۳ --- تا --- ۷۷

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾

"رحمٰن کے (اصلی) بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام"۔ اللہ کے بندوں کی صفات و علامات میں سے یہ پہلی صفت ہے کہ وہ زمین پر نرم چال چلتے ہیں۔ جن کی چال میں کوئی تکلف اور تصنع نہیں ہوتا۔ نہ کوئی تکبر' نہ کوئی غرور ہوتا ہے اور نہ ہی سستی اور ڈھیلا پن ہوتا ہے۔ یعنی ان کی چال پر وقار ہوتی ہے۔ یہاں چال سے مراد ان کی مجموعی شخصیت ہے' جس میں انسان کا شعور اور اس کی شخصیت معتدل کا اعتدال شامل ہے' جس کی وجہ سے انسان کی تمام صفات اور اس کے تمام افعال کے اندر' اعتدال پیدا ہو جاتا ہے اور ان معتدل صفات کی وجہ سے پھر اس شخص کی روش میں بھی ایک اعتدال اور وقار آ جاتا ہے۔ یہ شخص مطمئن اور پر وقار ہوتا ہے۔ اور ہر قسم کے حالات میں اس کے اندر ایک ٹھہراؤ ہوتا ہے۔

يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (۲۵:۶۳) کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ زمین پر مردوں کی طرح سر جھکائے ہوئے چلتے ہیں۔ اعضائے جسم کو لٹکائے ہوئے اس طرح چلتے ہیں کہ بس ابھی یہ صاحب زمین پر گرنے والے ہیں۔ بعض لوگ اظہار تقویٰ کی خاطر زمین پر اس طرح چلتے ہیں۔ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چال کے بارے میں تفصیلات موجود ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب چلتے تو لڑکھڑا کر چلتے تھے۔ آپ تمام لوگوں سے تیز چلتے تھے۔ آپ کی چال بہت خوبصورت اور سکون کے ساتھ ہوتی تھی۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خوبصورت کوئی چیز نہیں دیکھی۔ گویا سورج آپؐ کے چہرۂ مبارک پر چلتا ہے۔ اور میں نے کوئی شخص رسول اللہؐ سے تیز رفتار نہیں دیکھا۔ گویا آپؐ کے لیے زمین کو لپیٹ دیا جاتا تھا۔ ہم تو ہر معاملے میں پریشان ہوتے تھے لیکن آپؐ کوئی پرواہ نہ کرتے تھے۔ حضرت عمر ابن الخطاب فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لڑکھڑا کر چلتے تھے۔ یوں نظر آتا تھا کہ شاید آپؐ کسی نشیبی جگہ پر اتر رہے ہیں۔ ایک بار انہوں نے کہا کہ آپؐ اس طرح چلتے تھے جس طرح کوئی شخص اترتا ہے اور چڑھنے والے کی چال بھی اسی طرح ہوتی ہے جس طرح اترنے والے کی چال ہوتی ہے

اور اس قسم کی چال وہ لوگ چلتے ہیں جو اولوالعزم 'عالی ہمت اور بہادر ہوتے ہیں (زاد المعاد 'ابن القیم)

یہ لوگ چونکہ سنجیدہ 'پر وقار اور راست رو ہوتے ہیں اور ان کے پیش نظر چونکہ ہمیشہ بلند مقاصد ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ احمقوں 'نادانوں اور بے وقوفوں کی حماقتوں اور نادانیوں میں اپنے آپ کو نہیں الجھاتے۔ اس لیے وہ ایسے لوگوں کے ساتھ بحث و مباحثے اور بد کلامی میں حصہ نہیں لیتے۔ اگر کوئی ایسا موقعہ پیش آ جائے تو وہ نہایت ہی خوبصورتی سے اپنے آپ کو چھڑاتے ہیں۔

وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۲۵: ۶۳) "اور جاہل ان کو منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام"۔ یہ بات وہ نہ کسی کمزوری کی وجہ سے اور نہ تکبر کی وجہ سے کرتے ہیں۔ نہ اس وجہ سے کہ وہ عاجز ہیں۔ بلکہ ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو بلند رکھتے ہیں۔ وہ اپنے قیمتی اوقات کو ایسے کاموں میں صرف نہیں کرتے۔ جو شرفاء کے لائق نہیں ہیں۔ وہ فحش گوئی اور بد کلامی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ اور اپنے اوقات کو اچھے کاموں میں صرف کرتے ہیں۔

یہ تو تھا ان کا دن لوگوں کے ساتھ۔ وہ اس طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ رہی ان کی رات تو اس میں وہ خدا کا خوف کرتے اور اللہ سے ڈرتے رہتے تھے۔ اللہ کی بڑائی کا شعور ان کو ہوتا تھا۔ اور اللہ کے عذاب سے وہ ڈرتے تھے۔

وَ الَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا ﴿۶۴﴾ وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿۶۶﴾

"جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں جو دعائیں کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب! جہنم کے عذاب سے ہم کو بچا لے 'اس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے 'وہ تو بڑا ہی برا مستقر اور مقام ہے"۔

اللہ کے بندوں کی نمازوں کی تعبیر یہاں ارکان نماز سجود و قیام سے کی گئی تاکہ یہ معلوم ہو کہ ان کی سرگرمیاں کیا تھیں۔ راتوں کو جب تمام مخلوق سوتی ہے تو وہ جاگ رہے ہوتے ہیں۔ رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ وہ صرف اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور صرف اس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں۔ صرف اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور راتوں کو وہ فرحت بخش اور لذیذ نیند ترک کرتے ہیں کیونکہ ان کو اس میٹھی اور لذیذ نیند سے اللہ کے سامنے قیام و سجود میں زیادہ لذت آتی ہے۔ ان کا جسم ان کی روح اور ان کی سوچ اللہ سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس لیے لوگ غفلت کی نیند سوتے ہیں اور وہ رکوع و سجود میں مشغول ہیں۔ لوگ زمین پر لیٹے ہیں اور وہ آسمان اور بلندیوں کے ساتھ وابستہ ہیں اور ذوالجلال والاکرام کے ساتھ لو لگائے ہوئے ہیں۔

لیکن انہوں نے قیام و سجود کی محض صورت اور شکل ہی نہیں بنائی ہوئی ہوتی 'اس قیام اور سجود اور عالم بالا کی طرف

اپنی سوچ متوجہ کرنے ساتھ ساتھ ان کے دل میں خدا کا خوف اور تقویٰ بھی پایا جاتا ہے۔ ان کو یہ خوف دامن گیر ہے کہ کسی طرح وہ عذاب جہنم سے نجات پالیں۔ وہ ہروقت دعا کرتے ہیں۔

رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا (۲۵: ۶۵) اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا (۲۵: ۶۶) "اے ہمارے رب، جہنم کے عذاب سے ہم کو بچالے، اس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے، وہ تو بڑا ہی برا مستقر اور مقام ہے"۔ انہوں نے جہنم کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن جہنم کے وجود پر ایمان لائے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم نے جہنم کی جو تصویر کھینچی ہے انہیں اس پر پورا پورا یقین ہے۔ اس لیے ان کو جو خوف لاحق ہے اور وہ جو یہ کہتے ہیں کہ جہنم بہت بڑا ٹھکانا ہے، یہ ان کے پختہ یقین کا ثبوت ہے اور ان کے گہرے تصدیق کی وجہ سے ہے۔

وہ اپنے رب کی طرف نہایت ہی خضوع اور خشوع کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں تاکہ رب کریم مہربانی کر کے جہنم کے عذاب کو ان سے پھیر دے۔ صرف عبادت اور قیام و سجود ہی سے وہ مطمئن نہیں ہو جاتے۔ وہ اس قدر حساس متقی ہیں کہ اپنی عبادت پر تکیہ نہیں کرتے۔ وہ عبادت کو قلیل سمجھتے ہیں۔ اس لیے نجات کے لیے اسے پورا ضامن نہیں سمجھتے۔ چنانچہ وہ اس عبادت کے ساتھ ساتھ اللہ کے فضل و کرم کے بھی طلبگار ہیں کہ اللہ کے فضل و کرم ہی سے عذاب الٰہی ٹل سکتا ہے۔

انداز کلام سے جہنم کی نقشہ کشی یوں ہوتی ہے کہ وہ ایک زندہ بلا ہے۔ ہر شخص اس کے منہ میں ہے۔ ہر شخص کو وہ پکار رہی ہے، ہر شخص کو ہڑپ کرنا چاہتی ہے، ہاتھ آگے بڑھا بڑھا کر لوگوں کو اپنے قبضے میں لیتی جاتی ہے۔ دور اور قریب سب اس کی پہنچ میں ہیں اور اس کے خوف کے مارے اللہ کے یہ بندے رات دن اللہ کے سامنے کھڑے ہیں۔ اس سے ڈر ڈر کر اللہ سے پناہ مانگتے ہیں، عاجزی کرتے ہیں اور درخواستیں اور فریادیں کرتے ہیں کہ اے اللہ بچائیو، یہ تو کھائے جا رہی ہے۔

جب وہ اللہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر، نہایت ہی خوف سے اور نہایت ہی گھبراہٹ سے دعا کرتے ہیں تو انداز کلام ماحول کے اندر ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔

اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا (۲۵: ۶۵) "بے شک اس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے"۔ یعنی ایسا عذاب ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ پھر کبھی چھوڑتا نہیں۔ نہ کم ہوتا ہے اور نہ ختم ہونے کا نام لیتا ہے۔ یہی وصف ہے جہنم کا جو ان بندوں کو خائف کر رہا ہے اور وہ ہروقت اس سے ڈرے سہمے رہتے ہیں۔

اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا (۲۵: ۶۶) "وہ تو بڑا ہی برا مستقر و مقام ہے"۔

--- ○○○ ---

پھر یہ بندے اعتدال و میانہ روی کا نمونہ ہیں۔ ان کی زندگی نہایت ہی متوازن ہے۔

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾

"جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل ' بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے" ۔ یہ اسلام کی بنیادی خصوصیت ہے ' جسے وہ ایک مسلم فرد اور ایک مسلم جماعت کی زندگی کے اندر ایک حقیقت کی شکل میں پیدا کرتا ہے ۔ اسلام اس خصوصیت کو اپنے نظام تربیت و اخلاق اور نظام معیشت و قانون دونوں میں پیش نظر رکھتا ہے ۔ چنانچہ اسلامی نظام کے ہر جز کا مدار توازن اور اعتدال پر ہے ۔

باوجود اس کے کہ اسلام ایک فرد کو انفرادی مخصوص ملکیت رکھنے کی اجازت دیتا ہے لیکن اسلام ' ایک مسلم فرد کو کھلی چھٹی نہیں دیتا کہ وہ "اپنی" دولت کو جس طرح چاہے خرچ کرے ۔ جبکہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام میں ایک فرد کو مکمل آزادی ہے کہ وہ اپنی انفرادی دولت کو جس طرح چاہے خرچ کر دے ۔ اسی طرح تمام غیر مسلم اقوام کے ہاں بھی یہی اصول ہے کہ ایک شخص اپنی انفرادی ملکیت کو جس طرح چاہے ' خرچ کر دے ۔ اس پر کوئی قدغن نہیں ہے ۔ لیکن ایک مسلمان انفرادی دولت خرچ کرنے میں بھی اس بات کا پابند ہے کہ اسراف اور کنجوسی کے درمیان حد اعتدال پر قائم رہے ۔ اسراف کی وجہ سے جان ' مال اور معاشرے سب کی تباہی ہے ۔ اور کنجوسی بھی اسی طرح جان ' مال اور معاشرے کا نقصان ہے کہ ایک شخص اپنے مال سے فائدہ نہیں اٹھاتا ۔ کیونکہ اگر کوئی مال سے نفع اٹھاتا ہے اور خرچ کرتا ہے تو اس سے دوسرے کی آمدن ہوتی ہے اس لئے کہ مال تو ایک اجتماعی ذریعہ ہے جس سے پوری سوسائٹی کو فائدہ ملتا ہے اور اسراف اور کنجوسی دونوں سے معاشرے اور اجتماعی اقتصادیات کو نقصان پہنچتا ہے ۔ اگر مال کو روک دیا جائے تو کساد بازاری پیدا ہوتی ہے اور اگر ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے تو دوسروں کی قوت خرید متاثر ہوتی ہے اور پھر اس سے اخلاقی فساد بھی پیدا ہوتا ہے ۔

چنانچہ اسلام سوسائٹی کے اس پہلو کی بھی اصلاح کرتا ہے اور اعتدال اور توازن کو ایک مسلم شخصیت کا حصہ بنا دیتا ہے ۔ اور اس کا تعلق ایمان سے جوڑ دیتا ہے ۔

وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا (۲۵ : ۶۷) "بلکہ اس کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے" ۔

---ooo---

اور پھر عباد الرحمٰن کی بڑی صفت یہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک نہیں کرتے اور کسی زندہ جان کو قتل نہیں کرتے ۔ وہ زنا نہیں کرتے ۔ شرک ' قتل اور زنا اسلام میں اکبر الکبائر گناہ اور جرائم ہیں ۔ جو شخص یہ گناہ کرے گا وہ ضرور سزا کا مستوجب ہو گا ۔

وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا ﴿٦٨﴾ يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدْ فِيهِ مُهَانًا ﴿٦٩﴾ إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا

رَّحِيمًا ﴿٧٠﴾ وَمَن تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ﴿٧١﴾

"جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے' اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے' اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ کام جو کوئی کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا' قیامت کے روز اس کو مکرر عذاب دیا جائے گا اور اسی میں وہ ہمیشہ ذلت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ الا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو۔ ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا اور وہ بڑا غفور و رحیم ہے جو شخص توبہ کر کے نیک عمل اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے"۔

خدا کو وحدہ لاشریک جاننا اسلامی نظریہ حیات کی اساس ہے۔ عقیدہ توحید نہایت واضح' سیدھا اور سادہ عقیدہ ہے۔ اور اس کے مقابلے میں جس قدر عقائد ہیں وہ پیچیدہ' ٹیڑھے اور ناقابل فہم عقیدے ہیں۔ اسلامی نظریہ حیات پر جس طرح ایک صحیح نظام زندگی قائم ہوتا ہے اسی طرح دوسرے عقائد پر کوئی سیدھا اور صالح نظام زندگی قائم ہی نہیں ہو سکتا۔

کسی جاندار کو ناحق نہ قتل کرنا اور سوسائٹی کی اجتماعی زندگی کو پرسکون' پرامن اور مطمئن بنانا اسلامی اور انسانی زندگی کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے' جبکہ قتل و غارت اور لوٹ مار جنگل کی زندگی کا خاصہ ہوتا ہے اور کوئی ایسی سوسائٹی جس میں ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم ہو اور لوٹ مار عام ہو' اسے نہ انسانی سوسائٹی کہا جا سکتا ہے۔ اور نہ ایسی سوسائٹی میں کوئی ترقیاتی کام ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسلام قتل نفس کو بہت بڑا جرم قرار دیتا ہے۔

اسی طرح اسلام زنا کو گھناؤنا جرم قرار دیتا ہے اور اسے جرم قرار دے کر ہی دو قسم کی زندگیوں کے راستے جدا کیے جا سکتے ہیں۔ ایک ایسی زندگی ہے جس میں ایک شخص اپنے آپ کو ایک حیوان جیسی غلیظ جنسی خواہش سے ذرا بلند کر دیتا ہے اور وہ یہ یقین کر لیتا ہے کہ جنس آخر سے اس کے ملاپ کا ایک اعلیٰ و ارفع مقصد مقرر کیا گیا ہے۔ یہ محض لذت کوشی اور گری ہوئی غلیظ حیوانی زندگی کا ملاپ نہیں ہے' جو ایک نر اور مادے کے درمیان ہوتا ہے۔ اور جس کے اندر محض جسمانی تقاضے پورے ہوتے ہیں۔

غرض یہ تین صفات وہ صفات ہیں جو ایک انسانی اور شریفانہ زندگی اور ایک عام حیوانی اور گری ہوئی وحشیانہ زندگی کے درمیان حدود و امتیاز پیدا کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے عباد الرحمن کی صفات و نشانات کے اندر ان تینوں صفات کو داخل کیا ہے۔ کیونکہ عباد الرحمن اللہ کے نزدیک اعلیٰ و ارفع مخلوق ہے۔ اور ان کے نزدیک یہ نہایت ہی اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان صفات کے بعد یہ تہدید آتی ہے۔

وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا (۲۵ : ۶۸) "یہ کام جو کوئی کرے وہ اپنے گناہوں کا بدلہ پائے گا"۔
اثام کا مفہوم یہاں عذاب ہے۔ اس عذاب کی تشریح پھر یوں کی گئی ہے۔

يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدْ فِيهِ مُهَانًا (۲۵ : ۶۹) "قیامت کے روز اس کا عذاب دگنا کر دیا جائے گا اور اس میں وہ ہمیشہ ذلت کے ساتھ رہے گا"۔ یعنی نہ صرف یہ ہو گا کہ اس کا عذاب دگنا کر دیا جائے گا بلکہ وہ توہین آمیز بھی ہو گا۔ اور اس طرح یہ عذاب زیادہ شدید اور زیادہ تکلیف دہ بن جائے گا۔

ہاں یہ نہیں ہے کہ جس نے ان گناہوں کا ارتکاب ایک بار کر لیا تو اس کی معافی کی کوئی صورت نہیں ہے ۔ وہ توبہ اور عمل صالح کے ذریعے اس عذاب سے بچ سکتا ہے ۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا (۲۵ : ۷۰) "الا یہ کہ کوئی ان گناہوں کے بعد توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو"۔ ان کے ساتھ وعدہ یہ ہے کہ انہوں نے ایمان ' توبہ اور عمل صالح سے قبل جو برے کام کیے ان کو اللہ نیکیوں سے بدل دے گا۔

فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ (۲۵ : ۷۰) "ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا"۔ یہ تو اللہ کا فیضان رحمت ہے ۔ اور محض اللہ کا جود و کرم ہے جس کے بدلے میں انسان کا کوئی استحقاق نہیں ہے ۔ بس یہ انعام ہے اس شخص کے لیے جو راہ بد چھوڑ کر راہ ہدایت پر چل نکلتا ہے ۔ اللہ کی پناہ میں آ جاتا ہے اور بد عملی اور سرکشی کو ترک کر دیتا ہے ۔

وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۲۵ : ۷۰) "اور اللہ بڑا غفور و رحیم ہے"۔ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے جس کا ضمیر جس وقت بھی جاگ اٹھے ' اور جس مقام سے بھی کوئی واپس ہونا چاہے ' واپس آ سکتا ہے ۔ اسلام اس کی راہ نہیں روکتا ۔ اور اسلام کا دروازہ اس کے لیے کھلا ہے ۔ جو بھی ہو ' جس قدر گنہگار بھی ہو ' صد بار اگر توبہ شکستی باز آ"۔

طبرانی نے ابو المغیرہ ' صفوان ابن عمر ' عبد الرحمن ابن جبیر ' ابو فروہ سے روایت کی ہے ۔ یہ صاحب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا : حضور ؐ ایک شخص نے تمام گناہ کیے ۔ اس نے نہ کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا اور نہ کوئی بڑا گناہ ۔ کیا اس کے لیے بھی توبہ ہے ؟ تو حضور ؐ نے فرمایا کیا تو ایمان لایا ہے اس نے کہا ہاں میں اسلام لایا ہوں ۔ حضور ؐ نے فرمایا نیکیاں کرتے جاؤ اور برائیاں چھوڑتے جاؤ ۔ ان برائیوں کو بھی اللہ تمہارے لیے نیکیاں کر دے گا اس نے پھر کہا "اور میرا فسق و فجور بھی" ۔ حضور ؐ نے فرمایا "ہاں" ۔ یہ شخص اللہ اکبر ' اللہ اکبر کہتے ہوئے لوٹا یہاں تک کہ غائب ہو گیا ۔

لیکن توبہ کا قاعدہ بھی وضع کر دیا جاتا ہے ۔

وَ مَنْ تَابَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا (۲۵ : ۷۱) "جو شخص توبہ کر کے نیک عمل اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے"۔ توبہ کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ کسی گنہگار کو ندامت آ جائے اور پھر وہ معصیت کو چھوڑ دے ۔ اور اس کے بعد وہ نیکیوں پر عمل پیرا ہو جائے تو ثابت ہو گا کہ اس شخص کی توبہ صحیح ہے ۔ اور یہ شخص سچا ہے ۔ یعنی اس نے برائیوں کو ترک کر کے مثبت پیش رفت شروع کر دیا ہے ۔ کیونکہ معصیت دراصل زندگی کا ایک عمل اور تحریک ہوتی ہے جو شخص ان معاصی کو ترک کرے گا بے شک اس کی زندگی معاصی سے خالی ہو گی لیکن اس کی زندگی کے اس خلا کو مثبت اعمال صالح سے بھرنا بھی ضروری ہے ۔ یہ ہے اسلامی نظام تربیت کا وہ خاص پوائنٹ جس پر آ کر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور وہ انسان کے حالات نفس سے اچھی طرح باخبر ہے ۔ اس لیے اس نے ہدایت فرمائی کہ اس نفسیاتی خلا کو اعمال صالحہ کے ساتھ بھر دو ورنہ .....

---()()()---

اس جملہ معترضہ کے بعد پھر روئے سخن صفات عباد الرحمٰن کی طرف پھر جاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝

"(اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرف گزر جاتے ہیں"۔

جھوٹی شہادت نہ دینے کا قریبی اور اصطلاحی مفہوم بھی لیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی عدالت میں جھوٹی شہادت نہیں دیتے۔ کیونکہ اس کے نتیجے میں لوگوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں اور ظلم پر اعانت کا جرم واقع ہوتا ہے۔ اور اس سے حقیقی شہادت بھی مراد ہو سکتی ہے یعنی کسی مجلس، کسی سوسائٹی یا کسی جگہ میں جھوٹ اور برائی کا ارتکاب ہو رہا ہو تو یہ لوگ وہاں حاضر نہیں ہوتے یعنی ایسی سوسائٹی سے دور رہتے ہیں، جس میں برائی کا ارتکاب ہوتا ہے اور یہ زیادہ بلیغ اور دل لگتی تفسیر ہے۔ اسی طرح وہ لغو اور بیہودہ محافل یا مقامات سے بھی اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔

وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (۲۵ : ۷۲) "اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں"۔ وہ اپنے آپ کو اس میں مشغول نہیں کرتے، نہ وہ ان برائیوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ نہ دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں بلکہ وہ ایک مکرم اور معزز شخص کی طرح وہاں سے گزر جاتے ہیں۔ اس لیے کہ کسی مومن کے کاسہ حیات میں کوئی خالی جگہ ہی نہیں ہوتی کہ اس میں لغو اور بیہودگی بھی سما سکے۔ وہ اپنے عقیدہ و ایمان اور دعوت اسلامی اور اس کے تقاضوں سے فارغ کب ہوتا ہے۔ وہ تو ہر وقت اپنی اور معاشرے کی اصلاح میں لگا ہوا ہوتا ہے۔

---()()()---

اور ایک صفت عباد الرحمٰن کی یہ بھی ہے کہ جب ان کو یاد دہانی اور نصیحت کی جائے تو وہ سبق اور نصیحت کو قبول کر لیتے ہیں۔ وہ بات پر یقین کرتے ہیں، ان کے دل قبول حق کے لیے ہوتے ہیں۔ وہ ذہن رسا رکھتے ہیں اور قلب منیب کے مالک ہوتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝

"جنہیں اگر ان کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے"۔

اس آیت میں مشرکین مکہ پر ایک لطیف طنز بھی ہے کہ وہ اندھے اور بہرے ہو کر اپنے بتوں کی عبادت میں لگے ہوئے تھے اور احمقانہ اور باطل عقائد کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ نہ وہ کوئی عقل کی بات سننا چاہتے تھے اور نہ کھلے حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ نہ وہ کھلی روشنی کو دیکھتے تھے اور نہ سیدھی راہ کو دیکھتے ہوئے اس پر چلتے تھے۔ اوندھے

منہ اندھا اور بہرا ہو کر چلنا' بغیر سوچے سمجھے اور عقل وتدبر کرتے ہوئے چلنا۔ یہ محاورہ ایک ایسی حالت کی تصویر کشی کرتا ہے جس سے غفلت اور کم عقلی کی انتہائی حالت کا اظہار ہوتا ہے' جس میں کوئی غور وتدبر نہ ہو۔ رہے اللہ کے بندے اور رحمن کے بندے تو وہ ہر معاملے کو نہایت سوچ اور سمجھ کے ساتھ طے کرتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ان عقائد میں سچائی کیا ہے۔ وہ اس بات کو پاتے ہیں کہ فلاں فلاں دلائل و شواہد سچائی کو ثابت کرتے ہیں۔ ان کا ایمان علی وجہ البصیرت ہوتا ہے۔ اس لیے وہ جاہلوں کی طرح کسی بات پر اوندھے ہو کر نہیں گرتے۔ ان کے اندر اگر اپنے عقائد کے بارے میں جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ تو وہ علی وجہ البصیرت پایا جاتا ہے۔ علی وجہ الجہالت نہیں پایا جاتا۔ وہ عارف ذی البصیرت ہوتے ہیں۔

---()()()---

آخر میں یہ کہ وہ صرف رب کے سامنے سجدے اور قیام پر ہی اکتفاء نہیں کرتے' اور ان دوسری عظیم صفات کو اپنے اندر جمع کرنے پر ہی اکتفاء نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے بعد ایسی اولاد کی بھی امید کرتے ہیں جو ان کے طریقے پر چلنے والی ہو۔ ان کی بیویاں بھی ان ہی جیسی ہوں۔ ان کو دیکھ کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ ان کے دل ان کے بارے میں مطمئن ہوں۔ اور اس طرح ان کی بیویوں اور بچوں کے ذریعے عباد الرحمن کی تعداد میں اضافہ ہو۔ اور وہ یہ امید بھی کرتے ہیں کہ وہ دوسرے نیک بندوں کے لیے بھی اچھا نمونہ ہوں۔

وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝

"مانگا کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب' ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا"۔

یہ گہرا فطری اور ایمانی شعور ہے' یہ کہ ہر مومن صادق یہ خواہش رکھتا ہے کہ اس کے ساتھی زیادہ ہوں اور سب لوگ اللہ کی طرف چل پڑیں۔ اور دوسروں سے پہلے انسان اپنی بیویوں اور اولاد کے بارے میں یہ سوچتا ہے کہ وہ اس کی لائن پر آ جائیں۔ کیونکہ سب سے زیادہ کسی کی اولاد اس کی اطاعت پر آمادہ ہو سکتی ہے۔ اور سب سے زیادہ کوئی شخص اپنی اولاد اور اہل و عیال کے بارے میں مسئول ہو سکتا ہے۔ پھر کسی بھی مومن میں یہ فطری خواہش ہوتی ہے اور ہونا چاہئے۔ کہ وہ بھلائی کا نمونہ اور قائد ہو۔ اللہ کی طرف رجوع کرنے والے اس کی زندگی سے سبق سیکھیں۔ اہل ایمان کے لیے نمونہ اور اہل ایمان کا سرخیل ہونے کی تمنا کوئی بڑائی اور برتری کا جذبہ نہیں بلکہ بھلائی میں آگے بڑھنے کا جذبہ ہے ورنہ تو سب مومن ایک ہی راہ کے مسافر ہوتے ہیں۔

---()()()---

اب یہاں یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ ایسے بندگان رحمن کا انجام و انعام کیا ہو گا؟

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً

وَسَلٰمًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝

"یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے صبر کا پھل منزل بلند کی شکل میں پائیں گے۔ آداب و تسلیمات سے ان کا استقبال ہو گا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ کیا ہی اچھا ہے وہ مستقر اور وہ مقام"۔

غرفہ کا مفہوم منزل بلند ہے 'جس سے جنت مراد ہے۔ یا یہ جنت کا کوئی خاص مقام ہو گا۔ جیسا کہ بالاخانہ عام افتادہ مکان کے مقابلے میں زیادہ پسندیدہ ہوتا ہے۔ ہر شخص مہمانوں کو بالاخانوں میں بٹھاتا ہے۔ اور یہ لوگ بھی چونکہ اللہ کے معزز اور مکرم بندے ہیں اور ان کے لیے عباد الرحمن کا ٹائیٹل استعمال ہوا ہے اور ان کی صفات بھی گنوائی گئی ہیں لہٰذا ان کا اس خاص مقام میں تحیہ اور مبارک و سلامت سے استقبال ہو گا۔ اس لیے کہ انہوں نے دنیا میں صبر کیا۔ اور ان صفات پر رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عباد الرحمٰن کی ان صفات و علامات پر چلنا کارے دارد۔ بڑے صبر اور مصابرت کی ضرورت ہے۔ زندگی کی راہ پر دھوکہ دینے والی مرغوبات ہر طرف سے دامن کش رہتی ہیں۔ اس راہ پر گرنے اور پھسلنے کے مقامات جگہ جگہ موجود ہیں۔ زندگی کی اس طویل شاہراہ پر سیدھا چلنے کے لیے عزم و مصابرت کی ضرورت ہے۔ اس لیے اللہ نے یہاں بِمَا صَبَرُوْا (۲۵ : ۷۵) کا ذکر فرمایا۔

اور اس جہنم کے بالمقابل جس سے وہ بچنے کی دعا ہر وقت کرتے رہتے ہیں اور جو بہت ہی برا مقام ہے 'ان کے لیے ایک ایسا مقام ہو گا۔ یعنی جنت جو نہایت اچھا مقام ہو گا اور جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا (۲۵ : ۷۶) "یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور مستقر و مقام کے طور پر وہ بہترین جگہ ہو گی"۔ یہاں سے انہیں نکلنے کی کوئی ضرورت نہ ہو گی وہ نہایت سکون و قرار سے وہاں رہیں گے۔

---ooo---

عباد الرحمٰن کی تصویر کشی تو ہو چکی۔ بشریت کے نمک اور خلاصہ کی صفات کی تفصیلات تو دے دی گئیں۔ اب یہاں ان لوگوں کو یہ اعزاز دیا جاتا ہے کہ اگر اللہ کے یہ بندے نہ ہوں تو اللہ کے نزدیک پوری انسانیت پرکاہ کے اہمیت بھی نہیں رکھتی۔ رہے مکذبین تو ان کے لیے تو عذاب جہنم کا حتمی فیصلہ ہو چکا ہے۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاۗؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ
۷۷ يَكُوْنُ لِزَامًا ۝ الربع

"اے نبیؐ لوگوں سے کہو "میرے رب کو تمہاری کیا حاجت پڑی ہے اگر تم اس کو نہ پکارو۔ اب کہ تم نے جھٹلا دیا ہے 'عنقریب وہ سزا پاؤ گے کہ جان چھڑانی محال ہو گی"۔

یہ ایک خاتمہ کلام ہے جو پوری سورت کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس پوری سورت کا عمود یہ ہے کہ اس میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے۔ لوگوں کے انکار اور منہ موڑنے کی وجہ سے آپ کے دل پر جو غبار تھا' اسے دور کرنا اس سورت کا ہدف ہے کیونکہ وہ لوگ مقام محمدیؐ کو جانتے ہوئے انکار پر تل گئے تھے اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ جو زیادہ تکلیف دہ بات تھی۔ اس لئے یہاں بتایا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی حیثیت کیا ہے؟ یہ پوری انسانیت اللہ کے نزدیک پرکاہ کے برابر نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں انسانیت کا احترام اور رعایت تو اللہ کے ایسے بندوں کی وجہ سے ہے جن کی صفات گنوائی گئیں۔ جو ہروقت اللہ کو پکارتے ہیں اور عاجزی کرتے ہیں۔

ان لوگوں کی کیا حیثیت ہے؟ بلکہ پوری انسانی آبادی کی کیا حیثیت ہے؟ اور پھر اس پوری زمین کی کیا حیثیت ہے؟ اللہ کی کائنات میں تو یہ ایک ذرے کے برابر ہے اور انسانیت ایسی ہی ہے جس طرح اس دنیا میں کوئی زندہ مخلوق (مثلاً مچھر)۔ رہی اس زمین کی اقوام میں سے کوئی ایک قوم تو اس کی گزشتہ رفتہ نسلیں اور آنے والی سب نسلیں کیا ہیں؟ بس اللہ کی کتاب کائنات کے چند صفحات اور اس کتاب کائنات کے باقی صفحات تو ان کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔

اور انسان' اپنی اس بے بضاعتی اور اپنی اس بے قدری کے باوجود پھولتا ہے اور پھولتا رہتا ہے اور اپنے آپ کو بڑی شے سمجھتا ہے۔ پھر یہ سرکش ہو جاتا ہے۔ پھر اس قدر سرکش کہ یہ اپنے خالق کی جناب میں گستاخی کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ یہ کوئی چیز ہی نہیں ہے' اللہ کے مقابلے میں ضعیف تر اور پرتقصیرات۔ ہاں اس کی قوت کا سرچشمہ صرف اللہ ہے۔ اللہ سے جڑ کر انسان کچھ چیز بن سکتا ہے اور شمار میں آسکتا ہے۔ راہ ہدایت بھی پا سکتا ہے۔ یہ راہ ہدایت پالے اور اللہ سے جڑ جائے تو پھر اللہ کے ترازو میں اس کا وزن ہو جاتا ہے۔ بلکہ اللہ کے ترازو میں فرشتوں سے بھی بھاری ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اللہ نے انسان کو جو خصلت دی' فرشتوں کو جو حکم دیا کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ' یہ اس لیے کہ انسان اللہ کو پہچان لے' اس تک رسائی حاصل کرے' اس کا بندہ بن جائے' صرف اسی طرح وہ اپنے خصائص وصفات اور علامات و نشانات کو قائم رکھ سکتا ہے جن کی وجہ سے اسے فرشتوں پر فضیلت دی گئی تھی۔ اور جس کی وجہ سے فرشتوں نے اس کے سامنے سجدہ کیا تھا ورنہ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے بغیر اگر پوری انسانیت کو اللہ کے ترازو میں رکھ دیا جائے تو وہ ایک مچھر کے برابر بھی نہ ہوگی۔ اللہ کے ترازو اور میزان میں' یہ زمین تو ایک ذرہ ہے۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ (۲۵: ۷۷) "اے نبیؐ لوگوں سے کہو' میرے رب کو تمہاری کیا حاجت پڑی ہے اگر تم اس کو نہ پکارو"۔ یہ انداز کلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بہت بڑا سہارا ہے۔ کہا جاتا ہے لوگو' اگر تم نہیں مانتے ہو تو تمہاری کیا حیثیت رہ جاتی ہے اور اگر تم اللہ کے بندوں میں شامل نہیں ہوتے تو تم کچھ بھی نہیں ہو۔ تم تو جہنم کا ایندھن بنو گے۔

فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا (۲۵: ۷۷) "اب جبکہ تم نے جھٹلا دیا ہے تو عنقریب وہ سزا پاؤ گے کہ جان چھڑانی محال ہوگی"۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ---- چہارم

## پارہ ----- ۱۹

### سورۃ الشعراء ـ ۲۶

آیات ۱--- تا --- ۲۷

# سورۃ الشعراء ایک نظر میں

اس سورت کا موضوع بھی وہی ہے جو عام مکی سورتوں کا ہے یعنی اسلامی نظریہ حیات جس کے بنیادی عناصر کا خلاصہ یہ ہے :

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ (۲۶:۲۱۳) "پس نہ پکارو اللہ کے سوا کسی الٰہ کو ورنہ تم ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جن کو عذاب دیا جائے گا"۔ نیز آخرت کی جوابدہی کا احساس ۔

وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ (۲۶:۸۷) يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ (۲۶:۸۸)

اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (۲۶:۸۹) "اور مجھے اس دن رسوا نہ کرو جبکہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا اور نہ اولاد' بجز اس کے کہ کوئی شخص قلب سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو"۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی پر ایمان و تصدیق ۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۶:۱۹۲) نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (۲۶:۱۹۳)

عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (۲۶:۱۹۴) "یہ رب العالمین کی نازل کردہ چیز ہے اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار روح اتری ہے تاکہ تو ان لوگوں میں شامل ہو (جو خدا کی طرف سے خلق خدا کو) متنبہ کرنے والے ہیں"۔ اور پھر لوگوں کو ڈرایا گیا ہے کہ تکذیب کے نتائج بہت ہی برے ہوں گے' یا تو دنیا میں عذاب الٰہی نازل ہو گا اور تمہیں ایام سابقہ کے مکذبین کی طرح ہلاک کر دیا جائے گا یا پھر آخرت کا عذاب ہو گا جو کافروں کے انتظار میں ہے ۔

فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۲۶:۶) "اب جب کہ یہ جھٹلا چکے ہیں عنقریب ان کو اس چیز کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہتے ہیں"۔ اور

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (۲۶:۲۲۷) "اور ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں"۔ نیز اس سورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دلاسے اور تسلی کے مضامین بھی ہیں کہ مشرکین آپ کی تکذیب کرتے ہیں اور ایمان نہیں لاتے ۔ ارشاد الٰہی ہے کہ آپ پرواہ نہ کریں ۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۲٦ : ۳) "شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے"۔ اور اہل ایمان کو بھی یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ مشرکین کی جانب سے ہٹ دھرمی اور عناد کے مظاہرے پر صبر کریں اور اپنے پروگراموں اور نظریہ حیات پر ثابت قدمی سے آگے بڑھتے ہیں خواہ اس راہ میں ان کو جس قدر اذیتیں پہنچیں جس طرح انبیاء کی تاریخ میں تمام اہل ایمان ثابت قدمی دکھاتے رہے ہیں' وہ بھی ایسی ہی ثابت قدمی دکھائیں۔

اس سورت کے مضامین کا بڑا حصہ قصص القرآن پر مشتمل ہے۔ سورت کی کل ۲۲۷ آیات میں سے ۱۸۰ آیات میں تو قصص القرآن ہیں۔ پوری سورت میں ایک مقدمہ ہے' پھر یہ قصص ہیں اور آخر میں تبصرہ ہے جبکہ مقدمہ اور آخری تبصرے کا مضمون ایک ہے۔ ان میں سورت کے موضوع کو پیش نظر رکھتے ہوئے قصص کے اندر مختلف اسالیب سے' اس موضوع پر کلام کیا گیا ہے۔ انداز گفتگو سے ظاہر ہے کہ پوری سورت کے سامنے صرف ایک ہی ہدف ہے۔ اس لیے تمام قصص کے وہی حلقے اور کڑیاں پیش کی جاتی ہیں جن کا موضوع زیر بحث کے ساتھ تعلق ہے۔ باقی قصے کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

پوری سورت پر ڈراوے کی فضا ہے جبکہ مکذبین کی طرف سے مسلسل تکذیب ہے اور نتیجۃً عذاب الٰہی کا نزول۔ مقصد یہ ہے کہ اہل مکہ جو مسلسل تکذیب کر رہے ہیں اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے منہ موڑ رہے ہیں' یہ ان کے لیے خطرناک فعل ہے۔ ڈرانے والوں کے ساتھ یہ مذاق' اللہ کی آیات کی یہ مسلسل تکذیب اور پھر سرکشی میں یہ انتہا کہ رسولوں کو بار بار کہنا کہ لاؤ جس عذاب سے ہمیں ڈراتے ہو' قرآن کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرنا کہ یہ سحر ہے۔ یہ اشعار ہیں اور روح الامین نہیں' شیاطین اسے اتارتے ہیں۔

پوری کی پوری سورت دراصل ایک ہی مضمون اور ایک ہی سبق ہے۔ مقدمہ قصص اور تبصرہ لہٰذا ہم نے اسے چند پیراگرافوں میں تقسیم کر دیا ہے' اس کی ترتیب مضامین کے مطابق۔ آغاز ہم مقدمہ سے کرتے ہیں۔

---000---

# درس نمبر ١٦١ تشریح آیات

## ١ --- تا --- ٩

سورة الشعراء (٢٦) مكية (٤٢) آياتها ٢٢٧ ركوعاتها ١١

بسم الله الرحمن الرحيم

طٰسٓمّٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”ط۔ س۔ م یہ کتاب مبین کی آیات ہیں“۔

حروف تہجی سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ کتاب مبین اور یہ سورت انہی حروف سے بنائی گئی ہے اور جو لوگ تکذیب پر اصرار کرتے ہیں یہ حروف ان کے علم میں ہیں اور ان سے مرکب کلمات وہ بولتے ہیں لیکن وہ ایسی کتاب مبین پیش نہیں کر سکتے۔ اس کتاب کے بارے میں اس سورت میں بہت سی باتوں پر بحث کی گئی ہے۔ مقدمے میں بھی اور آخری نتائج میں بھی۔ اور یہ انداز ان تمام سورتوں کا ہوتا ہے جن کے آغاز میں حروف مقطعات لائے گئے ہوتے ہیں۔

اس تنبیہہ کے بعد حضور کو براہ راست مخاطب کیا جاتا ہے کیونکہ حضور مشرکین کے مقابلے میں ایک انتھک جدوجہد کر رہے تھے اور ان کی مسلسل تکذیب سے آپ کو دکھ پہنچ رہا تھا۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں تسلی دی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ آپ اس کام کے لیے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ بتایا جاتا ہے کہ ٹھیک ہے کہ آپ بہت کچھ برداشت کر رہے ہیں اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ اگر ہم چاہیں تو چشم زدن میں ان کی گردنیں جھکا دیں لیکن اللہ کی ایک اسکیم ہے۔ ذرا انتظار کریں۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ۝

"اے نبیؐ" شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے - ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں"۔

انداز کلام ایسا ہے کہ گویا خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہہ کی جاتی ہے کہ اپنی جان کو اس وجہ سے خطرے میں ڈال رہے ہیں کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ (۲۶ : ۳) "اے نبیؐ" شاید آپ اس غم میں اپنی جان کھو دو گے"۔ بخع النفس کے معنی قتل النفس ہیں - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرمؐ کفار قریش کے عدم ایمان پر کس قدر دل گیر تھے - کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ اگر یہ ایمان نہ لائے تو دوسری اقوام کی طرح کہیں یہ بھی نیست و نابود نہ کر دیئے جائیں - یوں آپ اپنے آپ کو اس غم میں گھول رہے تھے - حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ آپ کے رشتہ دار' اہل خاندان اور اہل قوم تھے - اس کی وجہ سے آپ زیادہ پریشان تھے - لیکن رب تعالیٰ کو آپ سے زیادہ ہمدردی تھی - اللہ نے آپ کو اس تباہ کن دل گرفتگی سے منع کر دیا - فرمایا کہ آپ ذرا آرام اور سکون سے کام جاری رکھیں - آپ کا یہ فریضہ نہیں ہے کہ لوگ ایمان لائیں' اگر محض لوگوں کا ایمان ہی مطلوب ہوتا تو ہم ایک ہی حکم سے ان کی گردنیں جھکا سکتے تھے - آسمان سے ہم ایسا معجزہ نازل کرتے کہ یہ لوگ سر جھکا دیتے اور نہ ماننے کی کوئی صورت نہ رہتی - اور نہ یہ لوگ ایمان سے منہ نہ موڑ سکتے - اور یکدم دبک کر رہ جاتے۔

فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ (۲۶ : ۴) "ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں" - یہ لوگ گردنیں جھکا کر اس طرح کھڑے ہو جاتے کہ گویا باندھے ہوئے ہیں اور اپنی جگہ سے یہ حرکت ہی نہیں کر سکتے - دست بستہ کھڑے ہو جاتے۔

لیکن اللہ کی مشیت یہ نہ تھی کہ اپنی اس آخری رسالت کو ان لوگوں سے زبردستی منوایا جائے - اس رسالت کو صرف ایک ہی معجزہ دیا گیا اور وہ معجزۂ قرآن تھا - یہ قرآن زندگی کا ایک مکمل نظام دیتا ہے اور یہ ہر پہلو کے اعتبار سے معجز ہے - بس اس کو آگے بڑھ کر قبول کریں۔

یہ قرآن انداز تعبیر اور فنی نظم و نسق کے اعتبار سے بھی معجز ہے - پورے قرآن میں یہ کلام اپنے اعلیٰ معیار اور بلند سطح کو برقرار رکھے ہوئے ہے - فنی اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اس میں کوئی نشیب و فراز نہیں ہے - یعنی کسی جگہ کلام اپنے معیار سے گرا ہوا نہیں ہے - کسی جگہ اس نے اپنی خصوصیات کو نہیں چھوڑا - ایسا نہیں ہے جس طرح انسانی کلام ہوتا ہے - جس میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں - کسی جگہ اونچا کسی جگہ درمیانہ اور کسی جگہ صاف ہی گرا ہوا - کسی جگہ پر شوکت اور کسی جگہ جھولدار - مثلاً ایک ہی مصنف ایک جگہ ایک طرح کی بات کرتا ہے اور دوسری جگہ انداز بدل جاتا ہے - لیکن قرآن ہے کہ آغاز سے انجام تک جوئے رواں ہے - ایک ہی سطح پر - ایک ہی رفتار سے اور ایک ہی معیار پر جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سرچشمہ بھی ایک ہے۔

پھر اپنے افکار و نظریات کے اعتبار سے بھی یہ معجز ہے - اس کے فکری اجزاء باہم مربوط ہیں - اس میں کوئی ایک بات نہیں ہے جو اس کے مجموعی نقشے سے لگا نہ کھاتی ہو - نہ کوئی اتفاقی بات ہے - تمام ہدایات' اور تمام ضابطہ بندیاں ایک ہی

ضابطے کے مطابق متکامل اور متناسق ہیں۔ یہ تعلیمات انسان کی پوری زندگی کو گھیرے ہوئے ہیں۔ زندگی کے مسائل کا پورا استیعاب ہے۔ اور پوری انسانی زندگی کے مسائل کا جواب شافی اس میں موجود ہے۔ اس کا ایک جزئیہ بھی ایسا نہیں ہے جو قرآن کریم کے تمام دوسرے جزئیات کے مخالف اور متضاد ہو۔ پھر یہ پورا فکری نظام ' نظام فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ تمام اجزاء فکر ایک ہی محور کے ارد گرد گھوم رہے ہیں۔ ایک ہی رسی میں سب کچھ بندھا ہوا ہے۔ مکمل ہم آہنگی کے ساتھ۔ انسان اپنی محدود مہارت کے ساتھ کوئی ایسا مربوط نظام فکر و عمل پیش کرنے کے قابل ہی نہیں ہے۔ لہذا یہ ماہر مطلق کا ارسال کردہ نظام ہے اور یہ زمان و مکان کے حدود و قیود سے ماوراء ہے۔ غرض قرآن کا یہ نظام اس قدر جامعیت لیے ہوئے ہے۔ اس کی فکری اور عملی تنظیم حیرت انگیز ہے۔

پھر اس کے اندر ایک اور اعجاز بھی ہے ' اس کی آواز سنتے ہی دلوں میں اتر جاتی ہے ' یہ دلوں کی کنجیاں رکھتا ہے۔ اس کو سنتے ہی دل کھل جاتے ہیں اور انسان کے اندر تاثر قبول کرنے والی پنہاں قوتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اور اس کی آواز پر لبیک کہتی ہیں۔ یہ الجھے ہوئے دینی مسائل کو اس قدر سادگی اور آسانی کے ساتھ حل کر دیتا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ بغیر کسی مشکل اور پیچیدگی اور زیادہ محنت کے۔ محض ایک لچ کے ساتھ دلوں کی دنیا کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تقاضا یوں ہوا کہ قرآن کریم کو اپنی اس آخری رسالت کے لیے ایک معجزہ قرار دے۔ اور اللہ نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ کوئی مادی اور طبیعی معجزہ نازل کرے ' جس کو دیکھ کر لوگوں کی گردنیں جھک جائیں اور وہ بامر مجبوری اسے تسلیم کر لیں۔ یہ اس لیے کہ یہ آخری نبوت تمام انسانوں کے لیے ایک عام اور کھلی رسالت تھی۔ اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے قیامت تک یہی ہدایت تھی اور یہ کسی ایک قوم تک محدود اور کسی محدود وقت کے ساتھ مقید اور موقوف رسالت نہ تھی۔ اس لیے اللہ نے اس رسالت کو ایک ایسا معجزہ دیا جو اقوام قریب و بعید دونوں کے لیے عام ہو۔ ہر قوم اور ہر نسل کے لیے ہو۔ جہاں تک مادی معجزات کا تعلق ہے ان کے سامنے تو صرف وہ لوگ جھکتے ہیں جو اسے دیکھتے ہیں۔ اور ان اقوام کے بعد تو وہ واقعات قصص و روایات بن جاتے ہیں۔ وہ آنے والی نسلوں کے لیے مشاہد نہیں ہوتے۔

رہا قرآن مجید تو وہ چودہ سو سال سے ایک معجزہ ہے۔ یہ ایک کھلی کتاب ہے ' ایک زبردست نظام زندگی ہے۔ اگر اس کو کسی بھی زمانے کے لوگ اپنا راہنما اور امام بنائیں۔ تو وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور وہ ان کی زندگی کے پورے مسائل حل کر سکتا ہے۔ اور ان کی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے بلکہ وہ ان کو ایک نہایت ہی اعلیٰ افق پر ' افضل زندگی اور بہترین نتائج تک پہنچا سکتا ہے۔ یہ وہ خزانہ ہے کہ آج ہم نے اپنے دور میں اس سے جو کچھ معلوم نہیں کیا ' آنے والی نسلیں اس سے معلوم کر لیں گی۔ یہ ہر سائل کو اس کے سوال کے مطابق دیتا ہے اور جھولی بھر کے دیتا ہے اور اس کے خزانے ختم نہیں ہوتے بلکہ از سر نو نئے نئے ذخیرے ملتے ہیں۔ لیکن لوگ ہیں کہ اس قرآن کے عظیم خزانوں اور حکمتوں کو پا نہیں رہے اور اعراض کرتے ہیں۔ جوں جوں قرآن کی کوئی نئی آیت نازل ہوتی تو وہ کہتے :

وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ ﴿٥﴾

"جن لوگوں کے پاس رحمن کی طرف سے جو نئی نصیحت بھی آتی ہے ' یہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں"۔

یہاں اللہ کے ناموں میں سے رحمٰن کو لایا گیا ہے' اشارہ اس طرف ہے کہ یہ کتاب اور یہ نصیحت نازل کر کے اللہ نے مخلوق پر بہت بڑی رحمت کی ہے اور اس رحمت سے وہ منہ موڑ رہے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ ان کا یہ فعل بہت ہی قبیح اور شنیع ہے۔ آسمانوں سے ان پر رحمت کا نزول ہو رہا ہے اور وہ اس سے بھاگ رہے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کی چیز سے محروم کر رہے ہیں جس کے وہ فی الحقیقت بہت ہی محتاج ہیں۔

اس لیے ان کے اس اعراض پر اللہ کی طرف سے بہت ہی سخت تہدید نازل ہوتی ہے کہ اللہ کا عذاب ان کے لیے منتظر ہے۔ بہت جلد یہ لوگ اس سے دوچار ہوں گے۔

فَقَدْ كَذَّبُوا فَسَيَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٦﴾

"اب جب کہ یہ جھٹلا چکے ہیں' عنقریب ان کو اس چیز کی حقیقت (مختلف طریقوں سے) معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں"۔

اور یہ تہدید نہایت خفیہ اور مجمل ہے اور عذاب مجہول ہے۔ یہ لوگ چونکہ ان دھمکیوں کو ایک مذاق سمجھتے تھے' اس لیے اللہ نے دھمکی کا انداز بیان بھی استہزائیہ کر دیا۔

فَسَيَأْتِيهِمْ أَنْبَٰٓؤُا مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (٢٦ : ٦) "عنقریب ان کو اس چیز کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں"۔ یعنی اس عذاب کی خبریں ان تک پہنچ جائیں گی۔ جس کا یہ مذاق اڑاتے ہیں۔ ان لوگوں تک اس عذاب کی صرف خبریں ہی نہ پہنچیں گی بلکہ یہ لوگ عذاب چکھیں گے بھی اور یہ بذات خود خبر بن جائیں گے۔ اور ان پر جو مصیبت آئے گی لوگ گلی کوچوں میں اس کی داستانیں ایک دوسرے کو سناتے رہیں گے۔ یہ چونکہ مذاق اڑاتے تھے' اس لیے اس تہدید میں بھی مذاقیہ جواب دیا گیا۔ لیکن یہ مذاق تہدید سے بھرا ہوا ہے۔

یہ لوگ ایک خارق عادت طبیعی معجزے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اللہ کی ان روشن اور روشن اور چمک دار آیات و معجزات کا نوٹس نہیں لیتے جو ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی ہیں۔ اور ان آیات و نشانات کے ہوتے ہوئے کسی قلب مفتوح اور کسی حساس بصیرت کو تو مزید کسی دلیل اور برہان کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس کائنات کا صفحہ اس قدر عجیب ہے کہ انسانی دل و دماغ اس کو دیکھ کر مطمئن ہو جاتا ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ كَمْ أَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ ﴿٧﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٨﴾

"اور کیا انہوں نے کبھی زمین پر نگاہ نہیں ڈالی کہ ہم نے کتنی کثیر مقدار میں ہر طرح کی عمدہ نباتات اس میں پیدا کی ہیں؟ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے' مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔

اس مردہ زمین سے ایک گونہ زندہ نباتات کا نکالنا کیا کم معجزہ ہے - پھر ان نباتات سے نر اور مادہ بنانا - بعض انواع میں یہ نر اور مادہ علیحدہ علیحدہ پودوں میں ہوتے ہیں اور یا پھر ایک ہی پودے میں نر اور مادہ پھول ہوتے ہیں جیسا کہ اکثر نباتات میں ہوتا ہے یعنی ایک ہی شاخ میں نر اور مادہ اجزا ہوتے ہیں - اور یہ معجزہ ان کے ماحول میں رات دن رونما ہوتا رہتا ہے -

اَوَ لَمْ یَرَوْا (۲۶ : ۷) "کیا انہوں نے نہیں دیکھا ہے" - یہ ایسے معجزات ہیں کہ جن کے صرف ایک ہی مشاہدے کی ضرورت ہے -

قرآن کے نظام تربیت کا یہ خاص انداز ہے کہ قرآن انسانی دل و دماغ کو اس کائنات کے مشاہد پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے - قرآن بجھے ہوئے احساس کو جگاتا ہے ' کند ذہن کو تیز کرتا ہے اور بند قوائے مدرکہ کو آزاد کرتا ہے اور ان کو اس کائنات میں پائے جانے والے ان معجزات کی طرف متوجہ کرتا ہے جو قدم قدم پر بکھرے ہوئے ہیں تاکہ انسان ایک زندہ دل دماغ کے ساتھ اس کائنات کو دیکھے - اللہ کی عجیب و غریب مصنوعات کو دیکھے - اور اسے اللہ کا شعور حاصل ہو - اور وہ اللہ کی معرفت ' اللہ کے عجائب مخلوقات کے ذریعے حاصل کرے - اور وہ اللہ سے ہر وقت ڈرمار ہے اور اسے یہ شعور ہو کہ اللہ دیکھ رہا ہے - پھر ہر انسان کو یہ شعور ہو کہ اللہ کی مخلوقات میں سے صرف وہی ہے جو یہ شعور رکھتا ہے - اور اللہ کی مخلوقات سے بھی وابستہ ہے - اور اللہ کے اس ناموس فطرت کے ساتھ بھی پیوستہ ہے - جس کو اللہ نے اس کائنات کے اندر جاری و ساری کر رکھا ہے - پھر اسے یہ بھی شعور ہو کہ اس کائنات میں اس نے ایک خاص کردار ادا کرنا ہے - خصوصاً اس کرۂ ارض کے حوالے سے تو اس کے کاندھوں پر ایک خاص ذمہ داری ڈالی گئی ہے -

اَوَ لَمْ یَرَوْا اِلَی الْاَرْضِ کَمْ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍ کَرِیْمٍ (۲۶ : ۷) "کیا انہوں نے کبھی زمین پر نگاہ نہیں ڈالی کہ ہم نے کثیر مقدار میں ہر طرح کی عمدہ نباتات اس میں پیدا کی ہیں" - یہ نہایت ہی عمدہ ہیں ' اس لیے کہ ان کے اندر زندگی ہے اور یہ زندگی رب کریم نے ان کے اندر پیدا کی ہے - لفظ کریم سے اللہ یہ تاثر دیتا ہے کہ اللہ کی صنعت کاریوں کو نہایت ہی توجہ ' اہمیت اور تکریم کی نگاہوں سے دیکھنا چاہئے - یہ کوئی معمولی حقائق نہیں ہیں کہ ان پر سے محض ایک نادان اور غافل کی طرح گزرا جائے -

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً (۲۶ : ۸) "ان میں تو یقیناً ایک نشانی ہے" - ان کے علاوہ مزید نشانیاں طلب کرنے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے - حالانکہ یہ لوگ ان پیش پا افتادہ نشانیوں پر ایمان نہیں لاتے -

وَمَا کَانَ اَکْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۲۶ : ۸) "مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں" - سورت کا یہ دیباچہ ایک ایسے سبق آموز فقرے پر ختم ہوتا ہے - جو اس سورت میں بار بار دہرایا گیا ہے -

ع ۹ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝۹

۵

"اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی" - یعنی وہ زبردست ہے اور قسم قسم کی معجزانہ

مخلوق کی پیدائش 'قسم قسم کے معجزات دکھانے اور مکذبین اور منکرین کو سزا دینے پر قدرت رکھتا ہے۔ اور وہ الرحیم بھی ہے کہ وہ اپنی کتاب میں اپنی مخلوقات میں سے۔ ان عجائب و غرائب کی کو پیش کرتا ہے اور دلائل و معجزات کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ اس طرح جن کا دل مائل بہدایت ہوتا ہے وہ ایمان لے آتے ہیں اور پھر وہ مکذبین کو بھی مہلت دیتا ہے اور جب تک ان کے پاس کوئی واضح پیغام دینے والا نہیں بھیجتا۔ اس وقت تک سزا بھی نہیں دیتا۔ حالانکہ اس کائنات کے نشانات میں بہت ہی وافر مقدار میں چیزیں موجود ہیں۔ مزید کسی دلیل و برہان کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہ اللہ کی رحمت ہے کہ وہ لوگوں کے ضمیر کو روشن کرنے کے لیے' ان کو بصیرت فراہم کرنے کے لیے اور ان کو اچھے انجام کی بشارت دینے کے لیے اور برے انجام سے خبردار کرنے کے لیے رسول بھی بھیجتا ہے اس لیے وہ رحیم ہے' کریم ہے۔

---000---

# درس نمبر ۱۶۲ ایک نظر میں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کا یہ حصہ 'اس سورت کے موضوع اور محور کے ساتھ بہت ہی ہم آہنگ ہے۔ اس سورت میں مدار کلام زیادہ تر اس پر ہے کہ مکذبین کا انجام کیسا ہوا کرتا ہے۔ پھر اس سورت میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اور مشرکین کی جانب سے روگردانی اور تکذیب کے نتیجے میں آپ کو جو مشکلات درپیش تھیں۔ ان پر آپ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار بھی اس سورت کا موضوع سخن ہے۔ پھر اس سورت میں اس بات کی یقین دہانی بھی ہے کہ اس دعوت اور اس کی حامل تحریک کا حامی و مددگار اور محافظ اللہ ہے۔ اگرچہ یہ لوگ کمزور ہیں اور ان کے مخالفین زاد و عتاد یعنی ساز و سامان سے لیس ہیں۔ اہل قوت اور جبار ہیں اور ان پر مظالم ڈھا رہے ہیں۔ کیونکہ اس سورت کے نزول کے وقت مکہ میں تحریک اسلامی کچھ ایسے ہی حالات سے گزر رہی تھی۔ انبیائے سابقین کے قصص قرآن کے مناہج تربیت میں ایک اہم مواد اور وسائل تربیت ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ اسلام کے قصے کی بعض کڑیاں سورت بقرہ' سورت مائدہ' سورت اعراف' سورت یونس' سورت اسراء' سورت کہف اور سورت طٰہٰ میں گزر چکی ہیں۔ جبکہ بعض دوسری سورتوں میں بھی حیات موسیٰ علیہ اسلام کی طرف مجمل سے اشارات موجود ہیں۔

جہاں جہاں بھی اس قصے کی کڑی کی طرف کوئی اشارہ آیا ہے یا کوئی کڑی تفصیل کے ساتھ دی گئی ہے وہاں موضوع سخن کے ساتھ وہ کڑی اور وہ حصہ نہایت ہی موزوں رہا ہے۔ ہر جگہ سیاق کلام کے ساتھ مناسب حصہ لایا گیا ہے۔ جس طرح اس قصے میں جو کڑیاں ہیں وہ اس سورت کے موضوع کے ساتھ متناسب ہیں۔ اور اسی مقصد کو واضح کرتی ہیں۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے فی ظلال پارہ ششم)

یہاں جو حلقہ دیا گیا ہے وہ رسالت اور اس کی تکذیب کے ساتھ متعلق ہے اور تکذیب نیز حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف سازش کی وجہ سے فرعون اور اس کی قوم کی غرقابی کے واقعات دیئے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ اور آپ کے ساتھی ظالموں کے چنگل سے رہائی پا گئے۔ چنانچہ یہ پوری کڑی اس آیت کی تصدیق ہے۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (۲۶: ۲۲۷) "اور عنقریب جان لیں گے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا کہ وہ کس انجام تک پہنچتے ہیں"۔ اور اللہ کے اس قول کی بھی تصدیق ہے۔

فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۲۶: ۶) "اب جبکہ انہوں نے جھٹلا دیا تو عنقریب پہنچ جائیں گی ان تک خبریں اس چیز کی جس کے ساتھ وہ مذاق کرتے تھے"۔ حضرت موسیٰ کے قصے کا یہ حصہ چند مناظر پر مشتمل ہے جن کو دکھانا ضروری تھا۔ ان مناظر کے درمیان گیپ اور وقفے ہیں جن کے اندر منظر پر پردہ گر جاتا ہے اور اس کے بعد جب پردہ اٹھتا ہے تو دوسرا منظر نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو پورے قرآن کریم میں قصص کے پیش کرتے وقت ملحوظ رہی ہے۔

اس کڑی میں سات مشاہد ہیں۔ پہلے منظر میں اللہ کی جانب سے ندا آتی ہے۔ حضرت موسیٰ رب سے ہمکلام ہوتے

ہیں اور ان کو منصب نبوت سے سرفراز کیا جاتا ہے اور ان پر وحی آتی ہے۔ دوسرے منظر میں کلیم اور فرعون کو آمنا سامنا ہوتا ہے۔ اس میں فرعون کے درباری بھی موجود ہیں۔ حضرت موسیٰ رسالت پیش فرماتے ہیں اور عصا اور ید بیضا کے معجزے بھی دکھائے جاتے ہیں۔ تیسرے منظر میں موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں جادوگروں کو لایا جاتا ہے۔ ایک وسیع میدان میں لوگ جمع ہو کر مقابلے کی تدابیر پر بحث ہوتی ہے۔ چوتھے منظر میں جادوگر فرعون کے دربار میں جمع ہیں اور انعام و اکرام کے پکے وعدے لے رہے ہیں۔ اگر وہ میدان مار لیں۔ پانچواں منظر مقابلے کا منظر ہے' مقابلہ ہوتا ہے' جادوگر ایمان لاتے ہیں۔ فرعون ان کو دھمکیاں دیتا ہے۔ چھٹے منظر میں دونوں کیمپوں کی جھلکیاں ہیں ایک طرف وحی الٰہی کا منظر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے کہ تم تیاری کرو اور میرے بندوں کو لے کر رات کے وقت نکل جاؤ۔ اور دوسری طرف فرعون تمام علاقوں میں اپنے کارندے بھیجتا ہے اور فوجیں جمع ہوتی ہیں۔ ساتویں منظر میں یہ تعاقب کرنے والی افواج اور بھاگنے والے مسلمان ایک سمندر کے سامنے ہیں۔ سمندر پھٹ جاتا ہے اور ان آبی راستوں سے یہ مظلوم پار ہو جاتے ہیں اور ظالم غرق ہو جاتے ہیں۔

یہی مناظر سورت اعراف' سورت یونس اور سورت طٰہٰ میں بھی پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن ہر جگہ انداز اور قصے کا رنگ مختلف ہے۔ اور بات جس رخ پر جارہی ہوتی ہے' قصے کو بھی اسی انداز پر لایا جاتا ہے۔ چنانچہ قصے کا وہ پہلو اجاگر کیا جاتا ہے جو زیر بحث موضوع کے ساتھ متعلق ہو۔

اعراف میں قصے کا آغاز ہی کلیم اور فرعون کے مختصر مکالمے سے ہوا ہے۔ پھر جادوگروں کے ساتھ مقابلے کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے جبکہ فرعون اور اس کے سرداروں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کو اچھی طرح تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ اور جادوگروں کے مقابلے اور لشکر فرعون کی غرقابی کے درمیان مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر میں معجزات دکھاتے ہوئے منظر پر لایا گیا ہے۔ پھر جب یہ لشکر کامیابی کے ساتھ سمندر سے گزر جاتا ہے تو پھر ہجرت کی زندگی کے کئی حلقے پیش کیے گئے ہیں' جبکہ یہاں اس سورت میں یہ کڑیاں حذف کر دی گئی ہیں اور حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان توحید کے موضوع پر مکالمہ طوالت کے ساتھ دیا گیا ہے کیونکہ یہ اس سورت کا موضوع ہے اور مشرکین مکہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان یہی مکالمہ زوروں پر ہے۔ اور سورت یونس میں مختصر مکالمہ کلیم و فرعون سے آغاز ہوتا ہے اور عصا اور ید بیضا کے معجزات بھی نہیں دکھائے جاتے اور جادوگروں کے ساتھ مکالمے کی تفصیلات بھی حذف کر دی گئی ہیں جبکہ یہاں ان دونوں کو مفصل لایا گیا ہے۔ اور طٰہٰ میں حضرت موسیٰ اور رب تعالیٰ کے درمیان مناجات کو مفصل لایا گیا ہے۔ پھر موسیٰ اور فرعون کا سامنا' جادوگروں کا مقابلہ سرسری طور پر اور بنی اسرائیل کا سفر ہجرت مفصل ہے۔ یہاں فرعون کی غرقابی پر قصہ کے مناظر ختم کر دیئے جاتے ہیں۔

اس طرح جب ہم اس قصے کو قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں بار بار پاتے ہیں تو قرآن کے اسلوب بیان کا یہ کمال ہمارے سامنے آتا ہے کہ کسی جگہ بھی ہمیں یہ نظر نہیں آتا کہ یہ وہی قصہ ہے جو دہرایا جارہا ہے کیونکہ ہر جگہ مختلف کڑیاں دکھائی گئی ہیں۔ مختلف مناظر ہیں۔ قصے کا ایک مخصوص پہلو کھول کر بیان کیا جاتا ہے اور انداز بیان تو ہر جگہ نیا ہوتا ہے۔ یہ تمام خصوصیات قصے کو ہر جگہ نیا بنا دیتی ہیں۔ اور ہر جگہ قصہ اپنے موضوع کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہوتا ہے۔

---OOO---

# درس نمبر ۱۶۲ تشریح آیات

## ۱۰ --- تا --- ۶۸

وَ اِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰۤی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰﴾
قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا یَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ﴿۱۲﴾ وَ یَضِیْقُ صَدْرِیْ
وَ لَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۴﴾
قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَاۤ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاْتِیَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلُ
رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱۷﴾

''انہیں اس وقت کا قصہ سناؤ جب کہ تمہارے رب نے موسیٰ کو پکارا ''ظالم قوم کے پاس جا فرعون کی قوم کے پاس ۔۔۔ کیا وہ نہیں ڈرتے ؟'' اس نے عرض کیا ''اے میرے رب ' مجھے خوف ہے کہ وہ مجھ کو جھٹلا دیں گے ۔ میرا سینہ گھٹتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی ۔ آپ ہارون کی طرف رسالت بھیجیں اور مجھ پر ان کے ہاں ایک جرم کا الزام بھی ہے ' اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے ''۔ فرمایا ''ہرگز نہیں ' تم دونوں جاؤ ہماری نشانیاں لے کر ' ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سنتے رہیں گے ۔ فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو ' ہم کو رب العالمین نے اس لیے بھیجا ہے کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے ''۔

اس سورت میں جو قصے لائے گئے ان کے ذریعے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا گیا ہے ۔ ذرا سورت کے آغاز کو ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیں ۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (۳) اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ
اٰیَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِیْنَ (۴) وَ مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا
كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِیْنَ (۵) فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَیَاْتِیْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ

(٦)(٢٦: ٣ تا ٦) "اے نبیؐ شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں۔ لوگوں کے پاس رحمٰن کی طرف سے جو نئی نصیحت بھی آتی ہے یہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں' اب جبکہ یہ جھٹلا چکے ہیں۔ عنقریب ان کو اس چیز کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے ہیں"اس تمہید کے بعد یہ تمام قصص لائے گئے ہیں اور ان میں بیان شدہ حصوں کا بنیادی مقصد مکذبین اور مستہزئین کا انجام بتانا ہے۔

وَ اِذْ نَادٰي رَبُّكَ مُوْسٰي اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (٢٦: ١٠) قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا يَتَّقُوْنَ (٢٦: ١١) "انہیں اس وقت کا قصہ سناؤ جب کہ تمہارے رب نے موسیٰ کو پکارا ""ظالم قوم کے پاس جا --- فرعون کی قوم کے پاس --- کیا وہ نہیں ڈرتے؟" یہ ہے یہاں اس قصے کا پہلا منظر' اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منصب رسالت عطا کر کے ایک مشن دے دیا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ تم نے ایک ظالم قوم کے پاس جانا ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنی ذات پر ظلم کیا ہے کہ کفر و گمراہی میں مبتلا ہیں۔ پھر انہوں نے بنی اسرائیل پر ظلم کیا ہے کہ یہ ان کی عورتوں کو زندہ رکھتے ہیں اور مردوں کو ذبح کرتے ہیں اور ان کے ساتھ جگہ جگہ مذاق کرتے ہیں اور طرح طرح کی سزائیں دیتے ہیں۔ اس قوم کی صفات پہلے بیان کرنے کے بعد اب ان کا نام لیا جاتا ہے۔ قوم فرعون کے پاس جاؤ۔ حضرت موسیٰ اور تمام انسان تعجب کرتے ہیں کہ کیا یہ ظالم قوم اپنے برے انجام سے نہیں ڈرتی۔ کیا ان کو خدا کا خوف نہیں ہے۔ کیا اپنے ان مظالم کا انجام انہیں معلوم نہیں ہے۔ کیا یہ لوگ اس قدر گھناؤنے جرائم کے بعد بھی باز نہیں آتے۔ ان کا معاملہ تو عجیب ہے اور تعجب انگیز ہے۔ اور اسی طرح تمام ایسی اقوام کا معاملہ ہے جو حد سے گزر جاتی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے فرعون اور اس کی قوم کا معاملہ کوئی نیا نہیں تھا۔ وہ تو ان کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ فرعون کے ظلم' اس کے جبر اور اس کی سرکشی سے اچھی طرح باخبر تھے۔ اور اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ تو ایک عظیم اور مشکل مشن ہے جو ان کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے رب کے سامنے اپنی کمزوریاں رکھ دیتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس دعوت سے پہلوتہی کرنا چاہتے ہیں اور مستقلاً معذرت کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس مشن کے لیے مزید ضروری امداد اور معاونت کے طلبگار ہیں۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ (٢٦: ١٢) وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰي هٰرُوْنَ (٢٦: ١٣) وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ (٢٦: ١٤) اس نے عرض کیا "اے میرے رب' مجھے خوف ہے کہ وہ مجھ کو جھٹلا دیں گے۔ میرا سینہ گھٹتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی۔ آپ ہارون کی طرف رسالت بھیجیں اور مجھ پر ان کے ہاں ایک جرم کا الزام بھی ہے' اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے"۔

یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جو بات نقل کی گئی ہے اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے وہ محض تکذیب کے خوف

سے یہ فرماتے ہیں بلکہ ان کو رسالت ایسے حالات میں دی جا رہی ہے کہ ان کے دل کے اندر تنگی پائی جاتی ہے۔ اور ان کو طلاقت لسانی کا ملکہ حاصل نہیں ہے۔ رسالت کے سلسلے میں ان کو ہر کسی سے مباحثہ اور گفتگو کرنی ہوگی اور ان کی حالت یہ ہے کہ ان کی زبان میں لکنت ہے اور اس کے بارے میں سورت طہٰ میں انہوں نے تصریح فرمائی ہے۔

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي "اور میری زبان میں جو گرہ ہے اسے کھول دے تاکہ وہ میری بات کو سمجھیں"۔ جب انسان کی زبان میں لکنت ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے سینہ میں تنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تنگی اس وقت سخت تکلیف دہ ہوتی ہے کہ انسان بات کرنا چاہتا ہے اور جذبات کے ساتھ دلائل کا اظہار چاہتا ہے اور زبان اس وقت ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ جوں جوں خیالات اور جذبات کا سیلاب رواں ہوتا ہے' زباں بند ہوتی ہے اور دل تنگ ہو جاتا ہے۔ اور انسان کی حالت قابل دید ہوتی ہے۔ یہ صورت حال ہر کسی کی دیکھی ہوتی ہے۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام پریشان ہیں کہ اگر ایسے حالات میں ان کی زبان کو گرہ لگ جائے تو بڑی عجیب پوزیشن ہوگی۔ خصوصاً جبکہ مقابلہ فرعون جیسے قہار و جبار کے ساتھ ہو۔ چنانچہ حضرت نے اپنی کمزوری اپنے رب کے سامنے رکھی اور ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی کہ حضرت ہارون کو بھی مقام رسالت عطا کر دیا جائے۔ ان کو بھی اس منصب میں شریک کر دیا جائے تاکہ وہ دونوں مل کر اس عظیم فریضے کو ادا کریں۔ مقصد یہ نہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس منصب کو قبول کرنے سے ہچکچا رہے ہیں یا پہلوتہی کرنا چاہتے ہیں۔ اور حضرت ہارون چونکہ حضرت موسیٰ سے زیادہ فصیح اللسان تھے اور جذباتی اعتبار سے وہ ٹھنڈے دل دماغ کے مالک تھے۔ جب دوران کلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زباں کو اگر گرہ لگ گئی تو حضرت ہارون ساتھ موجود ہوں گے وہ استدلال اور مکالمے کو آگے بڑھائیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اس لکنت کو دور کرنے کے لیے خصوصی دعا بھی فرمائی جس طرح سورت طہٰ میں ہے اور ہو سکتا ہے کہ اللہ نے اسے دور بھی کر دیا ہو لیکن آپ نے پھر بھی حضرت ہارون کو شریک منصب کرنے کے لیے دعا فرمائی۔ اور فرمایا کہ انہیں ان کے لیے وزیر مقرر فرمایا جائے۔

اسی طرح حضرت نے فرمایا۔

وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ (۲۶: ۱۴) "اور مجھ پر ان کے ہاں ایک جرم کا الزام بھی ہے اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے"۔ لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون سے مقابلہ کرنے سے نہیں ڈرتے تھے اور نہ وہ ادائیگی فرض سے پہلوتہی چاہتے تھے بلکہ آپ حضرت ہارون کو وزیر اور شریک کار مقرر کروانا چاہتے تھے کہ اگر یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جرم قتل میں سزائے موت دے دیں تو ان کے بعد رسالت کا کام حضرت ہارون جاری رکھیں۔ اور اس طرح فریضہ رسالت ادا ہوتا رہے جس طرح اللہ کا حکم تھا۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ احتیاطی تدابیر دعوت اسلامی اور رسالت کی خاطر اختیار کیں۔ داعی کی ذات کے لیے کچھ زیادہ فکر نہ تھی۔ یعنی اگر حضرت موسیٰ کی زبان کو گرہ لگ جائے اور آپ تقریر نہ کر سکیں تو حضرت ہارون تیار ہوں' یہ نہ ہو کہ نیا آنے والا نبی لوگوں کے سامنے تقریر کر رہا ہے اور اچانک اس کی بات ہی رک جائے۔ اور اس طرح دعوت اسلامی کو ایک کمزوری کا سامنا کرنا پڑے۔ اسی طرح اگر ان کو قتل ہی کر دیا جائے تو دعوت کا کام ہی رک

جائے ۔ حالانکہ دعوت کا کام جاری رہنا ضروری ہے ۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ سوچ بالکل فطری تھی ۔ اس لیے کہ اللہ نے ان کو منتخب ہی اسی کام کے لیے کیا تھا ۔ اور اللہ نے اپنی نگرانی میں ان کی تربیت ہی اسی مقصد کے لیے فرمائی تھی ۔ اور ان کو اللہ نے اپنے کام کے لیے ہی بنایا تھا ۔

جب حضرت موسیٰ نے اپنی اس دلچسپی کا اظہار کیا' دعوت کے بارے میں اپنے خدشات اور احتیاطی تدابیر کا اظہار کیا تو اللہ نے ان کی درخواست قبول کر لی ۔ اور آپ کو تسلی دے دی کہ آپ ڈریں نہیں' یہاں قبولیت دعا کا مرحلہ نہایت ہی مختصر ہے ۔ ہارون علیہ السلام کو نبی بنانا' حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مصر میں پہنچنا' ہارون علیہ السلام سے ملنا' تمام واقعات کو حذف کر کے صرف یہ دکھایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ اور ہارون دونوں اپنے رب کے احکام لے کر فرعون کے ساتھ ہمکلام ہونے کی تیاری کر رہے ہیں لیکن حضرت موسیٰ کے خدشات کو صرف ایک ہی سخت لفظ سے روکا جاتا ہے جو نفی کے معنی میں آتا ہے اور جو تنبیہہ کے لیے ہے کَلَّا "ہرگز نہیں" ۔

قَالَ كَلَّا فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ (۱۵) فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۶) اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۱۷) (۲۶ : ۱۵ تا ۱۷)

"فرمایا "ہرگز نہیں' تم دونوں جاؤ ہماری نشانیاں لے کر' ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سنتے رہیں گے ۔ فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو' ہم کو رب العالمین نے اس لیے بھیجا ہے کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے" ۔ ہرگز نہیں' نہ تمہارا دل تنگ ہو گا اور نہ تمہاری زبان میں لکنت ہو گی ۔ اور وہ ہرگز تمہیں قتل نہ کر سکیں گے ۔ یہ سب خدشات آپ اپنے دل سے نکال دیں ۔ تم اور تمہارا بھائی دونوں جاؤ ۔

فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ (۲۶ : ۱۵) "جاؤ ہماری نشانیاں لے کر" ۔ ان نشانیوں میں سے عصا اور ید بیضا کی نشانی تو حضرت موسیٰ نے دیکھی ہوئی تھی ۔ یہاں ان سب باتوں کو مختصر کر دیا جاتا ہے کیونکہ اس سورت میں پیش نظر فرعون کے سامنے رسالت کا پیش کرنا' جادوگروں کے کرتب دکھانا اور فرعون کی غرقابی کی منظر کشی کرنا ہے ۔ جاؤ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ (۲۶ : ۱۵) "ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سنتے رہیں گے" ۔ نہایت ہی زوردار اور تاکیدی الفاظ میں کہا جاتا ہے' جاؤ ۔ تمہیں اللہ کی حمایت یا رعایت اور تحفظ حاصل ہے ۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے جس طرح وہ ہروقت' ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے لیکن یہاں اللہ کی موجودگی کا مقصد یہ ہے کہ ہم تمہاری مدد اور تائید کے لیے حاضر ہیں ۔

یہاں نصرت و تائید کا یقین یوں دلایا گیا ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں' سن رہے ہیں یعنی حضوری اور توجہ انسانوں کے نزدیک اپنے عروج پر ہوتی ہے جب انسان سنتا ہے اس لیے ان کو یہ یقین دلایا جا رہا ہے کہ میری امداد اور نصرت ہروقت حاضر ہے ۔ یہ ہے قرآن کریم کا انداز کہ وہ ہر چیز کو ایک مشخص اور مجسم صورت میں پیش کرتا ہے ۔ اِذْهَبَا "جاؤ"

فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ "فرعون کے پاس جاؤ" ۔ اور اس کو اپنی مہم سے آگاہ کر دو ۔ اور بغیر کسی خوف کے اس کے سامنے اپنا مطلب صاف صاف بیان کر دو ۔

فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۶ : ۱۶) "کہ ہم رب العالمین کے بھیجے ہوئے ہیں"۔ یہ تو دو ہیں لیکن چونکہ ہم ایک ہیں ' رسالت ایک ہے ' اس لیے دونوں ایک رسول ہیں۔ یہ اس فرعون کے سامنے کھڑے ہیں جو الوہیت کا دعویٰ کرتا تھا اور اپنی قوم کو یوں باور کراتا تھا۔

مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ "میں تمہارے لیے ' اپنے سوا کسی دوسرے الٰہ کو نہیں جانتا"۔ یوں اس فرعون کے سامنے سب سے پہلے اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ہم دونوں رب العالمین کے فرستادہ ہیں یعنی وہ عالمین کا رب ہے اور وہی عالمین کا رب ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور اس میں کوئی مداہنت اور لیپا پوتی نہیں ہو سکتی۔

اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۶ : ۱۶) اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ

(۲۶ : ۱۷) "ہم کو رب العالمین نے اس لیے بھیجا ہے کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے"۔ قصہ موسیٰ کے ان اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو فرعون کے پاس اس لیے رسول بنا کر نہ بھیجا تھا کہ حضرت موسیٰ فرعون اور اس کی قوم کو دین اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دیں اور اسلام کے دین کو قبول کریں بلکہ ان کے پاس صرف اس لیے بھیجا گیا تھا کہ فرعون اور اس کی قوم سے بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کر دیں۔ وہ اس کی غلامی سے آزاد ہو جائیں اور پھر جس طرح چاہیں اپنے رب کی بندگی کریں۔ وہ تو پہلے سے دین اسلام کے پیرو کار تھے۔ حضرت یعقوب ؑ' حضرت یوسف کے دین کو مانتے تھے البتہ ان کے نظریات اور ان کے ذہن میں انحراف ہو گیا تھا ان کے عقائد میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا اس لیے اللہ نے ان کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو دوبارہ ارسال کیا کہ وہ ان کے عقائد بھی درست کر دیں اور ان کو فرعون کی غلامی سے بھی نجات دلائیں اور ان کو اچھی تربیت دے کر دوبارہ عقیدۂ توحید پر قائم کر دیں۔

---ooo---

یہاں تک تو ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو نبوت عطا ہوئی ' ان پر وحی آئی اور ان کو دعوت اسلامی کا مشن عطا ہوا۔ اب پردہ گرتا ہے اور دوسرے منظر میں پھر ہم فرعون کے دربار میں کھڑے ہیں۔ ان دونوں مناظر کے درمیان جو غیر ضروری افعال و حرکات ہیں ان کو کاٹ دیا جاتا ہے اور یہ قرآن کریم کا ایک مخصوص انداز بیان ہے کہ وہ مناظر و مشاہد کے درمیان سے غیر ضروری حصے کاٹ دیتا ہے یا مختصر کر دیتا ہے۔

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّ لَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾
وَ فَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَ اَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّ اَنَا
مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّ جَعَلَنِيْ
مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾ وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾

فرعون نے کہا "کیا ہم نے تجھ کو اپنے ہاں بچہ سا نہیں پالا تھا؟ تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں گزارے' اور اس کے بعد کر گیا جو کچھ کر گیا' تو بڑا احسان فراموش آدمی ہے"۔ موسیٰ نے جواب دیا "اس وقت وہ کام میں نے نادانستگی میں کر دیا تھا۔ پھر میں تمہارے خوف سے بھاگ گیا۔ اس کے بعد میرے رب نے مجھ کو حکم عطا کیا اور مجھے رسولوں میں شامل فرما لیا۔ رہا تیرا احسان' جو تو نے مجھ پر جتایا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا تھا"۔

فرعون کو سخت تعجب ہوتا ہے۔ وہ یہ یقین نہیں کر سکتا کہ موسیٰ اس قدر عظیم دعویٰ بھی کر سکتے ہیں کہ میں (رسول رب العالمین) ہوں اور پھر وہ فرعون سے اس قدر عظیم مطالبہ کرتے ہیں۔

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۲۶ : ۱۷) "کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دو"۔ کیونکہ انھوں نے جب موسیٰ کو آخری بار دیکھا تھا تو وہ ان کے گھر میں ان کا پروردہ تھا' جس کے صندوق کو انھوں نے دریا سے اٹھا لیا تھا۔ اور پھر ایک قبطی کے قتل کے بعد بھاگ گیا تھا۔ وہ قبطی جو ایک اسرائیلی کے ساتھ ناحق الجھ رہا تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ یہ قبطی فرعون کے حاشیہ نشینوں میں سے تھا۔ موسیٰ علیہ السلام دس سال تک غائب رہے اور اب آئے تو اس عظیم اور ناقابل تصور مطالبے کے ساتھ۔ یہی وجہ ہے کہ فرعون بات کا آغاز نہایت تعجب' حقارت اور مزاحیہ انداز سے کرتا ہے کہ تم وہی تو ہو جس نے یہ یہ کام کیے اور اب :

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِیْنَا وَلِیْدًا وَّلَبِثْتَ فِیْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِیْنَ (۲۶ : ۱۸) وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِیْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ (۲۶ : ۱۹) "فرعون نے کہا "کیا ہم نے تجھ کو اپنے ہاں بچہ سا نہیں پالا تھا؟ تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں گزارے' اور اس کے بعد کر گیا جو کچھ کر گیا' تو بڑا احسان فراموش آدمی ہے"۔ کیا اس پرورش اور عزت کا یہ صلہ ہے جو تو ہمیں دے رہا ہے؟ اب تو آیا ہے اور ہم جس نظام زندگی کے مطابق اپنا نظام چلا رہے ہیں تو اس کی مخالفت کر رہا ہے۔ تاکہ تو اس بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دے جس کے گھر میں پلا ہے اور میرے سوا تو کسی اور الٰہ اور رب اور حاکم کی بات کرتا ہے۔ تو ایک عرصہ تک ہمارے اندر رہ چکا ہے' اس وقت تو تو نے بھی ایسا کوئی پروگرام نہیں بتایا۔ نہ ایسے دعوے کیے جو اب کر رہا ہے۔ اس عظیم پروگرام سے تو' تو نے ہمیں خبردار نہیں کیا۔

اور فرعون قبطی کے قتل کے واقعہ کو نہایت مبالغے کے ساتھ پیش کرتا ہے اور دھمکی آمیز انداز میں یاد دلاتا ہے۔

وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِیْ فَعَلْتَ (۲۶ : ۱۹) "اور تو نے وہ اپنا کام کیا جو تو نے کیا"۔ یعنی بہت ہی برا کام' اس قدر برا کہ اس کو صراحت کے ساتھ منہ پر لانا ہی اچھا نہیں ہے۔ تو نے اس قدر عظیم جرم کا ارتکاب کیا۔

وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ (۲۶ : ۱۹) "اس طرح تو رب العالمین کا منکر بن گیا"۔ اور اب تو اسی رب العالمین کی باتیں کرتا ہے۔ اس وقت تو تو رب العالمین کی بات نہ کرتا تھا۔

یوں فرعون نے حضرت موسیٰ کی تردید میں تمام مسکت دلائل گنوا دیئے اور اس نے یہ خیال کیا کہ شاید موسیٰ علیہ السلام ان دلائل کے بعد لاجواب ہو جائیں گے۔ کوئی مقابلہ نہ کر سکیں گے' خصوصاً اس نے ایک سابق مقدمہ قتل کی

طرف بھی اشارہ کر دیا اور بالواسطہ دھمکی دے دی ہے کہ تمہارے خلاف اس مقدمہ کی کارروائی بھی ہو سکتی ہے اور سزائے قصاص تم پر نافذ ہو سکتی ہے۔

لیکن حضرت موسیٰ کی تو دعا قبول ہو چکی تھی۔اب ان کی زبان میں کوئی گرہ نہ تھی۔وہ بڑی روانی سے کہہ رہے تھے۔

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ (۲۶ : ۲۰) فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۲۶ : ۲۱) وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲۶ : ۲۲) "موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا"اس وقت وہ کام میں نے نادانستگی میں کر دیا تھا۔پھر میں تمہارے خوف سے بھاگ گیا۔اس کے بعد میرے رب نے مجھ کو حکم عطا کیا اور مجھے رسولوں میں شامل فرمالیا۔رہا تیرا احسان' جو تو نے مجھ پر جتایا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا تھا"۔میں نے جو قتل کا ارتکاب کیا تو اس وقت میں نادان تھا۔اس وقت میں نے اپنی مظلوم قوم کی حمایت کی بنا پر یہ فعل کیا تھا۔یہ کام میں اپنے اس نظریہ حیات کی حمایت میں نہ کیا تھا جو اللہ نے اب مجھے بطور حکمت عطا کیا ہے۔

فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ (۲۶ : ۲۱) "پھر میں تمہارے خوف سے بھاگ گیا"۔کیونکہ مجھے جان کا ڈر تھا۔اللہ کو میری خیریت مطلوب تھی۔اس نے مجھے یہ حکمت عطا کرنی تھی۔

وَّ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۲۶ : ۲۱) "اور مجھے رسولوں میں شامل کر لیا"۔میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں۔میں جماعت رسل میں سے ایک ہوں۔

اب حضرت موسیٰ اس شخص کی طنز کا جواب طنزیہ انداز میں دیتے ہیں۔

وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲۶ : ۲۲) "یہ احسان جو تو نے مجھ پر جتایا ہے' اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل غلام بنا لیا تھا"۔میں تمہارے گھر میں بامر مجبوری پلا' کیونکہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا۔تو ان کے لڑکوں کو قتل کرتا تھا' اس وجہ سے میری ماں مجبور ہوئی کہ مجھے صندوق میں بند کر کے موجوں کے حوالے کر دے۔اس طرح تم لوگوں نے صندوق کو پکڑ لیا اور اس طرح میں تمہارے گھر میں پلا۔اور والدین کے گھر میں پلنے سے محروم رہا۔تو کیا یہ ہے وہ احسان جو تم جتلاتے ہو اور کیا یہ تمہاری مہربانیاں ہیں؟

اب فرعون اپنی بات بدل دیتا ہے۔اس موضوع کو چھوڑ کر اب وہ اصل بات پر آجاتا ہے لیکن یہاں بھی وہ متکبرین کی طرح تجاہل عارفانہ کے انداز میں بات کرتا ہے۔مزاحیہ اور گستاخانہ انداز اور گستاخی بھی رب العالمین کے جناب میں۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾

فرعون نے کہا"اور یہ رب العالمین کیا ہوتا ہے ؟" اس کا خانہ خراب ہو وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں کہتا ہے کہ رب العالمین کیا ہوتا ہے ۔جس کی طرف سے تم کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے ۔ یہ اس انداز کا سوال ہے کہ گویا وہ رب العالمین کے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں لیکن یہ غرور کا ایک انداز ہے ۔ وہ گویا حضرت موسیٰ کے دعویٰ کو ایک عجیب و غریب دعویٰ تصور کر کے اسے ناممکن الوقوع تصور کرتا ہے اور یہ تاثر قائم کرتا ہے کہ ایسے دعویٰ پر تو بات کرنا بھی فضول ہے ۔

موسیٰ علیہ السلام اس طرح جواب دیتے ہیں کہ رب العالمین وہ ہے جس کی الوہیت تمام دکھائی دینے والی کائنات پر مشتمل ہے ۔ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا رب ۔

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝

موسیٰ نے جواب دیا" آسمانوں اور زمین کا رب ' اور ان سب چیزوں کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں ' اگر تم یقین لانے والے ہو"۔

یہ جواب اس کے تجاہل عارفانہ کے انداز کے سوال کا شافی جواب ہے یعنی اے فرعون رب العالمین اس پوری کائنات مشہود و غیر مشہود کا رب ہے ۔ اور اس کی بادشاہت اور اقتدار تک تمہاری بادشاہت نہیں پہنچ سکتی ۔ نہ اللہ کے علم تک تمہارا علم پہنچ سکتا ہے ۔ فرعون کا دعویٰ تو صرف یہ تھا کہ وہ مصری قوم کا الہ اور حاکم ہے ' صرف وادی نیل کا فرمان روا ہے ۔ رب العالمین کے مقابلے میں یہ کیا ربوبیت ہے ۔ اس قدر حقیر جس طرح اس عظیم کائنات کے اندر ایک ذرہ ہوتا ہے ۔

اس جواب کے ذریعے موسیٰ علیہ السلام اس کی توجہ اس عظیم کائنات کی طرف مبذول کراتے ہیں اور وہ خود جس ربوبیت کا دعویدار تھا اس کو حقیر اور باطل قرار دیتے ہیں اور اسے دعوت دیتے ہیں کہ اس کائنات میں تدبر کر کے ذرا اپنے ذہن کو کھول دیں اور رب العالمین کی حاکمیت کے وسیع دائرے کو دیکھیں اور اس کے بعد مختصر تبصرہ بھی فرما دیتے ہیں کہ تدبر تم تب کر سکتے ہو جب

اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ( ۲٦ : ۲٤ ) "اگر تم یقین کرنا چاہتے ہو"۔ اگر تم یقین کرنا چاہو تو پھر رب العالمین ہی یقین کرنے کے لائق ہے ۔

اب فرعون اپنے درباریوں کی طرف متوجہ ہو کر ان سے پوچھتا ہے کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ یہ صاحب کیا کہہ رہے ہیں ۔

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ۝

"فرعون نے اپنے گردوپیش کے لوگوں سے کہا" سنتے ہو"۔ کیا تم اس شخص کی عجیب باتیں نہیں سنتے ؟ یہ باتیں تو ہمارے سامنے کسی نے نہیں کیں اور نہ ہم نے کبھی سنی ہیں ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بغیر توقف کے ایک دوسرا وار کیا ۔ اور رب العالمین کا مزید تعارف کرایا۔

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٢٦﴾

"موسیٰ نے کہا "تمہارا رب بھی اور تمہارے ان آباؤاجداد کا رب بھی جو گزر چکے ہیں"۔ یہ بات فرعون نے بہت زیادہ محسوس کی کیونکہ اس کی زد فرعون کے دعووں اور اس کے طرز عمل پر پڑتی تھی۔ اس لئے کہ موسیٰ علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ وہ رب العالمین تو تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے آباء کا بھی رب ہے اور اے فرعون تم بھی تو بندگان رب العالمین میں سے ایک حقیر بندے ہو اور یہ کہ تم کسی کے رب نہیں ہو۔ جیساکہ تم رب مصر ہونے کے مدعی ہو' لہذا تمہارا دعوائے الوہیت و ربوبیت اور حاکمیت ہی سرے سے غلط ہے۔ اللہ ہی رب العالمین ہے' تھا اور رہے گا۔

یہ فرعونی نظریات پر سخت تباہ کن بمباری تھی۔ اور اس سے خود اس کے حاشیہ نشینوں کے متاثر ہونے کا خدشہ تھا۔ اس لیے وہ صبر نہ کر سکا لہذا اس نے حضرت موسیٰ کے بارے میں وہی الزام دہرایا جو ہمیشہ مستکبرین دہراتے ہیں۔

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْۤ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿٢٧﴾

"فرعون نے (حاضرین سے) کہا "تمہارے یہ رسول صاحب جو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں' بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں"۔

یہ رسول جو بزعم خود تمہارے پاس بھیجا گیا ہے اس کا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔ یہ شخص رسول خدا کے بارے میں یہ توہین آمیز ریمارکس اس لیے پاس کر رہا ہے کہ لوگوں پر اثر نہ ہو جائے اور یقین نہ کر لیں۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ حضرت فی الواقعہ رسول بھیجے گئے۔ یہ بات وہ بطور مذاق کہتا ہے کہ یہ شخص جو باتیں کرتا ہے وہ تو ہمارے مستحکم نظام سے متصادم ہیں اور ہمارا نظام تو صدیوں سے چل رہا ہے جس کے مطابق ہم رب ہیں اور یہ کسی دوسرے رب العالمین کی طرف بلا رہا ہے اور پھر یہ بھی کہتا ہے کہ وہ ہمارے آباء کا بھی رب العالمین ہے۔

لیکن اس مذاق اور استہزاء کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کیا اثر ہو گا۔ وہ تو اس پیغمبرانہ اعتماد سے بات کرتے ہیں۔ جس کے مقابلے میں بڑے بڑے جباروں کی ذہنی دنیا میں زلزلہ آ جاتا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں :

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢٨﴾

"موسیٰ نے کہا "مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب' اگر آپ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں"۔

مشرق و مغرب تو ہر دن انسانوں کو نظر آتے ہیں۔ اور اس دنیا میں ایک خوبصورت منظر پیش کرتے ہیں۔ یہ منظر تو بڑا عبرت آموز ہے لیکن چونکہ یہ ۲۴ گھنٹوں میں مسلسل دھرایا جاتا ہے اس لیے لوگوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لوگ اس کے عادی ہو گئے ہیں ان الفاظ سے جس طرح طلوع و غروب کا مفہوم ذہن میں آتا ہے' اسی طرح طلوع و غروب کے مقام کا مفہوم بھی ان میں ہے۔ یہ دو مناظر حضرت نے اس لیے پیش کیے کہ طلوع و غروب کے مظاہر کو اور مقامات و

طلوع اور مقامات غروب کو کوئی جابر بدل نہیں سکتا۔ نہ ان دونوں مناظر کی اس خصوصیت کا کوئی انکار کر سکتا ہے کہ آغاز تخلیق سے آج تک اس نظام کے اندر کوئی تبدیلی کوئی تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔ کند ذہن سے کند ذہن شخص بھی اگر ان حقائق پر غور کرے تو وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ غافل سے غافل دل جاگ اٹھتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس مکالمے میں ان کے ضمیروں کو جگانے کی بے حد کوشش کر رہے ہیں' دعوت دے رہے ہیں کہ غور و فکر کرو۔

اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (۲۶ : ۲۸) "اگر آپ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں"۔ سرکش حکمران دنیا میں کسی چیز سے نہیں ڈرتے جس قدر وہ قوم کی بیداری سے ڈرتے ہیں۔ ان کو دل و دماغ کی بیداری سے بہت ڈر لگتا ہے۔ یہ سرکش حکمران ہمیشہ ان لوگوں کو سخت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں جو لوگوں میں بیداری پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے ایسے حکمران ہمیشہ ایسے لوگوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فرعون کو حضرت موسیٰ پر بہت غصہ آ جاتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی دعوت دل و دماغ کی پرسکون تاروں کو چھیڑ رہی ہے' اس لیے وہ اب جوش میں آ جاتا ہے۔ دھمکی دیتا ہے' اور کھلے تشدد کی بات کرتا ہے۔ اور جس وقت کسی شخص کے پاس دلائل کے ہتھیار ختم ہو جاتے ہیں تو وہ تشدد پر اتر آتا ہے۔

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِىْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ

"فرعون نے کہا "اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو تجھے بھی ان لوگوں میں شامل کر دوں گا جو قید خانوں میں پڑے سڑ رہے ہیں"۔

یہ ہے سرکشوں کی دلیل اور حجت۔ یہ کہ تمہیں جیل میں ڈال دیا جائے گا۔ جیل تو تیار ہے اور دور بھی نہیں ہے۔ اور نہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جب سرکش عاجز آ جاتے ہیں اور جب ان کو احساس ہو جاتا ہے کہ ان کا موقف تو سچائی کے مقابلے میں کمزور پڑ رہا ہے کیونکہ سچائی ہمیشہ جارح ہوتی ہے تو پھر لاجواب سرکشوں کا قدیم زمانے سے یہ آخری ہتھیار ہوتا ہے۔ اور آج تک یہ آخری ہتھیار استعمال ہوتا ہے۔

لیکن حضرت موسیٰ حوصلہ نہیں ہارتے۔ آخر وہ رسول برحق ہیں۔ ان کے اور ان کے بھائی کے ساتھ 'اللہ بھی کھڑا ہے اور دیکھ رہا ہے چنانچہ فرعون جس بحث کا سلسلہ ختم کرنا چاہتا تھا حضرت موسیٰ اس کا دوسرا باب کھول دیتے ہیں۔ آپ ایک نئے موضوع پر سوال کر دیتے ہیں۔ ایک نیا استدلال۔

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ

"موسیٰ نے کہا "اگرچہ میں لے آؤں تیرے سامنے ایک صریح چیز بھی"۔ یعنی اگر میں اپنی رسالت پر ایک صریح اور واضح دلیل بھی پیش کر دوں تو بھی میری یہی سزا ہے کہ جیل جاؤں۔ حضرت موسیٰ اس طرح فرعون کو' اسکے سرداروں کے سامنے جو یہ تمام گفتگو سن رہے تھے' سخت مشکل میں ڈال دیتے ہیں۔ اگر وہ حضرت موسیٰ کی بات نہیں سنتا

تو ثابت ہو جاتا ہے کہ فرعون لاجواب ہو گیا حالانکہ وہ کہہ چکا ہے کہ یہ شخص تو مجنون ہے۔ چنانچہ مجبور ہو کر اس نے کہا اچھا لاؤ دلیل۔

قَالَ فَأْتِ بِهِۦٓ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴿٣١﴾

"فرعون نے کہا" اچھا تو لے آ اگر تو سچا ہے"۔ لاؤ اگر تمہارا دعویٰ سچا ہے۔ یا یہ کہ تم دعویٰ کرتے ہو کہ تمہارے پاس کوئی معجزانہ دلیل ہے' اس دعویٰ میں اگر تم سچے ہو' یہ شخص ابھی تک موسیٰ علیہ السلام کی حقانیت کے بارے میں شک کا اظہار کرتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس کے اردگرد جو لوگ بیٹھے ہیں کہیں وہ متاثر نہ ہو جائیں۔

اب حضرت موسیٰ اپنے معجزات پیش فرماتے ہیں۔ فرعون کے ساتھ چیلنج اور جوابی چیلنج چونکہ انتہا تک پہنچ گئے ہیں۔ اس لیے اب وقت آگیا ہے کہ فرعون پر آخری وار کیا جائے۔

۲
فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ﴿٣٢﴾ وَنَزَعَ يَدَهُۥ فَإِذَا هِىَ بَيْضَآءُ لِلنَّٰظِرِينَ ﴿٣٣﴾ ع ۲۴
۹

"(اس کی زبان سے یہ بات نکلتے ہی) موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک صریح اژدھا تھا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ (بغل سے) کھینچا اور وہ سب دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا"۔

انداز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عصا فی الحقیقت سانپ بن گیا تھا۔ زندہ ہو گیا اور زمین پر رینگنے لگا۔ اور جب انہوں نے اپنا ہاتھ بغل سے نکالا تو وہ فی الواقعہ سفید تھا اور یہ مفہوم (فَإِذَا هِيَ) کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ محض نظربندی یا تخیل نہ تھا جس طرح جادوگر کرتے ہیں اور چیزیں اپنی حقیقت پر ہی رہتی ہیں۔ محض لوگوں کے حواس کے اندر خلل آ جاتا ہے۔ اشیاء کی حقیقت نہیں بدلتی۔

زندگی کا عظیم معجزہ' جو اس کرۂ ارض پر رواں ہے' اور یہ معجزہ بروقت ہوتا رہتا ہے۔ لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ وہ اس کے ساتھ مانوس ہو گئے ہیں اور یہ معجزہ بار بار اس زمین پر دہرایا جاتا ہے یا لوگ زندگی کے ذریعہ رونما ہونے والی اس تبدیلی کا مشاہدہ نہیں کرتے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے یہ دونوں معجزے رکھے تو یہ ایک ایسا امر تھا کہ پہلی نظر میں اس نے لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

فرعون نے اب محسوس کیا کہ یہ معجزہ تو بہرحال بہت بڑا ہے اور اپنے اندر بڑی قوت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس نے فوراً اس معجزے کے اثرات کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ اپنے دل میں تو وہ خود جانتا تھا کہ اس کا موقف غلط ہے۔ یہ بھی ممکن تھا اس کے حاشیہ نشین چاپلوسی کرتے ہوئے حقیقی صورت حال نہ بتائیں۔ اس لیے یہ شخص حضرت موسیٰ اور قوم موسیٰ کی طرف سے سامنے آنے والے خطرے کو خود حاشیہ نشینوں کے سامنے رکھتا ہے تاکہ وہ ان معجزات کے اثرات کو کم کر سکے۔

قَالَ لِلْمَلَإِ حَوْلَهُۥٓ إِنَّ هَٰذَا لَسَٰحِرٌ عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾ يُرِيدُ أَن يُخْرِجَكُم مِّنْ

أَرۡضِكُم بِسِحۡرِهِۦ فَمَاذَا تَأۡمُرُونَ ۝٣٥

"فرعون اپنے گردوپیش کے سرداروں سے بولا "یہ شخص یقیناً ایک ماہر جادوگر ہے۔ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دے۔ اب بتاؤ تم کیا حکم دیتے ہو"۔

فرعون کے اس تبصرے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مانتا ہے کہ یہ معجزہ غیر معمولی معجزہ ہے۔ اگرچہ وہ اسے سحر بتاتا ہے۔ کیونکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ ساحر علیم ہے۔ اس کی بوکھلاہٹ کا اظہار اسی سے ہوتا ہے کہ قوم بھی معجزے سے متاثر ہوگئی ہے۔

یُرِیۡدُ اَنۡ یُّخۡرِجَکُمۡ مِّنۡ اَرۡضِکُمۡ بِسِحۡرِہٖ (۲۶: ۳۵) "وہ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون اندر سے شکست کھا گیا ہے۔ اب یہ اپنی قوم کے ساتھ نہایت مہذب انداز میں گفتگو کرتا ہے حالانکہ ان لوگوں کو وہ یہ کہتا ہے کہ میں تمہارا الٰہ ہوں اور وہ اس کے سامنے سجدے کرتے تھے۔ اب یہ الٰہ صاحب خود ان سے مشورہ کرتے ہیں کہ بتاؤ اس مسئلے کو کس طرح حل کیا جائے۔

اس دنیا میں تمام ڈکٹیٹروں کا یہی انداز ہوتا ہے کہ یہ بہت کروفر میں ہوتے ہیں لیکن جیسے ہی یہ دیکھتے ہیں کہ زمین ان کے قدموں کے نیچے سے نکل رہی ہے تو مجبور ہو کر یہ برخورداروں کی طرح بات کرتے ہیں۔ پھر یہ عوام کے ہاں پناہ لیتے ہیں۔ حالانکہ جب خطرے سے باہر تھے تو یہ ان عوام کو کچلتے تھے۔ بظاہر تو وہ یوں دکھاتے تھے کہ وہ شوریٰ 'مشورہ طلب کرتے ہیں لیکن دراصل ان کی حقیقت ایک بڑے ڈکٹیٹر کی ہوتی ہے۔ اور یہ نرمی بھی وہ صرف اس حد تک کرتے ہیں کہ خطرہ دور ہو جائے لیکن جونہی خطرہ دور ہوتا ہے یہ لوگ ایسے ہی جبار ہوتے ہیں اور ویسے ہی ظالم ہوتے ہیں۔

فرعون کے درباریوں نے مشورہ دیا کہ انہیں روک لو کیونکہ فرعون کی سازش سے وہ غلط فہمی میں مبتلا تھے اور فرعون اور اس کے نظام باطل میں وہ برابر کے شریک بھی تھے اور فرعونی نظام کے علیٰ حالہ رہنے میں ان کا مفاد بھی تھا کیونکہ اس نظام ہی کی وجہ سے یہ لوگ مقربین فرعون تھے۔ ان کو خوف یہ تھا کہ اگر عوام بھی بنی اسرائیل کے ساتھ حضرت موسیٰ کی اطاعت شروع کر دیں تو یہ لوگ ان پر غالب آ سکتے ہیں۔ اگر عوام نے حضرت موسیٰ کے صرف یہ دو معجزے ہی دیکھے اور پھر حضرت موسیٰ کی باتیں سننے لگ گئے۔ تو انہوں نے مشورہ دیا کہ ان کو روک لیں اور ان کے جادو کے مقابلے میں ایسے ہی جادو کا بندوبست کریں۔ تیاری کے بعد مقابلہ ہو۔

قَالُوٓاْ أَرۡجِهۡ وَأَخَاهُ وَٱبۡعَثۡ فِي ٱلۡمَدَآئِنِ حَٰشِرِينَ ۝٣٦ يَأۡتُوكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيمٖ ۝٣٧

"انہوں نے کہا "اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دیں اور شہروں میں ہرکارے بھیج دیجئے کہ ہر سیانے جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں"۔

یعنی ان کو اور ان کے بھائی کو روک لیں اور مصر کے بڑے بڑے شہروں میں ہرکارے بھیج دیں۔ ماہر ترین جادوگروں کو جمع کر لیں اور حضرت موسیٰ اور جادوگروں کے درمیان کھلا مقابلہ ہو۔

یہاں پردہ گرتا ہے اور پھر جادوگروں کے گروہ نمودار ہوتے ہیں اور عوام الناس مقابلے کے لیے دوڑے آ رہے ہیں۔ بادشاہ اور بادشاہ کے حامی عوام جادوگروں کے حق میں نعرے لگاتے آ رہے ہیں۔ اب حق و باطل کے درمیان کھلا مقابلہ ہے۔ ایمان اور کفر کے درمیان رسہ کشی شروع ہوتی ہے۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ﴿٣٨﴾ وَقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنتُم مُّجْتَمِعُونَ ﴿٣٩﴾ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ إِن كَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ ﴿٤٠﴾

"چنانچہ ایک روز مقرر وقت پر جادوگر اکٹھے کر لیے گئے اور لوگوں سے کہا گیا "تم اجتماع میں چلو گے شاید کہ ہم جادوگروں کے دین ہی پر رہ جائیں اگر وہ غالب رہے"۔

فرعون کی ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جادوگروں کی حمایت میں لوگوں کے اندر زبردست جوش و خروش پیدا کر رہا ہے۔

هَلْ أَنتُم مُّجْتَمِعُونَ (٣٩) لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ (٤٠) "تم اجتماع میں چلو گے شاید کہ ہم جادوگروں کے دین پر ہی رہ جائیں اگر وہ غالب رہے"۔ یعنی کیا تم مقابلے کے دن ضرور آؤ گے اور ہرگز پیچھے نہیں رہو گے۔ تاکہ ہم دیکھیں کہ جادوگر یہ میدان کس طرح مارتے ہیں اور موسیٰ اسرائیلی کے مقابلے میں مصری کس طرح غالب ہوتے ہیں اور عوام الناس ہمیشہ ایسے معاملات میں جمع ہوا کرتے ہیں لیکن ان کو اصل حقیقت کا پتہ نہیں ہوتا ہے کہ حکمرانوں عوام الناس کو کس طرح استعمال کرتے ہیں اور ان جماعتوں' اور جلسوں اور جلوسوں میں ان کو کس طرح کھلونا بناتے ہیں اور یہ کام وہ اس لیے کرتے ہیں تاکہ عوام پر وہ جو مظالم ڈھا رہے ہوتے ہیں اور جس طرح ان کی پسماندگی کے وہ ذمہ دار ہیں' ان کو ان باتوں پر غور کرنے کا موقعہ ہی نہ ملے۔ وہ موسیٰ اور جادوگروں کے مقابلے میں شغل میلا کریں۔

مقابلے سے قبل جادوگر فرعون کے دربار میں حاضر ہیں۔ وہ یہ یقین دہانی حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اگر ہمیں کامیابی حاصل ہوگئی تو ہمیں معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ یہ فرعون کی جانب سے ایک پختہ وعدہ حاصل کر لیتے ہیں کہ اگر کامیاب ہوئے تو ان کو معقول اجرت کے ساتھ ساتھ شاہی تخت و تاج کا قرب بھی حاصل ہوگا اور تم میرے مقربین میں سے ہو گے۔

فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالُوا لِفِرْعَوْنَ أَئِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِن كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ ﴿٤١﴾ قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ إِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٤٢﴾

"جب جادوگر میدان میں آئے تو انہوں نے فرعون سے کہا "ہمیں انعام تو ملے گا اگر ہم غالب رہے؟" اس نے کہا "ہاں' اور تم تو اس وقت مقربین میں شامل ہو جاؤ گے"۔

یہ ہے پوزیشن کرلیہ کے ان معاونین کی جو فرعون پورے ملک سے پیغمبر خدا کے مقابلے کے لیے جمع کر کے لایا ہے۔ اس نے ان کی خدمات چند ٹکوں کے عوض خریدی ہیں۔ان کے سامنے نہ کوئی قومی مسئلہ ہے اور نہ کوئی مقصد اور کوئی نظریہ ہے۔وہ تو صرف اجر اور مفادات کے بندے ہیں۔اور ہر زمان و مکان اور ہر دور میں ہمیشہ سرکش حکمران کرلیہ کے ایسے لوگوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔

اور یہ لوگ بھی اپنی چالاکی' شعبدہ بازی اور مہارت اور محنت کی قیمت چکاتے ہیں اور فرعون بھی اس مشکل گھڑی میں ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اجر اور انعامات کا وعدہ کرتا ہے۔وہ وعدہ کرتا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ میرے مقرب ہوں گے اور اپنے آپ کو وہ بادشاہ اور الٰہ اور حاکم سمجھتا ہے۔

---ooo---

اب آیئے میدان مقابلہ کی طرف فریقین تیار ہیں اور عوام جمع ہیں۔

قَالَ لَهُمْ مُّوسَىٰٓ اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ
وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَاَلْقٰى مُوْسٰى
عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۴۵﴾ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوْٓا
اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ
لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۚ لَاُقَطِّعَنَّ
اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۹﴾ قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۡ
اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ ۴
اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۱﴾ ع ۱۸
۷

"موسیٰ نے کہا"پھینکو جو تمہیں پھینکنا ہے"۔انہوں نے فوراً اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینک دیں اور بولے"فرعون کے اقبال سے ہم ہی غالب رہیں گے"۔پھر موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو یکایک وہ ان کے جھوٹے کرشموں کو ہڑپ کرتا چلا جارہا تھا۔اس پر سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے اور بول اٹھے کہ"مان گئے ہم رب العالمین کو--- موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کے رب کو"۔فرعون نے کہا"تم موسیٰ کی بات مان گئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا!ضرور یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔اچھا!ابھی تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے' میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور تم سب کو سولی چڑھادوں گا"۔انہوں نے جواب دیا"کچھ پرواہ نہیں' ہم اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں گے۔ اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہمارے گناہ معاف کردے گا کیونکہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے ہیں"۔

یہ منظر بڑی سنجیدگی کے ساتھ اور پروقار انداز سے شروع ہوتا ہے۔ البتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ چونکہ سچائی اور خدائی ہے اس لیے وہ بالکل گھبرائے ہوئے نہیں ہیں۔ فرعون نے پورے ملک کے ماہرین فن مکار جادوگروں کو بلایا ہوا ہے اور ان کے ساتھ گمراہ اور سادہ لوح عوام الناس کا ایک جم غفیر بھی جمع کر رکھا ہے' لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سرکاری تیاریوں کی کوئی پرواہ ہی نہیں کر رہے۔ حضرت موسیٰ کے اطمینان کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ وہ ان جادوگروں کو موقعہ دیتے ہیں کہ وہ پہلے اپنے کرتب دکھائیں۔

قَالَ لَهُمْ مُوْسٰي اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُلْقُوْنَ (۲۶:۴۳) "موسیٰ نے ان سے کہا پھینکو جو تمہیں پھینکنا ہے"۔ حضرت موسیٰ کا انداز تعبیر ہی ایسا ہے کہ وہ ان کے کرتب کو اہمیت نہیں دے رہے۔ پھینکو جو پھینکنا ہے۔

اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُلْقُوْنَ (۲۶:۴۳) آپ یہ بات لاپرواہی اور بغیر کسی اہتمام کے کہتے ہیں۔ چنانچہ جادوگروں نے اپنی پوری مہارت' اپنی پوری استادی اور اپنی پوری مکاری کو کام میں لاکر اور فرعون کے نام کا ورد کر کے اپنی باری کا آغاز کیا۔

فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ (۲۶:۴۴) "انہوں نے فوراً اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینک دیں اور بولے' فرعون کے اقبال سے ہم ہی غالب رہیں گے"۔ یہاں سیاق کلام میں ان کی رسیوں اور لاٹھیوں کی تفصیلات نہیں دی گئیں۔ سورہ اعراف اور طٰہٰ میں تفصیلات بھی دی گئی ہیں۔ اس لیے کہ یہاں سیاق کلام حضرت موسیٰ کے گہرے اطمینان کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ یہاں فوراً حضرت موسیٰ کی پوری کارروائی دکھا دی جاتی ہے کیونکہ غلبہ حق اس سورت کا محور اور مضمون ہے۔

فَاَلْقٰي مُوْسٰي عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ (۲۶:۴۵) "پھر موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا تو یکایک وہ ان کے جھوٹے کرشموں کو ہڑپ کرتا چلا جارہا تھا"۔ ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی فن کاری کی آخری صلاحیتیں صرف کی تھیں۔ انہوں نے ساری عمر اس شعبدہ بازی میں گزاری تھی اور اس میں پوری مہارت حاصل کی تھی۔ انہوں نے وہ تمام کرتب پیش کر دیے تھے جو ایک جادوگر کر سکتا ہے۔ وہ تھے بھی بڑی تعداد میں ہر طرف سے گروہ در گروہ جمع ہو کر آئے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام یکہ و تنہا تھے۔ ان کے پاس صرف اپنا عصا تھا۔ یہ عصا ان کی تمام رسیوں اور لاٹھیوں کو ہڑپ کر گیا۔ (لقف) کا لغوی مفہوم ہے ہڑپ کر لینا یعنی بڑی تیزی سے کسی چیز کو کھا لینا۔ جادوگروں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جادو کے ذریعے کوئی عصا کسی چیز کو نگل نہیں سکتا۔ اس میں تو صرف تخیل اور تنویم ہوتی ہے لیکن عصا نے تو درحقیقت تمام پھینکی ہوئی اشیاء کو کھا لیا۔ کسی چیز کا نام و نشان میدان میں نہ تھا۔ اگر جادو ہوتا تو جادو کے اثر کے بعد تخیل کے عمل کے اختتام پر اشیاء کو موجود ہونا چاہیے تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ میدان میں عملاً کچھ نہیں ہے --- ان کو یقین ہوگیا کہ حضرت موسیٰ تو ہرگز جادوگر نہیں ہیں۔ وہ پیغمبر برحق ہیں اور اس سچائی کو اس دنیا میں بہترین طور پر جاننے والے یہی جادوگر تھے۔

فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ (٢٦: ٤٦) قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (٢٦: ٤٧)

رَبِّ مُوْسٰي وَهٰرُوْنَ (٢٦: ٤٨) "اس پر سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے اور بول اٹھے کہ مان گئے ہم رب العالمین کو 'موسیٰ اور ہارون کے رب کو"۔ ایک ہی لمحہ قبل وہ کرایہ کے لوگ تھے اور فرعون کے ساتھ وہ اپنی مہارت اور اجرت کا مول تول کر رہے تھے۔ نہ وہ کوئی نظریہ رکھتے تھے اور نہ ان کے پیش نظر کوئی نصب العین تھا۔ لیکن اب ان کے دلوں تک جو سچائی پہنچ گئی اس نے ان کو پوری طرح بدل دیا۔ اس واقعہ نے انہیں ہلا کر رکھ دیا۔ ان کی دینی دنیا میں ایک زلزلہ پیدا ہو گیا اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے جو سچائی دیکھی وہ ان کے دلوں کی تہہ تک پہنچ گئی۔ اس نے ان کے دل پر تمام پردے زائل کر دیئے اور گمراہی کی جو تہیں ان کے دلوں پر جمی ہوئی تھیں' وہ صاف ہو گئیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر موسیٰ صرف جادوگر ہوتے تو ان کی رسیاں اور ڈنڈے کہیں بھی نہ جاتے۔ ان چیزوں کے اندر ان کے جادو سے ہلچل تو پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ غائب نہیں ہو سکتیں۔

چنانچہ ان کا دل صاف ہو گیا اور ان کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ بغیر ارادہ کے سجدے میں گر جائیں۔ ایمان کا اظہار کر دیں اور صاف صاف اظہار کر دیں۔

اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (٢٦: ٤٧) رَبِّ مُوْسٰي وَهٰرُوْنَ (٢٦: ٤٨) "مان گئے ہم رب العالمین کو جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے"۔ انسانی دل کی دنیا بھی عجیب ہے۔ ایک لمحے میں اس کی دنیا بدل سکتی ہے۔ ایک نظر میں اس میں انقلاب آ جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ہی سچ فرمایا۔ "جو دل بھی ہے وہ رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہے' اگر اللہ چاہے تو اسے سیدھا رکھے اور اگر چاہے تو گمراہ کر دے (ٹیڑھا) کر دے"۔ یوں جادوگر جو اجر کے طلبگار اور کرایہ کے لوگ تھے وہ برگزیدہ مومن بن گئے۔ اور یہ فرعون اور اس کے جبار و قہار کے ساتھیوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے اور فرعون کے جمع کردہ عوام الناس کے جم غفیر کا بھی انہوں نے کوئی لحاظ نہ رکھا۔ وہ ان نتائج کی پرواہ کیے بغیر ہی مسلمان ہو گئے جن کی توقع ان کو جابر و ظالم فرعون سے تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ فرعون کے مقابلے میں حضرت موسیٰ پر ایمان لانا اور اس طرح علی الاعلان لانا کیا معنی رکھتا ہے۔ اب ان کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ کون کیا کہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔

حالات نے اچانک جو پلٹا کھایا' ظاہر ہے کہ فرعون اور اس کے سرداروں پر تو بجلی گر گئی۔ کیونکہ لوگ سب جمع تھے۔ ان کو خود فرعون اور اس کے اہلکاروں نے جمع کیا تھا تاکہ وہ موسیٰ اور جادوگروں کا مقابلہ دیکھ لیں۔ انہوں نے عوام کے اندر یہ پروپیگنڈا کیا تھا کہ موسیٰ اسرائیلی ایک بہت بڑا جادو لے کر آیا ہے اور وہ جادو کے زور پر ہماری حکومت کو ختم کر کے اپنی قوم کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ کہ حکومت نے بڑے بڑے جادوگروں کو جمع کر کے اس کے مقابلے کا انتظام کیا ہے۔ ہمارے جادوگر اس پر غالب ہوں گے اور اس کا قلع قمع کر دیں گے۔ یہ لوگ جمع ہوتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ موسیٰ اللہ کا نام لے کر آتا ہے اور جادوگر عزت فرعون کے عنوان سے میدان میں آتے ہیں۔ یہ شکست کھاتے ہیں اور اپنی شکست کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ وہ فوراً حضرت موسیٰ کی رسالت کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے سچے نبی ہیں۔ وہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم موسیٰ اور ہارون کے رب کو مانتے ہیں۔ یہ فرعون کی بندگی کا جوا اپنی گردنوں سے اتار

پھینکتے ہیں' جبکہ ایک لمحہ قبل وہ فرعون کے سپاہی اور خدمت گار تھے اور اس کی جانب سے انعام کے طلبگار تھے اور اپنا کام انہوں نے عزت فرعون کے عنوان سے شروع کیا تھا۔

حالات کے اندر یہ اچانک انقلاب فرعون کے اقتدار کے لیے خطرہ تھا کیونکہ اب وہ افسانہ ہی ختم ہو گیا جس کی اساس پر فرعون کا اقتدار قائم تھا یہ کہ فرعون الہ ہے بایں معنی کہ وہ خدا کی اولاد میں سے ہے ۔ اور یہ جادوگر دین فرعون کے مذہبی راہنما تھے کیونکہ اس دور میں تمام کاہن جادوگر ہوتے تھے اور یہ تمام جادوگر اسی رب العالمین پر ایمان لے آئے ہیں جو ہارون اور موسیٰ کا رب ہے' جہاں تک جمہور عوام کا تعلق ہے وہ ہمیشہ مذہبی راہنماؤں کی اطاعت کرتے ہیں ۔ وہ عقائد انہی مذہبی راہنماؤں سے لیتے ہیں۔ اب فرعون کے اقتدار کے لیے وجہ جواز اور سہارا صرف قوت رہ گئی اور یہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ محض قوت کے بل بوتے پر کسی اقتدار کو قائم نہیں رکھا جا سکتا۔

ہمیں چاہئے کہ ہم ذرا اچھی طرح اندازہ کر لیں کہ اس صورت حال سے فرعون کس قدر بوکھلایا ہو گا اور اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے حاشیہ نشینوں کی حالت کیا ہو گئی ہو گی کہ جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ جادوگر ایمان لے آئے اور ایسا ایمان کہ ایمان لاتے ہی وہ رب العالمین کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور اعتراف حق کر کے اللہ کی طرف یکسو ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس صورت حال کو دیکھ کر فرعون پاگل ہو جاتا ہے ۔ وہ بوکھلاہٹ میں اعلان کر دیتا ہے کہ تم سازشی ہو تمہیں سخت ترین سزا دی جائے گی۔ پہلے تو اس نے یہ پروپیگنڈہ کیا تھا کہ حضرت موسیٰ اپنی قوم کے لیے حصول اقتدار کی سازش کر رہے ہیں۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ

(۲۶ : ۴۹) "فرعون نے کہا' تم موسیٰ کی بات مان گئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا۔ ضرور یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے ۔ اچھا ابھی تمہیں معلوم ہو جاتا ہے ۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا۔ اور تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا"۔ تم میری اجازت کے بغیر میرے مشورے کے بغیر ہی موسیٰ کی بات مان کر سجدہ ریز بھی ہو گئے ۔ یہاں اس نے یہ نہیں کہا اٰمنتم بہ "تم اس پر ایمان لائے"۔ بلکہ اس نے اٰمنتم لہٗ کہا یعنی تم نے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور میری اجازت کے بغیر۔ جس طرح کوئی شخص جنگی چال چلتا ہے' اپنے ارادے کا مالک ہوتا ہے' وہ اپنے ہدف کو جانتا ہے ۔ اور اپنے انجام کا اندازہ کرتا ہے ۔ ایسا شخص جو ہر کام منصوبہ بندی سے کرتا ہے وہ اس قدرتی لمحے اور اس قدرتی پیچ کو نہیں سمجھ سکتا جس کی گرفت میں جادوگروں کے دل آ گئے ۔ سرکش حکمران ایسے لمحات کو نہیں سمجھ سکتے کیونکہ ان کے دل پتھر ہو جاتے ہیں اور وہ ایسے روشن لمحات سے محروم ہوتے ہیں ۔ چنانچہ فرعون بڑی تیزی سے ان پر الزام لگاتا ہے اور عوام الناس کو لائن دیتا ہے کہ ان جادوگروں کے اندر کیوں اس قدر عظیم انقلاب آیا۔

اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ (۲٦ : ٤٩) ''ضرور' یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا'' ۔فرعون نے یہ عجیب الزام لگایا ہے ۔موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے' الا یہ کہ یہ جادوگر جب کاہن تھے اور موسیٰ علیہ السلام فرعون کے گھر میں پل رہے تھے تو شاید اس زمانے میں کاہن موسیٰ علیہ السلام کو تعلیم دیتے ہوں گے ۔یا موسیٰ علیہ السلام ان کی عبادت گاہوں میں جاتے ہوں گے ۔اس تعلق کی بنا پر اس نے یہ الزام لگایا پھر بجائے اس کے کہ یہ ان کو کہتا کہ موسیٰ تمہارا شاگرد ہے اس نے یہ الزام لگا دیا کہ یہ تمہارا بڑا استاد ہے ۔عوام الناس کے ذہن میں وہ موسیٰ علیہ السلام کو ملک کے لیے خطرہ ثابت کرنا چاہتا ہے ۔

اس کے بعد وہ صراحت کے ساتھ ان کو شدید عذاب کی دھمکی دیتا ہے کہ اچھا انتظار کرو' میری طرف سے سزا کا ۔

فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۲٦ : ٤٩) ''اچھا ابھی تمہیں معلوم ہو جاتا ہے ۔میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور تم سب کو سولی چڑھا دوں گا'' ۔یہ ہے وہ حماقت جس کا ارتکاب ہر سرکش ڈکٹیٹر کیا کرتا ہے ۔اور یہ وہ اس وقت کرتا ہے جب اس کی کرسی اور اقتدار کو خطرہ لاحق ہوتا ہے اور اس کی ذات کو خطرہ لاحق ہوتا ہے ۔اور اس میں وہ خود اپنے ضمیر کی ملامت کی بھی پرواہ نہیں کرتا ۔اور ظاہر ہے کہ یہ سزا فرعون سنا رہا ہے جس کا یہ لفظ قانون ہے اور اسی وقت نافذ کر دیا جاتا ہے ۔اب ذرا اس گروہ مومن کی بات بھی سن لیں جس نے روشنی کو دیکھ لیا ہے ۔

یہ اس دل کی بات ہے جس کو اللہ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے اور اس معرفت کے بعد اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ اب اس کا کیا ہوتا ہے ۔یہ ایسے دل کی بات ہے جس نے اللہ تک رسائی حاصل کر لی ہے اور ایمان کا ذائقہ چکھ لیا ہے ۔اس لیے وہ ڈکٹیٹر اور سرکش حکمران کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اور یہ ایک ایسے دل کی پکار ہے جو آخرت کا طلبگار ہے اور اس لیے اسے اس دنیا کے فائدے کی کوئی پرواہ نہیں رہتی ۔خواہ قلیل ہو یا کثیر۔

قَالُوْا لَا ضَيْرَ اِنَّآ اِلٰي رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ (۲٦ : ٥٠) اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَلَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲٦ : ٥١) ''انہوں نے جواب دیا کچھ پرواہ نہیں ہم اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں گے اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہمارے گناہ معاف کر دے گا کیونکہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے ہیں'' ۔کچھ پرواہ نہیں ہے ۔ہمیں اس بات کی اب کوئی فکر نہیں ہے کہ ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں ۔تشدد اور سولی کی سزا کی بھی کوئی پرواہ نہیں ہے ۔موت اور شہادت سے ہم نہیں ڈرتے ۔ہمیں تو ان باتوں کی کوئی پرواہ نہیں ہے' اگر ہم مر گئے تو ہم اپنے رب کے پاس چلے جائیں گے ۔آخر اس زمین کی زندگی میں رکھا کیا ہے؟ ہمارا مطمح نظر تو اب یہ ہے ۔

اَنْ يَّغْفِرَلَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ (۲٦ : ٥١) ''کہ ہمارا رب ہماری خطائیں معاف کر دے'' ۔اور یہ خطائیں اس اعزاز کی وجہ سے معاف کر دے کہ

اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۲۶: ۵۱) "یہ کہ ہم پہلے ایمان لانے والے بن گئے"۔ اب ہمیں سابقین اولین کا درجہ حاصل ہے۔

اے اللہ! کیا ہی شان ہے ایمان کی جب یہ ضمیر کی دنیا کو منور کر دے۔ جب اس کا فیضان روح پر ہو جائے۔ جب کاسہ قلب مومن ایمان سے بھر جائے تو مٹی کا یہ کالبد اعلیٰ علیین کے مقام پر چلا جاتا ہے۔ دل غنی ہو جاتا ہے۔ دلوں کے اندر دولت ایمان جمع ہو جاتی ہے اور اس کے مقابلے میں کہ روئے زمین کی سب دولت ہیچ نظر آتی ہے۔

اب سیاق کلام میں پھر ایک بار پردہ گرتا ہے اور جادوگروں کے روشن ضمیر کا یہ منظر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس پر مزید کوئی تبصرہ نہیں ہے۔ تاکہ ان سابقین اولین کا یہ گہرا اثر قاری کے دل میں بحال رہے۔ لوگ سوچیں کہ اہل مکہ اہل ایمان پر جو مظالم ڈھا رہے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تاریخ میں اہل ایمان اس قسم کے مظالم برداشت کرتے چلے آئے ہیں۔

اب اہل ایمان کے خلاف فرعون کی سد ابیر کا ایک منظر اور اہل ایمان کے لیے اللہ کی راہنمائی کا ایک منظر:

وَ اَوْحَیْنَآ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْۤ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ۝۵۲ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِی الْمَدَآىٕنِ حٰشِرِیْنَ۝۵۳ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِیْلُوْنَ۝۵۴ وَ اِنَّهُمْ لَنَا لَغَآىٕظُوْنَ۝۵۵ وَ اِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ۝۵۶

"ہم نے موسیٰ کو وحی بھیجی کہ "راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ' تمہارا پیچھا کیا جائے گا"۔ اس پر فرعون نے (فوجیں جمع کرنے کے لیے) شہروں میں نقیب بھیج دیئے (اور کہلا بھیجا) کہ "یہ کچھ مٹھی بھر لوگ ہیں' اور انہوں نے ہم کو بہت ناراض کیا ہے' اور ہم ایک ایسی جماعت ہیں جس کا شیوہ ہر وقت چوکنا رہنا ہے"۔

اب یہاں واقعات اور زمانے کے اعتبار سے ایک بڑا اور طویل خلا ہے۔ بیچ میں سے طویل زمانے اور واقعات کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ اس مقابلے کے بعد حضرت موسیٰ اور ہارون علیہ السلام بھی مصر میں کام کرتے رہے۔ اور سورت اعراف میں جن دوسرے معجزات کا ذکر ہوا ہے وہ بھی اس عرصہ میں رونما ہوئے اور آخر کار وہ وقت آگیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جائیں۔ لیکن اس سورت میں ان تمام واقعات کو لپیٹ کر رکھ دیا جاتا ہے اور قصہ موسیٰ کے ان حصوں کو یہاں لے لیا جاتا ہے جو اس سورت کے موضوع اور مضمون کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو بذریعہ وحی اجازت دے دی کہ آپ اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل جائیں۔ تمام بنی اسرائیل رات کو نکلیں۔ اس سفر کے لیے نہایت منظم خفیہ انتظامات کیے گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ اطلاع بھی کر دی گئی کہ فرعون ہر حال میں تمہارا پیچھا کرے گا۔ اور ساحل سمندر کی طرف نکل کھڑے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس جگہ ساحل سمندر تک پہنچے وہ خلیج سویز اور چھوٹے چھوٹے بحیروں کے موجودہ علاقے میں یہ واقع تھا۔

فرعون کو خفیہ طور پر اطلاعات مل گئیں کہ بنی اسرائیل نکلنے والے ہیں۔ تو اس نے بھی اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ جس وقت بھی خروج شروع ہو' پیچھا کرنے کے لیے افواج کو تیاری کی حالت میں رکھا جائے۔ تمام علاقوں میں اس نے اپنے ہرکارے بھیج دیئے کہ افواج کو تیار کیا جائے کہ یہ ایک چھوٹا سا گروہ ہے۔ یہ بچ نکلنے کی تدبیریں سوچ رہا ہے لیکن اسے پتہ نہ تھا کہ یہ خروج اللہ تعالیٰ کی طرف سے منظم کیا جا رہا ہے۔

فرعون کے لوگ فوجوں کو تیار کرتے رہے لیکن عوام کے اندر یہ بے چینی پیدا ہو سکتی تھی کہ آخر موسیٰ کے پاس کتنی بڑی طاقت ہے کہ اس کے مقابلے میں اس قدر وسیع پیمانے پر تیاریاں ہو رہی ہیں جبکہ فرعون اپنے آپ کو الٰہ بھی کہتا ہے اور پھر بھی ایک پبلک کے فرد کے مقابلے پر اس قدر جنگی تیاریاں کر رہا ہے۔ چنانچہ اس موقعہ پر فرعون کو اس قسم اعلان کی ضرورت پیش آئی۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ (۲۶ : ۵۴) "یہ کچھ مٹھی بھر لوگ ہیں"۔ تو سوال یہ ہے کہ پھر ان کے خلاف اس قدر انتظام کیوں ہو رہا ہے اور فوجیں کیوں جمع کی جا رہی ہیں اگر وہ مٹھی بھر لوگ ہیں"۔

وَ اِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ (۲۶ : ۵۵) "اور انہوں نے ہم کو بہت ہی ناراض کیا ہے"۔ یہ لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں اور ایسے کام کرتے ہیں جو ہمارے سامنے کسی نے نہیں کیے' اس لیے ان کی وجہ سے ہم غیظ و غضب میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ہمارے اندر جوش انتقام پیدا ہو گیا ہے۔

اگرچہ یہ لوگ نہایت ہی خطرناک ہیں اور ان کی تحریک ایک مضبوط تحریک ہے۔ لیکن سرکاری لوگ عوام سے کہیں کہ حکومت نے مکمل احتیاطی تدابیر اختیار کی ہوئی ہیں اور ان پر نظر رکھی ہوئی ہے۔

وَ اِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ (۲۶ : ۵۶) "اور ہم ایسی جماعت ہیں جس کا شیوہ ہمیشہ چوکنا رہنا ہے"۔ اور ہم ان کی سازشوں کے مقابلے میں بیدار ہیں۔ ان کے معاملات میں بڑی احتیاط برت رہے ہیں اور ان کو اچھی طرح کنٹرول کر رہے ہیں۔ جب بھی اہل باطل کا اہل ایمان سے مقابلہ ہوتا ہے تو اہل باطل اہل ایمان کے مقابلے میں اسی طرح حیران و پریشان ہوتے ہیں۔

--- ○○○---

قبل اس کے کہ آخری منظر پیش کیا جائے' یہاں قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ فرعونیوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی کی وجہ سے ان نعمتوں' ان باغات اور مکانات عالی شان اور اس عیش و عشرت سے نکال دیا اور یہ مقام اختیار و اقتدار بنی اسرائیل جیسے مستضعفین کو دے دیا۔

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۵۷﴾ وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۸﴾
كَذٰلِكَ ؕ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾

"اس طرح ہم انہیں ان کے باغوں اور چشموں اور خزانوں اور ان کی بہترین قیام گاہوں سے نکال لائے - یہ تو ہوا ان کے ساتھ ' اور (دوسری طرف) بنی اسرائیل کو ہم نے ان سب چیزوں کا وارث کر دیا"۔

یہ لوگ تو اس لیے نکلے کہ حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کا تعاقب کریں اور انہیں گرفتار کریں مگر اپنے گھروں سے ان کا یہ خروج آخری خروج تھا - یہ دراصل اللہ کی اسکیم میں ان کے لیے ان انعامات اور عیاشیوں سے اخراج تھا ' جن میں وہ تھے ' اعلیٰ سہولتوں ' عزت کے مقامات اور خوشحالی اور باغات و محلات سے اخراج تھا - اس کے بعد یہ پھر ان مقامات کی طرف واپس نہ آئے اور یہ تھی ان کی سزا ان مظالم کی وجہ سے جو یہ غریبوں پر ڈھاتے تھے -

وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِي إِسْرَائِيلَ (۲۶ : ۵۹) "اور دوسری طرف ہم نے بنی اسرائیل کو ان چیزوں کا وارث کر دیا"۔ تاریخ میں تو اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ یہ بنی اسرائیل فرعونیوں کے بعد دوبارہ مصر میں داخل ہوئے تھے اور مصر کے باغ و راغ اور مال و منال پر قابض ہو گئے تھے - اس لیے مفسرین یہ کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ دنیا کا مال و اقتدار ان کو دے دیا گیا جس طرح فرعونیوں کو دیا گیا تھا - مقصد یہ ہے کہ ایک قوم کو زوال دیا اور دوسری کو عروج اور اس عروج میں وہ اگلی قوم کی وارث ہو گئی - پہلے مقام کریم اس کے پاس تھا اب اس کے پاس ہے -

---ooo---

اور اس عمرانی سزا کے بعد اب ان کی جسمانی سزا اور آخری انجام کا ذکر آتا ہے -

فَأَتْبَعُوهُم مُّشْرِقِينَ ﴿٦٠﴾ فَلَمَّا تَرَاءَى الْجَمْعَانِ قَالَ أَصْحَابُ مُوسَىٰ إِنَّا لَمُدْرَكُونَ ﴿٦١﴾ قَالَ كَلَّا ۖ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿٦٢﴾ فَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۖ فَانفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ ﴿٦٣﴾ وَأَزْلَفْنَا ثَمَّ الْآخَرِينَ ﴿٦٤﴾ وَأَنجَيْنَا مُوسَىٰ وَمَن مَّعَهُ أَجْمَعِينَ ﴿٦٥﴾ ثُمَّ أَغْرَقْنَا الْآخَرِينَ ﴿٦٦﴾

"صبح ہوتے ہی یہ لوگ ان کے تعاقب میں چل پڑے - جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو موسیٰ کے ساتھی چیخ اٹھے کہ "ہم تو پکڑے گئے"۔ موسیٰ نے کہا "ہرگز نہیں - میرے ساتھ میرا رب ہے - وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا"۔ ہم نے موسیٰ کو وحی کے ذریعہ سے حکم دیا کہ مار اپنا عصا سمندر پر"۔ یکایک سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا - اسی جگہ ہم دوسرے گروہ کو بھی قریب لے آئے - موسیٰ اور ان سب لوگوں کو جو اس کے ساتھ تھے ' ہم نے بچا لیا اور دوسروں کو غرق کر دیا"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندوں کو لے کر رات کے وقت نکل پڑے - اللہ تعالیٰ کی راہنمائی اور ہدایت کے مطابق - صبح کے وقت جب فرعون نے دیکھا کہ بنی اسرائیل بھاگ گئے ہیں تو وہ اپنی فوجیں لے کر تعاقب میں نکلا - اس تعاقب کے لیے فرعون نے بڑی سخت تدابیر اختیار کر رکھی تھیں اور ان کو پکڑنے کا زبردست انتظام کیا تھا - اب یہ منظر اپنی انتہا

اور انجام کی طرف بڑھ رہا ہے - یہ معرکہ اپنی انتہائی بلندی پر پہنچ گیا- حضرت موسیٰ اور ان کی قوم ساحل پر پہنچ گئی ہے - وہاں کوئی کشتی نہیں ہے - بنی اسرائیل نہ سمندر عبور کر سکتے ہیں اور نہ فرعون کے ساتھ جنگ کے لیے کچھ سامان ہے - اور فرعون ان کا تعاقب نہایت ساز و سامان سے کر رہا ہے اور انہیں گرفتار کرنے کی بے رحمانہ اسکیم اس نے تیار کی ہوئی ہے -

بظاہر حالات یہی بتاتے ہیں کہ اب ان کے بھاگ نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے - آگے سمندر ہے اور پیچھے سے دشمن بڑھا چلا آ رہا ہے -

قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓي اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (۲۶ : ۶۱) "موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا ہم تو پکڑے گئے"- اہل ایمان کی بے چینی اب انتہا کو پہنچ گئی ہے - اب تو چند منٹوں کی بات ہے کہ لشکر فرعون انہیں قتل کرے یا گرفتار کرے - اور اس سے بظاہر چھوٹ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے -

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رابطہ تو عالم بالا سے قائم تھا - وحی مسلسل آ رہی تھی - ان کا کاسہ دل اطمنان سے لبالب تھا- پوری طرح یقین تھا کہ اللہ کوئی صورت نکالنے والا ہے - مدد کی کوئی سبیل نکل آئے گی -اللہ کا وعدہ ہے کہ نجات ملے گی - اگرچہ انہیں بھی معلوم نہ تھا کہ بات کیا ہو گی - البتہ یقین تھا کہ نجات یقینی ہے - کیونکہ یہ سب منصوبہ اللہ کا تیار کردہ ہے -

قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (۲۶ : ۶۲) "موسیٰ نے کہا ہرگز نہیں میرے ساتھ ' میرا رب ہے ' وہ ضرور میری راہنمائی فرمائے گا"- لفظ کلا ایسی جگہ استعمال ہوتا ہے ' جہاں شدید تاکید کے ساتھ نفی مطلوب ہو - یعنی تم ہرگز نہ پکڑے جاؤ گے اور تم ہرگز کسی فتنے میں نہ پڑو گے - ہرگز اللہ تمہیں ضائع نہ کرے گا- میرے ساتھ میرا رب ہے ' وہ ضرور میری راہنمائی کرے گا- حضرت موسیٰ بڑی تاکید ' اعتماد اور یقین کے ساتھ بات کرتے ہیں - مایوسی کے ان اندھیروں میں اچانک روشنی کی ایک کرن نمودار ہوتی ہے - نجات کی راہ اس طرف سے ملتی ہے جس طرف سے کوئی امید نہ تھی -

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰي مُوْسٰٓي اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ (۲۶ : ۶۳) "ہم نے موسیٰ کو وحی کے ذریعے حکم دیا کہ "مار اپنا عصا سمندر پر"- اب سیاق کلام میں آگے یہ نہیں کہا جاتا کہ انہوں نے اپنا عصا سمندر پر مارا بلکہ نتیجہ ہی جلدی سے ہمارے سامنے رکھ دیا جاتا ہے -

فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ (۲۶ : ۶۳) "یکایک سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک عظیم پہاڑ کی طرح ہو گیا"- یہ معجزہ واقع ہو گیا اور لوگ جس بات کو محال کہتے تھے ' وہ ہو گئی کیونکہ ان کا قیاس تو روز مرہ کے معمول کے واقعات پر تھا - اور یہ روز مرہ کے واقعات بھی تو اللہ کی قدرت کے پیدا کردہ اصولوں کے مطابق رونما ہوتے ہیں اور یہ ان اصولوں کے مطابق تب تک چلتے ہیں جب تک اللہ چاہتا ہے - اللہ کا حکم یوں ہوا کہ پانی راستوں کے دونوں طرف تودوں کی طرح کھڑا ہو گیا - بنی اسرائیل گھس کر دریا پار کر گئے -

فرعون اپنی افواج کے ساتھ دوسری جانب ششدر کھڑا رہ گیا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کے ساتھ یہ معجزہ دیکھا۔ لازم ہے کہ کچھ دیر کے لیے تو وہ حیرت زدہ ہو کر رہ گیا ہو گا۔ وہ دیکھ رہا ہو گا کہ موسیٰ اور ان کی قوم وہ گئے اور پار ہو گئے۔ اس نے بہرحال اپنی افواج کو اس راستے میں گھس جانے سے قبل سوچا تو ہو گا کیونکہ یہ ایک عجیب عمل تھا۔

اللہ کی اس تدبیر سے بنی اسرائیل دوسری طرف نکل گئے۔ ابھی تک پانی دو ٹکڑے ہی تھا۔ اور فرعون اور اس کا لشکر پانی کے اندر ہی تھے کہ اللہ نے ان کا انجام قریب کر دیا۔

وَ اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ (٦٤) وَ اَنْجَيْنَا مُوْسٰي وَ مَنْ مَّعَهٗ اَجْمَعِيْنَ (٦٥) ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ (٦٦)(٢٦: ٦٤ تا ٦٦) ”اسی جگہ ہم دوسرے گروہ کو بھی قریب لے آئے۔ موسیٰ اور ان سب لوگوں کو جو ان کے ساتھ تھے ہم نے بچا لیا اور دوسروں کو غرق کر دیا“۔ یہ معجزہ ایک عرصہ تک لوگوں کی زبان پر رہا۔ صدیوں تک وہ اس کا تذکرہ کرتے رہے۔ کیا اس پر زیادہ لوگ ایمان لے آئے؟

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

”اس واقعہ میں ایک نشانی ہے مگر ان لوگوں میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں“۔

اس لیے اگر خارق عادت معجزات کا صدور بھی ہو جائے تو نہ ماننے والے پھر بھی نہیں مانتے۔ اگرچہ بظاہر لوگ لاجواب ہو جائیں کیونکہ ایمان تو ایک ہدایت ہے اور ہدایت وہ ہوتی ہے جسے دل قبول کرے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ ع ۱۷

”اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی“۔ یہ پوری سورت کا سبق اور محور ہے کہ معجزات اور آیات پیش کرنے کے بعد ’اگر لوگ تکذیب پر اصرار کریں گے تو اللہ بھی عزیز ہے“۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۶۳ ایک نظر میں

حضرت موسیٰ ' فرعون اور سرداران فرعون کی کہانی آپ لوگوں نے سنی اور اس کا انجام دیکھ لیا۔ اس قصہ میں مکہ میں رہنے والے کمزور اور مظلوم اہل ایمان کے لیے ایک قسم کی بشارت تھی 'کہ جس طرح بنی اسرائیل پر ظلم ہوا اسی طرح آج مکہ کی جماعت قلیلہ بھی مظلوم ہے۔ مشرکین مکہ کا رویہ بھی بعینہ اسی طرح ہے جس طرح فرعونیوں کا تھا اور ان کا انجام بھی ویسا ہی ہو گا جو فرعونیوں کا ہوا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اب ذرا مزید پیچھے جاکر حضرت ابراہیم اور ان کی قوم کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو یہاں لایا جاتا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ ان کے سامنے ذرا اس قصے کو پڑھو۔ اس لیے کہ اہل مکہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جانشین اور پیروکار ہیں ۔ یہ دین ابراہیم پر ہیں ۔ حالانکہ کعبہ میں انہوں نے بت رکھے ہوئے ہیں اور بیت الحرام کے اندر جسے حضرت ابراہیم نے صرف اللہ کی عبادت کے لیے بنایا تھا۔ انہوں نے بت کھڑے کر رکھے ہیں ' ذرا ان کو حضرت ابراہیم کے یہ افکار و عقائد بھی پڑھ کر سنائیں ۔

اس سورت میں قصص تاریخی ترتیب کے مطابق نہیں ہیں ۔ کیونکہ اس سورت میں قصص مختصر برائے عبرت آموزی لائے گئے ہیں جبکہ اس سے قبل سورت اعراف میں یہی قصص تاریخی ترتیب کے ساتھ لائے گئے تھے ۔ وہاں موضوع سخن یہ تھا کہ زمین کی وراثت ہمیشہ اللہ کے صالح بندوں کو دی جاتی رہی ہے ۔ اس لیے وہاں قصص کا تاریخی پہلو بھی پیش نظر تھا ۔ یعنی آدم علیہ السلام کے نزول ' زوجیت اور انسانیت کا تاریخی سفر اور اس میں سنت الہیہ کا کام ۔

یہاں حضرت ابراہیم کے قصے کی وہ کڑی پیش کی جارہی ہے جس میں وہ اپنی قوم کے سامنے دعوت پیش کرتے ہیں اور ان کے ساتھ نظریاتی مکالمہ کرتے ہیں اور قوم کے لوگ جن الہوں کو مانتے ہیں آپ ان کا انکار کرتے ہیں اور ان کو یہ بتاتے ہیں کہ میری بندگی اور عبادت کا رخ تو صرف اللہ وحدہ کی طرف ہے ۔ اور یہ کہ میں پوری زندگی میں قیامت کو پیش نظر رکھ کر عمل کرتا ہوں ۔ اور اس موقعہ پر قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر بھی پیش کر دیا جاتا ہے ۔ قیامت کے دن ان بتوں اور الہوں کی بندگی کرنے والے لوگ الہوں کی مذمت کریں گے اور شرک کے ارتکاب پر سخت نادم ہوں گے ۔ یہ منظر یوں نظر آتا ہے کہ گویا یہ لوگ عملاً قیامت میں ہیں ۔ چنانچہ مشرکین مکہ کے لیے اس قصے میں سامان عبرت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس قصے میں عقیدۂ توحید کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور عقیدۂ شرک کے فساد کو بھی ظاہر کیا جاتا ہے ۔ اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ قیامت کے دن ان مشرکین کا انجام کیا ہو گا ۔ کیونکہ مقصد اور محور یہی ہے کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہونے والا ہے ' اس لیے قصے کے دوسرے واقعات جو دوسری سورتوں میں مفصل بیان ہوئے یہاں نہایت ہی اختصار کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ۔

' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے کی بعض کڑیاں سورۃ بقرہ ' سورہ انعام ' سورہ ہود ' سورہ ابراہیم ' سورہ ،

انعام، سورہ انبیاء اور سورہ حج میں دی گئی ہیں۔ ہر سورت میں یہ قصہ سیاق کلام کی مناسبت سے دیا گیا ہے اور سورت کی جو فضا تھی اور اس کے موضوع کے اعتبار سے جو سبق دینا مطلوب تھا وہ دیا گیا۔

سورہ بقرہ میں قصے کا وہ حصہ دیا گیا جس میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام خانہ کعبہ تعمیر کر رہے ہیں۔ پھر انہوں نے دعا کی کہ اے اللہ اس گھر کو پر امن بنا دے کہ لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آئیں اور یہ کہ اس گھر کی وراثت اور امامت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی جو مسلمان ہوں گے۔ جو حضرت ابراہیم کی ملت کے پیرو ہوں گے۔ وہ لوگ وارث نہ ہوں گے جو محض نسبت کے اعتبار سے ابراہیمی ہوں گے اور یہ قصہ اس لیے لایا گیا تھا کہ بنی اسرائیل کی خلاف ورزیاں ان کو اللہ کی طرف سے سزائیں اور ملعون کیے جانے کے اسباب بتائے جائیں اور یہ بتایا جائے کہ دنیا کی قیادت بنی اسرائیل سے لے کر کیوں مسلمانوں کو دی گئی۔

سورہ بقرہ میں حضرت ابراہیم اور وقت کے مشرک بادشاہ کے ساتھ آپ کا مناظرہ بھی نقل کیا گیا۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت، حاکمیت اور تخلیق پر بحث کی گئی ہے اور حضرت ابراہیم نے اسے بتایا کہ تخلیق بذات خود معجزہ ہے جب وہ نہ سمجھا تو آپ نے فرمایا کہ اچھا تو سورج کو مغرب سے طلوع کر کے دکھاؤ تو تب وہ بہوت الحواس ہو گیا۔

پھر خود آپ نے رب سے درخواست کی کہ اے اللہ، ذرا معجزہ تخلیق کا عملی مشاہدہ کرائیں۔ چنانچہ چار پرندے ذبح ہوئے، ان کے گوشت کو پہاڑوں پر تقسیم کیا گیا۔ اور علی رؤس الاشہاد ان کو دوبارہ زندہ کیا گیا اور یہ پرندے اڑ کر آئے اور اس طرح اس بادشاہ اور کافر لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ ہیں معجزات الٰہیہ اور اللہ وہی ہے جو جلاتے اور مارنے والا ہے۔

سورہ انعام میں ان کی جانب سے سورج اور چاند اور دوسرے پوجے جانے والے مظاہر پر غور کا قصہ لایا گیا ہے۔ یہ ستارے اور شمس و قمر بھی کیا الٰہ ہو سکتے ہیں؟ یہ کڑی اس سورت میں دی گئی جس کا موضوع عقیدۂ توحید اور نظریاتی مسائل ہیں۔ اور جس میں لوگوں کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ یہ پوری کائنات اور اس کے مناظر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس کا پیدا کرنے والا وحدہ لاشریک ہے۔

سورت ہود میں حضرت اسحاق کی خوشخبری والا حصہ ہے، یہ قصہ لوط کے لیے تمہید کے طور پر لایا گیا ہے کیونکہ ملائکہ کا اصل ٹارگٹ قوم لوط تھی۔ راستے میں وہ حضرت ابراہیم کے پاس بھی ٹھہرے۔ اس قصے میں یہ بتانا مقصود تھا کہ اللہ اپنے سچے بندوں کی نگرانی اور نصرت کس طرح کرتا ہے۔

اور سورہ ابراہیم میں اولاد کو مکہ میں بسانے کے بعد ان کے لیے دعا کرنے کا حصہ لایا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی اولاد کو وادی غیر ذی زرع میں بٹھا کر جا رہے ہیں۔ بڑھاپے میں اسحاق اور اسماعیل کی ولادت کا شکریہ یہ ہے کہ وہ دین کا کام کریں۔ اور یہ دعا ان کے لیے کی گئی کہ اے اللہ، میری اولاد نماز قائم کرنے والی ہو۔ اور یہ کہ اے اللہ اس دعا کو قبول فرما اور مجھے اور میرے والدین کو یوم الدین میں بخش دے۔ اس سورت میں انداز کلام یوں تھا کہ تمام رسول ایک امت ہیں۔ ایک جماعت ہیں اور ان کا مشن بھی ایک ہے یعنی عقیدۂ توحید۔ کام بھی ایک ہے اور انجام بھی ایک ہے۔ سب ایک صف میں کھڑے ہیں۔ ایک ہی بات کرتے ہیں۔ گویا کفر و انکار کے تپتے ہوئے صحرا میں صرف ایک ہی سایہ دار درخت ہے یعنی شجرۂ نبوت۔ اور لوگوں کو اگر آرام مل سکتا ہے تو اس درخت کے زیر سایہ مل سکتا ہے۔

سورہ حجر میں بھی وہی حصہ مذکور ہے جو ہود میں لایا گیا تھا۔ البتہ مجرمین کی قدرے تفصیلات ہیں اور اس میں یہ بتایا

گیا ہے کہ اللہ اپنے مومن بندوں پر رحمتوں کی بارش کرتا ہے اور مخالفین تحریک اسلامی اور مکذبین پر ہمیشہ اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے۔

اور سورہ مریم میں وہ حصہ ہے جس میں آپ اپنے باپ کے ساتھ نہایت ہی نرمی سے پیش آتے ہیں جبکہ باپ ان پر سختی کرتا ہے۔ اور آپ نہایت ہی خوش اسلوبی سے قوم اور والد کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ پھر اللہ آپ کو اسماعیل اور اسحاق دیتا ہے۔ اس پوری سورت کا مضمون بھی ایسا ہے کہ اللہ اپنے منتخب اور برگزیدہ بندوں کو نوازتا رہتا ہے اور ان کے ساتھ نرمی اور محبت کا سلوک کرتا ہے۔

سورہ انبیاء میں قصے کا وہ حصہ پیش کیا گیا ہے جہاں آپ اپنے والد اور قوم کو دعوت دیتے ہیں۔ بتوں کے توڑنے کا واقعہ' آپ کو آگ میں پھینکے جانے کا واقعہ' اور آگ کا ٹھنڈا اور پرسکون ہونے کا واقعہ' اور آپ اور آپ کے بھتیجے کو ان لوگوں سے نجات دلا کر ارض برکت فلسطین کی طرف نکال لے جانے کا واقعہ۔ اور یہ سب بات تمام انبیاء کے اس مسلسل بیان کے ضمن میں ہے کہ اللہ نے گروہ انبیاء کی ہمیشہ نصرت کی اور تمام انبیاء نے اس اللہ کی عبادت کی جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ جبکہ سورت حج میں یہ حکم دیا گیا کہ اس گھر کو یہاں رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں کے لیے ہر قسم کی گندگی سے پاک رکھو۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۱۶۳ تشریح آیات

## ۶۹ --- تا --- ۱۰۴

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۰﴾

”اور انہیں ابراہیم کا قصہ سناؤ جبکہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا تھا کہ ”یہ کیا چیزیں ہیں جن کو تم پوجتے ہو“۔

ان کے سامنے حضرت ابراہیم کا قصہ پیش کرو۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ابراہیم کے وارث ہیں اور ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں۔ ان کو بتاؤ کہ ابراہیم کے والد بھی تو بت پرست تھے اور انہوں نے تو والد کے فعل بت پرستی پر سخت مواخذہ کیا تھا۔ پھر تم بت پرست کس طرح بن گئے۔ وہ تو بت پرستی اور شرک کے مسئلے پر ہی اپنے والد اور قوم سے ٹکرا گئے۔ انہوں نے والد اور قوم کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ بت پرستی کھلی گمراہی ہے کس قدر سخت لہجے میں ما تعبدون "یہ کیا چیزیں ہیں جنہیں تم پوجتے ہو"۔ (۲۶ : ۷۰)

قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿۷۱﴾

”انہوں نے جواب دیا ”کچھ بت ہیں جن کی ہم پوجا کرتے ہیں اور انہی کی سیوا میں ہم لگے رہتے ہیں“۔ یہ لوگ اپنے بتوں کو الہ کہتے تھے لیکن قرآن کریم نے ان کی زبانی ان کے لیے اصنام کا لفظ بھی نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ یہ بت پتھروں سے گھڑے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ لوگ ان بتوں کی عبادت اور تعظیم میں لگے ہوئے ہیں اور یہ ان کے عقائد کی ایک عام کمزوری تھی لیکن جب عقائد اور خیالات بگڑ جاتے ہیں، تو پھر جن لوگوں نے ان بگڑے ہوئے عقائد کو سینے سے لگا لیا ہوتا ہے وہ سمجھ نہیں سکتے کہ ان کا یہ رویہ ان کو کس قدر ذلتوں اور کس قدر پستیوں تک گرا رہا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے غافل دلوں کو جگاتے ہیں، ان کی عقل سے اپیل کرتے ہیں کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ کس حد تک تم گر گئے ہو اور کیا کیا حماقتوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہو۔ بغیر سوچنے اور سمجھنے کے۔

قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ﴿٧٢﴾ أَوْ يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ﴿٧٣﴾

"اس نے پوچھا "کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انہیں پکارتے ہو' یا یہ تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں"۔

کسی الہ کی کم از کم جو خاصیت ہونا چاہیے 'کہ وہ سنے اور سوال و جواب کرے۔ کم از کم کوئی اپنے اس بندے جیسا تو ہونا چاہیے جو اس کی عبادت کر رہا ہے اور اس کے سامنے گڑگڑا رہا ہے۔ یہ الٰہ تو نہ سنتے ہیں اور نہ گویا ہیں اور نہ ہی کوئی نفع و ضرر دے سکتے ہیں۔ اگر یہ سن ہی نہیں سکتے 'بہرے ہیں تو پھر نفع و نقصان کیسے دیں گے۔ اس لیے ان کو کسی صورت میں پکارنا جائز نہیں ہے۔

لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوالات میں سے کسی کا جواب نہ دیا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت ابراہیم ان کے ساتھ سخت مذاق کر رہے ہیں اور ان کے بتوں اور ان کی روش پر تنقید کر رہے ہیں کیونکہ ان کے پاس اس کا کوئی جواب ہی نہ تھا۔ ان کا جواب بس یہ تھا جو ہر شخص کا جواب ہوتا ہے جو بے سوچے سمجھے تنقید کرتا ہے۔

قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ ﴿٧٤﴾

"انہوں نے جواب دیا "بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے"۔ بے شک یہ بت تو نہ نفع دیتے ہیں' نہ نقصان اور نہ سنتے ہیں لیکن ہمارے آباء و اجداد سے یہ عمل یوں ہی ہوتا چلا آرہا ہے کہ ہم ان بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔

یہ تو نہایت ہی شرمسار کرنے والا جواب ہے لیکن مشرکین بڑی ڈھٹائی سے یہ جواب دیتے ہیں اور اسی طرح مکہ کے مشرکین بھی یہی کہتے تھے اور کوئی شرم محسوس نہ کرتے تھے بلکہ ان کے لیے ان کے آباء و اجداد کا فعل ہی کافی دلیل تھا۔ مزید بحث کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ان لوگوں کی یہ آباء پرستی ہی اسلام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ کہ وہ آباء کے دین کو چھوڑ دیں 'یوں وہ آباء و اجداد کی پیروی ترک کر دیں اور بالواسطہ یہ اقرار کر لیں کہ ہمارے آباء گمراہی پر تھے۔ لہٰذا گزرے ہوئے اجداد کے حق میں یہ بات درست نہیں ہے۔ یوں آباء و اجداد کا یہ احترام 'بے حقیقت احترام' سچائی کو قبول کرنے کی راہ میں ہمیشہ ایک بڑی رکاوٹ رہا ہے۔ خصوصاً جب لوگ عقلی لحاظ سے جامد اور کورے ہو جاتے ہیں اور ایسے جمود اور وہم پرستی اور آباء پرستی سے لوگوں کو نکالنے کے لیے ان کو بڑا ذہنی جھٹکا دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ لوگ آزادانہ غور و فکر سے کام لیں۔

اس جمود اور غفلت میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو جگانے کے لیے ضروری تھا کہ حضرت ابراہیم ان کو ایک سخت جھٹکا دیں حالانکہ حضرت ابراہیم اپنے مزاج کے اعتبار سے نہایت ہی نرم اور سنجیدہ تھے۔ چنانچہ آپ یہ اعلان کرتے ہیں کہ اچھا میں تو ان کا دشمن ہوں اور ان تمام نظریات کا دشمن ہوں جو اس بت پرستی کی اساس پر اٹھائے گئے ہیں۔

قَالَ أَفَرَأَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ﴿٧٥﴾ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمُ الْأَقْدَمُونَ ﴿٧٦﴾

فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيٓ إِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِينَ ﴿۷۷﴾

"اس پر ابراہیم نے کہا کبھی تم نے (آنکھیں کھول کر) ان چیزوں کو دیکھا بھی جن کی بندگی تم اور تمہارے پچھلے باپ دادا بجالاتے رہے؟ میرے تو یہ سب دشمن ہیں، بجز ایک رب العالمین کے"۔

یوں انہوں نے اعلان کیا کہ میرا باپ اور میری قوم بھی ان کی پرستش کرتی ہے مگر میں ان عقائد کو نہ صرف ترک کرنے کا اعلان کرتا ہوں بلکہ ان کا دشمن ہوں۔ ان الٰہوں کا دشمن ہوں، آباء پرستی کا دشمن ہوں اور اپنی پرانی تاریخ اور قدیم سے قدیم ترین اجداد کا دشمن ہوں۔

یوں قرآن مجید اہل ایمان کو تعلیم دیتا ہے کہ سچائی کے مقابلے میں اگر باپ آجائے، قوم آجائے، آباؤ اجداد کی روایات آجائیں سب کو ٹھکرانا لازمی ہے کیونکہ اسلام کے بعد تمام انسانی رابطوں کو کاٹ کر صرف اسلامی رابطہ اور تعلق اپنانا فرض ہے۔ اسلام میں ایمان اور نظریہ کو اولیت حاصل ہے اور باقی سب چیزیں اس کے تابع ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام آباء واجداد کی روایات کا انکار کرتے ہوئے صرف رب العالمین کی روایات کو مستثنیٰ کرتے ہیں۔

فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيٓ إِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِينَ (۲۶:۷۷) "میرے تو یہ سب دشمن ہیں بجز رب العالمین کے"۔ کیونکہ ان کے آبائے اقدمین میں ضرور ایسے لوگ بھی ہوں گے جو صرف اللہ کی عبادت کرتے ہوں گے۔ تاریخ کے اس دور میں جب ان کے عقائد فساد کا شکار نہ ہوئے تھے اور ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے رب العالمین کے ساتھ دوسروں کی بندگی بھی کی ہو۔ اس لیے آپ نے غایت درجہ احتیاط کرتے ہوئے یہاں رب العالمین کو مستثنیٰ کر دیا اور یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے سنجیدہ شخص کے لائق تھی کیونکہ آپ یہاں ایمان اور نظریہ پر مکالمہ کر رہے تھے اور ظاہر ہے کہ ایمان اور عقیدے اور نظریہ کی بات بڑی نازک ہوتی ہے۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام رب العالمین کی صفات بیان کر کے تعارف کراتے ہیں جس کے ساتھ آپ کا رابطہ ہر حال اور ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ وہ ہمارے قریب ہے۔ انسان کی ہر حرکت اور ہر سکون میں وہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسان کی تمام حاجات اور ضروریات وہ فراہم کرتا ہے۔

الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ ﴿۷۸﴾ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ ﴿۷۹﴾ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ﴿۸۰﴾ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيٓ أَطْمَعُ أَن يَغْفِرَ لِي خَطِيٓئَتِي يَوْمَ الدِّينِ ﴿۸۲﴾

"جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔ جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روز جزا میں وہ

میری خطا معاف فرما دے گا"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں اپنے رب کی جو حمد کی ہے اور اس میں وہ تفصیلات تک چلے گئے ہیں اور تصویر کشی کی ہے' اس سے ہمیں یہ شعور ملتا ہے کہ آپ' اپنی پوری شخصیت کے ساتھ معرفت رب میں ڈوبے ہوئے تھے اور ان کی پوری شخصیت کا خدا کے ساتھ رابطہ تھا۔ وہ نہایت ہی محبت سے اللہ کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور حضرت اپنے رب کی حمد اس طرح کرتے تھے کہ گویا وہ اللہ کو دیکھ رہے ہوں۔ اور وہ اپنے تمام احساسات' تمام شعور اور وجدان کے ساتھ اور اپنے تمام اعضاء کے ساتھ اللہ کے فضل و کرم کو پا رہے تھے۔ قرآن کریم نے حضرت ابراہیم اور رب العالمین کے تعلق کو جس قدر دھیمے نغمے کے ساتھ یہاں بیان کیا ہے اس سے اس تعلق کی فضا' اس کے آثار اور پرتو اچھی طرح واضح ہوتا ہے۔ میٹھا اور نرم نغمہ اور طویل اور وسیع اثرات۔

الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ (٢٦:٧٨) "جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی میری راہنمائی فرماتا ہے"۔ اس نے مجھے پیدا کیا' وہی جانتا ہے اور میں نہیں جانتا کہ کہاں کہاں سے اجزائے جسم جمع ہوئے۔ میری ماہیت اور میری تشکیل سے وہی باخبر ہے۔ میرے فرائض اور میرے شعور کی باریکیوں سے بھی وہی باخبر ہے۔ میرے مال اور میرے مآل سے بھی وہی خبردار ہے۔ فَهُوَ يَهْدِيْنِ (٢٦:٧٨) "پھر وہی تو ہے جو میری راہنمائی فرماتا ہے"۔ اپنی طرف راہنمائی' جس راہ پر مجھے چلنا ہے اس کی نشاندہی' جس نظام کے مطابق مجھے زندگی بسر کرنی ہے۔ اس کی نشاندہی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ احساس دے رہے ہیں کہ وہ اس طرح ہیں جس طرح پگھلا ہوا مادہ۔ اس سے صانع جو چاہتا' بنا لیتا ہے۔ جس شکل و صورت میں چاہتا ہے مصنوعات تیار کر لیتا ہے یہ ہے مکمل اطاعت' مکمل سپردگی' مکمل اطمینان' راحت' سکون اور اعتماد ذات باری پر۔

وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَ يَسْقِيْنِ (٢٦:٧٩) وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ

(٢٦:٨٠) "جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی شفا دیتا ہے"۔ یہ براہ راست کفالت ہے' گہری شفقت ہے' ساتھ رہنے والی محبت ہے' اس کا احساس ابراہیم ہی کر سکتے ہیں۔ صحت میں اور مرض میں حضر میں اور سفر میں' ہر حال میں' بلند آداب نبوت کے ساتھ' جو جانتے ہیں کہ مرض بھی تو اللہ کی مشیت سے آتی ہے۔ نہیں' وہ اس کو اللہ کی طرف منسوب نہیں کرتے حالانکہ مرض و شفا دونوں اللہ کی طرف سے ہے۔ لیکن مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ (٢٦:٨٠) میں گہرا احترام ملحوظ ہے۔ کرم کا مقام يُطْعِمُنِيْ وَ يَسْقِيْنِ (٢٦:٧٩) اور يَشْفِيْنِ لیکن ابتلا میں فعل کا اسناد خود اپنی طرف کرتے ہیں۔ یہ ہے مقام ابراہیم۔

وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ (٢٦:٨١) "جو مجھے موت دے گا اور دوبارہ زندگی بخشے گا"۔ ہر مسلمان کا یہ ایمان ہے کہ موت کا فیصلہ اللہ کرتا ہے اور پھر ایک دن حساب و کتاب کے لیے اللہ ہی اٹھائے گا۔ لہذا یہ مکمل تسلیم و رضا کا اظہار ہے۔

وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَلِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ (۲۶ : ۸۲) "اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روز جزاء میں میری خطا معاف فرمائے گا"۔ حضرت ابراہیم جو نبی اور رسول ہیں ان کی منتہائے آرزو ہے کہ اللہ قیامت کے دن ان کی خطائیں معاف کر دے ' حالانکہ وہ پوری طرح عارف باللہ ہیں۔ وہ اللہ کی ذات کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور ان کے نفس کی گہرائیوں میں رب کی معرفت رچی بسی ہے۔ وہ اپنے نفس کو پاک و صاف تصور نہیں کرتے۔ اس معرفت اور قرب کے ساتھ پھر بھی ڈرتے ہیں کہ ان سے کوئی خطا ہوئی ہو' وہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہیں کرتے نہ وہ اپنے اعمال کی اساس پر اپنے آپ کو مستحق نجات کہتے ہیں۔ وہ فضل ربی پر بھروسہ کرتے ہیں' اللہ کی رحمت کے طلبگار ہیں اور یہ رحمت خداوندی ہے جس کے وہ امیدوار ہیں کہ عفو و درگزر ہو گا اور تب ان کی نجات ہو گی۔

تقویٰ اور خدا خوفی کا یہ پیغمبرانہ شعور ہے' ادب و احترام پر مبنی شعور ہے' نہایت احتیاط کا انداز ہے۔ اللہ کی عظمتوں اور اللہ کے انعامات کا یہ حقیقی شعور ہے۔ اس شعور کے مطابق عمل کی قیمت بہت ہی کم ہے اور مغفرت کی قیمت زیادہ ہے۔

یوں ذات باری کے بارے میں حضرت ابراہیم اپنے عقائد کے بنیادی عناصر ترکیبی یہاں بیان کرتے ہیں کہ رب العالمین وحدہ لاشریک ہے' زمین پر انسان کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی اللہ رب العالمین متصرف ہے۔ بعث بعد الموت اور حساب و کتاب میں صرف فضل الٰہی بندے کو بچا سکتا ہے۔ اعمال کے اعتبار سے بندہ پر تقصیر ہی ہوتا ہے اور یہ وہ باتیں ہیں کہ مشرکین اور ابراہیم کی قوم ان کی منکر ہے۔

حضرت ابراہیم جو نہایت ہی حلیم الطبع اور اللہ کے سامنے گریہ و بکا کرنے والے ہیں وہ نہایت ہی خضوع و خشوع کے ساتھ اپنی دعا کو آگے بڑھاتے ہیں۔

رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَّ أَلْحِقْنِي بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَاجْعَلْ لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَاجْعَلْنِي مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿۸۵﴾ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۹﴾

ابراہیم نے دعا کی "اے میرے رب' مجھے حکم عطا کر۔ اور مجھ کو صالحوں کے ساتھ ملا۔ اور بعد کے آنے والوں میں مجھ کو سچی ناموری عطا کر اور مجھے جنت نعیم کے وارثوں میں شامل فرما۔ اور میرے باپ کو معاف کر دے کہ بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے اور مجھے اس دن رسوا نہ کر جبکہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد' بجز اس کے کہ کوئی شخص قلب سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو"۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کی اس دعا پر ذرا غور فرمائیں کہ اس میں اس دنیا کے اغراض میں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ یہاں تک کہ یہ بھی نہیں کہا کہ اے اللہ' مجھے صحت عطا کیجئے۔ یہ پوری دعا بلند مقاصد اور اعلیٰ اور پاکیزہ شعور کی تحریک ہے۔ یہ اس خدا رسیدہ دل کی دعا ہے جس کے پیش نظر اللہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کے ہاں اللہ کے سوا ہر

چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اور معرفت کے جس مقام تک یہ دل پہنچا ہے اس کے آگے مزید کا طلبگار ہے اور ایک ایسے قلب سے نکلی ہوئی دعا بیم و رجا کی حالت میں ہے کیونکہ اس نے اللہ کے کرم دیکھے ہوئے ہیں اور مزید کا امیدوار ہے۔

رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا (٢٦:٨٣) "اے میرے رب' مجھے حکم عطا کر"۔ اے اللہ مجھے ایسی حکمت عطا کر جس کی روشنی میں کھری اور کھوٹی قدروں کے درمیان تمیز کر سکوں تاکہ میں ایسے طرز عمل پر قائم رہوں جو مجھے باقی رہنے والی قدروں تک پہنچائے۔

وَّأَلْحِقْنِي بِالصّٰلِحِيْنَ (٢٦:٨٣) "اور مجھے صالحوں کے ساتھ ملا دے"۔ یہ حضرت ابراہیم کی دعا ہے جو نبی اور رسول ہیں اور گڑگڑانے والے اور نہایت ہی حلیم الطبع ہیں۔ اس عظیم المرتبہ ابو الانبیاء کی تواضع قابل دید ہے۔ ان کی احتیاط قابل ملاحظہ ہے۔ کس قدر خدا خوفی ان کی باتوں میں اور کس قدر اعتراف قصور ہے۔ وہ بروقت ڈرتے ہیں کہ انسان کا دل کسی بھی وقت برائی کی طرف مائل ہو سکتا ہے اس لیے وہ صالحین کی محفل اور ماحول کے طلبگار ہیں وہ اللہ کی توفیق سے عمل صالح کے لیے یا عمل صالح پر قائم رہنے کے آرزومند ہیں۔

وَاجْعَلْ لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ (٢٦:٨٤) "اور بعد میں آنے والوں میں مجھ کو سچی ناموری عطا کر"۔ آپ کی دعا یہ ہے کہ میری شروع کی ہوئی دعوت توحید قیامت تک رہے۔ وہ کثرت اولاد کے لیے دعا نہیں کرتے بلکہ آپ کی دعا آنے والی نسلوں میں آپ کے نقش قدم پر چلنے والے مداحوں کے لیے ہے کہ وہ آپ کی دعوت توحید کو قبول کریں۔ اور "دین حنیف" کو اپنائیں اور یہی دعا آپ نے قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی کی ہے۔ اس وقت جب آپ اور آپ کے بیٹے اسماعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (١٢٨) رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (١٢٩) (٢: ١٢٨ - ١٢٩) "اے رب' ہم دونوں کو اپنا مسلم بنا' ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو' ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما۔ تو بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔ اور اے ہمارے رب' ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھائیو' جو انہیں تیری آیات سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے' تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے"۔ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول فرمائی۔ آپ کی دعوت کو پھیلایا۔ اور آنے والے زمانوں میں ان کے لیے

تمام لوگ کلمہ خیر کہنے والے ہوئے۔ اور پھر آپ کی دعا کے مطابق نبی آخر الزمان پیدا ہوئے۔ اور ہزار ہا سال کے بعد یہ دعا پوری ہوئی۔ لوگوں کے حساب میں تو دنیا کے ہزار ہا سال بہت طویل ہیں لیکن اللہ کے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اور اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ دعائے ابراہیمی اس قدر عرصہ کے بعد قبول ہو۔

وَاجْعَلْنِي مِنْ وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ (٨٥:٢٦) "اور مجھے جنت نعیم کے وارثوں میں شامل فرما"۔ اس سے قبل آپ نے دعا فرمائی تھی کہ مجھے صالحین کے گروہ میں شامل فرما اور عمل صالح کی توفیق دے کہ میں صالحین کی صفوں میں چلوں اور پھر اس جنت میں داخل ہو جاؤں جس کی وراثت عباد صالحین کا حق ہے۔

وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ (٨٦:٢٦) "اور میرے باپ کو معاف کر دے۔ بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے"۔ باوجود اس کے کہ حضرت ابراہیم کو ان کے والد نے سختی سے ڈانٹا اور تہدید آمیز گفتگو کی لیکن انہوں نے اس گفتگو کے وقت بھی وعدہ کیا تھا کہ میں تیرے لیے دعا ہی کرتا رہوں گا۔ یہ اس وعدے کی وجہ سے والد کے حق میں دعا فرما رہے ہیں۔ بعد میں یہ بات قرآن نے بیان کر دی کہ مشرکین کے لیے دعائے مغفرت کرنا جائز نہیں ہے۔ اگرچہ وہ قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہوں اور قرآن کریم نے اس بات کی بھی صراحت کر دی کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت اس لیے کی تھی کہ انہوں نے باپ کے ساتھ اس کا وعدہ کیا تھا۔

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ "جب اسے معلوم ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس نے باپ سے برات کا اظہار کر دیا"۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جان لیا کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست۔ یہاں تو اخوت نظریاتی اخوت ہیں۔ اسلامی تربیت کے بنیادی عناصر میں سے ایک عنصر یہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں پہلا آمیزہ اور رابطہ اور تعلق نظریاتی تعلق ہے۔ اور کسی انسان اور انسان کے درمیان مضبوط تعلق صرف نظریات کا ہو سکتا ہے جب یہ تعلق کٹ جائے تو تمام تعلقات کٹ جاتے ہیں۔ اور پھر انسان انسان سے دور ہو جاتا ہے۔ کوئی رابطہ اور تعلق نہیں رہتا۔

وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ (٨٧:٢٦) يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ (٨٨:٢٦)

إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (٨٩:٢٦) "اور مجھے اس دن رسوا نہ کر جبکہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد، بجز اس کے کہ کوئی شخص قلب سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو"۔ ابراہیم علیہ السلام کی اس بات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ قیامت کا دن کس قدر ہولناک ہو گا اور یہ کہ حضرت ابراہیم اللہ سے کس قدر حیا فرماتے ہیں، اور اللہ کے سامنے شرمندہ ہونے سے کس قدر خائف ہیں اور یہ خوف اپنی تقصیر کی وجہ سے ہے کہ وہ ایک معزز نبی ہیں۔ نیز حضرت کی اس دعا سے "جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے نہ اولاد، بجز اس کے کہ کوئی قلب سلیم لے کر اللہ کے حضور حاضر ہو"۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یوم قیامت کی ذمہ داریوں کو کس قدر تفصیل کے ساتھ سمجھ لیا تھا۔ نیز آپ نے دنیاوی اقدار اور اسلامی اقدار کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ کیونکہ یوم القیامہ میں وہی کامیاب ہو گا جو اخلاص کے ساتھ آئے اور اس کا دل اللہ کے لیے ہو جائے۔ اور اس کے اندر دنیا

کا کوئی بت یا مقصد نہ ہو۔ ہر بیماری سے پاک ہو' ہر فساد سے پاک ہو' ہر قسم کی خواہشات اور انحرافات سے پاک ہو۔ اللہ کے سوا کسی اور الٰہ د معبود سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ ہے قلب کی سلامتی جس کا اسلام اور قیامت میں کوئی وزن ہو گا۔

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ (۲۶ : ۸۸) "جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد"۔ دنیا کی کوئی قدر اور کوئی ترجیح اس دن مفید مطلب نہ ہو گی حالانکہ اس دنیا میں ان مطالب اور ترجیحات کے پیچھے انسان کتوں کی طرح دوڑتے ہیں لیکن آخرت کے ترازو میں یہ ترجیحات بے وزن ہیں۔

اب یہاں قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر آتا ہے۔ وہ دن جس سے حضرت ابراہیم اس قدر خائف ہیں تو وہ دیکھو وہ دن نمودار ہوا۔ حضرت ابراہیم ابھی ہاتھ اٹھائے ہوئے ہیں اور دست بدعا ہیں کہ منظر پر اس دن کا نقشہ نمودار ہوتا ہے۔

وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۹۰﴾ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِلْغٰوِیْنَ ﴿۹۱﴾ وَ قِیْلَ لَهُمْ اَیْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۹۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ هَلْ یَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ یَنْتَصِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَكُبْكِبُوْا فِیْهَا هُمْ وَ الْغَاوٗنَ ﴿۹۴﴾ وَ جُنُوْدُ اِبْلِیْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿۹۵﴾ قَالُوْا وَ هُمْ فِیْهَا یَخْتَصِمُوْنَ ﴿۹۶﴾ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۹۷﴾ اِذْ نُسَوِّیْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۸﴾ وَ مَاۤ اَضَلَّنَاۤ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۹۹﴾ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِیْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَ لَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۲﴾

"(اس روز) جنت پرہیزگاروں کے قریب لے آئی جائے گی اور دوزخ بہکے ہوئے لوگوں کے سامنے کھول دی جائے گی اور ان سے پوچھا جائے گا کہ "اب کہاں ہیں وہ جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے؟ کیا وہ تمہاری کچھ مدد کر رہے ہیں یا خود اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں؟" پھر وہ معبود اور یہ بہکے ہوئے لوگ' اور ابلیس کے لشکر سب کے سب اس میں اوپر تلے دھکیل دیئے جائیں گے۔ وہاں یہ سب آپس میں جھگڑیں گے اور یہ بہکے ہوئے لوگ (اپنے معبودوں سے) کہیں گے کہ "خدا کی قسم' ہم تو صریح گمراہی میں مبتلا تھے جب کہ تم کو رب العالمین کی برابری کا درجہ دے رہے تھے' اور وہ مجرم لوگ ہی تھے جنہوں نے ہم کو اس گمراہی میں ڈالا۔ اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے اور نہ کوئی جگری دوست۔ کاش ہمیں ایک دفعہ پھر پلٹنے کا موقع مل جائے تو ہم مومن ہوں"۔

جنت کو ایسے لوگوں کے بالکل قریب کر دیا جائے گا جو خدا کے عذاب سے ڈرتے تھے۔ اور جہنم پر سے بھی پردہ اٹھا دیا جائے گا بہکے ہوئے سرکش گمراہوں کے لیے بالکل صاف صاف نظر آئے گی' وہ لوگ جنہوں نے راستہ گم کر دیا تھا اور اس دن کو جھٹلاتے تھے۔ اب وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہاں اب ان پر لعنت و ملامت ہو گی اور قبل اس

کے کہ انہیں اس میں اوپر نیچے گرا دیا جائے ۔ان سے پوچھا جائے گا کہ یہ لوگ جن معبودوں کی بندگی کرتے تھے' وہ کہاں ہیں ۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے کی مناسبت سے یہاں یہ سوال لایا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے ساتھ ایسا ہی مکالمہ کیا تھا کہ آیا یہ بت سنتے بھی ہیں یا نفع و نقصان ہی دے سکتے ہیں ۔اب قیامت میں ان سے کہا جائے گا۔

اَیۡنَمَا كُنۡتُمۡ تَعۡبُدُوۡنَ (۲۶:۹۲) مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (۲۶:۹۳) "کہ اللہ کے سوا تم جن کی پوجا کرتے تھے وہ کہاں ہیں"۔

هَلۡ يَنۡصُرُوۡنَكُمۡ اَوۡ يَنۡتَصِرُوۡنَ (۲۶:۹۳) "کیا وہ تمہاری کچھ مدد کر سکتے ہیں یا اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں"۔ اس کے بعد ان کا کوئی جواب سامنے نہیں آتا نہ ان کے جواب کا انتظار کیا جاتا ہے ۔یہاں تو محض سوال کرنا ہی مطلوب تھا' صرف سوال ہی سے سرکوبی اور ملامت مطلوب تھی۔

فَكُبۡكِبُوۡا فِيۡهَا هُمۡ وَ الۡغَاوُنَ (۲۶:۹٤) وَ جُنُوۡدُ اِبۡلِيۡسَ اَجۡمَعُوۡنَ

(۲۶:۹۵) "پھر وہ معبود' یہ بہکے ہوئے لوگ اور ابلیس کے لشکر سب کے سب اس میں اوپر تلے دھکیل دیئے جائیں گے"۔ لفظ کبکبوا کے تلفظ ہی سے اور اس کی صوتی شوکت سے ہی یہ تاثر ملتا ہے کس طرح انہیں دفع کیا جاتا ہے' کس طرح جہنم کے دھانے سے نیچے بے رحمی کے ساتھ گرایا جاتا ہے' بغیر کسی ترتیب اور رعایت کے یہ لوگ اوپر تلے گرتے ہیں اور اس پورے عمل سے ایک کبکبہ اور ایک غلغلہ بلند ہوتا ہے۔جس طرح دریا کا کوئی بلند کنارہ گرتا ہے اور اس کے گرنے کی ذوبلی ہوئی آواز بلند ہوتی ہے۔کبکبوا ایسا ہی لفظ ہے جس کے تلفظ ہی سے مفہوم ذہن کی طرف دوڑتا ہے۔یہ چونکہ گمراہ اور سرکش تھے اس لیے ان کے ساتھ سب سرکش گرائے گئے۔اور شیطان کے لشکر کے لشکر لائے جاتے ہیں اور گرائے جاتے ہیں اور ان کے گرنے سے کبکبہ اور غلغلہ بلند ہوتا ہے۔یہاں مخصوص مجرمین کو پہلے خصوصیت کے ساتھ گرایا جائے گا اور بعد میں عام گرائی شروع ہوگی۔

اب یہ لوگ جہنم میں پڑے ہیں مگر مکالمہ بھی سنائی دیتا ہے ۔یہ اپنے بتوں اور الہوں کے بارے میں اب یوں تبصرے کرتے ہیں۔

تَاللّٰهِ اِنۡ كُنَّا لَفِيۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ (۲۶:۹۷) اِذۡ نُسَوِّيۡكُمۡ بِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ

(۲۶:۹۸) "یہ بہکے ہوئے لوگ ان معبودوں سے کہیں گے خدا کی قسم ہم تو صریح گمراہی میں مبتلا تھے جبکہ تم کو رب العالمین کی برابری کا درجہ دے رہے تھے"۔تمہاری عبادت بھی رب العالمین کی عبادت کی طرح کرتے تھے۔یا تو رب العالمین کے ساتھ تمہاری عبادت کرتے تھے یا اس سے الگ۔اب تو یہ لوگ جہنم میں یہ بات کہہ رہے ہیں لیکن اس کا فائدہ کیا ہے؟ یہ تو سب ذمہ داری ان لوگوں پر ڈال رہے ہیں جنہوں نے ان کو گمراہ کیا تھا۔جنہوں نے ان کو گمراہ کیا اور راہ راست کی طرف آنے سے روک دیا لیکن جب یہ جہنم میں قرار پکڑیں گے تو ہوش آئے گا کہ اب تو وقت گزر گیا

ہے - اور یہ واویلا بعد از وقت ہے - اب اگر ہم ذمہ داریاں تقسیم بھی کر دیں تو فائدہ کیا ہوگا -

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ (۲۶: ۱۰۰) وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ (۲۶: ۱۰۱) "اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے اور نہ کوئی جگری دوست" - اب نہ الٰہ ہیں جو سفارش کریں - نہ دوست ہیں جو کام آئیں - اگر سفارش نہیں ہے تو کیا ہم دنیا کی طرف لوٹ نہیں سکتے کہ وہاں دوبارہ جاکر درست رویہ اختیار کریں -

فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۶: ۱۰۲) "کاش ہمیں ایک دفعہ پھر پلٹنے کا موقعہ مل جائے تو ہم مومن ہوں" - مگر یہ تو تمنا ہی تمنا ہوگی - نہ واپسی ہوگی 'نہ سفارش ہوگی - یہ ہوگا یوم الدین - اب آخری تبصرہ!

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٠٣﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ ۵
لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٠٤﴾ ع ۲۳
۹

"یقیناً اس میں ایک بڑی نشانی ہے - مگر ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں - اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی"۔

یہ وہی تبصرہ ہے جو اس سورت میں قوم عاد' قوم ثمود اور قوم لوط کی تباہی کے واقعات کے بیان کے بعد آیا ہے - نیز یہ تبصرہ ان تمام معجزات کے بعد بھی آیا ہے - جو جھٹلانے والوں کو دکھائے گئے - قیامت کے مناظر میں سے یہ منظر ان مکذبین کے مناظر عبرت کے بالمقابل آیا ہے - جن کا تذکرہ اس سورت میں آیا ہے اور جن کو اس جہاں میں نیست و نابود کیا گیا - یہاں قوم ابراہیم اور ان مشرک اقوام کے انجام کی تصویر کشی کی گئی تھی - اور اس سورت کے تمام قصص سے یہی سبق دینا مطلوب ہے - قرآن کریم میں قیامت کے مناظر اسی طرح پیش کیے جاتے ہیں جس طرح گویا یہ افعال ہمارے سامنے واقع ہو رہے ہیں - ہمیں نظر آ رہے ہیں - اس انداز بیان سے وہ انسانی شعور کا جزء بن جاتے ہیں - انسانی وجدان جاگ اٹھتا ہے جس طرح تاریخ میں انسانوں نے دیکھا کہ مکذبین کو مختلف عذابوں میں مبتلا کر کے نیست و نابود کیا گیا اور لوگ دیکھتے ہی رہے - اسی طرح قیامت کے مناظر ہوں گے -

---()()()---

# درس نمبر ۱۶۴ ایک نظر میں

جس طرح سابقہ قصے میں گردش ایام کو پیچھے کی طرف دوڑایا گیا تھا اور روئے سخن قصہ موسیٰ سے پیچھے قصہ ابراہیم کی طرف چلا گیا تھا۔ یہاں بھی قصہ ابراہیم سے آپ مزید پیچھے قصہ نوح کی طرف ہم جا رہے ہیں۔ یہاں دراصل تاریخی ترتیب قصص ملحوظ نہیں ہے۔ مقصد شرکیہ عقائد کے خلاف جدوجہد کے چند نمونے دینے ہیں۔

قصہ نوح بھی قصہ موسیٰ اور قصہ ابراہیم کی طرح کئی سورتوں میں آیا ہے۔ یہ قصہ اس سے قبل سورہ اعراف میں آیا ہے۔ سورہ اعراف میں نزول آدم کے بعد اختصار کے ساتھ آیا تھا جس میں آپ نے قوم کو توحید کی طرف بلایا تھا اور قیامت کے دن کے عذاب عظیم سے ڈرایا تھا اور یہ بتایا تھا کہ قوم نوح نے الٹا نوح علیہ السلام سے کہا کہ وہ گمراہ ہو گئے ہیں۔ ان کو تعجب ہوا کہ اللہ ان کے طرف ان جیسا انسان کس طرح بھیج سکتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو ہدایت دے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے آپ کی قوم کو غرق کیا اور آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو نجات دے دی۔

یہ قصہ سورہ یونس میں بھی اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے' یہ آپ کی رسالت کا آخری دور تھا' جب آپ نے اپنی قوم کو چیلنج کیا۔ انہوں نے ان کی تکذیب کی۔ آپ اور آپ کے ساتھیوں کو کشتی کے ذریعے نجات ملی اور دوسرے فریق کو غرق کر دیا گیا۔

سورت ہود میں اس قصے کی تفصیلات دی گئی ہیں اس میں کشتی' طوفان اور اپنے بیٹے کے بارے میں حضرت نوح کی دعا جو غرق ہوا اور پھر طوفان کے بعد کے واقعات اور وہ واقعات جو طوفان سے پہلے تبلیغ کے دوران ان کو پیش آئے۔

سورت المومنون میں بھی یہ قصہ آیا ہے۔ وہاں حضرت نوح اپنی قوم کو رب واحد کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں جبکہ قوم یہ اعتراض کرتی ہے کہ تم تو ہم جیسے انسان ہو اور ہم پر فضیلت حاصل کرنے کے لیے یہ باتیں کرتے ہو۔ اگر اللہ کو کوئی نبی بھیجنا بھی تھا تو وہ فرشتے بھیج سکتا تھا۔ انہوں نے آپ پر مجنوں ہونے کا الزام عائد کیا۔ وہاں پھر حضرت نوح رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور نصرت طلب کرتے ہیں اور وہاں پھر کشتی اور طوفان کی طرف ایک سرسری اشارہ ہوتا ہے۔

بالعموم قصہ نوح' قصص عاد' ثمود' لوط اور اہل مدین کے قصے نے ساتھ آتا ہے۔ اس سورت میں بھی یہی صورت حال ہے۔ یہاں اس قصے میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ قوم سے کہتے ہیں کہ خدا خوفی اختیار کرو' یہ کہ وہ ان سے کسی اجر کے طلبگار نہیں ہیں اور یہ کہ ان کی قوم کے کبراء ان سے جو مطالبہ کرتے تھے کہ تمہارے پاس جو غریب اہل ایمان چپکے ہوئے ہیں' ان کو دور کرو' جس سے حضرت نوح انکار فرماتے تھے اور بعینہ یہی مطالبہ حضور اکرمؐ سے بھی اہل مکہ کرتے تھے۔ اس کے بعد حضرت نوح دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ان کے اور ان کی قوم کے تنازعہ کا فیصلہ حق کے ساتھ فرما دے۔ اللہ ان کے اس سوال کو پورا کرتا ہے اور مکذبین کو ہلاک کرتا ہے اور اہل ایمان کو بچا لیتا ہے۔

---()()()---

# درس نمبر ۱۶۴ تشریح آیات

# ۱۰۵---تا---۱۲۲

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ

"قوم نوح نے رسولوں کو جھٹلایا"۔ یہ تو قصے کا انجام بتا دیا' قصے کا انجام پہلے لا کر پھر تفصیلات دی جاتی ہیں تاکہ قاری کو معلوم ہو جائے کہ روئے سخن کدھر ہے۔

سوال یہ ہے کہ قوم و نوح نے تو صرف نوح علیہ السلام کو جھٹلایا جبکہ قرآن کہتا ہے اس نے رسولوں کو جھٹلایا۔ رسالت اپنی حقیقت کے اعتبار سے دراصل ایک حقیقت ہے۔ تمام رسولوں کی دعوت یہی رہی ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اور صرف اسی کی بندگی کرنا چاہیے۔ جو شخص یا جو قوم ایک رسول کی تکذیب کرے وہ دراصل تمام رسولوں کی تکذیب کرتا ہے۔ قرآن کریم اس مفہوم اور حقیقت کو مختلف مقامات پر دہراتا ہے۔ اور مختلف انداز اور اسالیب میں اس بات کو دہرایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ اسلامی نظریہ حیات کا ایک مسلمہ اصول ہے تمام رسولوں کی دعوت میں یہ اصول مسلم رہے ہیں۔ اور اسی اصول پر انسانیت کی تقسیم ہوتی رہی ہے۔ یعنی رسولوں کو ماننے والے ایک طرف اور نہ ماننے والے دوسری طرف۔ تمام رسالتوں اور تمام زمانوں میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ ایک مسلمان جب دیکھتا ہے تو ہر دین اور ہر عقیدے میں امت ایک ہی رہی ہے۔ ابتدائی تاریخ سے لے کر آج تک اور آخری دین توحید اسلام تک۔ ہر ملت اور ہر دین میں صنف مخالف کافروں اور منکرین کی رہی ہے۔ اہل ایمان وہ ہیں جو رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور اہل کفر وہ ہیں جو انکار کرتے ہیں۔ اہل ایمان تمام رسولوں کا احترام کرتے ہیں اور ان پر ایمان لاتے ہیں کیونکہ منصب رسالت کی نوعیت اور حقیقت ایک ہے۔

ایک مسلم کے اندازے کے مطابق انسانیت کی تقسیم رنگوں' علاقوں اور نسلوں کے مطابق نہیں کی جا سکتی۔ انسانیت کی تقسیم صرف اہل حق اور اہل باطل دو گروہوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اور آغاز انسانیت سے لے کر یہی تقسیم رہی ہے۔ لہذا اسلامی نقطہ نظر سے تاریخ کے لیے ایک ہی معیار اور ایک ہی ترازو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مسلم کی ذہنیت اور اس کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ وہ رنگ و نسل اور قوم و وطن سے بالا ہو کر سوچتا ہے۔ اس کے موجودہ روابط یا تاریخی روابط وہی ہوتے ہیں جو ایمانی اقدار پر مبنی ہوں۔ وہ ایمانی اقدار کے اصول پر سب کا محاسبہ کرتا ہے اور اپنی تمام اقدار اور افکار کو ایمان ہی کے معیار پر تولتا ہے۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٠٦﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٠٧﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٠٨﴾

”قوم نوح نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ ان کے بھائی نوح علیہ السلام نے ان سے کہا تھا ”کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں' لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو“۔

یہ تھی حضرت نوح کی قوم 'جس نے حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب کی۔ خود اپنی قوم نے ان کی تکذیب کی اور وہ خود ان کے بھائی تھے۔ حالانکہ اخوت کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ لوگ نوح کے ساتھ رواداری برتتے اور اطمینان سے ایمان لاتے اور تصدیق کرتے۔ لیکن ان کی قوم نے برادرانہ رواداری کا مظاہرہ بھی نہ کیا اور خود اپنے بھائی کی ہمدردانہ باتوں کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

الا تتقون (۲۶: ۱۰۶) ”کیا تم ڈرتے نہیں ہو“۔ ............... اور اس انجام سے نہیں ڈرتے ہو جو اس رویہ کا لازمی نتیجہ ہے جس پر تم ہو۔ اور تمہارے دل خوف اور خشیت محسوس نہیں کرتے۔ خدا خوفی کی طرف بلانا اس سورت کا مخصوص مضمون ہے۔ یہی بات حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہی اور یہی بات نوح نے اپنی قوم سے کہی اور یہی بات ہر رسول نے اپنی اپنی قوم سے کہی۔

انی لکم رسول امین (۲۶: ۱۰۷) ”میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں“۔ جو نہ خیانت کرتا ہے' نہ دھوکہ دیتا ہے اور نہ کوئی چیز چھپاتا ہے۔ نہ کوئی کمی کرتا ہے اور نہ بیشی اور مبالغہ کرتا ہے۔ بس جو کچھ اللہ نے حکم دیا وہ پہنچاتا ہے۔

فاتقوا اللہ و اطیعون (۲۶: ۱۰۸) ”لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو“۔ یوں حضرت نوح علیہ السلام ان کو خدا خوفی کی دعوت دیتے ہیں اور یہاں وہ ڈرنے کی نسبت اللہ کی طرف کرتے ہیں اور اس طرح ان کو اطاعت اور تسلیم پر آمادہ کرتے ہیں۔

پھر حضرت نوح دنیا کے مقاصد کی طرف سے ان کو اطمینان دلاتے ہیں۔ یہ کہ دعوت الی اللہ کی تحریک کے ساتھ ان کے کوئی مقاصد وابستہ نہیں ہیں۔ وہ ان سے کوئی اجر طلب نہیں کرتے کہ تم اللہ کی طرف رجوع کرو گے تو مجھے یہ انعام بھی دو گے۔ میرا اجر تو صرف اللہ پر ہے جس نے مجھے یہ دعوت دینے پر مامور کیا ہے۔ لوگوں سے یہ کہنا کہ میں تم سے کوئی دنیاوی اجر طلب نہیں کرتا' یہ بات ہر نبی نے کی ہے اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں تحریک اسلامی کی دعوت دینے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ تحریک کے ساتھ اپنے اغراض و مقاصد وابستہ نہ کریں کیونکہ ایک سچے داعی اور جھوٹے داعی میں فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ ایک جھوٹا داعی مفادات کے لیے دعوت سے وابستہ ہوتا ہے۔ تمام انبیاء کے زمانے میں کاہن اور دوسرے مذہبی راہنما لوگوں کے اموال باطل طریقے سے کھاتے تھے۔ ان کا کام ہی یہ ہوتا تھا کہ مختلف طریقوں

اور حیلوں سے لوگوں کے مال بٹورنے کی کوشش کریں۔ اس کے مقابلے میں داعیان حق ہمیشہ مخلص ہوتے تھے۔ وہ اس ہدایت پر کوئی فیس طلب نہ کرتے تھے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا اجر اللہ رب العالمین پر ہے۔

وَ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

"میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے"۔

یہاں ان سے مکرر یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ خدا سے ڈرو اور اطاعت اختیار کر لو' ہم تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے نہ مال کا حصول چاہتے ہیں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۱۰﴾

"پس تم اللہ سے ڈرو اور (بے کھٹکے) میری اطاعت کرو"۔ لیکن لوگ ان پر عجیب اعتراض کرتے ہیں اور انسانی تاریخ میں تمام رسولوں پر یہ اعتراض کیا گیا ہے۔

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَ اتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

"انہوں نے جواب دیا "کیا ہم تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے"۔

یہاں ارذلون سے مراد غرباء و فقراء ہیں اور یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو رسولوں کی پیروی اختیار کرتے ہیں۔ یہی لوگ ایمان لاتے اور استقامت [illegible] کرتے ہیں۔ اور ان غرباء کو راہ ہدایت اختیار کرنے سے یہی بے کار کبرا روکتے ہیں۔ اور یہ اس لیے روکتے ہیں کہ معاشرے میں ان کی پوزیشن اور ان کا مقام و مرتبہ کہیں آگے سے گر نہ جائے۔ غریب لوگ تو ہمیشہ دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور کبرا محروم رہتے ہیں ان کا مقام و مرتبہ انہیں حق سے دور رکھتا ہے۔ وہ اپنی مصلحتوں' جھوٹے حالات اور وہمی روایات کے خول سے باہر نہیں آ سکتے۔ پھر یہ کبرا اور معتبرین عقیدۂ توحید اختیار کر کے یہ پسند نہیں کرتے کہ عامۃ الناس اور جمہور کے ساتھ ان کا مقام اور مرتبہ برابر ہو جائے۔ کیونکہ اسلام میں داخل ہو کر نہ وہ خصوصی مراعات کا مطالبہ کر سکتے ہیں اور جھوٹے مرتبے کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ جبکہ اسلامی معاشرے میں ایک ہی قدر ہے "ایمان اور عمل صالح" یہی کسی کو اٹھاتی ہے اور کسی کو گراتی ہے اور اسلامی معاشرے میں ایک ہی میزان ہے "عقیدہ اور درست عمل"۔

چنانچہ حضرت نوح ان کو ایسا جواب دیتے ہیں جو ان ثابت شدہ قدروں کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ رسول کا فریضہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ لوگ جو کچھ کرتے ہیں ان کا ذمہ دار رسول نہیں ہے۔ حساب و کتاب لینے والا اللہ ہے۔

قَالَ وَ مَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى

رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَ مَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۵﴾

نوح نے کہا "میں کیا جانوں کہ ان کے عمل کیسے ہیں' ان کا حساب تو میرے رب کے ذمہ ہے 'کاش تم کچھ شعور سے کام لو۔ میرا یہ کام نہیں ہے کہ جو ایمان لائیں ان کو میں دھتکار دوں۔ میں تو بس ایک صاف صاف متنبہ کر دینے والا آدمی ہوں"۔

یہ بڑے لوگ عوام کے بارے میں ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ ان کے اخلاق و عادات اعلیٰ معیار کے نہیں ہوتے اور نہ ہی اعلیٰ طبقات میں برداشت کیے جاتے ہیں کیونکہ یہ اعلیٰ طبقات کے لوگ بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں اور ذوق لطیف رکھتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام ان سے کہتے ہیں کہ میں تو لوگوں سے ایمان لانے کے سوا کچھ مطالبہ نہیں کرتا اور یہ غریب لوگ جب ایمان لے آئے ہیں تو میں ان سے اب اور کیا مطالبہ کروں۔ اس سے قبل ان کے جو اعمال تھے وہ خدا ہی جانتا ہے۔ ان کی قدر و قیمت کا تعین اللہ کرے گا۔ اور اچھائیوں اور برائیوں پر جزا و سزا بھی اللہ دے گا۔ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے اور تمہاری حالت یہ ہے کہ وَ مَا تَشْعُرُوْنَ "تم شعور نہیں رکھتے"۔ کہ اللہ کے ترازو میں کون وزن رکھتا ہے جہاں تک میرا تعلق ہے تو میرا فریضہ صرف کھلے انداز سے ڈرانا ہے۔

جب حضرت نوح علیہ السلام نے واضح دلائل اور سیدھی منطق پیش کی اور اب وہ اس بات سے عاجز آگئے کہ حضرت نوح کے ساتھ مزید کوئی مکالمہ کر سکیں تو انہوں نے وہی ہتھیار استعمال کرنے کی دھمکی دی جس کو سرکش اور ظالم اور جابر ہمیشہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی حجت اور برہان کے مقابلے میں ڈنڈا۔ ہر زمان و مکان میں لاجواب انسان کا یہی دستور ہوتا ہے کہ جب اس کے پاس دلیل کا توشہ ختم ہوتا ہے تو وہ ہتھیار نکالتا ہے۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

"انہوں نے کہا "اے نوح' اگر تو باز نہ آیا تو پھٹکارے ہوئے لوگوں میں شامل ہو کر رہے گا"۔ اب سرکشی ننگی ہو کر سامنے آگئی۔ گمراہی نے اپنے ذرائع اور اوچھے ہتھیار استعمال کرنا شروع کر دیے اور حضرت نوح علیہ السلام کو معلوم تھا کہ یہ سنگ دل کوئی نرمی قبول نہیں کرتے۔

اب حضرت نوح علیہ السلام بھی اپنا آخری ہتھیار استعمال کرتے ہیں وہ اپنے والی اور مددگار کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کے سوا اہل ایمان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿۱۱۷﴾ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَ بَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّ نَجِّنِيْ وَ مَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

”نوح نے دعا کی ”اے میرے رب، میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا۔ اب میرے اور ان کے درمیان دو ٹوک فیصلہ کر دے اور مجھے اور جو مومن میرے ساتھ ہیں، ان کو نجات دے“۔

اور اللہ تعالیٰ کو تو خوب معلوم تھا کہ قوم نے ان کی تکذیب کر دی ہے۔ لیکن ہمیشہ شکایت، استغاثہ اور دادرسی کی استدعا وہاں کی جاتی ہے جہاں اختیار ہوتا ہے۔

فَافْتَحْ بَيْنِي وَ بَيْنَهُمْ فَتْحًا ( ۲۶ : ۱۱۸ ) ”میرے اور ان کے درمیان دو ٹوک فیصلہ کر دے“۔ حد ہو چکی ہے اور یہ لوگ ہرگز مان کر نہیں دیتے۔

وَ نَجِّنِي وَ مَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ( ۲۶ : ۱۱۸ ) ”مجھے اور جو مومن میرے ساتھ ہیں ان کو نجات دے“۔ اللہ نے اپنے نبی کا یہ استغاثہ قبول فرمایا۔ جن کو کفر نے دھمکی دی تھی کہ تمہیں رجم کر دیا جائے گا۔ کیونکہ تم لوگوں کو نیک بنانے کی کوشش کرتے ہو۔ اللہ اور رسول کی اطاعت کی دعوت دیتے ہو۔ اور پھر یہ کام بھی بہت ہی بے لوثی سے کرتے ہو۔ اور اس معاملے میں کوئی سودا بازی نہیں کرتے۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۱۹﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

”آخرکار ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو ایک بھری ہوئی کشتی میں بچا لیا اور اس کے بعد باقی لوگوں کو غرق کر دیا“۔

یوں نہایت ہی اختصار کے ساتھ حق اور باطل کی اس کشمکش کا انجام ہوا۔ اور یہ کشمکش بھی انسانیت کے نہایت ہی ابتدائی دور میں ہوئی۔ اور یہ کشمکش آخر تک اسی نہج پر چلتی رہی۔ جس طرح انسانی تاریخ طویل ہے اسی طرح حق و باطل کا یہ معرکہ بھی طویل ہے۔

اور اب وہی مانوس فقرہ، وہی عبرت آموز نتیجہ جو اس سورت میں مکرر آ رہا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ
٦
١٨ع لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۲﴾
١٠

”یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی“۔

--- ○○○ ---

# درس نمبر ۱۶۵ تشریح آیات

## ۱۲۳---تا---۱۴۰

قوم ہود احقاف میں رہتی تھی۔ یہ حضر موت کے قریب یمن کی طرف ریت کے ٹیلے ہیں۔ یہ قوم نوح علیہ السلام کے بعد بڑی ترقی یافتہ قوم رہی۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں کرۂ ارض کو سرکشوں سے پاک کر دیا گیا تھا، لیکن آپ کے بعد اپنی ترقی کی وجہ سے یہ لوگ سرکش ہو گئے۔

سورت اعراف میں ان کا قصہ مفصلاً آیا ہے۔ سورت ہود میں بھی آیا ہے۔ سورت مومنین میں یہ قصہ حضرت ہود کے ذکر کے بغیر آیا ہے۔ اس میں ان کا نام عاد بھی نہیں لیا گیا۔ یہاں بھی اس قصے کو بڑے اختصار کے ساتھ لیا گیا ہے۔ حضرت ہود اپنی قوم کو دعوت دیتے ہیں۔ قوم تکذیب کرتی ہے اور اللہ کی طرف سے مکذبین ہلاک کر دیے جاتے ہیں۔ اس کا آغاز بھی یوں ہوتا ہے جس طرح قصہ نوح کا آغاز ہوا تھا۔

كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۲۵﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾ وَ مَاۤ اَسْــٴَـلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۲۷﴾

"عاد نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ ان کے بھائی ہود نے ان سے کہا تھا "کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے"۔

ایک ہی بات ہے جسے تمام رسول دہراتے نظر آتے ہیں۔ اللہ کی طرف آ جاؤ، خدا سے ڈرو اور رسول کی اطاعت کرو، اور دنیا پرستی کو چھوڑ دو اور دنیا کا سازوسامان اور ترقی مومن کی منزل مقصود نہیں ہے۔ محض دنیا کے سازو سامان سے ذرا بلند ہو کر کام کرو، اور اللہ کے نزدیک جو عظیم اجر موجود ہے اس پر نظریں گاڑے رہو۔

اس کے بعد بعض اضافی باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس قوم کے مخصوص افعال تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ تم بڑے بڑے مکانات بنانے میں سخت اسراف اور فضول خرچی سے کام لیتے ہو، محض عظمت کے اظہار کے لیے، دولت کی نمائش کے

لیے - بڑے بڑے پلازے اور ملٹی سٹوری بلڈنگز - مزید یہ کہ تم نے دنیا کی مادی قوتوں کو مسخر کر لیا ہے اور اس پر نازاں ہو اور اللہ کی قوت سے غافل ہو جو تمہیں ہر وقت دیکھ رہا ہے۔

أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ﴿١٢٨﴾ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ﴿١٢٩﴾

"یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو' اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے"۔

ریع عربی میں بلند زمین کو کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اونچے مقامات پر مکانات بناتے تھے اور دور سے وہ مکانات یوں نظر آتے تھے جیسا کہ بڑا پہاڑ اور مقصود ان کا یہ دکھانا تھا کہ وہ بڑے ماہر فن اور بڑے صاحب مقدرت ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اس کے لیے عبث کا لفظ استعمال کیا' اگر یہ بڑے بڑے نشانات وہ مسافروں کی رہنمائی یا سمندری جہازوں کی راہنمائی کے لیے بناتے تو قرآن ان کے لیے عبث کا لفظ استعمال نہ کرتا۔ اس سے یہ تاثر دینا مطلوب ہے کہ قوت اور مہارت اور دولت کو منفعت بخش امور میں خرچ کرنا ہے۔ محض نمائش' زیبائش اور اظہار حسن و کمال کے لیے نہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس تبصرے میں ایک معنی خیز فقرہ بھی استعمال کیا ہے۔

وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ (۲۶ : ۱۲۹) "تم بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو' گویا تم نے ہمیشہ رہنا ہے"۔ قوم عاد تہذیب و تمدن میں قابل ذکر حد تک ترقی کر گئے تھے۔ بڑے بڑے محلات بنانے اور پہاڑوں کو کاٹنے کے لیے انہوں نے ترقی یافتہ ٹیکنالوجی ایجاد کر لی تھی۔ بڑے بڑے مینارے بلند مقامات پر بناتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ شاید یہ بڑے بڑے محلات اور اونچی اونچی علامات اور مینارے وہ اس لیے بناتے تھے کہ انہیں اس دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے۔ نہ اس دنیا کے طبعی حالات ان پر اثر انداز ہوں گے اور نہ کوئی دشمن ان پر فتح پا سکے گا۔

حضرت ہود اپنی تنقید جاری رکھتے ہیں :

وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ ﴿١٣٠﴾

"اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو جبار بن کر ڈالتے ہو"۔ یہ لوگ بہت بڑے نافرمان اور سرکش تھے۔ جب کسی کو اپنی ظالمانہ گرفت میں لیتے تو حد سے گزر جاتے۔ ظلم اور سنگدلی ان کا شیوہ ہوتا۔ جس طرح اس دنیا میں مادی قوت رکھنے والے ہر جبار کا قانون ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرت ہود ان کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ خدا سے ڈریں اور اس کے رسول کی اطاعت میں آ جائیں۔ تاکہ اللہ

اور رسول ان کو اس سختی سے روک دیں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾

"پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو"۔

حضرت ہود ان کو یاد دلاتے ہیں کہ تمہارے پاس جو مادی قوت ہے اور جس کے ذریعہ تم بڑے بڑے محلات بناتے ہو اور اپنی قوت کا رعب جماتے ہو۔ یہ تو سب اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے اور اس نعمت کے بدلے مناسب تو یہ تھا کہ تم اللہ کا شکر ادا کرتے اور اس بات سے ڈرتے کہ اللہ کہیں یہ نعمت تم سے چھین نہ لے اور مزید اس پر تمہیں سزا نہ دے دے کیونکہ تم تو اسراف کرتے ہو' بے فائدہ کام کرتے ہو اور ظلم و ستم ڈھاتے ہو۔

وَ اتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّ بَنِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۱۳۴﴾ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۳۵﴾

"ڈرو اس سے جس نے وہ کچھ تمہیں دیا ہے جو تم جانتے ہو۔ تمہیں جانور دیئے' اولاد دی' باغ دیئے اور چشمے دیئے۔ مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے"۔

حضرت ان کو پہلے اجمالی نعمت یاد دلاتے ہیں کہ تم جانتے ہو کہ تمہیں کیا کیا انعامات سے نوازا گیا۔ جو کچھ تم ہو' وہ تمہارے سامنے ہے۔ تم اس حال میں مست ہو لیکن بعض اہم چیزوں کا وہ نام بھی لیتے ہیں۔ تمہیں جانور دیئے' تمہیں اولاد دی' باغات دیئے اور پانی کے چشمے دیئے۔ اس دور کی ترقی میں یہی چیزیں اہم تھیں۔ جبکہ یہ چیز ہر دور کی ترقی میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں اور آج بھی اہم ہیں۔ حضرت ان لوگوں کو ایک عظیم دن کے عذاب سے ڈراتے ہیں۔ کیونکہ جو روش انہوں نے اختیار کر لی تھی اس کی وجہ سے وہ عذاب کے مستحق ہو گئے تھے اور حضرت ہود چونکہ انہی کے بھائی تھے۔ اس لیے وہ بڑی شفقت سے انہیں ڈرا رہے تھے نہایت والہانہ انداز میں۔ کیونکہ عذاب ان کو بصیرت نبوت کے ذریعے یقینی نظر آ رہا تھا۔

لیکن ان کی یہ مشفقانہ نصیحت اور ڈراوا ان کے دلوں پر اثر نہ کر رہا تھا جو بہت ہی سخت ہو گئے تھے اور عناد اور سرکشی پر تلے ہوئے تھے۔

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

انہوں نے جواب دیا "تو نصیحت کر یا نہ کر' ہمارے لیے سب یکساں ہے"۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہود صاحب آپ فضول لگے ہوئے ہیں۔ ہمارے لیے آپ کا وعظ کرنا نہ کرنا برابر ہے۔ یہ جواب ان کی طرف سے سخت توہین

آمیز، سنگدلانہ اور انتہائی ذہنی جمود اور بلادت کا مظہر تھا۔ یہ لوگ اپنے تقلیدی مذہب پر تلے ہوئے تھے، ہوئے تھے۔

إِنْ هَٰذَآ إِلَّا خُلُقُ الْأَوَّلِينَ ﴿١٣٧﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ﴿١٣٨﴾

"یہ باتیں تو یوں ہی ہوتی چلی آئی ہیں اور ہم عذاب میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں"۔

یعنی وہ جو کام کر رہے ہیں وہ تو اسی طرح ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہود علیہ السلام خواہ مخواہ گرفت کر رہے تھے وہ تو آباء و اجداد کی راہ پر جا رہے ہیں۔ اور کوئی عذاب آنے کا ڈر نہیں ہے کیونکہ ہمارے آباء پر تو عذاب نہیں آیا۔

اب قرآن مجید اس مکالمے کے بقیہ حصوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ بس انجام بتا دیا جاتا ہے، اختصار کے ساتھ۔

فَكَذَّبُوهُ فَأَهْلَكْنَٰهُمْ

"آخر کار انہوں نے اسے جھٹلا دیا اور ہم نے ان کو ہلاک کر دیا"۔

غرض صرف دو لفظوں میں ان کا انجام بتا دیا جاتا ہے۔ دو لفظوں میں قصہ تمام "تکذیب" کی "ہلاک ہوئے"۔ وہ تمام محلات لپیٹ دیئے گئے۔ وہ تمام انعامات و اکرامات واپس لے لیے گئے۔ وہ تمام مویشی، تمام آبادی، تمام باغات اور تمام چشمے لپیٹے گئے۔

قوم عاد کے بعد کئی دوسری اقوام نے انسانی تاریخ میں عادیوں کی طرح سوچا، عادیوں کی طرح دھوکہ کھایا، اللہ سے دور ہو کر انہوں نے تہذیب و تمدن میں ترقی کی، اور یہ سوچا کہ اب انسان اس قدر ترقی کر چکا ہے کہ اسے خدا کی ضرورت نہیں ہے۔ کئی اقوام نے دوسروں کے لیے ہلاکت کا سامان تیار کیا اور اپنے آپ کو بچایا۔ اور یہ سوچتی رہیں کہ یہ ساز و سامان اسے اپنے دشمنوں سے بچالے جائے گا لیکن ایسی اقوام کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس کے دائیں، اس کے بائیں، اس کے اوپر، اس کے نیچے اور ہر طرف سے اس پر عذاب ٹوٹ پڑتا ہے۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٣٩﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ
لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٤٠﴾ ع ۱۸

۱۱

"یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی"۔

--- ○○○ ---

# درس نمبر ۱۶۶ تشریح آیات

# ۱۴۱ --- تا --- ۱۵۹

---

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۴۳﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۱۴۴﴾ وَ مَاۤ اَسْــٴَـلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۴۵﴾

"ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ ان کے بھائی صالح نے ان سے کہا "کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں' میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے"۔

وہی الفاظ اور وہی دعوت جسے ہر رسول پیش کر رہا ہے۔ اور قرآن کریم تمام رسولوں کی طرف سے مختلف زمان و مکان اور مختلف اقوام و السان کے باوجود ایک جیسے الفاظ لاتا ہے۔ یہ بتانے کے لیے کہ تمام رسولوں کی رسالت کا ایک ہی مقصد اور ایک ہی مضمون تھا۔ ایک فکر اور ایک منہاج تھا۔ وہ ایک ہی اصول اور نظریہ تھا جس پر یہ رسالتیں اور یہ دعوتیں بلند ہوئیں۔ اللہ پر ایمان' اس کی جوابدہی کا احساس اور ڈر' اور ہر رسول کی اطاعت۔

اس کے بعد قرآن مجید قوم ثمود کی مخصوص باتیں بیان کرتا ہے۔ جو اس وقت سورت کے مضمون کے ساتھ مناسب ہیں۔ ان کو بھی حضرت صالح یاد دلاتے ہیں کہ دیکھو تم پر اللہ کے کیا کیا انعامات ہیں۔ یہ لوگ شام اور حجاز کے درمیان علاقہ حجر میں رہائش پذیر تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب جنگ تبوک میں گئے تو اپنے صحابہ کرام کے ساتھ آپ نے ان کے علاقے اور گھروں کا عبرت ناک دورہ فرمایا۔ حضرت صالح فرماتے ہیں کہ تمہارے اعمال کے پیش نظر اللہ تم سے یہ انعامات چھین سکتا ہے' ذرا خدا کا خوف کرو۔

اَتُتْرَكُوْنَ فِیْ مَا هٰهُنَاۤ اٰمِنِیْنَ ﴿۱۴۶﴾ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾ وَّ زُرُوْعٍ وَّ نَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِیْمٌ ﴿۱۴۸﴾ وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ ﴿۱۴۹﴾

"کیا تم ان سب چیزوں کے درمیان' جو یہاں ہیں 'بس یونہی اطمینان سے رہنے دیے جاؤ گے؟ ان باغوں اور چشموں میں؟ ان کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں؟ تم پہاڑ کھود کھود کر فخریہ ان میں عمارتیں بناتے ہو"۔

یہ لوگ ایسے معاشی حالات میں رہتے تھے جس کی تصویر کشی ان کے لیے ان کے بھائی صالح کر رہے تھے ۔ لیکن یہ لوگ نہایت غفلت سے زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس بات کی کوئی فکر نہیں کر رہے کہ یہ انعامات دینے والا کون ہے ۔ ان انعامات کا سرچشمہ اور آنے کی جگہ کون سی ہے ۔ یہ لوگ اس منعم حقیقی کا تصور بھی نہیں کرتے جس نے یہ انعامات عطا کیے ہیں ۔ چنانچہ رسول وقت نے ان کو اس طرف متوجہ کرنے کی ضرورت محسوس کی کہ ان نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرو ورنہ واپس لی جا سکتی ہیں ۔

حضرت صالح نے ان کو ایسے جھٹکے دیئے کہ ان کے غافل دل جاگ اٹھیں اور اللہ کا خوف کریں ۔

أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هَاهُنَا آمِنِينَ (٢٦ : ١٤٦) "کیا تم ان سب چیزوں کے درمیان جو یہاں ہیں' بس یوں ہی اطمینان سے رہنے دیے جاؤ گے"۔ مطلب یہ کہ کیا تم جس خوشحالی 'عیش و عشرت اور نعمتوں میں ڈوبے ہوئے ہو' ہمیشہ رہو گے' تمہیں کہیں جواب نہیں دینا ہے' کہیں نہیں جانا ہے ۔ کسی بالائی قوت سے تمہیں کوئی ڈر نہیں ہے ۔ ان کے زوال کا بھی کوئی ڈر نہیں ہے ۔ کیا تم ڈرتے نہیں ہو کہ حالات بدل بھی سکتے ہیں ۔

ان باغات اور چشموں میں' ان فصلوں اور میوہ جات میں' تاکستانوں اور نخلستانوں میں اور ان خوشگوار اور خوش ذائقہ میوہ جات میں' زود ہضم پھلوں میں اور پہاڑوں میں تم جو مکانات بناتے ہو' یا اپنی عیاشیوں کے لیے تم پہاڑوں جیسے اونچے مکانات بناتے ہو ۔ اور یہ سب کام عبث ہے کیونکہ یہ تمہاری رہائش کی ضرورت سے بہت ہی زیادہ ہے ۔ محض مہارت' حسن اور تعیش کے اظہار کے لیے ۔

یوں حضرت صالح ان غافل لوگوں کو سخت جھٹکے دے کر جگانے کے بعد ان کو دعوت دیتے ہیں کہ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ۔ اور ان لوگوں کی مخالفت کرو جو ظالم سردار ہیں اور جو ہروقت شر و فساد اور ظلم کی طرف مائل رہتے ہیں ۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٥٠﴾ وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ﴿١٥١﴾ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿١٥٢﴾

"اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ۔ ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے"۔

لیکن جب کسی قوم کے دل خشک ہو جاتے ہیں اور ان سے غور و فکر ختم ہو جاتا ہے ۔ تو ایسی درد بھری پکار بس ان کو سنائی نہیں دیتیں ۔ وہ کسی بات پر کان نہیں دھرتے اور ان کے دل نرم نہیں ہوتے ۔

قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ﴿١٥٣﴾ مَا أَنتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا فَأْتِ بِآيَةٍ إِن

كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۴﴾

انہوں نے جواب دیا "تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے۔ تو ہم جیسے ایک انسان کے سوا اور کیا ہے؟ لا کوئی نشانی اگر تو سچا ہے"۔

ان کا جواب یہ تھا کہ اے صالح تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے' اس لیے تو یہ باتیں بغیر سوچے سمجھے کر رہا ہے۔ ان کے خیالات کے مطابق خدا کی طرف دعوت دینے والے مجنون ہوتے ہیں۔

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (۲٦ : ۱۵٤) "تو ہم جیسے ایک انسان کے سوا اور کیا ہے"۔ جب بھی انسانوں کے کسی گروہ کے پاس کوئی رسول آیا ہے۔ انہوں نے یہی کہا ہے کہ تو تو ہم جیسا ہی ایک آدمی ہے۔ انسانوں نے ہمیشہ رسولوں کے بارے میں اور رسالت کے بارے میں کوتاہ بینی سے کام لیا۔ وہ اس بات کو کبھی نہ سمجھ سکے کہ رسول بشر کیوں ہوتا ہے۔ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ انسانوں میں سے کسی کو رسول بنا کر بھیجنا دراصل انسانیت کے لیے ایک عظیم تکریم ہے کہ انسانوں میں سے کوئی شخص عالم بالا سے مربوط ہو جاتا ہے اور رشد و ہدایت کے سرچشمے یعنی اللہ تعالیٰ کے دربار سے براہ راست ہدایت پاتا ہے۔

انسانوں نے ہمیشہ رسولوں کو ایک دوسری مخلوق سمجھا۔ یا لوگوں نے یہ سمجھا کہ ایسا ہونا چاہیے کہ رسول انسانوں سے کوئی بالا و برتر مخلوق ہو۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک انسان غیب کی خبریں دے۔ نظروں سے اوجھل دنیا کی بات کرے اور یہ انسان یہ بات اس لیے کرتے تھے کہ لوگ اس راز کو نہیں سمجھتے تھے کہ اللہ نے انسان کو یہ شرف بخشا ہے۔ کہ اس زمین میں رہتے ہوئے بھی اس انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں ہیں کہ وہ عالم بالا سے رابطہ رکھ سکے جو اس دنیا میں رہے۔ کھائے پیے۔ شادی کرے' سوئے بازاروں میں پھرے اور وہ سب کام کرے جو بشر کرتے تھے۔ میلانات اور جذبات رکھنے والا ہو لیکن اس کے باوجود وہ اس سر اعظم کا مالک ہو۔ وحی الٰہی کا مہبط ہو۔

پھر ہر دور میں انسانوں نے رسولوں سے معجزہ طلب کیا ہے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ حضور ایک سچے رسول ہیں۔

فَأْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲٦ : ۱۵٤) "لاؤ کوئی نشانی اگر تم سچے ہو"۔ تو ثمود نے بھی معجزہ طلب کیا اور حضرت صالح نے جواب دیا کہ ہاں یہ ہے معجزہ یہ ناقہ ہے' یہ ناقہ کیسی تھی؟ ہم یہاں اس کی تعریف میں وہ رطب و یابس کہانیاں لانا نہیں چاہتے جو مفسرین نے دی ہیں کیونکہ ان میں سے کوئی بھی کہانی صحیح اور مستند روایت سے منقول نہیں ہے۔ ہاں یہ ایک معجزاتی ناقہ تھی۔

قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۵﴾ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵٦﴾

صالح نے کہا "یہ اونٹنی ہے' ایک دن اس کے پینے کا ہے اور ایک دن تم سب کے پانی پینے کا۔ اس کو ہرگز نہ چھیڑنا ورنہ ایک بڑے دن کا عذاب تم کو آلے گا"۔

یہ معجزاتی اونٹنی اس شرط پر آئی کہ جو محدود آبنوشی کی سہولتیں انہیں حاصل تھیں وہ ایک دن کے لیے ناقہ کے لیے وقف ہوں گی۔ اور دوسرا دن ان کے لیے اور ان کے مویشیوں کے لیے ہوگا۔ ناقہ کے دن میں یہ دخل اندازی نہ کریں گے اور نہ ناقہ ان کے دن پانی پئے گی۔ دونوں دنوں کا پانی اکٹھا نہ ہوگا۔ نہ ان کا دن ناقہ کے دن سے ملے گا اور نہ ناقہ کا ان کے دن سے۔ تو صالح علیہ السلام نے ان کو ڈرایا کہ اس کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرو گے۔ ورنہ ایک عظیم عذاب تم پر نازل ہو جائے گا۔

ان سرکشوں کے لیے یہ معجزہ کوئی مفید ثابت نہ ہوا۔ ان کے دلوں کے اندر ایمان بھی نہ داخل ہوا' ان کی روحانی دنیا پر ظلمتیں چھائی رہیں لیکن پانی ان کے لیے نصف ہو گیا۔ باوجود تاکید و وصیت کے ان سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے وعدہ خلافی کر دی۔

فَعَقَرُوهَا فَأَصْبَحُوا نَادِمِينَ ﴿١٥٧﴾

"مگر انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں اور آخرکار پچھتاتے رہ گئے"۔ عقر کے معنی ذبح کرنے کے ہوتے ہیں اور جن لوگوں نے یہ کام کیا' یہ وہی تھے جو زمین میں فساد کرتے تھے اور اصلاح نہ کرتے تھے۔ ان کو حضرت صالح نے خوب ڈرایا تھا مگر وہ حضرت صالح کی تنبیہات کو خاطر میں نہ لائے۔ اس جرم کا عذاب پوری قوم کو ملا۔ اور سب پکڑے گئے۔

یہ لوگ آخرکار عذاب دیکھ کر نادم ہو گئے تھے لیکن وقت کے بعد ندامت کا فائدہ ہی کیا ہوتا ہے۔ وقت کے بعد ایمان اور تصدیق کا کیا فائدہ۔

فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۚ

"عذاب نے انہیں آلیا"۔ یہاں اس عذاب کی تفصیلات نہیں دی گئیں کیونکہ اس سورت میں تمام قصص کو اختصار کے ساتھ لانا مقصود تھا۔

اور اب آخری سبق :

۱۹ ع ۸ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٥٨﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٥٩﴾

۱۲ "یقیناً اس میں ایک نشانی ہے' مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی"۔

---()()()---

# درس نمبر ۱۶۷ تشریح آیات

## ۱۶۰ --- تا --- ۱۷۵

---

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۶۰﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿۱۶۱﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿۱۶۲﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۶۴﴾

"لوط کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ ان کے بھائی لوط نے ان سے کہا تھا "کیا تم ڈرتے نہیں ؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں' میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے"۔

قصہ لوط یہاں لایا گیا ہے حالانکہ تاریخی اعتبار سے اس کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ ہے۔ لیکن اس سورت میں قصص کی تاریخی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ یہاں اصل بات یہ دکھانی مطلوب ہے کہ تمام انبیاء کی دعوت ایک ہی رہی ہے۔ طریقہ کار بھی سب کا ایک ہی رہا ہے اور جھٹلانے والوں کا انجام بھی ایک ہی رہا ہے۔ یعنی مکذبین کو ہلاک کیا گیا اور مومنین کو عذاب سے بچایا گیا۔

حضرت لوط علیہ السلام بھی دعوت کا آغاز اسی طرح کرتے ہیں 'جس طرح حضرت نوح' حضرت ہود اور حضرت صالح علیہ السلام کرتے ہیں۔ قوم کی سرکشی اور عیاشی پر گرفت کرتے ہیں۔ ان کو خدا خوفی' ایمان اور اطاعت رسول کی طرف بلاتے ہیں۔ اور یہ اعلان بھی کرتے ہیں کہ اس ہدایت اور راہنمائی پر وہ ان سے کوئی مالی معاوضہ نہیں مانگتے۔

اس کے بعد حضرت ان کو تنبیہ کرتے ہیں کہ تم جس بدی میں مبتلا ہو' اس کا ارتکاب انسانی تاریخ میں نہیں کیا گیا۔

أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿۱۶۵﴾ وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ ۚ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ ﴿۱۶۶﴾

---

"کیا تم دنیا کی مخلوق میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو' اور تمہاری بیویوں میں تمہارے رب نے تمہارے لیے جو کچھ پیدا کیا ہے اسے چھوڑ دیتے ہو؟ بلکہ تم لوگ تو حد سے ہی گزر گئے ہو"۔

قوم لوط وادی اردن کی کئی بستیوں میں آباد تھی۔ یہ لوگ جس جرم کے عادی تھے وہ عمل قوم لوط کے نام سے مشہور ہے۔ یعنی مردوں کی ہم جنس پرستی۔ اور عورتوں سے جنسی تعلق کو ترک کرنا۔ یہ نہایت ہی مکروہ فطری بے راہ روی تھی۔ کیونکہ مرد اور عورت کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور ہر ایک کے اندر ایک دوسرے کے لیے جاذبیت رکھی ہے۔ یہ اللہ کا ایک تخلیقی راز ہے۔ اس طرح اللہ نے انسانی زندگی کے تسلسل کا انتظام کیا۔ نسل کشی کا یہ انتظام اللہ نے مرد اور عورت کے درمیان ملاپ کے ذریعہ سے جاری کیا۔ یہ نظام بھی اللہ کے اس نظام کا ایک حصہ ہے جو اس نے اس پوری کائنات میں جاری فرمایا ہے۔ جس نے اس کائنات کے ہر شخص اور ہر چیز کو باہم مربوط کر دیا ہے اور اس طرح اس کائنات کا ہر شخص اور ہر چیز ایک دوسرے کے ساتھ حالت تعاون میں ہے۔ رہی یہ حرکت کہ مرد' مرد کے ساتھ جنسی تعلق قائم کریں تو یہ تعلق بے مقصد اور غیر پیداواری ہو گا۔ اور اس سے کوئی مقصد پورا نہ ہو گا۔ اور یہ عمل فطرت کے قانون اور فطرت کے نظام دونوں کے خلاف ہو گا جن کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ بعض بے ذوق لوگوں کو اس عمل میں لذت ملتی ہے حالانکہ حقیقی لذت وہ ہوتی ہے جس میں مرد اور عورت کا التقاء ہو اور اس کے نتیجے میں مقاصد فطرت بھی پورے ہوں۔ لہذا عمل قوم لوط فطرت سے کھلا انحراف ہے۔ لہذا اس قوم کی سزا یہی تھی کہ یا تو وہ باز آ جائیں یا ان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ کیونکہ ایسے لوگ قافلہ انسانیت اور گروہ انسانیت سے نکل گئے ہیں اور اب انہوں نے وہ مقصد پورا کرنا چھوڑ دیا ہے جس کے لیے اللہ نے ان کو پیدا کیا تھا۔ یہ کہ سابقہ لوگوں کے فطری عمل سے یہ پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنے فطری عمل سے آنے والی اقوام کو پیدا کرنا تھا۔

جب حضرت لوط نے ان کو دعوت دی کہ وہ اس غیر فطری بے راہ روی کو ترک کر دیں اور اس بات پر انہوں نے ان کی سرزنش کی کہ انہوں نے اس راہ کو ترک کر دیا جو رب نے ان کے لیے پیدا کیا ہے۔ انہوں نے فطرت کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور اللہ کی تخلیق فطرت کو روک رکھا ہے۔ اور یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنی اس روش کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اللہ کی سنت اور فطرت کی طرف لوٹنے کو تیار نہیں ہیں۔

قَالُوا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۷﴾

"اگر تو ان باتوں سے باز نہ آیا تو جو لوگ ہماری بستیوں سے نکالے گئے ہیں ان میں تو بھی شامل ہو کر رہے گا"۔

حضرت لوط ان لوگوں میں باہر سے آکر بس گئے تھے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ عراق سے آئے تھے۔ جب حضرت ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم کو چھوڑ دیا۔ اور اپنے ملک کو بھی چھوڑ دیا اور دریائے اردن عبور کر کے اس کے اس پار آباد ہو گئے تھے۔ حضرت لوط ان لوگوں میں آکر آباد ہو گئے تھے اور بعد میں اللہ نے حضرت لوط کو انہی کی طرف نبی بنا کر بھیج دیا تھا تاکہ قوم لوط کے اندر جو برے کام راہ پا گئے تھے' اس کی اصلاح فرمائیں۔ اب جبکہ وہ حضرت کی بات نہیں مانتے تو یہ دھمکی دیتے ہیں کہ اگر وہ باز نہ آئے تو اسے ملک سے نکال دیں گے' یعنی وہ تو اس فعل سے باز

نہیں آ سکتے ۔ لوط ہی دعوت کا کام بند کر دیں ۔

چنانچہ حضرت لوط ان کی دھمکی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اعلان کرتے ہیں کہ وہ تمہارے عمل کو نہایت ہی مکروہ عمل سمجھتے ہیں ۔ یہ بہت بڑی گندگی اور گراوٹ ہے ۔

قَالَ اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِیْنَ ﴿۱۶۸﴾

"اس نے کہا "تمہارے کرتوتوں پر جو لوگ کڑھ رہے ہیں 'میں ان میں شامل ہوں"۔ القلی کے معنی ہوتے ہیں شدید نفرت ۔ حضرت لوط علیہ السلام یوں اظہار نفرت کر کے ان کے منہ پر تھوکتے ہیں 'اور اس کے بعد رب تعالیٰ کی طرف دست بدعا ہوتے ہیں ۔ کہ اے اللہ مجھے ان لوگوں سے نجات دے ۔

رَبِّ نَجِّنِیْ وَ اَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

"اے پروردگار' مجھے اور میرے اہل و عیال کو ان کی بدکرداریوں سے نجات دے"۔ حضرت جس قسم کے معاشرے میں فرائض سرانجام دے رہے تھے وہ ان کے لیے عذاب تھا' وہ ان لوگوں کے ساتھ نہ چل سکتے تھے ۔ وہ جانتے تھے کہ ان لوگوں کا عمل فطرتاً بھی مردود ہے ۔ لیکن ادائیگی فرض کے لیے ان میں رہ رہے تھے ۔ چنانچہ انہوں نے دعائی کہ انہیں اس معاشرے سے نجات مل جائے ۔

رب تعالیٰ نے دعا قبول کر لی ۔

فَنَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۷۰﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ ﴿۱۷۱﴾

"آخر کار ہم نے اسے اور اس کے سب اہل و عیال کو بچا لیا' بجز ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی"۔

یہ بوڑھی عورت کون تھی ۔ یہ ان کی بیوی تھی ۔ دوسری سورتوں میں تصریح آئی ہے ۔ یہ بھی بڑی مکروہ عورت تھی کہ یہ ان لوگوں کی حمایت میں تھی جو یہ مکروہ فعل کرتے تھے اور ان کی مددگار تھی ۔

ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ ﴿۱۷۳﴾

"پھر باقی ماندہ لوگوں کو ہم نے تباہ کر دیا اور ان پر برسائی ایک برسات' بڑی ہی بری بارش تھی' جو ان ڈرائے جانے والوں پر نازل ہوئی"۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کے گاؤں دھنس گئے اور پانی کے نیچے آ گئے ۔ ان گاؤں میں سے ایک گاؤں "سدوم" بھی تھا ۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کہتے ہیں کہ یہ گاؤں بحر مردار کے پانی کے نیچے موجود ہے ۔

بعض علمائے طبقات الارض کا یہ نظریہ ہے کہ بحر مردار کے نیچے ایسے گاؤں کے کھنڈرات ہیں جو کسی وقت آبادی سے بھرے ہوئے تھے ۔ آثار قدیمہ کے ماہرین نے اس دریا کے پاس ایک قلعے کے آثار دریافت کیے ہیں اور اس قلعے کے قریب ہی ایک مذبح ہے جس کے اوپر قربانیاں دی جاتی تھیں ۔

بہرحال قرآن کریم نے حضرت لوط کے گاؤں کی کہانی اسی طرح پیش فرمائی ہے اور سابقہ اقوام کی خبروں کے سلسلے میں قرآن کریم ہی حقیقی اور سچا ماخذ ہے ۔ کیونکہ اللہ کی کتابوں میں سے یہی محفوظ ہے ۔

آخر میں وہی تبصرہ انہی الفاظ میں جو ہر قصے کے بعد آیا ہے ۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٧٤﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ
۱۲ع لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٧٥﴾

"یقیناً اس میں ایک نشانی ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی" ۔

---()()()---

# درس نمبر۱۶۸ تشریح آیات

## ۱۷۶---تا---۱۹۱

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۰﴾

"اصحاب الایکہ نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ شعیب نے ان سے کہا تھا"کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے"۔

یہ حضرت شعیب علیہ السلام کا قصہ ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے کا واقعہ ہے۔ یہاں یہ قصہ بھی دوسرے قصص کی طرح محض عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کے لیے آیا ہے۔ اصحاب ایکہ غالباً اہل مدین ہی کا نام ہے ایکہ ایک گھرے سائے والے ایسے درخت کو کہتے ہیں جو دوہرا ہو گیا ہو۔ اور مدین کے گاؤں کو شاید ایسے بڑے بڑے درختوں نے گھیرا ہوا تھا۔ مدین حجاز اور فلسطین کے درمیان خلیج عقبہ کے کنارے تھا۔

ان کے سامنے حضرت شعیب نے وہی نظریہ حیات پیش کیا جو ہر رسول پیش کرتا چلا آیا ہے کہ اللہ کو ایک سمجھو، میری دعوت قبول کرو، میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ اس اصل دعوت کے پیش کرنے کے بعد پھر اہل مدین کے لیے دعوت کا مخصوص حصہ پیش کیا جاتا ہے۔

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۲﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۳﴾

"ٹھیک بھرو اور کسی کو گھاٹا نہ دو۔ صحیح ترازو سے تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو"۔

جس طرح سورت اعراف اور ہود میں تفصیلات دی گئی ہیں کہ یہ لوگ ناپ اور تول میں مطفف تھے - یہ لوگ لیتے وقت جبراً لوگوں سے زیادہ لیتے تھے اور دیتے وقت یہ جبریا انگل سے کم دیتے تھے - لیتے وقت کم قیمت دیتے تھے اور دیتے وقت بہت مہنگے داموں فروخت کرتے تھے - معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی بستی کسی ایسے تجارتی شاہراہ پر تھی - جہاں سے قافلے گزرتے تھے - یہ لوگ ان تجارتی قافلوں پر اپنی مرضی نافذ کرتے تھے - ان کے رسول ان کو یہ تعلیم دیتے تھے کہ عدل اور انصاف کے ساتھ معاملہ کرو کیونکہ صاف اور ستھرے عقیدے کا لازمی تقاضا ہے کہ معاملات میں بھی اچھائی اختیار کرو - یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اچھا عقیدہ اچھا عمل اختیار کرنے کا حکم نہ دے - اور حق' انصاف اور عدل کے بارے میں نظریہ خاموش ہو جائے -

اب حضرت شعیب علیہ السلام ان کے دلوں میں تقویٰ اور خدا خوفی کا جوش پیدا کرتے ہیں - وہ ان کو یاد دلاتے ہیں کہ ایک ذات ایسی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے - یہ ذات تمام نسلوں کی پیدا کرنے والی ہے -

وَاتَّقُوا الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۸۴﴾

"اور اس ذات کا خوف کرو جس نے تمہیں اور گزشتہ نسلوں کو پیدا کیا ہے" - اس بات کا تو ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا بس انہوں نے آسان الزام لگا دیا کہ آپ پر جادو چل گیا ہے - اس لیے آپ غلط ملط باتیں کرتے ہیں - اور واہیات کہہ رہے ہیں -

قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ﴿۱۸۵﴾

"انہوں نے کہا "تو محض ایک سحرزدہ آدمی ہے" - اور اگر آپ سحرزدہ نہیں ہیں تو پھر بھی ہم تیری رسالت کو نہیں مانتے اس لیے کہ تو تو ہماری طرح کا ایک آدمی ہے - رسول کوئی بشر نہیں ہو سکتا' لہٰذا تو جھوٹا ہے -

وَمَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا وَإِنْ نَظُنُّكَ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿۱۸۶﴾

"اور تو کچھ نہیں ہے مگر ایک انسان ہم ہی جیسا' اور ہم تو تجھے بالکل جھوٹا سمجھتے ہیں" -

ہاں اگر تم سچے ہو تو جس عذاب سے ہمیں ہروقت ڈراتے ہو وہ لے کر آؤ اور آسمان کا کوئی ٹکڑا یا تارا ہم پر لا کر گرا دو - یا آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو اور ہم پر گرا دو" -

فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِنَ السَّمَاءِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۱۸۷﴾

"اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے" - یہ ایک ایسے شخص کا چیلنج ہے جو نہایت ہی سرکش' مغرور اور لاپرواہ ہے - مکہ مکرمہ میں مشرکین بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے ہی مطالبہ کرتے تھے -

قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

''شعیب علیہ السلام نے کہا'' میرا رب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو''۔ اور اس کے بعد پھر سیاق کلام میں جلد ہی فیصلہ چکا دیا جاتا ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ

''انہوں نے اسے جھٹلا دیا آخر کار چھتری والے دن کا عذاب ان پر آگیا' اور وہ بڑے ہی خوفناک دن کا عذاب تھا''۔

ان کے بعد عذاب کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ اس قدر گرمی ہوئی کہ دم گھٹ کر مرنے لگے۔ اس کے بعد انہیں ایک بادل سا نظر آیا۔ اس کی طرف لپکے کہ سایہ لیں۔ تو وہ اس قدر ٹھنڈا تھا جس طرح برف۔ پھر یہ بادل ایک کڑک کی شکل اختیار کر گیا اور ان کو ہلاک کر کے رکھ دیا۔ اس حوالے سے ان کے عذاب کو بادل کے ٹکڑے کے دن سے تعبیر کیا گیا۔

اور اب وہی تبصرہ اور سبق آتا ہے جو تمام قصص کے بعد اس پوری سورت میں دہرایا گیا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ

۱۰ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ

ع ۱۲

۱۴

''یقیناً اس میں ایک نشانی ہے مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی''۔

یہاں آکر اس سورت کے قصص ختم ہو جاتے ہیں اور اگلا سبق اس پوری سورت کے مضامین پر ایک تبصرہ ہے۔

---()()()---

# درس نمبر۱۶۹ ایک نظر میں

یہاں آکر قصص کا اختتام ہو گیا۔ یہ تمام قصص رسولوں اور ان کی رسالت کی مختصر کہانی پر مشتمل تھے۔ قوموں کی طرف سے رسولوں کی تکذیب ہوتی رہی' اقوام منہ موڑتی رہیں۔ انہوں نے چیلنج کیا۔ معجزات بھی آئے اور جب تکذیب پر تل گئے تو پھر اللہ کا عذاب آ گیا۔

اس سورت کا پہلا سبق ایک افتتاحیہ تھا' اس میں مشرکین مکہ کے حوالے سے حضور اکرمؐ کو کہا گیا تھا۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۳) اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ (۴) وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ (۵) فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ

(۶) (۲۶: ۳ — ۶) "اے محمدؐ شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں۔ ان لوگوں کے پاس رحمٰن کی طرف سے جو نئی نصیحت آتی ہے یہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اب یہ جھٹلا چکے ہیں۔ عنقریب ان کو اس چیز کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے ہیں"۔ اس کے بعد قصص پیش کیے گئے۔ اور یہ نمونہ تھے ان خبروں کے جن کے بارے میں مکذبین ہمیشہ مذاق کرتے چلے آئے تھے۔

جب قصص ختم ہوئے تو سیاق کلام پھر اپنے موضوع کی طرف آ گیا۔ یعنی سورت کے محور کی طرف۔ یہ آخری سبق گویا پوری سورت پر تبصرہ ہے اس میں تاکید کی جاتی ہے کہ یہ قرآن رب العالمین کی طرف سے ہے۔ ان قصص پر تو مدتیں گزر گئیں لیکن قرآن کریم میں ان واقعات کو پیش کیا جا رہا ہے۔ بنی اسرائیل کے علماء رسول اللہ کو بھی جانتے ہیں اور رسول اللہ پر نازل ہونے والے قرآن کو بھی جانتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے کیونکہ یہ وہی واقعات اور وہی رسول ہے جس کا ذکر پہلے نبیوں کی کتابوں میں مذکور ہے۔ لیکن مشرکین مکہ واضح دلائل دیکھتے ہوئے بھی از روئے عناد تسلیم نہیں کرتے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ سحر ہے یا یہ شعر ہے۔ اگر یہ قرآن کسی عجمی پر نازل ہوتا اور وہ ان کے سامنے ان کی زبان میں اسے پیش کرتا تو پھر بھی یہ ایمان نہ لاتے کیونکہ یہ انکار اس لیے نہیں کرتے کہ ان کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے بلکہ محض عناد کی وجہ سے یہ ایمان سے محروم ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ اخبار کاہنوں کی طرف

شیطانی القاء کی طرح نہیں ہیں - نہ یہ قرآن شعر کی کوئی قسم ہے کیونکہ اشعار کا ایک مزاج ہے شعرا اچھی طرح جانتے ہیں - اور شعرا تو ایک ایسا طبقہ ہے جو ہر وادی میں گھومتا ہے - یہ کسی خیال کسی جذبے اور کسی بھی میلان کو موزوں کر دیتے ہیں - کبھی اچھا کبھی برا - رہا یہ کلام تو یہ اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے - مشرکین عرب کی نصیحت کے لیے - اور یاد دہانی کے لیے کہ سنبھل جائیں قبل اس کے کہ کوئی عذاب ان کو آلے - اور قبل اس کے کہ وہ باتیں حقیقت ہو کر ان کے سامنے آجائیں جن کا یہ مذاق اڑاتے ہیں -

وَ سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ (۲۶ : ۲۲۷) "اور ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں"-

--- ○○○ ---

# درس نمبر ۱۶۹ تشریح آیات

## ۱۹۲ --- تا --- ۲۲۷

وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٩٢﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١٩٣﴾ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴿١٩٤﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ﴿١٩٥﴾

"یہ رب العالمین کی نازل کردہ چیز ہے ۔ اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار روح اتری ہے تاکہ تو ان لوگوں میں شامل ہو' جو (خدا کی طرف سے خلق خدا کو) متنبہ کرنے والے ہیں' صاف صاف عربی زبان میں"۔

روح الامین سے مراد حضرت جبرئیل ہیں ۔ حضرت جبرئیل نے قرآن مجید حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل کیا ۔ اور جبرئیل جو کلام اللہ کی طرف سے لاتے ہیں ۔ اس میں وہ حفیظ اور امین ہیں ۔ اس طرح حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلام براہ راست عالم بالا سے پایا اور براہ راست اسے سمجھا ۔ اور آپ کے دل میں اسے واضح عربی یعنی عربی مبین میں بٹھایا گیا تاکہ آپ لوگوں کو ان کی زبان میں ڈرائیں اور سمجھائیں اور یہ کلام ان پر پڑھیں ۔ جبکہ عرب اچھی طرح جانتے تھے کہ انسان کی قدرت میں اچھے سے اچھا اسلوب کیا ہے اور انسان کس حد تک عربی مبین میں بیان کر سکتا ہے اور وہ یہ بھی جانتے اور سمجھتے تھے کہ قرآن کریم نے جس معجز اسلوب کے اندر یہ کلام اور پیغام پیش کیا ہے وہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے ۔ قرآن عربی میں تھا' اپنے منہاج' اپنے معانی' اور اپنی بلاغت اور اپنی تناسق کے اعتبار سے بالکل واضح ہے کہ اس کا منبع کوئی انسانی منبع اور مصدر نہیں ہے ۔

پھر اس عربی مبین کی دلیل سے ذرا دوسری دلیل کی طرف قارئین کی توجہ کو مبذول کیا جاتا ہے ۔

وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ﴿١٩٦﴾ أَوَلَمْ يَكُن لَّهُمْ آيَةً أَن يَعْلَمَهُ عُلَمَاءُ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿١٩٧﴾

"اور اگلے لوگوں کی کتابوں میں بھی یہ موجود ہے ۔ کیا ان (اہل مکہ) کے لیے یہ کوئی نشانی نہیں ہے کہ اسے علماء

بنی اسرائیل جانتے ہیں؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور ذکر اور جو عقیدۂ توحید اور نظریہ حیات آپ پیش فرماتے تھے - یہ دونوں امور کتاب سابقہ میں موجود تھے - یہی وجہ ہے کہ اس آخری رسالت کا انتظار علمائے بنی اسرائیل بڑی بے صبری سے کرتے تھے اور وہ "اس رسول" کا انتظار کرتے تھے - پھر ان میں سے اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ "اس رسول" کا زمانہ آ گیا ہے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ اس کے بارے میں بات کرتے تھے - جیسا کہ حضرت سلمان فارسی، عبداللہ ابن سلام اور دوسرے علماء بنی اسرائیل کی زبانی یہ باتیں معلوم ہو گئی ہیں۔

یہ مشرکین مکہ تو محض ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے نہیں مانتے - یہ بات نہیں ہے کہ ان کے سامنے دلائل پیش کرنے میں کوئی کمی رہ گئی ہے - اگر کوئی عجمی یہ قرآن لے کر آتا اور ان پر عربی زبان میں پڑھتا تو بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے - نہ تصدیق کرتے اور نہ یہ تسلیم کرتے کہ یہ قرآن ان کی طرف اتارا گیا ہے - اس قدر معجزانہ دلیل کو بھی وہ مان کر نہ دیتے -

وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِیْنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَیْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۹۹﴾

"(لیکن ان کی ہٹ دھرمی کا حال تو یہ ہے کہ) اگر ہم اسے کسی عجمی پر بھی نازل کر دیتے اور یہ (فصیح عربی کلام) وہ ان کو پڑھ کر سناتا تب بھی یہ مان کر نہ دیتے"۔

ان الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک گونہ تسلی ہی کہ آپ کے کام میں اور ہمارے کلام میں کوئی کوتاہی نہیں ہے - درحقیقت یہ لوگ سخت عناد اور ہٹ دھرمی میں مبتلا ہیں - اس لیے یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ نہیں مانیں گے اور یہ فیصلہ ان کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے کہ یہ اپنے عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے نہ مانیں گے - یہ قضا و قدر کا فیصلہ بن چکا ہے - یہ اس روش سے پھر نہیں سکتے - بس اب عذاب کا انتظار کریں کہ یہ غفلت میں ہوں اور مارے جائیں -

كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۲۰۰﴾ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ﴿۲۰۱﴾ فَیَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

"اسی طرح ہم نے اس (ذکر) کو مجرموں کے دلوں میں گزارا ہے - وہ اس پر ایمان نہیں لاتے جب تک کہ عذاب الیم نہ دیکھ لیں"۔

قرآن کریم ان کی جانب سے تکذیب کا نقشہ یوں کھینچتا ہے کہ یہ تکذیب ان کے ساتھ چپکی رہے گی اور یہ لوگ اسی طرح تکذیب کی حالت میں رہیں گے اور قرآن کریم کا انکار کرتے رہیں گے - ان کے دلوں کے اندر سے تکذیب کی روگزار دی گئی ہے - تکذیب ان کے دل ہی میں جاری ہے - یہ ایسے ہی حالات میں ہوں گے کہ ان کو عذاب الیم پکڑے گا - یہ عذاب اچانک آئے گا - ان کو اس کا کوئی احساس نہ ہو گا - ان میں سے بعض تو ایسی ہی حالت میں رہے کہ واصل

جہنم ہوئے یا مارے گئے اور جب عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے ۔

فَيَقُولُوا هَلْ نَحْنُ مُنظَرُونَ ﴿٢٠٣﴾

”پھر جب وہ بے خبری میں ان پر آپڑتا ہے اس وقت وہ کہتے ہیں کہ ”کیا اب ہمیں کچھ مہلت مل سکتی ہے؟“ یعنی کیا ہمیں دنیا میں ایک اور مہلت دے دی جائے گی تاکہ ہم اصلاح کر سکیں ۔ اے کاش کہ ایسا ہو جائے ۔

کفار مکہ بار بار مطالبہ کرتے تھے کہ تم جو عذاب الٰہی سے ڈراتے ہو اور اس کے قصے سناتے ہو' لاؤ وہ عذاب کہ دیکھیں ۔ یہ مذہب کا مذاق اڑاتے تھے ۔ کیا یہ لوگ اس قدر بے باک اور مغرور ہو گئے ہیں اس لیے کہ یہ خوشحال ہیں ۔ عیاشیوں نے ان کو غبی بنا دیا ہے اور یہ خدا کے عذاب کو بعید الوقوع قرار دیتے ہیں ۔ ان کی حالت ہمیشہ کے کھاتے پیتے لوگوں کی سی ہے ۔ ایسے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ہم ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے ۔ یہ حالات کے بدلنے کا تصور بھی نہیں کرتے ۔ یہاں ان کو اسی غفلت سے جگایا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس وقت ان کی حالت ایسی ہو گی کہ یہ دنیا کا سب ساز و سامان بے کار ہو جائے گا اور کوئی شے بھی ان کو فائدہ نہ دے سکے گی ۔

أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿٢٠٤﴾ أَفَرَءَيْتَ إِن مَّتَّعْنَٰهُمْ سِنِينَ ﴿٢٠٥﴾ ثُمَّ جَآءَهُم مَّا كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿٢٠٦﴾ مَآ أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا يُمَتَّعُونَ ﴿٢٠٧﴾

”تو کیا یہ لوگ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟ تم نے کچھ غور کیا' اگر ہم انہیں برسوں تک عیش کرنے کی مہلت بھی دے دیں اور پھر وہی چیز ان پر آ جائے جس سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے تو وہ سامان زیست جو ان کو ملا ہوا ہے' ان کے کس کام آئے گا؟“

ایک طرف ان کی طرف سے عذاب کا مطالبہ اور اس میں شتابی ہے اور دوسری جانب عذاب کا نزول ہے ۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ عیش و عشرت کی جو طویل زندگی وہ بسر کر رہے تھے وہ گویا تھی ہی نہیں ۔ اس پوری زندگی میں ان کے لیے کوئی فائدہ نہ ہو گا اور نہ اس میں کوئی ایسا عمل ہو گا جس کی وجہ سے ان کے عذاب میں کوئی تخفیف ہو ۔

ایک صحیح حدیث میں ہے ”کافر کو لایا جائے گا اور آگ میں اسے ایک غوطہ دیا جائے گا ۔ پھر اس سے کہا جائے گا کہ تم نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی بھلائی (اور آرام) دیکھا بھی ہے؟ کیا تم نے کوئی خوشحالی دیکھی ہے؟ وہ کہے گا نہیں' خدا کی قسم' پروردگار میں نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا ۔ اور پھر ایک ایسے شخص کو لایا جائے گا جو دنیا میں بدترین حالات میں تھا اور اسے جنت کا ایک رنگ دکھایا جائے گا ۔ پھر اس سے کہا جائے گا ۔ کیا تو نے برے دن بھی کبھی دیکھے ہیں؟ تو وہ کہے گا خدا کی قسم اے رب ذوالجلال! مجھ پر تو برے دن کبھی آئے ہی نہیں ۔ (ابن کثیر)

اس کے بعد ان کو ڈرایا جاتا ہے کہ یہ جو تمہیں خبردار کیا جا رہا ہے تو اس لیے کہ تم پر ہلاکت بڑی تیزی سے آ

رہی ہے اور اللہ کی رحمت کا تو یہ تقاضا ہے کہ کسی بستی کو اس وقت تک ہلاک نہ کرے جب تک رسول نہ آئے - یہ اللہ کی سنت ہے -

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۸﴾ ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۰۹﴾

"(دیکھو) ہم نے کبھی کسی بستی کو اس کے بغیر ہلاک نہیں کیا کہ اس کے لیے خبردار کرنے والے حق نصیحت ادا کرنے کو موجود تھے اور ہم ظالم نہ تھے"۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے یہ فطری عہد لیا ہے کہ وہ صرف اس کی بندگی کریں گے اور اسے وحدہ لاشریک سمجھیں گے - انسان کی فطرت از خود ایک خالق کائنات کے وجود کو تسلیم کرتی ہے بشرطیکہ اس کے اندر فساد اور انحراف پیدا نہ ہو جائے - (پارہ ۹' ص ----) اور پھر اللہ نے اس کائنات میں دلائل کا ڈھیر لگا دیا - یہ تمام دلائل اس بات کی طرف راہنمائی کرتے ہیں کہ اس کائنات کا ایک خالق موجود ہے - اگر لوگ اس فطری عہد کو بھول جائیں اور دلائل ایمان پر غور نہ کریں تو پھر ان کے پاس ایک ڈرانے والا آتا ہے جو ان کو یہ فطری سبق یاد دلاتا ہے اور خواب غفلت سے ان کو جگاتا ہے - اس معنی میں رسالت ایک یاد دہانی اور سوئے ہوئے لوگوں کو جگانے سے عبارت ہے - اور یہ اللہ کا رحم و کرم ہے کہ اللہ نے اپنے اوپر پیغمبر بھیجنا لازم کر دیا کہ ہم اس وقت تک عذاب نہیں دیتے جب تک رسول نہ بھیجیں - جب رسول آتا ہے اور لوگ پھر بھی نہیں مانتے' نہیں یاد کرتے اور نہیں جاگتے تو یہ ان کی ناکامی ہوتی ہے - اور وہ راہ ہدایت ترک کر دیتے ہیں - لہذا عذاب حق ہو جاتا ہے -

---()()()---

قرآن کریم کے بارے میں ایک جدید بحث :

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾
اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾

"اس (کتاب مبین) کو شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں' نہ یہ کام ان کو سجتا ہے' اور نہ وہ ایسا کر ہی سکتے ہیں - وہ تو اس کی سماعت تک سے دور رکھے گئے ہیں"۔

اس سے قبل قرآن کریم کے بارے میں کہا گیا تھا کہ یہ رب العالمین کی طرف سے ہے اور اسے روح الامین لے کر آتے ہیں - اور اس کے بعد بات آگے نکل گئی کہ یہ لوگ تکذیب پر تل گئے ہیں اور اپنی نادانی سے عذاب کے آنے میں شتابی کر رہے ہیں - لیکن قرآن کے بارے میں وہ یہ الزام بھی لگاتے تھے کہ یہ شیاطین کی طرف سے القاء ہوتا ہے - جس طرح کاہنوں پر شیاطین کچھ کلمات القا کرتے ہیں جن میں بعض خبریں غیب کی ہوتی ہیں اور جن کی وجہ سے وہ کہانت کی

دکان چمکاتے ہیں۔

لیکن یہاں اس کی تردید کی جاتی ہے کہ ہر مذہب و ملت جانتی ہے کہ شیطان کا کیا کام ہوتا ہے جبکہ قرآن تو اصلاح اور ہدایت کا کام کرتا ہے۔ اور شیطان ہر مذہب و ملت کے تصور کے مطابق برائی گمراہی اور ضلالت کی دعوت دیتا ہے۔

پھر شیطانی قوتوں کے اندر یہ طاقت کہاں ہے کہ وہ قرآن نازل کر سکیں۔ اللہ کی جانب سے نزول وحی اور قرآن کا انتظام نہایت محفوظ ہے۔ اس کو تو روح الامین 'رب العالمین کے حکم سے نہایت حفاظت اور امانت و دیانت سے لاتے ہیں۔

---000---

اب روئے سخن حضور اکرم کی طرف پھر جاتا ہے۔ آپ کو شرک سے ڈرایا جاتا ہے حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرک کا وقوع ایک مستبعد امر ہے۔ دراصل حضورؐ کو کہہ کر امت کو ڈرایا جاتا ہے اور آپ کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ آپ اپنے قریبی لوگوں کو ڈرائیں۔ اللہ پر بھروسہ کریں۔ اللہ ہمیشہ آپ کی نگرانی اور نگہبانی کرتا ہے۔

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾ وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲۱۷﴾ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۲۰﴾

"پس اے نبیؐ' اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو' ورنہ تم بھی سزا پانے والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ' اور ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ تمہاری پیروی اختیار کریں۔ ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ' لیکن اگر وہ تمہاری نافرمانی کریں' تو ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو' اس سے میں بری الذمہ ہوں اور اس زبردست اور رحیم پر توکل کرو جو تمہیں اس وقت دیکھ رہا ہوتا ہے۔ جب تم اٹھتے ہو' اور سجدہ گزار لوگوں میں تمہاری نقل و حرکت پر نگاہ رکھتا ہے۔ وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے"۔

اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کے سوا کسی اور کو پکاریں تو وہ بھی معذبین میں سے ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ محال ہے اور اللہ نے سمجھانے کے لیے فرض کیا ہے۔ تو پھر اور لوگ کس باغ کی مولی ہیں۔ جو لوگ رات اور دن اللہ کے سوا اوروں کو پکارتے ہیں وہ کس طرح عذاب الہی سے بچ سکتے ہیں۔ لہٰذا اس معاملے میں کوئی رو رعایت نہیں ہے۔ رسول بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اگر اس نے اس عظیم جرم کا ارتکاب کیا تو..... بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عذاب سے ڈرانے کے بعد اب یہاں آپ کے رشتہ داروں کو ڈرانے کا حکم دیا جاتا ہے تاکہ دوسرے لوگ زیادہ ڈر جائیں' اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار (مثلاً ابو طالب) ایمان نہ لائے اور شرک پر مرے تو معذبین میں سے ہو گا تو اور لوگوں کے لیے جاننا چاہیے کہ کوئی رعایت نہ ہو گی۔

بخاری اور مسلم شریف میں منقول ہے کہ یہ آیت نازل ہوئی تو آپ کوہ صفا پر چڑھے۔ اور پکارا "یاصباحا" تو

سب لوگ جمع ہو گئے۔ ہر شخص دوڑ کر آپ ؐ کے پاس پہنچ گیا یا اس نے اپنا کوئی نمائندہ بھیج دیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یا بنی عبدالمطلب یا بنی مرہ' یا بنی لوئی دیکھو! اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ پہاڑی اس طرف سے ایک لشکر تم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو تم میری تصدیق کرو گے؟ تو انہوں نے کہا' ہاں۔ آپ ؐ نے فرمایا کہ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ میں تمہارے لیے ڈرانے والا ہوں اور ایک شدید عذاب تمہارے انتظار میں ہے اس پر ابولہب نے کہا "تم پر ہلاکت ہو سارے دن کے لیے"۔ کیا تم نے صرف اس بات کے لیے ہمیں بلایا اور اسی موقعہ پر یہ سورت بھی نازل ہو گئی۔ تبت یدا ابی لهب و تب امام مسلم نے اپنی سند سے حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا جب یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (۲۶ : ۲۱۴) "اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ"۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور فرمایا "اے فاطمہؓ بنت محمد' اے صفیہ بنت عبدالمطلب' اے اولاد عبدالمطلب' میں تمہارے بارے میں اللہ کے ہاں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ میرے مال کے بارے میں تم جو چاہتے ہو' مجھ سے لے سکتے ہو"۔

امام ترمذی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ نقل فرمایا ہے۔ کہتے ہیں: جب یہ آیت نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو بلایا تو آپ ؐ نے عام بات بھی کی اور خاص بات بھی کی۔ فرمایا اے اہل قریش ' اپنے نفوس کو آگ سے بچاؤ' اے اولاد کعب اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ' اے فاطمہؓ بنت محمد اپنے نفس کو آگ سے بچاؤ' خدا کی قسم میرے پاس تمہارے لیے خدا کے ہاں کوئی اختیارات نہیں ہیں۔ میں تمہارا رشتہ دار ہوں۔

تو احادیث اور ان کے ساتھ دوسری احادیث ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کو اس طرح لیا اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو کس طرح خبردار کیا اور آخرت کے معاملے میں ان کو اپنے رب کے حوالے کر دیا اور ان کے سامنے صاف صاف کہہ دیا کہ میری قرابت کسی کو وہاں کوئی فائدہ نہ دے گی۔ اگر تمہارے لیے تمہارا عمل نافع نہ ہوا۔ اور یہ کہ تمہارے لیے میرے پاس اللہ کے ہاں کوئی اختیارات نہیں ہیں۔ حالانکہ آپ اللہ کے رسول تھے۔ غرض یہ ہے اسلام اور اس کی صاف صاف تعلیم' بالکل واضح اور دو ٹوک بات اور اللہ اور بندے کے درمیان ہر قسم کے واسطوں کی نفی۔ یہاں تک کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی واسطہ اور وسیلہ نہیں ہیں۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ جن مومنین نے تمہاری دعوت کو قبول کر لیا ہے ان کے ساتھ تمہارا معاملہ کیسا ہو گا۔

وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۶ : ۲۱۵) "اور ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ تمہاری پیروی اختیار کریں ان کے ساتھ تواضع کے ساتھ پیش آؤ"۔ پروں کو ان کے لیے بچھانے سے مراد تواضع کرنا اور نرمی کرنا ہے۔ نہایت ہی مجسم اور حسی انداز میں بیان فرمایا کہ جب پرندہ اترتا ہے تو پروں کو پوری طرح بچھاتا ہے اور رفتار نرم کرتا ہے۔ حضور اکرم نے اپنی پوری زندگی میں اہل ایمان کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ کیونکہ آپ کے اخلاق بعینہ قرآن تھے آپ کی زندگی قرآن کریم کا عملی ترجمہ تھی۔

اور جو لوگ آپ کی نافرمانی کرتے ہیں ان کا معاملہ خدا پر چھوڑ دیں اور ان سے اپنی برات کا اعلان کر دیں۔

فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (٢٦: ٢١٦) "اگر وہ تمہاری نافرمانی کریں تو کہہ دیں کہ میں ان باتوں سے بری الذمہ ہوں جو تم کرتے ہو"۔ یہ روش مکہ میں تھی' اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی راہ میں لڑنے کی اجازت نہ تھی۔ اب قرآن کریم آپ کو اللہ کی طرف متوجہ کرتا ہے اور یہ تسلی دیتا ہے کہ اللہ بروقت آپ کا نگران ہے اور بہت قریب سے دیکھ رہا ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَي الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ (٢٦: ٢١٧) الَّذِيْ يَرٰكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ (٢٦: ٢١٩) اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (٢٦: ٢٢٠) "اور اس زبردست اور رحیم پر توکل کر جو تمہیں اس وقت دیکھ رہا ہوتا ہے جب تم اٹھتے ہو اور سجدہ گزار لوگوں میں تمہاری نقل و حرکت پر وہ نگاہ رکھتا ہے' وہ سب کو سننے اور جاننے والا ہے"۔ ان کو' ان کی نافرمانیوں کے اندر چھوڑ دیں۔ اور ان کے اعمال سے اپنی برات کا اظہار کر دیں۔ اور اپنے رب پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوں اور ہر معاملے میں رب کریم سے استعانت طلب فرمائیں۔ یہاں اللہ کی دو صفات بیان کی گئی ہیں' جو اس سورت میں بار بار آتی ہیں یعنی صفت عزت اور صفت رحمت۔ اس کے بعد قلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انس اور محبت کا شعور دیا جاتا ہے کہ تمہارا رب تمہیں اس وقت بھی دیکھ رہا ہے جب تم اکیلے نماز میں ہوتے ہو اور اس وقت بھی دیکھ رہا ہے جب تم نمازیوں کے اندر ہوتے ہو۔ یعنی وحدت کی حالت میں بھی تمہیں دیکھ رہا ہے اور اجتماعی حالت میں بھی اس کی نظر تم پر ہے۔ یعنی جب تم ساجدین یعنی اہل ایمان کے اندر ہوتے ہو' ان کی تربیت کرتے ہو' ان کی امامت کرتے اور انہیں خطبہ دیتے ہو' اللہ آپ کی حرکات و سکنات کی نگرانی کر رہا ہے اور آپ کے دعوتی کام اور درپیش خطرات کو بھی دیکھ رہا ہے وہ سمیع و علیم ہے۔

اس انداز تعبیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر یہ شعور پیدا کرنا مطلوب ہے کہ اللہ آپ کے قریب ہے' دیکھ رہا ہے اور عنایات کر رہا ہے۔ یوں رسول اللہ یہ یقین رکھتے تھے کہ آپ اللہ کی حفاظت میں ہیں۔ اللہ کے جوار رحمت میں ہیں۔ چنانچہ اس خوشگوار ماحول محبت میں آپ زندگی بسر کرتے تھے۔

---()()()---

اس سورت کا یہ آخری سبق زیادہ تر قرآن کے بارے میں ہے۔ اس کے بارے میں ایک تاکید تو یہ کی گئی کہ یہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔ دوسری یہ کہ روح لاامیں اسے لے کر آئے تیسری یہ کہ اس کے نزول میں شیاطین کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ اور یہاں پھر تاکید کی جاتی ہے کہ شیاطین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کیسے اتر سکتے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو سچے' امین اور ایک پاک و صاف زندگی بسر کرنے والے ہیں۔ شیاطین تو جھوٹوں' کذابوں' بدکرداروں اور دھوکہ باز کاہنوں پر اترتے ہیں۔ اور یہ تو کاہن اور گمراہ مذہبی پیشوا ہیں جو شیطانی باتیں لے کر اور ان میں رنگ بھر کر عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿٢٢١﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿٢٢٢﴾

يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كٰذِبُونَ ﴿۲۲۳﴾

"لوگو' کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترا کرتے ہیں؟ وہ ہر جعل ساز' بدکار پر اترا کرتے ہیں۔ سنی سنائی باتیں کانوں میں پھونکتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں"۔

عربوں میں کاہن ہوا کرتے تھے' ان کا دعویٰ یہ تھا کہ جن انہیں غیب کی خبریں دیتے ہیں اور لوگ ان کے ہاں جاتے تھے۔ اور ان کی پیشن گوئیاں سنتے تھے۔ ان کاہنوں میں سے اکثر جھوٹے ہوتے تھے۔ ان کاہنوں کی تصدیق وہ لوگ کرتے تھے جو ہر قسم کے اوہام اور ہر قسم کے افسانوں پر یقین کرنے کے لیے تیار ہوتے تھے لیکن یہ کاہن بہرحال لوگوں کو کسی بھلائی کی طرف نہ بلاتے تھے۔ اور نہ لوگوں کی قیادت راہ ایمان کی طرف کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال ان سے بہت مختلف تھا۔ رسول اللہؐ تو قرآن کے ذریعہ ایک نہایت ہی ٹھوس نظام زندگی کی طرف بلاتے تھے۔

یہ کاہن قرآن کے بارے میں بھی کہتے یہ شعر ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہتے کہ آپؐ شاعر ہیں۔ لیکن وہ حیران تھے کہ یہ قرآن بہرحال ایک بے مثال کلام ہے' لوگوں کے دلوں تک اثر جاتا ہے۔ لوگوں کے اندر ایک نیا شعور پیدا کرتا ہے اور اس کے اس قدر گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں کہ عوام اسے رد نہیں کر سکتے۔

چنانچہ اس سورت میں اس نکتے کی وضاحت کر دی گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو نظام پیش کر رہے ہیں اور قرآن کریم جو نظام پیش کر رہا ہے' یہ کوئی شاعرانہ کلام اور سوچ نہیں ہے۔ قرآن کریم ایک ہی نظریہ اور ایک ہی منہاج پر اول سے آخر تک چل رہا ہے۔ اس کے سامنے ایک ہی متعین مقصد اور نصب العین ہے۔ وہ اپنے نصب العین کی طرف سیدھا آگے بڑھ رہا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی وہی منہاج ہے۔ یہ نہیں ہے کہ آپ آج ایک بات کریں اور کل اس کے برعکس بات کریں۔ آپ کبھی بھی بدلتے ہوئے میلانات و رجحانات اور وقتی خواہشات کے پیچھے نہیں پھرتے۔ ایک ہی دعوت ہے جسے آپ لے کر آئے ہیں اور وہی دے رہے ہیں۔ ایک ہی عقیدہ ہے جو آپ پیش فرما رہے ہیں اور آپ ایک ایسے منہاج کے مطابق کام کر رہے ہیں جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے۔ جبکہ شعراء ایسے نہیں ہوتے۔ شعراء بدلتے ہوئے تاثرات اور وقتی جذبات کے اسیر ہوتے ہیں۔ ان پر ان کے شعور کی حکمرانی ہوتی ہے۔ جس طرح شعور ہوتا ہے' اسی کا وہ اظہار کر دیتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں وہ ایک ہی حقیقت سیاہ دیکھتے ہیں تو اسے سیاہ کہہ دیتے ہیں۔ اسی بات کو وہ اگلے لمحے میں سفید دیکھتے ہیں تو اسے سفید کہہ دیتے ہیں۔ اگر کسی سے راضی ہوئے تو مدح کرتے ہیں اور اگر ناراض ہوئے تو مذمت کرتے ہیں۔ پھر ہر شاعر کا اپنا مزاج ہوتا ہے اور اس کی اپنی شاعری ہوتی ہے۔

پھر یہ شعراء اپنے لیے خود ایک جہاں پیدا کرتے ہیں اور اسی میں یہ گم گشتہ ہوتے ہیں۔ یہ بعض افعال اور بعض ذہنی نتائج تخلیق کرتے ہیں اور پھر ان کو حقائق مان کر خود ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ عملی لوگ نہیں ہوتے کیونکہ یہ اپنی خیالی دنیا میں گم رہتے ہیں۔

لیکن جو شخص ایک متعین دعوت لے کر اٹھتا ہے اس کا مزاج شاعرانہ نہیں ہوتا۔ متعین دعوت کا حامل تو اس دعوت کو عملاً دنیا میں قائم دیکھنا چاہتا ہے۔ کسی بھی داعی کا ایک متعین ہدف اور نصب العین ہوتا ہے۔ پھر ہر داعی نے اپنی دعوت کے قیام کے لیے ایک طریق کار متعین کر دیا ہوتا ہے۔ وہ اس متعین راہ پر' ایک متعین سمت کی طرف جاتا ہے۔

ادھر ادھر نہیں بھٹکتا۔اس کی نظریں تیز ہوتی ہیں ۔ عقل زندہ ہوتی ہے ۔وہ اوہام اور تخیلات کی دنیا میں زندہ نہیں رہتا۔ نہ وہ محض خیالی نقشہ پیش کر کے خوش ہوتا ہے۔وہ اپنے نقشے پر عملی دنیا تعمیر کرنا چاہتا ہے۔

لہٰذا رسولوں کے منہاج اور شعراء کے منہاج کے درمیان جوہری فرق اور دوری ہے ۔ ان دونوں کے اندر یقیناً کوئی اشتراک نہیں ہے ۔اور یہ بات کوئی زیادہ پیچیدہ بھی نہیں ہے ۔کہ اسے نہ سمجھا جا سکے ۔

وَ الشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿٢٢٤﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿٢٢٥﴾ وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٢٢٦﴾

”رہے شعراء تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے تھے ۔کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں“۔

یہ لوگ چونکہ خواہشات نفس اور اپنے مزاج کے پیچھے چلتے ہیں لہٰذا اکثر بہکے ہوئے لوگ شعراء کے پیچھے چلتے ہیں کیونکہ اکثر بہکے ہوئے لوگ بھی ہوائے نفس کے بندے ہوتے ہیں۔اور ایسے لوگوں کا کوئی متعین نصب العین نہیں ہوتا۔

یہ ذہنی شعور اور تخیل کی وادیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں ۔ تخیلات ‘تصورات اور اوہام کی وادیاں بہت ہی وسیع ہوتی ہیں‘ یہ اپنے تاثرات کے مطابق ان میں سے کسی وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں ‘جس وقت ان کا دل جس وادی سے متاثر ہوئے ‘اس میں پھرنے لگتے ہیں۔

پھر یہ جو باتیں کرتے ہیں وہ غیر عملی ہوتی ہیں کیونکہ یہ ایسی دنیا میں زندہ ہوتے ہیں جو انہوں نے خود پیدا کی ہوئی ہوتی ہے ۔ یہ تخیلات کی دنیا ہوتی ہے اور ان کے شعور میں ہوتی ہے ۔اس دنیا کو یہ کرۂ ارض پر عملی دنیا سے دور رکھتے ہیں کیونکہ عملی حقائق چونکہ تلخ ہوتے ہیں اس لیے وہ ان کو پسند نہیں ہوتے ۔اس لیے وہ بہت سی باتیں بناتے ہیں لیکن ایسا کرتے نہیں ۔کیونکہ ان کی دنیا عمل کی نہیں بلکہ وہم و گمان کی دنیا ہوتی ہے ۔اس نظر آنے والی دنیا میں ان کی دنیا کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا۔

اب اسلام کو دیکھو کہ وہ تو ایک عملی نظام زندگی ہے اور اس کے ہر حکم کے لیے حکم یہ ہے کہ اسے عملاً قائم کیا جائے ۔ اسلام گویا ایک عظیم تحریک ہے جو ضمیر و وجدان کی دنیا میں بھی ہے ۔عقائد و تصورات کی دنیا میں بھی ہے اور پھر یہ تحریک عملی دنیا میں بھی ہے ۔ لہٰذا اسلام کی دنیا شعراء کی دنیا سے بالکل مختلف ہے کیونکہ شاعر اپنے ذہن میں ایک سوچ کی تخلیق کرتا ہے اور اس میں گم ہو جاتا ہے جبکہ اسلام جو عقیدہ اپناتا ہے اسے عملی شکل دیتا ہے ۔گویا اسلام اعلیٰ تصورات کو عملی شکل دیتا ہے ۔اور اعلیٰ تصورات کو عمل اور اخلاق میں ظاہر کرتا ہے ۔

اسلام لوگوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ عملی حقائق سے فرار اختیار نہ کرو اور موہوم خیالات کی طرف نہ بھاگو۔اگر کوئی عملی حقیقت تمہیں پسند نہیں ہے تو اس سے بھاگ کر تخیلات کے قلعوں میں پناہ نہ لو۔بلکہ اس پر حملہ آور ہو جاؤ اور حالات اور واقعات کو اپنی منشا کے مطابق بدل کر رکھ دو لیکن شاعر صاحب کا یہ کام نہیں ہوتا۔

اسلام انسانوں کی پوری قوت کو مجتمع کر کے اعلیٰ قدروں کی عملی دنیا تعمیر کرنے پر صرف کرتا ہے وہ اپنی کسی قوت کو بھی موہوم تخیلات کی دنیا میں رہ کر برباد نہیں کرتا۔ یہاں تک تو اسلام شعروفن کو رد کرتا ہے اگر وہ عملی نہ ہوں۔

لیکن اسلام شعروفن کا مطلقاً خلاف نہیں ہے۔ جو لوگ قرآن مجید کے ان الفاظ کو پڑھتے ہیں اور سرسری طور پر پڑھتے ہیں وہ شاید یہ سمجھیں کہ قرآن شعروسخن کے مطلقاً خلاف ہے۔ دراصل قرآن کریم اس منہاج کے خلاف ہے جس پر ہمیشہ شعراور فن چل نکلتا ہے یعنی ایسا تخیلاتی اور وہمی منہاج جس کے اندر عمل کی کوئی صورت نہ ہو۔ تخیل اور مبالغہ ہی ہو۔ ظاہر ہے کہ وہم و خیال کی دنیا تو پھر بہت ہی وسیع ہے' انسان اس کے اندر غرق ہو جاتا ہے لیکن جب انسان کا شعور پختہ ہو جاتا ہے اور اس کے تاثرات شعروفن پختہ ہو جاتے ہیں تو وہ شعوری اور تخیلاتی دنیا میں بھی کام کرتے ہیں اور عملی دنیا میں بھی کام کرتے ہیں۔ ایسے عملی تخیلات پھر اخلاقی لحاظ سے بھی پاک ہوتے ہیں۔ اور جب کوئی صاحب فن اسلامی رنگ میں رنگا جاتا ہے تو وہ محض اوہام و تخیلات کی دنیا میں قید نہیں ہوتا وہ عمل اور حکمت کی دنیا میں آتا ہے اور اس کے خیالات پھر بہت ہی قیمتی' صاف اور روایتی شعراء سے مختلف ہوتے ہیں۔

جب کسی کی روح میں ایک مستقل منہاج رچ بس جاتا ہے۔ اس کا ایک اسلامی نصب العین قرار پاتا ہے۔ پھر وہ دنیا کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اسلام کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اسلام کے زاویہ سے دیکھتا ہے تو اس کا فن شعرسخن بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ ایسے معیار پر اسلام شعروسخن اور فن کے خلاف نہیں رہتا جیسا کہ قرآن مجید کے ظاہری الفاظ سے نظر آتا ہے۔

قرآن کریم نے تو خود انسانی عقل' سوچ اور خیال کو اس دنیا کے عجیب و غریب مظاہر اور حقائق کی طرف متوجہ کیا ہے۔ خود نفس انسانی کے اندر جو عجائبات ہیں' جن میں انسانی تخیلات اور تمام نفسیاتی افعال شامل ہیں' یہ غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ شعروسخن کا مواد تو انسان کے نفسیاتی افعال ہی سے بنتا ہے اور قرآن کے اندر جگہ جگہ اس کائنات کی عجیب تخلیق اور نفس انسانی کے عجیب افعال پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اور قرآن نے یہ دعوت اپنے اسلوب میں دی ہے کہ آج تک کوئی شاعر اس کمال اور بلندی تک نہیں پہنچ سکا۔ اپنی خوبصورتی' اپنی فصاحت اور قدرت تصور کے اعتبار سے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم سابقہ عمومی تبصرے کے اندر استثناء پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ قرآن مطلقاً شعروسخن اور فن کے خلاف نہیں ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ كَثِيرًا وَانتَصَرُوا مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا ۗ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ ﴿٢٢٧﴾

"بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے' اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا اور جب ان پر ظلم کیا گیا تو صرف بدلہ لے لیا...... اور ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں"۔

لہذا اہل ایمان ان لوگوں میں داخل نہیں ہیں۔ یہ لوگ ایمان لائے تو ان کے دل و دماغ اسلامی عقیدہ اور ایمان

سے بھر گئے ۔ ان کی زندگی ایک منہاج پر رواں ہو گئی ۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی میں نیک عمل کرنا شروع کر دیا اور ان کی قوتیں اعمال صالحہ اور خوبصورت بھلائی کی راہ پر صرف ہونے لگیں ۔ وہ صرف اوہام و تخیلات کی دنیا سے باہر آ گئے ۔ اور انہوں نے اپنے فن کو بھی اپنے نظریہ کے لیے استعمال کیا ۔ یعنی کسی نے ان پر ظلم کیا تو انہوں نے بدلہ لے لیا ۔ یعنی جس سچائی کو انہوں نے عملاً قبول کیا اس کی حمایت میں ان کا فن بھی میدان میں آ گیا ۔

ایسے ہی اہل فن میں ' معرکہ توحید شرک کے ابتدائی دور میں ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضرت حسان ابن ثابت 'کعب ابن مالک ' عبداللہ ابن رواحہ رضی اللہ عنہم شعراء انصار میں سے تھے اور عبداللہ ابن الزبیری ابوسفیان ابن الحارث ابن عبدالمطلب تھے ۔ یہ دونوں ایام جاہلیت میں حضور اکرمؐ کی ہجو بھی کرتے تھے ۔ جب مسلمان ہوئے اور خوب ہوئے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں بھی خوب کمالات دکھائے ۔ اور اسلام کی مدافعت کی ۔

صحیح حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان ابن ثابتؓ کو حکم دیا " ان کی ہجو کرو اور جبرئیل تمہارے ساتھ ہیں " ۔ عبدالرحمٰن ابن کعب نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے شعراء پر اشعار میں بھی نازل کیا ہے جو کچھ نازل کیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " ایک مومن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور اپنی زبان سے بھی جہاد کرتا ہے ' اس خدا کی قسم ' جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ جس چیز سے تم ان کو مارتے ہو وہ تیروں کی بارش ہے " ۔ (امام احمد)

اسلامی شعر و فن کا تحقق مختلف اسالیب میں ہو سکتا ہے ۔ یعنی یہ ایک صورت جو ابتدائے اسلام میں وجود میں آئی اور اس وقت اس کی ضرورت بھی تھی لیکن اسلامی تصور حیات کے مطابق شعر و سخن کے اور دائرے بھی بے شمار ہیں جن کی اسلام اجازت دیتا ہے ۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ اسلامی فن وہی ہو گا جو اسلام کے دفاع میں ہو ۔ یا براہ راست اس میں دعوت اسلامی موجود ہو ۔ یا جس میں اسلام کی تعریف ہو ' پیغمبر اسلام کی تعریف ہو یا اکابر اسلام کی تعریف و تمجید ہو ۔ یا اللہ کی حمد و ثنا؟ یہ ضروری نہیں ہے کہ شعر اگر ان موضوعات پر ہو تو اسلامی ہے اور اگر ان پر نہ ہو تو اسلامی نہیں ہے ۔ گردش لیل و نہار پر ایک شاعرانہ نظر ' اور مناظر کائنات پر ایک ایسی نظر جس کے ذریعے ایک مسلم کا شعور اور اس کا تخیل قدرت الٰہیہ کا احساس کرتا ہو ' حقیقی اسلامی فن ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک لمحہ جس میں انسان کے دل و دماغ پر اللہ کی حکمت روشن ہو جاتی ہے ۔ اور جس کے اندر انسان اس کائنات کے عجائبات کا احساس کرتا ہے ۔ ایسے لمحات ہی میں اسلامی ادب کی تخلیق ہوتی ہے ۔

اسلامی فن اور غیر اسلامی فن کے درمیان امتیاز اس سے ہوتا ہے کہ اسلام کا اپنا ایک تصور حیات ہے ۔ اسلامی سوسائٹی کے اندر روابط کی ایک مخصوص شکل پائی جاتی ہے ۔ اگر کوئی فن اسلامی تصورات ' اسلامی روابط کے اور اسلامی اخلاق کی اساس پر تخلیق ہوتا ہے تو وہ اسلامی ہے اور اسے اسلام پسند کرتا ہے ورنہ نہیں ہے ۔

اور سورت کا خاتمہ اس دھمکی اور مجمل تہدید پر ہوتا ہے ۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوٓا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ (۲۶ : ۲۲۷) " اور ظلم کرنے والوں کو

عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں"۔ اس پوری سورت کا مضمون یہ رہا اور اس میں مشرکین کے عناد اور ہٹ دھرمی کی تصویر کشی کی گئی۔ یہ بتایا گیا کہ وہ اللہ کی وعید کے مقابلے میں سرکشی کرتے رہے بلکہ الٹا عالم غرور میں عذاب کے جلدی نزول کا مطالبہ کرتے رہے۔ نیز اس سورت میں ایسے تمام لوگوں پر نازل ہونے والے عذابوں کی تصویر کشی بھی کی گئی اور مختلف رسولوں کے انجام دکھائے گئے۔

اس لیے سورت کے آخر میں مجملاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالف قوتوں کو بھی سمجھا دیا گیا کہ تم بھی ذرا اپنی خبر مناؤ کہ تمہارا انجام کیا ہونے والا ہے۔ گویا کفار مکہ ذہنی دنیا پر یہ آخری ضرب ہے۔ اور ایسے الفاظ میں ہے کہ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست کے مطابق ہر شخص کا خیال اس سے معانی پہچان سکتا ہے۔ لہٰذا یہ مشرکین کے ایوان میں ایک زلزلہ ہے جو سورت کے آخر میں برپا کر دیا گیا۔

--- ○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ---- چہارم

## پارہ ----- ۱۹

## سورۃ النمل - ۲۷

۱ --- تا --- ۵۹

# سورۃ النمل ایک نظر میں

یہ مکی سورت ہے اور یہ سورت شعرا کے بعد نازل ہوئی ہے۔ یہ بھی سورت شعراء کے انداز میں چلتی ہے۔ ایک مقدمہ ہے۔ ایک تعقیب و تبصرہ ہے۔ اس میں سورت کا بنیادی موضوع اور محور بنایا گیا ہے۔ اور مقدمہ اور آخری تبصرے کے درمیان قصص ہیں جن سے موضوع کو ثابت کیا جاتا ہے۔ جابجا اس طرف اشارہ ہے کہ سابق انبیا کی دعوتوں کے مقابلے میں ردعمل اور موجودہ دعوت کے مقابلے میں آنے والا ردعمل ایک ہی جیسا ہے۔ یہ مسلمانوں کو یہ سبق سکھانے کے لیے کہ اللہ کی سنت بھی ایک ہے اور تمام رسالتوں اور تمام دعوتوں کے نشیب و فراز بھی ایک جیسے ہیں۔

اب یہ کہ اس سورت کا موضوع کیا ہے؟ تو موضوع تمام مکی سورتوں کی طرح اسلامی نظریہ ہے یعنی عقیدۂ توحید' اللہ وحدہ پر ایمان' اللہ وحدہ کی بندگی' آخرت کی جوابدہی پر یقین' ثواب و عتاب پر یقین' وحی اور غیب پر ایمان اور یہ کہ علم غیب کا جاننے والا اللہ ہی ہے اس کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔ اللہ پر یہ ایمان کہ تمام کے لیے وہی خالق' رازق اور نعمتوں کا داتا ہے۔ لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنا کہ وہ شکر نعمات ادا کریں۔ یہ ایمان کہ اللہ کے سوا کوئی نفع نقصان دینے والا نہیں۔ قوت کا سرچشمہ اللہ ہے اس لیے اس پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

ان معانی کے ثبوت کے لیے قصص آتے ہیں۔ سابقہ مومنین اور سابقہ مکذبین کے حالات اور انجام۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کی وہ کڑی جب آپ کوہ طور پر آگ دیکھتے ہیں' وہاں جاتے ہیں۔ اور پھر عالم بالا سے پکار پاتے ہیں اور آگ کے بجائے رسالت ملتی ہے۔ اور یہ ڈیوٹی دی جاتی ہے کہ فرعون کے پاس جاؤ۔ سرداران فرعون کو دعوت دو' چنانچہ آپ جاتے ہیں۔ وہ آیات الہیہ کی تکذیب کرتے ہیں حالانکہ ان کو اچھی طرح یقین ہے کہ آپ سچے ہیں' تو ان کا جو انجام ہوا' وہ معروف ہے۔

وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

الْمُفْسِدِيْنَ (۲۷ : ۱٤) "انہوں نے سراسر ظلم اور غرور کی راہ سے ان نشانیوں کا انکار کیا۔ حالانکہ دل ان کے قائل ہو چکے تھے۔ اب دیکھ لو کہ ان مفسدوں کا انجام کیسا ہوا۔ اور یہی حال ہے مکہ کے کفار اور مکذبین کا۔ وہ بھی قرآن مبین کی آیات کے ساتھ یہی سلوک کر رہے ہیں۔

اس کے بعد حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام پر ہونے والے انعامات کی طرف اشارہ ہے۔ پھر سلیمان اور چیونٹی کے قصے کی طرف اشارہ ہے۔ پھر ہدہد کا واقعہ ہے۔ ملکہ سبا اور اس کی قوم کے واقعات ہیں۔ پھر حضرت سلیمان اور حضرت داؤد پر انعامات اور ان کی جانب سے ان انعامات کا شکر نعمت علم' نعمت اقتدار و بادشاہت اور ان پر پھر نبوت

کا مقام اور پھر روحانی طاقت کے ذریعے جنوں اور پرندوں کی تسخیر کی قوت اور تمام واقعات کے اندر وہ اصولی عقائد کی تعلیم ہے جس کو ہر رسول لے کر آتا ہے ۔ان واقعات میں اس نکتے کی بڑی وضاحت کی گئی ہے کہ جب سلیمان علیہ السلام کا خط ملکہ سبا کے دربار میں پہنچتا ہے ۔وہ اس خط کو کس طرح لیتی ہے اور اس کے مقابلے میں اہل مکہ اللہ کی کتاب کو کس غیر سنجیدگی سے لیتے ہیں ۔یہ لوگ اس کتاب کی تکذیب کرتے ہیں اور انکار کرتے ہیں جبکہ ملکہ سبا اور اس کی قوم ایمان لے آتے ہیں ۔یہ اللہ ہی تھا جس نے سلیمان علیہ السلام کو یہ کمالات بخشے ۔اور اس کے لیے چیزوں کو مسخر کیا ۔یہ اللہ ہی ہے جو ہر چیز کا مالک ہے ۔وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور حضرت سلیمان کو اللہ نے جو علوم سکھائے تھے وہ تو علوم الٰہیہ میں سے ایک قطرہ از دریا تھے ۔

اس کے بعد حضرت صالح اور ان کی قوم ثمود کا قصہ آتا ہے ۔اس قصے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوم کے بعض مفسد ان پر اور ان کے اہل و عیال پر زیادتی کرتے تھے اور یہ لوگ حضرت صالح کو خفیہ طور پر قتل بھی کرنا چاہتے تھے لیکن اللہ نے ان کی تدابیر کو ناکام کر دیا اور حضرت صالح اور مومنین کو نجات دی اور سازش کرنے والوں کو ثمودیوں کے ساتھ تباہ کر کے رکھ دیا۔

فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا (۲۷ : ۵۲) "وہ ہیں ان کے گھر خالی پڑے ہوئے' اس ظلم کی پاداش میں جو وہ کرتے تھے"۔ قریش بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے اور یہ بھی خفیہ طور پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا چاہتے تھے ۔جس طرح ثمودی حضرت صالح اور آپ کے ساتھی اہل ایمان کے قتل کی تدابیر کر رہے تھے ۔

یہاں قصص کا اختتام قصہ لوط اور قوم لوط پر ہوتا ہے ۔وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ حضرت لوط اور اہل ایمان کو اپنے گاؤں سے نکال دیں اور وہ دلیل یہ دیتے تھے کہ یہ لوگ ایسے ہیں کہ یہ ضرورت سے زیادہ اخلاقی تطہیر چاہتے ہیں ۔لیکن جب حضرت لوط اور اہل ایمان بستی سے نکل گئے ۔تو ان پر سخت تباہی آئی ۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ (۲۷ : ۵۸) "پھر برسائی ان لوگوں پر ایک برسات بہت ہی بری برسات تھی وہ ان لوگوں کے حق میں جو ڈرائے جا چکے تھے"۔ قریش نے بھی یہ ارادہ کر لیا تھا کہ رسول اللہ کو شہر سے نکال دیں اور اس بارے میں انہوں نے آپ کی ہجرت سے قبل مشورہ بھی کر لیا تھا۔

جب قصص ختم ہوئے تو آخری تبصرہ اور اختتامیہ آیا اور اس کا آغاز یوں ہوا۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى آللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ

(۲۷ : ۵۹) "اے نبیؐ کہو حمد اللہ کے لیے اور سلام اس کے ان بندوں پر جنہیں اس نے برگزیدہ کیا ۔اللہ بہتر ہے یا وہ معبود جنہیں یہ لوگ اس کا شریک بنا رہے ہیں؟ بتاؤ"۔ اس کے بعد پھر قاری کو اس کائنات کی سیر کرائی جاتی ہے ۔اس کے نفس کی گہرائیوں تک پہنچایا جاتا ہے' اللہ خالق رازق اور صانع کائنات کے دست قدرت کی

کاریگریاں بتائی جاتی ہیں جو وحدہ عالم الغیب ہے اور سب لوگوں نے اسی کی طرف لوٹنا ہے ۔ پھر بعض علامات قیامت بتائی جاتی ہیں اور قیامت کے بعض مناظر بھی لائے جاتے ہیں اور یہ بتایا جاتا ہے کہ جو لوگ قیامت کے منکر ہیں ۔ ان کے انتظار میں کتنا برا انجام ہے ۔

اس سورت کا اختتام ایسے انداز میں ہوتا ہے جو اس سورت کی فضا سے ہم آہنگ ہے ۔

إِنَّمَآ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ (۲۷ : ۹۱) وَأَنْ أَتْلُوَ الْقُرْآنَ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَقُلْ إِنَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُنذِرِينَ (۲۷ : ۹۲) وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ سَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَتَعْرِفُونَهَا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۲۷ : ۹۳) "اے نبی' ان سے کہو مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ اس شہر کے رب کی بندگی کروں' جس نے اسے حرم بنایا ہے اور جو ہر چیز کا مالک ہے ۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلم بن کر رہوں ۔ اور یہ قرآن پڑھ کر سناؤں اب جو ہدایت اختیار کرے گا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو' اس سے کہہ دو کہ میں تو بس خبردار کرنے والا ہوں ۔ ان سے کہو تعریف اللہ کے لیے ہے عنقریب وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انہیں پہچان لوگے اور میرا رب بے خبر نہیں ہے ۔ ان اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو" ۔

اس پوری سورت کا مرکزی مضمون علم ہے ۔ اللہ عالم ہے' ظاہر باطن سب کا اور تمام غیب اسی کے علم میں تھا جو اللہ نے داؤد اور سلیمان علیہ السلام کو بخشا تھا ۔ پھر سلیمان علیہ السلام کو پرندوں کی زبان سکھائی تھی ۔ چنانچہ اس سورت کے آغاز ہی میں آتا ہے ۔

وَإِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ (۲۷ : ۶) "بے شک تو قرآن پا رہا ہے حکیم علیم ذات کی طرف سے" ۔ اور اس کی تعقیب میں ہے ۔

قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ (۲۷ : ۶۵) بَلِ ادَّارَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ (۲۷ : ۶۶) "ان سے کہو' اللہ کے سوا آسمانوں اور زمینوں میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا اور وہ تمہارے معبود تو نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے بلکہ آخرت کا تو علم ہی ان لوگوں سے گم ہو گیا ہے" ۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ (۲۷ : ۷۴) وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ (۲۷ : ۷۵) "بے شک تیرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ یہ

اپنے سینے کے اندر چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ آسمان و زمین کی کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں ہے جو ایک واضح کتاب میں لکھی ہوئی موجود نہ ہو"۔ اور آخر میں آتا ہے۔

سَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَتَعْرِفُونَهَا (۲۷ : ۹۳) "عنقریب وہ اپنی نشانیاں تمہیں دکھا دے گا اور تم انہیں پہچان لو گے"۔ حضرت سلیمان کے قصے میں آتا ہے۔

ولقد اتینا داود و سلیمان علماً وقال الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي فَضَّلَنَا عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ (۲۷ : ۱۵) "اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا تھا۔ ان نے کہا تعریف ہے اس اللہ کی جس نے ہمیں اپنے مومن بندوں میں سے ایک کثیر تعداد پر فضیلت دی"۔ اور حضرت سلیمان کا یہ فرمان

يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ (۲۷ : ۱۶) "اے لوگو' ہمیں پرندوں کی باتیں سکھائی گئی ہیں"۔ اور ہدہد نے کہا:

أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ (۲۷ : ۲۵) "وہ اس خدا کو سجدہ کیوں نہیں کرتے جو آسمان اور زمین کی پوشیدہ چیزیں نکالتا ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم چھپاتے ہو اور ظاہر کرتے ہو"۔ اور جب حضرت سلیمان ملکہ سبا کے تخت کو حاضر کرنا چاہتے ہیں تو اسے جنوں کا ایک عفریت بھی نہیں لا سکتا ہے۔ اور اسے جو شخص لانے کی حامی بھرتا ہے اسے بھی یہ قدرت یوں ملی۔

الَّذِي عِندَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ (۲۷ : ۴۰) "جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا"۔ غرض پوری سورت کی فضا پر علم اور ٹیکنالوجی کی باتیں چھائی ہوئی ہیں۔ شروع سے آخر تک علم ہی علم ہے اور علم ہی کی دنیا میں بات چلتی ہے۔ اب ذرا اس کے مضامین پر تفصیلی بحث مناسب ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۷۰ تشریح آیات

## ۱--- تا--- ۶

سُوْرَةُ النَّمْلِ (۲۷) مَكِّيَّةٌ (۴۸)
اٰيَاتُهَا ۹۳ رُكُوْعَاتُهَا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰسٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۱﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ط۔س۔یہ آیات ہیں قرآن اور کتاب مبین کی"۔

حروف مقطعات دراصل اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ یہ سورت اسی مواد پر مشتمل ہے جو ان حروف سے بنا ہے۔ پورا قرآن بھی اسی سے بنا ہے۔ یہ مواد عام عربی دانوں کے دسترس میں ہے لیکن وہ اس مواد سے ایسی کتاب تصنیف کرنے سے عاجز ہیں۔ باوجود بار بار کی تحدی اور چیلنج کے۔

یہاں کتاب سے مراد قرآن مجید ہی ہے۔ یہاں قرآن مجید پر کتاب (خط) کا اطلاق اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کتاب اور قریش کی جانب سے اس کے حوالے سے ردعمل اور حضرت سلیمان کے خط اور ملکہ سبا کی جانب سے اس کے بارے میں ردعمل کے درمیان مقابلہ کیا جائے' حالانکہ سلیمان علیہ السلام اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ تھے۔

اس تمہید اور چیلنج کے بعد قرآن کریم کا ذکر اور اس کی تعریف یوں ہوتی ہے۔

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴿۲﴾

"ہدایت اور بشارت ان ایمان لانے والوں کے لیے"۔

یہ اسلوب اس سے زیادہ بلیغ ہے اگر کہا جاتا "اس میں ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت و بشارت ہے"۔ قرآن جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس کتاب کا مواد ہی بذات خود ہدایت و بشارت ہے۔ اس طرح

قرآن کریم اہل ایمان کو ان کی زندگی کے ہر نشیب و فراز میں ہدایت دیتا ہے۔ ہر پہلو سے ہدایت ہے اور انسان کی دنیاوی اور اخروی دونوں زندگیوں کے لیے یہ کتاب بشارت اور خوشخبری ہے۔

یہ کتاب صرف مومنین کے لیے ہدایت اور بشارت ہے؟ اس فقرے میں اللہ نے ایک عظیم اور گہری حقیقت کو سمو دیا ہے۔ یہ قرآن کوئی نظریاتی اور فلسفیانہ کتاب نہیں ہے کہ جو بھی اسے پڑھے اور اس کے مضامین کا انطباق کرے اور ان کو نافذ کر دے تو بس قرآن کا مقصد پورا ہو گیا۔ یہ کتاب سب سے پہلے انسان کے قلب و نظر کو مخاطب کرتی ہے تاکہ وہ اسے ایمان' احترام اور یقین کے ساتھ قبول کرے۔ کھلے دل سے قبول کرے۔ پھر یہ کتاب اپنا نور' اپنا عطر اور اپنی حکمت اس کے دل میں ڈال دیتی ہے۔ اور جس قدر قاری کا دل ایمان کی تراوٹ رکھتا ہو گا اسی قدر' وہ اس کے مٹھاس کو پائے گا۔ اس کے معانی اس پر کھلتے جائیں گے۔ اور اس کی توجہات اور تاویلات اس کی سمجھ میں آئیں گی۔ کسی سنگدل اور خشک دل و دماغ رکھنے والے انسان پر اس کتاب کے راز نہیں کھلتے۔ اسی طرح ایک مومن صادق کو اس سے وہ ہدایات ملتی ہیں جو منکر حق اور سخت دل کو نہیں ملتیں اور اس کے نور سے وہ شخص ہدایت پاتا ہے جو مومن ہو اور وہ نہیں پاتا جس کا دل و دماغ مسخ ہو چکے ہوں۔

بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ ایک انسان کسی آیت اور کسی سورت کو بار بار پڑھتا ہے۔ وہ غفلت اور جلدی میں گزر جاتا ہے۔ اس کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ اچانک اس کے قلب میں روشنی کی ایک چمک اٹھتی ہے۔ اس کے ذہن میں معانی کے جہان روشن ہو کر آ جاتے ہیں جن کے بارے میں کبھی اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ یوں اشراق کے ان اوقات میں اس کی زندگی میں ایک انقلاب آ جاتا ہے۔ وہ ایک منہاج سے دوسرا منہاج اور ایک راستے سے دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔

غرض قرآن کے اندر جس نظام' جس قانون اور جن اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے اس کا دارومدار ایمان پر ہے۔ لہذا جس شخص کے دل میں ایمان نہیں ہے اور وہ اس قرآن کریم کو منجانب اللہ وحی نہیں سمجھتا ہے اور یہ یقین نہیں رکھتا کہ اس کے اندر جو کچھ آیا ہے وہ ایک نظام ہے جسے اللہ تعالیٰ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جو شخص قرآن کے بارے میں ایسا ایمان و یقین نہیں رکھتا وہ قرآن کریم سے کوئی ہدایت نہیں پا سکتا۔ نہ اس میں پھر اس کے لیے کوئی خوشخبری ہے اور نہ کوئی فائدہ۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے اندر ہدایت و معرفت اور تحریک اور راہنمائی کے عظیم المقدار خزانے پڑے ہوئے ہیں لیکن ان خزانوں کے دروازے کھولنے کی چابی ایمان ہے۔ یہ خزانے اس چابی کے بغیر کھل نہیں سکتے۔ جو لوگ صحیح طرح ایمان لے آتے ہیں۔ ان ہاتھوں پر' اس قرآن کے ذریعے ایسے عظیم کارنامے صادر ہوتے ہیں جس طرح پیغمبروں کے معجزات لیکن اگر قرآن کی حیثیت یہ ہو جائے کہ اسے گانے والے ترنم سے گائیں تو اس صورت میں قرآن صرف کانوں کے پردوں سے ٹکراتا ہے' دلوں تک نہیں اترتا۔ اور اس صورت میں قرآن پھر کوئی تبدیلی نہیں لاتا۔ اور اس سے کسی کو کوئی فائدہ نہ ہو گا اور اس کی حیثیت اس خزانے کی سی ہوئی' جس کی چابی نہ ہو۔

اس سورت میں ان مومنین کی تعریف بھی کی گئی جن کے ہاتھ میں قرآن کے خزانوں تک پہنچنے کی چابی ہوتی ہے' یہ لوگ ایسے ہوتے ہیں۔

الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ﴿۳﴾

"جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں' اور پھر وہ ایسے لوگ ہیں جو آخرت پر پورا یقین رکھتے ہیں"۔

وہ نماز قائم کرتے ہیں اور نماز کی ادائیگی اس طرح کرتے ہیں جس طرح اس کا حق بنتے یوں کہ جب وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہوں تو ان کے دل جاگ رہے ہوں۔ اور اس وقت ان کو یہ شعور ہو کہ وہ ذوالجلال والاکرام کے دربار میں کھڑے ہیں۔ اس وقت ان کی توجہ اس بلند افق پر ہو' ان کے دل مناجات الٰہی میں مشغول ہوں' اسے پکار رہے ہوں اور اس کے عظیم دربار میں حاضر ہوں۔

وہ زکوٰۃ دیتے ہیں' اس طرح ان کے نفوس کنجوسی کی رذالت سے نجات پا جائیں۔ یوں ان کی روح مال کے فتنوں سے سربلند ہو جائے اور وہ بعض ان نادار بھائیوں کے ساتھ مربوط ہو جائیں اور ان تک رزق پہنچا دیں اور اس طرح اپنی اجتماعی ذمہ داریاں ادا کر دیں۔

وہ آخرت پر پختہ یقین رکھتے ہوں۔ ہر وقت ان کو احساس ہو کہ آخرت میں اللہ کے سامنے جواب دینا ہے۔ ان کا دل امور آخرت میں مشغول ہو' ان کا دل خدا کے خوف سے بھرا ہوا ہو اور انسانی خواہشات ان کے دل پر اثر نہ کرتی ہوں۔ اللہ کی خشیت اور قیامت کے حساب و کتاب کا غم ان کو کھائے جا رہا ہو۔

یہ مومن 'اللہ کو یاد کرنے والے' اس کے فرائض ادا کرنے والے' اس سے ڈرنے والے اصحاب خشیت' اللہ کے اجر اور ثواب کے امیدوار' یہ ہیں وہ لوگ جن کے دل قرآن کے لیے کھل جاتے ہیں' تو ایسے لوگوں کے لیے قرآن ہدایت و بشارت بن جاتا ہے۔ وہ ان کی روح کا نور بن جاتا ہے' یہ ان کے خون کو گرم کر دیتا ہے اور ان کی زندگی کو متحرک بنا دیتا ہے اور یہ قرآن پھر ان کا زاد راہ بن جاتا ہے جس کے ذریعے وہ منزل مقصود کو پہنچتے ہیں اور اپنے رب سے مربوط ہو جاتے ہیں۔

ذکر آخرت کے حوالے سے مزید تاکید کرتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ جو آخرت پر پختہ یقین نہیں رکھتے وہ اپنی گمراہی میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اچانک وہ اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُونَ ﴿٤﴾

"حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ان کے لیے ہم نے ان کے کرتوتوں کو خوشنما بنا دیا ہے' اس لیے وہ بھٹکتے پھرتے ہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ آخرت پر ایمان وہ قوت ہے جو اس دنیا میں انسانی خواہشات' اس کے جذبات کو دباتی ہے اور ان کو اعتدال اور توازن بخشتی ہے۔ جو شخص ایمان نہیں رکھتا وہ اپنی کسی خواہش اور کسی میلان کو دبانے کی طاقت اور اخلاقی قوت ہی نہیں رکھتا وہ تو یہ سمجھتا ہے کہ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست اور اس عالم میں زندگی بھی مختصر ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اگر ہم نے اس دنیا میں کوئی عیش اور کوئی لذت ترک کر دی یا ہم حاصل نہ کر سکے تو اس زندگی میں ایک منٹ کی توسیع ہو جائے۔ جب سوچ یہ ہو جائے تو کسی کو عیش و عشرت اور لذات و رغبات کے ہاتھوں کون چھڑا سکتا ہے۔ الا یہ کہ وہ اللہ کے سامنے کھڑا ہونے کا ایمان اپنے اندر پیدا کر دے۔ قیامت کے دن کے ثواب اور اجر کا امیدوار ہو اور آخرت کی سزا سے خائف ہو جہاں تمام لوگ کھڑے ہوں گے۔

لہذا جن لوگوں کا آخرت پر ایمان نہیں ہوتا ان کے لیے ہر قسم کی شہوات اور لذات کو خوبصورت بنا دیا جاتا ہے۔ وہ بغیر خوف خدا' بغیر خوف آخرت اور پھر بلا شرم و حیا ان کے پیچھے کتوں کی طرح بھاگتے ہیں۔ نفس کی فطرت اور پیدائش اس پر ہے کہ یہ لذت کا دلدادہ ہے۔ یہ حسن پرست اور جمال پر مٹنے والا ہے۔ الا یہ کہ اسے آیات الہیہ اور رسولان کریم کی راہنمائی نصیب ہو جائے اور وہ اسے دائرہ ایمان کے اندر لے آئیں اور وہ سمجھ لے کہ یہ جہاں تو فانی ہے۔ جب کوئی نفس یہاں تک پہنچ جائے تو اس کے اعمال کا رنگ بدل جاتا ہے۔ اس کا عالم اشواق بدل جاتا ہے۔ اسے پھر اچھے کاموں میں اسی طرح لذت آتی ہے جس طرح مادی لذت ہوتی ہے بلکہ پیٹ اور جسم کی لذت پھر اسے نہایت ہی حقیر و قلیل نظر آنے لگتی ہے۔

یہ اللہ ہی ہے جس نے انسان کو ایسا پیدا کیا ہے۔ اسے اس قابل بنایا ہے کہ اگر اس کا دل ہدایت کے لیے کھل جائے تو وہ راہ ہدایت پا سکے۔ اور اگر اس کا دل بجھ جائے اور شمع ایمان گل کر دی جائے تو پھر وہ گمراہی کی راہ پر سرپٹ دوڑتا ہے۔ پھر اس انسانیت کی ہدایت و ضلالت کے لیے اس نے ایک سنت بھی جاری کر دی ہے۔ اور اس کے مطابق وہ ہدایت پاتا ہے یا راہ ضلالت اختیار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم یہ صراحت کر دیتا ہے اور خدا اسے اپنا فعل بتاتا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔

زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُونَ (۲۷ : ٤) "ہم نے ان کے کرتوتوں کو ان کے لیے خوشنما بنا دیا ہے' اس لیے وہ بھٹکتے پھرتے ہیں"۔ چونکہ وہ آخرت پر ایمان نہیں لاتے' اس لیے اس پر اللہ کی سنت کا نفاذ ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح ان کے اعمال اور ان کی لذات اور خواہشات ان کے لیے خوشنما بنا دی جاتی ہیں۔ یہاں تزئین اعمال یعنی اعمال کو مزین بنانے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ اس طرح بھٹکتے ہیں کہ جس شر میں یہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں اسے شر نہیں سمجھتے۔ اس لیے یہ شر کے چکر میں رات دن پڑے ہوئے ہوتے ہیں لیکن ان کو اس کا شعور ہرگز نہیں ہوتا۔

اور جس شخص کے لیے شر کو مزین کر دیا گیا ہو اس کا انجام سب کو معلوم ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَهُمْ سُوءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ ۝

"یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے بری سزا ہے اور آخرت میں یہی سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے ہیں"۔

چاہے یہ برا عذاب ان کو دنیا میں ملے یا آخرت میں۔ لیکن مکمل خسارہ آخرت کا خسارہ ہے۔ وہ انسان کے اعمال کے عین مطابق ہوتا ہے۔ جتنا کوئی برائی کی طرف مائل ہوتا ہے اسی قدر وہاں اس کی سزا سخت ہوتی ہے۔

اب اس سورت کی اس تمہید کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اے نبی' تم جس مصدر سے قرآن پا رہے ہو یہ تو علیم و حکیم کا سرچشمہ ہے۔

وَإِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ ۝

"اور (اے نبیؐ) بلاشبہ تم یہ قرآن ایک حکیم و علیم ہستی کی طرف سے پا رہے ہو"۔ تلقی کے لفظ میں یہ اشارہ ہے آپ کو علیم و حکیم ذات کی طرف سے براہ راست ہدایات دی جارہی ہیں اور یہ ذات ہر چیز کو حکیمانہ انداز میں بنانے والی ہے۔ اور ہر معاملے کی تدبیر علم سے کرنے والی ہے۔ اور اس ذات کے علم و حکمت کا ایک نمونہ یہ قرآن ہے۔ اپنے منہاج کے اعتبار سے' اپنے احکام و فرائض کے لحاظ سے' اپنی ہدایات اور طریقہ کار کے لحاظ سے' اپنی آیات و احکام کے نزول کے اعتبار سے' اپنے اجزاء کے تسلسل اور اپنے مضامین و موضوعات کے توازن اور ہم آہنگی کے اعتبار سے۔

اب قرآن کریم قصص کو لیتا ہے اور ان قصص سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا علم' اللہ کی حکمت اور اللہ کی نہایت ہی خفیہ تدابیر اس کائنات میں اور اس قرآن میں کس قدر موثر ہیں۔

---()()()---

# درس نمبر ۱۷۱ تشریح آیات

## ۷ --- تا --- ۱۴

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کا یہ حلقہ نہایت اختصار اور تیزی سے اسکرین پر آتا ہے اور گزر جاتا ہے اور سیاق کلام میں یہ آیت

وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ (۲۷ : ٦) "اے نبیؐ، بلاشبہ آپ یہ قرآن ایک حکیم و علیم کی طرف سے پا رہے ہیں" کے بعد متصلا آتا ہے۔ اب گویا بتایا جاتا ہے کہ نزول قرآن کا یہ عمل کوئی انوکھی بات نہیں ہے، تمام انبیاء اللہ سے ہدایات اور کتب پاتے رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ کا حال بطور نمونہ پیش کریں کہ یہ فریضہ ان کو بھی سونپا گیا۔ وہ فرعون اور اس کے سرداروں اور قوم کے پاس گئے اور قوم نے تکذیب کی۔ جس طرح آج قریش تکذیب کر رہے ہیں۔ جس طرح قوم موسیٰ کو یقین تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جو آیات و معجزات پیش کرتے ہیں وہ حق ہیں اور پھر بھی انکار کرتے تھے اور یہ انکار ظلم اور تکبر کی وجہ سے تھا، یہی روش آج قریش کی ہے لیکن

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۷ : ۱٤) "دیکھ لیں کہ مفسدین کا انجام کیسا ہوا"۔ یہی انجام قریش کا بھی ہو گا۔ جو محض غرور کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖۤ اِنِّيْۤ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝

"انہیں اس وقت کا قصہ سناؤ جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ "مجھے ایک آگ سی نظر آئی ہے، میں ابھی یا تو وہاں سے کوئی خبر لے کر آتا ہوں یا کوئی انگارا چن لاتا ہوں تاکہ تم لوگ گرم ہو سکو"۔

سورۃ طٰہٰ میں بھی اس قصے کی یہ کڑی لائی گئی تھی۔ جب آپ مدین سے مصر کی طرف لوٹ رہے تھے اور آپ کے ساتھ آپ کی بیوی، حضرت شعیب علیہ السلام کی دختر بھی رفیق تھیں۔ ایک اندھیری سیاہ اور سرد رات میں آپ سے راستہ گم ہو گیا تھا۔ حضرت کے الفاظ "میں تو ابھی یا تو وہاں سے کوئی خبر لے آتا ہوں یا کوئی انگارا چن لاتا ہوں تاکہ تم گرم ہو سکو"۔ اس وقت حضرت موسیٰ کوہ طور کے ایک طرف تھے۔ اور اس زمانے میں یہ رواج تھا کہ بلند ٹیلوں پر رات کے وقت آگ جلائی جاتی تھی۔ تاکہ اگر کوئی مسافر بھٹک جائے تو اس کی راہنمائی ہو۔ ایسی صورت میں جب کوئی مسافر آتا تو

اسے مہمان نوازی بھی ملتی اور وہ سردی میں اپنے آپ کو گرم بھی کرتا اور صحراء میں راستے کی راہنمائی بھی ہوتی۔

اِنِّیْ اٰنَسْتُ نَارًا (۲۷ : ۷) "مجھے ایک آگ سی نظر آئی ہے"۔ دور سے انہوں نے آگ کو دیکھا تو ان کو ایک گونہ اطمینان حاصل ہو گیا اور یہ امید پیدا ہو گئی کہ اس آگ کے پاس جاکر انہیں کچھ نہ کچھ راہنمائی مل جائے گی یا وہ کوئی انگارا لے آئیں گے جس سے وہ آگ جلاکر اس صحراء میں اپنے آپ کو گرم کر سکیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس آگ کی طرف آگے بڑھے جسے انہوں نے دیکھا تھا کہ وہ وہاں سے کوئی خبر لائیں۔ اچانک یہاں انہیں ایک نہایت ہی معزز اور شاہانہ آواز آتی ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ یٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝

"وہاں جو پہنچا تو ندا آئی کہ "مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور جو اس کے ماحول میں ہے۔ پاک ہے اللہ' سب جہان والوں کا پروردگار' اے موسیٰ' یہ میں ہوں اللہ' زبردست اور دانا"۔

یہ وہ پکار ہے جس کے ساتھ پوری کائنات ہمقدم ہے اور جس کے ساتھ تمام جہان اور تمام آسمان ہم آہنگ ہیں۔ تمام کائنات اس کے سامنے سہمی ہوئی ہے اور انسانی روح اور ضمیر اسے سن کر کانپ اٹھتا ہے۔ یہ وہ آواز ہے جس کے ساتھ زمین و آسمان کا اتصال ہے۔ اور انسان جو ایک چھوٹا سا ذرہ ہے وہ عظیم اور بلند ذات کی آواز کو پاتا ہے۔ اور ایک فانی اور ضعیف انسان ایک لافانی اور قوی ذات باری کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے اور یہ مقام اسے محض فضل رب تعالیٰ سے ملتا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ (۲۷ : ۸) "جب وہ وہاں پہنچا تو ندا آئی"۔ پکارا گیا' یہاں قرآن پکارنے والے کا نام نہیں لیتا' لیکن وہ معلوم ہے۔ یہ نام نہ لینا اور ماضی مجہول کا صیغہ احترام' تعظیم اور جلالت شان کبریائی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا (۲۷ : ۸) "پکارا گیا کہ مبارک ہے وہ جو آگ میں ہے اور وہ جو اس کے ماحول میں ہے"۔ آگ میں کون تھا۔ اور آگ کے ماحول میں کون تھا؟ راجح تفسیر یہی ہے کہ یہ آگ ویسی آگ نہ تھی جسے ہم جلاتے ہیں بلکہ یہ ایک ایسی آگ تھی جس کا مصدر عالم بالا تھا۔ یہ وہ آگ تھی جسے پاک فرشتوں نے عظیم ہدایت کے لیے روشن کیا تھا اور یہ آگ کی طرح نظر آ رہی تھی اور یہ پاک روحیں اس میں تھیں لہذا یہ ندا کہ جو اس آگ میں ہے وہ مبارک ہے۔ یہ اعلان تھا کہ اس آگ اور اس کے اردگرد جو پاک روحیں ہیں وہ بابرکت ہیں۔ اور اس آگ کے ماحول میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تھے اور پوری کائنات نے اس اعزاز کو ریکارڈ کر دیا کہ یہ خطہ زمین اس پوری کائنات میں بابرکت جگہ ہے' ایک مقدس مقام ہے اور اس میں اس پر اللہ ذوالجلال کی تجلیات اور برکات کا نزول ہوا ہے اور پھر اس جگہ کے تقدس اور برکت کا اعلان بھی کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کو بھی ریکارڈ کر دیا گیا "کہ پاک ہے' اللہ سب جہان والوں کا پروردگار' اے موسیٰ! میں اللہ زبردست اور دانا"۔

وَ سُبۡحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (۲۷ : ۸) یٰمُوۡسٰۤی اِنَّہٗۤ اَنَا اللّٰہُ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ

(۲۷ : ۹) اس آیت میں اللہ نے اپنی ذات کی پاکیزگی اور پورے جہان کے لیے اس کی ربوبیت کا اعلان کر دیا۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ جو آواز آ رہی ہے وہ میں ہوں۔ جو عزیز و حکیم ہوں۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی ذات کے ذریعے پوری انسانیت کو یہ بلندی بخشی گئی اور وہ کائنات کے آسمان پر ایک چمکتا ہوا تارا بن گئی۔ موسیٰ علیہ السلام کو اس آگ کے پاس سے بہت بڑی خبر مل گئی جو انہوں نے دور سے دیکھی تھی لیکن یہ عظیم خبر ایک عظیم ذمہ داری تھی۔ آپ کو گرمانے والا انگارا بھی مل گیا مگر وہ عوام کو راہ ہدایت کی طرف لانے کی آگ تھی۔

یہ آواز حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چننے کے لیے تھی۔ اور ان کے ذمہ فریضہ رسالت عائد کرنے کے لیے تھی اور پیغام بھی ان لوگوں تک پہنچانا تھا جو اس کرۂ ارض کے عظیم ترین سرکش تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کو اس کام کے لیے تیار فرماتا ہے اور تربیت دیتا ہے اور دلائل و معجزات کے ساتھ مسلح کرتا ہے۔

وَ اَلۡقِ عَصَاکَ ؕ

"تو ذرا اپنی لاٹھی اٹھا اور پھینک"۔ یہاں بات اختصار سے کی جاتی ہی اور سورہ طٰہٰ کی طرح طویل مناجات نہیں ہے۔ یہاں مقصد آواز دینا اور فریضہ عائد کرنا ہے"۔

فَلَمَّا رَاٰہَا تَہۡتَزُّ کَاَنَّہَا جَآنٌّ وَّلّٰی مُدۡبِرًا وَّ لَمۡ یُعَقِّبۡ ؕ

"جونہی کہ موسیٰ نے دیکھا لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے تو پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا"۔

حضرت موسیٰ نے حکم کے مطابق عصا پھینکا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ایک سانپ ہے اور زمین پر رینگ رہا ہے۔ جیسا کہ چھوٹے اور سریع الحرکت سانپ تیزی سے دوڑتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام انفعالی طبیعت کے مالک تھے۔ یہ اچانک منظر ان کے لیے غیر متوقع تھا۔ حضرت اس سانپ سے دور بھاگ گئے اور واپس نہ دیکھا۔ یہ ایک ایسی حرکت تھی جو غیر متوقع اور اچانک پیش آ جانے کی صورت میں ہر انسان سے صادر ہوتی ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مزاج بھی ایسا تھا کہ وہ جلد متاثر ہوتے تھے۔

اب پھر عالم بالا سے آواز دی جاتی ہے۔ اطمینان عطا کرنے والی آواز۔ اعلان کیا جاتا ہے آپ کا منصب منصب رسالت ہے اور کسی رسول کے لیے ڈرنا مناسب نہیں ہے۔

یٰمُوۡسٰی لَا تَخَفۡ ۟ اِنِّیۡ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الۡمُرۡسَلُوۡنَ

"اے موسیٰ ڈرو نہیں۔ میرے حضور رسول ڈرا نہیں کرتے"۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ آپ کے اسرق رسالت کا منصب اور فرائض ہیں اور رسول اللہ کے دربار میں ہوتے ہیں اور وہاں ان کے ڈرنے کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔

إِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوٓءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١١﴾

"الا یہ کہ کسی نے قصور کیا ہو۔ پھر اگر برائی کے بعد اس نے بھلائی سے (اپنے فعل کو) بدل لیا تو میں معاف کرنے والا مہربان ہوں"۔

ہمارے ہاں تو وہ لوگ ڈرتے ہیں جو ظالم ہیں الا یہ کہ ظلم کے بعد وہ نیک ہو جائیں تو بھی معاف ہو جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے ظلم ترک کر کے عدل اپنا لیا ہے۔ شرک کو چھوڑ کر توحید کا عقیدہ اپنا لیا ہوتا ہے۔ شر کو چھوڑ کر خیر کی راہ لے لی ہے۔ میری رحمت وسیع ہے اور میری مغفرت بہت بڑی ہے۔

اب حضرت موسیٰ کو اطمینان اور قرار نصیب ہو گیا۔ اب اللہ آپ کو دوسرا معجزہ عطا فرماتا ہے لیکن ابھی تک ان کو رسالت کی مہم نہیں بتائی گئی کہ جانا کہاں ہے۔

وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوٓءٍ ۣ

"اور ذرا اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں تو ڈالو' چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے"۔

یہ عمل بھی ایسا ہی ہوا حضرت موسیٰ نے اپنا ہاتھ اپنے گریباں میں ڈالا اور جب نکالا تو وہ بغیر بیماری کے چمک رہا تھا۔ یہ کوئی مرض نہ تھی بلکہ معجزہ تھا اور اللہ نے ان کے ساتھ وعدہ کیا کہ اس قسم کی نو نشانیاں اور معجزات تمہیں دیئے جائیں گے جن میں سے دو کا مشاہدہ اور مظاہرہ تم نے دیکھ لیا۔ اب حضرت موسیٰ کے سامنے اس مہم کا انکشاف کیا جاتا ہے جو انہوں نے سر کرنی ہے اور جس کے لیے ان کو یوں تیار کیا گیا۔

فِي تِسْعِ ءَايَٰتٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِۦٓ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا۟ قَوْمًا فَٰسِقِينَ ﴿١٢﴾

"یہ (دو نشانیاں) نو نشانیوں میں سے ہیں فرعون اور اس کی قوم کی طرف (لے جانے کے لیے) وہ بڑے بدکردار لوگ ہیں"۔

یہاں باقی نشانیاں نہیں گنوائی گئیں جبکہ سورہ اعراف میں تفصیلات دی گئی ہیں جو یہ ہیں' خشک سالی' پیداوار کی' طوفان' ٹڈی دل کا حملہ' جوئیں اور مینڈک اور خون۔ کیوں کہ سورہ اعراف میں موضوع سخن یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑی قوی نشانیاں دی گئی تھیں لیکن پھر بھی فرعون نے انکار کیا۔ بہرحال ان نشانیوں کی وضاحت کافی اور شافی ہونے کے باوجود قوم نے انکار کر دیا۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ ءَايَٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا۟ هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿١٣﴾ وَجَحَدُوا۟ بِهَا

وَٱسْتَيْقَنَتْهَآ أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا ۚ فَٱنظُرْ كَيْفَ كَانَ عَٰقِبَةُ ٱلْمُفْسِدِينَ ﴿١٤﴾ ع

۱۶

"مگر جب ہماری کھلی کھلی نشانیاں ان لوگوں کے سامنے آئیں تو انہوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ انہوں نے سراسر ظلم اور غرور کی راہ سے ان نشانیوں کا انکار کیا حالاں کہ دل اس کے قائل ہو چکے تھے۔ اب دیکھ لو کہ ان مفسدوں کا انجام کیسا ہوا"۔

یہ بے شمار نشانیاں 'حق کو باطل سے واضح کرنے والی نشانیاں' ایسی نشانیاں کہ جس کو اللہ نے دو آنکھیں دی ہیں وہ انہیں دیکھ سکتا ہے۔ جن کے بارے میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ نشانیاں مبصر ہیں یعنی وہ دیکھنے والی ہیں۔ دیکھ دیکھ کر لوگوں کو راہ ہدایت کی طرف لانے والی ہیں۔ لیکن وہ لوگ ایسے ہٹ دھرم تھے کہ ان کو بھی انہوں نے کہا کہ سحر مبین ہے 'کھلا جادو ہے۔ یہ نہیں کہ وہ دل سے کہتے تھے یا وہ فی الواقعہ ایسا سمجھتے تھے یہ تو انہوں نے محض ظلم اور علو کی وجہ سے کہا۔ ان کے دل و دماغ تو اس پر مطمئن تھے کہ یہ حق ہے۔ بالکل ان کو کوئی شبہ نہ تھا۔

وَ اسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ (۲۷ : ۱٤ ) "حالانکہ ان کے دل ان کے قائل ہو چکے تھے"۔ محض ہٹ دھرمی اور مکابرہ کی وجہ سے کیونکہ یہ ایمان لانا نہیں چاہتے تھے اور نہ کوئی دلیل وہ طلب کرنا چاہتے تھے۔ یہ اپنے آپ کو سچائی سے برتر سمجھتے تھے اور اپنے نفوس پر ظلم کر رہے تھے کیونکہ قبول حق میں خود ان کی بھلائی تھی۔

بعینہ یہی حال اکابرین قریش کا بھی تھا۔ یہ قرآن کریم کو سنتے تھے 'ان کو اچھی طرح یقین تھا کہ یہ حق ہے لیکن محض ہٹ دھرمی کی وجہ سے انکار کرتے تھے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا انکار کرتے تھے حالانکہ یہ دعوت صرف اللہ وحدہ کی طرف تھی۔ وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ ہر حال میں اپنے دین اور عقائد پر قائم رہنا چاہتے تھے کیونکہ اس دین میں ایسے اصول تھے جن کی وجہ سے ان کو مسند حاصل تھی۔ کچھ مفادات حاصل تھے 'اور یہ مسندیں اور مفادات ان عقائد باطلہ پر مبنی تھے۔ دعوت اسلامی سے ان کے لیے خطرہ ہی یہ تھا۔ اس کی کامیابی سے ان کے یہ مفادات ختم ہو جائیں گے اور ان کا مقام و مرتبہ جاتا رہے گا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے قدموں کے نیچے سے زمین نکلی جا رہی ہے اور ان کے عقائد اور شعور کے اندر ایک زلزلہ برپا ہے اور قرآن کو "حق مبین" تھا اور اس کی کارگر ضربات ہروقت ان پر لگتی رہتی ہیں۔

سچائی کا انکار ہمیشہ اس لیے نہیں ہوتا کہ لوگ اسے جانتے نہیں ہیں 'بلکہ سچائی کا انکار اس لیے ہوتا ہے کہ لوگ جانتے ہیں کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ ان کے نفوس اچھی طرح جانتے ہیں۔ پھر ان منکرین کو اپنی جان کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا بلکہ اپنے حالات اپنے مفادات اور اپنی مصلحتوں کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ حق کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں حالانکہ سچائی واضح اور مبین ہوتی ہے۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۷ : ۱٤ ) "اب دیکھو کہ مفسدوں کا انجام کیسا ہوا"۔

فرعون اور اس کی قوم کا انجام کیا ہوا۔ قرآن نے دوسری جگہ اس کی پوری تفصیلات دی ہیں۔ یہاں صرف اشارہ کر دیا۔ شاید کہ انکار کرنے والوں میں سے کچھ عقلمند مان جائیں۔ قبل اس کے کہ ان کا وہ انجام ہو جو فرعون کا ہوا۔

--- ○○○ ---

# درس نمبر ۱۷۲ ایک نظر میں

"یہاں حضرت داؤد کی طرف صرف ایک اشارہ ہے لیکن پورا قصہ صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہے۔ اور اس سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کی ایک مختصر کڑی دی گئی ہے۔ یہ سب حضرات انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے اور اس سورت کے آغاز ہی میں قرآن کریم پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ کہا گیا تھا۔

انَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ

( ۷۶ : ۲۷ ) "یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے ان بیشتر باتوں کی تفصیلات بیان کرتا ہے جس میں وہ مختلف الرائے ہیں"۔ اس سورت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے کی سب سورتوں کے مقابلے میں زیادہ تفصیلات دی گئی ہیں' یعنی جہاں جہاں حضرت سلیمان کا تذکرہ ہوا ہے۔ اگرچہ یہاں ان کے حالات زندگی میں سے قصہ ہدہد اور ملکہ سبا کی تفصیلات ہیں۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام یہ اعلان فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان کو خصوصی طور پر پرندوں کی باتیں سکھائی ہیں اور ہر چیز عطا کی ہے اور اللہ نے ان پر جو فضل و کرم کیا ہے وہ اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک منظر آتا ہے جس میں حضرت سلیمان اپنے لاؤ لشکر سمیت چلتے نظر آتے ہیں۔ اس عظیم لشکر میں جن' انس اور پرندے سب شامل ہیں۔ جب یہ لشکر چلتا ہے تو ایک چھوٹی سی چیونٹی اپنی قوم کو خبردار کرتی ہے کہ ایک عظیم لشکر جرار اس علاقے کا رخ کر رہا ہے۔ لہٰذا اپنے آپ کو بچاؤ۔ حضرت سلیمان یہ الفاظ سنتے ہیں اور اس پر بھی رب کا شکر ادا کرتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس بات کو پاتے ہیں کہ نعمت تو ابتلا ہے۔ اس لیے وہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ تو اس ابتلا میں مجھے شکر اور کامیابی کی توفیق عطا فرما۔

یہ قصہ اس سورت میں کیوں لایا گیا ہے۔ سورت کے آغاز ہی میں بیان کر دیا گیا ہے کہ یہ کتاب ہدایت ہے اور پھر اسی سورت میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ قرآن کریم بنی اسرائیل کے سامنے ان بیشتر موضوعات پر کلام کرتا ہے جن کے بارے میں ان کے اندر اختلاف رائے ہے جیسا کہ اس سے قبل ہم کہہ آئے ہیں اور حضرت موسیٰ' حضرت داؤد' اور حضرت سلیمان علیہم السلام کے قصص تاریخ بنی اسرائیل کی اہم کڑیاں ہیں۔

یہاں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے کی جو کڑی پیش کی گئی ہے اس کی اس سورت کے مضمون سے مناسبت کیا ہے۔ یہ کڑی کئی پہلوؤں کے اعتبار سے مناسبت رکھتی ہے۔

اس سورت کا مرکزی مضمون علم ہے جیسا کہ ہم نے اس سورت پر تبصرے میں کہا ہے۔ اور حضرت داؤد و سلیمان کے قصے میں سب سے پہلا اشارہ ہی اس طرف ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا (۲۷ : ۱۵) "ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم عطا کیا" - اور پھر سلیمان علیہ السلام نے اس کڑی میں منطق الطیر کے علم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ کی نعمت کا اعتراف کیا ہے -

وَ قَالَ يٰاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ (۲۷ : ۱۶) "لوگو ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں" - اور اس قصے کے درمیان ہدہد اپنی غیر حاضری کا عذر بیان کرتے ہوئے یہ کہتا ہے -

اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَ جِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ (۲۷ : ۲۲) "میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو تیرے علم میں نہیں ہیں - میں سبا کے متعلق یقینی اطلاع لے کر آیا ہوں" - اور پھر اس قصے میں ہے کہ جس شخص کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا کہ میں ملکہ سبا کا تخت پلک جھپکتے لاتا ہوں -

سورت کے افتتاح میں تھا کہ یہ قرآن اللہ کی طرف سے ایک کتاب مبین ہے - اور اس کو مشرکین مکہ کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہے - لیکن وہ اس کی تکذیب کرتے ہیں - پھر اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک خط کا ذکر ہے جو ملکہ سبا کے نام لکھا گیا - لیکن وہ جب معلوم کر لیتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سچائی کی دعوت دیتے ہیں تو وہ اور اس کی قوم اسے جلد ہی قبول کر کے مطیع فرمان ہو جاتے ہیں - خصوصاً جبکہ وہ دیکھتے ہیں کہ جن و انس اور پرندوں کی قوتیں بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کر دی گئی ہیں اور یہ اللہ ہی ہے جس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ قوتیں عطا کی ہیں - وہی ہے اقتدار اعلیٰ کا مالک -

پھر اس سورت میں انسانوں پر اللہ کے انعامات کا بھی ذکر ہے - اس کائنات میں اس کے جو نشانات ہیں ان کا بھی ذکر ہے - لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ پھر بھی اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں - اور شکر نعمت بجا نہیں لاتے - اس قصے میں بھی ایک بندۂ شکر گزار کا ذکر ہے ' جو اللہ کے سامنے دست بدعا ہوتے ہیں کہ اے اللہ مجھے یہ توفیق دے کہ میں تیری انعامات کا شکر بجا لاؤں - جو اللہ کی آیات پر غور کرتے ہیں اور ان سے کسی وقت بھی غافل نہیں ہوتے اور نہ وہ اللہ کے انعامات کی وجہ سے سرکشی اختیار کرتے ہیں - نہ قوت کی وجہ سے وہ گھمنڈ میں مبتلا ہوتے ہیں - لہٰذا اس قصے کی مضمون سورت کے ساتھ کئی ربط اور مناسبتیں ہیں اور سورت کے موضوع اور قصے کے اندر جابجا واضح اشارات موجود ہیں -

حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کی کہانی کو جس طرح قرآن مجید نے بیان کیا ہے وہ اس بات کا نمونہ ہے کہ قرآن مجید قصص کو کس طرح لاتا ہے اور اس کا قصص کا فنی انداز بیان کیسا ہوتا ہے - اس قصے میں تگ و دو ' جذبات و تاثرات ' مختلف مناظر اور مشاہد پائے جاتے ہیں - پھر مختلف مناظر کے درمیان گیپ جن میں غیر ضروری حصوں کو کاٹ دیا گیا ہے - اور اس کے دوسرے فنی کمالات ہیں -

اب ذرا آیات کی تفصیلات

---()()()---

# درس نمبر ۱۷۲ تشریح آیات

## ۱۵--- تا--- ۴۴

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ وَ سُلَیۡمٰنَ عِلۡمًا ۚ وَ قَالَا الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیۡرٍ مِّنۡ عِبَادِہِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۵﴾

"(دوسری طرف) ہم نے داؤد و سلیمان کو علم عطا کیا اور انہوں نے کہا کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی"۔

یہ اشارہ ہے کہ اب قصے کا آغاز ہونے والا ہے اور یہ افتتاحی کلمات ہیں۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ اس قصے کے بڑے کرداروں کو ہم نے بڑے بڑے انعامات سے نوازا تھا اور سب سے بڑا اعزاز تو علم ہوتا ہے جو حضرت داؤد اور سلیمان علیہم السلام کو دیا گیا۔ حضرت داؤد کو جو علوم دیئے گئے تھے قرآن کریم کی دوسری سورتوں میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ یہ کہ زبور کی آیات کو ترتیل کے ساتھ پڑھنے کا فن ان کو دیا گیا تھا' وہ اس فن میں اس قدر ماہر تھے کہ جب وہ زبور کی آیات پڑھتے تھے تو یہ پوری کائنات ان کے ساتھ گنگناتی تھی۔ پہاڑ کی گونج اور پرندوں کی چہچہاہٹ ان کے ساتھ زبور کو گاتے۔ کیونکہ آپ کی آواز بے حد میٹھی تھی۔ وہ سوز دل سے پڑھتے تھے اور اپنے رب کے ساتھ مناجات میں وہ غرق ہو جاتے تھے۔ پھر ان کو اللہ نے جنگی سازوسامان کی بنیادی ٹیکنالوجی دی تھی۔ وہ اچھی زرہیں بناتے تھے' دھاتوں کو پگھلانے میں مہارت رکھتے تھے اور ان سے ہر قسم کی چیزیں بناتے تھے۔ اور وہ ایک بہترین جج تھے اور اس کام میں حضرت سلیمان ان کے مشیر خاص تھے۔

رہے سلیمان علیہ السلام تو اس سورت میں وہ پوری تفصیلات دی گئی ہیں جو اللہ نے ان کو سکھائیں یعنی پرندوں کی بولیاں' اور جس طرح دوسری سورتوں میں ذکر ہے کہ وہ ایک بہترین جج تھے اور ان کے لیے ہواؤں کو بھی مسخر کر دیا گیا تھا۔ اور اس قصے کا آغاز بھی اسی اشارے سے ہوتا ہے۔

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ وَ سُلَیۡمٰنَ عِلۡمًا (۲۷: ۱۵) "یہ واقعہ ہے کہ ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا تھا"۔ لیکن آیت ختم ہونے سے پہلے حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہم السلام کی جانب سے یہ بات آجاتی ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں اور علم کی نعمت کی ان کے ہاں بڑی قدر و قیمت ہے۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے

ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ نے اس معاملے میں ان کو اپنے مومن بندوں کی ایک بڑی تعداد کے مقابلے میں ترجیح دی ہے۔ یوں وہ علم کی قدر و قیمت اور پھر اس عظیم احسان کا اعتراف کرتے ہیں۔

یہاں اس علم کی نوعیت اور تفصیلات نہیں دی گئیں کیونکہ اللہ کے ہاں مطلق علم ایک فضل الہی ہے۔ عام علم کو اللہ کی نعمت بتانا مقصود ہے۔ ہر قسم کا اور ہر نوع علم مطلوب مومن ہے۔ پھر ہر عالم کا یہ فرض ہے کہ وہ اللہ کے اس فضل کا شکر ادا کرے۔ اور اللہ کا شکر اور اس کی حمد بیان کرتا رہے اور یہ دعا کرتا رہے کہ اے اللہ یہ علم میرے لیے نافع ہو۔ یہ نہ ہو کہ علم انسان کو اللہ سے دور کر دے' اللہ کو بھلانے کا سبب بنے حالانکہ علم دینے والا اللہ ہے۔

وہ علم جو قلب انسانی کو اللہ سے دور کرے' وہ فاسد علم ہے۔ وہ اپنے مقصد اور اپنے ہدف سے دور اور ایک طرف ہو گیا ہوتا ہے۔ ایسا علم صاحب علم کے لیے فلاح و نجات اور سعادت مندی کا باعث نہیں ہوتا۔ اور نہ ایسا علم انسانوں کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ ایسا علم انسانوں کے لیے مصیبت' بد بختی' خوف' قلق' بے چینی اور بالآخر ہلاکت کا سبب بنتا ہے۔ کیونکہ یہ علم اپنے مصدر و منبع سے کٹ گیا ہے' اس کی سمت غلط ہے اور اس نے اللہ تک پہنچنے کی راہ گم کر دی ہے۔

اس وقت انسانیت علم کے ایک اعلیٰ مرتبے تک پہنچ چکی ہے۔ خصوصاً ایٹم کے توڑنے کے بعد۔ اور پھر اسے مختلف مفید کاموں میں استعمال کرنے کے بعد۔ لیکن جن لوگوں کے ہاتھ یہ ایٹمی علم آیا اور جن کے دلوں میں خدا کا خوف نہ تھا۔ ان کے ہاتھوں انسانیت نے کس قدر کڑوا پھل چکھا اور کھایا۔ یہ اس لیے کہ ان لوگوں کے دل میں خدا کا خوف' خدا کی تعریف' اور خدا کی طرف توجہ نہ تھی۔ چنانچہ اس علم نے اور ایسے علماء نے ہیروشیما کا کارنامہ سرانجام دیا۔ ناگاساکی کی تباہی مچائی اور ان واقعات کے بعد اب شرق و غرب کے تمام انسان رات دن اس کرۂ ارض اور تمام انسانیت کی تباہی کا انتظار کر رہے ہیں۔

اس تمہید کے بعد کہ حضرت داؤد اور سلیمان دونوں کو ہم نے علم سے نوازا اور انہوں نے اللہ کی حمد اور تعریف کی کہ اللہ نے ان پر احسان کیا اور علم کی قدر و قیمت کو محسوس کیا۔ اب صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی کے واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝

"اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا اور اس نے کہا "لوگو' ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں' بے شک یہ (اللہ کا) نمایاں فضل ہے"۔

حضرت داؤد کو نبوت اور علم کے ساتھ ساتھ حکومت بھی دی گئی تھی لیکن ان دونوں پر اللہ کے فضل و کرم کے بیان میں ان کے اقتدار کا ذکر نہیں کیا گیا۔ صرف علم و حکمت کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ علم و حکمت کے مقابلے میں اقتدار ایک حقیر چیز ہے۔

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ (۲۷ : ۱۶) "اور سلیمان نے داؤد کی وراثت پائی"۔ یہاں وراثت سے مراد بھی

علم کی وراثت ہے کیونکہ علم و حکمت ہی اس قابل ہے کہ اس میں کوئی پیغمبر دوسرے کا وارث بنے اور اس بات کی تاکید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت سلیمان لوگوں میں یہ اعلان کرتے ہیں۔

وَ قَالَ یٰاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ وَ اُوْتِیْنَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ (۲۷ : ۱۶) "اے لوگو، ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں"۔ تو علم کا ذکر کر دیا گیا اور باقی نعمتوں کا ذکر اس کے ضمن میں کر دیا گیا۔ گویا داؤد نے یہ چیزیں نہیں دی ہیں بلکہ دینے والا اللہ ہے جہاں سے علم آیا۔

وَ قَالَ یٰاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ وَ اُوْتِیْنَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ (۲۷ : ۱۶) "لوگو ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں"۔ ان باتوں کا حضرت سلیمان علیہ السلام لوگوں میں اعلان کرتے ہیں۔ یہ اعلان وہ بطور تحدیث نعمت کرتے ہیں اور اللہ کے ہاں اپنے مقام فضیلت کے لیے کرتے ہیں' بطور فخر و مباہات نہیں کرتے۔ نہ یہ کہ آپ لوگوں پر رعب جماتے تھے اور ایسی باتوں کا ذکر کرتے تھے جو ان میں نہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد ذکر ہوا۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِیْنُ (۲۷ : ۱۶) "بے شک یہ اللہ کا نمایاں فضل ہے"۔ یعنی اللہ کا فضل ہے اپنے بندے پر۔ کیونکہ پرندوں کی بولیوں کی تعلیم پر صرف اللہ ہی قادر ہے۔ اور اس طرح حضرت داؤد و سلیمان کو علی العموم تمام انعامات دیئے گئے تھے۔ یہ بھی اللہ ہی دے سکتا ہے۔

پرندوں' حیوانوں اور حشرات الارض کو اللہ نے ایک دوسرے کو سمجھانے کے لیے وسائل دیئے تھے اور یہ ان کی زبان اور منطق ہے۔ اللہ ان تمام جہانوں کے خالق ہیں۔ فرماتے ہیں۔

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ (الانعام : ۳۸) "زمین پر چلنے والے جتنے جانور ہیں اور اڑنے والے پرندے جو اپنے دو پروں کے ساتھ اڑتے ہیں وہ تمہاری طرح امتیں ہیں"۔ یہ چیزیں امت تب ہی بن سکتی ہیں جب ان کے درمیان اجتماعی روابط ہوں۔ جن کے مطابق وہ رہتے ہوں اور ایسے وسائل اور ذرائع ہوں' جن کے ذریعے وہ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ بے شمار حشرات حیوانات اور پرندوں کے اندر یہ چیز نظر آتی ہے۔ حشرات الارض کی اقسام کے ماہرین نے اپنے اندازوں اور مشاہدوں کے ذریعے ان انواع کے ذرائع تفاہم کی بعض علامات دریافت بھی کی ہیں جو اگرچہ ظنی ہیں۔ رہا وہ علم جو حضرت سلیمان علیہ السلام کو دیا گیا تھا وہ ان کے ساتھ خاص تھا۔ اور وہ معجزانہ انداز میں ان کو دیا گیا تھا وہ عام انسانوں کا عام مشاہدہ نہ تھا۔ نہ وہ ایسا علم تھا جس طرح ہمارے دور میں مشاہدہ اور تتبع سے بعض لوگوں نے بعض انواع کے بارے میں معلوم کی ہیں۔ یہ انسانی علوم ظن و تخمین ہیں۔ ان کی نوعیت اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے علم کی نوعیت مختلف ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ بطور تاکید مزید اس بات کی وضاحت کر دوں کیونکہ بعض جدید مفسرین کو سائنس کی علمی کامیابیوں نے اس قدر متاثر کر دیا ہے کہ وہ قرآن کریم کی تفسیر جدید علمی اکتشافات کی روشنی میں کرتے ہیں۔ ان مفسرین نے حضرت

سلیمان علیہ السلام کے علم منطق الطیر کی ایسی ہی تشریح کی ہے کہ یہ ایسا ہی علم تھا جیسا کہ دور جدید کے بعض ماہرین نے حشرات الارض اور حیوانات کی بعض انواع و اجناس کے بارے میں معلوم کیا ہے۔ ایسی کوششیں دراصل قرآنی معجزات کو اپنی حقیقی ماہیت سے نکال دیتی ہیں۔ یہ دراصل ایک شکست خوردہ انداز فکر ہے اور جدید سائنس کے سامنے غیر ضروری طور پر بچھ جانا ہے۔ حالانکہ سائنس کی اکتشافات بہت ہی حقیر و قلیل ہیں جبکہ اللہ کے لیے یہ بات کوئی مشکل امر نہیں ہے کہ وہ کسی شخص کو حیوانات 'حشرات اور طیور و وحوش کے وہ تمام طریقہ اظہار اور مکالمہ سمجھا دے اور معجزانہ انداز میں سمجھا دے۔ بغیر سائنسی ریسرچ اور جہد کے اللہ کے لیے یہ اس طرح آسان ہے کہ اس نے انسانوں اور حیوانوں کے درمیان جو پردہ حائل کر دیا ہے بس صرف اسے ہٹانا ہے وہ تو تمام انواع کا خالق ہے۔

پھر یہ بات اس عظیم معجزے کا ایک پہلو تھا جو سلیمان علیہ السلام کو دیا گیا تھا۔ اس کا دوسرا مصدر یہ تھا کہ حضرت کے لیے جنوں اور پرندوں کی ایک بڑی تعداد کو مسخر کر دیا گیا تھا تاکہ وہ آپ کی حکومت کے ماتحت ہوں اور آپ کے لیے پوری طرح مطیع فرمان ہوں 'جس طرح انسانوں کی جو افواج آپ نے بھرتی کر رکھی تھیں اور پرندوں میں سے جو گروہ آپ کے زیر نگیں کر دیا گیا تھا اسے اللہ نے ایک خاص قوت مدرکہ دی تھی۔ اور وہ قوت ان جیسے عام پرندوں میں نہ تھی۔

یہ بات ہدہد کے قصے سے معلوم ہوتی ہے جس نے ملکہ سبا کی مملکت کے حالات معلوم کیے اور اس نے ان کے حالات کو اس طرح سمجھا جس طرح کہ اعلیٰ درجے کا عقلمند اور متقی شخص سمجھ سکتا ہے۔ اور یہ بھی اس معجزے کا ایک حصہ تھا جو حضرت سلیمان کو دیا گیا تھا۔

اللہ کی یہ سنت ہے کہ اللہ کی مخلوق میں جو حیوانات پائے جاتے ہیں ان کے درمیان عقلمندی کی سطح اونچی اور نیچی تو ہو سکتی ہے لیکن کسی حیوان کو یہ مقام حاصل نہیں ہوتا ہے کہ اس کی قوت مدرکہ انسان سے بڑھ جائے یا اس کے برابر ہو جائے۔ یہ حیوانات اور طیور کی خلقت میں سنت الہیہ نہیں ہے۔ اور نہ یہ سنت اس پوری کائنات کے نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور سنت الہیہ کے تابع ہے۔ یہ سنت اول روز سے ایسی ہی چل رہی ہے۔

آج ہمارے ہاں جو ہدہد پایا جاتا ہے' ہزارہا ملین سال پہلے بھی ہدہد اسی نہج پر پیدا ہو رہا تھا۔ جب سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے۔ کیونکہ اللہ نے ہر حیوان کے اندر ایسے جینز پیدا کیے ہیں کہ آج کا ہدہد ہزارہا ملین سال پہلے پیدا کیے جانے والے ہدہد کی پوری کاپی ہے۔ اس کے اندر جو اور جس قدر تبدیلی بھی ہو وہ اپنی نوعیت کے دائرے سے نہیں نکل سکتا۔ یہ بھی سنت الہیہ کا ایک پہلو ہے اور اس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

لیکن ان دونوں حقائق کے باوجود یہ نوامیس فطرت اور یہ سنت الہیہ اس بات سے مانع نہیں ہیں کہ اللہ اپنی قدرت کے اصولوں کے اندر استثنائی صورت پیدا کر دے۔ بعض اوقات یہ استثنائی حالت بھی دراصل ناموس عام اور سنت جاریہ ہی کا ایک حصہ ہوتی ہے لیکن ہم اس مخصوص پہلو سے خبردار نہیں ہوتے۔ اس جزئی ناموس اور استثنائی حالت کا علم دراصل صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بظاہر چلتے ہوئے اصول کو روک دیتا ہے۔ اس طرح سنت الہیہ میں بظاہر جو تبدیلی ہوتی ہے وہ بھی ایک برتر سنت ہوتی ہے۔ یہی تھی کہانی ہدہد اور سلیمان کی اور اللہ نے ان قوتوں کو سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کر دیا تھا۔

اب ہم اس نکتے سے سلیمان علیہ السلام کے قصے کی طرف آتے ہیں کہ حضرت داؤد کی وراثت پا کر انہوں نے اللہ کی

طرف سے کیا کیا انعامات پائے۔

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾

"سلیمان کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے"۔

یہ تھا حضرت سلیمان کا لشکر۔ بہت بڑی تعداد میں ہر طرف سے اٹھایا ہوا۔ جن' انس اور پرندوں پر مشتمل۔ انسان تو معلوم ہیں' جن وہ مخلوق ہے جس کے بارے میں خود قرآن نے معلومات دی ہیں اور ان کی حقیقت کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ وہ آگ کے شعلے سے پیدا شدہ ہیں۔ یعنی ایسے شعلے جو موجوں کی شکل میں اٹھتے ہیں۔ بشر ان کو نہیں دیکھ سکتے مگر وہ بشر کو دیکھ سکتے ہیں۔

اِنَّهٗ يَرٰكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ "وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھتا ہے مگر تم اسے نہیں دیکھتے"۔ یہ آیت اگرچہ ابلیس کے بارے میں ہے لیکن وہ جنوں میں سے تھا۔ پھر ان جنوں کے اندر یہ قوت ہے کہ یہ انسانوں کے دلوں میں برائی کے وسوسے ڈالتے ہیں اور پھر یہ انسانوں کو اللہ کی معصیت پر آمادہ کرتے ہیں۔ لیکن اس کی تفصیلی کیفیت ہمیں معلوم نہیں ہے۔ اور جنوں کا ایک طائفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان بھی لایا تھا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نہیں دیکھا۔ نہ آپ نے ان کے ایمان کو سنا' یا دیکھا۔ البتہ اللہ نے اس بات کی اطلاع حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۱)

يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (۲) (۷۲ : ۱ - ۲) "اے پیغمبر کہہ دے' میری طرف یہ وحی کی گئی ہے۔ ایک گروہ جس نے کان لگا کر سنا اور پھر کہا ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے' جو راہنمائی کرتا ہے عقلمندی کی راہ کی طرف تو ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے والے نہیں ہیں"۔ ہمیں اس کا علم ہے کہ جنوں کا ایک گروہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے زیر نگیں تھا۔ جو آپ کے لیے محرابی عمارات' تصویریں اور بڑے بڑے حوضوں جیسے کھانے کے لگن بناتا تھا اور یہ جن آپ کے لیے سمندر میں غوطے بھی لگاتے تھے۔ اور آپ کے دوسرے احکام بجالاتے تھے۔ اور یہ سب آپ کے لشکر میں انسانوں اور پرندوں کے ساتھ موجود تھے۔

اور یہ جو ہم کہتے ہیں کہ اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے جنوں اور انسانوں کا ایک گروہ مسخر کر دیا تھا تو اس لیے کہ تمام روئے زمین کے جن و انس حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں شامل نہ تھے کیونکہ حضرت سلیمان کی حکومت کی حدود فلسطین' شام' عراق تک محدود تھیں۔ اسی طرح تمام جن اور تمام پرندے بھی آپ کے لیے مسخر نہ تھے۔ ان میں سے ایک گروہ آپ کے لیے مسخر کر دیا گیا تھا۔

جن سب کے سب مسخر نہ تھے۔ اس لیے کہ ابلیس جنوں میں سے تھا' اس کی ذریت بھی جن تھی جس طرح قرآن مجید میں ہے۔

کَانَ مِنَ الْجِنِّ اور سورت الناس میں ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے اور حضرت سلیمان کے زمانے میں بھی شیطان جنات لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے تھے' لوگوں کو گمراہ کرتے تھے اور تمام شر کے کاموں پر آمادہ کرتے تھے۔ لہذا تمام جن حضرت سلیمان کے لیے مسخر نہ تھے ورنہ ان کی تسخیر میں ہوتے ہوئے وہ کس طرح فسادی کام کرتے۔ کیونکہ حضرت سلیمان ایک نبی تھے اور لوگوں کو ہدایت کی طرف بلاتے تھے لہذا صحیح بات یہ ہے کہ جنات کا ایک گروہ ان کے تابع تھا۔

پرندوں کے سلسلے میں بھی یہی استدلال ہے کہ جب پرندہ حاضر نہ پایا گیا' تو معلوم ہوا کہ تمام پرندے مسخر نہ تھے ورنہ ہزارہا پرندوں میں سے ایک کا ہونا نہ ہونا محسوس نہ ہوتا۔ جب ہدہد نہ پایا گیا تو آپ نے فرمایا

مَالِيَ لَآ اَرَي الْهُدْهُدَ ( ۲۷ : ۲۰ ) "یہ ہدہد کہاں گیا میں اسے نہیں دیکھ رہا ہوں"۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک مخصوص ہدہد تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ایک ہی ہدہد ہو۔ یا یہ کہ جو ہدہد ڈیوٹی پر تھا وہ موجود نہ تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس ہدہد یا مسخر ہدہدوں کو اللہ نے ادراک کی ذرا زیادہ قوت دے رکھی تھی جو اور ہدہدوں میں نہ تھی۔ اور یہ قوت مدرکہ صرف ان کے پرندوں کے لیے تھی جو سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کیے گئے تھے۔ کیونکہ ان آیات سے ہدہد کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ذہین اور نیک پرندہ تھا۔

غرض حضرت سلیمان کے لیے جن و انس اور وحوش و طیور کی ایک عظیم فوج اٹھائی گئی تھی۔ یہ ایک عظیم فوج تھی اور یہ سب کے سب بے حد منظم تھے۔ یہ غیر منظم بھیڑ کی شکل میں نہ تھی۔ اس لیے ان کو افواج کہا گیا ہے اور جنود کے لفظ سے دونوں مفہوم ظاہر ہوتے ہیں یعنی کثرت تعداد اور تنظیم۔

حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾

"(ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کوچ کر رہا تھا) یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا "اے چیونٹیو' اپنے بلوں میں گھس جاؤ' کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی

نہ ہو"۔ سلیمان اس کی بات پر مسکراتے ہوئے ہنس پڑا اور بولا "اے میرے رب، مجھے قابو میں رکھیں کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور ایسا عمل صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کر"۔

یہ لشکر جب نکلا، جس میں انسان، جن اور طیور شامل تھے۔ نہایت تنظیم اور ترتیب کے ساتھ۔ اس کا اول اس کے آخری حصہ سے مربوط تھا۔ اس کی صفیں منظم تھیں۔ اور اس کی حرکت بھی منظم تھی۔ یہ لشکر ایک ایسی وادی میں پہنچا جہاں چیونٹیاں بڑی تعداد میں تھیں۔ اس کثرت سے کہ اس وادی کا نام ہی وادی نمل تھا۔ تو ایک ایسی چیونٹی نے جو ان کی سربراہ تھی، چیونٹیوں سے کہا

ادْخُلُوا مَسٰكِنَكُمْ (۲۷ : ۱۸) "اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ"۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ چیونٹیاں بھی شہد کی مکھیوں کی طرح بہت منظم ہوتی ہیں۔ ان کے اندر ڈیوٹیاں تقسیم ہوتی ہیں اور یہ ایک عجیب نظام کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہیں۔ ایسے نظام کے ساتھ کہ خود انسانوں کے لیے اس قدر منظم زندگی بسر کرنا مشکل ہے۔ ان کو بڑی ترقی یافتہ عقل اور بلند قوت مدرکہ دی گئی ہے تو اس چیونٹی نے اپنی زبان میں کہا

لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۲۷ : ۱۸) "کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو"۔ حضرت سلیمان نے چیونٹی کی بات کو سمجھ لیا۔ ان کا دل بہت خوش ہوا کہ چیونٹی کیا احکام دے رہی ہے۔ انہوں نے اس پر تعجب کیا کہ ایک چیونٹی حضرت سلیمان کی شان کو جانتی ہے۔ خطرہ محسوس کرتی ہے، جبکہ ان کے دل میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ ان کو اذیت دیں جس طرح ایک چھوٹا بڑے کی اذیت سے ڈرتا ہے۔ حضرت سلیمان کو خوشی اس پر ہوئی کہ اس قدر چھوٹی مخلوق بھی ان کے بارے میں ادراک رکھتی ہے۔ اور پھر تعجب بھی ہوا کہ ایک چیونٹی کی اطاعت اس کے ماتحت کرتے ہیں اور کرتے ہیں۔ ان کو اللہ کی مخلوقات اور عجائبات پر بڑا تعجب ہوا۔

جب حضرت سلیمان کو یہ سب باتیں معلوم ہوئیں تو

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا (۲۷ : ۱۹) "سلیمان اس کی بات پر مسکراتے ہوئے ہنس پڑا"۔ لیکن اس مشاہدے نے ان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ان کے دل کو رب تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیا۔ جس نے انہیں یہ خارق عادت علم سے نوازا۔ یوں انسانوں اور دوسری مخلوقات کے درمیان راز کے جو پردے حائل تھے وہ ہٹا دیئے گئے۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نہایت عاجزی کے ساتھ رب کی طرف متوجہ ہوئے۔

وَ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ عَلٰي وَالِدَيَّ (۲۷ : ۱۹) اور کہا اے میرے رب، مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے"۔

اے رب یہ براہ راست ایک خدا رسیدہ شخص کی دعا ہے۔اَوْزِعْنِیْ یعنی مجھے جمع رکھ میرے شعور اور میرے اعضا جمع رکھ' میرے دل اور میری زبان کو قابو میں رکھ۔ میرے خیالات اور خلجانات کو منضبط کر دے اور میرے کلمات اور میری عبادات کو مجتمع کر دے۔ میرے اعمال اور میری سرگرمیوں کو منضبط کر دے۔ میری تمام طاقتوں کو مجتمع اور منضبط کر دے۔ میرے وجود کو اول سے آخر تک ایک کر دے۔ یہ سب مفہومات "اوزعنی" میں شامل ہیں۔ تاکہ میں پورے کا پورا مجسمہ شکر بن جاؤں۔ان انعامات کے عوض جو مجھ پر اور میرے والدین پر کیے گئے۔

اس انداز تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے قلب پر ان انعامات کا اثر تھا۔ان پر جو اثر تھا اس کی نوعیت بھی اس سے ظاہر ہوتی ہے اور ان کا وجود اور ان کا وجدان اللہ کے فضل و کرم کی اس بارش سے سرشار تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان پر اور ان کے والدین پر اللہ کا دست شفقت ہروقت نعمت' رحمت اور فضل و کرم کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔

"اے میرے رب' مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا"۔

وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ (۲۷ : ۱۹) "اور میں ایسا عمل کرتا رہوں جو تجھے پسند آئے"۔عمل صالح بھی دراصل اللہ کا فضل و کرم ہوتا ہے اور یہ اس شخص پر ہوتا ہے۔جو اللہ کا شکر گزار ہو اور سلیمان علیہ السلام ایسے شکر گزار ہیں کہ اس معاملے میں وہ اللہ کی استعانت طلب کرتے ہیں کہ شکر بھی اللہ کی امداد کے بغیر ممکن نہیں ہے اور توفیق عمل بھی اللہ کی طرف سے ایک نعمت ہے۔سلیمان علیہ السلام کو اس نکتے کا اچھا شعور تھا۔

وَ اَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ (۲۷ : ۱۹) "اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کر"۔حضرت جانتے ہیں کہ اللہ کے بندوں میں داخل ہو جانا اور ان کے ساتھ ہو لینا بھی اللہ کی رحمت ہے۔اس سے بھی انسان کی مدد ہوتی ہے۔اور انسان کو اچھے کام کی توفیق ہو جاتی ہے۔پھر وہ صالحین کے ساتھ چلتا ہے' اللہ سے دعا کرتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں میں ہو جن پر تیرا رحم ہوتا ہے' جو تیری راہ کے سالک ہیں اور اس گروہ میں ہیں۔حضرت سلیمان اللہ کے سامنے عاجزی کرتے ہیں حالانکہ وہ نبی ہیں انس' جن اور طیور ان کے لیے مسخر ہیں لیکن وہ پھر بھی اپنے آپ کو اللہ کی رحمت کا محتاج تصور کرتے ہیں' وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ان سے عمل صالح کی شکر نعمت میں کوتاہی نہ ہو جائے۔غرض تیز احساس' ایسا ہی شعور' اللہ کا خوف و خشیت' اللہ کی رضا اور رحمت کی طلبگاری کے پختہ شعور کے لحات ہی ہوتے جن میں اللہ کی نعمتیں اپنے خاص بندوں پر کھلی نازل ہوتی ہیں' جس طرح حضرت سلیمان پر نازل ہوئیں۔

اب یہاں ہمارے سامنے ایک نہیں' دو معجزات ہیں۔ایک معجزہ یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو علم ہو گیا ہے اور دوسرا یہ کہ چیونٹی کو یہ علم ہو گیا ہے کہ یہ لشکر سلیمان علیہ السلام کا ہے۔پہلا معجزہ تو یوں ہے کہ حضرت سلیمان کو اللہ نے تعلیم دی۔وہ نبی تھے' انسان تھے اور انسان کے بارے میں ایک انسان بسہولت سمجھ سکتا ہے کہ اسے چیونٹی کے احکامات کا علم ہو گیا۔لیکن دوسرا معجزہ جو چیونٹی کے قول میں ہے تو اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ چیونٹیوں کو معلوم ہو گیا کہ انسان ایک بڑی مخلوق ہے اور یہ ان کو روند ڈالیں گے۔ ہر زندہ مخلوق کے اندر زندگی بچانے کا داعیہ ہوتا ہے۔اسی طرح چیونٹیوں میں بھی یہ شعور ہو گا۔رہی یہ بات کہ ایک چیونٹی کو یہ علم کیسے ہو گیا کہ بڑی مخلوق کا یہ لاؤ لشکر سلیمان علیہ السلام

کا ہے ۔ یہ بہرحال ایک معجزہ ہے ۔ اور اسے معجزہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ نے اسے معجزانہ طور پر یہ بات سکھا دی تھی ۔

اب آیئے سلیمان علیہ السلام اور ہدہد کے واقعہ اور ملکہ سبا کے ساتھ معاملات کی طرف ۔ اس قصے میں چھ اہم مناظر ہیں ۔ ان مناظر کے درمیان خلا ہے ۔ غیر ضروری واقعات کو چھوڑ دیا گیا ہے ۔ درمیانی واقعات و مناظر دیکھنے کے بعد خود ذہن میں آجاتے ہیں ۔ اس طرح قصے بیان کرنے میں ایک اعلیٰ فنی مظاہرہ ہوتا ہے اور ان مناظر کے درمیان بعض سبق آموز تبصرے بھی ہوتے ہیں جن میں انسانی شعور کو اس مقصد اور ہدف کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے ۔ جس کے لیے یہ قصہ لایا گیا ہے ۔ اس طرح قصہ لانے کا حقیقی مقصد پورا ہو جاتا ہے ۔ یوں قصے کا فنی اسلوب اظہار کی خوبصورتی اور اخلاقی سبق اور دینی تعلیم دونوں مقاصد پورے ہو جاتے ہیں ۔

سلیمان علیہ السلام کے بارے میں بات شروع کرتے وقت ہی انس، جن اور طیور کا ذکر ہو گیا تھا ۔ جس میں سلیمان علیہ السلام پر اللہ کی نعمتوں میں سے نعمت علم کا اشارہ بھی تھا ۔ لہٰذا اس قصے میں انسانوں، جنوں اور طیور کا اہم رول ہر جگہ موجود ہے ۔ اور ان کے سب کردار کا تعلق پھر علم کے ساتھ ہے ۔ اور اس سورت کے مقدمہ میں بھی ان اہم کرداروں کی طرف اشارہ تھا ۔ اور یہ قرآنی قصوں کی اہم خصوصیت ہے ۔

پھر اس قصے میں جو کردار ہیں ان کی شخصیت ان کی ممتاز صفات اور خصوصیات بھی قصے میں موجود ہیں ۔ حضرت سلیمان کی شخصیت، ملکہ سبا کی شخصیت، ہدہد کی شخصیت، ملکہ سبا کی حاشیہ نشینوں کی شخصیات اور ان شخصیات اور کرداروں کی نفسیات، سوچ اور میلانات سب کے سب قصے میں موجود ہیں ۔

---()()()---

پہلا منظر حضرت سلیمان علیہ السلام کی لشکر کشی کا ہے یا یہ سامان حرب کی سالانہ پریڈ ہے ۔ یہ لشکر نکلتا ہے جس میں جن، انس اور طیور ہیں اور یہ وادی نملہ سے گزرتا ہے ۔ سلیمان علیہ السلام چیونٹی کی گفتگو سنتے ہیں اور اللہ کی طرف متوجہ ہو کر شکر بجالاتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللھم زدفزد ۔

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ ﴿٢٠﴾ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ ﴿٢١﴾

" (ایک اور موقعہ پر) سلیمان علیہ السلام نے پرندوں کا جائزہ لیا اور کہا "کیا بات ہے کہ میں فلاں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ کیا وہ کہیں غائب ہو گیا ہے؟ میں اسے سخت سزا دوں گا یا اسے ذبح کر دوں گا، ورنہ اسے میرے سامنے معقول وجہ پیش کرنی ہوگی" ۔

اس منظر میں حضرت سلیمان، ایک نبی اپنے ایک عظیم و کثیر لشکر میں نظر آتے ہیں ۔ جب وہ پرندوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہدہد کو غائب پاتے ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاص ہدہد تھا جسے اس لشکر میں ہونا چاہئے تھا ۔ یہ کوئی عام ہدہد نہ تھا کہ جس طرح لاکھوں میں سے ایک غائب ہو ۔ یا کرہ ارض کے تمام ہدہدوں میں سے صرف ایک کم تھا ۔ نیز اس سے

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخصوص ہدہد ایک خاص کردار رکھتا تھا اور مخصوص خصوصیات رکھتا تھا۔ یہ نہایت ہی بیدار مغز' باریک بین اور عقلمند ہدہد تھا۔ اور سلیمان علیہ السلام کی شخصیت بھی معلوم ہوتی ہے کہ آپ اپنی اس عظیم الشان فوج پر بھی پوری نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ فوج کو اول و آخر تک جانتے ہیں۔

وہ اس کے بارے میں ایک اعلیٰ کمانڈر انچیف کے نپے تلے جامع الفاظ میں پوچھتے ہیں۔

مَا لِيَ لَآ اَرَي الْهُدْهُدَ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِينَ (۲۷ : ۲۰) "کیا بات ہے میں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا۔ کیا وہ غائب ہو گیا ہے"۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہدہد غائب ہے اور سب کو معلوم ہوتا ہے کہ جب بادشاہ اس کے بارے میں پوچھتے ہیں تو وہ بغیر اجازت کے غائب ہے۔ لہٰذا اس معاملے کو اب سنجیدگی سے لیا جاتا ہے۔ تاکہ فوج کے اندر افراتفری نہ ہو اور دوسرے لوگ بھی ادھر ادھر کھسکنا شروع نہ کر دیں۔ کیونکہ بادشاہ کی جانب سے اس انکوائری کے بعد بات تو راز نہ رہی تھی۔ اگر اس پر سنجیدگی سے غور نہ کیا گیا تو یہ دوسرے فوجیوں کے لیے ایک بری مثال ہو گی۔ چنانچہ حضرت سلیمان اپنی فوج کے اس سپاہی کی غیر حاضری کو بڑی سنجیدگی سے لیتے ہیں۔

لَاُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَا اَذْبَحَنَّهُ (۲۷ : ۲۱) "میں اسے سخت سزا دوں گا یا اسے ذبح کر دوں گا"۔ لیکن بہرحال آپ نبی تھے' ------ جبار نہ تھے۔ ابھی تو آپ نے ہدہد کے عذرات نہیں سنے' اسے نوٹس نہیں دیا گیا' لہٰذا فیصلہ عذرات سننے کے بعد ہو گا۔ بغیر سنے فیصلہ اسلامی اصول عدل کے خلاف ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔

اَوْ لَيَاْتِيَنِّي بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۲۷ : ۲۱) "یا اسے میرے سامنے معقول وجہ پیش کرنی ہو گی"۔ یعنی ایسی دلیل اور ایسا عذر جس کی وجہ سے وہ مواخذے سے بچ جائے اور عذر معقول ہو۔

اب پردہ گرتا ہے اس قصے کا یہ پہلا منظر ہے۔ سلیمان علیہ السلام دوسرے کاموں میں مشغول ہیں یا ہدہد ہی کی تلاش میں ہیں۔ بہرحال ہدہد آ جاتا ہے۔ اس کے پاس ایک چونکا دینے والی خبر ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے بھی حیران کن اور ہمارے لیے بھی حیران کن جو ہم آج اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ۝۲۲ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّ لَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ۝۲۳ وَجَدْتُّهَا وَ قَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝۲۴ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ۝۲۵ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝۲۶ السجدۃ

"کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اس نے آکر کہا "میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں - میں سبا کے متعلق یقینی اطلاع لے کر آیا ہوں - میں نے وہاں ایک عورت دیکھی جو اس قوم کی حکمران ہے - اس کو ہر طرح کا سروسامان بخشا گیا ہے اور اس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے - میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کی بجائے سورج کے آگے سجدہ کرتی ہے" - شیطان نے ان کے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا دیئے اور انہیں شاہراہ سے روک دیا' اس وجہ سے وہ یہ سیدھا راستہ نہیں پاتے کہ اس خدا کو سجدہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں نکالتا ہے - اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم لوگ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو - اللہ کہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں' جو عرش عظیم کا مالک ہے"۔

یہ ہدہد بادشاہ کی دانشمندی اور بہترین تنظیمی صلاحیتوں سے باخبر تھا - اس لیے ہدہد نے پہلے ہی فقرے میں چونکا دینے والی خبر سے اپنی بات کا آغاز کیا تاکہ اس خبر کے بعد اس سے جواب طلبی کا موقعہ نہ رہے اور بادشاہ اس کی بات کو غور سے سنیں -

اَحَطْتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ (۲۷ : ۲۲) "میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں - میں سبا کے بارے میں یقینی معلومات لے کر آیا ہوں" - کون بادشاہ ایسا ہو گا اپنے کسی ملازم سے وہ باتیں نہ سنے جن کے بارے میں اسے علم نہیں -

جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے سننا شروع کیا تو اس نے تفصیلات بتانا شروع کر دیں - مملکت سبا جنوب یمن میں واقعہ تھی - ہدہد کہتا ہے کہ اس قوم پر عورت حکمرانی کرتی ہے -

وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (۲۷ : ۲۳) "اسے ہر طرح کا سروسامان بخشا گیا ہے" - یعنی اس کی مملکت عظیم اور مالدار ہے اور اس کے اندر خوشحالی اور تہذیب کے تمام اسباب موجود ہیں - قوت اور پیداوار

وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ (۲۷ : ۲۳) "اس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے" - یعنی جہاں ملکہ جلوس فرماتی ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی مملکت بڑی ہے' مالدار ہے' خوشحال ہے اور اس کے اندر صنعت و حرفت کی ترقیات ہیں اور ان لوگوں کی نظریاتی حالت یہ ہے کہ

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۲۷ : ۲۴) "میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کے بجائے سورج کے آگے سجدہ کرتی ہے" - یہاں ہدہد یہ تفصیل بھی بتاتا ہے کہ شیطان نے ان کے لیے ان کے ان برے اعمال کو مزین کر دیا ہے - لہٰذا ان کو گمراہ کر دیا ہے اور یہ لوگ اللہ وحدہ کی عبادت اور راہ ہدایت نہیں پاتے -

اَلَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۷ : ۲۵) "وہ اللہ جو آسمان اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو نکالتا ہے" - خبء کا مفہوم وہ چیز ہے جو چھپی ہوئی ہو - یہ پوشیدہ چیز خواہ آسمانوں کی بارش ہو' زمین کے اندر سے نباتات ہوں یا زمین و آسمان کے دوسرے اسرار و رموز ہوں - یعنی پردہ غیب کے پیچھے پائے جانے والے عجائب و غرائب جو اللہ نے پیدا کیا' نفس انسانی کے اندر پائے جانے والے عجائب غرض وہ سب چیزیں جو ظاہر ہیں یا باطن ہیں -

یہاں تک تو ہدہد ایک ملزم کی حیثیت میں کھڑا ہے - ابھی تک شاہ سلیمان علیہ السلام نے ان کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا - چنانچہ انتظامی لحاظ سے تحت گیر حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے وہ اپنی بات کے آخر میں نیک اشارہ کرتا ہے

کہ اللہ جو جبار و قہار ہے اور سب کا رب ہے 'صاحب عرش عظیم ہے۔ اس کے اقتدار اور انسانوں کے اقتدار کے درمیان کوئی مماثلت نہیں ہے تاکہ حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ کی اس برتری کے سامنے انسان کی بادشاہت کی کم مائیگی کے بارے میں سوچ لیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۲۷ : ۲۶) السجدة "اللہ جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے"۔ یوں ہدہد ملکہ سبا کی قوم پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ اشارہ کرتا ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ہدہد بھی بڑا عجیب پرندہ ہے۔ یہ نہایت ذہین 'سمجھدار اور مومن پرندہ ہے۔ اور اس نے نہایت ہی خوبصورت 'جامع اور مانع رپورٹ بھی پیش کر دی ہے۔ یہ حالات کو خوب جانتا ہے۔ اور حالات پر ماہرانہ رائے بھی دیتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ یہ ملکہ ہے 'یہ اس کی رعایا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ یہ سورج پرست قوم ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ کے سوا کسی کے سامنے سجدہ ریز ہونا جائز نہیں ہے۔ وہ اللہ جس نے زمین و آسمان کی تمام ظاہری اور خفیہ چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ وہ رب عرش عظیم ہے۔ ہر ہدہد تو ایسا علم نہیں رکھتا لہٰذا یہ کوئی مخصوص معجزاتی ہدہد ہے۔ عام ہدہد سے علیحدہ۔

اب حضرت سلیمان یوں نہیں کرتے کہ ہدہد کی رپورٹ کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لیں۔ وہ اس عظیم خبر پر اچھل نہیں پڑتے۔ چنانچہ وہ ایک تجربہ کار حکمران کی طرح اس کو تصدیق کے لیے لیتے ہیں۔ بادشاہ کے ساتھ ساتھ ایک عادل نبی اور رسول بھی ہیں۔

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾

سلیمان نے کہا "ابھی ہم دیکھے لیتے ہیں کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے۔ میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کی طرف ڈال دے 'پھر الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں"۔

اس منظر میں خط کا مضمون نہیں دکھایا جاتا۔ گویا یہ بند پیغام ہے تاکہ یہ مکتوب الیہ تک پہنچ جائے اور وہاں کھولا جائے تاکہ ہر نئی بات ناظرین کے سامنے اپنے صحیح وقت پر آئے۔

پردہ گرتا ہے۔ اب ہم ملکہ سبا کے دربار میں ہیں اور خط وہاں پہنچ گیا ہے اور کھولا جاتا ہے۔ ملکہ اب اپنی شوریٰ کے سامنے مضمون پیش کر کے مشورہ لیتی ہے۔

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّهٗ مِنْ ۳
سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ ع۱۷
۱۷

ملکہ بولی "اے اہل دربار ' میری طرف ایک بڑا اہم خط پھینکا گیا ہے ۔ وہ سلیمان کی جانب سے ہے اور اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے ۔ مضمون یہ ہے کہ میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ" ۔

وہ اپنی شوریٰ کو بتاتی ہے کہ اس کے دربار میں یہ خط پھینکا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے معلوم نہیں ہے کہ یہ خط پھینکا کس نے ہے ۔ اور کس طرح پھینکا ہے ۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اسے ہدہد نے پھینکا ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے تو وہ اس کا اعلان کر دیتی ۔ کیونکہ یہ ایک اور عجیب بات ہوتی اور یہ بات روزانہ کے معجزات تو تھے نہیں کہ ہدہد خط پھینکتا تھا ۔ چونکہ اس نے صیغہ مجہول استعمال کیا ہے اور اللہ نے نقل کیا ہے لہذا ہم سمجھتے ہیں کہ اسے معلوم نہ تھا کہ خط پھینکنے والا کون ہے ۔

ملکہ اسے ایک معزز خط "کتاب کریم" کہتی ہے ۔ شاید اس خط کے انداز تحریر ' اس کی مہر اور اس کے طریقہ تلفیف کی وجہ سے اس نے معلوم کیا ہو کہ یہ کوئی غیر معمولی خط ہے ۔ نیز جب اس کے مضمون سے اپنے مشیروں کو آگاہ کیا تو اس سے بھی اس کے دل میں اس خط کی مزید اہمیت بیٹھ گئی ۔ جس کا مضمون یہ تھا ۔

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۲۷ : ۳۰) اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَ اْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ (۲۷ : ۳۱) "یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے اور یہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کیا گیا ہے اور مضمون یہ ہے "میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ" ۔ یہ مسلمان تو نہ تھی لیکن سلیمان علیہ السلام کی حکومت کا شہرہ اس علاقے میں عام تھا ۔ قرآن کریم نے اس خط کے الفاظ کو جس طرح نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو ٹوک اور نہایت ہی رعب دار اور خوفناک مضمون کا خط تھا ۔ اسی وجہ سے اس نے اسے کتاب کریم کہا ۔

خط کا مضمون نہایت ہی سادہ ہے اور نہایت ہی پرتاثیر ۔ آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہے اور مضمون صرف یہ ہے کہ میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور میرے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے حاضر ہو جاؤ ۔ میرے سامنے نہیں بلکہ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اور مسلمان بن کر آ جاؤ ۔

ملکہ نے یہ کتاب اور یہ خط اپنے اہل حل و عقد کے سامنے رکھا اور ان سے اس کے بارے میں مشورہ طلب کیا ۔ وہ کہتی ہے کہ میں کسی معاملے میں بھی تمہارے مشورے سے قبل فیصلہ نہیں کرتی ۔ تمہاری رضامندی سے اور تمہارے اتفاق رائے سے سب کچھ ہوتا ہے ۔

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾

"(خط سنا کر) ملکہ نے کہا "اے سرداران قوم ' میرے اس معاملے میں مجھے مشورہ دو ' میں کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہیں کرتی ہوں" ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ سبا کس قدر ہوشیار عورت ہے اس نے اس خط کو لیا جبکہ اس کے پھینکنے والے کا کوئی پتہ نہیں ہے ۔ خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو ٹوک ہے اور جس نے لکھا ہے وہ کوئی سپر طاقت ہے ۔ یہ تاثر اس نے

اپنے اہل حل و عقد کے ذہنوں میں یوں نقل کیا کہ اس نے اسے ایک اہم کلا اور کتاب کریم کہا۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ملکہ مقابلہ کرنا نہیں چاہتی لیکن وہ بصراحت اس کا اظہار بھی نہیں کرتی۔ بطور تمہید کہہ دیتی ہے۔ پھر رائے طلب کرتی ہے اور حاشیہ نشینوں کا جواب آتا ہے۔ وہ حسب عادت یہی کہتے ہیں کہ حکم کیجئے ہم تیار ہیں۔ طاقتور ہیں لیکن بہرحال فیصلہ بدست حضور ہے!

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّ اُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ۬ وَّ الْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَا ذَا تَاْمُرِيْنَ ۝

"انہوں نے جواب دیا" ہم طاقت ور اور لڑنے والے لوگ ہیں۔ آگے فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ آپ کو کیا حکم دینا ہے"۔

اب یہاں اس عورت کی اصل شخصیت سامنے آئی ہے۔ یہ ملکہ سبا کی صورت میں ہے۔ ہر عورت تباہی اور بربادی کو فطرتاً ناپسند کرتی ہے۔ چنانچہ وہ سیاست اور تدبیر کے ہتھیار کو جنگی سازوسامان سے پہلے آزمانا چاہتی ہے۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَ كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝ وَ اِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ۝

ملکہ نے کہا کہ "بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اسے خراب اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں' یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں۔ میں ان لوگوں کی طرف ایک ہدیہ بھیجتی ہوں' پھر دیکھتی ہوں کہ میرے ایلچی کیا جواب لے کر پلٹتے ہیں"۔

وہ جانتی ہے کہ بادشاہ جب کسی بستی پر قابض ہوتے ہیں تو وہ اسے برباد کر دیتے ہیں۔ (لفظ قریہ عربی میں بڑے شہر پر بھی بولا جاتا ہے)۔ لوگوں کی عزت و آبرو کو خراب کر دیتے ہیں' خونریزی کرتے ہیں اور مقامی لوگوں کی قوت کو پاش پاش کر کے رکھ دیتے ہیں۔ وہ سب سے پہلے موجود رؤساء اور بااثر طبقات کو ختم کرتے ہیں۔ کیونکہ یہی لوگ ہوتے ہیں جو مقابلہ اور مدافعت کرتے ہیں۔ یہ ان کا تاریخی طرز عمل ہے۔

ہدیہ انسان کے دل کو نرم کر دیتا ہے اور محبت پیدا کرتا ہے۔ بسااوقات معمولی ہدیہ سے ایک بہت بڑی جنگ ٹل جاتی ہے۔ یہ ایک تجربہ ہے۔ اگر حضرت سلیمان ہدیہ قبول کر لیں تو یہ ایک دنیاوی معاملہ ہو گا اور دنیا میں ایسے ہی وسائل کارگر ہوتے ہیں اور فائدہ دیتے ہیں۔ اور اگر وہ قبول نہیں کرتے تو یہ ایک نظریاتی معاملہ ہو گا اور نظریاتی تحریکوں کو پیسے کے

ذریعے نہیں روکا جاسکتا۔ نہ اس دنیا کے کوئی ہتھکنڈے انہیں روک سکتے ہیں۔

اب یہاں پھر پردہ گرتا ہے۔ اب اگلے منظر میں ملکہ سبا کے کارندے حضرت سلیمان کے دربار میں ہدایا پیش کرتے ہیں اور حضرت سلیمان ان کی اس حرکت کو ناپسند کرتے ہیں کہ وہ انہیں مال و دولت کے ذریعہ خرید نا چاہتے ہیں اور دعوت اسلامی کو چند ٹکوں کے عوض خرید نا چاہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت سلیمان ان کو سخت تنبیہ کرتے ہیں اور سخت دھمکی دیتے ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

"جب وہ (ملکہ کا سفیر) سلیمان کے ہاں پہنچا تو اس نے کہا "کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں دیا ہے۔ تمہارا ہدیہ تم ہی کو مبارک رہے (اے سفیر) واپس جا اپنے بھیجنے والوں کی طرف۔ ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا مقابلہ وہ نہ کر سکیں گے اور ہم انہیں ایسی ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے"۔

ان لوگوں کے ہدایا کو رد کرتے وقت حضرت سلیمان علیہ السلام نے دولت کی حقارت کا اظہار بھی کیا۔ ان کو بتایا گیا کہ دولت کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن نظریات اور ایمانیات کے مقابلہ میں دولت ایک حقیر چیز ہوتی ہے۔

اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ (۲۷ : ۳۶) "کیا تم مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو"۔ کیا تم یہ حقیر چیز میرے سامنے پیش کرتے ہو اور میری اس قدر کم قیمت لگاتے ہو۔

فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ (۲۷ : ۳۶) "جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں دیا ہے"۔ مجھے مال بھی تم سے زیادہ دیا ہے اور منصب نبوت بھی دیا ہے جو جنس مال سے خیر ہے۔ علم نبوت جو بڑی دولت ہے۔ انسانوں، جنوں اور طیور کی تسخیر جو روپے کے ذریعے نہیں کی جاسکتی۔ لہٰذا اس زمین کی کوئی چیز مجھے خوش نہیں کر سکتی۔

بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ (۲۷ : ۳۶) "تمہارا یہ ہدیہ تمہیں مبارک ہو"۔ تم دنیا پرست لوگ ایسی چیزوں پر خوش ہوتے ہو، لیکن ہمارے نزدیک ان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ہم تو اللہ سے لو لگائے ہوئے ہیں اور اللہ کے ہدایا قبول کرتے ہیں۔

اس کے بعد انہیں سخت تہدید آمیز جواب دیا جاتا ہے۔

اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ (۲۷ : ۳۷) "واپس جا اپنے بھیجنے والے کی طرف"۔ یہ ہدایا ان کو دو اور عبرت آمیز

انجام کا انتظار کرو۔

فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا (۲۷ : ۳۷) "ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا مقابلہ وہ نہ کر سکیں گے"۔ یہ ایسی افواج ہیں جو دنیا کے کسی انسان کے پاس نہیں ہیں۔ اور ملکہ سبا اور اس کی قوم ہماری افواج کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (۲۷ : ۳۷) "اور ہم انہیں ایسی ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے"۔ اب یہاں پر رہ کرتا ہے اور یہ چیلنج اور تہدید کا منظر ختم ہو جاتا ہے۔ سفارت واپس ہو جاتی ہے۔ اب سیاق کلام یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ اگلے اقدام کے بارے میں یہاں ایک لفظ بھی نہیں کہا جاتا۔

حضرت سلیمان یہ جانتے ہیں کہ ملکہ کے ساتھ معاملہ ختم ہو گیا' وہ نہ مقابلہ کر سکتی ہے۔ نہ دشمنی چاہتی ہے۔ کیونکہ ہدایا کے ساتھ سفارت بھیجنے کا مقصد ہی یہ تھا۔ حضرت سلیمان جان گئے کہ یہ ملکہ مطابق حکم سلیمان دعوت قبول کرے گی اور اطاعت کر لے گی جیسا کہ بعد کے حالات بتاتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا۔

لیکن سیاق کلام میں یہ بات نہیں ہے کہ یہ سفارت واپس ہوئی۔ اس نے ملکہ کے سامنے یہ یہ رپورٹ پیش کی۔ نہ سیاق کلام میں ملکہ کے اگلے ارادے کا ذکر ہے۔ یہ سب خود بخود معلوم ہو جائیں گے جب ملکہ کا دورۂ دارالخلافہ معلوم ہو گا اب حضرت سلیمان علیہ السلام یہ حکم دیتے ہیں کہ کون ہے جو ملکہ کے پہنچنے سے قبل ہی اس کے عرش کو لے کر آ جائے اور پھر اس عرش اور تخت کو اس کے سامنے ذرا انجان ہو کر پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ عرش وہ اپنے علاقے میں چھوڑ کر آئی ہے اور یہ وہاں اس کے دارالخلافہ میں محفوظ و مامون ہے۔

قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ۝ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ۝ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ؕ

سلیمان نے کہا "اے اہل دربار' تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں؟ جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا "میں اسے حاضر کر دوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں میں اس کی طاقت رکھتا ہوں اور امانت دار ہوں۔ جس شخص کے پاس کتاب کا ایک علم تھا وہ بولا "میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں"۔

آپ کو معلوم ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اس کے تخت کو اس کی جانب سے اطاعت قبول کرنے سے قبل کس غرض کے لیے منگوایا؟ صحیح بات یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ کام اس لیے کیا کہ وہ ملکہ سبا کو دکھائیں کہ کائنات کی معجزانہ قوتیں ان کی تائید کر رہی ہیں تاکہ ملکہ سبا ان سے متاثر ہو جائے اور ظاہری انقیاد کے ساتھ ساتھ اس

کے ایمان لانے کی راہ بھی ہموار ہو جائے۔

جنوں میں سے ایک دیو ہیکل جن نے یہ پیش کش کی کہ وہ یہ تخت اس وقت تک حاضر کر دے گا جب تک یہ اجلاس جاری ہے۔ جیسا کہ روایات میں آتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام انتظامی اور عدالتی فیصلے کرنے کے لیے صبح سے ظہر تک بیٹھتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس عرصے کو طویل سمجھے۔ یہ کہا کہ اس وقت تک تو بہت دیر ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک شخص جس کے پاس علم کتاب تھا۔

الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ (۲۷ : ۴۰) "جس شخص کے پاس کتاب کا علم تھا"۔ اس نے کہا کہ پلک جھپکنے سے پہلے میں اسے لائے دیتا ہوں۔ یہاں اس شخص کا نام نہیں لیا گیا کہ وہ کون تھا۔ اور نہ اس کتاب کا ذکر ہے جس کا علم اس کے پاس تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک مومن شخص تھا' اللہ کے ساتھ اس کا اتصال تھا' خدا رسیدہ شخص تھا۔ اور وہ اللہ کی جانب سے ایسی قوتوں کے مالک تھے جن کے لیے غیب کے پردے اور دوریاں ختم ہو جاتی ہیں اور یہ ایسے امور اور کرامات ہیں جن کا صدور بعض اوقات خدا رسیدہ لوگوں سے ہوتا ہے اور جس کے اسرار و رموز سے عام لوگ واقف نہیں ہوتے۔ کیونکہ عام انسان جس دنیا میں رہتے ہیں اور جن اسباب کے تحت وہ زندگی بسر کرتے ہیں اس سے یہ مختلف زندگی ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قصے کہانیوں اور داستانوں اور خرافات سے نکلنے کے لیے بس اس مقام پر یہی کہا جا سکتا ہے۔

بعض مفسرین اس شخص کے پیچھے پڑے ہیں کہ یہ شخص کون تھا؟ اور کتاب کون سی تھی۔ کتاب کے بارے میں کہا کہ وہ تورات تھی۔ اور بعض نے کہا کہ یہ شخص اسم اعظم کو جانتا تھا اور بعض مفسرین نے اور اقوال اختیار کیے ہیں۔ تمام اقوال کی پشت پر کوئی مستند دلیل نہیں ہے۔ اگر واقعیت پسندی سے کام لیا جائے تو یہ معاملہ بہت آسان ہے۔ اس کائنات کے ہزارہا ایسے راز ہیں جن کو ہم نہیں جانتے۔ بے شمار ایسی قوتیں ہیں جن کو ابھی تک ہم کام میں نہیں لا سکے۔ خود نفس انسانی کے اندر ایسے راز موجود ہیں جن تک ابھی ہماری رسائی نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ جب کسی ایک انسان کو ان اسرار سے واقف کر دیتا ہے تو پھر دوسروں کے لیے ایک معجزہ صادر ہو جاتا ہے کیونکہ یہ معجزہ عام انسانوں کی طبیعی زندگی کے خلاف ہوتا ہے جبکہ یہ خارق عادت معجزہ بھی اللہ ہی کی قوتوں میں سے کسی قوت کے مطابق ہوتا ہے۔ اور اللہ اس خارق عادت بات کو جس کے ہاتھ پر چاہتا ہے چلا دیتا ہے۔ (اس طرح وہ معجزہ اور کرامت ہوتی ہے)

یہ شخص جس کے پاس علم کتاب تھا' اس علم کی وجہ سے اس کا نفس اس کام کے لیے تیار تھا۔ اللہ نے بعض کائناتی راز اس شخص پر منکشف کر دیئے تھے اور یوں یہ کرامت اس کے ہاتھ سے ظاہر ہوگئی کیونکہ علم کتاب کی وجہ سے یہ شخص خدا رسیدہ شخص تھا۔ اور وہ روحانی طور پر اس کے لیے تیار تھا کہ اس پر بعض اسرار کھول دیئے جائیں۔

بعض مفسرین نے کہا یہ شخص خود سلیمان علیہ السلام تھے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ شخص حضرت سلیمان نہ تھے۔ ورنہ پھر اپنے آپ کو چھپانے کی ضرورت کیا تھی۔ قصہ خود ان کا چل رہا تھا اور قصہ بھی ایسا کوئی نہ تھا کہ حضرت کا نام مخفی رکھا جائے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کا نام آصف ابن برقیا تھا۔ اس پر بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔

فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۫ۖ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ

أَمْ أَكْفُرُ ۖ وَمَن شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ ﴿٤٠﴾

"جونہی کہ سلیمان علیہ السلام نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا' وہ پکار اٹھا" یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافر نعمت بن جاتا ہوں اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے' ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے"۔

تخت کی اچانک اور برق رفتار حاضری کا سلیمان علیہ اسلام پر بے حد اثر ہوا۔ وہ ڈر گئے کہ اللہ نے کس طرح معجزاتی انداز میں ان کا مقصد پورا کر دیا۔ انہوں نے سوچ لیا کہ یہ ایک عظیم نعمت خداوندی ہے اور اس کا فضل و کرم ہے۔ اور اس قدر عظیم کرم دراصل ایک عظیم ابتلا ہے۔ ایک خوفناک ابتلا ہے۔ اس لیے اس ابتلا سے وہ کامیابی کے ساتھ تب ہی گزر سکتے ہیں جب وہ ہر وقت بیدار رہیں۔ اور اس آزمائش میں بھی کامیابی کے لیے اللہ کی مدد درکار ہے۔ اسے خدا خوفی کی ضرورت ہے' نعمت خداوندی کا احساس کرنا ضروری ہے۔ اور اللہ کے اس فضل پر شکر بجالانا ضروری ہے۔ تاکہ اللہ پر ثابت ہو جائے کہ میں شکرگزار ہوں جبکہ اللہ کو کسی کی جانب سے کسی شکر کی ضرورت نہیں ہے جو کوئی شکر کرتا ہے۔ وہ خود اپنے لیے کرتا ہے اور شکر سے زیادہ نعمت حاصل ہوتی ہے اور ابتلائے نعمت میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی شکر نہیں کرتا' ناشکری کرتا ہے تو اللہ تو عالم اور عالم والوں سے مستغنی ہے۔ وہ تو کریم ہے۔ بغیر کسی احتیاج کے شکر کرنے والوں کو بخشتا ہے۔

شکر نعمت اور شکر کو ایک آزمائش تصور کرنے کے بعد حضرت سلیمان ملکہ کو حیران کن صورت حال سے دوچار کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔

قَالَ نَكِّرُوا لَهَا عَرْشَهَا نَنظُرْ أَتَهْتَدِي أَمْ تَكُونُ مِنَ الَّذِينَ لَا يَهْتَدُونَ ﴿٤١﴾

سلیمان نے کہا "انجان طریقے سے اس کا تخت اس کے سامنے رکھ دو' دیکھیں وہ صحیح بات تک پہنچتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو راہ راست نہیں پاتے"۔ یعنی اس تخت کی امتیازی خصوصیات کو ختم کر دو تاکہ دیکھا جائے کہ وہ اس تخت کو اپنی فراست اور ذہانت سے پہچانتی ہے یا نہیں۔ یا اس معمولی تبدیلی سے اس کے لیے اس کا پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔

شاید یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے اس کی ذہانت اور فراست کا امتحان تھا۔ تخت کے بارے میں اس اچانک اور ناقابل توقع صورت حال سے دوچار ہونے کے بعد اب حضرت سلیمان اور ملکہ کی ملاقات ہوتی ہے۔

فَلَمَّا جَاءَتْ قِيلَ أَهَٰكَذَا عَرْشُكِ ۖ قَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ ۚ

"ملکہ جب حاضر ہوئی تو اس سے کہا گیا کہ تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ وہ کہنے لگی" یہ تو گویا وہی ہے"۔

یہ اس لیے ایک انوکھی اور غیر متوقع بات تھی۔ اس کی مملکت کہاں اور تخت کہاں۔ اور وہ دیکھ رہی ہے۔ آخر محفوظ مقامات کے اندر زیر حراست تخت یہاں کس طرح آگیا۔ جنوب یمن اور بیت المقدس کا فاصلہ یہ کیسے آگیا اور

کون اسے لایا ہے۔

لیکن تھوڑی سی تبدیلی کے باوجود تخت تو اسی کا ہے لیکن وہ غیر متوقع ہونے' حالاتی شہادت خلاف ہونے کی وجہ سے اور زیادہ تر علامات اصلی باقی رہنے کی وجہ سے وہ یوں کہتی ہے کہ "گویا یہ وہی ہے"۔ اس نے نہایت فراست اور عقلمندی سے یہ جواب دیا۔ جس میں نہ اس تخت کا اقرار ہے اور نہ انکار ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان غیر متوقع حالات میں بھی دھوکہ نہیں کھاتی اور اعلیٰ درجے کی سفارتی زبان استعمال کرتی ہے۔

اب یہاں سیاق کلام میں ایک خلا ہے۔ گویا اسے حضرت سلیمان نے اطلاع کر دی کہ یہ قوت ہے جس کے ذریعے ہم تمہارا تخت تم سے بھی پہلے لے آئے۔ تو اس کا جواب وہ دیتی ہے کہ ہم نے خود اپنے ہاں حالات کا جائزہ لے لیا تھا اور یہ عزم کر لیا تھا کہ ہم سلیمان کی اطاعت قبول کریں گے جب ہمارے ہدایا رد کر دیئے گئے تھے۔

وَ اُوْتِیْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِیْنَ (۴۲)

"ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم نے سر اطاعت جھکا دیا تھا"۔ اب قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ ملکہ سبا اپنی اس دانشمندی کے باوجود پھر حضرت سلیمان کے پہلے خط پر ایمان کیوں نہیں لائی۔ یہ اس لیے کہ یہ ایک کافر سوسائٹی میں پیدا ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ بھی عام رواج کے مطابق اللہ کی بندگی کے بجائے سورج کی بندگی کرتی رہی۔ جیسا کہ ہدہد کی رپورٹ سے ظاہر ہے۔

وَ صَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ (۴۳)

"اس کو (ایمان لانے سے) جس چیز نے روک رکھا تھا وہ ان معبودوں کی عبادت تھی جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتی تھی، کیونکہ وہ ایک کافر قوم سے تھی"۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ کو مرعوب کرنے کے لیے ایک دوسری غیر متوقع امتحان گاہ بھی اس کے لیے تیار کی تھی۔ یہ امتحان اس قدر اچانک ہے کہ یہاں بھی بیان قصہ کے وقت بھی اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ پہلے تخت کے سلسلے میں تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو بتا دیا کہ یہ تخت یوں معجزانہ انداز میں لایا گیا ہے۔ یہاں قرآن کریم کی طرز ادا بھی نہایت ہی بلیغانہ ہے۔

قِیْلَ لَهَا ادْخُلِی الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَیْهَا ؕ
قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ ؕ۬ قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَ اَسْلَمْتُ ۳
مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۴۴) ع ۱۴

18 "اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو۔ اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اترنے کے لیے اس نے

اپنے پائینچے اٹھا لیے۔ سلیمان نے کہا "یہ شیشے کا چکنا فرش ہے"۔ اس پر وہ پکار اٹھی "اے میرے رب (آج تک) میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی اور اب میں نے سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کر لی"۔

یہ غیر متوقع امتحان یوں تھا کہ حضرت سلیمان نے ایک عظیم الشان محل تعمیر کرایا تھا۔ یہ شیش محل تھا۔ اس کے فرش کے نیچے سے پانی گزارا گیا تھا۔ اور فرش شیشے کا بھی۔ اب فرش یوں نظر آرہا تھا کہ گویا پانی کی لہر ہے۔ جب ملکہ کو کہا گیا کہ آپ اس محل میں داخل ہوں تو اس نے سمجھا کہ اسے پانی سے چل کر گزرنا ہے۔ اس پر اس نے شلوار کے پائینچے اٹھا دیئے۔ اس کی ٹانگیں کھل گئیں۔ اس واقعہ کے بعد حضرت سلیمان نے اسے بتایا۔

قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ (۲۷ : ۴۴) "انہوں نے کہا کہ یہ شیشے کا چکنا فرش ہے"۔ یہاں ملکہ حیران رہ گئی کہ حضرت سلیمان کے پاس تو حیران کن عجائبات ہیں اور یقیناً یہ قوتیں فوق الفطرت ہیں۔ یوں اس نے اللہ کی طرف رجوع کیا۔ اور اللہ کو پکار اٹھی کہ اس نے اس سے قبل جو غیر اللہ کی عبادت کی ہے وہ اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے۔ چنانچہ اس نے سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا کہ میں اب سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کرتی ہوں۔

اس نے سوچ لیا کہ اسلامی نظام زندگی کیا چیز ہے۔ یہ کہ اس میں کوئی انسان کسی انسان کے آگے نہیں جھکتا۔ بلکہ سب انسان اللہ کے آگے جھکتے ہیں۔ سلیمان اگرچہ نبی ہیں لیکن وہ کہتی ہے کہ میں سلیمان کے ساتھ رب العالمین کی اطاعت قبول کرتی ہوں یعنی سلیمان کی معیت تو ہے جس طرح ایک مسلمان دوسرے مسلمانوں کا ساتھی ہوتا ہے لیکن اطاعت رب العالمین کی ہوتی ہے۔

اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۷ : ۴۴) قرآن کریم نے یہاں اس بات کو خصوصی طور پر ریکارڈ کیا ہوا ہے کہ اسلام اللہ کے لیے ہوتا ہے اور اسلام قبول کرنے سے ایک انسان ایک ایسی صف میں جا کر کھڑا ہو جاتا ہے جو مقتدر اعلیٰ ہوتی ہے بلکہ اسلام میں آکر غالب اور مغلوب اور محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دونوں بھائی ہوتے ہیں کوئی غالب و مغلوب نہیں ہوتا۔ سب مساوی طور پر رب العالمین کے آگے جھکتے ہیں۔

اہل قریش اسلام کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرتے تھے حالانکہ رسول اللہ انہیں اسلام اور رب العالمین کی اطاعت کی طرف بلاتے تھے۔ محمد ابن عبداللہ کی اطاعت کی ضرورت نہیں کہ وہ ایک سربراہ مملکت بن جائیں۔ قریش کو ملکہ سبا یہ تعلیم دیتی ہے کہ کسی نبی کی دعوت قبول کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان اس نبی کی معیت میں اللہ رب العالمین کا مطیع ہو جاتا ہے۔ داعی اور مدعو برابر ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ اسلام قبول کریں تو رسول اللہ کے ساتھ وہ رب العالمین کے مطیع ہوں گے۔

---○○○---

# درس نمبر ۱۷۳ تشریح آیات

## ۴۵ --- تا --- ۵۳

قرآن کریم میں حضرت صالح اور قوم ثمود کا قصہ بالعموم حضرت نوح ' حضرت ہود ' حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام کے قصص کے ساتھ آتا ہے۔ ان قصص کے ساتھ حضرت ابراہیم کا قصہ کبھی آتا ہے اور کبھی نہیں آتا۔ اس سورہ میں بھی بنی اسرائیل کے قصص آئے ہیں۔ حضرت موسیٰ اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے قصے گزر گئے ہیں۔ یہاں بھی حضرت ہود اور حضرت شعیب کا قصہ مختصراً آیا ہے جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ نہیں آیا۔

حضرت صالح کے قصے میں ناقہ والی کڑی نہیں ہے بلکہ اس کے بجائے ۹ مفسدین کا ذکر ہے جو حضرت صالح کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ حضرت صالح کو ان کی مکاریوں کا علم نہ تھا۔ ان کی ان سازشوں کے جواب میں اللہ نے ان کے خلاف ایسی تدبیر اختیار کی جس کا وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ وہ یہ کہ ان سب مفسدوں کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اور حضرت صالح اور اہل ایمان کو نجات دے دی۔ مشرکین مکہ کو کہا جاتا ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے ان کے مکانات کو دیکھتے ہو مگر عبرت نہیں پکڑتے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

"اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو (یہ پیغام دے کر) بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو ' تو یکایک وہ دو متخاصم فریق بن گئے"۔

حضرت صالح کی رسالت کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ "صرف اللہ کی بندگی کرو"۔ ہر دور میں انسانوں کو جو سماوی ہدایت دی گئی ہے اس کا خلاصہ یہی رہا ہے کہ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کرو ' ہر رسول اور ہر قوم کو یہی تعلیم دی گئی جبکہ اس کائنات میں انسانوں کے اردگرد پائی جانے والی کائنات میں اور خود انسانوں کے نفوس کے اندر بھی وجدانی دلائل موجود ہیں جو یہی حقیقت بتاتے ہیں کہ اس کائنات کا معبود ایک ہی ہے۔ لیکن انسان ہے کہ وہ اس سادہ حقیقت کا انکار کرتا ہے۔ نہ صرف انکار بلکہ وہ اس دعوت کے ساتھ مذاق بھی کرتا ہے۔ اور حقارت آمیز انداز میں اسے ٹھکراتا ہے۔ اور آج تک انسان بھٹک رہا ہے۔ مختلف راستوں پہ چلتا ہے ' ٹھوکریں کھاتا ہے لیکن صراط مستقیم کی طرف نہیں آتا۔

یہاں قرآن کریم نے حضرت صالح کی دعوت کا صرف یہ اثر بتایا ہے کہ قوم دو ٹکڑے ہو گئی اور ان کے درمیان مخاصمت شروع ہو گئی۔ایک فریق نے دعوت قبول کر لی اور دوسرا مخالف ہو گیا۔فریق مخالف 'تعداد میں بہت زیادہ تھا۔ جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری سورتوں سے ظاہر ہے۔

یہاں قصے کے اختصار کی وجہ سے خلا ہے۔اس میں قوم نے حضرت صالح سے مطالبہ کیا ہے کہ تم ہمیں جس عذاب سے ڈراتے ہو' اسے لے آؤ۔منکرین کا ہمیشہ یہ طریقہ ہوتا ہے کہ وہ ہدایت و رحمت طلب کرنے کی بجائے اللہ کا عذاب طلب کرتے ہیں جس طرح مشرکین قریش نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کرتے تھے۔حضرت صالح نے انہیں تنبیہہ کی کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم رحمت و ہدایت طلب کرنے کی بجائے خدا کا عذاب طلب کرتے ہو۔وہ ان کو مشورہ دیتے ہیں اللہ سے مغفرت طلب کرو وہ تم پر رحم کر دے گا۔

قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾

صالح نے کہا "اے میری قوم کے لوگو' بھلائی سے پہلے برائی کے لیے کیوں جلدی مچاتے ہو؟ کیوں نہیں اللہ سے مغفرت طلب کرتے؟ شاید کہ تم پر رحم فرمایا جائے"۔

لوگوں کے دماغ اس قدر بگڑ گئے تھے کہ سچائی کو جھٹلانے والے کہنے لگے تھے۔ اے اللہ 'اگر یہ شخص تیری طرف سے رسول ہے اور سچائی پر ہے تو' تو ہم پر پتھروں کی بارش کر دے اور دردناک عذاب نازل کر دے"۔حالانکہ ان کو کہنا یوں چاہئے تھا "اے اللہ 'اگر یہ شخص تیری طرف سے آیا ہوا ہے اور سچا ہے تو' تو ہمیں توفیق دے کہ ہم ایمان لے آئیں اور اس کی تصدیق کر دیں"۔

یہی حال قوم صالح کا ہو گیا تھا۔ان کا رسول ان کو رحمت 'توبہ اور استغفار کی راہ کی طرف بلاتا ہے اور بجائے اس کے کہ وہ اس دعوت کو قبول کریں 'یہ لوگ اس بات کا اظہار کرتے ہیں ہم تو صالح اور ان لوگوں سے تنگ آگئے ہیں جو اس کے ساتھ ہو گئے تھے کیونکہ یہ لوگ ہمارے لیے مصیبت بن گئے ہیں۔اور ہمیں خطرہ ہے کہ یہ لوگ ہم پر کوئی بڑی مصیبت لے آئیں گے۔

قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ؕ

انہوں نے کہا "ہم نے تو تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو بد شگونی کا نشان پایا ہے'۔

تطیر کے معنی بد شگونی کے ہیں۔یہ لفظ اقوام جاہلہ کی وہم پرستیوں اور خرافات سے نکلا ہے۔وہ اوہام جن سے کوئی شخص صرف سیدھے اور صاف ایمان کے ذریعے نکل سکتا ہے۔ایام جاہلیت میں اگر کوئی کسی کام کے لیے نکلنے کا ارادہ کرتا

تو وہ نیک شگون یا بد شگون معلوم کرنے کے لیے کسی پرندے سے فال گیری کرتا۔ وہ کسی جگہ بیٹھے ہوئے پرندے کو اڑاتا۔ اگر یہ پرندہ اس کے دائیں جانب سے بائیں جانب جاتا تو یہ خوش ہوتا اور وہ کام کر گزرتا۔ اور اگر یہ پرندہ بائیں جانب سے دائیں جان کی طرف جاتا تو یہ شخص بد شگونی کرتے ہوئے یہ سمجھتا کہ یہ معاملہ خطرناک ہے۔ سوال یہ ہے کہ کسی پرندے کو کیا معلوم ہے کہ وہ کدھر جائے اور کدھر نہ جائے۔ نیز کسی پرندے کی اتفاقی حرکت سے غیبی باتیں کس طرح معلوم ہو سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نفس انسانی اپنے معاملات ہمیشہ کسی غیبی قوت کے حوالے کرتا ہے۔ اگر کوئی اپنا غیب اور مستقبل اللہ علام الغیوب کے حوالے نہیں کرتا۔ اور اللہ پر بھروسہ نہیں کرتا تو پھر وہ ایسے ہی اوہام و خرافات کا شکار ہوتا ہے۔ پھر وہ اوہام و خرافات کسی حد پر جاکر رکتے نہیں۔ نہ عقل کی حدود میں رہتے ہیں۔ نہ ان سے کوئی یقین و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

آج صورت حال ایسی ہے جو لوگ ایمان نہیں لاتے اور عالم غیب کے پوشیدہ امور کو اللہ کے سپرد کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور جن کا زعم یہ ہے کہ انہوں نے اس قدر علمی ترقی حاصل کر لی ہے کہ دین و مذاہب کے خرافات پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔ یہ لوگ نہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں' نہ دین اسلام پر ایمان لاتے ہیں اور نہ غیب پر ایمان لاتے ہیں' لیکن ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کی وہم پرستی کا حال یہ ہے کہ یہ لوگ بھی عدد ۱۳ کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اور جب یہ لوگ جا رہے ہوں اور کوئی سیاہ بلی ان کے راستے سے گزر جائے تو اس کو بھی نہایت ہی اہم واقعہ سمجھتے ہیں۔ مثلاً' دیا سلائی کی ایک تیلی سے دو سے زیادہ سگرٹ جلانا اور اس قسم کے دوسرے خرافات پر یہ لوگ بڑا یقین رکھتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ اس قسم کے لوگ دراصل فطرت سے عناد کرتے ہیں حالانکہ فطرت سلیمہ کے اندر ایمان باللہ کی پیاس ہوتی ہے۔ وہ اللہ سے کبھی بھی مستغنی نہیں ہوتی۔

اس دنیا کے حقائق میں اسے عالم غیب کا سہارا لینا پڑتا ہے' جن تک انسانی علم و معرفت کی رسائی نہیں ہوتی۔ اور بعض حقائق تو ایسے ہیں کہ ان تک انسانی علم کبھی بھی نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ یہ حقائق انسان کی قوت مدرکہ کی حدود طاقت ہی سے ماوراء ہیں۔ اور جو انسان کے مخصوص مقصد پیدائش اور خلافت فی الارض کے منصب کے ساتھ متعلق ہی نہیں ہیں۔ اس لیے انسان کو ان کے علم کی طاقت ہی نہیں دی گئی۔ انسانی قوتیں اس کے منصب تک محدود ہیں۔

جب قوم صالح نے اپنی وہی بدویانہ اور گمراہانہ بات کی' جو اوہام و خرافات کے اندر ڈوبی ہوئی تھی تو حضرت صالح نے ان کو یقین کی روشنی کی طرف موڑ دیا اور ایک واضح حقیقت کی دعوت دی جس کے اندر کوئی پیچیدگی اور کوئی تاریک گوشہ نہ تھا۔

## قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ

صالح نے جواب دیا "تمہارے نیک و بد شگون کا سر رشتہ تو اللہ کے پاس ہے"۔ تمہارا نیک و بد اور تمہارا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ نے اس کائنات کے لیے ایک سنت جاری کی ہے اور پھر لوگوں کو کچھ احکام دیئے ہیں۔ اور لوگوں کے لیے ایک نہایت ہی سیدھی راہ تجویز کی ہے۔ پس جس نے سنن الہیہ کا اتباع کیا' اللہ کی ہدایات پر چلا تو اس کا انجام اچھا ہو گا اور اسے پرندے اڑانے کی کوئی ضرورت نہ ہو گی۔ اور جو شخص سنن الہیہ سے سرتابی کرے گا اور صحیح راستے سے ادھر ادھر ہو

جائے گا وہ ایک عظیم شر سے دوچار ہو گا۔ اسے پھر پرندوں سے نیک شگون اور بد شگون لینے کی ضرورت نہ ہو گی۔

بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُونَ ۝

"اصل بات یہ ہے کہ تم لوگوں کی آزمائش ہو رہی ہے"۔ اللہ نے تم پر جو انعامات کیے ہوئے ہیں۔ یہ تمہارے لیے ایک فتنہ ہے اور جو خیر و شر تمہیں پیش آ رہا ہے۔ وہ تمہارے لیے آزمائش ہے۔ لہٰذا بیداری' اللہ کے قوانین فطرت کے مطابق تدبیر اور واقعات و حادثات کو سمجھنا اور ان کے اندر جو آزمائش اور ابتلا ہوتی ہے' اس کا ادراک کرنا اور شعور رکھنا ہی اچھے انجام کا ضامن ہے۔ یہ جو تم پرندوں کو اڑا کر شگون یا بد شگون معلوم کرتے ہو' اس کا واقعات کے انجام پر کوئی اثر نہیں ہوتا' یہ محض تمہارے اوہام ہیں۔

ایک صحیح نظریہ اور عقیدہ لوگوں کو ذہنی روشنی اور استقامت عطا کرتا ہے اور انسان معاملات کی صحیح قدر معلوم کر لیتا ہے۔ انسان کا دل بیدار ہوتا ہے اور وہ اپنے ماحول پر اچھی نظر رکھتا ہے اور غور و فکر کرتا ہے۔ انسان کو یہ شعور ہوتا ہے کہ اس کے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے دست قدرت اس میں موثر ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں یہ واقعات یونہی اتفاقاً واقع نہیں ہوتے' نہ یہ زندگی ایک عبث عمل ہے بلکہ انسان کی زندگی بامقصد ہوتی ہے' وہ ایک قیمت رکھتی ہے۔ لوگوں کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ اور یوں یہ چھوٹا سا انسان اس کرۂ ارض پر ایک بامقصد سفر کرتا ہے۔ وہ اللہ سے بھی مربوط ہوتا ہے اور اللہ کی اس کائنات کے ساتھ بھی جڑا ہوا ہوتا ہے اور ان قوانین کے ساتھ بھی جڑا ہوا ہوتا ہے۔ جو خالق نے اس کائنات کے لیے وضع کیے ہیں۔ اور جن کے مطابق یہ کائنات بحفاظت چل رہی ہے۔

لیکن یہ سادہ سا استدلال ان لوگوں پر کیا اثر کرتا جن کے قلوب بگڑ چکے ہوں۔ ان کے دل اس قدر فساد میں ڈوبے ہوئے ہوں جہاں سے واپسی ممکن نہ ہو۔ اصلاح کا کوئی امکان نہ رہا ہو۔ قوم صالح بگاڑ کے اس مرحلے پر پہنچ گئی تھی جہاں سے واپسی ممکن نہ تھی۔ ان میں ۹ افراد ایسے تھے۔ جو پوری بگاڑ کے ذمہ دار تھے۔ یہ لوگ فساد کی آخری سرحدوں کو چھو رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے ایسی سازش تیار کی جس پر رات کے اندھیروں میں عمل کیا جانا تھا۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللَّهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝

"اس شہر میں نو جتھے دار تھے جو ملک میں فساد پھیلاتے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔ انہوں نے آپس میں کہا "خدا کی قسم کھا کر عہد کر لو کہ ہم صالح اور اس کے گھر والوں پر شبخون ماریں گے اور پھر اس کے ولی سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے' ہم بالکل سچ کہتے ہیں"۔

یہ نو افراد ایسے تھے جن کی اصلاح ناممکن ہوگئی تھی' یہ ہر وقت فساد اور سرکشی پر آمادہ رہتے تھے۔ یہ لوگ حضرت صالح کی دعوت سے اس قدر تنگ آگئے کہ انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ رات کو ایک خفیہ معاہدہ کیا اور اس عہد پر اللہ کے نام سے قسم بھی اٹھائی کہ اس پر عمل کریں گے' حضرت صالح کو قتل کر دیں گے۔ حالانکہ حضرت صالح تو ان کو صرف اللہ ہی کی طرف بلاتے تھے۔

یہاں عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے اس سازش پر بھی اللہ ہی کو گواہ ٹھہرایا۔

تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ (۲۷ : ۴۹)

"خدا کی قسم کھا کر عہد کر لو کہ ہم صالح اور اس کے گھر والوں پر شبخون ماریں گے اور پھر اس کے ولی سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے"۔ نہ ہم نے قتل کیا ہے نہ موجود تھے۔

وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (۲۷ : ۴۹) "اور ہم بالکل سچے ہیں"۔ اس لیے کہ یہ قتل رات کے اندھیرے میں ہوگا کوئی دیکھنے والا نہ ہوگا۔

ان لوگوں کی یہ تدبیر بھی نہایت سطحی اور سادہ تدبیر تھی لیکن بہرحال یہ تدبیر کر کے وہ اپنے آپ کو مطمئن کر رہے تھے۔ اور ان لوگوں کے نزدیک خدا کے نام پر یہ جھوٹ بالکل جائز تھا۔ اور پھر یہ اپنی اس اسکیم کے مطابق اپنے آپ کو بالکل سچا بھی ثابت کرتے ہیں۔ انسانی سوچ بھی عجیب پیچیدہ اور سطحی ہوتی ہے۔ خصوصاً جبکہ انسان کا دل نور ایمان سے خالی ہو' کیونکہ سیدھا راستہ تو ایمان ہی بتاتا ہے۔

یہ تھی ان کی تدبیر اور ان کی سوچ۔ لیکن اللہ بزرگ و برتر تو سب کچھ دیکھ رہا ہے اور یہ لوگ اللہ کو نہیں دیکھ رہے۔ اللہ کے علم میں ان کی پوری سازش ہے' لیکن اپنے خیال میں یہ سازش بھی اندھیرے میں کر رہے ہیں اور عمل بھی اندھیرے میں ہوگا۔ لیکن ہیں خود اندھیرے میں۔

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

"اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی انہیں خبر نہ تھی"۔ دیکھئے ان کی تدبیر کیا ہے۔ ان کی سازش بمقابلہ امر الٰہی۔ اللہ کی قوت کے مقابلے میں یہ شرپسند کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ اس دنیا میں جھوٹے جبار و قہار جو تھوڑی بہت قوت کے مالک بن جاتے ہیں وہ اپنی اس قوت میں اس قدر مست ہو جاتے ہیں کہ اوپر دیکھنے والی آنکھ سے غافل ہو جاتے ہیں۔ وہ اس قوت سے بالکل غافل ہوتے ہیں کہ جو اچانک ان کو پکڑ لے گی اور ان کو توقع ہی نہ ہوگی۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَ قَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً ۢ بِمَا ظَلَمُوْا ۭ

"اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا انجام کیا ہوا۔ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا ان کو اور ان کی پوری قوم کو۔ وہ ان کے گھر

خالی پڑے ہیں اس ظلم کی پاداش میں جو وہ کرتے تھے"۔

ایک لمحے کے اندر ان کو برباد کر کے رکھ دیا گیا۔ اگلے لمحے میں ان کے محلات ان پر الٹ دیئے گئے۔ گھر خالی رہ گئے۔ ایک لمحہ پہلے وہ تو اہل ایمان کے خلاف سازشیں کر رہے تھے اور ان کو پورا یقین تھا کہ وہ اپنی سازشوں پر عمل کر سکیں گے۔

سیاق کلام میں یہ مشابہی 'کہ ادھر سازش ہوئی' ادھر وہ صفحہ ہستی سے مٹا دیئے گئے۔ اس اچانک اور فیصلہ کن گرفت سے ڈرانا مقصود ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں قوت آجاتی ہے۔ وہ مغرور نہ ہوں اور غرے میں نہ آجائیں۔ اللہ ایسے لوگوں کو اسی طرح اچانک گرفت میں لے سکتا ہے اور ان کو ان کی مکاریوں اور تدابیر کے ساتھ ہلاک کر سکتا ہے۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٥٢﴾

"اس میں ایک نشان عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں"۔ اور اس پوری سورت میں علم اور ٹیکنالوجی مرکزی مضمون ہے۔ اس کے حادثات' واقعات اور قصص علم کے محور کے گرد گھومتے ہیں۔

وَأَنجَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿٥٣﴾

"اور بچا لیا ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لائے تھے اور نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے"۔ کفار کی اچانک ہلاکت کے بعد اب بتا دیا جاتا ہے کہ اہل ایمان کو نجات دے دی گئی۔ اس لیے کہ وہ دنیا کی قوتوں کی بجائے صرف اللہ سے ڈرتے تھے۔ اور کسی مومن کے دل میں اللہ کے ڈر کے ساتھ دوسرا کوئی ڈر جمع نہیں ہو سکتا۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۷۴ ایک نظر میں

حضرت لوط علیہ السلام کے قصے کا یہ مختصر ترین حلقہ مختصر اور شوٹنگ کے انداز میں ہے۔ قوم لوط حضرت لوط کو ملک بدر کرنا چاہتی ہے اور جرم کیا ہے؟ صرف یہ کہ وہ اخلاقی تطہیر اور پاکیزگی کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کو اس اخلاقی گندگی سے نکالنا چاہتے تھے جس میں یہ لوگ علانیہ اور اجتماعی طور پر مبتلا تھے۔ ہم جنس پرستی یعنی مردوں کا مردوں کے ساتھ جنسی ملاپ اور عورتوں کے قریب نہ آنا' یہ انتہائی گندگی' غلاظت اور خلاف فطرت عمل تھا۔

انسانی تاریخ میں یہ جنسی بے راہ روی کبھی کبھی اجتماعی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بعض اوقات بعض افراد تو اس میں مبتلا ہو سکتے ہیں اور ان کے لیے ایسے حالات بھی ہو سکتے ہیں مثلاً فوجی چھاؤنیوں میں لوگ خلاف فطرت جنسی عمل میں مبتلا ہو جاتے ہیں' جہاں انہیں فوجی کیمپوں میں عورتیں نہیں ملتیں۔ پھر قید خانوں اور جیلوں میں بھی یہ بیماری پھیل سکتی ہے۔ جہاں ایک طویل عرصے تک قیدیوں کو جنسی ملاپ سے محروم رکھا جاتا ہے اور ان پر جنسی ملاپ کا سخت دباؤ ہوتا ہے۔ اور عورتوں سے وہ دور ہوتے ہیں۔ رہی یہ صورت حال کہ کسی بستی میں یہ جنسی بے راہ روی اور ایک عام مسلمہ قاعدہ بن جائے' عورتیں موجود ہوں' نکاح ہو سکتے ہوں تو حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں فی الواقعہ' یہ ایک عجیب واقعہ ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی فطرت ایسی بنائی ہے اس میں نر اور مادہ ہیں اور فطرتاً نر اور مادہ کے درمیان ملاپ کا داعیہ رکھا ہے۔ تمام زندہ مخلوقات کی یہ فطرت ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۶ : ۳۶) "پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس میں سے یا ان اشیاء میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں"۔ تو اللہ نے تمام زندہ اشیاء کو جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا۔ خواہ زمین کی نباتات ہوں یا انسان ہوں یا دوسرے حیوان ہوں' خواہ ان کو انسان جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔ اللہ کی مخلوقات میں سے بے شمار ایسی مخلوق اب بھی ہے جسے ہم نہیں جانتے۔ لہذا نر و مادہ یا مخالف جوڑا اس پوری کائنات کی تخلیق میں اصل الاصول ہے۔ زندہ چیزوں کے علاوہ دوسری نامعلوم مخلوقات میں بھی۔ ایٹم' کائنات کا صغیر ترین ٹکڑا ابھی الیکٹرون سے پیدا شدہ ہے' جس میں مثبت اور منفی چارج ہوتے ہیں' گویا کائنات کے ہر ایٹم کے اندر جوڑا موجود ہے۔

---

(۱) مصنف جس وقت لکھ رہے تھے اس وقت یورپ کے ملکوں نے اس فعل کو قانوناً جائز نہ کیا تھا (مترجم)۔

جہاں تک زندہ مخلوقات کا تعلق ہے ان کے اندر نر و مادہ کا ہونا تو ایک لازمی امر ہے اور معلوم ہے یہاں تک کہ جن زندہ چیزوں میں نر اور مادہ نہیں ہوتے خود ان کے اندر نر اور مادہ کے خلیے ہوتے ہیں اور ان خلیوں کے اجتماع کی وجہ سے ان کے اندر پیداواری عمل جاری رہتا ہے۔

چونکہ نر اور مادہ کا ہونا اور تمام زندہ مخلوقات کا جوڑا جوڑا ہونا ناموس فطرت ہے۔ اس لیے اللہ نے فطرتاً نر اور مادہ کے درمیان ایک کشش رکھی ہے۔ ایسی کشش جسے کسی خارجی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نہ کسی غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اس لیے کہ اللہ نے زندگی کو اس کی صحیح راہ پر چلانا تھا۔ اور اس راستے پر چلنے کا داعیہ بھی فطرتاً رکھا گیا اور اس کے لیے تعلیم و ترغیب کی ضرورت ہی نہ رکھی گئی۔ لوگوں کے لیے دوامی فطرت کے تقاضوں کو پورا کرنے کا باعث لذت بنایا۔ اس طرح دست قدرت بغیر تعلیم اور ترغیب کے لوگوں سے یہ فطری کام لیتی ہے۔ اللہ نے نر اور مادہ کے مقامات نسانی کے اندر اس فطری ملاپ کا میلان رکھ دیا ہے اور یہ میلان اور لذت اللہ نے دو مردوں کے اعضاء کے اندر نہیں رکھا۔

یہی وجہ ہے کہ فطرت کا یہ اجتماعی بگاڑ' جو قوم لوط کے اندر ہوا' عجیب لگتا ہے کیونکہ یہ تقاضائے فطرت کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضرت لوط ان لوگوں کے اس فطری بگاڑ کی اصلاح کرنے لگے۔

--- ooo---

# درس نمبر ۱۷۴ تشریح آیات

## ۵۴ --- تا --- ۵۹

وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ۝۵۴ اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ١ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ۝۵۵

"اور لوط کو ہم نے بھیجا۔ یاد کرو وہ وقت جب اس نے اپنی قوم سے کہا "کیا تم آنکھوں دیکھتے بد کاری کرتے ہو؟ کیا تمہارا یہی چلن ہے کہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے جاتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ سخت جہالت کا کام کرتے ہو"۔

پہلے فقرے میں اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ تم جس بگاڑ میں مبتلا ہو یہ نہایت ہی عجیب و غریب ہے 'تم دیکھتے نہیں ہو کہ تمام زندہ مخلوقات کی فطرت کیا ہے۔ تم تو اچھی طرح دیکھتے ہو کہ حیات انسانی و حیوانی کے اندر قانون فطرت کیا ہے۔ تمام زندہ مخلوق میں سے صرف تم ایسے ہو کہ خلاف فطرت روش میں مبتلا ہو۔ اور دوسرے فقرے میں اس بات کی وضاحت کر دی کہ تمہارا یہ فعل انسانیت کے خلاف ہے کہ تم اپنی جنسی ضرورت عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے پوری کرتے ہو۔ محض یہ بیان کہ وہ ایسا کرتے تھے 'اس بات کے لیے کافی ہے کہ یہ فعل غیر فطری اور عجیب ہے۔ اور پوری حیوانی نباتاتی بلکہ کائناتی فطرت کے خلاف ہے۔

اس کے بعد ان پر تنقید کی کہ تم بہت ہی جاہل ہو۔ اس مفہوم میں بھی جاہل ہو کہ تمہیں فطرت کائنات اور ناموس کائنات کا علم نہیں ہے۔ اور اس لحاظ سے بھی جاہل اور احمق ہو کہ تم ایسے برے افعال کا ارتکاب کرتے ہو کیونکہ جو شخص فطرت کے تقاضوں سے نابلد ہو 'وہ جاہل ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بے وقوف اور احمق بھی ہوتا ہے۔

اب آپ کی قوم کا جواب کیا تھا؟ ان سے یہ کہا جا رہا تھا کہ اپنی جہالت اور حماقت کو چھوڑ کر اصل راہ فطرت کی طرف آجاؤ جس کے مطابق تم پیدا ہوئے ہو 'تو ان کا جواب یہی تھا جو ہر جاہل کا ہوتا ہے یعنی یہ کہ تم بہت پاک لوگ ہو 'نکلو ہمارے گاؤں سے"۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْۤا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ١ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ۝۵۶

"مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا "نکال دو لوط کے گھر والوں کو اپنی بستی سے یہ بڑے پاکباز بنتے ہیں"۔

انہوں نے بطور مزاح حضرت لوط اور مومنین کو "پاکباز" کہا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کا یہ فعل گندہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ الٹا ان پاکبازوں کو گندے لوگ سمجھتے ہیں اور ان کو یہ بات بری لگتی ہو کہ مسلمان اپنے آپ کو پاک سمجھتے ہیں کیونکہ ان لوگوں کی فطرت کے اندر اس قدر انحراف پیدا ہو گیا تھا کہ اس فعل کو گندگی نہ سمجھ رہے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس فعل کو چھوڑنا وہ اپنے لیے گندہ فعل سمجھ رہے ہوں۔

بہرحال ان لوگوں نے فیصلہ کر لیا اور پختہ ارادہ کر لیا کہ حضرت لوط کو ملک بدر کر دیں لیکن اللہ کا ارادہ کچھ اور تھا۔ اللہ نے ان کو دنیا بدر کر دیا۔

فَأَنجَيْنَاهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ قَدَّرْنَاهَا مِنَ الْغَابِرِينَ ﴿٥٧﴾ وَأَمْطَرْنَا

۴ ع ۱۴ عَلَيْهِم مَّطَرًا ۖ فَسَاءَ مَطَرُ الْمُنذَرِينَ ﴿٥٨﴾

"آخر کار ہم نے بچا لیا اس کو اور اس کے گھر والوں کو، بجز اس کی بیوی کے جس کا پیچھے رہ جانا ہم نے طے کر دیا تھا اور ۱۹
برسائی ان لوگوں پر ایک برسات بہت ہی بری برسات تھی۔ وہ ان لوگوں کے حق میں جو متنبہ کیے جا چکے تھے"۔

یہاں اس بارش کی تفصیلات نہیں دی گئیں جس طرح دوسری سورتوں میں دی گئی ہیں۔ لہذا ہم بھی سیاق کلام کے مطابق بس اس آیت کو اسی طرح مجمل چھوڑتے ہیں لیکن اس قوم کو پانی سے ہلاک کیا گیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ لوگ ماء حیات کو غلط جگہ گراتے تھے، جو فعل خلاف فطرت تھا۔ اس سے کوئی انسانی فعل مطلوب نہ تھا، اس لیے اللہ نے بھی ان کو پانی کے ذریعے ہلاک کیا حالانکہ پانی سے اللہ نے ہر زندہ چیز کو پیدا کیا ہے۔ یہ ان کے ساتھ ایک لطیف مذاق بھی تھا۔ واللہ اعلم! یہ میری رائے ہے ورنہ اللہ خوب جانتا ہے کہ اس کی سنت کس طرح اور کیوں کام کرتی ہے۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ وَسَلَامٌ عَلَىٰ عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَىٰ ۗ آللَّهُ خَيْرٌ

أَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٥٩﴾

"کہہ دو، تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں اور سلامتی ہے اس کے ان بندوں پر جنہیں اس نے چن لیا۔ کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جنہیں یہ شریک ٹھہراتے ہیں؟"

---۰۰۰---

# فی ظلالِ القرآن

پارہ ۲۰ تا ۲۶

جلد پنجم

سید قطب شہید

ترجمہ

سید معروف شاہ شیرازی

ادارہ منشورات اسلامی
بالمقابل منصورہ ملتان روڈ لاہور

| | | |
|---|---|---|
| تفسیر | ------- | فی ظلال القرآن |
| مصنف | ------- | سید قطب شہید ؒ |
| مترجم | ------- | سید معروف شاہ شیرازی |
| ناشر | ------- | سید عارف شیرازی |
| جلد پنجم | ------- | پارہ ۲۰ تا ۲۶ |
| تعداد | ------- | ۱۰۰۰ |
| مطبع | ------- | رضا پرنٹرز لاہور |
| ھدیہ | ------- | ۳۷۵ روپے |
| اشاعت اول | ------- | فروری ۱۹۹۷ء |
| اشاعت دوم | ------- | دسمبر ۱۹۹۷ء |



---○○○---

# عرض ناشر

**شہید اسلام سید قطبؒ** ۔ سید قطب کا شمار امت مسلمہ کی ان چند برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریک دور میں روشنی کے چراغ جلائے اور اسلامی نظام زندگی کی کھیتی کو اپنے خون سے سینچا۔

سید قطب ۱۹۰۶ء میں مصر کے ایک صوبہ ''اسیوط'' کے ایک گاؤں ''موشاء'' میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ دونوں عربی النسل تھے۔ سید قطب اپنے والدین کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔

آپ نے ثانوی تعلیم ''تجہیزیہ دارالعلوم'' نامی ایک اسکول میں حاصل کی۔ اس اسکول میں طلباء کو دارالعلوم میں داخلہ کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر آپ ۱۹۲۹ء میں قاہرہ کے دارالعلوم میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں آپ نے بی۔ اے کی ڈگری اور ڈپلومہ ان ایجوکیشن حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے محکمہ تعلیم میں بحیثیت انسپکٹر تعلیم ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۵۲ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران ۱۹۵۳ء میں آپ اخوان المسلمون سے متعارف ہوئے۔ اور ۲ جولائی ۱۹۵۴ء میں آپ کو اخوان کے شعبہ نشرو اشاعت کے اخبار ''الاخوان المسلمون'' کا ایڈیٹر مقرر کیا۔

شہید اسلام سید قطبؒ ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک جیل میں رہے اور اگست ۱۹۶۴ء میں مرحوم عبدالسلام عارف صدر عراق کی کوشش سے رہا ہوئے۔ رہا ہوتے ہی پوری دنیا کے نوجوانوں نے آپ کی طرف رجوع کیا' اور آپ کا لٹریچر جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیلنے لگا۔ چنانچہ لادین مغرب پرست کمیونسٹ اور سوشلسٹ عناصر چیخ اٹھے اور بیک وقت ماسکو اور واشنگٹن سے ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ چنانچہ آپ کو ایک سال بعد اگست ۱۹۶۵ء میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور ایک سال بعد ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء میں آپ کو شہید کر دیا گیا۔

سید قطب اخوان المسلمون میں آنے سے پہلے خالص ادبی کام کرتے رہے۔ لیکن تحریک اخوان المسلمون میں شامل ہونے کے بعد اسلامی انقلاب' اور تحریک اسلامی' ان کا خاص موضوع رہا۔

**تفسیر فی ظلال القرآن** ۔ مصنف نے فی ظلال القرآن میں قرآن پاک کی اثر انگیزی' جس نے عرب کی کایا پلٹ دی تھی' کی راہ میں حائل پردوں کو چاک کر دیا ہے۔ اس کے ذریعے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والا اس تحریک کے ساتھ جا کھڑا ہوتا ہے جو ہبوط آدم علیہ السلام کے وقت سے روئے زمین پر برپا ہوئی اور انبیاء علیہم السلام کی قیادت میں چلتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک آپہنچی۔ آپ صلعم کے بعد بھی یہ تحریک زندہ ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ قاری توحید و رسالت اور آخرت کے عقیدے کو قافلے کے ایک رفیق اور تحریک کے ایک کارکن کی حیثیت سے سنتا اور سمجھتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان کو امت کے ایک فرد کی حیثیت سے پڑھ کر اس سے سبق لیتا ہے۔

فی ظلال القرآن میں علمی موشگافیوں اور فقہی باریکیوں سے ہٹ کر قرآن پاک کے اصل مقصد اور دعوتی رنگ کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے لئے جو زبان استعمال کی گئی ہے۔ وہ سید کا ہی حصہ ہے اور اسے بلاشبہ الہامی زبان کہا جا سکتا ہے۔ اپنے اس رنگ میں یقیناً یہ ممتاز ترین تفسیر ہے۔ تفسیر کیا ہے ایک دعوت عمل اور دعوت انقلاب ہے' الفاظ اور معنی کا دریا ہے۔ جس میں تحقیق' علمی' وجدانی' اور ادبی نکات جابجا موجود ہیں۔ پورے ذخیرہ تفاسیر میں یہ پہلی تفسیر ہے۔ جو خود قرآن کے اسلوب بیان میں لکھی گئی ہے۔ دوسری تفاسیر بالعموم منطقی انداز بیان میں لکھی گئی ہیں اور فی ظلال القرآن قرآنی اور انقلابی انداز بیان میں ہے۔ اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ یہ اختلافی مسائل اور اسرائیلیات سے خالی ہے۔ اسلام کا جامع تصور دیتے ہوئے اس کے احیاء کا طریقہ کار نمایاں کرتی ہے۔ غرض اخلاص' روح ایمان' عمل صالح اور دعوت انقلاب اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ پندرہ پارے جیل سے باہر اور بقیہ

جیل میں لکھے گئے ہیں۔ عربی میں اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

**مترجم سید معروف شاہ شیرازی** ۔ سید معروف شاہ شیرازی ۱۸ اپریل ۱۹۳۲ء کو ضلع مانسہرہ کے ایک گاؤں حروڑی میں پیدا ہوئے' ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ ہی میں حاصل کی حصول علم کا شوق بچپن ہی سے انتہائی زیادہ تھا جس کی وجہ سے سرحد اور پنجاب کے مختلف دینی مدارس اور معروف علماء کرام سے تعلیم حاصل کرتے رہے' پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۵۲ء میں منشی فاضل اور ۱۹۵۳ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور اگلے ہی سال مشہور دینی درس گاہ جامعہ اشرفیہ لاہور سے دورہ حدیث کر کے سند فراغت حاصل کی' جبکہ ۱۹۶۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا' اور بعد میں ۱۹۶۷ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔

درس نظامی پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۵ تا ۱۹۶۵ء گورنمنٹ ہائی سکول ہل میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے لیکن بعد میں اس پیشہ کو ترک کر کے تصنیف و تالیف اور صحافت کے شعبہ سے منسلک ہو گئے۔ ایک سال تک ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی کے ایڈیٹر رہنے کے بعد اپنا رسالہ "اسوہ" راولپنڈی سے نکالنا شروع کیا لیکن بعد میں کراچی منتقل ہونے کی وجہ سے کراچی سے "اسوہ ڈائجسٹ" کے نام سے یہی رسالہ شائع کرتے رہے۔

اس دوران ادارہ معارف اسلامی کراچی میں ریسرچ اسکالر کے طور پر کام کرتے ہوئے مختلف عربی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا جو "اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو" "اسلام میں جرم و سزا" (دو حصے) "حسن البناء شہید کی یادداشتیں" اور "نشانات راہ" کے ناموں سے شائع ہوئیں۔

لیکن ۱۹۷۰ء میں ناسازی طبع کی بناء پر کراچی سے آبائی علاقہ میں منتقل ہو گئے اور وہاں ضلع مانسہرہ کی تحصیل بٹگرام میں وکالت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے اور ۱۹۹۲ء تک اسی پیشہ سے منسلک رہے۔ پیشہ وکالت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس دوران "سیرت القرآن" حصہ اول دوم "اسلامی انقلاب کا منہاج" "اسلام اور جمہوریت ججوں اور جرنیلوں کے زیر سایہ" "مدارس عربیہ اور اسلامی انقلاب" "سید مودودی کے فکری کام کا ایک جائزہ" "جماعت اسلامی انصاف کے دروازے پر" اور انگریزی کی کتاب "The Shape Of Basic Organs in Islamic State" ادارہ منشورات اسلامی منصورہ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔ گزشتہ ۲۹ سال میں دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ سید قطب شہید کی تفسیر فی ظلال القرآن کے اردو ترجمے کا کام بھی جاری رہا جو اکتوبر ۱۹۹۵ء میں مکمل ہوا۔

سید معروف شاہ شیرازی دوران تعلیم ہی سید مودودی ؒ سے متعارف ہوئے اور اکثر عصری مجالس میں حاضر رہتے تھے' تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ مولانا مودودی ؒ کے ساتھ بھی رہے' جبکہ مولانا مودودی ؒ اکثر انہیں مسکین شاہ صاحب کے نام سے یاد فرماتے تھے' ۱۹۶۲ء میں جماعت اسلامی کے رکن بنے اور ہمیشہ تحریکی سرگرمیوں میں مصروف رہے' قومی اتحاد کی تحریک کے دوران ہری پور جیل میں بھی رہے۔ موصوف آج کل انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے شعبہ شریعہ اکیڈمی میں بطور کنسلٹنٹ خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ نائب امیر جماعت اسلامی ضلع مانسہرہ کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں اور جماعت اسلامی صوبہ سرحد کی شوری کے بھی منتخب رکن ہیں۔

فی ظلال القرآن کے ترجمہ کے بعد موصوف اپنی زیر تکمیل کتب "حرمت سود" "تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل" "کتاب نکاح" "تحریکات اسلامیہ" "غیرت اسلام کی نظر میں" "مغلیہ دور حکومت میں سرحد کے صوفیاء کرام کا کردار" کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

فی ظلال القرآن کی پانچویں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس سلسلہ کی آخری جلد شائع کرنے کی توفیق نصیب فرمائے آمین ثم آمین (سید عارف شیرازی)

# جلد پنجم

نوٹ الذّریٰت ۔۵۱ آیات ۱۔تا۔۳۰ جلد ششم میں ملاحظہ فرمائیں۔

---OOO---

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# فہرست جلد پنجم

## پارہ نمبر- ۲۰------- سورہ النمل - ۲۷



## سورہ القصص - ۲۸



## سورہ العنکبوت - ۲۹

## پارہ نمبر۔ ۲۱



## سورہ الروم ۔ ۳۰



## سورہ لقمان ۔ ۳۱



## سورہ السجدہ ۔ ۳۲



## سورہ الاحزاب ۔ ۳۳



## پارہ نمبر۔ ۲۲

## سورہ السباء ـ ۳۴



## سورہ فاطر ـ ۳۵

## سورہ یٰسین ۔ ۳۶



## پارہ نمبر۔ ۲۳



## سورہ الصّٰفّٰت ۔ ۳۷



## سورہ ص ۔ ۳۸

## سورہ الزمر۔ ۳۹



## پارہ نمبر۔ ۲۴



## سورہ المومن ۔ ۴۰

## سورہ حم السجدہ - ۴۱



## پارہ نمبر- ۲۵



## سورہ الشوریٰ - ۴۲



## سورہ الزخرف - ۴۳

## سورہ الدخان ۔ ۴۴



## سورہ الجاثیۃ ۔ ۴۵



## پارہ نمبر- ۲۶-------- سورہ الاحقاف ۔ ۴۶



## سورہ محمد ۔ ۴۷

## سورہ الفتح ـ ۴۸



## سورہ الحجرات ـ ۴۹



## سورہ ق ـ ۵۰



## سورہ الذٰریٰت ـ ۵۱

سورۃ الذٰریٰت آیات ۱ تا ۳۰ جلد ششم میں ملاحظہ فرمائیں ـ

---○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ----- ۲۰

### سورۃ النمل ـ ۲۷

آیات ۵۹ --- تا --- ۹۳

### سورۃ القصص ـ ۲۸

آیات ۱ --- تا --- ۸۸

### سورۃ العنکبوت ـ ۲۹

آیات ۱ --- تا --- ۴۴

# درس نمبر ۱۷۵ ایک نظر میں

یہ سبق سورۂ نمل کا خاتمہ ہے۔درمیان میں حضرت موسیٰ' حضرت داؤد' حضرت سلیمان' حضرت صالح اور حضرت لوط علیہم السلام کے قصص سے مختصر کڑیاں لائی گئیں۔یہ خاتمہ سورت کے آغاز کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔اسی طرح سورت کے مضمون اور موضوع کے ساتھ بھی مربوط ہے۔اس سورت میں قصص انبیاء میں سے جو کڑیاں لائی گئی ہیں وہ بھی سورت کے آغاز' اختتام اور موضوع و مضمون کے ساتھ مربوط ہیں۔ ہر قصہ اس مقصد کو ثابت کرتا ہے جو اس سورت کے پیش نظر ہے۔

یہ سبق اللہ کی حمد کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔اور ان بندگان خدا پر سلامتی بھیجی جاتی ہے جو برگزیدہ ہیں۔ان میں وہ انبیاء و رسل شامل ہیں جن کے قصے اس سورت میں بیان کیے گئے ہیں۔اس حمد و سلام کے بعد پھر اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقیدے کا بیان شروع ہوتا ہے۔اس میں اس کائنات کے دلائل توحید نفس انسانی کے اندر پائے جانے والے وجدانی دلائل' بعض غیبی امور اور علامات قیامت اور پھر مشاہد قیامت اور پھر حشر و نشر کے ہولناک لمحات بیان کیے گئے ہیں۔جن کے اندر زمین و آسمان کی تمام مخلوق خوفزدہ ہوگی الا وہ شخص کہ جسے اللہ بچالے۔

--- ○○○---

اس سبق میں انسان کو نفس انسانی اور اس کائنات کے کچھ مشاہدات کرائے جاتے ہیں۔کوئی انسان ان مشاہدات اور ان دلائل کا انکار نہیں کر سکتا۔اور کوئی شخص بھی ان کی کوئی تشریح اس کے سوا نہیں کر سکتا کہ ایک واحد خالق ذات موجود ہے جو نہایت مدبر اور صاحب قدرت ہے۔

یہ مشاہدات مسلسل اور نہایت موثر ضربات کی شکل میں آتے ہیں اور انسان پر حجت تمام کرتے ہیں' اس کے شعور کو جگاتے ہیں' مسلسل سوالات ہیں جن کا جواب حقیقی یہی ہے کہ اللہ۔کون ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا؟ کون ہے جس نے آسمانوں سے پانی اتارا جس کے ذریعہ ہم نے تروتازہ باغات پیدا کیے؟ کون ہے جس نے اس زمین کو ٹھہرا رکھا ہے؟ کون ہے جس نے زمین کے اندر دریا بہائے؟ کون ہے جس نے زمین میں اونچے اونچے پہاڑ کھڑے کیے؟ کون ہے جس نے دو دریاؤں اور سمندروں کے درمیان پردے کھڑے کیے۔کون ہے جو ایک مضطرب شخص کی پکار سنتا ہے اور اس کی تکلیف دور کرتا ہے؟ کون ہے جو تمہیں زمین کے اندر اقتدار دے کر خلیفہ بناتا ہے؟ یہ بحر و بر کی ظلمات میں تمہیں راہ دکھانے والا کون ہے؟ پھر اپنی رحمت (بارش) سے قبل ٹھنڈی ہوا کون بھیجتا ہے؟ کون ہے جس نے یہ تخلیق کی اور پھر دوبارہ تخلیق کرے گا؟ کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سوالات مسلسل آتے ہیں اور ہر سوال کے بعد پھر ان کو جھنجوڑا جاتا ہے کہ آیا ہے کوئی الٰہ اللہ کے سوا؟ چنانچہ کوئی معقول شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ کوئی الٰہ اللہ کے ساتھ اور بھی ہے۔کوئی ایسا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن اس کے باوجود ان کا طرز عمل یہ ہے کہ وہ اللہ کے

سوا اور معبودوں کی بندگی کرتے ہیں۔

یہ ضربات جو براہ راست انسان کے دل پر پڑتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ اس کائنات کی کھلی کتاب کے صفحات ہیں اور یہ ان کا شعوری وجدان ہے جسے وہ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ پھر بھی آخرت کی تکذیب کرتے ہیں اور آخرت کے معاملے میں یہ لوگ نہایت التباس کا شکار ہیں۔ چنانچہ ان کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ امم سابقہ نے بھی اسی طرح تکذیب کی تھی تو اللہ نے ان کو ہلاک کر دیا تھا۔

یہاں سے بات پھر حشر و نشر کے ہولناک مناظر کی طرف لوٹ کر آتی ہے۔ دیکھیے ہر لمحے میں قارئین پھر دنیا کے اندر آ جاتے ہیں اور دوبارہ مشاہد قیامت نہایت ہی خوفناک انداز میں آتے ہیں۔ یوں انسانی دلوں کو ہلا مارا جاتا ہے اور ان کو خوب جھنجھوڑا جاتا ہے۔

اس سبق کے آخر میں ایک زبردست چوٹ لگائی جاتی ہے' جس طرح کوئی آخری بات کرتا ہے اور خوفناک نتائج سے خبردار کر کے اور آخری وارننگ دے کر اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا جاتا ہے کہ آپؐ اب ان مزاح کرنے والوں اور آخرت کا انکار کرنے والوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ آپؐ نے ان کو دلائل تکوینی کی طرف بھی متوجہ کر دیا۔ قیامت کے ہولناک مناظر بھی پیش کر دیئے۔ پس اب چھوڑ دیئے جائیں یہ لوگ تاکہ وہ اپنے فطری انجام تک پہنچ جائیں۔ کیونکہ انہوں نے اس انجام کو اپنے لیے خود پسند کیا ہے اور ان کو بتا دیا جاتا ہے کہ رسولؐ کے ذمہ جو کام ہے وہ تو محدود اور متعین ہے۔ اور رسول کے پاس جو ذرائع ہیں وہ محدود ہیں کیونکہ ڈرانے کے بعد اختیار ان کا ہے کہ وہ راہ راست کو اختیار کریں یا نہ۔

إِنَّمَآ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ وَّأُمِرْتُ أَنْ أَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۹۱) وَأَنْ أَتْلُوَ الْقُرْاٰنَ فَمَنِ اهْتَدٰى فَإِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ إِنَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (۹۲) (۲۷: ۹۱ - ۹۲) "اے نبیؐ کہو مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ اس شہر کے رب کی بندگی کروں جس نے اسے حرم بنایا ہے اور جو ہر چیز کا مالک ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلم بن کر رہوں اور یہ قرآن پڑھ کر سناؤں جو ہدایت اختیار کرے گا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو اس سے کہہ دو کہ میں تو بس خبردار کرنے والا ہوں"۔

اور یہ سبق اسی مضمون پر ختم ہوتا ہے جس کے ساتھ اس کا آغاز ہوا تھا۔ یعنی صرف اللہ کی حمد جس کا وہ اہل ہے۔ ان لوگوں کو اللہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو ان کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور جو ان کے اعمال سے اچھی طرح باخبر ہے خواہ ظاہر ہوں یا باطن۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ

(۲۷: ۹۳) "ان سے کہو تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ عنقریب تمہیں اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انہیں پہچان لوگے اور تیرا رب بے خبر نہیں ہے ان اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو"۔

# درس نمبر ۱۷۵ تشریح آیات

## ۶۰--- تا --- ۹۳

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ

(۵۹:۲۷) "(اے نبیؐ) کہو' حمد ہے اللہ کے لیے اور سلام اس کے ان بندوں پر جنہیں اس نے برگزیدہ کیا۔ (ان سے پوچھو) اللہ بہتر ہے یا وہ معبود جنہیں یہ لوگ اس کا شریک بنا رہے ہیں؟"

اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ کلمات سکھاتا ہے ہیں جن کے ساتھ ہر مومن کو اپنے کلام کا آغاز کرنا چاہئے۔ ہر مومن کو اپنی تقریر' اپنی تبلیغ اور اپنے مباحثے اور مکالمے کا آغاز ان کلمات سے کرنا چاہئے اور اپنے کلام کا خاتمہ بھی ایسے ہی کلمات پر ہونا چاہئے۔ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ "کو سب تعریف اللہ کے لیے ہے عنقریب وہ تمہیں دکھائے گا..."۔ اللہ نے اپنے بندوں پر جو انعامات کیے ہیں ان کی وجہ سے اللہ مستحق ہے کہ وہ اس کی تعریفیں کرتے رہیں اور اللہ کی نعمتوں میں سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے انسانوں کو صحیح راہ دکھائی۔ وہ نظام بتلایا جس کے مطابق انسانوں نے زندگی گزارنی ہے۔ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى (۵۹:۲۷) "اور سلام اس کے ان بندوں کے لیے جنہیں اس نے برگزیدہ کیا"۔ یعنی اپنی رسالت کے لیے دعوت کے لیے اور اسلامی نظام زندگی کی تبلیغ اور اقامت کے لیے۔

اس افتتاح کے بعد اب مشرکین پر حملے شروع ہوتے ہیں اور ان کو خوب ضربات لگائی جاتی ہیں۔ ان دلوں کو جھنجھوڑا جاتا ہے جو آیات الٰہیہ کا انکار کرتے ہیں۔ آغاز ایسے سوال سے کیا جاتا ہے جس کا صرف ایک ہی جواب ہے۔ اس سوال کے ذریعے ان پر تنقید کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہ ٹھہراتے ہیں۔ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ

(۵۹:۲۷) "اللہ بہتر ہے یا وہ معبود جنہیں یہ لوگ اس کا شریک بناتے ہیں"۔

یہ جن لوگوں کو شریک بناتے ہیں وہ بت ہیں یا آستانے ہیں یا ملائکہ ہیں اور یا جن ہیں اور یہ سب چیزیں اللہ کی مخلوق ہیں یا ان کے علاوہ کسی اور مخلوق کو یہ شریک کرتے ہیں۔ بہرحال ان کے معبودان باطل کسی حالت میں اللہ کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے' چہ جائیکہ وہ اللہ سے بہتر ہو جائیں۔ کوئی عقلمند آدمی ان معبودوں اور اللہ کے درمیان کوئی موازنہ نہیں کر سکتا۔ یہ سوال اپنے ان الفاظ میں گویا ان کے ساتھ ایک خوبصورت مزاح ہے اور ایک طرح کی تہدید اور توبیخ بھی ہے کیونکہ کوئی شخص اس قسم کا سوال سنجیدگی سے نہیں کر سکتا۔ نہ اس سوال کا جواب طلب کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ جواب کے انتظار سے بھی پہلے دوسرا سوال کر دیا جاتا ہے اور یہ سوال انسانوں کے اردگرد پھیلی ہوئی اس کائنات کے بارے میں ہے 'جس کی بوقلمونیوں کو وہ رات دن مشاہدہ کرتے ہیں۔

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾

"بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ وہ خوشنما باغ اگائے جن کے درختوں کا اگانا تمہارے بس میں نہ تھا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ (نہیں) بلکہ یہی لوگ راہ راست سے ہٹ کر چلے جارہے ہیں"۔

زمین و آسمان ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو ہمارے اردگرد قائم ہے۔ کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ اور نہ کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ جن الہوں کو وہ پکارتا ہے ان میں سے کسی نے ان کو پیدا کیا ہے 'کیونکہ یہ لوگ تو اصنام و اوثان اور ملائکہ وشیاطین اور شجرو حجر کے پوجنے والے تھے یا پھر شمس و قمر کے پجاری تھے۔ لہذا یہ بات بدیہی ہے کہ ان چیزوں نے اس کائنات کو پیدا نہیں کیا' بلکہ مشرکین میں ایسے بیوقوف بھی نہ تھے جو یہ دعویٰ کرتے ہوں کہ یہ کائنات خود اپنے وجود کی وجہ سے قائم ہے۔ بذات خود خالق و مخلوق ہے۔ اس قسم کے کم عقل صرف ہمارے ترقی یافتہ دور ہی میں پیدا ہوئے۔ لہذا صرف یہ بات ان کے لیے کافی تھی کہ ان کو اس کائنات کی طرف متوجہ کر دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ ذرا اس کے بارے میں غوروفکر کرو۔ محض یہ توجہ ہی کافی دلیل ہے 'رد شرک کے لیے اور مشرکین کو لاجواب کرنے کے لیے۔ اور یہ سوال انسان' ایک سوچنے والے انسان کے سامنے ہمیشہ قائم رہتا ہے کیونکہ اس کائنات کی تخلیق ایسی ہے کہ اسے کسی ذات نے ایک منصوبے اور ارادے سے پیدا کیا ہے۔ اس کے اندر کسی مدبر کی تدبیر صاف نظر آتی ہے۔ اس کے اصولوں کے اندر اس قدر ہم آہنگی ہے کہ یہ محض اتفاقی مخلوق معلوم نہیں ہوتی۔ صرف معمولی غور کرنے ہی سے انسان اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کی خالق کوئی عظیم قوت ہے۔ یہ واحد قوت ہے اور اس کی تخلیق کے آثار بتاتے ہیں کہ وہ وحدہ لاشریک ہے اور اس نے اس کائنات کو ایک زبردست منصوبے کے ساتھ بنایا ہے۔ اس کائنات کے اصولوں اور اس کے قوانین میں وحدت اور تناسق پایا جاتا ہے۔ لہذا اس کا خالق بھی ایک ہے اور وہ ایسا خالق ہے کہ اس کا ارادہ اس کائنات کی ہر چھوٹی اور بڑی چیز میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔

ذرا سوالات پر دوبارہ غور کریں۔ "بھلا وہ کون ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا؟"۔ "وہ کون ہے جس نے تمہارے لیے پانی برسایا؟"۔ "وہ کون ہے جس نے تمہارے لیے یہ رنگ برنگے در۔۔ ۔۔ئے؟"۔ "کیا تم ایسے درخت اگا سکتے ہو؟"۔

پانی آسمانوں سے بارش کے ذریعہ اترتا ہے ۔کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ اور کسی کے پاس اس کے حقیقی اسباب کے لیے اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ ایک خالق کائنات ہے جو اس کائنات کی تدبیر کر رہا ہے ۔ وہی ہے جس نے اس کائنات اور اس کے اس فطری نظام کو جاری کیا ہے ۔ اور اس کے جاری کردہ اس قانون قدرت کے مطابق ایک خاص مقدار میں بارش نازل ہوتی ہے ۔ پھر اس بارش کے ذریعہ اس کرۂ ارض پر اس انداز اور مقدار کے مطابق زندگی پائی جاتی ہے لہذا یہ سب کچھ محض اتفاق کے طور پر نہیں ہوتا بلکہ یہ اتفاقات ایک خاص پیچیدہ ترتیب کے مطابق ہوتے ہیں ۔ نہایت ہی طے شدہ اور مضبوط تسلسل کے ساتھ ۔ جس میں زندہ مخلوق کی تمام ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ خصوصاً انسان کی تو تمام ضروریات کے مطابق اس کائنات کو بنایا گیا ہے ۔ اس کی تخلیق میں انسانوں کی ضروریات کو مخصوص طور پر مدنظر رکھا گیا ہے ۔ قرآن کہتا ہے :

وَ اَنْزَلَ لَكُمْ (۲۷ : ۶۰) "اور اس نے تمہارے لیے نازل کیا ہے"۔ قرآن کریم اس طرف بار بار اشارہ کرتا ہے کہ نازل ہونے والے اس پانی کے اندر زندہ کرنے والے اثرات ہیں ۔ اس کے اندر انسان کے وجود' اس کی ضروریات اور اس کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ قرآن انسانوں کو ان زندہ آثار کی طرف متوجہ کرتا ہے ۔ جو ان کے سامنے زندہ موجود ہیں لیکن یہ لوگ ان سے غافل ہیں ۔

فَاَنْبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ (۲۷ : ۶۰) "پھر اس کے ذریعہ ہم نے وہ خوشنما باغ اگائے"۔ یعنی تروتازہ اور خوبصورت' زندہ اور خوش منظر باغ اگائے ۔ باغات کو دیکھ کر انسان کے دلوں میں زندگی' خوشی اور نشاط کی لہر دوڑ جاتی ہے ۔ اس حسن و جمال اور تروتازگی پر غور کرنے سے مردہ دل بھی زندہ ہو سکتے ہیں ۔ پانی سے پیدا ہونے والے اس حسن و جمال کے آثار پر غور کر کے ایک زندہ دل دماغ والا انسان صانع کائنات تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور اس کی تسبیح و تمجید کر سکتا ہے ۔ میں کہتا ہوں کہ ایک خوبصورت چیز کی ساخت پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کے تمام ماہرین فن بھی جمع ہو جائیں تو وہ ایک خوبصورت پھول بھی پیدا نہیں کر سکتے ۔ اس کے اندر رنگوں کی لہریں اور امتزاج' اس کے خطوط' اس کی پتیوں کی ترتیب و تنظیم صرف ایک پھول کے اندر تخلیق و فن کا وہ کمال ہے جو معجز ہے ۔ انسان کے قدیم اور جدید ترقی یافتہ فن کے اندر اس کی کوئی مثال نہیں ہے ۔ رہی پورے درخت کے اندر قوت نامیہ تو یہ ایک عظیم راز ہے ۔ پھر درخت کے اندر سے اس کی نسل کا تسلسل یہ وہ راز ہیں جو انسان کے لیے تو معجزہ ہیں ۔

مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا (۲۷ : ۶۰) "جن کے درختوں کا اگانا تمہارے لیے ممکن نہ تھا"۔ اور زندگی تو ابھی تک علماء کے نزدیک ایک راز ہی ہے ۔ خواہ نباتات کی ہو یا حیوانات کی ۔ آج تک کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ زندگی کس طرح وجود میں آگئی یا زندہ انسان کے جسم' حیوانات کے اجسام اور درختوں کے اجسام کے اندر پائے جانے والے مینرل کے ساتھ کس طرح وابستہ ہو گئی ۔ لہذا زندگی کی اس تخلیق کا مقصد کہیں اور تلاش کرنا ہو گا ۔

نباتات کی زندگی' اور اس کے آثار اور باغ و راغ کو پیش کر کے اور انسانی عقل کو دعوت غور و فکر دے کر اور انسان

کے قوائے مدرکہ کو تحریک دے کر اب قارئین کے سامنے ایک سوال رکھا جاتا ہے۔

ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰه (۲۷ : ۶۰) "کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ بھی ہے"۔کون ہے جو اس سوال کے جواب میں ہاں کہہ سکتا ہے۔اقرار اور یقین اور نفی شرک کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے لیکن ایسے واضح حالات میں بھی لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ پھر بھی عجیب موقف اختیار کرتے ہیں اور وہ ایسے خالق کائنات کے ساتھ اپنے نام نہاد معبودوں کو الٰہ سمجھتے ہیں' ان کی بندگی کرتے ہیں'

بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ (۲۷ : ۶۰) "بلکہ یہ لوگ راہ راست سے ہٹ کر چلے جا رہے ہیں"۔

یعدلون کا معنی یا تو یہ ہے کہ یہ برابر کرتے ہیں یعنی یہ لوگ ایسے خدا کو جو خالق کائنات اور موجد حیات ہے۔ ان معبودوں کے برابر کرتے ہیں جن کو وہ الٰہ سمجھتے ہیں اور یا اس کے معنی ہیں عدل عن الحق یعنی یہ لوگ سچے راستے سے ایک طرف ہو کر چلتے ہیں حالانکہ حق کا راستہ بالکل واضح ہے۔یعنی اللہ کے ساتھ دیگر الہوں کو شریک کر کے وہ سچائی کے راستے سے ہٹ گئے جبکہ اللہ وحدہ خالق ہے۔دونوں مفہوموں کے اعتبار سے ان کا موقف قابل تعجب ہے جو کسی عقلمند آدمی کے لائق نہیں ہے۔

اب ان کو ایک دوسری کائناتی حقیقت کی طرف منتقل کیا جاتا ہے۔جس طرح پہلے تخلیق حیات اور اس کے مظاہر کی طرف متوجہ کیا گیا تھا۔

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ وَ جَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾

"اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے اور اس میں (پہاڑوں کی) میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے حائل کر دیے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ نہیں' بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں"۔

اس کائنات کی پہلی حقیقت اور اس کے بارے میں پہلا سوال جو انسانی ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کیسے ہوئی۔پھر جب ہم کرۂ ارض پر ہیں' تو اس زمین کا اپنی موجودہ ہیئت پر وجود میں آنا ہمارے لیے ایک اہم سوال ہے۔پھر یہ کہ اس زمین کو زندگی کا مستقر اور سکون کی جگہ بنایا گیا ہے۔زمین کو ایسا بنایا گیا ہے کہ اس کے اندر زندگی وجود پا سکتی ہے' یہاں اسے سکون ملتا ہے اور نشوونما کے اسباب ملتے ہیں۔اگر اس زمین کی موجودہ شکل یہ نہ ہوتی اور شمس و قمر کے مقابلے میں اس کے موجودہ فاصلے نہ ہوتے یا اس کا حجم وہ نہ ہوتا جو ہے یا اس کے عناصر اور اس

کی فضا میں جو عناصر ہیں وہ نہ ہوتے' یا زمین کی حرکت اپنے محور کے اردگرد ذرا تیز ہوتی یا سورج کے اردگرد اس کی گردش موجودہ گردش سے زیادہ تیز ہوتی یا چاند کی گردش زمین کے گرد تیز ہوتی ۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے حالات جو محض اتفاق سے وجود میں نہیں آئے ۔ بلکہ ایک مکمل ترتیب اور ہم آہنگی کے ساتھ وجود میں لائے گئے ہیں ۔ اگر ان حالات میں سے کسی چیز میں کوئی ادنیٰ سا تغیر بھی آ جائے تو یہ زمین "قرار" نہ ہوتی اور نہ اس میں انسان یا کوئی اور چیز زندہ رہ سکتی ۔

یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کے پہلے مخاطب اللہ کے اس قول سے وہ باتیں نہ سمجھتے ہوں جو ہم سمجھتے ہیں : اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا (۲۷ : ۶۱) "کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا" ۔ لیکن اس قدر وہ لوگ بھی سمجھتے تھے کہ یہ زمین زندگی کے لیے ایک جائے قرار ہے اور اس کے اوپر زندگی کو ممکن بنایا گیا ہے ۔ وہ اس حقیقت کو ذرا اجمال کے ساتھ سمجھتے تھے اور ہم ذرا مزید تفصیلات کے ساتھ سمجھتے ہیں ۔ لیکن ان میں سے کوئی مشرک بھی یہ دعویٰ نہ کر سکتا تھا کہ ان کے الہوں میں سے کوئی الہ تخلیق زمین میں اللہ کے ساتھ شریک ہے ۔ پس اس آیت سے ان کے لیے یہ بات کافی تھی اور اس آیت کے معنی کے اندر علم کی وسعت کے ساتھ ساتھ اب تفصیلات کی وسعت پیدا ہو گئی اور ہوتی رہے گی ۔ یہ قرآن کریم کے انداز بیان اور طرز استدلال کا معجزہ ہے کہ اس سے سائنسی اعتبار سے پسماندہ سوسائٹی بھی اسی قدر استفادہ کرتی تھی جس طرح زمانوں بعد' آج کے ترقی یافتہ لوگ کرتے ہیں ۔

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا (۲۷ : ۶۱) "کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے" ۔ زمین کے اوپر اللہ نے جو دریا چلا رکھے ہیں وہ دراصل زندگی کے شریان ہیں ۔ یہ اس کرۂ ارض کی بلندیوں سے مشرق' مغرب' شمال اور جنوب کی سمتوں میں چلتے ہیں ۔ اور اپنے ساتھ سرسبزی شادابی اور نشوونما لاتے ہیں ۔ ان کی تشکیل ان پانیوں سے ہوتی ہے جن کو اللہ تعالیٰ زمین میں جمع فرماتا ہے' ہر علاقے کے طبعی حالات کے مطابق' جس ذات نے اس زمین کو پیدا کیا' اس نے اس کے منصوبے میں بادلوں کی تشکیل' بارش کا نظام اور دریاؤں کا بہاؤ رکھا ۔ کوئی ہے جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس نظام کی تشکیل میں خالق کائنات کے سوا کوئی اور بھی شریک ہے ۔ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ اس کرۂ ارض پر بڑے بڑے دریا بہہ رہے ہیں ۔ یہ سوال ایک حقیقی سوال ہے کہ آخر کون ہے جس نے ان دریاؤں کو یوں چلایا اور بہایا ۔ کیا ہے کوئی الہ اللہ کے ساتھ؟

وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ (۲۷ : ۶۱) "اور اس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں" ۔ رواسی کے معنی اونچے پہاڑ کے ہیں ۔ یہ اپنی جگہ جمے ہوئے اور زمین پر ٹھہرے ہوئے ہیں ۔ اور اکثر اوقات ان پہاڑوں ہی سے نہریں نکلتی ہیں ۔ جہاں سے بارشوں کے پانی نکل کر دریاؤں کی شکل اختیار کرتے ہیں اور پھر ان دریاؤں کی وجہ سے پہاڑی علاقوں میں شگاف اور گہرائیاں پیدا ہو کر وادیاں بن جاتی ہیں اور اونچے مقامات سے یہ دریا قوت کے ساتھ نشیبی علاقوں کی طرف چلتے ہیں ۔

یہاں انداز بیان میں اونچے اور جمے ہوئے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ندیاں اور دریا دکھائے گئے ہیں ۔

قرآن کی تصویر کشی کے اندر یہ طرز ادا عام ہے کہ وہ ایک ہی آیت میں باہم متضاد مناظر و معانی پیش کرتا ہے ۔ یہاں بھی چلتے دریاؤں کے بعد کھڑے پہاڑ دکھائے گئے ہیں ۔

وَ جَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ( ۲۷ : ۶۱ ) "اور پانی کے دو سمندروں کے درمیان پردے حائل کر دیئے"۔ ایک سمندر سخت نمکین کھارا اور دوسرا میٹھا اور خوشگوار ۔ دونوں کو بحرین کہا گیا۔ بطور تغلب کیونکہ دونوں کا مشترکہ مادہ پانی ہے اور دونوں کے درمیان پردہ ایک طبیعی پردہ ہوتا ہے ۔ اس طرح کہ سمندر کا پانی دریا کے پانی کے ساتھ ملتا نہیں ۔ اس طرح اسے کھارا نہیں بنا دیتا ۔ اس کی تفصیلات یوں ہیں کہ دریاؤں کی سطح سمندر کی سطح سے قدرے اونچی ہوتی ہے ۔ جب دریاؤں کا پانی سمندر میں گرتا ہے تو اس پانی کی سطح سمندر کی سطح سے اونچی ہوتی ہے ۔ یہ دریا پھر سمندر کی سطح کے اوپر دور تک چلتا رہتا ہے ۔ سمندر اس کو خراب نہیں کرتا۔ اب اگر دریا کا یہ پانی سمندر کے پانی سے نیچے بھی ہو جائے تو وہ آپس میں ملتے نہیں۔ اس وجہ سے کہ سمندر کا پانی دریا کے پانی کی نسبت زیادہ کثیف ہوتا ہے ۔ اس فرق کی وجہ سے دونوں پانی ایک دوسرے کے ساتھ ملتے نہیں 'جدا ہی بہتے ہیں ۔ یہ ہے اللہ کی سنت اپنی اس کائنات کے اندر اور اس معجزانہ انداز میں اللہ نے اپنی اس کائنات کو بنایا ہے ۔۔۔۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ یہ معجزانہ کام کس نے کیا ۔ اللہ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے ؟ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ( ۲۷ : ۶۱ ) اگر کوئی اللہ کے سوا کسی اور کی بابت ایسا دعویٰ کر سکتا ہے 'تو وہ سامنے آئے ۔ اگر نہیں تو اس کائنات کے یہ عجوبے اور یہ منصوبے دلیل ناطق ہیں کہ اس کا ایک خالق ہے اور وہ ایک ہی ہے ۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ( ۲۷ : ۶۱ ) "بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں"۔

یہاں بھی علم کا ذکر کیا کہ "بے علم نتواں خدا را شناخت"۔ اور جس طرح اس سورت کے خلاصہ میں اور پارۂ سابق میں ہم نے بتایا تھا کہ اس سورت کا محور ہی علم ہے ۔ پوری سورت میں علم کی اہمیت پر زور دیا گیا ۔

اب روئے سخن مشاہد کائنات سے خود انسان کی نفسیاتی دنیا کی وادیوں کی طرف پھر جاتا ہے ۔

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ؕ

"کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے ؟ اور (کون ہے جو) تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے ؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (یہ کام کرنے والا) ہے ؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو"۔

اب ان کے وجدان کو چھوا جاتا ہے ۔ ان کے نفس کے اندر موجود خلجانات کو چھیڑا جاتا ہے اور ان کی زندگی کے عملی حالات اور اہم واقعات کے دوران ان کے نفس کی کیفیات ان کے سامنے رکھی جاتی ہیں ۔ سمندر کے سفر میں جو لوگ نہایت ہی مشکل حالات میں گھر جاتے ہیں اور جہاں ظاہری اسباب ختم ہو جاتے ہیں اور بظاہر مدد کو پہنچنے والا کوئی نہیں

رہتا۔ صرف اللہ کی مدد کی امید ہوتی ہے اور تمام سہارے ختم ہو جاتے ہیں۔ انسان ہر طرف نظر دوڑاتا ہے اور کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ زمین کی کوئی قوت ان کی مدد کو نہیں پہنچ رہی ہوتی۔ انسان اپنے خیال میں جن قوتوں کے سہارے کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ وہ سب قوتیں ایک ایک کر کے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ ہر وہ قوت جس سے کچھ بھی توقع تھی وہ جواب دے دیتی ہے۔ ایسے مایوس کن حالات میں پھر انسان کی فطرت جاگ اٹھتی ہے۔ انسان اس قوت کی طرف متوجہ ہوتا ہے' جو صحیح قوت ہوتی ہے۔ اب انسان اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے حالانکہ اس سے قبل انسان اپنے نارمل حالات میں اللہ کو بھولا ہوا تھا۔ کیونکہ اب تو اللہ ہی ہے جو کسی مجبور شخص کو امداد دیتا ہے جب وہ بے سہارا ہو کر اسے پکارتا ہے اور یہ اللہ ہی ہے جو پھر اس کو مشکلات سے نکالتا ہے۔ امن و سلامتی عطا کرتا ہے اور اس مشکل سے نکالتا ہے۔

جب لوگ امن و عافیت اور خوشحالی میں ہوتے ہیں تو وہ غفلت میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ وہ ذات باری کو بھول جاتے ہیں۔ پھر وہ زمین کی قوتوں میں کسی قوت سے نصرت و امداد طلب کرتے ہیں۔ لیکن جب سختی آتی ہے اور انتہائی کرب کے حالات میں وہ گھر جاتے ہیں تو اس وقت غفلت کے پردے اتر جاتے ہیں اور اس وقت وہ گڑگڑا کر اپنے رب کی طرف لوٹتے ہیں۔ اگرچہ وہ غافل تھے اور ہٹ دھرمی کرنے والے تھے۔

قرآن کریم منکرین اور ہٹ دھرمی کرنے والوں کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جو خود ان کی فطرت میں ہے۔ یہ بات قرآن کریم ایسے ماحول میں ان کے سامنے پیش کرتا ہے جس میں زمین و آسمان کی تخلیق' آسمانوں سے پانی کا نزول' زمین کے اوپر تروتازہ باغ و راغ کی پیدائش' اس کرۂ ارض کا قرار' اس کے اوپر پہاڑوں کا نصب کرنا اس کے اندر دریاؤں اور نالوں کا چلانا اور بہانا اور سمندر کے اندر دو قسم کے پانیوں کے پردے حائل کرنے کے مناظر پیش کیے گئے ہیں اور پھر سمندر میں ایک مضطرب اور کربناک صورت حال پیش کر کے سمجھایا گیا کہ ایسے حالات میں تو کوئی شخص بھی اللہ کے سوا کسی کو نہیں پکارتا اور یہ بھی مذکورہ بالا کائناتی خالق کی طرح ایک حقیقت ہے۔ وہ حقائق کائناتی تھے اور اس کا تعلق انسان کی نفسیاتی دنیا سے ہے۔

اب ان کی نفسیات کی دنیا سے بھی باہر لا کر' اللہ تعالیٰ ان کو ان کی زندگی کے ایک عملی حال کی طرف لاتا ہے۔

وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْأَرْضِ (۲۷ : ۶۲) "اور تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے"۔ وہ کون ہے جس نے یہاں انسان کو پیدا کیا' پوری مخلوقات پر فضیلت بخشی۔ اس کے بعد پھر ایک کے بعد دوسرے کو اس زمین کا اقتدار دیتا رہا۔ کسی کو زوال ہوا اور دوسرے نے کمال حاصل کیا۔ یہ گرا اور وہ اٹھا۔

کیا یہ اللہ ہی نہیں ہے کہ جس نے قوانین قدرت کے مطابق تمہیں اس زمین پر زندگی بخشی اور پھر تمہیں ایسی قوتیں عطا کیں جن کی وجہ سے تم اس کرۂ ارض پر اللہ کی خلافت کے مستحق قرار پائے اور پھر تمہیں اس عظیم منصب کے لیے یہاں تیار کیا۔ زمین کو تمہارے لیے جائے قرار بنایا۔ اور اس کی ہر چیز کو تمہاری زندگی کے لیے ممد و معاون اور ہم آہنگ بنایا کہ زمین کی ہر چیز تمہارے لیے ممد حیات بن گئی اور اگر ایسا ہوتا کہ زمین کے اہم عناصر میں سے ایک عنصر غائب کر دیا جائے تو تمام انسان کیا تمام زندہ چیزیں ایک دم میں ختم ہو کر رہ جائیں۔ اور آئندہ کے لیے بھی یہاں کسی چیز کا وجود محال ہو جائے۔

سب سے آخر میں یہ بات ہے کہ اللہ ہے وہ ذات جس نے موت و حیات کو پیدا کیا اور ایک نسل کے بعد دوسرے لوگوں کو اٹھایا۔ اگر اللہ اگلی نسلوں کو اسی طرح قائم رکھتا اور آنے والی نسلیں پیدا ہوتی چلی جاتیں تو اس کرۂ ارض پر تل دھرنے کی جگہ ہی نہ ہوتی۔ زندگی کا یہ دھارا بہت ہی سست ہوتا۔ انسانی سوچ نہایت سست رفتار ہوتی۔ کیونکہ تازہ تازہ نسلیں وجود میں آنے کے ساتھ تازہ افکار اور تازہ خیالات بھی آتے ہیں۔ لوگ نئے نئے تجربے کرتے ہیں اور زندگی کی جدوجہد میں نئی نئی کوششیں کرتے ہیں۔ زندگی گزارنے کے نئے نئے طریقے دریافت کرتے ہیں اور اب تو صورت یہ ہے کہ پرانے اور نئے لوگوں کی جنگ صرف فکر و شعور کے میدان میں ہوتی ہے۔ اور اگر سابقہ لوگ بھی سب کے سب زندہ ہوتے تو پرانے اور نئے لوگوں کے درمیان جسمانی تصادم بھی ہوتا۔ اور زندگی کی گاڑی آگے بڑھنے کے بجائے باہم تضادات اور تصادمات کا شکار ہو جاتی۔

یہ تمام نفسیاتی حقائق ہیں جس طرح اس سے قبل بیان کیے جانے والے آفاقی حقائق تھے۔ کون ہے جس نے یہ حقائق پیدا کیے، تمہیں خلیفہ بنایا۔ کوئی ہے اللہ کے سوا؟ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ (۲۷ : ۶۲) "کیا اللہ کے ساتھ ہے کوئی اور الہ"۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ حقائق کو بھول جاتے ہیں جب سمندر کی مشکلات سے نکلتے ہیں تو سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ان کی فطرت بھی سو جاتی ہے اور یہ غافل ہو جاتے ہیں حالانکہ خود ان کے نفس اور ان کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات میں حقائق موجود ہیں۔

قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۲۷ : ۶۲) "تم لوگ کم ہی سوچتے ہو"۔ اگر انسان حقائق کو یاد رکھے، اور ان پر مسلسل غور کرتا رہے، تو وہ ہمیشہ اللہ کے ساتھ جڑا رہے اور فطرت کی پکار کو سنتا رہے۔ وہ کبھی اپنے رب سے غافل نہ ہو اور کبھی اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔

اس کے بعد لوگوں کی زندگی سے بعض اور حقائق پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق اس کرۂ ارض پر لوگوں کی سرگرمیوں سے ہے اور ان کے ان مشاہدات سے ہے جو ہر وقت دہرائے جاتے ہیں۔

اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۳﴾

"اور وہ کون ہے جو خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں تم کو راستہ دکھاتا ہے اور کون اپنی رحمت کے آگے ہواؤں کو خوشخبری لے کر بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (یہ کام کرتا) ہے؟ بہت بالا و برتر ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں"۔

سب لوگ بحری سفر کرتے ہیں اور ان میں وہ لوگ بھی تھے جو قرآن مجید کے مخاطب اول تھے۔ یہ لوگ بحر و بر کے راستوں میں سفر کرتے ہیں اور انہوں نے بحر و بر کی تاریکیوں میں اپنے تجربات اور علم کے مطابق سفر کیے اور کرتے ہیں۔ ان

سفروں میں وہ صحیح راستے معلوم کر لیتے ہیں' وہ کون ہے جو ان سفروں میں انسان کو سیدھے راستے بتاتا ہے؟ کس نے انسانوں کو یہ عقل و خرد عطا کیا جس کے ذریعے وہ ان راستوں کا ادراک کرتے ہیں۔ ستاروں کے علوم کس نے دیئے' پھر آلات دریافت کرنے کی قوت کس نے دی۔ اور تجربات و نشانات کس نے بتائے؟ وہ کون ذات ہے جس نے انسانی فطرت اور فطرت کائنات کے اندر ہم آہنگی پیدا کی۔ اور انسان کے لیے فطرت کائنات تک پہنچنے کی راہ ہموار کی۔ کون ہے جس نے کانوں کے ذریعے انسانوں کو آوازیں معلوم کرنے کی طاقت دی۔ کون ہے جس نے آنکھ کے ذریعے انسان کو دور تک مشاہدے کی طاقت دی۔ اور کون ہے جس نے حواس خمسہ کے ذریعے انسان کو تمام محسوسات معلوم کرنے کی توفیق دی؟ پھر انسان کو عقل کی طاقت دی جس کے ذریعے انسان حواس سے بھی زیادہ لطیف مدرکات معلوم کرتا ہے۔ پھر حواس کے تجربات سے نتائج اخذ کرنے اور وجدان اور الہام کے ذریعہ حقائق اخذ کرنے کی قوتیں دیں۔ ءَ اِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ (۲۷ : ۶۳) "کیا ہے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الہ"۔

وَ مَنۡ یُّرۡسِلُ الرِّیٰحَ بُشۡرًۢا بَیۡنَ یَدَیۡ رَحۡمَتِہٖ (۲۷ : ۶۳) "اور کون ہے جو اپنی رحمت کے آگے ہواؤں کو خوشخبری دے کر بھیجتا ہے"۔ یہ ہوائیں جن کے فلکی اسباب کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور کہا جائے گا لیکن یہ وہ ہیں جو روز اول سے اللہ نے اس کرۂ ارض کے ساتھ پیدا کی ہیں۔ اور جس طرح یہ چلتی ہیں روز اول سے ان کے لیے یہی منصوبہ ہے کہ یہ ایک جگہ سے بادلوں کو اپنی دوش پر لے کر چلتی ہیں اور انسانوں کو اس چیز کی خوشخبری دیتی ہیں جو مدحیات ہے یعنی پانی۔

سوال یہ ہے کہ یہ ہوائیں' یہ بادل اور یہ بارش کا نظام اپنی موجودہ شکل میں کس نے تخلیق کیا؟ اور پھر ہوائیں' ٹھنڈی ہوائیں' بادلوں اور بارش سے قبل کون بھیجتا ہے۔

ءَ اِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ (۲۷ : ۶۳) "کیا ہے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الہ"۔

تَعٰلَی اللّٰہُ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ (۲۷ : ۶۳) "بہت بلند اور بالا ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں"۔

اَمَّنۡ یَّبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ وَ مَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ ءَ اِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ ؕ قُلۡ ہَاتُوۡا بُرۡہَانَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۶۴﴾

"اور وہ کون ہے جو خلق کی ابتدا کرتا اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے؟ اور کون تم کو آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں حصہ دار) ہے؟ کہو کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو"۔

اس کائنات و مخلوقات کا آغاز ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار کوئی نہیں کر سکتا۔ نہ تخلیق کائنات کے مسئلے کو

اللہ وحدہ کے وجود کو تسلیم کیے بغیر حل کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کائنات کا وجود ہی اس بات کو مستلزم ہے کہ اللہ موجود ہے۔ دنیا میں جن لوگوں نے اس کائنات کے وجود کے مسئلے کو وجود باری تسلیم کرنے کے بغیر حل کرنے کی سعی کی ہے، درآں حالیکہ اس کائنات کے وجود ہی میں ایک مصمم ارادہ اور ایک قصد اور ایک منصوبہ نظر آتا ہے تو ایسے لوگ مسئلہ کائنات کے حل کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ اور اللہ کی وحدانیت اس لیے ثابت ہوتی ہے کہ اس کائنات کے تمام آثار کے اندر وحدت نظر آتی ہے، اس کی تدبیر ایک ہے، تقدیر ایک ہے اور اس پوری کائنات کی اسکیم میں ایک ایسا ربط اور ہم آہنگی ہے کہ اس کا ایک ہی خالق تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔

یہ تو تھا آغاز، رہا یہ معاملہ کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کی تخلیق کا دوبارہ اعادہ کرے گا تو اس بارے میں تمام کفار اور مشرکین کو خلجان تھا۔ لیکن جو شخص اس کائنات کے آغاز کے بارے میں اس نتیجے تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ ایک صاحب ارادہ و مدبر ذات کی تخلیق ہے اور وہ اس کائنات کے اندر پائی جانے والی وحدت اور ربط کی وجہ سے ایک ہے تو اس کے لیے یہ تسلیم کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہوتی کہ وہ ذات اسے دوبارہ پیدا کرے گی تاکہ اس دنیا میں آنے والے لوگ اپنے اعمال کی جزا پوری کی پوری وہاں پائیں گے کیونکہ اس دنیا میں اچھے برے عمل پر انسان کو اگرچہ جزاء و سزا ملتی ہے مگر وہ پوری جزاء و سزا نہیں ہوتی۔ لہٰذا مکمل مکافات عمل کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایسا جہاں ہو جس میں مکمل جزاء و سزا ہو۔ اس کے بغیر اس دنیا کی زندگی کی تکمیل ممکن ہی نہیں ہے۔ لہٰذا ایک آنے والی زندگی کی تصدیق ضروری ہے جس میں مکمل ہم آہنگی، مکمل کمال نصیب ہو۔ سوال یہ ہے کہ مکافات عمل کے اصول کے مطابق جزاء و سزا اس جہاں میں کیوں نہ ہوئی۔ تو یہ ان حکمتوں کی وجہ سے جن کو خالق کائنات ہی خوب جانتا ہے۔ کیونکہ اپنی مخلوق کے تمام راز خالق ہی کے پاس ہیں۔ اور یہ وہ غائبانہ راز ہیں جن کی اطلاع اللہ نے انسان کو نہیں دی۔

یہی اصول ہے جس کے مطابق اس آیت میں سوال کیا گیا ہے کہ کس نے ابتداء اس کائنات کو پیدا کیا اور کون ہے جو دوبارہ پیدا کرے گا؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب یہی ہے کہ کوئی نہیں ہے۔

ءَ اِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ (٢٧ : ٦٤) "کیا ہے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ"۔

رزق دینے کا تعلق، آغاز تخلیق سے بھی متعلق ہے اور اعادۂ تخلیق سے بھی وابستہ ہے۔ اللہ کے بندوں کے رزق کا انتظام بالکل ظاہر و باہر ہے۔ نباتات کی شکل میں اور حیوانات کی شکل میں۔ پانی اور ہوا، کھانے پینے اور سانس لینے کے لیے ضروری ہیں۔ زمین کے معدنی ذخائر اور دھاتیں بھی انسانوں کے لیے مفید اور ضروری ہیں، جن میں مقناطیسی قوت اور بجلی کی قوت بہت ہی اہم ہے۔ اس کائنات کے اندر اللہ نے انسانی زندگی کے لیے اس کے علاوہ اور بھی بے حد و حساب ایسی قوتیں رکھی ہیں جو انسانی زندگی کے لیے ضروری ہیں لیکن انسان کو ابھی تک ان کے بارے میں علم نہیں ہے۔ وقفے وقفے سے اللہ تعالیٰ انسانوں کو ان کے بارے میں بتاتا جاتا ہے۔

آسمانوں سے انسان کو کس طرح رزق فراہم ہوتا ہے؟ دنیا میں انسان کو آسمانوں سے روشنی فراہم ہوتی ہے، حرارت فراہم ہوتی ہے، بارش فراہم ہوتی اور تمام دوسری چیزیں جن کا مرکز آسمانوں میں ہے اور قیامت میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو جو درجات بلند اور جو انعامات دے گا وہ بھی معنوی اعتبار سے ایک آسمانی رزق ہے کیونکہ قرآن بھی آسمان ارتفاع اور

بلندی سے آتا ہے اور بلندی کے لیے آتا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے تخلیق اور اعادۂ تخلیق کے بعد اس بات کا ذکر فرمایا ہے کہ اللہ اپنی مخلوق کو آسمانوں سے رزق فراہم کرتا ہے۔ اس لیے کہ آغاز تخلیق کے ساتھ زمین کے ارزاق کا واضح تعلق ہے۔ تمام مخلوق زمین کے ارزاق کی وجہ سے زندہ ہیں۔ اور آخرت کے ساتھ ان ارزاق کا تعلق یوں ہے کہ آخرت کی زندگی میں جزاء و سزا اسی دنیا کی زندگی پر موقوف ہے۔ اور آسمانوں کے رزق کا تعلق بھی آغاز تخلیق سے واضح ہے۔ دنیا میں حیات انسانی کے لیے آسمانوں کے ارزاق اور سامان زیست کی ضرورت ہے اور آخرت میں یہ انعامات انسان کے جَزَاءً وِّفَاقًا "پوری پوری جزا" کی صورت میں ہوں گے۔ لہٰذا آغاز تخلیق اور زمین و آسمان کے ارزاق سے اس کا تعلق واضح ہے اور کلام الٰہی باہم حیرت انگیز انداز میں مربوط ہے۔

آغاز تخلیق اور اعادۂ تخلیق تو درحقیقت پیش پاافتادہ حقائق ہیں۔ اسی طرح زمین و آسمان سے انسانوں اور تمام مخلوقات کے لیے رزق کا سامان بھی دراصل معلوم حقائق ہیں لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ان حقائق پر غور نہیں کرتے۔ اس لیے قرآن نہایت زوردار اور تحدی یعنی چیلنج کے انداز میں ان کو اس طرح متوجہ کرتا ہے۔

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۷ : ٦٤) "کہو "لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو"۔

بے شک اس وقت بھی مخالفین اس قسم کی کوئی دلیل لانے سے عاجز رہے اور آج تک کوئی اس قسم کی کوئی دلیل نہیں لا سکا۔ یہ ہے نظریاتی مباحث میں قرآن کا انداز کلام۔ قرآن کریم کائنات کے مناظر و مشاہد پیش کرتا ہے۔ انسانی نفس کے اندر موجود حقائق کو پیش کرتا ہے۔ اس طرح قرآن جو منطق پیش کرتا ہے اس کا دائرہ اس پوری کائنات تک وسیع ہوتا ہے۔ انسانی فکر و نظر کو پوری کائنات میں گھماتا ہے۔ انسان کی فطرت کو صیقل کرتا ہے تاکہ انسانی دماغ اور انسانی فطرت خود کسی نتیجے تک پہنچ سکیں جو واضح اور سادہ ہو۔ اور انسانی شعور پرجوش ہو اور اس کی وجدانی قوت اچھی طرح کام کر رہی ہو' کیونکہ دلائل تو خود انسانی نفس اور انسانی فطرت میں موجود ہیں لیکن غفلت اور نسیان کی وجہ سے انسان ان کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ اور کفر اور انکار ان دلائل پر پردے ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ ان وجدانی اور کائناتی دلائل سے اور اپنی اس فطری منطق کے بل بوتے پر قرآن کریم انسان کو اس کائنات اور نفس انسانی کے اندر پائے جانے والے عظیم حقائق تک پہنچاتا ہے۔ یہ حقائق اس طرح واضح ہو جاتے ہیں کہ ان میں وہ شکوک و شبہات نہیں رہتے جو کسی خشک منطق استدلال سے بذریعہ صغریٰ وکبریٰ ثابت کیے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ کتابی منطق ہم تک یونانی ثقافت کے ذریعے آئی ہے اور ہمارے علم الکلام کا حصہ بن گئی حالانکہ اس کا انداز قرآنی نہ تھا۔ اس نے ہمیں قرآنی منطق سے دور کر دیا۔

انفس و آفاق کی وادیوں میں سیر کرتے ہوئے اور عقیدۂ توحید اور نفی شرک کو وجدانی طور پر ثابت کرنے کے بعد' اب قرآن کریم ہمیں اس وادی میں لے جاتا ہے جو عالم غیب کے اندر مستور ہے اور جس کے حالات صرف وہ خالق اور مدبر ہی بتا سکتا ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے یعنی یہ کہ موت کے بعد کیا ہو گا۔ آخرت کس طرح ہو گی کیونکہ یہ اللہ کے غیوب میں سے ایک غیب ہے۔ اور قرآنی منطق' وجدانی ہدایت اور انسانی فطرت اس کے وقوع کی شہادت دیتی ہیں اور انسان علم و ادراک کے ذریعہ اس بات کے تعین سے قاصر ہیں کہ یہ گھڑی کب آئے گی؟

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَمَا يَشْعُرُوْنَ
٥ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۣ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۣ بَلْ
ع ٨ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَاۗؤُنَآ اَىِٕنَّا
١ لَمُخْرَجُوْنَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ
الْاَوَّلِيْنَ ۝ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝
وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۝ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا
الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ
تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝
وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝ وَمَا مِنْ غَاۗىِٕبَةٍ فِي
السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

"ان سے کہو' اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا اور وہ (تمہارے معبود تو یہ بھی) نہیں جانتے کہ کب وہ اٹھائے جائیں گے۔ بلکہ آخرت کا تو علم ہی ان لوگوں سے گم ہو گیا ہے' بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں' بلکہ یہ اس سے اندھے ہیں۔ یہ منکرین کہتے ہیں "کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو چکے ہوں گے تو ہمیں واقعی قبروں سے نکالا جائے گا؟ یہ خبریں ہم کو بھی بہت دی گئی ہیں اور پہلے ہمارے آباؤ اجداد کو بھی دی جاتی رہی ہیں' مگر یہ بس افسانے ہی افسانے ہیں جو اگلے وقتوں سے سنتے چلے رہے ہیں"۔ کہو ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرموں کا کیا انجام ہو چکا ہے۔ اے نبی" ان کے حال پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چالوں پر دل تنگ ہو--- وہ کہتے ہیں کہ "یہ دھمکی کب پوری ہو گی اگر تم سچے ہو؟" کہو کیا عجب کہ جس عذاب کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو' اس کا ایک حصہ تمہارے قریب ہی آ لگا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب تو لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ بلاشبہ تیرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ آسمان و زمین کی کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں ہے جو ایک واضح کتاب میں لکھی ہوئی موجود نہ ہو"۔

غیب پر ایمان لانا' موت کے بعد اٹھایا جانا اور پوری زندگی کے اعمال کا حساب و کتاب دینا اسلامی عقائد کے اندر ایک بنیادی عنصر ہے۔ اسلامی زاویہ سے زندگی کا کوئی نظام ان عقائد کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ہر مسلمان پر لازم

ہے کہ وہ آنے والے جہان پر ایمان لائے' جہاں اعمال کی مکمل جزاء وسزا ہو اور عمل اور اس کی اجرت کے درمیان مکمل توازن ہو۔ یہ عقیدہ انسان کے دل میں جاگزیں ہو' انسانی نفس اس کے بارے میں حساس ہو' اور اس دنیا میں انسان کی تمام سرگرمیاں اس عقیدے پر قائم ہوں کہ اس نے آخرت میں اپنی زندگی کا پورا حساب وکتاب دینا ہے۔

انسانیت نے اپنی طویل تاریخ میں عقیدۂ آخرت کے بارے میں مختلف رسولوں کے مقابلے میں عجیب و غریب موقف اختیار کیے' حالانکہ یہ عقیدہ بہت ہی سادہ ہے اور بادی النظر میں بہت ہی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی رسول آیا اور اس نے لوگوں کو عقیدۂ آخرت کی طرف متوجہ کیا تو لوگوں نے اس دعوت کو بہت ہی عجیب و غریب سمجھا۔ حالانکہ یہ کائنات موجود تھی' اس کے اوپر یہ رنگا رنگ حیات موجود تھی' وہ خود موجود تھے کیا ان معجزات کو پہلی مرتبہ صادر کرنا اور پیدا کرنا مشکل تھا یا دوسری مرتبہ ان کو دہرانا مشکل تھا؟ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ انسانوں نے آخرت کے بارے میں ڈرانے والوں کی دعوت سے منہ موڑا۔ وہ اس دعوت کے بارے میں بکواس کرتے رہے۔ اور کفر و انکار میں بڑھتے ہی چلے گئے۔

قیام قیامت ایک غیب ہے جسے صرف اللہ جانتا ہے' اور اس کے بارے میں علم صرف اللہ کو ہے۔ کفار نے ہمیشہ نبیوں سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ قیامت کے وقوع کے وقت کا تعین کر دیں۔ جب یہ تعین نہ ہوا تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا اور اسے محض پرانے وقتوں کی ایک کہانی سمجھا کہ یہ ایک بات ہے جو پرانے وقتوں سے کہی جا رہی ہے لیکن ابھی تک واقع نہیں ہوئی۔

یہاں پہلے یہ بتایا جاتا ہے کہ تمہارا علم آخرت کے بارے میں محدود ہے اور آخرت کا وقوع ان غیبی امور میں سے ایک ہے جن کا انسان کو علم نہیں ہے۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (٦٥) بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ (٦٦)

(٢٧:٦٥ - ٦٦) "ان سے کہو' اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا اور وہ (تمہارے معبود تو یہ بھی) نہیں جانتے کہ کب وہ اٹھائے جائیں گے۔ بلکہ آخرت کا تو علم ہی ان لوگوں سے گم ہو گیا ہے' بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں' بلکہ یہ اس سے اندھے ہیں"۔

ابتدائے تخلیق سے انسان کو اس خفیہ غیب کا سامنا ہے۔ انسانی علم ایک حد سے آگے نہیں جا سکتا۔ غیب کے آگے جو پردے لٹک رہے ہیں ان سے وہ آگے نہیں جھانک سکتا۔ یہ مغیبات میں سے صرف اسی قدر علم حاصل کر سکتا ہے جس قدر اللہ تعالیٰ اسے توفیق دیتا ہے اور انسان کے لیے بھلائی اسی میں ہے کہ اللہ نے اسے مستقبل کے علوم غیبیہ سے محروم رکھا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس میں انسان کے لیے کوئی خیر دیکھتا تو وہ ضرور اسے عالم غیب کے بارے میں پورا علم عطا کر دیتا۔

اللہ نے انسان کو اس قدر قوت اور استعداد دی ہے جس کے ذریعے وہ اس دنیا میں اپنے فرائض بحیثیت خلیفۃ اللہ فی الارض پورے کر سکے۔ یہ فرائض کوئی معمولی فرائض نہیں ہیں۔ اس سے آگے اللہ نے انسان کو مزید غیبی قوتیں نہیں

ویں - اگر انسان کو ایسی قوت دے دی جاتی جس کے ذریعہ وہ مستقبل کے پردوں کو چاک کر کے معلومات حاصل کر سکتا تو اس کے ذریعہ اس کی ان قوتوں میں کوئی اضافہ ممکن نہ تھا - جن کے ذریعہ وہ یہاں بطور خلیفہ کام کر رہا ہے - بلکہ واقعات مستقبل کے سامنے پردوں کا نصب کرنا ہی دراصل اس شوق علم کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے - یوں وہ اپنے طور پر غیوب مستقبل کے لیے نقب زنی کرنے اور کھوج لگانے کی سعی کرتا رہتا ہے - اس طرح وہ زمین کے اندر پوشیدہ رازوں کو ڈھونڈتا ہے - وہ سمندر کے سینے کو چیرتا ہے - وہ آسمان کی فضاؤں میں دور تک دوڑتا ہے - وہ اس کائنات کے پوشیدہ رازوں کا انکشاف کرتا ہے - اور انسانوں کے لیے بھلائی کے جو راز ہیں' ان کو وہ دریافت کرتا رہتا ہے - وہ زمین سے مواد اور عناصر کی تحلیل کرتا ہے - اس کی ترکیب اور شکل و صورت میں کیمیاوی عمل کرتا ہے اور زندگی کی انواع و اقسام اور طرز و طریقوں میں تبدیلیاں لاتا ہے - اور اس طرح اس زمین کی تعمیر و ترقی میں نہایت ہی اہم کردار ادا کر رہا ہے اور جن ذمہ داریوں کے ساتھ اللہ نے انسان کو منصب خلافت دیا تھا انہیں پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کر رہا ہے -

صرف انسان ہی کو علوم غیبیہ سے محروم نہیں کیا گیا - زمین و آسمان میں جس قدر مخلوق بھی ہے اسے محروم کیا گیا ہے ' خواہ ملائکہ ہیں یا جن ہیں یا دوسری کوئی مخلوق ہے جو اللہ کے علم میں ہے - ان سب کو علم غیب نہیں دیا گیا اس لیے کہ ان کو اس کی ضرورت ہی نہ تھی - اس لیے تمام غیبی علوم اور واقع ہونے والے حوادث کا علم صرف اللہ کو ہے -

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (۲۷ : ۶۵) "کہو' آسمان اور زمین میں کوئی بھی غیب کا علم نہیں رکھتا' اللہ کے سوا" یہ ایک قطعی نص ہے' اور اس کے ہوتے ہوئے کوئی شخص علم غیب کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ اس سلسلے میں اوہام و خرافات پر یقین کرنے کی کوئی گنجائش رہتی ہے -

غیب کی عمومی نفی کے بعد اب قیام قیامت کی خصوصی نفی کی جاتی ہے - کیونکہ عقیدۂ توحید کے بعد اہل شرک کے ساتھ مسلمانوں کا بڑا نزاع یہی تھا - وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (۲۷ : ۶۵) "اور وہ تو نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے" - یعنی وہ لوگ جن کی پوجا تم کرتے ہو' ان کو تو قیامت کا شعور تک نہیں ہے - جب ان کو قیامت کا شعور ہی نہیں تو علم کیسے ہو گا تو قیام قیامت ان مغیبات میں سے ہے جن کا علم زمین و آسمان میں کسی کو نہیں ہے بلکہ آخرت کے بارے میں ان کا علم ہی بہت محدود ہے -

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ (۲۷ : ۶۶) "بلکہ آخرت کا تو علم ہی ان سے گم ہو گیا ہے" - یہ اپنے حدود میں بہت دور چلا گیا ہے اور لوگوں کا اس تک پہنچنا دور رہ گیا ہے - اور اس کے اور ان کے درمیان پردے حائل ہو گئے ہیں -

بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِّنْهَا (۲۷ : ۶۶) "بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں" - ان لوگوں کو اس قیامت کے آنے کا یقین نہیں ہے - یہ تو دور کی بات ہے کہ ان کو اس کے آنے کے وقت کا کوئی علم ہو یا اس کے وقوع کے بارے میں وہ انتظار کر رہے ہیں -

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا (۲۷ : ۶۶) "بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں"۔ ان لوگوں کو اس قیامت کے آنے کا یقین نہیں ہے۔ یہ تو دور کی بات ہے کہ ان کو اس کے آنے کے وقت کا کوئی علم ہو یا اس کے وقوع کے بارے میں وہ انتظار کر رہے ہیں۔

بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ (۲۷ : ۶۶) "بلکہ یہ اس سے اندھے ہیں"۔ یعنی وہ تو اس کے بارے میں اندھے ہیں۔ قیامت کے حوالے سے ان کو کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ نہ اس کی نوعیت کے بارے میں وہ کچھ یاد کریں گے۔ ان کی یہ دوری پہلی اور دوسری دوری سے بھی زیادہ ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ (۲۷ : ۶۷) "یہ منکر کہتے ہیں کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو چکے ہوں گے تو ہمیں واقعی قبروں سے نکالا جائے گا"۔ کفار کے سامنے یہی عقیدہ تھا کہ جب ہم مر جائیں گے اور قبروں میں ہمارے جسم مٹی ہو جائیں گے اور بکھر جائیں گے۔ جیسا کہ یہ مشاہدہ ہے کہ تمام مردے دفنائے جانے کے کچھ عرصہ بعد اسی طرح ہوتے ہیں۔ شاذونادر ہی جسم محفوظ رہتے ہیں۔ جب ہم بھی ایسے ہو جائیں گے اور ہمارے آباؤ اجداد بھی ایسے ہو جائیں گے تو کیا ہمیں دوبارہ نکالا جائے گا' زندہ کیا جائے گا جبکہ ہمارے اجسام کے ذرے مٹی میں مل چکے ہوں گے۔ یہ تو بڑی مستبعد بات ہے۔ وہ یہ بات کرتے ہیں اور مادہ کے بارے میں ان کا جو تصور ہے وہ ان کے لیے حیات اخروی کے تصور کو مشکل بنا رہا ہے لیکن وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ان کو پہلے بھی پیدا کیا گیا اور اس پیدائش سے قبل وہ کچھ بھی نہ تھے۔ کسی کو پتہ نہ تھا کہ اس کے جسم میں جو خلیے اور جو ذرات ہیں اور جن سے ان کی زندگی کا یہ ہیکل بنا ہوا ہے۔ یہ کہاں کہاں سے جمع ہوئے' یہ زمین کے اطراف اور سمندر کی گہرائیوں میں بکھرے ہوئے تھے اور یا اس کائنات کی فضاؤں میں اڑ رہے تھے۔ زمین میں سے مٹی لی گئی' ہواؤں سے ذرات لیے گئے' پانی کے ذرات کہاں کہاں سے کس کس بادل نے اٹھا کر لائے' اور بعض ذرات تو سورج سے آئے۔ پھر جو بدستور بذریعہ تنفس' نباتات نیز حیوانات کے دودھ اور گوشت' پھر بخارات کے ذریعہ جسم میں داخل ہوتے ہیں' پینے کے ذریعے جو چیزیں جسم کا حصہ بنتی ہیں۔ پھر سورج کی گرمی سے جو جسم اثر لیتا ہے۔ یہ سب متفرق چیزیں جن کی تعداد تو صرف اللہ جانتا ہے۔ یہ سب چیزیں انسانی جسم میں جمع ہو جاتی ہیں اور یہ انسان اس چھوٹے سے خوردبینی انڈے سے یہاں تک پہنچتا ہے' اور یہ انڈا رحم مادر کی دیواروں کے ساتھ متعلق ہوتا ہے اور بڑا ہو کر' مر کر کفن کے اندر یہ سب اجزاء جمع ہوتے ہیں۔ یہ تو ہے اس کی پہلی تخلیق۔ تو اس میں کیا تعجب ہے کہ اس مخلوق کو اللہ قبر سے دوبارہ اٹھا لے۔ لیکن وہ لوگ یہ بات بہرحال کرتے تھے اور اس قسم کے لوگوں میں سے بعض آج بھی موجود ہیں جو ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ وہ یہ باتیں کرتے تھے اور اس کے بعد مزید مزاح اور ناپسندیدگی کے اظہار کے لیے وہ یہ کہتے تھے۔

لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۲۷ : ۶۸)

"یہ خبریں ہم کو بھی دی گئی ہیں اور اس سے قبل ہمارے آباؤ اجداد کو بھی دی گئی ہیں لیکن یہ بس افسانے ہی افسانے ہیں جو اگلے وقتوں سے ہم سنتے چلے آ رہے ہیں"۔

---○○○---

یہ لوگ جانتے تھے کہ ان سے پہلے بھی 'رسولوں نے ان کے آبا کو اسی طرح قیامت سے ڈرایا ہے اور حساب و کتاب اور حشر و نشر کی بات کی ہے ۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے لیے عقیدۂ آخرت بالکل ایک نیا عقیدہ نہ تھا ۔ یہ نہ تھا کہ وہ بعث بعد الموت کے معنی ہی نہ سمجھتے ہوں بلکہ ان کا اعتراض یہ تھا کہ صدیوں سے یہ وعدے کیے جا رہے ہیں ان کا تحقق نہیں ہوا ۔ چنانچہ اس بناپر وہ اس عقیدے کا مذاق اڑاتے تھے ۔ اور کہتے تھے کہ یہ پرانے لوگوں کی کہانیاں ہیں اور حضرت محمدؐ ان کو نقل کرتے چلے آرہے ہیں ۔ یہ لوگ اس بات سے غافل تھے کہ قیام قیامت کے لیے تو ایک وقت مقرر ہے ۔ وہ نہ کسی کی جلد بازی کی وجہ سے جلدی آسکتا ہے اور نہ کسی کی غفلت کی وجہ سے موخر ہو سکتا ہے ۔ یہ تو ایک معلوم اور مقرر وقت پر ہو گا اور اس کا علم زمین و آسمان دونوں کی مخلوقات سے خفیہ رکھا گیا ہے ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے یہی کہا 'جب انہوں نے آپؐ سے قیامت کے بارے میں پوچھا

ما المسئو ل عنها باعلم من السائل ''اس کے بارے میں پوچھے جانے والا پوچھنے والے سے زیادہ علم نہیں رکھتا''۔

یہاں ان لوگوں کو ان لوگوں کی قتل گاہوں کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے 'جو ان سے قبل ہلاک کیے گئے 'جنہوں نے سچائی کا انکار کیا اور قرآن میں یہاں ان کو مجرمین سے تعبیر کیا گیا ہے ۔

قُلْ سِيرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ (۲۷ : ۶۹) ''کہو' ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرمین کا کیا انجام ہو چکا ہے''۔ یہاں 'اس ہدایت 'سیرفی الارض کے ذریعہ ان کی سوچ کے حدود کو وسیع کیا جاتا ہے ۔ کیونکہ انسانیت کی کوئی سوسائٹی بھی شجرۂ انسانیت سے مقطوع نہیں ہوتی ۔ انسانیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو سنن رکھے ہیں وہ سب کے لیے اٹل ہیں ۔ اس سے قبل انسانی سوسائٹیوں کے مجرمین کو جو حالات درپیش ہوئے 'بعد میں آنے والے بھی لازماً ان جیسے حالات ہی سے دوچار ہوں گے ۔ کیونکہ اللہ کے سنن اٹل ہوتے ہیں 'وہ کسی کی رورعایت نہیں کرتے ۔ اور زمین میں چلنے پھرنے سے نفس انسانی کی اطلاعات کا دائرہ بہت ہی وسیع ہو جاتا ہے ۔ انسان کا دماغ روشن ہو جاتا ہے اور سیرفی الارض کے دوران انسان پر ایسے لمحات آتے ہیں کہ انسان کا ضمیر روشن ہو جاتا ہے ۔ قرآن کریم انسانوں کو اس کائنات کے اٹل اصولوں اور سنن کی طرف بار بار متوجہ کرتا ہے ۔ اور انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ ان سنن یا بالفاظ دیگر سلسلہ علت و معلول پر ذرا غور کرو 'اس کی کڑیوں کو دیکھتے چلے جاؤ 'تاکہ تمہاری زندگی انسانیت کی مجموعی زندگی سے وابستہ اور متصل رہے اور تمہاری سوچ کی حدود وسعت اختیار کریں ۔ تمہاری سوچ محدود 'تنگ اور زندگی کے دھارے سے منقطع نہ ہو ۔

ان توجہات کے بعد اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ان لوگوں سے اپنے ہاتھ جھاڑ دیں ۔ ان کو چھوڑ دیں کہ وہ جس انجام سے دوچار ہوتے ہوں ہو جائیں ۔ جس طرح تاریخ میں ان سے قبل بھی ایسے مجرمین ایسے ہی انجام سے دوچار ہوئے ۔ اور یہ لوگ تحریک اسلامی کے خلاف جو مکاریاں کر رہے ہیں ' ' کو کوئی نقصان نہ دے سکیں گی ۔ نیز از روئے ہمدردی ان کے لیے پریشان بھی نہ ہوں کیونکہ آپ نے تبلیغ اور راہنمائی کا حق ادا کر دیا ہے اور ان

کو خوب سمجھا دیا ہے ۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ (۲۷ : ۷۰) "اے نبیؐ ان کے حال پر رنج نہ کرو' اور نہ ان کی چالوں پر دل تنگ ہو"۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر حساس تھے اور آپ کو اپنی قوم کے برے انجام کے بارے میں کس قدر فکرمندی تھی۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ جن اقوام نے تکذیب کی ان کا حشر کیا ہوا۔ اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے' اس وقت ان لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مکاری کے جال بن رکھے تھے۔ اور وہ مسلمانوں' دعوت اسلامی کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینکنا چاہتے تھے اور حضورؐ اس کے بارے میں بہت ہی فکرمند تھے ۔

بعث بعد الموت کے بارے میں ان کے جو خیالات تھے ان کے مزید نمونے یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ دنیا اور آخرت میں ان کو جس برے انجام سے ڈرایا جاتا تھا' وہ اس کے ساتھ مزاح کرتے تھے اور کہتے تھے ۔

وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۲۷ : ۷۱) "وہ کہتے ہیں یہ دھمکی کب پوری ہوگی اگر تم سچے ہو"۔ یہ وہ تب کہتے تھے جب بھی ان کو امم سابقہ کی طرح کے برے انجام سے ڈرایا جاتا تھا' جن کی بستیوں پر سے وہ رات دن گزرتے تھے مثلاً حضرت لوط کی قوم کی بستی سدوم' اور حجر میں ثمود کے آثار اور احقاف کے علاقے میں قوم عاد کے آثار اور قوم سبا کے کھنڈرات جو سیل العرم کے بعد تباہ ہوئے۔ تو یہ لوگ کہتے تھے کہ جن باتوں سے ہمیں ڈراتے ہو' متعین طور پر بتاؤ وہ عذاب کب آئے گا۔ اگر سچے ہو تو بتاؤ کہ وہ کیسا عذاب ہوگا اور کب ہوگا۔

یہاں پھر اس کا جواب بھی ویسے ہی حقارت آمیز انداز میں' نہایت ہی انتصار کے ساتھ دے دیا جاتا ہے۔

قُلْ عَسَى أَن يَكُونَ رَدِفَ لَكُم بَعْضُ الَّذِي تَسْتَعْجِلُونَ (۲۷ : ۷۲) "کہو' کیا عجیب ہے کہ جس عذاب کی تم جلدی مچا رہے ہو اس کا ایک حصہ تمہارے قریب ہی آ لگا ہو"۔ اس طرح اللہ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے دل میں عذاب اور ہلاکت کے تصور سے خوف پیدا کرتے ہیں۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ یہ عذاب تمہارے اسی طرح قریب ہو اور تمہارے ساتھ لگا ہوا ہو جس طرح اونٹ پر سوار شخص کے پیچھے بیٹھا ہوا دوسرا شخص اس کے بالکل قریب ہوتا ہے۔ اور تمہیں اس کا شعور نہ ہو۔ اور اپنی غفلت اور نادانی کی وجہ سے جلدی کر رہے ہو۔ حالانکہ وہ تمہارے پیچھے بیٹھا ہوا ہے اور اچانک تمہیں پکڑ لے گا۔ ردیف کی طرف سے اس طرح اچانک پکڑے جانے سے انسان کا پورا جسم کانپ اٹھتا ہے۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ یہ عذاب تمہیں پکڑ لے۔ اس حال میں کہ تم مزاح کر رہے ہو۔

کون جانتا ہے کہ مستقبل میں اور اگلے لمحے میں کیا ہونے والا ہے۔ کیونکہ مستقبل کا غیب تو مستور ہے۔ ہمارے اور اس کے درمیان پردے حائل ہیں۔ کسی کو کیا معلوم کہ پردوں کے پیچھے کیا ہے۔ بعض اوقات چند قدموں کے فاصلے پر ایک خوفناک صورت حالات ہوتی ہے۔ عقلمند شخص تو ہروقت چوکنا رہتا ہے' ڈرتا ہے اور ہروقت اور ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار رہتا ہے کہ کوئی صورت بھی پیش آ سکتی ہے۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ (۲۷ : ۷۳)

"حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب تو لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے"۔ اور اللہ کا فضل تو ظاہر و

با ہر ہے کہ اللہ لوگوں کو مہلت دیئے جا رہا ہے اور ان سے عذاب کو موخر کر رہا ہے ۔ حالانکہ وہ قصور وار اور گناہ گار ہیں اور گناہوں پر اصرار کر رہے ہیں ۔ یہ اس لیے کہ ان کی اصلاح کی امید ابھی باقی ہے اور عذاب کو موخر کرنا تو اللہ کا فضل ہے ۔ اس کا شکر ادا کرنا چاہئے لیکن اکثر لوگ شکر ادا کرنے کے بجائے الٹا مزاح کرتے ہیں ۔ اور اپنی گمراہی میں بغیر سوچے سمجھے بڑھے چلے جا رہے ہیں ۔

وَ انَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ (۲۷: ۷۴) "بلاشبہ تیرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں" ۔ اللہ ان پر عذاب نہیں لاتا اور اسے موخر کرتا چلا جاتا ہے ۔ اس کے باوجود کہ وہ خوب جانتا ہے کہ اپنے سینوں میں یہ لوگ کیا چھپائے ہوئے ہیں اور کیا وہ ظاہر کر رہے ہیں ۔

اس سبق کا خاتمہ اس بات پر ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی کوئی شے اللہ سے غائب اور پوشیدہ نہیں ہے ۔

وَ مَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۲۷: ۷۵) "آسمان اور زمین کی کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں ہے جو ایک واضح کتاب میں لکھی ہوئی نہ ہو" ۔ فکر و خیال اب زمین و آسمان کے وسیع میدان میں چلا جاتا ہے ۔ زمین و آسمان کے اندر چھپے ہوئے بھید تو بے شمار ہیں ۔ بے شمار راز' بے شمار قوتیں' بے شمار عجوبے' سب کے سب اللہ کے علم و ناموس کے پابند ۔ کوئی چیز بھی علم الہی سے چھپی ہوئی نہیں ہے ۔ اور نہ وہ بنسبت علم الہی غائب ہے ۔ یہ حاضر و غائب تو انسانی علم کی تقسیم ہے ۔ اس سورت کی تذکیر تو علم پر ہے ۔ پوری سورت میں علم کی طرف اشارات ہیں اور اس سبق کے اختتام پر یہ آخری اشارہ ہے ۔

اللہ کے علم مطلق کے حوالے سے یہاں علم الہی نے کس طرح قرآن کریم میں فیصلہ کن اور دو ٹوک باتیں سامنے لا کر بنی اسرائیل کے وہ مسائل حل کر دیئے جس میں وہ صدیوں سے مختلف فیہ تھے ۔ یہ قرآن اللہ کے علم کا ایک حصہ اور نمونہ ہے ۔ اور اللہ کے فضل میں سے ایک فضل ہے ۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک گونہ تسلی ہے کہ آپؐ ان لوگوں کو اللہ کے اس آخری فیصلے کی طرف بلاتے رہیں ۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۷۶﴾ وَ اِنَّهٗ لَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۸﴾ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿۷۹﴾ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۸۰﴾ وَ مَآ اَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾

"یہ واقعہ ہے کہ یہ قرآن بنی اسرائیل کو اکثر ان باتوں کی حقیقت بتاتا ہے جن میں وہ اختلاف رکھتے ہیں اور یہ ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔ یقیناً (اسی طرح) تیرا رب ان لوگوں کے درمیان بھی اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا اور وہ زبردست اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ پس اے نبی ﷺ اللہ پر بھروسہ کرو' یقیناً تم صریح حق پر ہو۔ تم مردوں کو نہیں سنا سکتے' نہ ان بہروں تک اپنی پکار پہنچا سکتے ہو' جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں' اور نہ اندھوں کو راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا سکتے ہو۔ تم تو اپنی بات انہی لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر فرماں بردار بن جاتے ہیں"۔

نصاریٰ کے درمیان حضرت عیسیٰ اور آپ کی والدہ کے بارے میں شدید اختلاف رائے تھا۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ حضرت عیسیٰ محض ایک انسان تھے۔ بعض کہتے تھے اللہ نے ان کے بارے میں باپ' بیٹے اور روح القدس کے جو الفاظ استعمال کیے ہیں دراصل وہ اللہ نے ذات باری کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں۔ تو اس گروہ کے نزدیک اللہ تین اقانیم سے مرکب ہے۔ اب' ابن اور روح القدس۔ ابن چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے تو اللہ' جو صورت رب میں تھے' وہ روح القدس کی صورت میں اترے اور حضرت مریم میں ایک انسان کی شکل اختیار کر گئے۔ اور یہ اللہ پھر مریم سے بصورت انسان پیدا ہوئے۔ ایک جماعت نے کہا کہ ابن ازلی نہیں ہے' جس طرح باپ ازلی ہے۔ ہاں وہ عالم سے قبل پیدا کر دہ ہے۔ لہٰذا وہ رب سے کم درجے کا ہے اور رب کے تابع فرمان ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ روح القدس اقنوم نہیں ہے اور نیقیائی مجلس منعقدہ ۳۲۵ نے یہ فیصلہ کیا اور قسطنطنیہ کی مجلس ۳۸۱ نے اس کی توثیق کی کہ ابن اور روح القدس باپ کے برابر ہیں اور یہ بھی لاہوت کی وحدت کا حصہ ہیں۔ یہ بیٹے بھی ازل ہی میں پیدا ہوئے تھے جبکہ روح القدس رب سے نکلے ہیں۔ اور طیطلہ کی مجلس منعقدہ ۵۸۹ نے یہ فیصلہ کیا کہ روح القدس ابن سے نکلا ہے۔ اس نکتے پر مشرقی اور مغربی کنیسہ کے درمیان افتراق پیدا ہو گیا جو آج تک نکتہ اختلاف ہے۔ قرآن کریم جب نازل ہوا تو اس نے ایک فیصلہ کن بات کر دی کہ وہ ایک کلمہ ہے جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا اور اللہ کی طرف سے روح ہے۔ اور وہ بشر ہیں۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۴۳:۵۹) "نہیں ہے وہ مگر ایک بندہ جس پر ہم نے انعام کیا اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ایک مثال بنا دیا"۔ یہ تھی وہ فیصلہ کن بات جس میں ان کے درمیان اختلاف رائے تھا۔

اسی طرح بنی اسرائیل کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سولی پر چڑھائے جانے کے مسئلے میں بھی اختلاف ہوا۔ بعض کا عقیدہ یہ تھا کہ آپ کو سولی پر چڑھایا گیا۔ آپ فوت ہو گئے اور دفن کر دیے گئے اور تین دنوں کے بعد آپ اپنی قبر سے نکلے اور آسمانوں کی طرف اٹھا لیے گئے۔ بعض کا عقیدہ یہ تھا کہ آپ کے حواریوں میں سے ایک شخص یہوذا کو حضرت مسیح کے مشابہ بنا دیا گیا اور اس کو سولی دے دی گئی اس لیے کہ اس شخص نے حضرت مسیح کے ساتھ خیانت کی تھی اور حکومت کو آپ کی نشاندہی کی تھی اور آپ گرفتار ہو گئے تھے۔ بعض کا عقیدہ یہ تھا کہ آپ کے ایک حواری شمعون کو آپ کا مشابہ بنا دیا گیا اور وہ گرفتار ہوئے۔ قرآن کریم نے اصل بات بتا دی وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (۴:۱۵۷) "انہوں نے اسے قتل نہیں کیا اور نہ سولی پر چڑھایا' لیکن ان کو شبہ میں ڈال دیا گیا"۔ اور دوسری

جگہ قرآن مجید نے فرمایا:

یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُكَ (۳:۵۵)"اے عیسیٰ میں تمہیں واپس لے لوں گا اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تمہیں پاک کرنے والا ہوں"۔ یہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں فیصلہ کن بات تھی۔

اس سے قبل یہودیوں نے بھی تورات کی شریعت کو بدل دیا تھا۔ کئی احکام میں تحریفات کر دی گئی تھیں۔ قرآن مجید آیا تو اصل شریعت بتا دی۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ "تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان' آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے بدلے ناک 'کان کے بدلے کان' دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ"۔

قرآن کریم نے بنی اسرائیل کی تاریخ اور ان کے انبیاء کے بارے میں حقائق بتائے۔ اور ان حقائق میں سے ان قصے اور کہانیوں اور افسانوں کو علیحدہ کر کے صاف کر دیا جو ان حقائق کے ساتھ انہوں نے ناحق ملا دیئے تھے۔ یہ افسانے ایسے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی نبی بھی معصوم اور پاک ہو کر نہیں نکل سکتا تھا۔ ان کے افسانوں کے چند نمونے مشہور ہیں۔ انہوں نے ابراہیم علیہ السلام پر الزام لگایا کہ انہوں نے ابومالک شاہ فلسطین اور فرعون شاہ مصر کے سامنے اپنی بیوی کو بہن کہہ کر پیش کیا۔ اور ان کے کہنے کے مطابق حضرت ابراہیم ان کی نظروں میں مقام بلند حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور حضرت یعقوبؑ جن کا نام اسرائیل تھا' انہوں نے خود اپنے باپ اسحاق سے 'حضرت ابراہیم کی برکات حیلہ سازی' جھوٹ اور چوری کے طور پر حاصل کیں۔ جبکہ یہ تبرکات ان کے بڑے بھائی عیسو کی ملکیت تھیں۔ اور حضرت لوط کے بارے میں ان کی روایات یہ ہیں کہ ان کی دو بیٹیوں نے ان کو شراب میں مدہوش کر کے ان کے ساتھ ہم بستری کی تاکہ اس طرح ان کے بطن سے نرینہ اولاد پیدا ہو اور ان کی میراث اوروں کے پاس نہ چلی جائے اور جس طرح ان لڑکیوں نے چاہا ایسا ہی ہوا۔ اور داؤد نے اپنے محل میں ایک خوبصورت عورت کو دیکھا اور معلوم ہوا کہ وہ ان کے فوجی کی بیوی ہے۔ پھر اس فوجی کو انہوں نے ایک ہلاکت آفرین مہم میں بھیجا تاکہ وہ بیوی کو حاصل کر سکیں۔ اور سلیمان بعل کی عبادت کی طرف مائل ہو گئے۔ محض اپنی عورتوں میں سے ایک عورت کو خوش کرنے کے لیے 'کیونکہ ان کو اس کے ساتھ محبت تھی اور وہ اس کے مطالبے کو رد نہ کر سکتے تھے۔ یہ تھے ان کے الزامات اپنے پیغمبروں پر۔

اور جب قرآن کریم نازل ہوا تو اللہ نے تمام پیغمبروں کی صفائی بیان کی اور ان اوہام اور افسانوں کو پیغمبروں کی سیرتوں سے نکال دیا۔ کیونکہ یہ اوہام یہود و نصاریٰ نے خود اپنی کتابوں کے اندر داخل کر دیئے تھے۔ خصوصاً قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی ذات کے ساتھ منسوب تمام غلط باتوں کی نفی کی اور وہ صحیح تعلیمات بیان کر دیں جو اللہ کی طرف سے تھیں۔ اس مفہوم میں اس قرآن کو سابقہ کتب کے لیے مہیمن کہا گیا ہے کہ وہ

سابقہ کتب کے اختلافات کا فیصلہ کرتا ہے اور تمام اختلافی اور جدلیاتی ملکوتی مسائل میں فیصلہ کن بات کرتا ہے۔

وَ اِنَّهٗ لَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۲۷: ۷۷) "اور یہ ہدایت و رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے"۔ یہ وہ ہدایت ہے جو اہل ایمان کو ضلالت اور اختلاف سے بچاتا ہے۔ ان کو ایک منہاج حیات دیتا ہے۔ زندگی کی راہ میں ان کے ساتھ معاونت کرتا ہے اور ان کو ایسی تعلیمات اور نظریات دیتا ہے جو اس پوری کائنات میں موجود سنن الہیہ سے ہم آہنگ ہیں۔ اور یہ قرآن ہدایت کے ساتھ رحمت بھی ہے۔ انسانوں کو شک' بے چینی اور پریشانی اور بے یقینی سے نجات دیتا ہے۔ اور انسان کو ایسے کچے نظریات سے بچاتا ہے جو آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ پائے چوبیں رکھتے ہیں اور اپنے حال پر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ اس کی تعلیمات انسان کو مطمئن کر کے اللہ کے جوار رحمت اور بارگاہ سکون تک پہنچاتی ہیں۔ اس طرح انسان اپنے ماحول' اپنی سوسائٹی اور خود اپنے افکار کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور آشتی کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور آخرت میں اللہ کی رضامندی اور عظیم ثواب کے مستحق ہوتے ہیں۔

انسانی نفس کی تربیت اور از سرنو قوانین فطرت کے مطابق اس کی تشکیل و تصفیل کے معاملے میں قرآنی طریق کار ایک منفرد طریق کار ہے۔ اس طریق کار کے مطابق انسان اپنی زندگی ان قوانین فطرت کے مطابق گزارتا ہے جو خود اس کائنات میں بھی جاری و ساری ہیں اور اس طرح انسان کی زندگی نہایت سکون کے ساتھ 'فطری انداز میں گزرتی ہے۔ اس میں کوئی تکلف اور بناوٹ نہیں ہوتی۔ اسلامی منہاج تربیت کے نتیجے میں انسان اپنی زندگی کی گہرائیوں تک میں اطمینان محسوس کرتا ہے اور یہ بہت بڑی دولت ہوتی ہے۔ اور یہ اطمینان اسے اس وجہ سے حاصل ہوتا ہے کہ اسلامی نظام تربیت کے مطابق انسان کی زندگی قوانین فطرت کے ساتھ متصادم نہیں ہوتی اور نہ انسان قوانین فطرت اور ان کے مطابق چلنے والی اس کائنات سے متصادم ہوتا ہے' نہ انسانی اخلاقیات ان قوانین فطرت سے متصادم ہوتی ہیں۔ بشرطیکہ انسان قوانین فطرت اور نوامیس کو اچھی طرح معلوم کر سکے اور وہ مقامات معلوم کر لے جہاں انسانی شخصیت اور اس کائنات کے درمیان باہم اتصال ہوتا ہے۔ اور انسان اس نتیجے تک پہنچ جائے کہ انسانی فطرت اور کائناتی فطرت اور اسلامی نظام زندگی کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ وہ باہم متناسب اور ہم آہنگ ہیں۔ یہ ہے وہ عظیم سلامتی جو انسانی شخصیت' اور انسان کے اردگرد پھیلی ہوئی اس عظیم کائنات کے درمیان قائم ہوتی ہے اور اس سلامتی کے نتیجے میں انسانی سوسائٹی نہایت ہی پرسکون زندگی بسر کرتی ہے۔ اور یہ ہے وہ رحمت جس کی طرف قرآن کریم اشارہ کرتا ہے۔ یہ رحمت الہیہ کا وسیع تر مفہوم ہے۔

ان اشارات کے بعد کہ قرآن کریم بنی اسرائیل کے بیشتر نظریاتی مسائل کو حل کرتا ہے' ان کے اختلافات کو دور کرتا ہے اور اہل ایمان کو ایک فطری نظام زندگی دے کر ان کو عظیم سکون اور سلامتی عطا کرتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دیتا ہے کہ آپ کی قوم آپ کے ساتھ ناحق مجادلہ کر رہی ہے۔ اس کا فیصلہ بھی عنقریب اللہ کر دے گا۔ ایسا فیصلہ جسے کوئی رد نہ کر سکے گا۔ کیونکہ اللہ کے فیصلے حقائق اور صحیح علم پر مبنی ہوتے ہیں۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ (۲۷: ۷۹) "پس اے نبیؐ اللہ پر بھروسہ رکھو یقیناً تم صریح حق پر ہو"۔ اللہ تعالیٰ نے حق کی نصرت کرنا' حق کو غالب کرنا' اپنے اوپر اسی طرح لازم قرار دیا ہے جس

طرح اس کائنات میں اللہ کے دوسرے چلنے والے قوانین لازمی اور اٹل ہیں۔ یہ قوانین رکتے نہیں' اسی طرح حق بھی غالب آتا ہے لیکن اللہ کی بعض پوشیدہ حکمتوں کی وجہ سے کبھی کبھار یہ غلبہ دیر سے آتا ہے اور ان حکمتوں کو اللہ ہی جانتا ہے۔ کچھ مقاصد ہوتے جن کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے لیکن یہ سنت پوری ہو کر رہتی ہیں اور آخر کار حق کو غلبہ نصیب ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اس کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ انسان کا ایمان اس وقت تک پورا اور مکمل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس سنت کے اٹل ہونے پر ایمان نہ لائے۔ مطلب یہ ہے کہ حق کی کامیابی کے لیے اللہ کے ہاں ایک وقت مقرر ہوتا ہے اور اس سے قبل یہ کامیابی نہیں آسکتی۔ انسان اگر جلدی کرتے ہیں تو یہ اس کی غلطی ہوگی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی طرف سے بڑی مشکلات درپیش تھیں' بات بات پر وہ جھگڑتے تھے' کٹ حجتی اور ہٹ دھرمی کرتے تھے۔ محض عناد کی وجہ سے بادی النظر چیزوں کو بھی نہ مانتے تھے۔ حضورؐ کی جدوجہد اور نہایت ہی واضح بیان و تبلیغ کے بعد بھی وہ کفر پر اصرار کر رہے تھے۔ قرآن کریم کے بار بار کے خطاب کو نظر انداز کر رہے تھے۔ ان سب باتوں پر آپ کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپؐ نے تو تبلیغ کا حق ادا کر دیا ہے' کوئی قصور نہیں کیا ہے' لیکن بات کو وہ لوگ سنتے ہیں جو زندہ ہوں اور ان کے کانوں کے پردے حساس ہوں۔ مردے تو کبھی سنا نہیں کرتے۔ مردوں کا دماغ مرچکا ہوتا ہے اور وہ غور و فکر سے عاری ہو جاتے ہیں۔ اس لیے مردے نہ ایمان لاتے ہیں اور نہ سنتے ہیں۔ بس آپ کی قوم کے دل و دماغ مرچکے ہیں۔ للذا ان کو سنانا اب نہ سنانے کے برابر ہو گیا ہے۔ ہدایت پر آنے کی ان کے سامنے کوئی سبیل باقی نہیں ہے۔ اب چھوڑ دیں ان کو اپنی گمراہی اور سرکشی اور بے راہ روی پر۔

إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ (۸۰) وَمَا أَنتَ بِهَادِي الْعُمْيِ عَن ضَلَالَتِهِمْ ۖ إِن تُسْمِعُ إِلَّا مَن يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُم مُّسْلِمُونَ (۸۱) (۲۷: ۸۰ ـ ۸۱) "تم مردوں کو نہیں سنا سکتے' نہ ان بہروں تک اپنی پکار پہنچا سکتے ہو' جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں' اور نہ اندھوں کو راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا سکتے ہو۔ تم تو اپنی بات انہی لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر فرماں بردار بن جاتے ہیں"۔

قرآن کریم نے نہایت ہی عجیب انداز میں ان لوگوں کی نظریاتی اور نفسیاتی حالت کی تصویر کشی کی ہے۔ چنانچہ غیر محسوس معانی کو محسوس شکل دے دی ہے۔ قلبی جمود' روح کی مردنی' کند ذہنی اور شعور کی گراوٹ کو یوں بیان کیا ہے کہ گویا یہ لوگ مردے ہیں اور بہرے ہیں اور رسول ان کو پکار رہا ہے۔ یہ نہیں سنتے' نہ جواب دیتے ہیں۔ کیونکہ مردے نہ سنتے ہیں' نہ ان کو شعور ہوتا ہے اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔ ایک دوسری محسوس صورت یوں ہے کہ ایک شخص بہرا ہے۔ بالکل نہیں سنتا اور پکار والے کی طرف اس کا رخ بھی نہیں ہے۔ بلکہ وہ مخالف سمت پر جا رہا ہے۔ ایسے شخص کو لاکھ پکارو وہ نہ سنے گا۔ کبھی قرآن ان کو اس شکل میں لاتا ہے جس طرح اندھا ہوتا ہے۔ ایک اندھا شخص راہ راست پر کیسے جا سکتا ہے۔ جب اسے اگلے قدم پر کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ ان آیات میں ان تمام صورتوں کو نہایت ہی مجسم و مشخص صورت میں پیش کر دیا گیا ہے۔

اب ان مردوں ' بہروں اور اندھوں کے مقابلے میں اہل ایمان ہیں ـ یہ زندہ ہیں ' یہ سنتے ہیں ' یہ دیکھتے ہیں ـ

اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲۷ : ۸۱) ”آپ اپنی بات انہی کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر فرماں بردار بن جاتے ہیں“ ـ یعنی جن لوگوں کے اندر زندگی ' قوت سامعہ اور قوت باصرہ ہے ـ آپ انہی کو سنا سکتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں کو سنائیں ـ یہ علامات زندگی ہیں اور شعور زندہ لوگوں میں ہوتا ہے ـ سننے والے اور دیکھنے والے ہی دعوت کو قبول کر سکتے ہیں اور یہ اہل ایمان ہی ہیں جن کے اندر حیات ' سماعت اور بصارت پائی جاتی ہے ـ ان لوگوں پر رسول اللہؐ نے کام کیا ـ انہوں نے دعوت کو قبول کیا اور سر تسلیم خم کر دیا ـ

اسلام بہت ہی سادہ اور قریب الفہم دین ہے ـ فطرت سلیم کے بہت ہی قریب ہے ـ قلب سلیم اور فطرت سلیم دعوت اسلامی کو پاتے ہی قبول کرتے ہیں اور سر تسلیم خم کر دیتے ہیں ـ وہ پھر قیل و قال اور جدل و جدال میں نہیں پڑتے ـ یہی تصویر ہے اہل ایمان کی اور ایسے ہی لوگوں کو دعوت دینا چاہئے ـ ایسے لوگ دعوت کو سنتے ہی اس کی طرف لپکتے ہیں اور فوراً ایمان لاتے ہیں ـ مردوں کو اپنی جگہ پر چھوڑ کر داعی کو ایسے لوگوں تک پہنچنا چاہئے جو قبولیت کے لیے تیار ہوں ـ

اب علامات قیامت کے موضوع پر اور قیامت کے بعض مناظر کی طرف بات نکلتی ہے ـ اور اس کے بعد اس سورت پر آخری تبصرہ ہو گا ـ ایک ایسا دابۃ الارض جو ان لوگوں کے ساتھ ہمکلام ہو گا ' جو اللہ کی تکوینی آیات کو نہیں مانتے ـ اس کے بعد حشر و نشر کا منظر جہاں یہ تکذیب کرنے والے اور جدل و جدال کرنے والے نہایت ہی خاموشی کے ساتھ چپ چاپ کھڑے ہوں گے ـ پھر یہاں دنیا کی آیات و نشانات مثلاً گردش لیل و نہار کے مناظر کی طرف بھی انسان کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ آیا ان سے بڑا معجزہ بھی کوئی ہو سکتا ہے ـ لیکن لوگ ان سے غافل ہیں ـ پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ جب صور پھونکا جائے گا تو یہ لوگ عظیم جزع و فزع میں مبتلا ہوں گے اور چیخ و پکار کریں گے مگر بے فائدہ ـ جب پہاڑ چل پڑیں گے اور یہ فضائے کائنات میں بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے ـ پھر بتایا جاتا ہے کہ کچھ لوگ اس جزع و فزع اور خوف و ہراس سے متاثر نہ ہوں گے اور بالکل مطمئن کھڑے ہوں گے اور کچھ دوسرے نہایت ہی دہشت زدہ سرنگوں ہوں گے ـ اور اسی حالت میں جہنم کے اندر گرا دیئے جائیں گے ـ

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ ٦
تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ۝ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ ۱۶ع
اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْ ۲
قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ وَوَقَعَ
الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ۝ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ
لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ وَيَوْمَ

يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ
اللَّهُ ۚ وَكُلٌّ أَتَوْهُ دَاخِرِينَ ﴿٨٧﴾ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ
السَّحَابِ ۚ صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ إِنَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ ﴿٨٨﴾ مَنْ
جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِنْهَا ۚ وَهُمْ مِنْ فَزَعٍ يَوْمَئِذٍ آمِنُونَ ﴿٨٩﴾ وَمَنْ
جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ ۖ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٩٠﴾

"اور جب ہماری بات پوری ہونے کا وقت ان پر آپہنچے گا تو ہم ان کے لیے ایک جانور زمین سے نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے' اور ذرا تصور کرو اس دن کا جب ہم ہر امت میں سے ایک فوج کی فوج ان لوگوں کی گھیر لائیں گے جو ہماری آیات کو جھٹلایا کرتے تھے' پھر ان کو (ان کی اقسام کے لحاظ سے درجہ بدرجہ) مرتب کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب سب آجائیں گے' تو (ان کا رب ان سے) پوچھے گا کہ "تم نے میری آیات کو جھٹلا دیا حالانکہ تم نے ان کا علمی احاطہ نہ کیا تھا؟ اگر یہ نہیں تو اور تم کیا کر رہے تھے؟" اور ان کے ظلم کی وجہ سے عذاب کا وعدہ ان پر پورا ہو جائے گا' تب وہ کچھ بھی نہ بول سکیں گے۔ کیا ان کو سجھائی نہ دیتا تھا کہ ہم نے رات ان کے لیے سکون حاصل کرنے کو بنائی تھی اور دن کو روشن کیا تھا؟ اس میں بہت نشانیاں تھیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے تھے۔ اور کیا گزرے گی اس روز جب کہ صور پھونکا جائے گا اور ہول کھا جائیں گے وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں --- سوائے ان لوگوں کے جنہیں اللہ اس ہول سے بچانا چاہے گا --- اور سب کان دبائے اس کے حضور حاضر ہو جائیں گے۔ آج تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوب جمے ہوئے ہیں' مگر اس وقت یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے' یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہو گا جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تم لوگ کیا کرتے ہو۔ جو شخص بھلائی لے کر آئے گا اسے اس سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا اور ایسے لوگ اس دن کے ہول سے محفوظ ہوں گے' اور جو برائی لیے ہوئے آئے گا' ایسے سب لوگ اوندھے منہ آگ میں پھینکے جائیں گے۔ کیا تم لوگ اس کے سوا کوئی اور جزا پا سکتے ہو کہ جیسا کرو ویسا بھرو؟""

زمین سے جانور نکالنے کا ذکر بعض احادیث میں آتا ہے۔ لیکن ان صحیح روایات میں اس جانور کی تفصیلات و صفات نہیں ہیں۔ جن روایات میں اس جانور کی کچھ صفات بیان ہوئی ہیں۔ وہ حد صحت تک پہنچی ہوئی نہیں ہیں' لہٰذا ہم یہاں ان صفات سے صرف نظر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ کسی جانور کا طول اگر ساٹھ گز ہو یا اس کا روئیں والا ہونا' یا داڑھی والا ہونا' یا اس کا سر بیل جیسا ہونا' یا اس کی آنکھیں خنزیر جیسی ہونا' یا اس کے کان ہاتھی جیسے ہونا یا اس کے سینگ بارہ سنگھے یا اس کی گردن آہو کی طرح ہونا اور اس کا سینہ شیر کی طرح ہونا اور اس کا رنگ چیتے کی طرح ہونا اور اس کے دونوں پہلو بلی کی طرح ہونا اور اس کی دم دنبے کی طرح ہونا' اس کے پاؤں اونٹ کی طرح ہونا اور پروں اور کھروں والا ہونا کوئی اہم بات نہیں ہے۔ یہ وہ اوصاف ہیں جن میں مفسرین پریشان ہوئے۔

بس ہمیں چاہئے کہ قرآنی نص اور صحیح احادیث پر اکتفاء کریں اور یہ عقیدہ رکھیں کہ علامات قیامت میں سے ایک یہ ہے کہ اس قسم کا جانور نکلے گا اور یہ اس وقت ہو گا جب توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ اس وقت جو لوگ ہوں گے ان پر فیصلہ اٹل ہو جائے گا اور اب ان کے لیے توبہ کرنے کا کوئی موقعہ نہ ہو گا۔ بس اب جو لوگ جس حالت اور جس عقیدے پر ہوں گے ان کے بارے میں فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اس وقت یہ جانور نکلے گا۔ یہ ان کے ساتھ بات کرے گا جبکہ عموماً جانور بات نہیں کرتے یا ہم لوگ ان کی باتوں کو نہیں سمجھتے۔ لیکن آج سب لوگ اس جانور کی بات سمجھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ یہ وہ معجزہ ہے جسے قیامت سے قبل آنا تھا۔ اس سے قبل وہ آیات الہیہ پر ایمان نہ لاتے تھے۔ نہ ان کی تصدیق کرتے تھے اور نہ قیامت کی تصدیق کرتے تھے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ سورت نمل میں ایسے مشاہدات و عجائبات کا ذکر ہے مثلاً حشرات الارض کی آپس میں گفتگو' طیور کی گفتگو' جنوں کی گفتگو' اور سلیمان علیہ السلام کا ان کی گفتگو سمجھنا۔ اسی ضمن میں دابۃ الارض اور لوگوں کے ساتھ اس کی گفتگو' مضمون کلام کی ہم آہنگی کا اظہار ہے۔ اس طرح قرآن کریم ہر سورت میں مناظر' مثالیں اور مضامین و مفاہیم و معانی بھی باہم متناسب اور ہم آہنگ لے کر آتا ہے۔ (دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی)

اب علامت قیامت دَآبَّۃَ الْاَرْضِ کے بیان کے بعد' بات خود مناظر قیامت میں داخل ہوتی ہے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ (۲۷ : ۸۳)

"اور ذرا تصور کرو اس دن کا جب ہم ہر امت میں سے ایک فوج کی فوج ان لوگوں کی گھیر لائیں گے جو ہماری آیات کو جھٹلایا کرتے تھے پھر ان کو مرتب کیا جائے گا"۔ تمام لوگوں کو اٹھایا جائے گا۔ اللہ کی مرضی یوں اس لیے ہوئی کہ وہ مکذبین کے موقف کو واضح کر دے۔ یُوْزَعُوْنَ کے معنی ہیں کہ ان سب کو ایک نظم کے ساتھ چلایا جائے گا' ان کا اپنا کوئی اختیار و ارادہ نہ ہو گا اور نہ وہ اپنی مرضی سے کسی طرح جا سکیں گے۔

حَتّٰى إِذَا جَآءُوْ قَالَ أَكَذَّبْتُمْ بِآيَاتِي وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا أَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ

(۲۷ : ۸۴) "یہاں تک کہ جب سب آ جائیں گے تو وہ پوچھے گا: تم نے میری آیات کو جھٹلا دیا حالانکہ تم نے ان کا علمی احاطہ نہ کیا تھا؟ اگر یہ نہیں تو اور تم کیا کر رہے تھے؟" پہلا سوال تو ان کو شرمندہ کرنے اور ملامت کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ بات تو معلوم و معروف تھی کہ انہوں نے تکذیب کی تھی۔ رہا دوسرا سوال تو وہ ان کی زندگی پر ایک بھرپور طنز ہے۔ اور اس انداز خطاب کے نظائر ہر زبان میں موجود ہوتے ہیں۔ کیا تم نے تکذیب کی یا تم کیا کرتے تھے؟ کیونکہ بظاہر تمہاری زندگی کا کوئی مصرف نظر نہیں آتا۔ یعنی تکذیب کے علاوہ تمہاری زندگی کا اور تو کوئی عمل معلوم نہیں ہے جبکہ تمہیں تکذیب نہ کرنا چاہئے تھی۔ ایسے سوالات کا جواب ظاہر ہوتا ہے اس لیے جواب نہیں دیا جاتا اور مخاطب خاموش رہتا ہے۔ گویا اس سوال ہی کی وجہ سے مخاطب گنگ ہو جاتا ہے اور اس سے کوئی جواب بن نہیں پاتا۔

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوا فَهُمْ لَا يَنْطِقُونَ (۲۷ : ۸۵) "اور ان کے ظلم کی وجہ سے عذاب کا وعدہ ان پر پورا ہو جائے گا تب وہ کچھ بھی بول نہ سکیں گے"۔ یعنی دنیا میں ظلم اور شرک کرنے کی وجہ سے ان

پر فیصلہ برحق ہو گیا اور اب وہ بیکار' لاجواب اور خاموش کھڑے ہیں اور یہ اس وقت ہو گا جب دابۃ الارض بات کرے گا اور لوگ بات نہ کر سکیں گے ۔ قرآن کے معجزاتی انداز کا یہ ایک پہلو ہے کہ وہ کلام کے اندر ایک حسین معنوی تقابل پیدا کرتا ہے کہ جانور بات کر رہا ہے' اس کے منہ میں زبان ہے اور یہ انسان ہو کر بھی لاکلام ہیں ۔ پھر یہاں مشاہد دنیا اور مشاہد قیامت کے درمیان بھی ایک امتزاج اور تقابل ہے ۔ کبھی دنیا کا منظر سامنے آتا ہے اور کبھی آخرت کا کیونکہ خروج دابہ دنیا کے آخری ایام میں ہو گا ۔ اور یوں فضا میں گہرا تاثر قائم ہو جاتا ہے ۔

یہاں پہلے قیامت کا منظر ہے کہ مکذبین وہاں مبہوت اور لاجواب کھڑے ہیں ۔ پھر بات دنیا کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور ان کے وجدان اور شعور کو بیدار کیا جاتا ہے اور دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ذرا اس نظام کائنات پر غور تو کریں کہ اللہ العالمین کس قدر عظیم قدرت والا ہے کہ تمہارے لیے وہ تمام اسباب حیات مہیا کرتا ہے ۔ تمہارے لیے دنیا میں راحت اور آرام کے اسباب مہیا کرتا ہے ۔ اس نے پوری کائنات کو اس طرح سازگار بنایا ہے کہ اس کے اندر تمہاری زندگی نہایت خوش و خرم گزر رہی ہے ۔ یہ کائنات اور اس کی قوتیں ممد حیات ہیں 'مضر حیات نہیں ہیں ۔ وہ حیات انسانی کے لیے معاون ہیں ۔ اس کے ساتھ برسرپیکار نہیں ہیں ۔

اَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّیْلَ لِیَسْکُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۲۷ : ۸۶) "کیا ان کو سجھائی نہ دیتا تھا کہ ہم نے رات ان کے لیے سکون حاصل کرنے کو بنائی تھی اور دن کو روشن کیا تھا؟ اس میں بہت نشانیاں تھیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے تھے" ۔ رات کا منظر بالکل پرسکون اور خاموش ہے اور دن روشن اور گویا ہے ۔ اور یہ منظر اس قابل ہیں کہ انسان کے اندر ایک ایسا شعور اور وجدان پیدا کریں جو اسے اللہ سے ملا دے ۔ جو رات اور دن کو گردش میں لانے والا ہے ۔ رات اور دن کا منظر تو دراصل دو کائناتی شواہد ہیں اور ان لوگوں کے لیے کافی ہیں جو ایمان لانا چاہیں لیکن وہ ایمان نہیں لاتے ۔

اگر رات نہ ہوتی تو تمام زمانہ دن پر مشتمل ہوتا اور اس کرۂ ارض پر حیات ممکن نہ ہوتی اور اسی طرح اگر مسلسل رات ہوتی تو بھی زندگی ممکن نہ ہوتی بلکہ اگر رات اور دن اپنے موجودہ وقت سے دس گنا بھی طویل ہوتے تب بھی اس کرۂ ارض پر زندگی محال ہو جاتی ۔ سورج تمام نباتات کو جلا ڈالتا ۔ اور رات تمام چیزوں کو منجمد کر کے رکھ دیتی ۔ لہٰذا گردش لیل و نہار بھی انسانوں کے لیے ذریعہ حیات ہے لیکن لوگ ہیں کہ ایمان نہیں لاتے ۔

اب گردش لیل و نہار کے ان دونوں دلائل و معجزات کے منظر سے بات چشم زدن میں قیامت کے مناظر کی طرف چلی جاتی ہے ۔ ایک لمحہ پہلے انسان اس کرۂ ارض پر خوش و خرم زندگی بسر کر رہے تھے کہ صور پھونک دیا گیا ۔ زمین و آسمانوں کے درمیان ایک بھونچال سا آگیا ۔ تمام مخلوقات الا ماشاء اللہ خوفزدہ ہو گئی ۔ پہاڑ اپنی جگہ سے چلنے لگے' حالانکہ وہ سکون و قرار کی علامت تھے ۔ پھر اس دن لوگوں کے انجام سامنے آگئے ۔ کسی کا انجام امن و عافیت ہوا اور کسی کا جزع و فزع اور اوندھے منہ آگ میں گرائے جانے تک پہنچا ۔

وَیَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ

وَكُلٌّ أَتَوْهُ دَاخِرِينَ (۸۷) وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ إِنَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ (۸۸) مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِنْهَا وَهُمْ مِنْ فَزَعٍ يَوْمَئِذٍ آمِنُونَ (۸۹) وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۹۰) (۲۷ : ۸۷ ـ ۹۰) ''اور کیا گزرے گی اس روز جب کہ صور پھونکا جائے گا اور ہول کھا جائیں گے وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں --- سوائے ان لوگوں کے جنہیں اللہ اس ہول سے بچانا چاہے گا --- اور سب کان دبائے اس کے حضور حاضر ہو جائیں گے ۔ آج تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوب جمے ہوئے ہیں 'مگر اس وقت یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے ' یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہو گا جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا ہے ۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تم لوگ کیا کرتے ہو ۔ جو شخص بھلائی لے کر آئے گا اسے اس سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا اور ایسے لوگ اس دن کے ہول سے محفوظ ہوں گے ' اور جو برائی لیے ہوئے آئے گا ' ایسے سب لوگ اوندھے منہ آگ میں پھینکے جائیں گے ۔ کیا تم لوگ اس کے سوا کوئی اور جزا پا سکتے ہو کہ جیسا کرو ویسا بھرو؟''

صور وہ نرسنگھا ہے 'جس میں قیامت کے دن پھونکا جائے گا ۔ اور یہ وہ آواز ہو گی جس سے زمین و آسمان کی تمام مخلوق خوفزدہ ہو جائے گی ۔ الا یہ کہ کسی کو اللہ اس سے مامون و محفوظ کر دے ۔ کہا گیا ہے کہ شہداء اس سے محفوظ ہوں گے ۔ تمام زندہ مخلوق بیہوش ہو جائے گی یا مر جائے گی ۔

اس کے بعد دوسری بار پھونکا جائے گا تو تمام لوگ یکدم جی اٹھیں گے ۔ وَكُلٌّ أَتَوْهُ دَاخِرِينَ (۲۷ : ۸۷) ''اور سب کان دبا کر اس کے حضور حاضر ہوں گے''۔ یعنی نہایت مطیع فرمان ' سرخم کیے ہوئے ہوں گے ۔ اس خوف و ہراس کے ساتھ ہی افلاک کا موجودہ نظام خلل پذیر ہو جائے گا اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑیں گے ۔ تمام مدار ختم ہوں گے ۔ اور پہاڑ بادلوں کی طرح چل پڑیں گے اور بکھر جائیں گے ۔ جس طرح لوگ مشوش ہوں گے اسی طرح پہاڑ بھی مشوش ہوں گے ۔ ذی حیات اور جمادات سب میں انتشار ہو گا گویا پہاڑ بھی خوفزدہ ہو جائیں گے اور حیران و پریشان دوڑتے پھریں گے ۔ اور پریشان و بے قرار ہوں گے ۔ زندہ چیزوں کی طرح ان کی حرکت کی نہ سمت ہو گی نہ کوئی قرار ہو گا ۔

صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ (۲۷ : ۸۸) ''یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہے جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا''۔ سبحان اللہ ' اس کی کاریگری کی خوبصورتی اور کمال تو اس کی تمام مصنوعات سے عیاں ہے ۔ اس کا ہر کام صحیح وقت پر ہوتا ہے ' اس میں کوئی نقص 'کوئی بخت و اتفاق 'کوئی بغاوت نہیں ہے نہ اس میں اللہ نے کوئی چیز بھلا دی ہے ۔ اس نے جو چیز بھی بنائی ہے اس کے مالہ وما علیہ کو مکمل کیا ۔ ہر چیز بامقصد بنائی ۔ ہر چھوٹی اور بڑی چیز ایک اندازے سے رکھی ۔ منصوبے اور مقاصد کے مطابق اور اس کے اندر اس قدر گہری حکمت اور دقیق منصوبہ بندی ہے کہ

سرجھکا جاتے ہیں۔ مزید تفصیلات دیکھیے سورۃ الفرقان کی آیت خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ کی تفسیر میں۔

اِنَّهٗ خَبِيْرٌ بِمَا تَفْعَلُوْنَ (۲۷ : ۸۸) "وہ خوب جانتا ہے کہ تم کیا کرتے ہو"۔ اور یہ ہے یوم الحساب، ان کاموں کا جو تم دنیا میں کرتے رہے ہو۔ اور اس دن کو اس ذات نے مقرر کیا ہے جس کی قدرت کا کرشمہ یہ پوری کائنات ہے۔ اللہ اسے اپنے وقت پر لایا ہے۔ اس میں ایک گھنٹے کی تقدیم و تاخیر ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور ہر چیز نے اس کی حکمت کے مطابق اپنا کردار ادا کرنا ہے تاکہ عمل اور مکافات عمل کی خدائی اسکیم اپنے انجام کو پہنچے۔ عمل پہلی زندگی میں ہو اور اس کا اجر و ثواب دوسری زندگی میں۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۭ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ (۲۷ : ۸۸) "یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہو گا جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تم کیا کرتے ہو"۔ اس خوفزدہ کرنے والے ہولناک دن میں، وہ لوگ جنہوں نے دنیا کی زندگی میں اچھے کام کیے، نہایت ہی امن و سکون میں ہوں گے۔ اور اس امن و سکون کے علاوہ ان کو جو اجر اور بدلہ ملے گا وہ بہت ہی بڑا ہو گا اور کافی و شافی ہو گا۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ (۲۷ : ۸۹) "جو شخص بھلائی لے کر آئے گا اسے اس سے بہتر صلہ ملے گا اور ایسے لوگ اس دن کے ہول سے محفوظ ہوں گے"۔ قیامت کے دن کے ہول سے پرامن رہنا ہی ہمارے حقیر اعمال کی پوری جزاء ہے۔ اس کے بعد جو انعامات و اکرامات ملیں گے وہ گویا انعام اور پنشن ہے۔ اس لیے کہ اہل تقویٰ دنیا میں بھی اللہ سے ڈرتے رہتے تھے لیکن دنیا میں اللہ کے خوف اور تقویٰ کے ساتھ آخرت کے ہول کو جمع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ بلکہ اللہ نے اہل تقویٰ کو اس سے مستثنیٰ کیا۔ اس دن جو مخلوق بھی زمین و آسمانوں میں ہے وہ اس ہول کا شکار ہو گی ماسوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ نے بچا لیا اور یہ متقین ہوں گے۔

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ (۲۷ : ۹۰) "اور جو برائی لیے ہوئے آئے گا ایسے سب لوگ اوندھے منہ آگ میں پھینکے جائیں گے"۔ یہ نہایت ہی خوفناک منظر ہے کہ لوگوں کو لا لا کر جہنم کے دہانے سے اوندھے منہ اس کے اندر گرایا جا رہا ہو گا اور اس پر مزید ان کو زجر و توبیخ بھی کی جا رہی ہو گی۔

هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۷ : ۹۰) "کیا تم لوگ اس کے سوا کوئی اور جزا پا سکتے ہو کہ جیسا کرو ویسا بھرو"۔ اس سے قبل دنیا میں انہوں نے ہدایت سے منہ موڑا اور انکار کیا۔ اس لیے یہاں ان کو بطور سزا منہ کے بل آگ میں گرایا جا رہا ہے کیونکہ ان کے سامنے سچائی نہایت ہی واضح ہو کر اور کھل کر آگئی تھی۔ اور اس طرح واضح تھی جس طرح رات اور دن واضح تھے مگر انہوں نے منہ موڑا۔

--- ooo ---

اب سورت کے آخر میں آخری ضربات ہیں۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ آپ اپنی دعوت کا خلاصہ بیان کریں۔ اپنے منہاج کار کی وضاحت کر دیں۔ طریقہ دعوت بتا دیں اور تبلیغ کر دینے اور خدا کا پیغام پہنچا دینے کے بعد اب ان کو اس انجام کے حوالے کر دیں۔ جو اللہ نے ان لوگوں کے لیے پسند فرمایا ہے اس لیے کہ انہوں نے خود

لیے اسے چنا ہے ۔ اور بات کا خاتمہ بھی اسی حمد و ثنا پر ہوتا ہے جس کے ساتھ آغاز ہوا تھا۔

إِنَّمَآ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ ٱلْبَلْدَةِ ٱلَّذِى حَرَّمَهَا وَلَهُۥ كُلُّ شَىْءٍ ۖ وَأُمِرْتُ
أَنْ أَكُونَ مِنَ ٱلْمُسْلِمِينَ ۝٩١ وَأَنْ أَتْلُوَا۟ ٱلْقُرْءَانَ ۖ فَمَنِ ٱهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِى
لِنَفْسِهِۦ ۖ وَمَن ضَلَّ فَقُلْ إِنَّمَآ أَنَا۠ مِنَ ٱلْمُنذِرِينَ ۝٩٢ وَقُلِ ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ سَيُرِيكُمْ
۷
۱۱ع ءَايَٰتِهِۦ فَتَعْرِفُونَهَا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝٩٣

۳ "(اے نبیؐ' ان سے کہو) "مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ اس شہر (مکہ) کے رب کی بندگی کروں جس نے اسے حرم بنایا ہے اور جو ہر چیز کا مالک ہے ۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلم بن کر رہوں اور یہ قرآن پڑھ کر سناؤں" ۔ اب جو ہدایت اختیار کرے گا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو اس سے کہہ دو کہ "میں تو بس خبردار کر دینے والا ہوں" ۔ ان سے کہو 'تعریف اللہ ہی کے لیے ہے' عنقریب وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انہیں پہچان لو گے 'اور تیرا رب بے خبر نہیں ہے' ان اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو" ۔

اہل عرب مکہ مکرمہ کو بیت الحرام اور حرم کو قابل احترام سمجھتے تھے اور مکہ مکرمہ اور حرم شریف کے اس احترام پر ان کی قیادت و سیادت قائم تھی لیکن اس کے باوجود وہ اس اللہ کو وحدہ لاشریک نہ سمجھتے تھے جس نے اس شہر اور کعبہ کو احترام دے کر ان کو عزت بخشی تھی ۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ان کے نظریہ کو اس طرح درست فرماتے ہیں جس طرح نظریہ کو درست کرنا چاہئے ۔ وہ اعلان فرماتے ہیں کہ لوگو مجھے سب سے پہلے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے رب کی بندگی کروں جس نے اس شہر کو محترم بنایا ہے ۔ اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے ۔ اللہ کی الوہیت کا پورا تصور یہاں یہ دیا جاتا ہے کہ وہ اس شہر کا مالک ہے اور اس شہر کے علاوہ بھی ہر چیز اس کی ملکیت ہے ۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ مجھے سب سے پہلے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں بھی سر تسلیم خم کر دینے والا بندہ 'مسلم بن جاؤں ۔ اس طرح کہ اس تسلیم و رضا میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو ۔ ایسا ہی مسلم وہ گروہ ہے جس پر پوری انسانی تاریخ میں دعوت اسلامی کا مدار رہا ہے ۔ جو پورے موحد اور پوری طرح سر تسلیم خم کرنے والے رہے ہیں ۔

یہ تو تھے دعوت اسلامی کے بنیادی عناصر ۔ رہا اس دعوت کا وسیلہ اور اس کا ذریعہ تو وہ تلاوت قرآن ہے ۔

وَ أَنْ أَتْلُوَ الْقُرْاٰنَ (۲۷ : ۹۲) "اور یہ کہ قرآن پڑھ کر سناؤں" ۔ قرآن دراصل دعوت اسلامی کی کتاب اول ہے ۔ یہ ہمارا دستور ہے اور ہماری کامیابی اور فلاح کا وسیلہ ہے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ اس قرآن کے ذریعے جہاد فرمائیں بمقابلہ کفار ۔ انسانی عقل اور انسانی روح کی تربیت کے لیے اس کے اندر بہت کچھ ہے ۔ یہ نفس انسانی کے ہر پہلو کو لیتا ہے ۔ یہ انسانی شعور کے تمام طریقوں کو آزماتا ہے ۔ اس کے اندر ایسی قوت ہے کہ وہ خشک دلوں کے اندر زلزلہ پیدا کر دیتا ہے ۔ وہ انسان کے دل و دماغ کو اس قدر جھنجوڑتا ہے کہ انہیں بے قرار کر دیتا ہے ۔

دعوت اسلامی کے لیے تو قرآن کافی و شافی ہے۔ اس کے ساتھ جہاد و قتال کو تو محض اس لیے فرض کیا گیا ہے کہ اہل ایمان کو فتنوں اور دشمنوں کے شر سے بچایا جا سکے۔ اور پوری دنیا میں قرآن کی دعوت کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اور جہاد کا دوسرا مقصد ایسی قوت کا حصول ہے جس کے ذریعے شریعت کے قانون کو نافذ کیا جا سکے۔ رہی دعوت اسلامی تو اس کا ذریعہ اور وسیلہ صرف کتاب اللہ ہے۔ وَ اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ (۹۲:۲۷) "مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن کریم کی تلاوت کروں"۔

فَمَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ

(۹۲:۲۷) "اب جو ہدایت اختیار کرے گا، وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو اس سے کہہ دو کہ میں بس خبردار کر دینے والا ہوں"۔ اس آیت میں انفرادی ذمہ داری کا اصول بیان کیا گیا ہے۔ یعنی ہدایت و ضلالت کی راہ اپنانے میں ہر شخص خود ذمہ دار ہے۔ اس انفرادی ذمہ داری کے اصول کے اندر یہ اصول کارفرما ہے کہ اللہ کے نزدیک انسان بہت ہی محترم ہے۔ اور اسلام احترام آدمیت کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ اسلام انسانوں کو حیوانوں کی طرح ہانک کر اسلام کے دائرے میں جبراً داخل نہیں کرتا۔ اسلام دعوت اسلامی کو قرآن کی شکل میں انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ یہ دعوت لوگوں کے دلوں پر اثر کرتی ہے۔ یہ ہے اسلام کا گہرا، عمدہ اور عمیق طریق کار۔ یہ انسانی فطرت کو اس کی گہرائیوں سے لیتا ہے جس طرح قرآن نے انسانی نفوس کی تربیت کے لیے نہایت ہی فطری منہاج اپنایا ہے۔

وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ (۹۳:۲۷) "ان سے کہو تعریف اللہ ہی کے لیے ہے"۔ اللہ کے کمالات اور کاریگریوں سے پہلے اللہ کی تعریف۔

سَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا (۹۳:۲۷) "عنقریب وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انہیں پہچان لو گے"۔ اللہ نے بالکل سچ کہا، اللہ کے بندے بیرون انفس و آفاق میں اللہ کی آیات و نشانات کو دیکھتے ہیں اور اللہ نے اس کائنات میں جو اسرار و رموز ودیعت کیے ہیں، آئے دن ان کے بارے میں انکشافات ہوتے رہے ہیں۔

وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۹۳:۲۷) "اور تیرا رب بے خبر نہیں ہے ان اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو"۔ یہ وہ آخری ضرب ہے جو انسانی عقل و خرد کی تاروں پر اس سورت کے آخر میں لگائی جاتی ہے۔ نہایت ہی میٹھے، خوبصورت اشاراتی اور پھر نہایت ہی دو ٹوک اور خوفناک انداز بیان میں۔ اس کے بعد لوگوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اب وہ جو چاہیں کریں لیکن ان کو اس تنبیہہ کے ساتھ آزاد چھوڑا جاتا ہے۔

وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۹۳:۲۷) "اور تیرا رب بے خبر نہیں ہے ان اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو"۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ---- پنجم

## پارہ ----- ۲۰

### سورۃ القصص ۔ ۲۸

آیات ۱--- تا--- ۸۸

# سورۂ قصص ایک نظر میں

یہ مکی سورت ہے ۔ یہ اس وقت نازل ہوئی جب مسلمان مکہ میں ایک کمزور اور قلیل جماعت کی شکل میں تھے جبکہ مشرکین مکہ شان و شوکت اور قوت و دبدبہ کے مالک تھے ۔ ان کے ہاتھ میں ملک کا اقتدار تھا ۔ چنانچہ اس سورت کے پیش نظر یہ بتانا ہے کہ حقیقی قوت کیا ہے اور حقیقی اقدار کیا ہیں ۔ یہ بتاتی ہے کہ اس پوری کائنات میں ایک ہی حقیقی قوت کام کر رہی ہے ۔ یہ اللہ کی قوت ہے اور اس کائنات میں ایک ہی اعلیٰ قدر ہے اور وہ ایمانی قدر ہے ۔ لہٰذا جس شخص کی پشت پر اللہ کی قوت ہو' اسے کوئی ڈر نہیں ہے ۔ اگرچہ بظاہر وہ قوت کے سرچشموں سے محروم اور خالی نظر آتا ہو اور جس شخص کے مخالف محاذ میں اللہ کی قوت کام کر رہی ہو' وہ کبھی بھی امن و سکون حاصل نہیں کر سکتا ۔ اگرچہ دنیا کی پوری قوتیں اس کی پشتیبان ہوں اور جس شخص نے ایمان کی دولت کو پالیا تو اس نے گویا تمام بھلائیوں کو پالیا اور جس شخص نے اس متاع کو گم کر دیا تو وہ گویا مفلس ہو گیا ۔ اب کوئی چیز اسے فائدہ نہ دے سکے گی ۔

یہی وجہ ہے کہ سورت کے آغاز میں فرعون و کلیم کی کشمکش کو لایا گیا ہے ۔ قارون اور اس کی مفلس قوم کا تذکرہ آخر میں آتا ہے ۔ حضرت موسیٰ اور فرعون کی کشمکش میں حکومت و اقتدار کی جابرانہ اور سرکش قوت کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے جو عظیم قوت ہے اور پوری قوم پر اس کی نظر ہے اور سخت احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی ہیں ۔ اس عظیم قوت کے مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک چھوٹے شیرخوار بچے کی شکل میں سامنے آتے ہیں ۔ جس کے پاس کوئی قوت اور طاقت نہیں ہے ۔ بلکہ اس کے زندہ بچنے کے لیے جائے پناہ بھی نہیں ہے ۔ زمین پر فرعون کو مکمل برتری حاصل ہے ۔ اس نے اپنی قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے ۔ Divide & Rule کے اصول کے مطابق ان گروہوں میں سے بنی اسرائیل کو خوب دبا کر رکھا ہے ۔ ان کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی ذبح کر دیتا ہے ۔ ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھا جاتا ہے ۔ یہ فرعون بنی اسرائیل سے ڈرتا ہے ۔ ان کی گردنوں پر سوار ہے اور اس نے ان کو غلام بنا رکھا ہے ۔ لیکن فرعون کی یہ عظیم قوت' اس کی یہ جباری و قہاری اور اس کی تمام احتیاطی تدابیر اسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں ۔ وہ اپنی ان تمام قوتوں اور احتیاطوں کے باوجود موسیٰ علیہ السلام جیسے ایک ناتواں بچے کو بھی نہیں پکڑ سکتا ۔ اس لیے کہ عالم بالا کی عظیم اور حقیقی قوت اس کی نگران ہے ۔ اللہ کی عنایات اسے ہر قدم پر بچائے چلی جا رہی ہیں ۔ تمام حملے خود بخود پسپا ہو رہے ہیں ۔ فرعون اور اس کی قوتوں کی آنکھیں اندھی ہو رہی ہیں ۔ فرعون اور اس کی قوتیں اس سے مصروف اور غافل نظر آتی ہیں اور یہ لاچار بچہ خود فرعون کی کفالت میں جا پہنچتا ہے ۔

بلکہ اس کی بیوی اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے ۔ فرعون کے ہاتھ بندھ جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ کے قتل سے ہاتھ روک لیتا ہے اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنے لیے وہ مصیبت فراہم کرتا ہے جس سے وہ رات ۔ ۔ دن خائف ہے ۔

دوسرے قصے میں دولت کی قدر و قیمت کو پیش کیا گیا ہے ۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ علم کی قدر و قیمت کیا

ہے - یہ دولت انسانوں کو حقیر سمجھتی ہے - قارون زیب و زینت کے ساتھ نکلا - لوگوں کو بھی معلوم تھا کہ وہ بہت مالدار ہے' اس قدر کہ قوی لوگوں کی ایک جماعت اس کے خزانوں کی چابیاں بھی بمشکل اٹھاتی تھی - پھر قارون کو علم بھی دیا گیا تھا وہ اپنے علم پر فخر کرتا تھا - اس کا یہ خیال تھا کہ وہ اس علم کے ذریعے مالدار بن گیا ہے لیکن قارون کی قوم میں سے جن لوگوں کو صحیح علم دیا گیا تھا' قارون کے خزانے اور قارون کی آرائش و زیبائش انہیں بلکا نہ کر سکی بلکہ وہ لوگ ایسے تھے جن کی نظریں رضائے الہی کے بلند مقاصد پر لگی ہوئی تھیں - وہ جانتے تھے کہ رضائے الہی کا حصول بہت ہی بلند مقصد ہے لیکن اس قصے میں دست قدرت سامنے آتا ہے - اس کا محل اس کی دولت سمیت زمین میں دھنس جاتا ہے - اس کا علم اور اس کی دولت اسے بالکل کوئی فائدہ نہیں دیتے - دست قدرت کی یہ مداخلت براہ راست اور کھلی مداخلت ہے - دست قدرت نے اس سے قبل فرعون کے معاملے میں ایسی ہی مداخلت کی تھی - فرعون کو غرق کر دیا گیا تھا اور وہ اور اس کے لشکری غرق ہونے والوں میں سے ہو گئے تھے -

فرعون نے بنی اسرائیل پر دست درازی کی - اور اپنی حکومتی قوت اور اقتدار اعلیٰ کے بل بوتے پر ان پر مظالم ڈھائے اور قارون نے بھی اپنی قوم پر ظلم کیا اور اپنے علم اور دولت کے بل بوتے پر لوگوں کا استحصال کیا - انجام فرعون و قارون دونوں کا ایک ہی ہوا - یہ اور اس کا محل زمین میں دھنس گئے اور وہ اور اس کی فوجیں سمندر کی نذر ہوئیں - اور زمین کی قوتوں میں سے کوئی قوت ان کی مدد کو نہ پہنچ سکی - دست قدرت نے علانیہ دونوں جگہ مداخلت کی - یوں اللہ نے ظلم اور فساد کے لیے حدود متعین کر دیئے لیکن دست قدرت نے یہ کام اس وقت کیا جب لوگ سرکشی اور فساد فی الارض کا دفعیہ کرنے سے عاجز آ گئے -

ان دونوں واقعات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب شر خالص ہو کر چھا جائے' اور فساد ہر طرف ظاہر ہو جائے' بھلائی کی راہیں مسدود ہو جائیں اور اصلاح اور نیکی کا پروگرام ناکام ہو جائے اور امن و امان ختم ہو جائے اور لوگ مال و دولت کے فتنے میں مبتلا ہوں تو پھر اللہ کی قدرت چیلنج کر کے سامنے آتی ہے - وہ پس پردہ نہیں ہوتی بلکہ کھل کر سامنے آتی ہے - کیونکہ انسانی قوتیں اس وقت شر و فساد کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ جاتی ہیں - (۱)

---

(۱) سورت طٰہٰ میں بنی اسرائیل کے موقف پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے کہا تھا "جب تک بنی اسرائیل ذلت کو قبول کرتے ہوئے فرعون کو غلامی کا خراج ادا کرتے رہے اس وقت تک دست قدرت ان کی امداد کے لیے متحرک نہیں ہوا اور ان کے حق میں کوئی آسمانی امداد نہیں آئی کیونکہ وہ ذلت' مسکنت اور خوف کی وجہ سے فرعون کی غلامی پر راضی ہو گئے تھے لیکن جب اہل ایمان نے حضرت موسیٰ پر ایمان لا کر بغیر جھجک کے اپنے ایمان کا اعلان کر دیا - اور اسی سلسلے میں وہ ہر قسم کی تکالیف اٹھانے کے لیے تیار ہو گئے - اور انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ وہ سر اٹھا کے چلیں گے - اور فرعون جیسے قہار و جبار حکمران کے سامنے کلمہ حق کہیں گے' بے باکی کے ساتھ اور سختی سے پہلوتہی نہ کرتے ہوئے' تو پھر اس وقت دست قدرت نے مداخلت کی اور ان کے لیے میدانی نصرت تب آئی جب انہوں نے روحانی اور نظریاتی اعتبار سے برتری حاصل کر لی" - یہاں جو کچھ میں نے کہا ہے - یہاں کے سیاق کلام کے مطابق زیادہ صحیح ہے اگرچہ سورت طٰہٰ میں جو کچھ کہا گیا' وہ بھی اپنی جگہ معمولی لفظی تغیر کے ساتھ درست ہے - ابتدائی اسباب یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچانے کے تو دست قدرت نے تیار کیے لیکن میدان میں عملاً نصرت تب ہی نصیب ہوئی' جب اہل ایمان نے فرعون کے سامنے جہاراً اور اعلاناً کلمہ حق کہہ دیا' باوجود اس کی قہاری و جباری کے' پس دونوں باتیں اپنی جگہ درست ہیں - (سید قطب)

قصص کے درمیان قرآن کریم پھیر پھیر کر مشرکین کو سمجھاتا ہے ۔ کبھی تو کہا جاتا ہے کہ اس کائنات میں جو نشانیاں تم ظاہر و باہر دیکھتے ہو' ان سے نصیحت حاصل کرو' پھر اقوام سابقہ کی ہلاکتوں کے قصص اور واقعات بھی ان کے سامنے رکھے جاتے ہیں ۔ پھر قیامت کے مناظر میں سے پرتاثیر مناظر بھی سامنے لائے جاتے ہیں ۔ غرض ان تمام طریقوں سے وہ نصیحت ان کے ذہن نشین کی جاتی ہے جو ان قصص سے نکلتی ہے ۔ نہایت ہی مربوط انداز میں تاکید اً بتایا جاتا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں سنت الہیہ ایک ہی جیسی رہی ہے' اٹل رہی ہے اور تمام نتائج سنت الہیہ کے مطابق نمودار ہوتے ہیں ۔ مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے ۔

اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا (۲۸ : ۵۷) "اگر ہم تمہارے ساتھ ہدایت کی پیروی اختیار کر لیں تو اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے" ۔ چنانچہ ہدایت نہ قبول کرنے کا عذر وہ یہ کرتے تھے کہ اگر ہم نے اسلام قبول کر لیا تو لوگ ہمیں اپنے گھروں اور اراضی سے نکال دیں گے ۔ اگر انہوں نے ان قدیم نظریات کو ترک کر دیا جن کی وجہ سے عربوں نے ان کی سیادت کو قبول کر لیا تھا اور جن کی وجہ سے لوگ ان کا اور بیت الحرام کا احترام کرتے تھے تو ان کا یہ مقام جاتا رہے گا ۔

ان لوگوں کے ان خدشات کو ختم کرنے کے لیے اللہ نے اس سورت میں فرعون اور موسیٰ کا قصہ بیان کیا اور ان کو سمجھایا کہ امن و امان کا مرجع اور سرچشمہ کہاں ہے ۔ اور ڈرنا کس سے چاہئے ۔ چنانچہ بتایا گیا کہ امن تو اللہ کے ہاں نصیب ہو گا ۔ اگرچہ کسی انسان کو ان اسباب امن و اطمینان میں سے کوئی سبب حاصل نہ ہو جو لوگوں کے ہاں متعارف ہیں اور خوف و ہراس اس میں ہے کہ انسان امن و اطمینان کے اس حقیقی سرچشمے سے کٹ جائے ۔ اگرچہ لوگوں کے ہاں متعارف امن و سکون کے رسائل موجود ہوں ۔ بس حقیقت کو دوسرے پیرائے میں بیان کرنے کے لیے قارون کا قصہ بھی بیان کر دیا کہ امن و سکون دولت سے بھی نصیب نہیں ہوتا ۔ لہذا نہایت تاکید کے ساتھ ان قصص میں اس حقیقت کو ثابت کیا گیا ۔

اور ان کے اس قول پر یہ تبصرہ کیا گیا ۔

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۸ : ۵۷) "کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پرامن حرم کو ان کے لیے جائے قیام بنا دیا جس کی طرف ہر طرح کے ثمرات کھنچے چلے آتے ہیں' ہماری طرف سے' رزق کے طور پر' مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں" ۔ اللہ تعالیٰ اہل مکہ کو یاد دہانی فرماتا ہے ہیں کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے ان کو خوف سے نجات دی اور امن و امان عطا کیا اور پورے حرم کو ان کے لیے پرامن بنا دیا ۔ یہ اللہ وہی ہے جو ان کے لیے' اس امن کو دوام بخشتا ہے یا امن ان سے سلب کر لیتا ہے ۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ان کو سرکشی اور ناشکری کے انجام سے ڈراتا ہے ۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۗ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ (۲۸ : ۵۸) "اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی

معیشت پر اترا تے تھے ' سو دیکھ لو ' وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے ' آخر کار ہم ہی وارث ہو کے رہے "۔

اللہ تعالیٰ ان کو ان کے انجام بد سے ڈراتا ہے کہ رسول کے بھیجنے کے بعد اب ان کے عذرات ختم ہو گئے ہیں۔ اب اگر تم لوگ پھر بھی تکذیب کرو گے تو ڈرانے والوں کے بعد اقوام سابقہ کا جو انجام ہوا وہ تمہارا بھی ہو گا۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ (۲۸ : ۵۹) "اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیات سناتا اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے رہنے والے ظالم نہ ہو جاتے"۔

اس کے بعد ان کے سامنے قیامت کا ایک منظر پیش کیا جاتا ہے کہ جب ان کے شرکاء کھلے بندوں ان سے اپنی برات کا اظہار کر دیں گے۔ اس منظر میں اللہ تعالیٰ ان کے سامنے آخرت کے عذاب کی تصویر کشی کرتا ہے جبکہ اس سے قبل بتا دیا گیا کہ دنیا میں بدکاروں کا انجام کیا ہوا کرتا ہے اور یہ کہ دنیا میں امن و سلامتی کے حصول کا طریقہ کیا ہے۔

اس سورت کا خاتمہ ایک وعدے پر ہوتا ہے۔ یہ وعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ قرآن کے تقاضے پورے کرتے ہوئے آپ کو اس زمین سے نکالا جا رہا ہے۔ لیکن آخر کار اللہ آپ کو آپ کے اسی شہر کی طرف لوٹائے گا اور شرک اور شرک والوں پر آپ کو غلبہ نصیب ہو گا۔ اے پیغمبر آپ سوچتے نہیں کہ آپ کو اللہ نے رسالت سے نوازا حالانکہ آپ کو یہ امید بھی نہ تھی کہ آپ رسول بھی بن سکتے ہیں۔ یہی اللہ ہے جو آپ کو آپ کے اس شہر کی طرف لوٹا دے گا جس سے مشرکین نکال رہے ہیں۔ آپ جلد ہی امن اور کامرانی کے ساتھ اس شہر میں داخل ہوں گے۔ اس سورت کے اندر جو قصص لائے گئے ہیں وہ ان حقائق کی تائید کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس شہر سے نکالا گیا تھا آپ پھر وہاں پرامن طور پر لوٹ گئے تھے۔ اس کے بعد آپ پوری قوم بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلا کر مصر سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ فرعون اور اس کا لشکر عظیم غرق ہو گیا اور موسیٰ اور ان کی قوم موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں معجزانہ طور پر نجات پا گئی۔

یہ وعدہ ہوتا ہے اس پر سورت کے مضامین ختم ہوتے ہیں۔ اور دل و دماغ کی تاروں پر آخری ضرب یوں لگتی ہے۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۸ : ۸۸) "اور اللہ کے سوا کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو ' اس کے سوا کوئی معبود نہیں ' ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے۔ فرمانروائی اسی کی ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو"۔

یہ ہے اس سورت کا موضوع۔ اس کی فضا اور اس کا پرتو۔ ہمیں چاہئے کہ اس کے چار اسباق کو ایک ایک کر کے لیں۔ یعنی حضرت موسیٰ کا قصہ اور اس پر تبصرہ قارون کا قصہ اور اس پر زبردست ڈراوا۔

# درس نمبر ۱۷۶ تشریح آیات

## ۱--- تا --- ۴۳

سُوْرَةُ الْقَصَصِ (۲۸) مَكِّيَّةٌ (۴۹) اٰيَاتُهَا ۸۸ رُكُوْعَاتُهَا ۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾

"ط - س - م ' یہ کتاب مبین کی آیات ہیں"۔ سورت کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے۔ حروف تہجی سے آغاز کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت ایسے ہی حروف سے مرکب ہے ' لیکن عام حروف تہجی سے مرکب یہ کتاب ایک بلند مرتبہ اور معجزانہ کتاب ہے۔ ان ہی حروف سے بننے والی دوسری کتابوں اور اس کتاب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ کتاب عام لوگوں ہی کی زبان میں ہے ' عام لوگ فانی ہیں لیکن یہ کتاب لازوال ہے۔ اور یہ

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۲۸ : ۲) "یہ کتاب مبین کی آیات ہیں"۔ لہذا یہ کتاب مبین کسی انسان کی بنائی ہوئی نہیں ہے کیونکہ اگر انسان کی بنائی ہوئی ہوتی تو دوسرے انسان بھی ایسی کتاب بنا کر لے آتے جبکہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسان ایسی کتاب نہیں لا سکے۔ لہذا ثابت ہوا کہ یہ وحی من جانب اللہ ہے اور اس سے اس کی فصاحت و بلاغت اور معجزانہ شان بالکل واضح ہے۔ پھر اس کے اندر جو مضامین ہیں وہ چھوٹے بڑے معاملے میں سچائی کی چھاپ لیے ہوئے ہیں۔

نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳﴾

"ہم موسیٰ اور فرعون کا کچھ حال ٹھیک ٹھیک تمہیں سناتے ہیں ' ایسے لوگوں کے فائدے کے لیے جو ایمان لائیں"۔ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے آ رہی ہو ایمان لانے والے ہوتے ہیں ' یہ ان کی تربیت کرتی ہے ' ان کو اٹھاتی ہے اور ان کے لیے منہاج حیات وضع کرتی ہے۔ راستہ بتاتی ہے۔ یہ قصص بھی ایسے ہی اہل ایمان کے لیے لائے جا رہے ہیں اور ایسے ہی

لوگ ان سے نفع اٹھاتے ہیں۔

اس کتاب کی یہ تلاوت براہ راست اللہ کی طرف سے ہے' یہ اللہ کی عنایات میں سے ایک عنایت ہے۔ اور اہل ایمان کے لیے اس کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ یہ کتاب اہل ایمان کو بتاتی ہے کہ وہ نہایت ہی بلند مرتبہ اور قیمتی لوگ ہیں اور اللہ کے نزدیک وہ مرتبہ بلند رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول پر یہ کتاب ان کے لیے تلاوت کرتا ہے اور ان کے لیے یہ کتاب ان کی صفت ایمان کی وجہ سے تلاوت کی جارہی ہے۔

لِقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ (۲۸ : ۳) "ایسے لوگوں کے فائدے کے لیے جو ایمان لائیں"۔

اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے' یہاں قصے کا آغاز حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے آغاز یعنی آپ کی ولادت سے ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ کئی سورتوں میں آیا ہے لیکن آپ کی ولادت کے واقعات کا بیان صرف اس سورت میں اس انداز سے ہے کیونکہ آپ کی سیرت کا پہلا دور یعنی آپ کی ولادت اور وہ حالات جن میں ولادت ہوئی بے بسی کا دور تھا ولادت ہوتے ہی آپ بے بس تھے۔ آپ کی قوم بھی بے بس تھی۔ فرعون کی غلامی میں یہ لوگ بندھے ہوئے تھے' ذلیل و خوار تھے اور یہی ذلت و مسکنت یہاں اس سورت کا حقیقی موضوع ہے۔ ایسے مشکل حالات میں صاف صاف نظر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچانے کے لیے دست قدرت واضح طور پر سرگرم ہے۔ جو تدابیر اختیار کی گئیں وہ بالکل ظاہر ہیں۔ ایسے حالات میں جبکہ ظلم زیادتی اور سرکشی کے خلاف تمام انسانی قوتیں عاجز آ گئی ہیں۔ دست قدرت اس عظیم قوت پر ایسی ضرب لگاتی ہے جس کی کوئی آواز نہیں ہے۔ اس طرح مستضعفین کی نصرت کا آغاز ایسے حالات میں ہوتا ہے کہ ان کے پاس حالات کو بدلنے کا کوئی چارہ ہی نہیں رہتا۔ قوم بنی اسرائیل کو سخت ترین عذاب اور ظلم اور تشدد کا نشانہ بنایا جارہا تھا اور ان کے پاس بچاؤ کی کوئی ظاہری سبیل نہیں ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال تھی جس سے مکہ میں مٹھی بھر ایمان والے دوچار تھے۔ مکہ کے اہل ایمان کو بھی اس طرح دست قدرت کی غیبی امداد کی ضرورت تھی اور مکہ میں تشدد کرنے والوں کو ضرورت تھی کہ ان کو متنبہ کیا جائے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے۔

دوسری سورتوں میں اکثر اوقات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کا آغاز رسالت کے سپرد کیے جانے کے واقعات سے ہوتا ہے۔ کسی جگہ اس قصے کا آغاز ولادت موسیٰ کے واقعات سے نہیں ہوا۔ دوسرے مقامات پر جب ہم دیکھتے ہیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک قوی مومن کی طرح ایک سرکش مقتدر اعلیٰ کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہیں اور یہ قوت ایمانی غالب آتی ہے اور ظلم اور سرکشی سرنگوں ہوتی ہے لیکن یہاں یہ مفہوم بتانا مقصود نہیں ہے۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ شر جب ننگا ہو کر اپنے عروج تک جا پہنچتا ہے تو اس کے اس عروج کے اندر سے اس کی خرابی کا سامان نمودار ہوتا ہے۔ شر اور ظلم جب کھل کر سامنے آجاتے ہیں تو پھر ان کی شکست و ریخت کا سامان قدرتی طور پر فراہم ہوتا ہے۔ کسی بیرونی دفاع کی ضرورت نہیں رہتی۔ شر کے خاتمے کے قدرتی عوامل شروع ہو جاتے ہیں اور دست قدرت خود اس کا دفعیہ کرتا ہے اور مظلوم اور پسے ہوئے طبقات کو ظلم کی چکی سے نجات دے دی جاتی ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے' خیر پھلتا اور پھولتا ہے۔ اس کی تربیت ہوتی ہے اور اہل خیر وقت کے امام بن جاتے ہیں اور تمام اقتدار ان کے ہاتھ میں آجاتا ہے اور

وہ اس کے وارث ہو جاتے ہیں۔

یہی وہ حکمت ہے جس کے لیے سورۂ قصص میں قصہ موسیٰ کو لایا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں اس قصے کی وہ کڑی لی گئی ہے جو پوری طرح اس مفہوم کو ظاہر کرتی ہے۔ قرآن کریم میں قصص جہاں جہاں بھی لائے گئے ہیں ' ہر جگہ ان سے ایک مخصوص غرض سامنے آتی ہے۔ لوگوں کی 'ایک زاویہ سے ' تربیت مقصود ہوتی ہے اور کچھ معانی 'کچھ حکمتیں اور کچھ اصول ان کو بتانے مقصود ہوتے ہیں۔ چنانچہ جس مقصد کے لیے قصہ لایا جاتا ہے ' وہ نہایت ہی ہم آہنگی کے ساتھ اور مربوط طریقے سے ذہنوں میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ حقائق پر دے دیئے جاتے ہیں اور قلب و نظر کی تعمیر صحیح خطوط پر ہوتی ہے۔

یہاں اس قصے کی جو کڑیاں لائی گئی ہیں ' مثلاً ولادت موسیٰ علیہ السلام ' وہ سخت حالات جن میں آپ کی ولادت ہوئی ' ان حالات میں جس معجزانہ انداز میں اللہ نے آپ کو بچانے کی تدابیر کیں ' پھر آپ کی پرورش کا معجزانہ انتظام اور آپ کو جوانی ' علم اور حکمت کا عطا ہونا ' قبطی کا قتل ہونا ' فرعون اور اس کے سرداروں کا آپ کے خلاف مشورت کرنا ' حضرت موسیٰ کا مصر سے مدین کی طرف بھاگنا ' وہاں شادی کرنا ' خدمت گزاری کی مدت پوری کرنا ' پھر طور پر آپ کا ندائے ربی سننا اور منصب رسالت پانا ' پھر آپ کا فرعون اور اس کے سرداروں کے سامنے فریضہ تبلیغ رسالت پورا کرنا۔ ان کی جانب سے تکذیب ' حضرت ہارون کو بحیثیت معاون نبی متعین کرنا اور آخری انجام کہ فرعون کی غرقابی۔ یہ سب امور نہایت ہی تیزی کے ساتھ سین پر آتے ہیں۔

یہاں قصے کی دو کڑیوں کو قدرے تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ان کو قرآن کریم میں پہلی بار لایا گیا ہے اور ان دونوں کے ذریعے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ اللہ کس طرح کھل کر ظلم کے خلاف اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔ فرعون کی تمام قوتیں اور مکاریاں فیل ہو جاتی ہیں۔ تمام احتیاطی تدابیر بے اثر ہو جاتی ہیں اور اللہ کے فیصلے نافذ ہو کر رہتے ہیں۔

وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ (۲۸ : ۶) "اور ان سے فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کی وہی کچھ دکھلا دیں جس کا انہیں ڈر تھا"۔

جس طرح پورے قرآن میں قرآن کریم کا انداز بیان قصص ہوتا ہے۔ قصہ فرعون و کلیم کو بھی یہاں مناظر کی شکل میں لایا گیا ہے۔ ان مناظر کے درمیان ان کڑیوں کو حذف کر دیا گیا ہے۔ جن کو انسان کی قوت متخیلہ خود بخود نظروں کے سامنے لے آتی ہے ' لہٰذا دو مناظر کے درمیان جو کڑیاں ترک کر دی جاتی ہیں۔ ان کے بارے میں انسان لاعلم نہیں رہتا ' بلکہ انسان کی قوت متخیلہ پردہ خیال پر ان واقعات کو لے آتی ہے۔ یوں ظاہری اسکرین کے ساتھ ساتھ پردہ خیال پر بھی مناظر آتے اور جاتے رہتے ہیں۔

اس قصے کا پہلا حصہ پانچ مناظر ' دوسرا نو مناظر ' تیسرا حصہ چار مناظر پر مشتمل ہے۔ اور ان مناظر اور ٹکڑوں کے درمیان ایک خلا ہے ' کہیں یہ گیپ بڑا ہے اور کہیں چھوٹا ہے۔ جس طرح پردہ گرتا ہے اور منظر آنکھوں سے غائب ہو جاتا ہے اور خیال کی اسکرین پر مناظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

قصہ کے آغاز سے بھی پہلے اس فضا کی تصویر کشی کی جاتی ہے جس کے اندر واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ وہ حالات

جن میں یہ قصہ واقع ہوا اور وہ مقاصد جن کے لیے دست قدرت نے یہ واقعات رونما کیے اور پھر وہ مقاصد جن کے لیے یہاں اس قصے کو دہرایا جا رہا ہے۔ یہ بھی قرآن کا ایک اسلوب ہے جو وہ قصہ پیش کرتے وقت اختیار کرتا ہے۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ﴿٤﴾ وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ﴿٥﴾ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ ﴿٦﴾

"واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا' اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔ اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انھیں پیشوا بنا دیں اور انہی کو وارث بنائیں اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں اور ان سے فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہی کچھ دکھلا دیں جس کا انھیں ڈر تھا"۔

یہ ہے وہ اسٹیج جس پر یہ واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ اس ماحول کو وہ ذات بیان کر رہی ہے جو ان واقعات کو رونما کرا رہی ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتا رہی ہے کہ ہم نے کیوں ایسا کیا اور یہ بھی صراحت کی کہ یہ ہم ہیں جو ایسا کر رہے ہیں۔ اور اس لیے کر رہے ہیں۔ "واقعات۔ قصہ" کے آغاز ہی میں صاف صاف بتا دیا جاتا ہے ہم ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ قصے کا ہدف واضح طور پر ہمارے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس عجیب انداز میں یہاں اس قصے کا آغاز ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ انداز اس کتاب کے عجائبات میں سے ہے۔

یہاں فراعنہ مصر میں سے اس فرعون کا نام نہیں لیا جاتا جس کے عہد میں یہ واقعات رونما ہوئے کیونکہ واقعات کا خالص تاریخی پہلو متعین کرنا مقاصد قرآن میں سے نہیں ہے۔ نہ اس سے اس علم و حکمت میں کوئی اضافہ ہوتا ہے جو قرآن کریم اہل ایمان کو سکھانا چاہتا ہے۔ یہ کافی ہے کہ حضرت یوسف کے زمانہ مصر کے بعد یہ واقعات رونما ہوئے کیونکہ حضرت یوسف کے والدین اور بھائیوں کی مصر منتقلی کے ساتھ بنی اسرائیل کی مصر منتقلی شروع ہوئی اور یہاں وہ پھلے پھولے۔

حضرت یوسف کے دور کے بعد سرکش فرعون نے مصر کا اقتدار اعلیٰ حاصل کیا۔ یہ بڑا جبار و قہار تھا۔ اس نے مصر میں طبقاتی نظام جاری کر دیا تھا۔ ہر طبقے کے فرائض متعین کر دیے تھے اور بنی اسرائیل پر اس دور میں بے حد مظالم ہو رہے تھے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے عقائد و نظریات مصریوں کے عقائد و نظریات سے بالکل جدا تھے۔ بنی اسرائیل اپنے دادا

حضرت ابراہیم کے دین پر تھے ۔ اگرچہ ان کے عقائد میں تغیر و انحراف واقع ہو گیا تھا لیکن دین کا بنیادی ڈھانچہ وہی تھا ۔ وہ عقیدۂ توحید کے قائل تھے ۔ فرعون کی الوہیت کے منکر تھے ۔ اس طرح فراعنہ جن بتوں کی پرستش کرتے تھے ۔ بنی اسرائیل ان کے قائل نہ تھے ۔

فرعون کو یہ خوف لاحق تھا کہ بنی اسرائیل مصر میں 'اپنے خیالات کی وجہ سے اس کے تاج و تخت کے لیے خطرہ ہیں ۔ وہ مصر سے ان کو یکلخت نکال بھی نہ سکتا تھا ۔ کیونکہ وہ لاکھوں کی تعداد میں تھے نیز اس صورت میں فرعون کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر اس قدر عظیم آبادی کو یکبارگی مصر سے نکال دیا جائے تو وہ دشمن مجاور اقوام سے مل کر مصر پر حملہ آور ہو جائیں گے ۔ اس لیے اس نے اس قوم کو نیست و نابود کرنے کے لیے نہایت ہی وحشیانہ طریقہ نکالا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری ۔ یہ لوگ نہ فرعون کو مانتے ہیں اور نہ اس کی خدائی کے قائل ہیں 'اس لیے اس نے اس قوم کو سخت ترین مشقت کے سپرد کر دیا' ان کو ہر طرح ذلیل کر کے رکھا' اور ان پر قسم قسم کے مصائب ڈھانے لگا ۔ آخر کار اس نے یہ انتہائی فیصلہ کیا کہ ان کے تمام پیدا ہونے والے لڑکوں کو ذبح کر دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے تاکہ ان کی آبادی میں اضافہ بالکل ختم ہو جائے ۔ مرد زیادہ نہ ہوں اس طرح ان کی عورتوں کی کثرت اور مردوں کی کمی کی وجہ سے ان کی قوت ٹوٹ جائے گی اور یہ لوگ اس سخت عذاب اور ظلم کی وجہ سے دبا کر بھی رکھے جا سکیں گے ۔

روایات میں آتا ہے کہ اس نے تمام حاملہ عورتوں کے لیے دائیاں مقرر کر رکھی تھیں جو ہر پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں فوراً رپورٹ کرتی تھیں اور اور بچے کو فوراً ٹھکانے لگا دیا جاتا تھا ۔ اور اس سنگدلانہ منصوبے پر عمل کرنے میں کوئی رو رعایت نہ برتی جاتی تھی ۔ فرعون کا یہ اس قدر ظالمانہ منصوبہ تھا کہ بے گناہ بچوں کو یوں ذبح کرنے کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔

ان حالات میں حضرت موسیٰ کا قصہ یوں ان کی ولادت سے شروع ہوتا ہے ۔ جیسا کہ قرآن میں ہے :

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ (۲۸ : ۴) "واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا ۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا ۔ اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا ۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا" ۔

لیکن اللہ کا ارادہ اور منصوبہ فرعون کے منصوبے سے مختلف تھا ۔ اللہ کا فیصلہ سرکش فرعون کے فیصلے سے جدا تھا ۔ ہمیشہ یوں ہوتا ہے کہ ظالم اور سرکش اپنی قوت اور تدابیر پر مست ہوتے ہیں' وہ اللہ کے فیصلوں اور قدرتوں کو بھلا دیتے ہیں ۔ وہ یوں سوچتے ہیں کہ یہ لوگ جو سوچیں گے نتائج ویسے ہی ہوں گے ۔ یہ لوگ اپنے دشمنوں کے لیے ان کا انجام خود متعین کرتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ حالات کے نتائج ان کے اندازوں کے مطابق ہی ہوں گے ۔

اللہ یہاں اپنے ارادے کا اعلان کرتا ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں ہماری تقدیر یہ ہے ۔ یہاں فرعون' ہامان اور ان کے لشکروں کو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ تم جو تدابیر اختیار کر رہے ہو وہ تمہارے لیے مفید مطلب نہ ہوں گی ۔

وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ (٥) وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ (٦) (۲۸: ۵ – ٦) "اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انہیں پیشوا بنا دیں اور انہی کو وارث بنائیں اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں اور ان سے فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہی کچھ دکھلا دیں جس کا انہیں ڈر تھا"۔ یہ کمزور لوگ جن کو اس سرکش نے پوری طرح غلام بنا رکھا تھا' ان کے حالات میں اپنی مرضی سے تصرف کرتا تھا' ان کو سخت سے سخت سزائیں دیتا تھا' ان کے لڑکوں کو ذبح کرتا تھا۔ اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑتا تھا۔ اس تشدد اور ظلم و ستم کے باوجود وہ اپنی ذات اور اپنے اقتدار کے بارے میں ان عوام سے سخت خائف تھا۔ چنانچہ اس نے ان کے خلاف خفیہ پولیس قائم کر رکھی تھی اور ان کے ہاں جو بچہ بھی پیدا ہوتا اسے رپورٹ مل جاتی اور وہ اسے مذبح خانے کو بھیج دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک قصاب تھا۔ یہ مفلوک الحال مستضعفین تھے جن پر اللہ بے پناہ فضل و کرم کرنے والا تھا۔ ان کو اللہ وقت کا امام بنانا چاہتا تھا۔ دنیا کی قیادت ان کے حوالے کرنے والا تھا۔ ان کو غلامی اور اطاعت کے درجے سے نکال کر قائدانہ رول دینا چاہتا تھا کہ وہ زمین پر اقتدار کے مالک بن جائیں۔ (بعد میں جب وہ اس کے مستحق بنے تو ایسا ہی ہوا لیکن یہ استحقاق ایمان و صلاح کی بنیاد پر تھا)۔ وہ ثابت قدم اور قوت و شوکت کے مالک بن جائیں اور ان کے ہاتھوں وہ خطرات واقعات بن جائیں جو ان سے فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو لاحق تھے اور جن کے خلاف وہ ممکن حد تک احتیاطی تدابیر اختیار کیے ہوئے تھے لیکن ان کو یہ شعور نہ تھا کہ دست قدرت سے کیا ظاہر ہونے والا ہے۔

غرض واقعات قصہ کے بیان سے بھی پہلے یہاں مقاصد قصہ بیان کر دیے جاتے ہیں۔ موجودہ صورت حالات کو بھی قارئین کے سامنے رکھا جاتا ہے اور جو ہونے والا ہے اس کی جھلکی بھی دکھائی جاتی ہے تاکہ دونوں قوتیں باہم بالمقابل ہوں۔ ایک طرف فرعون کا ظاہری کروفر ہے جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جو کچھ چاہے کر سکتا ہے اور دوسری طرف اللہ کی وہ عظیم حقیقی قوت ہے جس کے مقابلے میں انسانی قوتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کی قوت کے سامنے سب قوتیں ضعیف' لاغر اور نیست و نابود ہونے والی ہیں۔

اس قصے کے بارے میں یہ اعلان اس سے قبل ہو جاتا ہے کہ اس کے مناظر کا آغاز کیا جائے جبکہ لوگ واقعات قصہ کے منتظر بیٹھے ہیں۔ ان کو انتظار ہے کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ اور جس طرح اعلان کیا گیا ہے یہ مستضعفین کس طرح اس عظیم قوت کو پاش پاش کر کے اقتدار اعلیٰ پر قابض ہو جائیں گے؟

یوں یہ قصہ زندگی سے بھرپور ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ شاید اسے قرآن کریم میں سورۂ قصص میں پہلی بار لایا گیا اور یوں نظر آتا ہے کہ اس کے مناظر اب پیش ہو رہے ہیں۔ یہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔ گویا واقعات اب پیش ہو رہے ہیں۔ یہ قرآن کریم کا منفرد انداز بیان ہے کہ وہ تاریخی نہیں بلکہ تمثیلی انداز میں قصص کو بیان کرتا ہے۔

--- ○○○ ---

اس قصے کا آغاز ہوتا ہے 'اس چیلنج کے بعد دست قدرت کے تصرفات کھلے کھلے اسکرین پر نظر آتے ہیں۔حضرت موسیٰ کی ولادت ہوتی ہے اور جن حالات میں ہوتی ہے وہ بیان کر دیئے گئے ہیں۔ولادت کے ساتھ ہی یہ خطرہ لاحق ہے کہ ان کی ولادت کی رپورٹ ہو جائے اور وہ فوراً موت کے منہ میں چلے جائیں 'ان کی گردن پر چھری چل پڑے اور ان کا سرزمین پر جا گرے۔

ان کی والدہ سخت پریشان ہے۔اسے ان کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ہر آن یہ خطرہ ہے کہ ان جلادوں کو اطلاع ہو جائے۔وہ جب سوچتی ہے کہ اس معصوم کی گردن پر چھری چل رہی ہے تو وہ کانپ اٹھتی ہے 'یہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس بچے کو اٹھائے ہوئے ہے۔اس کے پاس اس کے بچانے کی کوئی قوت نہیں ہے۔وہ اسے چھپا بھی نہیں سکتی۔وہ اس کی فطری آواز' رونے کی آواز کو بھی نہیں دبا سکتی۔کوئی حیلہ اور وسیلہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔وہ اکیلی ہے 'عاجز ہے اور مسکین ہے۔

اس نازک موقعہ پر دست قدرت حرکت میں آتا ہے۔اس حیران و پریشان ماں کا رابطہ عظیم قوت کے ساتھ ہو جاتا ہے۔اسے اس حالت خوف میں ہدایت مل جاتی ہے کہ وہ کیا کرے۔اسے یوں حکم دیا جاتا ہے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ ۚ

''ہم نے موسیٰ کی ماں کو اشارہ کیا کہ ''اس کو دودھ پلا' پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ خوف اور غم نہ کر''۔

کیا شان کبریائی ہے 'اللہ کی عظیم قدرت قابل دید ہے! حکم ہوتا ہے 'موسیٰ کی ماں اسے دودھ پلاؤ' اسے پالتی رہو' اپنی حفاظت میں رکھو۔اور جب بھی تم خطرہ محسوس کرو' اسے دریا میں ڈال دو' بے خطر ہو کر اسے موجوں کے سپرد کر دو' اگرچہ اس وقت وہ دودھ پی رہا ہو اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔

وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ (۲۸ : ۷) ''کچھ خوف اور غم نہ کر''۔وہاں دریا میں یہ اللہ کی نگرانی میں ہو گا۔ایسی قوت کی نگرانی میں کہ امن و سلامتی اسی کے جوار رحمت میں دستیاب ہے۔اس کی قوت کی نگرانی میں کسی کے لیے کوئی ڈر رہتا ہی نہیں۔یہ وہی ہاتھ ہے جو آگ کو گلزار بنا دیتا ہے۔آگ کو ٹھنڈا اور سلامتی والا بنا دیتا ہے۔جو سمندر کو جائے پناہ بنانے والا ہے جس کو یہ ہاتھ پناہ دے دے اس کو فرعون جیسا جابر بھی ہاتھ نہیں لگا سکتا بلکہ زمین کا کوئی جبار و قہار بھی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

''ہم اسے تیرے ہی پاس لے آئیں گے اور اس کو پیغمبروں میں شامل کریں گے''۔میں رب ذوالجلال تمہارے

ساتھ وعدہ کرتا ہوں کہ وہ تمہارے ہاتھوں میں لوٹا دیا جائے گا' اس کی زندگی کے لئے کوئی خطرہ نہ رہے گا اور مزید خوشخبری یہ ہے کہ وہ نبیوں میں سے ہو گا اور اللہ سے زیادہ سچا وعدہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟

یہ اس قصے کا پہلا منظر ہے ۔ایک ماں ہے جو حیران و پریشان ہے ۔اسے خوف لاحق ہے کہ اس کے بچے کو قتل کر دیا جائے گا ۔اس قتل کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اس لیے وہ اس تصور ہی سے بے تاب ہو جاتی ہے کہ اسے عالم بالا سے ہدایات ملتی ہیں' اسے خوشخبری دے دی جاتی ہے ۔وہ مطمئن ہو جاتی ہے اور اسے سکون ملتا ہے ۔ ڈرے اور سہمے ہوئے اس دل پر ایسا اثر ہوتا ہے جس طرح حضرت ابراہیم کے لیے آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو گئی تھی ۔سیاق کلام میں اس کی تفصیلات نہیں ہیں کہ ام موسیٰ کو یہ ہدایات کس طرح ملیں اور کس طرح انہوں نے ان پر عمل کیا ۔پس پردہ گر جاتا ہے اور جب پردہ اٹھتا ہے تو ہماری نظروں کے سامنے ایک دوسرا منظر ہے ۔

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ

"آخر کار فرعون کے گھر والوں نے اسے (دریا سے) نکال لیا" ۔کیا یہی امن تھا؟ کیا یہی وعدہ تھا؟ اور کیا یہی فرعون تک بشارت تھی؟ کیا اہل فرعون کے علاوہ کسی اور سے اس بیچاری کو کوئی ڈر تھا؟ ڈر تو یہی تھا کہ اس کے حالات سے ظالم فرعونی خبردار نہ ہو جائیں ۔ڈر تو صرف یہ تھا کہ یہ بچہ فرعون کے ہاتھ نہ لگ جائے ۔دیکھئے قدرت خداوندی کا کرشمہ کہ یہ بچہ ان کے ہاتھ میں محفوظ ہے ۔

ہاں 'یہی کچھ تھا' یہ دست قدرت کا کھلا چیلنج ہے اور نہایت ہی کھلا چیلنج ہے ۔فرعون اور ہامان کی عظیم سیاسی اور مالی قوت کو چیلنج ہے ۔یہ عظیم قوت رات دن بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہونے والے لڑکوں کا پیچھا کر رہی ہے ۔ان کو ڈر ہے کہ ان کا اقتدار' ان کا تخت' بلکہ خود ان کی ذات کو ان لوگوں سے خطرہ ہے ۔فرعونیوں نے خفیہ سروس اور خفیہ ایجنسیوں کا جال پھیلا رکھا تھا' وہ ایک ایک گھر پر نظر رکھتے تھے کہ کوئی بچہ بچ کر نہ نکل جائے ۔لیکن خالق حقیقی ان کی ان سرگرمیوں کا دفعیہ بغیر کسی قیل و قال' بغیر کسی خفیہ سروس کے خود ان کے ہاتھوں سے کر رہا ہے ۔خود ان سے اس بچے کی پرورش کرا رہا ہے ۔یہ کون سا بچہ ہے؟ اس بچے کے ہاتھوں ان کی اس عظیم قوت کو پاش پاش ہونا ہے ۔یہ بغیر سہارے' بغیر کسی ظاہری تدبیر کے' عاجزی اور ناتوانی کی انتہائی شدید کمزوری کے حالات میں ان کے ہاتھوں میں ہے اور یہ بیچاری ماں اسے ان کے حوالے کر رہی ہے ۔ایسے حالات میں کہ یہ بچہ اپنے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا ۔یہ خود اس بچے کو فرعون کے مضبوط قلعوں تک پہنچا دیتی ہے ۔اس ظالم کو اس بچے کی تلاش بھی نہیں کرنا پڑتی ۔جس طرح وہ ہر پیدا ہونے والے بچے کی تلاش رات دن جاری رکھتے تھے ۔جس کے ہاں بھی بچہ پیدا ہوتا' سرکار وہاں پہنچ جاتی ۔

دست قدرت نہایت ہی چیلنج کے انداز میں اپنے منصوبے کا صاف صاف اعلان کر دیتا ہے ۔

لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ

"تاکہ وہ ان کا دشمن اور ان کے لیے سبب رنج بنے" ۔یہ بچہ ان کے لیے ایک ایسا دشمن بن جائے جو ان کی قوت

کو چیلنج کرے اور ان کے لیے پریشانی کا باعث بن جائے۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا كَانُوا خَاطِئِينَ ﴿٨﴾

"واقعی فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر (اپنی تدبیر میں) بڑے غلط کار تھے"۔ وہ کس طرح ان کا دشمن بنے گا اور کس طرح باعث تشویش ہو گا حالانکہ وہ ان کے ہاتھ میں ہے اور بے بس ہے۔ اس کے پاس کوئی قوت نہیں ہے۔ اس کے پاس کوئی ظاہری ذریعہ اور تدبیر بھی نہیں ہے۔ سیاق کلام اس کا جواب خود دیتا ہے۔

وَقَالَتِ امْرَأَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّي وَلَكَ ۖ لَا تَقْتُلُوهُ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٩﴾

"فرعون کی بیوی نے (اس سے) کہا "یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل نہ کرو، کیا عجب کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا ہی بنالیں۔ اور وہ (انجام سے) بے خبر تھے"۔

یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ تھا کہ اس نے حضرت موسیٰ کو فرعون کے حصن حصین میں داخل کر دیا، پھر فرعون کی بیوی کے دل میں ان کی محبت ڈال دی اور یوں محبت کے مہین اور شفاف پردے میں حضرت موسیٰ کو محفوظ فرما دیا۔ حضرت موسیٰ کی حفاظت نہ اسلحہ سے کی گئی اور نہ مال و منال کے ذریعے کی گئی۔ اللہ نے فرعون کی بیوی کے دل میں اس کی محبت ڈال دی۔ اس طرح فرعون کی سختی، اس کی سنگدلی اور اس کی تمام احتیاطی تدابیر دھری کی دھری رہ گئیں۔ اور اللہ کے لیے یہ مشکل نہ تھا کہ وہ اس ضعیف بچے کو محبت کے ان مہین پردوں کے سوا بھی بچالے، لیکن یہ اس کی ایک شان ہے۔

قُرَّتُ عَيْنٍ لِّي وَلَكَ لَا تَقْتُلُوهُ (۲۸ : ۹) "یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل نہ کرو"۔ اس عورت کے سوا وہ سب کے لیے دشمن اور موجب پریشانی بننے والا ہے اور اسی کے ہاتھوں فرعون اور اس کا لشکر غرق ہونے والا ہے جبکہ ان کی سوچ یہ تھی :

عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا (۲۸ : ۹) "عجب ہے کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو، یا ہم اسے بیٹا بنالیں"۔

حالانکہ اس بچے کے ساتھ ان کا وہ انجام بندھا ہوا ہے جس سے وہ ایک طویل عرصہ سے ڈر رہے تھے اور جس کے خلاف وہ احتیاطی تدابیر اختیار کر رہے تھے۔ لیکن انہیں کیا خبر تھی۔

وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (۲۸ : ۹) "وہ انجام سے بے خبر تھے"۔ قدرت ان کے ساتھ مذاق کر رہی تھی۔ یہاں آکر یہ دوسرا منظر بھی ختم ہو جاتا ہے۔ پردہ گرتا ہے۔

یہ تو تھے حالات حضرت موسیٰ کے ۔ ان کی غم زدہ ماں کی حالت کیا تھی ؟ اس کی بے تابیوں کا کیا عالم تھا؟

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ؗ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

”ادھر موسیٰ کی ماں کا دل اڑا جا رہا تھا ‘ وہ اس کا راز فاش کر بیٹھتی ‘ اگر ہم اس کی ڈھارس نہ بندھا دیتے تاکہ وہ (ہمارے وعدے پر) ایمان لانے والوں میں سے ہو ۔ اس نے بچے کی بہن سے کہا اس کے پیچھے پیچھے جائے ۔ چنانچہ وہ الگ سے اس کو اس طرح دیکھتی رہی کہ (دشمنوں کو) اس کا پتہ نہ چلا“ ۔

اس نے عالم بالا کی طرف سے اشارہ پایا اور اپنے بچے کو دریا کی موجوں کے نذر کر دیا ۔ لیکن اب وہ کہاں جا رہا ہے اس کا کیا انجام ہونے والا ہے ؟ وہ دل میں سوچتی رہی ۔ کس طرح اس کے لیے ممکن ہوا کہ وہ اپنے جگر گوشے کو دریا کی موجوں کے حوالے کر دے ۔ کس طرح اس سے یہ ہو سکا جبکہ اس سے قبل کوئی ماں ایسا نہ کر سکی تھی ۔ اس حالت خوف میں کیا یہی سلامتی کا راستہ تھا؟ کیونکر یہ ممکن ہوا کہ اس نے آواز غیب پر اس طرح لبیک کہہ دیا؟

قرآن کریم اس بیچاری کی دلی کیفیات کی تصویر کشی عجیب انداز میں کرتا ہے ۔ یہ دل خالی اور فارغ ہے ۔ نہ اس میں عقل ہے ‘ نہ اسے کچھ سمجھ میں آ رہا ہے ‘ نہ کوئی سوچ ہے اور نہ کوئی تدبیر ہے ۔

اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ (۲۸ : ۱۰) ”قریب تھا کہ وہ راز فاش کر بیٹھتی“ ۔ اور وہ مجنونہ کی طرح چیخ اٹھتی کہ میں نے اسے رکھا ہے ‘ میں نے اسے رکھا ہے ‘ تمام لوگوں کو خبر ہو جاتی اور قریب تھا کہ وہ پکار اٹھتی کہ میں نے اسے دریا برد کیا ہے اور ایک غیبی آواز پر میں نے ایسا کیا ہے ۔

لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا (۲۸ : ۱۰) ”اگر ہم اس کی ڈھارس نہ بندھا دیتے“ ۔ اس کے دل کو سخت نہ کر دیتے ‘ اس کے اندر قوت برداشت نہ پیدا کر دیتے ۔ اور اسے چیخ و پکار اور آہ و فغاں سے روک نہ دیتے تو وہ اس راز کو فاش کر دیتی ۔

لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۸ : ۱۰) ”تاکہ وہ ایمان لانے والوں میں سے ہو“ ۔ اسے اللہ کے وعدے کا پورا یقین ہو جائے ‘ اور اللہ کی راہ میں ابتلا پر صبر کرنے اور اس پر جمے رہنے کا مقام مل جائے ‘ اور وہ راہ ہدایت پر چلنے والی بن جائے ۔

لیکن ام موسیٰ پھر بھی تقاضائے فطرت انسانی تجسس سے نہ رکی ۔ اپنی سی کوشش اس نے کی ۔

وَ قَالَتْ لِاُخْتِہٖ قُصِّیْہِ (۲۸ : ۱۱) "اس نے بچے کی بہن سے کہا اس کے پیچھے پیچھے جاؤ"۔ ذرا دیکھتی جاؤ کہ کیا ہوتا ہے۔ دیکھو کہ یہ زندہ رہتا ہے؟ اگر رہتا ہے تو کیونکر رہتا ہے۔ اسے مچھلیاں کھا جاتی ہیں یا خشکی کے درندے کھا جاتے ہیں۔ کہاں ڈوبتا ہے اور کہاں رکتا ہے؟

بہن نے نہایت ہی خفیہ انداز میں نہایت ہی احتیاط کے ساتھ اس کا پیچھا کیا۔ راستوں اور بازاروں میں اس کی خبریں تلاش کرتی رہی۔ آخر کار اس کو معلوم ہو گیا کہ دست قدرت نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس نے دور سے دیکھ لیا کہ فرعون کے نوکروں نے اسے دریا سے پکڑ لیا ہے۔ بچہ دودھ نہیں پی رہا ہے اور نوکر اس کے لیے دودھ پلانے والی کی تلاش میں ہیں۔

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِن قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ أَهْلِ بَيْتٍ يَكْفُلُونَهُ لَكُمْ وَهُمْ لَهُ نَاصِحُونَ ﴿١٢﴾

"اور ہم نے بچے پر پہلے ہی دودھ پلانے والیوں کی چھاتیاں حرام کر رکھی تھیں۔ (یہ حالت دیکھ کر) اس لڑکی نے ان سے کہا "میں تمہیں ایسے گھر کا پتہ بتاؤں جس کے لوگ اس کی پرورش کا ذمہ لیں اور خیر خواہی کے ساتھ اسے رکھیں"۔

قدرت الٰہیہ کے اس تجربے پر غور کیجئے' اسے پیدا کیا گیا ہے اور اس کو پالا گیا ہے اس لیے کہ فرعون اور اس کی قوم کے لیے باعث ہلاکت ہو' لیکن تدبیر یوں ہے کہ وہ خود اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں' اس کے ساتھ محبت کرتے ہیں' اس کے لیے دودھ پلانے والی کو تلاش کرتے ہیں۔ دست قدرت اس پر تمام پلانے والیوں کا دودھ حرام کر دیتا ہے۔ دودھ پلانے والیاں دودھ پیش کرتی ہیں اور وہ پستان منہ میں نہیں لیتا۔ انہیں یہ خوف لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں وہ مر ہی نہ جائے۔ اس کی بہن دور سے یہ منظر دیکھتی ہے۔ قدرت اس کے لیے بات کرنے کے مواقع پیدا کر دیتی ہے۔ وہ آگے بڑھ کر پیشکش کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ کیا میں تمہیں ایک ایسی عورت کا پتہ دے دوں جو اس کی اچھی طرح تربیت کرے اور وہ اس کے لیے خیر خواہ بھی ہو؟ وہ خوشی خوشی اس پیشکش کو منظور کر لیتے ہیں۔ وہ امید کرتے ہیں کہ اگر یہ بچہ اس عورت کا دودھ لے لے' اور اس طرح موت سے بچ جائے تو بہت ہی اچھا ہو کیونکہ یہ بہت ہی پیارا بچہ ہے۔

اب یہاں یہ چوتھا منظر بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اب ہم اس کڑی کے پانچویں اور آخری منظر کے سامنے ہیں۔ یہ بچہ اب اپنی بے تاب ماں کی گود میں ہے۔ اس کو سکون مل گیا ہے۔ شاہی بچے کو دودھ پلانے کی وجہ سے ایک بلند مقام بھی مل گیا ہے۔ فرعون اور اس کی بیوی دونوں اس بچے کا خیال رکھتے ہیں' خوف کے سائے اس کے ارد گرد منڈلاتے ہیں لیکن وہ نہایت ہی پر سکون زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ ہیں دست قدرت کی صنعت کاریاں۔ قدرت کے اس تجربے کی پہلی کڑی یہاں اختتام کو پہنچی ہے۔

---ooo---

فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ وَ لِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ
۱۲ اع حَقٌّ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۠ (۱۳) الربع
۴

"اس طرح ہم موسیٰ کو اس کی ماں کے پاس پلٹا لائے تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو اور جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچا تھا مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے ان مناظر کے بعد اب سیاق کلام کے اندر کئی سالوں کا وقفہ ہے۔ قصے کا اگلا حصہ آپ کے شباب کے زمانے سے متعلق ہے۔ جب حضرت موسیٰ کو دودھ پلانے کے لیے ان کی ماں کے حوالے کر دیا گیا تو اس کے بعد کیا حالات پیش آئے' اس کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔ قصر فرعون کے اندر آپ کے شب و روز کیسے رہے اور یہ کہ زمانہ رضاعت کے اختتام کے بعد اپنی ماں کے ساتھ اس کا رابطہ کیسے تھا۔ یہ کہ بلوغ اور شباب کے بعد قصر شاہی میں آپ کا مقام و مرتبہ کیا تھا۔ آپ کا عقیدہ کیا تھا۔ بہرحال وہ فرعون اور اس کے کاہنوں کے درمیان باری تعالیٰ کی نگرانی میں تیار ہو رہے تھے تاکہ وہ اپنا فریضہ ادا کریں۔ اس طویل وقفے کے بعد پھر یہ حالات پیش آئے۔ بہرحال شباب اور بلوغ تک پہنچنے کے ساتھ ہی آپ کی علمی اور روحانی تربیت مکمل ہوئی۔ اللہ نے آپ کو علم و حکمت عطا کیا اور یہ تھی جزا نیک لوگوں کی۔

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰٓى اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (۱۴)

"جب موسیٰ اپنی پوری جوانی کو پہنچ گیا اور اس کی نشوونما مکمل ہو گئی تو ہم نے اسے حکم اور علم عطا کیا' ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں"۔

"بلوغ اشد" کے معنی ہیں جب آپ کی جسمانی قوتیں مکمل ہو گئیں اور استواء کا مفہوم ہے جسمانی اور عقلی اعتبار سے پختگی تک پہنچنا۔ یہ درجہ بالعموم تیس سال کی عمر میں حاصل ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس عرصے تک حضرت موسیٰ کیا فرعون کے قصر شاہی ہی میں رہے؟ اور فرعون اور اس کی بیوی کے لے پالک اور متبنیٰ رہے یا یہ ان سے علیحدہ ہو گئے اور انہوں نے قصر شاہی کو چھوڑ دیا۔ اس لیے کہ شاہی محلات کے گندے اور سڑے ہوئے ماحول میں کسی ایسے شخص کا رہنا ممکن ہی نہیں جس کی روح پاک و صاف ہو اور جس سے مستقبل میں نبوت کا کام لیا جانا ہے۔ خصوصاً جبکہ ان کی ماں نے ان کو یہ بات بتا دی ہو گی کہ ان کی شناخت کیا ہے۔ ان کی قوم کیا ہے اور ان کا دین کیا ہے اور اس کے بعد جب وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ ان کی قوم پر کس قدر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں' ان کو کس قدر ذلیل و خوار کر کے رکھا جا رہا ہے اور معاشرے کے اندر ایک ہمہ گیر فساد برپا ہے اور ہر طرف ظلم و تشدد کا دور دورہ ہے۔

لیکن ہمارے پاس ان کی اس زندگی کے بارے میں کوئی مستند ذریعہ علم نہیں ہے۔ البتہ بعد میں آنے والے واقعات کی

بنیاد پر انسان ان کی اس زندگی کے بارے میں قیاس کر سکتا ہے۔ بعد میں ہم اس پر تبصرہ کریں گے۔ یہاں اس پر غور کرنا ہے کہ علم و حکمت عطا کرنے کے بعد اللہ نے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے۔

وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (۲۸ : ۱۴) ''ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پاکیزگی اور احسان کی زندگی اپنائی تھی اور یہ علم و حکمت جزائے احسان تھا۔

وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَىٰ حِينِ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَٰذَا مِن شِيعَتِهِ وَهَٰذَا مِنْ عَدُوِّهِ ۖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِن شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ فَوَكَزَهُ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ ۖ قَالَ هَٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ ﴿١٥﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿١٦﴾ قَالَ رَبِّ بِمَا أَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ ﴿١٧﴾

''(ایک روز) وہ شہر میں ایسے وقت داخل ہوا جبکہ اہل شہر غفلت میں تھے۔ وہاں اس نے دیکھا کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں۔ ایک اس کی اپنی قوم کا تھا اور دوسرا اس کی دشمن قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی قوم کے آدمی نے دشمن قوم والے کے خلاف اسے مدد کے لیے پکارا۔ موسیٰ نے اس کو ایک گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ (یہ حرکت سرزد ہوتے ہی) موسیٰ نے کہا ''یہ شیطان کی کارفرمائی ہے' وہ سخت دشمن اور کھلا گمراہ کن ہے''۔ پھر وہ کہنے لگا ''اے میرے رب' میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا' میری مغفرت فرما دے''۔ چنانچہ اللہ نے اس کی مغفرت فرما دی' وہ غفور و رحیم ہے۔ موسیٰ نے عہد کیا کہ ''اے میرے رب' یہ احسان جو تو نے مجھ پر کیا ہے' اس کے بعد اب میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا''۔

''وہ شہر میں داخل ہوا'' اور شہر سے مراد دارالخلافہ ہے' جس طرح کہ اس وقت وہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کہاں سے آئے اور شہر میں داخل ہوئے۔ کیا یہ عین الشمس کے قصر شاہی سے نکل کر آئے یا یہ کہ انہوں نے شاہی محل اور دارالحکومت کو چھوڑ دیا تھا اور کسی اور جگہ رہائش اختیار کر لی تھی اور وہ شہر میں اس وقت داخل ہوئے جب لوگ غافل تھے یعنی دوپہر کا وقت تھا یا لوگوں کے آرام کا وقت تھا۔

جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں۔

فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَٰذَا مِن شِيعَتِهِ وَهَٰذَا مِنْ عَدُوِّهِ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِنْ

شِيعَتِهٖ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهٖ (۲۸ : ۱۵) "وہاں اس نے دیکھا کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں۔ایک اس کی اپنی قوم کا تھا اور دوسرا اس کی دشمن قوم سے تعلق رکھتا تھا۔اس کی قوم کے آدمی نے دشمن قوم والے کے خلاف اسے مدد کے لیے پکارا"۔ ان میں سے ایک قبطی تھا۔کہا جاتا ہے کہ یہ فرعون کے مصاحبین میں سے تھا' بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ شاہی محل کا باورچی تھا اور دوسرا اسرائیلی تھا۔یہ دونوں آپس میں لڑ رہے تھے۔تو بنی اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدد کے لیے پکارا کیونکہ قبطی دونوں کا دشمن تھا۔یہ کیسے ہوا؟ یہ کس طرح ممکن ہوا کہ ایک عام اسرائیلی فرعون کے پروردہ شخص کو خود فرعون کے ملازم یا اس کی قوم کے آدمی کے خلاف پکار رہا ہے۔اگر موسیٰ علیہ السلام کو بدستور شاہی محل میں فرض کر لیا جائے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ فرعون کے متبنی کو ایک دوسرے فرعونی کے خلاف پکارا جائے۔یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ فرض کیا جائے کہ انہوں نے شاہی محل کو ترک کر دیا ہے اور فرعون سے ان کے رابطے ختم ہیں۔بنی اسرائیل میں یہ بات پھیل گئی ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل سے ہیں اور یہ کہ وہ بادشاہ اور اس کے حاشیہ نشینوں کے خلاف ہیں اور اب وہ اپنی پسی ہوئی قوم کی حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔موسیٰ علیہ السلام جیسا مقام و مرتبہ رکھنے والے شخص کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ قصر شاہی سے نکل گئے ہوں کیونکہ آپ کا پاک نفس شر و فساد کے اس گندے نالے میں کس طرح رہ سکتا تھا۔

فَوَكَزَهٗ مُوسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ (۲۸ : ۱۵) "موسیٰ نے اس کو ایک گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا"۔ وکز اس ضرب کو کہتے ہیں جو انسان پورے ہاتھ کے ساتھ دوسرے کو لگائے۔انداز بیان سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہی گھونسے کے ساتھ قبطی ڈھیر ہو گیا۔اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کس قدر مضبوط اور قوی جوان تھے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ منفعل المزاج تھے اور سخت غصے والے تھے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں فرعونیوں اور فرعون کے خلاف سخت نفرت تھی۔

لیکن قرآن کریم کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس قبطی کو قتل کرنا نہ چاہتے تھے۔یہ نہ چاہتے تھے کہ اس کی جان لے لی جائے' جونہی آپ نے دیکھا کہ وہ تو آپ کے سامنے ٹھنڈا پڑا ہے' آپ پشیمان ہو گئے کہ آپ نے یہ غلط کام کر ڈالا۔آپ نے اسے شیطانی کام کہا کیونکہ یہ غصے کی وجہ سے کام ہوا اور غصہ شیطانی عمل ہوتا ہے یا یہ شیطان کی اکساہٹ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ (۲۸ : ۱۵) "موسیٰ نے کہا یہ شیطان کی کارفرمائی ہے وہ سخت دشمن اور کھلا گمراہ کن ہے"۔ حضرت موسیٰ مزید کہتے ہیں کہ غصے کی وجہ سے انہوں نے اس فعل کا ارتکاب کیا۔وہ اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے اس لغزش کا ارتکاب کر کے اپنے اوپر ظلم کیا۔چنانچہ آپ رب تعالیٰ سے طلب مغفرت کرتے ہیں۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ فَغَفَرَ لَهٗ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ

"پھر وہ کہنے لگا اے میرے رب' میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا' میری مغفرت فرما دے - چنانچہ اللہ نے اس کی مغفرت فرما دی' وہ غفور و رحیم ہے"۔ اللہ نے آپ کی عاجزانہ دعا کو قبول کر لیا۔ کیونکہ آپ کو غلطی کا احساس ہو گیا اور فوراً استغفار کر لیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام اپنے کانپتے ہوئے دل اور اپنے تیز احساس اور اپنی توجہ الی اللہ سے محسوس کر لیا کہ ان کے رب نے ان کو بخش دیا ہے۔ قلب مومن کو جب اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے تو وہ محسوس کر لیتا ہے اور جب دعا قبول ہوتی ہے تو بھی اسے احساس ہو جاتا ہے کہ دعا قبول ہو گئی' انسان اپنے تقویٰ خدا خوفی اور اپنے احساس کی وجہ سے اس مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام اپنے تیز شعور' اپنی طہارت قلبی اور اتصال باللہ کے ذریعہ یہ محسوس کر لیتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا ہے تو آپ فوراً اپنے اوپر لازم کرتے ہیں کہ رب' آپ نے مجھ پر جو انعامات کیے ہیں میں آیندہ ان کا شکر ادا کروں گا کہ مجرموں کے مددگار نہ بنوں گا۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ (۲۸ : ۱۷) "اے میرے رب' یہ احسان جو تو نے مجھ پر کیا ہے اس کے بعد میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا"۔

حضرت موسیٰ کی طرف سے یہ عام عہد ہے کہ وہ مجرموں کا معین و مددگار نہ بنیں گے یعنی آپ نے جرم اور مجرمین سے اپنی برات کا اظہار کیا' ہر حال اور ہر صورت میں۔ اگرچہ بعض اوقات ان کا طبعی غصہ انہیں اس بات پر مجبور کر دے۔ بعض اوقات ظلم اور تشدد کے نتیجے میں ایک معتدل مزاج میں بھی تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔

آپ یہ عہد اس لیے کر رہے ہیں کہ اللہ نے آپ کی دعا قبول فرمائی۔ پھر اللہ کے ان انعامات کے بدلے بطور شکر انہوں نے یہ عہد کیا کہ اللہ نے ان کو جسمانی قوت اور علم و حکمت سے نوازا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر نیکی اور صراط مستقیم پر چلنے کا یہ ارتعاش اور اس سے قبل اپنی قوم کے حق میں مشتعل ہونے اور انتقام لینے کا ارتعاش یہ بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت میں کس قدر سیمابیت تھی۔ آپ کا وجدان تیز' انتقام سخت تھا اور دوسرے مقامات پر آپ کی شخصیت کا یہ پہلو بار بار ظہور پذیر ہتا ہے۔ بلکہ اگلے ہی منظر میں دیکھئے کہ آپ پھر اپنی قوم کے شخص پر غصہ ہوتے ہیں۔

فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ۭ قَالَ لَهٗ مُوْسٰٓى اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝ فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ڰ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝

"دوسرے روز وہ صبح سویرے ڈرتا اور ہر طرف سے خطرہ بھانپتا ہوا شہر میں جا رہا تھا کہ یکایک کیا دیکھتا ہے کہ وہی

شخص جس نے کل اسے مدد کے لیے پکارا تھا' آج پھر اسے پکار رہا ہے۔ موسیٰ نے کہا "تو تو بڑا ہی بہکا ہوا ہے"۔ پھر جب موسیٰ نے ارادہ کیا کہ دشمن قوم کے آدمی پر حملہ کرے تو وہ پکار اٹھا "اے موسیٰ! کیا آج تو مجھے اسی طرح قتل کرنے لگا ہے جس طرح کل ایک شخص کو قتل کر چکا ہے؟ تو اس ملک میں جبار بن کر رہنا چاہتا ہے' اصلاح کرنا نہیں چاہتا"۔

پہلے معرکے میں تو قبطی کا کام تمام ہو گیا تھا' اس فعل پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہت ندامت ہوئی۔ آپ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ نے اس غلطی پر استغفار کیا اور آپ کو معاف کر دیا گیا۔ اور آپ نے اب عہد کر لیا کہ آپ کبھی بھی مجرمین کے معین و مددگار نہ ہوں گے۔

وہ دن تو گزر گیا لیکن آپ اس شہر میں ڈرے سہمے پھر رہے تھے شاید یہ راز کھل نہ گیا ہو۔ آپ ہر وقت راز کے انکشاف اور شرمندگی اور سزا سے خائف تھے۔ لفظ یَتَرَقَّبُ میں یہ تمام مفہوم موجود ہیں۔ آپ کی ہیئت سے بھی ظاہر تھا کہ آپ کسی پریشانی میں گھوم رہے ہیں۔ سہمے ہوئے' ہر لمحہ اور ہر لحظہ کسی خطرناک صورت حالات کی توقع کرتے ہوئے۔ ایک منفعل مزاج شخص کی حالت ہمیشہ ایسی ہوتی ہے کہ ذرا سا کھٹکا بھی اس کی حرکات و سکنات کو ظاہر کر دیتا ہے۔ یترقب سے خوف اور پریشانی کا اچھی طرح اظہار ہوتا ہے۔ یترقب کے بعد فی المدینہ سے اس میں مزید مبالغہ آ جاتا ہے کیونکہ شہر تو ہمیشہ امن و امان کی جگہ ہوتی ہے۔ لیکن وہ اس پر امن شہر میں بھی خائف ہیں اور سب سے بڑا خوف وہ ہوتا ہے جو انسان کو اپنے گھر اور جائے امن میں لاحق ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ پریشانی کن حالت قطعی طور پر بتاتی ہے کہ آپ اس وقت شاہی محل سے منسلک نہیں ہیں' کیونکہ شاہی محل کے لوگوں کو کسی ظلم و فساد کے نتیجے میں کوئی ڈر لاحق نہیں ہوتا۔ اگر آپ شاہی محل ہی میں مقیم ہوتے تو قرآن کریم' آپ کے لیے۔

فِی الْمَدِیْنَۃِ خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ (۲۸ : ۱۸) کے الفاظ استعمال نہ کرتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسے ہی حالات میں پھر رہے تھے کہ وہ ایک نیا منظر دیکھتے ہیں :

فَاِذَا الَّذِی اسْتَنْصَرَہٗ بِالْاَمْسِ یَسْتَصْرِخُہٗ (۲۸ : ۱۸) "یکایک کیا دیکھتے ہیں کہ وہی شخص جس نے کل اسے مدد کے لیے پکارا تھا آج پھر اسے پکار رہا ہے"۔ یہ وہی شخص ہے جس کی کل انہوں نے قبطی کے خلاف طرف داری کی تھی۔ یہی شخص اب کسی دوسرے قبطی کے ساتھ الجھ رہا ہے۔ اور حضرت موسیٰ کو پکار رہا ہے کہ بچاؤ مجھے اس سے۔ شاید اس کا خیال یہ تھا کہ حضرت موسیٰ اس دوسرے مشترکہ دشمن پر ایک ضرب کلیم لگائیں اور یہ بھی اسی طرح ڈھیر ہو جائے۔

لیکن حضرت موسیٰ کے ذہن پر تو کل کے مقتول کی سوچیں چھائی ہوئی تھیں اور اس پر انہوں نے اللہ سے معافی بھی مانگ لی تھی اور معافی ملنے کے بعد اللہ سے آپ نے عہد کر لیا تھا کہ آئندہ آپ کسی مجرم کے طرفدار نہ ہوں گے اور سابقہ فعل کے راز کے افشا کا خوف بھی ابھی زندہ تھا۔ اب آپ کو اس شخص پر غصہ آ گیا جو مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ آپ نے غصے میں اس شخص سے کہا کہ تم تو بہت بڑے شرپسند ہو۔

قَالَ لَهٗ مُوْسٰٓی اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ (۲۸ : ۱۸) "موسیٰ نے کہا تو بڑا ہی بہکا ہوا آدمی ہے" یعنی تو ایسا آدمی ہے کہ ہر کسی کے ساتھ الجھتا ہے اور تمہارا یہ الجھاؤ ختم نہیں ہوتا' ہر کسی کے ساتھ تیرا جھگڑا ہے' جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے ۔ اس طرح تو بنی اسرائیل پر کوئی بڑی مصیبت لے آئے گا اور ان کی پوزیشن یہ ہے کہ نہ وہ انقلاب لا سکتے ہیں اور نہ مزید تشدد کے متحمل ہو سکتے ہیں ۔ وہ اس وقت کوئی تعمیری تحریک چلانے کی پوزیشن میں نہیں ۔ لہٰذا اس قسم کی جزوی جھڑپوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے ۔

لیکن اس تنبیہہ کے بعد بھی موسیٰ علیہ السلام کو اس قبطی پر غصہ آ گیا ۔ موسیٰ علیہ السلام اس پر اسی طرح جھپٹے جس طرح انہوں نے گزشتہ روز کیا تھا اور اس کا کام بھی اسی طرح تمام کر دیں جس طرح کل انہوں نے کیا تھا ۔ یہاں بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ کی جلالی طبیعت قبطیوں کے مظالم کو برداشت نہ کر سکتی تھی ۔ آپ مشتعل ہو گئے کیونکہ قبطیوں کے مظالم حد سے بڑھ گئے تھے ۔ اس لیے ظلم و سرکشی کے خلاف ان کا یہ ردعمل فطری تھا جبکہ یہ مظالم ایک طویل عرصے سے ہو رہے تھے اور بنی اسرائیل کے دلوں میں ان لوگوں کے خلاف نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور بہت گہری ہو چکی تھی ۔

فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ یَّبْطِشَ بِالَّذِیْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا قَالَ یٰمُوْسٰٓی اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ اِنْ تُرِیْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ وَ مَا تُرِیْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ (۲۸ : ۱۹) "پھر جب موسیٰ نے ارادہ کیا کہ دشمن قوم کے آدمی پر حملہ کرے تو وہ پکار اٹھا "اے موسیٰ! کیا آج تو مجھے اسی طرح قتل کرنے لگا ہے جس طرح کل ایک شخص کو قتل کر چکا ہے؟ تو اس ملک میں جبار بن کر رہنا چاہتا ہے' اصلاح کرنا نہیں چاہتا" ۔ ایسی باتیں اس وقت عام ہو جاتی ہیں جب معاشرہ فساد پذیر ہو' اس میں مظالم عام ہو جائیں' معاشرہ سے اعلیٰ قدریں ختم ہو جائیں' ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہو ۔ ظلم کی وجہ سے لوگوں کا دم گھٹنے لگے ۔ حالات' قوانین اور رسم و رواج سب خراب ہو جائیں اور انسانوں کی فطرت اس طرح بدل جائے کہ لوگ ظلم کو دیکھیں اور ان کے اندر کوئی ردعمل پیدا نہ ہو ۔ ان پر زیادتی ہو رہی ہو اور ان کے نفوس کے اندر کوئی جوش مدافعت پیدا نہ ہو ۔ بلکہ لوگوں کی فطرت میں اس قدر بگاڑ پیدا ہو جائے کہ لوگ ان مظلوموں کو برا کہنے لگیں جو اپنی مظلومی کا دفاع کرتے ہوں اور جو شخص حق کا ساتھ دے اور ظلم کے خلاف آواز اٹھائے' اسے کہا جائے کہ یہ شرپسند اور دہشت گرد ہے ۔ اور یہ زبردستی اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتا ہے ۔ یہ الفاظ کہ "تو نے کل ایک شخص کو قتل کیا ہے اور جبار بن کر رہنے والا ہے" قبطی نے حضرت موسیٰ سے کہے ۔ اس لیے کہ ان قبطیوں نے یہی دیکھا تھا کہ اسرائیلیوں پر ہر طرف سے مظالم ہو رہے تھے اور وہ سر نہ ہلاتے تھے ۔ اس طرح ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ ایک اعلیٰ اخلاقی اصول ہے اور یہ فضائل اخلاق میں سے ہے اور نہایت مہذب زندگی ہے اور اعلیٰ اخلاقی رویہ ہے اور اسی میں معاشرے کی اصلاح و فلاح ہے کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے ۔ جب اس قسم کے لوگ دیکھتے کہ اور مظلوموں کے رویہ کے برعکس یہ شخص مدافعت کرتا ہے اور حکمرانوں نے جو غلامانہ اخلاقی نظام جاری کر رکھا تھا اور جس کے مطابق لوگ زندگی بسر کر رہے تھے اس کے خلاف

ایک شخص بغاوت کر رہا ہے تو یہ بات ان کے لیے انوکھی ہوتی تھی۔ اور ان کو خوف لاحق ہو جاتا تھا۔ وہ الٹا مظلوم کو جبار و قہار کہتے تھے اور اس پر دہشت گردی اور بداخلاقی کا الزام لگاتے تھے۔ الٹا مظلوم کو لعنت و ملامت کرتے تھے۔ ظالم تک ان کی لعنت و ملامت کا بہت ہی کم حصہ پہنچتا تھا۔ مظلوم کے لیے ان کے ذہنوں میں مدافعت کا کوئی جواز نہ تھا۔ اگرچہ وہ بند گلی تک پہنچ جانے کے بعد کوئی جسورانہ اقدام کرنے پر مجبور ہو گیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل پر ایک عرصے تک ظلم ہوتا رہا۔ موسیٰ علیہ السلام دیکھتے دیکھتے عاجز آ گئے۔ ان کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے وہ ایک اسرائیلی کی مدافعت کرتے ہیں اور نادم ہو جاتے ہیں لیکن حالات کا دباؤ اس قدر شدید ہے کہ وہ دوبارہ وہی فعل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور قریب ہے کہ وہ یہ کام کر گزریں۔ آپ ارادہ کر لیتے ہیں کہ اس شخص کو پکڑ لیں جو ان کا' اور ان کی قوم کا دشمن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ان کے اس فعل پر' حضرت موسیٰ کو چھوڑ نہ دیا بلکہ اللہ نے ان کی تربیت کی اور ان کی دعا کو قبول کیا۔ کیونکہ اللہ علیم و خبیر ہے۔ اس کو اچھی طرح معلوم ہے کہ انسان کس قدر قوت برداشت رکھتا ہے۔ جب ظلم شدید ہوتا ہے اور انصاف کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ تو مظلوم مجبور ہو کر حملہ کرتا ہے اور کسی بھی جسورانہ اقدام پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لہذا قرآن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے ارتکاب قتل کے فعل کو زیادہ خوفناک انداز میں بیان نہیں کیا' جس طرح ایسے کام کو وہ سوسائٹیاں بہت ہی خوفناک سمجھتی ہیں جن کی فطرت اور جن کا ضمیر غلامی کے مظالم سہتے سہتے بدل جاتا ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ حالات کے دباؤ اور تشدد کے جواب میں لوگ ایسے کام پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب ان کی قوت برداشت جواب دے دیتی ہے۔

قرآن کریم ان دونوں واقعات کا جس انداز میں ذکر کرتا ہے اس سے یہی تاثر ملتا ہے۔ قرآن نہ تو ان اقدامات کے لیے وجہ جواز بیان کرتا ہے اور نہ ہی ان کی برائی میں مبالغہ آرائی کرتا ہے۔ البتہ قرآن نے اس کو نفس پر ظلم اس لیے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس مقام پر قومیت کے جذبات کا اظہار کیا جب کہ وہ ہونے والے رسول تھے' اور اللہ تعالیٰ خود اپنی نگرانی میں ان کی تربیت فرما رہا تھا۔ یا اس وجہ سے کہ حضرت موسیٰ نے فرعون کے مظالم پر قبل از وقت کشمکش شروع کر دی تھی اور اللہ کا ارادہ اور اس کی اسکیم یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو پوری طرح اجتماعی نجات ملے۔ کیونکہ انفرادی جھڑپوں کے نتیجے میں کوئی اجتماعی تبدیلی ممکن نہیں ہوتی جس طرح مکہ میں مسلمانوں کو یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ ہاتھ روکے رکھیں۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ شاید پہلے قتل کی بات پورے مصر میں پھیل گئی تھی۔ حضرت موسیٰ کے بارے میں حکومتی حلقوں میں شبہات پھیل گئے تھے کیونکہ اس سے قبل فرعون اور اس کی کارروائیوں پر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کر چکے تھے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت موسیٰ کے ساتھی اسرائیلی نے بھی بطور افتخار اور مسرت اس راز کو پھیلا دیا ہو گا۔ خصوصاً بنی اسرائیل کے اپنے حلقوں کے اندر تو یہ تیزی سے پھیل گیا ہو گا۔ اور باہر والوں کے کان میں بھی بھنک پڑ گئی ہو گی۔

ہم اس کو اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ ایسے حالات میں موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے فرعون کے حاشیہ نشینوں میں سے کسی کو قتل کرنا ہر اسرائیلی کے لیے خوشی اور مسرت کی بات تھی۔ اس طرح ان کے غیظ و غضب کی آگ ٹھنڈی ہو سکتی تھی۔ ایسی باتیں بالعموم ایک سے دوسرے کی طرف بڑی تیزی سے پھیل جاتی ہیں۔ اور بعض اوقات ایک حلقے سے

نکل کر دوسرے حلقوں تک جا پہنچتی ہیں جبکہ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مشہور بھی تھا کہ وہ اس فرعونی تشدد پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور مظلوموں کی حمایت کرتے رہتے ہیں۔

جب موسیٰ نے یہ ارادہ کیا کہ دوسرے قبطی کو پکڑ کر گوشمالی کریں تو اس نے پکار کر ان سے پہلے قبطی کے قتل کا الزام لگا دیا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ موسیٰ اسے پکڑنے ہی والے ہیں۔ اور شاید ضرب کلیم اس کے لیے بھی جان لیوا ثابت ہو تو وہ پکار اٹھا۔

اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِىْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ (۲۸:۱۹) رہی باقی عبارت اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِى الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ (۲۸:۱۹) "تم مجھے اسی طرح قتل کرنا چاہتے ہو جس طرح کل تم ایک شخص کو قتل کر چکے ہو تو اس ملک میں جبار بن کر رہنا چاہتا ہے تو اصلاح کرنا نہیں چاہتا"، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت اصلاح کی کوئی تحریک شروع کر رکھی تھی اور وہ مصلح مشہور تھے' اس لیے وہ شخص آپ پر الزام لگاتا ہے کہ تم اپنے منشور کے خلاف عمل کر رہے ہو۔ تم ایک جبار شخص کی طرح اس ملک میں رہنا چاہتے ہو۔ اصلاح احوال کے بجائے لوگوں کو قتل کرنا چاہتے ہو۔ جس طرح یہ شخص حضرت موسیٰ پر الزام لگا رہا ہے اور جس انداز میں حضرت موسیٰ کو مخاطب کر رہا ہے ان دونوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں حضرت موسیٰ فرعون کے مقربین اور اہل خانہ میں سے نہ تھے۔ ورنہ کوئی مصری ان پر الزام لگانے کی اس قدر جسارت نہ کر سکتا تھا اور اس کا انداز خطاب بھی ایسا نہ ہو سکتا تھا۔

بعض مفسرین نے کہا کہ یہ فقرے اس اسرائیلی کے ہیں جس کی حمایت میں آپ قبطی کو پکڑنا چاہتے تھے' اس قبطی کے نہیں ہیں۔ کیونکہ حضرت موسیٰ نے اسرائیلی کو ڈانٹا تھا۔

اِنَّكَ لَغَوِىٌّ مُّبِيْنٌ (۲۸:۱۸) "تو تو بڑا ہی بہکا ہوا آدمی ہے"۔ اس فقرے کے بعد جب موسیٰ قبطی کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھے تو اس اسرائیلی نے یہ گمان کیا کہ شاید ضرب کلیم مجھ پر پڑنے والی ہے تو وہ خوف کے مارے یہ الزام لگا گیا اور راز فاش کر دیا۔ ان مفسرین نے یہ رائے اس لیے اختیار کی ہے کہ یہ راز مصر میں راز ہی تھا کہ اس شخص کا قاتل کون ہے؟

لیکن زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ بات قبطی نے کہی ہو۔ ہم نے بتا دیا ہے کہ یہ راز چپکے چپکے پورے شہر میں پھیل گیا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ مصری نے اپنی فراست اور دانش مندی سے یہ الزام لگا دیا ہو کہ مقتول مجہول کے قاتل موسیٰ ہی ہو سکتے ہیں۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب موسیٰ پر اس شخص نے قتل کا الزام لگایا تو موسیٰ علیہ السلام اس شخص کے پکڑنے سے رک گئے اور یہاں سے چھوٹ کر یہ شخص بھاگتے بھاگتے فرعون کے ہاں پہنچ گیا ہو گا اور کہہ دیا ہو گا کہ قاتل دراصل موسیٰ ہے۔ اب یہاں سابق منظر اور آنے والے منظر کے درمیان ایک وقفہ اور ... - اگلا منظر یہ ہے کہ ایک شخص بھاگتا ہوا مدینہ سے باہر یعنی شاہی دربار و رہائش کے علاقے سے آتا ہے اور حضرت موسیٰ کو خبردار کرتا ہے کہ تمہارے

بارے میں اعلیٰ سطح پر مشورے شروع ہو گئے ہیں اور تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ جان بچا کر مصر سے نکل جاؤ۔

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّىْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۰﴾

"اس کے بعد ایک آدمی شہر کے پرلے سرے سے دوڑتا ہوا آیا اور بولا "اے موسیٰ' سرداروں میں تیرے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں' یہاں سے نکل جا' میں تیرا خیر خواہ ہوں"۔

فرعون کے سرداروں' اس کے حاشیہ نشینوں اور حکومتی افسروں اور اس کے خاص الخاص لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ قتل میں موسیٰ کا ہاتھ ہے۔ اس لیے انہوں نے محسوس کر لیا کہ موسیٰ کی صورت میں خطرہ مجسم ہو کر آ گیا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا کام ہے جس کی نوعیت انقلابی اور خطرناک ہے۔ یہ بغاوت کا آغاز ہے۔ اور اس کے محرکات میں بنی اسرائیل کا جذبہ انتقام ہے۔ لہٰذا یہ ایک نہایت خطرناک رجحان ہے اور اس کے انسداد کے لیے سخت تدابیر کی ضرورت ہے۔ اگر یہ قتل کوئی معمولی واردات ہوتی تو اس پر انتہائی اعلیٰ سطح پر غور کی کیا ضرورت تھی۔ آئے دن انسانوں میں قتل ہوتے رہتے ہیں لیکن اس قتل نے پورے نظام حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے بھی تدابیر کا آغاز کیا اور دست قدرت نے بھی اپنا کام شروع کر دیا۔ سرداروں میں سے ایک شخص جو موسیٰ کا ہمدرد تھا' دست قدرت نے اس سے کام لیا۔ یہ شاید وہی شخص ہے جو اپنے ایمان کو چھپا رہا تھا اور جس کا ذکر سورہ غافر کی آیت ۲۸ میں ہوا ہے۔ یہ شخص اٹھا اور اس نے حضرت موسیٰ کو اعلیٰ سطح پر ہونے والے مشوروں سے آگاہ کر دیا۔ یہ شخص نہایت سنجیدگی' اہتمام اور جلدی میں آیا اور اس نے شاہی کارندوں کو کسی کارروائی سے قبل حضرت موسیٰ کو اطلاع کر دی۔

اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّىْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ (۲۸ : ۲۰)

"موسیٰ' سرداروں میں تیرے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں' یہاں سے نکل جا' میں تیرا خیر خواہ ہوں"۔

۲ ۸ ع ۵ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِىْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۱﴾

"یہ خبر سنتے ہی موسیٰ ڈرتا اور سہمتا نکل کھڑا ہوا اور اس نے دعا کی کہ "اے میرے رب' مجھے ظالموں سے بچا"۔

حضرت موسیٰ شہر سے ڈرے ہوئے اور سہمے ہوئے نکل کھڑے ہوئے' یکہ و تنہا' ڈر رہے ہیں اور اللہ پر اعتماد کے سوا ان کے پاس کوئی سازو سامان نہیں ہے۔ ان کی توجہ صرف اللہ کی طرف ہے۔ صرف اللہ کی مدد اور ہدایت کے وہ طلبگار ہیں۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّىْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِىْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۲۲﴾

"(مصر سے نکل کر) جب موسیٰ نے مدین کا رخ کیا تو اس نے کہا "امید ہے کہ میرا رب، مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے گا"۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یکہ و تنہا مصر سے نکلنے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں اور وہ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں بغیر کسی زاد و عتاد کے جانب مدین رواں ہیں، مدین کا علاقہ شام کے جنوب اور حجاز کے شمال میں ہے۔ یہ ایک طویل سفر ہے، دور دراز کا سفر۔ جس کے لیے حضرت موسیٰ نے کوئی تیاری نہیں کی۔ وہ شہر سے نہایت ہی ڈر کی حالت میں سہمے ہوئے نکلے اور فرعون کے سردار ناصح نے انہیں مزید خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس لیے آپ نے ایک منٹ کی تاخیر کے بغیر وہاں سے نکل جانے میں عافیت سمجھی۔ اس ناصح کی نصیحت میں آپ نے کوئی شک نہ کیا اور نہ نکلنے میں کوئی تردد کیا۔ کسی کو راہنما بنانے کی تاخیر بھی نہ کی اور نہ کوئی رفیق سفر تلاش کیا۔ لیکن صاف نظر آتا ہے کہ ان کا رخ اللہ کی طرف ہے، اللہ کے آگے انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ صرف اللہ کی راہنمائی کے طالب ہیں۔

عَسٰى رَبِّىْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِىْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (۲۸ : ۲۲) "امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے گا"۔

ایک بار پھر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ خطرات میں گھر گئے ہیں۔ بچپن کے بعد وہ نہایت امن سے عیش و آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے اور شاہی محل میں نہایت ہی آرام سے رہ رہے تھے لیکن وہی شہزادہ اب اکیلا اور تنہا صحرا نوردی کر رہا ہے اور اس کے پاس دنیا کا کوئی ساز و سامان نہیں ہے۔ فرعون اور اس کے جاسوس اس کے تعاقب میں ہیں۔ ہر جگہ اس کی تلاش ہو رہی ہے۔ آج وہ اس سے انتقام لینا چاہتے ہیں اور اس سے وہ متاع حیات چھین لینا چاہتے ہیں۔ جو بچپن میں وہ نہ چھین سکے۔ لیکن قدرت کی جن قوتوں نے اسے اس وقت بچایا وہ آج بھی اس کے ساتھ ہیں۔ قدرت اسے اس کے دشمنوں کے سپرد کرنا ہرگز گوارا نہیں کرتی۔ اس سے تو بہت سا کام لیا جاتا ہے، چنانچہ وہ بے آب و گیاہ صحرا میں اکیلے جا رہے ہیں۔ اب وہ ایسے علاقے تک پہنچ گئے جہاں فرعون کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ نہ وہ انہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۬ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۭ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَاۗءُ ۫ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ۝ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ۝

"اور جب وہ مدین کے کنویں پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور ان سے الگ ایک طرف دو عورتیں اپنے جانوروں کو روک رہی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان عورتوں سے پوچھا "تمہیں کیا

پریشانی ہے؟"۔ انہوں نے کہا "ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں جب تک یہ چرواہے اپنے جانور نہ نکال لے جائیں' اور ہمارے والد ایک بہت بوڑھے آدمی ہیں"۔ یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا' پھر ایک سائے کی جگہ جا بیٹھے اور بولے "پروردگار' جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کر دے میں اس کا محتاج ہوں"۔

یہ طویل صحرائی سفر ختم ہوا اور حضرت موسیٰ مدین کے ایک چشمے پر پہنچے۔ آپ تھکے ماندے مسافر ہیں۔ اس چشمے پر وہ ایک ایسا منظر دیکھتے ہیں جسے کوئی شریف اور بامروت آدمی برداشت نہیں کر سکتا اور پھر حضرت موسیٰ کیسے برداشت کرتے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ مرد چرواہے اپنے مویشیوں کو لا لا کر پانی پلا رہے ہیں اور دو عورتیں ہیں جو اپنی بکریوں کو پانی سے دور روک رہی ہیں۔ حالانکہ فطرت سلیمہ اور مروت کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے عورتوں کو موقعہ دیا جائے کہ وہ اپنی بھیڑوں کو پانی پلائیں اور چلی جائیں اور مرد ان کو موقع دیں اور ان کے ساتھ تعاون کریں۔ "Ladies First" ایک فطری اصول ہے۔

حضرت موسیٰؑ ایک غریب الدیار مسافر ہیں' اپنے علاقے سے نکلے ہوئے ہیں اور ان کا پیچھا بھی ہو رہا ہے۔ تھکے ہارے ہیں اور آرام کرنے کی خاطر اس چشمے پر آئے ہیں' وہ دیکھتے ہیں کہ یہ منظر معروف اخلاقی اصولوں کے خلاف ہے۔ وہ آگے بڑھتے ہیں اور ان دو عورتوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا معاملہ ہے؟

قَالَ مَا خَطْبُكُمَا (۲۸ : ۲۳) "تمہیں کیا پریشانی ہے۔"

قَالَتَا لَا نَسْقِي حَتَّىٰ يُصْدِرَ الرِّعَاءُ وَأَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ (۲۸ : ۲۳) "انہوں نے کہا ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں جب تک چرواہے اپنے جانور نکال نہ لے جائیں اور ہمارے والد ایک سن رسیدہ بوڑھے ہیں"۔ چنانچہ انہوں نے بتا دیا کہ وہ کیوں اپنے جانوروں کو روک رہی ہیں اور کیوں دوسروں کو پہلے موقعہ دیتی ہیں۔ سبب یہ ہے کہ وہ عورتیں ہیں اور ضعیف ہیں اور دوسرے چرواہے مرد ہیں اور زور آور ہیں۔ اور باپ بوڑھے ہیں وہ نہ مویشی چرا سکتے ہیں اور نہ ان مضبوط چرواہوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے جذبہ ایمانی جوش میں آیا۔ آپ کی فطرت سلیمہ جاگ اٹھی۔ وہ آگے بڑھے اور اصول کے مطابق کام کیا تاکہ بیچاری عورتیں پہلے پانی پلائیں جیسا کہ شریف اور مہذب لوگوں کا رواج ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ غریب الدیار تھے۔ ان کو کوئی نہ جانتا تھا' نہ یہاں ان کا کوئی حامی و مددگار تھا' تھکے ماندے تھے' ایک طویل سفر کاٹ کر یہاں تک پہنچے تھے اور ان کے پاس مزید سفر کے لیے کوئی سازوسامان بھی نہ تھا۔ ان کا پیچھا بھی ہو رہا تھا' دشمن تعاقب میں تھے لیکن یہ تمام امور ان کو اس بات پر آمادہ نہ کر سکے کہ وہ اس موقعہ پر مروت اور جوانمردی کا مظاہرہ نہ کریں۔ اور امر بالمعروف پر عمل پیرا نہ ہوں اور لوگوں کو یہ بتا نہ دیں کہ قدرتی انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ عورتوں کو پہلے موقعہ دیا جائے۔

فَسَقَىٰ لَهُمَا (۲۸ : ۲۴) "یہ سن کر موسیٰ نے ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا"۔ یہاں سیاق کلام سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نہایت ہی تربیت یافتہ شریف النفس شخصیت کے مالک تھے۔ وہ جسمانی لحاظ سے بھی ایک کڑیل جوان تھے' جسے دیکھ کر عام آدمی مرعوب ہو جاتا تھا۔ حالانکہ وہ طویل سفر سے تھکے ہوئے آئے تھے۔

چرواہوں پر ان کی جسمانی قوت سے زیادہ ان کی نفسیاتی برتری اور اخلاقی رویہ نے زیادہ اثر کیا۔ کیونکہ جسمانی قوت کے مقابلے میں لوگ اخلاقی رویوں سے زیادہ مرعوب ہوتے ہیں۔

ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ (۲۸ : ۲۴) "پھر ایک سائے کی جگہ جا بیٹھا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسم سخت گرمی اور لو کا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس قسم کی شدید گرمی میں یہ سفر کرنا پڑا تھا۔

فَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ (۲۸ : ۲۴) "اور بولا پروردگار جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کر دے، میں اس کا محتاج ہوں"۔ اس وقت انہوں نے جسمانی اعتبار سے درختوں کے گھنے سائے میں اپنے جسم کو آرام پہنچانے کے لیے پناہ لے رکھی ہے، لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت اور رحم و کرم کرنے والے بادشاہ کے سایہ رحمت میں بھی پناہ چاہتے ہیں۔ اپنی روح اور اپنے قلب کو اللہ کی طرف متوجہ کیے ہوئے ہیں۔ اے اللہ میں محتاج ہوں، شدید لو ہے، میں اکیلا ہوں۔ اے رب میں بے وسائل ہوں، اے رب میں تیرے فضل و کرم اور تیرے احسان کا بے حد محتاج ہوں۔

اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ (۲۸ : ۲۴) "جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کر دے میں اس کا محتاج ہوں"۔ ابھی ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مناجات کے اس منظر میں ہیں، کہ سیاق کلام میں نہایت فرحت بخش بشارت آتی ہے۔ اس کا آغاز حرف (فاء) تعقیب سے ہوتا ہے، گویا عالم بالا نے حضرت موسیٰ کی دعاء کو اس سے قبل قبول کر لیا کہ وہ ہاتھ نیچے کریں۔ کیونکہ وہ نہایت ہی خضوع سے یہ دعا کر رہے تھے۔

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِىْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۡ قَالَتْ اِنَّ اَبِىْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ؕ

"(کچھ دیر نہ گزری تھی) ان دونوں عورتوں میں سے ایک شرم وحیا کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی "میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے لیے جانوروں کو پانی جو پلایا ہے اس کا اجر آپ کو دیں"۔

اللہ کے فضل و کرم کے کیا کہنے، حضرت موسیٰ اللہ کے کس قدر قریب ہیں، ان کی پکار کس قدر تیزی سے سنی جاتی ہے۔ دو عورتوں کے والد سن رسید شیخ عالم بالا کی ہدایت پر حضرت موسیٰ کو دعوت دیتے ہیں، یہ دعوت عزت و احترام پر مبنی پناہ عطا کرنے اور جزائے احسان دینے کے لیے ہے۔ یہ دعوت لے کر ان دو دوشیزاؤں میں سے ایک آئی ہے اور وہ

تَمْشِىْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ (۲۸ : ۲۵) "شرم وحیا کے ساتھ چلتی ہوئی آئی ہے"۔ اس کی روش میں وقار ہے، عامیت نہیں ہے، وہ مقامات زینت کا اظہار نہیں کرتی بلکہ ان کو چھپا رہی ہے۔ نہ نسوانی غرور ہے اور نہ

جاذبیت کا اظہار ہے۔ وہ آتی ہے اور والد کی طرف سے نہایت ہی مختصر' جامع الفاظ میں یہ دعوت دیتی ہے۔ قرآن کریم نے اس کے الفاظ نقل کیے ہیں۔

اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْكَ لِیَجْزِیَكَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا (۲۸ : ۲۵) "میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے جانوروں کو پانی جو پلایا ہے 'اس کا اجر آپ کو دے دیں"۔ شرم و حیا کے دائرے میں نہایت وضاحت کے ساتھ' جامع الفاظ میں یہ پیغام پہنچا دیا جس میں کوئی بناوٹ کوئی جھجک کوئی توقف نہ تھا اور کوئی پیچیدگی یا لکنت نہ تھی۔ یہ اس طرح کیوں ہے' اس لیے کہ فطرت سلیمہ' عفیفہ اور سیدھے سادھے کیریکٹر والی خواتین کی روش ایسی ہی ہوتی ہے۔ سیدھی فطرت کی نوجوان عورت جب بھی مردوں سے ملتی ہے' اسے حیا آتی ہے۔ وہ مردوں سے بات کرتے ہوئے شرماتی ہے لیکن یہ لڑکی چونکہ پر اعتماد اور عفیف اور سلیم الفطرت ہے۔ اس لیے اس کی باتوں میں کوئی اضطراب نہیں ہے۔ ورنہ گری ہوئی فطرت اور کردار کی لڑکیاں ایسے موقع پر ناز و انداز اور کشش و ہیجان پیدا کرنے کا رویہ اختیار کرتی ہیں۔ لیکن اس لڑکی نے بس نہایت ہی مختصر الفاظ میں مطلوبہ پیغام پہنچا دیا۔ کوئی ایک لفظ بھی ضرورت سے زیادہ منہ سے نہیں نکالا۔

قرآن کریم بھی اس منظر کی یہی جھلک دکھاتا ہے اور اس پر کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ صرف شیخ کبیر کی طرف سے ایک لڑکی انہیں دعوت پیش کرتی ہے۔ موسیٰ قبول کر لیتے ہیں اور پردہ گرتا ہے۔ اگلا منظر دونوں کی ملاقات کا ہے۔ اس شیخ کبیر کا نام قرآن مجید نے نہیں لیا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ مشہور نبی حضرت شعیب علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور ان کا نام یثرون تھا۔(۱)

فَلَمَّا جَآءَهٗ وَ قَصَّ عَلَیْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ٚ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۵﴾

"موسیٰ جب اس کے پاس پہنچا اور اپنا سارا قصہ اسے سنایا تو اس نے کہا "کچھ خوف نہ کرو' اب تم ظالم لوگوں سے بچ نکلے ہو"۔

(۱) میں نے ان کے بارے میں بعض جگہ تو یہ کہا ہے کہ یہ حضرت شعیب ہیں' بعض جگہ یہ کہا ہے کہ یہ حضرت شعیب نبی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی اور ہوں۔ اب میرا میلان اس طرف ہے کہ شیخ کبیر حضرت شعیب نہیں ہیں۔ یہ مدین کے کوئی اور شخص تھے۔ اس رائے تک میں اس لیے پہنچا ہوں کہ یہ شخص تو شیخ کبیر ہیں' بوڑھے ہیں جبکہ حضرت شعیب کی قوم ان کی زندگی میں ہلاک ہوئی اور صرف اہل ایمان ہی زندہ بچے تھے۔ اگر یہی صاحب حضرت شعیب ہوتے اور اپنی مومن قوم کے اندر بستے ہوتے تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ اہل ایمان ایک نبی کی لڑکیوں سے بھی پہلے اپنے جانوروں کو پانی پلائیں اور ان کا اس قدر احترام بھی نہ کریں اور نبی کی لڑکیوں کے ساتھ یہ سلوک کریں۔ نیز قرآن کریم نے بھی حضرت موسیٰ کے سسر کے بارے میں کوئی صراحت نہیں کی۔ اگر یہ حضرت شعیب نبی ہوتے جن کے ہاں حضرت موسیٰ دس سال رہے تو قرآن ضرور ان کا ذکر کرتا۔ (سید قطب)

حضرت موسیٰ کو اس وقت سب سے پہلے جائے امن کی ضرورت تھی - نیز انہیں ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں ان کے کھانے پینے کا انتظام ہو جائے - لیکن ان کو کھانے پینے کی ضروریات سے زیادہ احتیاج ایک پر امن اور مامون و محفوظ ٹھکانے کا تھا - یہی وجہ ہے اس سنجیدہ اور سن رسیدہ بوڑھے نے سب سے پہلے انہیں کہا لَاتَخَفْ "خوف نہ کرو" - اس شخص نے ان کو سب سے پہلے جو بات کہی کہ آپ اطمینان رکھیں ' ڈر کی نہیں اور اس یقین دہانی کے بعد یہ فرمایا

نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۲۸ : ۲۵) "اب تم ظالم لوگوں سے بچ نکلے ہو" - مدین پر ان کی حکومت نہیں ہے - مدین کے باشندے کو مصری کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے -

اب منظر پر ایک نہایت ہی سلیم الفطرت اور عفیف عورت کی آواز آتی ہے -

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ۝۲۶

"ان دونوں عورتوں میں سے ایک نے اپنے باپ سے کہا "ابا جان ' اس شخص کو نوکر رکھ لیجئے ' بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو" -

ان دونوں بہنوں کو بھیڑ بکریاں چرانا پڑتی تھیں اور پانی پلاتے وقت ان کو مردوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ان کو مردوں سے واسطہ پڑتا تھا اور ان سے ٹکرانا پڑتا تھا ' جس طرح ہر اس عورت کو ایسے حالات درپیش ہوتے رہتے ہیں جو مردوں والا کام کرتی ہے - ان دونوں بہنوں کو ہر وقت اس کام میں اذیت کا سامنا کرنا پڑتا تھا - ان کی خواہش یہ تھی کہ وہ امور خانہ داری تک محدود ہو جائیں اور ایک پاک دامن عفت مآب "زن خانہ" کی طرح زندگی بسر کرنے کا موقع ملے اور انہیں چراگاہوں اور گھاٹوں پر غیر مردوں کے ساتھ اختلاط پر مجبور نہ ہونا پڑے - پاک دامن ' پاک فطرت اور سلیم الفطرت عورتوں کی روش یہی ہوتی ہے کہ ان کو مردوں کے ساتھ مقابلہ اور مزاحمت کرنا پسند نہیں آتا اور اس قسم کے اختلاط اور مزاحمت کی وجہ سے عورتوں کے اندر جو ہلکا پن پیدا ہو جاتا اسے کوئی سلیم الفطرت عورت پسند نہیں کرتی -

حضرت موسیٰ نوجوان ' مسافر اور غریب الوطن ہیں - اس کے ساتھ ساتھ قوی اور امین بھی ہیں - اس عورت نے دیکھ لیا تھا کہ ان کی قوت اور شخصیت کو دیکھ کر تمام چرواہے سہم گئے تھے - انہوں نے موسیٰ کو فوراً راستہ دے دیا تھا اور ان دو مستورات کے جانوروں نے پانی پی لیا تھا - حالانکہ حضرت موسیٰ غریب الوطن تھے اور غریب الوطن اگرچہ کوئی بڑا آدمی ہو - کمزور سمجھا جاتا ہے - اور جب یہ عورت موسیٰ کو دعوت دینے گئی تھی تو اس نے دیکھ لیا تھا کہ پاک نظر اور پاک زبان رکھتے ہیں - چنانچہ یہ عورت باپ کو مشورہ دیتی ہے کہ ابو آپ اس شخص سے اجارہ کر لیں تاکہ وہ اور اس کی بہن بکریاں چرانے کے عذاب سے نجات پالیں اور اس طرح ان کو وہ کام نہ کرنا پڑے جو مرد کرتے ہیں - حضرت موسیٰ مضبوط آدمی ہیں ' امین ہیں - اس لیے کہ جو شخص کسی دوشیزہ کی عفت کا امین ثابت ہو جائے ' وہ تمام امور پر امین ثابت ہو جاتا ہے - یہ اپنے اس مشورے میں بھی بالکل واضح سوچ رکھتی ہے اور صاف صاف بات کر رہی ہے اسے یہ خطرہ نہیں ہے کہ اس پر کوئی بدظنی کرے گا کیونکہ اس کی دل کی کتاب صاف ہے - اس کا احساس و شعور پاک ہے - اس لیے اسے کسی محاسبے سے ڈر نہیں ہے - چنانچہ وہ اپنی اس تجویز میں شف شف نہیں کرتی - اور نہایت ہی صاف الفاظ میں واضح

تجویز دیتی ہے ۔

یہاں ان روایات کو دہرانے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے جو مفسرین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوت کے بارے میں نقل کی ہیں ' مثلاً یہ کہ جس کنویں سے چرواہے پانی پلاتے تھے ' اس پر ایک بڑا پتھر رکھا ہوا ہوتا تھا جسے بیس ' چالیس یا اس سے بھی کم و بیش افراد اٹھا سکتے تھے ۔ حالانکہ قرآن کریم کے سیاق سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کنویں کے اوپر پتھر ہوتا تھا بلکہ دوسرے چرواہے پانی پلا چکتے تو بعد میں یہ دو عورتیں پانی پلاتیں ۔ حضرت موسیٰ نے ان چرواہوں کو ہٹایا اور ان عورتوں کے مویشیوں کو پانی پلا دیا یا دوسرے چرواہوں کے ساتھ ساتھ پانی پلا دیا ۔

نیز یہاں ان روایات کے دہرانے کی بھی ضرورت نہیں ہے جن میں ان کی دیانت و امانت پر یہ دلیل دی گئی ہے ۔ جس میں انہوں نے اس دوشیزہ سے کہا کہ تم میرے پیچھے چلو اور پیچھے سے مجھے راستہ بتلاتی چلو ' اس خوف سے کہ کہیں ان کی نظر اس عورت پر نہ پڑ جائے ۔ یا یہ کہ حضرت موسیٰ نے اس لڑکی کو پیچھے چلنے کا اس وقت کہا جب وہ آگے چل رہی تھی تو ہوا نے اس کے کپڑوں کو ٹخنوں سے اوپر کر دیا ۔ یہ محض تکلفات ہیں اور ان کے ذریعہ سے ایسے شکوک کو دور کرنے کی سعی کی گئی ہے جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے ۔ حضرت موسیٰ بذات خود عفیف الفطرت تھے ' پاک احساسات رکھتے تھے اور یہ عورت بھی پاک دامن تھی ' عفت اور امانت جہاں ہو ان کے ثبوت کے لیے ایسے تکلفات کی ضرورت نہیں ہے خصوصاً مرد اور عورت کی ملاقات کے وقت کیونکہ عفت وہ پختہ ملکہ ہے جو بغیر کسی تکلف اور بناوٹ کے حصہ کردار ہوتا ہے ۔

اس بوڑھے نے اپنی بیٹی کی اس تجویز کو قبول کر لیا ۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ لڑکی اور موسیٰ دونوں کے اندر خواہش اور اعتماد پایا جاتا ہے اور فطری میلان موجود ہے ۔ اور یہ دونوں مل کر ایک صالح خاندان کی بنیاد ڈال سکتے ہیں ۔ جب کسی نوجوان میں قوت اور عفت جمع ہو جائیں تو فطرتاً ہر سلیم الفطرت دوشیزہ ایسے شخص کو زندگی کا ساتھی بنانے پر راضی ہوتی ہے ۔ جو خود پاک دامن اور صالح ہو ۔ اس لیے اس بوڑھے نے حضرت موسیٰ کو پیش کش کر دی کہ وہ اپنی بیٹیوں میں سے ایک تمہارے نکاح میں دے سکتے ہیں ۔ اگر تم آٹھ سال تک میری خدمت کرو اور میرے مویشی چراؤ اور اگر بطور احسان تم دس سال تک یہ خدمت کرو تو تمہاری طرف سے احسان ہو گا ۔

قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَ مَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ ؕ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ۝۲۷

" اس کے باپ نے (موسیٰ سے) کہا " میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں بشرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کرو ' اور اگر دس سال پورے کر دو تو یہ تمہاری مرضی ہے ۔ میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا ۔ تم ان شاء اللہ مجھے نیک آدمی پاؤ گے " ۔

یوں نہایت ہی سادگی اور بے تکلفی سے اس شخص نے اپنی دو بیٹیوں میں ایک حضرت موسیٰ کے عقد میں دینے کے لیے خود پیش کش کر دی۔ شاید یہ وہی لڑکی تھی جس نے تجویز دی تھی اور اس کے اور موسیٰ علیہ السلام کے قلوب کا میلان ایک دوسرے کی طرف تھا۔ اس شخص نے بے تکلفی سے اور براہ راست پیش کش صراحت کے ساتھ کر دی۔ کیونکہ یہ پیش کش عقد کے لیے تھی۔ لہٰذا اس میں حجاب محسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ یہ پیش کش اس لیے تھی کہ ایک نیا خاندان وجود میں آ جائے۔ اس شخص نے تکلف اور کنایہ و اشارہ میں بات کرنے کا تکلف نہیں کیا۔ ایسے تکلفات اور بناوٹیں ان معاشروں میں ہوتی ہیں جن میں فطرت سے انحراف پیدا ہو جاتا ہے اور ایسے معاشرے نہایت ہی باطل، گندی رسومات اور تکلفات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان تکلفات کی وجہ سے والد یا سرپرست کسی بچی کو کسی کے عقد میں دینے کے لیے کبھی صاف صاف پیش کش نہیں کرتا، حالانکہ دل سے وہ کئی لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ فلاں رشتہ اس کی بہن بیٹی اور رشتہ دار کے لیے بہت مفید ہے، لیکن لوگ انتظار کرتے ہیں کہ خاوند، اس کے وکیل یا اس کے سرپرست کی طرف سے کوئی پیش کش ہو، بالعموم یہ تصور کیا جاتا ہے کہ عورت کی جانب سے پیش کش مناسب نہیں ہے۔

لیکن ایسی غیر فطری اور سڑی ہوئی سوسائٹیوں کے تضادات میں سے ایک تضاد یہ ہے کہ نوجوان لڑکے ایک دوسرے کے ساتھ آزادانہ میل جول رکھتے ہیں۔ آزادانہ گپ شپ لگاتے ہیں، آزادانہ اختلاط اور باہم انکشاف کے روادار ہوتے ہیں لیکن نکاح اور عقد کی پیش کش کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ جب نکاح کی پیش کش ہوتی ہے تو اس وقت بھی مصنوعی حجاب اور پردہ داری شروع ہو جاتی ہے اور لڑکا لڑکی ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت چھوڑ دیتے ہیں بلکہ پردہ شروع ہو جاتا ہے۔ غرض نکاح کی پیش کش میں فطری بے تکلفی نہیں ہوتی حالانکہ اس میں سادگی اور کھلا پن ہونا چاہئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں باپ صاف صاف اپنی لڑکیوں کا رشتہ پیش کرتے تھے بلکہ عورتیں بھی اپنے آپ کو پیش کرتی تھیں۔ عورتیں اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے کی پیش کش کرتی تھیں یا ان لوگوں کو بے تکلف پیش کش کرتی تھیں جو ان کے ساتھ نکاح میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ معاملہ نہایت سادگی اور علانیہ اور بے تکلفی اور کھلے پن سے طے ہو جاتا۔ اور اس کے لیے کوئی مخصوص آداب و تکلفات نہ تھے۔ نہ اس طرح پیش کش سے کسی کی عزت اور شرافت میں فرق آتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنی بچی حفصہ کی پیش کش حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کی تو وہ خاموش ہو گئے۔ پھر انہوں نے حضرت عثمان کو کی تو انہوں نے معذرت کی۔ جب انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ انہوں نے ایسا کیا ہے تو حضورؐ بہت خوش ہوئے اور فرمایا ہو سکتا ہے کہ اسے ایسا رشتہ مل جائے جو ان دونوں سے بہتر ہو۔ اس کے بعد حضور اکرمؐ نے خود ان کے ساتھ نکاح کر لیا۔ ایک دوسری عورت نے اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پیش کیا تو آپؐ نے معذرت کی۔ پھر اس عورت نے اپنے نکاح کا اختیار حضورؐ کو دے دیا۔ حضورؐ نے اس کا نکاح ایک ایسے شخص سے کر دیا جس کے پاس قرآن کی دو سورتیں تھیں۔ حضورؐ نے اس عورت کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا اور ان دو سورتوں کو اس کا مہر قرار دیا۔

--- ○○○ ---

یہ تھی وہ سادگی جس کے ساتھ اسلامی معاشرے میں خاندان بن رہے تھے اور اس طرح ایک اسلامی سوسائٹی وجود میں آ رہی تھی۔ اس معاملے میں ان کے ہاں کوئی اشارہ 'کنایہ' تکلف اور تصنع اور ٹیڑھ نہ تھی۔ مدین کے اس بوڑھے نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس نے خود موسیٰ علیہ السلام کو یہ پیش کش کی اور یہ وعدہ بھی کیا کہ اس عرصے میں وہ ان پر کوئی سختی نہ کرے گا۔ اور ان کی وسعت سے زیادہ کام نہ لے گا۔ اور وہ یہ امید کرتا ہے کہ تم ایک صالح نوجوان کا کردار ادا کرو گے۔ اور ہمارے معاملات صحت و صفائی کے ساتھ چلیں گے۔ یہ نہایت ہی خوبصورت اور سادہ آداب ہیں۔ وہ نہ اپنے آپ کو آسمانوں پر چڑھاتے ہیں اور پاکی داماں کی حکایات کرتے ہیں اور نہ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تعریف اور مدح سرائی کرتے ہیں۔ بس صرف خیر کی امید رکھتے ہیں۔ اور تمام معاملات اللہ کی مشیت کے سپرد کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ نے بھی اسی سادگی 'صداقت اور بے تکلفی سے اس پیش کش کو قبول کر لیا اور اس پر اللہ ہی کو گواہ ٹھہرا کیونکہ وہاں اللہ کے سوا ان کا گواہ تھا کون؟

قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ؕ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ
وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۲۸﴾ ع ۳/۷/۶

"موسیٰ نے جواب دیا" یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہو گئی۔ ان دونوں مدتوں میں سے جو بھی پوری کر دوں اس کے بعد پھر کوئی زیادتی مجھ پر نہ ہو' اور جو کچھ قول قرار ہم کر رہے ہیں 'اللہ اس پر نگہبان ہے"۔

جب دو افراد باہم معاہدہ کرتے ہیں تو اس میں کوئی بات پیچیدہ نہیں ہونی چاہئے اور نہ ہی بات کو مجمل چھوڑنا چاہئے۔ نہ اس موقعے پر بات چھپانا چاہئے بلکہ بات کھل کر ہونی چاہئے۔ عقد کے موقعہ پر کسی بات کی وضاحت کرنے میں شرم محسوس نہیں کرنی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ اس پیش کش کو مان لیتے ہیں اور نکاح کر لیتے ہیں۔ اس بوڑھے نے جو مشروط پیشکش کی اس کے متعلق حضرت موسیٰ یہ وضاحت کرتے ہیں ان دو میعادوں میں سے جو بھی وہ چاہیں پورا کریں۔

اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ (۲۸ : ۲۸) "دونوں مدتوں میں سے جو بھی میں پوری کروں اس کے بعد کوئی زیادتی مجھ پر نہ ہو گی"۔ چاہے میں آٹھ سال رہوں یا دس سال پورے کر دوں۔ لیکن کام کے فرائض میں زیادتی نہ ہو گی۔ یعنی آٹھ کے بعد دو سال کا جو اضافہ ہے وہ اختیاری ہے اور ہمارے اس معاہدے پر اللہ گواہ ہے کیونکہ وہ دیکھ رہا ہے اور معاہدہ کرنے والے دونوں فریقوں پر اللہ گواہ ہوتا ہے 'اور وہ کافی گواہ ہے۔

حضرت موسیٰ نے یہ بیان اپنی فطرت کے عین مطابق دیا۔ وہ نہایت ہی سیدھی اور کھلی طبیعت کے مالک تھے۔ انہوں نے دس سال پورے کرنے کے بارے میں جو صاف صاف اختیاری ہونے کی شرط کی وضاحت کی وہ اس لیے کہ معاہدہ کرنے والے فریقوں کا فرض ہے کہ وہ صاف صاف بات کریں۔ حالانکہ ان کی نیت یہ تھی کہ وہ ان دو میعادوں میں سے لمبی میعاد پر عمل کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لمبی اور

زیادہ طویل مدت پوری کی (بخاری)۔

یوں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے سسر کے گھر میں نہایت عزت اور احترام سے رہے۔ وہ فرعون اور اس کی سازشوں سے مامون و محفوظ ہو گئے۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا اللہ کی عین حکمت کے مطابق ہو رہا تھا۔ اب یہ دس سال کیسے گزرے اسے چھوڑ دیجئے۔ ہمارے قصے میں ان کی اہمیت نہیں ہے۔ قرآن نے ان کے مناظر کو کاٹ دیا ہے اور خاموش ہے۔ پردہ گرتا ہے۔

غرض یہ دس سال گزر گئے جن پر فریقین کے درمیان عقد ہوا تھا۔ اس سورت میں ان کے بارے میں کچھ مذکور نہیں ہے۔ اب اگلے منظر میں حضرت موسیٰ دس سال کی میعاد پوری کر کے جانب مصر رواں نظر آتے ہیں۔ یہ مدین کو چھوڑ کر اب مصر لوٹ رہے ہیں۔ یہ انہی راہوں پر واپس جا رہے ہیں جن پر وہ اکیلے آئے تھے' ڈرے اور سہمے ہوئے۔ لیکن اب ان کی واپسی کی فضا ایسی نہیں جس طرح ان کے فرار کی فضا تھی۔ وہ لوٹ رہے تھے لیکن اثنائے راہ وہ جن تجربات سے دوچار ہونے والے تھے ان کا خواب خیال بھی ان کے ذہن میں نہیں ہے' یہ کہ رب تعالیٰ انہیں پکارے گا۔ اب وہ موسیٰ کلیم اللہ ہو جائیں گے اور اب وہ مشن ان کے سپرد ہو جائے گا جس کے لیے اللہ نے انہیں اپنی نظروں میں بچائے رکھا۔ تربیت اور پرورش کی۔ یہ مشن کیا تھا فرعون جیسے جبار اور اس کے سرداروں کے سامنے کلمہ حق کا بلند کرنا۔ اور کلمہ بھی یہ کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دو کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے رب کی بندگی کریں اور رب تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور وہ اس سرزمین کو آزاد کرائیں جس کے بارے میں اللہ نے ان کے ساتھ وعدہ کر رکھا ہے اور یہ کہ حضرت موسیٰ فرعون ہامان اور ان کے حواریوں کے لیے دشمن ہوں اور ان کے لیے باعث پریشانی ہوں۔ تاکہ ان دونوں کا انجام حضرت موسیٰ کے ہاتھوں سے ہو کیونکہ یہ اللہ کا سچا وعدہ تھا۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤى اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۰﴾ وَ اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ یُعَقِّبْ ؕ یٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَ لَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ ﴿۳۱﴾ اُسْلُكْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ؗ وَّ اضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡىِٕهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ

مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾ وَ اَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ ۡاِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ۚ اَنْتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾

"جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی اور وہ اپنے اہل و عیال کو لے کر چلا تو طور کی جانب اس کو ایک آگ نظر آئی۔ اس نے اپنے گھر والوں سے کہا "ٹھہرو" میں نے ایک آگ دیکھی ہے ' شاید میں وہاں سے کوئی خبر لے آؤں یا اس آگ سے کوئی انگارہ ہی اٹھالاؤں جس سے تم تاپ سکو"۔ وہاں پہنچا تو وادی کے دہنے کنارے پر مبارک خطے میں ایک درخت سے پکارا گیا کہ "اے موسیٰ ' میں ہی اللہ ہوں ' سارے جہاں والوں کا مالک"۔ اور (حکم دیا گیا کہ) پھینک دے اپنی لاٹھی۔ جوں ہی کہ موسیٰ نے دیکھا کہ وہ لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ (ارشاد ہوا) "موسیٰ ' پلٹ آؤ اور خوف نہ کرو ' تو بالکل محفوظ ہے۔ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال ' چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے ' اور خوف سے بچنے کے لیے اپنا بازو بھینچ لے۔ یہ دو روشن نشانیاں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے ' وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں"۔ موسیٰ نے عرض کیا "میرے آقا ' میں تو ان کا ایک آدمی قتل کر چکا ہوں ' ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے ' اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہے ' اسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تاکہ وہ میری تائید کرے ' مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے"۔ فرمایا "ہم تیرے بھائی کے ذریعہ سے تیرا ہاتھ مضبوط کریں گے اور تم دونوں کو ایسی سعادت بخشیں گے کہ وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ ہماری نشانیوں کے زور سے غلبہ تمہارا اور تمہارے پیروؤں کا ہی ہو گا"۔

قبل اس کے کہ ہم اس حلقے کے ان دو مناظر پر تفصیلی گفتگو کریں ' ہمیں یہ غور کرنا چاہئے کہ ان دس سالوں کے وقفے میں اللہ نے حضرت موسیٰ کے حوالے سے کیا تدابیر اختیار کیں اور کیا اقدامات کیے۔ اس سفر اور آنے جانے میں کیا حکمت تھی۔

•

دست قدرت کو یوں منظور تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایک قدم آگے بڑھتے جائیں۔ یعنی اس وقت سے لے کر جب وہ شیرخوار بچہ تھے ' ان کی موجودہ پوزیشن تک ان کے ساتھ دست قدرت کا معاملہ کیا رہا۔ ان کو دریا میں پھینکا گیا تاکہ فرعون کے لوگ اسے پکڑ لیں۔ ان کو دیکھ کر فرعون کی بیوی ان پر فریفتہ ہو گئی یا کر دی گئی کہ وہ عین شاہی محل میں پرورش پائیں ' دشمن کے گھر میں پلیں۔ پھر وہ لوگوں کی غفلت کے وقت شہر میں داخل ہوئے اور ایک آدمی ان کے ہاتھوں مر گیا۔ پھر ان کے پاس فرعون کے حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص کو بھیجا گیا کہ نکلو تمہارے قتل کی تدابیر ہو رہی ہیں ' یہ تائید ایزدی مصر اور مدین تک کے صحرائی سفر میں اس کے ساتھ رہی جبکہ ان کے پاس کوئی زاد و عتاد نہ تھا۔ اور پھر مدین کے کنویں پر ان کی ملاقات دختران شیخ سے کرا دی گئی اور اس بہترین مربی اور بوڑھے کے ساتھ ان کا دس سالہ معاہدہ ہو گیا اور جب وہاں سے واپس ہوئے تو طور پر ان کو عظیم مشن سپرد کیا گیا۔

مشن سپرد کرنے کی ندا سے قبل ان پر خدا کا طویل فضل و کرم ہوتا رہا' ان کو تلقین ہوتی رہی اور تمام آسمانی قوتیں ان کی تائید میں بڑھتی رہیں۔ اور ان کو زندگی کے مختلف تجربات سے دوچار کیا جاتا رہا۔ مہربانی' محبت اور راہنمائی کا تجربہ' حالات کے دباؤ میں آکر انتہائی اقدام کرنے کا تجربہ' نادم ہوتے' احتیاط کرتے اور غلطی پر استغفار کرتے کا تجربہ۔ ڈر' تعاقب اور پریشانی کا تجربہ' تنہائی' مسافری اور بھوک و افلاس کا تجربہ اور دوسروں کی خدمت کرنے اور بکریاں تک چرانے کا تجربہ اور ان بڑے بڑے تجربوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے روز مرہ کے تجربات' دلی احساسات' مختلف قسم کے تصورات و خلجانات' نئی نئی دریافتیں اور معلومات۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ اللہ نے جوان ہوتے ہی ان کو علم و حکمت سے نواز لیا تھا۔ (ایک شاہزادے کی حیثیت سے نکال کر یہ تجربات کرائے گئے)

حقیقت یہ ہے کہ منصب رسالت ایک ایسا فریضہ اور ایک ایسی عظیم ذمہ داری ہوتی ہے جس کے متعدد پہلو ہوتے ہیں اور گوناگوں ذمہ داریاں نبی اور رسول پر آن پڑتی ہیں۔ لہٰذا نبی کو علم و فضل' حکمت و دانائی اور زندگی کے مختلف تجربات اور مختلف لوگوں کی عملی زندگی کا ادراک کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ عملی تجربہ اس لغوی علم و حکمت اور وحی الٰہی سے الگ ہوتا ہے جو ہر نبی کو کرایا جاتا ہے تاکہ نبی کا ضمیر پاک و صاف ہو جائے اور ہدایت نبی کے قلب میں بٹھا دی جائے۔

رسولوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام انبیاء کو سپرد کئے جانے والے مشنوں میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذمہ داریاں بہت بھاری اور مشکل ذمہ داری تھی۔ ان کو فرعون جیسے سرکش اور جبار و قہار حکمران کے سامنے جانا تھا۔ یہ اپنے دور کے بادشاہوں میں سے بڑا اور مالدار بادشاہ تھا۔ قدیم شاہی سلسلے کا مالک تھا۔ حکومت نہایت مستحکم تھی اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے مصر اس وقت ترقی یافتہ تھا۔ اس نے تمام بسی ہوئی اقوام کو غلام بنا رکھا تھا اور زمین کے اوپر اس کو مقام بلند حاصل تھا۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک ایسی قوم کی آزادی اور ہجرت کے لیے بھیجا گیا تھا جس کے دل و دماغ میں غلامی رچ بس گئی تھی۔ وہ غلامانہ زندگی کے عادی ہو گئے تھے اور ان کا ضمیر پوری طرح بدل گیا تھا۔ وہ عملاً ایک طویل زمانے تک غلام رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ غلامی انسانی فطرت کو بگاڑ دیتی ہے۔ اس کے اندر تعفن اور سڑاند پیدا ہو جاتی ہے اور اس قوم کے احساسات سے گندگی اور تعفن اور سڑاند کا احساس ہی جاتا رہتا ہے۔ بھلائی' خیر اور جمال اور برتری اس کو راس ہی نہیں آتی۔ اس طرح کی بگڑی ہوئی قوم کو اٹھانا معنی دارد۔

آپ کو ایسی قوم کی طرف بھیجا گیا جو قدیم زمانہ سے اسلامی نظریہ کی حامل تھی لیکن اس کے اندر نظریاتی انحراف پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے دل و دماغ میں اس کی اصل حقیقی صورت وہ نہ رہی تھی۔ نہ یہ قوم پرانے اسلامی عقیدہ اور شریعت پر قائم تھی اور نہ جدید عقیدے کو صحیح طرح قبول کر رہی تھی۔ اس قسم کے لوگوں کی اصلاح کرنا بہت ہی مشکل کام ہوتا ہے۔ ان کے اندر پائے جانے والی کجی کو درست کرنا' ان کے انحراف کو سیدھا کرنا اور ان کے اصل عقائد کے اوپر سے خرافات کی گہری تہوں کو ہٹانا اس مہم کی مشکل ترین باتیں تھیں۔

مختصراً یہ کہ حضرت موسیٰ نے بالکل ایک نئی امت کی تعمیر کرنا تھی۔ بالکل نئے سرے سے۔ پہلی مرتبہ بنی اسرائیل کو ایک خاص قوم' ایک خاص نظام کی حامل قوم اور ایک خاص رسالت کی حامل امت بنانا تھا اور ظاہر ہے کہ کسی قوم اور

امت کی تعمیر ایک نہایت ہی مشکل کام ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کو بار بار دہرایا ہے ۔ اس لیے کہ ایک نظریہ کی اساس پر کسی نئی امت کی تعمیر کے سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ایک مخصوص نمونہ تھی ۔ ایسے عظیم کام کی راہ میں داخلی اور خارجی مشکلات ہوتی ہیں ۔ ایسی ہمہ گیر دعوتوں میں کجی بھی پیدا ہوتی رہتی ہے ۔ وہ مخصوص شکل بھی اختیار کر لیتی ہے اور اسے بہت سے تجربات سے بھی گزرنا پڑتا ہے ۔ اور راستے میں مشکلات بھی آتی ہیں ۔

سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدین کی بدویانہ زندگی سے کیوں گزارا گیا تو یہ اس لیے تاکہ وہ عوام الناس کی پرمشقت زندگی کے نشیب و فراز بھی جان لیں اور براہ راست تجربہ بھی حاصل کر لیں ۔

شاہی محلات کی زندگی کی ایک مخصوص فضا ہوتی ہے ' مخصوص آداب اور پروٹوکول ہوتے ہیں ۔ اگر کوئی اعلیٰ درجے کا سلیم الفطرت ' پاک طینت اور صاحب علم و فضل کیوں نہ ہو ' محلات کی زندگی کی پرچھائیں اس پر ضرور پڑتی ہے ۔ اور اس کے کچھ نہ کچھ اثرات ضرور رہ جاتے ہیں جہاں تک رسالت کا تعلق ہے اس میں ایک رسول کا واسطہ غنی سے بھی پڑتا ہے اور فقیر سے بھی ۔ امت میں مالدار بھی ہوتے ہیں اور فقراء بھی ہوتے ہیں ۔ اس میں صاف ستھرے بھی ہوتے ہیں اور میل کچیل والے بھی ہوتے ہیں ' مہذب بھی ہوتے ہیں اور وحشی بھی ہوتے ہیں ۔ پاک فطرت بھی ہوتے ہیں اور خبیث الفطرت بھی ہوتے ہیں ۔ اچھے بھی اور برے بھی ' قوی بھی اور ضعیف بھی ۔ صابر بھی اور جزع و فزع کرنے والے بھی ۔ غرض امت میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور نبی نے سب کی اصلاح کرنی ہوتی ہے ۔ فقراء لوگوں کے کھانے پینے ' چلنے پھرنے اور لباس کی الگ عادات ہوتی ہیں ۔ وہ معاملات کو اپنے ذہن کے مطابق سمجھتے ہیں ۔ ان کے سامنے زندگی کا ایک مخصوص تصور ہوتا ہے ' ان کی بات چیت ان کی حرکات و سکنات ' ان کا کلام اور ان کے شعور کا اپنا مخصوص انداز ہوتا ہے ۔ یہ عوامی عادات ان لوگوں پر بہت بھاری ہوتی ہیں ' جنہوں نے محلات میں تربیت پائی ہوئی ہوتی ہے ۔ اونچے محلات کے لوگ ' ان کے عوامی انداز کو دیکھنے کے روادار بھی نہیں ہوتے ' چہ جائیکہ وہ انہیں برداشت کریں اور ان کا علاج کریں ۔ اگرچہ ان عامی لوگوں کے دل بھلائی سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں ۔ اور وہ اصلاح پذیر ہوتے ہیں کیونکہ ان کا ظاہری رنگ ڈھنگ ' ان کی ظاہری عادات ' اونچے محلات والے کو نہیں جچتے ۔

ایک رسول کو بعض اوقات مشقتوں ' تنہائیوں اور تنگ دستیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ لیکن وہ لوگ جو بڑے بڑے محلات میں رہنے کے عادی ہوتے ہیں ' ان کے اندر قربانی دینے کا بے پناہ جذبہ کیوں نہ ہو ' وہ بہت طویل عرصے تک تنگ دستی ' محرومی اور عملی زندگی میں مشقتوں کو برداشت نہیں کر سکتے کیونکہ وہ محلات کے اندر پرتعیش ' فراوانی اور آرام طلبی کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں ۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تقاضا یوں ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کو محلات کے اس اعلیٰ معیار کی زندگی سے ذرا نیچے لا کر عوامی زندگی کی سطح تک اتارا جائے ۔ انہیں چرواہوں کی سوسائٹی کے اندر ڈال دیا جائے اور خوف ' تعاقب اور پکڑے جانے کے ڈر سے فرار کے بعد ایک چرواہے کی زندگی گزارنے کا عادی بنایا جائے جہاں انہیں صرف کھانا اور ٹھکانا ملتا ہے تاکہ شہزادوں کے مزاج میں غربت اور غرباء سے جو کھچاؤ ہوتا ہے وہ دور ہو جائے ۔ چرواہوں کی عادات ' ان کے اخلاق ' ان کی درشتی اور ان کی سادگی کے بارے میں شہزادوں کے اندر جو ناگواری پائی جاتی ہے وہ دور ہو جائے ۔ ان کی جہالت '

غربت ' بدحالی اور مجموعی طور طریقوں سے حضرت موسیٰ شہزادہ اپنے آپ کو بلند اور دور نہ سمجھیں ' اور اس لیے کہ ان کو عوامی زندگی کے گہرے سمندروں کے اندر ڈال دیا جائے جبکہ پہلے وہ انسانی زندگی کے ایک محدود دھارے کے اندر تیرتے رہے تھے تاکہ آنے والی داعیانہ زندگی کے لیے وہ اچھی طرح تیار ہو جائیں ۔

جب موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت نے یہ تجربہ مکمل کر لیے اور وہ عوامی زندگی کے نشیب و فراز سے خوب واقف ہو گئے اور یہ تجربات انہیں ایک غریب الدیار اجنبی کی حیثیت سے دوسرے علاقے میں رہ کر ہوئے تو دست قدرت نے انہیں پھر اپنی جائے پیدائش کی طرف روانہ کیا ۔ جہاں ان کے اہل و عیال اور ان کی قوم رہتی تھی ۔ اور جہاں انہوں نے مشکل ترین فریضہ رسالت ادا کرنا تھا اب وہ اسی راہ پر چل رہے ہیں ۔ اس سے وہ بھاگے تھے اور بالکل یکہ و تنہا بھاگتے چلے جا رہے تھے ۔ سوال یہ ہے کہ اس ایک ہی راستے پر وہ کیوں آئے اور واپس ہوئے ؟ یہ دراصل ایک جنگی مشق تھی انہیں اس راستے کے نشیب و فراز اور راہ و گھاٹ سے خبردار کرنا مطلوب تھا ۔ کیونکہ قدرت نے طے کر رکھا تھا کہ عنقریب اسی راستے سے موسیٰ نے اپنی قوم کی قیادت کرتے ہوئے سینائی میں داخل ہونا ہے ۔ یہ دراصل ہراول دستے اور رہبری کی مشق تھی تاکہ حضرت موسیٰ کو خود اپنے سوا کسی اور راہنما کی ضرورت نہ پڑے ' راستہ بتلانے والے کی بھی ۔ کیونکہ ان کی قوم ایسی حالت میں جا گری تھی کہ انہیں چھوٹے بڑے سب کاموں میں راہنمائی کی ضرورت تھی اس لئے کہ ذلت ' غلامی اور ماتحتی نے انہیں پوری طرح بگاڑ کر رکھ دیا تھا ۔ ان کے اندر کوئی تدبر اور کوئی سوچ نہ رہی تھی ۔

اب معلوم ہو گیا کہ قدرت الٰہیہ کس طرح اپنی نظروں کے نیچے حضرت موسیٰ کی تربیت کر رہی تھی اور ان کو فریضہ رسالت کی ادائیگی کے لیے کس طرح اچھی تربیت دی گئی ۔ اب ذرا دیکھیے کہ حضرت موسیٰ نے واپسی کا سفر کس طرح طے کیا ؟

فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ

( ۲۸ : ۲۹ ) "جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی اور وہ اپنے اہل و عیال کو لے کر چلا تو طور کی جانب اس کو ایک آگ نظر آئی ۔ اس نے اپنے گھر والوں سے کہا "ٹھہرو ' میں نے ایک آگ دیکھی ہے ' شاید میں وہاں سے کوئی خبر لے آؤں یا اس آگ سے کوئی انگارہ ہی اٹھا لاؤں جس سے تم تاپ سکو" ۔

یہاں یہ ایک اہم سوال ہے کہ وہ کیا سوچ تھی جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر لوٹنے پر آمادہ کیا ۔ مدین میں انہوں نے عرصہ کار پورا کر دیا ۔ اب وہ مصر لوٹ رہے ہیں حالانکہ وہ مصر سے نہایت ہی خوف کی حالت میں نکلے تھے ۔ ان کو تعاقب کا ڈر تھا ۔ وہ یوں واپس ہو رہے تھے کہ شاید وہ اس خطرے کو بھول گئے ہیں جو مصر میں اب بھی ان کو درپیش ہے ۔ وہاں انہوں نے ایک آدمی کو قتل کیا ہوا ہے ' فرعون ابھی زندہ ہے جو اپنے سرداروں کے ساتھ آپ کے قتل کا مشاورت کر رہا تھا ۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ عالم بالا کی اپنی سکیم کے مطابق ہو رہا ہے ۔ اس بار شاید اہل و عیال اور قوم اور وطن

کے لیے فطری میلان انہیں واپسی پر مجبور کر رہا ہے اور ان کے دل سے وہ خطرات اب محو ہو گئے جن کی بنا پر اس نے یکہ و تنہا یہاں سے فرار اختیار کیا تھا۔ اور یہ دست قدرت اس لیے کر رہا ہے کہ وہ اس مہم اور منصب کے لیے تیار ہو جائیں جس کے لیے اللہ نے ان کو اول روز پیدا کیا ہے۔

بہرحال وجہ جو بھی ہو' حضرت موسیٰ واپس ہو رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے اہل و عیال بھی ہیں۔ رات کا وقت ہے' سخت اندھیرا ہے۔ یہ قافلہ راستے سے بھٹک گیا ہے۔ سردیوں کا موسم ہے۔ اس لیے کہ آگ دیکھ کر وہ وہاں سے آگ لانے کے لیے جا رہے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ آگ کے پاس جو کوئی ہو گا یا تو راستہ بتا دے گا ورنہ وہ ایک انگارہ لے آئیں گے تاکہ تاپ سکیں۔ یہ اس قصے کا پہلا منظر ہے۔

دوسرا منظر نہایت غیر متوقع ہے۔

فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ

(٢٨ : ٣٠) "وہاں پہنچا تو وادی کے داہنے کنارے پر مبارک خطے میں ایک درخت سے پکارا گیا"۔ حضرت موسیٰ تو دیکھ رہے ہیں کہ آگ ہے اور یہ وادی طور میں ان کے دائیں جانب ہے۔ اور یہ جگہ نہایت ہی متبرک ہے' اور یہ وادی بھی آج ہی متبرک ہو رہی ہے' پوری کائنات لمحہ بھر کے لیے خاموش ہے اور اس کے اندر عالم بالا اور رب ذوالجلال کی یہ آواز گونج رہی ہے' بظاہر کانوں پر وہ ایک درخت مبارک سے آ رہی ہے اور شاید یہ اس علاقے میں واحد درخت ہے۔

اَنْ یّٰمُوْسٰۤی اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (٢٨ : ٣٠) "اے موسیٰ' میں اللہ ہوں سارے جہانوں کا مالک"۔ حضرت موسیٰ نے اس آواز کو براہ راست سنا۔ اس گہری اور خاموش وادی میں وہ اکیلے کھڑے تھے۔ نہایت ہی تاریک اور خاموش رات میں۔ یہ آواز پوری کائنات بھی ہر طرف سے اس آواز کو سن رہی تھی' زمین اور آسمانوں کی دوریوں اور بلندیوں میں یہ آواز گونج رہی تھی۔ حضرت موسیٰ نے اس آواز کو پایا' کس ذریعہ سے پایا' کس طرح سے سنا' یہ ہمیں معلوم نہیں' البتہ حضرت موسیٰ کی ذات اور ان ماحول اور پوری کائنات اس سے گونج رہی تھی اور بھری ہوئی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے رب کائنات کی آواز کو پایا اور اس کے متحمل ہو گئے' کیونکہ ان کو اس کے لیے تیار کر لیا گیا تھا۔

اس کائنات کے ضمیر نے اس آواز کو ریکارڈ کر لیا' جہاں اس آواز کو حضرت موسیٰ نے پایا' وہ جگہ بابرکت ہو گئی۔ یہ جگہ اب مکرم ہو گئی اور حضرت موسیٰ اب نہایت ہی بابرکت اور مکرم جگہ میں کھڑے تھے اور یہ آواز ابھی ختم نہیں ہوئی مکالمہ جاری ہے۔

اَلْقِ عَصَاكَ (٢٨ : ٣١) "پھینک دے اپنی لاٹھی"۔ حضرت موسیٰ نے باری تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے فوراً لاٹھی پھینک دی۔ دیکھتے کیا ہیں؟ وہ تو اب ان کی وہ لاٹھی نہیں ہے جو ان کے ساتھ ایک عرصہ تک رہی

اور جس کو وہ یقیناً جانتے تھے کہ یہ ایک عصا ہے ۔ عصا نہیں اب تو وہ ایک سانپ ہے جو زمین پر رینگ رہا ہے ۔ بڑی تیزی سے ادھر ادھر جا رہا ہے اور یہ اس طرح کروٹیں بدل رہا ہے جس طرح چھوٹے چھوٹے سانپ بدلتے ہیں حالانکہ یہ بہت ہی بڑا سانپ نظر آتا ہے

فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ (۲۸ : ۳۱) "جو موسیٰ نے دیکھا کہ وہ لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے 'تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا" ۔ اس لیے کہ یہ نہایت ہی غیر متوقع صورت حال تھی 'اس کے لیے وہ ذہنا تیار نہ تھے 'پھر آپ کا مزاج بھی انفعالی تھا ۔ آپ پر ہر صورت حال کا جلد اثر ہو جاتا تھا ۔ آپ اس طرح بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ یہ سانپ ان کی طرف بڑھ بھی رہا ہے یا نہیں تاکہ وہ معلوم کرتے کہ یہ عجیب معجزہ ہے اور اس پر کچھ غور کرتے ۔ جو لوگ بھی جلد متاثر ہو جاتے ہیں ان کی روش اسی طرح ہوتی ہے ۔ ندائے ربانی جاری ہے ۔

يٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ (۲۸ : ۳۱) "موسیٰ پلٹ آ اور خوف نہ کر تو بالکل محفوظ ہے" ۔ موسیٰ علیہ السلام کے لیے خوف اور امن کے یہ تجربے کوئی نئے نہ تھے ۔ ان کی زندگی کے مختلف مراحل میں خوف اور امن کے چکروں پر مشتمل ہیں یہ خوف اور امن ان کی پوری زندگی کے موسم ہیں ۔ آغاز سے انجام تک اور موسیٰ علیہ السلام کا یوں متاثر ہو جانا بھی حکمت خداوندی پر مبنی اور مطلوب و مقصود تھا ۔ ان کی زندگی میں اسی طرح مقدر تھا کیونکہ حضرت موسیٰ کی زندگی میں یہ زیر و بم اور یہ اضطراب اور یہ تلاطم بنی اسرائیل کی جامد 'تقلیدی اور رکی ہوئی زندگی کے بالمقابل قصداً پیدا کیا گیا تھا ۔ یہ قدرت کی تقدیر تھی اور قدرت کی گہری حکمت اور تدبیر پر مبنی تھی ۔

اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ (۲۸ : ۳۱) "واپس آجاؤ 'اور ڈرو نہیں تم محفوظ ہو" ۔ کس طرح وہ محفوظ نہ ہو گا جسے دست قدرت آگے بڑھا رہا ہو اور جس کی نگرانی اللہ تعالیٰ خود کر رہا ہو ۔ ابھی مکالمہ جاری ہے ۔

اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ (۲۸ : ۳۲) "اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال 'چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے" ۔ حضرت موسیٰ نے حکم کی اطاعت فرمائی اور اپنے ہاتھ کو گریبان میں ڈالا اور نکالا ۔ یہ ان کے لیے اسی وقت دوسرا غیر متوقع منظر تھا کہ ہاتھ سفید اور چمکدار ہے اور بغیر کسی بیماری کے ایسا ہے حالانکہ پہلے وہ گندم گوں تھا ۔ ہاتھ کے سفید ہونے میں اشارہ اس طرف تھا کہ حق اور سچائی واضح اور صاف اور روشن دن کی طرح ہے ۔

اب موسیٰ علیہ السلام جذباتی اور متاثر ہونے والی شخصیت نے اپنا کام دکھایا ۔ وہ ان مناظر 'غیر متوقع مناظر کو دیکھ کر ڈر گئے اور کانپنے لگے ۔ ایک بار پھر ربانی ہدایت براہ راست آتی ہے ۔ حکم ہوتا کہ اپنے ہاتھوں کو اپنے بازوؤں کو بھینچ لو ' اس طرح تمہارے دل کی دھڑکن کم ہو گی اور تمہیں پورا اطمینان ہو جائے گا ۔

وَّ اضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ (۲۸ : ۳۲) ’’اور خوف سے بچنے کے لیے اپنا بازو بھینچ لو‘‘۔ گویا ان کا ہاتھ ان کا پر ہے جسے وہ سینے کے ساتھ ملا رہے ہیں جس طرح پرندہ مطمئن ہو کر پروں کو جسم سے جوڑ لیتا ہے۔ جب پرندہ پروں کے ساتھ پھڑپھڑاتا ہے تو اس کی کیفیت اس طرح ہوتی ہے جس طرح انسانی دل دھڑکتا ہے۔ اور جب وہ پروں کو جوڑتا ہے تو وہ اطمینان اور سکون کی کیفیت کے ساتھ مشابہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم یہاں اس مفہوم کی ایسی ہی تصویر کشی کرتا ہے :

اب موسیٰ علیہ السلام باری تعالیٰ کی طرف سے ہدایات پا چکے ہیں اور جو مشاہدات ان کو کرائے گئے وہ مشاہدہ وہ کر چکے ہیں۔ یہ دو نشانیاں اور معجزات تو وہ خود دیکھ چکے ہیں۔ پہلے وہ خود بھی خائف ہو گئے اور ان کا دل دھڑکنے لگا۔ پھر ان کو اطمینان دیا گیا۔ اب ان کو وہ اصل مشن سپرد کیا جاتا ہے جس کے لیے ان کو ابتدا سے آغاز پیدائش سے تربیت دی جا رہی ہے۔

فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَائِهٖ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ

(۲۸ : ۳۲) ’’یہ دو روشن نشانیاں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے ‘وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں‘‘۔

یہ پیغام گویا فرعون اور اس کے سرداروں کے لیے تھا۔ اور یہ اس وعدے کا ایفا ہوا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے ساتھ کیا گیا تھا کہ ’’ہم اسے تیری طرف لوٹانے والے ہیں اور اسے مرسلین میں سے بنانے والے ہیں‘‘۔ اور یہ پختہ وعدہ تھا‘ کئی سال گزر گئے کہ یہ طے ہوا تھا۔ لیکن یہ اللہ کا وعدہ تھا اور اللہ وعدہ خلافی نہیں فرمایا کرتا۔ وہ تو سب سے سچی بات کرنے والا ہے۔

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یاد آتا ہے کہ انہوں نے تو ان کا ایک آدمی قتل کیا ہے اور یہ کہ وہ ان سے اس وقت چلے گئے جب گرفتاری کا خطرہ تھا۔ اور اس لیے بھاگ گئے تھے کہ انہوں نے انہیں قتل کرنے کے مشورے شروع کر دیے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کا رب تعالیٰ کے ساتھ مکالمہ شروع تھا اور یہ عظیم اعزاز تھا جو انہیں بخشا گیا۔ پھر ان کو دو عظیم معجزات کا اعزاز بھی بخشا گیا۔ اور پھر اپنی نگرانی میں ان کی تربیت فرمائی۔ لہٰذا انہوں نے اپنے مشن کے سلسلے میں ایک عملی دشواری کی طرف سے خدشے کا اظہار کیا۔ یہ نہ ہو کہ وہ لوگ چھوٹتے ہی انہیں قتل کر دیں اور دعوت کا سلسلہ ہی کٹ جائے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ (۲۸ : ۳۳) ’’موسیٰ نے عرض کیا میرے آقا میں تو ان کا ایک آدمی قتل کر چکا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے‘‘۔ موسیٰ علیہ السلام منصب نبوت قبول کرنے سے معذرت نہ کر رہے تھے۔ نہ ان کا مقصد یہ تھا کہ پیچھے ہٹ جائیں یا منہ موڑ لیں اور نافرمانی کریں بلکہ وہ یقین دہانی چاہتے تھے اور یہ اطمینان چاہتے تھے کہ دعوت کو جاری رہنا چاہئے۔ اور اگر وہ قتل ہو گئے جس طرح خدشہ ہے تو سلسلہ شروع ہی سے ختم ہو جائے گا۔ یہ ان کی جانب سے ایک مناسب بات بھی ہے حالانکہ وہ قوی اور امین

تھے ـ ڈرنے والے نہ تھے ـ

وَ اَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْٓ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ (۲۸ : ۳٤) "اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہے 'اسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تاکہ وہ میری تائید کرے ـ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے"ـ ہارون مجھ سے زیادہ فصیح و بلیغ مقرر ہے اور دعوت کو اچھی طرح پیش کر سکتا ہے 'اسے میرے لیے تائید کنندہ کے طور پر بھیج دے تاکہ وہ میرے دعوائے رسالت کی تائید کرے اور اگر وہ مجھے قتل ہی کر دیں تو میرا خلیفہ ہو ـ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کو یقین دہانی کرائی جاتی ہے اور درخواست قبول کر لی جاتی ہے ـ

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا بِاٰیٰتِنَآ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ (۲۸ : ۳۵) "فرمایا"ہم تیرے بھائی کے ذریعہ سے تیرا ہاتھ مضبوط کریں گے اور تم دونوں کو ایسی سعادت بخشیں گے کہ وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے ـ ہماری نشانیوں کے زور سے غلبہ تمہارا اور تمہارے پیروؤں کا ہی ہو گا"ـ جو واقعات بھی رونما ہو رہے ہیں ان میں قدرت الٰہیہ کی معجزانہ قوتیں زیادہ واضح طور پر حضرت موسیٰ کے ساتھ کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی اور غلبہ کے پیچھے صرف متعارف اسباب ہی نظر نہ آئیں بلکہ اس پر عالم بالا کی مشیت کا رنگ غالب ہو تاکہ لوگوں کے نظریات کے اندر محض مادی اسباب کے علاوہ آسمانی قوتوں کی حیثیت بھی واضح طور پر اہمیت اختیار کرلے ـ لوگوں کو اللہ پر ایمان حاصل ہو اور وہ اللہ پر توکل کریں اور نتائج اللہ پر چھوڑ دیں ـ

یہ خوبصورت اور عظیم منظر ختم ہو جاتا ہے اور زمان و مکان کے فاصلے لپیٹ دیئے جاتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام اب دربار فرعون میں ہیں ـ اللہ کی واضح آیات لیے ہوئے ہیں ـ اب ہدایت و ضلالت آمنے سامنے ہیں ـ ان کے درمیان سخت مکالمہ شروع ہے ـ اور اس دنیا میں حق و باطل کی کشمکش کا فیصلہ یوں ہوتا ہے کہ باطل اپنے لاؤ لشکر سمیت غرق ہو جاتا ہے ـ اور آخرت میں لازماً وہ لعنت کا مستحق ہو گا ـ

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰی بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًی وَّ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰی رَبِّیْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰی مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَقَالَ فِرْعَوْنُ یٰٓاَیُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ ۚ فَاَوْقِدْ لِیْ یٰهَامٰنُ عَلَی الطِّیْنِ فَاجْعَلْ لِّیْ

صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۚ وَاسْتَكْبَرَ

هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۹﴾

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾

۴ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَ

۱۴ع اَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ﴿۴۲﴾

"پھر جب موسیٰ ....... ان لوگوں کے پاس ہماری کھلی کھلی نشانیاں لے کر پہنچا تو انہوں نے کہا کہ "یہ کچھ نہیں ہے مگر بناوٹی جادو۔ اور یہ باتیں تو ہم نے اپنے باپ دادا کے زمانے میں کبھی سنیں ہی نہیں"۔ موسیٰ نے جواب دیا "میرا رب اس شخص کے حال سے خوب واقف ہے جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ آخری انجام کس کا اچھا ہوتا ہے' حق یہ ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پاتے"۔

اور فرعون نے کہا "اے اہل دربار' میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا۔ ہامان' ذرا اینٹیں پکوا کر میرے لیے ایک اونچی عمارت تو بنوا' شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کو دیکھ سکوں' میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں"۔

اس نے اور اس کے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور سمجھے کہ انہیں کبھی ہماری طرف پلٹنا نہیں ہے۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا اور سمندر میں پھینک دیا۔ اب دیکھ لو کہ ان ظالموں کا کیسا انجام ہوا۔ ہم نے انہیں جہنم کی طرف دعوت دینے والے پیش رو بنا دیا اور قیامت کے روز وہ کہیں سے کوئی مدد نہ پا سکیں گے۔ ہم نے اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے روز وہ بڑی قباحت میں مبتلا ہوں گے۔

یہاں قرآن کریم نے نہایت ہی جلدی میں فرعون کا انجام بتا دیا اور ایک فیصلہ کن وار کے نتیجے میں اس کا کام تمام ہو گیا۔ یہاں جادوگروں کے مقابلے کو حذف کر دیا گیا ہے۔ جبکہ دوسری سورتوں میں بعض جگہ اجمال اور بعض جگہ تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر ہوا ہے۔ یہ کڑی یہاں اس لیے حذف کر دی گئی ہے کہ تکذیب کے بعد جلد ہی ہلاکت کا منظر پیش کر دیا جائے۔ اور نہ صرف یہ کہ دنیاوی عذاب کا ذکر ہو بلکہ آخرت کے عذاب کی ایک جھلک بھی دکھا دی جائے۔ اختصار اور جلدی کے ساتھ بات کو انجام پہنچانا اس سورت میں مقصود بالذات ہے۔ کیونکہ پوری سورت کا انداز یوں ہی ہے۔ اس سورت میں دست قدرت نمایاں طور پر متحرک نظر آتا ہے اس لیے یہاں بھی موسیٰ اور فرعون کے آمنے سامنے کے بعد جلد ہی فرعون کا انجام بد دکھا دیا گیا اور دست قدرت نے چشم زدن میں اس عظیم قوت کو ختم کر دیا اور تفصیلات بیان کرنے کے بجائے جلدی سے آخری جھلک دکھا دی۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا

فَلَمَّا جَآءَھُمْ ... اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ (۲۸ : ۳۶) ''پھر جب موسیٰ ....... ان لوگوں کے پاس ہماری کھلی کھلی نشانیاں لے کر پہنچا تو انہوں نے کہا کہ ''یہ کچھ نہیں ہے مگر بناوٹی جادو۔ اور یہ باتیں تو ہم نے اپنے باپ دادا کے زمانے میں کبھی سنیں ہی نہیں''۔ یہ ایک ایسی سچائی کا انکار ہے جس کا کوئی جواب ان سے بن نہ پڑتا تھا اور تمام زمانوں میں حاملین حق کے ساتھ مکذبین نے یہی سلوک کیا ہے۔ جب وہ لاجواب ہو گئے تو ایسی باتیں کرتے رہے۔ ان کا دعویٰ یہ رہا ہے کہ یہ جادو ہے۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہیں ہے کہ یہ تو نئی بات ہے۔ اس قسم کی بات ہم نے کبھی اپنے آباء سے نہیں سنی۔

یہ لوگ حضرت موسیٰ کے معجزات کے مقابلے میں کوئی حجت اور دلیل نہیں پاتے اور نہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں کوئی برہان پیش کرتے ہیں۔ وہ بس ایک مجمل بات کرتے ہیں جس سے نہ حق ثابت ہوتا ہے اور نہ باطل۔ نہ کوئی دعویٰ رد ہوتا ہے اور نہ ثابت ہوتا ہے۔ کیا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم نے یہ بات کبھی نہیں سنی۔ یہ محض شک کا اظہار ہے اور اہل باطل ہمیشہ جب سچائی کو تسلیم نہیں کرتے تو وہ اسے مشکوک بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ ہر دور میں باطل کا یہی رویہ رہا۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہاں بات مختصر کرتے ہوئے معاملہ کو اللہ کے حوالے کر دیا۔

وَقَالَ مُوْسٰی رَبِّیْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْھُدٰی مِنْ عِنْدِہٖ وَمَنْ تَکُوْنُ لَہٗ عَاقِبَۃُ الدَّارِ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۸ : ۳۷) ''موسیٰ نے جواب دیا ''میرا رب اس شخص کے حال سے خوب واقف ہے جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ آخری انجام کس کا اچھا ہوتا ہے' حق یہ ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پاتے''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے یہ نہایت ہی مہذب اور باادب جواب ہے۔ یہ جواب بہت ہی واضح اور نصیحت آموز ہے لیکن اس میں کوئی تلمیح اور اشارہ اور احتمال نہیں ہے۔ یہ جواب پر اعتمادی کے ساتھ دیا گیا ہے اور حضرت موسیٰ کو پورا اطمینان ہے کہ حق و باطل کے اس مقابلے میں حق فلاح پائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو خوب معلوم ہے کہ حضرت موسیٰ سچے ہیں اس لئے کہ وہ اللہ کی براہ راست ہدایت اور مکالمے کے تحت کام کر رہے ہیں۔ اور اچھا انجام ان لوگوں کے لیے ہے جو ہدایت پر ہیں اور ظالم کبھی فلاح نہیں پاتے۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ اگرچہ بعض معاملات بظاہر یوں نظر آتے ہیں کہ حق کو کامیابی حاصل نہیں ہو رہی ہے۔ یہ اللہ کی سنت ہے اور اسی سنت کے ساتھ حضرت موسیٰ بھی فرعون کے مقابلے میں اترے ہیں اور تمام انبیاء سنن الٰہیہ کے مطابق ہی کام کرتے ہیں۔

اب اس پر اطمینان' مہذبانہ اور معقول جواب کا جواب الجواب فرعون کیا دیتا ہے؟ محض دعویٰ سرکشی' کھیل اور مزاح اور غرور لاابالی پن اور سستی۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ یٰٓاَیُّھَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرِیْ فَاَوْقِدْ لِیْ یٰھَامٰنُ عَلَی الطِّیْنِ فَاجْعَلْ لِّیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓی اِلٰہِ مُوْسٰی وَاِنِّیْ لَاَظُنُّہٗ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ

(۲۸ : ۳۸) ''اور فرعون نے کہا ''اے اہل دربار' میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا۔ ہامان' ذرا اینٹیں

پکوا کر میرے لیے ایک اونچی عمارت تو بنوا' شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کو دیکھ سکوں' میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں"۔

اے سرداران مصر میں نہیں سمجھتا کہ میرے سوا تمہارا اور بھی کوئی حاکم و الٰہ ہے۔ فسق و سرکشی کا یہ بلند ترین رویہ ہے اور سردار ظاہر ہے کہ وہ اقرار کریں گے۔ اب وہ یہاں اس نظریہ کا سہارا لیتا ہے جو اس دور میں مصر میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا کہ بادشاہوں کا نسب نامہ الہوں سے ملتا ہے۔ اس کے بعد وہ اس جبر کا سہارا بھی لیتا ہے جس کے مقابلے میں کوئی دماغ سوچتا نہیں اور کوئی شخص سر اٹھا کر نہیں چلتا۔ اور کوئی زبان یہ جرات نہیں کرتی کہ کوئی اختلافی بات کرے' حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ بادشاہ انہی جیسا ایک بشر ہے جو پیدا ہوتا ہے اور مرتا ہے لیکن ان اساطیر اور پھر جبر کی بنا پر وہ ایسا کہتا تھا اور یہ تسلیم کرتے تھے' بغیر اعتراض اور تنقید کے۔

اب وہ ایک ایسی حرکت کرتا ہے جس سے بظاہر تو وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ فی الواقعہ حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ موسیٰ کے الٰہ کو وہ آسمانوں میں تلاش کرنے نکلا ہے لیکن دراصل وہ حضرت موسیٰ کے ساتھ ایک سنجیدہ مزاح کرتا ہے۔

فَاَوْقِدْ لِیْ یٰهَامٰنُ عَلَی الطِّیْنِ فَاجْعَلْ لِّیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓی اِلٰهِ مُوْسٰی

(۲۸ : ۳۸) "اے ہامان' ذرا اینٹیں پکوا کر میرے لیے ایک اونچی عمارت تو بنوا' شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کو دیکھ سکوں"۔

موسیٰ کہتا ہے کہ اس کا الٰہ آسمانوں میں ہے۔ بطور مزاح وہ کہتا ہے کہ مجھے تو اس میں شک ہے لیکن اس شک کے باوجود میں حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ (۲۸ : ۳۸) "میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں"۔

جس طرح دوسرے مقامات پر ہوا' یہاں حضرت موسیٰ اور جادوگروں کا مقابلہ بھی ہوا۔ جس کو یہاں حذف کر دیا گیا ہے۔

وَ اسْتَكْبَرَ هُوَ وَ جُنُوْدُهٗ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَیْنَا لَا یُرْجَعُوْنَ

(۲۸ : ۳۹) "اس نے اور اس کے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے اس بڑائی کا گھمنڈ کیا اور سمجھے کہ انہیں کبھی ہماری طرف پلٹنا نہیں ہے"۔ جب ان کو یہ واہمہ ہو گیا کہ انہوں نے اللہ کی طرف نہیں پلٹنا تو انہوں نے زمین میں ناحق گھمنڈ شروع کر دیا۔ اور معجزات اور پیغمبروں کو جھٹلایا۔ وہ معجزات جن کی تفصیلات اس سے قبل گزر گئی ہیں اور دوسری سورتوں میں ان کا مظاہرہ مفصل دکھایا گیا ہے۔

فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ (۲۸ : ۴۰) "آخر کار ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو

پکڑا اور سمندر میں پھینک دیا"۔ یہ نہایت ہی اختصار کے ساتھ لیکن فیصلہ کن انداز میں سخت پکڑ اور ' سمندر میں پھینک دیا جانا' ہے جس طرح انسان کسی کنکر اور کسی پتھر کو سمندر میں پھینک دیتا ہے ۔ جس طرح موسیٰ کی والدہ نے شیرخوار موسیٰ کو فرعون کے ڈر سے دریا میں پھینک دیا تھا' اس طرح اسے اور اس کے لشکروں کو سمندر میں پھینک دیا گیا۔ لیکن اس بچے کو اللہ نے بچانا تھا تو بچ گیا اور فرعون اور اس کے لشکروں کو غرق کرنا تھا تو غرق ہو گئے ۔ سمندر ان کے لیے باعث ہلاکت ہو گیا۔ لہٰذا امن و امان بھی اللہ کے ہاں ہے اور ڈرنا ہے تو اللہ ہی سے ڈرنا چاہئے کہ وہ ڈرنے کا مستحق ہے ۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ (۲۸ : ۴۰) "دیکھو' ان ظالموں کا کیسا انجام ہوا؟"۔ یہ انجام وہ منظر پر نظر آتا ہے ۔ تمام دنیا کے سامنے ہے ۔ اس میں مکذبین کے لیے بھی عبرت ہے اور نصیحت پانے والوں کے لیے بھی عبرت ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکش جباروں کو اللہ ہلاک کرنا چاہے تو چشم زدن میں نیست و نابود کر دیتا ہے 'نصف سطر لکھنے سے بھی پہلے ۔

اگلے لمحے فرعون اور اس کا لشکر اس دنیا سے اس جہاں میں ہیں اور فرعون اور اس کا لشکر وہاں بھی ایک عجیب منظر میں نظر آتے ہیں ۔ ان کو حشر کے فیصلے کے بعد جہنم کی طرف بلایا جاتا ہے ۔ فرعون وہاں بھی اپنے لاؤ لشکر سمیت جہنم کی طرف رواں دواں ہے جس طرح وہ تعاقب میں حضرت موسیٰ کے پیچھے رواں تھا۔

وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ (۲۸ : ۴۱) "ہم نے ان کو جہنم کی طرف دعوت دینے والے پیش رو بنا دیا"۔ کیا ہی بری دعوت ہے جو یہ لوگ دیتے ہیں ۔ اور کیا ہی بری قیادت و امامت ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں ۔

وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ (۲۸ : ۴۱) "اور قیامت کے روز کہیں سے کوئی مدد نہ پا سکیں گے"۔ دنیا میں بھی ان کو ہزیمت اٹھانی پڑی اور آخرت میں بھی ان کو ناکامی کا سامنا کرنا ہو گا۔ سرکشی اور ظلم کا یہی بدلہ تو ہوتا ہے ۔ وہاں صرف ناکامی ہی نہ ہو گی ' بلکہ ہر طرف سے لعنت و ملامت بھی ہو گی ۔ اس زمین پر بھی اور آخرت میں حشر کے میدان میں بھی ۔

وَ اَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ (۲۸ : ۴۲) "ہم نے اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے روز وہ بڑی قباحت میں مبتلا ہوں گے"۔ مقبوحین کا لفظ ہی ایسا ہے کہ اس کی آواز ہی اس کے مفہوم کو ظاہر کرتی ہے ۔ "دقبح" شرمندگی ' طعن ' تقبیح ' گندگی اور نفرت کے تمام مفہومات مقبوحین میں شامل ہیں ۔ یہ اس لیے کہ زمین میں یہ کبر و غرور کا روپ اختیار کرتے تھے ۔ عزت و جاہ اور قوت اور بندوں پر ظلم ان کا وطیرہ تھا۔

--- ○○○ ---

یہاں سیاق کلام میں مصر سے بنی اسرائیل کے خروج کو نہایت ہی اختصار کے ساتھ اور فرعون کے انجام بد کی ایک جھلک سرعت کے ساتھ دکھانے کے بعد یہ دکھایا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو کس قدر مقام بلند عطا ہوا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۴۳)

"پچھلی نسلوں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی ' لوگوں کے لیے بصیرتوں کا سامان بنا کر ' ہدایت اور رحمت بنا کر ' تاکہ شاید لوگ سبق حاصل کریں" ۔ یہ ہے حضرت موسیٰ کا انجام ۔ یہ ایک بہترین انجام ہے ' کس قدر باعزت انجام و مقام ہے یہ ۔ جہاں تک وہ پہنچے ' ان کو کتاب دی گئی جو لوگوں کے لئے اس طرح ذریعہ ہدایت تھی جس طرح انسانوں کے لیے آنکھیں ذریعہ ہدایت ہوتی ہیں ۔ ہدایت ہے اور رحمت ہے ۔ اور اس لیے ہے کہ بنی اسرائیل سبق سیکھیں ۔ دیکھیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے نشیب و فراز میں دست قدرت نے کس طرح بار بار مداخلت کی ۔ کس طرح اللہ نے کمزوروں کی حمایت کی اور جباروں کو ہلاک کیا ۔ اور مظلومین کو بالآخر برتری حاصل ہوئی ۔

قصہ موسیٰ و فرعون اس سورت میں یوں بیان ہوا ۔ اس سے یہاں یہ ہدایت دی گئی کہ امن و سکون اللہ کی جانب سے ہوا کرتا ہے ۔ اور انسانوں سے ڈرتے وہ لوگ ہیں جو اللہ سے نہیں ڈرتے ۔ جو اللہ سے دور ہو جاتے ہیں اور یہ کہ جب ظلم اور سرکشی حد سے بڑھ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ مظلوموں کے حق میں براہ راست مداخلت کرتا ہے اور ہمیشہ اللہ ظالم کا ہاتھ پکڑتا ہے ۔ لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب جبار و قہار لوگ ظلم کرنا شروع کر دیں اور مخلوق خدا اپنے دفاع سے عاجز آ جائے ۔ یہ وہ ہدایات تھیں جو اس وقت مکہ میں برسرعمل ایک مختصر سی انقلابی جماعت کے لیے بے حد ضروری تھیں ۔ نیز مکہ کے مشرکین جو ان بیچاروں کے لیے فرعون کی طرح جبار و قہار تھے ' ان کو بھی بار بار سنایا جاتا ہے کہ تم بھی غور کرو ' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی جہاں جہاں کوئی انقلابی عمل شروع کرے گا اسے ان ہدایات کی ضرورت ہو گی ۔ جہاں بھی دعوت ہو اور اس پر تشدد ہو ۔

قرآن کریم میں قصص صرف ایسی ہی انقلابی تعلیمات کے لیے آتے ہیں ۔ داعیوں کی تربیت کے لیے ۔ اللہ کے سنن کے مناظر دکھانے کے لیے کہ سنن الہیہ کس طرح کام کرتی ہیں ' تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں اور اپنی جدوجہد میں ان سے بصیرت حاصل کریں ۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۷۷ تشریح آیات

## ۴۴ --- تا --- ۷۵

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ابھی گزرا اور سابقہ سبق میں اس کی مفصل تشریح کی گئی ۔ اس سبق میں اس قصے پر تبصرے کیے گئے ہیں اور نتائج اخذ کیے گئے ہیں ۔ ان نتائج کے بعد پھر سورت کا مضمون اپنے اصلی موضوع کی طرف پلٹ جاتا ہے ۔ اصل موضوع یہ ہے کہ امن و خوف کا مالک اللہ ہے ۔ امن دینے والا بھی وہ ہے اور خوف میں مبتلا کرنے والا بھی وہ ہے ۔ اس کے بعد روئے سخن مشرکین مکہ کی طرف پھر جاتا ہے جو شرک پر جمے ہوئے تھے ۔ اسلام کا انکار کرتے تھے اور اس کے خلاف طرح طرح کے عذرات پیش کرتے تھے ۔ مشرکین کو اس پوری کائنات کے اندر موجود شواہد بتائے جاتے ہیں ۔ پھر ان کو ڈرانے کے لیے میدان حشر کے بھی بعض مناظر دکھائے جاتے ہیں ۔ ان کو بتایا جاتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو تعلیم لے کر آئے وہ سچی ہے ۔ اہل کتاب میں سے سلیم الفطرت لوگ اسے قبول کرتے ہیں جبکہ مشرکین مکہ مدعی دین ابراہیمی ہونے کے باوجود انکار کرتے ہیں اگر وہ اس دعوت کو قبول کرلیں تو یہ ان کے لیے رحمت ثابت ہوگی ۔

اس قصے سے جو پہلا نتیجہ یہاں نکالا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کلام نازل ہو رہا ہے وہ سچا ہے ۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان قصص کو اس طرح بیان کر رہے ہیں جس طرح کوئی عینی شاہد کسی واقعہ کو بیان کر رہا ہوتا ہے ' حالانکہ حضور اکرمؐ ان واقعات کے پیش آنے کے وقت وہاں موجود نہ تھے بلکہ یہ علیم و خبیر اللہ کی طرف سے وحی ہے جو آپ پر آرہی ہے اور یہ وحی رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو شرک میں مبتلا ہیں ۔ اور اس فعل کی وجہ سے دائمی عذاب کے مستحق ہو سکتے ہیں اور اس لیے کہ اگر یہ وحی نہ آتی تو ان لوگوں کو ایک بہانہ ہاتھ آجاتا ۔

رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۸ : ۴۷)

"پروردگار تو نے کیوں نہ ہماری طرف کوئی نبی بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہل ایمان میں سے ہوتے" ۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا

وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴۶ وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ
فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَ نَكُوْنَ مِنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴۷ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ
اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۫
وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ۝۴۸ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ
اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۴۹ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ
اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ ۵
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵۰ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝۵۱ ع ۸
۸

"(اے نبیؐ) تم اس وقت مغربی گوشے میں موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو یہ فرمان شریعت عطا کیا، اور نہ تم شاہدین میں شامل تھے، بلکہ اس کے بعد (تمہارے زمانے تک) ہم بہت سی نسلیں اٹھا چکے ہیں اور ان پر بہت زمانہ گزر چکا ہے۔ تم اہل مدین کے درمیان بھی موجود نہ تھے کہ ان کو ہماری آیات سنا رہے ہوتے، مگر (اس وقت کی یہ خبریں) بھیجنے والے ہم ہیں۔ اور تم طور کے دامن میں بھی اس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے (موسیٰ کو پہلی مرتبہ) پکارا تھا، مگر یہ تمہارے رب کی رحمت ہے (کہ تم کو یہ معلومات دی جا رہی ہیں) تاکہ تم ان لوگوں کو متنبہ کر دو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہوش میں آئیں۔ (اور یہ ہم نے اس لیے کیا کہ) کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے اپنے کیے کرتوتوں کی بدولت کوئی مصیبت جب ان پر آئے تو وہ کہیں "اے پروردگار، تو نے کیوں نہ ہماری طرف کوئی رسول بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہل ایمان میں سے ہوتے"۔

مگر جب ہمارے ہاں سے حق ان کے پاس آ گیا تو وہ کہنے لگے "کیوں نہ دیا گیا اس کو وہی کچھ جو موسیٰ کو دیا گیا تھا؟" کیا یہ لوگ اس کا انکار کر چکے ہیں جو اس سے پہلے موسیٰ کو دیا گیا تھا؟ انہوں نے کہا "دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں"۔ اور کہا "ہم کسی کو نہیں مانتے"۔ (اے نبیؐ) ان سے کہو "اچھا تو لاؤ اللہ کی طرف سے کوئی کتاب جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو اگر تم سچے ہو، میں اس کی پیروی اختیار کروں گا"۔ اب اگر وہ تمہارا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دراصل یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں، اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو گا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے؟ اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا۔ اور (نصیحت کی)

بات پے درپے ہم انہیں پہنچا چکے ہیں تاکہ وہ غفلت سے بیدار ہوں"۔

غربی سے یہاں طور کا جانب غربی مراد ہے جسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مکالمے اور چلہ کشی کے چالیس روز و شب کے لیے متعین فرمایا تھا۔ اصل میعاد تیس راتیں تھیں پھر اس میں دس کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس کا تذکرہ سورت اعراف میں گزر چکا ہے۔ اس عرصہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات کی وہ تختیاں دی گئیں جن میں احکام خداوندی لکھے ہوئے تھے تاکہ ان احکام پر بنی اسرائیل کا قانونی نظام قائم ہو۔ ظاہر ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہ تھے کہ آپ از خود ان حالات و مشاہدات کی رپورٹ دے رہا ہے کیونکہ حضورؐ اور حضرت موسیٰ کے زمانوں کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے۔

وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ (۲۸: ۴۵) "ہم بہت سی نسلیں اٹھا چکے ہیں اور ان پر زمانہ گزر چکا ہے"۔ لہذا اس سے معلوم ہوا کہ حضور اکرمؐ کو یہ اطلاعات اللہ علیم و خبیر دے رہا ہے اور یہ قرآن وحی من جانب اللہ ہے۔

قرآن کریم نے حضرت موسیٰ کے قیام مدین کے واقعات کے بارے میں بھی تحدی کی ہے اور چیلنج کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے وہاں قیام کیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ واقعات بتا رہے ہیں تو حضور بذات خود مدین میں بھی تو موجود نہ تھے کہ اس زمانے کی خبریں حضور اکرمؐ نے ان سے لی ہوں اور پھر تفصیلات بیان کر دیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ

لٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ (۲۸: ۴۵) "مگر یہ خبریں ہم بھیجنے والے ہیں"۔ تو معلوم ہوا کہ قرآن مجید اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے جس کے پاس انبیائے سابقین کی خبریں محفوظ ہیں۔

پھر قرآن مجید نے حضرت موسیٰ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان مناجات اور مکالمے کو بھی اپنی جزئیات کے ساتھ نقل کیا ہے۔ نہایت گہرائی کے ساتھ۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا (۲۸: ۴۶) "اور تم طور کے دامن میں اس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے پہلی مرتبہ موسیٰ کو پکارا"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پکار تو نہ سنی تھی۔ نہ اس کی تفصیلات انہوں نے قلم بند فرمائی تھیں۔ یہ اللہ کی جانب سے اہل مکہ قوم رسول کے لیے ایک رحمت ہے کہ وہ خبریں تفصیلات کے ساتھ دی جا رہی ہیں لہذا یہ خبریں بھی اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ آپ سچے ہیں اور جو دعویٰ کرتے ہیں اس پر پہلی دلیل خود یہ قرآن ہے تاکہ عرب جیسی قوم کو آپ ڈرائیں جن کے پاس اس سے قبل ڈرانے والا نہیں آیا۔ اس سے قبل کی رسالتیں بنی اسرائیل کے پاس آئی تھیں جو عربوں کے پڑوس میں بستے تھے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد اہل عرب میں کوئی رسول نہ آیا تھا تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

یہ قرآن لوگوں کے لیے رحمت خداوندی بھی ہے اور ان پر حجت بھی ہے تاکہ وہ قیامت کے دن یہ نہ کہیں کہ ہمارے لیے تو کوئی رسول بھیجا ہی نہ گیا تھا اور یہ کہ ان کو تو اچانک ہی پکڑ لیا گیا اور یہ کہ اس پکڑ سے قبل ہمیں کوئی نوٹس نہیں دیا گیا۔ یہ لوگ جس جاہلیت اور شرک میں مبتلا تھے وہ تو موجب عذاب تھی تو اللہ نے ان کی حجت بازی اور ان کے

عذرات کو ختم کرنے کے لیے رسول بھیج دیا اور آخری رسول بھیج دیا تاکہ ان کے بعد کوئی عذر نہ کرے۔

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۸ : ۴۷) ”اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے اپنے کرتوتوں کی بدولت کوئی مصیبت جب ان پر آئے تو وہ کہیں لے پروردگار تو نے کیوں ہماری طرف کوئی رسول نہ بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہل ایمان میں سے ہوتے“۔ اگر رسول نہ آتا تو وہ ایسی ہی بات کرتے۔ اگر چہ رسول کے پاس آیات نہ ہوتیں' لیکن جب رسول آگیا اور اس کے پاس آیات بھی ہیں تو یہ لوگ ماننے سے انکار کر رہے ہیں حالانکہ اس کے پاس ناقابل تردید و ناقابل شک دلائل ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا وَقَالُوْآ اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ

(۲۸ : ۴۸) ”مگر جب ہمارے ہاں سے حق ان کے پاس آگیا تو وہ کہنے لگے ”کیوں نہ دیا گیا اس کو وہی کچھ جو موسیٰ کو دیا گیا تھا؟“ کیا یہ لوگ اس کا انکار کر چکے ہیں جو اس سے پہلے موسیٰ کو دیا گیا تھا؟ انہوں نے کہا ”دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں“۔ اور کہا ”ہم کسی کو نہیں مانتے“۔ یہی غرض تھی ان کی بہانہ سازی اور ان کے غلط عذرات کی۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو بھی تسلیم نہ کیا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ معجزات کیوں نہیں دیئے گئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے تھے یعنی مادی معجزات یا قرآن کریم تختیوں پر لکھا ہوا کیوں نہیں اتار گیا جس طرح تورات کو لکھا ہوا اتار گیا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے جو دلیل بیان کی ہے' یہ اس میں سچے نہیں ہیں۔ نہ ان کا یہ اعتراض مخلصانہ ہے۔

اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ (۲۸ : ۴۸) ”کیا یہ لوگ اس کا انکار نہیں کر چکے جو اس سے پہلے موسیٰ کو دیا گیا تھا؟“ جزیرۃ العرب میں یہودی رہتے تھے۔ ان کے پاس تورات بھی تھی تو عربوں نے تورات کو کیوں نہ مانا۔ انہوں نے تو تورات کی بھی تکذیب کی تھی۔ نیز ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ تورات میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور صفات دونوں دی گئی ہیں اور انہوں نے قرآن کے بارے میں بعض اہل کتاب سے فتویٰ بھی پوچھا تھا اور انہوں نے کہہ دیا تھا کہ محمد جو تعلیم پیش کرتے ہیں وہ سچی ہے اور یہ تعلیم بھی کتب سابقہ کی تعلیمات کے مطابق ہے۔ لیکن انہوں نے ان فتاویٰ کو بھی تسلیم نہ کیا۔ انہوں نے تورات کو بھی جادو کہا۔ قرآن کو بھی جادو کہا اور چونکہ دونوں جادو ہیں اس لیے دونوں ایک دوسرے کے مطابق ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہے۔

قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا وَ قَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ (۲۸ : ۴۸) ”انہوں نے کہا دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور کہا ”ہم کسی کو نہیں مانتے“ وہ حق طلب کرنا ہی نہیں چاہتے ۔ ورنہ دلائل کی کوئی کمی نہیں ہے اور نہ قرآن کی پشت پر موجود دلائل ضعیف ہیں ۔

قرآن مجید ایک قدم آگے بڑھ کر ان کو اچھی طرح لاجواب کر دیتا ہے ' ان سے کہا جاتا ہے اگر تم قرآن کو تسلیم نہیں کرتے ' اور تورات کی تعلیمات بھی تمہارے دل کو نہیں لگتیں تو تم کوئی ایسی کتاب لاؤ جو تورات اور قرآن دونوں سے زیادہ ہدایت والی ہو ' ہم اس کتاب کو مان لیں گے ۔

یہ آخری بات ہے اور دلیل و برہان کی آخری حد ہے کہ تم ایسی کوئی کتاب لاؤ ' اس کے بعد بھی اگر کوئی حق کے سامنے نہیں جھکتا تو یہ مکابرہ ہو گا اور ہٹ دھرمی ہو گی ۔ اور ہٹ دھرمی کے سامنے کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی ۔

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۲۸ : ۵۰) ”اگر وہ تمہارا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دراصل یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں ' اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو گا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے ؟ اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا“ ۔

قرآن جن حقائق پر مشتمل ہے وہ نہایت واضح ہیں ۔ دین اسلام کے جو دلائل ہیں وہ قطعی الثبوت ہیں ۔ ان دلائل کا جو شخص انکار کرتا ہے وہ وہی شخص ہو گا جو اپنی خواہشات کی پیروی میں لگا ہوا ہو ۔ کیونکہ معقول انسان کے لیے دو ہی راستے ہیں ۔ تیسرا راستہ ہی نہیں ہے یا تو وہ مخلص اور حق قبول کرنے والا ہو گا تو وہ لازماً دلائل ایمان کو دیکھ کر ایمان لائے گا اور یا وہ شک میں مبتلا ہو گا ' اپنی خواہشات کا پیرو ہو گا وہ ہٹ دھرم اور کج بحثی کرنے والا ہو گا ۔ انکار محض ہٹ دھرمی کی وجہ سے کرے گا ' اس لیے نہیں کرے گا کہ اسلامی عقائد میں کوئی پیچیدگی ہے یا حجت میں کوئی ضعف ہے یا دلیل میں کوئی کمی ہے جیسا کہ نفس پرست لوگ کہتے ہیں ۔

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ (۲۸ : ۵۰) ”اگر وہ آپ کی بات نہیں مانتے تو جان لیں کہ وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں ۔ اور یہ فیصلہ حتمی ہے ' آخری ہے ' اللہ کا فیصلہ ہے ۔ اس لیے اسے رد نہیں کیا جا سکتا ۔ جو لوگ اس دین کو قبول نہیں کرتے وہ مفاد پرست ہیں ۔ اس کے سوا کوئی اور عذر نہیں ہے ۔ انہوں نے اپنے آپ کو زبردستی نا سمجھ بنا رکھا ہے دراصل اچھی طرح سمجھتے ہیں ۔ یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں ۔ حق واضح ہے اور پھر بھی یہ لوگ منہ موڑتے ہیں ۔

وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۲۸ : ۵۰) ”اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو گا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے ؟ اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا“ ۔ اور یہ اہل مکہ اس معاملے میں بڑے ظالم اور باغی ہیں ۔

یہ آیت ان لوگوں کے تمام عذرات ختم کر دیتی ہے جن کا کہنا یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کو سمجھا نہیں ہے اور ان کو دین کا پورا پورا علم نہ تھا۔ اسلام کا موقف ہے کہ اسلام بالکل واضح ہے۔ صرف لوگوں تک پہنچنا چاہئے' ان پر حجت تمام ہونا چاہئے کہ اسلام پہنچا دیا گیا۔ بس پھر مجادلہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ صرف پہنچا دینے سے لوگوں کے عذرات ختم ہو جائیں گے۔ دین پہنچ جانے کے بعد محض نفس پرست یا مفاد پرست ہی اس سے منہ موڑ سکتا ہے اور تکذیب وہی شخص کر سکتا ہے جو زبردستی اپنے آپ کو جاہل بنائے اور اپنے اوپر ظلم کرے۔ اس سچائی پر ظلم کرے۔ ایسا شخص مستحق ہدایت ہی نہیں ہوتا۔ "ایسے ظالموں کو تو اللہ ہدایت ہی نہیں بخشتا"۔

حق پہنچتے ہی ان کا عذر ختم ہوا۔ ان پر دعوت پیش کرتے ہی رسول اور امت کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ اب ایسے لوگوں کے پاس کوئی عذر نہ ہو گا۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (۲۸ : ۵۱) "اور نصیحت کی بات پے در پے ہم انہیں پہنچا چکے ہیں تاکہ وہ غفلت سے بیدار ہوں"۔

---○○○---

گذشتہ آیات میں ثابت کیا گیا کہ یہ لوگ منہ موڑتے ہیں' شک کرتے ہیں اور ہٹ دھرمی کرتے ہیں۔ اب یہاں بعض ایسے لوگوں اور ایسے کرداروں کا ذکر بھی کیا جاتا ہے جو حق کو خلوص نیت سے قبول کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی مثال اہل کتاب میں ملتی ہے۔ ذرا دیکھو انہوں نے سچائی پر مشتمل اس کتاب کو کس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ۝

"جن لوگوں کو اس سے پہلے ہم نے کتاب دی تھی' وہ اس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ "ہم اس پر ایمان لائے' یہ واقعی حق ہے ہمارے رب کی طرف سے ہم تو پہلے ہی سے مسلم ہیں" یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کا اجر دو بار دیا جائے گا اس ثابت قدمی کے بدلے جو انہوں نے دکھائی۔ وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جب انہوں نے بیہودہ بات سنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ "ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے' تم کو سلام ہے' ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے"۔

سعید ابن جبیر فرماتے ہیں کہ یہ ان ۷۰ پادریوں کے بارے میں ہے جنہیں نجاشی نے بھیجا تھا۔ جب یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ نے ان پر سورت یسین پڑھی۔ جب سورت ختم ہوگئی تو یہ لوگ رونے لگے اور مسلمان ہوگئے ان کے بارے میں زیر بحث آیات بھی نازل ہوئیں۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ (۲۸:۵۲) "وہ لوگ جنہیں ہم نے اس سے قبل کتاب دی ہے ' وہ اس پر ایمان لاتے ہیں"۔

محمد ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں نقل کیا ہے "اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قریباً بیس آدمی آئے۔ آپ مکہ میں تھے۔ یہ لوگ عیسائی تھے اور انہوں نے آپ کے بارے میں سنا تھا۔ یہ لوگ حبشہ سے آئے تھے۔ انہوں نے حضورؐ کو مسجد حرام میں پایا۔ یہ لوگ حضورؐ کے پاس بیٹھے اور آپؐ سے بات کرتے رہے۔ قریش کے کچھ لوگ کعبہ کے اردگرد محافل سجائے بیٹھے تھے۔ جب ان لوگوں کا سوال و جواب ختم ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا اور ان کے سامنے قرآن مجید پڑھا۔ جب انہوں نے قرآن مجید سنا تو ان کے آنسو جاری ہوگئے۔ انہوں نے دعوت الی اللہ قبول کرلی ' ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کی۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں آپ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہوا پایا تھا وہ علامات آپ میں معلوم کرلیں۔ جب یہ لوگ حضور اکرمؐ کے پاس سے اٹھ کر جانے لگے تو ابوجہل اور ہشام نے چند دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کی راہ روک لی اور انہوں نے ان لوگوں سے کہا تم کس قدر بدبخت مسافر ہو ' تمہیں تمہارے ملک کے ہم مذہب لوگوں نے بھیجا تھا کہ اس شخص کے بارے میں معلومات لے کر آؤ ' تم ابھی اس کے پاس اچھی طرح بیٹھے بھی نہ تھے کہ تم نے اپنا دین چھوڑ دیا اور اس شخص کی تصدیق کردی۔ ہم سمجھتے ہیں تم جیسا احمق اور کوئی سوار نہ ہوگا۔ انہوں نے کہا تم پر سلامتی ہو ' ہم تمہارے ساتھ جہالت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمارا دین ہمارا ہے اور تمہارا دین تمہیں مبارک ہو۔ ہم اپنے آپ کو خیر سے دور نہیں رکھتے"۔

کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ وفد نجران کے نصاریٰ کا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ یہ وفد نجرانیوں کا تھا یا حبشیوں کا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ آیت انہی کے بارے میں نازل ہوئی۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ (۲۸:۵۲) کہتے ہیں میں نے زہری سے پوچھا کہ یہ آیات کس کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنے علماء سے یہ سنتا رہا کہ یہ آیات نجاشی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور وہ آیات بھی جو سورت مائدہ میں ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّیْسِیْنَ وَرُهْبَانًا ..... فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ تک۔

بہرحال یہ آیات جس کے بارے میں بھی نازل ہوئی ہوں ' قرآن ایک واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس واقعہ کے بارے میں کفار جانتے تھے اور اس کا انکار نہ کرتے تھے تاکہ لوگ سمجھ سکیں کہ دنیا میں ایسے پاک نفس لوگ بھی ہیں جو قرآن کو سن کر اس کی تصدیق کرتے ہیں اور پھر اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور وہ اس سچائی کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جو اس میں ہے۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ ان کے پاس جو سابق کتاب تھی۔ قرآن کی تعلیمات اس کے مطابق ہیں۔ ایسے

لوگوں کو کوئی روکنے والا ایمان لانے سے روک بھی نہیں سکتا۔نہ ان کے اندر کا ان کا نفس امارہ اور نہ بڑائی کا تصور اور گھمنڈ ہے اور ایسے لوگ پھر دوسرا جہلاء کی طرف سے دی جانے والی اذیتوں اور طعنوں کو بھی برداشت کرتے ہیں۔اور ان ایذاؤں اور اپنی خواہشات نفس کے علی الرغم حق پر جم جاتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِہٖ ھُمْ بِہٖ یُؤْمِنُوْنَ (۲۸ : ۵۲) "وہ لوگ جنہیں اس سے قبل کتاب دی گئی ہے وہ اس پر ایمان لاتے ہیں"۔

اور قرآن کی حقانیت کے دلائل میں سے یہ ایک دلیل ہے' ورنہ تمام کتابیں اللہ کی طرف سے ہیں۔ان کے مضامین باہم ملتے جلتے ہیں جس کو اس کا ابتدائی حصہ دیا گیا وہ اس کے آخری حصہ میں بھی حق پاتا ہے' مطمئن ہوتا ہے' ایمان لاتا ہے' اور جان لیتا ہے کہ یہ بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

وَ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْھِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِہٖٓ اِنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا کُنَّا مِنْ قَبْلِہٖ مُسْلِمِیْنَ

(۲۸ : ۵۳) "جب ان کو سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔یہ واقعی حق ہے' ہمارے رب کی طرف سے۔ہم تو پہلے ہی مسلم ہیں"۔یعنی یہ کلام اس قدر واضح ہے کہ اسے صرف تلاوت کی ضرورت ہے' جن لوگوں کو پہلے کتاب حق دی گئی ہے وہ تو دیکھتے ہی معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ اسی سرچشمے سے ہے۔اور اس کا سرچشمہ بھی وہی ہے جس سے سچائی نکلتی ہے۔جھوٹ وہاں سے نہیں آ سکتا۔"یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے"۔اور یہ کہ "ہم تو اس سے پہلے سے مسلم تھے"۔اللہ کے مسلم ہونے کا مفہوم ہے کہ ہم پہلے سے اللہ کے مطیع فرمان تھے۔

یہ لوگ جو اللہ کے مطیع فرمان تھے اور پھر انہوں نے محض سنتے ہی قرآن کی بھی تصدیق کر دی۔

اُولٰٓئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَھُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا (۲۸ : ۵۴) "یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کا اجر دو بار دیا جائے گا' اس ثابت قدمی کے بدلے جو انہوں نے دکھائی"۔یہ کہ انہوں نے خالص اسلام پر صبر کیا' انہوں نے اپنے دل و دماغ کو اسلام کی طرف متوجہ کیا۔انہوں نے ذاتی خواہشات اور ہوائے نفس پر غلبہ پایا اور پہلے دین پر بھی جمے رہے اور دوسرے پر بھی جمے رہے۔اس لیے ان کو دو مرتبہ اجر دیا جائے گا۔یہ اس لیے کہ انہوں نے صبر کیا اور قبول حق کرنے کے بعد جم گئے۔کسی عقیدے کو قبول کرنے کے بعد جم جانا بہت ہی مشکل کام ہے اور پھر خواہشات نفس' چاہتوں' بے راہ روی اور سرکشی کے خلاف جم جانا تو بہت ہی مشکل کام ہے۔اور ان لوگوں نے یہ سب کام کیے۔ان لوگوں نے لوگوں کی ملامت کی بھی پرواہ نہ کی۔اور لوگوں کی طرف سے ایذا رسانی کی پرواہ نہ کی۔جیسا کہ سابقہ روایات میں ذکر ہوا۔

وَ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ (۲۸ : ۵۴) "اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں"۔یہ بھی ایک قسم کا صبر ہے۔اور یہ صبر خالص صبر سے زیادہ پر مشقت ہوتا ہے۔خالص صبر تو یہ ہے کہ ایذا رسانی اور مذاق پر صبر کیا جائے۔برائی پر صبر بہت مشکل ہے۔نفسانی غرور کو صرف اسی طرح قابو میں لایا جا سکتا ہے کیونکہ نفس چاہتا ہے کہ

مزاح اور ایذا رسانی کا جواب دیا جائے' غصہ کیا جائے اور انتقام لے کر دل کو ٹھنڈا کیا جائے اور پھر ایذا پر صبر کرنے کے بعد دوسرا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ایذا کے بدلے میں احسان کیا جائے۔ مزاح کے بدلے میں نرمی اور ٹھنڈے پن کا مظاہرہ کیا جائے اور پھر بدروی کے مقابلے میں اچھا رویہ اختیار کرنا اور برائی کے بدلے احسان کرنا صرف ان لوگوں کا کام ہے جو بھلائی اور احسان کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوں۔ یہ مقام صرف اچھے مومن ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ لوگوں سے اذیت پاتے ہیں اور پھر بھی راضی اور مطمئن رہتے ہیں۔

وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۲۸ : ۵۴) "اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں یہاں ان لوگوں کی قبولیت حق میں کشادہ دلی کے ساتھ ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کے سلسلے میں کشادہ دلی کا ذکر بھی کر دیا گیا۔ کیونکہ نیکی اور سخاوت ایک ہی سرچشمے سے نکلنے والی بھلائیاں ہیں اور یہ تب صادر ہوتی ہیں کہ جب انسان اپنی خواہشات نفس پر قابو پالے اور زمینی اقدار کے مقابلے میں اعلیٰ قدروں کو اہمیت دے۔ ان اقدار میں پہلی قدر کا تعلق نفسیات کی دنیا سے ہے اور دوسری کا معیشت سے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بسااوقات ایمان اور انفاق کا ذکر ایک جگہ آتا ہے۔

ایمان پر صبر کرنے والوں اور خالص عقیدہ اختیار کرنے والوں کی ایک دوسری صفت :

وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ

عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ (۲۸ : ۵۵) "اور جب انہوں نے بیہودہ بات سنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے' تم کو سلام ہے۔ ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے"۔ لغو کا مطلب فضول باتیں کرنا ہے جن میں کوئی فائدہ نہ ہو اور نہ ان کے پیچھے کوئی مقصد ہو۔ یعنی وہ لاحاصل گفتگو جس سے دل و دماغ کے اندر کسی مفید علم و حکمت کا اضافہ نہ ہو۔ یعنی وہ گری ہوئی باتیں جن سے احساس و شعور میں اور زبان و کلام میں گندگی اور برائی کا اضافہ ہو۔ چاہے وہ کسی کے ساتھ مکالمے کی صورت میں ہوں یا کسی غائب شخص کے واقعات نقل کرتے ہوئے ہوں۔

مومن دل کبھی بھی اس قسم کی لغو باتوں میں مشغول نہیں ہوتے۔ نہ وہ لغو باتیں سنتے ہیں کیونکہ ان کے پیش نظر بلند و بالا امور ہوتے ہیں' پاکیزہ اور نورانی باتیں۔

وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ (۲۸ : ۵۵) "انہوں نے جب بیہودہ بات سنی تو کنارہ کش ہو گئے"۔۔۔۔ لیکن وہ اہل لغو پر نہ غصہ ہوتے ہیں' نہ ان سے الجھتے ہیں کہ زبردستی منع کر دیں اور نہ وہ ان کے ساتھ بحث شروع کرتے ہیں۔ کیونکہ اہل لغو کے ساتھ الجھنا بھی ایک طرح کا لغو امر ہے۔ وہ بس ان کو چھوڑ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں۔

وَ قَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ (۲۸ : ۵۵) "اور کہا ہمارے اعمال

ہمارے لیے' اور تمہارے اعمال تمہارے لیے تم کو سلام ہے"۔ نہایت ادب سے' دعائے خیر کے ساتھ' اس خواہش کے ساتھ کہ وہ بھی ہدایت یافتہ ہو جائیں۔ لیکن یہ خواہش رکھتے ہوئے بھی یہ ان کے لغو میں شریک نہیں ہوتے۔

لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ (۲۸ : ۵۵) "ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار نہیں کرتے"۔ اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ اپنا قیمتی وقت ان کے ساتھ ضائع کریں۔ نہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے لغو میں شریک ہوں اور خاموشی سے سنتے رہیں۔ ایسی رواداری کے بھی قائل نہیں۔

یہ ایک روشن نفس کی تصویر ہے جو نفس مومنہ ہے' اپنے ایمان پر مطمئن ہے۔ لغو سے بالا و برتر ہے۔ لیکن کشادہ دل اور کشادہ دست ہے۔ یہ نفس مومنہ ان لوگوں کے لیے رسم و راہ مقرر کرتی ہے جو صحیح راستہ پر چلنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا جاہلوں کے ساتھ جاہلیت میں اشتراک بھی نہیں۔ ان کے ساتھ مخاصمت بھی نہیں' ان پر غصہ بھی نہیں' ان کے ساتھ ترش روئی بھی نہیں بلکہ سنجیدگی' سربلندی' کشادہ دلی' اور برائی کرنے والے کے ساتھ بھی نیکی اور بھلائی۔

یہ اہل کتاب' جو ایمان لائے' ان کے ایمان لانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی بڑا مجاہدہ کرنا نہیں پڑا۔ آپ نے صرف قرآن کی تلاوت فرمائی' بس چند سوالات کیے اور ایمان قبول کر لیا جبکہ وہ خود اپنی قوم کے ساتھ آپ رات دن سالوں تک مجاہدہ کرتے رہے۔ پھر اپنے محبوب رشتہ داروں کے ساتھ تو بہت ہی محنت کرتے رہے۔ لیکن ان لوگوں کو ایمان نصیب نہ ہوا۔ یہ بات حضورؐ خود جانتے تھے کہ آپؐ کے اختیار میں یہ بات نہیں ہے کہ آپ اپنے محبوبوں کو ہدایت دے دیں۔ اللہ تعالیٰ تو صرف ان لوگوں کو ہدایت عطا کرتا ہے جن کے نفس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ وہ مستحق ہیں اور ایمان کے لیے تیار ہیں۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ۝

"اے نبیؐ' تم جسے چاہو' اسے ہدایت نہیں دے سکتے' مگر اللہ جسے چاہتا ہے' ہدایت دیتا ہے اور وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو ہدایت قبول کرنے والے ہیں"۔

صحیحین میں وارد ہے کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کے حق میں نازل ہوئی۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حامی و مددگار تھے اور قریش کے مقابلے میں آپ کے دفاع کے لیے بنیان مرصوص بنے ہوئے تھے۔ یہ آپؐ کے اس قدر حامی تھے کہ ان کی حمایت کی وجہ سے آپ آزادانہ دعوت دے سکتے تھے۔ اس حمایت کی وجہ سے قریش نے ان کا اور پورے بنی ہاشم کا مقاطعہ کیا تھا' اور ان کو شعب ابو طالب میں محصور کر دیا۔ یہ سب کام وہ اپنے بھتیجے کی محبت میں کرتے تھے اور قومی حمیت اور عزت و آبرو کو بچانے کے لیے کرتے تھے جب آپ کی وفات کا وقت آیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو دعوت ایمان دی اور عرض کیا کہ آپ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ لیکن اللہ نے ان کے حق میں ایمان نہ لکھا تھا کیونکہ اس کا حقیقی علم اور اصلی سبب اللہ کو معلوم تھا۔

زھری اور سعید بن المسیب کہتے ہیں کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے تو ابوجہل ابن ہشام ان کے پاس بیٹھا تھا۔ عبداللہ ابن امیہ بھی تھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے چچا' صرف لا الہ الا اللہ کہہ دیں۔ میں اللہ کے ساتھ اس پر تمہارے لیے جھگڑوں گا۔ ابوجہل اور عبداللہ ابن امیہ نے کہا ابو طالب تم عبدالمطلب کی ملت کو چھوڑ رہے ہو' رسول اللہ بار بار ان پر یہ پیش فرماتے تھے اور یہ دونوں بار بار اسے روکتے تھے۔ اور یہی بات دہراتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے آخری الفاظ یہ کہے "عبدالمطلب کے دین پر"۔ اور لا الہ الا اللہ کہنے سے انکار کر دیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا واللہ (خدا کی قسم) میں تمہارے لیے مغفرت کی دعا کرتا رہوں گا جب تک مجھے منع نہ کر دیا جائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی'۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى اور ابو طالب ہی کے حق میں نازل ہوئی:

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (۲۸ : ۵٦) (صحیحین مسلم اور ترمذی نے' ابو حازم اور ابو ہریرہ کی روایت نقل کی کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت قریب آیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس پہنچے اور کہا "اے چچا کہہ دو "لا الہ الا اللہ"۔ میں قیامت میں تمہارے حق میں شہادت دوں گا۔ انہوں نے کہا اگر یہ بات نہ ہوتی کہ قریش مجھے طعنہ دیں کہ سکرات الموت کی تکلیف کی وجہ سے اس نے یہ کہہ دیا تو میں ضرور یہ کلمہ پڑھ دیتا' تیری آنکھوں کی ٹھنڈک کی وجہ سے۔ میں یہ کلمہ صرف تیری آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پڑھتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ

(۲۸ : ۵٦) "تم ہدایت نہیں دے سکتے جسے تم محبوب سمجھو' یہ اللہ ہے جسے چاہتا ہے' ہدایت دیتا ہے۔ وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے"۔

--- ○○○---

اور حضرت ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ سے روایت ہے اور مجاہد' شعبی اور قتادہ کی بھی یہی رائے ہے کہ یہ ابو طالب کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ اور انہوں نے جو آخری لفظ کہے وہ تھے علی ملۃ عبد المطلب۔

انسان جب اس حدیث پر غور کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام کس قدر پختہ اور سیدھا دین ہے۔ ابو طالب رسول اللہؐ کے حقیقی چچا' آپؐ کے کفیل' حامی اور آپؐ کا دفاع کرنے والے تھے۔ لیکن اللہ نے انہیں ایمان نصیب نہ کیا۔ باوجود اس کے کہ رسول اللہ کو ان سے بہت زیادہ محبت تھی اور آپؐ حد سے زیادہ خواہش مند تھے کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ابو طالب نے رشتے اور قومی حمیت کو ایمان سے زیادہ اہمیت دی۔ اللہ کو اس بات کا علم تھا اور اللہ کو اس بات کا خوب علم تھا کہ حضور اکرمؐ ان سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں

کہ شاید وہ ایمان لے آئیں ۔ اس لیے اللہ نے ہدایت نہ دینے کا اختیار حضورؐ کے اختیارات ہی سے خارج کر دیا ۔ ہدایت دینا یا نہ دینا صرف اللہ الٰہ العالمین کے اختیار میں ہے اور رسول کی ڈیوٹی صرف تبلیغ تک محدود ہے ۔ لہٰذا داعیوں کی ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ دعوت دیں ۔ دعوت کے بعد پھر لوگوں کے دلوں میں تصرف کرنا اللہ کا کام ہے ۔ لوگوں کے دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں ۔ اللہ لوگوں کو ہدایت دیتا ہے ' یا گمراہ کرتا ہے ۔ یہ فیصلے لوگوں کے دلوں کے حالات کے مطابق ہوتے ہیں اور ان کے شخصی استعداد پر ہوتے ہیں اور اس بارے میں علم صرف اللہ کو ہے ۔

اب قرآن مجید ان کے اس خدشے پر تبصرہ کرتا ہے جس کا اظہار وہ کرتے رہتے تھے کہ اگر ہم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا تو قبائل عرب پر اہل قریش کو قیادت و سیادت کا جو منصب حاصل ہے ' وہ جاتا رہے گا ۔ یہ لوگ خانہ کعبہ کی تعظیم کرتے ہیں ۔ خانہ کعبہ کے مجاوروں یعنی اہل قریش کی اطاعت کرتے ہیں ' خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کی تعظیم کرتے ہیں اس لیے یہ قبائل انہیں اچک لیں گے ۔ یا جزیرۃ العرب سے باہر کا کوئی دشمن ان پر فتح پا لے گا اور یہ قبائل ایسے دشمن کی حمایت کریں گے ' چنانچہ کہا جاتا ہے کہ خوف و امن کا سرچشمہ ذات باری ہے ۔ فرعون بھی بظاہر بہت بڑی قوت کا حامل تھا ۔ ہلاکت کا حقیقی سبب تو دنیا پرستی ' دولت پرستی ' اللہ کی آیات اور اللہ کے رسولوں کی تکذیب ہے ۔ اور حق سے منہ موڑنا ہے ۔ حق کو قبول کرنا ' ہلاکت کا سبب کبھی نہیں ہوا ۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ ہلاک وہ اقوام ہوا کرتی ہیں جن کے پیش نظر صرف دنیا کے مفادات ہوتے ہیں ' حالانکہ متاع دنیا ایک حقیر چیز ہے ' انسان کا اصل فائدہ آخرت میں ہے اور وہ اللہ کے پاس ہے ۔

وَقَالُوٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ۭ
اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ
فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ۝
وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ۝ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ
مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ ٦
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ ١٠ع
مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝ ٩

"وہ کہتے ہیں "اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کرلیں تو اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے"۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پرامن حرم کو ان کے لیے جائے قیام بنا دیا جس کی طرف ہر طرح کے ثمرات کھچے چلے آتے ہیں' ہماری طرف سے رزق کے طور پر؟ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے تھے۔ سو دیکھ لو' وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے' آخرکار ہم ہی وارث ہو کر رہے۔ اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیات سناتا اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے رہنے والے ظالم نہ ہو جاتے۔

تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور باقی تر ہے۔ کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے؟ بھلا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہو اور وہ اسے پانے والا ہو' کبھی اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جسے ہم نے صرف حیات دنیا کا سروسامان دے دیا ہو اور پھر وہ قیامت کے روز سزا کے لیے پیش کیا جانے والا ہو؟"

یہ اہل مکہ کا ایک سطحی اور دنیاوی نقطہ نظر تھا۔ قریش کو اسی دنیا پرستی کے نقطہ نظر نے ڈر میں مبتلا کر دیا تھا کہ اگر ہم نے اس جدید تحریک کو قبول کیا تو نقصان ہو گا۔ دشمن حملہ آور ہو جائیں گے اور معاون و مددگار حمایت سے ہاتھ اٹھا لیں گے اور ہم مالی لحاظ سے کمزور اور بدحال ہو جائیں گے۔

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا (۲۸ : ۵۷) "وہ کہتے ہیں اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کرلیں تو اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے"۔ یہ لوگ اس بات کے منکر نہیں تھے کہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جو تعلیمات پیش کرتے ہیں وہ حقیقی راہ ہدایت ہے۔ لیکن انہیں ڈر یہ تھا کہ مکہ کے اردگرد کے لوگ ان پر ٹوٹ پڑیں گے دراصل ان کی نظروں میں صرف دنیا کی قوت ہی تھی۔ ذات باری اور اللہ وحدہ کی قوت کو انہوں نے بھلا دیا تھا۔ حالانکہ حقیقی محافظ تو اللہ ہے۔ حقیقی بچانے والا تو وہی ہے۔ اگر وہ اللہ کی حمایت میں آ جاتے ہیں تو پوری کائنات کی قوتیں ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتیں۔ اور اگر اللہ ان کو ذلیل و خوار کرنا چاہے تو دنیا کی پوری قوتیں بھی ان کی کچھ مدد نہیں کر سکتیں۔ ان کا یہ نقطہ نظر اس لیے تھا کہ ایمان ان کے دلوں کی تہہ تک ابھی نہ اترا تھا۔ اگر اترا ہوتا تو حقیقی قوت کے بارے میں ان کا نقطہ نظر یہ نہ ہوتا۔ وہ معاملات کا اندازہ یوں نہ کرتے۔ اور ان کو یہ یقین ہو جاتا کہ امن تو اللہ کے جوار رحمت میں ہے اور خوف اور خطرات تو اللہ سے دوری کی راہ میں ہیں اور یہ کہ تحریک اسلامی میں شامل ہونا دراصل قوت اور عزت سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور یہ کہ اللہ کا حقیقی سرچشمہ قوت ہونا محض طفل تسلی نہیں ہے' نہ کوئی وہم ہے۔ بلکہ ایک سائنٹیفک حقیقت ہے' اس لیے کہ اللہ کا اتباع کرنا دراصل اس کائنات کے قانون قدرت کا اتباع ہے۔ اس طرح انسان اور کائنات کی قوتوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ یوں انسان کی پشت پر پوری تکوینی قوتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کہ اس کائنات کا خالق اور مدبر بھی اللہ ہے اور اسلامی دین کا بھیجنے والا بھی وہی ہے اور جو شخص اللہ کی ہدایت پر چلتا ہے وہ اللہ کی تمام قوتوں کو کام میں لاتا ہے اور اس کائنات کی قوتیں لامحدود

ہیں ۔ ایسا شخص گویا ایک عظیم سرچشمہ قوت سے مربوط ہو جاتا اور اس کا وارث بن جاتا ہے ۔ اور یہ ہے ایک تاریخی حقیقت اور پوری زندگی کے تجربوں سے ثابت شدہ حقیقت ۔

اللہ کی ہدایات ہی زندگی کا صحیح منہاج ہیں ۔ ان کے مطابق زندگی گزارنا ہی اس کرۂ ارض کی حقیقی زندگی ہے اور جب دنیا میں اسلامی نظام اور اسلامی منہاج حیات رائج اور قائم ہو جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں اخروی فلاح اور دنیا میں شوکت نصیب ہوتی ہے ۔ اور اس نظام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دنیا اور آخرت کے درمیان کوئی دوئی نہیں ہے ۔ ایسا نہیں ہے کہ فلاح اخروی تب ہی حاصل ہو سکتی ہے کہ اس دنیا کے نظام کو معطل کر دیا جائے یا اسے پس پردہ ڈال دیا جائے ۔ اسلامی منہاج حیات میں دنیا آخرت دونوں باہم مربوط اور باندھے ہوئے ہیں ۔ اسلام کیا ہے 'دل مومن کی اصلاح' انسانی سوسائٹی کی اصلاح اور اس کرۂ ارض پر اجتماعی نظام کی اصلاح ۔ یہی وجہ ہے کہ اس سوچ کے مطابق دنیا آخرت کے جہاں میں داخل ہونے کا راستہ ہے ۔ یہ دنیا آخرت کے لیے مزرعہ ہے 'کھیت ہے ۔ اس دنیا میں جنت کی تعمیر ہی دراصل وسیلہ ہے آخرت میں تعمیر جنت کا' اور اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنے کا بشرطیکہ یہ کام اسلامی ہدایت اور اسلامی شریعت کے مطابق کیا جائے اور دنیا کی تمام تعمیر میں رضائے الہٰی مطلوب ہو ۔

انسانی تاریخ کا تجربہ شاہد ہے کہ جب بھی کسی جماعت نے اللہ کی ہدایت کا جھنڈا اٹھایا ہے 'اللہ نے اسے قوت' شوکت اور دنیا کی قیادت دی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ جماعت اپنے آپ کو اس امانت کے اٹھانے کے لیے تیار کرے ' اس کی اہل ہو جائے اور جان لو کہ یہ امانت 'امانت خلافت ارضی ہے ۔ یعنی اس دنیا میں تمام قوتوں پر کنٹرول اور زندگی کے نشیب و فراز پر کنٹرول ۔

اکثر لوگ اتباع شریعت اور اللہ کی ہدایات پر چلنے سے بہت ڈرتے ہیں ۔ یہ لوگ اللہ کے دشمنوں کی عداوت اور ان کی مکاریوں سے ڈرتے ہیں ۔ یہ لوگ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اللہ کے دشمن ان پر ٹوٹ پڑیں گے ۔ یہ لوگ اقتصادی تکالیف اور اقتصادی پابندیوں سے بھی ڈرتے ہیں ۔ یہ اسی قسم کے اوہام ہیں جس طرح قریش کو یہ اوہام لاحق تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا

اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا (۲۸ : ۵۷) "اگر ہم آپ کے ساتھ ہدایت کی پیروی کریں تو اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے" ۔ لیکن جب انہوں نے اس ہدایت کو سینے سے لگا لیا تو وہ مشرق و مغرب پر قابض ہو گئے اور یہ قبضہ صرف ۲۵ سال کے عرصے میں مکمل ہو گیا ۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عذر لنگ کی اسی وقت تردید کر دی تھی کہ وہ کون ہے جس نے ان کو مکہ میں امن عطا کیا ہے ۔ وہ کون ہے جس نے ان کے لیے مکہ کو بیت الحرام قرار دیا ۔ وہ کون ہے جو تمام دنیا کے لوگوں کے دل مکہ کی طرف مائل کرتا ہے اور وہ دنیا کے تمام ثمرات لے کر وہاں حاضر ہوتے ہیں ۔ تمام دنیا سے جمع ہو کر حرم میں آتے ہیں حالانکہ ان کے ملک مختلف ہیں اور ان کی عیدیں مختلف ہیں ۔

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا

"کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پرامن حرم کو ان کے لیے جائے قیام بنایا جس کی طرف ہر قسم کے ثمرات کھچے چلے آتے ہیں' ہماری طرف سے رزق کے طور پر"۔ پھر وہ کیوں ڈرتے ہیں کہ لوگ ان کو اچک لیں گے ۔ اگر انہوں نے اللہ کی ہدایت کو قبول کر لیا۔ حالانکہ اس حرم کو جائے امن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے اللہ ہی نے تو بنایا تھا۔ سوال یہ ہے کہ نافرمان ہونے کے باوجود ان لوگوں کو کس نے یہ پرامن ماحول دیا ہے؟ اور اگر وہ فرمان بردار ہو جائیں تو اللہ ان کو لوگوں کے حوالے کر دے گا کہ ان کی زمین سے وہ ان کو اچک کر لے جائیں ۔ یہ کس طرح معقول ہو سکتا ہے؟

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۸:۵۷) "مگر ان میں سے اکثر لوگ مانتے نہیں"۔ وہ نہیں جانتے کہ امن کہاں سے ملتا ہے اور خوف کہاں سے ملتا ہے ۔ ان کو معلوم نہیں ہے کہ دراصل تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

اگر وہ بدامنی اور خوف سے بچنا چاہتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ وہ ہلاکت اور بربادی سے دوچار ہوں تو بربادی کے اسباب یہ ہیں ۔ ان کو چاہئے کہ وہ ان سے بچیں ۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ (۲۸:۵۸) "اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے تھے ۔ سو دیکھ لو' وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے' آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے"۔ انعامات خداوندی پر اترانا' اور ان کا شکر ادا نہ کرنا دراصل بستیوں کی ہلاکت کا حقیقی سبب رہا ہے۔ اہل قریش کو بھی اللہ نے پرامن حرم بطور نعمت خداوندی دیا ہے ۔ لہٰذا ان کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ اس پر اترائیں نہیں بلکہ شکر ادا کریں ورنہ ان کی ہلاکت بھی یقینی ہوگی جیسا کہ ان بستیوں پر اللہ کی ہلاکت آئی جن کے بارے میں خوب جانتے ہیں ۔ اور اہل قریش رات دن ان بستیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ برباد پڑی ہیں اور اس بربادی کے بعد کوئی بھی آ کر ان میں بسا تک نہیں ۔ ان کے کھنڈرات موجود ہیں ۔

لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا (۲۸:۵۸) "جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے"۔ یہ بستیاں صاف صاف نظر آتی ہیں اور اپنے باسیوں کی کہانی سنا رہی ہیں ۔ اور یہ کہانی سنا رہی ہیں کہ اللہ کے انعامات پر یعنی محض معاشی ترقی پر اترانے کا انجام کیا ہوتا ہے ۔ ان کے باشندے اس طرح فنا ہوئے کہ کوئی بھی پیچھے نہ رہا۔ کوئی ان کا وارث نہ ہوا۔

وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ (۲۸:۵۸) "آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے"۔ لیکن ان کے اس اترانے اور سرکشی کے باوجود اللہ نے ان کو تب ہلاک کیا جب ان بستیوں کے مرکزی مقامات پر رسول بھیجے 'کیونکہ یہ اللہ کی سنت ہے اور اس سنت کو اللہ نے انسانوں پر مہربانی کرتے ہوئے اپنے اوپر لازم کر دیا ہے ۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ (۲۸ : ۵۹) "اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیات نہ سناتا اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے رہنے والے ظالم نہ ہو جاتے"۔ رسولوں کو بستیوں کے مرکزی مقامات میں اس لیے بھیجا گیا کہ یہ مرکزی مقامات مراکز تبلیغ ہوں اور ان سے پیغام انہی اطراف و اکناف میں نشر ہو' تاکہ کوئی یہ کہہ نہ سکے ان تک تو پیغام نہیں پہنچا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں بھیجا گیا کیونکہ یہ عربوں کا ام القریٰ تھا۔ اور آپ کا فریضہ تھا کہ آپ ارد گرد کے تمام لوگوں کو ان اقوام کے انجام سے خبردار کریں جن کے پاس رسول آئے اور انہوں نے نہ مانا اور ظلم کیا۔

وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ (۲۸ : ۵۹) "ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے رہنے والے ظالم نہ ہو جاتے تھے"۔ وہ اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے تھے حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ حق ہیں۔

نیز یہ کہ زندگی کا پورا پورا سامان اور دنیا کی پوری دولت اور متاع' اور وہ تمام خزانے جو زمین کے اندر ودیعت ہیں اور وہ پیداواریں تو انسانوں کو اس کرۂ ارض پر دی گئیں۔ اور وہ تمام چیزیں جو تمام انسانوں کے لیے اس جہاں میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ سب چیزیں اللہ کے ہاں جنتوں میں تیار کردہ سازوسامان کے مقابلے میں ایک حقیر چیز ہیں۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲۸ : ۶۰) "تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے' وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے' وہ اس سے بہتر اور باقی تر ہے۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے"۔ یہ آخری حساب ہے۔ صرف اس سازوسامان کا نہیں جس کے فوت ہونے کا انہیں ڈر لاحق تھا۔ یعنی سامان زیست' امن اور زمین کا۔ یہ حساب صرف اقتدار' ہر قسم کی پیداواروں اور امن و امان ہی کا نہیں جس کا احسان اللہ نے ان کو جتلایا' صرف ان بستیوں کا حساب نہیں جنہیں اللہ نے ہلاک کیا' محض اس لیے کہ وہ اپنی معیشت پر اترا رہی تھیں' بلکہ یہ حساب ہے اس تمام سامان زندگی کا جس کا تعلق اس دنیا سے ہے۔ دنیا کا پورا سازوسامان' مکمل سازوسامان اور دائمی سازوسامان جس کے بعد کوئی ہلاکت اور بربادی بھی نہ ہو اور اس سے پوری طرح اور مکمل طور پر استفادہ بھی کیا گیا ہو' یہ سب سازوسامان اللہ کے ہاں پائے جانے والے اور ہمیشہ باقی رہنے والے متاع کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے وہ خیر ہے یعنی اپنی حقیقت کے اعتبار سے اور باقی رہنے والا ہے یعنی مدت کے اعتبار سے۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲۸ : ۶۰) "کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے"۔ یعنی اس دنیاوی سازوسامان اور اخروی سازوسامان کے درمیان فرق وہی شخص کر سکتا ہے جو دنیا و آخرت کی حقیقت کو سمجھتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آخری تعقیب

نہایت ہی ایسے الفاظ میں آئی ہے جن میں عقل سے کام نہ لینے پر سرزنش کی گئی ہے کیونکہ عقل سے کام لینا ہر شخص کے اختیار میں ہے۔

آخر میں دنیا اور آخرت دونوں کا تقابل پیش کیا جاتا ہے اور لوگوں کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ ان میں سے اپنے لیے جسے چاہیں پسند کرلیں۔

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ (۲۸ : ۶۱) "بھلا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہو اور وہ اسے پانے والا ہو کبھی اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جسے ہم نے صرف حیات دنیا کا سروسامان دے دیا ہو اور پھر وہ قیامت کے روز سزا کے لیے پیش کیا جانے والا ہو؟"۔

ایک طرف وہ شخص ہے جس کے ساتھ اچھا وعدہ ہے اور وہ اسے قیامت کے دن پانے والا ہے اور دوسرا شخص وہ ہے جسے دنیا کا سازوسامان دیا گیا ہے اور وہ یہ مختصر زندگی میں اس حقیر سامان کو برت لیتا ہے۔ اور پھر اسے قیامت کے دن زبردستی حساب کے لیے لایا جاتا ہے۔ اس کے لیے "محضرین" کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی گرفتار کر کے حاضر کیا جاتا ہے۔ اور ایسے لوگوں کی وہاں خواہش یہ ہوگی کہ ان کو حساب کے لیے نہ لایا جائے کیونکہ حساب کے بعد تو ان کے لیے عذاب حاضر ہے۔

وہ کہتے تھے کہ اگر ہم تمہارے ساتھ ایمان لے آئیں تو ہمیں اپنی زمین سے اچک لیا جائے گا اور اب ان کو اس طرح جواب دیا جاتا ہے کہ اگر تمہیں اچک بھی لیا جائے اور تم دنیا کے تمام سازوسامان سے محروم بھی کر دیئے جاؤ تو بھی یہ گھاٹا نہ ہوگا کیونکہ یہ محرومیت اس مصیبت سے ہلکی ہے کہ تمہیں گرفتار کر کے لایا جائے لیکن ایسی صورت بھی نہ ہوگی کیونکہ حضور اکرمؐ کے متبعین تو دنیا میں بھی امن اور اقتدار اعلیٰ کے مالک رہیں گے اور آخرت میں تو ان کو بہت بڑی عطا اور بڑا امن و امان ہوگا۔ لہٰذا اللہ کی ہدایت سے منہ وہی لوگ موڑتے ہیں جو بہت ہی غافل اور احمق ہیں۔ اور وہ عقل کو کام میں لا کر اس کائنات کی حقیقت کو سمجھنے کی سعی نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کو یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ خوف کا سبب کیا ہے اور امن کا سرچشمہ کیا ہے۔ اور یہی لوگ بڑے خسارے والے ہیں جو اپنی قوت اختیاری کو اچھی طرح استعمال نہیں کرتے اور اپنے آپ کو دائمی ہلاکت سے نہیں بچاتے۔

---

اب قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر جس میں ان لوگوں سے یوں سوال و جواب ہوگا اور اس سے اندازہ ہوگا کہ وہاں ان کی حالت زار کیسی ہوگی۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَآ

اِلَيْكَ ۫ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ
يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ
فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶۵﴾ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا
يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ
الْمُفْلِحِيْنَ ﴿۶۷﴾

"اور (بھول نہ جائیں یہ لوگ) اس دن کو جب کہ وہ ان کو پکارے گا اور پوچھے گا "کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے؟" یہ قول جن پر چسپاں ہو گا وہ کہیں گے "اے ہمارے رب، بے شک یہی لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا۔ انہیں ہم نے اسی طرح گمراہ کیا جیسے ہم خود گمراہ ہوئے۔ ہم آپ کے سامنے برات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ہماری تو بندگی نہیں کرتے تھے"۔ پھر ان سے کہا جائے گا کہ پکارو اب اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو یہ انہیں پکاریں گے مگر وہ ان کو کوئی جواب نہ دیں گے اور یہ لوگ عذاب دیکھ لیں گے۔ کاش یہ ہدایت اختیار کرنے والے ہوتے۔

اور (فراموش نہ کریں یہ لوگ) وہ دن جب کہ وہ ان کو پکارے گا اور پوچھے گا کہ "جو رسول بھیجے گئے تھے انہیں تم نے کیا جواب دیا تھا؟" اس وقت کوئی جواب ان کو نہ سوجھے گا اور نہ یہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ ہی سکیں گے۔ البتہ جس نے آج توبہ کرلی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے وہی یہ توقع کر سکتا ہے کہ وہاں فلاح پانے والوں میں سے ہو گا"۔

پہلا سوال تو سرزنش کے لیے ہو گا اور اس سے محض ان کو شرمندہ کرنا مطلوب ہو گا۔

اَيْنَ شُرَكَآءِىَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (۲۸ : ۶۲) "کہاں ہیں وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے"۔ اللہ کو اچھی طرح معلوم ہو گا کہ اس دن اس قسم کے کسی شریک کا وجود نہ ہو گا۔ اور اس دن ان کے متبعین کو بھی کچھ پتہ نہ ہو گا کہ ان شرکاء کا کوئی وجود ہے یا نہیں۔ نہ یہ لوگ ان شرکاء تک پہنچ سکیں گے۔ یہ سوال دراصل ان لوگوں کو مجمع عام میں شرمندہ کرنے اور سرزنش کرنے کے لیے کیا جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ جن سے متعلق یہ سوال کیا گیا وہ یہاں جواب نہیں دیتے کیونکہ یہ سوال جواب طلب ہی نہیں ہے بلکہ وہ لوگ کوشش کرتے ہیں کہ ان کے جو متبعین گمراہ ہوئے اور ان کی پیروی اختیار کی ان کے اس جرم سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیں۔ جیسا کہ کبراء قریش لوگوں کو گمراہی پر آمادہ کرتے تھے اور ان کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے۔ اس لیے ان کا جواب یوں ہو گا۔

رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ

(۲۸ : ۶۳) "اے ہمارے رب' بے شک یہی لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا۔ انہیں ہم نے اسی طرح گمراہ کیا جس طرح ہم خود گمراہ ہوئے۔ ہم آپ کے سامنے برات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ہماری کوئی بندگی نہ کرتے تھے"۔

ہمارے رب ہم نے ان کو زبردستی گمراہ نہیں کیا۔ ان کے دل و دماغ پر ہمیں کوئی کنٹرول حاصل نہ تھا۔ یہ لوگ اپنی مرضی اور آزادانہ اختیار سے گمراہی میں پڑے جیسا کہ ہم خود بغیر کسی مجبوری کے گمراہی میں پڑے۔

تَبَرَّأْنَآ اِلَيْكَ (۲۸ : ۶۳) "ہم آپ کے سامنے برات کا اظہار کرتے ہیں" کہ ہم نے ان کو گمراہ کیا ہے۔

مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ (۲۸ : ۶۳) "یہ ہماری بندگی تو نہ کرتے تھے"۔ بلکہ یہ بتوں' آستانوں اور دوسری مخلوقات کی بندگی کرتے تھے۔ ہم نے ان سے یہ نہ کہا تھا کہ ہم تمہارے الٰہ ہیں' اور نہ وہ وہاں ہماری عبادت کرتے تھے۔

اب ان کو اس مقام شرمندگی کی طرف لایا جا رہا ہے جس کی طرف وہ بات کا رخ کرنا نہیں چاہتے جس سے وہ بات کو پھیر کر دوسری طرف لے جانا چاہتے ہیں یعنی وہ شرکاء جو ان لوگوں کو اللہ کے سوا پکڑے ہوئے تھے۔

وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ (۲۸ : ۶۴) "پھر کہا جائے گا کہ پکارو' ان ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو"۔

یعنی ان کو پکارو' اور ان کی سیرت سے نہ بھاگو' ان کو پکارو کہ وہ اب تمہیں تمہاری پکار کو پہنچیں۔ تمہیں اس مصیبت سے چھڑائیں' ان کو پکارو کہ آج دن ہے ان کے کام کرنے کا۔ یہی تو ان کا فائدہ تھا۔

یہ بدبخت لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان شرکاء کو آج پکارنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے' لیکن بامر مجبوری وہ احکام الٰہیہ کو بجا لائیں گے۔

فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ (۲۸ : ۶۴) "یہ انہیں پکاریں گے مگر وہ ان کو کوئی جواب نہ دیں گے"۔ ان شرکاء سے یہی توقع تھی کہ وہ کوئی جواب نہ دیں گے۔ البتہ آواز اس لیے دلوائی جائے گی تا کہ یہ پکارنے والے اچھی طرح ذلیل ہوں۔

وَرَاَوُا الْعَذَابَ (۲۸ : ۶۴) "اور یہ لوگ عذاب دیکھ لیں گے" یعنی اس بحث و مباحثے کے درمیان ہی عذاب دیکھ لیں گے۔ یہ اس عذاب ہی کی طرف بڑھ رہے ہوں گے اور عذاب ان کو نظر آجائے گا۔ اس ذلیل کرنے والے منظر کے بعد پھر اسی عذاب کا منظر ہو گا۔

یہ شرمسار کنندہ منظر جب اپنی انتہاؤں پر ہوتا ہے تو اچانک ان پر وہ ہدایت پیش کر دی جاتی ہے کہ کاش تم اسے قبول کر لیتے۔ اس برے حال میں یہ لوگ یہی آرزو کرتے ہوں گے کہ اے کاش کہ وہ ایسا کرتے' دنیا میں تو یہ ہدایت ان کے دسترس میں تھی اور اگر وہ لبیک کہہ کر اسے قبول کر لیتے تو آج یہ حالت نہ ہوتی۔

لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ (۲۸ : ۶۴) ”کاش وہ ہدایت اختیار کرنے والے ہوتے“۔
اب سیاق کلام انہیں اس کربناک منظر کی طرف لے جاتا ہے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ (۲۸ : ۶۵) ”اور وہ دن جب وہ ان کو پکارے گا اور پوچھے گا کہ جو رسول بھیجے گئے تھے انہیں تم نے کیا جواب دیا تھا؟“ اور اللہ کو تو خوب معلوم ہے کہ انہوں نے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا۔ لیکن یہ باز پرس محض ذلیل اور شرمسار کرنے کے لیے ہو گا۔ اس سوال کے جواب میں وہ خاموش ہوں گے بلکہ مدہوش کھڑے ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ سخت کرب میں مبتلا ہوں گے اور ان کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو گا کہ وہ کیا جواب دیں۔

فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ (۲۸ : ۶۶) ”اس وقت کوئی جواب ان کو نہ سوجھے گا اور نہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ سکیں گے“۔ انداز گفتگو اس منظر میں لوگوں کی ایسی تصویر کھینچتا ہے کہ گویا وہ اندھے ہیں۔ گویا ”خبریں“ اندھی ہو گئی ہیں اور وہ ان تک پہنچ نہیں پاتیں۔ جس طرح اندھا آدمی کسی جگہ نہیں پہنچ جاتا۔ وہ کچھ نہیں جانتے۔ نہ پوچھ سکتے ہیں' نہ جواب سکتے ہیں۔ مدہوشی کی سی حالت میں کھڑے ہیں۔

فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ

(۲۸ : ۶۷) ”البتہ جس نے آج توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے وہی یہ توقع کر سکتا ہے کہ وہاں فلاح پانے والوں میں سے ہو گا“۔ یہ صفحہ بالمقابل ہے۔ جب غم اور تکلیف مشرکین کے لیے عروج پر ہو گی' اس وقت توبہ کرنے والوں' ایمان لانے والوں اور عمل کرنے والوں کے لیے ایسی فلاح ہو گی۔ اس لیے اے لوگو! یہ موقع ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ' ابھی تمہارے سامنے کھلا وقت ہے' بہتر ہے کہ اسے اختیار کر لو۔

اب ہر امر اور ہر چیز کو نتیجہ ارادہ الٰہی قرار دیا جاتا ہے' کیونکہ وہی ذات ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور تمام معاملات اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔ اول میں بھی آخر میں بھی۔ دنیا میں بھی وہی قابل تعریف ہے اور آخرت میں بھی وہی قابل تعریف ہے۔ دنیا میں بھی اس کا حکم چلتا ہے اور آخرت بھی اسی کی طرف لوٹتا ہے۔ لوگوں کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے خود کوئی فیصلہ کر سکیں نہ دوسروں کے بارے میں یہاں کوئی انسان کوئی فیصلہ کر سکتا ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے' تخلیق کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے' اختیار کر لیتا ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۗ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۸﴾ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۶۹﴾ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ لَهُ الْحَمْدُ فِى الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَلَهُ الْحُكْمُ

وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ

"تیرا رب پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور (وہ خود ہی اپنے کام کے لیے جسے چاہتا ہے) منتخب کر لیتا ہے' یہ انتخاب ان لوگوں کے کرنے کا کام نہیں ہے۔ اللہ پاک ہے اور بہت بالا تر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ تیرا رب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں۔ وہی ایک اللہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ اسی کے لیے حمد ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی' فرماں روائی اس کی ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو"۔

یہ تبصرہ ان لوگوں کے اس ریمارکس کے بعد آیا ہے کہ اگر ہم نے ہدایت کو قبول کر لیا تو ہم اپنی زمین سے اچک لے جائیں گے۔ اس قول کے بعد یوم الحساب کا ایک منظر پیش کیا گیا اور اس میں مشرکین کے موقف کو پیش کیا گیا۔ اب اس دوسرے تبصرے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کا اختیار تو خود ان کے نفوس کے بارے میں بھی نہیں ہے کہ وہ از خود امن اور خوف کا کوئی راستہ اپنے لیے اختیار کریں۔ اس لیے اللہ کی وحدانیت کے اختیارات کی وجہ سے آخر کار تمام امور میں اللہ ہی موثر ہے۔

وَ رَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ (۲۸ : ۶۸) "اور تیرا رب پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور منتخب کر لیتا ہے اور یہ انتخاب ان لوگوں کے کرنے کا کام نہیں ہے"۔ یہ وہ عظیم حقیقت ہے جسے بسا اوقات لوگ بھلا دیتے ہیں یا اس کے بعض پہلوؤں کو لوگ بھلا دیتے ہیں کہ اللہ جو چاہتا ہے' پیدا کرتا ہے۔ کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اللہ کے کاموں کے سلسلے میں کچھ تجاویز دے یا اللہ کی تخلیق میں حذف و اضافہ کرے یا اس کی تخلیق میں تغیر و تبدل کرے۔ وہ اپنی مخلوق میں سے مختلف چیزوں کو مختلف فرائض کے لیے اختیار کر لیتا ہے۔ مختلف مقامات میں مختلف چیزیں اپنا فریضہ ادا کرتی ہیں۔ اس لیے کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اللہ کے سامنے کسی شخص کو تجویز کرے' کسی حادثہ کی تجویز کرے' کسی حرکت' کسی بات اور کسی فعل کی تجویز کرے۔ اور نہ ایسا کام اختیار کرنے کا اللہ نے کسی کو اختیار دیا ہے۔ نہ اپنے نفسوں کے بارے میں اور نہ دوسروں کے بارے میں۔ غرض تمام امور کے فیصلے اللہ کرتا ہے' چھوٹے ہوں یا بڑے۔

اگر لوگوں کے دل و دماغ میں صرف یہ ایک حقیقت بیٹھ جائے تو لوگوں پر جو مصائب آتے ہیں وہ ان کی وجہ سے ہرگز پریشان نہ ہوں' یا ان کی اپنی وجہ سے ان کو جو تکلیف پہنچتی ہے اس کی وجہ سے بھی وہ پریشان نہ ہوں' نہ وہ اس چیز کی وجہ سے پریشان ہوں جو ان کے ہاتھوں سے نکل گئی یا وہ محروم ہو گئے کیونکہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ ہی ہے جو واقعات کا انتخاب کرتا ہے اور اس کو اختیارات ہیں۔

لیکن اس کا مفہوم یہ بھی نہیں ہے کہ لوگ اپنی عقل کو معطل کر دیں' ارادوں کو موقوف کر دیں اور سرگرمیاں چھوڑ کر ٹھنڈے ہو کر بیٹھ جائیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسان غور و فکر کر کے' اچھی سوچ کے بعد پوری جدوجہد کرے اور اپنی پوری قوت استعمال کرتے ہوئے ایک کام کرے اور اس کے بعد جو نتائج ہوں' ان کو اللہ پر چھوڑ دے۔ نتائج کو تسلیم

ورضا سے قبول کرے ۔کیونکہ اس کے دائرہ قوت میں جو کچھ تھا' اس نے کر لیا۔اس کے بعد کے امور اللہ کے لیے ہیں۔
مشرکین اللہ کے ساتھ خود ساختہ الہوں کو بھی شریک کرتے تھے۔ اور ان کو بھی پکارتے تھے۔ حالانکہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اور وہی اختیار و انتخاب کرتا ہے۔ اس تخلیق میں کوئی شریک نہیں اور نہ اس کے اختیارات میں کوئی شریک ہے۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۲۸ : ۶۸) "اللہ پاک ہے' اور بہت بالا تر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں"۔

وَ رَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ (۲۸ : ۶۹) "اور تیرا رب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں"۔ اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں"۔اس لیے وہ ان کی جن باتوں کو جانتا ہے' ان پر ان کو سزا دیتا ہے۔ان کے لیے نتائج وہ منتخب کرتا ہے ان کے لیے ہدایت و ضلالت کا فیصلہ بھی وہی کرتا ہے۔

وَ هُوَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (۲۸ : ۷۰) "وہ ایک اللہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ لہٰذا خلق میں یا اختیارات میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

لَهُ الْحَمْدُ فِى الْاُوْلٰى وَ الْاٰخِرَةِ (۲۸ : ۷۰) "اس کے لیے حمد ہے' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی"۔ اس بات پر کہ وہ کسی کے لیے کیا انجام اختیار کرتا ہے' کسی کے لئے کیا انعامات تجویز کرتا ہے' کسی کے لیے کیا حکمت و تدبیر اختیار کرتا ہے' کسی کے ساتھ کیا انصاف کرتا ہے اور کسی پر کیا رحمت کرتا ہے۔ حمد و ثنا صرف اسی کے لیے ہے۔

وَ لَهُ الْحُكْمُ (۲۸ : ۷۰) "حکم اس کا ہے"۔ اس لیے وہ اپنے بندوں کے درمان جو فیصلے چاہتا ہے' کرتا ہے اس کے کسی امر کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے۔ اور نہ اس کے فیصلوں کو کوئی بدل سکتا ہے۔

وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۸ : ۷۰) "اور اس کی طرف تم سب پلٹ کر جانے والے ہو"۔ اور آخری فیصلہ بھی وہاں اللہ ہی اپنے پورے اختیارات کے ساتھ کرے گا۔

یوں اللہ تعالیٰ یہ شعور اہل ایمان کے گلے میں تعویذ کی طرح باندھ دیتا ہے کہ اس کائنات میں صرف اللہ کا ارادہ چلتا ہے۔ اور یہ بھی سمجھا دیتا ہے کہ اللہ رازوں کو بھی جانتا ہے' اس سے کوئی چیز خفیہ نہیں ہے۔ سب نے اس کی طرف لوٹنا ہے۔ اس سے کوئی شخص بچ کر نہیں نکل سکتا۔ کس طرح یہ لوگ اللہ کے ساتھ شرک کی جرات کرتے ہیں حالانکہ یہ لوگ اس کے قبضے میں ہیں۔ اس سے نکل نہیں سکتے۔

---ooo---

اس کے بعد ایک سفر اس پوری کائنات کا بھی کرایا جاتا ہے جس میں یہ لوگ رہتے ہیں لیکن اس کے اندر اللہ کی جو گہری تدبیر و حکمت کام کر رہی ہے اس سے غافل ہیں۔ حالانکہ ان کی زندگی اور ان کی معیشت کے تمام فیصلے اللہ کے اختیار میں ہیں۔ اس طرح اللہ ان کے شعور کو اس کائنات کے دو بہت اہم مظاہر کی طرف متوجہ کرتا ہے یعنی گردش لیل و

نہار کی طرف ۔ اور اس امر کی طرف کہ گردش لیل و نہار کے اس نظام کے اندر اللہ وحدہ کی وحدانیت اور اس کے اختیار مطلق کے کیسے شواہد ہیں ۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

"اے نبیؐ' ان سے کہو کبھی تم لوگوں نے غور کیا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے رات طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہیں روشنی لا دے؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟ ان سے پوچھو' کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے دن طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہیں رات لا دے تاکہ تم اس میں سکون حاصل کر سکو؟ کیا تم کو سوجھتا نہیں؟ یہ اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے تاکہ تم (رات میں) سکون حاصل کرو اور (دن کو) اپنے رب کا فضل تلاش کرو' شاید کہ تم شکر گزار بنو" ۔

لوگوں کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے رات اور دن کی گردش دیکھ دیکھ کر ان سے اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ اس گردش کے اندر ان کو کوئی بات نئی نہیں لگتی ۔ وہ سورج کے طلوع اور غروب سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوتے ۔ اسی طرح دن کا نمودار ہونا اور رات کا چھا جانا بھی ان کو کچھ زیادہ متاثر نہیں کرتا ۔ اور یہی وجہ ہے کہ گردش لیل و نہار کے اندر انسانوں کے لیے جو فائدے ہیں اور جو رحمتیں ہیں اور جس طرح یہ گردش ان کو تباہی و ہلاکت سے بچاتی ہے ' اکتانے اور تھکانے سے بچاتی ہے ۔ یہ باتیں ان کے شعور میں مستحضر نہیں رہتیں ۔

قرآن کریم ان کو غفلت کی نیند سے جگاتا ہے ان کو ذرا اس عادی رویہ اور عادی منظر سے دور لے جاتا ہے ۔ ان کو متوجہ کرتا ہے کہ تمہارے ارد گرد گردش لیل و نہار کی وجہ سے کس قدر عظیم واقعات رونما ہوتے ہیں تو تم توجہ نہیں کرتے ۔ ذرا اتنا سوچو کہ رات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رک گئی یا دن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم ہو گیا ۔ تو کس قدر خوفناک نتائج کا سامنا تمہیں کرنا ہو گا ۔ انسانوں کو کسی چیز کی قدر و قیمت کا پتہ تب چلتا ہے جب وہ نہیں ہوتی ۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ (۲۸ : ۷۱) "اے نبیؐ' ان سے کہو کبھی تم لوگوں نے غور کیا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے رات طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہیں روشنی لا دے ۔ کیا تم سنتے نہیں ہو؟" ۔ جب سردیوں میں رات قدرے طویل ہو جاتی ہے تو لوگ سپیدۂ صبح کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں اور جب

سورج تھوڑی دیر کے لیے بادلوں میں چھپ جائے تو یہ آرزوئیں کرنے لگتے ہیں کہ سورج نکل آئے - اور اگر روشنی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی جائے تو ان کی حالت کیا ہو جائے گی جب رات ہمیشہ کے لیے قیامت تک ان پر مسلط ہو جائے - یہ تو اس صورت میں ہے کہ یہ پھر زندہ بھی کسی صورت میں رہ سکیں - حالانکہ ایسی صورت میں تو خطرہ یہ ہو گا کہ دنیا سے زندگی کے آثار ہی مٹا دیئے جائیں اور کبھی بھی دن نمودار ہو یا زندگی برقرار ہو -

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۲۸ : ۷۲) "ان سے پوچھو کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے دن طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہیں رات لا دے تاکہ تم اس میں سکون حاصل کر سکو؟ کیا تم کو سوجھتا نہیں"۔ لوگوں کی حالت یہ ہے کہ اگر دن ذرا طویل ہو جائے تو وہ سایوں کے تعاقب میں دوڑتے ہیں - اور گرمیوں میں دن طویل ہو تو رات کے مشتاق ہوتے ہیں اور رات کی تاریکی میں سکون و قرار تلاش کرتے ہیں - جبکہ زندگی رات کا سکون بھی چاہتی ہے جبکہ دوسرے دن' دن کی سرگرمی دکھائی جا سکے - لیکن اگر دن قیامت تک کے لیے جاری کر دیا گیا تو لوگوں کی حالت کیا ہو جائے گی - پہلے تو وہ ختم ہی ہو جائیں گے اور اگر کسی طرح زندہ رہ گئے تو زندگی کس قدر مشکل ہو جائے گی -

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے ہر چیز ایک مقدار کے مطابق بنائی ہے - اور اس جہاں کی چھوٹی اور بڑی ہر چیز کے پیچھے ایک تدبیر ہے اور ہر چیز اللہ نے ایک اندازے کے مطابق بنائی ہے -

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲۸ : ۷۳) "یہ اس کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے یہ رات اور دن بنائے تاکہ تم رات میں سکون حاصل کرو اور دن کو اپنے رب کا فضل تلاش کرو' شاید کہ تم شکرگزار بنو"۔

پس رات سکون و قرار کے لیے ہے - دن سرگرمیوں اور جدوجہد کے لیے ہے - اور دن کے اندر نکتہ توجہ یہ ہے کہ انسان کاروبار کرے اور رحمت الٰہی کی تلاش کرے - کیونکہ انسان کما کر ہی اللہ کے فضل سے کوئی چیز بطور شکر دوسروں کو دے سکتا ہے - اللہ نے تمہیں گردش لیل و نہار کی جو سہولت دی اس کی نعمت و رحمت ہے - پھر رات و دن کا ایک نظام کے ساتھ بدلتے رہنا بھی نعمت ہے اس کائنات کے دوسرے سنن اور قوانین طبیعیہ اللہ نے پیدا کیے ہیں' تم نے نہیں جاری کیے - اللہ نے ان قوانین کو اپنے علم و حکمت سے جاری کیا اور تم ان سے غافل ہو -

یہ سبق قیامت کے ایک ایسے منظر پر ختم ہوتا ہے جو بڑی تیزی سے نظروں کے سامنے سے گزر جاتا ہے - اس منظر میں سرزنش کے طور پر مشرکین سے پوچھا گیا کہ کہاں ہیں وہ شریک جن کو تم شریک سمجھتے تھے - وہاں ان کو ان کے باطل موقف سے دوچار کیا جاتا ہے - سوال و جواب کے اس شرمسار کنندہ موقف میں یہ لوگ پگھل کر رہ جاتے ہیں اور ٹوٹ کر زمین پر گرتے ہیں -

---

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ۝ وَنَزَعْنَا

مِن كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا فَقُلْنَا هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوا أَنَّ الْحَقَّ لِلَّهِ وَ

ضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝ ۱۵ع

۱۰ ”(یاد رکھیں یہ لوگ) وہ دن جب کہ وہ انہیں پکارے گا' پھر پوچھے گا ”کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے؟“ اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ نکال لائیں گے پھر کہیں گے کہ ”لاؤ اب اپنی دلیل“۔ اس وقت انہیں معلوم ہو جائے گا کہ حق اللہ کی طرف ہے' اور گم ہو جائیں گے ان کے وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے“۔

قیامت کے دن پکارنے کا منظر اور شرکاء کی بابت پوچھنے کا واقعہ گزشتہ سبق میں بھی گزرا ہے لیکن یہاں اسے بطور تاکید دوبارہ ایک نئے منظر میں لایا جاتا ہے۔ اس منظر میں یہ سوال و جواب ایک گواہ کے سامنے ہو گا۔ یہ ہر امت کا نبی ہو گا اور یہ شہادت دے گا کہ کس نے دعوت اسلامی کے حوالے سے کیا موقف اختیار کیا۔ اس منظر میں اصل مقصد یہ ہے کہ نبی کو سامنے لایا جائے گا تاکہ اس کی امت بھی اسے سب کی سب دیکھے اور وہ بھی ان کو سب کے سب کو دیکھے۔ اور اس عظیم گواہ کے سامنے مشرکین کو مزید شرمسار کرنے کے لیے ان سے پوچھا جائے کہ وہ شرکاء کہاں ہیں جن کو تم ایسا سمجھتے تھے۔ اس وقت ان کا نہ کوئی شریک ہو گا اور نہ اس شرک پر کوئی دلیل ہو گی۔ اور نہ وہ دنیا کی طرح ہٹ دھرمی کر سکیں گے۔ اور نہ کوئی مکالمہ اور دلیل پیش کر سکیں گے۔

فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰہِ (۲۸ : ۷۵) ”ان کو معلوم ہو گا کہ حق اللہ کی طرف ہے“۔ اور ایسا حق اور سچائی اللہ کی طرف ہو گی جس میں کوئی شبہ نہ ہو گا۔

وَ ضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۸ : ۷۵) ”اور گم ہو جائیں گے ان کے وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے“۔ یعنی ارتکاب شرک' شرکاء۔ نہ شرکاء ان کو دیکھیں گے اور نہ یہ شرکاء کو پا سکیں گے۔ حالانکہ اس مکالمے اور مناظرے کے وقت برہان کی ضرورت تھی۔

یہاں آکر موسیٰ علیہ السلام کے قصے پر تبصرہ ختم ہوتا ہے۔ اس تبصرے میں انسانوں کے دل و دماغ کو ایک وسیع بنیاد کی سیر کرائی گئی۔ دنیا کی بھی' آخرت کی بھی' انفس انسانی کے نشیب و فراز میں بھی اسے پھرایا گیا' اور اس کائنات کی وسعتوں میں بھی' سابقہ مکذبین کے کھنڈرات میں بھی اور اس کائنات کے سنن الہیہ میں بھی۔ اور یہ تمام سورت کے اصل مقاصد اور اس کے قصوں کے مضمون کے ساتھ ہم آہنگ اور مربوط رہی۔ اب ہم سورت کے دوسرے قصے کی طرف آتے ہیں۔

--- ooo---

# درس نمبر ۱۷۸ ایک نظر میں

اس سورت کا ابتدائی حصہ قصہ فرعون و کلیم پر مشتمل تھا۔اس قصے میں بتایا گیا تھا کہ قوت اور اقتدار کے نتیجے میں کس طرح نافرمانی اور سرکشی آتی ہے۔اور حکمران کس طرح اللہ کی ناشکری کرتے ہیں۔اللہ کی ہدایت سے دور ہوتے ہیں اور پھر ان سب باتوں کے نتیجے میں وہ زوال کا شکار ہوتے ہیں۔اب یہاں قارون کا قصہ لایا جاتا ہے کہ مال اور علم و ہنر جب سرکشی اختیار کر لیں' مالدار اترانے لگیں' عوام پر برتری جتلائیں' اللہ کی نعمتوں کا انکار کریں تو ان پر کس طرح ہلاکت آتی ہے۔اس کے بعد درست تصورات اور نظریات کے مطابق مال اور علم دنیا کی زیب و زینت ہیں اور ایمان اور نیک عمل کے مقابلے میں علم و ہنر اور مال و دولت کی کوئی قدر نہیں ہے۔نیز درست طرز فکر و عمل یہ ہے کہ علم و ہنر اور مال و دولت کو اعتدال کے ساتھ ضروریات زندگی کے لیے استعمال کیا جائے۔علو فی الارض اور فساد فی الارض کے لیے نہیں۔

قرآن کریم نے اس قصے کا زمان و مکان بیان نہیں کیا۔بس اس قدر معلومات کافی ہیں کہ یہ شخص قوم موسیٰ میں سے تھا اور یہ موسیٰ علیہ السلام سے باغی ہو گیا تھا۔کیا یہ واقعہ اس وقت ہوا تھا جب موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل خروج سے قبل مصر ہی میں تھے؟ یا موسیٰ علیہ السلام کے خروج کے بعد؟ یا بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام کے بعد یہ واقعہ پیش آیا۔بعض روایات میں ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد تھا۔اور خود موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہ واقعہ ہوا۔بعض روایات میں آتا ہے کہ قارون نے حضرت موسیٰ کو اذیت بھی دی تھی اور اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف رشوت دے کر ان کو ایک عورت کے ساتھ سکینڈل میں الجھانے کی کوشش کی تھی۔اللہ نے حضرت موسیٰ کو بچا لیا اور قارون زمین میں دھنسا دیا گیا۔

ہمیں ان روایات کی ضرورت نہیں ہے' نہ اس قصے کے زمان و مکان کے تعین کی ضرورت ہے۔قرآن کریم میں جس طرح یہ قصہ آیا ہے اس سے اس کے لانے کے مقاصد اچھی طرح واضح ہوتے ہیں اور وہ اقدار وہ اصول واضح طور پر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں جن کی وجہ سے یہ قصہ لایا گیا۔اگر اس کے زمان و مکان اور اس کے ماحول کے دوسرے واقعات و حالات کی یہاں ضرورت ہوئی اور ان سے کسی مزید حقیقت' قدر یا اصول کی وضاحت ہوتی تو اللہ ضرور وہ دوسری تفصیلات بھی دے دیتا۔لہٰذا ہم اس کی تشریح صرف قرآنی اسلوب ہی میں کرتے ہیں۔اور ان روایات سے ہٹ کر اس کی وضاحت کرتے ہیں کیونکہ ان تک اس کی تشریح کے سلسلے میں کوئی ضرورت باقی نہیں ہے۔

---

# درس نمبر ۱۷۸ تشریح آیات

## ۷۶ --- تا --- ۸۴

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ﴿٧٦﴾ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ۖ وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٧٧﴾ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي ۚ

"یہ ایک واقعہ ہے کہ قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا ایک شخص تھا' پھر وہ اپنی قوم کے خلاف سرکش ہو گیا۔ اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقت ور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی۔ ایک دفعہ جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا "پھول نہ جا' اللہ پھولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ احسان کر' جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے' اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر' اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا"۔ تو اس نے کہا "یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بناء پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے"۔

یوں اس قصے کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے ہیرو کا نام قارون ہے۔ اس کی قوم' قوم موسیٰ ہے اور اس نے اپنی قوم کے عقائد سے بغاوت کر لی۔ یہ اپنی قوم کے خلاف ظلم کا ارتکاب بھی کرتا اور یہ بغاوت اور ظلم وہ محض اپنی دولت مندی کی وجہ سے کرتا۔

وَ اٰتَیْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِی الْقُوَّةِ (۲۸ : ۷۶) "اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دیئے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقتور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی"۔

اور اس کے بعد پھر واقعات ' اقوال اور وہ تاثرات بیان کیے جاتے ہیں جو اس قصے کے ساتھ ساتھ ذہن میں آتے ہیں --- قارون موسیٰ علیہ السلام کا ہم قوم تھا۔ اللہ نے اسے بہت بڑی دولت دی۔ اس کی کثرت کی وجہ سے اسے خزانوں سے تعبیر کیا گیا۔ کنز (خزانہ) اس مال کو کہا جاتا ہے جو استعمال اور گردش سے زیادہ اور جسے محفوظ جگہ میں رکھا گیا ہو۔ نظروں سے اوجھل۔ اور یہ دولت اس قدر زیادہ تھی کہ اس کی تجوریوں کی چابیاں بھی بہت زیادہ تھیں۔ اور ان کو طاقتور آدمیوں کی ایک جماعت ہی اٹھا سکتی تھی۔ اس دولت کی وجہ سے قارون اپنی قوم سے باغی ہو گیا۔ یہاں اس کا ذکر نہیں ہے کہ اس نے کسی قسم کی بغاوت کی۔ یہاں بغاوت مجمل ہے اس لیے اس سے ہر قسم کی بغاوت اور نافرمانی مراد ہو سکتی ہے۔ یہ بغاوت بنی اسرائیل پر ظلم کے ذریعہ بھی ہو سکتی ہے۔ ان کی اراضی غصب کرنے کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ ان کی دوسری چیزیں چھین لینے سے بھی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ مال پر دست درازی کرنے والے اکثر لوگ کرتے ہیں۔ غریبوں کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ بھی بغاوت ہے کہ قارون کے مال میں غریبوں کا حق تھا اور وہ ادا نہ کرتا تھا۔ کیونکہ اغنیاء کے اموال میں فقراء کا حق ہوتا ہے۔ تاکہ یہ مال اغنیاء کے درمیان ہی گردش نہ کرتا رہے۔ محتاجوں تک بھی جائے۔ اس طرح طبقاتی نفرت پیدا ہوتی ہے اور سوسائٹی کا امن و امان تباہ ہوتا ہے۔ یہ بغاوتیں بھی ہو سکتی ہیں اور اس کے سوا اور بھی نافرمانیاں ہو سکتی ہیں۔

بہرحال قارون کی قوم میں ایسے لوگ تھے جو چاہتے تھے کہ یہ اس بغاوت سے باز آ جائے اور اسلام کے عادلانہ نظام معیشت کی طرف آ جائے ' جو اللہ نے دولت میں تصرف کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اور یہ ایسا نظام ہے کہ جس کے ذریعہ دولت مند اپنی دولت سے محروم نہیں ہوتا۔ اور وہ اعتدال کے ساتھ اپنی دولت سے استفادہ کر سکتا ہے ' جو اللہ نے اسے بخشا ہے لیکن یہ نظام میانہ روی اور اعتدال کو اہل ثروت کے لیے لازم قرار دیتا ہے ' اور یہ کہ وہ اس ذات کو ہروقت دل میں رکھیں جس نے انہیں یہ مال دیا ہے اور دولت کو اس طرح کام میں لائیں کہ قیامت میں اپنے کیے کا حساب دے سکیں۔

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ (۷۶) وَ ابْتَغِ فِیْمَاۤ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَ لَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا وَ اَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ وَ لَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ (۷۷) (۲۸:۷۶ ـ ۷۷) "ایک دفعہ جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا "پھول نہ جا ' اللہ پھولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ احسان کر ' جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے ' اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر ' اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا"۔ اس آیت میں ان سب اقدار اور خصوصیات کو جمع کر دیا گیا ہے جو تمام دوسرے نظامہائے زندگی کے مقابلے میں اسلامی نظام زندگی کی خصوصیات ہیں۔ اور وہ صرف اسلام میں پائی جاتی ہیں۔

لَا تَفْرَحْ (۲۸:۷٦) "پھول نہ جاؤ"۔ مال اور دولت پرست ہو کر حد سے زیادہ خوشی محسوس نہ کرو۔ دولت کے ساتھ ضرورت سے زیادہ دلچسپی نہ لو' اور دل کو خزانوں کے ساتھ باندھ نہ دو۔ مملوکات اور مقبوضات کو دیکھ کر زیادہ مسرت کا اظہار نہ کرو' اور دولت پر اس طرح نہ پھول جاؤ کہ دولت عطا کرنے والے ہی کو بھول جاؤ۔ اللہ کی نعمتوں کو بھلا دو اور اس کا حمد و شکر چھوڑ دو۔ بعض لوگ مال و دولت ہی کی وجہ سے ہلکے ہو کر ہوا میں اڑنے لگتے ہیں' ان کا دماغ بھی اڑنے لگتا ہے اور محض دولت کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھتے ہیں اور لوگوں پر دست درازی کرتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ (۲۸ : ۷٦) "اللہ پھول جانے والے لوگوں کو پسند نہیں کرتا"۔ اس طرح قارون کی قوم نے کوشش کی کہ قارون کو اللہ کی طرف لوٹا دے' کیونکہ اللہ مال اور دولت کی اساس پر غرور اور تکبر کو پسند نہیں کرتا اور نہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو دولت کی وجہ سے دوسرے کے ساتھ ظلم کرتے ہیں اور ان کا استحصال کرتے ہیں۔

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (۲۸: ۷۷) "جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے' اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا نظام زندگی کس قدر معتدل اور سیدھا ہے جو ایسے دل کو جس کے پاس دولت ہے آخرت کے ساتھ بھی باندھ دیتا ہے اور اسے دنیا کے حصہ سے بھی محروم نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اسے حکم دیتا ہے کہ دنیا میں مال سے استفادہ کو بھول نہ جاؤ' اس طرح نہ ہو کہ تم تارک الدنیا ہو کر اس دنیا کی زندگی کو معطل کر دو۔

اللہ نے دنیا کے اندر یہ پاکیزہ چیزیں اسی لیے تو پیدا کی ہیں کہ لوگ ان سے استفادہ کریں اور زمین میں ان پاکیزہ چیزوں کی پیداوار میں اضافے کے لیے ہروقت کوشاں رہیں اور زندگی میں ترقی اور تنوع ہوتا رہے۔ اور اس طرح انسان اس کرۂ ارض پر منصب خلافت ادا کرتا رہے۔ لیکن یہ پیداوار اور یہ ترقی عالم آخرت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہو۔ آخرت کی راہ سے لوگ منحرف نہ ہوں اور آخرت کی تکالیف اور فرائض کو بھول نہ جائیں۔ اس انداز سے دنیا کے سازوسامان سے لطف اندوز ہونا بھی ایک طرح کا شکر نعمت ہے اور اللہ کے دین کو قبول کرنا ہے اور ان سے لطف اندوز ہونا ہے اور یہ بھی اللہ کی عبادات میں سے ایک عبادت اور اطاعت ہے۔

یوں اسلامی نظام زندگی' انسانی زندگی کے اندر اعتدال اور ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے اور اس معتدل زندگی ہی کے ذریعہ اس کو روحانی ترقی کے مدارج بھی طے کراتا ہے جس میں کسی قسم کی محرومیت نہیں ہوتی اور نہ اسی میں انسان کی فطری زندگی کے کسی بھی حصے کا تعطل لازم آتا ہے۔

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (۲۸: ۷۷) "احسان کرو' جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا"۔ یہ مال اللہ کی طرف سے بخشش اور انعام ہے۔ اور اللہ کا احسان ہے۔ لہٰذا احسان کا بدلہ احسان ہونا چاہئے۔ اس احسان کو قبول کرو' احسان کے ساتھ اس میں تصرف کرو' اور لوگوں کے اوپر احسان کرو اور اپنے ذہن میں اللہ کے

اس احسان کا شعور تازہ رکھو اور شکر ادا کرتے رہو۔ گہرے شعور کے ساتھ صرف زبان سے شکر گذاری نہ کرو۔

وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ (۲۸: ۷۷) "اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کرو"۔ یعنی سرکشی اور ظلم کی وجہ سے فساد نہ کرو، اور دنیا کا سازو سامان اگر خدا خوفی اور آخرت کے حساب سے مبرا ہو کر استعمال کیا جائے تو اس سے زمین میں فساد برپا ہوتا ہے، یوں کہ مالداروں کے خلاف لوگوں کے دل میں حسد، بغض اور کینہ کی آگ جلنا شروع ہو جاتی ہے اور اگر مال کو بے جا طریقے سے خرچ کیا جائے تو بھی ظلم اور فساد کا باعث۔ اگر جائز طریقوں میں خرچ سے روکا جائے تو بھی ظلم کا باعث ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۸: ۷۷) "اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا"۔ جس طرح اللہ تعالیٰ پھولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح مفسدوں کو بھی پسند نہیں کرتا۔ یہ تو تھی نصیحت قوم قارون کی، قارون کو، اس پوری اصلاحی تقریر کے جواب میں وہ بس ایک ہی جملہ کہتا ہے لیکن یہ جملہ جامع شرو فساد ہے۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (۲۸: ۷۸) "تو اس نے کہا، یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے"۔۔۔۔ یعنی میرے علم و ہنر نے اس مال کو جمع کیا ہے، لہٰذا یہ میرا حق ہے۔ تم کون ہوتے ہو مجھے اس کے تصرف کے لیے خاص ہدایات دینے والے؟ اور میری مخصوص ذاتی ملکیت کے بارے میں از خود فیصلے کرنے والے۔ یہ مال تو میں نے بڑی جدوجہد کے بعد بنایا ہے اور اپنی مہارت اور دانش مندی کی وجہ سے اس دن کا اہل ہوا ہوں۔۔۔۔ یہ اس مغرور اور بر خود غلط شخص کی بات ہے جو نعمت اور حکمت کے اصل مصدر کو فراموش کر دیتا ہے اور جسے مال فتنے میں ڈال دیتا ہے اور دولت اندھا کر دیتی ہے۔

اس قسم کے لوگ انسانوں میں ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ کئی ایسے لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی جدوجہد ان کے مالدار ہونے کا حقیقی سبب ہے۔ اس لیے اپنے حاصل کیے ہوئے مال کے بارے میں انہیں مسئول نہ ہونا چاہئے۔ اس مال کو وہ اصلاح کے کاموں میں لگائے یا فساد کے کاموں میں، اس کے اوپر کوئی محاسبہ نہ ہونا چاہئے۔ اور اس کی خوشی اور غمی اور مرضی اور انکار کے اوپر اور کوئی نگرانی نہ ہونا چاہئے۔

اسلام انفرادی ملکیت کی اجازت دیتا ہے اور حلال طریقوں سے دولت جمع کرنے کی اسلام حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اسلام انفرادی جدوجہد کو نظر انداز نہیں کرتا اور نہ اسے فضول سمجھتا ہے۔ لیکن اسلام اس آزادی کے ساتھ ساتھ انفرادی دولت اور مملوکات کے استعمال کے لیے ضابطہ بھی متعین کرتا ہے جیسا کہ دولت کے کمانے اور ترقی دینے کے لیے اسلام ایک منہاج مقرر کرتا ہے۔ اسلام کا طریقہ کار اور اس کی معاشی پالیسی نہایت معتدل اور متوازن ہے۔ اس میں فرد اپنی جدوجہد کے ثمرات سے محروم نہیں ہوتا اور وہ اس جمع کردہ دولت کو اس طرح صرف بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اسراف اور تبذیر کی حدود میں داخل ہو جائے اور نہ اس کو یوں جمع اور خزانہ کرنے کی اجازت دیتا ہے کہ وہ کنجوسی اور مکھی چوسی کی حدود میں داخل ہو جائے۔ اسلام انفرادی ملکیت میں سوسائٹی کو بھی حصہ دار کرتا ہے اور انفرادی دولت کمانے کی بھی نگرانی کرتا ہے۔ دولت کو ترقی دینے کے طریقے بھی منصفانہ طور پر متعین کرتا ہے اور ان سے استفادہ کرنے اور خرچ کرنے پر

بھی کنٹرول کرتا ہے ۔اسلام کی معاشی ہدایات واضح ہیں اور ممتاز خصوصیات کی مالک ہیں ۔

بہرحال قارون نے اپنی قوم کی آواز پر لبیک نہ کہا۔اس نے اللہ کے انعامات کا شعور قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اسلام کی معاشی پالیسی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور نہایت ہی گھٹیا انداز میں قوم کی اس نصیحت سے اس نے منہ موڑا۔چنانچہ آیت کے خاتمہ سے بھی پہلے اسے تنبیہ کر دی گئی اور اس کے اس فقرے کو رد کر دیا گیا۔

اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ۝

"کیا اس کو یہ علم نہ تھا کہ اللہ اس سے پہلے بہت سے ایسے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت اور جمعیت رکھتے تھے ؟ مجرموں سے تو ان کے گناہ نہیں پوچھے جاتے"۔

اگر تم صاحب مال دولت ہو اور کچھ قوت رکھتے ہو' تو تم سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ایسی اقوام کو ہلاک کیا ہے جو تم سے مال میں بھی زیادہ تھیں اور قوت اور گرفت میں بھی ۔ یہ تاریخی حقیقت تمہیں معلوم ہونا چاہئے کیونکہ اس علم سے تمہیں نجات ملے گی ۔اس سے نہیں جس کے بل بوتے پر تم نے دولت جمع کی ہے ۔ تم جیسے نو دولتیے تو اس قابل ہی نہیں کہ ان کے گناہوں کی وجہ سے اللہ اگر انہیں ہلاک کرے تو اس سے پوچھے یا نوٹس دے ۔کیونکہ نہ تم فیصلہ کرنے والے ہو اور نہ گواہ ہو۔

وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ (۲۸:۷۸) "مجرموں سے تو ان کے گناہ نہیں پوچھے جاتے"۔اس قصے کے مناظر میں سے یہ پہلا منظر تھا اس منظر میں نظر آتا ہے کہ سرمایہ دار ہمیشہ سرکش اور ظلم کرتے ہیں ۔ وہ نصیحت پر کان نہیں دھرتے ' نصیحت سے اپنے آپ کو بالا سمجھتے ہیں کہ ان کا نفس کبھی ان کو شکر نعمت بجا لانے پر بھی آمادہ نہیں کرتا۔

دوسرے منظر میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ قارون کسی موقع پر اپنی دولت کی نمائش کرتا ہے ۔اس کی اس نمائش کو دیکھ کر بعض اہل ایمان کے دل بھی اڑنے لگے ۔ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہونے لگے اور وہ تمنائیں کرنے لگے کہ ہمیں بھی ایسا ہی دیا جائے جس طرح قارون کو دیا جاتا ہے اور وہ لوگ جن کو دولت سے محروم رکھا گیا تھا انہوں نے یہ تبصرہ کیا کہ قارون کو تو دولت کا حظ وافر دیا گیا ہے ۔اس موقع پر صحیح علماء اور مومنین سامنے آتے ہیں اور وہ دکھاتے ہیں کہ وہ قارون کی اس نمائش سے بلند ہیں اور جو لوگ اس مظاہرہ سے متاثر ہو گئے تھے ان کو وہ نہایت ہی اعتماد' یقین اور زور دار انداز سے منع کرتے ہیں"۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِىْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ

الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝

"ایک روز وہ اپنی قوم کے سامنے اپنے پورے ٹھاٹھ میں نکلا۔ جو لوگ حیات دنیا کے طالب تھے وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے "کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے' یہ تو بڑا نصیبے والا ہے"۔ مگر جو لوگ علم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے "افسوس تمہارے حال پر' اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو"۔

دنیا کی اس زندگی کے اس فتنے کے سلسلے میں دو قسم کے ردعمل سامنے آئے۔ ایک گروہ اس کی گرفت میں آگیا' مبہوت ہو گیا۔ اس منظر کے سامنے بچھ گیا اور اس پر ٹوٹ پڑا اور دوسرے گروہ کا ردعمل یہ تھا کہ وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا' نظر بلند رکھی' امیدیں اس ثواب کے ساتھ وابستہ کر لیں جو اللہ کے ہاں محفوظ ہے یوں اس کے نزدیک مال کی قوت کے مقابلے میں ایمان کا ترازو بھاری رہا۔

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ (۲۸ : ۷۹) "جو لوگ حیات دنیا کے طالب تھے وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا۔ یہ تو بڑا نصیبے والا ہے"۔ ہر دور میں دنیا کی زیب و زینت بعض لوگوں کا مقصد بن جاتی ہے اور جو لوگ دنیا کے طالب ہوتے ہیں ان کی آنکھیں اسے دیکھ کر چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ اور اس قسم کے لوگ اس چیز کی طرف بلند نظریں نہیں رکھتے جو اس دنیا سے اعلیٰ اور زیادہ قیمتی ہے۔ ایسے لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ اس زیب و زینت کو خریدنے والے نے کس قدر زیادہ قیمت ادا کر کے خریدا ہے۔ اور یہ دنیا کا سازو سامان اس شخص نے کیا کیا ذرائع کام میں لا کر حاصل کیا ہے۔ اس کے لیے مال' منصب اور عزت کی کیا کیا قربانیاں دی گئی ہیں۔ چنانچہ سطحی نگاہ رکھنے والے ایسے مظاہر پر ٹوٹ پڑتے ہیں جس طرح مکھیاں ہر میٹھی چیز پر جمع ہو جاتی ہیں۔ اور اس پر گرتی ہیں اور ایسے لوگ جب اہل ثروت کو دیکھتے ہیں تو ان کے منہ میں پانی آجاتا ہے لیکن ان کی نظر اس بات پر نہیں ہوتی کہ یہ دولت اور زیب و زینت جمع کرنے والے نے بہت مہنگی قیمت ادا کی' کن کن گندگیوں سے ہو کر گزرا ہے اور کیا کیا خبیس ذرائع استعمال کیے ہیں۔

اور جن لوگوں کا رابطہ اللہ سے ہوتا ہے اور وہ اعلیٰ اقدار کو اہمیت دیتے ہیں اور دولت اور دنیا کی زیب و زینت سے بڑھ کر ان کی نظروں میں مزید اعلیٰ قدریں بھی ہوتی ہیں۔ اپنی شخصیت کے اعتبار سے بلند ہوتے ہیں اور ان کا دماغ اس قدر اونچا ہوتا ہے کہ وہ زمین کی قدروں کے سامنے کسی مالدار کے سامنے نہیں جھکتے۔ یہ لوگ ہیں جن کو حقیقی علم دیا گیا ہے۔ یہی وہ علم ہے جو انسانی زندگی کو سیدھا رکھتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا

يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ (۲۸ : ۸۰) "مگر جو لوگ علم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے افسوس تمہارے حال پر' اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو"۔

اللہ کے ہاں جو درجہ ہے وہ اس زینت سے بہتر ہے' اللہ کے خزانے قارون کے خزانوں سے زیادہ ہیں اور یہ شعور اعلیٰ قدروں کی بابت صرف ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو صبر کرنے والے ہوں' جو دوسروں کے اعلیٰ معیار حیات کو دیکھ کر متاثر نہیں ہوتے۔ اور زندگی کے تمام فتنوں اور رعنائیوں کے مقابلے میں اپنے مقام پر جمے رہتے ہیں۔ جب ایسے لوگوں کا شعور یہ ہوتا ہے کہ آخرت کا اجر' اللہ کی رضامندی بہت قیمتی سامان ہے تو ان کا درجہ اور بلند ہوتا ہے۔ ایسے لوگ دنیا کے سازو سامان سے بلند ہو جاتے ہیں اور ان کی نظریں ثواب آخرت کے اعلیٰ افق پر ہوتی ہیں۔

--- ○○○---

جب زیب و زینت کا یہ فتنہ انتہا کو پہنچ جاتا ہے' اور لوگ اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتے بلکہ اس سے شکست کھا کر اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں تو اب دست قدرت کی طرف سے براہ راست مداخلت کا وقت آ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ضعیف الارادہ لوگوں کو اس کے جال میں شکار ہونے سے بچانے کے لیے اس قصے کو پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے۔ زیب و زینت کا یہ غرور ختم کر دیا جاتا ہے۔ اور عبرتناک منظر میں ایک فیصلہ کن گرفت کی جھلک پیش کرتا ہے :

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿۸۱﴾

"آخر کار ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔ پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کو آتا اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کر سکا"۔

نہایت ہی مختصر جملے میں ایک مختصر جھلکی کی صورت میں یہ انجام دکھایا گیا۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ (۲۸ : ۸۱) "آخر ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا"۔ زمین اسے بھی نگل گئی اور اس کے محل کو بھی نگل گئی۔ جس زمین پر وہ اپنے آپ کو سربلند سمجھتا تھا۔ جس کے اوپر وہ لوگوں پر ظلم کرتا تھا۔ اللہ نے اسے اسی کے اندر داخل کر دیا۔ اور وہ ضعیف و ناتواں ہو گیا۔ نہ اس کی مدد کوئی دوسرا کر سکا اور نہ وہ اپنی جاہ و مال کے ساتھ اپنی کوئی مدد کر سکا۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ فتنہ بھی دفن ہوا جس کے اوپر بعض لوگ فریفتہ ہو رہے تھے۔ غرض فیصلہ کن زد نے ان کو اللہ کی قدرت کی طرف پھیر دیا اور غضب اور گمراہی کے پردے دور ہو گئے اور یہ آخری منظر یوں رہا۔

وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ

۸

عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۖ وَيْكَأَنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ ﴿٨٢﴾ ع ۷

۱۱

"اب وہی لوگ جو کل اس کی منزلت کی تمنا کر رہے تھے' کہنے لگے "افسوس' ہم بھول گئے تھے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے' کشادہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے۔ اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ افسوس ہم کو یاد نہ رہا کہ کافر فلاح نہیں پایا کرتے"۔

اب یہ لوگ اس بات پر اللہ کی حمد و ثنا کر رہے ہیں کہ اللہ نے ان کی دعا قبول نہ کی۔ اور ان کو وہ دولت نہ دی جس کی وہ تمنا کرتے تھے اور جو دولت قارون کو دی گئی وہ ان کو نہ دی گئی۔ ورنہ ان کی حالت بھی وہ ہو جاتی جو چوبیس گھنٹوں میں قارون کی ہوگئی۔ ان کو اب ہوش آیا کہ دولت اس بات کی علامت اور دلیل نہیں ہے کہ دولت مند پر اللہ کا فضل ہے اور اللہ اس سے راضی ہے بلکہ اللہ اپنے بندوں میں سے کسی کو کم رزق دیتا ہے اور کسی کو زیادہ دیتا ہے یہ اس لیے نہیں ہے کہ اللہ ان سے راضی ہے یا ناراض ہے۔ رزق کی فراہمی کے اسباب اور ہیں۔ اگر وافر رزق اللہ کی رضامندی کی دلیل ہوتا تو قارون اللہ کی اس شدید گرفت اور پکڑ میں نہ آتا۔ ایسے ضعیف الاعتقاد لوگوں کو اب معلوم ہوا کہ کافر کبھی فلاح نہیں پاتے۔ قارون کے بارے میں قرآن نے کلمہ کفر نقل نہیں کیا گیا۔ البتہ مال و دولت پر غرور کرنا اور یہ سوچ رکھنا کہ یہ دولت اس نے خود اپنے علم و حکمت کے زور سے کمائی ہے' یہ بھی ایک قسم کا کفر ہے اور اس کا انجام ایسا ہوا جو کافروں کا ہوتا ہے یعنی مکمل تباہی اور ہلاکت۔

--- ○○○ ---

اب اس منظر پر بھی پردہ گر جاتا ہے۔ دست قدرت کی مداخلت سے اہل ایمان کے دلوں کو قوت ملی۔ اور اللہ کے پیمانوں میں ایمان کی قوت کو ترجیح ملی۔ اور اب ان مناظر پر بہترین تبصرہ:

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٨٣﴾

"وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں اور انجام کی بھلائی متقین ہی کے لیے ہے"۔

یہ دار آخرت جس کی بات اہل علم کرتے ہیں یعنی وہ لوگ جن کے پاس سچا علم ہے جو اشیاء کی صحیح قدر و قیمت متعین کرتا ہے یہ جہاں نہایت ہی بلند مرتبت ہے۔ بہت ہی وسیع ہے یہ جہاں کس کے لیے ہے؟

نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا (۲۸ : ۸۳) "یہ ہم نے ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیا ہے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں"۔ ایسے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال ہی نہیں آتا کہ وہ زمین میں برتری اپنی ذاتی سربلندی کے لیے حاصل کریں۔ وہ تو اپنی ذات اور اپنی شخصیت

پر بھی فخر نہیں کرتے ۔ ان کی ذات بھی اللہ کے تصور ' اللہ کی یاد اور اللہ کے شعور میں گم ہوتی ہے ۔ وہ اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ اللہ کے نظام حیات کے لیے ساعی ہوتے ہیں ' ان لوگوں کے پیمانوں میں ' اس زمین ' اس کی اشیاء ' اس کے سامان ' اور اس کی اقدار کا کوئی وزن نہیں ہوتا ۔ وہ اقتدار فساد فی الارض کے لیے نہیں حاصل کرتے ۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے اللہ نے دار آخرت تیار کیا ہے جو عالی شان ہے ۔

وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (۲۸ : ۸۳) "اور انجام کی بھلائی متقین ہی کے لیے ہے" ۔ جو اللہ سے ڈرتے ہیں ' جو اس کے غضب سے خائف ہوتے ہیں اور اس کی رضامندی کے طلبگار ہوتے ہیں" ۔

اس جہاں آخرت میں سب لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا ملے گی اور یہ بات اللہ نے اپنے اوپر لکھ دی ہے کہ نیکیوں کا اجر کئی گنا ملے گا اور برائیوں کی سزا ان کے برابر ہوگی ۔ زیادہ نہ ہوگی ۔ یہ ہے اللہ کی رحیمانہ شان ۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾

"جو کوئی بھلائی لے کر آئے گا اس کے لیے اس سے بہتر بھلائی ہے ' اور جو برائی لے کر آئے تو برائیاں کرنے والوں کو ویسا ہی بدلہ ملے گا جیسے عمل وہ کرتے تھے" ۔

--- ooo---

# درس نمبر ۱۷۹ تشریح آیات

## ۸۵--- تا--- ۸۸

اب قصص ختم ہیں۔ ان قصص پر جو تبصرے تھے وہ بھی ختم ہو گئے۔ اب روئے سخن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے۔ مکہ مکرمہ میں اس وقت مٹھی بھر اہل ایمان آپ کے ساتھ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خطاب ایسے حالات میں ہے کہ مکہ سے لوگ آپ کو نکالنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آپ مدینہ کی طرف جانے والے ہیں اور اس میں بھی قوم آپ کا پیچھا کر رہی ہے۔ ابھی آپ مدینہ نہیں پہنچے۔ راستہ ہی میں ہیں۔ یہ آیات جحفہ میں اتریں جو مکہ کے قریب ہے۔ اس وقت ہجرت کرتے ہوئے آپ کی نظریں اور آپ کا دل اپنے محبوب شہر مکہ کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ آپ پر مکہ چھوڑنا نہایت ہی دشوار گذر رہا ہے۔ اگر دعوت اسلامی کا عظیم مقصد آپ کے پیش نظر نہ ہوتا تو آپ اپنے بچپن کے اس شہر کو ہرگز نہ چھوڑتے 'جس کے ساتھ آپ کی یادیں وابستہ ہیں۔ جہاں آپ کے آباؤاجداد خوابیدہ ہیں اور جہاں آپ کے رشتہ دار رہتے ہیں۔ ایسے حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا ہے۔

إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ ۚ

"اے نبی' یقین جانو کہ جس نے یہ قرآن تم پر فرض کیا ہے وہ تمہیں ایک بہترین انجام کو پہنچانے والا ہے" (یعنی مکہ تک)۔

اللہ آپ کو مشرکین کے حوالے کرنے والا نہیں ہے۔ جبکہ اللہ نے آپ پر قرآن کی تبلیغ اور دعوت فرض کر دی ہے۔ اللہ مشرکین مکہ کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کو مکہ سے نکال دیں۔ آپ پر اور آپ کی دعوت کے حاملین پر تشدد اور ظلم کرتے رہیں۔ اللہ نے جو آپ کو قرآن کی دعوت کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ وہ ایک مقرر وقت پر آپ کی نصرت بھی کرنے والا ہے۔ لیکن اس کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ ٹھیک ہے آج ان لوگوں نے آپ کو نکال دیا ہے لیکن بہت جلدی آپ پھر واپس آنے والے ہیں۔

جن حالات میں حضور اکرم ہجرت پر مجبور ہوئے تھے وہ بہت زیادہ کربناک تھے لیکن اللہ نے چاہا کہ ایسے حالات ہی میں آپ کے ساتھ یہ پختہ عہد کر دیا جائے کہ آپ ظفرمندی کے ساتھ پھر اس شہر کو لوٹیں گے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کی مشکلات کو امن اور یقین کے ساتھ برداشت کریں۔ مطمئن ہو جائیں کہ جلدی آپ فاتح کی حیثیت سے لوٹنے والے ہیں۔ اور آپ کو اچھی طرح یقین ہو گیا کہ جلد ہی یہ تحریک مکہ میں فاتحانہ داخل ہو گی۔ اللہ کا یہ وعدہ ان

تمام لوگوں کے لیے قائم ہے جو بھی اس راہ پر چلنا چاہیں۔ جو شخص بھی اللہ کے لیے تشدد کا شکار ہو اور وہ اس پر صبر کرے اور یقین رکھے کہ اس ظلم اور تشدد کے بعد آخر کار اللہ کی مدد آئے گی تو اللہ نے آخر کار ایسے شخص کی مدد کی ہے۔ ایسا شخص آخر کار کامیاب ہوتا ہے اس معرکے سے سرخرو ہو کر نکلتا ہے۔ اس کے کاندھوں سے بوجھ اتر جاتا ہے اور وہ اپنے فرائض اچھی طرح ادا کر لیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ (۲۸ : ۸۴) "یقین کرو جس نے تم پر قرآن فرض کیا ہے وہ تمہیں ایک بہترین جگہ (مکہ) واپس پہنچانے والا ہے"۔ اور اس سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکال دیئے گئے تھے اور ان کا تعاقب بھی ہوا تھا لیکن اللہ نے ان کو پھر مصر کی طرف لوٹا دیا۔ وہ واپس ہوئے اور انہوں نے اپنی قوم کے کمزور لوگوں کو فرعون کی غلامی سے نکالا اور فرعون اور اس کی فوج ہلاک ہوئی اور اچھا انجام ان لوگوں کا ہوا جنہوں نے ہدایت قبول کی تھی۔ لہٰذا آپ بھی جس راہ پر نکل پڑے ہیں' چلتے رہیں اور آپ کی قوم اور آپ کے درمیان فیصلہ وہ کرے گا جس نے آپ کو اس ڈیوٹی پر مامور کیا ہے۔

قُلْ رَّبِّیْٓ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰی وَمَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴿۸۵﴾

"ان لوگوں سے کہہ دو کہ "میرا رب خوب جانتا ہے کہ ہدایت لے کر کون آیا ہے اور کھلی گمراہی میں کون مبتلا ہے" یعنی ہدایت و ضلالت کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔ وہ اہل ہدایت کو جزاء دے گا اور اہل ضلالت کو سزا دے گا۔

آپ پر جو قرآن فرض کیا گیا ہے وہ آپ پر اللہ کی طرف سے ایک رحمت اور مہربانی ہے۔ آپ کے تو خواب و خیال میں یہ بات نہ تھی کہ یہ امانت آپ کے حوالے کی جائے گی۔ یہ ایک عظیم منصب ہے جو آپ کو دیا گیا اور اس منصب کے دیئے جانے سے قبل آپ کے تصور میں بھی ایسی کوئی بات نہ تھی۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ یُّلْقٰٓی اِلَیْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ

"تم اس بات کے ہرگز امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی' یہ تو محض تمہارے رب کی مہربانی سے (تم پر نازل ہوئی ہے)"۔

یہ اس مسئلہ پر ایک فیصلہ کن بات ہے کہ رسالت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی امید نہ تھی کہ آپ رسول بھی ہو سکتے ہیں۔ پس یہ اللہ کا اچانک انتخاب تھا۔ اور اللہ جو چاہتا ہے' پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے' منتخب کرتا ہے۔ یہ اس قدر بلند منصب ہے کہ اس کے لیے کوئی انسان قبل از وقت توقع بھی نہیں کر سکتا' سوچ بھی نہیں سکتا کہ اللہ اسے اس منصب کے لیے چن لے گا یا اللہ اسے اس کے لئل بنا دے گا۔ یہ اللہ کا محض رحم و کرم ہوتا ہے۔ کسی شخص پر یا کسی قوم پر کہ ان میں سے کسی کو اللہ چن لیتا ہے اور یہ انتخاب ان کا ہوتا ہے جو اللہ کے اونچے بندے ہوں' ان کا انتخاب نہیں ہوتا جو اس منصب کے امیدوار ہوتے ہیں۔ مکہ کے ماحول میں عربوں میں اور اسرائیل میں بہت سے لوگ تھے۔ اس انتظار

میں تھے کہ نبی آخر الزمان آنے والا ہے' لیکن وہ کون ہو گا' یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ منصب رسالت کہاں لے جاکر رکھ دے ـ اللہ نے اس قوم اور اس شخص کو اس منصب کے لیے چن لیا جو اس کے لیے نہ امیدوار تھا اور نہ اس کو اس کا خیال تھا کیونکہ اللہ جہاں منصب نبوت دیتا ہے اس کے لیے پہلے اس کی قبولیت کے لیے فیض عظیم اور استعداد وافر عطا کرتا ہے ـ

یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کو حکم دیا جاتا ہے چونکہ آپ کو یہ کتاب دی گئی جس کے مطابق آپؐ نے حق پر فیصلے کرنے ہیں' لہٰذا کافروں کے مددگار نہ بنیں 'کیونکہ وہ تو آپ کو اللہ کی ان روشن نشانیوں سے روک دیں گے ـ بلکہ آپ مشرکین کے مقابلے میں صاف صاف عقیدۂ توحید پر مبنی دعوت لے کر اٹھیں ـ

فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكٰفِرِينَ ۝ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ
بَعْدَ إِذْ أُنزِلَتْ إِلَيْكَ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝
وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا 9
وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ الثلثة ع ٦
۱۲

"پس تم کافروں کے مددگار نہ بنو ـ اور ایسا کبھی نہ ہونے پائے کہ اللہ کی آیات جب تم پر نازل ہوں تو کفار تمہیں ان سے باز رکھیں ـ اپنے رب کی طرف دعوت دو اور ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو ـ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے ـ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے ـ فرمانروائی اسی کی ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو"ـ

اس سورت کے آخر میں یہ انسانی عقل و خرد کے تاروں پر آخری ضرب ہے ـ اس فیصلہ کن ضرب میں بتا دیا جاتا ہے کہ آپؐ اور آپؐ کے راستے اور مشرکین اور مشرکین کے طریقے کے درمیان بڑے فاصلے ہیں ـ آپ کے متبعین قیامت تک آپؐ کی راہ اور اس کے نشانات پر رہیں ـ یہ فیصلہ کن بات آپؐ کی ہجرت کے موقعہ آئی ہے جس کے ذریعے حضور اور مشرکین مکہ کے راستے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے تھے اور آنے والے عہد میں مختلف تاریخیں تیار ہونے والی تھیں ـ

فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكٰفِرِينَ (۲۸ : ۸٤) "پس آپ کافروں کے مددگار نہ بنیں" ـ کیونکہ مومن اور کافر کے درمیان کوئی تعاون اور باہم نصرت کا تعلق قائم نہیں ہو سکتا ـ دونوں کے راستے جدا ہیں' دونوں کے نظام زندگی متضاد ہیں ـ مومن حزب اللہ ہیں اور کافر حزب الشیطان ہیں ـ اس لیے دونوں کے باہم تعاون کے لیے کوئی مشترکہ اساس ہی نہیں ہے ـ دونوں کے تعاون کے لیے کوئی مشترکہ میدان نہیں ہے ـ

وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ إِذْ أُنزِلَتْ إِلَيْكَ (۲۸ : ۸۵) "اور ایسا کبھی نہ ہونے پائے کہ اللہ کی آیات جب تم پر نازل ہوں تو کفار تمہیں ان سے باز رکھیں" ـ کفار کا ہمیشہ یہ مقصد رہا ہے کہ اہل دعوت

کو کسی نہ کسی طریقے سے دعوت سے باز رکھیں اور مسلمانوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی دعوت کے راستے پر چلتے رہیں۔ اگرچہ رکاوٹیں ڈالنے والے رکاوٹیں ڈالیں۔ اور اس طرح چلتے رہیں کہ کوئی ان کو راہ دعوت سے روک نہ سکے۔ وہ قرآن اور سنت کی آیات کو لے کر اور ان پر بھروسہ کر کے اپنی راہ پر چل نکلیں۔

وَ ادْعُ اِلٰی رَبِّكَ (۲۸:۸۵) "اپنے رب کی طرف دعوت دو"۔ یہ دعوت خالص اسلامی دعوت ہو' بالکل واضح ہو اور اس کے اندر کوئی پیچیدگی اور کوئی التباس نہ ہو۔ یہ صرف اللہ کی طرف ہو' کسی قومیت اور کسی عصبیت کی طرف نہ ہو۔ کسی زمین اور کسی جھنڈے کے لیے نہ ہو' کسی مصلحت اور کسی مفاد کے لیے نہ ہو۔ کسی ذاتی خواہش اور کسی دنیاوی عیاشی کے لیے نہ ہو۔ اس دعوت کو کوئی قبول کرتا ہے یا نہیں کرتا' اس کی کوئی پرواہ نہ کی جائے۔ اور کوئی اس کو قبول نہیں کرتا تو وہ اپنے لیے کوئی اور راہ لے' ہمارا طریقہ اور راستہ تو یہی ہے۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۲۸:۸۵) وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (۲۸:۸۸)

"اور ہرگز مشرکین میں شامل نہ ہو اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود نہ پکارو"۔ ایک ہی اصول کو تاکیداً دو مرتبہ بیان کیا گیا یعنی شرک نہ کرو' اور اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو' اس طریقہ سے اسلامی نظریہ حیات نکھر کر سامنے آتا ہے۔ توحید اور شرک اسلامی عقیدہ کا بنیادی مسئلہ ہے۔ شرک کی نفی اور توحید کا اثبات بنیادی کلمہ ہے۔ اسی پر اسلامی نظریہ حیات قائم ہے۔ اسلام کے آداب' اس کے فرائض' اس کے اخلاقی ضابطے اور اس کے قانونی ضابطے سب اسی نظریہ پر قائم ہیں۔ ہر ہدایت اور ہر قانون نظریہ توحید پر قائم ہے۔ اس لیے ہر ہدایت اور ہر ضابطہ بندی سے قبل عقیدۂ توحید کا ذکر ہوتا ہے۔ مزید تاکید ملاحظہ ہو۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (۲۸:۸۸) "اس کے سوا کوئی معبود و اللہ نہیں ہے ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے"۔ لہٰذا اسی کے آگے جھکنا ہے۔ اسی کی بندگی کرنا ہے' اس کے سوا کسی کے پاس کوئی قوت نہیں ہے۔ اس کے سوا کسی کے پاس جائے پناہ اور جائے تحفظ نہیں ہے۔

كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (۲۸:۸۸) "ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے"۔ ہر شے زائل ہونے والی ہے' ہلاک ہونے والی ہے' مال ہو یا جاہ' اقتدار ہو یا قوت' زندگی ہو یا سامان زندگی' زمین ہو یا زمین کے باشندے۔ آسمان ہوں یا ان میں رہنے والی ہر چیز۔ اور یہ پوری کائنات جسے ہم جانتے ہوں یا جو ہمارے علم سے باہر ہو' ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے ماسوائے ذات باری تعالیٰ کے۔ صرف ذات باری تعالیٰ اکیلی ہی باقی رہے گی۔

لَهُ الْحُكْمُ (۲۸:۸۸) "فرمانروائی اسی کی ہے"۔ وہ جو فیصلے چاہتا ہے' کرتا ہے' جو احکام چاہتا ہے' دیتا ہے۔ اس کے احکام اور بادشاہت میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کے فیصلے کو کوئی رد نہیں کر سکتا۔ اس کے حکم کے بالمقابل کوئی حکم نہیں۔ اور وہ چاہے وہ ہوتا ہے اور اس کے سوا کوئی ایسی ذات

نہیں ہے جس کی مشیت چلتی ہو۔

وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۸ : ۸۸) "اور اسی کی طرف تم کو پلٹنا ہے"۔ لہٰذا اس کے حکم سے کوئی جائے خلاصی و جائے پناہ نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں فرار کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کے سوا کوئی ملجا و ماویٰ نہیں ہے۔

یوں اس سورت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ قدرت الٰہیہ اس میں برملا کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ذات باری دعوت اور داعیوں کی محافظ نظر آتی ہے۔ اور دعوت اسلامی کے مقابلے میں تمام قوتوں کو پاش پاش کرنے کے مناظر صاف نظر آتے ہیں۔ اور سورت کا اختتام دعوت اسلامی کی بنیاد یعنی عقیدۂ توحید پر ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ و حاکم نہیں ہے۔ حکم اور فیصلہ اسی کا چلے گا اور اس دعوت کو لے کر اہل دعوت کو چاہئے کہ وہ یقین' اعتماد اور یکسوئی کے ساتھ اپنی راہ پر گامزن رہیں۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ------ ۲۰

### سورۃ العنکبوت ۔ ۲۹

۱--- تا--- ۴۴

# سورۂ العنکبوت ایک نظر میں

سورۂ عنکبوت مکی ہے' بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ اس کی پہلی گیارہ آیات مدنی ہیں ـ محض اس لیے کہ ان میں جہاد اور منافقین کا ذکر ہے ـ لیکن ہم اس قول کو ترجیح دیتے ہیں یہ پوری سورت مکی ہے اور اس کی آٹھویں آیت کے بارے میں یہ روایت آتی ہے کہ یہ سعد ابن ابی وقاص کے اسلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے ـ جیسا کہ عنقریب اس کا ذکر ہو گا ـ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حضرت سعد ابن ابی وقاص مکہ میں مسلمان ہوئے ـ ظاہر ہے کہ جن آیات کو مدنی کہا گیا ہے یہ بھی ان میں سے ایک ہے ـ لہذا صحیح بات یہی ہے کہ ان سب آیات کو مکی کہا جائے ـ رہی یہ بات کہ ان میں جہاد کا ذکر آیا ہے تو اس کی تاویل آسان ہے کیونکہ مضمون کلام سے یہاں آزمائشوں کے خلاف جہاد معلوم ہوتا ہے ـ نفس کے خلاف جہاد اور نفاق کا ذکر بھی اسی کا مفہوم ہے یعنی ایسی منافقت کہ ایک آدمی بات کرتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا ـ ان آیات میں لوگوں کے ایک مخصوص نمونے کا ذکر ہے ـ

یہ پوری سورت آغاز سے اختتام تک ایک ہی لائن اور ایک ہی موضوع پر جاری ہے ـ اس کا آغاز حروف مقطعات اور ایمان اور ایمان والوں کی آزمائش سے ہوتا ہے ـ بتایا جاتا ہے کہ جب ایمان کسی شخص کے دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو اس شخص سے ایمان بھاری تقاضے کرتا ہے کیونکہ ایمان صرف چند کلمات کا نام نہیں ہے جو کہہ دیئے جائیں بلکہ ایمان کے نتیجے میں جو مشکلات آتی ہیں ان کو برداشت کرنا' اس کے تقاضوں کو پورا کرنا بھی ایمان کا حصہ ہوتا ہے ـ فرائض و مشکلات پر صبر کرنا بھی ایمان کا حصہ ہوتا ہے ـ

معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کا محور اور موضوع ہی "ایمان اور اس کے تقاضے" ہے کیونکہ ایمان اور مشکلات راہ کے ذکر کے بعد حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت لوط' حضرت شعیب علیہم السلام کے قصص آتے ہیں ـ پھر عاد' ثمود' قارون' فرعون اور ہامان کا ذکر ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر تمام زمانوں اور اقوام میں یہی صورت حال اہل ایمان کو پیش آتی رہی ہے یعنی ایمان کے ساتھ فتنے اور آزمائشیں لازم ہوتی ہیں ـ

اس کے بعد یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس دنیا میں شر کی قوتیں ہمیشہ ایمان کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتی ہیں اور مشکلات پیدا کرتی ہیں ـ شر کی قوتیں اہل ایمان کو معاشرے میں حقیر قوت ظاہر کرتی ہیں ـ ان کو نظرانداز کرتی ہیں لیکن اللہ ان کو خوب پکڑتا ہے ـ

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَّ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا (۲۹ : ۴۰) (۲۹:۴۰) "آخر کار ہر ایک کو ہم

نے اس کے گناہ میں پکڑا۔ پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی ' اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آ لیا ' اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا ' اور کسی کو غرق کر دیا "۔ پھر ان تمام قوتوں کی ایک مجسم مثال دی جاتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کے ہاں یہ کس قدر کمزور ہیں اللہ کی قوتیں جب اٹھتی ہیں تو یہ بے بس ہوتی ہیں۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ( ۲۹ : ۴۱ ) "جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنالیے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے "۔

اس کے بعد یہ سورت اس سچائی کو جو تمام انبیاء کی دعوتوں میں پائی جاتی ہے ' اس سچائی کے ساتھ جوڑ دیتی ہے ' جو زمین اور آسمان کی تخلیق میں ہے اور اس کے بعد ان تمام دعوتوں کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے کہ یہ سب اللہ کی جانب سے ہیں۔ سب دعوتیں اللہ وحدہ کی طرف پکارتی ہیں۔ اس کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی کتاب قرآن کریم پر بات ہوتی ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ مشرکین کا ردعمل اس کتاب کے حوالے سے کیا تھا۔ وہ اس کتاب کے ہوتے ہوئے خارق عادت معجزات طلب کرتے ہیں حالانکہ اس کے اندر جو دعوت ہے وہ اللہ کی رحمت اور نہایت ہی بہترین راہنمائی اور یاد دہانی پر مشتمل ہے۔ اور پھر تعجب انگیز انداز میں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس بارے میں جلدی کرتے ہیں کہ عذاب جلد کیوں نازل نہیں ہوتا حالانکہ جہنم تو بہت جلد ان کو اپنے گھیرے میں لینے والی ہے۔ پھر خود ان کی سوچ اور اپنے عقائد میں تضاد ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ "اگر ان سے پوچھو کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو ' تو ان کا جواب یہی ہو گا کہ اللہ نے "۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ "اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں سے پانی کس نے نازل کیا ' پھر زمین کے مردہ ہو جانے کے بعد اس کے ساتھ اسے زندہ کر دیا تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے "۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ( ۲۹ : ۶۵ ) "جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو صرف اللہ کو پکارتے ہیں ' پورا دین اس کے لیے خالص کرتے ہوئے "۔ لیکن یہ عقائد رکھنے کے باوجود یہ لوگ شرک کرتے ہیں اور اہل ایمان کو آزمائشوں میں ڈالتے ہیں۔

اس بحث و مباحثے کے درمیان مومنین کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ان آزمائشوں سے بچنے کے لیے ہجرت کریں ' موت سے نہ ڈریں کیونکہ

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُونَ "ہر نفس موت کو چکھنے والا ہے' پھر وہ سب ہماری طرف لوٹ کر آئیں گے"۔ نیز ہجرت کرتے ہوئے اس بات کی بھی پرواہ نہ کرو کہ ہم کھائیں گے کیا' کیونکہ

وَكَأَيِّنْ مِّنْ دَابَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ (۲۹ : ۶۰) "کتنے ہی زمین پر چلنے والے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے ہوئے نہیں ہوتے' اللہ انہیں رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی دیتا ہے"۔

سورت کے آخر میں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ان کی تعریف اور تمجید کی گئی ہے اور ان کو ہدایت پر مطمئن ہونے اور ثابت قدم رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (۲۹ : ۶۹) "وہ لوگ جنہوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا' ہم ضرور ان کی راہنمائی اپنے راستوں کی طرف کریں گے' بے شک اللہ محسن لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے"۔ یوں سورت کا خاتمہ اس کے آغاز کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور اس طرح پوری سورت کے پیش نظر جو حکمت ہے' وہ واضح ہو جاتی ہے۔ اور اس کے تمام حلقے مربوط ہو جاتے ہیں اور سب اس سورت کے محور کے ارد گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔

چنانچہ اس سورت کی بات' اپنے اس موضوع پر تین راؤنڈز میں چلتی ہے۔ پہلے راؤنڈ میں ایمان کی حقیقت' اللہ کی یہ سنت کہ وہ کارکنوں کو آزماتا ہے اور مشکلات میں مبتلا کرتا ہے اور پھر یہ کہ ایمان لانے والوں کا انجام کیا ہو گا اور کافروں کا انجام کیا ہو گا۔ اور یہ کہ ذمہ داری انفرادی ہے۔ لہٰذا قیامت کے دن کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھا سکے گا۔

وَلَيُسْأَلُنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ (۲۹ : ۱۳) "قیامت کے دن ضرور ان سے پوچھا جائے گا کہ وہ کیا افترا پردازیاں کرتے رہے تھے۔

دوسرے راؤنڈ میں وہ قصص ہیں جن کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کیا۔ ان قصص میں بھی وہ مشکلات اور رکاوٹیں بیان کی گئی ہیں جو ہمیشہ دعوت اور داعی کی راہ میں آتی ہیں۔ لیکن آخر میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کی قوتوں کے سامنے ان مشکلات اور رکاوٹوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ بتایا جاتا ہے کہ رسولوں کی دعوت حق پر مبنی ہوتی ہے اور اس کائنات کی تخلیق بھی اس حق کے اصول پر ہے۔ جس حق پر کائنات استوار ہے اور جس پر دین و شریعت استوار ہے' دونوں اللہ کی طرف سے ہیں۔

تیسرے راؤنڈ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اہل کتاب کے ساتھ مجادلہ نہ کرو مگر نہایت اچھے انداز میں۔ ہاں ان میں سے ایسے لوگوں کے خلاف سخت بات کی جا سکتی ہے جو ان میں سے ظالم ہوں۔ اہل کتاب سے یہ بات کی جا سکتی ہے کہ تمام ادیان ایک ہیں' اور کافر جس دین اسلام کا انکار کر رہے ہیں' یہ بھی تمام ادیان سماوی کا ہم مشرب دین ہے۔ سب کا سرچشمہ ایک ہے۔ اس راؤنڈ میں مشرکین کے ساتھ مباحثہ ہے۔ اور ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں کہ وہ مطمئن ہو جائیں' ان کے لیے خوشخبریاں ہیں اور ثابت قدمی سے اپنی راہ پر چلیں۔ کیونکہ۔

وَ انَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (۲۹ : ۶۹) "بے شک اللہ محسنین کے ساتھ ہے"۔

آغاز سے اختتام تک دوران کلام جابجا تبصرے آتے ہیں' جن میں ایمان کی حقیقت کو دلوں میں بٹھایا جاتا ہے۔ ان تبصروں کے ذریعے دلوں کو خوب جھنجوڑا جاتا ہے۔ اور داعیان حق کے دلوں کو راہ ایمان کی مشکلات کے سامنے کھڑا کیا جاتا ہے کہ یا تو ان مشکلات کو برداشت کر دیا اس راہ کو چھوڑ دو۔ اگر تم ایمان کے تقاضے پورے نہ کرو گے تو یہ نفاق ہو گا۔

غرض یہ ایسے اشارات اور ایسی ضربات ہیں جن پر ان نصوص کے ضمن ہی میں بحث کی جا سکتی ہے' جن میں یہ ضربات آتی ہیں۔ لہذا مفصل بات ہم نصوص کی تشریح تک موخر کرتے ہیں اور یہاں اسی اشارے پر اکتفاء کرتے ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۸۰ تشریح آیات

## ۱--- تا --- ۱۳

ا۔ل۔م ۔ان حروف میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ کتاب انہی حروف تہجی سے بنی ہے جو تمہیں معلوم ہیں اور تمہاری دسترس میں ہیں لیکن ان سے تم ایسی کتاب نہیں بنا سکتے جیسے قرآن ہے ۔اس لیے کہ یہ کتاب اللہ کا کلام ہے ' انسان کا کلام نہیں ہے ۔دوسرے مفسرین نے ان کے اور معانی بھی بیان کیے ہیں لیکن میں اس معنی کو ترجیح دیتا ہوں ۔

اس سے قبل ہم نے یہ بات کی ہے کہ جس سورت کے آغاز میں یہ حروف آئے ہیں 'اس کے بعد متصلا یا سورت کے درمیان قرآن کا ذکر ضرور ہوتا ہے ۔چنانچہ اس سورت میں بھی یہ آیات آئی ہیں ۔

اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ (۲۹ : ۴۵) "تمہاری طرف جو کتاب نازل کی جا رہی ہے اسے پڑھئے"۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الْكِتٰبَ (۲۹ : ۴۷) "اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی کتاب نازل کی ہے ۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ (۲۹ : ۴۸) "اس سے پہلے آپ کوئی کتاب نہ پڑھتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے ۔

اَوَلَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰى عَلَیْهِمْ (۲۹ : ۵۱) "کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر کتاب نازل کی ہے جو ان پر پڑھی جا رہی ہے"۔یہ تذکرہ اسی قاعدے کے مطابق ہے اور اسی لیے ہم نے حروف مقطعات کی تفسیر میں یہ رائے اختیار کی ہے ۔

ان کے بعد ایمان کی بات شروع ہوتی ہے اور ان آزمائشوں کی بات آتی ہے جو اس ایمان کی حقیقت سمجھنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں 'تاکہ معلوم ہو کہ مدعیان ایمان صادق ہیں یا کاذب 'اس لئے کہ سچے اور جھوٹے کی آزمائش ' آزمائش ہی سے ہوتی ہے ۔

---

سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوتِ مَكِّيَّةٌ

آیاتہا ۶۹ رکوعاتہا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝۱ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝۲ وَ
لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ
الْكٰذِبِيْنَ ۝۳

"ا ل م ـ ـ ـ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے" اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں ـ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟ـ

اس سورت کے پہلے پر زور قطعہ کا یہ دھماکہ خیز اعلان ہے' سرزنش آمیز سوالیہ کے ذریعے لوگوں کو متوجہ کیا گیا ہے کہ تم ایمان کو کیا سمجھتے ہو؟ کیا ایمان صرف چند الفاظ کا نام ہے جو زبانی اداکر دیئے جائیں؟

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (۲۹ : ۲) "کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ وہ کہہ دیں کہ "ہم ایمان لائے" اور ان کو آزمایا نہ جائے گا" ـ ایمان چند کلمات کا نام نہیں ہے جو زبان سے کہہ دیئے جائیں بلکہ وہ ایک حقیقت ہے جس کے اپنے تقاضے ہیں ـ وہ ایک امانت ہے جس کی کچھ ذمہ داریاں ہیں ـ یہ دراصل ایک جہاد ہے جس میں بڑے صبر کی ضرورت ہوتی ہے ـ لہذا یہ بات کافی ہے کہ کوئی زبان سے کہہ دے "ہم ایمان لائے" ـ اگر وہ ایمان کا دعویٰ کریں گے تو خود ان کی آزمائش شروع ہو جائے گی اور ان آزمائشوں میں ان کو ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا ہو گا ـ ان آزمائشوں سے وہ صاف ہو کر نکلیں گے اور ان کے دلوں کو خالص ہونا ہو گا ـ فتنہ کے معنی ہیں سونے کو گرم کر کے اس سے کھوٹ جدا کرنا ـ اس لفظ کے یہ لغوی معنی بھی یہاں مراد ہیں کہ آزمائشوں کے نتیجے میں ہی خالص لوگ سامنے آتے ہیں ـ آزمائشوں سے نکل کر کارکنوں کے دل صاف و شفاف ہو جاتے ہیں لہذا ایمان کے اعلان کے بعد آزمائش کا آنا ایک اصولی بات ہے ـ ایک جاری سنت ہے اور اللہ کا معیار ہے ـ جس پر اہل ایمان پرکھے جاتے ہیں ـ

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ

(۲۹ : ۳) "حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں ـ اللہ کو تو ضرور دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں" ـ اللہ کو تو ہر دل کی حقیقت معلوم ہے ـ ابتلا سے پہلے ہی معلوم ہے' لیکن مقصد یہ ہے کہ جو چیز اللہ کے علم میں ہے اور لوگوں سے پوشیدہ ہے وہ کھل کر سامنے آجائے تاکہ لوگوں کے ساتھ حساب و کتاب ان کے اعمال کے مطابق کیا جا سکے ـ اور صرف اسی بات پر ان کا محاسبہ نہ ہو کہ اللہ کو علم تھا کہ وہ ایسا کریں گے ـ اور یہ ایک پہلو سے اللہ کا کرم ہے اور اللہ کا عدل ہے اور لوگوں کی تربیت ہے کہ کسی شخص کو صرف ان اعمال پر پکڑا جا

سکتا ہے جو کھلے ہوں' اور جو ایک عملی حقیقت ہوں ۔ کسی کو اس کی نیت پر نہیں پکڑا جا سکتا ۔ کیونکہ دنیا کا کوئی حاکم اللہ سے زیادہ نیات کا جاننے والا نہیں ہے ۔

اب ہم اس مضمون کی طرف آتے ہیں کہ اللہ اہل ایمان کو' اپنی سنت کے مطابق ہمیشہ آزماتا ہے اور انہیں بعض مشکلات سے دوچار کرتا ہے' تاکہ یہ معلوم ہو کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان اور نظریہ اس کائنات میں اللہ کی امانت ہے ۔ اس امانت کے حامل وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اس کی اہلیت رکھتے ہوں اور جن کے اندر اس کے اٹھانے کی قدرت ہو' اور وہ ایمان اور نظریہ کے ساتھ مخلصانہ تعلق رکھتے ہوں' جو اپنا آرام اور امن اور سکون و سلامتی' سازو سامان اور عیش و عشرت اس پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوں ۔ یہ ایمان اور اسلامی نظریہ حیات اس زمین پر منصب خلافت الٰہیہ کا دوسرا نام ہے ۔ بایں معنی کہ اس زمین پر مومن عوام الناس کا قائد ہو اور اللہ کے احکام کو اس دنیا کی زندگی میں حقیقت کا روپ دے ۔ یہ ہے نہایت اہم اور قیمتی ذمہ داری اور یہ ایک ایسا کام ہے جو بہت ہی مشکل ہے اور اس کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو مشکلات کو انگیز کر سکتے ہوں ۔

اہل ایمان کی آزمائشوں میں سے ایک آزمائش یہ ہوتی کہ وہ ان مشکلات اور اذیتوں پر صبر کریں جو ان کو اہل باطل کی طرف سے پہنچیں ۔ خصوصاً ایسے حالات میں کہ ان کے لیے کوئی مددگار اور سہارا نہ ہو ۔ مومن نہ اپنا دفاع کر سکتا ہو اور نہ اسے کسی طرف سے کوئی مدد ملتی ہو ۔ نہ اس کے پاس کوئی ایسی قوت ہو جس کے ساتھ وہ زیادتی کرنے والوں کا مقابلہ کر سکے ۔ یہ آزمائش کی سخت ترین صورت ہوتی ہے ۔ قرآن کریم میں جب آزمائش کا ذکر ہوتا ہے تو ایسی ہی صورت حالات مراد ہوتی ہے ۔ لیکن فتنے اور آزمائش کی اس سے بھی زیادہ سخت اور شدید صورتیں ہو سکتی ہیں ۔

مثلاً بعض اوقات یہ خطرہ ہوتا ہے کہ ایک مومن کی وجہ سے اس کے دوستوں' احباب اور رشتہ داروں کو بھی اذیت دی جائے گی ۔ اور یہ مومن ان کے بارے میں بے بس ہوتا ہے ۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ یہ احباب دہائیاں دیتے ہیں کہ مومن ان کی خاطر نرمی کرلے یا باطل کے ساتھ مصالحت کرے تاکہ اقرباء اور رشتہ داروں پر تشدد نہ ہو اور دوسرے لوگ تباہ و برباد نہ ہوں ۔ اس سورت میں اس قسم کی آزمائشوں کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ جہاں مومن کے ساتھ بچے بھی مارے جاتے ہیں ۔

آزمائش کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ بعض اوقات باطل پرستوں پر دولت کی بارش ہوتی ہے ۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ اہل باطل خوشحال اور کامیاب ہیں ۔ دنیا ان کے نعرے بلند کرتی ہے ۔ عوام الناس تالیاں بجاکر ان کا استقبال کرتے ہیں ۔ اس کے راستے سے رکاوٹیں دور ہوتی چلی جاتی ہیں اور لوگ ان پر قربان ہوتے ہیں اور ان کی زندگی نہایت ہی خوشگواری سے گزرتی ہے اور یہ مومن بیچارہ نظروں سے گرا ہوا' غیر اہم جس کا کوئی حامی نہ ہو' اور وہ جس عظیم سچائی کا حامل ہے اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہے ۔ ہاں چند اس جیسے لوگ اور اس کے حامی ہوتے ہیں لیکن وہ خود معاشرے کے بے اثر لوگ ہوتے ہیں ۔

بعض اوقات ایک مومن اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہے' وہ دیکھتا ہے کہ وہ خود اپنی سوسائٹی میں غریب الدیار ہے' اس کا پورا ماحول گمراہی میں مبتلا ہے ۔ اور اس ماحول میں وہ انوکھا لگ رہا ہے ۔

اور آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مومن کو ایک عجیب اذیت کے ساتھ آزمایا جاتا ہے ۔ ایک مومن دیکھتا ہے کہ اس

کرۂ ارض پر بعض اقوام گمراہی اور رزالت میں کانوں تک ڈوبی ہوئی ہیں لیکن یہ اقوام نہایت ترقی یافتہ ہیں اور نہایت خوشحال اور مہذب ہیں اور ایسی اقوام میں ایک فرد' جو بھی ہو' وہ ایک انسان کے لائق عزت اور دیکھ بھال پاتا ہے۔ یہ اقوام مالدار اور خوشحال ہیں حالانکہ یہ اللہ کی نافرمان اقوام ہیں۔

اور اس سے بھی ایک عظیم آزمائش ایک مومن کے لیے اور ہے۔ یہ بہت ہی شدید ہے۔ نفس' نفسانیت اور شہوات کا فتنہ' دنیا کی کشش' جسمانی لذت' دولت اور اقتدار کی پیاس' خوشحالی اور مرفہ الحالی کی دوڑ' اور صراط مستقیم اور راہ ایمان پر چلنے کی دشواری۔ پھر اخلاق و کردار اور نفس کے مخالف میلانات کی دشواری' جدید دور کی زندگی کے حالات' جدید لوگوں کی سوچ' اور اہل زمانہ کے تصورات کے حملے اور آزمائش۔

اور جب ایک مومن کی جدوجہد طویل تر ہو جائے' اور اللہ کی طرف سے نصرت آنے میں تاخیر اور آزمائش شدید اور ناقابل برداشت ہو جائے اور ان کا مقابلہ وہی شخص کر سکتا ہو جسے اللہ ہی لغزشوں سے بچا رہا ہو' تو ایسے مومن ہی دراصل وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس امانت کا حق ادا کرتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں پر اس عظیم امانت کے سپرد کیے جانے کا اعتماد کیا جاتا ہے۔ یعنی زمین کے بارے میں عالم بالا کی امانت اور انسانی ضمیر میں ایمان باللہ کی امانت۔

خدا کی قسم' یہ بات نہیں ہے کہ اللہ آزمائشوں کے ذریعہ اہل ایمان کو محض سزا دینا چاہتا ہو' یا ان کو مصائب میں مبتلا کر کے ان کو اذیت دینا چاہتا ہو' بلکہ اللہ ان کو اس امانت کے اٹھانے کے لیے حقیقتاً تیار کرنا چاہتا ہے اور یہ تیاری اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اہل ایمان کو عملاً سختیوں میں مبتلا نہ کیا جائے' جب تک وہ صبر کر کے ہر قسم کی خواہشات اور شہوات پر برتری حاصل نہیں کر لیتے' جب تک وہ اذیتوں پر صبر کرنا سیکھ نہیں لیتے' اور جب تک انہیں اللہ کی نصرت پر حقیقی بھروسہ نہیں ہو جاتا۔ اگرچہ نصرت الٰہیہ بہت دیر کر دے اور اگرچہ ابتلاؤں کا دور طول کھینچ لے اور بہت شدید ہو جائے۔

نفس انسانی کو جب مصیبتوں کی بھٹی میں گرمایا جاتا ہے تو اس کا کھوٹ دور ہو جاتا ہے۔ اس کی خفیہ قوتیں جوش میں آتی ہیں' اس کی مدافعانہ قوتیں جمع ہوتی ہیں۔ مصائب کے یہ پہاڑ جب کسی پر ٹوٹتے ہیں تو اس کا باطن صیقل ہو جاتا ہے' اس کا جسم مضبوط ہوتا ہے اور یہ مومن ان مصائب و شدائد کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی جماعت پر یہ مشکلات آئیں تو وہ جماعت بھی اسی طرح صاف ہو جاتی ہے۔ اس کی صفوں سے کمزور لوگ نکل جاتے ہیں۔ مضبوط لوگ ہی رہ جاتے ہیں اور اولوالعزم اور قوی الارادہ اور اللہ کے ساتھ مضبوط تعلق والے ہی جماعت میں رہتے ہیں۔ وہ لوگ جنہیں کسی ایک نہ ایک اچھے نتیجے والے کی امید ہوتی ہے یا فتح کی یا اجر اخروی کی اور یہی لوگ ہوتے ہیں' جن کو آخر میں جھنڈے تھمائے جاتے ہیں اور اچھی تیاری اور ٹریننگ کے بعد پھر ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

ایسے لوگ جب اس امانت کو اٹھاتے ہیں تو یہ پھر انہیں دل و جان سے عزیز ہوتی ہے اس لیے کہ انہوں نے اس کے لیے قربانیاں دی ہوتی ہیں اور اس کی بھاری قیمت ادا کی ہوتی ہے۔ اس کی خاطر انہوں نے صبر کیا ہوتا ہے اور مشقتیں جھیلی ہوتی ہیں اور جو کارکن اپنا خون اور اپنے اعصاب قربان کرتا ہے' آرام اور اطمینان تج دیتا ہے۔ لذائذ اور مرغوبات کی قربانی دیتا ہے۔ اور پھر اذیتوں اور محرومیوں پر صبر کرتا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہی کارکن کو اس امانت اور نظریہ کا شعور ہوتا ہے کہ اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اس لیے وہ اسے ارزاں فروخت نہیں کرتا' کیونکہ اس نے اس کی بھاری

قیمت ادا کی ہوئی ہوتی ہے۔

رہی یہ بات کہ آخر کار یہ ایمان ' امانت اور اسلامی نظریہ حیات غالب ہو کر رہے گا تو یہ وہ وعدہ ہے جو اللہ نے کیا ہے اور اس کی ضمانت دی ہے۔ اور کوئی سچا مومن اللہ کے وعدے کے بارے میں شک نہیں کر سکتا' اگر یہ وعدہ دیر سے حقیقت بنتا ہے تو اس کی بھی کوئی حکمت ہو گی۔ اس میں اہل ایمان کے لیے بھلائی ہو گی۔ جان لو کہ اللہ جس قدر حق پر غیرت کرتا ہے' جس قدر ان کی حمایت کرتا ہے' اس سے زیادہ حق کی حمایت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ مومن کے لیے آزمائش اور مشقت ہی بہتر ہے تاکہ اس طرح وہ بندگان مختار میں شامل ہو جائے۔ حق کا امین بن جائے' اور اللہ اس پر گواہ ہو جائے کہ اس کا دین مضبوط ہے اور وہ حمل امانت کا اہل ہے اس لیے اسے آزمائش کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے "ابتلاؤں میں شدید اور مضبوط لوگ انبیاء ہوتے ہیں۔ پھر صالحین ہوتے ہیں' اور ان کے بعد درجہ بدرجہ' ہر آدمی کی آزمائش اس کے دین کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر اس کا دین مضبوط ہو تو اسے زیادہ آزمایا جاتا ہے"۔

رہے وہ لوگ جو اہل ایمان پر ظلم کر کے ان کو آزماتے ہیں اور برے کام کرتے ہیں تو وہ تو عذاب الٰہی سے بچ ہی نہیں سکتے۔ اگرچہ ان کی باطل قوتیں بہت پھلی پھولی ہوں۔ اگرچہ بظاہر وہ کامیاب و فاتح ہوں۔ اللہ کا وعدہ یہ ہے اور آخر کار اس کی سنت یہ ہے۔ سنو:

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ أَنْ يَسْبِقُونَا ۚ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿٤﴾

"اور کیا وہ لوگ جو بری حرکتیں کر رہے ہیں' یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ ہم سے بازی لے جائیں گے؟ بڑا غلط حکم ہے جو وہ لگا رہے ہیں"۔

کسی مفسد کو یہ خیال نہیں رکھنا چاہئے کہ وہ بچ نکلے گا یا بھاگ جائے گا۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے تو اس کا یہ فیصلہ غلط ہے۔ اس نے غلط اندازہ کیا ہے' اس کی سوچ پوچ ہے۔ کیونکہ اللہ نے اہل ایمان کی آزمائش کو ایک سنت بنایا ہے لیکن یہ اس لیے کہ سچے اور جھوٹے معلوم ہو جائیں' اس کی سنت کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ وہ بدکاروں کو پکڑتا ہے اور اس کی سنت کبھی بدلتی نہیں ہے۔

یہ اس سورت کے آغاز ہی میں ایک دوسری ضرب ہے' کہ آنکھیں کھول لو' اگر اہل ایمان کو آزمائش کی بھٹی سے گزارنا اور کھوٹے اور کھرے کے درمیان تمیز کرنا خدا کی سنت ہے تو بدکاروں اور مفسدوں کو پکڑنا بھی تو اللہ کی سنت ہے اس کے لیے بھی تیاریاں کر لو۔

اور تیسری ضرب' اس سورت کے آغاز میں یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ سے ملنے کا یقین ہے وہ اطمینان رکھیں اور یقین کر لیں جس طرح ان کے دل یقین کے درجے تک پہلے ہی پہنچ چکے ہیں کہ وقت آنے والا ہے۔

مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

”جو کوئی اللہ سے ملنے کی توقع رکھتا ہو (اسے معلوم ہونا چاہئے کہ) اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آنے ہی والا ہے' اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے“۔

جو دل اللہ کی ملاقات کی امید لیے ہوئے ہیں وہ مطمئن ہو جائیں اور انتظار کریں ان چیزوں کا جن کا اللہ نے ان کے ساتھ وعدہ کیا ہے۔ یہ انتظار اس انداز کا ہونا چاہئے جس طرح کسی کو کسی چیز کے ملنے کا پختہ یقین ہو اور وہ اس کا منتظر ہو۔ بس دن کے آنے کا انتظار ہو' اور شوق ملاقات بڑھتا ہی جائے۔ یہاں ایسے پاکیزہ قلوب کی تصویر بڑی اشاراتی ہے۔ ایک ایسے شخص کی تصویر جو ملاقات کا امیدوار بھی ہے' مشتاق بھی ہے' مربوط بھی ہے اور ایسے شخص کے شوق کے جواب میں اسے نہایت ہی فرحت بخش اشارے ملتے ہیں کہ دیکھو ہم دیکھ رہے ہیں' سن رہے ہیں اور ہمیں پورا پورا علم ہے۔

وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۲۹ : ۵) ”اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے“۔

چوتھی ضرب کا رخ ان لوگوں کی طرف ہے جو ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں' جہاد فی سبیل اللہ کی تکالیف اٹھاتے ہیں کہ یہ جہاد اور مشقتیں وہ اپنے لیے برداشت کر رہے ہیں۔ اپنے جمال و کمال اور اپنی خیر اور بھلائی کے لیے' اللہ کو تو ان چیزوں کی چنداں ضرورت نہیں ہے وہ تو جہانوں اور کائنات سے غنی ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

”جو شخص بھی جہاد کرے گا اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا۔ اللہ یقیناً دنیا جہان والوں سے بے نیاز ہے“۔

جب اللہ مومنین کے لیے آزمائشیں مقرر کرتا ہے اور ان کو حکم دیتا ہے کہ وہ یہ مشقتیں برداشت کریں تاکہ ان کے نفوس جنگاہ حیات میں مشکلات برداشت کرنے کے اہل بن جائیں' تو یہ احکام بھی خود اہل ایمان کی اصلاح کے لیے ہیں۔ یہ ان کو مکمل بناتے ہیں اور دنیا اور آخرت دونوں میں اہل ایمان کے لیے خیر کا باعث بنتے ہیں۔ جہاد کی وجہ سے تو ایک مومن کا نفس اور اس کا قلب پاک ہوتا ہے۔ ان کے تصورات میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور اس کے پیش نظر دنیا کے آفاق وسیع ہوتے ہیں۔ یہ حب مال اور حب نفس سے بھی بلند ہو جاتا ہے' اب اس کی شخصیت کے اعلیٰ جوہر کھلتے ہیں اور اس کی صلاحیت سامنے آتی ہے۔ اس کے بعد پھر وہ اپنی ذات سے آگے بڑھ کر ایک سوسائٹی کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔ اس سوسائٹی کی اصلاح ہوتی ہے' اسے فائدہ ملتا ہے۔ اس میں حق کے جھنڈے بلند ہوتے ہیں' بھلائی پھیلتی ہے اور غالب ہوتی ہے اور شر مغلوب ہوتا ہے۔ اصلاح کو ترقی ملتی ہے اور فساد سکڑتا ہے۔

وَ مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ (۶:۲۹) "جو شخص بھی جہاد کرے گا تو وہ اپنے بھلے کے لیے کرے گا"۔

کوئی شخص جہاد شروع کر کے 'آدھی راہ میں کھڑا نہ ہو جائے کہ لائیے جی معاوضہ اب تک کے جہاد کا۔ یا اللہ پر احسان جتلائے یا تحریک اسلامی پر احسان جتلائے یا یہ کہے کہ جی اس قدر جدوجہد سے ہمیں کیا ملا کیونکہ اس کے جہاد سے اللہ کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ اللہ کو انسانوں کی طرف سے جہاد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انسان کیا ہے اور اس کا جہاد کیا ہے؟ اللہ تو دو جہانوں سے بے نیاز ہے۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ اس نے اس ضعیف انسان کو اس عظیم کام کے لیے منتخب کیا۔ اسے زمین کا خلیفہ بنایا اور وہ اس زمین میں کام تو اپنے لیے کرتا ہے پھر بھی اللہ اسے اجر و ثواب دیتا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷﴾

"اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک اعمال کریں گے ان کی برائیاں ہم ان سے دور کر دیں گے اور انہیں ان کے بہترین اعمال کی جزا دیں گے۔"

لہٰذا اللہ کی راہ میں کام کرنے والے مزدور اس بات پر مطمئن ہو جائیں کہ انہیں بہت کچھ ملنے والا ہے' ان کی تقصیرات بھی معاف ہوں گی' ان کو اچھی جزاء ملے گی' لہٰذا ان کو جہاد کی تکلیفوں پر صبر کرنا چاہئے۔ مشکلات اور مصائب کو برداشت کرنا چاہئے کیونکہ ان کی امید روشن ہے اور جزاء پاکیزہ ہے۔ اللہ کے ہاں ان کا انتظار ہو رہا ہے۔ یہ اس قدر عظیم اجر ہے کہ اگر انہیں اس دنیا کی پوری زندگی میں انصاف نہ ملے تو بھی وہ کافی ہے۔

سورت کے آغاز میں ہم نے جن آزمائشوں کا ذکر کیا اس کا ایک رنگ اور پہلو اہل و عیال' محبوبوں اور دوستوں کا فتنہ ہے۔ ان آزمائشوں میں اللہ ایک مومن کو نہایت ہی معتدل موقف اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ؕ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ﴿۹﴾

"ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھہرائے جسے تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر۔ میری

ہی طرف تم سب کو پلٹ کر آنا ہے ' پھر میں تم کو بتا دوں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو ۔ اور جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ہوں گے ' ان کو ہم ضرور صالحین میں داخل کریں گے " ۔

والدین ' تمام اقرباء میں سے قریب تر اور زیادہ قابل احترام ہوتے ہیں ' ان کے حوالے سے اولاد کو مجسم شفقت بن جانا چاہئے اور ازروئے شریعت ان پر رحم اور ان کا احترام فرض کیا گیا ہے ۔ ان کے ساتھ محبت کا طریقہ یہ ہے کہ ان کا احترام کیا جائے ' اور ان کی اچھی طرح کفالت اور دیکھ بھال کی جائے ' لیکن ان کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ اللہ کے حقوق مار کر ان کو دیئے جائیں اور ان کی اطاعت اس طرح کی جائے کہ اللہ کی نافرمانی لازم آتی ہو یہ ہے صحیح راستہ ۔

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ( ۲۹ : ۸ ) "ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھہرائے جسے تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر " ۔

کیونکہ مومن کا پہلا تعلق اللہ سے ہے اور یہی تعلق اور رابطہ ناقابل شکست ہے ' اگر والدین مشرک و کافر ہوں تو ان کے ساتھ صرف حسن سلوک کیا جائے گا ۔ احترام و رعایت ہوگی ' اتباع ان کا نہ ہوگا ' دنیا کی اس مختصر زندگی میں یہی ہو گا ' اصل مقام تو آخرت ہے جہاں دونوں اللہ کے سامنے ہوں گے ۔

اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ( ۲۹ : ۸ ) "میری ہی طرف تم سب کو پلٹ کر آنا ہے ' پھر تم کو بتا دوں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو " ۔ قیامت میں پھر تعلق والدین و اولاد کا نہ ہو گا ۔ وہاں تو مومن باہم تعلق دار ہوں گے ۔ نسب اور رشتے نہیں رہ جائیں گے ۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ( ۲۹ : ۹ ) "جو لوگ ایمان لائے ہوں اور انہوں نے نیک عمل کیے ہوں گے ان کو ہم ضرور صالحین میں داخل کریں گے " ۔ یوں اللہ والے ایک جماعت ہوں گے ' جیسا کہ حقیقتاً وہ ایک جماعت ہیں ۔ اور نسب ' خون اور رشتے وہاں ختم ہوں گے ۔ یہ چیزیں یہاں دنیا ہی میں رہ جائیں گی ۔ یہ اس دنیا کے عارضی رشتے ہیں اور جو رشتے اس اصلی رشتے سے کٹ گئے یعنی رشتہ ایمان سے تو آخرت میں وہ نابود ہوں گے ۔

امام ترمذی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور انکی ماں حمنہ بنت ابی سفیان کے بارے میں نازل ہوئی ہے ۔ یہ اپنی ماں کے ساتھ بہت زیادہ حسن سلوک کرتے تھے ۔ اس نے ان سے کہا " یہ کیا دین ہے جو تو نے اپنایا ہے ؟ خدا کی قسم میں اس وقت تک کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی جب تک تم اس دین سے لوٹ نہیں جاتے یا یہاں تک کہ میں مر جاؤں ۔ اس طرح لوگ پوری زندگی تمہیں طعنہ دیتے رہیں گے اور لوگ کہیں گے "اے ماں کے قاتل " اس نے چوبیس گھنٹے تک یہ بھوک ہڑتال کی تو حضرت سعد اس کے پاس آئے اور عرض کی " اے ماں ' اگر تمہاری سو جانیں ہوں اور تم ایک کے بعد ایک جان دیتی چلی جاؤ تو بھی میں اپنا دین چھوڑنے والا نہیں ہوں ۔ اگر

چاہو تو کھا پی لو اگر نہ چاہو تو بھوک ہڑتال جاری رکھو"۔ جب وہ مایوس ہو گئی کہ یہ تو ماننے والا نہیں ہے تو اس نے کھانا پینا شروع کر دیا۔ تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو' لیکن شرک کرنے میں والدین کی اطاعت نہ کرو"۔

یوں اس واقعہ میں نسب کے قریب ترین رشتے پر ایمان غالب آ گیا لیکن قرآن نے رشتہ داروں اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک جاری رکھا۔ اہل ایمان کو ہر دور میں ایسی مشکلات پیش آتی رہتی ہیں۔ لہٰذا یہ آیت اور حضرت سعد کی یہ حدیث ہمارے لیے نشانات راہ ہیں۔ یہی امن و نجات کی راہ ہے۔

اب' مشکلات راہ ایمان ہی کے حوالے سے ایک دوسرا کردار' کہ جب مشکلات آتی ہیں تو چیختا چلاتا ہے' لیکن جب اللہ کی طرف سے کامیابی اور فتوحات آتی ہیں تو پھر لمبے چوڑے دعوے کرتا ہے' اللہ تعالیٰ چند کلمات میں اس کردار کو بھی نمایاں فرماتا ہے' یوں کہ ایک واضح تصویر سامنے آ جاتی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللَّهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللَّهِ ۖ وَلَئِنْ جَاءَ نَصْرٌ مِنْ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۚ أَوَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ ﴿١٠﴾ وَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنَافِقِينَ ﴿١١﴾

"لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر۔ مگر جب وہ اللہ کے معاملہ میں ستایا گیا تو اس نے لوگوں کی ڈالی ہوئی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا۔ اب اگر تیرے رب کی طرف سے فتح و نصرت آ گئی تو یہی شخص کہے گا کہ "ہم تو تمہارے ساتھ تھے"۔ کیا دنیا والوں کے دلوں کا حال' اللہ کو بخوبی معلوم نہیں ہے اور اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہی ہے کہ ایمان لانے والے کون ہیں اور منافق کون"۔

لوگوں میں ایسے کردار عام ہیں' ایسے لوگ لفظ ایمان کو ایک معمولی بات سمجھ کر اقرار کرتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ صرف زبان سے کلمہ پڑھنا ہے۔ اس کے کچھ تقاضے نہیں۔ لیکن جب اللہ کی راہ میں تکالیف آتی ہیں' اور یہ آزمائشیں اس کلمے کی وجہ سے آتی ہیں تو

جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللَّهِ (۲۹ : ۱۰) "اس آزمائش کو اللہ کا عذاب سمجھتا ہے"۔ اور جزع و فزع اور فریادیں شروع کر دیتا ہے۔ اب اس کی دینی قدریں مختلف ہو جاتی ہیں۔ اس کا عقیدہ متزلزل ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہی تو جہنم کا عذاب ہے' جہنم میں ہیں ہم۔ سوچتا ہے کہ یہی تو عذاب الیم ہے۔ لہٰذا ایمان پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آخر جس مصیبت میں ہم ہیں جہنم اس سے کیا زیادہ ہو گی۔ یہ ہوتی ہے اس کی سوچ۔ وہ دنیا کی اس معمولی تکلیف کو عذاب الٰہی سمجھتا ہے۔ حالانکہ جہنم میں وہ عذاب ہو گا جس کا تصور بھی ہم نہیں کر سکتے' نہ اس کی حدود ہوں گی ۔۔۔ یہ تو تھا اس کا کردار آزمائش میں۔ لیکن اگر خوشیاں ہوں تو۔

وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ (۲۹ : ۱۰) "اب اگر تیرے رب کی طرف سے فتح و نصرت آگئی تو یہی شخص کہے گا کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے"۔ہم تمہارے ساتھ تھے .... اور مشکلات میں وہ کس قدر ہلکا' ذلیل اور اس کی سوچ اور اس کے تخمینے کس قدر غلط تھے ....... اب تو وہ لمبے چوڑے دعوے کر رہا ہے' پھولا نہیں سماتا' اب کہتا ہے ۔

اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ (۲۹ : ۱۰) "ہم تو تمہارے ساتھ تھے"۔اور جواب خوب آتا ہے ۔

اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ (۲۹ : ۱۰) "کیا دنیا والوں کے دلوں کا حال اللہ کو بخوبی معلوم نہیں؟" تمہارے دل کی فلم اللہ کے ہاں موجود ہے ۔ اللہ کو تو معلوم ہے کہ کون صابر رہا اور کون جزع و فزع کرتا رہا۔ مومن کون ہے اور منافق کون ہے ۔ کیا یہ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں ۔

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ (۲۹ : ۱۱) "اور اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہی ہے کہ ایمان لانے والے کون ہیں اور منافق کون ہیں"۔ اللہ تو ان کو ظاہر کرنا چاہتا ہے اور یہ ضرور ظاہر ہوتے رہیں گے ۔ یہ آزمائشیں تو آتی ہی اس لیے ہیں کہ کھرے اور کھوٹے جدا ہوں ۔

اس منافق کردار کے بارے میں یہاں قرآن کریم نے جو الفاظ استعمال کیے وہ قابل غور ہیں ۔ ان الفاظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس کردار کو غلطی کہاں سے لگی ہے ۔

جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ (۲۹ : ۱۰) "تو لوگوں کی ڈالی ہوئی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا"۔ ان کی غلطی یہ نہیں ہے کہ ان پر جو سختی آئی اس کے برداشت کرنے میں ان کا صبر تمام ہو گیا' کیونکہ بعض اوقات ایک سچا مومن بھی برداشت نہیں کر سکتا' کیونکہ انسانی طاقت کے بہرحال حدود ہوتے ہیں ۔ لیکن ایک سچا مومن انسانوں کی طرف سے آنے والی اذیتوں اور اللہ کے عذاب کے درمیان بہرحال تمیز کرتا ہے ۔ وہ اس قدر غلطی نہیں کر سکتا کہ اس فانی دنیا کی کوئی چیز اور اللہ کے ہاں دائمی رہنے والے عالم آخرت کی کوئی چیز برابر ہو سکتی ہے ۔ یہاں تک کہ دنیا کا ناقابل برداشت عذاب بھی آخرت کے عذاب الہی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے ۔ مومن کے احساس میں اللہ اور اس کے بے مثال کام میں کوئی چیز اس کے برابر نہیں ہو سکتی ۔ یہ ہے فرق مومن اور منافق کے درمیان ۔

آخر میں لوگوں کو گمراہ اور بدراہ کرنے کی آزمائش کا نمونہ آتا ہے ۔ اور بتایا جاتا ہے کہ جزاء و سزا کے بارے میں اہل کفر کا تصور کس قدر پوچ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو گمراہ کر کے اخروی ذمہ داری خود لیتا ہے حالانکہ اللہ کے ہاں یہ اصل الاصول ہے کہ ہر شخص اپنے کیے کا خود ذمہ دار ہے ۔ یہ اعلیٰ درجے کا انصاف ہے جو اسلام نے واضح طور پر قائم کیا ۔ یہ عدل کا زرین اصول ہے ۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۲﴾

وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ ۖ وَلَيُسْأَلُنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
۱۳ع عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿١٣﴾
۱۳

"یہ کافر لوگ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمہاری خطاؤں کو ہم اپنے اوپر لے لیں گے۔ حالانکہ ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی وہ اپنے اوپر لینے والے نہیں ہیں' وہ قطعاً جھوٹ کہتے ہیں۔ ہاں ضرور وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ دوسرے بہت سے بوجھ بھی۔ اور قیامت کے روز یقیناً ان سے ان افتراپردازیوں کی باز پرس ہو گی جو وہ کرتے رہے ہیں"۔

یہ بات' یہ لوگ اس بدویانہ اصول کے مطابق کہتے تھے جس میں جرائم کے سلسلہ میں ذمہ داری اجتماعی ہوا کرتی تھی۔ کسی جرم کا ذمہ دار پورا قبیلہ ہوتا تھا۔ اس غلط رواج کے تحت وہ یہ بھی زعم رکھتے تھے کہ آخرت میں شرک کی ذمہ داری بھی وہ اپنے سر لے سکتے ہیں اور اس طرح وہ ان کو جرم کی سزا سے بچالیں گے۔ یہ دراصل آخرت کی جزاء و سزا کے ساتھ مزاح کر رہے تھے۔

اتَّبِعُوا سَبِيلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطَايَاكُمْ (۲۹ : ۱۲) "تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمہاری خطاؤں کو ہم اپنے اوپر لے لیں گے"۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا اٹل جواب آج ہے کہ ہر شخص اللہ کے سامنے ضرور حاضر ہو گا۔ ہر شخص سے اس کے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ اور کوئی شخص کسی کے اعمال کا ذمہ دار نہ ہو گا۔

وَمَا هُم بِحَامِلِينَ مِنْ خَطَايَاهُم مِّن شَيْءٍ (۲۹ : ۱۲) "حالانکہ ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی وہ اپنے اوپر لینے والے نہیں ہیں"۔ اور بتایا جاتا ہے کہ یہ جو لاف زنی کرتے ہیں اس میں جھوٹے ہیں۔

إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ (۲۹ : ۱۲) "وہ قطعاً جھوٹ کہتے ہیں"۔

ہاں یہ لوگ اپنی گمراہی کا بوجھ بھی اٹھائیں گے' شرک کا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اس افتراپردازی کا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کا بوجھ بھی اٹھائیں گے۔ جب دوسرے گمراہ ہونے والے بھی معاف نہ ہوں گے۔

وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ وَلَيُسْأَلُنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ

(۲۹ : ۱۳) "ہاں وہ ضرور اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے' اور اپنے بوجھوں کے ساتھ دوسرے بہت بوجھ بھی' اور قیامت کے روز یقیناً ان سے ان افتراپردازیوں کی باز پرس ہو گی جو وہ کرتے رہے ہیں"۔ چنانچہ اس آزمائش اور فتنے کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جاتا ہے اور اعلان کر دیا جاتا ہے کہ لوگوں کا حساب و کتاب جماعتی صورت میں نہ ہو گا' فرداً فرداً ہو گا اور ہر شخص اپنے کیے کا ذمہ دار ہو گا۔

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ "ہر شخص اس کمائی کا رہن ہو گا جو اس نے کمائی"۔

---()()()---

# درس نمبر ۱۸۱ ایک نظر میں

سابقہ راؤنڈ میں یہ بتایا گیا تھا کہ جو لوگ کلمہ ایمان کا اقرار کرتے ہیں' اللہ کی سنت جاریہ کے مطابق ان کو ضرور آزمایا جائے گا اور مشکلات سے دو چار کیا جائے گا تاکہ سچوں اور جھوٹوں کے درمیان امتیاز ہو جائے۔ آزمائشوں میں اذیت کی آزمائش' رشتہ داروں کی آزمائش اور سازشوں اور لالچوں کی آزمائش شامل ہے۔

اس سبق میں ان آزمائشوں کا ذکر ہے جو نوح علیہ السلام سے ادھر ہر اسلامی دعوت کے قائدین کو پیش آتی رہی چاہے وہ نبی ہیں یا ان کے متبعین اور ساتھی ہیں۔ دعوت و عزیمت کی اس تاریخ میں حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے حالات کو ذرا تفصیل سے لیا گیا ہے اور دوسرے انبیاء کے حالات مجملا بیان ہوئے ہیں۔

ان قصص میں بتایا گیا ہے کہ دعوت اسلامی کی راہ میں قسما قسم کی مشکلات اور رکاوٹیں آتی رہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے قصے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے طویل جدوجہد کی اور حاصل نہایت معمولی رہا۔ نو سو پچاس سال کی جدوجہد کے نتیجے میں بہت کم لوگ مسلمان ہوئے۔

فَاَخَذَهُمُ الطُّوفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ (۲۹: ۱۴) "آخر کار ان لوگوں کو طوفان نے آگھیرا اس حال میں کہ وہ ظالم تھے"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے مقابلے میں سرکش حکمران نے یہ صلہ دیا کہ وہ تشدد پر اتر آیا' حالانکہ آپ نے حتی المقدور ان کی ہدایت کے لیے سعی کی۔ معقول دلائل سے بات کی تو اس قوم کا ردعمل بھی یہ تھا:

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ (۲۹: ۲۴) "پھر ابراہیم کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا "قتل کر دو اسے یا جلا ڈالو اس کو"۔

حضرت لوط کے قصے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رذیل لوگ کس قدر خود سر ہو گئے ہیں اور کس قدر بے حیا اور طوطا چشم بن گئے تھے۔ نبی کا بھی کوئی لحاظ اور احترام نہیں کرتے تھے اور انہوں نے انسانیت کو حیوانیت کے درجے سے بھی گرا دیا تھا اور وہ گندگی اور رذائل میں مبتلا ہو گئے تھے اور وہ اپنے ڈرانے والے ہمدرد کے مقابلے میں یہ جرات کرتے ہیں۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲۹: ۲۹) "اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو اللہ کا عذاب ہم پر لے آؤ"۔

حضرت شعیب کے قصے میں بھی اہل مدین کی طرف سے فساد و سرکشی سامنے آتی ہے' اور وہ سچائی اور حق سے منہ موڑتے ہیں اور تکذیب کرتے ہیں۔

فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دَارِهِمۡ جٰثِمِیۡنَ (۲۹:۳۷) "آخر کار ایک سخت زلزلے نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں پڑے کے پڑے رہ گئے"۔

قوم عاد اور قوم ثمود کی طرف بھی غرور' قوت اور سرکشی کے مظاہرے کا اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح فرعون' قارون اور ہامان کی طرف یہ اشارہ کیا گیا کہ انہوں نے حق کے مقابلے میں مال و دولت' حکومت' سازش اور سرکشی کو سرچشمہ قوت سمجھا ان تمام تاریخی قوتوں پر قرآن یہ تبصرہ کرتا ہے کہ یہ قوتیں' چاہے وہ جس قدر زور دار کیوں نہ ہوں جب سچائی کے مقابلے میں آتی ہیں تو ان کی حیثیت مکڑی کے جالے کے برابر ہو جاتی ہے۔

كَمَثَلِ الۡعَنۡكَبُوۡتِ ۖ اِتَّخَذَتۡ بَيۡتًا ؕ وَاِنَّ اَوۡهَنَ الۡبُيُوۡتِ لَبَيۡتُ الۡعَنۡكَبُوۡتِ ۘ لَوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ (۲۹:۴۱) "ان کی مثال مکڑی جیسی ہے' جو اپنا گھر بناتی ہے' اور سب گھروں سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے"۔

یہ راؤنڈ ایک ایسی بات پر ختم ہوتا ہے جس میں حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ آپ قرآن کی تلاوت فرمائیں' نماز قائم کریں اور اس کے بعد دعوت کا انجام اللہ پر چھوڑ دیں۔

وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تَصۡنَعُوۡنَ "اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو"۔

--- ooo---

# درس نمبر ۱۸۱ تشریح آیات

## ۱۴ --- تا --- ۴۴

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا
خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ
اَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۵﴾

"ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ پچاس کم ایک ہزار برس ان کے درمیان رہا۔ آخر کار ان لوگوں کو طوفان نے آگھیرا' اس حال میں کہ وہ ظالم تھے۔ پھر نوح کو اور کشتی والوں کو ہم نے بچا لیا اور اسے دنیا والوں کے لیے ایک نشان عبرت بنا کر رکھ دیا"۔

حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تک دعوت دی۔ نبوت عطا ہونے سے پہلے بھی ان کی کچھ زندگی گزری ہوگی جس کا تعین یہاں نہیں ہے اور طوفان کے بعد بھی وہ زندہ رہے تھے' وہ عرصہ بھی متعین نہیں ہے۔ اس طرح حضرت نوح علیہ السلام کی عمر بقا پر موجودہ عمر طبعی سے بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن یہ عمر قرآن نے بتائی ہے جو اس کائنات میں سب سے سچا ذریعہ علم ہے اور اس کی صداقت کے لیے یہی کافی ہے کہ یہ قرآن کی تصریح ہے۔ اس کی توضیح اس طرح ہو سکتی ہے کہ اس وقت دست قدرت نے طویل عمریں اس لیے رکھیں کہ زمین آباد ہو اور نسل پھیلے۔ جب لوگوں کی کثرت ہوئی تو پھر لمبی عمر کی ضرورت نہ رہی۔ کئی زندہ چیزوں میں یہ اصول مروج نظر آتا ہے' اگر کسی زندہ کی تعداد کم ہو تو عمر زیادہ ہوتی ہے۔ مثلاً شکاری پرندے شاہین وغیرہ اور کچھوے جن کی عمریں اب بھی سینکڑوں سال ہوتی ہیں جبکہ مکھی زیادہ سے زیادہ دو ہفتے زندہ رہتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے

| | | | |
|---|---|---|---|
| بغاث | الطیر | اکثرھا | فراخًا |
| وام | الصقر | مقلاۃ | نزور |

"دیگر پرندوں کے بچے زیادہ ہوتے ہیں لیکن شاہین کی ماں بہت ہی کم بچے دینے والی ہوتی ہے"۔

یہی وجہ ہے کہ شاہین کی عمر زیادہ ہوتی ہے اور چھوٹے اور زیادہ بچے دینے والے پرندے کم عمر ہوتے ہیں ۔ اللہ کے کام حکمت پر مبنی ہوتے ہیں اور اس کے ہاں ہر چیز مقدار کے مطابق ہے ۔ بہرحال حضرت نوحؑ کے ساڑھے نو سو سالہ تبلیغ کے نتیجے میں ایک قلیل مقدار ہی اسلام میں آئی اور اکثریت کو ان کے ظلم کی وجہ سے طوفان بہا کر لے گیا ۔ چونکہ انہوں نے اس قدر طویل ہٹ دھرمی اور سرکشی کی اس لئے اللہ نے ان کو تباہ کیا اور عدد قلیل کو نجات دی جو مومن تھے ۔ یہ اصحاب سفینہ تھے ۔ انہی سے بعد میں انسانی نسل چلی ۔ اور طوفان تمام جہاں والوں کے لیے معجزہ بن گیا اور ایک عرصہ تک ظلم ' شرک اور کفر کا انجام قصہ نوح کے حوالے سے یاد ہوتا رہا ۔

نوح علیہ السلام کے بعد صدیوں کی تاریخ کو لپیٹ کر قرآن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات کو لیتا ہے ۔

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿١٦﴾ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿١٧﴾ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿١٨﴾

" اور ابراہیم کو بھیجا جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا :" اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو ۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو ۔ تم اللہ کو چھوڑ کر جنہیں پوج رہے ہو وہ تو محض بت ہیں اور تم ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو ۔ درحقیقت اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ تمہیں کوئی رزق بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے ۔ اللہ سے رزق مانگو ' اور اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو ' اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو ۔ اور اگر تم جھٹلاتے ہو تو تم سے پہلے بہت سی قومیں جھٹلا چکی ہیں ' اور رسولؐ پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے " ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو نہایت واضح اور سادہ دعوت دی جس میں کوئی پیچیدگی اور اجمال نہ تھا ۔ اس دعوت کو انہوں نے نہایت مرتب انداز میں پیش کیا ۔ جو لوگ دعوت اسلامی کا کام کرتے ہیں ۔ ان کو چاہئے کہ وہ دعوت کی اس ترتیب اور انداز پر غور کریں ۔

پہلے تو انہوں نے اپنی دعوت کی حقیقت ان کے سامنے رکھی ۔

اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ( ۲۹ : ۱۶ ) " اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو " ۔ اور اس کے بعد انہوں نے ان کے دلوں میں اس دعوت کے لیے دلچسپی پیدا کی کہ اس میں تمہارے لیے بہت خیر ہے ' بشرطیکہ وہ اچھائی اور برائی کو سمجھیں ۔ خیر اور مقامات خیر کو جانیں ۔

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۹ : ۱۶) "یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو"۔

اس شرطیہ تعقیب میں ان کو اس بات پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ جہالت کو ترک کر کے اور اپنی ذات کے حوالے سے جہالت کی نفی کر کے اپنے لیے بھلائی کی راہ اختیار کریں۔ یہ ایک حقیقت بھی ہے محض ایک خطابت اور جوش خطابت کی ہٹ دھرمی نہیں ہے اور نہ محض لفاظی ہے۔

تیسرے مرحلے میں انہیں بتایا جاتا ہے کہ وہ جو عقائد و نظریات رکھتے ہیں وہ متعدد پہلوؤں سے غلط ہیں۔ وہ بتوں کی پوجا کرتے ہیں اور یہ بت پتھر یا لکڑی سے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ بندگی اور پوجا نہایت غلط اور کھوٹا عمل ہے۔ جبکہ یہ انہیں اللہ وحدہ کی بندگی سے بھی روک رہا ہے۔ پھر وہ جو پوجا کرتے ہیں اس پر کوئی معقول برہان و دلیل بھی نہیں ہے بلکہ کچھ جھوٹی باتیں ہیں جو انہوں نے از خود گھڑ رکھی ہیں۔ ان کا نہ کوئی سابقہ اور نہ کوئی لاحقہ ہے بلکہ جھوٹی خود ساختہ باتیں ہیں۔ اور کسی مسلمہ اصول و قاعدے پر مبنی نہیں ہیں۔ پھر یہ بت ان کو کوئی نفع یا نقصان بھی نہیں پہنچا سکتے۔ نہ ان کو کچھ دے سکتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا (۲۹ : ۱۷) "درحقیقت اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ تمہیں کوئی رزق بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے"۔ اور چوتھے مرحلے میں قرآن پھر ان کو متوجہ کرتا ہے کہ اللہ سے رزق طلب کرو کہ وہ وحدہ رزاق ہے۔ یہ بات ان کے لیے بہت اہم ہے اور ان کی حاجات اور ضروریات اللہ کے دربار ہی سے پوری ہو سکتی ہیں۔

فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ (۲۹ : ۱۷) "اللہ سے رزق مانگو"۔

رزق دراصل مشغلہ نفوس ہے' خصوصاً نفوس مومنہ کا۔ اور رزق کو صرف اللہ کے ہاں طلب کرنا ایک حقیقت بھی ہے۔ یہ محض نفسیاتی ہیجان انگیزی نہیں ہے' نہ نفسیاتی میلان ہے جسے ابھارا جا رہا ہو' بلکہ ایک حقیقت ہے۔

آخر میں ان کو یہ دعوت دی جاتی ہے کہ انعامات اور ارزاق کے حقیقی مسبب اور حقیقی منعم کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔

وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ (۲۹ : ۱۷) "اور اس کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو"۔

آخر میں ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس سے بھاگ نہیں سکتے' نہ اس اللہ سے تم کہیں پناہ پا سکتے ہو۔ لہٰذا مناسب یہی ہے اور اسی میں تمہاری بھلائی ہے کہ تم اس کی طرف لوٹ آؤ اور ایمان لا کر اس کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو'

اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۹ : ۱۷) "اسی کی طرف تم پلٹ کر جانے والے ہو"۔

اور اگر اس دعوت کے بعد وہ تمہاری تکذیب کریں تو اس تکذیب کی کیا حیثیت ہے! اس سے اللہ کی بادشاہت میں کوئی نقص یا کمی واقع نہیں ہوتی۔ نہ رسول اللہؐ کے مقام و مرتبے میں کچھ کمی واقع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کئی لوگوں نے تکذیب کی ہے اور رسول اللہؐ کی ڈیوٹی تو صرف یہ ہے کہ آپؐ بس تبلیغ کر دیں۔

وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ

(١٨:٢٩) ”اگر تم جھٹلاتے ہو تو تم سے پہلے بہت سی قومیں جھٹلا چکی ہیں' اور رسول پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے“۔

یوں قرآن کریم قدم بقدم ان کی راہنمائی کرتا ہے۔ اور ان کے دلوں پر ہر طرف سے اثر انداز ہوتا ہے اور ان کے دل کے تاروں کو ہر طرف سے چھیڑتا ہے۔ یہ تدریجی اقدامات دعوت پیش کرنے کا ایک بہترین نمونہ ہیں اور دعوت اسلامی کے کارکنوں کو اس انداز پر اچھی طرح غور کرنا چاہئے۔ اور اس انداز سے انسانی نفوس پر اثر انداز ہونا چاہئے۔ قبل اس کے کہ اس کہانی کو اختتام تک پہنچایا جائے۔ ایک وقفہ کیا جاتا ہے اور یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ اس میں ہر اس شخص کو مخاطب کیا جاتا ہے جو دعوت ایمان کا منکر ہے۔ جو اللہ کی طرف رجوع سے انکار کرتا ہے اور بعث بعد الموت کا منکر ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۹﴾
قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ
الْاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ
يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ٢
وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ ع ٨
اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖۤ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾ ١٤

”کیا ان لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے کہ کس طرح اللہ خلق کی ابتدا کرتا ہے' پھر اس کا اعادہ کرتا ہے؟ یقیناً یہ (اعادہ تو) اللہ کے لیے آسان تر ہے۔ ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے' پھر اللہ بار دیگر بھی زندگی بخشے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جسے چاہے سزا دے اور جس پر چاہے رحم فرمائے اسی کی طرف تم پھیرے جانے والے ہو۔ تم نہ زمین میں عاجز کرنے والے ہو' نہ آسمان میں' اور اللہ سے بچانے والا کوئی سرپرست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا اور اس سے ملاقات کا انکار کیا ہے وہ میری رحمت سے مایوس ہو چکے ہیں اور ان کے لیے دردناک سزا ہے“۔

یہ ہر اس شخص کو خطاب ہے جو اللہ کا منکر ہے اور اللہ کے سامنے جو لیدی کا انکار کرتا ہے۔ اس خطاب پر اس پوری کائنات کو بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ اس استدلال کا دائرہ زمین و آسمانوں تک وسیع ہے۔ یہ قرآن کریم کا معروف طرز استدلال ہے کہ وہ اس پوری کائنات کو دلائل و نشانات الٰہیہ کی نمائش گاہ بنا دیتا ہے اور انسانی قلب و نظر کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کھلی کتاب میں دلائل و آیات الٰہیہ تلاش کریں۔ اللہ کے وجود' اس کی وحدانیت اور اس کے

وعدے اور وعید کی سچائی تلاش کریں ۔ اس کائنات کے یہ مشاہد اور مظاہر تو ہر وقت ہماری نظروں کے لیے کھلے ہیں اور حاضر ہیں ۔ پیش پاافتادہ ہیں لیکن انسان چونکہ انہیں ہر وقت دیکھتا رہتا ہے' اس وجہ سے ان کا عادی ہو جاتا ہے اور ان کے اعجاز کا پہلو نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور یہ معجزات چونکہ بار بار دہرائے جاتے ہیں اس لیے انسانی قلب و نظر پر ان کا زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ قرآن کریم کا یہ کمال ہے کہ وہ ان پیش پاافتادہ مناظر اور دلائل اعجاز کو از سرنو زندہ کر کے اور حسین بنا کر پیش کرتا ہے اور یہ اس قدر خوبصورت 'حسین اور پرتاثیر بن جاتے ہیں کہ انسان یہ سمجھتا ہے کہ گویا یہ مشاہد و مناظر اس کے سامنے پہلی بار پیش ہوئے ہیں ۔ یہ مناظرہ زندہ شکل میں سامنے آتے ہیں اور انسانی قلب و نظر پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انسان ان کے آثار و نتائج کو لغذ کرتا ہے اور یہی مناظر انسانی وجدان کے لیے دلائل اور براہین بن جاتے ہیں اور ان سے انسانی شعور بے حد متاثر ہوتا ہے ۔ یہ طرز استدلال خشک منطقی استدلال کی طرح نہیں ہوتا جس میں محض ظاہری جدل و جدال ہوتا ہے اور ایک مردہ انداز گفتگو ہوتا ہے ۔ یہ فلسفیانہ اور منطقی انداز استدلال اسلامی منطق اور شعور کے لیے ہمیشہ نا آشنا رہا ہے ۔ اس لیے اسلامی شعور اس سے کبھی گہرے طور پر متاثر نہیں ہوا۔ اسلامی انداز استدلال یہ ہے :

اَوَ لَمْ یَرَوْا کَیْفَ یُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ

( ۲۹ : ۱۹ ) "کیا ان لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے کہ کس طرح اللہ خلق کی ابتداء کرتا ہے' پھر اس کا اعادہ کرتا ہے' یقیناً یہ تو اللہ کے لیے آسان تر ہے"۔ بے شک یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ اللہ کس طرح تخلیق کرتا ہے' ایک چھوٹے سے پودے میں بھی یہ تخلیق نظر آتی ہے' ایک انڈے اور جنین میں بھی نظر آتی ہے ۔ اور ہر اس چیز میں نظر آتی ہے جو نہ تھی اور پھر موجود ہو گئی اور ان میں سے ہر چیز ایسی ہے کہ انسان انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر بھی کوشش کریں تو اس جیسی چیز کی تخلیق نہیں کر سکتے اور نہ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ اس کے خالق ہیں ۔ اللہ کی تخلیقات تو بہت ہیں' صرف معجزۂ حیات ہی ایک مسلسل معجزہ ہے ۔ یہ حیات کس طرح وجود میں آئی؟ یہ بھی ایک معجزہ ہے' کسی کی جانب سے ایجاد حیات کا دعویٰ کرنا تو ایک بڑی بات ہے ۔ حیات کے بارے میں تو انسان صرف یہی کہہ سکتا ہے کہ یہ اللہ کی پیدا کردہ ہے ۔ اللہ ہر لمحہ میں اسے دہراتا ہے اور لوگ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہیں اور اس کا انکار بھی نہیں کر سکتے ۔

لوگ دیکھتے ہیں کہ اللہ لوگوں کو پیدا فرما رہا ہے تو ان اشیاء کا دوبارہ پیدا کرنا اللہ کے لیے نہایت ہی آسان ہے ۔

اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ ( ۲۹ : ۱۹ ) "اور یہ (اعادہ) اللہ کے لیے آسان تر ہے"۔ اللہ کی مخلوقات میں سے تو کوئی چیز اللہ کے لیے مشکل نہیں ہے ۔ لیکن اللہ تعالیٰ انسانی معیار کے مطابق ان سے بات کرتا ہے ۔ کیونکہ انسانوں کی مصنوعات میں پہلی صنعت کے مقابلے میں اس کا اعادہ آسان ہوتا ہے ورنہ اللہ کے لیے آغاز و اعادہ یکساں ہیں ۔ اللہ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہے تو ارادہ متوجہ کر کے کن کہتا ہے اور وہ ہو جاتی ہے ۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ ذرا کھلی آنکھوں کے ساتھ زمین میں پھرو' اور اللہ کی آیات و نشانات کو دیکھو ۔ زندہ اور مردہ چیزوں میں عجائبات تخلیق الٰہی پر غور کرو' تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کی تخلیق بھی کسی مشقت کے بغیر خود کار طریقے سے ہو رہی ہے ۔ اور اعادہ بھی اسی طرح ہو گا ۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۹ : ۲۰) "ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتداء کی ہے 'پھر اللہ بار دیگر بھی زندگی بخشے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

زمین میں سیرو سیاحت سے انسان کی بصیرت اور بصارت دونوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ انسان ایسے مناظر دیکھتا ہے جو کبھی آنکھ نے نہیں دیکھے ہوتے اور قلب نے کبھی ان پر غور نہیں کیا ہوتا' اس آیت میں اللہ نے ایک گہری حقیقت کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ انسان کسی خطے میں بستا ہے اور اس کے مناظر اور عجائبات اس کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں لیکن جب وہ سیاحت کرتا ہے تو اس کے احساسات اور قوائے مدرکہ ہر نئے منظر کو غور سے دیکھتے ہیں۔ جدید دنیا اور علاقے میں اسے نئے مناظر و مشاہد متاثر کرتے ہیں۔ اگرچہ اس جیسے مناظر و مشاہد یا ان سے اچھے مناظر خود اس کے علاقے میں موجود ہوتے ہیں لیکن وہ کبھی ان کی طرف دیکھتا بھی نہیں ہے۔ جب وہ اپنے علاقے کو واپس آتا ہے تو پھر وہ خود اپنے مسکن کو بھی ایک جدید احساس اور جدید غور و فکر کے ساتھ دیکھتا ہے۔ اس سے قبل وہ جن چیزوں کو کوئی اہمیت نہ دیتا تھا' اب وہ چند یوم غائب رہنے کے سبب ان کو نئی نظر سے دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ اب یہ مناظر و عجائبات اس سے از سرنو ہمکلام ہوتے ہیں جبکہ اس سے قبل یہ عجائبات اس کے لیے نہ عجیب تھے اور نہ اس کے ساتھ ہمکلام ہوتے تھے۔

پس پاک ہے وہ ذات جس نے یہ قرآن نازل کیا۔ جو دلوں کی ان راہوں کو جانتا ہے جن کے ذریعے دل کی دنیا پر اثر ڈالا جا سکتا ہے' عالم نفس کی راہ و رسم سے بھی وہ واقف ہے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ (۲۹ : ۲۰) "ان سے کہو زمین میں چلو پھرو اور دیکھو اس نے کس طرح خلق کی ابتداء کی"۔

یہاں ماضی کے صیغے کے ذریعہ آغاز تخلیق کو بیان کیا گیا ہے۔

كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ (۲۹ : ۲۰) "اس نے تخلیق کا آغاز کیسے کیا تھا؟" اور اس بات کو تم زمین میں چل پھر کر' سیرو سیاحت کر کے معلوم کرو' اس سے ایک یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تم زمین میں چل پھر کر آغاز تخلیق الٰہی کو معلوم کرو' ان چیزوں پر غور کرو جن سے "حیات" کی ابتدائی حالت کا پتہ چلے کہ اس دنیا پر آغاز حیات کیسے ہوا؟ آج کل آثار قدیمہ کے بعض علماء زمین کو کھود کر ابتدائی تخلیق کی کیفیت معلوم کرتے ہیں کہ حیات کا آغاز کیسے ہوا اور اس نے کس طرح ترقی کی۔ اور وہ کس طرح پھیلی۔ ان تحقیقات کے باوجود ابھی تک یہ علماء "حیات" کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکے کہ یہ حیات ہے کیا؟ یہ کہاں سے آتی ہے؟ اور اس دنیا پر پہلا زندہ انسان یا مخلوق کیسے آیا۔ یہ سب تحقیقات اور یہ سب آثار دراصل دوبارہ تخلیق پر دلائل ہوں گے۔

اور اس خیال کے ساتھ ایک دوسرا خیال! کہ آغاز حیات کے آثار و کیفیات معلوم کرنے کے تو وہ لوگ قابل ہی نہ تھے جن پر قرآن نازل ہوا تھا۔ جس طرح آج کل کے لوگ اس کے قابل ہو گئے ہیں کہ آغاز حیات کے آثار و کیفیات کا مشاہدہ کریں۔ لہٰذا اس آیت کا اگر مفہوم یہی ہے تو وہ لوگ تو اس قابل ہی نہ تھے لہٰذا قرآن کریم اپنے پہلے مخاطبین سے

کوئی اور چیز معلوم کرنے کے لیے کہہ رہا تھا جسے وہ معلوم کر سکتے تھے ۔ اور جس کے معلوم کرنے سے وہ یہ نتیجہ نکال سکتے تھے کہ اس سے وہ نشاۃ ثانیہ کا امکان اخذ کریں ۔ لہٰذا ان سے مطلوب یہ ہو گا کہ وہ ہر جگہ نباتات ' حیوانات اور انسان کے آغاز تخلیق کا مشاہدہ کریں اور زمین میں پھریں اور ان کی یہ سیر اور مشاہدہ ان کی قوت مشاہدہ کو تیز کرنے کا باعث بنے جیسا کہ ہم نے پہلے پیرے میں وضاحت کی کہ وہ آثار قدرت الہیہ کا مشاہدہ کریں اور رات اور دن اللہ کی قدرت جن معجزات و نشانات کو ظاہر کر رہی ہے اس پر غور کریں ۔

ایک احتمال یہ بھی ہے جو قرآن کریم کے طریقہ کار کے مطابق ہے کہ قرآن ہر دور کے لوگوں کو ان کے حالات کے مطابق ' اور علم و ثقافت کے لحاظ سے ان کے مرتبہ و مقام کے مطابق اور ان کے حالات زندگی کے مطابق اور ان کے موجودہ وسائل انکشاف کے مطابق ' متوجہ کرتا ہے ' وہ اپنے ظروف و احوال کے مطابق اس کائنات میں پائے جانے والے دلائل قدرت الہیہ پر غور کریں ۔ اس طرح زندگی کے حالات کی ترقی کے مطابق قرآن کریم کے مفہوم کے فہم و ادراک میں بھی ترقی ہو گی اور دونوں خیالات میں کوئی تعارض بھی نہ ہو گا اور یہ مفہوم قرآن کے طریق کار کے زیادہ قریب ہے ۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ( ۲۹ : ۲۰ ) " یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے " ۔ اللہ اس زندگی کا آغاز بھی کرتا ہے اور اس کا اعادہ بھی کرے گا اور یہ اس کی قدرت قاہرہ کے ذریعہ ہو گا ۔ اور اللہ کی قدرتیں انسان کی محدود سوچ کے دائرے کے اندر محدود نہیں ہیں ۔ نہ اللہ کی قدرتوں کو ان کی سوچ کی محدود امکانیات کے اندر محدود کیا جا سکتا ہے کیونکہ انسان کی سوچ انسان کے محدود تجربات تک محدود ہوتی ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ وہ جسے چاہے عذاب دے دے اور جسے چاہے اپنی رحمت کے دائرے کے اندر لے آئے ۔ سب لوگوں نے آخر کار اس کی طرف لوٹنا ہے اور اللہ کو اس عمل کے کرنے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی نہ کوئی اس کی ممانعت کر سکتا ہے ۔

یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَرْحَمُ مَنْ یَّشَآءُ وَ اِلَیْهِ تُقْلَبُوْنَ ( ۲۹ : ۲۱ ) وَ مَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ

( ۲۹ : ۲۲ ) " جسے چاہے سزا دے اور جس پر چاہے رحم فرمائے اسی کی طرف تم پھیرے جانے والے ہو ۔ تم نہ زمین میں عاجز کرنے والے ہو ' نہ آسمان میں ' اور اللہ سے بچانے والا کوئی سرپرست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے " ۔ رحمت اور عذاب دونوں اللہ کی رحمت کے تابع ہیں ' اس طرح کہ اللہ نے ہدایت اور ضلالت کا راستہ بیان کر دیا ۔ اور انسان کے اندر ایسی استعداد پیدا کر دی کہ وہ ہدایت و ضلالت کے راستے میں سے جو راستہ چاہے اختیار کرے ۔ اور اس نے دونوں راستے انسان کے لیے میسر کر دیئے مطلب یہ انسان کی مرضی ہے کہ وہ کون سا طریقہ اختیار کرتا ہے ۔ البتہ اگر وہ اللہ کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اللہ نے اپنے اوپر لازم کر دیا ہے کہ ایسے شخص کی معاونت کرے اور اگر وہ اللہ کی دلائل سے منہ موڑے اور اللہ کے راستے سے رک جائے تو وہ اللہ سے رابطہ منقطع کر دیتا ہے اور اسی اصول کے نتیجے میں

اللہ کی رحمت اور اللہ کا عذاب لوگوں کو ملتا ہے ۔

وَ اِلَیۡهِ تُقۡلَبُوۡنَ ( ۲۹ : ۲۱ ) "اور اس کی طرف سے تم پھیرے جانے والے ہو"۔ یہ آخری انجام کی سخت تعبیر ہے اور بعد میں آنے والے مضمون کے ساتھ مناسب ہے ۔

وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ( ۲۹ : ۲۲ ) "تم نہ زمین میں عاجز کرنے والے ہو' نہ آسمان میں"۔ تمہارے پاس ایسی کوئی قوت نہیں ہے کہ تمام مخلوق کو اللہ کی طرف پھرنے سے روک سکو ۔ نہ زمین میں نہ آسمانوں میں ۔ جنات اور فرشتے بھی تمہاری قوت نہیں ہیں ۔

وَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ ( ۲۹ : ۲۲ ) "اور اللہ سے بچانے والا کوئی سرپرست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے"۔ اللہ کے سوا کوئی ولی اور مددگار ہے کون؟ اور کہاں ہے؟ کوئی ملائکہ ہے یا کوئی جن ہے؟ یہ تو سب خود اللہ کے بندے ہیں اور اللہ کی مخلوق ہیں ۔ یہ اپنے نفع و نقصان کے مالک نہیں' دوسروں کے لیے کیا کچھ کر سکیں گے ۔

وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ لِقَآئِهٖۤ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوۡا مِنۡ رَّحۡمَتِیۡ وَ اُولٰٓئِکَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ( ۲۹ : ۲۳ ) "جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا اور اس سے ملاقات کا انکار کیا ہے وہ میری رحمت سے مایوس ہو چکے ہیں اور ان کے لیے دردناک سزا ہے"۔ یہ اس لیے کہ انسان اللہ کی رحمت سے تب مایوس ہوتا ہے جب اس کا دل کافر ہو' اس حالات میں پھر اس کے اور رب کے درمیان رابطہ کٹ جاتا ہے ۔ جو بھی کفر کی راہ اختیار کرتا ہے اس کے اور رب تعالیٰ کے درمیان رابطہ کٹ چکا ہوتا ہے ۔ اس کی شخصیت میں تروتازگی نہیں ہوتی ۔ اس لیے اللہ کی رحمت میں داخل ہونے کے لیے وہ کوئی راہ نہیں پاتا ۔ اور پھر انجام بھی متعین ہوتا ہے ۔

اُولٰٓئِکَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ( ۲۹ : ۲۳ ) "ایسے لوگوں کے لیے دردناک سزا ہوتی ہے"۔

اس لمحہ فکریہ کے بعد اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کی طرف سے جواب آتا ہے ۔ یہ ضمنی خطاب ہر اس شخص کے غوروفکر کے لیے تھا جو دعوت ایمان کا انکار کرتا ہے' یہ جواب نہایت ہی مایوس کن اور عجیب ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر اور سرکشی کے حاملین کس طرح برخود غلط ہوتے ہیں اس لیے کہ ان کے پاس اقتدار کی قوت ہوتی ہے ۔

فَمَا کَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوا اقۡتُلُوۡهُ اَوۡ حَرِّقُوۡهُ فَاَنۡجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۴﴾

"پھر ابراہیم کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا "قتل کر دو اسے یا جلا ڈالو اس کو"۔ آخر کار اللہ

نے اسے آگ سے بچالیا تھا' یقیناً اس میں نشانیاں ہیں' ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے ہیں"۔

"اسے قتل کر دو یا جلا ڈالو" یہ اس سادہ اور قابل فہم دعوت کا جواب ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیش فرمائی۔ جو انہوں نے ان کی عقلوں کے سامنے نہایت ہی قابل فہم انداز میں پیش کی ہے جس طرح کوئی پیش کرتا ہے۔

جب کفر اور سرکشی کھل کر سامنے آگئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوزیشن یہ تھی کہ آپ اس ظلم اور سرکشی کا دفعیہ نہ کر سکتے تھے' وہ ایک فرد تھے اور ان کا کوئی والی اور مددگار نہ تھا۔ ایک طرف عظیم قوت ہے' دوسری جانب وہ اکیلے کھڑے ہیں۔ اس لیے ایسے حالات میں دست قدرت بھی کھل کر ان کا ساتھ دیتا ہے۔ ایک خارق عادت معجزہ نمودار ہوتا ہے۔ ایک ایسا معجزہ جو انسانوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

فَاَنْجٰهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ (۲۹ : ۲۴) "آخر کار اللہ نے اسے آگ سے بچالیا"۔ جس انداز میں خارق عادت کے طور پر اللہ نے ان کو بچایا تھا۔ یہ ان لوگوں کے لیے ایک معجزہ تھا جو ایمان لانے والے تھے مگر اس کے باوجود اس قوم نے ایمان قبول نہ کیا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ طے کر دیں کہ انہوں نے مان کر نہیں دینا ہے تو معجزات بھی ان کے لیے مفید نہیں رہتے۔ ہدایت اسے نصیب ہوتی ہے جو ایمان لانے کے لیے تیار ہو' اسی لیے کہا جاتا ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۲۹ : ۲۴) "یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے ہیں"۔ پہلی نشانی تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم آگ سے نجات پا گئے۔ دوسری نشانی یہ ہے کہ کفر اور سرکشی اور حکومتی قوت ایک فرد واحد کو اذیت نہ دے سکی۔ تیسرا معجزہ یہ ہے کہ اگر اللہ کسی کو ہدایت نہ دینا چاہے تو معجزات بھی مفید نہیں رہتے۔ اور یہ نشانیاں ان لوگوں کے لیے ہیں جو دعوت اسلامی کی تاریخ پر غور و فکر کرتے ہیں اور یہ معلوم کرتے ہیں کہ دلوں کو پھیرنے والا کون ہے اور ہدایت و ضلالت کے اسباب کیا ہوتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نجات کے بعد بھی یہ کہانی آگے بڑھتی ہے۔ حضرت ابراہیم اب اس قوم کی ہدایت سے مایوس ہو گئے ہیں جو اس قدر واضح اور بین معجزے کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتی تو قبل اس کے کہ حضرت ان کو الوداع کہیں ان کو آخری حجت کے طور پر ایک حقیقت کے سامنے کھڑا کرتے ہیں:

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَیْنِكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ ثُمَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّیَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۫ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۲۵﴾

"اور اس نے کہا "تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنا لیا ہے مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے اور آگ تمہارا ٹھکانا ہوگی اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا"۔

تم نے بتوں کی بندگی اس لیے اختیار نہیں کی کہ تم عقیدتاً ان کو الٰہ سمجھتے ہو اور تم ان کی بندگی پر مطمئن ہو بلکہ تم اس برائی پر ایک دوسرے کا لحاظ ملاحظہ کرتے ہوئے متفق ہو گئے ہو۔ محض ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے' یہ بندگی کرتے ہو۔ تم میں سے ایک دوست یہ نہیں چاہتا کہ دوسروں کے الٰہوں کو چھوڑ دے۔ اگرچہ حق واضح ہو گیا ہو۔ اگر کوئی نئی سچائی کو قبول کرلے تو اس صورت میں دوستیاں ختم ہونے کا خطرہ ہے۔ یہ دوستیاں تم سچائی کی حق تلفی کر کے قائم رکھتے ہو۔ تم سچائی کو نظرانداز کرتے ہو اور اس کے مقابلے میں دوستیوں کو زیادہ قائم رکھتے ہو۔ تم سچائی کو نظرانداز کرتے ہو اور اس کے مقابلے میں دوستیوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہو' حالانکہ دعوت اسلامی ایک سنجیدہ امر ہے۔ یہ کوئی نرمی' کوئی ڈھیل اور کوئی دوستی قبول نہیں کرتی۔

اس کے بعد ان کے اخروی انجام کے صفحات کھولے جاتے ہیں۔ جن دوستوں کا لحاظ کرتے ہوئے وہ حق کو نظرانداز کر رہے ہیں اور بتوں کی بندگی پر قائم ہیں۔ قیامت کے دن یہ لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔ ایک دوسرے پر لعن طعن کریں گے اور ایک دوسرے کو ملامت کریں گے اور یہ دوستیاں ٹوٹ جائیں گی۔

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (۲۹: ۲۵) "مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے"۔ لیکن یہ لعن و طعن کوئی فائدہ نہ دے گا۔ اس سے تمہارے عذاب میں کوئی کمی نہ آئے گی۔

وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (۲۹: ۲۵) "آگ تمہارا ٹھکانا ہوگی اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا"۔ اس آگ میں یہ لوگ رہیں گے جس کے ساتھ وہ حضرت ابراہیم کو جلانا چاہتے تھے لیکن اللہ نے ان کی مدد کی اور ان کو نجات دے دی۔ رہے وہ تو ان کے لیے نہ نصرت ہے اور نہ نجات ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اب اپنی قوم کو دعوت دینا چھوڑ دیا۔ یہ معجزہ جو ناقابل شک تھا' وہ بھی ان کے سامنے آ گیا۔ اس دعوت اور اس ناقابل تردید معجزے کے نتیجے میں صرف ایک شخص مسلمان ہوئے' حضرت لوط' ان کی بیوی نے بھی اسلام قبول نہ کیا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت لوط آپ کے بھتیجے تھے۔ یہی ایک مسلمان حضرت ابراہیم کے ساتھ کلدانیوں کے شہر اُر سے ہجرت کر کے اردن سے آگے کے علاقے میں جا کر آباد ہوئے۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ۬ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ
الْمُنْكَرَ ۭ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ ۳
مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۳۰﴾ ع ۸

"اس وقت لوط نے اس کو مانا اور ابراہیم نے کہا' میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں' وہ زبردست اور حکیم ہے"۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول قابل غور ہے' وہ کہتے ہیں ۔ 15

اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ (۲۹ : ۲۶) "میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں"۔ انہوں نے کیوں ہجرت کی۔ انہوں نے نجات کے لیے ہجرت نہیں کی۔ نہ زمین کے حصول کے لیے' نہ کسی تجارت اور کمائی کے لیے ہجرت کی تھی۔ انہوں نے رب کی طرف ہجرت کی' اللہ کے قریب ہونے اور اس کی پناہ میں آنے کے لیے ہجرت کی۔ اپنا دل اور اپنا نظریہ لے کر ہجرت کی۔ ان کے جسم اور خون سے پہلے ان کے دل و دماغ نے ہجرت کی۔ انہوں نے اللہ کی طرف ہجرت کی تاکہ خالص اللہ کی عبادت اور بندگی کریں' اپنا جسم اور اپنی سوچ اس کے لیے خاص کر دیں اور کفر اور ضلالت کے علاقے کو چھوڑ دیں اس لیے کہ اس علاقے کے لوگوں کی ہدایت کا اب کوئی امکان نہ رہا تھا۔

یہ علاقے چھوڑنے کا اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس دنیا میں بھی انعام دیا۔ اللہ نے ان کو ایسی صالح اولاد دی کہ رہتی دنیا تک ان کی وراثت اور نظریات کی وارث بنی۔ اس کے بعد نبوت ان کی اولاد ہی میں رہی۔ دنیا اور آخرت میں اس سے بڑا انعام نہیں ہے۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ وَ اٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۲۹ : ۲۷) "اور ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب (جیسی اولاد) عنایت فرمائی اور اس کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھ دی' اور اسے دنیا میں اس کا اجر عطا کیا اور آخرت میں وہ یقیناً صالحین میں سے ہوگا"۔

یہ اللہ کا ایسا انعام ہے جس میں سے فیوض و برکات کے سوتے پھوٹ رہے ہیں' جس میں اللہ کی رضامندی عیاں ہے۔ اس ذات بابرکات کی شخصیت میں یہ فیض عیاں ہے جس کے جلا ڈالنے پر تمام باغی اور سرکش قوتیں جمع ہو گئی تھیں لیکن اللہ نے عظیم معجزانہ انداز میں ان کے ماحول کو ٹھنڈا اور سلامتی سے بھرا ہوا بنا دیا۔ یہ تھی اللہ کی مہربانی' اس کا کرم اور اہل توحید کے لیے جزائے مناسب۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مختصر قصے کے بعد اب حضرت لوط کا قصہ آتا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ رب کی طرف مہاجر ہوئے۔ دونوں وادی اردن میں اترے۔ حضرت لوط بحر مردار کے کنارے کسی قوم کو دعوت دینے لگے۔ اس کے بعد اس بحیرے کا نام بحیرۂ لوط پڑ گیا۔ آپ شہر سدوم میں مقیم ہوئے۔ حضرت لوط نے ان لوگوں میں رشتہ داری بھی کی اور معاشی سرگرمی بھی ان لوگوں میں اختیار کی۔

اس قوم میں ایک عجیب اخلاقی بیماری پھیل گئی ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ قبیح بیماری اس سے قبل کسی قوم میں نہ پھیلی تھی ۔ یہ کہ ان لوگوں نے عورتوں کے مقابلے میں اور ان کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنا شروع کر دیئے ۔ حالانکہ اللہ نے اس مقصد کے لیے عورتوں کو پیدا کیا تھا تاکہ ایک مرد اور عورت سے ایک خاندان وجود میں آئے ۔ اور اس طرح فطری طور پر انسانی زندگی کا تسلسل قائم رہے ۔ جس طرح تمام دوسرے حیوانات میں یہ نظام قائم ہے کہ تمام حیوانات اور نباتات کو اللہ نے جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے ۔ مرد اور عورتیں ' مذکر اور مونث ۔ غرض یہ بماری قوم لوط سے قبل کسی اور قوم میں پیدا نہ ہوئی تھی ۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (۲۹:۲۸) اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲۹:۲۹) قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۹:۳۰)

"اور ہم نے لوط کو بھیجا جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا : "تم تو وہ فحش کام کرتے ہو' جو تم سے پہلے دنیا والوں میں سے کسی نے نہیں کیا ہے ۔ کیا تمہارا حال یہ ہے کہ مردوں کے پاس جاتے ہو' اور رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں برے کام کرتے ہو؟" پھر کوئی جواب اس کی قوم کے پاس اس کے سوا نہ تھا کہ انہوں نے کہا "لے آ' اللہ کا عذاب اگر تو سچا ہے" ۔ لوط نے کہا "اے میرے رب' ان مفسدوں کے مقابلے میں میری مدد فرما" ۔

حضرت لوط کی اس تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس برائی میں کانوں تک ڈوب گئے تھے ۔ یہ لوگ ایک ایسی برائی میں مبتلا ہو گئے تھے جس کا ارتکاب ان سے قبل کسی انسان نے نہیں کیا تھا ۔ یہ مردوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتے تھے ۔ یہ ایک انوکھا اور گندہ فعل تھا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی فطرت ہی بدل گئی تھی ۔ جب بھی کوئی قوم اعتدال کو چھوڑتی ہے اس کی فطرت بدل جاتی ہے کیونکہ پاکیزہ جنسی تعلق ایک عورت ہی کے ساتھ قائم ہوتا ہے ۔ لہٰذا اسے نہایت ہی گھناؤنا جرم قرار دیا گیا ۔ عورت کے ساتھ جنسی تعلق بھی بعض اوقات حدود و قیود سے نکل جاتا ہے لیکن وہ ہوتا بہرحال ایک فطری عمل ہے ۔ رہی ہم جنس پرستی تو یہ حیوانات سے بھی گری ہوئی حرکت ہے ۔ اس میں انسان کی فطری عضویاتی ترکیب کے لحاظ سے بھی فساد ہے ۔ اور نفسیاتی لحاظ سے بھی فساد ہے ۔ زوجین کے درمیان جو تعلق ہوتا ہے اس میں جو لذت ہوتی ہے وہ امتداد حیات کے عظیم مقصد کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے ۔ اور اس کے نتیجے میں انسانی حیات کا تسلسل قائم ہوتا ہے اور فریقین جسمانی اور روحانی اعتبار سے اس تعلق سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ان کے تعلق اور ملاپ کے اندر جسمانی اور عضویاتی ہم آہنگی ہوتی ہے ۔ رہا یہ تعلق جو قوم لوط قائم کرتی تھی ۔ یہ غیر فطری' غیر فرحت بخش اور بے مقصد تھا ۔ اگر اس تعلق میں کسی کو مزہ آتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسے لوگوں کی فطرت بگڑ گئی ہے ۔ اور مسخ ہو گئی ہے اور وہ حقیقت کے مطابق نہیں ہے ۔

یہ لوگ اس برائی کے ساتھ ڈاکے بھی ڈالتے تھے 'لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان سے مالی مفادات وصول کرتے تھے ـ پھر وہ اس فعل کا ارتکاب بھی مردوں کو مجبور کر کے کرتے تھے ـ یہ پھر اس فعل بد کی ایک گھناؤنی شکل تھی کہ لوٹ مار کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ساتھ اس بد فعلی کا ارتکاب کرتے تھے ـ

پھر یہ اس منکر فعل کا ارتکاب اپنی مجلسوں میں کرتے تھے ـ کھلے طور پر اور اجتماعی شکل میں ـ ایک دوسرے سے ' کتوں کی طرح ' شرم بھی محسوس نہ کرتے تھے ـ فحاشی کا یہ بدترین درجہ ہے ـ فساد فطرت کی یہ انتہا ہے اور یہ رذائل پر اس قدر فخر ہے کہ اس کے بعد کسی اصلاح کی کوئی امید نہیں رہتی ـ

یہاں اس قصے کو اختصار کے ساتھ لایا گیا ہے ـ ظاہر ہے کہ پہلے پہل حضرت لوط نے ان کو نہایت ہی اچھے انداز میں اس سے منع کیا ہو گا ـ انہوں نے اصرار کیا ہو گا ـ حضرت لوط نے ان کو عذاب الہی سے ڈرایا ہو گا اور یہ بتایا ہو گا کہ یہ بہت ہی قبیح فعل ہے اور اس کا انجام بھی خوفناک اور عبرتناک ہو گا ـ

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲۹ : ۲۹) "پھر کوئی جواب اس کی قوم کے پاس اس کے سوا نہ تھا کہ لے آؤ اللہ کا عذاب 'اگر تم سچے ہو" ـ

یہ ہے خود سری اور سرکشی ایک ڈرانے والے نبی کے مقابلے میں 'ایک چیلنج کے انداز میں تکذیب اور یہ ایک ایسا بگاڑ ہے جس سے کسی خیر کی توقع نہیں رہتی اور نہ اصلاح کی امید رہتی ہے ـ رسول خدا نے ان پر حجت تمام کر دی اور اس کے سوا کوئی راہ نہ رہی کہ وہ اللہ سے نصرت طلب کریں جو آخری سہارا ہے ـ

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۹ : ۳۰) "لوط نے کہا اے میرے رب' ان مفسدوں کے مقابلے میں میری مدد فرما" ـ

اب یہاں پردہ گرتا ہے ـ منظر پر صرف لوط علیہ السلام دعا کرتے نظر آتے ہیں ـ اب ہمارے سامنے اس دعا کی قبولیت کا منظر آتا ہے ـ جن کا ملائکہ کو حکم دیا گیا ہے کہ سدوم کو اوپر نیچے کر دو 'انہوں نے اس عمل سے پہلے حضرت ابراہیم کو خوشخبری بھی دی ہے ـ ایک ایسی بیوی سے صالح بیٹے کی خوشخبری جو بانجھ تھی ـ

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۚ ۝ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ۫ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۤ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝

"اور جب ہمارے فرستادے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر پہنچے تو انہوں نے اس سے کہا "ہم اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں' اس کے لوگ سخت ظالم ہو چکے ہیں"۔ ابراہیم نے کہا "وہاں تو لوط موجود ہے"۔ انہوں نے کہا' ہم خوب جانتے ہیں کہ وہاں کون کون ہے۔ ہم اسے' اور اس کی بیوی کے سوا' اس کے باقی سب گھر والوں کو بچالیں گے"۔ اس کی بیوی پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی"۔

یہ منظر' ابراہیم علیہ السلام اور فرشتوں کا منظر۔ یہ منظر یہاں چونکہ مقصود بالذات نہ تھا' اس لیے اسے نہایت اختصار کے ساتھ لیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں دوسری جگہ یہ بات آگئی ہے کہ انہیں حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کی بشارت دی گئی۔ اور حضرت اسحاق کی ولادت تو خوشخبری کا موضوع تھا۔ اس لیے ان باتوں کو ہاں مفصل نہیں دیا گیا کیونکہ مقصود اہتمام قصہ لوط تھا۔ یہاں صرف یہ کہہ دیا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرشتے اس لیے ہو کر آئے کہ انہیں خوشخبری دے دیں اور یہ بتادیں کہ وہ کس مہم پر آئے ہیں۔

اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ (۲۹ : ۳۱) "ہم اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں' اس کے لوگ سخت ظالم ہیں"۔

اب حضرت ابراہیم کا جذبہ رحم اور محبت امنڈ آیا۔ انہوں نے فوراً کہا کہ وہاں تو ان کے بھتیجے حضرت لوط بھی رہتے ہیں اور وہ تو ظالم نہیں' صالح ہیں۔ اللہ کے فرشتوں اور فرستادوں نے جواب دیا کہ ان کو اس مہم کے بارے میں پوری معلومات دی گئی ہیں اور وہ سب باتوں کو جانتے ہیں۔

قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ

(۲۹ : ۳۲) "انہوں نے کہا' ہم خوب جانتے ہیں کہ وہاں کون کون ہیں۔ ہم اسے' اور اس کی بیوی کے سوا' اس کے باقی سب گھر والوں کو بچالیں گے"۔ اس کی بیوی پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے"۔

یہ بیوی قوم کے ساتھ تھی۔ یہ بھی ان کے جرائم اور بداعمالیوں کی تصدیق کرتی تھی اور یہ عجیب بات تھی کہ عورت کے حقوق پر ایک عورت ڈاکہ ڈالے۔

اب یہ قصہ ایک تیسرے منظر میں داخل ہوتا ہے۔ یہ منظر بھی عجیب ہے۔ یہ فرشتے نہایت خوبصورت نوجوانوں کی شکل میں حضرت لوط کے پاس آتے ہیں۔ حضرت لوط بھی جانتے ہیں کہ یہ خطرناک مہمان ہیں' خوبصورت نوجوان اور قوم جس گندی حالت میں۔ لازم ہے کہ یہ لوگ ان مہمانوں کے ساتھ بدسلوکی کریں گے۔ اور وہ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اپنے مہمانوں کا دفاع کر سکیں اس لیے اس پریشانی سے ان کا دل بھر آیا' اور ان پر پریشانی اور وحشت طاری ہوگئی۔

وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا

"پھر جب ہمارے فرستادے لوط کے پاس پہنچے تو ان کی آمد پر وہ سخت پریشان اور تنگ دل ہوا"۔ یہاں ان اوباشوں

کی طرف سے مہمانوں پر ہجوم کے واقعہ کو بھی مختصراً بیان کیا گیا ہے ۔ اس موقعہ پر حضرت لوط کے ساتھ ان کا جو مکالمہ ہوا' اسے بھی کاٹ دیا گیا ہے' جبکہ وہ اس وقت اس بیماری کے جوش میں تھے ۔ یہاں بات کو انجام تک پہنچا دیا جاتا ہے اور آخری انجام کا ذکر ہوتا ہے اس لیے کہ یہ خدائی فرستادے خود بات کو کھول دیتے ہیں اور حضرت لوط کو اپنا تعارف کرا دیتے ہیں کیونکہ وہ شدید اعصابی دباؤ میں تھے اور سخت دل تنگ تھے ۔

وَ قَالُوْا لَا تَخَفْ وَ لَا تَحْزَنْ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَ اَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰۤى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۳۴﴾

"انہوں نے کہا' نہ ڈرو اور نہ رنج کرو۔ہم تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو بچالیں گے 'سوائے تمہاری بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے ۔ ہم اس بستی کے لوگوں پر آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں اس فسق کی بدولت جو یہ کرتے رہے ہیں" ۔

اس گاؤں کے لوگوں پر جو عذاب الٰہی ہو' اس کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے کہ حضرت لوط' ان کے اہل و عیال اور اہل ایمان کے سوا تمام لوگوں کو ہلاک کر دیا گیا ۔ ان پر خاک آلود پتھروں کی بارش کر دی گئی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اللہ کے فرشتوں نے آتش فشانی کا عمل برپا کر دیا جس کے نتیجے میں خاک آلود پتھروں کی بارش ہوا کرتی ہے --- اور اس عذاب کے آثار کو باقی رکھا گیا تاکہ آنے والی اقوام کے اہل عقل و دانش اس سے عبرت لیں اور صدیاں گزرنے کے بعد بھی یہ آثار باقی ہیں ۔

وَ لَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَاۤ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۳۵﴾

"اور ہم نے اس بستی کی ایک کھلی نشانی چھوڑ دی ہے 'ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں" ۔ اور یہ انجام اس قوم کا طبعی انجام تھا ۔ کیونکہ اس کی مثال ایک خبیث درخت اور پودے کی تھی جسے زمین سے زمیندار ہمیشہ اکھاڑ پھینکتا ہے کیونکہ یہ درخت نہ پیداوار دیتا ہے اور نہ زندگی کے لیے مفید ہوتا ہے اس کے ساتھ یہی سلوک ہو سکتا ہے کہ اسے اکھاڑ کر بھوسہ بنا دیا جائے ۔

اب قصہ حضرت شعیب علیہ السلام :

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ ارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۳۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ

الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۳۷﴾

"اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو' اللہ کی بندگی کرو اور روز آخر کے امیدوار رہو اور زمین میں مفسد بن کر زیادتیاں نہ کرتے پھرو"۔ مگر انہوں نے اسے جھٹلا دیا۔ آخر کار ایک سخت زلزلے نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں پڑے کے پڑے رہ گئے"۔

اس میں یہ اشارہ ہے کہ دعوت اسلامی تمام ادوار میں ایک رہی ہے اور دعوت اسلامی کا بنیادی عقیدہ بھی ایک رہا ہے۔

اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ ارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ (۲۹:۳۶) "اللہ کی بندگی کرو اور روز آخرت کے امیدوار رہو"۔ اللہ واحد کی بندگی کرنا اسلامی نظریہ حیات کی بنیاد ہے اور آخرت کی امیدواری کے ذریعہ یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ اس دنیا میں جو حلال و حرام سمیٹے چلے جا رہے تھے اور ناپ اور تول کے پیمانوں میں خیانت کر رہے تھے' اس سے باز آجائیں۔ نیز وہ جو لوگوں کے حقوق مارتے تھے اور راہ زنی کرتے تھے۔ شاید خوف آخرت کی وجہ سے وہ ان جرائم سے باز آجائیں۔ اس کے علاوہ بھی وہ لوگوں پر کئی قسم کی دست درازیاں کرتے تھے اور زمین میں فساد برپا کرتے تھے خوف آخرت سے ان کی اصلاح ہو سکتی تھی۔

غرض آخر کار انہوں نے اپنے رسول کی تکذیب کی اور ان پر خدا کا عذاب نازل ہوا اور اللہ نے مکذبین کے بارے میں اپنی سنت جاریہ کے مطابق ان کو ہلاک کر دیا اور صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ (۲۹:۳۷) "آخر کار ایک سخت زلزلے نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں پڑے کے پڑے رہ گئے"۔ اس سے قبل اس سخت زلزلے کی تفصیلات دے دی گئی ہیں' جس نے ان کی زمین کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور یہ زلزلہ ایک سخت چیخ کے بعد آیا تھا۔ جس نے ان کو بے ہوش کر دیا تھا اور لوگ اسی جگہ پڑے کے پڑے رہ گئے جہاں تھے۔ اور یہ سزا ان کے ان جرائم کی وجہ سے دی گئی جن میں وہ چیخ چلا کر لوگوں پر ڈاکے ڈالتے اور ان کو لوٹتے۔

اس کے بعد قوم عاد و ثمود کی ہلاکت کی طرف اشارہ :

وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ قَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿۳۸﴾

"اور عاد و ثمود کو ہم نے ہلاک کیا' تم وہ مقامات دیکھ چکے ہو جہاں وہ رہتے تھے۔ ان کے اعمال کو شیطان نے ان

کے لیے خوشنما بنا دیا اور انہیں راہ راست سے برگشتہ کر دیا حالانکہ وہ ہوش گوش رکھتے تھے"۔

عاد کے لوگ جزیرۃ العرب کے جنوب میں علاقہ احقاف میں رہتے تھے۔ یہ علاقہ حضر موت کے قریب ہے۔ اور ثمود علاقہ حجر شالی جزیرۃ العرب میں رہتے تھے۔ اور یہ وادی القریٰ کے قریب علاقہ ہے' قوم عاد کو تیز رفتار ہوائی طوفان کے ذریعہ ہلاک کیا گیا جو ناقابل کنٹرول تھا اور قوم ثمود کو ایک ہلاکت خیز چیخ کے ذریعہ جس کے بعد زلزلہ آیا۔ ان کے گھر عربوں کو معلوم تھے اور یہ لوگ اپنے گرمیوں اور سردیوں کے اسفار میں ان علاقوں سے گزرتے تھے اور ان کے آثار کو دیکھتے تھے کہ عزت اور اقتدار کے بعد یہ اقوام کس طرح ملیامیٹ ہوئیں۔

یہاں اس مختصر اشارے میں بتا دیا گیا ہے کہ ان کی گمراہی کا راز کیا تھا۔ یہی راز ہے دوسری تمام اقوام کی ضلالت کا۔

وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ

(۳۸:۹۸) "ان کے اعمال کو شیطان نے ان کے لیے خوشنما بنا دیا اور انہیں راہ راست سے برگشتہ کر دیا اور وہ ہوش وگوش رکھتے تھے"۔

یہ عقلمند تھے۔ ہدایت کے دلائل بھی ان کے سامنے تھے لیکن شیطان نے ان کو خواہشات نفسانیہ کے تابع کر کے ان کے ان اعمال کو ان کے لیے مزین بنا دیا تھا۔ اور ان پر وہ اس راستے سے حملہ آور ہوا جو کھلا تھا۔ یہ کہ وہ سخت مغرور تھے اور اپنے برے اعمال پر فخر کرتے تھے اور ان اعمال کے زریعہ انہوں نے جو قوت اور مال و متاع جمع کر لیا تھا' اس کی وجہ سے وہ اعمال انہیں اچھے لگتے تھے۔

فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ (۳۸:۹۸) "انہیں راہ راست سے برگشتہ کر دیا تھا"۔ اور ایمان کا تو یہ واحد راستہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے اس راہ پر چلنے کے مواقع گنوا دیے۔

وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ (۳۸:۹۸) "اور بڑے دانش مند تھے"۔ صاحب فکر و نظر تھے اور عقل و ادراک کی قوتوں کے مالک تھے۔

اب قارون' فرعون اور ہامان کی طرف اشارہ۔

وَ قَارُوْنَ وَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ ۫ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ﴿۳۹﴾

"اور قارون و فرعون و ہامان کو ہم نے ہلاک کیا اور موسیٰ ان کے پاس بینات لے کر آیا' مگر انہوں نے زمین میں

اپنی بڑائی کا زعم کیا' حالانکہ وہ سبقت لے جانے والے نہ تھے"۔

قارون قوم موسیٰ کا فرد تھا مگر اس نے اپنی دولت مندی کی وجہ سے ان سے بغاوت کی۔ اور اس نے نصیحت کرنے والوں کی یہ نصیحت نہ سنی کہ اعتدال اور تواضع کا راستہ اختیار کرو' لوگوں پر احسان کرو اور سرکشی اور بغاوت نہ کرو۔ اور فرعون ایک جبار اور سرکش حکمران تھا۔ اور قوم کے خلاف گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کرتا تھا۔ اس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور پوری طرح کنٹرول میں لے رکھا تھا۔ وہ بنی اسرائیل کے مردوں کو قتل کرتا تھا اور عورتوں کو زندہ رکھتا تھا۔ اور یہ محض ظلم کی وجہ سے۔ ہامان فرعون کا وزیر تھا اور اس کی ان قاہرانہ اور ظالمانہ ریاستی پالیسیوں کی تنفیذ وہ کرتا تھا۔ فرعون کے تمام جرائم میں یہ اس کے لیے معین و مددگار تھا۔

وَلَقَدْ جَآءَهُم مُّوسَىٰ بِالْبَيِّنَٰتِ فَاسْتَكْبَرُوا۟ فِى الْأَرْضِ (۲۹ : ۳۹) "اور موسیٰ ان کے پاس بینات لے کر آیا مگر انہوں نے زمین میں بڑائی کا زعم کیا"۔ پس ان کی دولت' ان کی قوت' اور ان کا جبر ان کو نہ بچا سکا اور اللہ جس کو پکڑے' اسے تو کوئی بھی بچا نہیں سکتا۔ یہ لوگ اللہ کے عذاب سے نہ بچ سکے اور ان کو اللہ نے خوب پکڑا۔

یہ لوگ جو قوت' مال اور اسباب حیات کے مالک تھے اور زمین پر پوری طرح غالب تھے ان سب کو اللہ نے پکڑا' کیونکہ انہوں نے لوگوں کو فتنے میں ڈال دیا تھا اور ان کو اذیت دیتے تھے۔ اور وہ طویل عرصہ تک ایسا کرتے رہے تھے۔

فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنۢبِهِۦ ۖ فَمِنْهُم مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُم مَّنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُم مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ وَمِنْهُم مَّنْ أَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٤٠﴾

"آخر کار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا۔ پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی' اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آ لیا' اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا' اور کسی کو غرق کر دیا۔ اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے"۔

قوم عاد پر اللہ نے ایسی تیز ہوا بھیجی جو پتھر اڑا کر پھینک رہی تھی۔ اسی طرح جو جہاں تھا' مارا گیا۔ قوم ثمود پر سخت دھماکہ دار چیخ آئی اور سب ڈھیر ہو گئے۔ اور قارون مع اپنی دولت اور کوٹھیوں کے زمین میں دھنس گیا۔ اور فرعون اور ہامان بحر احمر میں غرق ہوئے۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے ظلم میں پکڑے گئے۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۲۹ : ۴۰) "اللہ ان

پر ظلم کرنے والا نہ تھا مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے"۔

پوری انسانی تاریخ کے باغیوں' سرکشوں اور ظالموں کی تباہی اور بربادی کا عبرت آموز جائزہ لینے کے بعد اور آغاز سورت میں آزمائش اور گمراہی کے فتنوں کے ذکر کے بعد اب آخر میں' اسلام اور کفر اور ایمان اور ضلالت کی قوتوں کی کشمکش کو ایک تمثیل سے سمجھایا جاتا ہے کہ حقیقی قوت ایک ہی ہے اور وہ اللہ کی قوت ہے۔ اللہ کے سوا جس قدر قوتیں ہیں وہ نہایت ہی ناتواں اور کچی ہیں۔ ان کی مثال تار عنکبوت کی طرح ہے جو شخص تار عنکبوت کا سہارا لے گا وہ گویا ایک نہایت کچی چیز کا سہارا لیتا ہے۔ اللہ کے سوا تمام قوتوں کی یہی مثال ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۝

"جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے۔ یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جس چیز کو بھی پکارتے ہیں' اللہ اسے خوب جانتا ہے اور وہی زبردست اور حکیم ہے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کی فہمائش کے لیے دیتے ہیں مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں"۔

یہ ایک عجیب اور سچی تصویر ہے' ان تمام قوتوں کی جو اس کائنات میں موجود ہیں۔ اس میں ایک ایسی حقیقت کو نمایاں کیا گیا ہے جس سے لوگ بالعموم غافل رہتے ہیں اور اس غفلت کی وجہ سے پھر ان کے پیمانے اور اقدار بدل جاتی ہیں۔ پھر وہ غلط رابطے قائم کر لیتے ہیں۔ ان کو پتہ نہیں ہوتا کہ وہ غلط سمت میں جا رہے ہیں۔ وہ صحیح فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کیا لیں اور کیا چھوڑیں۔

اس غلط سوچ کی وجہ سے وہ پھر ریاستی قوت سے بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں' وہ سمجھتے ہیں کہ اس زمین پر ریاستی قوت ہی اصل قوت ہے اور سب کچھ ہے۔ اور ہر جگہ موثر ہے۔ اس لیے وہ اس قوت سے ڈرتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ وہ اس ریاستی قوت کی اذیتوں سے اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہیں اور اس کی حمایت کے حصول کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔

پھر ایسے لوگوں کو دولت کی قوت سے بھی دھوکہ ہوتا ہے' وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہی قوت ہے' جس کے نتیجے میں زندگی کی قدریں حاصل ہوتی ہیں۔ اور تمام اقدار حیات دولت کے تابع ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگ حصول دولت کا شوق رکھتے ہیں اور زوال دولت کا انہیں ہروقت خوف رہتا ہے۔ اور وہ حصول دولت کے لیے ہروقت جدوجہد کرتے ہیں تاکہ اس

دولت کے ذریعہ وہ لوگوں کی گردنوں پر سوار ہوں اپنے زعم کے مطابق ـ

یہ لوگ سائنس کی قوت کو بھی ایک بڑی قوت سمجھتے ہیں ـ اس کو بھی یہ مالی قوت اور تمام قوتوں کی بنیاد تصور کرتے ہیں' جن کے ذریعہ کوئی شخص گرفت کرتا ہے یا چلتا پھرتا ہے ـ سائنسی قوت کے سامنے بھی لوگ اس طرح جھکتے ہیں جس طرح سائنس کوئی معبود ہے اور لوگ اس کے بندے ہیں ـ

غرض انسان کو یہ سب ظاہری قوتیں دھوکہ دیتی ہیں ـ جن افراد کے پاس یہ قوتیں ہیں جن سوسائٹیوں کے پاس یہ وسائل ہیں یا جن حکومتوں کے پاس یہ قوتیں ہیں ان سے دوسرے لوگ ڈرتے ہیں اور ان کا طواف کرتے ہیں اور ان پر لوگ اس طرح فدا ہوتے ہیں جس طرح پروانہ چراغ پر گرتا ہے ـ یا جس طرح وہ آگ میں گرتا ہے ـ

ان ظاہری قوتوں سے دھوکہ کھا کر انسان اس اصلی قوت کو بھول جاتا ہے جو ان حقیر قوتوں کو پیدا کرنے والی عظیم قوت ہے ـ جو ان قوتوں کی پیدا کرنے والی ہے' جو ان سب قوتوں کی مالک ہے' جو کسی کو یہ قوتیں عطا کرتی ہے' جو ان قوتوں کی تسخیر کرتی ہے اور ان کا رخ جس طرف چاہتی ہے' پھیر دیتی ہے ـ

لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ دنیا کی ان حقیر اور ظاہری قوتوں کے پاس پناہ لینا' خواہ یہ قوتیں افراد کے ہاتھ میں ہوں' چاہے کسی سوسائٹی میں ہوں' چاہے کسی حکومت کے پاس ہوں' اسی طرح ہے جس طرح کوئی تار عنکبوت کا سہارا لے' یا بیت عنکبوت میں پناہ لے ـ یہ عنکبوت تو ایک کمزور' حقیر' اور نہایت نرم کیڑا ہے اس کی ساخت ہی کمزور ہے ـ اور اس کا گھر بھی کمزور گھر ہے ـ وہ کسی کو کیا پناہ دے سکتا ہے ـ

یاد رکھو! کہ حمایت صرف اللہ کی حمایت ہے' پناہ صرف اللہ کی پناہ ہے جو ایک قوی پناہ دینے والا ہے ـ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جو قرآن کریم مومن لوگوں کے دلوں میں بٹھاتا ہے ـ اور ایک بار جب قرآن نے اہل ایمان کے دلوں میں یہ حقیقت بٹھا دی تھی تو وہ گروہ دنیا کا ایک طاقت ور گروہ بن گیا تھا ـ اور اس نے ان تمام ظاہری قوتوں کو روند ڈالا تھا جو اس کی راہ میں کھڑی ہو گئی تھیں ـ زمین کے تمام جباروں اور قہاروں کی گردنیں مروڑ کر جھکا دی تھیں اور بڑے بڑے قلعے مسمار کر کے رکھ دیئے تھے ـ

یہ حقیقت قرآن نے اس گروہ میں کس طرح بٹھا دی تھی؟ یہ حقیقت ہر نفس میں بیٹھ گئی تھی ـ اس سے ہر دل بھر گیا تھا ـ یہ حقیقت ان کے خون میں مل گئی تھی اور یہ ان کی رگوں میں دوڑ رہی تھی ـ یہ حقیقت صرف الفاظ کی ادائیگی تک محدود نہ تھی ـ نہ یہ ایک موضوع بحث تھی جس پر سیمینار ہوتے تھے بلکہ یہ ان نفوس میں واضح طور پر نظر آتی تھی ـ اور ان کے حس و خیال میں اس کے سوا کوئی اور بات نہ تھی ـ یہ کہ اللہ کی قوت ہی واحد قوت ہے اور اللہ کی دوستی ہی واحد دوستی ہے اور اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ کمزور و ناتواں ہے ـ اگرچہ بظاہر دوسری قوتیں جس قدر بھی ظلم و استبداد کریں ـ اگرچہ انہوں نے ظلم و سرکشی کی حد کر دی ہو' اگرچہ ان کے پاس گرفت اور دست درازی کے تمام وسائل ہوں اور وہ پکڑ دھکڑ کر رہے ہوں ـ

یہ سب کچھ بیت عنکبوت ہے ـ یہ تمام قوتیں اور وسائل تار عنکبوت ہیں ـ

وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۲۹ : ۴۱) "اور سب گھروں سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے 'کاش کہ یہ لوگ جانتے"۔

وہ داعی جو فتنوں اور آزمائشوں سے دوچار ہو جاتے ہیں' جنہیں قید و بند اور تشدد و اذیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے' ان کو چاہئے کہ اس حقیقت پر غور کریں اور ایک لمحے بھر کے لیے بھی اسے نظروں سے اوجھل ہونے نہ دیں' ان کو تو اس میدان میں مختلف مزاحم قوتوں سے دوچار ہونا ہے ۔ یہ قوتیں ان پر وار کرتی ہیں اور ان کو نیست و نابود کرنا چاہتی ہیں ۔ بعض ایسی قوتیں ہوتی ہیں جو انہیں خریدنا چاہتی ہیں ۔ یہ سب قوتیں تار عنکبوت کی طرح ہوتی ہیں بشرطیکہ کسی کا ایمان و نظریہ مضبوط ہو' اور کوئی جانتا ہو کہ اصل اور حقیقی قوت ہے کیا۔

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ (۲۹ : ۴۲) "یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جس چیز کو پکارتے ہیں' اللہ اسے خوب جانتا ہے"۔ یہ لوگ اللہ کے سوا بعض دوسری چیزوں کا سہارا لیتے ہیں ۔ اور اللہ جانتا ہے کہ یہ سہارے کے قابل چیزیں نہیں ہیں ۔ ان کی حقیقت وہی ہے جو تمثیل سابق میں بیان کی گئی یعنی مکڑی کا جالا۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۲۹ : ۴۲) "وہی زبردست اور حکیم ہے"۔ وہی غالب ہے' وہی قاہر ہے' وہی حکیم ہے اور وہی اس پوری کائنات کا مدبر ہے۔

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (۲۹ : ۴۳) "یہ مثالیں ہم لوگوں کی فہمائش کے لیے دیتے ہیں مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھتے ہیں"۔ مشرکین کے بعض لوگ ایسے تھے جن کے دلوں پر تالے لگے ہوئے تھے اور ان کی عقل ماری گئی تھی' وہ لوگ اس تمثیل کے ساتھ یہ مزاح کرتے تھے اور کہتے تھے کہ محمد کے رب مکھیوں اور مچھروں کی بات بھی کرتے ہیں اور اس تمثیل میں جو حقیقت بیان کی گئی تھی' اس کو وہ سمجھ ہی نہ سکے تھے ۔ نہ اس کا ان پر اثر ہوا۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ

وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (۲۹ : ۴۳) "مگر ان چیزوں کو وہی لوگ سمجھے ہیں جو عقلمند ہیں"۔

اب آخر میں ان تمام حقائق کو اس عظیم حقیقت کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہے جو اس کائنات کے نقشے میں ودیعت کر دی گئی ہے' جس طرح قرآن کریم کا خاص اسلوب ہے۔

۴
خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۴۴ ع
۱۶

"اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے' درحقیقت اس میں ایک نشانی ہے اہل ایمان کے لیے"۔

تمام انبیاء کے قصص کے بعد یہ آیت آتی ہے اور اس تمثیل کے بعد آتی ہے جس میں اللہ کی قوت کے مقابلے میں

دوسری قوتوں کو تار عنکبوت کی طرح نزار و نحیف بتایا گیا ہے ـ یہ آیت ان سب قصص و تمثیلات کے ساتھ مربوط اور ہم آہنگ ہے ـ اور ان کے درمیان ایک گہرا رابطہ ہے کہ زمین و آسمان میں وہی حقیقت بکھری ہوئی ہے اور ہر سو نظر آتی ہے ـ یہ کائنات جس ٹھوس نظام پر قائم ہے ' اس کے اندر وہی حقیقت ہے وہی قوت ہے جو اس قرآن کے اندر پوشیدہ ہے ـ

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ( ۲۹ : ۴۴ ) "درحقیقت اس میں نشانی ہے اہل ایمان کے لیے" ـ کہ یہ ایک عظیم نظام ہے ' ناپیدا کنار کائنات ہے اور پھر بھی باہم متصادم نہیں ہے ـ اور اہل ایمان ہی ہیں جن کے دل اس کائنات میں بکھری ہوئی نشانیوں کے لیے کھلے ہوتے ہیں ' جن کا نظم و نسق یہ شہادت دیتا ہے ' جس قدر بھی دور تک ہمارا مشاہدہ جائے کہ یہ کائنات ایک عظیم سچائی پر پیدا کی گئی ہے صرف اہل ایمان ہی اس سے حقیقت کو پا سکتے ہیں اس لیے کہ ان کو مومنانہ بصیرت اور بصارت حاصل ہوتی ہے اور ان کا شعور اور قوت مدرکہ تیز ہوتی ہے ـ

آخر میں اس کتاب کو جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی ہے ' ذکر و صلوٰۃ سے مربوط کر دیا جاتا ہے ـ اور اس حق کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہے جو اس پوری کائنات میں پوشیدہ ہے اور اس ذکر و فکر سے مربوط کیا جاتا ہے جو نوح علیہ السلام سے ادھر تمام انبیاء کا نکتہ دعوت رہا ہے ـ

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ( ۲۹ : ۴۵ ) "جو کتاب آپ پر وحی کی گئی ہے اسے پڑھیے اور نماز قائم کیجئے بے شک نماز فحش اور منکرات سے روکتی ہے ـ بے شک اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے اور اللہ جانتا ہے جو کام تم کرتے ہو" ـ

ان کے سامنے کتاب پڑھیں کہ یہی ذریعہ دعوت اسلامی ہے ' اور ایک ربانی معجزہ ہے اور اس کتاب کے اندر بیان کردہ سچائی وہی ہے جو اس کائنات کے اندر پوشیدہ سچائی ہے ـ

اور نماز قائم کرو ' جب نماز قائم کی جاتی ہے تو یہ فحاشی اور منکرات سے روکتی ہے ' یہ اللہ کے ساتھ ایسا رابطہ ہے کہ جب کوئی یہ رابطہ قائم کرتا ہے تو پھر وہ فحاشی اور منکرات کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا ـ یہ ظاہری اور روحانی تطہیر کا ذریعہ ہے ـ لہٰذا اس کے ساتھ کوئی گندگی ' ناپاکی اور میل کچیل لگا ہی نہیں کھاتی ـ حضورؐ نے فرمایا "جو شخص ایسی نماز پڑھے جو اسے فحاشی اور منکرات سے نہ روکے تو وہ ایسی نماز سے ماسوائے اس کے کہ اللہ سے دور ہو جائے ـ اور کوئی مفاد نہ پائے گا" ـ (ابن جریر) ـ

اگر کوئی ایسی نماز پڑھتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے نماز ادا کر دی لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے نماز قائم کر دی ـ اور نماز ادا کرنے میں اور قائم کرنے میں بہت بڑا فرق ہے ـ اگر نماز قائم کی جائے تو یہ ذکر اللہ ہوتی ہے اور

وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ( ۲۹ : ۴۵ ) "اللہ کا ذکر بہت بڑا ہوتا ہے" ـ مطلقاً وہ بڑی چیز ہوتی ہے ـ ہر

تصور اور ہر جذبہ سے بڑا ہوتا ہے ـ ہر عبادت اور ہر عاجزی سے ذکر اللہ بڑا ہوتا ہے ـ

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (۲۹ : ٤٥) "اور اللہ جانتا ہے جو تم بناتے ہو" ـ اس پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے ـ اس پر کسی امر میں التباس نہیں ہوتا ـ تم نے آخر کار اس کی طرف لوٹنا ہے ـ اور وہ تمہاری تمام مصنوعات کا بدلہ تمہیں دینے والا ہے ـ

صدق اللہ العظیم

---○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ---- پنجم

## پارہ ------ ۲۱

سورۃ العنکبوت ـ ۲۹

آیات ۴۵--- تا--- ۶۹

# درس نمبر ۱۸۲ ایک نظر میں

یہ سورہ عنکبوت کا آخری سبق ہے ۔ پہلے دو سبق پارہ ۲۰ میں گزر چکے ہیں ۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا اس سورہ کا محور آزمائش و ابتلاء ہے ۔ جو لوگ بھی کلمہ حق بلند کرتے ہیں ان کی راہ میں رکاوٹیں آتی ہیں ۔ فتنوں اور آزمائشوں کی بھٹی میں سے گزار کر اللہ تعالیٰ سچے اور جھوٹے لوگوں کے درمیان فرق واضح فرما دیتے ہیں ۔ جو جس قدر گرم و سرد چشیدہ ہو گا اسی قدر وہ درجات بلند کا مالک ہو گا ۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں یہ بھی ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ زمین پر موجود شیطانی قوتیں اہل ایمان کا راستہ روکنے کے لئے چاہے جس قدر زور لگائیں ' ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے ۔ اہل ایمان اگر ذرا صبر کریں اور مصابرت سے کام لیں تو اللہ آخر کار بدکاروں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اہل ایمان کو کامیاب کرتا ہے ۔ یہ اللہ کی سنت ہے اور اسلامی دعوت کے ساتھ اللہ کی سنت کا ہمیشہ یہی معاملہ رہا ہے ۔ نوح علیہ السلام سے لے کر آج تک یہ سنت اٹل رہی ہے ۔ اس میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں ہوتی اور یہ سنت اس بڑی سچائی کے ساتھ بھی مربوط ہے جو اس کائنات میں کام کر رہی ہے جس طرح اللہ کی دعوت ایک ہے اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں اسی طرح اللہ کی سنت بھی ناقابل تغیر ہے ۔

درس سابق کا خاتمہ اس بات پر ہوا تھا کہ اے رسول اور اے اہل ایمان تمہاری طرف جو آیات الٰہی نازل ہو رہی ہیں بس تم ان کی تلاوت کرتے جاؤ ' ان کو سمجھو اور مطالعہ کرو اور نماز قائم کر کے ان پر عمل کرو ' اور اس بات کو ذہن میں حاضر رکھو کہ اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ بھی تم کرتے ہو ۔

اس سبق میں بھی کتاب اللہ کے بارے میں بات چلتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کتاب اور کتب سابقہ کے درمیان کیا تعلق اور نسبت ہے ۔ مسلمانوں کو نصیحت کی جاتی ہے کہ ظالموں کو چھوڑ کر دوسرے عام اہل کتاب کے ساتھ رویہ اچھا رکھو ' ان کے ساتھ اچھے انداز سے مکالمہ کرو ۔ ظالم لوگ وہ ہیں جنہوں نے کتاب اللہ میں تحریف کر دی اور جنہوں نے عقیدۂ توحید کو بدل کر شرک کا عقیدہ اپنا لیا اور شرک ہی بہت بڑا ظلم ہے ۔ اہل ایمان کی راہ اور عقیدہ یہ ہے کہ اللہ ایک ہے ۔ اس کی تمام رسالتیں ایک ہیں ' کتب ایک ہیں ' یہ کہ تمام کتابیں اللہ کے نزدیک عظیم سچائی پر مشتمل ہیں اور اہل ایمان ان کی تصدیق کرتے ہیں ۔

اس کے بعد بعض ایسے اہل کتاب کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو اس آخری کتاب پر ایمان لے آئے ہیں ۔ حالانکہ مکہ کے مشرکین جن کے اندر سے نبی آخر الزمان کا انتخاب ہوا ' اس پر ایمان نہیں لاتے ۔ وہ اس عظیم اعزاز اور عظیم رحمت کی قدر نہیں کرتے جو اللہ نے ان کو بخشی ۔ وہ اس کتاب کے اعجاز اور اس کی تعلیمات کو ' [illegible] کے بھیجے ہوئے رسول کو اپنے لیے غنیمت نہیں سمجھتے کہ وہ ان سے ہمکلام بھی ہے اور اللہ کا کلام بھی ان کو سنا رہا ہے جبکہ اس سے قبل مشرکین کے سامنے نہ انہوں نے کوئی کتاب پڑھی اور نہ وہ کوئی قلم کار تھے ۔ اگر حضورؐ مطالعہ کتب کرتے رہتے اور کتابیں لکھتے رہتے

تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ انہوں نے یہ کتاب خود تصنیف کر ڈالی ہو۔

مشرکین مکہ بات بات پر یہ مطالبہ کر دیتے تھے کہ اگر تم سچے ہو تو لاؤ عذاب الہی جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عذاب بہت ہی قریب ہے' اور یہ جہنم کی شکل میں تمہیں گھیرے گا۔ یہ قیامت کے دن اوپر سے بھی ہو گا اور پاؤں کے نیچے سے بھی ہو گا۔ ہر طرف سے گھیرے گا۔

اس کے بعد روئے سخن ان اہل ایمان کی طرف پھر جاتا ہے جو مکہ میں اہل کفر کے تشدد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ اگر مکہ میں ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا ہے تو وہ ہجرت کر جائیں تاکہ وہ رب واحد کی بندگی کر سکیں۔ یہ ہدایت ان کو ایک عجیب انداز میں دی جاتی ہے۔ ہجرت کے مشورہ سے ان کے دلوں میں جو پریشانیاں اور خدشات پیدا ہوتے ہیں انہیں دور کر دیا جاتا ہے۔ ان تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا جاتا ہے جو ان کی راہ میں حائل ہو سکتی ہیں۔ چند چٹکیوں کے ساتھ ان کی قلبی حالت بدل دی جاتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قرآن کو نازل کرنے والا وہی خالق ہے جو اس کائنات کو پیدا کرنے والا ہے کیوں کہ انسانی دلوں کی گہرائیوں تک اثر اور ان کے اندر اس قسم کے احساسات وہی ذات پیدا کر سکتی ہے جس نے ان دلوں کو پیدا کیا ہے کیونکہ وہی لطیف و خبیر ہے۔

اس کے بعد روئے سخن ان مشرکین کی طرف مڑ جاتا ہے جو نظریاتی انتشار میں مبتلا ہیں۔ وہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ وحدہ ہی خالق کائنات' خالق ارض و سما' مسخر شمس و قمر ہے اور وہی ہے جو آسمانوں سے پانی اتارتا ہے جس سے یہ زمین مردہ ہونے کے بعد زندہ ہو جاتی ہے۔ جب وہ بحری سفر میں ہوتے ہیں تو وہ صرف اللہ وحدہ کو پکارتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد وہ پھر شرک کرنے لگتے ہیں۔ اللہ کی کتاب کی حقانیت کا انکار کرتے ہیں' رسول اللہ کو ناجائز اذیتیں دیتے ہیں۔ اہل ایمان کو فتنوں اور مصیبتوں میں ڈالتے ہیں۔ اہل شرک کو یہ بھی یاد دلایا جاتا ہے کہ دیکھو تمہارے لیے اس حرم کو جائے امن بنایا گیا ہے جس میں تم چین سے رہتے ہو۔ تمہارے اردگرد تمام قبائل ہروقت خوف و ہراس میں رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ مشرکین اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور اللہ کے ساتھ خود ساختہ الہوں کو شریک کرتے ہیں۔ اس لیے ان کو دھمکی دی جاتی ہے کہ تم جہنم رسید ہو گے اور وہاں تمہیں ہمیشہ رہنا ہو گا۔

سورہ کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اللہ اہل ایمان کو کامیابی کی راہیں دکھائے گا لیکن ان اہل ایمان کو جو مومنین خالص ہوں' جنہوں نے رکاوٹوں کو پار کر لیا ہو' آزمائشوں سے گزر گئے ہوں اور مشکلات راہ پر قابو پا لیا ہو۔ اگرچہ اس راہ کی رکاوٹیں بہت ہیں' لیکن انہوں نے یہ مشکل کام کر لیا ہو۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۱۸۲ تشریح آیات

## ۴۵ --- تا --- ۶۹

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى

عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ

وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ

وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾

(اے نبیؐ) تلاوت کرو اس کتاب کی جو تمہاری طرف وحی کے ذریعہ سے بھیجی گئی ہے اور نماز قائم کرو ' یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر اس سے بھی زیادہ بڑی چیز ہے ۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو ۔ اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں اور ان سے کہو کہ "ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی ' ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اسی کے مسلم (فرمانبردار) ہیں"۔

وہ دعوت جس کا آغاز حضرت نوح علیہ السلام سے ہوا اور جس کا خاتمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا۔ یہ ایک ہی دعوت ہے ' ایک ہی اللہ کی طرف سے ہے اور اس دعوت کا مقصد اور مطلوب بھی ایک ہی ہے ۔ یہ کہ گمراہ انسانیت کو واپس لا کر رب العالمین کی راہ پر ڈال دیا جائے ' اللہ کی ہدایت اور منہاج کے مطابق وہ زندگی بسر کرے ۔ جو لوگ سابقہ رسولوں کی دعوت پر ایمان لاتے رہے ہیں وہ اہل ایمان کے بھائی ہیں ۔ سب ایک ہی امت ہیں ' ایک ہی اللہ کی بندگی کرتے ہیں ۔ انسانیت اپنے ہر دور اور ہر زمان و مکان میں دو گروہوں میں بٹی رہی ہے ۔ ایک گروہ مومنین کا ہے جسے حزب اللہ کہا جاتا ہے اور دوسرا گروہ اللہ کے دشمنوں کا ہے اور یہ حزب الشیاطین کے نام سے موسوم ہیں ۔ اس سلسلے میں کسی زمان و مکان میں کوئی فرق نہیں پڑا ۔ لہٰذا زمانہ قدیم سے لے کر آج تک مومنین ایک پارٹی ہیں اور اہل کفر ایک پارٹی ہیں ۔

یہ وہ عظیم اور بلند حقیقت ہے جس کے اوپر اسلام قائم ہے اور جسے اس آیت میں منضبط کیا گیا ہے ۔ یہ حقیقت ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان میں پائے جانے والے تعلقات اور روابط کو محض خون ' نسب ' قومیت ' وطن ' تجارت اور مفادات سے بلند کر کے انہیں الہ واحد کی اساس پر قائم کرتی ہے ۔ تمام انسانوں کا ایمان ایک ایسے نظریہ حیات

پر ہو جس میں تمام رنگوں اور تمام نسلوں کے لوگ پگھل جائیں۔ تمام قوتیں ختم ہوں خواہ نسلی ہوں یا وطنی ہوں اور جس میں زمان و مکان کی دوریاں غائب ہوں اور تمام انسانوں نے ایک ہی مضبوط رسی کو پکڑ رکھا ہو۔ خالق کائنات اور شارع کائنات کی رسی کو۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کو اہل کتاب کے ساتھ مکالمے اور مجادلے سے منع کیا جاتا ہے ماسوائے اس کے کہ یہ مجادلہ نہایت ہی مستحسن طریقے سے ہو۔ مسلمانوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کے اور سابقہ رسل کی تعلیم اور رسالت کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے اور یہ کہ مسلمانوں کو اس تاریخی اسلامی دعوت کی آخری شکل یعنی دین اسلام پر اکتفاء کرنا چاہئے' جو تمام سابقہ دعوتوں کے مطابق ہے۔ جو تمام سابقہ دعوتوں اور رسالتوں کی تکمیل ہے۔ یہ آخری صورت اس کو اللہ کے علم و حکمت نے دی ہے جو انسانوں کی مصلحت خود انسانوں سے زیادہ جاننے والے ہیں۔

اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ (۲۹: ۴۶) "سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں"۔ جنہوں نے توحید سے انحراف کیا' جو اسلامی نظریہ حیات کا سنگ اساس ہے' جنہوں نے اللہ کے ساتھ شرک کی اور جنہوں نے اسلام کو بحیثیت منہاج حیات چھوڑ دیا' کیونکہ ایسے لوگوں کے ساتھ نہ نرمی ہے اور نہ ایسے لوگوں کے ساتھ مکالمے کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی ظالم لوگوں کے ساتھ اسلام نے اس وقت جنگ کی' جب مدینہ میں اسلامی مملکت قائم ہو گئی۔

بعض لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگایا کہ مکہ میں جب اہل شرک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سخت برتاؤ کر رہے تھے تو آپ نے یہ باتیں کہیں کہ اہل کتاب کے ساتھ نرمی اور احسان کا طریقہ اختیار کیا جائے مگر جب مدینہ میں آپ کی حکومت قائم ہو گئی تو آپ نے اہل کتاب کے ساتھ مجادلہ شروع کر دیا اور جنگیں لڑیں اور مکی اقوال کے خلاف طرز عمل اختیار کیا۔ یہ بہت بڑا بہتان ہے اور خود یہ مکی آیت اس کا انکار کر رہی ہے۔ اسلام صرف ان اہل کتاب کے ساتھ نرم برتاؤ کرنے کی اجازت دیتا ہے' جو ظالم اور مشرک نہ ہوں' اپنے اصل دین پر ہوں اور سابقہ رسولوں کی ہدایات کے مطابق صحیح توحید پہ قائم ہوں۔

وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَ اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۲۹: ۴۶) "اور ان سے کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی اور ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اسی کے مسلم ہیں"۔ لہذا بحث و اختلاف کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے اور جدال و جدال بے محل ہے۔ ہم سب اللہ واحد کو خدا مانتے ہیں۔ اہل ایمان تو قرآن پر بھی ایمان لاتے ہیں اور انبیائے سابقہ کی کتب پر بھی ایمان لاتے ہیں کیونکہ اسلام کی ایک ہی زنجیر ہے اور تمام نبوتیں اس کی کڑیاں ہیں۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَآ اِلَّا

الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾

"(اے نبیؐ) ہم نے اسی طرح تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے' اس لیے وہ لوگ جن کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں' اور ان لوگوں میں سے بھی بہت سے اس پر ایمان لا رہے ہیں' اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں"۔

"اسی طرح" یعنی ایک ہی مسلسل اور تاریخی منہاج کے مطابق' ایک ہی سنت الہیہ کے مطابق جو اٹل ہے اور اسی طریقے کے مطابق جس کے ذریعے اللہ ہمیشہ رسولوں کو ہدایت دیتا رہا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ (۲۹: ۴۷) "اے نبیؐ' ہم نے اسی طرح تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے"۔ اور جب کتاب نازل کی تو لوگ اس کے مقابلے میں دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک تو وہ لوگ تھے جو اہل کتاب میں سے بھی تھے اور قریش میں سے بھی تھے وہ تو ایمان لے آئے اور دوسرا گروہ وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب کے ایمان اور شہادت کے بعد بھی اس کو تسلیم نہیں کرتے حالانکہ وہ اس کی سچائی کی تصدیق کر چکے ہیں۔

وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ (۲۹: ۴۷) "اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں"۔ یعنی یہ آیات اس قدر واضح ہیں' اس قدر سیدھی ہیں کہ ان کا انکار وہی شخص کر سکتا ہے جس کی عقل پر پردے پڑ گئے ہوں' جس کی روح مستور ہو' اور وہ اس قابل ہی نہ رہی ہو کہ سچائی کو دیکھ سکے۔ کفر کے حقیقی معنی ہی چھپانے اور پردوں میں ڈالنے کے ہیں۔ یہاں قرآن نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے اس میں کفر کے اصطلاحی معنوں کے ساتھ لغوی معنی بھی ملحوظ رکھے گئے ہیں۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾

"(اے نبیؐ) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے"۔

قرآن کریم کفار کے شبہات کا پیچھا کرتا ہے' یہاں تک کہ ان کے بچگانہ اعتراضات اور شبہات کا بھی دفعیہ کر دیا جاتا ہے۔ رسول اللہؐ نے زندگی کا طویل ترین حصہ کفار مکہ کے درمیان بسر کیا تھا۔ آپ نہ پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے۔ اچانک انہوں نے ایسی عجیب کتاب پیش کی جس نے تمام پڑھے لکھے لوگوں اور لکھنے والوں کو عاجز کر دیا۔ اگر حضور اکرمؐ نزول قرآن سے قبل پڑھے لکھے ہوتے تو کفار مکہ جائز طور پر اعتراض کرتے کہ حضورؐ خود تصنیف کر رہے ہیں لہٰذا اب وہ جو اعتراضات کرتے ہیں وہ بے بنیاد ہے۔

میں کہتا ہوں قرآن کریم ان کے لغو اور بچگانہ سوالات کا بھی جواب دیتا ہے ۔ ورنہ اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پڑھے لکھے تھے تو پھر بھی قرآن کریم پر ان کے لیے شبہ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا ۔ کیونکہ اگر قرآن کریم پر بذات خود غور کیا جائے تو یہ ایک معجز کتاب ہے اور انسانوں کی تصنیف کردہ کتاب نہیں ہے ۔ یہ انسانی قوت اور معرفت کے حدود سے باہر ہے ۔ انسانی علم و معرفت کی حدود سے اس کے مضامین وراء ہیں ۔ قرآن کریم میں جو سچائی درج ہے وہ بے قید سچائی ہے جس طرح اس کائنات کے اندر موجود سچائی بے قید ہے ۔ انسان جب بھی نصوص قرآنی پر غور کرتا ہے 'اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کی پشت پر بے پناہ قوت ہے ۔ قرآن کریم کی عبارت میں بھی ایک عظیم شوکت ہے اور یہ قوت اور یہ شوکت کلام انسانی طاقت سے وراء ہے ۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝

" دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم بخشا گیا ہے 'اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر وہ جو ظالم ہیں"۔

یہ قرآن اہل علم کے لیے واضح دلائل پر مشتمل ہے جن میں کوئی التباس اور پیچیدگی نہیں ہے نہ کوئی شبہ اور شک ہے ۔ یہ ایسے دلائل ہیں جو لوگوں کے سینوں میں موجود ہیں 'لوگوں کے دل ان دلائل پر مطمئن ہیں اس لیے اہل علم قرآنی آیات پر کوئی مزید دلیل طلب نہیں کرتے ۔ وہ علم جس پر لفظ علم کا اطلاق کیا جا سکتا ہے وہ ان لوگوں کے دلوں میں موجود ہے ۔ وہ بصورت ملکہ منتقل ہو کر وہاں بیٹھا ہے ۔ وہ دلوں سے پھوٹتا ہے 'وہ دلوں کی راہنمائی کرتا ہے اور سیدھا منزل مقصود تک پہنچاتا ہے ۔

وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ( ۲۹ : ۴۹ ) "اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر وہ لوگ جو ظالم ہیں" ۔ جو حقیقت اور معاملات کا صحیح اندازہ نہیں کرتے اور جو صراط مستقیم کو چھوڑ کر ٹیڑھی راہوں پر چلتے ہیں ۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

" یہ لوگ کہتے ہیں کہ "کیوں نہ اتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں اس کے رب کی طرف سے ؟" کہو "نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر" ۔

ان معجزات اور نشانیوں سے ان کی مراد وہ معجزات اور نشانیاں ہیں جو آغاز انسانیت یعنی انسانیت کے دور طفولیت میں ان کے سامنے پیغمبروں نے پیش کیں 'یعنی مادی معجزات ۔ اور یہ معجزات صرف ان لوگوں کے لیے حجت ہوتے تھے جو

ان کو دیکھتے تھے ۔ جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت وہ آخری اور دائمی رسالت ہے جو ان تمام لوگوں کے لیے حجت ہے جن تک اس کی دعوت پہنچ جائے اور یہ رسالت اس وقت تک جاری رہے گی جب تک انسانیت موجود ہے اور یہ دنیا قائم ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اس رسالت کو ایک ایسی معجزکتاب دی ہے جو ہمیشہ پڑھی جاتی ہے اور جس کا اعجاز ختم نہیں ہوتا ۔ اور جس کے کمالات و عجائبات ختم نہیں ہوتے ۔ اللہ کے لیے قرآن کے خزانوں کا علیحدہ ذخیرہ ظاہر ہوتا رہتا ہے اور اس کے یہ معجزات اور دلائل ہر دور کے اہل علم کے سینوں میں موجود رہتے ہیں ۔ جب بھی اہل علم اس پر غور کرتے ہیں وہ اس کتاب کے اعجاز اور معجزات کو پاتے ہیں اور وہ اچھی طرح محسوس کر لیتے ہیں کہ قرآن کریم کو یہ عظمت اور شوکت کس سرچشمے سے ملی ہے ۔

قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ( ۲۹ : ۵۰ ) "کہو 'نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں" ۔ اور اللہ اپنی نشانیاں اس وقت ظاہر کرتا ہے جب ان کی حاجت اور ضرورت ہو ۔ اور یہ سب کام 'اللہ کے نظام تدبیر اور تقدیر کے مطابق ہوتا ہے اس لیے میں اس سلسلے میں نہ کوئی تجویز دے سکتا ہوں اور نہ مطالبہ کر سکتا ہوں ۔ یہ میرے لائق نہیں ہے اور نہ ہی یہ میری عادت ہے ۔

وَ اِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ( ۲۹ : ۵۰ ) "میں صرف خبردار کرنے والا ہوں 'کھول کھول کر" ۔ میں ڈراتا ہوں اور خبردار کرتا ہوں اور لوگوں کے سامنے حقائق کھول کھول کر بیان کرتا ہوں اور یہی میرا فریضہ ہے جو میں ادا کرتا ہوں ۔ اس کے بعد جو کچھ ہو گا وہ اللہ کی تقدیر و تدبیر کے مطابق ہو گا ۔

اس طرح اللہ اسلامی نظریہ حیات کو ہر شک اور شبہ سے پاک کرتا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب اور مقام کی حدود کا تعین کر دیا جاتا ہے ۔ رسول اللہؐ کی صفات اور اللہ واحد و قہار کی صفات کے درمیان امتیاز کر دیا جاتا ہے ۔ اس طرح رسول اللہؐ کی شخصیت کے ارد گرد سے شبہات کے وہ بادل چھٹ جاتے ہیں جو ان رسولوں کی شخصیات کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے جن کو مادی معجزات دیے گئے کیونکہ سابقہ رسولوں کی صفات کو خدائی صفات کے ساتھ ملا دیا گیا تھا اور لوگوں نے ان رسولوں کی شخصیات کو اوہام و خرافات سے گھیر لیا تھا جس کی وجہ سے ان کے عقائد کے اندر بہت بڑا انحراف واقع ہو گیا ۔

یہ لوگ جو مادی معجزات طلب کر رہے ہیں اس بات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکے اور نہ اس کی اہمیت کو سمجھ سکے ہیں کہ اللہ نے تو قرآن نازل کر کے ان پر بہت بڑا احسان کیا ہے ۔

اَوَ لَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ ؕ
۵۱ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۠
ع ۷

"اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی

ہے؟ درحقیقت اس میں رحمت ہے اور نصیحت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں"۔

یہ ان کی جانب سے اللہ کی نعمتوں اور مہربانیوں کی ناشکری ہے' حالانکہ اللہ کے انعامات شکر اور قدر دانی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ یہ لوگ اس قرآن کے ساتھ آسمانوں میں پہنچ جائیں اور دیکھیں کہ یہ آسمانوں سے نازل ہو رہا ہے اور آسمانوں سے آکر وہ ان کے دلوں کے تاروں کو چھیڑ رہا ہے۔ ان کے دلوں کی بات کرتا ہے۔ ان کے ماحول کی باتیں کرتا ہے۔ ان کو یہ شعور دلاتا ہے کہ اللہ کی ان پر ہر وقت نظر ہے۔ اللہ کے ہاں تمہاری بہت اہمیت ہے کہ وہ تمہارے امور سے بحث کرتا ہے۔ تمہیں قصص سناتا ہے جبکہ اے انسان تو تو اللہ کی اس وسیع کائنات میں ایک مچھر سے بھی زیادہ کمزور اور چھوٹا ہے۔ بلکہ اے انسان تو' تمہاری یہ زمین اور تمہارا یہ شمس و قمر تو اللہ کی اس کائنات میں اس طرح ہیں جس طرح پر کاہ اس زمین کے مقابلے میں اور یہ پر کاہ بھی اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے' لیکن اس کے باوجود اللہ نے تمہیں مکرم بنایا ہے اور وہ تم پر بلندیوں سے یہ قرآن نازل کرتا ہے لیکن تم پھر بھی اس کی قدر نہیں کرتے ہو؟

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۲۹ : ۵۱) "بے شک اس میں رحمت ہے اور نصیحت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں"۔ اس لیے کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہی لوگ اس رحمت و شفقت کا احساس کر سکتے ہیں۔ اور وہی لوگ اس بات کا شعور حاصل کر سکتے ہیں کہ قرآن کو نازل کر کے اللہ نے اپنے بندوں پر کس قدر رحمت و شفقت فرمائی۔ یہی لوگ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ جو بہت ہی بلند مرتبہ ہے' جو بہت ہی عظمتوں والا ہے وہ اس ناچیز انسان کو اپنے اس دسترخوان پر بلاتا ہے۔ ایسے ہی لوگ اس قرآن سے نفع حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ یہ تو مطالعہ کرنے والے کے لیے آب حیات ہے اور اس کے ذریعہ مومن اور متدبر پر بے پناہ خزانوں کے دروازے کھل جاتے ہیں' اور ان کی روحوں کے اندر یہ قرآن ایک روشنی اور اشراق پیدا کر دیتا ہے۔

جن لوگوں کو ان امور کا شعور نہیں دیا گیا' وہ حقیر مادی معجزات طلب کرتے ہیں اور حقیر معجزات کے ذریعے وہ اس عظیم اور ابدی معجزے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی شخصیت مسخ ہو چکی ہے اس لیے ان کے دل اس نور کے لیے نہیں کھلتے لہٰذا ایسے لوگوں پر اپنا وقت نہ ضائع کرو۔ ان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔ ان کا فیصلہ وہی کرے گا۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ شَهِیْدًا ۚ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾

"(اے نبیؐ) کہو کہ "میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہی کے لیے کافی ہے۔ وہ آسمانوں اور زمین میں سب کچھ جانتا ہے۔ جو لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ سے کفر کرتے ہیں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں"۔

وہ ذات جو جہانوں کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے اس کی شہادت سے بڑی شہادت کس کی ہو سکتی ہے اور اللہ

اپنے علم سے شہادت دے رہا ہے کہ یہ لوگ باطل پر ہیں۔

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲۹:۵۲) "جو لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ سے کفر کرتے ہیں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں"۔ یہ مطلقاً خسارے میں ہیں۔ ہر چیز سے وہ محروم ہو گئے ہیں۔ دنیا و آخرت دونوں ہار چکے ہیں۔ اپنی ذات' شخصیت' ہدایت' استقامت' اطمینان' سچائی اور نور سب چیزوں سے محروم ہو چکے ہیں۔

اللہ کی ذات پر ایمان لانا بھی ایک عمل اور کمائی ہے۔ یہ بذات خود اچھی کمائی ہے۔ اس پر اللہ اپنے فضل و کرم سے اجر دیتا ہے۔ اجر یہ کہ ایمان سے قلبی اطمینان اور زندگی کی راہوں کا تعین ہو جاتا ہے۔ جو واقعات بھی اس زندگی میں پیش آئیں' بندۂ مومن ان کو خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہے' وہ اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے۔ اللہ کی حمایت کا طلبگار اور امیدوار ہوتا ہے اور اسے اچھے انجام کا یقین ہوتا ہے یہ بذات خود ایک کسب ہے' ایک کمائی ہے جس سے کافر محروم ہوتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲۹:۵۲) "وہی لوگ خسارے میں ہوتے ہیں"۔

اب مشرکین کی بحث ذرا آگے بڑھتی ہے کہ یہ لوگ عذاب کے آنے میں عجلت کرتے ہیں حالانکہ جہنم تو ان کے بہت ہی قریب ہے۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ لَوْ لَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَ لَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَ يَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

"یہ لوگ تم سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان پر عذاب آ چکا ہوتا۔ اور یقیناً (اپنے وقت پر) وہ آ کر رہے گا۔ اچانک' اس حال میں کہ انہیں خبر بھی نہ ہو گی۔ یہ تم سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں' حالانکہ جہنم ان کافروں کو گھیرے میں لے چکی ہے۔ (اور انہیں پتہ چلے گا) اس روز جب کہ عذاب انہیں اوپر سے بھی ڈھانک لے گا اور پاؤں کے نیچے سے بھی اور کہے گا کہ اب چکھو مزا ان کرتوتوں کا جو تم کرتے تھے"۔

مشرکین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ڈراوے اور تخویف کی آیات سنتے تھے' لیکن ان کی سمجھ میں یہ حکمت نہ آتی تھی کہ پھر ان کے کفر کی وجہ سے ان پر یہ عذاب نازل کیوں نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اس مہلت کی وجہ سے بے باک ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور چیلنج عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔ حالانکہ بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرمین کو حد سے گزرنے کی مہلت دیتا ہے تاکہ وہ سرکشی اور فساد کی آخری حدوں کو چھو لیں۔ پھر عذاب آ جاتا ہے یا یہ مہلت اس لیے طویل ہو جاتی ہے کہ اللہ اہل ایمان کا امتحان لینا چاہتا ہے تاکہ وہ بہت زیادہ ثابت قدم اور پختہ مومن بن جائیں اور

ان کی صفوں سے وہ شخص نکل جائے جو صبر و ثبات نہیں رکھتا۔ یا یہ مہلت اس لیے ہوتی ہے۔ اللہ علیم و خبیر ہے اور اسے معلوم ہے کہ اہل کفر کی صفوں میں ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جو حق کی راہیں تلاش کر کے ہدایت پر آ جائیں گے یا ان لوگوں کی اولاد میں سے ایسے لوگ پیدا ہونے والے ہوتے ہیں جو راہ ہدایت پا لینے والے ہوں گے۔ وہ اللہ کی پارٹی میں شامل ہوں گے اگر چہ ان کے والدین مشرک ہوں۔ ان کے علاوہ بھی اللہ کی مصلحتیں ہو سکتی ہیں جو وہ خود جانتا ہے اور جو ہم سے مستور ہیں۔

ان مشرکین کو ایسا فہم و ادراک حاصل نہ تھا کہ وہ اللہ کی ان حکمتوں اور تدبیروں کو سمجھ سکیں۔ اس لیے وہ علی سبیل التحدی اور بطور چیلنج عذاب کا مطالبہ کرتے تھے لیکن

وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ (۲۹ : ۵۳) "اگر ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان پر عذاب آ چکا ہوتا"۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس حکمت کے بیان کے درمیان میں بھی ان کو متنبہ کرتے ہیں کہ جس عذاب کے بارے میں تمہیں جلدی ہے وہ اچانک ہی تم پر آ جائے گا لیکن اس وقت تمہیں اس کا انتظار اور توقع نہ ہوگی اور جب یہ اچانک آ جائے گا تو یہ لوگ مبہوت ہو کر رہ جائیں گے۔

وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۲۹ : ۵۳) "اور یقیناً وہ آ کر رہے گا اچانک اس حال میں کہ انہیں خبر بھی نہ ہوگی"۔

اور بعد میں بدر کے میدان میں ان پر یہ عذاب آیا۔ اللہ کا کہنا سچ ہو کر رہا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اللہ کا وعدہ کس قدر سچا ہوتا ہے۔ اللہ نے ان پر ایسا جامع اور ہمہ گیر عذاب نازل نہ کیا جس طرح پہلی اقوام پر آیا اور اللہ نے مادی معجزات کے اظہار کا مطالبہ بھی قبول نہ کیا جس طرح پہلی اقوام کو معجزات دکھائے گئے۔ انہوں نے انکار کیا اور ان پر ہمہ گیر عذاب آیا۔ وہ نیست و نابود ہوئے کیونکہ ان میں ایسے لوگ موجود تھے جو علم الٰہی کے مطابق زمانہ مابعد میں ایمان لانے والے تھے۔ جو اسلامی لشکر کے بہترین لوگ بننے والے تھے اور ان کی نسلوں سے ایسے لوگ پیدا ہونے والے تھے جنہوں نے ازمنہ مابعد میں طویل عرصہ تک اسلام کے جھنڈے اٹھائے رکھے۔ یہ سب کچھ اللہ کی تدبیر و تقدیر کے مطابق ہونا تھا اور ہوا۔

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ (۲۹ : ۵۴) "یہ تم سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں حالانکہ جہنم ان کافروں کو گھیرے میں لے چکی ہے"۔ یہ قرآن کا مخصوص اور عجیب موثر اسلوب کلام ہے کہ وہ مستقبل موعود کو عالم شہود کی شکل دے دیتا ہے۔ ایسی تصور کشی یہاں کر دی گئی ہے کہ گویا جہنم کفار کو گھیرے میں لے چکی ہے جبکہ ابھی وہ مستقبل کے پردوں میں مستور ہے۔ لیکن ان کے کرتوتوں کے اعتبار سے وہ واقعہ ہے جو مشاہدہ میں آ چکا ہے اور انسانی احساس کے پردوں پر نظر آتا ہے۔ ان لوگوں کو ایسا خطرناک چیلنج دینے سے باز رہنا چاہیے۔ کیا وہ لوگ جلدی مچاتے ہیں جن کو جہنم گھیرے میں لے چکی ہے اور کسی بھی وقت گھیرا تنگ کر کے وہ ان کو گرفت میں لے سکتی ہے۔

اب وہاں ان کی صورت حالات کیا ہوگی جس کے لیے یہ بہت ہی شتابی کر رہے ہیں ۔

یَوْمَ یَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَ یَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۹ : ۵۵) "اس روز جبکہ عذاب انہیں اوپر سے بھی ڈھانپ لے گا اور پاؤں کے نیچے سے بھی ۔ اور کہے گا کہ اب چکھو مزا ان کرتوتوں کا جو تم کرتے تھے" ۔ یہ نہایت ہی خوفناک منظر ہوگا ۔ نہایت ہی خوفناک حالت میں ان کو یوں طنزیہ سرزنش کی جائے گی ۔

ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۹ : ۵۵) "اب چکھو مزا ان کرتوتوں کا جو تم کرتے تھے" ۔ یہ ہے انجام اس جلد بازی اور عجلت کا جو تم کرتے تھے اور ڈرانے والوں کو تم اہمیت نہ دیتے تھے ۔

--- ooo ---

یہاں سیاق کلام منکرین ' اور مکذبین اور حد سے گزرنے والوں کو ایک دردناک عذاب کے منظر میں چھوڑ دیتا ہے ' یہ عذاب انہیں اوپر نیچے سے گھیرے ہوئے ہے ۔ اب روئے سخن اہل ایمان کی طرف پھر جاتا ہے جن پر یہ مکذبین محض عقائد و نظریات کی وجہ سے مظالم ڈھاتے ہیں اور ان کو ان کے رب کی عبادت سے روکتے ہیں ' ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی زمین وسیع ہے اپنے دین ' اپنے عقائد کو لے کر کہیں اور جا بسو ۔ یہ نصیحت نہایت ہی پر محبت اور تر و تازہ اور نہایت ہی موثر اسلوب میں کی جاتی ہے ۔ اس طرح کا یہ نغمہ دل کی تمام تاروں کو چھیڑ دیتا ہے اور ان میں ارتعاش پیدا کر دیتا ہے ۔

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ۝ كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ۝ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ۝ الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ۝ وَ كَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ یَرْزُقُهَا وَ اِیَّاكُمْ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۝

"اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو ' میری زمین وسیع ہے ' پس تم میری ہی بندگی بجا لاؤ ۔ ہر متنفس کو موت کا مزا چکھنا ہے ' پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے ۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کو ہم جنت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ' وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے ' کیا ہی عمدہ اجر

ہے عمل کرنے والوں کے لیے ـــ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے ' اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رازق بھی وہی ہے ' وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے "۔

دلوں کے خالق ' دلوں کی خفیہ باتوں کے جاننے والے ' دلوں میں آنے والے خیالات کے جاننے والے ' اور دلوں میں پیدا ہونے والے وساوس ' اور دلوں میں چھپے ہوئے خدشات کو جاننے والے اور ان دلوں کے پیدا کرنے والے خالق کائنات یوں پکارتے ہیں " اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو " ان الفاظ کے ساتھ پکار کر ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ کی راہ میں ہجرت کرو ' اس خطاب کے ذریعے پہلے ہی مرحلہ پر بتا دیا جاتا ہے کہ اس ہجرت کی حقیقت کیا ہے یہ کہ اللہ اور رب کے لیے اور مولائے کریم کی راہ میں ' میں اس کے بندوں کی یہ نقل مکانی ہے۔

یہ تو تھا پہلا ٹچ ' اور دوسرا احساس ان کو یہ دلایا جاتا ہے۔

اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ (۲۹ : ۵۶) " میری زمین وسیع ہے "۔ تم میرے بندے ہو اور یہ میری زمین ہے اور بہت ہی وسیع ہے۔ اس قدر وسیع ہے کہ یہ تمہیں جگہ دے سکتی ہے اس لیے کیوں تم مکہ کی تنگنائیوں میں ڈٹے ہوئے ہو ' جہاں تم پر محض تمہارے دین اور عقائد و نظریات کی وجہ سے مظالم ہو رہے ہیں۔ یہاں تمہیں اس کی اجازت بھی نہیں ہے کہ تم اپنے رب اور مولائے کریم کی بندگی کر سکو۔ ان تنگیوں کو خیرباد کہو اور اللہ کی وسیع دنیا کی طرف نکل جاؤ۔ اپنے دین کو لے کر اس ظلم سے نجات پاؤ تاکہ آزادی سے اپنے رب کی بندگی کر سکو۔ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ

(۲۹ : ۵۶) " پس تم میری ہی بندگی بجا لاؤ "۔

جب کسی کو ملک چھوڑنے پر آمادہ کیا جاتا ہے تو دل میں پہلا دکھ ملک چھوڑنے کا کروٹیں لیتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہاں اس قدر میٹھا انداز اختیار کیا ' میرے بندو جو ایمان لائے ہو ' الا یہ کہ میری زمین وسیع ہے۔ مکہ بھی میرا اور مدینہ بھی میرا ہے۔ تمام زمین میری ہے۔ لہٰذا محبت صرف اسی زمین سے رکھو جس میں تم میری عبادت کر سکو اور جس میں تمہارے لیے وسعت ہو۔ دوسرا خیال ایسے مواقع پر ہجرت کے عمل کے خطرات اور خدشات کا آتا ہے یعنی یہ کہ اپنے گھروں سے نکلیں گے تو راستوں میں موت ہی نہ آجائے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ کفار نے مسلمانوں کو مکہ میں قید کر رکھا تھا۔ ان کو وہاں سے نکلنے کی اجازت ہی نہ دیتے تھے اس لیے مہاجرین کے لیے ہجرت کی راہ میں نکلنا بھی پرخطر تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کے اس خدشے کو بھی دور فرماتے ہیں۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (۲۹ : ۵۷) " ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ پھر تم سب ہماری طرف پلٹا کر لائے جاؤ گے "۔ جہاں تک موت کا تعلق ہے تو وہ ہر جگہ آنے والی ہے ' لہٰذا موت کی پرواہ مت کرو ' جبکہ موت کا وقت اور سبب کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ سب کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ یہ تو ہجرت کرنے والے ہیں اور اگر نہ بھی کریں تو پھر بھی اللہ کی طرف سب کو پلٹایا جانا ہے اور تم تو اللہ کے غلام ہو ' تم کو تو دنیا و آخرت دونوں میں اللہ ہی کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ لہٰذا اس بارے میں ڈرنا کیا یا دلوں میں خوف و خطر کو لانے کا کیا مقام ہے۔

پھر اللہ کا کام صرف یہ نہیں کہ وہ تمہیں دنیا میں زمین کی وسعت ۔۔۔ کا اور تم محفوظ ہو گے بلکہ قیامت میں تمہارے لیے جو آرام گاہ تیار ہے وہ تو بہت ہی عظیم ہے ۔ اب تم وطن چھوڑ رہے ہو تو دنیا میں بھی وسعت ملے گی اور گھر تم چھوڑ رہے ہو تو جنت میں تمہارے لیے محلات تیار ہیں اور وہ محلات تمہارے ان چھوٹے چھوٹے گھروندوں سے بہت ہی بڑے اور عظیم ہیں ۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا (۲۹ : ۵۸) "جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کو ہم جنت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ' وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے" ۔ اور وہاں ان کو خوش آمدید ان الفاظ میں کہا جائے گا اور ان کی جدوجہد کا تذکرہ ہو گا ۔

نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۲۹ : ۵۹) "کیا ہی عمدہ اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے ' ان لوگوں کے لیے جنہوں نے صبر کیا اور جو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں" ۔ چنانچہ یوں اہل ایمان کو ہجرت پر آمادہ کیا جاتا ہے ' ان کے ساتھ وعدے کیے جا رہے ہیں اور اس پریشانی ' خدشات اور خوف کے ماحول سے ان کو ثابت قدمی اور جرات مندی اور حوصلہ سکھایا جا رہا ہے ۔

قدرتی طور پر ہجرت کے وقت یہ فکر بھی لاحق ہو جاتی ہے کہ انسان کے ساتھ پیٹ تو لگا ہوا ہے ۔ آخر صبح و شام کی ضروریات کا بندوبست کیا ہو گا ۔ وطن چھوڑ دیں گے ' مال چھوڑ دیں گے ' روزگار ترک کر کے چلے جائیں گے ۔ یہاں تو مکہ میں بہرحال ضروریات زندگی کی فراہمی کا بندوبست تو یقینی ہے ۔ ہر شخص روزگار پر لگا ہے ۔ چنانچہ ان خدشات کا جواب بھی دے دیا جاتا ہے ۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَ اِيَّاكُمْ (۲۹ : ۶۰) "اور کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے ' اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رازق بھی وہی ہے" ۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو انسان کی آنکھیں کھول دیتا ہے اور یہ واقعی صورت حالات ہم رات اور دن اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ۔ ایسے جانور ہیں جو نہ رزق اٹھائے پھرتے ہیں ' نہ جمع کرتے ہیں ' نہ اس کا کوئی اہتمام کرتے ہیں ۔ ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ اس رزق کو پیدا کرنے کی کیا تدبیر کریں گے ۔ نہ ذخیرہ کرنا انہیں آتا ہے ۔ اس کے باوجود اللہ سب کو رزق دیتا ہے ۔ کوئی جانور کبھی بھوک سے نہیں مرا ۔ اسی طرح اللہ لوگوں کو بھی رزق دیتا ہے ۔ اگرچہ بعض لوگوں کو یہ زعم لاحق ہو جاتا ہے کہ وہ خود اپنے لیے رزق پیدا کرتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ وسائل رزق اللہ ہی فراہم کرتا ہے اور یہ وسائل ہی دراصل رزق ہیں ۔ اگر اللہ کے یہ پیدا کردہ وسائل نہ ہوں تو انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا ۔ لہذا ہجرت کی وجہ سے تم بھوک سے نہ مرو گے ۔ اس کی فکر نہ کرو ' تم اللہ کے بندے ہو اور اللہ اپنے بندوں کا بندوبست کرتا ہے جہاں بھی وہ ہوں جس طرح اللہ اپنی دوسری مخلوق کا بندوبست کرتا ہے اور کسی کو بھی بھوکا مرنے نہیں دیتا ۔

یہ محبت آمیز نغمے اس شعور پر آکر ختم ہوتے ہیں کہ اللہ اہل ایمان کے ساتھ ہے ۔ وہ ہروقت ان پر نظر کرم رکھتا ہے' وہ ان کی سب باتیں سنتا ہے ۔ ان کے حالات کو جانتا ہے اور کبھی بھی ان کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔

وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ( ۲۹ : ۶۰ ) "وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔ یہ دور یہاں آکر ختم ہوتا ہے' اس حال میں اللہ نے مہاجرین کے دلوں میں پائے جانے والے تمام خدشات دور کر دیئے اور اللہ کی راہ میں نکلتے وقت دل میں کھٹکنے والے تمام خدشات دور کر دیئے اور اہل ایمان کے دلوں میں جو جو خدشات اور اندیشے پائے جاتے تھے اب ان کی جگہ اطمینان نے لے لی ہے ۔ قلق و پریشانیوں کی جگہ اب وہ مطمئن ہیں اور اب اہل ایمان کے دل اس قدر سکون اور ٹھہراؤ اور ثبات پا چکے ہیں کہ وہ اللہ کا قرب' اللہ کی نگرانی اور اللہ کی پناہ میں اپنے آپ کو اب محفوظ تصور کرتے ہیں ۔

کون ہے جو انسان کے خدشات کو اس انداز میں محسوس کر سکتا ہے اور ان کو اس طرح دور کر سکتا ہے ماسوائے خالق کائنات کے ۔ جو ان تمام باتوں سے واقف ہوتا ہے' جو دلوں میں گزرتی ہیں ۔

مومنین کے ساتھ اس مختصر مکالمہ کے بعد روئے سخن پھر مشرکین کے باہم متضاد افکار کی طرف پھر جاتا ہے ۔ ان کے تصورات اس قدر غیر معقول ہیں کہ وہ ایک طرف تو یہ اقرار کرتے ہیں کہ صرف اللہ ہی ہے جو زمینوں اور آسمانوں کا خالق ہے ۔ وہی ہے جس نے شمس و قمر کو مسخر کر رکھا ہے ۔ وہی ہے جو آسمانوں سے بارشیں برساتا ہے اور زمین کو مردہ ہونے کے بعد دوبارہ زندہ کرتا ہے اور یہ کہ وہی ہے جو رزق کو کھلا بھی کرتا ہے اور تنگ بھی کرتا ہے ۔ جب یہ لوگ انتہائی خوف کی حالت میں ہوتے ہیں تو صرف اللہ کو پکارتے ہیں ۔ لیکن ان باتوں کو تسلیم کرنے کے بعد یہ لوگ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں ۔ جو لوگ صرف اللہ وحدہ کو پکارتے ہیں اور اس کی بندگی کرتے ہیں' یہ ان کو اذیت دیتے ہیں ۔ حالانکہ اللہ کو یہ بھی تسلیم کرتے ہیں اور بلاوجہ یہ لوگ ایسے لوگوں پر مظالم ڈھاتے ہیں ۔ اللہ نے ان پر جو احسانات کیے' ان کو یہ لوگ بھلاتے ہیں اور اللہ کے بندوں کو بیت اللہ میں خوفزدہ کرتے ہیں ۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ۚ فَأَنّٰى يُؤْفَكُونَ ﴿٦١﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ
الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۚ إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيمٌ ﴿٦٢﴾ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ ۶
بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٦٣﴾ وَمَا ۱۲ع
هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ ۚ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۲
لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٦٤﴾ فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ

فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۫
فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ
حَوْلِهِمْ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ
افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهٗ ۭ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾

”اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سورج کو کس نے مسخر کر رکھا ہے تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے 'پھر یہ کدھر سے دھوکا کھا رہے ہیں؟ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں میں سے جس کا چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کرتا ہے' یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے اور اگر تم ان سے پوچھو کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے مردہ پڑی ہوئی زمین کو جلا اٹھایا تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے۔ کہو 'الحمد للہ' مگر ان میں سے اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔

اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا۔ اصل زندگی کا گھر تو دار آخرت ہے 'کاش یہ لوگ جانتے۔ جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں' پھر جب وہ انہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو یکایک یہ شرک کرنے لگتے ہیں تاکہ اللہ کی دی ہوئی نجات پر اس کا کفران نعمت کریں۔ اور (حیات دنیا کے) مزے لوٹیں۔ اچھا' عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ کیا یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے ایک پر امن حرم بنا دیا ہے حالانکہ ان کے گرد و پیش لوگ اچک لیے جاتے ہیں؟ کیا پھر بھی یہ لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا کفران کرتے ہیں؟ اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا حق کو جھٹلائے جب کہ وہ اس کے سامنے آ چکا ہو؟ کیا ایسے کافروں کا ٹھکانا جہنم ہی نہیں ہے؟“

ان آیات میں نزول اسلام سے قبل عرب عقائد کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے اصل عقائد توحید پر مبنی تھے۔ بعد کے ادوار میں ان کے عقائد اور نظریات کے اندر انحراف پیدا ہو گیا۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے کیونکہ یہ اولاد اسماعیل تھے۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم کے دین پر ہیں اس لیے وہ اپنے عقائد کو حضرت اسماعیل و ابراہیم علیہم السلام کی طرف منسوب کرتے تھے۔ یہ لوگ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے دین کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔ یہ دین جزیرۃ العرب کے آس پاس موجود تھے کیونکہ یہ لوگ دین ابراہیم کو برتر سمجھتے ہوئے 'اس پر فخر کرتے تھے۔ لیکن وہ اس بات کو سمجھ نہ سکتے تھے کہ ان کے عقائد کے اندر اصل دین کے مقابلے میں کس قدر انحراف آ گیا ہے اور عملاً وہ مشرک ہو گئے ہیں۔

جب ان سے پوچھا جاتا کہ آسمانوں اور زمینوں کا خالق کون ہے؟ اور شمس و قمر کو کس نے مسخر کیا ہے؟ آسمانوں سے پانی کون برساتا ہے؟ مردنی کے بعد زمین میں روئیدگی کون لاتا ہے؟ تو یہ لوگ صاف صاف اقرار کرتے ہیں کہ یہ سب کام اللہ ہی کرنے والا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بتوں کو بھی پوجتے ہیں۔ جنوں کی عبادت بھی کرتے ہیں 'ملائکہ کی پرستش بھی کرتے ہیں' اور ان سب کو عبادت میں اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ جبکہ تخلیق میں ان کو اللہ کے ساتھ

شریک نہیں کرتے ۔ یہ عجیب تناقض تھا۔ اس تضاد کی وجہ سے ان آیات میں اللہ ان کے اس طرز فکر پر تعجب کا اظہار فرماتے ہیں :

فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۲۹ : ۶۱) "پھر یہ کدھر سے دھوکہ کھا رہے ہو"۔ یعنی کس طرح تم حق سے پھر کر ان مغلوبہ عقائد میں پھنس گئے ہو۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۲۹ : ۶۳) "ان میں سے اکثر لوگ سمجھتے نہیں"۔ کیونکہ جس کی عقل سلیم ہو وہ ایسے عقائد اختیار نہیں کرتا۔

خالق سماوات و ارض کے بارے میں سوال شمس و قمر کے مسخر کرنے والے کے بارے میں دریافت اور آسمانوں سے پانی نازل کرنے والے کے بارے میں سوال اور مردہ زمین کو سرسبز کرنے والے کے بارے میں سوال کے درمیان یہ بھی قرار دیا جاتا ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جو کسی کا رزق تنگ کر دیتا ہے اور کسی کا کشادہ کر دیتا ہے ۔ یوں تمام آثار قدرت کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ رازق بھی وہی ہے اور اللہ تمام مخلوقات کو جانتا ہے ۔ اور سب کو رزق پہنچاتا ہے ۔

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲۹ : ۶۲) "یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے"۔

آسمانوں کی گردش کے ساتھ رزق واضح طور پر مربوط ہے ۔ پانی ، زندگی اور روئیدگی بھی گردش افلاک سے مربوط ہے ۔ اسی طرح رزق کی کشادگی اور تنگی بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔ یہ تمام مظاہر ان آیات میں واضح طور پر دکھائے گئے ہیں ۔ رزق پانی سے وجود میں آتا ہے ۔ نہریں اور دریا بارش سے بہتے ہیں اور ان کی وجہ سے حیات و نبات قائم ہیں ۔ یہ پانی زمین کے اندر بھی ذخیرہ ہوتا ہے اور اوپر بھی بہتا ہے اور اس کی وجہ سے بحر و بر کا شکار پیدا ہوتا ہے ۔ غرض تمام ارزاق پانیوں سے وابستہ ہیں ۔ اس کائنات کے نوامیس فطرت کے مطابق پانی پیدا ہوتے ہیں اور شمس و قمر کے سب مظاہر شمس و قمر کی تسخیر کے نتیجے میں ' اور اگر یہ نوامیس فطرت ذرہ بھر بدل جائیں تو سطح زمین کا یہ منظر ہی یکلخت بدل جائے ۔ پھر زمین کے اندر کے تمام ذخائر اور قدرتی وسائل بھی اللہ کے جاری کردہ نوامیس زمان و مکان کے مطابق ہیں ۔ زمین کی یہ تمام بوقلمونیاں شمس و قمر کی گردش کے نتیجے میں ہیں (فی ظلال پارہ ۱۹ میں ہم نے تفصیلات دی ہیں )۔

قرآن کریم اس عظیم کائنات اور اس کے مشاہد و مناظر کو بطور حجت اور برہان پیش کرتا ہے ۔ جو سچائی قرآن لے کر آیا ہے اس کا نکتہ تدبر یہ عظیم کائنات ہے ۔ ایک متفکر اور سوچ رکھنے والا دل اس عظیم کائنات پر ضرور غور کرتا ہے ۔ وہ اس کائنات کے عجائبات کو دیکھ کر زندہ و بیدار رہتا ہے ' دست قدرت کی صنعت کاریوں کو سمجھتا ہے ۔ اس وسیع کائنات کے لیے جو نہایت ہی اٹل ناموس قدرت وضع کیا گیا ہے وہ اس کا شعور رکھتا ہے ۔ وہ نہایت ہی ٹھنڈے دل اور نہایت ہی سنجیدگی سے اور نہایت ہی سہولت سے اس شعور کو پا لیتا ہے ۔ اسے بہت گہرے غور و فکر کی ضرورت بھی نہیں پڑتی اور جب بھی یہ زندہ اور بیدار دل اس کائنات کی عظیم آیات میں سے کوئی نشانی پا لیتا ہے تو وہ اللہ کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہو جاتا ہے ۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۲۹ : ۶۳) "کہو الحمدللہ، مگر ان میں سے اکثر لوگ سمجھتے نہیں"۔

زمین کے اوپر آثار حیات اور رزق کی تنگی اور کشادگی کے حوالے سے انسانوں کے سامنے اقدار حیات کا حساس ترازو رکھ دیا جاتا ہے کہ دیکھو دنیا کی یہ زندگی اپنی تمام بوقلمونیوں اور لہو ولعب کے باوجود ایک تحصیل تماشا ہے۔ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۲۹ : ۶۴) "اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا۔ اصل زندگی کا گھر تو دار آخرت ہے، کاش یہ لوگ جانتے۔ یہ زندگی عمومی لحاظ سے تو ایک کھیل تماشا ہی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب یہ اس طرح گزر رہی ہو کہ آخرت کی کوئی فکر نہ ہو اور یہی دنیا لوگوں کا مقصد اعلیٰ ہو اور اس دنیا کا سازوسامان ہی غایت زندگی ہو۔ رہی آخرت کی زندگی تو وہ حقیقی زندگی ہے اور اس میں نہایت ہی اعلیٰ معیار ہوگا۔ وہی حقیقی زندگی ہے۔ وہ بھرپور ہے اور اس میں حقیقی حیات اور نشاط ہے۔

یہ کہہ کر قرآن یہ تعلیم بھی نہیں دیتا کہ دنیا کو ترک کر دیا جائے یا اس کے متاع کو دور پھینک دیا جائے یا زندگی کی سرگرمیوں سے فرار اختیار کر کے رہبانیت اختیار کی جائے۔ یہ نہ اسلام کی روح ہے اور نہ اسلام زندگی کا یہ رخ اختیار کرتا ہے بلکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اصل ہدف آخرت ہو اور حدود اللہ کا لحاظ رکھا جائے۔ اس زندگی پر سربلندی حاصل کر کے اسے اپنے قبضہ قدرت میں رکھا جائے اور انسان اس دنیا کے متاع کا اسیر نہ بن جائے۔ انسان زندگی کے فرائض پورے کرے اور اس سے فرار اختیار نہ کرے۔ غرض اصل مسئلہ صحیح سوچ اور صحیح قدر کا ہے۔ انسان کو اس دنیا کی بھی صحیح قدر و قیمت معلوم ہونا چاہئے اور آخرت کی بھی صحیح قدر و قیمت معلوم ہونی چاہئے۔ مومنین کو ان اقدار کا صحیح شعور ہونا ضروری ہے۔ اس طرح جب ایک باشعور مومن دنیا سے معاملہ کرے گا تو اس کا نقطہ نظر معتدل ہوگا کہ دنیا تو کھیل تماشا ہے مختصر وقت کے لیے ہے اور آخرت اس طرح سنجیدگی کے لائق ہے جس طرح کھیل تماشے اور میلے ٹھیلے کے بعد انسان سنجیدگی سے اس دنیا کے کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ فکر و نظر کی اس درستگی کے بعد اب بتایا جاتا ہے کہ کفار کے فکر و نظر میں کیا کیا تضادات ہیں۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ (۲۹ : ۶۶) "جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں۔ پھر جب وہ انہیں بچا کر خشکی پر لے جاتا ہے تو یکایک یہ شرک کرنے لگتے ہیں"۔ یہ بھی ان کے عقائد کا بہت بڑا تضاد ہے۔ ان کے عقائد اس قدر ڈانواں ڈول ہوتے ہیں کہ جب کشتی پر وہ گہرے سمندر میں ہوتے ہیں اور یہ جہاز بحری امواج کے تلاطم میں ایک کھلونا بن جاتا ہے اور ان پر خوف طاری ہوتا ہے تو وہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں

پکارتے ۔ اس وقت ان کو یہ ادراک ہوتا ہے کہ اصل قوت تو صرف اللہ ہی کی قوت ہے ۔ پھر ان کی سوچ میں بھی اللہ وحدہ ہوتا ہے اور اس کی زبان پر بھی اللہ وحدہ کا نام ہوتا ہے ۔ اب وہ اپنی اس فطرت کے تابع ہوتے ہیں جو وحدانیت کا شعور رکھتی ہے ۔ لیکن جب اللہ ان کو بچا کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو یہ لوگ اچانک پھر شرک کرنے لگتے ہیں اور وہ فطری شعور پھر دب جاتا ہے ۔ اب اچانک وہ اس حالت کو بھول جاتے ہیں جس میں وہ اللہ وحدہ کو پکارتے تھے اور اقرار اور تسلیم کے بعد دوبارہ یہ لوگ شرک کی راہ پر پڑ جاتے ہیں ۔

اس بے راہ روی اور گمراہی کا انجام کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ یہ لوگ ان انعامات کی ناشکری اور کفر کرتے ہیں جو اللہ نے ان کو دیئے ہوتے ہیں ۔ یہ لوگ اس فطری راہ سے منحرف ہو جاتے ہیں جو اللہ نے ان کی شخصیت کے اندر ودیعت کر دی ہوئی ہے ۔ ان فطری براہین کو نظرانداز کر دیتے ہیں جن کو وہ محسوس کرتے ہیں اور وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ حیات دنیا تو ایک محدود وقت تک کے لیے ایک سازوسامان ہے لیکن ان کو بہت جلد اپنے حقیقی انجام کا پتہ چل جائے گا ۔ وہ بہت ہی برا انجام ہو گا ۔

لِيَكْفُرُوا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ وَلِيَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (۲۹ : ۶۶) ”تاکہ اللہ کی دی ہوئی نجات پر اس کا کفران نعمت کریں اور حیات دنیا کے مزے لوٹیں ۔ اچھا عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا“ ۔ یہ نہایت ہی شدید ڈراوا ہے یعنی نامعلوم مصیبت کا ۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا؟

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو بتاتے ہیں کہ دیکھو اللہ نے تم کو یہ ”حرم امن“ دیا ہے جس کے اندر تم نہایت ہی امن و سکون سے زندگی بسر کرتے ہو ۔ کیا اللہ کی اس عظیم نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے ۔ یوں کہ صرف اللہ کی بندگی کریں اور اسی کو پکاریں بلکہ اس کے برعکس اس حرم امن میں اہل ایمان کو تم ڈراتے اور پریشان کرتے ہیں ۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ (۲۹ : ۶۷) ”کیا یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے ایک پرامن حرم بنایا ہے حالانکہ ان کے گردوپیش لوگ اچک لیے جاتے ہیں ۔ پھر بھی یہ لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کا کفران کرتے ہیں“ ۔

اہل مکہ کی حالت یہ تھی کہ وہ حرم مکی کی وجہ سے نہایت ہی امن و سکون سے زندگی بسر کرتے تھے ۔ لوگ بیت اللہ کی وجہ سے ان کی تعظیم کرتے تھے ۔ ان کے اردگرد جو عرب قبائل تھے وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کے دل میں دوسرے کا خوف ہوتا تھا ۔ ان کو اگر امان نصیب ہوتا تھا تو بیت اللہ کے سائے میں ہوتا تھا ۔ اور یہ امان اللہ نے دیا تھا لیکن یہ بہت بڑی ناشکری کی بات تھی کہ یہ لوگ بیت اللہ کو بتوں کا اڈہ بنا دیں اور بیت اللہ میں غیر اللہ کی بندگی ہوتی رہے ۔

اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ (۲۹ : ۶۷) ”کیا پھر بھی یہ لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں“ ۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ (۲۹ : ۶۸) ''اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا حق کو جھٹلائے جبکہ وہ اس کے سامنے آ چکا ہو' کیا ایسے کافروں کا ٹھکانہ جہنم نہیں...؟'' اور اہل مکہ اس جرم کا ارتکاب کر چکے ہیں ۔ انہوں نے اللہ پر افتراء باندھا ہے کہ اللہ نے خود اپنے ساتھ شریک ٹھہرائے ہیں اور ان کے پاس حق آ گیا اور انہوں نے تکذیب کر دی ہے ۔ آخر جہنم کے ٹھکانے کے سوا ایسے لوگ اور کس مقام کے مستحق ہیں ۔ اور ان کے پاس حق آ گیا اور انہوں نے تکذیب کر دی ہے ۔ آخر جہنم کے ٹھکانے کے سوا ایسے لوگ اور کس مقام کے مستحق ہیں ۔ یقیناً ایسے لوگ جہنم کے مستحق ہیں ۔

سورہ کا خاتمہ کفار کے فریق مقابل کی تصویر کشی پر ہوتا ہے ۔ وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی راہوں میں جدوجہد کی تاکہ وہ اللہ تک پہنچ جائیں ۔ ان کا رابطہ اللہ سے ہو جائے ۔ جنہوں نے اللہ کی راہ میں ناقابل برداشت مصائب جھیلنے کے باوجود نہ اپنا عہد توڑا اور نہ مایوس ہوئے ۔ جنہوں نے نفس کی خواہشات پر قابو پایا اور لوگوں کے تشدد کو بھی برداشت کیا ۔ جنہوں نے اپنے بوجھ اٹھائے اور ان بھاری بوجھوں کے ساتھ اس طویل سفر پر چل پڑے ' جو طویل بھی تھا اور پر مشقت بھی ۔ ایسے لوگوں کو اللہ اس سفر میں تنہا نہیں چھوڑتا اور نہ ان کے ایمان کو ضائع کرتا ہے اور نہ ان کی اس جدوجہد کو بھولتا ہے ۔ اللہ اپنے عرش بریں سے ان کو دیکھ رہا ہے اور ان سے بہت ہی راضی ہے ۔ وہ دیکھ رہا ہے اور قدم قدم پر ان کی راہنمائی کرتا ہے ۔ وہ ان کی کوششوں کو دیکھے گا اور ان کے ہاتھ پکڑ کر ان کو صحیح راہ پر ڈال دے گا ۔ ان کے صبر اور ان کی پاکیزگی کو دیکھا جا رہا ہے وہ بہت ہی اچھی جزاء دینے والا ہے ۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾ ع ۶ / ۳

''جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے ' اور یقیناً اللہ نیکو کاروں ہی کے ساتھ ہے'' ۔

--- ○○○ ---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ------ ۲۱

سورۂ روم ۔ ۳۰

آیات ۱--- تا--- ۶۰

# سورۂ روم ایک نظر میں

اس سورہ کی ابتدائی آیات ایک مخصوص تاریخی واقعہ کے حوالے سے نازل ہوئیں' جب اہل فارس نے اہل روما پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ کیونکہ فارس والے جزیرۃ العرب کو اپنے ماتحت رکھنا چاہتے تھے۔ یہ اس دور کا واقعہ ہے جب مکہ میں مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان نظریاتی جنگ جاری تھی۔ مسلمان مکہ میں تھے۔ ابھی ہجرت نہیں ہوئی تھی۔ اس دور میں رومی چونکہ اہل کتاب یعنی نصاریٰ تھے اور اہل فارس مجوسی یعنی مشرک تھے۔ اس لیے اس غلبے پر اہل مکہ خوش تھے کہ ایک مشرک ملت کے لوگ ایک کتابی ملت پر غالب آ گئے۔ انہوں نے مکہ میں شرک اور توحید کی کشمکش میں اس واقعہ کو اپنے لیے نیک فال تصور کیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ان آیات میں پیش گوئی کی گئی کہ چند سالوں کے اندر اندر اہل کتاب رومی' مشرک فارسیوں پر غلبہ پالیں گے اور اس وقت اہل ایمان خوش ہوں گے کیونکہ اہل ایمان دوسری ملتوں کے اہل توحید کے بھی حامی تھے۔ لیکن قرآن کریم نے بس صرف یہی بتانے پر اکتفاء نہیں کیا کہ اس واقعہ میں مشرکین مکہ کی پسندیدہ قوت کو جلد ہی شکست ہوگی بلکہ قرآن کریم مسلمانوں کو اس مخصوص واقعہ اور اس کے ماحول سے ذرا آگے ایک وسیع دنیا میں لے جاتا ہے کیونکہ یہ واقعہ تو ایک جزئی اور وقتی واقعہ تھا۔ قرآن کریم مسلمانوں کو بتاتا ہے کہ وہ جس حق اور جس سچائی کے حامل ہیں وہ دراصل اس عظیم سچائی اور حق کا ایک حصہ ہے جس کے اوپر زمین و آسمان اور اس پوری کائنات کا نظام قائم ہے اور ان دونوں سچائیوں کے درمیان گہرا ربط ہے۔ اس طرح انسانوں کا ماضی' ان کا حال اور ان کا مستقبل باہم مربوط ہیں۔ پھر اسی طرح یہ بات اس کائنات سے بھی آگے بڑھ کر عالم آخرت میں داخل ہوتی ہے اور اس حیات دنیا کے بعد بات اخروی زندگی میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس زمین کی محدود زندگی سے انسانوں کو آخرت کی وسعتوں میں لے جایا جاتا ہے۔ پھر اس پوری کائنات کی سیر کرائی جاتی ہے' پھر انسانی نفس کی گہرائیوں میں' انسان کے شب و روز میں انسانی فطرت کے عجائبات بتائے جاتے ہیں۔ یوں انسان اس محدود واقعہ کے حوالے سے اس عظیم کائنات کی وسعتوں میں چلا جاتا ہے اور علم و معرفت کے بے قید اصول معلوم کر کے اس کی زندگی لامحدود ہو جاتی ہے۔ اس کا نصب العین بلند' منزل بہت اعلیٰ و ارفع ہو جاتی ہے' اور وہ زمان و مکان کی تنگیوں سے نکل کر اللہ کی اس کائنات کی وسعتوں میں گم ہو جاتا ہے۔ اس کا ماضی' اس کا حال اور اس کا مستقبل سب کے سب اللہ کے وسیع اور لازوال قانون قدرت اور سنن فطرت میں گم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ایک مومن انسان کے ہاں اس دنیا کے تعلقات و روابط' اس عظیم کائنات کے حوالے سے' بہت ہی وسیع اور ارفع ہو جاتے ہیں اس لیے کہ اس کے ذہن میں وہ قوانین بہت ہی عظیم ہوتے ہیں جو اس عظیم کائنات کو چلاتے ہیں' وہ اصول بہت ہی حکیمانہ ہوتے ہیں جو فطرت انسانی میں ودیعت کر دیئے گئے ہیں۔ انسانی زندگی' اس کے مختلف حوادث' اور اس میں فتح و شکست اور وہ پیمانے جن کے مطابق انسانی اعمال کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے اور جن اصولوں کے

مطابق انسان اس زمین پر کام کرتا ہے اور جن کے مطابق اسے آخرت میں جزاء و سزا ملے گی' یہ سب پیمانے اور اصول اعلیٰ اور بامقصد ہو جاتے ہیں۔ اس سے اس پوری زندگی کے بارے میں انسان کا تصور بلند ہو جاتا ہے۔

اس ہمہ گیر اور بلند تصور کے نقطہ نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے جو دعوت دی ہے وہ عالمی اور ابدی دعوت ہے اور اس کا تعلق اس جہاں اور اس کے پورے ماحول سے ہے۔ اگرچہ یہ دعوت مکہ کے بلند پہاڑوں کے درمیان سے اٹھ رہی ہے لیکن یہ وہاں مکہ تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ اس کائنات کی فطرت سے مربوط ہے۔ اس کائنات کے قوانین سے ہم آہنگ ہے۔ نفس انسانی اور اس کے حالات کے عین مطابق ہے۔ انسان کے ماضی' حال اور مستقبل کا اس میں لحاظ رکھا گیا ہے۔ نہ صرف اس زمین پر بلکہ عالم آخرت کے ساتھ بھی اس دعوت کا گہرا تعلق ہے۔

یہ دعوت قلب مومن کو ان وسعتوں سے باندھ دیتی ہے۔ ایک مسلم کا تصور اور اس کا شعور اور اس کی اقدار حیات وسیع اور رفیع ہو جاتی ہیں۔ انسان کی نظریں عالم بالا پر' آسمان پر اور آخرت پر ہوتی ہیں۔ عالم بالا اور عالم سماوات کے اسرار و رموز پر وہ غور کرتا ہے۔ اس کی تحقیق' اس کے انقلابات پر اس کی نظر رہتی ہے اور یہ مخصوص واقعہ کو نہیں بلکہ اس کائنات کے تمام حادثات کو وہ اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اس عظیم کائنات بلکہ کائناتوں کے ایک سمندر میں اس کا موقف ایک عظیم امت کا موقف ہوتا ہے۔ وہ اپنی قدر و قیمت جانتا ہے' وہ اپنے اس عظیم تصور کی اہمیت سے واقف ہوتا ہے' اللہ کے حوالے سے بھی اور دوسرے انسانوں کے حوالے سے بھی' یوں ایک مومن عظیم انسان ہوتا ہے اور اس کا کردار بھی عظیم ہوتا ہے۔ وہ علی وجہ البصیرت اپنے اس کردار کو ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے فرائض ادا کرتا ہے نہایت اطمینان' نہایت وثوق اور نہایت اہتمام کے ساتھ۔

ان روابط پر غور کرنے' اس کائنات میں ان کے مفہوم و مدلول کو سمجھنے اور پھر انسانی دلوں میں ان کا تصور بٹھانے کے لیے یہ سورہ دو حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔

پہلے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ مومنین کی کامیابی اسی طرح برحق ہے جس طرح یہ کائنات ایک برحق نظام پر قائم ہے اور اہل ایمان کی اس کامیابی کے ساتھ دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کا تعلق ہے۔ انسانی تاریخ میں اللہ کی جو سنت کارفرما رہی ہے وہ بھی اس پر شاہد عادل ہے۔ کائنات کا یہ نظام شاہد ہے کہ اللہ دوبارہ تمام انسانوں کو اٹھائے گا اور حساب و کتاب ہوگا۔ اس لیے پہلے حصے میں قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر بھی یہاں پیش کیا جاتا ہے اور اس میں مومنین اور کافرین کے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا' وہ دکھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر اس کائنات پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے اندر اللہ کی کیا کیا نشانیاں پوشیدہ ہیں اور انسان کے دل و دماغ پر وہ نشانیاں کیا اثرات چھوڑتی ہیں۔ پھر خود انسان اور اس کے مملوک غلاموں کی مثال دے کر دکھایا جاتا ہے کہ عقیدہ شرک کس قدر غیر معقول عقیدہ ہے اور یہ کہ یہ نظریہ محض خواہشات نفسانیہ پر مبنی ہے' کسی سچائی اور کسی دلیل کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ آخر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپؐ اس سیدھے راستے پر ثابت قدمی کے ساتھ گامزن رہیں' یہ واضح راستہ ہے' فطری راستہ ہے جس کے اندر کوئی ٹیڑھ اور کوئی تغیر نہیں ہے اور یہ راستہ انسانوں کو متحد کرتا ہے' ان کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں کرتا جس طرح اہل شرک نے انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے طبقات میں تقسیم کر دیا ہے۔

دوسرے حصے میں بتایا گیا ہے کہ لوگوں کے اندر کس قدر تلون مزاجی ہے۔ اس تلون مزاجی کے اوپر زندگی کی

عمارت تعمیر نہیں ہو سکتی ۔ زندگی کا نظام تو ناقابل تغیر و تبدل اصولوں پر ہی قائم ہو سکتا ہے جن کو کچھ مخصوص لوگوں کی خواہشات کے مطابق بدلا نہ جا سکے ۔ ان کے سامنے خود انسانوں کے وہ حالات رکھے جاتے ہیں جن میں وہ امن و عافیت میں ہوں یا مصیبت اور مشکلات میں ہوں' خوشحال ہوں یا بدحال ہوں ۔ اس مناسبت سے پھر اس رزق کو خرچ کرنے اور اس کو ترقی دینے کا مضمون اور پھر رزق الٰہی کے حوالے سے شرک اور شرکاء کا تذکرہ کہ یہ ٹھہرائے ہوئے خود ساختہ شرکاء نہ تو رزق دے سکتے ہیں نہ زندگی عطا کر سکتے ہیں' نہ مار سکتے ہیں ۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر فساد لوگوں کے اعمال کی وجہ سے ہوتا ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ زمین میں سیر کرو' اور اس کے جغرافیائی مطالعہ کے ساتھ تاریخی مطالعہ کرو اور دیکھو کہ مشرکین کا انجام ہمیشہ کیا ہوتا رہا ہے ۔ حضور اکرم ؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ دین فطرت پر سیدھے جمے رہو یہاں تک کہ وہ دن آجائے جس میں ہر شخص کے سامنے اس کی کمائی رکھ دی جائے گی ۔ اس دوسرے حصے میں بھی مشاہد کائنات پیش کیے جاتے ہیں جس طرح پہلے حصے میں اس کائنات سے نشانیاں پیش کی گئی تھیں ۔ حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کے طریقے پر چلو ۔ رسول کا فریضہ تو صرف ابلاغ ہے ۔ رسول تو نہ اندھوں کو ہدایت کر سکتا اور نہ بہروں کو سنا سکتا ہے ۔ اس کے بعد خود انسان کے انفس کی سیر کرائی جاتی ہے اور اس کی پیدائش سے انتہا تک اسے اس کے اطوار حیات دکھائے جاتے ہیں کہ کس طرح انسان کو پیدا کیا گیا اور طفولیت کا دور کیسے گزرا ۔ پھر موت آئے گی اور دوبارہ بعث بعد الموت ہوگی ۔ یہ دوسرا حصہ بھی ختم ہوتا ہے اور رسول اللہ کو ہدایت دی جاتی ہے کہ آپ دعوت دیں ۔ صبر کریں اور لوگ جو تکالیف دیتے ہیں ان کو برداشت کریں ۔ اللہ نے جو وعدہ کیا ہے وہ آنے والا ہے لہٰذا آپ ان لوگوں کے طرز عمل سے پریشان نہ ہوں جو ایمان نہیں لاتے ۔

سورہ کی فضا اور اس کا انداز بیان سورہ کے مرکزی مضمون اور محور کی تصویر کشی میں باہم معاون ہیں ۔ محور یہ ہے کہ لوگوں کے حالات' زندگی کے واقعات' ان کی تاریخ اور ماضی اور حال کے درمیان گہرا ربط ہوتا ہے ۔ یہ سب امور پھر ان سنن الٰہیہ کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں جو اس کائنات میں جاری و ساری ہیں ۔ لہٰذا انسان کی ہر حرکت اور اس کا سکون' انسان کو پیش آنے والا ہر حادثہ اور اس کا ہر حال' انسان کی ہر سرگرمی اور اس کا ہر انجام' اس دنیا میں اس کی فتوحات اور ناکامیاں سب کی سب انسان کے ان روابط اور تعلقات کی روشنی میں ظاہر ہوتی ہیں ۔ اور ان کا سنن کونیہ کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے اور اصل بات یہ ہوتی ہے کہ تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں ۔

لِلّٰهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ (۳۰ : ۴) "تمام امور اللہ کے لیے ہیں' پہلے بھی اور بعد میں بھی" ۔ اور یہ وہ اساسی حقیقت جس کی توثیق و تاکید پورا قرآن کرتا ہے اور یہ بات اسلامی نظریہ حیات کی اساسی حقیقت ہے ۔ اسی اسلامی تصور حیات سے' اقدار' شعور اور اقدار و پیمانے پھوٹتے ہیں اور اس کے سوا کوئی تصور حیات اور کوئی قدر درست نہیں ہو سکتی' نہ اسلام اس کو تسلیم کرتا ہے ۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۸۲ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۳۲

---

سُوْرَةُ الرُّوْمِ (۳۰) مَكِّيَّةٌ (۸۴) اٰيَاتُهَا ۶۰ رُكُوْعَاتُهَا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿۲﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿۳﴾
فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۛ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۴﴾
بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۵﴾ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ
اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ښ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۷﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ا ـ ل ـ م ـ رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں' اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے ـ اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی ـ اور وہ دن وہ ہو گا جب کہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے ـ اللہ نصرت عطا فرماتا ہے جسے چاہتا ہے' اور وہ زبردست اور رحیم ہے ـ یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے' اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں ـ لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں"۔

سورہ کا آغاز حروف مقطعات سے ہے ـ اشارہ اس طرف ہے کہ یہ قرآن اور یہ سورہ انہی حروف سے بنائے گئے ہیں' جو عربوں کی دسترس میں ہیں لیکن اس کے باوجود یہ قرآن اور یہ سورہ معجز ہیں ـ آج تک وہ اس قسم کا کلام نہیں بنا سکے ـ یہ حروف تہجی خود ان کی زبان کے ہیں اور وہ ان سے کلمات و کلام بنا سکتے ہیں۔

اس کے بعد وہ بچی تاریخی پیش گوئی آتی ہے جس میں یہ کہا گیا کہ رومی چند سالوں میں پھر غالب آ جائیں گے ۔ ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ ایرانی رومیوں پر غالب تھے اور مشرکین عرب چاہتے تھے کہ ایرانی رومیوں پر غالب رہیں اور مسلمانوں کی خواہش نہ تھی کہ ایرانی رومیوں پر غالب آ جائیں ۔ اس لیے کہ رومی اہل کتاب تھے اور وہ مسلمانوں کے ذہن کے قریب تھے ۔ جب یہ آیت نازل ہوئی :

الٓمّٓ (۳۰ : ۱) غُلِبَتِ الرُّوْمُ (۳۰ : ۲) فِیْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ (۳۰ : ۳) فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ --- (۳۰ : ۴) "ا ـ ل ـ م ـ رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں 'اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے" ۔ تو مشرکین مکہ نے کہا ابوبکر! تمہارے دوست کہتے ہیں کہ رومی چند سالوں میں غالب آ جائیں گے ۔ تو حضرت ابوبکر نے فرمایا ہاں ' وہ سچ کہتے ہیں ۔ تو انہوں نے کہا شرط لگاتے ہو ' تو انہوں نے سات سالوں کی میعاد پر چار اونٹنیوں کی شرط لگائی ۔ یہ سات سال گزر گئے اور کچھ نہ ہوا ۔ مشرکین اس پر بہت ہی خوش ہوئے ۔ یہ بات مسلمانوں پر ناگوار گزری ۔ انہوں نے حضورؐ کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے فرمایا تمہاری زبان میں بضع سنین کا مفہوم کیا ہے ؟ تو انہوں نے فرمایا دس سے کم ۔ تو آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو حکم دیا کہ جائیں اور میعاد میں دو سال کا اضافہ کر دیں ۔ کہتے ہیں دو سال ابھی نہ گزرے تھے کہ سواروں نے آکر اطلاع دی کہ رومی فارس پر غالب آگئے ہیں ۔ اس پر مسلمانوں کو بہت خوشی ہوئی ۔

اس بارے میں بہت سی روایات وارد ہیں ۔ ان میں سے ہم نے امام ابن جریر کی روایت اختیار کی ہے ۔ قبل اس کے کہ ہم اس واقعہ سے آگے بڑھیں ' اس واقعہ میں جو ہدایات ہیں ان پر غور ضروری ہے ۔

اس واقعہ میں ہمارے لیے پہلی نصیحت یہ ہے کہ شرک اور کفر ہر زمان و مکان میں ایک ملت ہوتے ہیں اور وہ ہمیشہ ایمان اور عقیدۂ توحید کے خلاف رہے ہیں ۔ اگرچہ اس دور میں دنیا کی حکومتوں کے باہم روابط ہمارے دور کی طرح گہرے نہ تھے اس کے باوجود مشرکین مکہ یہ سمجھتے تھے کہ پوری دنیا میں مشرکین کا غلبہ ان کا غلبہ ہے ' اور اہل کتاب پر مشرکین کی فتح ان کی فتح ہے ۔ مکہ کے مسلمان بھی یہ سمجھتے تھے کہ ان کے اور اہل کتاب کے درمیان رابطے کی اساس موجود ہے اور وہ بھی اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ اہل کتاب پر مشرکین کو کسی بھی جگہ غلبہ حاصل ہو ۔ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ ان کی دعوت اور تحریک اس جہان میں الگ تھلگ نہیں رہ سکتی ۔ اور کفر و ایمان کی اس کشمکش پر بیرونی واقعات اثر انداز ہو سکتے ہیں ۔

یہ وہ کھلی حقیقت ہے جس سے ہمارے دور کے اکثر لوگ غافل ہیں اور وہ اس حقیقت کو اس طرح نہیں سمجھ سکتے ' جس طرح اس کو رسول اللہؐ کے زمانے کے مسلمانوں نے سمجھا تھا ۔ حالانکہ چودہ سو سال گزر چکے ہیں ۔ آج کے مسلمان صرف جغرافیائی حدود یا قومیت کی اصطلاح میں سوچتے ہیں حالانکہ مسئلہ دراصل کفر و ایمان کا ہے اور اصل معرکہ حزب اللہ اور حزب الشیطان کے درمیان ہے ۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان اس کشمکش کی اصل حقیقت کو سمجھیں کہ اصل مسئلہ کیا ہے ؟ اگر مسلمانوں نے اصل مسئلے کو سمجھ لیا تو پھر کفر و شرک کی علم بردار جماعتوں نے جو مختلف رنگوں کے جھنڈے اٹھائے ہوئے ہیں ' وہ مسلمانوں کو دھوکہ نہیں دے سکتے ۔ یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف جنگ ' محض اسلامی نظریہ حیات کی وجہ سے

کرتے ہیں۔ ذہنی طور پر معرکے کے اسباب و علل جو بھی ہوں' اصل جنگ نظریات کی ہے۔

دوسرا سبق اس واقعہ میں یہ ہے کہ اللہ کے وعدے پر بھروسہ کرو' جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے فوراً کہا کہ حضور اکرمؐ نے سچ کہا' جبکہ مشرکین کے نزدیک حضورؐ کا یہ کلام تعجب انگیز تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے صاف صاف کہہ دیا "انہوں نے سچ کہا"۔ انہوں نے شرط باندھی اور ابوبکرؓ نے قبول کر لی اور اللہ نے جو کہا تھا کہ چند سالوں میں یہ واقعہ ہو جائے گا تو ہو گیا۔ یہ پختہ اعتماد' یقین اور بھروسہ ہی تھا جس نے مسلمانوں کے دلوں کو یقین اور ثابت قدمی سے بھر دیا تھا اور وہ تمام مصائب اور مشکلات کو خوشی خوشی جھیل رہے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ کا کلمہ مکمل ہو گیا اور اللہ کا وعدہ سچا ہو گیا اور یہی بات جہاد کے طویل راستے میں ایک نظریاتی کارکن کا بہترین ہتھیار ہوا کرتا ہے۔

تیسرا سبق اس واقعہ کے بیان کے درمیان ایک نہایت ہی مختصر جملہ معترضہ کے ذریعہ دیا گیا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ بَعْدُ (۳۰ : ۴) "اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی"۔ نہایت ہی شتابی سے بتا دیا گیا کہ معاملات سب کے سب اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اس واقعہ میں بھی اور اس کے سوا دوسرے واقعات میں بھی۔ یہ ایک اٹل کلیہ ہے' اسلامی موقف کا یہ میزان ہے۔ فتح و ہزیمت' دنیا میں حکومتوں کا اٹھنا اور مٹنا' قوت پکڑنا اور ضعیف ہونا' اسی طرح ہے جس طرح اس کائنات میں دوسرے طبیعی واقعات رونما ہوتے ہیں۔ سب کے لیے ایک سنت مقرر ہے۔ یہ سنت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور جس طرح اللہ چاہتا ہے واقعات کا رخ پھیر دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کے ارادے اور اس کی حکمت پذیری سے واقع ہوتا ہے۔ تمام واقعات اور حادثات دراصل اللہ کے ارادۂ مطلقہ کے آثار ہیں اور ان کا رخ متعین کرنے میں کسی کا کوئی اختیار نہیں ہی۔ نہ کسی کے پاس قوت ہے۔ ان واقعات کے پیچھے جو حکمت کار فرما ہے اس کا بھی اللہ کے سوا کسی کو علم نہیں ہے۔ نہ کسی کو ان واقعات کے مصدر اور ابتداء کا پتہ ہے اور نہ انجام کا۔ لہٰذا ایک انسان کے لیے یہی محفوظ راستہ ہے کہ وہ تمام واقعات پر اللہ کے سامنے سرتسلیم خم کریں اور یہ کہہ دے کہ یہ اللہ کی مقرر کردہ تقدیر ہے۔

الٓمّٓ (۳۰ : ۱) غُلِبَتِ الرُّوْمُ (۳۰ : ۲) فِیْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ (۳۰ : ۳) فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ بَعْدُ وَ يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ (۳۰ : ۴) بِنَصْرِ اللّٰهِ --- (۳۰ : ۵) "رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں' اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور وہ دن وہ ہو گا جب کہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے"۔ اور اللہ کا وعدہ سچا ہوا اور مومنین نے اللہ کی دی ہوئی نصرت پر خوشیاں منائیں۔

يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۳۰ : ۵) "اللہ نصرت عطا کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ زبردست اور رحیم ہے"۔ غرض اختیارات سب اللہ کے ہیں' پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اللہ جسے چاہتا ہے نصرت عطا کرتا

ہے۔ اس کی مشیت پر کوئی قید نہیں ہے۔ اس کی مشیت جو نتیجہ چاہتی ہے ویسے ہی اسباب بھی مہیا کر دیتی ہے۔ وجود اسباب اور فتح و کامرانی کو اللہ کی مشیت کے ساتھ معلق کرنے کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس عالم اسباب کو جو قوانین قدرت کنٹرول کرتے ہیں وہ سب کے سب مشیت مطلقہ کے فراہم کردہ ہیں۔ مشیت الٰہیہ ہی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ایسے اسباب اور ایسے سنن اٹل جہاں میں جاری و ساری ہوں جو اٹل ہوں اور اس کائنات کے اندر ایک نظم اور ایک قرار و ثبات ہو۔ لہٰذا فتح و ہزیمت بھی قدرتی اسباب اور موثرات کے نتیجے میں ظاہر ہوتے ہیں ' اللہ کے جاری کردہ قوانین قدرت کے مطابق۔

اس موضوع پر اسلامی نظریہ حیات نہایت ہی واضح ' معقول اور منطقی ہے۔ وہ تمام امور کو اللہ کے حوالے کرتا ہے لیکن اسلام عالم اسباب کی نفی بھی نہیں کرتا اور انسان کو حکم دیتا ہے کہ وہ عالم اسباب کے اندر اپنی جدوجہد جاری رکھے ' تاکہ اللہ کے مقرر کردہ نتائج عالم ظہور میں آتے رہیں۔ انسانی جدوجہد کے مطابق عملاً نتائج نمودار ہوں یا نہ ہوں اس کا انسان ذمہ دار نہیں ہے۔ اس پر جدوجہد فرض ہے۔ انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ایک اعرابی نے اپنی اونٹنی کو مسجد نبوی کے دروازے پر کھلا چھوڑ دیا اور نماز پڑھنے کے لیے اندر آگیا اور کہا

تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ "میں نے اللہ پر توکل کیا"۔ اسے رسول ﷺ نے فرمایا اعقلها و توکل "اسے باندھ دو اور پھر توکل کرو"۔ اسلامی نظریہ حیات میں توکل عالم اسباب میں' مطابق اسباب جدوجہد کرنے کے بعد ہے۔ جدوجہد کرو اور پھر معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔

يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۳۰ : ۵) "اللہ نصرت عطا فرماتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ زبردست اور رحیم ہے"۔ یہ نصرت قدرت الٰہیہ کے سایوں مین ملفوف ہے اور یہ قدرت الٰیہ ہی ہے جو اس تصرف کو عالم واقعہ میں لاتی ہے۔ اس نصرت پر رحمت الٰہیہ کے سائے بھی چھائے ہوئے ہیں جس کے ذریعہ لوگوں کے مفادات حقیقت کا روپ اختیار کرتے ہیں۔ مغلوب اور پسے ہوئے طبقات کے لیے اس میں بہت سے فائدے ہوتے ہیں۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ "اگر اللہ کی طرف سے بعض لوگوں کو بعض دوسرے لوگوں کے ذریعہ دفع کرنے کا کام نہ ہوتا رہتا تو پوری زمین میں فساد واقعہ ہو جاتا"۔ زمین میں اصلاح اسی طرح ہو سکتی ہے کہ مظلوموں اور پسے ہوئے لوگوں کی حمایت کی جائے اور ان کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کیا جائے۔

وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰ : ۶) يَعْلَمُوْنَ

ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ښ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (۳۰ : ۷) "یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے' اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں"۔ یہ لہذا اللہ کا وعدہ ہے لہٰذا وہ لازماً واقع ہو کر رہے گا۔

لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ (۳۰ : ۶) "اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا"۔ کیونکہ اللہ کا

وعدہ اس کے بے قید ارادے کے تحت ہوتا ہے اور پھر اس کے اندر گہری حکمت مضمر ہوتی ہے اور وہ اپنے وعدہ کو حقیقت کا روپ دینے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ اس کی مشیت کو رد کرنے والی کوئی قوت نہیں ہے اور اس کے حکم سے کوئی سرتابی نہیں کر سکتا۔ اس پوری کائنات میں وہی کچھ ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔

اس وعدے کا پورا کرنا دراصل اللہ کے وسیع قانون قدرت کا ایک حصہ ہے اور اللہ کے ناموس اکبر اور اس کے قانون قدرت اور عظیم منصوبہ کائنات کے اندر کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں ہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰ : ٦) "مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔ اگرچہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے بڑے جبہ و دستار رکھتے ہیں اور ان کے پاس علم کی ایک بڑی مقدار ہے۔ لیکن ان کا علم سطحی ہے اور زندگی کے ظاہری امور سے متعلق ہے۔ اللہ کے اٹل قوانین قدرت 'اور اس کائنات کے حقیقی ضوابط اور اس کے عظیم ناموس 'اور اس کے نہایت ہی پختہ اور گہرے روابط کا انہیں علم نہیں ہے۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۳۰ : ۷) "لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو ہی جانتے ہیں"۔ اس ظاہر کے پیچھے وہ جھانکنے کی سعی نہیں کرتے اور اپنی بصیرت سے اس کے پس منظر کو دیکھنے کی سعی نہیں کرتے۔ یہ ظاہری دنیا تو صغیر و حقیر ہے۔ اگرچہ لوگوں کو یہ بہت ہی وسیع نظر آتی ہے لیکن دراصل یہ بہت ہی حقیر ہے۔ انسان اس دنیا میں بہت جدوجہد کرتا ہے لیکن انسان کی محدود زندگی میں یہاں بہت ہی کم کچھ کیا جا سکتا ہے اور انسان کی یہ محدود زندگی اس عظیم کائنات کی وسعتوں کے مقابلے میں ان کا ایک مختصر حصہ ہے۔ اور اس زندگی پر بھی انہی قوانین کا کنٹرول ہے جن کا کنٹرول اس پوری کائنات پر ہے۔

وہ شخص جس کا ضمیر و قلب کائنات کے ساتھ مربوط نہیں ہے اور اسے یہ احساس نہیں ہے کہ اس کائنات کو کچھ اٹل قوانین قدرت کنٹرول کر رہے ہیں 'ایسا شخص اس کائنات کو بظاہر دیکھ تو رہا ہوتا ہے لیکن وہ اسی طرح ہوتا ہے جس طرح اندھا ہوتا ہے۔ وہ ظاہری اشکال کو دیکھ رہا ہوتا ہے 'وہ دیکھ رہا ہوتا ہے کہ یہاں ہر چیز دائرے کی شکل میں سرگردان ہے لیکن وہ اس حرکت کی حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس لیے وہ اس جہاں میں نہیں ہوتا اور نہ وہ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ لوگوں کی اکثریت ایسی ہی ہوتی ہے کیونکہ حقیقی مومن تو وہ ہوتا ہے جو اس کائنات اور اس کے اندر پائے جانے والے زندگی کے اسرار و رموز سے واقف ہو۔ ایسا مومن ہی دراصل علم اور سائنس کو ایسی روح عطا کرتا ہے جو حقائق کا ادراک کرتی ہے۔ اس قسم کا ایمان رکھنے والے لوگ اس جہاں میں قلیل ہی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثریت حقیقی معرفت سے محجوب ہوتی ہے۔

وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (۳۰ : ۷) "اور آخرت سے وہ غافل ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ آخرت اس کائنات کے سلسلہ میں وجود ہی کی ایک کڑی ہے۔ آخرت کتاب کائنات کا ایک صفحہ ہے 'جو لوگ تخلیق کی حقیقت کو نہیں سمجھتے جو لوگ اس کائنات میں پائے جانے والے نوامیس فطرت کو نہیں سمجھتے 'وہ آخرت کو بھی نہیں سمجھتے۔ اس لیے وہ آخرت کو اہمیت نہیں دیتے 'اس کے لیے تیاری نہیں کرتے 'اور وہ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ حرکت کائنات

کی لائن پر آخرت بھی ایک نکتہ ہے۔ دنیا اور اس کائنات نے اس نکتے پر پہنچنا ہے اور اس کے بعد پھر نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

لیکن آخرت سے غفلت کے نتیجے میں ایسے غافل لوگوں کی اقدار مضطرب ہوتی ہیں' ان کی اقدار حیات میں کوئی ثبات اور پختگی نہیں ہوتی۔ ان کا تصور حیات' تعبیر واقعات اور ان کی قدر و قیمت کے پیمانے ناپختہ ہوتے ہیں۔ ان کا علم سطحی' ناقص اور ظاہری ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب ایک انسان اس پوری زندگی کے اختتام پر آخرت کے قیام کو تسلیم کرتا ہے تو اس جہان کے تمام واقعات کے بارے میں اس کا نقطہ نظر بدل جاتا ہے۔ اسے نظر آتا ہے کہ اس جہان میں اس کی زندگی ایک مختصر سا مرحلہ ہے اور اس جہاں میں اس کا جو حصہ ہے اور ہونا چاہئے وہ آخرت کے مقابلے میں بہت ہی معمولی اور حقیر ہے اور اس جہاں کی پوری زندگی دراصل طویل ترین ڈرامے کا ایک نہایت ہی مختصر شو یا جھلکی ہے۔ لہٰذا کسی شخص کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اس طویل ترین ڈرامے کی صرف مختصر ترین جھلکی کو دیکھ کر کوئی فیصلہ کر دے۔ اگر کوئی نہایت ہی حقیر جھلکی کو دیکھ کر پوری زندگی' پوری کائنات اور آخرت اور اس کی طویل زندگی کے بارے میں فیصلہ کرے گا تو یہ سطحی فیصلہ ہو گا۔

یہی وجہ ہے کہ ایک ایسا انسان جو قیامت کا قائل ہے' اور جو قیامت کے لیے تیاری کر رہا ہے' اس انسان کے ساتھ اکٹھا ہو کر نہیں رہ سکتا جس کا مطمع نظر صرف یہ دنیا ہے اور اس دنیا سے آگے اس کا کوئی ہدف نہیں ہے۔ اس قسم کے دو انسان نہ اس دنیا کے کسی پروگرام پر متفق ہو سکتے ہیں اور نہ ان کا یہاں کسی قدر پر اتفاق ہو سکتا ہے۔ دونوں کے پیمانے بالکل جدا ہوں گے۔ غرض ہر واقعہ' ہر حالت' اور زندگی کے حالات میں سے ہر حالت کے بارے میں دونوں کا فیصلہ جدا ہو گا کیونکہ دونوں کے میزان الگ ہوں گے۔ ہر ایک کا زاویہ نظر مختلف ہو گا۔ ہر ایک کی روشنی بھی مختلف ہو گی۔ لہٰذا ہر ایک کو ایک ہی چیز مختلف نظر آئے گی۔ واقعات' اقدار اور حالات کے بارے میں دونوں کا تصور جدا ہو گا۔ ایک دنیا کی ظاہری نظر سے دیکھنے والا ہے اور دوسرا گہری نظر سے واقعات کے پس منظر کو بھی دیکھ رہا ہے۔ وہ ظاہری اسباب اور واقعات کو بھی دیکھتا ہے اور باطن پر بھی اس کی نظر ہے۔ وہ ظاہر اور غائب دونوں کا علم رکھتا ہے۔ دنیا و آخرت دونوں کو جانتا ہے' حیات اور موت دونوں کی حقیقت کو جانتا ہے۔ ماضی' حال اور مستقبل سب کا تصور رکھتا ہے۔ وہ انسانوں کے جہان سے بھی باخبر ہے اور اس کائنات کے دوسرے جہانوں اور زندوں اور مردوں سب سے واقف ہے۔ یہ ہے وہ وسیع افق جس پر اسلام انسان کی نظریں فوکس کراتا ہے اور انسان کو ایک ایسا نقطہ نظر دیتا ہے جو انسان کے لائق ہے جو انسان کے لیے بحیثیت خلیفۃ اللہ فی الارض ضروری ہے اور انسان کی شخصیت میں اللہ نے جو روحانیت ودیعت کی ہے' اس کا بھی یہی تقاضا ہے۔

--- ooo ---

اس غرض کے لیے کہ اللہ کی نصرت کا وعدہ اسی طرح یہ حق ہے جس طرح یہ عظیم کائنات ایک عظیم حق پر قائم ہے' اور یہ کہ آخرت کا قیام اس عظیم سچائی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اب سیاق کلام ہمیں دوبارہ اس کائنات کے ضمیر کی سیر کراتا ہے۔ آسمانوں میں' زمین میں اور ان کے درمیان جو جہان موجود ہیں ان میں۔ اس کے بعد پھر انسان کو خود اس کے اپنے وجود کی سیر کرائی جاتی ہے تاکہ وہ تدبر کریں' شاید کہ وہ اس حقیقت کبریٰ تک پہنچ جائیں جس سے وہ اس وقت غافل ہو

جاتے ہیں جب وہ آخرت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ کسی سطحی نقطہ نظر کی وجہ سے وہ دعوت اسلامی کی حقیقت کو بھی نہیں سمجھ سکتے کیونکہ یہ دعوت اس عظیم سچائی اور اس کے گہرے تدبر پر مبنی ہے۔

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنفُسِهِم ۗ مَّا خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ لَكَافِرُونَ ﴿٨﴾

"کیا انہوں نے کبھی اپنے آپ میں غور و فکر نہیں کیا؟ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں 'برحق اور ایک مدت مقرر ہی کے لیے پیدا کیا ہے مگر بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں"۔

کیا یہ لوگ سوچتے نہیں کہ خود ان کی ساخت اور ان کی تخلیق اور ان کے ارد گرد موجود یہ وسیع کائنات اس بات پر گواہ ہیں کہ یہ وجود ایک سچائی پر قائم ہے۔ ایک ایسے اٹل ناموس فطرت کے مطابق رواں دواں ہے جس کے اندر کوئی اضطراب نہیں ہے۔ یہ نہیں ہوتا ہے کہ یہ کائنات کبھی ادھر ڈھلک گئی اور کبھی ادھر۔ نہ اس کی گردش میں فرق آتا ہے' نہ اجرام فلکی میں تصادم ہوتا ہے اور نہ اس کی حرکت کوئی غیر مرتب اندھی حرکت ہے۔ نہ یہ حرکت بدلتی ہوئی خواہشات کے مطابق بدلتی ہے۔ بلکہ یہ حرکت نہایت ہی گہری' دقیق اور حکیمانہ نظام کے مطابق چل رہی ہے۔ یہ سچائی جس کے مطابق انسانی زندگی اور یہ وسیع کائنات چل رہی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس جہان کا کوئی انجام ہو' جہاں جزاء و سزا پوری ہو سکے۔ جہاں خیر اور شر دونوں کو ان کا بدلہ مل سکے۔ یہ سچائی نظر آتی ہے کہ یہاں ہر چیز ایک مقررہ انجام تک پہنچتی ہے یہ حکمت مدبرہ کے مطابق ہے اور اس کائنات کا ہر واقعہ اپنے وقت پر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس میں کوئی تقدیم یا تاخیر نہیں ہوتی۔ اگر انسان یہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ آخرت کب وقوع پذیر ہوگی تو اس کے معنی یہ نہیں کہ آخرت نہیں آئے گی۔ آخرت کا عدم علم یا اس کی تاخیر سے صرف وہ لوگ غلط نتائج اخذ کرتے ہیں جو معاملات کا صرف ظاہری پہلو دیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح ان کو دھوکہ لگ جاتا ہے۔ اس وجہ سے

إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ لَكَافِرُونَ (۳۰ : ۸) "بے شک بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں"۔

---oOo---

ضمیر کائنات اور زمین و آسمان کے درمیان پائے جانے والی مخلوقات کی سیر جو نہایت ہی وسیع سیر ہے جس کے آفاق بہت ہی طویل و عریض ہیں اور ناقابل تصور وسعتیں رکھتے ہیں اور ان آفاق کے اندر متنوع مخلوق ہے۔ جو زندہ اور غیر زندہ' قسم قسم کی اشیاء پر مشتمل ہے جس میں اجرام سماوی' افلاک' نجوم و کواکب' بڑے اور چھوٹے تارے اور سیارے' ظاہر اور چھپے ہوئے' قریب و بعید اور معلوم و نامعلوم ہیں۔ اس وسیع سیر کے بعد اب قرآن کریم ہمیں خود اپنی

تاریخ کی سیر کی دعوت دیتا ہے کہ آغاز انسانیت کے بعد ذرا خود انسانی تاریخ کا بھی مطالعہ کرو' خود اس تاریخ میں بھی یہ عظیم سچائی سنت جاریہ کی صورت میں اپنا کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور انسانی تاریخ کے واقعات بھی ایسے ہی اٹل اسباب کی وجہ سے ظاہر ہوتے ہیں جس طرح اس کائنات کے حوادث۔

اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ
مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ کَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡهُمۡ قُوَّۃً وَّ اَثَارُوا الۡاَرۡضَ وَ عَمَرُوۡهَاۤ اَکۡثَرَ
مِمَّا عَمَرُوۡهَا وَ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ ؕ فَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیَظۡلِمَهُمۡ وَ
لٰکِنۡ کَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ؕ﴿۹﴾ ثُمَّ کَانَ عَاقِبَۃَ الَّذِیۡنَ اَسَآءُوا ۱
السُّوۡٓاٰۤی اَنۡ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ کَانُوۡا بِهَا یَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۱۰﴾ ۱۰ع
۴

''اور کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ ان سے زیادہ طاقت رکھتے تھے' انہوں نے زمین کو خوب ادھیڑا تھا اور اسے اتنا آباد کیا تھا جتنا انہوں نے نہیں کیا ہے۔ ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر آئے۔ پھر اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔ آخر کار جن لوگوں نے برائیاں کی تھیں ان کا انجام بہت برا ہوا اس لیے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تھا اور وہ ان کا مذاق اڑاتے تھے''۔

ان آیات میں ہمیں دعوت دی جاتی ہے کہ گزرنے والوں کا جو انجام ہوا' ذرا اس پر بھی غور کرو' یہ بھی تو تمہاری ہی کی طرح کے انسان تھے۔ اسی طرح اللہ کی مخلوق تھے جس طرح تم ہو۔ ان کا انجام تمہارے لیے ایک نمونہ ہے۔ کیونکہ اللہ کی سنت تمام انسانوں کے لیے یکساں ہے۔ اللہ کی سنت انسانی تاریخ کے بارے میں بھی اسی طرح اٹل ہے جس طرح اس کائنات کے بارے میں اٹل ہے۔ اللہ کا انسانوں کی کسی نسل کے ساتھ کوئی مخصوص تعلق نہیں ہے کہ ان کے ساتھ کوئی ممتاز سلوک کرے۔ نہ اللہ کی کچھ خواہشات ہیں جو زمان و مکان کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ معاذ اللہ رب العالمین

یہ اس بات کی دعوت ہے کہ اس زندگی کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھا جائے اور اس پر غور کیا جائے کہ انسانی زندگی کے اس جہاں میں جو روابط و تعلقات ہیں ان کی حقیقت کیا ہے اور گذشتہ تاریخ میں اس انسانیت کی تخلیق اور اس کا انجام کیا رہا ہے تاکہ انسانوں کا کوئی گروہ اور نسل صرف اپنی زندگی' اپنے تصورات اور اپنی اقدار تک محدود نہ ہو جائے۔ تمام نسلوں کے درمیان جو مضبوط رشتہ ہے اس سے غافل نہ ہو جائے اور اس سنت کو بھی نہ بھول جائے جو تمام نسلوں پر حکمران ہے۔ اور ان انسانی قدروں کو بھی نہ بھول جائے جو ہر زمان و مکان میں ایک ہوتی ہیں۔

تاریخ ماضی میں جو اقوام ہو گزری ہیں اور جو اہل مکہ سے پہلے ہو گزری ہیں۔ وہ اہل مکہ سے۔

كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً (۳۰ : ۹) "وہ ان سے زیادہ طاقت رکھتے تھے"۔

وَّ اَثَارُوا الْاَرْضَ (۳۰ : ۹) "انہوں نے زمین کو خوب ادھیڑا تھا"۔ انہوں نے اس میں کھیتی باڑی کا کام بھی کیا اور اس کے باطن کو پھاڑا اور اس کے ذخائر کو نکالا۔

وَ عَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا (۳۰ : ۹) "اور انہوں نے اسے اتنا آباد کیا تھا جتنا انہوں نے نہیں کیا"۔ وہ لوگ عربوں سے زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ تھے اور عربوں سے زیادہ زمین کے اندر تعمیرات کرنے والے تھے۔ یہ لوگ اس دنیا کی ظاہری ترقی اور خوبصورتی پر ہی اکتفاء کر گئے اور آخرت کی طرف نگاہ نہ ڈالی۔

وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ (۳۰ : ۹) "ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر آئے"۔ لیکن ان روشن نشانیوں کو دیکھ کر بھی ان کی آنکھیں نہ کھلیں اور یہ لوگ اس نور پر ایمان نہ لائے جو ان کو صحیح راستہ دکھا رہا تھا۔ چنانچہ ان پر اللہ کی اس سنت کا اطلاق ہو گیا جو ہمیشہ مکذبین پر نافذ ہوتی ہے۔ عذاب الہی کے مقابلے میں ان کی قوت ان کے کچھ کام نہ آئی۔ ان کا علم اور ان کی ترقی ان کے کچھ کام نہ آئی۔ اور ان کو ان کی وہ سزا و جزاء ملی جس کے وہ مستحق تھے۔

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۳۰ : ۹) "پھر اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے"۔

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى (۳۰ : ۱۰) "آخر کار جن لوگوں نے برائیاں کی تھیں ان کا انجام بہت ہی برا ہوا"۔ یعنی وہ لوگ جو برائیوں کا ارتکاب کرتے تھے ' ان برائیوں کے مطابق پوری پوری سزا اور جزاء ان کو دے دی گئی اور ان کی برائی کیا تھی؟ یہ کہ

اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ (۳۰ : ۱۰) "اس لیے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تھا اور وہ ان کا مذاق اڑاتے تھے"۔

قرآن کریم تکذیب کرنے والوں اور مزاح اڑانے والوں کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ ذرا خدا کی اسی زمین پر چلیں پھریں اور گھونگھے کی طرح اپنے خول ہی میں بند نہ رہیں۔ انسانی تاریخ کو بھی ذرا پڑھیں کہ آپ جیسے مکذبین اور مزاح کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا انجام بھی ان جیسا ہو۔ اللہ کی سنت اٹل ہے اور وہ کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتی۔ وہ ذرا اپنی سوچ اور فکر کو وسعت دیں۔ پوری انسانیت کو ایک وحدت سمجھیں انبیاء کی دعوت کو ایک سمجھیں۔ اور یہ یقین کر لیں کہ اللہ کے قوانین قدرت کے مطابق تمام لوگوں کا انجام ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ تصور جس میں اسلام تمام مومنین کے فکر و نظر کو رنگنا چاہتا ہے اور اس پر بار بار زور دیتا ہے۔

اس پوری کائنات کی گہرائیوں کے مطابق اور انسانی تاریخ کے گہرے مطالعے کے بعد اب قرآن کریم انسان کو اس

میدان میں لے جاتا ہے جس سے انسان ہمیشہ غافل رہتا ہے ۔ یعنی بعث بعد الموت کے میدان میں ۔ یہ اس عظیم سچائی کا ایک اہم عنصر ہے جس کے اوپر یہ پوری کائنات قائم ہے ۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۝۱۱

"اللہ ہی خلق کی ابتداء کرتا ہے ' پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا ' پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے "۔

یہ بہت ہی واضح اور سادہ حقیقت ہے اور اس کے دونوں اجزاء اور دونوں کڑیوں کے درمیان ربط بالکل واضح ہے کیونکہ کسی چیز کا پہلی بار بنانا اور اس کا دوبارہ بنانا قابل فہم بات ہے ۔ اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں ہے ۔ تخلیق میں یہی دو حلقے ہوتے ہیں ' ان کے درمیان یہی تعلق ہوتا ہے اور انسان کی تخلیق کے بعد اس کے خالق کے سامنے دوبارہ پیش ہونا ایک لازمی اور معقول امر ہے ۔ وہی پہلی بار تخلیق کرنے والا ہے اور وہی دوسری بار تخلیق کرنے والا ہے ۔ اور یہ اس لیے کہ اچھا اور برا کام کرنے والوں کو وہ پوری پوری جزاء اور سزا دے ۔

بعث بعد الموت پر یہ دلیل دینے کے بعد اب یہاں بعث بعد الموت کا ایک منظر پیش کیا جاتا ہے ۔ اس میں اہل ایمان اور اہل کفر کے انجام کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے ' جس کے اندر شریکوں اور عقیدۂ شرک کے بودے پن کو اچھی طرح ظاہر کیا گیا ہے ۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ۝۱۲ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ۝۱۳ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ۝۱۴ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ۝۱۵ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ۝۱۶

"اور جب وہ ساعت برپا ہو گی اس دن مجرم ہک دک رہ جائیں گے ۔ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی ان کا سفارشی نہ ہو گا اور وہ اپنے شریکوں کے منکر ہو جائیں گے ۔ جس روز وہ ساعت برپا ہو گی ' اس دن (سب انسان) الگ گروہوں میں بٹ جائیں گے ۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں وہ ایک باغ میں شاداں و فرحاں رکھے جائیں گے ' اور جنہوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ہے ' وہ عذاب میں حاضر رکھے جائیں گے "۔

یہ ہے وہ گھڑی جس سے لوگ غافل ہیں اور جھٹلانے والے جھٹلاتے ہیں ۔ یہ دیکھو وہ آگئی اور ذرا دیکھو اس کا منظر '

یہ ہے برپا ہو گئی وہ ـ ذرا مجرمین کو دیکھو کس طرح حیران و پریشان ہیں ـ کس قدر مایوس ہیں 'ان کو نجات کی کوئی امید نہیں ہے اور نہ ان کو رہائی کی کوئی امید ہے ـ وہ شرکاء اور سفارشی جو انہوں نے دنیا کی زندگی میں بنا رکھے تھے اور جن سے وہ دھوکہ کھا کر گمراہ ہو گئے تھے 'ان کی جانب سے اب نہ اقتدار میں کوئی شرکت ہو گی اور نہ وہ سفارش کر سکیں گے 'بلکہ وہ تو ان لوگوں کی طرف سے شرک کرنے اور ان کی بندگی کرنے سے صاف صاف انکار کر دیں گے کہ ہمیں تو معلوم ہی نہیں ہے کہ ان احمقوں نے ہمیں اللہ رب العالمین کے ساتھ شریک کیا ہے ـ چنانچہ اہل ایمان اور اہل کفر کے درمیان یوں تفریق کر دی جاتی ہے اور دونوں کے راستے جدا ہو جاتے ہیں ـ

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِیْ رَوْضَةٍ یُّحْبَرُوْنَ (۳۰:۱۵) "جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے وہ ایک باغ میں شاداں و فرحاں رکھے جائیں گے"ـ وہاں ان کو وہی صورت حال درپیش ہو گی جس سے وہ خوش ہوں گے ـ ان کے ضمیر میں فرحت پیدا ہو گی اور ان کے دل کو مسرت حاصل ہو گی ـ

وَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ (۳۰:۱۶) "اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کی تکذیب کی اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا وہ عذاب میں حاضر رہیں گے"ـ یہ ہے آخری انجام نیکو کاروں اور بدکاروں کا ـ

اب عالم آخرت کی سیر اور منظر سے ہم پھر واپس اس دنیا میں آ جاتے ہیں ـ اس کائنات اور اس کے اندر زندگی اور اس کے اسرار و رموز اور عجائبات و کرامات کی سیر شروع ہوتی ہے ـ فی الواقعہ یہ کائنات ایک دلچسپ تفریح گاہ ہے ـ آغاز سفر صبح و شام اللہ کی حمد سے ہوتا ہے کہ صبح و شام کے مناظر کو ذرا دیکھو کس قدر دلفریب مناظر ہوتے ہیں ـ

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَیُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ﴿۲۲﴾ وَ

مِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ ابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ
لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنَزِّلُ مِنَ
السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ
یَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ
دَعْوَةً ۖۗ مِّنَ الْاَرْضِ ۖۗ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ
كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَ هُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ ؕ ۳
وَ لَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۲۷﴾ الربع ع ۸

"پس تسبیح کرو اللہ کی جب کہ تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو۔ آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے حمد ہے اور (تسبیح کرو اس کی) تیسرے پہر اور جبکہ تم پر ظہر کا وقت آتا ہے۔ وہ زندہ کو مردے میں سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ میں سے نکال لاتا ہے اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ اسی طرح تم لوگ بھی (حالت موت سے) نکال لیے جاؤ گے۔ ۶

اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر یکایک تم بشر ہو کر (زمین میں) پھیلتے چلے جا رہے ہو۔

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کی پیدائش' اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے' یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانش مند لوگوں کے لیے۔ اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن کو سونا اور تمہارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سنتے ہیں۔

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی۔ اور آسمان سے پانی برساتا ہے' پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے' یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔ پھر جوں ہی کہ اس نے تمہیں زمین سے پکارا' بس ایک ہی پکار میں اچانک تم نکل آؤ گے۔ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں' اس کے بندے ہیں۔ سب کے سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔ وہی اللہ ہے جو تخلیق کی ابتداء کرتا ہے' پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے

آسان تر ہے ۔ آسمانوں اور زمین میں اس کی صفت سب سے برتر ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے"۔

یہ اس کائنات کا نہایت ہی گہرا اور عظیم مطالعاتی سفر ہے ۔ اس کائنات کی دوریوں اور گہرائیوں تک ۔ انسانی قوائے مشاہدہ کو صبح و شام کے مناظر کی سیر کرائی جاتی ہے ۔ زمین کے مناظر اور آسمانوں کے مناظر' صبح و شام کے علاوہ پھر دوپہر کی دنیا ۔ ان آفاق و مناظر میں حیات و ممات اور بہار و خزاں کی کارستانیاں دکھائی جاتی ہیں' ان خوشگوار فضاؤں میں انسان کو بتایا جاتا ہے کہ وہ ذرا اپنی تخلیق پر غور کرے' اپنی فطرت کے رجحانات اور میلانات کا مشاہدہ کرے ۔ اپنی جسمانی اور روحانی قوتوں اور ان کی کشاکش کو ذرا دیکھے ۔ اس دنیا میں ہر چیز جوڑے جوڑے ہے ۔ ان جوڑوں کی باہمی محبت کو دیکھے' اور زوجین کے رجحانات و میلانات اور ان کے قوائے فطرت کو ذرا دیکھے اور اس کائنات کے زمین و آسمان' باغ و راغ اور رنگ ڈھنگ اور پھر انسانوں کی شکلیں' ان کے رنگ اور ان کی ہزارہا زبانیں اور پھر انسان کی بیداری' اس کی ہشیاری اور اس کی نیند اور اس کی جدوجہد اور اس کا آرام ۔ پھر اس طبیعی کائنات میں طوفان باد باران اور برق و بادل اور پھر لوگوں کا ان کو چاہنا اور ان سے ڈرنا' اور پھر زمین کی مردنی اور روئیدگی اور پھر زندگی اور بہار اور پھر بحیثیت مجموعی اس کائنات کا قیام اور گردش اور نظام و انتظام' یہ سب کام اللہ کے سوا اور کون کر سکتا ہے ۔ یہ اللہ ہی تو ہے جس کی یہ تجلیات ہیں ۔ اس کے لیے یہ سب کام بہت ہی آسان ہیں ۔ وہی ہے جس نے ان اشیاء کو پیدا کیا ہے اور وہی ہے جو ان کو دوبارہ پیدا کرے گا اور دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے بہت ہی آسان ہے ۔ آسمانوں اور زمینوں میں ذات باری کے اعلیٰ مشاہد موجود ہیں جو بے مثال ہیں ۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ (۳۰:۱۷) وَ لَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ عَشِیًّا وَّ حِیْنَ تُظْهِرُوْنَ (۳۰:۱۸) "پس تسبیح کرو اللہ کی جب کہ تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو ۔ آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے حمد ہے اور (تسبیح کرو اس کی) تیسرے پہر اور جبکہ تم پر ظہر کا وقت آتا ہے"۔ تسبیح کا یہ حکم اور حمد سابق فقرات و آیات میں بیان کردہ مشاہد قیامت کے بعد آتا ہے جس میں بتایا گیا کہ اہل ایمان جنت کے ایک مخصوص باغ میں خوش و خرم ہوں گے ۔ اور کافر اور جھٹلانے والے' عذاب اور سزا کے سامنے پیش کیے جائیں گے ۔ تو یہ تسبیح دراصل بطور نتیجہ یہاں لائی گئی ہے اور سابقہ مناظر قیامت دراصل اس مطالعہ کائنات کے لیے تمہید تھے کہ یہ وسیع کائنات اور اس کے نشیب و فراز' نفس انسانی اور اس کی نفسیات و عجائبات اور اللہ کی یہ تخلیق اور اس کے اسرار و رموز یہ سب کے سب لایعنی نہیں ہیں ۔ ان پر قیامت کے نتائج مرتب ہوں گے ۔ پس سابقہ مناظر قیامت اور موجودہ مطالعہ کائنات کے اندر مکمل ربط و مناسبت ہے ۔

یہاں تسبیح اور حمد کے لیے کچھ اوقات بھی مقرر کیے گئے ہیں ۔ شام کے اوقات میں اور صبح کے مناظر میں' پچھلے پہر اور پہلے پہر میں ۔ پھر اس حمد و تسبیح کو آفاق سماوات کے ساتھ بھی جوڑا گیا تاکہ زمان و مکان کے فاصلے مٹا کر اس حمد و تسبیح کو ہمہ گیر بنا دیا جائے اور انسان کا دل ہر وقت اور ہر جگہ اللہ کے ساتھ جڑا رہے ۔ وہ اس کائنات کے ڈھانچے' اکرات سماوی کی گردش اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مظاہر صبح و مساء کے مظاہر کو دیکھ کر انسان ہر لمحہ اللہ کو یاد کرے ۔ اس کا دل کھلا رہے' حساس رہے' اور اپنے ماحول کے حوالے سے بیدار رہے ۔ اپنے بدلتے ہوئے حالات میں ماحول کا

مشاہدہ کرتا رہے اور اللہ کی حمد و تسبیح کے ساتھ یہ غور و فکر جاری رہے ۔ اور ان تمام امور کو اللہ اور خالق کائنات کی آیات و معجزات سمجھے ۔ یہ تمام حالات ' تمام مظاہر ' اور تمام اوقات دراصل ایک معجزہ کردگار ہیں ۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا

وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ (۳۰ : ۱۹) "وہ زندہ کو مردے میں سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ میں سے نکالتا ہے اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے اور اسی طرح تم لوگ بھی نکالے جاؤ گے"۔

"ہاں وہ زندہ چیزوں سے مردوں کو نکالتا ہے اور مردہ چیزوں سے زندہ کو نکالتا ہے"۔ اور یہ ایک دائمی عمل ہے ۔ نہ رکنے والا عمل ہے ۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس میں توقف نہیں ہوتا ۔ رات اور دن ہروقت یہ عمل جاری ہے ' ہر زمان و مکان میں جاری ہے ۔ زمین کی سطح میں سے چپے چپے پر جاری ہے ۔ فضائے کائنات میں جاری ہے ' سمندر کی تہوں میں جاری ہے ' ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں ' یہ عمل کوئی غیر معمولی عمل نہیں ہے ' یہ تو ایک معجزہ ہے ' لیکن رات اور دن اسے دیکھتے دیکھتے ہم اس کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ اس کا معجزانہ پہلو نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے حالانکہ ہر لحظہ نئی آن اور شان کے ساتھ مردے سے زندہ اور زندہ سے مردہ نکل رہا ہے ۔ ایک مردہ اور خشک بیج زمین میں ڈالا جاتا ہے اور اس سے خوشنما پودے اور پھول پیدا ہوتے ہیں ' فصلیں اگتی ہیں اور جب یہی پھل پھول خوشے اور پودے خشک ہو کر بھوسہ بن جاتے ہیں تو اس خشک بھوسے کے اندر ہزارہا مردہ بیج تیار ہو چکے ہوتے ہیں جن کے اندر پوری حیات موجود ہوتی ہے ۔ یہ مردہ پھر فضائے کائنات سے گری گیس ' پانی اور تپش حاصل کر کے پھر زندہ ہوتا رہتا ہے ۔ انسانوں اور حیوانوں کے جنین اور پرندوں کے جنین اور انڈے مختلف اشکال اور مختلف اندازوں سے زندگی کی شکل اختیار کرتے ہیں ۔ غرض انسان ' حیوانات ' کیڑے اور کوڑے اور حشرات اور بیج اور انڈے ہروقت زندگی اختیار کرتے رہتے ہیں اور پھر مردہ بیج پیدا کرتے رہتے ہیں ۔

یہ ایک مسلسل سرکل ہے اور زندہ مردہ اور مردہ زندہ ہوتا رہتا ہے ۔ کیا کسی زندہ اور جاگنے والے دل کے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ اللہ دوبارہ تخلیق کر سکتا ہے ۔ قرآن کی روشنی میں اس بات کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے کیونکہ قرآن کی روشنی اللہ کے نور سے نکلی ہوئی ہے ۔

وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ (۳۰ : ۱۹) "بعینہ اسی طرح تم نکالے جاؤ گے"۔ یہ ایک سہل الفہم مسئلہ ہے ۔ ایک عام اور معمولی بات ہے ' یہ تو تمہارا مشاہدہ ہے ۔ کائنات میں رات اور دن دیکھا جا رہا ہے ۔ رات اور دن اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے ۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ (۳۰ : ۲۰) "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ' پھر یکایک تم بشر ہو کر پھیلتے جا رہے ہو"۔ مٹی مردہ اور ساکن ہے ۔ اس مٹی ہی سے انسان کو پیدا کیا گیا ۔ قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ آیا ہے :

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ "ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے پیدا کیا"۔ (المومنون : ۱۲) مٹی دراصل انسان کا اصل الاصول ہے لیکن یہاں انسانی شخصیت کے اس اصل مادے کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ انسان مکمل شکل میں چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ بتلانا یہ مقصود ہے کہ ذرا تخلیق انسان کے اصل مادے کو دیکھو اور پھر تخلیق شدہ مکمل انسان کو دیکھو' دونوں کے اندر کس قدر فرق ہے۔ خصوصاً یہ اصول بیان کرنے کے بعد کہ

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ (۳۰:۱۹) "وہ زندہ سے مردہ چیزوں کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردے کو نکال لاتا ہے"۔ قرآن کریم کے انداز کے مطابق یہ معنوی ربط ہے۔

یہ معجزہ اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک اہم نشانی ہے۔ اور اس کی تشریح کر کے یہ بتلانا مقصود ہے کہ اس زمین پر رہنے والے انسان اور اس زمین کا آپس میں رشتہ کیا ہے اور وہ کیا نکتہ ہے جس میں وہ باہم ملتے ہیں یعنی اپنی اصل تخلیق اور ان قوانین قدرت کے زاویہ سے جو خود انسان پر بھی نافذ ہیں اور اس کائنات پر بھی نافذ ہیں۔

اس مردہ مٹی کے اندر یہ عظیم انقلاب بذات خود ایک معجزہ ہے کہ وہ ایک مردہ اور پیش پا افتادہ شکل سے ایک انسانی ذی اقتدار اور ذی قدر کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔ یہ ایک ایسی تبدیلی اور صنعت کاری ہے جس سے اللہ جل شانہ کی عظیم صنعت کاری کا علم ہو جاتا ہے۔ انسان کا قلب و ضمیر بے ساختہ اللہ کی تسبیح و تحمید پر آمادہ ہو جاتا ہے اور انسان اللہ جل شانہ کی اس عظیم صنعت کاری پر رطب اللسان ہو جاتا ہے۔

پھر خود انسان کی زندگی کی تقسیم مرد اور عورت کی شکل میں اور ان اصناف کا باہم تعلق اور مشترکہ زندگی کا موضوع سامنے آتا ہے۔ کیا یہ کسی خارق العادت معجزے سے کم معجزہ ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳۰:۲۱) "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں"۔ لوگوں کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کے جذبات جنس مخالف کے ساتھ کیا ہوتے ہیں۔ دونوں اجناس کے شعور اور اعصاب ایک دوسرے کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور اپنے جذبات اور میلانات کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے لیے بے پناہ کشش رکھتے ہیں۔ یہ جذبات اور میلانات ان کو بے شمار کاموں اور مشقتوں پر آمادہ کرتے ہیں۔ لیکن جس ذات حکیم نے یہ سب کچھ کیا ہے اس کے دست قدرت کی طرف میاں بیوی کے رجحانات جاتے ہی نہیں۔ جس خالق نے ان نفوس کے اندر یہ کشش اور یہ میلان رکھا ہے اسے کوئی یاد بھی نہیں کرتا۔ حالانکہ میاں بیوی کے اس تعلق کی وجہ سے انسان کے جسم' اس کی روح' اس کے اعصاب بلکہ اس کی پوری زندگی کے اندر ایک سکون اور ٹھہراؤ اور سنجیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس تعلق سے انسان جسمانی اور روحانی لذت بھی حاصل کرتا ہے اور یہ لذت مرد اور عورت دونوں کے لیے برابر ہوتی ہے۔

یہاں قرآن نے نہایت ہی لطیف اور نازک انداز بیان اختیار کیا ہے اور نہایت ہی اشاراتی پیرایہ میں میاں بیوی کے

تعلق کو ظاہر کیا ہے۔ گویا قرآن دل کی گہرائیوں اور احساس و شعور کی تہوں میں تصویر کھینچ رہا ہے۔

لِّتَسْكُنُوٓا۟ إِلَيْهَا (۳۰ : ۲۱) "تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو"۔

وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (۳۰ : ۲۱) "تمہارے درمیان الفت اور باہم نرمی کے جذبات پیدا کر دیئے"۔

إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (۳۰ : ۲۱) "یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں"۔ اور جب وہ فکر کریں گے تو ان کو معلوم ہوگا کہ مرد اور عورت کی اصناف کی تخلیق کے اندر خالق نے کیا کیا حکمتیں رکھی ہوئی ہیں۔ طبعی لحاظ سے دونوں کو کس طرح ایک دوسرے کے موافق اور تکمیلی بنایا ہے۔ کس طرح دونوں ایک دوسرے کی فطری ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے نفسیاتی، عقلی اور جسمانی لحاظ سے تکمیل کا درجہ رکھتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اطمینان، استقرار اور سکون کی جگہ ہیں۔ دونوں کے اجتماع سے تکمیل ہو جاتی ہے اور ایک خود مختار یونٹ وجود میں آ جاتا ہے۔ اس یونٹ کے اندر محبت اور رحمت ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کی جسمانی، نفسیاتی، اعصابی اور طبعی تشکیل ہی ایسی ہے کہ ایک دوسرے کے سوا ادھوری ہے۔ مرد عورت کی خواہشات کی تسکین کا محل ہے اور عورت مرد کی خواہشات کی تسکین کی جگہ ہے۔ اس طرح دونوں کا اتحاد یکجہتی اور ملاپ اس کرۂ ارض پر صدور حیات کا ذریعہ ہے۔ اس سے زندگی کی فصل کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔

وَمِنْ ءَايَٰتِهِۦ خَلْقُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَٱخْتِلَٰفُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَٰنِكُمْ ۚ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ لِّلْعَٰلِمِينَ (۳۰ : ۲۲) "اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمان و زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں دانش مند لوگوں کے لیے"۔ زمین و آسمان کی تخلیق وہ نشانی ہے جس کی جانب قرآن کریم نے بار بار توجہ مبذول کرائی ہے لیکن ہم رات اور دن اس زمین کے اوپر رہتے ہیں اور اس آسمان کے نیچے رہتے ہیں لیکن ہم اللہ کی اس تخلیق پر غور نہیں کرتے۔ حالانکہ زمین و آسمان اس قابل ہیں کہ ان پر طویل عرصہ تک غور کیا جائے اور بار بار غور کیا جائے اور گہرا غور و فکر کیا جائے۔

خلق السموات کا مفہوم کیا ہے کہ اللہ نے یہ عظیم، پیچیدہ اور نہایت ہی وسیع کائنات تخلیق کی ہے۔ اس عظیم اور وسیع کائنات کے ایک نہایت ہی معمولی حصے کا علم ہم ابھی تک حاصل کر سکے ہیں۔ افلاک اور فلکی کرات کا یہ عظیم اور لاتعداد اژدھام، ستارے، سیارے، ان کے مدار، کہکشاں اور بلیک ہول۔ اس پوری کائنات کے اندر ہماری یہ زمین اس طرح ہے جس طرح ایک حقیر ذرہ جو ہماری اس زمین کی فضا میں اڑ رہا ہے جس کا نہ کوئی وزن ہے اور نہ کوئی سایہ ہے۔ اس ہولناک کائنات کی ناقابل تصور وسعت کے ساتھ یہ کائنات نہایت دقیق اور ناقابل تغیر نظم کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ اس کی حرکات اور اس کے کرات کے مدارات میں بے انتہا نظم و ضبط ہے حالانکہ ان کے درمیان طویل فاصلے ہیں۔ ان حرکات میں کوئی اضطراب کوئی بے قاعدگی نہیں ہے اور ہر چیز حکم ربی کے مطابق چل رہی ہے۔

یہ مشاہدہ تو عمو ماً حجم اور ان کرات کی حرکت کے نظم کے اعتبار سے ہے ۔ رہے اس کائنات کے اسرار تو اس کے اندر پائی جانے والی متنوع مخلوقات ' ان کے مزاج اور وہ حالات جن میں وہ مخلوق رہتی ہے اور وہ حالات جو اس پر طاری ہوتے ہیں تو ان کی انتہا نہیں ہے ۔ پھر وہ قوانین جو اس تمام مخلوق کو محفوظ رکھتے ہیں ' اس مخلوق کو چلاتے ہیں ' اور اس کے اندر تصرف کرتے ہیں تو ان کی انتہا تک پہنچنا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے ۔ ان تمام امور اور موضوعات پر انسان کا علم بہت ہی محدود ہے ۔ سمندر میں سے قطرے کے برابر بھی نہیں ہے ۔

زمین و آسمان کی تخلیق پر یہ ایک سرسری نظر ہے ' بہت ہی اختصار کے ساتھ ۔ سائنس دان اور علمائے انسانیات نے اس سلسلے میں جو مختصر سا علم حاصل کر لیا ہے اس پر ہم طویل بحث کر سکتے ہیں ۔ اب تک جو معلومات فراہم ہو سکی ہیں ان کے مطابق یہ کائنات بہت ہی عظیم ہے اور اس کے مختلف اجزاء باہم مربوط ہیں ۔ یہ تمام اجزاء بغیر اس کے کہ باہم متصادم ہوں ' روز تخلیق سے حرکت میں ہیں ' ایک سیکنڈ کے لیے بھی ان میں ٹھہراؤ نہیں ہے لیکن اس عجیب نظام میں جو بہت ہی پیچیدہ ہے ' کبھی بھی یہ اجزاء اور اجرام باہم متصادم نہیں ہوتے ۔ اس نظام کے بارے میں موجودہ فراہم شدہ معلومات کے باوجود بعض ہلکے لوگ یہ کہنے کی جرات کرتے ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں ہے ۔ اور پھر اس کا کوئی مدبر نہیں ہے جو اسے یوں چلا رہا ہے ۔ ان نام نہاد سائنس دانوں کی یہ بکواس آج بھی سنی جاتی ہے ۔

پھر ان آسمانوں اور زمین کے ساتھ ساتھ اس میں پائے جانے والوں یعنی مختلف انسانوں کے مختلف رنگ اور مختلف شکلیں اور مختلف زبانیں ۔ یہ اختلاف بھی تخلیق سماوات سے مربوط ہے ۔ زمین پر مختلف قسم کے رنگوں اور زبانوں کا تعلق بھی تخلیق سماوات سے ہے ۔ مختلف علاقوں اور موسموں سے رنگ اور زبانیں بدل جاتی ہیں ۔ انسان کے رنگ و زبان اور شکل و صورت کا موسمیات کے ساتھ گہرا ربط ہے ۔

ہمارے دور کے علماء اور سائنس دان لوگوں کے رنگ اور زبانوں کے اختلاف کو دیکھتے ہیں اور کبھی انہوں نے اس پر غور نہیں کیا اور نہ وہ اس حقیقت کی طرف جاتے ہیں کہ اللہ کی تخلیقات کے یہ نمونے ہیں اور یہ کہ یہ باتیں بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں ۔ حالانکہ وہ زبانوں کے اختلاف پر بہت ہی گہرا مطالعہ کرتے ہیں لیکن وہ اسے اللہ کی نشانی سمجھ کر اللہ تک پہنچنے کی سعی نہیں کرتے ۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ باوجود اس کے کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم سائنس دان ہیں مگر دراصل وہ سائنس دان نہیں ہیں ۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ( ۳۰ : ۷ ) " یہ لوگ اس زندگی کے بھی بس ظاہری پہلو کو جانتے ہیں " ۔ اور انسان اور علوم انسانی کا یہ پہلو کہ لوگوں کے رنگ مختلف ہیں اور زبانیں مختلف ہیں اسے صرف حقیقی علماء اور مومن سائنس دان ہی دیکھ سکتے ہیں ۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ( ۳۰ : ۲۲ ) " بے شک اس میں نشانیاں ہیں صرف دانش مندوں کے لیے " ۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

یَسْمَعُوْنَ(۳۰ : ۲۳ ) ’’اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن کو سونا' اور تمہارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے ۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور سے سنتے ہیں‘‘ ۔ اس آیت میں بھی کائناتی مظاہر اور ان کے ساتھ انسانی احوال میں تبدیلی کی بات کی گئی ہے اور دونوں کے درمیان تعلق دکھایا گیا ہے ۔ جس کے ذریعے اس عظیم الجثہ موجودات کے اندر ربط ظاہر ہوتا ہے اور ان کے درمیان ہم آہنگی بتائی جاتی ہے ۔ شب و روز کے اختلاف کے ساتھ انسان کا سونا اور جاگنا اور اس دنیا میں رزق حلال کے لیے جدوجہد کرنا مربوط ہے ۔ رزق حلال کو یہاں فضل الٰہی سے تعبیر کیا گیا ہے بشرطیکہ وہ آرام کے بعد رزق حلال کے لیے جدوجہد کریں اللہ نے اس کائنات کو یوں بنایا ہے کہ وہ انسان کے لیے اس کی جدوجہد آسان کر دے اور وہ اس کرۂ ارض پر خوشگواری سے رہ سکے ۔ اس جدوجہد کے لیے دن کی روشنی کو موزوں بنایا ہے ۔ آرام اور راحت کے لیے رات کی تاریکی کو آسان بنایا ہے ۔ یہ منظر اس کرۂ ارض پر رہنے والی بیشتر مخلوقات کے لیے ہے ۔ ہر کسی کے لیے درجہ بدرجہ سہولت کا انتظام کیا گیا ہے ۔ غرض نظام کائنات میں موجودات میں سے ہر موجود اپنے لیے سہولیات پاتا ہے اور یہ سہولیات اس کے لیے نہایت فطری ہیں ۔ اس کی فطرت اور اس کی زندگی سے ہم آہنگ اور خوشگوار ۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ( ۳۰ : ۲۳ ) ’’یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سنتے ہیں‘‘ ۔ نیند سکون ہے اور سعی حرکت ہے ۔ دونوں کا ادراک سننے سے ہوتا ہے ۔ لہٰذا یسمعون کا لفظ قرآن کریم کے اسلوب بیان کے مطابق نہایت ہی موزوں ہے ۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ

بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ( ۳۰ : ۲۴ ) ’’اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی ۔ اور آسمان سے پانی برساتا ہے' پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے' یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں‘‘ ۔

بجلی کی چمک اس کائناتی نظام اور اس کی تخلیق کا ایک منظر ہے ۔ بعض سائنس دانوں نے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ بادلوں کے اندر بجلی موجود ہوتی ہے ۔ جب ان کے دو ٹکڑے باہم ملتے ہیں تو اس ٹکراؤ سے بجلی کا ایک شرارہ بادلوں کے اندر پائے جانے والی بجلی کو مشتعل کر دیتا ہے یا یوں ہوتا ہے کہ یہ بادل کسی پہاڑ کی چوٹی سے ٹکراتے ہیں اور ان سے یہ اشتعال پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے یہ بجلی چمک اٹھتی ہے ۔ بالعموم اس چمک اور تصادم کے بعد بارش ہو جاتی ہے ۔ بہرحال اس کی حقیقت جو بھی ہو' لیکن یہ اس کائنات میں دست قدرت کا ایک مظاہرہ ہے' ایک خوفناک مظاہرہ ۔ یہ اللہ کی ان قوتوں اور قدرتوں کا ظہور ہے جو اس نے اس کائنات میں ودیعت کی ہوئی ہیں ۔

کا اسلوب بیشتر اوقات میں یہی ہے کہ وہ ان قدرتی مظاہر کی حقیقت اور ان کے سائنسی اسباب پر بات نہیں کرتا بلکہ ان مظاہروں سے صرف یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ انسان کا دل و دماغ ان مظاہر کو دیکھ کر خالق تک رسائی حاصل کر لے ۔ اس لیے قرآن مجید ان مظاہر سے یہی سبق عطا کرتا ہے کہ یہ قدرت الٰہیہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے ۔

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا (۳۰: ۲۴) "اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے۔ خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی"۔ یہ وہ احساسات ہیں جو بجلی کی چمک کے ساتھ انسان میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔ انسان ڈرتا بھی ہے کیونکہ یہ انسانوں' حیوانوں اور فصلوں کو جلا دیتی ہے۔ اور پھر اس عظیم قوت اور چمک اور کڑک کو دیکھ کر انسان کے اندر اس عظیم الہیکل کائنات کی قوتوں سے خوف پیدا ہو جاتا ہے اور طمع یوں پیدا ہوتا ہے کہ اکثر اوقات بجلی کے ساتھ بارش ہوتی ہے جو انسان کے لیے بہت ہی مفید ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے چمک اور کڑک کے ساتھ بارش کا ذکر کر دیا ہے۔ وَّ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۳۰: ۲۴) "اور آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ساتھ مردہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے"۔

زمین کی طرف مرنے کی نسبت اور پھر مرنے کے بعد اس کی طرف زندگی کی نسبت کر کے یہ تصور دیا جا رہا ہے کہ یہ زمین دراصل زندہ ہے۔ یہ بھی زندہ ہوتی ہے اور مرتی ہے۔ اور حقیقت میں بھی یہ ایسی ہی ہے جس طرح قرآن کریم اس کی تصویر کشی کر رہا ہے۔ یہ زمین بھی دراصل ایک زندہ مخلوق ہے۔ یہ اللہ کے حکم کا امتثال کرتی ہے۔ اپنے رب کی مطیع اور فرمانبردار ہے۔ ہر وقت رب کے احکام پر لبیک کہتی ہے۔ یہ اللہ کی بندگی میں ہے اور یہ انسان جو اس کرۂ ارض پر رینگ رہا ہے' یہ بھی اللہ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے۔ یہ بھی اس زمین کے ساتھ اللہ رب العالمین کے احکام کے ساتھ چلا جا رہا ہے۔

مزید یہ کہ جب زمین پر بارش ہوتی ہے تو اس کے اندر سرسبزی اور شادابی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے بڑھنے والی فصلیں اگتی ہیں اور اس زمین کی سطح پر وہ لہلہاتی ہیں۔ یوں یہ زمین زندہ نظر آتی ہے۔ اس طرح جس طرح انسان اور حیوان زندہ ہوتے ہیں۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۳۰: ۲۴) "یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں"۔ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ (۳۰: ۲۵) وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (۳۰: ۲۶) "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔ پھر جوں ہی کہ اس نے تمہیں زمین سے پکارا' بس ایک ہی پکار میں اچانک تم نکل آؤ گے۔ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں' اس کے بندے ہیں۔ سب کے سب اسی کے تابع فرمان ہیں"۔

آسمانوں اور زمین کا انتظام و قیام نہایت ہی سلیم و متین انتظام ہے جس کی حرکات متعین ہیں اور ان میں ایک سیکنڈ کی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔ یہ اللہ جل شانہ کی تدبیر سے ہے۔ کوئی مخلوق یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ یا اس کے سوا کوئی اور یہ انتظام کر رہا ہے اور کوئی عقلمند شخص اس بات کا قائل نہیں ہو سکتا کہ یہ سب کچھ بغیر کسی کرنے والے مدبر کے ہو رہا

ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر یہ اللہ کے معجزات میں سے ایک معجزہ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یہ زمین و آسمان اللہ کے کھڑے کرنے سے کھڑے ہیں۔ اللہ کے احکام کی تعمیل کر رہے ہیں' اس کے مطیع فرمان ہیں۔ ان میں کوئی سرتابی' انحراف اور اضطراب نہیں ہے۔

ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ (۳۰: ۲۵) "پھر جونہی کہ اس نے تمہیں زمین سے پکارا بس ایک ہی پکار میں اچانک تم نکل آؤ گے"۔ جو سائنس دان بھی اللہ کے اس نظام اور ان اندازوں اور ان قدرتوں پر غور کرے وہ اللہ کی اس دعوت کے جواب میں لبیک ہی کہہ سکتا ہے کہ جب اللہ پکارے گا تو لوگ خودکار طریقوں سے نکل آئیں گے۔

اب یہاں اس بیان اور مضمون کا خاتمہ آتا ہے اور اس میں بتایا جاتا ہے کہ انسان' حیوان' نباتات و جمادات سب کے سب اللہ کے مطیع فرمان ہیں۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (۳۰: ۲۶) "اور آسمان و زمین میں جو ہیں اس کے بندے ہیں۔ سب کے سب اس کے تابع فرمان ہیں"۔ مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان میں جو مخلوق بھی ہے وہ اللہ کے بندے ہیں' طوعاً و کرہاً مطیع فرمان ہیں اور یہ سب کچھ اللہ کی سنت کے مطابق چلتے ہیں اور ان میں نہ تخلف ہو سکتا ہے اور نہ انحراف ہو سکتا ہے۔ سب چیزیں اللہ کی سنت اور مشیت کی محکوم ہیں۔ دینی اعتبار سے وہ مومن ہوں یا کافر ہوں۔ اگرچہ ان کا دل اور دماغ کافر ہوتا ہے لیکن ان کا پورا جسم اور ان کے گرد پھیلی ہوئی یہ پوری کائنات اللہ کی مطیع ہے۔ جس طرح کائنات کی دوسری اشیاء سنت الٰہیہ کے لیے قانت اور مطیع ہیں اسی طرح انسان بھی ہے۔ رب کائنات کا یہ گہرا' طویل اور عظیم سفر آخری اور اہم بات پر ختم ہوتا ہے کہ ایک دن تم نے اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے لیکن تم اس دن سے غافل ہو۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳۰: ۲۷) "وہی اللہ ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے' پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے آسان تر ہے۔ آسمانوں اور زمین میں اس کی صفت سب سے برتر ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے"۔

اس سورہ میں آغاز تخلیق اور اعادہ تخلیق کا ذکر پہلے بھی ہوا ہے۔ اس طویل سفر اور کائنات کی سیر کے بعد از سر نو اس کا ذکر اس اضافے سے کیا جاتا ہے۔

وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ (۳۰: ۲۷) "اور یہ اس کے لیے آسان تر ہے"۔ حالانکہ اللہ کے لیے کوئی چیز نہ آسان ہے اور نہ مشکل ہے اس کا معاملہ تو یہ ہے۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ "اس کا معاملہ یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا

ارادہ کرتا ہے تو صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا' پس وہ ہو جاتی ہے"۔ لیکن اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس انداز میں سمجھاتے ہیں جس طرح' اللہ جانتا ہے کہ وہ سمجھ سکتے ہیں۔ لوگوں کے ہاں پہلی تخلیق سے اعادہ آسان ہوتا ہے لیکن وہ خود اپنے تجربات کے خلاف جاتے ہیں کہ ابتدائی تخلیق سے اعادہ مشکل ہے۔ حالانکہ اعادہ آسان ہونا چاہئے۔

وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳۰:۲۷) "آسمانوں اور زمین میں اس کی صفت سب سے برتر ہے"۔ وہ آسمانوں اور زمین میں منفرد ہے۔ اس کی ذات و صفات میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ وہ اکیلا اور حمید ہے۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳۰:۲۷) "وہ زبردست اور حکیم ہے"۔ زبردست ہے اور قاہر ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے اور حکیم ہے جو بھی کرتا ہے حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کا کیا نہایت ہی پختہ اور پورا پورا ہوتا ہے۔ کامل مکمل۔

اس عظیم مطالعاتی سفر کے اختتام پر' جس میں ہم نے اس کائنات کے آفاق' طول و عرض' اس کے ظاہری احوال اور اس کی گہرائیوں کا سفر کیا' جس میں ہم نے مناظر بھی دیکھے اور حقائق بھی اخذ کیے' اب سیاق کلام میں عقل و خرد کی تاروں پر آخری ضرب لگائی جاتی ہے۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ۭ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَاۗءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۲۸

"وہ تمہیں خود تمہاری اپنی ہی ذات سے ایک مثال دیتا ہے۔ کیا تمہارے ان غلاموں میں سے جو تمہاری ملکیت میں ہیں' کچھ غلام ایسے بھی ہیں جو ہمارے دیئے ہوئے مال و دولت میں تمہارے ساتھ برابر کے شریک ہوں اور تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح آپس میں اپنے ہمسروں سے ڈرتے ہو۔ اس طرح ہم آیات کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں"۔

یہ مثال ان لوگوں کے لیے دی گئی ہے جو اللہ کی مخلوق میں سے کسی مخلوق کو اللہ کا شریک بناتے ہیں۔ چاہے جن ہوں' چاہے ملائکہ ہوں' پتھر ہوں یا درخت ہوں' لیکن ان کا حال یہ ہے کہ وہ خود اپنے مالوں میں' اپنے نوکروں اور غلاموں کو شریک نہیں کرتے۔ اپنے غلام کو شریک کیا' اپنے برابر انسان کا درجہ بھی نہیں دیتے۔ لہٰذا ان کا یہ رویہ بہت ہی عجیب ہے کہ وہ اللہ کا شریک ان لوگوں کو بناتے ہیں جو اللہ کی مخلوق ہیں جبکہ اپنے زیردستوں کو اپنے مالوں میں شریک نہیں کرتے۔ یہ ان کا مال خود ان کا تخلیق کردہ بھی نہیں ہے بلکہ وہ اللہ کا تخلیق کردہ ہے۔ لہٰذا ان کے موقف میں یہ واضح

تضاد ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کے سامنے اس تمثیل کو نہایت ہی تدریج کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (۳۰:۲۸) "وہ تمہیں خود تمہاری اپنی ہی ذات سے مثال دیتا ہے"۔ یہ مثال تمہاری عملی زندگی سے دور نہیں ہے کہ تم اسے سمجھ نہ سکو۔ اس کے ملاحظے کے لیے کسی دور دراز علاقے کا سفر ضروری نہیں ہے۔

هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ

(۳۰:۲۸) "کیا تمہارے ان غلاموں میں سے جو تمہاری ملکیت میں ہیں 'کچھ غلام ایسے بھی ہیں جو ہمارے دیئے ہوئے مال و دولت میں تمہارے ساتھ برابر کے شریک ہوں"۔ ظاہر ہے کہ مشرکین مکہ تو یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ ان کے غلام ان کی دولت میں شریک ہوں چہ جائیکہ کہ ان کے حقوق ان کے ساتھ مساویانہ ہوں۔

تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ (۳۰:۲۸) "اور تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح آپس میں اپنے آپ سے ڈرتے ہو"۔ یعنی ان کو وہی مرتبہ و مقام دیتے ہو جو تم آپس میں اپنے آزاد شرکاء کو دیتے ہو۔ اور تم ڈرتے ہو کہ وہ تم پر ظلم کریں گے اور تم ان کے ساتھ ظلم کرنے سے احتیاط کرتے ہو کیونکہ ان کو تمہارے ساتھ برابر کا مقام و مرتبہ حاصل ہے کیا تمہارے ماحول میں اور خود تمہارے معاشرے میں ایسا ہوتا ہے؟ اگر خود تم اپنے غلاموں کے ساتھ مساویانہ سلوک نہیں کرتے ہو اور نہ اس پر راضی ہوتے ہو تو بتاؤ کہ ملاء اعلیٰ کے بارے میں کیونکر ایسی بات سوچتے ہو۔

یہ ایک واضح 'سادہ اور فیصلہ کن مثال ہے۔ اس کے بعد اس موضوع پر کوئی جدل و جدال نہیں رہتا۔ یہ مثال ایک نہایت ہی سادہ استدلال اور عقل سلیم پر مبنی ہے۔

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۳۰:۲۸) "اسی طرح ہم آیات کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں"۔

ان کے عقائد کے اس بوچ تضاد کو یہاں تک کھول کر بیان کر دینے کے بعد اب یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کے عقائد کے اندر یہ تضاد پیدا کیوں ہوا۔ اس کا اصل سبب کیا ہے۔ صرف یہ کہ ان کا نفس یہی چاہتا ہے اور جب کوئی شخص خواہشات نفسانیہ کا غلام ہو جائے تو پھر عقل و بصیرت سے محروم ہو جاتا ہے۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۲۹

”مگر یہ ظالم بے سمجھے بوجھے اپنے تخیلات کے پیچھے چل پڑے ہیں - اب کون اس شخص کو راستہ دکھا سکتا ہے جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو 'ایسے لوگوں کا تو کوئی مددگار نہیں ہو سکتا“ -

ہوائے نفس کا پھر نہ کوئی معیار ہوتا ہے اور نہ کوئی ضابطہ ہوتا ہے - بس نفس انسانی کی بدلتی ہوئی خواہشات آگے آگے ہوتی ہیں اور انسان ان کے پیچھے ہوتا ہے - جس طرف میلان ہوا 'اسی طرف ڈھل گیا - جہاں کوئی ڈر ہوا 'رک گیا' جہاں ذرا بھی امید اور لالچ پیدا ہوا وہ ڈر کر آگے بڑھ گیا - نہ ایسا شخص کسی حد پر رکتا ہے 'نہ حق و باطل کا لحاظ رکھتا ہے اور نہ حلال و حرام کی تمیز کرتا ہے اور نہ اپنے تصورات و اعمال کو کسی ترازو میں تولتا ہے - جب کوئی اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کی ہدایت کی کوئی امید نہیں رہتی 'ایسا شخص گمراہی کی راہوں پر اس قدر دور چلا جاتا ہے کہ واپسی کی کوئی امید نہیں رہتی -

فَمَنْ يَّهْدِىْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ (۳۰ : ۲۹) ”اب کون اس شخص کو راستہ دکھا سکتا ہے جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو“ - یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ شخص ہوائے نفس کا مطیع فرمان ہو گیا ہے -

وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (۳۰ : ۲۹) ”ایسے لوگوں کا کوئی مددگار نہ ہو گا“ - جو ان کو اس برے انجام سے بچا سکتا ہو -

اب ان لوگوں کی بات ختم ہو جاتی ہے جو اس دنیا میں بدلتی ہوئی خواہشات کی بندگی کرتے ہیں اور جن میں ہر وقت اضطراب رہتا ہے - اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ اپنے دین حق پر قائم رہیں جو دین فطرت ہے - جو مضبوط دین ہے اور اس دین اور لوگوں کی فطرت کے درمیان مکمل موافقت ہے 'کیونکہ فطرت کا خالق اور لوگوں کا خالق اور اس دین کا شارع ایک ہے - یہ وہ واحد عقیدہ اور نظریہ اور طرز عمل ہے جو صراط مستقیم پر لے جاتا ہے - اس سے ادھر ادھر نہیں ہوتا - جس طرح کفار کی راہیں ہر وقت بدلتی رہتی ہیں - ہر روز کی خواہشات کے لیے ایک نیا دین ہوتا ہے -

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾

”پس (اے نبیؐ اور نبیؐ کے پیرو) یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو 'قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس

طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے ' اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی ' یہی بالکل راست اور درست دین ہے 'مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ (قائم ہو جاؤ اس بات پر) اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے ' اور ڈرو اس سے ' اور نماز قائم کرو ' اور نہ ہو جاؤ ان مشرکین میں سے جنہوں نے اپنا اپنا دین الگ بنا لیا ہے اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں ' ہر ایک گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے"۔

یہ ہدایت نہایت بروقت آتی ہے کہ اپنی توجہات اس دین کی طرف کر دو۔ یہ ہدایت اس وقت آتی ہے جب قرآن نے انسانی فکر کو اس کائنات کی ماہیت ' اس کائنات کے مناظر' نفس انسانی کی گہرائیوں اور اس کی فطرت کے نشیب و فراز میں خوب گھمایا اور دوڑایا۔ اس سیر اور مطالعہ کے بعد سلیم الفطرت ذہن تسلیم کرنے اور استقبال حق کے لیے تیار ہوتا ہے۔ لہذا یہ ہدایت کہ تم لوگ اپنے چہرے کو دین حنیف کی طرف پھیر دو' بہت بروقت ہدایت ہے۔ اس کے مقابلے میں منحرفین اور مکذبین کی حالت یہ ہے کہ ان کے سامنے عقل و خرد اور دلیل و برہان کے تمام ہتھیار کند ہو گئے اور انہوں نے مان کر دینے سے صاف صاف انکار کر دیا۔ باوجود اس کے کہ یہ ان کے پاس کوئی دلیل اور حجت نہیں ہے۔ یہ ہے وہ دلیل اور برہان ناطق اور لاجواب انداز گفتگو جس کے ذریعہ قرآن کریم حق کو پیش کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی عقل ٹھہر نہیں سکتی اور نہ فطرت سلیمہ انکار کر سکتی ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا (۳۰ : ۳۰) "پس یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو"۔ اور سیدھے سیدھے اس دین کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ کیونکہ یہی دین ایسا ہے جو انسان کو متفرق خواہشات سے بچا سکتا ہے ان خواہشات کی پشت پر حق بالعموم نہیں ہوتا۔ یہ علم اور تحقیق پر مبنی نہیں ہوتیں۔ یہ محض طبیعی شہوت اور مادی میلانات پر مبنی ہوتی ہیں اور ان کی پشت پر کوئی ضابطہ اور کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ لہذا تمام سمتوں کو چھوڑ کر دین اسلام کی سمت اختیار کر لو۔ سیدھے سیدھے۔ اس کے سوا تمام سمتوں کو پس پشت ڈال دو۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (۳۰ : ۳۰) "اس فطرت پر جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی"۔ یوں یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ فطرت انسانی اور اس دین کے اندر گہرا ربط ہے۔ یعنی دونوں اللہ کی مصنوعات و تخلیقات ہیں۔ دونوں اس ناموس کے مطابق ہیں جو اس کائنات کی روح ہے اور دونوں ایک دوسرے کے موافق اور ہم رخ اور ہم سمت ہیں۔ جس خدا نے انسان کو پیدا کیا اسی نے یہ دین نازل کیا کہ یہ انسانوں کی زندگیوں میں نافذ ہو اور انسانوں کی پوری زندگی اس کے مطابق چلے۔ یہ دین ہی فطرت انسانی کا علاج ہے ' اسے روحانی بیماریوں سے بچاتا ہے اور صحیح راہ سے منحرف ہونے نہیں دیتا۔ کیونکہ اللہ اپنی مخلوق کے بارے میں زیادہ جاننے والا ہے۔ وہ تو نہایت باریک بین اور بہت بڑا خبردار ہے۔ جس طرح فطرت ثابت ہے اسی طرح دین بھی ثابت اور مستحکم ہے۔

لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (۳۰ : ۳۰) "اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدل نہیں سکتی"۔ جب نفس انسانی فطری راہ سے منحرف ہو جائے تو صرف یہی دین اسے فطرت کی راہ پر ڈال سکتا ہے کیونکہ فطرت کائنات 'فطرت انسانی اور

فطرت دین ایک ہی ہیں۔

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰:۳۰) "یہی بالکل راست اور درست دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں"۔ چنانچہ وہ بغیر علم کے اپنی خواہشات کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ اور یوں راہ راست سے بھٹک کر بہت دور چلے جاتے ہیں"۔

یہ حکم کہ اپنے چہرے کو دین قیم کی طرف کر لو اگرچہ لفظاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن اس کے اندر تمام اہل ایمان بھی آتے ہیں لہٰذا آگے کی تفصیلات میں ان کو بھی شامل کر دیا گیا۔

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۳۰:۳۱)

مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰:۳۲)

"اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے اور ڈرو اس سے' اور نماز قائم کرو' اور نہ ہو جاؤ ان مشرکین میں سے جنہوں نے اپنا اپنا دین الگ بنا لیا ہے اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں' ہر ایک گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے"۔

انابت سے مراد اللہ کی طرف رجوع ہے۔ زندگی کے ہر معاملے میں۔ جب انسان کے اندر اللہ کا خوف پیدا ہوتا ہے اور وہ حساس ہو جاتا ہے تو وہ خفیہ اور کھلے بندوں ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ہر حرکت اور ہر سکون میں اسے خدا کا شعور ہوتا ہے۔ پھر وہ اس شعور اور حساسیت کے اعلیٰ مقام صلوٰۃ کی طرف دوڑتا ہے۔ اس شعور سے تمام ماسوا اللہ مٹ جاتا ہے لہٰذا وہ موحد ہو جاتا ہے اور مشرکین سے جدا ہو جاتا ہے اور مشرکین کون ہوتے ہیں۔

الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا (۳۰:۳۲) "جنہوں نے اپنا اپنا دین الگ بنا لیا اور گروہوں میں بٹ گئے"۔ شرک کے بھی کئی رنگ اور اقسام ہیں۔ بعض لوگ جنوں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض ملائکہ کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض آباؤ اجداد کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض ملوک و سلاطین کو' بعض کاہنوں اور مولویوں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض پتھروں اور درختوں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض سیاروں اور ستاروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض آگ کو شریک ٹھہراتے ہیں' بعض رات اور دن کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض جھوٹی اقدار کو شریک ٹھہراتے ہیں اور بعض خواہشات اور اغراض کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض پیروں اور فقیروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ غرض شرک کی بے شمار قسمیں ہیں اور

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰:۳۲) جبکہ دین قیم ایک ہے' اس میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ دین حق کے پیروکار صرف ایک اللہ' ایک قبلہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں' اس اللہ کی طرف جس نے ان آسمانوں کو تھام رکھا ہے۔ وہ آسمانوں کا بھی بادشاہ ہے اور زمین کا بھی اور سب اس کے مطیع فرمان ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۸۴ انظریں

اس سورہ کا یہ سفر اور یہ باب اس کے حقیقی موضوع پر ہے۔ یعنی اس کائنات کے واقعات و حادثات اور انسانی زندگی کی اقدار و حادثات کے اندر گھرا رہا ہے۔ اس کائنات کے نوامیس قدرت' اس زندگی کے قوانین فطرت اور اس دین کے قوانین شریعت باہم موافق' ہم آہنگ' مربوط اور بلاتضاد ہیں۔

اس سبق میں بتایا جاتا ہے کہ انسانی خواہشات تو بدلتی رہتی ہیں لیکن سنت الٰہیہ کے اندر کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ دین قیم کے اصولوں کے مقابلے میں شرکیہ عقائد پائے چوبیں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر اس سبق میں انسانی نفس کی کیفیات کی مختلف حالات میں تصویر کشی کی گئی ہے۔ حالت امن میں نفس انسانی کی حالت کیا ہوتی اور حالت خطرہ میں کیا ہوتی ہے۔ روح کی قبض کی حالت میں وہ کیسا ہوتا ہے اور بسط کی حالت میں کیا کرتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جب تک انسان اللہ کے پیمانوں کے مطابق اپنی اقدار اور تصورات کا ناپ و تول نہ کرے اس وقت تک انسانی قدروں اور اس کی روح میں ٹھہراؤ اور سکون نہیں آسکتا۔ ہاں جب انسان اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جو کسی کا رزق کشادہ کرتا ہے اور کسی کا تنگ کرتا ہے۔ پھر بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں رزق اور مال کو بڑھانے کا بھی ایک مستحکم طریقہ ہے۔ کس طریقے سے مال بڑھتا ہے اور کس سے گھٹتا ہے۔ کس سے پاک ہوتا ہے اور کس سے ناپاک ہوتا ہے اور مالیات کا قانون بھی وہی درست اور قیم ہو گا جو دین قیم کے مطابق ہو اور اس سے ماخوذ ہو۔ اس کے بعد سامعین کو لوٹا کر اس ذات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو خالق اور رازق اور زندگی دینے والا اور مارنے والا ہے۔ اللہ کے سوا جن ہستیوں کو تم شریک ٹھہراتے ہو' وہ تو یہ کام نہیں کر سکتے۔ بتایا جاتا ہے کہ ہر زمان و مکان میں شرک موجب فساد ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو دوبارہ یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ اس راست اور درست دین پر جم جائیں۔ اور جو کچھ کمانا ہے اس دن کے آنے سے قبل ہی کما لیں جہاں کوئی عمل اور کوئی کمائی نہ ہو گی۔ وہاں تو اعمال کا حساب و کتاب ہو گا۔ اس کے بعد ان کو بتایا جاتا ہے کہ اللہ نے ان کے لیے کیا کیا سہولیات دنیا میں پیدا کی ہیں۔ بعض چیزیں ان کی حیات مادی کے لیے ہیں' مثلاً پانی آسمانوں سے برستا ہے اور زمین زندہ اور تروتازہ ہو کر تمہارے لیے سب کچھ پیدا کرتی ہے۔ پھر سمندروں میں تمہارے لیے کشتی رانی کا سامان اور تمہاری روحانی زندگی کے لیے یہ آیات بینات ہیں جو رسول اللہؐ پر اتر رہی ہیں۔ جن سے دل و دماغ زندہ اور سرسبز ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ لوگ نہ ہدایت لیتے ہیں اور نہ سنتے ہیں۔ پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ اپنی دنیا میں زندہ رہ کر اللہ رب العالمین کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اس دن پھر کسی سے کوئی معذرت قبول نہ ہو گی اور نہ معافی کی درخواستیں طلب ہوں گی اور آخر میں رسول اللہ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپؐ ثابت قدمی سے اپنا کام جاری رکھیں' صبر کریں یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ سب بن کر سامنے آجائے۔ اللہ کا وعدہ حق الیقین ہے اور اٹل ہے۔

# درس نمبر ۱۸۴ تشریح آیات

## ۳۳ --- تا --- ۶۰

وَ اِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ
اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ
اٰتَيْنٰهُمْ فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا
كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَ اِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا وَ اِنْ
تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا
اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾

"لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتے ہیں' پھر جب وہ کچھ اپنی رحمت کا ذائقہ انہیں چکھا دیتا ہے تو یکایک ان میں سے کچھ لوگ شرک کرنے لگتے ہیں تاکہ ہمارے کیے ہوئے احسان کی ناشکری کریں۔ اچھا' مزے کر لو' عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کیا ہم نے کوئی سند اور دلیل ان پر نازل کی ہے جو شہادت دیتی ہو' اس شرک کی صداقت پر جو یہ کر رہے ہیں؟ جب ہم لوگوں کو رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر پھول جاتے ہیں اور جب ان کے اپنے کیے کرتوتوں سے ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یکایک وہ مایوس ہونے لگتے ہیں۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی رزق کشادہ کرتا ہے جس کا چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے (جس کا چاہتا ہے) یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں"۔

یہ ایک ایسے انسان کی نفسیاتی تصویر ہے جس کو پختہ رنگوں سے نہیں بنایا گیا۔ جو مستقل اقدار حیات نہیں رکھتا اور

جس کے سامنے واضح منہاج حیات نہیں ہے۔ اس شخص کا نفس وقتی انفعال اور وقتی تاثرات کے درمیان ڈول رہا ہے جو تصور ذہن میں آیا اس کی طرف لپکا۔ حادثات اور وقتی واقعات کی وجہ سے وہ بدلتا رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں' رب کو یاد کرتے ہیں اور اس حقیقی قوت کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جس کے سوا کوئی بچانے والا نہیں ہوتا۔ اور اس کے دربار میں گڑگڑانے کے سوا کوئی نجات نہیں ہوتی۔ اور جب مشکلات کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور سختی دور ہو جاتی ہے اور اللہ کی رحمت آ جاتی ہے۔

اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ (۳۰: ۳۳) "تو یکایک ان میں سے کچھ لوگ شرک کرنے لگتے ہیں"۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو صحیح عقیدے کا سہارا نہیں لیتے۔ جن کی قدریں مستقل نہیں ہوتیں۔ کیونکہ اللہ کی رحمتیں اور دنیا کی سہولیات ان کو ان مجبوریوں سے نکال دیتی ہیں جن کی وجہ سے ایسے لوگ اللہ کی طرف متوجہ تھے۔ وہ اچانک اپنے وہ مشکل کے دن بھول جاتے ہیں جن میں وہ خدا کو یاد کیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اللہ کی دی ہوئی ہدایت کی ناشکری کر کے اور اللہ کی رحمتوں کو چھوڑ کر کفر کی طرف چلے جاتے ہیں حالانکہ حالت رحمت میں خصوصاً مصیبت کے بعد رحمت میں ان کو تو شکر اور انابت الی اللہ پر جم جانا چاہئے تھا۔

ایسے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں موجود تھے' اللہ بھی نہایت مختصر الفاظ میں جلدی سے ان کو دھمکی دیتے ہیں اور ان کو یوں خطاب ہوتا ہے۔ حضور اکرمؐ کے دور کے متعین افراد پیش نظر ہیں۔ اس لیے خطاب کا صیغہ استعمال کیا گیا۔

فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۳۰: ۳۴) "اچھا' مزے کر لو' عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا"۔ یہ سخت خوفناک تہدید ہے۔ اگرچہ براہ راست نہیں ہے۔ انسان کی حالت تو یہ ہے کہ وہ ایک معمولی حاکم اور رئیس کی دھمکی سے بھی ڈرتا ہے۔ اللہ جل شانہ کی دھمکی تو بہت ہی خوفناک ہے کیونکہ اللہ کے سامنے کوئی بات مشکل نہیں ہے۔ ہر بات لفظ کن سے وجود میں آ جاتی ہے۔

فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۳۰: ۳۴) "اچھا مزے کر لو' عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا"۔

جلدی اور اختصار کے ساتھ یہ دھمکی دینے کے بعد اب ان کے اس موقف پر سخت برہمی کے ساتھ گرفت کی جاتی ہے کہ یہ اللہ کی نعمتوں اور رحمتوں کے باوجود شرک کرتے ہیں اور کفر کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ آخر اس پر ان کے پاس کیا دلیل ہے؟

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ (۳۰: ۳۵) "کیا ہم نے کوئی سند اور دلیل ان پر نازل کی ہے جو شہادت دیتی ہو' اس شرک کی صداقت پر جو یہ کر رہے ہیں"۔ اس لیے کہ کسی شخص کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے عقائد و نظریات اللہ کے سوا کسی اور ماخذ سے لے۔ کیا ہم نے کوئی دلیل شرک پر نازل کی ہے؟ نہیں۔ یہ سخت سرزنش اور استنکاری سوال ہے۔ نیز اس میں مزاح اور حقارت کا رنگ بھی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ان کا یہ رویہ نہایت ہی احمقانہ ہے۔ اس پر کوئی حجت اور دلیل اور سلطان نہیں ہے۔ دوسرے

الفاظ میں یہ ایک تقریری سوال بھی ہے ۔ مفہوم یہ ہے کہ کوئی عقیدہ اللہ کی نازل کردہ وحی کے بغیر ثابت نہیں ہوتا۔ جب اللہ نے شرک پر کوئی دلیل نہیں اتاری تو گویا عقیدہ شرک باطل ہے ۔ بے اصل ہے ' ضعیف ہے ۔

اب انسان کی ایک دوسری نفسیاتی تصویر ۔ جب وہ خوش حال اور خوش و خرم ہوتا ہے تو وہ ہلکا اور مغرور ہو جاتا ہے ۔

وَ اِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ (۳۰ : ۳۶) "جب ہم لوگوں کو رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر پھول جاتے ہیں اور جب ان کے اپنے کیے کرتوتوں سے ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یکایک وہ مایوس ہونے لگتے ہیں" ۔

یہ بھی ایک ایسے شخص کی نفسیاتی تصویر ہے ' جو اپنے معاملات کی ماہیت کو ایک مستقل پیمانے کے مطابق سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ ان کا رویہ ایسا نہیں ہوتا کہ ہر حال میں ایک معیار اور پیمانہ ان کے سامنے رہے ۔ ایسا مستقل پیمانہ کہ وہ کبھی بدلتا نہیں ۔ یہاں مراد وہ لوگ ہیں جن کی قدریں اور پیمانے مستقل اور دائمی نہیں ہوتے ۔ جب اچھے دن آتے ہیں تو آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور یہ اچھے دن عطا کرنے والے کو بھول جاتے ہیں اور ہوا میں ہوتے ہیں ۔ عیش و عشرت میں غرق ہو جاتے ہیں اور اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے جو منعم حقیقی ہے اور وہ یہ بات پیش نظر نہیں رکھتے کہ اللہ کی رحمت اور خوشحالی بھی ایک امتحان ہوتا ہے لیکن جب اللہ کی مشیت ان کی اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ان پر مصیبت لاتی ہے تو پھر وہ اندھے پن کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یہ یقین نہیں کرتے کہ یہ بھی ایک آزمائش ہے اور یہ بدحالی کی آزمائش ہے ۔ لہٰذا اللہ کو یاد کریں اور صبر کریں کہ وہ مشکلات دور کر دے ۔ اس کے بجائے وہ مایوس ہو جاتے ہیں اور واہی تواہی بکتے ہیں ۔ یہ تصویر ان دلوں کی ہے ' جو اللہ سے کٹے ہوئے ہوتے ہیں ۔ جو نہ سنن الہیہ کو جانتے ہیں نہ حکمت الہیہ ان کے سمجھ میں آتی ہے ۔ یہ لوگ دراصل نہیں جانتے ۔ بے علم ہوتے ہیں ۔ یہ زندگی کے ظاہری حالات کو دیکھ کر ہی فیصلے کرتے ہیں ۔

اس نفسیاتی تصویر کشی کے بعد ایک سخت تہدیدی سوال کیا جاتا ہے جس میں ان کے معاملے پر سخت تعجب کا اظہار بھی ہے ۔ ان کے اندھے پن اور بے بصیرتی پر ماتم بھی ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ خوشحالی اور بدحالی دونوں اللہ کے ایک مستقل قانون قدرت کے مطابق آتی ہیں ۔ ان کا تعلق سنن الہیہ اور اللہ کی مشیت سے ہے کیونکہ رحمت بھی وہی کرتا ہے اور مصیبت بھی وہی لاتا ہے ۔ وہی رزق میں کشادگی کرتا ہے اور وہی تنگی کرتا ہے ۔ سب کچھ اس کی حکمتوں کے تقاضے کے مطابق ہوتا ہے ۔ اس جہان میں ہر وقت اس اصول کے مطابق واقعات ہوتے رہتے ہیں لیکن لوگ اندھے بن جاتے ہیں ' دیکھتے ہی نہیں ۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (۳۰ : ۳۷) "کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ اللہ ہی رزق کشادہ کرتا ہے ' جس کا چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے" ۔ لہٰذا جب رزق کشادہ ہو جائے تو تکبر اور غرور نہ کرنا چاہئے ۔ پھولنا مناسب نہیں ہے اور جب رزق تنگ ہو جائے تو مایوس نہیں ہونا چاہئے ۔ یہ تو عارضی حالات ہوتے ہیں ' حکمت الہیہ کے مطابق آتے رہتے ہیں ۔ ان حالات کی وجہ سے قلب مومن تو یقین کر لیتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کا ہے ۔ سنت الہیہ اپنا کام کرتی رہتی ہے ۔ اللہ کا نظام مستقل ہے ۔ اس کی حکمت کے مطابق روز و شب بدلتے رہتے ہیں ۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۳۰:۳۷) "یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں"۔ چونکہ رزق کی کشادگی اور رزق کی تنگی صرف اللہ کے اختیار میں ہے' وہی ہے جو دیتا ہے اور وہی ہے جو روکتا ہے اپنی مشیت کے مطابق لہٰذا وہ تمہیں بتا دیتا ہے کہ تمہاری معیشت کی ترقی کی راہ کون سی ہے اور وہ کون سی معیشت ہے جو ترقی نہیں کرتی ۔ حالانکہ لوگ اسے ترقی پذیر معیشت سمجھتے ہیں' ہدایت ہوتی ہے ۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَاۡ فِیْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝

"پس (اے مومن) رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین و مسافر کو (اس کا حق)۔ یہ طریقہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہوں' اور وہی فلاح پانے والے ہیں ۔ جو سود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں شامل ہو کر وہ بڑھ جائے' اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا' اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ارادے سے دیتے ہو' اسی کے دینے والے درحقیقت اپنے مال بڑھاتے ہیں"۔

جب تصور یہ ہے کہ تمام دولت اللہ کی ہے اور اللہ نے اپنے بندوں میں سے بعض کو زیادہ اور بعض کو کم دے رکھی ہے ۔ اس تصور کے مطابق اللہ تعالیٰ تمام اموال کا مالک اول ہے ۔ تو وہ حکم دیتا ہے کہ جو لوگ نادار ہیں ان کی طرف دولت کو منتقل کیا جاتا رہنا چاہئے ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اسے ناداروں کا حق کہا ہے ۔ یہاں ان ناداروں میں بعض لوگوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے ۔

وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ (۳۰:۳۸) "رشتہ داروں' مسکینوں اور مسافر کو"۔ جس دور میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اس میں زکوٰۃ کا تعین نہ ہوا تھا ۔ نہ اس کے مستحقین کے مدات کا تعین ہوا تھا ۔ اصولاً یہ بات متعین کر دی گئی تھی کہ تمام مال دراصل اللہ کی ملکیت میں ہے' کیونکہ رازق اللہ ہے ۔ محتاج لوگوں کا اس مال میں ایک حق متعین ہے اور یہ حق مال کے اصل مالک نے دیا ہے ۔ یہ حق ان تک اس شخص کے واسطہ سے پہنچتا ہے جس کے ہاتھ میں مال جمع ہے ۔ مال کے بارے میں اسلام کا یہ بنیادی نظریہ ہے ۔ اسلام کے اقتصادی اور معاشی نظریات کی اساس یہی تصور ہے کہ اصل مالک اللہ ہے ۔ جب مال اللہ کا ہے تو اللہ کی جانب سے عائد شدہ واجبات سب سے پہلے ادا ہوں گے ۔ مال کے بارے میں اللہ کے احکام ملکیت ہوں' یا احکام ترقی اور تنمیہ ہوں یا احکام انفاق ہوں' یہ سب لازمی احکام ہیں اور مال کا قابض آزاد نہیں ہے کہ اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف کرے ۔

اب یہاں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جن کو اس نے بطور امانت یہ مال دیا ہے' کہ تم لوگ کس طریق کار کے مطابق اس مال کو بڑھاؤ گے اور ترقی دو گے ۔ بڑھانے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے رشتہ داروں' مسافروں اور مسکینوں پر

خرچ کیا جائے۔ یہ سب اللہ کے راستے میں خرچ ہو گا۔

ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۳۰:۳۸) "یہ طریقہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں"۔

بعض لوگ اپنا مال بطور ہدیہ مالدار لوگوں کو دیتے تھے تاکہ وہ ہدیہ کے جواب میں زیادہ لوٹا دیں ۔ دو گنا' تین گنا' تو اللہ نے بتایا یہ مال بڑھانے کا طریقہ نہیں ہے۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ (۳۰:۳۹) "اور جو سود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں شامل ہو کر وہ بڑھ جائے تو اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا"۔ روایات میں اس آیت کا یہی مفہوم بتایا گیا ہے لیکن قرآن کی نص عام ہے اور وہ تمام سودی معاملات اس کی زد میں آتے ہیں جن کے ذریعے سے لوگ مال بڑھاتے ہیں چاہے اس کی شکل و صورت جو بھی ہو۔ ربا کے طریق کے مطابق مال بڑھانے کے بجائے یہ بتایا گیا کہ حقیقی ترقی کی صورت کیا ہے۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (۳۰:۳۹)

"اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی کے لیے دیتے ہو' اس کے دینے والے درحقیقت اپنا مال بڑھاتے ہیں"۔ یہ ہے وہ ذریعہ اور طریقہ جو مال کے بڑھانے کا یقینی طریقہ ہے۔ یعنی مال مفت عطا کرو' کسی جوابی انعام کا انتظار نہ کرو' کوئی معاوضہ نہ ہو۔ خالص فی سبیل اللہ اور لوجہ اللہ خرچ کرو اس لیے کہ وہی اللہ ہے جو رزق میں کشادگی عطا کرتا ہے اور وہی رزق کو تنگ کرنے والا بھی ہے۔ دینے والا اور روکنے والا وہی ہے۔ جو لوگ اللہ کے لیے خرچ کرتے ہیں وہ ان کو کئی گنا زیادہ دیتا ہے اور جو لوگ لوگوں کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں' ان کے اموال میں وہ کمی کرتا ہے۔ یہ سودی کاروبار دنیا کا انتظام ہے اور وہ حساب آخرت ہے اور اس میں کئی گنا مال ملتا ہے۔ یہی نفع بخش تجارت ہے' یہاں بھی اور وہاں بھی۔

اب رزق اور کسب کے زاویہ سے شرک کے مسئلہ کو لیا جاتا ہے۔ موجودہ لوگوں میں شرک کے آثار اور امم سابقہ میں شرک کے آثار بتائے جاتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ هَلْ
۴ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا
۱۴ع يُشْرِكُوْنَ ۝ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ
۷ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ
فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ۝

"اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا' پھر تمہیں رزق دیا' پھر وہ تمہیں موت دیتا ہے' پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا۔ کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا ہے جو ان میں سے کوئی کام بھی کرتا ہو؟ پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے۔ لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے تاکہ مزہ چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا' شاید کہ وہ باز آئیں۔ (اے نبیؐ) ان سے کہو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو۔ پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہو چکا ہے' ان میں سے اکثر مشرک ہی تھے"۔

اللہ ان کی زندگی کی حقیقی صورت حال ان کے سامنے رکھتے ہیں اور ان کے ایسے حالات ان کے سامنے پیش فرماتے ہیں جن کے بارے میں انہیں شک نہیں ہے کہ ان حالات کا موجد اللہ ہے' یا ایسے حالات جن کے بارے میں وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان کے مزعومہ خدا اور الٰہ ان حالات کے موجد ہیں' یا شریک ہیں' یہ کہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ وہی ہے جو تمہارا رازق ہے' وہی تمہیں مارتا ہے' وہی تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ جہاں تک تخلیق کا تعلق ہے' اس کا وہ اقرار کرتے تھے' جہاں تک رزق کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں بھی وہ یہ دعویٰ نہ کر سکتے تھے کہ ان کے مزعومہ الٰہ ان کو رزق دیتے ہیں۔ رہا مارنا تو وہ اس بات کے سوا اور کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے تھے کہ اللہ ہی مارنے والا ہے۔ رہا مسئلہ بعث بعد الموت کا تو اس میں وہ شک کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مسلمات کے ساتھ بعث بعد الموت کو بھی فہرست مسلمات میں پیش فرماتے ہیں تاکہ ان کا شعور جاگ اٹھے۔ اور اس طرح وہ اس کے قائل ہو جائیں۔ یہ براہ راست ان کی فطرت اور وجدان سے ہمکلامی ہے۔ اگرچہ ان کی فطری سوچ کے اندر انحراف آ گیا تھا لیکن اگر فطرت کو اصل حالات پر چھوڑا جائے اور انسان فطری انداز میں سوچے تو بعث بعد الموت کے عقیدے کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کے بعد ان سے پوچھتے ہیں۔

هَلْ مِنْ شُرَكَآءِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ (۳۰ : ۴۰) "کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے' جو ان میں سے کوئی کام بھی کرتا ہو"۔ اس سوال کے جواب کا انتظار نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ ایک ایسا سوال ہے جو تردید کے لیے ہے اور ساتھ ساتھ سرزنش بھی جس کے جواب کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ بس اس کے بعد یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ اس قسم کے شریکوں سے پاک ہے۔

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۳۰ : ۴۰) "اللہ پاک ہے' بہت بالا و برتر اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں"۔

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں انسانی زندگی کی اصلاح و فساد کا تعلق لوگوں کے اعمال سے ہے۔ جب لوگوں کے دل بگڑ جائیں' ان کے اعمال خراب ہوں اور ان کے عقائد خراب ہوں تو اس سے نظام ارضی میں خلل پڑ جاتا ہے اور خشکی اور تری دونوں اس فساد کی لپیٹ میں آ جاتی ہیں۔ لوگوں کی اقدار حیات پر یہ فساد غالب آ جاتا ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ (۳۰ : ۴۱) "خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے"۔ دنیا کے نظام میں فساد کا ظہور اور اس کا پھیل جانا بے مقصد نہیں ہوتا۔ اور نہ اچانک بطور اتفاق ہو جاتا ہے۔ یہ اللہ کی تدبیر اور اس کے قوانین فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔

لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا (۳۰: ۴۱) "تاکہ مزہ چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا"۔ یعنی جب وہ ایسے اعمال کر رہے ہوں جو شرو فساد کا باعث ہوں اور جب اس عمومی فساد کی لپیٹ میں وہ آ جاتے ہیں اور اس کی جلن اور تپش محسوس کرتے ہیں تو امکان پیدا ہو جاتا ہے۔

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۳۰: ۴۱) "شاید کہ وہ باز آ جائیں"۔ اور عزم کر لیں کہ ہم اس فساد کا مقابلہ کریں گے اور اللہ کی طرف رجوع کر کے عمل صالح شروع کر دیں گے اور زندگی کے راست اور درست نظام کو اپنا لیں گے۔

اس سبق کے آخر میں ان کو اس انجام سے ڈرایا جاتا ہے جو زمانہ ماقبل کے مشرکین کو نصیب ہوا۔ اہل مکہ ان میں سے اکثر کے انجام سے واقف بھی تھے کیونکہ وہ اپنے سفروں میں ان کے آثار دیکھا کرتے تھے۔ یہ آثار امام مبین پر تھے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلُ كَانَ أَكْثَرُهُم مُّشْرِكِينَ (۳۰: ۴۲) "(اے نبیؐ) ان سے کہو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو۔ پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہو چکا ہے' ان میں سے اکثر مشرک ہی تھے"۔ ان کا انجام وہ بار بار دیکھتے تھے جب وہ زمین میں پھرتے تھے۔ یہ انجام ایسا تھا جو کسی کو اس رویے پر آمادہ نہ کرتا تھا جو ان لوگوں نے اختیار کیا ہوا تھا۔

یہاں آ کر اب دوسرا راستہ بھی بتا دیا جاتا ہے جس پر چلنے والے کبھی گمراہ نہیں ہوتے۔ اور ایک دوسرے بلند افق کی طرف ان کی نظریں مبذول کرائی جاتی ہیں جس کی طرف جانے والے کبھی نامراد نہیں ہوتے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ يَوْمَئِذٍ يَصَّدَّعُونَ ۝ مَن كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِأَنفُسِهِمْ يَمْهَدُونَ ۝ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِن فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ۝

"(اے نبیؐ) اپنا رخ مضبوطی کے ساتھ جما دو' اس دین راست کی سمت میں قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس کے ٹل جانے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ اس دن لوگ پھٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے' جس نے کفر کیا ہے اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے' اور جن لوگوں نے نیک عمل کیا ہے' وہ اپنے ہی لیے (فلاح کا راستہ) صاف کر رہے ہیں تاکہ اللہ ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کو اپنے فضل سے جزا دے' یقیناً وہ کافروں کو پسند نہیں کرتا"۔

دین قیم کی طرف متوجہ ہونے والے کے لیے قرآن جو شکل تجویز کرتا ہے وہ نہایت ہی اثر انگیز ہے اور یہ بتاتی ہے کہ متوجہ ہونے والا شخص اپنی پوری توجہ سے اس طرف مڑ گیا ہے۔ وہ سنجیدہ اور سیدھا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ (۳۰:۴۳) "اپنا رخ مضبوطی کے ساتھ جما دو دین راست کی سمت میں"۔ نہایت اہتمام' نہایت توجہ' صدور حکم کے انتظار کی طرح' نہایت پختگی کے ساتھ اپنا رخ عالم بالا کی طرف کر دو جس طرح ایک فوجی (اٹن شن) کی حالت میں ہوتا ہے۔

دین قیم کی طرف رخ جما دینے کا حکم پہلی مرتبہ اس سورہ میں اس وقت آیا تھا جب بات لوگوں کی خواہشات نفسانیہ کے پیچھے دوڑنے کے موضوع پر ہو رہی تھی اور مختلف احزاب مختلف سمتوں میں دوڑ رہی تھیں۔ یہاں شرکاء کے مقابلے میں یہ حکم آیا ہے۔ رزق کے اضافے کے مضمون کے موقعہ پر ہے۔ شرک کی وجہ سے فساد پیدا ہونے اور لوگوں کی بدعملی کی وجہ سے پوری دنیا میں فساد پھیلنے کے مضمون کے موقعہ پر یہ حکم آیا ہے۔ اس کے بعد یہاں بتایا جاتا ہے کہ جس نے اچھے عمل کیے تو وہ اچھا پھل پائیں گے اور جس نے برے کام کیے تو اس کا برا انجام ہو گا۔ یہ دن ایسا ہو گا کہ جہاں لوگوں کے دو فریق ہوں گے' اہل ایمان اور اہل کفر اور ہر ایک کا اپنا انجام ہو گا اور یہ دن اٹل ہو گا۔

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ (۳۰:۴۴) "جس نے کفر کیا ہے اس کے کفر کا وبال اس پر اور جن لوگوں نے نیک عمل کیا ہے' وہ اپنے ہی لیے (فلاح کا راستہ) صاف کر رہے ہیں"۔ یمھد کا مفہوم ہے تیار کرنا' کنٹرول میں لانا' پنگھوڑا تیار کرنا جس میں بچہ آرام سے رہتا ہے' راستہ تیار کرنا' بستر تیار کرنا' جس پر آرام کیا جاتا ہے۔ تمام مفاہیم کا مطلب یہ ہے کہ اپنے لیے کسی چیز کو ہموار کرتے ہیں۔ یمھدون سے عمل صالح کے مزاج' نوعیت اور اس کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ جو لوگ عمل صالح کرتے ہیں وہ دراصل خود اپنے لیے آرام' خوشگواری اور مسرت کا ماحول تیار کرتے ہیں' یعنی حالت عمل میں بھی ان کو یہ نتائج مل جاتے ہیں' بعد کی بات تو اور ہے۔ قرآن کے انداز تعبیر يَمْهَدُوْنَ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ (۳۰:۴۵) "تاکہ اللہ ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کو اپنے فضل سے جزا دے"۔ فضل سے جزاء دینے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان جنت کا مستحق صرف اپنے اعمال ہی پر نہیں ہو سکتا۔ انسان جس قدر اعمال بھی کرے ان سے وہ اللہ کے ایک معمولی فضل کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا۔ جنت صرف فضل ربی سے مل سکتی ہے۔ اللہ سبحانہ کافروں کو بہت ہی ناپسند کرتے ہیں۔

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (۳۰:۴۵) اب یہاں اللہ کی بعض نشانیوں کی سیر کرائی جاتی ہے۔ اللہ کی نشانیاں ہونے کے ساتھ ساتھ انسانوں کے لیے وہ فضل و رحمت بھی ہیں۔ ان نشانیوں کی وجہ سے انسان کو رزق فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ ان کے لیے ہدایت ہے لیکن وہ اللہ کی ان نشانیوں میں سے بعض کو پہچانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ
مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝۴۶
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا

مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ۝ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ۝

"اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے' بشارت دینے کے لیے اور تمہیں اپنی رحمت سے بہرہ مند کرنے کے لیے اور اس غرض کے لیے کہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکرگزار ہو۔ اور ہم نے تم سے پہلے رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے' پھر جنہوں نے جرم کیا ان سے ہم نے انتقام لیا اور ہم پر یہ حق تھا کہ ہم مومنوں کی مدد کریں۔

اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں' پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے' پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے' برساتا ہے تو یکایک وہ خوش و خرم ہو جاتے ہیں حالانکہ اس کے نزول سے پہلے وہ مایوس ہو رہے تھے۔ دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات کہ وہ مردہ پڑی ہوئی زمین کو وہ کس طرح جلا اٹھاتا ہے' یقیناً وہ مردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اگر ہم ایک ایسی ہوا بھیج دیں جس کے اثر سے وہ اپنی کھیتی کو زرد پائیں تو وہ کفر کرتے رہ جاتے ہیں"۔

ان آیات میں بظاہر نہایت مختلف النوع موضوعات کو جمع کیا گیا۔ بشارت دینے والی ہوائیں' رسولوں کو معجزات اور نشانیوں کے ساتھ بھیجنا' مومنین کا رسولوں کے ذریعہ مدد کرنا' ایسی بارشوں کا نزول جو مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہیں اور بعث بعد الموت کا مسئلہ۔ یہ اجتماع بامقصد ہے۔ یہ سب چیزیں اللہ کی رحمت کی نشانیاں ہیں۔ یہ سب سنت الہیہ کے مظاہر ہیں' یہ سب اس کائنات کے نظام کے تحت ہیں' رسولوں کو ہدایت کے ساتھ بھیجنے اور مومنین کی نصرت کے درمیان گہرا تعلق ہے اور یہ سب آیات الہیہ کے مختلف نمونے ہیں۔ یہ سب امور اللہ کی نعمتوں اور رحمتوں سے متعلق ہیں۔ لوگوں کی زندگی ان سب امور پر موقوف ہے اور یہ سب امور نظام کائنات کے ساتھ متعلق ہیں۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ یُرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ (۳۰: ۴۶) "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے بشارت دینے کے لیے"۔ یہ ہوائیں بارشیں برساتی اور پھیلاتی ہیں۔ یہ لوگ بارش برسانے والی ہواؤں کو خوب جانتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کو مہارت اور تجربہ حاصل تھا۔ جب ایسی ہوائیں چلتیں تو یہ لوگ خوش ہوتے۔

وَلِیُذِیْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ (۳۰: ۴۶) "تاکہ وہ انہیں اپنی رحمت سے بہرہ مند کرے"۔ اس رحمت کے نتیجے میں سرسبزی اور شادابی اور روئیدگی ہوتی ہے۔

وَلِتَجْرِیَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ (۳۰: ۴۶) "تاکہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں"۔ یہ کشتیاں اس طرح بھی چلتی ہیں کہ یہ ہوائیں انہیں چلاتی ہیں اور یوں بھی کہ ہواؤں سے بارش برستی ہے' دریا بہتے ہیں اور ان میں کشتیاں چلتی ہیں۔ یہ ان ظاہری اسباب کے باوجود امرالہی سے چلتی ہیں۔ اس سنت الہیہ کے مطابق جس کے مطابق اللہ نے اس کائنات کو بنایا ہے۔ اللہ کے اس نظام تقدیر کے مطابق کہ اللہ نے ہر چیز کے اندر ایک خاصیت مقدر کر دی ہے۔ مثلاً یوں کہ پانی کی سطح پر کشتی کو ہلکا بنایا اور وہ چلنے لگی۔ اور یوں کہ یہ کشتی ہوا اور موجوں کے رخ پر اور ہوا اور موجوں کے رخ کے تضاد میں چلے۔ اللہ نے ہر چیز کو ایک مقدار کے مطابق بنایا ہے۔

وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (۳۰: ۴۶) "تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو"۔ یعنی تجارتی سفروں میں اور فصل کاٹنے میں' لین اور دین میں یہ سب امور اللہ کے فضل سے ہیں اور اللہ نے ہر چیز کو ایک مقدار کے مطابق پیدا کیا ہے --- پورا پورا۔

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۳۰: ۴۶) "تاکہ تم شکر کرو"۔ یہ سب امور فضل الہی ہیں اور ان پر تم شکر کرو۔ یہ تمام امور ایسے ہیں جن کے مقابلے میں بندگان خدا کا فرض ہے کہ وہ اللہ کی ان نعمتوں کے مناسب رویہ اختیار کریں۔ ہواؤں کے بھیجنے کی طرح رسولوں کا بھیجنا بھی انسانوں پر اللہ کا فضل وکرم ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰی قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ (۳۰: ۴۷) "اور ہم نے تم سے پہلے رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے"۔ لیکن لوگوں نے اللہ کی اس رحمت کا انتظار نہ کیا حالانکہ اللہ کی یہ رحمت ایسی تھی کہ ان کو اس کا استقبال تو ہواؤں سے زیادہ کرنا چاہئے تھا۔ ان لوگوں نے رسولوں سے کوئی استفادہ نہ کیا حالانکہ یہ نفع زیادہ اور دائمی نفع تھا بمقابلہ بارش اور پانی کے منافع کے اور رسولوں کے مقابلے میں یہ لوگ بٹ گئے۔ ایک گروہ ان مجرمین کا تھا جو ایمان نہ لاتے تھے۔ اللہ کی آیات پر تدبر نہ کرتے تھے۔ رسولوں کو اذیت دینے سے بھی نہ چوکتے تھے' اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے باز رکھنے کے جرم سے بھی باز نہ آتے تھے۔ دوسرا گروہ ان مومنین کا تھا جو اللہ کی آیات کو سمجھ جاتے تھے۔ اللہ کا شکر ادا کرتے تھے' اللہ کے وعدوں پر اعتماد کرتے تھے اور وہ ان مجرمین کے ہاتھوں اذیتیں برداشت کرتے۔ بہت زیادہ اذیتیں۔ چنانچہ انجام وہی ہوتا تھا جو اللہ کے عدل کے مطابق تھا اور اللہ کا وعدہ ہمیشہ پختہ ہوتا ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۳۰:۴۷) "پھر جنہوں نے جرم کیا ان سے ہم نے انتقام لیا اور ہم پر یہ حق تھا کہ ہم مومنوں کی مدد کریں"۔

پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے اوپر مومنین کی امداد فرض کر لی۔ اور اسے مومنین پر محض فضل و کرم کے بجائے ان کا حق قرار دیا۔ اسے اس انداز میں موکد قرار دیا اور لازمی قرار دیا کہ اس امداد میں کوئی شک و شبہ نہ رہا اور شک و شبہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب وعدہ کرنے والا اللہ ہو' جو قوی' عزیز اور جبار ہے۔ وہ بلند اور اپنے بندوں پر کنٹرول کرنے والا اور حکیم و خبیر ہے۔ یہ اللہ فرماتے ہیں جس کا ارادہ کبھی رد نہیں ہوتا اور اس کی سنت کبھی بھی ٹلنے والی نہیں ہوتی کیونکہ اس کا ناموس فطرت اس پوری کائنات میں جاری ہے۔

بعض اوقات یہ نصرت بظاہر دیر میں آتی ہے لیکن یہ دیر انسانوں کے اپنے اندازوں کے مطابق ہوتی ہے کیونکہ لوگ معاملات کا حساب اپنے پیمانوں سے کرتے ہیں' اللہ کے پیمانوں سے نہیں کرتے۔ معاملات کا اندازہ اللہ کے اندازوں کے ساتھ نہیں کرتے اور اللہ حکیم اور خبیر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ امداد کا صحیح وقت کون سا ہے۔ اس کا وعدہ اس وقت سچ ہوتا ہے جس وقت اللہ کی مشیت ہو۔ اس کی حکمت کا تقاضا ہو' اللہ جو وقت مقرر کرتا ہے اس کی حکمت بعض اوقات انسانوں کو معلوم ہوتی ہے اور بعض اوقات معلوم نہیں ہوتی لیکن اللہ جو چاہتا ہے' وہی بہتر ہوتا ہے اور اللہ جو وقت مقرر کرتا ہے وہی صحیح ہوتا ہے۔ لیکن اللہ کا وعدہ قطعی ہے اور عین الیقین ہے اور صبر کرنے والے' اس پر بھروسہ کرنے والے بڑے اطمینان سے اس کا انتظار کرتے ہیں۔

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے' جو بارشیں برساتی ہیں۔ جن سے زمین زندہ ہوتی ہے حالانکہ وہ مرچکی تھی۔ بس یہی انداز ہو گا حشر میں لوگوں کے اٹھائے جانے کا۔ یہی انداز ہو گا۔ فصل کی طرح لوگ زمین سے اگ آئیں گے۔ یہ دونوں اس کائنات کے طبیعی سنن ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِىْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ (۳۰:۴۸) "اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے"۔ یہ ہوائیں اس کے قانون قدرت کے مطابق چلتی ہیں اور یہ قانون اس کائنات میں اچھی طرح متصرف ہے۔

فَتُثِيْرُ سَحَابًا (۳۰:۴۸) "وہ بادل اٹھاتی ہیں"۔ اور یہ ہوائیں پانی کے بخارات اٹھاتی ہیں۔ ان بخارات کو وہ آسمانوں میں پھیلاتی ہیں۔

فَيَبْسُطُهٗ فِى السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ (۳۰:۴۸) "پھر ان کو آسمانوں میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے"۔

وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا (۳۰:۴۸) "پھر انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے"۔ یعنی جمع کرتا ہے۔ وہ کثیف اور بوجھل بن جاتے ہیں۔ وہ پھر ایک دوسرے کے اوپر اور نیچے تہوں میں جم جاتے ہیں۔ بعض ٹکڑیوں کا بعض کے ساتھ تصادم ہوتا ہے۔ پھر بجلیاں چمکتی ہیں۔

فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ (۳۰:۴۸) "پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکتے چلے آتے ہیں"۔ ودق کے معنی بارش کے ہیں جو بادلوں سے نکلتی ہے۔

فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۳۰:۴۸) "یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے' برساتا ہے تو یکایک وہ خوش و خرم ہو جاتے ہیں"۔ اس خوشی کو اچھی طرح وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کی زندگی بارش پر موقوف ہوتی ہے۔ عرب اس منظر سے اچھی طرح واقف تھے جن کی پوری معیشت آسمانوں کے پانیوں پر موقوف تھی اور ہے۔ اس کا تذکرہ وہ اپنے اشعار اور اپنی روایات و محاورات میں بڑی محبت سے کرتے ہیں اور بڑے فخر و مباہات کے ساتھ کرتے ہیں۔

وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ (۳۰:۴۹) "حالانکہ اس کے نزول سے پہلے وہ مایوس ہو رہے تھے"۔ یہ تو ہے ان کی حالت اس وقت جب بارش نہ برسی ہوئی تھی۔ وہ مایوس ہوتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ گویا وہ مرنے ہی والے ہیں۔ لیکن جب بارش آجاتی ہے تو وہ خوش و خرم ہوتے ہیں۔

فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ (۳۰:۵۰) "دیکھو' اللہ کی رحمت کے اثرات کو"۔ ذرا ان خوش و خرم چہروں کو دیکھو جو بالکل مایوس ہو گئے تھے اور اس زمین پر ان آثار کو دیکھو جو تباہ شدہ تھی اور مردہ تھی۔ اور ذرا اس زندگی میں دیکھو جو زمین پر چلتی پھرتی ہے اور اسے ذرا لوگوں کے دلوں میں دیکھو کہ خوشی کی وجہ سے ان میں کیا کیا امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔

يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۳۰:۵۰) "کہ مردہ پڑی ہوئی زمین کو کس طرح جلا اٹھاتا ہے"۔ یہ تو ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ اس کے دیکھنے کے لیے کسی زیادہ عقل کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی بات دلیل روشن ہے اس پر کہ حشر کے دن اس زمین سے انسان اسی طرح اُگ آئیں گے۔ یہ قرآن کریم کا وجدانی طرز استدلال ہے کہ وہ اس کائنات کے قابل مشاہدہ مناظر سے عقائد اور مستقبل کے واقعات اور امکانیات ثابت کرتا ہے۔ قرآن انہی پیش پا افتادہ مناظر سے اپنا مدعا ثابت کرتا ہے۔

اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۳۰:۵۰) "یقیناً وہ مردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ اس زمین پر اللہ کی رحمت کے یہ آثار بتاتے ہیں کہ اللہ کا یہ وعدہ سچا ہے کہ وہ لوگوں کو اٹھائے گا اور ان کا اچھا یا برا انجام ہو گا' حسب وعدۂ الٰہی۔

اس حقیقت کی تصویر کشی کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ لوگ پانی سے لدے ہوئے بادل لانے والی ہواؤں کی آمد پر خوش ہوتے ہیں اور جب وہ اللہ رحمت کے آثار بادلوں اور بارش کی صورت میں دیکھتے ہیں تو خوش و خرم ہوتے ہیں۔ یہی لوگ اگر دیکھیں کہ یہ ہوا اور یہ بادل زرد ہیں' ان ہواؤں میں پانی کے بجائے گرم ریت اور مٹی بھری ہوئی ہے۔ پانی کا قطرہ بھی نہیں ہے' اور یہ ہوا ایسی ہے کہ فصلوں کو زرد کر کے رکھ دیتی ہے اور دودھ پلانے والے جانوروں کو خشک کر دیتی ہے اور جس سے فصل زرد ہو کر قبل از وقت خشک ہو کر بھوسہ بن جاتی ہے تو ان کی حالت یہ ہوتی ہے :

وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ (۳۰:۵۱) "اور اگر ہم ایک ایسی ہوا بھیج دیں جس کے اثرات سے وہ اپنی کھیتی کو زرد پائیں تو وہ کفر کرتے رہ جائیں"۔ اس عذاب کو پا کر اور

مایوس ہو کر بھی وہ کفر کریں ۔ اور اللہ کی قدرت کا اقرار نہ کریں اور اللہ کے سامنے نہ گڑگڑائیں کہ وہ اس مصیبت کو دور کرے بلکہ کفر کے رویہ ہی پر جم جائیں ' ایمان نہ لائیں اور یہ ہرگز نہ سمجھ سکیں کہ اللہ کی حکمت اور تدبیر کیا کیا کرتی ہے ۔ ان کو ان مصیبتوں کے پیچھے دست قدرت نظر نہ آئے ۔ وہ ان واقعات اور حادثات کی تفسیر و تعبیر اس طرح نہ کریں کہ یہ سب کچھ اللہ کے قانون قدرت اور ناموس فطرت کے مطابق ہو رہا ہے ...... بلکہ ابدی کافرانہ تاویلات ہیں ۔

جب لوگ اس حد تک پہنچ جائیں کہ وہ اس دنیا کے واقعات اور حادثات کی تعبیر بھی اپنی خواہشات کے مطابق کرنے لگیں اور ان واقعات کے اندر جو اللہ کے نشانات و اشارات پنہاں تھے ' ان کو سمجھنے کی سعی ہی نہ کریں ۔ اپنے ماحول کے اندر غور ہی نہ کریں ۔ ان مشاہدات میں ان کو اللہ کی قدرت اور حکمت نظر ہی نہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جاتا ہے کہ بس ایسے لوگوں کو ہدایت دینے سے آپ معذور ہیں ۔ ایسے لوگوں کو ان کے مزاج کے حوالے کر دیں کیونکہ ان کی بصیرت اور بصارت دونوں ختم ہو چکی ہیں ۔

فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا
۵ مُدْبِرِينَ ﴿٥٢﴾ وَمَا أَنتَ بِهَادِ الْعُمْيِ عَن ضَلَالَتِهِمْ ۖ إِن تُسْمِعُ إِلَّا مَن يُؤْمِنُ
۱۳ع بِآيَاتِنَا فَهُم مُّسْلِمُونَ ﴿٥٣﴾
۸

" (اے نبی) تم مردوں کو نہیں سنا سکتے ' نہ ان بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے ہو جو پیٹھ پھیرے چلے جا رہے ہوں ' اور نہ تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال کر راہ راست دکھا سکتے ہو ۔ تم تو صرف انہی کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے اور سر تسلیم خم کر دیتے ہیں " ۔

یہ لوگ مردے ہیں ' ان میں زندگی کی رمق نہیں ' یہ بہرے ہیں ' کوئی آواز نہیں سن سکتے ۔ یہ اندھے ہیں ان کو کچھ بھی نظر نہیں آتا ۔ جو شخص اپنے احساس کے دروازے اس کائنات اور نوامیس فطرت کے لیے بند کر دیتا ہے اور اسے فطرت کے یہ نشانات نظر نہیں آتے وہ مرچکا ہے ۔ اس میں حیات نہیں ہے ۔ اگر کوئی زندگی ہے تو پھر یہ حیوانی زندگی ہے بلکہ وہ حیوانوں سے بھی زیادہ گمراہ ہے ۔ حیوانوں میں ایک فطری شعور ہوتا ہے اور وہ شعور کبھی بھی غلطی نہیں کرتا ۔ جو شخص اللہ کی ان نشانیوں کی پکار نہیں سنتا وہ بالکل بہرہ ہے ۔ اگرچہ اس کے کان ہوں اور ان کے ساتھ آواز ٹکراتی ہو ۔ جو شخص اس کائنات میں بکھری ہوئی اللہ کی نشانیوں کو نہیں دیکھتا ' وہ اندھا ہے اگرچہ حیوان کی طرح اس کے بڑے بڑے موٹے موٹے دیدے ہوں ۔

اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ( ۳۰ : ۵۳ ) " تم صرف انہی کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے اور سر تسلیم خم کر دیتے ہیں " ۔ ایسے ہی لوگ دعوت کو سنتے ہیں کیونکہ ان کے دل زندہ ہوتے ہیں اور زندہ دراصل دل کی زندگی ہوتی ہے ۔ ان کی آنکھیں بینا ہوتی ہیں ۔ ان کی قوائے مدرکہ صحیح و سلامت ہوتی ہیں '

لہٰذا وہ سنتے ہیں ۔ سر تسلیم خم کرتے ہیں ۔ دعوت کی پکار ان کی فطرت سے ٹکراتے ہی ان کے اندر انابت پیدا کرتی ہے ۔

--- ○○○ ---

اب ذرا انسان کو خود اس کی ذات اور اس کے جسم کی دنیا میں گھمایا جاتا ہے ۔ اپنے ماحول سے لاکر خود اپنے نفس کی وادیوں میں پھرایا جاتا ہے کہ تم پیدا کیسے ہوئے ؟ اس زمین پر تمہاری پیدائش کیسی ہے ؟ زندگی کیسی ہے اور تم مر کس طرح جاتے ہو؟ اور پھر قیامت کا منظر کیا ہو گا؟

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ ۝ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ۬ مَا لَبِثُوْا غَیْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا یُؤْفَكُوْنَ ۝ وَ قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِیْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰی یَوْمِ الْبَعْثِ ؗ فَهٰذَا یَوْمُ الْبَعْثِ وَ لٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ فَیَوْمَئِذٍ لَّا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَا هُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ ۝

”اللہ ہی تو ہے جس نے ضعف کی حالت سے تمہاری پیدائش کی ۔ ابتدا کی ‘ پھر اس ضعف کے بعد تمہیں قوت بخشی ‘ پھر اس قوت کے بعد تمہیں ضعیف اور بوڑھا کر دیا ۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے ‘ پیدا کرتا ہے ۔ اور وہ سب کچھ جاننے والا ‘ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۔ اور جب وہ ساعت برپا ہو گی تو مجرم قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھہرے ہیں ‘ اسی طرح وہ دنیا کی زندگی میں دھوکا کھایا کرتے تھے ‘ مگر جو علم اور ایمان سے بہرہ مند کیے گئے تھے وہ کہیں گے کہ خدا کے نوشتے میں تو تم روز حشر تک پڑے رہے ہو ‘ سو یہ وہی روز حشر ہے ‘ لیکن تم جانتے نہ تھے ۔ پس وہ دن ہو گا جس میں ظالموں کو ان کی معذرت کوئی نفع نہ دے گی اور نہ ان سے معافی مانگنے کے لیے کہا جائے گا“ ۔

یہ ایک بہت ہی طویل مطالعاتی سفر ہے ۔ اس کا آغاز تو انسانی زندگی کے آغاز سے ہوتا ہے اور یہ ہمارے سامنے ہے اور آئے دن کا مشاہدہ ہے ۔ اس کا آخری حصہ نہایت ہی اگرچہ مشہود نہیں ہے لیکن قرآن کی تصویر کشی ایسے الفاظ میں کرتا ہے کہ گویا وہ ہماری نظروں کے سامنے ہے ۔ یہ ایک ایسا مطالعاتی سفر ہے کہ چشم بینا رکھنے والوں کے لیے اور کھلے کان رکھنے والوں کے لیے اور کان لگا کر سننے والوں کے لیے اس میں سامان عبرت ہے ۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ( ۳۰ : ۵۴ ) ”اللہ ہی تو ہے جس نے ضعف کی حالت سے تمہاری پیدائش کی“ ۔ یہ کہا کہ تمہیں ضعف سے پیدا کیا ۔ یہ نہ کہا کہ تمہیں ضعیف پیدا کیا ۔ گویا ان کی حیات کے آغاز کا عنصر ہی ضعیفی ہے اور یہاں جس ضعف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کے کئی مفہوم اور مظاہر ہیں اور یہ مظاہر انسان کے

اندر قابل مشاہدہ ہیں اور مزید مشاہدات ہوتے جاتے ہیں ۔

وہ چھوٹا سا خلیہ جس سے جنین بنتا ہے ' جو بہت ہی خوردبینی اور چھوٹا سا ہے اور ضعیف ہے ۔ پھر جنین اور اس کے تمام مدارج حالت ضعف ہیں ۔ پھر زمانہ طفولیت سب کا سب حالت ضعف ہے ' اس وقت تک جب انسان مکمل نوجوان ہو جاتا ہے ۔

پھر وہ مادہ جس سے انسان بنتا ہے ' ضعیف ہے مٹی ۔ اگر اس میں نفخ ربانی نہ ہوتی تو یہ مٹی ہی ہوتی یا نباتات ہوتے یا حیوانات ہوتے ۔ جو انسان کے مقابلے میں سب حالات ضعف ہیں ۔ پھر انسان اپنی خواہشات کے سامنے کمزور ہے ۔ امتحانات و میلانات اسے مجبور کر دیتے ہیں ' اگر اللہ کی جانب سے نفخ روح نہ ہوتا تو انسان اس احسن تقویم میں نہ ہوتا ۔ اس کے اندر یہ صلاحیتیں نہ ہوتیں اور یہ بھی دوسرے حیوانات کی طرح ایک ضعیف اور لاچار حیوان ہوتا ۔

ثُمَّ جَعَلَ مِنۢ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ( ۳۰ : ۵۴ ) "پھر اس ضعف کے بعد تمہیں قوت بخشی" ۔ ایسی قوت اور ان معنوں میں قوت جن معنوں میں ضعف بیان ہوا ۔ جسمانی قوت ' انسانی ساخت میں قوت ' انسان کی نفسیاتی اور روحانی قوت اور انسان کی فکری اور عقلی قوت ۔

ثُمَّ جَعَلَ مِنۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَّ شَيْبَةً ( ۳۰ : ۵۴ ) "پھر اس قوت کے بعد تمہیں ضعیف اور بوڑھا کر دیا" ۔ انسانی جسم ڈھیلا پڑ گیا ' بڑھاپا دراصل انسان کی تمام قوتوں کے اندر طفولیت کی طرف رجوع ہوتا ہے ۔ کبھی کبھی اس کے اندر نفسیاتی گراوٹ بھی آجاتی ہے اور انسان ضعیف الارادہ ہو جاتا ہے ۔ بعض اوقات ایک بوڑھا اس طرح لایعنی باتیں کرتا ہے جس طرح ایک بچہ ہوتا ہے ۔ اس کے ارادے کے اندر کوئی قوت نہیں ہوتی ۔ بڑھاپے کے ساتھ بالوں کی سفیدی دراصل بڑھاپے کو مجسم کر دیتی ہے اور بالوں کی سفیدی کے ساتھ قوائے انسانی کا ضعف سامنے نظر آتا ہے ۔

یہ ادوار ' جن سے کوئی فانی چیز نہیں بچ سکتی اور جس شخص کو طویل عمر نصیب ہو ' ان کے اندر کبھی کوئی دور غائب نہیں ہوتا ' کبھی یوں نہیں ہوتا کہ ان میں سے کوئی دور اپنے وقت پر نہ آئے ۔ ان ادوار کا اسی ترتیب کے ساتھ ہر شخص پر آنا اس بات کا مظہر ہے کہ یہ انسان کسی مدبر ہستی کے کنٹرول میں ہے ۔ وہ ہستی جو چاہتی ہے ' تخلیق کرتی ہے ' جو چاہتی ہے ' مقدر بناتی ہے اور جس طرح چاہتی ہے ' ہر مخلوق کے لیے اس کے حالات اور طور طریقوں کا منصوبہ بناتی ہے ۔ یہ سب کام اللہ کے پختہ علم ' اس کی تقدیر اور گہری ٹیکنالوجی کے مطابق انجام پاتے ہیں ۔

يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ( ۳۰ : ۵۴ ) "وہ جو کچھ چاہتا ہے ' پیدا کرتا ہے ' جو سب کچھ جانتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۔

لہٰذا اس محکم اور ٹیکنیکل اور نقشے کے مطابق بنی ہوئی اس مخلوق کا کچھ بامعنی انجام بھی ہے ۔ ہاں اس کا ایک نہایت ہی بامعنی انجام اور فلسفہ ہے اور دیکھو اسے ایک منظر میں جو قیامت کے مناظر میں سے ایک پرتاثیر منظر ہے اور حرکت اور مکالموں سے ہر منظر میں پیش کیا جاتا ہے ۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ( ۳۰ : ۵۵ ) "اور جب

وہ ساعت برپا ہوگی تو مجرم قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھہرے ہیں"۔ ان کے احساس میں دنیا میں گزرا ہوا پورا زمانہ سکڑ جائے گا۔ اس لیے وہ اپنے احساس کے مطابق قسم کھائیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ قبروں میں گزرے ہوئے زمانہ کے بارے میں یہ کہہ رہے ہوں کہ یہ زمانہ اس قدر مختصر تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد پورا زمانہ ہو یعنی زمین کی زندگی کا اور پھر قبروں میں رہنے کا۔

كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ (۳۰ : ۵۵) "اسی طرح وہ دنیا کی زندگی میں دھوکہ کھایا کرتے تھے"۔ اور حق سے منہ پھیرتے تھے اور دنیا میں بھی انہوں نے واقعات کا صحیح اندازہ نہ لگایا تھا۔ چنانچہ اہل علم اور اہل ایمان ان کے اس خیال کی تصحیح کر دیں گے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ

فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۳۰ : ۵۶) "مگر جو اہل علم اور ایمان سے بہرہ مند کیے گئے تھے، وہ کہیں گے کہ خدا کے نوشتے میں تو تم روز حشر تک پڑے رہے ہو، سو یہ وہی روز حشر ہے، لیکن تم جانتے نہ تھے"۔ یہ صاحبان علم و بصیرت وہی تھے جو اہل ایمان تھے۔ جنہوں نے حشر پہ یقین کیا ہوا تھا۔ اور انہوں نے وہ حقائق بھی جان لیے تھے جو اس ظاہری دنیا کے پیچھے تھے۔ یہ لوگ بھی معاملے کو اللہ کے علم کے سپرد کر دیتے ہیں۔

لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ (۳۰ : ۵۶) "درحقیقت اللہ کی کتاب میں تم یوم حشر تک رہے ہو"۔ یہ ہے وہ میعاد مقرر۔ اور اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ حشر تک پہنچتے پہنچتے تمہیں کتنی دیر لگی۔ یہ تھا مقررہ دن اور یہ آگیا دیکھ لو۔

اب یہ منظر ایک اجمالی کلیہ کی شکل میں ختم ہوتا ہے اور اس میں بتایا جاتا ہے کہ اب ظالموں کو کیا حالات پیش آنے والے ہیں جو حشر اور قیامت کی تکذیب کرتے تھے۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ (۳۰ : ۵۷) "پس یہ وہ دن ہو گا جس میں ظالموں کو ان کی معذرت کوئی نفع نہ دے گی اور نہ ان سے معافی مانگنے کے لیے کہا جائے گا"۔ نہ ان کی کوئی معذرت قبول ہو گی اور نہ کوئی ان پر عتاب کرے گا کہ تم نے ایسا ایسا کیوں کیا ہے۔ مانگو معافی، توبہ کرو، کیونکہ آج تو سزا ہو گی، یہاں کسی کو کوئی سرزنش نہ ہو گی، یہ یوم عقاب ہو گا، یوم عتاب نہ ہو گا۔

اب اس برے اور مایوس کن منظر سے واپس لا کر انہیں ان کے اس حال میں لایا جاتا ہے جس میں وہ اپنے عناد اور تکذیب میں ڈرے ہوئے تھے۔ یہ تھا عناد کا انجام اور یہ تھا تکذیب کا خاتمہ۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَئِنْ

جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ۞ كَذٰلِكَ

يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾

”ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا ہے۔ تم خواہ کوئی نشانی لے آؤ' جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے' وہ یہی کہیں گے کہ تم باطل پر ہو۔ اس طرح ٹھپہ لگا دیتا ہے اللہ ان لوگوں کے دلوں پر جو بے علم ہیں“۔

سیاق کلام میں اور مخاطبین کے زمان و مکان میں یکایک تبدیلی آگئی۔ یہ بہت ہی دور رس تبدیلی ہے لیکن یہاں دوریوں کے فاصلے سمیٹ لیے جاتے ہیں اور جس مقام پر اب ہم کھڑے ہیں وہ بہت ہی قریب نظر آتا ہے۔ دوبارہ ہم قرآن کے سامنے ہیں اور اس کی اعلیٰ مثالیں سن رہے ہیں۔ قرآن کے مختلف اور متنوع اسالیب کلام ہمارے سامنے ہیں' جہاں ہر رنگ اور ہر اسلوب اور ہر طریقے سے دلوں میں بات اتارنے کی سعی کی گئی ہے اور جس کے اندر بے شمار ایسے لمحات آتے ہیں جو انسان پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ یہ قرآن ہر دل سے ہم کلام ہے' ہر درجے کی عقل سے مخاطب ہے۔ ہر معاشرے اور ہر تہذیب سے اس کے مکالمات بقدر عقول الناس ہیں۔ وہ نفس انسانی کو اس کے مختلف حالات میں خطاب کرتا ہے۔ انسان کے حالات و اطوار میں سے ہر حال اور ہر طور کو زیر بحث لاتا ہے۔ لیکن ان ہمہ گیر اور ہمہ جہت مساعی کے بعد بھی لوگ تکذیب پر تلے ہوئے ہیں۔ اور یہ اللہ کی نشانیوں اور آیات کی تکذیب پر ہی اکتفاء نہیں کرتے بلکہ یہ لوگ صحیح علم رکھنے والوں پر دست درازیاں بھی کرتے ہیں اور الٹا ان پر الزام لگاتے ہیں کہ یہ لوگ باطل پرست ہیں۔

لَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ (۳۰: ۵۸) ”تم خواہ کوئی نشانی لے کر آ جاؤ' جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے' وہ یہی کہیں گے کہ تم باطل پر ہو“۔ پھر ز باتوں پر یہ تبصرہ آتا ہے:

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰: ۵۸) ”اس طرح ٹھپہ لگا دیتا ہے اللہ ان لوگوں کے دلوں پر جو بے علم ہیں“۔ یوں' یعنی اس طریقے کے مطابق اور ان وجوہات سے۔ یہ لوگ جو نہیں جانتے ان کے دلوں پر مہریں لگ گئی ہیں۔ ان کی چشم بصیرت اللہ کی آیات اور اس کے نشانات کو دیکھنے کے لیے کھلتی ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ اہل علم اور اہل ہدایت پر دست درازی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس بات کے مستحق بن گئے ہیں کہ اللہ ان کی بصیرت کو مسخ کر دے۔ ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دے کیونکہ اللہ سبحانہ ان دلوں کے بارے میں خوب جانتا ہے اور ان کی بصیرتوں کو بھی وہ اچھی طرح دیکھتا ہے۔

اس سورہ میں مشرکین کے ساتھ مکالمے' اس کائنات کی سیر' انسانی تاریخ کے مطالعے' اور انسانی شخصیت' انسانی زندگی اور اس کی نشوونما کی سیر کے بعد اور تمام شواہد اور نشانیوں کے دیکھ لینے کے بعد بھی بعض ایسے لوگوں کے مشاہدے کے بعد جو بالکل نہیں مانتے' اب یہ آخری ضرب ہے عقل و خرد کے تاروں پر۔ اس کے ذریعہ اہل ایمان اور رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ۶

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع ۷
۹

"پس (اے نبیؐ) صبر کرو' یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے' اور ہرگز ہلکا نہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے"۔

اس طویل جدوجہد اور اسلامی انقلاب کے دشوار گزار سفر میں صبر ہی وسیلہ مومنین ہے۔ یہ سفر اس قدر طویل ہے' اس قدر مشکل ہے کہ بعض اوقات انسان کو لاانتہا نظر آتا ہے۔ لیکن اللہ کے وعدے پر یقین کرنا چاہئے۔ بغیر کسی بے چینی' کسی تزلزل' بغیر کسی حیرانی و پریشانی کے اپنے مقصد پر جم جانا ہی اس راہ کا توشہ ہے۔ اس وقت صبر اور ثابت قدمی کا مظاہرہ جبکہ دوسرے لوگ ڈگمگا جائیں' جبکہ بعض لوگ تکذیب کر دیں اور اللہ کے وعدے میں شک کرنے لگیں۔ اس لیے کہ شک کرنے والے اسباب یقین سے محروم ہوتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اللہ تک پہنچ چکے ہیں جنہوں نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے' ان کا منہاج صبر و ثبات کا منہاج ہے۔ اگرچہ راہ طویل ہو جائے۔ اگرچہ اس کا انجام نظروں سے اوجھل ہو۔ اگرچہ وہ غبار اور بادلوں کے پیچھے محجوب ہو۔

---ooo---

یہ سورہ یوں ختم ہوتی ہے جبکہ اس کا آغاز اس مضمون سے ہوا تھا کہ شکست یافتہ رومیوں کو اللہ کے وعدے کے مطابق چند سالوں کے بعد فتح نصیب ہوگی اور اسی وقت مومنین کو بھی فتح نصیب ہوگی اور اس کا خاتمہ اس مضمون پر ہوتا ہے کہ اگر تم صبر و ثبات سے کام لو تو اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا کہ اللہ اہل ایمان کی مدد کرتا ہے۔ نیز جب لوگ اس تحریک کو بے وقار کرنے کی سعی کر رہے ہوں اور ان کی صفوف کے اندر وسوسہ اندازی کر رہے ہوں اور یہ لوگ وہی ہوتے جو تحریک اسلامی کے دشمن ہوتے ہیں اور ان کا اس جدید دعوت پر ایمان نہیں ہوتا تو ایسے حالات میں صبر ہی اہل ایمان کا ہتھیار ہوتا ہے۔

یوں سورہ کا آغاز اور انجام ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ یوں یہ سورہ ختم ہوتی ہے اور ایک سچے قاری کے ذہن میں ایک قوی امید چھوڑ جاتی ہے کہ اگر صبر و ثبات سے کام لیا جائے تو اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ اللہ کا وعدہ سچا ہوتا ہے اور وہ اہل یقین سے بے وفائی نہیں کرتا۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ------ ۲۱

### سورہ لقمان ۔ ۳۱

آیات ۱--- تا--- ۳۴

# سورۂ لقمان ایک نظر میں

قرآن کریم نے انسانی فطرت سے فطری منطق کے ذریعہ خطاب کیا اس لیے کہ یہ کلام فطرت کا کلام ہے ۔ خالق جانتا ہے انسان کے لیے کیا مفید ہے ' اور کس چیز سے اس کی اصلاح ممکن ہے ۔ اسے معلوم ہے کہ انسانی فطرت کے ساتھ کس انداز کا مکالمہ مناسب ہے ۔ خالق اپنی مخلوق کی رسم راہ سے بہت ہی اچھی طرح واقف ہے ۔ چنانچہ قرآن نے اس فطرت انسانی کے سامنے وہی حقیقت پیش کی جو اس میں پہلے سے موجود تھی ۔ فطرت انسانی اس حقیقت سے پہلے ہی خبردار تھی ' قرآن کے مکالمے سے بھی پہلے ۔ کیونکہ انسانی فطرت اس اصول پر قائم ہے جو انسانی فطرت کے اندر تخلیق کے وقت سے ودیعت کر دیا گیا ہے ۔ وہ حقیقت کیا ہے ؟ یہ کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور یہ کہ وہ خالق وحدہ لاشریک ہے ۔ یہ پوری کائنات اس کی ثناخواں ہے ۔ سو عاد کرہ اس کے احکام کی مطیع فرمان ہے حمد و تسبیح کرنے والی ہے ۔ لہٰذا انسان کو صرف اسی کی بندگی اور اسی کی طرف رجوع کرنا چاہئے ۔ یہ ہے اصل فطرت لیکن یہ فطرت اس دنیا کے گرد و غبار اور دھوئیں کی تہوں کے نیچے دب جاتی ہے اور گوشت و پوست کی سفلی خواہشات اس کو دبا لیتی ہیں ۔ خواہش نفس اور جسمانی شہوات اسے جادۂ مستقیم سے منحرف کر دیتی ہیں ۔ چنانچہ قرآن کریم آتا ہے اور وہ اس فطرت کو اس کے اندر موجود سبق یاد دلاتا ہے اور فطری منطق کے مطابق اس کے ساتھ مکالمہ کرتا ہے ۔ اس کو یاد دلاتا ہے کہ وہ خارجی وجوہات سے غافل ہو گئی ہے اور یہ یاد دہانی ایسے اسلوب میں کی جاتی ہے کہ جیسے فطرت جانتی ہے ۔ چنانچہ قرآن کریم اس فطری منہاج پر یہاں ایک مکمل نظام وضع کرتا ہے ۔ یہ منہاج درست عقیدہ کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔ نہایت فطری ہے اور اسی راستے پر ہے جو انسان اور فطرت کے خالق کا پیدا کردہ ہے ۔

یہ مکی سورہ ہے اور یہ نمونہ اور مثال ہے قرآن مجید کے اندر مکالمات کا کہ قرآن کس طرح انسانی دل میں بات اتارتا ہے ۔ خصوصاً عقیدۂ توحید کو مشرکین کے سامنے کس اسلوب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے ۔ یہ عقیدۂ توحید وہ بنیادی مسئلہ ہے جسے تمام مکی سورتیں مختلف اسالیب میں پیش کرتی ہیں ۔ مختلف زاویوں سے بات کرتی ہیں اور قلب انسانی کو مختلف پہلوؤں سے لیتی ہیں اور مختلف پہلوؤں سے فطرت کے ساتھ ہم کلام ہو کر اسے جگانے کی کوشش کرتی ہیں ۔

اس سورہ میں نظریاتی بحث عقیدۂ توحید ' اللہ وحدہ کی بندگی اور اللہ وحدہ کا شکر ادا کرنے کے موضوعات تک محدود ہے ۔ آخرت پر یقین اور آخرت میں عادلانہ جزاء و سزا اور ان عقائد کے سوا تمام دوسرے اعتقادات کی نفی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت ' یہ ہیں اہم موضوعات اس سورہ کے ۔

یہ سورہ عقیدے کے مسئلے کو قرآن کے بیان اور موضوع کے دائرے کے اندر پیش کرتی ہے ۔ قرآن کریم کا دائرۂ بحث اس پوری کائنات تک وسیع ہے ۔ آسمان ' زمین ' شمس و قمر ' شب و روز ' فضا اور سمندر ' لہریں اور بارش ' نباتات اور درخت ' یہ ہیں وہ موضوعات جن پر قرآن بحث کرتا ہے اور یہ بحث قرآن میں بار بار دہرائی جاتی ہے ۔ چنانچہ اس

پوری کائنات کو قرآن کریم ایک ناطق موثر عامل کے طور پر پیش کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اس کے اندر آیات الٰہیہ بکھری پڑی ہیں۔ اس میں دلائل ایمان بھی ہیں اور دلائل اخلاق بھی ہیں۔ یہ تمام نشانات و دلائل قلب انسانی پر اثرانداز ہوتے ہیں' اس کے اندر جوش پیدا کرتے ہیں اور اس کا ایک رخ متعین کرتے ہیں اور اسے سمت عطا کرتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ مسئلہ ایک ہی ہے اور اس مسئلہ کا میدان بحث بھی ایک ہے لیکن اس ایک ہی سورت میں اسے چار مرتبہ پیش کیا گیا ہے اور چار بار عقیدۂ توحید کو ثابت کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ہربار انسانی دل و دماغ کو اس وسیع کائنات میں لے جایا گیا' پھرایا گیا' اور ہربار ایک نیا تاثر چھوڑا گیا۔ ہربار بیان اور زبان کا ایک نیا انداز اپنایا گیا۔ کائنات کی یہ سیر پے درپے آتی ہے۔ سفر کا آغاز ہوتا ہے اور ختم ہوتا ہے اور اس سیر میں قلب و نظر کو عجیب عجیب تفریحات ملتی ہیں اور قلب انسانی ایک نئے تاثر سے مالا مال ہو کر از سرنو آمادۂ عمل ہوتا ہے۔

ان اسفار اربعہ کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ سورہ بھی انہی حروف سے مرکب ہے اور یہ کتاب حکیم کی آیات پر مشتمل ہے۔ اور محسنین کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔ یہ محسنین کون ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ (۳۱:۴)
"جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں"۔ گویا محسن وہ ہے جو اللہ کی عبادت کرتا ہے اور آخرت کی جوابدہی پر یقین رکھتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے خوشخبری یہ ہے کہ

اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۳۱:۵) "یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں"۔ پھر کون ہے جو کامیاب نہ ہونا چاہتا ہو۔ ان کے مقابلے میں دوسرے لوگ وہ ہیں جو لہو و لعب کی باتیں قیمتاً خریدتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے بدراہ کریں' یہ لوگ جاہل ہیں۔ یہ اللہ کی آیات کا مزاح اڑاتے ہیں اور ایسے لوگوں کا انجام بھی بتا دیا جاتا ہے تاکہ ان کے ذہن کا آپریشن ہو جائے اور وہ جو آیات الٰہیہ کا مزاح اڑاتے ہیں اس کا نفسیاتی جواب ہو جائے۔

اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ (۳۱:۶) "ایسے لوگوں کے لیے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے"۔
اس کے بعد اس فریق کی مزید حرکتیں بیان کی جاتی ہیں۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِ اٰیٰتُنَا وَلّٰی مُسْتَکْبِرًا کَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْھَا (۳۱:۷) "اسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ اس طرح رخ پھیرلیتا ہے کہ گویا اس نے انہیں سنا ہی نہیں"۔

اس بیان کے ساتھ ایک ایسی بات بھی کہہ دی جاتی ہے جو نفسیاتی اعتبار سے قاری کو متاثر کرتی ہے اور اس قسم کے لوگوں کے لیے ایک قسم کی تحقیر بھی اس میں ہے۔

کَاَنَّ فِیْٓ اُذُنَیْہِ وَقْرًا (۳۱:۷) "گویا اس کے دونوں کانوں میں پردے ہیں"۔ اور ایک دوسری پرتاثیر بات جس میں مزاح کا رنگ بہت نمایاں ہے۔

فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳۱ : ۷) "اسے دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو"۔ بشارت کا لفظ بطور تحقیر اور مذاق اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے بعد روئے سخن اہل ایمان کی طرف پھر جاتا ہے 'ان کی کامیابیوں کے بیان کے بعد جو سورہ کے آغاز ہی میں بیان کی گئی ہیں۔ آخرت میں ان کی جزاء کا تذکرہ ہے۔ دوسری جانب اسلام کے ساتھ مزاح کرنے والے بڑے لوگوں کی جزاء کا بھی ذکر ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ (۳۱ : ۸) خٰلِدِيْنَ فِيْهَا

وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳۱ : ۹) "البتہ جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے۔ اور وہ زبردست و حکیم ہے"۔ یہاں آکر عظیم کتاب کائنات کا ایک صفحہ کھولا جاتا ہے۔ جس میں فطرت کے براہین ہیں' یہ براہین فطرت انسانی کے مطالعہ کے لیے ہیں' یہ اس فطرت کو خطاب کرتے ہیں اور اس کے سامنے وہ عظیم سچائی پیش کرتے ہیں' جسے لوگ نہیں دیکھتے اور نہایت لاپرواہی سے اس پر سے گزر جاتے ہیں۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَ اَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ

بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ

(۳۱ : ۱۰) "اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تمہیں نظر آئیں۔ اس نے زمین میں پہاڑ جما دیئے تاکہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیئے اور آسمانوں سے پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اگا دیں"۔ ان کائناتی دلائل کے بعد جس سے احساس میں خوف پیدا ہوتا ہے اور شعور ششدر رہ جاتا ہے 'اب بے راہ روش اختیار کرنے والے دلوں کو گریبان سے پکڑا جاتا ہے' جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی آنکھوں کے ساتھ اللہ کی اس عظیم اور ہولناک کائنات کو دیکھ رہے ہیں۔

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ

(۳۱ : ۱۱) "یہ تو ہے اللہ کی تخلیق اب ذرا مجھے دکھاؤ ان دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے؟--- اصل بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں"۔ پہلا سبق یا پہلا مطالعاتی سفر اس کائناتی مطالعہ کے بعد یہاں ختم ہو جاتا ہے اور مسائل و نظریات کی یہ بحث اللہ کی وسیع کائنات کے میدان میں ہے۔

دوسرے سبق کے کردار انسانی نفوس ہیں۔ یہ سبق بھی مسئلہ توحید ہی کو موضوع بحث بناتا ہے۔ یہ بحث بھی کائناتی میدان میں ہے۔ البتہ اسلوب بحث جدید ہے اور اس میں بعض نئے دلائل دیئے گئے ہیں جن کا اثر نیا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ (۳۱ : ۱۲) "ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی"۔ یہ حکمت کیسی تھی

اور اس کا اظہار کس شکل میں ہوا؟ خلاصہ صرف یہ تھا کہ اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرو '

اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ (۳۱:۱۲) "کہ اللہ کا شکر ادا کرو"۔ یہ تھا اس حکمت کا خلاصہ اور یہ تھی اس کی سمت ۔ اور اس کا دوسرا رخ یہ تھا کہ حضرت لقمان اپنی اولاد کو نصیحت کرتے ہیں ۔ ایک دانشمند آدمی اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے ۔ یہ نصیحت ہر قسم کی کمزوری سے پاک ہو گی اس لیے کہ نصیحت کرنے والا حکیم ہے ' اور یہ نصیحت مشکوک بھی نہیں ہے کیونکہ کوئی والد اپنے بیٹے کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اس نصیحت میں یہ حکیم اپنے بیٹے کو عقیدۂ توحید کی تلقین کرتے ہیں اور آخرت کے خوف اور جوابدہی کی طرف متوجہ کرتے ہیں ' نہایت ہی پر اثر انداز میں اور نئے موثر الفاظ اور دل میں اترنے والے دلائل کے ساتھ ۔

وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ یَعِظُهٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (۳۱:۱۳) "یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا " بیٹا خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو ' حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے"۔ ایک دوسری دلیل اس موضوع پر یہ دی جاتی ہے اور اس سلسلے میں باپ اور اولاد ' ماں اور اولاد کے رشتے کو پیش کیا جاتا ہے ' نہایت ہی موثر اور جذباتی انداز میں ۔ جس کے نتیجے میں رحم و محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں ۔

وَ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ (۳۱:۱۴) "اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے ۔ اس کی ماں نے ضعف پہ ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے"۔ یوں اللہ کے شکر کا حکم والدین کے شکر کے ساتھ یکجا ہو جاتا ہے ۔ اور اپنے شکر کو ان کے شکر پر مقدم رکھا جاتا ہے ۔

اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیْكَ (۳۱:۱۴) "میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا"۔ اس کے بعد اسلامی نظریہ حیات کا پہلا اصول سامنے لایا جاتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں نظریاتی اخوت گوشت و پوست کی اخوت اور قوم و نسب کے تعلق پر مقدم ہو گی ۔ اگرچہ نسب اور خون کے رشتے بہت مضبوط ہوتے ہیں لیکن یہ اللہ کی ذات اور عقیدۂ توحید اور نظریہ حیات کے زاویہ سے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں ۔

وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا٘ وَّ اتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ (۳۱:۱۵) "لیکن اگر وہ یہ دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان ۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے"۔ اس کے بعد آخرت کی جوابدہی کا احساس ۔

ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳۱: ۱۵) "پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے اس وقت میں تمہیں بتا دوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو"۔ اب ایک دوسری دلیل توحید سامنے آتی ہے۔ یہ ایک عظیم دلیل ہے۔ اس میں اللہ کے علم کے عموم و شمول اور جامعیت و مانعیت کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ یہ علم محیط ہے۔ یہ تصویر کشی اس قدر موثر ہے کہ انسانی شعور میں ایک قسم کا ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ جب انسانی سوچ اس دلیل کا میدان کائنات میں پیچھا کرتی ہے۔

یٰبُنَیَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ (۳۱: ۱۶) "بیٹا، کوئی چیز رائی کے دانہ کے برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو اللہ اسے نکال لائے گا، وہ باریک بین اور باخبر ہے"۔ اس کے بعد لقمان اپنے بیٹے کو عقیدۂ توحید کے تقاضوں کی نصیحت کرتے چلے جاتے ہیں کہ امر بالمعروف کرو، منکر سے روکو اور اسلامی نظریہ حیات اور اس کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے آپ کو جو تکالیف پیش آئیں ان پر صبر کرو کیونکہ داعی الی اللہ کو مشکلات آتی ہیں اور اس طریقہ پر صبر ہوتا ہے۔ لوگوں پر دست درازی نہ کرو، اس لیے کہ زبان سے جو اصلاح کی جائے گی برے عمل سے وہ بگڑ جائے گی۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۳۱: ۱۸) وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ (۳۱: ۱۹) "اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، نہ زمین میں اکڑ کر چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز پست رکھ سب آوازوں میں سے زیادہ بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے"۔ یہاں کسی سے منہ پھیرنے اور تکبر نہ کرنے کے لیے لاتصعر اور لاتمش مرحا کے الفاظ استعمال کر کے ان حرکتوں کو حقیر بتایا گیا ہے۔ یہاں آکر یہ سبق ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں بھی اصل موضوع بحث عقیدۂ توحید ہی ہے بالکل عملی انداز میں۔ اور نئے موثر دلائل اور نئے اسلوب کے ساتھ۔

تیسرے سبق میں بھی یہی عقیدۂ توحید ہے، لیکن اسے زمین و آسمان کے وسیع میدان میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ دلیل یہ دی گئی کہ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو اللہ نے انسان کے لیے مسخر کیا ہے اور انسان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کا شکر بجالائے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًی وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِیْرٍ (۳۱: ۲۰) "کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین و آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر رکھی

ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں ۔اس پر بھی حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو یا ہدایت یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب"۔اور اس کائنات اور اس کے اندر اللہ کی نعمتوں کو دیکھتے ہوئے فطرت انسانی کے بارے میں ایسے مباحثے سے نفرت کرتی ہے ۔اس کے بعد راہ راست پر چلنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے کفر اور افکار پر سرزنش کی جاتی ہے ۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَ نَا

(۳۱: ۲۱) "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے ۔تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے"۔یہ کس قدر بودا موقف ہے اس لیے اس کی پر زور دلائل سے تردید کر دی جاتی ہے ۔

اَوَلَوْ كَانَ الشَّیْطٰنُ یَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِیْرِ (۳۱: ۲۱) "کیا یہ انہی کی پیروی کریں گے خواہ شیطان ان کو بھڑکتی ہوئی آگ ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا ہو"۔اب آخرت کی جزاء و سزا کو ایمان کے ساتھ مربوط کر کے پیش کر دیا جاتا ہے ۔

وَ مَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى وَ اِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۳۱: ۲۲) وَ مَنْ كَفَرَ فَلَا یَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ـــ (۳۱: ۲۳) "جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے اور عملاً وہ نیک ہو اس نے فی الواقعہ ایک بھروسے کے قابل سہارا تھام لیا اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے ۔اب جو کفر کرتا ہے اس کا کفر تمہیں غم میں مبتلا نہ کرے ۔انہیں پلٹ کر آنا تو ہماری طرف ہے ۔پھر ہم بتا دیں گے کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں"۔اب یہاں پھر اللہ کے وسیع علم کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے :

اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۳۱: ۲۳) "یقیناً اللہ سینوں میں چھپے ہوئے راز جانتا ہے"۔اور اب تہدید اور تنبیہ

نُمَتِّعُهُمْ قَلِیْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِیْظٍ (۳۱: ۲۴) "ہم تھوڑی مدت انہیں دنیا میں مزے کرنے کا موقعہ دے رہے ہیں پھر ان کو بے بس کر کے ایک سخت عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے"۔اس سبق کے خاتمے کے قریب ان کو فطرت کا آمنا سامنا کرا دیا جاتا ہے ۔ان کو اس پوری کائنات کا مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے ۔اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہتا کہ وہ اعتراف ہی کر لیں ۔

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۱ : ۲۵) ”اگر ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے تو پھر یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے 'کہو الحمد للہ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں“۔

اس سفر کا خاتمہ ایک کائناتی منظر پر ہوتا ہے جس میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے علم کی انتہا نہیں ہے اور زمین و آسمان میں اللہ کی مشیت حاکم ہے۔ وہ خالق مطلق ہے۔ اس سے بعث بعد الموت پر استدلال کیا جاتا ہے اور دوبارہ تخلیق کا اسے ثبوت قرار دیا جاتا ہے۔

وَ لَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۳۱ : ۲۷) مَا خَلْقُكُمْ وَ لَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ (۳۱ : ۲۸) ”زمین و آسمان میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر دوات بن جائے جسے مزید سات سمندر روشنائی فراہم کریں 'تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی بے شک اللہ زبردست و حکیم ہے۔ تم سارے انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر دوبارہ جلا اٹھانا بس ایسا ہے جیسے ایک متنفس کو پیدا کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے“۔

چوتھا سفر بھی ایک کائناتی منظر میں ہے۔ قلب بشری پر اس کے زبردست اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ منظر لیل و نہار ہے۔ رات لمبی ہوتی ہے اور دن کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور یوں لمبی ہوتی جاتی ہے 'اور دن لمبا ہوتا ہے اور وہ رات کے جسم میں داخل ہوتا ہے اور آگے ہی بڑھتا ہے۔ شمس و قمر اپنے فلک میں مسخر ہیں اور یہ چلتے ہیں اور چلتے رہیں گے اس وقت تک جس میں ان کا خاتمہ ہو گا' خالق ہی جانتا ہے کہ یہ وقت کب آئے گا جو ان چیزوں کو بھی جانتا ہے اور لوگوں کو بھی جانتا ہے اور زمان و مکان سے بھی باخبر ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِی النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِیْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۳۱ : ۲۹) ”کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں پروتا ہوا لے آتا ہے۔ اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ سب وقت مقررہ تک چلے جا رہے ہیں۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو' باخبر ہے۔ اس منظر سے فطرت انسانی کی راہنمائی اس حقیقت کی طرف کی جاتی ہے جو زیر بحث ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِيْرُ (۳۱ : ۳۰) ”یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی برحق ہے اور اسے چھوڑ کر جن دوسری چیزوں کو

یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں اور اللہ ہی بزرگ و برتر ہے"۔

اب اللہ کی ایک دوسری نعمت لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ یہ بھی کائنات کا ایک حصہ ہے۔ انسانوں کے دلوں کو چھوا جا رہا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِیُرِیَكُمْ مِّنْ اٰیٰتِهٖ (۳۱ : ۳۱) "تم دیکھتے نہیں ہو کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے تاکہ وہ تمہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائے۔ اب ان کو اپنے فطری خوف کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ یہ سمندر میں ہیں۔ ان کے پاس اب نہ علم ہے اور نہ قدرت۔ تمام قدرتیں اللہ کے پاس ہیں اور یہ بھی دلیل ہے عقیدۂ توحید پر کہ سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

وَ اِذَا غَشِیَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَ مَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ (۳۱ : ۳۲) "اور جب سمندر میں ان لوگوں پر ایک موج سائبان کی طرح چھا جاتی ہے تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں، اپنے دین کو بالکل اسی کے لیے خالص کر کے پھر جب وہ بچا کر انہیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی اقتصاد برتتا ہے اور ہماری نشانیوں کا انکار نہیں کرتا مگر ہر وہ شخص جو غدار اور ناشکرا ہے"۔ امواج بحری ہولناکی قیامت کے ہول کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ ایک عظیم خوف ہو گا، یہ یوم آخرت ہو گا۔ ایسا ہولناک منظر ہو گا کہ وہاں وہ تمام رشتے کٹ جائیں گے جو دنیا کی کسی ہولناکی میں نہیں کٹتے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَ اخْشَوْا یَوْمًا لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَ لَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَیْـًٔا اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَ لَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (۳۱ : ۳۳)

"لوگو، بچو اپنے رب کے غضب سے اور ڈرو اس دن سے جبکہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے بدلہ نہ دے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کی طرف کچھ بدلہ دینے والا ہو گا۔ فی الواقعہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ پس یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے۔ اور نہ کوئی دھوکہ باز تمہیں اللہ کے معاملے میں دھوکہ دینے پائے۔ اس مقطع پر سورہ ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس حال میں ختم ہوتی ہے کہ مومنین کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ سورہ کے مسائل پر بحث ختم ہوتی ہے اور قاری اور سامع کے دل اور دماغ پر گہرے اثرات پڑ چکے ہوتے ہیں اور اب قلب و نظر کے تاروں پر آخری ضرب

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّا ذَا تَكْسِبُ غَدًا وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (۳۱ : ۳۴) "اس گھڑی کا علم اللہ کے پاس ہے، وہی بارش برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا پرورش پا رہا ہے۔ کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرنے والا ہے اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس

سرزمین میں اسی کی موت آتی ہے ۔ اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے"۔

یہ چار سفر اور سبق اپنے مخصوص انداز بیان ' دلائل اور آیات و نشانات کے ساتھ ایک نمونہ ہیں کہ قرآن مجید کس انداز سے دلوں میں اپنی بات اتارتا ہے اور یہ انداز اللہ نے اختیار کیا ہے جو انسانی دلوں کا خالق ہے ۔وہ ان راہوں کو جانتا ہے جن کے ذریعے ان دلوں میں اترا جاسکتا ہے ۔وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ان کے لیے کیا مفید ہے اور کس طرح مفید ہے۔

اب مناسب ہے کہ اس اجمالی اور سرسری نظر کے بعد آیات کی تفصیلات کی طرف آئیں ۔ ہم ان اسفار اربعہ کو دو سبقوں کی شکل میں پیش کریں گے کیونکہ مضمون و موضوع بہرحال ایک ہے ۔

---OOO---

# درس نمبر ۱۸۵ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۱۹

---

سُوْرَةُ لُقْمٰنَ (۳۱) مَكِّيَّةٌ (۵۷) — اٰيَاتُهَا ۳۴ — رُكُوْعَاتُهَا ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ "ا۔ل۔م۔ یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں' ہدایت اور رحمت نیکو کار لوگوں کے لیے' جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں"۔

حروف مقطعات ا۔ل۔م سے آغاز ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد یہ فقرہ آتا ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (۳۱ : ۲) "یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں"۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ یہ کتاب انہی حروف سے مرکب ہے۔ جیسا کہ دوسری سورتوں میں بھی یہی اشارات موجود ہیں۔ کتاب کو کتاب حکمت کہا گیا ہے۔ کیونکہ اس کا اصل موضوع ہی فلسفہ و حکمت ہے لہذا یہاں اس کتاب کی اس صفت کو لایا گیا کیونکہ اس سورہ کے مضامین کے ساتھ اس کی مناسبت ہے اور یہی قرآن کا انداز ہے۔ کتاب کو کتاب حکیم کہہ کر یہ تاثر دیا گیا کہ یہ ایک زندہ کتاب ہے۔ اور یہ ارادتاً ایک ہدف کی بڑھ رہی ہے۔ گویا یہ ایک زندہ شخصیت ہے۔ بہت ہی دانشمند اور اس کی گفتگو میں ایک مقصد ہے۔ اس کا ایک متعین ہدف ہے' اور یہ اس ہدف کی طرف بالارادہ بڑھ رہی ہے۔ اس میں روح ہے' اس میں زندگی ہے۔ اس میں حرکت ہے' اور اس کتاب کی ایک ذات اور شخصیت ہے جو متعین ہے۔ یہ محبت کرنے والی ہے اور

یہ ہر اس شخص کے ساتھ مکالمہ کرتی ہے جو اس کی صحبت میں بیٹھے ۔ جو اس کے سایوں میں زندگی بسر کرے اور وہ اس کی اس کشش کو محسوس کرے جس طرح ایک زندہ دوسرے زندہ کی طرف رکھتا رکھتا ہے اور جس طرح دوست دوست کی طرف کھنچتا ہے ۔

یہ ہے کتاب حکیم ۔ اور اس کی آیات ہدایت اور رحمت ہیں محسنین کے لیے ۔ یہ اس کی اصل ماہیت ہے کہ یہ کتاب ہدایت ہے اور یہ محسنین کے لیے ہمیشہ ہدایت رہتی ہے ۔ یہ ان کو ایک متعین منزل مقصود تک پہنچاتی ہے جس طرح ایک زندہ شخص کسی کو راہ دکھاتا ہے مگر کرخت طریقے سے نہیں بالکل الفت اور محبت کے ساتھ نہایت آرام اطمینان کے ساتھ اور اس کی ہدایت یہ ہے کہ پہلے نماز قائم کرو اور اپنے رب سے رابطہ قائم کرو اور پھر زکوۃ ادا کرو' اہل ایمان کے دل اس کے ذریعے باہم جوڑ کر رکھ دو اور پھر تمام اہل ایمان اللہ کی اس کائنات کے لیے ہمکلام اور مربوط ہو جائیں جس میں وہ رہتے ہیں ۔ یہ کتاب وہ اقدار اور وہ حالات پیدا کرتی ہے جس میں تمام انسانوں کا مقام متعین ہو اور وہ اپنی اصل پہچان جان سکیں ۔ اس کتاب کے ہدایت یافتہ لوگ اس فطرت سے بھی متعارف ہوں جس فطرت پر انہیں پیدا کیا گیا ہے اور سیدھے ہوں اور ان کے اندر کوئی زیغ اور ٹیڑھ نہ ہو ۔

یہ کتاب جن محسنین کے لیے ہدایت ہے وہ کون ہیں؟

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (۳۱ : ۴)

"جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں" ۔ جب کوئی نماز قائم کرتا ہے ۔ اس کے پورے ارکان کے ساتھ اسے ادا کرتا ہے' بروقت ادا کرتا ہے اور مکمل طور پر ادا کرتا ہے تو اس کی حکمت' اس کا اثر انسانی شعور اور انسانی طرز عمل میں واضح ہو کر سامنے آتا ہے' اور اس کے ذریعہ اللہ اور بندے کے درمیان وہ تعلق قائم ہو جاتا ہے' جو مطلوب ہے ۔ اللہ سے انس پیدا ہوتا ہے اور نماز کے اندر مٹھاس پیدا ہو جاتی ہے اور زکوۃ کا فائدہ یہ ہے کہ انسان کے اندر جو فطری بخل ہے' اس پر انسان قابو پا لیتا ہے ۔ وہ امت مسلمہ کے لیے ایک اجتماعی نظام کی بنیاد ہوتی ہے اور امت کے اندر اجتماعی کفالت کی بنیاد پڑتی ہے ۔ اس سوسائٹی میں امیروں اور غریبوں دونوں کے اندر اعتماد ہوتا ہے ۔ اطمینان ہوتا ہے اور باہم مودت اور محبت ہوتی ہے ۔ اس کے اندر طبقاتی نفرت نہیں ہوتی اور آخرت پر ایمان تو تمام نیکیوں کی اساس ہے ۔ اس سے قلب بشری ہر وقت بیدار رہتا ہے ۔ اس کی نظریں عالم آخرت پر ہوتی ہیں اور زمین کی گندگیوں اور زیبق کے عارضی ساز و سامان کے مقابلے میں اس کی نظریں بلند ہوتی ہیں ۔ خفیہ طور پر اور اعلانیہ طور پر انسان یہ دیکھتا ہے کہ اسے اللہ دیکھ رہا ہے اور انسان درجہ احسان تک پہنچ جاتا ہے جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو کہ اسے تم دیکھ رہے ہو' اگر تم اسے نہ دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے" ۔ (بخاری و مسلم' کتاب الایمان)

یہ لوگ جو ایسی نماز پڑھتے ہیں' جو اس نیت سے زکوۃ دیتے ہیں ۔ اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں ۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۳۱ : ۵) "یہی لوگ رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں" ۔ جس نے ہدایت پائی' اس نے فلاح پائی ۔ وہ ایک

روشنی پر چل رہا ہوتا ہے۔ منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ گمراہیوں سے اور فساد سے بچ جاتا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اس کرۂ ارض پر اپنے اس سفر پر وہ مطمئن ہوتا ہے، خوش رہتا ہے۔ وہ اس کائنات کے ساتھ ہم سفر ہوتا ہے اور اس کائنات کے ایک جزء کے طور پر اس کے ساتھ ہم آہنگی سے سفر طے کرتا جاتا ہے، نہایت انس و محبت کے ساتھ۔

ایسے ہی لوگ اس کتاب کی آیات سے راہنمائی پاتے ہیں۔ محسن، نمازی، زکوۃ دینے والے، آخرت کا یقین رکھنے والے۔ یہ لوگ دنیا اور آخرت میں فلاح پانے والے ہیں۔ یہ لوگ ایک فریق ہیں۔ ان کے مقابلے میں ایک فریق اور بھی ہے۔ کیا ہیں اس کے خدوخال؟

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿٦﴾ وَإِذَا تُتْلَى عَلَيْهِ آيَاتُنَا وَلَّى مُسْتَكْبِرًا كَأَنْ لَمْ يَسْمَعْهَا كَأَنَّ فِي أُذُنَيْهِ وَقْرًا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٧﴾

"اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام دلفریب خرید کر لاتا ہے تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اس راستے کی دعوت کو مذاق میں اڑا دے۔ ایسے لوگوں کے لیے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ اسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ اس طرح رخ پھیر لیتا ہے گویا کہ اس نے انہیں سنا ہی نہیں، گویا کہ اس کے کان بہرے ہیں۔ اچھا، مژدہ سنا دو اسے ایک دردناک عذاب کا"۔

لہو الحدیث سے مراد تفریحی اور دلچسپ کلام ہے جس سے محض وقت گزارنا مطلوب ہو۔ اس کلام سے کوئی اچھا اور مفید نتیجہ نہ نکلتا ہو اور نہ اس میں کوئی ایسی تعمیری بات ہو، جو انسان کے منصب خلافت سے متعلق ہو۔ جو انسان کی ذہنی، اخلاقی اور معاشی اور دینی اور اخروی کسی غرض سے وابستہ نہ ہو۔ اسلام انسان کے لیے اس دنیا میں کچھ فرائض متعین کرتا ہے۔ ان فرائض کے حدود، وسائل اور طریقہ کار بھی متعین کرتا ہے۔ یہ آیت عام ہے۔ یہ انسانوں کا ایک نمونہ پیش کرتی ہے جو ہر زمان و مکان میں بالعموم پایا جاتا ہے۔ بعض روایات یہ بتاتی ہیں کہ اسلام کی پہلی جماعت کے دور میں ایک متعین واقعہ بھی ہوا تھا، اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ مکہ کا ایک ادیب نضر ابن الحارث ایران سے ایسی کتابیں خرید کر لاتا تھا جن میں ایرانیوں اور ان کے بڑے لوگوں کے افسانے اور تاریخی واقعات ہوتے تھے اور ان کی جنگوں کے دلچسپ واقعات ہوتے تھے۔ یہ شخص مکہ کی گلیوں میں بیٹھ کر ان لوگوں کو روکتا جو قرآن سننے کے لیے جاتے تھے اور ان کو یہ افسانے سناتا۔ یہ شخص قصص القرآن کے مقابلے میں قصص ایران سناتا تھا۔ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ یہ آیت اس واقعہ میں وارد ہے تو بھی یہ آیت عام ہے۔ یہ لوگوں کی اس قسم کے خدوخال واضح طور پر بتاتی ہے۔ اس قسم کے لوگ ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی موجود تھے جس دور میں مکہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ (۳۱ : ۶) "انسانوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام دلفریب خرید کر لاتا ہے"۔ یعنی اس کام میں اپنا مال اور اپنا وقت خرچ کرتا ہے اور اپنی زندگی اس میں کھپاتا ہے۔ اس قدر قیمتی چیزیں وہ اس قدر بے وقعت اور بے قیمت چیزوں میں خرچ کرتا ہے۔ اپنی محدود اور قیمتی عمر اس میں کھپاتا ہے۔ یہ عمر جو نہ واپس آتی ہے اور نہ واپس لائی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کام کیوں کرتا ہے۔

لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا (۳۱ : ۶) "تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اس راستے کی دعوت کو مذاق میں اڑا دے"۔ ایسا شخص جاہل ہے اور اس کی نظروں سے حقیقت اوجھل ہے۔ وہ کوئی بات علم و یقین کی بنیاد پر نہیں کرتا۔ نہ وہ حکمت کی بنیاد پر کوئی کام کرتا ہے۔ اس کی نیت بھی خراب ہے اور اس کی غرض بھی فاسد ہے۔ وہ لوگوں کو بدراہ کرنا چاہتا ہے۔ خود اپنے آپ کو بھی گمراہ کرتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے اور اپنی زندگی کو اس میں فضول ضائع کرتا ہے۔ پھر وہ اس قدر گستاخ ہے کہ دعوت اسلامی کے ساتھ مذاق کرتا ہے اور اس اسلامی نظام کے ساتھ مذاق کرتا ہے جو اللہ نے وضع کیا ہے تاکہ وہ لوگوں کی زندگی کا دستور و قانون ہو۔ چنانچہ قرآن مجید ایسے لوگوں کی تصویر کشی سے بھی قبل ان کو اہانت آمیز عذاب کی دھمکی دیتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (۳۱ : ۶) "ایسے لوگوں کے لیے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ان کے لیے توہین آمیز عذاب ہو گا' اس لیے کہ انہوں نے یہاں دعوت اسلامی کی توہین کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ لوگ اسلامی نظام زندگی کے ساتھ مزاح کرتے تھے۔

اب اس دھمکی کے بعد اس گروہ کے خدوخال قلم بند کیے جاتے ہیں۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا (۳۱ : ۷) "اسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ اس طرح رخ پھیر لیتا ہے گویا اس نے انہیں سنا ہی نہیں"۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جس کے اندر اس متکبر شخص کی ہیئت کذائی کو اچھی طرح قلم بند کر دیا گیا ہے۔ وہ نہایت غرور سے منہ موڑ کر گزر جاتا ہے' سنی ان سنی کر دیتا ہے۔ چنانچہ اگلا رنگ اس تصویر میں نہایت حقارت آمیزی سے بھرا جاتا ہے۔

كَاَنَّ فِىْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا (۳۱ : ۷) "گویا اس کے کان بہرے ہیں"۔ گویا اس کے کانوں کا یہ بھاری پن اللہ کی آیات کو اس کے کانوں تک پہنچنے ہی نہیں دیتا۔ ورنہ ان آیات کو کوئی انسان بھی اگر سنے تو وہ ان کے ساتھ یہ مذموم برتاؤ نہیں کر سکتا۔ یہ رنگ پھر مزید اہانت آمیز کر دیا جاتا ہے۔

فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳۱ : ۷) "مژدہ سنا دو اسے دردناک عذاب کا"۔ یہ موقع کسی بشارت کا موقع نہیں ہے لیکن یہاں ان کی توہین مطلوب ہے اور ایسے متکبرین مسخروں کے لیے یہی انداز مناسب ہے۔

--- ooo---

اعراض کرنے والوں' تکبر کرنے والوں اور کفر کرنے والوں کی اس اہانت آمیز سزا کی مناسبت سے یہاں ضروری ہے

کہ اچھے عمل کرنے والے اہل ایمان کے انعام اور جزا کا بھی ذکر کر دیا جائے ۔ اس سورہ کے آغاز میں ان کا ذکر ہو چکا ہے اور ان کی کامیابی کا ذکر کر دیا گیا ہے ۔ اگرچہ وہاں اجمالی تھا ۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتُ النَّعِيمِ ﴿٨﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٩﴾

"البتہ جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں ' ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے ۔ یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے" ۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں اہل ایمان کی جزاء کا ذکر ہے وہاں ایمان کے ساتھ عمل صالح کا ذکر ضرور کیا گیا ہے اس لیے کہ اسلامی نظریہ حیات کا مزاج یہ نہیں ہے کہ ایمان محض مجمد ' پوشیدہ ' معطل اور مجرد تصور ہی ہو بلکہ ایمان کو ایک زندہ ' فعال اور متحرک حقیقت ہونا چاہئے ۔ جب وہ دل میں پیدا ہو ' قرار پکڑے پورا ہو ' تو متحرک ہو کر عملی شکل اختیار کرے ۔ وہ حرکت اور طرز عمل کی شکل اختیار کرے اور عالم واقعہ میں اس کے آثار اپنی ترجمانی کریں ۔ اور یہ معلوم کیا جا سکے کہ اس مومن کے دل میں کیا ہے ۔

یہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو عملی شکل دی ۔

لَهُمْ جَنَّاتُ النَّعِيمِ (۳۱ : ۸) "ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے" ۔ یہ باغات اور یہ دوام اللہ کے عہد کے مطابق ان کو دیا جا رہا ہے ۔

وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا (۳۱ : ۹) "یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے" ۔ اللہ کی مہربانی اس حد تک آگے بڑھ گئی کہ اس نے اپنے اوپر اپنے بندوں کے ساتھ احسان کرنا فرض کر لیا ۔ یہ ان کے نیکی اور ان کے نیک اعمال کے بدلے میں حالانکہ اللہ تو غنی ہے ۔ اسے کسی کے عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۳۱ : ۹) "وہ تو زبردست و حکیم ہے" ۔ وہ اپنے عہد کو پورا کرنے کی قدرت رکھتا ہے ۔ مخلوقات کو اس نے بڑی حکمت سے بنایا ہے ۔ وعدہ بھی حکمت سے کرتا ہے اور پورا بھی حکمت سے کرتا ہے ۔

---ooo---

اس بات کی دلیل کیا ہے کہ اللہ عزیز و حکیم ہے اور اس سے قبل جو کچھ کہا اس کا ثبوت کیا ہے ؟ یہ عظیم کائنات جس کی تخلیق کا دعویٰ کوئی انسان اور کوئی قوت نہیں کر سکتی ماسوائے اللہ کے ۔ یہ کائنات بہت ہی عظیم ہے اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہے ۔ اس کا نظام نہایت مستحکم اور دقیق ہے ۔ اس کی ساخت نہایت ہی متوازن ہے ۔ جوں جوں اس کائنات کے بارے میں زیادہ معلومات ہوتی ہیں اور انسان غور کرتا جاتا ہے ' عقل دنگ رہ جاتی ہے اور انسان کا تصور بھی رک جاتا ہے اور یہ عظیم کائنات ایک ایسی دلیل اور ایک ایسی شہادت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ جس سے کوئی منہ نہیں موڑ

سکتا۔ جو بھی ذرا غور کرے ' ذات باری کے تسلیم کرنے کے سوا اس کے لیے چارہ کار ہی نہیں ہے اور جو لوگ پھر بھی اللہ وحدہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں وہ حق کے ساتھ ظلم کرتے ہیں۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَ اَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ
وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ
زَوْجٍ كَرِیْمٍ ۝۱۰ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ ا
الظّٰلِمُوْنَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝۱۱ ۱۱ ع

"اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں۔ اس نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیے اور آسمان سے پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اگا دیں۔ تو یہ ہے اللہ کی تخلیق 'اب ذرا مجھے دکھاؤ 'ان دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں"۔

یہ آسمان 'بغیر اس کے کہ ان کے بارے میں ہم جدید پیچیدہ سائنسی معلومات پیش کریں 'اپنی ظاہری حالت میں جب ہمارے حواس کے سامنے آتے ہیں تو یہ بہت ہی عظیم لگتے ہیں۔ یہ آسمان ستارے اور سیارے ہوں 'یا کہکشاں اور سدم ہوں۔ جو بلندیوں میں تیر رہے ہیں اور ان کے حقیقی راز سے صرف اللہ ہی واقف ہے یا آسمان سے مراد یہ قبہ ہو جسے ہم دیکھتے ہیں اور جس کی حقیقت سے اللہ ہی خبردار ہے۔ غرض آسمان سے مراد جو بھی ہو 'بہرحال یہ عظیم کرات بغیر سہارے اور ستونوں کے کھڑے ہیں۔ انسان رات اور دن ان سماوات کو دیکھتے ہیں اور جس چھوٹے سے ستارے پر انسان سوار ہیں 'اس تک ہم جس قدر دوریاں قریب کر دیں اس عالم کا محض تصور ہی سر کو چکرا دیتا ہے کہ یہ عالم کس قدر عظیم اور ہولناک ہے جس کے حدود و قیود انسان کے ادراک سے ابھی تک باہر ہیں۔ پھر جب ایک انسان سوچتا ہے کہ اس عظیم کائنات کو ایک منظم نظام میں باندھ دیا گیا ہے کہ اس کی حرکت میں ایک سیکنڈ کا فرق بھی نہیں آتا۔ پھر اس عالم کو کس قدر خوبصورت بنایا گیا ہے کہ انسان دیکھتا ہی رہ جائے۔ دل سوچتا ہی رہے اور نہ تھکے۔ نظریں بھرتی ہی رہیں اور اس کے نظارے سے ملول نہ ہوں اور جب انسان یہ سوچے کہ اس گول آسمان میں جو چھوٹے چھوٹے نکتے نظر آتے ہیں ان میں سے ایک ایک ستارہ زمین سے ہزاروں گنا بڑا ہے (مثلاً مشتری ایک ہزار گنا) لاکھوں گنا بڑا ہے تو کسی بھی عقلمند انسان کے لیے یہی کافی دلیل ہے۔

فضائے کائنات کے اس لاانتہا سفر سے واپس آیئے 'یہ تو قرآن نے ایک سرسری اشارہ ہی کیا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (۳۱ : ۱۰) "اس نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے پیدا کیا جو تم کو نظر آئیں"۔ اب اسی زمین کی طرف 'اور ذرا جم کر دیر تک اس کے نظاروں کو غور سے دیکھئے۔ یہ چھوٹی سی زمین ' کائنات کا ایک ذرہ 'اس عظیم کائنات میں تو یہ ایک ذرہ ہی ہے جو فضا میں اڑ رہا ہے۔ ہم اس پر واپس آتے ہیں۔ ہم

سمجھتے ہیں کہ یہ زمین بہت وسیع اور طویل و عریض ہے ۔ انسان اپنی مختصر زندگی میں اس کی سیر بھی نہیں کر سکتا۔ اگرچہ وہ پوری عمر اس چھوٹے سے ذرے کے سیر و سفر میں گزار دے ۔ انسان کو کہا جاتا ہے کہ ذرا اسی کا مطالعہ کھلی آنکھوں سے کرو ' اور طویل الفت اور بار بار دیکھنے کی وجہ سے انسان سے اس کا انوکھا پن گم ہو گیا ہے ۔ ذرا اس کے عجائبات کو دیکھو۔

وَ اَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ (۳۱ : ۱۰) "اور اس نے زمین میں پہاڑ جما دیئے کہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے" ۔ رواسی معنی پہاڑ ۔ علمائے طبقات الارض یہ کہتے ہیں کہ پہاڑ دراصل زمین کے چھلکے کی شکنیں ہیں ۔ جب زمین کا چھلکا سرد ہو گیا اور اس کے اندر کی گیسیں سکڑ گئیں تو زمین کا حجم کم ہوتا گیا جس کی وجہ سے زمین کے چھلکے کے اندر شکنیں پیدا ہو گئیں اور اس طرح زمین کے اوپر بلندیاں اور پستیاں اور نشیب و فراز پیدا ہو گئے ۔ جس قدر جہاں زیادہ سکیڑ کا عمل ہوا اسی قدر پہاڑ بلند ہو گئے ۔ اب چاہے علمائے طبقات الارض کا یہ نظریہ درست ہو یا غلط ہو ' لیکن اللہ کی کتاب یہ کہتی ہے ۔ اللہ نے پہاڑ جما دیئے تاکہ زمین کی رفتار کے اندر توازن ہو اور انسان اس کی سطح پر رک سکے اور اس کے اندر ڈولنے کا عمل نہ ہو ۔ علمائے طبقات الارض کا یہ نظریہ درست ہو سکتا ہے اور وہ اس بات کو تسلیم بھی کرتے ہیں کہ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو زمین کی رفتار محوری کے اندر وہ توازن نہ ہوتا جو ہے اور اللہ کا حکم ہر حالت میں بلند ہے اور رہے گا کیونکہ اللہ تمام متکلمین میں سے سچا اور صادق ہے ۔ صدق اللہ العظیم ۔

وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ (۳۱ : ۱۰) "اور اس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیئے" ۔ اس عظیم کائنات کے عجائبات میں سے یہ ایک حیرت انگیز اعجوبہ ہے کہ اس زمین کے اوپر اللہ نے رنگا رنگ زندگی کو پھیلایا ہے ۔ آج تک کوئی شخص راز حیات ہی کو نہیں پا سکا اس کی یہ بوقلمونی اور رنگا رنگی تو بڑی چیز ہے ۔ انسان اس حیات کی سادہ ترین صورت کو بھی نہیں پا سکا چہ جائیکہ وہ زندگی کی اعلیٰ اقسام ' اس کی رنگا رنگی اور مختلف ضخامتیں ' اور خوبصورت جانور اور پرندوں کو جان سکے جن کی تعداد کا بھی انسان کو علم نہیں ہے ۔ بے حد افسوس ہے کہ بعض لوگ علم کے باوجود ان عجائبات پر آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں گویا وہ ایک بالکل معمولی چیز دیکھ رہے ہیں ۔ یہی انسان جب انسان کی بنائی ہوئی ایک چھوٹی سی مشین کو دیکھتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے اور بار بار الٹ پلٹ کر اسے دیکھتا چلا جاتا ہے حالانکہ یہ مشین اللہ کے پیدا کردہ ایک سادہ خلیے سے زیادہ پیچیدہ نہیں ہو سکتی اور ان خلیوں کے جو دقیق اور پیچیدہ متصرفات ہیں ' وہ سب اعجوبے ہیں ۔ ہم صرف سادہ خلیے کے عجائبات کی بات کرتے ہیں ۔ رہے وہ پیچیدہ تخلیق والے بڑے انسان جن کے جسم میں سینکڑوں کیمیاوی تجربہ گاہیں اور لیبارٹریاں کام کر رہی ہیں جن کے اندر سینکڑوں سٹورز ہیں جہاں مواد جمع ہوتے ہیں اور تقسیم ہوتے ہیں اور جن کے اندر ایک عجیب مواصلاتی نظام ہے جو لاسلکی کے طور پر پیغامات لیتا ہے اور ارسال کرتا ہے اور سینکڑوں دوسرے عوامل ہزارہا فرائض سرانجام دے رہے ہیں ۔

وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ (۳۱ : ۱۰) "اور آسمانوں سے پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اگا دیں" ۔ آسمانوں سے پانی برسانا عجائبات تکوینی میں سے ایک اعجوبہ ہے لیکن چونکہ یہ اکثر ہمارے سامنے دہرایا جاتا ہے اس لیے ہم اس پر سے غفلت کے ساتھ گزر جاتے ہیں ۔ یہ پانی جس

سے نہریں ہو کر بہتی ہیں جس سے بحیرے بھر جاتے ہیں جس کے ساتھ زمین میں چشمے پھوٹتے ہیں ۔ یہ پانی ایک نہایت ہی پیچیدہ نظام کے تحت آسمانوں سے برستا ہے ۔ یہ آسمانوں کے نظام کے ساتھ مربوط ہے ۔ اس کا مزاج ' اس کی تشکیل اور کرات کی دوریوں سے یہ مربوط ہے ۔ پھر پانی کے نزول کے بعد زمین کے اندر مختلف النوع اور مختلف المشکل نباتات ' ذائقے مختلف ' رنگ مختلف ' حجم مختلف ' خواص مختلف ۔ ان کے اندر ایسے ایسے عجائبات کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتے نباتات میں زندگی اور نمو ان کا تنوع ' ان کی وراثتی خصوصیات جو چھوٹے سے بیج کے اندر موجود ہوتے ہیں ۔ یہ چھوٹا سا بیج اپنے آپ کو دہراتا ہے ۔ پودا ' پھول اور درخت کی شکل اختیار کرتا ہے ۔ ایک ہی پھول کے اندر رنگوں کی تقسیم کا مطالعہ ہی انسان کو خالق کائنات کی عظیم قوتوں کی طرف کھینچ لیتا ہے اور انسان کا ایمان گہرا ہوتا چلا جاتا ہے ۔

پھر قرآن تصریح کرتا ہے کہ اللہ نے نباتات میں بھی جوڑے پیدا کیے ۔

مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ (۳۱ : ۱۰) "عمدہ قسم کے جوڑے" ۔ یہ وہ عظیم حقیقت ہے کہ سائنس کو بہت ہی قریب زمانے میں اس کا علم اور تجربہ ہو سکا ہے ۔ ہر پودے میں نر اور مادہ خلیے ہوتے ہیں ۔ یہ خلیے ایک ہی پھول میں یا ایک ہی شاخ کے دو پھولوں میں ہوتے ہیں یا یہ خلیے دو درختوں میں علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور کوئی پودا اس وقت پھل نہیں دیتا جب تک نر اور مادی خلیے باہم ملتے نہیں ہیں ۔ جیسا کہ انسانوں اور حیوانوں کے توالد کا نظام واضح ہے ۔

اور زوج کے ساتھ کریم کی صفت ' یہاں اس لفظ کے استعمال کے ذریعے ایک خاص تاثر دینا مطلوب ہے کہ یہ اللہ کریم کی تخلیق ہے اور یہ بہت ہی اہم اعجوبہ ہے جسے دیدۂ عبرت سے دیکھا جانا چاہیے اور اس کا احترام کرنا چاہئے ۔ یہ اس لیے بھی لایا گیا ہے کہ اللہ نے تو یہ عمدہ کام کیے ہیں اور جن ہستیوں کو تم الٰہ سمجھے ہوئے ' زرا بتاؤ انہوں نے کیا کام کیے ہیں ۔ یہ تو ہے

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِه (۳۱ : ۱۱) "یہ تو ہے اللہ کی تخلیق اب زرا مجھے دکھاؤ ان دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے" ۔ زوج کریم کے بعد یہ چیلنج اور اب یہ نتیجہ

بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۳۱ : ۱۱) "اصل بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں" ۔ اور شرک سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے جبکہ اس عظیم کائنات کا یہ معجزہ ہمارے ساتھ ہے ۔ یہاں پہلا سفر ختم ہوتا ہے اور نہایت ہی رو داد الفاظ پر ۔

--- ○○○ ---

اس کے بعد اب دوسرا راؤنڈ شروع ہوتا ہے ۔ یہ بالکل جدید ترتیب سے ہے ۔ یہ بالواسطہ ہدایت اور حکایتی انداز تلقین ہے ۔ موضوع بحث اللہ وحدہ کا شکر ادا کرنا ہے ۔ اور اللہ کو ہر قسم کے شرک سے پاک قرار دینا ہے ۔ اس حکایت کے درمیان آخرت اور اعمال اور ان کی جزا کی بات کی گئی ہے ۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّشْكُرْ

فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿١٢﴾

"ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر گزار ہو۔ جو کوئی شکر کرے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے اور جو کفر کرے تو حقیقت میں اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے"۔

حضرت لقمان حکیم کی زبانی یہاں عقیدۂ توحید' عقیدۂ آخرت اور دوسری اخلاقی تعلیمات یہاں دی گئی ہیں۔ ان کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ نبی تھے اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ نبوت کے منصب کے بغیر ایک عبد صالح تھے۔ زیادہ تر مفسرین اس دوسری رائے کی طرف گئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ایک حبشی غلام تھے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ نوبہ کے رہنے والے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے ججوں میں سے ایک جج تھے۔ وہ جو بھی ہوں قرآن نے ہمیں یہ اطلاع دی ہے کہ وہ ایک ایسا شخص تھا جس کو اللہ نے حکمت عطا کی تھی اور اس حکمت اور فلسفے کا خلاصہ یہ تھا کہ اللہ کا شکر ادا کیا جائے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلَّهِ (۳۱ : ۱۲/۱) "ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کے شکر گزار ہو"۔ چنانچہ قرآن کریم ہمیں اس قصے کے ضمن میں یہ ہدایت دیتا ہے کہ تم لوگ اللہ کا شکر ادا کرو اور اس کے ساتھ ساتھ یہ ہدایت اور اطلاع کہ شکر تو شکر کرنے والے کے لیے ایک ذخیرہ ہے۔ اس کے نتیجے میں خود شاکر کو نفع ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تو غنی بادشاہ ہے کوئی شکر کرے یا نہ کرے اس کی بادشاہت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اللہ تو بذات خود محمود اور قابل ستائش ہے' چاہے کوئی اس کی حمد و ثنا کرے یا نہ کرے۔

وَمَن يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ (۳۱ : ۱۲) "جو کوئی شکر کرے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے اور جو کفر کرے تو حقیقت میں اللہ بے نیاز ہے"۔ لہٰذا بہت بڑا احمق ہے وہ جو حکمت کے مخالف ہو اور وہ اپنے لیے یہ سرمایہ جمع نہ کرتا ہو۔

اب مسئلہ توحید ایک تقریر کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کے سامنے کی۔

وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴿١٣﴾

"یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا "بیٹا' خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا' حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے"۔

یہ ایک ایسا وعظ ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے کیونکہ کوئی والد اپنے بیٹے کے لیے اچھائی کے سوا اور کوئی ارادہ ہی نہیں کر سکتا۔ ایک والد اپنے بیٹے کے لیے ناصح مشفق ہی ہو سکتا ہے۔ یہ ہیں لقمان حکیم جو اپنے بیٹے کو شرک سے منع کرتے ہیں اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ شرک دراصل ایک عظیم ظلم ہے۔ وہ اس بات کو دو بار اپنی تقریر میں

دہراتے ہیں۔ایک بار تو وہ شرک سے روک کر اس کی علت بتاتے ہیں اور دوسری تاکید لفظ ان اور لام تاکید کے ساتھ کرتے ہیں۔یہی وہ بات ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہ ہیں کہ ناحق مجادلہ کرتے ہیں اور اس عقیدے پر زور دینے کی وجہ سے حضرت پر الزامات عائد کرتے ہیں کہ شاید ان کی کوئی ذاتی غرض اس سے وابستہ ہے' مثلاً یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حکمران بنا چاہتے ہیں اور ان کے مقابلے میں بڑا آدمی بنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ان کی یہ بات درست نہیں ہے اس لیے کہ حضرت لقمان اپنے بیٹے کے سامنے یہی تقریر کرتے ہیں اور ان کو شرک سے رکنے کا امر کرتے ہیں ظاہر ہے کہ کوئی والد کم از کم اپنے بیٹے سے کوئی غلط بات نہیں کر سکتا۔لہٰذا یہ نصیحت ہر قسم کے ظن اور گمان سے پاک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جسے بھی حکمت دی گئی وہ عقیدۂ توحید کا قائل ہوتا ہے۔عقیدۂ توحید سے غرض خیر ہی خیر ہے اور کچھ بھی نہیں اور یہ ایک نفسیاتی استدلال ہے۔

---ooo---

چونکہ یہ والد کی جانب سے اپنے بیٹے کو ایک مشفقانہ وعظ تھا' اس لیے یہ بھی بتا دیا گیا کہ جب والد اپنی اولاد کے حق میں اس قدر مخلص اور مشفق ہوتا ہے تو تمام انسانوں کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ والدین کا تم پر حق ہے۔یہ تقریر بھی نہایت ہی محبت بھرے الفاظ میں ہے۔یہ باپ اور بیٹے' والدین اور اولاد کے تعلق کو نہایت ہی شفیقانہ اور اشاراتی انداز میں بیان کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود نظریاتی تعلق اور نظریاتی روابط کو نسب اور خون کے تعلق سے مقدم رکھا جاتا ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿١٤﴾ وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٥﴾

"اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔ (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا' میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے' اس وقت میں تمہیں بتا دوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو"۔

قرآن کریم میں بار بار اولاد کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے والدین کا خیال رکھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نصائح میں بھی اس کی بار بار تاکید آتی ہے لیکن اس کے مقابلے میں والدین کو اپنی اولاد کے بارے میں بہت کم ہدایت دی گئی ہے۔جو نصیحت کی گئی ہے وہ زندہ درگور کرنے کی بری رسم کے سلسلے میں ہے جبکہ یہ رسم بہت ہی محدود علاقوں

میں تھی ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچوں پر رحم و شفقت ہر انسان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے ۔ اللہ نے سلسلہ حیات کو جاری رکھنے کے لیے والدین کے اندر یہ داعیہ رکھ دیا ہے کہ وہ بچوں کی نگہداشت کریں ۔ والدین ' اپنے جسم ' اپنے اعصاب اور اپنی عمریں بچوں کے لیے کھپا دیتے ہیں ۔ وہ اپنی ہر قیمتی چیز اپنے بچوں پر قربان کر دیتے ہیں اور اس راہ میں جو بھی مشکلات آ جائیں اف نہیں کرتے اور نہ شکوہ کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات والدین لاشعوری طور پر بچوں کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں بلکہ وہ بچوں پر نہایت ہی خوشی خوشی سے سب کچھ قربان کر دیتے ہیں ۔ اس طرح گویا یہ سب کچھ والدین اپنے لیے کرتے ہیں ۔ لہذا بچوں کے لیے فطرت انسانی خود کفیل ہوتی ہے ' مزید کسی وصیت اور تاکید کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ۔ رہا لڑکا اور اولاد تو ان کو بار بار یاد دہانی کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس نسل کا خیال رکھیں جس نے تم پر سب کچھ قربان کر دیا ہے ' جس نے سب تدبیریں تمہارے لیے کیں اور جواب ٹمٹماتے چراغ ہیں یا چراغ سحری ہیں جنہوں نے اپنی عمر ' اپنے جسم اور اپنی روح کو کشید کر کے تمہاری زندگی کا ساماں تیار کیا ہے اور جہاں تک بچوں اور اولاد کا تعلق ہے وہ والدین کی قربانیوں کا پورا معاوضہ نہیں دے سکتے اگرچہ وہ اپنی پوری عمر ہی والدین کے لیے وقف کر دیں ۔ ذرا اس پر تاثیر تصویر کو دیکھیں ۔

حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰى وَهۡنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِىۡ عَامَيۡنِ ( ۳۱ : ۱۴ ) "اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے" ۔ اس قربانی اور اس نیکی کی تصویر اس سے اچھی نہیں بنائی جا سکتی ۔ والدہ اپنے فریضہ طبعی کی رو سے زیادہ قربانی دیتی ہے اور بچوں کے لیے اس کی محبت ' شفقت اور نرمی باپ کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے ۔ حافظ ابوبکر بزار نے اپنی سند میں یہ روایت کی ہے بذریعہ بریدہ اور اس کے والد کہ ایک شخص طواف میں تھا اور اپنی ماں کو اٹھا کر طواف کرا رہا تھا تو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا میں نے اس کا حق ادا کر دیا ہے ؟ تو حضور ؐ نے فرمایا نہیں ' ایک سانس کے برابر بھی نہیں ۔ یوں ایک سانس کے برابر بھی نہیں ۔ حمل کے دور میں اور وضع حمل کے دور میں ' جب کہ وہ اسے ضعف پر ضعف جھیل کر اٹھا رہی تھی ۔

اس خوشگوار شکر گزاری کے ساتھ میں متوجہ کیا جاتا ہے کہ منعم اول کا شکر ادا کرنا بھی ضروری ہے ۔ پہلا شکر اللہ کا ہے اور دوسرا والدین کا ہے ۔

اَنِ اشۡكُرۡ لِىۡ وَلِوَالِدَيۡكَ ( ۳۱ : ۱۴ ) "کہ میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا" ۔ اور ان حقائق کے ساتھ یہ اہم حقیقت بھی یاد رکھو ۔

اِلَىَّ الۡمَصِيۡرُ ( ۳۱ : ۱۴ ) "میری ہی طرف تمہیں پلٹنا ہے" ۔ اور وہاں یہی سازوسامان تمہیں فائدہ دے گا ۔

لیکن والدین اور اولاد کے اس تاکیدی تعلق کے باوجود اور اولاد کی جانب سے اس حرمت اور ادب کے باوجود یہ تعلق ثانوی ہے ۔ اس سے قبل نظریاتی تعلق ہے ۔ لہذا اولاد کو یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ نظریات کے سلسلے میں والدین کے احکام اور خواہش کو بھی رد کیا جا سکتا ہے ۔

وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا ( ۳۱ : ۱۵ )

"لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان"۔ کیونکہ والدین کی اطاعت کی سرحد یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے آگے رب تعالیٰ کی اطاعت کا حکم ہے اور نظریاتی تعلق باپ بیٹے کے تعلق سے افضل و اعلیٰ ہے۔ اس لیے والدین کسی کو مشرک بنانے کے جو احکام دیں 'جدوجہد کریں' دباؤ ڈالیں' مطالبے کریں' ناراض ہوں' تو ان کی یہ بات نہیں مانی جا سکتی کیونکہ اولاد جانتی نہیں ہے کہ اللہ کا کوئی شریک بھی ہے۔ لہٰذا حکم یہ ہے کہ یہاں سے آگے والدین کی اطاعت نہیں ہے۔ خالق کی اطاعت ہے۔

لیکن نظریاتی اختلاف اور نظریات کے بارے میں والدین کی عدم اطاعت کے حکم کے باوجود والدین کی عزت و احترام اور ان کے ساتھ شفقت کا برتاؤ ضروری ہے۔

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (۳۱ : ۱۵) "دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ"۔ یہ دنیا کی زندگی تو ایک مختصر سفر ہے۔ اصل سفر یہ ہے۔

وَّ اتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ (۳۱ : ۱۵) "مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے"۔ یعنی اہل ایمان کی پیروی کرو۔ اور اس مختصر سفر کے بعد پھر تم نے اللہ کے سامنے حاضری دینی ہے۔

ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳۱ : ۱۵) "پھر تم سب کو پلٹنا میری طرف ہے۔ پھر میں تمہیں بتا دوں گا کہ تم کیسے عمل کر کے آئے ہو"۔ اور ہر شخص کے لیے وہاں جزاء ہو گی اس کے اعمال کی چاہے اس نے شکر کیا یا کفر کیا۔ شرک کی راہ اختیار کی یا توحید کا راستہ اپنایا۔

روایات میں آتا ہے کہ یہ آیت اور سورہ عنکبوت کی آیت جو اس کے مشابہ ہے اور سورہ احقاف کی ایک آیت جس کا یہی مضمون ہے' یہ آیات حضرت سعد ابن ابی وقاص اور اس کی ماں کے حق میں نازل ہوئیں۔ (میں نے بیسویں پارے میں سورہ عنکبوت کی آیت کے ضمن میں تفصیلات دی ہیں) بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ آیت سعد ابن مالک کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ طبرانی نے اسے کتاب العشرۃ میں نقل کیا ہے جو انہوں نے داؤد ابن ہند سے روایت کی ہے۔ مسلم کی حدیث میں سعد ابن ابی وقاص کا قصہ آیا ہے اور راجح بات یہی ہے لیکن مفہوم اور حکم تمام ایسے حالات پر عام ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ تعلقات میں بھی درجات ہیں اور فرائض میں بھی درجات ہیں۔ ہر حکم اور ہر تعلق کی اپنی قدر و قیمت ہوتی ہے لہٰذا اسلام میں اللہ کا رابطہ سب سے پہلا رابطہ ہے اور اللہ کے حقوق سب سے اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ قرآن کریم مراتب کے اس ذوق کو بار بار جتاتا ہے کہ اگر فرق مراتب نہ کنی زندیقی۔ اور بار بار تاکید اس لیے کی جاتی ہے کہ اس معاملے میں کوئی اجمال و اشکال نہ رہے۔

یہ تو تھا جملہ معترضہ حضرت لقمان کی تقریر میں۔ اس کے بعد ان کی تقریر اور نصیحت پھر شروع ہوتی ہے۔ اور یہ مسئلہ بعث بعد الموت اور حشر و نشر اور جزاء و سزا کے بارے میں ہے کہ وہاں سب کو جزاء و سزا ملے گی اور یہ بہت ہی عادلانہ ہو گی لیکن اس اصول کو محض اصول کے طور پر پیش نہیں کیا جاتا بلکہ اسے ایک کائناتی تمثیل اور تصویر کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس قدر موثر انداز میں جس سے انسانی شعور بے حد متاثر ہوتا ہے اور اس تصویر میں بتایا گیا ہے کہ اللہ اس

کائنات کے ذرے ذرے کو جانتا ہے اس لیے ہر کسی کے اجزائے جسم کے تمام ذرات کو وہ لا سکتا ہے۔

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۶﴾

"(اور لقمان نے کہا تھا کہ) "بیٹا' کوئی چیز رائی کے دانہ برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو' اللہ اسے نکال لائے گا۔ وہ باریک بین اور باخبر ہے"۔

اگر کوئی اللہ کے علم کی جامعیت اور ملنیت کو محض اصولی الفاظ میں بیان کر دے اور اللہ کو بہت قدرتوں والا کہہ دے اور یہ کہ اسے ذرے ذرے کا حساب لینے والا کہہ دے تو وہ اس قدر موثر نہیں ہو سکتا جس طرح یہ مصور انداز تعبیر موثر اور دلنشین ہے۔ یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز تعبیر ہے کہ نہایت معنوی اور ذہنی امور کو مصور کر دیا جاتا ہے۔ (دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی)۔ رائی کا دانہ بہت ہی چھوٹا' گم گشتہ' بے حقیقت اور بے وزن ہوتا ہے۔ اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ پھر یہ دانہ کسی چٹان ( صخرہ) میں ہو کہ وہاں تک پہنچنے کی کوئی راہ بھی نہ ہو یا وہ سماوات میں ہو' جن کی دوریوں کے تصور ہی سے سر چکرا جاتا ہے' جن کے اندر بڑے بڑے عظیم الجثہ کرات بے وزن تیر رہے ہیں یا اس زمین کے اندر وہ رائی کا دانہ کہیں غبار میں پڑا ہو تو اسے بھی اللہ ڈھونڈ لائے گا۔ پس ذرا تصور کر لو اس کے علم و قدرت کے بارے میں۔ وہ بہت ہی باریک بین ہے۔

يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ (۳۱ : ۱۶) اس مضمون کے ساتھ لطیف کا لفظ بہت ہی موزوں ہے۔

اور خیال اس ہولناک' عظیم اور وسیع و عریض کائنات کی وادیوں میں اس رائی کے دانے کے پیچھے سرپٹ دوڑ رہا ہے اور یہ اللہ کے علم اور قدرت کے تصور پر احاطہ کرنے سے عاجز رہ جاتا ہے' اس لیے وہ اللہ کی طرف مڑ کر اپنی عاجزی کا اقرار کرتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ اللہ ہر خفیہ بات کا جاننے والا ہے اور وہ بات ذہن نشین ہو جاتی ہے جسے پورا قرآن انسان کے ذہن میں بٹھانے کے درپے ہے کہ "وہ" دیکھ رہا ہے۔ نہایت ہی بہترین انداز میں اور دلنشیں اسلوب ہیں۔

حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت جاری رکھے ہوتے ہیں۔ اللہ پر پختہ ایمان لانے اور دل سے ہر قسم کے شرک کا شائبہ تک دور کرنے اور عقیدۂ آخرت ثابت کرنے اور اسلامی نظریہ حیات دل میں بٹھانے کے بعد اب وہ اسلامی عقیدے کے تقاضے سامنے لاتے ہیں۔ وہ تقاضے یہ ہیں کہ اللہ کے ساتھ رابطہ قائم رکھنے کے لیے نماز پڑھیں' یہ معراج المومنین ہے۔ لوگوں کے ساتھ رابطہ رکھنے کے لیے ان کو اسلام کی دعوت دیں۔ جو بھی دعوت دیتا ہے اسے مشکلات پیش آتی ہیں' اس لیے مشکلات پر صبر کرو۔

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ

عَلٰی مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝

"بیٹا' نماز قائم کر' نیکی کا حکم دے' بدی سے منع کر' اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے"۔

یہ اسلامی نظریہ حیات کا راستہ ہے کہ اللہ کو وحدہ لاشریک سمجھنا' یہ شعور پیدا کرنا کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ اس بات کا حتمی ہونا کہ اصل اجر اس کے پاس ہے۔ اس پر بھروسہ کرنا کہ وہ عدل کرے گا اور اس کے عذاب سے ہروقت ڈرنا اور اس کے بعد لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دینا' ان کی اصلاح کرنا اور ان کو معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا اور ان تمام امور سے قبل اپنے آپ کو کفر کے ساتھ معرکہ آرائی کے لیے تیار کرنا اور اس راہ میں مادی تیاری سے زیادہ اہم تیاری اخلاقی تیاری ہے۔ اور وہ اقامت صلوٰۃ اور اس کے بعد پیش آنے والی مشکلات پر صبر' کیونکہ لوگ دعوت کے مقابلے میں کج روی اختیار کرتے ہیں۔ دعوت کے ساتھ عناد رکھتے ہیں اور اعراض کرتے ہیں۔ اذیت میں لسانی اذیت اور دست درازی کی دونوں اذیتیں شامل ہیں۔ مال کی آزمائش اور جان کی آزمائش۔

اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۱۷:۳۱) "یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے"۔ عزم الامور کا مفہوم ہے راستے میں تردد ہونے کے بعد جب کوئی کسی طرف عزم کر لیتا ہے اور پھر راستہ طے کرتا ہے۔

اب حضرت لقمان اپنی نصیحت کو نظریات و عبادات کے بعد اخلاقیات کی حدود میں داخل کرتے ہیں۔ جو کسی بھی داعی کا بہترین زاد راہ ہے کیونکہ دعوت الی اللہ دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان دوسروں کو حقیر سمجھے اور اپنے آپ کو برتر سمجھے اور پھر دعوت دیتے وقت اگر امیر بن جائے تو وہ لوگوں پر اپنی قیادت مسلط کرے اور اگر ایک آدمی دعوت الی الخیر کا کام بھی نہیں کرتا اور پھر بھی وہ بڑا بنتا ہے اور لوگوں سے اونچا رہتا ہے تو یہ بہت ہی زیادہ قبیح حرکت ہے۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا
۲ يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ
ع ۸ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۝
۱۱

"اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر' نہ زمین میں اکڑ کر چل' اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کر' اور اپنی آواز ذرا پست رکھ' سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے"۔

صعر ایک بیماری ہے جب اونٹ کو لگ جاتی ہے تو وہ اپنی گردن ٹیڑھی کر لیتا ہے۔ قرآن کریم مغرور شخص کے فعل کو صعر کے ساتھ تشبیہ دے کر اس سے لوگوں کو متنفر کرنا چاہتا ہے۔ کبر اور سرتابی کے عمل کو صعر کہا گیا یعنی اپنے رخساروں کو

لوگوں سے کبرو غرور کی وجہ سے پھیر دینا۔ زمین پر اکڑ کر چلنے کے معنی ہیں غرور اور استکبار کے ساتھ چلنا۔ بھولا ہوا اور لوگوں کو کچھ نہ سمجھنے والا' یہ ایسی حرکت ہے جسے اللہ بھی مکروہ سمجھتا ہے اور لوگ بھی اسے برا سمجھتے ہیں۔ ایسا شخص اپنے بارے میں اونچا خیال رکھتا ہے اور اپنی رفتار میں اس کا اظہار کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۳۱:۱۸) "اللہ کسی خود پسند اور فخر جتلانے والے کو پسند نہیں کرتا"۔

اکڑ کر چلنے کی ممانعت کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا کہ اعتدال کے ساتھ چلو۔

وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ (۳۱:۱۹) "اور اپنی چال میں اعتدال اختیار کرو"۔ قصد سے مراد میانہ روی ہے۔ یعنی وہ اقتصادی پالیسی جس میں اسراف نہ ہو' کیونکہ جو شخص اکڑ کر چلتا ہے' گردن مروڑ کر چلتا ہے اور اپنے آپ کو اونچا سمجھتا ہے وہ اپنی قوت کو ضائع کرتا ہے۔ گویا اسراف کرتا ہے۔ قصد سے مراد ارادہ بھی ہو سکتا ہے یعنی تمہارے چلنے کی حرکت بامقصد ہو اور تمہاری منزل متعین ہو۔ اور اکڑ کر خود پسندی سے چلنے والا شخص ماسوائے دکھاوے کے اور اپنے ذہن میں بڑائی کے کوئی اور مقصد نہیں رکھتا اور یہ کوئی مقصد نہیں ہے' یعنی اگر چلتے ہو تو کسی مقصد سے سادہ طریقے سے چلو۔

دھیمی آواز میں شائستگی ہوتی ہے۔ اس میں جو شخص بات کرتا ہے وہ اعتماد سے بات کرتا ہے اور اسے اپنی بات کی سچائی کا یقین ہوتا ہے۔ اونچی اور گرجدار آواز سے بات کرنے والا شخص عموماً بے ادب ہوتا ہے یا اسے اپنی بات پر یقین نہیں ہوتا۔ یا وہ اپنی شخصیت کی کمزوری کو شور و شغب میں چھپانا چاہتا ہے۔ جھوٹا شخص ہمیشہ جوش و خروش دکھاتا ہے۔

قرآن کریم کا اپنا اسلوب ہے' یہاں بے مقصد اونچی آواز کی قباحت کو ظاہر کرنے کے لیے ایک نہایت ہی مکروہ' حقیر اور احمقانہ صورت پیش کی جاتی ہے۔

اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ (۳۱:۱۹) "سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے"۔ یوں ہر اونچی آواز کو گدھوں کی آواز سے تشبیہ دے کر' اسے قابل نفرت بنا دیا گیا اور یوں ہر عقلمند اور مہذب شخص اسے حقیر اور قابل نفرت سمجھنے لگتا ہے۔ یہ حقارت آمیز تصویر جس شخص کی نظروں میں ہو' وہ کبھی بھی گدھوں کی آواز کی طرح آواز نہیں نکالے گا۔

یوں یہ دوسرا سفر ختم ہوتا ہے جس کے اندر پہلے ہی مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔ یہ بحث نہایت ہی متنوع اور جدید سے جدید اسلوب میں کی گئی ہے' قرآن کے اپنے انداز تصویر کشی میں۔

---000---

# درس نمبر ۱۸۶ تشریح آیات

## ۲۰ --- تا --- ۳۴

یہ اس سورہ کا تیسرا راؤنڈ ہے۔ اس کا آغاز تکوینی دلیل کے بیان سے ہوتا ہے جس کا تعلق لوگوں سے اور ان کی زندگی کی سہولیات و مفادات سے ہے کہ اللہ نے ان پر کیا کیا انعامات کیے' جو ظاہر بھی ہیں اور باطن بھی ہیں' جن سے وہ رات اور دن فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن ان کے باوجود انہیں شرم نہیں آتی کہ وہ ایسے منعم' فضل و کرم کرنے والے' داتا کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور اس کے بعد وہی مسئلہ توحید بیان ہوتا ہے جو اس سے قبل دونوں اسفار میں بیان ہوا۔

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً ۗ وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ ﴿٢٠﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ ﴿٢١﴾

"کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لئے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں؟ اس پر حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو ان کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو' یا ہدایت' یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ انہی کی پیروی کریں گے خواہ شیطان ان کو بھڑکتی ہوئی آگ ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا رہا ہو؟

یہ وہ نظارہ ہے جسے ہم روز دیکھتے ہیں۔ جسے قرآن کریم بار بار نقل کرتا ہے اور ہر بار منظر کائنات پڑھنے والے کو نیا نظر آتا ہے کیونکہ یہ عظیم کائنات اور اس کے کسی پہلو پر بھی اگر غور کیا جائے' جب بھی غور کیا جائے اور اس کے اسرار و رموز پر تدبر کیا جائے اور اس کے عجائبات دیکھے جائیں تو یہ نیا نظر آتا ہے۔ اور اس کے اسرار اور عجائبات ختم نہیں ہوتے۔ انسان اپنی محدود عمر میں وہ پوری معلومات حاصل نہیں کر سکتا۔ جب بھی کوئی دریافت ہوتی ہے عقل دنگ رہ جاتی ہے

اور جب بھی ہم از سرنو غور کرتے ہیں اسے جدید پاتے ہیں۔

یہاں قرآن کریم اس کائنات کے اس پہلو کو پیش کرتا ہے کہ اللہ نے یہ کائنات ہمارے لیے مسخر کر دی ہے اور یہ ہر طرف سے انسانی ضروریات کو پورا کر رہی ہے۔ پھر جب اس کائنات کے اندر پائے جانے والی تمام چیزوں کا تجزیہ کیا جائے تو اس کی ترکیب بڑی عجیب ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے کسی مدبر انجینئر نے بنایا ہے اور یہ یونہی اتفاقی طور پر پیدا نہیں ہوگئی۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ارادہ اس پوری کائنات کے پیچھے کام کر رہا ہے اور وہ اللہ مدبر ہے 'جس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کائنات کی تمام چیزوں کو انسان کی خدمت میں لگا دیا اور پھر اس کرۂ ارض کی تو ہر چیز کو خدمت انسان میں لگا دیا۔

جہاں تک اس ہولناک کائنات کا تعلق ہے 'یہ زمین اس کا ایک چھوٹا سا ذرہ ہے اور اس زمین پر پھر انسان ایک چھوٹی سی ضعیف مخلوق ہے بمقابلہ حجم زمین اور بمقابلہ ان قوتوں کے جو اس زمین کے اندر قدرت نے رکھی ہیں جو زندہ بھی ہیں اور مردہ بھی ہیں۔ ان قوتوں کے مقابلے میں انسان اپنے حجم' طاقت اور وزن کے اعتبار سے کچھ بھی نہیں۔ لیکن اللہ نے انسان کو فضیلت دی اور اس کے جسم میں اپنی روح پھونکی اور اسے اپنی مخلوقات کے ایک بڑے حصے پر فضیلت دے دی۔ اللہ کا یہ فضل وکرم ہی تھا جس کا تقاضا یہ ہوا کہ اس مخلوق کی اس کرۂ ارض پہ اہمیت ہو۔ اور اس کا سب مخلوق سے بلند مقام ہو۔ اس کے اندر یہ قوت اور صلاحیت ہو کہ وہ اس دنیا کے وسائل کو کام میں لائے اور اس کے اندر یہ قوت اور صلاحیت ہو کہ وہ اس دنیا کے وسائل کو کام میں لائے اور اس کے قدرتی ذخائر کی تلاش کرے۔ اس آیت میں جس تسخیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے 'وہ یہی ہے کیونکہ تسخیر کائنات ہی میں اللہ کی ظاہری اور پوشیدہ نعمتوں کا شمار ہوتا ہے۔ یہ تسخیر اس کے علاوہ ہے جو اللہ نے سماوات کی قوتوں کو بھی انسان کے لیے مفید بنایا ہے۔ انسان کا وجود ہی اللہ کا فضل ہے اور پھر انسان کو اس قدر قوت وصلاحیت دی جاتی ہے کہ وہ اس کائنات کی سرکش قوتوں کو مسخر کرے۔ یہ اللہ کا دوسرا فضل ہے اور پھر اس کی ہدایت کے لیے رسولوں کو بھیجنا 'اللہ کا مزید فضل ہے۔ ہر وہ سانس جو وہ لیتا ہے 'دل کی ہر دھڑکن جو اس کے جسم میں خون دوڑاتی ہے۔ اس دنیا کا ہر منظر جسے وہ دیکھتا ہے' ہر وہ آواز جو اس کے کانوں سے ٹکراتی ہے' ہر وہ خیال جو اس کے ضمیر میں آتا ہے' ہر نئی فکر جو وہ تخلیق کرتا ہے۔ یہ سب اللہ کے وہ انعامات ہیں جن میں ایک کا شکر بھی انسان اپنی پوری زندگی میں ادا نہیں کر سکتا۔ یہ سب اللہ کے فضل ہی فضل ہیں۔

اس انسانی مخلوق کے لیے اللہ نے ان تمام قوتوں کو مسخر کیا ہے جو زمین و آسمان کے درمیان ہیں۔ سورج کی کرنوں کو اس کی خدمت میں لگا دیا۔ چاند کے نور کو اس کے لیے مفید کر دیا' ستاروں سے اس کے لیے سمندروں میں راہنمائی فراہم کی۔ بارش' ہوا' پرندے اور چرندے اس کے مفید مطلب بنا دیئے گئے۔ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کے لیے مفید اور مسخر ہوگئے۔ یہ تو ہم بڑی سہولت سے دیکھ سکتے ہیں۔ ان پر تو ہمیں رات اور دن تدبر کرنا چاہئے۔ اس طویل و عریض کرۂ ارض پر اسے خلیفہ بنایا گیا اور زمین کے تمام خزانوں پر اس کا کنٹرول قائم کر دیا گیا۔ بعض خزانے ظاہر ہیں اور بعض باطن ہیں۔ بعض ایسے ہیں جن کے آثار و اثرات اس کے ادراک میں ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو ابھی اس کے ادراک سے باہر ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ ان سے وہ استفادہ کرتا رہا لیکن اسے ان کا علم ہی نہ تھا۔ غرض انسان ہے کہ رات اور دن کے ہر لمحے میں اس پر اللہ کے فضل وکرم کی بارش ہو رہی ہے اور وہ اللہ کی رحمتوں میں غرق ہے لیکن اسے معلوم نہیں

کہ ان رحمتوں کی انتہا کیا ہے ۔ اس کے انواع و اقسام کیا کیا ہیں لیکن ان سب امور کے باوجود لوگوں میں سے ایک فریق ایسا ہے جو اللہ کی ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا' ان پر غور نہیں کرتا' اپنے ماحول میں غور و فکر کر کے یقین نہیں رکھتا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ (۳۱ : ۲۰)

"اس کے باوجود حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو یا کوئی ہدایت یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب"۔

اللہ کے بارے میں یہ مجادلہ عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے جبکہ یہ کائنات اور اس کی بوقلمونیاں ہمارے سامنے ہیں اور ان وافر نعمتوں کی تعداد ہی ہمیں معلوم نہیں۔ ایسے حالات میں یہ انکار اور یہ تکذیب نہایت قبیح' نہایت مذموم' قابل نفرت اور فطرت کے خلاف ہے۔ اور انسان اگر غور کرے تو مارے خوف کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور واضح طور پر نظر آتا ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا یہ انکار کرنے والا شخص دراصل فطرتاً منحرف ہے۔ اس کے اندر فطری بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کی پکار کو نہیں سن رہا ہے اور وہ اس قدر جری اور بے شرم ہو گیا ہے کہ وہ اپنے ایسے منعم کے بارے میں گستاخی کرتا ہے۔ پھر اس شخص کا یہ مجادلہ اور یہ انکار کسی علم سائنس پر بھی مبنی نہیں ہے۔ محض جہالت پر مبنی ہے۔ پھر ایسے شخص کے پاس نہ کوئی کتابی ثبوت ہے اور نہ دلیل منیر ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا

(۳۱ : ۲۱) "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا"۔ یہ ہے ان کی واحد دلیل جو وہ اپنے رویے پر پیش کر سکتے ہیں۔ یہ بھی عجیب دلیل ہے۔ پتھر جیسی جامد تقلید' جو نہ علم پر مبنی ہے' نہ کسی نظریہ پر مبنی ہے۔ یہی وہ تقلید ہے جس سے اسلام انسانیت کو چھڑانا چاہتا ہے۔ ان کی عقل کو آزادی دیتا ہے کہ وہ آزادانہ غور و فکر کریں اور انسان کے اندر بیداری' حرکت اور روشنی پھیلانا چاہتا ہے لیکن انسان ہیں کہ وہ اپنے ماضی کے آثار سے منحرف ہو گئے ہیں اور انہوں نے زبردستی قلادے اپنی گردنوں میں ڈالے ہوئے ہیں اور مویشیوں کی طرح اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھا ہوا ہے اور بیڑیاں از خود پہن رکھی ہیں۔

اسلام تو دراصل ضمیر کی حریت اور شعور کی حریت کا نام ہے۔ وہ نور کی تلاش میں آگے بڑھتا ہے۔ وہ زندگی کا ایسا نظام ہے جس میں کوئی تقلید اور کوئی غلامی اور جمود نہیں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ لوگ اس کا انکار کرتے ہیں اور اپنی روح سے اس آزادی کو پرے پھینکتے ہیں اور اللہ کے بارے میں بغیر علم' بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی کتاب منیر کے مجادلہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب ان کے ساتھ مذاق کیا جاتا ہے اور ان کے موقف کی ایک خفیہ خطرناکی بیان کر دی جاتی ہے۔

اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ (۳۱ : ۲۱) "کیا یہ انہی کی پیروی

کریں گے خواہ شیطان انہیں کھینچ کر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرف کیوں نہ بلاتا ہو"۔ انہوں نے جو یہ موقف اختیار کر رکھا ہے تو وہ شیطان کی دعوت پر اختیار کر رکھا ہے تاکہ وہ انہیں جہنم کی آگ تک پہنچا دے۔ تو سوال یہ ہے کہ اگر شیطان انہیں جہنم کی طرف لے جا رہا ہے تو پھر بھی یہ اس کی تقلید کریں گے۔ یہ نہایت ہی احساس دلانے والی چٹکی ہے۔ نہایت ہی بیدار کرنے والی اور ڈرانے والی۔ خصوصاً اس عظیم کائناتی دلیل کے بعد۔

اس ہٹ دھرمی پر مبنی جدال اور بے دلیل جھگڑے کے حوالے سے۔ اب ان کو بتایا جاتا ہے کہ ان کے لیے مناسب طرز عمل کیا ہے اور اس کائناتی دلیل اور اللہ کے وسیع انعامات کے بعد انہیں کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۝

"جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے اور عملاً وہ نیک ہو، اس نے فی الواقع ایک بھروسے کے قابل سہارا تھام لیا اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے"۔

یعنی پوری طرح اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا اور اس کے ساتھ حسن عمل اور حسن سلوک کو اپنانا، یعنی مکمل سپردگی اور اللہ کے فیصلوں پر پوری طرح راضی ہونا، اللہ کے احکام، ہدایات اور فرائض میں رنگ جانا، اس شعور اور یقین کے ساتھ کہ اللہ کی رحمت ہمارے شامل حال ہے اور اللہ ہر وقت نگہبان ہے۔ اس کا وجدان اللہ کی رضامندی کو پاتا ہو اور وہ اس سپردگی میں اپنے ساتھ پوری کائنات کو سربسجود دیکھتا ہو۔ یہ سب اشارات اپنے چہرے کو اللہ کے حوالے کرنے کے لفظ کے اندر موجود ہیں۔ چہرہ دراصل نہایت ہی مکرم حصہ ہے وجود انسانی کا۔

وَ مَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗ اِلَى اللّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى

(۳۱ : ۲۲) "جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے اور عملاً وہ نیک ہو، اس نے فی الواقع ایک بھروسے کے قابل سہارا تھام لیا"۔ یعنی وہ رسی جو نہیں کٹتی۔ جو کبھی ڈھیلی نہیں پڑتی۔ جو کبھی اس شخص کو دھوکہ نہیں دیتی جو اسے پکڑتا ہے۔ مراد وہ سہارا ہے جسے انسان تھام لیتا ہے یعنی جو شخص اللہ کے سپرد ہو جائے وہ سمجھے کہ وہ مشکل ترین حالات میں، تاریک راتوں میں، سخت مشکلات میں، سخت آندھیوں میں، کبھی بے سہارا نہ ہو گا۔

یہ مضبوط سہارا وہ یقین ہے اور وہ گہرا رابطہ ہے جو بندۂ مومن اور اس کے رب کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ ایسا شخص ہر حال میں مطمئن ہوتا ہے اور اس پر جو مشکلات بھی آئیں وہ انہیں برداشت کرتا ہے۔ نہایت اطمینان اور نہایت وقار کے ساتھ۔ بڑے بڑے واقعات اور حادثات میں وہ باوقار رہتا ہے اور مشکلات کو برداشت کرتا ہے۔ نیز وہ اگر خوشحال ہوتا ہے تو بھی وہ آپے سے باہر نہیں ہوتا اور اعتدال اور سنجیدگی کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ اسی طرح اگر اس پر اچانک کوئی بحران آ جائے تو وہ حواس باختہ نہیں ہوتا اور نہ خدا کے راستے میں آنے والی گوناگوں مشکلات میں پریشان ہوتا ہے۔

دعوت اسلامی کا سفر طویل اور خطرات سے پر ہے۔ اس میں محرومیاں اور مشکلات بھی خطرناک ہوتی ہیں لیکن

خوشحالی اور مالداری اس سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔ مصیبت بھی آزمائش اور عافیت بھی آزمائش ۔ لہٰذا ایسے سہارے کی اس راہ میں ہروقت ضرورت ہوتی ہے جو کبھی ڈھیلا نہ ہو۔ایسی رسی کی ضرورت ہوتی ہے جو ٹوٹ نہ جائے اور یہ ضرورت ہروقت رہتی ہے ۔ یعنی مضبوط سہارے کی اور یہ مضبوط سہارا کیا ہے؟ اسلام لانا' اللہ پر یقین کرنا' اس کے سپرد ہو جانا اور راہ احسان اختیار کرنا۔ پھر انجام اللہ کے ہاتھ میں دے دینا۔

وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۳۱:۲۲) ''اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے''۔ یعنی اسی کی طرف لوٹنا ہے اور آخری مرجع وہی ہے تو مناسب ہے کہ انسان پہلے سے اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دے اور اس کی طرف نہایت روشن اعتماد اور قرآن و سنت کی ہدایت کے مطابق راستے طے کرتا رہے۔

وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ۭ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۲۳ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝۲۴

''اب جو کفر کرتا ہے اس کا کفر تمہیں غم میں مبتلا نہ کرے' انہیں پلٹ کر آنا تو ہماری ہی طرف ہے' پھر ہم انہیں بتا دیں گے کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ یقیناً اللہ سینوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔ ہم تھوڑی مدت انہیں دنیا میں مزے کرنے کا موقع دے رہے ہیں' پھر ان کو بے بس کر کے ایک سخت عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے''۔

وہ تو تھا انجام ان لوگوں کا جو اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کے سپرد کر دیں اور یہ ہے انجام ان لوگوں کا جو کفر اختیار کرتے ہیں اور متاع دنیا ان کو دھوکے میں ڈال دیتی ہے ۔ دنیا میں ان کا انجام یہ ہو گا کہ رسول اور اہل ایمان ان کو اہمیت ہی نہ دیں گے۔

وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ (۳۱:۲۳) ''اور جو کفر کرتا ہے' اس کا کفر تمہیں غم میں مبتلا نہ کرے''۔ ان کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ آپ جو سرور کونین ہیں ان کے لیے پریشان ہوں۔ یہ تو بہت ہی حقیر و صغیر ہیں اور آخرت میں ان کا انجام اس سے بھی زیادہ حقارت آمیز ہونے والا ہے ۔ یہ اللہ کے قبضے میں ہیں ۔ یہ اللہ سے بچ کر نہیں نکل سکتے ۔ اللہ ان کو ان کے اعمال کے بدلے پکڑے گا' وہ ہر شخص کے اعمال کو اچھی طرح جانتا ہے' خواہ ظاہر ہو یا خفیہ ہو' یا اس کے سینے میں ہو یا اس کی نیت میں ہو۔

اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۳۱:۲۳)
''انہیں پلٹ کر آنا تو ہمارے ہی طرف ہے۔ پھر ہم انہیں بتا دیں گے کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ یقیناً اللہ سینوں میں چھپے ہوئے راز جانتا ہے''۔ زندگی کا ساز و سامان جو انسان کو فریب دیتا ہے ایک مختصر عرصے کے لیے ہے اور نہایت ہی کم قیمت

ہے۔

نُمَتِّعُهُمْ قَلِيلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابٍ غَلِيظٍ ( ۳۱ : ۲۴ ) ”ہم انہیں تھوڑی مدت اس دنیا میں مزے کرنے کا موقعہ دے رہے ہیں 'پھر ان کو بے بس کر کے ایک سخت عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے“۔ تھوڑے دن تو مزے کریں گے 'پھر خوفناک عذاب سے دوچار ہوں گے اور انہیں اس عذاب کی طرف دھکیل کر لے جایا جائے گا۔ عذاب کی تعریف میں غلیظ کا لفظ آیا ہے اور اس کے ذریعے عذاب کو مجسم کر دیا گیا ہے۔ اور اضطرار کے معنی میں کفار کی بے بسی کا اظہار کیا گیا یعنی وہ اس عذاب سے اپنے آپ کو بچا نہ سکیں گی اور نہ لیت و لعل کر سکیں گے۔ یہ تو تھا کافروں کا حال لیکن جو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لے اور اپنے رخ کو اللہ کے سپرد کر دے اور سنجیدہ اور مطمئن ہو کر رب تعالیٰ کی طرف چل پڑے وہ نہایت ہی اعلیٰ مقام پر ہو گا بمقابلہ کافر کے۔

--- ○○○---

اب ان کو خود ان کی فطرت کی منطقی دلیل سے دوچار کر دیا جاتا ہے 'جب ان کے سامنے یہ عظیم کائنات رکھ دی جاتی ہے اور سوال یہ ہے کہ آیا اس کا کوئی خالق ہے یا نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ ہے کیونکہ ذات باری تو انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔ اس کے سوا اس کائنات کی اور کوئی تعبیر ہی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ لوگ فطرت کی اس سادہ منطق سے بھی کجی اختیار کرتے ہیں اور اسے بھی بھلا دیتے ہیں حالانکہ اس سے اور کوئی قوی اور درست دلیل نہیں ہے۔

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۚ
قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٢٥﴾ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ
إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿٢٦﴾

”اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے 'تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ کہو الحمدللہ۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ بے شک اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے۔

کوئی معقول انسان جب خود اپنے دل سے پوچھے کہ آخر اس کائنات عظیم کا خالق کون ہے تو وہ یہی جواب پائے گا کہ اللہ۔ یہ جواب ہر شخص اپنی فطرت میں پاتا ہے۔ یہ زمین اور یہ افلاک ہماری نظروں کے سامنے قائم ہیں 'ان کے حالات 'ان کے حجم 'ان کی حرکات 'ان کی دوریاں 'ان کے خواص اور ان کی صفات سب کے سب اندازہ کیے ہوئے 'صحیح اور متعین اور باہم نظم اور نسق میں پروئے ہوئے۔ پھر یہ مخلوق ہیں اور کوئی مدعی بھی نہیں ہے کہ ان کا وہ خالق ہے۔ نہ یہ کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے ان کا اور یہ بھی عقلاً ممکن نہیں ہے کہ یہ عظیم کائنات خود بخود

یونہی پیدا ہوگئی ہے۔ پھر یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ کسی مدبر کے بغیر ہی یہ صدیوں سے اس قدر اٹل تنظیم کی گرفت میں ہے۔ اور اس کے نظام میں کوئی خلل نہیں ہے۔ لہٰذا مدبر کا ہونا لازم ہے۔ جو شخص اس کا قائل ہے کہ یہ خود بخود وجود میں آگئی' خود بخود قائم ہوگئی اور منظم ہوگئی محض اتفاقاً' تو اس سے بڑا احمق اور کوئی نہیں ہے۔ اس قسم کے قول کو فطرت اپنی گہرائیوں کے ذریعہ مسترد کر دیتی ہے۔

وہ لوگ جو اس دور میں عقیدۂ توحید کا مقابلہ کر رہے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا راستہ روکے کھڑے تھے سخت مجادلہ کر رہے تھے۔ یہ لوگ خود اپنی فطرت کے شعور اور منطق کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے' جب ان کے سامنے یہ کائنات اور اس کی موجودگی کو رکھا جاتا تھا' جو ان کی آنکھوں کے سامنے موجود تھی اور صرف دیکھنے کی ضرورت تھی۔

اس لیے وہ اس سوال کے جواب میں کوئی تردد نہ کرتے تھے۔ جب پوچھا جاتا کہ "زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا؟" تو وہ فوراً کہہ دیتے "اللہ نے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ اس جواب کے جواب میں بس اللہ کی حمد کریں "الحمد للہ"۔ الحمد للہ کہ ان پر حق واضح ہوگیا اور انہوں نے فطری منطق کو تسلیم کر لیا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ اس کائنات کی تخلیق کی حد تک موحد ہوگئے۔ اس کے سوا ہر حال میں حمد و ثنا کرتے رہو۔ اب جدال و مباحثہ کو چھوڑ کر ایک دوسرا تبصرہ۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۱: ۲۵) "مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں"۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ بحث اور مجادلہ کرتے ہیں۔ دلائل فطرت کو نہیں سمجھتے اور اس عظیم کائنات کے ہوتے ہوئے بھی عقیدۂ توحید کے قائل نہیں۔

انہوں نے چونکہ زمین اور آسمان کی تخلیق کی حد تک اللہ کی وحدانیت کو مان لیا ہے اس لیے اب بتایا جاتا ہے کہ اللہ خالق ہونے کے ناطے اس کائنات کا مالک مطلق بھی ہے۔ اس حصے کا بھی جسے انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے اور اس حصے کا بھی جسے مسخر نہیں کیا گیا۔ لیکن وہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان سازی مخلوق سے غنی ہے اور وہ اپنی ذات میں خود محمود ہے اگرچہ لوگ اس کی حمد و ثنا نہ کریں۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۳۱: ۲۶) "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ بے شک اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے"۔ یہ سفر اب اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ فنا ختم ہونے والی نہیں۔ اللہ کا علم لامحدود' اس کی قدرت بے انتہا اور اس کی مشیت کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ تمام مخلوق پر وہ قادر ہے اور یہ بات ایک کائناتی منظر کی شکل میں بتائی جاتی ہے۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۷ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝۲۸

"زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے) جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں (لکھنے سے) ختم نہ ہوں گی۔ بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے۔ تم سارے انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر دوبارہ جلا اٹھانا تو (اس کے لیے) بس ایسا ہے جیسے ایک متنفس کو (پیدا کرنا اور جلا اٹھانا)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

یہ ایک ایسا منظر ہے جو انسانوں کی معلومات اور ان کے محدود مشاہدات سے لیا گیا ہے تاکہ اللہ کی مشیت کے لامحدود کارناموں کو ان کے تصور کے قریب کر دیا جائے۔ اس تمثیل اور مجسم انداز کے بغیر انسانی تصور اس کا ادراک ہی نہیں کر سکتا تھا۔

انسان اپنے علم کو لکھتے ہیں اور اپنے اقوال کو ریکارڈ کرتے ہیں' اپنے احکام کو نافذ کرتے ہیں اور قلموں کے ذریعے وہ لکھتے ہیں۔ یہ قلمیں جنگلوں اور کلک سے بناتے ہیں اور پھر سیاہی بنا کر اس سے لکھتے ہیں۔ یہ سیاہی ایک شیشی یا ایک دوات میں ہوتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ پوری زمین کے درختوں سے قلمیں بنا دی جائیں اور تمام سمندروں کے پانی کو سیاہی میں بدل دیا جائے اور ان جیسے سات اور سمندر بھی لے آئے جائیں اور لکھنے والے بیٹھ جائیں۔ اللہ کے نئے نئے کلمات جو اللہ کے علم پر دلالت کرتے ہوں تو یہ سب سمندروں کی روشنائی ختم ہو جائے اور اللہ کے کلمات علیہ ختم نہ ہوں اور اللہ کے علم کی انتہا نہ ہو۔ اس لیے کہ ایک محدود قوت لامحدود کو احاطہ میں لانا چاہتی ہے۔ محدود قوت جس قدر بھی آگے جائے' بہرحال اس کی قوت ایک جگہ جا کر ختم ہو جاتی ہے اور لامحدود غیر محیط ہی رہتا ہے۔ غرض اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوتے کیونکہ اللہ کا علم لامحدود ہے۔ اللہ کا ارادہ کسی سرحد پر نہیں رکتا۔ اور اللہ کی مشیت کے حدود و قیود نہیں ہیں۔

درخت اور سمندر غائب ہو جاتے ہیں۔ تمام زندہ چیزیں اور تمام مردہ چیزیں غائب ہو کر ختم ہو جاتی ہیں۔ تمام حالات اور صورتیں پس پردہ چلی جاتی ہیں اور انسانی دل' اللہ کے جلال اور قدرت کے سامنے سہا ہوا رہ جاتا ہے۔ وہ قدرت جو نہ پھرتی ہے' نہ بدلتی ہے اور نہ غائب ہوتی ہے۔ اللہ خالق اور قوی اور مدبر اور حکیم کے سامنے انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ (۳۱ : ۲۷) "بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے"۔

اس سفر میں ہم ہولناک منظر کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور اب انسانی فکر و نظر کی تاروں پر آخری مضراب! بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے سامنے تمام لوگوں کا دوبارہ اٹھانا بہت ہی آسان ہے۔

مَا خَلۡقُکُمۡ وَ لَا بَعۡثُکُمۡ اِلَّا کَنَفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ (۳۱ : ۲۸) "تم سارے انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر دوبارہ جلا اٹھانا تو بس ایسا ہی ہے جیسے ایک نفس کو پیدا کرنا اور اٹھانا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا ہے"۔ وہ ارادہ جس کے متوجہ ہوتے ہی مخلوق پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے برابر ہے کہ وہ ارادہ ایک چیز کی طرف متوجہ ہو یا بے شمار چیزوں کی طرف متوجہ ہو۔ اللہ کے لیے یہ نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایک آدمی کو بناتا پھرے اور ایک ایک آدمی پر محنت کرے۔ اس کے لیے ایک آدمی کا پیدا کرنا اور بے شمار ملین لوگوں کا پیدا کرنا ایک ہی طرح کا ہے۔ ایک شخص کا زندہ کر کے اٹھانا اور بے شمار بلین لوگوں کو اٹھانا اللہ کے لیے ایک ہی جیسا ہے۔ اللہ نے تو

صرف ایک لفظ کن کہنا ہے ۔

اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ''اس کا حکم' جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہے' تو یہ ہوتا ہے کہ اسے کہہ دے کہ ہو جا' بس وہ ہو جاتی ہے''۔

اس قدرت' اس علم' اور اس مہارت کے ساتھ تخلیق اور بعث بعد الموت اور حساب و کتاب کا عمل سرانجام دیا جائے گا۔ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ (۳۱ : ۲۸) ''اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے''۔

--- ○○○---

اب اس سورہ کا تیسرا سفر یا تیسرا راؤنڈ ہے ۔ اور اس میں بھی وہی مسئلہ توحید زیر بحث ہے جو پہلے دو اسفار میں تھا۔ فیصلہ ہوتا ہے کہ اللہ حق ہے ۔ لوگ جن شرکاء کو پکارتے ہیں وہ باطل ہیں' عبادت صرف اللہ وحدہ کی چاہئے ۔ قیامت کے دن کے بعد جو حساب و کتاب ہو گا اس میں نہ والد اپنی اولاد کا فدیہ دے سکے گا اور نہ ہی بچہ اپنے والدین کی طرف سے کوئی بدلہ دے سکے گا۔ ان فیصلوں کے ساتھ کئی دوسرے اور جدید ایشوز نہایت موثر انداز میں لیے گئے ہیں ۔ یہ سب مسائل بھی اس کائنات کے فریم ورک میں زیر بحث آتے ہیں ۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَ یُوْلِجُ النَّھَارَ فِی
الَّیْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ اَنَّ اللّٰہَ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہِ ۳
الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ ۝ ع ۱۱

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں؟ اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے' سب ایک وقت مقرر تک چلے جا رہے ہیں' اور (کیا تم نہیں جانتے) کہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو' اللہ اس سے باخبر ہے؟ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور اسے چھوڑ کر جن دوسری چیزوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں' وہ سب باطل ہیں' اور (اس وجہ سے کہ) اللہ ہی بزرگ و برتر ہے''۔ ۱۲

رات کا دن میں داخل ہونا اور دن کا رات میں داخل ہونا' ان کا باہم متضاد ہونا اور مختلف موسموں میں ان کا لمبا اور چھوٹا ہونا ایک عجیب منظر ہے ۔ لیکن سالوں سے اسے دیکھتے چلے جانا اور بار بار ایسا ہونا انسانوں کو اس سے مانوس کر دیتا ہے اور اکثریت اس اعجوبے کو دیکھتے ہوئے بھی اس کو محسوس نہیں کرتی ۔ حالانکہ وہ نہایت ہی باریکی کے ساتھ اور کڑے نظم کے ساتھ واقعہ ہو رہا ہے اور اس میں سیکنڈ کا فرق بھی نہیں آتا۔ اس میں کوئی خلل نہیں آتا۔ کبھی ایک بار بھی۔ یہ مسلسل دوران زمین اور دوران گردش' جس میں کوئی کرہ اپنے مدار سے نہ ادھر ادھر ہوتا ہے اور نہ رکتا ہے ۔ ایک عظیم اعجوبہ ہے ۔ صرف اللہ وحدہ کی ذات ہی اس قسم کے نظام کو وجود میں لا سکتی ہے اور چلا سکتی ہے اور حفاظت سے رکھ سکتی

ہے۔ اس حقیقت کا ادراک صرف افلاک سماوی اور گردش فلکی کے مدارات ہی کے مشاہدے سے ہو جاتا ہے۔

رات اور دن کے اس تغیر کا تعلق شمس و قمر کے دوران سے بھی واضح ہے۔ شمس و قمر کو مسخر کر کے فضا میں رکھنا، روز و شب کے ظہور سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ ان کے لیے چھوٹے ہوتے سے بھی زیادہ عجیب۔ اس عظیم نظام کو صرف اللہ ہی مسخر کر سکتا ہے جو مدبر و خبیر ہے، وہی ہے جو ان چیزوں کو وقت معلوم تک صحیح اندازے سے چلا سکتا ہے۔ رات کا دن میں داخل ہونا اور دن کا رات میں داخل ہونا تو اس پوری کائنات کا ایک معمولی حصہ ہے۔ شمس و قمر کی تسخیر بھی ایک واضح حقیقت ہے، شمس و قمر کی اہمیت ایک عام آدمی کے لیے یہ ہے کہ یہ دونوں اجرام فلکی انسان کے سامنے اور قریب ہیں ورنہ کائنات میں تو یہ بھی ذرے اور حقیر ذرے ہی ہیں۔ اس عظیم علم اور انتظام کے بعد پھر:

اَنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ (۳۱ : ۲۹) "جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے"۔ یہ تو ایک معمولی سی بات ہے۔ ان کائناتی حقائق کے بعد یہ غیبی حقیقت بہت ہی چھوٹی ہے اور اللہ کے لیے اس کا کرنا مشکل نہیں۔ یہ دونوں حقائق باہم مربوط ہیں۔

گردش لیل و نہار، تسخیر شمس و قمر اور اللہ کے علیم و خبیر ہونا، ان تین حقائق کے بعد ایک عظیم حقیقت بیان کی جاتی ہے جس کے اوپر ان تینوں حقائق کا دارومدار ہے اور اس عظیم حقیقت کو اس سفر میں بیان کیا گیا ہے اور اس کے لیے یہ دلیل دی گئی ہے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡحَقُّ وَ اَنَّ مَا یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہِ الۡبَاطِلُ ۙ وَ اَنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡعَلِیُّ

الۡکَبِیۡرُ (۳۱ : ۳۰) "یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور اسے چھوڑ کر جن دوسری چیزوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں، وہ سب باطل ہیں، اور (اس وجہ سے کہ) اللہ ہی بزرگ و برتر ہے"۔ "یہ" یعنی یہ نظام کائنات جو بہت ہی پیچیدہ، باریک دائم، ثابت اور نہایت ہی ہم آہنگ ہے۔ یہ نظام اس لیے قائم ہے کہ اللہ حق ہے اور اللہ کے سوا تمام دوسرے معبود و الٰہ باطل ہیں۔ یہ نظام کائنات حقیقت کبریٰ کی وجہ سے قائم ہے اور حقیقت کبریٰ اللہ واجب الوجود ہے جس کی وجہ سے یہ پورا وجود قائم ہے۔ چونکہ یہ کائنات قائم ہے، لہٰذا اللہ حق ہے اور تبھی یہ کائنات قائم ہے۔ وہی اسے قائم کرتا ہے، چلاتا ہے، حفاظت کرتا ہے اور تدبیر کرتا ہے۔ وہی ہے جو اس کائنات کے قائم رہنے کی ضمانت ہے، وہی اس کے قرار ربط اور نظم کا سبب ہے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡحَقُّ (۳۱ : ۳۰) "یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے"۔ اللہ کے سوا ہر چیز متغیر اور متبدل ہے۔ اللہ کے سوا ہر چیز اپنا رخ بدلتی ہے۔ اللہ کے سوا ہر چیز میں زیادتی اور نقصان واقع ہوتا ہے۔ اس کے اوپر ضعف اور قوت، جوانی اور بڑھاپا، عروج و زوال، اقبال و ادبار آتا ہے۔ اللہ کے سوا ہر چیز نہ تھی نہ ہوئی نہ تھی اور نہ ہوگی۔ یہ صرف اللہ ہی ہے جو قائم و دائم ہے۔ اور اس پر کوئی تغیر، تبدل اور زوال نہیں آتا۔

نفس انسانی کے اندر ایک چیز رہتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ کا یہ قول۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ (۳۱:۳۰) کی پوری مراد ہم الفاظ میں منتقل نہیں کر سکتے۔اس کا ایک مفہوم ہے اور اس کو محسوس کیا جاتا ہے لیکن میرے لیے اسے الفاظ میں لانا مشکل ہے۔اسی طرح یہ تعبیر اَنَّ اللّٰهَ هُوَ

الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (۳۱:۳۰) اس کے سوا کوئی علی اور کبیر نہیں ہے۔ان تعبیرات کے بارے میں 'میں نے ایک ایسی بات کہہ دی ہے جس کو میرا پورا وجود پاتا ہے۔میں کہتا ہوں کہ انسانی تعبیرات میں وہ الفاظ نہیں ہیں کہ ان کے ذریعے ان دو فقروں میں پائے جانے والے حقائق کا اظہار کیا جا سکے۔یہ بہت ہی بلند حقائق ہیں۔اللہ حق ہے 'علی ہے 'کبیر ہے۔انسانی تعبیرات ان مفاہیم کو جو ان فقروں سے محسوس کیے جا سکتے ہیں اور محدود کر دیتی ہیں۔ اس لیے صرف قرآن کی تعبیر ہی ان کے لیے کافی ہے۔

اس کائناتی منظر' عالم بالا کے منظر کے بعد اب ایک دوسرا منظر جو انسانوں کے تجربے اور مشاہدے میں آتا ہی رہتا ہے' روز و شب انسان ان کے تجربے سے گزرتے ہیں۔یہ ایک کشتی ہے جو سمندر کی وسعتوں میں تیر رہی ہے۔یہ بھی اللہ کے فضل و کرم سے تیر رہی ہے۔اللہ لوگوں کو اس منظر میں ایک خطرناک حالت کے ساتھ کھڑا کر دیتے ہیں۔ایسے مناظر سے اکثر مخاطبین خود گزر چکے ہیں۔یہ ایک فطری سفر ہے۔اس میں انسان قدرت اور قدرتی قوتوں کے اندر گھرا ہوتا ہے۔اس کے پاس کوئی قوت 'کوئی مقابلہ 'کوئی گرفت اور کوئی غرور نہیں ہوتا۔جب انسان اس کشتی میں سفر کر رہا ہوتا ہے اور سمندر کی گہرائیوں میں ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۱﴾ وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۲﴾

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے تاکہ وہ تمہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائے؟ درحقیقت اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔اور جب (سمندر میں) ان لوگوں پر ایک موج سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہے تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں اپنے دین کو بالکل اسی کے لیے خالص کر کے۔ پھر جب وہ بچا کر انہیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی اقتصاد برتتا ہے اور ہماری نشانیوں کا انکار نہیں کرتا مگر ہر وہ شخص جو غدار اور ناشکرا ہے"۔

یہ کشتی ان قوانین قدرت کے مطابق چلتی ہے جو اللہ نے سمندر 'کشتی 'ہوا' زمین اور آسمانوں میں رکھتے ہیں۔اللہ نے ان چیزوں کو ان خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا کہ کشتی سمندروں میں چلنے لگی ہے 'نہ ڈوبتی ہے 'اور نہ ایک جگہ منجمد رہتی ہے۔اگر ان خواص میں سے کوئی بھی خاصیت کسی ایک چیز کی ختم ہو جائے تو کشتی سمندر میں نہ چل سکے۔اگر پانی کی کثافت

ختم ہو جائے یا کشتی کے مادے کی کثافت ختم ہو جائے یا اس کی مقدار میں کمی بیشی ہو جائے۔ ہوا کا دباؤ سمندر پر کم ہو جائے ' ہوا کی موجیں یا سمندر کی موجوں میں خلل ہو جائے اور اگر وہ درجہ حرارت ختم ہو جائے جس کے مطابق پانی پانی رہتا ہے اور جس کی وجہ سے ہوا اور پانی کی موجیں مناسب حدود میں رہتی ہیں۔ اگر موجودہ حالت سے ایک فیصدی تبدیلی بھی ہو جائے تو کشتی سمندر کے پانیوں کے اوپر نہ تیر سکے۔ ان خواص کے علاوہ دوسرے عوامل کے مقابلے میں اللہ پر کشتی کا حامی و مددگار ہوتا ہے کہ امواج کی سرکشی کو روکتا ہے۔ طوفانوں اور موسمی اثرات سے بچاتا ہے۔ سمندر کی دوریوں میں اللہ کے سوا کوئی اور بچانے والا نہیں ہوتا لہذا یہ ہر حال میں اللہ کے رحم و کرم اور فضل و مہربانی کے ساتھ چلتی ہے۔ پھر اس کے اندر اللہ کے فضل کی چیزیں لدی ہوتی ہیں۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ فضل کے یہ دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔

لِيُرِيَكُم مِّنْ آيَاتِهِ (۳۱ : ۳۱) "تاکہ وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھائے جو تمہاری نظروں کے سامنے ہیں۔ بشرطیکہ کوئی دیکھنا چاہے۔ ان میں کوئی اجمال اور اخفا نہیں ہے۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ (۳۱ : ۳۱) "اس میں نشانیاں ہیں ہر صبار اور شکور کے لیے"۔ یعنی مشکلات پر صبر کرنے والا اور سہولیات پر شکر کرنے والا۔ انسان ہر وقت ان دونوں حالات میں سے کسی ایک میں تو ہوتا ہی ہے۔ لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ نہ صبر کرتے ہیں اور نہ شکر کرتے ہیں۔ جب مصیبت آتی ہے تو چیخنے لگتے ہیں اور اگر نجات دے دی جاتی ہے تو چند لوگوں کے سوا شکر نہیں کرتے۔

وَإِذَا غَشِيَهُم مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (۳۱ : ۳۲) "اور جب ان پر ایک موج سائبان کی طرح چھا جاتی ہے تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں اپنے دین کو صرف اسی کے لیے خالص کر کے"۔ ایسے حالات میں کہ کشتی گہرے سمندروں میں ایک پرکاہ کی طرح ہوتی ہے اور موجیں ایسی اٹھ رہی ہوتی ہیں جیسے سائبان ' اور کشتی کے اوپر آ جاتی ہیں تو ایسے خطرناک حالات میں یہ لوگ جھوٹے خداؤں کو چھوڑ کر ' موہومہ خداؤں کو چھوڑ کر صرف اللہ کو پکارتے ہیں۔ امن و امان کے دنوں میں یہ جھوٹے اور موہوم معبود ان کی فطرت کو ڈھانپ لیتے ہیں اور فطرت اور خالق فطرت کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں اور حالت خطر میں جب یہ پردے گر جاتے ہیں اور ان کی فطرت پردوں اور تہوں کے نیچے کھل ہو کر سامنے آتی ہے اور وہ اپنے رب کے سامنے سیدھی کھڑی ہوتی ہے۔ اپنے رب کی طرف رجوع کر لیتی ہے۔ دین اللہ کے لیے خالص کر دیتی ہے۔ اب وہ ہر جھوٹے مدعی کا انکار کر دیتی ہے ہر اس معبود کو ترک کر دیتی ہے جو اجنبی ہے اور دین اللہ کے لیے خالص کر کے صرف اسی کو پکارتی ہے۔

فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ (۳۱ : ۳۲) "پھر جب وہ بچا کر انہیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی اقتصاد برتتا ہے"۔ اب امن و سلامتی اور خوشحالی و سرکشی اور حد سے گزرنے کی طرف نہیں کھینچ لاتی۔ اور یہ مسلسل اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا ہے۔ اگرچہ یہ ذکر و فکر میں اللہ کا پورا حق ادا نہیں کرتا کیونکہ ذاکر و شاکر جن انتہاؤں تک پہنچ سکتا ہے وہ یہی ہو سکتی ہیں کہ وہ ادا میں مقتصد ہو اور باطل سیدھا ہو۔ (لہذا مقتصد کا مطلب میانہ

روی کا ہے)

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ خطرہ ٹلتے ہی اور حالت امن آتے ہی وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔

وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ (۳۱ : ۳۲) "اور ہماری آیتوں کا انکار وہی شخص کرتا ہے جو غدار اور ناشکرا ہو"۔ ختار 'سخت غدار کو کہتے ہیں اور کفور شدید کفر کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔ یہ مبالغہ ایسا ہے کہ جو کسی شخص کا وصف بن جاتا ہے اور یہ الفاظ اس شخص کے لیے بہت ہی مناسب ہیں جو کائنات کی ان لاجواب نشانیوں دیکھ کر بھی اور فطرت کی واضح منطق پاکر بھی اللہ کی آیات کا انکار کرتا ہے۔

--- ○○○---

سمندر کی خوفناکیوں کی مناسبت سے 'جہاں لوگوں کا غرور علم' غرور قوت اور غرور قدرت کافور ہو جاتا ہے اور فطرت کے اوپر سے باطل کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور انسان فطری دلائل و نشانات کو اپنے سامنے پاتا ہے۔ ان خوفناکیوں کی مناسبت سے یہاں بتا دیا جاتا ہے کہ اصل ہولناکیوں کا دن تو قیامت کا دن ہو گا۔ اس کے مقابلے میں سمندر کی ہولناکیاں کچھ بھی نہیں ہیں۔ وہ ایسا ہولناک دن ہو گا کہ باپ بیٹے کا تعلق 'رحم کا تعلق اور خون کا تعلق بھی ختم ہو گا۔ والد اپنی اولاد کو چھوڑ دے گا اور بیٹا والدین سے بھاگ رہا ہو گا وہاں ہر شخص اکیلا کھڑا ہو گا۔ کوئی مددگار نہ ہو گا اور کوئی سہارا نہ ہو گا۔ تمام رشتہ داریاں اور تعلقات ختم ہوں گے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝

"لوگو' بچو اپنے رب کے غضب سے اور ڈرو اس دن سے جب کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے بدلہ نہ دے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کی طرف سے کچھ بدلہ دینے والا ہو گا۔ فی الواقعہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ پس یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ دھوکہ باز تم کو اللہ کے معاملے میں دھوکا دینے پائے"۔

یہ نفسانفسی کا عالم ہو گا۔ یہاں دنیا میں جو خوف ہوتا ہے دلوں میں اور شعور میں اس کی تو مثال ہوتی ہے۔ لیکن قیامت کا یہ خوف بے مثال ہو گا۔ اس میں تمام رشتہ داری اور خون کے تعلقات ختم ہوں گے۔ والد اولاد سے بھاگ رہا ہو گا۔ اور اولاد کو والدین کی پرواہ اور فکر نہ ہو گی۔ ہر شخص کو اپنی پڑی ہو گی' نفسانفسی کا عالم ہو گا' کوئی کسی کی جگہ ضامن نہ ہو گا' کسی کو بھی خود اس کے اپنے اعمال کے سوا کسی کا عمل فائدہ نہ دے سکے گا۔ ایسے حالات ظاہر ہے کہ ایسے خوف میں ہوں گے جس کی کوئی نظیر اس دنیا میں نہ ہو گی۔ لہذا یہاں خدا سے ڈرنے کی دعوت دینا بہت ہی برمحل دعوت ہے اور آخرت کا مسئلہ نہایت ہی خوف کے عالم میں پیش ہوا ہے اس لیے دل و دماغ اس کی طرف متوجہ ہیں۔

اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ( ۳۱ : ۳۳ ) "فی الواقعہ اللہ کا وعدہ سچا ہے" ۔ نہ اللہ اس کے خلاف کرتا ہے اور نہ اللہ کا کہا ٹل سکتا ہے ۔ ہر شخص کو اس بے مثال خوف سے گزرنا ہے اور ہر شخص کو پوری باریکی سے حساب و کتاب دینا ہے ۔ ایک عادلانہ فیصلہ سننا ہے جس کے نتیجے میں نہ باپ بیٹے کا بدل ہو گا اور نہ بیٹا باپ کا ۔

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ( ۳۱ : ۳۳ ) "پس یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے" ۔ اس دنیا میں سازوسامان ہے 'لہو و لعب ہے لیکن اس کی مہلت بہت ہی محدود ہے ۔ یہاں انسان آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہے ۔

وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ( ۳۱ : ۳۳ ) "اور نہ دھوکہ باز تمہیں اللہ کے معاملے میں دھوکا دینے پائے" ۔ کوئی سازوسامان تمہیں دھوکا نہ دے 'کوئی شغل میلہ تمہیں بدراہ نہ کر دے 'کوئی شیطان تمہیں وسوسے میں نہ ڈالے ۔ دھوکہ باز بہت ہیں 'شیطان بے شمار ہیں اور دنیا کی دلچسپیاں بھی ہر طرف سے دامن کش ہیں ۔ مال کا غرور بھی شیطان ہے ۔ علم کا غرور بھی شیطان ہے 'قوت کا غرور بھی شیطان ہے ۔ اور شیطان پرستی بھی شیطان ہے 'خواہش نفس بھی شیطان ہے ۔ شہوت جسمانی بھی شیطان ہے ۔ ان تمام شیطانوں سے بچانے والی قوت خوف خدا کی قوت ہے ۔

--- ooo---

اس سورہ کے خاتمے اور اس چوتھے راؤنڈ کے خاتمے پر اور اس خوفناک منظر آخرت کی مناسبت سے فکر و خرد کے تاروں پر یہ آخری اور ذرا شدید مضراب لگتا ہے ۔ اس میں اللہ کے علم لامحدود اور انسان کے محدود علم کی تصویر کھینچی جاتی ہے ۔ انسان کا علم جس کی دسترس سے ہر وہ چیز غائب ہے جو نظروں سے اوجھل ہو ۔ اب اس مسئلے کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے جو اس سورہ کا موضوع ہے اور یہ نتیجہ قرآن کی عجیب تصویر کشی سے نکلتا ہے 'اللہ کے علم ازلی اور ابدی کی تصویر ۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي
الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ ۴
اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ ۳۴ ع ۴
۱۲

"اس گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے 'وہی بارش برساتا ہے 'وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا پرورش پا رہا ہے 'کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے والا ہے 'اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین میں اس کو موت آنی ہے 'اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے" ۔

اللہ تعالیٰ نے قیام قیامت کی گھڑی کو ایک ایسا غیب رکھا ہے جس کا علم کسی کو نہیں ہے تاکہ لوگ ہر وقت چوکنے رہیں ۔ ہر وقت قیامت کی توقع کرتے رہیں ۔ اور ہر وقت یہ کوشش کرتے رہیں کہ اس کے لیے کچھ کمائیں ۔ ان کو معلوم نہیں ہے کہ کب قیامت ہو گی ۔ بہرحال یہ اچانک آ جائے گی اور اس وقت پھر کسی تیاری کی کوئی مہلت نہ دی جائے گی ۔

نہ کوئی توشہ جمع کرنے کی اجازت ہوگی ۔

اللہ اپنی حکمت کے مطابق جہاں چاہتا ہے ' بارش برساتا ہے 'جس قدر چاہتا ہے ' برساتا ہے ۔لوگ اپنے تجربوں اور آلات و علامات کے ذریعہ بارش کے قریب ہونے کا اندازہ لگاتے ہیں ۔ لیکن وہ نہ بارش برسانے کے اسباب پیدا کر سکتے ہیں اور نہ وقت کا علم رکھتے ہیں ۔ آیت میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ بارش اللہ برساتا ہے کیونکہ اللہ ہی ہے جو بارش کے لیے طبیعی اسباب فراہم کرتا ہے اور ان کو منظم کرتا ہے ۔ بارش میں اللہ کا اختصاص یہ ہے کہ اللہ ہی ان کے برسانے پر قادر ہے ۔ جیسا کہ آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے ۔ جن لوگوں نے بارش کے وقت کو اللہ کے مخصوص غیبی علوم میں داخل کیا ہے ' ان کا خیال درست نہیں ہے ' حالانکہ علم دراصل اللہ ہی کا ہوتا ہے اور وہ ہر معاملے میں مختص ہوتا ہے کیونکہ اللہ کا علم ہی صحیح ' دائمی اور حاوی ہوتا ہے اور اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی ۔

وَيَعۡلَمُ مَافِي الۡاَرۡحَامِ ( ۳۱ : ۳۴ ) "وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا پرورش پا رہا ہے"۔ یہ اس طرح کا مخصوص علم ہے جس طرح قیام قیامت کا علم ہے اور اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ ماں کے رحم میں کیا ہے ۔ یعنی پیٹ کے اندر ہر لحظہ اور ہر لمحہ کیا پرورش ہو رہی ہے ۔ خصوصاً اس وقت جبکہ حمل کا کوئی وزن اور حجم نہیں ہوتا ۔ پیٹ میں مذکر ہے یا مونث ہے ' ابتدائی وقت سے جب خلیہ انڈے میں داخل ہوتا ہے ' اللہ کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خدو خال کیا ہیں ۔ خواص کیا ہیں ' حالت کیا اور صلاحیت کیا ہے ۔ یہ سب امور اللہ کے علم کے ساتھ مختص ہیں ۔

وَ مَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌ مَّا ذَا تَكۡسِبُ غَدًا ( ۳۱ : ۳۴ ) "کوئی متنفس نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کمائی کرنے والا ہے" ۔ اچھائی کمائے گا یا برائی ۔ اسے نفع ہو گا یا نقصان ۔ آسانی ہوگی یا مشکلات سے دوچار ہو گا ۔ صحت مند رہے گا یا بیمار ہو گا ۔ اللہ کی اطاعت کرے گا یا معصیت کرے گا ۔ اس لیے کہ کسب محض منافع سے بہت عام ہے ۔ کسب کے اندر وہ تمام حالات داخل ہیں جو کسی شخص کو پیش آسکتے ہیں ۔ یہ ایک غیبی امر ہے جس کے دروازے بند ہیں ۔ یہ پردوں کے پیچھے ہے اور انسان پردوں کے پیچھے کھڑا ہوتا ہے ۔ اور وہ نہیں جانتا کہ آگے کیا ہے ؟

وَ مَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌ بِاَیِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ ( ۳۱ : ۳۴ ) "کسی شخص کو خبر نہیں کہ کس زمین پر اسے موت آئے گی" ۔ کیونکہ یہ بھی ایک ایسا معاملہ ہے جو پردہ فردا کے پیچھے ہے اور مستقبل کا دبیز پردہ اس کے اور نفس انسانی کے درمیان حائل ہے ۔

نفس انسانی ان پردوں سے ادھر کھڑا ہے ۔ وہ بے بس ہے ' اسے کچھ معلوم نہیں کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے ۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان کا علم کس قدر محدود ہے ۔ اس کی بے بسی واضح ہے ۔ اس طرح سوچنے سے اس کے ذہن سے علم و معرفت کا غرور ختم ہو جاتا ہے اور اس طرح ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان کو بہت ہی قلیل علم دیا گیا ہے اور یہ کہ پس پردہ فردا بے شمار ایسے امور ہیں جنہیں انسان نہیں جانتا ۔ اگر انسان ان پردوں سے ادھر کی تمام چیزوں کو جانتا تو وہ ان پردوں کے پاس کھڑا ہو جاتا اور معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ کل کیا ہو گا ۔ لیکن انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ کل کیا ہو گا بلکہ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے ۔ یوں انسانی نفس اپنی کبریائی سے ذرا نیچے اتر آتا

ہے ۔ وہ اللہ سے ڈرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اے اللہ اگلے لمحے میں خیر ہو۔

قرآن کریم اللہ کے ان مخصوص علوم کو نہایت وسیع دائرے میں پیش کرتا ہے ۔ ایسے وسیع دائرے میں جس کا انسان پر بہت اثر ہوتا ہے ۔ نہایت ہی گہرا اثر۔

یہ میدان زمان و مکان کی وسعت کو بھی سمیٹے ہوئے ہے ۔ حاضر بھی اس کی لپیٹ میں ہے اور آنے والا مستقبل بھی ۔ قریب بھی اور بعید بھی ۔ دلوں کے خیالات میں بھی اور وسوسوں اور تفکرات میں بھی ۔ قیام قیامت کی ساعت بھی اور بارش کے اوقات بھی ۔ پھر رحم مادر تک یہ میدان پھیلا ہوا ہے جو نظروں سے اوجھل ہے ۔ پھر یہ مستقبل قریب کے پیچھے کہ کل کیا ہو گا ۔ زمانہ اگرچہ قریب ہے لیکن علم جہالت کی دور وادیوں میں ہے ۔ موت اور قبر تک یہ دائرہ پھیل جاتا ہے ۔

غرض اللہ کے مخصوص علم کا ایک وسیع دائرہ ہے ۔ لیکن اس وسیع چادر کے کونوں کو سمیٹ کر قرآن کے انداز بیان نے اسے ایک گٹھڑی کی شکل میں جمع کر دیا ہے ۔ یہ علم غیب کی وسیع چادر ہے اور اس کے اندر مختلف النوع تمام امور 'کو رکھ کر سمیٹ لیا گیا ہے ۔ اب یہ سب امور،امور غیبہ مخصوصہ ہیں اور یہ گٹھڑی مضبوطی سے بندھی ہوئی ہے ۔ اور اس سے سوئی کے ناکے کے برابر کوئی چیز باہر نہیں آ سکتی ۔ انسان کے سامنے ان علوم کا دروازہ بند ہے کیونکہ یہ دائرہ قدرت انسان سے باہر ہیں ۔ انسان کے علم سے وراء ہیں ' اللہ کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا ' ہاں اللہ اپنے حکم سے کسی کو کچھ بتا دے تو الگ بات ہے ' اللہ علیم و خبیر ہے اور اس کے سوا کوئی علیم و خبیر نہیں ہے ۔

یہاں یہ سورہ ختم ہوتی ہے ۔ یہ درحقیقت ایک طویل اور دور دراز کا سفر تھا ۔ اب ہم اس دور دراز کے مطالعاتی سفر سے تھک کر واپس ہوتے ہیں ۔ ہم نے اس میں طویل راہوں کو طے کیا ' بوجھ اٹھایا اور غور و فکر کیا ۔ اس کائنات کا مشاہد قدرت دنیا اور اس کے بوقلموں پرندے اور چرندے دیکھے ۔ یہ سورہ ۳۴ آیات پر مشتمل ہے لیکن معانی و افکار کی دنیا طویل و عریض ہے ' بڑی برکت والی ہے ' وہ ذات جس نے دل و دماغ کی تخلیق کی ۔ جس نے اس قرآن کو اتارا ' جو دلوں کی بیماریوں کے لیے شفاء ہے اور مومنین کے لیے ہدایت و رحمت ہے ۔

--- ooo ---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ------ ۲۱

### سورۃ السجدۃ ـ ۳۲

آیات ۱--- تا--- ۳۰

# سورہ سجدہ ایک نظر میں

یہ ایک مکی سورہ ہے اور یہ اس عظیم عقیدۂ توحید اور نظریہ حیات کو قلب انسانی میں بٹھانے اور فطرت انسانی کے قریب تر کرنے کے لیے بہترین انداز خطاب کا ایک دوسرا نمونہ ہے۔ یہ عظیم عقیدہ کیا ہے؟ یہ کہ اللہ ایک ہے اور بے نیاز ہے۔ نظام زندگی اسی کا ہوگا اور وہی اس کائنات کا خالق ہے۔ وہی آسمانوں اور زمینوں کا مدبر ہے۔ اور اس کائنات کے اندر پائے جانے والی تمام مخلوقات جس کا علم صرف اللہ وحدہ کو ہے وہ سب اس اللہ ہی کے کنٹرول میں ہے۔ یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ ان پر یہ کلام اللہ کی طرف سے نازل ہوتا ہے اور یہ پوری انسانیت کی ہدایت کے لیے ہے۔ لوگوں کو ایک دن دوبارہ اٹھایا جاتا ہے اور وہ قیامت کا دن ہوگا اور جزاء و سزا ہوگی۔

یہ ہے وہ نظریہ حیات جسے یہ سورہ ذہن نشین کراتی ہے اور تمام مکی سورتیں اسی نظریہ اور عقیدہ کی دعوت دیتی ہیں۔ ہر سورہ کا اپنا اسلوب ہوتا ہے' اپنے دلائل ہوتے ہیں اور یہ سورتیں قلب انسانی سے مکالمہ کرتی ہیں اور ان میں خطاب اللہ علیم و بصیر کی طرف سے ہوتا ہے۔ اللہ انسانی دلوں کے پوشیدہ رازوں اور خفیہ باتوں سے بھی واقف ہے اور وہ انسانی شخصیت کے نشیب و فراز کو اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ اس کی ساخت اور تخلیق سے بھی اچھی طرح واقف ہے' اس کے اندر جو جذبات' خواہشات اور تقاضے ہیں' ان سے بھی واقف ہے اور مختلف حالات اور مختلف مقامات پر اس کے جو تقاضے ہوتے ہیں ان سے بھی واقف ہے۔

سورہ سجدہ کا موضوع وہی ہے جو سورۂ فرقان کا تھا' مگر اس کا انداز سورہ فرقان سے بالکل مختلف ہے۔ ابتدائی آیات ہی اس نظریہ کو بیان کر دیتی ہیں۔ اس کے بعد یہ سورہ دل کو جگانے والے دلائل' روح کو روشن کرنے والے براہین اور غور و فکر کو جگانے والے شواہد پیش کرتی ہے جیسا کہ اس سے قبل ہم کہہ آئے ہیں کہ اس موضوع پر اس کائنات اور اس کے صفحات اور مناظر میں دلائل و شواہد موجود ہیں۔ خود انسان کی پیدائش میں اور اس کے مختلف حالات اور اطوار میں اور قیامت کے مناظر میں سے بعض مناظر پیش کر کے بھی اس موضوع کے شواہد دیئے جاتے ہیں۔ یہ مناظر ہاؤ ہو اور دوڑ دھوپ سے بھرپور ہوتے ہیں۔ پھر یہ شواہد گزشتہ زمانوں کی ہلاک شدہ قوموں کے آثار میں بھی موجود ہیں۔ لیکن صرف ان لوگوں کے لیے جو سنتے اور تدبر کرتے ہیں۔

اس سورہ میں ایک سچے مومن کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے کہ وہ کس طرح اللہ سے ڈرتا ہے اور کس طرح اس کی نظریں ہر وقت اللہ کی طرف اٹھی رہتی ہیں۔ اس میں ان نفسوں کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے جو منکر ہیں اور انکار پر مصر ہیں۔ اس جزاء کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے جو ان دونوں فریقوں کو ملنے والی ہے۔ یہ منظر اس طرح بیان ہوا ہے کہ گویا وہ واقعہ ہو گیا اور نظر آ رہا ہے اور ہر قاری قرآن اسے دیکھ رہا ہے۔

ان تمام مناظر اور مظاہر میں قلب مومن کو بیدار کرنے' متحرک کرنے اور اسے غور و فکر پر آمادہ کرنے کی کوشش کی

گئی ہے۔ کبھی ڈرایا دھمکایا گیا ہے' کبھی امید دلائی گئی ہے اور حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ کبھی تہدید ہے تو کبھی امید ہے۔ کبھی وعظ ہے اور کبھی استدلال ہے' اور اس کے بعد قلب بشری کو ذرا آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ ان مظاہر' مشاہد اور براہین کو پیش نظر رکھ کر جو چاہے' رویہ اختیار کرے۔ اپنے نفس کے لیے جو منہاج چاہے' اختیار کرے اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور ہدایت اور ضلالت کو دیکھ پرکھ کر اپنے لیے کوئی راستہ اختیار کرے۔

سورہ اس مسئلے کو چار یا پانچ حصوں میں بیان کرتی ہے۔ آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے۔ الف' لام' میم۔ اشارہ اس طرف ہے کہ یہ سورہ انہی حروف سے مرتب ہے اور اس کے من عند اللہ نزول میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۳۲ : ۲) "یہ رب العالمین کی طرف سے ہے"۔ اور اس کے بعد نہایت ناخوشگواری سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اس کے باوجود یہ لوگ ایسے الزامات لگاتے ہیں۔ یہ محض افتراء ہیں۔ یہ تو حق ہے ان کے رب کی طرف سے تاکہ حضرت محمد اپنی قوم کو ڈرائیں۔

لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (۳۲ : ۳) "شاید کہ وہ ہدایت پائیں"۔ یہ مسئلہ اسلام کا پہلا نکتہ ہے یہ کہ رسول اکرم ؐ اللہ کے پیغمبر ہیں اور ان پر وحی آتی ہے اور وہ یہ تبلیغ بحیثیت مامور من جانب اللہ کر رہے ہیں۔

اس کے بعد اس کائنات میں اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کے مسئلے کو لیا جاتا ہے' یوں کہ زمین اور آسمانوں اور ان کے درمیان پائے جانے والی تمام مخلوق کا خالق اللہ ہی ہے۔ اس پوری کائنات کو اللہ نے سنبھال رکھا ہے اور زمین و آسمان کی تدبیر اس کے ہاتھ میں ہے۔ آخرت میں بھی تمام لوگ اس کے آگے پیش ہونے والے ہیں۔ انسان کا پیدا کرنا اس کے مختلف طور طریقوں میں اس کی سرگرمیاں' اسے سننے' دیکھنے اور ادراک کی قوت دینا وغیرہ لیکن افسوس ہے کہ لوگ ان شواہد کو دیکھ کر بھی شکر بجا نہیں لاتے۔

یہ دوسرا مسئلہ ہے یعنی الوہیت حاکمیت اور اس کے خدوخال۔ صفت تخلیق' صفت تدبیر کائنات' صفت احسان صفت انعام' صفت علم' صفت رحمت۔ یہ سب صفات تخلیق اور تکوین کی آیات کے ضمن میں آتی ہیں۔

اس کے بعد مسئلہ حشر و نشر پیش کیا جاتا ہے اور ان کے اس اشکال کا ذکر کیا جاتا ہے کہ جب ہم مر کر ذرات کی شکل اختیار کر لیں گے تو پھر کس طرح اٹھائے جائیں گے۔

وَقَالُوْآ ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِى الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِىْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (۳۲ : ۱۰) "اور وہ کہتے ہیں کہ جب ہم زمین میں رل مل چکے ہوں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے"۔

اس کے بعد تیسرا مسئلہ آتا ہے۔ خیر و شر اور آخری فیصلے کا مسئلہ۔ اس کے لیے قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر پیش کیا جاتا ہے۔

اذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۳۲ : ۱۲) "جب مجرم سر جھکائے رب کے ہاں کھڑے ہوں گے"۔ یہ اس وقت اپنے یقین بالآخرت کا اظہار کر رہے ہوں گے اس وقت یہ اس قرآن کی بھی تصدیق کر رہے ہوں گے۔ وہ ایسی باتیں کریں گے کہ اگر یہ باتیں وہ دنیا میں کرتے تو ان کے لیے اب جنت کے دروازے کھل جاتے۔ لیکن اے کاش کہ اب یہ یقین و اقرار ان کے لیے مفید نہ ہو گا۔ یہ منظر اس لیے پیش کیا گیا کہ ذرا وقت جانے سے پہلے ہی ان کی آنکھیں کھول دی جائیں اور وہ اس کلمے کا اقرار کر لیں جس کا وہ اس مصیبت کے وقت اقرار کریں گے۔ اب یہ لوگ اقرار کر لیں گے لیکن اب وقت نہیں۔

اس منظر کے ساتھ ہی مومنین کا منظر بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی حالت یہ ہے کہ جب ان کو اللہ کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو

خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۳۲ : ۱۵) تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ

(۳۲ : ۱٦) "سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔ ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ بھی رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں"۔ یہ نہایت ہی صاف شفاف تصویر ہے اور اس کو دیکھ کر دل پھڑپھڑاتے ہیں۔ اس تصویر کے ساتھ ساتھ وہ انعامات و اکرامات بھی بتا دیئے جاتے ہیں جو ان کے لیے منتظر ہیں۔ یہ اکرام ایسا ہے کہ انسان کے تصور سے بالا ہے اور یہ اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ لوگ جو اللہ سے ڈر کر خضوع و خشوع کرتے تھے' اس انجام کے امیدوار تھے۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۳۲ : ۱۷) "پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزاء میں ان کے لیے چھپا رکھا گیا ہے اس کی کسی شخص کو خبر نہیں ہے" اس کے بعد مومنین کے انجام کی ایک سرسری جھلک جنت میں اور فاسقین کی جزاء کی ایک سرسری جھلک جہنم میں دکھائی جاتی ہے۔ اور فاسقین کو یہ دھمکی بھی دے دی جاتی ہے کہ جہنم سے قبل اس جہان میں بھی تمہیں سزا دی جا سکتی ہے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کی طرف ایک مختصر اشارہ ہے۔ مطلب یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کے مقاصد ایک تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے بھی مومن تھے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے بھی مومن ہیں۔ انہوں نے بھی دعوت اسلامی کی راہ میں مشکلات اٹھائیں اور صبر کیا۔ اور ان کو جزاء یہ دی گئی کہ امت موسیٰ علیہ السلام نے دنیا کے لوگوں کی امامت کی۔ اشارہ اس طرح ہے کہ مسلمان بھی مشکلات پر صبر کریں اور ان کے خلاف جو سازشیں ہو رہی ہیں ان کو برداشت کریں کیونکہ انہوں نے بھی فرائض امامت ادا کرنے ہیں۔

اس کے بعد اقوام سابق کی ہلاکت کی طرف مختصر اشارات ہیں۔ لیل کمہ رات اور دن ان کھنڈرات سے گزرتے ہیں۔ پھر یہ بھی اشارہ کہ مردہ زمین کو اللہ کس طرح زندہ کرتا ہے اور کس طرح دنیا کی زندگی کی ترقی اور نشوونما ہوتی ہے۔

اور سورہ کا خاتمہ ان کی اس بات پر ہوتا ہے۔

مَتٰی ھٰذَا الْفَتْحُ (۲۸:۳۲) "وہ کہتے ہیں یہ فیصلہ کب ہوگا"۔ وہ تو یہ سوال اس لیے کرتے تھے کہ ان کو یقین نہ تھا۔ اس لیے جواب نہایت خوفناک دیا جاتا ہے' نہایت تہدید آمیز۔ اور حضور سے کہا جاتا ہے کہ ان سے منہ پھیرلیں اور چھوڑ دیں انہیں کہ اپنے انجام' طے شدہ انجام تک پہنچ جائیں۔

اب ہم تفصیلات کی طرف آتے ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۸۷ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۳۰

--------------------------

سُوْرَةُ السَّجْدَةِ (۳۲) مَكِّيَّةٌ (۷۵) اٰيَاتُهَا ۳۰ رُكُوْعَاتُهَا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝

"ا ـ ل ـ م ـ اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ رب العالمین کی طرف سے ہے ۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے تاکہ تو متنبہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا' شاید کہ وہ ہدایت پا جائیں"۔

الف ۔ لام ۔ میم --- یہ وہ حروف ہیں جن سے عرب واقف تھے جن سے یہ کتاب سب سے پہلے مخاطب تھی ۔ وہ جانتے تھے کہ ان حروف سے کلام کس طرح بنایا جاتا ہے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان حروف سے وہ جو کلام بناتے ہیں اس میں اور اس کلام میں کس قدر فرق ہے ۔ ہر وہ شخص یہ فرق جانتا تھا جو اسالیب کلام سے واقف تھا ۔ اور جو شخص بھی افکار و معانی کو الفاظ کا لباس پہنانے کا کام کرتا تھا ۔ یہ لوگ یہ بھی جانتے تھے اور اسے مانتے تھے کہ نصوص قرآنی کے اندر کوئی خفیہ قوت ہے اور اس کے اندر کوئی گہرا عنصر ہے' جو اسے ایک ایسی قوت قاہرہ عطا کرتا ہے جو بات کو دل میں اتار دیتا ہے ۔ ایسی تاثیر ان تمام باتوں اور اشعار میں نہیں ہے جو انسان خود بناتا ہے' یا اس نے بنائے ہیں ۔ یہ قرآن مجید کی ایسی خصوصیت تھی جس میں کسی کو کلام نہ تھا' موافق ہو یا مخالف ۔ کیونکہ جو شخص بھی یہ کلام سنتا تھا وہ اسے محسوس کرتا تھا ۔ وہ اس کلام کو دوسرے کلاموں سے ممتاز پاتا تھا اور اس پر جھوم جاتا تھا ۔ اگرچہ وہ یہ نہ جانتا تھا کہ یہ کلام الہی ہے ۔

قرآن کریم کو مکہ میں جن مخالف لوگوں نے بھی سنا' کلام کا یہ عنصر ان پر اثر انداز ہوا۔ مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف واقعات پیش آئے۔

ادبائے عرب کے کلام اور شعر میں اور قرآن کریم کی سورتوں اور آیات میں وہی فرق ہے جو اللہ کی مصنوعات میں اور انسانوں کی مصنوعات میں ہے۔ اللہ کی مصنوعات واضح اور ممیز اور جدا ہیں۔ کوئی انسانی مصنوعی چیز اللہ کی بنائی ہوئی چیز کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کسی بھی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو لے لیں۔ ایک اصلی پھول کو لے لیں اور ایک مصنوعی پھول کو لے لیں۔ اگر دنیا کے تمام تصویر کشوں کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ مل کر ایسی تصویر بنائیں جس میں کسی ایک اصلی پھول میں رنگوں کی تقسیم کا مقابلہ ہو تو وہ ایسا نہ کر سکیں گے۔ ایک پھول کی کلر اسکیم ہی ایک معجزہ ہے۔ یہی حال ہے کلام الٰہی کا اور دوسرے انسانی کلاموں کا جو سب کے سب انہی حروف تہجی سے بنے ہوئے ہیں۔

تَنْزِيلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِينَ (۳۲ : ۲) "اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ رب العالمین کی طرف سے ہے"۔ یہ ایک فیصلہ کن بات ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے ہے۔ یہاں آیت کے درمیان لَا رَيْبَ فِيهِ یعنی شک کی نفی کو لایا گیا ہے۔ یعنی مبتداء اور خبر کے درمیان کیونکہ یہ حقیقی "ایشو" ہے اور اس آیت کا اصل مدعا یہ ہے کہ شک کی تردید کی جائے اور اس فقرے کا آغاز حروف مقطعات سے اس بات کا اظہار ہے کہ اگر کوئی شک کرتا ہے تو یہ رہے وہ حروف' وہ میٹریل جس سے یہ کلام بنا ہے' تم بھی بنا لو۔ لہذا شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ حروف تمہیں مہیا ہیں' تم لسان ہو' اس کتاب کا انداز ایسا ہے جس کو تم بھی معجزانہ کلام تصور کرتے ہو۔ یہ تمہارا تجربہ ہے اور تمہارے تجربہ کار لوگوں کا یہی کہنا ہے۔

اس قرآن کی ہر سورہ اور ہر آیت اپنے اندر ایک معجزانہ عنصر رکھتی ہے۔ یہ عنصر اس کلام کے اندر بہت ہی گہرا ہے اور وہ یہ جاتا ہے کہ اس کلام کے اندر کوئی خفیہ قوت ہے۔ جب اس کی تلاوت ہوتی ہے تو انسان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ جھوم اٹھتا ہے' وہ متزلزل ہو جاتا ہے اور اسے اپنے اوپر کنٹرول نہیں رہتا۔ جب بھی کسی نے اس کے لیے دل کھولا' احساس نے کان دھرا' اور انسانی ادراک بلند ہوا اور اس کو سننے اور قبول کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ انسانی ثقافت اور علم و بصیرت جوں جوں وسیع ہوتی جاتی ہے' قرآن کریم کی یہ خصوصیت بہت ہی نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ جوں جوں انسان کا علم بڑھتا ہے' وہ اس کائنات کے اندر دور تک اپنا مشاہدہ بڑھاتا ہے اور وہ اس کائنات اور اس کے اندر کی مخلوق اور افراد تک اپنا علم بڑھاتا ہے۔ اس کلام کی تاثیر وقتی نہیں ہوتی۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہوتی ہے جب قرآن انسانی فطرت سے ہمکلام ہوتا ہے اور یہ تاثیر ایک حقیقت بن کر سامنے آتی ہے جب قرآن ایک تجربہ کار دل و دماغ سے مخاطب ہو۔ جب یہ ایک تعلیم یافتہ عقل سے ہمکلام ہو' جو ایک بھرے ہوئے ذہن سے بات کر رہا ہو' جس کے اندر علم و معلومات ہوں۔ جوں جوں انسان کا درجہ علم' ثقافت اور معلومات بلند ہوتا ہے' اس قرآن کے معانی' مفاہیم اور اثرات بڑھتے جاتے ہیں (بشرطیکہ انسانی فطرت سیدھی ہو' اس میں ٹیڑھ نہ ہو اور اس کے اوپر خواہشات نفسانیہ کے پردے نہ پڑ گئے ہوں) اور انسان علی وجہ الیقین یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہے۔

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰهُ (۳۲ : ۳) "تو یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے"۔ یہ بات انہوں نے محض ضد اور عناد سے کہی تھی۔ لیکن سیاق کلام میں یہاں اس کو بصورت سوال استنکاری اور نہایت ہی ناپسندیدہ بات کے لاتا ہے۔ کیا وہ ایسا کہتے ہیں؟ ایسی بات تو انہیں نہیں کہنا چاہئے اس لیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار اور سیرت ان کے اندر موجود مثال ہے۔ انہوں نے تو کبھی کسی پر الزام نہیں لگایا۔ کیا وہ اللہ پر الزام لگاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب بذات خود اپنے اوپر شہادت ہے اس میں تو شک کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔

بَلۡ هُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ (۳۲ : ۳) "بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے"۔ سچائی' یہ فطرت ازلی کے عین مطابق ہے۔ یہ کائنات کے اندر موجود حق اور سچائی کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا اس کے اندر گہری سچائی پائی جاتی ہے۔ اس کی ساخت' اس کے بیان' اور اس کے نظام کا ثبات و دوام اور اس کا جامع و مانع ہونا۔ اس کے اجزاء کا باہم ہم آہنگ ہونا اور متصادم نہ ہونا اور اس کے اجزاء کا باہم تعارف اور یگانگت یہ سب اس کے حق پر ہونے پر شاہد ہیں۔

یہ قرآن دراصل اس کائنات کے قوانین قدرت کا ترجمان ہے۔ اس کائنات کے اندر جو سچائی ودیعت شدہ ہے قرآن اس کا لفظی ایڈیشن ہے۔ کائنات عمل ہے اور قرآن اس عمل کی ترجمانی ہے' اس لیے حق ہے۔

یہ اس لیے حق ہے کہ یہ انسان اور اس کائنات کے اندر پائے جانے والے قوانین فطرت کے درمیان رابطہ پیدا کرتا ہے۔ انسان اور اس کائنات کے قوانین کلیہ کے درمیان مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور قرآن انسان اور ان کائناتی قوتوں کے درمیان توافق اور سلامتی پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ انسانی قوت اور کائناتی قوتیں باہم معاون' باہم ملاقی ہو جاتی ہیں اور ان کے درمیان پوری پوری مفاہمت ہوتی ہے۔ یوں انسان اپنے اس وسیع ماحول کا دوست بن جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے کہ جب انسانی فطرت اسے پاتی ہے تو اس پر لبیک کہتی ہے۔ نہایت یسر' نہایت خوشی اور نہایت شوق سے بغیر کسی تشتت اور دشمنی کے کیونکہ دونوں کے اندر ازلی اور قدیم حق رکھ دیا گیا ہے۔

یہ ایک ایسی سچائی ہے جس کے اندر کوئی تعارض' کوئی تضاد نہیں ہے اور وہ پوری انسانیت کے لیے ایک مکمل منہاج حیات ہے۔ یہ منہاج انسانوں کی شخصیت ان کی قوت' ان کے جذبات و میلانات' ان کی حالت صحت اور حالت مرض اور حالت قوت اور حالت ضعف حالت امن اور حالت فساد کو اچھی طرح مدنظر رکھ کر بنایا گیا ہے۔

یہ ایک ایسی سچائی ہے جس میں مکمل عدل ہے۔ یہ نہ دنیا میں بے انصافی کرتا ہے نہ آخرت میں' انسانوں کے اندر جو قوتیں موجود ہیں ان کے ساتھ بھی یہ کوئی بے انصافی نہیں کرتا۔ یہ ذہنی اور فکری قوتوں کے ساتھ بھی بے انصافی نہیں کرتا۔ یہ انسان کی کسی حرکت کے ساتھ ظلم کر کے اسے کسی معقول سرگرمی سے نہیں روکتا۔ جب تک وہ سرگرمی اس عالم گیر سچائی کے دائرہ کے اندر ہو' جو اس پوری کائنات کے اندر ودیعت کر دی گئی ہے۔

بَلۡ هُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ (۳۲ : ۳) "بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے"۔ یہ تمہاری طرف سے نہیں ہے۔ یہ رب کی طرف سے ہے۔ یہ رب مسلمانوں کا ہی نہیں ہے' رب العالمین ہے۔ یہ ہے اس حق میں کرامت انسانی۔ اس میں رسول کی تکریم ہے کہ وہ اپنی طرف سے افتراء نہیں باندھ رہا۔ پھر یہ اللہ اور رسولؐ کے درمیان

قرب کا ایک رنگ اور پرتو ہے۔ اور یہ دربردہ جواب ہے ان کے اس الزام کا کہ یہ اللہ پر افتراء ہے۔ ربک سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ حضورؐ اور قرآن کریم کا مصدر اور سرچشمہ باری تعالیٰ کے درمیان پختہ تعلق ہے۔ ایک باعزت تعلق اور اس کی وجہ سے وہ نہایت ذمہ داری اور امانت داری کے ساتھ ٹھیک ٹھیک وحی نقل کرتے ہیں۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (۳۲ : ۳) "تاکہ تو متنبہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا شاید کہ وہ ہدایت پا جائیں"۔ عرب جن کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا تھا۔ آپؐ سے قبل ان کی طرف کوئی رسول نہ بھیجا گیا تھا۔ تاریخ میں بنی اسماعیل میں سے کسی رسول کے آنے کا ذکر نہیں ہے جو عربوں کے جد اول تھے۔ اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کتاب نازل کی جو سچائی پر مشتمل ہے تاکہ آپ ان کو ڈرائیں اور وہ ہدایات پالیں۔ ان کی ہدایت اسی کتاب کے ذریعے ممکن ہے کیونکہ اس میں سچائی ہے، وہ سچائی جو انسان کی فطرت میں بھی موجود ہے۔ انسانوں کے دلوں کے اندر بھی موجود ہے۔

یہ لوگ جن کے ڈرانے کے لیے یہ کتاب نازل کی گئی ہے کہ ان کو ڈرایا جائے، یہ اللہ کے ساتھ دوسرے الہوں کو شریک کرتے تھے۔ چنانچہ یہاں سے اللہ کی ان صفات کا بیان شروع ہوتا ہے جن کے ذریعہ وہ معلوم کرلیں کہ اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کی مخصوص صفات کیا ہیں اور اس طرح انہیں معلوم ہو جائے کہ ان کے عقائد نہایت پوچ ہیں۔ ان عظیم صفات کا موصوف تو اللہ ہے جو رب العالمین ہے اور اس کے ہم پلہ و ہمسر ہونے کا کوئی مستحق نہیں ہے۔ نہ ان کو چاہئے کہ وہ کسی اور کو اس کا ہم پلہ بنائیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاۗءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۵ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝۶ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝۷ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ مَّهِيْنٍ ۝۸ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْــِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۹

"وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کے بعد عرش پر جلوہ فرما ہوا، اس کے سوا نہ تمہارا کوئی حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کے آگے سفارش کرنے

والا ' پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے ؟ وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے اور اس تدبیر کی روداد اوپر اس کے حضور جاتی ہے ۔ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے ۔وہی ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ' زبردست اور رحیم ۔جو چیز بھی اس نے بنائی خوب ہی بنائی ۔ اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی ' پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے ' پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیئے ' آنکھیں دیں اور دل دیئے تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو"۔

یہ ہے اللہ ۔اور یہ ہیں اس کی الوہیت کے آثار و شواہد ۔یہ کائنات ایک کھلی کتاب ہے اور لاانتہا عالم میں اس کے شواہد ہیں جو انسان کے محدود ادراک سے وراء ہے ۔خود انسان کی پیدائش اور اس کی نشوونما کے مختلف مدارج ہیں جنہیں لوگ جانتے ہیں اور انسانی نشوونما کے ان مدارج میں جن سے انسان ابھی تک بے خبر ہے ' اس کے شواہد موجود ہیں ۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ( ۳۲ : ۴ ) "وہ اللہ ہی ہے جس نے زمین و آسمان کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ' چھ دنوں میں پیدا کیا"۔اور یہ چھ دن ہمارے ان دنوں سے یقیناً مختلف ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں کیونکہ زمین کے دن تو وہ ہیں جو سورج کے سامنے زمین کی گردش محوری سے پیدا ہوتے ہیں ۔یہ دن ایک شب و روز پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ زمین اس کائنات کے اندر بہت ہی مختصر سا ٹکڑا ہے ۔ایک ذرہ ہے جس کی اس عظیم فضا میں کوئی وقعت نہیں ہے ۔ہمارے روز و شب تو زمین و آسمان کی پیدائش کے بعد پیدا ہوئے اور یہ روز و شب زمانہ کی وہ مقدار ہے جس کے مطابق ہم حساب و کتاب کرتے ہیں ۔

ان چھ ایام کی حقیقت کیا ہے تو اس کا علم اللہ ہی کو ہے ۔ہمارے پاس ان دنوں کے حساب و کتاب کا کوئی ذریعہ نہیں ہے ۔یہ اللہ کے ایام ہیں جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا

فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ( ۳۲ : ۵ ) "اور تمہارے رب کے نزدیک ایک دن ' تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار سال ہے"۔

یہ چھ دن وہ چھ حالات بھی ہو سکتے ہیں جن سے زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی فضا گزری ' یہاں تک کہ وہ اپنی موجودہ حالت تک پہنچی یا یہ تخلیق کے چھ مراحل تھے یا یہ چھ زمانے تھے جن کے درمیان کے وقت کے بارے میں اللہ ہی جانتا ہے ۔ بہرحال جو بھی مراد ہو ' ان سے وہ دن مراد نہیں ہیں جو ہمارے زمانے کے دن ہیں ۔بہرحال وہ ایک غیبی امر ہے اور اس کی مراد ہم متعین نہیں کر سکتے ۔ مراد وہ زمانہ ہے جو تخلیق ' تقدیر میں مطابق حکمت الہیہ صرف ہوا اور اس زمانے میں اللہ نے ہر چیز کو اس کی موجودہ شکل تک پہنچایا مختلف مراحل ' ادوار سے گزار کر ۔

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ( ۳۲ : ۴ ) "اور اس کے بعد عرش پر جلوہ فرما ہوا"۔استواء علی العرش اشارہ ہے اس طرف کہ اللہ کے قبضہ قدرت میں تمام کائنات ہے ۔رہا یہ کہ عرش کیا ہے تو ہم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتے ۔انہی الفاظ پر بات کو ختم کرتے ہیں ۔بہرحال استواعلی العرش سے مراد ہے قدرت شاملہ ہے ۔پھر لفظ ثم بھی ترتیب زمانی کے لیے نہیں ہے کیونکہ اللہ کے حالات بدلتے نہیں ہیں ۔یہ نہیں ہو سکتا کہ پہلے اللہ کس حال میں تھا

پھر کسی دوسرے حال میں ہوگیا۔ یہ معنوی ترتیب ہے کہ اللہ نے اس کائنات کو پیدا کیا اور جب سے پیدا کیا وہ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے یعنی بالعموم یہ کہا جاتا ہے کہ پیدا پہلے کیا اور قبضہ قدرت میں بعد میں ہوا اور نہ ایسا کوئی زمانہ نہ تھا کہ اللہ کے قبضہ قدرت میں نہ ہو۔ اس بے قید قبضہ قدرت کے بیان کے بعد اب لوگوں سے کہا جاتا ہے۔

مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ (۳۲ : ٤) "اس کی مانند نہ تمہارا کوئی حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کے آگے سفارش کرنے والا ہے"۔ کہاں اور کون سفارشی ہو سکتا ہے جبکہ اللہ سبحانہ عرش پر متمکن ہوں اور زمین و آسمان سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہوں اور خالق ارض و سما بھی وہی ہو۔ تو اس کے سوا کوئی حامی ہو سکتا ہے اور اس کے سوا سفارش کرنے والا کون ہو سکتا ہے اور کون سفارشی اللہ کی سلطنت سے خارج ہو سکتا ہے۔

اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ (۳۲ : ٤) "کیا تم ہوش میں نہیں آتے"۔ یہ حقیقت اس بات کی یاد دہانی کراتی ہے کہ اللہ کا اقرار کرو، اور اپنا رخ اسی کی طرف کر دو۔ تخلیق اسی کی ہے وہی مکمل اختیارات رکھتا ہے، وہی تدبیر کرتا ہے اور امور طے کرتا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ زمین و آسمان کے تمام امور اس کی طرف بلند ہوتے ہیں، قیامت میں بھی تمام معاملات اس کے سامنے پیش ہوں گے اور دنیا میں بھی تمام رپورٹیں اس کی طرف پہنچتی ہیں اس طویل دن میں جس کی مقدار اس کو معلوم ہے۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲ : ۵) "وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے اور اس تدبیر کی روداد اوپر اس کے حضور جاتی ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے"۔

قرآن کا انداز تعبیر اللہ کے تدبیر کائنات کے وسیع ترمیدان کی خوب تصویر کشی کرتا ہے۔

مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (۳۲ : ۵) "آسمانوں سے زمین تک"۔ اس سے انسانی ذہن کے اندر بات بلحاظ مقصود ہے یعنی ان الفاظ میں جن کا تصور ذہن انسانی کر سکتا ہے تاکہ دل میں خوف خدا پیدا ہو۔ ورنہ اللہ کی تدبیر کائنات کا دائرہ زمین اور آسمان سے بہت ہی وسیع ہے۔ لیکن انسانی احساس اور شعور کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اس کائنات کے سامنے کھڑا ہے اور اپنے شعور اور مشاہدے کی حد تک اللہ کی وسعت تدبیر کا تصور کر رہا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی وسعت تدبیر ہمارے تصور اور ہمارے ان شماریات سے بھی وسیع ہے جو ہمارے استعمال میں ہیں۔

پھر اللہ کی تمام تدابیر اور اللہ کی تمام تقدیرات کی رپورٹ میں ان کے نتائج اللہ کی طرف اٹھائے جاتے ہیں اور یہ روئیداد اسے پورے عواقب و نتائج کے ساتھ، تمام اعمال، اموال اور افعال کے ساتھ، اشیاء اور زندوں اور تمام مواد کائنات کے بارے میں ایک دن اٹھائی جاتی۔ اس دن کی مقدار ایک ہزار سال ہمارے شماریات کے مطابق ہے۔ غرض اس کائنات کی کوئی چیز یونہی نہیں چھوڑ دی جاتی ہے، نہ کسی چیز کو عبث پیدا کیا گیا ہے بلکہ ایک مقررہ وقت تک تمام چیزوں کی تدبیر کی گئی ہے۔ ہر شے، ہر معاملہ، ہر نتیجہ اور ہر واقعہ اللہ کے تحت ہے اور اس کی روئیداد اللہ کے ہاں پہنچتی

ہے جس طرح وہ طلب کرتا ہے۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيْمُ (۳۲ : ۶) "وہی ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا' زبردست اور رحیم"۔ یعنی یہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور یہ استواء علی العرش اور آسمانوں سے زمین تک تمام امور کا انتظام۔ یہ ہے اللہ عالم غیب اور عالم مشاہدہ کا جاننے والا' وہی خالق ہے۔ وہ قادر مطلق ہے اور زبردست اور رحیم ہے۔ قدرت رکھنے والا ہے' اور جو چاہے کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنے برتاؤ میں مخلوقات کے ساتھ رحم کرنے والا ہے۔

الَّذِيْ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (۳۲ : ۷) "جو چیز بھی اس نے بنائی خوب بنائی"۔ کیا شان ہے اللہ کی! بے شک یہ حق ہے' فطرت اسے دیکھ رہی ہے' آنکھیں دیکھ رہی ہیں' دل اسے دیکھ رہا ہے اور عقل اس کی تصدیق کر رہی ہے۔ یہ حق جو اشیاء کی شکل میں بھی ہے۔ ان کے فرائض میں بھی ہے' ان کی طبیعت اور ان کی ہم آہنگی میں بھی ہے۔ ان کی ہیئت میں بھی ہے اور ان کی شکل میں بھی ہے۔ بہرحال جو چیز بھی حسن اور احسان سے متعلق ہے وہ اس مخلوقات میں موجود ہے۔

سبحان اللہ! یہ ہے اللہ کی کاریگری تمام اشیاء میں۔ اس کے دست قدرت کے کمالات تمام اشیاء میں موجود ہیں۔ جو چیز بھی اللہ نے بنائی ہے وہ حسین اور مکمل ہے۔ نہ حد سے آگے ہے اور نہ اس میں کوئی قصور ہے۔ حسن سے زیادہ نہ کم۔ نہ افراط ہے نہ تفریط۔ حجم کے اعتبار سے' شکل کے لحاظ سے اور مقاصد اور مفاد کے زاویہ سے۔ ہر چیز ایک متعین قدر کے ساتھ ہے۔ نہ حد حسن و جمال سے کم یا زیادہ ہے۔ اپنے وقت سے نہ پہلے آتی ہے' نہ بعد میں۔ نہ اپنی حد سے آگے بڑھتی ہے اور نہ پیچھے رہتی ہے۔ ذرے سے لے کر بڑے سے بڑے اجسام تک میں حسن ملحوظ ہے۔ سادہ خلیے سے لے کر پیچیدہ ترین ذی حیات اشیاء تک ہر چیز حسین اور موزوں ہے۔ اسی طرح' اعمال' اطوار' واقعات اور حرکات سب کے سب مقدر ہیں۔ سب اللہ کی تخلیق ہیں اور ہر واقعہ اور ہر حادثہ اپنے مقرر معیار کے مطابق ہوتا ہے اور اس کے مقررہ اثرات مرتب ہوتے ہیں' اور یہ اس منصوبے اور نقشے کے مطابق ہوتا ہے جو ازل میں اللہ نے تیار کیا ہے اور ابد تک ایسا ہی تدبیر الٰہی کے مطابق ہوتا رہے گا۔

ہر چیز اور ہر مخلوق اس لیے بنائی گئی ہے کہ وہ اپنا مقرر اور متعین فریضہ ادا کرے اور اس فریضے کا تعین نہایت دقیق وزن کے ساتھ کر دیا گیا ہے۔ اس چیز کے تمام فرائض اس کے اندر رکھ دیئے گئے ہیں اور ان خواص کی وجہ سے وہ اپنا فریضہ منصبی پورا کرتی ہے اور اس کے لیے پوری طرح اہل ہے۔ یہ خلیہ جو متعدد مقاصد کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ کیڑا رینگ رہا ہے اور جس کے پاؤں اور بال و پر ہیں۔ یہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ اس زمین پر اپنے لیے راستہ نکالے۔ یہ اپنا کام احسن طریقے سے کرتا ہے۔ یہ پرندہ' یہ حیوان' اور یہ انسان' یہ کواکب' یہ ستارے' یہ سیارے' یہ افلاک اور جہاں اور یہ جہانوں کے جہاں' یہ کرات اور ان کے دورے اور گردشیں' متعین اور مقرر' عجیب اور مضبوط اور نہایت ہی وقت کے ساتھ متعین وقت کے حامل۔ دائمی طور پر متحرک۔ غرض اس کائنات کی جس چیز کو دیکھو چھوٹی یا بڑی ہر چیز حسین و جمیل ہے۔ اس کے حسن و جمال میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہر کھلی آنکھ' ہر حساس انسان' اور ہر صاحب بصیرت شخص اس حسن اور احسان کو دیکھ سکتا ہے جو اس کائنات کی

مجموعی شکل میں بھی ہے اور اس کی ایک ایک چیز میں بھی ہے ۔جب قلب و نظر اور ذہن و خیال متوجہ ہوں تو انسان اس جہان میں حسن و جمال اور صنعت و کمال کے بڑے بڑے ذخائر دریافت کر سکتا ہے ۔اس حسن و جمال اور اس تدبر و کمال کے نتیجے میں ہر طرف سے انسان کے لیے خیر اور برکات جمع ہوتے ہیں ۔ مثلاً نہایت ہی خوشگوار پھل اور وہ روحانی ذوق و شوق جس سے کاسہ دل بھر جاتا ہے اور اس طرح انسان اس ربانی میلے میں اور اس خدائی جشن میں جدھر دیکھے 'حسن و جمال ہی نظر آئے 'جس چیز کا مطالعہ کرے وہ بدیع الجمال اور انتہائے کمال پر نظر آئے ۔اس طرح اس جہان فانی کے زائل ہونے والے اس حسن و جمال ۔ آگے بڑھ کر عالم آخرت کے دائمی حسن و جمال اور لازوال کمال تک پہنچ سکتا ہے جو صفت الٰہی میں ہے اور جس کا تصور بھی کسی دل میں نہیں آیا۔

انسان ان انعامات اور حسن و جمال اور دقت و کمال کو اس وقت دیکھ سکتا ہے جب انسان ایک عادی اور معمولی اور روٹین کے مناظر کو ذرا آنکھیں کھول کر دیکھے ۔ یہ اس وقت ہی اسے پا سکتا ہے جب وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کی گھنٹیوں کو سنے ۔فطرت کے اشارات کو سمجھنے کی کوشش کرے ۔جب وہ اس جہاں کو نور ربانی کے ساتھ دیکھے ۔جب وہ ان کو ربانی نور کے ساتھ دیکھے گا تو پھر اس کو معلوم ہو گا کہ ہر چیز کے اندر کیسا حسن و جمال ہے اور ہر چیز کی صنعت میں انوکھا پن کیا ہے اور یہ حسن اسے اس وقت نظر آئے گا جب وہ ہر حسین چیز کو دیکھ کر اللہ کو یاد کرے اور سبحان اللہ کہے ۔یوں اس کا تعلق خالق کائنات سے پیدا ہو گا۔ یوں اس کا شعور جمال تک پہنچ جائے گا کیونکہ مخلوقات کے کمال و جمال سے انسان اللہ کے کمال و جمال تک پہنچ سکتا ہے ۔

یہ کائنات جمیل ہے اور اس کا جمال ختم نہیں ہوتا اور انسان اس جمال کے ادراک میں روز بروز ترقی کرتا ہے ۔اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کا یہ فائدہ غیر محدود ہے ۔وہ جس قدر چاہے اس فائدے کو آگے بڑھا سکتا ہے ۔جہاں تک بدیع السموات انسان کے لیے مقدر کرتا ہے اور موقع دیتا ہے ۔

پھر اس مخلوق میں خوبصورتی کا عنصر مقصود بالذات ہے ۔اللہ نے ہر چیز کو خوبصورت بنایا ہے کیونکہ جب کسی بنائی ہوئی چیز کو خوبصورت اور اچھا بنایا جاتا ہے تو وہ اپنا فرض منصبی یا ڈیوٹی بہت اچھی طرح ادا کرتی ہے ۔یوں مصنوعات کی عمدگی کو بڑھا کر کمال تک پہنچایا جاتا ہے جبکہ اس کائنات کی خوبصورتی اس کے ہر جزء سے ظاہر ہے اور مخلوقات کی ہر قسم سے عیاں ہے ۔ذرا اس کھجور کو دیکھئے 'ذرا کسی ایک پھول کو دیکھئے 'ذرا ایک چھوٹے سے چھوٹے ستارے کو دیکھئے 'ذرا رات کو دیکھئے اور پھر دن کو دیکھئے 'چھاؤں اور بادلوں کو دیکھئے 'اس پورے وجود کے اندر جاری و ساری نغمہ سرائی کو دیکھئے اور غایت درجہ کی ہم آہنگی 'ہمواری اور حرکت کو دیکھئے ۔فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

--- ○○○---

یہ ایک سیاحت ہے اور اس خوبصورت وجود اور نہایت ہی خوبصورت اور انوکھی کائنات میں ایک تفریح ہے اور مخلوقات کا مطالعاتی سفر ہے ۔قرآن کریم ہماری توجہ اس طرف مبذول کراتا ہے اور ہدایت کرتا ہے کہ اس سے لطف اٹھاؤ۔

اَلَّذِىْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَىْءٍ خَلَقَهٗ (۳۲ : ۷) "جس نے ہر چیز کو خوبصورت تخلیق بخشی"۔ اس ہدایت سے انسان اس کائنات میں حسن و جمال کے نکات تلاش کرتا ہے 'اور لطف اٹھاتا ہے ۔

وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ (۳۲: ۷) "اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی"۔ اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہے کہ اس نے انسان کی تخلیق گارے سے کی۔ انداز تعبیر سے یوں سمجھ میں آتا ہی کہ انسان کا آغاز گارے سے تھا۔ یعنی انسان کی ابتدائی شکل مٹی کے گارے کی سی تھی۔ اللہ نے یہ نہیں بتایا کہ گارے سے انسان تک کتنے مراحل سے انسان گزرا یا کتنا زمانہ اس میں لگا۔ اس معاملے میں قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ خصوصاً جب ہم اس آیت کو سورہ المومنون کی آیت سے ملا کر پڑھیں۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ "انسان کو مٹی کے ست سے پیدا کیا گیا"۔ لہٰذا یہ کہنا ممکن ہے کہ انسان کی تخلیق ایسے مراحل سے گزری ہے جس کا اصل مٹی تک جا پہنچتا ہے۔

اس سے مراد وہ خلیہ بھی ہو سکتا ہے جو اس زمین میں پیدا کیا گیا اور یہ خلیہ مٹی سے پیدا کیا گیا تھا۔ اور نفخ حیات اور نفخ روح سے وہ خالص مٹی تھا اور یہی وہ راز ہے جس تک آج تک انسان نہیں پہنچ سکا۔ نہ انسان یہ معلوم کر سکا ہے کہ یہ زندگی کیا ہے اور نہ یہ معلوم کر سکا ہے کہ اس خلیے میں روح کیسے داخل ہوئی اور اس خلیے سے بھی انسان کیسے پیدا کیا گیا۔ قرآن کریم نے اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ یہ پورا عمل کیسے انجام تک پہنچا اور نہ یہ بتایا ہے کہ اس پر کس قدر وقت لگا۔ اس تحقیق کے لیے اللہ نے انسان کو آزاد چھوڑ دیا ہے کہ جس طرح چاہے فیصلہ کرے اور اس قسم کی تحقیقات نص قرآنی کے خلاف نہیں ہیں۔ نص قرآنی میں صرف یہ ہے کہ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے یا مٹی کے ست سے ہوئی ہے۔ یہ ہے وہ موقف جس میں قرآن مجید جو قاطع ہے اپنی جگہ رہتا ہے۔ اور سائنسی تحقیقات بھی اپنے مقام پر رہتی ہیں۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ صراحت کر دی جائے کہ ڈارون کا نظریہ ارتقا کہ تمام حیوانات ایک ہی خلیے سے ارتقاء کر کے مختلف انواع کی شکل اختیار کر گئے ہیں اور خود انسان بھی بندر کی ترقی یافتہ شکل ہے اور یہ کہ انسان اور اعلیٰ قسم کے بندر کے درمیان ارتقائی مراحل کے انواع موجود رہے ہیں۔ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ نیز ڈارون کو وراثتی خصوصیات (جینز) کا علم ہی نہ تھا۔ لیکن جینز کی دریافت کے بعد تو یہ طے ہو گیا ہے کہ ایک نوع کا دوسرے نوع میں منتقل ہونا محال ہو گیا ہے۔ ہر خلیے یعنی نوع حیوان کے خلیے کے اندر ایسے جینز ہیں جو اسے اپنی نوع بدلنے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔ یہ جینز اپنی صورت نوعیہ کی پوری طرح حفاظت کرتے ہیں۔ لہٰذا بلی جس خلیے سے پیدا کی گئی وہ بلی ہی رہی ہے اور اس کی صورت نوعیہ میں کسی مرحلے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کتا کتا رہا ہے' بیل بیل رہا ہے' گھوڑا ہمیشہ گھوڑا رہا ہے' بندر ہمیشہ بندر رہا ہے اور انسان ہمیشہ انسان رہا ہے۔ جو چیز ممکن ہے وہ یہ ہے کہ ایک نوع اپنی حدود کے اندر ترقی کرے یا زوال پذیر ہو۔ بہرحال ممکن ہے کہ ایک نوع اپنی حدود کو کراس کر کے دوسری نوع میں داخل ہو جائے۔ یہ وہ بات ہے جو ڈارون کے نظریہ کی حقیقت ہی باطل کر رہی ہے۔ بہرحال یہ لوگ سائنس کے نام پر خود اپنے نظریات گھڑتے ہیں' ان پر یقین کرتے ہیں لیکن یہ نظریات کسی دن جا کر باطل ہو جاتے ہیں۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ (۳۲: ۸) "پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے یعنی نطفے کے پانی سے جو جنین کے ارتقاء کی پہلی شکل ہے کہ وہ ایک نقطے سے ایک لوتھڑا بن جاتا ہے۔ پھر وہ گوشت کی بوٹی بن جاتا ہے۔ پھر اس کے اندر ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں۔ پھر وہ مکمل جنین بن جاتا ہے۔ یہ پانی کا ست

اور اس کا ارتقاء ہے۔ یہ نقطہ جو اس حقیر پانی میں ہوتا، جس طرح یہ ارتقائی مراحل طے کرتا ہے اور جس طرح آج کل اس کا مشاہدہ ہوا ہے یہ ایک عظیم ارتقاء ہے اور پھر یہ پورے انسان کی شکل میں آ جاتا ہے اور یہ انسان اپنی ذات میں ایک عجیب جہان ہے اور اس حقیر پانی کے ست میں ایک دوسرے نقطے کو دیکھو اور پھر اس مکمل انسان کو دیکھو کہاں سے کہاں تک آ گیا اور کیا سے کیا کچھ بن گیا۔ قرآن کریم اس عظیم تغیر و ارتقاء کو اس طرح ایک ہی آیت میں بیان کر دیتا ہے۔

ثُمَّ سَوّٰهُ وَ نَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ

(۳۲ : ۹) "پھر اس نے اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیئے، آنکھیں دیں اور دل دیئے"۔ سبحان اللہ یہ کس قدر عظیم ارتقائی سفر ہے انسان کا۔ کن کن مشکل حالات سے یہ انسان گزرا ہے۔ کس قدر عظیم معجزہ ہے خود انسان کی تخلیق لیکن لوگ اس سے غافل ہیں۔ انسان کو دیکھو اور اس معتبر نطفے کے پانی کے اندر اس نکتے کو دیکھو۔ اگر دست قدرت اس معجزانہ عمل کو تکمیل تک نہ پہنچائے۔ یہ دست قدرت ہی ہے جو اس نہایت ہی چھوٹے نکتے کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ ان دشوار گزار مراحل اور راستوں سے گزر کر انسان کی شکل اختیار کر لے۔

اس چھوٹے سے نقطے اور اس خلیے کے اندر کس قدر تقسیم ہوتی ہے اور کس قدر کثرت ہوتی ہے۔ یہ بڑھتا بھی جاتا ہے اور تقسیم بھی ہوتا جاتا ہے۔ اس سے مزید مختلف قسم کے خلیے بنتے جاتے ہیں۔ یہ خلیے پھر باہم متضاد ہوتے ہیں۔ یہ بڑھتے جاتے ہیں۔ پھر اس انسان کے ہر ہر عضو کے اپنے خلیے ہوتے ہیں، ان کی مخصوص نوعیت ہوتی ہے اور ان کے پھر مزید اجزاء ہوتے ہیں اور ہر جزء کا اپنا وظیفہ ہوتا ہے۔ ایک ہی عضو کے اندر کئی قسم کے خلیے بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ پہلا خلیہ کس طرح اس قدر کثرت میں آ جاتا ہے، پھر اس کے اندر نوعیت کے اعتبار سے یہ تقسیم کس طرح ہو جاتی ہے، پھر اس ایک ہی ابتدائی نکتے اور خلیے سے خلیات کا عظیم مجموعہ کس طرح بن جاتا ہے۔ پھر ان خلیات کے اندر انسانی خصوصیات کہاں چھپی تھیں۔ پھر یہ جنین کے اندر مخصوص صلاحیتیں کہاں سے آ جاتی ہیں۔ ہر خلیے کے لیے متعین فریضہ کس طرح قائم ہو جاتا ہے۔ اور ہر ایک کی خصوصیات دوسرے سے جدا کس طرح ہو جاتی ہیں۔ کون ہے جو اس قسم کے معجزے کے صادر ہونے کا یقین کرتا اگر عملاً یہ معجزہ روز ہمارے سامنے وجود میں نہ آتا۔

یہ اللہ کا دست قدرت ہی ہے جس نے انسان کو اس طرح برابر کیا اور درست کیا اور پھر یہ اللہ کی جانب سے انسان کے اندر روح پھونکنے کا عمل ہے جو انسان کو انسان بنا دیتا ہے۔ یہی ایک معقول تشریح ہے اس معجزے کی جو ہر سیکنڈ میں واقع ہو رہا ہے۔ لیکن لوگ ہیں کہ اس سے غافل ہیں۔ یہ اللہ کا نفخ روح ہے جس کی وجہ سے انسان انسان بن جاتا ہے۔ اس کے اندر سننے اور دیکھنے کی قوت آ جاتی ہے اور اس سمع و بصر ہی کی وجہ سے تمام عضویاتی حیوانات سے انسان مختلف اور ممتاز ہوتا ہے۔

وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ (۳۲ : ۹) "تم کو کان دیئے، آنکھیں دیں اور دل دیئے"۔ یہ وہ معجزہ ہے جو ہمارے سامنے ہر سیکنڈ میں رونما ہوتا ہے۔ اس کی تشریح اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی جانب سے نفخ روح ہے ورنہ عقل انسانی اس اتھاہ سمندر میں غوطے کھاتی رہتی اور قیامت تک وہ اس کی تشریح نہ

کر سکتی۔ اس کے علاوہ یہ اللہ کے فض و کرم کا فیضان ہے اور یہ اللہ کا فضل ہی ہے جو اس حقیر پانی کے ایک قطرے سے انسان بنا دیتا ہے۔ پھر وہ اللہ ہی ہے جو اس ایک حقیر خلیے کے اندر ارتقا اور نمو کی وہ خصوصیات رکھ دیتا ہے کہ وہ' تبدیلیوں سے ہوتے ہوئے اور اپنے اندر مزید خصوصیات لیتے ہوئے انسان کی شکل میں پہنچ گیا۔ جس کے اندر ایسی خصوصیات پیدا ہو گئیں کہ انسان تمام دوسرے حیوانات میں ممتاز ہو گیا۔ لوگ ہیں کہ اللہ کے اس فضل و کرم کا کوئی شکر ادا نہیں کرتے۔ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۳۲: ۹)

--- ooo ---

انسان کی پیدائش' اس کے مختلف مراحل اور ان سے اس کا عجیب انداز سے گزرنا اور ہر وقت اس عظیم معجزے کا صادر ہونا اور اس معجزے کا ہمارے سامنے بار بار دہرایا جانا' ان امور کی روشنی میں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ یہ انسان جب مر کر پھر مٹی بن گیا اور زمین کی دوسری مٹی میں مل گیا تو حشر و نشر کیسے ہو گا۔ اس بیان کے بعد یہ شک اور یہ اعتراض بجائے خود عجیب اور احمقانہ نظر آتے ہیں۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ بَلْ هُمْ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۰

"اور یہ لوگ کہتے ہیں: "جب ہم مٹی میں رل مل چکے ہوں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟" اصل بات یہ ہے کہ یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں"۔

یہ لوگ کہتے تھے کہ مرنے اور دفن کرنے کے بعد اور اجسام کے مٹی ہو کر مٹی میں رل مل جانے کے بعد یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہمیں از سر نو پیدا کر دیا جائے جبکہ ہمارے ذرات دوسرے ذرات میں مل کر ناپید اور گم ہو جائیں گے۔ جب انسان کی تخلیق اول پر غور کیا جائے تو اللہ کے لیے اس کا دوبارہ تحقق کرنا کوئی عجیب و غریب چیز نہیں ہے۔ آغاز میں اللہ نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا اور یہ مٹی اس زمین سے تھی جس میں وہ اپنی ذات کو گم کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری پیدائش بھی تو پہلی پیدائش ہی کی طرح ہے۔ اس میں کوئی عجیب و غریب بات تو نظر نہیں آتی۔ اصل بات یہ ہے۔

بَلْ هُمْ بِلِقَآىِٔ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ (۳۲: ۱۰) "کہ یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں"۔ اس وجہ سے وہ ایسی باتیں کرتے ہیں۔ اللہ کے سامنے حاضری کا یہ انکار ہی ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ اس قسم کے واضح معاملے میں اپنے اوپر شک طاری کرتے ہیں' یہ معاملہ ایسا ہے جو ایک بار ہو چکا ہے اور اس قسم کے واقعات و معجزات ہر لحظہ ہوتے رہتے ہیں۔ تاکید اً ان کی وفات اور اللہ کی طرف لوٹ آنے کی تاکید کی جاتی ہے اور دلیل وہی ہے جو اس سے

پہلے دے دی گئی ہے۔ ۱

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝۱۱ ع ۱۱

۱۴

"ان سے کہو "موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو پورا کا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا اور پھر تم اپنے رب کی طرف پلٹالائے جاؤ گے"۔

یہ ایک یقینی اطلاع کی صورت میں بتا دیا جاتا ہے۔ ملک الموت کون ہے اور وہ انسانوں کو پورا پورا اپنے قبضے میں کس طرح لے لیتا ہے یہ اللہ کے غیبی نوشتوں میں سے ایک ہے۔ اس کے بارے میں اللہ نے ہمیں یہ اطلاع دے دی ہے کہ وہ لوگوں کو پورے کا پورا قبضے میں لے لیتا ہے اور پھر قیامت میں پیش کر دے گا۔ ہمیں اس پر یقین کرنا چاہئے اور زیادہ تفصیلات میں نہیں جانا چاہئے۔ یقین اس لیے کہ یہ اللہ کے سچے ذریعے سے اطلاع مل گئی ہے۔

--- ○○○---

موت کے بعد جی اٹھنے کے مسئلے کی مناسبت سے جس میں وہ شک کرتے تھے یا شک کرنا چاہتے تھے اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں۔ یہ ایک زندہ و تابندہ منظر ہے۔ حرکات اور مکالمات سے بھرپور۔ یوں کہ گویا ابھی یہ واقعہ ہو رہا ہے۔

وَلَوْ تَرٰۤی اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۳﴾ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِیْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

"کاش تم دیکھو وہ وقت جب یہ مجرم سر جھکائے اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے (اس وقت یہ کہہ رہے ہوں گے) "اے ہمارے رب، ہم نے خوب دیکھ لیا اور سن لیا، اب ہمیں واپس بھیج دے تاکہ ہم نیک عمل کریں، ہمیں اب یقین آگیا ہے"۔ (جواب میں ارشاد ہو گا) "اگر ہم چاہتے تو پہلے ہی ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے مگر میری وہ بات پوری ہو گئی جو میں نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے بھر دوں گا۔ پس اب چکھو مزا اپنی اس حرکت کا کہ تم نے اس دن کی ملاقات کو فراموش کر دیا، ہم نے بھی اب تمہیں فراموش کر دیا ہے۔ چکھو ہیشگی کے عذاب کا مزا اپنے کرتوتوں کی پاداش میں"۔

یہ ایک ایسا منظر ہے جس میں منکرین قیامت نہایت ہی شرمندگی کے ساتھ اعتراف کر رہے ہیں۔ اب وہ اس سچائی کو مان رہے ہیں جس کا وہ انکار کرتے تھے۔ وہ یہ درخواست کریں گے کہ ہمیں ایک بار پھر زمین پر لوٹا دیا جائے اور وہ اب کی بار اس کمی کو پورا کر دیں گے جو پہلی بار ہو گئی۔ یہاں شرمندگی کی وجہ سے وہ سرنگوں کھڑے ہوں گے۔ اب یہ لوگ اپنے اس رب کے پاس (عِنْدَ رَبِّهِمْ) ہوں گے جس کے پاس حاضر ہونے کا وہ انکار کرتے تھے۔ لیکن ان کی یہ سب

باتیں بعد از وقت ہوں گی اور اب اعتراف اور اعلان ان کو کوئی فائدہ نہ دے گا۔

قبل اس کے کہ ان کی اس شرمندگی پر کوئی تبصرہ کیا جائے' یہ بتا دیا جاتا ہے کہ دنیا اور آخرت میں فیصلہ کن قوت کون سی ہے اور وہ کون سی قوت ہے جو لوگوں کے آخری انجام کا فیصلہ کرنے والی ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ

وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ (۳۲ : ۱۳) "اگر ہم چاہتے تو پہلے ہی ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے مگر میری وہ بات پوری ہو گئی جو میں نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا"۔ اگر اللہ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی راہ پر ڈال دیتا۔ اور یہ تھا طریقہ ہدایت' جس طرح اس مخلوقات کا طریقہ ایک ہے جو الہام فطرت کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے اور وہ پوری زندگی ایک ہی طرح سے گزارتی ہے جیسے حشرات الارض پرندے اور زمین پر چلنے والے جانور یا وہ مخلوق جو اطاعت شعار ہے مثلاً فرشتے' لیکن اللہ کی مشیت کا تقاضا یوں ہوا کہ انسانوں کا ایک خاص مزاج اور ماہیت ہو۔ اس کے اختیار میں ہو کہ وہ ہدایت اختیار کرے یا ضلالت اختیار کرے اور وہ اپنی اس مخصوص طبیعت کے ساتھ اس جہان میں ایک مخصوص کردار ادا کرے جس کے لیے اللہ نے اسے اس کرۂ ارض پر بھیجا ہے اور ایک منصوبے کے مطابق بھیجا ہے۔ چنانچہ اس منصوبے کے تقاضے کے طور پر اللہ نے لکھ دیا کہ جنوں اور انسانوں سے وہ جہنم کو بھر دے گا ان لوگوں سے جو جنوں اور انسانوں میں سے ضلالت کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ جس راہ کا انجام جہنم ہے۔ یہ لوگ جو اللہ کے سامنے قیامت کے دن پیش کیے گئے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اختیار اور خوشی سے جہنم کی راہ اختیار کی۔ اب وہ اللہ کے سامنے سر جھکائے شرمندہ کھڑے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے :

فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا (۳۲ : ۱۴) "اب چکھو مزا اپنی اس حرکت کا کہ تم اس دن کی ملاقات کو فراموش کر دیا تھا"۔

یہ ہے تمہارا دن جو حاضر ہے کیونکہ اس منظر میں ہم اسے حاضر دیکھ رہے ہیں۔ تم نے چونکہ اس دن کو بھلا دیا تھا۔ اب اس کا مزہ چکھو۔ تمہارے پاس کافی وقت تھا مگر تم نے اس کے لیے تیاری نہ کی۔

اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ (۳۲ : ۱۴) "ہم نے بھی تمہیں بھلا دیا ہے"۔ اللہ تو کسی کو نہیں بھلاتا۔ لیکن ان کے ساتھ معاملہ اس طرح کرتا ہے کہ گویا وہ نسیاً منسیاً کر دیے گئے ہیں۔ یہ ایسا سلوک ہے جس میں انہیں توہین آمیز انداز میں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳۲ : ۱۴) "چکھو' اب ہیشگی کے عذاب کا مزہ اپنے کرتوتوں کی پاداش میں"۔ اب اس منظر پر پردہ گر جاتا ہے۔ فیصلہ کن بات کر دی جاتی ہے اور مجرموں کو ان کے برے انجام میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ منظر قرآن کے پڑھنے والے کے پردۂ فکر پر یوں نقش ہوتا ہے کہ گویا اب یہ لوگ وہاں اسی حال میں چھوڑ دیے گئے ہیں۔ تو وہ وہاں ہی کھڑے ہیں جہاں چھوڑ دیے گئے ہیں۔ یہ ہے قرآن کی

اندر کی تصویر کشی۔

اب اس مشاہدہ و منظر پر پردہ گرتا ہے اور ایک دوسرا منظر سامنے آتا ہے' اس دوسرے منظر کا ماحول اور فضا مختلف ہے۔ یہ ایک دوسری ہی عطر آمیز اور فرحت بخش فضا ہے جس میں دل اڑا جا رہا ہے۔ یہ مومنین کا منظر ہے۔ وہ لوگ جو اللہ سے ڈرتے ہیں' نہایت یکسوئی سے اس کی عبادت کرتے ہیں' وہ اللہ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں اس حال میں کہ ان کے دل کے اندر خدا کا خوف بیٹھا ہے۔ ان کے دل کانپ رہے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے فضل و کرم کی امیدیں لیے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے رب ذوالجلال نے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جس کا کوئی انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔

إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَ
سَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۩ ﴿۱۵﴾ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ
الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿۱۶﴾ فَلَا تَعْلَمُ
نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۷﴾

"ہماری آیات پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جنہیں یہ آیات سنا کر جب نصیحت کی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔ ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں' اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے' اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزاء میں ان کے لیے چھپا رکھا گیا ہے اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے"۔

یہ اہل ایمان کی نہایت ہی خوبصورت اور روشن تصویر ہے۔ یہ نہایت ہی لطیف اور شفاف اور حساس لوگ ہیں۔ ان کے دل خوف خدا سے کانپتے ہیں اور وہ نہایت ہی پر امید انداز سے اس کی اطاعت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی بندگی کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ نہ وہ اللہ کے مقابلے میں بڑائی اور تکبر کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ ہی دراصل اللہ کی آیات پر ایمان لانے والے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کی آیات کو تیز احساس' بیدار دل اور روشن ضمیر کے ساتھ لیتے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو اللہ کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو یہ سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

اذا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا (۳۲:۱۵) اس لیے کہ وہ اللہ کی آیات سے بہت ہی متاثر ہو جاتے ہیں۔ وہ اللہ کی باتیں سن کر اللہ اور اس کی آیات کی تعظیم کرتے ہوئے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں یہ احساس کرتے ہوئے کہ اللہ اور اس کی آیات کی عظمت کا اظہار صرف سجدہ ریز ہو کر ہی کیا جا سکتا ہے اور اپنی پیشانی کو خاک آلود کرنے ہی سے اس کا اظہار ہو سکتا ہے۔

وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (۳۲:۱۵) "اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں"۔

یعنی جسمانی اعتبار سے وہ سجدہ کرتے ہیں اور زبان کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔

وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ (۳۲ : ۱۵) "اور وہ تکبر نہیں کرتے"۔ کیونکہ وہ مطیع فرمان ہو کر' اللہ کی طرف رجوع کر کے' اللہ کی کبریائی کا شعور رکھتے ہوئے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

اب ذرا ان کی جسمانی شکل و ہیئت کی تصویر دیکھئے' انداز تعبیر اس طرح ہے کہ ان کی قلبی' روحانی اور ذہنی کیفیت مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا (۳۲ : ۱۶) "ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں۔ اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں"۔ یہ لوگ رات کو نماز کے لیے اٹھتے ہیں یعنی عشاء کی آخری نماز کے لیے۔ وتروں کے لیے' تہجد کے لیے اور رات کو دعاؤں کے لیے۔ لیکن قرآن نے ان امور کو اس انداز سے بیان کیا : ان کی پیٹھیں ان کے بستروں سے الگ رہتی ہیں۔ رات کے وقت بستروں کی تصویر کشی یوں کی جاتی ہے کہ انسان اس راحت' آرام' نیند اور دوسری لذتوں کو بڑی مشکل سے چھوڑتا ہے۔ لیکن ان کی پیٹھیں' نرم بستروں' آرام اور نیند اور عیش کے مقابلے میں دوسرا کام رکھتی ہیں۔ ان کا اپنے رب کے ساتھ کام ہوتا ہے۔ ان کو خیال ہوتا ہے کہ ان کو ایک دن رب کے ہاں حاضر ہوتا ہے اور وہ خوف و رجاء کے درمیان اللہ کی طرف متوجہ ہیں۔ خوف ان کو اللہ کے عذاب کا ہوتا ہے اور امید اللہ کی رحمت کی ہوتی ہے۔ خوف اللہ کے غضب کا ہوتا ہے اور امید اللہ کی رضامندی کی ہوتی ہے۔ خوف اللہ کی معصیت کا ہوتا ہے اور امید اس کی توفیق اطاعت کی ہوتی ہے۔ ان تمام امور کو قرآن کریم نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ نہایت ہی مجسم انداز میں۔

يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا (۳۲ : ۱۶) "اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں"۔ اس حساسیت اور لچک' خضوع و خشوع کے ساتھ نماز اور گڑگڑا کر دعا کرنے کے علاوہ اپنی سوسائٹی کی بھلائی کے لئے بھی فکر مند ہوتے ہیں اور اللہ کو راضی کرتے ہوئے وہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ (۳۲ : ۱۶) "اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں"۔

ان بلند' روشن' حساس اور مشفق صورتوں کے ساتھ اللہ کا معاملہ بھی بہت مشفقانہ ہے اور نہایت ہی منفرد قسم کی جزاء ان کے لیے تیار ہے۔ وہ جزاء جس کے اندر ان کے لیے خاص مہربانی جھلکتی ہے۔ ان کے لیے ایک خاص اعزاز کا اعلان ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سے ان پر کرم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے بلند نفوس کے لیے کیا خصوصی اور مخفی مہربانیاں اور تعلقات رکھتے ہیں۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۳۲ : ۱۷)

"پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزاء میں ان کے لیے چھپا رکھا گیا ہے اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے"۔

یہ ایک عجیب انداز تعبیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ خفیہ تعلق ہوتا ہے اور اللہ نے بذات خود اپنے دوستوں کے لیے تحفے تیار کر رکھے ہیں' ان کو خفیہ رکھا ہے اور اللہ نے ان کے بارے میں کسی کو کوئی اطلاع بھی نہیں دی تاکہ ان کو قیامت کے دن اچانک ظاہر کیا جائے۔ اب یہ ہونے والی ملاقات کس قدر باعث احترام ہے' کس قدر اس کا انتظار ہے اور کس قدر شاندار ہے کہ اس میں اللہ اپنے دوستوں میں نادیدہ تحفے تقسیم کریں گے جو تیار ہو چکے ہیں اور اللہ اپنی موجودگی میں یہ تحفے تقسیم کریں گے۔

سبحان اللہ! اپنے بندوں پر اللہ کے کیا کرم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کس طرح ان کو اپنے فضل و کرم سے نوازتا ہے۔ ان کا عمل جو بھی ہو' ان کی عبادت جو بھی ہو' اور ان کی اطاعت جس قدر بھی ہو' بہرحال اللہ تعالیٰ نے خود ان کے لیے بعض تحفے تیار کر رکھے ہیں۔ نہایت اہتمام' رعایت اکرم اور شفقت کے ساتھ۔ یہ اللہ کا فضل و کرم ہے اور وہ بہت ہی فضل و کرم کرنے والا ہے۔

پھر دوبارہ اس اجمال کی تفصیل دی جاتی ہے۔ ذلیل شدہ مجرمین کے انجام کے مقابلے میں مومنین کا بہترین انجام ذرا مفصلاً بیان ہوتا ہے کہ اللہ مومنین کو کس قدر منصفانہ جزاء ان کے اعمال کی دے گا۔ وہ مومنین اور مجرمین کے انجام میں دنیا اور آخرت دونوں میں فرق کرے گا یعنی خفیہ تحفوں کے علاوہ ان کے اعمال کا بھی پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۚ لَا يَسْتَوُونَ ﴿١٨﴾ أَمَّا الَّذِينَ
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ جَنَّاتُ الْمَأْوَىٰ نُزُلًا بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾ وَأَمَّا
الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۖ كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَ
قِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ﴿٢٠﴾ وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ
۲ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٢١﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ
اا ع مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا ۚ إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنْتَقِمُونَ ﴿٢٢﴾
۱۵

"بھلا کہیں یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص مومن ہو' وہ اس شخص کی طرح ہو جائے جو فاسق ہو؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کے لیے تو جنتوں کی قیام گاہیں ہیں' ضیافت کے طور پر ان کے اعمال کے بدلے میں۔ اور جنہوں نے فسق اختیار کیا ہے' ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ جب بھی وہ اس سے نکلنا چاہیں گے اسی میں دھکیل دیئے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ چکھو اب اسی آگ کے عذاب کا مزا جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔ اس بڑے عذاب سے پہلے ہم اسی دنیا میں (کسی نہ کسی چھوٹے) عذاب کا مزا انہیں چکھاتے رہیں گے' شاید

کہ یہ (اپنی باغیانہ روش سے) باز آجائیں - اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جسے اس کے رب کی آیات کے ذریعہ سے نصیحت کی جائے اور پھر وہ ان سے منہ پھیر لے - ایسے مجرموں سے تو ہم انتقام لے کر رہیں گے"۔

مومنین اور فاسقین' مزاج' شعور اور طرز عمل کسی چیز میں برابر نہیں ہوتے کہ وہ دنیا و آخرت کی جزاء میں برابر ہو جائیں - مومن کی فطرت سیدھی' سلیم ہوتی ہے اور وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں - وہ اللہ کے سیدھے راستے اور سیدھے نظام کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اور فاسق منحرف' بے راہ رو' مفسد فی الارض ' اور اللہ کے سیدھے راستے پر چلنے والے نہیں ہوتے اور نہ اسلامی نظام اور اسلامی قانون کے مطابق زندگی گزارتے ہیں - لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ مومن اور فاسق ایک جیسی زندگی بسر نہ کریں اور ان کی زندگی کا انجام ایک نہ ہو' دنیا اور آخرت میں - اور ان میں سے ہر ایک کو دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے کیے کے مطابق جزاء و سزا ملے گی۔

اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى (۳۲:۱۹) "جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے' ان کے لیے تو جنتوں کی قیام گاہیں ہیں" - یہ ان قیام گاہوں میں فروکش ہوں گے اور یہ قیام گاہیں ان کو اپنے اندر لے لیں گی - یہ ان کے لیے اچھی منزلیں ہوں گی اور ان منازل میں وہ رہیں گے اور یہ بطور جزاء ہوں گی ان کے اعمال حسنہ پر۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰهُمُ النَّارُ (۳۲:۲۰) "اور جنہوں نے فسق اختیار کیا ہے ان کا ٹھکانا دوزخ ہے - وہ اس کی طرف لوٹیں گے اور وہ وہاں سر چھپائیں گے - کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔

كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا (۳۲:۲۰) "جب کبھی نکلنا چاہیں گے اس میں دھکیل دیئے جائیں" - یہ ایک ایسا منظر ہے جس میں بھرپور دوڑ دھوپ ہے - لوگ بھاگ رہے ہیں اور انہیں پکڑ پکڑ کر دوبارہ دوزخ میں ڈالا جا رہا ہے۔

وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۳۲:۲۰) "اور ان سے کہا جائے گا کہ چکھو اب اسی آگ کے عذاب کا مزہ جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے" - یہ ان کی سرزنش ہے - ان کو زیادہ ذلیل کرنے اور زیادہ سزا دینے کے لیے۔

یہ ہے آخرت میں انجام فاسق لوگوں کا - لیکن ان کو قیامت کے عذاب کے آنے تک مہلت نہیں دے دی گئی - ان کو قیامت سے پہلے اس جہاں میں بھی عذاب کی دھمکی دی جاتی ہے۔

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ

(۳۲:۲۱) "اس بڑے عذاب سے پہلے ہم اسی دنیا میں (کسی نہ کسی چھوٹے) عذاب کا مزا انہیں چکھاتے رہیں گے' شاید کہ یہ (اپنی باغیانہ روش سے) باز آجائیں"۔

لیکن ان چھوٹے موٹے عذابوں کی تہہ میں بھی دراصل اللہ کی رحمت پوشیدہ ہے - اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں

فرماتے کہ اپنے بندوں کو بہرحال عذاب دیں ۔ اگر وہ عذاب کے مستحق نہ ہوں ۔ اگر وہ عذاب کے معصیات پر اصرار نہ کریں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرا چھوٹا موٹا عذاب جو بندوں پر آتا رہتا ہے وہ بھی انہیں متنبہ کرنے کے لیے آتا ہے کہ شاید وہ لوٹ آئیں ۔ ان کی فطرت جاگ اٹھے اور یہ عذاب انہیں راہ راست پر لے آئے ۔ اور اگر وہ باز آ جائیں تو وہ اس عذاب اکبر سے بچ جائیں جو ابھی ان کے سامنے گذشتہ منظر میں پیش کر دیا گیا ہے ۔ اگر ان کو رب تعالیٰ کی آیات کی یاد دہانی کی گئی اور انہوں نے ان سے اعراض کیا اور اس کی وجہ سے ان پر معمولی عذاب آ گیا اور پھر انہوں نے عبرت حاصل نہ کی اور اپنی روش سے نہ لوٹے تو اب یہ ظالم ہیں ۔

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا (۳۲ : ۲۲) "اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جسے ہماری آیات سنائی گئیں اور پھر وہ اس دن ان سے منہ پھیر لے" ۔ لہٰذا ایسے لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان سے انتقام لیا جائے ۔

اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ (۳۲ : ۲۲) "ایسے مجرموں سے تو ہم انتقام لے کر رہیں گے" ۔ یہ ایک خوفناک تہدید ہے کہ اللہ جبار اور متکبر یہ دھمکی دے رہا ہے اور وہ اعلان کرتا ہے کہ ایسے مجرموں سے میں انتقام لوں گا ۔ اللہ کے مقابلے میں یہ بیچارے ضعیف کر بھی کیا سکیں گے ۔ واو رے اللہ کا انتقام!

یہ سبق اب مجرمین اور صالحین ' مومنین اور فاسقین کے انجام پر ختم ہوتا ہے ۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کا انجام مناظر قیامت کی شکل میں ہے ۔ جس کے وقوع میں یہ لوگ شک کرتے تھے ۔ اس کے بعد سیاق کلام میں ایک نظر حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کے حالات پر ڈالی جاتی ہے ۔ حضرت موسیٰ کو کتاب دی گئی تھی کہ بنی اسرائیل کے لیے کتاب ہدایت ہو جیسا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن دیا گیا ہے کہ یہ مومنین کے لیے ہدایت ہو ۔ صاحب قرآن اور صاحب تورات ایک ہی نظریہ حیات پر متفق ہیں اور جس طرح حضرت موسیٰ کے متبعین نے صبر و ثبات سے کام لیا اور ان کو ائمہ ہدایت بنایا گیا تھا اس طرح اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی اگر صبر و ثبات سے کام لیں تو وہ بھی امامت کے مستحق ہوں گے امامت کی مستحق امت کی صفات کیا ہوتی ہیں ۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝۲۳ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۣ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ۝۲۴ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۲۵

"اس سے پہلے ہم موسیٰ کو کتاب دے چکے ہیں ' لہٰذا اسی چیز کے ملنے پر تمہیں کوئی شک نہ ہونا چاہیے ۔ اس کتاب کو ہم نے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا تھا ' اور جب انہوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ان کے اندر

ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے ۔ یقیناً تیرا رب ہی قیامت کے روز ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں (بنی اسرائیل ) باہم اختلاف کرتے رہے ہیں ۔

فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَائِهِ ( ۲۳:۳۲ ) "لہٰذا اس چیز کے ملنے پر تمہیں کوئی شک نہ ہونا چاہئے"۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حق آپ کو دیا گیا ہے آپ اس پر ثابت قدم رہیں ۔ یہی کافی ہے جو حضرت موسیٰ کو دی گئی تھی اور ان دو رسولوں کی دو کتابوں میں یہی سچائی تھی ۔ یہ تفسیر اس تفسیر سے زیادہ اچھی ہے جو بعض مفسرین نے بیان کی ہے کہ اس آیت میں اشارہ اس طرف ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج میں حضرت موسیٰ سے ملے تھے ۔ غرض حضرت موسیٰ سے ملنے کے مقابلے میں اس سچائی کا ملنا زیادہ احسن ہے جو حضرت موسیٰ کو بھی ملی تھی اور دونوں رسول ایک ہی حق اور ایک ہی سچائی پر باہم مل گئے اور اس بات کا ذکر یہاں موزوں ہے ۔ یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ اس میں ان مصائب و شدائد کی طرف اشارہ ہے جو رسول اللہ اور مسلمان مخالفین کے ہاتھوں جھیل رہے تھے ۔ رسول اللہ کی تکذیب ہو رہی تھی اور کفار اعراض کر رہے تھے' اس لیے یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ ثابت قدم رہو اور بعد کی آیات بھی اسی کی طرف اشارہ کر رہی ہیں ۔

وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ

( ۲۴:۳۲ ) "اور جب انہوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر ایمان لاتے رہے تو ان کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے راہنمائی کرتے تھے"۔ یہاں مکہ میں چھوٹی سی مومن جماعت کو یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ تم اسی طرح صبر کرو جس طرح موسیٰ کے مختار مومنین نے صبر کیا اور جس طرح ان میں سے امام پیدا کیے گئے جو اللہ کی شریعت کے مطابق حکمرانی کرتے تھے' تم میں سے بھی ایسے امام پیدا ہوں گے جو اسلامی شریعت کے مطابق حکمرانی کریں گے بشرطیکہ صبر کیا اور یقین کیا ۔ رہا یہ سوال کہ بنی اسرائیل نے بعد کے ادوار میں اختلاف کیا تو وہ اللہ کے حوالے ہے ۔ وہی ان اختلافات کے بارے میں فیصلہ کرے گا ۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ( ۲۵:۳۲ ) "یقیناً تیرا رب ہی قیامت کے دن ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ باہم اختلاف کرتے رہے"۔

--- ooo ---

اب سیاق کلام مکذبین مکہ کو ذرا پیچھے انسانی تاریخ کے سامنے کھڑا کرتا ہے کہ ذرا دیدہ عبرت سے دیکھو ۔

اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ۭ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ۝۲۶

"اور کیا ان لوگوں کو (ان تاریخی واقعات میں) کوئی ہدایت نہیں ملی کہ ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں' جن کے رہنے کی جگہوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں؟ اس میں بڑی نشانیاں ہیں 'کیا یہ سنتے نہیں ہیں؟"

تاریخ کی ہلاک شدہ اقوام کے ساتھ جو کچھ ہوا' وہ تمام بعد کے جھٹلانے والوں کے لیے عبرت ہے۔ اللہ کی سنت تو اس جہان میں جاری و ساری ہے اور وہ کسی کی رو رعایت نہیں کرتی۔ یہ انسانیت ترقی اور زوال کے لیے الہی قوانین فطرت کے تابع ہے۔ اس کی کمزوری اور اس کی قوت کا راز الہی قوانین کے اتباع و انکار میں ہے۔ قرآن کریم بار بار اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اقوام کے عروج و زوال کے لیے اللہ نے خصوصی قوانین جاری کر رکھے ہیں اور یہ قوانین مسلسل جاری ہیں اور ماضی کے واقعات اور اقوام ہلاک شدہ کے آثار میں بڑی عبرت ہے۔ اس موضوع پر آزادانہ مطالعہ ہونا چاہئے تاکہ باقی آثار سے لوگوں کے دل بیدار ہوں' ان کے اندر احساس پیدا ہو' اور لوگ اللہ کی پکڑ اور انتقام سے ڈریں کیونکہ اللہ نے بڑے بڑے جباروں کو پکڑا ہے۔ پھر تاریخی واقعات میں سنن الہیہ کے مناظر اور مظاہر ہیں۔ لوگوں کے ادراک اور ان کی اقدار اور انداز قیاس و استنباط کے لیے تاریخی مطالعہ ضروری ہے کیونکہ کوئی قوم زمان و مکان کے کسی گوشے میں گوشہ نشین نہیں ہو سکتی۔ نہ وہ اس نظام کو نظرانداز کر سکتی ہے جس کے مطابق انسانیت کی زندگی کا قافلہ آگے بڑھ رہا ہے اور صدیوں سے تسلسل کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ چونکہ اکثر اقوام نے تاریخ سے سبق نہیں سیکھا' اس لیے وہ نیست و نابود ہوئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہلاک شدہ اقوام کے آثار میں بہت ہی گہرا سبق ہوتا ہے اور یہ سبق بہت ہی خوفناک ہوتا ہے۔ بشرطیکہ دل شعور رکھتا ہو' احساس و بصیرت موجود ہو۔ اگر کوئی اس سبق کو پڑھے تو پڑھنے والے پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ ضمیر کانپ اٹھتا ہے اور دل دہل جاتے ہیں۔ عرب جن کو ان آیات میں پہلی بار خطاب کیا گیا تھا وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی اقوام عاد' ثمود' لوط کے آثار دیکھتے رہتے تھے۔ قرآن کریم ان لوگوں کو ملامت کرتا ہے کہ ان اقوام کے آثار تمہارے سامنے بکھرے پڑے ہیں۔ تم رات اور دن ان پر سے گزرتے ہو' لیکن تمہارے دلوں میں پھر بھی خدا کا خوف پیدا نہیں ہوتا۔ تمہارا شعور بیدار نہیں ہوتا۔ تمہارے احساسات کے اندر روشنی کی چمک پیدا نہیں ہوتی۔ اور تم اس قسم کے انجام ........ سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں کرتے ہو۔ تم ہدایت اخذ نہیں کرتے اور احتیاطی اور انسدادی تدابیر اختیار نہیں کرتے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ (۲۶:۳۲) "اس میں بڑی نشانیاں ہیں کیا یہ سنتے نہیں"۔ ان کو چاہئے کہ ان لوگوں کے جو قصے قرآن کریم پیش کرتا ہے ان کو سنیں اور پھر ان کے انجام پر غور کریں' جبکہ رات اور دن ان لوگوں کے مساکن اور کھنڈرات سے یہ گزرتے ہیں۔ قبل اس کے کہ ڈرانے والے کی بات سچی ہو جائے اور یہ بھی ہلاک ہو جائیں انہیں ہوش میں آجانا چاہیے۔

اس ہلاکت اور تباہی کے منظر کے بعد فکر و احساس کی اس بیداری اور خوف خدا پر ابھارنے اور ڈرانے کے بعد اور ان کے دلوں پر کپکپی طاری کرنے کے بعد ان کو ایک دوسری نشانی کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو اس خوفناک فضا کے بعد بہت ہی خوشگوار منظر ہوتی ہے۔ دیکھو ایک مردہ زمین تمہارے سامنے پڑی ہوتی ہے' خشک سالی سے سوختہ اور ہم اس کی

طرف پانی چلاتے ہیں۔ اس کے اندر زندگی حرکت کرنے لگتی ہے۔ جبکہ اقوام سابقہ کے حالات میں ہم نے پڑھا کہ اس طرح کی سرسبز اور شاداب اراضی کو اللہ بنجر بھی کر دیتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ۚ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

"اور کیا ان لوگوں نے یہ منظر کبھی نہیں دیکھا کہ ہم ایک بے آب و گیاہ زمین کی طرف پانی بہا لاتے ہیں اور پھر اسی زمین سے وہ فصل اگاتے ہیں جس سے ان کے جانوروں کو بھی چارہ ملتا ہے اور یہ خود بھی کھاتے ہیں؟ تو کیا انہیں کچھ نہیں سوجھتا"۔

یہ مردہ زمین ' تباہ حال زمین ' یہ دیکھتے ہیں کہ قدرت خداوندی اس کی طرف پانی چلاتی ہے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ یہی مردہ زمین سرسبز و شاداب ہو کر زندگی سے بھرپور ہو گئی ہے اور لہلہاتی ہے۔ فصلیں اگتی ہیں۔ لوگ بھی کھاتے ہیں اور ان کے مویشی بھی کھاتے ہیں۔ مردہ زمین کا منظر جس پر بارش برستی ہے اور وہ زندہ و تابندہ ہو جاتی ہے۔ یہ منظر دراصل دلوں کے بند دروازوں کو کھولنے کے لیے نہایت ہی موثر منظر ہے۔ دیکھو ہر طرف زندگی اور نباتات کا اگاؤ اور لوگوں اور مویشیوں کی خوشیاں اور ان کا استقبال۔ زندگی کی مٹھاس اور تروتازگی کا شعور۔ پھر اس سرسبز زندگی اور خوبصورت اور تروتازہ ماحول کی خوبصورتی۔ قرب اور محبت کی فضا میں زمزمے ' جن میں اللہ کی قدرت کا جمال ہر طرف نظر آتا ہے اور اس کی صنعت کاریوں کے نمونے جابجا بکھرے پڑے ہیں اور جن سے اس کائنات کے صفحات پر ہر طرف زندگی اور خوبصورتی کے مناظر نظر آتے ہیں۔

یوں قرآن مجید دل انسان کو زندگی کے مختلف نشیب و فراز کی سیر کراتا ہے۔ جہاں زندگی بھی ہے اور نشو و نما بھی ہے اور سرسبزی و شادابی بھی ہے اور اقوام سابقہ کی ہلاکتوں کے میدان اور آثار بھی ہیں۔ ہر جگہ قرآن کریم کی یہ کوشش ہے کہ کسی طرح قلب انسانی کے اندر حرکت پیدا ہو ' وہ جاگے اور اسے اس جہان کے ساتھ الفت پیدا ہو۔ اس جہاں اور اس کی بوقلمونیوں پر سے محض غافل ہو کر نہ گزرے۔ آنکھوں پر سے پردے دور کر دے۔ ان مشاہد اور مناظر قدرت کے اسرار و رموز کو جاننے کی کوشش کرے۔ واقعات سے عبرت حاصل کرے اور تاریخ سے برہان اور دلائل حاصل کرے۔

آخر میں اس طویل سیاحت کے بعد سورہ کا مقطع آتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس عذاب کے آ جانے میں جلدی کرتے ہیں ' جس سے انہیں ڈرایا جاتا ہے۔ دراصل یہ لوگ اس ڈراوے اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی نصیحت کو مشکوک بات سمجھتے ہیں۔ ان کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ جس چیز سے تمہیں ڈرایا جا رہا ہے ' وہ حق ہے اور حقیقت بننے والی ہے۔ اس دن ان کا ایمان ان کو کوئی نفع نہ دے گا۔ اور اس وقت ان سے جو غلطی ہو چکی ہو گی اس کی تلافی ممکن نہ ہو گی۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ ان کو چھوڑ دیا جائے وہ اپنے حتمی انجام تک پہنچنے والے ہیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ

يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَعْرِضْ ۳
عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ع ۸
۱۶

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ "یہ فیصلہ کب ہو گا اگر تم سچے ہو؟" ان سے کہو "فیصلے کے دن ایمان لانا' ان لوگوں کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو گا جنہوں نے کفر کیا ہے اور پھر ان کو کوئی مہلت نہ ملے گی"۔ اچھا' انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور انتظار کرو' یہ بھی منتظر ہیں"۔

فتح دراصل فریقین کے درمیان اختلاف کے فیصلے کو کہا جاتا ہے۔ وہ عذاب جس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ڈرا رہے تھے اس کا آنا بھی فتح ہے۔ یہ لوگ غافل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بہرحال کسی حکمت کی وجہ سے اس کے آنے کی میعاد موخر کی ہوتی ہے۔ وہ اگر سو بار بھی مطالبہ کریں اللہ کا کام اپنے وقت پر ہوتا ہے اور جب وہ آئے گا تو یہ لوگ اس کی مدافعت نہ کر سکیں گے اور اس سے بچ کر نہ نکل سکیں گے۔

قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ (۲۹:۳۲) "ان سے کہو' فیصلے کے دن ایمان لانا ان لوگوں کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو گا جنہوں نے کفر کیا ہے اور پھر ان کی کوئی مہلت نہ ملے گی"۔ خواہ فیصلے کا دن اس دنیا میں ہو۔ اس وقت ان کو دھر لیا جائے گا جبکہ وہ کافر ہوں گے۔ پھر ان کو کوئی مہلت نہ دی جائے گی۔ نہ ان کا ایمان لانا اس وقت نافع ہو گا اور یہ فیصلے کا دن آخرت میں ہو گا۔ اس وقت یہ مہلت طلب کریں گے اور مہلت نہ دی جائے گی۔

یہ جواب اعصاب شکن ہے اور اس سے دل دہل جاتے ہیں اور آخری ضرب ان پر یہ لگائی جاتی ہے۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ (۳۰:۳۲) "انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور انتظار کرو' یہ بھی منتظر ہیں"۔ اس فقرے کی تہ میں دراصل بالواسطہ ایک دھمکی چھپی ہوئی ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دامن جھاڑ لیں اور انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیں تو انجام معلوم ہے۔

اس آخری ضرب پر یہ سورہ ختم ہوتی ہے۔ اس میں طویل مطالعاتی سفر ہے' اشارات و ہدایات ہیں اور قسم قسم کے مشاہدات اور دلائل دیئے گئے ہیں اور قلب انسانی کو ہر پہلو سے متاثر کرنے کی سعی کی گئی ہے اور ہر راستے سے اس کو کھینچ کر ہدایت کی طرف لانے کے لیے حملہ کیا گیا ہے۔

--- ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ---- پنجم

## پارہ ----- ۲۱

## سورۃ الاحزاب ۔ ۳۳

آیات ۱--- تا--- ۲۷

# سورۃ احزاب ایک نظر میں

یہ سورہ جماعت مسلمہ کی سیرت کا ایک حقیقی حصہ ہے۔اس کا تعلق بدر الکبریٰ سے لے کر صلح حدیبیہ سے پہلے کے زمانے کے ساتھ ہے۔یہ اس دور کے مسلمانوں کی حقیقی زندگی کی ایک خوبصورت تصویر کشی ہے۔اس میں اس عرصہ کے بیشتر واقعات بیان ہوئے ہیں۔نیز اس میں اس عہد کے اداروں اور انتظامی معاملات سے بھی بحث کی گئی ہے۔

اس سورہ میں ان واقعات اور ان انتظامی اقدامات کے بارے میں ہدایات بہت کم ہیں۔ہدایات و احکام سورہ کے ایک قلیل ہی حصے میں دیئے گئے ہیں۔ان ہدایات کے ذریعہ واقعات اور انتظامی معاملات کو اسلام کی بنیادوں سے مربوط کیا گیا ہے یعنی اللہ پر ایمان لانا اور اللہ کے نظام قضا و قدر پر ایمان لانا مثلاً سورہ کا آغاز یوں ہے :

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۱) وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۲) وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (۳) مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ (۳۳ : ٤) "اے نبیؐ اللہ سے ڈرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو۔حقیقت میں علیم و خبیر تو اللہ ہی ہے۔پیروی کرو اس چیز کی جس کا اشارہ تمہارے رب کی طرف سے تمہیں کیا جا رہا ہے' اللہ ہر اس بات سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو' اللہ پر توکل کرو' اللہ ہی وکیل ہونے کے لیے کافی ہے۔۔۔ اللہ نے کسی شخص کے دھڑ میں دو دل نہیں رکھے"۔

اسی طرح سورہ کے آغاز میں بعض انتظامی امور پر ایک تبصرہ آیا ہے :

كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا (۳۳ : ٦) وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (۳۳ : ۷) لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا

"یہ حکم کتاب الٰہی میں لکھا ہوا ہے اور اے نبی یاد رکھو اس عہد و پیمان کو جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا' تم بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی' سب سے ہم پختہ عہد لے چکے ہیں تاکہ سچے لوگوں سے ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے اور کافروں کے لیے تو اس نے دردناک عذاب مہیا کر ہی رکھا ہے"۔ اور پھر جنگ احزاب کے موقعہ پر مدینہ میں افواہیں پھیلانے والوں پر تبصرہ ہوا ہے' یاد رہے کہ یہ سورہ اسی نام سے احزاب کہلائی ہے۔

قُلْ لَّنْ یَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَ اِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا (۳۳:۱۶) قُلْ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً وَ لَا یَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا (۳۳:۱۷) "اے نبی' ان سے کہو اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمہارے لیے کچھ نفع بخش نہ ہو گا۔ اس کے بعد زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی موقعہ تمہیں مل سکے گا۔ ان سے کہو کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکتا ہو۔ اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر تم پر مہربانی کرنا چاہے۔ اللہ کے مقابلے میں تو یہ لوگ کوئی حامی و مددگار نہیں پا سکتے"۔ مثلاً بعض ایسے انتظامی امور پر تبصرہ' یہ انتظامی امور ان کے زمانہ جاہلیت میں جاری طریقے کے خلاف تھے اور ان کی جاہلی ذہنیت کے بھی خلاف تھے۔

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ یَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا (۳۳:۳۶) "کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے خود اپنے معاملے کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہو"۔ اور آخر میں وہ عظیم تبصرہ:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۳۳:۷۲) "ہم نے اس امانت کو آسمان اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھا لیا' بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے"۔

تحریک اسلامی اور اسلامی سوسائٹی اس دور میں ایک خاص خصوصیت رکھتی تھی۔ اس دور میں اسلامی سوسائٹی اور اسلامی مملکت کے خدوخال ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن یہ خدوخال اور اسلامی مملکت ابھی مستحکم نہ ہوئے تھے' جس طرح فتح مکہ کے بعد اسلامی سوسائٹی اور اسلامی مملکت مستحکم ہو گئی تھی اور لوگ فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہو رہے تھے اور تمام اختیارات اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کو حاصل ہو گئے تھے۔

اس سورہ میں اسلامی سوسائٹی کو از سرنو منظم کرنے کی سعی کی گئی ہے اور جدید اقدامات کو اسلامی معاشرے اور اسلامی حکومت میں مستحکم کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ بتایا گیا کہ اسلامی نظام میں نظریہ حیات کیا ہے اور اسلامی مملکت کا دستوری نظام کیا ہو گا۔ بعض جاہلانہ رسومات اور رواجات اور قوانین کے اندر تبدیلیاں کی گئیں اور ان امور کو اسلامی تصور حیات اور اسلامی دستوری نظام کے مطابق ڈھالا گیا۔

ان معاشی 'معاشرتی اور دستوری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ غزوۂ احزاب پر بھی تبصرہ کیا گیا۔ اور غزوۂ بنی قریظہ اور اس کے بارے میں کفار 'منافقین اور یہودیوں کے موقف کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ لوگ اسلامی صفوں کے اندر جس طرح سازشیں کر رہے تھے اس کا بھی تذکرہ ہے اور ان سازشوں کی وجہ سے اسلامی سوسائٹی میں جو بے چینی پیدا ہوئی تھی اس کا بھی تذکرہ ہے۔ اس طرح وہ مسلمانوں کے اخلاق آداب' ان کی بیویوں اور ان کے گھروں کے بارے میں جو سازشیں کرتے تھے اس پر بھی تبصرے ہیں۔

اس سورہ میں بیان کردہ اخلاقی 'تنظیمی اور قانونی اور دستوری اصلاحات اور ان دو غزوات کے واقعات کے درمیان مابہ الاشتراک کیا ہے کہ ان معاملات کے بارے میں کافر' یہودی اور منافقین ایک خاص موقف رکھتے تھے۔ یعنی اسلامی سوسائٹی کے خلاف مخالفین کی سازشوں کا جواب 'یہ لوگ اس جدید اسلامی سوسائٹی اور مملکت کے اندر بے چینی پیدا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ اگر کسی جنگی حملے کا موقعہ ہوتا تو وہ بھی کرتے۔ اگر افواہیں پھیلانی ہوتیں تو بھی پھیلاتے۔ اگر لوگوں کو بددل کر کے شکست پر آمادہ کرنے کے مواقع ہوتے تو یہ بھی کرتے۔ اگر کوئی جدید اسلامی اخلاقیات میں سے کوئی بات جاری ہوتی تو یہ اس پر بھی معترض ہوتے۔ پھر غزوات کی وجہ سے جو اموال غنیمت آتے تھے اور اسلامی سوسائٹی کے جو حالات بدل رہے تھے تو اس کی وجہ سے بھی بعض معاشی روابط بدل رہے تھے۔ جدید اسلامی خطوط پر نئے اجتماعی روابط اور ادارے قائم ہو رہے تھے۔ لہذا اس پہلو سے یہ تمام متفرق اصلاحات باہم مربوط ہو جاتی ہیں اور سورہ کا مضمون ایک وحدت بن جاتا ہے۔ اگرچہ موضوعات بظاہر متنوع ہیں لیکن جن متنوع اختلافات مابہ الاشتراک میں واقعات پر تبصرہ ہے' وہ ایک ہی دور سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے سورہ کے مضامین باہم مربوط ہیں۔

--- ooo ---

آغاز یوں ہوتا ہے کہ اے پیغمبر آپ اللہ سے ڈریں۔ کافرین 'منافقین کی اطاعت نہ کریں۔ آپ پر جو وحی اللہ کی طرف سے آتی ہے اسی کا اتباع کریں اور اللہ پر توکل کریں۔ اس سورہ میں جو واقعات' جو انتظامی اصلاحات جو قانونی اور دستوری دفعات' جو اخلاقی اور معاشی آداب ہیں ان میں آپ صرف قرآن اور وحی کا اتباع کریں۔ سب سے بڑا اللہ ہے۔ اللہ کے ارادے اور ہدایت ہی کا اتباع کیا جائے۔ اللہ ہی کے نظام کو اختیار کیا جائے۔ اس پر توکل کیا جائے اور کفار اور منافقین سے اب مشورے نہ لیے جائیں اور اللہ کی نصرت پر بھروسہ کریں یہ لوگ آپ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔

اب اس کے بعد بعض اجتماعی رسم و رواج کے اندر اصلاحات کر کے اسلام کا کلمہ حق بتایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہا جاتا ہے کہ تمام اداروں کا اخذ اب خدا سے ہو گا۔ انسان بیک وقت اپنے اندر دو دل نہیں رکھ سکتا۔ اس کے دو قبلے نہیں ہو سکتے۔ نہ دو مختلف نظاموں کو بیک وقت چلایا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو وہ منافق ہو جائے گا۔ اس کے اقدامات میں اضطراب ہو گا۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ (۳۳ : ۴) "اللہ نے کسی کے دھڑ میں دو دل نہیں رکھے"۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ وہ ایک الٰہ' ایک عقیدہ اور ایک نظام کی طرف متوجہ ہو اور اب مسلمانوں کو چاہئے کہ تمام جاہلی اطوار' عادات' رسم و رواج اور قوانین کو یکلخت چھوڑ دیں۔

پہلی اصلاح قانون ظہار میں کی گئی۔ مثلاً جاہلیت میں کوئی اپنی بیوی کو کہتا کہ وہ میرے لیے میری ماں کی پیٹھ (ظہر) کی طرح ہے تو یہ عورت اس پر ماں کی طرح تا ابد حرام ہو جاتی تھی۔

وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ (۳۳ : ۴) "اللہ نے ان بیویوں کو تمہاری ماں نہیں بنایا ہے جن سے تم ظہار کرتے ہو"۔ یہ ایک بات ہے جو تم اپنی زبان سے کہتے ہو اور یہ بیوی کو ماں نہیں بنا دیتی۔ ان الفاظ کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بیوی' بیوی ہی رہتی ہے' اس کلام کی وجہ سے ماں نہیں بن جاتی۔ اسی طرح متبنی بنانے اور اس پر جو آثار مرتب ہوتے تھے ان کو بھی لپیٹ کر رکھ دیا گیا۔

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ (۳۳ : ۴) "اور اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو حقیقی بیٹا نہیں بنایا"۔ لہٰذا آج کے بعد اس قسم کے تعلق کے ذریعے ان کے درمیان وراثت جاری نہ ہوگی۔ اور نہ دوسرے آثار حرمت ان کے درمیان پیدا ہوں گے۔ تفصیلات کا انتظار کریں۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آیندہ تمام اہل ایمان کے ولی ہوں گے اور یہ ولایت ان کی خود اپنے اختیارات ذاتی سے بھی برتر ہوگی اور نبی کی بیویاں آج کے بعد تمام اہل ایمان کی مائیں ہیں۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ (۳۳ : ۶) "بلاشبہ نبی تو اہل ایمان کے لیے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہے اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں"۔ اس کے بعد اسلام کے ابتدائی دنوں میں مہاجرین اور انصار کے درمیان جو مواخات قائم کی گئی تھی اور ان کے درمیان وراثت کے حقوق تھے' ان کو ختم کر دیا گیا اور اب وراثت اپنے نسبی قریبی رشتہ داروں کے درمیان محدود کر دی گئی۔

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ

(۳۳ : ۶) "کتاب اللہ کی رو سے عام مومنین اور مہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے سے زیادہ حقدار ہیں"۔ یوں اسلامی سوسائٹی کے قانون نظام کو معقول اور طبعی بنیادوں پر استوار کیا جاتا ہے اور جو جاہلی رسوم تھیں یا وقتی انتظامات تھے' ان کو ختم کر دیا گیا۔

یہ نیا انتظام جو اسلام اور اللہ کے احکام پر مبنی تھا' اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی قدیم کتاب میں درج شدہ ہے۔ اور یہ اس عہد کے مطابق ہے جو تمام انبیاء سے لیا گیا تھا۔ خصوصاً انبیاء میں سے اولوالعزم نبیوں سے لیا گیا تھا۔ یہ قرآن کا مخصوص انداز ہے کہ وہ قانون سازی کرنے کے بعد اس پر تبصرہ کر کے ہدایات بھی دیتا ہے تاکہ وہ نیا قانون لوگوں کے ایمان اور ضمیر کا حصہ بن جائے۔ یہ تھا خلاصہ پہلے سبق کا۔

دوسرے سبق میں یہ بتایا گیا ہے کہ مومنین پر اللہ کا کس قدر رحم و کرم ہے کہ اس نے حملہ آور جماعتوں کی سازشوں کو رد فرمایا۔ اس کے بعد جنگ احزاب اور جنگ بنو قریظہ کے واقعات کی تصویر کشی کی جاتی ہے اور یہ تصویر کشی پے درپے مناظر کی شکل میں ہے۔ ان کے اندرونی احساسات کو کاغذ پر منقش کر دیا جاتا ہے۔ ان کی ظاہری دوڑ دھوپ اور افراد و جماعتوں کے مکالمات بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔ ان معرکوں کے واقعات کے بیان کے درمیان جابجا تبصرے بھی آتے ہیں اور واقعات سے قرآن کریم تھوڑی قدر میں اخذ کر کے ان کو آئندہ زندگی کے لیے راہنما بناتا ہے۔ یعنی ان واقعات سے جو عہد ہوئے اور ان باتوں سے جو لوگوں کے دلوں اور ضمیروں میں پیدا ہوئیں۔

قرآن کریم کا انداز ہی ایسا ہے کہ وہ واقعات پر تبصرہ کر کے اہل ایمان کے نفوس کی تربیت کرتا ہے۔ اقدار اور پیمانے وضع کرتا ہے اور ان کے دل و دماغ میں ایسے تصورات وضع کرتا ہے جو ان کے لیے آئندہ فکری اساس ہوں۔ قرآن کا انداز بیان یوں ہے کہ وہ واقعہ بیان کرتا ہے جو عملاً ہوا۔ اس کے بارے میں لوگوں کے خیالات' اور اندرونی سوچ بیان کرتا ہے اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کے بعد اہل ایمان کو اس واقعہ کی حکمت بتائی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس پر نقد و تبصرہ کیا جاتا ہے کہ اس کا اچھا پہلو کیا تھا اور برا کیا تھا۔ کس نے راہ صواب اختیار کیا اور کون غلطی پر تھا۔ اس کے بعد غلطیوں کا ازالہ کیا جاتا ہے اور اس کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔ پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ جو ہو گیا سو ہو گیا اللہ کے ہاں مقرر یوں ہی تھا۔ یوں تمام معاملات کو اللہ کی مشیت اور قانون فطرت کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہے۔

چنانچہ اس معرکے کے بیان کا آغاز یوں ہوتا ہے :

يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُودٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَّجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا (۳۳ : ۹) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یاد کرو اللہ کے احسان کو جو اس نے تم پر کیا ہے جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں' اللہ سب کچھ دیکھ رہا تھا"۔ اور ان واقعات کے درمیان یہ تبصرے

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُونَ اِلَّا قَلِيلًا (۳۳ : ۱٦) قُلْ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِّنْ دُونِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيرًا (۳۳ : ۱۷) "اے نبی' ان سے کہو اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمہارے لیے کچھ بھی نفع بخش نہ ہو گا۔ اس کے بعد زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی موقعہ تمہیں مل سکے گا۔ ان سے کہو کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکتا ہے۔ وہ اگر تمہیں نقصان پہنچانا چاہے اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر تم پر مہربانی کرنا چاہے۔ اللہ کے مقابلے میں تو یہ لوگ کوئی حامی و مددگار نہیں پا سکتے"۔ اور دوسرا تبصرہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا (۳۳: ۲۱) "درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ تھا۔ اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے"۔ اور خاتمہ اس پر ہوتا ہے:

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۳۳: ۲۴) "تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کی جزاء دے اور منافقوں کو چاہے تو سزا دے اور چاہے تو ان کی توبہ قبول کرلے، بے شک اللہ غفور و رحیم ہے"۔

اس کے ساتھ ساتھ اس جنگ کے بارے میں مومنین صادقین کا موقف، ان کے تصورات اور منافقین کا موقف ان کے تصورات اور احساسات بھی یہاں پیش کیے گئے تاکہ مسلمانوں پر سچی قدریں اور کھوٹی قدریں اچھی طرح واضح ہو جائیں۔

وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا (۳۳: ۱۲) "یاد کرو جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا، صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کیے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے"۔ اور دوسری طرف

وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا (۳۳: ۲۲) "جب مومنین نے احزاب کو دیکھا تو پکار اٹھے۔ یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی۔ اس واقعہ نے ان کے ایمان اور ان کی سپردگی کو اور بڑھا دیا"۔ اس کے بعد اس کا فیصلہ کن انجام یقینی الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔

وَ رَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا وَ كَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ وَ كَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا (۳۳: ۲۵) "اللہ نے کفار کا منہ پھیر دیا۔ وہ کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر اپنے دل کی جلن لیے یونہی پلٹ گئے اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی جنگ کرنے کے لیے کافی ہو گیا، اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے"۔

اس کے بعد ازواج مطہرات کو اختیار دینے کا مشہور واقعہ ہے کہ جب مسلمانوں پر ہر طرف سے اموال غنیمت آنے شروع ہو گئے تو انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر نان و نفقہ کا مطالبہ شروع کر دیا۔ یہ اموال غزوہ بنی قریظہ کے ذریعے اور اس سے قبل کے اموال غنیمت کے ذریعہ مسلمانوں کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ ازواج مطہرات کو دو باتوں کے درمیان میں سے ایک کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا یا تو وہ دنیا کی زیب و زینت اور عیش و عشرت کی زندگی

اختیار کرلیں اور یا اللہ اور رسول اور آخرت کو اختیار کرلیں۔ چنانچہ انہوں نے اللہ ' رسول اور آخرت کو اختیار کر لیا۔ تم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کے مقام محترم کو چن لیا اور زندگی کے عیش اور عشرت کو ترک کر دیا۔ اس کے بعد اعلان کر دیا گیا کہ جس طرح تم نے اللہ و رسول اور آخرت کو اختیار کیا ہے تو تمہاری جزائے بھی عظیم ہوگی اور اگر تم نے گناہ اور فحاشی اور دنیا پرستی کو اختیار کیا تو تمہارے لیے سزا بھی دوسرے لوگوں سے زیادہ ہوگی۔ اور یہ اس لیے کہ تم نبی کریم کی عظیم ازواج ہو اور تمہارے گھروں میں قرآن نازل ہو رہا ہے اور اس کی تلاوت ہو رہی ہے۔ وہ رات اور دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکمت بھرے وعظ سن رہی ہیں۔ اس کے بعد تمام مومنین و مومنات کی جزائے اخروی کو بیان کر دیا جاتا ہے۔ یہ تیسرا سبق تھا۔

چوتھا سبق آپ کی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش کے بارے میں ہے۔ یہ قریشی اور ہاشمی النسب تھیں۔ ان کا نکاح آپ کے آزاد کردہ غلام زید ابن حارثہ سے ہوا تھا۔ اس کے بارے میں یہ حکم ہوا تھا۔ مومنین اور مومنات کے معاملات کا اختیار اللہ کو ہے۔ اب ان کا اپنے بارے میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ نہ وہ اللہ اور رسول کے فیصلوں کے بعد کوئی اختیار رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کا ارادہ ہے جو تمام معاملات کو چلاتا ہے اور مومنین کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے بارے میں سر تسلیم خم کر دیں۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَّكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ

مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِينًا (۳۳:۳۶) "کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے میں فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا"۔ یہ تو تھا زینب کے نکاح کا معاملہ۔

اب نکاح کے بعد ان کے درمیان طلاق ہو گئی۔ طلاق کے بعد متبنی بنانے کے قانون کو منسوخ کر دیا گیا۔ اس کے بارے میں پہلے بات ہو چکی ہے اور یہ قانون پہلے ہی منسوخ ہو چکا تھا۔ یہ قانون عرب معاشرے میں چونکہ جڑیں پکڑ گیا تھا' اس لیے اللہ نے اس کے اجراء کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کو چنا۔ چنانچہ اس سلسلے میں خود رسول اللہ کو آزمائش میں ڈالا گیا تاکہ آپ خود اس بات کو اپنے اوپر نافذ کریں اور یہ نیا اصول عربی معاشرے میں قائم ہو جائے اور سابقہ جاہلی قانون کا قلع قمع کر دیا جائے۔

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِيٓ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ

اللّٰهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشٰهُ فَلَمَّا

قَضَى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ

ادعیاۗئِہِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْہُنَّ وَطَرًا وَ کَانَ اَمْرُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا (۳۳: ۳۷) "پھر جب زید اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس کا تم سے نکاح کر دیا تاکہ مومنین پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ رہے ' جبکہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہئے"۔ اس مناسبت سے یہاں حضور اکرمؐ اور مومنین کے باہم تعلق کے بارے میں ہی بات ہو جاتی ہے۔

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَ لٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ

(۳۳: ۴۰) "محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے"۔ اس سبق کا خاتمہ رسول اللہؐ اور مومنین کے نام اس ہدایت کے اجراء سے ہوتا ہے :

وَ لَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ دَعْ اَذٰىہُمْ وَ تَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ

وَکِیْلًا (۳۳: ۴۸) "اور ہرگز اطاعت نہ کرو کفار اور منافقین کی 'کوئی پرواہ نہ کرو ان کی اذیت رسانی کی اور بھروسہ کر لو اللہ پر۔ اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ اپنے معاملات اس کے سپرد کیے جائیں"۔

پانچویں سبق میں ان طلاق شدہ عورتوں کے مسائل ہیں جن کی رخصتی نہ ہوئی ہو۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عائلی زندگی کے بارے میں کچھ احکام ہیں 'کہ کون سی عورتیں آپؐ پر حرام ہیں اور کون سی حلال ہیں۔ پھر مومنین کا تعلق ازواج مطہرات سے کیا ہے۔ زندگی میں اور آپ کی وفات کے بعد اور یہ کہ ان کا حجاب کن کن سے ہو گا۔ باپ' بیٹے' بھائیوں' بھتیجوں یا غلاموں کے سوا تمام دوسرے لوگوں سے حجاب ہو گا۔ پھر ان لوگوں کا حکم جو رسول اللہؐ کو آپؐ کی بیویوں اور خاندان کے بارے میں اذیت دیتے ہیں۔ ان پر دنیا و آخرت میں لعنت بھیجی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت منافقین اور کافرین اس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔

اس کے بعد یہ حکم آتا ہے کہ ازواج مطہرات' آپ کی بیٹیاں مومنین کی ازواج اور تمام مومنہ عورتیں اپنی اوڑھنیاں سینوں پر ڈال لیا کریں۔

ذٰلِکَ اَدْنٰۤی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ (۳۳: ۵۹) "تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں"۔

اس کے بعد ان منافقین کو تہدید آمیز تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ اگر مدینہ میں شر و فساد اور افواہیں پھیلانے سے باز نہ آئے تو ہم رسول اللہؐ کو آمادہ کریں گے کہ تم لوگوں کے خلاف وہ کاروائی کریں 'تمہیں نکال دیں جس طرح بنی قینقاع کو نکال دیا۔ بنو نضیر کو نکال دیا۔ یا تمہارا کام ہی تمام کر دیں۔ جس طرح بنی قریظہ کا کام تمام کر دیا۔ یہ سب امور یہ بتاتے ہیں کہ اس دور میں منافقین رات اور دن مدینہ میں اسلام کے خلاف سرگرم تھے اور شرارتیں کرتے تھے۔

آخری سبق لوگوں کے اس سوال کا جواب ہے کہ قیامت کب آئے گی اور اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ اس طرف اشارہ ہے کہ شاید یہ قریب ہی ہو۔ اس کے بعد قیامت کے مناظر میں سے دو منظر پیش کیے جاتے ہیں۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَٰلَيْتَنَآ أَطَعْنَا ٱللَّهَ وَأَطَعْنَا ٱلرَّسُولَا

(۳۳: ۶۶) "جس روز ان کے چہرے آگ پر الٹ پلٹ کیے جائیں گے' اس وقت وہ کہیں گے کہ کاش ہم نے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی ہوتی"۔ وہ اپنے اکابر پر لعنت اور ملامت کریں گے جن کی انہوں نے اطاعت کی اور انہوں نے ان کو گمراہ کیا۔

وَقَالُوا۟ رَبَّنَآ إِنَّآ أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَأَضَلُّونَا ٱلسَّبِيلَا۠ (۳۳: ۶۷) رَبَّنَآ

ءَاتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ ٱلْعَذَابِ وَٱلْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا (۳۳: ۶۸) "اور کہیں گے اے ہمارے رب' ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راہ راست سے بے راہ کر دیا۔ اے رب' ان کو دہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر"۔

سورہ کا خاتمہ نہایت ہی عظیم اور گہرے تبصرے پر ہوتا ہے۔

إِنَّا عَرَضْنَا ٱلْأَمَانَةَ عَلَى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَٱلْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَ

أَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا ٱلْإِنسَٰنُ ۖ إِنَّهُۥ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (۳۳: ۷۲) "ہم نے امانت کو آسمان' زمین اور پہاڑوں کے ساتھ پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھا لیا اور بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے تاکہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے۔ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے"۔

یہ آخری تبصرہ یہ بتاتا ہے کہ انسانیت کے کاندھوں پر کس قدر بڑی ذمہ داری ڈالی گئی ہے خصوصاً جماعت مسلمہ کے کاندھوں پر۔ یہ عظیم امانت فی الوقت جماعت مسلمہ ہی اٹھا رہی ہے۔ یعنی اسلامی نظریہ حیات کے پھیلانے کی ذمہ داری۔ اور اس دعوت کی راہ میں آنے والی مشکلات پر صبر کرنا' شریعت کو قائم کرنا' اپنے اوپر اور زمین پر شریعت کو قائم کرنا وغیرہ یہ سب امور اسی سورہ کے موضوع کا اہم حصہ ہیں۔ یعنی اسلامی نظریہ حیات سے اسلامی نظام' اسلامی دستور و قانون اور سلامی معاشرے کا قیام اللہ کی امانت ہے جو مومنین کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے۔

اب سورہ ہذا کی آیات کی تشریح۔

--- ooo ---

# درس نمبر ۱۸۸ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۸

---

سُورَةُ الْاَحْزَاب (۳۳) مَدَنِيَّة (۹۰) اٰيَاتُهَا ۷۳ رُكُوعَاتُهَا ۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ﴿۱﴾ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ﴿۲﴾ وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"اے نبیؐ" اللہ سے ڈرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو، حقیقت میں علیم اور حکیم تو اللہ ہی ہے۔ پیروی کرو اس بات کی جس کا اشارہ تمہارے رب کی طرف سے تمہیں کیا جا رہا ہے، اللہ ہر اس بات سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو۔ اللہ پر توکل کرو، اللہ ہی وکیل ہونے کے لیے کافی ہے"۔

یہ اس سورہ کا آغاز ہے جس میں اس نئے اسلامی معاشرے کی اخلاقی اور اجتماعی زندگی کی تنظیم نو کی گئی ہے۔ یہ آغاز ہی بتاتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی کا مزاج کیا ہے اور وہ قواعد اور اصول کیا ہیں جن پر اسلامی نظام عملاً قائم ہے۔ وہ تصورات کیا ہیں جن کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے ضمیر و اخلاق پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اسلام محض ہدایات اور وعظ نہیں ہے۔ نہ اسلام محض چند اخلاقی تعلیمات کا نام ہے، نہ اسلام صرف قوانین کا مجموعہ ہے۔ نہ وہ محض رسم و رواج کا نام ہے۔ اسلام دراصل مذکورہ بالا تمام چیزوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن یہ سب چیزیں بھی اسلام نہیں ہیں۔ اسلام دراصل سرتسلیم خم کر دینے کا نام ہے۔ اللہ کی مشیت اور اللہ کی خواہش کے سامنے سرتسلیم خم کر دینا۔ اللہ کی تقدیر کے سامنے جھکنا۔ اور سب سے اول بات یہ کہ اللہ کے احکام اوامر و نواہی کے ماننے کے لیے تیار ہو

جانا۔ اللہ انسانوں کے لیے جو نظام تجویز کرتا ہے اس کے مطابق زندگی بسر کر کے' بغیر ادھر ادھر توجہ کرنے کے' اور اس کے سوا کسی اور طرف رخ کرنے کے۔ بغیر اس کے کہ اللہ کے سوا کسی اور قوت پر بھروسہ کیا جائے۔ اسلام کا بنیادی شعور یہ ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ وہ ایک ایسے قانون قدرت کا تابع ہے جو خود انسان اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی پوری کائنات کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ نظام افلاک و کواکب کو بھی کنٹرول کرتا ہے اور تمام وجود کو بھی کنٹرول کرتا ہے خواہ خفیہ ہو یا ظاہر ہو۔ غائب ہو یا حاضر ہو۔ انسان اسے سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہو۔ اس یقین کے ساتھ کہ ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ انھوں نے صرف اللہ کے احکام کا اتباع کرنا ہے اور ان کاموں سے رو کنا ہے جن سے رکنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ ان اسباب اور ذرائع کو استعمال کرنا ہے جو اللہ نے ان کے لیے فراہم کیے ہیں اور پھر ان نتائج کا انتظار کرنا ہے جو اللہ نے نکالنے ہیں۔ یہ وہ قاعدہ ہے جس کے اوپر تمام شریعتیں اور تمام قوانین قائم ہوتے ہیں' رسم و رواج قائم ہوتے ہیں' آداب و اخلاق قائم ہوتے ہیں یعنی وہ عقیدہ جو ضمیر و شعور میں ہوتا ہے وہ انسانی زندگی میں عملاً ظہور پذیر ہو اور انسان کی زندگی میں اس کے عملی آثار موجود ہوں کہ انسان کا نفس اللہ کے سامنے جھک گیا ہے اور وہ اسلامی نظام حیات کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے شریعت پھوٹتی ہے۔ اس شریعت پر بھی ایک پورا نظام زندگی استوار ہوتا ہے اور یہ تینوں امور باہم مربوط اور ہم جسم ہوتے ہیں۔ یہ ہے اسلام۔

چنانچہ اس سورہ کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے لیے جدید قانون سازی کی جائے یعنی اللہ سے ڈرنا۔ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے کیونکہ حضور اکرمؐ ہی اس جدید معاشرے کے منتظم اعلیٰ تھے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ (۳۳ : ۱) "اے نبی' اللہ سے ڈرو"۔ اللہ سے ڈرنا اس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ اللہ ہمارے اوپر نگران ہے اور وہ بہت جلیل القدر ہے۔ یہ اسلام کا بنیادی شعور اور بنیادی قاعدہ ہے۔ تقویٰ ہی انسان کے اندر ایک پاسبان ہوتا ہے جو انسان کو اللہ کے احکام کی پیروی پر مائل کرتا ہے۔ چنانچہ تقویٰ ہی کی وجہ سے اسلامی نظام زندگی عملاً قائم ہوتا ہے۔

دوسرا حکم آیا ہے کہ کافروں اور منافقوں کی خواہشات کی اطاعت نہ کرو۔ ان کی تجاویز اور ان کی ہدایات کو نظر انداز کرو' نہ ان سے رائے لو اور نہ ان کے اصرار کو تسلیم کرو۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ (۳۳ : ۱) "کفار اور منافقین کی اطاعت نہ کرو"۔ اللہ کے احکام کی اطاعت کرنے کا حکم یہاں بعد میں آتا ہے۔ اس سے بھی پہلے کہا گیا کہ کفار اور منافقین کی اطاعت نہ کرو' اس لیے کہ اس دور میں کفار اور منافقین کی طرف مسلمانوں اور حضور اکرمؐ پر بہت ہی دباؤ تھا۔ اس لیے یہاں حکم دیا گیا کہ آئندہ اسلامی معاشرے کی عملی تنظیم میں بھی ان کی کوئی بات نہ سنو اور ان کے دباؤ کے آگے نہ جھکو۔ حضورؐ کو تو اس وقت کے حالات کے مطابق حکم دیا گیا لیکن تحریک اسلامی کو ہر زمان و مکان میں یہی کرنا چاہیے کہ جہاں اپنی حکومت قائم ہو تو وہاں غیروں کی آراء و تجاویز کو قبول نہ کرو تاکہ اسلامی نظام حیات خالص اپنی پالیسی پر آگے بڑھے اور وہ کسی غیر کی پالیسی کے دباؤ میں نہ ہو۔

کسی مسلمان کو یہ دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ ان کفار اور منافقین کے پاس مہارت ہے اور وہ علم و تجربہ رکھتے ہیں جس

طرح آج کل اپنے لیے اپنی کمزوری کے دور میں یہ وجہ جواز تلاش کرتے ہیں اس لیے کہ اللہ ہی علیم و حکیم ہے ۔ اس نے مسلمانوں کو جو نظام زندگی دیا ہے وہ اس نے علم و حکمت کی اساس پر دیا ہے ۔ اس میں کوئی فتور اور قصور نہیں ہے اور لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی علم و حکمت نہیں ہے ۔

اور اس کے بعد متصلاً یہ حکم دیا جاتا ہے ۔

وَّ اتَّبِعْ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۳۳ : ۲) "اور پیروی کرو اس بات کی جس کا اشارہ تمہارے رب کی طرف سے تمہیں کیا جارہا ہے"۔ کیونکہ مسلمانوں کے لیے ہدایات اللہ سے آیا کرتی ہیں ۔ کفار اور منافقین کی طرف سے نہیں ۔ مسلمان خدا کا اتباع کرتے ہیں کسی اور کا نہیں ۔ اس آیت کی طرز تعبیر ہی میں بعض گہرے اشارات پائے جاتے ہیں یعنی اتباع کرو اس بات کی جو تمہارے طرف وحی (اشارہ) کی جارہی ہے ' خصوصیت کے ساتھ ۔ پھر یہ اشارہ رب کی طرف سے ہے ۔ گویا یہاں یہ خاص اشارات کئے جارہے ہیں ' ان کو سمجھو ۔ اور یہ اشارات اللہ مطاع کی طرف سے ہیں ۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا (۳۳ : ۲) "اللہ ہر اس بات سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو ۔ اللہ جو ہدایات دیتا ہے وہ اعلیٰ درجے کے علم اور مہارت پر مبنی ہیں ۔ وہ تمہارے اعمال کی حقیقت سے باخبر ہے ' تمہارے رجحانات اور تمہاری خواہشات سے باخبر ہے ۔

اور آخری ہدایت یہ ہے کہ

وَّ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا (۳۳ : ۳) "اللہ پر توکل کرو ' اللہ ہی وکیل ہونے کے لیے کافی ہے"۔ یہ بات اہم نہیں ہے کہ کفار و منافقین تمہارے ساتھ ہیں یا تمہارے خلاف ہیں ۔ نہ ان کی مکاریوں اور سازشوں کی کوئی حیثیت ہے ۔ اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو ' اللہ تمہارے معاملات کے اندر اپنے علم ' اپنی خبرداری اور مہارت سے تصرف کرے گا ۔ معاملات کو اللہ پر چھوڑ دینا ہی وہ چیز ہے جس پر آخر کار انسان کا دل مطمئن ہوکر شرح صدر حاصل کر لیتا ہے اور وہ اپنے حدود و قیود سے باخبر ہو جاتا ہے ۔ اپنے حدود سے باہر کے معاملات کو اللہ پر چھوڑ دیتا ہے ۔ اپنی حدود پر رک جاتا ہے اور آگے کی بات ' بات والے پر چھوڑ دیتا ہے ۔ نہایت اطمینان ' پورے بھروسے اور پورے یقین کے ساتھ اپنے حصے کا کام کرتا ہے ۔

یہ تین عناصر ' خدا کا خوف ' وحی الٰہی کا پورا اتباع اور اللہ وحدہ پر بھروسہ یہ کسی بھی داعی کے اصل زاد راہ ہیں ۔ بشرطیکہ کہ وہ کفار اور منافقین سے کٹ جائے ۔ یہ عناصر دعوت اسلامی کو اپنے منہاج پر قائم رکھتے ہیں یعنی اللہ سے (خوف) ' اللہ کی طرف سے آنے والے حکم کا اتباع اور اللہ پر بھروسہ ۔ یہ ہدایات ایک زبردست ' گہرے تبصرے پر رقم ہوتی ہیں اور یہ تبصرہ ایک حسی مشاہدے پر مبنی ہے ۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِهٖ

"اللہ نے کسی شخص کے دھڑ میں دو دل نہیں رکھے"۔ ہر انسان کے اندر ایک ہی دل اور ایک ہی دماغ ہوتا ہے۔ لہذا اس کا تصور بھی ایک ہو گا اور اس کا نظام بھی ایک ہو گا۔ وہ ایک ہی صراط مستقیم پر چل سکتا ہے۔ اس کے سامنے ایک ہی پیمانہ ہو گا جس سے وہ حسن و قبح کو ناپے گا۔ اور ایک ہی پیمانے سے وہ واقعات اور اقدار کو ناپے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس کی زندگی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ وہ منافق ہو گا۔ اس کی زندگی میں نشیب و فراز ہوں گے اور وہ صراط مستقیم پر نہ ہو گا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک انسان اپنے اخلاق و آداب ایک سرچشمے سے لے اور اپنا دستور و قانون کسی دوسرے سرچشمے سے لے اور اپنا اجتماعی اور معاشی نظام کسی تیسرے سرچشمے سے لے اور اپنے فنون اور فلسفے کسی چوتھے سرچشمے سے لے۔ اس قسم کے مخلوط خیالات کسی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ ایسا شخص اور اس کی شخصیت ٹکڑے ٹکڑے ہو گی اور اس کا وجود قائم نہ رہ سکے گا۔

ایک نظریاتی شخص، جس کا فی الواقعہ کوئی نظریہ اور عقیدہ ہو، یہ نہیں کر سکتا کہ وہ زندگی کے چھوٹے یا بڑے معاملے میں کوئی نظریاتی موقف نہ رکھتا ہو۔ وہ ہر وقت اپنے نظریات کے تقاضوں کے مطابق قدریں اپناتا ہے اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ کوئی بات کرے یا کوئی حرکت کرے، یا کوئی نیت و ارادہ کرے یا کوئی سوچ کرے اور وہ اس کے نظریات سے متاثر نہ ہو یا اس کے عقیدے سے مبرا ہو۔ کیونکہ اللہ نے کسی انسان کے سینے میں دو دل نہیں رکھے۔ ایک دل ہوتا ہے، ایک عقیدہ ہوتا ہے، ایک عمل ہوتا ہے، ایک سمت ہوتی ہے اور ایک ہی پیمانہ اور قدر ہوتی ہے۔

کوئی نظریاتی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کام میں نے اپنی ذاتی حیثیت میں کیا ہے اور یہ میں نے ایک مسلمان کی حیثیت میں کیا ہے۔ جیسا کہ آج کل کے سیاست دان ایسا کرتے ہیں، یا جیسا کہ اجتماعی جمعیتیں کرتی ہیں یا علمی سوسائٹیاں کرتی ہیں۔ غرض انسان ایک ہوتا ہے، اس کا دل ایک ہوتا ہے، نظریہ ایک ہوتا ہے، قبلہ ایک ہوتا ہے، اس کا تصور ایک ہوتا ہے، اقدار اور حسن و قبح کے پیمانے ایک ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ اس کے عقائد میں ہوتا ہے۔

غرض اسی ایک دل کے ساتھ انسان تنہا بھی زندہ رہتا ہے، خاندان میں بھی رہتا ہے، جماعت میں بھی رہتا ہے، حکومت میں بھی رہتا ہے، دنیا میں بھی رہتا ہے، چھپے بھی رہتا ہے اور برملا بھی رہتا ہے۔ مزدور و آقا بھی رہتا ہے، حاکم و محکوم بھی رہتا ہے۔ مشکلات اور سہولیات میں بھی رہتا ہے۔ غرض یہ اس کا رنگ ہوتا ہے۔ یہ تبدیل نہیں ہوتا۔ نہ اس کا معیار بدلتا ہے اور نہ قیمت بدلتی ہے۔ نہ اس کی سوچ بدلتی ہے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ (۳۳ : ۴) لہذا کسی بھی نظریاتی اسلام کا منہاج ایک ہوتا ہے، راستہ ایک ہوتا ہے، رخ ایک ہوتا ہے۔ صرف اللہ کے حکم کے سامنے جھکتا ہے۔ دل ایک ہے تو الٰہ بھی ایک ہے، آقا بھی ایک ہے، منہاج حیات بھی ایک ہے اور اگر کوئی ایسا نہ ہو گا تو اس کی زندگی منتشر ہو گی اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے گا۔

اس فیصلہ کن تبصرے کے بعد اور منہاج حیات کے تعین کے بعد اب سیاق کلام قانونی اصلاحات شروع کرتا ہے۔ پہلے ظہار اور متبنی بنانے کا قانون منسوخ کیا جاتا ہے تاکہ خاندان کو بیرونی عناصر سے پاک کر کے خالص رشتہ داری اور قدرتی بنیادوں پر تعمیر کیا جائے۔

وَمَا جَعَلَ اَزۡوَاجَكُمُ الّٰٓـئِْ تُظٰهِرُوۡنَ مِنۡهُنَّ اُمَّهٰتِكُمۡ‌ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدۡعِيَآءَكُمۡ اَبۡنَآءَكُمۡ‌ ؕ ذٰ لِكُمۡ قَوۡلُـكُمۡ بِاَفۡوَاهِكُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ يَقُوۡلُ الۡحَـقَّ وَهُوَ يَهۡدِى السَّبِيۡلَ ﴿۴﴾ اُدۡعُوۡهُمۡ لِاٰبَآئِهِمۡ هُوَ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ‌ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اٰبَآءَهُمۡ فَاِخۡوَانُكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَمَوَالِيۡكُمۡ‌ ؕ وَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ فِيۡمَاۤ اَخۡطَاۡتُمۡ بِهٖ ۙ وَلٰكِنۡ مَّا تَعَمَّدَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۵﴾

* "نہ اس نے تم لوگوں کو ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو' تمہاری ماں بنا دیا ہے' اور نہ اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنایا ہے۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو لوگ تم اپنے منہ سے نکال دیتے ہو' مگر اللہ وہ بات کہتا ہے جو مبنی بر حقیقت ہے اور وہی صحیح طریقے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو' یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے۔ اور اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں۔ نادانستہ جو بات تم کہو' اس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں ہے' لیکن اس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا تم دل سے ارادہ کرو' اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے"۔

جاہلیت میں رواج یہ تھا کہ ایک شخص اپنی بیوی سے کہتا تھا تم مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو۔ یعنی تم مجھ پر اس طرح حرام ہو جس طرح ماں حرام ہے۔ اسی وقت سے اس پر اس کے ساتھ مجامعت حرام ہو جاتی۔ اب یہ معلقہ ہو جاتی نہ یہ مطلقہ ہوتی کہ دوسرا کوئی اس سے نکاح کرتا' نہ اس کی بیوی بن سکتی۔ اور یہ عورتوں پر ہونے والے مظالم میں سے سب سے بڑا ظلم تھا۔ اور جاہلیت کے دور کی بدسلوکیوں میں سے ایک بدسلوکی تھی۔

اسلام نے اصلاحات کا کام سب سے پہلے خاندانی نظام سے شروع کیا۔ خاندان کے اندر ہونے والے اس ظلم کو ختم کیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ خاندان انسانی اجتماعیت کا پہلا دائرہ ہے۔ اس لیے اسلام نے خاندانی نظام کی طرف بہت توجہ دی تاکہ جس تربیت گاہ میں بچے پرورش پاتے ہیں' اس کی فضا خوشگوار ہو' اور پرامن ہو۔ چنانچہ عورت کو اس عظیم بوجھ سے نکالا گیا اور اسے اس حالت قید سے رہائی دلا دی گئی۔ اور میاں بیوی کے تعلقات کو از سر نو عدل و انصاف پر استوار کیا۔ چنانچہ یہ قانون وضع کیا گیا۔

وَمَا جَعَلَ اَزۡوَاجَكُمُ الّٰٓـئِىۡ تُظٰهِرُوۡنَ مِنۡهُنَّ اُمَّهٰتِكُمۡ (۳۳ : ۴) "اس نے تم لوگوں کی ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو' تمہاری ماں نہیں بنا دیا ہے"۔ کیونکہ صرف زبان سے ماں کہنے سے بیوی ماں نہیں بن جاتی۔ حقیقت واقعہ کے مطابق ماں' ماں ہے اور بیوی' بیوی ہے۔ محض ایک لفظ کہنے سے تعلقات و روابط کی نوعیت نہیں بدل جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ظہار کی وجہ سے ابدی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ جس طرح ماں حرام ہوتی ہے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں تھا۔

روایات میں آتا ہے کہ سورہ مجادلہ میں ظہار کے ظالمانہ قانون کو باطل کیا گیا اور واقعہ یوں ہوا کہ اوس ابن الصامت نے اپنی بیوی خولہ بنت ثعلبہ کے ساتھ ظہار کر لیا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اس نے یہ دعویٰ کیا رسول خدا! یہ میرا مال کھا گیا' اس نے میری جوانی کو ختم کر دیا' اور میرا پیٹ پھول گیا۔ اور میری عمر بڑھ گئی اور میری اولاد ختم ہو گئی تو اس نے میرے ساتھ ظہار کر لیا۔ حضور اکرم ؐ نے فرمایا "میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ تم اس پر حرام ہو گئی ہو"۔

اس نے اپنی شکایت بار بار پیش کی۔ اس پر سورہ مجادلہ کی یہ آیات نازل ہوئیں :

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ (۵۸ : ۱) اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ وَ اِنَّهُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَ زُوْرًا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ (۵۸ : ۲) وَ الَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (۵۸ : ۳) فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا فَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْكِیْنًا ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۵۸ : ۴) "اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملے میں تم سے تکرار کر رہی ہے اور اللہ سے فریاد کیے جاتی ہے۔ اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے' وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں ان کی بیویاں ان کی مائیں نہیں ہیں' ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں ان کو جنا ہے۔ یہ لوگ ایک سخت ناپسندیدہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں اور حقیقت یہ کہ اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے اور درگزر فرمانے والا ہے۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اپنی اس بات سے رجوع کریں جو انہوں نے کہی تھی تو قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں ایک غلام آزاد کرنا ہو گا' اس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اس سے باخبر ہے اور جو شخص غلام نہ پائے وہ دو مہینے کے پے درپے روزے رکھے' قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں اور جو اس پر بھی قادر نہ ہو وہ ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ یہ حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول ؐ پر ایمان لاؤ۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں اور کافروں کے لیے دردناک سزا ہے"۔

اس قانون کی رو سے ظہار کی وجہ سے میاں بیوی کو وقتی طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا اور سابق قانون میں جو ابدی حرمت تھی' اسے ختم کر دیا گیا۔ اور اگر میاں بیوی باہم دوبارہ ازدواجی زندگی اختیار کرنا چاہیں تو اس سے قبل وہ ایک غلام آزاد کریں یا مسلسل دو ماہ روزے رکھیں یا ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلائیں۔ یوں دوبارہ وہ بیوی خاوند کے لیے

حلال ہو جائے گی اور دونوں کی ازدواجی زندگی حسب سابق شروع ہو جائے گی۔ اور یہ نیا قانون واقعیت پسندانہ ہے اور واقعی صورت حالات پر مبنی ہے۔

وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ (۳۳: ۴) "اللہ نے تمہاری ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو، تمہاری مائیں نہیں بنایا"۔ اس جاہلی عادت کی وجہ سے خاندان ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا تھا اور دوسری جانب عورت پر ایک دائمی ظلم تھا اور وہ زندہ درگور ہو جاتی تھی۔ یوں خاندانی روابط کے اندر اضطراب، طوائف الملوکی اور پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی تھیں اور یہ سب کچھ مرد کی ذاتی خواہشات اور جاہلی سوسائٹی میں ان کی برتری اور تشدد کی وجہ سے تھا۔

یہ تو تھا مسئلہ ظہار رہا قانون متبنی اور لوگوں کو اپنے باپوں کے سوا دوسروں کے نام سے پکارنا، یہ بھی خاندانی نظام کے لیے باعث پریشانی تھا اور اس کی وجہ سے ایک خاندان کی ہم آہنگی میں خلل پڑتا تھا۔

اس کے باوجود کہ عربی معاشرے میں عفت اور نسب کا بہت بڑا خیال رکھا جاتا تھا اور نسب پر فخر کیا جاتا تھا لیکن اس فخر و مباہات کے ساتھ ساتھ بعض کمزور پہلو بھی عرب معاشرے میں پائے جاتے تھے۔ معدودے چند خاندانوں کے سوا یہ کمزوریاں عموماً تھیں۔

بعض لوگوں کے ہاں ایسے بیٹے بھی تھے جن کے سرے سے باپ معلوم ہی نہ تھے۔ بعض لوگوں کو اس قسم کے نوجوان پسند آئے تو وہ انہیں اپنا بیٹا بنا لیتے اس کو اپنے نسب میں شمار کر لیتے اور دونوں ایک دوسرے کی میراث کے حقدار ہو جاتے۔

بعض بیٹے ایسے تھے کہ ان کے باپ معلوم تھے لیکن بعض اوقات ایک شخص کو کوئی ایسا لڑکا پسند آ جاتا، وہ اسے اپنا بیٹا بنا لیتا۔ اور اسے اپنے نسب میں شریک کر لیتا۔ لوگوں کے اندر وہ ابن فلاں مشہور ہوتا۔ وہ اس کے خاندان کا فرد بن جاتا۔ یہ معاملہ خصوصاً جنگی قیدیوں اور اغوا شدہ لوگوں کے ساتھ ہوتا۔ جنگ اور ڈاکوں میں بچے اور نوجوان لڑکے قید ہو جاتے۔ بعض لوگ ایسے لوگوں کو اپنا بیٹا بنا لیتے۔ اسے اپنا نام دے دیتے اور وہ اس کے ساتھ مشہور ہو جاتا اور وہ بیٹے کے حقوق و فرائض ادا کرتا۔

انہی میں سے زید ابن حارثہ کلبی بھی تھا۔ یہ ایک عربی قبیلہ ہے، ایام جاہلیت کے دور کی ڈکیتیوں میں سے کسی ڈکیتی میں یہ قید ہو کر آ گیا۔ اسے حکیم ابن حزام نے اپنی پھوپھی خدیجہ کے لیے خرید لیا۔ جب حضورؐ نے خدیجہ کو اپنے نکاح میں لے لیا تو اس نے یہ حضورؐ کو بخش دیا۔ اس کے بعد اس کے باپ اور بیٹے نے اسے آزاد کرنے کا مطالبہ کیا تو حضور اکرمؐ نے اسے اختیار دے دیا تو زید نے حضورؐ کو اختیار کر لیا۔ حضور اکرمؐ نے اسے آزاد کر کے متبنی بنا دیا اور لوگ اسے زید ابن محمد کہنے لگے۔ غلاموں میں سے حضورؐ پر وہ سب سے پہلے ایمان لائے۔

جب اسلام نے خاندانی تعلقات کو اپنی طبعی اور فطری بنیادوں پر استوار کرنا شروع کیا، خاندانی روابط کو مستحکم بنانے کی سعی کی اور خاندان کو خالص خاندانی حد تک محدود کیا تو جاہلی قانون متبنی کو ختم کر دیا اور خاندانی روابط کو نسب کی بنیاد پر قائم کر دیا۔ یعنی خونی رشتے باپ بیٹے کی اساس پر۔ اور یہ حکم دیا۔

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ (۳۳: ۴) "اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا

نہیں بنایا"۔

ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ (۳۳ : ۴) "یہ وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکالتے ہو"۔ صرف باتوں سے واقعات اور حقائق نہیں بدلتے۔ اور صرف باتوں سے خونی رشتے بھی قائم نہیں ہوتے اور وراثت کے حقوق بھی پیدا نہیں ہو جاتے۔ اور محض زبان سے یہ رشتے ایسے نہیں ہوتے جو اس وقت ہوتے ہیں جب ایک زندہ بچہ زندہ ماں سے پیدا ہوتا ہے یا حقیقی باپ سے پیدا ہو جاتا ہے۔

وَ اللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ (۳۳ : ۴) "مگر اللہ جو بات کہتا ہے وہی حقیقت ہے اور وہی صحیح طریقے کی طرف راہنمائی کرتا ہے"۔ وہ مطلق حق کہتا ہے جس کے اندر کوئی باطل نہیں ہوتا اور ان سچائیوں میں سے ایک سچائی یہ ہے کہ خاندانی قوانین اور رشتے حقیقت پر مبنی ہوں۔ یعنی خون اور نسب کے روابط ہوں' نہ محض زبانی باتوں پر۔ وہ قانون سازی میں سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے اور اسی کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ یہ فطری قانون ہوتا ہے اور انسان کے بنائے ہوئے قوانین ان فطری قوانین کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ خصوصاً جبکہ وہ حقائق نہ ہوں' محض خالی باتیں ہوں۔ ایسے الفاظ ہوں جن کا کوئی مفہوم نہ ہو' لہٰذا ایسے قوانین و روابط پر حقیقی قوانین و ضوابط غالب ہو جاتے ہیں جو سیدھے راستے پر مبنی ہوں۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ (۳۳ : ۵) "منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے"۔ منصفانہ بات یہ ہے کہ بیٹے کو باپ کے نام سے پکارا جائے۔ یہی اس والد کے ساتھ انصاف ہے جس کے جسم سے یہ ٹکڑا علیحدہ ہو کر شخص بنا۔ بیٹے کے ساتھ بھی انصاف ہے اور انہی دونوں کے درمیان وراثت بھی انصاف ہے۔ باپ اور بیٹا ہی ایک دوسرے کے حقیقی معاون ہو سکتے ہیں۔ بیٹا باپ کی خفیہ خصوصیات کا بھی امین ہو سکتا ہے اور آباؤ اجداد کے خصائص کا بھی امین ہے۔ یہ اس طرح بھی عدل ہے کہ ہر حق کو اس کی جگہ رکھ دیا گیا اور روابط کو فطری اصولوں پر قائم کر دیا گیا۔ نہ والد کی حق تلفی ہو اور نہ بیٹے کی حق تلفی ہو۔ غیر حقیقی والد کو متبنیٰ ہونے کی ذمہ داریاں نہ اٹھانی پڑیں گی اور نہ اسے وہ مفادات ملیں گے جن کا وہ مستحق نہ تھا۔ نہ متبنیٰ غیر ضروری ذمہ داریاں اٹھائے گا اور نہ وہ مفادات لے سکے گا جس کا وہ مستحق نہ تھا۔

یہ وہ عائلی نظام ہے جس کی وجہ سے خاندان کی ذمہ داریوں میں توازن پیدا ہوتا ہے اور خاندان نہایت ہی مستحکم اور گہری اور واقعیت پسندانہ بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ اس کی اساس میں سچائی' حق پسندی اور فطرت سے ہم آہنگی ہے۔ ہر وہ نظام جو خاندانی نظام کو نظرانداز کرتا ہے وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وہ ضعیف کمزور اور جعلی بنیادوں پر اٹھا ہوا ہوتا ہے اور کوئی ایسا نظام زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ (۱)

---

(۱) اشتراکیت نے اپنے نظام کو خاندانی بنیاد پر استوار نہیں کیا۔ آج تک اشتراکی معاشرہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔ روسی نظام کی مذہبی اور فلسفیانہ بنیادوں کی مخالفت کے باوجود' یہ ملک آہستہ آہستہ خاندانی نظام کی طرف منتقل ہوا اور خاندانی قوتیں منظم ہو رہی ہیں۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ دور جاہلیت میں خاندان کے روابط میں بہت انتشار تھا۔ اسی طرح جنسی تعلقات میں بھی انتشار تھا' اس کے نتیجے میں انساب کے اندر بہت ہی اختلاط پیدا ہو گیا تھا اور بعض اوقات لوگوں کے باپوں کا بھی پتہ نہ لگتا تھا۔ اسلام نے اس معاملے کے اندر سہولت پیدا کر دی کیونکہ اسلام کا منشا یہ تھا کہ خاندانی نظام کو از سر نو منظم کیا جائے۔ اور اسلام خاندان کی اساس پر اجتماعی نظام کی تشکیل کے درپے تھا۔ اس لیے جن لوگوں کے آباء و اجداد کا پتہ نہ تھا' ان کو اسلامی جماعت میں ایک مقام دے دیا۔ یہ اخوت اسلامی کا مقام تھا۔

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (۳۳ : ۵) "اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور رفیق ہیں"۔ اخوت فی الدین کا تعلق ایک اخلاقی اور روحانی تعلق ہے اور اس پر کوئی قانونی حقوق و فرائض مرتب نہیں کیے گئے۔ مثلاً وراثت کی کفالت اور ادائیگی دے کر' جبکہ متبنیٰ بنانے پر یہ قانونی حقوق و فرائض مرتب ہوتے تھے۔ یہ اس لیے کہ ان لوگوں کا بھی اسلامی جماعت میں کوئی نہ کوئی مقام اور رابطہ ہونا چاہئے۔

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ (۳۳ : ۵) "اگر تمہیں ان کے آباؤ اجداد معلوم نہ ہوں"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دور جاہلیت کے معاشرے میں نسب کے اعتبار سے بہت بڑا انتشار تھا۔ اس کے نتیجے میں جنسی تعلقات کے معاملے میں بھی انتشار تھا۔ اس انتشار سے بچنے کے لیے اسلام نے خاندانی نظام کو از سر نو مرتب کیا۔ یوں خاندانی نظام مستحکم بنیادوں پر استوار ہو گیا۔

انساب کو اپنی حقیقت کی طرف واپس کر دینے کے بعد اب یہ کہا جاتا ہے کہ اگر کسی کو اپنا نسب صحیح معلوم نہ ہو اور وہ نسب کے سلسلے میں کوئی غلط بات کہہ دے تو اس کا کوئی قصور نہ ہو گا۔

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ (۳۳ : ۵)
"نادانستہ جو بات تم کہو اس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں لیکن اس بات پر ضرور گرفت ہے کہ تم دل سے ارادہ کرو۔ یہ اللہ کی بہت بڑی مہربانی ہے کہ اللہ کسی پر کوئی ایسا حکم عائد نہیں کرتا جس کے بجا لانے کی ان میں طاقت نہ ہو۔

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۳۳ : ۵) "اور اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نسب کے سلسلے میں بہت ہی تاکید اور تشدید فرمائی ہے کیونکہ اسلام کا مقصد یہ تھا کہ جدید معاشرے کو ایسے خطوط پر منظم کیا جائے جس میں کوئی انتشار نہ ہو جس طرح جاہلی معاشروں میں کسی کے بارے میں کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ کون کس کی اولاد سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اپنا نسب چھپاتے ہیں ان کو سخت وعید کی گئی اور ان پر کفر کا اطلاق کیا گیا۔ ابن جریر نے 'یعقوب ابن ابراہیم سے 'ابن علیہ سے 'عیینہ ابن عبدالرحمن نے ان کے باپ سے 'ابوبکرؓ سے فرماتے ہیں 'اللہ نے فرمایا۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ (۳۳ : ۵) "منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو' یہ اللہ کے نزدیک بہت

ہی منصفانہ بات ہے۔ اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں"۔ میرے باپ نے کہا "عیینہ ابن عبدالرحمن کہتے ہیں"۔ "خدا کی قسم میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ اگر کسی کو یقین ہوتا کہ میرا باپ گدھا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرتا"۔ اور حدیث میں آیا ہے۔

من ادعی الی غیر ابیہ وھو یعلم الا کفر "جس نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے سوا اور کسی طرف منسوب کیا اور وہ جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہے تو اس نے کفر کا ارتکاب کیا"۔ یہ تہدید اس پالیسی کے مطابق ہے جس کے ذریعے اسلام خاندان اور خاندانی روابط کو ہر شک و شبہ سے پاک رکھنا چاہتا ہے اور اسلام سلسلہ نسب کو صحیح ' سلامت ' مسلم الثبوت رکھنا چاہتا ہے تاکہ اس پر اسلامی معاشرے کی تعمیر کی جائے اور یہ معاشرہ صحیح اور پاک معاشرہ ہو۔

--- ooo---

اس کے بعد ایک دوسرے عبوری قانون کے اندر ترمیم کر دی جاتی ہے۔ حضور اکرمؐ جب وارد مدینہ ہوئے تو وہاں آپؐ نے انصار اور مہاجرین کے درمیان مواخات قائم کی۔ اسلام سے قبل جاہلیت میں اس قسم کا کوئی نظام نہ تھا۔ یہ نظام ہجرت کے بعد اسلام نے ایجاد کیا تھا کیونکہ مہاجرین اپنی دولت مکہ میں چھوڑ آئے تھے۔ یہاں تہی دست وارد ہوئے۔ اسی طرح مدینہ میں بھی ایسے لوگ تھے جن کو ان کے خاندان والوں نے گھروں سے نکال دیا تھا کیونکہ وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ مواخات کو ختم کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ولایت عامہ دے دی گئی اور یہ ولایت تمام دوسری ولایتوں پر مقدم قرار دے دی گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ولی عام بننے کے ساتھ ساتھ آپ کی ازواج کو بھی روحانی مائیں قرار دے دیا گیا۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤی اَوْلِیٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۶﴾

"بلاشبہ نبی تو اہل ایمان کے لیے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہے ' اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں ' مگر کتاب اللہ کی رو سے عام مومنین و مہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں ' البتہ اپنے رفیقوں کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کر سکتے ہیں۔ یہ حکم کتاب الٰہی میں لکھا ہوا ہے"۔

مہاجرین نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر مدینہ چلے آئے ' اللہ کی طرف بھاگ نکلے۔ صرف دین لے کر بھاگ گئے۔ انہوں نے اپنے عقیدہ کو اپنی برادری کے تعلقات ' اپنے مال کے ذخائر ' اپنے اسباب حیات ' بچپن کی یادوں ' یاروں اور دوستوں کی محفلوں پر ترجیح دے دی۔ یہ لوگ صرف اپنا عقیدہ بچا کر نکل آئے اور

اس کے سواسب کچھ چھوڑ چھاڑ دیا۔ اس انداز پر ہجرت کر کے انہوں نے وہ تمام چیزیں چھوڑ دیں جو ہر انسان کے لیے عزیز ہوتی ہیں۔ اہل و عیال ' بیٹے بیٹیاں اور دوسرے رشتہ دار۔ یہ ایک زندہ مثال تھی اور یہ اس کرۂ ارض پر واقع ہوئی کہ لوگوں نے صرف عقائد کی خاطر سب کو چھوڑ دیا۔ ان کے دلوں پر عقیدہ چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ ان کے دل میں اس عقیدے اور نظریہ کے سوا کوئی چیز باقی ہی نہ رہی۔ ان کی شخصیت مجتمع ہو گئی۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ (۳۳ : ۴) "اللہ نے کسی انسان کے دھڑ میں دو دل نہیں بنائے"۔ اسی طرح مدینہ میں بھی ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی۔ بعض خاندانوں کے افراد اسلام میں داخل ہو گئے اور دوسرے لوگ شرک کرتے رہے۔ دونوں کے درمیان تعلقات کٹ گئے۔ غرض خاندانی روابط کے اندر ایک بھونچال سا آ گیا اور اجتماعی نظام بھی درہم برہم ہو گیا۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ اسلامی معاشرہ نوزائیدہ تھا۔ اور اسلامی مملکت ابھی مستحکم نہ تھی۔ یہ دراصل ابھی تک ایک مجوزہ نظام ہی تھا جس کا زیادہ حصہ تصورات ہی میں تھا۔ ابھی تک اس کے مستحکم ادارے تشکیل نہ پائے تھے۔

غرض مدینہ میں ایک نظریاتی طوفان اٹھا۔ یہ اسلامی نظریہ حیات کا طوفان تھا۔ اس نے تمام جذبات ' تمام رسم و رواج اور تمام روابط اور تعلقات کو ختم کر دیا اور اس نئی سوسائٹی کے اندر صرف اسلامی رابطہ باقی رہ گیا۔ تمام دل عقیدہ اسلامی پر جمع تھے ' خاندان ' نسب ' قبیلہ ' دوستی اور قومی تعلقات نظریاتی لہروں کے نیچے دب گئے اور یہ نئی اکائیاں جو اسلامی سوسائٹی میں جمع ہو چکی تھیں باہم مل گئیں۔ ایک نئی سوسائٹی وجود میں آ گئی اور اسلامی اخوت پر لوگ جمع ہو گئے۔ یہ لوگ اسلامی اخوت پر کسی قانون یا حکم کے ذریعہ جمع نہ ہو گئے تھے بلکہ اسلامی نظریہ حیات نے ان کے اندر ایک زبردست اتحادی شعور پیدا کر دیا تھا۔ یہ شعور اس قدر پختہ تھا کہ انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہ تھی۔ غرض اس طرح ایک بہت بڑا خاندان وجود میں آ گیا۔ ایک جماعت وجود میں آ گئی۔ اس قسم کا خاندان نہ حکومت کی اساس پر قائم ہو سکتا تھا ' نہ معاشرتی حالات اسے پیدا کر سکتے تھے۔ بہرحال یہ اخوت اسلامی تھی ' ایک اندرونی شعور تھا۔

مہاجرین انصار بھائیوں کے ہاں آ کر اترے۔ جنہوں نے ان کے لیے مدینہ کو خوب سنبھالا۔ استقبال کیا۔ ان کو اپنے دلوں اور گھروں میں اتارا اور آنکھوں پر بٹھایا۔ انہوں نے ان کو اپنے مالوں میں شریک کیا اور ایک دوسرے سے بڑھ کر ان کو پناہ دی۔ اس قدر مقابلہ ہوا کہ کوئی مہاجر کسی انصاری کے ہاں صرف قرعہ اندازی کے ذریعے جا سکتا تھا۔ کیونکہ مہاجرین کم تھے اور انصار زیادہ تھے جو پناہ دینا چاہتے تھے۔ یہ پناہ نہایت اعتماد اور شوق سے دی گئی۔ حقیقی خوشی اور دلی مسرت کے ساتھ دی گئی۔ یہ پناہ ہر قسم کے فطری بخل اور تکبر اور نمائش سے پاک تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کی۔ یہ نظام نظریاتی سوسائٹیوں کی تاریخ میں ایک بے مثال نظام تھا۔ یہ برادری باقاعدہ خون کی برادری کے قائم مقام ہو گئی۔ چنانچہ اس نظام کے تحت لوگ ایک دوسرے کے وارث بھی ہوئے اور اجتماعی تکافل کے دوسرے فرائض و واجبات بھی ادا کرتے رہے۔ مثلاً دیت وغیرہ۔

یہ شعوری اتحاد نہایت بلند مقام تک جا پہنچا اور مسلمانوں نے بڑی سنجیدگی سے ان تعلقات کو مستحکم کیا۔ اسی طرح وہ بھائی بن گئے جس طرح اسلام کے دوسرے احکام انہوں نے قبول کیے۔ چنانچہ یہ سوسائٹی ایک مستحکم حکومت کی شکل اختیار

کر گئی ہے اور مواخات کے اصول باقاعدہ حکومتی ادارہ' ایک قانونی نظام اور ایک مستقل صورت حال اختیار کر گئے ۔ بلکہ اس کی جڑیں بہت گہری ہو گئیں ۔ اس نئی جماعت اور سوسائٹی کو کسی دھچکے سے بچانا بھی ضروری تھا ۔ یہ نظام جو مستقل شکل اختیار کر رہا تھا اللہ کے منشاء کے مطابق ایک عارضی انتظام تھا ۔

جس جماعت کو بھی ایسے حالات کا سامنا ہو جیسا کہ مدینہ کی اسلامی جماعت کو تھا' اس کے لیے اس قسم کا شعور پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ اس شعور کے تحت ایک مستقل سوسائٹی اور حکومت وجود میں آ جائے ۔ ایک قانونی نظام ہو' اور مسلم ادارے ہوں تاکہ غیر معمولی حالات میں ایسی جماعت کو درپیش مسائل حل کیے جا سکیں اور اس طرح جماعتی زندگی کو ترقی دی جا سکے ۔ یہ کام اس وقت تک ہوتا رہے جب تک حالات معمول پر نہیں آ جاتے ۔

اسلام اگرچہ اس قسم کے شعور کو ہر وقت زندہ رکھنا چاہتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اس قسم کی اخوت اور ایثار کے فوارے اسلامی سوسائٹی کے اندر پھوٹتے ہی رہیں ۔ ان سے محبت اور قوت کے چشمے جاری رہیں لیکن اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ سوسائٹی کا ارتقاء طبیعی حالات کے مطابق ہو اور اجتماعیت کا نظام محض وقتی جذبات اور وقتی طوفان پر نہ ہو' جن سے غیر معمولی حالات میں کام لیا جاتا ہے بلکہ سوسائٹی کو طبیعی اور نارمل حالات پر استوار کیا جاتا رہے ۔ اور معمول کے مطابق نظام چلتا رہے ۔ حتیٰ کہ غیر ضروری اور استثنائی حالات ختم ہوں ۔

جب غزوۂ بدر کے بعد مدینہ میں حالات قدرے معمول پر آ گئے' اسلامی حکومت مستحکم ہو گئی' اجتماعی حالات معمول کے مطابق مستحکم ہو گئے اور لوگوں کے لیے روزگار کا انتظام ہو گیا ۔ اسلامی لشکروں نے جو چھوٹی موٹی لشکر کشیاں شروع کر دی تھیں' بدر کی جنگ کے بعد ان کی وجہ سے لوگوں کے مالی حالات درست ہو گئے' خصوصاً بنی قینقاع کی جلاوطنی کی وجہ سے مسلمانوں کے پاس کافی اموال جمع ہو گئے ۔ جونہی سوسائٹی کے اندر دوسرے ذرائع سے سوشل سیکورٹی کا انتظام ہو گیا قرآن کریم نے مواخات کے اس غیر معمولی نظام کو ازروئے قانون ختم کرنے میں ایک منٹ کی دیر نہیں لگائی اور اجتماعی کفالت کا نظام خاندانی اور نسب کے نظام کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ۔ البتہ اسلام نے اسلامی اخوت اور مواخات کے پیچھے جو شعوری جذبہ تھا' اسے بہرحال بحال رکھا کہ اگر پھر اس قسم کے غیر معمولی حالات پیدا ہو جائیں تو دوبارہ یہ نظام قائم ہو سکے ۔ اس طرح جماعت مسلمہ کے اندر اجتماعی کفالت کا نظام اپنی حقیقی حالت کی طرف لوٹا دیا گیا' غرض وراثت و دیات میں تکافل خون اور نسب کی طرف لوٹا دیا گیا ۔ جیسا کہ اللہ کی کتاب میں پہلے ہی یہ درج تھا

وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا (۶:۳۳) ”مگر کتاب اللہ کی رو سے عام مومنین و مہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں' البتہ اپنے رفیقوں کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کر سکتے ہیں ۔ یہ حکم کتاب الٰہی میں لکھا ہوا ہے“ ۔

فیصلہ کر دیا گیا کہ رسول اللہ ولی عام ہیں اور یہ وہ ولایت ہے جو رشتہ داری بلکہ اپنے نفوس پر بھی مقدم ہے ۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (۶:۳۳) ”نبی مومنین کے لیے ان کے نفسوں سے بھی

مقدم ہے"۔ اور یہ بھی فیصلہ کر دیا گیا کہ ازواج مطہرات روحانی مائیں ہیں۔

وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ (۳۳ : ۶) "آپ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولایت عام ولایت ہے' آپ کو اختیارات حاصل تھے کہ آپ امت مسلمہ کو زندگی کا پورا نظام دے دیں۔ اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ رسول اللہ پر درود وسلام بھیجیں اور ان کے لیے کوئی راہ اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ ان امور کو اپنالیں جو ان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کر لیے۔

لا یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبع لما جئت بہ "تم میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشات ان احکام کے تابع نہ ہو جائیں جو میں لے کر آیا ہوں"۔

اس میں مسلمانوں کا شعور بھی شامل ہے' لہٰذا ان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سب چیزوں سے زیادہ محبوب ہونی چاہئے۔ اپنی جان سے بھی وہ بمقابلہ رسول زیادہ محبت نہیں کر سکتے۔ ان کے دلوں میں کوئی ذات یا کوئی چیز ذات رسول سے مقدم نہ ہونی چاہئے۔ حدیث صحیح میں ہے۔

والذی نفسی بیدہ لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من نفسہ ومالہ وولدہ والناس اجمعین "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا' جب تک میں اس کے نزدیک اس کے نفس اس کے مال' اور اس کی اولاد بلکہ تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ صحیح حدیث میں ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔ میں نے کہا حضور' آپ میرے نفس کے سوا مجھے دنیا کی تمام چیزوں سے عزیز ہیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں اے عمر' یہاں تک کہ میں آپ کے لیے تمہاری جان سے بھی محبوب نہ ہو جاؤں"۔ اس پر اس نے کہا رسول خدا' خدا کی قسم بے شک آپ مجھے تمام چیزوں سے محبوب ہیں یہاں تک میرے نفس سے بھی۔ اس پر آپؐ نے فرمایا "اب اے عمر"۔ یہ صرف باتیں ہی نہ تھیں۔ یہ ایک بلند معیار تھا جس تک اسلامی سوسائٹی پہنچی ہوئی تھی اور اس تک کوئی دل تب ہی پہنچ سکتا ہے جب تک کسی دل کو عالم بالا کی جانب سے مساس حاصل نہ ہو جائے اور وہ اپنی نظر بس افق بلند تک اونچی نہ کر دے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ذات کی کشش اور اس کی گہری محبت بھی رسول اللہؐ کے لیے ہو جاتی ہے۔ انسان اپنی ذات اور اپنی ذات کے متعلقات سے ناقابل تصور محبت کرتا ہے۔ بعض اوقات اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے جذبات اور احساسات پر قابو پالیا ہے۔ اپنے نفس کو رام کر لیا ہے اور حب ذات کی بلندیوں سے وہ اتر آیا ہے لیکن جب اس کی ذلت اور اس کے مفادات پر زد پڑتی ہے تو وہ یوں اچھل پڑتا ہے جیسا کہ اسے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ وہ اس چبھن کو اس طرح محسوس کرتا ہے کہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ اگر برداشت کر بھی لے تو یہ درد اس کے شعور میں بیٹھ جاتا ہے اور اس کی گہرائیوں میں گھر کر لیتا ہے۔ بعض اوقات انسان اپنی پوری زندگی بھی قربان کر دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے لیکن اپنی ذاتی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ نہ وہ کوئی ایسا عیب برداشت کر سکتا ہے جو اس کی ذات وصفات کی طرف منسوب کیا جائے اگرچہ کوئی بظاہر یہ ظاہر کرے کہ

وہ ان باتوں پر کوئی اعتراض نہیں کرتا' یا ان کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ غرض اپنی ذات پر قابو پانا اور اپنی ذات سے بھی حضور اکرمؐ اور اپنے نظریہ کو زیادہ اہمیت دینا' محض زبانی بات نہیں ہے کہ کوئی آسانی سے کہہ دے ۔ یہ ایک ایسا مقام بلند ہے جس تک عالم بالا کے مساس کے بغیر کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے طویل جدوجہد' طویل مشق اور دائمی بیداری اور مخلصانہ خواہش کی ضرورت ہے جس کے ساتھ اللہ کی خاص مدد شامل حال رہے ۔ یہ ہے عظیم جہاد۔ جیسا کہ اسے رسول اللہؐ نے جہاد اکبر کہا اور یہ وہ مقام ہے کہ حضرت عمرؓ جیسی شخصیت کو بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے تنبیہ اور تصحیح کی ضرورت پڑ گئی ۔ یہ ان کے قلب صافی کی ایک چنگی تھی جس کے نتیجے میں حضرت عمرؓ اس مقام بلند تک پہنچ گئے اور ایک سیکنڈ میں ۔ ولایت عامہ میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے امت کے افراد پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ حدیث صحیح میں ہے ''جو بھی مومن ہیں میں ان کے لیے تمام لوگوں سے محبوب ہوں' دنیا اور آخرت دونوں میں' اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ (۳۳ : ۶) ''نبی مومنین کے لیے ان کے نفسوں سے بھی مقدم ہے''۔ اس لیے جس مومن نے مال چھوڑا تو یہ اس کے عصبات کو ملے گا جو بھی ہوں اور اگر اس پر قرض ہو یا کوئی تاوان ہو تو وہ میرے پاس آئے' میں اس کا والی ہوں''۔ معنی یہ ہے کہ اگر مومن مر جائے اور اس کی میراث میں مال نہ ہو جس سے اس کا قرضہ ادا کر دیا جائے تو میں اس کا قرض ادا کروں گا اور اگر اس کے عیال ہوں تو میں ان کی پرورش کروں گا' اگر چھوٹے ہوں۔ اس کے علاوہ عام حالات میں' عام لوگوں کی زندگی طبعی حالات کے مطابق اپنی جدوجہد کے مطابق گزرے گی' اس کے لیے اس قسم کے غیر معمولی جوش و خروش پیدا کرنے کی ضرورت نہیں جو غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے ۔ اگرچہ نظام مواخات قانونی اعتبار سے تو ختم کر دیا گیا مگر اخلاقی دائرے میں موجود رہا۔ لہٰذا اگر کوئی دوست اپنے دوست کے لیے کوئی وصیت کر جائے تو اسے ثلث مال تک وصیت کی اجازت ہے ۔

اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِکُمْ مَّعْرُوْفًا (۳۳ : ۶) ''الا یہ کہ تم اپنے دوستوں کے ساتھ کوئی احسان کرنا چاہو''۔

ان تمام اقدامات کو مضبوطی سے اس کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ یہ اللہ کا ارادہ اور مشیت ہے اور کَانَ ذٰلِکَ فِی الْکِتٰبِ مَسْطُوْرًا (۳۳ : ۶) ''یہ قانون کتاب میں لکھا ہوا تھا''۔ لہٰذا دل مطمئن رہیں اور اس اصل کو مضبوطی سے پکڑے رکھیں جس کی طرف تمام قوانین لوٹتے ہیں۔

یوں اب لوگوں کی معاشی زندگی اپنے قدرتی اصولوں پر استوار ہو جاتی ہے اور نہایت ہی سنجیدگی اور اطمینان سے چلتی ہے ۔ اور اس کو ایسے معیار پر نہیں رکھا گیا جو غیر معمولی حالات میں قائم کیے جا سکتے ہیں ۔ محدود جماعتوں اور محدود افراد کے اندر۔

لیکن اسلام اس فیاض سرچشمے کو بند بھی نہیں کرتا تاکہ اگر مستقبل میں اسلامی جماعت کو کسی استثنائی حالت میں ضرورت پڑے تو وہ اس جذبہ کو کام میں لائے یعنی ہنگامی حالات میں۔

اس بات کی مناسبت سے کہ یہ سب کچھ پہلے ہی کتاب میں لکھا ہوا تھا اور اللہ کی مشیت نے طے کر دیا تھا کہ وہ باقی

رہنے والا دائمی قانون بن جائے اور مسلسل طریقہ کار ہو۔اس حوالے سے نبیوں کے ساتھ ہونے والے معاہدے کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔خصوصاً اولوالعزم نبیوں سے کہ وہ اسلامی نظام کے قیام کی ذمہ داری قبول کریں اور اس تحریک پر جمے رہیں لوگوں کے اندر تبلیغ و تحریک کا کام جاری رکھیں اور ان اقوام میں اس دعوت کو جاری رکھیں جن کی طرف ان کو بھیجا گیا ہے تاکہ یہ بات لوگوں کے خلاف حجت ہو کہ ان تک پیغام پہنچا تھا اور وہ اپنی ضلالت و ہدایات کے ذمہ دار ہیں کفر اور ایمان کے ذمہ دار ہیں۔کیونکہ پیغمبروں کی تبلیغ کے بعد تو حجت تمام ہو جاتی ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِيْمَ
وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۙ لِّيَسْـَٔلَ
ع ۸ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۧ
۱۷

اور (اے نبیؐ) یاد رکھو اس عہد و پیمان کو جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا ہے ' تم سے بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی۔سب سے ہم پختہ عہد لے چکے ہیں۔تاکہ سچے لوگوں سے (ان کا رب) ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے ' اور کافروں کے لیے تو اس نے دردناک عذاب مہیا کر ہی رکھا ہے"۔

یہ وعدہ نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک مسلسل لیا گیا۔یہ واحد میثاق والا نظام ہے اور یہ واحد امانت ہے۔ہر نبی اپنے ماقبل سے لیتا رہا اور آنے والے کو دیتا رہا۔

ابتداء میں تمام نبیوں کے بارے میں کہا گیا کہ ہم نے ان سے میثاق لیا اور اس کے بعد قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی طور پر تھا (وَمِنْكَ) کیونکہ آپ خاتم النبین ہیں اور آپ کی دعوت عالمی ہے۔اس کے بعد اولوالعزم رسولوں کے نام گنوائے 'نوح ' ابراہیم ' موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کا ذکر ہوا۔

اصحاب میثاق کے ذکر کے بعد اب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ عہد تھا کیا اور کیسا تھا تو وہ بہت پختہ عہد تھا ' بہت بھاری عہد تھا۔

مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (۳۳ : ۷) پختہ عہد۔اس میں لفظ میثاق کے لغوی معنے کی طرف اشارہ ہے۔لغت میں میثاق بٹی ہوئی رسی کو کہتے ہیں۔استعارہ کے طور پر عہد کے لیے استعمال کیا گیا۔اس لفظ کے استعمال سے ایک معنوی مفہوم کو مجسم کر کے دکھانا مطلوب ہے تاکہ انسانی شعور اچھی طرح سمجھ لے کہ یہ کوئی پختہ اور اہم عہد تھا جو اس قدر بڑے بڑے پیغمبروں سے لیا گیا کہ وہ وحی وصول کریں ' اس کی تبلیغ کریں اور اس کے مطابق اسلامی نظام قائم کریں اور نہایت امانت اور استقامت کے ساتھ ' اس کی ذمہ داریاں برداشت کریں۔

لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ (۳۳ : ۸) "تاکہ اللہ سچے لوگوں سے ان کی سچائی کے بارے میں

سوال کرے"۔ اور صادق اہل ایمان ہیں کیونکہ انہوں نے سچ کہا اور سچے عقیدے کو قبول کیا۔ ان کے سوا تمام دوسرے لوگ جھوٹے ہیں کیونکہ ان کے عقائد باطل ہیں اور ان کی باتیں باطل ہیں۔ لہذا تعبیر کا خاص مفہوم ہے۔ سچوں سے سوال ایسا ہی ہو گا جس طرح ایک لائق شاگرد سے استاد لوگوں کے سامنے مجلس یا تقریب میں یہ پوچھتا ہے کہ تم نے کتنے نمبر لیے اور کیسے جوابات دیئے اور یوں کامیابی حاصل کی۔ یہ سوال ان کی عزت افزائی کے لیے اعلانیہ تمام لوگوں کے سامنے ہو گا تاکہ تمام سننے والے بھی ان کی تعریف کریں۔ اسی طرح یوم الحشر میں اللہ صادقین سے سوال ان کی تکریم کے لیے کرے گا۔

اب دوسرے لوگ جنہوں نے باطل نظریات اپنائے اور جنہوں نے جھوٹے بول بولے حالانکہ ان کے سامنے اس کائنات کا بہت بڑا مسئلہ پیش کیا گیا تھا، جس میں یا انہوں نے سچا کلمہ کہنا تھا یا جھوٹا، ان سے سوال ہو گا اور ان کے لیے سزا بھی حاضر ہو گی اور وہ تیار کھڑی ہو گی۔

وَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا (۳۳:۸) "اور کافروں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۸۹ ایک نظر میں

جنگاہ حیات اور حادثات کے میدان کارزار میں اسلامی شخصیت کی تشکیل ہو رہی تھی۔ ہر نئے دن کے طلوع ہونے کے بعد اور ہر نئے حادثے کے بعد یہ شخصیت واضح ہوتی جاتی تھی۔ اس کے خدوخال نکھر کر سامنے آتے تھے۔ جماعت مسلمہ ان شخصیات سے تشکیل پارہی تھی جن کی خاص صلاحیتیں تھیں۔ ان کی خاص اقدار حیات تھیں اور تمام دوسری سوسائٹیوں سے اس کا رنگ ڈھنگ بالکل مختلف تھا۔

اس جماعت کے خلاف روز کوئی نہ کوئی واقعہ پیش آتا اور یہ واقعات جماعت کے لیے بڑا فتنہ بن جاتے اور یہ فتنہ اس طرح ہوتا تھا جس طرح سونے کا "فتنہ" ہوتا ہے۔ اس فتنے سے اصلی جوہر اور کھوٹ علیحدہ ہو جاتے تھے' انسانوں کی حقیقت اور ان کا اصل جوہر سامنے آجاتا تھا۔ جھاگ دور ہو جاتی تھی اور خالص سونا جدا ہو جاتا تھا۔ یوں اسلامی سوسائٹی سے ایسی قدریں ختم ہو جاتی تھیں جن میں ملاوٹ ہوتی تھی۔

ان ابتلاؤں میں قرآن کریم نازل ہوتا تھا یا واقعات و حادثات کے بعد ان پر تبصرہ ہوتا تھا۔ اس تبصرے میں واقعات بتائے جاتے' ان پر روشنی ڈالی جاتی اور ان کے نشیب و فراز بتائے جاتے۔ یوں ہر ایک کا موقف سامنے آتا۔ ضمیر و شعور اور نیت و ارادے کی اصلاح ہوتی اور ان واقعات کی روشنی میں لوگوں کو ہدایات دی جائیں اور وہ ہدایات اچھی طرح ان کی سمجھ میں آجاتیں لوگ ان ہدایات سے اچھی طرح متاثر ہوتے اور اپنی اصلاح کرتے۔ یوں اسلامی جماعت کی تربیت ہر دن کے بعد ہوتی رہتی اور ہر حادثے کے بعد اسے ہدایات ملتی رہتیں۔ اسلامی نظام حیات کے اہداف کے مطابق اس جماعت مسلمہ کی شخصیت بنتی اور وہ ان تبصروں سے تاثرات لیتے۔

یوں نہیں ہوا کہ تمام احکام اور ہدایات ایک ہی بار نازل کر کے مسلمانوں کے سامنے رکھ دیئے گئے ہوں اور پھر یہ کہا گیا ہو کہ جاؤ ان پر عمل کرو۔ بلکہ یہ ہدایات اور یہ قوانین واقعات کے بعد نازل ہوتے رہے' آزمائشیں آتیں' فتنے آتے اور واقعات پیش آتے' ادھر سے وحی آجاتی کیونکہ اللہ خالق کریم کو یہ علم تھا کہ انسانی اخلاق کو صرف تدریج ہی کے ساتھ اچھی طرح نئے سانچے میں ڈھالا اور اچھی طرح پختہ کیا جا سکتا ہے۔ انسانی اخلاق کی نوک پلک صرف آزمائشوں اور واقعات و حادثات کی شکل میں درست کی جا سکتی ہے۔ یعنی واقعاتی تجربات کی صورت میں۔ کیونکہ عملی تجربات کے نتیجے میں بات دلوں کی تہ تک اتر جاتی ہے اور اعصاب بھی اس کے مطابق حرکت کرنے لگتے ہیں۔ یہ اعصاب پھر اس طرح جدید ردعمل ظاہر کرتے ہیں جس طرح معرکہ کارزار میں یا واقعات اور حادثات میں انسان کا فطری ردعمل ہوتا ہے۔ ایسے واقعات میں جب قرآن نازل ہوتا تو وہ بتا دیتا کہ یہ واقعہ کیا ہے۔ اس کے پیچھے کیا عوامل ہیں اور اس میں ایک مسلمان کا اسلامی ردعمل کیا ہونا چاہئے۔ اس طرح اسلامی شخصیت آزمائشوں کی بھٹی سے صاف ستھری ہو کر نکل آتی' نکھر آتی' آزمائش کی تپش اس کے اخلاقی جسم سے ہر قسم کا کھوٹ نکال کر رکھ دیتی اور اب اسلام جس سانچے میں چاہتا' ان شخصیات کو ڈھال لیتا۔

یہ ایک عجیب دور تھا جو مسلمانوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں گزارا۔ اس میں آسمانوں و زمین کے قلابے ملے ہوئے تھے۔ آسمان سے اہل زمین کا براہ راست رابطہ تھا۔ تمام واقعات اور تمام مکالمات میں آسمان سے ہدایت آ جاتی۔ ہر مسلمان رات اور دن یوں زندگی بسر کر رہا تھا کہ اللہ دیکھ رہا ہے سن رہا ہے۔ ابھی کوئی ہدایت یا تبصرہ نہ آ جائے۔ اس کا کوئی کلمہ، اس کی کوئی حرکت بلکہ اس کا کوئی ارادہ نزول وحی کا سبب نہ بن جائے۔ لوگوں کے سامنے ظاہر نہ ہو جائے، رسول اللہ کے پاس سے اس کے بارے میں کوئی تبصرہ نہ آ جائے۔ گویا ہر مسلمان محسوس کرتا تھا کہ وہ رب تعالیٰ کے ساتھ براہ راست منسلک ہے۔ اگر اسے کوئی معاملہ درپیش ہوتا یا کوئی مشکل درپیش ہوتی تو وہ انتظار کرتا کہ اس کے بارے میں کوئی فتویٰ، کوئی ہدایت، کوئی فیصلہ آسمان سے آ جائے اور اللہ بتا دے بذات خود، اے فلاں تم نے یہ کہا، تم نے یوں کہا، تم نے یوں سوچا۔ یہ ظاہر کیا اور یہ چھپایا، یوں کرو، یوں نہ کرو، اور ایسا طرز عمل اختیار نہ کرو۔ یہ ایک عجیب دور تھا کہ اللہ کا ایک متعین حکم کسی متعین شخص کے بارے میں آ پہنچتا۔ اور یہ حکم پھر اس کے لیے بھی ہوتا اور تمام اہل زمین کے لیے بھی ہوتا۔ زمین کے ذرے ذرے کے لیے ہوتا۔ پوری زمین کے لیے ہی ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ عجیب دور تھا۔ آج جب انسان اس کے بارے میں سوچتا ہے اس کے واقعات اور حادثات کو دہراتا ہے، پڑھتا ہے، پڑھاتا ہے تو وہ اچھی طرح ایک نقشہ ذہن میں لا سکتا ہے، ایک منظر دیکھ سکتا ہے کہ کس قدر عجیب دور تھا یہ۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی تربیت صرف اس شعور کے ذریعہ ہی نہیں کی کہ ان کی شخصیت کو پختہ کر دیا جائے بلکہ ان کو عملی تجربوں سے گزارا گیا۔ ان کو آزمائشوں میں مبتلا کیا گیا جس میں ان کا نقصان بھی ہوا لیکن فائدے بہت ہوئے اور یہ سب امور اللہ کی گہری حکمتوں کے مطابق سرانجام پاتے، کیونکہ اللہ علیم و خبیر ہے اور وہ اپنی مخلوق کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے۔

یہ حکمت کیا تھی؟ ہمیں اس پر ذرا طویل غور و فکر کرنا چاہئے تاکہ ہم اسے معلوم کر لیں، پھر اس پر تدبر کریں۔ اور پھر ہم زندگی کے واقعات، آزمائشوں پر اس کی روشنی میں غور کریں۔

--- OOO---

اس سبق میں تحریک اسلامی کو پیش آنے والے ایک بڑے واقعہ کی تشریح کی گئی ہے۔ اور اسلامی تاریخ کے اس واقعہ میں جماعت مسلمہ کے لیے ایک بڑی آزمائش تھی اور یہ وقت امت مسلمہ پر بہت برا وقت تھا۔ بڑی مشکل دور سے تحریک گزر رہی تھی۔ یعنی غزوۂ احزاب کا دور۔ یہ جنگ ہجرت کے پانچویں یا چوتھے سال میں پیش آئی۔ یہ اس نئی اٹھنے والی تحریک کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔ تحریک اسلامی کی تمام اقدار اور تمام نظریات داؤ پر تھے۔ ان آیات پر غور کرنے سے، غزوۂ احزاب کے واقعہ کے پیش کرنے سے، اس کے اسلوب بیان سے، بعض واقعات پر تبصرے سے، بعض لوگوں کی حرکتوں سے، بعض افراد کی سوچ سے، اور بعض لوگوں کے خدشات سے اور پھر اس جنگ میں سامنے آنے والی اقدار سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے ذریعہ امت مسلمہ کی تربیت کس خوش اسلوبی سے فرما رہے تھے۔

جنگ احزاب جیسے اہم واقعہ پر قرآن کریم کس انداز سے تبصرے کرتا ہے اور امت کو کس انداز سے ہدایات دیتا ہے۔ قرآنی نصوص کی تشریح سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ اس واقعہ کی پوری تفصیل ذرا اختصار سے کتب سیرۃ سے نقل کر دی

جائے۔ اس سے ہم تقابلی مطالعہ کر سکیں گے کہ انسان واقعات کو کس طرح بیان کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے تبصرہ کیسے ہوتا ہے۔

محمد ابن اسحاق نے اپنی سند کے ساتھ ایک جماعت سے نقل کیا ہے.... جنگ خندق کے واقعات میں یہ ہے کہ کچھ یہودی جن میں سے سلام ابن ابو الحقیق نضری' یحییٰ ابن اخطب نضری' کنانہ ابن ابو الحقیق نضری' ہودہ ابن قیس وائلی اور ابو عمار وائلی تھے اور ان کے ساتھ کچھ لوگ بنو نضیر' کچھ لوگ بنی وائل کے بھی تھے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے رسول اللہ کے خلاف لشکر جمع کیے۔ یہ سب سے پہلے گھروں سے نکلے' قریش سے ملے اور ان کو دعوت دی کہ رسول خداؐ کے خلاف جنگ کریں اور انہوں نے کہا کہ ہم تمہارا ساتھ اس وقت تک دیں گے جب تک اس کو بنیاد سے نہ اکھاڑ دیں۔ قریش نے کہا' اے ملت یہود' تم لوگ پہلی کتاب کے حاملین ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کیا اختلاف ہے' تم لوگ بتاؤ کہ اس کا دین اچھا ہے یا ہمارا۔ تو انہوں نے کہا اس کے دین سے تمہارا دین سچا ہے اور اس کے مقابلے میں تم زیادہ برحق ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں یہ آیات اتریں :

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا (٤ : ٥١) "کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں"۔ یہاں سے لے کر آیت

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا (٥٤) فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا (٥٥) (٤ : ٥٤ — ٥٥) "پھر کیا یہ دوسروں سے اس لیے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا اگر یہ بات ہے تو انہیں معلوم ہو کہ ہم نے تو ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی اور ملک عظیم بخش دیا۔ مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لائے اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا اور منہ موڑنے والوں کے لیے تو جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے"۔

جب انہوں نے قریش کو یہ فتویٰ دیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور جوش میں آگئے اور رسول اللہ کے خلاف لڑنے کی حامی بھرلی۔ یہ لوگ اب قریش کو چھوڑ کر غطفان کے پاس گئے' جو قیس غیلان کی نسل سے ہیں۔ انہوں نے ان کو بھی دعوت دی کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لڑیں انہوں نے ان کو بتایا کہ یہ خود بھی ساتھ دیں گے اور قریش بھی ساتھ دیں گے۔ لہٰذا تم لوگ قریش کے ساتھ میٹنگ کرو۔

چنانچہ قریش کا یہ لشکر ابو سفیان ابن حرب کی سربراہی میں' غطفان اپنے سردار عیینہ ابن حصن بن فزاری کے ساتھ' اور حارث ابن عوف بنی مرہ کے ساتھ اور مسعر ابن امیہ اپنے متبعین بنی اشجع کے ساتھ نکلے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لشکر کشی کی اطلاعات ملیں تو آپ ؐ نے مدینہ کے اردگرد خندق کھودنا شروع کر دی ۔ خندق کھودنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کام کیا اور مسلمانوں نے بھی کام کیا ۔ آپ نے بھی جانفشانی سے کام کیا اور مسلمانوں نے بھی سخت جانفشانی سے کام کیا ۔ اس کام میں رسول اللہ ؐ اور مسلمانوں کے مقابلے میں بعض منافقین نے نہایت سست روی سے کام لیا ۔ وہ بہت چھوٹے موٹے کاموں میں لگ جاتے اور بغیر اذن رسول ؐ کے کھسک جاتے ۔ وہ گھروں کو چلے جاتے اور رسول اللہ کو علم بھی نہ ہوتا ۔ اور مسلمانوں کی روش یہ ہوتی کہ اگر کسی کا کوئی ضروری کام پیش آتا تو وہ رسول اللہ ؐ سے اجازت لے کر چلا جاتا اور کام کر کے جلدی سے واپس آ جاتا ۔ اور نہایت ہی ذوق و شوق سے کام کرتا ۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰى یَسْتَاْذِنُوْهُ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ( ۲۴ : ۶۲ ) " مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ؐ کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام کے موقعہ پر رسول کے ساتھ ہوں تو اس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں ۔ اے نبی جو لوگ تجھ سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور رسول کے ماننے والے ہیں ۔ پس وہ اپنے کسی کام سے اجازت مانگیں تو جسے چاہو اجازت دے دیا کرو ۔ اور ایسے لوگوں کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کیا کرو ۔ اللہ غفور و رحیم ہے " ۔ اس کے بعد اللہ نے ان لوگوں کے بارے میں کہا جو بغیر اجازت کے کھسک جاتے تھے اور کام چوری کرتے تھے ۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِیْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ یُصِیْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ( ۲۴ : ۶۳ ) " مسلمانو ! اپنے درمیان رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کا سا بلانا نہ سمجھ بیٹھو ۔ اللہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی آڑ لے کر چپکے سے کھسک جاتے ہیں ۔ رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آ جائے " ۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق سے فارغ ہوئے تو قریش حبشیوں ، کنانہ اور تہامہ کا ایک بڑا لشکر جرار لے کر پہنچ گئے ۔ یہ مقام رومہ کے مجمع اسیال پر اترے اور غطفان اور ان کے تابع دوسرے کچھ قبائل احد کے پاس ذنب نقمی پر اترے ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان تین ہزار کی تعداد میں تھے ۔ اسنادی سر کی پشت کو وہ سلع کی طرف

تھی ۔ یہ لشکر یہاں اترا اور احزاب اور مسلمانوں کے لشکر کے درمیان خندق تھی ۔ بچوں اور عورتوں کو حکم دیا کہ وہ قلعہ بند ہو جائیں ۔

--- ○○○---

اللہ کا دشمن حیی ابن اخطب نضری 'کعب ابن اسد قرظی سے ملا ۔ یہ صاحب تھے جنہوں نے بنی قریظہ کی طرف سے عہد کیا تھا اس نے اپنی قوم کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین دہانی کرائی تھی اور ان پر رسول اللہؐ سے عہد و پیمان کیا تھا ۔ حیی کعب ابن اسد سے چپکا رہا اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف آمادہ کرتا رہا ۔ اسے دھوکہ دینے کے لیے بار بار چکر لگاتا رہا ۔ یہاں تک کہ اس نے اس سے بھی وعدہ لے لیا کہ اگر قریش اور غطفان واپس ہو گئے اور محمد پر حملہ آور نہ ہوئے تو میں تمہارے ساتھ تمہارے قلعہ میں رہوں گا تاکہ مجھے بھی وہ بات نہ پہنچ جائے جو تجھے پہنچے ۔ ان یقین دہانیوں پر کعب ابن اسد نے حضور اکرمؐ سے کیے ہوئے عہد کو توڑ دیا اور اس کے اور رسول اللہؐ کے درمیان جو عہد تھا' اس سے براءت کا اظہار کر دیا ۔

اس پر مسلمانوں کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا اور خوف و ہراس پھیل گیا ۔ اب اوپر سے بھی دشمن حملہ آور ہو گیا اور نیچے سے بھی ۔ مسلمانوں نے ہر قسم کے خیالات دل میں دوڑانے شروع کر دیئے ۔ بعض منافقین کا نفاق بھی ظاہر ہونا شروع ہو گیا ۔ ایک شخص معتب ابن قشیر' بنی عمرابن عوف قبیلے کے فرد سے یہ کہتے سنا گیا "محمدؐ تو ہم سے یہ وعدے کرتے تھے کہ قیصر و کسریٰ کے خزانے کھائیں گے اور آج ہماری حالت یہ ہے کہ ہم' میں سے کوئی بے خوف ہو کر قضائے حاجت کے لیے نہیں جا سکتا" ۔ اور قبیلہ بنی حارثہ کے ایک شخص اوس ابن قیظی کہنے لگا "حضور ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں اور یہ بات انہوں نے اپنی قوم کے سامنے کی تو آپ ہمیں اجازت دے دیں کہ ہم لوگ اپنے گھروں کو چلے جائیں کیونکہ ہمارے گھر مدینہ سے باہر ہیں" ۔

رسول اللہؐ بھی ڈٹے رہے اور مشرکین بھی تقریباً ایک ماہ تک پڑے رہے ۔ جنگ صرف تیروں اور محاصرے تک محدود رہی ۔ جب لوگوں کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا تو حضورؐ نے ایک وفد عیینہ ابن حصن اور حارث ابن عوف کی طرف بھیجا ۔ یہ دونوں غطفان کے لیڈر تھے ۔ ان کو یہ پیش کش کی کہ ہم مدینہ کی کھجوروں کا ۳/۱ حصہ ادا کریں گے اس شرط پر کہ تم لوگ اپنے آدمیوں کو لے کر واپس ہو جاؤ ۔ صلح کے مذاکرات ہوئے' ایک معاہدے کا مسودہ بھی تیار ہو گیا ۔ شہادت اور دستخط ابھی نہ ہوئے تھے جب حضورؐ نے دستخط کرنا چاہے تو آپ نے سعد ابن معاذ رئیس اوس اور سعد ابن عبادہ رئیس خزرج کو بلایا اور ان کے سامنے اس معاہدے کا تذکرہ کیا اور مشورہ طلب کیا ۔ انہوں نے کہا حضور اکرمؐ اگر آپ اس معاہدے کو پسند کرتے ہیں تو آپ کی مرضی ہے' دستخط کر دیں ۔ یا اگر اللہ کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر ۔ اور اگر یہ بات آپ ہمارے مفاد میں کرنا چاہتے ہیں تو جائیں ۔ حضورؐ نے فرمایا میں یہ صرف تمہاری خاطر کرنا چاہتا ہوں ۔ میں تو یہ اس لیے کر رہا ہوں کہ تمام عرب ایک ہی کمان سے تمہارے خلاف تیراندازی کر رہے ہیں اور ہر طرف سے تمہارے اوپر ٹوٹ پڑے ہیں ۔ تو میں نے سوچا کہ ان کی قوت میں کچھ کمی کر دوں" ۔ اس پر سعد ابن معاذ نے فرمایا ہم اور یہ لوگ سب شرک پر تھے ۔ اور بتوں کی بندگی کرتے تھے ۔ نہ اللہ کی بندگی کرتے تھے اور نہ اللہ کو پہچانتے تھے ۔ یہ لوگ ہم سے کھجور کا ایک دانہ بھی نہ لے سکتے تھے الا یہ کہ بیعہ خریدتے یا بطور مہمان نوازی کے ہم ان کو کھلاتے ۔ اب جبکہ اللہ نے ہمیں

اسلام کے ذریعہ عزت بخشی ہے اور ہمیں ہدایت دی ہے اور آپ کے ذریعہ ہمیں اعزاز دیا ہے تو کیا اب ہم ان کو اپنا دل دے دیں ۔ ہمیں اس رعایت کی ضرورت نہیں ہے ۔ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ تلوار کرے گی ۔ تو حضورؐ نے فرمایا جو آپ کی مرضی ہو ۔ سعد ابن معاذ نے وہ مسودہ لیا اور اس کے اندر جو کچھ لکھا تھا' مٹا دیا ۔ اس نے کہا وہ ہمارے خلاف جو کچھ کرنا چاہیں کریں ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان نہایت خوف اور شدت کی حالت میں رہے ۔ کیونکہ دشمن نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا اور اس کی قوت زیادہ تھی ۔ یہودیوں نے ان کے ساتھ معاہدہ کر لیا تھا کہ وہ خیبر کی کھجوریں دیں گے ۔ اگر وہ اس موقعہ پر ان کی امداد کریں (تبریزی) ۔ حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ میں حضورؐ کے ساتھ کئی شدت اور خوف کے مقامات پر رہی ہوں ۔ غزوہ مریسیع' خیبر' حدیبیہ' فتح مکہ' حنین ۔ ان میں سے کسی جگہ حضورؐ نے تھکاوٹ محسوس نہیں کی ۔ نہ زیادہ خائف ہوئے' جس قدر تھکاوٹ اور خوف خندق میں تھا ۔ بنی قریظہ عورتوں اور بچوں کے قریب تھے ۔ مدینہ میں ساری رات پہرہ ہوتا تھا ۔ ہم مسلمانوں کا نعرۂ تکبیر صبح تک سنتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے خود بخود ان کو واپس کر دیا ۔

--- ○○○ ---

ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ ایک شخص نعیم ابن مسعود ابن عامر غطفانی رسول اللہؐ کے پاس آیا ۔ اس نے کہا رسول خداؐ میں مسلمان ہو چکا ہوں لیکن میری قوم کو میرے اسلام کا پتہ نہیں ۔ آپ جو خدمت میرے سپرد کر دیں' اس وقت کر سکتا ہوں ۔ حضورؐ نے فرمایا "ہم میں آپ واحد آدمی ہیں تو جس طرح ہو سکے' لوگوں کو ہمارے خلاف جنگ کرنے سے روک لیں کیونکہ جنگ ایک قسم کی چال ہوتی ہے ۔ اس نے ایک ایسی کارروائی کی جس کی وجہ سے ان احزاب اور بنو قریظہ کے درمیان اعتماد ختم ہو گیا ۔ اس کی تفصیلات کتب سیرت میں مفصلاً موجود ہیں ۔ اللہ نے احزاب کے اندر بھی بددلی پیدا کر دی اور ایک ایسا طوفان باد و باراں بھیجا کہ سردیوں کی شدید ٹھنڈی رات میں ان کے خیمے اکھڑ گئے' ان کی ہانڈیاں الٹ گئیں اور چولہے بجھ گئے --- جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ان کے اختلافات پہنچے' اور ان کی اجتماعیت ختم ہو گئی تو اس آخری رات کے حالات معلوم کرنے کے لیے حضورؐ نے حضرت حذیفہ ابن الیمان کو بھیجا ۔

محمد ابن اسحاق نے روایت کی ہے کہ میرے سامنے زید ابن زیاد ابن محمد ابن کعب قرظی نے روایت کی ہے "ایک کوفی باشندے نے حضرت حذیفہ ابن الیمان سے کہا : ابو عبداللہ! تم نے رسول اللہ کو دیکھا ہے اور آپ کے ساتھ صحبت کی ہے ۔ تو اس نے کہا ہاں بھتیجے میں نے دیکھا اور صحبت کی ۔ تو پھر تم کیا کرتے تھے؟ خدا کی قسم ہم بہت جدوجہد کرتے تھے تو اس شخص نے کہا خدا کی قسم اگر ہمیں رسول اللہؐ کو پاتے تو اسے ہرگز زمین پر چلنے نہ دیتے ۔ اور اپنی گردنوں پر انہیں اٹھائے رکھتے ۔ اس پر حضرت حذیفہ نے فرمایا : بھتیجے ہم نے حضورؐ کے ساتھ جنگ خندق میں حصہ لیا ۔ یوں ہوا کہ حضورؐ نے رات کے ایک حصے میں نماز پڑھی اور پھر ہماری جانب متوجہ ہوئے ۔ کون ہے جو اٹھے اور جا کر معلوم کرے کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں ۔ پھر وہ واپس آ جائے ۔ اس کے لیے رسول اللہؐ نے واپسی کی شرط لگائی ۔ میں اللہ سے سوال کروں گا کہ وہ جنت میں میرا ساتھی ہو" ۔ اس قدر شدید خوف تھا کہ کوئی نہ اٹھا ۔ اس قدر شدید بھوک تھی کہ کسی میں تاب نہ تھی اور سردی بھی شدید تھی ۔ جب کوئی نہ اٹھا تو مجھے رسول اللہؐ نے پکارا ۔ جب حضورؐ نے نام لیا تو میرے لیے اب کوئی چارۂ کار نہ تھا ۔ فرمایا "حذیفہ جاؤ' ان لوگوں میں داخل ہو جاؤ' دیکھو وہ کیا کرتے ہیں اور کوئی بات نہ کرو جب تک

ہمارے پاس نہ آجاؤ"۔ حذیفہ کہتے ہیں میں گیا۔ لشکر کے اندر داخل ہو گیا۔ طوفان اور اللہ کے لشکر ان کے ساتھ وہ کچھ کر رہے تھے جو کر رہے تھے۔ ہانڈیاں اپنی جگہ ٹھہر نہ سکتی تھیں۔ آگ سلگ نہ سکتی تھی۔ ابو سفیان کھڑا ہوا' حکم دیا کہ ہر شخص اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کے بارے میں تسلی کرے۔ میں نے پہلے ہی اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھ لیا کون ہو؟ تو اس نے بتایا فلاں ابن فلاں۔ اس کے بعد ابو سفیان نے کہا اہل قریش اب یہاں مزید نہیں رہ سکتے۔ گھوڑے اور اونٹ ہلاک ہو گئے۔ بنو قریظہ نے ہمارے ساتھ وعدہ خلافی کر دی اور ان کی جانب سے ہمیں وہ جواب ملا جسے ہم ناپسند کرتے ہیں' طوفان اس قدر ہے جو تم دیکھ رہے ہو۔ ہنڈیا اپنی جگہ قرار نہیں پکڑتی' آگ نہیں جلتی' خیمے اکھڑ گئے۔ لہٰذا کوچ کرو میں تو یہ گیا۔ یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ اپنے اونٹ کو اٹھایا۔ وہ تین ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا اور اس کا عقال اس نے کھڑے کھڑے کھولا۔ اگر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم نہ دیا ہوتا کہ کوئی بات نہ کرو جب تک میرے پاس نہ آجاؤ تو میں ایک ہی تیر مار کر ابو سفیان کا کام تمام کر دیتا۔ حذیفہ کہتے ہیں کہ میں جب واپس پہنچا تو دیکھا کہ حضورؐ کھڑے ہیں اور ایک لمبی چادر میں نماز پڑھ رہے ہیں جو لمبی تھی اور منقش تھی۔ یہ آپؐ کی ازواج میں سے کسی کی تھی۔ جب آپؐ نے مجھے دیکھا تو مجھے اپنے پاؤں کے نیچے چادر میں داخل کر لیا اور چادر کا ایک حصہ مجھ پر ڈال دیا۔ اس کے بعد آپؐ نے رکوع کیا اور سجدہ کیا اور میں چادر ہی میں لپٹا رہا۔ جب آپؐ نے سلام پھیرا تو میں نے آپؐ کو پوری اطلاع دی۔ اب غطفان نے جب سنا کہ قریش نے یہ کام کیا ہے تو وہ بھی اپنے علاقوں کی طرف واپس ہو گئے۔

قرآن کے ان نصوص میں اشخاص کے نام نہیں لیے گئے۔ بلکہ لوگوں کے نمونے دیئے گئے ہیں اور واقعات کی تفصیلات اور جزئیات بھی قرآن نے چھوڑ دی ہیں۔ قرآن نے وہ اقدار' وہ کردار اور وہ طرز عمل یہاں ریکارڈ کیے ہیں جو نمونہ ہیں اور ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ وہ کردار جو کسی واقعہ کے ساتھ مخصوص نہیں' جو کسی شخص کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جو حالات کے مٹ جانے سے مٹتے نہیں۔ وہ کردار اور وہ قدریں یہاں درج کر دی ہیں جو آیندہ کی نسلوں کے لیے نمونہ عبرت ہیں اور ہر گروہ کے لیے معیار مطلوب ہیں۔ قرآن کریم تمام واقعات اور حادثات کو اللہ کی تدبیر اور تقدیر کے ساتھ منسلک کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ دست قدرت کس کس مرحلے پر مسلمانوں کا معاون رہا۔ اس معرکے کے ہر مرحلے میں تدبیر الٰہی نے اپنا کام کیا اور قرآن نے ہر مرحلے کا تبصرہ پیش کیا۔

قرآن کریم نے یہ قصہ ان لوگوں کے سامنے دہرایا۔ جو اس کے اندر موجود تھے جو اس کے کردار تھے۔ لیکن قرآن کریم وہ اسباب بھی ان کے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے جن کا انہیں علم نہ تھا۔ ان واقعات و حادثات کے وہ پہلو جو نظروں سے اوجھل تھے حالانکہ وہ اس کہانی کے کردار تھے۔ قرآن کریم نفس انسانی کے نشیب و فراز کو بھی کھول کر ان کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ وہ لوگوں کے ضمیر کے میلانات بتاتا ہے اور بتاتا ہے کہ لوگوں کے دلوں کے اندر کیا کیا خلجانات پیدا ہو گئے تھے۔

ان باتوں کے علاوہ انداز بیان کی خوبصورتی' اس کا رعب اور شوکت کلام' بات کی قوت اور حرارت اور منافقین کے بارے میں مزاحیہ انداز' اور ان کے نفاق کے پیچ و تاب اور مسلمانوں کی شجاعت اور ایمان' صبر اور اللہ پر پورا بھروسہ' غرض یہ سب باتیں قرآن نہایت خوبصورتی کے ساتھ قلم بند کرتا ہے۔

یہ نصوص قرآنی دراصل ہر پڑھنے والے کو عمل پر آمادہ کرتی ہیں۔ یہ صرف ان لوگوں کو آمادہ نہیں کرتیں جن

لوگوں نے یہ معرکے لڑے اور ان میں ان کا بنیادی کردار رہا اور انہوں نے سب کچھ دیکھا بلکہ زمانہ مابعد کے تمام ادوار اور معاشروں میں بھی یہ نصوص ابھارنے والی ہیں' جب بھی تحریک اسلامی کو ایسے ہی حالات سے واسطہ پڑتا ہے جیسا کہ ان لوگوں کو پڑا اگرچہ بہت زمانہ گزر چکا ہو۔ اگر جدید ترین متنوع معاشروں میں بھی ایسے حالات پیش ہوں تو بعینہ اسی طرح یہ نصوص ایک مومن کو متحرک رکھتی ہیں جس طرح قرون اول میں انہوں نے مسلمانوں کو متحرک رکھا۔

ان نصوص کو صحیح طرح وہی شخص سمجھ سکتا جس کے لیے ویسے ہی حالات درپیش ہوں جس طرح جنگ احزاب میں اس وقت کے مسلمانوں کو درپیش تھے۔ جب ایسے حالات ہوں پھر ان آیات سے ہدایات کے چشمے پھوٹتے ہیں اور اسلام کے لیے کام کرنے والوں کے دل ان کے معانی کے لیے کھل جاتے ہیں۔ اب قرآن کے کلمات اور سطریں قوت اور اسلحہ بن جاتی ہیں اور کارکن ویسے ہی معرکوں میں کود جاتا ہے۔ پھر یہ آیات زندہ' بیدار' آگے بڑھنے والے لوگ پیدا کرتی ہیں اور یہ لوگ ایک حقیقی تحریک لے کر اٹھتے ہیں۔ قرآن کریم کی یہ نصوص عالم واقعہ میں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔

یاد رہے کہ قرآن کریم محض تلاوت اور علمی مباحث کی کتاب نہیں ہے۔ یہ کام تو بہت ہو چکا' یہ تو ایک زندگی ہے' اچھلتی آگے بڑھتی زندگی۔ یہ تو نئے نئے واقعات کے لیے نئی نئی ہدایات ہیں۔ جب بھی کوئی دل ان نصوص کو لے کے ان کے ہمقدم ہو کر چلے' ان پر لبیک کہے تو ان نصوص کے اندر پوشیدہ قوت کے سرچشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ یہ ہے اس کتاب کا راز کہ اس کے اندر انفجار و قوت کے ذخائر ہیں۔

ایک انسان ایک آیت کو ہزار بار پڑھتا ہے' پھر وہ ایسے موقف اور ایسے حادثے کا شکار ہوتا ہے اور جب وہ اسی آیت کو پڑھتا ہے تو یہ وہ آیت نہیں ہوتی۔ یہ بالکل ایک نئی آیت ہوتی ہے۔ یہ اسے وہ کچھ بتلاتی ہے جو پہلے نہ بتلاتی تھی۔ یا اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ یہ حیران کن سوالات کا جواب دینے لگتی ہے۔ یہ پیچیدہ مشکلات حل کر دیتی ہے۔ صاف صاف راستہ بتلاتی ہے۔ ایک سمت متعین کر دیتی ہے اور وہ اس دل کو اس معاملے میں عزم بالجزم میں تبدیل کر کے رکھ دیتی ہے اور پڑھنے والے کو پورا پورا اطمینان ہو جاتا ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۸۹ تشریح آیات

## ۹ --- تا --- ۲۷

قرآن کریم اس سورۃ کا آغاز یوں کرتا ہے کہ اے اہل ایمان اس بات کو ذرا یاد کرو کہ یہ لشکر تمہارے خلاف جمع ہوئے اور ان کا ارادہ یہ تھا کہ تمہیں بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیں اللہ نے محض اپنے کرم سے اور اپنی خاص فوجوں کی مدد سے ان کو نامراد واپس کر دیا۔ چنانچہ پہلی ہی آیت میں واقعہ کا مزاج' اس کا آغاز اور اس کا انجام بتا دیا گیا۔ تفصیلات سے بھی پہلے تاکہ جس نکتے کو اللہ ان کے ذہن میں بٹھانا چاہتے ہیں وہ اچھی طرح بیٹھ جائے۔ وہ اس کو یاد کریں' اور ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے کہ اللہ کا منشاء یہ ہے' کہ تم اللہ' رسول' اور وحی کی اتباع کرو' اس پر توکل کرو' اور کافرین اور منافقین کی اطاعت نہ کرو' اور یہ کہ اللہ کی دعوت اور اس کے نظام پر جو لوگ عمل کرتے ہیں' اللہ ان کا حامی و مددگار ہوتا ہے بمقابلہ کافرین اور منافقین کے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۟

"اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' یاد کرو اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اس نے تم پر کیا ہے۔ جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے"۔

یوں اس اجمالی آغاز ہی میں معرکہ کا آغاز اور انجام قلم بند کر دیا گیا۔ اور وہ عناصر بھی بتا دیئے گئے جو اس معرکے میں فیصلہ کن رہے۔ یعنی احزاب کا جمع ہو کر ٹوٹ پڑنا' اور طوفان باد باراں اور دوسری خدائی افواج کا آنا جو نظر نہ آتی تھیں' اور اللہ کی نصرت جو اللہ کے علم و تدبیر پر مبنی تھیں اور وہ مسلسل نگرانی کر رہا تھا۔

اب اس کے بعد تفصیلات :

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۟ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ

الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ﴿١١﴾ وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي
قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا ﴿١٢﴾ وَإِذْ قَالَتْ طَائِفَةٌ
مِنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا ۚ وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِنْهُمُ النَّبِيَّ
يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۛ إِنْ يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا ﴿١٣﴾

"جب دشمن اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے' جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں' کلیجے منہ کو آگئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے' اس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے۔

یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا' صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو وعدے ہم سے کیے تھے' وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔ جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ "اے یثرب کے لوگو' تمہارے لیے اب ٹھہرنے کا کوئی موقعہ نہیں ہے' پلٹ چلو"۔

جب ان کا ایک فریق یہ کہہ کر نبیؐ سے رخصت طلب کر رہا تھا کہ "ہمارے گھر خطرے میں ہیں' حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے' دراصل وہ (محاذ جنگ سے) بھاگنا چاہتے تھے۔

یہ وہ ہولناک صورت حال ہے جس نے مدینہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہر شخص خوف اور کرب میں مبتلا تھا۔ اس صورت حال سے کوئی ایک شخص بھی غیر متاثر نہ تھا۔ قریش اور اس کے حوالی و موالی' بنی غطفان اور ان کے زیر اثر قبائل' اور یہودیاں بنی قریظہ ہر طرف سے اٹھ آئے تھے' اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی۔ ایسے حالات تھے کہ ان کا خوف ایک دل اور دوسرے دل میں جدا نہ تھا۔ اختلاف جو تھا وہ ردعمل میں تھا۔ اللہ کے بارے میں یقین میں اختلاف تھا۔ طرز عمل' اقدار' اسباب کے تصور اور نتائج کے ظہور میں اختلاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ایک ہمہ گیر آزمائش تھی اور اس نے مومنین اور منافقین میں بالکل جدائی کر دی۔

آج ہم جب اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم اسی موقف میں کھڑے ہیں۔ وہی حالات ہیں' وہی تاثرات ہیں' وہی ظلجانات ہیں' وہی حرکات ہیں اور ان نصوص کے شیشے کے اندر ہمیں اپنے چہرے صاف صاف نظر آتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں اور یہ منظر ہمیں صاف صاف نظر آتا ہے۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ (۳۳ : ۱۰) "جب دشمن اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے"۔ اور اس کے بعد لوگوں پر اس موقف کے اثرات

وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (۳۳ : ۱۰) "جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے"۔ یہ ایک نہایت ہی مکمل تصویر ہے اس شخص کی جو انتہائی تنگی' خوف اور

کرب میں مبتلا ہو۔ اس تصویر میں چہرے کی حالت اور دلوں کی حرکت دونوں کو دکھایا گیا ہے۔

وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا (۳۳ : ۱۰) "اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے"۔ ان گمانوں کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔ ان کو مجمل چھوڑ کر تمام حالات اضطراب، تمام خلجانات اور تمام برے احساسات کو اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔ مختلف دلوں میں ظنون کی تفصیل مختلف ہو گی۔

اب ذرا اس خوفناک صورت حالات کو مزید کھولا جاتا ہے۔ اور اس کے خدوخال اور اس کی حرکات کو سامنے لایا جاتا ہے۔

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (۳۳ : ۱۱) "اس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے"۔ وہ خوف جو اہل ایمان کو ہلا مارتا ہے، لازم ہے کہ وہ بہت ہی شدید اور ہولناک ہو گا۔

محمد ابن مسلمہ وغیرہ نے روایت کی کہ خندق میں ہماری رات بھی دن ہوتا تھا جبکہ مشرکین نے اپنے لیے باری مقرر کر رکھی تھی۔ ایک دن ابو سفیان ابن حرب اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنگ کے لیے آتا، ایک دن خالد ابن ولید اپنے ساتھیوں سمیت آتا، اور ایک دن عمرو ابن عاص آتا، ایک دن ہبیرہ ابن ابو وھب آتا اور ایک دن عکرمہ ابن ابوجہل آتا اور ایک دن ضرار ابن الخطاب۔ یہاں تک کہ یہ مصیبت بہت بڑھ گئی اور لوگوں کے اندر شدید خوف پھیل گیا۔

مقریزی نے اپنی کتاب امتاع الاسماع میں مسلمانوں کے حال کی تصویر کشی یوں کی ہے: "مشرکین نے صبح کے تڑکے اچانک حملہ کیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو تیار کیا۔ اس دن رات کے ایک حصے تک لڑائی رہی اور رسول اللہؐ اور مومنین میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ حضورؐ ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نماز نہ پڑھ سکے۔ آپؐ کے ساتھی یہ کہنے لگے رسولؐ خدا ہم نے نماز نہیں پڑھی۔ اس پر رسولؐ اللہ نے فرمایا، خدا کی قسم میں نے بھی نماز نہیں پڑھی۔ یہاں تک کہ اللہ نے مشرکین کو ہٹا دیا۔ دونوں فریق اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔ اسید ابن حضیر خندق کے کنارے پر دو سو آدمیوں کو لے کر کھڑے ہوئے، خالد ابن ولید کی سرکردگی میں مشرکین نے حملہ کر دیا، یہ اچانک حملہ کرنا چاہتے تھے۔ تھوڑی دیر انہوں نے مقابلہ کیا۔ وحشی نے طفیل ابن نعمان، ابن حنسا انصاری سلمی کو ایک نیزے کے ساتھ مارا۔ اسے اسی طرح قتل کر دیا جس طرح احد میں حضرت حمزہ کو قتل کیا تھا۔ اس دن حضور اکرمؐ نے فرمایا "مشرکوں نے ہمیں درمیانی نماز، نماز عصر سے مشغول رکھا اللہ ان کے دلوں اور پیٹوں کو آگ سے بھر دے"۔

یوں ہوا کہ مسلمانوں کے دو دستے رات کو نکلے۔ وہ آپس میں الجھ پڑے کسی کو علم نہ تھا کہ وہ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ہر ایک کا خیال تھا کہ ہم دشمن سے لڑ رہے ہیں۔ ان کے درمیان بھی قتل ہوئے اور بعض لوگ زخمی ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے اسلامی شعار سے پکارا۔ کو ڈور ڑ تھا۔

(حم لا ینصرون) چنانچہ وہ رک گئے۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا "تمہارا زخمی ہونا اللہ کے لیے ہے اور جو قتل ہو گیا وہ شہید ہے"۔

مسلمانوں پر شدید مشکلات اس وقت آئیں جب وہ خندق کے دہانے پر مصروف جنگ تھے۔ ادھر بنو قریظہ کی طرف سے خبریں آ رہی تھیں کہ وہ وعدہ خلافی پر مائل ہو گئے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو ہروقت یہ ڈر رہتا تھا کہ کسی وقت بھی مشرکین کا لشکر خندق کی جانب سے حملہ آور ہو سکتا ہے اور پیچھے سے یہودی حملہ کر سکتے ہیں اور وہ ان عظیم لشکروں کے درمیان ایک قلیل تعداد میں ہیں۔ یہ لشکر آتے اس لیے ہیں کہ مسلمانوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں اور یہ معرکہ فیصلہ کن اور آخری معرکہ ہو۔

یہ حالات اس کے علاوہ تھے۔ مدینہ میں منافقین سازشیں کر رہے تھے اور افواہیں پھیلا رہے تھے خود اسلامی صفوں میں بددلی پھیلائی جا رہی تھی۔

وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا (۳۳: ۱۲) "یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا، صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو وعدے ہم سے کیے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے"۔ ان شدید حالات میں ان لوگوں کو بھی موقع مل گیا کہ وہ اپنے خبث باطن کا اظہار کر دیں جبکہ مسلمان شدید کرب میں مبتلا تھے اور کلیجے منہ کو آ رہے تھے۔ ایسے حالات میں کوئی نہ تھا جو ان کو ملامت کرتا۔ ان لوگوں کو مسلمانوں کی توہین اور تذلیل اور شکوک پھیلانے کا موقع مل گیا۔ اور انہوں نے برملا کہنا شروع کر دیا کہ اللہ اور رسول کے وعدے جھوٹے تھے حالانکہ اللہ اور رسولؐ کے وعدے تو پورے ہونے والے تھے۔ یہ منافقین یہ باتیں اس لیے کرتے تھے کہ ان حالات میں ان پر گرفت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ بظاہر حالات ایسے تھے کہ ان کی بات درست معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنے خیال میں درست موقف پر تھے۔ مسلمان جن ہولناک حالات سے دوچار تھے ان کی وجہ سے ان منافقین کے چہروں پر ایک جو مہین پردہ تھا، جس کی وجہ سے وہ رکھ رکھاؤ کرتے تھے وہ بھی اتر گیا۔ اور ان کے نفوس نے ان کو اس پر آمادہ کر دیا کہ وہ اس ظاہری رواداری کو بھی ختم کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے حقیقی شعور کا اظہار کر دیا اور رکھ رکھاؤ کا پردہ چاک کر دیا۔

اس قسم کے منافقین اور افواہیں پھیلانے والے ہر جماعت میں ہوتے ہیں اور مشکل حالات میں ان کا موقف بھی ایسا ہوتا ہے جیسا کہ ان کے بھائیوں کا موقف ہوتا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے لوگ تمام نسلوں میں ایک مکرر نمونہ ہوتے ہیں۔ زمان و مکان کی قید کے بغیر اس قسم کے لوگ ہر جماعت میں ہوتے ہیں۔

وَ اِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا (۳۳: ۱۳) "جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا: اے اہل یثرب، تمہارے لیے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، پلٹ چلو"۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ لوگ صف بندی کو ترک کر کے گھروں میں بیٹھ جائیں اور یہ کہہ دیں کہ خندق کے سامنے اس طرح صف بندی کر کے کھڑے رہنے کا کیا موقع و محل ہے۔ پیچھے سے گھروں کو خطرہ ہے۔ یہ ایک ایسی دعوت تھی جہاں سے لوگ متاثر ہو سکتے تھے کیونکہ عورتیں اور بچے خطرے میں تھے۔ خطرہ حقیقی تھا۔ خوف ہر طرف سے لاحق تھا اور حالات بہت ہی مخدوش

تھے ۔ کسی کا دل قرار نہ پکڑتا تھا۔

وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ (۳۳ : ۱۳) "جب ان کا ایک فریق یہ کہہ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگتے کہ ہمارے گھر خطرے میں ہیں"۔ یعنی ہمارے گھر دشمن کے سامنے کھلے ہیں اور ان کا کوئی دفاع نہیں ہے ــــ لیکن قرآن یہاں اصل حقیقت بھی کھول دیتا ہے :

وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ (۳۳ : ۱۳) "حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے"۔ چنانچہ یہاں صاف صاف کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ بزدل ہیں ۔ بھاگنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے یہ جھوٹے حیلے گھڑتے ہیں۔

إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا (۳۳ : ۱۳) "دراصل وہ بھاگنا چاہتے ہیں"۔ روایات میں آتا ہے کہ بنی حارث نے اوس ابن قیظی کو رسول اللہؐ کے پاس بھیجا اور یہ کہا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں اور انصاریوں میں سے کسی کا گھر ہمارے گھروں کی طرح نہیں ہے ۔ ہمارے اور غطفان کے درمیان کوئی نہیں ہے جو ان کو روک سکے ۔ تو آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم گھروں کی طرف لوٹ جائیں تاکہ گھروں اور عورتوں کی حفاظت کر سکیں ۔ حضورؐ نے ان کو اجازت دے دی ۔ یہ بات سعد ابن معاذ تک پہنچی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ حضورؐ ان کو اجازت نہ دیں کیونکہ ہمیں اور ان کو جب بھی کوئی مشکل پیش آتی ہے 'انہوں نے ایسا ہی کیا ہے خدا کی قسم! چنانچہ حضورؐ نے ان کو واپس کر دیا ــــ غرض قرآن ان کو ملامت کرتا ہے کہ یہ محض فرار چاہتے ہیں 'وہ تھے ہی ایسے ۔

--- ooo ---

یہاں سیاق کلام قدرے رک جاتا ہے ۔ ایک بہترین تصور پر غور کرنے کے لیے جس میں اس وقت کے خوفناک اور پریشان کن حالات اور باہم حیلہ بازی کے موقف کی تصویر کشی کی گئی ہے تاکہ ان بیمار دلوں والے منافقین کی نفسیاتی تصویر بھی دکھا دی جائے ۔ یہ ان کی داخلی تصویر ہے اور یہ حالت ان کی اس لیے ہے کہ ان کا عقیدہ اور نظریہ کمزور ہے ۔ یہ بزدل ہیں اور اسلامی صفوں سے یہ لوگ ایک معمولی بہانہ اور عذر کی وجہ سے بھی بھاگنے کے لیے تیار ہوئے ہیں ۔ یہ کسی موقف پر جمنے والے نہیں ہیں اور نہ ہی یہ اس سلسلے میں کوئی رکھ رکھاؤ کرنے والے ہیں۔

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِم مِّنْ أَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَآتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوا بِهَا إِلَّا يَسِيرًا ﴿١٤﴾

"اگر شہر کے اطراف سے دشمن گھس آئے ہوتے اور اس وقت انہیں فتنے کی طرف دعوت دی جاتی تو یہ اس میں جا پڑتے اور مشکل ہی سے انہیں شریک فتنہ ہونے میں کوئی تامل ہوتا"۔

یہ ہے ان منافقین کی اندرونی تصویر ۔ دشمن ابھی تو مدینہ سے باہر ہے ۔ ابھی تو وہ شہر کے اندر گھسنے نہیں پایا ۔ اگرچہ حالات بہت ہی خوفناک تھے لیکن ابھی تو حملہ آور باہر ہی پڑے تھے ۔ کوئی خطرہ ابھی واقع نہ ہوا تھا ۔ اگر لشکر مدینہ کے

اطراف سے حملہ آور ہو جاتا اور پھر

سُئِلُوا الْفِتْنَةَ (۳۳ : ۱۴) "پھر ان کو فتنے کی دعوت دی جاتی یعنی ان سے مطالبہ کیا جاتا کہ تم مرتد ہو جاؤ تو یہ لوگ فوراً مرتد ہو جاتے اور کچھ دیر نہ کرتے اور نہ ہی کوئی تردد کرتا۔

اِلَّا قَلِيْلًا یعنی اگر دیر کرتے تو تھوڑی ہی دیر کرتے یا ان میں سے قلیل لوگ تردد کرتے ۔یعنی مرتد ہونے سے قبل کچھ دیر کے لیے سوچتے ۔یہ ہے نقشہ ڈھیلے عقیدے اور نظریہ کا ہے ۔یہ گہری کمزوری ہے اس کے ساتھ یہ مقابلہ نہیں کر سکتے۔
یوں قرآن مجید ان کی حقیقت کا اظہار کرتا ہے اور ان کی اندرونی کیفیت سے پردہ اٹھا دیتا ہے اور اس کے بعد ان پر الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے عہد توڑ دیا اور وعدے کی خلاف ورزی کر دی ۔یہ عہد کس کے ساتھ تھا؟ یہ عہد انہوں نے اللہ کے ساتھ کیا تھا کہ بھاگیں گے نہیں ۔ان کے ساتھ یہ پہلے بھی ہو چکا ہے ۔

وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ؕ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا ۝۱۵

"ان لوگوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ یہ پیٹھ نہ پھیریں گے 'اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی باز پرس تو ہونی ہی تھی"۔
ابن ہشام نے ابن اسحاق کی روایت اپنی سیرۃ میں نقل کی ہے کہ یہ لوگ بنو حارثہ تھے ۔یہی لوگ تھے جو احد کے دن بھی بھاگنا چاہتے تھے اور بنو سلمہ اور ان دونوں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن بعد میں انہوں نے اللہ کے ساتھ عہد کر لیا تھا کہ وہ ایسا ہرگز نہ کریں گے ۔ یہاں یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ تم نے خود یہ عہد اللہ کے ساتھ کیا تھا کہ آئندہ ایسا نہ کریں گے ۔
احد کے دن تو اللہ کے فضل و کرم سے وہ بچ گئے تھے ۔ اللہ نے ان کو ثابت قدمی دے دی تھی ۔ اور ان کو فرار کے نتائج سے بچا لیا تھا۔ ابتدائی زمانے میں جہاد کے اسباق میں سے یہ ایک سبق تھا لیکن آج تو تحریک اسلامی پر طویل دور گزر گیا ہے ۔کافی تجربات ہو گئے ہیں ۔اس لیے قرآن کریم ان پر یہ سخت تبصرہ کرتا ہے ۔
آج جب انہوں نے عہد توڑ دیا۔ آج وہ خطرے سے بچنے کے لیے اور خوف کی حالت سے بھاگنے کے لیے عہد توڑ چکے 'تو قرآن کریم ان کو بتاتا ہے اور ہروقت بتاتا ہے کہ اسلامی نظریہ حیات میں اعلیٰ قدر کیا ہے اور اسلامی تصور حیات میں موت اور زیست کا تصور کیا ہے ۔کیا فرار اور نقض عہد زندگی کا ضامن ہے ؟

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۱۶ قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ

أَرَادَ بِكُمْ سُوٓءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۚ وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿١٧﴾

"اے نبیؐ ان سے کہو اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمہارے لیے کچھ نفع بخش نہ ہو گا۔ اس کے بعد زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی سوقعہ تمہیں مل سکے گا۔ ان سے کہو کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکتا ہو۔ اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر تم پر مہربانی کرنا چاہے۔ اللہ کے مقابلے میں تو یہ لوگ کوئی حامی و مددگار نہیں پا سکتے ہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام واقعات اللہ کے نظام قضا و قدر کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ نظام قضا و قدر ان واقعات و نتائج کو آگے بڑھاتا جاتا ہے اور ہر معاملہ اس نظام کے مطابق انجام کو پہنچتا ہے۔ موت اور قتل ایک تقدیر ہے' اس سے تو کوئی فرار ممکن نہیں ہے۔ یہ وقت پر آتی ہے۔ ایک لحظہ پہلے اور بعد میں نہیں آتی۔ فرار کی وجہ سے موت موخر نہیں ہوتی۔ اگر کوئی جنگ سے بھاگ گیا تو اپنی موت مرجائے گا جس کا وقت بہت قریب ہے۔ دنیا کا تو ہر عرصہ قریب ہی ہے۔ تیز دنیا کا ہر ساز و سامان بھی قلیل ہوتا ہے۔ بچانے والا کوئی نہیں ہے صرف یہ کہ اللہ کی مشیت کسی کی موت کی راہ میں حائل ہو جائے۔ یہ اللہ ہی ہے جو کسی کے بارے میں برائی کا فیصلہ کرتا ہے اور کسی کے بارے میں اچھائی کا فیصلہ کرتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی ولی اور مددگار نہیں ہے۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو کسی کو تقدیر الہی سے بچا لے۔ لہذا سپردگی' سپردگی ہے' اطاعت' اطاعت ہے' وفا' وفا ہے' خواہ وہ سہولیات کے دور میں ہو یا مشکلات کے دور میں۔ تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اللہ پر توکل کرنا چاہئے۔ وہ جو چاہتا ہے' کرتا ہے۔

اب بات کا رخ ان لوگوں کی طرف مڑ جاتا ہے جو جنگ میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں جو جہاد سے لاپرواہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور جو دوسروں کو بھی جہاد سے روکتے ہیں اور کہتے ہیں۔

لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا (۳۳ : ۱۳) "تمہارے ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے' لوٹ جاؤ"۔ اور ان کی عجیب تصویر یہاں کھینچی جاتی ہے۔ یہ تصویر پچی تصویر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین کارٹون ہے اور اس قسم کے لوگ ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ بزدل' پیچھے ہٹنے والے' بہت چیخنے اور چلانے والے' شدید حالات میں جزع و فزع کرنے والے اور پر امن حالات میں تیز و طرار بات کرنے والے' ہر بھلائی کے معاملے میں کنجوس' جدوجہد سے فراری۔ اگر ذرا بھی ڈر کا خطرہ ہو' اگرچہ دور ہو تو ایک دم مضطرب ہونے والے۔ قرآن کا انداز تعبیر ایسا دلکش ہے کہ اس تصویر کے کسی رنگ کو بدلا نہیں جا سکتا۔ ذرا خود قرآنی رنگ میں پڑھئے :

قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الْمُعَوِّقِينَ مِنكُمْ وَالْقَائِلِينَ لِإِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ إِلَيْنَا ۖ وَلَا يَأْتُونَ الْبَأْسَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٨﴾ أَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۖ فَإِذَا جَاءَ الْخَوْفُ

رَاَیۡتَھُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡکَ تَدُوۡرُ اَعۡیُنُھُمۡ کَالَّذِیۡ یُغۡشٰی عَلَیۡہِ مِنَ الۡمَوۡتِ ۚ
فَاِذَا ذَھَبَ الۡخَوۡفُ سَلَقُوۡکُمۡ بِاَلۡسِنَۃٍ حِدَادٍ اَشِحَّۃً عَلَی الۡخَیۡرِ ؕ اُولٰٓئِکَ
لَمۡ یُؤۡمِنُوۡا فَاَحۡبَطَ اللّٰہُ اَعۡمَالَھُمۡ ؕ وَکَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرًا ﴿۱۹﴾ یَحۡسَبُوۡنَ
الۡاَحۡزَابَ لَمۡ یَذۡھَبُوۡا ۚ وَاِنۡ یَّاۡتِ الۡاَحۡزَابُ یَوَدُّوۡا لَوۡ اَنَّھُمۡ بَادُوۡنَ فِی
الۡاَعۡرَابِ یَسۡاَلُوۡنَ عَنۡ اَنۡۢبَآئِکُمۡ ؕ وَلَوۡ کَانُوۡا فِیۡکُمۡ مَّا قٰتَلُوۡۤا اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۲۰﴾ ۲ ع ۱۲

18 "اللہ تم میں سے ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو (جنگ کے کام میں) رکاوٹیں ڈالنے والے ہیں، جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ "آؤ ہماری طرف"۔ جو لڑائی میں حصہ لیتے بھی ہیں تو بس نام گنانے کو، جو تمہارا ساتھ دینے میں سخت بخیل ہیں۔ خطرے کا وقت آجائے تو اس طرح دیدے پھرا پھرا کر تمہاری طرف دیکھتے ہیں جیسے کسی مرنے والے پر غشی طاری ہو رہی ہو، مگر جب خطرہ گزر جاتا ہے تو یہی لوگ فائدوں کے حریص بن کر قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبانیں لیے تمہارے استقبال کو آجاتے ہیں۔ یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائے، اسی لیے اللہ نے ان کے سارے اعمال ضائع کر دیئے۔ اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔ یہ سمجھ رہے ہیں کہ حملہ آور گروہ ابھی گئے نہیں ہیں۔ اور اگر وہ پھر حملہ آور ہو جائیں تو ان کا جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر کہیں صحرا میں بدوؤں کے درمیان جا بیٹھیں اور وہیں سے تمہارے حالات پوچھتے رہیں۔ تاہم اگر یہ تمہارے درمیان رہے بھی تو لڑائی میں کم ہی حصہ لیں گے"۔

آغاز یوں ہوتا ہے کہ اللہ ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہے جو لوگوں کو جنگ سے روکتے ہیں اور اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ جو اپنے بھائیوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ جنگ میں شرکت نہ کریں گھروں میں بیٹھے رہیں۔

وَلَا یَاۡتُوۡنَ الۡبَاۡسَ اِلَّا قَلِیۡلًا (۳۳ : ۱۸) "جو لڑائی میں حصہ لیتے بھی ہیں تو بس نام گنانے کو"۔ یہ جہاد میں محض دکھاوے اور نام داخل کرنے کے لیے شریک ہوتے ہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ معلوم لوگ ہیں اور ان کی مکاریاں بھی معلوم ہیں۔

اب اللہ اپنے معجزانہ قلم ان کے اور ان جیسے لوگوں کے خدوخال سے بڑی خوبصورتی سے رقم فرماتے ہیں :

اَشِحَّۃً عَلَیۡکُمۡ (۳۳ : ۱۹) "یہ تمہارا ساتھ دینے میں بہت بخیل ہیں"۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف بغض اور دشمنی بھری ہوئی ہے۔ یہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں بھی بخیل ہیں، مالی امداد میں بھی بخیل ہیں اور اچھی نیت اور اچھی خواہشات میں بھی بخیل ہیں۔

فَاِذَا جَآءَ الۡخَوۡفُ رَاَیۡتَھُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡکَ تَدُوۡرُ اَعۡیُنُھُمۡ کَالَّذِیۡ یُغۡشٰی عَلَیۡہِ مِنَ

لْمَوْتِ (۳۳ : ۱۹) "خطرے کا وقت آ جائے تو دیدے پھرا پھرا کر تمہاری طرف دیکھتے ہیں جیسے کسی مرنے والے پر غشی طاری ہو رہی ہو"۔ یہ ایک واضح تصویر ہے جس کے خدوخال واضح ہیں 'جس کے اعضاء متحرک ہیں' لیکن ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ یہ تصویر مضحکہ انگیز ہے۔ اس سے ان کی بزدلی ٹپکتی پڑتی ہے۔ اس قدر بزدل کہ مارے خوف کے ان کے اعضاء کانپ رہے ہیں اور ان کے پورے جسم پر رعشہ طاری ہے۔ لیکن جب خوف چلا جاتا ہے تو ان کی تصویر زیادہ مضحکہ انگیز ہو جاتی ہے۔

فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ (۳۳ : ۱۹) "مگر جب خطرہ گزر جاتا ہے تو یہی تمہارے استقبال میں قینچی کی طرح تیز زبانوں کے ساتھ آ جاتے ہیں"۔ یہ سوراخوں سے نکل آتے ہیں' ان کی آوازیں بلند ہو جاتی ہیں حالانکہ پہلے ان پر رعشہ طاری تھا۔ ان کی گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے ہیں۔ پہلے تو سکڑ گئے تھے' اب پھول گئے اور بغیر شرم و حیاء کے لمبے لمبے دعوے کرنے لگے کہ ہم نے یہ یہ مشقتیں برداشت کیں۔ یہ یہ جنگیں کیں اور یہ یہ فضائل اعمال کیے اور اس قدر شجاعت اور بہادری دکھائی --- اور پھر یہ لوگ۔

اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ (۳۳ : ۱۹) "مال کے لیے بہت لالچی ہیں"۔ یہ کسی بھلائی کے کام میں کچھ خرچ نہیں کرتے۔ نہ اپنی قوت' نہ اپنا عمل' نہ اپنی دولت اور نہ اپنی جان --- حالانکہ وہ بہت بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ ان کی زبان تیز ہے اور اپنے آپ کو بہت ہی بڑا سمجھتے ہیں۔

اس قسم کے لوگ کسی ایک قوم قبیلے تک محدود نہیں ہیں۔ یہ ہمیشہ ہر معاشرے میں رہتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ بڑے بہادر' فصیح اللسان اور چیلنج کرنے والے ہوتے ہیں بشرطیکہ وہاں امن ہو۔ اور اگر خوف اور شدید خطرہ ہو تو یہ بخیل' بزدل' خاموش اور پیچھے پیچھے رہنے والے۔ یہ لوگ ہر بھلائی اور ہر خیر کے معاملے میں بہت ہی بخیل ہوتے ہیں بس زبانی کلامی یہ ہر کام میں حصہ لیتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ (۳۳ : ۱۹) "یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لاتے اس لیے اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے"۔ ان کی منافقت کا پہلا سبب یہ ہے کہ ایمان ان کے دلوں ہی میں نہیں اترا اور ایمان کی روشنی میں انہوں نے اپنا راستہ تلاش نہیں کیا۔ نہ یہ لوگ ایمان کے طریقوں پر چلنے والے ہیں۔ اس لیے اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے ہیں اور یہ کامیاب نہیں کیونکہ کامیابی کا اصلی مواد ہی ان کے پاس نہیں ہے۔

وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (۳۳ : ۱۹) "اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے"۔ اللہ کے لیے کوئی کام مشکل نہیں 'بس سمجھ لو کہ ان کے اعمال ضائع ہو گئے۔

رہا یہ کہ یوم الاحزاب میں ان کی حالت کیا تھی اور ان کی سوچ کیا تھی۔

يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا (۳۳ : ۲۰) "سمجھ رہے ہیں کہ حملہ آور گروہ ابھی گئے نہیں

ہیں"۔ گویا یہ لوگ ابھی تک کانپ رہے ہیں' ابھی تک جنگ سے چھپ رہے ہیں' لوگوں کو روک رہے ہیں' ان کو یقین ہی نہیں آ رہا ہے کہ احزاب تو بھاگ گئے ہیں اور خوف ختم ہو گیا ہے اور امن و امان لوٹ آیا ہے۔

وَ اِنْ یَّاْتِ الْاَحْزَابُ یَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِی الْاَعْرَابِ یَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ

(۳۳ : ۲۰) "اور اگر وہ پھر حملہ آور ہو جائیں تو ان کا جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر کہیں صحرا میں بدوؤں کے درمیان جا بیٹھیں اور وہیں سے تمہارے حالات پوچھتے رہیں"۔ کیا سنجیدہ مزاح ہے ان کے ساتھ اور کس قدر بھونڈی تصویر ہے ان لوگوں کی --- یوں جس طرح کارٹون۔ اگر دوبارہ احزاب حملہ آور ہوں تو یہ لوگ چاہیں گے کہ یہ اہل مدینہ ہی نہ ہوں اور دور کہیں بدو باشندے ہو جائیں اور مدینہ والوں کی زندگی اور ذمہ داریوں میں شریک ہی نہ ہوں۔ ان کو معلوم ہی نہ ہو کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس کے بارے میں ان کو پتہ ہی نہ ہو اور دوسروں سے اہل مدینہ کے حالات اس طرح پوچھیں جس طرح اجنبی' اجنبی کے بارے میں پوچھتا ہے اور ان کو اہل مدینہ سے کوئی ذاتی تعلق نہیں ہے اور یہ بزدل جان بچا کر نکل آتے ہیں۔

یہ لوگ ایسی مضحکہ خیز تمنائیں کرتے ہیں' یہ معرکے سے دور ہیں اور اس معرکے میں ذاتی طور پر شریک نہیں ہیں نہ براہ راست یہ لوگ اس معاملے کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ یہ دور سے بھی ڈرتے ہیں اور اس قدر بعید ہو کر بھی جزع و فزع کرتے ہیں۔

وَلَوْ كَانُوْا فِیْكُمْ مَّا قٰتَلُوْۤا اِلَّا قَلِیْلًا (۳۳ : ۲۰) "تاہم اگر یہ تمہارے درمیان رہے بھی تو لڑائی میں کم ہی حصہ لیں گے"۔ یہ آخری لائن ہے جس کے کھینچنے سے یہ تصویر مکمل ہو جاتی ہے۔ یہ ہے تصویر ان منافقین کی جو مدینہ طیبہ میں اٹھنے والی اس نئی اسلامی جماعت کے اندر رہتے تھے۔ ایسے ہی لوگ قیامت تک اٹھنے والی ہر تحریک میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہی ہر دور کے منافقین کے خدوخال ہوتے ہیں۔ یہ تصویر یہاں ختم ہوتی ہے اور اہل ایمان کے دل میں ان کی تحقیر' ان سے نفرت اور ان سے دوری اچھی طرح بٹھا دی جاتی ہے اور یہ لوگ اللہ کے ہاں بھی ہلکے ہو جاتے ہیں اور لوگوں کی نظروں میں بھی گر جاتے ہیں۔

--- ooo ---

یہ تو تھا حال ان لوگوں کا جو منافق تھے' جن کے دلوں میں روگ تھا' جو اسلامی صفوں میں بد دلی پھیلاتے تھے۔ یہ تھی ان کی مکروہ تصویر' لیکن جنگ احزاب کے شدید اور ہلا مارنے والے خوف اور بد تر حالات نے تمام لوگوں کو اس طرح مکروہ الصورت نہ بنا دیا تھا۔ ان تاریک اور کربناک حالات میں کچھ روشن چہرے بھی موجود تھے۔ ان ہلا مارنے والے حالات میں ایسے لوگ بھی تھے جو چٹان کی طرح مضبوط کھڑے تھے۔ جن کا اپنے اللہ پر پورا بھروسہ تھا۔ اللہ کے فیصلوں پر راضی تھے۔ ان کو یقین تھا کہ اللہ کی نصرت آئے گی باوجود اس کے کہ بظاہر حالات بہت ہی مایوس کن تھے اور ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔

اب قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور نمونہ پیش کر کے ان روشن چہروں کے البم کا آغاز کرتا ہے اور

دیکھیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کو۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ﴿٢١﴾

"درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ تھا' ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے"۔

اس خوفناک ڈر' اور جان لیوا حالات کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے لیے امن و اطمینان کا سرچشمہ تھے اور آپؐ کی ذات وثوق' اطمینان اور امیدوں کا سرچشمہ تھی۔ اس مشکل وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کردار ادا کیا وہ دراصل تمام تحریکات اسلامی کے قائدین کے لیے مثال اور نمونہ ہے۔ ان تمام لوگوں کے لیے اسوۂ حسنہ ہے جو صرف رضائے الٰہی اور یوم آخرت کے لیے کام کرتے ہیں اور جو اپنے آپ کو بہترین قائد ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ جو ہر وقت اللہ کو یاد رکھتے ہیں اور کبھی بھی اللہ کو نہیں بھولتے۔

ہمیں چاہئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جنگ میں جو موقف اختیار فرمایا اس کی کچھ جھلکیاں یہاں دے دیں۔ پوری تفصیلات تو یہاں دینا ممکن ہی نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکلے اور عام مسلمانوں کے ساتھ خندق کھودنے لگے۔ آپ کدال سے زمین کھودتے اور بیلچے سے مٹی جمع فرماتے اور پھر ٹوکری میں بھر کر کناروں پر ڈالتے۔ کام کرنے والے جو رجز پڑھتے آپ بھی ان کے ساتھ شریک ہوتے۔ یہ لوگ اونچی آواز سے رجز پڑھتے' رجز کے آخری لفظ کو دہراتے۔ وہ لوگ سادہ قسم کے ترانے گاتے تھے جن کا تعلق اس وقت کے واقعات سے ہوتا تھا۔ ایک شخص تھا جس کا نام جعیل تھا۔ حضور اکرمؐ کو یہ نام اچھا نہ لگا تو آپؐ نے اس کا نام بدل کر عمرو رکھ دیا۔ اب مسلمانوں نے اس کے ساتھ رجز بنایا' بہت ہی سادہ :

سماہ من بعد جعیل عمرًا　و کان للبائس یومًا ظہرًا

جب مسلمان یہ رجز پڑھتے اور "عمرا" کہتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی جواب میں "عمرا" فرماتے اور جب وہ دوسرے فقرے میں لفظ "ظہرا" پڑھتے تو آپؐ بھی ان کے جواب میں ظہراً دہراتے --- اب ذرا اس فضا کے بارے میں سوچئے اور اس جوش و خروش کا تصور کیجئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رجز کے ساتھ مقطع دہراتے ہیں۔ "عمرا" اور "ظہرا" ---- اور ساتھ ساتھ کدال بھی مار رہے ہیں۔ بیلچے سے مٹی بھی جمع کر رہے ہیں اور پھر ٹوکری میں مٹی اٹھا کر بھی لے جا رہے ہیں اور ساتھ ساتھ رجز کا جواب بھی دے رہے ہیں۔ یہ طرز عمل ان لوگوں کے جسم کے رونگٹے رونگٹے کو قوت سے بھر رہا ہو گا۔ ان کی ارواح کا پیمانہ کس قوت و شجاعت سے لبریز ہو گا اور کس قدر جرأت' شجاعت اور اعتماد اور اعزاز ان کو حاصل ہو رہا ہو گا۔

○ زید ابن ثابت مٹی لے جا رہے تھے تو حضورؐ نے فرمایا یہ ایک بہترین نوجوان ہے۔ اسے نیند آگئی اور خندق ہی میں سو گیا۔ بہت سردی تھی۔ حضرت عمارہ ابن حزم نے ان کا اسلحہ چپکے سے لے لیا' اسے پتہ بھی نہ چلا۔ آنکھ کھلی

تو اسلحہ ندارد ۔ یہ پریشان ہو گئے ۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا "اے ابو اماد (زیادہ سونے والے کے باپ) تم اس قدر سو گئے کہ اسلحہ ہی چلا گیا"۔ پھر آپؐ نے فرمایا "کس کو اس نوجوان کے اسلحہ کے بارے میں علم ہے؟" عمارہ نے فرمایا "رسول خداؐ وہ میرے پاس ہے"۔ آپؐ نے فرمایا اسے دے دو اور اس کے بعد حکم دیا کہ کسی مسلمان کی کوئی چیز بطور مزاح بھی نہ چھپاؤ۔۔۔ یہ واقعہ بھی بتاتا ہے کہ اسلامی صفوں میں جو لوگ تھے وہ بیدار مغز اور بیدار چشم تھے اور حضورؐ کی نظر ہر کسی پر تھی، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سنجیدہ مزاح اور خوش مزاجی ان مشکل حالات میں بھی قائد انقلاب کے ساتھ تھے ۔ "اے سونے والے کے باپ' تم سو گئے اور اسلحہ چلا گیا"۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کن حالات میں تھے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کس قدر قریب تھے ۔

○ آپؐ کی روح دور دور تک اسلامی انقلاب کے نقوش دیکھ رہی تھی ۔ پتھروں کی چمک میں بھی اللہ آپؐ کو اسلامی انقلاب کی وسعتوں کو دکھاتے تھے ۔ پہلے دن سے آپؐ نے خوشخبری سنائی تھی کہ قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے ہاتھ آئیں گے ۔ لیکن جنگ احزاب جیسے مایوس کن حالات میں بھی جب کدال کی ضرب سے پتھر سے چمک نکلتی تو اس سے بھی حضورؐ کو مستقبل کا نقشہ بتا دیا جاتا اور آپؐ فوراً مسلمانوں کو بتا دیتے اور اس کی وجہ سے ان کے دلوں میں یقین اور امید کے چشمے پھوٹ نکلتے ۔

ابن اسحاق لکھتے ہیں ۔ سلمان فارسی کی یہ روایت مجھ تک پہنچی ہے کہ میں خندق کا ایک کونا کھود رہا تھا کہ ایک پتھر میرے لیے مشکل ہو گیا ۔ رسول اللہ اس وقت میرے قریب تھے ۔ آپ نے دیکھا کہ میں مسلسل د[illegible] رہا ہوں اور جگہ میرے لئے مشکل ہو گئی ہے ۔ حضورؐ اترے اور میرے ہاتھ سے کدال لیا اور پتھر پر وار کیا ۔ کدال کے نیچے سے ایک چمک اٹھی ۔ پھر آپؐ نے دوسری ضرب لگائی اور پھر پتھر سے ایک چمک اٹھی ۔ پھر آپؐ نے تیسری ضرب لگائی اور پتھر سے پھر چمک اٹھی ۔ کہتے ہیں میں نے پوچھا رسول خداؐ یہ چمک کیسی تھی جو میں دیکھ رہا ہوں کہ آپؐ جب مارتے ہیں تو کدال چمک اٹھتا ہے ۔ حضورؐ نے فرمایا (سلمان تو نے یہ دیکھ لیا ہے) میں نے کہا ہاں ۔ پہلی چمک میں یہ بات دکھائی گئی کہ میرے لیے یمن فتح ہو گیا ہے ۔ دوسری چمک میں یہ دکھایا گیا کہ اللہ نے میرے لیے شام اور مغرب کا علاقہ فتح کر دیا اور تیسری چمک میں یہ بات تھی کہ اللہ نے میرے لیے مشرق کو فتح کر لیا ہے ۔

مقریزی نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عمرؓ کو پیش آیا اور اس وقت سلمان فارسی بھی موجود تھے ۔ ہمارے لیے سبق اس بات میں یہ ہے کہ اس قسم کے خوفناک ماحول میں بھی مسلمانوں کے دل و دماغ اعتماد سے بھرپور تھے ۔

○ ذرا وہ وقت بھی یاد کیجئے کہ حذیفہؓ شدید سردی میں دشمن کے کیمپ سے نکل آئے ہیں ۔ ان کے پاس اطلاعات ہیں ۔ وہ سردی سے کانپ رہے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں میں سے ایک کی لمبی شال میں نماز پڑھ رہے ہیں ۔ حضورؐ نماز میں ہیں ۔ اپنے رب کے ساتھ مناجات میں ہیں ۔ آپ حضرت حذیفہ کو چھوڑ نہیں دیتے کہ وہ اس وقت تک کانپتے رہیں جب تک حضورؐ نماز سے فارغ نہیں ہو جاتے بلکہ آپ حذیفہؓ کو اپنے پاؤں ٹانگوں کے اندر دبا لیتے ہیں اور اپنی شال کا ایک کونہ ان پر ڈال دیتے ہیں کہ وہ گرم ہو جائیں اور آپؐ نماز جاری رکھتے ہیں ۔ نماز ختم ہوتی ہے ۔ حذیفہ آپؐ کو اطلاعات فراہم کرتے ہیں اور آپؐ کو خوشخبری سناتے ہیں کیونکہ [illegible] مبارک کہہ رہا تھا کہ آج کچھ ہونے والا ہے ۔ حذیفہ اسے دیکھ کر آ گئے ۔

○ جہاں تک آپؐ کی شجاعت ' ثابت قدمی اور اللہ پر بھروسے کا تعلق ہے تو وہ آپ کی سیرت سے عیاں ہیں اور اس پورے قصے سے بالکل عیاں ہیں ۔ اور مشہور ہیں ' لہٰذا ہم یہاں تفصیلات نہیں دے سکتے ۔ اللہ نے سچ کہا " درحقیقت تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک بہترین نمونہ تھا ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے"۔

--- ○○○---

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب ایک سچے مومن کی تصویر ملاحظہ ہو ۔ جو اللہ پر پورا پورا بھروسہ رکھتا ہے اور پوری طرح مطمئن ہے ۔ یہ تصویر روشن ' چمکدار اور خوبصورت ہے ۔ دیکھیے ہر قسم کے ہولناک حالات کے مقابلے میں یہ مومن ڈٹا ہوا ہے ۔ خطرات میں کود پڑتا ہے ۔ ایسے خطرناک حالات میں چٹان کی طرح ڈٹا ہے جن میں عام لوگوں پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور خطرہ جس قدر شدید ہوتا ہے اسے اسی قدر زیادہ اطمینان ' اللہ پر زیادہ بھروسہ اور خوشخبری کا یقین ہوتا ہے ۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾

"اور سچے مومنوں (کا حال اس وقت یہ تھا کہ) جب انہوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ "یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا ' اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات بالکل سچی تھی"۔ اس واقعہ نے ان کے ایمان اور ان کی سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا"۔

اس جنگ میں مسلمان جس خوف سے دوچار ہوئے وہ اس قدر عظیم تھا ' اور اس غزوہ میں جو دکھ ان کو پہنچا وہ اس قدر شدید تھا ' اور اس واقعہ میں وہ جس بے چینی کا شکار ہوئے ' وہ اس قدر سخت تھی کہ وہ ہلا مارے گئے اور قرآن نے اس کے لیے زِلْزَالًا شَدِيْدًا (۳۳ : ۱۱) کا لفظ استعمال کیا ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (۳۳ : ۱۱) "یہاں مومنین کو آزمایا گیا اور وہ ہلا مارے گئے"۔

یہ لوگ بہرحال انسان تھے اور انسان کی قوت برداشت بہرحال محدود ہوتی ہے ۔ اللہ بھی انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بناتا ۔ اگرچہ ان کو پورا پورا یقین تھا کہ آخری فتح ہماری ہی ہوگی ۔ اور رسول اللہ نے ان کو بشارت بھی دے دی تھی اور یہ بشارت نہ صرف عرب بلکہ یمن ' شام اور مشرق و مغرب کی فتح کی تھی ۔ لیکن ان حقائق کے باوجود موجودہ ہولناک حالات نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا اور وہ مسلسل کرب اور خوف محسوس کرتے تھے ۔

مسلمان کن حالات میں تھے اور کس قدر سہمے ہوئے تھے ' اس کی تصویر حضرت حذیفہ ابن ایمان کی روایت سے بہت وضاحت سے معلوم ہوتی ہے ۔ اصحاب رسولؐ کی حالت کیا تھی اور ان کی اندرونی حالت کیا تھی ۔ "حضورؐ صحابہؓ سے کہتے ہیں کون ہے وہ شخص جو کھڑا ہو اور جائے اور دشمن کے لشکر کے اندر جا کر معلوم کرے کہ وہ کیا کرتے ہیں ۔ اس کے

لیے شرط ہے کہ وہ واپس آئے گا۔ میں اللہ سے دعا کروں گا کہ اللہ اسے میرے ساتھ جنت میں رکھے"۔ باوجود اس کے کہ اس شخص کی واپسی کی بھی ضمانت ہے اور اس کے لیے جنت کی دعاء کی بھی ضمانت ہے ' لیکن کوئی بھی خود اٹھ کر نہیں آتا۔ اور حضورؐ تین بار دہراتے ہیں۔ آخر میں حضورؐ حضرت حذیفہؓ کا نام لے کر پکارتے ہیں اور حذیفہؓ بھی فرماتے ہیں کہ جب میرا نام لے لیا گیا تو اب میرے لیے جانے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ رسولؐ یہ موقف انتہائی خوف کی حالت ہی میں اختیار کر سکتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات ان کی طاقت سے زیادہ تھی۔

لیکن اس زلزال شدید کے باوجود' اور آنکھیں پتھرانے کے باوجود جان کی بے چینی کے باوجود' ان لوگوں کا اللہ کے ساتھ ایک غیر منقطع تعلق تھا۔ وہ سنن الٰہیہ کو اس حد تک جانتے تھے کہ وہ کسی وقت بھی ان نظروں سے اوجھل نہ ہوتی تھیں اور ان کو سنن الٰہیہ پر غیر متزلزل بھروسہ تھا کہ اللہ کے یہ سنن ناقابل تغیر ہیں اور جب ان کے مطابق اسباب فراہم ہوں تو نتائج ضرور ان کے مطابق نکلیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مومنین نے یہ سمجھ لیا کہ اس شدید خوف اور ہلا مارنے کے بعد اب نصرت قریب آگئی ہے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ اللہ نے فرمایا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (حوالہ) "کیا تم یہ گمان رکھتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور تم پر وہ حالات نہ آئیں گے جو تم سے پہلے لوگوں پر آئے۔ ان پر سختیاں آئیں مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی--- ہاں اللہ کی مدد قریب ہے"۔ اور اب چونکہ وہ ہلا مارے گئے ہیں لہٰذا نصرت الٰہی قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کہا: "یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی"۔ (اس واقعہ نے ان کے ایمان اور سپردگی کو اور زیادہ کر دیا)۔

هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ (۳۳ : ۲۲) "یہ وہی چیز ہے جس کو اللہ اور رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا"۔ یہ خوف' یہ بے چینی' اور یہ کپکپی' یہ تنگی وہ چیزیں ہیں جن پر ہم سے نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا نصرت آنے ہی والی ہے۔

وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ (۳۳ : ۲۲) "اور اللہ اور رسول کی بات بالکل سچی تھی"۔ یعنی اللہ اور رسول نے نصرت الٰہی کی آمد کے لیے جو علامات رکھی تھیں' وہ سچ تھیں اور اب وہ علامات ظاہر ہو رہی ہیں تو بھی سچی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دل اللہ کی نصرت کے آنے پر مطمئن ہو گئے۔

وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا (۳۳ : ۲۲) "اس واقعہ نے ان کے ایمان اور سپردگی کو اور

زیادہ کر دیا"۔

بہرحال وہ انسان اور بشر تھے اور بشری جذبات سے وہ بھی پاک نہ ہو سکتے تھے۔ بشری کمزوریاں ان کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں۔ ان سے شریعت کا مطالبہ یہ نہ تھا کہ وہ بشر سے زیادہ بوجھ اٹھائیں۔ دائرہ بشریت کے اندر ہی ان کو رہنا تھا۔ اور بشریت کی خصوصیات اور سمات کا ان کے اندر پایا جانا حکمت خداوندی تھا۔ اس لیے ان کو پیدا کیا گیا تھا تاکہ وہ بشر ہوتے ہوئے کام کریں اور بشریت کے علاوہ کوئی اور جنس نہ ہوں۔ نہ ملائکہ ہوں اور نہ شیاطین ہوں۔ نہ جانور ہوں اور نہ پتھر ہوں۔ وہ بشر تھے۔ اس لیے ان پر خوف بھی طاری ہوتا تھا اور انہیں پریشانی بھی لاحق ہوتی تھی اور تنگی بھی محسوس کرتے تھے۔ اگر خطرہ حد برداشت سے زیادہ ہو جاتا تو ان پر کپکپی بھی طاری ہوتی تھی۔ لیکن ان کمزریوں کے باوجود مضبوط رسی سے ان کا ربط تھا۔ وہ اللہ سے باندھے ہوئے تھے اور اللہ ان کو گرنے سے بچا رہا تھا۔ از سر نو امید یں ان کے اندر پیدا فرماتا ہے اور ناامیدی سے ان کو بچاتا تھا۔ اس لیے وہ انسانیت کی تاریخ میں ایک منفرد مثال تھے۔ ایسی مثال جس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ جس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔

ہمیں چاہئے کہ اس حقیقت کا ادراک کریں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ پوری انسانی تاریخ کے انسانوں میں ایک ایسا نمونہ بھی تھا اور کبھی بشریت اس معیار تک بھی پہنچی تھی۔ یہ بشر تھے 'فرشتے نہیں تھے' ان میں کمزوریاں بھی تھیں اور قوت بھی تھی اور ان کا اعزاز اور معیار یہ ہے کہ انہوں نے بشریت کو اس قدر اونچے معیار تک پہنچا دیا یوں کہ دائرہ بشریت کے اندر رہتے ہوئے وہ اس قدر بلند معیار تک پہنچ گئے۔

جب ہم دیکھیں کہ ہمارے اندر کمزوری آگئی ہے یا ہمارے قدم متزلزل ہوگئے ہیں' یا ہم ڈر گئے ہیں' یا ہم پر تنگی کا وقت آگیا ہے۔ ہولناک اور خطرناک حالات سے دوچار ہو گئے ہیں تو ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے اور ہمیں چیخ و پکار نہ شروع کر دینا چاہئے کہ وائے مارے گئے۔ لیکن ہمیں یہ موقف بھی نہ اختیار کرنا چاہئے کہ یہ کمزوریاں تو خیر القرون میں بھی تھیں اور یہ ہماری فطرت کا حصہ ہیں اور ہم بلکہ تمام انسانوں سے اچھے لوگوں میں بھی تھیں' اس لیے کہ ایک مضبوط رسی بھی ہے' یہ مضبوط رسی آسمان سے تعلق کی رسی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اللہ پر بھروسہ کریں۔ اس کی رسی کو تھامیں اور اعتماد اور اطمینان کو واپس لوٹائیں اور ہمارے جب قدم متزلزل ہو جائیں تو ہم سمجھ لیں کہ اب اللہ کی نصرت آنے والی ہے تاکہ ہم ثابت قدم رہیں۔ ہمیں استقرار حاصل ہو اور نہایت ہی قوت سے از سر نو راہ حق پر چل پڑیں۔

آغاز اسلام میں اللہ نے صحابہ کرام کی جو ٹیم تشکیل دی تھی اسے یہی توازن عطا کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک منفرد ٹیم تھی۔ اس ٹیم کی تعریف خود قرآن بار بار کرتا ہے کہ اس ٹیم نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے۔ کس طرح ثابت قدم رہے۔ ان میں سے بعض تو اللہ کے ہاں پہنچ گئے اور بعض انتظار میں ہیں۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

"ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے ۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے ۔ انہوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی" ۔

یہ نمونہ اس مکروہ نمونے کے بالمقابل ہے ۔ یہ مکروہ نمونہ وہ ہے جس میں لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ پیٹھ نہ پھیریں گے مگر بعد میں انہوں نے اپنا عہد وفا نہ کیا ۔

وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا "اور اللہ کے عہد کے بارے میں تو پوچھا جاتا ہے" ۔

امام احمد نے حضرت ثابت سے نقل کیا ہے کہ "میرے چچا انس ابن نضرؓ رسول اللہؐ کے ساتھ بدر میں حاضر نہ ہو سکے تھے ۔ ان پر یہ بات بہت شاق تھی ۔ وہ کہتے تھے کہ یہ پہلا معرکہ تھا جس میں رسول خداؐ شریک ہوئے اور میں غائب رہا ۔ اگر اللہ نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی معرکے میں شریک کیا تو اللہ تعالیٰ دیکھ لے گا کہ میں کیا کرتا ہوں ۔ ان کے سوا اور کوئی یہ بات نہ کہہ سکا ۔ یہ رسول اللہؐ کے ساتھ احد کے دن حاضر ہوئے ۔ یہ سعد ابن معاذؓ کے سامنے آگئے ۔ انس نے ان سے کہا ابو عمر! واہ! واہ! جنت کی ہوا کیا خوب ہے ۔ مجھے تو احد سے جنت کی ہوا آرہی ہے ۔ کہتے ہیں اس نے ان کے ساتھ جنگ کی اور وہ قتل ہوگئے ۔ ان کے جسم پر ۸۰ سے اوپر زخم تھے ۔ تیروں، تلواروں اور نیزوں کے ۔ ان کی بہن میری پھوپھی ربیع بنت نضر نے کہا میں نے اپنے بھائی کو اس کی انگلیوں کے پوروں سے پہچانا ۔ کہتی ہیں ان پر یہ آیت نازل ہوئی :

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا (۳۳ : ۲۳) صحابہ کرامؓ کا خیال تھا کہ یہ آیت انس ابن نضر اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ۔ بے مثال مومنین کی یہ نہایت ہی روشن تصویر ہے ۔ یہاں ہم اس کا تذکرہ اس لیے کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ ایمان کی حقیقت کیا ہوتی ہے ۔ اور نفاق کیا ہوتا ہے ۔ وفائے عہد کیا ہوتا ہے اور نقض عہد کیا ہوتا ہے ۔ یہ میدان تربیت گاہ کے درمیان تقابلی مطالعہ تھا ۔

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کو ایسی آزمائشوں میں کیوں ڈالتا ہے اور جو لوگ وفائے عہد نہیں کرتے ان کا انجام کیا ہوتا ہے اور جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں ان کا انجام کیا ہوتا ہے ۔

لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ﴿۲۴﴾

(یہ سب کچھ اس لیے ہوا) "تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کی جزا دے اور منافقوں کو چاہے تو سزا دے اور چاہے تو ان کی توبہ قبول کر لے ، بے شک اللہ غفور و رحیم ہے" ۔

قرآن کریم میں واقعات و حادثات پر ایسا تبصرہ آتا رہتا ہے ۔ مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ تمام معاملات اللہ کے اختیار میں ہیں ۔ ان واقعات کی حکمت بھی بتا دی جاتی ہے کہ کوئی واقعہ عبث یا یونہی پیش نہیں آجاتا ۔ ہر واقعہ حکمت الٰہیہ کا حصہ ہوتا ہے اور مقررہ وقت پر آتا ہے ۔ اس کے پیچھے بامقصد تدبیر ہوتی ہے اور اس کے مقررہ نتائج نکلتے ہیں ۔ اللہ کے بندوں کے

لئے رحمت اور فضل اس میں عیاں ہوتا ہے اور یہ جان لینا چاہئے کہ اللہ کی رحمت اور اس کا فضل ہمیشہ عیاں ہوتا ہے۔

انَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۳۳: ۲۴) "بے شک اللہ غفور و رحیم ہے"۔ اور یہ عظیم واقعہ اس پر ختم ہوتا ہے کہ مومنین کا اپنے رب کے بارے میں جو یقین تھا وہ درست ثابت ہوا اور منافقین اور افواہیں پھیلانے والے غلط خیالات لیے ہوئے تھے۔ غرض ایمانی اقدار آخر کار کامیاب رہیں۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۚ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴿۲۵﴾

"اللہ نے کفار کا منہ پھیر دیا' وہ کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر اپنے دل کی جلن لیے یونہی پلٹ گئے' اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لیے کافی ہو گیا' اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے"۔

اس معرکے کا آغاز ہوا۔ یہ آگے بڑھا۔ اپنے انجام تک پہنچا لیکن پورے دور میں اس کی باگیں اللہ کے ہاتھ میں تھیں۔ جس طرح اللہ چاہتا تھا' واقعات کا رخ موڑ دیتا تھا۔ قرآن کریم اپنے انداز تعبیر کے ذریعہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔ جو بھی واقعات ہوئے' وہ اللہ نے کرائے اور یہ بات اچھی طرح اہل ایمان کے دلوں میں بٹھا دی گئی۔ یوں اسلامی تصور حیات کو واضح کر دیا گیا۔

---ooo---

اب اس لشکرکشی کا وبال صرف مشرکین قریش' اور غطفان پر ہی نہ پڑا بلکہ مشرکین کے حلفاء بنی قریظہ بھی اس کی زد میں آگئے۔

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿۲۶﴾ وَاَوْرَثَكُمْ
اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ ۳
شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۷﴾ ع ۷
۱۹

"پھر اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا' اللہ ان کی گڑھیوں سے انہیں اتار لایا اور ان کے دلوں میں اس نے ایسا رعب ڈال دیا کہ آج ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے گروہ کو قید کر رہے ہو۔ اس نے تم کو ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور وہ علاقہ تمہیں دیا جسے تم نے کبھی پامال نہ کیا تھا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

بنی قریظہ کا کیا قصہ تھا؟ اس کا تعلق مسلمانوں اور یہودیوں کے باہم تعلقات سے ہے ۔ مناسب ہے کہ یہاں اس کی وضاحت کر دی جائے ۔ یہودیوں نے اسلام کے ساتھ بہت ہی مختصر عرصہ کے لیے رواداری کا رویہ اپنایا ۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آتے ہی ان کے ساتھ باہمی امن کا معاہدہ کر لیا تھا اور ذمہ داری قبول فرمائی تھی کہ مسلمان ان کی نصرت اور حمایت کریں گے بشرطیکہ وہ غداری نہ کریں 'فسق و فجور نہ کریں' جاسوسی نہ کریں دشمن کی حمایت نہ کریں 'اور کسی مسلمان کو اذیت نہ دیں ۔

بہت ہی تھوڑے دن گزرے تھے کہ یہودیوں نے یہ محسوس کیا کہ دین جدید ان کے لیے بھی خطرہ بن گیا ہے اور ان کی موروثی امتیازی حیثیت کہ وہ اہل کتاب ہیں 'اب ختم ہو رہی ہے ۔ یہ لوگ اہل یثرب کے درمیان اپنی اس امتیازی حیثیت کی وجہ سے ایک اہم مقام رکھتے تھے ۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں مسلمانوں کی جدید صف بندی سے بھی خطرات محسوس کر لیے ۔ اس سے قبل وہ اوس اور خزرج کے درمیان پائے جانے والے طویل اختلافات اور جنگوں سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے ۔ اس طرح مدینہ میں انہی کی بات ہوتی تھی ۔ جب نبی کریمؐ کی قیادت میں اسلام نے ان روایتی دشمنوں کو باہم شیروشکر کر دیا تو یہودیوں کے وہ مفادات ختم ہو گئے جو وہ ان دونوں فریقوں سے حاصل کرتے تھے ۔

جس بات نے جلتی پر تیل کا کام کیا وہ یہ تھی کہ ان کے عالم اور مذہبی راہنما عبداللہ ابن سلام مسلمان ہو گئے ۔ ان کا دل اسلام کے لیے کھل گیا ۔ یہ مسلمان ہو گیا ۔ اس نے اپنے خاندان سے بھی کہا تو وہ بھی مسلمان ہو گئے لیکن اس نے کہا کہ اگر وہ ایسے ہی اپنے اسلام کا اعلان کر دے تو یہودی الزام لگائیں گے تو انہوں نے رسول اللہؐ سے مطالبہ کیا کہ میرے بارے میں پہلے آپ ان سے پوچھ لیں ۔ پہلے اس کے کہ میرے اسلام کا اعلان ہو' تو انہوں نے کہا یہ ہمارے سردار ہیں' سردار کے بیٹے ہیں ۔ ہمارے حبر اور عالم ہیں ۔ اس پر عبداللہ ابن سلام نکلے اور ان سے کہا کہ ایمان لاؤ چنانچہ انہوں نے اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور تمام یہودی قبائل کو ان کے بارے میں آگاہ کر دیا ۔ اب انہوں نے محسوس کر لیا کہ ہمارے دین کو حقیقی خطرہ ہے ۔ چنانچہ انہوں نے اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشیں شروع کر دیں ۔ ایسی سازشیں جو کبھی رکتی نہ تھیں ۔ اس دن سے یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو جنگ شروع ہوئی وہ آج تک جاری ہے اور یہ میدان کارزار آج تک ٹھنڈا نہیں ہوا ۔

پہلے یہ سرد جنگ تھی اور جوں جوں ہمارے مسلمانوں کے حالات خراب ہوتے رہے' یہ جنگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور اسلام کے خلاف جاری رہی ۔ اس جنگ نے مختلف رنگ اور اسلوب اختیار کیے ۔ پہلے انہوں نے جدید رسالت کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلائے ۔ پھر جدید عقیدے پر الزامات لگائے ۔ پھر انہوں نے مسلمانوں کے درمیان عداوتیں ڈالنا شروع کر دیں ۔ اوس اور خزرج کو بار ہا لڑانا چاہا ۔ انصار اور مہاجرین کے درمیان انہوں نے دشمنی ڈالی ۔ یہ مسلمانوں کے خلاف مشرکین مکہ کے لیے جاسوسی بھی کرتے رہے ۔ یہ پھر منافقین کے دوست بن گئے ۔ ان منافقین کے ذریعے اسلامی صفوں میں فتنے ڈالتے ۔ آخر کار یہ کھل کر سامنے آگئے اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف لشکر کشیاں کیں اور احزاب کو جمع کرنا شروع کر دیا ۔ مثلاً غزوۂ احزاب کی شکل میں ۔

ان کے اہم قبیلے بنی قینقاع اور بنی النضیر اور بنی قریظہ تھے ۔ ان میں سے ہر ایک کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور

مسلمانوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ تھا۔ بنو قینقاع یہودیوں میں سے بہت ہی دلیر تھے۔ ان کے دل تو اس وقت جل اٹھے جب مسلمانوں کو بدر میں کامیابی ہوئی۔ انہوں نے عہد کی خلاف ورزی شروع کر دی بلکہ عہد سے انکار ہی کر دیا اور ان کا خیال یہ تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو کفار قریش کے ساتھ پہلے ہی معرکے میں کامیاب رہے ہیں لہٰذا اگر حالت یونہی رہی تو یہ ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں گے۔

ابن ہشام نے اپنی سیرت میں ابن اسحاق کے ذریعہ سے ان کے یہ حالات درج کیے ہیں۔ بنی قینقاع کا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ نے ان کو قینقاع کے بازار میں جمع کیا اور کہا: اے اہل یہود، اللہ سے ڈرو، جس طرح اللہ نے قریش پر وبال نازل کیا ہے، ویسا ہی حال تمہارا نہ ہو جائے۔ اسلام قبول کر لو، تمہیں تو معلوم ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ یہ بات تمہاری کتاب کے اندر موجود ہے"۔ انہوں نے کہا اے محمدؐ، تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم قریش کی طرح ہیں۔ تم اس بات پر مغرور نہ ہو جاؤ کہ تم ایک ایسی قوم پر غالب آگئے جنہیں جنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے اور تم نے انہیں مار لیا۔ اگر ہم نے تمہارے ساتھ جنگ کی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کیسے لوگ ہیں۔

ابن ہشام نے بواسطہ عبداللہ ابن جعفر نقل کیا ہے --- بنی قینقاع کا قصہ یوں ہوا کہ ایک عرب عورت دودھ لے کر آئی اور بنی قینقاع کے بازار میں اسے فروخت کیا، اس کے بعد وہ ایک سنار کے ہاں زیور بنانے کے لیے بیٹھ گئی۔ انہوں نے یہ کوشش کی کہ اس عورت کے چہرے کو کھول دیں۔ اس نے انکار کیا۔ سنار نے جھٹ اس کے کپڑے کو اس کی پیٹھ کے ساتھ باندھ دیا۔ جب وہ اٹھی تو اس کی شرم گاہ ننگی ہو گئی۔ اس پر وہ خوب ہنسے۔ اس نے چلا کر مدد کے لیے پکارا۔ ایک مسلمان سنار پر ٹوٹ پڑا اور اسے قتل کر دیا۔ یہ یہودی تھا۔ تمام یہودی مسلمان پر ٹوٹ پڑے اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ آوازیں ہوئیں۔ تمام مسلمان قینقاع کے خلاف جمع کیے اور یوں ان کے درمیان شر شروع ہوا۔

ابن اسحاق نے بات یوں مکمل کی --- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کیا۔ ان لوگوں نے حضورؐ کے حکم پر ہتھیار ڈال دیئے۔ اس پر عبداللہ ابن ابی ابن السلول نے کہا: "محمدؐ یہ لوگ میرے دوست ہیں ان کے ساتھ بھلائی کرو، یہ خزرج کے دوست تھے۔ حضورؐ خاموش رہے۔ اس کے بعد اس نے دوبارہ یہ مطالبہ کیا کہ یہ میرے دوست ہیں ان کے ساتھ حسن سلوک کرو"۔ اس پر حضورؐ نے پھر اعراض فرمایا۔ اب اس نے حضورؐ کے زرہ کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔ رسول اللہؐ نے اسے کہا مجھے چھوڑ دو۔ آپؐ نے سخت غصہ میں فرمایا۔ یہاں تک کہ آپؐ کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا بدبخت چھوڑ دو مجھے۔ اس پر اس نے کہا۔ خدا کی قسم میں آپؐ کو اس وقت نہ چھوڑوں گا جب تک آپؐ میرے دوستوں کے ساتھ احسان نہ کریں۔ یہ چار سو شہ سوار اور تین سو زرہ پوش ہیں۔ انہوں نے سرخ و سیاہ اقوام کے خلاف میری مدد کی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم ان کو صبح کے تڑکے فصل کی طرح کاٹ دو۔ میں ایک ایسا آدمی ہوں جو مشکلات سے ڈرتا ہوں۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا تم جو چاہتے ہو وہی ہو گا۔

عبداللہ ابن ابی ابھی تک اپنی قوم میں ذی حیثیت تھا۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے اس کی سفارش قبول کر لی اور فیصلہ یہ ہوا کہ بنی قینقاع مدینہ سے نکل جائیں۔ وہ اپنے ساتھ اپنے مال لے جائیں ماسوائے اسلحہ کے۔ یوں مدینہ یہودیوں کی ایک ٹکڑی سے خالی ہوا۔ یہ رجمنٹ بڑی قوت والی تھی۔

رہے بنی نضیر تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بدر کے بعد سن چار ہجری میں ان کے پاس گئے۔ آپ نے ان

سے دو مقتولین کی دیت میں شرکت کا مطالبہ کیا۔حسب عہد انہوں نے یہ ادائیگی کرنی تھی ۔جب حضورؐ آئے تو انہوں نے کہا ہاں ابو القاسم ہم آپ کی امداد حسب خواہش کریں گے ۔اس کے بعد یہ لوگ علیحدہ ہو کر مشورہ کرنے لگے کہ تم اس شخص کو کبھی ایسی حالت میں نہ پاؤ گے ۔اس وقت رسول ان کی ایک دیوار کے نیچے بیٹھے تھے ۔تو انہوں نے کہا کہ کون ہے جو جاکر ایک پتھر گرائے تاکہ اس شخص سے ہماری جان چھوٹے ۔

چنانچہ یہ لوگ اس سازش کو عملی جامہ پہنانے میں لگ گئے ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی اس کی اطلاع دے دی گئی ۔حضورؐ اٹھ کھڑے ہوئے اور مدینہ کی طرف لوٹ آئے ۔آپ نے حکم دیا کہ ان کے ساتھ جنگ کی تیاری کرو' یہ لوگ قلعہ بند ہوگئے ۔عبداللہ ابن ابی ابن السلول نے ان کو پیغام بھیجا کہ ڈٹ جاؤ۔ہم تمہیں ان کے سپرد نہ کریں گے ۔اگر جنگ ہوئی تو ہم تمہارے ساتھ مل کر جنگ کریں گے ۔اگر تمہیں نکالا گیا ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے ۔لیکن منافقین نے اپنا یہ عہد پورا نہ کیا۔بنی نضیر کو اللہ نے مرعوب کر دیا۔بلا حرب و قتال انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے ۔انہوں نے رسول اللہؐ سے درخواست کی کہ ان کو جلاوطن کر دیں اور قتل نہ کریں ۔اونٹوں پر وہ اسلحہ کے سوا جو کچھ لے جا سکتے ہیں' لے جائیں ۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔یہ لوگ خیبر کو چلے گئے ۔بعض لوگ شام کو چلے گئے ۔حضورؐ نے یہ درخواست منظور کر لی۔ان کے اشراف میں سے جو لوگ خیبر کو گئے' یہ لوگ تھے ۔سلام ابن ابوالحقیق' کنانہ ابن ابرہہ' حیی ابن اخطب۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے غطفان اور قریش کو جمع کیا مسلمانوں کے خلاف اور غزوۂ احزاب برپا کیا۔

اب رہا بنی قریظہ کا قصہ ۔غزوۂ احزاب میں انہوں نے جو کردار ادا کیا وہ معلوم ہو چکا ہے ۔یہ بھی مشرکین کے ساتھ جمع ہوگئے تھے ۔بنی نضیر کے زعماء کی تحریص اور آمادہ کرنے پر اور حیی ابن اخطب اس کام کا ذمہ دار تھا۔بنی قریظہ کی عہد شکنی دوسرے احزاب کے مقابلے میں مسلمانوں پر بہت ہی گراں گزری ۔ان لوگوں کا رویہ کس قدر خطرناک تھا۔اس کا اندازہ تم اس سے کر سکتے ہو کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی عہد شکنی کی اطلاعات ملیں تو آپ نے سعد ابن معاذ رئیس اوس کو ان کے پاس بھیجا۔اور سعد ابن عبادہ رئیس خزرج بھی ساتھ ہوئے ۔ان کے ساتھ عبداللہ ابن رواحہ اور خوات ابن جبیر بھی گئے ۔حضورؐ نے فرمایا کہ ذرا جاکر دیکھو کہ ہم تک جو اطلاعات پہنچ رہی ہیں وہ درست ہیں یا نہیں؟ اگر یہ اطلاعات درست ہوں تو میرے سامنے ایسے الفاظ میں رپورٹ دو کہ میں ہی سمجھوں اور مسلمانوں پر اس کا برا اثر نہ ہو اور اگر وہ وفا پر قائم ہوں تو پھر اعلانیہ کہہ دینا۔(اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کس طرح سمجھتے تھے کہ لوگوں پر اس خبر کا اثر کیا ہوگا)

یہ وفد گیا تو دیکھا کہ یہ لوگ اطلاع سے بھی زیادہ خراب پوزیشن میں تھے ۔انہوں نے رسول اللہؐ کو برا بھلا کہا۔اور کہا کون رسول' کس کی بات کرتے ہو۔ ہمارے اور محمدؐ کے درمیان کوئی عہد و معاہدہ نہیں ہے ' وفد آیا۔انہوں نے رسول اللہؐ کو اطلاع دی ۔اشاروں کے ساتھ ۔رسول اللہ نے فرمایا اللہ اکبر! مسلمانو تمہیں خوشخبری دی ہے (حضورؐ نے یہ الفاظ مسلمانوں کو ثابت قدم بنانے کے لیے کہے )۔

ابن اسحاق کہتے ہیں اب مصیبت دگنی ہوگئی ۔خوف پھیل گیا۔اوپر اور نیچے سے دشمن آگئے اور اب مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوگئے ۔بعض منافقین کھل کر سامنے آگئے ۔

معرکہ احد سے پہلے تو یہ صورت حالات تھی ۔لیکن جب اللہ کے نبی کو جنگ احزاب میں اللہ کی نصرت ملی اور دشمنان

مسلمانان خائب و خاسر ہوئے 'انہیں کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ اللہ نے خود ہی مومنین کی طرف سے جنگ کی۔ حضورؐ مدینہ کی طرف کامیاب لوٹے۔ لوگوں نے اسلحہ رکھنا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل جنگی حالت کی وجہ سے غسل کرنے لگے تھے۔ آپ اُم سلمہ کے گھر تھے تو جبریل علیہ السلام آگئے۔ ''حضورؐ آپ نے اسلحہ رکھ دیا ہے''۔ حضورؐ نے فرمایا ''ہاں''۔ ''لیکن ملائکہ نے تو اسلحہ نہیں رکھا اور میں ابھی اس قوم کا پیچھا کر کے آرہا ہوں''۔ اس کے بعد حضرت جبریل نے فرمایا'' اللہ کا حکم ہے بنی قریظہ کی طرف پہنچو''۔ بنی قریظہ مدینہ سے کئی میل دور تھے۔ یہ واقعہ نماز ظہر کے بعد کا ہے۔ حضورؐ نے حکم دیا ''کوئی شخص نماز نہ پڑھے مگر دیار بنی قریظہ میں'' لوگ نکل پڑے۔ راستے میں نماز عصر کا وقت آ گیا۔ بعض لوگوں نے راستہ ہی میں نماز پڑھ لی اور انہوں نے کہا کہ رسول اللہؐ کا ارادہ صرف یہ تھا کہ جلدی پہنچو لیکن دوسروں نے کہا کہ ہم بنی قریظہ کی بستیوں سے ادھر نماز نہ پڑھیں گے لیکن اس پر کسی نے ایک دوسرے کو ملامت نہ کی۔ حضورؐ ان کے بعد پہنچے۔ مدینہ میں ابن ام مکتوم صاحب۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی کو والی مقرر کر دیا۔ جھنڈا حضرت علیؓ ابن ابوطالب کو دیا گیا۔ حضورؐ نے ان کا پچیس دنوں تک محاصرہ کیا اور ان کو کہا کہ ہتھیار ڈال دو۔ جب ان پر معاملہ طویل ہو گیا تو انہوں نے سعد ابن معاذ رئیس اوس کے حکم پر ہتھیار ڈال دیئے۔ جاہلیت میں یہ ان کے حلفاء میں سے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ان کے ساتھ احسان کریں گے۔ جس طرح عبداللہ ابن ابی ابن السلول نے اپنے دوستوں کے ساتھ کیا تھا اور ان کو رسول اللہ سے چھڑا لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سعد ابن معاذ بھی وہی کرے گا جو عبداللہ ابن ابی نے کیا۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ سعد کو ایک تیر بازو کی بڑی رگ میں لگا ہوا تھا۔ اور اگر یہ رگ کٹ جائے تو وہ زخمی ہرگز تندرست نہ ہوتا تھا۔ یہ خندق کے ابتدائی دنوں ہی میں لگ گیا تھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے داغ دھوئے تھے اور مسجد کے اندر ہی ایک خیمے میں انہیں رکھا ہوا تھا تاکہ حضورؐ سہولت کے ساتھ ان کی تیمارداری کر سکیں اور سعد یہ دعا کیا کرتے تھے اے اللہ! اگر آپ نے ہمارے اور قریش کے درمیان ابھی مزید جنگیں لکھی ہوئی ہیں تو مجھے زندہ رکھ اور اگر ہمارے ان کے درمیان جنگ ختم ہو چکی ہے تو پھر یہ زخم بہتا رہے اور پھر میری صرف یہ تمنا ہے کہ میری آنکھیں بنی قریظہ کے معاملے میں ٹھنڈی ہو جائیں۔ اللہ نے اس کی دعا قبول کی اور یہ مقدر کر دیا کہ وہ انہی کے فیصلے پر ہتھیار ڈال دیں اور یہ درخواست خود انہوں نے اپنی خوشی سے کی۔

اب رسول اللہؐ نے حضرت سعد کو مدینہ سے بلایا کہ وہ ان لوگوں کے بارے میں فیصلہ کریں۔ جب وہ آیا اور وہ ایک گدھے پر سوار تھا جو انہوں نے اس کے لیے خوب تیار کیا تھا تو اوس اس کے پاؤں پڑنے لگے۔ کہتے اے سعد ہم تیرے دوست ہیں۔ ان کے ساتھ احسان کرو' وہ تو منتیں کر رہے تھے کہ اس کے دل کو ان کے لیے نرم کر دیں۔ سعد ابن معاذ خاموش ہیں اور کچھ بھی نہیں کہہ رہے۔ جب انہوں نے اصرار کر لیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ سعد اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈرے۔ تو انہوں نے جان لیا ہے کہ سعد درست فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں۔

جب سعد اس خیمے کے پاس گئے جو رسول اللہ کا خیمہ تھا' تو حضورؐ نے فرمایا ''اٹھو اپنے سردار کے احترام و استقبال

ہیں ـ مسلمان اٹھے اور اسے اتارا۔بہت ہی اعزاز و احترام اور اکرام کے ساتھ ـ تاکہ ان کا فیصلہ اچھی طرح نافذ ہو ـ

جب سعد بیٹھے تو حضور اکرمؐ نے فرمایا ان لوگوں نے اشارہ بنی قریظہ کی طرف--- تمہارے فیصلے پر ہتھیار ڈالے ہیں ـ لہٰذا آپ جو چاہیں ان کے بارے میں حکم دیں ـ تو اس پر اس نے کہا "کیا میرا حکم ان پر نافذ ہو گا؟" حضور اکرمؐ نے فرمایا "ہاں" ـ "اور ان تمام لوگوں پر نافذ ہو گا جو اس خیمے میں ہیں؟" تو آپؐ نے فرمایا "ہاں" ـ پھر انھوں نے کہا اور وہاں جو لوگ ہیں ان پر بھی (اس وقت سعد نے حضور اکرمؐ کی جگہ کی طرف اشارہ کیا جبکہ وہ خود اپنا منہ بوجہ حیاء اور احترام و اکرام پھیرے ہوئے تھے) تو رسول اللہؐ نے فرمایا "ہاں" ـ اس پر سعد ابن معاذؓ نے فرمایا: "میں فیصلہ کرتا ہوں کہ ان کے جنگی لوگوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کے اموال اور اولاد کو مال غنیمت بنا دیا جائے ـ اس پر حضورؐ نے فرمایا "تم نے بے شک اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے اور اللہ نے یہ فیصلہ سبع سموات کے اوپر کر دیا تھا" ـ

پھر حضورؐ نے حکم دیا کہ زمین میں گڑھے کھودے جائیں اور یہ لوگ باندھے ہوئے لائے گئے ـ ان کی گردنیں اڑا دی گئیں ـ یہ لوگ سات آٹھ سو کے قریب تھے اور جو مرد عورتیں بالغ نہ تھے ان کو غلام بنا لیا گیا ـ مقتولین میں حیی ابن اخطب بھی تھا ـ یہ حسب معاہدہ ان کے ساتھ قلعہ بند ہو گیا تھا ـ

اس وقت سے یہودی ذلیل ہوئے اور آج کے بعد مدینہ میں نفاق کی تحریک کمزور پڑ گئی ـ منافقین کے سر نیچے ہو گئے اور اس سے قبل وہ جو کچھ کرتے تھے اب اس سے ڈر گئے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس دن کے بعد کفار نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کی ـ بلکہ اب حملے مسلمانوں کی طرف سے ہوتے رہے ـ یہاں تک کہ مکہ اور طائف فتح ہوئے ـ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہودیوں، مشرکین مکہ اور منافقین کی تحریکات کا تانا بانا ملا ہوا تھا اور جب یہودی مدینہ سے جلاوطن ہوئے تو یہ ریشہ دوانیاں ختم ہو گئیں اور آج کے بعد اسلامی مملکت کی بنیاد مستحکم ہو گئی ـ یہ ہے پس منظر اس قول ربانی کا ـ

وَ اَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَیَاصِیْهِمْ وَ قَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ وَ تَاْسِرُوْنَ فَرِیْقًا (۲٦) وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَ دِیَارَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ وَ اَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا (۳۳ : ۲۷) "پھر اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا ان کی گڑھیوں سے انھیں اتار لایا اور ان کے دلوں میں اس نے اب رعب ڈال دیا کہ آج ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے گروہ کو قید کر رہے ہو؟ اس نے تم کو ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور وہ علاقہ تمہیں دیا جسے تم نے کبھی پامال نہ کیا تھا ـ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ـ صیاصی سے مراد قلعے ہیں اور وہ زمین جو مسلمانوں نے پامال نہ کی تھی وہ ارض بنو قریظہ تھی جو ان کی مملوکہ تھی ـ ان کے محلے کے اردگرد اور یہ زمین بھی ان کے اموال کے ساتھ مسلمانوں کے ہاتھ آ گئی ـ اور یہ اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ بنی قریظہ نے بغیر قتال کے زمین دے دی اور پامال کرنے سے مراد جنگ ہے ـ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ـ

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا (۳۳:۲۷) ان تمام واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یعنی تمام امور اللہ کے اختیارات میں ہیں۔ اس پورے قصے میں تمام امور کو اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور تمام واقعات کو دست قدرت کا نتیجہ بتایا گیا ہے تاکہ باقی مسلمانوں کے دلوں میں اللہ واقعات کے ذریعے بٹھانا چاہتے ہیں اور واقعات کے بعد پھر قرآن کو نازل کر کے بٹھانا چاہتے ہیں کہ اسلامی تصور حیات صاف اور ستھرا دلوں میں بیٹھ جائے۔

یوں یہ عظیم حادثہ یہاں اختتام کو پہنچا۔ اس کے اندر بے شمار سنن الہیہ ' بے شمار اعلیٰ قدریں ' بے شمار ہدایات اور بے شمار اصول بیان کیے گئے تاکہ یہ چیزیں صاف صاف ہو کر جماعت مسلمہ کی زندگی کا حصہ بن جائیں۔

یوں یہ واقعات تربیت کے لیے ایک اچھا مواد ہیں اور قرآن میں ان کو جگہ دے کر اسلامی نمونہ حیات کے لیے معیار اور راہنما بنا دیا گیا۔ ان آیات کو اسلامی جماعت کا رخ قرار دیا اور ان کے تصورات کو اچھی طرح ان کی زندگی کے اندر بٹھا دیا گیا۔ اسلامی جماعت کے لیے اعلیٰ قدریں واضح کر دی گئیں اور ان ابتلاؤں اور آزمائشوں میں اسلامی کردار نکھر کر سامنے آ گیا۔

--- ○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ----- ۲۲

سورۃ الاحزاب ۔ ۳۳ آیات ۲۸--- تا--- ۷۳

سورۃ سبا ۔ ۳۴ آیات ۱--- تا--- ۵۴

سورۃ فاطر ۔ ۳۵ آیات ۱--- تا--- ۴۵

سورۃ یٰسین ۔ ۳۶ آیات ۱--- تا--- ۲۱

# درس نمبر ۱۹۰ تشریح آیات

## ۲۸ --- تا --- ۳۵

یہ سورہ احزاب کا تیسرا سبق ہے اور یہ ازواج مطہرات کے ساتھ مخصوص ہے۔ ماسوائے اس کے آخری فقرے کے جس میں تمام مسلمین اور مسلمات کے لیے اجر عظیم کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سورہ کے آغاز میں ازواج مطہرات کو امہات المومنین کا لقب دیا گیا تھا اور اس لقب کے فرائض بھی بتائے گئے تھے اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس صفت کی وجہ سے ان کو بہت ہی عظیم مقام نصیب ہوا ہے۔ اس لقب کے بھی فرائض ہیں اور رسول اللہ کی بیویاں ہونے کی وجہ سے بھی فرائض ہیں۔ اس سبق میں ان فرائض کا ایک حصہ بیان ہوا ہے اور وہ اقدار بتائی گئی ہیں جن کے اعتبار سے گھرانہ نبوت ایک مثال ہونا چاہئے اور یہ ایک ایسا مقام ہونا چاہئے جس سے لوگ روشنی حاصل کریں یعنی گھرانہ نبوت روشنی کا مینار ہو۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ﴿٢٨﴾ وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٢٩﴾

"اے نبیؐ، اپنی بیویوں سے کہو، اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ اور دار آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکو کار ہیں اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے"۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نفس اور اپنے اہل بیت کے لیے بقدر کفاف زندگی بسر کرنے کا راستہ اختیار کیا، یہ اس وجہ سے نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وسائل نہ تھے۔ عربوں کے ایک بڑے علاقے کو آپ نے فتح کر لیا تھا، اموال غنیمت کی کثرت تھی، اور صدقات بہت جمع ہو رہے تھے۔ وہ لوگ بھی غنی ہو گئے جن کے پاس اس سے قبل نہ مال تھا اور نہ اخراجات کے لیے کچھ تھا۔ ان جیسے حالات کے باوجود ایک ایک مہینہ گزر جاتا اور حضورؐ کے ہاں چولہا نہ جلتا اور حضورؐ کے پاس جو کچھ آتا آپ بطور ہبہ، صدقہ اور ہدیہ لوگوں میں بانٹ دیتے۔ لیکن یہ زندگی حضورؐ نے اس لیے اختیار کی کہ آپ اس دنیا اور متاع دنیا کو بھی فتح کرنا چاہتے تھے اور صرف اللہ کے لیے خالص

ہونا چاہتے تھے ۔حضور اکرمؐ اپنی یہ خواہشات پوری کرنے کی پوزیشن میں تھے لیکن آپ نے ان رغبات کو رضاکارانہ طور پر ترک فرما دیا اور بلند رویہ اختیار کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عقیدے یا اپنی شریعت کی رو سے اس بات کے پابند نہ تھے کہ وہ یہ رویہ اختیار کریں اور اپنے اہل و عیال اور گھر والوں کو بھی اسی طرح رکھیں کیونکہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی شریعت کی رو سے طیبات حرام نہ تھیں ۔جب آپؐ کے سامنے یہ طیبات پیش کی جاتیں تو آپؐ ان کے تناول کرنے سے کبھی انکار نہ فرماتے ۔ بلا تکلف آپ استعمال فرماتے بشرطیکہ یہ چیزیں روٹین میں آپ کے سامنے آ جائیں 'آپؐ خواہش لے کر ان کے پیچھے کبھی نہ جاتے اور نہ ان طیبات میں ڈوب جاتے اور اپنے آپ کو ان میں مشغول کر لیتے ۔آپ نے اپنی امت کو بھی اس بات کا حکم نہیں دیا کہ عام لوگ بھی آپ کی طرح زہد اور ورع اختیار کریں ۔ ہاں جو شخص رضاکارانہ طور پر چاہے تو اختیار کرے یعنی اپنے آپ کو لذائذ اور دنیا کی عیش و عشرت سے بلند کرتے ہوئے اور دنیا کی رغبات اور سازو سامان کے بوجھ سے اپنے آپ کو سربلند کرتے ہوئے 'اور ان بکھیڑوں سے اپنے آپ کو آزاد کرتے ہوئے ۔

لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات بہرحال عورتیں تھیں 'بشر تھیں ۔ ان کے اندر بھی انسانی خواہشات تھیں ۔ ان کی فضیلت 'ان کی کرامت اور سرچشمہ نبوت سے ان کے قرب کے باوجود ان کے دلوں میں بھی قدرتی خواہشیں اور چاہتیں ان کے نفوس کے اندر بھی زندہ تھیں ۔جب اللہ نے نبی پر اور مسلمانوں پر ہر طرف سے مال و دولت کے دروازے کھول دیئے تو انہوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مناسب نفقات کے سلسلے میں کچھ مطالبات کیے ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس مطالبے پر خوشی کا اظہار نہ کیا بلکہ آپ کو یہ مطالبہ ناگوار لگا اور آپ نے ناراضی کا اظہار کیا۔کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان حالات میں زندگی بسر کرنا چاہتے تھے جو اللہ ان کے لیے پسند فرماتے تھے یعنی آزادی 'بلندی اور قناعت اور معیار زندگی کے بارے مکمل لاپرواہی اور اس کے بارے میں معمولی مصروفیت سے بھی اجتناب اور آپ کی خواہش یہ تھی کہ آپ کی زندگی اور آپ کے زیر سایہ رہنے والوں کی زندگی دنیا کے تمام شوائب سے پاک اور بلند افق پر ایک روشن مثال نظر آئے ۔اس نقطہ نظر سے نہیں کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے؟ کیونکہ حلال اور حرام تو قرآن نے بیان کر دیئے تھے بلکہ اس زاویہ سے کہ آپؐ اپنے آپ کو زندگی کی ضروریات اور اس دنیا کی خواہشات اور دنیا کے جھمیلوں سے آزاد اور سربلند رکھنا چاہتے تھے ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ازواج مطہرات کے ان مطالبات سے اس قدر دکھ پہنچا کہ آپ نے صحابہ کرام کے ساتھ مجلس عام بند کر دی اور آپ گھر ہی میں بیٹھ گئے ۔ صحابہ کرامؓ تو ہر بات برداشت کر سکتے تھے لیکن حضورؐ کا ان میں نہ بیٹھنا یہ ان کے لیے قابل برداشت نہ تھا۔ لوگ آئے 'حضورؐ نے ان کو ملاقات کی اجازت نہ دی ۔ امام احمد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے ۔ حضرت ابوبکر تشریف لائے اور لوگ آپ کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے ۔تو آپ نے اجازت نہ دی ۔ پھر حضرت عمرؓ تشریف لائے اور انہوں نے اجازت طلب کی تو ان کو بھی اجازت نہ دی گئی ۔ حضورؐ اندر بیٹھے ہوئے تھے ۔اس کے بعد حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کو اجازت دے دی ۔یہ دونوں اندر حضورؐ کے پاس گئے ۔ حضورؐ بیٹھے ہوئے تھے ۔ آپ کے ارد گرد ازواج مطہرات بیٹھی ہوئی تھیں اور آپ خاموش تھے ۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں ایسی بات کروں گا کہ حضور اکرم ہنس پڑیں گے ۔حضرت عمرؓ نے کہا رسول خدا! ابھی آپ کے سامنے اگر زید کی بیٹی 'میری بیوی 'مجھ سے نفقہ طلب کرے تو میں اس کی گردن توڑ دوں ۔اس پر حضورؐ ہنس پڑے یہاں تک کہ آپؐ کے دانت مبارک نظر آ گئے ۔ حضورؐ

نے فرمایا: یہ سب میرے گرد جمع ہوگئی ہیں اور یہ نفقہ ہی مانگ رہی ہیں"۔ حضرت ابوبکر اٹھے کہ حضرت عائشہؓ کو ماریں اور حضرت عمرؓ اٹھے کہ حفصہ کو ماریں۔ دونوں یہ کہہ رہے تھے کہ تم دونوں ہرگز نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ کچھ نہ مانگو جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مارنے سے روک دیا۔ انہوں نے کہا کہ اس مجلس کے بعد ہم رسول اللہؐ سے وہ کچھ نہ مانگیں گی جو آپؐ کے پاس نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ اللہ نے خیار نازل کر دیا ہے۔ حضورؐ نے حضرت عائشہ سے شروع کیا۔ حضورؐ نے فرمایا میں تمہارے سامنے ایک بات رکھتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ اس کے بارے میں جلدی نہ کریں اور اپنے والدین سے مشورہ کریں۔ انہوں نے کہا کیا ہے وہ؟ حضورؐ نے فرمایا

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ (۳۳:۲۸) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا "کیا میں آپ کے بارے میں اپنے والدین سے مشورہ کروں! میں تو اللہ اور رسول کو اختیار کرتی ہوں اور میری درخواست ہے کہ آپ دوسری عورتوں سے اس کا ذکر نہ کریں کہ میں نے آپ کو چن لیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ نے مجھے سختی کرنے والا نہیں بنا کر بھیجا بلکہ معلم اور آسانی کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ جو عورت بھی مجھ سے پوچھے کہ عائشہ نے کیا فیصلہ کیا ہے تو میں ضرور انہیں بتاؤں گا۔ (مسلم)

بخاری میں ابو سلمہ' ابن عبدالرحمٰن اور عائشہ سے روایت ہے کہ جب اللہ نے اپنے رسول کو یہ حکم دیا کہ اپنی بیویوں کو اختیار دے دیں تو آپ سب سے پہلے میرے پاس آئے۔ اور یہ فرمایا میں ایک بات آپ کے سامنے رکھتا ہوں لیکن آپ پر لازم نہیں ہے کہ آپ جلدی فیصلہ کر دیں۔ مناسب ہے کہ والدین سے مشورہ کر لیں۔ حضورؐ کو معلوم تھا کہ میرے والدین مجھے یہ مشورہ نہ دیں گے کہ تم رسول اللہؐ کو چھوڑ دو۔ اس کے بعد رسول اللہ نے یہ پڑھا:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ (۳۳:۲۸) "میں نے کہا کہ میں کس معاملے میں اپنے والدین سے مشورہ کروں' اللہ اور رسولؐ کے بارے میں یا دارالآخرۃ کے بارے میں۔

قرآن کریم کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی تصور حیات کے لیے مستقل قدریں وضع کر دے اور ان قدروں کا مجسم اور زندہ ترجمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے میں ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ان کی ترجمان ہو اور یہ ترجمانی بیت نبوت میں نہایت ہی وضاحت اور تفصیل سے ہو کیونکہ یہ گھرانہ پورے کرۂ ارض کے مسلمانوں کے لیے روشنی کا مینار تھا اور رہنے والا تھا۔ ازواج مطہرات کو اختیار دینے والی یہ دو آیات نازل ہوئیں اور ان آیات نے طریقہ کار متعین کر دیا۔ وہ طریقہ اور منہاج یہ ہے کہ یا تو تم لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت اختیار کر سکو گی یا اللہ اور رسول اللہ اور دار آخرت کو حاصل کر سکو گی۔ انسان کا دل ایک ہوتا ہے اور اس ایک دل میں دو متضاد باتیں بیک وقت نہیں سما سکتیں۔ اللہ نے کسی ایک جسم میں دو دل پیدا نہیں کیے۔

مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ (۳۳:٤) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج نے یہ تو وعدہ کر لیا تھا کہ آج کی مجلس کے بعد ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف وہ کچھ طلب کریں گے جو آپ کے پاس ہے۔ وہ نہیں طلب کریں گی جو آپ کے پاس نہیں۔ اس کے بعد پھر قرآن کریم کی ہدایت آئی تاکہ اصل مسئلہ کا فیصلہ کر

دے ۔ مسئلہ یہ نہ تھا کہ آپ کے پاس کچھ تھا یا نہ تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ اللہ ' اللہ کے رسول اور دار آخرت کو تمام چیزوں پر ترجیح دے دیں یا وہ دنیا کی زینت کے اسباب اختیار کر لیں ۔ چاہے پوری دنیا کا مال و اسباب ان کے ہاتھ میں ہو یا ان کے گھر خرچے سے بھی خالی ہوں۔ اس تخییر کے بعد سب نے اللہ اور رسول اللہ ؐ اور دار آخرت کو چن لیا اور وہ ایسی ہو گئیں جس کا تقاضا وہ مقام کرتا تھا جس میں وہ تھیں ۔ وہ رسول کرم ؐ کے گھر میں تھیں ۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس اختیار کے نتیجے میں بہت خوش ہوئے ۔

مناسب ہے کہ اس واقعہ پر ہم قدرے غور کریں اور اس کے بعض گوشوں کو واضح کریں ۔ یہ واقعہ اسلام کی قدروں کو بہت ہی واضح شکل میں پیش کرتا ہے اور دنیا اور آخرت کا شعوری احساس انسان کے اندر پیدا کرتا ہے ۔ یہ واقعہ انسانوں کے دل سے ہر قسم کی غیر یقینی صورت حال اور ہر قسم کا شف شف ختم کر کے رکھ دیتا ہے کہ کبھی ایک مسلمان دنیا پرست ہو جائے اور کبھی آخرت پرست ۔ کبھی وہ بندۂ نفس ہو اور کبھی بندۂ خدا ہو ۔ اللہ کے ساتھ خلوص اور آخرت کی فکر کی راہ میں جو بات بھی رکاوٹ بنتی ہے' یہ واقعہ اس کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے ۔

یہ تو ایک پہلو ہے' دوسرا پہلو یہ ہے کہ حضور ؐ کی حقیقی زندگی اس واقعہ سے ہمارے سامنے آتی ہے اور پھر ان انسانوں کی حقیقی زندگی بھی ہمارے سامنے آتی ہے جو حضور ؐ کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے ۔ اس زندگی میں جو اعلیٰ درجے کی خوبصورتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ زندگی انسانوں کی ایک معیاری زندگی ہے ۔ یہ لوگ بشر تھے ۔ بشریت کے خواص اور تقاضے ان سے سلب نہ کر لیے گئے تھے ۔ ان کا شعور انسانی تھا اور ان کے خصائص انسانی تھے ۔ باوجود اس کے کہ وہ بہت ہی اعلیٰ درجے کے بشر تھے ' باوجود اس کے کہ وہ اللہ اور آخرت کے ساتھ اعلیٰ درجے کا خلوص رکھتے تھے ' انسانی خواہشات اور انسانی شعور ان نفوس قدسیہ کے اندر سے ختم نہ کر دیا گیا تھا البتہ یہ نفوس بہت ہی سربلند ہو گئے تھے ۔ وہ دنیا کی آلودگیوں سے پاک ہو گئے تھے ۔ اس کے باوجود ان کی انسانیت ' طبیعت اور ان کی میٹھی زندگی موجود تھی ۔ ان کے راستے میں کوئی ایسی رکاوٹ نہ آسکتی تھی جو ان کو اس مقام بلند تک پہنچنے سے روکتی جو انسانوں کے لیے مقدر تھا۔

انسان بعض اوقات یہ غلطی کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کے لیے غیر حقیقی زندگی کے تصورات اپناتے ہیں یا ہم ان کو انسان کامل نہیں سمجھتے بلکہ تمام انسانی جذبات اور خواہشات ہی سے ان کو پاک کر دیتے ہیں ۔ ہمارا خیال یہ ہوتا ہے کہ ہم ان کو بلند درجہ دیتے ہیں ۔ ہم ان کو پاک تصور کرتے ہیں اور ان کو نقص اور ضعف سے پاک سمجھتے ہیں ۔

یہ پوری غلطی ہے کہ اس طرح ہم ان نفوس قدسیہ کو غیر حقیقی شخصیات بنا دیتے ہیں ۔ ہم ان کے گرد اوہام کا ایک ایسا ہالہ بنا دیتے جس کے اندر ان کی کامل درجے کی انسانی صفات غائب ہو جاتی ہیں اس لیے ہمارے اور ان کے درمیان بشری رشتہ ختم ہو جاتا ہے اور ہمارے احساس کے اندر اس ہالہ کے اندرون ایسی شخصیات بن جاتی ہیں جو موہومہ شخصیات ہوتی ہیں ۔ ہم نہ ان کو چھو سکتے ہیں اور نہ ان کو ہاتھ لگا سکتے ہیں اور ہمارے شعور کے اندر یہ بات آجاتی ہے کہ شاید وہ ایک ایسی مخلوق تھے جو ہمارے جیسے نہ تھے ۔ وہ ملائکہ تھے یا ایسے لوگ تھے جو انسانی خواص سے عاری تھے ۔ باوجود اس تصور اور تصویر کی خوبصورتی کے ' ہم اس کے دائرے سے دور ہو جاتے ہیں ۔ نہ ہم ان کے ساتھ ہم محفل ہو سکتے ہیں اور ان سے متاثر ہو سکتے ہیں ۔ اس کے نتیجے میں ہمارے اندر ایک مایوسی پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم ان جیسے کیسے بن سکتے ہیں ' ہم

ان جیسے کام کیسے کر سکتے ہیں؟ اور اس طرح سیرت رسولؐ اور سیرت صحابہؓ کا ایک اہم عنصر اور اہم محرک ہم سے چلا جاتا ہے یعنی ہمارے شعور کے اندر ان حضرات کی تقلید سے مایوسی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے اندر ان کا رعب بیٹھ جاتا ہے اور ہم ان کو فوق الفطرت مخلوق سمجھنے لگتے ہیں۔ ہماری واقعی اور عملی زندگی پر ان کا اثر نہیں ہوتا۔ پھر ہمارے اور ان شخصیات کے درمیان ہم آہنگی نہیں رہتی کیونکہ ہم ان کے ساتھ ہم آہنگ تب ہی ہو سکتے ہیں اور ان کے ہمقدم تب ہی ہو سکتے ہیں۔ جب ہم یہ شعور رکھتے ہوں کہ یہ لوگ دراصل انسان تھے 'بشر تھے۔ وہ انسانی جذبات' میلانات' اور خواہشات رکھتے تھے اور اس اعلیٰ مقام تک پہنچنے کے وہی میلانات 'جذبات اور خواہشات ہم بھی رکھتے ہیں۔ لیکن ہم ان کی طرح سربلند نہیں ہوتے اور وہ ہو گئے۔

اس سے وہ حکمت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ نے رسولوں کو انسان اور بشر بنایا۔ نہ ملائکہ بنایا اور نہ کوئی دوسری مخلوق بنایا' تاکہ رسولوں اور ان کے متبعین کے درمیان حقیقی ربط قائم ہو۔ یہ متبعین محسوس کریں کہ رسول اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ ویسے ہی جذبات' ویسا ہی شعور اور ویسی ہی سوچ اور ویسی ہی خواہشات رکھتے تھے جیسی ہم رکھتے ہیں لیکن انہوں نے باطن کو صاف کیا۔ اپنے آپ کو دنیا کی آلودگیوں سے ہلکا کیا۔ اس طرح وہ جلدی سے اٹھ کر مقام بلند تک پہنچ گئے لہٰذا متبعین انسانوں کی طرح رسولوں سے محبت کرتے تھے جس طرح ایک چھوٹا انسان بڑے انسان کا احترام کرتا ہے۔

پھر اس واقعہ میں ازواج مطہرات کی طبیعی خواہشات بھی سامنے آتی ہیں کہ ان کے گھر میں بھی سازوسامان ہو۔ پھر حضور اکرمؐ کے گھر کا ماحول سامنے آتا ہے اور اس میں ازواج مطہرات ایک بشر کی طرح اپنے خاوند سے اچھے حالات کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ حضور اکرمؐ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان کی گردن توڑ دیں البتہ اللہ تعالیٰ نہایت ہی شائستگی کے ساتھ ان پر جسمانی ضرب سے زیادہ سخت ضرب لگاتے ہیں۔ مارتے اس لیے نہیں کہ مسئلہ انسان کی جائز خواہشات کا ہے' اسے پورا کیا جانا چاہئے اور خواہشات کو دبانا نہیں چاہئے۔ یہ معاملہ یوں ہی رہ جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تخییر نازل فرماتے ہیں۔ ایسا اختیار جس میں ضرب نہیں ہے۔ کوئی دباؤ نہیں ہے' مکمل آزادانہ اختیار ہے اور جب وہ آزادانہ اختیار کو بھی اپنی آزادی کے لیے نہیں بلکہ رسول کی غلامی کے لیے استعمال کرتی ہیں تو حضورؐ بہت خوش ہوتے ہیں۔

پھر اس واقعہ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں حضرت عائشہ کے لیے جذبہ محبت ہے اور وہ ہر میلان سے محبت کرتے ہیں۔ آپؐ چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت عائشہ اس مقام عالی پر فائز ہونے کا اعلان کر دیں جو اللہ کو حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے لیے پسند ہے۔ اس لیے آپ یہ تجویز سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کے سامنے رکھتے ہیں اور آپ کی خواہش یہ ہے کہ وہ آپؐ کے ساتھ اس مقام بلند میں تعاون کریں اور دنیاوی آلودگیوں سے پاک ہو جائیں اس لیے آپ ان کو مشورہ دیتے ہیں کہ پیش آنے والی بات کے معاملے میں جلدی فیصلہ نہ کریں اور والدین سے مشورہ کے بعد فیصلہ کریں۔ حضورؐ کو یقین تھا کہ وہ بہرحال آپؐ کے حق میں مشورہ دیں گے اور یہ جذبہ محبت جو حضرت عائشہ کے ساتھ تھا' اس کے جواب میں حضرت عائشہؓ کی جانب سے بھی کسی غلطی کا ارتکاب نہیں ہوتا۔ وہ بھی اسے پاتی ہیں۔ یہ جذبہ انہیں بھی خوش کرتا ہے اور وہ اسے ریکارڈ پر لاتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرمؐ بھی ایک بشر ہیں اور وہ اپنی اس چھوٹی بیوی سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ لہٰذا آپ پسند فرماتے ہیں

کہ وہ اس افق تک بلند ہو جائے جس تک آپؐ چاہتے ہیں اور آپؐ کے ساتھ اس مقام بلند پر رہیں اور آپؐ کے ساتھ اس شعور میں حصہ دار ہوں کہ اعلیٰ قدریں کیا ہوتی ہیں' جن کو اللہ حضورؐ کے لیے پسند فرماتے ہیں اور آپ کے اہل بیت کے لیے پسند فرماتے ہیں ۔یوں حضرت عائشہؓ بھی ایک بشر ہیں اور اللہ نے ان کے خاوند کے دل میں ان کے لیے ایک اچھا مقام پیدا کر دیا ہے ۔وہ اس پر بہت خوش ہیں ۔پھر وہ اس پر بھی خوش ہیں کہ آپؐ اس کے والدین کی امداد بھی چاہتے ہیں کہ وہ اس مقام بلند کا انتخاب کریں جو رسول اللہ ان کے لیے پسند کرتے ہیں ۔پھر وہ جب اللہ اور رسول کو اختیار کرتی ہیں تو وہ حضورؐ سے درخواست کرتی ہیں کہ ان کا یہ فیصلہ دوسری ازواج مطہرات کو نہ بتایا جائے تاکہ وہ منفرد رہیں یا بعض کے مقابلے میں ممتاز رہیں ۔اور دوسری جانب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کہ آپ ان سے کہتے ہیں۔

ان اللہ لم یبعثنی ھنھا ولکن بعثنی معلما میسرا ''مجھے اللہ نے سخت گیر بنا کر نہیں بھیجا بلکہ معلم اور سہولت دینے والا بنایا ہے''۔اس لیے آپؐ نے فرمایا کہ مجھ سے جو بھی پوچھے گی میں تو بتاؤں گا۔اس لیے آپ نے کسی بھی بیوی سے ایسی بات چھپانا مناسب نہ سمجھا جس سے کسی کار خیر میں مدد مل سکتی ہو۔ لہٰذا ان کو اندھیرے میں رکھ کر ان سے امتحان لینا مناسب نہیں تھا بلکہ اس امتحان میں ان کی جس قدر معاونت ہو سکتی تھی 'کی گئی ۔تاکہ دوسری ازواج بھی دنیا پر خدا' رسولؐ اور آخرت کو ترجیح دے کر سربلند ہو جائیں اور دنیاوی آلودگیوں سے صاف ہو جائیں ۔

یہ بشری خدوخال نہایت اہم ہیں ۔سیرت کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں چاہیے کہ ہم ان کے آثار نہ مٹائیں اور نہ ان کو مہمل چھوڑ دیں اور نہ یہ مناسب ہے کہ ان کی قدر و قیمت کم کر دیں ۔ان کا صحیح طرح ادراک کرنا ہی ہمیں رسول اللہؐ کی ذات اور صحابہ کرامؓ کی شخصیات سے اچھی طرح مربوط کر سکتا ہے ۔یہ رابطہ زندہ رابطہ ہو گا۔ان میں باہم محبت اور ہم آہنگی پیدا ہو گی اور انسانوں کے دل میں ان ذوات سے ہمدردی پیدا ہو کر ہم ان کی اقتداء کر سکیں گے ۔

اس نوٹ کے بعد اب ہم نص قرآن کی طرف آتے ہیں ۔اب ہم دنیا اور آخرت کے فرق کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں اور یہ بات بھی اچھی طرح ہماری سمجھ میں آچکی ہے کہ اللہ نے کسی انسان کے سینے میں دو دل نہیں رکھے ۔یہ حقیقت ہمارے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ایک عملی مثال میں پیش کر دی گئی ہے جس میں آپ کے اہل بیت بھی فریق تھے ۔اب اہل بیت النبی سے کہا جاتا ہے کہ اگر تم لوگ تقویٰ کی راہ اختیار کرو تو تمہارے لیے رزق کریم ہو گا اور اگر تم نے برے کام کیے تو تمہارے مقام کے حساب سے تمہاری سزا بھی بہت بڑی ہو گی ۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۳۰

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ۝۳۱

"نبی کی بیویو' تم میں سے جو کسی صریح فحش حرکت کا ارتکاب کرے گی اسے دوہرا عذاب دیا جائے گا' اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہے اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گی اور نیک عمل کرے گی اس کو ہم دوہرا اجر دیں گے اور ہم نے اس کے لیے رزق کریم مہیا کر رکھا ہے"۔

یہ اس بلند مقام کا تقاضا ہے جس پر وہ فائز ہیں ۔وہ سرور دوعالم کی بیویاں ہیں ۔ان کو امہات المومنین کا مرتبہ دیا گیا ہے اور یہ دونوں اعزاز ان پر بہت ہی بھاری ذمہ داریاں عائد کرتے ہیں ۔ان کا پہلا تقاضا ہے کہ تم تمام فاحشات سے مکمل اجتناب کرو' اگر بفرض محال ان میں سے کسی نے بھی فحاشی کا ارتکاب کیا تو اسے دوہرا عذاب دیا جائے گا اور اس فرضی دھمکی کے ذریعے دراصل بتانا یہ مقصود ہے کہ وہ کس قدر بلند مقام پر فائز ہیں اور اس کے تقاضے کیا ہیں۔

وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (۳۳ : ۳۰) "اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہے"۔رسول اللہ کی بیویاں ہونے کے باوجود بھی اللہ کو کوئی نہیں روک سکتا کہ تمہیں سزا نہ دے ۔ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ رسول مختار صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو سزا دینے میں شاید کوئی رکاوٹ ہو' اس لیے تردید کر دی گئی۔

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا (۳۳ : ۳۱) "اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گی اور نیک کام کرے گی"۔قنوت کے معنی طاعت اور خضوع وخشوع ہیں اور عمل صالح قنوت کا صحیح ترجمہ ہے۔

نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ (۳۳ : ۳۱) "تو اس کو ہم دہرا اجر دیں گے"۔جس طرح ان میں سے اگر کوئی فحاشی کا ارتکاب کرے تو سزا دگنی ہوگی۔

وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا (۳۳ : ۳۱) "اور ہم نے اس کے لیے رزق کریم مہیا کر رکھا ہے"۔ وہ حاضر ہے' تیار ہے' دوگنے اجر کے بعد رزق کریم مزید ہے' یہ اللہ کا فضل وکرم ہوگا۔

---ooo---

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ نبی کی ازواج مطہرات عام عورتوں کی طرح نہیں ہیں لہٰذا لوگوں کے حوالے سے بھی ان کے کچھ فرائض ہیں اور اللہ کی بندگی کرنے میں بھی ان کے کچھ فرائض ہیں ۔گھروں میں بھی ان کے فرائض ہیں ۔بتایا جاتا ہے کہ اس عظیم گھرانے کا نگہبان اللہ خود ہے ۔اللہ اس گھرانے کی زندگی کو پاک وصاف کرنا چاہتا ہے ۔ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہارے گھروں کے اندر جس حکمت اور آیات الٰہیہ کا نزول ہو رہا ہے اس کے حوالے سے تم پر خاص ذمہ داریاں ہیں اور یہ گھریلو ماحول تمہیں تمام جہان کی ازواج اور عورتوں سے ممتاز کرتا ہے۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا

مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾ وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ
الصَّلٰوةَ وَ اٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ
عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾ وَ اذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ ۳
بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴿۳۴﴾ ع ۷

"نبیؐ کی بیویو' تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو' اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل ا کی خرابی میں مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔ اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔ نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبیؐ سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے۔ یاد رکھو اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جو تمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں' بے شک اللہ لطیف اور باخبر ہے۔

جب اسلام آیا تو اس وقت عربی معاشرے میں' تمام دوسرے جاہلی معاشروں کی طرح حالت یہ تھی کہ عورت کو سامان تعیش سمجھا جاتا تھا اور فقط شہوت رانی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی نقطہ نظر سے اسے ایک گری ہوئی مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ نیز عربی معاشرے میں جنسی اعتبار سے بھی بڑی بے قاعدگی اور افراتفری پائی جاتی تھی اور نظام خاندانی میں ثبات نہ تھا جس طرح اس سورہ میں ہم نے تفصیلات دی ہیں۔

پھر جاہلیت کے زمانے میں عورت کی صنف کی طرف نہایت گری ہوئی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور ذوق جمال بھی نہایت گرا ہوا تھا۔ ننگے اجسام کی طرف زیادہ توجہ تھی اور اعلیٰ اور پاکیزہ ذوق جمال مفقود تھا۔ زمانہ جاہلیت کے اشعار کے اندر یہ خصوصیات اچھی طرح نظر آتی ہیں جو عورت کے جسم خصوصاً عورتوں کے اندامہائے نسائی کے بارے میں تھیں اور پھر نہایت ہی عریاں افعال اور معانی سے متعلق اشعار سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

جب اسلام آیا تو اس نے عورت کو معاشرے میں ایک باعزت مقام دیا اور مرد اور عورت کے درمیان تعلق کے معاملے میں انسانی پہلو کو زیادہ اہمیت دی۔ کیونکہ مرد اور عورت کا تعلق محض جسمانی بھوک کو فرو کرنے ہی کا تعلق نہیں ہوتا اور نہ خون اور گوشت کے جوش کو ٹھنڈا کرنا مطلوب ہوتا ہے بلکہ مرد اور عورت کا تعلق دراصل دو انسانی شخصیات کا اتصال ہے جن کو نفس واحد سے پیدا کیا گیا ہے اور ان کے درمیان محبت اور شفقت پیدا کی گئی ہے۔ ان کے ملاپ کی وجہ سے دونوں کو راحت اور سکون ملتا ہے اور دونوں کے ملاپ کا ایک ہدف مقرر ہے اور اس وقت سے مقرر ہے جب سے اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ پھر اس کا مقصد زمین کی آبادی ہے۔ اس میں انسان نے سنن الہیہ کے مطابق جو فرائض ادا کرنے ہیں' ان کا ادا کرنا ہے۔

اسلام نے خاندانی تعلقات کو لیا اور خاندانی تعلقات کو اس طرح منظم کیا کہ اسلام کی اجتماعی تنظیم کے لیے اسے اساس بنایا اور پھر خاندان کو ایک ایسی نرسری قرار دیا جس کے اندر آیندہ نسلوں کے لیے پودے تیار ہوتے ہیں اور اس نرسری کی نشوونما اور ارتقا اور تربیت کے لیے تمام ضروریات فراہم کیں اور اسے بچانے' پاک و صاف رکھنے کے

انتظامات کیے' خصوصاً نئی نسل کے شعور اور خیالات کو پاک و صاف رکھنے کے لیے۔

اسلام کے نظام قانون میں خاندانی نظام کی حفاظت کے لیے سب سے زیادہ قانون سازی کی گئی ہے اور قرآن کریم کی کئی آیات اس کے لیے مخصوص ہیں۔ قانونی اقدامات کے علاوہ بھی اسلام کے نظام اجتماعی کے اس ابتدائی یونٹ کو محفوظ کرنے کے لیے اسلام نے مسلسل ہدایات دی ہیں' خصوصاً اس یونٹ کی روحانی تطہیر کے لیے اور اس میں دو اصناف کے جنسی تعلق کے زاویہ سے' اس تعلق کو عریانی' بے راہ روی سے پاک کیا گیا اور محض جسمانی ملاپ کے لیے بھی سخت ہدایات دی گئیں۔

اس سورہ میں بھی اجتماعی تنظیم اور خاندانی نظام کی پختگی کے لیے آیات کا ایک بڑا حصہ وقف ہے۔ آیات زیر بحث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو خطاب ہے۔ ان کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق' ان کا لوگوں کے ساتھ تعلق' ان کا اللہ کے ساتھ تعلق' اور ان کے بارے میں اللہ کے ارادے کا ذکر کیا گیا ہے۔

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا

(اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبی سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے"۔ (۳۳:۳۳)

اب ہمیں دیکھنا یہ ہی کہ وہ کون سے وسائل ہیں جن کے ذریعہ اللہ نبیؐ کے اہل بیت کو پاک کرنا چاہتے ہیں اور اہل بیت کے لیے ان کو لازمی قرار دیتے ہیں جبکہ ازواج مطہرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہیں اور وہ اس زمین کی تمام عورتوں سے زیادہ پاک ہیں۔ ظاہر ہے کہ تمام دوسری عورتیں ان وسائل اور ان اقدامات کی بہت زیادہ محتاج ہیں۔ کیونکہ اگر ازواج مطہرات کو ان وسائل کی ضرورت تھی جو نبیؐ کے گھر میں رہتی تھیں تو دوسری بیویوں کو ان کی بدرجہ اتم ضرورت ہے۔

پہلا وسیلہ یہ ہے کہ ازواج مطہرات کو یہ شعور دیا جاتا ہے کہ تم نہایت ہی اونچے مرتبہ اور منصب اور مقام پر فائز ہو چکی ہو۔ تم تمام نساء عالم سے بلند مرتبہ ہو' لہٰذا سب سے پہلے تم اپنے اس مقام بلند کا خیال رکھو اور اس کے تقاضے پورے کرو۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ (۳۲:۳۳) "نبیؐ کی بیویو' تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو"۔ اگر تم خدا کا خوف کرو تو تم عام عورتوں کی طرح نہ رہو گی۔ تم تو ایسے مقام پر بیٹھی ہو جو قابل رشک ہے' اور اس میں تمہارے ساتھ عام عورتیں شریک نہیں ہیں' اور نہ تم اس میں کسی کو شریک کرتی ہو۔ لیکن یہ امتیاز تمہیں تقویٰ سے حاصل ہو گا کیونکہ محض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرابت داری کچھ چیز بھی نہیں ہے بلکہ تقویٰ کے ساتھ اس قرابت داری کے تقاضے بھی پورے کرنے ہوں گے خود اپنے نفوس کے اندر۔

یہ وہ دوٹوک سچائی ہے جس کے اوپر یہ دین قائم ہے۔ اس کا اعلان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رشتہ داروں کے سامنے کر دیا کہ لوگو' تمہیں رسول اللہؐ کی رشتہ داری کہیں دھوکہ میں نہ ڈالے۔ کیونکہ رسول خدا تمہارے معاملے میں کچھ اختیارات نہیں رکھتے۔ "اے فاطمہ بنت محمد! اے صفیہ بنت عبدالمطلب! اے اولاد عبدالمطلب! میں تمہارے حق

میں اللہ کے ہاں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ جہاں تک میرے مال کا تعلق ہے' اس کے بارے میں تم جو چاہتے ہو' مجھ سے مانگ لو"۔ (مسلم) دوسری روایت میں ہے "اے اہل قریش ' اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ۔ اے لولادِ کعب اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ' اے فاطمہ بنت محمد! اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ! خدا کی قسم میں اللہ کے ہاں تمہارے بارے میں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ ہاں میرے ساتھ تمہاری قرابت ہے اور اس کا حق میں ادا کرتا رہوں گا"۔ (مسلم ترمذی)

جب ان کو ان کی منزلت اور مقام سے آگاہ کر دیا گیا کہ اس مقام تک وہ صرف تقویٰ سے پہنچ سکتی ہیں تو اب اللہ تعالیٰ وہ ذرائع بیان فرماتے ہیں جن کے ذریعہ اللہ اہل بیت نبی کو مکمل طور پر پاک و صاف کرنا چاہتے ہیں اور ان کی مکمل تطہیر پیش نظر ہے۔

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ (۳۳: ۳۲) "تو دبی زبان سے بات نہ کرو کہ دل کی خرابی میں مبتلا کوئی شخص لالچ میں نہ پڑ جائے"۔ اللہ ازواج مطہرات کو پہلا حکم یہ دیتے ہیں کہ جب ان کو غیر محرم لوگوں سے بات کرنا پڑے تو ان کی زبان میں وہ لچک نہیں ہونا چاہئے کہ جو نرم اور دبی زبان میں بات کریں تو سننے والے کے لیے شہوت انگیزی کا باعث ہو۔ کیونکہ بالعموم نرم باتوں سے مردوں کو اشتہا پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے اندر تحریک ہوتی ہے اور بیمار دل اور کمزور اخلاق کے لوگ برے خیالات دلوں میں لا سکتے ہیں۔

ذرا یہاں غور کریں کہ وہ کون خواتین ہیں جن کو اللہ یہاں ڈرا رہا ہے۔ یہ ازواج مطہرات ہیں۔ امہات المومنین ہیں جن کے بارے میں کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کر سکتا اور نہ کوئی طمع کر سکتا ہے اور نہ کسی بیمار کی بیماری کا اثر ان پر پڑ سکتا ہے۔ بظاہر انسان یہی سوچ سکتا ہے۔ پھر یہ تنبیہ کس دور میں ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ' ان ممتاز اور برگزیدہ صحابہ کرام کے دور میں جن کے معیار کے لوگ نہ پہلے گزرے اور نہ بعد میں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ جس خدا نے مردوں اور عورتوں کو پیدا کیا وہ تو جانتا تھا کہ عورت اگر دبی اور نرم زبان میں ناز و انداز سے بات کرے تو لوگوں کے دلوں میں غلط خیالات پیدا کر سکتی ہے اور دلوں میں فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔ خصوصاً وہ دل جو پہلے سے مریض ہوں وہ تو فوراً اشتعال میں آ سکتے ہیں اور یہ مریض دل ہر دور اور عہد میں موجود ہوتے ہیں۔ ہر معاشرے میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں اور ایسے مریض ہر عورت کی طرف مائل ہو سکتے ہیں چاہے وہ نبی آخر الزمان کی زوجہ محترمہ ہو امہات المومنین میں سے ہو۔ کوئی ماحول اس وقت تک پاک اور صاف نہیں ہو سکتا جب تک گندگی کے اسباب کا سد باب نہ کیا جائے۔

اور ہم آج جس معاشرے میں رہتے ہیں' اس کا حال کیا ہے؟ یہ معاشرہ پہلے سے مریض ' ناپاک اور گرا ہوا ہے جس میں قدم قدم پر فتنے ہیں۔ ہر طرف شہوت انگیزیاں ہیں' خواہشات پھڑپھڑاتی پھرتی ہیں۔ اس ماحول میں ہمیں کیا کرنا چاہئے جس میں ہر طرف سے شہوت کو اٹھایا جاتا ہے' جگایا جاتا ہے' اور جنس کو گرم سے گرم تر کیا جاتا ہے۔ اس معاشرے اور اس زمانے میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ ہمارا دور جس میں عورتوں کا لہجہ نہایت لوچ دار' جن کی آواز نہایت ہی مائع' نسوانیت کے تمام فتنے مجتمع کیے ہوئے' جنسی کشش کے تمام فتنے پیدا کیے ہوئے' نہایت ہی خوش الحانی اور فتنہ سامانی کے ساتھ ہر جگہ حاضر۔ ایسی عورتیں کہاں پاک ہیں اور پاکی کی فضا کہاں ہے۔ یہ تو اپنی حرکات' اپنی آواز اور اپنی عریانی کے ذریعہ ان تمام گندگیوں میں ملوث ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ازواج مطہرات کو پاک کرنا چاہتے ہیں اور جس سے اللہ

اپنے مختار بندوں کو پاک کرنا چاہتے ہیں۔ایسے حالات میں عریانی اور اختلاط کس قدر خطرناک ہے!

وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (۳۳:۳۲) "بلکہ صاف سیدھی بات کرو"۔پہلے ان کو نرم اور لوچدار آواز سے منع کیا گیا اور اب یہاں کہا گیا کہ وہ سیدھی سادی بات کریں معروف طریقے کے مطابق۔جس طرح عام طور پر ایک اجنبی مرد اور اجنبی عورت ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں۔ان باتوں میں کوئی منکر بات نہ ہو۔بعض اوقات نرم لہجے سے زیادہ موضوع گفتگو بھی بے راہ روی پر آمادہ کر سکتا ہے۔لہٰذا کسی اجنبی مرد اور عورت کے درمیان لب و لہجے کا اشارہ بھی نہ ہو۔نہ ان کے درمیان گپ شپ ہو' نہ مزاح اور غیر سنجیدہ گفتگو ہو' تاکہ اس کے نتیجے میں کچھ دوسرے امور کی طرف میلان نہ ہو' اور قریباً یا بعیداً لوگ غلط راستوں پر نہ پڑ جائیں۔

اللہ تعالیٰ خالق ہے اور اپنی مخلوق کے مزاج اور طبیعت کے بارے میں بہت ہی اچھا جانتا ہے۔یہ اللہ ہی ہے جو امہات المومنین کو یوں مخاطب کر رہا ہے تاکہ وہ اپنے دور کے اجنبی لوگوں کے ساتھ اس انداز میں گفتگو کریں جبکہ وہ خیر القرون تھا۔

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ (۳۳:۳۳) "اور اپنے گھروں میں وقار سے رہو"۔قرن' وقر یقر سے ہے معنی ہیں بھاری ہوا' اپنی جگہ پر ٹھہر گیا۔اس کے لغوی معنی یہ نہیں کہ گھروں کے اندر بند رہیں اور گھروں سے باہر ہی نہ نکلیں۔یہ ایک لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ عورت کی اصل جگہ اس کا گھر ہے۔یہ ان کا مقر ہے اور اس کے سوا وہ اگر کہیں پائی جائیں تو وہ عارضی حالت ہوگی اور استثنائی صورت ہوگی۔اس پر وہ قائم و دائم نہیں رہیں گی۔یا بر محض ضرورت سے نکلنا ہوگا۔

بیت اور گھر عورت کا وہ مستقر اور جائے آرام ہے جو اللہ نے اس کے لیے ازروئے تخلیق و فطرت پسند فرمایا ہے۔ جس میں وہ اپنی فطرت سے منحرف نہیں رہتی' غلط کاریوں میں ملوث نہیں ہوتی اور جہاں وہ ان مشقت آمیز فرائض میں نہیں جتی ہوتی ازروئے فطرت اس کے لیے تیار نہیں کیے۔جہاں وہ اس کام میں لگی ہوتی ہے جس کے لیے دراصل اللہ نے اسے پیدا کیا ہے۔"اس لیے کہ اسلام گھر کے لیے ایک مخصوص فضا مہیا کر دے اور تاکہ بچوں کی پرورش اس فضا میں خوب سے خوب تر ہو سکے۔اللہ نے مرد پر بیوی کا نفقہ لازم کیا' اور اسے لازمی قرار دیا تاکہ ماں کو معاشی جدوجہد نہ کرنا پڑے اور اسے محنت و مزدوری میں وقت نہ لگانا پڑے' وہ پوری طرح مطمئن ہو کر بچوں کی تربیت کر سکے اور گھر کے نظام اور سجاوٹ اور خوشی کو دوبالا کر سکے۔وہ عورت جو محنت کر کے تھکی ہاری ہوئی ہوتی ہے' جسے اپنی ملازمت کے فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں اور جس کے اوقات اور مصروفیات بیرون خانہ ہوں اور اس کی قوتیں وہاں خرچ ہوتی ہوں' اس کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ گھر کو خوشیاں دے سکے۔اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ ناتواں بچوں کی پوری تربیت کر سکے۔جو عورتیں ملازمت کرتی ہیں' ان کے گھر' ہوٹل اور بیکریوں سے زیادہ کوئی مقام نہیں رکھتے۔ان کے اندر وہ کشش نہیں ہوتی جو گھر میں ہوتی ہے۔حقیقی گھر تو وہ ہوتا ہے جس کی تخلیق ایک گھریلو عورت کرتی ہے اور گھر کی کشش بھی وہی ہوتی ہے جس کا منبع ایک اچھی بیوی ہو۔گھر کی محبت کا سرچشمہ ماں ہوتی ہے۔وہ بیوی' وہ ماں یا وہ عورت جو اپنا وقت ملازمت میں گزارتی ہے وہ گھر کو تنگی اور حزن و ملال کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتی"۔(اسلام اور عالمی سلامتی)

"عورت کا گھر سے نکلنا کسی گھرانے کے لیے بہت ہی بڑا حادثہ ہوتا ہے اور کبھی کبھار اس کی حقیقی ضرورت بھی ہوتی

ہے لیکن اگر کسی کو ضرورت نہ ہو تو اس صورت میں یہ عقل و خرد کے لیے ایک لعنت ہے اور اس کا رواج ان زمانوں میں ہوا جن میں شر و فساد اور بے راہ روی اور گمراہی بڑھ گئی اور انسانیت نے ہزیمت اختیار کر لی" (ایضاً)

رہا عورت کا بغیر کسی ضرورت کے یا بغیر کسی ملازمت کے گھر سے نکلنا اور مرد و زن کا بازاروں اور گلیوں میں اختلاط اختیار کرنا تو یہ وہ ہزیمت ہے جس کے بعد انسانیت گندگی کے دلدل میں گر جاتی ہے اور انسان حیوان کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں عورتیں نماز کے لیے نکلتی تھیں اور اب بھی شرعاً اس کی ممانعت نہیں ہے۔ لیکن وہ ایک ایسا دور تھا جس میں لوگ عفت اور پاکیزگی کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ لوگوں کے اندر خدا خوفی تھی اور عورت نماز کے لیے پوری طرح لپٹ کر نکلتی تھی۔ یوں کہ لوگ اسے پہچان نہ سکیں اور اس وقت خواتین اپنے مقامات فتنہ ہرگز نہ ظاہر کرتی تھیں۔ اس کے باوجود حضرت عائشہؓ نے اس دور میں ان کا نکلنا ناپسند فرمایا۔

صحیحین میں روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا مومنین کی بیویاں حضورؐ کے ساتھ نماز صبح میں شریک ہوتی تھیں۔ پھر وہ اپنی چادروں میں لپٹی واپس ہوتی تھیں اور اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہ جاتی تھیں۔

اور صحیحین ہی میں ان کی روایت ہے کہ اگر حضورؐ وہ دور پاتے جس میں عورتوں نے نئی نئی باتیں ایجاد کر لی ہیں تو ان کو اسی طرح منع فرماتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کے دور میں عورتوں نے کیا نیا فیشن اختیار کر لیا تھا؟ اور وہ کیا تبدیلیاں تھیں کہ اگر حضورؐ دیکھتے تو عورتوں کو نماز سے منع کر دیتے۔ ذرا قیاس کرو کہ یہ خیر القرون تھا اور آج ہم کہاں کھڑے ہیں۔

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى (۳۳:۳۳) "اور سابق دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو"۔ یعنی جب کوئی تم میں سے باہر نکلنے پر مجبور ہو۔ اس سے قبل گھروں میں ٹک کر رہنے کا حکم دیا جا چکا ہے۔ جاہلیت کے دور میں عورتیں زیب و زینت کی نمائش کرتی تھیں لیکن روایات میں اس سج دھج کی جو صورتیں مروی ہیں وہ سب کی سب بہت سادہ اور سنجیدہ ہیں۔ آج کے دور میں عورتوں نے جو عریانی اختیار کر رکھی اس کا دور جاہلیت سے بھی کوئی موازنہ نہیں ہے۔

مجاہد کہتے ہیں "جاہلیت میں عورتیں نکلتی تھیں اور مردوں کے اندر پھرتی تھیں یہ تھا تبرج جاہلیہ"۔ قتادہ کہتے ہیں "یہ ناز و انداز سے چلتی تھیں' اس سے منع کیا گیا"۔ مقاتل ابن حیان کہتے ہیں "عورتیں سروں پر دوپٹہ ڈالتی تھیں' اور اسے یوں نہ لپیٹتی تھیں کہ وہ گردن کے زیورات کو ڈھانپ لے یا کانوں کے زیورات چھپالے۔ اس وقت گردن کا زیور اور کان کا زیور ظاہر ہوتے تھے"۔

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں "عورت مردوں میں اس طرح نکلتی کہ اس کا سینہ کھلا ہوتا' اور اس کے اوپر کچھ نہ ہوتا' بعض اوقات اس کی گردن اور بالوں کی مینڈھیاں ننگی ہوتیں اور کان کے بندے بھی ظاہر ہوتے۔ اللہ نے مومنات کو حکم دیا کہ وہ ان چیزوں کو ظاہر نہ کریں۔

یہ تھی جاہلیت کی سج دھج اور قرآن اس وقت کے برے آثار سے اسلامی معاشرے کو پاک کرنا چاہتا تھا کہ فتنے کے

تمام عوامل اسلامی معاشرے سے ناپید ہو جائیں اور اسلامی معاشرے کے آداب ،تصورات اور اس کا اجتماعی شعور اور ذوق بلند اور پاکیزہ ہو۔

ہم نے اسلامی معاشرے کی تطہیر میں "ذوق" کی تطہیر کو بھی شامل کیا ہے کیونکہ جسم انسانی کو ننگا دیکھنا ایک ایسا ذوق ہے' جو نہایت ہی غلیظ اور پسماندہ ذوق ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ذوق سنجیدہ اور مستقل اور منظم ذوق جمال کے مقابلے میں بد دیانہ ہے۔اس بد دیانہ ذوق میں روح 'عفت اور شعور کا ذوق مفقود ہوتا ہے۔

یہ کہ اسلامی معیار انسانی سطح کو بلند کرتا ہے اور انسان کو ترقی یافتہ بناتا ہے۔سنجیدگی اور وقار اپنی جگہ ایک خوبصورتی ہے۔یہ حقیقی حسن ہوتا ہے لیکن اس حقیقی حسن کے ادراک و شعور سے سطحی اور جاہلی ذوق محروم ہوتا ہے۔کیونکہ گرے ہوئے جاہلی ذوق کے مطابق حسن صرف گوشت و پوست میں ہوتا ہے اور جاہلی ذوق کا داعیہ یہی ذوق ہوتا ہے۔

قرآن کریم کی یہ آیات یہاں جاہلی بج دھج کی طرف اشارہ کر کے یہ بتاتی ہیں کہ یہ گری ہوئی جاہلیت کی باقیات ہیں اور جو لوگ جاہلیت کے دور کو لے کر کے آگے بڑھ گئے ہیں وہ اس معیار سے بلند ہو جاتے ہیں اور ان کا شعور اور ان کا ذوق جمال بھی جاہلیت کی سطح سے بلند ہوتا ہے۔

جاہلیت کسی متعین زمانے کا نام نہیں ہے۔زمانہ جاہل نہیں ہوتا'لوگ جاہل ہوتے ہیں۔جاہلیت ایک حالت کا نام ہے۔اس میں لوگوں کے خاص تصورات ہوتے ہیں اور یہ حالت ،یہ تصورات اور یہ رسم و رواج ہر زمان و مکان میں ہو سکتے ہیں۔

اس معیار کے مطابق ہم آج دور جاہلیت میں ہیں۔بالکل اندھی جاہلیت میں۔جس کا احساس غلیظ ہے'شعور غلیظ ہے جس کے تصورات حیوانی ہیں اور مقام انسانی سے فروتر گندگی میں لت پت مقام کو یہ شعور پسند کرتا ہے۔جس کے اندر کوئی طہارت 'پاکیزگی اور برکت نہیں ہوتی۔انسانیت اس میں ڈوبی ہوئی ہے اور وہ اس معیار کے مطابق تطہیر نہیں چاہتی جس کے مطابق اسلام انسانی معاشرے کو پاک کرنا چاہتا ہے۔اسے جاہلیت اولیٰ کے باقیات کو زائل کرنا چاہتا ہے اور یہ کام قرآن اور اسلام نے اہل بیت نبوی ؐ سے شروع کیا ہے تاکہ وہ عام مسلمانوں کے لیے طہارت' لطافت اور روشنی کا مینار ہو۔

قرآن کریم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو متوجہ کرتا ہے کہ وہ یہ اقدامات کریں۔ازواج مطہرات کے دلوں کو اللہ سے جوڑ دیں' اور ان کا نصب العین بلند افق پر متعین کر دیں۔نہایت روشن' نہایت پاکیزہ اور یوں وہ اس روشن مینار تک بتدریج بلند ہو جائیں۔

وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (۳۳:۳۳) "نماز قائم کرو' زکوۃ دو' اور اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرو"۔اللہ کی بندگی اجتماعی طرز اور اجتماعی اخلاق کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اللہ کی بندگی وہ راستہ ہے جس کے ذریعہ انسان اعلیٰ اور بلند اخلاق اور اجتماعی سطح تک بلند ہو سکتا ہے۔اللہ کی بندگی ہی سالک کے لیے زاد راہ ہے۔سالک کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کی بندگی کے لیے مدد لے۔لہذا اللہ سے تعلق کی ضرورت ہے جہاں سے انسان کو مدد ملے اور اللہ کے ساتھ ایسے تعلق کی ضرورت ہے جس سے دل صاف اور پاک ہوتا

رہے ـ اللہ کے ساتھ ایسے مضبوط رابطے کی ضرورت ہے جس کی وجہ سے انسان لوگوں کے متعارف طرزعمل سے اور موجودہ معاشرے کے رسم و رواج سے بالا ہو جائے ـ اس کے اندر یہ سوچ اور یہ شعور ہو کہ اللہ سے رابطہ لوگوں اور پورے معاشرے اور اپنے خاندان سے اعلیٰ و ارفع ہے ـ اس تعلق کی وجہ سے انسان میں یہ جذبہ پیدا ہو کہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی تعلق باللہ کی طرف دعوت دے ـ یہ نہ ہو کہ ایک شخص اسلام کی روشنی سے خبردار ہوتے ہوئے بھی دوسرے لوگوں کا پیروکار بن جائے اور وہ اس کی قیادت ظلمت اور تاریکی کی طرف کریں جو عموماً اللہ سے تعلق کٹ جانے کی وجہ سے ہر طرف چھا جاتی ہے ـ

اسلام ہی ہر قسم کے مراسم عبودیت ' ہر قسم کے اخلاق و آداب ' ہر قسم کے قوانین اور ہر قسم کے دستوری انتظامات کا حامل دین ہے ـ یہ تمام امور ایک نظریہ حیات کے فریم ورک کے اندر ہیں اور یہ تمام امور اس فریم ورک میں رہتے ہوئے اسلامی نظریہ حیات کے مقاصد پورے کرتے ہیں ـ یہ سب شعبے باہم توافق کے ساتھ ایک ہدف کی طرف بڑھتے ہیں اور اسی ہم آہنگی اور توافق سے دین اسلام کا مجموعی ڈھانچہ تیار ہوتا ہے ـ ان تمام عناصر کی موجودگی اور توافق کے بغیر یہ دین ہرگز قائم نہیں ہو سکتا ـ

یہی وجہ ہے کہ حکم دیا گیا کہ تم نماز کو قائم کرو ' زکوۃ دو ' اور اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے اندر تمام شعوری سمت ' تمام اخلاقی ہدایات ' ہر قسم کا طرزعمل ' خاندان اور اجتماعی معاملات میں رویہ سب کے سب سمٹ آتے ہیں ـ کیونکہ اسلام اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک کوئی ان کو قائم نہ کرے اور یہ مجموعی اطاعت شعاری ایک خاص مقصد کے لیے ہے ـ

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا

( ۳۳ : ۳۳ ) "اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبیؐ سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے"ـ

اس تعبیر میں کئی اشارات ' سب کے سب محبت ' شفقت ' وارفتگی اور نرمی سے بھرے ہوئے ہیں ـ ان سے کہا جاتا ہے کہ "تم اہل بیت نبی" ہو اہل بیت میں تصریح تو نہیں لیکن نبی کے گھر کی طرف اشارہ ہے ـ گویا دنیا میں یہی ایک عظیم گھرانا ہے اور یہ گھرانا اس صفت کا مستحق ہے ـ جب "البیت" کہہ دیا تو گویا مراد بیت النبیؐ ہے ـ یہی اشارات خانہ کعبہ کے بارے میں قرآن میں ہوتے ہیں ـ اسے بھی "البیت" "البیت الحرام" کہا جاتا ہے اور اسی معنی میں بیت نبی کو بھی البیت کہا گیا ـ گویا یہ عظیم گھرانا ہے ' یہی گھرانا ہے ـ

اور پھر یہ تعبیر کہ اے اہل بیت تم سے اللہ گندگی کو پوری طرح دور کر کے صاف کرنا چاہتا ہے یعنی نبی کے گھرانے کو پاک کرنے کا کام خود اللہ نے سنبھال لیا ہے ـ اللہ تعالیٰ اور کسی گھر کی تطہیر کے کام کی ذمہ داری خود لینا! گویا یہ اہل بیت نبی کا نہایت ہی بلند مرتبہ ہے ـ یہ وہ ذات کہہ رہی ہے جس نے پوری کائنات کو کن فیکون سے بنا دیا ـ اور وہ عزیز و جبار اور علی کل شیئ قدیر ہے اور وہ اس کام کو کرنا چاہتا ہے تو یہ اہل بیت کے لیے بڑا اعزاز بھی ہے ـ

یہ بات اللہ اپنی اس کتاب میں کہہ رہے ہیں جو آسمانوں پر پڑھی جاتی ہے ـ زمین پر پڑھی جاتی ہے ـ ہر دور اور ہر جگہ پڑھی جاتی ہے اور جس کی پیروی ہر دور میں کئی ملین لوگ کرتے چلے آئے ہیں اور جس کی تلاوت ہر وقت کئی ملین

لوگ کرتے ہیں۔

آخری بات یہ ہے کہ یہ اوامر اور یہ ہدایات یہاں تطہیر اور پاکی کا وسیلہ بتائے جا رہے ہیں اور ان کے زریعہ اس گھرانے کو پاک کرنا مقصود ہے۔ تطہیر تطہر سے ہے "گندگی تب دور ہوتی ہے جب کوئی ایسے وسائل اختیار کرے جس سے وہ دور ہو اور یہ کام لوگ خود کریں اور اپنی عملی زندگی کی تطہیر کریں۔ لوگوں کے اندر پاکیزگی کا شعور ہو اور وہ متقی ہوں' ان کا طرز عمل پاکیزہ ہو۔ وہ پوری طرح اسلام میں داخل ہو کر اپنی زندگی کا رخ اسلام کی طرف کر دیں اور اس کے اہداف اسلامی ہوں۔

اور یہ بحث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو مزید ہدایات پر ختم ہوتی ہے کہ ازواج مطہرات کو پھر یاد دلایا جاتا ہے کہ تمہارا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔ دوسری عورتوں سے تم ممتاز ہو۔ اس لیے کہ تم سرور کونین ؐ کے گھرانے کی فرد ہو۔ تمہارے گھروں کے اندر قرآن نازل ہو رہا ہے۔ جو حکمت و دانائی پر مشتمل ہے۔ گویا تمہارے گھر حکمت و دانائی کے مقامات نزول ہیں۔ نور ہدایت اور ایمان کی بارشیں وہاں ہو رہی ہیں۔

وَ اذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا

خَبِيْرًا (۳۳ : ۳۴) "یاد رکھو' اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جو تمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں بے شک اللہ لطیف اور باخبر ہے"۔ یہ وہ بلند مرتبہ ہے جس کا ان کو یاد دلانا ہی کافی ہے۔ ہر کوئی اس مرتبہ بلند کو محسوس کرتا ہے۔ یہ اللہ کا دیا ہوا بہت بڑا مقام ہے اور وہ انعام ہے جس ؓ کے برابر کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ نصیحت اس خطاب اور تقریر کے آخر میں دہرائی جاتی ہے جو ازواج مطہرات کے سامنے اس وقت کی گئی جب ان کو اختیار دیا جاتا تھا کہ تمہیں اختیار ہے کہ تم دنیا اور اس کی زوال پذیر آرائشوں کو پسند کرتی ہو یا اللہ اور رسول اللہ اور دار آخرت کو اختیار کرتی ہو۔ دکھایا جاتا ہے کہ غور کر لو' اللہ نے تمہیں بہت ہی بڑی نعمت دی ہے اور یہ پوری زندگی اس کے مقابلے میں کوئی چیز بھی نہیں ہے۔

--- ooo---

نبی کے گھرانے کے بعد اب اسلامی سوسائٹی کے اندر تطہیر کے اسباب بھی نہایت تفصیل اور باریکی کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں۔ اس میں مرد اور عورتیں دونوں برابر ہیں۔

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْقٰنِتِيْنَ

وَ الْقٰنِتٰتِ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ

وَ الْخٰشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ وَ الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآئِمِيْنَ

وَ الصّٰٓئِمٰتِ وَ الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا

وَّ الذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةً وَّ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۳۵﴾

"بالیقین جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں' مومن ہیں' مطیع فرمان ہیں' راست باز ہیں' صابر ہیں' اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں' صدقہ دینے والے ہیں' روزے رکھنے والے ہیں' اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں' اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں' اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے"۔

یہ تمام صفات جو اس آیت میں جمع کر دی گئی ہیں یہ نفس انسانی کی تربیت اور تشکیل میں بہت ہی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ صفات کیا ہیں' اسلام' ایمان' اطاعت امر' راست بازی' صبر' اللہ کے آگے جھکنا' صدقہ دینا' روزے رکھنا' اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنا اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنا۔ یہ تمام صفات ایسی ہیں کہ انسان کی شخصیت کی تعمیر اور کردار کی تشکیل میں بہت اہم ہیں۔ اسلام سرتسلیم ختم کر دینے کا نام ہے' ایمان کے معنی یقین اور تصدیق کے ہیں اور ان کے درمیان بہت گہرا تعلق ہے۔ ہر ایک دوسرے کے لیے ایک شکل ہے۔ اللہ کے سامنے سرتسلیم خم کر دینے کا مطلب انتہائی اور گہری تصدیق ہے۔ اور جہاں بھی تصدیق ہو وہاں سرتسلیم خم کرنا خود بخود پایا جاتا ہے۔

قنوت کے معنی اطاعت امر کے ہیں لیکن اس اطاعت کے پیچھے ایمان اور اسلام موجود ہو۔ یہ اطاعت اور اس کا داعیہ اندر سے ہو' محض جبریہ نہ ہو۔ خوشی سے ہو' اکراہ سے نہ ہو۔

صدق ایک مسلمان کی عمومی صفت ہے اور ایک عمومی لباس ہے' اور جو سچا نہ ہو وہ امت مسلمہ سے خارج تصور ہوتا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔

اِنَّمَا یَفْتَرِی الْکَذِبَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِآیَاتِ اللّٰهِ "جھوٹ وہی باندھتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے"۔ جھوٹا اسلامی صفوں سے نکال دیا جاتا ہے کیونکہ امت کی صف سچوں کی صف ہے۔

صبر وہ صفت ہے جس کے سوا ایک مسلم اور مومن اپنے فرائض سرانجام دے ہی نہیں سکتا۔ مومن ہر وقت صبر کا محتاج ہے' قدم قدم پر۔ نفسانی خواہشات پر صبر' دعوت اسلامی کی راہ میں مشکلات پیش آنے پر صبر۔ لوگوں کے اذیت دینے پر صبر۔ دلوں کی کمزوریوں' دلوں کے تلون اور کجی پر صبر' ابتلاء' امتحان اور مشکلات پر صبر' خوشی اور غم پر صبر۔ غرض ہر صورت میں صبر اور سنجیدگی ایک مشکل اور ضروری کام ہے۔

خشوع اور خشیت دلی اور ظاہری اعضا دونوں کی صفت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قلب اور اعضاء دونوں اللہ کی کبریائی' اللہ کی ہیبت اور عظمت کو محسوس کر رہے ہوں اور اللہ سے ڈرتے ہوں۔

روزہ کو بھی مومن کی صفت قرار دیا گیا ہے۔ اشارہ اس طرح ہے کہ روزہ رکھنا اور اس کا انتظام اور استقبال کرنا مومنین کی صفات میں سے ہے۔ روزہ کے ذریعہ خواہشات' ضروریات کی چاہت کو ایک محدود وقت کے لیے روکنا مطلوب ہوتا ہے اس میں صبر بھی شامل ہے۔ قوت ارادی کی پختگی بھی مطلوب ہے اور انسانی صفات کا حیوانی صفات پر غلبہ مطلوب ہے۔

حفظ فروج' شرم گاہوں کی حفاظت کرنا' اور اس طرح پاکیزگی اختیار کرنا' اور گہرے فطری میلانات پر قابو پائے رکھنا'

جو انسانی ذات کا حصہ ہوتے ہیں اور اس کے اندر گہرائی تک موجود ہوتے ہیں۔ یہ میلانات اس قدر قوی ہوتے ہیں کہ ان پر قابو وہی لوگ پا سکتے ہیں جن کو اللہ کی نصرت اور معاونت حاصل ہو۔ پھر اس کے ذریعہ سوسائٹی میں مرد و زن کے باہم تعلق کی تنظیم بھی مطلوب ہے۔ اور انسان کو اعلیٰ اور ارفع مقاصد کی طرف متوجہ کرنا مطلوب ہے۔ مرد اور عورتوں کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنے جنسی میلانات اور خواہشات کو شریعت کے تابع بنائیں۔ اس میں بہت بلند حکمت کارفرما ہے اور انسان اس ضابطہ کی پابندی سے اس زمین پر اپنے فرائض اچھی طرح ادا کر سکتا ہے۔

اللہ کا ذکر کثیر۔ یہ وہ صفت ہے جس سے انسان کی پوری زندگی مربوط ہو جاتی ہے۔ زندگی کے اعمال نظریہ حیات سے مربوط ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک انسان کا دل بروقت اس بات کا شعور رکھتا ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ اس نے اللہ کی رسی اور رابطہ مضبوطی سے پکڑا ہوتا ہے۔ اس کا کوئی خیال، کوئی تصور اور عمل اس رابطے سے باہر نہیں ہوتا۔ پھر اللہ کی یاد سے اس کا دل نور ربانی سے منور، پاک اور صاف ہوتا ہے۔ ایسے انسان کی پوری زندگی صاف ستھری اور روشن ہوتی ہے۔

جن لوگوں میں یہ صفات جمع ہو جائیں وہ مل کر ایک ایسی شخصیت بناتی ہیں جو ایک کامل شخصیت ہوتی ہے۔ اس دنیا میں بھی ممتاز اور آخرت میں۔

اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا (۳۳ : ۳۵) "اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے"۔ یوں ان آیات نے ایک مسلم اور مسلمہ کی شخصیت کے بنیادی عناصر یہاں گنوائے ہیں۔ یہ آیت ان ہدایات کے بعد آئی ہے جو اس سبق کے آغاز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئیں۔ یہاں مردوں کے ساتھ ساتھ خصوصاً عورتوں کا بھی ذکر کیا گیا تاکہ یہ بتایا جائے کہ بحیثیت مسلمان اور انسان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور معاشرے میں جو اسلامی حیثیت مرد کی ہے وہ عورت کی بھی ہے۔ اسلامی نظریہ حیات 'ایمان' عبادت' اخلاق اور زندگی کے ہر طرز عمل میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۹۱ ایک نظر میں

یہ سبق بھی اسلامی سوسائٹی اور اسلامی جماعت کے درمیان باہم روابط کو مضبوط کرنے کے لیے ہے ۔ یہ سبق دراصل اسلامی سوسائٹی سے رسم تبنیت کو ختم کرنے اور نئے اسلامی معاشرے میں روابط کو اپنے حقیقی اصولوں پر قائم کرنے کے لیے ہے ۔ اللہ نے اس رسم کو ختم کرنے کے لیے' اس کا عملی آغاز خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کرایا ۔ اہل عرب کے اندر یہ رواج تھا کہ جس طرح بیٹے کی مطلقہ حرام ہوتی ہے اسی طرح متبنیٰ (منہ بولے بیٹے) کی مطلقہ بھی اس شخص پر حرام سمجھی جاتی تھی ۔ اسلامی معاشرے میں متبنیٰ کی مطلقہ عورت کو حلال قرار دینے کے لیے کسی مثال اور نظیر کا پایا جانا ضروری تھا ۔ کسی مثال کے بغیر محض قانون بنانے سے یہ تبدیلی ممکن نہ تھی ۔ چنانچہ اللہ نے اس غرض کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب کیا اور یہ اس قدر عظیم بوجھ تھا جس طرح رسالت کا بوجھ ہوتا ہے ۔ اس واقعہ کا جو ردعمل ہوا اس نے ثابت کر دیا کہ رسول اللہ کے سوا کوئی اور شخص اس رسم کو نہیں توڑ سکتا تھا ۔ یہ رسم معاشرے میں بہت ہی گہری جڑیں رکھتی تھی اور آپ ؐ کے سوا کسی کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ ایسا انوکھا اور نامانوس کام کر سکے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس واقعہ کے بعد جو طویل تبصرہ آیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا تعلق خدا سے کیسا ہونا چاہئے ۔ آپس میں کس طرح ہونا چاہئے اور ان کے درمیان نبی کے فرائض کے حوالے سے ان کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے ۔ یہ سب اقدامات لوگوں کی آسانی کے لیے کیے گئے اور اس لیے کیے گئے کہ لوگ تسلیم ورضائے اللہ کے احکام کو دل کی خوشی کے ساتھ قبول کریں ۔

اس واقعہ کے بیان سے قبل یہ اصول بیان کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اللہ اور رسول اللہ ؐ کا حکم ماننا لازمی ہے ۔ اگر اللہ اور رسول اللہ ؐ کوئی فیصلہ کر دیں تو پھر مسلمانوں کو کسی بھی ایسے معاملے میں چوں چرا کرنے کا اختیار نہیں ہے ۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم عربوں کے اندر گہری جڑیں رکھتی تھی اور اسے آسانی سے ختم کرنا ممکن نہ تھا ۔ یہ ایک سخت رسم تھی ۔

--- OOO---

# درس نمبر ۱۹۱ تشریح آیات

## ۳۶ --- تا --- ۴۸

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا ۝

"کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا"۔

روایات میں آتا ہے کہ یہ آیت زینب بنت حجشؓ کے بارے میں اتری ہے۔ حضورؐ نے چاہا جماعت مسلمہ کے اندر جو طبقاتی فرق پایا جاتا ہے اسے پاش پاش کر دیا جائے اور لوگ اسی طرح برابر ہو جائیں جس طرح ایک کنگھی کے دندانے ہوتے ہیں۔ تقویٰ کے سوا کسی کو دوسروں پر فضیلت حاصل نہ ہو۔ اس دور میں آزاد کردہ غلاموں کو "موالی" کہتے ہیں۔ اور یہ لوگ عام لوگوں سے ذرا کم تر سمجھے جاتے تھے۔ رسول اللہؐ کے آزاد کردہ غلام زید ابن حارثہ ان میں سے ایک تھے۔ ان کو رسول اللہ نے متبنیٰ بنا دیا تھا۔ حضورؐ نے یہ مثال قائم کرنا چاہی کہ بنو ہاشم کی ایک شریف زادی کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا جائے جو حضورؐ کی قریبی بھی تھی یعنی زینب بنت حجشؓ کا نکاح زید سے کر دیا جائے' تاکہ یہ طبقاتی فرق ختم ہو جائے اور یہ کام وہ خود اپنے خاندان میں کر دیں۔ یہ بات یہاں نوٹ کرنا چاہئے کہ جس طرح متبنیٰ کی رسم پختہ اور شدید تھی اسی طرح معاشرے میں آزاد شدہ غلاموں کو بھی کم درجے کے لوگ سمجھا جاتا تھا۔ اس فرق کو بھی خود حضور اکرمؐ کے عملی قدم ہی سے ختم کیا جا سکتا تھا تاکہ جماعت اس کی تقلید کرے اور پوری انسانیت ایک ہی راہ پر گامزن ہو جائے۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے عوفی کی ایک روایت نقل کی ہے کہ زیر تفسیر آیت مَا كَانَ ۔۔۔۔۔ کی شان نزول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید ابن حارثہ کے لیے ایک دوشیزہ کے لیے پیغام دینا چاہا تو آپ زینب بنت حجش اسدیہ کے پاس گئے۔ آپ نے ان کو پیغام دیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں اس کے ساتھ نکاح نہیں کرنا چاہتی۔ حضورؐ نے فرمایا تم اس کے ساتھ نکاح کر لو۔ اس پر اس نے کہا کہ میں اس پر غور کروں گی۔ یہ بات ہو رہی تھی کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا (۳۳: ۳۶) تو اس پر زینب نے کہا رسول خدا! کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں کہ میرا نکاح اس کے ساتھ ہو؟ تو حضورؐ نے فرمایا ہاں میں نے تو یہ فیصلہ کر دیا ہے۔ تو اس پر اس نے کہا اچھا مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔ میں رسولؐ خدا کی نافرمانی نہیں کروں گی۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے نکاح میں دے دیا۔

ابن لھیعہ نے ابو عمرہ سے 'عکرمہ سے' ابن عباسؓ سے 'فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے زینب بنت جحش کا رشتہ زید ابن حارثہ کے لیے طلب کیا۔ اس نے اسے پسند نہ کیا اور کہا میں اس سے حسب ونسب میں برتر ہوں' یہ ایک سخت مزاج عورت تھی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ (۳۳: ۳۶) یہی تفسیر مجاہد' قتادہ' مقاتل ابن حیان نے کی ہے کہ یہ آیت زینب بنت جحش کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس وقت نازل ہوئی جب حضورؐ نے ان کا رشتہ زید ابن حارثہ کے لیے طلب فرمایا۔ پہلے اس نے انکار کیا اور پھر قبول کر لیا۔

ابن کثیر نے تفسیر میں ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے کہ عبدالرحمن ابن زید ابن اسلم کا کہنا یہ ہے کہ یہ آیت ام کلثوم بنت عقبہ ابن ابو معیط کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ صلح حدیبیہ کے بعد پہلی عورت تھی جو ہجرت کر کے آگئی تھی۔ اس نے اپنا نفس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بخش دیا تھا۔ تو حضورؐ نے فرمایا اچھا میں نے قبول کر لیا۔ حضورؐ نے اسے زید ابن حارثہ کے نکاح میں دے دیا [شاید زینب کے فراق کے بعد] اس پر یہ عورت اور اس کا بھائی ناراض ہوگئے۔ انہوں نے کہا ہم نے تو حضور اکرمؐ کو بخشا تھا' انہوں نے اپنے غلام کو بخش دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا (۳۳: ۳۶) وہ کہتے ہیں' قرآن میں اس سے بھی زیادہ جامع حکم آیا ہے۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (۳۳: ۶) "نبی تمام مومنین کے لیے ان کی جانوں سے بھی زیادہ عزیز ہیں"۔ انہوں نے کہا کہ پہلی آیت خاص ہے اور یہ جامع ہے۔

امام احمد نے ایک تیسری روایت بھی نقل کی ہے۔ عبدالرزاق سے' معمر سے' ثابت بنانی سے' حضرت انسؓ سے حضورؐ نے انصاریوں کی ایک عورت کے بارے میں جلیبیب کے لیے اس عورت کے والد کو پیغام بھیجا تو اس شخص نے کہا کہ میں اس کی ماں سے مشورہ کرتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا' اچھا مشورہ کر لیں۔ یہ شخص بیوی کے پاس گیا اور اس نے اس کا تذکرہ کیا تو عورت نے کہا خدا کی قسم حضور اکرمؐ کو جلیبیب کے علاوہ کوئی نہیں ملا۔ اور ہم نے تو فلاں فلاں کا پیغام رد کیا ہے۔ یہ لڑکی پردے میں سن رہی تھی۔ یہ شخص حضورؐ کی طرف نکلنے لگا کہ حضورؐ کے سامنے انکار کر دے۔ تو اس لڑکی نے کہا کیا تم لوگ رسول اللہؐ کے حکم کو رد کر رہے ہو۔ اگر حضورؐ تمہارے لیے اس بات کو پسند کرتے ہیں تو منظور کر لو۔ گویا اس نے اپنے والدین سے برتر رویہ اختیار کیا۔ دونوں نے کہا یہ ٹھیک کہتی ہے تو یہ شخص حضورؐ کے پاس گیا کہ اگر آپ راضی ہیں تو ہم راضی ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا میں تو راضی ہوں۔ کہتے ہیں اس نے لڑکی جلیبیب کو نکاح کر کے دے

یہ ایک آزاد کردہ غلام تھا۔

ہم نے یہاں تیسری روایت کو بھی نقل کر دیا ہے جس کا تعلق جلیبیب سے تھا۔ کیونکہ اس کا تعلق ایک ایسی مہم سے ہے جس کے ذریعے حضور اکرمؐ خاندانی روایات کی ذہنیت کو توڑنا چاہتے تھے کیونکہ اسلام معاشرتی مساوات قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی سوسائٹی کو جدید تصورات پر استوار کیا جائے۔ اس کرۂ ارض کی زندگی کے لیے اسلام نے جو قدریں وضع کیں ان کے مطابق اسلام نے لوگوں کے فضول روایاتی بندھنوں سے آزاد کرنے کا جو بیڑا اٹھایا تھا اس مہم کا تعلق اس روح سے تھا۔

بہر حال آیت کی عبارت کسی مخصوص واقعہ سے عام ہے۔ اس کا تعلق رسم تبنی کے مٹانے سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ متبنیٰ کی مطلقہ کے ساتھ نکاح جائز ہے اور اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے زینب سے نکاح کر لیا جبکہ زید نے اسے طلاق دے دی۔ اس پر مدینہ میں ایک غلغلہ بلند ہو گیا اور آج بھی بعض دشمنان اسلام اس کو بنیاد بنا کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تنقید کرتے ہیں۔ اسی واقعہ کے اوپر افسانوں کی قسمیں چڑھاتے ہیں۔ چاہے سبب نزول وہ ہو جو ان روایات میں آیا ہے یا زینب بنت جحش کے ساتھ آپ کا نکاح ہو۔ لیکن یہ اصول بہت عام ہے کہ اللہ و رسول جو فیصلہ کر دیں اس کے بعد مسلمانوں کو اس موضوع پر کوئی اختیار نہیں رہتا۔

غرض اسلامی نظریہ حیات کے بنیادی عناصر میں سے یہ عنصر ایسا تھا جو پہلی جماعت مسلمہ کے دلوں میں پوری طرح بیٹھ گیا تھا۔ ان کے دلوں میں اس کا یقین آ گیا تھا' اور ان کا شعور اس میں ڈوب گیا تھا۔ یہ عنصر کیا تھا' یہ کہ ان کے اختیار میں' اسلام لانے کے بعد' اب کچھ بھی نہیں رہا۔ وہ بذات خود' ان کی تمام مملوکات' اور ان کے جذبات سب کے سب اللہ کے اختیار میں ہیں' وہ جس طرح چاہے' ان کو پھیر دے اور یہ کہ ان کی حیثیت وہی ہے جس طرح اس کائنات کی ہے۔ وہ اس کا حصہ ہیں اور اللہ اسے جس طرح چاہتا ہے' چلاتا ہے۔ جس طرح اللہ اس کائنات کی دوسری چیزوں کو چلاتا ہے اور اس اس عظیم وجود کے چلانے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جو فرائض مقرر کر دیئے ہیں وہ ان کے مطیع ہیں۔ ان کے لیے اس عظیم اسٹیج پر جو کردار متعین کر دیا گیا ہے وہ اسے پورا پورا ادا کریں گے۔ ان کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے خود کوئی کردار متعین کریں۔ کیونکہ جو قصہ انہوں نے پیش کرنا ہے وہ خود اس سے زیادہ خبردار نہیں ہیں۔ نیز وہ اپنے لیے کوئی حرکت یا کردار خود پسند نہیں کرتے۔ اس طرح کسی بھی کھیل کا پورا کھیل بگڑ جاتا ہے۔ وہ اس کھیل کے ڈائریکٹر نہیں ہیں۔ یہ تو کردار ہیں اور ڈائریکٹر کے مطیع فرمان ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے کردار کا معاوضہ طے شدہ ہے۔ یہ اپنا کردار ادا کریں اور معاوضہ باقی' ان کو کوئی چوں و چرا کا اختیار نہیں ہے۔

انہوں نے اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ اسلامی نظام کے تمام اجزاء کو قبول کر لیا ہے۔ اس لیے معاہدے کے بعد اب ان کے پاس ان کے اختیار میں کوئی چیز باقی نہیں ہے اور جس طرح یہ کائنات حکم الٰہی سے چل رہی ہے یہ شریعت الٰہیہ کے مطابق چلیں۔ اپنی تمام حرکات میں اپنا متعین کردار ادا کریں اور اپنے مدار میں اس طرح چلیں جس طرح کرات اپنے اپنے مدارات میں چلتے ہیں' نہ ادھر نہ ادھر' نہ آگے نہ پیچھے۔ تمام دوسرے کرات کے توازن کے ساتھ۔

ان لوگوں نے سر تسلیم خم کر دیا' ان سب حادثات کے لیے جو تقدیر الٰہی نے ان کے لیے مقدر کر دیئے ہیں۔ ان کا اندرونی شعور اس بات کو تسلیم کر چکا ہے کہ جو کچھ پیش آتا ہے اللہ کے حکم سے پیش آتا ہے۔ ایک شخص کے لئے ہر

حادثہ ' ہر حالت اللہ کی آورد ہے اور وہ مانتے ہوئے خوشی خوشی سے ' نہایت اطمینان سے اللہ کی تقدیر کو قبول کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ ان کی حالت یہ ہو گئی کہ وہ اللہ کے فیصلوں کو نہ سمجھتے تھے۔ جب ان پر نازل ہو جاتے۔ نہ وہ ظاہر داری کرتے ہوئے جزع و فزع سے اپنے آپ کو بچاتے تھے یا وہ کوئی تکلیف محسوس کرتے تھے مگر صبر و مصابرت سے کام لے کر خاموش ہو جاتے تھے بلکہ ان کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ اللہ کے فیصلوں کا استقبال کرتے تھے جیسے وہ پہلے سے خبردار ہوں اور ان کے انتظار میں ہوں۔ جو فیصلہ آ رہا ہے وہ ان کے حس و شعور میں ہے۔ ان کو معلوم ہے اور ان کے ضمیر کی آواز ہے۔ کوئی اچنبھا کوئی انوکھا پن اور کوئی بدک ان کے اندر نہ پید ہوتی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ وہ یہ نہ چاہتے کہ آسمانوں کی رفتار ذرا تیز ہو جائے اور وہ کام جلدی سے ہو جائیں جو وہ چاہتے تھے۔ اور وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ کچھ واقعات جلدی وقوع پذیر ہوں تاکہ ان کی بعض ضروریات پوری ہو جائیں۔ وہ اپنے طریقے کے مطابق تقدیر الہی کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ اور یہ تقدیر الہی جہاں ان کو پہنچا دیتی تھی وہ اس پر راضی ہو جاتے تھے ' خوش ہوتے تھے۔ ان کے پاس جو کچھ تھا ' وہ اس راہ میں خرچ کر رہے تھے۔ جان تک قربان کر دیتے تھے ' مال خرچ کر دیتے تھے ' نہ جلدی کرتے ' نہ تنگی محسوس کرتے ' نہ غرور کرتے اور نہ حسرت کرتے۔ ان کو پوری طرح یقین تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے ' یہ اللہ کا فیصلہ ہے ' جو اللہ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور ہر کام کے لیے ایک وقت متعین ہے اور ریکارڈ شدہ میعاد ہے۔

ان کے قدم پوری طرح اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اٹھتے تھے۔ ان کی حرکات اللہ کی ڈائریکشن کے مطابق تھیں۔ وہ امن ' بھروسے اور یقین کا پورا شعور رکھتے تھے۔ وہ نہایت سادگی ' نرمی اور آسانی سے تقدیر کے ساتھ چلتے تھے۔

اس تسلیم و رضا کا یہ اثر نہ تھا کہ وہ عمل نہ کریں یا ان کے پاس جو کچھ تھا ' اسے سب کا سب لٹا دیں ' یا وقت اور جدوجہد میں عقیدہ تقدیر کی وجہ سے کوئی کمی کریں۔ وہ اسباب سے قطع نظر نہ کرتے تھے۔ وہ ایسی باتیں اپنے اوپر نہ لیتے تھے جن کی ان کے اندر قدرت نہ ہو۔ مالا یطاق ہوں۔ وہ بشریت اور اس کے حدود و قیود سے بھی نہ نکلتے تھے۔ ضعیف بھی تھے ' قوی بھی تھے۔ وہ ان باتوں کا دعویٰ نہ کرتے تھے جو ان میں نہ تھیں ' وہ اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ ایک کام انہوں نے نہ کیا ہو اور اس پر ان کی تعریف کی جائے ' نہ وہ ایسی باتوں کا دعویٰ کرتے تھے جو انہوں نے کی نہ ہوں۔

اللہ کی تقدیر کے سامنے مطلقاً سر تسلیم خم کر دیتے اور پھر عملاً جدوجہد کرتے جہاں ان کی طاقت ہو۔ ہر کام کے درمیان انہوں نے ایک حسین توازن قائم کر دیا تھا اور جو بات ان کی استطاعت میں تھی ' وہ کرتے تھے۔ جماعت اول کے کردار میں یہ توازن نہایت مکمل تھا۔ اور یہ توازن ان کا خصوصی امتیاز تھا۔ یہی توازن تھا جس کی وجہ سے وہ اس عظیم امانت کے اٹھانے کے لائق ہوئے ' جس کے اٹھانے سے پہاڑوں نے بھی انکار کر دیا تھا۔

اسلام کی جماعت اول نے اپنی زندگی میں ان معجزات کو دکھایا اور حقیقت بنا دیا۔ یہ اس توازن کے مرہون منت تھے۔ اس وقت کے انسانی معاشرے ہی میں یہ معجزات رونما ہوئے۔ یہ معجزات کہ اس جماعت کی حرکات اور اعمال کس طرح متوازن تھے کہ یہ جماعت افلاک کی طرح منظم تھی اور مربوطی کے ساتھ حرکت پذیر تھی۔ ان کے اقدامات اور اعمال اسی طرح تھے جس طرح زمانے کی گردش مربوط ہے۔ یہ لوگ فطرت کے ساتھ متصادم نہ تھے اور نہ الجھتے تھے کہ

گردش زمانہ ان کو الجھاتی بلکہ وہ نظام قضا و قدر جس کا ایک حصہ گردش زمانی ہے' اس کے ساتھ چلتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایک نہایت ہی مختصر عرصے میں وہ نتائج پیدا کر دیئے جو تاریخ پیدا نہ کر سکی۔

یہ انقلاب یوں برپا ہوا کہ وہ اپنے عمل میں اس پوری کائنات کی حرکت کے ساتھ چلتے تھے۔ اللہ کی تقدیر کے مطابق قدم اٹھاتے تھے۔ یہی انقلاب تھا جس نے معجزات صادر کیے۔ یہ معجزات اس ذات نے پیدا کیے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ جس نے کواکب و افلاک کو پیدا کیا اور جس نے پہلی جماعت کو اس طرح راضی برضائے تقدیر الٰہی کیا جس طرح افلاک تقدیر العزیز العلیم سے سرمو انحراف نہیں کر سکتے۔

یہ وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم کی بیشتر آیات اشارہ کر رہی ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ "تم ہدایت نہیں دے سکتے جن کو محبوب سمجھو بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے' ہدایت دیتا ہے"۔ اور دوسری جگہ ہے :

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰاهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ "تم پر ان کی ہدایت کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے' ہدایت دیتا ہے"۔ دوسری جگہ

اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ "ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے"۔ یہ ہے ہدایت اپنی عظیم حقیقت کے حوالے سے اور اپنے وسیع مفہوم میں۔ یعنی یہ راہنمائی کہ اس عظیم کائنات میں انسان کا مقام کیا ہے اور یہ کہ اس کی حرکت' حرکت کائنات سے ہم آہنگ ہو جائے۔

انسانی جدوجہد اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتی جب تک انسان کا دل اس مفہوم میں ہدایت یافتہ نہ ہو۔ ایک فرد کی جدوجہد اس کائنات کی حرکت کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو۔ اور جب تک انسانی شعور و ضمیر تقدیر الٰہی پر راضی نہ ہو' بایں مفہوم کہ یہاں جو واقعہ ہوتا ہے' وہ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی یہ آیت

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (۳۳ : ۳۶) "کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسولؐ کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے"۔ کسی مخصوص واقعہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ یہ زیادہ عام' شامل اور کامل اصول ہے اور دور رس نتائج کا حامل ہے۔ یہ اسلامی نظام کا ایک بنیادی دستوری اصول ہے۔

--- ooo---

اس کے بعد زینب بنت جحش کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ آتا ہے۔

وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَ
اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ
اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى
الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْۤ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَ كَانَ اَمْرُ
اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۳۷﴾ مَا كَانَ عَلَى النَّبِیِّ مِنْ حَرَجٍ فِیْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ
فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ﴿۳۸﴾ الَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ
رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ یَخْشَوْنَهٗ وَ لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِیْبًا ﴿۳۹﴾
مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ؕ وَ
٥ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ﴿۴۰﴾
ع ٦
٢

”اے نبی“ یاد کرو وہ موقع جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا کہ ”اپنی بیوی کو نہ چھوڑو اور اللہ سے ڈرو“۔ اس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا، تم لوگوں سے ڈر رہے تھے حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ پھر جب زید اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس (مطلقہ خاتون) کا تم سے نکاح کر دیا تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ رہے جبکہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہیے تھا۔ نبی پر کسی ایسے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہو۔ یہی اللہ کی سنت ان سب انبیاء کے معاملہ میں رہی ہے جو پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ کا حکم ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے۔ (یہ اللہ کی سنت ہے ان لوگوں کے لیے) جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور ایک خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور محاسبہ کے لیے بس اللہ ہی کافی ہے۔ (لوگو) محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے“۔

اس سورہ کے آغاز ہی میں متبنیٰ بنانے کی رسم کو ختم کر دیا گیا تھا اور یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ ایسے لوگوں کو اب ان کے حقیقی آباء کی طرف منسوب کر دیا جائے اور عائلی تعلقات حقیقی نسب پر قائم ہوں گے، کہا گیا تھا۔

وَ مَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَ اللّٰهُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَ

هُوَ یَهْدِی السَّبِیْلَ (۳۳:۴) اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَ هُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ وَمَوَالِیْكُمْ وَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ فِیْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (۳۳:۵) "نہ اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنایا ہے۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو۔ مگر اللہ وہ بات کہتا ہے جو مبنی بر حقیقت ہے اور وہی صحیح طریقے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے۔ اور اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں۔ نادانستہ جو بات تم کہو' اس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں ہے لیکن اس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا دل سے ارادہ کرو۔ اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے"۔

عربی سوسائٹی میں منہ بولے بیٹوں کے پختہ رسم و رواج تھے اور گہرے آثار تھے۔ ان آثار کو مٹانا اس قدر آسان نہ تھا جس قدر نفس متبنی کو مٹانا آسان تھا۔ اس لیے کہ اجتماعی رسم و رواج دلوں پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ اس لیے اس قسم کی رسومات کو مٹانے کے لیے ان کے بالمقابل سخت اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ بالعموم پہلے پہل جو اقدامات کیے جاتے ہیں ان کے خلاف شور و غل بھی ہوتا ہے اور ابتدا میں اس کے اثرات بھی نفوس پر پڑتے ہیں۔

اس سے قبل یہ بات آگئی ہے کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زید ابن حارثہ کی شادی کرائی تھی۔ یہ آپ کے متبنی تھے اور ان کو زید ابن محمد کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد زید ابن حارثہ کہلانے لگا۔ یہ شادی زینب بنت جحش سے کرائی گئی تھی جو آپ کی پھوپھی زاد تھیں' مقصد یہ تھا کہ غلاموں کو عرب سوسائٹی میں جو دوسرے درجے کا انسان سمجھا جاتا تھا' اسے دور کر دیا جائے اور اللہ تعالیٰ نے شرافت و کرامت کا جو اصول مقرر فرمایا ہے اسے بروئے کار لایا جائے۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ "تمہارے اندر زیادہ شریف وہی ہے' جو زیادہ متقی ہے"۔ اور یہ مثال عملاً قائم کی جائے جو فی الواقعہ مثال ہو۔

اس کے بعد مشیت الٰہیہ کا تقاضا یوں ہوا کہ رسالت کی ذمہ داریوں میں اس ذمہ داری کا اضافہ کر دیا جائے کہ متبنی کی مطلقہ کے ساتھ نکاح کی مثال بھی حضورؐ خود قائم کریں تاکہ متبنی کی رسم کے جو گہرے آثار تھے' وہ بھی مٹ جائیں اور حضورؐ یہ نمونہ معاشرے کے سامنے پیش کریں۔ ان حالات میں کہ کسی اور کی ہمت اس کام کے لیے نہ ہو سکتی تھی اگرچہ رسم متبنی قانوناً اور شرعاً اس سے قبل ختم ہو گئی تھی۔

اللہ نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتا دیا کہ زید عنقریب اپنی بیوی کو طلاق دے دیں گے اور آپ کو یہ نکاح کرنا ہو گا۔ یہ تقاضائے حکمت الٰہیہ ہے۔ اس دوران زید اور زینب کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے اور آثار بتا رہے تھے کہ یہ نکاح قائم نہیں رہ سکتا۔

حضرت زید بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شکایت کر رہے تھے کہ ان کی زندگی زینب کے ساتھ بہت مضطرب ہے اور یہ کہ وہ مزید ان کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑی بے باکی سے اسلامی نظریہ حیات کی تبلیغ فرماتے تھے اور اس سلسلے میں کسی کی پرواہ نہ فرماتے تھے لیکن زینب کے ساتھ نکاح کرنے کے معاملے میں آپ بھی متامل تھے۔ اس سلسلے میں آپ بھی عوام کا سامنا کرنے سے گھبراتے تھے اور آپ ہمیشہ زید سے کہتے 'جن پر اللہ کا انعام ہوا تھا کہ وہ مسلمان ہوئے اور پھر رسول اللہؐ کے قریب ہوئے اور رسول اللہؐ آپ سے محبت فرماتے تھے اور یہ محبت ایسی تھی کہ بلا استثناء سب سے زیادہ تھی۔ پھر رسول اللہ نے ان پر یہ مہربانی کی کہ انہیں آزاد کر دیا۔ ان کی تربیت کی اور ان سے بہت پیار کرتے۔ حضرت زید سے رسول اللہؐ یہی کہتے۔

اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ (۳۳: ۳۷) "کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑو اور اللہ سے ڈرو"۔ اور دراصل حضور اکرمؐ اس طرح اس عظیم معاملے کو موخر کرنا چاہتے تھے جس کے وقوع کے بعد آپ کو عوام کا سامنا کرنے میں تردد تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تصریح فرمائی۔

وَ تُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ (۳۳:

۳۷) "اس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا۔ تم لوگوں سے ڈر رہے تھے حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو"۔ اور حضورؐ اپنے دل میں یہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کا اللہ نے آپ کو یہ سبب بتا دیا تھا کہ اگر حضرت زید ان کو طلاق دیں گے تو آپ کو نکاح کرنا ہو گا۔ یہ معاملہ صریح حکم نہ تھا' ورنہ حضورؐ اس میں تردد نہ فرماتے 'نہ موخر کرتے اور نہ یہ کوشش کرتے کہ کسی طرح ٹل جائے اور حضورؐ اس وقت اس کا اعلان کر دیتے۔ نتائج جو بھی ہوتے' البتہ حضورؐ کے دل میں بطور الہام یہ بات ڈال دی گئی تھی اور حضورؐ اس وقت پریشان تھے کہ لوگ غوغا آرائی کریں گے یہاں تک کہ خدا کے حکم سے زید نے طلاق دے دی اور یہ تصور نہ زید کا تھا اور نہ زینب کا کہ اس کے بعد حضورؐ سے نکاح ہو گا کیوں کہ عربوں میں یہ قانونی رواج تھا کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ کے ساتھ نکاح جائز نہ تھا۔ یہاں تک کہ متبنیٰ بنانے کے قانون اور رواج کو ختم کر دینے کے بعد بھی لوگ مطلقہ متبنیٰ کو حرام سمجھتے تھے اور ابھی ان کے حلال ہونے کا حکم بھی نہ آیا تھا۔ صرف اس واقعہ سے یہ رسم ختم ہوئی لیکن یہ واقعہ بہرحال اس سوسائٹی میں ایک دھماکہ اور ایک انوکھی اور نئی بات تھی۔

اس تفسیر سے وہ تمام روایات ختم ہو جاتی ہیں جن پر اعتماد کر کے دشمنان اسلام نے قدیم دور میں بھی اور جدید دور مین بھی افسانے تصنیف کیے ہیں اور حاشیہ آرائیاں کی ہیں۔ معاملہ بس اس قدر تھا۔

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ

اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا (۳۳: ۳۷) "پھر جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے اس کا تم سے نکاح کر دیا تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں کوئی تنگی

رہے جب کہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں"۔ اور یہ واقعہ رسالت کی ان بھاری ذمہ داریوں میں سے ایک تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اٹھایا۔ یوں آپ نے ایک ایسے معاملے میں جاہلی معاشرے کی ایک رسم مٹانے میں نمونہ پیش کیا جسے ایام جاہلیت میں ایک مکروہ فعل سمجھا جاتا تھا۔ یہ فعل اس قدر مکروہ سمجھا جاتا تھا کہ حضور اکرمؐ نے اسلامی نظریہ حیات کے حوالے سے بڑی بڑی باتوں میں تامل نہ فرمایا تھا مگر اس میں متردد تھے۔ مثلاً عربوں کے خود ساختہ الہٰوں کی مذمت آپ نے بے دھڑک فرمائی اور یہ آپ نے برملا اعلان فرمایا کہ ہمارے آباء و اجداد غلطی پر تھے۔

وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا (۳۳: ۳۷) "اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہئے تھا"۔ حضرت زینب سے حضور اکرم کا نکاح عدت پوری ہونے کے بعد طے ہوا تھا"۔ یعنی اسے رد نہ کیا جا سکتا تھا اور نہ اس سے کوئی مفر تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی اور اٹل حقیقت تھی اور اس سے کوئی پہلوتہی نہ کر سکتا تھا۔

آپ کا نکاح زینب سے عدت گزر جانے کے بعد ہوا اور حضورؐ نے ان کو انہیں حضرت زید کے ذریعہ پیغام بھیجا تھا۔ یہ زید حضورؐ کو بہت ہی محبوب تھے۔ یہ گئے اور انہوں نے حضورؐ کا پیغام ان کو دیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے 'فرماتے ہیں کہ جب زینب کی عدت ختم ہو گئی تو حضورؐ نے زید ابن حارثہ سے کہا "آپ جائیں اور زینب کو میرے لیے پیغام دیں"۔ زید گئے 'اس وقت وہ آٹے میں خمیر ڈال رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ جب میں نے اسے دیکھا تو میرا ان کے ساتھ سامنا کرنا مشکل ہو گیا۔ میں ان کو دیکھ نہ سکا اور نہ کہہ سکا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا تذکرہ کیا ہے۔ میں نے ان کی طرف اپنی پیٹھ پھیری اور واپس جاتے ہوئے یہ کہا "اے زینب تمہارے لیے خوشخبری ہے 'حضورؐ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ میں ان کا پیغام آپ تک پہنچا دوں"۔ اس نے کہا "میں کوئی بات اس وقت تک کرنے والی نہیں ہوں جب تک میں اپنے رب کے ساتھ اس معاملے میں مشورہ نہ کر لوں۔ وہ اٹھی اور اپنی جائے نماز پر نماز پڑھنے لگی"۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور رسول اللہؐ اس کے بعد اس سے اجازت لینے کے بغیر اس کے پاس آگئے۔ (روایت احمد 'مسلم اور نسائی بطریقہ سلیمان ابن مغیرہ)۔

بخاری شریف میں حضرت انس کی روایت ہے کہ حضرت زینب دوسری ازواج مطہرات پر یہ فخر کرتی تھی کہ تمہارا نکاح تمہارے رشتہ داروں نے کیا ہے اور میرا نکاح اللہ نے سات آسمانوں کے اوپر کیا ہے۔

یہ معاملہ اسی طرح آسانی سے طے نہ پا گیا بلکہ اسلامی سوسائٹی میں اس کی وجہ سے ایک بھونچال آگیا اور منافقین کو ایک مسئلہ مل گیا کہ حضورؐ نے اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے۔ چونکہ یہ معاملہ اسلامی معاشرے میں قانونی اصلاحات سے متعلق تھا اور اسلامی معاشرے کے لیے ایک نیا اصول طے کرنا تھا۔ اس لیے اللہ نے اس کی تاکید مزید کر دی اور پھر اس میں لوگوں کے نزدیک جو انوکھا پن تھا اسے یوں زائل کیا اور معاملات کو اپنی اصل حقیقت کی طرف لوٹا دیا۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ (۳۳: ۳۸) "نبی پر کسی ایسے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہو"۔ اللہ نے نبی پر فرض کر دیا تھا کہ زینب کے ساتھ اس کا نکاح ہو تاکہ یہ جاہلی رسم ٹوٹے کہ کسی کا نکاح ان کے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نہیں ہو سکتا جبکہ اس نے اسے طلاق دے دی ہو یا مر گیا ہو 'اور یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی پہلے رسول نہیں ہیں۔ اس سے پہلے بھی رسولوں کے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ (۳۳: ۳۸) "یہی اللہ کی سنت ان سب انبیاء کے معاملے میں رہی ہے جو پہلے گزر چکے ہیں" ـ تو یہ معاملہ سنت الٰہیہ کے مطابق جا رہا ہے اور اس میں کوئی تغیر اور تبدل نہیں ہوتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان رسوم اور رواجات کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکتا رہا ہے جو معاشرے میں رائج رہی ہیں اور جن کی کوئی حقیقت و افادیت نہ تھی ـ

وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَقْدُورًا (۳۳: ۳۸) "اور اللہ کا حکم قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے"۔ اللہ کا حکم نافذ ہوتا ہے اور اسے نافذ کیا جانا ہی چاہئے ـ اس کے سامنے کوئی بھی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی اور نہ بننا چاہئے ـ اللہ تعالیٰ تمام امور کو نہایت مہارت سے طے کرتا ہے' نہایت حکمت سے طے کرتا ہے اور اس کی تہہ میں وہ مقاصد ہوتے ہیں جو اللہ کے پیش نظر ہوتے ہیں ـ اللہ ہی ان احکام کی ضرورت اور کسی زمان و مکان میں ان کی اہمیت کو جانتا ہے اور اللہ نے رسول اللہ کو حکم دے دیا ہے کہ وہ اس عادت کو محو کر دیں' اس کے عملی آثار کا بھی قلع قمع کر دیں اور یہ کام وہ بنفس خود کریں ـ اللہ کے حکم کے نفاذ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جا سکتی اور اللہ کے رسولوں کی یہ سنت رہی ہے ـ تمام گزرے ہوئے رسولوں کی :

الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللّٰهَ (۳۳: ۳۹)

"جو لوگ اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور ایک خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے"۔ ایسے لوگوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے نظام کو عملاً قائم کرتے ہیں اور لوگوں کی باتوں سے نہیں ڈرتے ـ اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں ـ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے ـ وہ اللہ کے احکام پہنچاتے ہیں اور نافذ کرتے ہیں ـ

وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيبًا (۳۳: ۳۹) "اور محاسبہ کے لیے اللہ ہی کافی ہے"۔ حساب و کتاب نیک و بد کا اللہ ہی لے گا اور لوگوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے نبی کا محاسبہ کریں ـ

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ (۳۳: ٤٠) "محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں"۔ لہٰذا زینب محمد کے کسی بیٹے کی مطلقہ نہیں ہے ـ زید ابن محمد دراصل زید ابن حارثہ ہیں ـ لہٰذا اس میں کوئی الجھنے کی بات نہیں ہے اگر حقیقت پسندانہ نظروں سے دیکھا جائے ـ حضرت محمدؐ اور تمام لوگوں کا آپس میں تعلق نبی اور قوم کا تعلق ہے وہ ان میں سے کسی کا باپ نہیں ہے ـ

وَلٰكِنْ رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ (۳۳: ٤٠) "وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں"۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ قانون بناتے ہیں ـ اور یہ دائمی اور آخری شریعت ہے اور یہ قیامت تک رہنی ہے ـ اس کے بعد ان قوانین میں کوئی تغیر و تبدل ہونے والا نہیں ہے ـ

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا (۳۳: ٤٠) "اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے"۔ اللہ ہی جانتا ہے

کہ انسانیت کے لیے کون سا قانون مفید ہے ۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے نبی پر یہ کام کرنا فرض کیا اور اس کے لیے یہ آسائش مقرر کی تاکہ لوگوں کے لیے منہ بولے بیٹوں کے معاملہ میں پابندی ختم ہو ۔ جبکہ وہ کسی بیوی کو طلاق دے چکے ہوں اور ان سے اپنی ضرورت پوری کر چکے ہوں اور ان کو آزاد کر چکے ہوں ۔ اللہ نے اپنے علم کے مطابق فیصلہ فرمایا ہے اور اللہ ہی ہے جو اپنی حکمت اور علم کے مطابق قانون بنانے والا ہے ۔

--- ○○○ ---

اب سیاق کلام میں اللہ کے ساتھ تعلق کو مضبوط کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے کہ اللہ کو یاد کرو ' صبح و شام ' اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے رہو ۔ وہی تو ہے جس نے اپنی مہربانی اور رحمت سے تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں داخل کیا ۔ وہ مومنین پر کس قدر رحیم ہے ۔ جب یہ مومنین قیامت میں حاضر ہوں گے تو ہر طرف سے مبارک سلامت ہو گی ۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ﴿٤١﴾ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٤٢﴾ هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ﴿٤٣﴾ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ ۚ وَأَعَدَّ لَهُمْ أَجْرًا كَرِيمًا ﴿٤٤﴾

" اے لوگو ' جو ایمان لائے ہو ' اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو ' وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمہارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے ' وہ مومنوں پر بہت مہربان ہے جس روز وہ اس سے ملیں گے ' ان کا استقبال سلام سے ہو گا اور ان کے لیے اللہ نے بڑا باعزت اجر مہیا کر رکھا ہے " ۔

اللہ کا ذکر انسان کو اللہ کے ساتھ مربوط رکھتا ہے ۔ اور انسان کا دل اللہ کی فکر اور سوچ میں رہتا ہے کہ اللہ کی ذات ہی سب کچھ کرنے والی ہے ۔ صرف زبان ہی سے اللہ اللہ کرنا ذکر نہیں ہے ۔ نماز قائم کرنا بھی ذکر الہی کی ایک شکل ہے بلکہ خصوصی قرآن وسنت میں ذکر کا مطلب تقریب قریب نماز ہی ہے ۔ امام ابو داؤد اور ابن ماجہ نے اعمش کی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے اغر ' ابو سعید اور ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب کسی شخص نے اپنی بیوی کو رات کے وقت جگایا اور دونوں نے دو رکعت نماز پڑھی تو دونوں اس پوری رات میں ذاکرین اور ذاکرات میں شمار ہوں گے " ۔

اگرچہ ذکر الہی نماز سے عام ہے لیکن ہر وہ صورت جس میں بندہ خدا کو یاد کرے ' وہ ذکر الہی ہے ۔ جس میں بندے کا دل رب سے مربوط ہو ' چاہے زبان سے وہ ادا کرے یا نہ کرے ۔ اصل بات یہ ہے کہ قلبی اور روحانی لحاظ سے انسان اللہ سے مربوط ہو جائے ۔

جب انسان اللہ سے غافل ہو ' تو اس کا دل خالی ہوتا ہے ' وہ لاپرواہ ہوتا ہے اور وہ حیران و پریشان ہوتا ہے ۔ جب وہ اللہ تک پہنچ جاتا ہے اور اللہ کو یاد کرتا ہے تو وہ مانوس اور پرسکون ہو جاتا ہے ۔ اب اس کا قلب بھرا ہوا ہوتا ہے ۔ وہ سنجیدہ

بن جاتا ہے ۔اسے قرار و سکون مل جاتا ہے ۔ اسے زندگی کی راہ معلوم ہو جاتی ہے' وہ اپنے منہاج سے باخبر ہوتا ہے ۔اسے پتہ ہوتا ہے کہ وہ کہاں ہے' اسے کہاں جانا ہے اور اس کی راہ کون سی ہے

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ذکر الہیٰ پر بہت زور دیتا ہے ۔بہت ہی آیات آتی ہیں کہ اللہ کو یاد کرو' چنانچہ قرآن مجید ذکر الہیٰ کو انسان کے مصروف ترین اوقات اور حالات سے مربوط کرتا ہے تاکہ کسی بھی مصروفیت میں انسان ذکر الہیٰ سے غافل نہ ہو جائے ۔اس کے وہ اوقات اور حالات بھی وسیلہ یاد الہیٰ بن جائیں اور یوں انسان حالات اور اوقات کے حوالے سے بھی اللہ سے مربوط ہو جائے ۔

وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (۳۳ : ۴۲) "صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو"۔ صبح و شام کے اوقات میں ایک خاصیت ہے ۔وہ یہ کہ ان اوقات میں انسانی قلب اللہ کی طرف مائل ہوتا ہے ۔کیونکہ ان اوقات میں انسان کے حالات اور دن اور رات کے اصول بدلتے ہیں جبکہ اللہ لازوال ہے اور اس کے سوا ہر چیز تغیر پذیر اور زوال پذیر ہے ۔

اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ جس ذات کو تم یاد کرتے ہو' اور جس کی تسبیح کرتے ہو' وہ لازوال ہونے کے ساتھ تم پر بہت ہی رحیم و کریم ہے اور وہی ہے جو تمہاری تخلیق کرتا ہے' تمہاری بہتری چاہتا ہے' حالانکہ وہ غنی بادشاہ ہے اور تم محتاج ہو ۔اس کو کوئی ضرورت نہیں ہے ۔یہ تو محض اس کا فضل و کرم ہے ۔

هُوَ الَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا (۳۳ : ۴۳) "وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمہارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے اور وہ مومنین پر بہت مہربان ہے"۔ اللہ بہت بلند ہے' اس کی رحمتیں بہت زیادہ ہیں ۔ اس کا فضل و کرم بہت ہی عظیم ہے ۔ اللہ اپنے ان ضعیف اور محتاج بندوں پر رحمت فرماتا ہے جو کمزور اور بے قرار ہوتے ہیں' ان کو نصیحت کرتا ہے' ان پر رحم و کرم کرتا ہے ۔اس کے فرشتے انسانوں کے لیے دعا کرتے ہیں اور ان کو بھلائی سے یاد کرتے ہیں ۔ یوں پھر پوری کائنات بھی بندوں کو یاد کرتی ہے ۔ رسول اللہؐ نے فرمایا "اللہ فرماتے ہیں جس نے مجھے یاد کیا اپنے دل میں' میں اسے دل میں یاد کرتا ہوں ۔ جس نے مجھے لوگوں میں یاد کیا میں اسے ان سے اچھے لوگوں میں یاد کرتا ہوں"۔

یہ ایک عظیم قسمت ہے جس کا تصور انسان کے لیے ممکن نہیں کہ انسان اور یہ زمین اس کائنات کا ایک حقیر ذرہ ہیں اور یہ افلاک اور یہ پوری کائنات اللہ کی لاتعداد مخلوقات و املاک کا حقیر حصہ ہیں جو کن فیکون سے پیدا ہوئے ۔

هُوَ الَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ

(۳۳ : ۴۳) "وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمہارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئیں"۔

اللہ کا نور ایک ہے' وہ ہر کسی کے شامل حال ہے اور عام ہے ۔ اللہ کے نور کے سوا جس قدر افکار و خیالات بھی ہیں' وہ ظلمات ہیں ۔ جب بھی لوگ اللہ کے نور سے نکلیں گے وہ تاریکیوں میں ہوں گے ۔ جزوی تاریکی ہو گی یا کلی تاریکی ہو گی ۔ اور یہ تاریکی صرف ایک ہی ذریعہ سے دور ہو سکتی ہے کہ کسی کے دل میں نور آفتاب طلوع ہو جائے ۔ اس کی روح بدل جائے' وہ فطرت کی طرف لوٹ آئیں ۔ یہی کائنات کی فطرت ہے اور یہی رحمت الٰہی' دعائے ملائکہ اور یہی وہ راہ ہے جس کے ذریعے انسان ظلمات سے نکل آتا ہے لیکن جب اس کا دل کھل جائے ۔

وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا (۳۳ : ۴۳) "اللہ مومنوں پر بہت مہربان ہے"۔

یہ تو ہے دنیا میں اہل ایمان کا معاملہ ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دنیا دارالعمل ہے ۔ رہی آخرت جو دارالجزاء ہے تو وہاں بھی اللہ کا فضل و کرم ان کے شامل حال رہے گا اور اللہ کی رحمت وہاں بھی ان کو ڈھانپے ہوئے ہو گی ۔ وہ ان کے لیے بہت ہی اعزاز ہو گا' بہت ہی خصوصی کرم ہو گا اور اجر عظیم ان کے لیے وہاں تیار ہے ۔

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ وَأَعَدَّ لَهُمْ أَجْرًا كَرِيمًا (۳۳ : ۴۴) "جس روز وہ اس سے ملیں گے' ان کا استقبال سلام سے ہو گا اور ان کے لیے اللہ نے باعزت اجر تیار کر رکھا ہے"۔ ان کے لیے ہر خوف و خطر سے سلامتی ہو گی ۔ ہر تھکاوٹ سے وہ دور ہوں گے ۔ ان کے لیے کوئی مشکل نہ ہو گی ۔ اللہ کی طرف سے مبارک و سلامت کے پیغامات فرشتوں نے اٹھائے ہوئے ہوں گے ۔ یہ فرشتے ان کے پاس ہر طرف سے آتے ہوں گے اور اللہ کی جانب سے سلام پہنچا رہے ہوں گے ۔ یہ سلام ان باعزت اجر و معاوضات کے علاوہ ہو گا جو ابھی سے تیار ہیں ۔

یہ ہے وہ رب کریم جو لوگوں کے لیے قانون بناتا ہے جو ان کے لیے راہ پسند کرتا ہے ۔ لہٰذا کون بدبخت ہو گا جو ایسے رب کے اختیار کردہ نظام سے منہ موڑے گا ۔

--- ooo ---

رہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو ان لوگوں تک اللہ کے پسند کردہ قوانین اور ضوابط پہنچاتے ہیں اور خود اپنی سنت اور اپنے اسوہ اور نمونہ کے ذریعے وہ راستے متعین فرماتے ہیں تو یہاں ان کے بارے میں بھی بتا دیا جاتا ہے کہ ان کے فرائض کیا ہیں ۔ آپ کس مشن پر مامور ہیں اور ان کے ذریعے اس دنیا میں اللہ مومنین پر کس قدر فضل کر رہے ہیں ۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٤٥﴾ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ﴿٤٦﴾ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا ﴿٤٧﴾ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ وَدَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿٤٨﴾

"اے نبیؐ' ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر' بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر' اللہ کی اجازت سے اس کی

طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔ بشارت دے دو ان لوگوں کو جو (تم پر) ایمان لائے ہیں کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے اور ہرگز نہ دبو کفار و منافقین سے 'کوئی پرواہ نہ کرو ان کی اذیت رسانی کی اور بھروسہ کر لو اللہ پر' اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اس کے سپرد کر دے"۔

نبی کا فریضہ منصبی یہ ہے کہ آپ لوگوں پر گواہ ہوں لہٰذا لوگوں کو ایسا عمل کرنا چاہئے کہ حضور اکرمؐ اچھی شہادت دینے کے قابل ہوں کیونکہ آپ نے تو سچی شہادت دینی ہے۔ اصل واقعہ سے کوئی تغیر و تبدیلی آپ نے نہیں کرنی ہے۔ رسول تو خوشخبری دینے والے ہیں ان لوگوں کو جو اچھے کام کرتے ہیں۔ نیک لوگوں کے لیے اللہ کی رحمت انتظار میں ہے اور غافل اور بے راہ رو لوگوں کو ڈرانے والے ہیں کہ ان کے لیے سخت عذاب ہے تاکہ وہ بیچارے غفلت میں نہ مارے جائیں اور اگر سزا دی جائے تو وارننگ کے بعد۔

وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ (۳۳ : ۴۶) "اور اللہ کی طرف بلانے والا بنا کر بھیجا ہے"۔ اس لیے نہیں بھیجا کہ صرف تمہاری دنیا اچھی ہے۔ تم دنیا میں برتر ہو جاؤ اور قومی وقار تمہارا بلند ہو۔ نہ جاہلی عصبیات کے لیے اسے داعی بنایا ہے۔ نہ مال غنیمت کے حصول کے لیے اٹھایا ہے۔ نہ نظام مملکت کا قیام مطلوب ہے۔ صرف دعوت الی اللہ ان کا منشور و مطلوب ہے اور یہ کام اللہ کے حکم سے انہوں نے شروع کیا ہے۔ نہ یہ اپنی طرف سے ہے اور نہ رضاکارانہ ہے۔ نہ آپ اپنی طرف سے یہ کام بطور رضاکار کرتے ہیں۔ یہ سب کام اللہ کے حکم سے ہے۔

وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا (۳۳ : ۴۶) "آپ روشن چراغ ہیں"۔ آپ ظلمتوں کو دور کرنے والے ہیں۔ شہادت کو قائم کرتے ہیں۔ راستہ متعین کرتے ہیں اور لوگوں کے لیے ایسے راہنما ہیں جس طرح سراج منیر ہوتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح روشنی لے کر آئے۔ یہ روشنی ایک واضح تصور تھا' ایک واضح نظریہ اور عقیدہ تھا' جس نے پوری کائنات کو منور کر دیا۔ اس کائنات اور انسان کا ربط واضح کر دیا اور اس کائنات میں انسان کے مقام و مرتبہ کو متعین کیا۔ ان اقدار کی وضاحت کی جن پر یہ کائنات قائم ہے۔ انسان کا مقصد' اس کی غرض' اور اس کے حصول کا طریقہ متعین کیا۔ نہایت ہی واضح اسلوب میں اور نہایت ہی فطری انداز میں۔ اس طرح کہ بات انسان کے دل کی گہرائیوں تک اتر جاتی ہے۔ مشکل سے مشکل مسائل اور زندگی کے نشیب و فراز میں پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو آسان ترین طریقوں سے حل کر دیا گیا ہے۔

مکرر اس بات کی تفصیل دی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داریوں میں اس بات کا اضافہ کیا جاتا ہے کہ آپ مومنین کے لیے مبشر ہیں۔

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا (۳۳ : ۴۷) "بشارت دے دو ان لوگوں کو جو تم پر ایمان لائے کہ ان کے لیے اللہ کا بہت بڑا فضل ہے"۔ اس سے قبل آیت

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا (۳۳ : ۴۵) رہے ہیں' ہم نے آپ

کو گواہ ' مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے ) میں مجملاً آپ کو مبشر کہا گیا تھا اور یہ تفصیل اس لیے دی ہے کہ مومنین یقین کر لیں کہ ان پر اللہ کا بہت بڑا فضل و کرم ہو گا اور یہ جو ان کے لیے قوانین اور ضوابط تیار ہو رہے ہیں اور نبی اپنے عمل سے ان کے لیے جو راہ و رسم وضع کر رہے ہیں یہ آخر کار ان کے لیے خوشخبری اور عظیم فضل و کرم کی بشارت ہوں گے ۔

اس خطاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ آپ کافروں اور منافقوں کی کسی معاملے میں اطاعت کریں اور مومنین اور آپ کو یہ لوگ جو اذیت دیتے ہیں اس کی بھی کوئی پرواہ نہ کریں ۔ صرف اللہ وحدہ پر توکل کریں ۔ وہی تمہارے لیے کافی مددگار ہے ۔

وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ دَعْ اَذٰىهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا ( ۳۳: ٤٨ ) "اور ہرگز نہ دبو کافروں اور منافقین سے 'کوئی پرواہ نہ کرو ان کی اذیت رسانی کی ۔ اور بھروسہ کر لو اللہ پر ' اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اس کے سپرد کر دے" ۔

یہ وہی خطاب ہے جو سورہ کے آغاز میں بھی تھا ۔ اس سے قبل کہ وہاں قانون سازی کا آغاز کیا جاتا اور جدید انتظامی ہدایات دی جاتیں ۔ یہاں البتہ یہ بات زیادہ ہے کہ نبی آپ کافروں اور منافقوں کی اذیت رسانی کی کوئی پرواہ نہ کریں اور نہ ان کی پیروی کسی معاملے میں کریں اور نہ کسی معاملے میں ان پر اعتماد کریں ۔ کیونکہ اللہ وحدہ قابل اعتماد ہے ۔

وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا ( ۳۳: ٤٨ ) "اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اس کے سپرد کر دے" ۔

یوں زید اور زینبؓ کے واقعہ اور منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے ساتھ نکاح کے جواز کے مسئلہ کی تمہید اور تبصرہ دونوں طویل ہیں اور یہ عملی مثال جسے پیش کرنے کے فریضے کو حضورؐ بھی بہت بھاری محسوس سمجھ رہے تھے ۔ اس لیے اس میں اللہ کی طرف سے تشریح اور لوگوں کی حوصلہ افزائی کی ضرورت تھی ۔ ان معاملات میں تعلق باللہ کو مضبوط کرنے کی ضرورت تھی تاکہ بندہ اللہ کے احسان اور رحمت کا گہرا شعور حاصل کر لے اور ان احکام کو خوشدلی سے وصول کرے ' قبول کرے اور تسلیم و رضا کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہو ۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۱۹۲ ایک نظر میں

اس سبق کے ابتدائی حصہ میں عام خاندانی اور عائلی قانون سازی ہے ۔ مطلقہ جسے رخصتی سے قبل طلاق ہو چکی ہو' اس کا حکم عدت وغیرہ ۔ اس کے بعد حضورؐ کی خاندانی زندگی کے لیے ہدایات' ازواج کے ساتھ آپ کے تعلقات' اور رواج کے دوسرے لوگوں سے رابطے کی ضابطہ بندی اور مسلمانوں کا رسول کے گھرانے سے تعلق' اور پھر اس گھرانے پر درود و سلام ۔ پھر پردے کا عام حکم جس میں رسول اللہؐ کی بیٹیاں' بیویاں اور مومنین کی تمام عورتیں شامل ہیں یہ کہ جب وہ قضائے حاجت کے لیے باہر نکلیں تو اپنی اوڑھنیاں سینوں پر لٹکا لیا کریں تاکہ وہ اس لباس کے ساتھ پہچانی جا سکیں اور ان کے ساتھ تعرض نہ کیا جا سکے ۔ کیونکہ منافقین' فساق و فجار اور مدینہ میں افواہیں پھیلانے والے اوباش عورتوں سے چھیڑ خانی کرتے تھے ۔ آخر میں ایسے لوگوں کو دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی ان کارروائیوں سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف سخت اقدامات کیے جائیں گے ۔

یہ تمام قانونی' معاشرتی اور امن و امان کے اقدامات اس لیے تھے کہ مدینہ کی سوسائٹی کو مکمل اسلامی خطوط پر منظم کیا جائے ۔ جو ہدایات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے بارے میں ہیں' وہ اس لیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس گھرانے کو قیامت تک کے لیے آنے والی نسلوں کے لیے کھلی کتاب کے طور پر باقی رکھنا چاہتے تھے کیونکہ یہ کتاب تو قیامت تک پڑھی جانے والی تھی اور پھر یہ ہدایات اور کتاب الٰہی میں ان کا ثبت کیا جانا اس گھر کے لیے ایک اعزاز بھی تھا کہ خود اللہ اس کی تربیت کر رہے ہیں اور قیامت تک کے لیے نمونہ بنا رہے ہیں ۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۹۲ تشریح آیات

## ۴۹ --- تا --- ۶۲

---

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝۴۹

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو' اور پھر انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو تو تمہاری طرف سے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کر سکو۔ لہٰذا انہیں کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رخصت کر دو"۔

سورہ بقرہ میں یہ احکام اس عورت کے بارے میں گزر گئے تھے جس کو قبل از رخصتی طلاق دے دی گئی ہو۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً وَّ مَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ (۲ : ۲۳۶) وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّاۤ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَ اَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲ : ۲۳۷)

(۲ : ۲۳۶ ۔ ۲۳۷) "تم پر کچھ گناہ نہیں اگر اپنی عورتوں کو طلاق دے دو قبل اس کے کہ ہاتھ لگانے کی نوبت آئے یا مہر مقرر ہو۔ اس صورت میں انہیں کچھ نہ کچھ ضرور دینا چاہئے ۔ خوشحال آدمی اپنی مقدرت کے مطابق اور غریب اپنی مقدرت کے مطابق معروف طریقہ سے دے ۔ یہ حق ہے نیک آدمیوں پر ۔ اور اگر تم نے ہاتھ لگانے سے

پہلے طلاق دی ہو مگر مہر مقرر کیا جا چکا ہو تو اس صورت میں نصف مہر دینا ہو گا۔ یہ اور بات ہے کہ عورت نرمی برتے۔ یا وہ مرد جس کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے نرمی سے کام لے اور تم نرمی سے کام لو' تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو' تمہارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے"۔

لہٰی مطلقہ جس کی رخصتی نہ ہوئی ہو اگر مہر مقرر ہو تو نصف مہر ادا کرنا ہو گا اور اگر مہر مقرر نہ ہو تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ سامان دینا لازمی ہے۔ مالدار پر اس کی حیثیت کے مطابق اور غریب پر اس کی حالت کے مطابق۔ اس آیت میں عدت کے مسئلے کا اضافہ کر دیا گیا جو وہاں نہ تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ چونکہ رخصتی نہیں ہوئی ہے اس لیے عدت نہ ہو گی۔ کیونکہ ان لوگوں کے درمیان چونکہ ہم بستری نہیں ہوئی اس لیے عدت کے ذریعے رحم کو پاک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ سابقہ نکاح کے آثار ہی موجود نہیں تاکہ نسب کا اختلاط نہ ہو اور کسی آدمی کی طرف وہ بچہ منسوب نہ ہو جو دراصل اس کا نہ ہو۔ یا ایک شخص کا بچہ ہو اور وہ اس سے محروم ہو جائے لیکن رخصتی نہ ہونے کی صورت میں تو رحم پاک ہے۔ لہٰذا نہ عدت ہے اور نہ انتظار ہے۔

فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا (۳۳: ۴۹) "تمہاری طرف سے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کرو"۔ فَمَتِّعُوهُنَّ "انہیں کچھ مال دو"۔ اگر مہر مقرر ہو تو نصف مہر ہے۔ اور اگر نہ ہو تو بھی کچھ دو' اپنی مالی حالت کے مطابق۔

وَ سَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا (۳۳: ۴۹) "اور بھلے طریقے سے رخصت کر دو"۔ نہ روکے رکھو' نہ اذیت دو' نہ بغض رکھو اور نہ ان کو جدید ازدواجی زندگی گزارنے سے روکو۔ اس سورہ میں یہ عام حکم ہے اور پوری اسلامی سوسائٹی کے لیے ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ کے لیے کون سی عورتیں حلال کی گئی ہیں اور وہ خصوصیات جو آپ کی ذات اور آپ کے اہل بیت کے لیے ہیں۔ یہ احکام سورہ نساء کی آیت (مثنیٰ وثلاث ورباع) کے بعد آئے۔ وہاں مسلمانوں کے لیے چار عورتوں سے زیادہ کرنا حرام کر دیا گیا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں ۹ بیویاں تھیں۔ ہر ایک کے ساتھ نکاح ایک خاص ضرورت کے تحت ہوا تھا۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بیٹیاں تھیں۔ یہ آپ کے قریبی ساتھی تھے۔ ام حبیبہ ابو سفیان کی بیٹی تھی۔ ام سلمہ' سودہ بنت زمعہ' زینب بنت خزیمہ ان لوگوں میں سے تھیں جو خاوندوں سے محروم ہو گئی تھیں اور حضورؐ نے ان کی حوصلہ افزائی اور عزت افزائی فرمائی۔ زینب بنت جحشؓ کا قصہ تو ابھی گزرا ہے۔ چونکہ آپؐ نے اصرار پر ان کو زید ابن حارثہ غلام کے ساتھ بیاہ دیا تھا اور یہ شادی کامیاب نہ ہو سکی تو اللہ نے حضورؐ سے ان کا نکاح کر دیا۔ ان کی دل جوئی کے لیے اور متبنیٰ بنانے کی رسم کے آثار کو ختم کرنے کے لیے' تفصیلات گزر چکی ہیں۔ جویریہ بنت الحارث بنی المصطلق اور صفیہ بنت حیی ابن اخطب' دونوں غلام ہو کر آئیں اور حضورؐ نے ان کو آزاد کر کے نکاح میں لے لیا تاکہ ان قبائل سے تعلقات قائم ہوں اور ان دونوں دختران سرداران کی عزت ہو۔ یہ دونوں اسلام لا چکی تھیں اگرچہ ان کی اقوام کے ساتھ سخت سلوک ہوا۔

یہ سب عورتیں وہ تھیں جنہوں نے امہات المومنین کا مقام پایا اور جب آیت تخییر نازل ہوئی تو ان سب نے اللہ اور رسول اللہؐ کو اختیار کیا اور دنیا پر آخرت کو اختیار کر لیا۔ نیز جب عورتوں کی تعداد کو چار کے اندر محدود کر دیا گیا تو ان ازواج نبی کے لیے حضور اکرمؐ سے علیحدہ ہونا شاق گزرا۔ اللہ نے ان پر نظر کرم فرمائی اور بقرہ کی آیت سے حضورؐ کو مستثنیٰ کر دیا اور ان تمام عورتوں کو اپنے پاس رکھنے کی اجازت دے دی۔ ان سب کو آپ کے لیے حلال کر دیا لیکن اس کے بعد یہ حکم بھی دے دیا کہ آپ ان پر اضافہ نہیں کر سکتے۔ نہ ان میں سے کسی ایک کے بدلے دوسری لا سکتے ہیں۔ یہ اجازت صرف موجودہ ازواج تک محدود ہے تاکہ وہ شرف زوجیت رسولؐ سے محروم نہ ہو جائیں جبکہ اس سے قبل وہ اللہ کے رسول اور دار آخرت کو ترجیح دے چکی تھیں۔ یہی موضوعات ہیں ان آیات کے۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ
وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ
وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً
اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا
خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ
وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۵۰
تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَآ
اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ۝۵۱ لَا
يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ ۲
حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ۝۵۲ ع ۱۳
۳

"اے نبیؐ! ہم نے تمہارے لیے حلال کر دیں تمہاری وہ بیویاں جن کے مہر تم نے ادا کیے ہیں، اور وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے تمہاری ملکیت میں آئیں، اور تمہاری وہ چچا زاد اور پھوپھی زاد اور ماموں زاد اور خالہ

زاد بہنیں جنہوں نے تمہارے ساتھ ہجرت کی ہے اور وہ مومن عورت جس نے اپنے آپ کو نبیؐ کے لیے ہبہ کیا ہو اگر نبی اسے نکاح میں لینا چاہے ۔ یہ رعایت خالصتاً تمہارے لیے ہے ۔ دوسرے مومنوں کے لیے نہیں ہے ۔ ہم کو معلوم ہے کہ عام مومنوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں ہم نے کیا حدود عائد کیے ہیں ۔ تمہیں ان حدود سے ہم نے اس لیے مستثنیٰ کیا ہے تاکہ تمہارے اوپر کوئی تنگی نہ رہے ' اور اللہ غفور و رحیم ہے ۔ تم کو اختیار دیا جاتا ہے کہ اپنی بیویوں میں سے جس کو چاہو ' اپنے سے الگ رکھو ' جسے چاہو اپنے ساتھ رکھو اور جسے چاہو الگ رکھنے کے بعد اپنے پاس بلا لو ۔ اس معاملہ میں تم پر کوئی مضائقہ نہیں ہے ۔ اس طرح زیادہ متوقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور وہ رنجیدہ نہ ہوں گی اور جو کچھ بھی تم ان کو دو گے اس پر وہ سب راضی رہیں گی ۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ تم لوگوں کے دلوں میں ہے ' اور اللہ علیم و حلیم ہے ۔ اس کے بعد تمہارے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں ' اور نہ اس کی اجازت ہے کہ ان کی جگہ اور بیویاں لے آؤ خواہ ان کا حسن تمہیں کتنا ہی پسند ہو ' البتہ لونڈیوں کی تمہیں اجازت ہے ۔ اللہ ہر چیز پر نگران ہے "۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس آیت میں مذکورہ عورتوں کو حلال قرار دیا گیا ۔ اگرچہ وہ چار کی تعداد سے زیادہ ہوں جبکہ دوسرے مسلمانوں پر چار سے زیادہ تعداد حرام ہے ۔ یہ اقسام یہ ہیں : وہ ازواج جن کو مہر دے کر آپ نے نکاح فرمایا ۔ وہ عورتیں جو غلام بن کر آ جائیں ۔ چچازاد اور خالہ زاد عورتیں ۔ پھوپھی زاد اور ماموں زاد عورتیں ۔ ان میں سے صرف وہ جو آپ کے ساتھ ہجرت کر کے آئیں ۔ یہ ان مہاجرات کی عزت افزائی کے لیے ہے ۔ نیز وہ عورت بھی جو اپنے نفس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بخش دے ' بغیر مہر کے اگر نبی اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہیں ۔ (روایات میں اضطراب ہے کہ آیا اس قسم کی عورتوں میں سے کسی کے ساتھ حضورؐ نے نکاح فرمایا یا نہیں ۔ راجح بات یہ ہے کہ جن عورتوں نے اپنے آپ کو حضورؐ کے لیے پیش کیا آپؐ نے ان کے ساتھ نکاح کیا ) ۔ یہ اقسام حضورؐ کے لیے بطور خصوصیت جائز کی گئیں کیونکہ حضورؐ مومنین اور مومنات کے ولی بھی تھے ۔ رہے دوسرے لوگ تو وہ اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے معاملے میں اللہ کے جاری کردہ قوانین کے پابند تھے ۔ یہ استثناء اس لیے کی گئی کہ حضورؐ اپنے شخصی اور اجتماعی حالات کی وجہ سے مشکلات میں مبتلا نہ ہوں ۔

اس کے بعد یہ اختیار بھی حضور اکرمؐ کو دے دیا کہ اگر کوئی اپنی ذات کے بارے میں حضورؐ کو پیش کش کرے تو حضورؐ اسے اپنے حرم میں لے لیں یا موخر کر دیں ۔ اور جن کے معاملے کو آپ نے موخر کر دیا تو بعد میں اسے حرم میں داخل کر دیں ۔ یہ بھی اختیار دے دیا کہ جن عورتوں کو الگ کر دیں انہیں دوبارہ ساتھ بلا لیں ۔

ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَ لَا يَحْزَنَّ وَ يَرْضَيْنَ بِمَاۤ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ (۳۳ : ۵۱)

"اس طرح زیادہ متوقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں ۔ اور جو کچھ بھی تم ان کو دو گے اس پر وہ سب راضی ہوں گی "۔ گویا یہ حضور اکرمؐ کے خاص حالات کے تحت اجازت دی گئی ۔ کیونکہ سب عورتیں آپ کی طرف راغب تھیں اور آپ کے ساتھ رابطہ چاہتی تھیں ۔ اللہ کو ان حالات کا سب سے زیادہ علم تھا ۔

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا (۳۳ : ۵۱) "اللہ جانتا ہے جو تم لوگوں کے دلوں میں ہے اور اللہ علیم و حلیم ہے "۔

اس کے بعد یہ حکم ہے کہ آپ کے حرم میں جو عورتیں ہیں، وہ ذاتی طور پر آپ کے لیے جائز ہیں، تعداد مطلوب نہیں ہے۔ اس لیے آپ ان میں سے کسی کے بدلے کسی دوسری عورت کو نہیں لا سکتے۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ آیا حضورؐ نے اس آیت کے نزول سے قبل کسی عورت کا اضافہ کیا تھا۔

لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِھِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَکَ حُسْنُھُنَّ

(۳۳: ۵۲) "اس کے بعد تمہارے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں اور نہ اس کی اجازت ہے کہ ان کی جگہ اور بیویاں لے آؤ، خواہ ان کا حسن تمہیں کتنا ہی پسند ہو۔ اس میں کوئی استثناء نہیں۔

اِلَّا مَا مَلَکَتْ یَمِیْنُکَ (۳۳: ۵۲) "البتہ لونڈیوں کی تمہیں اجازت ہے"۔ لونڈیاں جس قدر چاہیں رکھ سکتے ہیں۔

وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا (۳۳: ۵۲) "اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے"۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ یہ حرمت بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل اٹھالی گئی تھی لیکن اجازت کے باوجود حضور اکرمؐ نے ان کے سوا کسی عورت کے ساتھ نکاح نہ کیا اس لیے وہی امہات المومنین رہیں۔

--- ooo ---

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے اور عام مسلمانوں کے تعلقات و روابط کی ضابطہ بندی کی گئی ہے کہ آپ کی زندگی میں لوگوں کا ربط آپ کی ازواج کے ساتھ کیسا ہو گا اور آپ کی وفات کے بعد کیا تعلق ہو گا۔ یہ احکام اس وقت کے واقعی حالات کے مطابق آئے۔ کیونکہ بعض منافقین اور بعض مریض اخلاق والے لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی ازواج کے بارے میں اذیت دیتے تھے۔ اس لیے ان آیات میں ان کو سخت دھمکی دی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے نزدیک ان کی حرکات بہت ہی گھناؤنی ہیں۔ یہ لوگوں سے تو چھپ سکتے ہیں مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔ اللہ ان کی شرارتوں کو بھی جانتا ہے اور نیتوں کو بھی۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّآ اَنْ یُّؤْذَنَ
لَکُمْ اِلٰی طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىہُ ۙ وَلٰکِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا
طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی
النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ ۫ وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ
مَتَاعًا فَسْئَلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِکُمْ اَطْھَرُ لِقُلُوْبِکُمْ وَقُلُوْبِھِنَّ ؕ وَمَا

كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا ۚ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمًا ﴿٥٣﴾ إِنْ تُبْدُوا شَيْئًا أَوْ تُخْفُوهُ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٥٤﴾

"اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' نبی کے گھروں میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو۔ نہ کھانے کا وقت تاکتے رہو۔ ہاں اگر تمہیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ۔ مگر جب کھانا کھالو تو منتشر ہو جاؤ۔ باتیں کرنے میں نہ لگے رہو۔ تمہاری یہ حرکتیں نبیؐ کو تکلیف دیتی ہیں' مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے۔ اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا۔ نبیؐ کی بیویوں سے اگر تمہیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔ یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے۔ تمہارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اللہ کے رسولؐ کو تکلیف دو' اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو' یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ تم خواہ کوئی بات ظاہر کرو یا چھپاؤ' اللہ کو ہر بات کا علم ہے"۔

امام بخاری نے حضرت انس ابن مالک کی روایت نقل فرمائی ہے کہ حضورؐ نے جب زینب بنت جحش سے شادی کی تو روٹی اور گوشت کی دعوت دی اور مجھے بلانے کے لیے بھیجا گیا۔ لوگ آتے اور کھانا کھا کر چلے جاتے۔ میں نے سب کو بلایا یہاں تک کہ کوئی نہ رہا۔ تو میں نے کہا حضور اکرمؐ کوئی رہ نہیں گیا۔ تو حضورؐ نے فرمایا اب دستر خوان اٹھالو' کمرے میں تین آدمی بیٹھ گئے جو باتیں کر رہے تھے۔ حضور اکرمؐ نکلے اور حضرت عائشہؓ کے کمرے میں گئے۔ اور فرمایا السلام علیکم اہل البیت ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ نے فرمایا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ اے رسول خداؐ آپ کی نئی بیوی کیسی ہیں۔ اللہ آپ کے لیے اسے مبارک کرے۔ آپؐ اپنی ازواج کے ہاں گئے اور ایسا ہی مکالمہ کیا جس طرح عائشہؓ سے ہوا اور سب نے ایسا ہی جواب دیا۔ جب حضورؐ واپس ہوئے تو یہ تین افراد اسی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ حضورؐ نہایت ہی حیادار تھے۔ تو حضورؐ حضرت عائشہؓ کے کمرے میں چلے گئے۔ معلوم نہیں کہ حضرت عائشہؓ نے حضورؐ کو اطلاع دی کہ لوگ چلے گئے یا کسی اور نے اطلاع دی۔ جب حضورؐ واپس ہوئے اور اپنا پاؤں دروازے کی چوکھٹ سے اندر رکھا اور دوسرا باہر تھا تو میرے اور اپنے درمیان پردہ گرا دیا اور اس وقت حجاب کی آیت نازل ہوئی۔

اس آیت میں وہ آداب مذکور ہیں جو دور جاہلیت میں ناپید تھے۔ یہاں تک کہ حضورؐ کے گھر میں بھی یہ ناپید تھے۔ لوگ گھروں میں بغیر اجازت کے داخل ہو جاتے تھے جیسا کہ سورہ نور کی آیت استیذان کی تشریح میں تفصیلات گزر گئیں اور حضور اکرمؐ کے گھر میں تو ان آداب کا بالکل خیال نہ رکھا جاتا تھا اس لیے کہ آپ کا گھر ایک مقام اجتماع تھا اور وہاں لوگ ہر وقت علم و حکمت کے حصول کے لیے بیٹھے رہتے تھے۔ بعض لوگ آتے اور دیکھتے کہ کچھ پک رہا ہے تو وہ بیٹھ جاتے تا کہ بغیر دعوت کی کھالیں۔ بعض لوگ کھا پی لینے کے بعد بھی بیٹھے رہتے۔ چاہے دعوت دی گئی یا خود گھس آئے ہوں۔ پھر باتوں میں لگ جاتے اور نہ سمجھتے کہ اس سے حضور اکرمؐ کو کس قدر تکلیف ہو رہی ہے اور آپ کے اہل بیت کو کس قدر تکلیف ہو رہی ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ تین افراد جب باتیں کر رہے تھے تو اس وقت حضورؐ کی دلہن اسی کمرے میں منہ دیوار کی طرف کر کے بیٹھی تھی اور حضورؐ اس بات سے حیا کرتے تھے کہ وہ ان لوگوں کو بتا دیں کہ وہ آپ کے لیے کس قدر بوجھ ہیں۔ محض اس لیے کہ وہ شرمندہ نہ ہوں۔ چنانچہ اللہ نے رسول اللہؐ کی جانب سے یہ اعلان فرمایا۔

وَ اللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ (۳۳ : ۵۳) "اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا"۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی غیرت کی بنیاد پر اور حساس ہونے کی وجہ سے حضورؐ کے سامنے یہ تجویز رکھا کرتے تھے کہ حجاب نافذ ہو جائے اور یہ تمنا بھی کرتے تھے یہاں تک کہ آیت حجاب نازل ہو گئی۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا "حضورؐ آپ کے پاس تو نیک و بد سب آتے ہیں۔ لے کاش کہ آپؐ امہات مومنین کو پردے کا حکم دیتے"۔

اس آیت میں یہ تعلیم دی گئی کہ لوگ نبی کے گھر میں بغیر اجازت کے داخل نہ ہوں۔ جب کسی دعوت طعام کے لیے بلایا جائے تو داخل ہوں۔ اگر بلائے نہ گئے ہوں تو جلدی میں نہ آئیں اور کھانے کے پکنے کا انتظار جائے دعوت میں جا کر نہ کریں۔ پھر جب ان کو کھانا کھلا دیا جائے تو چلے جائیں اور کھانا کھانے کے بعد محض گپ شپ کے لیے بیٹھ نہ جائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے مقابلے میں آج مسلمان آداب کے زیادہ محتاج ہیں کیونکہ اس ترقی کے دور میں بھی ہم ان آداب سے دور ہیں کیونکہ جن لوگوں کو دعوت پر بلایا جاتا ہے وہ کھانے کے بعد بھی جم جاتے ہیں بلکہ کھانا کھاتے وقت ہی وہ طویل باتیں کرتے ہیں اور گھر والے جو اسلام کے احکام حجاب سے بعض احکام ہی کی پیروی کرتے ہیں وہ قید ہوتے ہیں اور مہمان اپنی باتوں میں غرق ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی آداب ہر دور اور ہر معاشرے کے لیے مفید ہیں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اسلامی اور خدائی آداب اختیار کرنے کے لیے تیار ہوں۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت اور عام لوگوں کے درمیان حجاب کی بات سامنے آتی ہے۔

وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (۳۳ : ۵۳) "نبی کی بیویوں سے اگر تم نے کچھ مانگنا ہے تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو"۔ اور یہ حجاب تمہارے دلوں کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔

ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ (۳۳ : ۵۳) "یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے مناسب طریقہ ہے"۔ لہٰذا کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ کی اس بات کے سوا کوئی اور بات کہے۔ اس لیے کسی کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ اختلاط، بے پردگی، بے باک باتیں، بے قید ملاقاتیں، ہم نشینی اور جنسیں کے درمیان اشتراک دلوں کو پاک کرتا ہے اور اس طریقے سے ضمیر زیادہ عفیف ہوتے ہیں۔ اس طرح میلانات اور خواہشات دب جاتی ہیں۔ انسانی سلوک اور شعور شفاف ہو جاتے ہیں۔ یہ ہیں بعض وہ خرافات جو اللہ کی مخلوق میں سے گرے ہوئے لوگ کہتے ہیں۔ میں مشورہ دوں گا کہ کسی کو یوں نہیں کہنا چاہئے جبکہ اللہ فرماتے ہیں۔

وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ (۳۳ : ۵۳) "نبی کی بیویوں سے اگر تم نے کچھ مانگنا ہے تو پردے کے پیچھے سے مانگو، یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے نہایت مناسب طریقہ ہے"۔ یہ حضور اکرمؐ کی بیویوں کے بارے میں کہا جا رہا ہے جو امہات المومنین ہیں اور ان لوگوں سے کہا جا رہا ہے جو زمین کا نمک ہیں۔ رسول کے ساتھی ہیں جن کی ہمسری کا کوئی سوچ بھی

نہیں سکتا۔ جب اللہ بات کرتا ہے اور دوسری جانب سے اللہ کی مخلوق ایک بات کرتی ہے تو بات اللہ کی ہوتی ہے اور دوسروں کی باتیں خرافات ہوتی ہیں۔ اللہ کے مقابلے میں انسانوں کی باتوں کو اہمیت وہی شخص دے سکتا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ایک انسان اللہ سے زیادہ جانتا ہے۔

سالوں کے تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اللہ نے جو کچھ کہا' وہ زیادہ سچا تھا اور یہ چھوٹے اور بونے لوگ جو کچھ کہتے ہیں' ان کو سالوں اور صدیوں کے تجربات نے غلط ثابت کر دیا ہے۔ آج مغرب میں جہاں عورت و مرد کا اختلاط اپنی انتہاؤں کو چھو رہا ہے کیا تمام لوگوں کے دل پاک و صاف ہو گئے ہیں۔ امریکہ اس میدان میں سب سے عروج پر ہے۔ ذرا اسی کے حالات کا مطالعہ کر لو۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ بلانے سے بھی پہلے آ جانا اور کھانے کے پکنے کا انتظار کرنا اور پھر کھانے سے فارغ ہونے کے بعد دور دراز کی باتیں کرنا حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تکلیف دہ تھا اور آپ ازروئے حیا چشم پوشی خاموش تھے۔ حالانکہ مسلمانوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دیں یا آپ کے بعد آپ کی ازواج سے نکاح کریں۔ جبکہ وہ ان کی ماؤں جیسی ہیں۔ رسول اللہؐ کے مقام و مرتبے کا یہ تقاضا ہے کہ آپ کے بعد کوئی ان کے ساتھ نکاح نہ کرے' اس گھرانے کی حرمت اور عزت کو قائم کرنے کے لیے۔

وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا

(۳۳ : ۵۳) "تمہارے لیے ہرگز جائز نہیں ہے کہ رسول کو تکلیف دو اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو"۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ بعض منافقین یہ کہتے تھے کہ وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ حضورؐ کی وفات ہو اور وہ عائشہؓ سے نکاح کریں۔

اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا (۳۳ : ۵۳) "یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے"۔ اور جو گناہ اللہ کے ہاں عظیم ہو وہ کس قدر ہولناک ہو گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے بعد مزید دھمکی دی جاتی ہے جو بہت ہی شدید ہے۔

اِنْ تُبْدُوْا شَيْئًا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۳۳ : ۵۴) "تم خواہ کوئی بات ظاہر کرو یا چھپاؤ' اللہ کو ہر بات کا علم ہے"۔ لہٰذا یہ سب معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ ہر ظاہر اور چھپے کا جاننے والا ہے۔ ہر تدبیر اور ہر سوچ کو جانتا ہے اور یہ معاملہ اس کے ہاں ہے بھی گناہ کبیرہ۔ اگر کوئی پھر بھی اس کے ساتھ الجھتا ہے تو وہ اللہ کے ساتھ جنگ کرتا ہے اور جس نے اللہ سے جنگ کی وہ مٹ گیا۔

اس عام حجاب کے بعد ازواج مطہرات کے لیے بعض محرمات سے پردہ نہ کرنے کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ ان کے سامنے آ سکتی ہیں۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ

وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَ لَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۵۵﴾

"ازواج نبیؐ کے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ان کے باپ' ان کے بیٹے' ان کے بھائی' ان کے بھتیجے' ان کے بھانجے' ان کے میل جول کی عورتیں اور ان کے مملوک گھروں میں آئیں۔ (اے عورتو) تمہیں اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کرنا چاہئے اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے"۔

یہ وہی محرم ہیں جن کے سامنے تمام مسلمان عورتوں کو حجاب نہ کرنے کی اجازت ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ ان دو آیات میں سے کون سی پہلے نازل ہوئی ہے۔ یعنی یہ آیت جو ازواج نبی کے ساتھ مخصوص ہے یا سورہ نور کی وہ عام آیت جو تمام مسلم عورتوں کے لیے ہے۔ راجح بات یہ ہے کہ پہلے حکم ازواج مطہرات کے لیے آیا اور پھر عام مسلم عورتوں کے لیے اور یہ اللہ کی طرف سے فرائض عائد کیے جانے کے مزاج کے مطابق ہے۔

اس اجازت کو بھی خدا کے خوف کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔ اللہ سے ڈرو' اللہ ہر چیز سے خبردار ہے۔ تقویٰ اور اللہ کی نگرانی کو ذہن میں رکھنا ایسے مقامات پر بالعموم مذکور ہوتا ہے کیونکہ تقویٰ ہر برائی سے بچنے کی آخری ضمانت ہے۔ یہ وہ نگران ہے جو ہر وقت دل و دماغ کی نگرانی کرتا ہے۔

---ooo---

سیاق کلام لوگوں کو اس بات سے ڈرانے میں ذرا مزید آگے بڑھتا ہے کہ وہ رسول اللہ کو اذیت نہ دیں۔ نہ آپ کی ذات کے معاملے میں اور نہ آپ کے خاندان کے معاملے میں۔ اس کام کے گھناؤنے پن کو مزید وضاحت سے بیان کیا جاتا ہے اور یہ بات دو طریقوں سے بیان کی جاتی ہے۔ پہلے طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ حضور اکرمؐ اللہ کے ہاں کس قدر بلند مرتبہ ہیں اور دوسرا طریقہ یہ کہ براہ راست یہ کہا گیا کہ حضور اکرم کو ایذا دینے والے دراصل اللہ کو ایذا دیتے ہیں اور اس کی سزا اللہ کے ہاں یہ ہے کہ ان کو اللہ کی رحمت سے دور کر دیا جاتا ہے اور وہ دنیا اور آخرت میں محروم ہوں گے اور ان کو یہ عذاب دیا جائے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰۗىِٕكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَي النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۵۷﴾

"اللہ اور اس کے ملائکہ نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں' اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو۔ جو لوگ

اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ نے لعنت فرمائی ہے اور ان کے لیے رسواکن عذاب مہیا کر دیا ہے"۔

اللہ کی طرف سے رسول اللہؐ پر درود بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ عالم بالا میں نبی کی تعریف کی جاتی ہے اور فرشتوں کی طرف سے درود کے معنی یہ ہیں کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دعا کرتے ہیں۔ کیا ہی عظیم مرتبہ ہے حضورؐ کا اللہ کے ہاں کہ یہ پوری کائنات آپ کے لیے دعاگو ہے۔ اس کے ذریعہ پوری کائنات منور ہو جاتی ہے اور اللہ کی جانب سے یہ ثنا اور تعریف ہوتی ہے اور جو باقی ہے اور ازلی اور ابدی ہے اور پوری کائنات اس کے ہمقدم ہے۔ اس نعمت اور تکریم سے بڑی اور نعمت کیا ہو سکتی ہے۔ ہم انسانوں کے درود و سلام کا اللہ اور پوری کائنات کے درود و سلام سے کیا مقابلہ۔ انسانوں سے صلوۃ و سلام کا مطالبہ اس لیے کیا گیا ہے کہ ان کی یہ حقیر آواز بھی کائنات کی گونج سے مل کر اس عظیم ثنا میں شریک ہو جائے اور اس طرح انسان بھی اس بڑی تقریب میں شرکت کے مدعی بن جائیں جبکہ اللہ کی جانب سے صلوۃ و سلام تو ازلی اور ابدی ہو گا۔

اس عظیم حمد و ثنا کو دیکھتے ہوئے جس میں رب تعالیٰ' فرشتے' کائنات اور انسان بھی شریک ہیں۔ اگر کوئی بدبخت نبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ممدوح کائنات اور رب کائنات کو اذیت دیتا ہے تو اس کا یہ فعل کس قدر گھناؤنا' کس قدر قبیح اور قابل ملامت ہو جاتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا (۳۳ : ۵۷) "جو لوگ اللہ اور رسول اللہؐ کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا و آخرت میں اللہ نے لعنت فرمائی ہے اور ان کے لیے رسواکن عذاب مہیا کر دیا ہے۔ یہ فعل اور بھی قبیح ہو جاتا ہے کہ ایک مخلوق اپنے خالق کو اذیت دیتی ہے۔ حالانکہ لوگ اللہ کو اذیت دے ہی نہیں سکتے۔ بلکہ انداز کلام یہ بتاتا ہے کہ وہ رسول اللہ کو اس قدر سخت اذیت دیتے ہیں جس سے گویا اللہ جل و شانہ کو اذیت پہنچتی ہے۔ لہٰذا ان کی یہ حرکت بہت بری' بہت قبیح اور نہایت گھناؤنی ہے۔

اس کے بعد مومنین و مومنات کی ایذا کا ذکر آتا ہے کہ ان کو اذیت دینا' ان پر بہتان باندھنا' کہ ان میں کوئی عیب نہیں جیسے یہ منافقین ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا
ع ۶ فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ﴿۵۸﴾

"اور جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو بے قصور اذیت دیتے ہیں انہوں نے ایک بڑے بہتان اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لے لیا ہے"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مدینہ میں ایک ایسا طبقہ موجود تھا جو اس طرح مومنین اور مومنات کو اذیت

رسانی کے مشغلے میں مصروف تھا۔ مومنین کے بارے میں بری باتیں رات اور دن منسوب کی جاتی تھیں۔ ان کے خلاف سازشیں کرتے' تہمتیں لگاتے' جس طرح ہر زمان و مکان میں اسلامی تحریکات کے خلاف ہوا کرتا ہے۔ بدکار اور اشرار کے ہر معاشرے میں مومنین اور مومنات کے ساتھ ہمیشہ یہی سلوک ہوا ہے۔ مریض دل لوگ اور منافقین کا کسب ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ اللہ نے مومنات کا دفاع یہاں اپنے ذمہ لیا ہے اور الزام لگایا ہے کہ ان کے دشمن جھوٹے اور جنسی ہیں اور اللہ سے سچا اور کون ہو سکتا ہے۔

---○○○---

اس کے بعد حکم دیا جاتا ہے کہ اے نبی اپنی بیویوں' لڑکیوں اور مومنین کی عورتوں کو یہ ہدایت کرو کہ وہ جب باہر نکلیں تو اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لیا کریں تاکہ وہ پہچان لی جائیں کہ وہ شریف زادیاں ہیں۔ اس طرح کہ ان کے سر' چہرے اور سینے پوشیدہ ہوں۔ جیوب جمع جیب ہے اور یہ قمیص کا کھلا شگاف ہوتا ہے جو سینے پر ہوتا ہے۔ اس دور میں لوگ عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ اس لیے اس طرح کے لباس سے اس قسم کے شرپسند ذرا سہم جائیں گے اور سمجھ جائیں گے کہ یہ خواتین شرم و حیا والی ہیں لہٰذا وہ دست درازی کی جرأت نہ کر سکیں گے۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۹﴾

"اے نبیؐ اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے"۔

سدی کہتے ہیں کہ مدینہ میں ایسے فساق موجود تھے جو اس دور میں رات کو نکلتے تھے' اس وقت جب اندھیرا گہرا ہو جاتا تھا اور مدینہ کی تنگ گلیوں میں عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ کیونکہ لوگوں کے گھر تنگ تھے اور قضائے حاجت کے لیے عورتوں کو باہر نکلنا پڑتا تھا۔ یہ فساق ان عورتوں کے پیچھے پڑتے تھے۔ جب وہ دیکھتے کہ کسی عورت نے حجاب کیا ہوا ہے تو وہ یہ کہتے کہ یہ آزاد عورت ہے اس لیے یہ اس سے رک جاتے۔ اور جب وہ دیکھتے کہ پردہ نہیں ہے تو یہ اس پر ٹوٹ پڑتے۔

مجاہد کہتے ہیں کہ معنی یہ ہے کہ اپنے اوپر جلباب ڈال لیں تاکہ معلوم ہو کہ یہ آزاد عورتیں ہیں تاکہ کوئی فاسق ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کرے یا شک نہ کرے اور یہ کہ۔

كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۳۳: ۵۹) "اور اللہ غفور درحیم ہے"۔ یعنی ایام جاہلیت میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ اس سے درگزر فرمائے گا کیونکہ اس وقت ان کو نہ حکم تھا اور نہ علم تھا۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ عرب کے گندے معاشرے کو اسلام آہستہ آہستہ پاک کر رہا تھا اور فتنہ و فساد اور جنسی بے راہ روی کی ایک ایک راہ کو بند کرتا چلا جاتا تا اور بدی کا دائرہ تنگ کیا جا رہا تھا تاکہ اسلام کی پاک رسم و راہ آہستہ آہستہ اسلامی معاشرے میں جڑ پکڑتی چلی جائے۔

آخر میں مدینہ کے ان ناپسندیدہ عناصر کو سخت دھمکی دی جاتی ہے کہ منافقین' بیمار اخلاق کے لوگ اور ہیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے اگر باز نہ آئے اور جن کارروائیوں میں وہ مصروف ہیں ان کو ترک نہ کیا تو ان کے خلاف رسول اللہ کو سخت کارروائی کرنے کا حکم دے دیا جائے گا۔ نبی اور مومنین اور مومنات ان پر مسلط کر دیئے جائیں گے جس طرح یہودیوں پر نبی اور مسلمانوں نے مکمل اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ پھر ان کے لیے مدینہ میں رہنا مشکل ہو جائے گا اور ان کو بھی ملک بدر کر دیا جائے گا۔ ان کے خلاف کارروائی یہ ہوگی کہ مومنین و مومنات ۔ اذیت دینے والے مباح الدم ہیں جہاں ملیں ان کا سر قلم کر دیا جائے جس طرح یہودیوں کا حشر انہوں نے دیکھ لیا ہے اور جس طرح ازمنہ ماضیہ میں غیر یہودی فساق و فجار کا یہی حشر انبیاء کے ہاتھوں ہوتا رہا ہے۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۶۰ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ۝۶۱ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝۶۲ الربع

"اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے' اور وہ جو مدینہ میں ہیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے ہیں' اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے تمہیں اٹھا کھڑا کریں گے' پھر وہ اس شہر میں مشکل ہی سے تمہارے ساتھ رہ سکیں گے۔ ان پر ہر طرف سے لعنت کی بوچھاڑ ہوگی' جہاں کہیں پائے جائیں گے' پکڑے جائیں گے اور بری طرح مارے جائیں گے۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو ایسے لوگوں کے معاملے میں پہلے سے چلی آ رہی ہے' اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

اس تہدید سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی قریظہ کے قلع قمع کے بعد مدینہ میں مسلمان چیلنج پاور بن گئے تھے اور اسلامی مملکت قوت سے اخلاقی تعلیمات نافذ کر رہی تھی اور منافقین کارنر ہو گئے تھے۔ صرف خفیہ سازشیں کرتے تھے' کھلے بندوں مسلمانوں کے خلاف ظاہر نہ ہو سکتے تھے بلکہ بظاہر وہ خائف اور سہمے ہوئے تھے۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۹۳ ایک نظر میں

یہ اس سورہ کا آخری سبق ہے' اس میں لوگوں کے اس سوال کا جواب دیا گیا ہے جو وہ قیامت کے بارے میں کرتے تھے اور قیام قیامت کے لیے مطالبے کرتے تھے بلکہ دراصل ان کو وقوع قیامت کے بارے میں شک تھا۔ جواب یہ دیا جاتا ہے کہ قیام قیامت کا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ البتہ اس کا وقت بہت دور بھی ہے اور ممکن ہے کہ وہ اچانک ہی تمہیں آلے اور تم غفلت میں ڈوبے رہو۔ اس کے بعد مناظر قیامت میں سے ایک ایسا منظر پیش کیا جاتا ہے جو وقوع قیامت کا مطالبہ کرنے والوں کے لیے ہرگز مسرت بخش نہیں ہے۔ جب ان کے چہرے جہنم میں الٹ پلٹ کئے جائیں گے اور اس وقت وہ اللہ اور رسول اللہ ؐ کی معصیت پر سخت نادم ہوں گے' جب وہ اپنے لیڈروں اور پیشواؤں کے لیے دگنا عذاب طلب کریں گے۔ یہ اس قدر شرمسار کنندہ منظر ہے کہ کوئی شتابی کرنے والا ہرگز اسے پسند نہ کرے گا۔

اب اس منظر سے ان کو واپس لاکر پھر اس دنیا میں قوم موسیٰ کی مثال ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے کہ اس قوم نے بھی موسیٰ علیہ السلام کو اذیت دی تھی اور پھر اللہ نے حضرت موسیٰ کو ان کے لگائے ہوئے الزام سے بری کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عملی واقعہ تھا۔ اشارہ اس طرف ہے کہ مدینہ میں جو لوگ حضور ؐ کے خلاف باتیں کرتے ہیں کہ حضور ؐ نے زینب کے ساتھ نکاح کر کے عربوں کے رواج کے خلاف کیا ہے۔ ایسا ہی کوئی الزام حضرت موسیٰ پر بھی تھا اور مومنین سے کہا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی معاملے میں سیدھی بات کیا کریں اور اشارہ و کنایہ میں الزمات عائد نہ کیا کریں تاکہ اللہ تمہارے اعمال و اخلاق کو درست کر دے۔ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے اور جو اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت کرے گا' اللہ ان کو بہت بڑی کامیابی عطا کرے گا۔

سورہ کا خاتمہ ایک عظیم تبصرے پر ہوتا ہے یہ کہ زمین و آسمان نے دعوت قرآنی کی امانت کی ذمہ داری اٹھانے سے انکار کر دیا لیکن انسان نے اس عظیم ذمہ داری کو قبول کر لیا تاکہ اللہ کی اسکیم پایہ تکمیل تک پہنچے۔ لوگوں کے اعمال پر جزاء و سزا مرتب ہو اور انسان اپنے لیے جو راہ اختیار کرتا ہے اس پر اس کا محاسبہ اور جزاء و سزا ہو۔

لِّيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۳۳:۷۳) ”تاکہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے اور اللہ درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے“۔

--- ooo ---

# درس نمبر ۱۹۳ تشریح آیات

## ۶۳ --- تا --- ۷۳

يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۖ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ
وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ﴿٦٣﴾

""لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کی گھڑی کب آئے گی۔ کہو اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ تمہیں کیا خبر' شاید کہ وہ قریب ہی آگئی ہو""۔

اہل مکہ مسلسل قیامت کے دن کے بارے میں رسول خداؐ سے پوچھتے رہتے تھے 'کیونکہ حضورؐ نے ان سے قیامت کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کیے تھے اور ان کو قیامت سے بہت زیادہ ڈرایا تھا۔ اور قرآن کریم نے قیامت کے مناظر اس قدر طوالت سے ذکر کیے کہ یوں نظر آنے لگا کہ شاید یہ مناظر آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اے پیغمبر' آپ سے یہ لوگ قیامت کے وقت وقوع کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ یہ جلدی واقع ہو جائے اور یہ لوگ جلدی اس لیے کر رہے تھے کہ ان کو دراصل اس کے وقوع میں شک تھا۔ یا جلدی کا مطالبہ کر کے دراصل وہ تکذیب کرنا چاہتے تھے یا قیامت کے ساتھ مزاح کرنا چاہتے تھے۔ ہر سائل کا سوال اس کی نفسیات کے اعتبار سے تھا' جس کے جو خیالات تھے اور جس کے جو اعتقادات تھے وہ اپنے اعتقاد کے مطابق سوال کرتا۔

قیام قیامت کا علم ایک ایسا غیب ہے جو خاصہ خدا ہے اور اللہ نے اپنی مخلوقات میں سے کسی کو بھی اس کی اطلاع نہیں دی' نہ رسولوں کو نہ ملائکہ مقربین کو۔ عبداللہ ابن عمر سے جو حدیث حقیقت ایمان اور حقیقت اسلام کے بارے میں وارد ہے' اس میں ہے کہ ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص نمودار ہوا' بالکل سفید لباس میں۔ بالکل اس پر سفر کے آثار میں سے کوئی علامت نہ تھی ہم میں سے کوئی اسے نہ پہچانتا تھا۔ وہ رسول اللہ کے سامنے بیٹھ گیا اور اپنے زانو حضورؐ کے زانوؤں کے ساتھ ملا دیئے۔ اپنے ہاتھ آپ کی رانوں پر رکھ دیئے اور کہا اے محمد! بتایئے اسلام کیا ہے؟ تو حضورؐ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ نماز پڑھے' زکوٰۃ دے اور رمضان کے روزے رکھے اور حج کرے اگر راستے کی طاقت ہو تو اس نے کہا :

"آپ نے سچ کہا"۔ ہم نے تعجب کیا کہ عجیب شخص ہے خود پوچھتا ہے اور خود ہی تصدیق کرتا ہے۔ پھر اس نے پوچھا ایمان کیا ہے؟ تو حضورؐ نے فرمایا: یہ کہ تو اللہ پر ایمان لائے' اس کے ملائکہ' اس کی کتابوں' اس کے رسولوں' قیامت کے دن' اور اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لے آئے"۔ تو اس نے کہا: آپ نے درست کیا۔ اس کے بعد اس نے پوچھا' پھر احسان کے معنی کیا ہیں؟ تو آپ نے فرمایا یہ کہ تو اپنے رب کی عبادت اس طرح کرے کہ تو اسے دیکھ رہا ہے' اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تو تجھے ہی دیکھ رہا ہے۔ پھر اس نے سوال کیا مجھے قیامت کے بارے میں بتایئے؟ تو آپ نے فرمایا پوچھے جانے والا پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ جبرائیل علیہ السلام تھے اور یہ تمہارے پاس آئے تمہیں تمہارا دین سکھا رہے تھے۔

مسئول عنہ رسول اللہؐ تھے اور سائل جبرئیل تھے۔ دونوں کا علم برابر تھا یعنی قیامت کے بارے میں دونوں نہ جانتے تھے۔

قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ (۳۳:۶۳) "کہو' اس کا علم اللہ ہی کو ہے"۔ اور یہ اللہ کی خصوصیت ہے اور اللہ اس کے بارے میں منفرد ہیں اور اللہ کی مخلوق میں سے کسی کو اس کا علم نہیں۔

یہ اللہ کی حکمت ہے کہ اس نے اس کا علم کسی کو نہیں دیا۔ ہماری سمجھ میں اسی قدر حکمت آتی ہے کہ لوگ اس سے ہر وقت ڈرتے رہیں اور ہر وقت اس کی توقع کرتے رہیں اور اس کے اچانک آجانے کی تیاری میں لگے رہیں۔ یہ تو ان لوگوں کے لیے ہے جن کو اللہ نے اس کے ذریعے بھلائی کی راہ کی طرف پھیر دیا اور اس کے دل میں قیامت کا ڈر پیدا کر دیا۔ رہے وہ لوگ جو اس سے غافل ہیں اور ہر وقت اس کی تیاری میں لگے نہیں رہتے تو وہ لوگ اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں اور اپنے آپ کو آگ سے نہیں بچاتے۔ ایسے لوگوں کے سامنے اللہ نے اس کے مناظر رکھے' اس سے ڈرایا اور اسے غیب قرار دیا جو رات اور دن کے کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا (۳۳:۶۳) "شاید کہ وہ قریب ہی آ لگی ہو"۔

إِنَّ اللَّهَ لَعَنَ الْكَافِرِينَ وَأَعَدَّ لَهُمْ سَعِيرًا ﴿٦٤﴾ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ لَا يَجِدُونَ
وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿٦٥﴾ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا
اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا ﴿٦٦﴾ وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا 8
السَّبِيلَا ﴿٦٧﴾ رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا ﴿٦٨﴾ ۱۰ع

"بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ اللہ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر دی ہے جس میں 5
وہ ہمیشہ رہیں گے' کوئی حامی و مددگار نہ پا سکیں گے۔ جس روز ان کے چہرے آگ پر الٹ پلٹ کیے جائیں گے اس وقت
وہ کہیں گے کہ "کاش ہم نے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی ہوتی"۔ اور کہیں گے "اے رب ہمارے' ہم نے اپنے

سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راہ راست سے بے راہ کر دیا۔ اے رب ' ان کو دوہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر"۔

یہ لوگ قیامت کے قیام کے بارے میں پوچھتے ہیں ' ذرا ان کو قیام قیامت کا ایک منظر ہی بتا دو۔

اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَ اَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا (۳۳ : ٦٤) "بے شک اللہ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر دی ہے"۔ اللہ نے کافروں کو اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور ان کے لیے دہکتی ہوئی آگ تیار کی ہے۔ وہ ان کے لیے تیار اور حاضر ہے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ (۳۳ : ٦٥) "اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔ اس قدر طویل عرصہ اس میں رہیں گے کہ اس کی طوالت کا علم اللہ ہی کو ہے۔ اس کی انتہا نہیں ہے الا یہ کہ اللہ کے علم میں ہو ' جب وہ چاہے ختم کر دے۔ ان کے ساتھ کوئی بھی معاونت کرنے والا نہ ہو گا۔ کوئی مددگار نہ ہو گا۔ لہٰذا اس آگ سے نکلنے کی کوئی امید ان کو نہ ہو گی۔

لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۳۳ : ٦٥) "کوئی حامی و مددگار وہ نہ پا سکیں گے"۔ اس عذاب میں ان کا منظر نامہ کیا ہو گا؟ نہایت ہی بری حالت اور نہایت ہی المناک صورت حال :

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ (۳۳ : ٦٦) "جس روز ان کے چہرے آگ پر الٹ پلٹ کیے جائیں گے"۔ ہر طرف سے آگ ان کو ڈھانپ رہی ہو گی۔ یہاں ان کی حرکات کی تصویر یعنی فلم بنائی جا رہی ہے اور اسے مجسم کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس طرح کہ ان کے چہروں کے ہر حصے کو آگ جھلسائے گی اور اس طرح انہیں سخت سے سخت عذاب دیا جائے گا۔

يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا (۳۳ : ٦٦) "اس وقت وہ کہیں گے اے کاش ہم نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی ہوتی"۔ یہ ان کی جانب سے بالکل بے کار تمنا ہو گی۔ کیونکہ تب اطاعت کا موقع و محل کہاں ہو گا۔ اس وقت تو کوئی موقع نہ ہو گا آزمائش کا۔ اب تو صرف حسرت ہی ہے۔ اب ان کو اپنے سرداروں اور کبراء پر سخت غصہ آئے گا ' جنہوں نے دراصل ان کو گمراہ کیا تھا ' اور وہ اب اللہ کے مطیع فرمان بننے کی سعی کریں گے مگر اب اطاعت کا موقع ہی ختم ہو گیا۔

وَ قَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا (۳۳ : ٦٧) رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَ الْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا (۳۳ : ٦٨) "اور کہیں گے اے رب ہمارے ' ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راہ راست سے بے راہ کر دیا۔ اے رب ان کو دوہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر"۔

یہ ہے قیامت کا نمونہ۔ پوچھتے کیا ہو؟ اس روز بچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ اس کے لیے تیاریاں کرو ورنہ یہ المناک انجام تمہارے سامنے ہو گا۔

حضرت زینب کے ساتھ حضورؐ کا نکاح چونکہ جاہلیت کی ایک نہایت ہی گہری رسم کے خلاف تھا اور اسلام نے اسی لیے اس پر حضور اکرمؐ کے فعل کے ذریعے ضرب کاری لگائی تھی' لیکن اس معاشرے نے درد محسوس کیے بغیر اپنے اندر سے اس رسم کا اکھاڑ پھینکنا قبول نہ کیا۔ منافقین اور مریض اخلاق کے لوگوں نے سخت غوغا آرائی شروع کر دی۔ ان کے ساتھ ہاں میں ہاں ملانے والے ایسے مسلمان بھی تھے جن کے ذہنوں میں اسلامی تصور حیات ابھی اچھی طرح نہ بیٹھا تھا۔ چنانچہ یہ عناصر طنز و تشنیع' اعتراض و تنقید کرتے تھے۔ پورے شہر میں انہوں نے کانا پھوسی شروع کر رکھی تھی اور حضور اکرمؐ کے بارے میں بری باتیں کرتے تھے۔

منافقین اور افواہیں پھیلانے والے کب خاموش رہ سکتے تھے۔ وہ کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے جس طرح غزوۂ احزاب میں انہوں نے ایک زبردست مہم شروع کر رکھی تھی۔ افک کے معاملے میں وہ اس سے قبل تجربہ کر چکے تھے۔ مال غنیمت کی تقسیم میں وہ ایسی ہی مہم چلا چکے تھے۔ غرض ہر موقع و محل میں یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اذیت کا باعث تھے اور بالکل بے جواز۔

اس دور میں جبکہ بنی قریظہ اور سارے یہودیوں کو مدینہ سے نکالا گیا تھا' مدینہ میں کوئی کافر اور مشرک نہ تھا۔ اہل مدینہ یا تو سچے مسلمان تھے اور یا منافق تھے اور اس قسم کی مہم یہ منافق ہی چلاتے تھے۔ یہ جھوٹی افواہیں پھیلاتے۔ بعض سادہ لوح مسلمانوں پر بھی ان کا اثر تھا جو ان کے ساتھ ناسمجھی کی وجہ سے شریک ہو جاتے تھے۔ اس لیے قرآن کریم نے اہل ایمان کو یہاں متنبہ کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعث اذیت نہ بنو' اس سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی مومنین نے بھی حضرت موسیٰ کو اذیت دی تھی۔ اس لیے ان منافقین کی باتوں پر بلاتحقیق و تفتیش کان نہ دھرو۔ اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کرو' تمہارے لیے یہ بڑی کامیابی ہوگی۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَى فَبَرَّأَهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا ۚ وَكَانَ عِنْدَ اللَّهِ وَجِيهًا ﴿٦٩﴾ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٧٠﴾ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴿٧١﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جنہوں نے موسیٰ کو اذیتیں دی تھیں' پھر اللہ نے ان کی بنائی ہوئی باتوں سے اس کی براءت فرمائی اور وہ اللہ کے نزدیک باعزت تھا۔ اے ایمان لانے والو' اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو۔ اللہ تمہارے اعمال درست کر دے گا اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔

قرآن کریم نے اس ایذا کا تعین نہیں کیا جو حضرت موسیٰ کو دی گئی تھی ۔ البتہ روایت میں اس کا تعین کیا گیا ہے ۔ لہذا ہم اس بات کو مجمل ہی چھوڑتے ہیں جسے قرآن کریم نے مجمل چھوڑ دیا ۔ یہاں مقصد اہل ایمان کو اس بات سے خبردار کرنا ہے کہ وہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت نہ دیں ۔ اللہ نے قرآن کریم میں بنی اسرائیل کی بدعملیوں اور بدکرداریوں کی کئی مثالیں دی ہیں ۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ کر دیا کہ انہوں نے اپنے نبی کو اذیت دی تھی ۔ لہذا مسلمانوں کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تاکہ مسلمانوں کا شعور ایسا بن جائے کہ وہ کسی معاملے میں بھی بنی اسرائیل کے مماثل نہ ہوں ۔ ان کے دلوں میں ان کی نفرت بیٹھ جائے کیونکہ یہ لوگ مجسم بدعمل ' بے راہرو ' نبی کو ہر وقت تنگ کرنے والے تھے ۔

بنی اسرائیل نے اپنے نبی پر جو الزام لگایا تھا اللہ نے ان کو اس سے بری کر دیا تھا ۔

وَكَانَ عِندَ اللَّهِ وَجِيهًا (۳۳ : ۶۹) "اور وہ اللہ کے نزدیک باعزت تھا" ۔ یعنی وہ اللہ کے نزدیک صاحب قدر و منزلت تھا ۔ اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ اپنے رسولوں کو ہر قسم کے بہتان اور الزام سے علی روس الاشہاد بری کرتا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں اس لیے اللہ ان کو بھی بری اور پاک کرتا ہے ۔

قرآن کریم اہل ایمان کو ہدایت کرتا ہے کہ کسی معاملے میں منافقین اور دشمنوں کے ساتھ اتفاق کرنے سے قبل اس کی تحقیق اور درستگی کا پتہ کرنا فرض ہے ۔ خصوصاً اپنے نبی ' مرشد اور ولی اور دوست کے بارے میں گمراہوں اور فساق و فجار کی باتوں پر کان دھرنے سے اجتناب کرنا چاہئے ۔ قرآن کریم ان کو ایک صالح بات کی ہدایت کرتا ہے جس کے نتیجے میں عمل صالح نمودار ہوتا ہے ۔ جو لوگ سچے ہوتے ہیں اللہ ان کی نگہبانی کرتا ہے اور ان کی راہنمائی اعمال خیر کی طرف کرتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ اچھی باتیں کرنے والوں اور اچھے اعمال کرنے والوں کی مغفرت فرماتا ہے اور ان کی تقصیرات کو معاف کرتا ہے کیونکہ تقصیرات سے کوئی آدمی محفوظ نہیں رہتا ۔ ان تقصیرات سے آدمی صرف مغفرت الٰہی سے نکل سکتا ہے ۔

مَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا (۳۳ : ۷۱) "جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی ۔ اطاعت الٰہی بذات خود فوز عظیم ہے ' کیونکہ اطاعت سے انسان اللہ کے نہج پر قائم ہوتا ہے ۔ اور اللہ کے طریقے پر استقامت انسان کے لیے نفع بخش ہوتی ہے ۔ اور جسے اللہ کے سیدھے طریقہ اور راستے کی طرف ہدایت ہو جائے یہ بذات خود دائمی سعادت اور نیک بختی ہے ۔ اگرچہ اس کے سوا اس کے لیے کوئی اجر و جزاء نہ ہو ۔ کیونکہ جو شخص ٹھیک ٹھیک اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھ رہا ہو ' اسے اپنا راستہ صاف نظر آ رہا ہو اور اس کے اردگرد مخلوق اسی کے ساتھ معاون ہو وہ اس شخص کی طرح نہیں ہو سکتا جسے اپنی راہ معلوم نہ ہو ' پریشان ہو ' اور اس کی راہ کے اردگرد تمام کائنات اس سے متصادم ہو اور اس کے لیے اذیت ناک ہو ۔ لہذا اللہ اور رسول کی اطاعت بذات خود احسن الجزاء ہے ۔ یہی فوز عظیم ہے ۔ یوم الحساب اور جنت نعیم سے بھی پہلے یہ کامیابی ہے ۔ اخروی کامیابی تو فضل عظیم ہے اور یہ بونس ہے جو نعمت ملے گی اور یہ فضل اللہ جسے چاہتا ہے ' دیتا ہے ۔ یہ اللہ کا فضل اس لیے ہے کہ حضرت انسان بہت ہی ضعیف ہیں ۔ اور اللہ نے انسان کے کاندھوں پر جو ذمہ داری عائد کی ہے وہ بہت ہی بھاری ہے اور انسان نے اپنی نادانی کی وجہ سے اس قدر عظیم بوجھ اپنے اوپر لیا ہے جس کے اٹھانے سے آسمان ' زمین اور پہاڑوں نے معذرت کی تھی ۔ حالانکہ اسے اپنی کمزوریاں معلوم تھیں ۔ شہوات و میلانات کا دباؤ ' علم و ہنر کا قصور ' عمر کا

اختصار اور زمان و مکان کی مشکلات اور مستقبل کے واقعات کی پیش بینی میں انسان کی کمزوری وغیرہ۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ﴿۷۲﴾

"ہم نے اس امانت کو آسمانوں' اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے' مگر انسان نے اسے اٹھا لیا' بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے"۔

زمین و آسمان اور زمین کے اندر بڑے بڑے پہاڑ' دراصل ایک عام انسان کے لیے عظیم مخلوق ہیں' جن کا یہاں قرآن نے ذکر کیا ہے اور جن کے اندر انسان رہتا ہے' ان کے مقابلے میں انسان بہت ہی ضعیف اور حقیر ہے۔ یہ مخلوقات اپنے خالق کو اچھی طرح جانتی ہے اور اللہ کے تکوینی نظام اور قانون کے مطابق چل رہی ہے۔ اللہ کے احکام کو براہ راست پاتی ہے اور ان پر عمل پیرا ہے۔ یہ اس ناموس فطرت کے مطابق چلتی ہے جو اللہ نے اس کے اندر جاری کیا ہے۔ آغاز تخلیق سے یہ کائنات یونہی' نظام قضا و قدر کے مطابق جاری و ساری ہے۔ نہ اللہ کی اطاعت سے نکلتی ہے اور نہ اللہ کے ناموس فطرت سے سرمو انحراف کرتی ہے اور نہ کر سکتی ہے۔ یہ سب مخلوق اپنا فریضہ منصبی ادا کر رہی ہے' چاہے اسے شعور ہو یا نہ ہو۔ چاہے اس کا کوئی اختیار ہو یا نہ ہو۔

یہ سورج اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے اور اس کے دورے میں کوئی خلل نہیں آتا۔ یہ چمک رہا ہے اور جہاں تک اللہ کا حکم ہو گا' کائنات کو گرم اور روشن کرتا رہے گا۔ پھر اس سورج کا کنبہ بھی اس کے دائرے کے اندر ٹھیک ٹھیک اپنے اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہے اور اپنا فریضہ منصبی ادا کر رہا ہے۔

یہ زمین اپنے مدار میں گردش کر رہی ہے۔ اس گردش کے نتیجے میں فصلیں اگتی ہیں۔ انسانوں کے رزق کا انتظام ہو رہا ہے۔ یہ مردوں کو سمیٹتی ہے۔ اس کے اندر سے چشمے پھوٹتے ہیں اور یہ سب کام سنت الٰہیہ کے مطابق ہوتا ہے بغیر زمین کے ارادہ کے۔

یہ چاند اور یہ ستارے و سیارے' یہ ہوائیں اور یہ بادل یا یہ پانی اور یہ سمندر' یہ پہاڑ اور یہ میدان سب کے سب اپنے رب کے حکم سے اور اپنے خالق کی تقدیر سے اپنے اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں اور یہ تمام اشیاء یہ فرائض بغیر جہد و مشقت کے ادا کرتی ہیں۔ یہ ارکان کائنات بار امانت نہ اٹھا سکے' ڈر گئے اور سہم گئے۔ یہ اس عظیم امانت کو نہ اٹھا سکے۔ یہ امانت کیا تھی' ذاتی ارادے اور اختیار سے اپنے فرائض کو سرانجام دینا اور اپنے اعمال اور افعال کا ذمہ دار ہونا۔ لیکن!

وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ (۳۳ : ۷۲) "مگر انسان نے اسے اٹھا لیا"۔ انسان جو اللہ کو اپنے شعور اور اپنے ادراک سے جانتا ہے' اپنے تدبر اور اپنی بصیرت سے ناموس قدرت کو معلوم کرتا ہے' اور اپنی سعی و جدوجہد سے اس ناموس کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے' وہ اپنے ارادے سے اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور بالارادہ ذمہ داریاں اٹھاتا ہے۔ اور اپنے میلانات اور خواہشات پر قابو پاتا ہے۔ اپنی زندگی کے ہر قدم پر وہ متحرک بالارادہ ہے۔ اپنی راہ کا ادراک رکھتا

ہے ۔ جان بوجھ کر اپنے لیے راہ اختیار کرتا ہے اور علی وجہ البصیرت کسی کی راہ پر چلتا ہے ۔

یہ ہے وہ عظیم امانت جو اس انسان نے اٹھائی حالانکہ انسان بہت ہی ضعیف 'کمزور اور چھوٹا اور بے طاقت تھا۔ جس طرح اس کی قوت محدود تھی اس طرح اس کی عمر بھی محدود تھی اور پھر اس ضعیف انسان پر ہر طرف سے میلانات خواہشات اور طبیعی شہوات کی افواج حملہ آور تھیں ۔

اس زاویہ سے اس ضعیف انسان نے اپنے کاندھوں پر ایک عظیم ذمہ داری اٹھائی ۔ بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔ اپنے نفس پر اس نے ظلم کیا کہ یہ بھاری بوجھ اس پر ڈالا اور اپنی قوت کی کمی سے وہ بے خبر تھا۔ لیکن جب انسان اس ذمہ داری کو پورا کرے جو اس نے اٹھائی اور جب وہ اپنی معرفت اور اپنے ادراک سے باری تعالیٰ تک پہنچ جائے تو وہ براہ راست ناموس الٰہی کی معرفت حاصل کر لیتا ہے' اور پوری طرح اپنے رب کے ارادے کا مطیع ہو جاتا ہے ۔ یہ معرفت 'یہ ہدایت اور یہ اطاعت اپنی حقیقت کے اعتبار سے اور اپنے آثار کے اعتبار سے ایک بلند مقام تک پہنچ جاتی ہے اور اس قدر خودکار طریقے سے کام کرتی ہے جس طرح آسمان اور زمین اور پہاڑ بڑی سہولت سے 'براہ راست ہدایت 'معرفت اور اطاعت پذیر ہوتے ہیں 'کیونکہ یہ تمام مخلوقات براہ راست اللہ کی معرفت حاصل کیے ہوئے ہوتی ہیں ۔ براہ راست اللہ کی ہدایت کے تحت چلتے ہیں ۔ براہ راست اطاعت کرتے ہیں اور ان کے اور باری تعالیٰ کے درمیان کوئی حائل اور کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی اور کوئی چیز ان کو اللہ کی اطاعت سے روکنے والی نہیں ہوتی' تو جب انسان بھی اس پوری کائنات کی طرح اللہ کی معرفت 'ہدایت اور اطاعت کا پابند ہو جاتا ہے تو اس وقت وہ واصل باللہ ہو جاتا ہے اور تب اللہ کی مخلوقات میں اس کا مقام منفرد ہو جاتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ارادہ 'ادراک اور اختیار اور ذمہ داری اٹھانا ہی انسان کی امتیازی خصوصیات ہیں اور انہی کی وجہ سے انسان ان مخلوقات کے اندر ایک ممتاز مقام رکھتا ہے ۔ یہی وہ کرامت اور شرف ہے جس کا اعلان اللہ نے عالم بالا میں کیا تھا کہ فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ اس انسان کے سامنے سجدہ ریز ہوں اور قرآن کے اندر یہ اعلان قیامت تک ثبت کر دیا ۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ "حقیقت یہ ہے کہ ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی" ۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی اس تکریم کی اصلی وجہ سمجھے اور اللہ نے اس کے حوالے جو امانت کی ہے اور اس نے جسے قبول کیا ہے اور جس کے اٹھانے سے آسمانوں' زمین اور پہاڑوں نے انکار کیا' اور ڈر گئے اسے اچھی طرح ادا کرے ۔ یہ امانت یا ذمہ داری اللہ نے انسان کے اوپر کیوں ڈالی؟

9 لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَ
يَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

"اس بار امانت کو اٹھانے کا لازمی نتیجہ ہے تاکہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں 'اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے 'اللہ درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے" ۔

وہ خصوصیات کیا ہیں جو انسان نے اپنے کاندھوں پر اٹھائیں ؟ یہ کہ اپنے آپ کو پہچانے ' اپنی قوت عقلیہ سے معرفت کردار حاصل کرے ۔ بذات خود عمل کرے اور خود خدا تک پہنچے ۔ یوں وہ اپنے اختیار کو صحیح استعمال کرے اور اپنے اعمال کی سزا اور جزاء کا ذمہ دار ہو ۔ اس طرح منافقین اور منافقات سزا کے مستحق ہوں ' مشرکین اور مشرکات اپنے انجام تک پہنچیں اور اللہ مومنین و مومنات کی امداد کرے اور ان سے جو تقصیرات ' کمزوریاں ' ناتوانیاں صادر ہوں ان کو معاف کرے ۔ کیونکہ انسان کی راہ میں ضعف ' کمزوری ' شہوات ' جذبات ' میلانات اور معاشرے کے تاثرات کی بے شمار رکاوٹیں ہیں اور اس کو اللہ کی رحمت اور مغفرت کی بے حد ضرورت ہے اور اللہ ہے بھی غفور و رحیم ۔

اس عظیم تبصرے اور عقل و خرد کی تاروں پر آخری اور شدید ضرب سے اس سورہ کا خاتمہ ہوتا ہے جس کا آغاز اس مضمون سے ہوا تھا کہ اے نبی تم اللہ کی اطاعت کرو اور کفار اور منافقین کی خواہشات کی پیروی نہ کرو ۔ اللہ کی وحی اور اشاروں کے مطابق کام کرو ' اللہ پر بھروسہ کرو ' اور اللہ کے سوا کسی قوت پر تکیہ نہ کرو ۔ اس کے بعد اسلامی نظام حیات کے لیے ضروری قانون سازی اور مملکت اسلامی کو عملی ہدایات دی گئی تھیں اور حکم تھا کہ اللہ کے قانون اور اللہ کی حکمت عملی پر چلو ۔

اس آخری ضرب اور تبصرے میں یہ بتایا گیا کہ جو ذمہ داری انسان پر عائد ہو ' اس کا ذرا احساس کرے ۔ یہ کس قدر عظیم ذمہ داری تھی ؟ کہ پہاڑ بھی اس کے اٹھانے سے کانپ اٹھے ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح یہ کائنات ۔۔۔ اللہ کے ناموس کی مطیع ہے انسان طوعا اللہ کے ناموس تک رسائل حاصل کر کے مطیع ہو جائے اور اللہ کی مشیت کی اطاعت کرے ۔

اس تبصرے پر سورہ ختم ہوتی ہے ۔ اس کا آغاز اور اختتام دونوں باہم متناسب پاس اور پوری سورہ اس آغاز اور اختتام کے رخ پر رواں دواں ہے ۔ نہایت توافق کے ساتھ ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی ذات کریم اس کتاب کو بھیجنے والی ہے جو اس کائنات کو چلا رہی ہے ۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ------ ۲۲

### سورۃ سبا ۔ ۳۴

آیات ۱--- تا--- ۵۴

# سورہ سبا ایک نظر میں

اس کی سورہ کے موضوعات عقائد سے متعلق ہیں۔ اللہ وحدہ لاشریک ہے' وحی پر ایمان' بعث بعد الموت کا عقیدہ اور اسلامی نظریہ حیات کے بارے میں بعض اہم اقدار کی تصحیح۔ یہ کہ ایمان اور عمل صالح ذریعہ نجات ہے۔ مال اور اولاد ذریعہ نجات نہیں ہے۔ اللہ کے نزدیک جزاء و سزا کا مدار ایمان و عمل پر ہے۔ اللہ اگر پکڑنا چاہے تو اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ اور اللہ کے ہاں کوئی سفارش نہیں ہو سکتی الا یہ وہ اجازت دے۔

اس سورہ میں بعث بعد الموت اور جزاء و سزا کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور یہ کہ اللہ کا علم محیط ہے' عام ہے اور بہت گہرا اور پیچیدہ اور نہایت دقیق ہے۔ اس سورہ میں مختلف اسالیب سے ان دونوں موضوعات کو بار بار لایا گیا ہے اور ابتداء سے انتہاء تک اس سورہ کی فضا یہی ہے۔

بعث بعد الموت کے بارے میں ہے

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۳۴ : ۳) "منکرین حق کہتے ہیں کہ کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آتی؟ کہو میرے پروردگار عالم الغیب کی قسم وہ تم پر آکر رہے گی اللہ سے ایک ذرے کے برابر چیز بھی پوشیدہ نہیں نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں بلکہ اس کے ہاں چھوٹی اور بڑی ہر چیز کھلی کتاب میں موجود ہے"۔

سزا و جزا کے بارے میں کہا گیا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (۳۴ : ۷) اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ (۳۴ : ۸) "منکرین لوگوں سے کہتے ہیں "ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ جب تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہو گا' اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیئے جاؤ گے؟ نہ معلوم یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گھڑتا ہے یا اسے جنوں لاحق ہے"۔ نہیں بلکہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں اور بری طرح بہکے ہوئے ہیں"۔ اور دوسری جگہ ہے :

لِّيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (٣٤: ٤) وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّن رِّجْزٍ أَلِيمٌ (٣٤: ٥) "اور یہ قیامت اس لیے آئے گی کہ جزا دے اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے رہے ہیں' ان کے لیے مغفرت ہے اور رزق کریم ہے اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے زور لگایا ہے' ان کے لیے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے"۔

اس سورہ میں متعدد مناظر قیامت دکھائے گئے ہیں۔ ان میں قیامت کے منکرین کو سخت سرزنش کی گئی ہے اور عذاب کی ایسی صورتیں پیش کی گئی ہیں جن کی وہ تکذیب کرتے تھے یا ان کے واقعہ ہونے میں شک کرتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن نُّؤْمِنَ بِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ مَوْقُوفُونَ عِندَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْلَ يَقُولُ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَا أَنتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ (٣٤: ٣١) قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا أَنَحْنُ صَدَدْنَاكُمْ عَنِ الْهُدَىٰ بَعْدَ إِذْ جَاءَكُم بَلْ كُنتُم مُّجْرِمِينَ (٣٤: ٣٢) وَقَالَ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا بَلْ مَكْرُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُونَنَا أَن نَّكْفُرَ بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُ أَندَادًا وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ وَجَعَلْنَا الْأَغْلَالَ فِي أَعْنَاقِ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (٣٤: ٣٣) "کافروں نے کہا کہ ہم نہ تو قرآن کو مانیں نہ اس سے پہلے کی کتابوں کو کاش تم دیکھو ان کا حال' اس وقت جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے۔ اس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔ وہ بڑے بننے والے ان دبے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے: "کیا ہم نے تمہیں اس ہدایت سے روکا تھا جو تمہارے پاس آئی تھی؟ نہیں' بلکہ تم خود مجرم تھے؟ وہ دبے ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے "نہیں' بلکہ شب و روز کی مکاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہرائیں"۔ آخر کار جب یہ لوگ عذاب دیکھیں تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے اور ہم ان منکرین کے گلوں میں طوق ڈالیں گے۔ کیا لوگوں کو اس کے سوا اور کوئی بدلہ دیا جا سکتا ہے۔ جیسے اعمال ان کے تھے' ویسے ہی جزاء وہ پائیں گے؟"

یہ مناظر اس سورہ میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں اور بار بار آتے ہیں اور خاتمہ یوں ہوتا ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓی اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّکَانٍ قَرِیْبٍ (۳۴:۵۱) وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِہٖ وَاَنّٰی لَہُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّکَانٍ بَعِیْدٍ (۳۴:۵۲) وَّقَدْ کَفَرُوْا بِہٖ مِنْ قَبْلُ وَیَقْذِفُوْنَ بِالْغَیْبِ مِنْ مَّکَانٍ بَعِیْدٍ (۳۴:۵۳) وَحِیْلَ بَیْنَہُمْ وَبَیْنَ مَا یَشْتَہُوْنَ کَمَا فُعِلَ بِاَشْیَاعِہِمْ مِّنْ قَبْلُ اِنَّہُمْ کَانُوْا فِیْ شَکٍّ مُّرِیْبٍ (۳۴:۵۴) "کاش تم دیکھو انہیں اس وقت جب یہ لوگ گھبرائے پھر رہے ہوں گے اور کہیں بچ کر نہ جا سکیں گے ' بلکہ قریب ہی سے پکڑ لیے جائیں گے ۔ اس وقت یہ کہیں گے کہ ہم اس پر ایمان لائے حالانکہ اب دور نکلی ہوئی چیز کب ہاتھ آ سکتی ہے ۔ اس سے پہلے یہ کفر کر چکے تھے اور بلاتحقیق دور دور کی کوڑیاں لایا کرتے تھے ۔ اس وقت جس چیز کی یہ تمنا کر رہے ہوں گے اس سے محروم کر دیئے جائیں گے جس طرح ان کے ہم مشرب پیش رو محروم ہو چکے ہوں گے ۔ یہ بڑے گمراہ کن شک میں پڑے ہوئے ہیں"۔

سورہ کے آغاز میں اللہ کے علم محیط اور شامل کے متعلق کہا گیا ہے۔

یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْہَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْہَا وَہُوَ الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ (۳۴:۲) "جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے ہر چیز کو وہ جانتا ہے"۔

اور قیامت کے منکرین پر جگہ جگہ تبصرے ہوتے ہیں کہ قیامت آئے گی۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَاْتِیْنَا السَّاعَۃُ قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتَاْتِیَنَّکُمْ عٰلِمِ الْغَیْبِ لَا یَعْزُبُ عَنْہُ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْبَرُ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (۳۴:۳) "منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے قیامت ہم پر آکیوں نہیں جاتی ' کہو قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی ' وہ تم پر آ کر رہے گی ۔ اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہے ' نہ زمین میں ' نہ ذرے سے بڑی نہ اس سے چھوٹی ' سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے"۔

اور سورہ کے خاتمہ کے قریب آتا ہے۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا یُعِیْدُ (۳۴:۴۹) "منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے قیامت ہم آکیوں نہیں جاتی ۔ کہو ' میرا رب حق کا القاء کرتا ہے ۔ وہ تمام پوشیدہ حقیقتوں کا جاننے والا ہے"۔

توحید کے مضمون کا آغاز اللہ کی حمد و ثنا سے ہوتا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَہُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَۃِ وَہُوَ الْحَکِیْمُ الْخَبِیْرُ (۳۴:۱) "حمد اس خدا کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے اور

آخرت میں بھی اس کے لیے حمد ہے ۔وہ دانا اور خبیر ہے"۔اور مشرکین کو ان کے بنائے ہوئے الہوں کے بارے میں بار بار چیلنج دیا جاتا ہے ۔ جن کو وہ پکارتے ہیں ۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِن شِرْكٍ وَمَا لَهُ مِنْهُم مِّن ظَهِيرٍ ( ۳۴ : ۲۲ ) "ان سے کہو کہ پکارو اپنے ان معبودوں کو جنہیں تم اللہ کے سوا اپنا معبود سمجھے بیٹھے ہو ۔وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرہ برابر چیز کے مالک ہیں، نہ زمین میں ۔وہ آسمان و زمین کی ملکیت میں شریک بھی نہیں ہیں ۔ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار بھی نہیں ہے"۔

قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں اشارتاً کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ ملائکہ اور جنوں کی بندگی کرتے ہیں ۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَائِكَةِ أَهَٰؤُلَاءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ ( ۳۴ : ۴۰ ) قَالُوا سُبْحَانَكَ أَنتَ وَلِيُّنَا مِن دُونِهِم بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ أَكْثَرُهُم بِهِم مُّؤْمِنُونَ ( ۳۴ : ۴۱ ) "اور جس دن وہ تمام انسانوں کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے پوچھے گا کہ یہ لوگ تمہاری ہی عبادت کرتے تھے ؟ تو وہ جواب دیں گے، پاک ہے آپ کی ذات ۔ہمارے ولی تو آپ ہیں نہ یہ لوگ، دراصل یہ ہماری نہیں جنوں کی عبادت کرتے تھے ۔ان میں سے اکثر انہی پر ایمان لائے ہوئے تھے ۔

اور اس بات کی تردید کر دی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ بعض مشرکین کا یہ عقیدہ غلط ہے کہ ملائکہ اللہ کے ہاں ان کی کوئی سفارش کریں گے ۔

وَلَا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ عِندَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ حَتَّىٰ إِذَا فُزِّعَ عَن قُلُوبِهِمْ قَالُوا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ( ۳۴ : ۲۳ ) "اور اللہ کے حضور کوئی شفاعت بھی کسی کے لیے نافع نہیں ہو سکتی ۔بجز اس شخص کے جس کے لیے اللہ نے سفارش کی اجازت دی ہو ۔حتیٰ کہ جب لوگوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو گی تو وہ پوچھیں گے کہ تمہارے رب نے کیا کہا ۔وہ کہیں گے ٹھیک جواب ملا ہے اور وہ بزرگ و برتر ہے ۔

جنوں کی عبادت کی تردید کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام کا قصہ لایا جاتا ہے کہ وہ پوری طرح ان کے زیر کنٹرول تھے اور ان کو پتہ ہی نہ چلا کہ حضرت فوت ہو گئے ہیں ۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ( ۳۴ : ۱۴ ) "پھر جب سلیمان پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز اس

گھن کے سوا نہ تھی جو اس عصا کو کھا رہا تھا۔ اس طرح جب سلیمان گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے"۔

اور اس رسالت کے بارے میں آتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَوْ تَرٰى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَاۤ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ (٣٤ : ٣١) "اور کافر کہتے ہیں کہ ہم ہرگز اس قرآن کو نہ مانیں گے اور نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو تسلیم کریں گے کاش دیکھو ان کا حال اس وقت جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے اس وقت کمزور متکبرین سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔" اور دوسری جگہ ہے۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكٌ مُّفْتَرًى وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (٣٤ : ٤٣) "اور ان لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو ان معبودوں سے برگشتہ کر دے جن کی عبادت تمہارے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔ اور یہ قرآن محض ایک جھوٹ گھڑ لایا ہے۔ ان کافروں کے سامنے جب حق آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو صریح جادو ہے"۔

اس کی تردید یوں کی جاتی ہے کہ یہ قرآن وحی من جانب اللہ ہے۔

وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ وَيَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (٣٤ : ٦) "اے نبی علم رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ سراسر حق ہے اور خدائے عزیز و حمید کا راستہ دکھاتا ہے"۔ اور دوسری جگہ ہے:

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (٣٤ : ٢٨) "اور ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں"۔

اقدار حیات کے سلسلے میں آتا ہے:

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (٣٤ : ٣٤) وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ وَ لٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ
(۳۴:۳۶) وَ مَآ اَمْوَالُکُمْ وَ لَآ اَوْلَادُکُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُکُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَ
عَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَ هُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ
(۳۴:۳۷) وَ الَّذِیْنَ یَسْعَوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِکَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ

(۳۴:۳۸) "کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو' اور اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو اس کو ہم نہیں مانتے' انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال اور اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں"۔ اے نبی' ان سے کہو "میرا رب جسے چاہتا ہے' کشادہ رزق دیتا ہے یا نپا تلا عطا کرتا ہے۔ مگر اکثر لوگ اس کی حقیقت نہیں جانتے"۔ یہ تمہاری دولت اور تمہاری اولاد نہیں ہے جو تمہیں ہم سے قریب کرتی ہو۔ ہاں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے' یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے عمل کی دہری جزاء ہے اور وہ بلند و بالا عمارتوں میں اطمینان سے رہیں گے۔ رہے وہ لوگ جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں تو وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے"۔

اور اس مضمون پر بعض تاریخی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ آل داؤد کا قصہ پیش کیا جاتا ہے جو اللہ کی نعمتوں پر شکر کرنے والے تھے اور اہل سبا کا قصہ پیش کیا جاتا ہے۔ جو دولت کی وجہ سے سرکش ہو گئے تھے اور دونوں کا جو انجام ہوا وہ بھی پیش کیا گیا ہے اور ان دو مثالوں میں مدعا کی پوری تصدیق ہے۔

---ooo---

یہ مسائل جن پر اکثر مکی سورتیں بحث کرتی ہیں' ان کو مختلف سورتوں میں پیش کیا جاتا ہے اور ہر سورہ میں ایک مستقل تکوینی پس منظر میں ان موضوعات کو پیش کیا جاتا ہے۔ ہر بار نئے دلائل کے ساتھ اور ہر بار دل پر ان کا ایک نیا اثر مرتب ہوتا ہے۔ سورہ سبا میں بھی ان مسائل کو اسی طرح کائناتی پس منظر میں لایا گیا ہے۔ اس معلوم کائنات کے وسیع پس منظر میں اور اس سے بھی وسیع تر عالم غیب کے میدان میں جو ابھی تک نامعلوم ہے۔ پھر ان حقائق کو حشر کے میدان کے زبردست مناظر کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور پھر خود انسان کی شخصیت کی گہرائیوں میں اور انسانی تاریخ کے صفحات میں اور جس پس منظر میں بھی ان حقائق کو قرآن پیش کرتا ہے ہر مرتبہ ایک نیا تاثر قائم کرتا ہے اور انسان کے لئے غفلت سے جاگنے کا سبب بنتا ہے۔

سورہ کے آغاز ہی سے اس کائنات کی عظیم نشانیوں کو وحدت کردگار کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کائنات کے صفحات کو پیش کیا جاتا۔ اس کے اندر جو نشانیاں ہیں انہیں پیش کیا جاتا ہے اور ان سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ اللہ کا علم بہت ہی گہرا' دقیق اور محیط ہے۔

یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَ مَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعْرُجُ فِیْهَا

هُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ (٣٤ : ٢) "جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے اور وہ رحیم و غفور ہے ۔" اور دوسری جگہ ۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (٣٤ : ٣) "منکرین حق کہتے ہیں کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آرہی ہے ۔کہو "قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی وہ تم پر آکر رہے گی ۔ اس سے ذرا برابر کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں' نہ ذرے سے بڑی اور نہ اس سے چھوٹی سب ایک نمایاں دفتر میں درج ہے" ۔

اور جو لوگ آخرت کی تکذیب کرتے ہیں ان کو عظیم کائناتی حادثات کی دھمکی دی جاتی ہے ۔

اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ (٣٤ : ٩) "کیا انہوں نے کبھی آسمان اور زمین کو نہیں دیکھا جو انہیں آگے اور پیچھے سے گھیرے ہوئے ہے؟ ہم چاہیں تو انہیں زمین میں دھنسا دیں یا آسمان کے کچھ ٹکڑے ان پر گرا دیں ۔ درحقیقت اس میں ایک نشانی ہے ہر اس بندے کے لیے جو خدا کی طرف رجوع کرنے والا ہو" ۔

اور جو لوگ اللہ کے سوا اوروں کی پوجا کرتے ہیں ملائکہ کی یا جنوں کی' ان کو عالم غیب کے حقائق کے سامنے پیش کیا جاتا ہے ۔یہ ملا اعلیٰ کا ایک خوفناک منظر ہے ۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (٣٤ : ٢٣) "اور اللہ کے ہاں کوئی شفاعت کسی کے لیے نافع نہیں ہو سکتی بجز اس شخص کے جس کے لیے اللہ نے سفارش کی اجازت دی ہو' حتیٰ کہ جب لوگوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوگی تو وہ پوچھیں گے کہ تمہارے رب نے کیا جواب دیا' وہ کہیں گے کہ ٹھیک جواب ملا ہے اور وہ بزرگ و برتر ہے" ۔

اور دشمنوں کے لیے ان کو حشر کے میدان میں پیش کیا جاتا ہے جہاں کوئی شک و شبہ نہ ہوگا اور نہ کوئی بات کی گنجائش ہوگی؟

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ (٣٤ : ٤٠) "اور جس دن وہ تمام انسانوں کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا کیا یہ لوگ

تمہاری ہی عبادت کیا کرتے تھے؟" تو وہ جواب دیں گے پاک ہے آپ کی ذات ہمارا تعلق تو آپ سے ہے نہ ان سے ' دراصل یہ ہماری نہیں بلکہ جنوں کی عبادت کرتے تھے"۔

اور رسول اللہ کو جھٹلانے والے ' جو یہ کہتے ہیں کہ آپ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں ' یا یہ کہ آپ مجنون ہیں ' ان کو بھی لا کر ان کی فطرت کی عدالت میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے دل کی عدالت میں ان کو پیش کیا جاتا ہے جہاں کوئی جھوٹی اور مصنوعی شہادت پیش ہوتی۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ (۳۴ : ۴۶) "اے نبیؐ ان سے کہو کہ "میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں ' خدا کے لیے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو ' تمہارے صاحب میں آخر کون سی بات ہے جو جنوں کی ہو؟ وہ تو ایک سخت عذاب سے پہلے تم کو متنبہ کرنے والا ہے"۔

یوں یہ سورہ انسانی عقل و خرد کو لے کر ان مختلف میدانوں کی سیر کراتی ہے ' مختلف دلائل اور اشارات سے دوچار کرتی ہے اور آخرت کے ہولناک مناظر کی سیر بھی کراتی ہے۔

اس سورہ کو اپنے ان مضامین ' دلائل اور اشارات کے اعتبار سے ہم پانچ چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ پانچ حصوں میں بھی ہم اسے محض آسان تفسیر کے لیے تقسیم کرتے ہیں ورنہ پوری سورہ ایک مسلسل مضمون ہے۔ یہی اس سورہ کی خصوصیت ہے۔

سورہ کا آغاز اللہ کی حمد سے ہوتا ہے جو زمین و آسمان کا مالک اور دنیا و آخرت میں محمود ہے۔ اور اس کا علم محیط ہے۔ اوپر سے نیچے آنے والی چیزوں اور نیچے سے اوپر جانے والی ہر چیز پر محیط ہے۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ قیامت کس طرح برپا ہوگی اور انسانوں کے ذرے ذرے کو اللہ کس طرح جمع کرے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا علم ذرے ذرے پر محیط ہے۔ اللہ سب کو جمع کرے گا اور جزاء و سزا دے گا۔ خصوصاً ان لوگوں کو سزا دے گا جو اللہ کی اس دعوت کو مٹانا چاہتے ہیں۔ جو لوگ اہل علم ہیں اور فطرت سلیم رکھتے ہیں ' وہ قیام قیامت کو حق سمجھتے ہیں اور جو لوگ اس پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں وہ دراصل راہ حق سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ ایسے لوگوں کا علاج تو یہ ہے کہ ان پر آسمان کا کوئی حصہ گرا دیا جائے۔

دوسرے حصے میں آل داؤد کے احوال ہیں جنہوں نے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا کیونکہ اللہ نے اکثر کائناتی قوتوں کو ان کے لیے مسخر کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مغرور اور سرکش نہ بنے اور ان مسخر کردہ قوتوں میں سے جنوں کی قوت بھی تھی جن کو بے وقوف عرب پوجتے ہیں اور ان سے غیبی باتیں معلوم کرتے ہیں۔ حالانکہ جنوں کو بھی غیب کا علم نہیں ہوا۔ یہ تو خود سلیمان علیہ السلام کے لیے مشقت کرتے رہے۔ وہ مر بھی گئے ان کو علم نہ ہوا۔ یہ راز تو تب کھلا جب ان کے عصا کو گھن نے کھا لیا اور سلیمان کے شکر الہی کے مقابلے میں قوم سبا کی ناشکری اور سرکشی ' کا قصہ۔ ان کو بھی اللہ نے نعمتوں سے نوازا تھا۔ اس ناشکری کی وجہ سے۔

فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (۳۴ : ۱۹) "ہم نے ان کو داستان سابقہ بنا دیا

اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا"۔ کیونکہ یہ شیطان کے پیرو ہو گئے تھے۔ حالانکہ شیطان کا ان پر کوئی جبر نہ تھا۔ یہ خوشی سے شیطان کے پیرو ہو گئے تھے۔

اور تیسرا سبق اس چیلنج سے شروع ہوتا ہے جو مشرکین کو دیا گیا ہے کہ وہ ذرا ان الہوں کو بلائیں جن کو وہ الٰہ سمجھتے ہیں حالانکہ وہ قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَمَا لَهُ مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيرٍ (۳۴: ۲۲) "کہو کہ پکار دیکھو اپنے ان معبودوں کو جنہیں تم اللہ کے سوا اپنا معبود سمجھے بیٹھے ہو۔ وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرہ برابر چیز کے مالک ہیں اور نہ زمین میں، وہ زمین و آسمان کی ملکیت میں شریک بھی نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار بھی نہیں ہے"۔ ان کو اللہ کے ہاں سفارش کا بھی کوئی اختیار نہیں ہے اگرچہ وہ ملائکہ ہوں۔ کیونکہ ملائکہ تو نہایت عاجزی سے احکام لیتے ہیں اور وہ اس وقت تک بات نہیں کرتے جب تک ان پر سے خوف دور نہیں ہو جاتا۔ ان سے پوچھا جاتا ہے کہ آسمان و زمین میں سے ان کو کوئی رزق دیتا ہے جبکہ مالک اُن کا اللہ ہے اور وہی ان کو رزق دیتا ہے۔ بہرحال معاملہ اللہ کے حوالے ہے، وہی قیامت کے دن وہ فیصلہ کرے گا۔ سبق کا خاتمہ بھی اس تحدی پر ہوتا ہے جو شرک کرتے ہیں کہ وہ اس سے باز آ جائیں۔ معبود تو صرف ایک ہے جو اللہ عزیز و حکیم ہے۔

چوتھے سبق کا موضوع وحی و رسالت ہے۔ اس کے متعلق مشرکین کے موقف پر بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح یہ بتایا گیا کہ مشرکین کے مالدار لوگ یہ کہتے تھے کہ منصب رسالت کے ہم مستحق ہیں، جواب آتا ہے کہ مال اور اولاد اسلام میں معیار مطلوب نہیں ہے۔ جزاء و سزا میں امارت اور غربت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ایمان اور عمل پر دارومدار ہے۔ اولاد اور مال پر نہیں ہے۔ اس سبق میں مکذبین کا انجام انسانی تاریخ سے بھی پیش کیا گیا ہے اور مناظر قیامت میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ جہاں اطاعت کرنے والے غریب امراء لیڈروں سے براءت کا اظہار کریں گے جیسا کہ ملائکہ گمراہوں اور مشرکین کی عبادت سے انکار کریں گے۔ اس کے بعد لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے دل میں اور اپنی فطری منطق کے ذریعے غور و فکر کریں کہ آخر دعوت اسلامی میں کیا نقص ہے اور داعی اسلام میں کیا چیز ہے کہ تم تکذیب کرتے ہو۔ وہ تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ یہ جھوٹا اور مجنون نہیں ہے۔ پھر قیامت کا ایک منظر، اور آخر میں ایک زبردست تبصرہ۔

قُلْ إِنَّ رَبِّي يَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَّامُ الْغُيُوبِ (۳۴: ۴۸) قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ (۳۴: ۴۹) قُلْ إِنْ ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي وَإِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوحِي إِلَيَّ رَبِّي إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ (۳۴: ۵۰) "ان سے کہو میرا رب مجھ پر حق کا القاء کرتا ہے اور وہ تمام پوشیدہ حقیقتوں کا جاننے والا ہے۔ کہو "حق آ گیا اور اب باطل کے لیے کچھ نہیں ہو سکتا"۔ کہو "اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں تو میری گمراہی کا وبال مجھ پر ہے۔ اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو اس وحی کی بنا پر ہوں جو میرا رب میرے اوپر نازل کرتا ہے۔ وہ سب کچھ سنتا ہے اور قریب ہی ہے"۔

اور سورہ اور اس سبق کا خاتمہ قیامت کے ایک مختصر منظر پر ہوتا ہے جس کے اندر حرکات مختصر مگر بہت ہی قوی اور سخت ہیں۔ اب آیات کی تشریح۔

# درس نمبر ۱۹۴ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۹

---

سُورَةُ سَبَا ٣٤ — مَكِّيَّةٌ ٥٨ — اٰيَاتُهَا ٥٤ — رُكُوعَاتُهَا ٦

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِی
الْاٰخِرَةِ ؕ وَ هُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ۝١ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَ مَا یَخْرُجُ
مِنْهَا وَ مَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَ هُوَ الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ ۝٢

"حمد اس خدا کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے اور آخرت میں بھی اسی کے لیے حمد ہے۔ وہ دانا اور باخبر ہے۔ جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے، ہر چیز کو وہ جانتا ہے، وہ رحیم اور غفور ہے"۔

یہ اس سورہ کا آغاز ہے جس میں مشرکین کے شرک، ان کی جانب سے رسول اللہ کی تکذیب، آخرت میں تشکیک اور ان کی طرف سے بعث بعد الموت کو مستبعد سمجھنے کے موضوعات پر کلام کیا گیا ہے۔ آغاز ان کلمات کے ساتھ ہے کہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ جو بذات خود محمود ہے اگرچہ مخلوقات میں سے کوئی بھی اس کی تعریف نہ کرے۔ وہ اس پوری کائنات میں محمود ہے اور اس کائنات کی پوری قوتیں اور مخلوقات اللہ کی حمد کرتی ہیں اگرچہ یہ انسان اس کی حمد نہ کرے۔

حمد کے ساتھ اللہ کی اس صفت کا ذکر ہے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔ اللہ کے ساتھ کسی کا کوئی حق نہیں ہے۔ نہ زمین اور آسمانوں میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک ہے۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے اور یہ اسلامی نظریہ حیات کا پہلا اور اساسی نکتہ ہے۔ اس طویل و عریض کائنات کا مالک اللہ ہے اور اس کے سوا کوئی شریک نہیں ہے۔

وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ (٣٤ : ١) "اور آخرت میں بھی اسی کے لیے حمد ہے"۔ یعنی اللہ اپنی ذات

میں محمود ہے اور بندوں کی طرف سے کی جانے والی حمد بھی اسی کے لیے ہے۔ غرض وہ لوگ جو اللہ کا انکار کرتے ہیں یا اس کے ساتھ کسی کو شریک کرتے ہیں ان کی طرف سے بھی حمد اللہ ہی کے لیے ہے اور وہی اس کا مستحق ہے اور ان پر یہ بات آخرت میں منکشف ہوگی۔

وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ (۳۴ : ۱) "وہ دانا اور باخبر ہے"۔ وہ ایسا حکیم ہے کہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے۔ وہ زمین اور آسمان کو بھی حکمت سے چلاتا ہے۔ اس کائنات کی تدبیر نہایت حکمت سے کرتا ہے۔ وہ ہر چیز سے خبردار ہے، ہر معاملے کا اسے علم ہے اور اس کا علم بہت گہرا، شامل اور محیط ہے۔ اللہ کے علم کو اگر دیکھنا ہے تو اس کی مثال کے لئے اس کی کتاب علم کا ایک صفحہ ملاحظہ ہو۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا

(۳۴ : ۲) "جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے، ہر چیز کو وہ جانتا ہے"۔ یہ چند الفاظ ہیں ذرا ان پر غور کرو کس قدر تعداد زمین کے اندر جاتی ہے کس قدر اس سے نکلتی ہے کس قدر تعداد کا آسمانوں سے نزول ہوتا ہے اور کس قدر اشیاء کا عروج ہوتا ہے۔ مختلف حرکات، مختلف شکلوں، مختلف صورتوں، مختلف تصورات اور مختلف ہیئات ہیں۔ اس قدر کثیر کہ خیال ان کو اپنے دائرے میں نہیں لے سکتا۔

اگر تمام اہل زمین ایک سیکنڈ میں ہونے والے مذکورہ اعمال کا احاطہ کرنا چاہیں تو شمار نہ کر سکیں۔ اگرچہ پوری زندگی اس کام میں لگا دیں۔ یقیناً وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ لاتعداد اشیا اس ایک لحظہ میں زمین میں داخل ہوتی اور نکلتی ہیں اور آسمان سے لاتعداد اشیاء کا نزول و عروج ہوتا ہے۔ کس قدر بیج زمین میں گرتے ہیں اور کس قدر کونپلیں نکلتی ہیں، کتنے ہی حشرات داخل ہوتے اور نکلتے ہیں۔ کس قدر اجرام اور حیوانات، کس قدر پانی کے قطرے اور کس قدر گیس کے ذرات اور کس قدر کہربائی ذرات زمین کے اطراف میں داخل ہوتے ہیں اور کس قدر دوسری اشیاء داخل و خارج ہوتی ہیں۔ اللہ کی آنکھ ان کو دیکھ رہی ہے اور شمار کر رہی ہے۔

ذرا نباتات ہی کو دیکھئے! ذرا چشموں کو دیکھئے، ذرا آتش فشاں پہاڑوں کو دیکھئے، ذرا دوسری گیسوں کو دیکھئے اور یہ دیکھئے کہ کس قدر مستور خزانے ہیں اور ذرا حشرات الارض کو دیکھئے جو نظر آتے ہیں اور جو خوردبینوں سے بھی نظر نہیں آتے۔ بعض کے بارے میں انسان نے علم حاصل کر لیا ہے اور لاتعداد ابھی تک نامعلوم ہیں۔

آسمانوں سے نازل ہونے والے بارش کے قطروں کا شمار کر سکتے ہو! شہاب ثاقب تو قطرے نہیں ان کی تعداد معلوم ہے۔ سورج سے کسی بھی لمبے شعاعیں نکلتی ہیں۔ کس قدر جلانے والی، کس قدر روشنی کرنے والی، کس قدر فیصلے نافذ ہو رہے ہیں اور کس قدر ابھی تک چھپے ہوئے ہیں۔ کس قدر رحمتیں ہیں جو عوام الناس پر ہیں اور کس قدر ہیں جو بعض بندوں پر نافذ ہونے والی ہیں۔ کس قدر رزق ہے جو تقسیم ہوتا ہے اور کس قدر رزق ہے جو روک لیا جاتا ہے اور کیا کچھ ہے جو صرف اللہ کے علم میں ہے۔

کتنے نفوس اور کتنے سانس ہیں جو آسمانوں کی طرف بلند ہوتے ہیں، نباتات کے، حیوانات کے جراثیم کے اور دوسری مخلوقات کے اور کتنی ہی دعوتیں ہیں جو اللہ کی طرف سے دی جا رہی ہیں، اعلانیہ ہیں یا چھپی ہوئی ہیں اور کوئی

ان کو نہیں سنتا مگر اللہ!

کس قدر روحیں ہیں جن کو ہم جانتے ہیں یا نہیں جانتے ۔ یہ اللہ کی طرف اٹھتی ہیں اور کتنے ہی فرشتے ہیں جو ہر روز اللہ کے ہاں واپس ہوتے ہیں اور کتنی روحیں اس کائنات میں ہیں جنہیں صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

سمندر سے بخارات کے کس قدر ذرے اور گیس کے دوسرے ذرات اٹھتے ہیں' جن کا علم صرف اللہ کو ہے ۔ یہ تمام اشیاء صرف ایک ہی لمحہ میں یہ عمل کرتی ہیں ۔ یہ ایک لمحے کی بات ہے جس کا شمار سب انسان پوری زندگی لگا کر بھی نہیں کر سکتے ۔ اگرچہ وہ عمریں صرف کر دیں جبکہ اللہ کا علم شامل اور محیط ہے۔ ہر لمحے اور ہر زمانے اور ہر جگہ کے ان واقعات کا اس کے ہاں حساب و کتاب ہے بلکہ وہ انسان کی حرکات و سکنات اور خیالات و وساوس کا بھی حساب کرتا ہے لیکن وہ ستار ہے اور انسان کی کمزوریوں کو چھپاتا ہے ۔

وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ (۳۴ : ۲) وہ رحیم و غفور ہے"۔

قرآن کریم کی آیات میں سے ایسی ایک ایک آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ قرآن انسانی کلام نہیں ہے ۔ انسانی عقل کا مزاج یہ ہے کہ وہ اس قدر گہرا تصور پیش ہی نہیں کر سکتی جس کی انتہاؤں تک وہ خود نہ جا سکے ۔ انسانی تخیل میں ایسے عمومی اور جامع خیالات آ ہی نہیں سکتے ۔ اور اس قسم کے جوامع الکلم جس کے اندر اس قدر مفہومات و مدلولات آ جائیں جن کا احاطہ ممکن نہ ہو ۔ انسانی کلام میں نہیں ہوتے کیونکہ انسانی کلام انسانی عقل کا نتیجہ ہوتا ہے اور انسانی عقل کے مزاج کے یہ بات خلاف ہے ۔ اس قسم کی آیات بندوں کے کلام سے مختلف ہیں ۔

اللہ کے علم کی اس جامعیت اور اللہ کے شماریات کے محیط ہونے کے ثبوت اور معجزانہ بیان کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اہل کفر قیامت کا انکار کرتے ہیں جبکہ خود ان کا علم اس قدر محدود ہے کہ وہ کل کے بارے میں نہیں جانتے کہ کیا ہو گا ۔ جبکہ اللہ علیم و بصیر ہے ۔ زمین اور آسمانوں میں کوئی شے بھی اس کے علم سے باہر نہیں ہے اور قیامت اس لیے ضروری ہے کہ نیک اور بد دونوں کو اپنے کیے کا انجام ملے ۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝

"منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آرہی ہے! کہو "قسم ہے عالم الغیب پروردگار کی' وہ تم پر آکر رہے گی ۔ اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں ۔ نہ ذرے سے بڑی اور نہ اس

سے چھوٹی ـ سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے" ـ اور یہ قیامت اس لیے آئے گی کہ جزا دے اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے رہے ہیں ـ ان کے لیے مغفرت ہے اور رزق کریم اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے زور لگایا ہے' ان کے لیے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے ـ

کافروں کی جانب سے آخرت کا انکار اس وجہ سے تھا کہ وہ تخلیق انسانیت میں پنہاں حکمت الٰہیہ اور تقدیر الٰہی کا ادراک نہ کر سکے ـ اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کو شتر بے مہار کی طرح نہ چھوڑ دیا جائے کہ جو اچھائی کرے اس کی بھی مرضی ہے اور جو برائی کرے اس کی بھی مرضی ہے ـ نہ محسن کو جزاء ملے اور نہ بدکار کو سزا ملے ـ اللہ نے اپنے رسولوں کی زبانی لوگوں کو متنبہ کر دیا تھا کہ جزاء کا ایک حصہ آخرت کے لیے باقی رہتا ہے اور سزا کا ایک حصہ بھی آخرت کے لیے چھوڑا جاتا ہے ـ لہٰذا جن لوگوں کو حکمت تخلیق کا ادراک ہو جائے وہ جان لیتے ہیں کہ اللہ کی اسکیم کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ آخرت برپا ہو' تاکہ اللہ کا وعدہ پورا ہو اور اللہ کی اطلاع سچی ہو ـ کفار کی نظروں سے بس یہی حکمت اوجھل ہوتی ہے ـ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتے تھے ـ

لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ (۳۴ : ۳) "قیامت ہم پر نہیں آئے گی" ـ اور اللہ ان کی اس بات کی پرزور تردید فرماتے ہیں ـ

قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ (۳۴ : ۳) "کہہ دیجئے' ہاں میرے رب کی قسم قیامت تم پر ضرور آئے گی" ـ اللہ بھی سچا ہے اور اس کے رسول بھی سچے ہیں ـ وہ غیب تو نہیں جانتے لیکن وہ اللہ پر اعتماد کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں ـ جس چیز کا خود انہیں علم نہیں ہوتا اس کے معاملے میں وہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں ـ اللہ جو تاکید اً کہتا ہے کہ قیامت آئے گی وہ عالم الغیب ہے اس لیے اس کی بات سچ ہے کیونکہ وہ علم پر مبنی ہے ـ

اب علم الٰہی کو ایک کائناتی حقیقت کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جس طرح سورہ کے آغاز ہی میں اس کی ایک جامع مثال دی گئی تھی ـ اس شہادت سے معلوم ہوا تھا کہ یہ قرآن انسانی کلام نہیں ہے کیونکہ اس قسم کی جامع تمثیلات انسانی فکر کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں ـ اسی بات کو اب یہاں دوسرے الفاظ میں پڑھئے ـ

لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۳۴ : ۳) "اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمان میں چھپی ہے نہ زمین میں ـ نہ ذرے سے بڑی نہ اس سے چھوٹی ـ سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے" ـ میں اس بات کو یہاں دوبارہ دہراتا ہوں کہ یہ تصور ایک انسانی تصور نہیں ہے اور نہ انسان اس طرح کی جامع سوچ سوچتا ہے ـ آج تک انسانی کلام کے جو نمونے ہیں نظم کے ہیں یا نثر کے' ان میں ایسی جامع بات نہیں ملتی ـ جب بھی انسان علم کی جامعیت اور اس کے احاطے کے بارے میں کوئی سوچ پیش کرتا ہے وہ اس قدر کائناتی رنگ میں نہیں ہوتی ـ

لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ (۳۴ : ۳) "اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمان میں چھپی ہے نہ زمین میں' نہ ذرے سے بڑی نہ اس سے

چھوٹی"۔کم ازکم انسانی نمونہ ہائے کلام میں علم کی شمولیت 'گہرائی اور جامعیت کے لیے ایسا انداز نہیں ملتا جو قرآن نے اختیار کیا ہے ۔یہ اللہ ہی ہے جو اس طرح اپنے علم کی جامعیت کو بیان کر سکتا ہے اپنے علم کی گہرائی کو بیان کر سکتا ہے ۔یہ باتیں انسانی تخیل کے احاطے میں ہی نہیں آ سکتیں۔اسی طرح مسلمانوں کا تصور الٰہ اس طرح بلند ہو جاتا ہے جس کی مثال ان کے خیال میں نہیں آتی۔وہ اپنے تصور اور خیال کو سمجھتے ہوئے اور اسے فوق التصور اور فوق الخیال سمجھتے ہوئے اس کی بندگی کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کتاب مبین کیا ہے؟ کتاب مبین اللہ کا علم ہی ہے جس نے ہر چیز کو اپنے احاطے میں لیا ہوا ہے۔ جس سے کائنات کے اندر تیرنے والا ذرہ بھی چھوٹ کر رہ نہیں گیا'نہ ذرے سے کم اور نہ اس سے بڑی کوئی چیز۔

ذرا اس تعبیر پر کھڑے ہو کر غور کیجئے"نہ ذرے سے کم" نزول قرآن کے زمانہ تک معروف اور مشہور بات یہ تھی کہ ذرہ صغیر ترین جسم ہے ۔اس سے کم کا تصور موجود ہی نہ تھا۔ آج ذرے کے توڑنے سے انسان کو معلوم ہوا کہ ذرے سے زیادہ چھوٹی چیز بھی موجود ہے ۔اس وقت انسان کے تصور اور حساب میں اس کا کوئی وجود نہ تھا۔اللہ بہت ہی برکت والا ہے کہ اس کے بندے اس کی صفت کے وہ اسرار و رموز بھی جانتے ہیں۔دوسرے لوگ صدیوں بعد مانتے ہیں اور یہ اللہ ہی ہے جو کسی بھی وقت ان اسرار و رموز سے پردہ اٹھا دیتا ہے' جب چاہتا ہے ۔یہ قیامت کیوں برپا ہوگی؟ جس کا حتمی اور جزی علم اللہ کو ہے جو صغیر و کبیر کا جاننے والا ہے؟

لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (٣٤ : ٤) وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ (٣٤ : ٥)

"اور یہ قیامت اس لیے آئے گی کہ اللہ جزاء دے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔ان کے لیے مغفرت ہے اور رزق کریم ہے ۔اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے زور لگایا ہے ان کے لیے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے"۔

یہ ہے اللہ کی حکمت' اس کا ارادہ اور اس کی تدبیر۔اللہ نے اس بات کو مقدر بنا دیا ہے کہ جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد نیک کام کیے ان کو پوری جزاء دے اور ان لوگوں کو بھی سزا دے جنہوں نے اللہ کی آیات کو نیچا دکھانے کے لیے مقدر بھر کوشش کی۔

وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کا ایمان اعمال صالحہ کے روپ میں نمودار ہوا۔ ان کے لیے مغفرت ہے' ان معاملات کے لیے جو ان سے غلط ہو گئے اور تقصیرات ہو گئیں اور پھر مغفرت کے بعد ان کے لیے رزق کریم ہے ۔اس سورہ میں رزق کا ذکر بہت آتا ہے' مراد جنتیں ہیں کیونکہ اللہ کی نعمتیں رزق کریم ہیں۔

رہے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی آیات کو نیچا دکھانے کی ساعی کیں اور تحریک اسلامی کے خلاف پوری قوت لگا دی ان کے لیے دردناک عذاب ہے ۔رجز نہایت ہی برے عذاب کو کہا جاتا ہے ۔یہ اس لیے کہ انہوں نے تحریک اسلامی کے خلاف سرگرمیاں دکھائیں' تحریک کو ناکام کرنے کی سعی کی اور بری راہ پر جدوجہد کرتے رہے ۔یوں اللہ کی حکمت اور اس کا منصوبہ مکمل ہوتا ہے اور ان لوگوں نے جو نظریہ اپنا رکھا ہے کہ آخرت برپا نہ ہوگی اس کی وجہ ان کی لاعلمی ہے۔

حالانکہ اہل علم جانتے ہیں کہ یہ ضرور آئے گی۔

---OOO---

ان لوگوں نے یقین کر لیا تھا کہ قیامت نہ آئے گی جبکہ وہ اللہ کے مخصوص غیوب میں سے ایک غیب ہے اور اللہ نے فیصلہ دے دیا کہ وہ ضرور آئے گی۔ اللہ ہی عالم الغیب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دے دیا کہ آپؐ اس پیغام کو نشر کر دیں اور یہ کہ ان کا یہ عقیدہ جہالت پر مبنی ہے۔ اہل علم بھی اس نتیجے تک پہنچے ہیں جس تک اہل ایمان پہنچے ہیں۔ یہی راستہ ہے اللہ عزیز و حمید کا۔

وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ وَيَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ﴿٦﴾

"اے نبیؐ، علم رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ سراسر حق ہے اور خدائے عزیز و حمید کا راستہ دکھاتا ہے"۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ اہل العلم سے مراد اہل کتاب ہیں جن کو اپنی مذہبی کتابوں کی پیشن گوئیوں کی وجہ سے معلوم تھا کہ قرآن کتاب برحق ہے اور وہ صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرنے والا ہے، لیکن آیت کا دائرہ اطلاق اہل کتاب تک محدود نہیں ہے۔ اس سے مطلق اہل علم مراد ہیں۔ یہ آیت کسی زمان و مکان تک بھی محدود نہیں ہے۔ ہر زمانے کے اہل علم اس کے دائرے میں آتے ہیں۔ ہر زمانے، ہر نسل اور ہر قسم کے اہل علم مراد ہیں۔ بشرطیکہ ان کا علم صحیح علم ہو۔ اس لیے کہ قرآن کریم تو تمام زمانوں کے لیے کھلی کتاب ہے۔ اس کے اندر جو سچائی ہے وہ ہر زمانے اور علاقے کے اہل علم کے لیے سچائی ہے۔ یہ کتاب اسی سچائی پر مشتمل ہے جو اس کائنات کی تہ میں ہے۔ اس لیے قرآن کریم اس کائناتی سچائی کا بہترین اور سچا ترجمہ ہے۔

وَيَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ (۳۴ : ۶) "اور خدائے عزیز و حمید کا راستہ دکھاتا ہے"۔ اللہ عزیز و حمید کا راستہ وہی ہے جو اللہ نے اس کائنات کے لیے اختیار کیا ہے اور وہی راستہ اللہ نے انسان کے لیے بھی اختیار کیا ہے تاکہ انسانی رفتار کے ساتھ ہم آہنگ ہو جو اس کائنات کے لیے ہے جس میں انسان رہتا ہے۔ یہ راستہ قانون قدرت ہے اور ناموس فطرت کا راستہ ہے جس کے مطابق یہ کائنات چلتی اور جس کے مطابق خود یہ زندگی چلتی ہے کیونکہ خود انسانی زندگی اپنے نظام اور اپنی رفتار کے مطابق اس کائنات سے علیحدہ نہیں ہے۔ نہ ان تمام چیزوں سے علیحدہ ہے جو اس کائنات میں ہیں۔

وہ اللہ عزیز و حمید کی راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے، یوں کہ وہ مومنین کی قوت مدرکہ کے اندر اس کائنات کا متناسب تصور پیدا کرتا ہے، اور پھر اس کائنات کے ساتھ مومنین کے تعلقات، روابط اور اقدار کا ایک تصور پیدا کرتا ہے کہ اس کائنات کے اندر انسان کا مقام کیا ہے۔ اس کے اندر انسان کا کردار کیا ہے، انسان اور اس کے گرد پھیلی ہوئی کائنات

مل کر کس طرح اللہ کی حکمت تخلیق کو بروئے کار لا سکتے ہیں اور انسان اور یہ کائنات باہم مل کر کس طرح اللہ جل شانہ کی سمت کی طرف سفر کر سکتے ہیں۔

یہ سچائی انسان کو عزیز و حمید کے راستے کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ یوں کہ وہ انسان کو ایک منہاج فکر دیتی ہے۔ اس فکر کو نہایت ہی مضبوط بنیادوں پر اٹھاتی ہے اور یہ کائناتی اثرات فطرت انسانی پر اثر انداز ہو کر اسے اس کائنات کا بہترین ادراک عطا کرتے ہیں۔ انسان اس کائنات کے خواص اور قوانین کو سمجھتا ہے اور ان سے استفادہ کرتا ہے۔ پھر وہ کائناتی حقائق کے ساتھ ٹکرانے کے بجائے ان کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

یہ سچائی انسان کو اللہ عزیز و حمید کی راہ یوں دکھاتی ہے کہ ایک فرد کی تربیت کر کے اسے ایک سوسائٹی کے ساتھ ہم آہنگی کے ساتھ چلانا سکھاتی ہے۔ پھر یہ ایک سوسائٹی کو دوسری سوسائٹیوں کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اس پوری کائنات کی تعمیر اور ترقی کے لیے ہم آہنگ کرتی ہے۔ اور تمام سوسائٹیوں کو اس کائنات کے ساتھ ہم قدم کرتی ہے تاکہ یہ کائنات اور اس کے اندر انسانی سوسائٹیاں بڑی سہولت کے ساتھ چل سکیں۔

یہ سچائی اللہ عزیز و حمید کی راہ کی طرف یوں بھی ہدایت کرتی ہے کہ وہ انسان اور انسانی سوسائٹی کو ایسے قوانین عطا کرتی ہے جو فطرت انسانی سے ہم آہنگ ہوں۔ انسانی زندگی کے حالات اور انسانی معیشت کے بارے میں ایسی ہدایات دیتی ہے کہ انسان تمام زندہ مخلوقات کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر چلے۔ یہ نہ ہو کہ انسانی نظام اس کائنات اور اس کے اندر موجود دوسرے حیوانات کے نظام کے ساتھ متضاد ہو۔ حالانکہ انسان بھی اس کرۂ ارض کی دوسری مخلوقات اور امم میں سے ایک امت ہے۔

غرض یہ کتاب اور یہ سچائی راہنما ہے 'سیدھی راہ کی طرف اور یہ راہنما بھی اللہ کا ارسال کردہ ہے اور یہ راستہ بھی اسی کا پیدا کردہ ہے۔ اگر آپ نے کسی سڑک پر چلنا ہے اور آپ کو راہنمائی کے لیے وہی انجینئر مل جائے جس نے اس راستے کا نقشہ بنایا تھا تو آپ جیسا خوش قسمت اور کون ہے اور آپ کس خوش اسلوبی اور بے فکری سے یہ سفر طے کر سکیں گے۔ یقیناً بہت اطمینان کے ساتھ!

اس حساس تبصرے کے بعد اب دوبارہ بات شروع ہوتی ہے بعث بعد الموت کے موضوع پر' تعجب کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ بعث بعد الموت پر کس قدر بے تکے اعتراضات کرتے ہیں۔ وہ اپنی جانب سے حضورؐ پر تعجب کرتے ہیں کہ آپ ایسی انہونی باتیں کرتے ہیں' یا اللہ پر افتراء باندھتے ہیں حالانکہ خود ان کی تعجب انگیزی احمقانہ ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يُنَبِّئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۚ أَفْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَم بِهِ جِنَّةٌ ۗ بَلِ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلَالِ الْبَعِيدِ ۝٨

"منکرین لوگوں سے کہتے ہیں "ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ جب تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہو گا اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیئے جاؤ گے؟ نہ معلوم یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گھڑتا ہے یا اسے جنون لاحق ہے"۔ نہیں' بلکہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں اور وہی بری طرح بہکے ہوئے ہیں"۔

یہ لوگ قیام قیامت کو اس قدر عجیب سمجھتے تھے۔یہ لوگ قیامت کے قائل کو قابل تعجب یا مجنون یا جھوٹا سمجھتے تھے۔ذرا انداز گفتگو کو دیکھو "بتائیں تمہیں ایسا شخص جو کہتا ہے کہ جب تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو جائے گا اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیئے جاؤ گے"۔یہ ایک عجیب و غریب شخص پیدا ہو گیا ہے جو اس قسم کی انہونی باتیں کرتا ہے کہ مرنے کے بعد' مٹی کے ذرات بن جانے کے بعد اور مٹی میں رل مل جانے کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کر دیا جائے گا۔

یہ لوگ مزید تعجب کرتے ہیں اور نہایت ہی انوکھا سمجھتے ہوئے یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ یا تو یہ اللہ کے نام سے افتراء باندھتا ہے اور یا پھر یہ شخص مجنون ہے۔کیونکہ ان کے زعم کے مطابق اس قسم کی باتیں یا تو جھوٹا شخص کر سکتا ہے یا مجنوں کر سکتا ہے۔اگر مجنون ہے تو یہ کلام ہذیان ہے اور اگر جھوٹا ہے تو یہ تعجب خیز ہے۔وہ یہ باتیں کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے ہیں کہ تمہیں دوبارہ پیدا کیا جائے گا لیکن خود ان کی بات تعجب خیز ہے۔کیا یہ لوگ پہلی بار پیدا نہیں کیے گئے؟ انسان کی تخلیق کیا کوئی کم واقعہ ہے۔پہلی بار ایسی تخلیق؟ اگر یہ اسے تدبر اور غور سے دیکھیں تو کبھی بھی تعجب نہ کریں۔لیکن یہ گمراہ ہیں اور ہدایت کی راہ نہیں لیتے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے اس تعجب پر ان کو سخت دھمکی دی جاتی ہے۔

بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ (٣٤: ٨) "بلکہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں اور وہی بری طرح بہکے ہوئے ہیں"۔اس عذاب سے مراد عذاب آخرت بھی ہو سکتا ہے گویا وہ عذاب ان پر واقعہ ہو گیا ہے۔چونکہ وہ گمراہی میں بہت دور تک چلے گئے ہیں اس لیے اب ان کے ہدایت پر آنے کی کوئی امید نہیں ہے۔اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ جس طرح عذاب الٰہی میں مبتلا ہیں اسی طرح گمراہ بھی ہیں۔یہ بہت گہری حقیقت ہے اس لیے کہ جس شخص کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا وہ نفسیاتی لحاظ سے سخت عذاب اور کشمکش میں ہوتا ہے۔ایسے شخص کو دنیا کی بے انصافیوں میں نہ انصاف کی امید ہوتی ہے' نہ عدل کی' نہ جزائے آخرت کی اور نہ اخروی اجر کی۔انسانی زندگی میں ایسے واقعات اور حوادث آتے ہیں کہ انسان انہیں صرف اجر اخروی کی خاطر ہی برداشت کر سکتا ہے اور یہ تسلی رکھتا ہے کہ نیکوکار کے لیے اجر حسن ہے اور بدکار کے لیے سزا ہے۔کئی ایسی مشکلات ہوتی ہیں کہ انسان رضائے الٰہی اور جزائے اخروی کے لیے انہیں برداشت کرتا ہے کیونکہ آخرت میں چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی ضائع نہیں ہوتا۔اگر وہ ذرا برابر ہو اور کسی چٹان کے اندر ہو' وہاں سے بھی اللہ اس مطلوب ذرے کو جو رائی کے دانے کے برابر ہو' لے کر آتا ہے اور جو شخص اس تروتازہ اور فرحت بخش اور روشن چراغ سے محروم ہے وہ گویا دائمی عذاب میں ہے۔اس دنیا میں بھی منکر آخرت ایک مسلسل عذاب میں گرفتار ہوتا ہے اور آخرت میں تو وہ اپنے اعمال کی جزا بہرحال پائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ آخرت کا عقیدہ انسان کے لیے ایک رحمت ہے' ایک عظیم نعمت ہے جس کے مستحق اللہ کے مخلص بندے ہوتے ہیں' جو حق کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں اور جن کی خواہش ہر وقت یہ ہوتی ہے کہ وہ راہ راست پر

گامزن ہوں۔ راجح بات یہی ہے کہ اس آیت میں اسی نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ گمراہی کے ساتھ ساتھ اس دنیا میں بھی ایک مصیبت میں گرفتار ہیں۔

ان مکذبین کو اب ایک سخت دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر اللہ چاہے تو ان کی اس گمراہی کی وجہ سے مزید عذاب دنیا ان پر نازل کر دے اور آسمان کا ایک ٹکڑا ان پر گرا دے یا ان کو اس ضلالت کی وجہ سے زمین کے اندر دھنسا دے۔ یہ اس نظام کائنات پر غور نہیں کرتے کہ یہ نظام تو کسی بھی وقت بگڑ سکتا ہے۔

أَفَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۚ إِن نَّشَأْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَاءِ ۚ
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ﴿٩﴾

ع ۹

"کیا انہوں نے کبھی اس آسمان و زمین کو نہیں دیکھا جو انہیں آگے اور پیچھے سے گھیرے ہوئے ہے؟ ہم چاہیں تو انہیں زمین میں دھنسا دیں، یا آسمان کے کچھ ٹکڑے ان پر گرا دیں۔ در حقیقت اس میں ایک نشانی ہے ہر اس بندے کے لیے جو خدا کی طرف رجوع کرنے والا ہو"۔

یہ ایک سخت ڈراؤنا کائناتی منظر ہے۔ یہ منظر ان کے مشاہدات سے ماخوذ ہے جن کو وہ رات اور دن دیکھتے رہتے ہیں۔ زمین کا دھنس جانا بھی انسانی مشاہدہ ہے اور قصص اور روایات میں بھی آتا ہے۔ اسی طرح شہاب ثاقب کے گرنے اور بجلیوں کے گرنے سے بھی آسمانی چیزیں گرتی رہی ہیں۔ یہ سب چیزیں ان کی دیکھی سنی ہیں۔ اس قدر خوفناک حالات کی طرف ان کو متوجہ کر کے ڈرایا جاتا ہے جو قیام قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ اگر قیام قیامت سے پہلے ہی اللہ ان کو عذاب دینا چاہے تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اسی زمین اور اسی آسمان میں ان کو یہ عذاب دے دیا جائے جو ان کے آگے پیچھے ان کو گھیرے ہوئے ہے اور یہ ان سے دور بھی نہیں ہے جس طرح قیام قیامت ان کو بعید نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے عذاب سے تو غافل لوگ ہی بے فکر ہوتے ہیں۔

یہ آسمانوں کے اندر جو عملیات وہ دیکھتے ہیں، بجلیاں اور شہاب ثاقب اور زمین کا دھنس جانا اور زلزلے۔ کسی وقت بھی ان میں سے کوئی عذاب اگر آ جائے تو قیامت ہی ہو گی۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّکُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ (۳۴ : ۹) "حقیقت یہ ہے کہ اس میں نشانی ہے ہر اس بندے کے لیے جو خدا کی طرف رجوع کرنے والا ہو"۔ اور جو غلط راہ پر اس قدر دور نہ چلا گیا ہو۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۱۹۵ ایک نظر میں

اس سبق میں شکر اور سرکشی کی دو صورتیں پیش کی گئی ہیں اور یہ مثال بھی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کے لیے ایسی قوتیں مسخر کر دیتے ہیں جو عموماً لوگوں کے لیے مسخر نہیں کی جاتیں ۔ لیکن اللہ کی مشیت اور اللہ کی تقدیر کو لوگوں کی عادات کے تابع نہیں کیا جا سکتا۔ ان نقوش کے درمیان جنوں کی حقیقت بھی سامنے آتی ہے جن کی پوجا بعض عرب کیا کرتے تھے یا ان سے یہ عرب قبائل غیب کی خبریں طلب کرتے تھے جبکہ یہ جنات بذات خود غیب کی خبروں سے محروم ہوتے ہیں ۔ اس سبق میں گمراہی کے وہ اسباب بھی بیان کیے گئے ہیں جن کے ذریعے شیطان لوگوں کو گمراہ کرتا ہے ۔ لیکن یہ اسباب انسان کے دائرہ اختیار کے اندر ہیں ۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا کہ لوگوں کے جو اعمال پوشیدہ ہوتے ہیں اللہ ان کو ظاہر فرماتے ہیں اور اس سبق کا خاتمہ بھی سابقہ سبق کی طرح ذکر آخرت پر ہوتا ہے ۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۹۵ تشریح آیات

## ۱۰ --- تا --- ۲۱

---

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۭ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۝۱۰ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۱۱

"ہم نے داؤد کو اپنے ہاں سے بڑا فضل عطا کیا تھا۔ (ہم نے حکم دیا کہ) اے پہاڑو' اس کے ساتھ ہم آہنگی کرو۔ (اور یہی حکم ہم نے) پرندوں کو دیا۔ ہم نے لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ زرہیں بنا اور ان کے حلقے ٹھیک اندازے پر رکھ۔ (اے آل داؤد) نیک عمل کرو' جو کچھ تم کرتے ہو' اس کو میں دیکھ رہا ہوں"۔

حضرت داؤد اللہ کے مطیع فرمان بندے تھے۔ گزشتہ سبق کا خاتمہ اس ذکر سے ہوا تھا۔

اِنَّ فِیْ ذَالِكَ لَاٰیَةً لِّکُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ "اس میں نشانی ہے ہر اس بندے کے لیے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو"۔ اس اشارہ کے بعد حضرت داؤد کا قصہ لایا گیا اور اس کا آغاز اس بات سے کیا گیا جو بطور فضیلت ان کو دی گئی۔

یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَ الطَّیْرَ (۳۴ : ۱۰) "اے پہاڑو' اس کے ساتھ ہم آہنگی کرو اور اے میرے پرندو تم بھی"۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو بہت ہی خوبصورت آواز دی گئی تھی۔ یہ آواز اپنی خوبصورتی میں ایک معجزانہ آواز تھی۔ وہ اپنے ترانے نہایت خوش الحانی سے گاتے تھے۔ یہ ترانے اللہ کی حمد پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض عہد قدیم میں موجود ہیں اگرچہ ہم ان کی صحت کے بارے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کی آواز سنی جو رات کو قرآن پڑھتے تھے' آپ کھڑے ہو کر سننے لگے تو آپ نے فرمایا کہ "ان کو ایسی خوش الحانی دی گئی ہے جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کو دی گئی تھی"۔

اس آیت میں حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ کے فضل و کرم کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ اس قدر شفاف ہے کہ ان کی حمد و ثنا کے نتیجے میں ان کے اور اس کائنات کے درمیان پردے اٹھ گئے تھے۔ ان کی حقیقت' حقیقت کائنات کے ساتھ

ہم آہنگ ہو گئی تھی ۔ اور جس طرح وہ رب تعالیٰ کی حمد گاتے تھے ۔ اسی طرح پہاڑ بھی ان کے ساتھ گاتے تھے اور ان کی حمد کے جواب میں پہاڑ اور پرندے بھی حمد گاتے تھے ۔ اس طرح کہ ان کے وجود اور کائنات کی حقیقت کے درمیان فاصلے مٹ گئے تھے ۔ یہ کائنات بھی اللہ کی حدی خواں تھی اور حضرت داؤد بھی ۔ یوں اللہ کی مخلوقات کی دو اقسام کے درمیان فاصلے مٹ گئے اور دونوں مخلوقات الہی حقیقت کے ساتھ مربوط ہو گئیں جس نے ان کے درمیان یہ پردے قائم کر رکھے تھے ۔ دونوں اللہ کی تسبیح اور حمد گانے لگیں اور دونوں کا نغمہ ایک ہو گیا ۔ یہ اشراق' صفائی اور خلوص کا ایک درجہ ہے اور اس مقام اور درجے تک اللہ کے فضل و کرم کے سوا کوئی نہیں پہنچ سکتا ۔ جب حقیقت نوعیہ کے پردے اٹھ جائیں تو اللہ کی مخلوق ایک رہ جاتی ہے اور تمام حائل پردے اٹھ جاتے ہیں ۔ کوئی رکاوٹ نہیں رہتی ۔

جب حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کی حمد و ثنا گاتے تو پہاڑ اور پرندے ان کے ساتھ گاتے ۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی شخصیت میں جو ترنم تھا' وہ پوری کائنات میں سرایت کر جاتا اور یوں پوری کائنات خالق کی طرف متوجہ ہو کر حمد گاتی ۔ یہ وہ لمحات ہوتے ہیں جن کا ذوق انہی لوگوں کو ہوتا ہے جو ان تجربات سے گزرے ہوں اور جن لوگوں نے اپنی زندگی میں ایسے لمحات پائے ہوں ۔

وَ اَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ( ۳۴ : ۱۰ ) ”ہم نے لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا“ ۔ یہ اللہ کے فضل و کرم کا ایک دوسرا رنگ تھا جو حضرت داؤد علیہ السلام پر ہوا تھا ۔ حضرت داؤد علیہ السلام پر انعامات کا جس طرح یہاں بیان ہو رہا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی خارق العادت عمل تھا ۔ معاملہ یہ نہ تھا جس طرح بھٹیوں میں لوہے کو گرم کر کے ان کو پگھلاتے ہیں اور پھر ڈھلائی کا کام کرتے ہیں ۔ یہ دراصل ایک معجزانہ عمل تھا اور حضرت داؤد علیہ السلام کی نبوت پر ایک دلیل تھا اور سیاق کلام سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہاں مخصوص فضل و کرم کا ذکر ہو رہا ہے ۔ یہ کوئی معمولی اور عادی ٹیکنالوجی نہ تھی ۔

اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِي السَّرْدِ ( ۳۴ : ۱۱ ) ”اس ہدایت کے ساتھ کہ زرہیں بنا اور اس کے حلقے ٹھیک اندازے سے رکھ“ ۔ سابغات معنی زرہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سے قبل تختیاں بنائی جاتی تھیں اور تختیوں کی زرہیں جسم کے لیے ثقیل ہوتی تھیں اور جسم کو زخمی کر دیتی تھیں ۔ اللہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ امر سکھایا کہ آپ گرم تاروں سے ان کو بنائیں تاکہ وہ نرم ہوں اور کپڑے کی طرح جسم ان کے اندر حرکت کر سکے ۔ حکم دیا کہ اس زرہ کے حلقے تنگ کیے جائیں تاکہ اس کے اندر سے تیر نہ جائیں اور حلقے سب کے سب ایک اندازے سے بنائے جائیں اور یہ تمام کام اللہ کی جانب سے الہامی طور پر ہوا ۔ ان کو مزید ہدایات یوں دی گئیں :

وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ( ۳۴ : ۱۱ ) ”اے آل داؤد نیک عمل کرو' جو کچھ تم کرتے ہو' میں دیکھ رہا ہوں“ ۔ اس زرہ سازی کے کام ہی میں نہیں' بلکہ ہر کام میں اعمال صالحہ کرو' ہر معاملے میں اللہ کو حاضر سمجھو ۔ اور یہ یقین رکھو کہ اللہ جزاء دینے والا ہے ۔ اس سے کوئی چیز رہ نہ جائے گی ۔ وہ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے ۔

--- ○○○---

یہ تو تھا حضرت داؤد علیہ السلام کا معاملہ ـ رہے حضرت سلیمان تو ان پر بھی بہت ہی بڑا فضل و کرم ہوا تھا ـ

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ۭ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۭ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَاۗءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ۭ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝

"اور سلیمان کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا' صبح کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک اور شام کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک ـ ہم نے اس کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہا دیا اور ایسے جن اس کے تابع کر دیے جو اپنے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے ـ ان میں سے جو ہمارے حکم سے سرتابی کرتا اس کو ہم بھڑکتی ہوئی آگ کا مزہ چکھاتے ـ وہ اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا' اونچی عمارتیں 'تصویریں' بڑے بڑے حوض جیسے لگن اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی بھاری دیگیں ـــ اے آل داؤد' عمل کرو شکر کے طریقے پر' میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار ہیں ـ

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا گیا تھا' اس کے بارے میں بہت ہی روایات وارد ہیں ـ ان روایات پر اسرائیلیات کا رنگ غالب ہے ـ اگرچہ یہودی کتابوں میں ان کا تذکرہ نہیں ہے ـ ان روایات میں پڑنے سے بچنا ہی بہتر ہے ـ آیت میں جو کچھ آیا ہے بس اس پر اکتفا محفوظ راستہ ہے ـ آیات کا ظاہری مفہوم ہی مراد لیا جائے ـ آیات کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا تھا اور یہ ہوا صبح کے وقت ایک علاقے کی طرف چلتی تھی ـ (سورہ انبیاء میں ہے کہ یہ ارض مقدس کی طرف چلتی تھی) اور ایک مہینے کا فاصلہ طے کرتی تھی اور شام کے وقت وہ دوسرے علاقے کی طرف چلتی اور مسافت ایک ماہ کا فاصلہ ہوتا ـ دونوں سے حضرت سلیمان اپنے مفادات لیتے اور اللہ کے حکم سے استفادہ کرتے ـ اس کی تفصیلات کیا ہیں ـ وہ ہمیں معلوم نہیں ـ اور بلا تحقیق افسانوں کے پیچھے پڑنے کی ضرورت بھی نہیں ہے ـ

وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ (۳۴ : ۱۲) "ہم نے اس کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا ایک چشمہ بہا دیا تھا" ـ قطر نحاس یعنی تانبے کو کہتے ہیں ـ سیاق کلام سے یہاں بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوہے کو نرم کرنے کی طرح 'تانبے کا چشمہ بھی کوئی معجزانہ عمل تھا ـ یوں ہو سکتا ہے کہ اللہ نے آتش فشانی کے عمل کی طرح ان کے لیے تانبے کا چشمہ بہا دیا ہو یا یوں کہ اللہ نے ان کو بطور الہام تانبا پگھلانا سکھا دیا ہو ـ یہ بھی اللہ کی طرف سے فضل عظیم تھا ـ

وَ مِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ (٣٤ : ١٢) "جن ان کے تابع کر دیئے جو اپنے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے"۔ اللہ نے معجزانہ طور پر جن ان کے تابع کر دیئے تھے اور وہ ان کی مملکت میں معجزانہ ڈیوٹیاں دیتے تھے۔ عربی میں ان تمام مخفی قوتوں کو جن کہا جاتا ہے جو نظر نہیں آتیں۔ یہ ایک مخلوق ہے جس پر اللہ نے جن کے لفظ کا اطلاق کیا ہے ہم اس مخلوق کے بارے میں وہی کچھ جانتے ہیں جو اللہ نے بتایا ہے اس سے زیادہ نہیں۔ یہاں اللہ نے صرف یہی کہا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ان کا ایک گروہ مسخر کر دیا گیا تھا جو آپ کے تحت کام کرتا تھا اور ان میں سے جو بھی بھاگ جاتا اسے اللہ سخت سزا دیتے تھے۔

وَ مَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ (٣٤ : ١٢) "ان میں سے جو ہمارے حکم سے سرتابی کرتا اس کو ہم بھڑکتی ہوئی آگ کا مزہ چکھاتے"۔ جنوں کی تسخیر کی بات ختم ہونے سے قبل ہی یہ تبصرہ کیا گیا کہ جن اللہ کے اس طرح قبضے میں ہیں کہ اگر نافرمانی کریں تو اللہ انہیں آگ میں ڈال دے۔ چونکہ بعض مشرکین جنوں کی پوجا کرتے تھے اس لیے یہاں ان کی اس بے بسی کو بیان کیا گیا کہ مشرکین کی طرح ان کے معبود بھی نار جہنم میں جائیں گے بوجہ نافرمانی کے --- جن حضرت سلیمان کے لیے یوں مسخر تھے۔

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ (٣٤ : ١٣ ب) "وہ اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا تھا۔ اونچی عمارات' تصاویر' بڑے بڑے حوض جیسے لگن اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی بڑی بڑی دیگیں"۔ محاریب تو ان جگہوں کو کہا جاتا ہے جہاں عبادت کی جاتی ہے۔ تماثیل تانبے اور لکڑی کی تصاویر کو کہتے ہیں۔ جوابی جابیہ کی جمع ہے وہ حوض جس میں پانی آئے۔ جن حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ایسے بڑے لگن بناتے تھے جو حوضوں کی طرح تھے اور وہ ان کے لیے ایسے بڑے دیگ بناتے تھے جو اپنی بڑائی کی وجہ سے جڑے رہتے تھے۔ یہ تمام خدمات وہ ہیں جن پر جنات مامور تھے۔ یہ تمام امور اس وقت خارق عادت تھے اس لیے ان کی یہی تفسیر درست ہے۔ اگر ان کو معمولی بنا دیا جائے تو یہ فضل نہیں رہتا۔

اب آل داؤد کو مخاطب کر کے ہدایت دی جاتی ہے۔

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا (٣٤ : ١٣) "اے آل داؤد عمل کرو شکر کے طریقے پر"۔ ہم نے تمہارے لیے یہ فضل و کرم حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی شکل میں فراہم کر دیا ہے' لہٰذا اے آل داؤد تم شکر کا طریقہ اختیار کرو۔ فخر و مباہات کا طریقہ نہ اپناؤ اور عمل صالح کا طریقہ اپناؤ۔

وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (٣٤ : ١٣) "میرے بندوں میں سے کم ہی شکرگزار ہیں"۔ یہ ایک ایسا تبصرہ ہے جو حقیقت نفس الامری قارئین کے سامنے رکھتا ہے اور یہ قرآن کریم کے تمام قصوں پر آتا ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ اللہ کا فضل و کرم انسانوں پر اس قدر زیادہ ہے کہ کم انسان شکر ادا کر سکتے ہیں اور بشر ہمیشہ شکر الٰہی کی بجاآوری میں قاصر ہی رہتے ہیں۔ وہ جس قدر زیادہ شکر بھی ادا کریں پھر بھی قاصر رہتے ہیں لیکن اگر وہ بالکل شکر ہی نہ

کریں تو ان کا قصور بہت زیادہ ہوگا اور اگر سرکشی کریں تو.......

اللہ کے بندے نہایت ہی محدود قوت کے مالک ہیں اور ان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اللہ کی لامحدود نعمتوں پر شکر بجالا سکیں۔ اگر اللہ کی نعمتوں کو کوئی گنے تو گن ہی نہ سکے' یہ نعمتیں گو انسان کو اوپر سے ڈھانپ رہی ہے' پاؤں کے نیچے سے انسان ان میں غرق ہے' دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے انسان ان سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اس کی ذات ان میں ڈوبی ہوئی ہے۔ خود انسان انعامات الٰہیہ کا ایک نمونہ ہے۔

ایک بار ہم بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ نہایت ہی دلچسپی کے ساتھ ہمکلام تھے۔ ہر قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اچانک چھوٹی بلی سو سو نمودار ہوئی۔ یہ ہمارے اردگرد گھوم رہی تھی گویا کوئی چیز تلاش کر رہی ہے لیکن وہ بلی زبان سے کچھ کہنے پر قادر نہ تھی۔ اچانک اللہ نے ہمارے دل میں ڈال دیا کہ شاید پیاسی ہے۔ جب ہم نے پانی فراہم کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پیاسی تھی' اسے شدید پیاس لگی ہوئی تھی لیکن وہ زبان سے کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ انسان پر اللہ کے فضل وکرم سے ایک بڑا فضل وکرم زبان بھی ہے جس کا شکر ادا کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔

ایک طویل عرصے تک ہم نے سورج نہ دیکھا تھا۔ سورج کی شعاعیں صرف ایک پیسے کے برابر ہم پر چمکتی تھیں ہم اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور اپنے منہ' ہاتھ اور چہرے اس سورج کے سامنے لاتے' سر' پیٹھ اور پاؤں کو اس سورج کی شعاعوں کی ٹکیا سے غسل دیتے۔ اور ہم سب یہ عمل باری باری کرتے۔ یہ ایک نعمت تھی جو ہمیں مل رہی تھی اور جب پہلے دن ہم سورج میں نکلے تو میں وہ خوشی بھول نہیں سکتا۔ اس وقت ہر ایک کے چہرے پر جو مسرت تھی اس کا تصور بھی کوئی نہیں کر سکتا۔ ہر ایک اللہ کا گہرا شکر ادا کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا' الحمدللہ یہ ہے سورج اور یہ تو ہمیشہ ہی چمکتا رہتا ہے۔

روزانہ یہ شعاعیں کس قدر پھیلتی ہیں اور ہم ان سے گرمی حاصل کرتے ہیں۔ اور ان شعاعوں میں غسل کرتے ہیں۔ یوں ہم اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں اور اللہ کی نعمت میں غرق رہتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ ہم اس عظیم فیض الٰہی سے کس قدر فائدہ اٹھاتے ہیں جو مفت اور بلاحساب ہمیں فراہم کر دیا گیا ہے بغیر مشقت اور بغیر کسی تکلیف کے۔

اگر ہم اسی طرز پر اللہ کی نعمتوں کو پیش کرتے رہیں تو ہماری عمر ختم ہو جائے' ہماری پوری قوت صرف ہو جائے لیکن پھر بھی ہم ان نعمتوں میں سے کسی معتدبہ حصے کا شمار نہ کر سکیں۔ لہٰذا ہم بھی یہاں اسی مجمل اشارے پر اکتفاء کرتے جو قرآن نے کیا ہے تاکہ آگے اہل فکر وتدبر خود ہی سوچ لیں اور وہ جس قدر اللہ چاہے اس سے تاڑ لیں۔ یہ تو ہے اللہ کی نعمتوں کا ایک حصہ اور وہی شخص ان کو پا سکتا ہے جو نہایت ہی توجہ' خلوص اور یکسوئی کے ساتھ اس طرف متوجہ ہو۔

اب ہم قرآنی قصے کی آخری آیات کی طرف آتے ہیں۔ یہ آخری منظر کا حصہ ہیں۔ حضرت سلیمان وفات پا جاتے ہیں اور جنات ان احکام کی تعمیل میں لگے ہوئے تھے جو انہوں نے اپنی زندگی کے دوران دیے تھے۔ جنات کو معلوم نہیں ہے کہ حضرت سلیمان تو فوت ہو چکے ہیں۔ حضرت سلیمان جنات کے سامنے عصا پر ٹیک لگائے کھڑے ہی تھے کہ گھن نے ان کے عصا کو کھا لیا اور آپ گر گئے۔ تب جنوں کو معلوم ہوا کہ وہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے اس مشقت میں مبتلا رہے۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ

الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ﴿١٤﴾

"پھر جب سلیمان علیہ السلام پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز اس گھن کے سوا نہ تھی جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ اس طرح جب سلیمان گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے"۔

روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا وقت آگیا تو وہ عصا پر تکیہ کیے ہوئے تھے۔ جن اپنی اپنی ڈیوٹیاں سرانجام دے رہے تھے اور ان کے ذمہ بہت سے شدید فرائض تھے جو ان کو کرتے تھے۔ جنوں کو ایک عرصہ تک معلوم نہ ہوا کہ حضرت سلیمان فوت ہو گئے ہیں یہاں تک کہ گھن نے ان کے عصا کو چاٹ لیا۔ یہ کیڑا جہاں ہوتا ہے چھت کے شہتیروں، دروازوں، ستونوں کو بری طرح کھا جاتا ہے۔ پورٹ سعید کے علاقے میں لوگ گھر بناتے ہیں اور اس گھن کے ڈر سے اس میں ایک لکڑی بھی نہیں لگاتے کہ یہ کیڑا ہر قسم کی لکڑی کو چاٹ جاتا ہے۔ جب اس نے عصا کو چاٹ لیا تو وہ حضرت سلیمان کو نہ سہار سکا اور آپ زمین پر گر پڑے۔ اس وقت جنوں کو معلوم ہوا کہ حضرت تو وفات پا چکے ہیں۔ یہاں آکر جنوں کو معلوم ہوا۔

تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ

(٣٤ : ١٤) "یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے"۔ یہ ہیں وہ جن جن کو عرب پوجتے ہیں اور ان کو اللہ نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کے تابع بنا دیا اور ان کو اپنے قریب کے غیب کا بھی علم نہ تھا۔ لیکن بعض لوگ اس قدر کم فہم ہیں کہ ان سے دور کی باتیں پوچھتے ہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے گھرانے کا قصہ تو ان اہل ایمان کا قصہ تھا جو اللہ کے فضل و کرم کا بے حد شکر ادا کرنے والے تھے۔ اس کے بالمقابل قوم سبا کا قصہ ہے۔ سورہ نمل میں حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کے حالات گزر گئے ہیں۔ اب ان کا قصہ بعد کے ادوار سے متعلق ہے کیونکہ جن واقعات کا یہاں ذکر ہے وہ زمانہ مابعد سے متعلق ہیں۔

راجح بات یہ ہے کہ جب قوم سبا نے سرکشی اختیار کی تو اللہ نے ان سے اپنی نعمتیں چھین لیں اور اس کے بعد یہ لوگ اس علاقے سے منتشر ہو گئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں یہ لوگ ایک بہت بڑی ترقی یافتہ مملکت کے مالک تھے اور ان کے علاقے میں ہر طرف خوشحالی اور رفاہ عامہ کے کام تھے۔ کیونکہ ہدہد نے سلیمان علیہ السلام کے سامنے یہ رپورٹ پیش کی۔

إِنِّي وَجَدتُّ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ وَجَدتُّهَا

تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ "میں نے دیکھا کہ ایک عورت ان کی ملکہ ہے اور اسے ہر چیز دی گئی ہے اور اس کا ایک عظیم تخت ہے۔ میں نے پایا کہ وہ اور اس کی قوم سورج کے پجاری ہیں 'اللہ کے سوا"۔ اس کے بعد پھر ملکہ سبا سلیمان علیہ السلام کے سامنے مسلمان ہو کر آ جاتی ہے۔ لہٰذا یہاں کے جو واقعات ہیں وہ ملکہ سبا کے زمانہ کے بعد سے متعلق ہیں۔ یہ مصائب ان پر اس وقت آئے جب انہوں نے سرکشی اختیار کر لی۔ اور اللہ کی ناشکری کی وجہ سے اللہ نے اپنے انعامات ان سے چھین لیے۔

قصے کا آغاز اس حالت کے بیان سے ہوتا ہے جس میں وہ تھے۔ اچھے دن 'فراوانی' ترقی اور اللہ کی نعمتیں اور ہر طرح کی پیداوار جس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ان انعامات کے بدلے میں اللہ کا شکر ادا کرتے۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِیْ مَسْكَنِهِمْ اٰیَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ یَّمِیْنٍ وَّ شِمَالٍ ۬ؕ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَیِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ ﴿۱۵﴾

"سبا کے لیے ان کے اپنے مسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھی ' دو باغ دائیں اور بائیں۔ کھاؤ اپنے رب کا رزق اور شکر بجا لاؤ اس کا 'ملک ہے عمدہ و پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشش فرمانے والا"۔

سبا اس قوم کا نام ہے جو جنوب یمن میں رہتی تھی۔ ان کی زمین تروتازہ تھی۔ اس کا ایک حصہ آج بھی اسی حالت میں موجود ہے۔ یہ اس قدر ترقی یافتہ تھے کہ مشرق اور جنوب سے آنے والی بارشوں کے پانی کا انہوں نے ذخیرہ بنا لیا تھا۔ ایک ایسا ڈیم بنایا تھا جس کے دونوں جانب قدرتی پہاڑ تھے۔ پہاڑوں کے درمیان تنگ جگہ پر انہوں نے ڈیم بنا لیا تھا' جس میں سے چشمے اور نہریں نکلتی تھیں۔ ان کا پانی وہ حسب ضرورت بند کرتے تھے اور کھولتے تھے۔ انہوں نے پانی کی بہت ہی بڑی مقدار کو جمع کر لیا تھا اور اس ذخیرے پر انہیں کنٹرول حاصل تھا۔ چنانچہ یہ ان کے لیے ایک وسیع ذریعہ آبپاشی تھا۔ اسے یہ لوگ سد مارب کہتے تھے۔

اس ڈیم کے دائیں اور بائیں جانب کی نہروں کے تحت باغات تھے۔ یعنی پورا علاقہ سرسبز اور شاداب تھا' حسین و جمیل تھا اور یہ نشانی تھی 'رب کریم کی انعامات کی۔ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ رب غفور کا شکر ادا کریں ان نعمتوں پر۔

كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ (۳۴ : ۱۵) "کھاؤ اپنے رب کا رزق اور شکر بجا لاؤ اس کا"۔ ان کو یہ نصیحت کی گئی کہ اللہ کی نعمتوں پر غور کرو' جس نے تمہیں یہ خوبصورت علاقہ دیا۔ اور اس میں ہر قسم کی پیداوار دی اور پھر تم سے جو تقصیرات سرزد ہوئیں وہ بھی معاف کی گئیں۔

بَلْدَةٌ طَیِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ (۳۴ : ۱۵) "ملک عمدہ اور پروردگار بخشش کرنے والا"۔ زمین عمدہ'

پیداوار والی' اور نعمتوں اور آسانیوں والی اور آسمانوں کی بادشاہت معاف کرنے والی۔ سوال یہ ہے کہ زمین ہر قسم کا پھل دینے والی ہے اور اللہ غفور الرحیم ہے تو پھر شکر ادا نہ کرنے اور اللہ کی حمد نہ کرنے کا جواز کیا ہے؟ لیکن اس کے باوجود انہوں نے شکر ادا نہ کیا۔

فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُم بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِّن سِدْرٍ قَلِيلٍ ﴿١٦﴾

"مگر وہ منہ موڑ گئے۔ آخر کار ہم نے ان پر بند توڑ سیلاب بھیج دیا اور ان کے پچھلے دو باغوں کی جگہ دو اور باغ انہیں دیئے جن میں کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی بیریاں"۔

انہوں نے اللہ کے شکر بجا لانے سے منہ موڑ لیا۔ نیک کام کرنا چھوڑ دیا۔ اللہ کے انعامات میں غلط تصرفات کرنا شروع کر دیئے۔ لہٰذا اللہ نے ان سے وہ خوشحالی چھین لی جس میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان پر اس قدر شدید سیلاب بھیجا جو راستے میں آنے والے پتھروں کو بھی بہا کر لے جا رہا تھا۔ العرم کے معنی پتھر ہیں۔ یوں یہ ڈیم ٹوٹ گیا۔ پانی نے سیلاب کی شکل اختیار کر لی۔ یہ گاؤں اور باغات تباہ ہو گئے۔ اور از سر نو پانیوں کے ذخیرہ کرنے کا انتظام ان سے نہ ہو سکا۔ اس لیے خوشحالی کی جگہ خشک سالی نے لی۔ زمین خشک ہو کر جل گئی اور سرسبز باغات بیریوں کی جھاڑیوں میں بدل گئے اور سرسبز زمین صحرا میں بدل گئی۔

وَبَدَّلْنَاهُم بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِّن سِدْرٍ قَلِيلٍ (٣٤: ١٦) "اور ان کے پچھلے دو باغوں کے بدلے دو اور باغ انہیں دیئے جن میں کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی بیریاں"۔ خمط اراک کے درخت کو کہتے ہیں۔ ہر خار دار درخت کو بھی خمط کہتے ہیں۔ اور اثل ایک درخت ہے جو الطرفاء کے مماثل ہوتا ہے یعنی جھاؤ۔ اور سدر بیری کو کہتے ہیں اور یہ بیری جو اب ان کے لیے بہترین پھل رہ گئی تھی یہ بھی قلیل مقدار میں تھی۔

ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِمَا كَفَرُوا ۖ وَهَلْ نُجَازِي إِلَّا الْكَفُورَ ﴿١٧﴾

"یہ تھا ان کے کفر کا بدلہ جو ہم نے ان کو دیا' اور ناشکرے انسان کے سوا ایسا بدلہ ہم اور کسی کو نہیں دیتے"۔ یعنی کفران نعمت کی وجہ سے ان کو یہ سزا دی گئی۔

لیکن ابھی تک یہ لوگ اپنی بستیوں ہی میں رہ رہے تھے اگرچہ اس سیلاب کی وجہ سے ان کے رزق کے ذرائع محدود ہو گئے تھے۔ خوشحالی اور سہولیات کے بدلے بدحالی اور مشکلات معیشت نے جگہ لے لی تھی۔ لیکن ابھی تک ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین کے اندر بکھیر نہ دیا گیا تھا۔ اور ان کی بستیوں اور برکت والی بستیوں مکہ مکرمہ اور بیت المقدس کے

درمیان مواصلات کا سلسلہ باقی تھا۔ علاقہ سبا کے شمال میں یمن کا علاقہ بھی آباد تھا اور یمن مکہ اور مدینہ کے ذریعہ شام اور بیت المقدس سے جڑا ہوا تھا۔ یہ راہ مامون اور جاری تھی۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ ۖ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ ﴿١٨﴾

"اور ہم نے ان کے اور ان بستیوں کے درمیان 'جن کو ہم نے برکت عطا کی تھی' نمایاں بستیاں بسا دی تھیں اور ان میں سفر کی مسافتیں ایک اندازے پر رکھ دی تھیں۔ چلو پھرو ان راستوں میں رات دن پورے امن کے ساتھ"۔

یہ راستہ ایسا تھا کہ مسافر اور قافلے صبح نکلتے اور اندھیرا ہونے سے پہلے دوسرے شہر تک پہنچ جاتے۔ لہٰذا ان شہروں کے درمیان محدود فاصلے کا سفر ہوتا اور یہ راستہ مسافروں کے لیے نہایت ہی امن و امان کا اور محفوظ ہوتا تھا۔ روز کے سفر کے بعد مسافر آرام کر سکتے تھے اور ان کو جگہ جگہ سروسز کی سہولیات مل جاتی تھیں۔

فَقَالُوا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿١٩﴾

مگر انہوں نے کہا "اے ہمارے رب 'ہمارے سفر کی مسافتیں لمبی کر دے"۔ انہوں نے خود مطالبہ کیا کہ اے اللہ ہمیں طویل المسافت سفر دے۔ ایسا سفر جو سالوں میں کیا جا سکے کیونکہ ان تھوڑے تھوڑے مختصر سفروں سے ہم تنگ آ گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے دماغ اور ان کے نفوس فساد پذیر ہو گئے تھے۔

وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ (۳۴ : ۱۹) "انہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا"۔ انہوں نے یہ دعا کر کے اپنے اوپر ظلم کیا۔ اللہ نے بھی ان کی دعا قبول کر لی۔ یہ دعا دراصل سرکشی کی دعا تھی اور اللہ نے اسے بطور سزا قبول کر لیا۔

فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (۳۴ : ۱۹) "آخر کار ہم نے انہیں افسانہ بنا کر رکھ دیا اور انہیں بالکل تتر بتر کر ڈالا"۔ وہ خود اپنی خواہش کے مطابق اس ملک سے نکال دیئے گئے 'تتر بتر ہو گئے اور پورے جزیرۃ العرب میں پھیل گئے۔ ان کی تاریخ افسانہ بن گئی۔ صرف قصے رہ گئے قوم اور ملک ناپید ہو گیا۔ حالانکہ وہ ملک اور امت کے مالک تھے اور بہترین زندگی بسر کرتے تھے۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ (۳۴ : ۱۹) "یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو بڑا صابر و شاکر ہو"۔ شکر کے ساتھ یہاں صبر کا ذکر بھی کیا گیا ہے کیونکہ مشکلات میں صبر بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔ نعمتوں میں شکر انسان کے لیے بہت ہی مفید رویہ ہوتا ہے اور قصہ قوم سبا میں دونوں کے لیے سبق ہے۔

یہ تو تھا آیت کا ایک مفہوم لیکن ایک دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے ۔ اس آیت کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً (۳۴ : ۱۸) "اور ہم نے ان بستیوں اور برکت والی بستیوں کے درمیان ایسی بستیاں پیدا کر دیں جو قوت اور شوکت والی تھیں" ۔ یعنی ان ہلاک شدہ بستیوں اور مبارک بستیوں کے درمیان غالب بستیاں وجود میں آگئیں ۔ جبکہ سبا کے لوگ فقراء بن گئے اور خشک صحراوی زندگی کی طرف لوٹ گئے ۔ ان کو چراگاہوں اور پانیوں کی طرف رات دن سفر کرنا پڑتا ۔ انہوں نے ان آزمائشوں پر صبر نہ کیا ۔ اور یہ دعا کی اے رب باعد ۔

بین اسفارنا (۳۴ : ۱۹) "ہمارے سفروں کو دور کر دے" ۔ یعنی ہماری حالت پاوندگی کو ختم کر دے ۔ ہم تنگ آگئے ۔ یہ دعا انہوں نے انابت اور اصلاح حال کے ساتھ نہ کی تھی اور وہ پوری طرح تائب نہ ہوئے تھے ۔ اس لیے دعا قبول نہ ہوئی ۔ انہوں نے خوشحالی کی وجہ سے سرکشی اختیار کی تھی اور مشکلات پر صبر نہ کیا تو اللہ نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا ۔ یوں یہ لوگ افسانہ بن گئے جس کا کوئی مصداق روئے زمین پر نہ رہا ۔

اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۳۴ : ۱۹) "بے شک اس میں نشانیوں میں ہر اس شخص کے لیے جو صابر اور شاکر ہو" ۔ چونکہ انہوں نے شکر نہ کیا تھا اور مشکلات میں صبر نہ کیا تھا ۔ اس آیت کی یہ بھی ایک تفسیر ہے جو ذہن میں آتی ہے ۔

--- ooo---

اب آخر میں بات قصے کے محدود احاطے سے نکل کر اللہ کی عمومی تدبیر کے دائرے میں آتی ہے ۔ اللہ کا نظام قضا و قدر جو نہایت ہی محکم ہے ، جو عام اور جو بطور سنت الٰہیہ اس کائنات میں جاری و ساری ہے ۔ قصے کا سبق یوں نچوڑا جاتا ہے ۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا
مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ
۲ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ۭ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝
۱۲ع

۸ "ان کے معاملہ میں ابلیس نے اپنا گمان صحیح پایا اور انہوں نے اسی کی پیروی کی ، بجز ایک تھوڑے سے گروہ کے جو مومن تھا ۔ ابلیس کو ان پر کوئی اقتدار حاصل نہ تھا مگر جو کچھ ہوا وہ اس لیے ہوا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کون آخرت کا ماننے والا ہے اور کون اس کی طرف سے شک میں پڑا ہوا ہے ۔ تیرا رب ہر چیز پر نگراں ہے" ۔

یہ قوم 'اس راستے پر چل کر اس کا یہ انجام کیوں ہوا؟ اس لیے کہ ابلیس نے اپنی منصوبہ بندی کو درست پایا اور وہ ان کو گمراہ کرنے میں کامیاب رہا ۔ ہاں اہل ایمان کو وہ گمراہ نہ کر سکا 'مومنین کے گروہ کو وہ گمراہ نہ کر سکا ۔ کیونکہ ہر گمراہ سوسائٹی میں لوگوں کی ایک قلیل تعداد ایسی رہ جاتی ہے جو گمراہ ہونے سے انکار کر دیتی ہے اور یہ قلیل گروہ مومنین اس

بات کا گواہ ہوتا ہے کہ سچائی اپنی جگہ قائم ہوتی ہے ۔ صرف اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی سچائی کا طالب ہو ۔ اگر کوئی طالب ہو تو سچائی مل جاتی ہے ۔ بد ترین حالات میں بھی سچائی قائم رہتی ہے ۔ جہاں تک ابلیس کا تعلق ہے لوگوں کے اوپر اس کو کوئی جابرانہ اقتدار حاصل نہیں ہے کہ وہ ان کو مجبور کر کے گمراہی کی طرف لے جاتا ہے ۔ شیطان ہر حال میں لوگوں پر مسلط ہوتا ہے ۔ اب لوگوں میں سے بعض حق پر ثابت قدم ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ حق کے طالب ہی نہیں ہوتے ' وہ گمراہ ہو جاتے ہیں ۔ پھر عالم واقعہ میں یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ مومن کون ہے اور مومن کو اس کا ایمان برے راستے سے بچاتا ہے ۔

مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ( ٣٤ : ٢١ ) "اس سے جو آخرت سے شک میں ہوتا ہے" ۔ جو شخص آخرت پر یقین رکھتا ہے وہ بچ جاتا ہے اور جو آخرت کے بارے میں شک کرتا ہے وہ شیطان کی گمراہی کا شکار ہو جاتا ہے ۔

اللہ کو تو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ کون سیدھی راہ لے گا اور کون غلط لے گا لیکن اللہ تعالیٰ فیصلوں کو تب صادر کرتا ہے جب وہ عملاً صادر ہو جاتے ہیں ۔

اس وسیع میدان میں یعنی اللہ کی تدبیر اور تقدیر کے وسیع میدان میں شیطان کو یہ آزادی دی گئی ہے کہ وہ کسی کو مجبور کیے بغیر لوگوں پر مسلط ہو جائے اور ان نتائج کو ظاہر کر دے جو پہلے سے اللہ کے علم میں تھے ۔ اس میدان میں قصہ سبا دراصل تمام اقوام عالم کا قصہ ہے ۔ اقوام کے عروج و زوال کی داستان وہی ہے جو سبا کی ہے ۔ اس لیے اس آیت کے دائرہ اطلاق کو وسیع کر دیا جاتا ہے ۔ یہ اصول قوم سبا تک محدود نہیں رہتا ۔ تمام انسانوں کے اچھے اور برے حالات اسی اصول کے تحت آتے جاتے ہیں ۔ لوگوں کا ہدایت پانا اور گمراہ ہونا اسباب ہدایت اور اسباب ضلالت اختیار کرنے کے نتیجے میں ہوتا ہے ۔

وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ( ٣٤ : ٢١ ) "اور تیرا رب ہر چیز پر نگران ہے" ۔ اس سے کوئی چیز غائب نہیں ہوتی 'کوئی چیز نظام تخلیق میں مہمل نہیں ہوتی اور نہ بے کار ہوتی ہے" ۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۹۶ ایک نظر میں

یہ ایک مختصر سبق ہے جس کا موضوع توحید اور شرک ہے' لیکن اس سبق میں انسان کے عقل و خرد کو پوری کائنات کی سیر کرائی جاتی ہے ۔ ظاہری کائنات ہو یا مخفی ہو' حاضر ہو یا غائب ہو' زمین سے ہو یا افلاک سے ہو' دنیا سے متعلق ہو یا آخرت سے ۔ اس سفر میں انسان پر اس قدر خوف طاری کر دیا جاتا ہے کہ اس کا وجود کانپنے لگتا ہے اور اللہ کا جلال اس پر اس قدر طاری ہوتا ہے کہ انسان مدہوش ہو جاتا ہے ۔ انسان کے سامنے اس کا نسب' اس کا رزق اور جزاو سزا کے مناظر رکھے جاتے ہیں ۔ اس سبق میں نہایت ہی زور دار الفاظ میں لفظ قل قل قل کے ساتھ انسان کو جھنجھوڑا جاتا ہے ۔ ہر فقرے میں ایک لاجواب دلیل سامنے لائی جاتی ہے ۔ نہایت ہی قوی دلیل ۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۹۶ تشریح آیات

## ۲۲ --- تا --- ۲۷

---

قُلِ ادۡعُوا الَّذِيۡنَ زَعَمۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ‌ۚ لَا يَمۡلِكُوۡنَ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الۡاَرۡضِ وَمَا لَهُمۡ فِيۡهِمَا مِنۡ شِرۡكٍ وَّمَا لَهٗ مِنۡهُمۡ مِّنۡ ظَهِيۡرٍ ﴿۲۲﴾

("اے نبی" ان مشرکین سے) کہو کہ "پکار دیکھو اپنے ان معبودوں کو جنہیں تم اللہ کے سوا اپنا معبود سمجھے بیٹھے ہو۔ وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرہ برابر چیز کے مالک ہیں نہ زمین میں۔ وہ آسمان و زمین کی ملکیت میں شریک بھی نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار بھی نہیں ہے"۔

آسمانوں اور زمین کے وسیع میدان میں یہ چیلنج ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ مِنْ دُونِ اللّٰه (۳۴: ۲۲) "کہو کہ پکار دیکھو اپنے معبودوں کو جن کو تم اللہ کے سوا اپنا معبود سمجھے بیٹھے ہو"۔ ان کو بلاؤ، وہ آئیں۔ ذرا ظاہر تو ہوں میدان میں، وہ خود دعویٰ کریں یا تم ان کی جانب سے دعویٰ کرو کہ زمین و آسمانوں کی بادشاہت میں ان کے اختیارات کیا ہیں؟ کچھ نہیں۔

لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ (۳۴: ۲۲) "وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرے کے برابر چیز کے مالک ہیں اور نہ زمین میں"۔ ظاہر ہے کہ وہ اور نہ ان کی جانب سے کوئی اور اس زعم کا دعویٰ کر سکتا ہے کیونکہ مالک تو وہ ہوتا ہے جو کسی چیز میں متصرف ہوتا ہے اور اس میں وہ متصرف نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ معبود کسی چیز کے مالک نہیں ہیں کیونکہ اس وسیع کائنات میں ان کا کوئی تصرف نہیں ہے۔

وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِنْ شِرْكٍ (۳۴: ۲۲) "آسمان اور زمین کی ملکیت میں وہ شریک ہی نہیں"۔ یعنی نہ تو وہ واحد مالک ہیں اور نہ وہ شریک مالک ہیں۔

وَّ مَا لَهٗ مِنۡهُمۡ مِّنۡ ظَهِيۡرٍ ( ۳۴ : ۲۲ ) "ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار بھی نہیں ہے"۔ تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ رضاکارانہ طور پر اللہ کے مددگار ہوں، یہ بھی نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اشارہ مخصوص قسم کے معبودوں اور مخصوص قسم کے شرک کی طرف ہے۔ یعنی اشارہ ملائکہ کی طرف ہے، جنہیں عرب اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔ سفارشی سمجھتے تھے اور انہی کے بارے میں ان کا کہنا تھا۔

مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰى "ہم ان کی بندگی اس لیے کرتے ہیں کہ یہ تو ہمیں اللہ کے بہت قریب کرتے ہیں"۔ یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں سفارش کی نفی کی جاتی ہے اور ایک ایسے منظر میں جو نہایت ہی خوفناک ہے"۔

وَلَا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا لِمَنۡ اَذِنَ لَهٗ ؕ

"اور اللہ کے حضور کوئی شفاعت بھی کسی کے لیے نافع نہیں ہو سکتی بجز اس شخص کے جس کے لیے اللہ نے سفارش کی اجازت دی ہو"۔

اللہ کے ہاں شفاعت وہی لوگ کر سکیں گے جن کو اللہ کی جانب سے اجازت ہو گی۔ اللہ کسی ایسے شخص کے لیے اجازت نہیں دیا کرتا جو مومن نہ ہو اور سفارش کا مستحق نہ ہو۔ وہ لوگ جو شرک کرتے ہیں وہ اس کے مستحق نہیں رہتے۔ نہ ملائکہ کو اس کی اجازت ہے اور نہ ان کے علاوہ اور لوگوں کو جن کو شفاعت کی اجازت ہو گی۔ جن حالات میں شفاعت کرنے والے شفاعت کریں گے باوجود اجازت کے، وہ کس قدر خوفناک ہوں گے، کس قدر دہشت ناک ہوں گے؟

حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ عَنۡ قُلُوۡبِهِمۡ قَالُوۡا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمۡ ؕ قَالُوا الۡحَـقَّ ۚ وَهُوَ الۡعَلِىُّ الۡكَبِيۡرُ ۝۲۳

"حتیٰ کہ جب لوگوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو گی تو وہ (سفارش کرنے والوں سے) پوچھیں گے کہ تمہارے رب نے کیا جواب دیا، وہ کہیں گے کہ ٹھیک جواب ملا ہے اور وہ بزرگ و برتر ہے"۔

یہ اس دن کا منظر ہے جو نہایت ہی خوفناک ہو گا۔ لوگ قیامت کے دن کھڑے ہوں گے۔ سفارش کرنے والے اور جن کی سفارش ہو رہی ہو گی سب کے سب سہمے ہوئے ہوں گے۔ پہلے تو سفارش کرنے والے اجازت کے منتظر ہوں گے۔ یہ انتظار طویل ہو گا۔ لوگ توقعات میں کھڑے ہوں گے اور تھک جائیں گے۔ سہمے ہوئے ہوں گے، دل ڈرے ہوئے ہوں گے اور کان فیصلہ سنتے ہوں گے۔

جب اللہ کی بارگاہ عزت سے فیصلہ صادر ہو گا تو سفارش کرنے والے اور جن کی سفارش ہو رہی ہے اس قدر ڈرے ہوئے ہوں گے کہ وہ فیصلے کو سمجھ ہی نہ سکیں گے۔

حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ عَنۡ قُلُوۡبِهِمۡ ( ۳۴ : ۲۳ ) "حتیٰ کہ جب لوگوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو گی"

جب حالت خوف سے وہ نکلیں گے اور وہ اس ہیبت سے نکل آئیں جس کی وجہ سے وہ مدہوش ہوگئے تھے تو پھر کہیں گے۔

مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ ( ۳۴ : ۲۳ ) "تمہارے رب نے کیا جواب دیا"۔ یعنی وہ ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔ ان میں سے شاید بعض لوگوں نے حواس بحال رکھ کر بات کو سمجھ لیا ہوگا۔

قَالُوا الْحَقَّ ( ۳۴ : ۲۳ ) "انہوں نے کہا حق کہا"۔ شاید یہ کہنے والے ملائکہ مقربین تھے جنہوں نے یہ مجمل اور جامع بات کہہ دی کیونکہ اللہ نے جو کچھ کہنا تھا وہ حق ہی تھا۔ وہ حق ہے 'ازلی حق اور ابدی حق ہے۔ لہٰذا اس کی بات بھی حق ہے۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ( ۳۴ : ۲۳ ) "اور وہ بزرگ و برتر ہے"۔ اللہ کی یہ صفت ایسے مقام پر آئی ہے 'جس میں اللہ کی علو شان نمایاں ہے اور اس مقام پر ہر شخص اللہ کی شان بلند کا ادراک کر سکتا ہے"۔

یہ مجمل سورہ اس بات کا مظہر ہے کہ فضا کے اندر گہری سنجیدگی اور خوف چھایا ہوا ہے کہ اس میں بھی مختصر بات کی جا سکتی ہے۔ یہ سفارش کا خوفناک موقعہ ہے۔ اگر منظور نہ ہو تو؟ اور یہ حالت ملائکہ مقربین کی ہے۔ کیا اس خوفناک منظر کے بعد کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ شریک ہے یا کوئی عقلمند شخص یہ عقیدہ رکھ سکتا ہے؟

یہ تو تھی عقل و خرد کے تاروں پر پہلی ضرب اور دوسری ضرب کا تعلق ان ارزاق سے ہے جو انسان رات اور دن استعمال کرتے ہیں۔ یہ انسانی ضروریات کون فراہم کرتا ہے۔ انسانی حیات اور اس کے قائم رکھنے کے لیے خوراک ہی پر اگر غور کیا جائے تو یہ بھی اللہ وحدہ کی ذات پر ایک سلطان اور برہان ہے۔

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾

"(اے نبیؐ) ان سے پوچھو "کون تم کو آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے؟" کہو' اللہ۔ اب لامحالہ ہم میں اور تم میں سے کوئی ایک ہی ہدایت پر ہے یا کھلی گمراہی میں پڑا ہوا ہے"۔

رزق ہر انسان کی زندگی کا واقعی اور زندہ مسئلہ ہے۔ رزق نتیجہ ہے آسمانوں سے بارشوں 'سورج کی روشنی اور نور کا۔ یہ باتیں تو اس وقت قرآن کے مخاطب جانتے تھے۔ اس کے بعد رزق کے بارے میں بہت سے انکشافات ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ زمین کے رزق کیا ہیں۔ نباتات' حیوانات' چشمے 'نہریں' معدنیات اور خزانے۔ سابقہ ادوار کے لوگ بھی ان سے واقف تھے 'بعد کے لوگوں نے مزید انکشافات کیے۔

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ ( ۳۴ : ۲۴ ) "کون ہے جو آسمانوں اور زمین میں سے تمہیں رزق دیتا ہے 'کہو اللہ"۔ اس لیے کہ وہ اس جواب میں شک نہ کر سکتے تھے اور نہ اس کے سوا کسی

اور جواب کا دعویٰ کر سکتے تھے ۔

کہو کہ رزق تو اللہ ہی دیتا ہے اور تمہارے امور اور ان کے امور اللہ کے سپرد ہیں ۔ تم دونوں میں سے کوئی ایک خواہ مخواہ ضلالت پر ہے ۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ دونوں ہدایت پر ہوں' یا دونوں ضلالت پر ہوں ۔ لہٰذا ایک فریق ایک راستے پر ہے اور دوسرا دوسرے پر ہے ۔

وَ اِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ( ۳۴ : ۲۴ ) "اب لامحالہ ہم میں اور تم میں سے کوئی ایک ہدایت پر ہے یا کھلی گمراہی میں پڑا ہوا ہے" ۔ بحث و مباحثہ میں یہ نہایت ہی معتدلانہ انداز گفتگو ہے کہ رسول اللہؐ مشرکین سے کہتے ہیں کہ ہم اور تم میں سے ایک فریق ہدایت پر ہے اور دوسرا ضلالت پر ہے ۔ ہدایت یافتہ اور گمراہ فریق کا تعین نہیں کیا جاتا تاکہ سامع خود غور و فکر کے بعد تعین کرے ۔ نہایت سنجیدگی کے ساتھ 'بغیر ہٹ دھرمی اور بغیر بحث و جدال اور حجت بازی کے ۔ کیونکہ حضور اکرمؐ تو ایک ہادی اور معلم تھے ۔ آپ کا مقصد لوگوں کو راہ راست دکھانا تھا ۔ ان کو لاجواب کر کے ذلیل کرنا مطلوب نہ تھا ۔

اس انداز گفتگو سے نہایت معاند' متکبر' سرکش اور دست درازی کرنے والے شخص کے دل پر بھی بات کا اثر ہوتا ہے اور کسی شخص کا مقام و مرتبہ راہ ہدایت لینے میں رکاوٹ نہیں ۔ اور ایک بلند مقام رکھنے والا بھی سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور نہایت ہی ٹھنڈے دل سے غور کرتا ہے ۔ اسے اطمینان ہو جاتا ہے ۔ یہ انداز گفتگو خصوصاً ان لوگوں کے گہرے غور کا مستحق ہے جو دعوت اسلامی کا کام کرتے ہیں ۔

--- ooo---

اب عقل و خرد کے تاروں پر تیسری ضرب' نہایت منصفانہ اور عادلانہ انداز گفتگو کے ساتھ لگائی جاتی ہے ۔ ہر دل کو اس کے اعمال اور ان کے نتائج کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے ۔

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾

"ان سے کہو' جو قصور ہم نے کیا ہو اس کی کوئی باز پرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو' اس کی کوئی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی" ۔

مشرکین رسول اللہؐ اور آپؐ کے ساتھیوں پر یہ الزام لگاتے تھے کہ یہ لوگ غلط کار' صابی اور مجرم ہیں اور انھوں نے اپنا حقیقی دین چھوڑ دیا ہے جو ان کے آباء و اجداد کا دین تھا ۔ اہل باطل اہل حق کو ہمیشہ گمراہ کہتے چلے آئے ہیں ۔ یہ ان کی طوطا چشمی اور غرور ہوتا ہے اور اس کا جواب یہی ہے ۔

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ( ۳۴ : ۲۵ ) "کہہ دو' جو قصور ہم نے کیا ہو اس کی کوئی باز پرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو' اس کی کوئی جواب طلبی ہم سے نہ ہوگی" ۔ ہر شخص اپنے عمل کا ذمہ دار ہوگا ۔ اور ہر شخص کو اپنے اعمال ہی کی جزاء ملے گی ۔ لہٰذا یہ ہر شخص کا اپنا کام ہے کہ وہ خوب سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھائے ۔ فلاح کی طرف یا ہلاکت کی طرف ۔

یوں قرآن ان کو جھنجوڑتا ہے کہ وہ غور و فکر کریں۔ سچائی کی طرف چلنے کے لیے یہ پہلا مرحلہ ہے کہ انسان راہ حق پر غور کرے۔

اب چوتھی ضرب :

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۚ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيمُ ﴿٢٦﴾

"کہو ' ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا ' پھر ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا۔ وہ ایسا زبردست حاکم ہے جو سب کچھ جانتا ہے"۔

پہلے سبق میں اللہ اہل حق اور اہل باطل کے درمیان مشترکہ فیصلہ دیا گیا کہ دونوں میں سے ایک ہی حق پر ہے ' اور ایک باطل پر ہے۔ اور حق اور باطل کا آمنا سامنا ہوا تھا تاکہ اہل حق ' حق کی طرف آئیں ' داعی اپنی دعوت پیش کریں اور حق و باطل باہم کشمکش کریں۔ دلائل کے سامنے شبہات لائے جائیں اور باطل حق کو بچھاڑنے کی کوشش کرے۔ لیکن یہ صورت ایک مختصر وقت کے لیے ہوتی ہے۔ اس کے بعد فریقین کے درمیان فیصلہ ہو جاتا ہے۔ یہ فیصلہ دو ٹوک ہے اور فیصلہ کرنے والا بہت بڑا حاکم ہے اور علیم بھی ہے۔ وہ علم اور معرفت پر فیصلہ کرتا ہے۔

اللہ کو فتاح علیم کہہ کر یہ بتلانا مقصود ہے کہ اللہ کے فیصلے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ ایسا حاکم ہے جو حق و باطل کے درمیان علم کے مطابق فیصلہ کرنے والا ہے۔ وہ حق و باطل کو نکھار کر رکھ دیتا ہے اور ان کے درمیان التباس رہنے نہیں دیتا۔ حق پرستوں اور باطل پرستوں کو اکٹھا اور ملا جلا نہیں چھوڑا جاتا بشرطیکہ حق اپنی دعوت زوردار انداز سے پیش کرے ' قوت اس راہ میں لگا دے۔ پورے تجربات سے کام لے اور پوری قوت لگا کر معاملے کو اللہ کے سپرد کر دے تاکہ اللہ فتاح علیم فیصلہ کرے۔

یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ کس وقت کرتا ہے۔ اس فیصلے کے لیے وقت کا تعین بھی اللہ کرتا ہے۔ نہ اس میں جلدی کا کوئی داعیہ ہے کیونکہ یہ اللہ ہی ہے جو حق و باطل کا آمنا سامنا کراتا ہے ' کشمکش کراتا ہے اور پھر فیصلہ کراتا ہے۔ وہی فتاح علیم ہے۔

--- ооо---

اب آخری ضرب ' یہ آخری ضرب پہلی ضرب کے مشابہ ہے۔ اس میں اللہ کے نام نہاد شرکاء کو چیلنج دیا جاتا ہے۔

قُلْ أَرُونِيَ الَّذِينَ أَلْحَقْتُمْ بِهِ شُرَكَاءَ ۖ كَلَّا ۚ بَلْ هُوَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٢٧﴾

"ان سے کہو ' ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی وہ کون ہستیاں ہیں جنہیں تم نے اس کے ساتھ شریک لگا رکھا ہے۔ ہرگز نہیں زبردست اور دانا تو بس وہ اللہ ہی ہے"۔

یہ نہایت ہی تہدید آمیز اور حقارت آمیز سوال ہے۔ ذرا دکھاؤ تو سہی وہ کون لوگ ہیں جن کو تم نے اللہ کے ساتھ

الوہیت میں ملحق کر دیا ہے ۔ یہ لوگ کون ہیں؟ ان کی کیا حیثیت ہے ۔ کس درجے کے لوگ ہیں یہ! اور پھر اس مقام کے لیے ان کا استحقاق کیا ہے؟

اس کے بعد لفظ کلا سے ان کی سرزنش کی جاتی ہے ۔ کہاں سے یہ لائیں گے جبکہ اللہ کا کوئی شریک ہی نہیں ہے ۔

بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳۴ : ۲۷) "زبردست اور دانا تو بس اللہ ہی ہے"۔ جس ذات کی صفات یہ ہوں اس کا کوئی شریک کیسے ہو سکتا ہے اور ضرورت بھی کیا ہے 'لہٰذا اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے ۔

اس پر یہ سبق ختم ہوتا ہے ۔ اس کے آخر میں نہایت ہی دو ٹوک اور سبق آموز تبصرے ہیں ۔ اس عظیم کائنات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۔ ایسے حالات میں جبکہ قیامت میں شفاعت کا مرحلہ ہو گا ۔ حق و باطل کی کشمکش کے حوالے سے اور نفس انسانی کے اندر غور و فکر اور سوچ و بچار کے حوالے سے ۔

--- ooo---

# درس نمبر ۱۹۷ ایک نظر میں

اس سبق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اوپر نازل ہونے والی کتاب کے بارے میں مشرکین کا موقف بیان کیا گیا ہے۔ یہ ہر رسول کے مقابلے میں اختیار کیا جانے والا کھاتے پیتے لوگوں کا موقف ہے۔ اس قسم کے لوگ اپنے مال اور اولاد اور اپنے معاشرتی مقام کی وجہ سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ ان کے پیش نظر صرف اس دنیا کے مفادات ہوتے ہیں اور یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ چونکہ یہ دنیا کے مفادات حاصل کرنے میں دوسروں سے آگے ہیں اس لیے یہ مختار اور افضل لوگ ہیں۔ اور یہ کہ اس دنیاوی دولت کی وجہ سے وہ دنیا و آخرت دونوں کے عذاب سے بچ جائیں گے۔ چنانچہ یہاں ان کے سامنے وہ منظر پیش کیا جاتا ہے جو آخرت میں ان کا ہوگا۔ یہ منظر ایسا ہے کہ گویا واقعہ ہو چکا ہے تاکہ وہ دیکھ لیں کہ جن چیزوں نے ان کو مغرور کر دیا ہے' وہ تو قیامت میں کچھ فائدہ دینے والی نہیں ہیں۔ اس منظر میں یہ بات بھی دکھائی گئی ہے کہ دنیا میں وہ جن فرشتوں اور جنوں کی بندگی کرتے تھے وہ تو قیامت کے دن ان کے لیے ذرہ بھر مفید نہیں ہیں۔ اس منظر کے مکالموں کے درمیان یہ بات بتائی گئی ہے کہ اللہ کے ترازو میں کون سی چیز وزن رکھتی ہے۔ اسی طرح ان کھوٹی قدروں کی تردید خود بخود ہو جاتی ہے۔ جن کو وہ اس دنیا میں سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ ثابت یہ ہوتا ہے کہ رزق کا کشادہ ہونا یا محدود ہونا مشیت الٰہیہ پر موقوف ہے اور یہ اللہ کے غضب یا رضامندی کی دلیل نہیں ہے۔ یہ ایک قسم کی آزمائش ہوتی ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۹۷ تشریح آیات

## ۲۸--- تا --- ۴۲

---

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا وَّلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ
۳ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝ وَيَقُوۡلُوۡنَ مَتٰى هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝
۹ع قُلْ لَّكُمۡ مِّيۡعَادُ يَوۡمٍ لَّا تَسۡتَاۡخِرُوۡنَ عَنۡهُ سَاعَةً وَّلَا تَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ۝ النصف
۹

”اور (اے نبیؐ) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے ‘مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں ۔ یہ لوگ تم سے کہتے ہیں کہ ”وہ (قیامت کا) وعدہ کب پورا ہو گا اگر تم سچے ہو؟“ کہو ‘تمہارے لیے ایک ایسے دن کی میعاد مقرر ہے جس کے آنے میں نہ ایک گھڑی بھر کی تاخیر تم کر سکتے ہو اور نہ ایک گھڑی بھر پہلے اسے لا سکتے ہو؟“

گذشتہ سبق میں یہ بات طے کی گئی تھی کہ ہر شخص اپنے کیے کا ذمہ دار ہے اور اہل حق اور اہل باطل کے درمیان مکالمہ ضرور ہونا چاہیے ۔ اہل حق کو چاہیے کہ اپنی بات کھول کر رکھ دیں نہایت حکمت کے ساتھ ‘ پھر معاملہ اللہ کے سپرد ہے ۔ وہاں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ نبی کا منصب و مقام اور فریضہ کیا ہے یہ لوگ منصب نبوت سے جاہل ہیں ۔ آخرت کی جس جزاء و سزا کا نبی ذکر کرتے ہیں اپنی اس جہالت کی وجہ سے یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قیامت برپا کیوں نہیں ہو جاتی تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ قیامت کے برپا ہونے کے لیے ایک وقت مقرر ہے ‘اس سے وہ نہ پہلے آ سکتی ہے اور نہ بعد میں ۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا ( ۳۴ : ۲۸ ) ”اے نبیؐ ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے“ ۔ یہ رسالت کے منصب کے عام فرائض ہیں کہ آپ کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا ہے اور تمام انسانوں کے لیے بھیجا گیا ہے ۔ نبی کا فرض پورا ہو جاتا ہے جب وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لوگوں کو جنت کی خوشخبری دے دے اور دوزخ کے عذاب سے ڈراوے ۔

وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ( ۳۴ : ۲۸ ) وَيَقُوۡلُوۡنَ مَتٰى هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ كُنۡتُمۡ

صٰدِقِيْنَ (٣٤ : ٢٩ ) "لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ تم سے کہتے ہیں کہ وہ ڈراوا کب آئے گا اگر تم سچے ہو"۔ ان کے اس سوال ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی رسول کے فرائض منصبی ہی سے واقف نہیں ہیں۔ آخر رسول کا یہ فرض نہیں ہوتا کہ وہ انجام برپا کر دے۔ رسول کا فریضہ صرف یہ ہے کہ وہ لوگوں کو خبردار کر دے۔ رسول کی ڈیوٹی محدود ہوتی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں اور اپنے فرائض سے رسول اللہؐ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتے۔ اصل اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہی بھیجنے والا ہے، وہی کام کی حدود مقرر کرنے والا ہے۔ اللہ نے رسول کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ قیامت برپا کر دیں یا اس کا وقت بتا دیں۔ یہ رب تعالیٰ کا کام ہے۔ رسول اپنے حدود کار سے باخبر ہیں لہٰذا وہ اللہ سے کوئی ایسا سوال نہیں کرتے جو ان کی ڈیوٹی کی حدود سے باہر ہو۔ اور اس کے بارے میں کوئی ذمہ داری ان پر ڈالی نہ گئی ہو۔ حکم دیا جاتا ہے کہ ان کو ایک اصولی بات بتا دی جائے۔

قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ (٣٤ : ٣٠ ) "کہو، تمہارے لیے ایک دن کی میعاد مقرر ہے جس کے آنے میں نہ ایک گھڑی کی تاخیر تم کر سکتے ہو اور نہ گھڑی بھر پہلے اسے لا سکتے ہو"۔ ہر میعاد اپنے مقررہ وقت پر آتی ہے، جو اللہ نے مقرر کیا ہے، اس میں تقدیم و تاخیر ممکن نہیں ہے۔ نہ کسی کی خواہش پر اللہ اس طرح کرتا ہے۔ دنیا میں کوئی کام نہ عبث ہوتا ہے، نہ اتفاقاً واقعہ ہو جاتا ہے۔ ہر واقعہ اللہ کا تخلیق کردہ اور تقدیر کے مطابق ہوتا ہے۔ ہر معاملے کا تعلق آخرت سے ہے۔ اللہ کی تقدیر ان واقعات کو اپنی حکمت کے مطابق روبعمل لاتی ہے اور حکمت الٰہی سے انسان اسی قدر خبردار ہوتا ہے جس قدر اللہ انسان کو سمجھاتا ہے۔ ورنہ اللہ کی حکمت کا بیشتر حصہ مستور ہوتا ہے۔

اللہ کے وعدے اور اللہ کی سزا کے معاملے میں جلدی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا مطالبہ کرنے والا انسان اس اصول اور حکمت ربانی کے نظام سے واقف نہیں ہے اور علم نہیں رکھتا۔ اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں اور اپنی لاعلمی کی وجہ سے جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ

"یہ کافر کہتے ہیں کہ "ہم ہرگز اس قرآن کو نہ مانیں گے اور نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو تسلیم کریں گے"۔ یہ ہے وہ عناد جس میں مخالفین اسلام اول روز سے مبتلا تھے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہدایت کو مان کر نہ دیں گے اگرچہ اس کا منبع کتب سابقہ میں ہو۔ نہ قرآن کو مانیں گے اور نہ پہلی کسی کتاب کو۔ نہ اس کو نہ سابقہ کتب کو۔ یہی فیصلہ مخالفین اسلام کا کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ کفر پر اصرار کرتے ہیں۔ پختہ فیصلہ انہوں کر لیا ہے کہ وہ کفر پر اصرار کریں گے اور دلائل ہدایت پر غور ہی نہ کریں گے۔ جب انہوں نے یہ فیصلہ کر ہی دیا ہے تو ان کا علاج یہی ہے کہ ان کے سامنے بس مناظر قیامت میں سے ایک منظر پیش کر دیا جائے۔

وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖۚ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ

إِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْلَ ۚ يَقُولُ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَا أَنتُمْ
لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ ﴿٣١﴾ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا أَنَحْنُ صَدَدْنَاكُمْ
عَنِ الْهُدَىٰ بَعْدَ إِذْ جَاءَكُم ۖ بَلْ كُنتُم مُّجْرِمِينَ ﴿٣٢﴾ وَقَالَ الَّذِينَ
اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا بَلْ مَكْرُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُونَنَا أَن نَّكْفُرَ
بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُ أَندَادًا ۚ وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ وَجَعَلْنَا
الْأَغْلَالَ فِي أَعْنَاقِ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٣٣﴾

"کاش تم دیکھو ان کا حال اس وقت جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے۔ اس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے۔ جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ "اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے"۔ وہ بڑے بننے والے ان دبے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے۔ "کیا ہم نے تمہیں اس ہدایت سے روکا تھا جو تمہارے پاس آئی تھی؟ نہیں' بلکہ تم خود ہی مجرم تھے"۔ وہ دبے ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے "نہیں' بلکہ شب و روز کی مکاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہرائیں"۔ آخر کار جب یہ لوگ عذاب دیکھیں گے تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے اور ہم ان منکرین کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے۔ کیا لوگوں کو اس کے سوا اور کوئی بدلہ دیا جا سکتا ہے کہ جیسے اعمال ان کے تھے' ویسے ہی جزا وہ پائیں؟"

یہ تو تھی ان کی دنیاوی بات "ہم ہرگز قرآن کو نہ مانیں گے اور نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو تسلیم کریں گے"۔ لیکن ان ظالموں کی حالت قیامت کے دن دیکھنے کے قابل ہوگی جب یہ لوگ ــــــ اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے اور بطور ملزم اللہ کی عدالت میں سزا کا انتظار کر رہے ہوں گے اور ان کو اس وقت یقین ہو گا کہ انہوں نے تو ہدایت کا انکار کیا تھا لہٰذا نتیجہ سامنے ہے۔ اب اور تو کچھ بس نہ چلے گا ایک دوسرے پر لعنت و ملامت کریں گے اور اس انجام کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالیں گے۔ یہ اس وقت کیا کہیں گے؟

يَقُولُ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَا أَنتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ (٣٤: ٣١)

"جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے "اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے"۔ اس وقت وہ جس خوفناک صورت حالات سے دوچار ہیں یہ اس کی ذمہ داری اکابرین پر رکھیں گے۔ کیونکہ ان کو نظر آ رہا ہے کہ مصیبت سر پر ہے۔ آج تو وہ ان کے منہ پر یہ حق بات کہہ رہے ہیں لیکن دنیا میں ان کو یہ حق بات کہنے کی توفیق نہ تھی۔ ان کو وقت' کمزوری' غلامی' حق بات کہنے نہ دیتی تھی۔ انہوں نے اللہ کی بخشی ہوئی آزادی کو فروخت کر دیا تھا۔ وہ

عزت جو اللہ نے ہر انسان کو دی تھی اس سے وہ دستبردار ہو گئے تھے۔ وہ قوت مدرکہ جو ہر انسان کو دی گئی' انہوں نے معطل کر دی تھی۔ آج تو سب جھوٹی اور کھوئی قدریں ختم ہیں۔ سامنے دردناک عذاب ہے۔ اب وہ یہ حق بات کہتے ہیں جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ (۳۴ : ۳۱) "اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے"۔

اور یہ اکابرین بھی نہایت ہی تنگی اور ترشی سے جواب دیتے ہیں۔ خطرہ تو اب دونوں کے لیے برابر ہے۔ یہ اپنی ذمہ داری خواہ مخواہ ان پر ڈالتے ہیں۔ وہ بھی خوب جواب دیتے ہیں۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ (۳۴ : ۳۲) "اور ان بڑے بننے والوں نے جواب دیا' کیا ہم نے تمہیں اس ہدایت سے روکا تھا جو تمہارے پاس آئی تھی؟ نہیں بلکہ تم خود مجرم تھے"۔ یوں وہ کسی ذمہ داری کے قبول کرنے کا صاف انکار کر دیتے ہیں۔ اور یہ اقرار کر لیتے ہیں کہ ہدایت آئی تھی۔ یہ مستکبرین دنیا میں تو ضعفاء کو کوئی اہمیت ہی نہ دیتے تھے۔ نہ ان سے رائے طلب کرتے تھے' بلکہ ان کا وجود ہی تسلیم نہ کرتے تھے اور یہ بات برداشت ہی نہ کرتے تھے کہ یہ ضعفاء ان کی مخالفت کریں یا مباحثہ کریں لیکن آج جبکہ عذاب کا سامنا ہے تو وہ صاف صاف انکار کرتے ہیں کہ۔

اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ (۳۴ : ۳۲) "کیا ہم نے تمہیں روکا تھا' جب تمہارے پاس ہدایت آئی تھی"۔ بلکہ تم خود ہی مجرم تھے۔ تم نے مجرمانہ انداز اختیار کر لیا تھا۔

اگر دنیا ہوتی تو ان کمزور لوگوں کے ہونٹ سلے ہوئے ہوتے لیکن آخرت میں دنیا کے تمام جھوٹے پردے اٹھ جائیں گے۔ جھوٹی قدریں مٹ جائیں گی۔ آنکھیں کھل جائیں گی اور چھپے حقائق پردے سے باہر آ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں یہ کمزور لوگ بھی کھل کر بات کریں گے۔ بلکہ اب وہاں مستکبرین کے منہ میں منہ ڈال کر بات کریں گے اور کہیں گے کہ تم ہی اس سب صورت حالات کے ذمہ دار ہو۔ تم رات اور دن مکاری کرتے تھے اور ہمیں ہدایت سے روکتے تھے۔ تم نے باطل کو تھام رکھا تھا' ہم پر مسلط کر دیا تھا اور دعوت اسلامی کو ہم پر مشتبہ بنا دیا تھا۔ تم اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کر کے ہمیں گمراہ کرتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا (۳۴ : ۳۳) وہ دبے ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے' "نہیں' بلکہ شب و روز کی مکاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہرائیں"۔

اب ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مکالمہ اور مجادلہ نہ ان کے لیے مفید ہے اور ان کے لیے ـ نہ بڑوں کی نجات ممکن ہے اور نہ چھوٹوں کی ـ ہر گروہ مجرم ہے ' البتہ بڑوں پر اپنی گمراہی کی بھی ذمہ داری ہے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کی بھی ذمہ داری ہے ـ چھوٹوں پر یہ ذمہ داری ہے کہ انہوں نے کیوں ان بڑے لوگوں کی اطاعت کی ـ یہ بات وہاں معافی کی وجہ نہیں بن سکتی کہ یہ ضعیف تھے ـ اللہ نے ان کو عقل اور آزادی دی تھی ـ انہوں نے عقل سے کام نہ لیا اور اپنی آزادی رائے کو فروخت کر دیا ـ وہ طفیلی بن رہنے پر راضی ہوئے اور ذلت کی زندگی قبول کی ـ اس لیے وہ عذاب کے مستحق بن گئے ـ اس گفتگو کے دوران ہی ان پر سخت ندامت طاری ہو گئی اور یہ اسے چھپانے لگے ـ جب انہوں نے عذاب دیکھ لیا ـ

وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ( ۳۴ : ۳۳ ) "جب یہ عذاب دیکھیں گے تو پچھتائیں گے" ـ اور اپنی ندامت کو چھپانے کی کوشش کریں گے ـ یہ ایسی حالت ہوتی ہے کہ دل کی بات دل ہی میں رہ جاتی ہے ـ زبانیں بند ہو جاتی ہیں ' ہونٹ سل جاتے ہیں اور سخت عذاب انہیں آ لیتا ہے ـ

وَ جَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْۤ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ( ۳۴ : ۳۳ ) "ہم ان منکرین کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے" ـ اب یہ لوگ طوقوں میں بندھے ہوئے ہیں لیکن بات کا رخ ان سے پھر جاتا ہے اور عام بدکاروں سے کہا جاتا ہے کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے ـ

هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ( ۳۴ : ۳۳ ) "کیا لوگوں کو اس کے سوا اور کوئی بدلہ دیا جا سکتا ہے کہ جیسے اعمال ان کے تھے ' ویسی ہی جزا وہ پائیں" ـ

اب بڑے بننے والے اور چھوٹے بننے والے دونوں قسم کے ظالموں کے اس منظر پر پردہ گرتا ہے ـ دونوں ظالم ہیں ـ یہ اس لیے ظالم ہیں کہ سرکش تھے اور باغی تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے ـ وہ اس لیے ظالم تھے کہ انہوں نے انسانی شرافت اور آزادی کے مقام کو ترک کر دیا اور اپنے جیسے انسانوں کے غلام بن گئے ـ ان کے سامنے ذلت اختیار کی ـ اب دونوں کے لیے دائمی عذاب ہے ـ

پردہ گرتا ہے اور ظالم اپنا منظر اچھی طرح دیکھ چکے ' زندہ شکل میں ـ انہوں نے اپنی ہر حالت دیکھ لی اور وہ اس زمین پر زندہ ہیں ـ دوسروں نے بھی اس منظر کو دیکھ لیا ـ سب کے سامنے ابھی مہلت کی گھڑیاں ہیں ـ

--- ○○○ ---

کبراء قریش جو باتیں کرتے ہیں ایسی ہی باتیں اقوام رفتہ کے مستکبرین بھی کرتے چلے آئے ہیں ـ

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ

کہا ہو کہ "جو پیغام تم لے کر آئے ہو' اس کو ہم نہیں مانتے"۔

یہ ایک عام رویہ ہے' بار بار دہرایا جاتا ہے' اس دنیا میں - زمانوں سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے - خوشحالی دلوں کو سخت کر دیتی ہے - دلوں سے احساس ختم ہو جاتا ہے - فطرت بگڑ جاتی ہے - اور باطل کے نیچے دب جاتی ہے - اسے دلائل ہدایت نظر ہی نہیں آتے - اس لیے ہدایت کے مقابلے میں مفسدین اپنے آپ کو اونچا سمجھتے ہیں اور ان کے سینے روشنی کے لیے بند ہو جاتے ہیں -

ہمیشہ یوں ہوتا ہے کہ اہل ثروت اور کھاتے پیتے لوگوں کی جھوٹی قدریں ان کو دھوکہ دیتی ہیں - ان کے پاس جو دولت اور قوت ہوتی ہے وہ ان کو دھوکے میں ڈالتی ہے - یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ اثر ان کو عذاب الہی سے بھی بچا لے گا - اللہ نے جو ان کو دولت دی ہے یہی تو اللہ کی رضا کی علامت ہے اور یہ کہ وہ حساب و کتاب اور جواب دہی کے مقام سے بلند ہیں -

وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۙ وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ﴿۳۵﴾

"انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ "ہم تم سے زیادہ مال اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں"۔

لیکن قرآن کریم جواب دہی کے لیے وہ معیار اور وہ قدریں وضع کرتا ہے جو اللہ کے ہاں معمول بہا ہیں - اللہ کے ہاں رائج ہیں - یہ بیان کیا جاتا ہے کہ رزق کی کشادگی اور تنگی پر مدار فیصلہ نہیں ہے - فیصلہ اللہ کی رضا و غضب پر ہو گا - رزق نہ کسی کو سزا دیتا ہے اور نہ بچاتا ہے - حساب و کتاب اور جزاء و سزا کا معاملہ دولت مندی اور تنگدستی سے جدا ہے - اللہ کی رضامندی اور ناراضگی کا تعلق رزق سے نہیں ہے اس کے لیے دوسرا معیار ہے -

۴ قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ
ع ۶ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾
۱۰

"اے نبی' ان سے کہو "میرا رب جسے چاہتا ہے' کشادہ رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے' نپا تلا عطا کرتا ہے مگر اکثر لوگ اس کی حقیقت نہیں جانتے"۔

یہ مسئلہ یعنی رزق کی فراوانی اور تنگی کا مسئلہ' عیش و عشرت کے وسائل کی ملکیت اور زیب و زینت کے ذرائع اور ان سے محرومی کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے کئی لوگوں کے دلوں میں بے حد خلجان پیدا ہوتا ہے - جب لوگ دیکھتے ہیں کہ اہل شر' اہل فساد اور باطل پرستوں پر دنیا کے مال و دولت کے دروازے کھلے ہیں - اہل حق' اہل خیر اور نیک لوگ ان سے محروم ہیں اس لیے بعض لوگ یوں سوچتے ہیں کہ اگر اللہ ان لوگوں سے ناراض ہوتا تو ان پر وسائل کی یوں بارش کیوں کرتا - بعض اوقات لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ نیکی' سچائی اور پاکبازی ہمیشہ محروم رہتی ہے -

یہاں قرآن مجید دنیا کے مال و متاع اور سازوسامان اور ان قدروں کے درمیان جدائی کر دیتا ہے جو اللہ کی نظروں میں بلند ہیں - فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ رزق کی تنگی اور فراوانی اللہ کی مشیت کے تحت ہے - اس کا اللہ کی رضامندی اور

ناراضگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض اوقات اللہ ایک ایسے شخص کو بھی رزق فراواں دے دیتا ہے جس سے وہ ناراض ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کو بھی دیتا ہے جس سے راضی ہوتا ہے۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ اہل شر اور اہل خیر دونوں غریب اور نادار ہوتے ہیں لیکن تمام حالات میں علل و اسباب ایک نہیں ہوتے۔

بعض اوقات اللہ اہل شر کو زیادہ نوازتا ہے تاکہ وہ سرکشی، فساد اور نافرمانی میں آگے بڑھ جائیں۔ یوں ان کو پکڑنا مقصود ہوتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ جرائم کا ارتکاب کرلیں تاکہ ان کو زیادہ سزا ملے۔ پھر اللہ ان کو دنیا میں بھی سزا دیتا ہے اور آخرت میں بھی دے گا۔ اپنی حکمت اور تدبیر کے مطابق بھی بعض اوقات اللہ اہل شر کا رزق تنگ کرتا ہے تو وہ مزید جرائم کرتے ہیں۔ اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں اور اپنی ناداری کی وجہ سے شر و فساد اور ظلم و ضلالت کی حدوں کو پار کر جاتے ہیں۔

بعض اوقات اللہ اہل خیر پر بارش کر دیتا ہے تاکہ وہ مزید نیکی کے کام کریں۔ اگر ان کے پاس دولت نہ ہوتی تو وہ یہ کام نہ کر سکتے اور اس لیے بھی کہ وہ اللہ کا شکر ادا کریں۔ دل کے ساتھ، زبان کے ساتھ اور عمل کے ساتھ۔ وہ اپنے مال کے ذریعے ایسی نیکیاں کمائیں جو اللہ کے ہاں ان کے لیے ذخیرہ ہوں اور کبھی اہل خیر محروم کیے جاتے ہیں تاکہ محرومیت پر ان کے صبر اور شکر کو آزمایا جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ وہ اللہ پر کس قدر بھروسہ کرتے ہیں۔ کس قدر رحمت کے امیدوار ہوتے ہیں اور اللہ کی تقدیر پر ان کو کس قدر یقین ہوتا ہے۔ کس قدر راضی برضا ہوتے ہیں اور رب تعالیٰ اچھا اور باقی رہنے والا ہے۔ اس طرح ان کا ذخیرہ آخرت بڑھ جاتا ہے اور اللہ ان سے بہت راضی ہوتا ہے۔

بہرحال رزق کی فراوانی اور تنگی کے جو اسباب بھی ہوں، اور لوگوں کے اعمال اور حکمت الہیہ کے حوالے سے جو بھی سبب ہو، حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ اللہ کے ہاں مقبولیت سے بالکل علیحدہ مسئلہ ہے۔ اس کی بنا پر اللہ کے ہاں کوئی مقدم و موخر نہیں ہوتا۔ اللہ کے ہاں مقدم اور موخر ہونے کا دارومدار اس پر ہے کہ جس شخص کے مال اور اولاد میں فراوانی دی گئی ہے وہ اپنے مال اور اولاد میں تصرف کیسے کرتا ہے۔ اسی طرح جسے رزق کی تنگی دی گئی ہے وہ کس قدر صبر و شکر کرتا ہے۔ لہٰذا مال و اولاد والا شخص اگر اپنے مال اور اولاد میں اچھا تصرف کرتا ہے تو اللہ اس کے اجر میں اضافہ کرے گا۔

وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۡفَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

”یہ تمہاری دولت اور تمہاری اولاد نہیں ہے جو تمہیں ہم سے قریب کرتی ہو۔ ہاں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے عمل کی دہری جزا ہے۔ اور وہ بلند و بالا عمارتوں میں اطمینان سے رہیں گے۔ رہے وہ لوگ جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں، تو وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے“۔

نہایت صراحت کے ساتھ بتایا جاتا ہے کہ رزق کی فراوانی کے ذریعہ کوئی اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہو جاتا۔ ہاں اگر کوئی اپنی دولت میں سے فی سبیل اللہ خرچ کرتا ہے تو وہ اللہ کے ہاں مفید ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ یَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ۚ وَ هُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ۝۳۹

”اے نبی ؐ ان سے کہو ” میرا رب اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے ' کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ' نپا تلا دیتا ہے۔ جو کچھ تم خرچ کر دیتے ہو ' اس کی جگہ وہی تم کو اور دیتا ہے ' وہ سب رازقوں سے بہتر رازق ہے“۔

یہ سبق اب ایک ایسے منظر پر ختم ہوتا ہے جس میں وہ تمام لوگ فرشتوں کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں ' جو فرشتوں کی بندگی کرتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا تھا کہ قیامت کے عذاب سے ڈرو تو وہ کہتے تھے کہاں ہے قیامت ' لاؤ۔ ان سے کہا جائے گا اب چکھو اس عذاب کو جس کے متعلق تمہیں جلدی تھی۔

وَ یَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰۤؤُلَآءِ اِیَّاكُمْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ۝۴۰ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۝۴۱ فَالْیَوْمَ لَا یَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ؕ وَ نَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝۴۲

”اور جس دن وہ تمام انسانوں کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا ”کیا یہ لوگ تمہاری ہی عبادت کیا کرتے تھے؟“ تو وہ جواب دیں گے کہ ”پاک ہے آپ کی ذات ' ہمارا تعلق تو آپ سے ہے نہ کہ ان لوگوں سے۔ دراصل یہ ہماری نہیں بلکہ جنوں کی عبادت کرتے تھے ' ان میں سے اکثر انہی پر ایمان لائے تھے۔ (اس وقت ہم کہیں گے کہ) آج تم میں سے کوئی نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان ' اور ظالموں سے ہم کہہ دیں گے کہ اب چکھو اس عذاب جہنم کا مزہ جسے تم جھٹلایا کرتے تھے“۔

ان فرشتوں کی وہ اللہ کے سوا پرستش کرتے تھے یا ان کو وہ اللہ کے ہاں سفارشی بناتے تھے۔ اب ان کو ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ فرشتے اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں اور اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ یہ لوگ ان کی عبادت کرتے تھے۔ گویا یہ بندگی اور عبادت ان کی جانب سے لغو اور کالعدم حرکت تھی۔ گویا یہ ہوئی ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بندگی دراصل شیطان کی بندگی ہے۔ یا تو یہ لوگ شیطان کی پوجا کرتے تھے یا شیطان کا حکم سن کر اس کی اطاعت کرتے تھے۔ جب وہ فرشتوں کی بندگی کرتے تھے تو گویا شیطان کی بندگی کرتے تھے۔ جنوں کی بندگی تو عربوں میں، [illegible] تھا۔ بعض لوگ ایسے تھے جو جنوں کی بندگی بھی کرتے تھے اور ان سے استعانت بھی کرتے تھے۔

بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُؤْمِنُونَ (٣٤ : ٤١) "دراصل یہ ہماری نہیں بلکہ جنوں کی عبادت کرتے تھے اور ان میں سے اکثر انہی پر ایمان لائے تھے"۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ قصہ سلیمان علیہ السلام کا ان مسائل کے ساتھ تعلق ہے۔ یہ قرآن کریم کا خاص انداز ہے کہ قصص سورہ کے موضوع سے مربوط ہوتے ہیں۔

یہ منظر اسکرین پر چل رہا تھا کہ اچانک کلام کا اسلوب بدل جاتا ہے اور براہ راست خطاب شروع ہو جاتا ہے اور یہ شرمسار کنندہ باتیں ان سے کہی جاتی ہیں۔

فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا (٣٤ : ٤٢) "آج تم میں سے کوئی نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان"۔ نہ فرشتے کسی کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ نہ یہ کفار ایک دوسرے کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ وہ آگ جس کی ظالم تکذیب کرتے تھے اور جس کے بارے میں وہ مطالبہ کرتے تھے کہ لاؤ وہ آگ، اسے اب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے۔

وَنَقُولُ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابَ النَّارِ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ (٣٤ : ٤٢) "اور ظالموں سے ہم کہہ دیں گے کہ اب چکھو اس عذاب جہنم کا مزہ جسے تم جھٹلایا کرتے تھے"۔

یہاں یہ سبق ختم ہو جاتا ہے جس کا مرکزی مضمون حساب و کتاب، سزا و جزاء اور قیام قیامت ہے، جس طرح دوسرے اسباق کا بھی یہی مضمون رہا ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۱۹۸ ایک نظر میں

اس سورہ کے اس آخری سبق کا آغاز مشرکین اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کے بارے میں ان کے اقوال سے ہوتا ہے ۔ ان کو یہ بات یاد دلائی جاتی ہے کہ ان جیسے لوگوں کا انجام کیا ہوا کرتا ہے ۔ انسانی تاریخ کی ایسی اقوام کی داستانوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو ان سے زیادہ قوی ' زیادہ علم والی اور زیادہ مالدار تھیں ' جن کو اس دنیا ہی میں پکڑ لیا گیا۔

اس کے بعد عقل و خرد کے تاروں پر مسلسل شدید ترین ضربات لگائی جاتی ہیں ۔ پہلی ضرب میں ان کو یہ بات سکھائی جاتی ہے کہ ذرا تنہائی میں ' تمام رکاوٹوں اور پردوں کو ہٹا کر جو انہیں صحیح فکر و نظر سے روکتے ہیں اللہ کے بارے میں سوچیں ۔ دوسری ضرب میں ' ان کو اس حقیقت پر غور کرنے کے لیے دعوت دی گئی ہے کہ وہ دیکھیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو مسلسل جو دعوت دے رہے ہیں اس دعوت میں ان کا کوئی مفاد بھی نہیں ہے اور آپ ان سے اجر بھی طلب نہیں کرتے تو آخر یہ لوگ حضور کی دعوت میں شک کیوں کرتے ہیں اور منہ کیوں موڑتے ہیں ۔ اس کے بعد قل قل سے یہ ضربات مسلسل لگائی جاتی ہیں اور یہ اس قدر زوردار ہیں کہ اگر کسی دل میں ذرہ برابر بھی شعور ہو تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اور یہ سبق قیامت کے ایک نہایت ہی متحرک منظر پر ختم ہوتا ہے جو نہایت ہی متحرک ہے اور سابقہ ضربات کے ساتھ مناسب بھی ہے ۔

--- ooo ---

# درس نمبر ۱۹۸ تشریح آیات

## ۴۳ --- تا --- ۵۴

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ أَنْ
يَصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُكُمْ ۚ وَقَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا إِفْكٌ مُفْتَرًى ۚ وَقَالَ
الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ﴿٤٣﴾ وَمَا آتَيْنَاهُمْ
مِنْ كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا ۖ وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَذِيرٍ ﴿٤٤﴾ وَكَذَّبَ الَّذِينَ ۵
مِنْ قَبْلِهِمْ وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي ۖ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿٤٥﴾ ۹ع
۱۱

"ان لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو ان معبودوں سے برگشتہ کر دے جن کی عبادت تمہارے باپ دادا کرتے آئے ہیں"۔ اور کہتے ہیں کہ "یہ (قرآن) محض ایک جھوٹ ہے گھڑا ہوا"۔ ان کافروں کے سامنے جب حق آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ "یہ تو صریح جادو ہے"۔ حالانکہ نہ ہم نے ان لوگوں کو پہلے کوئی کتاب دی تھی کہ یہ اسے پڑھتے ہوں اور نہ تم سے پہلے ان کی طرف کوئی متنبہ کرنے والا بھیجا تھا۔ ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ جھٹلا چکے ہیں۔ جو کچھ ہم نے انہیں دیا تھا اس کے عشر عشیر کو بھی یہ نہیں پہنچے ہیں۔ مگر جب انہوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی"۔

ان لوگوں کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت واضح سچائی پیش فرماتے تھے لیکن وہ اس کا مقابلہ ماضی کے افسانوں سے کرتے تھے۔ یہ چند پارینہ رسم رواج تھے اور اوہام و خرافات تھے جو انہوں نے سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ ان کے اندر کوئی جامعیت اور ربط بھی نہ تھا۔ جب ان لوگوں نے دیکھا کہ قرآن مجید سیدھی سادی سچائی پیش کر رہا ہے اور قرآن کی تعلیمات ایک مکمل اور مربوط نظام زندگی ہیں اور معقول اور دل کو لگتی ہیں تو انہوں نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ ان کے آباؤ اجداد سے منقول خرافات، غیر معقول، رسم و رواج اس معقول نظام زندگی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے انہوں نے یہ اعلان کیا کہ یہ نئی تعلیم ان کے تمام سرمایہ رسوم کے لیے خطرہ ہے۔

مَا هَٰذَا إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ أَنْ يَصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُكُمْ (٣٤ : ٤٣) "کہ یہ

شخص تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو ان معبودوں سے برگشتہ کر دے جن کی عبادت تمہارے باپ دادا کرتے آئے ہیں"۔
لیکن صرف یہ الزام لگا دینا تو کافی نہ تھا کیونکہ صرف یہ بات کہ آباء و اجداد کے معبودوں سے روکتا ہے سب لوگوں کے لیے مسلم نہ ہو سکتی تھی ۔اس لیے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک دوسرا الزام بھی لگایا کہ جو تعلیمات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔

وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى (۳۴ : ۴۳) "اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن تو محض ایک جھوٹ گھڑا ہوا ہے"۔ افک کے معنی جھوٹ اور افتراء کے ہیں۔ لیکن مفتری کا لفظ بطور تاکید مزید لائے ہیں تاکہ ابتداء ہی سے قرآن کی قدر و قیمت میں کمی کر دیں کیونکہ جب قرآن کریم کے حقیقی مصدر ہی کو مشکوک بنا دیا گیا تو اس کی قدر و قیمت ظاہر ہے کہ کم ہو جاتی ہے۔
اور مزید یہ الزام۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۳۴ : ۴۳)
"ان کافروں کے سامنے جب حق آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو صریح جادو ہے"۔ اور یہ الزام انہوں نے اس لیے لگایا کہ قرآن ایک نہایت موثر کلام تھا۔ جو اس کو سنتا اس کی دنیا میں بھونچال آ جاتا۔ اس لیے صرف یہ بات بھی کافی نہ تھی کہ یہ جھوٹ اور گھڑا ہوا ہے۔ اس لیے اس کے اثر کی تاویل یہ کی کہ یہ کھلا جادو ہے۔
یہ مسلسل الزامات تھے۔ ایک کے بعد دوسرا الزام اور یہ الزامات بھی وہ اللہ کے قرآن پر لگا رہے تھے تاکہ لوگوں کے دلوں پر اس کا اثر نہ ہو لیکن یہ لوگ جو الزام لگاتے تھے ان میں سے کسی پر خود ان کے ساتھ کوئی ثبوت نہ تھا۔ یہ سب جھوٹے الزامات تھے اور عوام الناس کو گمراہ کرنے کے لیے تھے۔ جو لوگ یہ الزامات لگاتے تھے وہ کبراء اور سردار تھے۔ یہ کبراء اور سردار خود پوری طرح یقین رکھتے تھے کہ قرآن کریم خدا کی سچی کتاب ہے۔ یہ کتاب انسانی طاقت سے باہر ہے۔ بڑے سے بڑے متکلمین بھی اس قسم کا کلام لانے سے عاجز آ گئے تھے۔ ہم نے ظلال القرآن میں ایسے لوگوں کی کئی روایات دی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے بارے میں ان کی اصل رائے کیا تھی۔ اور یہ روایات بھی ہم نے بتا دیں کہ وہ قرآن کریم کے بارے میں اور اس کے خلاف کیا کیا تدابیر کرتے تھے۔
قرآن کریم نے ان کی اس کمزوری کو کھول دیا۔ اور یہ کہا کہ یہ عرب تو امی تھے' یہ اہل کتاب نہ تھے کہ وہ کسی آسمانی کتاب کی تعلیمات کے بارے میں کوئی فیصلہ کن بات کر سکیں۔ یہ لوگ وحی کے بارے میں بھی نہ جانتے تھے۔ اس لیے یہ لوگ وحی کے بارے میں بھی کوئی ماہر لوگ نہ تھے۔ نیز ان کے پاس حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کوئی رسول بھی نہیں آیا تھا کہ یہ اس بارے میں کوئی ماہرانہ رائے دے سکیں۔ لہٰذا وہ رسول اللہ' قرآن اور وحی کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ ایسی باتیں ہیں جس موضوع پر ان کو کوئی علم نہیں۔

وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ (۳۴ : ۴۴)
"حالانکہ ہم نے ان لوگوں کو پہلے کوئی کتاب نہ بھیجی تھی کہ یہ اسے پڑھتے ہوں اور نہ تم سے پہلے ان کی طرف کوئی متنبہ

کرنے والا بھیجا تھا" ۔ ان کے دلوں کو احساس دلایا جاتا ہے کہ ذرا ان سے پہلے کے ان لوگوں کے انجام پر غور کرو جنہوں نے تکذیب کی ۔ تم لوگ ان لوگوں کے مقابلے میں بہت کم قوت والے ہو ۔ وہ علم والے تھے ' مال والے تھے ' قوت والے تھے اور ترقی یافتہ تھے لیکن جب انہوں نے رسولوں کی تکذیب کی تو ان کو عذاب الہی نے گھیر لیا اور وہ بہت ہی سخت پکڑ میں آگئے ۔

وَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ مَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ( ٣٤ : ٤٥ ) "ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ جھٹلا چکے ہیں جو کچھ ہم نے انہیں دیا تھا اس کا عشر عشیر بھی ان کے پاس نہیں ہے مگر جب انہوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی" ۔ لٰہذا کی یہ سزا نہایت ہی تباہ کن تھی ۔ ان منکرین میں سے بعض لوگ ایسے تھے جن کے بارے میں قریش جانتے بھی تھے لہذا ان کو یہ یاد دہانی کافی تھی ۔ لیکن یہاں طنزیہ انداز میں سوال کیا گیا ہے ۔

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ( ٣٤ : ٤٥ ) "میری سزا کیسی تھی" ۔ چونکہ مخاطبین کو معلوم تھا کہ یہ سزا کیسی تھی اس لیے یہ سوالیہ انداز نہایت موثر ہے ۔

--- ooo---

اب لوگوں کو نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ یہ دعوت دی جاتی ہے کہ سچائی کے ساتھ تم حق کو تلاش کرو اور سچائی کے بارے میں جو جھوٹا پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے اسے سمجھنے کی کوشش کرو اور جو دعوت تمہارے سامنے پیش کی جارہی ہے اس کے بارے میں خارجی موثرات سے آزاد ہو کر سوچو اور اس کی قدر و قیمت معلوم کرو ۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴿٤٦﴾

"اے نبی ؐ ان سے کہو کہ "میں تمہیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں ۔ خدا کے لیے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو ' تمہارے صاحب میں آخر کون سی بات ہے جو جنون کی ہو؟ وہ تو ایک سخت عذاب کی آمد سے پہلے تم کو متنبہ کرنے والا ہے" ۔

یعنی اللہ کے معاملے میں غور کرو ' اور یہ غور اپنی ذاتی خواہشات کو ایک طرف رکھ کر دو ۔ اپنی مصلحتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے غور کرو ۔ دنیا کے حالات اور میلانات سے ہٹ کر کرو ' اور ان وسوسوں اور خلجانات سے ہٹ کر کرو جو دلوں میں پیدا ہوتے ہیں ' یہ سب چیزیں انسان کو اللہ سے دور کرتی ہیں ' غرض تمہاری سوسائٹی اور تمہارے معاشرے کے

اندر رائج تصورات سے ہٹ کر تم اللہ کے معاملے پر غور کرو۔

یعنی دعوت اسلامی کے مضمون کو سادہ انداز میں لو' اپنے رائج تصورات کے حوالے سے نہ لو۔ نہ خالص منطقی اور فلسفیانہ انداز میں لو جس میں لفاظی تو بہت ہوتی ہے لیکن سیدھی سادہ حقیقت کو جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ منطقیانہ سوچ کے بجائے فطرت کی سنجیدہ سوچ کا راستہ اختیار کرو۔ جس میں شور و شغب کم ہوتا ہے اور غلط مبحث نہیں ہوتا نہ سوچ میں ٹیڑھ ہوتی ہے اور نہ فکر میں گدلا پن ہوتا ہے بلکہ صاف و شفاف سوچ ہوتی ہے۔

لیکن فطری انداز میں تلاش حقیقت بھی دراصل حقیقت کی تلاش ہی ہوتی ہے۔ جبکہ یہ سوچنے کا سیدھا سادہ طریقہ ہوتا ہے۔ جس پر معاشرے کے رائج افکار اثر انداز نہیں ہوتے' نہ معاشرے کے اندر رائج غلط رسم و رواج اثر ڈالتے ہیں صرف خدا کا خوف اور اللہ کی نگرانی ہی بڑی موثر ہوتی ہے۔

اس سوچ کا راستہ صرف ایک ہی ہے خدا کا راستہ' خدا کے سامنے جھکنے کا راستہ' خدا کی رضا کا راستہ۔ اور بے لوث راستہ جس میں کوئی ذاتی خواہش' کوئی مصلحت' کوئی مفاد موثر نہ ہو' خالص انداز میں فطری سوچ جس پر کوئی خارجی عوامل اثرانداز نہ ہوں۔ یعنی صرف اللہ کے لیے سوچ۔

اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى (٣٤ : ٤٦) "خدا کے لیے تم اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ"۔ دو دو اس طرح کہ دعوت اسلامی کے مسئلے پر ایک دوسرے کے ساتھ مذاکرہ کرو' یعنی محدود تعداد میں شور و شغب سے علیحدہ ہو کر مذاکرہ کرو' عوام الناس کی بھیڑ سے الگ ہو کر۔ حالات اور عوام سے متاثر ہوئے بغیر کیونکہ عوام الناس وقتی حالات سے متاثر ہوتے جاتے ہیں' اور اکیلے غور کرو' جو غور و فکر کا سب سے موثر طریقہ ہے۔

ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ (٣٤ : ٤٦) "سوچو کہ تمہارے صاحب میں آخر کون سی بات ہے جو جنون کی ہو"۔ آپ کے سامنے تو وہ عقل' تدبر اور نہایت ہی دانائی کی بات کرتا ہے۔ اور آخر وہ کون سی بات ایسی کرتا ہے جس سے معلوم ہو کہ اس کی عقل میں فرق ہے۔ وہ تو نہایت ہی مضبوط' قوی اور واضح بات کرتا ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ (٣٤ : ٤٦) "وہ تو ایک سخت عذاب کی آمد سے پہلے تم کو متنبہ کرنے والا ہے"۔ شدید ترین عذاب کے واقع ہونے کا امکان انسان کو غور و فکر پر آمادہ کرتا ہے اور ڈرانے والے نے متنبہ بھی کر دیا تاکہ جو بچنا چاہتا ہے' بچ جائے۔ مگر ایک شخص چلاتا ہے کہ آگ لگ گئی ہے بھاگو۔ اگر کوئی نہیں بھاگتا تو اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتا ہے جبکہ آواز دینے والا ہے بھی سچا شخص اور نہایت ہی بہترین کردار کا مالک ہے۔

امام احمد نے ابو نعیم شیر سے عبداللہ ابن بریدہ سے' اس نے اپنے باپ سے' کہتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ہم پر نکلے تو تین بار آواز دی لوگو' تمہیں معلوم ہے کہ میری اور تمہاری مثال کیا ہے؟ لوگوں نے کہا اللہ اور رسول اللہ خوب جانتے ہیں۔ تو آپ ؐ نے فرمایا: "میری اور آپ لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک قوم کو کسی دشمن کے حملے کا خطرہ ہو۔ انہوں نے ایک آدمی بھیجا کہ وہ حالات معلوم کر کے بتائے۔ یہ شخص دیکھ رہا تھا کہ دشمن آگیا۔ وہ چلانے لگا اور اسے ڈر تھا کہ لوگوں کو اس

کی آواز پہنچنے سے پہلے ہی اسے دشمن پکڑ نہ لے ۔ تو اس نے دور ہی سے کپڑا ہلایا 'لوگو' دشمن آگیا' دشمن آگیا' لوگو تم پر حملہ ہو گیا" ۔ اور ایک دوسری روایت میں حضورؐ سے مروی ہے کہ میں اور قیامت ایک ہی ساتھ بھیجے گئے ہیں ۔ اس بات کا امکان ہے کہ قیامت مجھ سے بھی پہلے آجائے ۔

یہ تو تھی پہلی ضرب 'اب دوسری ضرب ملاحظہ ہو ۔

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۴۷﴾

"ان سے کہو "اگر میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو وہ تم ہی کو مبارک رہے ۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے" ۔

پہلے تو آپ نے ان کو دعوت دی کہ تم لوگ اکیلے یا دو دو مل کر تحریک اسلامی پر غور کرو کہ تمہارے ساتھی کی دعوت میں آخر جنوں کی کیا بات ہے ۔ یہاں کہا جاتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ حضور اکرمؐ لوگوں کے ڈرانے میں اس قدر مگن ہیں اور لوگوں کو شدید عذاب سے ڈرا رہے ہیں ۔ آخر اس میں ان کا مفاد کیا ہے ۔ اس کے اسباب کیا ہیں ۔ حضورؐ کو کیا فائدہ ہے ۔ اس حقیقت کی طرف ان لوگوں کی سوچ اور قوت استدلال کو نہایت ہی موثر انداز میں متوجہ کیا جاتا ہے ۔

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ( ۳۴ : ۴۷ ) "کہو 'میں اگر تم سے کوئی اجر مانگتا ہوں تو وہ تم ہی لے لو" ۔ یہ اجر تمہیں ہی مبارک ہو ۔ یہ نہایت ہی طنزیہ انداز ہے اور اس میں ان کے لیے سرزنش بھی ہے ۔

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ( ۳۴ : ۴۷ ) "میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے" ۔ اسی نے مجھے اس کام پر لگایا ہے ۔ وہی معاوضہ دے گا ۔ میں اسی سے امید رکھتا ہوں اور جو شخص اللہ کے عطیہ کا امیدوار ہو 'اس کے نزدیک پھر اہل دنیا کا ہر عطیہ حقیر اور بے قیمت ہو جاتا ہے ۔ اس کے بارے میں ایسا شخص سوچتا ہی نہیں ہے ۔

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ( ۳۴ : ۴۷ ) "وہ ہر چیز پر گواہ ہے" ۔ وہ جانتا ہے 'دیکھتا ہے اور اس سے کوئی چیز خفیہ نہیں ہوتی ۔ وہ میرے اوپر گواہ ہے ۔ میں جو کچھ سوچتا ہوں 'جو کچھ کہتا ہوں اور جو کچھ کرتا ہوں ۔

اب تیسرا مضراب :

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۴۸﴾

"ان سے کہو 'میرا رب (مجھ پر) حق کا القاکرتا ہے اور وہ تمام پوشیدہ حقیقتوں کا جاننے والا ہے" ۔

یعنی میں جو چیز لے کر آیا ہوں وہ حق ہے ۔ یہ وہ مضبوط حق ہے جسے اللہ قوت سے پھینکتا ہے ۔ اس سچائی کے مقابلے میں کون کھڑا ہو سکتا ہے جسے اللہ زور دار انداز سے نازل کر رہا ہو ۔ یہ ایک نہایت ہی مجسم اور مصور انداز تعبیر ہے ۔ گویا

حق کے گولے برس رہے ہیں، بمباری ہو رہی ہے اور کسی کو ہمت نہیں ہے کہ اس کے سامنے کھڑا ہو سکے ۔ اللہ سچائی کے گولے پھینک رہا ہے جو علام الغیوب ہے ۔ وہ علم سے یہ گولے پھینک رہا ہے ۔ علم کے ساتھ ان کا رخ کسی کی طرف کرتا ہے ۔ اس کا نشانہ خطا نہیں ہوتا ۔ کوئی چیز اس سے غائب نہیں ہے اور کوئی چیز اس سچائی کی زد سے بچ نہیں سکتی اس لیے کہ رکاوٹ بننے والی کوئی چیز سامنے نہیں ہے ۔ اللہ کے سامنے نشانہ کھلا ہے ۔

اب آخری ضرب :

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ ﴿٤٩﴾

"کہو، حق آگیا اور اب باطل کے لیے کچھ نہیں ہو سکتا" ۔ سچائی آگئی ہے، رسول آگیا، قرآن آگیا، اسلامی نظام زندگی سیدھا سیدھا آگیا ۔ اعلان کر دو، اور کھلا اعلان کر دو کہ اب حق آگیا ہے ۔ یہ گولہ قوت کے ساتھ پھینکا گیا ہے ۔ قوت اور سربلندی کے ساتھ آگیا ہے ۔

وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ ( ٣٤ : ٤٩ ) "باطل کے لیے اب نہ آغاز ہے اور نہ انجام" ۔ اس کا معاملہ اب ختم ہے ۔ اس کی زندگی ختم ہے ۔ اب اس کے لیے کوئی میدان عمل نہیں ہے ۔ اس کا جانا ٹھہر گیا ہے ۔ یہ ایک نہایت ہی ہلا مارنے والی ضرب ہے ۔ جو کوئی بھی اس اعلان کو سنتا ہے، وہ یقین کر لیتا ہے کہ اب کوئی گنجائش نہیں ہے، باطل کے قائم رہنے کی ۔ لہٰذا حق کے سوا اب کسی اور کی حکمرانی نہ ہو گی ۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب سے قرآن آیا ہے ۔ سچائی کا منہاج دنیا میں قائم ہو گیا ہے اور باطل اب اس سچائی کے سامنے دفاعی پوزیشن میں ہے کیونکہ سچ نے غالب ہونے کا عزم بالجزم کیا ہوا ہے ۔ اگرچہ بعض اوقات باطل کو مادی قوت حاصل ہوتی ہے لیکن وہ کبھی حق پر نظریاتی برتری حاصل نہیں کر سکا ۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات اہل باطل اہل حق پر غالب آجاتے ہیں لیکن یہ اہل حق کی غلطی کی وجہ سے وقتی تزلزل ہوتا ہے ۔ جہاں تک حق کا تعلق ہے، وہ اپنی جگہ جما ہوا ہوتا ہے ۔ واضح ہوتا ہے، صریح ہوتا ہے ۔

اور آخری ضرب ۔

قُلْ إِن ضَلَلْتُ فَإِنَّمَآ أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي ۖ وَإِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوحِيٓ إِلَيَّ رَبِّيٓ ۚ إِنَّهُۥ سَمِيعٌ قَرِيبٌ ﴿٥٠﴾

"کہو، اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں تو میری گمراہی کا وبال مجھ پر ہے، اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو اس وحی کی بناء پر ہوں جو میرا رب میرے اوپر نازل کرتا ہے، وہ سب کچھ سنتا ہے اور قریب ہی ہے" ۔

اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں تو اس کا وبال تم پر نہ ہو گا ۔ میں خود ذمہ دار ہوں گا اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو اللہ نے بذریعہ وحی مجھے یہ ہدایات دی ہیں ۔ میں خود از خود کوئی کام کرنے کا مجاز نہیں ہوں ۔ میں تو خود بھی اسیر اشارہ ابرو ہوں ۔

اَنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ ( ۳۴ : ۵۰ ) "وہ سب کچھ سنتا ہے اور قریب ہی ہے"۔ یہ لوگ اللہ کو قریب پاتے تھے ۔ ان کے تصور میں اللہ کی یہ صفات بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کی حقیقی زندگی میں یہ صفات موثر تھیں ۔ ان کو یقین تھا کہ اللہ سمیع ہے اور قریب ہے ۔ اور وہ ان کے امور کو براہ راست دیکھ رہا ہے ۔ ان کی شکایت اور ان کے مشورے سب اللہ کے سامنے ہیں۔ اللہ نے اپنے بندوں کو چھوڑ نہیں رکھا اور نہ کسی کے حوالے کر رکھا ہے ۔ چنانچہ ان کی زندگی اللہ کے انس و محبت میں گزرتی تھی ۔ اللہ کے زیر سایہ تھی ۔ اس کے پڑوس میں تھی ۔ اس کی مہربانیوں میں تھی ۔ اس کی نگرانی میں تھی اور یہ عقیدہ وہ اپنے نفوس کے اندر زندہ پاتے تھے ' زندہ اور سادہ شکل میں ۔ یہ صفات محض تصور ہی نہ تھیں بلکہ زندہ اور عملی تھیں اَنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ ( ۳۴ : ۵۰ )

اب خاتمہ اس سورہ کا قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کے ساتھ ہوتا ہے ۔ یہ منظر حرکت اور دوڑ دھوپ سے پر ہے ۔ اس میں دنیا اور آخرت کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں ۔ گویا دنیا اور آخرت ایک ہی اسٹیج پر ہیں ۔ اس منظر کی جھلکیاں بڑی تیزی سے اسکرین پر گزرتی ہیں ۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿٥١﴾ وَّ
قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴿٥٢﴾ وَّ قَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ
قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴿٥٣﴾ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ ٦
كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ۗ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴿٥٤﴾ ٩ ع

"کاش تم دیکھو انہیں اس وقت جب یہ لوگ گھبرائے پھر رہے ہوں گے اور کہیں بچ کر نہ جا سکیں گے ' بلکہ قریب ہی سے پکڑ لیے جائیں گے ۔ اس وقت یہ کہیں گے کہ ہم اس پر ایمان لے آئے ۔ حالانکہ اب دور نکلی ہوئی چیز کہاں ہاتھ آ سکتی ہے ۔ اس سے پہلے یہ کفر کر چکے تھے اور بلاتحقیق دور دور کی کوڑیاں لایا کرتے تھے ۔ اس وقت جس چیز کی یہ تمنا کر رہے ہوں گے اس سے محروم کر دیئے جائیں گے جس طرح ان کے پیش رو ہم مشرب محروم ہو چکے ہوں گے ۔ یہ بڑے گمراہ کن شک میں پڑے ہوئے تھے"۔ ١٢

کاش تم دیکھو ' منظر تو سب کے سامنے کھلا ہے اور دیکھا جا سکتا ہے ۔ دیکھو یہ کس طرح گھبرائے پھر رہے ہیں ۔

فَزِعُوْا ( ۳۴ : ۵۱ ) اچانک ان پر خوف طاری ہو گیا ہے ۔ یہ بھاگنا چاہتے تو تھے لیکن دیکھو پکڑے جا رہے ہیں ' کوئی ایک بھی بھاگ نہیں سکتا ۔ بلکہ یہ دور تک نہیں بھاگ سکتے قریب ہی سے پکڑے جا رہے ہیں ۔

وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ( ۳۴ : ۵۱ ) اچانک انہوں نے تھوڑی بہت حرکت تو کی بھاگنے کے لیے مگر نہ بھاگ سکے ۔

اب سب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے بعد از وقت ۔ اب تو ایمان ان سے بہت دور نکل گیا ہے ۔ بہت دور جا چکا

ہے ۔ یہ اب اسے پکڑ نہیں سکتے ۔

التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ( ٣٤ : ٥٢ ) اب ان کی سعی اس طرح ہے جس طرح کوئی کسی چیز کو دور سے پکڑنا چاہے مگر نہ پکڑ سکے ۔ ایمان تو دور دنیا میں رہ گیا ہے ۔ انہوں نے موقع ضائع کر دیا ۔

وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ( ٣٤ : ٥٣ ) "اس سے پہلے انہوں نے ایمان سے انکار کر دیا" ۔ اب یہاں تو معاملہ ختم ہے 'مہلت ختم' اب سعی لاحاصل ہے ۔

وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ( ٣٤ : ٥٣ ) "یہ دور سے غائب نشانے پر پھینکتے تھے" ۔ اس وقت انہوں نے انکار ہی کر دیا تھا کہ قیامت نہیں ہے حالانکہ وہ مستقبل کے پردوں میں اسے کس طرح دیکھ سکتے تھے کہ نہیں ہے ۔ اس طرح وہ دور نامعلوم نشانے پر بمباری کر رہے تھے ۔ اور اب ایمان لانے کی سعی کر رہے ہیں جبکہ وہ دور نکل گیا ہے ۔

وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ ( ٣٤ : ٥٤ ) "اس وقت جس چیز کی یہ تمنا کر رہے ہوں گے ۔ اس سے وہ محروم کر دیئے جائیں گے" ۔ اب یہ ایمان سے محروم ہوں گے کیونکہ وہ بعد از وقت ہو گا ۔ اب عذاب سے بچنا ممکن نہ ہو گا کہ وہ سر پر ہو گا ۔

كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ( ٣٤ : ٥٤ ) "جس طرح ان کے پیش رو ہم مشرب محروم کر دیئے جائیں گے" ۔ یعنی جب ان پر پکڑ آئی تو انہوں نے نجات کی دعا کی لیکن اب نہ دعا کا وقت تھا نہ بھاگنے کی جگہ تھی ۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ( ٣٤ : ٥٤ ) "یہ بڑے گمراہ کن شک میں پڑے ہوئے تھے" ۔ اور اب یقین کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں" ۔

اس سورہ کا خاتمہ اس شدید ضرب پر ہوتا ہے ۔ اور یہ منظر قیامت 'قیام قیامت کو عملاً ثابت کر دیتا ہے کہ وہ دیکھو قیامت برپا ہو گئی! یہی مضمون تھا اس سورہ کا ۔ آغاز بھی قیامت کے قیام سے ہے اور انتہا بھی احوال قیامت پر ۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ------ ۲۲

### سورۃ فاطر ۔ ۳۵

آیات ۱--- تا--- ۴۵

# سورۃ فاطر ایک نظر میں

یہ بھی سورہ ہے اور سیاق کلام اور موضوع کے اعتبار سے اس کا ایک مخصوص انداز ہے۔اس کا انداز سورہ رعد کے مطابق ہے۔ آغاز سے لے کر انتہا تک قلب انسانی کے لیے نہایت ہی موثر ضربات لگائی گئی ہیں۔ یہ ضربات نہایت ہی موثر اور اشاراتی اور انسان کو خوب جھنجھوڑنے والی ہیں۔ انسان کو غفلت سے جگاتی ہیں تاکہ وہ غور کرے اور اس کائنات کی عظمت کا ادراک کرے۔ اس کائنات کی حیران کن خوبصورتی سے لطف اندوز ہو سکے اور اس کے اندر خالق کائنات کے وجود پر جو دلائل اور نشانیاں جابجا بکھری پڑی ہیں ان پر انسان غور اور تدبر کرے۔ اللہ کی نعمتوں کو یاد کرے اور اللہ کی رحمت اور اللہ کی نگرانی اور مہربانی کو یاد کرے۔ گزرے ہوئے لوگوں کی مقتل گاہوں کو دیکھے اور قیامت کے مناظر بھی دیکھے۔ اس کائنات میں اللہ کی صنعت کاریوں' دست قدرت کے معجزات' انسانی نفس کے اندر تخلیق کردہ اعجوبے' انسانی زندگی کے عجیب نشیب و فراز اور انسانی تاریخ کے عبرت آموز واقعات کو دیکھ کر اللہ کا خوف اپنے دل کے اندر پیدا کرے۔ پھر وہ دیکھے کہ اس کائنات اور ان تمام آثار کے اندر ایک ہی سچائی اور ایک ہی قانون جاری و ساری ہے اور ایک ہی صانع' مبدع اور قوی دست قدرت کام کر رہا ہے۔ یہ تمام امور ایسے موثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں کہ کوئی زندہ دل ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ سورہ اس طرح ہے جس طرح زنجیر کی کڑیاں باہم پیوست ہوتی ہیں' اس کو اسباق اور دروس کے اندر تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ پوری سورہ کا ایک ہی موضوع ہے۔ انسان کے قلب و خرد کی تاروں پر ضربات ہیں اور یہ ضربات اس کائنات' نفس انسانی' حیات انسانی' تاریخ انسانی' بعث بعد الموت کے واقعات سے مملو ہیں۔ یوں یہ زمزمے نفس کو ہر پہلو سے متاثر کرتے ہیں اور دل کو ہر طرف سے گھیرتے ہیں اور انسان کی روحانی دنیا کو ایمان' خضوع و خشوع اور یقین سے بھر دیتے ہیں۔

ان تمام تبصروں اور نصیحتوں میں ممتاز بات یہ ہے کہ تمام ڈوریوں کے سرے دست قدرت میں پکڑے گئے ہیں اور یہ دکھایا گیا ہے کہ دست قدرت کی کارفرمائیاں ہیں کہ وہ ان ڈوریوں کو ہلاتا ہے اور اس کائنات میں اعجوبے نمودار ہوتے ہیں۔ یہ دست قدرت ہی ہے جو کسی رسی کو کھینچ لیتا ہے اور کسی کو دراز چھوڑتا ہے' کسی کو سخت کرتا ہے اور کسی کو نرم کرتا ہے۔ اسے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی مددگار اور شریک ہے۔

سورہ کے آغاز ہی سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ دست قدرت کی یہ کارفرمائیاں نمایاں ہیں۔ اور یہ سورہ کے خاتمے تک یونہی جاری ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہا گیا ہے کہ یہ عظیم کائنات دست قدرت کا کرشمہ ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو اسے وجود میں لایا ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۳۵ : ۱) "تعریف اللہ ہی کے لیے جو آسمان اور زمین کا بنانے والا اور فرشتوں کو پیغام رساں مقرر کرنے والا ہے جن کے دو دو' تین تین اور چار چار بازو ہیں۔ وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے' یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

اور اللہ کا یہ قبضہ قدرت بے قید ہے۔ اگر اللہ رحمت کا فیضان عام کرتا ہے تو اسے کوئی بند نہیں کر سکتا اور اگر اللہ اپنی رحمت کے سرچشمے خشک کر دے تو کوئی نہیں ہے کہ انہیں جاری کر سکے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ بَعْدِهٖ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳۵ : ۲) "اللہ جس رحمت کا لوگوں کے لیے دروازہ کھول دے تو اسے کوئی روکنے والا نہیں ہے اور جسے بند کر دے' اسے کوئی دوسرا کھولنے والا نہیں ہے۔ وہ زبردست اور حکیم ہے"۔

ہدایت اور ضلالت بھی ایک قسم کی رحمت ہے یا زحمت۔

فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (۳۵ : ۸) "اللہ ہی ہے جسے چاہے گمراہ کر دے اور جسے چاہے ہدایت دے دے"۔

اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَ مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ (۳۵ : ۲۲) اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ (۳۵ : ۲۳) "اللہ جسے چاہتا ہے' سنواتا ہے مگر تم ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں مدفون ہیں۔ تم تو بس ایک خبردار کرنے والے ہو"۔

یہی دست قدرت ہے جس نے پہلے زندگی پیدا کی اور وہ دوبارہ بھی زندگی عطا کرے گا اور قیامت میں مردوں کو اٹھائے گا۔

وَ اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ (۳۵ : ۹) "وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے' پھر وہ بادل اٹھاتی ہیں پھر ہم اسے ایک اجاڑ زمین کی طرف لے جاتے ہیں جو مری پڑی تھی۔ مرے ہوئے انسانوں کا جی اٹھنا بھی اس طرح ہو گا"۔ اور عزت اور برتری سب اللہ کے لیے ہیں۔ اور ہر قسم کی عزت اور برتری کا سرچشمہ اللہ ہی ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا (۳۵ : ۱۰) "جو عزت چاہتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ عزت ساری کی ساری اللہ کے لیے ہے"۔

تخلیق ' وجود میں لانا 'نسل چلانا اور پھر مارنا سب کے سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ وَ مَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۳۵: ۱۱) "اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا' پھر نطفہ سے۔ پھر تمہارے جوڑے بنا دیئے۔ کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی اور نہ بچہ جنتی ہے مگر یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہوتا ہے۔ کوئی عمر پانے والا عمر نہیں پاتا اور نہ کسی کی عمر میں کچھ کمی ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوا ہوتا ہے' اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہوتا ہے"۔

اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں آسمان و زمین کی کنجیاں' افلاک و کواکب کی حرکات اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ (۳۵: ۱۳) "وہ دن کے اندر رات اور رات کے اندر دن کو پروتا ہے ہوا لے آتا ہے' چاند اور سورج کو اس نے مسخر کر رکھا ہے۔ یہ سب کچھ ایک وقت مقررہ تک چلے جا رہا ہے۔ وہی اللہ تمہارا رب ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے۔ اسے چھوڑ کر جن دوسروں کو تم پکارتے ہو' وہ ایک پرکاہ کے مالک بھی نہیں ہیں"۔ اللہ کا دست قدرت اس کائنات میں متصرف ہے۔ وہ جمادات' نباتات اور حیوانات اور انسانوں میں تصرف کر رہا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ (۳۵: ۲۷) وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (۳۵: ۲۸) "کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمانوں سے پانی برسا رہا ہے اور پھر اس کے ذریعے سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں۔ جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں بھی سفید سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں۔

یہ دست قدرت انسان کو قدم بقدم آگے لے آتا ہے اور ایک نسل کو دوسری نسل کا وارث بناتا ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا (۳۵: ۳۲) "پھر ہم نے اس کتاب کا

وارث بنا دیا ان لوگوں کو، جنہیں ہم نے اپنے بندوں کے لیے منتخب کیا"۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ (۳۵:۳۹) "وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو خلیفہ بنایا"۔اور یہی اللہ ہے جس نے اس پوری کائنات کو تھام رکھا ہے اور اسے زوال سے محفوظ کر دیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَ لَئِنْ زَالَتَاۤ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ (۳۵:۴۱) حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو زمین و آسمان کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے سوا کوئی دوسرا انہیں تھامنے والا نہیں ہے"۔

تمام امور اللہ کے دست قدرت کے قبضہ میں ہیں اور اللہ تعالیٰ کو کوئی قوت کسی کام سے عاجز نہیں کر سکتی۔

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعْجِزَهٗ مِنْ شَیْءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الْاَرْضِ (۳۵:۴۴) "اللہ تعالیٰ کو زمین و آسمان کی کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی"۔

اِنَّهٗ كَانَ عَلِیْمًا قَدِیْرًا (۳۵:۴۴) "وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۳۵:۲) "وہ عزیز و حکیم ہے"۔

وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۳۵:۴) "تمام امور اللہ کی طرف لوٹتے ہیں"۔

عَلِیْمٌۢ بِمَا یَصْنَعُوْنَ (۳۵:۸) "وہ ان باتوں کو جانتا ہے جو تم کرتے ہو"۔

لَهُ الْمُلْكُ "بادشاہت اسی کی ہے"۔

الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ "وہ غنی اور اپنی ذات میں محمود ہے"۔

اِلَى اللّٰهِ الْمَصِیْرُ (۳۵:۱۸) "اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے"۔وہ "عزیز و غفور" ہے۔وہ "غفور و شکور" ہے وہ "خبیر و بصیر" ہے۔وہ "زمین و آسمانوں" کے غیب کا جاننے والا ہے۔وہ علیم بذات الصدور ہے۔وہ حلیم و غفور ہے۔وہ علیم و قدیر ہے۔وہ تمام بندوں پر بصیر ہے۔ان آیات اور آیات کے تراجم سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ کی فضا کیا ہے اور اس پوری سورہ کا یہ رنگ ہے۔

ہاں سورہ کی تشریح کی خاطر ہم نے اسے چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے تاکہ اس کے معانی اور تشریحات سہولت سے کی جائیں ورنہ یوں یہ سورہ دراصل ایک ہی حلقہ اور ایک ہی سبق ہے اور اول سے آخر تک مضمون و موضوع بھی ایک ہی رنگ کا ہے۔

--- ooo---

# درس نمبر ۱۹۹ تشریح آیات

## ۱ ۔ تا ۔ ۳

---

سُوْرَةُ فَاطِرٍ مَكِّيَّةٌ (۴۳) آیاتها ۴۵ رکوعاتها ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ①

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ "تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمان اور زمین کا بنانے والا اور فرشتوں کو پیغام رساں مقرر کرنے والا ہے جن کے دو دو' تین تین اور چار چار بازو ہیں۔ وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے' یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

سورہ کا آغاز حمد باری سے ہو رہا ہے۔ اس پوری سورہ کا مضمون یہ ہے کہ انسانی دل کو اللہ کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اللہ کی نعمتوں کو دیکھا جائے' اللہ کی رحمتوں کا شعور زندہ کیا جائے اور انسان کو اس طرف متوجہ کیا جائے کہ اپنی مخلوقات میں اللہ نے کیا کیا عجائبات پیدا کیے ہیں۔ انسانی احساس کو ان عجائبات کے شعور سے بھر دیا جائے اور نتیجۃً انسان اللہ کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہو۔

سب حمد اللہ کے لیے ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (۳۵ : ۱) "سب تعریف اللہ کے لیے ہے"۔ اور اس کے بعد اللہ کی وہ صفت بیان ہو رہی ہے جو خلق اور ایجاد پر دلالت کرتی ہے۔

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۳۵ : ۱) "جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے"۔ وہ ان عظیم اور ہولناک مخلوقات کا پیدا کرنے والا ہے جنہیں ہم اپنے اوپر نیچے دیکھ رہے ہیں۔ جہاں بھی ہم ہوں اور ان میں سے نہایت ہی چھوٹے اجسام اور ہم سے قریب ترین اجسام کے بارے میں ہم کچھ معلومات رکھتے ہیں۔ ان تمام اجسام کو ایک ہی قانون قدرت کنٹرول کرتا ہے 'نہایت ہی تناسب اور توافق کے ساتھ۔ یہ سب چیزیں چلتی ہیں اور ان کا تصور بھی ہم اپنے ذہن پر بہت بڑا بوجھ ڈال کر کر سکتے ہیں۔ یہ تمام اجسام اپنی عظمت اور خوفناکی کے ساتھ ساتھ ایک ایسے دقیق اور پیچیدہ تناسب کے ساتھ اپنے مدارات میں ایک ہی رخ پر چلتے ہیں کہ اگر اس تناسب میں بالفعل ایک معمولی فرق آ جائے تو یہ تمام عظیم اجسام ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں اور قیامت برپا ہو جائے اور سب کے سب روئی کے گالوں کی طرح بکھر جائیں۔

قرآن کریم اسی عظیم تخلیق سماوات کی طرف بار بار اشارہ کرتا ہے اور ہم اس پر سے یونہی گزر جاتے ہیں 'بغیر اس کے کہ ہم اس کے سامنے رک کر قدرے تامل اور تدبر کریں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ کہ ہمارا احساس جمود اختیار کر گیا ہے۔ ہماری عقل و خرد کے تار زنگ آلود ہو گئے ہیں اور ان پر قرآن کریم کے مضراب کی اس قدر سخت ضربات بھی کارگر نہیں ہیں اور ان ضربات کے باوجود ان سے کوئی نغمہ نہیں نکلتا۔ وہ سرود جو کبھی اللہ کے لیے جڑے ہوئے دلوں سے نکلتا تھا' جو اللہ کو یاد کرتے تھے اور اللہ کی قدرت کی ان نشانیوں کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے اور یہ بڑی وجہ ہے کہ اس عظیم کائنات کو ہم دیکھتے دیکھتے اس کے اس قدر عادی بن گئے ہیں کہ اس کے عجائبات ہمیں عجائبات ہی نہیں لگتے۔ ان کا بے مثال حسن ہمیں متاثر ہی نہیں کرتا اور ان کی نہایت ہی پیچیدہ ٹیکنالوجی ہمیں ششدر نہیں کرتی۔ اگر ہم ان پر ایسی نظر ڈالیں جس طرح کوئی انہیں پہلی مرتبہ دیکھتا ہے اور بہت ہی حیران ہو جاتا ہے۔

یاد رہے کہ کھلے دل' اللہ کے ساتھ جڑے ہوئے دل کے لیے آسمان میں' ستاروں کے مواقع و مدارات پر غور اور تدبر کرنے کے لیے' ان کے حجم اور عظمت کو دیکھنے کے لیے' اور ان کے ماحول کے مطالعے کے لیے' بعض کا دوسرے کے ساتھ تعلق اور کشش کے معلوم کرنے کے لیے۔ اور ہر ایک کے حجم' ہر ایک کی حرکت اور ہر ایک کے حالات معلوم کرنے کے لیے کسی بڑے علم کی ضرورت نہیں ہے' جو دل اللہ سے جڑا ہوا ہو' اس کے لیے کسی بڑے اور گہرے علم کی ضرورت نہیں ہے۔ معمولی توجہ سے اس کائنات کے حسن و جمال کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ مناظر ایک خدا رسیدہ شخص کے دماغ کے تاروں کے اندر نغمہ پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ رات کے وقت ذرا صاف ستھری فضا اور صاف موسم میں ان گنت تاروں ہی کو چمکتا ہوا دیکھ لیجئے! تاریک رات ہو اور موسم صاف ہو اور ہر ستارہ زمین پر ضو پاشی کر رہا ہو۔ پھر صبح کے وقت ذرا سپیدۂ صبح کی نمو داری اور سورج کے طلوع ہونے کے منظر کو دیکھئے۔ اسی طرح پہاڑوں کی اوٹ میں ڈوبنے والے سورج اور سرخ شفق ہی کو دیکھئے۔ پھر اس چھوٹی سی زمین اور اس کے مختلف مواقع اور مناظر کو دیکھئے۔ ان مناظر کو کوئی سیاح ختم نہیں کر سکتا اور نہ ان کی سیر سے سیر ہو سکتا ہے۔ بلکہ میں کہوں گا کہ صرف ایک پھول ہی کو دیکھئے۔ اس کا رنگ اور اس کی پتیاں اور اس کی تشکیل اور رنگوں کی تنظیم سُبْحَانَ اللّٰهِ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ۔

قرآن کریم ان امور کی طرف جابجا اشارات کرتا ہے۔ بڑے بڑے مناظر کی طرف بھی اور چھوٹے چھوٹے پیش پا افتادہ مناظر کی طرف بھی۔ اگر کوئی زندہ دل ان میں سے ایک کی طرف بھی اشارہ کر دے تو زندہ و بیدار مغز انسان کی

ہدایت کے لیے صرف ایک ہی چیز یا ایک ہی پھول کا مطالعہ کافی ہے اور کسی ایک چیز کے اندر موجود عجائبات پر بھی انسان اللہ کی حمد و ثنا کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (۳۵ : ۱) "تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا اور فرشتوں کو پیغام رساں مقرر کرنے والا ہے 'جن کے دو دو' تین تین 'اور چار چار بازو ہیں"۔ اس سورہ میں موضوع سخن رسولوں 'وحی الہی اور نزول وحی ہے۔ فرشتوں کا اس کے اندر بہت اہم کردار ہے کیونکہ یہ فرشتے ہی آسمانوں سے وحی لے کر مختار رسولوں کے پاس آیا کرتے ہیں اور یہ پیغام رسانی جو اللہ سے رسولوں کے پاس آتی ہے 'نہایت ہی اہم اور نہایت ہی بھاری کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کائنات کی عظیم تخلیقات کے بعد فرشتوں کی تخلیق کا خصوصی ذکر ہوا کیونکہ یہ فرشتے ہی زمین اور آسمان کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہیں۔ وہی رابطہ ہوتے ہیں خالق سماوات و ارض اور اللہ کے مختار بندوں یعنی رسولوں کے درمیان اور یہ پیغام رسانی اور ذریعہ ربط اس کائنات کا اہم کام فریضہ رسالت کے بارے میں ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں آغاز سے یہاں تک فرشتوں کا ذکر تو ہوتا رہا ہے لیکن فرشتوں کی شکل و صورت کے بارے میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے۔ اس سے قبل فرشتوں کی طبیعت اور ان کے فریضہ منصبی کی بات ہوتی رہی ہے مثلاً

وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا یَسْتَحْسِرُوْنَ (۲۱ : ۱۹) یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ (۲۱ : ۲۰) (انبیاء :۱۹۔۲۰)"اور جو اس کے پاس ہیں وہ نہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اس کی بندگی سے سرتابی کرتے ہیں۔ نہ ملول ہوتے ہیں۔ شب و روز تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ دم نہیں لیتے"۔ دوسری جگہ ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَیُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ یَسْجُدُوْنَ (۷ : ۲۰۶) "جو فرشتے تمہارے رب کے حضور تقرب کا مقام رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آکر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے۔ اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کے آگے جھکے رہتے ہیں"۔ (۷ :۲۰۶) یہاں ایک نئی بات یہ کہی گئی ہے کہ ان کی تخلیقی صورت کیا ہے کہ "جن کے دو دو' تین تین اور چار چار بازو ہیں"۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جس کی کوئی مثال نہیں ہے 'نہ اس کا ہم کوئی تصور کر سکتے ہیں کہ ان کے بازو اور پر کیسے ہیں۔ ہمیں بس چاہئے اور ہم یہی کر سکتے ہیں کہ بس اجمالاً ایمان لائیں کہ ان کے پر ایسے ہوں گے۔ اس بارے میں کوئی متعین تصور ہم نہیں کر سکتے کیونکہ ہم جو اندازہ بھی کریں گے اس میں غلطی ہوگی جبکہ ان کی شکل کے بارے میں تفصیلات ہمیں احادیث صحیحہ سے بھی نہیں ملتیں۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ ان کی ایک اور صفت آئی ہے اور وہ یہ ہے۔

عَلَيْهَا مَلٰئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۶۶ : ۶)

"جن پر نہایت تند خو اور سخت گیر فرشتے ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں"۔ اس میں بھی فرشتوں کی شکل کو متعین نہیں کیا گیا۔ احادیث میں جو کچھ آتا ہے وہ یہ ہی کہ رسول اللہ نے جبرئیل علیہ السلام کو دو مرتبہ اپنی اصل شکل میں دیکھا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ اس کے چھ سو پر تھے اس سے بھی ان کی شکل و ہیئت کا تعین نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ معاملہ بھی علوم غیبیہ میں سے ایک ہے۔

ان کے دو دو یا تین تین یا چار چار پر ہیں اور انسانوں نے صرف پرندوں کے پر دیکھے ہیں۔ اس لیے اللہ فرماتے ہیں۔

يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (۳۵ : ۱) "وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے 'اضافہ کرتا ہے"۔ یوں اللہ کی مشیت بے قید ہے اور وہ خود اپنی بنائی ہوئی اشکال کا پابند نہیں ہے۔ اس کی مخلوقات میں ہم دیکھتے ہیں کہ لاتعداد شکلیں ہیں اور لاتعداد شکلیں ایسی ہیں جو ابھی تک ہمارے علم ہی سے باہر ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۳۵ : ۱) "اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ یہ تبصرہ نہایت وسیع ہے اور زیادہ جامع ہے"۔ لہٰذا کسی صورت کے تعین کی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی تمام شکلیں اللہ کی قدرت کے دائرے کے اندر آتی ہیں۔ ہر قسم کا تغیر و تبدل اللہ کی قدرت کے تحت ہوتا ہے۔

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ②

"اللہ جس رحمت کا دروازہ بھی لوگوں کے لیے کھول دے اسے کوئی روکنے والا نہیں ہے اور جسے وہ بند کر دے اسے اللہ کے بعد پھر کوئی دوسرا کھولنے والا نہیں۔ وہ زبردست اور حکیم ہے"۔

اس سورہ کی اس دوسری آیت میں اللہ کی قدرتوں کا ایک رنگ دکھایا گیا ہے جبکہ پہلی آیت میں اللہ کی قدرت کا ذکر تھا۔ جب یہ رنگ کسی انسان کے تصور اور عمل میں بیٹھ جاتا ہے تو اس کے تصورات 'اس کا شعور 'اس کا رخ' اس کے حسن و قبح کے پیمانے بھی اس رنگ میں رنگے جاتے ہیں اور اس کی پوری زندگی اس رنگ میں رنگی جاتی ہے۔

یوں کہ یہ رنگ انسان کو اس کائنات کی پوری قوتوں سے کاٹ کر اللہ کی قوت سے جوڑ دیتا ہے۔ اسے زمین و آسمان کی تمام مشکوک رحمتوں سے مایوس کر دیتا ہے۔ صرف اللہ کی رحمت سے جوڑتا ہے اور اس کا امیدوار بنا دیتا ہے۔ زمین و آسمان کے تمام دروازے بند کر کے صرف اللہ کا دروازہ کھلا چھوڑتا ہے اور اس کے سامنے زمین و آسمان کے تمام راستے بند کر کے صرف اللہ کا دروازہ کھلا چھوڑتا ہے۔ اس کے سامنے زمین و آسمانوں کے تمام راستے بند کر کے صرف اللہ کا راستہ کھلا چھوڑتا ہے۔

اللہ کی رحمت کے مظاہر متعدد ہوتے ہیں' لاتعداد ہوتے ہیں۔ اللہ نے انسانوں کی جس انداز سے تخلیق کی' اس کے

نفس کے اندر جو ممتاز قوتیں ودیعت کیں اور اپنی مخلوق میں سے جس طرح اسے مکرم بنایا صرف ان رحمتوں کو اگر انسان قلم بند کرنا چاہے تو وہ انتہاؤں تک نہیں پہنچ سکتا۔ جس طرح اللہ نے انسان کے لیے اس کے ماحول کو سازگار بنایا ہے ۔ اس کے اردگرد' اس کے اوپر نیچے ہر چیز کو اس کے لیے مسخر کیا ہے اور اس کے اوپر جو انعامات کیے ہیں جنہیں وہ جانتا ہے اور وہ انعامات جنہیں وہ نہیں جانتا' یہ انعامات بے شمار ہیں' ان گنت ہیں ۔

اللہ کی رحمت ان چیزوں میں بھی موجود ہے جو ممنوع ہیں ۔ ان میں بھی موجود ہے' جن کی اجازت ہے اور جس شخص پر اللہ کی رحمتوں کا دروازہ کھل جاتا ہے' اسے یہ رحمت ہر چیز میں نظر آتی ہے ۔ ہر حال' ہر ماحول' اور ہر جگہ نظر آتی ہے ۔ اس کے شعور میں' اس کے ماحول میں جہاں بھی وہ ہو' جیسا بھی ہو' اگرچہ انسان ان تمام نعمتوں سے محروم ہو جائے جنہیں لوگ محرومیت سمجھتے ہیں ۔ اس رحمت سے اپنے آپ کو وہ ہر شخص محروم پاتا ہے جس پر اللہ اس کا دروازہ ہر چیز میں بند کر دیتا ہے ۔ ایسا شخص پھر ہر حال میں' ہر صورت میں اور ہر جگہ محروم ہی ہوتا ہے اگرچہ اس کے پاس بظاہر وہ سازو سامان موجود ہوں جس کو لوگ خوشحالی تصور کرتے ہیں ۔

دنیا کے بے شمار سازو سامان ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ اللہ کی رحمت شامل نہیں ہوتی' وہ عذاب الٰہی بن جاتے ہیں اور کئی ایسی مشکلات ہوتی ہیں جن کے ساتھ اللہ کی رحمت شامل ہوتی ہے ۔ یہ مشکلات بذات خود رحمت بن جاتی ہیں ۔ بعض اوقات انسان کانٹوں پر سوتا ہے مگر اس پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے ۔ یہ کانٹے اس کے لیے نرم بچھونا ہو جاتے ہیں ۔ بعض اوقات نرم و نازک بستر انسان کے لیے کانٹے بن جاتے ہیں اور بہت ہی اذیت کا باعث ہوتے ہیں ۔ انسان مشکل ترین کام کر رہا ہوتا ہے اور وہ اس کے لیے اللہ کی رحمت ہوتے ہیں ۔ وہ نہایت ہی پر تعیش زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے لیکن وہ اس کے لیے مصیبت ہوتی ہے ۔ بعض اوقات وہ ایک خوفناک صورت حالات میں گھس جاتا ہے اور وہ اس کے لیے امن ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ مشکلات کے بغیر مراحل عبور کر لیتا ہے اور وہ اس کے لیے ہلاکت کا باعث بن جاتے ہیں ۔

اللہ کی رحمت کے ساتھ کوئی تنگی' تنگی نہیں رہتی ۔ اگرچہ کوئی جیل کی تاریکیوں میں ہو' یا ہلاکت کی دیواروں میں یا سخت مصائب میں ہو' بلکہ اللہ کی رحمت کے سوا تمام کشادگیاں تنگی ہوتی ہیں ۔ اگرچہ کوئی نعمتوں اور سہولتوں میں زندگی بسر کر رہا ہو' خوشحال ہو' اسے زندگی کی تمام سہولیات حاصل ہوں ۔ جب انسان اللہ کی رحمت کی وجہ سے قلبی طمانیت کا مقام حاصل کر لیتا ہے تو اس کے اندر سے نیک بختی' رضامندی اور اطمینان کے سرچشمے پھوٹنے لگتے ہیں اور یوں نفس کے اندر قلق' تھکاوٹ' واماندگی اور محنت و مشقت کی تکلیف دہ نیش زنیاں ختم ہونا شروع ہو جاتی ہیں اگرچہ وہ نفس کے اندر جمی ہوئی ہوں ۔

اللہ کی رحمت کی کنجی تمام دروازوں کے لیے ماسٹر چابی ہے ۔ اس سے تمام دروازے کھل جاتے ہیں' اس سے تمام چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بند ہو جاتی ہیں اور تمام غلط راہیں مسدود ہو جاتی ہیں' انسان بے فکر ہو جاتا ہے' اللہ کی رحمت کا دروازہ کھل جانے سے پھر وسعتیں' کشادگیاں اور آرام و سکون حاصل ہو جاتا ہے ۔ یہ ایک ایسا دروازہ ہے کہ اس کے کھل جانے سے تمام نفع بخش دروازے اور راستے کھل جاتے ہیں اور تمام غیر نفع بخش دروازے بند ہو جاتے ہیں اور جب یہ دروازہ بند ہو جائے تو تمام ایسے دروازے' کھڑکیاں اور راستے کھل جاتے ہیں جو نفع بخش نہیں ہوتے اور انسان تنگی' کرب' بختی' بے چینی اور واماندگی میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔

بعض اوقات اللہ کا یہ فیض انسان کو ڈھانپ لیتا ہے' پھر اگر زندگی تنگ ہو یا مالی حالت اچھی نہ ہو' رہنے اور سہنے کے

حالات خراب ہوں تو کوئی پرواہ نہیں ہوتی ۔ یہ فیض رحمت ہی دوام ' راحت ' سعادت ہے ۔ اور جب اس رحمت کا دروازہ بند ہوتا ہے اور دوسری جانب سے رزق کشادہ ہوتا ہے اور ہر سامان کی آمد آمد ہوتی ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اس سے تنگی ' حرج اور شقاوت و بدبختی حاصل ہوتی ہے ۔

مال و دولت ' صحت و قوت ' شان و شوکت بھی بسااوقات رنج الم اور تھکاوٹ اور مشقت کا باعث ہوتے ہیں ۔ اگر دست قدرت اپنا فضل و رحمت کھینچ لے ۔

بعض اوقات اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور متاع حسن اور دنیا کے سازو سامان کو جمع کر دیا ۔ پھر کیا ہوتا ہے ' ہر طرف آرام اور سکون ہوتا ہے ۔ دنیا میں عیش و عشرت اور آخرت کے لیے پوری تیاری ہوتی ہے ۔ ایسے لوگوں کے خلاف پھر دنیا پرستوں کے دل میں حسد اور کینہ برپا ہوتا ہے لیکن مال و دولت کے ساتھ ایک شخص کو اگر بخل دے دیا جائے تو وہ محروم ہو جاتا ہے یا مال و دولت کے ساتھ بیماری بھی دے دی جائے تو بھی وہ دنیا کے انعامات سے محروم ہو جاتا ہے اور بعض اوقات مالدار سرکش ہو جاتا ہے اور اس کا مال تلف بھی ہو جاتا ہے ۔

بعض اوقات اللہ کسی کو اولاد دیتا ہے اور اس اولاد کے ساتھ رحمت خداوندی بھی شامل ہوتی ہے ۔ پھر یہ اولاد زینت حیات بن جاتی ہے ۔ خوشی اور سعادت کا باعث بن جاتی ہے اور آخرت میں ' مزید اجر کا باعث بنتی ہے ۔ وہ اس شخص کے لیے نیک اور اچھے جانشین بن جاتے ہیں اور اسی اولاد کے ساتھ اگر رحمت خداوندی نہ ہو تو یہی میٹھی اولاد زحمت بن جاتی ہے ' بلائے جان ہوتی ہے ' باعث بدبختی اور پریشانی ہوتی ہے ۔ راتوں کی نیند حرام کر دیتی ہے اور دن کا آرام غارت کر دیتی ہے ۔ اللہ انسان کو صحت اور قوت دیتا ہے ۔ اب اگر اس صحت اور قوت کے ساتھ رحمت خداوندی بھی ہو تو یہ نعمت ہوتی ہے ۔ زندگی اچھی طرح بسر ہوتی ہے ۔ زندگی کی لذتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔ لیکن اگر اس صحت و قوت کے ساتھ رحمت خداوندی شامل نہ ہو تو یہ صحت اور یہ قوت بلائے جان بن جاتی ہیں ۔ اور ایک صحیح اور قوی شخص مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ وہ اپنی صحت اور اپنی قوت کو ان کاموں میں کھپا دیتا ہے جو خود اس کی صحت اور قوت کے لیے تباہ کن ثابت ہوتے ہیں ۔ اس کی روح اور اس کے اخلاق کی تباہی کے ساتھ ساتھ اس کی آخرت بھی تباہ ہو جاتی ہے ۔

بعض لوگوں کو اللہ مرتبہ اور مقام دیتا ہے اور اس کی رحمت ایسے لوگوں کے شامل حال ہوتی ہے ۔ یہ مرتبہ و مقام اصلاح کا ذریعہ بن جاتے ہیں ۔ ملک میں امن قائم ہو جاتا ہے اور یہ مرتبہ و جاہ اس بات کا ذریعہ بن جاتے ہیں کہ انسان اپنے پیچھے اچھے اعمال اور اچھے آثار چھوڑے جو آخرت کا بہترین ذخیرہ ہوں ۔ اگر اللہ کی رحمت اقتدار اور جاہ کے ساتھ شامل نہ ہو تو وہ شخص بے چین رہتا ہے ۔ لوگوں پر ظلم کرتا ہے ۔ حد سے تجاوز کرتا اور سرکشی اختیار کرتا ہے ۔ لوگوں کے ساتھ نہایت بغض اور کینہ رکھتا ہے ۔ یہ جاہ و اقتدار ہی ایسے لوگوں کے لیے عداوت کا ذریعہ بن جاتا ہے اور ایسا شخص پھر ایسے کام کرتا ہے کہ اپنے لیے آخرت میں آگ کا ایک بہت بڑا سرمایہ جمع کر لیتا ہے ۔

گہرا علم اور طویل عمر اور جاہ و مرتبہ بدلتے رہتے ہیں ۔ کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ علم و معرفت کسی کے لیے مفید ہوتے ہیں اور کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ طویل عمر باعث برکت ہو ۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ قلیل عمر ہی برکت کا باعث ہوتی ہے اور نہایت ہی قلیل مال و دولت بڑی سعادت مندی کا ذریعہ ہو جاتا ہے ۔

جماعت بھی ایک فرد کی طرح ہوتی ہے اور ملت بھی ایک فرد ہے ۔ ہر حال اور ہر صورت میں اور مثالوں پر غور

کرنے سے کوئی نہیں ٹالتا مشکل کام نہیں ہے۔

اللہ کی رحمت کی علامت یہ ہے کہ انسان اللہ کی رحمت کو محسوس کرے۔اس طرح اللہ کی رحمت پھر انسان کو سینے سے لگالیتی ہے اور رحمت الٰہی کی بارش ہو جاتی ہے۔فیوض و برکات نازل ہوتے ہیں۔لیکن کسی کا یہ شعور کہ اس پر اللہ کی رحمت ہے 'سب سے بڑی رحمت یہی ہے۔کسی انسان کا صرف اللہ سے امیدوار ہونا' اسی پر بھروسہ کرنا رحمت ہے۔ ہر معاملے میں اللہ سے امیدیں وابستہ کرنا اور اللہ پر اعتماد کرنا ہی رحمت ہے۔اور حقیقی عذاب یہ ہے کہ انسان اس سے چھپ جائے۔اس سے مایوس ہو جائے اور اس میں شک کرے۔یہ ایک ایسا عذاب ہے جو کسی مومن کے کبھی قریب ہی نہیں جاتا۔

انَّهُ لَا يَيْئَسُ مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ "اس میں شک نہیں ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس صرف کافر ہوا کرتے ہیں"۔

اللہ کی رحمت کا اگر کوئی طالب ہو تو وہ ہر کسی کو ہر جگہ مل جاتی ہے۔کسی کے لیے ناپید نہیں ہے۔ابراہیم علیہ السلام نے اسے آگ میں پایا۔یونس علیہ السلام نے اسے مچھلی کے پیٹ کے اندھیروں میں پایا۔موسیٰ علیہ السلام نے اسے سمندر کی لہروں میں پایا جبکہ وہ طفل ناتواں تھے۔پھر انہوں نے اسے فرعون کے محل میں پایا جبکہ وہ ان کا دشمن ہو گیا اور اس کی تلاش میں نکل گیا۔اصحاب کہف نے اسے غار میں پایا جبکہ محلات اور شہروں میں وہ اس سے محروم رہے جب انہوں نے یہ فیصلہ کیا۔

فَاْوٗا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ (۱۸ : ۱۶) "غار میں پناہ لے لو' تمہارا رب تمہارے لیے اپنی رحمت کی چادر بچھا دے گا"۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفیق نے اسے غار میں پایا جبکہ کفار ان لوگوں کا تعاقب کر رہے تھے۔اور ان کے قدموں کے نشانات کو تلاش کر کے غار کے دھانے تک پہنچ گئے تھے۔یہ رحمت ہر اس شخص کو ملتی ہے جو تمام دوسرے ذرائع سے مایوس ہو جائے اور اسے بالکل یہ امید نہ رہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور قوت بھی بچانے والی ہے اور وہ پوری طرح یقین کرتا ہو کہ اب اللہ کی رحمت ہی بچانے والی ہے اور تمام دروازوں کو چھوڑ کر وہ اللہ کے در پر سوالی ہو گیا ہو۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر اللہ اپنی رحمت کا دروازہ کسی پر کھول دے تو اس کا بند کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اور جب اللہ اپنی رحمت کے دروازے کسی پر بند کر دے تو کوئی کھولنے والا نہیں ہوتا۔لہٰذا ایک سچے مومن کے دل میں کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔کسی سے کچھ امید نہیں رہتی۔کسی چیز کے چلے جانے کا خوف نہیں رہتا اور کسی چیز کی امید نہیں رہتی۔ کسی ذریعے کے فوت ہونے کا ڈر نہیں ہوتا اور کسی وسیلے کی موجودگی کی بھی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی۔اللہ کی مطلق مشیت ہی اصل فیکٹر ہے۔لہٰذا اللہ اپنی رحمت کے دروازے کھول دے تو کوئی بند کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ بند کر دے تو کوئی کھولنے والا نہیں ہے۔معاملہ براہ راست اللہ کے ہاتھ میں ہے۔وہ عزیز و حکیم ہے۔وہ ایسے اندازے اور تقدیر مقرر کرتا ہے کہ کسی کو روکنے یا عطا کرنے کا کوئی اختیار ہی نہیں رہتا۔اللہ کی عطا اور اللہ کا روک لینا اس کی اپنی رحمت کے مطابق ہوتا ہے۔بلکہ اس کی اپنی حکمتوں کے مطابق ہوتا ہے اور اللہ کے ہر کام کے پیچھے ایک حکمت کام کر رہی ہوتی ہے۔

مَا يَفْتَحِ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةِ اللَّهِ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ”اللہ جس رحمت کا دروازہ بھی لوگوں کے لیے کھول دے اسے کوئی روکنے والا ہی نہیں ہے“۔ اللہ کی رحمت اور لوگوں کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں۔ لوگ براہ راست اللہ سے براہ راست طلب کر سکتے ہیں۔ وہ بلاواسطہ اور بلاوسیلہ طلب کر سکتے ہیں۔ صرف بندے کی طرف سے توجہ ' اطاعت ' امید ' بھروسے اور سر اطاعت خم کر دینے کی ضرورت ہے۔

وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ ”اور جسے وہ بند کر دے اسے پھر اللہ کے سوا کوئی کھولنے والا نہیں ہے“۔

یہ آیت انسانی ضمیر کو انتہائی قرار و سکون اور انسانی شعور اور تصور کو نہایت ہی نمایاں کرتی اور انسانی اقدار اور پیمانوں کو اونچا معیار عطا کرتی ہے۔ انسانی شخصیت کو وقار اور اطمینان ملتا ہے۔

یہ ایک مختصر آیت ہے لیکن زندگی کے لیے بالکل ایک نیا نقشہ تیار کرتی ہے۔ انسانی تصور اور شعور کو نہایت مستحکم قدریں عطا کرتی ہے۔ ایسی قدریں جن میں نہ تزلزل ہے ' نہ جھکاؤ اور نہ وہ وقتی باتوں سے متاثر ہوتی ہیں۔ یہ اثر انداز ہونے والے فیکٹر آئیں یا جائیں ' بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں 'عظیم ہوں یا چھوٹے ہوں ' ان کا مبدا لوگ ہوں یا واقعات ہوں ' یا اشیاء ہوں ' ان سے یہ قدریں متاثر نہیں ہوتیں۔

یہ زندگی کی ایک صورت ہے اگر یہ عقیدہ انسانی زندگی میں بیٹھ جائے تو وہ واقعات ' اشیاء ' افراد ' بڑی بڑی قوتوں ' اقدار اور حالات کے سامنے پہاڑ کی طرح سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو جائے۔ اگرچہ اس پر جن و انس باہم مل کر ' سب کے سب ٹوٹ پڑیں۔ یہ تمام جن و انس نہ اللہ کی رحمت کے دروازے کو بند کر سکتے اور نہ اگر بند ہوں تو کھول سکتے ہیں۔ صرف اللہ ہی العزیز اور الحکیم ہے۔

اسلام کے آغاز میں اسلام اور قرآن نے انسانوں کا ایک ایسا ہی گروہ پیدا کر دیا تھا۔ یہ ایسا گروہ تھا کہ اللہ نے خود اپنی نگرانی میں اس قرآن کے ذریعہ پیدا کر دیا تھا ' تاکہ یہ گروہ قدرت الٰہیہ کے لیے دست قدرت ہو۔ یہ گروہ اس زمین کے اندر وہ عقائد و تصورات تخلیق کرے جنہیں اللہ چاہتا تھا۔ وہ قدریں عطا کرے جن کو اللہ کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ وہ حالات اور صورت حالات پیدا کر دے جو اللہ چاہتا تھا اور دنیا کے اندر ایک ایسی زندگی ' عملی زندگی قائم کر کے چلا جائے جس کے بارے میں آج جب ہم پڑھتے ہیں تو وہ ہمیں افسانہ اور قصے نظر آتے ہیں۔ وہ گروہ جو اللہ کی تقدیر تھا ' اسے اللہ جس پر چاہتا تھا ' مسلط کر دیتا تھا۔ اس کے ذریعہ اللہ نے کچھ کو اقوام کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا اور کچھ کو قائم کر دیا۔ جنہیں اللہ مٹانا چاہتا تھا یا جنہیں اللہ کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس لیے کہ یہ گروہ اس قرآن کے الفاظ ہی کے ساتھ معاملہ نہ کرتا تھا ' نہ خوبصورت نظریات و تصورات ہی سے بحث کرتا تھا بلکہ اس نے قرآن کو اپنی زندگیوں کے اندر عملاً قائم کر دیا تھا اور وہ گروہ قرآن کی دنیا میں زندہ رہتا تھا۔

وہی قرآن لوگوں کے پاس موجود ہے۔ یہ قرآن اب بھی ایسے گروہ پیدا کر سکتا ہے جو دنیا سے اقوام کو مٹا دیں اور دوسری اقوام کو اٹھا دیں۔ لیکن یہ تب ہو گا کہ قرآنی تصورات کسی گروہ کی زندگی میں ٹھوس شکل میں ' عملی شکل میں بیٹھ جائیں ' رائج ہو جائیں اور قرآن کسی گروہ کی زندگی میں چلتا پھرتا نظر آئے۔ اسے لوگ آنکھوں سے دیکھ سکیں اور ہاتھوں سے چھو سکیں۔

اب میں اس طرف آتا ہوں کہ اس مختصر آیت کے ذریعے میں نے معلوم کر لیا ہے کہ اللہ کی مجھ پر خاص رحمت

ہے۔میں نے جب اس آیت کا سامنا کیا تو میں روحانی لحاظ سے نہایت ہی خشک، فکری لحاظ سے بہت تنگ، نفسیاتی لحاظ سے بہت ہی پریشان، جسمانی اور سازو سامان کے لحاظ سے مشکل حالات میں تھا۔ ایسے سخت اور شدید حالات میں، میں نے اس آیت کا مطالعہ کیا۔ اللہ نے مجھے اس آیت کی حقیقت تک پہنچا دیا۔ یہ حقیقت میری روح میں انڈیل دی گئی۔ گویا وہ ایک شراب طہور ہے جو میرے جسم کی رگ رگ میں سرایت کر رہی ہے اور میں اسے محسوس کر رہا ہوں۔ یہ حقیقت ہے جس کا میں ادراک کر رہا ہوں۔ محض تصور نہیں ہے۔ یہ حقیقت بذات خود میرے لیے رحمت ہے اور یہ آیت میرے سامنے خود اپنی تفسیر بیان کر رہی ہے۔ یہ ایک واقعی اور عملی تفسیر تھی۔ جس طرح اس آیت کے اسرار و رموز میرے سامنے کھلے اسی طرح اللہ کی رحمت کے دروازے بھی میرے سامنے کھلے۔ اس سے قبل میں اس آیت کو پڑھتا رہا اور اس آیت کے پاس سے اس سے قبل میں بارہا گزرا ہوں لیکن آج یہ آیت مجھ پر رحمت کا فیضان کر رہی ہے۔ میں اس کے معانی اور مفہومات سے سیراب ہو رہا ہوں۔ میں اس آیت کی حقیقت کو صاف صاف دیکھ رہا ہوں۔ یہ آیت مجھے پکار رہی ہے کہ آیئے میں ادھر ہوں۔ میں اللہ کی رحمت ہوں، جس کا دروازہ کبھی بھی کھلتا ہے۔ ذرا دیکھئے اللہ کی رحمت کے کرشمے۔

غور کیجئے میرے ماحول کی کوئی چیز نہیں بدلی لیکن میرے احساس نے اب ہر چیز کو ایک نیا رنگ دے دیا ہے۔ یہ ایک نہایت عظیم رحمت ہے جو کسی پر ہو جاتی ہے۔ اللہ کی رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ جس طرح اس آیت کے خزانے مجھ پر کھل گئے۔ یہ ایک نعمت خداوندی ہے اور جب یہ کسی پر آتی ہے تو انسان اسے چکھتا ہے۔ اس کے اندر زندگی بسر کرتا ہے لیکن ان کے لیے اس کو بیان کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح اس احساس کو اور اس ذوق کو قلم بند کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ میں ایک عرصہ رحمت خداوندی کے اس فیضان میں زندہ رہا ہوں، اسے محسوس کرتا رہا ہوں اور اسے پہچانتا رہا ہوں۔ اپنی زندگی کے مشکل ترین حالات میں مجھ پر یہ کیفیت طاری ہوئی ہے۔ اب میری حالت یہ ہے کہ میں کشادگی، خوشی، سیرابی، آزادی اور بے قیدی محسوس کرتا ہوں۔ ہر چیز سے آزادی، ہر کرب اور ہر رنج سے آزادی محسوس کرتا ہوں اور میں اسی جگہ ہوں، جہاں تھا۔ یہ اللہ کی رحمت ہی ہے جس کے دروازے مجھ پر کھل گئے ہیں۔ یہ اللہ کا فیض ہی ہے جس کی مجھ پر اس آیت کے ذریعہ بارش ہو رہی ہے۔ یہ آیت ہے، قرآن کی بس ایک ہی آیت لیکن اس نے تاریک کوٹھڑی میں روشنی کا ایک طاق کھول دیا ہے۔ اس نے میری سیرابی کے لیے خشک جگہ پر ایک چشمہ آب صافی بہا دیا ہے اور میں اب نہایت ہی کھلی شاہراہ پر رضائے الٰہی کی سمت نہایت ہی اطمینان کے ساتھ بڑھ رہا ہوں۔ اور چشم زدن میں۔ اذیت کے بجائے میری زندگی راحت میں بدل گئی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰه، حَمْدًا كَثِيرًا "اے پروردگار، جس نے اس قرآن کو اللہ کی رحمت بنا کر بھیجا مومنین کے لیے رحمت اور شفاء اور ہدایت"۔

مطالعہ کلام الٰہی کے دوران یہ ایک چمک تھی جسے میں نے قلم بند کر دیا۔ اب دوبارہ ہم سورہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پہلی دو آیات کے اندر جو اشارات تھے وہی تیسری آیت میں بھی ہیں۔ لوگوں پر ان کے حوالے سے اللہ کے انعامات اور رحمتوں کا ذکر ہے۔ اللہ جس کے سوا کوئی الٰہ مالک اور حاکم اور رازق نہیں ہے۔ تعجب انگیز اسلوب سے کہا جاتا ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ لوگ یہ اختیارات اللہ کے سوا کسی اور معبود کو دیتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ ۚ هَلْ مِنْ خَالِقٍ

غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ

"لوگو' تم پر اللہ کے جو احسانات ہیں انہیں یاد رکھو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو؟..... کوئی معبود اس کے سوا نہیں' آخر تم کہاں سے دھوکا کھا رہے ہو؟"

اللہ کی نعمتوں کی تو یاد دہانی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ نعمتیں بہت ہی واضح اور کھلی ہیں' جو ان کو دیکھتے ہیں' محسوس کرتے ہیں اور چھوتے ہیں۔ لیکن وہ بھول جاتے ہیں۔ ان کو یہ نعمتیں یاد نہیں رہتیں۔

ذرا اس زمین و آسمان اور انسان کو گھیرے ہوئے اس کائنات پر نگاہ دوڑاؤ' ہر وقت اللہ کے انعامات انسان پر برسا رہی ہے۔ رزق کے دروازے ان پر کھل گئے ہیں۔ ہر قدم پر ایک نعمت ہے۔ ہر لحظہ میں ایک نیا فیض ہے۔ آسمانوں اور زمین سے انسان کے لیے سہولیات چلی آرہی ہیں اور یہ اللہ کی طرف سے آرہی ہیں جو وحدہ خالق و رازق ہے۔ اللہ کا فیض عام ہے اور یہ کس کی طرف سے ہے؟ سخت سے سخت مشرک بھی یہ نہیں کہہ سکتے۔

کیا ان فیوض و برکات اور رحمتوں کا نزول خالق کائنات اللہ کے سوا کوئی اور کر رہا ہے۔ جب اللہ کے سوا کوئی خالق اور رازق نہیں ہے تو پھر کیوں وہ نصیحت حاصل کر کے شکر الہی بجا نہیں لاتے؟ پھر کیوں وہ اللہ کی حمد و ثنا نہیں کرتے اور صرف اسی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور بندگی سے منہ موڑتے ہیں؟ اس کے سوا تو کوئی حاکم نہیں ہے۔ آخر وہ ایسے خدا پر ایمان لانے سے کیوں منہ موڑتے ہیں جس میں کوئی شک نہیں ہے۔

فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۳۵ : ۳) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ "آخر تم کہاں دھوکہ کھا رہے ہو؟" تعجب انگیز بات ہے کہ ایک ایسے واضح حق اور بین سچائی سے عقل مند لوگ منہ موڑیں جو رات اور دن انہیں رزق بھی دے رہا ہے اور پھر اس سے بڑا تعجب خیز امر اور کیا ہو گا کہ لوگ رب ذوالجلال کا انکار بھی نہیں کر پاتے اور اس کا اعتراف بھی نہیں کرتے؟

یہ تین ضربات تھیں' نہایت ہی قوی اور تیز جو عقل و خرد کی تاروں پر لگائی گئیں اور سورہ کا آغاز ہوا تاکہ پوری سورہ کے زمزمے کو لوگ توجہ سے سنیں۔ ہر آیت میں انسان کو جو تعلیم دی گئی ہے وہ انسان کی کایا پلٹ دیتی ہے اور اس کے شعور میں ایک گہری حقیقت کے طور پر بیٹھ جاتی ہے۔ یہ تینوں ضربات باہم مربوط اور متناسب ہیں اور مختلف سمتوں سے ایک ہی اثر ڈالتی ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۰۰ ایک نظر میں

پہلا سبق اس کائنات کے نہایت ہی بنیادی تین حقائق پر تھا۔ یعنی یہ کہ اس کائنات کا خالق اور موجد اللہ وحدہ ہے۔ رحمت کا خزانہ اسی کے پاس ہے اور رازق بھی وہی وحدہ ہے۔ اس دوسرے سبق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپ ان لوگوں کی تکذیب اور انکار سے پریشان نہ ہوں۔ ان کا اور ان کے ردعمل کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیں اور لوگوں سے زوردار اور بلند آواز کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ اللہ کا وعدۂ قیامت برحق ہے اور شیطان سے خبردار رہیں کیونکہ اس کا مشن ہی یہ ہے کہ تمہیں ان عظیم حقائق سے بدراہ کرے۔ تمام لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ جو ایمان لائیں گے ان کا صلہ کیا ہو گا اور جو شیطان کے دھوکے میں آجائیں گے ان کا انجام کیا ہو گا۔ آخر میں دوبارہ حضور اکرمؐ کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ اپنے آپ کو پریشان کر کے اپنی جان نہ گھلائیں۔ ہدایت و ضلالت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ لوگوں کی صنعت کاریوں کے بدلے ان کو ملتی ہے اور اللہ ان کے کارناموں سے واقف ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۰۰ تشریح آیات

## ۴ --- تا --- ۸

وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

"اب اگر (اے نبیؐ) یہ لوگ تمہیں جھٹلاتے ہیں (تو یہ کوئی نئی بات نہیں) تم سے پہلے بھی بہت سے رسولؑ جھٹلائے جا چکے ہیں اور سارے معاملات آخر کار اللہ ہی کی طرف رجوع ہونے والے ہیں"۔

یہ عظیم حقائق بالکل واضح ہیں۔ اگر پھر بھی یہ لوگ تکذیب کرتے ہیں تو آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کیا آپ سے پہلے رسول نہیں آتے رہے۔

فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ (۳۵ : ٤) "تم سے پہلے بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں"۔ تمام امور اللہ کے لیے ہیں اور تمام معاملات کے فیصلے اللہ کی طرف جاتے ہیں۔ تبلیغ و تکذیب تو ایک روٹین کام ہے۔ یہ اللہ نے اسباب مقرر کیے ہیں۔ انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے اور انجام کی تدبیر وہ جس طرح چاہتا ہے، کرتا ہے۔ لوگوں کو دوسری آواز یہ دی جاتی ہے کہ خبردار!

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ٚ وَ لَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝

"لوگو، اللہ کا وعدہ یقیناً برحق ہے، لہٰذا دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے، اور نہ وہ بڑا دھوکے باز تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ دینے پائے، درحقیقت شیطان تمہارا دشمن ہے اس لیے تم بھی اسے اپنا دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنے پیروؤں کو اپنی راہ پر اس لیے بلا رہا ہے کہ وہ دوزخیوں میں شامل ہو جائیں"۔

اللہ کا وعدہ برحق ہے اور وہ واقع ہونے والا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ جب یہ حق ہے تو حق ہوتا ہی وہ ہے جو واقع ہونے والا ہو۔ حق نہ ضائع ہوتا ہے، نہ باطل ہوتا ہے اور نہ کالعدم ہوتا ہے، نہ اپنا دھارا اور راستہ بدلتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان کو صرف یہ دنیاوی زندگی دھوکہ دیتی ہے ۔

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا (۳۵ : ۵) "لہذا دنیا کی زندگی تمہیں دھوکہ نہ دے" ۔ لیکن شیطان تو رات اور دن لگا ہوا ہے دھوکہ دینے میں' اس لیے تم کو چاہئے کہ اس سے چوکنے رہو ۔

وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (۳۵ : ۵) "اور نہ کوئی بڑا دھوکہ باز تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ دینے پائے" ۔ شیطان نے اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ تمہارا دشمن ہے اور اسے تمہاری دشمنی پر اصرار بھی ہے ۔

فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا (۳۵ : ۶) "لہذا تم بھی اسے اپنا دشمن ہی سمجھو" ۔ اس کی طرف نہ جھکو "اسے اپنا ناصح نہ سمجھو ۔ اس کے نقش قدم پر نہ چلو کیونکہ دشمن' دشمن کے قدم پر نہیں چلا کرتا ۔ اگر وہ عقلمند ہے کیونکہ دشمن انسان کو کبھی بھی بھلائی کی طرف نہیں بلاتا اور نہ دشمن دشمن کی فلاح و نجات چاہتا ہے ۔

اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (۳۵ : ۶) "وہ تو اپنے پیروؤں کو اپنی راہ پر اس لیے چلا رہا ہوتا ہے کہ وہ دوزخیوں میں شامل ہو جائیں" ۔ کیا کوئی عاقل یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ جہنمیوں میں سے ہو جائے ۔

یہ ایک وجدانی احساس ہے ۔ جب انسان اس بات کو ذہن میں رکھ لے کہ اس کے اور شیطان کے درمیان معرکہ جاری ہے تو وہ اپنی پوری قوت مجتمع کر لیتا ہے ۔ وہ ہروقت بیدار رہتا ہے اور اپنی ذات اور اپنے خیالات کا دفاع کرتا ہے ۔ وہ دشمن کے دھوکے اور گمراہ کن اقدامات سے اپنے آپ کو بچاتا ہے اور وہ ہر وسوسہ اندازی سے بیدار رہتا ہے ۔ ہر نئی بات کو اللہ اور رسول کے پیمانوں سے پیمائش کرتا ہے تاکہ وہ معلوم کر سکے کہ یہ حقیقت ہے یا دھوکہ ہے ۔

یہ ایک وجدانی حالت ہے جسے قرآن ہر ضمیر میں پیدا کرنا چاہتا ہے یعنی ہروقت شیطانی وساوس سے بچاؤ کے لیے تیار رہنا اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنا ۔ جیسا کہ کوئی شخص یا ملک اپنے دشمن سے ہروقت چوکنا رہتا ہے ۔ اور اس کے شر و فساد کا مقابلہ کرنے کے لیے ہروقت تیار رہتا ہے ۔ دشمن کے ذہنی اور جسمانی شر سے بچاؤ کے لیے ۔ اور ہروقت کسی بھی معرکے میں کود نے کے لیے تیاری کی حالت کا برقرار رکھنا' اسی احتیاط' مدافعتی تیاری اور احتیاطی تدابیر کو مزید مستحکم کرنے کے لیے بتایا جاتا ہے کہ کافرین کا انجام کیا ہوگا اور اہل اسلام کا کیا ہوگا ۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۧ ۷ ع ۱۲

"جو لوگ کفر کریں گے ان کے لیے سخت عذاب ہے اور جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے" ۔ اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ شیطان کس طرح انسان کو گمراہ کرتا ہے اور شیطان کا عمل اور اس کی گمراہ کن چالیں کیسی ہوتی ہیں ۔ وہ کون سا دروازہ کھول دیتا ہے جس سے ہر قسم کا شر در آتا ہے ۔ کس طرح وہ انسان کو راہ

ضلالت پر دور تک لے جاتا ہے تاکہ وہاں سے کوئی واپس نہ آسکے ۔

أَفَمَن زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا ۖ فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ ۖ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ۝

(بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس شخص کی گمراہی کا) جس کے لیے اس کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہو اور وہ اسے اچھا سمجھ رہا ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے ۔پس (اے نبیؐ) خواہ مخواہ تمہاری جان ان لوگوں کی خاطر غم و افسوس میں نہ گھلے ۔جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے"۔

شر کا دروازہ اور اس کی کنجی یہ ہے کہ انسان کے لیے اس کے برے اعمال کو اچھا بنا دیا جائے ۔ شیطان یہی کام کرتا ہے کہ انسان کے لیے اس کے برے اعمال اچھے بنا دیئے جاتے ہیں اور وہ برے کاموں کو اچھے کام سمجھتا ہے ۔وہ جس قدر برے افعال کرتا ہے 'وہ سمجھتا ہے کہ وہ اچھا کر رہا ہے اور وہ کام اسے لگتے بھی اچھے ہیں ۔ایسا شخص کبھی اپنے اعمال کا جائزہ بھی نہیں لیتا کہ ان میں کیا کیا غلطی کے مقامات ہیں کیونکہ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ غلطی نہیں کرتا ۔اسے پختہ یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ کہتا اور کرتا ہے 'وہ درست ہے ۔وہ اپنے قول و عمل پر اتراتا ہے اور اپنے کاموں سے اسے عشق ہو جاتا ہے ۔اسے یہ خیال بھی نہیں آتا ہے کہ وہ اپنے کسی کام پر نظر ثانی کرے یا اپنا محاسبہ خود کرے ۔لہٰذا وہ اپنے کسی خیال اور کسی عمل سے رجوع نہیں کرتا ۔کیونکہ جب کوئی سمجھے کہ وہ اچھا کر رہا ہے تو وہ کس طرح اسے چھوڑ سکتا ہے کیونکہ اچھے کام کبھی نقصان دہ نہیں ہوتے ۔

أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا (۳۵ : ۸) "بھلا ہے کچھ ٹھکانا اس شخص کی گمراہی کا جس کے لیے اس کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہو"۔

یہ ہے وہ عظیم مصیبت جو انسان پر شیطان لاتا ہے اور یہ ہے وہ مقام جہاں تک شیطان انسان کی راہنمائی کر کے اسے لے جاتا ہے ۔پہلے اسے گمراہ کرتا ہے 'پھر اسے ہلاکت کے گڑھے میں گراتا ہے ۔

جس شخص کے لیے اللہ ہدایت اور بھلائی لکھ دیتا ہے اس کے دل میں احساس ' شعور ' احتیاط اور غور و فکر کی عادت ڈال دیتا ہے ۔وہ اللہ کی تدبیروں سے غافل نہیں رہتا ۔اور نہ اس بات سے غافل ہوتا ہے کہ اللہ انسان کے دل کو کسی بھی وقت بدل سکتا ہے ۔نہ وہ انسان کی فطری کمزوری ' تزلزل اور خطاکاری سے غافل رہتا ہے ۔نہ وہ انسان کے فطری نقص اور عاجزی کو نظر انداز کر سکتا ہے ۔ایسا شخص ہر وقت اپنے اعمال پر نظر رکھتا ہے ۔ ہر وقت اپنا محاسبہ کرتا رہتا ہے ۔اپنے بارے میں بہت حساس رہتا ہے ۔وہ شیطان سے ہر وقت ڈرتا ہے اور ہر وقت اللہ کی مدد اور نصرت کا امیدوار ہوتا ہے ۔

یہ ہے مقام امتیاز اور جدائی ہدایت و ضلالت اور فلاح اور بربادی کے درمیان ---- یہ ایک گہری نفسیاتی حقیقت ہے

جس کی تصویر کشی قرآن کریم ان الفاظ میں کرتا ہے ۔

أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوْءُ عَمَلِهِ فَرَاٰهُ حَسَنًا ( ۳۵ : ۸ ) "بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس شخص کی گمراہی کا جس کے لیے اس کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہو اور وہ اسے اچھا سمجھ رہا ہو"۔

یہ ہے نمونہ اس گمراہ شخص کا جو تباہ و برباد ہو گیا اور آخر کار وہ ہلاکت کے برے انجام تک پہنچ گیا اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ اس کے لیے اس کے برے اعمال کو مزین بنا دیا گیا۔ اس خوشنمائی کی وجہ سے وہ مغرور ہو گیا۔ یوں اس شخص کے دل پر اور آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور وہ صحیح راہ کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔ ایسا شخص کوئی اچھا کام بھی نہیں کر سکتا اس لیے کہ وہ خود اپنے کام کو اچھا سمجھتا ہے ۔ ایسا شخص اپنی غلطی کی اصلاح بھی نہیں کر سکتا اس لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس سے غلطی سرزد ہی نہیں ہو سکتی ۔ وہ کسی فاسد کام کی اصلاح بھی نہیں کر سکتا کیونکہ بزعم خود اس سے ۔فاسد کام کا صدور ہی نہیں ہو سکتا۔ ایسا شخص کسی حد پر جا کر رکتا بھی نہیں کیونکہ وہ اپنے ہر قدم کو اصلاح سمجھتا ہے ۔ غرض شیطان کا صرف یہی کام تمام فسادوں کا دروازہ ہے اور آخری گمراہی کی چابی ہے ۔

یہاں اللہ سوال فرماتے ہیں کہ اس شخص کی گمراہی کی کیا حد ہو گی جس کے لیے اس کے برے اعمال خوبصورت بنا دیئے گئے ہیں اور وہ انہیں اچھا سمجھتا ہے ؟ اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ اس لیے کہ اس کا کوئی جو جواب بھی دے وہی جواب ہو گا۔ کیا ایسے شخص کی اصلاح کی امید کی جا سکتی ہے ؟ کیا یہ شخص اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو ہر وقت اپنے اعمال کا محاسبہ کرتا رہتا ہے اور اللہ سے ڈرتا ہے ۔ کیا یہ شخص اللہ سے ڈرنے والوں جیسا ہو سکتا ہے ۔ غرض اس سوال کا اب جو جواب بھی دیں وہی جواب ہو گا۔ یہ وہ اسلوب ہے جو قرآن کریم میں بہت آتا ہے ۔ لیکن اس میں ان جوابات میں سے ایک جواب کی طرف بالواسطہ اشارہ کر دیا گیا ہے ۔

فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ( ۳۵ : ۸ ) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ' راہ راست دکھاتا ہے"۔ گویا یہ جواب دیا گیا کہ جس شخص کے لیے شیطان اس کے اعمال کو خوشنما بنا دے ایسے شخص پر ضلالت لکھ دی جاتی ہے ۔ اس کے لیے اللہ نے ضلالت کا راستہ کھول دیا ہے ۔ وہ اس کے اندر چلا گیا ہے ' اس کی واپسی کی کوئی امید نہیں ہے ۔ یہ اللہ کا اختیار ہے کہ وہ جسے چاہے ہدایت دے دے اور جسے چاہے ' ضلالت دے دے ۔ یوں کہ جو شخص طالب ضلالت ہوتا ہے اسے ضلالت ملتی ہے اور جو طالب ہدایت ہوتا ہے ' اسے ہدایت مل جاتی ہے ۔ ضلالت کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ برے اعمال کو اچھا دکھاتی ہے اور ہدایت کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ ہدایت پانے والا ہر معاملے میں محتاط ہوتا ہے ' ڈرتا ہے ' محاسبہ کرتا ہے اور یہی فرق ہے ہدایت اور ضلالت کا۔

اور جب فیصلہ یہی ہے ۔

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ( ۳۵ : ۸ ) "آپ اپنی جان کو ان لوگوں کے غم میں نہ

بھلائیں"۔ یہ معاملہ ہدایت و ضلالت کا معاملہ ہے جو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگرچہ یہ بشر خود رسول اللہؐ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ دل اللہ کی انگلیوں کے درمیان رہیں اور اللہ مقلب القلوب ہے۔ اس طرح اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہیں۔ تاکہ آپ کا رحیم و شفیق دل قرار پکڑے کیونکہ آپ سے ان لوگوں کی گمراہی دیکھی نہ جاتی تھی۔ جبکہ آپ دیکھ رہے تھے کہ ان بیچاروں کا کس قدر برا انجام ہونے والا ہے اس لیے آپ کا دل جوش مارتا تھا کہ آپ ان کے سامنے جو حق پیش کر رہے ہیں وہ اسے تسلیم کر لیں۔ یہ انسانی حرص ہے ہر شخص جانتا ہے کہ انسان جس چیز کو پسند کرتا ہے' وہ چاہتا ہے کہ سب لوگ اسے قبول کر لیں اور اللہ کو رسول اللہؐ سے ہمدردی ہے کہ ایسے احساسات پر یہ ناحق بوجھ ہے کیونکہ یہ حضورؐ کے اختیار اور استطاعت ہی میں نہیں ہے کہ وہ سب کو ہدایت میں لے آئیں' یہ کام اللہ کا ہے۔

تمام مخلص داعیوں کو اس کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وہ اپنی دعوت کی اہمیت' خوبصورتی اور افادیت کو دیکھتے ہیں۔ دوسری جانب عوام کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ وہ اس خوبصورتی' افادیت اور حسن کو محسوس نہیں کر سکتے جو داعی محسوس کرتا ہے۔ اس عدم احساس کی وجہ سے یہ اس دعوت سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ لہٰذا ایسے مخلص داعیوں کو چاہئے کہ وہ اللہ کی اس ہدایت کو پلے باندھ لیں۔ اپنی پوری قوت دعوت میں جھونک دیں اور پھر لوگوں کو اللہ کے سپرد کر دیں۔ اگر کسی قوم کے لیے اللہ نے سچائی کو مقدر نہ کیا ہو تو اسے اپنے حال پر چھوڑ دیں اور مایوس نہ ہوں۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (۸:۳۵) "جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے"۔ وہی ہدایت کی تقسیم کرتا ہے اور کسی کے لیے ضلالت مقدر کرتا ہے۔ یہ سب کام اس کے علم اور اس کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ اللہ ان باتوں کو اس وقت سے جانتا ہے جب ان کا صدور بھی نہیں ہوا ہوتا۔ اسے پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہو گا۔ یہ تقسیم اس نے علم ازلی سے کر لی ہوئی ہے۔ لیکن اللہ اپنے علم ازلی کی بنیاد پر سزا نہیں دیتا۔ سزا اس وقت دیتا ہے جب ان سے اس معصیت کا صدور ہوتا ہے۔ یہاں دوسرا سبق ختم ہوتا ہے۔ اس سبق اور پہلے سبق کے درمیان گہرا ربط ہے اسی طرح آنے والے سبق سے بھی ربط ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۰۱ ایک نظر میں

یہ تیسرا سبق دراصل پے در پے اسفار پر مشتمل ہے ۔ یہ سفر انسانی خیال کو' اس کائنات کی وسعتوں میں کرائے گئے ہیں اور قرآن نے ان اسفار میں انسان کو دلائل ایمان سے آگاہ کیا ہے ۔ ان اسفار کے درمیان انسان کو جو مظاہر دکھائے گئے ہیں' ان سے قرآن دعوت اسلامی پر دلائل و براہین فراہم کرتا ہے ۔

یہ اسفار اس مضمون کے بعد آئے ہیں کہ ہدایت و ضلالت کا اختیار صرف اللہ کو ہے اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ آپ منہ موڑنے والوں کے رویہ کی کوئی پرواہ نہ کریں اور ان کا معاملہ اس اللہ کے سپرد کر دیں جو ان کی تمام کارستانیوں سے باخبر ہے ۔ اس سبق کا مضمون یہ ہے کہ اگر کوئی ایمان لانا چاہتا ہے تو یہ دیکھو دلائل ایمان اس کائنات میں جابجا بکھرے پڑے ہیں ۔ جس کے اندر کوئی پیچیدگی نہیں ہے لیکن بہرحال اگر کوئی گمراہ ہونا ہی چاہے تو وہ اس حال میں گمراہ ہو گا کہ دلائل ایمان ہر طرف سے اس کا گھیراؤ کیے ہوئے ہوں گے ۔

صرف ایک منظر پر غور کرو' یہ زمین بالکل مردہ ہونے کے بعد سرسبز ہو جاتی اور زندہ و تابندہ ہو جاتی ہے ۔ کیا اس میں اس بات کے لیے دلیل نہیں ہے کہ موت کے بعد اسی طرح لوگوں کو اٹھایا جائے گا ۔ پھر انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا اور اسے اس کی موجودہ شکل میں ایک نہایت ہی برتر مخلوق بنایا گیا ۔ یہ بھی ایک برہان ہے ۔ پھر انسانی تخلیق کے مراحل میں سے ہر مرحلہ ایک حجت ہے اور انسان اپنے تخلیقی مراحل میں نہایت ہی طے شدہ نقشے کے مطابق آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے اور یہ نقشہ بھی کتاب مبین میں درج ہے اور ایک برہان ہے ۔

پھر دو قسم کے پانی ایک ہی سمندر میں علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں ۔ ایک میٹھا ہے دوسرا کھارا ہے ۔ یہ بھی ایک حجت ہے ۔ اور سمندروں کے اندر مزید اللہ کی نعمتیں ہیں اور ہر ایک چیز میں اللہ کی کبریائی ہے ۔

پھر رات اور دن کا منظر جو ایک دوسرے کے اندر داخل ہوتے ہیں' بڑھتے گھٹتے ہیں ۔ یہ بھی ایک حجت ہے اور اس نظام کو جاری کرنے میں بھی ایک حجت ہے ۔ شمس و قمر کو ایک نظام کے اندر مسخر کر دیا جانا بھی ایک حجت اور دلیل ہے ۔

یہ سب دلائل و براہین اس کائنات کے اندر بکھرے ہوئے ہیں اور یہ اللہ ہے جو خالق و مالک ہے اور جو لوگ اللہ کے سوا دوسرے معبود سمجھے جاتے ہیں ۔ وہ تو ایک گٹھلی کے برابر بھی تخلیق نہیں کر سکتے ۔ جو نہ سنتے ہیں اور نہ جواب دیتے ہیں ۔ وہ قیامت کے دن ان کی عبادت سے براءت کا اظہار کریں گے اور یہ فیصلہ دیں گے کہ یہ لوگ گمراہ تھے اور سچائی کے علاوہ جو کچھ بھی ہے' گمراہی ہے ۔

--- ○○○---

# درس نمبر۲۰۱ تشریح آیات

## ۹ --- تا --- ۱۴

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝

"وہ اللہ ہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے 'پھر وہ بادل اٹھاتی ہیں' پھر ہم اسے ایک اجاڑ علاقے کی طرف لے جاتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے اسی زمین کو جلا اٹھاتے ہیں جو مری پڑی تھی ۔ مرے ہوئے انسانوں کا جی اٹھنا بھی اسی طرح ہو گا"۔

یہ منظر قرآن میں دلائل تکوینی کے بیان کے دوران بار بار آتا ہے ۔ ہواؤں کا منظر' بادلوں کا منظر' سمندروں کا منظر۔ بادلوں کو ہواؤں کا چلانا' سمندروں سے بخارات کا اٹھنا۔ گرم ہوائیں بخارات اٹھاتی ہیں ۔ سرد ہوائیں ان کو کثیف کر کے بادل کی شکل دیتی ہیں ۔ سمندروں سے یہ بخارات اور بادل پھر ہوا کی موجوں کی سمت میں شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کی طرف چلتے ہیں جس طرف بھی اللہ کو ان کا چلانا منظور ہوتا ہے ۔ یہاں تک کہ وہ منزل مقصود پر پہنچ کر برستے ہیں اور جہاں مردہ زمینوں پر بارش ہوتی ہے ۔ وہاں زمین زندہ ہو جاتی ہے ۔

فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ( ۳۵ : ۹ ) "اور اس کے ذریعے سے اس زمین کو جلا اٹھاتے ہیں جو مری پڑی تھی"۔ یوں یہ معجزہ برپا ہوتا ہے لیکن تعجب کی بات ہے کہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ہر لحظہ اس قسم کے معجزات دیکھتے ہوئے بھی انہیں قیامت میں لوگوں کا اٹھایا جانا مستبعد نظر آتا ہے حالانکہ حشر و نشر تو ان کے ہاتھوں میں اس دنیا میں موجود ہے ۔

كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ( ۳۵ : ۹ ) "مرے ہوئے انسانوں کا جی اٹھنا بھی اسی طرح ہو گا" ۔ یہی سادہ طریق استدلال ہے قرآن کا ۔ اسی طرح آسانی سے یہ عمل ہو گا' اللہ کے لیے اس میں کوئی دقت نہیں ہے ۔

یہ منظر قرآن میں کائناتی دلائل کے بیان کے دوران بار بار دہرایا جاتا ہے ۔ اس لیے کہ یہ منظر ایسا ہے جسے ہر شخص دیکھتا ہے اور اس کے انکار کا کوئی جواز انسان کے سامنے نہیں ہے ۔ پھر یہ منظر انسان کو بے حد جھنجھوڑتا ہے بشرطیکہ انسان اسے دیکھیں ۔ اسے سمجھیں اس حال میں کہ ان کے دل زندہ ہوں اور جب بھی انسان اس منظر پر غور کرے تو یہ انسانی شعور پر چھا جاتا ہے ۔ پھر یہ منظر ایک خوبصورت اور پسندیدہ منظر ہے ۔ خصوصاً صحرائی علاقوں میں جہاں انسان ریگستانوں میں

جلتا رہتا ہے ۔ اچانک جب سرسبز اور شاداب علاقہ آ جاتا ہے تو انسان کی نگاہ گرویدہ ہو جاتی ہے ۔ حالانکہ کل جب بارش نہ ہوئی تھی تو یہی علاقہ چٹیل میدان اور خشک صحرا تھا ۔ قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ وہ اپنے دلائل ایسے مناظر سے اخذ کرتا ہے جو انسان نے دیکھے ہوئے ہوں ۔ جبکہ ان مناظر سے انسان روز گزرتے ہیں لیکن نہایت غفلت سے ۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ان مناظر پر انسان غور کرتا ہے تو اسے یہ منظر معجزات نظر آتے ہیں ۔

اب روئے سخن مردہ زمین کے احیا کے موضوع سے ہٹ کر نفسیاتی شعور کے میدان میں آتا ہے ۔ موضوع کی یہ تبدیلی بظاہر عجیب لگتی ہے یہ کہ عزت ' سربلندی ' قوت اور شوکت کا سرچشمہ کیا ہے ؟ اور عزت اور سربلندی کو مربوط کیا جاتا ہے ۔ قول طیب اور قول صالح کے ساتھ ' کیونکہ قول صالح بھی اللہ کی طرف اٹھتا ہے اور عمل صالح بھی عزت اور رفعت پاتا ہے اور اس کے مقابلے میں قول خبیث اور عمل خبیث سرنگوں ہو کر ہلاکت اور تباہی کی طرف آتے ہیں ۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ۭ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ۭ وَ الَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَ مَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ ۝

" جو کوئی عزت چاہتا ہو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے ۔ اس کے ہاں جو چیز اوپر چڑھتی ہے وہ صرف پاکیزہ قول ہے ' اور عمل صالح اس کو اوپر چڑھاتا ہے ۔ رہے وہ لوگ جو بے ہودہ چال بازیاں کرتے ہیں ' ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کا مکر خود ہی غارت ہونے والا ہے " ۔

شاید مردہ زمین میں اٹھنے والی نباتاتی زندگی اور کلمہ طیبہ اور عمل صالح کے درمیان ربط یہ ہے کہ دونوں میں پاکیزہ زندگی اور قدر مشترک ہے ۔ نباتات کی بھی طیب زندگی ہے اور عمل صالح اور کلمہ طیبہ بھی پاک زندگی ہے ۔ اور ان کے درمیان ربط اور تعلق وہی ہے جس کی طرف سورہ ابراہیم کی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے ۔ یعنی کائنات کے مزاج اور اسلامی زندگی کے مزاج کی یکسانی سورہ ابراہیم میں فرمایا :

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (۲۴) تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۲۵) وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (۲۶) (ابراہیم ۲۴ تا ۲۶) " کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے ۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی

ہیں ۔ ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے ۔ یہ مثالیں اللہ اس لیے دیتا ہے کہ لوگ اس سے سبق لیں اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بد ذات درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے ۔ اس کے لیے کوئی استحکام نہیں ہے"۔ یہ ایک حقیقی مشابہت ہے جو ایک پاک کلمہ اور پاک درخت کے درمیان پائی جاتی ہے ۔ دونوں کے اندر حیات اور بڑھنا موجود ہے ۔ ایک کلمہ اور نظریہ بھی نشوونما پاتا ہے اور بار آور ہوتا ہے اور ایک درخت بھی نشوونما پاتا ہے اور پھل دیتا ہے ۔ دونوں کی ایک ہی مثال ہے ۔

مشرکین اس لیے شرک کرتے تھے کہ مکہ کے اندر ان کا جو دینی مقام تھا وہ برقرار رہے ۔ محض عقیدے اور نظریہ کی وجہ سے وہ دوسرے قبائل سے برتر تسلیم کیے جاتے تھے ۔ پھر ان کو مالی مفادات بھی حاصل تھے ۔ مثلاً ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اس وجہ سے وہ پرشوکت اور پرقوت تھے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ کہتے تھے ۔

اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا "اگر تمہارے ساتھ ہدایت کے تابع ہو جائیں تو ہمیں ہماری زمین سے اچک لیا جائے گا"۔۔۔ لہٰذا اللہ فرماتے ہیں :

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ( ۳۵ : ۱۰ ) "جو کوئی عزت چاہتا ہو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے"۔ یہ حقیقت جب کسی کے دل میں بیٹھ جائے تو اس انسان کی قدریں اور حسن و قبح کے اصول بدل جاتے ہیں ۔ ان قدروں کے حصول کے ذرائع اور منصوبے ہی بدل جاتے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ عزت سب کی سب اللہ کے لیے ہے اور عزت کا کوئی حصہ بھی اللہ کے سوا کسی کا نہیں ہے ۔ اگر کوئی عزت چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ عزت اپنے مصدر حقیقی سے طلب کرے اور اللہ کے سوا عزت کا کوئی سرچشمہ نہیں ہے ۔ اگر کوئی اللہ کے ہاں عزت طلب کرے گا تو وہاں لازماً جائے گا اور اسے عزت ضرور ملے گی اور اگر کسی اور دروازے پر عزت تلاش کرے گا تو خوار ہو گا اس لیے کہ ۔

فَاِنَّ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ جَمِيْعًا "عزت تو سب کی سب اللہ کے ہاں ہے"۔

قریش اپنے بت پرستانہ عقیدے کی وجہ سے لوگوں سے عزت چاہتے تھے ۔ وہ لوگوں کے علی الرغم ہدایت قبول کرنے سے ڈرتے تھے حالانکہ وہ سمجھتے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو دعوت دیتے ہیں وہ ہدایت ہے ۔ وہ اس لیے ڈرتے تھے کہ ان کے مقام و مرتبہ میں فرق نہ آجائے ۔ جن عوام اور قبائل سے وہ ڈرتے تھے ان کے پاس عزت کا کوئی سرچشمہ ہی نہ تھا ۔ وہ عزت کے مالک ہی نہ تھے ۔ عزت کا مالک تو اللہ ہے ۔

فَاِنَّ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ جَمِيْعًا "بے شک عزت اللہ کی ہے"۔ اگر قریش قوی تھے تو قوت کا مصدر بھی اللہ ہی ہے ۔ لہٰذا ان کا فرض ہے کہ وہ عزت اور قوت اور شوکت اپنے اصلی مصدر سے لیں 'لوگوں سے نہ لیں ۔ یہ لوگ تو خود عزت کے طالب ' محتاج اور کمزور ہیں ۔

اسلامی نظریہ حیات کے حقائق میں سے یہ اولین حقیقت ہے ۔ یہ ایسی حقیقت ہے کہ اگر کسی کے ذہن میں بیٹھ جائے تو اس کی قدریں بدل کر رکھ دیتی ہے ۔ حسن و قبح کے پیمانے بدل دیتی ہے ۔ اقوام کے فیصلے اور ان کی تقدیریں بدل دیتی ہے ۔ ان کا منہاج زندگی اور طرز عمل بدل جاتا ہے ۔ وہ اپنے اسباب و وسائل بدل دیتے ہیں ۔ ہمیں چاہئے کہ ہم صرف

اس حقیقت کو ذہن نشین کر لیں اور پھر پوری دنیا کے مقابلے میں کھڑے ہو جائیں ۔ پھر ہم دنیا میں نہایت معزز' پر وقار اور مستقل مقام و مرتبہ پائیں گے ۔ اقوام عالم میں ہمارا وزن ہو گا۔ یہی ہے عزت و وقار کا طریقہ ۔ ایک مسلمان کے لیے اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں ہے ۔

جب کسی دل میں یہ حقیقت بیٹھ جاتی ہے تو وہ دل پھر کسی جبار و قہار کے سامنے نہیں جھکتا۔ وہ کسی تند و تیز طوفان سے بھی نہیں ڈرتا۔ کوئی عظیم حادثہ بھی اس کے عزائم کو ختم نہیں کر سکتا۔ کوئی صورت حال اور کوئی حکومت اسے متاثر نہیں کر سکتی ۔ کوئی مملکت اور کوئی مصلحت اسے متاثر نہیں کر سکتی ۔ اس کرۂ ارض کی قوتوں میں سے کوئی قوت اسے نہیں جھکا سکتی اور کیوں ایسا ہو سکے ؟ جب کہ ہر قسم کی قوت کا سرچشمہ اللہ کے پاس ہے اور اس کے سوا کسی کے پاس کوئی قوت نہیں ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں کلمہ طیبہ اور عمل صالح کا ذکر ہوتا ہے ۔

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (۳۵ : ۱۰) "اس کے ہاں جو چیز اوپر چڑھتی ہے وہ پاکیزہ قول ہے اور عمل صالح اس کو اوپر اٹھاتا ہے"۔

اس عظیم حقیقت کے ذکر کے بعد اس تبصرے کا ایک خاص مفہوم اور اشارہ ہے ۔ اشارہ اس طرف ہے کہ اگر کوئی عزت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے ذرائع کیا ہیں ؟ وہ ہیں قول طیب اور عمل صالح ۔ قول طیب سیدھا اللہ کی طرف بلند ہوتا ہے اور عمل صالح اللہ کی طرف اٹھایا جاتا ہے ۔ یوں اللہ عمل صالح کو مکرم بناتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قول طیب اور عمل صالح کے مالک ہمیشہ سربلند اور معزز اور مکرم ہوتے ہیں اور ان کو عزت عطا ہوتی ہے ۔

صحیح عزت وہ ہوتی ہے جو قبل اس کے کہ اس دنیا میں وہ نمودار ہو یا اس کے آثار نمودار ہوں ایک شخص کے قلب میں بیٹھتی ہے ۔ جب یہ حقیقت کسی دل میں بیٹھ جائے تو ایسا شخص ذلت اور سرنگوں کے تمام اسباب کے دائرے سے باہر نکل آتا ہے ۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جب کسی کے دل میں بیٹھ جائے تو سب سے پہلے تو وہ خود اپنے نفس امارہ پر قابو پا لیتا ہے ۔ یہ سب سے پہلے اپنی سفلی خواہشات کو کنٹرول کر لیتا ہے ۔ جب کوئی انسان ان انسانی کمزوریوں پر قابو پالے تو پھر اس کو ذلیل کرنے اور تابع کرنے کا کوئی سبب ہی نہیں رہتا۔ لوگوں کو جو چیز ذلیل کر کے رکھ دیتی ہے وہ ان کی خواہشات اور رغبات ہوتی ہیں ۔ ڈر اور لالچ ہوتا ہے اور جو شخص ان کمزوریوں پر غالب آجاتے وہ گویا تمام انسانوں پر غالب آگیا۔ اور وہ یہ حقیقی عزت ہے جس کے ذریعے انسان سربلند' قوی اور نڈر ہو جاتا ہے ۔

عزت یہ نہیں ہے کہ انسان حق کے ساتھ معاند ہو' خود سر ہو اور باغی ہو اور باطل کو بلند کرنے کی سعی کرتا ہو نہ قوت اس بات کا نام ہے کہ کوئی فاسق و فاجر ہو جائے' اللہ کا باغی اور نافرمان ہو جائے اور نہایت ہی جبر اور اصرار کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کرے اور نہ قوت اس بات کا نام ہے کہ اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے کوئی آزادانہ شہوت رانی اور بے حیائی کا رویہ اختیار کرے ۔ نہ قوت یہ ہے کہ کوئی بغیر کسی اصول اور ضابطے کے طاقت کا استعمال کرے اور انصاف اور اصلاح کے مقاصد کے بغیر پکڑ دھکڑ شروع کر دے ۔ ہرگز نہیں' بلکہ قوت یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پالے ۔ انسان ذلت اور غلامی کا مقابلہ کرے' اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے نہ جھکے اور صرف اللہ و ہ کے سامنے عاجزی اور خشوع کرے' اللہ کا خوف کرے' اس سے ڈرے' خوشی اور غم دونوں حالتوں میں اللہ سے ڈرے ..جب کوئی ایسی قوت حاصل کر لے تو پھر اس کی پیشانی بلند ہو گی اور ایسا انسان ہر اس بات کا مقابلہ کر سکے گا جسے اس کا ضمیر پسند نہ کرتا ہو ۔ اور ایسا انسان اللہ

کی رضا کے سوا کسی اور چیز کو خاطر میں نہ لائے گا ۔ یہ ہے کلمہ طیبہ اور عمل صالح کا مقام ۔ عزت کے حوالے سے اور سیاق کلام میں بات کی مناسبت اور ربط کے ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے بعد صفحہ بالمقابل کی تکمیل یوں کی جاتی ہے ۔

وَ الَّذِیْنَ یَمْكُرُوْنَ السَّیِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ وَ مَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ یَبُوْرُ

(۳۵ : ۱۰) ''رہے وہ لوگ جو بیہودہ چال بازیاں کرتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کا مکر خود ہی غارت ہونے والا ہے''۔ یمکرون کے اندر تدبیر کے معنی بھی شامل ہیں لیکن یہاں مکر بمعنی سازش اور چال اس لیے استعمال ہوا ہے کہ اس کا اکثر استعمال برے معنوں ہی میں ہوتا ہے ۔ ایسے لوگوں کے لیے عذاب شدید ہے اور یہ عذاب تو ان کے لیے مقدر ہے کہ ان کی یہ چال بازیاں غارت جائیں گی' نہ قائم رہیں گی اور نہ ان کا کوئی نتیجہ نکلے گا ۔ یہ ''بور'' ہے اور ''بور'' اور ''بوران'' دونوں کے ایک ہی معنی ہیں ۔ آیت سابقہ میں چونکہ اشارہ زمین کی آبادی اور پھل دینے کے معنی کی طرف تھا' یہاں اس کے بالمقابل بوران کا لفظ لایا گیا ہے جس میں پھل ضائع ہو جانے کے معنی ہیں ۔

جو لوگ یہ چال بازیاں کرتے ہیں وہ جھوٹی عزت حاصل کرنے کے لیے یہ کام کرتے ہیں ۔ چاہتے ہیں کہ سوسائٹی میں عام لوگوں کی نظروں میں' وہ معزز ہوں ۔ بظاہر وہ بڑے لوگ اور صاحب عزت ہوں اور قوت والے نظر آئیں ۔ یہاں عزت ذرا وسیع مفہوم میں ہے لیکن ہر بری تدبیر جس میں قول طیب نہ ہو اور عمل صالح نہ ہو' اس کا مدبر کبھی بھی معزز' پر وقار اور صاحب قوت نہیں ہوتا ۔ اگرچہ بعض اوقات وہ ایک مختصر وقت کے لیے اپنا رعب جما لیتا ہے لیکن آخر کار وہ ہلاکت کی طرف جاتا ہے ۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے ۔ اور اللہ اپنے وعدوں سے کبھی الٹ نہیں کرتا ۔ ہاں وہ ہر مکار کو قدرے مہلت ضرور دیتا ہے لیکن جب وقت آتا ہے تو یہ تمام مکاریاں غارت چلی جاتی ہیں ۔

---ooo---

اب انسان کی پہلی زندگی اور پہلی پیدائش کا ایک منظر' اس سے قبل کے منظر میں بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک خشک زمین کو پانی کے ذریعہ کس طرح زندہ اور سرسبز و شاداب بنا دیتا ہے ۔ انسان کی پیدائش میں اس کے زمانہ حمل مادر اور پھر اس کی طویل عمر یا قصیر عمل ۔ یہ سب چیزیں اللہ کے علم اور منصوبے کے مطابق ہوتی ہیں ۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ ۝

''اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا' پھر نطفہ سے' پھر تمہارے جوڑے بنا دیے (یعنی مرد اور عورت) کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی اور نہ بچہ جنتی ہے مگر یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہوتا ہے ۔ کوئی عمر پانے والا عمر نہیں پاتا ۔ اور نہ کسی کی عمر میں کچھ کمی ہوتی ہے ۔ مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوتا ہے ۔ اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہے''۔

انسان کی پہلی تخلیق کی طرف قرآن کریم میں بار بار اشارہ کیا گیا ہے کہ اسے مٹی سے پیدا کیا گیا۔اسی طرح قرآن میں حمل کے ابتدائی مراحل کی طرف بھی مفصل اشارہ کیا گیا ہے۔یعنی نطفے کی طرف۔ تراب وہ عنصر ہے جس میں زندگی نہیں ہوتی اور نطفہ وہ عنصر ہے جس میں زندگی ہوتی ہے۔اس کائنات کے عظیم معجزات میں سے ایک یہ ہے کہ اس بے جان عنصر میں کس طرح جان ڈال دی گئی اور حیات کس طرح پہلے عنصر کے ساتھ گھل مل گئی۔ آج تک یہ راز معمہ ہے اور انسان ابھی تک اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکا۔یہ ایک قائم اور دیکھی جانے والی حقیقت ہے۔اس کے اعتراف کے سوا چارۂ کار بھی نہیں ہے۔یہ معجزہ خالق' زندہ کرنے والے اور عظیم قدرت والے اللہ کی طرف انسان کو دھکیل کر لے جاتا ہے اور انسان کسی شکل میں بھی اسے رد نہیں کر سکتا اور نہ اس میدان میں کوئی چوں چرا کر سکتا ہے۔

بے جان سے جان دار کی طرف کسی عنصر کو منتقل کرنا نہایت ہی بڑا انقلاب ہے اور یہ زمان و مکان کی دوریوں سے بھی زیادہ اہم ہے۔اس انقلاب پر ایک زندہ دل شخص جس قدر بھی غور کرے وہ ملول نہ ہو گا۔اس طرح اس کائنات کے اسرار بھی ختم نہ ہوں گے اور اس راہ میں علم کے آگے بڑھنے سے جو اسرار و رموز بھی کھلیں گے ہر اگلا راز پچھلے سے زیادہ عجیب ہو گا۔

اب اس نطفے سے ذرا آگے بڑھئے۔ایک خلیہ کامل ہوتا ہے 'جنین بنتا ہے اور پھر ایک مرحلے میں اس جنین کی جنس کا تعین ہوتا ہے۔ مرد اور عورت الگ الگ۔پھر وہ صورت بنتی ہے جس کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے۔

ثُمَّ جَعَلَكُمْ أَزْوَاجًا (۳۵ : ۱۱) "پھر تمہارے جوڑے بنا دیئے"۔چاہے اس سے مراد یہ ہو کہ جنین کی حالت میں مذکر اور مونث کا امتیاز کر دیا یا اس سے مراد یہ ہو کہ ولادت کے بعد اور بالغ ہونے کے بعد شادیاں کر کے جوڑے بنا دیا۔ یہ انقلاب بھی کیا فکر و نظر کے لیے کم ہے کہ نہایت چھوٹے نطفے سے یوں مذکر و مونث بنا دیا گیا تو یہ بھی ایک عظیم انقلاب ہے۔یا تو ایک چھوٹا سا نکتہ جو نطفے کی شکل میں ہے اور یا پھر ایک مکمل انسان جو ایک قوی ہیکل مخلوق ہے اور جس کے جسم کے اندر کثیر التعداد مشینیں ہیں جو مختلف کام کر رہی ہیں۔جس کی تفصیلات میڈیکل سائنسز میں موجود ہیں اور باہم بالکل جدا ہیں۔

اب ہمارے زیر مطالعہ یہ سادہ خلیہ ہے۔یہ اب تقسیم در تقسیم ہوتا ہے اور اس سے اور خلیے نکلتے ہیں۔اب اس ایک خلیے سے خلیات کے مجموعے بنتے چلے جاتے ہیں اور اعضاء بنتے چلے جاتے ہیں اور ہر عضو کا ایک فریضہ مقرر ہوتا چلا جاتا ہے۔ان تمام اعضا سے ترکیب پاکر ایک انسان وجود میں آتا ہے اور اس کے تمام اعضاء باہم مربوط اور ہم آہنگ ہوتے ہیں۔یہ انسان ایک بالکل ممتاز مخلوق ہوتا ہے۔یہ اپنے ہم جنس بنی نوع انسان سے بھی الگ خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔بلکہ اپنے قریبی رشتہ داروں سے بھی جدا ہوتا ہے۔ممکن ہی نہیں ہے کہ دو انسان بالکل ایک ہی جیسے ہوں' حالانکہ یہ ایک ہی نطفے سے پیدا ہوئے اور اس کے اندر کسی فرق کا ادراک انسان کو نہ تھا۔پھر یہ خلیے مرد و عورت کی شکل اختیار کر کے جوڑے بن جاتے ہیں اور ان جوڑوں کے ذریعے پھر اس تخلیق کا تسلسل قائم ہوتا ہے اور یہ تسلسل انہی مراحل میں چلتا ہے۔ وہی مراحل دوبارہ دہرائے جاتے ہیں۔یہ اس قدر عجیب سلسلہ ہے کہ جس کے عجائبات ختم نہیں ہوتے۔اس وجہ سے قرآن میں اس اعجوبے کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے۔یہ ایک راز نہیں ہے بلکہ جسم انسانی میں رازوں کا مجموعہ ہے۔لوگ اگر اس پر تدبر کریں تو ایک انسان کے جسم میں بے شمار عجائبات ہیں اور انسان کی روح ان پر تدبر کر کے جاگ سکتی

ہے ۔یہی وجہ ہے کہ قرآن اس زاویہ سے انسان کو بار بار جھنجھوڑتا ہے اور جگاتا ہے ۔

اس باریک مطالعہ کو پیش کرنے کے بعد اللہ کے علم کی وسعت کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے ۔ جیسا کہ سورہ سبا میں اس کی تفصیلات آئی ہیں کہ اللہ کا علم بہت ہی وسیع ہے ۔یہاں مذکر و مونث کی تخلیق اور حمل اور وضع حمل بھی اس کے علم میں رہتا ہے ۔

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِہٖ (۳۵ : ۱۱) ''کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی اور نہ کوئی بچہ جنتی ہے مگر یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہوتا ہے''۔ اب یہاں مذکر و مونث کا دائرہ عام کر دیا جاتا ہے ۔انسان ' حیوان ' طیور ' مچھلیاں اور تمام حشرات الارض اس کے دائرے میں آ جاتے ہیں ۔ چاہے ہم ان کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں کہ جن کا وضع حمل ہوتا ہے یا جو انڈے دیتے ہیں کیونکہ انڈا بھی ایک قسم کا حمل ہوتا ہے ۔ انڈے کے اندر جو جنین ہوتا ہے وہ ماں کے پیٹ میں نہیں بڑھتا بلکہ انڈے کے اندر بڑھتا ہے ۔ صرف انڈا ماں کے پیٹ سے باہر آ جاتا ہے اور یہ بھی اللہ کی صنعت کاری کا ایک کرشمہ ہے کہ ایک عمل جو پیٹ کے اندر ہوتا ہے ' یہاں یہ پوری ٹیکنالوجی انڈے کے اندر پیٹ کے باہر کر دی جاتی ہے اور پھر وہ بڑھتی ہے اور ان سب عملوں کو اللہ جانتا ہے اور اس پر اس کا علم محیط ہے ۔ اس پوری کائنات کے مختلف اطراف ہیں ۔

اللہ کے علم کی یہ جامعیت ایسی ہے کہ ذہن انسانی اس کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا ۔ نہ تصور کے اعتبار سے اور نہ انداز تعبیر کے اعتبار سے جیسا کہ ہم نے سورہ سبا میں یہ نکتہ بیان کیا ۔ یہ تو بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ ہی قرآن کا نازل کرنے والا ہے اور قرآن کا مصدر وسیع ذات باری ہے اور یہ ایک منفرد انداز استدلال ہے ۔پھر مختلف افراد و اشیاء کی عمر بھی اللہ کے علم میں ہے اور کتاب میں درج ہے ۔

وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِہٖٓ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ

(۳۵ : ۱۱) ''کوئی عمر پانے والا عمر نہیں پاتا اور نہ کسی کی عمر میں کچھ کمی ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوتا ہے ۔ اللہ کے لیے یہ سب کچھ بہت آسان کام ہے ۔ جب خیال اس طرف جاتا ہے کہ اس کائنات میں نباتات ' پرندے ' حیوانات اور انسان اور دوسری چیزیں ' جن کے سائز اور حجم مختلف ہیں اور مختلف انواع و اقسام کی ہیں ۔ مختلف علاقوں اور زمانوں میں ہیں ' پھر انسان جب یہ تصور کرتا ہے کہ یہ عظیم تعداد ' جس کا صحیح علم صرف خالق ہی کو ہے ' اس کے ہر فرد کو ایک عمر دی جاتی ہے ۔ یہ عمر طویل ہو یا قصیر ہو ' اس میں زیادتی ہو یا کمی ہو ' سب کی سب ایک کتاب میں درج ہے اور اللہ سب کے بارے میں جانتا ہے ۔

بلکہ ہر ایک فرد کے جزء کے بارے میں بھی اللہ جانتا ہے کہ اس کی عمر کیا ہو گی ۔ زیادہ ہو گی یا کم ہو گی مثلاً کسی درخت کے پتے کی عمر کیا ہو گی ۔کب نکلے گا اور کب گرے گا اور کب مٹی ہو گا ۔ ہر پرندے کے ہر پر کے بارے میں بھی اللہ کو معلوم ہے کہ وہ کب جسم سے الگ ہو گا ۔ ہر حیوان کا ہر سینگ کس قدر عمر پائے گا یا حیوانات کی باہم ٹکر میں کوئی سینگ ٹوٹ جائے گا ۔ پھر انسان کے اعضاء آنکھ اور کان وغیرہ یہ کب تک رہیں گے اور کب کام چھوڑ دیں گے ۔

یہ سب باتیں اللہ کی کتاب تقدیر میں درج ہیں ۔ اور اللہ کے علم میں شامل ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کو اس سلسلے میں کوئی جہد

کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۳۵: ۱۱) "اللہ کے لیے یہ بہت آسان ہے"۔

جب انسانی خیال ان باتوں پر غور وفکر کرتا ہے اور ان لائنوں پر آگے بڑھتا ہے تو یہ بہت ہی عجیب نظر آتا ہے۔ اس آیت کے ضمن میں ہم اس طرف متوجہ ہوتے ہیں جس طرف انسانی خیال بالعموم متوجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس طرح کی باتیں سوچنا انسان کی عادت ہی نہیں ہے۔ یہ صرف خداوند قدوس کی ہدایت ہے کہ تم ذرا اس انداز سے غور کرو۔

اور عمر کی زیادتی سال و ماہ کی تعداد کے ذریعے بھی ہوتی ہے اور عمر میں برکت کے ذریعے بھی ہوتی ہے۔ عمر میں برکت یوں ہوتی ہے کہ انسان کی عمر اچھے کاموں میں صرف ہو اور اس میں دوڑ دھوپ' مفید کام اور اعمال و آثار زیادہ ہوں۔ اور عمر کا نقص بھی اسی طرح ہے یا تو ماہ و سال کم ہو جائیں یا عمر کی افادیت کم ہو جائے اور اس سے برکت نکل آئے بجائے اس کے کہ انسان اچھے کام کرے اس کی زندگی خالی ہو۔

بعض اوقات زندگی کا ایک گھنٹہ بھی پوری عمر کے برابر ہوتا ہے۔ وہ افکار اور شعور اور احساسات سے بھرپور ہوتا ہے۔ اور اس کے اندر اونچے درجے کے اعمال عمل میں آجاتے ہیں اور اچھے نتائج نکلتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات انسان کا پورا سال خالی خولی گزر جاتا ہے اور اس کا کوئی حساب و کتاب نہیں ہوتا۔ اللہ کے نزدیک اس سال کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ یہ سب امور اللہ کے حساب و کتاب میں ہیں اور ہر موجود مخلوق کے بارے میں یہ سب امور صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

جماعتیں افراد کی طرح ہیں۔ اسی طرح اقوام بھی ایک فرد کی طرح ہیں۔ ان کی عمر کا بھی یہی قانون ہے۔ کسی کی عمر میں اضافہ ہوتا ہے اور کسی امت کا پتہ جلد ہی کاٹ لیا جاتا ہے اور یہ سب معانی اس آیت میں داخل ہیں۔ امم کی بھی تقدیر ہوتی ہے اور وہ طاؤس و رباب پر ختم ہوتی ہے۔ تمام اشیاء کی بھی عمر ہوتی ہے جس طرح زندہ چیزوں کی عمر ہوتی ہے۔ ایک چٹان کی بھی عمر ہوتی ہے۔ ایک پہاڑ کی بھی عمر ہوتی ہے۔ ایک نہر کی بھی عمر ہوتی ہے اور ایک پتھر کی بھی عمر ہوتی ہے۔ پھر وہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔ ایک غار کی بھی عمر ہوتی ہے اور پھر وہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ ایک نہر کی عمر ہوتی ہے اور جب عمر ختم ہو تو نہر خشک ہو کر ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔

بعض اشیاء ایسی ہوتی ہیں جن کو انسان بناتا ہے۔ ان کی بھی عمر ہوتی ہے۔ مشینیں' کپڑے اور تمام دوسری مصنوعات کی بھی عمر ہوتی ہے اور اپنی مقررہ عمر پوری کر کے وہ ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔۔۔ اور یہ سب کام اللہ کی تقدیر میں ہیں اور معلوم و مقدر ہیں۔

اس زاویہ سے اگر امور پر تدبر کیا جائے تو اس کائنات کا مطالعہ ایک نئے افق سے ہوتا ہے۔ یہ کائنات کے مطالعہ کا یہ ایک نیا اسلوب ہے اور انسانی فہم و ادراک کی قوتوں کو ایک نیا شعور ملتا ہے۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ اللہ کی قدرت اور علم وسیع اور شامل اور کامل ہے۔ لہٰذا انسان اس شعور کے ہوتے ہوئے کبھی غافل اور گمراہ نہیں ہو سکتا۔ وہ جہاں دیکھتا ہے' دست قدرت کی کاریگری نظر آتی ہے۔ اللہ کی نگرانی نظر آتی ہے اور ہر چیز میں اللہ کی مہربانی اور قدرت نظر آتی ہے۔

---ooo---

اب سیاق کلام کا رخ کائناتی مناظر کے ایک منظر کی طرف ہوتا ہے۔ سمندر کے پانیوں کے مناظر میں سے ایک منظر' پانیوں کی اقسام۔ یہ ہے میٹھا پانی اور وہ ہے سخت کھارا۔ دونوں قسم کے پانیوں کے پہاڑ سمندر کے اندر ساتھ ساتھ چلتے

ہیں ۔ دونوں انسانوں کی خدمت کرتے ہیں ' باہم ملتے نہیں ہیں ۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ ۖ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ۖ وَمِن كُلٍّ تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا ۖ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٢﴾

"اور پانی کے دونوں ذخیرے یکساں نہیں ہیں ۔ ایک میٹھا اور پیاس بجھانے والا ہے ' پینے میں خوشگوار اور دوسرا سخت کھاری کہ حلق چھیل دے ۔ مگر دونوں سے تم تر و تازہ گوشت حاصل کرتے ہو ' پہننے کے لیے زینت کا سامان نکالتے ہو ' اور اسی پانی میں تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں اس کا سینہ چیرتی چلی جارہی ہیں تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو"۔

پانی کی تخلیق میں انواع و اقسام واضح ہیں ۔ اور اس تقسیم کے پیچھے جو خدمت ہے وہ بھی واضح ہے ۔ میٹھے پانی کا استعمال تو واضح ہے ۔ رات اور دن ہم اسے استعمال کرتے ہیں ۔ ہر قسم کی زندگی تو پانی پر موقوف ہے اور پانی زندگی کا اہم عنصر ہے ۔ رہا کڑوا پانی مثلاً سمندر اور بڑے سمندر تو اس کے بارے میں بعض سائنس دانوں نے عجیب معلومات دی ہیں اور بتایا ہے کہ اس کی تخلیق میں کس قدر گہری انجینئرنگ کارفرما ہے ۔

"لاکھوں سالوں سے زمین مختلف قسم کے گیس چھوڑتی ہے اور ان میں سے اکثر گیسیں زہریلی ہوتی ہیں ۔ لیکن قدرت الٰہیہ کی منصوبہ بندی دیکھیے کہ زمین کے اوپر جو ہوا ہے ' اس کے اندر پائے جانے والی نسبت متاثر نہیں ہوتی ۔ جو انسان کے وجود کے لیے ضروری ہے ۔ اس عظیم توازن کی گاڑی پانی کی وہ عظیم مقدار ہے یعنی گہرا سمندر جس سے زندگی ' غذا ' بارش ' معتدل موسم اور نباتات اور پھر خود انسانی زندگی حاصل کرتے ہیں"۔

پانی کی تخلیق کے بارے میں آج تک جو راز معلوم ہوئے ہیں ' ان میں بالارادہ رکھی ہوئی حکمت بالکل واضح ہے ۔ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس تخلیق میں خالق نے بالارادہ توازن اور ہم آہنگی رکھی ہے ۔ اور ان ہم آہنگیوں اور توازنوں پر اس کائنات کی مختلف چیزوں کی زندگی قائم ہے اور حیات کا پورا نظام ایستادہ ہے ۔ اور یہ پیچیدہ نظام اللہ جل شانہ نے بالارادہ وضع کیا ہے ۔ یہ توازن اس قدر پیچیدہ ہے اور اس قدر باریک انجینئرنگ پر مبنی ہے کہ کوئی عقلمند انسان یہ نہیں سوچ سکتا کہ یہ اتفاقاً ایسا ہو گیا ہے ۔ یہاں دو قسم کے سمندری پانی کی طرف اشارے کا مقصد یہ ہے کہ یہ پانی ایک دوسرے کے ساتھ مکس نہیں ہوتے ۔ ان کے درمیان واضح فرق ہے ۔ اس قسم کا امتیازی افتراق انسانی جذبات ' انسانی شعور ' انسانی رجحانات اور انسانی قدروں میں بھی ہوتا ہے ۔ پھر دونوں قسم کے پانی انسانوں کے لیے مسخر کر دیئے گئے ہیں ۔

وَمِن كُلٍّ تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَ (۳۵ : ۱۲) "مگر دونوں سے تم تر و تازہ گوشت حاصل کرتے ہو ' پہننے کے لیے زینت کا سامان نکالتے ہو اور اسی پانی میں تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں اس کا سینہ چیرتی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور اس کے

شکر گزار بنو"۔ تروتازہ گوشت سے مراد مچھلیاں اور سمندر کے دوسرے جانور ہیں جو مختلف قسم کے ہیں اور زیب و زینت کے لیے سیپ اور مرجان اور دوسرے موتی جو سمندر سے نکالے جاتے ہیں۔ یہ موتی سمندر کی سیپوں میں پائے جاتے ہیں۔ سیپوں کے اندر جب پانی اور ریت کے ذرات داخل ہوتے ہیں تو اس کے اندر کیمیاوی عمل سے یہ موتی تیار ہوتے ہیں۔ مرجان ایک حیوانی پودا ہے جو سمندر میں میلوں تک پھیل جاتا ہے اور یہ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ بعض اوقات سمندری سفر کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ بعض اوقات اس کی شاخوں میں زندہ مخلوق بھی پھنس جاتی ہے۔ یہ مرجان بھی ایک خاص طریقے سے کاٹ کر اس سے زیورات بنائے جاتے تھے۔

کشتی سمندروں اور دریاؤں کو چیرتی چلی جاتی ہے اس لیے کہ اللہ نے پانی اور کشتی دونوں میں بعض خواص رکھ دیئے ہیں۔ جن چیزوں سے کشتی بنائی جاتی ہے' ان کی کثافت اور ساخت اور سمندر کے پانی کی اپنی کثافت ہے۔ یوں سمندر کی سطح پر کشتی تیرتی ہے۔ ہواؤں کے اندر بھی یہی خصوصیات رکھ دی گئی ہیں۔ پھر اللہ نے ان قوتوں کو انسان کے لیے مسخر کر دیا اور انسان ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (۳۵ : ۱۲) "تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو"۔ سفر اور تجارت کے ذریعہ سے تم اللہ کا فضل تلاش کرو۔ سمندر سے مفاد کی چیزیں نکالو اور پانی اور کشتیوں کو نقل و حمل کے مقاصد کے لیے استعمال کرو۔

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۳۵ : ۱۲) "تاکہ تم اللہ کا شکر ادا کرو"۔ اللہ نے تمہارے لیے شکر کے اسباب فراہم کر دیئے ہیں۔ یہ اسباب تمہارے ہاتھ میں ہیں اور یوں اللہ تمہاری جانب سے ادائے شکر میں بھی تمہارا مددگار ہے۔

---ooo---

اور اب رات اور دن کے منظر پر یہ کائناتی سفر ختم ہوتا ہے۔ شمس و قمر کی تسخیر جو اللہ کے وسیع کائناتی نظام کا ایک حصہ ہے۔

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ

"وہ دن کے اندر رات اور رات کے اندر دن کو پروتا ہوا لے آتا ہے۔ چاند اور سورج کو اس نے مسخر کر رکھا ہے۔ یہ سب کچھ ایک وقت مقرر تک چلے جا رہا ہے"۔

رات کو دن میں داخل کرنا اور دن کو رات میں۔ یہ نہایت ہی خوبصورت مناظر ہیں۔ جب رات دن میں داخل ہوتی ہے تو روشنی آہستہ آہستہ مدہم پڑتی ہے اور تاریکی دھیرے دھیرے چھاتی ہے۔ غروب کے بعد پھر تاریکی گہری ہوتی جاتی ہے اور رات کے اندر دن کے داخل ہونے کا منظر بھی بہت ہی دلچسپ ہے۔ سفیدۂ صبح آہستہ آہستہ نمودار ہوتا ہے' روشنی پھیلتی جاتی ہے اور اندھیرا آہستہ آہستہ غائب ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ روشنی نمودار ہوتی ہے اور خوب پھیل

جاتی ہے۔ یعنی رات دن کو پوری طرح کھا جاتی اور دن رات کو کھا جاتا ہے۔ دونوں اوقات میں دل کو خوشی اور سکون حاصل ہوتا ہے اور دونوں اوقات میں انسان کے غور و فکر کی قوت تیز ہوتی ہے۔ وہ خدا سے ڈرتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ وہ خدا بہت ہی عظیم ہے جو یہ عظیم تصورات لاتا ہے۔ یوں خطوط کھینچتا ہے۔ ایک رسی کو کھینچتا ہے اور دوسری کو ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے۔ اور گردش لیل و نہار کا یہ نظام نہایت ہی پیچیدہ اور حساس ہے۔اس کے اندر اس قدر استحکام ہے کہ کبھی اس میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی اضطراب پیدا نہیں ہوتا اور نہ کبھی اس میں خلل پڑتا ہے۔

شمس و قمر کی تسخیر اور اجل مقرر تک ان کا یونہی چلتے رہنا۔ اس وقت تک جس کے بارے میں صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ وہ منظر ہے جسے ہر انسان دیکھتا ہے اور سنتا ہے۔ چاہے اسے شمس و قمر کا صحیح علم ہو یا نہ ہو' چاہے اسے ستاروں اور سیاروں کے جسم' حرکت اور حجم کے بارے میں معلومات ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن یہ دونوں اجرام فلکی ہمارے سامنے طلوع اور غروب ہوتے ہیں۔ ہر آنکھ کے سامنے چڑھتے اور گرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی یہ حرکت ایک مسلسل حرکت ہے اور اس کے اندر ایک لمحے کے لیے بھی خلل' اضطراب اور وقفہ نہیں ہوتا۔ اس منظر کو اس حد تک دیکھنے کے لیے کسی گہرے علم و حساب کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ لہٰذا گردش لیل و نہار اور شمس و قمر کا طلوع و غروب وہ منظر ہے جو ہماری نظروں کے سامنے بچھا ہوا ہے۔ آج ہم ان کے بارے میں ذرا زیادہ جانتے ہیں بہ نسبت ان لوگوں کے جن کے سامنے یہ قرآن نازل ہو رہا تھا۔

لیکن علم کی مقدار اہم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم ان سے کس قدر متاثر ہوتے ہیں۔ ہمارے دل اس سے کس قدر اثر لیتے ہیں۔ ہمارے اندر غور و فکر کی کس قدر قوت پیدا ہوتی ہے اور ہم اس منظر سے اللہ کی قدرت کا کس قدر گہرا ادراک کرتے ہیں۔ اس سے ہمارے دل کس قدر زندہ ہوتے ہیں کیونکہ اصل زندگی تو دلوں کی زندگی ہوتی ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے۔ کہ زندگی تو عبارت ہے تیرے جینے سے

--- ooo---

نہایت ہی گہرائی تک متاثر کر دینے والے ان مناظر کی چھاؤں میں اور حیران کن حد تک متاثر کر دینے والے دلائل ربوبیت کے ان مناظر میں بتایا جاتا ہے کہ رب تعالیٰ وحدہ لاشریک ہے۔ یہ اسی کے کارنامے ہیں اور جو لوگ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں وہ نہایت ہی بڑے خسارے میں ہوں گے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ
دُوْنِهٖ مَا یَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ ﴿۱۳﴾ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ
۲ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ؕ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ؕ وَلَا یُنَبِّئُكَ
۷ ع مِثْلُ خَبِیْرٍ ﴿۱۴﴾ الثلثة

۱۴ ”وہی اللہ (جس کے یہ سارے کام ہیں) تمہارا رب ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے۔ اسے چھوڑ کر جن دوسروں کو تم

پکارتے ہو، وہ ایک پرکاہ کے مالک بھی نہیں ہیں۔ انہیں پکارو، تو وہ تمہاری دعائیں سن نہیں سکتے۔ اور سن لیں تو ان کا تمہیں کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ اور قیامت کے روز وہ تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے۔ حقیقت حال کی ایسی صحیح خبر تمہیں ایک خبردار کے سوا کوئی نہیں دے سکتا"۔

یہ ہے وہ رب جس نے ہواؤں کے ذریعہ بادل بھیجے، جس نے بادلوں کے ذریعہ بارشیں بھیجیں، جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، جس نے تمہیں جوڑے جوڑے بنایا، جو جانتا ہے کہ ہر مادہ کیا حمل لیتی ہے، وہ جو جانتا ہے کہ کس کی عمر کیا ہے اور ڈیوریشن کیا ہے، جس نے دو سمندر پیدا کیے۔ میٹھا اور کھارا، جس نے رات اور دن پیدا کیے، جس نے شمس و قمر کی گردش مقرر کی۔ یہ ہے تمہارا رب۔

سب کچھ اسی کا ہے۔

لَهُ الْمُلْكُ (۳۵:۱۳) اور وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ (۳۵:۱۳) "اور اس کے سوا جن دوسروں کو تم پکارتے ہو، وہ پرکاہ کے مالک بھی نہیں ہیں"۔ قطمیر گٹھلی کے غلاف اور مہین پردے کو کہتے ہیں۔ یہ مہین اور حقیر پردہ بھی ان کی ملکیت میں نہیں ہے جن کو تم خواہ مخواہ پکارتے ہو۔

ذرا مزید تشریح۔

اِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَآءَكُمْ (۳۵:۱۴) "انہیں پکارو تو وہ تمہاری دعائیں سن ہی نہیں سکتے"۔ یہ تو بت اور مورتیاں ہیں، درخت ہیں، ملائکہ اور جن ہیں۔ یہ سب کے سب بھی قطمیر کے مالک نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی تمہاری دعائیں نہیں سنتا۔ اگر سنتا بھی ہے تو وہ سمجھتا نہیں۔ اگر سمجھتا بھی ہے تو مدد نہیں دے سکتا۔

وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا (۳۵:۱۴) "اگر سنیں بھی تو جواب نہیں دے سکتے"۔ مثلاً جن و ملائکہ تو سنتے ہیں تو جن جواب ہی نہیں دے سکتے۔ اور ملائکہ بھی از خود کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ یہ تو ہے ان کی حالت دنیا میں اور قیامت میں تو وہ تم سے براءت کا اعلان کر دیں گے۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ (۳۵:۱۴) "اور قیامت کے روز تمہارے شرک سے انکار کر دیں گے"۔ ذرا ہوش کرو، یہ اطلاع تمہیں کون دے رہا ہے"۔

وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ (۳۵:۱۴) "ایسی صحیح خبریں تمہیں خبردار کرنے والے کے سوا کوئی نہیں دے سکتا"۔ یہاں یہ سبق ختم ہوتا ہے اور اس کائنات کی سیر ختم ہوتی ہے۔ اس سیر سے قلب مومن نے بہت کچھ سیکھا اور دیکھا۔ وہ کیفیات مغفرت میں ڈوبا اور تیرا۔ اگر کوئی ہدایت لینا چاہے تو قرآن کی ایک سورہ کا ایک ہی سبق اس کے لیے کافی ہے بشرطیکہ کوئی برہان و سلطان کا متلاشی ہو کسی نشانی اور معجزات کا طالب ہو۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۰۲ ایک نظر میں

ایک بار پھر پکارا جاتا ہے کہ لوگو! ذرا اپنی حقیقت پر غور کرو' اور اپنے تعلق باللہ کا جائزہ لو۔ ایک بار پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپ صبر کریں۔ یہ جو لوگ روگردانی کرتے ہیں' یہ خود اپنا نقصان کرتے ہیں۔ اس سورہ کے دوسرے سبق میں بھی حضورؐ کو ایسی ہی تسلی دی گئی تھی۔ البتہ یہاں ذرا اس بات کی وضاحت کر دی جاتی ہے کہ ہدایت اور ضلالت کی حقیقت اور ماہیت ایک نہیں ہے' دونوں کے درمیان اس طرح کا فرق و امتیاز ہے جس طرح اندھے اور بینا میں ہوتا ہے۔ جس طرح نور و تاریکی میں ہے' جس طرح سائے اور کڑکتی دھوپ میں ہے۔ جس طرح موت و حیات میں ہے۔ پھر ہدایت' بصیرت' نور' سائے اور زندگی اپنے اندر بذات خود ایک گہرا ربط اور مشابہت رکھتے ہیں اور اسی طرح اندھاپن' تاریکی' گرمی اور موت باہم مربوط اور مماثل ہیں۔ یہ سبق مکذبین کے انجام پر ختم ہوتا ہے۔

--- ٥٥٥ ---

# درس نمبر ۲۰۲ تشریح آیات

## ۱۵ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۲۶

يَاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾
اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ وَ مَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۱۷﴾

"لوگو' تم ہی اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تو غنی و حمید ہے ۔ وہ چاہے تو تمہیں ہٹا کر کوئی نئی خلقت تمہاری جگہ لے آئے 'ایسا کرنا اللہ کے لیے کچھ بھی دشوار نہیں"۔

لوگوں کو جب یہ دعوت دی جائے کہ وہ اندھیروں سے نکل کر روشنی میں آنے کی جدوجہد کریں اور ضلالت کے بدلے ہدایت اختیار کریں تو اس وقت ان کو یہ حقیقت یاد دلانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ فقراء ہیں اور اللہ کی طرف محتاج ہیں جب کہ اللہ ان کے مقابلے میں پوری طرح غنی ہے اور جب ان کو ایمان' اللہ کی عبادت اور اللہ کی حمد و ثنا کی دعوت دی جاتی ہے تو اللہ ان کی عبادت اور حمد سے پوری طرح بے نیاز ہے ۔ وہ تو بذات خود محمود ہے ۔ اپنی ذات میں ستودہ صفات ہے ۔ یہ اللہ کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے ۔ اگر اللہ چاہے تو ان کو ختم کر کے ان کی جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے اور ان کو اپنا خلیفہ بنا لے تو یہ اللہ کا کیا بگاڑ سکتے ہیں اور یہ کام اللہ کے لیے بہت آسان ہے ۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ لوگوں کو یہ حقیقت یاد دلائی جائے تاکہ ان کے ذہنوں سے یہ غرور نکل جائے کہ اللہ ان کی ہدایت کے لیے رسول بھیجتا ہے اور ان کی ہدایت کا سازو سامان کرتا ہے تو شاید اللہ کو ہماری ہدایت کی کوئی ضرورت ہے ۔ اللہ رسول بھیجتا ہے اور وہ پوری انسانی تاریخ میں لوگوں کی ہدایت کے لیے جدوجہد کرتے رہے ہیں ۔ لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف لاتے رہے ہیں ۔

اللہ اپنے بندوں کے ساتھ مہربانی کرتا ہے' ان پر رحمت کرتا اور ان پر فضل و کرم کرتا ہے یوں کہ ان کے پاس اپنے رسول بھیجتا ہے ۔ یہ رسول لوگوں کی نافرمانی اور لوگوں کی ایذا رسانی کی وجہ سے مصیبتیں برداشت کرتے ہیں اور ان روگردانیوں اور ایذا رسانیوں کے باوجود وہ دعوت حق پر ڈٹے رہتے ہیں تو یہ اہتمام کر کے اللہ اپنے بندوں پر محض رحم و کرم کرتے ہیں کیونکہ وہ رحیم و کریم ہے ۔ یہ اس کی ذاتی صفات ہیں' اس لیے نہ یہ لوگ اللہ کی حکومت میں پرکاہ کے برابر کوئی اضافہ کر سکتے ہیں یا اللہ کی حکومت میں ذرے کے برابر کسی چیز کا اضافہ کر سکتے ہیں ۔ نیز اللہ کے مقابلے میں

انسان کوئی بڑی طاقتور یا غالب مخلوق نہیں ہے کہ اللہ ان کو بدل نہیں سکتا۔ اس لیے اللہ ان کی غلطیوں کو برداشت کرتا ہے۔ کیا یہ انسان ایک ایسی مخلوق ہیں جن کو بدلا نہیں جا سکتا۔ ایسی صورت نہیں ہے۔

انسان جب اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کو دیکھتا ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے کہ ایک طرف یہ انسان کمزور 'حقیر اور ناتواں ہے اور اس کے مقابلے میں ذات باری ہے 'جو بہت طاقتور ہے اور اس کی جانب سے انسانوں پر یہ مہربانیاں ہیں۔

انسان تو اس کائنات کے مکینوں میں سے ایک نہایت ہی چھوٹی سی مخلوق ہے اور یہ انسان سورج کے گرد چکر لگانے والے ذرات و کرات میں سے ایک نہایت ہی چھوٹے سے کرے پر رہتا ہے۔ سورج بھی ان ستاروں میں سے ایک ستارہ ہے اور سورج جیسے ستاروں کی تعداد کا بھی ابھی تک انسان کو علم نہیں ہے۔ یہ دوسرے ستارے تو چھوٹے چھوٹے نظر آتے ہیں حالانکہ اپنی جگہ نہایت دوریوں میں وہ بہت ہی عظیم الجثہ ہیں اور یہ عظیم الجثہ ستارے اس فضا میں حقیر ذروں کی طرح تیرتے پھرتے ہیں۔ یہ اللہ کی مخلوقات کا نہایت ہی مختصر حصہ ہیں۔

اس کے باوجود انسان اللہ کی جانب سے اس قدر عظیم فضل و کرم اور اس کے بے شمار فیوض کا وصول کنندہ ہے۔ اس پر اس قدر مہربانیاں ہیں جو اس کے لیے اس زمین میں رکھ دیئے گئے ہیں۔ اس کے جسم کے اندر ودیعت کر دیئے گئے ہیں اور اس کے لیے مسخر کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیر مخلوق گمراہ ہو کر اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتی ہے اور اللہ کو اس کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے رسول بھیجنے پڑے۔ ایک کے بعد دوسرا رسول آیا۔ رسولوں پر کتابیں بھیجی گئیں۔ رسولوں کو خوارق عادت معجزات دیئے گئے۔ اور اللہ کا یہ فضل و کرم اس مقام تک پہنچ گیا کہ اللہ نے اپنی آخری کتاب بھیج دی۔ اس میں تمام انبیاء کے قصص بھی ثبت کر دیئے۔ اسلاف کی تاریخ اس میں ثبت کر دی۔ پھر انسان کو جو صلاحیتیں دی گئیں اور اس کے اندر جو کمزوریاں رکھ دی گئی تھیں وہ سب اس میں بیان کر دی گئیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک ایک انسان کی مشکلات کا حل بتا دیا اور اس کی مشکلات کو دور کر دیا۔

یہ عظیم کرم ایک طرف اور دوسری جانب یہ حقیقت کہ یہ انسان سکان زمین میں سے ایک حقیر اور کمزور مخلوق ہے۔ یہ زمین جس پر وہ رہتا ہے۔ یہ شمسی کہکشاں کا ایک حقیر تابع ستارہ ہے جو اس عظیم اور ہولناک عظیم الجثہ کائنات کے اندر یوں ہے جس طرح زمین کی فضا میں تیرتا ہوا ایٹم اور اللہ سبحانہ اس پوری کائنات و سماوات کا پیدا کنندہ ہے۔ اس نے اس پوری کائنات اور مافیہا کو صرف ایک کلمہ سے پیدا کیا۔ صرف ارادہ متوجہ ہوا اور کن فیکون سے سب کچھ وجود میں آ گیا اور وہ ایسا کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔

لوگوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھیں اور غور کریں کہ اللہ کا فضل و کرم کس قدر ہے اور وہ معلوم کر لیں کہ اگر وہ زندہ رہ رہے ہیں تو محض اللہ کے فضل و کرم کی وجہ سے زندہ رہ رہے ہیں اور اللہ کی عظیم رحمت کی وجہ سے زندہ رہ رہے ہیں اور یہ رحمت انسان کے انکار 'اعراض 'نافرمانیوں کے باوجود ہے۔

اس لحاظ سے یہ ایک نہایت ہی وجدانی ٹچ ہے جبکہ یہ ایک حقیقت بھی ہے۔ قرآن کریم ایسے ہی حقائق انسانی قلوب پر القاء کرتا ہے۔ کیونکہ جب حقیقت انسان کے دل پر روشن ہوتی ہے تو وہ انسان کے دل کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ قرآن حق ہے اور سچائی کے ساتھ یہ نازل ہو رہا ہے۔ لہٰذا قرآن کی تمام باتیں حق ہیں۔ وہ سچائی کے ساتھ لوگوں کو مطمئن کرتا ہے 'سچائی پیش کرتا ہے۔ اس کے اشارات تمام کے تمام حق ہیں۔

---ooo---

اب ایک دو سرا اصول۔یہ کہ دنیا و آخرت میں ذمہ داری انفرادی ہے ۔ذمہ داری انفرادی ہوگی 'کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ نہ کوئی کسی کو فائدہ دے سکے گا۔لہٰذا لوگ اگر ہدایت یافتہ ہو جائیں تو اس سے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف ان کے اعمال اور فرائض کے بارے میں پوچھا جائے گا جب کہ دوسرے تمام افراد سے ان کے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ ہر شخص اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو گا۔کوئی اس سے پوچھنے والا نہ ہو گا۔اگر کوئی پاکیزہ زندگی اختیار کرتا ہے تو اپنے لیے کرتا ہے وہ اپنے لیے کرتا ہے۔کسی اور کے لیے نہیں اور قیامت میں معاملات کا اختیار صرف اللہ کے ہاتھ میں ہو گا۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۭ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

"کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا' اور اگر کوئی لدا ہوا نفس اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے پکارے گا تو اس کے بار کا ایک ادنیٰ حصہ بھی بٹانے کے لیے کوئی نہ آئے گا چاہے وہ قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ (اے نبیؐ) تم صرف انہی لوگوں کو متنبہ کر سکتے ہو جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔جو شخص بھی پاکیزگی اختیار کرتا ہے اپنی ہی بھلائی کے لیے کرتا ہے اور پلٹنا سب کو اللہ ہی کی طرف ہے"۔

انفرادی ذمہ داری کے اصول کا انسانی اخلاقیات پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے اور اسی طرح انسانی طرز عمل پر بھی اس کا فیصلہ کن اثر ہوتا ہے۔ کسی انسان میں یہ شعور پیدا ہونا ضروری ہے کہ اسے سزا و جزاء صرف اس کے اعمال پر ہوگی اور اس سے مواخذہ صرف اس کے اعمال پر ہو گا۔کسی دوسرے کی بدعملی پر اسے سزا نہ ہوگی اور اپنے اعمال بد سے بھی وہ کسی طرح بچ کر نہ نکل سکے گا۔یہ ایک ایسا فیکٹر ہے جو انسان کو ہروقت بیدار رکھتا ہے اور اس کا یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ انسان جھوٹی امیدوں پر تکیہ نہیں کرتا کہ کوئی اسے فائدہ دے گا یا اس کی جگہ کوئی ذمہ داری برداشت کرلے گا۔یہ اصول انسانوں کے لیے باعث اطمینان بھی ہے ۔اس میں ایک فرد اس بات سے مطمئن ہو جاتا ہے کہ پوری جماعت کی بداعمالیوں کا مواخذہ اس سے نہ ہو گا۔یوں وہ خود اپنے اچھے اعمال سے مایوس نہ ہو گا بشرطیکہ اس نے جماعت اور سوسائٹی میں تبلیغ و نصیحت اور معروف کو جاری کرنے اور منکر کو روکنے کی سعی کی ہو اور اپنی طاقت اس کام کے لیے استعمال کی ہو۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کا محاسبہ بحیثیت جماعت نہیں کرے گا۔بلکہ ہر ایک فرد کا محاسبہ ہو گا۔اور یہ محاسبہ اس کے پورے اعمال کا ہو گا۔ان حدود کے اندر ہو گا جو اس پر فرض کیے گئے ہیں اور ہر فرد پر یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ دوسروں کو نصیحت

کرے اور اپنی طاقت کی حد تک ان کی اصلاح کا فریضہ سرانجام دے ۔ اگر اس نے اپنی یہ اجتماعی ذمہ داری ادا کر دی تو پھر سوسائٹی جو کچھ بھی کرتی ہے وہ اس کا ذمہ دار نہ ہو گا۔ وہ صرف اپنے اچھے اعمال کی جزاء پائے گا۔ نیز اگر جماعت اور سوسائٹی اچھی ہو اور یہ شخص اس کے اندر گمراہ اور بدکار ہو تو بھی سوسائٹی کی اچھائی اسے کچھ فائدہ نہ دے گی ۔ کیونکہ اللہ لوگوں کا محاسبہ فہرستوں کے مطابق نہ کرے گا۔

قرآن کریم نے اس اصول کو قرآن کے مخصوص انداز تعبیر کے مطابق بیان کیا ہے ۔ اس انداز کا نہایت ہی گہرا اثر ہوتا ہے ۔ یوں بتایا جاتا ہے کہ بے شمار لوگ ہیں اور انہوں نے اپنا اپنا بوجھ اٹھا رکھا ہے ۔ کوئی شخص جس کا بوجھ ہلکا ہو وہ دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا رہا۔ اگر کسی کا بار گناہ زیادہ ہے اور وہ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو بلاتا ہے تو کوئی شخص اس کی اس دعوت پر لبیک نہیں کہتا اور کوئی اس کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

یہ ایک ایسے قافلے کا منظر ہے جس میں ہر شخص اپنا اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے ۔ اپنے راستے پر جا رہا ہے یہاں تک کہ لوگ ترازو کے سامنے پہنچ جاتے ہیں اور وزن کرنے والا وزن کرنا شروع کر دیتا ہے ۔ اس منظر کو دیکھ کر نظر آتا ہے کہ ہر شخص بوجھ کے نیچے ہے ۔ کوئی تھکا ماندہ ہے اور کوئی ہلکا ہے ۔ ہر شخص اپنے اپنے نتیجے کا منتظر ہے اور اپنے آپ میں مشغول ہے ۔

اس منظر کو دیکھتے ہوئے جس میں لق قافلہ تھکے ماندے ہیں روئے سخن حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے ۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ (۳۵ : ۱۸) ”تم صرف انہی لوگوں کو متنبہ کر سکتے ہو جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں“ ۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے ڈرانا مفید ہوتا ہے ۔ وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں حالانکہ انہوں نے اپنے رب کو دیکھا نہیں ہے اور وہ نماز قائم کر کے اپنے رب کے ساتھ رابطہ قائم کرتے ہیں ۔ ایسے لوگ ذات پیغمبر سے استفادہ کر سکتے تھے ۔ تمہاری بات سن سکتے تھے ۔ لہٰذا آپ پر ان لوگوں کی ذمہ داری نہیں ہے جو اللہ سے نہیں ڈرتے اور جو نماز قائم نہیں کرتے ۔

وَمَنْ تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی لِنَفْسِہٖ (۳۵ : ۱۸) ”اور جو شخص پاکیزگی کی راہ اختیار کرتا ہے وہ اپنے ہی کے لیے کرتا ہے“۔ نہ آپ کسی کے ذمہ دار ہیں اور نہ کوئی اور کسی کا ٹھیکہ دار ہے ۔ جو شخص نیکی اختیار کرتا ہے اور پاکیزگی کرتا ہے وہ خود اس سے نفع اندوز ہوتا ہے ۔ (تزکّی) کے اندر نہایت ہی لطیف اور گہرا مفہوم ہے ۔ جس کے اندر ظاہری صفائی بھی شامل ہے ۔ جس کے اندر قلب و شعور کی صفائی بھی شامل ہے ۔ جس کے اندر طرز عمل اور رویہ کی صفائی بھی شامل ہے ۔ (تزکّی) کے اندر گہرا اشاراتی مفہوم پایا جاتا ہے ۔

وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ (۳۵ : ۱۸) ”اور پلٹنا اللہ ہی کی طرف ہے“ ۔ اللہ ہی محاسب ہے ۔ وہی جزاء و سزا دینے والا ہے ۔ اس کے ہاں نہ اچھا عمل ضائع ہوتا ہے ' نہ برا عمل شمار سے رہ سکتا ہے اور نہ جزاء و سزا کے احکام ایسے لوگوں کے حوالے کیے جاتے ہیں جو فیصلے میں رعایت کرتے ہیں ' یا بھولتے ہیں یا ویسے ہی چھوڑ دیتے ہیں ۔

---ooo---

اللہ کے نزدیک ایمان و کفر برابر نہیں ہیں۔ خیر و شر کی برابر قیمت نہیں۔ ہدایت و ضلالت اللہ کے ہاں برابر نہیں ہوتے۔ اندھا اور آنکھوں والا بھی اس کے ہاں ایک نہیں ہوتے۔ روشنی اور تاریکی کی قدر وہاں ایک نہیں ہے۔ چھاؤں اور گرمی کی افادیت بھی برابر نہیں ہے اور نہ اللہ کے ہاں زندہ اور مردہ برابر ہوتے ہیں۔ یہ سب چیزیں واضح طور پر قدر و قیمت کے اعتبار سے جدا ہیں۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ﴿١٩﴾ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ﴿٢٠﴾ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ﴿٢١﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ

"اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہیں۔ نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں۔ نہ ٹھنڈی چھاؤں اور دھوپ کی تپش ایک جیسی ہے اور نہ زندے اور مردے مساوی ہیں"۔

یہاں ایک طرف کفر' اندھے پن' تاریکی' گرمی اور موت سب کے سب ایک مزاج رکھتے ہیں اور ان کے مفہومات کے درمیان ربط ہے۔ دوسری جانب ایمان' نور' بصارت' چھاؤں اور زندگی کے مفہومات کا ایک ہی مزاج ہے اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔

ایمان نور ہے۔ دل میں نور' اعضاء میں نور' حواس میں نور' ایسا نور جس سے اشیاء کی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ اقدار اور واقعات روشن ہوتے ہیں اور ان کی حدود اور روابط واضح ہوتے ہیں۔ مومن اس نور سے تمام اشیاء کو دیکھتا ہے اور وہ روشنی کے اندر واقعات کو دیکھتا ہے۔ اس لیے اس کے معاملات اچھے ہوتے ہیں۔ اس کے اقدامات درست سمت میں ہوتے ہیں اور اس کے قدم ڈگمگاتے نہیں۔

ایمان ایک آنکھ ہے جو دیکھتی ہے۔ یہ آنکھ چیزوں کو ان کی حقیقت کے مطابق دیکھتی ہے۔ نہ اس میں تزلزل ہوتا ہے اور نہ اس میں انتشار ہوتا ہے اور صاحب ایمان اپنی راہ پر روشنی میں' اعتماد کے ساتھ اور اطمینان کے ساتھ چلتا ہے۔

پھر ایمان ایک سایہ ہے جس کے نیچے انسان راحت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا نفس اس میں آرام کرتا ہے اور روح خوش ہوتی ہے۔ شک' بے چینی' حیرت اور اندھیروں کے سفر کی گرمی سے انسان پناہ میں ہوتا ہے۔

پھر ایمان ایک زندگی ہے۔ دلوں اور شعور کی زندگی۔ ارادہ کی زندگی' رخ اور سمت کی زندگی۔ ایمان ایک حرکت اور جدوجہد کا نام ہے۔ یہ تعمیری جدوجہد ہے' مفید اور بامقصد زندگی ہے' جس کے اندر یہ مردگی اور مردنی نہیں ہے اور زندگی بجھی بجھی بھی نہیں ہوتی ہے۔ نہ اس میں کوئی چیز عبث ہے اور نہ بیہودگی ہے۔

کفر تاریکی ہے یا تاریکیاں ہیں۔ جب لوگ نور ایمان کے دائرہ سے نکل آئیں تو پھر وہ مختلف قسم کے اندھیروں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ایسے اندھیرے جن کے اندر کسی چیز کی صحیح حقیقت نظر نہیں آتی۔ کفر ایک قسم کی سخت دھوپ ہے۔ اس کے اندر دل حیرانی' پریشانی' قلق' بے چینی' تزلزل اور عدم اطمینان کی گرم آندھیوں کی لپیٹ میں آ جاتا ہے اور آخرت میں جہنم کی گرمی کا شکار ہوتا ہے۔ کفر ایک طرح کی موت ہے۔ ضمیر کی موت' منبع حیات سے کٹ جانا' صحیح راستے

سے کٹ جانا' حقیقی سرچشمے سے کٹ جانا اور حقیقی آب حیات سے محروم ہونا' جس سے انسانی سیرت متاثر ہوتی ہے۔ غرض ان صفات میں سے ہر ایک صفت کی ایک حقیقت ہے اور دونوں کے درمیان مکمل تضاد ہے اور اللہ کے ہاں دونوں برابر نہیں ہیں۔

--- ○○○---

اب روئے سخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے۔ آپ کو تسلی دی جاتی ہے اور آپ کو بتایا جاتا ہے کہ دعوت اسلامی کے حوالے سے آپ کے فرائض اور عمل کی حدود کیا ہیں۔ اپنے فرائض و حدود سے آگے جو معاملات ہیں وہ اللہ کے سپرد کر دیں کیونکہ اللہ ہی ان کا ذمہ دار ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي
الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ﴿۲۳﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۭ وَاِنْ
مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿۲۴﴾ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ ۚ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ ۳
اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۲۶﴾ ۱۲۰ ع
۱۵

"اللہ جسے چاہتا ہے 'سنواتا ہے' مگر (اے نبیؐ) تم ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں مدفون ہیں۔ تم تو بس ایک خبردار کرنے والے ہو۔ ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اور کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔ اب اگر یہ لوگ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں۔ ان کے پاس ان کے رسول کھلے دلائل اور صحیفے اور روشن ہدایات دینے والی کتاب لے کر آئے تھے۔ پھر جن لوگوں نے نہ مانا ان کو میں نے پکڑ لیا اور دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی"۔

اس کائنات کی حقیقت اور نفس انسانی کی ماہیت میں امتیازات حقیقی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ لوگوں کا مزاج مختلف ہوتا ہے اور دعوت اسلامی کے حوالے سے ان کا ردعمل بھی جدا ہوتا ہے اس طرح جس طرح بصارت اور اندھے پن کا' سائے اور دھوپ کا' اندھیروں اور روشنی کا اور حیات اور موت کا' اور ان تمام معاملات کی پشت پر اللہ کی حکمت اور قدرت کام کر رہی ہوتی ہے۔

لہٰذا رسول صرف نذیر ہوتا ہے۔ اس کی انسانی طاقت محدود ہوتی ہے۔ وہ قبروں کے اندر پڑے مردوں تک دعوت نہیں پہنچا سکتا۔ نہ ایسے چلتے پھرتے مردوں کو وہ دعوت دے سکتا ہے یا سنا سکتا ہے۔ وہ اصل میں حقیقی مردوں کی طرح ہوتے ہیں۔ اللہ ہی ہے جو ہر اس شخص کو سنا دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ جب چاہے' جس طرح چاہے۔ لہٰذا رسول اللہؐ کی ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ اگر کوئی گمراہ ہوتا ہے تو کیوں ہوتا ہے۔ اگر کوئی منہ پھیرتا ہے تو پھیرے بشرطیکہ رسولؐ نے دعوت

وے دی ہو اور رسالت کی ڈیوٹی ادا کر دی ہو۔ لہٰذا جو سنتا ہے 'سنے ' اور جو اعراض کرتا ہے 'اعراض کرے۔
اس سے قبل رسول اللہؐ سے کہا گیا تھا۔

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ (۳۵ : ۸) "پس آپؐ ان پر حسرت کر کے اپنے آپ کو گھلا نہ دیں"۔ اللہ نے رسول اللہؐ کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا تھا۔ آپؐ کا منصب ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ کے دوسرے بھائی رسولوں کا تھا۔ وہ تعداد میں تو بہت زیادہ تھے کیونکہ ہر امت اور ہر قوم کے لیے رسول بھیجا جاتا رہا ہے۔

وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (۳۵ : ۲۴) "اور کوئی امت نہیں گزری جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو"۔ اگر آپ کی قوم تکذیب کر رہی ہے تو بے شمار رسولوں کی اقوام نے اسی طرح تکذیب کی ہے اور اس تکذیب کی وجہ رسولوں کی تبلیغ کا قصور نہ تھا۔ اور نہ دلائل کی کمی تھی۔

وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالزُّبُرِ وَ بِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ (۳۵ : ۲۵) "اب اگر یہ لوگ جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں۔ ان کے پاس ان کے رسول کھلے دلائل اور صحیفے اور روشن ہدایات دینے والی کتاب لے کر آئے تھے"۔ بینات سے مراد مختلف قسم کے دلائل ہیں۔ معجزات بھی دلائل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ رسول اللہؐ سے معجزات طلب کرتے تھے اور تحدی دیتے تھے۔ الزبر سے مراد متفرق صحیفے 'رسائل اور پمفلٹ ہیں 'جن میں نصیحتیں 'ہدایات اور تکالیف و فرائض ہوتے تھے۔ کتاب منیر سے مراد مطابق قول راجح حضرت موسیٰ کی کتاب تورات ہے۔ لیکن ان کی امت نے کتب الہیہ کی تکذیب کی۔

ہمیشہ اکثر اقوام نے رسولوں اور ان کی ہدایات اور کتابوں کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ لہٰذا معاملہ جدید نہیں ہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونے والا سلوک کوئی منفرد سلوک نہیں ہے۔ یہ تو ایک معمول بہ طرز عمل ہے۔ لیکن ایسا رویہ اختیار کرنے والوں کا انجام بھی ایک ہی رہا ہے۔

ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۳۵ : ۲۶) "پھر جن لوگوں نے ظلم کیا میں نے ان کو پکڑا"۔ اور ذرا دیکھو یہ پکڑ کیسی تھی۔

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ (۳۵ : ۲۶) "دیکھو لو' میری سزا کیسی سخت تھی"۔ اللہ کی پکڑ بہت سخت تھی اور وہ یہ تھی کہ اللہ نے ان کو ہلاک کر کے رکھ دیا۔ لہٰذا جو لوگ اس راہ پر گامزن ہیں 'انہیں ذرا ڈرنا چاہئے کہ ان کا انجام ایسا ہی نہ ہو جائے۔

یہ ہے قرآنی منہج جس کے ساتھ یہ سبق مکمل ہوتا ہے۔ اب ہم ایک دوسری وادی کے لیے رخت سفر باندھتے ہیں۔

--- ooo---

# درس نمبر ۲۰۳ ایک نظر میں

یہ سبق اس کائنات کی کتاب اور اللہ کی کتاب کے ایک اقتباس پر مشتمل ہے۔ کتاب کائنات کا مطالعہ اور اس کے خوبصورت اور عجیب صحائف پر ایک نظر ہے جو مختلف اقسام اور مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔ جن کے پھل قسما قسم ہیں' جس کے پہاڑ رنگا رنگ ہیں۔ جس کے انسان' حیوان اور زمین پر چلنے والے جانور مختلف النوع اور مختلف الاشکال ہیں۔ اس خوبصورت کائنات کا یہ عجیب مطالعہ بہت ہی دلچسپ ہے اور پوری کائنات اس کا موضوع ہے۔ پھر اللہ کی کتاب منزل کا مطالعہ اور اس کے اندر جو تعلیمات ہیں اور جو سچائیاں ہیں اور جو اس سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کی تصدیق و تائید کرتی ہے پھر امت مسلمہ کا سابقہ امتوں کا وارث بنایا جانا اور وارثوں کے درجے اور اہل ایمان کے لیے جو عفو و مغفرت اور انعامات تیار کیے گئے ہیں۔ جنتوں کے مناظر اور جہنم کے مناظر اور کافروں کے حالات' اور آخر میں یہ قرارداد کہ یہ سب کچھ اللہ کے علم کے مطابق ہوتا ہے۔

---000---

# درس نمبر ۲۰۳ تشریح آیات

## ۲۷--- تا --- ۳۸

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا ۚ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ ﴿٢٧﴾ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ ۗ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ﴿٢٨﴾

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ذریعہ سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں بھی' سفید' سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔ بے شک اللہ زبردست اور درگزر فرمانے والا ہے"۔

یہ اس کائنات کی ایک جھلک ہے۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ کتاب اللہ کا سرچشمہ اور کتاب کائنات کا سرچشمہ ایک ہے۔ اس جھلکی میں پوری زمین کو دکھا دیا گیا ہے اور پوری زمین کے رنگ ڈھنگ ظاہر کیے گئے ہیں۔ پھلوں کے رنگ و اقسام' پہاڑوں کے رنگ اور ان کی انواع' لوگوں کے رنگ اور شکلیں' حیوانات اور مویشیوں کی اقسام و انواع' چند الفاظ کے اندر پوری زمین کے خدوخال ضبط کر دیئے گئے ہیں جس میں زندہ اور غیر زندہ سب چیزوں کو لپیٹ لیا گیا ہے۔ چند الفاظ کے اندر خداوند قدوس کی اس نمائش کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے جو بہت ہی دلکش ہے اور یہ دلکشیاں پوری زمین پر پھیلی ہوئی ہیں۔

آغاز میں ہم دیکھتے ہیں کہ بارشیں ہو رہی ہیں۔ اور ان بارشوں کے نتیجے میں اس زمین پر رنگا رنگ پھل پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں چونکہ مختلف رنگوں کی نمائش مقصود ہے اس لیے پھلوں کے ذکر کے بجائے ان کے رنگ دکھائے جاتے ہیں۔

فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا (۳۵:۲۷) "اور پھر اس کے ذریعے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں"۔ پھلوں کے رنگ بھی درحقیقت ایک عظیم نمائش گاہ ہے اور اس میں رنگوں کی جو اسکیم ہے' اس کا کوئی حصہ' دنیا کے تمام نقاش مل کر بھی تیار نہیں کر سکتے۔ ایک قسم کے پھلوں کا رنگ دوسری اقسام سے مختلف ہے۔ بلکہ ایک قسم کے پھلوں میں بھی مختلف رنگ ہیں اور ایک قسم کا رنگ دوسروں سے مختلف ہے۔ اور ہر دانے کا رنگ بھی

دوسروں سے مختلف ہے۔

اور پھلوں کے رنگ کے بعد پھر پہاڑوں کے رنگ' اور پھلوں کے رنگوں اور پہاڑوں کے رنگوں کے درمیان بظاہر کوئی ربط نظر نہیں آتا لیکن اگر حقیقی مطالعہ اور تحقیق کی جائے تو ایک قدرتی ربط موجود ہے۔ پہاڑوں کے رنگوں اور پھلوں کے رنگوں کے درمیان ایک قسم کا ربط موجود ہے۔ بلکہ پتھروں اور پہاڑوں کے رنگ بھی بعض اوقات پھلوں کے رنگوں جیسے ہوتے ہیں۔

وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيبُ سُوْدٌ

( ۳۵ : ۲۷ ) "پہاڑوں میں سفید' سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں"۔ جدد کے معنی راستے اور شاخیں ہیں یعنی دھاریاں۔ آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ "جدد بیض" کا رنگ بھی مختلف ہے اسی طرح "جدد حمر" کا رنگ بھی مختلف ہے۔ یعنی ہر قسم یعنی سفید و سرخ کا رنگ بھی مختلف ہے اور بعض دھاریاں شدید درجے کی سیاہ ہیں۔

یہاں اس بات کی طرف توجہ دی جاتی ہے کہ ایک رنگ کے پتھر مثلاً سرخ و سفید پھر آپس میں مختلف ہیں۔ پہاڑوں اور پتھروں کے یہ مختلف رنگ' پھلوں کے مختلف رنگوں کے بعد ذکر ہوئے۔ اس سے انسان کے دل میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور ذوق جمال تیز ہو جاتا ہے۔ یوں یہاں جمال اور خوبصورتی کو بھی تجریدی آرٹ کی شکل میں پیش کیا گیا جو بیک وقت پتھروں میں بھی ذوق نظر کے لیے دامن کش ہے اور پھلوں میں بھی ذوق نظر کو کھینچتا ہے جبکہ پھلوں میں اور پتھروں میں بظاہر کوئی نسبت نہیں ہے۔ لیکن تجریدی ذوق جمال ہر جگہ خوبصورتی کو دیکھ لیتا ہے اور قرآن کی یہ خصوصیت قابل التفات ہے۔

پھر لوگوں کے رنگ؟ یہ انسانوں کے عام رنگوں تک محدود نہیں' بلکہ ایک رنگ کے مختلف لوگوں کے رنگ اور ہر ایک کی بناوٹ کے درمیان فرق ہے بلکہ دو توام بھائی بھی رنگ میں مختلف ہوتے ہیں۔

انسانوں سے آگے پھر پرندوں' چرندوں اور درندوں کے رنگ' دابہ ہر حیوان کو کہا جاتا ہے جو زمین پر چلتا ہے۔ انعام اونٹ' گائے' بھیڑ اور بکریوں کے لیے آتا ہے۔ دواب کے لفظ کے بعد انعام کا خصوصی ذکر اس لیے کیا کہ انسان ان سے زیادہ مانوس ہے۔ ان کے رنگوں کی اسکیم بھی پھلوں اور پتھروں کی طرح حیران کن ہے۔

اس کائنات کے رنگوں کا یہ البم عجیب و غریب ہے۔ قرآن کریم اس کی ورق گردانی کرتا ہے اور انسان کو متوجہ کرتا ہے کہ چشم بینا کے ساتھ رنگوں کی اس کائناتی اسکیم پر غور کرے۔ صرف اہل علم اور اہل ذوق ہی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ صرف اہل علم ہی حکمت اور قدرت خداوندی کو پا کر اللہ کی عظمت کا خیال کر کے اس سے ڈر سکتے ہیں۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ( ۳۵ : ۲۸ ) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں"۔ کتاب کائنات کے جو اوراق قرآن مجید نے الٹے ہیں وہ اس کے بہت کم اوراق ہیں اور علماء دراصل اس کائنات پر غور کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے علماء ہی دراصل اللہ کی حقیقی معرفت رکھتے ہیں۔ وہ اللہ کی صنعتوں کے آثار سے زیادہ واقف ہوتے ہیں اور اللہ کی معرفت کا ادراک' اس کی قدرت کے آثار

سے ملاحظہ کرتے ہیں۔ اللہ کی تخلیق کے عجائبات کو دیکھ کر اس کی عظمت کا شعور رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اللہ سے صحیح معنوں میں ڈرتے ہیں۔ وہ اس کی حقیقی بندگی اس کے خوف کی وجہ سے کرتے ہیں۔ اللہ کے بارے میں ان علمائے کائنات کا شعور مہمل اور پیچیدہ شعور نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے بارے میں ان کو گہری معرفت حاصل ہوتی ہے۔

قرآن کے یہ صفحات اللہ کی کتاب کا نمونہ ہیں جبکہ رنگ اور دوسرے کائناتی عجائبات اس کائنات کا نمونہ ہیں اور ان کی حقیقت دراصل علمائے کائنات ہی مانتے ہیں۔ وہ لوگ جو حقیقی علم کتاب رکھتے ہیں اور جو حقیقی تکوینی علم بھی رکھتے ہیں۔ جو اللہ کی معرفت براہ راست رکھتے ہیں۔ ایسا علم جو ان کے دل کا شعور ہو اور جس کے ذریعہ ان کا دل متحرک ہو۔ جس کے ذریعہ وہ اس کائنات کے خوبصورت رنگوں کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں' اور ان سے خوشی حاصل کر سکتے ہیں اور اللہ کی قدرت کاملہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

اس کائنات کی تشکیل و تخلیق میں حسن و جمال کا عنصر اصل مقصود ہے اور اس حسن کا کمال یہ ہے کہ ہر چیز اپنے فرائض منصبی اپنے طبیعی جمال اور حسن کے واسطے سے ادا کرتی ہے۔ یہ پھول اپنے حسن و جمال اور اپنی نہایت ہی اچھی خوشبو کی وجہ سے شہد کی مکھیوں اور پروانوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ مکھیوں اور پروانوں کی ڈیوٹی پھولوں کے حوالے سے یہ ہے کہ یہ مادہ اور نر پھولوں کے درمیان ملاپ کرائیں تاکہ پودوں کے ساتھ پھل لگیں۔ یوں یہ پھول اپنی خوبصورتی اور حسن و جمال کے ذریعے یہ کام کرواتے ہیں۔ مادہ اور نر کے درمیان حسن و جمال ایک دوسرے کے لیے باعث کشش ہوتا ہے اور اس طرح دو صنفیں اپنا اپنا فریضہ منصبی اور طبیعی ادا کرتے ہیں۔ یوں تمام اشیاء فریضہ طبیعی حسن و جمال کے ذریعے سرانجام دیتی ہیں۔ پس جمال اس کائنات کی اسکیم میں مقصود بالذات ہے اور یہی وجہ ہے کہ کتاب کائنات کے حسن و جمال کے اظہار کے لیے کتاب الٰہی جابجا انسانی نظر کے لیے دامن کش ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ (۳۵:۲۸) "بے شک اللہ زبردست اور درگزر فرمانے والا ہے"۔ وہ زبردست ہے جس نے یہ اشیاء پیدا کیں اور وہ جزاء و سزا بھی دے سکتا ہے۔ وہ غفور ہے اور جو لوگ اس کی اطاعت اور خوف و خشیت میں تقصیر کرتے ہیں وہ ان کو معاف کرتا ہے۔ نیز جو لوگ اللہ کی صنعت کے عجائبات میں غور نہیں کرتے وہ ان کو بھی معاف کرتا ہے۔

اب صفحات کائنات سے روئے سخن صفحات کتاب الٰہی کی طرف پھر جاتا ہے کہ جو لوگ اس کی تلاوت کرتے ہیں ان کے پیش نظر کیا ہے اور ان کے لیے کیا کیا انعامات تیار ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً یَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿۲۹﴾ لِیُوَفِّیَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَ یَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۰﴾

"جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں' اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق دیا ہے اس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں' یقیناً وہ ایک ایسی تجارت کے متوقع ہیں جس میں ہرگز خسارہ نہ ہو گا۔ (اس تجارت میں انہوں نے اپنا سب کچھ اس لیے کھپایا ہے) تاکہ اللہ ان کے اجر پورے کے پورے ان کو دے اور مزید اپنے فضل سے ان کو عطا فرمائے۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور قدر دان ہے"۔

تلاوت کتاب سے مراد صرف جہراً یا خاموشی کے ساتھ کلمات کتاب دہرانے کے بجائے کوئی اور چیز ہے اور وہ ہے قرآن کو تدبر کے ساتھ پڑھنا۔ جس کے بعد پڑھنے والا کسی حقیقت کا ادراک کرے اور اس سے متاثر ہو۔ اس کے بعد وہ اس پر عمل کرے اور اپنی زندگی کو اس پر ڈھالے۔ یہی وجہ ہے کہ تلاوت قرآن کے بعد اقامت صلوٰۃ اور انفاق کا ذکر ہوا' خواہ پوشیدہ ہو یا علانیہ ہو۔ اور اس کے بعد پھر ایسے لوگوں کو یہ امید ہو کہ اس سودے میں انہیں کوئی گھاٹا نہ ہو گا۔ ایسے لوگوں کو یہ معرفت حاصل ہو کہ اللہ کے ہاں جو اجر ہے وہ ان امور سے بہتر ہے جو ان کے ہاں ہیں۔ ان کو یہ یقین بھی ہو کہ وہ ایک ایسی تجارت کر رہے ہیں جس کا فائدہ محفوظ ہے اور ضمانت شدہ ہے۔ وہ اللہ وحدہ سے معاملہ کیے ہوئے ہیں اور اللہ کے ساتھ کیا ہوا بیوپار بہت ہی نفع بخش ہوتا ہے۔ یہ تجارت اخروی تجارت ہے جس میں منافع کی شرح بہت زیادہ ہے۔ یہ ایک ایسی تجارت ہے جس میں لین دین بالکل پورا پورا ہوتا ہے اور اس پر فضل اللہ بھی ہوتا ہے۔ وہ (غفور و شکور ہے) تقصیرات کو معاف کرتا ہے اور بہت ہی شکر کرنے والا ہے۔ اور اللہ کی طرف سے شکر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ بہترین جزاء دیتا ہے لیکن لفظ شکر انسان کے لیے حوصلہ افزائی کے لیے استعمال ہوا ہے اور یہ بات انسان کو شرم دلانے کے لیے اور حیا کرنے کے لیے کہی گئی ہے کہ جب اللہ منعم حقیقی اپنے بندوں کا شکر کرتا ہے تو پھر بندوں کا تو فرض ہے کہ وہ ہر وقت اللہ کے شکر میں رطب اللسان رہیں۔

---ooo---

اس کے بعد اس کتاب کے مزاج کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے اندر حق ہی حق ہے اور اس کے وارث جنتوں کے وارث ہوں گے۔ آگے اس حق کے وارثوں کی بات آ رہی ہے۔

وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ ھُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِعِبَادِہٖ لَخَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۳۱﴾

"(اے نبیؐ) جو کتاب ہم نے تمہاری طرف وحی کے ذریعہ سے بھیجی ہے وہی حق ہے' تصدیق کرتی ہوئی آئی ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے آئی تھیں۔ بیشک اللہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے"۔

سچائی کے دلائل اس کتاب کے مضامین میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہیں۔ یہ کتاب اس کائنات کے حقائق کی ترجمان ہے۔ بلکہ یہ کتاب اس کائنات کا وہ صفحہ ہے جو پڑھا جاتا ہے اور پوری کائنات وہ صفحہ ہے جو خاموش ہے اور اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب تصدیق کرتی ہے ان کتابوں کی جو اللہ نے پہلے بھی بھیجی ہیں کیونکہ دونوں کا مصدر اور سرچشمہ ایک ہے۔ اور سچائی ہمیشہ ایک ہوتی ہے۔ اس میں تعدد نہیں ہوتا۔ اس کتاب کے نازل کرنے والے نے اسے لوگوں کے

لیے بھیجا ہے اور وہ لوگوں کا خالق ہے اور وہ اچھی طرح لوگوں کو جانتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس چیز میں ان کی مصلحت ہے اور کس چیز کے ذریعہ ان کی اصلاح ممکن ہے ۔

اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ (۳۵ : ۳۱) "بے شک اللہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر اور ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے"۔

یہ تو ہے حقیقت اس کتاب کی ۔ یہ کتاب اللہ نے امت مسلمہ کو دی ہے اور اللہ نے اس کام کے سلسلہ میں اس کا انتخاب کیا ہے جیسا کہ اللہ فرماتے ہیں :

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ

"پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنا دیا ان لوگوں کو جنہیں ہم نے (اس وراثت کے لیے) اپنے بندوں میں سے چن لیا"۔ ان الفاظ پر امت مسلمہ کو غور کرنا چاہئے ۔ اللہ نے اسے بہت ہی بڑا اعزاز دیا ہے اور اللہ نے اس کے کاندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی ہے ۔ اس انتخاب کے ذریعہ سے اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کتاب کے کچھ تقاضے ہیں ۔ کیا یہ برگزیدہ امت سن رہی ہے کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ اور اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہی ہے ۔ اللہ نے تو اس امت کو اس انتخاب کی وجہ سے بہت بڑی عزت دی ہے اور اس کے بعد اللہ نے اس پر جزاء اور انعام مقرر کر کے اسے مزید فضیلت عطا کر دی ہے ۔

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ

"اب کوئی تو ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے ' اور کوئی بیچ کی راس ہے ' اور کوئی اللہ کے اذن سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے"۔ پہلا فریق تعداد میں زیادہ ہو گا اس لیے اس کا ذکر پہلے کیا گیا ۔ یہ لوگ اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہوں گی اور ان لوگوں کے اعمال میں سے سئیات زیادہ ہوں گے اور نیکیاں کم ہوں گی ۔ اور دوسرا فریق مقتصد ہو گا ۔ یعنی میانہ روی والا ۔ اس کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی ۔ اور تیسرا فریق سابق بالخیرات ہو گا یعنی نیکیوں میں سبقت لے جانے والا ۔ اس کی نیکیاں برائیوں سے بہت زیادہ ہوں گی لیکن ان تینوں کے ساتھ اللہ کا فضل شامل رہے گا ۔ یہ سب لوگ آنے والی آیتوں میں مذکور نعمتوں میں داخل ہوں گے ۔ اگرچہ درجات میں مختلف ہوں گے ۔

قرآن کریم نے امت کی کرامت کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے ہم اس میں کوئی اضافہ کرنا نہیں چاہتے کیونکہ اللہ نے اس امت کو برگزیدہ کر لیا ہے اور اس کے لیے جزائے خیر کا اعلان کر دیا ہے ۔ آیات یہی بتاتی ہیں کہ آخر کار امت کا انجام یہی ہو گا ۔ امت سب کی سب اس اچھے انجام تک پہنچ جائے گی اور اس کی تفصیلات ہم اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں ۔ اس جزاء کو ہم یہاں لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں جو اللہ نے اس امت کے ان تینوں قسم کے لوگوں کے لیے مقدر کر رکھی ہے اور وہ

اچھی ہی جزاء ہوگی۔

ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿٣٢﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿٣٣﴾ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۨ﴿٣٤﴾ الَّذِيْۤ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ﴿٣٥﴾

"یہی بہت بڑا فضل ہے ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن میں یہ لوگ داخل ہوں گے ' وہاں انہیں سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا ' وہاں ان کا لباس ریشم ہو گا ' اور وہ کہیں گے کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم سے غم دور کر دیا ' یقیناً ہمارا رب معاف کرنے والا اور قدر فرمانے والا ہے ' جس نے ہمیں اپنے فضل سے ابدی قیام کی جگہ ٹھیرا دیا ' اب یہاں نہ ہمیں کوئی مشقت پیش آتی ہے اور نہ تکان لاحق ہوتی ہے"۔

اس منظر میں نہایت ٹھوس اور مادی نعمتوں کا ذکر ہے اور ایسی نفسیاتی سہولتوں کا ذکر ہے جنہیں محسوس کیا جاتا ہے۔ وہاں ان کی ظاہری حالت یہ ہوگی۔

يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا وَ لِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ (۳۵ : ۳۳) "وہاں انہیں سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا ' وہاں ان کا لباس ریشم ہو گا"۔ یہ سازو سامان مادی اور ٹھوس ہے اور نظر آنے والا ہے۔ انسان کا نفس ان چیزوں کو پسند کرتا ہے اور اس کے علاوہ اللہ کی رضامندی ' دلی اطمینان اور امن و سکون ہو گا۔

وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (۳۵ : ۳۴) "شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم سے غم دور کیا"۔ اور یہ دنیا جہاں ہر شخص قلق و بے چینی ' اور مصائب و مشکلات سے دوچار ہوتا ہے آخرت کے مقابلے میں حزن ہے جہاں نعیم مقیم ہو گا۔ حشر کے دن کی پریشانی دنیا کی پریشانیوں سے بھی بڑی ہوگی جس سے ان کو نجات مل چکی ہوگی۔

اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (۳۵ : ۳۴) "بے شک ہمارا رب معاف کر دینے والا اور قدر فرمانے والا ہے"۔ اس نے ہمیں بخش دیا ' ہمارے معتبر اعمال کی قدر کی اور اس پر بہت بڑا معاوضہ دیا۔

الَّذِيْۤ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ (۳۵ : ۳۵) "جس نے ہمیں اپنے فضل سے ابدی قیام کی جگہ ٹھہرایا"۔ ہمیشہ کے لیے رہائش پذیر کر دیا اور مستقلاً ہم آباد ہو گئے۔ یہ کام اس نے اپنے فضل و کرم سے کیا کیونکہ ہم اپنے اعمال

کے بل بوتے پر تو مستحق نہ تھے ۔ یہ تو فضل تھا ہمیں کوئی مشقت پیش آتی ہے اور نہ تکان لاحق ہوتی ہے ۔ بلکہ یہاں راحت 'اطمینان اور ہر قسم کی نعمتیں جمع ہیں ۔

پوری فضا آرام 'راحت اور نعمتوں سے مالا مال ہے ۔ اور اس نرم و نازک اور پرلطف ماحول کے لیے اللہ نے الفاظ بھی نہایت ہی نرم و نازک چنے ہیں ۔ یہاں تک کہ لفظ حزن کو بھی یہاں حزن کہہ کر نرم و نازک کر دیا گیا ہے اور جنت کے لیے دار المقامہ کا لفظ استعمال ہوا ہے ۔ تکان اور مشقت کے بارے میں یہ کہا گیا کہ وہ چھو کر بھی نہ جا سکے گی ۔ اور الفاظ اور فقروں کا ترنم اپنی جگہ نہایت ہی فرحت بخش ہے ۔ نہایت ہی دھیمی موسیقی کی طرح ۔ اب ذرا دوسری جانب آیئے اقلق 'اضطراب اور پریشانی اور افراتفری ۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۭ

"اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے لیے جہنم کی آگ ہے ۔ نہ ان کا قصہ پاک کر دیا جائے گا کہ مر جائیں اور نہ ان کے لیے جہنم کے عذاب میں کوئی کمی کی جائے گی" ۔ نہ یہ ہے اور نہ وہ ۔ ان کے لیے موت بھی نہ ہو گی ۔

كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ۝

"اس طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ہر اس شخص کو جو کفر کرنے والا ہو" ۔ اور اب ہمارے کان ایک کرخت اور سخت آواز سنتے ہیں ۔ یہ ایک غوغا ہے جو مختلف آوازوں سے مل کر اٹھ رہا ہے ۔ یہ مختلف اطراف سے آنے والی چیخ و پکار ہے ۔ ان کی طرف سے جو جہنم میں پھینک دیئے گئے ہیں ۔

وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ
كُنَّا نَعْمَلُ ۭ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاۗءَكُمُ
۴ النَّذِيْرُ ۭ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۝
ا ا ع
۱۶

"وہ وہاں چیخ چیخ کر کہیں گے کہ اے ہمارے رب' ہمیں یہاں سے نکال لے تاکہ ہم نیک عمل کریں ان اعمال سے مختلف جو پہلے کرتے رہے تھے ۔ (انہیں جواب دیا جائے گا) "کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا؟ اور تمہارے پاس متنبہ کرنے والا بھی آ چکا تھا ۔ اب مزا چکھو ۔ ظالموں کا یہاں کوئی مددگار نہیں ہے" ۔

وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا (۳۵ : ۳۷) "وہ وہاں چیخ چیخ کر کہیں گے"۔ لفظ (یصطرخون) کے تلفظ کے اندر ہی اس کے تمام مفہوم ثبت ہیں۔ اس کرخت آواز ہی سے اس کا مفہوم ظاہر ہو جاتا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں :

رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِىْ كُنَّا نَعْمَلُ (۳۵ : ۳۷) "اے ہمارے رب، ہمیں یہاں سے نکال لے تاکہ ہم نیک عمل کریں ان اعمال سے مختلف جو پہلے کرتے رہے تھے"۔ اب یہ اللہ کی طرف جھک رہے ہیں۔ اعتراف گناہ کر رہے ہیں اور نادم ہیں لیکن جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ دیکھئے کس قدر سخت اور دو ٹوک جواب سنتے ہیں ہم جس کے اندر سرزنش بھی ہے۔

اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ (۳۵ : ۳۷) "(انہیں جواب دیا جائے گا) "کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا؟ اور تمہارے پاس متنبہ کرنے والا بھی آچکا تھا۔ اب مزا چکھو۔ ظالموں کا یہاں کوئی مددگار نہیں ہے"۔

تمہیں ہم نے 'عمر دی' تم نے اس سے استفادہ نہ کیا' حالانکہ یہ عمر ان لوگوں کے لیے کافی تھی جو نصیحت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پھر تمہاری مزید سہولت کے لیے انبیاء بھی بھیجے گئے۔ انہوں نے تمہیں ڈرایا مگر تم نہ ڈرے۔ ان آیات میں دو باہم متقابل صورتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک جانب امن و راحت ہے اور دوسری جانب قلق و اضطراب ہے۔ ایک طرف شکر نعمت کا میٹھا نغمہ ہے اور دوسری طرف چیخ و پکار ہے۔ ایک طرف اعزاز و اکرام و استقبال ہے اور دوسری جانب نظرانداز کرنا اور سرزنش کرنا ہے۔ ایک طرف نرم و نازک اور فرحت بخش الفاظ اور دوسری جانب کرخت اور سخت جھڑکی ہے۔ یوں کلام کے دونوں اطراف میں مکمل تقابل ہے' ہر ہر جزء میں۔

اور سب سے آخر میں تمام مناظر پر ایک آخری تبصرہ آتا ہے' خصوصاً اہل دین اور امت مصطفوی کو چن لینے اور اسے اعزاز و اکرام دینے پر۔

اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۳۸

"بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر پوشیدہ چیز سے واقف ہے۔ وہ تو سینوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے"۔

اللہ کا کامل و شامل اور وسیع و عریض علم تو ان موضوعات کے بعد بیان کیا گیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے کتاب نازل کی اور اس کتاب کے جو لوگ وارث بنائے گئے ہیں' وہ جہاں والوں سے برگزیدہ کیے گئے ہیں۔ ان میں سے اگر بعض لوگوں سے کوئی ظلم و تقصیر صادر ہو جائے تو اللہ ان کو معاف کر دے گا۔ یہ اللہ کی جانب سے ان پر فضل و کرم ہو گا اور پھر اہل کفر کا جو انجام بتایا گیا۔ ان سب حقائق پر یہ آخری تبصرہ کہ وہ عالم الغیب ہے اور آسمانوں اور زمینوں میں پائی جانے والی ہر چیز کو جانتا ہے۔ وہ دلوں کی باتوں کو بھی جانتا ہے لہٰذا وہ تمام فیصلے اپنے اس عظیم اور کامل و شامل علم کے ذریعے کرے گا۔ اللہ کے فیصلوں میں کوئی ناانصافی نہ ہو گی۔

# درس نمبر ۲۰۴ ایک نظر میں

یہ اس سورہ کا آخری سبق ہے اور یہ وسیع مطالعاتی اسفار پر مشتمل ہے ۔ اس میں جابجا دل و دماغ کو تیز احساس دلایا گیا ہے اور اشارات و ہدایات دی گئی ہیں ۔ انسانوں کی تاریخ کی طویل وادی میں دور تک یہ سفر ہے 'جس میں بے شمار نشیب و فراز آتے ہیں ۔ بعض اقوام و ملل کیا اور بعض کچھ ہیں ۔ پھر زمین و آسمان کا ایک سفر بھی اس میں ہے جس میں سعی بسیار کے باوجود اللہ کا کوئی شریک اور ہمسر نہ ملا ۔ پوری کائنات کو چھان مارا ۔ پھر ایک سفر اس مطالعہ کے لیے ہے کہ زمین و آسمان کو اللہ نے کس طرح تھام رکھا ہے ۔ وہ بہین توازن کیا ہے جس کی وجہ سے کائنات کے یہ دیو ہیکل کرے باہم نہیں ٹکراتے ۔ پھر ایک سفر اس قوم کی وادیوں میں ہے جس نے ہدایت کو ٹھکرا دیا ہے حالانکہ اس سے قبل یہ قوم دعائیں کرتی تھی کہ اگر اس کے اندر کوئی رسول آگیا تو وہ دو امتوں میں سے کسی ایک کے مقابلے میں کم از کم زیادہ ہدایت پر ہوں گے ۔ لیکن جب ان کے ہاں رسول بشیر و نذیر بھیجا گیا تو وہ اپنے وعدے کو بھلا بیٹھے اور بے حد نفرت کرنے لگے اپنے مطلوب رسول سے ۔ اور پھر انسانی تاریخ کی طویل وادیوں میں ہلاک کردہ اقوام کی سیر جن پر عذاب آئے اور ہلاک ہوئیں لیکن آج کے لوگ ان مصائب سے کوئی عبرت نہیں لیتے اور پھر اس سبق کا خوفناک خاتمہ ۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ (۳۵ : ۴۵)

”اگر کہیں اللہ لوگوں کو ان کے کرتوتوں پر پکڑتا تو زمین پر کسی متنفس کو جیتا نہ چھوڑتا“ ۔ لیکن یہ اللہ کا عظیم فضل ہے کہ وہ لوگوں کو مہلت دیئے جا رہا ہے اور ان پر تباہ کن عذاب نازل نہیں فرماتا حالانکہ وہ اس کے مستحق ہیں ۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۰۴ تشریح آیات

## ۳۹ --- تا --- ۴۵

---

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۭ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ﴿۳۹﴾

"وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ اب جو کوئی کفر کرتا ہے اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے' اور کافروں کو ان کا کفر اس کے سوا کوئی ترقی نہیں دیتا کہ ان کے رب کا غضب ان پر زیادہ سے زیادہ بھڑکتا چلا جاتا ہے۔ کافروں کے لیے خسارے میں اضافے کے سوا کوئی ترقی نہیں"۔

زمین کے اوپر نسلوں کا آنا اور جانا اور اس کا تسلسل اور ایک نسل کا مٹنا اور دوسری کا اس کی جانشینی کے مقام کو پانا' ایک مملکت کا ختم ہونا اور دوسری کا قیام عمل میں آنا' ایک شعلہ جو اللہ کا بجھنا اور دوسرے کا اشتعال پذیر ہونا' ایک قوم کا مٹنا اور دوسری کا ظاہر و غالب ہونا اور صدیوں سے ایسا ہوتے چلے جانا۔ تاریخ کی اس رفتار پر غور و فکر کرنے سے انسان کو بہت سا سبق اور عبرت حاصل ہوتی ہے اور حاضر اقوام یہ سوچتی ہیں کہ انہیں بھی اسی طرح نیست و نابود ہونا ہے۔ ان کے آثار پر بھی آنے والے اسی طرح غور کریں گے جس طرح ہم جانے والوں کے آثار پر غور کرتے ہیں۔ یوں غافل سے غافل شخص بھی ہوش کے ناخن لے سکتا ہے۔ یوں ایک غور کرنے والا یہ غور کر سکتا ہے کہ وہ دست قدرت کیا ہے جس کی یہ سب کرشمہ سازیاں ہیں کہ کسی کی عمر کم ہے اور کسی کی زیادہ۔ آج ایک حکومت ہے اور کل دوسری۔ آج ایک ملک پر قابض ہے اور کل دوسرا قابض ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کی جانشین ہے۔ ہر چیز جاری ہے۔ اس کی انتہاء ہو رہی ہے اور باقی ہے صرف نام اللہ کا۔ جو نہ زائل ہوتا ہے اور نہ اس کے لیے انتہاء ہے۔

جو چیز جانے والی ہے اور اس کا وجود ختم ہوتا ہے وہ دائمی نہیں ہوتی۔ اس کی مثال اس طرح ہے جس طرح ایک مسافر کسی منزل پر رکتا ہے۔ کل اسے آگے جانا ہوتا ہے۔ اور بعد میں دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ اس نے کیا کیا اور کیا چھوڑا۔ اور اس کا انجام یہ ہونے والا ہے کہ اس کا حساب کیا جائے کہ اس نے کیا کیا اور کیا نہ کیا۔ لہٰذا ہر شخص کا یہ

فرض ہے کہ وہ اپنی قلیل زندگی میں اچھے کام کرے اور اپنے پیچھے ذکر جمیل چھوڑے ۔ کچھ ایسے کام کرے جو اس کے جائے آرام میں اسے کام آئیں ۔

یہ ہیں بعض وہ خیالات جو دل و دماغ کی دیواریں پھلانگ کر آتے ہیں لیکن اس وقت جب کوئی اقوام کے عروج و زوال کو دیکھتا ہے ۔ طلوع و غروب پر غور کرتا ہے ۔ عروج پانے والی قوتوں اور مٹ جانے والی قوتوں کے امور پر غور کرتا ہے اور ایک قوم کو دیکھتا ہے کہ وہ دوسری قوم کی وارث ہو جاتی ہے ۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ (۳۵ : ۳۹) ”وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے“ ۔ اس موثر مسلسل اور دیکھے جانے والے منظر کے سائے میں ' انسانوں کو یہ یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ ذمہ داری انفرادی ہے ۔ لہٰذا قیامت میں کوئی کسی کی جگہ کوئی ذمہ داری نہ اٹھا سکے گا اور کوئی کسی کے مقابلے میں مدافعت نہ کر سکے گا ۔ یہاں اشارہ کیا جاتا ہے کہ تم جس طرح منہ پھیرتے ہو' جس طرح کفر کرتے ہو' جس طرح گمراہی میں مبتلا ہوتے ہو' آخر کار اس کا انجام نہایت ہی گھناؤنا ہو گا ۔

فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَیْهِ كُفْرُهٗ وَ لَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا وَ لَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا (۳۵ : ۳۹) ”اب جو کوئی کفر کرتا ہے اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے ' اور کافروں کو ان کا کفر اس کے سوا کوئی ترقی نہیں دیتا کہ ان کے رب کا غضب ان پر زیادہ سے زیادہ بھڑکتا چلا جاتا ہے ۔ کافروں کے لیے خسارے میں اضافے کے سوا کوئی ترقی نہیں“ ۔ مقت کا مفہوم شدید غضب ہے اور جس پر اللہ کا شدید غضب ہو جائے تو اسے جان لینا چاہئے کہ کس قدر برا انجام اس کے انتظار میں ہے ۔ اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہو سکتا ہے ۔

--- ooo ---

دوسرا سفر آسمانوں کی وسعتوں میں ہے تاکہ معلوم کیا جا سکے کہ جن لوگوں کو یہ اللہ کا شریک بناتے ہیں آیا ان کے کسی کارنامے کے کوئی آثار زمین و آسمان میں ہیں ۔ زمین و آسمان میں تو ان کا کوئی اتہ پتہ نہیں ہے اور نہ کچھ آثار ہیں ۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَیْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰی بَیِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ یَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۴۰﴾

”(اے نبیؐ) ان سے کہو ”کبھی تم نے دیکھا بھی ہے اپنے ان شریکوں کو جنہیں ، تم خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہو؟ مجھے بتاؤ' انہوں نے زمین میں کیا پیدا کیا ہے؟ یا آسمانوں میں ان کی کیا شرکت ہے (اگر یہ نہیں بتا سکتے تو ان سے پوچھو) کیا ہم

نے انہیں کوئی تحریر لکھ کر دی ہے جس کی بنا پر یہ (اپنے اس شرک کے لیے) کوئی صاف دلیل رکھتے ہوں؟ نہیں ' بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے کو محض فریب کے جھانسے دیئے جارہے ہیں"۔

یہ حجت بالکل واضح ہے اور یہ دلیل محتاج تشریح نہیں ہے۔ یہ زمین اور اس کے اندر جو بھی ہے اس کے ساتھ وہ اللہ کی مخلوق ہے اور یہ آسمان اپنی وسعتوں تک اللہ کا ہے۔ اس زمین کے اندر نظر آنے والی اشیاء میں سے کون سی چیز ایسی ہے جس کے بارے میں اللہ کے سوا کوئی اور دعویٰ کر سکتا ہو یا کسی اور کے بارے میں دعویٰ کیا جا سکتا ہو کہ اس نے اسے پیدا کیا ہے۔ اگر کوئی ایسا دعویٰ کرتا ہے تو ہر چیز اس کے دعویٰ کے خلاف پکار اٹھے گی کہ یہ غلط ہے اور ہر چیز پکار کر کہے گی کہ اسے اللہ نے پیدا کیا ہے۔ ہر چیز اپنے اندر ایسے آثار اٹھائے ہوئے ہے کہ وہ کسی مدعی کے دعویٰ کو رد کرنے کے لیے کافی ہیں کیونکہ یہ آثار کسی انسانی صنعت سے مشابہت ہی نہیں رکھتے۔ یعنی انسانوں نے جس قدر چیزیں بنائی ہیں ان میں نظام قدرت کی مصنوعات کی صفات نہیں ہیں۔

اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ (۳۵: ۴۰) "یا آسمانوں میں ان کی کیا شرکت ہے"۔ یہ تو بطریق اولیٰ مسترد ہے۔ جب زمین کی کسی چیز میں وہ شریک نہیں تو آسمان کی کسی چیز میں شریک کیسے ہیں۔ کیونکہ جب زمین کی کسی چیز کے بارے میں کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ ان نام نہاد والیوں کی مخلوق ہے تو آسمان کی کسی چیز کے بارے میں کوئی کیسے دعویٰ کر سکتا ہے۔ غرض نہ یہ الٰہ آسمانوں کی کسی چیز کی تخلیق میں شریک ہیں اور نہ ملکیت میں شریک ہیں۔ جو چیز بھی آپ کہیں۔ یہاں تک کہ جن اور ملائکہ کو بھی ایسی کوئی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ ان کے بارے میں تو ان کا زعم یہ تھا کہ جن آسمانوں کی خبریں چرا کر لاتے ہیں اور یہ ان سے یہ خبریں معلوم کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ عقیدہ کبھی نہیں رہا ہے کہ جن یا ملائکہ آسمانوں میں خدا کے ساتھ شریک ہیں۔

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ (۳۵: ۴۰) "کیا ہم نے ان کو کوئی تحریر لکھ کر دی ہے جس کی بنا پر کوئی صاف سند رکھتے ہیں"۔ یہ کہ اللہ نے ان خود ساختہ خداؤں کو کوئی تحریر دی ہو اور انہیں یقین ہو کہ وہ بھی خدا کے ساتھ شریک ہیں یہ مفروضہ بھی غلط ہے۔ یہاں یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ یہ استفہام انکاری شرکاء کے بجائے مشرکین سے ہو ' یعنی ان خود ساختہ الہوں پر ان لوگوں کا جو اندھا عقیدہ ہے کیا یہ عقیدہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کسی تحریر پر مبنی ہے۔ جو ان مشرکین پر اتری ہو۔ اس سے یہ اپنا عقیدہ لیتے ہوں اور استدلال کرتے ہوں جبکہ یہ صحیح نہیں ہے اور نہ وہ کوئی ایسی تحریر پیش کر سکتے ہیں۔ یہاں اس تفسیر کے مطابق یہ اشارہ بھی نکلے گا کہ عقائد صرف اللہ کی جانب سے کسی کتاب اور صریح نص ہی سے ثابت ہوتے ہیں اور کتاب اللہ ہی نظریات کے لیے ماخذ ہو سکتی ہے کیونکہ یہی یقینی سرچشمہ ہدایت ہوتی ہے۔ ان کے پاس کوئی منصوص دلیل چونکہ نہیں ہے اس لیے ان کا دعویٰ غلط ہے۔ ان کے مقابلے میں رسول اللہؐ کا ہر قول اللہ تعالیٰ کا فرمایا ہوا ہے اور مستند ہے۔ پس کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ منہ پھیرتے ہیں حالانکہ عقائد لینے کا صحیح راستہ یہی ہے کہ یہ لوگ رسولؐ کی بات مانیں۔

بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا (۳۵: ۴۰) "بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے کو

محض فریب کے جھانسے دیئے جا رہے ہیں"۔ یہ ظالم ایک دوسرے سے لمبے چوڑے وعدے کرتے ہیں کہ ان کا راستہ یہی راستہ ہے جو آباء و اجداد کا ہے اور یہ کہ وہ آخرکار کامیاب ہوں گے۔ حالانکہ یہ لوگ فریب خوردہ اور مغرور ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ بعض کو دھوکہ دیتے ہیں۔ وہ اس غرور میں زندہ رہتے ہیں اور یہ ان کے لیے کوئی نفع بخش صورت حال نہیں ہے۔

اس کے بعد کہ اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے نہ آسمانوں میں' نہ زمین میں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ دست قدرت کا کارنامہ ہے کہ جس نے زمین و آسمان کو تھام رکھا ہے اور وہ بلاشرکت غیرے اس کائنات کا مدبر اور چلانے والا ہے۔ کائنات میں کوئی اور الٰہ تلاش کرنے کے بجائے خود اس کو دیکھو۔

إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهِ ۚ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ﴿۴۱﴾

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے' اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا انہیں تھامنے والا نہیں ہے۔ بے شک اللہ بڑا حلیم اور درگزر فرمانے والا ہے"۔

ذرا اس آسمان پر نگاہ ڈالو' ذرا زمین کو دیکھو اور ان لاتعداد اربوں اجرام فلکی کو دیکھو جو اس لاانتہا فضا میں بکھرے ہوئے ہیں۔ تمام کے تمام اپنی جگہ پر رکے ہوئے ہیں جو اپنے افلاک میں پھر رہے ہیں۔ اپنے مدارات میں مقرر' پھر ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ نہ ان کی رفتار میں کوئی خلل آتا ہے نہ مدار سے نکل سکتے ہیں' نہ ان کی رفتار سست ہو سکتی ہے' اور نہ تیز ہو سکتی ہے۔ لیکن ان کو اس طرح اپنے مقام پر ٹھہرانے کے لیے کوئی ستون نہیں لگا ہوا اور نہ یہ مضبوط رسیوں سے باندھے ہوئے ہیں۔ کسی چیز کا بقا ہر ان پر کوئی سہارا نہیں ہے۔ اس عظیم مخلوق کو دیکھتے ہو جو اربوں کھربوں کی تعداد سے زیادہ ہے اور جو نہایت ہی عجیب و غریب ہے۔ ایک عقلمند انسان کی آنکھیں ضرور کھل جانی چاہئیں کہ اس کے پیچھے ایک نہایت طاقتور الله العالمین کا دست قدرت کام کر رہا ہے' جس نے اس عظیم کارخانے کو تھام رکھا ہے۔

اگر آسمانوں کے یہ سیارے اور ستارے اور زمین اپنی جگہ سے ٹل جائیں اور بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھر جائیں تو ان کو کوئی پھر سے مرتب نہیں کر سکتا۔ یہ ہے وہ وقت جب قیامت برپا ہو جائے گی اور اس جہان کے خاتمہ کے لیے قرآن نے اسی نظام کے اختلال کو علامت قرار دیا ہے جہاں پہاڑ اور ستارے روئی کے گالوں کی طرح اڑ جائیں گے اور اس نظام کائنات کی ہر شے دوسری سے ٹکرا جائے گی۔

یہ وہ مقرر وقت ہے جس میں تمام لوگوں کا حساب و کتاب ہو گا اور دنیا میں جس نے جو عمل کیا اس کا محاسبہ ہو گا۔ دنیا کا انجام عالم آخرت پر ہو گا اور یہ دوسرا جہان اپنے مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے اس دنیا سے بالکل مختلف ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ زمین و آسمان کو تھامے رکھنے پر یہ تبصرہ ہوتا ہے۔

إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا (۳۵ : ۴۱) "اللہ بڑا حلیم اور درگزر فرمانے والا ہے"۔ وہ حلیم ہے۔

لوگوں کو مہلت دیتا ہے' وہ ان کی بدعملی کی وجہ سے اس جہان کو ختم نہیں کرتا اور اجل مقرر سے قبل ہی ان سے حساب و کتاب لینا نہیں شروع کر دیتا۔ لوگوں کو توبہ کا بھی موقعہ دیتا ہے' قیامت کی تیاری کی مہلت بھی دیتا ہے اور غفور اس طرح ہے کہ لوگوں نے جو جو جرائم کیے سب پر مواخذہ نہیں کرتا بلکہ اللہ لوگوں کی برائیوں کے ایک بڑے حصے سے درگزر فرماتا ہے۔ جب بھی اللہ ان میں کوئی بھلائی دیکھے تو ان کی مغفرت کر دیتا ہے۔ یہ ایک ہدایت ہے جو لوگوں کو خبردار کرتی ہے کہ وہ اس موقع اور ضرورت کو غنیمت سمجھیں اور اگر یہ فرصت گنوا دی تو یہ واپس نہ آئے گی۔

---ooo---

چوتھا سفر اہل مکہ اور اس کے اردگرد کے مشرکین کے احوال کا ہے۔ ان لوگوں کی دعا ہمیشہ یہ ہوتی تھی کہ اگر اللہ ان میں رسول بھیج دے اور اسے کتاب دے دے تو وہ ایمان لائیں گے۔ پھر انہوں نے نقض عہد کیا اور فساد فی الارض کا ارتکاب کیا۔ ان کو ڈرایا جاتا ہے کہ اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ۝ اسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۭ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۭ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۝

"یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا ہوتا تو یہ دنیا کی ہر دوسری قوم سے بڑھ کر راست رو ہوتے۔ مگر جب خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا تو اس کی آمد نے ان کے اندر حق سے فرار کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کیا۔ یہ زمین میں اور زیادہ سرکشی کرنے لگے اور بری بری چالیں چلنے لگے' حالانکہ بری چالیں اپنے چلنے والوں ہی کو لے بیٹھتی ہیں۔ اب کیا یہ لوگ اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ پچھلی قوموں کے ساتھ اللہ کا جو طریقہ رہا ہے وہی ان کے ساتھ بھی برتا جائے؟ یہی بات ہے تو تم اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنت کو اس کے مقرر راستے سے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے"۔

اہل عرب دیکھتے تھے کہ یہودی جزیرۃ العرب میں ان کے ساتھ رہتے ہیں اور ان کو ایک کتاب دی گئی ہے اور وہ دیکھتے تھے کہ یہ یہودی اپنے دین سے منحرف ہو گئے ہیں اور بے عمل ہیں۔ عرب ان کی تاریخ بھی پڑھتے تھے کہ انہوں نے اپنے بے شمار رسولوں کو قتل بھی کیا اور جب بھی ان کے پاس سچائی آئی انہوں نے اس سے منہ پھیرا۔ اس وقت یہ یہودیوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے قسمیں کھایا کرتے تھے کہ اگر اللہ نے ہمیں کوئی پیغمبر دیا' اور وہ عربوں میں مبعوث ہوا تو وہ دنیا کی تمام امتوں سے بڑھ کر نیک ہوں گے۔ مراد ان کی یہ تھی کہ یہودیوں سے وہ زیادہ ہدایت پر

رہیں گے ۔یہ لوگ اشارہ یہودیوں کی طرف کرتے تھے ۔

لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيرٌ لَّيَكُونُنَّ أَهْدٰى مِنْ إِحْدَى الْأُمَمِ (۳۵ : ۴۲) ''اگر کوئی خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا ہوتا تو وہ دنیا کی ہر قوم سے زیادہ راست رو ہوتے''۔

یہ تھا ان کا حال قبل بعثت اور یہ تھا ان کا عقیدہ۔ یہ عقیدہ قرآن مجید ان پر اس طرح پیش کرتا ہے کہ ذرا تم اس صورت حالات کو یاد کرو کہ تم کیا کہا کرتے تھے ۔ بس کے بعد ان کے سامنے وہ حالات پیش کیے جاتے ہیں جو عملاً رسول کے آنے کے بعد پیش آئے ۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيرٌ مَّا زَادَهُمْ إِلَّا نُفُورًا (۳۵ : ۴۲) اسْتِكْبَارًا فِي الْأَرْضِ وَ مَكْرَ السَّيِّئِ (۳۵ : ۴۳) ''مگر جب خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا تو اس کی آمد نے ان کے اندر حق سے فرار کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کیا۔ زمین میں اور زیادہ سرکشی کرنے کی خاطر اور بری چالیں چلنے کی وجہ سے''۔ یہ کس قدر بری بات ہے کہ ایک شخص قسمیں کھائے کہ اس کا رویہ یہ ہوگا اور پھر وہ اس کے الٹ رویہ اختیار کرے ۔ مگر تکبر و غرور کی وجہ سے اور اپنی بری سازشوں کی وجہ سے ۔ قرآن مجید ان کے انکار کا اصلی سبب ریکارڈ کرتا ہے اور اس کے بعد قرآن مجید پھر ان کی ان مکاریوں کے بارے میں یہ فیصلہ اور جواب یوں دیتا ہے کہ جو شخص اس قدر قبیح حرکت کرتا ہے اس کا ایمان کیا ہوگا۔ اور انجام کیا ہوگا۔

وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ (۳۵ : ۴۳) ''حالانکہ بری چالیں اپنے چلنے والوں ہی کو لے بیٹھتی ہیں''۔ یعنی ان کی بری چالیں ان ہی کے خلاف پڑیں گی اور یہ بری چالیں ان کو مخبوط الحواس کر دیں گی اور ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے ۔اگر صورت یہ ہے تو پھر یہ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں۔ صرف اس کا کہ ان پر بھی وہی مصائب آجائیں جو ان سے پہلی اقوام پر آئے ۔ سابقہ اقوام کے قصے تو انہیں معلوم ہیں ۔ وہ بس اسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ کی مستحکم سنت انہیں پکڑ لے ۔

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا (۳۵ : ۴۳) ''یہی بات ہے تو تم اللہ کی سنت میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے ۔ اور تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنت کو اس کے مقررہ راستے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے ۔

---ooo---

لوگوں کے معاملات اتفاقاً نہیں چل رہے اور اس زمین پر یہ زندگی اور مخلوقات عبث طور پر نہیں پیدا کیے گئے ۔ اس دنیا کے کچھ قوانین ہیں جو ہرگز تبدیل نہیں ہوتے ۔ قرآن کریم اس حقیقت کی تصدیق کرتا ہے اور لوگوں کو اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ وہ اس دنیا کے واقعات کو ایک انفرادی واقعہ ہی نہ سمجھیں اور اپنی زندگی ان سنن الہیہ سے غافل ہو کر نہ گزاریں بلکہ اپنی زندگی کو زمان و مکان کے مختصر ترین لمحات و مقامات تک بھی محدود نہ کر دیں ۔ قرآن ان کے تصور کو ذرا

بلند کر کے ان کی زندگی کے طریقوں کو اس کائنات کے طریقوں کے ساتھ مربوط کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید بار بار اس طرف توجہ کرتا ہے کہ اس کائنات میں اللہ نے کچھ اٹل اصول جاری کر رکھے ہیں۔ وہ ان کو ان واقعات کی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے جو اس دنیا میں ان سنن الٰہیہ کے مطابق ظاہر ہوئے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان کا ماضی بتاتا ہے کہ یہ سنن اس کائنات میں جاری ہیں۔

یہ پانچواں سفر اسی کی ایک مثال ہے۔ یہاں بھی یہ کہنے کے بعد کہ اللہ کے سنن نہیں بدلتے' اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَكَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِن شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا ﴿٤٤﴾

"یہ لوگ زمین میں کبھی چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان سے بہت زیادہ طاقت ور تھے؟ اللہ کو کوئی چیز عاجز کرنے والی نہیں ہے' نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ وہ سب کچھ جانتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

اس زمین میں سیر کھلی آنکھوں اور بیدار دل و دماغ کے ساتھ ہونا چاہئے اور اس میں گزشتہ اقوام کے واقعات بھی پیش نظر رہنے چاہئیں کہ وہ کیا کرتے تھے اور ان کا انجام کیا ہوا۔ زمین کے واقعات و حادثات سے انسانی شعور اور دل میں خدا کا خوف اور عبرت آموز اشارات کا بیٹھنا ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بار بار یہ ہدایت کی گئی ہے کہ زمین میں پھرو اور اقوام کے عروج و زوال کی داستانوں کا مطالعہ کرو' ہلاک شدہ اقوام کے شب و روز دیکھو' جن کا نام و نشان اس زمین سے مٹا دیا گیا۔ ان سے عبرت حاصل کرو اور ان دلوں کو جگاؤ جن کو علم نہیں ہے۔ اگر علم ہے تو ان کے اندر احساس نہیں ہے اور اگر احساس ہے تو وہ عبرت نہیں لیتے۔ ان مردہ دلوں میں سنن الٰہیہ کا کوئی شعور نہیں ہے اور وہ تاریخی واقعات کی تعبیر سنن الٰہیہ کی روشنی میں نہیں کرتے۔ حالانکہ انسان اور حیوان کے اندر فرق ہی صرف یہ ہے کہ انسان واقعات کی تعبیر و تشریح اصولوں کی روشنی میں کرتا ہے جبکہ حیوان حالات' واقعات' اصولوں اور قواعد اور سنن الٰہیہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچتا' نہ وہ کسی واقعہ سے احکام و نتائج اخذ کرتا ہے۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ تمام بنی نوع انسان سنن الٰہیہ اور نوامیس فطرت کے سامنے یکساں ہوتے ہیں۔

اس تاریخی سفر میں قرآن کریم ناظرین کو تاریخ کی ہلاک شدہ اقوام کے کھنڈرات کے دہانے کھڑا کر کے ان کو یاد دہانی کراتا ہے کہ یہ لوگ نہایت قوت اور شوکت والے تھے اور ان کو ان کی یہ قوت اور شوکت بچا نہ سکی' لہٰذا تمام قوتوں سے برتر قوت موجود ہے۔ وہ قوت جس کے مقابل کی کوئی قوت نہیں ہے اور نہ اس کو کوئی قوت عاجز کر سکتی ہے۔ یہ قوت

ان لوگوں کو اسی طرح پکڑ سکتی ہے جس طرح سابقہ اقوام کو اس نے پکڑا۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ (۳۵: ۴۴) "اور اللہ کو کوئی چیز عاجز کرنے والی نہیں ہے' نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں" اور اس پر یہ تبصرہ آتا ہے جو اس کی تفسیر کرتا ہے اور دلیل پیش کرتا ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا (۳۵: ۴۴) "وہ سب کچھ جانتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ سب سے آخر میں سورہ کا خاتمہ آتا ہے جس میں اللہ کی مہربانیاں اور معافیاں اور درگزر کا اظہار بھی کیا جاتا ہے اور اللہ کی قدرت اور قوت کا احساس بھی دلایا جاتا ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ لوگوں کو جو مہلت دیئے جا رہا ہے وہ اس لیے دے رہا ہے کہ وہ رحیم و کریم ہے اور اللہ حساب و کتاب میں نرم رویہ اختیار کرتا ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا
مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ
۵ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ۝۴۵
۸ ع
۱۷

"اگر کہیں وہ لوگوں کو ان کے کیے کرتوتوں پر پکڑتا تو زمین پر کسی متنفس کو جیتا نہ چھوڑتا۔ مگر وہ انہیں ایک مقرر وقت تک کے لیے مہلت دے رہا ہے۔ پھر جب ان کا وقت آن پورا ہو گا تو اللہ اپنے بندوں کو دیکھ لے گا"۔

لوگ جو اللہ کے انعامات کا کفر کرتے ہیں' زمین میں شر و فساد کا ارتکاب کرتے ہیں اور ظلم و زیادتی اور سرکشی کرتے ہیں یہ ان کی جانب سے بہت ہی بری حرکت ہے۔ اگر اللہ لوگوں کو ان کی اس بری حرکت پر پکڑتا تو اللہ کی پکڑ کا دائرہ پورے کرۂ ارض تک پھیل جاتا اور یہ پورا کرۂ ارض زندگی کے قابل ہی نہ رہتا۔ صرف انسانوں کے لیے نہیں بلکہ کوئی زندہ چیز بھی یہاں نہ رہتی۔

اس انداز تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ بہت برا اور گھناؤنا کام ہے اور اگر اللہ اس پر فوراً ہی پکڑ لیتا تو لوگوں کے اعمال کے طبعی اور اخلاقی نتائج ان کی فوری بربادی پر منتج ہوئے۔ لیکن اللہ حلیم ہے اور وہ لوگوں کی پکڑ میں شتابی نہیں فرماتا۔

وَلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (۳۵: ۴۵) "لیکن وہ انہیں ایک مقررہ وقت تک کے لیے مہلت دیتا ہے"۔ یعنی ہر فرد کو اس کی عمر طبیعی تک مہلت دیتا ہے اور دنیا میں وہ اپنی عمر پوری کرتا ہے۔ اور وہ سوسائٹیوں اور ملتوں کو بھی اپنے وقت مقررہ تک مہلت دیتا ہے یہاں تک کہ وہ نیست و نابود ہو کر دوسری نسل کے لیے جگہ خالی کرتی ہیں اور پوری بنی نوع انسان کو وہ مہلت دیتا ہے۔ جب وقت مقرر آئے گا تو قیامت برپا کر کے حساب و

کتاب لے گا اور وہ اس طرح لوگوں کو موقع دیتا ہے کہ وہ شاید نیک کام کر سکیں۔

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ (۳۵ : ۴۵) "پھر جب ان کا وقت پورا ہو گا"۔ جب کسب وعمل کا وقت پورا ہو گا اور حساب وکتاب کا وقت آئے گا تو اللہ ان پر کوئی ظلم نہ کرے گا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا (۳۵ : ۴۵) "تو اللہ اپنے بندوں کو دیکھ لے گا"۔ اللہ کا اپنے بندوں کو دیکھ لینا اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ پورا پورا حساب وکتاب ان کے اعمال کے مطابق کر لے۔ ان کے اعمال میں سے صغیرہ اور کبیرہ کوئی چیز رہ نہ جائے گی۔

--- ooo ---

یہ اس سورہ کا آخری زمزمہ ہے۔ اس کا آغاز حمد الٰہی سے ہوا تھا جو آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ

جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ (۳۵ : ۱) "جو فرشتوں کو رسول بناتا ہے جو پروں والے ہیں"۔ اور جو آسمانوں سے اس کا پیغام زمین پر لاتے ہیں جس کے اندر خوشخبری اور ڈراوا ہے۔ خوشخبری جنت کی ہے اور ڈراوا جہنم کا ہے۔

اس آغاز اور اختتام کے درمیان اس سورہ نے قارئین کو اس پوری کائنات کے مطالعہ کے لیے بے شمار سفر کرائے۔ یہ ہے اختتام ان اسفار کا۔ یہ ہے انجام زندگی کا اور یہ ہے انجام حضرت انسان کا۔

مانسہرہ - ۵ نومبر ۱۹۹۴ء

--- ooo ---

# فی ظلال القرآن

## جلد ---- پنجم

## پارہ ----- ۲۲

## سورۃ یٰسین ۔ ۳۶

آیات ۱--- تا--- ۲۱

# سورۂ یٰسین ایک نظر میں

یہ مکی سورت ہے اور اس کے فقرے مختصر ہیں ۔ یوں لگتا ہے اس میں عقل و خرد کی تاروں پر جلدی جلدی ضربات لگائی جاتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کی آیات ۸۳ ہونے کے باوجود یہ اس سے پہلے آنے والی سورت 'سورۂ فاطر سے بہت چھوٹی ہے جبکہ اس کی آیات ۴۵ ہیں ۔

مختصر فقرات اور آیات کے آخر میں فواصل اور پے درپے ضربات کی وجہ سے اس سورت کا ایک خاص مزاج اور ایک خاص طبیعت واضح نظر آتی ہے ۔ عقل و خرد کی تاروں پر مسلسل ضربات ' انسانی احساس کو بیدار کرتی چلی جاتی ہیں اور کلام کی اس تیز رفتاری کی وجہ سے اس سورت کے اثرات میں اضافہ ہوتا ہے ۔ اور وہ سائے اور تصویر کشیاں اور مناظر جو اس سورت کے آغاز سے انجام تک مسلسل اور پے درپے آرہے ہیں ' وہ انسان پر مختلف النوع اور گہرے اثرات چھوڑتے ہیں ۔

اس سورت کا مرکزی موضوع اور مضمون وہی ہے جو تمام مکی سورتوں کا ہوا کرتا ہے ۔ سورت کا مقصد اس کے آغاز ہی سے یہ نظر آتا ہے کہ یہ اسلامی نظریہ حیات کے بنیادی نکات کو مستحکم کرنا چاہتی ہے ۔ چنانچہ آغاز ہی سے وحی و رسالت کی سچائی پر زور دیا جاتا ہے ۔

يٰسٓ (۳۶: ۱) وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ (۳۶: ۲) اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۳۶: ۳) عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۳۶: ۴) تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ (۳۶: ۵) (۳۶:۵) "یٰس ۔ قسم ہے قرآن حکیم کی کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو' سیدھے راستے پر ہو اور یہ قرآن غالب اور رحیم ہستی کا نازل کردہ ہے" ۔

اس کے بعد اصحاب القریہ کا قصہ آتا ہے ۔ اس گاؤں والوں کے پاس رسول آتے ہیں ۔ یہ رسول لوگوں کو وحی و رسالت کی تکذیب سے ڈراتے ہیں اور قصہ کا انجام دکھا کر سورت کے محور اور موضوع کو ثابت کیا جاتا ہے اور سورت کے اختتام کے قریب بھی دوبارہ اسی موضوع کو لیا جاتا ہے ۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ (۳۶: ۶۹) لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۳۶: ۷۰) "اور ہم نے اس نبی کو شعر نہیں سکھایا اور نہ شاعری اس کو زیب ہی دیتی ہے ۔ یہ تو ایک نصیحت ہے اور صاف صاف پڑھی جانے والی کتاب تاکہ ہر اس شخص کو خبردار کر دے جو زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر حجت تمام ہو جائے" ۔

اس سورت میں اللہ کی حاکمیت اور وحدانیت کے مسئلے کو بھی لیا گیا ہے ۔ایک رجل مومن کی زبانی شرک کی کراہت اور نہایت گھناؤنے پن کو ظاہر کیا جاتا ہے ۔یہ شخص اس قریہ کے دور دراز علاقوں سے آیا اور رسولوں کے حوالے سے اپنی قوم کے رویے پر اس نے سخت مواخذہ کیا۔اس نے اپنی قوم پر اس طرح تنقید کی۔

وَ مَالِیَ لَاۤ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (۳۶: ۲۲) ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنْ یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْـًٔا وَّ لَا یُنْقِذُوْنِ (۳۶: ۲۳) اِنِّیْۤ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۳۶: ۲۴) "آخر کیوں نہ میں اس ہستی کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا اور جس کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے ۔کیا میں اس کو چھوڑ کر دوسروں کو معبود بنالوں حالانکہ اگر خدائے رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا ہے تو نہ ان کی شفاعت کچھ کام آسکتی ہے اور نہ وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں ۔اگر میں ایسا کروں تو میں صریح گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا"۔اور سورت کے خاتمے کے قریب اس موضوع کو دوبارہ لایا جاتا ہے۔ وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ یُنْصَرُوْنَ (۳۶: ۷۴) لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَهُمْ وَ هُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ (۳۶: ۷۵) "اور انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے خدا بنا لیے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی مدد کی جائے گی ۔وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ یہ لوگ الٹے ان کے لئے حاضر ہیں"۔

جس مسئلے پر اس سورت میں بہت زور دیا گیا ہے وہ مسئلہ بعث بعد الموت ہے ۔اس سورت میں یہ مسئلہ بہت سے مقامات پر دہرایا گیا ہے ۔اس کے آغاز میں اس پر یوں بحث کی گئی ہے ۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْیِ الْمَوْتٰی وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ وَ كُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْۤ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ (۳۶: ۱۲) "ہم یقیناً ایک روز مردوں کو زندہ کرنے والے ہیں ۔جو کچھ افعال انہوں نے کیے ہیں وہ ہم سب لکھتے جارہے ہیں اور جو آثار انہوں نے چھوڑے ہیں وہ بھی ہم ثبت کر رہے ہیں ۔ہر چیز کو ہم نے ایک کھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے"۔اور گاؤں والوں کے قصہ میں بھی بعث بعد الموت کا ذکر آتا ہے ۔رجل مومن کے واقعہ کے ضمن میں اور سیاق کلام میں اس کی جزاء کا فوری تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے ۔

قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ (۳۶: ۲۶) بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَ جَعَلَنِیْ مِنَ الْمُكْرَمِیْنَ (۳۶: ۲۷) "اس شخص سے کہہ دیا کہ "داخل ہو جا جنت میں" اس نے کہا کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ میرے رب نے کس چیز کی بدولت میری مغفرت فرما دی اور مجھے باعزت لوگوں میں داخل کر دیا"۔اس کے بعد سورت کے وسط میں بھی اس کا تذکرہ ہوتا ہے ۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۳۶:۴۸) مَا يَنظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ (۳۶:۴۹) فَلَا يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً وَلَا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ (۳۶:۵۰) "یہ لوگ کہتے کہ یہ قیامت کی دھمکی آخر کب پوری ہوگی؟ بتاؤ اگر تم سچے ہو" دراصل یہ جس چیز کی راہ تک رہے ہیں وہ بس ایک دھماکہ ہے جو یکایک انہیں عین اسی حالت میں دھر لے گا جب یہ اپنے دنیوی معاملات میں جھگڑ رہے ہوں گے اور اس وقت یہ وصیت نہ کر سکیں گے' نہ اپنے گھروں کو پلٹ سکیں گے"۔

اس کے بعد پھر مناظر قیامت میں سے ایک مکمل منظر دیا جاتا ہے اور سورت کے آخر میں اس موضوع کو ایک مکالمے کی صورت میں لیا جاتا ہے۔

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ (۳۶:۷۸) قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ (۳۶:۷۹) "اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔ کہتا ہے "کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں" اس سے کہو انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے"۔

یہ مسائل تو وہ تھے جو اسلامی نظریہ حیات کے بنیادی مسائل سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ مسائل بار بار زیر بحث لائے جاتے ہیں اور کئی سورتوں میں تو ان پر کلام بار بار کیا جاتا ہے۔ لیکن ہر بار ان مسائل کو مختلف زاویوں سے لیا جاتا ہے اور ہر بار قصہ نیا نظر آتا ہے۔ موضوع پر ہر بار نئی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اور ہر بار اس کے اثرات نئے ہوتے ہیں اور ہر بار سورت کی مجموعی فضا' اس کے ماحول اور اس کی تصاویر کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ سب اثرات مناظر قیامت کے ذریعہ اور پھر قصے کے مناظر اور اس کے کرداروں کے موقف اور ان کے مکالمات کے ذریعہ نفس انسانی پر نقش کیے جاتے ہیں۔ پوری انسانی تاریخ میں گزری ہوئی اقوام پر آنے والے عذاب اور اس کائنات کے مختلف النوع اور حیرت انگیز مظاہر کے ذریعہ انسان کو مسحور کرایا جاتا ہے۔ ایک بے آب و گیاہ مردہ زمین ہے اور چشم زدن میں سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ اندھیری رات ہے اور اس سے سپیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے اور پھر شام کے بعد اندھیرا۔ پھر سورج اپنے جائے قرار کے لیے چل رہا ہے۔ چاند اپنی منازل میں سرگرداں ہے اور سوکھتے سوکھتے کھجور کی خشک شاخ کی طرح بن جاتا ہے۔ پھر ذرا سمندر کے سینے پر کشتی کو دیکھو کہ وہ انسانوں سے بھری جاری ہے۔ اور پھر ذرا حیوانات کو دیکھو کہ وہ انسانوں کے لیے مسخر ہیں اور پھر انسان کو دیکھو کہ نطفے کے اندر وہ خوردبین کے ذریعے بمشکل نظر آتا ہے اور پھر مختلف مراحل سے ہو کر جب وہ مکمل انسان بنا دیا جاتا ہے تو وہ باتیں بناتا ہے۔ اور سرسبز و شاداب درخت کو تو دیکھو کہ اس کے اندر تمہارے لئے آگ کو مسخر کر دیا گیا ہے اور تم اسے جلاتے ہو۔

ان مشاہد کے علاوہ اس سورت میں کچھ اور بھی سحر انگیز چیزیں ہیں جو انسانی وجدان پر اثر ڈالتی ہیں اور اسے جگاتی ہیں۔ مثلاً ان مکذبین کی تصویر کشی جن کے خلاف خود ان کے کفر کی وجہ سے اللہ کا فیصلہ صادر ہو گیا اور ان کی حالت یہ ہو

گئی نہ ذرا وان پر اثر انداز ہوا اور نہ آیات الٰہیہ ان کے لیے نفع بخش ثابت ہوئیں ۔

اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَی الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ (۳۶:۸) وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (۳۶:۹)

"ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں جن سے وہ ٹھوڑیوں تک جکڑے گئے ہیں ۔ اس لیے وہ سر اٹھائے کھڑے ہیں ۔ ہم نے ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کر دی ہے اور ایک دیوار ان کے پیچھے ہم نے انہیں ڈھانک دیا ہے ۔ انہیں اب کچھ نظر نہیں آتا۔

انہی چیزوں میں سے یہ امر بھی ہے کہ لوگوں کے نفسیاتی حالات سے اللہ تعالیٰ باخبر ہے ' چاہے وہ چھپے ہوئے ہوں یا ظاہر ہوں--- اور یہ کہ عمل تخلیق صرف ایک لفظ کن سے مکمل ہوتا ہے ۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (۳۶:۸۲) "وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے ۔

یہ تمام امور انسان کے دل و دماغ کو چھوتے ہیں اور انسان ان چیزوں کے مفہوم کو عالم واقعہ میں موجود پاتا ہے ۔

--- ooo---

یہ سورت اپنے مضامین کے بیان کے اعتبار سے تین اسباق میں منقسم ہوتی ہے ۔

۱۔ پہلا سبق دو حروف کے ساتھ قسم کھا کر شروع کیا جاتا ہے ۔ یاسین اور ان حروف کی قسم کے بعد پھر قرآن مجید کے ساتھ قسم کھائی جاتی ہے ۔ یہ قسم اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے کھائی جاتی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے رسول ہیں اور بالکل سیدھے راستے پر چل رہے ہیں اور جو لوگ غفلت کی وجہ سے آپ کی تکذیب کر رہے ہیں ' ان کا انجام نہایت ہی برا ہونے والا ہے ۔ اللہ نے ان لوگوں کے بارے میں فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ لوگ راہ راست کی طرف نہ پلٹ سکیں گے ۔ کیونکہ ان کے اپنے عمل کی وجہ سے ان کے اور راہ راست کے درمیان مشیت الٰہیہ حائل ہو چکی ہے اور اس حقیقت کی تفصیل یہ ہے کہ ہدایت صرف اس شخص کے لیے مفید ہوا کرتی ہے جو اللہ سے غائبانہ طور پر ڈرتا ہے اور جو نصیحت قبول کرنے کا داعیہ رکھتا ہو ۔ اور اس کا قلب دلائل ہدایت کی طرف مائل ہو اور اس کائنات میں جو شواہد انسان کو ایمان لانے پر مجبور کرتے ہیں وہ ان کو دیکھنے کے لئے تیار ہو ۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ان کے سامنے اصحاب قریہ کا قصہ اور مثال بیان کریں ۔ اور ذرا ان کو بتائیں کہ جھٹلانے کا انجام کیا ہوا کرتا ہے ۔ اور ایمان لانے والا دل کیا ہوتا ہے اور جو شخص ایمان لے آتا ہے اس کا انجام کیا ہوتا ہے ۔

دوسرا سبق ایسے مکذبین کی حالت پر سخت افسوس کے اظہار پر مشتمل ہے ' جو تکذیب پر تل جاتے ہیں ۔ ہر رسول کی تکذیب ایسے ہی لوگ کرتے چلے آئے ہیں بلکہ وہ اس پر مزید استہزاء اور مذاق بھی کرتے چلے آتے ہیں اور انسانوں نے کبھی بھی اپنی تاریخ میں ' اس تکذیب کی وجہ سے ہلاک کی جانے والی اقوام کے انجام پر غور نہیں کیا ۔ اور یہ لوگ ہمیشہ غافل رہتے ہیں اور اس کائنات میں پائی جانے والی روشن نشانیوں پر غور نہیں کرتے ۔ اور اس کے بعد دوسرے سبق میں

ان نشانیوں کو تفصیل سے لایا جاتا ہے ۔ جیسا کہ اس سے قبل ہم کہہ آئے ہیں ۔ اس سبق میں بڑی تفصیل سے قیامت کے مظاہر بھی دیئے جاتے ہیں ۔

تیسرے سبق میں دوبارہ پوری سورت کے مضامین کو دہرایا گیا ہے ۔ پہلے یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ لے کر آئے ہیں وہ شعروشاعری نہیں ہے ۔ اس کے بعد بعض وجدانی اشارات دیئے جاتے ہیں کہ اللہ ایک ہے اور وحدہ لاشریک ہے ۔ اس بات پر افسوس کیا جاتا ہے کہ لوگ اللہ کے سوا دوسری ہستیوں کو الٰہ پکڑتے ہیں ۔ یہ لوگ ان الٰہوں سے نصرت طلب کرتے ہیں اور خود ان الٰہوں کے فوجدار بنے ہوئے ہیں ' اس کے بعد مسئلہ بعث بعد الموت کو لیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ دیکھو تمہیں اللہ نے نطفے سے پیدا کیا ' کیا اس کے لیے بوسیدہ ہڈیوں سے ایک انسان کو کھڑا کرنا مشکل ہے ۔ اس میں آخر انوکھے پن کی کیا بات ہے ۔ اللہ تو وہ ہے جو بالکل سرسبز درخت سے آگ پیدا کر دیتا ہے ۔ یہ بات کیا عجیب تر نہیں ہے ۔ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین پر مشتمل یہ عظیم کائنات تخلیق کی ہے ۔ اللہ ایسا ایک دوسرا جہان بھی پیدا کر سکتا ہے ۔ اور آخرت میں انسانوں کو بھی دوبارہ بنا سکتا ہے ۔ اب سورت کے آخر میں فکر و نظر کی تاروں پر ضرب لگائی جاتی ہے ۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (٣٦: ٨٢) فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (٣٦: ٨٣) "وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے ۔ پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو" ۔

---○○○---

# درس نمبر ۲۰۵ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۲۹

---

سُوْرَةُ يٰسٓ (۳۶) مَكِّيَّةٌ (۴۱)
اٰيَاتُهَا ۸۳ — رُكُوْعَاتُهَا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰسٓ ﴿١﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴿٢﴾ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٣﴾ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٤﴾
تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿٥﴾ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿٦﴾
لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰۤى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٧﴾ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ
اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ﴿٨﴾ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ
سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿٩﴾ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ
ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠﴾ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ
وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ﴿١١﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ
الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۗ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْۤ اِمَامٍ
مُّبِيْنٍ ﴿١٢﴾ ع ۱۲

۱۸ اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔

یٰس ۔ قسم ہے قرآن حکیم کی کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو ' سیدھے راستے پر ۔ ۔ ۔ ( اور یہ قرآن ) غالب اور رحیم ہستی کا نازل کردہ ہے تاکہ تم خبردار کرو ایک ایسی قوم کو جس کے باپ دادا خبردار نہ کیے گئے تھے اور اس وجہ سے وہ

غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر لوگ فیصلہ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں' اسی لئے وہ ایمان نہیں لاتے۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں جن سے وہ ٹھوڑیوں تک جکڑے گئے ہیں' اس لیے وہ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ ہم نے ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کر دی ہے اور ایک دیوار ان کے پیچھے۔ ہم نے انہیں ڈھانک دیا ہے' انہیں اب کچھ نہیں سوجھتا۔ ان کے لیے یکساں ہے' تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو' یہ نہ مانیں گے۔ تم تو اسی شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمان سے ڈرے۔ اسے مغفرت اور اجر کریم کی بشارت دے دو۔ ہم یقیناً ایک روز مردوں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ جو کچھ افعال انہوں نے کیے ہیں وہ سب ہم لکھتے جا رہے ہیں' اور جو کچھ آثار انہوں نے پیچھے چھوڑے ہیں' وہ بھی ہم ثبت کر رہے ہیں۔ ہر چیز کو ہم نے ایک کھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے''۔

اللہ تعالیٰ دو حرفوں ''یا'' اور ''سین'' کی قسم اٹھاتا ہے اور اسی طرح قرآن کریم کی بھی قسم اٹھاتا ہے۔ اللہ نے یہاں قسم میں ان حروف اور قرآن کریم کو یکجا فرمایا ہے' اس سے حروف مقطعات کی اس تفسیر کو ترجیح حاصل ہو جاتی ہے جو ہم نے ان حروف کے حوالے سے اختیار کی ہے۔ ان حروف کے تذکرے اور قرآن کے تذکرے کے درمیان یہ ربط ہے کہ یہ قرآن انہی حروف سے بنا ہے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قرآن اللہ کی جانب سے ہے اور جس پر یہ لوگ تدبر نہیں کرتے' اس کے ذریعہ قرآن کریم ان لوگوں کو متوجہ کرتا ہے کہ تم اس نکتے پر غور کرو' کہ یہ قرآن انہی حروف سے بنایا گیا ہے جو تمہاری دسترس میں ہیں۔ لیکن قرآن کا انداز تعبیر' اس کا انداز بیان اور اس کی منطق فکر ایسی ہے کہ تم اس جیسا کلام پیش کرنے سے عاجز آ گئے ہو۔

قسم کھائے ہوئے قرآن کی جو صفت یہاں لائی جاتی ہے۔ وہ صفت حکمت ہے۔ حکمت ایک ذی عقل کی صفت ہوتی ہے جو زندہ اور عقلمند ہو۔ قرآن کریم کی یہ صفت بتا کر یہ تاثر دینا مطلوب ہے کہ یہ زندہ اور قصد و ارادے کی مالک کتاب ہے۔ اسی وجہ سے یہ حکیم ہے۔ اگرچہ قرآن کریم کے لیے یہ صفت بطور مجاز استعمال کی گئی ہے لیکن یہ ایک عظیم حقیقت کی مظہر ہے۔ ایک اہم حقیقت کو اذہان کے قریب لایا جا رہا ہے۔ وہ یہ کہ اس کتاب کی ایک روح اور ایک زندگی ہے۔ اور جب قاری کا دل صاف ہو جائے اور وہ محبت کے ساتھ اس سے ہم کلام ہو جائے تو یہ کتاب نہایت الفت اور محبت کے ساتھ اس شخص کے ساتھ ہمکلام ہوتی ہے اور وہ ایسے شخص پر پھر اپنے اسرار و رموز کھولتی ہے بشرطیکہ قاری خود اس کے لئے اپنا دل کھول دے اور اپنے دل و جان کے ساتھ اس کا ہو جائے۔ پھر اس کے قاری کو اس کے وہ خدوخال نظر آئیں گے جس طرح کسی دوست کے چہرے میں انسان کو نظر آتے ہیں۔ اور وہ اس کتاب کی طرف اسی شوق کے ساتھ مائل ہو گا جس طرح کوئی اپنے دوست کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور پھر قرآن میں اسے وہی سکون ملتا ہے جس طرح ایک دوست کی محفل میں ملتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں سے قرآن کو سننا پسند فرماتے تھے۔ آپ ایسے دروازوں پر کھڑے ہو جاتے اور سنتے جن میں قرآن حکیم کی تلاوت ہو رہی ہوتی تھی۔ جس طرح کوئی عاشق اپنے محبوب کی باتیں غور سے سنتا ہے۔

اور قرآن تو حکیم ہے۔ وہ ہر اس شخص سے ہمکلام ہوتا ہے جو اس کا گرویدہ ہو جائے۔ وہ ایک مومن کے دل کی حساس تاروں کو چھیڑتا ہے۔ اس کے ساتھ اسی مقدار میں ہمکلام ہوتا ہے جس قدر اس کو ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ مکالمہ نہایت حکمت سے ہوتا ہے۔ اس انداز میں کہ مخاطب کی اصلاح ہوتی ہے اور اس کو ایک سمت ملتی ہے۔

قرآن حکیم ہے' بڑی حکمت کے ساتھ تربیت کرتا ہے ۔ نہایت ہی معقول انداز میں ۔ درست نفسیاتی سمت میں ۔ ایسے انداز میں کہ جس میں تمام انسانی صلاحیتوں کو تعمیری انداز میں کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے اور انسانی صلاحیتوں کو صحت مند ترقی کے لئے ایک سمت دی جاتی ہے ۔ یہ انسانوں کو زندگی گزارنے کا نہایت ہی حکیمانہ نظام دیتا ہے جس کے کھلے اور وسیع حدود کے اندر انسان زندگی کی سرگرمیاں جاری رکھتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ یا اور سین اور پھر قرآن مجید کی قسم کھا کر یقین دہانی فرماتا ہے کہ اے رسول آپ رسولوں میں سے ہیں اور آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے ۔ آپ رسول کریم ہیں اور یہ قرآن حکیم ہے ۔

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۳۶ : ۳) عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۳۶ : ٤) "تم یقیناً رسولوں میں سے ہو' سیدھے راستے پر ہو" ۔ اللہ تعالیٰ کو قسم اٹھانے کی ضرورت کیا ہے؟ لیکن قرآن اور حروف قرآن کی یہ قسم' ان چیزوں کو جلالت شان عطا کرتی ہے جن کی قسم اٹھائی گئی ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ کسی عظیم الشان اور اہم چیز کی قسم اٹھاتا ہے یہاں تک کہ اس چیز کی اہمیت ایک شاہد اور ثابت کنندہ کی ہو جاتی ہے ۔

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۳۶ : ۳) "تم یقیناً رسولوں میں سے ہو" ۔ جس انداز سے یہ آیت آئی ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ہاں رسولوں کا بھیجنا اور انتخاب پہلے سے طے شدہ ہے ۔ یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حقیقہ بیان کی صورت میں بتایا جاتا ہے کہ آپ کا نام رسولوں کی فہرست میں ہے اور یہاں مکذبین اور منکرین کو خطاب کرنے کی بجائے رسول اللہ کو خطاب فرمایا جاتا ہے ۔ اس میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ رسول اور منصب رسالت' اس قدر بلند و بالا ہیں کہ جن پر کوئی کلام اور مباحثہ اور مجادلہ نہیں ہو سکتا ۔ بس اللہ کی جانب سے رسول کو اطلاع دے دینا ہی مکمل ثبوت تصور ہوتا ہے ۔

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۳۶ : ۳) عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۳۶ : ٤) "تم یقیناً رسولوں میں سے ہو' سیدھے راستے پر ہو" ۔ رسولوں کے تعین اور تقرر کے بعد بتایا جاتا ہے کہ رسالت کی نوعیت کیا ہے؟ یہ کہ وہ ایک سیدھا راستہ ہے ۔ یہ رسالت تلوار کی دھار کی طرح سیدھی ہوتی ہے ۔ اس میں کوئی ٹیڑھا پن اور کوئی انحراف نہیں ہوتا ۔ نہ اس میں کوئی پیچیدگی ہوتی ہے اور نہ کوئی لچک ہوتی ہے ۔ یہ ایسی سچائی پر مشتمل ہوتی ہے جو بالکل واضح ہوتی ہے ۔ اور اس میں کوئی التباس نہیں ہوتا ۔ نہ وہ خواہشات نفسانیہ کی تابع ہے ۔ اور نہ وہ مصلحتوں کی سمت میں قبلہ بدلتی ہے ۔ جو شخص بھی اس سچائی کی تلاش کرے اور مخلص ہو' یہ اسے مل جاتی ہے ۔

یہ رسالت چونکہ سیدھا راستہ بتاتی ہے اس لیے اس میں نہ کوئی اشکال ہے' نہ پیچیدگی ہے' اور نہ کوئی چکر ہے ۔ یہ مسائل کو مشکل نہیں بناتی ۔ نہ لوگوں کو مشکلات میں ڈالتی ہے' اس کے اندر جدلیاتی مسائل پر مکالمہ نہیں ہوتا ۔ اور نہ فلسفیانہ تصورات میں الجھایا جاتا ہے ۔ یہ سچائی کو نہایت ہی سادہ شکل میں پیش کرتی ہے ۔ اور اس قدر سادہ شکل میں جس میں کوئی شبہ اور کوئی غلط مبحث نہیں ہوتا ۔ اس قدر سادہ کہ اسے مزید تشریح کی ضرورت ہی نہیں ہوتی ۔ الفاظ کا جوڑ توڑ' اور باتوں سے بات نکالنا اس میں پیش ہوتا ہے اور نہ پیچیدہ اور ژولیدہ افکار کو زیر بحث لایا جاتا ہے ۔ اسی رسالت کے ساتھ موجود ہدایات اور ظاہری احکام پر عمل

کرتے ہوئے زندگی بسر کی جا سکتی ہے ـ یہ امی اور عالم دونوں کے لیے ہدایت ہے ـ یہ دیہاتی اور شہری دونوں کے لیے ہدایت ہے ـ ہر شخص اور ہر طبقہ اس کے اندر اپنی ضرورت کی ہدایت پاتا ہے ـ اور اس کے ساتھ اس کی زندگی کی اصلاح ہو جاتی ہے ـ اس کا نظام زندگی درست ہو جاتا ہے ـ زندگی کے طور طریقے درست ہو جاتے ہیں اور انسانوں کے باہم تعلقات نہایت ہی آسانی کے ساتھ سرانجام پاتے ہیں ـ

پھر یہ رسالت اس کائنات کی فطرت اور اس کائنات کے اندر جاری و ساری قانون الٰہی کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے ـ انسان اور انسان کے ماحول میں پائے جانے والی دیگر اشیاء کے ساتھ بھی یہ رسالت ہم آہنگ ہے ـ یہ نہ دنیا کی اشیاء کے ساتھ متصادم ہے' نہ انسان کو یہ رسالت حکم دیتی ہے کہ وہ فطرت کے ساتھ متصادم ہو ـ یہ اپنے منہاج پر درست استوار ہے ـ اور اس کائنات کے ساتھ متوازی ہے ـ یہ معاون ہے' یہ ایک ایسا نظام دیتی ہے جو مکمل کائنات ہے ـ

یہ رسالت اللہ تک پہنچنے کا صحیح راستہ بتاتی ہے' اور اللہ تک پہنچاتی ہے ـ اس رسالت کے متبعین کو بھی یہ خطرہ درپیش نہیں ہوتا کہ وہ راستہ بھلا دیں ـ نہ ان کی راہ میں کوئی ٹیڑھ آتی ہے جو اس وادی میں داخل ہوتا ہے ـ وہ اس کے نشیب و فراز سے ہوتا ہوا سیدھا رضائے الٰہی اور اپنے خالق عظیم تک جا پہنچتا ہے ـ

اس رسالت نے یہ قرآن دیا ہے ـ جو اس سیدھی راہ کا پورا نقشہ بتاتا ہے اور ایک گائیڈ ہے ـ جب انسان اس کتاب کی راہنمائی میں چلے تو وہ سچائی کی سیدھی فکر پا لیتا ہے ـ وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور پھر اس کی قدروں کے بارے میں یہ کتاب فیصلہ کن ہدایت دیتی ہے اور ہر چیز کو اس کی صحیح جگہ پر رکھ دیتی ہے ـ

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ (۳۶ : ۵) "یہ غالب اور رحیم ہستی کا نازل کردہ ہے"۔ ایسے مقامات پر اللہ اپنے بندوں سے اپنے آپ کو متعارف فرماتا ہے تاکہ وہ اللہ کے کلام کی حقیقت کو سمجھیں کہ اللہ غالب ہے اور رحیم ہے ـ وہ غالب ہے لہٰذا جو چاہے کر سکتا ہے ـ اور رحیم ہے' اس لیے اپنے بندوں کے ساتھ رحیمانہ برتاؤ کرتا ہے ـ اس لیے اللہ کے احکام میں رحمت کا پہلو ضرور ہوتا ہے ـ

رہی یہ بات کہ اس قرآن کے نزول کے مقاصد کیا ہیں اور اس کی حکمت کیا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کو انجام بد سے ڈرایا جائے اور ان تک سچائی کا پیغام پہنچایا جائے' خصوصاً

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (۳۶ : ۶) "تاکہ تم خبردار کرو ایسی قوم کو جس کے باپ دادا خبردار نہ کیے گئے تھے اور اس وجہ سے وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں"۔ غفلت وہ بڑی بیماری ہے جس کی وجہ سے دلوں میں فساد پیدا ہو جاتا ہے ـ ایک غافل دل دراصل اپنے فریضہ منصبی کو چھوڑ دیتا ہے' اس لیے وہ ایک عضو معطل ہو جاتا ہے ـ کیونکہ ہدایت اخذ کرنا اور اسے قبول کرنا یہ دل کا کام ہے ـ جب انسانوں کے سامنے دلائل ہدایت پیش کیے جاتے ہیں تو انسانی دل یا تو ان پر غافل ہو کر گزر جاتا ہے اور یا ان دلائل کو اخذ کر لیتا ہے ـ لہٰذا ان غافل لوگوں کو ڈرانا مفید تھا ـ کیونکہ نسلیں گزر گئی تھیں اور اس قوم کے پاس کوئی ڈرانے والا نہ آیا تھا ـ نہ کوئی ایسا شخص آیا تھا جو ان کو متنبہ کرتا ـ یہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امت اور اولاد میں سے تھے ـ اور ان کے بعد صدیاں گزر گئی تھیں ـ اور ان کے پاس کوئی نبی اور نذیر نہ آیا تھا ـ لہٰذا ایسا ڈرانے والا ان کی ضرورت تھا' جو ان کو خواب غفلت سے بیدار کر دے

کیونکہ آباؤ اجداد کے وقت سے یہ لوگ خواب غفلت میں پڑے ہوئے تھے۔

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ ان غافلوں کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ اللہ کے نظام قضا و قدر نے ان کے بارے میں کیا فیصلہ کر دیا ہے کیونکہ اللہ کو ان کے قلوب کے بارے میں خوب علم تھا۔ وہ ان سے سرزد ہونے والے امور کو پہلے سے جانتا تھا۔ انہوں نے جو کیا وہ بھی اللہ کے علم میں تھا اور جو ہونے والا تھا' وہ بھی اس کے علم میں تھا۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۳۶ : ۷) "ان میں سے اکثر لوگ فیصلہ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں اسی لیے وہ ایمان نہیں لاتے"۔ ان کے معاملے میں اللہ نے فیصلہ صادر کر دیا ہے اور اللہ کا فیصلہ ان کے حق میں درست ہے۔ یہ فیصلہ سچائی پر ہوا ہے۔ حق کے مطابق ہے۔ کیونکہ اللہ ان کی حقیقت سے خوب واقف تھا۔ اللہ ان کے شعور اور میلانات سے بھی واقف تھا۔ یہ لوگ ایمان لانے والے ہی نہ تھے۔ اکثریت کا یہی انجام ہے۔ ان کے نفوس اور ہدایت کے درمیان پردے حائل ہو چکے ہیں۔ وہ نہ سچائی کے دلائل کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ ان کو ان کا شعور حاصل ہے۔

جن لوگوں پر اللہ کا فیصلہ حق ہو چکا ان کی نفسیاتی حالت کی تصویر یہ ہے۔ ان کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں' ان طوقوں کے اندر وہ ٹھوڑیوں تک جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ دیکھ بھی نہیں سکتے۔ ان کے اور ہدایت کے درمیان پردے اور رکاوٹیں حائل ہو چکی ہیں۔ ان کی آنکھوں پر پردے پڑ چکے ہیں' اس لیے وہ دیکھنے کے اہل ہی نہیں رہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِىَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ (۳۶ : ۸) وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (۳۶ : ۹)

"ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں جن سے وہ ٹھوڑیوں تک جکڑے گئے ہیں' اس لیے وہ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ ہم نے ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کر دی ہے اور ایک دیوار ان کے پیچھے۔ ہم نے انہیں ڈھانک دیا ہے' انہیں اب کچھ نہیں سوجھتا"۔

ان کے ہاتھ طوقوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ پھر یہ ان کی گردنوں کے ساتھ بندھے ہیں اور ان کی ٹھوڑیوں کے نیچے جکڑ دیئے گئے ہیں۔ اس طرح ان کے سر مجبوراً اوپر کی طرف اٹھ گئے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے سامنے کی طرف نیچے راستے کو دیکھنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ چونکہ وہ اس بری حالت میں ہیں۔ اس لیے نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کچھ کر سکتے ہیں۔ پھر ان کے آگے بھی ایک دیوار ہے اور پیچھے بھی ایک دیوار ہے۔ اس طرح وہ کسی طرح بھی حق تک پہنچنے کے اہل ہی نہیں رہے۔ یہ کسے ہوئے ہیں لہٰذا دیکھ نہیں سکتے۔ آگے پیچھے دیواریں ہیں جن سے ان کی نظریں پار نہیں ہو سکتیں۔ خود اپنی اپنی نالائقی اور بدعملی کی وجہ سے وہ اس نفسیاتی حالت تک پہنچے ہیں۔

یہ منظر حسی ہے اور بڑا شدید منظر ہے لیکن روز مرہ کی زندگی میں ہمیں بے شمار لوگ ملتے ہیں جن کے بارے میں انسان اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ یہ لوگ واضح سچائی کو نہیں دیکھ پا رہے۔ لہٰذا ان کے سامنے ایسے پردے اور ایسی دیواریں حائل ہیں کہ وہ ان سے اس پار نہیں دیکھ سکتے۔ اگر ہاتھ پاؤں یوں بندھے ہوئے نہ بھی ہوں اور ان کے سر اوپر

کی طرف کس نہ بھی دیئے گئے ہوں کہ وہ اوپر ہی کو دیکھ سکتے ہوں' بلکہ وہ بظاہر صحیح سالم اور آزاد ہوں لیکن ان کی نفسیاتی حالت ایسی ہی ہوتی ہے 'کہ وہ اپنی بصیرت کے ذریعے ہدایت کو نہیں دیکھ پاتے اور دلائل ہدایت اور ان کی سوچ کے درمیان غیر مرئی دیواریں حائل نظر آتی ہیں ۔ یہی حالت مکہ کے ان لوگوں کی تھی جنہوں نے قرآن کا استقبال ایسی ہی نفسیاتی حالت کے ساتھ کیا۔ قرآن ان کے سامنے صاف صاف دلائل و نشانیاں پیش کرتا اور وہ انکار پر مصر رہتے ۔ پیش کردہ دلائل کے علاوہ قرآن تو بذات خود معجزانہ دلیل اور نشانی تھا جس کے مقابلے میں کوئی صاحب بصیرت انسان نہیں ٹھہر سکتا تھا مگر یہ لوگ انکار پر مصر رہے ۔

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۳۶ : ۱۰) "ان کے لیے یکساں ہے تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو' یہ نہ مانیں گے"۔ اس لیے کہ ان کے معاملے میں اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کیونکہ اللہ کو علم تھا کہ ان کے دلوں میں ایمان کے راہ پانے کی کوئی صورت نہیں ہے ۔ اور ایسے دلوں پر خبردار کرنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جو ایمان کے لیے تیار ہی نہ ہوں۔ وہ دل جو بند ھے ہوئے ہیں جن کے اور سچائی کے درمیان دیواریں حائل ہوں۔ انذار اور تبلیغ کی وجہ سے مردہ دلوں کو زندہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ غافل اور سوئے ہوؤں کو جگایا جا سکتا ہے ۔ خصوصاً ایسے سوئے ہوئے دلوں کو جو ہدایت لینا چاہیں اور اس کے لیے تیار ہوں ۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ

(۳۶ : ۱۱) "تم تو اسی شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرے' اسے مغفرت اور اجر کریم کی بشارت دے دو"۔ الذکر سے یہاں قرآن کریم مراد ہے ۔ راجح قول یہی ہے ۔ وہ شخص جو قرآن کی تابعداری کرے اور رحمٰن سے بن دیکھے ڈرے' یہی شخص ڈرانے سے استفادہ کر سکتا ہے ۔ گویا یہی شخص ہے جس کے لیے ڈراوا آیا ہے ۔ گویا ایسے ہی شخص کے لیے رسول اللہ کو بھیجا گیا ہے ۔ اگر چہ رسالت عمومی ہے لیکن دوسرے لوگوں اور ہدایت کے درمیان پردے حائل ہو چکے ہیں ۔ لہٰذا ہدایت اس شخص تک محدود ہو گئی جو قرآن کو مان لے اور بن دیکھے رحمٰن سے ڈرے ۔ ایسے ہی لوگ جب وہ ڈراوے سے استفادہ کرتے ہیں تو وہ خوشخبری کے مستحق ہو جاتے ہیں ۔

فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ (۳۶ : ۱۱) "اسے مغفرت اور اجر کریم کی بشارت دے دو"۔ مغفرت ان غلطیوں پر جو واقع ہو گئیں اور ان پر اصرار نہ کیا گیا۔ اور اجر کریم اس لیے کہ یہ شخص غائبانہ طور پر اللہ سے ڈرتا رہا۔ اور اللہ کی جانب سے جو یاد دہانی آتی رہی اس کا اتباع کرتا رہا۔ یہ دونوں چیزیں قلب مومن میں باہم دگر لازم و ملزوم ہیں ۔ جب بھی کسی دل میں خدا کا خوف پیدا ہو تو انسان خدا کی ہدایات پر عمل شروع کر دیتا ہے اور جس نظام زندگی کا اس نے ارادہ کیا اس پر استقامت حاصل ہو جاتی ہے ۔

چنانچہ یہاں یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ ایک دن تم نے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے ' تمہارا حساب نہایت وقت کے ساتھ تیار ہو گا اور اس میں سے کوئی بات چھوٹی ہوئی نہ ہو گی ۔

اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیِ الۡمَوۡتٰی وَ نَکۡتُبُ مَا قَدَّمُوۡا وَ اٰثَارَہُمۡ ؕ وَ کُلَّ شَیۡءٍ اَحۡصَیۡنٰہُ فِیۡۤ

اِمَامٍ مُّبِیۡنٍ (۳۶ : ۱۲) "یقیناً ہم ایک روز مردوں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ جو کچھ افعال انہوں نے کیے ہیں وہ سب ہم لکھتے جا رہے ہیں اور جو کچھ آثار انہوں نے پیچھے چھوڑے ہیں وہ بھی ہم ثبت کر رہے ہیں۔ ہر چیز کو ہم نے ایک کھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے"۔

مردوں کو دوبارہ زندہ کرنا وہ مسئلہ ہے جس پر ہمیشہ مباحثہ ہوتا رہا ہے۔ اس سورت میں بھی اس کے امکان پر کئی مثالیں دی جائیں گی۔ یہاں ان کو ڈرایا جاتا ہے کہ وہ جو اعمال بھی کر رہے ہیں اور اپنے پیچھے جو بھی اچھے یا برے آثار چھوڑ رہے ہیں وہ سب اللہ کے ہاں ریکارڈ ہو رہے ہیں۔ ان اعمال میں سے نہ کوئی چیز چھوٹ سکتی ہے اور نہ بھول سکتی ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ وہی ہے جو ان کے اعمال و آثار کو قلم بند کر رہا ہے۔ وہی ہے جو ہر چیز کو لکھ رہا ہے۔ لہٰذا یہ تمام امور اسی طرح ظہور پذیر ہوں گے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے دست قدرت سے انہیں ظاہر کرے گا اور جس طرح اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہے کہ وہ ان امور کو اسی طرح ظاہر کرے گا۔

امام مبین سے مراد لوح محفوظ ہے یا وہ دفتر جہاں اللہ کے نظام کے مطابق اعمال ریکارڈ ہوتے ہیں 'لوح محفوظ سے اللہ کا ازلی اور قدیم علم مراد ہے۔ اور اللہ کا علم ہر چیز کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔

--- ooo---

وحی و رسالت کے مسئلے کے اس تاکیدی بیان اور قضیہ حساب و کتاب کے اس اٹل اعلان کے بعد 'اب اسی مضمون کو قصے کی صورت میں لایا جاتا ہے۔ اس قصے میں ایمان اور کفر کے جو دو باہم متقابل موقف سامنے آتے ہیں وہ نفس انسانی پر نہایت گہرے اثرات چھوڑتے ہیں اور دونوں موقف کا انجام بھی آنکھوں کے سامنے منقش نظر آتا ہے۔

وَ اضۡرِبۡ لَہُمۡ مَّثَلًا اَصۡحٰبَ الۡقَرۡیَۃِ ۘ اِذۡ جَآءَہَا الۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۱۳﴾ اِذۡ
اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡہِمُ اثۡنَیۡنِ فَکَذَّبُوۡہُمَا فَعَزَّزۡنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوۡۤا اِنَّاۤ اِلَیۡکُمۡ
مُّرۡسَلُوۡنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوۡا مَاۤ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ۙ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ الرَّحۡمٰنُ مِنۡ شَیۡءٍ ۙ
اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا تَکۡذِبُوۡنَ ﴿۱۵﴾ قَالُوۡا رَبُّنَا یَعۡلَمُ اِنَّاۤ اِلَیۡکُمۡ لَمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۱۶﴾ وَ
مَا عَلَیۡنَاۤ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۷﴾ قَالُوۡۤا اِنَّا تَطَیَّرۡنَا بِکُمۡ ۚ لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَہُوۡا
لَنَرۡجُمَنَّکُمۡ وَ لَیَمَسَّنَّکُمۡ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱۸﴾ قَالُوۡا طَآئِرُکُمۡ مَّعَکُمۡ ؕ اَئِنۡ ذُکِّرۡتُمۡ ؕ
بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ مُّسۡرِفُوۡنَ ﴿۱۹﴾

”انہیں مثال کے طور پر اس بستی والوں کا قصہ سناؤ جب کہ اس میں رسول آئے تھے ۔ ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے اور انہوں نے دونوں کو جھٹلا دیا۔ پھر ہم نے تیسرا مدد کے لیے بھیجا اور ان سب نے کہا ”ہم تمہاری طرف رسول کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں“۔ بستی والوں نے کہا ”تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے چند انسان اور خدائے رحمٰن نے ہرگز کوئی چیز نازل نہیں کی ہے ' تم محض جھوٹ بولتے ہو“۔

رسولوں نے کہا ”ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم ضرور تمہاری طرف رسول بناکر بھیجے گئے ہیں ' اور ہم پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے“۔ بستی والے کہنے لگے ”ہم تو تمہیں اپنے لیے فال بد سمجھتے ہیں۔ اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے اور ہم سے تم بڑی دردناک سزا پاؤ گے“۔ رسولوں نے جواب دیا ”تمہاری فال بد تو تمہارے اپنے ساتھ لگی ہوئی ہے ۔ کیا یہ باتیں تم اس لیے کرتے ہو کہ تمہیں نصیحت کی گئی؟ اصل بات یہ ہے کہ تم حد سے گزرے ہوئے لوگ ہو“۔

قرآن کریم نے اصحاب قریہ کا نام نہیں لیا' نہ اس گاؤں کا اتہ پتہ بتایا ہے ۔ اس کے بارے میں مفسرین نے بہت سی روایات نقل کی ہیں ۔ ان روایات کے پیچھے پڑنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے ۔ نہ ان پر بحث کی ضرورت ہے ۔ قرآن کریم کا اس شہر کا نام نہ لینا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ قصہ کے جو مقاصد ہیں ان میں اس گاؤں کا نام لینے سے کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس شہر اور اس کے محل وقوع کا نام نہیں لیا۔ اور قصے' اور اس سے حاصل ہونے والے سبق ہی پر اکتفاء کیا۔ بہرحال یہ ایک گاؤں تھا جس کی طرف دو رسول بھیجے گئے تھے ۔ جس طرح حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہما السلام دونوں کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا گیا تھا۔ اس گاؤں والوں نے ان رسولوں کی تکذیب کی ۔ اللہ نے ان دونوں رسولوں کی تائید میں ایک تیسرا رسول بھی بھیج دیا اور اس تیسرے نے لوگوں کو بتایا کہ یہ دونوں برحق رسول ہیں' چنانچہ ان تینوں نے از سرنو اپنی دعوت کا آغاز کیا۔

فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ (۳۶ : ۱۴) ”ان سب نے کہا ہم تمہاری طرف رسول کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں“۔ اب اس گاؤں والوں نے ان پر وہی گھسے پٹے اعتراضات کیے جو ہمیشہ رسولوں پر ہوتے ہیں۔

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَ مَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ

(۳۶ : ۱۵) ”بستی والوں نے کہا ”تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے چند انسان اور خدائے رحمٰن نے ہرگز کوئی چیز نازل نہیں کی ہے ' تم محض جھوٹ بولتے ہو“۔ یہ اعتراضات جو تمام رسولوں پر ہوتے رہے ہیں' ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بہت ہی سادہ لوح تھے اور ان کی سوچ ناپختہ تھی ۔ یہ لوگ رسول اور رسالت کے بارے میں عجیب تصورات رکھتے تھے ۔ ان کے خیال میں رسول کی شخصیت ایک پر اسرار شخصیت ہونا چاہئے اور اس کی شخصیت کے ساتھ بہت سے اوہام اور قصے منسوب ہونے چاہئیں ۔ اس لیے کہ رسول آسمان کی طرف سے زمین والوں کی طرف آتا ہے لہٰذا اس کی شخصیت کے ساتھ اوہام و اساطیر وابستہ ہونا ضروری ہیں ۔ یہ کیسے ممکن ہو کہ ایک رسول کھلا اور سادہ انسان ہو۔ ہماری طرح اس کی زندگی میں کوئی راز نہ ہو اور نہ کوئی عجوبہ ہو ۔ ہم جیسا ایک عام اور معمولی انسان رسول کس طرح ہو

سکتا ہے جو بازاروں میں پھرتا ہو اور ہمارے جیسے گھروں میں رہتا ہو۔

یہ تھی ان کے فکر اور ان کی سوچ کی سادگی۔ اس لیے کہ نبوت کے ساتھ پراسراریت لازم نہیں ہے، لیکن مقام نبوت اس قدر سادہ بھی نہیں ہے جس طرح یہ لوگ سمجھے ہیں۔ منصب رسالت اور منصب نبوت میں ایک عظیم اور گہرا راز بھی پوشیدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک عام اور سادہ انسان کے اندر ایسی استعداد پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ایک عام انسان ہونے کے باوجود باری تعالیٰ سے وحی وصول کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات اس سے زیادہ تعجب خیز ہے کہ ایک رسول فرشتہ ہو جیسا کہ ان لوگوں کی تجویز تھی کہ رسول کو تو فرشتہ ہونا چاہئے۔

اصل بات یہ ہے کہ رسالت کا مقصد لوگوں کو اسلامی نظام زندگی سے روشناس کرنا ہوتا ہے اور رسول کی زندگی اس نظام کا عملی نمونہ ہوا کرتی ہے اور رسول کی دعوت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو اس عملی نظام کے اتباع کی طرف بلاتا ہے۔ لوگ چونکہ انسان ہیں، اس لیے ان کا مقتدا بھی انسان ہونا چاہئے تاکہ وہ ان لوگوں کے لیے عملی نمونہ پیش کر سکے۔ اور وہ اس کی تقلید کر سکیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہر رسول کی زندگی لوگوں کے لیے ایک کھلی کتاب ہوا کرتی ہے۔ قرآن جو اللہ کی محکم کتاب ہے، اس نے اس تفصیلی زندگی کے ایک معنوی اور اصولی حصے کو قلم بند کیا، تفصیلات کے بجائے اصول لکھ دیئے۔ باقی تفصیلی نظام زندگی رسول وقت کی عملی زندگی سے اخذ کرتی ہے اور وہ عملی زندگی ایک کھلی کتاب کے طور پر تمام امت کے سامنے ہوتی ہے اور کئی سالوں پر پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ ان تفصیلات میں رسول کی خاندانی اور گھریلو زندگی کے خدوخال اور اجتماعی زندگی کے نمونے سب موجود ہوتے ہیں۔ بعض اوقات قرآن نے تو رسول کی نفسیاتی کیفیات کو بھی قلم بند کیا ہے تاکہ آنے والی امتیں بھی دیکھیں کہ نبی امین کی قلبی کیفیت کیا تھی۔

یہ تھی وہ واضح اور قریب الفہم حقیقت جس پر ہمیشہ انسانوں کی طرف سے اعتراض ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ اس گاؤں کے باشندوں نے تینوں رسولوں سے یہ کہا

مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (۳۶ : ۱۵) "تم اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم جیسے انسان ہو"۔ یہ تم محض دعویٰ کر رہے ہو کہ تم رسول ہو۔

اب ذرا رسولوں کا جواب دیکھیں۔ وہ حقیقت حال سے واقف ایک مطمئن اور پر اعتماد شخص کی طرح جواب دیتے ہیں۔

قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ (۳۶ : ۱۶) وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ

(۳۶ : ۱۷) "رسولوں نے کہا، ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم ضرور تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور ہم پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے"۔ اللہ جانتا ہے کہ ہم رسول ہیں، بس یہی ہمارے لیے کافی ہے۔ ہمارا فریضہ صرف یہ ہے کہ رب کا پیغام پہنچا دیں۔ اور یہ تو ہم نے ادا کر دیا ہے۔ اس کے بعد لوگ آزاد ہیں اپنی زندگی میں جو تصرف چاہیں کریں۔ اور وہ جو رویہ بھی اختیار کریں گے، اس کی ذمہ داری وہ اٹھائیں گے۔ رسولوں اور

استوں کے درمیان تعلق صرف فریضہ رسالت کی ادائگی کا ہے ۔ جب یہ فریضہ ادا کر دیا گیا تو اس کے نتائج اللہ کے اختیار میں ہیں اور اللہ ہی کے حوالے ہیں ۔

لیکن جاہلی گروہ اور جھٹلانے والے اس معاملے کو اس طرح سادگی سے اور آسانی سے نہیں لیتے ۔ وہ داعیان حق کو برداشت کرنے کے روادار بھی نہیں ہوتے ۔ ان کو ان کا غرور نفس مجبور کرتا ہے کہ وہ کوئی سخت قدم اٹھائیں ۔ وہ محبت اور دلیل کے مقابلے میں تشدد اور بدمزاجی اور سخت کلامی کا سہارا لیتے ہیں کیونکہ باطل ہمیشہ تمرّد والا ہوتا ہے ۔

قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ

(۱۸:۳۶) بستی والے کہنے لگے ہم تو تمہیں اپنے لیے فال بد سمجھتے ہیں ۔ اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے اور ہم سے تم بڑی دردناک سزا پاؤ گے " ۔ تم منحوس لوگ ہو ' تمہاری وجہ سے ہم پر مصیبت آگئی ہے ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تمہاری دعوت کی وجہ سے ہماری بستی میں شر و فساد پھیل جائے گا ۔ اگر تم باز نہ آئے تو ہم خاموش نہ رہ سکیں گے ۔ اور ہمارے لیے یہ ممکن نہ ہو گا کہ تم اس طرح دعوت دیتے چلے جاؤ ۔

لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۸:۳۶) "اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے اور ہم سے تم بڑی دردناک سزا پاؤ گے " ۔ یوں باطل نے اپنی برہمی کا اظہار کر دیا اور ہدایت دینے والوں کو دھمکی دے دی اور پرامن کلمہ حق کے مقابلے میں سرکشی اختیار کی اور فکر و خیال اور انداز گفتگو میں بدمستی کا اظہار کیا ۔

لیکن رسولوں کا فریضہ تو یہ ہے کہ جیسے بھی حالات ہوں وہ اپنی راہ پر چلتے رہیں ۔ اس لیے ان کا رویہ بالکل مختلف ہے ۔

قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ (۱۹:۳۶) "رسولوں نے کہا تمہاری فال بد تمہارے اپنے ساتھ لگی ہوئی ہے " ۔ اس لیے کہ نیک فالی یا بدفالی دونوں جاہلیت کے خرافات میں ہیں ۔ اور رسولوں کے مشن میں یہ بھی داخل ہے کہ اس وہم کو بھی دور کیا جائے ۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کو خیر و شر باہر سے نہیں ملتا بلکہ خیر اور شر دراصل خود اس کے نفس کے اندر سے پیدا ہوتا ہے ۔ خیر اور شر تو تمہارے ساتھ لگا ہوا ہے ۔ تمہاری نیتوں اور تمہارے اعمال سے آنے والے خیر و شر کا گہرا ربط ہے اور خیر و شر کا مدار تمہارے اعمال پر ہے ۔ یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ تم آنے والے واقعات کو اپنے لیے بہتر بناؤ اور نیک انجام پاؤ یا اسے خود اپنے لیے شر بنا دو کیونکہ اللہ لوگوں کے بارے میں وہی فیصلے کرتا ہے جن کے لیے ان کے نفوس میں میلان ہو اور اپنے عمل کی وجہ سے اس طرف انسانوں کا رجحان ہو ۔ لہٰذا تمہارا شگون اور بدشگونی تمہارے ساتھ اور تمہارے نفوس کے اندر ہے ۔ یہ ہے ایک قائم اور دائم حقیقت ۔ رہی یہ بات کہ کسی کا منہ دیکھ کر فال بد لینا ' یا کسی جگہ سے بدشگونی یا الفاظ سے بدشگونی لینا یہ خرافات جاہلیت میں سے ایک موہوم بات ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ۔

اس لیے رسولوں نے کہا اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ (۱۹:۳۶) "کیا یہ باتیں تم اس لیے کرتے ہو کہ تمہیں نصیحت کی گئی ؟ " یعنی تم ہمیں رجم کرنے کی دھمکی اس لیے دیتے ہو یا ہمیں سخت سزا اس لیے دیتے ہو کہ ہم تمہیں نصیحت کر رہے

ہیں اور راہ بد سے بچا رہے ہیں۔

بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ (۳۶: ۱۹) "اصل بات یہ ہے کہ تم حد سے گزرے ہوئے لوگ ہو"۔ یعنی اپنی سوچ اور واقعات کو وزن کرنے میں تم حدود سے نکل چکے ہو' تم نصیحت کا بدلہ دھمکی سے دیتے ہو' اور تشدد پر اتر آئے ہو۔ اور دعوت اسلامی کے جواب میں تشدد اور قتل کی بات کرتے ہو۔

---ooo---

جن لوگوں کے دلوں پر پردے پڑگئے تھے۔ ان کی جانب سے رسولوں کی دعوت کا جواب یہ دیا گیا اور یہ ہے مثال ان سرکش لوگوں کی جو ہمیشہ دعوت اسلامی کی راہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور تشدد پر اتر آتے ہیں۔ جب بھی دعوت اسلامی کا آغاز ہو گا اس قسم کے لوگ متحرک ہو جائیں گے۔ یہ ہے راہ ورسم دعوت اللہ کے کام کی۔

اس کے بالمقابل انسانوں میں سے ایک دوسرا نمونہ بھی ہوتا ہے جو نصیحت قبول کر کے اس کی اطاعت کرتا ہے۔ رحمن سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔ اس لیے اس دوسرے نمونے کا رویہ بالکل پہلے رویے سے مختلف ہوتا ہے۔ اور اس کا ردعمل پہلے والے لوگوں کے ردعمل سے بالکل جدا ہوتا ہے۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾

"اتنے میں شہر کے دور دراز گوشے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور بولا "اے میری قوم کے لوگو' رسولوں کی پیروی اختیار کر لو۔ پیروی کرو ان لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں"۔

یہ ہے نمونہ فطرت سلیمہ کا۔ جب فطرت سلیمہ ایک سیدھے سادے حق کو سنتی ہے تو وہ فوراً تصدیق کرتی ہے۔ نہایت سادگی اور نہایت ہی گرم جوشی کے ساتھ اور فطرت سلیمہ کی فکر مستقیم ہوتی ہے۔ اور وہ پر شوکت سچائی کے مقابلے میں جوش و خروش سے لبیک کہتی ہے۔

یہ ایک شخص بھی اسی معاشرے اور گاؤں کا فرد ہے' دعوت اسلامی کو سنتے ہی وہ لبیک کہتا ہے۔ وہ سچائی کے دلائل و نشانات کو اچھی طرح پاتا ہے۔ رسولوں اور ان کی قوم کے درمیان جو مکالمہ ہوا ہے اس کے اندر پائے جانے والی گہری منطق کو وہ پا لیتا ہے۔ جب یہ سچائی اس کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو گئی تو وہ فوراً حرکت میں آجاتا ہے۔ اب وہ خاموش نہیں رہ سکتا۔ یہ اپنا دروازہ بند کر کے اپنے گھر میں بیٹھا بھی نہیں رہتا جبکہ اس کے ارد گرد گمراہی کا دور دورہ ہو' فسق و فجور عام ہو اور لوگ کفر کر رہے ہوں' اس کے ضمیر کے اندر جو سچائی اتر چکی ہے اور جس کو اس کا شعور حق تسلیم کر چکا ہے وہ اسے لے کر دوڑتا ہوا آتا ہے' وہ اپنی قوم کے پاس آتا ہے' یہ قوم جو انکار کر رہی ہے' دھمکیاں دے رہی ہے' تشدد پر اتر آئی ہے۔ یہ شخص شہر کے مضافاتی علاقے میں رہتا ہے۔ یہ اپنا فریضہ ادا کرنے کے لیے بھاگ نکلا ہے۔ اور اپنی اس منکر حق قوم کو دعوت حق دیتا ہے ان کو بغاوت' سرکشی اور تشدد سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے جس کا وہ اپنے رسولوں کے بارے میں ارادہ کر چکے ہیں۔

معلوم یوں ہوتا ہے کہ یہ شخص اس سوسائٹی کا کوئی بااثر فرد نہ تھا۔ نہ اس کے پاس کوئی خاندانی وجاہت اور قوت تھی کہ اس کو ان سرکشوں کے تشدد سے بچائے۔ ہاں اس کے قلب میں ایک زندہ اور پرجوش ایمان تھا۔ یہ ولولہ انگیز ایمان تھا جو اسے بستی کے مضافات سے اٹھا لایا۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ رَجُلٌ یَّسْعٰى قَالَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ (۳۶:۲۰)

اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۳۶:۲۱) ”اتنے میں شہر کے دور دراز گوشے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور بولا ”اے میری قوم کے لوگو ' رسولوں کی پیروی اختیار کر لو۔ پیروی کرو ان لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں“۔

جو شخص اس قسم کی تحریک اٹھاتا ہے اور اس پر کوئی اجر طلب نہیں کرتا ' نہ کوئی مفاد اس کا اس تحریک سے وابستہ ہوتا ہے۔ بے شک وہ سچا ہے۔ اگر یہ فریضہ اس کی جانب سے عائد نہیں ہے اور اللہ کے لیے نہیں ہے تو پھر وہ کیوں یہ سب کچھ برداشت کرتا ہے۔ لہٰذا لازی نتیجہ ہے کہ یہ سچا ہے۔ اگر سچا نہیں تو پھر وہ کیوں خواہ مخواہ یہ مشکلات برداشت کرتا ہے۔ لوگوں کو ایسے خیالات و نظریات دیتا ہے جن کے وہ عادی نہیں ہیں 'لوگ اسے اذیت دیتے ہیں ' اس کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں 'اس کے ساتھ مذاق کرتے ہیں 'اس سے انتقام لیتے ہیں ' وہ یہ سب کچھ برداشت کرتا ہے۔ حالانکہ اس کا کوئی مفاد اس کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ نہ وہ کوئی اجرت طلب کرتا ہے۔ لہٰذا معقول راہ یہی ہے کہ

اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۳۶:۲۱) ”پیروی اختیار کرو ان لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں“۔

ان کی ہدایت تو ان کی دعوت اور ان کے کردار سے واضح ہے۔ وہ فقط ایک اللہ کی دعوت دیتے ہیں اور یہ نہایت ہی معقول بات ہے۔ وہ ایک واضح منہاج زندگی کی طرف دعوت دیتے ہیں جو واضح طور پر معقول ہے۔ وہ ایسے عقائد و نظریات کی طرف دعوت دیتے ہیں جن میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے اور نہ کوئی وہم و گمان ہے۔ یہ لوگ دراصل ایک نہایت ہی درست اور سیدھے راستے کی طرف راہ پا چکے ہیں اور ہدایت یافتہ ہیں۔

اس پورے معاشرے اور بستی سے پھر یہ اکیلا شخص کیوں ایمان لایا۔ اس کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ دیکھو میرے ایمان کے اسباب یہ ہیں۔ میری فطرت جاگ اٹھی ہے۔ اور اپنی فطری سلامتی کی وجہ سے بات میری سمجھ میں آگئی ہے اور کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ اس دعوت سے کوئی سلیم الفطرت شخص منہ موڑے۔

---()()()---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ------ ۲۳

سورۃ یٰسین ۔ ۳۶

آیات ۲۲--- تا--- ۸۳

سورۃ الصفات ۔ ۳۷

آیات ۱--- تا--- ۱۸۲

سورۃ ص ۔ ۳۸

آیات ۱--- تا--- ۸۸

سورۃ الزمر ۔ ۳۹

آیات ۱--- تا--- ۳۱

**وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾**

"آخر کیوں نہ میں اس ہستی کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے؟ کیا میں اسے چھوڑ کر دوسرے معبود بنا لوں؟ حالانکہ اگر خدائے رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو نہ ان کی شفاعت میرے کسی کام آ سکتی ہے اور نہ وہ مجھے چھڑا ہی سکتے ہیں۔ اگر میں ایسا کروں تو میں صریح گناہوں میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ میں تو تمہارے رب پر ایمان لے آیا' تم بھی میری بات مان لو"۔

یہ سوچ اور یہ سوالات ایک ایسی فطرت کے ہیں جسے خالق کائنات کا شعور حاصل ہو چکا ہو' جو اپنے مقصد وجود کو پا چکی ہو اور اس کے ساتھ پوری طرح وابستہ ہو چکی ہو۔ پھر اس کی پکار یہ ہوتی ہے۔

وَمَالِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ (۳۶ : ۲۲) "آخر کیوں نہ میں اس ہستی کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا"۔ آخر میں اس فطری منہاج سے کیوں ہٹ جاؤں جو میرے دل میں پیوست ہو چکا ہے۔ کیونکہ انسان کے اندر اس ذات کی کشش ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ سب سے پہلے انسانی فطرت خدا اور خالق کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اور اگر فطرت اس راہ سے انحراف کرتی ہے تو اس کے اسباب خارجی ہوتے ہیں اور یہ گمراہ کن اسباب اور موثرات انسانی طبیعت کے اندر نہیں ہوتے۔ اور خالق کی طرف توجہ فطرت کا پہلا اور بہترین داعیہ ہوتا ہے۔ یہ فطرت کے اندر ہوتا ہے اور اس کے لیے کسی بیرونی محرک یا موثر کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ نفس انسانی فطری طور پر اس کی طرف مائل ہوتا ہے جب کسی کے دل میں ایمان داخل ہو جاتا ہے کہ تو نفس کے اندر گہرائیوں میں وہ اپنے خالق کو محسوس کرتا ہے۔ اس رجل مومن کی یہ تعبیر اس کے اس فطری میلان کا ظہور ہے۔ بلا تکلف وہ پکار اٹھتا ہے کہ کیوں میں اس خالق کی بندگی نہ کروں؟

یہ فطرت سلیمہ یہ بات بھی محسوس کرتی ہے کہ آخرکار انسان نے اپنے خالق ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ اسی لیے وہ کہتا ہے وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۳۶ : ۲۲) "اور اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے"۔ فطری سوچ یہ ہے کہ جس نے میری تخلیق کی ہے میں اس کی بندگی کیوں نہ کروں؟ جبکہ تم سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے کیونکہ تمہارا خالق بھی تو وہ ہے' اور تمہارا حق بھی یہ ہے کہ تم بھی اسی کی بندگی کرو۔

اب یہ رجل مومن مخلصانہ رویہ پر بھی تبصرہ کرتا ہے کہ میرا رویہ اور میری سوچ تو معقول اور فطری ہے اور اس کے خلاف اگر میں رویہ اختیار کروں تو وہ خلاف فطرت اور گمراہانہ ہو گا۔

ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ (۳۶ : ۲۳)

"کیا میں اسے چھوڑ کر دوسرے معبود بنا لوں حالانکہ اگر خدائے رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو نہ ان کی شفاعت

میرے کسی کام آ سکتی ہے اور نہ وہ مجھے چھڑا ہی سکتے ہیں' ۔

اس سے بڑا گمراہ اور کون ہو سکتا ہے جو اس فطری سوچ کو ترک کر دے کہ جو ہر مخلوق کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنے خالق کی عبادت کرے اور ایسے معبودوں کی بندگی نہ کرے جو خالق نہیں ہیں ۔ جن کا کوئی جواز نہیں اور جن میں کوئی معقولیت نہیں ۔ اور یہ معبود ہوں بھی ضعیف و ناتواں' نہ کسی کی حمایت کر سکتے ہیں اور نہ کسی سے مدافعت کر سکتے ہیں' خصوصاً جبکہ حقیقی خالق کسی کو اس کی گمراہی کی وجہ سے سزا دینا چاہے ۔

اِنِّیْٓ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۳۶ : ۲۴) "اگر میں ایسا کروں تو میں صریح گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا" ۔ اس رجل مومن نے لوگوں کے سامنے فطری سوچ تو پیش کر دی' نہایت ہی سچے اور عارفانہ اور واضح انداز میں ۔ اب وہ خود اپنا فیصلہ ان کو سناتا ہے ۔ وہ جو تکذیب پر تلے ہوئے' وہ جو تشدد پر آمادہ ہیں ۔ یہ فیصلہ وہ اس لیے سناتا ہے کہ یہ فطری آواز اس کے دل کو ایمان سے بھر چکی ہے ۔ اس کا دل اب کسی دھمکی اور کسی نامعقول تہدید و تکذیب کو خاطر ہی میں نہیں لاتا ۔ وہ کہتا ہے ۔

اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ (۳۶ : ۲۵) "میں تمہارے رب پر ایمان لایا ہوں سن لو میری بات" ۔ یوں اس نے نہایت اطمینان' نہایت اعتماد کے ساتھ اپنے ایمان کا آخری اعلان کیا اور اس پر اس نے خود ان کو گواہ ٹھہرایا ۔ اشارہ یہ دیا کہ جس طرح میں ایمان لایا ہوں تم بھی ایمان لاؤ کیونکہ میں جس رب پر ایمان لایا ہوں وہ تمہارا ہی رب ہے یا یہ کہ سن لو میں ایمان لایا ہوں جو چاہو کرو' جو چاہو کہو ۔

--- ○○○ ---

اس کے بعد اس رجل مومن کی تقریر پر جو تبصرہ آتا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اس شخص کو تو وہیں شہید کر دیا ۔ اگرچہ قرآن کریم نے اس کی صراحت نہیں کی ۔ لیکن اس قصے کا وہ منظر جو اس دنیا سے تعلق رکھتا ہے' وہ ختم ہو جاتا ہے ۔ پردہ گر جاتا ہے ۔ دنیا اور اس کے اندر اس کی قوم کے ساتھ یہ مکالمہ ختم ہوتا ہے ۔ اب یہ شہید آخرت میں نظر آتا ہے ۔ جس نے کلمہ حق بلند کیا' جس نے اپنی فطرت کی پکار پر لبیک کہا' اور جس نے اپنے ایمان کا اعلان ان لوگوں کے سامنے جہاراً کیا جو نبیوں کو بھی قتل اور تشدد کی دھمکیاں دے رہے تھے ۔ اب یہ شخص عالم آخرت میں ہے ۔ وہاں اللہ کے ہاں اس کا عظیم استقبال ہو رہا ہے ۔ جیسا کہ مومنین صادقین اور شہداء کا وہاں ہوتا ہے ۔

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۷﴾

"(آخر کار ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا اور) اس شخص سے کہہ دیا گیا کہ "داخل ہو جا جنت میں" ۔ اس نے کہا "کاش میری قوم کو یہ معلوم ہوتا کہ میرے رب نے کس چیز کی بدولت میری مغفرت فرما دی اور مجھے باعزت لوگوں میں داخل فرمایا" ۔

یہاں دنیا کی زندگی کے ڈانڈے آخرت سے مل جاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ موت اور شہادت نے اسے عالم فنا سے عالم بقا کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ یہ ایک جست ہوتی ہے جس کے ذریعے ایک مومن دنیا کی تنگنائیوں سے نکل کر جنت کی وسعتوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ باطل کی زیادتیوں سے رہائی پا کر سچائی کی مطمئن دنیا میں داخل ہو جاتا ہے اور تشدد کی دھمکیوں سے نکل کر 'امن و سلامتی کی نعمتوں میں پہنچ جاتا ہے اور جاہلیت کے اندھیروں سے یقین کی روشنی میں آ جاتا ہے۔

اب ہم اس رجل مومن کو دیکھتے ہیں۔ یہ ان انعامات و اکرامات کی اطلاع چشم زدن میں پا چکا ہے۔ لیکن وہاں سے بھی قوم کے نام اس کی ایک پکار آتی ہے' اس کی اس پکار میں کوئی تلخی نہیں ہے اس کا نفس راضی ہے' وہاں بھی وہ یہی تمنا کرتا ہے کہ لے کاش میری قوم جانتی کہ میں کہاں پہنچ چکا ہوں' اللہ کے اکرام اور انعام کی کیا شان ہے تاکہ وہ بھی حق کو قبول کر لیں اور ان کو بھی یقین کی دلالت مل جائے۔

---()()()---

یہ تو ہے جزائے ایمان' رہے نبیوں کے مقابلے میں ڈٹ جانے ۔۔۔ تو ان کی حیثیت ہی کیا ان کو تو اللہ اپنے ملائکہ کے ذریعے ہلاک کر سکتا ہے۔ وہ تو بہت ہی ضعیف و حقیر ہیں۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿۲۹﴾

"اس کے بعد اس کی قوم پر ہم نے آسمان سے کوئی لشکر نہیں اتارا۔ ہمیں لشکر بھیجنے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ بس ایک دھماکہ ہوا اور یکایک وہ سب بجھ کر رہ گئے"۔

ان سرکشوں کا کیا انجام ہوا' یہاں اللہ تعالیٰ ان کو حقیر سمجھتے ہوئے قلم زد فرما دیتا ہے۔ ان حقیر لوگوں کے خلاف کسی لشکر کشی کی ضرورت نہ تھی۔ بس اچانک ایک دھماکہ ہوا' ایک سخت چیخ اٹھی اور وہ بجھ کر رہ گئے۔ یہاں اب ان لوگوں کے اس حسرتناک' ذلت آمیز اور توہین آمیز انجام پر پردہ گرتا ہے۔ اور یہ منظر یہاں لپیٹ لیا جاتا ہے۔

---()()()---

# درس ۲۰۶ ایک نظر میں

پہلے سبق میں بات ان لوگوں کے بارے میں تھی جنہوں نے دعوت اسلامی کا استقبال انکار اور تکذیب کے ساتھ کیا۔ اور اس کا انجام ان کے گاؤں کا قصہ بیان کر کے بتایا گیا کہ ان جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ ان کا انجام یہ ہوا کہ

فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ (۳۶ : ۲۹) "اچانک وہ بجھ کر رہ گئے"۔ لیکن اس سبق میں تمام ملتوں اور تمام کتب سماوی کے مکذبین کا انجام بتایا گیا ہے۔ اور پوری انسانی تاریخ سے گمراہ انسانوں کے خدوخال اور نقوش یہاں بتائے گئے ہیں اور یہاں نہایت ہی دلدوز آواز و انداز میں پکارا جاتا ہے کہ تعجب ہے کہ لوگ ان اقوام کی تاریخ سے سبق نہیں سیکھتے۔ جن کو سچائی کو جھٹلانے کی وجہ سے ہلاک کیا گیا۔ یہ مکذبین وہ ہیں جو گمراہی کے راستے پر آگے ہی بڑھ رہے ہیں اور یوم الدین کا انہیں کوئی خیال نہیں ہے۔

وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ (۳۶ : ۳۲) "ان سب کو ایک روز ہمارے سامنے حاضر کیا جانا ہے"۔

اس کے بعد تکوینی دلائل اور معجزات اور نشانیوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ یہ وہ نشانیاں ہیں جن کو یہ لوگ رات اور دن دیکھتے ہیں اور نہایت ہی لاپرواہی سے ان پر سے گزر جاتے ہیں۔ یہ خود ان کے نفوس کے اندر بھی موجود ہیں۔ ان کے ماحول میں بھی موجود ہیں۔ ان کی قدیم تاریخ میں بھی موجود ہیں لیکن ان کو اس کا شعور نہیں ہے اور جب ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو وہ یاد نہیں کرتے۔ سبق نہیں حاصل کرتے۔

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ (۳۶ : ۴۶) "ان کے سامنے ان کے رب کی آیات میں سے جو آیت بھی آتی ہے، یہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے"۔ اس کے برعکس یہ لوگ اللہ کے عذاب کے بارے میں جلد آنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور یہ مطالبہ وہ اس لیے کرتے ہیں کہ ان کو عذاب کے آنے کا کوئی یقین نہیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۶ : ۴۸) "کہتے ہیں کہ یہ قیامت کی دھمکی آخر کب پوری ہوگی؟ بتاؤ اگر تم سچے ہو"۔

چونکہ یہ لوگ عذاب میں شتابی کا مطالبہ کرتے ہیں، قیامت کے آنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور دل میں یہ ہے کہ ان کو ان امور کے واقع ہونے کا یقین نہیں ہے۔ اس لیے یہاں مناظر قیامت میں سے ایک طویل منظر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ منظر صاف صاف بتاتا ہے کہ ان کا انجام کیا ہوگا، جس کے واقع ہونے کی ان کو بہت جلدی ہے۔ یہ منظر اس انداز میں بیان کیا جاتا ہے کہ گویا ان کا انجام واقع ہو گیا اور یہ لوگ اسے دیکھ رہے ہیں۔

# درس نمبر ۲۰٦ تشریح آیات

## ٣٠ --- تا --- ٦٨

یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيهِمْ مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ
يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٣٠﴾ أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا ٢
يَرْجِعُونَ ﴿٣١﴾ وَإِن كُلٌّ لَّمَّا جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿٣٢﴾ ع ٢٠

"افسوس بندوں کے حال پر' جو رسول بھی ان کے پاس آیا اس کا وہ مذاق ہی اڑاتے رہے ۔ کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں اور اس کے بعد وہ پھر کبھی ان کی طرف پلٹ کر نہ آئے ؟ ان سب کو ایک روز ہمارے سامنے حاضر کیا جانا ہے"۔

حسرت ایک ایسی نفسیاتی حالت ہے جس میں انسان کو بے حد افسوس ہوتا ہے لیکن وہ اس حالت کو بدلنے کی طاقت نہیں رکھتا ۔ پس وہ دیکھ دیکھ کر کڑھتا ہے اور اسے اذیت ہوتی ہے ۔ اللہ کو تو بندوں کے ایمان نہ لانے پر کوئی حسرت نہیں ہوتی ۔ مفہوم یہ ہے کہ انسانی نقطہ نظر سے یہ لوگ قابل حسرت ہیں ۔ وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی حالت پر افسوس کیا جائے ۔ کیونکہ ان کا یہ حال نہایت ہی قابل تاسف ' پریشان کن اور قابل رحم ہے کہ یہ لوگ اپنی اس ضلالت کی وجہ سے دائمی شر اور دائمی مصیبت میں مبتلا ہونے والے ہیں ۔

یقیناً وہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان کی حالت پر افسوس کیا جائے جن کو نجات کا موقعہ ملتا ہے اور وہ اس سے استفادہ نہیں کرتے ۔ ان کے سامنے انسانی تاریخ موجود ہے اور وہ اس تاریخ سے عبرت نہیں پکڑتے اور نہ ہی تاریخی واقعات پر غور کرتے ہیں ۔ ان لوگوں کے پاس وقتاً فوقتاً اللہ ان کی ہدایت کے لیے رسولوں کو بھیجتا ہے لیکن یہ لوگ اللہ کی رحمت کے دروازوں سے دور ہو جاتے ہیں اور پھر اللہ کی شان میں گستاخی بھی کرتے ہیں ۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ

"جو رسول بھی ان کے پاس آیا اس کا وہ مذاق ہی اڑاتے رہے"۔ ( ٣٦ : ٣٠ )

اَلَمۡ يَرَوۡا كَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ اَنَّهُمۡ اِلَيۡهِمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ (۳۶ : ۳۱) "کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں اور اس کے بعد وہ پھر کبھی ان کی طرف پلٹ کر نہ آئے"۔ وہ اقوام جو ہلاک کی گئیں اور اس دنیا سے مٹا دی گئیں' ان کے مٹ جانے میں لوگوں کے لیے سامان عبرت و نصیحت ہے ۔ اور طویل انسانی تاریخ انسانوں کے لیے موضوع غور و فکر و تدبر ہے ۔ لیکن یہ بدبخت لوگ انسانی تاریخ پر غور نہیں کرتے ۔ حالانکہ اپنی اس لاپرواہی کی وجہ سے وہ ہلاکت اور بربادی کی طرف بڑھ رہے ہوتے ہیں ۔ تو ان کی اس افسوسناک حالت پر حسرت کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے ۔

ایک حیوان بھی جب دوسرے حیوان کی موت اور ہلاکت اپنے سامنے دیکھتا ہے تو وہ کانپ اٹھتا ہے اور مقدور بھر کوشش کرتا ہے کہ وہ اس انجام سے بچ جائے ۔ لیکن انسان کی حالت یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ اپنے بھائیوں کو اپنی بے راہ روی کی وجہ سے ہلاک ہوتے دیکھتا ہے اور پھر وہ اسی راہ پر چلتا ہے ۔ محض اپنے غرور اور کبر اور لاپرواہی کی وجہ سے' وہ دھوکہ کھاتا ہے اور دیکھنے کے باوجود اسی راہ پر چلتا ہے ۔ انسان کی ایک طویل تاریخ اس کے سامنے ہے اور وہ جانتا بھی ہے کہ انسانوں کی ہلاکت فلاں فلاں اسباب کی وجہ سے ہوئی لیکن وہ پھر بھی اندھوں کی طرح لاپرواہی سے اسی راہ پر چلتا ہے ۔ اور نہیں دیکھتا۔

جب ہلاک ہونے والے اور نابود کر دیے جانے والے اب اپنے جانشینوں کے پاس واپس نہیں آ سکتے تو یہ جانشین بھی اسی راستے پر جائیں گے ۔ یہ ہم سے بچ کر نہ نکل سکیں گے ۔ ان سے بھی حساب لیا جائے گا۔

وَاِنۡ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيۡعٌ لَّدَيۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ (۳۶ : ۳۲) "ب شک ان سب کو ایک روز ہمارے سامنے حاضر کیا جانا ہے"۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الۡاَرۡضُ الۡمَيۡتَةُ ۖۚ اَحۡيَيۡنٰهَا وَاَخۡرَجۡنَا مِنۡهَا حَبًّا فَمِنۡهُ يَاۡكُلُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَجَعَلۡنَا فِيۡهَا جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِيۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ وَّفَجَّرۡنَا فِيۡهَا مِنَ الۡعُيُوۡنِ ﴿۳۴﴾ لِيَاۡكُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتۡهُ اَيۡدِيۡهِمۡ ؕ اَفَلَا يَشۡكُرُوۡنَ ﴿۳۵﴾ سُبۡحٰنَ الَّذِىۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَمِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَمِمَّا لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۶﴾

"ان لوگوں کے لیے بے جان زمین ایک نشانی ہے ۔ ہم نے اس کو زندگی بخشی اور اس سے غلہ نکالا جسے یہ کھاتے ہیں ۔ ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کیے اور اس کے اندر سے چشمے پھوڑ نکالے تاکہ یہ اس کے پھل کھائیں ۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے ۔ پھر کیا یہ شکر ادا نہیں کرتے ؟ پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس (یعنی نوع انسانی) میں یا ان

اشیاء میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں ہیں"۔

یہ لوگ رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں اور انسانی تاریخ کے اندر تکذیب کرنے والوں کی قتل گاہوں اور بربادیوں پر غور نہیں کرتے۔اور یہ لوگ مخلوق کی اس حالت سے کوئی سبق نہیں لیتے کہ لوگ چلے جارہے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی واپس نہیں ہورہا ہے۔اور رسول کی دعوت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔وہ اللہ جس کے وجود پر ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی یہ کائنات اچھی طرح دلالت کرتی ہے۔اللہ کی ثنا کرتی ہے اور اس کے وجود پر شاہد ہے۔یہ زمین جو ان کے پاؤں کے نیچے ہے' یہ دیکھتے ہیں کہ ایک وقت میں یہ مرجاتی ہے۔اس میں کوئی روئیدگی نہیں ہوتی۔پھر یہ زندہ ہو جاتی ہے۔اس میں حیوانات پیدا ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ اس کے اندر باغات پیدا ہوتے ہیں۔کھجوریں 'انگور اور پھر ان باغات کے اندر چشمے پھوٹ پڑتے ہیں اور یوں انسانی اور دوسری زندگی رواں دواں نظر آتی ہے۔

اور پھر یہ زندگی بذات خود ایک معجزہ ہے اور کوئی انسان یہ قدرت نہیں رکھتا کہ وہ زندگی کا اجرا کر سکے' اس کی تخلیق کر سکے اور اس کے بعد اس کا سلسلہ تناسل کو جاری کر سکے۔زندگی کے اس عظیم معجزے کا اجراء دست قدرت کا عجیب کارنامہ ہے۔مردہ جسم کے اندر زندگی کی روح پھونک دی جاتی ہے دم بدم بڑھنے والی فصل کو دیکھ کر 'گھنی چھاؤں والے باغات کو دیکھ کر' اور اس سے بھرے ہوئے پختہ پھلوں کو دیکھ کر انسانی دل و دماغ کے دروازے کھل جاتے ہیں۔انسان دیکھتا ہے کہ یہ پوری زمین کو پھاڑ کر روشنی اور آزادی کے لیے سر نکالتے ہیں۔اور یہ سر نکالنے والی لکڑی سورج کی روشنی میں سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔اور پھر یہ پوداپتوں اور پھلوں سے مزین ہو جاتا ہے۔پھول کھل جاتے ہیں' پھل پک جاتے ہیں اور توڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ (۳٦ : ۳۵) "تاکہ یہ اس کے پھل کھائیں اور یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے"۔یہ اللہ ہی کا ہاتھ ہے جس نے ان کو اس کام پر قدرت دی۔جس طرح اس نے فصلوں اور پھلوں کو بڑھنے کی صلاحیت دی۔

اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ (۳٦ : ۳۵) "پھر کیا یہ شکر ادا نہیں کرتے۔

اس کے بعد قرآن کریم میں ایک لطیف اشارہ' اس طرح آتا ہے کہ جس ذات نے انسان کی راہنمائی ان نباتات اور باغات کی طرف فرمائی۔وہ وہی ہے جس نے فصلوں کے اندر بھی جوڑے پیدا کیے یعنی نر اور مادہ جس طرح انسانوں اور حیوانوں کے اندر جوڑے ہیں اور تمام دوسری مخلوق میں بھی جوڑے ہیں جن کو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ (۳٦ : ۳٦) "پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نباتات سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس میں سے یا ان اشیاء میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں"۔

اللہ کی یہ تسبیح نہایت ہی موزوں وقت پر آتی ہے اور تسبیح کے ساتھ ساتھ یہ اس کائنات کی عظیم حقیقت کا اظہار بھی کر رہی ہے۔یہ کہ تمام مخلوق ایک جیسی ہے۔اللہ کی تخلیق کا ایک اصول ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے تمام مخلوقات کو

جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے ۔ نباتات بھی انسانوں کی طرح جوڑے ہیں ۔ اور انسانوں اور نباتات کے علاوہ دوسری مخلوق بھی جوڑے ہیں ۔

وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ (۳۶ : ۳۶) "اور ان اشیاء میں بھی جوڑے ہیں جنہیں یہ جانتے تک نہیں" ۔ اصول تخلیق اور تکوین کی یہ یگانگت بتلاتی ہے کہ اس کائنات کا خالق بھی ایک ہے ۔ تمام شکلوں ' تمام مجموعوں ' تمام انواع ' تمام اجناس ' تمام خصائص اور تمام علامات کے اندر یہ قاعدہ پوری طرح کارفرما ہے ۔ یہ بات معلوم ہوگئی ہے کہ ایٹم اس کائنات کا وہ چھوٹا سا حصہ ہے جو آج معلوم ہو چکا ہے اور یہ ایٹم بھی دو جوڑوں سے مرکب ہے ۔ یعنی مثبت اور منفی الیکٹرانک شعاعیں ۔ یہ باہم جدا بھی ہوتی ہیں اور متحد بھی ۔ اسی طرح ہزاروں ستارے ایسے معلوم ہو چکے ہیں جو مزدوج تخلیق کے مالک ہیں ۔ جو دو ستاروں سے بنے ہوئے ہیں اور باہم مرتب و ہم آہنگ ہیں اور ایک ہی مدار میں پھرتے ہیں ۔ گویا وہ ایک مرتب نغمہ کی شکل میں ہیں ۔

---

یہ تو تھی مردہ زمین جس سے زندگی پھوٹ رہی ہے ۔ اب زمین سے آگے بڑھ کر قرآن آسمان کی طرف متوجہ ہوتا ہے ' آسمانی نظارے ہمارے سامنے پیش ہوتے ہیں اور یہ تمام نظارے دست قدرت کے عجوبے ہیں ۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۖۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۳۸﴾ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿۳۹﴾ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾

"ان کے لیے ایک اور نشانی رات ہے ' ہم اس کے اوپر سے دن ہٹا دیتے ہیں تو ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے اور سورج ' وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے ۔ یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے ۔ اور چاند ' اس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے ۔ نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے ۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں" ۔

رات کے آنے کا منظر ' روشنی ختم ہو جاتی ہے اور اندھیرا آہستہ آہستہ چھا جاتا ہے ۔ یہ وہ منظر ہے جسے تمام انسان ۲۴ گھنٹوں میں دہرایا ہوا دیکھتے ہیں ' ماسوائے ان خطوں کے جہاں رات اور دن کا عمل چھ ماہ کے بعد دہرایا جاتا ہے ۔ یعنی ان علاقوں میں جو قطبین کے بہت قریب ہیں ۔ یہ عمل اگرچہ رات اور دن میں بار بار دہرایا جاتا ہے لیکن اگر اس پر غور کیا جائے تو یہ اللہ کی قدرت کا ایک عجوبہ ہے اور اس قابل ہے کہ انسان اس پر غور و فکر کریں ۔

یہاں اس مقام پر اس عجوبے کا انداز تعبیر بھی منفرد ہے ۔ یہاں رات کو دن میں ملبوس تصور کیا گیا ہے اور جب دن کا لباس اتر جائے تو رات آجاتی ہے ۔ اور لوگ اچانک اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں ۔ اسی انداز تعبیر کا ادراک یوں ہو سکتا ہے اور یہ اس وقت پھر مجاز کے بجائے حقیقت نظر آتی ہے' جب ہم زمین کی گردش محوری پر غور کریں ۔ سورج کے سامنے اس کی اس گردش کے بدولت زمین کا ایک نقطہ سورج کے سامنے رہتا ہے اور وہاں دن ہوتا ہے اور جب زمین کا وہ حصہ غائب ہوتا ہے تو اچانک دن کا لباس اتار دیا جاتا ہے اور ماحول پر پھر اندھیرا چھا جاتا ہے ۔ اور یہ منظر نہایت ہی تنظیم کے ساتھ یونہی چلتا رہتا ہے ۔ ہر وقت دن کے لباس کو رات کے جسم سے کھینچا جاتا ہے اور رات ظاہر ہوتی رہتی ہے ۔ غرض یہ قرآنی تعبیر حقیقی بھی ہے اور نہایت ہی فصیح اور ادیبانہ بھی ۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ( ۳۶ : ۳۸ ) "اور سورج' وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے"۔ سورج بھی گردش محوری رکھتا ہے ۔ بالعموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اپنی جگہ ایستادہ ہے لیکن تازہ ترین سائنسی معلومات یہ ہیں کہ یہ سورج اپنی جگہ رکا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ بھی چل رہا ہے' عملاً رواں ہے ۔ یہ ایک ہی سمت میں جا رہا ہے ۔ اس عظیم کائنات اور اس فضا اور خلا میں یہ ایک طرف جا رہا ہے ۔ اور یہ ۱۲ میل فی سیکنڈ کے حساب سے ایک ہی سمت میں جا رہا ہے ۔ لیکن اس کی حرکت اور رفتار کے بارے میں اللہ ہی جانتا ہے جو خبیر و بصیر ہے اور اللہ صریح طور پر فرماتا ہے کہ اس کی ایک جائے قرار ہے اور اس کے لیے وہ بے تابی سے چل رہا ہے ۔ کس طرح اور کب وہاں پہنچتا ہے یہ قیامت ہے اور اس کا علم اللہ ہی کو ہے ۔

جب ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ اس سورج کا حجم زمین سے ایک ملین گنا زیادہ ہے اور یہ سورج اپنی اس کہکشاں کے ساتھ (اور کہکشاں کس قدر عظیم ہے' ذرا سوچ لیں) ایک فضائے لامتناہی میں اپنے مستقر کے لیے رواں ہے' تو اس سے اللہ کے علم اور قدرت کا اندازہ ہو جاتا ہے ۔ یہ ہے مفہوم اس آیت کا ۔

ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ( ۳۶ : ۳۸ ) "یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے"۔

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ( ۳۶ : ۳۹ ) "چاند' اس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کی مانند رہ جاتا ہے"۔ لوگ چاند کو تو اپنی ان منزلوں میں دیکھ سکتے ہیں ۔ وہ ہلال کی طرح نمودار ہوتا ہے اور اس کے بعد وہ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ گول ہو کر بدر ہو جاتا ہے ۔ اس کے بعد گھٹنا شروع ہوتا ہے اور پھر وہ ہلال کی طرح ہو جاتا ہے اور یوں نظر آتا ہے جس طرح کھجور کی پرانی خشک شاخ ۔ الْعُرْجُوْن اس شاخ کو کہتے ہیں جس میں کھجور کی قسم "بلح" ہوتی ہے ۔

جو لوگ چاند کو ہر رات دیکھتے ہیں وہ قرآن کریم کی اس انداز تعبیر کا لطف اٹھا سکتے ہیں ۔

عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ( ۳۶ : ۳۹ ) "یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے"۔ خصوصاً اس تعبیر میں لفظ قدیم معنی خیز ہے ۔ چاند پہلی راتوں میں ہلال ہوتا ہے اور آخری راتوں میں بھی ہلال ہوتا ہے لیکن پہلی راتوں میں وہ شگفتہ اور نشوونما والا نظر آتا ہے ۔ اور آخری راتوں میں پژمردہ' زوال پذیر

اور خشکی اور سکڑنے کا منظر پیش کرتا ہے ۔ یہ سکڑ کر اس قدر خشک ہو جاتا ہے جس طرح خشک شاخ ۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ قرآن نے یہ انداز تعبیر اختیار کیا ہے بلکہ یہ بامقصد اور اصل صورت کا حقیقی اظہار ہے اور عجیب ہے ۔

چاندنی راتوں میں مسلسل غور و فکر کرنے سے انسانی احساس کے پردوں پر شعور اور تجلیات کی عجیب و غریب اور تروتازہ کیفیات آتی ہیں اور انسان پر اس سوچ کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں ۔ اور وہ انسان جو اس چاند کا پورے ایک ماہ تک مشاہدہ کرتا ہے اور غور کرتا ہے وہ تاثرات لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بدیع السموات اور خالق جلال و جمال کی قدرت کی شان کیا ہے جس نے اس قدر عظیم اجرام سماوی کو یہ خوبصورتی اور یہ تنظیم عطا کی ہے ۔ ہر شخص اس منظر سے بقدر ہمت ہدایت لے سکتا ہے ۔ چاہے وہ اس عظیم کائنات کے ان رازوں کو جانتا ہے یا نہیں ۔ میں کہتا ہوں صرف رات کے وقت چاند کا مشاہدہ ہی انسانی دل کو ہلا دینے کے لیے کافی ہے ۔ اس سے شعور بیدار ہوتا ہے اور انسان کے اندر غور و فکر کی عادت پڑتی ہے ۔

اب اللہ ذرا اس عظیم کائنات اور ان عظیم اجرام فلکی کی لطیف تنظیم کی طرف اشارہ فرماتا ہے اور اس تنظیم اور ترتیب کی وجہ سے کیا کیا مظاہر پیدا ہوتے ہیں ؟ غور کیجئے !

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ( ۳۶ : ۴۰ ) "نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے ۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں" ۔ ہر ستارے اور سیارے کے لیے ایک فلک ہے یا اس کا اپنا مدار ہے ۔ اپنی رفتار اور گردش میں وہ اپنی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ ستاروں اور سیاروں کے درمیان عظیم فاصلے ہیں ۔ زمین سورج کے درمیان ۹۳ ملین میل کا فاصلہ ہے اور چاند زمین سے ۲۴۰ ملین میل دور ہے ۔ لیکن یہ فاصلے بھی اپنی اس دوری کے باوجود شمسی کہکشاں اور اس کے قریب ترین دوسری کہکشاں کے قریب تارے سے چار نوری سال دور ہے ۔ اور نوری سال میں ٹائم کا تعین یوں کیا گیا ہے کہ جس میں روشنی کی رفتار ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ ہو گویا سورج کی کہکشاں سے قریب ترین ستارہ ایک سو چار ملین میل دور ہے ۔

اللہ جو اس کائنات کا خالق ہے 'اس نے ستاروں اور سیاروں کے درمیان اس قدر عظیم فاصلے پیدا کیے ہیں اور جس نے اس عظیم کائنات کا یہ عجیب نقشہ تیار فرمایا ہے تاکہ اسے باہم تصادم اور ٹکراؤ سے بچایا جائے اور یہ نظام یونہی جاری رہے الا یہ کہ اللہ تعالیٰ قیامت برپا کر دے اس لیے سورج کے اندر یہ قوت نہیں ہے کہ وہ چاند کو جا لے ۔ اور نہ رات دن سے پہلے آ سکتی ہے نہ اس کے مقابلے میں کھڑی ہو سکتی ہے ۔ کیونکہ جس گردش کی وجہ سے روز و شب پیدا ہوتے ہیں وہ جاری ہے ۔ لہٰذا ان دونوں میں سے کوئی دوسرے سے آگے نہیں ہو سکتا اور نہ دوسرے کی راہ روک سکتا ہے ۔

وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ( ۳۶ : ۴۰ ) "اور سب ایک فلک میں تیر رہے ہیں" ۔ فضائے کائنات میں ان سیاروں اور اجرام فلکی کی حرکت یوں ہے جس طرح سفینہ سمندر میں تیر رہا ہوتا ہے ۔ یہ بحری جہاز اپنی عظمت کے باوجود اس عظیم سمندر میں ایک سیاہ نکتہ ہی ہوتا ہے ۔

انسان حیران اور ششدر رہ جاتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ لاکھوں سیارے اور جرم فلکی اس وسیع فضائے کائنات میں بکھرے پڑے ہیں اور تیر رہے ہیں ۔ ہر سیارے اور اجرام فلکی کے ارد گرد ایک وسیع فضا ہے اور وہ دوسرے سے بہت دور ہے اور ان سیاروں اور اجرام کا حجم بہت بڑا ہونے کے باوجود اس وسیع فضا میں وہ ایک نکتہ ہیں ۔ بہت ہی معمولی نکتہ !!

--- ○○○ ---

وَ اٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَ خَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَ اِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۴۴﴾

"ان کے لیے یہ بھی ایک نشانی ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کر دیا' اور پھر ان کے لیے ویسی ہی کشتیاں اور پیدا کیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں ۔ ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں 'کوئی ان کی فریاد سننے والا نہ ہو' اور کسی طرح یہ نہ بچائے جا سکیں ۔ بس ہماری رحمت ہی ہے جو انہیں پار لگاتی اور ایک وقت خاص تک زندگی سے متمتع ہونے کا موقعہ دیتی ہے"۔ یہاں سیاق کلام میں ایک نہایت ہی لطیف مناسبت ہے ۔ ستارے اور سیارے بلند فضائے کائناتی میں تیر رہے ہیں اور کشتی اولاد آدم سے بھری ہے اور وہ پانیوں میں تیر رہی ہے ۔ ان دونوں مناظر کے اندر ظاہری نسبت بھی ہے 'رفتار کی مناسبت بھی ہے' اور یہ ربط بھی ہے کہ ان دونوں کو اللہ نے مسخر کر لیا ہے ۔ اور اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کے اندر اپنی قدرت سے ان کو تھام رکھا ہے ۔

یہ دونوں مناظر انسانوں کی نظروں کے سامنے ہیں لیکن انسان ان پر غور نہیں کرتے ۔ اگر انسان اپنے قلب کو کھول دے اور اپنے دماغ کو وسعت دے تو ان امور پر غور و تدبر کر کے وہ بڑی سہولت سے اللہ کی نشانیوں کو پا سکتا ہے ۔

بھری ہوئی کشتی سے مراد شاید کشتی نوح ہو جس نے اولاد آدم کو اٹھایا اور اس کے بعد اللہ نے ان کے لیے ایسی ہی دوسری کشتیاں پیدا کیں جو انسانوں کو اٹھا کر چلتی ہیں اور ان دونوں کو اللہ کے ان قوانین قدرت نے چلایا جو اس نے اس کائنات میں ودیعت کیے کہ کشتی پانیوں کی سطح پر تیر رہی ہے ۔ سیارے آسمانوں کی فضاؤں میں تیر رہے ہیں اور لکڑی 'پانی اور ہوا' بخارات یا ایٹمی قوت پیدا کی جس کی وجہ سے یہ بڑے بڑے جہاز چلتے ہیں ۔ یہ سب امور تقدیر الٰہی کے مطابق ہیں ۔

وَ اِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَ لَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ (۳۶ : ۴۳) اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ (۳۶ : ۴۴) "ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں 'کوئی ان کی فریاد سننے والا نہ ہو' اور کسی طرح یہ نہ بچائے جا سکیں ۔ بس ہماری رحمت ہی ہے جو انہیں پار لگاتی اور ایک وقت خاص تک زندگی سے متمتع ہونے کا موقعہ دیتی ہے"۔

گہرے سمندروں میں کشتی کی حیثیت وہی ہوتی ہے جس طرح طوفان میں ایک پر کی ہوتی ہے ۔ جس قدر بھی کشتی بھاری اور بڑی ہو' اور چاہے وہ بہت ہی اعلیٰ سائنسی اصولوں کے مطابق بنی ہو ۔ اگر ان کشتیوں کے ساتھ اللہ کی رحمت اور شفقت نہ

ہو تو دو رات یا دن کے کسی بھی لمحے میں تباہ ہو جائیں ۔ وہ لوگ جنھوں نے سمندروں کا سفر کیا ہے ' چاہے یہ سفر چھوٹے بجرے میں ہوا ہو یا بڑے بحری جہاز میں ...... وہ سمندر کی ہولناکی کو اچھی طرح جانتے ہیں ۔ وہ جانتے ہیں کہ سمندر کی طاقتور لہروں کے مقابلے میں انسانی بچاؤ کی تدابیر کس قدر معمولی ہوتی ہیں ۔ اس لیے ایسے لوگ اللہ کی رحمت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم کائنات میں عالم طبیعت کے طوفانوں اور انقلابات کے مقابلے میں صرف اللہ کی رحمت ہے جس نے سرکش طبیعی قوتوں کی لگام تھام رکھی ہے ۔ زمین و آسمان میں اللہ کے دست قدرت کے سوا اور کوئی نہیں ہے جس نے سب چیزوں کو تھام رکھا ہے ۔ یہاں تک کہ قیام قیامت کا وقت آپہنچے جس طرح اللہ حکیم و خبیر نے اس کے لیے وقت مقرر کیا ہے ۔

وَ مَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ (۳۶ : ۴۴) "پھر وقت خاص تک متمتع ہونے کا موقعہ دیتی ہے"۔

---

لیکن ان واضح ترین نشانیوں کے باوجود لوگ غفلت کی نیند میں سوئے ہوئے ہیں ۔ ان کی نظر ان نشانیوں پر نہیں پڑتی ۔ اور ان کے دل بیدار نہیں ہوتے اور وہ انکار اور تمسخرانہ انداز کو نہیں چھوڑتے ۔ اور بس انہوں نے یہی رٹ لگا رکھی ہے کہ جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو بس اسے لے ہی آؤ ۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ وَ مَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَ مَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ﴿۴۶﴾ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۖۗ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۴۷﴾ وَ یَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۴۸﴾

"ان لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ بچو اس انجام سے جو تمہارے آگے آ رہا ہے اور تمہارے پیچھے گزر چکا ہے ' شاید کہ تم پر رحم کیا جائے (تو یہ سنی ان سنی کر جاتے ہیں) ۔ ان کے سامنے ان کے رب کی آیات میں سے جو آیت بھی آتی ہے ' یہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے ۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو رزق تمہیں عطا کیا ہے ' اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں بھی خرچ کرو تو یہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہے ایمان لانے والوں کو جواب دیتے ہیں "کیا ہم ان کو کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا؟ تم تو بالکل ہی بہک گئے ہو" ۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ "یہ قیامت کی دھمکی آخر کب پوری ہوگی؟"

یہ نشانیاں بھی ان کے دل و دماغ میں تجسس ' تدبر اور احساس خدا خوفی پیدا نہیں کرتیں ۔ حالانکہ اگر کسی انسان کا دل کھلا ہو تو یہ نشانیاں اس کے اندر حرکت پیدا کرتی ہیں ' اسے جھنجوڑتی ہیں اور اسے پرجوش رویہ اختیار کرنے پر آمادہ

رہتی ہیں ـ اور یہ نشانیاں اس قابل ہیں کہ انسان کو اس کائنات کے ساتھ ملا دیں ـ وہ کائنات جو ایک کھلی کتاب ہے اور اس کا ہر ایک صفحہ خالق کی عظمت کا کھلا ثبوت ہے ـ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تدابیر بہت گہری اور اس کے اندازے نہایت ہی درست ہوتے ہیں ـ لیکن یہ لوگ جن کی فطرت اور بصیرت مسخ ہو چکی ہے ـ وہ ان نشانیوں کو نہیں دیکھ سکتے ـ اور اگر وہ ان کو دیکھ بھی لیں ' ان پر تدبر نہیں کرتے ـ لیکن اللہ تعالیٰ اپنی عظیم رحمتوں کی وجہ سے پھر بھی ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ نہیں دیتا ـ اللہ پھر بھی ان کے پاس رسول بھیجتا ہے ' جو ان کو ڈراتا ہے ـ اور ان کو اس کائنات کے خالق کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ اسے وجود میں لانے والا ایک قادر مطلق ہے ـ یہ رسول ان کو ڈراتا ہے ' ان کے دل میں خوف اور تقویٰ پیدا کرتا ہے ـ اور ان کو اللہ کے غضب اور ان کو عذاب الٰہی کے اسباب فراہم کرنے سے ڈراتا ہے ـ کیونکہ اللہ کے عذاب نے تو ان کو احاطہ میں لیا ہوا ہے ـ ان کے آگے اور پیچھے عذاب الٰہی موجود ہے ـ اگر یہ لوگ محتاط نہ رہے تو کسی بھی وقت اللہ کے عذاب میں پڑ سکتے ہیں اور ان کے قدم پھسل سکتے ہیں ـ پھر ان تکوینی نشانیوں کے علاوہ دوسری نشانیاں اور معجزات بھی اللہ پے درپے ان کے لیے بھیجتا ہے لیکن وہ توجہ نہیں کرتے اور اپنی روش پر آگے ہی بڑھ رہے ہیں لاپرواہ ہو کر ـ

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۳۶:۴۵)

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ (۳۶:۴۶) "ان لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ بچو اس انجام سے جو تمہارے آگے آرہا ہے اور تمہارے پیچھے گزر چکا ہے ' شاید کہ تم پر رحم کیا جائے (تو یہ سنی ان سنی کر جاتے ہیں) ـ ان کے سامنے ان کے رب کی آیات میں سے جو آیت بھی آتی ہے ' یہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے" ـ

اور اگر ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنی دولت میں سے کچھ فقراء پر بھی خرچ کرو تو وہ مزاح کرتے ہوئے کہتے ہیں ـ

اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۶:۴۷) "کیا ہم ان کو کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلاتا؟ تم تو بالکل ہی بہک گئے ہو" ـ مزاح کے علاوہ یہ لوگ ان لوگوں پر گمراہی کا الزام لگاتے جو ان کو دعوت انفاق دیتے ہیں ـ

ان لوگوں کے اس انداز گفتگو سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ انسانوں کی زندگی میں جاری و ساری سنن الٰہیہ سے بالکل بے بہرہ ہیں ـ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ ہی سب کو کھلاتا ہے ـ اللہ ہی سب کا رازق ہے ـ زمین میں بندوں کے پاس جو دولت اور جو رزق ہے وہ اللہ ہی کا تخلیق کردہ ہے ـ انسانوں نے خود تو اپنے لیے کچھ پیدا کیا ہی نہیں ' اور نہ وہ کسی ایک چیز کی تخلیق پر قدرت رکھتے ہیں ـ لیکن اللہ کی مشیت یہ ہے کہ اس زمین کو انسان آباد کریں ـ اس لیے اللہ نے لوگوں کو ضروریات کا محتاج کیا ـ یہ ضروریات لوگوں کو صرف ان کی جہد اور سعی سے مل سکتی ہیں ـ زمین کے اندر زراعت کا انتظام صنعتوں کا انتظام پھر زمین کے خزانوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا انتظام ـ پھر ان اشیاء کی

سپلائی اور خرید و فروخت مختلف زمانوں میں مختلف طریقوں سے ۔ یہ سب انتظامات اللہ نے کیے ۔ پھر لوگ اپنی قابلیت اور صلاحیت کے اعتبار سے مختلف اور متفاوت ہیں اور اللہ اپنی مشیت کے مطابق مختلف لوگوں کو مختلف صلاحیتیں دیں اور یہ اس لیے تاکہ انسان مل کر خلافت ارضی کے فرائض سرانجام دیں ۔ انسان کی صلاحیتوں کے اندر تفاوت صرف مال اور دولت جمع کرنے ہی میں نہیں ہے ۔ بلکہ بعض اوقات انسان دوسری ضروریات میں مصروف ہوتے ہیں اور یہ دوسرے میدان بھی خلاف ارضی کا تقاضا ہوتے ہیں ۔ اس لیے بعض انسان مال دولت جمع کرنے کے کام کے لیے فارغ ہی نہیں ہوتے اور مالی لحاظ سے محتاج ہوتے ہیں ۔

ایک طرف انسان کے منصب خلافت ارضی کے وسیع تقاضے ہوتے ہیں اور دوسری طرف ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے صلاحیتیں ہوتی ہیں ۔ اور ان صلاحیتوں کے مطابق پھر انسانوں کے درمیان ضروریات اور منافع کا لین دین ہوتا ہے ۔ لوگوں کے درمیان مقابلہ اور حصہ رسدی کا تعین ہوتا ہے ۔ یہ ایک وسیع معاشی نظام ہے جس کی بے شمار کڑیاں ہیں اور ہر کڑی دوسری سے ملی ہوئی ہے بلکہ اس کا تعلق نسلوں سے بھی ہے ۔ یعنی نسلا بعد نسل ایسے اسباب ہوتے ہیں جو لوگوں کی معاشی جدوجہد پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ غرض معاشیات کے میدان میں مختلف اور متنوع اسباب کی بنا پر اللہ نے لوگوں کے درمیان دولت اور ان کے رزق میں تفاوت رکھی ۔ یہ تفاوت اپنی حقیقت کے اعتبار سے تو اس لیے رکھی گئی ہے کہ انسان خلافت ارضی کے منصب کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اس زمین کی تعمیر و ترقی میں کوشاں رہے لیکن اس تفاوت کو حد اعتدال میں رکھنے کے لیے اسلام نے بعض انفرادی محرومیوں کا مداوا بھی کیا ہے ۔ وہ یہ کہ اہل ثروت پر لازم ہے کہ وہ اپنی دولت کا ایک حصہ فقراء اور محرومین کے لیے نکالیں ۔ اور معاشرے کے اندر کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ رہے جو بنیادی معاشی ضروریات سے محروم ہو ۔ ان انتظامات کی وجہ سے اغنیاء اور فقراء کی اخلاقی اور نفسیاتی اصلاح ہو جاتی ہے ۔ اس انفاق کے لیے اسلام زکوۃ لیتا ہے اور زکوۃ کے لغوی مفہوم میں طہارت کے معنی شامل ہیں ۔ گویا یہ انفاق طہارت مال بھی ہے اور عبادت بھی ۔ اور اس کے ذریعے اللہ نے فقراء اور اغنیاء کے درمیان محبت اور دوستی کا رشتہ بھی استوار کر دیا ہے

لہٰذا ان لوگوں کا جو حکمت خداوندی کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے : یہ کہنا ۔

أَنُطْعِمُ مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ (٣٦ : ٤٧) ”کیا ہم ان کو کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا؟“ اور اس پر مزید پھر ان کی جانب سے انفاق کی دعوت دینے والوں پر یہ الزام

إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (٣٦ : ٤٧) ”تم تو بالکل ہی بہک گئے ہو“ ۔ دراصل حقیقی گمراہی ہے ۔ اور یہ لوگ اس کائنات میں جاری سنن الٰہیہ سے بے خبر ہیں ۔ اور یہ لوگ اس جہاں میں زندگی کی حقیقی چلن اور اس کے متنوع معاشی اسباب سے بھی بے خبر ہیں ۔ پھر اس جہاں میں اللہ نے جن مقاصد کی خاطر لوگوں کو متنوع صلاحیتیں دی ہیں اور جن کے نتیجے میں لوگ مختلف کام کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے پھر سامان زیست کا تبادلہ ہوتا ہے اور دنیا کا معاشی نظام چل رہا ہے ۔ یہ لوگ اس سے بھی واقف نہیں ہیں ۔

اسلام ایک ایسا نظام معیشت وضع کرتا ہے جس کے اندر تمام لوگوں کو کام کرنے کے آزادانہ مواقع حاصل ہوتے

ہیں۔ اس کے بعد اسلامی نظام تمام لوگوں کے مختلف قسم کے کام کرنے کے آزادانہ مواقع فراہم بھی کرتا ہے۔ اور لوگ اس طرح پاک اور صاف زندگی بسر کرتے ہیں اور اس کے بعد اپنے عملی اقدامات سے معاشی ناہمواریوں کے حل کے لیے خصوصی اقدامات بھی کرتے ہیں۔

سب سے آخر میں بات ان کے اس خلجان پر ہوتی ہے۔ جو انہیں بعث بعد الموت کے سلسلے میں تھا۔ اور جس کی وجہ سے وہ اس قسم کا عقیدہ رکھنے والوں کا مذاق اڑاتے تھے۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۶: ۴۸) "یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قیامت کی دھمکی آخر کب پوری ہوگی؟ بتاؤ اگر تم سچے ہو"۔

اللہ نے قیامت کے واقع ہونے کے لیے جو وقت مقرر کر رکھا ہے وہ انسانوں کی جلد بازی یا مطالبے کی وجہ سے وقت سے پہلے نہیں آسکتا۔ اور اگر لوگ یہ امید کریں کہ وہ اپنے مقررہ وقت سے ذرا دیر کر کے واقع ہوگا تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک ہر شے ایک مقدار کے مطابق ہے۔ اور ہر واقعہ اپنے مقررہ وقت پر ہوتا ہے۔ تمام واقعات اپنے وقت پر ہوتے ہیں جس طرح اللہ نے ان کے بارے میں فیصلہ ازل میں کر رکھا ہے اور اپنی حکمت کے مطابق کر رکھا ہے۔ اس دنیا کا ہر واقعہ اپنے وقت پر نظام قضا و قدر کے مطابق ظہور پذیر ہوتا ہے۔

ان لوگوں کے ان سوالات اور خلجانات کا جواب کیا ہے تو وہ قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کی صورت میں دیا گیا ہے۔ اس منظر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جب قیامت ہوگی تو اس کی کیفیت یہ ہوگی۔ رہی یہ بات کہ یہ کب ہوگی تو اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔

۳ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ۝
۱۸ع فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ
۲ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ
مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً
وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ۝

"دراصل یہ جس چیز کی راہ تک رہے ہیں وہ بس ایک دھماکہ ہے جو یکایک انہیں اس حالت میں دھر لے گا جب یہ (اپنے دنیوی معاملات میں) جھگڑ رہے ہوں گے، اور اس وقت یہ وصیت تک نہ کر سکیں گے، نہ اپنے گھروں کو پلٹ سکیں گے۔ پھر ایک صور پھونکا جائے گا اور یکایک یہ اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لیے اپنی اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے۔ گھبرا کر کہیں گے: "ارے، یہ کس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے اٹھا کھڑا کیا؟" ــــ "یہ وہی چیز ہے جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں کی بات سچی تھی"۔ ایک ہی زور کی آواز ہوگی اور سب کے سب ہمارے سامنے

حاضر کر دیئے جائیں گے"۔

جھٹلانے والوں کا سوال یہ تھا۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۳۶:۴۸) "یہ قیامت کی دھمکی کب پوری ہوگی؟ بتاؤ اگر تم سچے ہو"۔ لہٰذا ان کا جواب اس منظر کی شکل میں دیا گیا۔

مَا يَنظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ (۳۶:۴۹) فَلَا يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً وَلَا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ (۳۶:۵۰) "دراصل یہ جس چیز کی راہ تک رہے ہیں وہ بس ایک دھماکہ ہے جو یکایک انہیں عین اس حالت میں دھر لے گا جب یہ جھگڑ رہے ہوں گے اور اس وقت یہ وصیت تک نہ کر سکیں گے اور نہ اپنے گھروں کو پلٹ سکیں گے"۔ قیامت اچانک لوگوں کو اپنی گرفت میں لے لے گی' اس وقت وہ اپنے دنیاوی جھگڑوں یا مذہبی مباحثوں میں مصروف ہوں گے اور ان کو وقوع قیامت کی امید ہی نہ ہوگی۔ اور نہ وہ اسے کچھ اہمیت دیں گے۔ لیکن وہ اچانک واقع ہو جائے گی۔ ہر شخص اسی حال میں گرفتار ہو گا۔ جس پر وہ اس وقت ہو گا۔ کسی کو آنے والوں کے بارے میں نہ وصیت کے مواقع ہوں گے۔ اور نہ ان کو اس قدر مہلت ہوگی کہ وہ گھر تک چلا جائے اور گھر والوں سے کچھ کہہ دے۔ اور وہ ہوں گے کہاں؟ کیونکہ گھر والے بھی جہاں ہوں گے اسی قیامت کی گرفت میں ہوں گے۔

اور اس کے بعد صور پھونکا جائے گا۔ ہر شخص اپنی قبر سے اٹھے گا اور جلدی سے دوڑ پڑے گا۔ یہ انتہائی درجے میں ہیبت زدہ اور دہشت زدہ ہو گا۔ ہر شخص دوسرے سے پوچھے گا۔

مَن بَعَثَنَا مِن مَّرْقَدِنَا (۳۶:۵۲) "ارے یہ کس نے ہماری خوابگاہ سے ہمیں اٹھا کر کھڑا کیا؟ قدرے وقفے کے بعد اب دہشت ختم ہوگی تو اصل حقیقت ان کو معلوم ہو جائے گی۔

هَٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ (۳۶:۵۲) "یہ وہی چیز ہے جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں کی بات سچی تھی"۔

اور اب آخری آواز ہوگی۔ ایک پکار اور یہ تمام بکھرے ہوئے پریشان اور حیران لوگ اللہ کے حضور حاضر ہوں گے۔

فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ (۳۶:۵۳) "اور اچانک سب کے سب ہمارے سامنے حاضر کر دیئے جائیں گے"۔ اور سب کے سب صفوں کی صورت میں منظم کر دیئے جائیں گے اور یہ چشم زدن میں ہوگی اور صدائے بازگشت کی طرح ہوگی اور اس موقعہ و محل پر اللہ کا یہ فیصلہ سنایا جائے گا اور اعلان ہو گا کہ جزاء و سزائیں کسی کے ساتھ کوئی بے انصافی نہ ہوگی۔

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۵۴﴾

"آج کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ کیا جائے گا اور تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے تم عمل کرتے رہے تھے"۔
یوں نہایت تیزی کے ساتھ تین مناظر کی جھلک دکھائی جاتی ہے اور ان لوگوں کے شکوک اور خلجانات کا رد کر دیا جاتا ہے جو خواہ مخواہ وقوع قیامت میں شک کرتے ہیں اور نہایت ہی ترتیب کے ساتھ۔
اب یہاں اہل ایمان کے ساتھ حساب و کتاب کا حال بھی چند لمحوں میں لپیٹ لیا جاتا ہے اور ان کا انجام بھی تیزی کے ساتھ دکھا دیا جاتا ہے۔

إِنَّ أَصْحَٰبَ ٱلْجَنَّةِ ٱلْيَوْمَ فِى شُغُلٍ فَٰكِهُونَ ﴿٥٥﴾ هُمْ وَأَزْوَٰجُهُمْ فِى ظِلَٰلٍ عَلَى ٱلْأَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔونَ ﴿٥٦﴾ لَهُمْ فِيهَا فَٰكِهَةٌ وَلَهُم مَّا يَدَّعُونَ ﴿٥٧﴾ سَلَٰمٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ ﴿٥٨﴾

"آج جنتی لوگ مزے کرنے میں مشغول ہیں۔ وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں ہیں۔ مسندوں پر تکیے لگائے ہوئے' ہر قسم کی لذیذ چیزیں کھانے پینے کو ان کے لیے وہاں موجود ہیں' جو کچھ وہ طلب کریں ان کے لیے حاضر ہے' رب رحیم کی طرف سے ان کو سلام کہا گیا ہے"۔
یہ عیش و عشرت میں مشغول ہوں گے' ان پر اللہ کے انعامات کی بارش ہو گی اور نہایت ہی خوشگوار چھاؤں میں بیٹھے ہوں گے۔ آمنے سامنے تختوں پر تکیے لگائے ہوئے ہوں گے اور وہ جنت کے مالک ہوں گے اور ان کا یہ حق ہو گا کہ جو چاہیں گے' مہیا ہو گا۔ اور ان لذائذ کے اوپر مزید ان کے اہل خانہ بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ اور ان کی تکریم ہو گی کہ خود اللہ تعالیٰ ان کے نام سلام بھیجے گا۔ یہ رب کریم کی طرف سے ان کا اعزاز ہو گا۔

سَلَٰمٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ (٣٦:٥٨) "رب رحیم کی طرف سے ان کو سلام کہا گیا ہے"۔ رہے کفار تو ان کے ساتھ حساب و کتاب یہاں نہیں دکھایا گیا بلکہ یہاں محض سرزنش اور جھڑکی اور ملامت کر دی جاتی ہے۔

وَٱمْتَٰزُوا۟ ٱلْيَوْمَ أَيُّهَا ٱلْمُجْرِمُونَ ﴿٥٩﴾ أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَٰبَنِىٓ ءَادَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا۟ ٱلشَّيْطَٰنَ ۖ إِنَّهُۥ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٦٠﴾ وَأَنِ ٱعْبُدُونِى ۚ هَٰذَا صِرَٰطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾ وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا ۖ أَفَلَمْ تَكُونُوا۟ تَعْقِلُونَ ﴿٦٢﴾ هَٰذِهِۦ جَهَنَّمُ ٱلَّتِى كُنتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٦٣﴾ ٱصْلَوْهَا ٱلْيَوْمَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٦٤﴾

"اور اے مجرمو' آج تم چھٹ کر الگ ہو جاؤ۔ آدم کے بچو' کیا میں نے تم کو ہدایت نہ کی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرو' وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور میری ہی بندگی کرو' یہ سیدھا راستہ ہے؟ مگر اس کے باوجود اس نے تم میں سے ایک گروہ

کثیر کو گمراہ کر دیا۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے تھے؟ یہ وہی جہنم ہے جس سے تم کو ڈرایا جاتا رہا تھا جو کفر تم دنیا میں کرتے رہے ہو' اس کی پاداش میں اب اس کا ایندھن بنو"۔

ان لوگوں کی تواضع حقارت اور توہین سے کی جائے گی۔

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ (۳۶: ۵۹) "اور اے مجرمو' آج تم چھٹ کر الگ ہو جاؤ"۔ تم اہل ایمان سے دور ہو کر الگ ہو جاؤ۔

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ

(۳۶: ۶۰) "آدم کے بچو' کیا میں نے تم کو ہدایت نہ کی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرو' وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"۔ "آدم کے بچو!" کے الفاظ سے پکار کر ان کو شرمندہ کیا گیا ہے' اس لیے کہ شیطان نے ان کے باپ کو جنت سے نکالا تھا' اس کے باوجود تم اس کی بندگی کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

وَأَنِ اعْبُدُونِي هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ (۳۶: ۶۱) "میری بندگی کرو' یہ سیدھا راستہ ہے"۔ یہ راستہ مجھ تک پہنچانے والا ہے اور اس پر چلنے سے میری رضامندی حاصل ہوتی ہے --- تم اس دشمن سے نہ ڈرے جس نے تمہاری نسلوں اور گروہوں کو گمراہ کر دیا۔

أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ (۳۶: ۶۲) "کیا تم عقل نہیں رکھتے تھے"۔

اور اس موقع پر ان کو دی جانے والی سزا یہاں سنا دی جاتی ہے جو نہایت ہی دردناک ہے۔ اور یہ فیصلہ بھی سختی اور سرزنش کے انداز میں سنایا جاتا ہے۔

هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ (۳۶: ۶۳) اصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ

(۳۶: ۶۴) "یہ وہی جہنم ہے جس سے تم کو ڈرایا جاتا رہا تھا' جو کفر تم دنیا میں کرتے رہے ہو اس کی پاداش میں اب اس کا ایندھن بنو"۔

یہ پیشی یہاں ختم نہیں ہو جاتی اور اس کی بساط کو لپیٹ نہیں لیا جاتا بلکہ اس موضوع پر بات چیت جاری ہے اور ایک نیا منظر ہمارے سامنے آتا ہے۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۶۵﴾

"آج ہم ان کے منہ بند کیے دیتے ہیں' ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ دنیا

میں کیا کمائی کرتے رہے ہیں"۔

یوں وہ ایک دوسرے کو ملامت کرتے ہیں۔ ان پر خود ان کے اعضاء شہادت دے رہے ہیں خود ان کی اپنی شخصیت بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے اور ان کی ذات کے حصے ایک دوسرے کے خلاف گواہ ہوں گے اور انسان کا ہر عضو اپنے رب کے سامنے انفرادی طور پر ذمہ دار ہو گا۔ اور اللہ کے سامنے ہر عضو اقرار گناہ کرے گا اور سر تسلیم خم کرے گا۔ یہ نہایت ہیبت ناک اور خوفناک منظر ہے۔ انسان اس منظر کے بارے میں سوچتے ہی کانپ اٹھتا ہے۔

---ooo---

یہ منظر یوں اختتام پذیر ہوتا ہے کہ ان کی زبانیں بند ہیں اور ان کے ہاتھ بات چیت کر رہے ہیں۔ ان کے پاؤں شہادت دے رہے ہیں' حالانکہ انہیں اپنے ہاتھ پاؤں سے یہ توقع ہرگز نہ تھی۔ اگر اللہ چاہتا تو وہ ان کے ساتھ اس کے سوا کوئی اور سلوک کرتا اور انہیں جو سزا چاہتا' دیتا اور ان پر جو مصیبت چاہتا لے آتا۔ یہاں اللہ دوسری سزاؤں کے دو نمونے بھی دیتا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو یوں ہوتا۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى
۴ يُبْصِرُوْنَ ﴿۶۶﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا
۱۷ع وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۷﴾
۳

"ہم چاہیں تو ان کی آنکھیں موند دیں' پھر یہ راستے کی طرف لپک کر دیکھیں' کہاں سے انہیں راستہ سجھائی دے گا؟ ہم چاہیں تو انہیں ان کی جگہ ہی پر اس طرح مسخ کر کے رکھ دیں کہ یہ نہ آگے چل سکیں نہ پیچھے پلٹ سکیں"۔

یہ دو مناظر ہیں ان میں عذاب اور سزا بھی ہے اور تحقیر اور مزاح بھی ہے۔ تحقیر ان لوگوں کی ہے جو دعوت اسلامی کی تکذیب کرتے ہیں اور مزاح ان لوگوں کا ہے جو دین اسلام کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں۔ جو یہ کہتے تھے۔

مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۶:۴۸) "یہ وعدہ کب پورا ہو گا اگر تم سچے ہو"۔

چنانچہ پہلے منظر میں ان کو ان کی شکل بگاڑ کر ان کو اندھا کر دیا گیا ہے۔ اندھوں کے درمیان ایک دوسرے کے درمیان آگے بڑھنے کا مقابلہ ہے۔ وہ راستے کو عبور کر کے ایک دوسرے سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ لیکن ان کو اندھوں کی طرح راہ نہیں سوجھتی۔ اور وہ گرتے پڑتے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ سیدھی راہ دیکھ سکیں۔

فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ (۳۶:۶۶) "کہاں سے انہیں راستہ سجھائی دے گا"۔

اور دوسرے منظر میں انہیں یوں دکھایا گیا ہے کہ چلتے چلتے وہ اپنی جگہ جم گئے۔ بت بن گئے جو نہ آگے جا سکتے ہیں اور نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔ حالانکہ ابھی یہ لوگ اندھے تھے اور ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔

ان دو مناظر میں وہ کھلونے نظر آتے ہیں' ایسے کھلونے جنہیں دیکھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ یہ وہی لوگ تھے جو

قیامت کے وقوع کے بارے میں مزاح کرتے تھے اور اسے اہمیت ہی نہ دیتے تھے ۔

--- ○○○---

یہ حالت تو ان کی اس وقت ہوگی جب قیامت واقع ہو جائے گی جس کے بارے میں انہیں بہت جلدی ہے لیکن اگر انہیں زمین پر مہلت دے دی گئی اور انہوں نے اس میں خوب ترقی کی اور اسے ترقی دی اور قیام قیامت تک اللہ کے منصوبے کے مطابق یہاں زندہ رہے تو بھی یہ لوگ ایک ایسی ناپسندیدہ حالت تک پہنچ جائیں گے جس کے اندر زندگی گزارنے کے بجائے وہ جلدی مرنا زیادہ پسند کریں گے ۔ یہ لوگ ایسے ناتواں اور بوڑھے ہو جائیں گے اور ان کی جسمانی اور دماغی قوتیں اس قدر مضمحل ہو جائیں گی کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہ آئے گی ۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۖ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ﴿٦٨﴾

"جس شخص کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں اس کی ساخت کو ہم الٹ ہی دیتے ہیں کیا (یہ حالات دیکھ کر) انہیں عقل نہیں آتی؟"۔ جب انسان بہت بوڑھا ہو جاتا ہے تو وہ دوبارہ الٹ کر طفل ناتواں بن جاتا ہے ۔ لیکن اس میں بچوں جیسی محبوبیت اور کشش نہیں ہوتی ۔ یوں بوڑھے لوگ پیچھے کی طرف چلتے رہتے ہیں ۔ ان کے پاس جو علم تھا' اسے بھولتے جاتے ہیں ۔ ان کے اعصاب کمزور ہوتے جاتے ہیں ۔ ان کی فکر مضمحل ہوتی جاتی ہے ۔ ان کی قوت برداشت ختم ہوتی جاتی ہے ۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ایسا انسان خالص بچہ ہو جاتا ہے ۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ بچہ اگر توتلی زبان بھی بولتا ہے تو اچھا لگتا ہے ۔ لوگ اسے دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں ۔ وہ اگر کوئی حماقت کرتا ہے تو بھی دیکھنے والے خوش ہوتے ہیں ۔ لیکن بوڑھا تو کبیدہ خاطر ہوتا ہے ۔ اس کی حماقتوں کو محض رحم اور احترام ہی سے برداشت کیا جا سکتا ہے ۔ اور جوں جوں اس کی قوتیں مضمحل ہوتی ہیں اور اس سے حماقتیں سرزد ہوتی ہیں ۔ لوگ اس کے ساتھ مزاح کرتے ہیں ۔ جوں وہ ناتواں ہوتا ہے اس کی کمر ٹیڑھی ہوتی ہے وہ پیچھے ہٹتا ہے اور ہٹتا چلا جاتا ہے ۔

دونوں صورتوں میں یہ برا انجام ہے جو دعوت اسلامی کو جھٹلانے والوں کے انتظار میں ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو ان کے اعمال کی وجہ سے اللہ نے رشد و ہدایت سے محروم کر دیا ہے اور ایمان کی وجہ سے ان کو جو اعزاز ملنے والا تھا' اس سے وہ بے بہرہ رہ گئے ۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۲۰۷ تشریح آیات

## ۶۹ --- تا --- ۸۳

یہ اس سورت کا آخری سبق ہے اور اس میں ان تمام مسائل کو لیا گیا ہے جو اس سورت کا محور ہیں۔ وحی کا مسئلہ ' وحی کی ماہیت ' مسئلہ الوہیت اور وحدانیت الٰہی ۔ بعث بعد الموت اور حشر و نشر۔ اس سبق میں یہ تمام مسائل علیحدہ علیحدہ یکے بعد دیگرے بیان کیے گئے ہیں ' نہایت ہی موثر اور زور دار انداز میں ۔ تمام موضوعات میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ہر چیز کی صنعت میں دست قدرت کارفرما ہے اور اس کائنات کی کنجیاں اللہ کے ہاتھ میں ہیں ۔ یہ مضمون اس سبق اور اس سورت کی آخری آیت میں بیان کیا گیا ہے ۔

فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (۳۶ : ۸۳) "پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو" ۔ یہ دست قدرت اور اس کی صنعت کاریاں ہیں کہ اس نے جانوروں کو بشر کے لیے پیدا کیا اور ان کے تابع فرمان کر دیا ۔ جس نے انسان کو ایک حقیر نطفے سے پیدا کیا اور جس طرح ایک نہایت ہی چھوٹے نطفے سے اسے پیدا کیا ۔ اسی طرح بوسیدہ ہڈیوں سے اسے دوبارہ پیدا کر دے گا ۔ جس نے سرسبز درخت سے آگ پیدا کی ۔ جس نے زمین و آسمان جیسی عظیم کائنات پیدا کی ۔ اور جو اس جہاں کی ہر چیز کا مالک اور مقتدر اعلیٰ ہے ۔ یہ ہے اس سورت کا خلاصہ ۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ ۝ لِّیُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَیًّا وَّیَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ ۝

"ہم نے اس (نبیؐ) کو شعر نہیں سکھایا ہے اور نہ شاعری اس کو زیب ہی دیتی ہے ۔ یہ تو ایک نصیحت ہے اور صاف پڑھی جانے والی کتاب ' تاکہ وہ ہر اس شخص کو خبردار کر دے جو زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر حجت قائم ہو جائے ۔

وحی کے موضوع پر سورت کے آغاز ہی میں بحث ہوئی تھی ۔

یٰسٓ (۳۶ : ۱) وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ (۳۶ : ۲) اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (۳۶ : ۳) عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۳۶ : ۴) تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ (۳۶ : ۵) لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اُنْذِرَ اٰبَاۤؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (۳۶ : ۶) "یٰس ' قسم

ہے قرآن حکیم کی کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو' سیدھے راستے پر ہو اور یہ قرآن غالب اور حکیم ہستی کا نازل کردہ ہے تاکہ تم خبردار کرو ایک ہی قوم کو جس کے باپ دادا خبردار نہ کیے گئے تھے اور اس وجہ سے وہ غفلت میں پڑے ہوئے تھے"۔ یہاں وحی کا ذکر اس مضمون اور مناسبت سے آتا ہے کہ یہ وحی الٰہی ہے' شاعری نہیں ہے۔ کیونکہ بعض لوگ آپ پر یہ الزام لگاتے تھے کہ آپ شاعر ہیں اور قرآن کریم ایک مخصوص قسم کا شعری کلام ہے۔ دراصل کبرائے قریش جانتے تھے کہ معاملہ یہ نہیں ہے۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کلام لائے ہیں وہ عربوں کے اسالیب شعر کے مطابق نہ شعر ہے اور نہ ان کی نثر کی طرح نثر ہے۔ یہ الزام دراصل اسلام کے خلاف ان کی جانب سے پروپیگنڈے کی جنگ تھی۔ اور عوام الناس کو گمراہ کرنے کے لیے قرآن اور حضورؐ پر یہ الزام تھا۔ ہاں یہ لوگ قرآن کریم کے حسن و جمال اور انوکھے اور موثر اسلوب کلام سے یہ استدلال کرتے تھے۔ اس طرح عوام الناس اشعار اور قرآن میں فرق نہ کر سکتے تھے اور اس لیے وہ اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوتے تھے۔

یہاں اللہ اس بات کی تردید فرماتا ہے کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعری سکھائی ہے جب اللہ نے آپ کو شعر کا علم نہیں سکھایا تو آپ کو شعر کا علم ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انسان وہی جانتا ہے جو اللہ اسے سکھاتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس حقیقت سے بھی نقاب کشائی کرتا ہے کہ شعر کہنا آپ کے شایان شان ہی نہیں ہے۔ (وَمَا يَنۡبَغِيۡ لَهٗ) کیونکہ شاعری کا منہاج نبوت کے منہاج سے بہت ہی مختلف ہوتا ہے۔ شعر ایک تاثر ہوتا ہے اور تاثرات کا بیان ہوتا ہے۔ اور انسانی تاثرات مختلف حالات میں بدلتے رہتے ہیں جبکہ نبوت کا منہاج وحی پر مبنی ہوتا ہے اور مستقل ہوتا ہے۔ اور نبی ایک سیدھے راستے پر ہوتا ہے۔ اور اس ناموس الٰہی کے تابع ہوتا ہے جس کے مطابق یہ پوری کائنات رواں دواں ہوتی ہے۔ اور یہ ناموس بدلتی ہوئی خواہشات اور بدلتے ہوئے تاثرات کے مطابق نہیں بدلتا۔ جس طرح شعر بدلتے رہتے ہیں اور ہر حال میں شعر میں ایک نظریہ نہیں پایا جاتا۔

نبوت میں تو نبی براہ راست ہر وقت اللہ سے مربوط ہوتا ہے اور وہ براہ راست اللہ کی وحی سے ہدایت لیتا ہے اور اس کی جدوجہد دائمی انداز لئے ہوئے ہوتی ہے کہ زندگی کا نظام اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق چلے۔ جبکہ شعر' اپنے اعلیٰ معیار کے ساتھ محض انسانی خواہشات اور جمال و کمال کے تاثرات پر مشتمل ہوتا ہے۔ انسان میں انسانی سوچ کی تقصیرات اور کمزوریاں موجود ہوتی ہیں۔ اور وہ انسان کے محدود تصورات کا عکس ہوتا ہے اور انسان کی محدود صلاحیت اور علم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ شعر جب اپنے اعلیٰ مقام سے گر جاتا ہے تو یہ محض جسمانی لذت اور طبعی خواہشات اور جنسی لذت تک گر کر محدود ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر وہ جسمانی بخار کا نام ہوتا ہے۔ لہٰذا نبوت اور شاعری اپنی نوعیت اور ماہیت کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ شعر اگر اعلیٰ درجے کا بھی ہو وہ ان خواہشات پر مشتمل ہوتا ہے جو زمین سے اٹھتی ہیں اور نبوت آسمانوں سے ایک ہدایت کی شکل میں نازل ہوتی ہے۔

اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ وَّقُرۡاٰنٌ مُّبِيۡنٌ (۳۶:۶۹) "یہ تو ایک نصیحت ہے اور صاف پڑھے جانے والی کتاب ہے"۔ ذکر اور قرآن دونوں ایک ہی چیز کی صفات ہیں۔ ذکر اس معنی میں ہے کہ اس کتاب کا اصل مقصد ہی نصیحت ہے اور قرآن اس حساب سے ہے کہ اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ یہ گویا اللہ کی یاد ہے اور دل اس میں مشغول

ہوتا ہے اور قرآن ہے جس کی تلاوت زبان سے ہوتی ہے اور اسے نازل اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ اپنا متعین مقصد پورا کرے۔

لِّیُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَیًّا وَّیَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ (۳۶ : ۷۰) "تاکہ وہ ہر اس شخص کو خبردار کر دے جو زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر حجت تمام ہو جائے"۔ قرآن نے کفر اور حیات کو بالمقابل رکھا ہے۔ گویا کفر موت کے ہم معنی ہے۔ اور جس شخص کے دل میں ایمان کی استعداد ہو' وہ زندہ ہے اور قرآن کا مقصد یہ ہے کہ وہ رسول اللہؐ پر اس لیے نازل ہوا ہے تاکہ آپ اس کے ذریعے ان لوگوں کو ڈرائیں جو زندہ ہوں' جن لوگوں کے اندر زندگی کی رمق ہو' وہ مر نہ گئے ہوں تاکہ ڈرانے کا انہیں فائدہ ہو۔ رہے کفار تو وہ مردے ہوتے ہیں۔ ان کو ڈرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ نیز ڈرانے کا فریضہ اس لیے عائد کیا گیا ہے تاکہ وہ عذاب کے مستحق ہو جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک کسی کو سزا نہیں دیتا جب تک اس تک اللہ کا پیغام پہنچ نہ جائے اور پھر وہ کفر نہ کر دے۔ اور پھر اگر اللہ انہیں ہلاک کر دے تو وہ بلاحجت اور بغیر سبب کے ہلاک نہ کیا جائے۔

یوں لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کے حوالے سے لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک فریق وہ ہے جو اسے قبول کرتا ہے تو وہ زندہ ہے اور ایک وہ ہے جو قبول نہیں کرتا تو وہ مردہ ہے۔ اور اس فریق کو معلوم ہو جائے کہ اس کے خلاف فیصلہ برحق ہوا اور وہ سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔

--- ○○○ ---

اس سبق کے دوسرے ٹکڑے میں الوہیت اور وحدانیت کا مضمون بیان ہوا ہے۔ الوہیت اور وحدانیت کا یہ بیان لوگوں کے مشاہدات کے فریم ورک میں ہے کہ ذرا دیکھو کہ اللہ کے ان پر کس قدر انعامات ہیں جنہیں وہ استعمال کر رہے ہیں لیکن اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَاۤ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَ ذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَ مِنْهَا یَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ لَهُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَ مَشَارِبُ ؕ اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَ هُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَ مَا یُعْلِنُوْنَ ﴿۷۶﴾

"کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لیے مویشی پیدا کیے ہیں اور اب یہ ان کے مالک ہیں۔ ہم نے انہیں اس طرح ان کے بس میں کر دیا ہے کہ ان میں سے کسی پر یہ سوار ہوتے ہیں' کسی کا یہ گوشت کھاتے ہیں' اور ان کے اندر ان کے لیے طرح طرح کے فوائد اور مشروبات ہیں۔ پھر کیا یہ شکر گزار نہیں

ہوتے؟ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے خدا بنا لیے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی مدد کی جائے گی۔ وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ یہ لوگ الٹے ان کے لیے حاضر باش لشکر بنے ہوئے ہیں۔ اچھا' جو باتیں یہ بنا رہے ہیں' وہ تمہیں رنجیدہ نہ کریں' ان کی چھپی اور کھلی سب باتوں کو ہم جانتے ہیں"۔

کیا یہ دیکھتے نہیں؟ اللہ کی نشانیاں تو ان کے سامنے موجود ہیں اور سب کو نظر آتی ہیں۔ نہ ان سے اوجھل ہیں اور نہ دور ہیں۔ اور نہ یہ نشانیاں اس قدر پیچیدہ ہیں کہ انہیں سمجھنے کے لیے کسی بڑے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ یہ انعامات جو اللہ نے انسانوں کے لیے پیدا کیے اور انسانوں کو ان کا مالک بنایا' ان میں سے جانور ہیں جن کو انسانوں کے تابع بنایا جن پر انسان سوار ہوتے ہیں' ان میں سے بعض نعمتوں کو کھاتے اور پیتے ہیں۔ اور بعض سے بعض دوسرے فائدے اٹھاتے ہیں اور یہ سب امور اللہ کی تدابیر اور تقادیر کے مطابق ہے۔ اور پھر اللہ نے انسانوں کے اندر مختلف صلاحیتیں اور خصوصیات ودیعت فرمائیں۔ پھر جانوروں کو مختلف خصائص اور صلاحیتیں دیں۔ انسانوں کو یہ قدرت دی کہ وہ ان کو اپنا تابع فرمان بنائیں اور ان سے فائدے اٹھائیں۔ چنانچہ وہ سدھائے گئے تابع فرمان بنائے گئے اور ان سے انسانوں کی مختلف حاجات و ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ انسانوں کے اندر یہ قدرت نہ تھی کہ وہ ازخود ان نعمتوں کو پیدا کر سکتے۔ سب نعمتیں تو بڑی بات ہے اگر تمام انسان جمع ہو جائیں اور وہ ایک مکھی کی تخلیق کرنا چاہیں تو وہ بھی نہ کر سکیں گے۔ نیز اللہ نے چونکہ مکھی کے اندر یہ خاصیت نہیں رکھی کہ وہ انسانوں کے تابع ہو جائے اس لیے آج تک انسان مکھی کو تابع نہ کر سکے۔

اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ (۳۶ : ۷۳) "پھر کیا یہ شکر گزار نہیں ہوتے"۔ جب انسان ان معاملات کے بارے میں اس انداز سے سوچتا ہے اور قرآن کریم کی روشنی میں ان امور پر غور کرتا ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ تو اللہ کے انعامات کے اندر ڈوبا ہوا ہے اور اس پر اللہ کے کرم کی ہروقت بارش ہو رہی ہے۔ اس کے ماحول کی ہر چیز اس کے لیے رحمت ہے۔ جب بھی وہ کسی حیوان پر سوار ہوتا ہے' یا گوشت کا کوئی ٹکڑا کھاتا ہے' یا دودھ کا ایک گھونٹ پیتا ہے یا سوت' اون اور ریشم کا کوئی کپڑا پہنتا ہے' یا گھی اور پنیر استعمال کرتا ہے یا اپنے انعامات کو کام میں لاتا ہے تو اسے گہرا شعور حاصل ہوتا ہے کہ خالق کائنات کی رحمت کس قدر وسیع ہے اور اس کے انعامات کا دائرہ کس قدر بڑا ہے۔ غرض یہ شعور اور بھی پختہ ہو جاتا ہے جب انسان اس جہاں کی تازہ اور باسی فصلوں اور پھلوں کو استعمال کرتا ہے اور اسی شعور کے نتیجے میں انسانی زندگی پوری کی پوری حمد و ثنا ہو جاتی ہے۔ قدم قدم پر اس شعور کی وجہ سے انسان عبادت اور بندگی کرتا ہے اور رات دن اللہ کا ثنا خواں ہوتا ہے۔

لیکن لوگوں کے اندر یہ شعور نہیں ہے اس لیے وہ شکر نہیں بجا لاتے بلکہ انہوں نے الٹا اللہ کی مخلوق میں دوسری چیزوں کو اللہ کے سوا الٰہ اور مددگار بنا رکھا ہے۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ (۳۶ : ۷۴) لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ (۳۶ : ۷۵) "انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے خدا بنا لیے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی مدد کی جائے گی۔ وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ یہ لوگ الٹے ان کے لیے حاضر باش لشکر بنے

ہوئے ہیں"۔ ماضی میں یوں ہوتا تھا کہ بت اور آستانے پوجے جاتے تھے 'یا درختوں اور ستاروں کی پوجا کی جاتی تھی۔ فرشتوں' اور جنوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ ماضی کی بت پرستی آج بھی بعض علاقوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن جو لوگ اس مظاہر پرستی میں مبتلا نہیں ہیں وہ بھی خالص توحید کے قائل نہیں ہیں۔ آج اکثر لوگ اللہ کے سوا دوسری کھوٹی اور جھوٹی قوتوں سے خائف ہیں اور اللہ کے سوا دوسرے سہاروں پر اعتماد کرتے ہیں۔ شرک کے بہرحال بہت سے رنگ ہوتے ہیں۔ زمان و مکان کے اختلاف سے اس کے رنگ ڈھنگ بھی بدلتے رہتے ہیں۔

یہ لوگ ان الہوں کی بندگی اس لیے کرتے تھے کہ ان کے ذریعے یہ لوگ کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ حالانکہ عملاً صورت حالات یہ ہوتی تھی کہ ان کے الہوں کے خلاف اگر کوئی کچھ اقدام کرتا تھا تو یہ لوگ اپنے الہوں کی امداد کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے اور اپنے الہوں کی حمایت کرتے تھے۔ اصل میں تو یہ لوگ اپنے کھوٹے خداؤں کے مددگار ہوتے تھے۔

وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُحْضَرُونَ (۳۶:۷۵) "وہ اپنے الہوں کے لیے حاضر باش فوجدار تھے"۔ یہ ان کی سوچ اور فکر کی انتہائی کمزوری تھی۔ آج بھی لوگوں کی اکثریت اسی سوچ میں مبتلا ہے۔ اور صرف شکل و صورت کے اعتبار سے ہی اختلاف ہے۔ اصل سوچ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آج جو لوگ بڑے بڑے سرکشوں اور ڈکٹیٹروں کو الہ بنائے ہوئے ہیں۔ وہ ازمنہ سابقہ کے بتوں کے پجاریوں سے کہیں دور نہیں ہیں۔ دراصل یہ لوگ ان بتوں کے فوجدار ہیں۔ یہ لوگ ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کو پوجتے بھی ہیں۔ اور ان کی حمایت و مدافعت بھی کرتے ہیں۔

بت پرستی بہرحال بت پرستی ہے۔ اس کی شکل و صورت مختلف ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ہر دور میں موجود ہوتی ہے۔ اور جب بھی عقیدۂ توحید میں اضطراب پیدا ہوتا ہے بت پرستی کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ شرک اور جاہلیت لے لیتی ہے۔ انسانوں کی فلاح اور نجات صرف توحید خالص میں ہے جس کے اندر صرف اللہ ہی کو الہ سمجھا جائے۔ صرف اس کی بندگی کی جائے۔ اور صرف اسی پر بھروسہ کیا جائے اور اطاعت اور تعظیم بھی اسی کی کی جائے۔

فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ إِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ (۳۶:۷۶) "اچھا جو باتیں یہ بنا رہے ہیں وہ تمہیں رنجیدہ نہ کریں۔ ان کی چھپی اور کھلی سب باتوں کو ہم جانتے ہیں"۔ اس میں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ آپ کے مخاطب وہی لوگ تھے جنہوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو الہ بنا رکھا تھا۔ اور یہ لوگ اللہ کا شکر ادا نہ کرتے تھے۔ لہذا یہ لوگ نصیحت بھی نہ لیتے تھے۔ حضور سے کہا گیا کہ آپ ان کی فکر نہ کریں۔ اللہ ان کے بارے میں خوب جانتا ہے۔ وہ تحریک اسلامی کے خلاف اور بت پرستی کے حق میں جو تدابیر اختیار کر رہے ہیں' وہ ہماری نظروں میں ہیں۔ لہذا اے رسول آپ پر ان باتوں کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ان کے معاملات قدرت الٰہیہ کے سامنے کھلے ہیں اور اللہ کی قدرت ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

تحریک اسلامی کے کارکن جب یہ عقیدہ رکھیں تو ان کا معاملہ بہت ہی سہل ہو جاتا ہے۔ وہ چونکہ صرف اللہ پر بھروسہ کرنے والے ہوتے ہیں اس لیے ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ کیونکہ ان کو یقین ہوتا ہے کہ اللہ ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ یہ کہ وہ اللہ کے قبضے میں ہیں' اللہ کی نظروں میں ہیں اگرچہ بظاہر یہ بات نظر نہ آتی ہو۔

اس آخری سبق کا یہ تیسرا حصہ ہے۔ اس میں حشر و نشر کے مسئلہ کو لیا گیا ہے۔

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ﴿٧٧﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۖ قَالَ مَن يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ﴿٧٨﴾ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ﴿٧٩﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ ﴿٨٠﴾ أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَن يَخْلُقَ مِثْلَهُم ۚ بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ﴿٨١﴾ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَن يَقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٨٢﴾

"کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا؟ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔ کہتا ہے "کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں؟" اس سے کہو' انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا' اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے' وہی جس نے تمہارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے اپنے چولہے روشن کرتے ہو۔ کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے؟ کیوں نہیں' جب کہ وہ ماہر خلاق ہے۔ وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے"۔

اس حصے میں بات کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ انسان کو خود اپنے وجود اور اپنی ذات کی طرف دیکھنا چاہئے۔ اس کی تخلیق کا آغاز کس طرح ہوا' وہ کس طرح بڑا ہوا اور سن بلوغ کو پہنچا۔ یہ سب مراحل جو اس کی زندگی میں طے ہوئے وہ اس کی نظروں میں ہیں۔ وہ دیکھتا رہا ہے۔ کیا اس سے وہ کوئی سبق اور نصیحت نہیں لے رہا ہے۔ کیا خود انسانی زندگی تخلیق و تشکیل سے وہ یہ سبق نہیں اخذ کر سکتا کہ اللہ کے لیے دوبارہ اٹھانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اگرچہ وہ مٹ جائے اور اس کی ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں۔

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ (۳۶:۷۷) "کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا"۔

سوال یہ ہے کہ وہ نطفہ کیا چیز ہے جس کے بارے میں انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ انسان کا اصل قریب ہے۔ یہ ایک حقیر پانی سے مرکب ہے' یہ کوئی ٹھوس چیز ہے اور نہ اس کی کوئی قیمت ہے۔ یہ ایک پانی ہے جس میں ہزار ہا خلیے ہوتے ہیں۔ ان ہزار ہا خلیوں میں سے صرف ایک جنین بنتا ہے۔ اور یہ ایک جنین پھر انسان بنتا ہے۔ یہ پھر اپنے رب اور خالق کے ساتھ گستاخانہ باتیں کرتا ہے۔ رب کی مخالفت کرتا ہے اور اپنے خالق سے برہان و دلیل کا مطالبہ کرتا ہے۔

حالانکہ وہ خالق قدیر ہی ہے جس نے اس قدر حقیر چیز سے انسان کو بنایا اور وہ "خصیم مبین" اور صریح جھگڑالو بن گیا۔

ذرا غور تو کیا جائے کہ یہ انسان کیا سے کیا بن گیا۔ ذرا اس کے آغاز اور انجام پر غور کیا جائے۔ کیا اس قدرت "قادرہ" کے سامنے یہ کوئی مشکل کام ہے کہ وہ اجزائے جسم کو دوبارہ یکجا کر دے۔ اگر چہ وہ مرنے کے بعد زمین میں بکھر گئے ہیں۔

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ (۳۶:۷۸)

قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ (۳۶:۷۹) "وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔ کہتا ہے "کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں"۔ اس سے کہو 'انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے" کس قدر سادہ منطق ہے یہ؟ نہایت فطری استدلال۔ ایسا استدلال جو مشاہدہ کے مطابق نظر آتا ہے۔

یہ نطفہ جو کچھ کہ وہ ہے کیا وہ بوسیدہ ہڈیوں سے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔ کیا انسان اسی نطفے سے نہیں بنا اور کیا انسان کی پیدائش ثانی کا عمل پیدائش اول کا عمل نہیں ہے۔ اور جس ذات نے اس حقیر نطفے کو ایک انسان بنایا اور اسے وہ شخصیت دی کہ وہ صریح جھگڑالو بن گیا تو وہ ذات ان بوسیدہ ہڈیوں سے انسان کو تیار نہیں کر سکتی اور انہی ہڈیوں اور اجزاء سے ایک خلق جدید تیار نہیں کر سکتی؟

یہ معاملہ تو بہت ہی آسان اور ظاہر ہے۔ اور اس قدر ظاہر و باہر ہے کہ اس پر کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ کوئی اس پر مباحثہ کرے۔

قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ (۳۶:۷۹) "اس سے کہو 'انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے"۔

اس کے بعد اللہ کی قدرت خالقہ کی ماہیت کا ایک نمونہ انہیں بتایا جاتا ہے تاکہ یہ بات ان کے ذہن میں بیٹھ جائے۔ اللہ کی یہ صنعت کاری ان کے مشاہدہ اور ان کے روز مرہ کے معمولات میں سے ہے اور یہ اسے آزماتے رہتے ہیں۔

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ (۳۶:۸۰)

"وہ جس نے تمہارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے اپنے چولہے روشن کرتے ہو"۔ یعنی یہ سادہ ابتدائی مشاہدہ ہی اللہ کی قدرت مذکورہ کی تصدیق کر دے گا۔ یہ مشاہدہ تم لوگ روز کرتے ہو لیکن اس کی حقیقت نہیں پاتے ہو۔ یہ سرسبز درخت جو پانی کے رس سے بھرا ہوا ہے جب اس کا ایک حصہ دوسرے سے رگڑا جاتا ہے تو اس سے آگ پیدا ہوتی ہے اور یہ درخت بھی پھر اس آگ کا ایندھن بن جاتا ہے۔ باوجود اپنی سرسبزی اور تروتازگی کے۔ اور وہ گہری تحقیق کہ درخت کے اندر جو طبعی حرارت کا خزانہ ہوتا ہے 'جو وہ سورج کی تاب کاری سے جذب کرتا ہے اور وہ اسے اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتا ہے حالانکہ وہ پانی کے رس سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اور ان درختوں کے رگڑ سے پھر وہ آگ پیدا ہوتی ہے جس طرح جلنے کے عمل سے آگ پیدا ہوتی ہے تو اس تحقیقی علم و معرفت سے یہ حقیقت اور کھل کر سامنے آتی ہے کہ ہرے بھرے درخت سے آگ کس طرح نمودار ہوتی ہے۔ خالق کائنات ہی نے درختوں کے اندر یہ

کمالات ودیعت فرمائے جس نے ہر چیز کو اس کی تخلیق دی اور پھر اسے حکم دیا کہ وہ ان مقاصد کو پورا کرے جن کے لیے پیدا کیا گیا۔ ہاں یہ ہماری بے راہ روی ہے کہ ہم اس مخلوق کو اس زاویہ نظر سے نہیں دیکھتے اور نہ کھلی آنکھوں سے کائنات کے ان عجائبات پر غور کرتے ہیں۔ اس لیے ہم پر یہ اسرار و رموز نہیں کھلتے اور نہ وہ ہماری راہنمائی اس خالق اور صانع کی طرف کرتے ہیں۔ اگر ہم کھلے دلوں اور گہری نظروں کے ساتھ دیکھیں تو یہ اسرار و رموز ہماری دسترس میں ہیں اور ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ ہم انہیں سمجھیں' اللہ کی بندگی کریں اور ہر وقت اللہ کی حمد و ثنا کرتے رہیں۔

اس کے بعد دلائل قدرت الٰہیہ بیان کیے جاتے ہیں اور یہ بتایا جاتا ہے کہ تخلیق کا یہ عمل کس قدر سادہ ہے اور اسی طرح اللہ کے لوگوں کا دوبارہ پیدا کرنا کس قدر آسان ہے۔

اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰی وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ (۳۶ : ۸۱) "کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کر دیا اس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے کیوں نہیں! جبکہ وہ ماہر خلاق ہے"۔ آسمان اور زمین اور یہ وسیع کائنات تو ایک عجیب مخلوق ہے۔ یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں لہذا اس میں لاکھوں ملین اجناس و اصناف مخلوقات موجود ہیں' بعض اس قدر باریک کہ ہم ان کے حجم ہی کو نہیں پکڑ سکتے۔ نہ ہم ان کی حقیقت کو پا سکتے ہیں۔ اور ان کے بارے میں آج تک ہم بہت کم جانتے ہیں۔ یہ زمین اس سورج کے کہکشاں میں سے ایک چھوٹا سا تابع سیارہ ہے جس پر ہم رہتے ہیں۔ اس میں ہم سورج کی روشنی اور حرارت سے رہتے ہیں اور ہمارا یہ سورج جس کہکشاں کے تابع ہے' اس کے اندر ایک کروڑ ستاروں میں سے سورج ایک ہے جس سے ہماری قریب کی یہ دنیا بنتی ہے۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اس جہاں میں کئی اور کہکشاں ہیں۔ اور کئی ایسی دنیائیں ہیں جس طرح ہماری قریب کی دنیا ہے۔ ماہرین فلکیات ابھی تک ایک کروڑ کہکشاؤں تک شمار کر سکے ہیں اور یہ شمار انہوں نے اپنی محدود طاقت والی دوربینوں سے کیا ہے۔ اور وہ اس انتظار میں ہیں کہ کئی اور کہکشاں دریافت ہوں گے جب طاقتور رصد گاہیں اور بہت ہی دور تک دکھانے والی دوربینیں بنا دی جائیں گی۔ ہماری اس کہکشاں اور اس سے قریب ترین کہکشاں کے درمیان فاصلہ کتنا ہے؟ سات لاکھ پچاس ہزار نوری سال کا فاصلہ ہے۔ اور ایک نوری سال کا فاصلہ کیا ہوتا ہے یعنی ۲۶ ملین میل۔ کہتے ہیں کہ طبعی مواد کا ایک عظیم ذخیرہ یا گور تھا اور اس کے بکھرنے سے یہ سورج بنے ہیں۔ یہ ہے اللہ کی وسیع کائنات اور اس کی وسیع کرسی اور اس کے بارے میں ہمارے حقیر اور محدود معلومات۔

یہ سورج جن کو گنا نہیں جا سکتا ان میں سے ہر ایک کا ایک مدار یا آسمان اور فلک ہے جس کے اندر یہ سورج چلتا ہے اور ان سورجوں میں سے ہر سورج کے اپنے تابع اجرام ہیں جن کے اپنے اپنے مدار ہیں۔ وہ ان مداروں میں اپنے اپنے سورجوں کے گرد گھومتے ہیں۔ جس طرح ہماری زمین ہمارے سورج کے گرد گھومتی ہے۔ یہ تمام گھومنے والے اربوں سورج اور چاند اور ستارے نہایت ہی دقیق اور متعین رفتار کے ساتھ چلتے ہیں اور کبھی اپنی رفتار اور مدار کو نہیں بدلتے۔ ایک لمحہ کے لیے نہیں رکتے۔ اگر ایسا ہو جائے تو کائنات کے تمام مجموعے جو اس وقت ان فضاؤں میں تیر رہے ہیں' سب باہم متصادم ہو جائیں اور یہ تمام نظام درہم برہم ہو جائے۔

یہ فضا جس میں اربوں اجرام فلکی چکر لگا رہے ہیں اور جن کی تعداد ابھی ابھی تک معلوم نہیں' یوں ہیں جس طرح

چھوٹے چھوٹے ذرے ہیں - نہ ان کی تصویر کشی ہو سکتی ہے اور نہ یہ دائرہ تصور میں آسکتے ہیں - یہ اس قدر وسیع و عریض کائنات کے حصے ہیں جس کے تصور ہی سے سر چکرا جاتا ہے -

اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَھُمْ

( ۳۶: ۸۱ ) "وہ جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے" - لوگوں کی تخلیق تو ایک معمولی بات ہے جبکہ یہ کائنات بہت ہی وسیع اور عظیم ہے -

بَلٰی وَھُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ( ۳۶ : ۸۱ ) "ہاں وہ ماہر خلاق ہے" - اللہ نے یہ سب چیزیں پیدا کیں وہ ان کے علاوہ اور چیزوں کو بھی پیدا کر سکتا ہے اور بغیر کسی تکلیف اور محنت کے - اللہ کے لیے چھوٹی یا بڑی چیز کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں ہے -

اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ( ۳۶ : ۸۲ ) "وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے" - یہ چیز زمین ہو یا آسمان ہوں 'مچھر ہو یا پسو ہو 'یا چیونٹی 'یہ سب چیزیں اللہ کے حکم کے سامنے یکساں ہوتی ہیں - کن فیکون -

اللہ کے سامنے مشکل و آساں کوئی چیز نہیں ہے - اللہ کے لیے قریب و بعید یکساں ہیں - صرف ارادے کا متوجہ ہونا ہوتا ہے - ادھر ارادہ ہوا ادھر وہ چیز ہو گئی - وہ جو بھی ہو - اللہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ لوگ اللہ کے اعمال و افعال کو سمجھ جائیں - ورنہ انسان کی محدود قوت مدرکہ کے لیے چیزوں کا سمجھنا ہی مشکل ہے -

--- ۰۰۰---

اب اس سورت میں انسان کے قلب و نظر کی تاروں پر ایک آخری ضرب لگائی جاتی ہے - یہ ایک ایسی ضرب ہے ں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کیا ہے -

۵
ع ۱۶ فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾
۴

"پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے 'اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو" -

لفظ ملکوت سے خالق و مخلوق کے تعلق کی اہمیت اور عظمت کا اظہار ہوتا ہے - یعنی یہ کہ اس کائنات کی ہر چیز مطلقاً اللہ کی ملکیت ہے اور اس کائنات کی تمام مملوکات پر اللہ کا مکمل قبضہ اور کنٹرول ہے -

دوسری بات یہ کہ تمام چیزوں کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے - یہ آخری ضرب ہے اور اس سورت کی نہایت عظیم اور ہولناک فضا کے لیے یہ نہایت ہی مناسب تنبیہہ ہے - اس سورت کا موضوع بھی نہایت ہی عظیم اور اہم ہے - اور اس کے اندر جو حقائق اور دلائل بھی لائے گئے ہیں وہ بھی بہت ہی عظیم اور ہولناک ہیں اور اس عظیم حقیقت سے مربوط و متعلق ہیں جن کی تفصیلات اور موضوع اس سورت میں دی گئی ہیں -

--- ۰۰۰---

# فی ظلال القرآن

## جلد ---- پنجم

## پارہ ----- ۲۳

## سورہ الصّٰفّٰت ۔ ۳۷

### آیات ۱--- تا--- ۱۸۲

# سورۃ الصٰفٰت ایک نظر میں

سابقہ سورت کی طرح یہ سورت بھی مکی ہے۔ اس کی آیات اور فواصل مختصر اور زود اثر ہیں اور ان کے اندر مختلف مناظر اور مختلف مواقف ہیں۔ مختلف تصاویر اور مختلف سائے ہیں۔ اس کے اندر تمام واقعات ایسے ہیں جن کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن بعض واقعات خصوصی طور پر نہایت ہی شدید 'سخت اور گہرے اثرات چھوڑ جاتے ہیں۔

تمام دوسری مکی سورتوں کی طرح اس سورت کا ہدف بھی یہی ہے کہ انسانوں کے نظریات اور عقائد کو درست کیا جائے۔ انسانی سوچ کو ہر قسم اور ہر شکل و صورت کی شرک سے پاک کیا جائے۔ لیکن خصوصاً یہاں شرک کی اس صورت کو لیا گیا ہے جو اس وقت عربی معاشرے میں رائج تھی۔ یہ سورت شرک کی اس قسم پر طویل تبصرہ کرتی ہے اور مختلف وسائل اور ذرائع سے اس کے کھوٹ اور باطل ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ جاہلیت عربیہ نے اس شرک کی شکل و صورت یوں گھڑ رکھی تھی کہ وہ اللہ اور جنوں کے درمیان رشتہ داریاں ثابت کرتے تھے۔ اس سوچ میں وہ اس قدر آگے بڑھے تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اللہ نے نعوذ باللہ جنوں کے ساتھ شادی کی اور اس کے نتیجے میں ملائکہ پیدا ہوئے۔ پھر یہ بھی ان کا عقیدہ تھا کہ فرشتے عورتیں ہیں اور یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔

اس سورت میں ان خرافاتی کہانیوں پر تنقید کی گئی ہے۔ اس تصور کے پوچ اور اس سوچ کے کھوٹے پن سے بحث کی گئی ہے۔ چونکہ اس سورت کا یہ اہم موضوع تھا' اس لیے سورت کے آغاز ہی میں فرشتوں کے بعض گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ اللہ کے حوالے سے ان کی حیثیت کا تعین ہو۔

وَ الصّٰٓفّٰتِ صَفًّا (۳۷:۱) فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا (۳۷:۲) فَالتّٰلِیٰتِ ذِکْرًا

(۳۷:۳) "قطار در قطار صف باندھنے والوں کی قسم' پھر ان کی قسم جو ڈانٹنے پھٹکارنے والے ہیں۔ پھر ان کی قسم جو کلام نصیحت سنانے والے ہیں"۔ اس کے بعد سرکش شیاطین کا ذکر آتا ہے جن کو شہاب ثاقب کے ذریعہ مارا جاتا ہے تاکہ وہ ملاء اعلیٰ کے قریب نہ جا سکیں۔ اور عالم بالا میں اللہ کے تکوینی امور کے بارے میں جو فیصلے ہوتے ہیں ان کے سننے کے لیے یہ کان نہ لگائیں۔ اگرچہ عربوں میں مروج وہم پرستانہ کہانیوں کے مطابق عالم بالا سے ان شیاطین کو یوں نہ بھگایا جا سکتا تھا۔ اس سورت میں زقوم کے پودے کے پھلوں کو رؤس الشیاطین سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی اس درخت کو مزید گھناؤنا اور قبیح ثابت کرنے کے لیے 'سورت کے آخر میں اس پوچ تصور پر براہ راست حملہ کیا گیا ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ (۳۷:۱۴۹) اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّ هُمْ شٰهِدُوْنَ (۳۷:۱۵۰) اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ (۳۷:۱۵۱) وَلَدَ اللّٰهُ

وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۵۲:۳۷) اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ (۱۵۳:۳۷) مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (۱۵۴:۳۷) اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۱۵۵:۳۷) اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ (۱۵۶:۳۷) فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۵۷:۳۷) وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ (۱۵۸:۳۷) سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۱۵۹:۳۷)(۱۴۹:۳۷–۱۵۹) "پھر ذرا ان لوگوں سے پوچھو' کیا (ان کے دل کو یہ بات لگتی ہے کہ) تمہارے رب کے لیے تو ہوں بیٹیاں اور ان کے لیے ہوں بیٹے؟ کیا واقعی ہم نے ملائکہ کو عورتیں ہی بنایا ہے اور یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں؟ خوب سن رکھو' دراصل یہ لوگ اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ "اللہ اولاد رکھتا ہے"۔ اور فی الواقع یہ جھوٹے ہیں۔ کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لیے پسند کر لیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے' کیسے حکم لگا رہے ہو؟ کیا تمہیں ہوش نہیں آتا؟ یا پھر تمہارے پاس اپنی ان باتوں کے لیے کوئی صاف سند ہے' تو لاؤ اپنی وہ کتاب اگر تم سچے ہو۔ انہوں نے اللہ اور ملائکہ کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے' حالانکہ ملائکہ خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ مجرم کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں۔ اللہ پاک ان باتوں سے جو یہ لوگ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں"۔

اس مخصوص صورت شرکیہ کی تردید کے ساتھ ساتھ' اس سورت میں ان تمام دوسرے غلط عقائد کی بھی تردید کی گئی ہے جو کہ سورتوں کا خاص موضوع ہے۔ چنانچہ خالص توحید پر اس ظاہرو باہر کائنات سے استدلال کیا جاتا ہے۔

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ (۴:۳۷) رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ (۵:۳۷) "تمہارا معبود حقیقی بس ایک ہے' وہ جو زمین اور آسمانوں اور تمام ان چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں اور سارے مشرقوں کا مالک ہے"۔ یہ سورت تصریح کرتی ہے کہ شرک جہنم رسید ہونے اور عذاب پانے کا سبب اول ہے۔ یہ تصریح مناظر قیامت کے ایک منظر میں کی جاتی ہے۔

فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ (۳۳:۳۷) اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ (۳۴:۳۷) اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ (۳۵:۳۷) وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (۳۶:۳۷) بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ (۳۷:۳۷) اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ (۳۸:۳۷) وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳۹:۳۷)

(۳۳:۳۷ تا ۳۹) "اس طرح وہ سب اس روز عذاب میں مشترک ہوں گے۔ ہم مجرموں کے ساتھ یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے تو یہ گھمنڈ میں آ جاتے تھے

اور کہتے تھے کہ ہم ایک شاعر مجنون کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں ۔ حالانکہ وہ حق لے کر آیا تھا اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی تھی ۔ اب ان سے کہا جائے گا کہ تم لازما دردناک سزا کا مزہ چکھنے والے ہو اور تمہیں جو بدلہ بھی دیا جا رہا ہے وہ انہی اعمال کا دیا جا رہا ہے ۔ جو تم کرتے رہے ہو ۔

اس سورت میں بعث بعد الموت اور جزاء و سزا کے مسئلے کو بھی لیا گیا ہے ۔

وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۳۷:۱۵) ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ (۳۷:۱۶) اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ (۳۷:۱۷) قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ

(۳۷:۱۸) ”اور وہ کہتے ہیں یہ تو صریح جادو ہے ۔ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں اس وقت ہم پھر ...... زندہ کر کے اٹھا کھڑے کیے جائیں گے اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آباؤ اجداد بھی اٹھائے جائیں گے ۔ ان سے کہو ہاں اور تم خدا کے مقابلے میں بے بس ہو“ ۔ اور اس کے بعد پھر مناظر قیامت میں سے ایک طویل اور منفرد منظر پیش کیا جاتا ہے ، جس کے اندر بے شمار مناظر ، حرکات ، تاثرات اور اچانک آنے والے حالات پیش کیے گئے ہیں ۔

اس سورت میں وحی الٰہی اور منصب رسالت سے بھی بحث کی گئی ہے ۔ وہ کہتے تھے ۔

وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (۳۷:۳۶) ”کیا ہم اپنے الہوں کو ایک شاعر اور مجنوں کی وجہ سے چھوڑ دیں“ ۔ اس کا جواب یوں آتا ہے :

بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ (۳۷:۳۷) ”بلکہ وہ سچ لے کر آیا ہے اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی ہے“ ۔

اہل مکہ کی گواہی اور تکذیب کی مناسبت سے رسولوں کے قصے بھی اس سورت میں لائے گئے ہیں ۔ حضرت نوح ، حضرت ابراہیم اور آپ کی اولاد کے قصص لائے گئے ہیں ۔ حضرت موسیٰ ، حضرت ہارون ، حضرت الیاس ، حضرت لوط اور حضرت یونس علیہم السلام کے قصص بھی لائے گئے ہیں ۔ ان قصص سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اپنے رسولوں پر ہمیشہ رحمت فرماتا رہا ہے اور ان کی نصرت کرتا رہا ہے ۔ اور ان کے مخالفین اور مکذبین پر اللہ کا عذاب آتا رہا ہے ۔ اور ان کو سزا دی جاتی رہی ہے ۔

وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ (۳۷:۷۱) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ (۳۷:۷۲) فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ (۳۷:۷۳) اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ (۳۷:۷۴) ”حالانکہ ان سے پہلے بہت سے لوگ گمراہ ہو چکے تھے اور ان میں ہم نے تنبیہ

کرنے والے رسول بھیجے تھے ۔ اب دیکھو کہ ان تنبیہ کیے جانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ اس بدگمانی سے بس اللہ کے وہی بندے بچے ہیں جنہیں اس نے اپنے لیے خالص کر لیا تھا"۔

ان قصص میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بہت ہی ممتاز ہے ۔ حضرت اپنے بیٹے کو خواب میں اشارے کی بنا پر ذبح کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طاعت اور سرتسلیم خم کرنے کا اعلیٰ ترین معیار کیا ہوتا ہے ۔ یہ اطاعت امر رب کی اعلیٰ ترین مثال ہے اور اس اعلیٰ اور بلند ترین چوٹی پر وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جنہوں نے اپنے نفوس کی تربیت اعلیٰ مقاصد کے لیے کی ہو اور ان کی نظریں افق اعلیٰ پر ہوں جو نہایت ہی روشن ہے ۔

اس سورت میں موضوع سخن اور مسائل زیربحث کے نتیجے میں جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کا خلاصہ واضح طور پر یوں ہے :

۱۔ آسمانوں کے مناظر' کواکب اور شہاب ثاقب کے حیران کن مناظر :

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ (۶:۳۷) وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ (۷:۳۷) لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ (۸:۳۷) دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ (۹:۳۷) اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (۱۰:۳۷) "ہم نے آسمان دنیا کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے اور ہر شیطان سرکش سے اس کو محفوظ کر دیا ہے ۔ یہ شیاطین ملاء اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے ۔ ہر طرف سے مارے اور ہانکے جاتے ہیں اور ان کے لیے پیہم عذاب ہے ۔ تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے"۔

۲۔ قیامت کے مناظر اور اس کے نہایت ہی اچانک' غیر متوقع اور دہشت ناک مناظر اور نہایت ہی قوی اثرات اس سورت میں بیان کیے گئے ۔ اس سورت میں یہ مناظر ایک خصوصی شان لیے ہوئے ہیں ۔ ان کی تفصیلات ہم تشریح آیات کے وقت دیں گے ۔ انشاء اللہ!

۳۔ پھر اس سورت میں لائے ہوئے قصص میں خاص اشارات اور اسباق پوشیدہ ہیں ۔ خصوصاً قصہ ابراہیم اور آپ کے ذبیح بیٹے اسماعیل علیہ السلام کے واقعات میں یہ اثرات اپنے عروج پر نظر آتے ہیں ۔ باپ جب بیٹے کو حکم الٰہی کے تحت ذبح کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں تو تسلیم و رضا کی یہ ایک اعلیٰ ترین مثال قرار پاتی ہے اور بہت ہی مشکل تعمیل۔

۴۔ پھر اس سورت میں ترنم انگیز فواصل آیات ہیں ۔ مختصر آیات اور آیات کا ہم وزن خاتمہ ۔ اس سورت کے مناظر' اس کے پرتوؤں اور اس کے مواقف اور اشارات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں ۔

یہ سورت ان موضوعات کو تین اسباق کی شکل میں لیتی ہے ۔

۱۔ پہلے سبق کا آغاز ان ملائکہ کی قسم کے ساتھ کیا جاتا ہے ۔ جو صف بستہ تعمیل حکم ... ہیں اور جو ڈانٹتے اور پھٹکارتے ہیں اور وہ جو کلام نصیحت سناتے اور پھیلاتے ہیں ۔ یہ قسم اس بات پر اٹھائی جاتی ہے کہ تمام مشرقوں کا رب

اللہ وحدہ ہے جس نے آسمانوں کو کواکب کے ذریعے مزین کیا ہے ۔ پھر شیاطین ' ان کی جانب سے عالم بالا کے راز چرانے اور شہاب ثاقب سے مارے جانے کا ذکر ہے اور اس کے بعد سوال کیا جاتا ہے ۔

اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا (۳۷ : ۱۱) "کیا یہ لوگ زیادہ طاقتور ہیں" یا یہ بندگان خدا ملائکہ 'کواکب 'شیاطین اور شہاب ثاقب؟ اس سے اس بات پر استدلال کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ بعث بعد الموت کو بعید سمجھتے ہیں ۔ حالانکہ اللہ کے لیے یہ بہت ہی آسان کام ہے ۔ یہ لوگ اپنی کج فہمی کی وجہ سے اسے مستبعد سمجھتے ہیں اور مزاح کرتے ہیں ۔ چنانچہ اس کے بعد حساب و کتاب اور جنت و دوزخ کا ایک طویل منظر پیش کیا جاتا ہے 'یہ ایک منفرد منظر ہے ۔

۲۔ دوسرے سبق کا آغاز اس مضمون سے کیا جاتا ہے ۔ کہ مکہ کے گمراہوں کی مثالیں امم سابقہ میں بھی موجود رہی ہیں ۔ ان کے پاس بھی ڈرانے والے آئے تھے لیکن ان میں سے اکثر لوگ گمراہ ہی رہے ۔ ان ڈرانے والوں میں قوم نوح ' قوم ابراہیم 'موسیٰ ' ہارون ' الیاس 'لوط اور یونس علیہم السلام کے قصص لائے گئے ہیں ۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان ڈرانے والوں کی اقوام کا انجام کیا ہوا ۔

۳۔ تیسرے سبق میں وہ خرافاتی تصور پیش کر کے اسے رد کیا گیا ہے ۔ جس کا تذکرہ ہم کر آئے ہیں ۔ یعنی جنات اور ملائکہ کا قصہ ۔ اس آخری سبق میں اللہ کے اس عہد کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو اس نے تمام رسولوں کے ساتھ کیا ہے ۔

وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ (۳۷ : ۱۷۱) اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ (۳۷ : ۱۷۲) وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۳۷ : ۱۷۳) "اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا" ۔ سورت کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ تمام شرکوں سے پاک ہیں ۔ اس کے رسولوں پر دنیا و آخرت میں سلامتی ہے ۔ اور ہر قسم کی حمد و ثنا اور حاکمیت و ربوبیت اللہ کے لیے ہے ۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۳۷ : ۱۸۰) وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ (۳۷ : ۱۸۱) وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۳۷ : ۱۸۲) "پاک ہے تیرا رب 'عزت 'کا مالک ' ان تمام باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں اور سلام ہے رسولوں پر ' اور ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے" یہی وہ اصل مسائل ہیں جو اس سورت کا موضوع سخن ہیں ۔ اور سورت کے مضامین انہی کے گرد گھومتے ہیں ۔

اب تفصیلات اور تشریحات ۔

--- ooo ---

# درس نمبر ۲۰۸ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۶۸

---

آیاتھا ۱۸۲ سُوْرَةُ الصّٰفّٰتِ (۳۷) مَكِّيَّةٌ (۵۶) رکوعاتھا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَ الصّٰٓفّٰتِ صَفًّاۙ۝۱ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًاۙ۝۲ فَالتّٰلِیٰتِ ذِكْرًاۙ۝۳ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌؕ۝۴
رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا وَ رَبُّ الْمَشَارِقِؕ۝۵

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”قطار در قطار باندھنے والوں کی قسم، پھر ان کی قسم جو ڈانٹنے پھٹکارنے والے ہیں، پھر ان کی قسم جو کلام نصیحت سنانے والے ہیں، تمہارا معبود حقیقی بس ایک ہی ہے --- وہ جو زمین اور آسمانوں کا اور تمام ان چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں، اور سارے مشرقوں کا مالک“۔

قطاروں میں صف آرا ہونے والے، زجر کرنے والے اور تلاوت کرنے والے دراصل وہ فرشتے ہیں جو ان اعمال کے حامل ہیں۔ صفیں باندھنے والے یعنی نمازوں میں یا اللہ سے احکام لینے کے انتظار میں صف بستہ مراد ہوں اور زجر و توبیخ سے مراد یہ ہو سکتی ہے کہ جن نافرمانوں کی روح قبض کرنا مقصود ہو تو وہ ڈانٹتے ہوئے لیتے ہیں، یا وہ جو حشر میں ان کو ڈانٹ ڈپٹ سے جہنم کی طرف چلائیں گے۔ یا کسی بھی حال میں اللہ کی مرضی کے مطابق زجر کرنے والے۔ اور تلاوت و ذکر کرنے والوں سے مراد کتاب الٰہی پڑھنے والے اور اللہ کی تسبیحات کرنے والے ہو سکتے ہیں۔

غرض ملائکہ کی ان خاص اقسام و انواع کی قسم کھانے کی غرض و غایت یہ ہے کہ لوگو! جان لو کہ۔

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ (۳۷ : ٤) ”تمہارا معبود حقیقی بس ایک ہی ہے“۔ اور ان فرشتوں کی اس حالت کی پھر قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ فرشتوں کے بارے میں عربوں کا مقصود بہت غلط تھا جیسا کہ ہم نے کہا کہ عرب فرشتوں کو اللہ کی اولاد سمجھتے تھے اور بعض عرب فرشتوں کو الٰہ بھی اس لیے بتاتے تھے کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں لہٰذا ہماری دیویاں ہیں۔

ضروری ہوا کہ فرشتوں کی حیثیت بتانے کے بعد اللہ خود اپنی تعریف بھی فرما دے :

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ رَبُّ الْمَشَارِقِ (۳۷ : ۵) "وہ جو زمینوں اور آسمانوں کا اور تمام ان چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان ہیں اور سارے مشرقوں کا مالک ہے" ۔ یہ زمین اور آسمان جو انسانوں کے ارد گرد قائم ہیں وہ انسانوں کو بتاتے ہیں کہ اس عظیم کائنات کا ایک خالق مدبر ہے ۔ اس جہاں میں کوئی ذات اس کے سوا نہیں ہے جس کا یہ دعویٰ ہو کہ اس کی تخلیق اور تدبیر میں اس کا بھی حصہ ہے ۔ کوئی عقلمند انسان اس اعتراف سے نہیں بھاگ سکتا کہ اس جہاں کا خالق بے قید قدرتوں کا مالک ہے ۔ اور وہ رب ہے اور وہی مالک ہے زمین و آسمان اور ان کے درمیان ہر چیز کا ۔ خواہ ہوائیں ہیں ' بادل ہیں ' روشنی ہے ' مخلوقات ہیں ' دیکھی جانے والی مخلوقات ہیں یا ایسی مخلوقات ہیں جو نظر نہیں آسکتیں اور آئے دن ان کے بارے میں انسانوں کے علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے ۔ لیکن ان کی اکثریت اب بھی نظروں سے اوجھل ہے ۔

آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی مسافتیں اسی قدر وسیع ' اس قدر عظیم ہیں اور ان کے درمیان پائی جانے والی مخلوقات اس قدر متنوع ' خوبصورت اور باہم ہم آہنگ ہیں کہ ایک زندہ دل انسان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ اور اس کائنات سے گہرے تاثر اور عبرت پکڑتے اور اس پر غور و فکر کے بغیر وہی شخص گزر سکتا ہے جس کا دل مر چکا ہو ' اس لیے ایسے شخص پر پھر یہ خوشگوار تاثرات کوئی اثر نہیں کرتے اور اس کا دل و دماغ ان عجائبات کو دیکھ کر بھی جوش میں نہیں آتا ۔

رَبُّ الْمَشَارِقِ (۳۷ : ۵) "مشرقوں کا مالک" ۔ ہر ستارے کے لیے ایک مشرق ہے اور ہر سیارے کا بھی ایک مشرق ہے ۔ لہٰذا اس کائنات میں بے شمار مشارق ہیں ۔ ان وسیع اجرام فلکی میں ان گنت مشارق ہیں ۔ اس تعبیر میں اس زمین کی طرف بھی گہرا اشارہ ہے جس پر ہم رہتے ہیں ۔ زمین جب سورج کے سامنے حرکت محوری کا عمل کرتی ہے ' تو کسی نہ کسی وقت اس کا ایک حصہ مشرق ہوتا ہے ۔ اسی طرح کسی نہ کسی وقت اس کا ایک حصہ مغرب ہوتا رہتا ہے ۔ اور یہ عمل پے درپے چلتا رہتا ہے ۔ جونہی کوئی حصہ سورج کے سامنے آتا ہے وہ مشرق ہوتا ہے ۔ اور اس کے بالمقابل حصہ مغرب ہوتا ہے ۔ جوں جوں حرکت اور گردش ہوتی رہتی ہے ' مشرق بھی بدلتا رہتا ہے اور مغرب بھی ۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے نزول قرآن کے وقت لوگ بے خبر تھے ۔ لیکن اللہ نے ان کو اس قدر قدیم زمانے میں خبر دے دی ۔

یہ نہایت ہی گہرا انتظام ہے ' جس کے مطابق اس زمین پر مشارق رواں دواں ہیں اور یہ خوبصورتی جو طلوع آفتاب کے وقت اس زمین پر بکھر جاتی ہے ' یہ اس قابل ہے کہ انسانی دل کو خوشگوار ' تاثر اور گہرے غور و فکر کے تاثرات سے بھر دیں ۔ اور انسان چلا اٹھے کہ صانع کائنات کی کیا شان ہے اور انسان چلا اٹھے کہ بے شک اللہ وحدہ خالق کائنات ہے کہ اس عجیب صفت کے آثار اور اس کی ساخت اور طبیعت یہ بتاتی ہے کہ اس کا بنانے والا ایک ہی ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں اللہ کی صفت رب المشارق کو لایا گیا ہے ۔ عنقریب ہم کواکب ' شہاب ثاقب ' شیاطین اور ان کے بھگائے جانے پر بحث کریں گے ' اس موقعہ پر رب المشارق کے کچھ اور مفہوم اور مناسبتیں بھی بیان کریں گے ۔

---000---

اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِزِیۡنَةِ ۣالۡکَوَاکِبِ ﴿۶﴾ وَ حِفۡظًا مِّنۡ کُلِّ شَیۡطٰنٍ مَّارِدٍ ﴿۷﴾ لَا یَسَّمَّعُوۡنَ اِلَی الۡمَلَاِ الۡاَعۡلٰی وَ یُقۡذَفُوۡنَ مِنۡ کُلِّ جَانِبٍ ﴿۸﴾ دُحُوۡرًا وَّ لَهُمۡ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ﴿۹﴾ اِلَّا مَنۡ خَطِفَ الۡخَطۡفَةَ فَاَتۡبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿۱۰﴾

"ہم نے آسمان دنیا کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے اور ہر شیطان سرکش سے اس کو محفوظ کر دیا ہے۔ یہ شیاطین ملاء اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے۔ ہر طرف سے مارے اور ہانکے جاتے ہیں اور ان کے لیے پیہم عذاب ہے۔ تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔

سورت کے آغاز میں ملائکہ کے بارے میں عربوں کے غلط خیالات پر بحث کی گئی تھی' یہاں شیاطین کے بارے میں ان کے غلط خیالات کو لیا جاتا ہے۔ عربوں کے یہ خیالات تھے کہ اللہ اور جنوں کے درمیان رشتہ داری ہے۔ بعض عرب محض اس خیال سے شیاطین کی پوجا کرتے تھے کہ شیاطین کو ملکوت السموات کی بعض غیوب کا علم ہوتا ہے۔ وہ ملاء اعلیٰ سے وابستہ ہوتے ہیں اور یوں نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

زمین' آسمان اور مشرقوں کے ذکر کے بعد' چاہے ان سے مراد ستاروں کے مشرق ہوں' زمین کے اوپر جاری مشرق ہوں' یا دونوں مشرق ہوں یا ان سے مراد نور اور روشنی ہو' بہرحال اب یہاں کواکب کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِزِیۡنَةِ ۣالۡکَوَاکِبِ (۳۷:۶) "ہم نے آسمان دنیا کو تاروں سے آراستہ کیا ہے"۔ صرف ایک نظر ہی سے یہ زینت دکھائی دیتی ہے۔ چاندنی رات میں تارے اور کواکب کیا نظارہ پیش کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق کائنات میں جمال ایک اہم عنصر ہے۔ جس طرح اللہ کی تخلیق غور و فکر کے بعد انوکھی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح خوبصورت بھی معلوم ہوتی ہے۔ جمال اس کائنات کے نقشے میں کوئی عارضی رنگ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک حقیقی عنصر ہے۔ تخلیق کائنات میں دو چیزیں بنیادی مواد ہیں۔ ایک کمال درجے کا منصوبہ اور دوسرا نہایت ہی خوبصورت نقوش فطرت۔ یہ دونوں عنصر برابر اور مقصود بالذات ہیں۔ اور اس کائنات میں کمال و جمال دونوں اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔

چاندنی رات میں جب انسان تاروں بھرے آسمان کو دیکھتا ہے تو وہ اس دنیا کے خوبصورت ترین منظر کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ یہ منظر اس قدر خوبصورت ہوتا ہے کہ انسان دیکھتا چلا جائے' نظریں تھکتی نہیں اور دل ملول نہیں ہوتا۔ ہر ستارہ ضو بار ہوتا ہے اور چمکتا ہے۔ ہر سیارہ اپنا نور بکھیر رہا ہوتا ہے۔ انسان محسوس کر رہا ہے کہ یہ کائنات کی محبت بھری آنکھیں ہیں جو نظر چرا کے دیکھ رہی ہیں اور جب انسان ان پر نظر ڈالتا ہے تو یہ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں' چھپ جاتی ہیں اور جب آپ ان سے نظر ہٹاتے ہیں تو یہ آنکھیں پھر چمک اٹھتی ہیں اور اپنے منظور نظر کی تلاش میں رہتی ہیں۔ ہر رات ان آنکھوں کا موقف مختلف ہوتا ہے اور منزل جدا ہوتی ہے۔ یہ بھی انسان کے لیے ایک ذہنی اور نفسیاتی خوراک ہے اور اسے جس قدر بھی کوئی کھائے سیر نہیں ہوتا اور نہ ملول ہوتا ہے۔

اگلی آیت میں بتایا جاتا ہے کہ ان کواکب کا ایک دوسرا فریضہ بھی ہے۔ ان میں سے بعض شہاب ثاقب ہوتے ہیں اور یہ ان شیاطین پر بمباری کرتے ہیں جو ملاء اعلیٰ کے قریب جانے کی سعی کرتے ہیں۔

وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ (۳۷:۷) لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ (۳۷:۸) دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ (۳۷:۹) اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (۳۷:۱۰) اور ہر سرکش شیطان سے اس کو محفوظ کر دیا ہے۔ یہ شیاطین ملاء اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے۔ ہر طرف سے مارے اور ہانکے جاتے ہیں اور ان کے لیے پیہم عذاب ہے۔ تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔

بعض سیارے ایسے ہوتے ہیں جو عالم بالا کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کی ڈیوٹی یہ ہوتی ہے کہ یہ عالم بالا میں جو فیصلے اس عالم کے بارے میں ہوتے ہیں' شیاطین کو ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے سے روکتے رہیں۔ جب بھی کوئی شیطان عالم بالا سے کوئی راز چرانے کی سعی کرتا ہے تو شہاب ثاقب اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ اور ان کو مار کر ہانک دیتے ہیں۔ ایسے شیاطین متمردین کے لیے آخرت میں ایسا عذاب ہو گا جو کبھی ختم ہونے والا نہ ہو گا۔ بعض اوقات شیاطین' بعض معلومات لے اڑتے ہیں ایسے شیاطین کا پیچھا یہ شہاب ثاقب کرتے ہیں۔ یہ شہاب ایسے شیاطین پر لگتے ہیں اور انہیں جلا کر رکھ دیتے ہیں۔

ہم ان کیفیات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے کہ یہ شیاطین جاسوسی کا یہ عمل کس طرح کرتے ہیں اور کس طرح وہ کچھ معلومات لے اڑتے ہیں اور کس طرح انہیں شہاب ثاقب کے ذریعے بھسم کر دیا جاتا ہے۔ یہ عالم غیب کی باتیں ہیں اور انسانی فہم وادراک کی جو طبیعت ہے وہ ان کے معلوم کرنے سے عاجز ہے۔ اور نہ ان کی کیفیات کا تصور کر سکتی ہے۔ ہمارا طریقہ یہی ہے کہ اللہ کی طرف سے جو کچھ آ جائے ہم اس کی تصدیق کر دیں' اس جہاں کے اندر ہم طبیعیات کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں وہ سطحی علم ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ شیاطین جن کو عالم بالا تک پہنچنے نہیں دیا جاتا۔ اور وہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کی طرف کان لگانے سے بھی ان کو روکا جاتا ہے۔ وہی شیاطین ہیں جن کے بارے میں عرب کے لوگوں کا دعویٰ تھا کہ ان کا اور اللہ تعالیٰ کا آپس میں رشتہ ہے (نعوذ باللہ)۔ اگر ان لوگوں کا یہ دعویٰ درست ہوتا تو معاملہ مختلف ہوتا۔ اور یہ نہ ہوتا کہ اللہ کے رشتہ داروں کو اس طرح دھتکارا جاتا' ہانکا جاتا اور اگر کچھ بات وہ لے اڑیں تو انہیں رجم کر دیا جاتا۔ یہ رشتہ دار تو عالم بالا میں آزادانہ آتے جاتے۔

ملائکہ کے ذکر اور آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان اشیاء کے ذکر کے بعد اور ان ستاروں کے ذکر کے بعد جن سے آسمانوں کو مزین کیا گیا اور ان شیطانوں کے ذکر کے بعد جو سرکش ہیں اور جن پر شہاب ثاقب چھوڑے جاتے ہیں' اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ذرا ان لوگوں سے پوچھیں کہ وہ زیادہ طاقتور ہیں یا مذکورہ بالا ... طاقتور ہے اور زیادہ قوی ہے تو پھر وہ دوبارہ اٹھائے جانے کے

تصور سے کیوں دہشت زدہ ہو جاتے ہیں اور مزاح کرتے ہیں ۔ اور اس کے وقوع کو مستبعد سمجھتے ہیں ۔ حالانکہ قیامت میں لوگوں کو دوبارہ اٹھانا اس عظیم اور ہولناک مخلوقات کی پیدائش سے زیادہ مشکل امر نہیں ہے ۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۱۶﴾ اَوَاٰبَاۗؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۱۷﴾

”اب ان سے پوچھو ‘ ان کی پیدائش زیادہ مشکل ہے یا ان چیزوں کی جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں؟ ان کو تو ہم نے لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے ۔ تم (اللہ کی قدرت کے کرشموں پر) حیران ہو اور یہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں ۔ سمجھایا جاتا ہے تو سمجھ کر نہیں دیتے ۔ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اسے ٹھٹھوں میں اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں ”یہ تو صریح جادو ہے ‘ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مرچکے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں اس وقت ہم پھر زندہ کر کے اٹھا کھڑے کیے جائیں؟ اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آباؤ اجداد بھی اٹھائے جائیں گے“ ۔

ذرا ان سے پوچھو کہ تم مانتے ہو کہ ملائکہ ‘ سماوات ‘ زمین ‘ ان کے درمیان فضائیں ‘ شیاطین ‘ ستارے اور شہاب ثاقب سب اللہ کی مخلوق ہیں ۔ تو کیا تمہاری تخلیق زیادہ مشکل ہے یا اللہ کے ان جہانوں کی تخلیق؟

اس سوال کے بعد ان کے جواب کا انتظار ہی نہیں کیا جاتا کیونکہ جواب تو ظاہر ہے ۔ یہ سوال تو محض سرزنش کے لیے کیا گیا ہے اور ان کی غباوت پر تعجب کے اظہار کے لئے کیا گیا ہے ۔ اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ لوگ حد درجہ غافل اور حیران کن حد تک نافہم نہیں ۔ چنانچہ ان کے سامنے یہ حقیقت رکھی جاتی ہے کہ آغاز میں تمہیں ایک لیس دار گارے سے بنایا گیا ہے ۔ اور یہ گارا اسی زمین سے لیا گیا ہے ۔ جو خلائق میں سے ایک ہے ۔

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ (۳۷ : ۱۱) ”ہم نے انہیں لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے“ ۔

لہٰذا یہ لوگ پیدائش کے اعتبار سے کوئی زیادہ دشوار نہیں ہیں اور نہ ان کی تخلیق مشکل ہے ۔ لہٰذا ان کا موقف عجیب ہے کہ اپنی حماقتوں کو نہیں سمجھتے ۔ الٹا اللہ کی آیات کے ساتھ مذاق کرتے ہیں ۔ ان کو بعث بعد الموت کی جواب دہی سے ڈرایا جاتا ہے اور یہ اسے مذاق سمجھتے ہیں ۔ ان کی یہی حماقت ہے جس پر حضور اکرم ؐ کو تعجب ہوتا ہے اور یہ لوگ ہیں کہ اپنی روش پر چل رہے ہیں ۔

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ (۳۷ : ۱۲) وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ (۳۷ : ۱۳) وَاِذَا

وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ (۳۷ : ۱۴) "تم حیران ہو اور یہ مذاق اڑا رہے ہیں۔ سمجھایا جاتا ہے تو سمجھ کر نہیں دیتے۔ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اسے ٹھٹھوں میں اڑا دیتے ہیں"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو حق ہے کہ آپ ان کے معاملات پر تعجب کریں۔ کیونکہ آپ تو اللہ کو اپنے قلب میں پاتے ہیں۔ جس طرح ہر مومن پاتا ہے اور اللہ کی آیات کو واضح طور پر دیکھتا ہے۔ جو اس کائنات میں ہر طرف بکھری پڑی ہیں۔ آپ کو اس پر تعجب ہے کہ ان آیات اور نشانیوں کو دیکھتے ہوئے کس طرح ایک شخص اندھا ہو سکتا ہے اور کس طرح اس قسم کا جاہلانہ موقف اختیار کر سکتا ہے۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے رویہ کی وجہ سے انگشت بدنداں ہیں' ادھر ان کی حالت یہ ہے کہ مسئلہ کی اس قدر وضاحت کے باوجود' عقیدہ توحید اور بعث بعد الموت کے مسائل کے واضح ہونے کے باوجود ان کے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں ان کی فطرت مسخ ہو چکی ہے۔ اور وہ مذاق کرتے ہیں۔ بلکہ وہ مذاق طلب کرتے ہیں۔ دوسروں کو بھی مذاق کی دعوت دیتے ہیں۔ لفظ (یستسخرون) سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔

ان کے مذاق اور ناسمجھی کا ایک نمونہ یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن مجید کو جادو کہتے ہیں اور اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ قرآن کریم موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے نظریہ کی دعوت دیتا ہے۔

وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۳۷ : ۱۵) ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ (۳۷ : ۱۶) اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ (۳۷ : ۱۷) "اور وہ کہتے ہیں یہ تو صریح جادو ہے۔ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا پنجرہ رہ جائیں اس وقت ہم پھر زندہ کر کے اٹھا کھڑے کیے جائیں گے اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آباؤاجداد بھی اٹھائے جائیں گے"۔

اپنے ماحول میں اللہ کی قدرت کے آثار کے دیکھنے سے یہ لوگ غافل ہیں' خود اپنی ذات کے اندر اللہ کی قدرت کے آثار یہ دیکھ نہیں پاتے۔ زمین اور آسمانوں کی تخلیق کے اندر جو آثار پائے جاتے ہیں' ان سے بھی یہ غافل ہیں۔ ستاروں' سیاروں اور شہاب ثاقب پر بھی غور نہیں کرتے۔ ملائکہ' شیاطین کی تخلیق پر غور نہیں کرتے۔ خود اپنی تخلیق پر غور نہیں کرتے کہ کسی طرح ایک لیس دار گارے سے ان کو بنایا گیا۔ یہ سب آثار قدرت ان کی نظروں سے اوجھل ہیں اور تعجب کرتے ہیں اس بات پر کہ جب وہ مر مٹ جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو انہیں دوبارہ کس طرح اٹھایا جائے گا اور پھر اگلے دور کے آباء کو کس طرح اٹھایا جائے گا۔ جن کی ہڈیاں بھی نہیں۔ حالانکہ اس طرح دوبارہ اٹھائے جانے میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے نہ یہ بعیداز امکان ہے۔ صرف معمولی غور و فکر کی ضرورت ہے اور انفس و آفاق کے مذکورہ مشاہدات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

---000---

اگر یہ لوگ اس جہاں میں ان مشاہدات پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر نہیں کرتے اور صحیح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ ان کے سامنے یہ ہولناک منظر پیش فرماتا ہے کہ اب یہ لوگ گویا موت کے بعد اٹھا دیئے گئے ہیں۔ قیامت کے اس منظر کی تصویر کشی اس قدر خوفناک انداز میں کی گئی ہے کہ اس میں وہ سانپ کی طرح مضطرب نظر آتے ہیں۔

قُلۡ نَعَمۡ وَ اَنۡتُمۡ دَاخِرُوۡنَ ﴿۱۸﴾

"ان سے کہو ہاں' اور تم (خدا کے مقابلے میں) بے بس ہو"۔ ہاں تم اور تمہارے آباء و اجداد ازمنہ قدیم والے بھی اٹھائے جائیں گے۔ اور نہایت ہی بے بسی کی حالت میں' ذلیل اور گرفتار کر کے' یوں کہ سرتابی کی مجال نہ ہوگی۔ اور یہ کس طرح ہوگا۔ ذرا دیکھو اس منظر کو اب قیامت کا ایک طویل منظر پیش کیا جاتا ہے۔ اس منظر کے پیش کرنے کا اسلوب منفرد ہے۔ زندہ اور متحرک ہے۔ مکالمے اور حرکات سے بھرپور ہے۔ کبھی بیانیہ انداز کلام ہے اور کبھی مکالمے کی شکل میں ہے اور کبھی واقعات پر بیچ میں تبصرہ آجاتا ہے۔ چنانچہ کلام کے اعلیٰ ترین خصوصیات پر یہ منظر مشتمل ہے۔

فَاِنَّمَا هِیَ زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ ﴿۱۹﴾

"بس ایک ہی جھڑکی ہوگی اور یکایک یہ اپنی آنکھوں سے (وہ سب کچھ جس کی خبر دی جا رہی ہے) دیکھ رہے ہوں گے"۔ یعنی پلک جھپکتے ہی وہ یہ منظر دیکھ رہے ہوں گے۔ بس ایک تنبیہہ آمیز چیخ ہوگی۔ (زجرۃ) کا لفظ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ اس میں سختی کلام ہوگی۔ ایک برتر اتھارٹی کی طرف سے حاکمانہ چیخ۔ اس چیخ کے ساتھ ہی وہ اپنی نظروں کے سامنے سب کچھ دیکھ رہے ہوں گے۔ یہ منظر ان کے سامنے اچانک بغیر کسی تمہید کے ہوگا۔ یہ لوگ حواس باختہ ہو کر چیخنے چلانے لگیں گے۔

وَ قَالُوۡا یٰوَیۡلَنَا هٰذَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ ﴿۲۰﴾

"اس وقت یہ کہیں گے ہائے ہماری کم بختی' یہ تو یوم الجزاء ہے"۔ یہ لوگ اسی حالت میں ہوں گے' ان کے حواس ابھی تک درست نہ ہوں گے کہ اچانک ان کے کانوں سے ایک دوسری سخت آواز ٹکرائے گی' بالکل خلاف توقع!

ع ۲۱ هٰذَا یَوۡمُ الۡفَصۡلِ الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ بِهٖ تُکَذِّبُوۡنَ ﴿۲۱﴾

۵ "یہ وہی فیصلے کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے"۔ اب یہاں انداز کلام "بیانی" اور "خبری" سے بدل کر خطاب کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور خطاب ان لوگوں سے ہے جو مرنے کے بعد اٹھائے جانے کی تکذیب کرتے تھے۔ ایک سخت حکم ہے جو ان کے کانوں سے بڑی سختی سے ٹکراتا ہے۔ فیصلہ کن انداز میں۔ اور اس کے بعد روئے سخن اللہ کے کارندوں کی طرف۔

اُحۡشُرُوا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا وَ اَزۡوَاجَهُمۡ وَ مَا کَانُوۡا یَعۡبُدُوۡنَ ﴿۲۲﴾

الربع مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَاهۡدُوۡهُمۡ اِلٰی صِرَاطِ الۡجَحِیۡمِ ﴿۲۳﴾ وَ قِفُوۡهُمۡ اِنَّهُمۡ

مَسْئُوْلُوْنَ ﴿۲۴﴾

(حکم ہو گا) "گھیر لاؤ سب ظالموں اور ان کے ساتھیوں اور ان معبودوں کو جن کی وہ خدا کو چھوڑ کر بندگی کیا کرتے تھے 'پھر ان سب کو جہنم کا راستہ دکھاؤ اور ذرا انہیں ٹھیراؤ' ان سے کچھ پوچھنا ہے"۔

گھیر لاؤ اور اٹھا لاؤ گرفتار کر کے ان لوگوں جنہوں نے ظلم کیا اور جو ظالموں کی صف میں تھے۔ یہ ایک جیسے ہیں۔ اس لیے ان کو جوڑے بنا دیا اور ان کو جہنم کا راستہ دکھاؤ۔ انداز کلام کس قدر سخت فیصلہ کن اور توہین آمیز ہے۔

فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ (۲۳:۳۷) "ان کو جہنم کا راستہ دکھاؤ"۔ جنت کا راستہ تو ان کو دکھایا جا رہا تھا لیکن انہوں نے اسے رد کر دیا۔ اب جہنم کا راستہ ہی ان کے لیے رہ جاتا ہے جو ان کے لائق ہے۔

چشم زدن میں ان کو جہنم رسید کر دیا گیا۔ جہنم تک پہنچا دیا گیا لیکن ایک ضمنی حکم میں کہا گیا کہ ذرا ٹھہراؤ ان کو' ان سے کچھ پوچھ ہی لیا جائے اور اچانک ان کو ملامت سے بھرپور انداز میں خطاب کیا جاتا ہے۔ سوالیہ انداز میں مکالمہ ہے۔

مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿۲۵﴾

"کیا ہو گیا تمہیں' اب کیوں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے"۔ اب کیا وجہ ہے کہ تم یہاں کوئی اجتماعی بچاؤ کی تدابیر نہیں کرتے۔ یہاں تو تم سب کھڑے ہو اور اب تمہیں ایک دوسرے کی امداد کی بہت ضرورت بھی ہے۔ اور وہ دیکھو تمہارے وہ معبود بھی کھڑے ہیں جن کی دنیا میں تم بندگی کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ان کے پاس نہ کوئی جواب ہے اور نہ وہ بات کر سکتے ہیں۔ یہ سوال تو کیا ہی اس لیے گیا ہے کہ اس پر ایک تبصرہ ہو۔

بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿۲۶﴾

"ارے' آج تو یہ اپنے آپ کو (اور ایک دوسرے کو) حوالے کیے دے رہے ہیں"۔ یعنی ہر ایک اپنے آپ کو بے بسی میں دوسرے کے حوالے کر رہا ہے' بندگی کرنے والے ہوں کہ معبود ہوں۔

اب یہاں خطابی انداز کلام کو بدل کر پھر مطابقتی اور بیانیہ انداز سامنے آتا ہے۔ اس منظر میں یہ ایک دوسرے سے جھگڑتے ہیں۔

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿۲۸﴾

"اس کے بعد یہ ایک دوسرے کی طرف مڑیں گے اور باہم تکرار شروع کر دیں گے۔ (پیروی کرنے والے اپنے

پیشواؤں سے ) کہیں گے "تم ہمارے پاس سیدھے رخ سے آتے تھے"۔
یعنی تم سیدھے رخ سے آکر ہمارے دلوں میں وسوسے ڈالتے تھے ' بالعموم جب کسی کے کان میں کوئی بات ڈالتا ہے تو وہ دائیں جانب سے آتا ہے ۔ لہٰذا تم ہماری اس حالت کے ذمہ دار ہو۔
اور ان کا جواب یہ آتا ہے کہ تمہارا یہ الزام احمقانہ ہے ۔ تم خود اپنے کیے کے ذمہ دار ہو ' جو فیصلہ کیا تم نے کیا۔

قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۹﴾

"وہ جواب دیں گے "نہیں ' بلکہ تم خود ایمان لانے والے نہ تھے"۔ یہ ہمارا وسوسہ ہی نہ تھا جس نے تمہیں گمراہ کیا بلکہ تم تو ایمان ہی نہ لائے تھے اور تم نے تو ہدایت کو قبول ہی نہ کیا تھا۔

وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ

"ہمارا تم پر کوئی زور نہ تھا"۔ کہ ہم نے تمہیں اس رائے کے اختیار کرنے پر مجبور کیا جو ہماری تھی ۔ ایسا نہ تھا کہ تم ایک رائے کو اختیار کرنا تو نہ چاہتے تھے اور ہم نے تم سے زبردستی کر کے اس رائے کے اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴿۳۰﴾

"تم خود ہی سرکش لوگ تھے"۔ تم خود ہی حد سے گزرنے والے تھے ۔ کسی حد پر رکنے والے نہ تھے ۔

فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآىِٕقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿۳۲﴾

"آخر کار ہم اپنے رب کے اس فرمان کے مستحق ہو گئے کہ ہم عذاب کا مزا چکھنے والے ہیں ۔ سو ہم نے تم کو بہکایا' ہم خود بہکے ہوئے تھے"۔
لہٰذا ہم لوگ اور تم لوگ دونوں عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں ۔ وہ ارادہ اب ہم پر حق بن کر آگیا ہے ۔ اب ہمارے لیے عذاب کا مزہ چکھنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے ۔ تم لوگ ہمارے ساتھ اس لیے آگئے تھے کہ تم ہمارے راستے پر چلنے کے لیے تیار ہو گئے تھے ۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ تم ہمارے پیچھے لگ گئے تھے ۔

فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ (۳۷ : ۳۲) "سو ہم نے تم کو بہکایا' ہم خود بہکے ہوئے تھے"۔ اب یہاں اس صورت حال پر ایک دوسرا تبصرہ آتا ہے ۔ یہ گویا عدالت 'کھلی عدالت کا ایک فیصلہ ہے ۔ جس کے اندر دلائل بھی موجود ہیں ۔ بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں یہ لوگ ایسے کام کرتے رہے ۔ اس لیے آخرت میں ان کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا گیا :

فَاِنَّهُمْ يَوْمَىِٕذٍ فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۳۵﴾

وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُوا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ ﴿٣٦﴾

"اس طرح وہ سب اس روز عذاب میں مشترک ہوں گے ۔ ہم مجرموں کے ساتھ یہی کچھ کیا کرتے ہیں ۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا "اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے"۔ تو یہ گھمنڈ میں آ جاتے تھے اور کہتے تھے "کیا ہم ایک شاعر مجنون کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟"

اور یہ تبصرہ اور یہ فیصلہ ان لوگوں کی سرزنش پر ختم ہوتا ہے جنہوں نے دنیا میں یہ رائے اختیار کی تھی جبکہ یہ رائے نہایت ہی گھٹیا رائے تھی ۔

بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٣٧﴾ إِنَّكُمْ لَذَائِقُوا الْعَذَابِ الْأَلِيمِ ﴿٣٨﴾ وَمَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٩﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿٤٠﴾

"حالانکہ وہ حق لے کر آیا تھا اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی تھی ۔ (اب ان سے کہا جائے گا کہ) تم لازماً دردناک سزا کا مزا چکھنے والے ہو ۔ اور تمہیں جو بدلہ بھی دیا جا رہا ہے انہی اعمال کا دیا جا رہا ہے جو تم کرتے رہے ہو ..... مگر اللہ کے چیدہ بندے (اس انجام بد سے) محفوظ ہوں گے ۔

مجرموں کے خلاف فیصلہ سناتے ہوئے اور اللہ کے مخلص بندوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا تھا کہ وہ عذاب الیم سے بچ گئے تھے ۔ اس مناسبت سے قیامت میں ان کے انجام کی ایک جھلک بھی دکھا دی جاتی ہے ۔ ان مجرموں کے عذاب الیم کے بالمقابل وہ انعامات بھی رکھ دیئے جاتے ہیں ۔ جن میں وہ مزے لے رہے ہوں گے ۔ انداز یوں ہے کہ ایک منظر کے بالمقابل دوسرا منظر ۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ ﴿٤١﴾ فَوَاكِهُ ۖ وَهُم مُّكْرَمُونَ ﴿٤٢﴾ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٤٣﴾ عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿٤٤﴾ يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ﴿٤٥﴾ بَيْضَاءَ لَذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ ﴿٤٦﴾ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنزَفُونَ ﴿٤٧﴾ وَعِندَهُمْ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ عِينٌ ﴿٤٨﴾ كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ ﴿٤٩﴾

"ان کے لیے جانا بوجھا رزق ہے ' ہر طرح کی لذیذ چیزیں اور نعمت بھری جنتیں جن میں وہ عزت کے ساتھ رکھے جائیں گے ۔ تختوں پر آمنے سامنے بیٹھیں گے ۔ شراب کے چشموں سے ساغر بھر بھر کر ان کے درمیان پھرائے جائیں گے ۔

چمکتی ہوئی شراب' جو پینے والوں کے لیے لذت ہوگی ۔ نہ ان کے جسم کو اس سے کوئی ضرر ہو گا اور نہ ان کی عقل اس سے خراب ہوگی اور ان کے پاس نگاہیں بچانے والی' خوبصورت آنکھوں والی عورتیں ہوں گی 'ایسی نازک جیسے انڈے کے چھلکے کے نیچے چھپی ہوئی جھلی"۔

جنت کی نعمتیں کیسی ہوں گی؟ اس میں نعمتوں کا ہر رنگ ہو گا جس میں نفس انسانی کی غذا بھی ہوگی اور انسانی احساسات اور انسانی جسم سب کے لیے متاع ہو گا۔ مزید یہ کہ وہاں جو نفس جو کچھ چاہے گا وہ اسے ملے گا۔ قسما قسم انعامات 'اس لیے کہ یہ لوگ سب سے پہلے تو اللہ کے مکرم بندے ہیں' اللہ کی بندگی انسان کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے ۔ پھر عالم بالا میں وہ معزز ترین مہمان ہوں گے ۔ یہ ان کے آرام کی جگہ ہوگی اور وہاں ان کو کوئی مشقت اور ڈیوٹی نہ کرنا ہوگی ۔ پھر مزید یہ کہ آرام کے ساتھ اللہ کی رضامندی بھی انہیں حاصل ہوگی ۔ جو سب سے بڑی نعمت ہوگی۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ (۳۷:۴۵) بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ (۳۷:۴۶)

لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ (۳۷:۴۷) "شراب کے چشموں سے ساغر بھر بھر کر ان کے درمیان پھرائے جائیں گے چمکتی ہوئی شراب جو پینے والوں کے لیے لذت ہوگی ۔ نہ ان کے جسم کو اس سے کوئی ضرر ہو گا اور نہ ان کی عقل اس سے خراب ہوگی"۔ یہ جنت کی شراب کی نہایت ہی خوبصورت تعریف ہے کہ اس سے شراب کی لذت تو ہوگی لیکن شراب کے مضرات اس میں نہ ہوں گے ۔ اس میں نشہ نہ ہو گا جس سے سر چکرا جائیں گے ۔ اور نہ اس سے کمی ہوگی کہ کبھی ملے اور کبھی نہ ملے اور مزہ جاتا رہے ۔

وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ (۳۷:۴۸) "اور ان کے پاس نگاہیں بچانے والی خوبصورت آنکھوں والی عورتیں ہوں گی"۔ نہایت حیادار' نظریں اپنے خاوندوں کے سوا کسی پر نہ ڈالیں گی بوجہ حیا و عفت ۔ اور ان کی آنکھیں بہت ہی خوبصورت ہوں گی ۔ وہ نہایت محفوظ' نرم و نازک اور پتلی ہوں گی ۔

كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ (۳۷:۴۹) " جیسے انڈے کے چھلکے کے نیچے چھپی ہوئی جھلی" یہ جھلی ایسی ہوتی ہے کہ نہ اس کو کسی کا ہاتھ لگ سکتا ہے اور نہ آنکھ دیکھ سکتی ہے اور ہوتی بھی نرم و نازک ہے ۔

یہ تصویر کشی ابھی جاری ہے ۔ اللہ کے یہ مخلص اور نیک بندے جو جنت کے متاع اور عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے ہیں' نہایت ہی خوشگوار موڈ میں باہم گفتگو بھی کرتے ہیں ۔ اس گفتگو میں اپنے ماضی اور حال پر بحث کرتے ہیں جبکہ اس سے قبل ہم پڑھ آئے ہیں کہ مجرمین بھی باہم لعن طعن کرتے تھے ۔ چنانچہ جنتیوں میں ایک شخص دوسروں کے سامنے اپنے حالات رکھتا ہے ۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۵۰﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ﴿۵۱﴾ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ﴿۵۲﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا

تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ﴿۵۳﴾

"پھر وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر حالات پوچھیں گے ۔ ان میں سے ایک کہے گا" دنیا میں میرا ایک ہم نشین تھا جو مجھ سے کہا کرتا تھا' کیا تم بھی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو؟ کیا واقعی جب ہم مرچکے ہوں گے اور مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جائیں گے تو ہمیں جزا و سزا دی جائے گی ؟"

اس جنتی کا یہ دوست وقوع قیامت اور حساب و کتاب کا منکر تھا اور وہ اس جنتی کو ملامت کرتا تھا کیا تم اس بات کو تسلیم کرتے ہو کہ لوگ قیامت میں دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور ان کا حساب و کتاب ہو گا ۔ اس کے بعد کہ وہ مٹی ہو جائیں اور محض ہڈیاں رہ جائیں گی ۔

یہ جنتی اپنے ساتھیوں کے ساتھ محو گفتگو ہے کہ اچانک اس کے دل میں خیال آتا ہے کہ ذرا تلاش تو کرے کہ اس کے دوست کا انجام کیا ہوا ہے ۔ اسے یقین ہے کہ جنت میں تو وہ ہو نہیں سکتا لازماً جہنم میں ہو گا ۔ وہ خود بھی تلاش کرتا ہے اور دوستوں سے بھی کہتا ہے کہ اسے تلاش کیا جائے ۔

قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿۵۵﴾

"اب کیا آپ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ صاحب اب کہاں ہیں؟" یہ کہہ کر جونہی وہ جھکا تو جہنم کی گہرائی میں اس کو دیکھ لیا"۔

اب یہ جنتی اپنے دوزخی دوست سے ہم کلام ہوتا ہے جسے اس نے جہنم میں دیکھ لیا ۔ یہ اس سے یوں مخاطب ہوتا ہے ۔ اے فلاں' قریب تھا کہ اپنی وسوسہ اندازیوں کی وجہ سے تو مجھے ہلاک کر دیتا ۔ یہ تو مجھ پر اللہ کا انعام تھا کہ اس نے مجھے بچا لیا اور میں نے تیری باتوں پر توجہ نہ دی ۔

قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ﴿۵۶﴾ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۵۷﴾

"اور اس سے خطاب کر کے کہے گا" خدا کی قسم' تو تو مجھے تباہ ہی کر دینے والا تھا ۔ میرے رب کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو آج میں بھی ان لوگوں میں سے ہوتا جو پکڑے ہوئے آئے ہوں" ۔

یعنی میں بھی ان لوگوں میں سے ہوتا جنہیں پکڑ کر کچہری میں لایا جاتا ہے اور وہ دراصل پیش نہیں چاہتے ۔

اس دوست کو دیکھو وہ اپنی خوشحالی اور نیک انجامی کو بیان کر کے اپنی خوشی میں اضافہ کرتا ہے ۔ جب کہ اس کا دوست جہنم کے بیچ میں پڑا ہے اور یہ اور اس کے دوست انعامات الٰہیہ میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔ یہ تحدیث نعمت ہے' دوام نعمت پر خوشی کا اظہار ہے اور یوں لذت میں نفسیاتی اضافہ ۔

اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۵۹﴾

"اچھا تو کیا اب ہم مرنے والے نہیں ہیں؟ موت جو ہمیں آنی تھی وہ بس پہلے آ چکی؟ اب ہمیں کوئی عذاب نہیں

ہوتا؟؟" اب یہاں قرآن ایک تبصرہ لاتا ہے جس کے ذریعے قارئین کو اچھے کاموں میں باہم مسابقت اور اچھے انجام کے لیے جہد مسلسل پر ابھارا جاتا ہے۔

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٦٠﴾ لِمِثْلِ هَٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ ﴿٦١﴾

"یقیناً یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے"۔

اس قسم کے اچھے انجام کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے جو دائمی ہے۔جس کے ختم ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔جس کے بعد کوئی موت نہیں ہے۔جس کے بعد کسی عذاب اور سزا کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔یہ انجام ہے جس کی فکر ہونی چاہیے۔اس کے علاوہ جو کچھ بھی اس زمین پر ہے اور جس کے لیے اہل زمین عمریں کھپا دیتے ہیں وہ ہیچ ہے۔اس اخروی انجام کے مقابلے میں جو دائمی ہے۔

یہاں فریق مخالف کے انجام کا منظر بھی دے دیا جاتا ہے جو قیامت اور حشر و نشر کا منکر تھا تاکہ اہل جنت کے اچھے' دائمی' پر امن اور ہمہ گیر عیش اور اچھے انجام کی اہمیت اور اجاگر ہو جائے اہل جہنم کا انجام یہ ہو گا۔

أَذَٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ ﴿٦٢﴾ إِنَّا جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً لِّلظَّالِمِينَ ﴿٦٣﴾ إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ ﴿٦٤﴾ طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ ﴿٦٥﴾ فَإِنَّهُمْ لَآكِلُونَ مِنْهَا فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ ﴿٦٦﴾ ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيمٍ ﴿٦٧﴾ ثُمَّ إِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَإِلَى الْجَحِيمِ ﴿٦٨﴾

"بولو' یہ ضیافت اچھی ہے یا زقوم کا درخت؟ ہم نے اس درخت کو ظالموں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے۔وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہ سے نکلتا ہے۔اس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر۔جہنم کے لوگ اسے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے' پھر اس پر پینے کے لیے ان کو کھولتا ہوا غیر خالص پانی ملے گا اور اس کے بعد ان کی واپسی اسی آتش دوزخ کی طرف ہوگی"۔

یہ قائم اور دائم نعمتیں بہتر ہیں اور جنت بہترین جائے قیام ہے۔یا زقوم کا درخت بطور خوراک اور جہنم جائے قیام بہتر ہے اور زقوم ہے کیا؟

إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ (۳۷:۶۴) طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ (۳۷:۶۵) "وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہ سے نکلتا ہے۔اس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر"۔اور لوگ شیطانوں کے سروں کو نہیں جانتے۔لہٰذا ان کی سمجھ میں کیا آئے ؟ یہ دراصل ایک خوفناک صورت حال ہے۔اس کا محض تصور ہی خوفناک ہے۔چہ جائیکہ وہ اسے کھائیں گے اور اس سے اپنے پیٹ بھریں

گے۔

اللہ نے اس درخت کو ظالموں کے لیے ایک آزمائش بنا دیا ہے جب وہ زقوم کا نام سنتے تھے تو اس کے بارے میں مذاق کرتے تھے کہ کس طرح یہ درخت جہنم میں اگ سکے گا۔کیا جلے گا نہیں؟ بعض لوگوں نے کہا' مثلاً ابوجہل ابن ہشام نے نہایت ہی مزاحیہ انداز میں "اے اہل قریش تمہیں معلوم ہے کہ زقوم کا درخت کیا ہے؟ محمد تمہیں اس سے ڈراتا ہے تو انہوں نے کہا: ہمیں تو معلوم نہیں۔اس نے کہا یہ یثرب کے عمدہ کھجور اور مکھن ہو گا اور اگر یہ ہمیں دستیاب ہوا تو ہم اسے ضرور نگل جائیں گے"۔ لیکن اسے کیا معلوم کہ یہ زقوم کا درخت ایک دوسری چیز ہے جسے انسانوں نے نہیں چکھا۔ اور نہ جانتے ہیں۔

فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ (۳۷ : ۶۶) "جہنم کے لوگ اسے کھائیں گے اور اس سے پیٹ بھریں گے"۔اور اس کے کھانے میں اور نگلنے میں ان کو تکلیف ہوگی کیونکہ یہ توشیاطین کے سروں جیسا ہو گا۔ اور اس سے ان کے پیٹ جل اٹھیں گے۔اس لئے کہ یہ تو پیدا ہی جہنم میں ہو گا۔اور یہ خود نہیں جلے گا یہ ہو گا ہی آگ کی نوعیت کا۔اب یہ پانی کی طرف متوجہ ہوں گے تاکہ پیاس بجھا سکیں۔چنانچہ پینے کے لیے ان کو غیر خالص پانی ملے گا۔

ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ (۳۷ : ۶۷) "پھر پینے کے لیے ان کو کھولتا ہوا غیر خالص پانی ملے گا"۔اور اس کے بعد یہ لوگ اس دستر خوان سے اٹھیں گے اور اپنے اصل مقر جہنم کی طرف جائیں گے۔کیا ہی برا مقام اور جائے قرار ہے۔ اللہ کی پناہ۔

ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ (۳۷ : ۶۸) "اس کے بعد ان کی واپسی اسی آتش دوزخ کی طرف ہوگی"۔یوں اس منفرد منظر کا خاتمہ ہوتا ہے۔اور اس سورت کا پہلا سبق ختم ہوتا ہے۔گویا یہ منظر ایک دیکھا ہوا منظر ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۰۹ تشریح آیات

## ۶۹ --- تا --- ۱۴۸

اس سبق میں سیاق کلام عالم آخرت' اللہ کی نعمتوں اور قیامت میں اللہ کی سزاؤں سے نکل کر اب انسانی تاریخ اور امم ماضیہ کے حالات میں داخل ہوتا ہے ۔ انسانیت کے آغاز سے قصہ ہدایت و ضلالت کو لیا جاتا ہے ۔ یہ قصہ تمام اقوام کے ہاں ایک ہی ہے اور نظر آتا ہے کہ مکہ کے منکرین جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی تکذیب کرتے ہیں ۔ وہ سابقہ مکذبین کے بقایا اور نمونہ ہیں ۔ ان کو بتایا جاتا ہے کہ تم سے پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے ۔ یوں ان کے دلوں کے سامنے انسانی تاریخ کے قدیم ترین صفحات رکھے جاتے ہیں ۔ ان قصص میں اہل ایمان کے لیے بھی اطمینان کا سامان ہے کہ پوری انسانی تاریخ شاہد ہے کہ اللہ نے ہمیشہ اہل ایمان کا خیال رکھا ہے ۔

چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے قصے' کا ایک رخ حضرت ابراہیم' اسماعیل' اسحاق' موسیٰ' ہارون' الیاس' لوط اور یونس علیہما السلام کے قصص کے بعض حصے قارئین کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں ۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے حالات ذرا طوالت کے ساتھ لیے گئے ہیں' جن میں عظمت ایمان' قربانی' اطاعت اور ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام کے ذہنوں میں اسلام کا جو تصور تھا' وہ یہاں بیان کیا جاتا ہے اور اس میں ان کے قصے کا ایک ایسا حلقہ دیا جاتا ہے جو اس سورت کے سوا کسی دوسری سورت میں نہیں دیا گیا ۔ اس سبق کا بنیادی مواد انہی قصص پر مشتمل ہے ۔

إِنَّهُمْ أَلْفَوْا آبَاءَهُمْ ضَالِّينَ ﴿٦٩﴾ فَهُمْ عَلَىٰ آثَارِهِمْ يُهْرَعُونَ ﴿٧٠﴾ وَلَقَدْ ضَلَّ
قَبْلَهُمْ أَكْثَرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٧١﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيهِمْ مُنْذِرِينَ ﴿٧٢﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ ۲
عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِينَ ﴿٧٣﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿٧٤﴾ ع ۵۳
۶

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا اور انہی کے نقش قدم پر دوڑ چلے حالانکہ ان سے پہلے بہت سے لوگ گمراہ ہو چکے تھے ۔ اور ان میں ہم نے تنبیہ کرنے والے رسول بھیجے تھے ۔ اب دیکھ لو کہ ان تنبیہ کیے جانے والوں کا کیا انجام ہوا ۔ اس بد انجامی سے بس اللہ کے وہی بندے بچے ہیں جنہیں اس نے اپنے لیے خالص کر لیا ہے" ۔

یہ لوگ ضلالت اور گمراہی میں غرق ہو چکے ہیں ۔ یوں کہ وہ ہر بات میں آباو اجداد کی تقلید کرتے ہیں ۔ کسی پیش آمدہ

معاملے پر غور و فکر نہیں کرتے ۔ بلکہ یہ جلد بازوں کی طرح اڑتے اور دوڑتے چلے جا رہے ہیں ۔ آباؤاجداد کے قدموں پر قدم رکھتے چلے جا رہے ہیں' بغیر سوچے اور بغیر عقل سے کام لیتے ہوئے اور وہ چونکہ گمراہ تھے لہٰذا یہ بھی گمراہ ہیں ۔

اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ (۶۹:۳۷) فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ (۷۰:۳۷)

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے باپ دادا کو گمراہ پایا اور انہی کے نقش قدم پر دوڑتے چلے گئے"۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اور ان کے آباؤاجداد اسی گمراہی پر تھے جس میں اکثر مکذبین مبتلا تھے ۔

وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ (۷۱:۳۷) "حالانکہ ان سے پہلے بہت سے لوگ گمراہ ہو چکے ہیں"۔ اور یہ گمراہی اس کے باوجود تھی کہ ہم نے ان کی خاطر ڈرانے والے بھیجے تھے ۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ (۷۲:۳۷) "اور ان میں ہم تنبیہ کرنے والے رسول بھیجے تھے"۔

لیکن ان لوگوں کا کیا انجام ہوا اور اللہ کے مخلص بندوں کا انجام کیا ہوا؟ یہ سب آپ کو انبیاء کے قصص سے معلوم ہو جائے گا ۔ یہ بات یہاں محض متوجہ کرنے کے لیے کہی جا رہی ہے ۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ (۷۳:۳۷) اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ

(۷۴:۳۷) "اب دیکھ لو' ان تنبیہ کیے جانے والوں کا انجام کیا ہوا' اس بدانجامی سے بس اللہ کے وہی بندے بچے ہیں جنہیں اس نے اپنے لیے خالص کر لیا"۔

اب قصہ نوح کا آغاز کیا جاتا ہے اور اس میں اللہ کے نیک بندوں کا انجام نہایت ہی تیزی سے بتا دیا جاتا ہے اور یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ اللہ اپنے مخلص بندوں کے انجام کا لحاظ رکھتا ہے ۔

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ ﴿۷۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۹﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۱﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۸۲﴾

"ہم کو (اس سے پہلے) نوح نے پکارا تھا' تو دیکھو کہ ہم کیسے اچھے جواب دینے والے تھے ۔ ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو کرب عظیم سے بچا لیا ۔ اور اسی کی نسل کو باقی رکھا' اور بعد کی نسلوں میں اس کی تعریف و توصیف چھوڑ دی ۔ سلام ہے نوح پر' تمام دنیا والوں میں ۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں ۔ درحقیقت وہ ہمارے مومن

بندوں میں سے تھا۔ پھر دوسرے گروہ کو ہم نے غرق کر دیا"۔

اس میں حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعا کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے رب تعالیٰ سے کی تھی۔ اور اللہ نے ان کی دعا کو پوری طرح قبول فرمایا تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بہترین جواب دینے والا ہے۔

فَلَنِعْمَ الْمُجِيبُونَ (۳۷: ۷۵) "ہم کیسے اچھے جواب دینے والے تھے"۔ اور اللہ نے ان کو اور ان کے اہل و عیال کو کرب عظیم سے نجات دی تھی۔ یعنی وہ کرب عظیم دراصل وہ طوفان تھا جس سے صرف وہی لوگ بچے جن کے بچانے کا اللہ نے ارادہ کر لیا تھا۔ اور جن کی زندگی ابھی باقی تھی اور اللہ کی تقدیر میں جن لوگوں کے بارے میں لکھا تھا کہ اللہ نوح کی اولاد سے ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جنہوں نے اس زمین پر بطور خلیفۃ اللہ کام کرنا تھا اور اس زمین کو آباد رکھنا تھا تاکہ حضرت نوح کا ذکر آنے والی نسلوں میں باقی رہے۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ (۳۷: ۷۸) "اور بعد کی نسلوں میں ان کی تعریف و توصیف چھوڑی"۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ دونوں جہانوں میں نوح پر سلامتی ہوگی اس لیے کہ انہوں نے نیک راہ اختیار کی۔

سَلَٰمٌ عَلَىٰ نُوحٍ فِي الْعَٰلَمِينَ (۳۷: ۷۹) إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ

(۳۷: ۸۰) "سلام ہے نوح پر تمام دنیا والوں میں۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزاء دیا کرتے ہیں"۔ اللہ کے سلام کے بعد اور کیا جزاء درکار ہے کسی بندے کو۔ اور تمام جہاں میں قیامت تک کسی کے نام کو باقی رکھنے کے بعد اور کیا انعام ہے کسی بندے کے لیے۔ احسان اور اس کے بعد انعام کا حقیقی سبب بہرحال ایمان ہے۔ اس لیے کہا گیا۔

إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ (۳۷: ۸۱) "درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا"۔ اور یہی جزاء ہے اہل ایمان کی۔ رہے وہ لوگ جو قوم نوح سے غیر مومن تھے تو ان پر اللہ نے ہلاکت اور فنا لکھ دی تھی۔

ثُمَّ أَغْرَقْنَا الْآخَرِينَ (۳۷: ۸۲) "پھر دوسرے گروہ کو ہم نے غرق کر دیا"۔ لہٰذا انسانیت کے آغاز ہی سے سنت الٰہیہ یہی رہی ہے جس طرح ان قصص کے آغاز میں کہا گیا۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيهِم مُّنذِرِينَ (۳۷: ۷۲) فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنذَرِينَ

(۳۷: ۷۳) إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ (۳۷: ۷۴) "اور ان میں ہم نے تنبیہ کرنے والے رسول بھیجے تھے۔ اب دیکھ لو کہ ان تنبیہ کیے جانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ اس بدانجامی سے بس اللہ کے وہی بندے بچے ہیں جنہیں اس نے اپنے لیے خالص کر لیا ہے"۔

---ooo---

اس کے بعد حضرت ابراہیم کا قصہ آتا ہے۔ اس قصے کی دو کڑیاں یہاں لائی گئی ہیں۔ پہلی کڑی میں آپ اپنی قوم کو

دعوت دیتے ہیں ۔بتوں کو توڑتے ہیں' لوگ آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں اور اللہ کے حکم سے ان کے لیے آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور قصے کا یہ حصہ کئی دوسری سورتوں میں بھی آیا ہے ۔اور دوسری کڑی وہ ہے جو صرف اسی سورت میں آئی ہے' یعنی خواب' ذبح اور فدیہ ۔ یہ کڑی نہایت ہی تفصیل کے ساتھ آئی ہے' جس کے واقعات اور مراحل کو نہایت ہی تفصیلات کے ساتھ دیا گیا ہے ۔اسلوب کلام نہایت موثر' دلکش اور پر شوکت ہے ۔اس کڑی کے اندر تسلیم و رضا' سمع و طاعت کا اعلیٰ معیار اور اعلیٰ مثال پائی جاتی ہے ۔انسانی نظریات کی تاریخ میں اس قسم کی کوئی مثال نہیں ہے ۔

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ﴿۸۳﴾ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۴﴾
اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۸۵﴾ اَىِٕفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ﴿۸۶﴾
فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾

"اور نوح ہی کے طریقے پر چلنے والا ابراہیم تھا۔ جب وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم لے کر آیا۔ جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا" یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کر رہے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ گھڑے ہوئے معبود چاہتے ہو؟ آخر رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟""

یہ اس قصے کا آغاز ہے اور قصے کے اندر پہلا منظر ہے ۔نوح سے اب ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام تک آگئے ۔ان دونوں انبیاء کی دعوت' نظریہ اور منہاج دعوت ایک ہے ۔اگرچہ دونوں کے درمیان زمان و مکان کے فاصلے ہیں لیکن دونوں ایک ہی گروہ کے لوگ ہیں ۔اس لیے کہ اللہ کا دیا ہوا نظام زندگی ایک ہے ۔ اور اس زاویہ سے یہ دونوں باہم مربوط ہیں اور ان کا تعلق ایک ہی سلسلہ سے ہے جس میں وہ باہم شریک ہیں ۔

ابراہیم علیہ السلام کی صفات میں قلب کی سلامتی' عقیدے کی راستی اور خلوص ممتاز صفات ہیں ۔

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (۳۷ : ۸۴) "جب وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم لے کر آیا"۔

قلب سلیم کیا چیز ہے؟ پوری طرح اسلام کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ۔اللہ کے ساتھ پوری محبت رکھنا ۔صاف ستھری' سیدھی روش سلامت قلبی ہے ۔قلب سلیم کی تعبیر نہایت معنی خیز اور اپنے مفہوم کی واضح تصویر لیے ہوئے ہے ۔ تعبیر سادہ اور قریب الفہم بھی ہے اور واضح بھی ۔قلب سلیم کے اندر صفائی' اخلاص' سیدھا پن اور پاکیزگی کے مفاہیم شامل ہیں ۔یہ لفظ بہت ہی سادہ ہے ۔ پیچیدہ نہیں ۔اور مذکورہ تمام معانی پر حاوی ہے جبکہ مذکورہ الفاظ کے اندر اس قدر جامعیت نہیں ہے ۔یہ قرآن مجید کا انوکھا انداز تعبیر ہے ۔

یہ قلب سلیم ہی تھا جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی قوم کے عقائد کو ناپسند کیا ۔انسان جب صحت مند سوچ رکھتا ہے اور سلیم الفطرت ہوتا ہے تو وہ ازروئے طہارت قلب ناپسندیدہ چیز کو ناپسند کرتا ہے ۔تصور میں بھی اور عمل میں بھی ۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا ذَا تَعْبُدُوْنَ (۸۴:۳۷) اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ (۸۶:۳۷) فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۸۷:۳۷) "جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا۔ یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کر رہے ہو۔ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ گھڑے ہوئے معبود چاہتے ہو۔ آخر رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے"۔ حضرت دیکھ رہے تھے کہ وہ بتوں اور آستانوں کو پوجتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی فطرت سلیمہ کی رو سے ان پر شدید گرفت کرتے ہیں کہ تم یہ کیا کر رہے ہو؟

مَا ذَا تَعْبُدُوْنَ (۸۴:۳۷) "یہ کیا ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو"۔ یعنی یہ کیا چیزیں ہیں؟ یہ تو اس قابل ہرگز نہیں کہ ان کی بندگی کی جائے یا کوئی ان کا بندہ ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسان ان کے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو محض گھڑے ہوئے ہیں 'افتراء ہیں اور ان کے من گھڑت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ کیونکہ ان جھوٹے خداؤں کی بندگی کر کے تم عمداً افتراء باندھتے ہو۔

اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ (۸۶:۳۷) "جھوٹ گھڑے ہوئے معبود تم چاہتے ہو"۔ یہ تمہارا اللہ کے بارے میں کیا تصور ہے۔ تمہارا تصور الہ اس قدر گرا ہوا ہے کہ انسانی فطرت سلیمہ پہلی نظر ہی میں اس کا انکار کر دیتی ہے۔

فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۸۷:۳۷) "آخر رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟" اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت سلیمہ ایسے امر کا پہلی ہی نظر میں انکار کر دیتی ہے جو عقل و ضمیر کے خلاف ہو اور انسانی عقل اور شعور اس کا انکار کرتے ہوں۔

اب سیاق کلام میں ان کی جانب سے کسی جواب کا تذکرہ نہیں ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام از روئے فطرت سلیمہ اور قلب سلیم جس نتیجے تک پہنچے اگلی کڑی میں وہ بتا دیا جاتا ہے کیونکہ ان کی قوم کھلے من گھڑت عقائد پر تھی۔

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴿۹۰﴾ فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ ﴿۹۳﴾

"پھر اس نے تاروں پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا میری طبیعت خراب ہے۔ چنانچہ وہ لوگ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کے پیچھے وہ چپکے سے ان کے معبودوں کے مندر میں گھس گیا اور بولا "آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں ہیں؟ کیا ہو گیا' آپ لوگ بولتے بھی نہیں؟" اس کے بعد وہ ان پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں"۔

روایات میں آتا ہے کہ اس وقت عید یا میلے کا دن تھا۔ شاید نوروز ہو۔ اس دن لوگ شہر سے باہر چلے جاتے تھے۔ رواج کے مطابق وہ اپنے الہوں کے سامنے برائے تبرک پھل رکھتے تھے۔ اور سیر اور تفریح کے بعد وہ یہ مبارک کھانے لیتے تھے۔ حضرت ابراہیم نے جب معقول باتوں کے مقابلے میں مایوس کن رویہ پایا اور اس نتیجے تک پہنچے کہ ان کے عقائد اور نظریات کے اندر اس قدر بگاڑ پیدا ہو گیا ہے کہ اب ان کی اصلاح کی کوئی صورت نہیں ہے۔ تو انہوں نے دل میں ...... ایک فیصلہ کر لیا کہ ان کو ذرا تلخ سبق دیا جائے۔ آپ نے اپنے منصوبے کے لیے اس دن کا انتظار فرمایا۔ کیونکہ اس دن یہ لوگ عبادت گاہوں کو خالی چھوڑ کر باہر چلے جاتے تھے۔ اور حضرت کے لیے اپنے منصوبے پر عمل کرنا ممکن ہو سکتا تھا۔ ان لوگوں کی تنگ نظری اور کج فہمی حضرت ابراہیم کے لیے اب قابل برداشت نہ رہی تھی۔ جب دوسرے لوگوں نے ان سے کہا کہ تم عبادت گاہ کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ چلو تو آپ نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا کہ میری طبیعت خراب ہے۔ میں سیر و تفریح کے لیے نہیں جا سکتا۔ کیونکہ سیر و تفریح اور میلوں میں تو وہ لوگ جاتے ہیں جو عیش و عشرت کرنا چاہیں، جن کے دل خالی ہوں اور ان کے لیے کوئی دلچسپی یا اہم کام پیش نظر نہ ہو۔ حضرت ابراہیم تو ہر وقت پریشان تھے۔ اپنی قوم کی اس بیماری کی وجہ سے۔ اس لیے ان کے قلب سلیم کو سیر و تفریح میں خوشی کب نصیب ہوئی تھی۔

بہرحال لوگ جلدی میں تھے تاکہ جائیں اور اپنے رسم و رواج کے مطابق اپنی عید منائیں۔ اس لیے انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کوئی زیادہ فکر نہ کی بلکہ ان کو چھوڑ کر چلے گئے اور اپنی خوشیاں منانے لگے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہ موقعہ مل گیا جس کی تلاش میں تھے۔

حضرت ابراہیم فوراً ان کے نام نہاد الہوں کے پاس پہنچے۔ ان کے سامنے قسم قسم کے کھانے اور تازہ پھل رکھے ہوئے تھے۔ بطور مزاح حضرت نے فرمایا تم کھاتے نہیں ہو؟ ظاہر ہے کہ بتوں نے اس مزاح کا کیا جواب دینا تھا۔ اب آپ نے ذرا غصے اور کھلے مزاح کے ساتھ کہا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم بات کیوں نہیں کرتے۔ بعض اوقات انسان ایسی چیز سے بطور مزاح ہمکلام ہوتا ہے جس کے بارے میں اس کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ نہیں سنتی اور نہ جواب دے سکتی ہے۔ حقیقت کا علم ہوتے ہوئے بھی انسان ایسی باتیں کرتا ہے۔ یہ بات دراصل حضرت ان لوگوں کے پوچ اور غلط عقائد سے تنگ آ کر کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ بتوں نے جواب تو نہ دینا تھا اور نہ دیا۔ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان کے بجائے آپ کے ہاتھ حرکت میں آ گئے۔

فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ (۳۷:۹۳) "اس کے بعد وہ ان پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں"۔ اب آپ کی بیماری دل گرفتگی اور پریشانی دور ہوئی۔ بالفاظ دیگر آپ کا دل ٹھنڈا ہوا۔

اب یہ منظر ختم ہوتا ہے اور دوسرا منظر سامنے آتا ہے۔ لوگ واپس ہوئے انہیں علم ہوا کہ ان کے بتوں کے سر پاؤں اور ہاتھ کٹے ہوئے ہیں۔ دوسری سورتوں میں تفصیلات آتی ہیں کہ انہوں نے تفتیش کی کہ کس نے یہ کام کیا ہے۔ آخر وہ اس نتیجے تک پہنچے کہ ابراہیم نام کا ایک شخص ان کے بارے میں بدگوئی کرتا ہے۔ بہرحال یہاں اختصار کر کے فریقین کا آمنا سامنا دکھایا جاتا ہے۔

فَأَقْبَلُوٓا إِلَيْهِ يَزِفُّونَ ﴿٩٤﴾

(واپس آکر) "وہ لوگ بھاگے بھاگے اس کے پاس آئے"۔ انہوں نے ایک دوسرے سے یہ خبر سن لی تھی ۔ یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ کام کرنے والا کون ہے ۔ لہٰذا سب لوگ دوڑ کر ابراہیم کے پاس پہنچے ۔ سب ان کے اردگرد جمع ہو گئے ۔ لوگوں کی بڑی تعداد بلکہ پورا میلہ اکٹھا ہو گیا ۔ سب لوگ ایک طرف اور ایک مومن ایک طرف ۔ ایک ایسا فرد جو کام کرنا چاہتا ہے ۔ ایسا فرد جس کا تصور اللہ واضح ہے جس کا عقیدہ ٹھوس اور متعین ہے ۔ وہ اپنے نفس کے اندر اسے حقیقت کے طور پر پاتا ہے ۔ وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات میں اسے پاتا ہے ۔ یہ ایک فرد ہے لیکن افراد کی اس بھیڑ اور جم غفیر سے وہ اپنے آپ کو قوی پاتا ہے ۔ جن کا عقیدہ درست نہیں ۔ جن کا تصور حیات ٹھوس نہیں ۔ چنانچہ وہ فطری سچائی کے ساتھ جرأت مندانہ طریقے سے ان کو یوں خطاب کرتا ہے ۔ اور ان کے کسی ردعمل کا کوئی خیال نہیں کرتا ۔ حالانکہ یہ لوگ اس وقت اشتعال کی حالت میں ہیں اور بڑی تعداد میں ہیں ۔

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

"اس نے کہا "کیا تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو؟ حالانکہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان چیزوں کو بھی جنہیں تم بناتے ہو"۔

یہ ایک فطری استدلال تھا' حضرت ابراہیم نے بیانگ دہل ان کے سامنے رکھ دیا کہ تم اپنی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو ۔ معبود حق تو وہ ہو سکتا ہے جو سب چیزوں کا بنانے والا ہو نہ کہ اسے کسی سنگ تراش نے تراشا ہو ۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (۳۷ : ۹۶) "اللہ تو وہ ہے جس نے تمہیں بھی بنایا اور تمہاری مصنوعات کو بھی بنایا" ۔ یہ صانع مطلق اس قابل ہے کہ اس کی پوجا کی جائے ۔

اس استدلال کی سادگی اور واضح ہونے کے باوجود' لوگوں نے اپنی غفلت اور غلط روش کی وجہ سے اس پر کان نہ دھرا ۔ باطل کی روش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وہ سچائی کے نہایت ہی سادہ اور منطقی استدلال پر کان نہیں دھرتا ۔ اور اللہ کی جانب سے جن لوگوں کے ذمہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ڈیوٹی لگائی جاتی ہے ۔ وہ ہمیشہ اہل باطل کی طرف سے تشدد سہتے رہے ہیں ۔

قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ﴿۹۷﴾

"انہوں نے کہا اس کے لیے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو" ۔ یہ ہے قوت اور طاقت کا استدلال ۔ اور آگ اور تشدد جس کے سوا سرکشوں کے پاس اور کوئی استدلال نہیں ہوتا ۔ جب بھی دلیل ختم ہوتی ہے اور کوئی سرکش حجت پیش نہیں کر سکتا' وہ تشدد کرتا ہے ۔ خصوصاً جبکہ سرکشوں کے سامنے کلمہ حق پیش کیا جائے اور وہ اسے لاجواب کر دے ۔

ان کی اس دھمکی کے بعد کیا ہوا' یہاں قرآن مجید اس کی کوئی صراحت نہیں کرتا ۔ اور یہ بتا دیا جاتا ہے کہ اہل حق کو

کامیابی نصیب ہوئی اور مکذبین گھاٹے میں رہے۔

فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۹۸﴾

"انہوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی 'مگر ہم نے انہی کو نیچا دکھا دیا"۔ جب اللہ نہ چاہے تو ضعیف بندوں کی تدابیر کیا کر سکتی ہیں اور اللہ کے معاملے میں ضعیف اور حقیر بندے کر بھی کیا سکتے ہیں۔ دنیا کے سرکش ' جبار ' حکمران ' ڈکٹیٹر اور ان کے اعوان و انصار اللہ کے مقابلے میں ہیچ ہوتے ہیں۔ جب اللہ کا فضل اللہ کے بندوں کے شامل حال ہو۔

---ooo---

اب قصہ ابراہیم علیہ السلام کی دوسری کڑی شروع ہوتی ہے۔ اپنے باپ اور اپنی قوم کے ساتھ آپ کا تنازعہ ختم ہو گیا۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ ایک خود ساختہ جحیم (آگ) میں آپ کو جلا دیں۔ اور اللہ نے ارادہ کیا کہ وہ گھاٹے میں رہیں۔ اور حضرت ابراہیم ان کی سازش سے بچ گئے۔ یہاں آکر حضرت ابراہیم نے اپنی سابقہ زندگی کو خیرباد کہا اور زندگی کے نئے مرحلے کا آغاز کیا۔ سابقہ زندگی کا دفتر لپیٹ لیا گیا اور زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہو گیا۔

وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۹۹﴾

"ابراہیم نے کہا "میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں' وہی میری راہنمائی کرے گا"۔ میں رب کی طرف ہجرت کر کے جا رہا ہوں۔ یعنی مسافاتی ہجرت سے قبل یہ نفسیاتی اور نظریاتی ہجرت ہے۔ ایک ایسی ہجرت جس میں وہ اپنی تمام ماضی اور آبائی مقام کو خیرآباد کہہ رہے ہیں۔ اپنے باپ اور قوم کو چھوڑ رہے ہیں۔ اپنے گھر اور وطن کو چھوڑ رہے ہیں۔ ان تمام روابط کو کاٹ رہے ہیں جو انسان کو اس زمین سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں سے وابستہ کر دیتے ہیں' تمام رکاوٹوں کو عبور کر کے آگے بڑھ رہے ہیں۔ تمام مصروفیتوں کو ختم کر رہے ہیں۔ تمام بوجھ ہلکے کر کے اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ تمام چیزوں کو پس پشت ڈال رہے ہیں۔ اپنی پوری ذات کو رب کے سپرد کر رہے ہیں۔ اور اپنی ذات کا کوئی حصہ اپنے لیے نہیں رکھ رہے ہیں انہیں یقین ہے کہ ان کا رب ضرور انہیں ہدایت دے گا۔ ان کی مدد کرے گا اور سیدھی راہ بھائے گا۔

یہ ایک مکمل ہجرت ہے بلکہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف مکمل انتقال ہے۔ تمام روابط کو کاٹ کر صرف ایک رب سے جڑنا' یہ گویا نہایت ہی یکسوئی' تجرد' خلوص اور سر تسلیم خم کر دینے کا اقدام ہے۔ پورے اطمینان اور پورے یقین کے ساتھ۔

حضرت ابراہیم اس وقت تک اکیلے تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ پیچھے وہ جو کچھ چھوڑ رہے تھے وہ اقرباء اور رشتہ داری کے تعلقات تھے۔ ہر قسم کی دوستی اور آشنائی کو ترک کر رہے تھے۔ ماضی کے تمام مالوفات اور عادات کو ترک کر رہے تھے۔ ان تمام روابط کو کاٹ رہے تھے جو جنم بھومی سے قائم ہو جایا کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم اور ان کے اہل کے درمیان پائے جانے والے تمام روابط کٹ گئے جنہوں نے ان کو آگ میں ڈالنے کا اقدام کیا۔ اس لیے آپ نے اس عزم

کا ارادہ کر لیا کہ اب میں اللہ کی طرف جا رہا ہوں اور چونکہ اہل و اہالی رہ گئے اس لیے رشتہ داروں کی جگہ اولاد اور جانشیں کے طلبگار ہوئے۔

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۰﴾

"اے پروردگار، مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو"۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس مخلص بندے کی دعا قبول کر لی۔ جس نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور قلب سلیم لے کر اللہ کے دربار میں آگیا تھا۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

"(اس دعا کے جواب میں) ہم نے اس کو ایک حلیم (بردبار) لڑکے کی بشارت دی"۔ یہ حضرت اسماعیل ہیں جس طرح اس سورت اور سیرت کے سیاق سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور اللہ نے ان کے علم اور صبر اور بردباری کی تعریف کی۔ جبکہ وہ ابھی لڑکے تھے۔ ہمیں چاہئے کہ اس مقام پر حضرت ابراہیم کی تنہائی، وطن سے جدائی اور اہل قرابت سے دوری کے بارے میں سوچیں اور پھر اس بچے کی خوشخبری پر خوشی کا تصور کریں جس کی تعریف رب تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ یہ بچہ غلام حلیم ہو گا۔

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی، ان کا وہ طرز عمل سامنے آتا ہے جو پوری انسانی تاریخ میں ایک منفرد طرز عمل ہے اور ان کی زندگی میں تو وہ بہرحال ایک یادگار طرز عمل ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو قیامت تک امت مسلمہ کے لیے ایک اعلیٰ و ارفع مثال ہے۔ یہ عمل حضرت ابراہیم نے خود پیش فرمایا۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

"وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیم نے اس سے کہا "بیٹا، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، اب تو بتا تیرا کیا خیال ہے؟" اس نے کہا "ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے، اسے کر ڈالیے، آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے"۔

یا اللہ، کیا عظیم ایمان ہے اور تسلیم و رضا کا کیا اعلیٰ مقام ہے۔

یہ ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک بوڑھے، اپنے اقرباء اور رشتہ داروں سے دور، اپنے ملک اور وطن سے دور۔ ان کو بڑھاپے اور کبر سنی میں ایک بیٹا عطا ہوتا ہے۔ ایک طویل عرصہ تک انہوں نے اس بچے کا انتظار فرمایا۔ جب اللہ ان کو یہ ممتاز اور ذی صلاحیت بیٹا دیا اور ان کے مرتبہ و مقام کی شہادت دی۔ وہ ابھی ان کے ساتھ اچھی طرح مانوس بھی نہیں ہوا، ابھی بچہ ہے۔ آپ کے ساتھ چلنے پھرنے لگا ہے اور قریب ہے کہ اب وہ زندگی کا ساتھی بن جائے۔ غرض ابراہیم علیہ السلام کی اس بچے سے امیدیں وابستہ ہو ہوئی تھیں کہ وہ خواب میں دیکھتے ہیں کہ وہ اس بچے کو ذبح کر رہے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے اشارہ ہے کہ اس بچے کی قربانی دے دو۔ اب کیا ہوتا ہے؟ آپ بالکل تردد نہیں کرتے۔ آپ کو کوئی شک اور خلجان نہیں ہوتا۔ بس جذبہ اطاعت ہی سامنے آتا ہے۔ آپ تسلیم امر ربی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض اشارہ تھا۔ یہ امر صریح نہ تھا' نہ براہ راست وحی آئی تھی۔ لیکن آپ نے رب کی طرف سے اشارہ ہی کو کافی سمجھا۔ آپ کے لیے تو اشارہ ہی کافی تھا۔ آپ نے لبیک کہہ دیا۔ اور تعمیل پر آمادہ ہو گئے بغیر کسی اعتراض کے 'بغیر کسی سوال کے کہ اے اللہ میں اپنے واحد بیٹے کو کیوں ذبح کر دوں۔

حضرت ابراہیم جزع و فزع کی حالت میں لبیک نہیں کہتے۔ نہ ان پر کوئی اضطرابی کیفیت طاری ہوتی ہے' بلکہ وہ تسلیم ورضا کے پیکر ہیں' مطمئن اور پر وقار ہیں اور ان کا یہ اطمینان 'ٹھہراؤ اور تسلیم و رضا ان کے ان کلمات سے ظاہر ہوتی ہے جن میں وہ یہ تجویز اپنے بیٹے کے سامنے رکھتے ہیں۔ یہ تو نہایت ہی عظیم اقدام ہے لیکن ان کے الفاظ نہایت سنجیدہ اور ان کی روش پر وقار ہے۔

قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى (۳۷:۱۰۲)

''ابراہیم نے اس سے کہا'' بیٹا' میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں' اب تو بتا تیرا کیا خیال ہے؟'' یہ الفاظ اس شخص کے ہیں جن کو اپنے اعصاب پر پورا پورا کنٹرول حاصل ہے۔ وہ درپیش اہم معاملے کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہے۔ اسے یقین ہے اور وہ اس پر تلا ہوا ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرے گا۔ یہ ایک مومن کے الفاظ ہیں ایسے مومن کے جسے یہ عظیم امر خوفزدہ نہیں کر رہا ہے تاکہ وہ جلدی جلدی اسے کر گزرے۔ آنکھیں بند کر کے تاکہ وہ اس سے بچ جائے اور یہ معاملہ ختم ہو جائے اور اس کے اعصاب پر جو ناقابل برداشت بوجھ آپڑا ہے وہ اتر جائے۔ ایسا نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ فعل ناقابل برداشت ضرور ہے۔ مطالبہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو کسی معرکہ کارزار میں بھیج دیں۔ نہ حکم یہ ہے کہ اسے ایک ایسے کام میں لگا دیں جس سے اس کی زندگی ختم ہو جائے۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کر دیں۔ اور یہ حکم انہیں اس طرح خواب میں ملتا ہے۔ اور آپ اسے اپنے اکلوتے بیٹے کے سامنے رکھتے ہیں۔ اور اس سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس معاملے پر غور کرے اور اپنی رائے دے۔

نیز حضرت ابراہیم اپنے بیٹے کو اچانک پکڑ کر ایسی حالت میں ذبح نہیں کر دیتے کہ انہیں پتہ ہی نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے اور معاملہ ختم کر دیا جائے۔ بلکہ معاملہ تجویز کی صورت میں ان کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ ابراہیم علیہ السلام محسوس کرتے ہیں کہ ان کے رب کی مرضی ہی ایسی ہے۔ لہٰذا اس معاملے کو اس طرح سرانجام دینا چاہیے جس طرح رب کی مرضی ہے۔ رب کا حکم سر آنکھوں پر۔ لہٰذا بچے کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ معاملہ کیا درپیش ہے اور وہ بھی اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ کوئی جبر اور کوئی اضطرار نہ ہو تاکہ اس کو بھی اطاعت امر کا اجر ملے۔ وہ بھی تسلیم و رضا کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو اور اطاعت امر کے مٹھاس کو پالے۔ ذرا ان کے اکلوتے بھی جان سپردگی کی لذت چکھ لیں اور وہ بھی وہ بھلائی دیکھ لیں جو زندگی کے مقابلے میں اعلیٰ و ارفع ہے۔

اب بیٹے کا فیصلہ کیا ہے؟ کہ اس کے باپ نے خواب دیکھا ہے اور باپ خواب بیٹے کے سامنے رکھتے ہیں اور تجویز یہ ہے کہ بیٹے کو ذبح کر دیا جائے' فیصلہ کیا ہے؟ بیٹا بھی آخر حضرت ابراہیم کا بیٹا ہے۔ وہ بھی اس مقام بلند پر پہنچ چکے ہیں جس پر حضرت ابراہیم ہیں۔

قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (۱۰۲:۳۷)

"اس نے کہا 'ابا جان' جو کچھ آپ کو حکم دیا جارہا ہے اسے کر ڈالئے۔ آپ انشاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے"۔

حضرت اسماعیل بھی اس حکم کے سامنے صرف سر تسلیم خم نہیں کر دیتے بلکہ وہ نہایت اعتماد اور رضائے الٰہی سے سرشار ہوکر تسلیم کرتے ہیں۔ یاابت 'ابا جان' نہایت ہی محبت اور نہایت ہی اپنائیت کے ساتھ۔ وہ ذبح ہونے جارہے ہیں لیکن ان پر کوئی خوف طاری نہیں ہے 'کوئی جزع و فزع نہیں ہے۔ ان کے حواس بحال ہیں بلکہ ادب اور محبت میں بھی کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (۱۰۲:۳۷) "آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل فرمائیں"۔ حضرت اسماعیل کا احساس بھی وہی ہے۔ جو اس سے قبل آپ کے باپ کا تھا۔ بیٹا بھی یہ سمجھا ہے کہ باپ کو ذبح عظیم کا اشارہ مل گیا ہے۔ اور خدا کی طرف سے اشارہ بھی امر ربی ہے اور ایک جلیل القدر پیغمبر کے لیے یہ اشارہ ہی کافی ہے کہ وہ بغیر کسی تردد' بغیر کسی شک اور بغیر کسی بہانہ سازی کے عمل کریں۔

بارگاہ رب العزت میں نہایت ادب کے ساتھ بات ہو رہی ہے۔ بات کرنے والے کو اپنی قوت کے حدود کا اچھی طرح علم ہے اور اپنی قوت برداشت کا بھی علم ہے۔ اسے اپنی کمزوریوں کا علم ہے۔ اس لیے اللہ کی معاونت طلب کی جاتی ہے۔ اس لیے اس قربانی اور اطاعت شعاری کی نسبت بھی اللہ کی مشیت کی طرف کی جاتی ہے۔

سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (۱۰۲:۳۷) "آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے"۔

یہ بیٹے اپنی بہادری کا اظہار بھی نہیں کرتے۔ نہ جسورانہ اور تہورانہ بات کرتے ہیں۔ نہ لاپرواہی سے دوڑ کر خطرے میں کودتے ہیں۔ وہ اپنی شخصیت کا کوئی رنگ یہاں نہیں دکھاتے۔ نہ اپنا حجم اور نہ اپنا وزن جتاتے ہیں۔ تمام معاملے کی نسبت اللہ کی طرف کرتے ہیں۔ کہ اللہ نے جو قربانی طلب کی ہے اگر اللہ کی معاونت شامل حال رہی اور اس نے صبر عطا کر دیا تو یہ کام ہو جائے گا۔

سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (۱۰۲:۳۷) "اگر اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں سے پائیں گے"۔ ورنہ نہیں۔

کیا شان ہے اللہ کے جناب میں عاجزی کی۔ اور کس قدر روشن ایمان ہے کس قدر عالی شان اطاعت اور بے مثال تسلیم و رضا ہے یہ!

باتوں سے آگے اب اس منظر میں واقعات ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ اب صرف مکالمہ نہیں ہے۔ عمل شروع ہو رہا ہے۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴿۱۰۳﴾

"آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا" ۔ ایک بار پھر یہاں اطاعت سربلند ہوتی ہے اور عظمت ایمان کا اظہار ہوتا ہے اور تسلیم ورضا کی وہ مثال سامنے آتی ہے جو پوری انسانی تاریخ کا ایک جلی عنوان ہے ۔ ایک انسان اپنے اکلوتے بیٹے کو منہ کے بل گراتا ہے تاکہ اسے ذبح کے لیے تیار کرلے ۔ اور یہ لڑکا بھی سر تسلیم خم کرتا ہے اور بے حس و حرکت گر جاتا ہے ۔ بات اب عمل تک آپہنچی ہے اور قریب ہے کہ چھری چل جائے ۔

باپ بیٹے دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا ہے ۔ یہی ہے اسلام ۔ اسلام میں تسلیم و رضا ہی اصل حقیقت ہے ۔ اعتماد ' طاعت ' اطمینان اور تسلیم و رضا ' دونوں کے جذبات ' نظریات اور عمل یکساں ہیں ۔ نفاذ امر کے لیے تیار ہیں ۔ اس قسم کی تیاری کہ تنفیذ کے لیے بس ایک کش کی ضرورت ہے اور یہ کام ایک عظیم ایمان ہی کر سکتا ہے ۔

یہ جرات اور جسارت کا معاملہ نہیں ہے ۔ یہ جوش اور بہادری کا معاملہ نہیں ہے ۔ بعض اوقات میدان کارزار میں ایک مجاہد پرجوش انداز میں آگے بڑھتا ہے ' قتل کرتا ہے اور قتل ہوتا ہے ۔ بعض اوقات ایک فدائی اقدام کرتا ہے اور اسے علم بھی ہوتا ہے کہ وہ زندہ نہ بچے گا لیکن وہ جذبہ فداکاری سے سرشار ہوتا ہے اور یہ ایک انداز ہوتا ہے ' لیکن حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل جو کچھ کر رہے ہیں اس کی ادا بالکل نرالی ہے ۔ یہاں کوئی خونی جوش نہیں ہے ۔ نہ جذبہ حمایت کارفرما ہے ۔ نہ عجلت پسندانہ جوش ہے جس کی تہہ میں خوف و ہراس کو چھپایا جاتا ہے ۔ کمزوری اور بزدلی کو نعروں میں لپیٹ لیا جاتا ہے ۔ بلکہ یہ ایسی تسلیم و رضا ہے جو معاملے کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر کی جارہی ہے ۔ عقلمندی کے ساتھ ایک کام ہو رہا ہے ۔ قصد و ارادے اور سوچ و فکر کے بعد ہو رہا ہے ۔ پورے مشورے اور بحث و مباحثے کے بعد ۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہم کیا کر رہے ہیں ' اطمینان کے ساتھ کہ نتائج کیا ہوں گے ۔ ٹھنڈی رضامندی ' خوشی خوشی سے اللہ کا جذبہ اطاعت کام کر رہا ہے ۔

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے حق ادا کر دیا ۔ تسلیم و رضا کا اظہار ہو گیا ۔ امر الٰہی کو وہ رو بعمل لے ہی آئے ۔ فرض پورا کر دیا ۔ بس چھری کی ایک کش ہی باقی رہ گئی تھی ۔ خون کی ایک دھار ہی باقی تھی ۔ اکلوتے بیٹے کی روح کی پرواز ہو چکنا باقی تھی ۔ اللہ کے ہاں اس روح کی کوئی زیادہ اہمیت نہ تھی ۔ اللہ کے پیمانے میں وزن کسی اور چیز کا تھا جو ہو چکا ۔ دونوں نے عزم و ارادہ اس میزان میں رکھ دیا تھا ۔ رب جانتا تھا کہ ان کے شعور کی حالت کیا ہے ' ان کا جذبہ کیا ہے ۔

یہ ایک امتحان تھا جو ہو چکا ۔ اس میں وہ فتح یاب ہو گئے ۔ نتائج سامنے آگئے ۔ مقصد امتحان پورا ہو گیا جو بات رہ گئی وہ صرف یہ تھی کہ کوئی تڑپ جائے ۔ خون بہہ جائے ۔ ذبیح کا جسم ٹھنڈا ہو جائے ۔ لیکن اللہ بندگی و اطاعت چاہتا ہے ۔ عبادت کے معنی اسلام میں ابتلا اور تعذیب نہیں ۔ اللہ خون اور جسموں کو گرانا نہیں چاہتا ۔ جب خلوص کا اظہار ہو گیا ۔ بندہ اس مشکل حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہو گیا ۔ اپنے دل و جان سے تیار ہو گیا تو فرض ادا ہو گیا اور امتحان میں وہ کامیاب ہو گیا ۔

اللہ جانتا تھا کہ ابراہیم اور اسماعیل دونوں سچے ہیں ۔ اس لیے اللہ نے ان کی تیاری ہی کو عمل سمجھا ۔

---

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُۙ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ

نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۰۵﴾ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ﴿۱۰۶﴾ وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ﴿۱۰۷﴾

"اور ہم نے ندا دی کہ "اے ابراہیم' تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں ۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی"۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا"۔

تمہارا خواب بھی سچا تھا' تم نے اسے سچ کر دکھایا۔ عملاً سچا کر دیا۔ اللہ تو تسلیم و رضا کا خواہش مند ہے ۔ یوں کہ نفس کے اندر کوئی ایسی بات نہ رہے جو اللہ سے چھپائے' جو اللہ کے حکم سے زیادہ عزیز ہو' یا حکم الٰہی کے مقابلے میں کوئی تحفظ ہو۔ اگرچہ وہ اکلوتا بیٹا اور جگر گوشہ ہو۔ اگرچہ وہ جان اور روح ہو۔ اے ابراہیم تو نے تو یہ گویا کر دکھایا۔ تم تو ذبح عظیم کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اگر اللہ ہاتھ کو نہ پکڑتا۔ تم نے تو عزیز ترین متاع قربان کر دی تھی۔ اور تم نہایت ہی سنجیدگی' دھیمے انداز اور پر وقار طریقے سے' اطمینان اور اعتماد کے ساتھ' مشورے اور سوچ کے ساتھ قربانی کر دی۔ اب تو صرف خون اور گوشت رہ گیا تھا۔ اس مقام پر انسان کے خون اور گوشت کے بدلے قربانی کا خون اور گوشت پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس کا بدل دے دیا جاتا ہے اور اسے ذبح عظیم کا نام بھی دے دیا جاتا ہے۔ ایک مینڈھا حکم ربی سے ابراہیم علیہ السلام کی چھری کے نیچے آجاتا ہے۔ اور وہ اسے اسماعیل علیہ السلام کے بدلے ذبح کر دیتے ہیں اور کہا جاتا ہے :

إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (۳۷ : ۱۰۵) "ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں"۔ ہم ان کو اس قسم کی آزمائش کے لیے چن کر ان پر کرم کرتے ہیں اور ان کے دلوں کو تسلیم و رضا اور اطاعت وفا کے لیے تیار کر کے اور ان کو اس عظیم کام پر آمادہ کر کے ان پر انعام کرتے ہیں اور اس قسم کی عظیم قربانی پر ان کو قدرت دے کر اور صبر دے کر ان کو جزاء دیتے ہیں۔ اور حقیقی جزاء کے مستحق قرار دے کر ان پر احسان کرتے ہیں۔

اس تعذیب و ابتلا کو ایک سنت جاریہ بنایا گیا ہے۔ ہر بقر عید پر قربانی جاری ہو گئی۔ یہ اس عظیم واقعہ کی دائمی یادگار ہے۔ جس کے اندر ایمان اپنے عروج پر نظر آتا ہے جس میں اطاعت کا حسن اور تسلیم و رضا کی بلندی اور عظمت نظر آتی ہے۔ اور امت مسلمہ اس قربانی کی یاد تازہ کرتی رہتی ہے تاکہ اپنے جد امجد حضرت ابراہیم کی عظمت کی معرفت تازہ ہوتی رہے۔ جن کی ملت پر یہ امت ہے جن کی نسبت اور جن کی نظریاتی میراث کی وہ وارث ہے تاکہ وہ اس نظریہ حیات اور ان عقاید و ایمانیات کا اچھی طرح ادراک کر سکے جو ملت ابراہیمی کی میراث ہیں۔ اور جسے معلوم ہو کہ مسلم وہ ہوتا ہے۔ جو بے چون و چرا رب تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرے' خوشی خوشی۔ اور اللہ کا حکم پاتے ہی بلکہ اشارہ پاتے ہی وہ اسے روبعمل لائے۔ اپنے لیے کچھ نہ رکھے۔ کوئی تحفظ نہ ہو۔ وہ اللہ کی اطاعت میں کوئی اپنا طریقہ' اپنا اسلوب اختیار نہ کرے بلکہ اللہ کی مرضی اور اس کے طریقے کے مطابق عمل پیرا ہو' جس طرح حکم ہو اور جس طرح حکم ملا ہو۔

پھر امت کو یہ بھی سبق دیا گیا کہ اللہ کے احکام کی تعمیل میں امت پر سختی اور تشدد مطلوب نہیں ہے کہ اسے ایسے احکام دیئے جائیں جو اس کی وسعت اور طاقت میں نہ ہوں۔ اللہ ایسے احکام دیتا ہے جن پر امت لبیک کہہ کر تعمیل کر سکے۔ اور پوری طرح ان احکام کو ادا کر سکے۔ اور جو حکم بھی آئے اس پر سلمنا کہے۔ اور اپنی طرف سے کوئی تجویز نہ دے۔ نہ اس میں سستی دکھائے اور نہ احسان جتلائے۔ جب اللہ آمادگی اور تسلیم کو جان لیتا ہے تو پھر وہ اپنے بندوں کو

عذاب دے کر اور ان پر تشدد کر کے خوش نہیں ہوتا۔ آمادگی اور سر تسلیم خم کرنا ہی دراصل عمل شمار ہوا اور اصل عمل کا فدیہ دے دیا گیا۔ یہ سلوک اللہ کا اس امت کے ساتھ ہے جس طرح اس کے جد امجد ابراہیم کے ساتھ ہوا۔

وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ

"اور اس کی تعریف و توصیف ہمیشہ کے لیے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی"۔ صدیوں سے اس واقعہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام امہ قرار پائے۔ انبیاء کے باپ قرار پائے۔ اس امت کے باپ قرار پائے۔ یہ امت ان کی ملت کی وارث ہوئی۔ اور اللہ نے اسی لیے ان کے ذمہ پوری بشریت کی راہنمائی اور قیادت کا فریضہ عائد کیا۔ چنانچہ اس امت کو ابراہیم کا جانشین قرار دیا گیا' قیامت تک کے لیے۔

سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ

"سلام ہے ابراہیم پر"۔ رب تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم پر سلام آتا ہے۔ اس کو قرآن کریم جیسی دائمی اور باقی رہنے والی کتاب میں رجسٹر کر دیا جاتا ہے۔ اور یوں اسے اس کائنات کے وجود میں ثبت کر دیا جاتا ہے۔

كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ

"ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں"۔ آزمائش میں ڈال کر ان سے وفا کا اظہار کرا کے' ان کے ذکر کو دوام بخش کر' ان پر سلام بھیج کر' اور ان کو اعزاز دے کر ہم جزاء دیتے ہیں۔

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ

"یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا"۔ یہ ہے جزاء ان کے ایمان کی اور اس کی حقیقت وہ ہے جو اس آزمائش میں کامرانی سے ظہور میں آئی۔ اس کے بعد اللہ ان پر ایک بار پھر تجلیات فرماتا ہے۔ اور اللہ کا ایک بار پھر کرم ہوتا ہے۔ اور وہ یوں کہ بڑھاپے میں ان کو ایک دوسرا لڑکا اسحاق دیا جاتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو بھی برکت دی جاتی ہے۔ اور ان کے بیٹے اسحاق کو بھی برکت دی جاتی ہے اور حضرت اسحاق کو بھی صالح نبی بنایا جاتا ہے۔

وَ بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ وَ بٰرَكْنَا عَلَيْهِ ۳
وَ عَلٰٓى اِسْحٰقَ ؕ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ع ۳۹
۷

"اور ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی' ایک نبی صالحین میں سے اور اسے اور اسحاق کو برکت دی۔ اب ان دونوں کی ذریت میں سے کوئی محسن ہے اور کوئی اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والا ہے"۔

اسماعیل اور اسحاق کے بعد ان کی اولاد کا سلسلہ چلتا ہے لیکن ان کی اولاد کی وراثت 'وراثت گوشت و پوست نہیں ہے۔ یہ نظریاتی اور ملی وارثت ہے لہذا جو اس ملت پر رہا وہ محسن رہا اور جس نے ملت اور نظریات سے انحراف کیا وہ ظالم قرار پایا اور قرابت اور نسب اس کے لیے مفید نہ ہوا۔

وَ مِنْ ذُرِّیَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِیْنٌ (۳۷ : ۱۱۳) "اب ان دونوں کی ذریت میں سے کوئی محسن ہے اور کوئی اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والا ہے"۔ اور انہی کی اولاد سے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام تھے۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰی مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَ نَجَّیْنٰهُمَا وَ قَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ﴿۱۱۵﴾ وَ نَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِیْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَ اٰتَیْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِیْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَ هَدَیْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴿۱۱۸﴾ وَ تَرَكْنَا عَلَیْهِمَا فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۱۱۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰی مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۲۱﴾ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۲۲﴾

"اور ہم نے موسیٰ و ہارون پر احسان کیا' ان کو اور ان کی قوم کو کرب عظیم سے نجات دی' انہیں نصرت بخشی جس کی وجہ سے وہی غالب رہے' ان کو نہایت واضح کتاب عطا کی' انہیں راہ راست دکھائی اور بعد کی نسلوں میں ان کا ذکر خیر باقی رکھا۔ سلام ہے موسیٰ اور ہارون پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں' درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے"۔

قصہ موسیٰ کی اس جھلک میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اللہ نے ان پر احسان کیا کہ ان کو منصب نبوت کے لیے منتخب کیا اور ان کے ذریعہ ان کو اور ان کی قوم کو نجات دی اور یہ نجات ان کو اس عظیم ازیت سے دلائی جس میں وہ اور ان کی قوم مبتلا تھے۔ دوسری سورتوں میں اس کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ یہاں صرف یہ کہا کہ ظالموں اور جلادوں پر ان کو نصرت اور غلبہ دیا گیا اور ان کو واضح احکام پر مشتمل کتاب دی گئی اور ان کو صراط مستقیم کی ہدایت دی گئی۔ وہ راستہ جو اللہ تمام اہل ایمان کو عطا کرتا ہے یعنی اسلامی نظام زندگی اور ان پر یہ احسان کہ موسیٰ و ہارون کے ذکر کو دوام بخشا گیا۔ اس حصے کا خاتمہ بھی موسیٰ اور ہارون پر اللہ کی طرف سے سلامتی کے اظہار سے ہوتا ہے۔ یہ مختصر اور پرتاثیر فقرے بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ یہ جتانے کے لیے کہ اللہ اپنے محسن بندوں پر احسان بھی کرتا ہے اور ان کے ذکر کو دوام بھی بخشتا ہے۔ اور یہ جتانے کے لیے کہ اہل ایمان کی قدر و قیمت ان کے ایمان اور اسلام کی وجہ سے ہوتی ہے یعنی احسان کی وجہ سے۔

--- ○○○ ---

اس کے بعد ایک جھلک حضرت الیاس علیہ السلام کی۔ یہ کون تھے؟ راجح بات یہ ہے کہ عہد نامہ قدیم میں جو پیغمبر

ایلیا کے نام سے مذکور ہیں' وہی الیاس ہیں - یہ شام کے لوگوں کی طرف بھیجے گئے تھے - یہ لوگ ایک بعل نامی بت کے پرستار تھے - بعلبک آج تک اسی بت کے آثار میں سے ہے - بعل کے پرستار یہاں رہتے ہوں گے -

وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۲۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾

"اور الیاس بھی یقیناً مرسلین میں سے تھا - یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "تم لوگ ڈرتے نہیں ہو؟ کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑ دیتے ہو' اس اللہ کو جو تمہارا اور تمہارے اگلے پچھلے آباؤاجداد کا رب ہے؟" مگر انہوں نے اسے جھٹلا دیا' سو اب یقیناً وہ سزا کے لیے پیش کیے جانے والے ہیں' بجز ان بندگان خدا کے جن کو خالص کر لیا گیا تھا اور الیاس کا ذکر خیر ہم نے بعد کی نسلوں میں باقی رکھا - سلام ہے الیاس پر - ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں - واقعی وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا" -

حضرت الیاس نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی اور اس بات پر تنقید کی کہ تم بعل کی عبادت کرتے ہو اور اس ذات کو چھوڑتے ہو جو احسن الخالقین ہے - تمہارا بھی رب ہے' اور تمہارے آباؤاجداد کا بھی رب ہے' بعینہ اسی طرح جس طرح حضرت ابراہیم نے اپنی قوم اور باپ کی بت پرستی پر تنقید کی تھی - جس طرح ہر رسول اپنی اپنی قوم کی بت پرستی پر احتساب کرتا آیا تھا -

نتیجہ یہ تھا کہ قوم نے تکذیب کی - اللہ تعالیٰ ماقبہ فرماتا ہے کہ ان کو گرفتار کر کے حاضر کیا جائے گا - اور ان کو وہی سزا ملے گی جو ہمیشہ مکذبین کو ملتی ہے - ہاں ان میں سے اہل ایمان اور اللہ کے خالص بندے مستثنیٰ ہوں گے -

حضرت الیاس علیہ السلام کے ساتھ یہ محفل بھی اس بات پر ختم ہوتی ہے کہ اللہ کی طرف سے ان پر سلام آتا ہے - ان کی بھی تکریم ہوتی ہے - اور اہل ایمان اور اہل احسان کو اللہ ایسی ہی جزاء دیتے ہیں -

حضرت الیاس علیہ السلام کی سیرت یہاں پہلی مرتبہ آتی ہے مگر نہایت اختصار کے ساتھ - ہم بھی اختصار کے ساتھ اسی پر اکتفاء کرتے ہیں - البتہ یہاں ایک فنی نکتہ بیان کرنا ضروری ہے -

سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ (۳۷ : ۱۳۰) "سلام ہے الیاس پر" - یہاں الیاس علیہ السلام کے نام کے ساتھ "ین" کا فاصلہ لگا دیا گیا تاکہ عبارت کا صوتی حسن دوبالا ہو جائے - اور یہ قرآن کا مخصوص انداز بیان ہے کہ

سورت کی آیات کا خاتمہ تقریباً صوتی ہم آہنگی کے ساتھ ہوتا ہے اور اس انداز تعبیر کا سامع پر بہت اثر ہوتا ہے۔

---○○○---

اب قصہ لوط کی ایک جھلک۔ دوسرے مقامات پر یہ قصہ حضرت ابراہیم کے قصے کے ساتھ آتا ہے۔

وَ اِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ اِلَّا
عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَ اِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ ۴
مُّصْبِحِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَ بِالَّيْلِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ ع۲۵
۸

"اور لوط بھی انہی لوگوں میں سے تھا جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یاد کرو جب ہم نے اس کو اور اس کے سب گھر والوں کو نجات دی' سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔ پھر باقی سب کو تہس نہس کر دیا۔ آج تم شب و روز ان کے اجڑے دیار پر سے گزرتے ہو۔ کیا تم کو عقل نہیں آتی؟"

یہ جھلک نوح علیہ السلام کے قصے کی جھلک کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ اس میں اس بات کا ذکر ہے کہ لوط علیہ السلام رسول تھے۔ ان کو اپنے اہل و عیال کے ساتھ نجات دی گئی۔ ماسوائے ان کی بیوی کے۔ اور گمراہ جھٹلانے والوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ عربوں کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ تم تو روز و شب علاقہ لوط پر سے گزرتے ہو۔ کیا تمہارے دل بیدار نہیں ہوتے اور تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ کیا یہ کھنڈرات جو کہانی سناتے ہیں' تم اس کی طرف کان نہیں لگاتے اور کیا تمہارے دل میں ایسے انجام کا ڈر پیدا نہیں ہوتا۔

قصص انبیاء کی یہ جھلکیاں قصہ یونس پر ختم ہوتی ہیں۔

وَ اِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾
فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَ هُوَ مُلِيْمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوْ لَاۤ
اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ فَنَبَذْنٰهُ
بِالْعَرَآءِ وَ هُوَ سَقِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَ اَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿۱۴۶﴾ وَ اَرْسَلْنٰهُ
اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۴۸﴾

"اور یقیناً یونس بھی رسولوں میں سے تھا۔ یاد کرو جب وہ ایک بھری کشتی کی طرف بھاگ نکلا' پھر قرعہ اندازی میں شریک ہوا اور اس میں مات کھائی۔ آخر کار مچھلی نے اسے نگل لیا اور وہ ملامت زدہ تھا۔ اب اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں

سے نہ ہوتا تو روز قیامت تک اسی مچھلی کے پیٹ میں رہتا۔ آخر کار ہم نے اسے بڑی سقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینک دیا۔ اور اس پر ایک بیلدار درخت اگا دیا۔ اس کے بعد ہم نے اسے ایک لاکھ 'یا اس سے زائد لوگوں کی طرف بھیجا۔ وہ ایمان لائے 'اور ہم نے ایک وقت خاص تک انہیں باقی رکھا"۔

قرآن کریم اس بات کا تذکرہ نہیں کرتا کہ قوم یونس کہاں تھی۔ یہ بات قرآن سے صاف صاف معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ کسی ساحلی بستی میں آباد تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت یونس کی قوم کی جانب سے مسلسل تکذیب کی وجہ سے ان کا دل بھر آیا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی قوم کو یہ وارننگ دے دی کہ جلد ہی تم پر عذاب آنے والا ہے۔ آپ نے اپنی قوم سے سخت غصہ ہو کر نکل کھڑے ہوئے۔ چنانچہ آپ سمندر کے ساحل پر چلے گئے۔ اور وہاں ایک ایسی کشتی میں سوار ہو گئے جو سواریوں سے بھری ہوئی تھی۔ سمندر کے درمیان میں کشتی کو طوفان نے آ لیا اور وہ موجوں کی لپیٹ میں آ گئی۔ لوگوں کی طرف سے اعلان ہوا کشتی کے سواروں میں کوئی شخص ایسا ہے جس نے غلطی کا ارتکاب کیا ہے اور وہ مغضوب علیہ ہے اور یہ بات لازمی ہے کہ ایسے شخص کو سمندر میں پھینک دیا جائے تاکہ کشتی نجات پا جائے۔ اس لیے ان لوگوں نے قرعہ اندازی کی کہ جس کا قرعہ نکلا اسے سمندر میں پھینک دیا جائے۔ یونس علیہ السلام کا قرعہ نکل آیا۔ ان لوگوں کے اندر یونس علیہ السلام نیکی اور تقویٰ میں معروف تھے۔ لیکن جب ان کے نام بار بار قرعہ نکلا تو انہوں نے انہیں سمندر میں پھینک دیا یا خود وہ سمندر میں کود گئے۔ چنانچہ ان کو مچھلی نے نگل لیا۔ اس وقت سب لوگ ان کو ملامت کر رہے تھے یعنی وہ ملامت کے بظاہر مستحق تھے کیونکہ انہوں نے اس مہم کو چھوڑ دیا تھا جس کے لیے ان کو بھیجا گیا تھا اور اپنی قوم سے ناراض ہو کر ان کو چھوڑ دیا حالانکہ ابھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نہ آئی تھی۔ جب مچھلی کے پیٹ میں انہوں نے احساس کر لیا تو اس ظلم سے استغفار کرنا شروع کر دیا۔ اور یہ اعتراف کر لیا کہ میں نے ظلم کیا ہے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ "نہیں ہے کوئی حاکم مگر تو 'تو پاک ہے 'بے شک میں ظالموں میں سے تھا"۔ اللہ نے ان کی دعا کو سنا اور قبول کر لیا۔ چنانچہ مچھلی نے ان کو ساحل پر اگل دیا۔

فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ (۳۷: ۱۴۳) لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ

(۳۷: ۱۴۴) "اب اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا تو روز قیامت تک اس مچھلی کے پیٹ میں رہتا"۔ جب آپ مچھلی کے پیٹ سے نکلے تو بہت ہی کمزور ہو چکے تھے اور آپ کے پاس اوڑھنے کے لیے بھی کچھ نہ تھا اور آپ ساحل کی گرمی میں پڑے تھے۔

وَاَنْۢبَتْنَا عَلَیْهِ شَجَرَةً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ (۳۷: ۱۴۶) "اور ہم نے اس پر ایک بیلدار درخت اگا دیا"۔ اور یہ کدو کی بیل تھی۔ یہ اپنے پھیلے ہوئے پتوں کے ذریعہ انہیں دھوپ سے بچاتی اور یہ ان سے مکھیوں کو بھی دور رکھتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مکھیاں اس درخت کے قریب نہیں جاتیں۔ یہ اللہ کا لطف و کرم تھا اور معجزانہ تدابیر تھیں۔ جب ان کی صحت لوٹ آئی تو اللہ نے ان کو اپنی اس قوم کے پاس واپس بھیجا جن سے ناراض ہو کر وہ آ گئے تھے۔ حضرت یونس

کے بعد یہ لوگ ڈر گئے تھے' ایمان لے آئے تھے ۔ اللہ سے استغفار کیا اور اجتماعی طور پر معافی مانگی اور اللہ نے ان کی دعا قبول کر لی اور ان پر وہ عذاب سنت الٰہیہ کے مطابق نہ آیا جو مکذبین پر آتا رہتا ہے ۔

فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰی حِیْنٍ (۳۷:۱۴۸) "وہ ایمان لے آئے اور ہم نے ایک مقررہ وقت تک ان کو متاع حیات دیا" ۔ ان کی تعداد ایک لاکھ یا اس سے زیادہ تھی ۔ اور یہ سب کے سب ایمان لے آئے تھے ۔

یہ قصہ یہاں یہ بتاتا ہے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوتا ہے جو ایمان لاتے ہیں جبکہ سابقہ قصص کا مدعا یہ بتانا تھا کہ جو ایمان نہیں لاتے ان کا انجام کیا ہوتا ہے ۔ لہٰذا اے قوم محمد' تم ان دو انجاموں میں سے اپنے لیے جو انجام چاہتے ہو' اختیار کر لو--- یہاں آکر اس سورت کا یہ سبق ختم ہوتا ہے اور اس پر وہ تاریخی جائزہ بھی ختم ہوتا ہے جو نوح علیہ السلام کے بعد تمام ڈرانے والوں کی اقوام کے انجام کے بارے میں تھا' خواہ وہ مومنین تھے یا مکذبین تھے ۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۱۰ ایک نظر میں

اس سورت کے سبق ۲ میں لائے جانے والے قصص نے جن امور پر روشنی ڈالی اور اللہ اور اس کے بندوں کے تعلق کی جو وضاحت کی اور اللہ کی جانب سے اپنے رسولوں کے مکذبین کو جس طرح پکڑا گیا جو غیر اللہ کی بندگی کرتے تھے اور اللہ کے ساتھ خود اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق کو شریک کرتے تھے اور اس حقیقت کی روشنی میں جو درس اول کا موضوع تھی' اب اس آخری سبق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی جاتی ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ اس موضوع پر مکالمہ کریں کہ ان تمام حقائق کے مقابلے میں ان کے اس افسانوی عقیدے کی کیا حقیقت ہے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں نیز ان کے اس افسانوی عقیدے کی کیا حیثیت ہے جس کے مطابق وہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ اور جنوں کے درمیان کوئی رشتہ داری ہے اور ان کو یاد دلائیں کہ تم تو تمنائیں کرتے تھے کہ ہم میں بھی کوئی رسول آجائے اور تم یہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی رسول آجائے تو ہم اس کی ہدایات کو بسر و چشم قبول کریں گے لیکن اب تمہارا حال یہ ہے کہ جب رسول آگیا تو تم نے کفر کا رویہ اختیار کر لیا۔ سورت کا خاتمہ اس ریکارڈ پر ہوتا ہے کہ اللہ نے رسولوں کے ساتھ وعدہ کر لیا ہے کہ وہی غالب رہیں گے اور یہ کہ یہ مشرکین اللہ کی طرف جو نسبتیں کرتے ہیں وہ ان سے پاک ہے اور تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں۔ چنانچہ آغاز ہوتا ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۱۰ تشریح آیات

## ۱۴۹ --- تا --- ۱۸۲

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۷﴾

"پھر ذرا ان لوگوں سے پوچھو 'کیا (ان کے دل کو یہ بات لگتی ہے کہ) تمہارے رب کے لیے تو ہوں بیٹیاں اور ان کے لیے ہوں بیٹے؟ کیا واقعی ہم نے ملائکہ کو عورتیں ہی بنایا ہے اور یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں؟ خوب سن رکھو ' دراصل یہ لوگ اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ "اللہ اولاد رکھتا ہے" اور فی الواقع یہ جھوٹے ہیں۔ کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لیے پسند کر لیں 'تمہیں کیا ہو گیا ہے 'کیسے حکم لگا رہے ہو؟ کیا تمہیں ہوش نہیں آتا؟ یا پھر تمہارے پاس اپنی ان باتوں کے لیے کوئی صاف سند ہے 'تو لاؤ اپنی وہ کتاب اگر تم سچے ہو"۔

ان کے اس غلط عقیدے کا ہر طرف سے گھیراؤ کیا جاتا ہے۔ ان کے خلاف ان کی زبان میں بات کی جاتی ہے اور ان کے سماج میں جو سوچ تھی اسی کو ان کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ عربوں کے سماج میں لڑکوں کو لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اور وہ بچیوں کی پیدائش کو مصیبت سمجھتے تھے۔ لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابلے میں کم تر مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کے باوجود وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ فرشتے دیویاں ہیں اور یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ چنانچہ اس عقیدے کو ان کی منطق اور سوچ کے مطابق رد کر دیا گیا تاکہ وہ دیکھ لیں کہ حقیقت تو دور کی بات ہے خود ان کے تسلیم شدہ معیار کے مطابق بھی ان کا عقیدہ غلط ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ (۳۷: ۱۴۹) "پھر ذرا ان سے پوچھو کہ تمہارے رب کے لیے تو ہوں بیٹیاں اور ان کے لیے ہوں بیٹے"۔ کیا تمہارے دل کو یہ بات لگتی ہے۔ جبکہ تمہارے سماج میں لڑکیاں لڑکوں سے کم تر رتبہ رکھتی ہیں۔ کیا خوب تقسیم ہے تمہاری 'کہ تمہارے لیے ہوں بیٹے اور خالق کے لیے ہوں

بیٹیاں یا یہ کہ خود اللہ نے اپنے لیے بیٹیاں چن لیں اور بیٹے تمہارے لیے چھوڑ دیئے ۔ یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں ۔ تمہارے یہ مزعومات کس قدر پوچ ہیں ۔

آج تمہارے اندر یہ افسانوی سوچ کیسے پیدا ہو گئی ۔ کہاں سے یہ عقیدہ پھیل گیا کہ فرشتے مونث ہیں ۔ کیا انہوں نے ان کی پیدائش کو دیکھا ہے' اس وقت یہ موجود تھے اور انہوں نے ان کی جنس کو معلوم کر لیا؟

اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ (۳۷ : ۱۵۰) "کیا ہم نے ملائکہ کی تخلیق مونث کے طور پر کی اور یہ اس وقت دیکھ رہے تھے"۔

یہاں اللہ تعالیٰ ان کے اس مقولے اور عقیدے کو ان کے منصوص الفاظ میں نقل کر کے رد کرتا ہے ۔

اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ (۳۷ : ۱۵۱) وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ

(۳۷ : ۱۵۲) "دراصل یہ لوگ اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ "اللہ اولاد رکھتا ہے" اور فی الواقع یہ جھوٹے ہیں"۔ یہ اپنے سماج کے مسلمہ رواج اور اپنی ثابت شدہ روایات کے خلاف یہ بات کرتے ہیں ۔ یہ خود تو بیٹے چاہتے ہیں اور اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرتے ہیں ۔

اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ (۳۷ : ۱۵۳) "کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لیے پسند کیں"۔ تمہاری یہ منطق خود تمہارے غلط یا صحیح مسلمات کی رو سے ہی غلط ہے ۔

مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (۳۷ : ۱۵۴) اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۳۷ : ۱۵۵) "تمہیں کیا ہو گیا ہے' کیسے حکم لگا رہے ہو' کیا تمہیں ہوش نہیں آتا"۔ یہ استدلال تم کہاں سے نکال لائے ہو' عجیب ہے یہ؟

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ (۳۷ : ۱۵۶) فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

(۳۷ : ۱۵۷) "پھر کیا تمہارے پاس اپنی باتوں کے لیے کوئی صاف سند ہے تو لاؤ اپنی وہ کتاب اگر تم سچے ہو"۔

ان کا دوسرا افسانہ یہ تھا کہ اللہ اور جنوں کے درمیان رشتہ داری ہے ۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۭ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝۱۵۸

"انہوں نے اللہ اور جنوں کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے' حالانکہ جن خوب جانتے ہیں کہ یہ مجرم کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں"۔

ان کا زعم یہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں تھیں اور ان سے جن پیدا ہوئے یوں جنوں اور اللہ کے درمیان قرابت ہو گئی۔ جنوں کو تو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اللہ کی دوسری مخلوق کی طرح ایک مخلوق ہیں۔ اور وہ قیامت کے دن اللہ کے حکم سے حاضر کیے جائیں گے اور رشتہ داروں کے ساتھ یہ سلوک تو نہیں کیا جاتا کہ وہ بطور مجرم پکڑے جا کر پیش کیے جائیں۔

اس کے ساتھ ساتھ صراحت کے ساتھ اس عقیدے کی تردید بھی کر دی جاتی ہے۔

سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ ۝۱۵۹

"اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں"۔

یہاں جنوں سے اللہ کے نیک بندوں کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے جو جنوں سے ہیں اور جو ایمان لانے والے ہیں۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ۝۱۶۰

"ماسوائے اللہ کے ان بندوں کے جو مخلص ہیں"۔

اس کے بعد فرشتوں کی طرف سے خطاب ہے، ان مشرکین کو اور ان کے ان معبودوں کو، جن کی وہ بندگی کرتے تھے۔ یہ خطاب ان کے خود ساختہ عقائد پر ہے جو وہ رکھتے ہیں۔ بظاہر انداز کلام سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب فرشتوں کا ہے۔

فَاِنَّكُمۡ وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ ۝۱۶۱ مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَيۡهِ بِفٰتِنِيۡنَ ۝۱۶۲ اِلَّا مَنۡ هُوَ صَالِ الۡجَحِيۡمِ ۝۱۶۳ وَمَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعۡلُوۡمٌ ۝۱۶۴ وَّاِنَّا لَنَحۡنُ الصَّآفُّوۡنَ ۝۱۶۵ وَاِنَّا لَنَحۡنُ الۡمُسَبِّحُوۡنَ ۝۱۶۶

"پس تم اور تمہارے یہ معبود اللہ سے کسی کو پھیر نہیں سکتے مگر صرف اس کو جو دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھلسنے والا ہو۔ اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کا ایک مقام مقرر ہے اور ہم صف بستہ خدمت گار ہیں اور تسبیح کرنے والے ہیں"۔

مفہوم یہ ہے کہ تم اور تمہارے معبود مل کر اللہ کے مقابلے میں اس کے بندوں میں سے کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے ماسوائے ان لوگوں کے جو جہنم کے حساب میں لکھے جا چکے ہیں اور تقدیر الٰہی نے فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ جہنمی ہیں۔ تم لوگ اس مومن کو گمراہ نہیں کر سکتے جس کا نیک انجام لکھا ہوا ہے کہ اس نے راہ اطاعت لی ہے۔ کیونکہ جہنم کے ایندھن کا انتظام بھی اللہ نے کرنا ہے۔ اور سب کو معلوم ہے کہ یہ ایندھن وہ لوگ اور ان کے معبود ہیں جو اس فتنے کی راہ خود اختیار کرتے ہیں اور جو فتنہ پردازیوں کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں۔

یہ فرشتے اس افسانوی عقیدے پر صرف یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ اللہ نے ہر کسی کے لیے مقام و انجام مقرر کر دیا ہے۔

ہر کسی نے اس تک لامحالہ پہنچنا ہے ۔ہم فرشتے تو سب اللہ کے بندے ہیں ' مخلوق ہیں ' ہمارے لیے اللہ نے اپنی اطاعت کے فرائض مقرر کر رکھے ہیں۔ہم نماز کے لیے صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں۔ہم اللہ کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور ہم میں سے ہر ایک اپنے مقام پر کھڑا ڈیوٹی دے رہا ہے اور اللہ تو اللہ ہے (فرشتوں کی بات یہاں ختم ہو گئی)۔

اب روئے سخن پھر مشرکین کی طرف پھر جاتا ہے جو ان افسانوی عقیدے کے قائل تھے ۔ان کو ان کے وہ وعدے اور وہ آرزوئیں یاد دلائی جاتی ہیں کہ جب وہ اہل کتاب کے ساتھ حسد کرتے ہوئے یہ کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے پاس بھی کوئی ایسی کتاب آ جائے جس میں پہلے لوگوں کا ذکر ہو یعنی حضرت ابراہیم اور آپ کے بعد آنے والوں کا تو ہم اللہ کے مخلص اور اعلیٰ بندے بن جائیں اور اللہ کے ہاں ہمارا بلند مقام ہو۔

وَ اِنۡ کَانُوۡا لَیَقُوۡلُوۡنَ ﴿۱۶۷﴾ لَوۡ اَنَّ عِنۡدَنَا ذِکۡرًا مِّنَ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۶۸﴾ لَکُنَّا عِبَادَ اللّٰہِ الۡمُخۡلَصِیۡنَ ﴿۱۶۹﴾ فَکَفَرُوۡا بِہٖ فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾

"یہ لوگ پہلے تو کہا کرتے تھے کہ کاش ہمارے پاس وہ "ذکر" ہوتا جو پچھلی قوموں کو ملا تھا تو ہم اللہ کے چیدہ بندے ہوتے ۔مگر (جب وہ آ گیا) تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔اب عنقریب انہیں (اس روش کا نتیجہ) معلوم ہو جائے گا"۔یہ ہے وہ ذکر جو ان کے پاس آ گیا اور یہ اس کرۂ ارض پر عظیم ترین نصیحت ہے لیکن ان لوگوں نے اسے نہ پہچانا۔

فَکَفَرُوْا بِہٖ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ (۳۷ : ۱۷۰) "مگر جب آ گیا تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ اب عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"۔

(عنقریب) کے لفظ میں در پردہ دھمکی بھی ہے اور یہ دھمکی ان کے مناسب حال ہے کیونکہ وہ خود تمنائیں کرتے تھے اور اب انکار کرتے ہیں۔-- اس تہدید خفی کے بعد اب بتایا جاتا ہے کہ اللہ اپنے رسولوں کو غالب کرے گا اور ان کی نصرت کرے گا۔

وَ لَقَدۡ سَبَقَتۡ کَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۷۱﴾ۚۖ اِنَّہُمۡ لَہُمُ الۡمَنۡصُوۡرُوۡنَ ﴿۱۷۲﴾ وَ اِنَّ جُنۡدَنَا لَہُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ﴿۱۷۳﴾

"اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا"۔یہ وعدہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے اور اللہ کی بات اپنی جگہ قائم ہے۔زمین کے اوپر توحیدی نظریہ حیات قائم ہے۔ ایمان کی عمارت مکمل ہو چکی ہے ۔تمام مشکلات اور رکاوٹوں کے علی الرغم توحید کا کلمہ بلند ہے ۔اگرچہ جھٹلانے والے جھٹلاتے ہیں۔اگرچہ دنیا میں اسلام کی دعوت اور اسلام کے قیام کا علم بلند کرنے والوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔آج بھی کفار کے عقائد ' ان کا رعب دنیا سے ختم ہے۔کفار ' مشرکین کا تمام نظریاتی زور ختم ہے۔ آج دنیا

میں وہی عقائد و نظریات زندہ ہیں جو رسولوں نے پیش کیے ۔ آج بھی رسولوں کا پیش کردہ عقیدۂ توحید لوگوں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے ۔ لوگوں کے تصورات اور نظریات کو ایک خاص کیف دے رہا ہے اور تمام رکاوٹوں کے باوجود اس کرۂ ارض پر انسانوں کے دل و دماغ پر واضح طور پر چھایا ہوا ہے ۔ اور وہ تمام نظریات ناکام ہو چکے ہیں جو رسولوں کے پیش کردہ نظریہ توحید کے مخالف تھے ۔ یہ نظریات ان علاقوں میں بھی ختم ہو چکے ہیں جہاں سے وہ اٹھے تھے ۔ (سوشلزم روس میں) اور اللہ کے رسولوں کا کلمہ آج بھی بلند ہے اور وہ اللہ کا لشکر نظریاتی اعتبار سے آج بھی غالب ہے ۔

یہ تو ہم ایک عمومی بات کرتے ہیں لیکن ایک بات تمام روئے زمین پر بطور حقیقت پائی جاتی ہے اور وہ ہمیشہ ہر زمانے میں پائی گئی ہے اور ہر تحریک اور دعوت پر وہ اصول صادق آیا ہے کہ جب داعی مخلص ہوں' سچے ہوں اور دعوت کے لیے یکسو ہوں تو وہ ہر حال میں غالب رہتے ہیں ۔ اس کے راستے میں مشکلات اور رکاوٹوں کے پہاڑ کیوں نہ کھڑے کر دیئے جائیں ۔ اللہ کا لشکر بہرحال غالب رہتا ہے اور اسے اللہ کی نصرت حاصل رہتی ہے ۔ مخلصین کی راہ میں مشکلات کے پہاڑ کیوں نہ کھڑے کر دیئے جائیں اور دشمن کی قوتیں اور شیطانی قوتیں ان کے خلاف حرب و ضرب کا بازار کیوں نہ گرم کریں ۔ وہ غالب رہتے ہیں ۔ مخلصین کو بے شک مختلف جنگیں لڑنی پڑتی ہیں جو کبھی لڑائی سے سابقہ پیش آتا ہے لیکن آخری نتیجہ وہی ہوتا ہے کہ اللہ کا لشکر غالب ہوتا ہے ۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے ۔ اگر پوری دنیا کی قوتیں اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں' یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا ۔ مخلصین مومنین کو نصرت ملے گی' وہ غالب ہوں گے اور زمین پر ان کا اقتدار قائم ہو گا ۔

اللہ کا یہ وعدہ کوئی جزوی واقعہ نہیں ہو گا بلکہ یہ اس کائنات کی سنتوں میں سے ایک سنت الٰہیہ ہے ۔ اور اللہ کی سنت اس طرح حرکت میں رہتی ہے جس طرح یہ ستارے اور سیارے اپنے مدار میں متحرک ہوتے ہیں ۔ ان کے مدار پر ان کی رفتار میں ایک لمحے کا فرق نہیں آتا ۔ جس طرح رات اور دن کے ظہور میں کوئی خلل نہیں پڑتا ۔ صدیوں سے یہ ظہور جاری ہے ۔ جس طرح بہار و خزاں کے مظاہر آتے جاتے ہیں اور مردہ زمین کو زندہ کرتے رہتے ہیں اسی طرح سنت الٰہیہ بھی جاری و ساری ہے ۔ لیکن وہ اللہ کی تقدیر کی پابند ہے اور اللہ کے ارادے کے مطابق چلتی ہے ۔ اور جس طرح اللہ چاہتا ہے' اس کا ظہور ہوتا ہے ۔ کبھی کبھی اس کے ظہور میں دیر نظر آتی ہے اور یہ دیر عجلت پسند انسان کی تمناؤں کی وجہ سے آتی ہے ۔ لیکن اس سنت میں تخلف نہیں ہوتا ۔ بعض اوقات یہ سنت اس طرح اپنا کام کرتی ہے کہ انسان اسے سمجھ ہی نہیں سکتا ۔ وہ ایسی شکل و صورت میں آتی ہے جو انسان کے تصور میں نہیں ہوتی ۔ اور جب سنت الٰہیہ اپنا کام کر کے چلی جاتی ہے تو ایک عرصے کے بعد اہل ایمان کو پتہ چلتا ہے کہ فلاں گوشے سے نصرت الٰہیہ نے کام کیا تھا ۔

اللہ کے رسولوں کا اتباع کرنے والے لشکر خداوندی کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی امداد اس متعین صورت میں ہو جو اس کے ذہن میں ہے ۔ لیکن اللہ کی مشیت یہ ہوتی ہے کہ یہ نصرت نہایت ہی اعلیٰ اور مکمل شکل میں ہو ۔ چنانچہ ہوتا وہی کچھ ہے جو اللہ چاہتا ہے ۔ اگرچہ یہ لشکر اپنے خیال میں بہت زیادہ مشقت اٹھا رہا ہو اور اس کے خیال میں جدوجہد پر بہت عرصہ گزر چکا ہو اور انتظار ان کے تصور سے زیادہ ہو گیا ہو ۔ مثلاً مسلمانوں کا ارادہ یہ تھا کہ جنگ بدر کے موقعے پر قافلہ ان کے ہاتھ آ جائے لیکن اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ یہ دنیاوی نفع ان کے ہاتھ سے جاتا رہے اور ان کی مڈ بھیڑ فوج اور لشکر جرار سے ہو جائے اور وہ ایک ایسے گروہ سے ٹکرا جائیں جو زاد و عتاد رکھتا ہو ۔ اور اللہ نے جو چاہا وہ بہتر تھا ۔ اسلام اور مسلمانوں دونوں کے لیے بہتر تھا ۔ یہ تھی اللہ کی نصرت لشکر الٰہی کے حق میں ۔ اللہ پوری انسانی تاریخ میں اپنے لشکروں کے

ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا ہے۔

بعض او قات اللہ کے لشکر کسی نہ کسی جنگ میں شکست بھی کھا جاتے ہیں اور جنگ کا رخ ان کے خلاف چلا جاتا ہے۔ ان پر ابتلائیں اور مشکلات بھی آ جاتی ہیں۔ کیونکہ اللہ کی مشابیہ ہوتی ہے کہ کسی دوسرے بڑے معرکے میں نصرت اور غلبہ دے۔ اور اللہ جانتا ہے کہ اس موقعے پر اس کے لشکر کے لیے فتح مفید نہیں ہے اور اگلے موقعے پر وہ فتح بہت وسیع 'بہت ہمہ گیر اور دور رس اثرات کی حامل ہوگی۔

اللہ نے اپنی بات کر دی ہے 'اس کا وعدہ اور ارادہ کام کر چکا ہے اور اللہ کی سنت بارہا ثابت ہو چکی ہے۔

وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ (۳۷:۱۷۱) اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ (۳۷:۱۷۲) وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۳۷:۱۷۳) "اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا"۔

---ooo---

اس فیصلہ کن وعدے کے بعد اور نہایت ہی دیرینہ دستاویز ہونے کے بعد اور اللہ کی طرف سے ہونے کے بعد اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ اب آپ مشرکین مکہ کو چھوڑ دیں۔ اب دیکھیں کہ اللہ کا یہ وعدہ کس طرح سچا ہوتا ہے اور سنت الٰہیہ کس طرح کام کرتی ہے۔ آپ بھی انتظار کریں اور وہ بھی انتظار کریں اور اللہ کے کاموں اور شانوں کا نظارہ کریں۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۴﴾ وَّ اَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۵﴾ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۷﴾ وَ تَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۸﴾ وَّ اَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

"پس اے نبیؐ' ذرا کچھ مدت تک انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور دیکھتے رہو' عنقریب یہ خود بھی دیکھ لیں گے۔ کیا یہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟ جب وہ ان کے صحن میں اترے گا تو وہ دن ان لوگوں کے لیے بہت برا ہو گا' جنہیں متنبہ کیا جا چکا ہے۔ بس ذرا انہیں کچھ مدت کے لیے چھوڑ دو اور دیکھتے رہو' عنقریب یہ خود دیکھ لیں گے"۔

ان سے منہ پھیر لیں۔ ان کو پوری طرح نظرانداز کر دیں۔ ان کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ ان کو اس دن تک اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ جب آپ ان کو دیکھیں گے اور وہ آپ کو دیکھ رہے ہوں گے اور اللہ کا وعدہ سچا ہو رہا ہو گا۔ ہاں اگرچہ یہ ہمارے عذاب کے آنے کے لیے بہت جلدی کر رہے ہیں لیکن اے کاش کہ وہ سوچ سکتے کہ اس دن کیا تباہی مچے گی۔ جب یہ عذاب ان کے صحن میں ہو گا جب ہمارے رسول ڈراتے ہیں اور لوگ مان کر نہیں دیتے تو اس وقت سخت عذاب

نازل ہوتا ہے۔

دوبارہ حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ان سے روگردانی کرلیں اور ان کو نظرانداز کر دیں ۔ یہ دراصل ان کو درپیش آنے والے خوفناک انجام کی طرف اشارہ ہے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ (۳۷: ۱۷۴) "ذرا انہیں کچھ مدت کے لیے چھوڑ دیں"۔ اور عذاب کی ہولناکی کی طرف بھی دوبارہ اشارہ کر دیا جاتا ہے۔

وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ (۳۷: ۱۷۵) "اور دیکھتے رہو عنقریب یہ خود بھی دیکھ لیں گے"۔

سورت کا خاتمہ اللہ کی پاکی کے بیان پر ہوتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ عزت اور غلبہ اسی کا ہے ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی طرف سے سلامتی ہے جس طرح تمام رسولوں پر ہے ۔ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو بلاشرکت غیرے رب العالمین ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَ

۵ ع ۴۴ ۹ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾

پاک ہے تیرا رب 'عزت کا مالک' ان تمام باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں 'اور سلام ہے رسولوں پر' اور ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے"۔

یہ ایسا خاتمہ ہے جو اس سورت کے تمام موضوعات پر حاوی ہے اور مضامین سورت اور مسائل زیر بحث کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہے۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ----- ۲۳

### سورہ ص ۔ ۳۸

آیات ۱--- تا--- ۸۸

# سورۂ ص ایک نظر میں

یہ مکی سورت ہے۔ مکی سورتوں کی طرح اس میں بھی مسئلہ توحید، مسئلہ وحی الٰہی اور مسئلہ بعث بعد الموت پر بحث کی گئی ہے۔ یہ تینوں مسائل اس سورت کے آغاز میں پہلے ہی سبق میں لیے گئے ہیں۔ جن آیات میں ان مسائل کو لیا گیا ہے۔ وہ فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان میں اس تعجب، دہشت اور اچنبھے کو ظاہر کیا گیا جو مشرکین کے سرداروں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے طاری ہو گیا تھا۔ ان کو یہ بات بہت ہی انوکھی لگی کہ یہ شخص ایک خدا کا قائل ہے اور باقی تمام الہوں کو اس نے ختم کر دیا ہے۔ پھر وہ اس بات پر بھی متعجب تھے کہ اس پر وحی آتی ہے اور وہ اللہ کا فرستادہ بن گیا ہے۔

وَ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ (۳۸:۴) اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (۳۸:۵) وَ انْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَ اصْبِرُوْا عَلٰۤى اٰلِهَتِكُمْ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ (۳۸:۶) مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ (۳۸:۷) ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَیْنِنَا (۳۸:۸) "ان لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود انہی میں سے آگیا۔ منکرین کہنے لگے کہ یہ ساحر ہے سخت جھوٹا ہے 'کیا اس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے اور سرداران قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر۔ یہ بات تو کسی اور ہی غرض کے لیے کہی جا رہی ہے۔ یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات۔ کیا ہمارے درمیان بس ایک ہی شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کر دیا گیا"۔

نیز جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس بات سے ڈرایا کہ تمہاری تکذیب کی وجہ سے تم پر عذاب نازل ہو جائے گا تو انہوں نے مذاق کرتے ہوئے دعا کی۔

وَ قَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ یَوْمِ الْحِسَابِ (۳۸:۱۶) "یہ کہتے ہیں اے ہمارے رب، یوم الحساب سے پہلے ہمارا حصہ ہمیں جلدی سے دے دے"۔ ان لوگوں نے اس بات کو ناقابل تصور سمجھا کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے ایک شخص پر ذکر نازل کر دے اور پھر یہ شخص محمد ابن عبد اللہ ہو، جو کوئی رئیس نہ تھا اور نہ اس کی سابقہ ریاست تھی۔ نہ وہ علاقے کا حکمران تھا۔ چنانچہ ان کے اس تعجب کے سبب ہی سے ان کا یہ قول نقل کیا کہ کیا ہم میں سے

اسی پر یہ ذکر نازل ہوتا تھا۔اس پر اللہ نے ان سے پوچھا کہ کیا اللہ عزیز اور وہاب کے خزانوں کی چابیاں ان کے پاس ہیں یا زمین آسمانوں اور ان کے درمیان کی حکومت ان کے پاس ہے۔

أَمْ عِندَهُمْ خَزَائِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيزِ الْوَهَّابِ (۳۸:۹) أَمْ لَهُم مُّلْكُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا فَلْيَرْتَقُوا فِي الْأَسْبَابِ (۳۸:۱۰) "کیا تیرے داتا اور غالب پروردگار کی رحمت کے خزانے ان کے قبضے میں ہیں؟ کیا یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کے مالک ہیں۔اچھا یہ عالم اسباب کی بلندیوں پر چڑھ دیکھیں"۔

اللہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس کی کی رحمت کو کوئی چیز روک نہیں سکتی۔اپنی رحمت کے دروازے وہ جس پر چاہتا ہے' کھول دیتا ہے۔زمین اور آسمان اور ان کے درمیان کی چیزوں کے مالک وہ نہیں ہیں۔لہذا یہ خزانے اللہ جسے چاہے دے دے۔اپنے بندوں میں سے جسے چاہے مختار بنا دے۔کیونکہ وہی جانتا ہے کہ کسی منصب کا مستحق کون ہے وہ اپنے بندوں پر بے قید اور بے حساب انعامات کر سکتا ہے۔چنانچہ اس نکتے کو ثابت کرنے کے لیے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے قصے لائے گئے کہ اللہ نے انہیں نبوت' حکومت' پہاڑوں کی تسخیر' پرندوں کی تسخیر جنوں اور ہواؤں کی تسخیر کی قوت دی اور زمین کے خزانوں کا تو شمار ہی نہ تھا۔اور دنیا کا سازو سامان اور زیب و زینت تو بے انتہا تھی۔

کیا داؤد و سلیمان ان سب انعامات کے باوجود انسان نہ تھے۔کیا ان کے اندر بشری کمزوریاں نہ تھیں۔کیا وہ ہر رحمت خداوندی کے محتاج نہ تھے۔کیا ان جیسے طاقتور نبیوں اور بادشاہوں کی امداد اللہ نے قدم قدم پر نہ کی تھی۔کیا ان کی غلطی پر توبہ قبول نہ کی تھی اور راہ صواب کی طرف ان کی راہنمائی نہ کی تھی۔

ان قصص کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلام کو ہدایت کی گئی کہ آپ ان مکذبین کی ایذا رسانیوں پر صبر کریں اور اللہ کے فضل کے امیدوار رہیں۔اللہ آپ کا نگہبان ہے۔

اصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُولُونَ وَ اذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ ذَا الْأَيْدِ إِنَّهُ أَوَّابٌ (۳۸:۱۷)

"اے نبیؐ صبر کرو ان باتوں پر جو یہ لوگ بناتے ہیں اور ان کے سامنے ہمارے بندے داؤد کا قصہ بیان کرو جو بڑی قوتوں کا مالک تھا۔اور ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والا تھا"۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا قصہ اس مقصد کے لیے لایا گیا کہ اللہ اپنے مخلص ترین بندوں کو ابتلاؤں میں آزماتا ہے۔ لہذا دعوت اسلامی کے کارکنوں کو اس طرح صبر کرنا چاہئے جس طرح حضرت ایوب علیہ السلام نے صبر کیا۔یہ قصہ نیک لوگوں کے حسن انجام کی تصویر ہے۔نیکوں پر بالآخر اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔وہ رحمت میں ڈوب جاتے ہیں۔قدرت اپنے رحیمانہ ہاتھوں سے ان پر شفقت کا ہاتھ پھیرتی ہے۔اس دور میں رسول اللہ اور اہل ایمان مکہ میں بے حد مصائب برداشت کر رہے تھے۔ان کو یہ اشارہ دیا جا رہا ہے کہ ان مشکلات کے بعد رحمتوں کا فیضان ہو گا۔اور اللہ کے خزانوں کے منہ کھل جائیں گے۔

یہ قصص سورت کے ایک بڑے حصے پر پھیلے ہوئے ہیں۔اور سورت کا سبق نمبر ۲ انہی پر مشتمل ہے۔

یہ لوگ عذاب کے نازل ہونے میں بہت جلدی کرتے تھے وہ کہتے تھے :

وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ (۳۸: ۱۶) "اے ہمارے رب' یوم الحساب سے پہلے ہمارا حصہ ہمیں جلدی سے دے دے"۔ چنانچہ ان قصص کے بعد قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر یہاں لایا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ متقین کا انتظار کیا انعامات کر رہے ہیں اور یہ کہ جہنم کس شان سے مکذبین کا انتظار کر رہی ہے۔ قیامت کے اس منظر میں بتایا جاتا ہے کہ وہ حقیقی قدریں کیا ہیں جن کی وہاں اہمیت ہے۔ یہ سردار وہاں اپنا انجام دیکھ لیں گے۔ اور دنیا میں جن فقراء اور مساکین کے ساتھ وہ مذاق کرتے تھے اور ان کو اس بات کا اہل نہ سمجھتے تھے کہ یہ بھی اللہ کی رحمتوں اور خزانوں کے حق دار ہو جائیں۔ یہاں معلوم ہو گا کہ یہ سردار امراء نہیں اور یہ فقراء 'فقراء نہیں۔ یہاں ان فقراء کا انجام یہ ہو گا۔

جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ (۳۸: ۵۰) مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ (۳۸: ۵۱) وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ (۳۸: ۵۲) "ہمیشہ رہنے والی جنتیں جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے ان میں وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ خوب خوب خوراک اور مشروب طلب کر رہے ہوں گے اور ان کے پاس شرمیلی ہم سن بیویاں ہوں گی"۔

اور جو سرکش ہیں ان کا انجام بہت ہی برا ہو گا۔

جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمِهَادُ (۳۸: ۵۶) هٰذَا فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ (۳۸: ۵۷) وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖ اَزْوَاجٌ (۳۸: ۵۸) "جہنم جس میں وہ جھلسے جائیں گے۔ بہت ہی بری قیام گاہ یہ ہے ان کے لیے۔ پس وہ مزہ چکھیں کھولتے ہوئے پانی اور پیپ' لہو اور اس قسم کی دوسری تلخیوں کا"۔ یہ لوگ جہنم میں ایک دوسرے کو لعنت و ملامت کریں گے۔ باہم جھگڑیں گے اور یہ بات یاد کریں گے کہ وہ تو مومنین کو حقیر سمجھ کر ان سے مذاق کرتے تھے۔

وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ (۳۸: ۶۲) اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ (۳۸: ۶۳) "وہ آپس میں کہیں گے کیا بات ہے ہم ان لوگوں کو کہیں نہیں دیکھتے جن کو ہم دنیا میں برا سمجھتے تھے۔ ہم نے یونہی ان کا مذاق بنا لیا تھا یا کہیں وہ نظروں سے اوجھل ہیں"۔ یہ لوگ ان مومنین کو جہنم میں نہ پائیں گے اور یہ بات تو معلوم ہے کہ وہ جنت میں ہیں۔ لہذا یہ ہے جواب ان کے اس مطالبے کا اور مذاق کا۔ یہ منظر اس سورت کا تیسرا سبق ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن کفار کو علوم وحی سناتے وہ تکذیب کرتے ہوئے ان باتوں کو انہونی سمجھتے۔ حضرت

آدم علیہ السلام کا قصہ سنا کر ان کو بتایا جاتا ہے کہ دیکھو یہ قصص بذریعہ وحی آرہے ہیں ورنہ وہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو موجود نہ تھے ۔ یہ خبریں ان کو اللہ بتاتا ہے ۔ وہاں آدم علیہ السلام کے سوا کوئی اور تو موجود ہی نہ تھا ۔ دوران قصہ بتایا جاتا ہے کہ ابلیس کو جس امر نے ہلاکت میں ڈالا وہ صرف یہ تھا کہ اسے حضرت آدم کے ساتھ ضد ہو گئی تھی ۔ اور اس نے اس بات کو ناپسند کیا کہ اللہ نے اس کے مقابلے میں آدم علیہ السلام کو کیوں ترجیح دی ۔ جس طرح اہل مکہ یہ کہتے تھے کہ بس یہی رہ گیا ہمارے میں سے نبی بننے کے لیے ۔ اشارہ یہ مطلوب ہے کہ ان کے موقف اور ابلیس کے موقف میں پوری پوری یگانگت ہے ۔ لہٰذا جس طرح وہ راندۂ درگاہ ہوا یہ بھی ہوں گے ۔

اس سورت کا خاتمہ سبق چہارم پر ہوتا ہے ۔ اس میں حضور ان لوگوں سے خطاب کر رہے ہیں کہ آپ جو دعوت دے رہے ہیں وہ خود اپنی جانب سے نہیں دے رہے ہیں ۔ اور نہ آپ اس پر ان سے کوئی اجرت طلب کرتے ہیں اور یہ کہ اس دعوت کے بہت ہی عظیم نتائج نکلنے والے ہیں ۔

قُلْ مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَکَلِّفِیْنَ (۳۸:۸۶) اِنْ هُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ (۳۸:۸۷) وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِیْنٍ (۳۸:۸۸) "اے نبی ان سے کہہ دو کہ میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا اور نہ میں بناوٹی لوگوں میں سے ہوں ۔ یہ تو ایک نصیحت ہے تمام جہان والوں کے لیے اور تھوڑی مدت ہی گزرے گی کہ تمہیں اس کا حال خود معلوم ہو جائے گا" ۔

یہ چاروں سبق اس سورت کے موضوعات کو اس طرح آگے بڑھاتے ہیں کہ انسان کے دل و دماغ کو تاریخ کے ان اقوام کی سیر کراتے ہیں جنھوں نے زمین پر بڑائی حاصل کی ' جباری و قہاری کا رویہ اختیار کیا اور رسولوں اور مومنین پر دست درازیاں کیں ۔ لیکن ان کا انجام تباہی و بربادی اور مکمل ہلاکت کی صورت میں سامنے آیا ۔

جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ (۳۸:۱۱) کَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ (۳۸:۱۲) وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ لْئَیْکَةِ اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ (۳۸:۱۳) اِنْ کُلٌّ اِلَّا کَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ (۳۸:۱۴)

"یہ تو جتھوں میں سے ایک چھوٹا جتھہ ہے جو اسی جگہ شکست کھانے والا ہے ۔ ان سے پہلے نوح کی قوم اور عاد اور میخوں والا فرعون اور ثمود اور قوم لوط اور ایکہ والے جھٹلا چکے ہیں ۔ جتھے وہ تھے ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور میری عقوبت کا فیصلہ ان پر چسپاں ہوا" ۔

چنانچہ انسانی فکر کے سامنے اقوام کی تاریخی ہلاکتیں ' بربادیاں اور تمام سرکشوں کی بربادیاں پیش کر کے اس کے مقابلے میں اللہ کے سچے بندوں اور اللہ کے لشکروں کی کامیابیاں بھی بیان کی جاتی ہیں ۔ عزت ' اقتدار اعلیٰ اور اللہ کی رحمت اور شفقت ان کے شامل حال رہتی ہے ۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے قصص کی صورت میں رسولوں اور اللہ کے بندوں کی کامیابیاں بھی بیان کی جاتی ہیں ۔

یہ کامیابیاں تو زمین پر ہیں ۔ اس کے بعد کچھ مناظر قیامت کی کامرانیوں کے بھی پیش کیے جاتے ہیں ۔ نعمتیں اور اللہ کی رضامندیاں ۔ دوسری جانب جہنم اور اللہ کا غضب مکذبین کے لیے ۔ اس دار فناء کے بعد دار بقا میں دونوں فریقوں کے حال و احوال بھی ان اسباق میں پیش کیے گئے ہیں ۔

آخری سبق قصہ انسانیت ہے ۔ کس طرح شیطان نے حسد اور بغض کی وجہ سے انسانیت کے خلاف سازش کی ۔ آج بھی یہی شیطان درحقیقت مکذبین کی نکیل تھامے ہوئے ہے مگر وہ غافل ہیں ۔

ان اسباق کے دوران انسانی احساس کو پکار کر بتایا جاتا ہے کہ زمین و آسمان کے اندر دراصل ایک حقیقی سچائی کام کر رہی ہے ۔ یہ ایک سچے نظام پر قائم ہیں ۔ بعینہ اس طرح رسول بھی ایک سچائی لے کر آئے ہوئے ہیں ۔ یہ دونوں سچائیاں ایک ہیں ۔ نہ انسان بے مقصد ہے اور نہ یہ کائنات بے مقصد ہے ۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا بَاطِلًا (۳۸ : ۲۷) ”ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان پائی جانے والی چیزوں کو فضول پیدا نہیں کر دیا“ ۔ قرآن کریم میں ایسے بے شمار اشارات موجود ہیں اور یہ وہ اصل نظریہ ہے جس پر یہ کائنات اور یہ شریعت قائم ہے اور تمام کی تمام قرآن میں اس حقیقت کی طرف بار بار اشارہ کیا گیا ہے ۔

اب تفصیلات اور تشریحات ۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۱۱ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۱۶

---

سُورَةُ صٓ (۳۸) مَكِّيَّةٌ — اٰيَاتُهَا ۸۸ — رُكُوْعَاتُهَا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

صٓ وَ الْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ﴿١﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ ﴿٢﴾ كَمْ اَهْلَكْنَا

مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّ لَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ﴿٣﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ص، قسم ہے نصیحت بھرے قرآن کی' بلکہ یہی لوگ' جنھوں نے ماننے سے انکار کیا ہے' سخت تکبر اور ضد میں مبتلا ہیں۔ ان سے پہلے ہم ایسی کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں (اور جب ان کی شامت آئی ہے) تو وہ چیخ اٹھے ہیں' مگر وہ وقت بچنے کا نہیں ہوتا"۔

اللہ تعالیٰ حرف ص اور قرآن کریم کی قسم کھاتا ہے۔ اس قرآن کی قسم جو نصیحت سے مالا مال ہے۔ یہ حرف ص بھی اللہ کا بنایا ہوا ہے اور یہ قرآن بھی اللہ کا کلام ہے۔ اور یہ اللہ ہی ہے جو انسان کے گلے میں حرف صاد پیدا کرتا ہے اور پھر یہ حرف اور اللہ کے پیدا کردہ دوسرے حروف تہجی مل کر قرآن کے اسالیب کلام پیدا کرتے ہیں۔ لیکن تمام انسان ایسا کلام پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ کیونکہ قرآن کلام الٰہی ہے اور اس کے اندر وہ ادبی صنعت کاری ہے جو انسان کے دائرہ قدرت سے باہر ہے اور اللہ کا یہ اعجاز' کلام الٰہی قرآن میں بھی ہے اور دوسری پیدا کردہ چیزوں میں بھی ہے۔ یہ آواز ص جو انسان کے گلے سے نکلتی ہے' یہ اس اللہ کی تخلیق سے نکلتی ہے۔ جس نے انسان کا گلا بنایا' جس سے اس کے سوا دوسری آوازیں بھی نکلتی ہیں۔ انسانوں کی قدرت میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ آواز نکالنے کا کوئی ایسا چلتا پھرتا زندہ آلہ بنالیں اور یہ بھی ایک خارق العادت معجزہ ہے اور اس قسم کے ہزارہا معجزات خود ان کے جسم میں ہیں۔ اگر یہ لوگ صرف اپنے انفس کے اندر پائے جانے والے معجزات ہی پر غور کرتے تو انہیں اس بات پر کوئی اچنبھا نہ ہوتا کہ اللہ نے اپنے بندوں میں سے

ایک بندے پر وحی نازل کی ہے اور ایک بندے کو مختار بنایا ہے کیونکہ وحی کے اندر اچنبھے کی کوئی ایسی بات نہیں ہے جس طرح اللہ کے پیدا کردہ انسان اور دوسری چیزوں کے اندر ایک ایک بات معجزہ ہے۔

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ (۳۸ : ۱) "ص ، قسم ہے نصیحت بھرے قرآن کی"۔ قرآن کریم میں جس طرح قوانین ، دستور ، قصص ، فلسفہ اور تہذیب کی باتیں ہیں اسی طرح نصیحت اور یاد دہانی بھی ہے۔ لیکن نصیحت اور اللہ کی طرف راہنمائی سب دوسرے مضامین کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ قرآن کی اصل غرض نصیحت و ہدایت ہے بلکہ نصیحت کے سوا دوسرے مضامین بھی دراصل اللہ تک پہنچانے والے ہیں۔ یوں کہ سب اللہ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ ذوالذکر کا مفہوم مذکور اور مشہور بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی قرآن کی صفت ہے کہ وہ بہت مشہور ہے۔

بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّۃٍ وَّشِقَاقٍ (۳۸ : ۲) "بلکہ یہی لوگ جنہوں نے ماننے سے انکار کیا ہے سخت تکبر اور ضد میں مبتلا ہیں"۔ یہاں کلام میں اضراب اور اچانک موضوع سخن کی تبدیلی نظر آتی ہے۔ پہلے قرآن کا موضوع تھا ، اب مشرکین پر تبصرہ شروع ہو گیا کہ وہ کبر و غرور میں ڈوبے ہوئے ہیں اور سخت ضد اور دشمنی میں مبتلا ہیں۔ لیکن یہ موضوع سخن کی تبدیلی فقط ظاہری ہے اور اس ظاہری تبدیلی سے غرض یہ ہے کہ قاری مسئلے پر ذرا سنجیدگی سے غور کرے۔ یہاں ص اور قرآن ذی ذکر کی قسم اٹھائی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس بات کا ذکر ہو رہا ہے وہ بہت بڑی بات ہے۔ اسی لیے اللہ نے اس پر قسم اٹھائی ہے۔ اس کے بعد مشرکین کے غرور اور ہٹ دھرمی کا ذکر کیا گیا۔ مسئلہ "بل" حرف اضراب سے قبل اور بعد ایک ہی ہے۔ ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جاتی ہے کہ اللہ قرآن کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اور مشرکین ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے کس طرح قرآن کو نظر انداز کرتے ہیں۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا کہ اس سے قبل انسانی تاریخ میں جن جن اقوام نے غرور و تکبر کیا اور اس کی وجہ سے ضد اور ہٹ دھرمی میں مبتلا ہوئے وہ صفحہ ہستی سے مٹا دیئے گئے۔ کیونکہ انہوں نے بہت بڑا تکبر کیا اور دعوت اسلامی سے شدید دشمنی اختیار کی۔ ذرا تاریخ میں ان کا منظر دیکھو کہ چیخ و پکار کر رہے ہیں اور کوئی سنتا ہی نہیں۔ اب تو ان کے دماغ سے وہ سب کچھ نکل گیا ہے۔ اب تو وہ بچھے جا رہے ہیں۔ دشمنی انہوں نے ترک کر دی اور اب تو وہ بہت ہی برخوردار بنے جا رہے ہیں۔ لیکن اس وقت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت!

کَمْ اَهْلَکْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ (۳۸ : ۳) "ان سے پہلے ہم ایسی کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں اور جب ان کی شامت آئی تو وہ چیخ اٹھے ہیں مگر وہ وقت بچنے کا نہیں"۔

شاید تاریخ کے ان صفحات کے مطالعے کا ان پر اثر ہوا اور وہ اپنے کبر و غرور سے دستکش ہو جائیں اور اپنی بے جا دشمنی کو ترک کر دیں۔ اور اپنے آپ کو اس موقف پر کھڑا نہ کریں جو ان ہلاک شدہ اقوام کا تھا کہ وہ چیختے پکارتے رہے لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی۔ اب تو ان کے سامنے وسیع وقت ہے۔ وہ اس بے بسی کی پکار سے بچ سکتے ہیں۔ جب کوئی سننے والا نہ ہو۔ اور نہ بچنے کی کوئی راہ ہو۔

---000---

یہ تو تھی ان کو جھنجھوڑنے کے لیے ایک سخت ضرب۔ اب تفصیلاً بتایا جا رہا ہے کہ ان کے تکبر اور ان کی دشمنی کی تفصیلات کیا تھیں۔ سنئے تفصیلات :

وَعَجِبُوٓا اَنۡ جَآءَهُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡهُمۡ وَقَالَ الۡكٰفِرُوۡنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۚ اَجَعَلَ الۡاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیۡءٌ عُجَابٌ ۞ وَانۡطَلَقَ الۡمَلَاُ مِنۡهُمۡ اَنِ امۡشُوۡا وَاصۡبِرُوۡا عَلٰٓی اٰلِهَتِكُمۡ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیۡءٌ یُّرَادُ ۞ مَا سَمِعۡنَا بِهٰذَا فِی الۡمِلَّةِ الۡاٰخِرَةِ ۚ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا اخۡتِلَاقٌ ۞

"ان لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود انہی میں سے آ گیا۔ منکرین کہنے لگے کہ "یہ ساحر ہے، سخت جھوٹا ہے، کیا اس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے"۔ اور سرداران قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ "چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر۔ یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کہی جا رہی ہے۔ یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات"۔

تکبر یہ تھا۔

ءَاُنۡزِلَ عَلَیۡهِ الذِّكۡرُ مِنۡۢ بَیۡنِنَا (۸:۳۸) "کیا ہمارے درمیان بس یہی شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کر دیا گیا"۔ اور دشمنی یہ تھی کہ

اَجَعَلَ الۡاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (۵:۳۸) "کیا اس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا"۔ اور یہ بھی دشمنی کی وجہ ہے۔

مَا سَمِعۡنَا بِهٰذَا فِی الۡمِلَّةِ الۡاٰخِرَةِ (۷:۳۸) "یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی"۔ اور یہ کہ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ (۴:۳۸) "یہ جادوگر ہے بڑا جھوٹا"۔ اور اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا اخۡتِلَاقٌ

(۷:۳۸) "یہ کچھ نہیں مگر ایک من گھڑت بات"۔ یہ سب دشمنی کی وجوہات تھیں۔

رسول کا انسان ہونا زمانہ قدیم سے قابل تعجب رہا ہے۔ ہر زمانے میں اس کا اعادہ ہوا ہے۔ جب سے رسالتوں کا آغاز ہوا ہے، یہ اعتراض ہوتا رہا ہے۔ رسول بھی آتے رہے اور اس قسم کے اعتراضات بھی ہوتے رہے۔

وَعَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَهُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡهُمۡ (۴:۳۸) "اور ان لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود انہی میں سے آ گیا"۔ حالانکہ مناسب ترین اور معقول ترین بات تو یہی ہے کہ ڈرانے والا انہی میں سے ہو، وہ بشر ہو اور یہ بات جانتا ہو کہ انسان کیا سوچتے ہیں اور ان کے احساسات کیا ہوتے ہیں۔ ان کے خلجانات کیا ہوتے ہیں اور ان کے وجود میں کیا کشمکش ہے۔ اور ان کے اندر کیا کیا کمزوریاں ہوتی ہیں اور کیا کیا کوتاہیاں ان کے وجود

میں ہوتی ہیں ۔ ایک انسان ہی یہ جان سکتا ہے کہ انسان میں کہاں کہاں کیا کمزوری ہے ۔ کہاں کہاں وہ جذبات اور میلانات کا دباؤ محسوس کرتا ہے ۔ اس کی وسعت اور قدرت کی حدود کیا ہیں ۔ وہ کس قدر مشقت برداشت کر سکتے ہیں ۔ کن کن رکاوٹوں اور مشکلات کے سامنے وہ بے بس ہو جاتے ہیں اور کیا کیا چیزیں ان پر اثر انداز ہوتی ہیں ۔

رسول ایک انسان ہوتا ہے 'انسانوں سے ہوتا ہے ' انسانوں میں رہتا ہے تو اس کی زندگی ان کے لیے نمونہ ہوتی ہے ۔ اور وہ اس کے اسوہ کو اپناتے ہیں ' وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارا ہی بھائی ہے اور ہم ہی میں سے ہے ۔ اور یہ کہ قوم اور رسول کے درمیان انسانی اور سماجی روابط پہلے سے موجود ہوتے ہیں ۔ لہٰذا وہ اس منہاج کو اپنا سکتے ہیں جس پر وہ ہوتا ہے ۔ اور لوگوں سے بھی یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ اسے اپناؤ ۔ کیونکہ رسول جیسے طرز عمل کو وہ بھی اپنا سکتے ہیں ۔ اس لئے کہ اس نظام پر ایک شخص نے عمل کر کے دکھا دیا ہے ۔ جو خود ان میں سے ہے اور ان جیسا انسان ہے ۔

لیکن یہ بات تعجب انگیز ہے کہ یہ معقول ترین اور لازمی امر بھی ہمیشہ لوگوں کے لیے باعث تعجب بنا رہا ہے ۔ وہ اسے انوکھا سمجھتے رہے ہیں اور تکذیب کرتے رہے ہیں ۔ کیونکہ یہ لوگ انسانوں میں سے رسول بھیجنے کی حکمت کو نہ سمجھتے تھے ۔ وہ رسالت کے منصب کی حقیقت کو بھی نہ سمجھتے تھے ۔ بجائے اس کے کہ وہ رسول کو ایک بشر قائد اور راہنما سمجھتے جو ان کو اللہ کی راہ دکھاتا ہے ' وہ رسول کو ایک عجوبہ ناقابل فہم اور خیالی شخصیت سمجھتے تھے ۔ وہ یوں سیدھے سادے انسانوں کو رسول نہ مانتے تھے ۔ وہ رسول کو بھی ایسی شخصیت سمجھتے تھے جو خیالی ہو ' جسے چھوا نہ جا سکتا ہو ۔ جسے دیکھا نہ جا سکتا ہو ۔ وہ ظاہر و باہر نہ ہو ' جو اس کرۂ ارض پر ایک عملی زندگی نہ رکھتا ہو ۔ غرض وہ رسولوں کو ایک افسانوی شخصیت کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے ۔ اور جس طرح ان کے عقائد تھے وہ رسولوں کو بھی ایسا ہی دیکھنا چاہتے تھے ۔

لیکن اللہ کی مرضی یہ تھی کہ انسانوں کے لیے اس کی یہ آخری رسالت نہایت عملی اور واقعیت پسندانہ ہو ۔ اس میں لوگوں کے لیے پاکیزہ 'طیب اور اعلیٰ درجے کی زندگی کا انتظام ہو ۔ اور یہ آخری رسالت زمین کے اوپر ایک حقیقت ہو ۔ اوہام تخیلات اور محض ہوائی مثالوں اور افسانوں پر مبنی نہ ہو ۔ حقائق پر مبنی ہو 'محض اوہام و اساطیر نہ ہو ۔

وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ (۳۸ : ۴) "منکرین کہنے لگے یہ تو ساحر ہے 'سخت جھوٹا ہے"۔ اور کافروں نے یہ بات محض اس لیے کہی کہ وہ اپنے جیسے ایک شخص کی رسالت کا تصور ہی نہ کر سکتے تھے ۔ اور پھر انہوں نے یہ بات اس لیے بھی کہی کہ لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متنفر ہو جائیں اور وہ سچائی جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے جو واضح تھی اور پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ صدق و صفا میں مشہور تھے ' وہ اس کو لوگوں کی نظروں میں مشتبہ بنانے کے لیے ایسا کرتے تھے ۔

اصل حقیقت یہ ہے اور اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ مشرکین مکہ نے کسی بھی مرحلے میں خود اپنی اس بات کو کبھی بھی سچا نہیں سمجھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جادوگر ہیں یا بہت بڑے جھوٹے ہیں کیونکہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت اچھی طرح جانتے تھے ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈے اور گمراہ کن نشرواشاعت کی جو مہم چلا رہے تھے ۔ یہ اس کے ہتھیاروں میں سے ایک اوچھا ہتھیار تھا ۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو 'اپنے مقام و مرتبہ کو اور اپنے غلط عقائد کو بچانا چاہتے تھے ۔ کیونکہ تحریک اسلامی کی صورت میں ان کو جو خطرہ درپیش تھا 'اس کی

وجہ سے ان کی کھوئی اور جھوٹی اقتدار کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور ان کے بناوٹی طور طریقوں کے وجود تک کو خطرہ لاحق تھا اور کبرائے قریش اسے اچھی طرح سمجھتے تھے۔

ہم نے یہ بات اس سے پہلے بھی نقل کی ہے اور یہاں بھی نقل کر رہے ہیں کہ کبرائے قریش نے پروپیگنڈے کی یہ جھوٹی مہم نہایت ہی سنجیدگی اور سوچ سمجھ کر شروع کی تھی۔ اس طرح وہ اپنے وجود' اپنے طور طریقوں اور اپنے نظریات کو بچانا چاہتے تھے۔ نیز اس طرح موسم حج میں عرب قبائل میں تحریک اسلامی کے اثرات کے پھیلنے کا جو خطرہ درپیش تھا اس کا وہ سدباب چاہتے تھے۔

محمد ابن اسحاق نے نقل کیا ہے کہ ولید ابن مغیرہ کے پاس قریش کے کچھ معمر لوگ جمع ہوئے' موسم حج آنے والا تھا۔ ولید نے ان سے کہا کہ اکابرین قریش آپ کو معلوم ہے کہ موسم حج آ رہا ہے اور عرب کے وفود آنے شروع ہوں گے۔ نیز انہوں نے اس شخص کے بارے میں بھی سن رکھا ہو گا۔ لہٰذا اس موضوع پر اپنی بات کو ایک کر لو۔ یوں نہ ہو کہ ہر شخص ایک علیحدہ بات کرے اور تم خود ایک دوسرے کی تکذیب کرتے پھرو۔ تو انہوں نے کہا عبدشمس تم ہی کچھ کہو اور ہمیں ایک مضبوط موقف دے دو تاکہ ہم سب ایک ہی بات کریں تو ولید نے کہا تم کہو میں سن کر قیاس کروں گا۔ کسی نے کہا اسے کاہن کہو' ولید نے کہا یہ تو بات نہیں ہے۔ خدا کی قسم یہ کاہن نہیں ہے۔ ہم نے کاہنوں کو خوب دیکھا ہوا ہے۔ نہ قرآن کاہنوں کا زمزمہ ہے اور نہ ان کا سجع کلام ہے تو کسی نے کہا اسے پاگل کہو۔ تو انہوں نے کہا کہ یہ مجنون بھی نہیں ہے۔ لوگ مجنونوں اور پاگلوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ نہ وہ مجنونوں کی طرح گلوگیر ہے۔ نہ ذہنی خلجان میں مبتلا ہے اور نہ اسے کوئی وسوسہ ہے۔ تو پھر اسے شاعر کہنا چاہئے۔ تو اس نے کہا کہ اس کا کلام شعر بھی نہیں ہے۔ ہم اشعار کو جانتے ہیں۔ نہ رجز ہے' نہ ہزج ہے' نہ قریض ہے' نہ مقبوض ہے' نہ مبسوط ہے۔ لہٰذا یہ کلام شعر نہیں ہے تو انہوں نے کہا پھر اسے جادوگر ہی کہا جا سکتا ہے۔ تو ولید نے کہا وہ تو جادوگر بھی نہیں ہے۔ ہم نے جادوگر بھی دیکھے ہوئے ہیں۔ ان کے جادو کے کرشمے بھی دیکھے ہوئے ہیں۔ نہ یہ ان کی پھونک ہے اور نہ ان کی بندش ہے تو ان اکابرین نے کہا عبدشمس پھر تم ہی بتاؤ کہ کیا کہیں اسے۔ تو اس نے کہا خدا کی قسم اس کی بات میں مٹھاس ہے۔ اس کی جڑیں بہت ہی گہری ہیں۔ اور اس کی شاخوں پر پھل ہیں اور تم ان باتوں میں سے جس کا بھی پروپیگنڈہ کرو معلوم ہو گا کہ تمہاری بات غلط ہے۔ ہاں ممکن حد تک جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ تم اسے ساحر کہو کہ وہ جو کلام لایا ہے وہ جادو کی طرح ایک شخص اور اس کے بھائی' ایک شخص اور اس کی بیوی ایک شخص اور اس کے خاندان کے درمیان تفریق کرتا ہے۔ لہٰذا سب یہی ایک بات کرو' چنانچہ موسم حج میں یہ لوگ راستوں پر بیٹھ گئے۔ اور جو بھی گزرتا اسے وہ کہتے تھے کہ لوگو ڈرو اس شہر میں ایک جادوگر پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہ از خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تفصیلات بتاتے۔

یہ تھی حقیقت اس بات کی جو وہ کہتے تھے۔

سٰحِرٌ كَذَّابٌ (۳۸ : ٤) جبکہ وہ خود جانتے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچ کہتے تھے' نہ ساحر تھے اور نہ کذاب تھے۔

نیز وہ اس بات پر بھی تعجب کرتے تھے کہ وہ تمام الہوں کی جگہ ایک ذات کو الٰہ ماننے کی دعوت دے رہا ہے۔

حالانکہ سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ اس کائنات کا الہ ایک ہی ہے ۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (٣٨ : ٥) وَ انْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَ اصْبِرُوْا عَلٰی اٰلِهَتِكُمْ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ (٣٨ : ٦) مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ (٣٨ : ٧) کیا اس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے اور سرداران قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر ۔ یہ بات تو کسی اور ہی غرض کے لیے کی جا رہی ہے ۔ یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی ۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات"۔

قرآن کریم اسلامی نظریہ حیات سے ان کی دہشت اور بوکھلاہٹ کی خوب تصویر کشی کرتا ہے ۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (٣٨ : ٥) "کیا اس نے تمام الہوں کو ایک الہ بنا دیا"۔ گویا اسلام کا فطری عقیدہ ایک انہونی اور ناقابل تصور بات ہے ۔

اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (٣٨ : ٥) "یہ تو ایک عجیب نظریہ ہے"۔ لفظ "عجاب" یہ بتاتا ہے کہ ان کی دہشت زدگی اور بوکھلاہٹ بہت ہی عظیم تھی ۔

جمہور کے ذہنوں سے اسلامی عقائد کے اثرات مٹانے کے لیے وہ جس قسم کی جدوجہد کر رہے تھے ۔ قرآن کریم اس کی بھی زبردست تصویر کشی کر رہا ہے ۔ وہ بے حد جدوجہد کر رہے تھے کہ لوگ اپنے موروثی عقائد پر جمے رہیں ۔ اگرچہ وہ عقائد و نظریات باطل اور پوچ ہوں ۔ وہ عوام کو یہ باور کراتے تھے کہ دراصل اس تحریک کے پیچھے کوئی خفیہ ہاتھ ہے ۔ اور یہ کہ وہ سردار ہیں اور خفیہ سازشوں سے باخبر ہیں ۔ اور یہ گہری سازش کی جا رہی ہے ۔

وَ انْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَ اصْبِرُوْا عَلٰی اٰلِهَتِكُمْ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ

(٣٨ : ٦) "اور سرداران قریش یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ چلو اور اپنے معبودوں کی عبادت پر ڈٹے رہو ۔ یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کی جا رہی ہے"۔ یہ کوئی دین اور نظریہ کی بات نہیں ہے ۔ یہ کوئی اور ہی گہری سازش ہے اور جمہور عوام کا یہ فرض ہے کہ یہ معاملہ اکابر پر چھوڑ دیں ۔ جو خفیہ باتوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں ۔ لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنے موروثی طرز عمل پر جمے رہیں اور اپنے آباؤ اجداد کے عقائد کو سختی سے پکڑے رکھیں ۔ اور اس جدید تحریک کے پیچھے جو سازش ہے اس میں نہ پڑیں ۔ یہ لیڈروں کا کام ہے کہ وہ ان سازشوں کا دفاع کریں ۔ عوام کو مطمئن رہنا چاہئے ۔ قیادت اپنے مفادات ' عوام کے مفادات اور اپنے الہوں کے مفادات کو اچھی طرح جانتی ہے ۔

یہ ہے ایک عام اور ہر سوسائٹی میں دہرائے جانے والا طریقہ کار جس کے مطابق لوگ عوام الناس کو ملک و ملت کے

مسائل سے ہٹانے کے لیے جسے ہر سوسائٹی کے سرکش ' باغی اور ڈکٹیٹر اور طاغوتی قوتیں استعمال کرتی ہیں۔ اس لیے کہ اگر عوام الناس قومی مسائل پر سوچنا شروع کر دیں تو یہ طاغوتی قوتوں کے لیے ایک خطرناک علامت ہوتی ہے۔ طاغوت کے اقتدار کے لیے یہ خطرہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طرح ان اندھیروں کے چھٹ جانے کا خطرہ ہوتا ہے جن میں عوام الناس غرق ہوتے ہیں۔ کیونکہ طاغوت کا اقتدار قائم ہی تب ہوتا ہے جب جمہور جہالت میں غرق ہوں۔

اس کے بعد وہ اہل کتاب کے ظاہری عقیدے سے عوام کو دھوکہ دیتے ہیں یعنی اہل کتاب کے حوالے سے جبکہ اہل کتاب کے عقائد میں بھی افسانے داخل ہو گئے تھے اور انہوں نے توحید کے خالص عقیدے میں تحریف کر کے اسے شرکیہ عقائد بنا دیا تھا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں :

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ (۳۸ : ۷) "یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات"۔

نزول قرآن کے زمانے میں عیسائیوں کے درمیان عقیدۂ تثلیث عام ہو گیا تھا اور حضرت عزیر کی الوہیت کا عقیدہ بھی یہودیوں کے درمیان پھیل گیا تھا۔ اکابرین قریش اس طرف اشارہ کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ "یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں نہیں سنی۔ یہ خالص توحید تو نہ یہودیت میں ہے اور نہ عیسائیت میں۔ لہٰذا حضرت محمدؐ جو کچھ پیش کر رہے ہیں ' یہ ان کا من گھڑت دین ہے۔

اسلام نے خالص توحید کے قیام کے لیے بہت ہی جدوجہد کی۔ اور عقیدۂ توحید سے ہر قسم کے افسانوں ' شرک خفی اور شرک جلی اور تمام دوسری بے راہ رویوں اور کج فکریوں کو دور کر دیا۔ یہ اس لیے کہ عقیدۂ توحید وہ حقیقت ہے جس پر یہ پوری کائنات قائم ہے۔ اور اس پر یہ پوری کائنات شہادت دے رہی ہے۔ نہایت ہی واضح انداز میں۔ پھر انسان کی شخصیت کی اصلاح ' اس کی ذات میں ' ان کے اصول حیات میں اور زندگی کے فروعی مسائل میں اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ عقیدہ توحید پر قائم نہ ہو۔

یہاں مناسب ہے کہ اس بات کی تفصیل دے دی جائے کہ قریش عقیدۂ توحید کی کس قدر شدید مزاحمت کر رہے تھے۔ اس عقیدے کی وجہ سے وہ کس قدر زیادہ دہشت زدہ ہو گئے تھے اور وہ بے شمار الہوں کی جگہ الٰہ واحد کے عقیدے کو کس قدر عجیب اور انوکھا سمجھتے تھے۔ اور یہ بھی بیان کر دیں کہ قریش سے قبل انسانی تاریخ میں تمام مشرکین نے کس طرح ہمیشہ اس عقیدے کی مخالفت کی اور آدم علیہ السلام سے ادھر تمام انبیائے کرام نے کس طرح ہمیشہ اس عقیدے پر اصرار کیا۔ اور اس بات کے لیے ان تھک مساعی کیں کہ لوگ اس عقیدے کو تسلیم کر لیں اور یہ کہ حقیقتاً ان کے ذہنوں میں یہ عقیدہ بیٹھ جائے۔ سب سے پہلے یہ مناسب ہے کہ قارئین عقیدۂ توحید کی اہمیت کو سمجھ لیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عقیدۂ توحید وہ بنیادی سچائی ہے جس کے اوپر یہ پوری کائنات قائم ہے اور یہ پوری کائنات نہایت وضاحت کے ساتھ وحدت الوہیت پر شہادت دیتی ہے۔

وہ قوانین قدرت جو اس پوری زمین پر لاگو ہیں اپنی حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے بالکل ایک اکائی ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ جس ارادے کے تحت یہ قوانین وجود میں آئے ہیں ' وہ ایک ہی ارادہ ہے۔ اس کائنات پر مجموعی نظر ڈالنے

سے یا اس کائنات کے ایک ہی جزء کے مطالعے سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر وحدت پائی جاتی ہے ۔ اور یہ وحدت بتاتی ہے کہ اس کو وجود میں لانے والا ارادہ ایک ہی ہے ۔

اس کائنات میں جس قدر اشیاء ہیں' ان میں سے ہر شے متحرک ہے ۔ یہ پوری کائنات چھوٹے چھوٹے ذرات سے مرکب ہے ۔ خواہ زندہ کائنات ہو یا مردہ ۔ یہ تمام ذرات الیکٹرون سے مرکب ہیں اور یہ الیکٹران ایک گٹھلی کے ارد گرد حرکت کرتے ہیں جو پروٹونز سے مرکب ہے ۔ یہ حرکت اسی طرح ہے جس طرح کواکب سورج کے ارد گرد حرکت کرتے ہیں ۔ اور جس طرح بے شمار سورجوں کا مجموعہ کہکشاں اپنے ارد گرد حرکت کرتا ہے ۔ یہ تمام حرکات غرب سے شرق کی طرف حرکت کرتے ہیں ۔ یہ وقت کی حرکت سے متضاد حرکت ہے ۔

وہ عناصر جن سے زمین اور دوسرے ستارے اور سیارے مرکب ہوتے ہیں یہ ایک ہی ہیں ۔ تمام ستارے بھی انہی عناصر سے مرکب ہیں جن سے زمین مرکب ہے ۔ یہ تمام عناصر ذرات سے مرکب ہیں اور ذرات الیکٹرون' پروٹون اور نیوٹرون سے مرکب ہیں ۔ تمام ذرات بلا استثناء ان تین اجزاء سے مرکب ہیں ۔

"جس طرح پورا مادہ ان تین اجزاء سے مرکب ہے' اسی طرح قوت بھی ایک ہی اصل کی طرف لوٹتی ہے ۔ روشنی اور حرارت' بنفشی شعائیں' لاسلکی شعاعیں' ماورائے بنفشی شعاعیں اور تمام دوسری شعاعیں دراصل مقناطیسی کہربائی قوت کی مختلف اقسام ہیں ۔ ان کی رفتار ایک ہے' اختلاف صرف ان کی موجوں میں ہے" ۔

"مادہ تین اجزاء سے مرکب ہے اور قوت موجوں سے مرکب ہے" ۔

"آئن سٹائن کا مخصوص نظریہ اضافت یہ ثابت کرتا ہے کہ مادہ اور قوت ایک ہی چیز ہے ۔ تجربات نے اس دعویٰ کی تصدیق کر دی ہے ۔ ایک آخری تجربہ بھی سامنے آگیا ہے ۔ جس نے جہاراً یہ اعلان کر دیا ہے اور تمام دنیا نے اسے سن لیا ہے کہ ایک جدید بم میں ایٹم نے قوت کی شکل اختیار کر لی" ۔

"یوں ثابت ہوتا ہے کہ مادہ اور قوت ایک چیز ہے" ۔ (۱)

یہ ہے اس کائنات کی طبیعی تشکیل میں وحدت اور حال ہی میں انسان اس کی حقیقت کو معلوم کر سکا ہے ۔ اس کائنات کی مسلسل حرکت میں بھی ایک طرح کی یگانگت اور وحدت ہے جیسا کہ ہم نے بار بار اس کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ پھر اس کائنات کی تمام حرکات منظم اور مسلسل ہیں ۔ اس قدر باقاعدہ کہ ان میں سے ایک سیکنڈ کا خلل بھی نہیں پڑتا ۔ نہ اس میں کوئی اضطراب ہے ۔ پھر پورے نظام میں اس قدر توازن ہے کہ نہ کسی جرم فلکی کی حرکت میں تعطل آتا ہے اور نہ ہی اجرام فلکی کے درمیان کوئی تصادم آتا ہے اور وہ ستارے اور سیارے جو ان کہکشانوں میں جو ہمارے قریب ہیں اور جو اس فضائے کائنات میں تیر رہی ہیں' ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مدار' ان کی حرکت اور ان کے فاصلے متعین ہیں ۔ ان کے اندر کوئی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوتا ۔ ان کی ہر چیز مقدر ہے ۔ ایک منصوبے کے مطابق' یعنی یہ ایک ناقابل تغیر و تبدل منصوبے اور نقشے کے مطابق چل رہے ہیں ۔

---

(۱) تفصیلات کے لیے دیکھئے "اللہ کے ساتھ آسمانوں میں" مصنفہ ڈاکٹر احمد زکی' سابق وائس چانسلر جامعہ ازہر ۔

میں سمجھتا ہوں کہ نظام کائنات کے اندر پائی جانے والی وحدت اور عقیدۂ توحید پر کائناتی شہادت کے مطالعہ کے لیے یہ سرسری وقفہ کافی ہے۔ عقیدۂ توحید وہ اہم حقیقت ہے کہ انسان کی اصلاح اور ترقی اس کے سوا کسی اور عقیدے پر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا عقیدۂ توحید کی وضاحت کے بغیر انسان کا تصور کائنات مکمل ہی نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کائنات میں انسان کی قدر و قیمت متعین ہو سکتی ہے۔ اور نہ انسان اور اس کائنات کا باہم تعلق صحیح سمت لے سکتا ہے۔ نہ انسانوں کے ذہنوں میں اس کائنات کو وجود میں لانے والی ہستی کا تصور درست ہو سکتا ہے اور نہ انسان اور خدا کا تعلق درست ہو سکتا ہے۔ لہٰذا انسان کے شعور کو صحیح سمت دینے کے لیے اور انسان کے طرز عمل کو درست حالت میں رکھنے کے لئے عقیدۂ توحید کی تشریح ضروری ہے۔

اب دیکھیے کہ جو شخص اللہ وحدہ پر ایمان لاتا ہے' جو اس عقیدۂ توحید کے معنی کو سمجھتا ہے۔ اس کا تعلق اپنے رب کے ساتھ بھی درست ہوتا ہے۔ اور اس کا تعلق اللہ کے سوا پوری کائنات کے ساتھ بھی درست ہو جاتا ہے۔ اور یہ تعلقات نہایت حقیقت پسندانہ ہوتے ہیں اور ان میں افراط و تفریط نہیں ہوتی۔ یوں اس کے شعور میں انتشار نہیں ہوتا۔ اور اس کی سوچ مختلف الٰہوں میں نہیں بٹتی۔ اور نہ اس پر اللہ کے سوا کوئی اور مسلط ہوتا ہے۔

اور جو شخص اللہ پر ایمان لے آتا ہے اور جو اللہ کو اس کائنات کا مصدر و منبع سمجھتا ہے وہ اس کائنات کے ساتھ' اس کے اندر موجود اشیاء کے ساتھ باہم تعارف' محبت اور الفت کے ساتھ معاملہ کرتا ہے اور اس کی زندگی پرامید ہوتی ہے اور اس کی زندگی کی ایک ایسی صورت گری ہوتی ہے جو اس شخص سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتا۔ اور وہ اپنے آپ کو اپنے ماحول اور اپنے معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ نہیں پاتا۔

وہ شخص جو اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ اللہ کی جانب سے مخصوص ہدایات پاتا ہے تاکہ وہ اپنی زندگی کو اس کائنات کے اندر پائے جانے والے ناموس اور اللہ کی طرف سے نازل شدہ شریعت کے مطابق تشکیل دے۔ کائنات پر بھی اللہ کا قانون جاری و ساری ہے اور انسانی زندگی پر اللہ کی مقرر کردہ شریعت جاری ہوتی ہے اور یوں انسان کی عملی زندگی اس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

غرض اس حقیقت کا ادراک اس لیے ضروری ہے کہ انسان کا شعور درست ہو۔ وہ روشن ہو' وہ صحیح سمت رکھتا ہو۔ اور وہ اپنے گرد پھیلی ہوئی کائنات کے ساتھ ہم آہنگ متناسق اور متوازن ہو۔ اور انسان کے باہمی تعلقات' اس کائنات کے ساتھ تعلقات اور اپنے معاشرے کے ساتھ تعلقات واضح اور متعین ہوں۔ یہ تعلقات اخلاقی ہوں یا طرز عمل سے متعلق ہوں' اجتماعی معاملات سے متعلق ہوں' شخصی ہوں یا انسانی ہوں۔ (۱) (۱)

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم عقیدۂ توحید کو اس قدر اہمیت دیتا ہے اور عقیدۂ توحید کے لیے یہ جدوجہد آدم علیہ السلام سے ادھر آنے والے تمام انبیاء نے کی ہے۔ اور تمام رسولوں نے عقیدۂ توحید پر سخت اصرار کیا ہے۔ کلمہ توحید کے الفاظ بھی ایک رہے ہیں اور مفہوم بھی ایک رہا ہے۔

(۱) میں ارادہ رکھتا ہوں کہ ان نکات کی تفصیل ایک مجوزہ کتاب "انسان' انسانی زندگی اور اس کائنات کے بارے میں اسلامی تصور" میں مرتب کروں۔ (سید قطب)

قرآن میں تو عقیدۂ توحید پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ اسے بار بار دہرایا گیا ہے ۔ اس پر اصرار کیا گیا ہے ۔ مسئلہ توحید اور اس کے تقاضوں کی بار بار مختلف اسالیب سے تشریح کی گئی ہے ۔ خصوصاً مکی سورتوں میں تو اس پر بہت زور دیا گیا ہے جبکہ مدنی سورتوں میں بھی عقیدۂ توحید پر مدنی موضوعات کے اعتبار سے زور دیا گیا ہے ۔ جہاں حاکمیت اور قانون سازی کے حق کا پہلو زیادہ نمایاں ہے ۔

یہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے مشرکین مکہ تعجب کر رہے تھے کہ حضور اکرم ؐ تمام الہوں کو رد کر کے صرف ایک ہی اللہ کے قائل ہیں ۔ چنانچہ اس پر وہ حضور اکرم ؐ سے الجھتے تھے ۔ تعجب کرتے تھے ' لوگوں کو اس نظریہ سے پھیرتے تھے اور اس نظریہ حیات کے خلاف اپنے تمام وسائل انہوں نے مجتمع کر لیے تھے ۔

اب ان کے تعجب کا دوسرا پہلو ' یہ کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دولت اور شخصی وجاہت کے زاویہ سے منصب نبوت کے قابل نہ سمجھتے تھے ۔ وہ سمجھتے تھے کہ قائد کوئی خان اور نواب ہونا چاہئے ۔

## ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ؕ

"کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کیا گیا؟" یہ کوئی قابل تعجب بات تو نہ تھی مگر اکابرین قریش حسد میں مبتلا تھے ۔ اس حسد کی وجہ سے وہ غرور ' دشمنی اور کینہ پر اتر آتے تھے ۔

ابن اسحاق نے محمد ابن مسلم ابن شہاب زہری سے نقل کیا ہے کہ ایک بار ابو سفیان ابن حرب ' ابوجہل ابن ہشام اور اخنس ابن شریق ابن عمرو ابن وہب ثقفی حلیف بنی زہرہ رات کے وقت نکلے کہ قرآن سنیں ۔ حضور ؐ رات کے وقت نماز میں قرآن کریم پڑھا کرتے تھے ۔ ان تینوں میں سے ہر شخص دوسرے سے بے خبر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گیا ۔ رات دیر تک یہ سنتے رہے ۔ جب سپیدۂ صبح نمودار ہوئی تو یہ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے ۔ راستے میں وہ اتفاقاً مل گئے اور انہوں نے ایک دوسرے کو خوب ملامت کی ۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا آئندہ یہ حرکت مت کرو ' اگر بعض نادانوں نے تمہیں دیکھ لیا تو ان کے دلوں میں بات بیٹھ جائے گی ۔ یہ لوگ چلے گئے جب دوسری رات ہوئی تو دوبارہ ہر شخص پھر آکر اپنی مقررہ جگہ پر بیٹھ گیا ۔ رات گئے تک سنتے رہے ۔ جب فجر نمودار ہوئی تو یہ لوگ نکلے اور راستے میں پھر اکٹھے ہو گئے ۔ انہوں نے گزشتہ رات کی طرح ایک دوسرے کو ملامت کی ۔ اور چلے گئے ۔ تیسری رات کو پھر ہر شخص آکر بیٹھ گیا ۔ رات کو سنتے رہے ۔ جب فجر ہوئی تو جانے لگے اور راستے میں پھر ایک دوسرے کو دیکھ لیا ۔ اب انہوں نے کہا کہ جب تک ہم کوئی معاہدہ نہ کر لیں ' نہ جائیں گے ۔ چنانچہ انہوں نے باقاعدہ معاہدہ کیا اور پھر چلے گئے ۔ صبح ہوئی تو اخنس ابن شریق نے اپنی عصا لی ۔ یہ پہلے ابو سفیان کے پاس گیا ۔ اس نے کہا ابو حنظلہ تم نے محمد سے جو کچھ سنا ' بتاؤ ۔ اس کے بارے میں کیا رائے ہے ۔ اس نے کہا میں نے بعض باتیں سنی جو میرے علم میں ہیں اور میں ان کا مطلب بھی سمجھتا ہوں اور بعض باتیں میں نے نہیں سنی اور نہ میں ان کا مطلب سمجھتا ہوں ۔ تو اس نے کہا خدا کی قسم میرا بھی یہی حال ہے ۔ اس کے بعد یہ شخص ابوجہل کے پاس آیا ۔ اس کے گھر میں اس سے ملا ۔ اس سے کہا ابوالحکم ' محمد سے تم نے جو کچھ سنا ' اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس نے کہا میں نے کیا سنا؟ ہمارا اور بنو عبد مناف کے درمیان ہمیشہ مقابلہ رہا ۔ انہوں نے کھانا کھلایا ' ہم نے بھی کھلایا ۔ انہوں نے لوگوں کو سواریاں دیں ' ہم نے بھی سواریاں دیں ۔ انہوں نے عطیے دیئے ہم نے بھی عطیے دیئے ۔ جنگ

میں بھی ہم نے مقابلہ کیا یہاں تک کہ ہم مقابلے کے گھوڑوں کی طرح ساتھ ساتھ رہے ۔ اب وہ کہتے ہیں ہم میں نبی پیدا ہو گیا ہے ۔ اس پر آسمانوں سے وحی آتی ہے اب ہم ان کے مقابلے میں نبی کہاں سے لائیں ؟ کبھی بھی ہم اس پر ایمان نہ لائیں گے ' خدا کی قسم اور کبھی بھی اس کی تصدیق نہ کریں گے ۔ اخنس اٹھ کھڑا ہوا اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا ۔

دیکھئے یہ کھلا کینہ ہے جس کی وجہ سے ابوجہل حق کا اعتراف نہیں کر رہا ہے ۔ حالانکہ جب مسلسل تین راتوں کو وہ کلام الٰہی سن رہا تھا تو وہ جانتا تھا کہ یہ برحق ہے ۔ یہ حسد اور کینہ تھا جو اس کے ایمان کی راہ میں رکاوٹ بنا رہا یہی ہے راز اس بات میں ہے ۔

ءَ اُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا ( ۳۸ : ۸ ) "کیا ہمارے درمیان میں اس شخص پر کلام الٰہی نازل ہوا' اور کوئی نہ تھا" ۔

یہی لوگ تھے جو یہ کہتے تھے ۔

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ( ۴۳ : ۳۱ ) "یہ قرآن ان دو بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ ہوا؟" ۔ ان دو بستیوں سے ان کی مراد مکہ اور طائف تھی ۔ جہاں قریش کے اکابر حکمران تھے ۔ جہاں ان لوگوں کی مذہبی سیادت و قیادت قائم تھی ۔ نیز انہوں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ ایک نیا نبی آنے ہی والا ہے اور جب اللہ نے یہ منصب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کر دیا تو یہ لوگ جل بھن گئے ۔ اور انہوں نے یہ خیال کیا کہ اللہ کی اس عظیم رحمت اور اس اونچے منصب کے مستحق وہ نہیں ہیں ۔ کیا سارے جہاں سے محمد ہی اس کے مستحق ٹھہرے ؟

اللہ تعالیٰ بھی ان کو اسی انداز میں جواب دیتا ہے حقارت کے ساتھ 'جس کے اندر تہدید اور ڈراوے کے اشارات موجود ہیں ۔

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ۝

"اصل بات یہ ہے کہ یہ میرے "ذکر" پر شک کر رہے ہیں 'اور یہ ساری باتیں اس لیے کر رہے ہیں کہ انہوں نے میرے عذاب کا مزا چکھا نہیں ہے" ۔

ان کا سوال یہ تھا کہ "کیا ہمارے درمیان سے نزول قرآن کے لیے صرف اس شخص کا انتخاب کیا جانا تھا؟" جبکہ وہ خود قرآن کی سچائی ہی کے بارے میں مشکوک ہیں ۔ ان کے دلوں کے اندر یہ یقین ہی نہیں ہے کہ یہ قرآن اللہ کی جانب سے ہے ۔ وہ تو حقیقت وحی کے بارے میں سخت خلجان میں تھے لیکن اس کے باوجود یہ بھی وہ تسلیم کرتے تھے کہ یہ قرآن ایک عام کلام کے مقابلے میں ایک بلند پایہ کلام ہے ۔

اب قرآن کریم کے بارے میں ان کی بات سے روئے سخن پھر جاتا ہے ۔ اور ان کے خلجان کو بھی ایک طرف چھوڑ دیا جاتا ہے ۔ اور ان کو سخت عذاب کی دھمکی دی جاتی ہے ۔

بَلْ لَمَّا يَذُوقُوا عَذَابِ (۳۸ : ۸) "یہ ساری باتیں اس لیے کر رہے ہیں کہ انہوں نے میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا۔ یعنی اللہ نے اپنی مہربانی سے نجات دی ہوئی ہے لیکن جب ان کو عذاب نے آلیا تو پھر وہ ایسی باتیں نہ کریں گے۔ اس وقت ان کو حقیقت حال کا اچھی طرح علم ہو جائے گا۔

اب آخری تبصرہ یہ آتا ہے کہ یہ لوگ حضرت محمد ﷺ پر ہونے والے فضل و کرم کو ان کے استحقاق سے زیادہ سمجھتے ہیں تو سوال یہ کیا جاتا ہے کہ کیا رحمت ربی کی تقسیم کے انچارج یہ ہیں اور ان کا اختیار ہے کہ کسی پر رحمت کریں کس پر نہ کریں۔

أَمْ عِندَهُمْ خَزَائِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيزِ الْوَهَّابِ ۝٩

"کیا تیرے داتا اور غالب پروردگار کی رحمت کے خزانے ان کے قبضے میں ہیں"۔

یہ ان کو سخت تنبیہ ہے کہ ان کی یہ باتیں بارگاہ عزت میں صریح گستاخی ہیں۔ یہ ان معاملات میں ٹانگ اڑا رہے ہیں جن میں مداخلت کرنے کا ان کو کوئی حق نہیں ہے۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ کسی پر فضل کرتا ہے یا کسی سے اپنے فضل کو روکتا ہے۔ وہ غالب ہے' قدرتوں والا ہے' کوئی شخص اس کے ارادے کے سامنے بطور رکاوٹ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ وہ داتا ہے' سخی ہے اور اس کی داد و دہش کی کوئی حد نہیں ہے۔

یہ لوگ اس بات پر چیں بجبیں ہیں کہ حضرت محمدؐ رسول بنا دیئے گئے ہیں۔ کیا اللہ کی کرم نوازیوں کی تقسیم ان کے ہاتھ میں ہے؟ کیا اللہ کے خزانے ان کے چارج میں ہیں؟

أَمْ لَهُم مُّلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا

"کیا یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کے مالک ہیں"۔ اس کا وہ کوئی جواب نہیں دے سکتے کیونکہ یہ دعویٰ وہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ خود ان کا یہ عقیدہ تھا کہ زمین اور آسمانوں کا مالک اللہ ہے اور وہ دیتا ہے اور وہی روکتا ہے۔ وہ کرم نوازیاں کرتا ہے اور وہی مناصب عطا کرتا ہے۔ اور چونکہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کا اقتدار انہیں حاصل نہیں ہے۔ اس لیے اللہ مقتدر اعلیٰ کے معاملات میں ان کو دخل بھی نہ دینا چاہئے وہ تو بلاقید متصرف ہے۔

اب بطور مزاح اور لاجواب کرنے کی خاطر انہیں کہا جاتا ہے کہ اگر ان کا جواب اثبات میں ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کے مقتدر اعلیٰ ہیں تو وہ اپنی قوت مقتدرہ کو کام میں لائیں۔

فَلْيَرْتَقُوا فِي الْأَسْبَابِ ۝١٠

"اچھا تو یہ عالم اسباب کی بلندیوں پر چڑھ کر دیکھیں!" تاکہ زمین اور آسمانوں اور ان کے درمیان جو مدارج ہیں ان پر ان کا کنٹرول ظاہر ہو۔ اور وہ اللہ کے کام خود سرانجام دیں۔ اللہ کے خزانوں کی تقسیم کریں۔ جسے چاہیں' دیں اور جس سے چاہیں روک لیں۔ جب کہ ان کے رویے کا تقاضا ہے کہ وہ منصب نبوت کی تقسیم پر اعتراضات کرتے ہیں۔ یہ تو تھا مزاح' اب حقیقت کیا ہے اور کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں یہ لوگ؟

جُندٌ مَّا هُنَالِكَ مَهۡزُومٌ مِّنَ ٱلۡأَحۡزَابِ ﴿١١﴾

"یہ تو جتھوں میں سے ایک چھوٹا سا جتھہ ہے جو اسی جگہ شکست کھانے والا ہے"۔ ان کا انجام اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ دور جا کر پھینک دیئے جائیں اور ان کے اس لشکر کو شکست ہو جائے۔ وہ مقام جس کا اپنے لئے یہ دعویٰ کرتے ہیں اس سے بہت دور اور بہت فرو تر کسی جگہ ان کا لشکر شکست کھانے والا ہے۔ یہ لشکر اللہ کی مملکت میں دخیل نہیں ہے۔ یہ اللہ کے ارادوں کو نہیں بدل سکتا۔ اور اللہ کی مشیت کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ ایک مجہول النسب لشکر ہے' مجہول الشان ہے اور شکست خوردہ ہے۔ گویا شکست اس کی لازمی صفت ہے۔ اس کی شخصیت کا حصہ ہے اور یہ لشکر مختلف احزاب سے بنا ہوا ہے۔ جن کے رجحانات مختلف ہیں اور جن کی خواہشات مختلف ہیں۔

اللہ اور رسول اللہ کے دشمن صرف اسی قدر ترقی کر سکتے ہیں جس کی تصویر کشی قرآن کریم کمزوری' عجز اور ضعف کے رنگوں کے ساتھ کرتا ہے۔ اور یہ تاثر دیتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کے تصرف اور تدبیر کے دائرے سے بہت ہی دور ہیں۔ اگرچہ دنیا کی نظروں میں وہ جبار و قہار ہوں اور ان کی پکڑ سخت ہو اور کچھ عرصہ کے لیے دنیا میں ان کی بات چلتی ہو۔

پوری تاریخ انسانی میں ایسے جباروں کے بارے قرآن مجید یہ تصویر کشی کرتا ہے۔

جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ (۳۸ : ۱۱) "یہ تو جتھوں میں سے ایک چھوٹا سا جتھا ہے جو اسی جگہ شکست کھانے والا ہے"۔

كَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ نُوحٖ وَعَادٞ وَفِرۡعَوۡنُ ذُو ٱلۡأَوۡتَادِ ﴿١٢﴾
وَثَمُودُ وَقَوۡمُ لُوطٖ وَأَصۡحَٰبُ لۡـَٔيۡكَةِۚ أُوْلَٰٓئِكَ ٱلۡأَحۡزَابُ ﴿١٣﴾ إِن كُلٌّ إِلَّا
۱۴ع كَذَّبَ ٱلرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ﴿١٤﴾
۱۰

"ان سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم اور عاد' اور میخوں والا فرعون اور ثمود اور قوم لوط اور ایکہ والے جھلا چکے ہیں۔ جتھے وہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھلایا اور میری عقوبت کا فیصلہ اس پر چسپاں ہو کر رہا"۔

یہ مثالیں تو ان لوگوں کی ہیں جو قریش سے قبل تاریخ میں گزرے ہیں۔ قوم نوح' قوم عاد' فرعون جو بڑے بڑے اہراموں والا تھا۔ یہ اہرام زمین پر ایسے ہیں جیسی میخیں' قوم ثمود' قوم لوط' قوم شعیب جنہیں اصحاب الایکہ بھی کہا جاتا ہے یعنی گھنے جنگلوں والے' یہ ہیں وہ جتھے جنہوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔ تو انجام کیا ہوا ان کا۔ حالانکہ وہ بڑے جبار اور پکڑ والے تھے۔ یہ ہوا کہ فَحَقَّ عِقَابِ (۳۸ : ۱۴) "میرے عذاب کا فیصلہ ان پر چسپاں ہوا"۔ جو ہونا تھا وہ ہوا۔ وہ اس طرح نیست و نابود کر دیئے گئے کہ ان کا کوئی نشان باقی نہیں رہا ہے۔

یہ تو تھی پوزیشن ان لوگوں کی جو زمانہ ماضی میں گزرے۔ رہے یہ لوگ تو ان کے لیے بھی ایک عذاب آنے والا

ہے ۔ یہ دن یوم الحساب سے قبل آئے گا اور ایک چیخ ہوگی اور پوری دنیا میں کچھ نہ رہے گا۔

وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ﴿۱۵﴾

"یہ لوگ بھی بس ایک دھماکے کے منتظر ہیں جس کے بعد کوئی دوسرا دھماکہ نہ ہوگا"۔

یعنی جب یہ وقت آئے گا تو اس میں اس قدر تاخیر بھی نہ ہوگی جس قدر اونٹنی کا دودھ دوہنے کے دو اوقات میں ہوتا ہے ۔ اس لیے کہ دودھ دینے والے جانوروں کا دودھ وقت مقررہ پر نکالا جاتا ہے جس میں تقدیم و تاخیر نہیں کی جاتی ۔ یہ امت آخری امت ہے اور اللہ نے اسے قیامت تک کا وقت اور مہلت دے دی ہے ۔ کیونکہ اس امت کو اللہ امم سابقہ کی طرح نیست و نابود نہیں کرتا۔

یہ اللہ کی بہت بڑی رحمت ہے کہ اس امت کو اللہ نے طویل مہلت دے دی ہے لیکن افسوس کہ اہل قریش نے اس کو غنیمت نہ جانا اور اس پر خدا کا شکر ادا نہ کیا ۔ الٹا اپنے مقررہ انجام کے جلدی آنے کا مطالبہ کرتے رہے ' دعا کرتے رہے کہ اے اللہ ' تم میں سے جس کا انجام برا ہے جلدی وہ اس تک پہنچ جائے ۔ اور یوم الحساب سے بھی پہلے اسی دنیا میں یہ عذاب آجائے ۔

وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۱۶﴾

"اور یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ' یوم الحساب سے پہلے ہی ہمارا حصہ ہمیں جلدی سے دے دے"۔ بس یہاں آکر قرآن مجید ان کے بارے میں بات ختم کر دیتا ہے اور روئے سخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے ۔ آپ کو تسلی دی جاتی ہے کہ ان کی حماقتوں کی پرواہ نہ کریں ۔ یہ عذاب کا مطالبہ کر کے اللہ کے جناب میں سوء ادب کا ارتکاب کر رہے ہیں ۔ دراصل یہ قیامت کے قیام پر یقین ہی نہیں رکھتے ۔ اللہ کی رحمت پر ناشکری کرتے ہیں ۔ آپ کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپ انبیائے سابقہ کے حالات پڑھیں کہ ان پر کیا کیا آزمائشیں آئیں ۔ اور اس کے بعد اللہ کی رحمتیں ان پر نازل ہوئیں ۔

--- ooo---

# درس نمبر ۲۱۲ تشریح آیات

## ۱۷ --- تا --- ۴۸

یہ پورا سبق قصص اور رسولوں کی زندگیوں کی اعلیٰ مثالوں پر مشتمل ہے ۔ یہ مثالیں رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس لیے پیش کی جا رہی ہیں کہ آپ ذرا رسل سابقین کی زندگیوں پر غور کریں اور قریش جو تکذیب کر رہے تھے ۔ الزام تراشیاں کرتے تھے ' الزام لگاتے تھے اور آپ کی رسالت کو انوکھا سمجھتے تھے ' اس پر صبر کریں اور ان مشکلات کو برداشت کریں جن کی وجہ سے انسان کا جی بھر آتا ہے ۔

یہ تمام قصص ' حضور اکرم ﷺ کو تسلی دینے کے لیے رسولوں پر اللہ کی رحمتوں اور مہربانیوں کے واقعات پیش کرتے ہیں ۔ اس طرح کہ ان رسولوں پر اللہ نے کیا کیا کرم نوازیاں کیں ' بعض رسولوں کو اللہ نے حکومتیں اور بڑی بڑی سلطنتیں عطا کیں ۔ اور ان پر بڑے بڑے انعامات کیے ۔ یہ واقعات اس لیے بیان کیے کہ اہل قریش کو اس بات پر تعجب ہو رہا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب رسالت کیوں عطا کر دیا گیا ۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ کوئی پہلے رسول نہ تھے ۔ رسولوں کو تو بڑی بڑی مملکتیں عطا ہوئی ہیں ۔ بعض کے لیے تو پہاڑ بھی مسخر کر دیئے گئے اور پرندے ان کے ساتھ مل کر تسبیح پڑھتے تھے ۔ بعض کے لیے ہوائیں مسخر تھیں اور جن اور شیطان بھی ان کے تابع تھے مثلاً داؤد و سلیمان علیہما السلام ۔ آخر یہ کوئی تعجب کی بات ہے کہ محمد ابن عبداللہ کو نبی آخر الزمان کے منصب کے لیے منتخب کر دیا گیا ۔

ان قصص میں یہ بھی ثبت ہے کہ اللہ اپنے رسولوں کی نگرانی ہر وقت کرتا رہتا ہے ۔ ان کی زندگی کے ہر موڑ پر ہر وقت ہدایات دی جاتی ہیں ' ان کو تجربات کرائے جاتے ہیں ۔ وہ بھی بشر تھے جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں ۔ ان رسولوں میں بشری کمزوریاں بھی تھیں ۔ چنانچہ اللہ ہر وقت نگرانی کر کے ان کو بشری کمزوریوں سے بچاتا تھا ۔ اللہ ہر وقت ان کو صحیح موقف بتاتا ہے ' ان کی راہنمائی کرتا ہے اور ان کو آزماتا ہے تاکہ ان کی لغزشوں پر مغفرت کر دے ۔ یہ باتیں بتانے سے حضور اکرم ﷺ کے دل کو تسلی دینا مقصود ہے کہ آپ اپنے رب کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں اور قدم قدم پر اللہ تعالیٰ آپ کی نگرانی اور حمایت کر رہا ہے ۔

اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ﴿۱۸﴾ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ﴿۲۰﴾

"اے نبی صبر کرو ان باتوں پر جو یہ لوگ بناتے ہیں' اور ان کے سامنے ہمارے بندے داؤد کا قصہ بیان کرو جو بڑی قوتوں کا مالک تھا۔ ہر معاملہ میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والا تھا۔ ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ مسخر کر رکھا تھا کہ صبح و شام وہ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ پرندے سمٹ آتے' سب کے سب اس کی تسبیح کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ ہم نے اس کی سلطنت مضبوط کر دی تھی' اس کو حکمت عطا کی تھی اور فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بخشی تھی"۔

اِصْبِرْ صبر کرو' یہ تمام رسولوں کی زندگی کا اہم خاصہ ہے۔ وہ خاصہ جس کی بناء پر یہ سب لوگ ایک ہی گروہ قرار پاتے ہیں۔ سب اسی راہ پر چلے' سب نے تکالیف برداشت کیں۔ سب پر آزمائشیں آئیں اور سب نے ان پر صبر کیا۔ صبر سب کا زاد راہ تھا۔ انبیائی سلسلہ کے اندر سب نے درجہ بدرجہ مشکلات برداشت کیں۔ ان کی زندگی تجربہ تھی اور یہ تجربہ مشقتوں اور ابتلاؤں سے بھرا ہوا تھا۔ مصائب پر وہ صبر کرتے تھے اور یہ ان کے لیے آزمائش تھی اور پھر اللہ کے فضل و کرم پر بھی وہ صبر کرتے تھے اور یہ بھی ابتلا تھی۔ دونوں حالات میں صبر ضروری ہوتا ہے اور انہوں نے صبر کیا۔

جس طرح قرآن نے رسولوں کی زندگی کی حکایات بیان کی ہیں اگر ہم ان سب کو پیش نظر رکھیں تو ان کی زندگی کی بنیاد اور ان کی زندگی کا اہم فیچر ہی صبر ہے۔ ان کی پوری زندگی عبارت ہے آزمائشوں' مشقتوں اور جدوجہد اور صبر و مصابرت سے۔

انبیاء کی زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزمائشوں پر مشتمل ایک برگزیدہ زندگی ہے۔ فی الواقع یہ ایک پر مشقت زندگی ہے۔ یہ ایک کھلی کتاب ہے' جس کے اندر صرف ابتلاؤں اور صبر کے نقشے لکھے ہوئے ہیں۔ اور انسانیت کے لیے بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں تاکہ تاریخ کے اندر اس بات کو ریکارڈ کر دیا جائے کہ روح انسان کس طرح مصائب اور زندگی کی ضروریات اور سہولیات کی خواہش پر غالب ہو جاتی ہے۔ اور انسانی روح کس طرح ان تمام اقدار سے برتر ہو جاتی ہیں جن پر دنیا فخر کرتی ہے اور کس طرح انسانی روح دنیا کی دھوکہ دینے والی چیزوں اور نفس کو مرغوب چیزوں سے لاتعلق ہو جاتی ہے۔ صرف اللہ کے لیے ہو جاتی ہے اور یوں آزمائشوں میں فلاح پا لیتی ہے۔ وہ اللہ کو تمام ماسوا اللہ پر ترجیح دے دیتی ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر ہی پھر وہ انسانیت کو چیلنج کر کے کہہ سکتی ہے کہ یہ ہے طریق زندگی۔ یہ ہے سربلندی کی راہ۔ اور یہ ہے وہ راہ جو نہایت ہی بلندیوں پر اللہ کی طرف جاتی ہے۔

اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (۳۸ : ۱۷) "یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو"۔ اور وہ کیا باتیں کرتے تھے؟

هٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ (۳۸ : ٤) "یہ جادوگر ہے بہت بڑا جھوٹا"۔ اور وہ یہ کہتے تھے۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (۳۸ : ٥) "کیا اس نے تمام الہوں کی جگہ ایک خدا ٹھہرا لیا ہے"۔ اور وہ یہ کہتے تھے۔

ءَ اُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّکْرُ (۳۸ : ۸) "کیا خدا کے کلام کے لیے ہمارے درمیان میں سے صرف اسی کا

انتخاب ہونا تھا" وغیرہ۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو متوجہ فرماتا ہے کہ بس آپ صبر کرتے چلے جائیں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ ان کفار کے ماڈلوں کے مقابلے میں کچھ دوسرے ماڈلوں میں زندہ رہیں۔ پر خلوص اور شریف النفس ماڈلوں کے ساتھ۔ یہ ماڈل آپ کے بھائی انبیائے سابقہ کے ماڈل ہیں۔ آپ کے سامنے ان کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ آپ ان کے ساتھ قریبی تعلق کا احساس کریں کہ یہ ہیں آپ کے بھائی' آپ کے نسبی اور رشتہ دار۔ چنانچہ حضور فرماتے ہیں۔ اللہ میرے فلاں بھائی پر رحم کرے .... اور میں اس نبی کا زیادہ قریبی ہوں۔

اصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَ اذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَیْدِ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ (۳۸:۱۷)

"اے نبی صبر کرو' ان باتوں پر جو یہ لوگ بناتے ہیں اور ان کے سامنے ہمارے بندے داؤد کا قصہ بیان کرو' جو بڑی قوتوں کا مالک تھا اور ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والا تھا"۔ داؤد علیہ السلام کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ نہایت قوتوں والے تھے لیکن ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ اس سے قبل قوم نوح' قوم عاد اور فرعون' قوم ثمود' قوم لوط اور اصحاب ایکہ کا ذکر ہوا تھا۔ یہ سب اقوام نہایت ہی سرکش تھیں۔ وہ اپنی قوت کا اظہار یوں کیا کرتی تھیں کہ وہ لوگوں پر ظلم' زیادتی کرتی تھیں اور حق کی تکذیب کرتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں داؤد علیہ السلام بھی بڑی قوتوں والے تھے۔ لیکن وہ اواب تھے۔ ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اللہ کے مطیع' عبادت گزار اور اسے یاد کرنے والے۔ حالانکہ وہ قوتوں والے اور مقتدر اعلیٰ تھے۔

حضرت داؤد کے قصے کا ابتدائی حصہ اور طالوت کے لشکر میں ان کی نمایاں کارکردگی بیان ہو چکی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کا یہ لشکر طالوت کی قیادت میں اٹھا تھا۔ اس دور میں بنی اسرائیل زوال پذیر تھے اور انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ ہمارے لیے اللہ کی طرف سے بادشاہ اور قائد ریاست مقرر ہو۔ یہ لشکر بنی اسرائیل کے جبار دشمن جالوت سے ٹکرایا۔ داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا۔ اس دور میں حضرت داؤد نوجوان تھے۔ یوں ان کا ستارہ چمکا اور بالاخر وہ بادشاہ بن گئے۔ لیکن ان کا رویہ یہ تھا کہ وہ ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ اطاعت شعار اور عبادت گزار تھے اور ہر وقت ذکر و استغفار میں لگے رہتے تھے۔

اس اقتدار و سلطنت کے ساتھ اللہ نے ان کو نبوت بھی عطا کی اور نہایت ہی خوبصورت آواز ان کو دی گئی تھی۔ یہ نہایت ہی خوش الحانی کے ساتھ اللہ کی ثنا کرتے تھے۔ یہ ذکر میں اس قدر مستغرق تھے اور حمد و ثنا کو اس قدر ترتیل سے پڑھتے تھے کہ ان کے اور اس کائنات کے درمیان کے تمام پردے اٹھ گئے تھے۔ یوں ان کے ساتھ پرندے' اور پہاڑ بھی ثنا پڑھتے تھے اور اللہ کی تعریف و تمجید کرتے تھے۔ پہاڑ ان کے ساتھ گنگناتے تھے اور پرندے ان کے ارد گرد پھڑپھڑاتے تھے۔ اور سب کے سب مولائے کریم کے ثناخواں تھے۔

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَ الْاِشْرَاقِ (۳۸:۱۸) وَ الطَّیْرَ مَحْشُوْرَةً كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ (۳۸:۱۹) "ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ مسخر کر رکھا تھا کہ صبح و شام وہ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ پرندے سمٹ آتے سب کے سب اس کی تسبیح کی طرف متوجہ ہو جاتے"۔

عام لوگ اگر اس آیت کو پڑھیں تو حیران رہ جائیں گے کہ جامد پہاڑ کس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور یہ تسبیح وہ صبح و شام کرتے تھے' خصوصاً جب وہ اپنے رب کی یاد کے لیے تخلیہ میں جاتے تھے۔ وہاں وہ اللہ کی حمد گاتے تھے۔ نہایت ہی خوش الحانی کے ساتھ۔ اور اللہ کی تعریف و تمجید کرتے تھے۔ پرندے ان کے نغمات کو سن کر جمع ہوتے تھے۔ اور وہ بھی ان کو دہراتے تھے۔ فی الواقع لوگوں کے لیے یہ بات حیران کن ہوگی۔ کیونکہ عادی امور اور عادی روش اس کے خلاف ہے۔ لوگ جب گوشہ نشین ہوتے ہیں تو وہ ایسی باتیں محسوس نہیں کرتے۔ انسانوں اور پرندوں کے اجناس میں اور جامد پہاڑوں کے درمیان یہ یگانگت کیسے وجود میں آگئی۔

لیکن اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ کوئی تعجب خیز دعویٰ نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تمام مخلوقات کی حقیقت اور ماہیت ایک ہے۔ اگرچہ شکل و صورت اور جنس و نوع میں وہ باہم مختلف ہیں۔ یہ سب چیزیں اپنے خالق کے حوالے سے ایک ہیں۔ اور ایک کلی وجود کا حصہ ہیں۔ زندہ وجود ہو یا غیر زندہ چیزیں ہوں۔ جب ایک انسان اپنے رب کے لیے خالص ہو جاتا ہے اور اسے صفائے باطن اور اشراق کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے تو جنس و نوع کے یہ تمام پردے اٹھ جاتے ہیں اور یہ تمام چیزیں اپنی اصل حقیقت کے ساتھ سامنے آجاتی ہیں۔ یہ سب مخلوق ان ظاہری پردوں کی پشت سے ایک ہو جاتی ہیں۔ مختلف اجناس' اصناف' شکلیں اور صورتیں' ظاہری رنگ اور خصوصیات تو دراصل پردے ہیں۔ حقیقت ان کے پیچھے ہے۔

وَ شَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَ اٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَ فَصْلَ الْخِطَابِ (۳۸: ۲۰) "ہم نے اس کی حکومت مضبوط کر دی تھی اور اس کو حکمت عطا کی تھی اور فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بخشی تھی"۔ چنانچہ آپ کی حکومت بہت ہی مضبوط تھی۔ آپ کی حکومت کی پالیسی حکمت دانش مندی اور ٹھوس فکر پر مبنی تھی۔ اور اس کے فیصلے دو ٹوک ہوتے تھے۔ آپ کے اندر بے پناہ قوت فیصلہ تھی۔ کسی حکومت میں جب قوت اور حکمت جمع ہو جائے تو وہ کمال کی انتہاؤں کو چھو لیتی ہے۔

لیکن ان کمالات کے باوجود حضرت داؤد پر بھی اللہ کی طرف سے امتحان آئے۔ ان کو بھی آزمایا گیا۔ ان آزمائشوں میں بھی وہ اللہ کی نگرانی میں رہے' کیونکہ وہ پیغمبر تھے اور اللہ اپنے پیغمبروں کو غلطی سے بچاتا ہے۔ ان کی کمزوریوں کے مقامات پر دست گیری کرتا ہے۔ اور اس راہ کی مشکلات سے انہیں بچاتا ہے۔ احتیاط کے طریقے سکھاتا ہے۔

وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿۲۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿۲۲﴾ اِنَّ هٰذَآ اَخِيْ ۫ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۫ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا

مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِىْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ۭ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۩

''پھر تمہیں کچھ خبر پہنچی ہے ان مقدمے والوں کی جو دیوار چڑھ کر اس کے بالاخانے میں گھس آئے تھے؟ جب وہ داؤد کے پاس پہنچے تو وہ انہیں دیکھ کر گھبرا گیا۔ انہوں نے کہا ''ڈریے نہیں' ہم دو فریق مقدمہ ہیں جن میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ آپ ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیجئے' بے انصافی نہ کیجئے اور ہمیں راہ راست بتایئے۔ یہ میرا بھائی ہے' اس کے پاس ننادوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک ہی دنبی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ یہ ایک دنبی بھی میرے حوالے کر دے اور اس نے گفتگو میں مجھے دبا لیا''۔ داؤد نے جواب دیا: ''اس شخص نے اپنی دنبیوں کے ساتھ تیری دنبی ملا لینے کا مطالبہ کر کے یقیناً تجھ پر ظلم کیا' اور واقعہ یہ ہے کہ مل جل کر ساتھ رہنے والے لوگ اکثر ایک دوسرے پر زیادتیاں کرتے رہتے ہیں' بس وہی لوگ اس سے بچے ہوئے ہیں جو ایمان رکھتے اور عمل صالح کرتے ہیں' اور ایسے لوگ کم ہی ہیں''۔ داؤد سمجھ گیا کہ یہ تو ہم نے دراصل اس کی آزمائش کی ہے' چنانچہ اس نے اپنے رب سے معافی مانگی اور سجدے میں گر گیا اور رجوع کر لیا''۔

اس واقعہ کی تشریح یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے وقت کا ایک حصہ امور مملکت کو دیتے تھے' لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتے تھے۔ کچھ وقت وہ خلوت تنہائی' عبادت اور حمد و ثنا اور حمد الٰہی کے ترانے پڑھنے کے لیے دیتے تھے۔ جب آپ محراب میں خلوت گزیں ہوتے تھے تو کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ جب تک کہ آپ خود باہر نہ آجائیں۔

ایک دن یوں ہوا کہ دو افراد دیوار پھلانگ کر اس خلوت گاہ میں گھس آئے۔ آپ ان کے اس طرح گھس آنے سے گھبرا گئے۔ کیونکہ کوئی اہل ایمان یا کوئی ذمہ دار شخص یوں ان کی خلوت گاہ میں نہ آسکتا تھا۔ چنانچہ ان دو افراد نے بھی آپ کے خوف کو محسوس کیا اور جلدی سے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

قَالُوْا لَا تَخَفْ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ (٣٨ : ٢٢) ''انہوں نے کہا ڈریے نہیں' ہم دو فریق مقدمہ ہیں جن میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے''۔ چنانچہ ہم فیصلے کے لیے آئے ہیں۔

فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ (٣٨ : ٢٢) ''آپ ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیجئے' بے انصافی نہ کیجئے اور ہمیں راہ راست بتایئے''۔ اس کے بعد ایک نے بیان دعویٰ شروع کر دیا۔

اِنَّ هٰذَآ اَخِىْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِىَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِىْ فِى الْخِطَابِ (٣٨ : ٢٣)

''یہ میرا بھائی ہے' اس کے پاس ٩٩ دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دنبی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ یہ ایک

دنبی میرے حوالے کر دے اور اس نے گفتگو میں مجھے دبا لیا"۔ اکفلنی کے معنی ہیں مجھے دے دے، میری ملکیت میں دے دے اور میری کفالت میں دے دے اور عزنی کے معنی ہیں مجھ پر بات میں سختی کی اور غالب ہو گیا۔

جہاں تک مقدمے کا تعلق ہے خود بیان دعویٰ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسا ظالمانہ فعل ہے جس کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ حضرت داؤد نے بھی جواب دعویٰ سننے سے پہلے ہی فیصلہ کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ بادی النظر میں اس بھائی کا فعل ظالمانہ تھا۔ اس لیے حضرت داؤد نے دوسرے فریق سے بات ہی نہ کی۔ نہ جواب دعویٰ سنا نہ اس سے کوئی عذر طلب کیا۔ بس دعویٰ سن کر ہی فیصلہ کر دیا۔

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ إِلَىٰ نِعَاجِهِ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ (۳۸: ۲۴)

"داؤد نے جواب دیا اس شخص نے اپنی دنبیوں کے ساتھ تیری دنبی ملا لینے کا مطالبہ کر کے یقیناً تجھ پر ظلم کیا اور واقعہ یہ ہے کہ مل جل کر رہنے والے لوگ اکثر ایک دوسرے پر زیادتیاں کرتے رہتے ہیں۔ بس وہی لوگ اس سے بچے ہوئے ہیں جو ایمان رکھتے ہوں اور عمل صالح کرتے ہیں اور ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں"۔ خلطاء سے مراد اقربا جو اکٹھے ہوتے رہتے ہیں۔ سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اشخاص اس مرحلے پر غائب ہو گئے کیونکہ یہ فرشتے تھے اور امتحان لینے آئے تھے یعنی اس نبی کا امتحان مطلوب تھا جسے اللہ نے عوام الناس کا حاکم اور سربراہ اور جج بنایا تھا۔ اور حکم دیا تھا کہ لوگوں کے درمیان عدل کے مطابق فیصلہ کریں۔ اور فیصلہ سنانے سے قبل مقدمات کی اچھی طرح تفتیش کریں۔ امتحان اس طرح زیادہ شدید ہو جاتا ہے جب ان کے سامنے ایک ایسا مقدمہ پیش کیا جاتا ہے تو بادی النظر میں صریح ظلم نظر آتا ہے لیکن ایک جج کا یہ رویہ ہوتا ہے کہ وہ کسی فریق کی بات سے متاثر نہ ہو۔ وہ جلدی میں فیصلہ نہ کرے۔ محض ظاہری باتوں یا حالات پر فیصلہ نہ کرے۔ بیان دعویٰ کے مقابلے میں جواب دعویٰ طلب کرے۔ کیونکہ بعض اوقات جواب دعویٰ سننے سے دعویٰ کی حیثیت ہی بدل جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بیان دعویٰ اگر ظاہراً درست ہے مگر درحقیقت مسئلہ کی نوعیت دوسری ہے۔ یا یہ کہ مدعی بعض باتیں چھپا رہا ہے اور دھوکہ دے رہا ہے۔

اس مقام پر داؤد علیہ السلام کو یہ خیال آیا کہ یہ معاملہ کوئی حقیقی مقدمہ نہ تھا بلکہ پرچہ امتحان تھا۔

وَظَنَّ دَاوُودُ أَنَّمَا فَتَنَّاهُ (۳۸: ۲۴) "اب داؤد کو یقین ہو گیا کہ ہم نے دراصل اس کی آزمائش کی ہے"۔ یہاں اب ان کا اصل مزاج سامنے آتا ہے۔ وہ تو ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ (۳۸: ۲۴) "السجدۃ" "چنانچہ اس نے اپنے رب سے معافی مانگی اور سجدے میں گر گیا اور رجوع کر لیا"۔

فَغَفَرْنَا لَهُ ذَٰلِكَ ۖ وَإِنَّ لَهُ عِندَنَا لَزُلْفَىٰ وَحُسْنَ مَآبٍ ﴿٢٥﴾

"تب ہم نے اس کا وہ قصور معاف کیا اور یقیناً ہمارے ہاں اس کے لیے تقرب کا مقام اور بہتر انجام ہے"۔

بعض تفاسیر نے اس آیت کے تحت اسرائیلیات سے رطب و یابس جمع کیا ہے اور حضرت داؤدؑ کی آزمائش کے معاملے میں بہت دور تک چلے گئے ہیں۔ انہوں نے ایسی باتیں بھی نقل کی ہیں جو نبوت کے شایان شان ہی نہیں ہیں۔ بلکہ وہ مطلقاً منصب نبوت کے ساتھ یکجا نہیں ہو سکتیں۔ بعض روایات نے اگرچہ بعض انسانوں کی تاویل کر کے ان کی قباحت کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن انہوں نے بھی بعض افسانوی پہلو اپنے اندر سمیٹ لیے ہیں۔ لہٰذا یہ روایات اس قابل ہی نہیں ہیں کہ ان کو نقل کیا جائے اور ان پر نظر ڈالی جائے۔ کیونکہ یہ روایات قرآن کریم کے اس تبصرے کے بالکل خلاف ہیں۔

وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ (۳۸:۲۵) "یقیناً ہمارے ہاں اس کے لیے تقرب کا مقام اور بہتر انجام ہے"۔

اس قصے پر جو تبصرہ آیا ہے، وہ صاف صاف بتاتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کی آزمائش کی نوعیت کیا تھی۔ اللہ نے حضرت داؤد کو حکومت دی تھی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلے کریں، اس لیے متعین ہو گیا کہ اس آزمائش و امتحان کا تعلق جوڈیشل پروسیڈنگز سے تھا۔ چنانچہ کہا گیا:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ
۲ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ
۱۲ع الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾

(ہم نے اس سے کہا) "اے داؤد، ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یقیناً ان کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے"۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ کہا گیا کہ آپ کو زمین کا اقتدار اعلیٰ دیا گیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان حق پر مبنی فیصلے کریں اور ان فیصلوں میں اپنی ذاتی چاہت کا خیال نہ رکھیں۔ جہاں تک نبی کا تعلق ہے وہ تو خواہشات نفس کی پیروی سے محفوظ ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ابتدائی میلان پر ہی فیصلہ نہ کر دیا کریں۔ یہ نہ ہو کہ بغیر سوچے سمجھے اور بغیر تحقیقات کیے ہی فیصلہ نہ کر دیا کریں۔ کیونکہ اس طرح جلدی میں بغیر تحقیق کے فیصلے اکثر غلط ہوتے ہیں۔ آیت کے آخر میں حکم عام ہے۔ ان تمام لوگوں کے لیے جو اللہ کے راستے سے گمراہ ہوتے ہیں۔ جو اللہ کو بھول جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قیامت کے دن شدید عذاب سے دوچار ہوں گے۔

اللہ کی حضرت داؤد پر کرم نوازی دیکھئے کہ پہلی فرصت میں ان کو متنبہ کر دیا گیا اور اپنے ذاتی میلان سے روک دیا گیا اور آپ کو دور رس انجام سے ڈرایا گیا حالانکہ حضرت داؤد علیہ السلام نے عملاً اس غلط اقدام کی طرف ایک قدم بھی نہ اٹھایا تھا۔ اللہ کے تمام مختار بندوں پر یہ اللہ کا فضل ہوتا ہے کہ انھیں قبل از وقت متنبہ کر دیا جاتا ہے۔ وہ بمقتضائے بشریت ذرا سی لغزش کھاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ثابت قدم کر دیتا ہے۔ ان کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے' ان کو تعلیم دیتا ہے اور ان کو اپنی طرف موڑ دیتا ہے۔ ان کی لغزش صاف کر دیتا ہے۔ اور اس آزمائش کے بعد ان پر رحمتوں کی بارش کر دیتا ہے۔

خلافت ارضی میں سچائی پر چلنے کے اصول کے طے ہونے کے بعد اور لوگوں کے درمیان سچائی اور حق پر مبنی فیصلے کے احکام کے بعد اور قصہ داؤد علیہ السلام کے ختم ہونے سے پہلے اس سچائی کو اس عالم گیر سچائی کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے جس کے اوپر زمین و آسمان قائم ہیں اور آسمان اور زمینوں کے درمیان پوری کائنات قائم ہے۔ یہ سچائی اس کائنات کے اندر بہت گہری ہے اور صرف خلافت فی الارض کی سچائی اور لوگوں کے درمیان عدل کی سچائی سے بہت عام ہے۔ یہ سچائی اس زمین سے بھی وسیع تر ہے جبکہ یہ صرف اس دنیا کی زندگی سے بھی آگے عالم آخرت تک پھیلی ہوئی ہے۔ جس طرح یہ کائنات اس کی لپیٹ میں ہے اسی طرح عالم آخرت بھی اس کی لپیٹ میں ہے۔ اس عالم گیر سچائی پر یہ آخری رسالت مبنی ہے اور اللہ کی یہ آخری کتاب اسی ہمہ گیر اور عالم گیر سچائی کی مظہر اور مفسر ہے۔

وَ مَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِکَ ظَنُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ۚ فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنَ النَّارِ ﴿ؕ۲۷﴾ اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالۡمُفۡسِدِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ۫ اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِیۡنَ کَالۡفُجَّارِ ﴿۲۸﴾ کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰہُ اِلَیۡکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوۡۤا اٰیٰتِہٖ وَ لِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۲۹﴾

"ہم نے اس آسمان اور زمین کو' اور اس دنیا کو جو ان کے درمیان ہے' فضول پیدا نہیں کر دیا۔ یہ تو ان لوگوں کا گمان ہے جنھوں نے کفر کیا ہے' اور ایسے کافروں کے لیے بربادی ہے جہنم کی آگ سے۔ کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لاتے اور نیک اعمال کرتے ہیں اور ان کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں' یکساں کر دیں؟ کیا متقیوں کو ہم فاجروں جیسا کر دیں؟ یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبیؐ) ہم نے تمھاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں"۔

یہ ہے اصل بات' ان تین آیات میں وہ عظیم حقیقت بیان کر دی گئی ہے' جس کی قرآن میں بہت اہمیت ہے۔ یہ نہایت ہی گہری' عمومی اور عظیم الشان حقیقت ہے۔ اس کی جڑیں اور شاخیں اس پوری کائنات کے اندر گہری ہیں اور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی مخلوق کوئی کھیل تماشا نہیں ہے۔ یہ باطل نہ تھی' نہ ہے اور نہ ہوگی۔ بلکہ یہ حق ہے۔ یہ کائنات حقائق پر قائم ہے۔ اس ہمہ گیر سچائی سے تمام سچائیاں پھوٹتی ہیں

اور یہ سچائی دراصل اس کائنات اور پھر اس زمین کی حقیقت و ماہیت ہے - اس دنیا پر انسان کی حکمرانی میں سچائی 'لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کے قیام میں سچائی 'لوگوں کے شعور و خیال میں سچائی اور ان کے اعمال میں سچائی کا قیام اس عظیم حق اور سچائی کی شاخیں ہیں - لہٰذا جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور شعور کی سچائی رکھتے ہیں اور جو لوگ نیک عمل کرتے ہیں اور ان کا طرز عمل درست ہے وہ مفسدین کی طرح نہیں ہو سکتے - لہٰذا اس کرۂ ارض پر متقین کا وزن اور فساق و فجار کا وزن برابر نہیں ہو سکتا - جس عظیم سچائی کو یہ کتاب لے کر آئی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات پر تدبر کریں اور ان میں سے جو عقلمند ہیں وہ اس سے نصیحت حاصل کریں - وہ عظیم سچائی ہے - اور لوگوں کو چاہئے کہ وہ اس عظیم حقیقت کا وافر حصہ پالیں اور اس پر تدبر کریں - کافر در حقیقت اس عظیم سچائی کا تصور اور شعور بھی نہیں رکھتے - کیونکہ ان کی فطرت' ان کا شعور اس عظیم سچائی سے محروم ہے جس کے اوپر یہ کائنات قائم ہے - اور جس کا حامل قرآن ہے - کافر تو رب تعالیٰ کے بارے میں سوئے ظن رکھتے ہیں - اور وہ اس عظیم سچائی کے ادراک سے محروم ہوتے ہیں -

ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ (۳۸ : ۲۷) "یہ تو ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کیا اور ایسے کافروں کے لیے بربادی ہے 'جہنم کی آگ سے"-

اسلامی شریعت دراصل اللہ کے اس عظیم حق کی تشریح کر رہی ہے - جس پر یہ پوری کائنات قائم ہے - اللہ تعالیٰ اس دنیا میں حکام اور خلفاء سے جس سچائی اور عدل کا مطالبہ فرماتا ہے وہ اس کلی حق اور سچائی کا ایک حصہ ہے - اس حق کا تقاضا یہ ہے کہ جس طرح وہ کائنات میں قائم ہے اسی طرح انسانوں کے نظام اور معاشرے میں بھی قائم ہو تاکہ یہ عظیم سچائی ادھوری نہ ہو - اس کے تمام اطراف قائم ہو جائیں - اس لیے جو لوگ شریعت سے انحراف کرتے ہیں' عدالت سے انحراف کرتے ہیں - وہ دراصل اس سچائی سے انحراف کرتے ہیں جس کے اوپر یہ پوری کائنات قائم ہے - اس طرح وہ اس کائنات میں ایک عظیم شر و فساد پیدا کر دیتے ہیں - یوں کائناتی قوتوں کے درمیان تصادم پیدا ہو جاتا ہے - لہٰذا اس صورت میں ان کائناتی قوتوں کے درمیان بھی تصادم کا خطرہ ہوتا ہے اور انسانی قوتوں کے درمیان بھی - یوں کائنات اور انسانی معاشرے دونوں میں ٹوٹ پھوٹ کا خطرہ ہوتا ہے - کیونکہ ایک ظالم' باغی اور ناموس الٰہی اور شریعت الٰہیہ سے متصادم ہونے والا شخص صحیح سالم اور صراط مستقیم پر قائم نہیں رہ سکتا - اور یہ ضعیف اور ناتواں انسان اگر بغاوت بھی کرے تو اللہ کی عظیم قوتوں کا وہ کیا بگاڑ سکتا ہے - وہ اگر کوئی فساد برپا کرے گا اور نقصان کرے گا تو اپنا کرے گا - اللہ کی جبار و قہار قوتوں کے مقابلے میں تو وہ بے بس ہو جائے گا -

یہ وہ عظیم حقیقت ہے جس کے اوپر تمام اہل دانش کو غور و فکر کرنا چاہئے اور اصحاب دانش اور عقل کو چاہئے کہ وہ اس سے نصیحت حاصل کریں - اس قصے کے درمیان یہ سبق آموز واقعہ بیان ہوا اور اس پر تبصرہ ہوا تاکہ اس اہم بات کی وضاحت کر دی جائے - حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ کے مزید انعامات گنائے جاتے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ان کی اولاد میں حضرت سلیمان جیسے باکمال شخص پیدا کیے جن پر اللہ کا بہت بڑا کرم ہوا - بلکہ کئی قسم کی کرم نوازیاں ہوئیں - حضرت سلیمان کی آزمائش' ان پر اللہ کے کرم کے واقعات اور آزمائش کے بعد اللہ کی رحمتوں کی بارش کے واقعات کا ذکر ہوتا ہے -

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿۳۰﴾
اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ﴿۳۱﴾ فَقَالَ اِنِّىْٓ اَحْبَبْتُ
حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿۳۲﴾ رُدُّوْهَا
عَلَيَّ ۭ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا
عَلٰي كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ
لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ
رُخَاۗءً حَيْثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّاۗءٍ وَّغَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ
فِي الْاَصْفَادِ ﴿۳۸﴾ ھٰذَا عَطَاۗؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا ۳
لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾ ع۱۴
۱۲

"اور داؤد کو ہم نے سلیمان (جیسا بیٹا) عطا کیا' بہترین بندہ' کثرت سے اپنے رب کی طرف رجوع کرنے والا۔ قابل ذکر ہے وہ موقع جب شام کے وقت اس کے سامنے خوب سدھے ہوئے گھوڑے پیش کیے گئے تو اس نے کہا "میں نے اس مال کی محبت اپنے رب کی یاد کی وجہ سے اختیار کی ہے"۔ یہاں تک کہ جب وہ گھوڑے نگاہ سے اوجھل ہو گئے تو (اس نے حکم دیا کہ) انہیں میرے پاس واپس لاؤ' پھر لگا ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے۔ اور (دیکھو کہ) سلیمان کو بھی ہم نے آزمائش میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک جسد لاکر ڈال دیا۔ پھر اس نے رجوع کیا اور کہا کہ "اے میرے رب' مجھے معاف کر دے اور مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو' بے شک تو ہی اصل داتا ہے"۔ تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی۔ جدھر وہ چاہتا تھا' اور شیاطین کو مسخر کر دیا' ہر طرح کے معمار اور غوطہ خور اور دوسرے جو پابند سلاسل تھے (ہم نے اس سے کہا) "یہ ہماری بخشش ہے' تجھے اختیار ہے جسے چاہے دے اور جس سے چاہے روک لے' کوئی حساب نہیں"۔ یقیناً اس کے لیے ہمارے ہاں تقرب کا مقام اور بہتر انجام ہے"۔

یہاں دو اشارات ہیں۔ ایک الصافنات الجیاد ہے یعنی اچھے سدھے ہوئے قیمتی گھوڑے۔ اور دوسرا اشارہ یہ کہ حضرت سلیمان کی کرسی پر ایک جسد ڈال دیا۔ ہمارے تفسیری ذخیرے میں جس قدر روایات یا تاویلات وارد ہیں۔ ان میں سے ان اشارات کی تفسیر میں کسی ایک تفسیر اور روایت پر میرا دل مطمئن نہیں ہے۔ جہاں تک روایات کا تعلق ہے' ان میں سے بہت تو اسرائیلیات سے متعلق ہیں اور تفاسیر جو بھی کی گئی ہیں وہ ایسی تاویلات ہیں جن کے اوپر کوئی صحیح سند نہیں

ہے ـ یہ دو واقعات اصل میں کیا ہیں؟ ان کے بارے میں کوئی اطمینان بخش چیز سامنے نہیں آئی تاکہ اس پر غور کر کے میں یہاں نقل کر دوں ـ ماسوائے ایک حدیث کے اور کوئی صحیح حدیث بھی منقول نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جائے ـ ایک صحیح حدیث ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا تعلق ان واقعات کے ساتھ ہے ـ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے ـ امام بخاری نے یہ حدیث مرفوعاً نقل کی ہے ـ "حضرت سلیمان نے کہا میں آج رات اپنی ستر بیویوں کے پاس جاؤں گا ـ ہر ایک سے ایک جوان پیدا ہو گا ـ جو جہاد فی سبیل اللہ کرے گا ـ لیکن انہوں نے ان شاء اللہ نہ کہا ـ وہ ان بیویوں کے پاس گئے ـ ان میں سے صرف ایک کا حمل ٹھہرا اور جب بچہ پیدا ہوا تو ناتمام تھا ـ خدا کی قسم اگر حضرت سلیمان ان شاء اللہ کہتے تو یقیناً یہ سب اللہ کی راہ میں جہاد کرتے" ـ یہ ہو سکتا ہے کہ ان آیات میں جس فتنے کا ذکر کیا گیا ہے 'وہ یہی ہو اور ان کی کرسی پر یہی جسد ناتمام پھینکا گیا ہو ـ لیکن یہ بھی احتمال درجے میں ہے ـ گھوڑوں کا قصہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ شام کے وقت ان کے سامنے گھوڑے پیش کیے گئے اور غروب سے قبل وہ جو عبادت کرتے تھے وہ قضا ہو گئی تو حضرت نے کہا ان سب گھوڑوں کو واپس کرو' چنانچہ انہوں نے ان کی گردنوں اور پنڈلیوں کو تلوار سے کاٹنا شروع کیا ـ کیونکہ ان کی وجہ سے ان کی نماز قضا ہوئی اور وہ ذکر رب سے غافل ہو گئے ـ بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ ان کے پاؤں اور گردنوں پر ہاتھ پھیر کر ان کو تھپکی دیتے تھے اور ان کی عزت کرتے تھے ـ کہ یہ اللہ کی راہ میں لڑنے والے گھوڑے ہیں ـ دونوں روایتوں پر کوئی دلیل نہیں ہے ـ اور اس کے بارے میں کوئی فرضی بات نہیں کر سکتے ـ لہٰذا کوئی محقق ان دونوں واقعات کے بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کر سکتا ـ

جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی آزمایا گیا ـ اور یہ آزمائش امور مملکت کے بارے میں تھی اور اسی نوعیت کی تھی جس طرح تمام انبیاء کو راہ حق دکھانے کے لیے آزمایا جاتا ہے ـ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس راہ میں ان سے کوئی لغزش سرزد نہ ہو جائے ـ اس آزمائش کے بعد حضرت سلیمان نے اپنے رب کی طرف انابت اور رجوع کر لیا اور مغفرت طلب کی ـ اور اللہ کی طرف مڑ کر دست بدعا ہوئے :

قَالَ رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (۳۸ : ۳۵) "کہا 'اے میرے رب مجھے معاف کر اور مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو' بے شک تو ہی اصل داتا ہے"۔

حضرت سلیمان کی مذکورہ بالا دعا کا مطلب جو سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ایسی خصوصیت چاہتے تھے جو معجزانہ ہو ـ یعنی ان کو حکومتی اقتدار چلانے کے لیے معجزانہ قوتیں دی جائیں اور تمام دوسرے ذی اقتدار لوگوں سے یہ اعجاز مختلف ہو ـ اس کی ایک متعین شکل ہو' جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہ ہو ـ یعنی عوام الناس کے ہاں جس طرح کی حکومتیں متعارف ہیں ـ

رب تعالیٰ نے بھی ان کی دعا قبول کرنے میں دیر نہیں فرمائی ـ چنانچہ جیسی حکومت انہوں نے چاہی تھی وہ ان کو دے دی ـ ایسی حکومت جو آئندہ کسی کو نہ دی جائے گی ـ

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ (۳۸:۳۶) وَالشَّيٰطِينَ كُلَّ بَنَّاءٍ وَّغَوَّاصٍ (۳۸:۳۷) وَّاٰخَرِينَ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ (۳۸:۳۸) "تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی' جدھر وہ چاہتا تھا اور شیاطین کو مسخر کر دیا۔ ہر طرح کے معمار اور غوطہ خور اور دوسرے جو پابند سلاسل تھے"۔

ہوا کو اللہ کے حکم سے اس کے بندوں میں سے کسی کے لیے مسخر کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہوا اللہ کے ارادے سے باہر آگئی۔ انسانوں کی تسخیر کے باوجود ہوا بدستور ارادہ الٰہی کے تحت چلتی ہے۔ اللہ کے حکم سے اس کے نوامیس فطرت کے مطابق ہی چلتی ہے۔ جب اللہ اپنے کسی بندے کے لیے یہ بات سہل بنا دے کہ اس کا فعل ارادۂ الٰہی کی تعبیر ہو اور بندے کا حکم الٰہی کے موافق ہو جائے تو ایسے حالات میں کائناتی قوتیں اللہ کے امر کے ساتھ ساتھ بندے کے امر کے ساتھ چلتی نظر آتی ہیں۔ پھر یہ ہوائیں نہایت ہی نرمی کے ساتھ جہاں وہ بندہ چاہتا ہے ادھر چلتی ہیں۔ یہ ایک ایسا فعل ہے جس کا صدور اللہ سے مستبعد نہیں ہوتا ہے۔ یہ فعل کئی صورتوں میں سرزد ہوتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرماتا ہے۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ إِلَّا قَلِيْلًا (۳۳:۶۰) "اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے' اور وہ مدینہ میں ہیجان انگیز افواہیں پھیلاتے ہیں ایسی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے تمہیں اٹھا کھڑا کریں گے۔ پھر وہ اس شہر میں مشکل ہی سے تمہارے ساتھ رہ سکیں گے"۔ اس کا مفہوم کیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ باز نہ آئے تو اللہ اپنا ارادہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے کی صورت میں حرکت میں لائے گا اور آپ کو ان کے خلاف اٹھا کر یوں ان کو مدینہ سے نکال دے گا۔ اللہ کے ارادے کے نتیجے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خلاف قتال شروع کر دیں گے۔ یوں اللہ کے ارادے اور نبی کے ارادے میں توافق پیدا ہو جائے گا۔ دونوں کے ارادے باہم مل جائیں گے اور اللہ کا ارادہ رسول اللہ ﷺ کے اقدامات کی شکل میں نظر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کو اسی معنی میں مسخر کر دیا تھا جس طرح حضرت سلیمان چاہتے۔ اسی طرح اللہ ہواؤں کو مسخر فرما دیتا۔ یا جس طرح اللہ چاہتا اسی طرف حضرت سلیمان کا ارادہ ہو جاتا۔

اسی طرح آپ کے لیے شیاطین کو بھی مسخر کر دیا گیا اور آپ ان سے تعمیرات کا کام لیتے تھے۔ سمندر میں اور خشکی میں یہ لوگ آپ کے لیے غوطے لگاتے تھے اور جو اشیاء حضرت سلیمان چاہتے تھے وہ نکال لاتے تھے اور مخالفین اور مفسدین کو سزا دینے کی پوری پوری قدرت اللہ نے آپ کے لیے ودیعت کر دی تھی۔ مجرموں کو گرفتار کرنے 'قید کرنے اور پکڑنے کی پوری قدرت آپ کو دے دی تھی۔ آپ کی حکومت میں امن و امان کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ یعنی مجرم اکیلے اور اجتماعی شکل میں گرفتار ہو کر پابہ زنجیر کر دیئے جاتے۔

زمین میں دولت کی تقسیم کے پورے اختیارات آپ کو دے دیئے تھے۔ جسے چاہتے عطا کرتے' جسے چاہتے نہ

دیتے ـ یا جسے جس قدر چاہتے ' دے دیتے ـ

ھٰذا عطاؤنا فامنن او امسك بغیر حساب (۳۸ : ۳۹) "یہ ہماری بخشش ہے تجھے اختیار ہے ' جسے چاہے دے ـ اور جس سے چاہے روک لے کوئی حساب نہیں ہے"۔ یہ اس لیے کہ آپ کو اللہ بہت بڑا اعزاز دینا چاہتا تھا کہ آپ کی حکومت پر کوئی مالی قدغن عائد نہیں ہے ـ مزید اس پر یہ اضافہ فرمایا کہ حضرت سلیمان ہمارے نزدیک بہت ہی مقرب اور برگزیدہ بندے تھے ـ اور ان کا انجام بہتر ہو گا ـ

وان لہ عندنا لزلفی و حسن ماٰب (۳۸ : ۴۰) "یقیناً اس کے لیے ہمارے ہاں تقرب کا مقام اور بہتر انجام ہے"۔ یہ ایک نہایت ہی عظیم مقام و مرتبہ ہے جو حضرت سلیمان کو دیا گیا ـ نہایت ہی فضل و کرم اور رضامندی اور بخشش اور مہربانیاں ـ

--- ○○○ ---

حضرت سلیمان کے بعد اب حضرت ایوب علیہ السلام کا قصہ ابتلا آتا ہے اور اس کے بعد ان پر اللہ کا فضل و کرم ـ حضورؐ اور مسلمانوں کے لیے امید پیدا کی جاتی ہے ـ

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ﴿۴۱﴾ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ﴿۴۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۴۳﴾ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ۭ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾

"اور ہمارے بندے ایوب کا ذکر کرو' جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھے تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے ـ (ہم نے اسے حکم دیا) اپنا پاؤں زمین پر مار' یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے کے لیے اور پینے کے لیے ـ ہم نے اسے اس کے اہل و عیال واپس دیئے اور ان کے ساتھ اتنے ہی اور' اپنی طرف سے رحمت کے طور پر' اور عقل و فکر رکھنے والوں کے لیے درس کے طور پر ـ (اور ہم نے اس سے کہا) تنکوں کا ایک مٹھا لے اور اس سے مار دے ' اپنی قسم نہ توڑ ـ ہم نے اسے صابر پایا' بہترین بندہ ' اپنے رب کی طرف بہت رجوع کرنے والا"۔

حضرت ایوب کے صبر کا قصہ تو ایک مثال بن گیا ہے ـ اور بہت ہی معروف و مشہور ہے ـ صبر ایوبی ایک محاورہ ہے ـ لیکن اس قصے کے اوپر اسرائیلی روایات کی تہہ جم گئی ہے ـ اور حقیقت خرافات میں کھو گئی ہے ـ اصل حقیقت وہ ہے جس طرح قرآن کریم تصریح کرتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام بندۂ صالح اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے ـ اللہ کی آزمائش ان پر آئی اور اس میں انہوں نے خوب صبر فرمایا ـ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آزمائش اس طرح تھی کہ مال چلا گیا' صحت چلی گئی اور بیوی بھی ساتھ چھوڑ گئی ـ لیکن ان تمام جان لیوا تکالیف میں انہوں نے رب تعالیٰ کا دامن تھامے

رکھا۔ اللہ پر ان کا بھروسہ رہا اور وہ راضی برضائے الٰہی رہے۔

شیطان ان لوگوں کے دل میں وسوسے ڈالتا رہا جو تعداد میں تھوڑے تھے مگر ان کے ساتھ وابستہ رہے۔ ان میں سے ان کی بیوی بھی تھی۔ شیطان ان کے دلوں میں یہ وسوسے ڈالتا کہ اگر ایوب اللہ کا برگزیدہ بندہ ہوتا تو اللہ ہرگز ان کو اس آزمائش میں نہ ڈالتا۔ جب یہ لوگ حضرت ایوب کو یہ باتیں بتاتے تو مالی جسمانی مصیبت سے بھی زیادہ اذیت ان کو ان شیطانی وسوسہ اندازیوں سے ہوتی۔ جب ان کی بیوی نے ان کے سامنے ایسی باتیں کیں تو آپ نے حلف اٹھایا کہ اگر اللہ نے اس مصیبت سے نجات دی اور وہ تندرست ہوگئے تو بیوی کو کوڑے ماریں گے۔ بعض نے سوکوڑے کہا ہے۔

انہی آزمائشوں پر جب شیطان کی جانب سے ایذا رسانی بھی شروع ہوگئی اور اس کا اثر ان کے مخلصین پر بھی ہونا شروع ہوگیا اور خود ان کے دل پر اثر ہوگیا تو وہ دست بدعا ہوئے۔

أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ (۳۸ : ۴۱) "کہ شیطان نے مجھے تکالیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے"۔

جب یہ بات ظاہر ہوگئی کہ وہ سچے اور صابر ہیں اور وہ شیطانی وسوسہ اندازیوں سے بھی نفرت کرتے ہیں اور اس سے ان کی اذیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تو اب اللہ کی رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے۔ آزمائش کے دن بیت جاتے ہیں۔ ان کی صحت لوٹ آتی ہے۔ رب تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ اپنے قدموں کو زمین پر ماریں۔ ٹھنڈا پانی نکل آئے گا۔ اس سے وہ پئیں اور غسل کریں۔ صحت لوٹ آئے گی۔

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ (۳۸ : ۴۲) "اپنا پاؤں زمین پر مار' یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے اور پینے کے لیے"۔ مزید رحمتیں یوں آتی ہیں :

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَ ذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ

(۳۸ : ۴۳) "اور ہم نے اسے اہل وعیال واپس کر دیئے اور اپنی طرف سے رحمت کے طور پر ان کے ساتھ اتنے ہی اور دیئے اور عقل وفکر رکھنے والوں کے لیے درس کے طور پر"۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ اللہ نے ان کے وہ بچے زندہ کر دیئے جو فوت ہو گئے تھے اور اسی تعداد میں اور اولاد بھی دے دی۔ قرآن کریم اس بات کی صراحت نہیں کرتا کہ مردوں کو زندہ کیا گیا۔ مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو لوگ ان کو چھوڑ کر غائب ہو گئے تھے' وہ اور ان کے اہل خانہ واپس کر دیئے گئے اور پھر مزید اولاد دی گئی۔ مزید انعام اور رحمت ورعایت کے طور پر۔ اور یہ انعامات اس لیے کیے گئے کہ اہل عقل و دانش اس سے عبرت لیں۔

ان تمام قصص سے مقصود یہ ہے کہ اللہ کے جو بندے مشکلات اور آزمائشوں میں صبر کریں اللہ ان پر کرم نوازی کرتا ہے اور آخر کار ان پر کرم ہوتا ہے۔

یہ کہ ان کی قسم کا نتیجہ کیا ہوا تو اللہ کی رحمت نے ان کو اور ان کی بیوی کو ڈھانپ لیا۔ کیونکہ ان کی بیوی نے اس

طویل آزمائش میں حضرت ایوب کی بہت خدمت کی تھی ۔ اور اس نے بھی بہت ہی مصابرت سے کام لیا تھا ۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ انہوں نے جتنے کوڑے مارنے کی قسم اٹھائی ہے اتنی ہی شاخیں لیں اور ان تمام شاخوں سے ایک ہی وار اس پر کر لیں ۔ اس طرح ان کی قسم پوری ہو جائے گی اور وہ حانث نہ ہوں گے ۔

وَ خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَ لَا تَحْنَثْ (۳۸ : ۴۴) "تنکوں کا ایک مٹھا لے اور اس سے مار دے ' اپنی قسم نہ توڑ" ۔ یہ سہولت ان کو اس لیے دی گئی کہ اس عظیم امتحان میں انہوں نے اللہ کی خشاء کے مطابق صبر کیا اور اطاعت شعار بندے کے طور پر رہے اور آخر میں للہ ہی سے التجا کی ۔

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ (۳۸ : ۴۴) "ہم نے اسے صابر پایا ۔ بہترین بندہ اپنے رب کی طرف رجوع کرنے والا" ۔

یہ تین قصص تو قدرے تفصیل سے ذکر ہوئے ۔ مقصد یہ بتانا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی موجودہ مشکلات پر صبر کریں ۔ اب رسولوں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے ۔ ان کے قصص میں بھی آزمائشیں اور صبر کے واقعات ہیں اور ان پر بھی اللہ کے انعامات اور فضل و کرم ہوتے رہے ہیں جس طرح حضرت داؤد ' حضرت سلیمان اور ایوب علیہم السلام کے قصص میں آزمائشیں اور فضل و کرم ہیں ۔ ان میں سے بعض انبیاء تو ان سے پہلے گزرے ہیں اور معروف ہیں اور بعض ایسے ہیں جن کے زمانے کا تعین نہیں ہے ۔ کیونکہ قرآن اور ہمارے ہاں حقیقی تاریخی مصادر کے اندر ان کے زمانے کا تعین نہیں کیا گیا ۔

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَ الْاَبْصَارِ۝۴۵ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ۝۴۶ وَ اِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ۝۴۷ وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ ذَا الْكِفْلِ ؕ وَ كُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ۝۴۸

"اور ہمارے بندوں ' ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا ذکر کرو ۔ بڑی قوت عمل رکھنے والے اور دیدہ ور لوگ تھے ۔ ہم نے ان کو ایک خالص صفت کی بنا پر برگزیدہ کیا تھا ' اور وہ دار آخرت کی یاد تھی ۔ یقیناً ہمارے ہاں ان کا شمار چنے ہوئے نیک اشخاص میں ہے ۔ اور اسماعیل ' الیسع اور ذوالکفل علیہم السلام کا ذکر کرو ' یہ سب نیک لوگوں میں سے تھے" ۔

حضرت ابراہیم ' حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل علیہم السلام تو یقیناً حضرت داؤد اور حضرت سلیمان سے قبل تھے لیکن حضرت ایوب کے دور کے بارے میں ہمیں یقینی معلومات نہیں ہیں ۔ الیسع و ذوالکفل کے بارے میں بھی صحیح معلومات نہیں ہیں ۔ ان کے بارے میں قرآن کریم میں صرف اشارات ہی پر اکتفاء کیا گیا ہے ۔ بنی اسرائیل کے نبیوں میں سے ایک نبی کا نام عبرانی میں الیشع آتا ہے ۔ یہی عربی میں الیسع ہیں ۔ اسی لیے ہم بھی ترجیح دیتے ہیں ۔ رہے ذوالکفل تو ان کے بارے

میں زیادہ تاریخی معلومات نہیں ہیں۔

اللہ نے حضرت ابراہیم ' حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے بارے میں صرف یہ کہا ہے کہ وہ

اُولِی الْاَیْدِیْ وَ الْاَبْصَارِ (۳۸: ۴۵) "بڑی قوت رکھنے والے اور دیدہ ور لوگ تھے"۔

مطلب یہ ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں سے عمل صالح کرنے والے اور نظریاتی اعتبار سے فکر مستقیم کے مالک تھے۔ گویا جو عمل صالح نہیں کرتا وہ کمزور ہوتا ہے اور جو شخص فکر سلیم نہیں رکھتا وہ آنکھوں کے باوجود اندھا ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ان پیغمبروں کے اعزاز کی صفت کے بیان میں کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کے خالص بندے تھے۔ اور ان کی دوسری خاص صفت یہ تھی وہ دار آخرت کو ہروقت یاد کرنے والے اور اس کا لحاظ کرنے والے تھے۔ وہ صرف رضائے الٰہی اور فلاح اخروی کے لیے کام کرتے تھے۔

اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ (۳۸: ۴۶) "ان کو ایک خاص صفت کی بنا پر برگزیدہ کیا تھا اور وہ دار آخرت کی یاد تھی"۔ یہ ان کا مرتبہ اور ان کی بلندی تھی اور اس مرتبے اور بلندی نے ان کو برگزیدہ بنا دیا تھا۔

وَ اِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ (۳۸: ۴۷) "اور یقیناً ہمارے ہاں ان کا شمار چنے ہوئے نیک اشخاص میں سے ہے"۔

نیز اللہ تعالیٰ تصریح فرماتا ہے کہ حضرت اسماعیل ' حضرت ذوالکفل اور حضرت الیسع علیہم السلام اس کے برگزیدہ بندوں میں سے ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرماتا ہے کہ تم لوگ ان کی روحانی صحبت میں رہو۔ ان کے صبر و مصابرت کو یاد کرو ' اور آخر کار ان پر جو فضل و کرم ہوا ' اس کی امید رکھو۔ اور تمہاری قوم کی طرف سے جو تکذیب ہو رہی ہے اور اس پر تمہیں جو اذیت ہو رہی ہے اس کو برداشت کرو۔ کیونکہ تمام رسولان کرام کا طریقہ صبر اور مصابرت کا ہے۔ اور رسولوں کے بعد بھی تمام دعوتوں کا طریقہ بھی صبر کا ہے اور ہمیشہ یوں ہی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے صبر کرنے والے بندوں پر رحم و کرم کرتا ہے۔ ان کو قوت اور اقتدار عطا کرتا ہے اور ان پر رحمتیں اور برکتیں نازل کرتا ہے۔ اللہ کے ہاں اپنے بندوں کے لیے جو اجر اور انجام ہوتا ہے وہ بہرحال بہتر ہوتا ہے۔ اور اللہ کی رحمتوں ' اللہ کی برکتوں کے مقابلے میں سازشیوں کی سازشوں اور مکاروں کی مکاریوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ اللہ اپنے بندوں کا ہروقت نگہبان ہوتا ہے۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۲۱۳ تشریح آیات

## ۴۹ --- تا --- ۶۴

هٰذَا ذِكْرٌ ۚ وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَآبٍ ﴿٤٩﴾ جَنّٰتِ عَدْنٍ
مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْأَبْوَابُ ﴿٥٠﴾ مُتَّكِئِينَ فِيهَا يَدْعُونَ فِيهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ وَّ
شَرَابٍ ﴿٥١﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ أَتْرَابٌ ﴿٥٢﴾ هٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِيَوْمِ
الْحِسَابِ ﴿٥٣﴾ إِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهُ مِنْ نَّفَادٍ ﴿٥٤﴾ هٰذَا ۚ وَإِنَّ لِلطّٰغِينَ لَشَرَّ
مَآبٍ ﴿٥٥﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٥٦﴾ هٰذَا ۙ فَلْيَذُوقُوهُ حَمِيمٌ وَّ
غَسَّاقٌ ﴿٥٧﴾ وَّآخَرُ مِنْ شَكْلِهِ أَزْوَاجٌ ﴿٥٨﴾ هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا
مَرْحَبًا بِهِمْ ۚ إِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿٥٩﴾ قَالُوا بَلْ أَنْتُمْ ۖ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ ۖ أَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوهُ
لَنَا ۖ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٦٠﴾ قَالُوا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي
النَّارِ ﴿٦١﴾ وَقَالُوا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْأَشْرَارِ ﴿٦٢﴾ أَتَّخَذْنٰهُمْ
سِخْرِيًّا أَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْأَبْصَارُ ﴿٦٣﴾ إِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ أَهْلِ النَّارِ ﴿٦٤﴾ ع ۲۴ ۴ ۱۳

"یہ ایک ذکر تھا (اب سنو کہ) متقی لوگوں کے لیے یقیناً بہترین ٹھکانا ہے' ہمیشہ رہنے والی جنتیں جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے ۔ ان میں وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے' خوب خوب فواکہ اور مشروبات طلب کر رہے ہوں گے' اور ان کے پاس شرمیلی ہم سن بیویاں ہوں گی ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں حساب کے دن عطا کرنے کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے ۔ یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ۔ یہ تو ہے متقیوں کا انجام ۔ اور سرکشوں کے لیے بدترین ٹھکانا ہے'

جنہم جس میں وہ جھلسے جائیں گے بہت ہی بری قیام گاہ۔ یہ ہے ان کے لیے' پس وہ مزا چکھیں کھولتے ہوئے پانی اور پیپ' لہو اور اسی قسم کی دوسری تلخیوں کا۔ (وہ جہنم کی طرف اپنے پیروؤں کو آتے دیکھ کر آپس میں کہیں گے)" یہ ایک لشکر تمہارے پاس گھسا چلا آرہا ہے' کوئی خوش آمدید ان کے لیے نہیں ہے' یہ آگ میں جھلسنے والے ہیں"۔ وہ ان کو جواب دیں گے "نہیں بلکہ تم ہی جھلسے جا رہے ہو' کوئی خیر مقدم تمہارے لیے نہیں ہے۔ تم ہی تو یہ انجام ہمارے آگے لائے ہو' کیسی بری ہے یہ جائے قرار"۔ پھر وہ کہیں گے "اے ہمارے رب' جس نے ہمیں اس انجام کو پہنچانے کا بندوبست کیا' اس کو دوزخ کا دوہرا عذاب دے"۔ اور وہ آپس میں کہیں گے "کیا بات ہے' ہم ان لوگوں کو کہیں' نہیں دیکھتے جنہیں ہم دنیا میں برا سمجھتے تھے؟ ہم نے یونہی ان کا مذاق بنا لیا تھا' یا وہ کہیں نظروں سے اوجھل ہیں؟" بے شک یہ بات سچی ہے' اہل دوزخ میں یہی کچھ جھگڑے ہونے والے ہیں"۔

درس ماضی میں ہم اللہ کے مختار بندوں کے ہم محفل تھے۔ ان لوگوں کی زندگی کی آزمائش اور پھر ان کی جانب سے مشکلات پر صبر کا پہلو نمایاں طور پر موضوع سخن تھا۔ آزمائش کے بعد ان سب بندوں کو اللہ کی رحمت اور اس کے فضل و کرم نے ڈھانپ لیا۔ اس محفل ذکر میں ہمیں یہ بتانا مقصود تھا کہ اس کرۂ ارض پر یہ اعلیٰ ترین زندگی ہے اور اس عارضی زندگی کو اس طرح گزارنا چاہئے۔ اب یہاں اس سبق میں یہ بتایا جاتا ہے عالم آخرت میں اللہ کے متقی بندوں کا کیا حال ہو گا اور سرکشوں اور جھٹلانے والوں کے شب و روز کیا ہوں گے۔ گویا سابقہ سبق میں حیات فانی موضوع سخن تھا اور اس میں حیات باقیہ کے شب و روز زیر بحث ہیں۔ یہ زندگی یہاں مناظر کی شکل میں دکھائی گئی جیسا کہ قرآن کریم کا انداز ہے۔ یہاں مناسب ہے کہ میں اپنی کتاب "مشاہد قیامت" کے کچھ اقتباسات دے دوں۔

ان مناظر کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ دو مناظر ہیں اور دو انجام ہیں اور ایک دوسرے کے بالکل بالمقابل ہیں۔ مجموعی طور پر بھی ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں اور اجزاء کے اعتبار سے بھی یہ دونوں مناظر باہم متقابل ہیں۔ ہیئت و شکل اور مفہوم اور خواص کے اعتبار بھی دونوں مناظر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں۔ متعین ایک اچھے انجام تک پہنچ چکے ہیں (حسن مآب)۔ جبکہ مفسدین برے انجام تک پہنچ چکے (شر مآب)۔ اگر متقین کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے دروازے ان کے لیے ہر وقت کھلے ہیں۔

جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ (۳۸ : ۵۰) اور وہ اس میں بالمقابل تکیے لگائے بیٹھے ہیں اور اچھا کھانا اور اچھا پینا ان کو میسر ہے۔ اور ان کو نوجوان حوریں میسر ہیں اور جوانی کے باوجود وہ شرمیلی بھی ہیں۔ نہ وہ کسی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی ہیں اور نہ سر اٹھا کر چلتی ہیں اور جوانی کے ساتھ ہم عمر بھی ہیں۔ پھر یہ تمام سہولیات دائمی ہیں اور اللہ کی طرف سے ہیں اور مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ "ختم ہونے والی نہیں ہیں"۔

تو مکذبین بھی ایک جائے قرار میں نظر آتے ہیں۔ یہ بہت ہی بری جائے قرار ہے۔

فَبِئْسَ الْمِهَادُ (۳۸ : ۵۶) وہاں ان کے پینے کے لیے گرم پانی ہے اور قابل نفرت اور قے لانے والا کھانا وہ کھا رہے ہوں گے۔ یعنی ان کے زخموں کا دھوون اور پیپ۔ اس قسم کے کئی دوسرے عذاب ان کے لیے ہوں گے۔ اور ان عذابوں کو ازواج سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ان مذکورہ تلخیوں کے علاوہ دوسری بھی تلخیاں ہوں گی۔

ان دو مناظر کے بعد اب تیسرا منظر دیکھئے جس کے کردار ایک دوسرے سے ہمکلام بھی ہیں۔ اہل جہنم سرکشوں کا ایک گروہ دنیا میں ایک دوسرے کا جگری دوست تھا۔اب یہ لوگ یہاں ایک دوسرے کے لیے اجنبی اور نفرت کرنے والے ہیں۔ دنیا میں یہ گمراہی کے ہم سفر تھے۔ یہ مومنین سے اپنے آپ کو برتر سمجھتے تھے۔ مومنین کی دعوت اور ان کے منشور کے ساتھ یہ لوگ مذاق کرتے تھے۔ خصوصاً ان کے اس عقیدے کے ساتھ کہ وہ جنتوں میں ہوں گے جیسا کہ قریش کہتے تھے۔

ءَ اُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَیْنِنَا "کیا ہم میں سے ذکر اسی پر اتر گیا!"

ذرا ان کے منظر کو دیکھئے کہ یہ فوج در فوج جہنم میں گھسے جا رہے ہیں' یا دھکیلے جارہے ہیں اور ایک دوسرے سے وہ یوں ہمکلام ہیں۔

هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ (۳۸ : ۵۹) "یہ لشکر تمہارے پاس گھسا چلا آرہا ہے"۔ جواب کیا ہے؟ نہایت ہی تنگ مزاجی سے جواب آتا ہے۔

لَا مَرْحَبًا بِهِمْ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ (۳۸ : ۵۹) "کوئی خوش آمدید ان کے لیے نہیں ہے۔ یہ تو آگ میں جھلنے والے ہیں"۔ جس فوج پر یہ تبصرہ کیا جارہا ہے' وہ بھی سن کر جل بھن جاتی ہے اور ان کا جواب یہ ہے'

قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا فَبِئْسَ الْقَرَارُ (۳۸ : ۶۰) "وہ کہیں گے بلکہ تمہارے لیے کوئی خوش آمدید نہیں ہے' تم ہی تو یہ انجام ہمارے آگے لائے ہو۔ کیسی بری ہے یہ جائے قرار"۔ تم ہی تو اس مصیبت کا باعث بنے ہو۔ اب یہ لوگ نہایت دل تنگی' گھٹن اور انتقام کے جذبات سے مغلوب ہو کر یہ درخواست کرتے ہیں۔

قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِی النَّارِ (۳۸ : ۶۱) "پھر وہ کہیں گے اے ہمارے رب' جس نے ہمیں اس انجام کو پہنچایا اس کو دوزخ کا دوہرا عذاب دے"۔

اب یہ لوگ جہنم میں مومنین کو تلاش کریں گے۔ ان کا کوئی اتہ پتہ جہنم میں نہ ہو گا۔ حالانکہ یہ لوگ اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں اونچے لوگ سمجھتے تھے' اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ تو چند شریر لوگ ہیں۔ اور ان کے دستور اور منشور کے ساتھ بھی مذاق کرتے تھے۔ اور جن اعلیٰ مقاصد اور رضائے الٰہی کے لیے وہ کام کرتے تھے' اس کو حماقت سمجھتے تھے۔ یہ لوگ ان جہنم میں گھسنے والوں میں نہیں ہیں۔ یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ کہاں چلے گئے وہ لوگ۔ یہاں وہ موجود نہیں یا ہمیں نظر نہیں آتے۔

وَ قَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰی رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ (۳۸ : ۶۲) اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِیًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ (۳۸ : ۶۳) "وہ آپس میں کہیں گے "کیا بات ہے' ہم ان لوگوں

کو کہیں نہیں دیکھتے جنہیں ہم دنیا میں برا سمجھتے تھے اور ہم نے یونہی ان کا مذاق بنا لیا تھا' یا وہ کہیں نظروں سے اوجھل ہیں؟"
یہ لوگ ان کے بارے میں جہنم میں لتہ پتہ دریافت کر رہے ہیں حالانکہ وہ لوگ جنتوں کے مزوں میں ہیں۔
یہ منظر اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ اہل دوزخ میں یہ جھگڑے یونہی چلتے رہیں گے۔

إِنَّ ذَٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ أَهْلِ النَّارِ (۳۸: ۶۴) "بے شک یہ بات سچی ہے کہ اہل دوزخ میں یہی کچھ جھگڑے ہونے والے ہیں"۔

زرا دیکھئے کہ ان کا انجام اہل ایمان کے انجام سے کس قدر مختلف اور اپنے طور پر کس قدر بھیانک ہے۔ دنیا میں تو اہل جہنم متقین کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ اللہ نے ان پر جو کلام الٰہی نازل کیا ہے۔ یہ اس کے اہل ہی نہیں۔ اور یہی وہ نقشہ عذاب ہے جس کے یے وہ بچوں کی شتابی مچا رہے تھے۔ اور کہتے تھے۔

وَقَالُوا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ (۳۸: ۱۶) "اے ہمارے رب' ہمارا حصہ ہمیں یوم الحساب سے بھی پہلے ہمیں دے دے"۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۱۴ تشریح آیات

## ۶۵ --- تا --- ۸۸

یہ اس سورت کا آخری سبق ہے اور یہ ان مسائل کو دہراتا ہے جو اس سورت کے آغاز میں دہرائے گئے تھے ۔ مسئلہ توحید ' مسئلہ وحی الٰہی ' مسئلہ جزاء و سزا ' حضرت آدم علیہ السلام کے قصے کو ثبوت وحی کے لیے پیش کیا جاتا ہے کیونکہ رسولوں کا بھیجنا اس وقت طے ہو گیا تھا جب اللہ تخلیق آدم کے بارے میں فرشتوں کو بتا رہا تھا ۔ نیز اسی دن یہ طے ہو گیا تھا کہ ہدایت و ضلالت کی راہ اختیار کرنے کا حساب اللہ لے گا اور جزاء و سزا ہوگی ۔ اس قصے میں یہ بھی بتایا گیا ہے ۔ انسان کے ساتھ شیطان کو روز ازل سے حسد اور کینہ ہے کیونکہ اس نے روز اول سے اپنے آپ کو انسان سے افضل سمجھا ۔ یوں معرکہ آدم و ابلیس شروع ہوا اور یہ معرکہ ہمیشہ جاری ہے اور قیامت تک یہ جنگ سرد نہیں پڑ سکتی ۔ کوئی فریق ہتھیار نہ ڈالے گا ۔ شیطان کا ہدف یہ ہے کہ وہ انسانوں کی بڑی سے بڑی تعداد کو گمراہ کر دے تاکہ وہ ان کو جہنم رسید کر دے اور یہ وہاں اس کے ساتھی ہوں ۔ یہ شیطان کی طرف سے انسان سے انتقام ' ان کے باپ سے انتقام ہے ' اس نے آدم کو جنت سے نکالا لیکن تعجب ہے کہ ابن آدم اس کھلی دشمنی کے باوجود شیطان کی اطاعت قبول کرتا ہے ۔

سورت کا اختتام وحی الٰہی کے مضمون پر ہوتا ہے ۔ انسان کے لیے وحی الٰہی کی اہمیت بہت ہی عظیم ہے ۔ جبکہ تکذیب کرنے والے غافل وحی الٰہی کی اہمیت کو سمجھ نہیں پا رہے ۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۶۵﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿۶۶﴾

" ( اے نبی ؐ ) ان سے کہو " میں تو بس خبردار کر دینے والا ہوں ۔ کوئی حقیقی معبود نہیں ۔ مگر اللہ جو یکتا ہے ' سب پر غالب ' آسمانوں اور زمین کا مالک اور ان ساری چیزوں کا مالک جو ان کے درمیان ہیں ' زبردست اور درگزر کرنے والا " ۔

ان مشرکین سے کہو ' جن پر تحریک اسلامی کی وجہ سے دہشت طاری ہو گئی اور یہ لوگ حیران ہو کر کہتے ہیں ۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ---------- اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (۳۸ : ۵)

" کیا اس نے تمام الٰہوں کے بجائے صرف ایک الٰہ اختیار کر لیا ہے ---- یہ تو ایک عجیب چیز ہے " ۔ ان سے کہو کہ یہی تو حقیقت عظمیٰ ہے ۔

وَّ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۳۸: ۶۵) "کوئی معبود نہیں مگر اللہ جو یکتا سب پر غالب"۔ اور ان سے صاف صاف کہہ دیں کہ اختیارات میرے پاس نہیں ہیں۔ میرے ذمے جو کام ہے وہ صرف یہ ہے کہ میں لوگوں کو ڈراؤں اور اس کے بعد اللہ واحد اور قہار پر ان کا انجام چھوڑ دوں جو

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا (۳۸: ۶۶) "جو زمین و آسمان اور ان ساری چیزوں کا رب ہے جو ان کے درمیان ہیں"۔ لہٰذا اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے اور زمین و آسمان میں کسی کے لیے اس کے دربار کے سوا جائے پناہ نہیں ہے۔ وہ عزیز ہے 'قوی ہے' اور وہ گناہوں کا بخشنے والا ہے' وہ درگزر فرمانے والا ہے۔ جو لوگ توبہ کر کے اس کی پناہ گاہ میں آتے ہیں وہ محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ جو کلام عظیم میں لایا ہوں' اس کی جو قدر و قیمت تم متعین کرتے ہو' وہ اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اور اس کے تو بہت عظیم نتائج' انقلابی نتائج نکلنے والے ہیں مگر تم غافل ہو۔

قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴿٦٧﴾ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ﴿٦٨﴾

ان سے کہو "یہ ایک بڑی خبر ہے جس کو سن کر تم منہ پھیرتے ہو"۔

کہہ دو' قرآن کریم اپنے موجودہ زمانے اور مستقبل قریب کی بہ نسبت آگے چل کر بہت ہی عظیم نتائج پیدا کرنے والا ہے۔ اس کائنات میں یہ امرالٰہی ہے۔ اور اس کا تعلق اس پوری کائنات کے عظیم معاملات میں سے ہے۔ یہ اس کائنات میں جاری و ساری نظام قضا و قدر سے متعلق ہے۔ یہ قرآن اور اس کا نزول زمین و آسمانوں کے معاملات سے کوئی علیحدہ فیصلہ نہیں ہے۔ اس سے ماضی بعید کے امور بھی متعلق ہیں اور مستقبل کی تبدیلیاں بھی اس کے نتیجے میں ہوں گی۔

یہ تو ایک عظیم شہ سرخی ہے۔ یہ عظیم خبر قریش سے بھی آگے بڑھنے والی' یہ مدین اور جزیرۃ العرب سے بھی آگے پھیلنے والی ہے۔ یہ اس وقت کی موجود نسل سے بھی آگے آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک شہ سرخی ہے۔ یہ خبر زمان و مکان میں محدود رہنے والی نہیں ہے۔ یہ انسانیت کے مستقبل کے زمانوں میں اور تمام اقطار عالم میں انقلاب برپا کرنے والی خبر ہے۔ اور یہ انسانیت کے حالات اور مسائل کو اس وقت تک متاثر کرتی رہے گی جب تک قیامت برپا نہیں ہو جاتی۔ نظام کائنات میں اس خبر کے لیے جو وقت مقرر تھا۔ یہ خبر عین اپنے وقت پر نشر ہوئی ہے تاکہ اس کے ذریعے دنیا کے اندر وہ تغیرات پیدا ہوں جو اللہ چاہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دست قدرت نے اس بناء عظیم کے ذریعے انسانیت کے سفر کے لیے جو راہ متعین کی ہے اور جس طرح انسانیت کو صراط مستقیم پر ڈالا ہے اس کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو وہ انقلابی تغیرات ثابت ہوں گے۔ ان لوگوں پر تو یہ اثرات ہوئے جو ماننے والے تھے لیکن اس سے وہ لوگ بھی متاثر ہوئے جو نہ ماننے والے تھے بلکہ جو مخالف تھے۔ نزول قرآن کے دور میں جانی جانے والی نسلیں بھی اس سے متاثر ہوئیں اور بعد میں آنے والے بھی اس سے متاثر ہوئے۔ پوری انسانی تاریخ پر کسی بات' کسی خبر نے اس قدر گہرے اثرات مرتب نہیں کیے جو قرآن نے کیے۔

قرآن نے دنیا کو اعلیٰ اقدار اور برتر تصورات عطا کیے۔ اس دنیا کو ضابطہ اخلاق' ضابطہ قانون اور بین الاقوامی

قانون دیا۔ اور یہ قوانین اور انتظامات پوری انسانیت کے لیے تھے۔ ان اقدار اور ضابطہ عمل کے بارے میں عربوں نے تو سوچا ہی نہ تھا۔

عربوں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا اور نہ سوچ سکتے تھے کہ اس عظیم خبر کے نتیجے میں روئے زمین پر اس قدر تغیرات واقع ہوں گے۔ تاریخ کا دھارا بدل جائے گا۔ اس زندگی کا نقشہ اللہ کی تقدیر کے مطابق بدل جائے گا۔ انسان کے ضمیر و شعور اور اس کے حالات میں انقلاب برپا ہو جائے گا۔ اور یہ تغیرات اس لائن پر ہوں گے جس پر یہ پوری کائنات چل رہی ہے اور یہ کہ یہ خبر دراصل اس سچائی کی خبر ہے جس کے اوپر یہ کائنات چل رہی ہے اور قیامت تک زندگی نے اب اس طرح چلنا ہے اور اس طرح اس بناء عظیم نے انسانوں کی قسمت کو بدلنا ہے۔

آج مسلمانوں کا ردعمل اس خبر پر وہی ہے جس طرح ابتداء میں عربوں کا تھا۔ وہ یہ نہ سمجھ پائے کہ اس خبر کا تعلق روح کائنات کے ساتھ ہے۔ آج مسلمان بھی یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بناء عظیم اسی سچائی کی حامل ہے جس پر یہ کائنات قائم ہے۔ مسلمان اس کائنات پر اس کے اثرات کو اس طرح پیش نہیں کرتے۔ جس طرح فی الواقع وہ اثرات مرتب ہوئے۔ انسانی تاریخ پر وہ قرآنی نظریہ اور قرآنی زاویہ سے نگاہ نہیں ڈالتے بلکہ وہ انسانی اور خود اپنی تاریخ اور اس عظیم خبر کو ان لوگوں کی عینک لگا کر پڑھتے ہیں جو اسے سرے سے درست ہی نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اس کرۂ ارض پر نہ اپنے ماضی کے کردار کو سمجھے ہیں، نہ اپنے حالیہ کردار کی اہمیت کو سمجھے ہیں اور نہ مستقبل میں جو کردار انہوں نے ادا کرنا ہے اس کو سمجھے ہیں۔ حالانکہ قیامت تک یہ کردار ادا کرنا ان کا فریضہ ہے۔

ابتدائی دور کے عرب یہ سمجھتے تھے کہ یہ معاملہ عربوں کا ہے، قریش کا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اور صرف یہ ہے کہ عربوں سے محمد نامی شخص کو نبی چن لیا گیا حالانکہ ان کے خیال میں وہ کوئی بڑا آدمی نہ تھا۔ ان کے ارادے اور ان کی سوچ اس قدر محدود شکل میں تھی۔ قرآن کریم ان سے کہتا ہے کہ یہ کوئی میونسپل مسئلہ نہیں ہے، یہ تو بہت ہی عظیم امر ہے۔ یہ محمد ابن عبداللہ کا ذاتی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ تو صرف اس عظیم خبر کو نشر کرنے والے ہیں۔ یہ خود اس کے موجد بھی نہیں ہیں۔ وہ صرف وہ بات کہہ رہے ہیں جس کے بارے میں ان کو حکم دیا گیا ہے کہ اس عظیم خبر کا اعلان کر دو۔ محمد کو کیا پتہ کہ آغاز کائنات میں اللہ نے تخلیق انسانیت کے بارے میں کیا مکالمہ کیا۔

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَإِ الْأَعْلَىٰ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿٦٩﴾ إِن يُوحَىٰ إِلَيَّ إِلَّا أَنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٧٠﴾

”(ان سے کہو) ”مجھے اس وقت کی کوئی خبر نہ تھی جب ملاء اعلیٰ میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ مجھ کو تو وحی کے ذریعہ سے یہ باتیں صرف اس لیے بتائی جاتی ہیں کہ میں کھلا کھلا خبردار کرنے والا ہوں“۔

یہاں پھر قصہ انسانیت شروع ہوتا ہے کہ اس بناء عظیم میں انسان کا کیا مقام ہے۔ اس وقت عالم بالا میں وہ مکالمہ ہوا جس سے انسانی تاریخ کی لائن متعین ہوتی ہے۔ اور انسانی قدریں متعین ہوتی ہیں اور اسی نظریہ اور فلسفہ کی تبلیغ کے لیے حضرت محمد ﷺ بھیجے گئے ہیں۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝

"جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا "میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں' پھر جب میں اسے پوری طرح بنا دوں' اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ"۔

ہمیں اس کا علم نہیں ہے کہ یہ مکالمہ کس انداز میں ہوا۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی فرشتوں کے ساتھ مکالمے کی کیفیت کیا ہے اور یہ بھی ہمیں معلوم نہیں ہے کہ فرشتے اللہ سے ہدایات کس طرح اخذ کرتے ہیں۔ نہ ہم فرشتوں کی حقیقت سے باخبر ہوں۔ نہ ہمیں ان مسائل میں الجھنے کی ضرورت لاحق ہے اور نہ کوئی فائدہ متوقع ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس قصے کا جو مطلب ہے اور اس کے اندر جو فلسفہ ہے اس پر بات کریں۔

اللہ نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ جس طرح زمین کی تمام ذی روح چیزوں کو مٹی سے بنایا۔ تمام زندہ مخلوقات کے عناصر ترکیبی مٹی میں موجود ہیں۔ صرف ایک چیز ابھی تک راز ہے کہ روح اور حیات اس کے اندر کہاں سے آئی اور کس طرح آئی۔ اس راز کے سوا انسان کی ذات کے تمام عناصر مٹی سے ہیں۔ اور انسان دوسرے حیوانوں کے مقابلے میں انسان قرار پایا۔ وہ اسی روح کی وجہ سے جو اللہ نے اس کی ذات کے اندر پھونکا۔ انسان کی ماں یہ زمین ہے۔ زمین کے عناصر سے اس کی تخلیق ہوئی ہے اور جب اس سے روح جدا ہوتی ہے تو وہ پھر مٹی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جب اس کے جسد خاکی سے روح نکلتی ہے تو اس سے اس کے آثار علوی نکل جاتے ہیں۔

روح کی پھونک کی کیا حقیقت ہے' اس کی ماہیت سے ہم بے خبر ہیں' البتہ روح کے آثار ہمارے علم میں ہیں۔ یہ روحانی آثار ہیں جن کی بنا پر یہ حضرت انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور اس روح ہی کی وجہ سے وہ روحانی اور عقلی ارتقاء کرتا ہے۔ یہ روح ہی ہے جس کی وجہ سے انسان ماضی سے تجربات حاصل کرتا ہے۔ اور مستقبل کے لیے راہ عمل متعین کرتا ہے۔ اس طرح انسانی عقل حواس کے مدرکات اور عقل کے مدرکات سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ اور اسے وہ روحانی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو حواس اور عقل کے دائرے سے وراء ہیں۔

عقل اور روحانی ارتقاء انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس زمین پر زندہ ہونے والے تمام دوسرے ذی حیات انسان کے ساتھ اس خاصہ میں شریک نہیں ہیں۔ جب سے انسان پیدا ہوا ہے اس کے ساتھ دوسرے حیوانات بھی پیدا ہوئے۔ لیکن انسان اور زمین کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حیوانات میں سے کوئی حیوان عقل اور روح کے اعتبار سے انسان جیسی ترقی کر گیا ہو۔ اگر ہم عضویاتی ارتقاء کو تسلیم بھی کر لیں لیکن عقلی ارتقاء کی کوئی مثال نہیں ہے۔

اللہ نے اس بشری مخلوق میں اپنی روح پھونکی ہے۔ کیونکہ اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ یہ حضرت انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہو اور اس خلافت اور نیابت کی رو سے زمین کے اختیارات اپنے حدود قدرت کی حد تک سنبھال لے۔ یعنی اس کی تعمیر کرے۔ اس کے اندر پوشیدہ قوتوں کو اپنے کام میں لائے اور یہاں خدا کی منشاء کو پورا کرے۔

اللہ نے انسان کو ترقی اور حصول علم کی قوت دی اور اپنے روز آفرینش سے وہ ترقی کر رہا ہے بشرطیکہ وہ اس روح

کے منبع سے جڑا رہے یعنی ذات باری سے ۔ اور ذات باری سے وہ صراط مستقیم کی طرف گامزن ہونے کی ہدایت لیتا رہے لیکن اگر وہ عالم بالا کی ہدایات سے منحرف ہو جائے تو پھر انسان کی ذات میں ترقی اور آگاہی کا جو تموج ہے وہ متوازن نہیں رہتا۔ اور اس کی سمت بھی درست نہیں رہتی۔ اور بعض اوقات انسان آگے بڑھنے کے بجائے ترقی معکوس کرتا ہے اور یہ تموج پھر اس کی ذاتی اور انسانی سلامتی کے لیے خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اگر وہ انسانی خصوصیات میں رجعت قہقری اختیار کر لے تو حقیقی ارتقاء کے بجائے وہ زوال کی راہ پر پڑ جاتا ہے۔ اگرچہ بظاہر اس کے علوم و فنون زیادہ ہو گئے ہوں۔ وہ تجربات میں بہت آگے جا چکا ہو اور زندگی کے بعض پہلوؤں کے اعتبار سے ترقی کر گیا ہو۔

یہ انسان! نہایت ہی چھوٹا انسان 'کائنات کے ان عظیم اور ہولناک اجسام و کرات کی یہ نسبت! یہ انسان! جس کی قوتیں نہایت محدود ہیں جس کا عمل بہت قصیر ہے۔ جس کا علم بہت ہی محدود ہے۔ یہ انسان اس قدر عظمت و کرامت حاصل ہی نہ کر سکتا تھا۔ اگر اللہ نے اس میں اپنی روح نہ پھونکی ہوتی اور اس پر اللہ کا یہ مخصوص کرم نہ ہوا ہوتا۔

ذرا سوچو 'اس انسان کی حیثیت ہی کیا ہے۔ یہ تو اس کائنات کے اندر ایک نہایت ہی چھوٹا سا کیڑا ہے اور یہ لَاتَعُدُّ وَلَا تُحْصِی دوسرے زندہ کیڑوں 'مکوڑوں اور پرندوں اور چرندوں کے ساتھ یہاں رہتا ہے اور یہ زمین کیا ہے 'یہ کسی ایک نظام شمسی میں چھوٹی سی گیند ہے اور اس قسم کی کئی بلین گیندیں اس کائنات میں تیرتی پھرتی ہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کا آغاز کہاں سے ہے اور انتہا کہاں پر ہے 'یہ انسان! اس انسان کو فرشتے سجدہ کرتے ہیں۔ اللہ کے فرشتے 'یہ محض اس نفخ روح کی وجہ سے ہے جو نہایت ہی گہرا راز ہے اور عظیم راز ہے۔ اس راز ہی کی وجہ سے یہ انسان زمان قدیم سے محض حیوان رذیل نہیں ہے۔ اگر اس سے یہ روح اور روحانیات کو منفی کر دیا جائے تو یہ ایک حقیر مٹی کا ٹکڑا ہے۔ ملائکہ نے بہرحال امرالہی کی تعمیل کی۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۷۳﴾

"حکم کے مطابق فرشتے سب کے سب سجدے میں گر گئے"۔ کس طرح سجدہ کیا۔ کہاں کیا' کب کیا؟ یہ سب اللہ کے علوم غیبیہ سے ہیں۔ اگر یہ معلومات اللہ فراہم ہی کر دیتا تو اس سے اس قصے کے مفہوم اور مطلب میں کسی چیز کا اضافہ نہ ہوتا۔ قصے 'کا مقصد یہ ہے کہ مٹی سے بنایا ہوا یہ حضرت انسان جو دوسرے حیوانات کی طرح ہے کس طرح مکرم اور مسجود ملائک بن گیا۔ یوں کہ اسے نفخ ربانی کی وجہ سے یہ برتری حاصل ہوئی۔ اس کی روح اور روحانیات کی وجہ سے نہ جسم اور جسمانیات کی وجہ سے۔

ملائکہ نے از راہ امتثال امرالہی سجدہ کر لیا۔ وہ اس کی حکمت کو پا گئے تھے۔ کیونکہ اللہ ان کو سکھا گیا تھا۔

اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾

"مگر ابلیس نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا"۔ کیا ابلیس فرشتوں میں سے تھا؟ ظاہر یہ ہے کہ نہ تھا۔ کیونکہ اگر یہ فرشتوں میں سے ہوتا تو معصیت کیسے کرتا اس لئے کہ فرشتے تو اللہ کے اوامر سے معصیت نہیں کرتے اور ان کو جو بھی حکم دیا جاتا ہے۔ اسے وہ کر گزرتے ہیں۔ آئندہ یہ بات آئے گی کہ یہ آگ سے پیدا شدہ مخلوق ہے۔ اور

یہ بات معقول ہے کہ فرشتے نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن وہ فرشتوں میں رہتا تھا۔ اور اسے بھی حکم دیا گیا تھا کہ سجدہ کرو۔ اور حکم دیتے وقت صرف فرشتوں کا تذکرہ ہوا۔ اور اس کا تذکرہ نہ ہوا یعنی "یہ نہیں کہا کہ اے فرشتو اور شیطان سجدہ کرو"۔ اس لیے کہ اللہ کے علم میں تھا کہ یہ نافرمانی کرے گا لہٰذا اسے نظرانداز کرنے کے لیے ایسا کیا گیا۔ ہمیں تب معلوم ہوا کہ شیطان کو بھی سجدے کا حکم دیا گیا تھا جب اس پر عتاب نازل ہوا۔

قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ۖ أَسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِينَ ﴿٧٥﴾

"رب نے فرمایا "اے ابلیس، تجھے کیا چیز اس کو سجدہ کرنے سے مانع ہوئی جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے؟ تو بڑا بن رہا ہے یا تو ہے ہی کچھ اونچے درجے کی ہستیوں میں سے"۔

میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا؟ اللہ تو سب مخلوقات کا خالق ہے۔ لہٰذا انسان کی تخلیق میں کوئی امتیازی بات ہے، اس لیے یہاں اللہ نے اپنے دست قدرت کا ذکر کیا۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے اس مخلوق پر مخصوص عنایات کی ہیں، اس میں اپنی مخصوص روح پھونکی ہے اور اس پر بہت کچھ عنایات کی ہیں۔

تو نے میرے حکم کے مقابلے میں سرکشی کی ہے یا تو کچھ اونچے درجے کی ہستیوں میں سے ہے۔ (أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِينَ (۳۸: ۷۵) یعنی ان لوگوں میں سے ہے جو میری بغاوت پر تلے ہوئے ہوتے ہیں۔

قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ ۖ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ﴿٧٦﴾

"اس نے جواب دیا "میں اس سے بہتر ہوں، آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے"۔

اس جواب سے حسد ٹپکا پڑتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جسد آدم میں مٹی کے عنصر سے جو زائد عنصر ہے، شیطان اس سے غافل تھا۔ یہ وہی زائد عنصر تھا یعنی روح ربانی جو اس عزت افزائی کا مستحق تھا۔ بہرحال یہ اس ذات کی جانب سے ایک کورا جواب ہے جو اس منظر میں ہر قسم کی خیر اور بھلائی سے محروم ہوتی ہے۔

چنانچہ بارگاہ رب العزت سے حکم نامہ جاری ہوا اور اس قبیح ذات کو دربار عالیہ سے نکال دیا گیا۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ﴿٧٧﴾ وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ﴿٧٨﴾

"فرمایا "اچھا تو یہاں سے نکل جا، تو مردود ہے، اور تیرے اوپر یوم الجزاء تک میری لعنت ہے"۔

یہ واضح نہیں ہے کہ منہا کی ضمیر کس طرف عائد ہوتی ہے۔ کیا یہ جنت کی طرف راجع ہے اور یہ خبیث جنت میں تھا۔ یا اس کا مرجع رحمت الٰہیہ ہے۔ دونوں کی طرف یہ ضمیر راجع ہو سکتی ہے۔ اس پر کسی مباحثہ کی ضرورت نہیں ہے۔ غرض شیطان راندۂ درگاہ ہو گیا اس پر اللہ کی لعنت ہوئی اور غضب ہوا کیوں؟ اس لیے کہ اس نے امرالٰہی کے مقابلے

میں سرکشی اختیار کی اور اللہ کے احکام کے مقابلے میں جرات اور جسارت کا مظاہرہ کیا۔

اب یہ حسد دشمنی میں بدل جاتا ہے اور شیطان انتقام کا منصوبہ بناتا ہے۔

قَالَ رَبِّ فَأَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿٧٩﴾

وہ بولا "اے میرے رب ' یہ بات ہے تو پھر اس وقت تک کے لیے مجھے مہلت دے دے جب یہ لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے"۔ اللہ کی مشیت کا تقاضا یوں تھا کہ اس کی درخواست منظور کر لی جائے اور اسے قیامت تک فرصت و مہلت دے دی جائے۔

قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿٨٠﴾ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿٨١﴾

فرمایا "اچھا ' تجھے اس روز تک کی مہلت ہے جس کا وقت مجھے معلوم ہے"۔

شیطان نے اپنے مقاصد صاف صاف بتا دیئے کہ اپنی کینہ پروری وہ ان مقاصد کے لیے استعمال کرے گا۔

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٢﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿٨٣﴾

اس نے کہا "تیری عزت کی قسم ' میں سب لوگوں کو بہکا کر رہوں گا ' بجز تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے خالص کر لیا ہے"۔

اس نے اپنا منہاج کار بھی متعین کر دیا ' وہ اللہ کی عزت کی قسم اٹھا کر اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ میں ان تمام انسانوں کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ ہاں وہ صرف ان لوگوں کو مستثنیٰ کرتا ہے جن پر اس کا بس نہیں چلتا۔ اس لیے نہیں کہ اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ وہ کچھ مہربانی کرنا چاہتا ہے بلکہ وہ اس کے دام میں آنے والے نہیں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ شیطان کی دست درازیوں سے محفوظ ہیں۔ ان کے اور شیطان کے درمیان کیا پردہ ہوتا ہے؟ وہ یہ کہ بندہ اللہ کی بندگی اخلاص کے ساتھ کرے تو وہ شیطان کی دسترس سے دور ہو جاتا ہے۔ یہی طریق نجات ہے اور یہی زندگی کی مضبوط رسی ہے۔ اور یہ بھی اللہ کے ارادے اور تقدیر کے مطابق ہوتا ہے۔ اللہ کی مشیت کے دائرہ کے اندر ہلاکت یا نجات ملتی ہے۔ اس موقعہ پر اللہ نے بھی اپنے ارادے کا برملا اظہار کر دیا اور اللہ نے بھی اپنے منہاج کا اعلان کر دیا۔

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُولُ ﴿٨٤﴾ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكَ وَمِمَّن تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٥﴾

فرمایا "تو حق یہ ہے ' اور میں حق ہی کہا کرتا ہوں ' کہ میں جہنم کو تجھ سے اور ان سب لوگوں سے بھر دوں گا جو ان انسانوں میں سے تیری پیروی کریں گے"۔

اللہ حق بات کہتا ہے اور ہمیشہ حق بات کہتا ہے۔ اس بات کی طرف اس سورت میں مختلف اسالیب میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ دو فریق مقدمہ جو دیوار پھلانگ کر داؤد علیہ السلام کے پاس برائے فیصلہ پہنچ گئے تھے وہ کہتے ہیں۔

فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ (۳۸ : ۲۲) "ہمارے درمیان حق پر مبنی فیصلہ کرو اور بے انصافی نہ کرو"۔

اللہ اپنے بندے داؤد کو کہتا ہے۔

فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى (۳۸ : ۲۶) "لوگوں کے درمیان حق پر ہی فیصلہ کرو اور اپنی خواہش کی پیروی نہ کرو"۔ اس کے بعد زمین اور آسمانوں کی تخلیق کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ تخلیق حق پر ہوئی ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

(۳۸ : ۲۷) "اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو باطل طور پر پیدا نہیں کیا۔ یہ ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا"۔ اس کے بعد حق کا تذکرہ اللہ قوی اور عزیز کی زبان پر ہوتا ہے۔

فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ (۳۸ : ۸۴) "تو حق یہ ہے اور میں حق ہی کہا کرتا ہوں"۔

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۳۸ : ۸۵) "کہ میں جہنم کو تجھ سے اور ان لوگوں سے بھر دوں گا جو ان انسانوں میں سے تیری پیروی کریں گے"۔ یہ ہے معرکہ انسانوں یعنی بنی آدم اور شیطان کے درمیان۔ یہ معرکہ باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ہے۔ اور اللہ نے بھی ان کو ان کا انجام نہایت ہی واضح الفاظ میں بتا دیا۔ اور اس وضاحت کے بعد اب لوگ جو راہ اختیار کریں وہ خود ذمہ دار ہوں گے۔ اللہ کی رحمت کا تقاضا یہ ہوا کہ لوگوں کو بے خبری میں نہ پکڑا جائے۔ نہ جہالت میں رکھ کر پکڑ لیا جائے۔ اس لیے اللہ نے انبیائے منذرین ان کے پاس بھیجے۔

سبق کے آخر اور سورت کے اختتام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو آخری بات صاف طور پر کہہ دی جائے۔

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴿۸۶﴾ ۵
اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴿۸۸﴾ ع ۲۴
۱۴

"(اے نبیؐ) ان سے کہہ دو کہ میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا' اور نہ میں بناوٹی لوگوں میں سے ہوں۔

یہ تو ایک نصیحت ہے تمام جہان والوں کے لیے اور تھوڑی مدت ہی گزرے گی کہ تمہیں اس کا حال خود معلوم ہو جائے گا"۔ یہ تو خالص نجات کی دعوت ہے ۔انجام بتا دیا گیا اور اس سے خوب ڈرا بھی دیا گیا۔ یہ ایسی مخلصانہ دعوت ہے کہ داعی کسی اجر و انعام کا طلبگار نہیں ہے ۔ یہ داعی سلیم الفطرت ہے ۔ وہ عام لوگوں کی زبان میں بات کرتا ہے ۔ کوئی تکلیف اور کوئی بناوٹ اس کی بات میں نہیں ہے ۔ وہ وہی باتیں کرتا ہے جو اسے فطرت کی منطق سکھاتی ہے اور جو قریب الفہم ہے اور یہ ان لوگوں کے لیے یاددہانی ہے، جو اپنی غفلت کی وجہ سے اس وعظ و نصیحت کو بھول چکے ہیں اور یہ تو وہ عظیم خبر اور شہ سرخی ہے جس کے نتائج عنقریب وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے ۔ لیکن بہت ہی تھوڑی دیر کے بعد ۔ یہ پورے کرۂ ارض کی عالمی خبر ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کے چند سال بعد ہی ان لوگوں نے اس کے نتائج دیکھ لیے ۔ اور قیامت میں بھی اس کے نتائج دیکھ لیں گے کہ انسانوں اور جنوں سے جہنم کو بھر دیا جائے گا۔

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَ مِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۳۸ : ۸۵) "میں ضرور جہنم کو تجھ سے اور ان سب لوگوں سے بھر دوں گا جو ان انسانوں میں سے تیری پیروی کریں گے"۔

یہ اس سورت کا خاتمہ ہے اور یہ اس سورت کے افتتاحی کلام اور اس کے موضوعات و مسائل سے ہم آہنگ ہے' جن کے بارے میں اس سورت میں بحث کی گئی ہے ۔ یہ ایک آخری اور گہری ضرب ہے ۔ اور اس کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ اسلامی انقلاب کی اس تحریک کی خبریں مستقبل میں کیا ہوں گی۔

وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ (۳۸ : ۸۸) "تھوڑے ہی وقت کے بعد تم اس کی خبر پا لو گے"۔

صدق اللہ العظیم

مانسہرہ جمعہ ۲۲ جولائی ۱۹۹۴ء

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ----- ۲۳

### سورۃ الزمر ۔ ۳۹

آیات ۱--- تا--- ۳۱

# سورۃ الزمر ایک نظر میں

اس پوری سورت میں مسئلہ توحید کو لیا گیا ہے۔ انسان کے دل و دماغ کو پے در پے سوچ کی وادیوں کی سیر کرائی گئی ہے۔ اور انسانی سوچ کی تاروں کو بار بار مضراب سے چھیڑا گیا ہے اور بار بار ان پر شدید ضربات لگائی گئی ہیں تاکہ انسانی فکر میں مسئلہ توحید کو اچھی طرح بٹھا دیا جائے اور انسانی عقائد کو شرک اور شرک کے شائبہ تک سے پاک کر دیا جائے اور انسانی فکر و نظر پر شرک کا خفیف سا سایہ بھی باقی نہ رہے۔ اس لیے یہ سورت آغاز سے انجام تک ایک ہی موضوع رکھتی ہے۔ البتہ اس موضوع پر متنوع اسالیب سے بات کی گئی ہے جس طرح قرآن کا طریقہ ہے۔

سورت کے آغاز ہی سے مسئلہ توحید نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے اور پوری سورت میں یہی نظر آتا ہے کہ اس سورت میں عقیدۂ توحید ہی سے بحث ہو گی۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۳۹ : ۱) اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (۳۹ : ۲) اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (۳۹ : ۳) "اے نبی' یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف برحق نازل کی ہے۔ لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو' دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ خبردار دین خالص اللہ کا حق ہے"۔ اس سورت میں آیات کے مقاطع پر بار بار منصوص طور پر یا اشارۃً یا معناً عقیدہ توحید ہی کو لایا گیا ہے۔

منصوص طور پر یوں مثلاً

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (۳۹ : ۱۱) وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ (۳۹ : ۱۲) قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّیْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۳۹ : ۱۳) قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِیْ (۳۹ : ۱٤) فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ (۳۹ : ۱۵) (۱۱ تا ۱۴۔) "اے نبی' ان سے کہو مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں خود مسلم بنوں' کہو اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔ کہہ دو کہ میں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کروں گا۔ تم اس کے سوا جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو"۔

اور دوسری جگہ ہے :۔

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ (۳۹ : ۶۴) وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۳۹ : ۶۵) بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ (۳۹ : ۶۶) "اے نبی' ان سے کہو' پھر کیا اے جاہلو' تم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کے لیے مجھ سے کہتے ہو؟ تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے تمام انبیاء کی طرف یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضائع ہو جائے گا اور تم خسارے میں رہو گے ۔ لہٰذا تم بھی اللہ ہی کی بندگی کرو اور شکر گزار بندوں میں ہو جاؤ" ۔

اور مفہوم کے اعتبار سے بھی ' مثلاً

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۹ : ۲۹) "اللہ ایک مثال دیتا ہے ۔ ایک شخص تو وہ ہے جس کے مالک ہونے میں بہت سے کج خلق آقا شریک ہیں جو اسے اپنی طرف کھینچتے ہیں اور دوسرا شخص پورا کا پورا ایک ہی آقا کا غلام ہے ۔ کیا ان دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے؟ الحمدللہ ۔ مگر اکثر لوگ نادانی میں پڑے ہوئے ہیں" ۔ یا یہ قول ۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۳۹ : ۳۶) وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ (۳۹ : ۳۷) "اے نبی' کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ یہ لوگ اس کے سوا دوسروں سے تم کو ڈراتے ہیں حالانکہ اللہ جس کو گمراہی میں ڈال دے اسے کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہے اور جسے وہ ہدایت دے اسے بھٹکانے والا بھی کوئی نہیں ہے ۔ کیا اللہ زبردست اور انتقام لینے والا نہیں ہے" ۔

حقیقت توحید جو اس سورت کا اہم موضوع ہے ۔ اور اسے یہ سورت مومن کے دل و دماغ میں اچھی طرح بٹھانا چاہتی ہے لیکن اس کے علاوہ دل مومن کو جگانے کے لیے اور اس کے اندر شدید احساس پیدا کرنے کے لیے اور اسے اخذ ہدایت کے لیے تیار پاکر ہوکر دعوت حق پر لبیک کہنے کا جوش لانے کے لیے اس سورت میں خصوصی ہدایات و اشارات بھی ہیں ۔ مثلاً یہ فرمان ۔

وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى فَبَشِّرْ عِبَادِ (۳۹ : ۱۷) الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳۹ : ۱۸) "جن

لوگوں نے طاغوت کی بندگی سے اجتناب کیا اور اللہ کی طرف رجوع کر لیا - ان کے لیے خوشخبری ہے - پس اے نبی بشارت دو میرے ان بندوں کو جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں - یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی اور یہی دانشمند ہیں -

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۳۹ : ۲۳) "اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے' ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزاء ہم رنگ ہیں' اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں' اسے سن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں - یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے وہ راہ راست پر لے آتا ہے' جسے چاہتا ہے اور جسے اللہ ہی ہدایت نہ دے اس کے لیے پھر کوئی ہادی نہیں" -

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ (۳۹ : ۸) "انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتا ہے - پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نوازتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پہلے پکار رہا تھا اور دوسروں کو اللہ کا ہمسر ٹھہراتا ہے تاکہ اس کی راہ سے گمراہ کرے - اے نبی اس سے کہو تھوڑا اپنے کفر سے لطف اٹھا لے یقیناً تو دوزخ میں جانے والا ہے" -

اس سورت کے اندر ایک خاص بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے - وہ یہ کہ اس سورت کے آغاز سے آخر تک اس پر قیامت کا سایہ چھایا ہوا ہے - اور اس کے تمام مختصر راؤنڈز میں سیاق کلام انسان کو عالم آخرت کی سیر کراتا ہے - اور انسان کا بڑا وقت عالم آخرت کی سیر میں گزرتا ہے - یہ ہے اس سورت کا پہلا دائرہ کلام اور اس پر اس میں بار بار نہایت ہی موثر دلائل دیئے گئے ہیں بار بار - چنانچہ اس سورت میں بار بار قیامت کے مناظر آتے ہیں یا ہر آیت کے مقطع میں قیامت کی طرف صراحت کے ساتھ یا رمز کے ساتھ اشارہ موجود ہے - مثلاً درج ذیل اشارات اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ (۳۹ : ۹) "وہ جو مطیع فرمان ہے' رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا ہے اور سجدے کرتا ہے' آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت سے امید لگاتا ہے -

قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۳۹ : ۱۳) "کہو' اگر میں اپنے

رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے"۔

أَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ أَفَأَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ (۳۹ : ۱۹) "اے نبیؐ اس شخص کو کون بچا سکتا ہے جس پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہو؟ کیا تم اسے بچا سکتے ہو جو آگ میں گر چکا ہو۔

أَفَمَنْ يَتَّقِي بِوَجْهِهِ سُوءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۳۹ : ۲۴) "اب اس شخص کی بدحالی کا تم کیا اندازہ کر سکتے ہو جو قیامت کے روز عذاب کی سخت مار اپنے منہ پر لے گا"۔

وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۳۹ : ۲۶) "اور آخرت کا عذاب تو اس سے شدید تر ہے، کاش یہ لوگ جانتے"۔

أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِلْكَافِرِينَ (۳۹ : ۳۲) "کیا کافروں کے لیے جہنم میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے"۔

وَلَوْ أَنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ مِنْ سُوءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَبَدَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ (۳۹ : ۴۷)

"اگر ان ظالموں کے پاس زمین کی ساری دولت بھی ہو، اور اتنی ہی اور بھی تو یہ روز قیامت کے برے عذاب سے بچنے کے لیے سب کچھ فدیے میں دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ وہاں اللہ کی طرف ان کے سامنے وہ کچھ آئے گا جس کا انہوں نے کبھی اندازہ ہی نہیں کیا ہے"۔

وَأَنِيبُوا إِلَى رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا لَهُ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ (۳۹ : ۵۴) وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (۳۹ : ۵۵) أَنْ تَقُولَ نَفْسٌ يَا حَسْرَتَى عَلَى مَا فَرَّطْتُ فِي جَنْبِ اللَّهِ وَإِنْ كُنْتُ لَمِنَ السَّاخِرِينَ (۳۹ : ۵۶) أَوْ تَقُولَ لَوْ أَنَّ اللَّهَ هَدَانِي لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (۳۹ : ۵۷) أَوْ تَقُولَ حِينَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ أَنَّ لِي كَرَّةً فَأَكُونَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ (۳۹ : ۵۸) "پلٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور مطیع بن جاؤ، قبل اس کے کہ تم پر عذاب آ جائے اور پھر کہیں سے تمہیں مدد نہ مل سکے۔ اور پیروی اختیار کر لو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب کے بہترین پہلو کی قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آ جائے اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی شخص کہے "افسوس میری اس تقصیر

جو میں اللہ کی جناب میں کرتا رہا' بلکہ میں تو الٹا مذاق اڑانے والوں میں سے تھا" ۔ یا کہے "کاش اللہ نے مجھے ہدایت بخشی ہوتی تو میں متقیوں میں سے ہوتا یا عذاب دیکھ کر کہے کاش مجھے ایک موقع اور مل جائے اور میں بھی نیک عمل کرنے والوں میں شامل ہو جاؤں" ۔ یہ مقاطع اور آیات کے آخری حصے ان مکمل مناظر اور مشاہد قیامت سے علیحدہ ہیں جو اس سورت کا بڑا حصہ ہیں اور جن کی پوری فضا قیامت کے مضامین پر مشتمل ہے ۔

رہے وہ کائناتی مناظر' جو تمام مکی سورتوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں' خصوصاً اسلامی نظریہ حیات پر بطور دلائل و نشانات تو وہ بھی اس سورت میں ہیں مگر بہت ہی کم ۔

ایک کائناتی منظر سورت کے آغاز ہی میں ہے ۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ یُکَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّیْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی اَلَا هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ

( ۳۹ : ۵ ) "اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ۔ وہی دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے ۔ اس نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کر رکھا ہے کہ ہر ایک 'ایک وقت مقرر تک چلے جا رہا ہے ۔ جان رکھو' وہ زبردست ہے اور درگزر کرنے والا ہے" ۔ اور ایک دوسرا منظر سورت کے وسط میں ہے ۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَکَهٗ یَنَابِیْعَ فِی الْاَرْضِ ثُمَّ یُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ یَهِیْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَجْعَلُهٗ حُطَامًا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِی الْاَلْبَابِ ( ۳۹ : ۲۱ ) "کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا' پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا' پھر اس پانی کے ذریعہ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں ۔ پھر وہ کھیتیاں پک کر سوکھ جاتی ہیں ۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ گئیں' پھر آخر کار ان کو بھس بنا دیتا ہے ۔ درحقیقت اس میں ایک سبق ہے عقل رکھنے والوں کے لیے" ۔

ان دونوں کھلے مشاہد اور مناظر میں زمین و آسمان کی تخلیق کی طرف مختصر اشارات کیے گئے ہیں ۔ اس سورت میں انسانی زندگی کی جھلکیاں بھی دکھائی گئی ہیں ۔ انسانی نفسیات میں گہرائیوں تک جا کر بعض موتی نکال لائے گئے ہیں ۔ اور یہ اس سورت میں جگہ جگہ بکھیر دیے گئے ہیں ۔

آغاز ہی میں تخلیق انسانیت کی کہانی ہے ۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ یَخْلُقُكُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ

رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (۳۹ : ۶) "اس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا' پھر وہی ہے جس نے اس جان سے اس کا جوڑا بنایا اور اس نے تمہارے لیے مویشیوں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے ۔ وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں میں تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے ۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے' بادشاہی اس کی ہے 'کوئی معبود اس کے سوا نہیں ۔ پھر تم کدھر پھرائے جا رہے ہو ۔

اور مشکلات اور آسانیوں میں نفس انسانی کا مختلف ردعمل ۔

وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْۤا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ (۳۹ : ۸) "انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتا ہے ۔ پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نواز دیتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پہلے پکار رہا تھا" ۔

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ (۳۹ : ۴۹) "انسان کو جب مصیبت چھو جاتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے اور جب ہم اسے اپنی طرف سے نعمت دے کر اٹھا دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے علم کی بنا پر دیا گیا ۔

نیز یہ کہ انسانی جانیں اور نفوس دراصل ہر حال میں اللہ کے قبضے میں ہیں ۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳۹ : ۴۲) "یہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت روحیں قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا ہے اس کی روح نیند میں قبض کر لیتا ہے ۔ پھر جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کرتا ہے' اسے روک لیتا ہے اور دوسروں کی روحیں وقت مقررہ تک کے لیے واپس بھیج دیتا ہے ۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں" ۔

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کہ پوری سورت میں آخرت کی فضا ہے ۔ اور سورۃ کا خاتمہ بھی ایک ایسے منظر پر ہوتا ہے جس میں آخرت کے حالات عیاں ہیں ۔

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَ قِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۳۹ : ۷۵) "اور تم دیکھو گے کہ فرشتے عرش کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنے رب کی حمد و تسبیح کر رہے ہوں گے اور لوگوں کے درمیان ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ ہو گا اور پکار دیا جائے گا کہ حمد ہے اللہ رب العالمین کے لیے" ۔

آخرت کی یہ فضا ۔ اس پوری سورت کے مضامین اور اس کی فضا کے ساتھ نہایت موزوں ہے ۔ اور رنگ اور ان

احساسات کے مطابق ہے جو اس سورت میں انسانی دل کے اندر پیدا کیے گئے ہیں۔ پوری سورت میں انسان کے اندر خضوع' خشوع' آخرت کا خوف اور اس کے قلب کے اندر کپکپی پیدا کی گئی ہے۔چنانچہ پوری سورت میں ہم وہ حالات پاتے ہیں جو انسانی دل میں خشیت' خوف اور ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً ایسا کردار اس سورت میں ہے' جو اللہ کے سامنے رات کو کھڑا ہے' سجود اور رکوع میں اور آخرت سے ڈر رہا ہے اور رحمت ربی کا امیدوار ہے۔پھر ایسے کردار بھی نظر آتے ہیں جو اللہ سے ڈرے سہمے ہیں اور جن کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہیں اور جب وہ تلاوت قرآن کرتے ہیں تو ان کے دل تسبیح کرتے جاتے ہیں اور وہ اللہ کے ذکر و فکر میں مشغول ہوتے ہیں۔اس سورت میں ہدایات دی جاتی ہیں کہ اللہ سے ڈرو' تقویٰ اختیار کرو اور اللہ کے عذاب سے بچنے کی فکر کرو۔

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ (۳۹:۱۰) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنے رب سے ڈرو"۔

قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۳۹:۱۳) "کہہ دیجئے میں اگر اپنے رب کی معصیت کروں تو یوم عظیم کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔

لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ (۳۹:۱۶) "ان پر آگ کی چھتریاں ہیں۔اوپر سے بھی چھائی ہوئی ہوں گی اور نیچے سے بھی۔ یہ وہ انجام ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے کہ اے میرے بندو' میرے غضب سے بچو"۔پھر قیامت کے مناظر اور وہاں کے جزع و فزع میں اور اللہ کی طرف یکسوئی اور اس کے خوف میں یہی خدا خوفی کی فضا نظر آتی ہے۔

یہ پوری سورت عقیدۂ توحید اور فکر آخرت کے موضوع پر مشتمل ہے۔اس سورت کو بڑے بڑے دروس میں تقسیم کرنا مشکل ہے۔یہ چھوٹے چھوٹے اسفار پر مشتمل ہے جو توحید و قیامت کے مطالعاتی سفر ہیں اور ان میں یا تو قیامت کا کوئی منظر پیش کیا گیا ہے یا قیامت کی کوئی جھلک دکھائی گئی ہے۔مناسب ہے کہ اس سورت کو اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی شکل میں لیا جائے۔

# درس نمبر ۲۱۵ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۷

سُوْرَةُ الزُّمَرِ (٣٩) مَكِّيَّةٌ (٥٩)
اٰیَاتُهَا ٧٥ رُكُوْعَاتُهَا ٨

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿١﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴿٢﴾ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ڛ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿٣﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔

"اس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے"۔ (اے نبیؐ) یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف برحق نازل کی ہے' لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو' دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے ۔ خبردار' دین خالص اللہ کا حق ہے ۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے اس کے سوا دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں (اور اپنے اس فعل کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ) ہم تو ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرادیں' اللہ یقیناً ان کے درمیان ان تمام باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں ۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا ۔ جو جھوٹا اور منکر حق ہو"۔

سورت کا آغاز اس فیصلہ کن قرارداد سے ہوتا ہے ۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۳۹ : ۱) "اس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے"۔ وہ زبردست ہے اور وہ اس قسم کی کتاب کے نزول پر قدرت رکھتا ہے ۔ اور وہ حکیم و دانا ہے اور وہ جانتا ہے کہ نزول قرآن کس بارے میں ہے اور یہ حکیم کیوں ہے ۔ یہ تمام کام اللہ نہایت حکمت اور تدبر اور تقدیر سے کرتا ہے ۔

اس قرارداد پر بات طویل نہیں ہوتی کیونکہ یہ تو تمہید تھی' اصل بات کے لیے اور اصل موضوع کے لیے یہ پوری

سورت وقف ہے ۔ سورت کا نزول ہی اس موضوع کا ثبوت اور تاکید ہے ۔ یعنی مسئلہ توحید ' اللہ کی بندگی میں توحید اور اسلامی نظام زندگی میں توحید ۔ اور عقیدے ' بندگی اور نظام زندگی کو ہر پہلو سے شرک سے پاک کرنا ۔ اور پھر اللہ تک رسائی کے لیے واسطوں کو ختم کر کے براہ راست اس کو پکارنا بغیر کسی سفارش کے ۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ( ۳۹ : ۲ ) "اے نبی' یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف برحق نازل کی ہے" ۔ اور جس سچائی پر یہ کتاب نازل کی گئی ہے ۔ وہ ہمہ جہت وحدانیت ہے ' جس کے اوپر یہ کائنات قائم ہے ۔ اس سورت کی پانچویں آیت میں ہے :

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ( ۳۹ : ۵ ) "آسمانوں اور زمین کو اس نے برحق پیدا کیا ہے" ۔ لہٰذا جس حق اور سچائی پر سماوات کا قیام ہے ' وہی سچائی اس کتاب کا موضوع ہے ۔ اس کتاب کا تصور توحید اور اس کائنات کی تخلیق کی وحدت ایک ہی ہیں ۔ جس طرح یہ کائنات اللہ واحد کی تخلیق اور مصنوع ہے اور جس طرح یہ انسان اللہ کی تخلیق اور اس کے امر پر قائم ہے ' اسی طرح یہ کتاب بھی اللہ کے اوامر پر قائم ہے ۔ لہٰذا منطقی نتیجہ یہ ہے :

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ( ۳۹ : ۲ ) "لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو ' دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے" ۔

خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے جن کی طرف یہ کتاب برحق نازل کی گئی ۔ اور یہ کتاب رسول کا پیش کردہ منہاج حیات ہے جس کی طرف آپ تمام انسانوں کو دعوت دیتے ہیں ۔ جو اس عقیدے پر قائم ہے کہ اللہ ایک ہے ' اسی کی بندگی کرنی ہے ۔ نظام زندگی صرف اسی سے اخذ کرنا ہے اور پوری زندگی کو اس عقیدۂ توحید پر قائم کرنا ہے ۔

اللہ کو ایک الٰہ سمجھنا اور دین اس کے لیے خالص کرنا محض چند کلمات کا نام نہیں ہے جو زبان سے ادا کر دیئے جائیں ۔ یہ دراصل زندگی کا پورا نظام ہے جو انسان کے دل و دماغ سے عقیدۂ توحید کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور ایک اسلامی سوسائٹی میں مکمل نظام زندگی کے قیام پر ختم ہوتا ہے ۔

وہ دل جو اللہ وحدہ کو الٰہ سمجھتا ہے ' جو صرف اللہ کی بندگی کرتا ہے ' وہ اپنا سر کسی کے آگے نہیں جھکاتا ۔ وہ نہ تو غیر اللہ سے کوئی چیز طلب کرتا ہے ' نہ غیر اللہ پر اعتماد کرتا ہے ۔ ایسے شخص کے نزدیک صرف اللہ ہی قوی ہے اور صرف اللہ اس پوری کائنات پر غالب ہے ۔ سب کے سب ضعیف اور کمزور ہیں اور وہ کسی کے لیے کوئی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے ۔ لہٰذا کسی انسان کو کسی انسان کے سامنے سر نہیں جھکانا چاہیے ۔ کیونکہ یہ انسان سب کے سب اسی کی طرح ہیں اور خود اپنے نفع و نقصان کے مختار بھی نہیں ۔ اللہ وحدہ ہی دینے والا اور روکنے والا ہے ۔ لہٰذا اللہ کو اس سلسلے میں کسی وسیلے اور واسطے کی ضرورت نہیں ۔ تمام مخلوق اس کی محتاج ہے اور وہ غنی ہے ۔

پھر جو دل عقیدۂ توحید سے لبریز ہے وہ اس بات پر بھی ایمان لاتا ہے کہ اس کائنات کے ایک ہی قانون قدرت اور ناموس فطرت کنٹرول کرتا ہے ۔ لہٰذا اس کا یہ ایمان ہوتا ہے کہ جو نظام زندگی اللہ نے انسانوں کے لیے تجویز کیا ہے ' یہ بھی انہی قوانین قدرت کا حصہ ہے ۔ جو اس کائنات کے لیے وضع ہوئے ہیں ۔ لہٰذا یہ انسان اس دنیا کے ساتھ ہم آہنگی کی

زندگی نہیں بسر کر سکتا الا یہ کہ وہ اسلامی نظام زندگی کو اپنا لے ۔ لہذا وہ وہی احکام و انتظام اختیار کرتا ہے جو اللہ چاہتا ہے یعنی وہ اللہ ہی کی شریعت کی اطاعت کرتا ہے جو اس نظام کائنات اور انسان کے وجود کے نظام کے ساتھ موافق ہے ۔

پھر جو دل اللہ کو وحدہ لاشریک سمجھتا ہے ' وہ اپنے اور اس اللہ کی پیدا کردہ تمام کائنات کے درمیان ایک قربت اور تعلق محسوس کرتا ہے ۔ اس کائنات کی زندہ چیزیں ہوں یا مردہ ۔ لہٰذا اس کی زندگی ایک ایسے ماحول کے اندر بسر ہوتی ہے جو اس کا دوست ' مدد و معاون اور اس کے ساتھ ہمقدم اور محبت کرنے والا ہوتا ہے ۔ وہ اپنے ماحول میں اللہ کے دست قدرت کی کارستانیاں محسوس کرتا ہے ۔ لہٰذا وہ اس ماحول میں اللہ اور اس کی مخلوقات کے ساتھ مانوس ہو کر رہتا ہے ۔ اس کے ساتھ اللہ کی مخلوق ہوتی ہے ۔ اس کی آنکھیں اللہ کی پیدا کردہ عجائبات پر ہوتی ہیں ۔ وہ یہاں اس کائنات کی کسی چیز کو ایذا نہیں دیتا ۔ وہ اس کائنات کی کسی چیز کو تلف نہیں کرتا مگر امر الٰہی سے ۔ کیونکہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے ۔ وہی زندگی دینے والا ہے ۔ وہ سب کا رب ہے اور ہر چیز کا رب ہے ۔

اسی طرح انسانی تصورات اور میلانات میں بھی توحید ظاہر ہوتی ہے ۔ انسانی طرز عمل اور اس کی چال ڈھال میں بھی توحید کا اثر ہوتا ہے ۔ اور انسانی زندگی اور سوسائٹی کے لیے منہاج اور طریق زندگی میں بھی توحید کا اثر ہوتا ہے ۔ اور عقیدۂ توحید محض ایک کلمہ نہیں رہتا جسے زبان سے کہہ دیا جائے ۔ وہ ایک مکمل نظام بن جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ پورے قرآن میں عقیدۂ توحید کو بہت ہی بڑی اہمیت دی گئی ہے ۔ ہر جگہ اس پر اصرار و تکرار کیا گیا ہے ۔ لہذا توحید پر ان زاویوں سے غور کیا جانا چاہئے ۔ اس زاویہ سے توحید ایک فکر ' ایک نظام عمل ' ایک نظام اجتماعی اور نظام حکومت بن جاتی ہے ۔ اور اس پر ہر وقت تدبر کی ضرورت ہے ۔ ہر زمانے میں ' ہر خاندان اور سوسائٹی میں اور اسی مفہوم میں اس پر تدبر کی ضرورت ہے ۔

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (۳۹ : ۳) "خبردار دین خالص اللہ کا حق ہے"۔ نہایت ہی اونچی نہایت ہی طویل اور نہایت ہی رعب دار آواز میں ۔ گویا اعلان شاہی ہے اور لفظ "الا" خبردار ! سے اس کا آغاز ہوتا ہے اور نہایت ہی قصر اور حصر کے الفاظ میں کہ اللہ ہی کا حق ہے نظام زندگی اور خالص اللہ کا حق ہے ۔ جس طرح مفہوم موکد ہے اس طرح الفاظ بھی پر شوکت ہیں ۔ یہ اصول حیات ہے ۔ پوری زندگی اس پر قائم ہے بلکہ پوری کائنات اس اعلان پر قائم ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس قدر مختصر زور دار اور قصر و حصر کے الفاظ میں یہ قانون نافذ ہوتا ہے ۔

اور اس کے مقابلے میں اس دور کی جاہلیت کا کلمہ اور نظریہ کیا تھا ' جسے رد کیا گیا ۔

وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ

(۳۹ : ۳) "رہے وہ لوگ جنہوں نے اس کے سوا دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں (کہتے ہیں) ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں ۔ اللہ یقیناً ان کے درمیان ان تمام باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں ۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکر حق ہو" ۔ وہ اعلان کرتے تھے کہ اللہ ان کا

خالق ہے۔وہ سموات اور زمین کا خالق ہے۔لیکن پھر وہ فطری استدلال کی راہ پر نہ چلتے تھے کہ اگر وہی خالق ہے تو وہی بندگی کے لائق ہے۔اور پھر دین اور دستور اور قانون اسی کا چلنا چاہئے۔یہاں آکر وہ یہ افسانہ گھڑتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔پھر وہ فرشتوں کے بت بناتے اور ان کو پوجتے۔پھر یہ کہتے کہ وہ ملائکہ کے بتوں کی عبادت اس لیے کرتے ہیں' جن کو وہ الٰہ کہتے تھے۔لات' منات اور عزیٰ' یہ دراصل ان کی عبادت نہیں ہے بلکہ یہ محض اللہ کے قریب ہونے کے لیے ہم ان کے آگے جھکتے ہیں' تاکہ یہ فرشتے اللہ کے ہاں ہماری سفارش کریں۔اور یوں ہم اللہ کے نزدیک ہو جائیں۔

یہ عقیدہ سیدھے فطری انداز فکر سے انحراف ہے اور یہ عقیدہ غلط ہونے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ اور ناقابل فہم بھی ہے۔نہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور نہ یہ بت فرشتوں کے بت ہیں۔نہ اللہ نے اس کی اجازت دی ہے۔نہ اللہ کسی کی سفارش سنتا ہے اور نہ اللہ اپنے بندوں کو اس طریقے پر اپنے قریب لاتا ہے۔

جب بھی انسانیت نے عقیدۂ توحید کو ترک کیا ہے۔وہ فطرت کے سیدھے انداز فکر اور سیدھے سادے انداز استدلال سے محروم ہو گئی ہے' جو اسلام اول روز سے لے کر آیا ہے اور آدم علیہ السلام سے لے کر ادھر تمام رسولان محترم نے یہی عقیدۂ توحید پیش کیا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت ہر جگہ نیک لوگوں اور اولیاء کی عبادت اسی طرح کی جاتی ہے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں عرب فرشتوں اور فرشتوں کے بتوں کی عبادت بطور تقرب الٰہی' اپنے زعم کے مطابق کیا کرتے تھے۔مقصد ان کی سفارش کا حصول ہوتا تھا' لیکن اللہ عقیدۂ توحید' اور سیدھے راستے کی نشاندہی فرماتا ہے ایسی توحید جس کے ساتھ کوئی التباس' کوئی سفارشی اور کوئی افسانوی مقربین خدا نہ ہوں۔

انَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ (۳۹ : ۳) ''اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکر حق ہو''۔کیونکہ یہ لوگ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں۔ایک تو یہ جھوٹ ہے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں' دوسرا یہ جھوٹ ہے کہ یہ اللہ کے ہاں سفارش کرتے ہیں جبکہ فرشتے ان کی اس بندگی کی تکذیب کرتے ہیں۔یہ لوگ دراصل اللہ کے صریح احکام کا کفر کرتے ہیں۔اس لیے اللہ ان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا جو اس پر جھوٹ باندھتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں۔ہدایت تو ان کو ملتی ہے جو مخلص ہوں' متوجہ ہوں' برائی سے بچنا چاہتے ہوں اور ان کو نیکی کے کاموں میں دلچسپی بھی ہو اور وہ غور و فکر کر کے اپنے لیے صحیح راستے کا انتخاب کرتے ہوں۔جو لوگ جھوٹ باندھتے ہیں' اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں تو وہ اللہ کی ہدایت اور مہربانیوں کے مستحق نہیں ہوتے اس لیے کہ ایسے لوگ جان بوجھ کر صحیح راستے سے دوری اختیار کرتے ہیں۔

اس کے بعد اس شرکیہ تصور خدا کی کمزوری اور پوچ ہونے کو ظاہر کیا جاتا ہے۔

لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰی مِمَّا یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝

''اگر اللہ کسی کو بیٹا بنانا چاہتا تو اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا' برگزیدہ کر لیتا' پاک ہے وہ اس سے (کہ کوئی اس کا

بنا ہو) 'وہ اللہ ہے اکیلا اور سب پر غالب"۔

یہ ایک استدلالی مفروضہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر اللہ کسی کو اپنا شریک بناتا تو اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی شریک کر کے اس کا اعلان کر دیتا۔ اس کا ارادہ تو بے قید ہے 'لیکن اللہ کی ذات ان سے پاک ہے۔ اس لیے اللہ کی طرف نہ بیٹے کی نسبت ہو سکتی ہے 'نہ اللہ کسی کا بیٹا ہے۔ یہ اللہ کی مشیت و ارادہ اور اس کی تقدیر ہے۔ ان چیزوں سے اللہ پاک ہے۔

سُبْحٰنَهٗ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۳۹ : ٤) "پاک ہے وہ اس سے 'وہ اللہ ہے اکیلا اور سب پر غالب"۔

اللہ اپنے لیے کسی کو بیٹا کب بناتا ہے۔ وہ تو ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ ہر چیز کا خالق ہے۔ ہر چیز کا مدبر ہے۔ ہر چیز اور ہر انسان اس کی ملکیت میں ہے اور وہ جس طرح چاہتا ہے 'تصرف کرتا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝

"اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔ وہی دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔ اسی نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کر رکھا ہے کہ ہر ایک ایک وقت مقررہ تک چلے جا رہا ہے۔ جان رکھو 'وہ زبردست ہے اور درگزر کرنے والا ہے"۔

آسمان و زمین کی بادشاہت پر یہ ایک سرسری نظر 'لیل و نہار کے نظام اور شمس و قمر کے نظام اور اسے زبردست طریقے سے مسخر کرنے کے نظارے پر ایک نگاہ 'اس بات کو ثابت کر دیتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور الہٰ نہیں ہے۔ یہ نظام فطرت دل کے اندر یہ بات اتار دیتا ہے کہ نہ اللہ کا کوئی شریک ہے اور نہ اس کا کوئی بیٹا ہے۔

زمین و آسمان کی تخلیق میں اللہ کی وحدانیت کے دلائل بالکل ظاہر ہیں اور ان قوانین میں بھی وحدت الٰہی کے نشانات ظاہر ہیں جو ان کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ اس پوری کائنات پر ایک سرسری نظر ہی اس بات کو ظاہر کر دیتی ہے کہ اس کو چلانے والا ارادہ ایک ہے۔ آج تک انسانوں نے جو سائنسی انکشافات کیے ہیں 'ان میں وحدت الوہیت کے لیے بے شمار دلائل موجود ہیں۔ یہ بات انسانوں پر ثابت ہو گئی ہے کہ یہ کائنات جس تک انسان نے رسائی حاصل کر لی ہے 'یہ ایسے ذرات سے بنی ہوئی ہے جن کی حقیقت اور ماہیت ایک ہے اور ان ذرات میں سے ہر ایک ذرہ ایسی شعاعوں سے مرکب ہے 'جن کی حقیقت ایک ہے۔ اور یہ بات بھی معلوم ہو چکی ہے کہ ان ذرات سے جو اجرام فلکی بنے ہیں خواہ وہ ایسے ہوں جس میں ہم رہتے ہیں یا دوسرے سیارے اور ستارے ہوں۔ یہ سب کے سب ایک مکمل حرکت میں ہیں اور اس حرکت کا ایک مخصوص جاری قانون ہے جس سے کوئی ستارہ بھی ہٹ نہیں سکتا۔ چھوٹے ذرات اور ستاروں میں بھی وہی حرکت ہے اور اس دنیا کے عظیم ترین ذرات میں بھی وہی حرکت ہے۔ پھر مطالعہ کائنات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ

اس حرکت کا ایک نظام ہے ۔ یہ نظام وہ حقیقت ہے جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اس پوری کائنات کا خالق و مدبر ایک ہے ۔ سائنس دان ہر روز جس نئی حقیقت کی دریافت کرتے ہیں اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس کائنات کے منصوبے میں جو کچھ رکھا ہوا ہے وہ اللہ وحدہ کی ذات پر شاہد عادل ہے اور یہ ایک سچائی ہے اور یہ لوگوں کی خواہشات کے مطابق نہیں بدلتی ۔ اور نہ کسی شخص کے میلانات کے مطابق کسی طرف مائل ہوتی ہے ۔ نہ اپنی راہ ایک سیکنڈ کے لیے چھوڑتی ہے اور نہ بے راہ روی اختیار کرتی ہے ۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ( ۳۹ : ۵ ) ”اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا“ ۔ اور کتاب بھی اس نے برحق نازل فرمائی ۔ لہٰذا اس کائنات میں بھی حق ہے اور اس کتاب میں بھی حق ہے اور یہ ایک ہی حق اور سچائی ہے جو اس کائنات میں بھی ہے اور اس کتاب میں بھی ہے اور دونوں کا منبع و مصدر ایک ہی ہے ۔ اور دونوں اس بات کی نشانی ہیں کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا ایک ہی ہے ۔

یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّهَارِ وَ یُکَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیْلِ ( ۳۹ : ۵ ) ”وہی ہے جو دن پر رات کو اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے“ ۔ یہ انداز تعبیر ایسا ہے کہ انسان کا دامن کھینچ کر ان جدید انکشافات کی طرف اس کی توجہ مبذول کراتا ہے جن کے مطابق زمین کا گول ہونا ثابت ہوا ہے ۔ باوجود اس خواہش کے کہ میں قرآن مجید کی تفسیر میں جدید سائنسی انکشافات سے دامن بچاؤں ۔ کیونکہ انسانی نظریات کبھی درست ہوتے ہیں کبھی غلط ۔ آج ثابت ہوتے اور کل باطل ہو جاتے ہیں جبکہ قرآن حق ہے اور اپنی سچائی پر وہ خود دلیل ہے ۔ ”آفتاب آمد دلیل آفتاب“ قرآن اپنی سچائی کا ثبوت اپنے موافق یا مخالف سے مانگتا ہی نہیں ۔ نہ ان انکشافات سے جو یہ ضعیف انسان فراہم کرتا ہے ۔ لیکن اپنے اس رویے کے باوجود یہ انداز تعبیر مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں زمین کی گردش محوری اور اس کی کروی ساخت پر غور کروں اس لیے کہ ایک ظاہری منظر اس تعبیر سے صاف صاف نظر آتا ہے اور اس کا انکار ممکن نہیں ۔ زمین گول ہے اور گردش محوری کے ساتھ سورج کے سامنے ہے ۔ اس لیے اس کا جو حصہ سورج کے سامنے ہے ' وہ روشن ہے اور دن ہے لیکن یہ حصہ ایک جگہ کھڑا نہیں رہتا ۔ جونہی یہ حصہ حرکت کر کے آگے بڑھتا ہے ۔ اندھیرا زمین کے اس حصے کو ڈھانپتا جاتا ہے ۔ اور اسے لپیٹتا جاتا ہے ۔ لہٰذا یہ دن والا حصہ لپیٹتا جا رہا ہے اور رات اسے لپیٹتی جاتی ہے ۔ دوسری جانب سے جہاں رات لپٹی ہوئی ہے وہ بھی آگے بڑھتی اور روشنی رات والے حصے کو لپیٹتی ہے اور اس میں دن آتا جاتا ہے ۔ یوں ایک طرف سے دن کو رات کور (Cover) کرتی ہے اور دوسری طرف سے رات دن کو کور کرتی جاتی ہے اور یہ حرکت جاری ہے ۔

یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّهَارِ وَ یُکَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیْلِ ( ۳۹ : ۵ ) یہ الفاظ صورت حال کا خوب نقشہ کھینچتے ہیں اور صورت حال کا صحیح نقشہ ذہن میں آ جاتا ہے ۔ اس طرح زمین کی حرکت کی نوعیت کا اظہار بھی ہو جاتا ہے ۔ زمین کا گول ہونا بھی ثابت ہوتا ہے ۔ اس کا دورہ بھی ثابت ہوتا ہے ۔ اس انداز بیان کی یہ بہترین تفسیر ہے 'اس کے سوا کوئی دوسری تفسیر اس سے زیادہ گہری نہیں ہو سکتی ۔

وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى (۳۹: ۵) "اس نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کر رکھا ہے کہ ہر ایک ایک وقت مقرر تک چلے جا رہا ہے"۔ سورج اپنے مدار پر چل رہا ہے اور چاند اپنے مدار پر چل رہا ہے۔ اور دونوں حکم الٰہی سے مسخر ہیں۔ اور کسی کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ ان کو چلا رہا ہے اور فطری استدلال اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ بغیر کسی محرک کے یہ حرکت ہو رہی ہے اور از خود یہ نہایت ہی پیچیدہ نظام اس باقاعدگی سے چل رہا ہے کہ کئی ملین سال گزرنے کے بعد ہمیں اس حرکت میں بال برابر کی بیشی نظر نہیں آتی۔ اور یہ شمس و قمر اسی طرح جاری رہیں گے اور ایک وقت تک جاری رہیں گے۔ یعنی قیامت تک اور اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ جب حکم ہو گا یہ رک جائیں گے۔

اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ (۳۹: ۵) "جان رکھو وہ زبردست ہے اور درگزر کرنے والا ہے"۔ لہٰذا قوت قدرت اور غلبے کی وجہ سے وہ کائنات کو سنبھالتا ہے اور اس قوت کے ساتھ ساتھ وہ غفار بھی ہے۔ جو لوگ اس کی طرف مڑ جاتے ہیں' ان کی کوتاہیوں کو بخش دیتا ہے حالانکہ انہوں نے تکذیب اور شرک جیسے بڑے جرائم کیے تھے۔ اور وہ اللہ کے ساتھ الٰہ بناتے تھے۔ اور پھر اللہ کے لیے اولاد مقرر کرتے ہیں اور دوسرے جرائم کرتے ہیں لیکن توبہ کا دروازہ کھلا ہے اور اس سے داخل ہونے کے لیے راہ واگزار ہے اور اللہ عزیز و غفار ہے۔

---ooo---

اس عظیم کائنات کے مطالعے کے لیے اس سرسری نظر کے بعد اب روئے سخن ذرا پھر جاتا ہے۔ انسان کے نہایت ہی چھوٹے نفس کی طرف جو اپنے اندر ایک عظیم جہان رکھتا ہے۔ صرف اس پہلو کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ ذرا "زندگی" اور "حیات" پر غور کرو۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۶

"اسی نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا' پھر وہی ہے جس نے اس جان سے اس کا جوڑا بنایا۔ اور اسی نے تمہارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے۔ وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمہارا رب ہے' بادشاہی اسی کی ہے' کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے' پھر تم کدھر سے پھرائے جا رہے ہو؟"

انسان جب اپنے نفس پر غور کرتا ہے' اس نفس پر جسے اس نے خود پیدا نہیں کیا اور وہ اس کی تخلیق کے آغاز کے بارے میں بھی خود نہیں جانتا۔ صرف وہی معلومات اس کے پاس ہیں جو اللہ خالق نے دیئے ہیں۔ انسان کا نفس ایک

ہے' اس کی ذات ایک ہے ۔ اس کی اس ذات اور نفس کے خصائص ایک ہیں اور اس نفس انسانی کے بعض خصائص دوسری مخلوقات سے بالکل جدا ہیں ۔ جس طرح نفس انسانی کے تمام افراد ایک مخصوص دائرے کے اندر محدود اور متمیز ہیں ۔ اسی طرح "نفس انسانی" ان اربوں افراد کے درمیان ایک ہے جو اس زمین میں منتشر ہیں یا رہتے ہیں ۔ اسی نفس واحد سے پھر اس کا جوڑا یا بیوی بھی پیدا ہوئی ۔ تمام انسانی خصوصیات کے اندر عورت مرد کے ساتھ شریک ہے ۔ اگرچہ تفصیلی خصوصیات مختلف ہیں لیکن بنیادی خصوصیات ایک ہی ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد و عورت کی ساخت ایک ہی نقشے کے مطابق ہے ۔ اسی نقشے کے اندر بعض ترمیمات کی وجہ سے مرد اور عورت الگ الگ ہو گئے ۔ ایک ہی ارادہ ہے جو مرد اور عورت کو الگ کرتا ہے ۔

نفس انسانی کے اندر مرد و عورت کے اختلافات کے حوالے اور مناسبت سے یہاں دوسرے حیوانات کی اہم اجناس کے نر و مادہ کے نظام کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ اس پوری کائنات میں اور انسانوں کے علاوہ دوسرے حیوانات میں بھی حق جاری ہے ۔

وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ (۳۹ : ۶) "اور اسی نے تمہارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے" ۔ یہ آٹھ جانور نر و مادہ جس طرح دوسری آیات میں آئے ہیں' بھیڑ' بکریاں' ڈنگر اور اونٹ ہیں ۔ یعنی نر و مادہ کے شمار سے آٹھ بنتے ہیں ۔ اور جب نر و مادہ کو جمع کیا جائے تو ان پر ازواج یعنی جوڑوں کا لفظ بولا جاتا ہے ۔ یوں مجموعہ آٹھ بن جاتا ہے ۔

انداز بیان یہ بتاتا ہے کہ اللہ نے ان کو نازل کیا ہے یعنی پیدا کر کے تمہارے لیے مسخر کیا ہے ۔ یہ تسخیر اللہ کی طرف سے منزل ہے ۔ یعنی اللہ کے علوشان کا یہ کارنامہ ہے اور اس اللہ نے اس کی اجازت دی ہے کہ انسان ان آٹھ قسم کے جانوروں کا گوشت استعمال کرے ۔

جانوروں میں نر و مادہ کی خصوصیات کے تذکرے کے بعد پھر ماؤں کے پیٹ میں پائے جانے والے جنین کے مختلف مراحل کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے ۔

يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ (۳۹ : ۶) "پھر وہ ماؤں کے پیٹوں میں تخلیق کے بعد تخلیق کرتا چلا جاتا ہے" ۔ پہلے نطفہ' پھر لوتھڑا' پھر گوشت کا ٹکڑا' پھر ہڈیاں' پھر واضح شکل اور آخر میں اس کے اندر انسانی حواس کا پیدا کرنا اور انسانی خصوصیات کا پیدا کرنا ۔

فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ (۳۹ : ۶) "تین تین تاریک پردوں کے اندر" ۔ پہلے اس پردے کی تاریکی جس کے اندر جنین ہوتا ہے' پھر رحم مادر کی ظلمت جس کے اندر وہ ملفوف ہوتا ہے اور پھر ماں کا پیٹ جس کے اندر رحم ہوتا ہے اور اللہ کا دست قدرت اس ذرے کو روز بڑھاتا چلا جاتا ہے ۔ اور یہ دست قدرت روز اسے بڑھاتا چلا جاتا ہے ۔ پھر اس کی شکل و صورت بدلتی چلی جاتی ہے ۔ یہ ترقی کرتا چلا جاتا ہے ۔ اللہ اس مخلوق کی نگرانی کرتا ہے اور اسے بڑھنے کی طاقت دیتا ہے ۔ اور یوں شکل بدلنا اس کے لیے ممکن ہوتا ہے ۔ یہ قدم بقدم آگے جاتا ہے ۔ اللہ کی تقدیر اور اندازے کے مطابق ۔

انسان کے اس مختصر سفر اور اس کے اندر اس کی ساخت کی ان دور رس تبدیلیوں پر ایک نظر ڈالنے اور ان تغیرات کو غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر پائی جانے والی عجیب و غریب خصوصیات کی کارفرمائی اور راہنمائی میں اس کمزور ترین اور خوردبینی خلیے نے جس انداز سے ترقی کی' ان اندھیروں میں اور اس عجیب انداز میں' تو انسان کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ سب باتیں انسان کے علم و بصیرت اور اس کی قدرت سے وراء ہیں۔

یہ تمام حقائق اس بات کے لیے کافی ہیں کہ انسان کو خالق کائنات کی معرفت پر مجبور کریں۔ اور انسان خالق کائنات کو اس کے ان زندہ آثار کے ذریعے پہچان لے اور اس تخلیق کے اندر جو وحدانیت ہے۔ اس کے آثار بالکل ظاہر و باہر ہیں اور کوئی سوچنے والا انسان کس طرح ان سے صرف نظر کر سکتا ہے۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (۳۹ : ۶) "یہی تمہارا رب ہے' بادشاہی اسی کی ہے' کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے' پھر تم کدھر پھرے جا رہے ہو؟"

اللہ وحدہ کی ان نشانیوں کو دیکھتے ہوئے' اللہ کی بے قید قدرت کے ان نشانات کو ملاحظہ کرتے ہوئے یہاں لوگوں کو خود اپنے طرز عمل پر غور کرنے کے لیے ذرا کھڑا کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اب تمہارے سامنے صرف دو راستے ہیں۔ شکر کی راہ اور کفر کی راہ اور جو راہ بھی تم اختیار کرو گے اس کے سارے نتیجے کی ذمہ داری انفرادی ہے۔ اور اشارہ دے دیا جاتا ہے کہ وقت قریب ہے۔ دنیا کا یہ مرحلہ ختم ہونے والا ہے۔ پھر حساب و کتاب ہو گا اور یہ حساب و کتاب وہ ذات لے گی جس نے تمہیں تین تاریک ترین پردوں کے اندر سے نکال کر ذمہ دار بنایا ہے۔ اور وہ اب تمہارے دلوں کی خفیہ ترین باتوں کو بھی جانتا ہے۔

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۟ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

"اگر تم کفر کرو تو اللہ تم سے بے نیاز ہے' لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا' اور اگر تم شکر کرو تو اسے وہ تمہارے لیے پسند کرتا ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ آخر کار تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے' پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو' وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے"۔

تمہاری ماؤں کے پیٹ کا عرصہ تو تمہارے طویل سفر زندگی کا ایک مختصر حصہ ہے۔ ابتدائی مرحلہ ہے۔ پھر پیٹ سے باہر آکر تم قدرے طویل مرحلے میں داخل ہو گے۔ اس کے بعد تیسرا طویل اور ابدی مرحلہ ہو گا۔ حساب و کتاب ہو گا اور یہ مرحلہ اللہ علیم و خبیر کی تدبیر سے طے ہو گا۔

جہاں تک اللہ کی ذات کا تعلق ہے وہ انسان جیسی کمزور مخلوق کا محتاج نہیں ہے۔ انسان بہت ہی ضعیف مخلوق ہے۔

یہ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ وہ انسانوں کی طرف متوجہ ہے اور ان کی نگرانی اور ان پر مہربانی کرتا ہے ۔ اور وہ کس قدر ضعیف ہیں اور کس قدر کمزور ہیں ۔

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ (۳۹ : ۷) "اگر تم کفر کرو تو اللہ بے نیاز ہے"۔ کیونکہ تمہارا ایمان اللہ کی مملکت میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کر سکتا۔ اور تمہارا کفر اس میں کسی چیز کی کمی نہیں کر سکتا۔ لیکن اللہ اپنے بندوں کی جانب سے کفر کو پسند نہیں کرتا اور کفر کو محبوب نہیں رکھتا۔

وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ (۳۹ : ۷) "لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا"۔ اور اگر تم شکر کرو۔

وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ (۳۹ : ۷) "اگر تم شکر کرو تو اسے وہ تمہارے لیے پسند کرتا ہے"۔ وہ شکر کو محبوب رکھتا ہے' اور اس پر جزائے خیر دیتا ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۳۹ : ۷) "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا"۔ آخر کار ہم نے اللہ کے ہاں لوٹنا ہے۔ صرف اس کے آگے پیش ہونا ہے اور اس کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔

ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳۹ : ۷) "آخر کار تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے۔ پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو"۔

اس پر کوئی امر مخفی نہیں ہے۔

اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۳۹ : ۷) "وہ دلوں کا حال جانتا ہے"۔ یہ ہے انجام حیات ۔ یہ ہیں دلائل ہدایت اور یہ ہے دوراہہ جس سے دونوں راستے الگ ہوتے ہیں۔ ایک ہدایت کا راستہ اور ایک ضلالت کا راستہ ۔ اب ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔ جو شخص جس راستے کو اختیار کرے خوب سمجھ کر اختیار کرے۔ غور و تدبر کے بعد کرے۔ علم اور فکر کے ساتھ کرے۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۱۶ ایک نظر میں

پہلے سبق میں یہ بات کہی گئی کہ تخلیق انسان کی کہانی کیا ہے ـ یہ کہ تمہیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا گیا ہے اور پھر اسی نفس سے ایک جوڑا بھی بنایا گیا ہے ـ پھر مویشیوں کو بھی بے شمار جوڑوں کی صورت میں بنایا گیا ہے ـ اور پھر تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تخلیق کے بعد تخلیق تمہیں دی اور تین ظلمتوں کے اندر تمہیں پیدا کیا ـ پھر اللہ نے تمہیں انسانی خصوصیات عطا کیں اور پھر ان خصائص کا نظام تسلسل قائم کیا اور اس کو ترقی دی ـ

اب یہاں انسانوں کی نفسیاتی دنیا کے حالات بتائے جاتے ہیں کہ خوشی اور غم اور امن و خوف کے وقت اس کی حالت کیا ہوتی ہے ـ وہ کس قدر کمزور ہیں اور کس قدر متلون مزاج ہیں اور کس قدر کمزور و ناتواں ہیں الا یہ کہ وہ رب تعالیٰ کے ساتھ رابطہ قائم کر لیں ـ اور اسی کی طرف امید لگائے رہیں' اس کے مطیع فرمان ہو جائیں اور صحیح راستہ پہچان لیں ـ اور اصل حقیقت کو پالیں اور اللہ نے انسان کو جو انسانی خصائص دیے ہیں اپنے آپ کو ان کی راہ پر ڈالیں ـ

---ooo---

# درس نمبر۲۱۶ تشریح آیات

## ۸ --- تا --- ۱۰

وَ اِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّہٗ مُنِیۡبًا اِلَیۡہِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَہٗ
نِعۡمَۃً مِّنۡہُ نَسِیَ مَا کَانَ یَدۡعُوۡۤا اِلَیۡہِ مِنۡ قَبۡلُ وَ جَعَلَ لِلّٰہِ اَنۡدَادًا
لِّیُضِلَّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ؕ قُلۡ تَمَتَّعۡ بِکُفۡرِکَ قَلِیۡلًا ٭ۖ اِنَّکَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ ﴿۸﴾

"انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتا ہے۔ پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نواز دیتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پہلے پکار رہا تھا اور دوسروں کو اللہ کا ہمسر ٹھیراتا ہے تاکہ اس کی راہ سے گمراہ کرے۔ (اے نبیؐ) اس سے کہو کہ تھوڑے دن اپنے کفر سے لطف اٹھا لے' یقیناً تو دوزخ میں جانے والا ہے"۔

یہ انسان کی فطرت کا مزاج ہے کہ جب خطرات لاحق ہوں تو انسانی فطرت کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور وہ تمام پردے اور حجابات دور ہو جاتے ہیں جو اس فطرت کے اوپر چھائے ہوئے ہوں اور تمام اوہام و خرافات بھی دور ہو جاتے ہیں۔ خطرے کے وقت انسان صرف رب ذوالجلال کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کے آگے جھک جاتا ہے۔ فطرت انسانی اس وقت اس بات کا ادراک کر لیتی ہے کہ یہ خطرہ صرف اللہ ہی کے ٹالنے سے ٹل سکتا ہے۔ اللہ کے سوا تمام دوسری قوتیں جھوٹی ثابت ہوتی ہیں۔

لیکن جب مشکلات دور ہوتی ہیں اور امن و امان اور خوشحالی کا دور آتا ہے اور اللہ مشکلات کو نعمتوں سے بدل دیتا ہے اور یوں مشکلات دور ہو جاتی ہیں تو یہی انسان جس کی فطرت کھل کر سامنے آگئی تھی پھر اوہام و خرافات میں پھنس کر اپنی سابقہ حالت کے زیر اثر آجاتا ہے۔ اور مشکلات میں اپنے گڑگڑانے' اللہ کی طرف متوجہ ہونے اور توبہ کرنے کو بھول جاتا ہے۔

اس وقت پھر اس کی وہ حالت نہیں ہوتی کہ وہ اللہ ہی کو پکارے' اس سے ڈرے اور یہ سمجھے کہ اب اللہ کے سوا کوئی بھی مشکلات کو دور نہیں کر سکتا۔ یہ تمام حالات بھلا کر اب دوبارہ اللہ کے ساتھ اوروں کو شریک کرتا ہے۔ یا تو وہ ان

الہوں کو پوجتا ہے جو جاہلیت کے دور میں پوجے جاتے تھے یا بعض اشخاص کو پوجتا ہے ـ یہ ایسے حالات کی بندگی کرتا ہے جو اللہ کے ساتھ شریک ہوتے ہیں ـ جس طرح ہر جاہلیت کا ایک الٰہ ہوتا ہے ـ کبھی وہ اپنی خواہشات اور اپنے مفادات کو پوجتا ہے یا وہ مستقبل کی امیدوں اور ان جانے خوف سے ڈرتا ہے یا اپنی اولاد و اور حکام کو پوجتا ہے یا اپنے سرداروں اور لیڈروں کو پوجتا ہے ـ یاد رہے کہ یہ سردار بھی پوجے جاتے ہیں جس طرح خدا کو پوجا جاتا ہے ـ بعض اوقات یہ خدا ـ بھی زیادہ پوجے جاتے ہیں ـ یاد رہے کہ شرک کی بھی کئی اقسام ہیں ـ بعض شرک نہایت ہی خفی ہوتے ہیں ـ لوگ نہ اسے دیکھ سکتے ہیں اور نہ ان کو اس کا احساس ہوتا ہے ـ قرآن کریم صرف معروف و مشہور شرک ہی کو نہیں لیتا بلکہ وہ ہر اس بات کو لیتا ہے جو اپنے نقشے کے اعتبار شرک ہو ـ

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا انسان اللہ کے راستے سے گمراہ ہو جاتا ہے ـ کیونکہ اللہ کی راہ تو ایک ہوتی ہے ـ اس میں تعدد ممکن نہیں ہے ـ وہ یہ کہ بندگی صرف اللہ ہی کی ہوگی ـ محبت صرف اللہ کے ساتھ ہوگی ـ اور کسی شخص کے تصور میں بھی اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو ـ نہ مال کا خدا شریک ہو' نہ اولاد کا خدا شریک ہو' نہ وطن کا خدا شریک ہو' نہ زمین کا خدا شریک ہو' نہ رشتہ داری کا خدا شریک ہو' شرک کی ان صورتوں میں سے جو بھی کسی کے دل میں جاگزیں ہوگی تو یہ انداد اللہ میں شامل ہوگی ـ اللہ کے راستے سے گمراہی ہوگی ـ اور اللہ کے راستے سے گمراہی کا انجام آگ ہے اور یہ بات بہت جلد اس دنیا کی قلیل زندگی کے بعد سامنے آنے والی ہے ـ

قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيلًا إِنَّكَ مِنْ أَصْحٰبِ النَّارِ (۳۹ : ۸) "کہہ دیجئے کہ تھوڑے ہی دن اپنے کفر سے لطف اٹھالے یقیناً تو دوزخ میں جانے والا ہے" ـ اس دنیا کے دن جس قدر بھی طویل ہوں' تھوڑے ہی ہیں ـ انسان کے دن زمین پر بہرحال گنے چنے ہیں اگرچہ عمر طویل کوئی پائے ـ بلکہ خود پوری جنس انسانی کی زندگی بھی اس کرۂ ارض پر قلیل ہے ـ جب ہم اس عمر کا مقابلہ ایام اللہ سے کریں ـ

--- OOO---

اس بری تصویر کے مقابلے میں ایک اچھی تصویر اور اچھی نفسیاتی کیفیت بھی ہے ـ اللہ سے ڈرنے والا دل' ہر حالت میں' ہر آفت میں اللہ کو یاد کرنے والا دل' دنیا میں آخرت کو نظر میں رکھ کر زندگی گزارنے والا دل' اللہ کی رحمت کا طلبگار' اللہ کے ساتھ ایسا رابطہ کرنے والا دل جس سے علم صحیح پیدا ہو' اور اس کائنات کی حقیقت کو پالینے والا دل' اس کی تصویر یہ ہے :

أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا يَحْذَرُ الْآخِرَةَ
وَيَرْجُوا رَحْمَةَ رَبِّهِ ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ
ع ۹ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ ﴿٩﴾
۱۵

"(کیا اس شخص کی روش بہتر ہے یا اس شخص کی) جو مطیع فرمان ہے 'رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا اور سجدے کرتا ہے 'آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت سے امید لگاتا ہے؟ ان سے پوچھو کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟ نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں؟"

یہ نہایت ہی روشن اور حساس تصویر ہے۔ مطیع فرمان 'اطاعت شعار 'سجدے کی حالت میں اور رکوع کی حالت میں ہونا دراصل حساس اطاعت شعاری ہے۔ ایسا شخص آخرت سے ڈرتا ہے اور اللہ کی رحمت کا امیدوار ہوتا ہے۔ یہ صفائی اور باطن کی یہ شفافی انسانی بصیرت کو کھول دیتی اور انسانی دل و دماغ کو دیکھنے 'اخذ کرنے اور فکر کرنے کی قوت عطا کرتی ہے۔ ان تمام امور کے ذریعہ مومنین کی بہت ہی اچھی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ جبکہ آیت سابقہ میں مشرکین کی نہایت ہی بھونڈی تصویر تھی۔ اس کے بعد ان کے درمیان موازنہ دیکھئے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۹ : ۹) "ان سے پوچھو کیا علم رکھنے والے اور نہ رکھنے والے دونوں یکساں ہو سکتے ہیں"۔

سچا علم دراصل معرفت الہی کا نام ہے۔ سچائی تک پہنچنے کا نام ہے۔ اور ایسا علم انسانی بصیرت کو کھول دیتا ہے۔ اور یوں ایک عالم ان حقائق تک رسائی حاصل کر لیتا ہے جو اس وجود میں ہوتی ہے۔ علم ان معلومات کا نام نہیں ہے جو ذہن میں جمع ہو جائیں اور جن سے کوئی سچا اصول اور کوئی سچی حقیقت ذہن نشین نہ ہو۔ اور نہ محسوسات کے علاوہ کوئی حقیقت ذہن میں بیٹھی ہو۔

یہ ہے صحیح راستہ علم حقیقی اور اس حقیقت کا جو دل و دماغ کو منور کر دیتی ہے۔ یہی ہے اللہ کا مطیع فرمان ہونا۔ دل کا حساس ہونا اور آخرت کا خوف اور اللہ کے فضل و کرم کی امیدواری اور یہ ہے اللہ کا خوف اور اللہ کے سامنے ڈرے اور سہمے رہنا۔ علم اور حقیقی علم یہی ہے اور اس طرح جو عقلیت پیدا ہوتی ہے وہ دیکھنے والی اور سننے والی اور جس چیز کو وہ پاتی ہے اس سے فائدہ اٹھانے والی ہوتی ہے اور یوں اس قسم کا علم ان مشاہدات کے پیچھے حقیقت عظمیٰ تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ انفرادی تجربات کو علم کہتے ہیں اور صرف ان چیزوں کو معلومات کہتے ہیں جو نظر آتی ہیں۔ ایسے لوگ معلومات جمع کرنے والے تو ہیں لیکن علماء نہیں۔

اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳۹ : ۹) "نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں"۔ یعنی کھلے دلوں والے 'جن کی بصیرت کے دروازے وا ہوں اور جو ظواہر و مشاہد کے پیچھے جھانک سکتے ہوں۔ وہ لوگ عقلمند ہیں اور وہی لوگ ہر چیز میں اللہ کے نشانات دیکھ کر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور وہ اللہ کے سامنے جوابدہی کے یقین کو بھول نہیں جاتے۔

ان دو تصویروں کے بعد اہل ایمان کو مخاطب کیا جاتا ہے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور اچھے کام کریں اور اس مختصر زندگی میں طویل زندگی کے لیے کچھ کما کر اور سجا کر چھوڑیں۔

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ

الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۗ وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ ۗ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿١٠﴾

"(اے نبی) کہو کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو' اپنے رب سے ڈرو۔ جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک رویہ اختیار کیا ہے ان کے لیے بھلائی ہے اور خدا کی زمین وسیع ہے' صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا"۔

کہو اے میرے بندو' جو ایمان لائے ہو' قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۳۹: ۱۰) اہل ایمان کی طرف نہایت ہی نظر کرم ہے۔ اصل میں عربی عبارت یوں ہے:

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۳۹: ۱۰) یعنی ان سے میرا یہ پیغام کہہ دو کہ متقی بن جاؤ۔ اپنے رب سے ڈرو۔ لیکن اللہ نے اسے براہ راست پکار کے صیغے میں تبدیل کر دیا۔ یہ ایک قسم کا اعلان اور تنبیہ ہے۔ رسول اللہ ؐ تو مسلمانوں کو (یاعبادی) کہہ کر نہیں پکارتے تھے آپ تو یاعباد اللہ کہہ کر انہیں پکارتے تھے لیکن یہ اللہ کی نظر کرم ہے کہ وہ حضورؐ سے فرماتا ہے کہ (یاعباد) کہہ کر پکارو۔ یوں یہ پکار اللہ کی جانب سے ہو اور حضور اکرم ؐ اللہ کے ڈائریکٹ خطاب کی حکایت فرمائیں۔

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ (۳۹: ۱۰) "اے نبی کہو' اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو' اپنے رب سے ڈرو"۔ تقویٰ کیا ہے' وہی دل کی حساسیت۔ اللہ کی طرف ڈر اور خشیت کے ساتھ دیکھنا۔ امید اور طمع کے ساتھ دیکھنا۔ اس کے غضب' ناراضگی سے ڈرتے رہنا۔ یہ ہے بہترین تصویر اہل ایمان کی۔ اس آیت میں جو تصویر کشی کی گئی ہے اور اس میں جو رنگ بھرے گئے ہیں وہ وہی ہیں جو آیت سابقہ میں ہیں' البتہ یہ عملی رنگ ہیں۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ (۳۹: ۱۰) "جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک رویہ اختیار کیا' ان کے لیے بھلائی ہے"۔ کیا خوب جزاء ہے کہ اس دنیا میں اچھا سلوک کرو۔ تو یہاں اس حقیر دنیا میں بھی اچھائی پاؤ اور آخرت میں بھی اچھائی پاؤ۔ جو دار بقا اور دار دوام ہے۔ لیکن یہ انسان پر فضل و کرم ہے اور اللہ کو معلوم ہے کہ یہ انسان کس قدر ضعیف اور ناتواں ہے۔ اس لیے اللہ نے اس پر بے پناہ کرم کیا۔

وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ (۳۹: ۱۰) "خدا کی زمین وسیع ہے"۔ لہٰذا زمین کی محبت اور کسی ایک جگہ کے ساتھ الفت تمہیں بہا کر نہ رکھ دے۔ نسب' رشتہ داری اور دوستی کے روابط تمہیں بڑے کاموں سے روک نہ دیں۔ ہجرت ایک عظیم مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ اگر کوئی جگہ تمہارے دین کے لیے تنگ ہو اور جہاں تم اسلام کا محسنانہ نظام جاری نہیں کر سکتے تو پھر زمین سے چمٹے رہنا شیطان کی حرکت ہے۔ اور یہ انسان کے دل پر ... کا ایک رنگ ہے۔
یہ قرآن کا نہایت ہی لطیف اشارہ ہے' اس طرف کہ انسان کے دل و دماغ میں شرک خفی اس طرح سرایت کرتی

ہے کہ بات اللہ کی وحدانیت اور اللہ سے ڈرنے کی ہو رہی ہے ۔ اور اس میں یہ لطیف اشارہ کیا گیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا سرچشمہ وہی ذات باری ہے جس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے ۔ کیونکہ انسان کے دل و دماغ کا یہ علاج وہی ذات کر سکتی ہے جو انسان کی خالق ہے اور جو انسان کے بارے میں پوری معلومات رکھتی ہے ۔ اور انسان کی شخصیت کے خفیہ گوشوں کو جانتی ہے ۔

اللہ جانتا ہے کہ یہ ہجرت انسانوں کے لیے کس قدر مشکل کام ہے ۔ دنیا کے ان رابطوں کو یکلخت ترک کر دینا' کوئی آسان کام نہیں ہے ۔ ایک چالو زندگی کو ترک کرنا' رزق کے ایسے وسائل جن کا انسان عادی ہو جائے ۔ ان کو ترک کرنا' چلتے ہوئے کاروبار کو چھوڑنا' اور بالکل ایک نئی سرزمین پر از سرنو زندگی شروع کرنا ایک بہت ہی مشکل کام ہے ۔ اس کے لئے انسان مشکل سے تیار ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اس معاملے کو بڑا صبر کہا گیا ہے اور اس پر بڑے اور پورے اجر کا وعدہ کیا گیا ہے ۔

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۹ : ۱۰) "صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا" ۔ یہاں اللہ تعالیٰ انسانی دلوں کو نہایت ہی برمحل یہ احساس دلاتا ہے اور ان کو اس کام کے لیے آمادہ فرماتے ہیں جو بالعموم انسانوں کے لیے بہت ہی دشوار ہوتا ہے ۔ اور ہجرت جیسے شدید حالات میں اللہ ان پر اپنی رحمت اور شفقت اور اپنے قرب کی شبنم گراتا ہے ۔ اور وطن کے روابط' الفت و محبت اور اہل و عیال اور رشتہ داریوں اور دوستیوں کو قربان کرنے پر بعض بے حساب اجر کا وعدہ فرماتا ہے ہیں ۔ پاک ہے وہ ذات جو انسان کے بارے میں علیم و خبیر ہے ۔ اور انسانی قلوب کے ساتھ یہ مشفقانہ معاملہ کرتی ہے ۔ اور انسانی نفسیات کے نشیب و فراز کے اندر گہرائیوں تک پائے جانے والے نہایت ہی خفیہ احساسات کو جانتی ہے اور ان کا مداوا کرتی ہے ۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۲۱۷ ایک نظر میں

اس سبق پر آخرت کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ اور آخرت کے عذاب کے مختلف رنگ اور سائے ہیں۔ نیز آخرت کے ثواب کی امیدیں بھی ہیں۔ حضور اکرم ؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ خالص توحید کے عقیدے کا اعلان کر دیں۔ اور یہ بھی اعلان کر دیں کہ اگر میں اس سے انحراف کروں تو مجھے عذاب الٰہی کا ڈر ہے اور یہ کہ میں اپنے منصوب اور منہاج پر قائم ہوں اور تم جانو اور تمہارا منہاج و طریقہ۔ البتہ اسلامی منہاج کا انجام یہ ہو گا اور کفریہ منہاج کا انجام یہ ہو گا۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۱۷ تشریح آیات

## ۱۱ --- تا --- ۲۰

---

قُلْ إِنِّيٓ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ ﴿١١﴾ وَأُمِرْتُ لِأَنْ أَكُونَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٢﴾ قُلْ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٣﴾

(اے نبیؐ) ان سے کہو' مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کروں' اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں خود مسلم بنوں۔ کہو' اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے"۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلان ہے کہ آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ اللہ وحدہ کی بندگی کریں اور دین اس کے لیے خالص کر دیں۔ اور اس طرح آپ پہلے مسلمان بن جائیں اور یہ بھی اعلان کر دیں کہ اگر میں اپنے رب کی معصیت کا ارتکاب کر لوں تو میرے لیے بھی عذاب الٰہی کا خطرہ ہے۔ اسلام نے جو عقیدۂ توحید پیش کیا ہے اس کو خالص کرنے کے لیے اس اعلان کی بڑی اہمیت ہے۔ اس عقیدے کے حوالے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کے ایک بندے ہی ہیں اور آپؐ مقام بندگی سے آگے نہیں جا سکتے۔ اور تمام انسان بھی بندگی کے مقام پر مساوی طور پر کھڑے ہیں اور صرف ذات باری ہی ہے جو ان بندوں کے اوپر نگہبان ہے۔ یہ ہے مراد اس آیت سے۔

اس طرح مقام الوہیت اور مقام بندگی اپنی اپنی جگہ پر الگ ہو جاتے ہیں اور بالکل متمیز ہو جاتے ہیں۔ ان میں نہ کوئی اختلاط ہوتا ہے اور نہ کوئی اشتباہ ہوتا ہے اور وحدانیت کی صفت اللہ وحدہ کے لیے مختص ہو جاتی ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا۔ اور جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت بندہ دوسرے بندوں کے ساتھ ہم صف کھڑے ہیں اور آپ بھی اللہ کی معصیت کے ارتکاب سے ڈرتے ہیں لہٰذا بتوں اور فرشتوں کی سفارش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ اللہ کے ساتھ ساتھ یا مستقلاً ان کی عبادت کا سوال پیدا ہوتا ہے' حضور اکرمؐ ایک بار پھر اللہ کی بندگی کا اعلان فرماتے ہیں اور اصرار کے ساتھ بندگی کا اعلان فرماتے ہیں اور مشرکین سے کہہ دیا جاتا ہے کہ تم جانو اور تمہارا دردناک انجام۔

قُلِ اللَّهَ أَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُ دِينِي ﴿١٤﴾ فَاعْبُدُوا مَا شِئْتُم مِّن دُونِهِ ۗ قُلْ

اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۵﴾

''کہہ دو کہ میں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اسی کی بندگی کروں گا' تم اس کے سوا جس جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو۔ کہو' اصل دیوالیے تو وہی ہیں جنہوں نے قیامت کے روز اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو گھاٹے میں ڈال دیا۔ خوب سن رکھو' یہی کھلا دیوالیہ ہے''۔

اور دوبارہ اعلان کیا جاتا ہے کہ دیکھو میں تو اپنی راہ پر چل رہا ہوں' میں بندگی صرف اللہ کی کرتا ہوں' نظام زندگی صرف اللہ کا اپناتا ہوں' تم بھی جس راہ کو پسند کرو اور جس کی بندگی چاہو' اختیار کرو لیکن تم اس عظیم دیوالیہ پن سے دوچار ہو گے۔ اتنا بڑا خسارہ ہو گا تمہیں جس سے بڑا اور کوئی خسارہ نہ ہو گا۔ تم اپنی جان کو جہنم تک پہنچا دو گے۔ تمہیں اہل و عیال کا خسران ہو گا چاہے مومن ہوں یا کافر۔ اگر اہل مومن ہوں تو وہ جنتوں کو چلے جائیں گے اور یہ جہنم میں ان سے بہرحال گم ہوں گے۔ اگر کافر ہوں تو جس طرح خود کو گنوایا اسی طرح ان کو بھی گنوایا۔ دونوں جہنم میں ہوں گے۔

ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (۳۹ : ۱۵) ''یہی کھلا دیوالیہ ہے''۔ اور اس خسارے کا ایک منظر یہ ہے :

لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ؕ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ؕ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ﴿۱۶﴾

''ان پر آگ کی چھتریاں اوپر سے بھی چھائی ہوں گی اور نیچے سے بھی۔ یہ وہ انجام ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے' پس اے میرے بندو' میرے غضب سے بچو''۔

فی الواقع یہ ایک خوفناک منظر ہے۔ یہ آگ کا منظر ہے۔ ان کے اوپر بھی آگ کی چھتریاں ہوں گی اور نیچے بھی اور وہ ان چھتریوں میں لپٹے ہوں گے اور آگ کے یہ شعلے جنہیں چھتریاں کہا گیا ہے ان پر حاوی ہوں گے۔ یہ خوفناک منظر اللہ اپنے بندوں کے سامنے اس وقت پیش کرتا ہے جبکہ ابھی وہ دنیا میں ہیں اور اگر وہ اس سے بچنا چاہیں تو بچ سکتے ہیں۔

ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ (۳۹ : ۱۶) ''یہ وہ انجام ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے''۔ ان کو زور زور سے پکارتا ہے کہ بچو بچو! آگے بہت بڑا خطرہ ہے۔

يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ (۳۹ : ۱۶) ''اے میرے بندو' میرے غضب سے بچو''۔ اور دوسری جانب' بالمقابل پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں وہ لوگ جو نجات پا چکے ہیں' جو دنیا میں اس برے انجام سے ڈر گئے تھے :

وَ الَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَ اَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ

الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿۱۷﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۸﴾

"بخلاف اس کے جن لوگوں نے طاغوت کی بندگی سے اجتناب کیا اور اللہ کی طرف رجوع کر لیا ان کے لیے خوشخبری ہے ۔پس (اے نبیؐ) بشارت دے دو میرے ان بندوں کو جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں ۔یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی دانش مند ہیں"۔

طاغوت کا صیغہ طغیان سے ہے ۔جس طرح ملکوت' عظوت اور رحموت کے صیغے بنے ہیں اس کے مفہوم میں ضخامت اور مبالغہ پایا جاتا ہے ۔اس کا مروج مفہوم یہ ہے کہ جو بھی سرکشی کرے اور حد سے تجاوز کر جائے' وہ طاغوت ہے ۔اور جو لوگ طاغوت کی بندگی اور طاعت سے اجتناب کرتے ہیں وہ لوگ کون ہیں؟ وہ جو کسی شکل میں بھی طاغوت کی بندگی نہ کریں ۔اور یہ وہی لوگ ہوں گے جو ہر چھوٹے بڑے کام میں اللہ کی بندگی کرنے والے ہوں' اس کی طرف لوٹنے والے ہوں اس کی طرف رجوع کرنے والے ہوں اور بندگی کے صحیح مقام پر کھڑے ہوں۔

ایسے ہی لوگوں کے لیے بشارت ہے اور یہ بشارت عالم بالا سے ہے اور رسول اللہؐ ان کو اس کی خوشخبری دے رہے ہیں ۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فَبَشِّرْ عِبَادِ (۳۹:۱۷) "ان کے لیے خوشخبری ہے ۔(پس اے نبیؐ) بشارت دے دو میرے ان بندوں کو"۔ان کے لیے عالم بالا سے بشارت آئی اور رسول اللہؐ نے سنا دی تو اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے؟

اللہ کے ایسے بندوں کی صفت یہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ اللہ کی جو بات سنتے ہیں اسے غور سے سنتے ہیں ۔پھر اس بات کی وہ اطاعت کرتے ہیں کیونکہ وہ بہت ہی احسن ہوتی ہے اور دوسری باتوں کو وہ ترک کر دیتے ہیں ۔لہذا وہ صرف اچھی بات ہی لیتے ہیں ۔اس کے ذریعہ اپنے اذہان و قلوب کو صاف کرتے ہیں ۔اور ہمیشہ یوں ہوتا ہے کہ پاک اور طیب نفوس پاک اور احسن باتوں کے لیے ہمیشہ کھلے ہوتے ہیں ۔وہ فوراً قبول کرتے ہیں اور ناپاک اور خبیث دل طیب چیزوں کے لیے بند ہوتے ہیں ۔اور گندی باتیں ہی قبول کرتے ہیں ۔

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ (۳۹:۱۸) "یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے"۔کیونکہ اللہ نے دیکھ لیا کہ ان کے دلوں میں خیر موجود ہے ۔لہذا اللہ نے ان کو خیر کی طرف ہدایت دی اور انہوں نے اچھی باتوں کو سنا اور قبول کر لیا ۔اور ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے ۔

وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳۹:۱۸) "اور یہی لوگ دانشمند ہیں"۔عقل سلیم ہی انسانوں کو پاکیزگی کی طرف مائل کرتی ہے ۔نجات کی طرف مائل کرتی ہے ۔لہذا جو شخص پاکیزگی اور نجات کی طرف میلان نہیں رکھتا

وہ گویا مسلوب العقل ہے اور اس نے اللہ کی دی ہوئی نعمت سے انکار کر دیا ہے۔ قبل اس کے پاکیزہ لوگوں کے انعام و انجام کو پیش کیا جائے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ طاغوت کے یہ بندے دراصل عملاً آگ تک پہنچ گئے ہیں اور ان میں سے ایک بھی آگ سے نجات نہیں پا سکتا۔

اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۭ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ۝۱۹

"(اے نبیؐ) اس شخص کو کون بچا سکتا ہے جس پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہو؟ کیا تم اسے بچا سکتے ہو جو آگ میں گر چکا ہو"۔

خطاب رسول خدا سے ہے۔ اور اگر رسول اللہؐ ان کو آگ سے نہیں بچا سکتے تو آپ کے سوا اور پھر کون ہے جو ان لوگوں کو آگ سے بچا سکے"۔

ان جہنمیوں کے منظر کے بالمقابل ان لوگوں کا منظر ہے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور ان باتوں سے ڈرتے ہیں جن سے اللہ نے ان کو ڈرایا ہے۔ گویا یہ جہنمی عملاً جہنم میں ہیں اور جنتی عملاً جنت میں ہیں۔

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ڛ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ۝۲۰

"البتہ جو لوگ اپنے رب سے ڈر کر رہے ان کے لیے بلند عمارتیں ہیں منزل پر منزل بنی ہوئی' جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے' اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا"۔

اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے منزل پر منزل بنی ہوئی بلند عمارتوں یعنی بالا خانوں کا یہ منظر اہل جہنم کے اس منظر کے بالمقابل ہے جن کے اوپر بھی چھتریاں ہوں گی آگ کی اور نیچے بھی ہوں گی۔ یہ تقابل قرآن کے انداز کلام کا ایک حصہ ہے۔ اور یہ ان تمام مناظر میں پایا جاتا ہے جو قرآن مجید میں تقابلی مناظر کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔

یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کا وعدہ ہمیشہ واقع ہو کر رہتا ہے۔ جن مسلمانوں نے سب سے پہلے اس قرآن کو سنا۔ انہوں نے ان مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کے لیے کوئی وعدہ یا وعید دور نہ تھا۔ ان کے قلوب اور ان کے احساسات تو ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ وعدے اور وعید تو ان کے لیے مشاہدہ تھے۔ یہ وعدے اور وعید سن کر وہ کانپ اٹھتے تھے اور ان کے نفوس اس طرح اپنا رخ قرآن کے ساتھ بدل دیتے تھے۔ جس طرح بادنما ہوا کے ساتھ رخ کو بدل دیتا ہے۔ اور وہ اپنی زندگی کو اخروی مناظر کے مطابق بدل دیتے تھے اور وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی مناظر قیامت میں زندہ رہ رہے تھے۔ یہی رویہ ہونا چاہئے ایک مسلمان کا قرآن کے حوالے سے کہ وہ قرآن کو سمجھے اور اپنی عملی زندگی کے رخ کو قرآن کے رخ پر ڈالتا رہے۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۲۱۸ ایک نظر میں

یہ سبق عالم نباتات کی ایک جھلک دکھاتا ہے کہ کس طرح اللہ پانی آسمانوں سے اتارتا ہے اور پھر زمین سرسبز ہو کر فصلیں اگتی ہیں اور یہ فصلیں اپنے انجام تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ مثال قرآن میں زمین کی بے ثباتی اور حیات دنیا کے اختصار کے لیے دی جاتی ہے۔ اور اہل فکر و نظر کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس پر غور و فکر کریں۔ پھر آسمانوں سے پانی کے نزول کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ یہ کتاب بھی ایک قسم کا باران رحمت ہے جو آسمانوں سے نازل ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ سے خشک دل سرسبز ہو جاتے ہیں اور کھل جاتے ہیں۔ اس موقعہ پر ایک نہایت ہی اشاراتی تصویر بھی پیش کی جاتی ہے کہ کھلے دل اس کتاب سے کس طرح استفادہ کرتے ہیں۔ وہ اس سے ڈرتے ہیں' ان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے' رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور نرم ہو کر ان کے اندر قبولیت پیدا ہوتی ہے اور پھر ہدایت قبول کر کے وہ خوب مطمئن ہو جاتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کی تصویر جو ذکر الہی کی طرف لبیک کہتے ہیں اور ان کی تصویر جن کے دل پتھر ہو گئے ہیں۔ آخر میں توحید کی حقیقت کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور ایک مثال دی جاتی ہے کہ اللہ واحد کی بندگی کرنے والوں اور متعدد الہوں کی بندگی کرنے والوں کی حالت کیا ہوتی ہے۔ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ دونوں کا ایک حال نہیں ہو سکتا' مثلاً ایک غلام جس کے مختلف اور باہم لڑنے جھگڑنے والے مالک ہوں اور دوسرا غلام جو صرف ایک ہی سنجیدہ مالک کا غلام ہو۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۱۸ تشریح آیات

## ۲۱ --- تا --- ۲۹

---

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِى الْاَرْضِ
ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ ۲
يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۲۱﴾ ع۱۲
۱۶

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا' پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا' پھر اس پانی کے ذریعہ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں' پھر وہ کھیتیاں پک کر سوکھ جاتی ہیں' پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ گئیں' پھر آخر کار اللہ ان کو بھس بنا دیتا ہے ۔ درحقیقت اس میں ایک سبق ہے عقل رکھنے والوں کے لیے"۔

یہ منظر جس کی طرف یہاں قرآن کریم ہماری توجہ مبذول کراتا ہے' ایک ایسا منظر ہے جو اس کرۂ ارض پر ہر جگہ دہرایا جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ اس منظر میں جو عجائبات ہیں ان کی تعجب خیزی بوجہ بار بار دہرائے جانے کے' ختم ہو جاتی ہے اور انسان ان سے مانوس ہو جاتا ہے ۔ قرآن کریم انہی مناظر کو دوبارہ گہرے غور و فکر کے لیے پیش کرتا ہے کہ انسان اس منظر کی ترقی پر مرحلہ وار غور کرے ۔

دیکھو' آسمانوں سے پانی نازل ہو رہا ہے ۔ یہ پانی کیا ہے اور کس طرح یہ آ رہا ہے ۔ یہ چونکہ اکثر نازل ہوتا رہتا ہے ۔ اس لیے ہم اس پر سے یوں ہی گزر جاتے ہیں ۔ یہ پانی اور اس کی تخلیق بذات خود ایک معجزہ ہے ۔ اگرچہ ہمیں اس قدر معلوم ہو گیا ہے کہ یہ ایک متعین انداز میں ہائیڈروجن کے دو ذروں کا آکسیجن کے ایک ذرے کے ملاپ کا نام ہے ۔ لیکن ہمارا یہی علم ہے کہ اللہ نے کائنات کے اندر ہائیڈروجن اور آکسیجن کو پیدا کیا اور پھر ایسے حالات پیدا کیے ۔ کہ یہ ذرے آپس میں مل گئے اور اس اتحاد کے نتیجے میں پانی وجود میں آگیا ۔ اور اس کے بعد اس زمین پر حیات کا پیدا کیا جانا ممکن بنا دیا گیا اور اللہ کا دست قدرت ان تمام امور کے پیچھے ہے ۔ اور یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی صنعت کاریاں ہیں ۔ پھر آسمانوں سے اس پانی کا نازل کرنا' اس مخصوص انداز میں ایک دوسرا معجزہ ہے کہ اس زمین اور اس کائنات کو اس انداز

میں بنایا کہ پانیوں کا برسنا ممکن ہو گیا۔

پھر اس کے بعد جو مرحلہ آتا ہے وہ یہ کہ

فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ (۳۹ : ۲۱) "پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا"۔ اس میں وہ دریا بھی شامل ہیں جو زمین پر بہتے ہیں۔ اس میں وہ ذخیرے بھی شامل ہیں جو سطح زمین کے نیچے ادھر ادھر چلتے ہیں۔ اور سوتوں اور چشموں کی شکل میں نکلتے ہیں۔ یا اس سطح زمین کے اندر کنویں نکال کر جاری کیے جاتے ہیں اس طرح کہ اللہ اس پانی کو سطح کے قریب رکھتا ہے اور یہ پانی دور تک نہیں جاتے کہ کبھی واپس ہی نہ ہو سکیں۔

ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ (۳۹ : ۲۱) "پھر اس پانی کے ذریعہ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جس کی قسمیں مختلف ہیں"۔ نباتاتی زندگی جو بارش کے نتیجے میں نمودار ہوتی ہے اور بارش سے پیدا ہوتی ہے ایک ایسا معجزہ ہے جس کا مقابلہ انسانی جدوجہد نہیں کر سکتی۔ ایک چھوٹی سی کونپل جو زمین سے سر نکالتی ہے 'زمین کے بھاری بوجھ کو پھاڑ کر اور سر نکال کر کھلی فضا میں سانس لیتی ہے اور روشنی اور ہوا سے لطف اندوز ہوتی ہے اور آزاد فضا میں آزادی سے لہلہاتی ہے اور پھر یہ فضا میں آہستہ آہستہ اوپر اٹھتی ہے۔ صرف اس کونپل کا ملاحظہ ہی انسان کے دل و دماغ کو ذکر الہی سے بھر دیتا ہے۔ اور اللہ خالق کائنات کے احساس کی ایک لہر انسان کے ذہن میں اٹھا دیتا ہے وہ اللہ جس نے ہر چیز کو اس کا وجود بخشا اور پھر اسے ہدایت دی پھر ایک ہی قطعہ زمین میں مختلف قسم کے پھل' مختلف پھل نہیں بلکہ ایک چھوٹا سا پودا بلکہ ایک ہی قطعہ زمین میں مختلف قسم کے پھل' مختلف پھل نہیں بلکہ ایک چھوٹا سا پودا بلکہ ایک چھوٹا سا پھول بھی قدرت باری تعالیٰ کی ایک عظیم نمائش گاہ ہے۔ انسان صرف ایک پھول کا تجزیہ کر کے ہی اپنے عجز کا اظہار کر دیتا ہے۔

اور پھر یہ سرسبز فصل اپنی سرسبزی ختم کر کے پک جاتی ہے اور اپنے دن پورے کر کے۔

ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا (۳۹ : ۲۱) "پھر وہ کھیتیاں پک کر سوکھ جاتی ہیں۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ گئیں"۔ اور اس کائنات کے ناموس فطرت میں اس کے لیے جو انجام مقرر ہے اس تک وہ پہنچ جاتی ہے اور مراحل حیات طے کر کے پک جاتی ہے۔

ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا (۳۹ : ۲۱) "پھر آخر کار اللہ ان کو بھس بنا دیتا ہے"۔ اس کا وقت مقررہ آ پہنچا ہے۔ وہ اپنا کردار ادا کر دیتی ہے۔ اور اس کا دور ختم ہوتا ہے جو زندگی بخشنے والے اللہ نے اس کے لیے مقرر فرمایا تھا۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ (۳۹ : ۲۱) "درحقیقت اس میں سبق ہے عقل رکھنے والوں کے لیے"۔ وہ عقل رکھنے والے جو غور کرتے ہیں' سبق لیتے ہیں اور اللہ نے ان کو جو صلاحیتیں دی ہیں اور جو عقل و خرد دی' ہے اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

أَفَمَن شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِ ۚ فَوَيْلٌ

لِلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ڰ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝

”اب کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا اور وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہے (اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس نے ان باتوں سے کوئی سبق نہ لیا؟)۔ تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جن کے دل اللہ کی نصیحت سے اور زیادہ سخت ہو گئے۔ وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے' ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزاء ہم رنگ ہیں اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں۔ اسے سن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں' اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے وہ راہ راست پر لے آتا ہے جسے چاہتا ہے اور جسے اللہ ہی ہدایت نہ دے اس کے لیے پھر کوئی ہادی نہیں ہے“۔

جس طرح آسمانوں سے پانی نازل ہوتا ہے' زمین سے نباتات اگتے ہیں اور ان کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح آسمان سے ذکر اور نصیحت نازل ہوتی ہے۔ اس ذکر سے بھی زندہ دل فائدہ اٹھاتے ہیں' ان دلوں کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ وہ ہدایات لیتے ہیں اور اچھے کاموں کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ اور جس طرح آسمانوں کی بارش پتھروں پر فصل نہیں اگاتی۔ اسی طرح سنگدل لوگوں پر ذکر آسمانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور نہ ان میں کار خیر کی روئیدگی ہوتی ہے اور نہ فکر خیر کی روئیدگی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اسلام کے لیے ایسے دلوں کے اندر شرح صدر پیدا کر دیتا ہے جن کے بارے میں اللہ کے علم میں ہوتا ہے کہ ان کے اندر خیر ہے۔ ان تک نور الٰہی پہنچتا ہے تو وہ چمک اٹھتے ہیں اور ان سے روشنی پھوٹتی ہے۔ اور شرح صدر والے قلوب اور سنگدل قلوب میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (۳۹ : ۲۲) ”تباہی ان لوگوں کے لیے جن کے دل نصیحت سے اور سخت ہو جاتے ہیں“۔

اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۹ : ۲۲) ”وہ لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں“۔ یہ آیت کریمہ ان دلوں کی حقیقت بیان کرتی ہے جو اسلام کے لیے کھل جاتے ہیں' جو اسلام سے ہدایات لیتے ہیں اور اسلام سے تروتازگی حاصل کرتے ہیں اور اپنے دلوں کا تعلق اللہ سے جوڑتے ہیں۔ ان کی شرح صدر کی حالت سے ان کی تروتازگی' ان کے اندر پائی جانے والی بشاشت اور مسرت اور نورانیت اور اشراق کی کیفیات وجود میں آتی ہیں اس کے مقابلے میں یہ آیت

ان دلوں کا حال بھی بتاتی ہے جو سخت اور پتھر ہیں۔ جو اپنی خشکی کی وجہ سے مرچکے ہیں۔ بانجھ اور تاریک ہو چکے ہیں۔ غرض اللہ جس کو اسلام کے لیے پسند کرتا ہے اس کا دل اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور اسلام کا نور ان کے دلوں میں داخل ہو جاتا ہے اور جسے محروم کرنا چاہتا ہے اس کا دل سخت کر دیتا ہے اور ان دونوں کے اندر بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔

دوسری آیت میں یہ بتایا گیا کہ اہل ایمان قرآن کریم کو کس انداز میں لیتے ہیں۔ قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جس کے اندر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس کی طبیعت اور مزاج میں' اس کی سمت میں' اس کی روح میں' اس کے خصائص میں' یہ ان تمام زاویوں سے متشابہ اور مثانی ہے (دہرائی ہوئی)۔ اس کی آیات کے آخری حصے یعنی مقطعے' اس کے قصص اور اس کی ہدایات اور اس کے مناظر بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں تضاد نہیں ہوتا۔ ہر جگہ ایک نئے زاویہ سے دہرائے جاتے ہیں اور ہر جگہ نئے لگتے ہیں اور ہر جگہ نیا فائدہ ہوتا ہے۔ نہایت ہم آہنگی' نہایت سنجیدگی اور مضبوط اصولوں کے مطابق' جن میں نہ تصادم ہے اور نہ تضاد ہے۔

وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس کے احکام کے مطابق پرہیز کرتے ہیں اور ہر وقت احتیاط میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ہر وقت اللہ کے فضل کے امیدوار ہوتے ہیں۔ وہ قرآن کریم کے باران رحمت کو نہایت خوف اور کپکپی سے لیتے ہیں۔ اور وہ اس سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ کانپ اٹھتے ہیں۔ ان کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد ان کے نفوس کے اوپر سکون کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور ان کے دل اس ذکر سے مانوس ہو جاتے ہیں' پھر ان کے دل نرم ہو کر اس نصیحت کو قبول کر لیتے ہیں۔

یہ ایک زندہ اور حساس صورت حالات ہے۔ یہ صورت حالات الفاظ کے رنگ سے منقش ہے اور یہ تصاویر یوں نظر آتی ہیں کہ گویا زندہ و متحرک ہیں۔

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (۳۹:۲۳) "یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے وہ جس کو چاہتا ہے' راہ راست پر لے آتا ہے"۔ یہ دل از خود اس طرح کانپ نہیں جاتے بلکہ یہ رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہوتے ہیں اور رحمٰن کے فضل و کرم سے وہ لبیک کہتے ہیں اور ان کے اندر نور پیدا ہو جاتا ہے' اللہ کو تمام قلوب کی حقیقت کا علم ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ کسی کو ہدایت دیتا ہے اور کسی کو گمراہی لیکن یہ ان قلوب کی پسند کے مطابق ہوتا ہے۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۳۹:۲۳) "اور جسے اللہ گمراہ کر دے اس کے لیے پھر کوئی ہادی نہیں ہے"۔ اللہ اس کو اس لیے گمراہ کرتا ہے کہ وہ شخص گمراہی اختیار کرتا ہے اور اللہ کو علم ہوتا ہے کہ اس نے ایسا کر لیا ہے یا کرے گا اور وہ کبھی بھی ہدایت کو قبول نہ کرے گا۔ اور نہ ہدایت کے سامنے سر جھکائے گا۔

اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَقِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝۲۴

"اب اس شخص کی بدحالی کا تم کیا اندازہ کر سکتے ہو جو قیامت کے روز عذاب کی سخت مار اپنے منہ پر لے گا؟ ایسے ظالموں سے تو کہہ دیا جائے گا کہ اب چکھو مزہ اس کمائی کا جو تم کرتے رہے تھے"۔

انسان کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں اور اپنے جسم کے ذریعے بھی اپنے چہرے کو بچاتا ہے ۔ یہاں دوزخ کے اندر تو وہ اپنے آپ کو کسی صورت میں بھی آگ سے نہیں بچا سکتا۔ نہ ہاتھوں سے ' نہ پاؤں سے ۔ لہٰذا وہ یہاں چہرے سے آگ کو دفع کرے گا۔ اور چہرے کے ذریعہ سخت عذاب سے بچنے کی سعی کرے گا۔ یہاں مراد ہے شدید ڈر' شدید خوف اور شدید اضطراب ۔ اس قسم کی صورت حال میں اب کفار کو سرزنش کی جاتی ہے اور اس کے سامنے اس کی پوری زندگی کی کمائی پیش کی جاتی ہے ۔

وَقِيلَ لِلظَّلِمِينَ ذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ (۳۹ : ۲۴) "اور ظالموں سے کہہ دیا جائے گا' اب چکھو مزہ' اس کمائی کا جو تم کرتے تھے"۔ اب روئے سخن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرنے والے لوگوں سے پھر کر ان اقوام کی طرف چلا جاتا ہے جنہوں نے انسانی تاریخ میں دوسرے نبیوں کی تکذیب کی تاکہ ذرا وہ تاریخ سے بھی سبق لیں اور اپنا بندوبست بھی کر لیں ۔

كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَأَتَىٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٥﴾ فَأَذَاقَهُمُ اللَّهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٢٦﴾

"ان سے پہلے بھی بہت سے لوگ اسی طرح جھٹلا چکے ہیں۔ آخر ان پر عذاب ایسے رخ سے آیا جدھر ان کا خیال بھی نہ جا سکتا تھا۔ پھر اللہ نے ان کو دنیا ہی کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا' اور آخرت کا عذاب تو اس سے شدید تر ہے' کاش یہ لوگ جانتے"۔

یہ ہے حال مکذبین کا دنیا اور آخرت دونوں میں ۔ دنیا میں بھی اللہ نے ان کو شرمندہ اور ذلیل کیا۔ آخرت میں بھی ان کے لیے ایک عظیم عذاب انتظار میں ہے ۔ اللہ کی سنت اپنا کام کرتی ہے ۔ وہ اٹل ہے ۔ اقوام رفتہ کا انجام پوشیدہ نہیں ہے ۔ وہ شاہد عادل ہے ۔ اللہ کی دھمکی قائم ہے کہ وہ آخرت میں ان کو سزا دے گا۔ ان کے سامنے اب بھی فرصت کے لمحات موجود ہیں ۔ ان کو غنیمت سمجھیں اور قرآن کی نصیحت سے ہدایت لیں'

لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۳۹ : ۲۶) "کاش یہ لوگ جانتے"۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٢٧﴾

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۲۸﴾ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۹﴾

"ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح کی مثالیں دی ہیں کہ یہ ہوش میں آئیں ۔ ایسا قرآن جو عربی زبان ہے ' جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے ' تاکہ یہ برے انجام سے بچیں ۔ اللہ ایک مثال دیتا ہے ۔ ایک شخص تو وہ ہے جس کے مالک ہونے میں بہت سے کج خلق آقا شریک ہیں جو اسے اپنی اپنی طرف کھینچتے ہیں اور دوسرا شخص پورا کا پورا ایک ہی آقا کا غلام ہے ۔ کیا ان دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے ؟ --- الحمد للہ ' مگر اکثر لوگ نادانی میں پڑے ہوئے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کسی ایسے بندے کی جو موحد ہے اور کسی ایسے بندے کی جو مشرک ہے ' یہ مثال دیتا ہے کہ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک غلام ایک شخص کی خالص ملکیت ہو اور دوسرا غلام کئی مختلف الخیال مالکان کے درمیان مشترکہ ہو ۔ اس مشترکہ غلام میں مختلف مالکان کے علیحدہ علیحدہ مطالبے ہیں ۔ اور یہ بیچارہ ان کے درمیان حیران و پریشان ہے ۔ کوئی ادھر کھینچتا ہے ' کوئی ادھر ۔ وہ اسے کوئی ایک پروگرام نہیں دیتے اور اس بیچارے کی یہ طاقت ہی نہیں ہے کہ وہ ان کی متضاد فرمائشیں شروع کر سکے ۔ کیونکہ وہ اس کے رخ کو بھی تبدیل کر رہی ہیں ۔ اور اس کی خواہشات کو بھی تبدیل کر رہی ہیں ۔ اور ایک مالک کا غلام یکسو ہے ۔ اس کو مالک نے ایک پروگرام دیا ہوا ہے اور اسے معلوم ہے کہ اس نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایک آقا کا غلام مطمئن ' خوش اور یکسو ہو گا ۔

هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ( ۳۹ : ۲۹ ) "کیا ان دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے"۔ یقیناً دونوں برابر نہیں ہیں ۔ ظاہر ہے کہ جس کا ایک آقا ہے وہ آرام ' استراحت ' استقامت اور یقینی پروگرام رکھتا ہے ۔ اس کی قوتیں مجتمع ہیں ۔ اس کا رخ متعین ہے ۔ اس کی راہ متعین ہے اور جس غلام کے مختلف الخیال آقا ہیں ۔ وہ ایک دائمی عذاب میں ہے ۔ ایک دائمی کشاکش میں ہے ۔ اور ہروقت قلق و بے چینی میں مبتلا ہے ۔ کسی ایک حال پر برقرار نہیں ہے ۔ اور اس سے ایک مالک بھی راضی نہ ہو گا ' سب کا راضی ہونا تو محال ہے ۔

یہ مثال حقیقت توحید اور حقیقت شرک پر تمام حالات میں منطبق ہے ۔ ایک موحد و مومن اس زمین پر اپنا سفر نہایت ہی سیدھے راہ پر علی وجہ البصیرت طے کرتا ہے ۔ کیونکہ ان کی نظریں ہمیشہ ایک نصب العین پر مرکوز ہیں ۔ پوری زندگی ' پوری قوت اور تمام ضروریات اور تمام نفع و نقصان وہ ایک جہت سے طلب کرتا ہے ۔ ایک ذات ہے جو اسے روکتی ہے اور ایک ہی ذات ہے جو اسے اجازت دیتی ہے ۔ لہٰذا اس کے قدم سیدھے اس ایک سرچشمے کی طرف بڑھتے ہیں ۔ وہ اسی سرچشمے سے اخذ کرتا ہے اور اس کے ہاتھوں میں ایک ہی مضبوط رسی ہے جسے اس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے ' ایک ہی ہدف ہے جس پر وہ نظریں جمائے ہوئے ہے ۔ ایک ہی آقا کی وہ خدمت کرتا ہے ۔ اسے معلوم ہے کہ میرا

آقا کس بات پر راضی ہوتا ہے اور کس پر ناراض ہوتا ہے ۔ یوں اس کی قوتیں مجتمع ہوتی ہیں اور یوں وہ پوری قوت کے ساتھ زمین پر کام کرتا ہے ۔ اور آسمان پر نظریں جمائے ہوتا ہے ۔

اور اس مثال پر تبصرہ الحمدللہ سے کیا جاتا ہے کہ اس نے عقیدۂ توحید کے ذریعے اپنے بندوں کو آرام و اطمینان اور راحت بخشی ہے ۔ اور ان کی زندگی کو ثبات و قرار عطا کیا ۔ اب اگر وہ اس سے انحراف کرتے ہیں تو وہ لاعلم ہیں ۔

یہ ان مثالوں میں سے ایک ہے جو قرآن نے لوگوں کی راہنمائی کے لیے دی ہیں تاکہ لوگ حقیقت کو جان سکیں ۔ یہ قرآن عربی ہے 'سیدھا' واضح اور بین ہے ۔ اس کے معانی میں کوئی التباس نہیں ۔ نہ پیچیدگی اور انحراف ہے اور یہ عوام الناس کو ایک فطری استدلال سے خطاب کرتا ہے 'جو ان کی سمجھ میں آتا ہے ۔

---ooo---

# درس نمبر۲۱۹ ایک نظر میں

یہ سبق اس سے ماقبل کے تمام اسباق پر ایک تبصرہ ہے۔ آسمانوں سے پانی کے نزول کی نشانی بیان کرنے کے بعد' مردہ زمین پر روئیدگی پیدا ہو کر فصل کاٹنے تک کی نشانی کے بعد' اور اللہ کی جانب سے نازل ہونے والی اس کتاب کی نشانیوں کے بعد اور قرآنی امثال کے بیان کے بعد اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ یقین دہانی کرانے کے بعد کہ اکثر لوگ نہیں جانتے' یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ لوگوں کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اب بعث بعد الموت کے بعد ہی اللہ تمام حقائق کا فیصلہ کر دے گا۔ لہذا تکذیب کرنے والوں کو ان کی تکذیب کا بدلہ مل جائے گا اور وہ اس کے مستحق ہوں گے۔ اور سچوں کو سچائی کا وہ صلہ مل جائے گا جس کے وہ مستحق ہوں گے۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۲۱۹ تشریح آیات

## ۳۰ --- تا --- ۳۵

۳ إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ ﴿٣٠﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِندَ
ع۱۰ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ ﴿٣١﴾
۱۷

"(اے نبیؐ) تمہیں بھی مرنا ہے اور ان لوگوں کو بھی مرنا ہے' آخر کار قیامت کے روز تم سب اپنے رب کے حضور اپنا اپنا مقدمہ پیش کرو گے"۔

ہر زندہ مخلوق نے اس جام کو ہونٹوں سے لگانا ہے' باقی رہے گا صرف نام اللہ کا۔ اور موت کے معاملے میں تمام انسان برابر ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جان دینی ہے اور یہاں اس کا ذکر بھی توحید کے ثبوت کے لیے ہے۔ اور توحید اس سورت کا بڑا موضوع ہے۔ اس کے بعد بعث بعد الموت کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ کیونکہ موت ہی پر معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ تو ایک مرحلہ ہے۔ اس کے بعد کے مراحل آنے والے ہیں۔ اس لئے کہ مخلوقات میں سے کوئی چیز عبث نہیں ہے کہ یونہی چلی جائے کہ بس پیدا ہوئے اور مر گئے۔ آج دنیا میں جن موضوعات پر لوگ باہم دست و گریباں ہیں ان پر رب کے ہاں بھی جھگڑے ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے ہاں کھڑے ہوں گے اور وہاں پھر پوچھا جائے گا کہ اب بتاؤ تم رسول اللہ کے مقابلے میں کیا کیا کرتے رہے ہو۔ اور اللہ کی ہدایت اور قرآن کا کیا کیا مقابلہ کرتے رہے ہو۔

--- ○○○ ---

# فی ظلال القرآن

## پارہ ۔ ۲۴

## جلد پنجم

سورہ الزمر ۔ ۳۹

۳۲ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۷۵

سورہ المومن ۔ ۴۰

۱ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۸۵

سورہ حم السجدہ ۔ ۴۱

۱ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۴۶

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝

"پھر اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور جب سچائی اس کے سامنے آئی تو اسے جھٹلا دیا۔ کیا ایسے لوگوں کے لیے جہنم میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے؟"

یہ سوال استفہام کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ سوال تقریری ہے۔ اس لیے کہ ایسے شخص سے بڑا ظالم اور کوئی نہیں ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے' کسی کو اللہ کا بیٹا اور کسی کو بیٹی کہتا ہے۔ سچائی کی تکذیب کرتا ہے جسے رسول اللہ لے کر آئے ہیں۔ وہ کلمہ توحید کی تصدیق نہیں کرتا۔ چونکہ یہ ایک کفریہ عمل ہے' اور کافروں کا ٹھکانہ یقیناً جہنم ہے اس لئے اس کے فیصلہ کن اظہار کی خاطر سوالیہ انداز اور اسلوب اختیار کیا گیا ہے تاکہ بات زیادہ واضح ہو جائے اور اس کی زیادہ تاکید ہو جائے۔

یہ تو مجادلہ اور جھگڑے کا ایک فریق تھا۔ اور فریق مقابل کون ہے؟ تو وہ شخص ہے جو اللہ کی طرف سے وہ سچائی لے کر آیا۔ اور اس نے اس کی تصدیق کی اور اس سچائی کو لوگوں تک پہنچایا' نہایت عقیدت مندی اور تسلی کے ساتھ۔ اور اس شخص یعنی رسول اللہ کے ساتھ تمام رسول اور انبیائے کرام شامل ہیں۔ اور اسی طرح رسول اللہ کے ساتھ اس میں وہ تمام لوگ بھی شامل ہیں جو اسلام کی طرف دعوت دیتے ہیں درآنحالیکہ وہ اسلام پر پوری طرح ایمان لاتے ہیں اور اچھی طرح مطمئن ہیں اور اس دعوت میں ان کا قلب اور ان کی زبان دونوں شریک ہیں ایسے تمام لوگ متقی ہیں۔

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

"اور جو شخص سچائی لے کر آیا اور جنہوں نے اس کو سچ مانا' وہی عذاب سے بچنے والے ہیں"۔

یہاں متقین اور ان کے لیے تیار شدہ جزاء کی تفصیلات دی جاتی ہیں:

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ۝

"انہیں اپنے رب کے ہاں وہ سب کچھ ملے گا جس کی وہ خواہش کریں گے۔ یہ ہے نیکی کرنے والوں کی جزاء"۔

یہ ایک جامع انداز تعبیر ہے جو بھی چیز دل مومن کو مرغوب ہو اور جس کی چاہت اس کے دل میں پیدا ہو وہ اس کے لیے اس کے رب کے ہاں تیار ہو گی۔ یہ اس کا حق ہو گا' جس میں کوئی خسارہ نہ ہو گا اور نہ کوئی حصہ اس کا ضائع ہو گا۔

ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ (۳۹ : ۳۴) "یہ ہے نیکی کرنے والوں کی جزاء"۔

اور یہ اس لیے کہ اللہ نے ان کے لیے جس بھلائی اور جس عزت افزائی کا ارادہ فرما لیا تھا وہ حقیقت بن جائے اور عدل سے آگے بڑھ کر ان کے ساتھ فضل و کرم کا معاملہ کرے۔

لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ

بِأَحْسَنِ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٣٥﴾

"تاکہ جو بدترین اعمال انہوں نے کیے تھے انہیں اللہ ان کے حساب سے ساقط کر دے اور جو بہترین اعمال وہ کرتے رہے ان کے لحاظ سے ان کو اجر عطا فرمائے"۔

اس لیے کہ عدل تو یہ ہو گا کہ نیکیوں کا بھی حساب کیا جائے اور برائیوں کا بھی حساب کیا جائے اور پھر دونوں پر سزا و جزاء دی جائے --- لیکن اللہ یہاں فضل و کرم کرے گا۔ اللہ اپنے متقی بندوں پر اپنے کرم کی تجلی کرے گا۔ یوں کہ ان کے بہت برے اعمال کو قلم زد کر دے گا۔ لہذا میزان میں ان کا کوئی حساب نہ ہو گا اور ان کو اجر بھی احسن طریقے سے دے گا' یعنی ان کے استحقاق سے زیادہ۔ چنانچہ ان کے ترازو میں ان کی نیکیوں کو زیادہ وزن دے دیا جائے گا۔ یہ اللہ کا فضل ہو گا اور یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ جسے چاہے' یہ فضل دے۔ ہاں اللہ نے اپنے ڈرنے والے بندوں کے لیے یہ وعدہ کر دیا ہے لہذا ایسا ہی ہو گا اور اہل تقویٰ اس پر مطمئن ہیں۔

---000---

# درس نمبر ۲۲۰ ایک نظر میں

اس سورت کا یہ سفر تمام اسفار سے زیادہ طویل اور وسیع ہے۔ اس میں عقیدہ توحید کو مختلف زاویوں سے لیا گیا ہے اور اس کے بارے میں نہایت ہی حساس دلائل دیئے گئے ہیں۔ اور یہ نہایت ہی متنوع دلائل ہیں۔ اس سبق کا آغاز ایک سچے مومن کی قلبی کیفیات سے کیا گیا ہے 'جو صرف اللہ پر اعتماد رکھتا ہے۔ اللہ ہی کو بڑی قوت سمجھتا ہے اور اللہ کے سوا تمام حقیر اور کمزور قوتوں کو خاطر ہی میں نہیں لاتا۔ اس لیے وہ ان تمام قوتوں سے قطع تعلق کر کے اپنے امور اور ان کے امور کا فیصلہ قیامت کے دن پر چھوڑ دیتا ہے اور وہ اپنے راستے پر ثابت قدمی 'اعتماد اور یقین کے ساتھ گامزن رہتا ہے۔

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فریضے کا تعین کیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ آپ لوگوں کے ذمہ دار اور ٹھیکہ دار نہیں ہیں کہ ضرور ان کو راہ ہدایت پر لاتا ہے۔ وہ تو اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ ان کی چوٹی اللہ کے ہاتھ میں' ہر حال اور ہر صورت میں۔ لوگوں کے لیے اللہ کے سوا اور کوئی سفارش بھی نہیں ہے۔ سفارش کے اختیارات تو اللہ کے پاس ہیں۔ زمین و آسمانوں کا مالک ہی وہ ہے۔ اور سب نے اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

پھر مشرکین کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان کی نفسیاتی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کلمہ توحید کا ذکر ہو تو ان کی طبیعت منقبض ہو جاتی ہے اور اگر شرکیہ کلمہ سنیں تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ کلمہ توحید کا اعلان کر دیں۔ اور مشرکین کو اللہ پر چھوڑ دیں۔ اور ان کی ایک تصویر آپ کے سامنے کر دی جاتی ہے کہ قیامت کے دن تو یہ چاہیں گے کہ پوری روئے زمین کی دولت اور اس جیسی مزید دولت بھی فدیے میں دے کر جان چھڑا لیں۔ اس لیے کہ وہاں وہ اللہ کی وہ بادشاہت دیکھ لیں گے جس سے وہ حواس باختہ ہو جائیں گے۔

اور ان کی حالت یہ ہے کہ جب وہ کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں تو وہ اللہ وحدہ کو پکارتے ہیں اور اگر وہ خوشحالی پا لیں تو پھر اکڑ کر لمبے چوڑے دعوے کرنے لگتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض یہ تک کہہ دیتے ہیں کہ یہ دولت ہمیں اپنے علم و ٹیکنالوجی کی وجہ سے دے دی گئی ہے اور یہ وہی بات ہے جو ان سے پہلے لوگوں نے بھی کہی تھی اور ان کو اللہ نے پکڑا اور وہ اللہ کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ بن سکے اور نہ اللہ کو عاجز کر سکے۔ رہی رزق کی فراخی اور اس کی تنگی تو یہ اللہ کے سنن اور قوانین پر موقوف رکھی گئی ہے اور اللہ کے یہ قوانین قدرت اس کی حکمت کے مطابق چلتے ہیں۔ وہی ہے جو رزق میں کشادگی دیتا ہے۔ اور وہی ہے جو کسی کا رزق تنگ کر دیتا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۳۹ : ۵۲) "بے شک اس میں آیات اور نشانیاں ہیں' ہر اس قوم کے لیے جو مومن ہو"۔

# درس نمبر ۲۲۰ تشریح آیات

## ۳۶ --- تا --- ۵۲

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ وَ يُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ
وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۶﴾ وَ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ؕ
اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ ﴿۳۷﴾ وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ
اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ
رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۳۸﴾ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى
مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ
يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۴۰﴾

"(اے نبیؐ) کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ یہ لوگ اس کے سوا دوسروں سے تم کو ڈراتے ہیں۔ حالانکہ اللہ جسے گمراہی میں ڈال دے اسے کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہے۔ اور جسے وہ ہدایت دے ' اسے بھٹکانے والا بھی کوئی نہیں۔ کیا اللہ زبردست اور انتقام لینے والا نہیں ہے؟ ان لوگوں سے اگر تم پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے ' تو یہ خود کہیں گے کہ اللہ نے۔ ان سے پوچھو ' جب حقیقت یہ ہے تو تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا تمہاری یہ دیویاں ' جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو ' مجھے اس کے پہنچائے ہوئے نقصان سے بچا لیں گی؟ یا اللہ مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو کیا یہ اس کی رحمت کو روک سکیں گی؟ بس ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے ' بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ان سے صاف کہو کہ "اے میری قوم کے لوگو ' تم اپنی جگہ اپنا کام کیے جاؤ ' میں اپنا کام کرتا رہوں گا ' عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسوا کن عذاب آتا ہے اور کسے وہ سزا ملتی ہے

ہو کبھی ٹلنے والی نہیں"۔

یہ چار آیات بتاتی ہیں کہ اہل ایمان کا سیدھا سادا استدلال کیا ہوتا ہے' یہ استدلال کس قدر قدرتی اور پرزور ہوتا ہے۔ کس قدر واضح اور گہرا ہوتا ہے۔ جس طرح یہ استدلال اور یہ سوچ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں ہے اور جس طرح اسے ہر مومن کے قلب میں ہونا چاہئے۔ جس کا ایمان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر پختہ ہو۔ اور وہ اسی دعوت پر قائم ہو اور اسی کی تبلیغ کر رہا ہو اور جسے وہ اپنا دستور و منشور سمجھتا ہو اور وہ اس کے لیے کافی و شافی ہو۔ اور وہ اس کو ایک مکمل راستہ بتاتی ہو' جو سیدھا منزل مقصود تک پہنچتا ہو اور مستقل راستہ ہو۔

اس آیت کے نزول میں ایسی روایات آئی ہیں کہ مشرکین مکہ رسول اللہ کو اپنے بتوں اور ان کے غضب سے ڈراتے تھے۔ جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ صفات ان کے سامنے رکھتے تھے اور ان کی بے بسی و بے کسی بیان فرماتے تھے۔ مشرکین مکہ حضور اکرمؐ کو ڈراتے تھے کہ اگر آپؐ نے ان کے بارے میں خاموشی اختیار نہ کی تو یہ بت آپؐ کو اذیت دیں گے۔

لیکن اس آیت کا مفہوم اس مخصوص شان نزول سے زیادہ وسیع ہے۔ مراد ہر وہ دعوت حق ہے جو اس کرۂ ارض پر قیام نظام اسلامی کے لیے اٹھی ہے اور ہر وہ قوت ہے جو اس نظام اور اس دعوت کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ یہاں دعوت حق اٹھانے والے اہل ایمان کے مکمل بھروسے' اطمینان اور یقین کا ذکر کیا گیا ہے اور ان مخالف قوتوں کو بھی صحیح طرح تولا گیا ہے کہ ان کا وزن کیا ہے۔

اَلَیْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ (۳۹ : ۳۶) "کیا اللہ اپنے بندوں کے لیے کافی نہیں ہے"۔ ہاں اللہ کافی ہے' لہٰذا وہ لوگ کون ہیں جن سے حضورؐ کو ڈرایا جا رہا ہے۔ اللہ جب اپنے بندے کے ساتھ ہے' تو ان دوسری مخلوقات کی حیثیت کیا ہے۔ خصوصاً جبکہ حضورؐ نے بندگی کا منصب لے لیا ہو اور وہ بندگی کا حق بھی ادا کر رہے ہوں۔ اللہ نہایت قوی اور اپنے تمام بندوں پر کنٹرول کرنے والا ہے۔

وَ یُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ (۳۹ : ۳۶) "یہ لوگ اس کے سوا دوسروں سے تم کو ڈراتے ہیں"۔ آپؐ کس طرح ڈر سکتے ہیں۔ اللہ کے سوا دوسری تمام قوتیں کس طرح ڈرا سکتی ہیں۔ اس شخص کو جس کی حفاظت اللہ کر رہا ہو۔ اور تمام روئے زمین پر جو قوتیں ہیں وہ اللہ سے فروتر قوتیں ہیں۔

یہ ایک بالکل سادہ اور واضح مسئلہ ہے۔ یہ کسی بڑی بحث اور مباحثے اور کسی زیادہ سوچ کا محتاج نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ہر داعی کا حامی تو اللہ ہے اور دوسری تمام قوتیں فروتر ہیں۔ اور جب کوئی شخص یہ موقف اختیار کرے تو پھر کوئی شک اور اشتباہ نہیں رہتا کہ اللہ کا ارادہ ہی نافذ ہو کر رہتا ہے اور اللہ کی مشیت ہی غالب رہتی ہے۔ وہ اپنے بندوں کے درمیان فیصلے فرماتا ہے۔ ان کی ذات کے بارے میں' ان کے دلوں کے بارے میں اور ان کی سوچ اور شعور کے بارے میں بھی۔

وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۳۹ : ۳۶) وَ مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ (۳۹ : ۳۷)

"اللہ جسے گمراہی میں ڈال دے اسے کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہے۔ اور جسے وہ ہدایت دے دے اسے بھٹکانے والا بھی کوئی نہیں ہے"۔ اللہ جانتا ہے کہ ضلالت کا مستحق کون ہے لہٰذا وہ اسے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہدایت کا مستحق کون ہے لہٰذا وہ اسے ہدایت دے دیتا ہے۔ اور وہ جس کے بارے میں جو فیصلہ بھی کر دے اس کے فیصلے کو بدلنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِى انْتِقَامٍ (۳۹: ۳۷) "کیا اللہ زبردست اور انتقام لینے والا نہیں ہے"۔ ہاں وہ انتقام لینے والا ہے۔ اور وہ عزیز و قوی ہے۔ اور وہ ان تمام لوگوں کو ان کے استحقاق کے مطابق جزاء دیتا ہے۔ اور جس سے وہ انتقام لیتا ہے۔ وہ مستحق ہوتا ہے کہ اس سے انتقام لیا جائے لہٰذا اس کی بندگی کرنے والے کو کسی چیز کا ڈر نہیں رہتا وہ کافی اور کفیل ہے۔

اس کے بعد خود ان کی منطق اور ان کے زاویہ نگاہ کے مطابق استدلال کر کے یہی نتائج نکالے جاتے ہیں اور اس منطق اور اس طرز فکر کا وہ اقرار کرتے تھے اور اللہ کے بارے میں وہ اس قسم کا تصور رکھتے تھے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِىَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِىْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ قُلْ حَسْبِىَ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (۳۹: ۳۸) "ان لوگوں سے اگر تم پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے' تو یہ خود کہیں گے کہ اللہ نے۔ ان سے پوچھو' جب حقیقت یہ ہے تو تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا تمہاری یہ دیویاں' جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو' مجھے اس کے پہنچائے ہوئے نقصان سے بچا لیں گی؟ یا اللہ مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو کیا یہ اس کی رحمت کو روک سکیں گی؟ بس ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے' بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں"۔

جب ان لوگوں سے پوچھا جاتا تھا کہ خالق ارض و سما کون ہے؟ تو وہ اقرار کرتے تھے کہ خالق ارض و سماء اللہ وحدہ ہے۔ کوئی صحیح الفطرت انسان اس کے سوا جواب دے ہی نہیں سکتا۔ اور کوئی عقلمند زمین و آسمان کی تخلیق کا سبب ایک ذات بلند اور عالی مقام کے سوا کوئی اور نہیں بتا سکتا۔ لہٰذا قرآن ان کو اور تمام عقلاء کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ تمہاری فطرت کے اندر یہ بات بیٹھی ہوئی ہے اور بہت واضح ہے۔ اگر صورت یہی ہے تو پھر کوئی ہے جو اس مصیبت کو روک سکنے والا ہو جو وہ ذات عالی اپنے بندوں پر لانا چاہے' یا زمین و آسمان میں کون ہے کہ اگر وہ کسی بندے پر رحمت کرنا چاہے تو اس کی رحمت کو روک سکے۔

تو ان سوالات کا قطعی جواب یہ ہے کہ "نہیں"۔ اگر یہ بات طے ہو جاتی ہے تو داعی الی اللہ کس سے ڈر سکتا ہے۔ وہ کس سے خائف ہو سکتا ہے اور کس سے امیدیں وابستہ کر سکتا ہے۔ کون ہے جو اس کی مصیبتوں کو دور کر سکتا ہے۔ کون ہے جو اللہ کی رحمت کو اس سے دور کر سکتا ہے۔ کون ہے جو اسے بے چین کر سکتا' اسے ڈرا دھمکا سکتا ہے اور اپنے

راستے سے ہٹا سکتا ہے؟

جب قلب مومن میں یہ حقیقت بیٹھ جاتی ہے تو اس کی نسبت سے معاملہ ختم ہو جاتا ہے' تنازعہ ختم ہے' غیر اللہ سے تمام امیدیں ختم ۔ صرف اللہ سے امید باقی رہ جاتی ہے ۔ وہ اپنے بندوں کے لیے کافی ہے اور ہمیں اسی پر توکل کرنا چاہئے ۔

قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (۳۹ : ۳۸) "بس کہہ دو' اللہ میرے لیے کافی ہے اور بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں"۔

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ آپ اعلان کر دیں کہ مجھے رب تعالیٰ پر پورا اعتماد' بھروسہ اور یقین ہے ۔ اس قدر بھروسہ جس میں کوئی شک نہیں ۔ ایسا یقین جس میں کوئی تزلزل نہیں ۔ اور اس قدر اطمینان جس میں بے چینی کا شائبہ نہیں ۔ اور اس زادراہ کے ساتھ آپ چل پڑیں اور منزل تک پہنچنے سے پہلے دم نہ لیں ۔

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۳۹ : ۳۹) مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (۳۹ : ۴۰) ان سے صاف کہو کہ "میری قوم کے لوگو' تم اپنی جگہ اپنا کام کیے جاؤ' میں اپنا کام کرتا رہوں گا' تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسوا کن عذاب آتا ہے اور کسے وہ سزا ملتی ہے جو کبھی ٹلنے والی نہیں"۔ اے قوم تم اپنے منہاج کے مطابق کام کرو' اور میں اپنی راہ پر چل پڑا ہوں' نہ ڈرتا ہوں اور نہ شک ہے مجھے ۔ تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ اسی دنیا میں تم پر کس قدر شرمسار کنندہ عذاب آتا ہے اور پھر آخرت میں تو یہ عذاب دائمی ہو گا ۔

اس معاملے کا فیصلہ ہو چکا' اور اس فطری استدلال کے ذریعہ ہوا جس پر ہر سلیم الفطرت انسان گواہی دیتا ہے اور جس پر یہ کائنات گواہ ہے کہ اللہ خالق سماوات ہے اور خالق ارض ہے ۔ اور تمام رسولوں نے آج تک جو دعوت پیش کی ہے یہ دعوت اللہ کی ہے ۔ لہٰذا اللہ کے رسولوں اور داعیان حق کے لیے زمین اور آسمان میں کون ہے جو کوئی اختیار رکھتا ہے ۔ کوئی ہے جو ان سے مصائب دور کر سکتا ہے ۔ اگر ایسا نہیں ہے تو لوگ غیر اللہ اور ان دنیاوی قوتوں سے ڈرتے کیوں ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ معاملہ واضح ہے اور راستہ صاف ہے اور اب بحث و مباحثے کی مزید کچھ ضرورت نہیں ہے ۔

--- ooo ---

یہ تو ہے تعلق رسولوں اور داعیان حق کا اور ان قوتوں کا جو ان کی راہ روکنے کی کوشش کرتی ہیں اب سوال یہ ہے کہ دعوت حق کے حوالے سے رسولوں اور داعیان کا فریضہ کیا ہے اور جھٹلانے والوں کے ساتھ وہ کیا رویہ اختیار کریں گے ۔

۴ اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ

ع۱۰ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۴۱﴾

۱ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ

الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَ یُرْسِلُ الْاُخْرٰۤی اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَ لَوْ كَانُوْا لَا یَمْلِكُوْنَ شَیْـًٔا وَّ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

"(اے نبیؐ) ہم نے سب انسانوں کے لیے یہ کتاب برحق تم پر نازل کر دی ہے۔ اب جو سیدھا راستہ اختیار کرے گا اپنے لیے کرے گا) اور جو بھٹکے گا اس کے بھٹکنے کا وبال اسی پر ہو گا' تم ان کے ذمہ دار نہیں ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت روحیں قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا ہے اس کی روح نیند میں قبض کر لیتا ہے' پھر جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کرتا ہے' اسے روک لیتا ہے اور دوسروں کی روحیں ایک وقت مقرر کے لیے واپس بھیج دیتا ہے۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔ کیا اس خدا کو چھوڑ کر ان لوگوں نے دوسروں کو شفیع بنا رکھا ہے؟ ان سے کہو 'کیا وہ شفاعت کریں گے خواہ ان کے اختیار میں کچھ ہو نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی نہ ہوں؟ کہو 'شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا وہی مالک ہے۔ پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو"۔

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ (۳۹ : ۴۱) "ہم نے سب انسانوں کے لیے یہ کتاب برحق تم پر نازل کی ہے"۔ اس کتاب کی ماہیت سچائی ہے۔ یہ جو طرز زندگی اور منہاج حیات انسان کو عطا کرتی ہے' وہ برحق ہے۔ اس کا قانون برحق ہے اور یہی وہ سچائی ہے جس پر زمین و آسمان قائم ہیں اور وہ نظام جو اس کتاب نے انسانوں کے لیے وضع کیا ہے اور وہ ضابطہ جو اللہ نے اس کائنات کے چلانے کے لیے وضع کیا' دونوں حق ہیں اور باہم ہم آہنگ اور متوافق ہیں۔ یہ سچائی لوگوں کے لیے نازل کی ہے کہ لوگ اس سے ہدایات لے کر اس کے مطابق زندگی بسر کریں اور آپ اس حق کے مبلغ ہیں۔ اور یہ فیصلہ انہوں نے کرنا ہے کہ وہ اپنے لیے راہ ہدایت کا انتخاب کرتے ہیں یا راہ ضلالت کا۔ جنت کی نعمتیں حاصل کرتے ہیں یا جہنم کی آگ اختیار کرتے ہیں۔ ہر شخص اپنے نفس کو جدھر چاہے لے جائے۔ نہ آپ ان کے ذمہ دار ہیں اور نہ حوالدار۔

فَمَنِ اهْتَدٰی فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ (۳۹ : ۴۱) "اب جو سیدھا راستہ اختیار کرے گا تو اپنے لیے کرے گا' اور جو بھٹکے گا تو اس کے بھٹکنے کا وبال اسی پر ہو گا۔ تم ان کے ذمہ دار نہیں ہو"۔ ان کا ذمہ دار اللہ ہے۔ وہ بیداری میں بھی اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور سوتے میں بھی اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اپنے تمام حالات میں وہ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ جس طرح چاہتا ہے' ان کے اندر تصرف فرماتا ہے۔

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰٓی اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی ( ۳۹ : ۴۲ ) "وہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت روحیں قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا ہے اس کی روح نیند میں قبض کر لیتا ہے 'پھر جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کرتا ہے 'اسے روک لیتا ہے اور دوسروں کی روحیں ایک وقت مقرر کے لیے واپس بھیج دیتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ تمام مردوں کی روحیں ان کے وقت مقرر کے مطابق قبض کرتا ہے۔ اس سے قبل اللہ ہر شخص کی روح کو سونے کی حالت میں بھی قبض کرتا ہے۔ اگرچہ وہ شخص مردہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس کی روح اس وقت بھی قبض ہوتی ہے' ایک وقت مقررہ تک کے لیے۔ اگر سوتے ہی میں اس کا وقت مقرر آجائے تو پھر وہ شخص جاگ نہیں اٹھتا۔ اور اگر وقت مقرر نہ آیا تو روح واپس بھیجی جاتی ہے۔ اور یہ شخص جاگ اٹھتا ہے۔ لہٰذا تمام نفوس اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں' سوتے میں بھی اور جاگتے میں بھی۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ( ۳۹ : ۴۲ ) "اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو فکر کرتے ہیں"۔ غرض یہ لوگ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اللہ ہی ان کا ذمہ دار ہے اور آپ ان کے انجام کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ اگر وہ ہدایت پاتے ہیں تو اپنے لیے پاتے ہیں اور اگر وہ گمراہی کی راہ اختیار کرتے ہیں تو اپنے لیے کرتے ہیں۔ محاسب سب کے لیے ہے۔ کوئی بھی مہمل چھوڑ دیا جانے والا نہیں ہے۔ لہٰذا ان کو اپنے آپ کو چھڑانے کی فکر کرنی چاہئے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ شُفَعَآءَ قُلْ اَوَلَوْ کَانُوْا لَا یَمْلِکُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَعْقِلُوْنَ ( ۳۹ : ۴۳ ) قُلْ لِّلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیْعًا لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ

( ۳۹ : ۴۴ ) "کیا اس خدا کو چھوڑ کر ان لوگوں نے دوسروں کو شفیع بنا رکھا ہے؟ ان سے کہو 'کیا وہ شفاعت کریں گے خواہ ان کے اختیار میں کچھ ہو نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی نہ ہوں؟ کہو 'شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا وہی مالک ہے۔ پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو"۔ یہ ان کے ساتھ ایک مذاق ہے۔ وہ لوگ یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ ملائکہ کی بندگی اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ملائکہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں گے۔

اَوَلَوْ کَانُوْا لَا یَمْلِکُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَعْقِلُوْنَ ( ۳۹ : ۴۳ ) "خواہ ان کے اختیار میں کچھ نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی کچھ نہ ہوں"۔ اور اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ سفارش تو اللہ کے اختیار میں ہے۔ یہ اللہ ہی ہے کہ جس کو سفارش کی چاہے اجازت دے دے۔ لیکن اگر اللہ کسی کو سفارش کی اجازت دے تو ہمارے لیے یہ جائز نہ ہوگا کہ ہم اسے اللہ کا شریک بنالیں۔

لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ( ۳۹ : ۴۴ ) "زمین و آسمان کی بادشاہی کا وہی مالک ہے"۔ اس

بادشاہی میں کوئی اس کی ملکیت اور ارادہ کے دائرہ سے باہر نہیں ہے۔سب نے اسی کی طرف لوٹنا ہے۔اور اس سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ہے اور سب نے آخر کار اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔

---()()()---

یہ نظریہ اور موقف کہ اللہ وحدہ بادشاہ ہے۔وہ تمام اختیارات کا مالک ہے اور قہار ہے اور جس کا خلاصہ کلمہ توحید ہے' اس سے وہ کس قدر بدکتے ہیں اور کلمہ شرک کے لیے یہ کس قدر خوش ہوتے ہیں' حالانکہ کلمہ شرک کا انکار ان کی فطرت بھی کرتی ہے۔اور ان کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات بھی کرتی ہے۔

وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۖ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿٤٥﴾

"جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کڑھنے لگتے ہیں' اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکایک وہ خوشی سے کھل اٹھتے ہیں"۔

یہ ایک حقیقی صورت حال کی نقشہ کشی ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں موجود تھی۔اس وقت صورت یہ تھی کہ جب مشرکین کے خداؤں کا ذکر احترام سے کیا جاتا تو یہ مشرکین کھل اٹھتے اور بہت خوش ہوتے۔اور جب کلمہ توحید کا بیان ہوتا تو یہ لوگ مرجھا جاتے اور ان کی طبیعت میں انقباض پیدا ہو جاتا--- لیکن یہ ایک نفسیاتی حالت ہے جو ہر زمان و مکان میں پائی جاتی ہے۔ہر دور میں ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ وحدہ کی طرف لوگوں کو دعوت دی جائے اور صرف اللہ کی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کیا جائے اور صرف اسلامی نظام اور اسلامی دستور و منشور کی بات کی جائے تو ان کو سخت انقباض ہوتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں جب انسانوں کے بنائے ہوئے نظام ہائے زندگی کی بات کی جائے' انسانی قوانین کی بات کی جائے تو وہ بہت ہی خوش ہوتے ہیں' کھل اٹھتے ہیں اور ایسی باتوں کو خوش آمدید کہتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔یہ وہ لوگ ہیں جن کی تصویر کشی اس آیت میں کی گئی ہے۔یہ لوگ ہر زمان و مکان میں پائے جاتے ہیں۔ان کی فطرت مسخ ہو چکی ہے۔ان کے مزاج میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔اور یہ لوگ ضال اور مضل ہیں۔اگرچہ کوئی معاشرہ حضور اکرمؐ کے معاشرے سے مختلف ہو۔اگرچہ ان کی جنس اور قوم عربوں سے جدا ہو۔

ایسے منحرفین 'گمراہوں اور بگڑے ہوئے لوگوں کا جواب وہی ہے جو اللہ نے حضورؐ کو بتایا تھا جب آپ کو ایسے حالات سے مقابلہ درپیش تھا۔

قُلِ اللَّهُمَّ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِي مَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٤٦﴾

"کہو' خدایا' آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے' حاضر و غائب کے جاننے والے' تو ہی اپنے بندوں کے درمیان

اس چیز کا فیصلہ کرے گا' جس میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں"۔

یہ اس فطرت کی پکار ہے جو زمین و آسمان کو دیکھ رہی ہو۔ اور اس کے لیے یہ بات مشکل ہو کہ وہ اللہ کی ذات کے سوا کسی کو الٰہ مان سکے جو خالق ارض و سما ہے۔ لہٰذا یہ فطرت اس کی طرف اعتراف اور اقرار کے ساتھ متوجہ ہوتی ہے اور اللہ کی تعریف و تمجید ان صفات کے ساتھ کرتی ہے جو اس کے لائق ہیں یعنی "اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے"

عٰلِمَ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ (۳۹ : ۴۶) "اے حاضر و غائب کو جاننے والے"۔ اے ظاہر و باطن کو جاننے والے۔

اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِي مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۳۹ : ۴۶) "تو ہی اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہتے ہیں"۔ کیونکہ قیامت کے دن تو وہی حاکم ہو گا۔ اور سب نے قیامت میں اسی کے سامنے آنا ہو گا۔ اور کوئی قیامت کی حاضری سے بچ کر نکلنے والا نہیں ہے۔

--- ooo---

اور جب اللہ کے بندے قیامت کے روز کے فیصلے کے لیے حاضر کیے جائیں گے تو ان کی حالت پھر کیا ہو گی ذرا اسکرین پر یہ منظر دیکھیں :

وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۸﴾

"اگر ان ظالموں کے پاس زمین کی ساری دولت بھی ہو' اور اتنی ہی اور بھی' تو یہ روز قیامت کے برے عذاب سے بچنے کے لیے سب کچھ فدیے میں دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ وہاں اللہ کی طرف سے ان کے سامنے وہ کچھ آئے گا جس کا انہوں نے کبھی اندازہ ہی نہیں کیا ہے۔ وہاں اپنی کمائی کے سارے برے نتائج ان پر کھل جائیں گے اور وہی چیز ان پر مسلط ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں"۔

ایک ہولناک صورت حال کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ یہ قرآن ہی کر سکتا ہے' یہ ظالم جو اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں اور شرک ظلم عظیم ہے۔ اگر قیامت کے دن ان کے قبضے میں یہ پوری زمین ہو اور اس جیسی ایک اور زمین بھی اور وہ اس کے اور مافیہا کے واحد مالک ہوں تو وہ قیامت کے دن کے عذاب سے بچنے کے لیے وہ سب کچھ دینے کے لیے تیار ہوں گے۔ اور اس عذاب سے یہ لوگ رہائی نہ پا سکیں گے۔

ان جامع الفاظ کے اندر ایک دوسری دھمکی بھی چھپی ہوئی ہے۔

وَ بَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ یَكُوْنُوْا یَحْتَسِبُوْنَ (۳۹ : ۴۷) "اور اللہ کی طرف سے ان کے سامنے وہ کچھ آئے گا جس کا انہوں نے کبھی اندازہ ہی نہیں کیا ہے"۔ یہاں اس بات کا تذکرہ نہیں کیا گیا کہ وہاں ان کے سامنے اللہ کی طرف سے کیا غیر متوقع انکشافات ہوں گے؟ لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ جو کچھ ظاہر ہو گا وہ بہت ہی خوفناک ہو گا اور وہ ان کو مدہوش کر دے گا۔ اور وہ حواس باختہ پھریں گے۔ ایک طرف اللہ ہے اور دوسری طرف یہ ضعفاء ہیں اور اللہ کی طرف سے ان کے سامنے خوفناک انکشافات ہوں گے یہاں ان کو متعین نہیں کیا گیا۔

وَ بَدَا لَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ (۳۹ : ۴۸) "وہاں اپنی کمائی کے سارے نتائج ان پر کھل جائیں گے اور وہی چیز ان پر مسلط ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں"۔ اس سے بھی ان کی حالت مزید بگڑ جائے گی۔ جب ان کے سامنے اپنے کرتوتوں کے نتائج بھیانک شکل میں آئیں گے۔ اور جس عذاب کا وہ مذاق اڑاتے تھے وہ انہیں گھیرلے گا۔ اور وہ نہایت ہی کربناک حالت میں ہوں گے۔ اعاذنا اللہ منہا۔

--- ooo---

اب اس موقف کے بعد جب وہ اپنے رب کے سامنے حاضر کیے جائیں گے' اس رب کے سامنے جس کے ساتھ یہ لوگ شرک کرتے تھے اور جب اللہ وحدہ کا ذکر کیا جاتا تو ان کے دل سکڑ جاتے تھے اور جب ان کے شرکاء کا ذکر ہوتا تو وہ کھل جاتے تھے۔ ان مضامین کے بعد ان کی ایک عجیب حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ یہ اللہ کی وحدانیت کا تو انکار کرتے ہیں لیکن جب یہ کسی بڑی مصیبت میں پھنستے ہیں تو صرف اللہ وحدہ کو نہایت عاجزی سے پکارتے ہیں۔ لیکن جب ان سے یہ مصیبت ٹل جائے تو پھر تکبر کرتے ہوئے انکار کرتے ہیں۔

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ؗ ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ؕ بَلْ هِیَ فِتْنَةٌ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۴۹

"یہی انسان جب ذرا سی مصیبت اسے چھو جاتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے' اور جب ہم اسے اپنی طرف سے نعمت دے کر ابھار دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے علم کی بنا پر دیا گیا ہے' نہیں بلکہ یہ آزمائش ہے' مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔

یہ آیت انسانوں کے ایک ایسے نمونے کا ذکر کرتی ہے جو ہر جگہ اور ہر زمانے میں پایا جاتا ہے۔ یہ ایسا نمونہ ہے جس کی فطرت نے سچائی تک رسائی حاصل نہیں کی۔ رب واحد کے عقیدے تک نہیں پہنچ سکی کہ اسے صحیح رویہ معلوم ہو اور خوشی اور غم کی حالت میں بھی وہ اپنا صحیح راستہ نہ بھولے۔

مصیبت' انسانی فطرت کے اوپر سے خواہشات نفسانیہ کی جمی ہوئی ریزتوں کو دور کر دیتی ہے اور مصنوعی عوامل کو

ہٹا کر انسانی ضمیر کے اندر موجود سچائی نکھارتی ہے۔ جب انسان مشکلات سے دوچار ہوتا ہے تو اسے اللہ نظر آتا ہے "جب کیا تنگ بتوں نے تو خدا یاد آیا" اب خدا کی تعریف ہونے لگتی ہے اور لوگ صرف اللہ وحدہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور جب یہ شدت اور مصیبت ختم ہو جاتی ہے اور خوش حالی اور امن لوٹ آتا ہے تو انسان ان باتوں کو بھول جاتا ہے جو اس نے شدت و مصیبت کے وقت میں کی تھیں اور اس کی فطرت پھر خواہشات نفسانیہ اور وقتی عوامل کے دباؤ میں آجاتی ہے اور پھر اللہ کی نعمتوں اور فضل و کرم کے بارے میں وہ کہتا ہے۔

اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ (۳۹ : ۴۹) "یہ تو مجھے علم کی بناء پر دیا گیا ہے"۔ یہ بات قارون نے بھی کہی تھی۔ ہر وہ شخص اور قوم جسے یہ دھوکہ ہو جائے کہ اس کے اچھے دن علم و حکمت اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے ہیں۔ یہ اس کی مہارت ہے کہ اس کو مال اور اقتدار ملا ہے۔ ایسے لوگ فضل و کرم کے اصل مصدر سے غافل ہوتے ہیں اور علم دینے والے کو نہیں پہچانتے جو مسبب الاسباب ہے اور جو رزق مقرر کرتا ہے۔

یہ ہے امتحان اور آزمائش۔ اس کے ذریعے اللہ معلوم کرتا ہے کہ جس پر فضل و کرم ہو رہا ہے' وہ شکر کرے گا یا کفر کرے گا۔ آیا اس فضل و کرم کی وجہ سے اس کی اصلاح ہوتی ہے یا وہ مزید بگڑتا ہے۔ وہ راہ راست لیتا ہے یا گمراہی کی راہ پر آگے بڑھتا ہے۔

قرآن کریم نے بندوں پر مہربانی کرتے ہوئے یہ راز ان پر کھول دیا ہے اور اس خطرے سے انہیں پیشگی آگاہ کر دیا ہے کہ یہ مال اور دولت اور اقتدار و جاہ بھی تمہارے لیے آزمائش ہے۔ قرآن کریم اقوام گزشتہ کے حالات ان پر پیش کر کے ان کو متنبہ کرتا ہے کہ پہلے بھی اس قسم کے لوگوں نے کہا تھا کہ۔

اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ (۳۹ : ۴۹) "یہ تو مجھے علم کی بنا پر دیا گیا ہے"۔

قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ؕ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝

"یہی بات ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ بھی کہہ چکے ہیں' مگر جو کچھ وہ کماتے تھے وہ ان کے کسی کام نہ آیا۔ پھر اپنی کمائی کے برے نتائج انہوں نے بھگتے' اور ان لوگوں میں سے بھی وہ جو ظالم ہیں وہ عنقریب اپنی کمائی کے برے نتائج بھگتیں گے' یہ ہمیں عاجز کر دینے والے نہیں ہیں"۔

یہ وہی الفاظ ہیں جو اس سے قبل کے بدفطرت لوگوں نے کہے تھے۔ اور اس کا و ... آیا۔ نہ ان کا علم ان کے کام آیا' نہ ان کا اقتدار انہیں بچا سکا۔ اور نہ ان کی ٹیکنالوجی اور اللہ کے عذاب نے انہیں آلیا۔ یہ اللہ کی آزمائش تھی

اس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اور اللہ کو عاجز کرنے والا کوئی نہیں۔ انسان جیسی ضعیف مخلوق اللہ کو کیسے عاجز کر سکتی ہے۔

رہی یہ بات کہ اللہ نے ان کو مال و اقتدار دیا تو یہ اللہ کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ اور یہ حکمت اللہ خود ہی جانتا ہے کہ وہ کسی کو مال و اقتدار کی فراوانی کیوں دیتا ہے۔ اصل بات ہوتی ہے اس کی مشیت اور اس کی آزمائش۔

اَوَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُؕ اِنَّ
۵۲
فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۠۝۵۲ ع ۱۱
۲

"اور کیا انہیں معلوم نہیں ہے کہ اللہ جس کا چاہتا ہے' رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے' تنگ کر دیتا ہے؟ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں"۔

یہ تو اللہ کی نشانیاں ہیں کہ وہ کسی کو زیادہ اور کسی کو کم دیتا ہے' اور ان نشانات سے راہ ہدایت لینا چاہیے' نہ یہ کہ ان نشانات الہیہ کو کفر و ضلالت کا ذریعہ بنایا جائے۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۲۲۱ ایک نظر میں

اس سے پہلے سبق میں بتایا گیا تھا کہ قیامت کے دن ظالموں کے حالات کیا ہوں گے۔

وَلَوْ أَنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ مِنْ سُوءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَبَدَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ (۳۹ : ۴۷)

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (۳۹ : ۴۸) "اگر ان ظالموں کے پاس زمین کی ساری دولت بھی ہو، اور اتنی ہی اور بھی، تو یہ روز قیامت کے برے عذاب سے بچنے کے لیے سب کچھ فدیے میں دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ وہاں اللہ کی طرف سے ان کے سامنے وہ کچھ آئے گا جس کا انہوں نے کبھی اندازہ ہی نہیں کیا ہے۔ وہاں اپنی کمائی کے سارے برے نتائج ان پر کھل جائیں گے اور وہی چیز ان پر مسلط ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں"۔

اس لیے اس سبق میں توبہ کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور کوئی کس قدر گناہوں کا مرتکب کیوں نہ ہو گیا ہو، اسے دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہرگز نہ ہوں، چاہے وہ میری راہوں پر بہت آگے نکل گئے ہوں۔ دعوت دی جاتی ہے کہ لوٹ آؤ، میرے در پر کوئی مایوسی نہیں ہے، لیکن اگر اس عام معافی اور عام دعوت سے تم نے فائدہ نہ اٹھایا اور توبہ نہ کی تو پھر تمہارے لیے وہ عذاب ہے جس سے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہ ہو گی۔ اس فرصت سے فائدہ اٹھاؤ، قبل اس کے کہ وقت چلا جائے۔

---000---

# درس نمبر ۲۲۱ تشریح آیات

## ۵۳ --- تا --- ۶۱

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾

"(اے نبیؐ) کہہ دو کہ اے میرے بندو ' جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے ' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا ' یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے ' وہ تو غفور و رحیم ہے"

اللہ کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ وہ بڑی سے بڑی معصیت کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے ' چاہے وہ جو بھی ہو۔ یہ توبہ اور واپس آ جانے کی دعوت عام ہے۔ ان لوگوں کو دعوت ہے جو گمراہی ' فسق و فجور اور بدکاری کی راہوں میں بہت دور چلے گئے ہیں اور مایوس ہو گئے ہیں۔ ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں ' اللہ پر بھروسہ کریں اور اللہ کی رحمت کا دروازہ وسیع ہے اور عفو و درگزر کی چادر بہت کھلی ہے۔ وہ اپنے بندوں پر رحیم و کریم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میرے بندے کس قدر کمزور اور ضعیف ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ ان کے طرز عمل پر داخلی اور خارجی عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔ اللہ کو یہ بھی معلوم ہے کہ شیطان لعین گھات میں بیٹھا ہوا ہے اور دائیں بائیں ہر طرف سے وہ ان کے راستوں پر بیٹھا ہوا ہے اور ان کو گمراہ کرتا ہے۔ اور اپنی تمام سوار افواج اور پیدل افواج اس نے انسانوں پر حملہ آور کر دی ہیں۔ اور وہ اپنے اس خبیث منصوبے میں بہت ہی سنجیدہ ہے۔ اور اللہ جانتا ہے کہ انسان کی ساخت بہت ہی کمزور ہے اور اس غریب کے ہاتھ سے جونہی حبل متین چھوٹتی ہے یہ اپنے ذاتی میلانات ' نفسیاتی رجحانات سے برائی کی طرف مائل ہو جاتا ہے اس کا توازن ختم ہو جاتا ہے اور وہ انحراف کی راہوں پر چل نکلتا ہے اور اس کا توازن ختم ہو کر وہ معصیت کی راہوں پر نکل پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی اس مخلوق کی ان سب کمزوریوں سے واقف ہے۔ اس لیے اللہ اس کی معاونت فرماتا ہے اس کے لیے دامن رحمت وسیع فرماتا ہے اور سزا صرف اس وقت دیتا ہے جب اس کی اصلاح کے لیے تمام وسائل کام میں لائے کہ وہ راہ راست پر آ جائے اور جب وہ معصیت کی راہوں پر دور نکل جائے ' گناہوں میں حد سے گزر جائے ' اور اسے یقین ہو جائے کہ وہ تو اب ہر مردود و مسترد ہو گیا ہے اور اس کے لیے نہ اب واپسی ممکن ہے اور نہ معافی ' اس قسم کی مایوسی اور قنوطیت کی حالت میں اللہ کی یہ پکار سنتا ہے۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (۳۹ : ۵۳) "(اے نبیؐ) کہہ دو کہ اے میرے بندو' جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا' یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے' وہ تو غفور و رحیم ہے"۔

یہ شخص معصیت میں حد سے گزر گیا ہے' گناہوں میں ڈوب گیا' محفوظ جگہ سے بھاگ گیا ہے اور راستے سے بے راہ ہو گیا ہے' اب اس کے اور سایہ رحمت' ترو تازہ کرنے والی رحمت' زندہ کرنے والی رحمت' نرم و نازک رحمت کے درمیان صرف ایک ہی دروازہ رہ گیا ہے۔ یہ ہے توبہ کا دروازہ' یہ دروازہ ہروقت کھلا ہے' اس پر کوئی دربان نہیں ہے۔ اس دروازے سے رحمت خداوندی کے سایوں تک پہنچنے کے لیے کسی اجازت نامے کی ضرورت نہیں ہے بس توبہ کرو اور لوٹ آؤ' صد بار اگر توبہ شکستی باز آ۔

وَاَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ وَاَسْلِمُوْا لَہٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ بَغْتَۃً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

"پلٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور مطیع بن جاؤ اس کے قبل اس کے کہ تم پر عذاب آ جائے اور پھر کہیں تمہیں مدد نہ مل سکے۔ اور پیروی اختیار کر لو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب کے بہترین پہلو کی۔ قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آ جائے اور تم کو خبر بھی نہ ہو"۔

انابت' اسلام اور سرتسلیم خم کر دینے کے دائرے میں لوٹ آنا ایک ہی مفہوم رکھتا ہے اور ایک ہی حقیقت ہے۔ اللہ کی اطاعت کے حظیرہ میں داخل ہونا ایک ایسا عمل ہے جس میں کوئی مراسم نہیں' کوئی رکاوٹ نہیں' کوئی واسطہ اور سفارش نہیں' جو چاہے' جس وقت چاہے' اسلام کے سادہ سے نظام میں داخل ہو جائے۔

اسلام بندے اور رب کے درمیان بلاواسطہ دین ہے۔ یہ خالق اور مخلوق کے درمیان بلاواسطہ تعلق ہے۔ گناہ گاروں میں سے جو بھی واپس ہونا چاہے' گمراہوں میں سے جو چاہے' لوٹ آئے' جو لوگ بھی جس قدر نافرمانی کرتے رہے ہیں وہ سرتسلیم خم کر دیں اور واپس آ جائیں' دروازہ کھلا ہے۔ سایہ دار پناہ گاہ موجود ہے۔ ترو تازہ اور نرم و نازک فضا موجود ہے۔ اور یہ سب چیزیں ایک ایسے دروازے کے اندر ہیں جس کے لیے کوئی دربان نہیں ہے اور اس دروازے سے داخل ہونے کے لیے کوئی حساب و کتاب نہیں ہے۔

لوٹ آؤ' لوٹ آؤ' قبل اس کے کہ آواز آ جائے کہ فلاں نماند!

مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (۳۹ : ۵۴) "قبل اس کے کہ تم پر عذاب آ

جائے اور پھر کہیں سے تمہیں مدد نہ مل سکے"۔ وہاں تو کوئی مددگار نہ ہوگا۔ اس لیے لوٹ آؤ' وقت کے ختم ہونے میں دیر نہیں ہے۔ کسی بھی وقت آخری گھڑی کا فیصلہ ہو سکتا ہے اور دروازہ بند ہو سکتا ہے۔ رات اور دن کے کسی وقت میں مہلت کی گھڑیاں ختم ہو سکتی ہیں۔

وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۳۹: ۵۵) "اور پیروی اختیار کرو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب کے بہترین پہلو کی"۔ اس سے مراد قرآن کریم ہے جو تمہارے ہاتھوں میں ہے۔

مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۳۹: ۵۵) "قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آجائے اور تم کو خبر بھی نہ ہو"۔

لہٰذا باز آجاؤ' قبل اس کے کہ فرصت ختم ہو جائے' مہلت جاتی رہے اور تم نے اللہ کے حق میں کوتاہی کی ہو اور پھر تم پچھتاؤ کہ کیوں ہم اللہ کے وعدے کا مذاق اڑاتے تھے۔

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ﴿٥٦﴾

"کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی شخص کہے "افسوس میری اس تقصیر پر جو میں اللہ کی جناب میں کرتا رہا' بلکہ میں تو الٹا مذاق اڑانے والوں میں شامل تھا"۔

یا کوئی یہ بات کہے کہ اللہ نے میرے لیے تو گمراہی لکھ دی تھی۔ اگر اللہ میرے لیے ہدایت مقدر کر دیتا تو میں ہدایت پر آجاتا۔

اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٥٧﴾

"یا کہے "کاش اللہ نے مجھے ہدایت بخشی ہوتی تو میں بھی متقیوں میں سے ہوتا"۔ یہ استدلال بادی النظر میں غلط ہے۔ فرصت کی گھڑی موجود ہے' ہدایت کے ذرائع موجود ہیں' توبہ کا دروازہ کھلا ہے اور تمہیں آزادی دی گئی ہے۔

اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٨﴾

"یا عذاب دیکھ کر کہے "کاش مجھے ایک موقع اور مل جائے اور میں بھی نیک عمل کرنے والوں میں شامل ہو جاؤں"۔

اور یہ تو ایک ایسی آرزو ہے' جسے کوئی نہیں پا سکتا۔ جب یہ زندگی ختم ہو گی تو دوبارہ اس جہاں میں کسی کے بھیجے جانے کی کوئی امید نہیں ہے۔ کیا تم دار العمل میں موجود نہیں ہو۔ یہ ایک فرصت ہے اور جب یہ ختم ہو جائے تو پھر وقت لوٹ کر نہیں آتا۔ اور اس وقت کے بارے میں تم سے نہایت ہی سرزنش کے انداز میں بازپرس ہو گی!

بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَ اسْتَكْبَرْتَ وَ كُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۹﴾

"(اور اس وقت اسے یہ جواب ملے کہ) "کیوں نہیں ' میری آیات تیرے پاس آچکی تھیں ' پھر تو نے انہیں جھٹلایا اور تکبر کیا اور تو کافروں میں سے تھا"۔

--- ooo---

سیاق کلام اب قیامت میں متقین اور منکرین کا ایک منظر پیش کرتا ہے ۔ عین اس وقت جب قارئین کو قیامت کے برپا ہونے کے آخری لمحات تک پہنچا دیا گیا ہے ۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۶۰﴾ وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۚ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۱﴾

"آج جن لوگوں نے خدا پر جھوٹ باندھے ہیں قیامت کے روز تم دیکھو گے کہ ان کے منہ کالے ہوں گے ۔ کیا جہنم میں متکبروں کے لیے کافی جگہ نہیں ہے؟ اس کے برعکس جن لوگوں نے یہاں تقویٰ کیا ہے ' ان کے اسباب کامیابی کی وجہ سے اللہ ان کو نجات دے گا ' ان کو نہ کوئی گزند پہنچے گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے"۔

یہ ہے آخری انجام ' ایک گروہ ہے کہ شرمندگی کی وجہ سے اس کا چہرہ سیاہ ہے ۔ نیز غم کی وجہ سے اور جہنم کی شعلوں کی وجہ سے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زمین میں اپنے آپ کو بہت ہی بڑا سمجھتے تھے ۔ ان کو رات اور دن اللہ کی دعوت دی جاتی تھی ۔ یہ دعوت اس وقت بھی برقرار تھی جب یہ گناہوں میں گردن تک ڈوبے ہوئے تھے لیکن انہوں نے داعی کی پکار پر کان نہ دھرا ۔ آج یہ گروہ بہت ہی شرمندہ ہے ۔ شرمندگی اور کبیدگی کی وجہ سے اس کا چہرہ سیاہ ہے اور دوسرا فریق نجات پا چکا ہے ' کامیاب ہو گیا ہے ۔ اب اسے کوئی گزند پہنچنے کا امکان ہی باقی نہیں رہا ۔ نہ اسے کوئی پریشانی لاحق ہوگی ۔ یہ متقین کا فریق ہے جو دنیا میں اس طرح زندہ رہے کہ آخرت سے ڈرتے رہے اور اللہ کی رحمت کے امیدوار رہے ۔ آج وہ نجات ' کامیابی ' امن اور سلامتی میں ہیں ۔

لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۳۹ : ۶۱) "ان کو اب کوئی گزند نہ پہنچے گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے"۔ اس صورت حال کے بعد اب جو چاہے داعی حق کی پکار پر لبیک کہے اور اللہ کی تر و تازہ رحمت اور جنت میں داخل ہو جائے ۔ یہ رحمتیں اور یہ جنتیں توبہ کے دروازے کے ساتھ موجود ہیں ۔ دروازہ کھلا ہے ۔ چھوڑ دو اپنا اسراف ' چھوڑ دو بے راہ روی اور ترک کر دو فسق و فجور ' قبل اس کے کہ تمہیں عذاب الٰہی آلے اور تمہیں اس کا شعور ہی نہ ہو ۔

--- ooo---

# درس نمبر ۲۲۲ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا آخری سبق ہے 'اس میں تخلیق کائنات کے حوالے سے حقیقت توحید کے مضمون کو لیا گیا ہے ۔ یہ کہ اللہ نے تمام چیزوں کی تخلیق کی ہے ۔ وہ تمام چیزوں میں مالکانہ تصرف رکھتا ہے ۔ لہذا مشرکین کی یہ تجویز کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے الهوں کی بندگی کریں اور ہم اس کے مقابلے میں اللہ رب العالمین کی بندگی کریں ۔ یوں ایک مشترکہ دین وجود میں آ جائے ' یہ تجویز اور مطالبہ نہایت احمقانہ ہے اور عجیب و غریب ہے ۔ اللہ تو خالق کائنات ہے ۔ آسمانوں اور زمین کے تمام اختیارات اور بادشاہت اسی کی ہے ۔ اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے ۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور چیز کی بندگی بھی کی جائے ۔ جبکہ زمین و آسمان کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں ہیں ۔

حقیقت یہ ہے ۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ "اور ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہیں کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے"۔ یہ لوگ اللہ کے ساتھ اوروں کو شریک کرتے ہیں ۔ حالانکہ اللہ وحدہ معبود ' قدرت والا اور تمام کائنات کا کنٹرول کرنے والا ہے ۔

وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ (۳۹:۶۷)

"قیامت کے روز پوری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دست راست میں لپٹے ہوں گے"۔ اور اس حقیقت کو اس انداز میں ریکارڈ کرنے کے لیے قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر پیش کیا جاتا ہے اور یہ منظر اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ فرشتے عرش الہی کے اردگرد ننگے پاؤں پھر رہے ہوں گے ۔ یہ اللہ کی تسبیح کے ساتھ اس کی حمد بیان کر رہے ہوں گے ۔ پوری کائنات حمد و ثنا میں رطب اللسان ہوگی ۔ اور کہا جائے گا ہر طرف اور ہر جہت سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ "سب تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں"۔ اور اس کائنات کی حقیقت میں یہ ایک فیصلہ کن بات ہوگی ۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۲۲ تشریح آیات

## ۶۲ --- تا --- ۷۵

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۶۲﴾ لَهٗ
۶ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ
۱۱ع الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۳﴾
۳

"اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے۔ زمین اور آسمانوں کے خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، اور جو لوگ اللہ کی آیات سے کفر کرتے ہیں۔ وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں"۔

یہ وہ حقیقت ہے جس پر ہر چیز گواہ ہے۔ کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے کوئی چیز بنائی ہے اور کوئی معقول انسان یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ یہ کائنات بغیر کسی پیدا کرنے والے کے خود وجود میں آگئی۔ حالانکہ اس کائنات کے اندر جو موجودات بھی ہیں، ان کی ذات اور ان کی اسکیم بتاتی ہے کہ اس کو بالارادہ بنایا گیا ہے۔ کوئی چیز اتفاقی نظر نہیں آتی، چاہے چھوٹی ہو یا بڑی۔

وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (۳۹ : ۶۲) "اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے"۔ زمین و آسمان کو وہی چلانے والا ہے اور اپنے ارادے اور منشا کے مطابق اللہ زمین و آسمان کو چلاتا ہے۔ یہ پوری کائنات اللہ کے نظام قضا و قدر کے مطابق چلتی ہے۔ اللہ کے ارادے کے سوا کسی اور کا ارادہ ان تصرفات میں دخیل نہیں ہے۔ اس بات کی شہادت فطرت دیتی ہے۔ حقیقت واقعہ بھی اسی کی تائید کرتی ہے اور انسانی عقل و ضمیر بھی اس کی تائید میں ہے۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۳۹ : ۶۳) "اور جو لوگ اللہ کی آیات سے کفر کرتے ہیں وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں"۔ ان کو اس علم اور آگاہی سے محرومی ہے جس کے ذریعے ان کی زندگی اس پوری کائنات کی حرکت سے ہم آہنگ رہتی ہے۔ یہ ان کے لیے بڑا خسارہ ہے۔ وہ ہدایت کی راحت اور ایمان کے حسن سے محروم رہے اور اعتقاد اور نظریہ کے اطمینان اور یقین کی مٹھاس سے بھی محروم رہے اور آخرت

میں وہ خود بھی گھاٹے میں رہے اور ان کی وجہ سے ان کے خاندان بھی گھاٹے میں رہے ۔ وہ تو اس قدر نقصان اٹھا رہے ہیں کہ ان پر الخاسرون کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے ۔

---ooo---

اس حقیقت کی روشنی میں جس پر آسمان اور زمین گواہ ہیں اور جس پر اس کائنات کی ہر چیز گواہ ہے ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ ان سے کہو : کیا تجویز کرتے ہو کہ میں تمہارے الہوں کی بندگی کروں اور اس بدلے میں تم اللہ العالمین کی بندگی کرو ۔ کس قدر جاہلانہ تجویز ہے یہ ؟ کیا سچائی کوئی بکنے والی جنس ہے جس کا بازاروں میں سودا ہوتا ہو ۔

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿۶۴﴾

" (اے نبی ؐ) ان سے کہو " پھر کیا اے جاہلو ' تم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کے لیے مجھ سے کہتے ہو " ۔ یہ ایک فطری سرزنش ہے اور ان لوگوں کی پوچ تجویز کا مناسب جواب ہے ان کی اس تجویز ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر گہری جہالت میں ڈوبے ہوئے تھے اور خالص اندھے تھے ۔

چنانچہ اس کے بعد مشرک لوگوں کو ڈرایا جاتا ہے اور اس ڈراوے کے مخاطب اول حضور اکرم ؐ اور تمام انبیاء علیہم السلام ہیں ۔ حضرات انبیاء کے بارے میں تو شرک کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا ۔ دراصل یہ ڈراوا ان کی امتوں کو ہے کہ وہ اللہ کی ذات کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کریں ۔ اور بندگی صرف اللہ کی کریں اور تمام انسان جن میں انبیاء علیہم السلام بھی ہیں اللہ کو وحدہ لاشریک سمجھیں ۔

وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۵﴾

" (یہ بات تمہیں ان سے صاف کہہ دینی چاہیے کیوں کہ ) تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے تمام انبیاء کی طرف یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضائع ہو جائے گا اور تم خسارے میں رہو گے " ۔

شرک سے ڈراوے کا خاتمہ توحید پر کاربند ہونے کے حکم پر کیا جاتا ہے ۔ یعنی صرف اللہ کی بندگی کرو اور ایمان اور ہدایت پر اللہ کا شکر ادا کرو اور اللہ کی ان نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرو جو اللہ کے بندوں کو ڈھانپ لیتی ہیں اور جن کو وہ گن بھی نہیں سکتے جبکہ وہ ان میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں :

بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

" لہٰذا (اے نبی ؐ) تم بس اللہ ہی کی بندگی کرو اور شکر گزار بندوں میں سے ہو جاؤ " ۔

---ooo---

اب اللہ جل شانہ کی قدرت اور اللہ کے مقام کے بارے میں بتایا جاتا ہے جس کے ساتھ شریک کرنے کی تجاویز وہ دیتے تھے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ

"ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے"۔ حقیقت یہ کہ انہوں نے اللہ کی ذات کی قدر نہیں کی۔ ورنہ وہ اللہ کے ساتھ اس کی مخلوقات کو شریک نہ کرتے۔ نہ انہوں نے اللہ کی بندگی کا حق ادا کیا ہے 'کیونکہ وہ عقیدۂ توحید اور اللہ کی عظمت کو سمجھ ہی نہیں سکے۔ ان کو اللہ کی جلالت قدر کا شعور ہی نہیں ہے۔

اللہ کی جلالت قدر اور عظمت کا شعور ان کو یوں دیا جاتا ہے' قرآن کے مخصوص انداز بیان کے مطابق کہ قرآن اعلیٰ عقلی افکار کو بھی نہایت ہی مشخص انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ کلی اور عقلی مفاہیم محدود انسانی ادراک کے قریب آجائیں۔

وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٧﴾

"اس کی قدرت کاملہ کا حال تو یہ ہے کہ قیامت کے روز پوری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی' اور آسمان اس کے دست راست میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔ پاک اور بالا تر ہے وہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں"۔

قرآن و سنت میں جہاں جہاں اس قسم کی تصاویر اور مناظر آتے ہیں وہ دراصل تمثیلات ہیں اور حقائق کو انسانی ادراک کے قریب تر کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ معانی کو ایسے الفاظ میں بیان کیا جائے جن کا تصور ان کے لیے ممکن ہو' یہاں بھی اللہ کی قدرت مطلقہ کو مٹھی کی شکل میں لایا گیا ہے' ورنہ اللہ نہ کسی شکل' نہ کسی جگہ اور نہ کسی حد کا پابند ہے۔ یہاں عقلی حقائق کو حسی انداز دیا گیا ہے۔

--- ○○○ ---

اس کے بعد قیامت کا ایک طویل منظر آتا ہے۔ اس کا آغاز نفخ اولیٰ سے ہوتا ہے اور خاتمہ اس وقت ہوتا ہے جب قیامت کے تمام معاملات چکا دیئے جاچکے ہیں۔ اور اہل جہنم کو جہنم کی طرف چلا دیا جاتا ہے۔ اور اہل جنت کو جنت کی طرف رخصت کر دیا جاتا ہے۔ اور صرف ذات باری رہ جاتی ہے اور تمام کائنات ذات باری کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہوتی ہے۔

یہ ایک زبردست منظر ہے۔ جوش و خروش اور حرکت سے پر ہے اور اس کی حرکات نہایت ترتیب سے آہستگی کے ساتھ شروع ہوتی ہیں اور آگے بڑھتی ہیں۔ یہاں تک کہ تمام حرکات ختم ہو جاتی ہیں' تمام آوازیں بیٹھ جاتی ہیں اور منظر پر ایک خوفناک خاموشی چھا جاتی ہے۔ تمام مخلوقات اللہ واحد اور قہار کے سامنے سہم جاتی ہیں۔

دیکھئے! ایک سخت آواز بلند ہو جاتی ہے اور سب لوگ مر کر گر جاتے ہیں۔ اس وقت زمین میں موجود پوری آبادی چشم زدن میں بے جان ہو جاتی ہے۔ آسمانوں کی پوری مخلوق بھی ختم ہو جاتی ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ اب ہمیں یہ معلوم نہیں

ہے کہ کتنے وقفے کے بعد دوسری چیخ بلند ہوتی ہے - لیکن دوسری چیخ بلند ہو جاتی ہے -

وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۝۶۸

"اور اس روز صور پھونکا جائے گا اور وہ سب مر کر گر جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں' سوائے ان کے جنہیں اللہ زندہ رکھنا چاہے - پھر ایک دوسرا صور پھونکا جائے گا اور یکایک سب کے سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے -

یہاں تیسری آواز کا تذکرہ نہیں ہے - جس میں جمع ہونے اور اللہ کے ہاں حاضر کا حکم ہو گا - اور حشر و نشر کی چیخ و پکار اور اژدہام کے شور کی تصویر کشی نہیں کی گئی کیونکہ اس منظر کو نہایت ہی پرسکون انداز میں پیش کرنا مطلوب ہے -

وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹ : ۶۹) "زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی" - یعنی وہ میدان جس میں قیامت برپا ہوگی - یہ میدان جہاں نور ربی ہو گا دوسرا کوئی نور نہ ہو گا -

وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ (۳۹ : ۶۹) "کتاب اعمال لا کر رکھ دی جائے گی" - وہ کتاب جس میں لوگوں کا اعمال نامہ درج ہو گا -

وَ جِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَ الشُّهَدَآءِ (۳۹ : ۶۹) "انبیاء اور تمام گواہ حاضر کر دیئے جائیں گے" - تاکہ وہ حق بات کہہ دیں جو وہ جانتے تھے اور ہر تنازعہ وہاں طے کر دیا گیا - نہایت خاموشی کے ساتھ کیونکہ اس منظر میں تمام معاملات خشوع اور خضوع سے طے ہوتے ہیں - کوئی تنازعہ نہیں رہتا -

وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ وَ جِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۶۹ وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝۷۰ ع ۴

"لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا' ان پر کوئی ظلم نہ ہو گا اور ہر متنفس کو جو کچھ بھی اس نے عمل کیا تھا' اس کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا - لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں' اللہ اس کو خوب جانتا ہے" -

یہاں کسی کو کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے' نہ کوئی آواز اٹھانے کی یہاں کوئی ضرورت ہے۔ چنانچہ پوری انسانیت کا حساب و کتاب بڑی خاموشی کے ساتھ لپیٹ لیا جاتا ہے اور اجمال کے ساتھ جبکہ دوسرے مناظر میں تفصیلات دی گئی ہیں' کیونکہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اس دن اللہ کا رعب اور خوف چھایا ہوا ہو گا۔ اور اللہ کے جلال کے سامنے کسی کو دم مارنے کی سکت نہ ہو گی۔

وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَ يُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ لٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝۷۱

"(اس فیصلہ کے بعد) وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا' جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے' یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے' تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے کارندے ان سے کہیں گے "کیا تمہارے پاس تمہارے اپنے لوگوں میں سے ایسے رسول نہیں آئے تھے جنہوں نے تم کو تمہارے رب کی آیات سنائی ہوں اور تمہیں اس بات سے ڈرایا ہو کہ ایک وقت تمہیں یہ دن بھی دیکھنا ہو گا؟" وہ جواب دیں گے۔ "ہاں' آئے تھے' مگر عذاب کا فیصلہ کافروں پر چپک گیا"۔

یہاں فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور کہیں گے ہاں تم اس جہنم کے مستحق ہو اور یہ ہیں اس کے اسباب۔ کافروں کے خلاف اللہ کا فیصلہ برحق صادر ہو چکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اس لیے کافر یہاں بغیر کسی مخاصمت کے اسے تسلیم کرتے ہیں' اقرار کرتے ہیں کہ ہم مجرم تھے اور سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

قِيْلَ ادْخُلُوْۤا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝۷۲

"کہا جائے گا' داخل ہو جاؤ' جہنم کے دروازوں میں' یہاں اب تمہیں ہمیشہ رہنا ہے' بڑا ہی برا ٹھکانا ہے یہ متکبروں کے لیے"۔ یہ جہنمیوں کا قافلہ ہے۔ متکبرین کا قافلہ ہے۔ وہ گیا' اس کے لیے دروازے کھلے --- لیکن دیکھیے دوسری طرف متقین کا قافلہ بھی آ رہا ہے۔ یہ اہل جنت کا قافلہ ہے!

وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ۝۷۳

""اور جو لوگ اپنے رب کی نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے انہیں گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے' اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہوں گے' تو اس کے منتظمین ان سے کہیں گے کہ ""سلام ہو تم پر' بہت اچھے رہے' داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ کے لیے""۔

یہ ایک بہترین استقبال ہے۔ تعریف ہے۔ اور اس کے اندر اس کا سبب بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ طِبْتُمْ ""تم اچھے رہے"" یعنی تم پاکیزہ رہے۔ تم پاک تھے۔ پاک ہو کر آئے کیونکہ جنت میں تو پاک لوگ ہوں گے۔ پاک لوگ ہی وہاں داخل ہو سکتے ہیں کیونکہ وہاں تو خلود اور نعمتیں ہیں۔

اب یہاں اہل جنت کی آوازیں نہایت خشوع سے بلند ہوتی ہیں اور وہ دھیمی آواز کے ساتھ اللہ کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ۖ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ﴿٧٤﴾

""اور وہ کہیں گے ""شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا' اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں""۔

یہ جنت کی سرزمین کے وارث ہو گئے۔ جہاں چاہتے ہیں اس کے اندر جا رہے ہیں اور بس رہے ہیں۔ جو چاہتے ہیں کھا رہے ہیں' سب کچھ موجود ہے۔ پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے۔

اب اس منظر کا خاتمہ نہایت ہی خوفناک انداز میں ہوتا ہے' لیکن یہ جلال بھی نہایت دھیمی انداز کا ہے۔ اس منظر کی فضا سے ہم رنگ۔ پوری کائنات رب کی ثنا میں رطب اللسان ہے۔ نہایت ہی دھیمے انداز میں' خشوع اور سرافگندگی کے ساتھ اور ہر زندہ مخلوق جس کلمے کو دہراتی وہ نہایت عجز کے ساتھ دہراتی ہے۔

وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ ۸
رَبِّهِمْ ۖ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٧٥﴾ ع ۵
۵

""اور تم دیکھو گے کہ فرشتے عرش کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنے رب کی حمد و تسبیح کر رہے ہوں گے اور لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ چکا دیا جائے گا' اور پکار دیا جائے گا کہ حمد ہے ""اللہ رب العالمین کے لیے""۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ------ ۲۴

### سورۃ المومن ـ ۴۰

آیات ۱--- تا--- ۸۵

# سورۃ المومن ایک نظر میں

اس سورت میں حق و باطل کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ایمان اور کفر کے مسئلے پر بحث ہے۔دعوت اسلامی کے مقاصد اور زمین پر جابرانہ نظام اور بغیر استحقاق کے اقتدار کے حصول کے مسائل زیر بحث آئے ہیں۔اور یہ بتایا گیا کہ اس طرح جبار اور قہار لوگوں کے ساتھ اللہ کا پھر سلوک کیا ہوتا ہے۔اس موضوع کے درمیان مومنین اور اللہ کے مطیع فرمان لوگوں کو تسلی دی جاتی ہے کہ اللہ کی نصرت تمہارے شامل حال رہے گی۔فرشتے تمہارے لیے دعاگو ہیں اور اللہ تمہارے بارے میں فرشتوں کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے اور آخرت میں تو بہت بڑے انعام و اکرام تمہارے انتظار میں ہیں۔

اس سورت کی مجموعی فضا 'اس کے موضوع کے اعتبار سے یوں لگتی ہے کہ گویا جنگ ہو رہی ہے اور کشمکش برپا ہے۔ حق و باطل کا باہم ٹکراؤ ہے۔ایمان اور کفر میدان معرکہ میں ہیں۔زمین کی سرکش قوتوں کے مقابلے میں عذاب الٰہی ہے کہ انہیں تباہ و برباد کر رہا ہے اور اس فضائے کشمکش کے درمیان جب مومنین کا ذکر آتا ہے تو گویا رحمت خداوندی کی باد نسیم چل پڑتی ہے۔

معرکے کی یہ فضا اس سورت میں جابجا بکھری ہوئی ہے۔جہاں اقوام ماضی کی تباہی کے مناظر آتے ہیں ان میں بھی اور جہاں قیامت کے مناظر آتے ہیں ان میں بھی ہے اور انداز بیان نہایت ہی سخت اور خوفناک ہے۔جس طرح پوری سورت کی فضا ہے۔رعب 'شدت اور سختی اس کے انداز بیان کا خاص رنگ ہے۔

غالباً اس سورت کی عمومی فضا کی مناسبت ہی سے شاید سورت کا آغاز شاندار اور زوردار فقروں سے کیا گیا ہے جن کے ذریعہ غور و فکر کی تاروں پر زوردار ضربات لگا کر ایک خاص زمزمہ پیدا کیا گیا ہے:

غَافِرِ الذَّنْبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوْ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (٤٠ : ٣) "گناہ معاف کرنے والا 'توبہ قبول کرنے والا سخت سزا دینے والا' بڑا صاحب فضل ہے 'کوئی معبود اس کے سوا نہیں 'اس کی طرف پلٹنا ہے"۔یہ منظم ضربات ہیں جن کی آواز منظم ہے 'جن کی تاثیر مستقل ہے' آیات کے مقاطع جس طرح زوردار ہیں 'اسی طرح معانی بھی ذی جلال ہیں اور موسیقی بھی پرتاثیر ہے۔

اسی طرح اس سورت میں الباس ، باس اللہ ، باسنا کے الفاظ بار بار دہرائے جاتے ہیں اور سورت میں مختلف مقامات پر آتے ہیں۔اس کے سوا بعض دوسرے الفاظ بھی ہیں جن کے مفہوم و مراد میں سختی پائی جاتی ہے۔

بالعموم یوں نظر آتا ہے کہ پوری سورت میں دل و دماغ کو کھٹکھٹایا جاتا ہے اور بہت ہی زوردار انداز میں تاکہ انسان کا دل و دماغ بیدار ہو 'یہ سختی گزشتہ ملتوں کی ہلاک شدہ اقوام کے واقعات کے بیان میں بھی ہے اور قیامت کے مظاہر کے

بیان کے دوران بھی ہے ۔ لیکن بعض اوقات انداز بیان نرم بھی ہو جاتا ہے ۔ دل و دماغ کے تاروں کو نہایت ہی لطف اور محبت سے چھیڑا جاتا ہے ' خصوصاً جبکہ ان فرشتوں کا بیان آتا ہے جو حاملین عرش ہیں ' جو اپنے رب کو پکارتے ہیں کہ اے اللہ اپنے مومن بندوں پر فضل و کرم فرما اور خصوصا اس وقت جب انسان کے سامنے اس کائنات کی نشانیاں پیش کی جا رہی ہوں یا خود نفس بشری کے اندر موجود آیات دکھائی جا رہی ہوں ۔

بعض مثالوں کا یہاں ذکر ضروری ہے جن سے معلوم ہو کہ سورت میں پایا جانے والا سخت انداز کیا ہے اور نرم انداز کیا ہے --- ہلاک شدہ اقوام کے بارے میں :

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّ الْاَحْزَابُ مِنْ بَعْدِهِمْ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَ جٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ

( ۴۰ : ۵ ) "ان سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم بھی جھٹلا چکی ہے اور اس کے بعد بہت سے جتھوں نے بھی یہ کام کیا ۔ ہر قوم اپنے رسول پر جھپٹی تاکہ اسے گرفتار کرے ' ان سب نے باطل کے ہتھیاروں سے حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کی مگر آخر کار میں نے ان کو پکڑ لیا ' پھر دیکھ لو میری سزا کیسی سخت تھی" ۔

اَوَ لَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ( ۴۰ : ۲۱ ) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ( ۴۰ : ۲۲ ) "کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا ۔ جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے اور ان سے زیادہ زبردست آثار زمین پر چھوڑ گئے تھے ۔ مگر اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا ' اور ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا ۔ یہ ان کا انجام اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول بینات لے کر آئے اور انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا ' آخر کار اللہ نے ان کو پکڑ لیا ۔ یقیناً وہ بڑی قوت والا اور سزا دینے میں بہت سخت ہے ۔

اور قیامت کے مناظر میں یہ دو منظر :

وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّ لَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ( ۴۰ : ۱۸ ) "اور ان لوگوں کو اس دن سے جو قریب آ لگا ہے ' ڈراؤ ' جب کلیجے منہ کو آ رہے ہوں گے اور لوگ چپ چاپ غم کے گھونٹ پی رہے ہوں گے ' ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہو گا اور نہ کوئی شفیع

جس کی بات مانی جائے"۔

اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِالْکِتٰبِ وَ بِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ (۴۰ : ۷۰)

اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلٰسِلُ یُسْحَبُوْنَ (۴۰ : ۷۱) فِی الْحَمِیْمِ ثُمَّ فِی النَّارِ

یُسْجَرُوْنَ (۴۰ : ۷۲) "یہ لوگ اس کتاب کو اور ان ساری کتابوں کو جھٹلاتے ہیں جو ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ بھیجی تھیں' عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا جب طوق ان کی گردن میں ہوں گے اور زنجیریں جن سے پکڑ کر وہ کھولتے ہوئے پانی کی طرف کھینچے جائیں گے اور پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دیئے جائیں گے"۔

اور وہ دیکھیے کہ حاملین عرش نہایت ہی خشوع کے ساتھ مومنین کے لیے دعا کر رہے ہیں! کس قدر خوشگوار اور تروتازہ منظر ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ کُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَ قِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ (۴۰ : ۷) رَبَّنَا وَ اَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ اِلَّتِیْ وَ عَدْتَّهُمْ وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۴۰ : ۸) وَ قِهِمُ السَّیِّاٰتِ وَ مَنْ تَقِ السَّیِّاٰتِ یَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ وَ ذٰلِكَ

هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۴۰ : ۹) "عرش الٰہی کے حامل فرشتے اور وہ جو عرش کے گرد پیش حاضر رہتے ہیں' سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں' وہ کہتے ہیں: "اے ہمارے رب تو اپنی رحمت اور اپنے علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ بس معاف کر دے اور عذاب دوزخ سے بچالے ان لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ اے ہمارے رب اور داخل کر ان کو ہمیشہ رہنے والی ان جنتوں میں' جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کے والدین اور بیویوں اور اولاد سے' جو صالح ہوں۔ تو بلاشبہ قادر مطلق اور حکیم ہے۔ اور بچا دے ان کو برائیوں سے اور جن کو تو نے قیامت کے دن برائیوں سے بچا دیا' اس پر تو نے بڑا رحم کیا۔ یہی بڑی کامیابی ہے"۔

اس سورت میں ان نشانات کو بھی بیان کیا گیا ہے جو انفس و آفاق میں ہیں' نہایت ہی دلکش اور نرم انداز میں۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُکُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّکُمْ

ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخًا وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَ لِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۴۰: ۶۷) هُوَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَ يُمِيْتُ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۴۰: ۶۸) "وہی تو ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا' پھر نطفے سے' پھر خون کے لوتھڑے سے' پھر تمہیں بچے کی شکل میں نکالتا ہے' پھر تمہیں بڑھاتا ہے تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ' پھر اور بڑھاتا ہے تاکہ تم بڑھاپے کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی بلا لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو' وہی ہے زندگی دینے والا اور وہی ہے موت دینے والا۔ وہ جس بات کا بھی فیصلہ کرتا ہے' بس ایک حکم دیتا ہے کہ وہ ہو جائے' وہ ہو جاتی ہے"۔

اَللّٰهُ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (۴۰: ۶۱) ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۴۰: ۶۲) "وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو' اور دن کو روشن کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے ۔ وہی اللہ تمہارا رب ہے' ہر چیز کا خالق' اس کے سوا کوئی معبود نہیں' پھر تم کدھر بہکائے جا رہے ہو"۔

اَللّٰهُ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۰: ۶۴) "اللہ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا اور اوپر آسمان کا گنبد بنایا جس نے تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی' جس نے تمہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا۔ وہی تمہارا رب ہے' بے حساب برکتوں والا ہے' وہ کائنات کا رب ہے۔

یہ دونوں قسم کے انداز اور مناظر سورت کی فضا بناتے ہیں۔ اور یہ اس کے موضوع اور مضمون کے مطابق مناسب انداز بیان بھی ہیں۔ سورت کا سیاق ہم نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ چار ممتاز اسباق پر مشتمل ہے۔

پہلا سبق حروف مقطعات سے سورت کا آغاز کرتا ہے۔

حٰمٓ (۴۰: ۱) تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۴۰: ۲) "حا' میم' اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے' جو زبردست ہے' سب کچھ جاننے والا ہے"۔ اور اس کے بعد عقل و خرد کے تاروں پر وہ مضبوط اور مستقل ضربات ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا۔

غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ إِلَيْهِ الْمَصِيرُ (۴۰ : ۳) "گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے' سخت سزا دینے والا اور بڑا صاحب فضل ہے' کوئی معبود اس کے سوا نہیں' اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے"۔ اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ یہ پوری کائنات مسلم ہے۔ اور اللہ کے سامنے سرتسلیم خم کرنے والی ہے۔ اور اللہ کی نشانیوں کے بارے میں وہی لوگ مجادلہ کرتے ہیں جو کفر پر اصرار کرتے ہیں لہٰذا وہ اس پوری کائنات سے مختلف رویہ اختیار کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ ان کو رسول اللہ کوئی اہمیت دیں۔ اگرچہ وہ مالدار ہوں اور ان کی بات چلتی ہو۔ کیونکہ یہ اسی انجام تک پہنچنے والے ہیں جس سے اس سے قبل انسانی تاریخ کے دوسرے مکذبین پہنچے۔ اللہ نے ان کو خوب پکڑا۔ اور ان کو ایسا عذاب دیا جو حیران کن تھا۔ اس دنیا میں بھی ان کو عبرتناک سزا دی گئی اور آخرت کا عذاب تو مستقلاً ان کے لیے تیار ہے اور ان کے انتظار میں ہے۔ یہ تو کفر کرتے ہیں لیکن جن فرشتوں نے اللہ کے عرش کو اٹھا رکھا ہے' وہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ اپنے رب پر ایمان لائے ہیں۔ اس کی بندگی کرتے ہیں پھر زمین میں جو لوگ ایمان لاتے ہیں۔ یہ حاملین عرش ان کے لیے دعا کرتے ہیں' ان کی مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور ان کے لیے دائمی نعمتوں اور فلاح کی دعا کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی قیامت میں کافروں کے منظر کی ایک جھلک بھی دکھائی جاتی ہے کہ ان پر یہ پوری کائنات ہر طرف سے آواز سے کسے گی' وہ کائنات جو مومن اور سرتسلیم خم کرنے والی ہے :

لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ

(۴۰ : ۱۰) "آج تمہیں جتنا شدید غصہ اپنے اوپر آرہا ہے۔ اللہ تم پر اس سے زیادہ غضبناک ہے اس وقت ہوتا تھا جب تمہیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا اور تم کفر کرتے تھے"۔ اب یہ لوگ انکسار کے بجائے نہایت ہی ذلت کے مقام پر کھڑے ہیں' اپنے گناہوں کا اقرار کر رہے ہیں' رب کا اعتراف کر رہے ہیں لیکن یہ اقرار و اعتراف مفید ہی نہیں ہے۔ بس وہی گناہ یاد کیے جا رہے ہیں جو یہ شرک اور تکبر کی صورت میں کرتے تھے اور اب روئے سخن قیامت کے اس منظر سے پھر کر دنیا میں آجاتا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا (۴۰ : ۱۳) "وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے' اور آسمانوں سے تمہارے لیے رزق نازل کرتا ہے"۔ یہ اس لیے یاد دلایا جاتا ہے کہ وہ رب کی طرف لوٹ کر اسے وحدہ لاشریک سمجھیں۔

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۴۰ : ۱۴) "اللہ ہی کو پکارو' اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے' خواہ تمہارا یہ فعل کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو"۔ پھر وحی کی طرف اشارہ آتا ہے اور قیامت کے ہولناک دن سے ڈرایا جاتا ہے۔ اور پھر قیامت کا ایک منظر

يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ (۴۰ : ۱۶) "وہ دن جب کہ سب لوگ بے پردہ ہوں گے' اللہ سے ان کی کوئی بات چھپی ہوئی نہ ہوگی"۔

اس دن جبار' متکبر اور جھگڑنے والوں کا نام و نشان نہ ہوگا۔

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۴۰ : ۱۶) "آج بادشاہی کس کی ہے؟ اللہ واحد قہار کی"۔ آج کے دن کا بیان چلتا ہے۔ جہاں فیصلے اور احکام صرف اللہ کے چلتے ہیں اور اللہ کے سوا جو دوسرے معبود تھے ' وہ چھپ گئے ہیں۔ مضمحل ہو گئے ہیں۔ جس طرح اس دن سرکشوں اور فاسق فاجر لوگوں کا کوئی نام و مقام نہیں ہے۔

دوسرے سبق میں سابق اقوام کی ہلاکتوں سے بات چلتی ہے۔ اس کا آغاز حضرت موسیٰ اور فرعون ' ہامان اور قارون کے قصے سے ہوتا ہے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ ہمیشہ سرکش لوگ دعوت اسلامی کے مقابلے میں کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں قصہ موسیٰ کا ایک ایسا حصہ بیان کیا جاتا ہے جو اس سے پہلے بیان نہیں ہوا۔ اور یہ کڑی صرف اسی سورت میں ہے۔ ایک مومن شخص حضرت موسیٰ کی حمایت کرتا ہے اور ان کے قتل کے منصوبے کی مخالفت کرتا ہے۔ اور نہایت ہی احتیاط کے ساتھ حق بات کہتا ہے۔ نرمی اور حکمت کے ساتھ بات شروع کرتا ہے اور جب سمجھتا ہے کہ بات میں اثر ہے تو وہ نہایت وضاحت اور صراحت سے اپنی بات کرتا ہے اور اپنی تقریر میں وہ حق کے دلائل دیتا ہے۔ یہ دلائل نہایت قوی اور واضح ہیں ' وہ ان کو قیامت کے دن سے ڈراتا ہے اور قیامت کے بعض مناظر بھی ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ نہایت موثر انداز میں یہ شخص تقریر کرتا ہے۔ یہ شخص ان کو خود ان کا موقف بھی یاد دلاتا ہے اور اس سے قبل انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا تھا وہ بھی یاد دلاتا ہے۔ اور قصے کے آخر میں وہ ان کو قیامت کے مناظر تک لے جاتا ہے کہ وہاں وہ آگ میں ایک دوسرے سے جھگڑتے ہیں۔ اور ضعفاء اور متکبرین ایک دوسرے کو ملامت کرتے ہیں اور پھر یہ سب جہنم کے داروغوں کے ساتھ مکالمہ کرتے ہیں کہ کیا کوئی صورت ہے رہائی کی۔ لیکن اے کاش کہ وقت گزر گیا ہے۔ اس تقریر اور اس منظر کی روشنی میں حضور ؐ کو تلقین کی جاتی ہے کہ آپ صبر کریں اور حمد و تسبیح کے ساتھ استغفار کریں۔

تیسرے سبق کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ جو لوگ سچ بات کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ' ان کو اس بات پر وہ کبر آمادہ کرتا ہے جو ان کے نفس میں ہوتا ہے حالانکہ وہ اپنے آپ کو جس قدر بڑا سمجھتے ' در حقیقت اس کے مقابلے میں ان کے قد اتنے ہی بونے ہوتے ہیں۔ یہاں سیاق کلام لوگوں کو اس عظیم کائنات کی طرف متوجہ کرتا ہے جسے اللہ نے پیدا کیا اور وہ اللہ ہے جو اکبر اور کبیر اور متکبر ہے۔ یہ اس لیے کہ شاید وہ اللہ کی عظمت اور کائنات کی عظمت کو دیکھ کر اپنے حدود میں آجائیں۔ اور ان کی آنکھیں کھل جائیں۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيرُ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيٓءُ قَلِيلًا مَّا تَتَذَكَّرُونَ (۴۰ : ۵۸) "اور یہ نہیں ہو سکتا کہ اندھا اور بینا یکساں ہو جائیں اور ایماندار اور صالح اور بدکار برابر ٹھہریں۔ مگر تم لوگ کم ہی سمجھتے ہو"۔ پھر ان کو قیام قیامت کی یاد دہانی کی جاتی ہے اور ان کو اس دعا کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو مستجاب ہوتی ہے ' جو لوگ اللہ کو پکارنے سے اپنے آپ کو برتر سمجھتے ہیں وہ جہنم میں الٹے منہ پھینکے جائیں گے ' ذلیل و خوار ہوں گے۔ یہاں بعض ایسی نشانیوں کو ان کے سامنے رکھا جاتا ہے جن پر سے وہ رات اور دن گزرتے ہیں لیکن ان سے غافل ہو کر گردش لیل و نہار ' زمین کا اپنی جگہ رکے ر۔" " آسمانوں کی دوریاں اور چھت کی طرح رہنا۔ پھر خود حضرت انسان کی ذات و شخصیت اور اس کی خوبصورتی۔ ان سب دلائل کے پیش نظر کہا جاتا ہے کہ

صرف اللہ کو پکارو' اس کے دین کو خالص کرتے ہوئے' حضورؐ سے فرمایا جاتا ہے کہ آپ ان کے معبودوں کی عبادت سے برات کا اعلان کر دیں کہ اللہ نے مجھے اس سے روکا ہے اور یہ حکم دیا کہ میں صرف خدا کے سامنے سرتسلیم خم کر دوں۔ اس لیے کہ صرف اللہ ہے جس نے انسان کو مٹی سے اور نطفے سے پیدا کیا' وہی پیدا کرنے والا اور مارنے والا ہے۔ حضورؐ سے نہایت تعجب کے انداز میں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور عذاب قیامت کا ایک خوفناک منظر پیش کر کے ان کو ڈرایا جاتا ہے۔

اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلٰسِلُ یُسْحَبُوْنَ (۴۰ : ۷۱) فِی الْحَمِیْمِ ثُمَّ فِی النَّارِ یُسْجَرُوْنَ (۴۰ : ۷۲) "جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں جن سے پکڑ کر وہ کھولتے ہوئے پانی کی طرف کھینچے جائیں گے اور پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دیئے جائیں گے"۔ اس وقت ان کے معبود اس بات کا انکار کر دیں گے کہ وہ انہیں پوجتے تھے اور آخر کار یہ جہنم رسید ہوں گے۔

اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِیْنَ (۴۰ : ۷۶) "اب جاؤ' جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ' ہمیشہ تم کو وہیں رہنا ہے۔ بہت ہی برا ٹھکانا ہے متکبرین کا"۔ اس منظر کی روشنی میں اللہ حضور اکرمؐ کو تسلی دیتا ہے کہ آپ صبر کریں اور یقین کریں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے چاہے آپ موجود ہوں اور ان کا انجام دیکھیں یا آپ کی وفات کے بعد یہ لوگ اس انجام سے دوچار ہوں اور اللہ کا وعدہ پورا ہو۔

آخری سبق کا مضمون تیسرے سبق سے ملتا جلتا ہے۔ حضورؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ صبر کریں' انتظار کریں' آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیجے گئے اور ان کے ساتھ یہی ہوا۔

وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴۰ : ۷۸) "کسی رسول کی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر خود کوئی نشانی لے آتا"۔ اور یہ دیکھتے نہیں کہ یہ کائنات ایک پوری نشانی ہے۔ ان کے سامنے معجزات موجود ہیں۔ لیکن یہ ان پر غور نہیں کرتے۔ کیا یہ جانوروں پر غور نہیں کرتے' جو ان کے لیے مسخر کر دیئے ہیں' کیا یہ سمندروں میں کشتیوں کی پلٹ کو نہیں دیکھتے' کیا یہ انسانی تاریخ پر غور نہیں کرتے کہ کس طرح اللہ نے بڑی بڑی قوموں کو نیست و نابود کر دیا اور سورت کا خاتمہ ایک ایسی قوی ضرب سے ہوتا ہے جس سے دل و دماغ کی تمام یادیں زمزمہ بکھیرتی ہیں کہ جب جھٹلانے والوں پر ہلاکت آئی اور انہوں نے عذاب دیکھا تو فوراً برخوردار بن گئے اور ایمان لانے لگے لیکن فَلَمْ یَكُ یَنْفَعُهُمْ اِیْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِهٖ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (۴۰ : ۸۵) "مگر ہمارا عذاب دیکھنے کے بعد ان کا ایمان ان کے لیے نافع نہ ہو سکتا تھا کیونکہ یہی اللہ کا مقرر ضابطہ ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں پر جاری رہا ہے' اور اس وقت کافر لوگ خسارے میں پڑ گئے"۔ یہ ہے سورت کا خاتمہ جس میں متکبرین کا انجام بتایا گیا ہے اور یہ خاتمہ اس سورت کے موضوعات و مضامین اور اس کی فضا کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

اب ہم اس سورت کے اسباق و آیات کی تفصیلات کی طرف آتے ہیں۔

---OOO---

# درس نمبر ۲۲۳ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۲۰

---

سُورَۃُ الْمُؤْمِنِ (۴۰) مَکِّیَّۃٌ (۶۰) اٰیَاتُہَا (۸۵) رُکُوْعَاتُہَا ۹

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۲﴾ غَافِرِ الذَّنْبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ذِی الطَّوْلِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اِلَیْہِ الْمَصِیْرُ ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ح' م۔ اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست ہے' سب کچھ جاننے والا ہے' گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے' سخت سزا دینے والا اور بڑا صاحب فضل ہے' کوئی معبود اس کے سوا نہیں' اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے"۔

یہ سورت ان سات سورتوں میں سے پہلی سورت ہے جن کا آغاز حا اور میم کے حروف مقطعات سے ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک سورت ایسی ہے جس میں حا۔ میم کے بعد عین' سین اور قاف بھی آیا ہے۔ حروف مقطعات کے بارے میں ہم تمام سورتوں میں کہہ آئے ہیں کہ ان میں اشارہ اس طرف ہے کہ یہ کلام انہی حروف تہجی سے بنا ہے اور یہ ایک معجز کلام ہے حالانکہ یہ حروف تہجی تمہاری دسترس میں ہیں۔ یہ تمہاری زبان کے حروف ہیں اور اس زبان کو تم بولتے بھی ہو' لکھتے بھی ہو۔

ان حروف کے بعد پھر نزول کتاب کی طرف اشارہ ہے۔ یہ وہ بات ہے جو اکثر مکی سورتوں کے آغاز میں کہی جاتی ہے جن کا مضمون اکثر اسلامی نظریہ حیات اور کلمہ توحید سے ہوتا ہے۔

تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ( ۴۰ : ۲ ) "اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست ہے اور سب کچھ جاننے والا ہے"۔

اس اشارے کے بعد اب بات اس ذات کی بعض صفات کی طرف منتقل ہوتی ہے جس نے یہ کلام نازل کیا ہے۔ یہ وہ صفات ہیں جن کا اس سورت کے موضوع کے ساتھ گہرا ربط ہے۔ اس سورت میں جو موضوعات اور جو مسائل لیے گئے ہیں ان کے ساتھ ان صفات انہی کا ربط ہے۔

غَافِرِ الذَّنْبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِى الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ( ۴۰ : ۳ ) "زبردست ہے' سب کچھ جاننے والا ہے' گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے' سخت سزا دینے والا اور بڑا صاحب فضل ہے' کوئی معبود اس کے سوا نہیں' اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے"۔

اس آیت میں عزت' علم' گناہوں کی مغفرت' توبہ کی قبولیت' سخت سزا' فضل و کرم' الوہیت اور حاکمیت کی وحدت اور سب لوگوں کا اس کی طرف لوٹنے کی صفات بیان کی گئی ہیں۔

اور اس سورت کے تمام موضوعات انہی معانی کے ارد گرد گھومتے ہیں جن کو اس آیت میں قلم بند کیا گیا ہے۔ اس آیت میں نہایت زوردار انداز' زوردار آواز میں اور قوی تر تراکیب اور جملوں میں نہایت پختگی اور استقلال سے لایا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ صفات یہاں متعارف کرائی ہیں جن کا انسانی وجود اور انسانی زندگی پر گہرا اثر ہے۔ یوں اللہ نے انسانوں کے دلوں اور ان کے شعور کے احساسات کو تیز کیا۔ ان کے اندر رجائیت پیدا کی اور امید کو جگایا۔ ان کے اندر خوف اور تقویٰ پیدا کیا گیا اور ان کو یہ یقین دلایا گیا کہ وہ اللہ کے قبضے میں ہیں۔ وہ اللہ کے تصرفات سے کہیں بھاگ نہیں سکتے۔ ذرا ان صفات کا تفصیلی جائزہ لیں۔

الْعَزِيْزِ ( ۴۰ : ۲ ) "وہ قوی اور قادر مطلق جو ہر کسی پر غالب ہے' اور اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ وہ تمام امور میں تصرف کرتا ہے اور اس پر کوئی قدرت نہیں رکھتا اور نہ اس کے اوپر کوئی نگران ہے۔

الْعَلِيْمِ ( ۴۰ : ۲ ) وہ ذات ہے جو اس کائنات کو علم اور مہارت سے چلاتی ہے' اس پر اس کائنات کا کوئی راز مخفی نہیں ہے۔ اور کوئی چیز اس کے علم سے غائب نہیں ہے۔

غَافِرِ الذَّنْبِ ( ۴۰ : ۳ ) وہ جو بندوں کے گناہوں کو بخشتا ہے' ان بندوں کے گناہوں کو جن کے بارے میں اپنے شامل علم کے ذریعے اللہ جانتا ہے کہ وہ بخشش کے مستحق ہیں۔

وَ قَابِلِ التَّوْبِ ( ۴۰ : ۳ ) وہ جو نافرمانوں پر مہربانی کرتا ہے اور ان کو لوٹا کر اپنے خطیرۂ امن میں لاتا ہے اور ان کے لیے اپنی رحمت کا دروازہ کھول دیتا ہے اور بلا روک ٹوک ان کو اندر آنے دیتا ہے۔

شَدِيْدِ الْعِقَابِ ( ۴۰ : ۳ ) جو متکبرین کو نیست و نابود کرتا ہے' اور اسلام کے دشمنوں کو سزا دیتا ہے'

جو نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ استغفار کرتے ہیں۔

ذِی الطَّوْلِ (۴۰ : ۳) وہ جو لوگوں کو انعامات دیتا ہے ' جو نیکیوں میں اضافہ کرتا ہے اور لوگوں کو اس قدر دیتا ہے کہ ان انعامات کا کوئی حساب نہیں کیا جا سکتا۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (۴۰ : ۳) الوہیت ' حاکمیت اسی کی ہے ' اور وہ وحدہ لاشریک ہے ' اپنی ذات و صفات میں۔

اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۴۰ : ۳) حساب و کتاب کے لیے ہر کسی نے اس کے سامنے حاضر ہونا ہے اور اس سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور اس سے ملاقات ہوگی۔ تمام مخلوق نے اسی کی طرف لوٹنا ہے اور وہی لوٹنے کی جگہ ہے۔

یوں بندوں کا تعلق اللہ سے اور اللہ کا تعلق بندوں سے واضح کیا جاتا ہے۔ بندوں کے شعور ان کے تصورات ' ان کے ادراک ' اور ان کے علم میں اللہ سے رابطہ بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ کس قدر چوکنا ہو کر اور احتیاط سے معاملہ کرنا ہے اور یہ جانتے ہوئے معاملہ کرنا ہے کہ کس چیز سے اللہ ناراض ہوتا ہے اور کس چیز سے راضی ہوتا ہے۔

جن لوگوں کے ادیان اور عقائد افسانوی ہیں ' وہ اپنے الہوں کے بارے میں جو تصور رکھتے ہیں ' وہ اس کے بارے میں حیرت میں رہتے ہیں ' انہیں ان الہوں کے بارے میں کوئی ٹھوس معلومات نہیں ہوتیں ' ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ کیا چیز انہیں ناراض کرتی ہے اور کس سے وہ راضی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے الہوں کی جو تصویر کھینچتے ہیں۔ اس کے مطابق ان الہوں کی خواہشات بدلتی رہتی ہیں ' ان کا رجحان صاف نہیں ہوتا۔ وہ الٰہ جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ان الہوں کے ساتھ ہمیشہ بے چینی کی زندگی گزارتے ہیں اور ہر وقت اس بات کی تلاش میں رہتے ہیں کہ ان کی رضا کس میں ہے اور کس میں نہیں ہے۔ آیا وہ تعویذوں سے راضی ہوتے ہیں ' قربانیوں سے راضی ہوتے ہیں۔ ذبیحوں سے راضی ہوتے ہیں یا اور اگر وہ یہ کام کر بھی گزریں تو بھی ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ راضی ہوگئے یا نہیں ہوئے۔

ان حالات میں اسلام آیا ' اس نے واضح اور ستھرے تصورات و عقائد دیئے ' لوگوں کو اپنے سچے خدا سے ملا دیا۔ ان کو اللہ کی صحیح صفات سے آگاہ کر دیا۔ ان کو اللہ کی مشیت کے بارے میں بتا دیا ' یہ بھی صاف صاف بتا دیا کہ وہ اللہ کے قریب کس طرح ہو سکتے ہیں ' اس کی رحمت کی امید وہ کس طرح کر سکتے ہیں۔ اس کے عذاب سے کس طرح ڈر سکتے ہیں اور اللہ کا سیدھا اور درست راستہ کون سا ہے۔

---ooo---

مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ۝ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۠ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۢ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ

الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝ وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝

"اللہ کی آیات میں جھگڑے نہیں کرتے مگر صرف وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے۔اس کے بعد دنیا کے ملکوں میں ان کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔ان سے پہلے نوح کی قوم بھی جھٹلا چکی ہے' اور اس کے بعد بہت سے دوسرے جتھوں نے بھی یہ کام کیا ہے۔ ہر قوم اپنے رسول پر جھپٹی تاکہ اسے گرفتار کرے۔ان سب نے باطل کے ہتھیاروں سے حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کی' مگر آخر کار میں نے ان کو پکڑ لیا' پھر دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔اسی طرح تیرے رب کا یہ فیصلہ بھی ان سب لوگوں پر چسپاں ہو چکا ہے۔جو کفر کے مرتکب ہوئے ہیں کہ وہ واصل بجہنم ہونے والے ہیں"۔

اس فیصلے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند صفات رکھتا ہے اور وہ وحدہ لاشریک ہے' اب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ حقائق' اس کائنات کی ہر چیز کی طرف سے مسلم ہیں کیونکہ اس کائنات کی فطرت ان حقائق کے ساتھ مربوط ہے اور یہ تعلق براہ راست ہے جس میں کوئی تنازعہ اور کوئی مجادلہ نہیں ہے۔یہ پوری کائنات بڑے اطمینان سے آیات الٰہیہ کو تسلیم کرتی ہے' اللہ کی وحدانیت پر شاہد عادل ہے۔اور اس میں مجادلہ وہی لوگ کرتے ہیں جو کفر پر تلے ہوئے ہیں اور یہ لوگ اس کائنات سے منحرف ہیں۔

مَا يُجَادِلُ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۴۰ : ۴) "اللہ کی آیات میں جھگڑے نہیں کرتے مگر وہی لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے"۔"وہی لوگ" یعنی اس کائنات میں سے صرف وہی لوگ اکیلے ان آیات کا انکار کرتے ہیں جو کفر پر تلے ہوئے ہیں۔اس عظیم مخلوقات میں سے صرف یہی لوگ منحرف ہیں۔اور ان کی اس عظیم الشان وجود میں چیونٹی سے بھی کم حیثیت ہے۔جس طرح اس کرۂ ارض کی نسبت سے ایک چیونٹی حقیر شے ہے۔اس طرح اس کائنات کے حوالے سے انسان ایک چیونٹی سے بھی کم ہے۔لیکن جھگڑتا ہے یہ حضرت انسان اللہ کی نشانیوں کے بارے میں' جبکہ یہ عظیم کائنات اہل کفر کے مقابلے میں کھڑی ہے۔اور حق تعالیٰ کا اعتراف کر رہی ہے۔اور عزیز و جبار کی قوتوں کی معترف ہے۔یہ لوگ' اس موقف میں اپنے انجام کے خلاف کھڑے ہیں۔یہ لوگ چاہے دنیا میں قوت رکھتے ہوں اور جاہ و مال کے مالک ہوں اور مقتدر اعلیٰ ہوں' لیکن جس جگہ انہوں نے جانا ہے' اس کی انہیں کوئی فکر نہیں ہے۔

فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ (۴۰ : ۴) "اس کے بعد دنیا کے ملکوں میں ان کی چلت پھرت تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے"۔وہ جس قدر دوڑ دھوپ کریں' جس قدر اقتدار اور مال و جاہ کے وہ مالک ہوں' جس قدر وہ عیش و عشرت میں ہوں' آخر کار یہ لوگ تباہ و برباد اور ہلاک ہونے والے ہیں۔ان کی اس جنگ کا انجام معروف ہے۔کیا یہ ممکن ہے کہ اس عظیم خالق کائنات کے درمیان اور اس کائنات کی ایک حقیر چیونٹی کے درمیان کوئی معرکہ برپا ہو سکتا ہے۔

ان سے پہلے ان جیسی کئی اقوام اس زمین پر ہو گزری ہیں' ان کا جو انجام ہوا' اس سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسی اقوام کا انجام کیا ہوا کرتا ہے' جو اللہ کی قوت کے مقابلے میں آجائیں۔اللہ کی قوت ان کو پیس کر رکھ دیا کرتی ہے

اور ہر اس قوت کو پیس ڈالتی ہے جو اللہ کے ساتھ جنگ کے لیے اٹھتی ہے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّ الْاَحْزَابُ مِنْ بَعْدِهِمْ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَ جٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ

( ۰ ٤ : ۵ ) "ان سے پہلے نوح کی قوم بھی جھٹلا چکی ہے اور ان کے بعد بہت سے دوسرے جتھوں نے بھی یہ کام کیا۔ ہر قوم اپنے رسول پر جھپٹی تاکہ اسے گرفتار کرے۔ ان سب نے باطل کے ہتھیاروں سے حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کی مگر آخر کار میں نے ان کو پکڑ لیا۔ پھر دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی"۔ یہ سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے چلا آ رہا ہے اور یہ ایک ایسا معرکہ ہے جو ہر زمان و مکان میں برپا ہے' اور یہ آیت اس قصے کا خلاصہ بتاتی ہے۔ رسولوں اور ان کی تکذیب کا قصہ۔ اور ان کے اور اللہ کے مقابلے میں سرکشی کا رویہ ہر زمان و مکان میں یونہی ہوتا رہا ہے اور انجام بھی ایک رہا ہے۔

رسول آیا ہے' اس کی قوم کے سرکشوں نے اس کی تکذیب کی ہے۔ انہوں نے دلیل کا جواب دلیل سے نہیں دیا' بلکہ دلیل کے مقابلے میں تشدد کے ہتھیار لے کر آئے اور انہوں نے رسول کو پکڑ کر گرفتار کرنے کی کوشش کی اور جمہور عوام کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کی کوشش کی تاکہ حق کا مقابلہ کریں' حق کو نیچا دکھائیں مگر اللہ کی قوت جبارہ نے مداخلت کی ہے۔ اور ایسے سرکشوں کو اس طرح چوٹی سے پکڑا کہ وہ آنے والوں کے لیے عبرت بن گئے۔

فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ( ۰ ٤ : ۵ ) "میری سزا کیسی سخت تھی"۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی سزا تباہ کن تھی' بہت سخت تھی۔ ان اقوام کے جو آثار بھی آج باقی ہیں' وہ بتاتے ہیں کہ یہ سزا بہت سخت تھی۔ اور احادیث و روایات بھی یہ بتاتی ہیں کہ وہ سزا بہت سخت تھی۔

اور یہ معرکہ یہاں ختم نہیں ہو گیا بلکہ یہ قیامت تک چلا گیا:

وَ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ( ۰ ٤ : ٦ ) "اسی طرح تیرے رب کا یہ فیصلہ بھی ان سب لوگوں پر چسپاں ہو چکا ہے جو کفر کے مرتکب ہوئے ہیں کہ وہ واصل بجہنم ہونے والے ہیں"۔ جب یہ اللہ کا فیصلہ حق ہوا' چسپاں ہوا' گویا نافذ ہو گیا' اور ہر قسم کا مباحثہ ہی ختم ہو گیا۔

یوں قرآن کریم ایک حقیقی صورت حال کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ایمان اور کفر کے طویل معرکہ کی تصویر کشی۔ حق اور باطل کے درمیان معرکہ آرائی' ان لوگوں کے درمیان جو اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور ان لوگوں کے درمیان معرکہ آرائی جو زمین میں سرکشی اختیار کرتے ہیں' بغیر دلیل کے بات کرتے ہیں۔ یوں قرآن یہ بتاتا ہے کہ یہ معرکہ حق و باطل آغاز انسانیت سے شروع ہے اور اس کا میدان زمین سے بھی آگے ہے۔ اس پوری کائنات میں بھی یہ جاری ہے

کہ یہ پوری کائنات اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے لیکن ایک کافر نہ صرف اہل ایمان سے بلکہ پوری کائنات کے ساتھ بھی بر سرپیکار ہوتا ہے۔ یہ اس کائنات کے اندر موجود اللہ کی نشانیوں سے بھی لڑتا ہے اور اس معرکہ آرائی کا انجام بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق کی قوتیں' بہت بڑی' بہت طاقتور ہیں۔ اللہ ہے' پوری کائنات ہے' اہل ایمان ہیں اور اس کے مقابلے میں کفار کی قلیل و حقیر قوت ہے۔ اگرچہ عارضی طور پر اس کا پلہ بھاری ہو اور بظاہر یہ قوت بہت ہی خوفناک نظر آئی ہو مگر آخر کار یہ تباہ ہونے والی ہے۔

یہ حقیقت کہ حق و باطل کا معرکہ اور اس میں لڑنے والی قوتیں اور اس کا میدان جنگ یعنی طویل انسانی تاریخ' اس کی تصویر کشی قرآن اس لیے کرتا ہے کہ اہل ایمان کے دلوں میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ جائے' خصوصاً ان اہل ایمان کے دلوں میں جو پیغمبروں کے اصول و مناہج پر دعوت حق لے کر آئے ہیں اور ہر زمان و مکان میں دعوت ایمان دیتے ہیں وہ اچھی طرح جان لیں اور یقین کر لیں کہ باطل کی قوت کچھ بھی نہیں ہے۔ اگرچہ وہ بظاہر پھولی ہوئی نظر آئے' ایک محدود وقت کے لیے کسی محدود سرزمین میں' یہ قوت حقیقت نہیں ہے۔ اصل حقیقت وہ ہے' جس کی نشاندہی اللہ کی کتاب کر رہی ہے' جسے وہ کلمۃ الحق کہتی ہے' اور حق غالب ہوا کرتا ہے۔ اللہ سب سے سچا ہے اور اس کی بات سچی ہے۔

---ooo---

اس حقیقت کے ساتھ ساتھ کہ دعوت حق ہے اور اس کے حامل مومنین ہیں۔ ان کے ساتھ وہ مومنین بھی شامل ہیں جو اللہ کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے اردگرد متعین وہ بھی اہل ایمان کے ساتھ تائید میں کھڑے ہیں۔ وہ ہروقت انسان مومنین کی رپورٹ اللہ کے ہاں پیش کرتے ہیں' ان کے لیے مغفرت طلب کرتے رہتے ہیں اور ان کے لیے جو اللہ کا وعدہ ہے' اللہ سے اس کے پورا کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ انسان بھی مومن ہیں اور وہ بھی مومن ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّ
عِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ رَبَّنَا
وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ
وَذُرِّيّٰتِهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ۭ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ ا
يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ ع ۹
٦

"عرش الٰہی کے حامل فرشتے' اور وہ جو عرش کے گردوپیش حاضر رہتے ہیں' سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی

تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "اے ہمارے رب' تو اپنی رحمت اور اپنے علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے' پس معاف کر دے اور عذاب دوزخ سے بچا لے' ان لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ اے ہمارے رب' اور داخل کر ان کو ہمیشہ رہنے والی ان جنتوں میں جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے' اور ان کے والدین اور بیویوں اور اولاد میں سے جو صالح ہوں (ان کو بھی وہاں ان کے ساتھ ہی پہنچا دے)۔ تو بلاشبہ قادر مطلق اور حکیم ہے۔ اور بچا دے ان کو برائیوں سے' جس کو تو نے قیامت کے دن برائیوں سے بچا دیا اس پر تو نے بڑا رحم کیا' یہی بڑی کامیابی ہے"۔

ہم نہیں جانتے کہ عرش کی حقیقت کیا ہے' نہ اس کی صورت متعین کر سکتے ہیں اور ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ اس کے اٹھانے والے اسے کس طرح اٹھاتے ہیں۔ یہ بھی نہیں جانتے کہ اس کا ماحول کیسا ہے اور اس کے اردگرد فرشتے کیسے ہیں' لہٰذا ہمیں ان چیزوں کی ہیئت اور ماہیت معلوم کرنے کی فضول جدوجہد نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ اشیاء انسانی ادراک کے دائرہ سے ماوراء ہیں۔ نہ ہمیں ان غیبی امور کے پیچھے پڑنا چاہئے' جن کے بارے میں مباحثہ کرنے والوں کو کوئی علم نہیں دیا گیا۔ جو بات آیات سے سمجھ میں آتی ہے' وہ صرف یہ ہے کہ اللہ کے بعض مقرب بندے' رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں' اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور قرآن کریم ان کے ایمان کی تصریح اس لیے کر رہا ہے کہ ان کا ربط مومن انسانوں کے ساتھ واضح ہو جائے اور اللہ کے یہ مقرب بندے ان مومن انسانوں کے لیے دعائے خیر کرتے ہیں جو یہاں اس دنیا میں معرکہ خیر و شر میں کودے ہوئے ہیں۔ یہ بندے جس انداز سے دعا کرتے ہیں اس میں ہمارے لیے تعلیم ہے کہ ہر انسان کو چاہئے کہ وہ اللہ کو یوں مخاطب کرے۔ وہ کہتے ہیں:

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (۴۰ : ۷) "اے ہمارے رب' تو اپنی رحمت اور اپنے علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے"۔ وہ اللہ کے سامنے طلب رحمت کے لیے یوں درخواست کرتے کہ (اے اللہ) ہم انسانوں کے لیے وہ رحمت طلب کرتے ہیں جو دراصل ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور وہ اللہ کے علم کو ذریعہ بناتے ہیں جو ہر چیز کو شامل ہے۔ وہ اللہ کے سامنے کوئی نئی چیز پیش نہیں کرتے جو اللہ کے پیش نظر نہ ہو۔ اللہ کی رحمت اور علم جو ہر چیز کو محیط ہیں انہی کے واسطہ سے وہ التجا کرتے ہیں۔

فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ (۴۰ : ۷) "پس معاف کر دے اور عذاب دوزخ سے بچا لے' ان لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے"۔ اس دعا میں ایک اشارہ مغفرت اور توبہ کا ہے جو آغاز سورت میں غافر الذنب اور قابل التوب کے ساتھ موافق ہے اور دوسرا اشارہ عذاب جہنم سے بچانے کی طرف ہے جو آغاز سورت میں شدید العقاب کے ساتھ موافق ہے۔

اس کے بعد یہ بندے دعا میں ذرا آگے بڑھتے ہیں' اب وہ مغفرت اور عذاب جہنم سے بچانے سے بھی آگے جنت عطا کرنے کا سوال کرتے ہیں اور ان وعدوں کے پورے کیے جانے کا سوال کرتے ہیں جو اللہ نے اپنے نیک بندوں سے کر رکھے ہیں۔

رَبَّنَا وَ اَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ﹰالَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۴۰ : ۸) "اے ہمارے رب' اور داخل کر ان کو ہمیشہ رہنے والی ان جنتوں میں جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے' اور ان کے والدین اور بیویوں اور اولاد میں سے جو صالح ہوں (ان کو بھی وہاں ان کے ساتھ ہی پہنچا دے)۔تو بلاشبہ قادر مطلق اور حکیم ہے"۔

جنت میں داخلہ' بے شک بہت بڑی نعمت اور بہت بڑی کامیابی ہے' اور اس پر مزید کہ آباء' ازواج اور اولاد بھی ساتھ ہوں۔یہ مزید نعمت ہے۔اس سے اس بات کا مظاہرہ ہوتا ہے کہ مومنین جنت میں بھی اکٹھے خاندانی نظام کی شکل میں ہوں گے۔یہ ایمان ہے جو اباء' ازواج اور اولاد کے درمیان اکٹھ پیدا کرتا ہے' اگر ایمان نہ ہوتا تو یہ رشتے کٹ جاتے۔ اور اس فقرے پر جو آخری نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔

اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۴۰ : ۸) "تو قادر مطلق اور حکیم ہے"۔اس میں ایک طرف قوت ہے اور دوسری طرف حکمت۔بندوں کے معاملے میں کوئی فیصلہ قوت اور حکمت کے سوانہیں ہو سکتا۔

وَ قِهِمُ السَّیِّاٰتِ وَ مَنْ تَقِ السَّیِّاٰتِ یَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۴۰ : ۹) "اور بچا دے ان کو برائیوں سے 'جس کو تو نے قیامت کے دن برائیوں سے بچا دیا اس پر تو نے بڑا رحم کیا' یہی بڑی کامیابی ہے"۔جنت میں داخل ہونے کی دعا کے بعد یہ دعا کہ ان کو برائیوں سے بچا' یہ توجہ دلاتی ہے کہ ذرا غور کرو کہ یہ سیئات اور برائیاں ہی ہیں جو ان کا ارتکاب کرنے والوں کو برباد کرتی ہیں۔اور یہ بربادی آخرت میں ظاہر ہوتی ہے۔یہی جہنم رسید کرتی ہیں۔جب اللہ نے مومنین کو برائیوں سے بچا لیا تو وہ جہنم سے ہی بچ گئے اور برے نتائج سے بھی۔یہی رحمت خداوندی کا عروج ہو گا اس مشکل وقت میں۔اور

وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۴۰ : ۹) "یہی بڑی کامیابی ہے"۔کہ کوئی برائیوں سے بچ جائے۔

---ooo---

ایک طرف عرش کے حاملین اپنے مومنین بھائیوں کے لیے دعاگو ہیں' دوسری جانب کفار کی حالت یہ ہے کہ وہ سخت مصیبت میں پھنس گئے ہیں' کسی مددگار کی تلاش میں ہیں اور کوئی مددگار نہیں ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اور پوری کائنات کے درمیان کوئی ربط نہیں رہا ہے۔ہر طرف سے ان پر پھٹکار اور لعنت و ملامت ہے۔دنیا کے استکبار کے بعد اب یہاں وہ سخت ذلت میں ہیں۔اور بے یار و مددگار ہیں' لیکن پھر بھی موہوم امیدوں کے سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں' لیکن کہاں ہے منزل مراد!

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِیْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ ۝ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَ

اَحۡيَيۡتَنَا اثۡنَتَيۡنِ فَاعۡتَرَفۡنَا بِذُنُوۡبِنَا فَهَلۡ اِلٰى خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِيۡلٍ ﴿۱۱﴾ ذٰلِكُمۡ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِىَ اللّٰهُ وَحۡدَهٗ كَفَرۡتُمۡ‌ۚ وَاِنۡ يُّشۡرَكۡ بِهٖ تُؤۡمِنُوۡا‌ ؕ فَالۡحُكۡمُ لِلّٰهِ الۡعَلِىِّ الۡكَبِيۡرِ ﴿۱۲﴾

"جن لوگوں نے کفر کیا ہے 'قیامت کے روز ان کو پکار کر کہا جائے گا' "آج تمہیں جتنا شدید غصہ اپنے اوپر آرہا ہے ' اللہ تم پر اس سے زیادہ غضبناک اس وقت ہوتا تھا جب تمہیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا اور تم کفر کرتے تھے" ۔ وہ کہیں گے "اے ہمارے رب ' تو نے واقعی ہمیں دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی دے دی ' اب ہم اپنے قصوروں کا اعتراف کرتے ہیں 'کیا اب یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی سبیل ہے ؟" (جواب ملے گا) "یہ حالت جس میں تم مبتلا ہو ' اس وجہ سے ہے کہ جب اکیلے اللہ کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم ماننے سے انکار کر دیتے تھے اور جب اس کے ساتھ دوسروں کو ملایا جاتا تو تم مان لیتے تھے ۔ اب فیصلہ اللہ بزرگ و برتر کے ہاتھ ہے" ۔

مقت کا مفہوم ہے بہت شدید ناپسندیدگی ۔ ان کو سب مخلوق خدا ہر طرف سے یہ پکارے گی 'کہ بدبختو تمہیں رسول اللہ ایمان کی پکار دیتے تھے اور تم ناحق انکار کرتے تھے ۔ اور اللہ تم پر بہت ناراض ہوتا تھا ۔ اور تمہارے رویے کو بہت ناپسند فرماتا تھا 'جس طرح آج تمہیں حقیقت معلوم ہوئی ہے تو تم اپنے اس رویے کو ناپسند کرتے ہو لیکن تم سے تو وقت چلا گیا ہے ۔ تم نے کفر کیا ' ایمان سے منہ موڑا اور تم سے ایک عظیم دولت چلی گئی ۔ پوری کائنات کی جانب سے یہ ملامت آرہی ہو گی اور یہ ان کے لیے سخت سوہان روح ہو گی ۔ اس برے دن میں کسی تسلی کے بجائے ہر طرف سے مزید ملامت ۔

اب تو دھوکے اور گمراہی کے پردے آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئے ہیں ۔ اور جانتے ہیں کہ نجات کی جگہ اب صرف ذات باری ہے ۔ لہٰذا گڑگڑاتے ہیں :

قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثۡنَتَيۡنِ وَاَحۡيَيۡتَنَا اثۡنَتَيۡنِ فَاعۡتَرَفۡنَا بِذُنُوۡبِنَا فَهَلۡ اِلٰى خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِيۡلٍ

(۴۰ : ۱۱) "وہ کہیں گے "اے ہمارے رب ' تو نے واقعی ہمیں دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی دے دی ' اب ہم اپنے قصوروں کا اعتراف کرتے ہیں 'کیا اب یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی سبیل ہے ؟" یہ ایک نہایت ہی بدحال ' مایوس اور بدبخت شخص کی درخواست ہے ' اب تو وہ کہتے ہیں "اے ہمارے رب" اور اس وقت وہ رب کا انکار کرتے تھے ' تو نے پہلی مرتبہ ہمیں زندگی دی ۔ مردے میں روح ڈالی ' وہ زندہ ہو گیا ۔ پھر مرنے کے بعد دوبارہ زندگی دی اور اب ہم میدان حشر میں ہیں ۔ اس لئے تو اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ ہمیں موجودہ مصیبت سے نکال دے ۔ اب تو ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے ۔

فَهَلۡ اِلٰى خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِيۡلٍ (۴۰ : ۱۱) "کیا نکلنے کا کوئی راستہ ہے" ۔ یہ ہے سرزنش جس سے ان کی بے تابی ' مایوسی اور تلخی ظاہر ہوتی ہے ۔

اس کڑے وقت میں ان کو یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ تمہارے اس برے انجام کا اصل سبب کیا ہے :

ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ

الْكَبِيْرِ ( ۴۰ : ۱۲ ) "یہ حالت جس میں تم مبتلا ہو' اس وجہ سے ہے کہ جب اکیلے اللہ کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم ماننے سے انکار کر دیتے تھے اور جب اس کے ساتھ دوسروں کو ملایا جاتا تو تم مان لیتے تھے ۔ اب فیصلہ اللہ بزرگ و برتر کے ہاتھ ہے"۔ میں ذلیل کرنے والے انجام تک تمہیں یہ بات لائی ہے کہ تم عقیدۂ توحید کا انکار کرتے تھے ۔ اور عقیدۂ شرک کو مان لیتے تھے ۔ لٰہذا اب فیصلہ اللہ وحدہ کے ہاتھ میں ہے جو علی اور کبیر ہے ۔ فیصلے کے حوالے سے یہ دونوں مناسب صفات ہیں ۔ کوئی فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے جو بزرگ ہو اور برتر مقام رکھتا ہو اور اللہ تو ہر چیز پر برتر ہے اور ہر چیز سے بڑا ہے ' خصوصاً قیامت کے دن ۔

--- ○○○---

یہاں اللہ کی صفات علی و کبیر کی ایک جھلک بھی دکھائی جاتی ہے اور مومنین کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس علی و کبیر کی بارگاہ میں دعا کرو اور توحید کا عقیدہ اپنا کر نظام زندگی بھی اسی کا اپنالو' یہاں قیامت کے فیصلے کی گھڑی سے بھی ڈرایا جاتا ہے جہاں اللہ واحد و قہار کے پاس سب اختیارات ہوں گے اور وہ بہت ہی بلند و برتر ہے ۔

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا ؕ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ۝۱۳ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۱۴ رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ۝۱۵ يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝۱۶ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ؕ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۱۷

"وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور آسمان سے تمہارے لیے رزق نازل کرتا ہے ' مگر (ان نشانیوں کے مشاہدے سے) سبق صرف وہی شخص لیتا ہے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو ۔ (پس اے رجوع کرنے والو) اللہ ہی کو پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے ' خواہ تمہارا یہ فعل کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو ۔ وہ بلند درجوں والا ' مالک عرش ہے ۔ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے ' اپنے حکم سے روح نازل کر دیتا ہے تاکہ وہ ملاقات کے دن سے خبردار کر دے ۔ وہ دن جب کہ سب لوگ بے پردہ ہوں گے ' اللہ سے ان کی کوئی بات چھپی ہوئی نہ ہو گی ۔ (اس روز پکار کر پوچھا جائے گا) آج بادشاہی کس کی ہے ؟ (سارا عالم پکار اٹھے گا) اللہ واحد قہار کی ۔ (کہا جائے گا) آج ہر متنفس کو اس کمائی بدلہ دیا جائے گا ۔ جو اس نے کی تھی ' آج کسی پر کوئی ظلم نہ ہو گا اور اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے"۔

هُوَ الَّذِی یُرِیکُمْ اٰیٰتِہٖ (۴۰ : ۱۳) "وہی تو ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے"۔ اور اللہ کی نشانیاں تو اس کائنات کی ہر چیز میں نظر آتی ہیں۔ شمس و قمر کی گردش میں' رات اور دن کے نظام میں۔ رعد و برق اور باد و باراں میں' ذرے' خلیے' پتے اور پتیوں میں غرض ہر چیز میں ایک معجزانہ نشانی ہے اور اس نشانی کی عظمت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان اس کی نقل کرنے کے لیے بیٹھے۔ یا اس جیسی کوئی چیز بنائے لیکن اے کاش کہ وہ اس قسم کی کسی چیز کی نقل کر سکتا یا اس جیسی ہی بنا سکتا اور اللہ کی بنائی ہوئی ایک نہایت ہی چھوٹی چیز ہی بنا سکتا۔

وَیُنَزِّلُ لَکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا (۴۰ : ۱۳) "اور آسمانوں سے تمہارے لیے رزق نازل کرتا ہے"۔ لوگوں کو صرف بارش کے بارے میں علم ہے جس کی وجہ سے اس زمین پر زندگی قائم ہے' اور یہ کھانے و پینے کے تمام اسباب فراہم کرتی ہے اور آسمانوں سے نازل ہونے والی دوسری اشیاء بھی بے شمار ہیں جن کے انکشافات روز ہوتے رہتے ہیں' ان میں وہ شعاعیں ہیں جو زندگی بخشتی ہیں کہ اگر وہ نہ ہوں تو زمین کے اس ستارے پر زندگی نہ ہوتی اور یہ بھی انسان کے لیے ایک ذہنی اور روحانی غذا ہے جو آدم علیہ السلام سے انبیاء پر نازل ہوتی چلی آ رہی ہے اور جس کے ذریعے انسان بچپنے سے آگے بڑھ کر بالغ ہو گیا ہے۔ اور اب نبوت محمدیؐ کی وجہ سے صراط مستقیم پر گامزن ہو گیا ہے۔ اور اس رزاق نے اسے منہاج حیات دیا' اور اس کائنات کا مستقل قانون عطا کیا۔

وَمَا یَتَذَکَّرُ اِلَّا مَنْ یُّنِیْبُ (۴۰ : ۱۳) "سبق صرف وہی شخص لیتا ہے جو اللہ سے رجوع کرنے والا ہو"۔ جو شخص اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے' وہ جانتا ہے کہ اللہ کا فضل و کرم کس قدر عظیم ہے اور وہ اس کائنات میں اللہ کی نشانیوں کو پاتا ہے جبکہ غافل اور سخت دل ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے --- انابت کی وجہ سے اہل ایمان کے دل میں جو یاد الٰہی پیدا ہوتی ہے' اور وہ ان نشانیوں پر غور و فکر کرتے ہیں' اس کے حوالے سے مسلمانوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اللہ وحدہ کو پکاریں' اسی کا طے کردہ نظام زندگی جاری کریں اور کافروں کی ناپسندیدگی کی کوئی پرواہ نہ کریں۔

اگر مومنین اپنا دین اللہ کے لیے خالص کر دیں اور صرف اسلامی نظام زندگی نافذ کر دیں تو اس صورت میں کافران سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح وہ اگر اللہ وحدہ کو پکاریں تو بھی کافر راضی نہیں ہو سکتے۔ مومنین کافروں کے ساتھ جس قدر نرمی بھی کریں' جس قدر مصالحت بھی کریں اور ان کی رضا جوئی کے لیے جس قدر جتن بھی کریں وہ ان سے راضی نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا مومنین کو بے خطر اپنے راستے پر گامزن ہو جانا چاہئے۔ رب واحد کو پکارنا چاہئے' اس کے لیے عقیدہ خالص اختیار کرنا چاہئے۔ دلوں کو اللہ کی طرف متوجہ کرنا چاہئے' چاہے کافر خوش ہوں یا خفا ہوں وہ تو کبھی راضی نہ ہوں گے۔

اب بتایا جاتا ہے کہ اس اللہ کی صفات کیا ہیں جس کی عبادت کی طرف اہل ایمان متوجہ ہوں گے اور اس پر کافر ناپسندیدگی کا اظہار کریں گے۔ وہ صفات یہ ہیں :

رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ (۴۰ : ۱۵)
"وہ بلند درجوں والا ہے' مالک عرش ہے' اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنے حکم سے روح نازل کر دیتا ہے"۔ اللہ

ہی رفعتوں والا اور عالی مقام ہے۔ اور وہ ایک ایسے عرش کا مالک ہے جو قابض ہے پوری کائنات پر اور بہت ہی بلند ہے اور یہ وہی ہے جو اپنے کسی بندے پر روحانی تعلیمات نازل کر دیتا ہے۔ اور ان کی وجہ سے یہ زمین دوبارہ زندہ ہو جاتی ہے۔ اس میں بسنے والے انسانوں کی روح اور دل زندہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے مراد وحی اور رسالت ہے۔ لیکن انداز تعبیر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وحی اور رسالت کی غرض و غایت کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وحی لوگوں کے لیے روح اور زندگی ہے۔ اور پھر یہ بلندیوں سے اللہ کے چنے ہوئے بندوں پر آتی ہے۔ یہ سب صفات اور سائے اور رنگ اللہ کی اس صفت کے ساتھ متناسب ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ وہ العلی الکبیر ہے۔

اب جن لوگوں کو چنا جاتا ہے اور ان پر روح نازل کی جاتی ہے۔ ان کا فریضہ منصبی کیا ہے؟ صرف لوگوں کو متنبہ کرنا۔

لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ (۴۰:۱۵) "تاکہ وہ ملاقات کے دن سے خبردار کر دے"۔ اس دن تمام لوگ باہم ملیں گے، لوگ اپنے اعمال کے ساتھ دوچار ہوں گے۔ لوگ ملائکہ، جنوں اور تمام مخلوقات سے ملیں گے اور تمام لوگوں کو پھر باری تعالیٰ سے ملنا ہو گا اور حساب دینا ہو گا۔ گویا یہ دن اپنے ان تمام مفاہیم کے ساتھ یوم التلاق ہے۔

پھر یہ ایسا دن ہو گا جو کھلا ڈھلا ہو گا، کوئی پردہ، کوئی ملمع کاری اور کوئی دھوکہ بازی اس میں نہ چلے گی:

يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ (۴۰:۱۶) "وہ دن جبکہ سب لوگ بے پردہ ہوں گے، اللہ سے ان کی کوئی بات چھپی ہوئی نہ ہو گی"۔ اور اللہ سے تو کسی بھی وقت، کسی بھی دن اور کسی بھی حال میں کوئی شئی مخفی نہیں ہوتی، لیکن دوسرے دنوں میں، اس دنیا کے دنوں میں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مخفی ہیں اور ان کے اعمال اور حرکات پوشیدہ ہیں، آج لوگ خود بھی یہ سمجھیں گے کہ اب تو سب کچھ کھل گیا ہے، ان کا سیاہ و سپید سامنے ہے۔ اور سب پردے غائب ہیں اور وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہیں۔

آج تو مکذبین اور متکبرین برخوردار ہوں گے، سکڑے اور سمٹے ہوئے ہوں گے۔ تمام کائنات سہمی ہوئی ہو گی، لوگ ڈرے ہوئے ہوں گے۔ بادشاہت صرف اللہ واحد و قہار کی ہو گی۔ اللہ تو ہر وقت وحدہ بادشاہ ہے لیکن پہلے لوگوں کو اللہ کی بادشاہت نظر نہ آتی تھی۔ آج ان کا دل و دماغ تسلیم کرتا ہے کہ بادشاہت اللہ کی ہے۔ ہر منکر اور ہر متکبر بھی جان جائے گا کہ بادشاہ صرف اللہ ہے۔ ہر قسم کی شور و غوغا اس دن ختم ہو گی اور ایک عظیم القدر اور صاحب جلالت آواز آئے گی۔ خود ہی سوال کرے گی اور خود ہی جواب دے گی کیونکہ پوری کائنات میں تو آج جواب دینے والا ہی کوئی نہیں ہے۔

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۴۰:۱۶) "آج بادشاہی کس کی ہے؟ اللہ واحد قہار کی"۔

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۴۰:۱۷) "آج ہر متنفس کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے گا، جو اس نے کی تھی، آج کسی پر کوئی ظلم نہ ہو گا۔ اور اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے"۔ آج کا دن جزائے حق کا دن ہے۔ آج عدل کا دن ہے، آج فیصلے اور حکم سنانے کا دن ہے۔ کوئی مہلت کسی کے لیے نہیں اور نہ سست روی ہے۔

فضا پر رعب اور خاموشی چھا جاتی ہے ـ لوگوں پر خشوع اور خوف طاری ہو جاتا ہے' تمام مخلوق بات سنتی ہے اور سہم جاتی ہے ـ تمام معاملات طے کر دیے جاتے ہیں اور تمام دفاتر لپیٹ لیے جاتے ہیں' بڑی تیزی میں ـ

سورت کے آغاز میں کہا گیا تھا کہ جو لوگ اللہ کی آیات میں جھگڑتے ہیں۔

فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ( ۴۰ : ۴ ) "شہروں میں ان کی چلت پھرت تمہیں دھوکہ نہ دے ـ یہاں بتا دیا کہ زمین میں ان کی اس چلت پھرت کا' ان کی سربلندی اور ناحق بڑائی کا' ان کی جباری و قہاری کا' اور ان کی دولت و سازو سامان کا یہ انجام ہے کہ مارے خوف کے سہمے ہوئے ہیں' بات تک نہیں کر سکتے ـ

--- ○○○---

اب روئے سخن حضور اکرمؐ کی طرف مڑ جاتا ہے کہ اپنی قوم کو اس سخت دن سے ڈرائیں ـ ایک منظر پیش کیا جاتا ہے جس میں فیصلے کے اختیارات صرف اللہ کے ہیں' جبکہ اس سے قبل ان کے اس دن کے حالات حکایتی انداز میں بیان کیے گئے تھے اور اس میں ان کو بات کرنے کی کوئی اجازت نہ تھی ـ

وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْآزِفَةِ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَاظِمِينَ ۚ مَا لِلظَّالِمِينَ
مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ ﴿١٨﴾ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ﴿١٩﴾
۲ وَاللَّهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ ۖ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا يَقْضُونَ بِشَيْءٍ ۗ
۱۱ع إِنَّ اللَّهَ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿٢٠﴾

۷ "اے نبیؐ ڈراؤ ان لوگوں کو اس دن سے جو قریب آلگا ہے' جب کلیجے منہ کو آرہے ہوں گے اور لوگ چپ چاپ غم کے گھونٹ پیئے کھڑے ہوں گے ـ ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہو گا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے ـ اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے اور وہ راز تک جانتا ہے جو سینوں نے چھپا رکھے ہیں اور اللہ ٹھیک ٹھیک بے لاگ فیصلہ کرے گا ـ رہے وہ جن کو (یہ مشرکین) اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں' وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں ـ بلاشبہ اللہ ہی سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے"ـ

آزفہ کے معنی ہوتے ہیں قریبہ' جلدی آنے والی' معنی ہے قیامت ـ یہ لفظ قیامت کی تصویر اس طرح کھینچ رہا ہے کہ گویا وہ پہنچنے ہی والی ہے ـ انسانی سانس تیز ہو گا' لوگ ہانپ رہے ہوں گے ـ اور کلیجے منہ کو آرہے ہوں گے اور لوگوں پر بہت بڑا دباؤ ہو گا لیکن یہ پریشان دل لوگ دباؤ کا مقابلہ کرنے کی سعی کریں گے ـ سانس کی تیزی کو روک رہے ہوں گے ـ درد پر قابو پانے کی سعی کریں گے' خوف کو چھپائیں گے ـ اور اس برداشت کی وجہ سے ان پر مزید دباؤ ہو گا' ان کے سینے پھٹ رہے ہوں گے ـ کوئی دوست نہ ہو گا جس کے سامنے سینہ کھول کر رکھ دیں اور وہ ہمدردی کرے' کوئی سفارشی نہ ہو گا جو ان کے حق میں کوئی بات کرے ـ اس قدر خوفناک اور کربناک مقام پر کوئی کیا بات کر سکتا ہے ـ

ان کے راز اس دن کھلیں گے ' ان کی کوئی بات اللہ سے مخفی نہ ہوگی ۔ یہاں تک کہ آنکھوں کے خائن کی کوئی بات بھی مخفی نہ ہوگی اور دلوں کے راز بھی مخفی نہ ہوں گے ۔

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَ مَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ( ۴۰ : ۱۹ ) "اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے ' اور وہ راز تک جانتا ہے جو سینوں میں چھپا رکھے ہیں" ۔ خائن آنکھیں ہمیشہ اپنی خیانت کو چھپائے رکھتی ہیں ۔ لیکن اللہ پر تو کوئی بات مخفی نہیں ہوتی ' نہ دلوں کا راز مخفی ہوتا ہے ' اللہ تو سب کچھ جانتا ہے ۔

اس دن صرف اللہ ہی فیصلے کرے گا ۔ یہ سچے فیصلے ہوں گے ۔ لوگوں نے جن کو اللہ بنا رکھا ہے ' ان کا کوئی اختیار نہ ہوگا اور نہ وہ فیصلہ کر سکیں گے ۔

وَ اللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ( ۴۰ : ۲۰ ) "اور اللہ ٹھیک ٹھیک بے لاگ فیصلے کرے گا ۔ رہے وہ جن کو اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں" ۔ اللہ حق کے فیصلے علم اور مہارت سے کرتا ہے ۔ وہ دیکھ سن کر فیصلے کرتا ہے ۔ نہ کسی پر ظلم کرتا ہے اور نہ کوئی چیز بھولتا ہے ۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ( ۴۰ : ۲۰ ) "بلاشبہ اللہ ہی سب کچھ دیکھنے اور سننے والا ہے" ۔

--- ooo ---

# درس نمبر ۲۲۴ ایک نظر میں

اس سے قبل ہم اس سبق پر اجمالی تبصرہ کر آئے ہیں۔ تفصیلی تشریح سے قبل یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ یہاں یہ قصہ سورت کے موضوع کی مناسبت سے لایا گیا ہے۔ اور اس سورت کے انداز بیان کے ساتھ ہم آہنگ کر کے لایا گیا ہے ' بلکہ بعض اوقات اسی سورت کے فقروں ہی کو استعمال کیا گیا ہے۔ اور ایک ہی انداز بیان اختیار کیا ہے۔ مثلاً رجل مومن فرعون کے سامنے جو تقریر کرتا ہے ' اس کے بعض فقرے اس سے قبل اسی سورت میں موجود ہیں۔ وہ فرعون ' ہامان اور قارون کو نصیحت کرتا ہے کہ تم لوگ زمین میں چلت پھرت رکھتے ہو ' نیز ان کو وہ ایک ایسے دن سے ڈراتا ہے جو دوسری اقوام کو پیش آیا۔ اور وہ ان کو قیامت کے دن سے بھی اسی طرح ڈراتا ہے۔ جس طرح اس سے قبل سورت میں قیامت کے مشاہد ذکر ہوئے۔ یہ اس بات کو دہراتا ہے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہو گا جو اللہ کی آیات میں جھگڑتے ہیں۔ اللہ کی ناراضگی کا ذکر ' اہل ایمان کی ناراضی جس طرح پہلے سبق میں ذکر ہوئی۔ اس کے بعد جہنم میں ان کا منظر ' جہاں سے وہ نکالے جانے کی درخواست کریں گے لیکن منظور نہ ہوگی جیسا کہ ایسا ہی منظر اس سے پہلے ذکر ہو۔

رجل مومن کی پوری تقریر اس سورت کے مضامین کو دہراتی ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان سب کے سب ایک طرح سوچا کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تقریر سے سورت کی فضا یک رنگ ہو جاتی ہے۔ اس سورت کی ایک شخصیت سامنے آتی ہے جس کے خدوخال واضح ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جو پورے قرآن میں پیش نظر رکھی گئی ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۲۴ تشریح آیات

## ۲۱ --- تا --- ۵۵

اَوَ لَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ
كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا
فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۲۱﴾
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ
قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۲﴾

"کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے اور ان سے زیادہ زبردست آثار زمین میں چھوڑ گئے ہیں مگر اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا اور ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ ان کا انجام اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول بینات لے کر آئے اور انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے ان کو پکڑ لیا یقیناً وہ بڑی قوت والا اور سزا دینے میں بہت سخت ہے"۔

یہ آیات قصہ موسیٰ اور سورت کے سابقہ مضامین کے درمیان پل کا کام دے رہی ہیں۔ مشرکین مکہ کو یاد دلاتی ہیں کہ تم ذرا ان تاریخی واقعات پر غور کرو اور ان سے عبرت حاصل کرو جو تمہارے گردوپیش ہی میں واقع ہوئے۔ زمین کے اندر پھرو اور گزشتہ اقوام کی ہلاکت کے واقعات پر غور کرو، جنہوں نے سچائی کے مقابلے میں وہی رویہ اختیار کیا تھا جو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ وہ قوت کے اعتبار سے اور زمین کے اوپر آثار چھوڑنے کے اعتبار سے تمہارے مقابلے میں زیادہ قوی تھے لیکن اپنی اس زبردست تہذیب و تمدن کے باوجود اللہ کے عذاب کے مقابلے میں بے بس تھے۔ اپنے گناہوں کی وجہ سے وہ قوت کے اصلی مرکز سے دور ہو گئے تھے۔ چنانچہ ان کے گناہوں نے اہل ایمان کو دعوت دی کہ وہ ان کی ہلاکت کے لیے اٹھیں جن کے ساتھ اللہ عزیز و قہار کی قوتیں معاون و مددگار تھیں۔

فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ (۴۰ : ۲۱) "مگر اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا اور ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا"۔ کیونکہ بچانے والی چیز ایمان اور عمل صالح ہوتی ہے۔ اور اس سے وہ محروم تھے۔ پھر بچانے والی چیز یہ ہوتی ہے کہ انسان ایمان، عمل صالح اور سچائی کے محاذ کے ساتھ ہو لیکن وہ تو

تکذیب کرنے والے اور اللہ کی نشانیوں کو جھٹلانے والے تھے اور ان چیزوں کا انجام بربادی اور ہلاکت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانَتْ تَّأْتِيهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۴۰ : ۲۲) "یہ ان کا انجام اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول بینات لے کر آئے اور انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے ان کو پکڑ لیا۔ یقیناً وہ بڑی قوت والا اور سزا دینے میں بہت سخت ہے"۔

---ooo---

اس اصولی اور کلی اشارے کے بعد اب اللہ تعالیٰ ایسی اقوام میں سے ایک نمونہ پیش فرماتا ہے۔ یہ لوگ مشرکین مکہ سے بہت قوی تھے اور انہوں نے زمین پر بہت سے آثار چھوڑے تھے۔ ان کے گناہوں کی وجہ سے اللہ نے انہیں پکڑ لیا۔ یہ تھے فرعون' قارون اور ہامان۔ اور ان کے ساتھ بڑے بننے والوں کے ٹولے بھی تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قصہ کئی حصوں اور مناظر پر مشتمل ہے۔ آغاز اس مقام سے ہوتا ہے جہاں حضرت موسیٰ فرعون کے سامنے اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں اور اس کا انجام اس پر ہوتا ہے کہ آخرت میں جہنم رسید ہو کر وہ آگ میں باہم لڑتے ہیں۔ یہ بہت ہی طویل سفر ہے لیکن یہاں اس طویل سفر کی جھلکیوں پر اکتفاء کیا گیا ہے اور یہ جھلکیاں اس قصے کے وہ تمام حصے دکھا دیتی ہیں جو یہاں مطلوب ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۳﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۲۴﴾

"ہم نے موسیٰ کو فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف اپنی نشانیوں اور نمایاں سند ماموریت کے ساتھ بھیجا' مگر انہوں نے کہا "ساحر ہے' کذاب ہے"۔

یہ ہے فرعون کے ساتھ پہلا ملاپ۔ حضرت موسیٰ بمعہ معجزات کھڑے ہیں اور ان کے ساتھ وہ ہیبت بھی ہے جو ہر سچائی کے ساتھ ہوتی ہے اور سچائی ان کے ہاتھ میں ہے۔ فرعون' ہامان اور قارون بھی موجود ہیں۔ ان کے ساتھ ان کا کھوٹا اور باطل موقف ہے اور ان کے ساتھ ان کی ظاہری قوت ہے اور وہ مقام و مرتبہ ہے جس کے چلے جانے کا ان کو بہت ڈر ہے' یہ لوگ سچائی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ اب باطل بحث و مباحثے میں پڑ گئے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں سٰحِرٌ كَذَّابٌ (۴۰ : ۲۴) "جادوگر ہے جھوٹا ہے"

---ooo---

یہاں اب قصے میں سے وہ تمام حصے کاٹ دیئے جاتے ہیں' جو اس مباحثے کے بعد پیش آئے۔ جادوگروں کے ساتھ مقابلے کا حصہ بھی کٹ جاتا ہے' جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے سب باطل جادو ٹونوں کو عصائے موسوی چاٹ گیا تو وہ ایمان

لاتے ہیں تو یہ سب جھے کاٹ کر فرعونیوں کے وہ اقدامات لائے جاتے ہیں جو انہوں نے میدان میں ہارنے کے بعد کیے ۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَ اسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ۭ وَ مَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝

"پھر جب وہ ہماری طرف سے حق ان کے سامنے لے آیا تو انہوں نے کہا "جو لوگ ایمان لا کر اس کے ساتھ شامل ہوئے ہیں' ان سب کے لڑکوں کو قتل کرو اور لڑکیوں کو جیتا چھوڑ دو" ۔ مگر کافروں کی چال اکارت ہی گئی" ۔ یہی انداز ہمیشہ سب سرکشوں کا ہوتا ہے جب ان سے دلیل و حجت کے ہتھیار ختم ہوتے ہیں تو وہ تشدد کے ہتھیار تھام لیتے ہیں' جب بھی دلائل کے اعتبار سے وہ ذلیل ہوتے ہیں اور ان کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ حق تو غالب آنے والا ہے کیونکہ اس کی بات صاف' زوردار ہے ۔ واضح اور قابل فہم ہے' اور دل لگتی اور فطرت کو اپیل کرتی ہے' جس طرح جادوگروں کی فطرت نے قبول کر لیا' وہ ایمان لے آئے حالانکہ وہ مقابلے کے لیے لائے گئے تھے ۔ انہوں نے حق کو قبول کر کے فرعون کا مقابلہ شروع کر دیا حالانکہ وہ بہت بڑا جبار تھا ۔ اس پر یہ تبصرہ نہایت برمحل ہے "کافروں کی چال اکارت گئی" ۔

اب فرعون اور ہامان اور قارون کیا کرتے ہیں ۔ انہوں نے کہا :

اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَ اسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ( ۴۰ : ۲۵ ) "جو لوگ ایمان لا کر اس کے ساتھ شامل ہوئے ہیں ان کے لڑکوں کو قتل کرو اور لڑکیوں کو جیتا چھوڑ دو" ۔

فرعون نے اس قسم کا حکم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے زمانے میں جاری کیا تھا ۔ ہو سکتا کہ اس سے پہلے فرمان کے صدور کے بعد یہ ہوا کہ جس فرعون نے یہ حکم جاری کیا تھا وہ مر گیا ہو' اور اس کا بیٹا اور ولی عہد فرعون مقرر ہو گیا ہو اور جدید عہد میں یہ ظالمانہ فرمان مردہ قانون ہو گیا ہو' اور حضرت موسیٰ جب آئے اور انہوں نے فرعون کو دعوت دی تو وہ آپ کو جانتا تھا کیونکہ آپ کی تربیت تو شاہی محل میں ہوئی تھی ۔ اور یہ جدید فرعون یہ بھی جانتا تھا کہ سابقہ حکومت نے ایک فرمان بنی اسرائیل کے خلاف جاری کیا تھا کہ ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑو اور مردوں کو قتل کر دو' یوں اس کے حاشیہ نشینوں اور مشیروں نے یہ مشورہ دیا ہو کہ موسیٰ پر جو لوگ ایمان لائے ہیں ان پر وہی فرمان دوبارہ نافذ کیا جائے' چاہے وہ جادوگر مصری ہوں یا بنی اسرائیل ہوں یا اور لوگ ہوں جنہوں نے موسیٰ کی دعوت کو قبول کر لیا ہو ۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرعون وہی ہو جس نے موسیٰ علیہ السلام کو پالا تھا لیکن اس کے سابقہ فرمان میں قدرے نرمی کر دی گئی ہو اور اس قانون کے نفاذ میں شدت نہ رہی ہو اور اب یہاں اس کے مشیروں نے از سر نو مشورہ دیا ہو کہ اس قانون کو صرف ان لوگوں پر نافذ کیا جائے جو حضرت موسیٰ پر ایمان لائے ہوں تاکہ ان کو ڈرایا جا سکے ۔

رہا فرعون تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی رائے اور تھی ۔ وہ یہ کہتا تھا کہ موسیٰ تمہارا دین بدل دے گا اور ملک کا امن و امان تباہ ہو جائے گا لہٰذا مجھے اجازت دو کہ میں موسیٰ سے تمہاری جان ہی چھڑا دوں ۔

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ

يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾

"ایک روز فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا "چھوڑو مجھے 'میں اس موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں' اور پکار دیکھے یہ اپنے رب کو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تمہارا دین بدل ڈالے گا' یا ملک میں فساد برپا کرے گا"۔

اس کے اس قول سے ذَرُوْنِیْ اَقْتُلْ مُوْسٰی (۴۰ : ۲۶) "چھوڑو مجھے 'میں اس موسیٰ کو قتل کروں" سے معلوم ہوتا ہے' اس کے حاشیہ نشینوں کی جانب سے حضرت موسیٰ کے قتل کے خلاف دلائل دیئے جا رہے تھے کہ اگر آپ موسیٰ کو قتل کر بھی دیں تو مسئلہ ختم نہ ہو گا' جمہور عوام انہیں شہید سمجھ کر اسے ایک مقدس شخصیت قرار دیں گے۔ اس طرح لوگ شعوری طور پر ان کے دین کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں' خصوصاً جبکہ ایک قومی میلے کے دن جادوگر اس پر ایمان لا چکے ہیں اور انہوں نے اپنے ایمان کی وجہ بھی لوگوں کو بتا دی ہے۔ حالانکہ جادوگروں کو جمع اس لیے کیا گیا تھا کہ اس کے دین کو باطل ثابت کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بادشاہ کے بعض مشیر دل ہی دل میں ڈر گئے ہوں کہ حضرت موسیٰ کا خدا ان سے انتقام لے گا۔ اور وہ خدا کی پکڑ میں آ جائیں گے' یہ بات بعید از امکان نہیں ہے کیونکہ بت پرست تو متعدد الہوں کے قائل دتے تھے۔ اور وہ قدرتی طور پر سوچ سکتے تھے کہ موسیٰ کا خدا ان سے انتقام لے۔ اور فرعون کا یہ قول کہ وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ (۴۰ : ۲۶) "اور یہ اپنے رب کو بھی پکار دیکھے"۔ اگرچہ بظاہر فرعون کی ایک متکبرانہ بات ہے۔ لیکن شاید یہ ان مشیروں کے رد میں ہو اور اسی متکبرانہ بات کی وجہ سے بعد میں اسے اللہ نے پکڑا اور ہلاک کر دیا۔ جیسا کہ بعد میں آئے گا۔

یہ بات بڑی دلچسپ ہے جو فرعون نے حضرت موسیٰ کے قتل کے جواز کے بارے میں کی۔

اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ (۴۰ : ۲۶) "مجھے ڈر ہے کہ یہ تمہارا دین بدل ڈالے گا یا زمین میں فساد برپا کر دے گا"۔ فرعون کی اس دلیل پر غور ضروری ہے۔ کیا ایک بت پرست بادشاہ کی یہ بات کوئی نئی بات ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ یہ تمہارا دین بدل دے گا' یا کم از کم ملک میں فساد ضرور برپا کر دے گا۔

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر سرکش اور مفسد ہمیشہ یہی کہتا ہے' جب بھی کسی نے اسلام کی اصلاحی دعوت شروع کی ہے۔ مفسدین نے یہی بات کہی کہ انہوں نے اصلاح کو فساد کہا' ہمیشہ اہل ایمان داعیوں اور مصلحین کے بارے میں مطلب پرست سرکشوں اور مفسدوں نے عوام کے سامنے یہی عذر پیش کیا۔

جب بھی حق و باطل کے درمیان کشمکش شروع ہوئی' باطل کی منطق اور استدلال یہی رہا۔ ایمان اور کفر کی جنگ میں یہی منطق چلتی رہی۔ ہر زمان و مکان میں اور تاریخ کے ہر دور میں اصلاح کو فساد اور فساد کو اصلاح کہا گیا۔ غرض یہ قدیم کہانی ہے اور اسے بار بار دہرایا جاتا ہے۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے تھے۔ ان کا بھروسہ نہایت مضبوط قوت پر تھا۔ وہ حصن حصین میں محفوظ تھے۔ اور انہوں نے اس ذات کے ہاں پناہ لے رکھی تھی جہاں ہر سرکش متکبر سے بھاگ کر لوگ پناہ لیتے ہیں۔

وَقَالَ مُوْسٰۤى اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا

۳

ع۷ يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۲۷﴾

۸ ”موسیٰ نے کہا ”میں نے تو ہر اس متکبر کے مقابلے میں جو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتا' اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے“۔

حضرت موسیٰ نے یہ بات کہہ دی اور مطمئن ہو گئے اور اپنی حفاظت کا معاملہ اس ذات کے سپرد کر دیا جو ہر متکبر سے بلند ہے۔ ہر جبار کے اوپر ہے' اور تمام دوسرے جباروں سے بھاگ کر اس کی پناہ میں آنے والوں کی حفاظت کرتا ہے۔ حضرت نے یہ کہا کہ وہ اس رب کی پناہ میں ہیں جو خود ان کافروں کا بھی رب ہے اور ہمارا بھی رب ہے' اللہ نے ہمیں بھلا نہیں دیا اور نہ فرعون کی دھمکیوں کے مقابلے میں بے سہارا چھوڑ دیا ہے۔ یہ لوگ تو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس لیے یہ زمین میں اپنی کبریائی قائم کرتے ہیں۔ کوئی شخص جو قیامت کی جوابدہی پر ایمان رکھتا ہو وہ متکبر نہیں بن سکتا۔ کیونکہ وہ تصور کر سکتا ہے کہ قیامت کے دن لوگ کس قدر ذلیل' سہمے ہوئے اور ڈرے ہوئے ہوں گے۔ کوئی قوت اور طاقت اور کوئی سہارا نہ ہو گا' نہ کوئی دوست ہو گا اور نہ کوئی سفارشی ہو گا اور نہ کوئی فدیہ دیا جا سکے گا۔

اب یہاں منظر پر خود فرعون کے حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص آتا ہے۔ اس کے دل پر سچائی اثر انداز ہو گئی۔ لیکن اس نے اپنا ایمان ابھی چھپا رکھا ہے۔ یہ شخص حضرت موسیٰ کی مدافعت میں آواز بلند کرتا ہے' کوشش کرتا ہے کہ لوگ حضرت موسیٰ کے قتل سے باز آ جائیں۔ یہ اپنی تقریر میں مختلف پہلوؤں سے بات کرتا ہے۔ یہ اپنی ناصحانہ باتیں ان کے دلوں میں اتارنے کی کوشش کرتا ہے' ان کے اچھے جذبات کو ابھارتا ہے' ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے اور انجام بد سے بھی ڈراتا ہے۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲۸﴾ يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ۭ قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾ وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ﴿۳۰﴾ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴿۳۱﴾ وَيٰقَوْمِ اِنِّىْٓ اَخَافُ

عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿٣٢﴾ يَوْمَ تُوَلُّونَ مُدْبِرِينَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ ۗ
وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴿٣٣﴾ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِن قَبْلُ
بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا جَاءَكُم بِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَن
يَبْعَثَ اللَّهُ مِن بَعْدِهِ رَسُولًا ۚ كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ ﴿٣٤﴾
الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ ۖ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ وَ
عِندَ الَّذِينَ آمَنُوا ۚ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿٣٥﴾

"اس موقع پر آل فرعون میں سے ایک مومن شخص ' جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا ' بول اٹھا :"کیا تم ایک شخص کو صرف اس بنا پر قتل کر دوگے کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے ؟ حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس بینات لے آیا ـ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اسی پر پلٹ پڑے گا ـ لیکن اگر وہ سچا ہے تو جن ہولناک نتائج کا وہ تم کو خوف دلاتا ہے ان میں سے کچھ تو تم پر ضرور ہی آجائیں گے ـ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا اور کذاب ہو ـ اے میری قوم کے لوگو ' آج تمہیں بادشاہی حاصل ہے اور زمین میں تم غالب ہو ' لیکن اگر خدا کا عذاب ہم پر آگیا تو پھر کون ہے جو ہماری مدد کر سکے گا" ـ فرعون نے کہا "میں تو تم لوگوں کو وہی رائے دے رہا ہوں جو مجھے مناسب نظر آتی ہے اور میں اسی راستے کی طرف تمہاری رہنمائی کرتا ہوں جو ٹھیک ہے" ـ

وہ شخص جو ایمان لایا تھا اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو ' مجھے خوف ہے کہ کہیں تم پر بھی وہ دن نہ آجائے جو اس سے پہلے بہت سے جتھوں پر آچکا ہے ' جیسا دن قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ان کے بعد والی قوموں پر آیا تھا ـ اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا ـ اے قوم ! مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم پر فریاد و فغاں کا دن نہ آجائے ـ جب تم ایک دوسرے کو پکاروگے اور بھاگے بھاگے پھروگے ' مگر اس وقت اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا ـ سچ یہ ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دے اسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہوتا ـ اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس بینات لے کر آئے تھے مگر تم ان کی لائی ہوئی تعلیم کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہے ـ پھر جب ان کا انتقال ہوگیا تو تم نے کہا اب ان کے بعد اللہ کوئی رسول ہرگز نہ بھیجے گا" ـ اسی طرح اللہ ان سب لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیتا ہے جو حد سے گزرنے والے اور شکی ہوتے ہیں اور اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں ' بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی سند یا دلیل آئی ہو ـ یہ رویہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے نزدیک سخت مبغوض ہے ـ اسی طرح اللہ ہر متکبر و جبار کے دل پر ٹھپہ لگا دیتا ہے" ـ

یہ وہ عظیم گفتگو ہے ' جو رجل مومن نے فرعون کے سازشی حاشیہ نشینوں کے ساتھ کی ـ اس شخص نے نہایت فطری انداز میں ' نہایت احتیاط کے ساتھ ' نہایت مہارت اور زوردار انداز میں یہ بات کی ـ پہلے تو اس نے یہ کہا کہ تم جو تجویز پیش کر رہے ہو اور وہ نہایت گھناؤنی تجویز ہے ـ

اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّىَ اللّٰهُ (۴۰ : ۲۸) ''کیا تم ایک شخص کو صرف اس بناء پر قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے''۔

کیا یہ کوئی جرم ہے کہ کوئی ایک خدا ہونے کا عقیدہ رکھے۔ یہ ہر کسی کا حق ہے کہ وہ وہی عقیدہ رکھے جس پر اس کا قلب اور اس کا نفس مطمئن ہو۔ کسی عقیدے پر کوئی اس بات کا مستحق ہو جاتا ہے کہ اس کی جان لے لی جائے۔ یہ تو نہایت مکروہ اور ظالمانہ بات ہے اور اس کی کراہت اور برائی اور گھناؤنا پن بالکل ظاہر ہے۔

اس کے بعد یہ شخص ایک قدم آگے بڑھتا ہے کہ یہ شخص جو کہتا ہے کہ ''میرا رب صرف اللہ ہے''۔ تو وہ بے دلیل بات بھی نہیں کرتا' وہ دلیل و برہان اور معجزات دکھا کر بات کرتا ہے۔

وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ (۴۰ : ۲۸) ''حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس دلائل لے کر آیا ہے''۔ اشارہ ان معجزات کی طرف ہے جو حضرت موسیٰ نے پیش فرمائے۔ اور انہوں نے چشم سر دیکھے اور جمہور عوام سے دور اپنی اس اونچی محفل میں تو وہ ان معجزات کا انکار بھی نہیں کر سکتے اور نہ شک کر سکتے ہیں۔

اب یہ شخص بطور فرض ان کے سامنے اس اقدام کے برے نتائج پیش کرتا ہے اور اس مسئلہ کا ایک منصفانہ حل پیش کرتا ہے کہ تم اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو فرض کر سکتے ہو وہ یہ ہے۔

وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ (۴۰ : ۲۸) ''اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ اسی پر پلٹ پڑے گا''۔ اپنے جھوٹ کا وہ خود ذمہ دار ہو گا۔ اور اپنے انجام تک پہنچ جائے گا اور اپنے جرم کی سزا پائے گا۔ محض جھوٹ بولنے پر تم کسی شخص کو کیسے قتل کر سکتے ہو۔

لیکن ایک دوسرا احتمال بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ شخص سچا ہو' لہٰذا تم اس کو بھی بطور احتیاط پیش نظر رکھو اور اپنے آپ کو برے نتائج کا مستحق نہ ٹھہراؤ۔

وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِىْ يَعِدُكُمْ (۴۰ : ۲۸) ''لیکن اگر وہ سچا ہے تو جن ہولناک نتائج کا وہ تم کو خوف دلاتا ہے ان میں سے کچھ تو تم پر ضرور ہی آ جائیں گے''۔ وہ جن چیزوں سے تمہیں ڈراتا ہے ان میں بعض کا تو احتمال پیش نظر رکھو' یہ شخص ان کو تمام امور سے نہیں ڈراتا بلکہ مباحثے کو کم کرنے کے لیے بعض کے احتمال کا ذکر کرتا ہے یعنی اپنی بات کو منصفانہ بناتا ہے۔

اب وہ مزید اصولی بات کرتا ہے جو دونوں فریقوں پر منطبق ہو سکتی ہے اگرچہ خفیہ اشارہ ان کے لیے ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ (۴۰ : ۲۸) ''اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا اور کذاب ہو''۔ اگر موسیٰ جھوٹا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت بھی نہ دے گا اور توفیق بھی نہ دے گا۔ پھر چھوڑ دو اسے کہ اپنے انجام کو پہنچے۔ اور اگر تم جھوٹے ہو اور موسیٰ کے خلاف جھوٹ بک رہے ہو اور اس

کے بارے میں حد سے گزر رہے ہو تو تم پر اللہ کا عذاب آ سکتا ہے۔

جب اس نے ان کو اس بات سے ڈرایا کہ اللہ حد سے گزرنے والوں اور جھوٹوں کو ہدایت نہیں دیتا تو اب مزید کہتا ہے اگر اللہ کا عذاب ہم پر آگیا تو ہمیں کون بچا سکتا ہے اللہ کے عذاب سے کیونکہ موجودہ قوت اور سلطنت اور اقتدار کا ہم شکر ادا نہیں کر رہے ہیں' کفران نعمت کر رہے ہیں اور قوت کے بل بوتے پر ایک شخص کو قتل کرنے جا رہے ہیں۔

یٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا

( ۲۹ : ۴۰ ) "اے میری قوم کے لوگو' آج تمہیں بادشاہی حاصل ہے اور زمین میں تم غالب ہو' لیکن اگر خدا کا عذاب ہم پر آ گیا تو پھر کون ہے جو ہماری مدد کر سکے گا"۔ اس شخص کو وہ مکمل شعور حاصل ہے جو ایک صحیح مومن کو حاصل ہوتا ہے کہ اللہ کا عذاب بادشاہوں' بر سر اقتدار طبقات اور زمین پر بااختیار لوگوں پر سب سے پہلے آتا ہے اور ان کو چاہئے کہ وہ اللہ کے عذاب سے زیادہ ڈریں ۔ یہ عذاب تو رات اور دن کے ہر لمحے میں تمہارے انتظار میں ہے ۔ اس لیے یہ شخص ان کو یاد دلاتا ہے کہ تم زمین کے مقتدر اعلیٰ ہو' بادشاہ ہو' لہٰذا تمہیں اللہ سے' ان کے مقابلے میں زیادہ ڈرنا چاہئے۔ یہ بات اس رجل مومن کے احساسات کا حصہ ہے' اور جب اللہ کے عذاب کی بات وہ کرتا ہے تو اپنے آپ کو ان میں شامل کرتا ہے۔

فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ( ۲۹ : ۴۰ ) "اگر خدا کا عذاب ہم پر آگیا تو پھر کون ہے جو ہماری مدد کر سکے گا"۔

جب تقریر یہاں تک پہنچتی ہے تو فرعون کے اندر وہی ردعمل پیدا ہوتا ہے جو ہر سرکش پر طاری ہوتا ہے۔ جھوٹا وقار ہر شخص کو برائی پر آمادہ کرتا ہے۔ اور ایسا شخص خالص نصیحت کو بھی اپنی سلطنت اور اختیارات پر حملہ تصور کرتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ نصیحت کرنے والا کہیں اقتدار میں شرکت چاہتا ہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ( ۲۹ : ۴۰ )

"فرعون نے کہا' میں تو لوگوں کو وہی رائے دے رہا ہوں جو مجھے مناسب نظر آتی ہے۔ اور میں اس راستے کی طرف تمہاری راہنمائی کرتا ہوں' جو ٹھیک ہے"۔ میں تمہیں وہی کچھ کہتا ہوں جسے میں درست سمجھتا ہوں۔ اور میں یقین کرتا ہوں کہ وہ مفید ہے اور بغیر شک کے وہی صحیح راستہ ہے۔ ظاہر ہے کہ سرکش ڈکٹیٹر جو سوچتا ہے وہی درست ہوتا ہے۔ کسی کو یہ کیسے اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ سوچے کہ بادشاہ غلط بھی سوچ سکتے ہیں یا کر سکتے ہیں یا کسی کو یہ اختیار کب ہے کہ وہ شاہ یا ڈکٹیٹر کی رائے ہوتے ہوئے کوئی دوسری رائے رکھے۔ اگر یہ بات ہو سکتی ہے تو پھر وہ کس چیز کے بادشاہ اور ڈکٹیٹر ہیں!

لیکن رجل مومن کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ شاہ کے مقابلے میں مستقل سوچ رکھے۔ پھر ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ ان کو ڈرائے اور متنبہ کرے اور نصیحت کرے اور ایمانداری سے اس کی جو رائے ہے' اس کا اظہار کرے۔ اور اس بات کو اپنا فریضہ سمجھے کہ جس رائے کو وہ حق سمجھتا ہے' اس کی حمایت کرے' سرکشوں' ڈکٹیٹروں اور بادشاہوں کی جو رائے ہو'

سو ہو ـ اس لیے یہ رجل مومن اس دوسرے زاویہ سے ان کے دل و دماغ پر دستک دیتا ہے کہ شاید وہ احساس کر لیں، جاگ اٹھیں اور ان کے اندر ارتعاش پیدا ہو اور وہ نرم ہو جائیں، اس لیے وہ ان کو تاریخ میں گزری ہوئی سرکش اقوام کے برے انجام کی طرف متوجہ کرتا ہے ـ تاریخ کے اندر بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جو بتاتے ہیں کہ سرکشوں اور حد سے گزرنے والوں کو اللہ نے پکڑا ہے ـ

وَقَالَ الَّذِیْٓ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ مِّثْلَ یَوْمِ الْاَحْزَابِ (۴۰:۳۰) مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (۴۰:۳۱) "وہ شخص جو ایمان لایا تھا، اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو، مجھے خوف ہے کہ کہیں تم پر بھی وہ دن نہ آ جائے جو اس سے پہلے بہت سے جتھوں پر آ چکا ہے، جیسا دن قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ان کے بعد والی قوموں پر آیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا" ـ ہر جتھے کا ایک دن علیحدہ تھا ـ لیکن رجل مومن نے تمام علیحدہ علیحدہ دنوں کی تعبیر ایک ہی دن سے کر دی ـ

مِثْلَ یَوْمِ الْاَحْزَابِ (۴۰:۳۰) وہ گویا ایک ہی دن تھا، جس کی نوعیت ایک طرح تھی ـ اگرچہ احزاب بہت تھے ـ

وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (۴۰:۳۱) "اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا" ـ اللہ ان کے گناہوں پر انہیں پکڑتا ہے ـ اور ان لوگوں کے انجام کو دیکھ کر دوسرے لوگ جو ان کے اردگرد رہتے ہیں، ان کی اصلاح ہو جاتی ہے اور جو لوگ ان ہلاک شدہ اقوام کے بعد آتے ہیں ان کو عبرت ہوتی ہے ـ

اب یہ رجل مومن ان کے دلوں پر ایک اور دستک دیتا ہے اور یہ اللہ کے دنوں میں سے بڑے دن یوم آخرت کو یاد دلاتا ہے ـ اسے یہاں فریاد و فغاں کا دن کہا گیا ہے ـ

وَیٰقَوْمِ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ یَوْمَ التَّنَادِ (۴۰:۳۲) یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَ مَا لَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۴۰:۳۳) "اے قوم، مجھے ڈر ہے کہ کہیں فریاد و فغاں کا دن نہ آ جائے جب تم ایک دوسرے کو پکارو گے اور بھاگے بھاگے پھرو گے، مگر اس وقت اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا ـ سچ یہ ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دے اسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہوتا" ـ

تنادی کے معنی ہیں باہم پکار، اس دن ملائکہ جو لوگوں کو پکڑ کر حساب و کتاب کے لیے لائیں گے اور ایک دوسرے کو احکامات دیتے ہوئے پکاریں گے ـ پھر اصحاب اعراف جنت والوں کو پکاریں گے، اور دوزخ والوں کو بھی پکاریں گے اور دوزخی جنت والوں کو پکاریں گے ـ لہٰذا مختلف صورتوں میں لوگ ایک دوسرے کو پکاریں گے اس لیے قیامت کے دن کو

یوم التناد کیا گیا ہے جس کے مفہوم میں باہم چیخ و پکار اور فریاد و فغاں شامل ہے ۔ ہر طرف سے دوڑ دھوپ اور شور ہو گا۔ یہ مفہوم رجل مومن کے اس قول کے مطابق ہے ۔

يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ (۳۳:۴۰) "جس دن تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے مگر اس وقت اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا"۔ یہ جہنم کے خوف سے بھاگنے کی کوشش بھی کریں گے لیکن بھاگ نہ سکیں گے ۔ یہاں فریاد و فغاں اور فرار اور پکڑے جانے کی جو تصویر کھینچی گئی ہے' وہ ان متکبرین کے لیے نہایت ہی مناسب ہے' جو یہاں جاہ و مرتبہ رکھتے ہیں کہ وہاں یہ حالت ہوگی تمہاری ۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۳۳:۴۰) "سچ یہ ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دے اسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں"۔ اس میں ایک خفیہ اشارہ فرعون کے اس قول کی طرف ہے ۔

وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ (۲۹:۴۰) "اور میں تو صرف صحیح راستے کی طرف تمہاری راہنمائی کرتا ہوں"۔ اشارہ یہ ہے کہ ہدایت والا راستہ تو وہ ہے جو اللہ بتائے اور فرعون کا بتایا ہوا راستہ وہ نہیں ہے جو اللہ نے بتایا ہے ۔ کیونکہ اللہ لوگوں کی حقیقت اور ان کے حالات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ ان کے لیے ہدایت کا راستہ کیا ہے اور ضلالت کیا ہے ۔ آخر میں یہ رجل مومن ان کو یاد دلاتا ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں کیا موقف اختیار کیا تھا۔ یہ موسیٰ علیہ السلام انہی کی اولاد سے تھے ۔ یہ مصری حضرت یوسف علیہ السلام کی رسالت میں بھی شک کرتے تھے حالانکہ آپ آیات اور نشانیاں لے کر آئے تھے ۔ لہذا وہی سلوک حضرت موسیٰ سے نہ دہراؤ ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کی بھی تصدیق فرما رہے ہیں ۔ تم نے حضرت یوسف کی تعلیمات میں بھی شک کیا اور یہ غلط تصور قائم کر دیا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد اللہ کسی کو رسول بنا کر نہ بھیجے گا۔ حضرت موسیٰ حضرت یوسف کے ایک عرصہ بعد آگئے ہیں اور انہوں نے تمہارے اس اعتقاد کی تکذیب کر دی ہے کہ اب رسالت ختم ہے ۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ (۳۴:۴۰) الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (۳۵:۴۰)

"اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس بینات لے کر آئے تھے مگر تم ان کی لائی ہوئی تعلیم کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہے ۔ پھر جب ان کا انتقال ہو گیا تو تم نے کہا اب ان کے بعد اللہ کوئی رسول ہرگز نہ بھیجے گا"۔ اسی طرح اللہ ان سب لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیتا ہے جو حد سے گزرنے والے اور شکی ہوتے ہیں اور اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں' بغیر

اس کے کہ ان کے پاس کوئی سند یا دلیل آئی ہو۔ یہ رویہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے نزدیک سخت مبغوض ہے۔ اسی طرح اللہ ہر متکبر و جبار کے دل پر ٹھپہ لگا دیتا ہے"۔

یہ واحد جگہ ہے جس میں قرآن نے حضرت یوسف کی رسالت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کو مصر والوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا تھا۔ سورت یوسف سے ہمیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ آپ کو مصر کے خزانے حوالے کر دیئے گئے تھے۔ آپ ان میں خود مختاری کے ساتھ تصرف کر رہے تھے اور آپ "عزیز مصر" کے مرتبے تک پہنچ گئے تھے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ اس وقت مصری وزیر اعظم کا لقب تھا۔ سورت یوسف میں یہ بھی آتا ہے کہ آپ مصر کے تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ بات یقینی نہیں کہ آپ بادشاہ مصر بن گئے تھے۔

وَ رَفَعَ اَبَوَیۡهِ عَلَی الۡعَرۡشِ وَ خَرُّوۡا لَهٗ سُجَّدًا وَ قَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاۡوِیۡلُ رُءۡیَایَ مِنۡ قَبۡلُ قَدۡ جَعَلَهَا رَبِّیۡ حَقًّا (یوسف : ۱۰۰) "اور انہوں نے اپنے والدین کو تخت پر اٹھایا۔ وہ اس کے سامنے سجدے میں گر گئے اور اس نے کہا اے باپ! یہ ہے تاویل میرے خواب کی جو میں نے پہلے دیکھی تھی' جسے اللہ نے حق بنا دیا"۔

یہ ہو سکتا ہے کہ جس تخت پر آپ نے اپنے والدین کو اٹھا کر بٹھایا وہ کوئی اور ممتاز جگہ ہو اور مملکت مصر کا تخت نہ ہو جس پر فرعون بیٹھا کرتے تھے۔ لیکن ان آیات سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسف اقتدار اعلیٰ تک پہنچ گئے تھے۔ اس لیے ہم رجل مومن کے اس قول کے مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں کہ ان کو حضرت یوسف کی تعلیمات کے بارے میں شک تھا۔ البتہ حضرت یوسف چونکہ اقتدار کے بہت ہی اعلیٰ مقام پر تھے اس لیے لوگ آپ کی مخالفت میں آواز نہ اٹھاتے تھے۔

حَتّٰۤی اِذَا هَلَكَ قُلۡتُمۡ لَنۡ یَّبۡعَثَ اللّٰهُ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ رَسُوۡلًا (۴۰ : ۳۴) "یہاں تک کہ جب آپ فوت ہو گئے تو تم نے کہا اس کے بعد اللہ ہرگز کوئی رسول نہ بھیجے گا"۔ گویا آپ کی موت سے ان کو بے حد خوشی ہوئی اور خوشی کا اظہار انہوں نے اس شکل میں کیا کہ رسالت کا خاتمہ کر دیا کیونکہ شاید وہ آپ کی تعلیمات کو پسند نہ کرتے تھے کیونکہ آپ تو توحید خالص کی تعلیم دیتے تھے۔ یہ تعلیم جیسے آپ کی تقریر زنداں سے واضح ہے۔

ءَاَرۡبَابٌ مُّتَفَرِّقُوۡنَ خَیۡرٌ اَمِ اللّٰهُ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ (۱۲ : ۳۹) "کیا کئی رب بہتر ہیں یا ایک اللہ واحد اور زبردست"۔ انہوں نے یہ عقیدہ اس لیے اختیار کیا کہ حضرت یوسف کے بعد کوئی رسول نہ آئے اس لیے وہ اس طرح چاہتے تھے۔ بعض اوقات ایک شخص ایک چیز کو بہت پسند کرتا ہے۔ پھر وہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ یہ بات واقع ہو گئی ہے کیونکہ اس طرح اس کی خواہش پوری ہوتی ہے۔

رجل مومن کا انداز یہاں قدرے سخت ہو جاتا ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے تم شک کرتے ہو اور حد سے گزر کر تکذیب کرتے ہو۔

كَذٰلِكَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ هُوَ مُسۡرِفٌ مُّرۡتَابُۨ (۴۰ : ۳۴) "اللہ ان لوگوں کو اسی طرح گمراہ کرتا

ہے جو حد سے گزرنے والے اور شک کرنے والے ہوتے ہیں"۔ یہ رجل مومن ان کو ڈراتا ہے کہ اللہ نے جو دعوت نشانیوں کے ساتھ بھیجی ہے اس کے بارے میں جو حد سے گزرے گا اور اس میں شک کرے گا' تو اللہ اسے گمراہ کر دے گا' وہ تو دیکھ رہا ہے۔ اس کے بعد بڑی سختی سے ان کو بتلاتا ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کے بارے میں بلاحجت و دلیل جھگڑتے ہیں' ان کو مومنین اور اللہ دونوں ناپسند کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا رویہ بہت ہی برا ہے۔ اور ان کے تکبر اور جبر کے رویہ پر بھی یہ شخص تنقید کرتا ہے اور ان کو اللہ کی پکڑ سے ڈراتا ہے اور اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ جباروں اور قہاروں کو بالآخر پکڑتا ہے!

الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (۴۰ : ۳۵) "اور اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں' بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی سند یا دلیل آئی ہو۔ یہ رویہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے نزدیک سخت مبغوض ہے۔ اسی طرح اللہ ہر متکبر و جبار کے دل پر ٹھپہ لگا دیتا ہے"۔ رجل مومن کی زبانی جو بات کی گئی وہی بات سورت کے آغاز میں براہ راست بھی کہی گئی کہ جو لوگ اللہ کی آیات میں بغیر دلیل و حجت کے مجادلہ کرتے ہیں' ان کے دلوں میں ہدایت کی کوئی جگہ نہیں ہوتی اور نہ ان کا دماغ حقیقت کے ادراک تک پہنچ سکتا ہے۔

---ooo---

رجل مومن کی اس طویل ترین تقریر کے باوجود جس میں ان کو تاریخ کے بہت سے نشیب و فراز دکھائے گئے اور ان کو متاثر کرنے کی سعی کی گئی' فرعون اپنی گمراہی میں آگے ہی بڑھتا رہا اور اس نے حق کو پہچاننے کی کوئی سعی نہ کی لیکن بظاہر اس نے یہ احمقانہ رویہ اختیار کیا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے دعاوی کی تحقیقات کر رہا ہے۔ بہرحال رجل مومن کی تقریر کا یہ اثر ضرور ہوا کہ فرعون کسی نہ کسی انداز میں اس تحریک کے بارے میں تحقیق پر آمادہ ہوا یوں فرعون نے مجلس شیوخ کی رائے کو براہ راست رد نہ کیا۔

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝
اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَ كَذٰلِكَ زُيِّنَ
لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ صُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ مَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ
تَبَابٍ ۝

۴
ع ۱۰
۹ "فرعون نے کہا "اے ہامان' میرے لیے ایک بلند عمارت بنا تاکہ میں راستوں تک پہنچ سکوں' آسمانوں کے راستوں تک' اور موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھوں۔ مجھے تو یہ موسیٰ جھوٹا ہی معلوم ہوتا ہے"۔۔۔ اسی طرح فرعون کے لیے اس کی بدعملی خوشنما بنا دی گئی اور وہ راہ راست سے روک دیا گیا۔ فرعون کی ساری چال بازی (اس کی اپنی) تباہی کے راستہ

ہی میں صرف ہوئی)"۔

فرعون نے ہامان سے کہا میرے لیے ایک بلند عمارت بنا تاکہ میں آسمان کے راستوں تک پہنچ سکوں اور موسیٰ کے خدا کے بارے میں جان سکوں۔

وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا (۴۰ : ۳۷) "مجھے تو یہ موسیٰ جھوٹا ہی معلوم ہوتا ہے"۔ یہ سرکش فرعون کی چالاکی اور اٹکل بازی ہے' وہ سچائی کے مقابلے میں علانیہ آنا نہیں چاہتا اور عقیدۂ توحید کا اعتراف بھی نہیں کرتا کیونکہ اس صورت میں اس کی حکومت جاتی ہے' جن افسانوں پر اس کی مملکت قائم تھی وہ عقیدۂ توحید کے بعد باطل قرار پاتے تھے۔ یہ بات بعید از امکان ہے کہ فرعون اس قدر کم عقل تھا اور وہ اس علمی سطح کا آدمی تھا۔ اور وہ الہ موسیٰ کو اس سادہ انداز سے دھوکہ دے رہا تھا کیونکہ فراعنہ مصر علمی لحاظ سے بہت ہی ترقی یافتہ تھے۔ یہ دراصل س کی طرف سے حضرت موسیٰ اور اللہ العالمین کے ساتھ مذاق تھا۔ البتہ اس مذاق کے ساتھ وہ اپنے رویہ کو بظاہر منصفانہ بنانا چاہتا تھا۔ اور رجل مومن نے جو زبردست منطقی تقریر کی تھی اس سے جان چھڑانے کا یہ بھونڈا طریقہ اور تدبیر تھی لیکن یہ سب باتیں یہ ضرور ظاہر کر دیتی ہیں کہ فرعون مصر کو اپنی گمراہی پر اصرار تھا اور وہ کبر میں مبتلا تھا۔ اور حضرت موسیٰ کی دعوت کو رد کرنے پر تلا ہوا تھا۔

وَ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ صُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ (۴۰ : ۳۷) "اس طرح فرعون کے لیے اس کی بد عملی خوشنما بنا دی گئی اور وہ راہ راست سے روک دیا گیا"۔ اور اب وہ اس بات کا مستحق قرار پا گیا کہ اسے راستے سے روک دیا جائے کیونکہ وہ جس رویے کا اظہار کر رہا تھا' وہ صراط مستقیم سے دور اور انحراف کا رویہ تھا۔ نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ وہ بربادی اور ناکامی کی طرف بڑھ رہا ہے۔

وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِیْ تَبَابٍ (۴۰ : ۳۷) "اور فرعون کی ساری چالبازی تباہی کے راستہ ہی میں صرف ہوئی"۔

---ooo---

اسی مذاق اور فریب اور گمراہی پر یہ اصرار کو دیکھ کر رجل مومن نے بھی مناسب سمجھا کہ ایک آخری بات ان سے کہہ دے۔ یہ بہت ہی بلند' واضح بات ہے۔ اس سے پہلے تو لوگوں کو یہ دعوت دی کہ میرا اتباع کرو' میں تمہیں سیدھی راہ کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ پھر اس نے لوگوں کو بتایا کہ یہ زندگی تو بہت ہی مختصر اور فانی زندگی ہے۔ اس لیے تم اس زندگی کا انتظام کرو جو باقی رہنے والی ہے اور آخرت کے دائمی عذاب سے بچو اور اس نے واضح طور پر بتایا کہ شرک کے عقیدے میں کیا کیا کمزوریاں ہیں:

وَ قَالَ الَّذِیْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۚ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۫ وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ

هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿٣٩﴾ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا ۖ وَمَنْ
عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ
الْجَنَّةَ يُرْزَقُونَ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٤٠﴾ وَيَا قَوْمِ مَا لِي أَدْعُوكُمْ إِلَى النَّجَاةِ وَ
تَدْعُونَنِي إِلَى النَّارِ ﴿٤١﴾ تَدْعُونَنِي لِأَكْفُرَ بِاللَّهِ وَأُشْرِكَ بِهِ مَا لَيْسَ لِي بِهِ
عِلْمٌ وَأَنَا أَدْعُوكُمْ إِلَى الْعَزِيزِ الْغَفَّارِ ﴿٤٢﴾ لَا جَرَمَ أَنَّمَا تَدْعُونَنِي إِلَيْهِ لَيْسَ
لَهُ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْآخِرَةِ وَأَنَّ مَرَدَّنَا إِلَى اللَّهِ وَأَنَّ الْمُسْرِفِينَ
هُمْ أَصْحَابُ النَّارِ ﴿٤٣﴾ فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ ۚ وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ ۚ
إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ﴿٤٤﴾

"وہ شخص جو ایمان لایا تھا' بولا "اے میری قوم کے لوگو' میری بات مانو' میں تمہیں صحیح راستہ بتاتا ہوں۔ اے قوم' یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے' ہمیشہ کے لیے قیام کی جگہ آخرت ہی ہے' جو برائی کرے گا اس کو اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنی اس نے برائی کی ہو گی۔ اور جو نیک عمل کرے گا' خواہ وہ مرد ہو یا عورت' بشرطیکہ ہو وہ مومن' ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ جہاں ان کو بے حساب رزق دیا جائے گا' اے قوم' آخر یہ کیا ماجرا ہے' کہ میں تو تم لوگوں کو نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم لوگ مجھے آگ کی طرف دعوت دیتے ہو! تم مجھے اس بات کی دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ سے کفر کروں اور اس کے ساتھ ان ہستیوں کو شریک ٹھیراؤں جنہیں میں نہیں جانتا' حالانکہ کہ میں تمہیں اس زبردست مغفرت کرنے والے خدا کی طرف بلا رہا ہوں۔ نہیں' حق یہ ہے اور اس کے خلاف نہیں ہو سکتا کہ جن کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو' ان کے لیے نہ دنیا میں کوئی دعوت ہے' نہ آخرت میں' اور ہم سب کو پلٹنا اللہ ہی کی طرف ہے' اور حد سے گزرنے والے آگ میں جانے والے ہیں۔ آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں' عنقریب وہ وقت آئے گا' جب تم اسے یاد کرو گے۔ اور اپنا معاملہ میں اللہ کے سپرد کرتا ہوں' وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے"۔

یہ وہ حقائق ہیں جن کے بارے میں اس سورت کے آغاز میں دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا گیا تھا۔ یہاں رجل مومن اپنی تقریر میں فرعون کے سامنے ان کو دہراتا ہے۔ یہ فرعون کے سامنے کہتا ہے۔

يٰقَوْمِ اتَّبِعُونِ أَهْدِكُمْ سَبِيلَ الرَّشَادِ (۴۰ : ۳۸) "اے قوم' میری بات مانو' میں تمہیں صحیح راستہ بتاتا ہوں"۔ اس سے چند لمحے پہلے فرعون نے یہ کہا تھا:

وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ (۴۰ : ۲۹) "اور میں تو تمہیں سیدھے راستے کے سوا کوئی

راستہ نہیں بتاتا"۔ رجل مومن کی طرف سے گویا فرعون کو اس کی بادشاہت اور جباری و قہاری کے باوجود صریح چیلنج ہے۔ یہ چیلنج اس وقت دیا جا رہا ہے جبکہ اس کے پاس اس کے امرا ہامان اور قارون بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں فرعون کے وزیر تھے جیسا کہ روایات میں آتا ہے۔

رجل مومن ان کے سامنے دنیا کی زندگی کی حقیقت یوں کھولتا ہے۔

اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ (۴۰ : ۳۹) "یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے"۔ ایک ایسا سازوسامان ہے جو زائل ہونے والا ہے اس کے لیے ثبات و دوام نہیں ہے۔

وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ (۴۰ : ۳۹) "اور دار آخرت ہی ہمیشہ قیام کی جگہ ہے"۔ آخرت اصل ہے اور اسے زیادہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔

پھر وہ یہ بات دو ٹوک الفاظ میں کہتا ہے کہ

مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ (۴۰ : ۴۰) "جو برائی کرے گا اس کو اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنی اس نے برائی کی ہو گی اور جو نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے، جہاں ان کو بے حساب رزق دیا جائے گا"۔

اللہ کے فضل و کرم کا تقاضا ہوا کہ نیکیوں کو بڑھایا جائے اور بغیر حساب معاوضہ ہو اور برائیوں کو نہ بڑھایا جائے۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے اپنے بندوں پر۔ بندوں کی کمزوریوں کا اللہ نے خیال رکھا ہے اور خیر اور بھلائی کے کاموں کو پرکشش بنانے کے لیے اللہ نے ان کے اجر کو زیادہ رکھا تاکہ لوگ اس راہ پر ثابت قدمی سے گامزن ہوں۔ اللہ نے نیکی کو سیئات اور برائیوں کا کفارہ بنا دیا اور جب وہ اس نرم حساب و کتاب کے بعد جنت میں پہنچیں گے تو وہاں بغیر حساب و کتاب ان کو دیا جائے گا۔ یہ رجل مومن اپنی تقریر میں ان پر تنقید بھی کرتا ہے کہ وہ تو ان کو راہ نجات کی طرف بلاتا ہے۔ جنتوں کی طرف بلاتا ہے، اور وہ اسے آگ کی طرف بلا رہے ہیں۔ وہ سرزنش کے انداز میں کہتا ہے:

وَ يٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَ تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ (۴۰ : ۴۱) "اے قوم، آخر یہ کیا ماجرا ہے کہ میں تو تم کو نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے آگ کی طرف دعوت دیتے ہو"۔ انہوں نے تو بظاہر اس کو آگ کی طرف نہیں بلایا، شرک کی طرف بلایا۔ ظاہر ہے کہ شرک کی طرف بلانے اور آگ کی طرف بلانے میں کیا فرق ہے۔ یہ ایک ہی بات ہے اور اگلی آیت میں بات صاف کر دیتا ہے۔

تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ اُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ اَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ (۴۰ : ۴۲) "تم مجھے اس بات کی طرف دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ سے کفر کروں اور اس کے ساتھ ان ہستیوں کو

شریک ٹھہراؤں جنہیں میں نہیں جانتا حالانکہ میں تمہیں زبردست مغفرت کرنے والے خدا کی طرف بلاتا ہوں" ۔ اور ان دونوں دعوتوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے ۔ میری دعوت تو بہت واضح اور صاف ہے ۔ عزیز و غفار کی طرف سے یہ دعوت ۔ ایک ایسے اللہ وحدہ کی طرف دعوت ہے جس کی وحدانیت پر اس کائنات کے تمام آثار شاہد ہیں اور اس کی قدرت اور حکمت پر اس کائنات کی ہر چیز شاہد عادل ہے ۔ وہ ان کو اس کی طرف بلاتا ہے جو مغفرت کرنے والا ہے تاکہ بخش دے ۔ جو بہت بڑا بخشنے والا ہے ۔ اور یہ لوگ اس رجل مومن کس طرف بلاتے ہیں؟ کفر کرنے کے لیے 'شرک کرنے کے لیے 'جس کا اسے کوئی علم نہیں ہے ۔ محض دعویٰ ہے 'اوہام ہیں اور افسانے ہیں جن پر ان کا عقیدہ ہے ۔ وہ ان کو دو ٹوک الفاظ میں کہتا ہے کہ جن ہستیوں کو تم نے خدا کا شریک بنا رکھا ہے ۔ ان کی تو نہ دنیا میں کوئی پوزیشن ہے اور نہ آخرت میں کوئی پوزیشن ہے ۔ آخر کار تمام انسانوں کو تو صرف اللہ کے ہاں لوٹنا ہے ۔ اور یہ تم لوگ جو اسراف کرتے ہو اور حدود کو یاد کرتے ہو تمہارے لیے تو جہنم کے سوا کچھ نہیں ہے ۔

لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِیْ اِلَیْهِ لَیْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَا فِی الْاٰخِرَةِ وَ اَنَّ مَرَدَّنَاۤ اِلَی اللّٰهِ وَ اَنَّ الْمُسْرِفِیْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ (۴۰ : ۴۳) "حق یہ ہے اور اس کے خلاف نہیں ہو سکتا کہ جن کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو 'ان کے لیے نہ دنیا میں کوئی دعوت ہے 'نہ آخرت میں اور ہم سب کو پلٹنا اللہ ہی کی طرف ہے اور حد سے گزرنے والے آگ میں جانے والے ہیں" ۔ عقائد کے حوالے سے یہ بنیادی باتیں دو ٹوک انداز میں بیان کر دینے کے بعد کوئی چیز باقی نہیں رہتی ۔ یہ سب باتیں اس رجل مومن نے فرعون 'اس کے درباریوں اور وزراء سامنے کر دیں 'بغیر کسی جھجک اور شش و پنج کے ۔ پہلے تو وہ اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا لیکن تقریر کے آخر میں اس نے اس کا اظہار کر دیا ۔ اب صرف یہ بات رہتی ہے کہ حق تبلیغ ادا کرنے کے بعد وہ تمام امور کو اللہ پر چھوڑ دے ۔ اس نے بات کہہ دی 'اس کا ضمیر مطمئن ہو گیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ لے کاش! عنقریب تم میری باتوں کو یاد کرو گے لیکن اس وقت اس نصیحت کا تمہیں کوئی فائدہ نہ ہو گا ۔ حقیقت میں معاملات کی باگ ڈور اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ (۴۰ : ۴۴) "آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں عنقریب وہ وقت آئے گا جب تم اسے یاد کرو گے اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں ۔ وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے" ۔ اب اس پر یہ تقریر اور مکالمہ ختم ہوتا ہے ۔ رجل مومن نے کلمہ حق اس کائنات کے ضمیر میں ریکارڈ کرا دیا اور قرآن نے اسے لازوال دوام بخشا ۔

--- ○○○ ---

یہاں سیاق کلام حضرت موسیٰ اور فرعون کی طویل کشمکش کی بعض کڑیوں کو مجمل کر دیتا ہے ۔ اب یہاں بنی اسرائیل کے فرار اور نجات اور فرعون کی غرقابی کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس پر تبصرے کیے جاتے ہیں ۔ برزخی زندگی میں اس کا حال یہ ہو گا ۔

فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ
سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۟
اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾ وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا
لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾
قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ ۙ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ﴿۴۸﴾ وَقَالَ
الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿۴۹﴾
قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۭ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا
ع ۱۳ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۵۰﴾

"آخر کار ان لوگوں نے جو بری سے بری چالیں اس مومن کے خلاف چلیں' اللہ نے ان سب سے اس کو بچالیا' اور فرعون کے ساتھ خود بدترین عذاب کے پھیر میں آ گئے۔ دوزخ کی آگ ہے جس کے سامنے صبح و شام وہ پیش کیے جاتے ہیں اور جب قیامت کی گھڑی آ جائے گی تو حکم ہو گا کہ آل فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو۔ پھر ذرا خیال کرو اس وقت کا جب یہ لوگ دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں گے۔ دنیا میں جو لوگ کمزور تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ "ہم تمہارے تابع تھے' اب کیا یہاں تم نار جہنم کی تکلیف کے کچھ حصے سے ہم کو بچا لوگے"؟ وہ بڑے بننے والے جواب دیں گے "ہم سب یہاں ایک حال میں ہیں' اور اللہ بندوں کے درمیان فیصلہ کر چکا ہے"۔ پھر یہ دوزخ میں پڑے ہوئے لوگ جہنم کے اہل کاروں سے کہیں گے "اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے عذاب میں بس ایک دن کی تخفیف کر دے"۔ وہ پوچھیں گے "کیا تمہارے پاس رسول بینات لے کر نہیں آتے رہے تھے؟" وہ کہیں گے "ہاں"۔ جہنم کے اہل کار بولیں گے: "پھر تو تم ہی دعا کرو' اور کافروں کی دعا اکارت ہی جانے والی ہے"۔

یہاں اس دنیا کے صفحات کو لپیٹ دیا جاتا ہے اور کتاب دنیا کا آخری صفحہ جو ہم نے پڑھا یہ ہے کہ رجل مومن جس نے کلمہ حق نہایت بے باکی کے ساتھ کہا اور چلا گیا تو اس کو اللہ نے فرعون کی بری اور گہری مکاریوں سے بچالیا۔ فرعون اور اس کے حاشیہ نشین نہ اسے اس دنیا میں گزند پہنچا سکے اور نہ آخرت میں جبکہ فرعون اور اس کے تمام ساتھی ایک نہایت ہی برے عذاب میں گھر گئے۔

اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ
اَشَدَّ الْعَذَابِ ( ۴۰ : ۴۶ ) "دوزخ کی آگ ہے جس کے سامنے یہ صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں اور جب

قیامت کی گھڑی آئے گی تو حکم ہو گا کہ آل فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو"۔ آیت اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ صبح و شام ان کو آگ پر پیش کیا جاتا ہے۔ ان کی موت کے بعد اور قیامت سے پہلے کے زمانے میں' یہ ہو گا عذاب قبر۔ کیونکہ اس کے بعد یہ فقرہ آتا ہے۔

وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْآ اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (۴۰:۴۶) "اور جب قیامت کی گھڑی آئے گی تو حکم ہو گا کہ آل فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو"۔ لہٰذا آگ پر پیش کرنے کا عذاب قیامت سے پہلے کا عذاب ہو گا اور یہ بہت ہی سخت سزا ہے کہ صبح و شام ان کو آگ پر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ اسے دیکھتے اور سوچتے ہیں کہ یہ آگ ہے جو انہیں جلائے گی۔ اس کی حرارت تو ان کو بہرحال پہنچے گی۔ یہ بھی شدید عذاب ہے کیونکہ لفظ عرض قرآن میں چھونے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تو معنی یہ ہوں گے کہ عملاً انہیں صبح و شام آگ میں جلایا جاتا ہے اور قیامت کے دن پھر مستقلاً شدید ترین عذاب میں داخل ہوں گے۔

لیکن اگلی آیت میں اب جو منظر ہے اس میں قیامت عملاً برپا ہے۔ ایک جھلک جہنم کی دکھائی جاتی ہے۔ جہاں وہ یوں جھگڑتے ہیں:

فَیَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِیْبًا مِّنَ النَّارِ (۴۰:۴۷) "دنیا میں جو لوگ کمزور تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے 'ہم تمہارے تابع تھے' اب کیا یہاں تم نار جہنم کی تکلیف کے کچھ حصے سے ہم کو بچالو گے"۔ اس وقت ضعفاء بھی مستکبرین کے ساتھ جہنم میں ہوں گے۔ یہ بات ان کے لیے مفید نہ ہو گی کہ وہ دوسروں کے تابع محمل تھے اور ماتحت تھے۔ ان کے لیے یہ بات مفید نہ ہو گی کہ انہیں تو دنیا میں بھیڑ بکریوں کی طرح چلایا جا رہا تھا۔ اور ان کی کوئی رائے اور کوئی ارادہ نہ تھا اور نہ اختیارات تھے۔

اللہ نے تو ان کو بہت بڑا مرتبہ دیا تھا' انسانی کرامت اور شرافت دی تھی اور یہ شرافت دی تھی کہ ہر ایک فرد اپنے کیے کا ذمہ دار ہے۔ اور ہر فرد کو آزادی اور حریت دی تھی لیکن انہوں نے از خود ان سب باتوں کو ترک کر دیا اور از خود انہوں نے ان بڑے اور سرکشوں کے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ اس لیے اب یہ لوگ ان کبراء سے کیوں شکایت کرتے ہیں بلکہ وہ اس شکایت کے بارے میں سوچتے کیوں ہیں بلکہ یہ جو شکایت کرتے ہیں اس کے بارے میں انہوں نے سوچا ہی نہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا (۴۰:۴۷) "ہم تمہارے تابع تھے"۔ لیکن یہ اس لیے تو تابع نہ ہوئے تھے اور اپنی آزادی سے اس لیے تو دستکش نہ ہوئے تھے کہ اللہ کے ہاں یہ کبراء کوئی شفاعت کریں گے۔ وہ تو اس وقت آگ میں جل رہے ہیں اور یہاں تک کبراء ہی نے ان کو پہنچایا ہے' جس طرح وہ دنیا میں ان کو چلاتے تھے' اس طرح جیسے بھیڑ بکریوں کو چلایا جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ ان کبراء سے پوچھتے ہیں۔

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِیْبًا مِّنَ النَّارِ (۴۰:۴۷) "اب کیا یہاں تم نار جہنم کی تکلیف کے کچھ

حصے سے ہم کو بچالو گے"۔ جس طرح زمین میں تمہارا دعویٰ تھا کہ ہم عوام کو سیدھے راستے کی طرف لے جاتے ہیں اور فساد سے بچاتے ہیں اور شر اور تکلیفوں اور دکھوں سے اور دشمنوں کی سازشوں سے بچاتے ہیں۔

رہے وہ لوگ جو دنیا میں بڑے بنے ہوئے تھے۔ وہ اس سوال کا جواب بڑی ترشی سے دیتے ہیں 'کیونکہ وہ جہنم کے عذاب میں جل رہے ہیں 'نہایت ہی تنگدلی کے ساتھ 'وہ دو ٹوک الفاظ میں 'جواب دیتے ہیں اور استکبار کے بعد اب اجرام کا اقرار کرتے ہیں۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ (۴۰ : ۴۸) "بڑے بننے والے جواب دیں گے 'ہم سب یہاں ایک حال میں ہیں اور اللہ بندوں کے درمیان فیصلہ کر چکا ہے"۔ ہم سب اس میں ہیں

اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ (۴۰ : ۴۸) "ہم سب اس میں ہیں" اب ہم سب ضعفاء ہیں۔ کوئی معاون اور کوئی مددگار نہیں ہے۔ سب رنج و الم میں مبتلا ہیں 'سب کے سب درد و کرب میں ہیں۔ اس لیے تمہارا سوال احمقانہ ہے۔ یہاں تو کبراء و ضعفاء سب ہی مر رہے ہیں۔ اللہ نے فیصلہ سب کا کر دیا ہے 'اس پر کوئی اپیل نہیں ہو سکتی 'اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ یہ فائنل فیصلہ ہے۔ بندوں میں سے تو کوئی اللہ کے کسی فیصلے کی سزا میں کمی نہیں کر سکتا۔

جب دونوں نے معلوم کر لیا کہ اللہ کے سوا کوئی شنوائی نہیں کر سکتا تو یہ لوگ اب جہنم کے داروغہ کی طرف جاتے ہیں 'نہایت ہی ذلت کی حالت میں 'نہایت ہی عاجزی اور بے کسی میں 'اور یہ حالت کبراء و ضعفاء 'دونوں پر طاری ہے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ فِى النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ (۴۰ : ۴۹) "پھر یہ دوزخ میں پڑے ہوئے لوگ جہنم کے اہل کاروں سے کہیں گے "اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے عذاب میں بس ایک دن کی تخفیف کر دے"۔ اب یہ جہنم کے اہل کاروں کی سفارش لانے کی سعی کریں گے کہ وہ ان کی درخواست پیش کریں 'ان اہل کاروں سے امیدیں وابستہ کریں گے کیونکہ عذاب سخت ہے۔ اور تم لوگ رب تعالیٰ سے صرف ایک دن کی معافی دلوا دو۔ صرف ایک دن۔ کہ ایک دن کے لیے تو ہم سانس لے سکیں اور ایک دن ہی تو آرام سے گزر جائے۔ جہنم میں ایک دن بھی اس قدر اہم ہو گا کہ اس کے لیے یہ عاجزانہ التماس کر رہے ہیں۔

لیکن جہنم کے اہل کار اس عاجزانہ درخواست پر بحث ہی نہیں کرتے۔ جو نہایت ہی ذلت اور مصیبت میں دی گئی ہے کیونکہ ان کو اللہ کے قواعد معلوم ہیں۔ ان کو سنت الٰہیہ کا علم ہے۔ ان کو معلوم ہے کہ ان لوگوں نے وقت گنوا دیا ہے۔ لہٰذا وہ ان کو ملامت کر کے مزید دکھ دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اب تو سوچو کہ اس حالت زار تک کس طرح پہنچے۔

قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا بَلٰى (۴۰ : ۵۰) "وہ پوچھیں گے کیا تمہارے پاس تمہارے رسول نشانیاں لے کر نہیں آتے رہے تھے۔ وہ کہیں گے ہاں"۔ جہنم کے اہل کار ان کا یہ سوال جواب ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ بات یہاں ختم ہو جائے۔ اب جہنم کے اہل کار ان سے دامن جھاڑ لیتے ہیں اور نہایت ہی حقارت اور استہزاء کے ساتھ ان کو اس مایوسی میں ڈوبا ہوا چھوڑ دیتے ہیں۔

قَالُوا فَادْعُوا (۴۰ : ۵۰) "پھر تو تم دعا کرو" ۔ اگر یہ دعا تمہاری اس حالت کے اندر کوئی تبدیلی پیدا کر سکتی ہے ۔۔۔ اور آخر میں یہ تبصرہ آتا ہے :

وَ مَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (۴۰ : ۵۰) "اور کافروں کی دعا اکارت ہی جانے والی ہے" ۔ وہ مقام تک نہیں پہنچ سکتی ۔ وہ نہ جگہ تک پہنچتی ہے اور نہ اس کا جواب آتا ہے ۔ یوں ضعفاء اور کبراء دونوں کو ناقابل التفات حالت میں چھوڑ دیا جاتا ہے ۔

--- ○○○ ---

جہنم کے اس فیصلہ کن موقف کے بعد پھر آخری تبصرہ یہ ہے ۔ یہ تمام مخلوق کے لیے سبق ہے ۔ اس سے قبل اس طرف اشارہ آیا تھا کہ جو گروہ اور پارٹیاں اللہ کے عذاب کو دعوت دیتی ہیں اور رسول کی تکذیب کرتی ہیں اور زمین میں استکبار کا رویہ اختیار کرتی ہیں' قیامت میں تو ان کا یہ حال ہو گا ہی دنیا میں بھی بے غم نہ رہیں گے ۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿۵۱﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَ اَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ﴿۵۳﴾ هُدًى وَّ ذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۵۴﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ ﴿۵۵﴾

"یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں' اور اس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے' جب ظالموں کو ان کی معذرت کچھ بھی فائدہ نہ دے گی اور ان پر لعنت پڑے گی اور بدترین ٹھکانا ان کے حصے میں آئے گا ۔ آخر دیکھ لو کہ موسیٰ کی ہم نے رہنمائی کی اور بنی اسرائیل کو اس کتاب کا وارث بنا دیا جو عقل و دانش رکھنے والوں کے لیے ہدایت و نصیحت تھی ۔ پس اے نبی صبر کرو' اللہ کا وعدہ برحق ہے' اپنے قصور کی معافی چاہو اور صبح و شام اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو" ۔

اس دو ٹوک موقف پر یہ فیصلہ کن تبصرہ بہت ہی مناسب ہے ۔ انسانیت کو معلوم ہو گیا کہ حق و باطل کی کشمکش کا آخری انجام کیا ہوا کرتا ہے ۔ اس دنیا میں دونوں کا انجام کیا ہوتا ہے اور آخرت میں دونوں کا انجام کیا ہو گا ۔ انسانوں نے دیکھ لیا کہ فرعون اور اس کے سرداروں کا انجام اس دنیا میں کیا ہوا جس طرح انہوں نے قیامت کے منظر میں دیکھ لیا کہ وہ آگ میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ لڑ رہے تھے ۔ اور ان کو نہایت حقارت کے ساتھ ناقابل التفات چھوڑ دیا گیا ۔ ہر کشمکش کا فیصلہ یہی ہوتا ہے جس طرح قرآن کا صریح فیصلہ ہے ۔

اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡاَشۡهَادُ (۴۰: ۵۱) یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ الظّٰلِمِیۡنَ مَعۡذِرَتُهُمۡ وَ لَهُمُ اللَّعۡنَةُ وَ لَهُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ (۴۰: ۵۲) "یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں، اور اس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے، جب ظالموں کو ان کی معذرت کچھ بھی فائدہ نہ دے گی اور ان پر لعنت پڑے گی اور بد ترین ٹھکانا ان کے حصے میں آئے گا"۔ رہی آخرت تو کسی مومن کی جانب سے تو اس کے بارے میں کسی بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر بحث ہو سکے۔ رہی دنیا میں نصرت تو اس کی تشریح کی ضرورت ہے۔

بہرحال اللہ کا فیصلہ اور وعدہ تو یقینی ہے۔ قطعی الفاظ میں ہے۔

اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (۴۰: ۵۱) "بے شک ہم اپنے رسولوں اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے دنیا کی زندگی میں مدد کرتے ہیں"۔ لیکن لوگوں کا مشاہدہ یہ ہے کہ رسولوں میں سے بعض تو قتل بھی کیے گئے، بعض کو اپنی زمین سے بھی نکالا گیا۔ ان کو اپنا گھر اور قوم چھوڑنا پڑی اور علاقہ بدر کر دیے گئے۔ مومنین میں سے بعض بعض کو سخت عذاب دیا جاتا ہے۔ بعض کو گڑھوں میں جلایا جاتا ہے، بعض شہید ہوتے ہیں، بعض نہایت دکھ درد اور مصیبتیں جھیلتے ہیں تو پھر یہ قطعی وعدہ کس طرح ہے کہ ہم حیات دنیا میں اپنے رسولوں اور مومنین کی مدد کرتے ہیں۔ اس سوال کے ذریعہ شیطان اللہ کے بندوں پر حملہ آور ہوتا ہے اور ان کے ساتھ کیا کچھ کرتا ہے؟ تو حقیقت کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ تمام امور کے ظاہری پہلو ہی کو جانتے ہیں۔ ان کے سامنے وہ بیشتر قدریں اور حقائق نہیں ہوتے۔ جن کا تعلق اللہ کے نظام قضا و قدر سے ہوتا ہے۔۔۔ پھر لوگوں کی سوچ، اعمال و نتائج کے بارے میں ایک محدود زمانے تک محدود ہوتی ہے اور انسان کے قیاس اور سوچ کا دائرہ محدود ہوتا ہے، رہے اللہ کے فیصلے تو زمان و مکان کے اعتبار سے ان کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک زمانے اور دوسرے زمانے میں جدائی نہیں کرتا۔ ایک علاقے اور دوسرے علاقے میں فرق نہیں کرتا۔ اگر ہم زمان و مکان کے حدود سے آگے بڑھ کر ایمان کے مسئلہ پر سوچیں تو حقیقت یہ سامنے آئے گی کہ ایمان کامیاب رہتا ہے۔ ایمان اور عقیدے کی کامیابی دراصل ان لوگوں کی کامیابی ہوتی ہے جو ایمان اور عقیدے کو اپناتے ہیں۔ اہل ایمان کا ایمان سے باہر کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ اور ایمان کا پہلا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ ایمان لانے والے اس میں فنا ہو جائیں۔ وہ خود مٹ جائیں اور ایمان کو نمایاں کر دیں۔

پھر نصرت کا مفہوم بھی لوگوں کے ہاں محدود ہے۔ وہ قریبی نصرت دیکھتے ہیں جسے وہ خود دیکھ سکیں۔ لیکن نصرت کی اشکال تو بے شمار ہیں۔ بعض اوقات تو یوں ہوتا ہے کہ انسان کو نصرت بظاہر شکست نظر آتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا جاتا ہے لیکن وہ اپنے عقیدے اور دعوت سے نہیں پھرتے۔ سوال یہ ہے کہ ان کو نصرت ہوئی یا وہ شکست کھا گئے۔ ایمان کے پیمانوں سے دیکھا جائے تو ان کو فتح ہوئی۔ اس وقت بھی وہ فاتح تھے، جب ان کو آگ میں پھینکا

جا رہا تھا اور اس وقت بھی وہ فاتح تھے جب ان کو نجات دی گئی۔ یہ بھی فتح کی ایک صورت ہے اور آگ گلزار ہونا بھی اس کی ایک صورت ہے۔ جبکہ بظاہر دونوں کی صورتیں مختلف ہیں۔ لیکن اپنی اصلیت میں دونوں ایک ہیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کربلا میں شہادت پاتے ہیں' یہ ایک دلدوز واقعہ ہے۔ یہ فتح تھی یا شکست۔ اگر بظاہر محدود پیمانوں سے دیکھا جائے تو شکست تھی۔ اور اگر حقیقت کے پیمانوں سے دیکھا جائے تو یہ عظیم فتح ہے۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

حسین کو آج تک محبت کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ آج تک لوگوں کے دل حسین کے ساتھ ہیں۔ آج تک لوگ ان پر فدا ہوتے ہیں جبکہ فاتح یزید کا نام و نشان غائب ہے۔ حسین پر شیعہ سنی سب فدا ہیں اور یزید کے بارے میں کوئی نہیں کہتا کہ وہ لولا ریزید ہے یا یزید ہی ہے۔

کئی ایسے شہداء ہیں کہ اگر وہ ہزار سال زندہ رہتے تو اپنے نظریات کو پھیلا نہ سکتے۔ لیکن ایک شہادت سے ان کے نظریات اقطار عالم تک پھیل گئے۔ کوئی بھی شہید اپنے بیان اور تقریروں سے عوام کو بلند مقاصد عطا نہیں کر سکتا۔ نہ عوام کو بلند مقاصد کے لیے ابھار سکتا ہے۔ لیکن اپنے خون کے ذریعہ وہ جو خطبہ دیتا ہے اور وہ اس کا آخری خطاب ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محرک ہوتا اور نسلوں تک نشان منزل رہتا ہے۔ اور بعض اوقات تو ایک شہید جو راہ متعین کرتا ہے صدیوں تک تاریخ اس پر چلتی رہتی ہے اور قافلے اسی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔

تو پھر فتح کیا ہے اور ہزیمت کیا ہے؟ ہمیں چاہئے کہ فتح و شکست کے جو پیمانے ہم نے اپنے ذہنوں میں قائم کر رکھے ہیں ان پر ذرا نظر ثانی کریں۔ اور اس کے بعد پھر پوچھیں کہ اللہ کی وہ مدد کہاں ہے' جس کا وعدہ اللہ نے مومنین سے کیا ہے' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

ہاں بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ جب ظاہری صورت حال' اللہ کے اعلیٰ اور دور رس پیمانوں کے ساتھ موافق ہو جاتی ہے تو فوری فتح بھی نصیب ہو جاتی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے اپنی زندگی ہی میں نصرت اور کامرانی عطا فرمائی تھی کیونکہ دنیا میں اسلامی نظریہ حیات کی حقیقت اور یہ نصرت ساتھ ساتھ قائم ہو گئی تھیں۔ عقیدے کو نصرت تب ملتی ہے جب عقیدہ انسانی سوسائٹی پر غالب آ جائے اور وہ سوسائٹی اس کے رنگ میں رنگ کر اس کے اندر ڈوب جائے۔ ایک فرد' ایک جماعت اور ایک قوت حاکمہ سب کی سب اس میں ڈوب جائیں تو پھر اللہ ایسے داعیوں اور ایسی دعوت کی مدد کرتا ہے اور یہ نظریہ اور یہ نظام اپنی حقیقی صورت میں پھر قائم ہو جاتا ہے اور یہ نظام غالب ہو کر تاریخ پر اپنے نقوش چھوڑتا ہے۔ اور تاریخ پر اس کے یہ نقوش نمایاں نظر آتے ہیں۔ یوں قریبی نصرت کی صورت اور دور رس مقاصد کی صورت باہم متصل ہو جاتی ہیں۔ اب بظاہر نصرت عاجلہ ظہور میں آتی ہے جو دور رس سنت الٰہیہ کا حصہ ہوتی ہے۔ یوں سنت الٰہیہ اور تقدیر الٰہی کے اندر ایک فوری فتح کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جس کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ اللہ کا وعدہ اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کے ساتھ قائم ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ وعدے کے مستحق ہونے والے مومنین کے دلوں کے اندر حقیقت ایمان صحیح طرح قائم اور جاگزیں ہو جائے تاکہ اس پر اللہ کا وعدہ مرتب ہو۔ حقیقت ایمان کے سلسلے میں بسا اوقات لوگ سہل

انکاری سے کام لیتے ہیں۔ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ قلب مومن میں شرک کا شائبہ تک نہ رہے۔کسی قسم کی شرک بھی دل کے قریب نہ ہو۔شرک کی بعض صورتیں نہایت خفیہ ہوتی ہیں۔ان سے دل پاک و صاف اس وقت ہوتا ہے جب انسان صرف اللہ وحدہ کی طرف متوجہ ہو۔اور صرف اللہ وحدہ پر توکل کرے۔اور اللہ انسان کے بارے میں جو فیصلہ کرے اس پر وہ مطمئن ہو جائے۔اور انسان اپنے آپ کو تقدیر الٰہی کے سپرد کر دے۔انسان کے اندر یہ احساس ہو کہ اس کے معاملات میں صرف اللہ ہی متصرف ہے۔لہٰذا اس کے لیے اللہ جو اختیار کرتا ہے اس پر وہ کسی حال میں حیران نہ ہو اور اس کو جو پیش آئے اسے نہایت اطمینان' اعتماد اور سرتسلیم خم کر کے قبول کرے۔جب انسان تسلیم و رضا کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ بھی اللہ کے آگے نہیں بڑھتا اور جلد بازی نہیں کرتا۔اور اللہ کے سامنے فتح و نصرت اپنی پسندیدہ صورت میں پیش نہیں کرتا۔اپنے معاملات اللہ کے حوالے کر دیتا ہے اور اپنی راہ پر گامزن رہتا ہے۔اسے اسی راہ میں جو بھی پیش آتا ہے' وہ اسے خیر سمجھتا ہے۔یہ ہے حقیقی نصرت...... یہ ہے نصرت اور فتح اپنی ذات' اپنی خواہشات پر۔یہ ہے اندرونی فتح اور خالص فتح تب ہی حاصل ہوتی ہے' جب اندرونی فتح مکمل ہو۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (۴۰ : ۵۱) يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (۴۰ : ۵۲) "یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں' اور اس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے' جب ظالموں کو ان کی معذرت کچھ بھی فائدہ نہ دے گی اور ان پر لعنت پڑے گی اور بدترین ٹھکانا ان کے حصے میں آئے گا"۔

سابقہ منظر میں ہم نے دیکھا کہ ظالموں کے لیے کوئی معذرت مفید نہیں ہے۔اور ان کا انجام یہ ہوا کہ ان پر لعنت پڑی اور جہنم رسید ہوئے۔رہی یہ بات کہ اللہ رسولوں کی مدد کس طرح کرتا ہے تو اس کی ایک صورت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اللہ نے مدد فرمائی۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَ اَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ (۴۰ : ۵۳) هُدًى وَّ ذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ (۴۰ : ۵۴) "آخر کار دیکھ لو کہ موسیٰ کی ہم نے رہنمائی کی اور بنی اسرائیل کو اس کتاب کا وارث بنا دیا جو عقل و دانش رکھنے والوں کے لیے ہدایت و نصیحت تھی"۔یہ اللہ کی نصرت کا ایک نمونہ تھا کہ حضرت موسیٰ کو کتاب دی' ہدایت دی اور پھر نجات دی۔یہاں بطور مثال قصہ موسیٰ کی طرف اشارہ کر دیا۔یہ قصہ بہت ہی طویل ہے اور اس میں نصرت اور تائید خداوندی کے کئی نمونے ہیں۔

اس مثال کے بعد ایک آخری تسلی کیونکہ مکہ میں مسلمان اور رسول اللہ بہت ہی مشکل حالات میں زندگی بسر فرما رہے تھے' ان کو تسلی دی جا رہی ہے کہ نصرت ضرور آئے گی اور رسول اللہ کے بعد جو لوگ دعوت اسلامی کا کام کر رہے ہیں اور ایسے ہی حالات میں ہیں' ان کے لیے بھی ایسی ہی تسلی ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ (۰ ۴ : ۵ ۵)

"اے نبی' صبر کرو' اللہ کا وعدہ برحق ہے' اپنے قصوروں کی معافی چاہو اور صبح و شام اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو"۔ عقل و خرد کی تاروں پر یہ آخری ضرب ہے۔ صبر کی دعوت' لوگوں کی جانب سے تکذیب پر صبر کرو' اس پر صبر کرو کہ باطل کو اقتدار اور قوت حاصل ہے اور اس کی وجہ سے وہ پھیل رہا ہے لیکن یہ ایک عرصے کے لیے ہے' لوگوں کے مزاج۔ ان کے اخلاق اور ان کے معاملات کی غلطیوں پر صبر کرو' انسان کے نفس' اس کی خواہشات اور چاہتوں پر صبر کرو' خصوصاً جب نفس یہ چاہے کہ اللہ کی نصرت بہت جلد آنی چاہئے اور نصرت کے نتیجے میں ہونے والی کامیابیوں اور تحریک اسلامی کی طویل جدوجہد میں دشمنوں سے بھی پہلے دوستوں کی طرف سے پیدا کی جانے والی مشکلات پر صبر کرو۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (۰ ۴ : ۵ ۵) "اے نبی صبر کرو' اللہ کا وعدہ حق ہے"۔ دیر آید درست آید۔ اگر آپ کے معاملات پیچیدہ ہوں۔ اگر بظاہر اسباب نصرت نہ نظر آتے ہوں' کیونکہ نصرت کا وعدہ وہ ذات باری کر رہی ہے جو اپنے وعدے کو حقیقت کا جامہ پہنا سکتی ہے اور اللہ نے وعدہ کیا ہے تو اللہ نے ارادہ کر لیا ہے۔

وَّ اسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ (۰ ۴ : ۵ ۵) "اور اپنے قصور کی معافی چاہو اور صبح و شام اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو"۔ یہ ہے اصلی زاد سفر۔ نہ راہ بہت طویل ہے اور دشوار گزار ہے۔ اس میں وہی شخص آگے قدم بڑھا سکتا ہے جو اپنے قصوروں کی معافی چاہتا رہے' جو حمد باری تعالیٰ کرتا رہے اور حمد کے ساتھ اللہ کی تسبیح اور پاکی بیان کرتا رہے۔ اس میں نصرت بھی مل سکتی ہے' اور نفس انسانی کی تربیت بھی۔ اور اس راستے پر چلنے کی تیاری بھی اور قلب و نظر کی تطہیر بھی۔ یہ وہ نصرت ہے جو قلت تعداد کے اندر بھی اپنا کام کرتی ہے اور اس کے بعد نصرت کی وہ صورت سامنے آتی ہے جو زندگی کی عملی صورت میں ہوتی ہے۔

صبح و شام کا ذکر یا تو اس لیے ہے کہ اس سے مراد پورا وقت ہے کیونکہ صبح و شام اوقات کے اطراف ہیں۔ یا ان اوقات میں انسانی قلب صاف اور متوجہ ہوتا ہے اور ان اوقات میں غور و فکر اور اللہ کی حمد و تسبیح کے اثرات گہرے ہوتے ہیں۔

یہ ہے وہ منہاج جس کے مطابق اللہ کی نصرت حاصل ہو سکتی ہے اور اسے اللہ نے اپنی نصرت دینے کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اسی کے مطابق اس راستے پر چلنے کی تیاری ہوگی' زاد سفر تیار ہو گا۔ اور تب نصرت ملے گی اور کسی بھی معرکے کے لیے تیاری اور ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی جنگ بغیر تربیت اور سامان کے نہیں ہو سکتی۔

--- ooo---

# درس نمبر ۲۲۵ ایک نظر میں

یہ سبق اپنے موضوع اور مضمون کے اعتبار سے پوری طرح سابق سبق سے بالکل مربوط اور یکساں ہے ـ اس سبق میں وہی مضمون آگے چلتا ہے جو پہلے سبق کے آخر میں چھوڑا گیا تھا ـ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ لوگ دعوت اسلامی کی جو ناحق تکذیب کرتے ہیں ـ آپ اس پر صبر کریں ـ وہ آپ کو ایذا دیتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو اسلام کی طرف آنے سے روکتے ہیں' یہ سب کچھ وہ اپنے جھوٹے فخر و غرور کی وجہ سے کر رہے ہیں ـ اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ لوگ بغیر دلیل و برہان کے اللہ کی آیات میں کیوں جھگڑتے ہیں ـ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ ہیں تو بہت چھوٹے اور بونے مگر اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے ہیں اور یہ کبر ان کے دلوں میں بیٹھا ہے اور حق کو تسلیم کرنے سے مانع ہو رہا ہے ـ

چنانچہ ان کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ تم بڑے ہو یا اللہ کی بنائی ہوئی یہ کائنات بڑی ہے ـ ذرا آسمانوں کی دوریوں پر غور کرو اور اس زمین پر غور کرو' تمہیں نظر آجائے گا کہ تم کتنے بڑے ہو ـ یہ سبق آگے بڑھتا اور اس کائنات کی بعض نشانیوں کو بیان کرتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ دیکھو ان عظیم نشانیوں کو اس چھوٹے اور کمزور انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے ـ پھر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ خود انسانی ذات پر اللہ نے جو فضل و کرم کیے ہیں ـ ذرا ان پر تو غور کرو' کیا یہ سب چیزیں اللہ وحدہ کے وجود اور اس کی بادشاہت اور وحدانیت پر مکمل دلیل نہیں ہیں ـ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جاتا ہے کہ آپ کلمہ توحید بلند کریں اور ان الہوں سے منہ پھیر لیں جن کی پرستش یہ لوگ کرتے ہیں ـ اس سبق کا خاتمہ ایک ایسے خوفناک منظر کے ساتھ ہوتا ہے جو قیامت کے مناظر میں سے ہے ـ ان کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے وہاں ان سے پوچھا جائے گا کہ کہاں ہیں وہ تمہارے الہ ـ اور اس کا خاتمہ بھی درس سابق کے خاتمہ کی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تلقین پر ہوتا ہے کہ آپ صبر فرمائیں ـ چاہے اللہ آپ کو اسلامی انقلاب کا کچھ حصہ دکھاوے' یا آپ کو اٹھالے ـ قبل اس کے کہ نصرت آئے ـ یہ معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور سب نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے ـ

---ooo---

# درس نمبر ۲۲۵ تشریح آیات

## ۵۶ --- تا --- ۷۷

إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ ۙ
إِن فِي صُدُورِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ مَّا هُم بِبَالِغِيهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ
السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿٥٦﴾ لَخَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَ
لَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥٧﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۙ وَالَّذِينَ
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ ۚ قَلِيلًا مَّا تَتَذَكَّرُونَ ﴿٥٨﴾ إِنَّ السَّاعَةَ
لَآتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٥٩﴾ وَقَالَ رَبُّكُمُ
ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ ٦
ع ١٠ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ﴿٦٠﴾

١١ ”حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ کسی سند و حجت کے بغیر' جو ان کے پاس آئی ہو' اللہ کی آیات میں جھگڑ رہے ہیں' ان کے دلوں میں کبر بھرا ہوا ہے' مگر وہ اس بڑائی کو پہنچنے والے نہیں ہیں جس کا وہ گھمنڈ رکھتے ہیں۔بس اللہ کی پناہ مانگ لو' وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسان کو پیدا کرنے کی بہ نسبت یقیناً زیادہ بڑا کام ہے' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔اور یہ نہیں ہو سکتا کہ اندھا اور بینا یکساں ہو جائیں اور ایماندار و صالح اور بدکار برابر ٹھہریں مگر تم لوگ کم ہی کچھ سمجھتے ہو۔ یقیناً قیامت کی گھڑی آنے والی ہے' اس کے آنے میں کوئی شک نہیں' مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔ تمہارا رب کہتا ہے ”مجھے پکارو' میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا' جو لوگ گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں' ضرور وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے“۔

یہ انسان بسا اوقات اپنے آپ کو بھول جاتا ہے' یہ بھول جاتا ہے کہ وہ اس کائنات کی ایک چھوٹی اور ضعیف مخلوق ہے۔ یہ بذات خود قوت کا سرچشمہ نہیں ہے بلکہ یہ اپنی قوت دراصل قوت کے اصلی سرچشمے سے اخذ کرتا ہے' یعنی اللہ

ہے۔ جب اللہ سے اس کا رابطہ کٹ جاتا ہے تو پھر وہ پھولنا سوجنا شروع ہو جاتا ہے' اونچا ہونا اور سرکش ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس کے دل میں یہ بات بیٹھنا شروع ہو جاتی ہے کہ وہ کوئی بہت بڑی چیز ہے اور اس کی یہ سوچ شیطان سے اخذ ہوتی ہے جو اس کبر ہی کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہوا اور پھر اللہ نے اسے انسان پر مسلط کر دیا' جس پر وہ ہر طرف سے حملہ آور ہوتا ہے۔

یہ انسان پھر اللہ کی نشانیوں کے بارے میں جھگڑتا رہتا ہے اور ہٹ دھرمی کرتا ہے۔ یہ ہٹ دھرمی ایک ایسی صفت ہے جس سے انسان کی فطرت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس قسم کا انسان خود اپنے آپ کو اور لوگوں کو یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ حق کے لیے تحقیق و تفتیش کر رہا ہے اور بحث اس لیے کر رہا ہے کہ اسے تسلی نہیں ہوئی۔ اور اسے پورا پورا یقین نہیں ہے لیکن اللہ تو اپنے بندوں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ سمیع و بصیر ہے اور دل کے رازوں کا جاننے والا ہے' یہ اللہ فیصلہ فرماتا ہے کہ یہ کبر کی وجہ سے ہے صرف اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ یہ کبر دل میں جاگزیں ہوتا ہے اور یہ کسی شخص کو ایسے مسئلے میں جھگڑے پر آمادہ کر دیتا ہے جو جھگڑے کا ہوتا نہیں ہے۔ یہ کبر ہی ہے جو انسان کو ایسے کاموں میں ہاتھ ڈالنے پر آمادہ کرتا ہے جو انسان کی حقیقت سے زیادہ اونچے ہوتے ہیں' انسان ایسے مقام تک پہنچنے کی سعی کرتا ہے جو اس سے بلند ہوتا ہے اور انسانی حقیقت سے بالا ہوتا ہے۔ انسان کے پاس اس کے لیے نہ دلیل ہوتی ہے اور نہ وجہ جواز۔ صرف اس کبر کی وجہ سے وہ اس طرح کی اونچی پرواز شروع کر دیتا ہے' ایسے ہی لوگ ہیں

اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ (۴۰ : ۵۶) "حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ کسی سند اور حجت کے بغیر جو ان کے پاس آئی ہو' اللہ کی آیات میں جھگڑ رہے ہیں' ان کے دلوں میں کبر بھرا ہوا ہے' مگر وہ اس بڑائی کو پہنچنے والے نہیں ہیں جس کا وہ گھمنڈ رکھتے ہیں"۔ اگر انسان اس کائنات کو اچھی طرح سمجھ لے اور اپنی ذات کی معرفت حاصل کر لے اور اس کائنات میں اپنی حیثیت کا ادراک کرے تو وہ مطمئن ہو جائے اور اپنی حیثیت اور منصب سے آگے نہ بڑھے۔ اگر وہ یہ معلوم کرے کہ وہ ان لاتعداد موجودات میں سے ایک ہے اور جس طرح یہ پوری کائنات امر ربی کی پابند ہے' اس طرح وہ بھی ہے اور وہ بھی اللہ کے نظام قضا و قدر کے مطابق چل رہا ہے جسے صرف اللہ جانتا ہے اور یہ کہ اس کائنات میں اس کا کردار ایک متعین کردار ہے' اگر انسان ان حقائق کا ادراک کرے تو وہ مطمئن اور آرام سے بیٹھ جائے ور اس کا سر قدرے جھک جانے اور اس کے اندر تواضع پیدا ہو جائے اور وہ اپنے آپ کے ساتھ' اس کائنات کے ساتھ اور اپنے ماحول کے ساتھ نہایت امن و سلامتی کے ساتھ رہے۔

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (۴۰ : ۵۶) "پس اللہ کی پناہ مانگ لو وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے"۔ کبر کے مقابلے میں اللہ کی پناہ مانگنے کا مشورہ دینا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ بہت ہی قبیح اور قابل نفرت خصلت ہے۔ کیونکہ اللہ کی پناہ نہایت ہی قبیح اور ناپسندیدہ چیز سے مانگی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں شر و فساد اور اذیت ملتی ہے۔ اور کبر میں یہ سب چیزیں موجود ہیں۔ کبر خود صاحب کبر کے لیے مصیبت ہے اور اس کے ماحول کے لیے بھی

مصیبت ہے ۔جس دل میں کبر ہو' اس کے لیے بھی اذیت ہے اور دوسروں کے دلوں کو بھی دکھانے والی عادت ہے ۔ لہذا کبر ایک ایسا شر اور فساد ہے جس سے اللہ کی پناہ مانگنا ضروری ہے ۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ( ۴۰ : ۵۶ ) "وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے"۔ کبر انسان کو ایسی حرکات پر آمادہ کرتا ہے جو دیکھی جا سکتی ہیں اور انسان سے ایسی باتیں کرواتا ہے جو سنی جا سکتی ہیں اس سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو سننے اور دیکھنے والے کی ولایت میں دے دو ۔

اس کے بعد انسان کو بتایا جاتا ہے کہ اس عظیم کائنات میں اس کا حقیقی مقام کیا ہے ۔ اور اللہ کی بعض مخلوقات جسے انسان دیکھ سکتے ہیں ۔ ان کے مقابلے میں وہ کس قدر چھوٹا اور کمزور ہے ۔ اور یہ چیزیں جن کا یہاں ذکر ہو رہا ہے ۔ دیکھتے ہی انسان ان کی ضخامت کا قائل ہو جاتا ہے ۔ اور جب ان کی پوری حقیقت ان کی سمجھ میں آ جائے تو ان کا شعور اور پختہ ہو جاتا ہے ۔

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ( ۴۰ : ۵۷ ) "آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کے مقابلے میں یقیناً زیادہ بڑا کام ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔ آسمان اور زمین انسان کے سامنے بچھے ہوئے ہیں اور انسان ان کو دیکھتا ہے ۔ اور انسان کی طاقت میں ہے یہ بات کہ وہ ان کے حوالے سے اپنی قدر و قیمت معلوم کرے ۔جب انسان کو اس زمین و آسمان کے حوالے سے اپنی نسبت' آسمانوں کی دوریاں اور افلاک سماوی کے حجم کا علم ہوتا ہے تو اس کا سر جھک سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اپنی کم مائیگی کے شعور کی وجہ سے وہ پگھل کر رہ جائے الا یہ کہ وہ انسان کے اس شرف کو یاد کرے جو اللہ نے اس کے اندر رکھا ہے اور جس کی وجہ سے انسان کو مکرم بنایا گیا ہے ۔ وہ واحد صفت ہے جس کی وجہ سے انسان اس کائنات کی عظمت کے سامنے کھڑا ہو سکتا ہے کیونکہ کائنات بہت ہی عظیم اور ہولناک ہے اور وہ بہت ہی چھوٹا ہے ۔

اس عظیم کائنات کے اور اوپر ایک لحہ غور کرنا انسان کو یہ سب کچھ معلوم کرنے کے لیے کافی ہے ۔یہ زمین جس کے اوپر ہم رہتے ہیں ۔یہ سورج کے تابع ستاروں میں سے ایک چھوٹا سا ستارہ ہے ۔ اس سورج کے تابع ستاروں کی تعداد لاکھوں میں ہے اور یہ زمین سورج سے دس لاکھ گنا چھوٹی ہے ۔پھر یہ سورج اس قسم کے سو ملین سورجوں میں سے ایک ہے' جو ہمارے قریب ترین کہکشاں میں ہیں ۔ اور ہم بھی اسی کہکشاں میں ہیں' اور انسانوں نے آج تک سو ملین کہکشاں دریافت کر لیے ہیں جو اس عظیم فضا میں تیر رہے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ اس فضا کا نہایت ہی چھوٹا حصہ ہوں ۔

جہاں تک انسانی معلومات کا تعلق ہے تو انسان نے ابھی تک اس کائنات کے ایک مختصر اور قابل ذکر حصے کی دریافت کی ہے اور یہ چھوٹا سا حصہ بھی اس قدر بڑا ہے کہ صرف اس کے تصور ہی سے انسان کا سر چکرا تا ہے ۔ہم اپنے سورج سے تقریباً ۹۲ ملین میل دور ہیں اور یہ سورج ہماری اس چھوٹی سی زمین کے کنبے کا سرخیل ہے ۔ اور یہ زمین بھی اپنی اس ماں کی جھولی سے یعنی سورج سے ۹۲ ملین میل دور ہے ۔یہ زمین سورج ہی سے جدا ہوئی ہے ۔

وہ کہکشاں جس کے تابع یہ سورج ہے' اس کا قطر تقریباً ایک لاکھ ملین نوری سال ہے ۔ اور نوری سال چھ سو ملین

میل ہوتا ہے کیونکہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ ہوتی ہے۔

اور ہماری کہکشاں سے قریب ترین کہکشاں ایک لاکھ سات سو پچاس ہزار نوری سال دور ہے۔ ہمیں یہاں یہ بات پیش نظر رکھنا چاہئے کہ یہ دوریاں اور حجم وہ ہیں جو اس حقیر انسان نے دریافت کر لیے ہیں اور اس کے ساتھ انسان نے یہ بھی دریافت کر لیا ہے وہ حقیقت کا نہایت ہی چھوٹا سا حصہ ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۰ : ۵۷) "آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسان کو پیدا کرنے کی بہ نسبت یقیناً زیادہ بڑا کام ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں"۔

اللہ کی قدرت کے سامنے کوئی بات نہ بڑی ہے اور نہ چھوٹی' نہ مشکل ہے اور نہ آسان۔ وہ تو ہر چیز کی تخلیق ایک کلمہ سے کرتا ہے۔ یہ صفات تو اشیاء کی ہیں۔ لوگ انہیں کم دیکھتے ہیں یا زیادہ' آسان دیکھتے یا مشکل۔ پھر انسان اور اس ہولناک سر چکرا دینے والی کائنات کی باہم کیا نسبت ہے؟ اس کم مائیگی کے باوجود پھر انسان کا یہ کبر!

وَمَا يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ لَا الْمُسِيْٓءُ (۴۰ : ۵۸) "اور یہ نہیں ہو سکتا کہ اندھا اور بینا یکساں ہو جائیں اور ایماندار اور صالح اور بدکار برابر ٹھہریں"۔

صاحب بصارت تو دیکھتا ہے اور اسے علم ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی قدر و قیمت بھی جانتا ہے۔ حد سے نہیں گزرتا' پھولتا نہیں اور نہ تکبر کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے' اندھا نہ دیکھتا ہے اور نہ خود اپنی قدر و قیمت جانتا ہے' نہ اپنی پوزیشن جانتا ہے اور نہ اپنے ماحول کے ساتھ اپنی نسبت کو جانتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے وہ اپنے بارے میں غلط اندازہ کرتا ہے۔ پھر اپنے ماحول کے بارے میں غلط فیصلہ کرتا ہے۔ اور ان غلط اندازوں کی وجہ سے پھر وہ راہ بھول جاتا ہے۔ اس طرح مومن و صالح اور بدکار برابر نہیں ہو سکتے۔ مومن دیکھنے والے اور جاننے والے ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنا اور اپنے ماحول کا صحیح اندازہ کرتے ہیں' جبکہ کافر اور بدکار جاہل ہوتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو برباد کر دیتے ہیں۔ اپنے آپ کو' اپنے ماحول کو' لوگوں کو' اور سب سے پہلے وہ اپنے عمل اور فہم کو برباد کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے ماحول کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ اندھے ہوتے ہیں' دلوں کے اندھے۔

قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ (۴۰ : ۵۸) "مگر تم لوگ کم ہی سمجھتے ہو"۔ اگر ہم سمجھتے تو ہمیں حقیقت معلوم ہوتی۔ بات واضح ہے۔ صرف یاد دہانی کی ضرورت ہے۔ اگر ہم آخرت پر پختہ یقین رکھتے اور اسے یاد کرتے اور مقامات قیامت کو ذہن میں رکھتے اور وہاں کی حاضری ہمارے ذہن میں ہوتی تو ہم پختہ مومن ہوتے۔

اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۴۰ : ۵۹) "یقیناً قیامت آنے والی ہے۔ اس کے آنے میں کوئی شک نہیں مگر اکثر لوگ نہیں مانتے"۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اللہ کی آیات میں

مجادلہ کرتے ہیں اور کبر کرتے ہیں ۔ ورنہ اگر مانتے اور یقین کرتے تو وہ حق کو پہچانتے ۔ وہ جانتے کہ حق کے حوالے سے اس کا کیا مقام ہے ۔ اس لیے تجاوز نہ کرتے ۔

صرف اللہ کی طرف متوجہ ہونا اور بندگی کرنا' اور نہایت عاجزی کے ساتھ اللہ کو پکارنا' انسان کو اس کبر سے بچاتا ہے ۔ جس کی وجہ سے انسان پھول جاتا ہے اور بغیر حجت کے اللہ کی آیات میں جھگڑا کرنے لگتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے اپنے دروازے کھولتا ہے تاکہ ہم اس کی طرف متوجہ ہوں اور اس کو پکاریں اور اعلان فرماتا ہے کہ میں نے ہر پکارنے والے کی پکار کو قبول کرنا اپنے اوپر لکھ دیا ہے ۔ اور ان لوگوں کو ڈراتا ہے جو اللہ کی پکار کے مقابلے میں تکبر کرتے ہیں کہ وہ آگ میں ذلیل و خوار ہوں گے ۔

وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ( ۴۰ : ۶۰ ) "تمہارا رب کہتا ہے مجھے پکارو' میں تمہاری دعا قبول کروں گا ۔ جو لوگ گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں' ضرور وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے"۔ یہ یاد رہے کہ دعا کے بھی آداب ہیں اور ان کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ۔ قلب کو اللہ کے لیے خالص ہونا چاہئے' کوئی صورت متعین کیے بغیر مانگنا چاہئے اور اس یقین کے ساتھ مانگنا چاہئے کہ اللہ ضرور قبول فرماتا ہے ۔ قبولیت کے ظروف و احوال اور زمان و مکان متعین نہ کرنا چاہئے کیونکہ یہ آداب دعا کے سراسر خلاف ہے ۔ اور یہ یقین کرنا چاہئے کہ دعاء کی توفیق صرف اللہ ہی دیتا ہے ۔ یہ بھی ایک انعام ہے' قبول ہونا دوسرا انعام ہے ۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں "میں استجابت دعا کی پریشانی اٹھا کر نہیں پھرتا' میری ذمہ داری تو یہ ہے کہ دعا کروں ۔ جو مجھے یہ توفیق دے دی گئی اور یہ الہام کر دیا گیا کہ دعا کرو تو قبولیت ساتھ ہوتی ہے"۔ دعاء تو عارف کے دل کی بات ہوتی ہے' عارف اس بات کو جانتا ہے کہ جس خدا نے دعاء کو مقدر کیا وہی قبولیت کا فیصلہ بھی کرتا ہے ۔ جب اللہ توفیق دے تو دعاء اور قبولیت دونوں باہم موافق اور مطابق اور ساتھ ساتھ ہوتے ہیں ۔

جو لوگ اللہ کی طرف متوجہ ہونے سے کبر کرتے ہیں تو ان کی سزا یہ ہے کہ جہنم میں خوار اور ذلیل کر کے پھینکے جائیں اور کبر کی سزا اللہ کے ہاں یہی ہے جس کی وجہ سے انسان پھولتا ہے ۔ ایک چھوٹا سا انسان' اس چھوٹی سی زمین پر اور اس چھوٹی سی زندگی میں ۔ اور یہ شخص اللہ کی عظیم تخلیق کو بھول جاتا ہے' اللہ کی عظمت کو بھول جاتا ہے اور آخرت کو بھول جاتا ہے جبکہ یہ آنے والی ہے' اور وہاں پھر اسے ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں گرنا ہو گا ۔

--- ooo ---

جب ان لوگوں کا ذکر ہوا جو اللہ کی بندگی کرنے اور اسے پکارنے سے کبر کرتے ہیں تو اس حوالے سے اللہ کی بعض نعمتوں کا ذکر کر دیا گیا ۔ وہ نعمتیں جو اللہ کی عظمت کی گواہ ہیں اور اس قسم کے متکبر ان پر اللہ کا شکر نہیں بجا لاتے بلکہ اللہ کی عبادت کرنے' اسے پکارنے اور اس کی طرف متوجہ ہونے سے کبر کرتے ہیں :

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۶۱﴾
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۲﴾
كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ
لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَ رَزَقَكُمْ
مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚۖ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۴﴾

"وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو' اور دن کو روشن کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ وہی اللہ (جس نے تمہارے لیے یہ کچھ کیا ہے) تمہارا رب ہے۔ ہر چیز کا خالق۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر تم کدھر سے بہکائے جا رہے ہو؟ اسی طرح وہ سب لوگ بہکائے جاتے رہے ہیں جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے۔ وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا اور اوپر آسمان کا گنبد بنا دیا۔ جس نے تمہاری صورت بنائی اور بڑی ہی عمدہ بنائی۔ جس نے تمہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا۔ وہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمہارا رب ہے۔ بے حساب برکتوں والا ہے۔ وہ کائنات کا رب ہے۔ وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کو تم پکارو اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کر کے۔ ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے"۔

گردش لیل و نہار تو دو کائناتی مظاہر ہیں جبکہ زمین و آسمان دو کائناتی تخلیقات ہیں۔ ان دونوں کو یہاں ذکر کر کے پھر بتایا جاتا ہے کہ اس لیل و نہار اور ارض و سماء کے اندر اللہ نے تمہاری خوبصورت شکلیں پیدا کیں اور پھر تمہارے لیے اس جہان میں قسم قسم کے رزق پیدا کیے۔ یہ ہے تمہارا رب اور یہ ہیں اس کے کارنامے۔ بڑی ہی برکتوں والا ہے رب العالمین! وہی زندہ ہے اور اس کے سوا کوئی زندہ نہیں ہے اور یہ سب کچھ اس کا فضل ہے۔ لہذا اللہ کو وحدہ لاشریک سمجھتے ہوئے صرف اسی کی بندگی کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کائناتی مظاہر اور ان تکوینی معانی اور اللہ کی ان تخلیقات کو اللہ کی توحید اور اللہ کے نظام زندگی کے حوالے سے وسیع دائرہ میں پڑھنا' ان پر تدبر کرنا اور توحید اور شریعت کے ساتھ ان کا ربط پانا ضروری ہے۔ اور یہ دیکھنا کہ اس تکوینی نظام' شرعی نظام کے درمیان ہم آہنگی کیا ہے۔

یہ کائنات اللہ نے جس اصول پر بنائی ہے' پھر اللہ نے اسے جس ناموس فطرت کے مطابق چلایا ہے' وہی اللہ ہے جس نے اس کرہ ارض پر زندگی کو چلایا' اس کی ترقی اور نشوونما کا انتظام فرمایا۔ پھر یہ وہی ذات باری ہے جس نے انسان کو اس کی موجودہ شکل عطا فرمائی جسے ہم دیکھ رہے ہیں۔ اور انسان کی تخلیق اور اس کی حیات کے لیے ضروری امور کو اس کائنات کے اندر ملحوظ رکھا۔ وہی تو ہے جس نے رات کو سکون' آرام اور راحت کے لیے بنایا۔ اور دن روشن' دیکھنے کے لیے معاون اور دوڑ دھوپ کے لیے بنایا۔ اور زمین کو زندگی کے قابل اور چلنے پھرنے کے اہل بنایا اور آسمان کو ایک چھت کی طرح بنایا کہ وہ بلندیوں پر سیاروں اور ستاروں کو لیے ہوئے ہے' جو گرتے نہیں۔ اور جن کی دوریاں بھی باہم ایک

دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر خلل نہیں ڈالتیں۔ اگر ان دوریوں میں ذرا بھر فرق پڑ جائے تو اس چھوٹے سے کرۂ ارض پر انسان کے وجود کے اندر خلل واقع ہو جائے۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے اس زمین پر پاک خوراک پیدا کی۔ یہ رزق اسی زمین سے پیدا کیا۔ یہ رزق آسمانوں سے بارش کی شکل میں نازل ہوتا ہے اور لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔ اور انسانی صورتیں کس قدر خوبصورت اور رنگا رنگ ہیں۔ اور پھر وہی ہے جس نے انسان کے اندر وہ صلاحیتیں پیدا کیں جو اس کائنات کے ساتھ متفق ہیں۔ اور یہ صلاحیتیں اس زمین پر رہنے کے لیے کافی ہیں۔ پھر یہ صلاحیتیں اس پوری کائنات کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہیں۔ تو یہ تمام امور باہم مربوط اور موافق ہیں جیسا کہ ہر شخص ملاحظہ کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام امور کو قرآن ایک ہی جگہ لیتا ہے۔ اسی ترتیب اور ربط سے لیتا ہے اور ان امور سے وحدانیت پر برہان قاطع پیش کرتا ہے۔ اور ان امور ہی کی روشنی میں قلب انسانی کو دعوت دیتا ہے کہ اللہ وحدہ کو پکارو۔ اور دین اور نظام زندگی صرف اسی کا رائج کرو۔ اور آخر میں کہا جاتا ہے 'الحمد للہ رب العالمین! اور یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ رب العالمین وہی ذات ہو سکتی ہے جس نے ان تمام چیزوں کو اس طرح پیدا کیا۔ یہی ہے اللہ 'رب العالمین' لہٰذا تعجب ہے کہ لوگ اس عظیم سچائی سے کس طرح منہ موڑتے ہیں۔

یہاں ہم سرسری طور پر وہ جھلکیاں دیتے ہیں جو خود بتائیں گی کہ اس کائنات کی ساخت میں' اور انسان کی زندگی کے ساتھ اس کے تعلق میں یہ امور ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ اللہ نے یہاں جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے' اس سمت میں چند لمحات۔

"یہ زمین سورج کے سامنے گردش محوری کر رہی ہے جس کے نتیجے میں لیل و نہار کا نظام وجود میں آیا ہے' اگر اپنی گردش کی موجودہ رفتار سے اس کی رفتار قدرے تیز ہو جائے تو تمام مکانات گر جائیں' اس زمین کے اجزاء ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور فضائے آسمانی میں بکھر جائیں"۔

"اور اگر یہ زمین موجود گردش محوری کی رفتار سے اپنی رفتار ذرا کم کر دے تو لوگ گرمی یا سردی سے ہلاک ہو جائیں۔ زمین کی موجودہ گردش محوری ایسی بنائی گئی ہے کہ یہ اس زمین کے اوپر حیوانی اور نباتاتی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ اور ان کے لیے اپنے وسیع معنوں میں مفید ہے"۔

"اور اگر زمین کی گردش محوری صرف رک جائے تو بخارات ختم ہو جائیں اور سمندر پانیوں سے خالی ہو جائیں"۔

"اگر زمین گردش محوری ختم کر دے اور سورج کے اردگرد اپنی گردش سالانہ جاری رکھے تو کیا ہو گا۔ تمام فصلیں ختم ہو جائیں' لوگوں کو پتہ نہ چلے کہ گرمیاں کہاں ہیں اور سردیاں کب ہوئیں اور ربیع و خریف ختم ہو جاتے"۔

"اگر زمین کا چھلکا چند قدم اور دبیز ہوتا تو بعض گیسوں کے جذب کر لینے کی وجہ سے نباتات ختم ہو جائے"۔

"زمین کے اوپر کرۂ ہوائی جس قدر بلندی پر ہے اگر اس سے مزید بلند ہو جائے تو آج کل لاکھوں کے حساب سے ہوا میں جو شہاب ثاقب جل جاتے ہیں' وہ سب کے سب کرۂ ارض پر گرنے لگتے' ان کی رفتار ۲۶ میل فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ اس طرح وہ زمین کے اوپر ان تمام چیزوں کو جلا کر رکھ دیں گے جو جلنے کے قابل ہیں۔ اور اگر یہ شہاب بندوق کی گولی کی رفتار سے بھی چلیں تب بھی سب کے سب زمین سے ٹکرا جائیں۔ اور اس کے نتائج نہایت ہی خوفناک ہوں۔ انسان بیچارے کی حالت تو یہ ہے کہ اگر ایک چھوٹا سا شہاب جس کی رفتار بندوق کی گولی سے ستر مرتبہ زیادہ ہو' اس زمین سے

بھی ٹکرا جائے تو اس شہاب کے گزرنے سے جو حرارت پیدا ہوگی ' صرف اس حرارت ہی سے اس کے اجزائے جسم بکھر کر رہ جائیں "۔(۱)

"اس وقت ہوا میں آکسیجن کی نسبت ۲۱ فیصد ہے اگر یہ ۵۰ فیصد ہو جائے تو جل جانے کی قابل تمام چیزیں آگ پکڑ لیں اور جل جائیں ۔ بس آگ کی ایک چنگاری لگتے ہی تمام جنگلات جل جائیں بلکہ بھک سے اڑ جائیں ۔ اگر ہوا کی آکسیجن کم ہو کر ۱۰ فیصد ہو جائے یا اس سے کم ہو جائے تو کرۂ ارض کی زندگی شاید ایک طویل عرصہ بعد اپنے آپ کو اس کے ساتھ ہم آہنگ کر ہی لے لیکن وہ تمام سہولیات ختم ہو جائیں جن کی وجہ سے انسان متمدن قرار پایا ہے مثلاً آگ وغیرہ"۔(۲)

غرض اس کائنات کی تخلیق و تشکیل میں ہزاروں ایسی مد اور معاون چیزیں ' باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ رکھی ہوئی نظر آتی ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک چیز میں معمولی خلل آ جائے تو ہماری زندگی اپنی موجودہ شکل میں نہ رہے ۔ اسی طرح دوسرے حیوانات کی زندگی کی موجودہ شکل بھی نہ رہے ۔

رہا انسان تو اس کی تو یہ پیاری پیاری صورت ہی ایسی ہے ' جو نہایت ہی منفرد انداز میں ہے اور تمام زندہ اشیاء میں ممتاز ہے ۔ یہ ایک اس قدر کامل اور مکمل تخلیق ہے کہ وہ اپنے تمام فرائض نہایت ہی سہولت اور باریکی سے ادا کرتی ہے ۔ اس کی یہ تخلیق اس کی زمین کے اوپر حرکت اور وہ حالات جن میں اس کے لیے زندہ رہنا اور کام کرنا آسان بنایا گیا ہے ' پھر اس کی وہ اعلیٰ و ارفع خصوصیت جس کے ذریعہ اسے تمام روئے زمین کی مخلوقات کا سردار بنایا گیا ہے اور اسے منصب خلافت ارضی دی گئی ہے اور اس منصب کے فرائض کی ادائیگی کے لیے اسے عقل و خرد سے نوازا گیا ہے ۔ اور پھر رب تعالیٰ کے ساتھ اسے رابطے کا اعزاز دیا ہے ۔ یہ تو انسان کی ممتاز ترین خصوصیات ہیں ۔

اب ذرا ذات انسان کی طرف آیئے ' اگر انسانی ذات اس کے اعضاء ' اور ان کے فرائض کی باریکی پر بحث کریں ' جو اس آیت کا مفہوم بھی ہے ۔

وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (۴۰ : ۶۴) "جس نے تمہاری صورت بنائی اور بہت ہی عمدہ بنائی" ۔ تو ہمیں انسان کے چھوٹے چھوٹے اعضاء میں سے ہر ایک کا مطالعہ کرنا پڑے گا ۔ بلکہ انسان کے خلیات میں سے ہر ایک خلیے پر بحث کرنی ہوگی ۔

ایک ہی مثال سے تخلیق انسانی اور جسم انسان کی گہری ٹیکنالوجی کا پتہ چل سکتا ہے ۔ انسان کے جبڑے کو لیجئے اور اس کے اندر دانتوں کی تنصیب کو اگر آلہ خوراک کے زاویہ سے دیکھا جائے تو یہ اس قدر حساس ہیں کہ اگر زبان یا لعاب میں ۱۰/ ا ملی میٹر کی حد تک ابھار آ جائے تو یہ جبڑے زبان اور لعاب کی مزاحمت کرتے ہیں ۔ اور اگر کسی دانت میں اسی قدر ابھار آ جائے تو وہ اپنے مقابل جسم کے ساتھ ٹکرانا شروع کر دے اور اگر دو جبڑوں کے درمیان سگریٹ کے کاغذ جتنا موٹا کاغذ آ جائے تو وہ دونوں جبڑوں کا دباؤ محسوس کرے گا ۔ اور اس پر بھی دونوں جبڑوں کا دباؤ ہو گا کیونکہ دونوں جبڑوں

---

(۱) "اللہ کے ساتھ جو آسمانوں میں ہے" ڈاکٹر احمد زکی ۔
(۲) "سائنس ایمان کا تقاضا کرتی ہے" ترجمہ ڈاکٹر صالح فلکی

کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ جب یہ دونوں ملتے ہیں تو دونوں طرف کے دانت پوری طرح ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔ یوں یہ پینے اور چبانے کا عمل کرتے ہیں اور ایسی چیزوں کو بھی چبا لیتے ہیں جن کا موٹاپا سگریٹ کے ابری کاغذ جیسا باریک ہو۔

پھر اسی انسان کو اپنی اس ساخت کے ساتھ' اس زمین پر رہنے کے لیے سہولیات فراہم کی گئی ہیں کہ یہ یہاں زندہ رہے۔ اس کی آنکھوں کو روشنی کی لہروں پر بنایا گیا ہے تاکہ یہ دیکھنے کا کام کریں۔ اور اس کے کانوں کو ہوا اور آواز کی لہروں پر بنایا گیا ہے تاکہ یہ سننے کا کام کریں۔ غرض اس کے تمام اعضاء اور حواس کو اس فضا کے مطابق بنایا گیا ہے جس کے اندر اس نے زندگی بسر کرنا ہے اور اسے یہ طاقت بھی دی گئی ہے کہ وہ ایک حد تک اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال سکے۔

غرض اسے اس زمین کے لیے بنایا گیا ہے تاکہ یہ یہاں زندہ رہے۔ اس سے متاثر ہو' اس کو متاثر کرے۔ غرض یہ ماحول جس میں انسان رہتا ہے' اس کے اور انسان کی تخلیق کے درمیان گہری منصوبہ بندی موجود ہے۔ پھر انسان کی موجودہ شکل و صورت کا بھی اس کے موجودہ ماحول کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اس کی ساخت کو اس ماحول کے مطابق بنایا گیا ہے' جہاں وہ رہتا ہے' یعنی اس زمین و آسمان کے مطابق۔ اس لیے یہاں اللہ نے انسان کی اسی شکل کا ذکر اس آیت کے درمیان کیا ہے جس میں زمین و آسمان کی تخلیق کا ذکر ہے۔

اب قرآنی آیات کی قدرے تشریح۔

اَللّٰهُ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا (۴۰ : ۶۱) "وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو' اور دن کو روشن کیا"۔ رات کو سکون حاصل کرنا ہر زندہ چیز کے لیے ضروری ہے۔ نیز ایک تاریکی کا عرصہ ضروری ہے تاکہ اس میں زندہ خلیے آرام کر سکیں اور اس وقت کے بعد پھر روشنی میں کام شروع کر سکیں۔ صرف نیند ہی کافی نہیں ہے تاریکی بھی ضروری ہے۔ بلکہ رات ضروری ہے۔ کیونکہ زندہ خلیہ روشنی کو برداشت کرتے کرتے اس قدر تھک جاتا ہے کہ اس کے اعصاب تلف ہونا شروع ہو جاتے ہیں چونکہ روشنی میں اسے آرام نہیں مل سکتا۔ لہٰذا رات کی تاریکی ضروری ہے۔

وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا (۴۰ : ۶۱) "دن کو روشن کیا"۔ انداز تعبیر بالکل مشخص ہے گویا دن ایک شخص ہے جو دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ لوگ دن میں دیکھتے ہیں۔ یہ تو ہے دن کی غالب افادیت اور صفت --- لیکن گردش لیل و نہار کا یہ نظام ایک نعمت ہے جو اپنے اندر مزید نعمتیں پوشیدہ رکھتی ہے۔ اگر رات اور دن میں سے کوئی ایک دائمی ہو جائے' بلکہ اپنے موجودہ وقت سے وہ ذرا طویل ہی ہو جائے تو زندگی ناپید ہو جائے' یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد اللہ کے اس فضل کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جس کا لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (۴۰ : ۶۱)
"حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے"۔ اور ان دو فطری مظاہر یعنی

گردش لیل و نہار کے بعد یہ تصریح کر دی جاتی ہے کہ ان کو اللہ نے پیدا کیا ہے لہٰذا وہی الٰہ ہونے کا مستحق ہے اور یہ نام "اللہ" ایک عظیم نام ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۴۰: ۶۲) "یہ ہے اللہ تمہارا رب جو ہر چیز کا خالق ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے' پھر تم کدھر بہکائے جا رہے ہو"۔ یہ ایک نہایت ہی تعجب انگیز اور حیرت افزا بات ہے کہ لوگ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر چیز میں اللہ کا ہاتھ ہے' اور تمام اشیاء کا موجود ہونا ہی ازروئے عقل اس بات کو فرض کر دے کہ اس کا اللہ خالق ہے اور اللہ کے سوا کوئی اور قوت بھی نہ ہو کہ وہ خالق ہونے کی مدعی ہو' اور یہ بات بھی ذہن میں نہ آتی ہو کہ یہ چیزیں خود بخود وجود میں آگئی ہوں' یہ فی الواقع ایسی عجیب بات جو ہر معقول انسان کے لیے تعجب انگیز ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے اور دیکھتے ہوئے بھی لوگ ایمان لانے سے منہ موڑیں۔

فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۴۰: ۶۲) "کدھر بہکائے جا رہے ہو"۔

لیکن' ہوئی رہا ہے کہ لوگ بدستور اس واضح سچائی سے منہ موڑ رہے ہیں جیسا کہ قرآن کے پہلے مخاطب منہ موڑ رہے تھے اور اس کے بعد بھی ہر زمان و مکان میں منہ موڑ رہے ہیں۔ بغیر سبب' بغیر حجت اور بغیر دلیل کے۔

كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۴۰: ۶۳) "اسی طرح وہ سب لوگ بہکائے جا رہے ہیں' جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے"۔

اب سیاق کلام اس طرف آتا ہے کہ زمین کو اپنی جگہ ٹھیرایا گیا اور آسمان کو چھت کی طرح اوپر ٹھیرایا گیا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً (۴۰: ۶۴) "وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا اور اوپر آسمان کا گنبد بنا دیا"۔ زمین تو برقرار ہے اور انسانوں کی رہائش کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اور اس میں ایسی بے شمار سہولیات رکھ دی گئی جو انسان کے لیے ضروری ہیں اور جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور آسمان ایک ایسی چھت ہے جس کی نسبتیں متعین اور مقرر ہیں۔ جس کی دوریاں' حرکتیں اور چکر مقرر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وجہ سے زمین پر انسان کی زندگی کو قرار حاصل ہے اور یہ قرار اور یہ سہولیات اس کائنات کے نقشے کے اندر باقاعدہ حساب سے رکھ دی گئی ہیں اور اس کی تعمیر میں انہیں ایک خاص نسبت سے رکھا گیا ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق کے ساتھ ہی انسان کی پیاری صورت اور انسان کے لیے رزق کو بھی مربوط کر دیا گیا جیسا کہ ہم نے ان باتوں کی طرف اجمالی اشارہ کر دیا ہے۔

وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ (۴۰: ۶۴)

"جس نے تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی جس نے تمہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا"--- اور پھر ان نشانیوں اور مہربانیوں پر یہ تبصرہ:

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۰ : ۶۴) "یہ ہے اللہ تمہارا رب ' بے حساب برکتوں والا ہے ۔ وہ کائنات کا رب ہے"۔ یہ اللہ جو تخلیق کرتا ہے ' جو انداز سے تخلیق کرتا ہے اور پھر اپنی مخلوقات کا مدبر بھی ہے ۔ وہ تمہاری نگہبانی کرتا ہے اور تمہیں اس نے اپنی اس مخلوق میں بسایا ہے ۔ یہ ہے تمہارا رب ' برکتوں والا ' اور بہت بہت برکتوں والا اور تمام جہانوں والا ' جن کے تصور ہی سے سر چکرا جاتا ہے ۔

هُوَ الْحَيُّ (۴۰ : ۶۵) "وہی زندہ ہے"۔ ہاں ' وہی اکیلا زندہ ہے ۔ اس کی ذاتی زندگی ہے ' کسی سے لی نہیں گئی ' کسی کی تخلیق کردہ نہیں ہے ۔ نہ اس کی ابتداء اور نہ انتہا ہے نہ اس کے درمیان کوئی حائل ہے اور نہ وہ زائل ہونے والی ہے ۔ نہ اس میں کوئی انقلاب آتا ہے اور نہ تغیر۔ اللہ کے سوا کسی کو یہ صفات حاصل نہیں ہیں ۔ اللہ پاک ہی منفرد ہے ان صفات میں ۔ لہٰذا وہی منفرد ہے الوہیت میں ۔ اس لیے کہ زندہ وہی ہے ۔ لہٰذا حق یہی ہے کہ وہی واحد و قہار ہو ۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (۴۰ : ۶۵) "نہیں کوئی الٰہ مگر وہ" تو پھر صرف : فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (۴۰ : ۶۵) "اسی کو تم پکارو ' اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کر کے"۔ اس کی حمد کرو ' اس سے دعا کرو '

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۰ : ۶۵) "ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے"۔

--- ooo ---

ان نشانیوں اور مہربانیوں کے تذکرے اور ان پر تبصرے کے بعد اور حقیقت الوہیت اور عقیدۂ توحید اور مظاہر ربوبیت کی تشریح کے بعد اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ آپ اعلان کر دیں کہ ان نشانیوں اور دلائل کی بنا پر میں روک دیا گیا ہوں کہ میں تمہارے معبودوں کی بندگی کروں ' مجھے تو حکم دے دیا گیا کہ صرف رب العالمین کے سامنے سر تسلیم خم کر دوں ۔

هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ ؗ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶۶

"اے نبی" ان لوگوں سے کہہ دو کہ مجھے تو ان ہستیوں کی عبادت سے منع کر دیا گیا ہے ۔ جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو ۔ (میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں) جب کہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے بینات آچکی ہیں ۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں رب العالمین کے آگے سر تسلیم خم کر دوں"۔

یہ اعلان ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ کی آیات سے منہ موڑتے ہیں اور اللہ کے عطیات کی ناشکری کرتے ہیں کہ میں تو ان معبودوں کی بندگی سے منع کر دیا گیا ہوں جن کو تم پکارتے ہو ۔ لہٰذا میں منع ہو گیا ہوں ۔ اس لیے کہ میرے پاس نشانات آگئے ہیں اور آئے بھی میرے رب کی طرف سے ہیں ۔ میرے پاس دلائل پہنچ چکے ہیں اور میں ان پر ایمان لا چکا ہوں ۔ اور اللہ نے میرے پاس جو دلائل بھیجے ہیں' ان کا حق ہے کہ میں ان پر مطمئن ہو جاؤں اور تصدیق کر دوں اور اس سچائی کا اعلان کر دوں جو میرے پاس آگئی ہے ۔ اور غیر اللہ کی بندگی سے رک جانا ہی کافی نہیں بلکہ رب العالمین کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا اور ایک مثبت پروگرام شروع کرنا بھی بڑا مشن ہے ۔ اس میں ''لا'' بھی ہے اور ''الا'' بھی ہے ۔

اور آفاقی دلائل الٰہیہ کے بیان کے بعد اب انفس کی طرف روئے سخن مڑتا ہے ۔ انفس کے دلائل میں سے بڑی دلیل ظہور حیات انسانی ہے اور پھر اس کے ظہور کے عجیب اطوار و درجات ہیں ۔ انسانی حیات کا مطالعہ ایک مقدمہ ہے ۔ اس بات کے لیے کہ اس کائنات میں ہر قسم کی حیات درحقیقت اللہ کے دست قدرت کا کرشمہ ہے اور اس کی مٹھی میں ہے ۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ
ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ
یُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَ لِتَبْلُغُوْۤا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ هُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ
ع ۸ وَ یُمِیْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۶۸﴾
۱۲

''وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا' پھر نطفے سے' پھر خون کے لوتھڑے سے' پھر وہ تمہیں بچے کی شکل میں نکالتا ہے' پھر تمہیں بڑھاتا ہے تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ' پھر اور بڑھاتا ہے تاکہ تم بڑھاپے کو پہنچو اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے ۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو ۔ وہی ہے زندگی دینے والا' اور وہی موت دینے والا ہے ۔ وہ جس بات کا بھی فیصلہ کرتا ہے' بس ایک حکم دیتا ہے کہ وہ ہو جائے اور وہ ہو جاتی ہے''۔

اس کرۂ ارض پر انسانی پیدائش کا ادراک انسانی علم نہیں کر سکتا' کیونکہ انسان اس وقت نہ تھا جب اسے پیدا کیا گیا تھا' انسانی پیدائش کے تسلسل میں بعض امور ایسے ہیں جن کا مشاہدہ انسان کرتا ہے لیکن یہ انسانی مشاہدہ اپنی موجودہ ترقی یافتہ شکل میں زمانہ حال میں سامنے آیا ہے' نزول قرآن کے صدیوں بعد ۔

پہلی بات یہ ہے کہ انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا اور یہ واقعہ اس وقت ہوا جب انسان نہ تھا ۔ لیکن معلوم ہو گیا کہ اس کرۂ ارض پر مٹی ہی حیات کی بنیاد ہے ۔ اسی سے انسان کو بنایا گیا ہے اور اسے زندگی دی گئی ہے ۔ یہ بات اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا کہ یہ معجزہ کس طرح ظہور میں آیا زندگی اور زمین کی تاریخ میں یہ عظیم واقعہ کب اور کس طرح وجود میں آیا ۔ رہا نسلوں کا چلنا تو اس کا نظام یوں بنایا گیا کہ مرد کا خلیہ یعنی نطفہ جب عورت کے انڈے سے ملتا ہے اور یہ دونوں آپس میں متحد ہو جاتے ہیں اور رحم میں خون کے ایک لوتھڑے کی شکل میں لٹک جاتے ہیں تو جنین اپنے مراحل طے کرتا ہے اور

اپنے آخری مرحلے میں بچہ نمودار ہوتا ہے۔ پیدا ہونے سے قبل بچے میں بہت بڑے بڑے انقلابات ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ابتدائی خلیے کو غور سے دیکھا جائے تو اس کی زندگی بچے کی زندگی سے زیادہ طویل ہے یعنی ولادت سے لے کر موت تک کے عرصہ سے 'سیاق کلام میں قرآن مجید نے یہاں صرف اس کی بعض ممتاز صفات و مراحل کا ذکر کیا ہے۔ یعنی بچپنے کا مرحلہ' پھر سن رشد تک پہنچنا یعنی تیس سال کی عمر تک پھر بڑھاپا۔ یہ وہ مراحل ہیں جنہیں طے کر کے انسان اپنے کمزور' آغاز و انجام کے درمیان اپنی پوری قوت تک پہنچتا ہے۔

وَ مِنكُم مَّن يُتَوَفّٰى مِن قَبلُ ( ٤٠ : ٦٧ ) "تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے"۔ اور وہ یہ پورے مراحل طے نہیں کرتا یا بعض مراحل اس سے چھوٹ جاتے ہیں اور وہ فوت ہو جاتا ہے۔

وَ لِتَبلُغُوٓا اَجَلًا مُّسَمًّى ( ٤٠ : ٦٧ ) "یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ"۔ یہ وقت مقرر' طے شدہ اور معلوم ہے۔ اس میں کوئی تقدیم اور تاخیر نہیں ہوتی۔

وَّ لَعَلَّكُم تَعقِلُونَ ( ٤٠ : ٦٧ ) "اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو"۔ جنین کا سفر طے کرنا' پھر بچے کا سفر طے کرنا' پھر ان کی شکل و صورت کا حسن اور ان کی طبیعی نشوونما کے صحیح صحیح اندازے اور اطوار میں سوچنے کا بہت بڑا سامان ہے۔

جنین کا سفر تو نہایت ہی حیرت انگیز سفر ہے۔ علوم طبیہ کی ترقی کے بعد تو اس کے بارے میں ہم نے حیرت انگیز معلومات حاصل کر لی ہیں۔ علوم جنین ایک مستقل شعبہ ہے لیکن قرآن نے جس انداز سے آج سے چودہ سو سال قبل اس کے بعض مراحل کی طرف جس ٹھیک ٹھیک اندازے سے اشارہ کیا ہے' یہ فکر و نظر کے لیے دامن گیر ہے۔ انسان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ ان مراحل سے غافل ہو کر گزر جائے اور ان پر گہرا غور و فکر نہ کرے۔ جنین کا سفر اور بچے کا سفر انسانی احساس پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں اور انسانی دل کو خوب جھنجھوڑتے ہیں۔ چاہے عقل و رشد کے جس مرحلے میں بھی وہ ہو۔ ہر نسل انسانی' اپنی معلومات کے حوالے سے اس سے متاثر ہوتی ہے' اس لیے قرآن نے انسانی نسلوں کو اس طرف متوجہ کیا ہے اس لیے کہ اس سے انسان متاثر ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ آزاد ہے' لبیک کہے یا نہ کہے۔

اس بحث کے بعد زندہ کرنے اور مارنے اور تخلیق اور نشوونما کے بارے میں ایک سبق آموز تبصرہ:

هُوَ الَّذِي يُحيٖ وَ يُمِيتُ فَاِذَا قَضٰٓى اَمرًا فَاِنَّمَا يَقُولُ لَهٗ كُن فَيَكُونُ ( ٤٠ : ٦٨ )

"وہی ہے زندگی اور موت دینے والا۔ وہ جس بات کا بھی فیصلہ کرتا ہے بس ایک حکم دیتا ہے کہ وہ ہو جائے اور وہ ہو جاتی ہے"۔ قرآن میں آیات موت و حیات کا بہت ذکر ہوا ہے۔ کیونکہ موت و حیات کا مضمون انسانی شخصیت کو گہرے طور پر متاثر کرتا ہے۔ یہ نہایت ہی ممتاز اور بار بار دہرائے جانے والے واقعات ہیں اور انسانی حس ان کو بہت ہی قریب سے دیکھتی ہے۔ بادی النظر میں زندہ کرنے اور مارنے سے جو بات انسان کی سمجھ میں آتی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو حیات و ممات کا مفہوم اس سے کہیں گہرا ہے۔ حیات کی بھی کئی اقسام ہیں' موت کی بھی کئی اقسام ہیں۔ زمین کو ہم مردہ

دیکھتے ہیں ـ پھر زمین ہی کو ہم زندہ اور سرسبز دیکھتے ہیں ـ جب مردہ ہو تو درختوں کے پتے نہیں ہوتے ' شاخیں خشک نظر آتی ہیں ' ایک تو یہ موسم ہوتا ہے ' اور جب یہ زندہ ہوتے ہیں تو یہی مردہ شاخیں اور ٹہنیاں سرسبز اور شاداب ہو کر لہلہاتی ہیں ـ ان شاخوں کا انگ انگ پھوٹ جاتا ہے اور پھول اور پتے نکل آتے ہیں ـ یوں لگتا ہے کہ زندگی ان شاخوں سے ابلی پڑتی ہے ـ ایک انڈے کو دیکھو ' پھر بچے کو دیکھو ' بیج کو دیکھو اور اگنے والے پودے کو دیکھو ' اور پھر الٹے سفر کو دیکھو کہ یہی زندگی موت میں بدل جاتی ہے اور بجھے ہوئے کھیت سامنے آتے ہیں ـ یہ سب حالات دل اور دماغ کو متاثر کرتے ہیں اور بموجب "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" ہر شخص کا تاثر مختلف ہوتا ہے ـ

آخر میں موت و حیات سے آگے ' اہم سوال کہ کائنات کس طرح وجود میں آئی؟ بس اللہ کا ارادہ ہوا ' کن کا حکم ہوا اور سب کچھ ہو گیا یا جو چاہا ہو گیا ـ یہ کائنات ہوتی چلی گئی اور تسلسل قائم ہوتا چلا گیا ـ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ

--- ○○○---

حیات و ممات کے اس منظر کے بعد اور انشاء و تخلیق کے کن فیکون کے بعد ' اللہ کی نشانیوں اور مہربانیوں میں جدل و جدال اور بحث و تکرار لاحاصل اور بہت عجیب و غریب ہے اور رسولوں کے پیغام اور دعوت کی تکذیب اس سے بھی عجیب تر ہے ـ اب ہو جاؤ خبردار! ایک خوفناک منظر تمہارے سامنے آنے والا ہے ـ خبردار! یہ قیامت ہے اور تم نے اس منظر کو دیکھنا ہے ' ذرا دیکھنے سے پہلے ہی دیکھ لو!

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ﴿٦٩﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ڕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٠﴾ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ۭ يُسْحَبُوْنَ ﴿٧١﴾ فِي الْحَمِيْمِ ڏ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴿٧٢﴾ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿٧٣﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـــًٔا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٧٤﴾ ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ﴿٧٥﴾ اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿٧٦﴾

"تم نے دیکھا ان لوگوں کو جو اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں ' کہاں سے وہ پھرائے جا رہے ہیں؟ یہ لوگ جو اس کتاب کو اور ان ساری کتابوں کو جھٹلاتے ہیں جو ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ بھیجی تھیں ' عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں کھینچی جائیں گی ' کھولتے ہوئے پانی میں اور دوزخ کی آگ میں

بھونک دیئے جائیں گے ۔ پھر ان سے پوچھا جائے گا کہ "اب کہاں ہیں اللہ کے سوا وہ دوسرے خدا جن کو تم شریک کرتے تھے؟" وہ جواب دیں گے "کھوئے گئے وہ ہم سے ' بلکہ ہم اس سے پہلے کسی چیز کو نہ پکارتے تھے"۔ اس طرح اللہ کافروں کو گمراہ ہونا متحقق کر دے گا۔ ان سے کہا جائے گا "یہ تمہارا انجام اس لیے ہوا ہے کہ تم زمین میں غیر حق پر مگن تھے ۔ اور پھر اس پر اتراتے تھے ۔ اب جاؤ ' جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ ' ہمیشہ تم کو وہیں رہنا ہے 'بہت ہی برا ٹھکانا ہے متکبرین کا"۔

یعنی گزشتہ آیات میں اللہ کی جو نشانیاں بیان ہوئیں ان کے ہوتے ہوئے ان لوگوں کا رویہ قابل تعجب ہے جو اللہ کی ان نشانیوں کے بارے میں پھر بھی جث و جدال کرتے ہیں 'لیکن ان کا انجام کیا ہونے والا ہے 'نہایت عبرت آموز!

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ (۴۰ : ۶۹) اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا (۴۰ : ۷۰) "تم نے دیکھا ان لوگوں کو جو اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں 'کہاں سے وہ پھرائے جا رہے ہیں؟ یہ لوگ جو اس کتاب کو اور ان ساری کتابوں کو جھٹلاتے ہیں جو ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ بھیجی تھیں"۔

انہوں نے تو صرف ایک کتاب قرآن اور ایک رسول حضرت محمد ﷺ کو جھٹلایا تھا مگر اس طرح کر کے انہوں نے تمام کتابوں اور تمام رسولوں کو جھٹلا دیا کیونکہ تمام رسولوں کا عقیدہ بالآخر ایک ہی تھا اور یہی عقیدہ اپنی مکمل صورت میں خاتم النبین ﷺ کو دیا گیا۔ لہذا انہوں نے گویا تمام رسالتوں اور تمام رسولوں کی تکذیب کر دی ۔ ہر مکذب نے یہی کیا خواہ قدیم زمانے میں تھا یا جدید زمانے میں اس نے عقیدۂ توحید ہی کی تکذیب کی ۔

فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (۴۰ : ۷۰) "عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"۔ کہ ان کا انجام کیا ہو گا۔ آگے تفصیلات دے دیں کہ ایسے لوگوں کا انجام کیسا ہوتا ہے ۔ یہی کہ نہایت توہین آمیز اور حقارت آمیز انداز میں ان کو سزا دی جائے گی صرف سزا نہ ہوگی بلکہ اہانت اس کے ساتھ شامل ہو گی۔

اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ (۴۰ : ۷۱) "جب طوق اور زنجیریں ان کی گردنوں میں ہوں گی 'اور کھینچے جائیں گے"۔ اس طرح جس طرح مویشی کھینچے جاتے ہیں 'اہانت کے ساتھ ۔ عزت ان کی کیوں ہو 'انہوں نے خود ہی عزت کا لباس اتار پھینکا تھا۔ یوں توہین کے ساتھ کھینچ کر اور چلا کر آخر کار انہیں گرم پانیوں اور آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

فِى الْحَمِيْمِ ثُمَّ فِى النَّارِ يُسْجَرُوْنَ (۴۰ : ۷۲) "گرم پانی میں 'پھر آگ میں جھونک دیئے جائیں گے"۔ یعنی ان کو باندھا جائے گا۔ پھر کتوں کی طرح گلے میں زنجیریں ڈال کر ہانکا جائے گا اور ان کو ایسے مکان میں گرا دیا جائے گا جو گرم پانی اور آگ سے بھرا ہو گا۔

یہ لوگ ایسی ہی حالت میں ہوں گے کہ ان پر سرزنش 'ملامت دھتکار آئے گی :

ثُمَّ قِيلَ لَهُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ تُشْرِكُونَ مِن دُونِ اللَّهِ (۴۰ : ۷۴) "پھر ان سے پوچھا جائے گا اب کہاں ہیں اللہ کے سوا وہ خدا جن کو تم شریک کرتے تھے"۔

اب وہ ایسا جواب دیتے ہیں جس طرح وہ شخص دیتا ہے جس کے ساتھ دھوکہ ہوا اور پھر یہ دھوکہ ظاہر ہو گیا اور وہ نہایت مایوس اور ضرر رسیدہ ہوتا ہے :

قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا بَل لَّمْ نَكُن نَّدْعُو مِن قَبْلُ شَيْئًا (۴۰ : ۷۴) "وہ جواب دیں گے کھوئے گئے وہ ہم سے ' بلکہ ہم اس سے پہلے کسی چیز کو نہ پکارتے تھے"۔ وہ تو ہم سے اس طرح غائب ہو گئے کہ اب ہمیں ان کے ڈھونڈنے کا راستہ تک معلوم نہیں۔ اور نہ اب وہ ہم کو راستہ بتاتے ہیں۔ بلکہ اس سے پہلے ہم جن کو پکارتے تھے وہ تو کوئی چیز ہی نہ تھے محض اوہام اور افسانے تھے۔۔۔ اس مایوس کن جواب پر یہ تبصرہ اور عبرت۔

كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ الْكَافِرِينَ (۴۰ : ۷۴) "اس طرح اللہ کافروں کا گمراہ ہونا متحقق کر دے گا" اور اس کے بعد پھر سرزنش اور ان کے گمراہی کا سبب۔

ذَٰلِكُم بِمَا كُنتُمْ تَفْرَحُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنتُمْ تَمْرَحُونَ (۴۰ : ۷۵) ادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ

(۴۰ : ۷۶) "ان سے کہا جائے گا" یہ تمہارا انجام اس لیے ہوا ہے کہ تم زمین میں غیر حق پر مگن تھے۔ اور پھر اس پر اتراتے تھے۔ اب جاؤ' جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ' ہمیشہ تم کو وہیں رہنا ہے' بہت ہی برا ٹھکانا ہے متکبرین کا"۔

اے فریاد رس خداوند! یہ طوق اور زنجیریں گلے میں باندھ کر گرم پانیوں اور آگ میں کہاں لے جائے گئے؟ معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کے دائمی عذاب سے پہلے گرم پانی اور آگ کا عذاب دیا گیا۔

فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ (۴۰ : ۷۶) "بہت ہی برا ٹھکانا ہے متکبرین کا"۔ یہ توہین آمیز سزا ان کو جو دی جا رہی ہے اس کا حقیقی سبب تو کبر ہی ہے اور اس کبر ہی کی وجہ سے اس سخت سزا کے ساتھ تحقیر اور تذلیل کو شامل کیا گیا ہے۔

--- ○○○---

اس خوفناک عذاب کے منظر اور ذلت آمیز سلوک کے بعد' جو آیات الہی میں ناروا جدل و جدال کے نتیجے میں ان پر نازل ہوا اور جس کا سبب حقیقی کبر تھا' جو انسان کو پھلا دیتا ہے' اس منظر کے بعد اور اس برے انجام کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ صبر کریں کیونکہ ان لوگوں کے کبر و جدال کی وجہ سے آپ کو بے حد تکلیف ہوتی ہے' آپ کو تسلی دی جاتی ہے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ چاہے اسلامی انقلاب کا وعدہ آپ کی حیات میں پورا ہو یا بعد

میں ' یہ اللہ کی رضا ہے کہ وہ جس طرح چاہے ' کرے رسول کا کام یہ ہے کہ وہ تبلیغ کر کے اللہ کے پاس چلا جائے ۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۷۷﴾

"پس اے نبی ؐ صبر کرو ' اللہ کا وعدہ برحق ہے ' اب خواہ ہم تمہارے سامنے ہی ان کو ان برے نتائج کا کوئی حصہ دکھا دیں جن سے ہم انہیں ڈرا رہے ہیں ' یا (اس سے پہلے) تمہیں دنیا سے اٹھالیں ' پلٹ کر آنا تو انہیں ہماری ہی طرف ہے" ۔

یہ ایک جھلک ہے ' ہمیں چاہئے کہ ذرا اس پر غور کریں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دور میں مخالفین کی جانب سے کبر ' اذیت ' تکذیب اور نافرمانی کی اذیت جھیل رہے تھے ۔ آپ کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ کے فرائض یہ ہیں ' بس آپ ان تک اپنے آپ کو محدود کر دیں ' رہے نتائج تو ان کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے یہاں تک کہ وہ مکذبین اور متکبرین کو اس دنیا میں سزا پاتے دیکھنے کی خواہش بھی نہ رکھیں ۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ حکم بجا لائیں ' اپنا فریضہ ادا کر دیں ' کیونکہ انجام تک کسی بات کو پہنچانا یہ داعی کا کام نہیں ہے ۔ یہ اللہ کے اختیار میں ہے ' اور وہ وہی کچھ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے ۔

الہ العالمین ! کس قدر بلند مقام ہے یہ ۔ کس قدر کامل آداب کی تلقین ان لوگوں کو جو دعوت اسلامی کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور یہ کون ہیں ؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ؐ کے رفقاء !

نفس انسانی کے لیے یہ حکم بہت بھاری ہے ۔ یہ ایک ایسا حکم ہے جو ضعیف انسان کی چاہتوں کے خلاف ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں یہ حکم دینے سے بھی پہلے صبر کی تلقین کی گئی ہے ۔ لہٰذا یہاں دوبارہ صبر کی تلقین کا حکم دینا تکرار نہیں ہے ۔ یہ ایک نئے انداز کا صبر ہے ۔ یہ صبر ایذا ' تکذیب اور استہزاء سے بھی زیادہ مشکل صبر ہے ۔ تمام داعیوں کو ' انسان اور بشر داعیوں کو ' یہ کہہ دینا کہ تمہارے دشمنوں کو ضرور سزا ہو گی ' اللہ ان کو ضرور پکڑے گا لیکن شاید تم نہ دیکھ سکو ' یہ انسان کی اس خواہش کے خلاف ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کو سزا پاتے دیکھے ۔ یہ شدید خواہش ہوتی ہے ' جبکہ داعیوں پر مظالم ہو رہے ہوں لیکن یہ آداب الٰہیہ ہیں اور یہ اللہ کی جانب سے اپنے مختار بندوں کی تربیت ہے اور نفس انسانی کو ہر اس بات سے پاک کرنا مطلوب ہے جس میں کوئی ادنیٰ سی خواہش بھی ہو ۔ اگرچہ یہ خواہش صرف یہ ہو کہ دشمنان دین کو سزا ہو جائے ۔

اس نکتے پر تمام داعیان دین کو غور کر لینا چاہئے ' چاہے وہ جس زمان و مکان میں بھی ہوں ' خواہشات کے طوفانوں میں یہ کامیابی کا لنگر ہے ۔ یہ خواہشات تو ابتداء میں بڑی پاکیزہ نظر آتی ہیں لیکن آخر میں شیطان ان میں گھس آتا ہے ۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۲۶ ایک نظر میں

یہ پورا سبق اس سے پہلے سبق کے آخر میں آنے والے درس عبرت کی تکمیل و تشریح ہے۔ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی مومنین کو ہدایت کی گئی تھی کہ آپ لوگ مشکلات راہ پر صبر کریں۔ اس وقت تک کہ اللہ کا حکم آجائے اور اللہ نے فتح اسلام کا جو وعدہ کیا ہے وہ پورا ہو جائے۔ چاہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہو یا آپؐ کی وفات کے بعد ہو۔ کیونکہ اختیار آپؐ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ بلکہ معاملہ اسلام اور اسلام کو ماننے والوں اور ان کے مخالفین اور مجادلین کا ہے۔ دونوں برسرجنگ ہیں اور فیصلہ ان کے درمیان اللہ کو کرنا ہے۔ اور یہ اللہ ہی ہے جو اسلامی انقلاب کی تحریک کو چلاتا ہے 'جس طرح چاہتا ہے۔

یہ سبق جس پر اس سورت کا خاتمہ ہو رہا ہے 'اس حقیقت کو ایک دوسرے رنگ میں پیش کر رہا ہے یہ کہ کفر و اسلام کی جنگ کوئی نئی بات نہیں ہے اور نہ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور اسلام سے شروع ہوئی ہے۔ آپؐ سے قبل بھی رسول بھیجے گئے ہیں بعض کے قصے آپ کے سامنے بیان کیے گئے ہیں اور بعض کے بیان نہیں کیے گئے۔ ان سب کا استقبال تکذیب اور انکار سے کیا گیا۔ سب سے مطالبہ کیا گیا کہ معجزات پیش کرو 'اور سب نے یہ تمنائیں کیں کہ کاش اللہ کوئی معجزہ صادر کر دے جس کو دیکھ کر تکذیب کرنے والے مان لیں 'لیکن معجزات کا صدور اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اور اس وقت ہوتا ہے جب اللہ چاہتا ہے۔ یہ دعوت 'اللہ کی دعوت ہے وہ جس طرح چاہتا ہے 'اسے چلاتا ہے۔

البتہ اللہ کے بعض معجزات اس کائنات میں بکھرے پڑے ہیں' ہر زمان و مکان کے لوگوں کی نظروں کے سامنے ہیں۔ مثلاً مویشی 'کشتیاں اور دوسری چیزیں جن کا انکار کوئی نہیں کر سکتا۔

اور اس سبق کا خاتمہ ایک نہایت شدید جھٹکے سے ہوتا ہے جس میں ان اقوام کی ہلاکت دکھائی گئی ہے جنہوں نے اس سے قبل تکذیب کی اور وہ اپنے مال' دولت اور ترقی پر نازاں رہے۔ اللہ نے پھر ان کو اپنی سنت کے مطابق پکڑا۔

فَلَمْ يَكُ يَنفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا سُنَّتَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ (۴۰ : ۸۵) "مگر ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان ان کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو سکتا تھا 'کیونکہ یہی اللہ کا مقرر شدہ ضابطہ ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہا ہے اور اس وقت کافر لوگ خسارے میں پڑے۔

--- ۰۰۰ ---

# درس نمبر ۲۲۶ تشریح آیات

## ۷۸ --- تا --- ۸۵

---

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَ
مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ
۸ ع ۱۰ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝۷۸
۱۳

"اے نبیؐ، تم سے پہلے ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں جن میں سے بعض کے حالات ہم نے تم کو بتائے ہیں اور بعض کے نہیں بتائے۔ کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر خود کوئی نشانی لے آتا۔ پھر جب اللہ کا حکم آ گیا تو حق کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا اور اس وقت غلط کار لوگ خسارے میں پڑ گئے"۔

اقامت دین کی جدوجہد کی مثالیں اور پیغمبر بھیجنے کی مثالیں سابقہ تاریخ میں موجود ہیں۔ بعض کے واقعات قرآن میں بیان کیے گئے ہیں اور بعض کا تذکرہ نہیں کیا گیا' اور جن کے واقعات بیان کیے گئے ہیں ان میں تحریک اسلامی کی طویل جدوجہد کے نشانات راہ موجود ہیں۔ یہ راستہ واضح ہے اور طویل ہے اور اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ اور ان پیغمبروں کے واقعات صاف صاف بتاتے ہیں کہ اللہ کی سنت کیا ہے اور رسولوں کا فریضہ کیا ہے۔

اور جس بات کی تاکید مطلوب ہے اس کی وضاحت بھی کر دی گئی جس پر ہر داعی کو اعتبار کرنا چاہئے وہ یہ کہ۔

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴۰ : ۷۸) "کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر خود کوئی نشانی لے آئے"۔

نفس انسانی کی یہ شدید خواہش ہوتی ہے' اگرچہ رسول ہی کیوں نہ ہو کہ دعوت اسلامی کے مخالفین دعوت اسلامی کو قبول کر لیں' اور اس کے مقابلے میں سرکشی اور ضد کرنے والے لوگ اس پر یقین کر لیں۔ اس لیے قدرتی طور پر انسانی نفوس معجزات کے صدور کی خواہش رکھتے ہیں تاکہ مخالفین کی زبانیں بند ہو جائیں اور وہ یقین کر لیں لیکن اللہ کی خواہش یہ ہے کہ اس کے مختار بندے صبر کا سہارا لیں اور اپنے آپ کو دعوت پر قائم رکھیں۔ یہ بات یوں کہی جاتی ہے کہ فتح و شکست کا معاملہ تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم دعوت پہنچا دو۔ رہا معجزہ دکھانا' تو یہ اللہ کا کام ہے'

جس وقت اللہ چاہے گا معجزہ آ جائے گا۔ تم اطمینان رکھو' ثابت قدم رہو اور دلجمعی سے کام کرو اور جو نتائج تمہارے ہاتھوں سے بر آمد ہوتے ہیں' ان پر صبر کرو' دعوت کا انجام اللہ کے سپرد کر دو۔

یہاں یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ لوگ حقیقت الوہیت کو بھی جان لیں اور منصب رسالت کو بھی سمجھ لیں۔ اور یہ جان لیں کہ رسول بھی بشر ہوتے ہیں۔ ان کو اللہ نے منصب نبوت کے لیے چن لیا ہوتا ہے۔ ان کے لیے فریضہ مقرر کر دیا جاتا ہے' نہ وہ طاقت رکھتے ہیں اور نہ ان کو اجازت ہے کہ اپنے فرائض کے حدود سے آگے بڑھیں۔

پھر یہ کہ معجزات کے آنے میں تاخیر ان کے لیے ایک نعمت ہے کیونکہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ جب معجزات آتے ہیں اور لوگ انکار کرتے ہیں تو اللہ پھر ایسی اقوام کو ہلاک کر دیتا ہے' اس لیے معجزہ نہ آنا دراصل ایک مہلت ہے اور یہ مہلت اللہ کی طرف سے ہے۔

فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِیَ بِالْحَقِّ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ (۴۰:۷۸) "پھر جب اللہ کا حکم آ گیا تو حق کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا۔ اور اس وقت غلط کار لوگ خسارے میں پڑ گئے"۔ اب پھر عمل اور توبہ یا واپسی کی کوئی مہلت باقی نہیں رہتی اور آخری فیصلہ ہو جاتا ہے۔

--- ○○○ ---

اب ان لوگوں کو جو معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں' ان آیات و معجزات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو اس کائنات میں بکھرے پڑے ہیں اور جن کو رات دن دیکھتے دیکھتے انسان ان کے ساتھ اس قدر مانوس ہو گیا ہے کہ اب وہ اس کے لیے معجزہ نہیں رہے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر ان پر غور و فکر کیا جاتا تو ہرگز مزید کسی معجزے کا مطالبہ نہ ہوتا۔ یہ تمام چیزیں اللہ کی الوہیت کی بھی نشانیاں ہیں' کیونکہ اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں ہے جو دعویٰ کر سکتا ہو کہ اس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے اور اسی طرح یہ دعویٰ بھی بادی النظر میں مسترد ہے کہ یہ تمام کائنات از خود وجود میں آ گئی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَ لَكُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَ لِتَبْلُغُوْا عَلَیْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَ عَلَیْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾

"اللہ ہی نے تمہارے لیے یہ مویشی جانور بنائے ہیں تاکہ ان میں سے کسی پر تم سوار ہو اور کسی کا گوشت کھاؤ۔ ان کے اندر تمہارے لیے اور بھی بہت سے منافع ہیں۔ وہ اس کام بھی آتے ہیں کہ تمہارے دلوں میں جہاں جانے کی حاجت ہو وہاں تم ان پر پہنچ سکو۔ ان پر بھی اور کشتیوں پر بھی تم سوار کیے جاتے ہو۔ اللہ اپنی یہ نشانیاں تمہیں دکھا رہا ہے' آخر تم اس کی کن کن نشانیوں کا انکار کرو گے"۔

ان مویشیوں کی ابتدائی تخلیق اسی طرح نشانی ہے جس طرح انسان کی تخلیق نشانی اور معجزہ ہے' ان حیوانات کے اندر

روح ڈالنا' ان کو اس شکل و صورت میں بنانا اور ان کو رنگا رنگ پیدا کرنا سب معجزات ہیں ۔پھر یہ تمام جانور اور مویشی انسان کے لیے مسخر کیے گئے ہیں حالانکہ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو جسم کے اعتبار سے بھی اور قوت کے اعتبار سے بھی انسان سے زیادہ قوی ہیں لیکن ۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ( ۴۰ : ۷۹ ) "اللہ ہی نے تمہارے لیے یہ مویشی جانور بنائے ہیں تاکہ ان میں سے کسی پر تم سوار ہو اور کسی کا گوشت کھاؤ" ۔اب اگر کوئی کہے کہ یہ جانور اسی طرح دنیا میں پائے گئے ہیں اور یہ کہ انسان کے لیے یہ کوئی معجزہ نہیں ہیں' یا یہ کہ یہ جانور کسی خالق پر دلالت نہیں کرتے جس نے انہیں پیدا کیا ہو اور انسان کے لیے مسخر کیا اور ان جانوروں کے اندر یہ خصائص موجود ہیں اور انسانوں کے اندر بھی یہ خصائص موجود ہیں تو اسی قسم کی باتیں قابل قبول نہیں ہیں اور انسانی کی فطری سوچ اس کے خلاف ہے ۔ لہذا جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ بہت ہی سطحی لوگ ہیں اور ان کی یہ باتیں بالکل سطحی اور محض جدال ہیں ۔

ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ ان آیات میں کیا کیا خوارق عادت معجزات ہیں اور کیا کیا نعمتیں ہیں ۔

لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ( ۴۰ : ۷۹ ) وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَ لِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَ عَلَيْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ( ۴۰ : ۸۰ ) "تاکہ ان میں سے کسی پر تم سوار ہو اور کسی کا گوشت کھاؤ ۔ان کے اندر تمہارے لیے اور بھی بہت سے منافع ہیں ۔وہ اس کام بھی آتے ہیں کہ تمہارے دلوں میں جہاں جانے کی حاجت ہو وہاں تم ان پر پہنچ سکو ۔ان پر بھی اور کشتیوں پر بھی تم سوار کیے جاتے ہو" ۔ اور وہ خواہشات جو ان کے دلوں میں ہوتی تھیں اور ان جانوروں پر سوار ہو کر وہ ان تک پہنچتے تھے ۔وہ بہت بڑی حاجات و ضروریات تھیں' خصوصاً اس دور میں ۔ اس دور میں نقل و حمل کے موجودہ ذرائع تو تھے نہیں ۔ لیکن آج تک یہ جانور بعض ضروریات پورا کرتے ہیں ۔ آج بھی بعض پہاڑ ایسے دشوار گزار ہیں کہ وہاں تک کوئی جہاز' کوئی ریل 'کوئی موٹر وغیرہ نہیں جاتے ۔وہاں یہی جانور کام آتے ہیں ۔ان پہاڑوں میں راستے اس قدر تنگ ہوتے ہیں کہ وہاں یہی جانور کام کرتے ہیں ۔

وَ عَلَيْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ( ۴۰ : ۸۰ ) "ان پر بھی اور کشتیوں پر تم سوار کیے جاتے ہو" ۔ یہ دونوں اللہ کی نشانیوں میں سے نشانیاں ہیں ۔اور اللہ کی ان مہربانیوں میں سے ہیں جو اس نے انسان پر کیں ۔کشتی کو پانی پر چلایا ۔یہ وہ خصوصیات ہیں جو پانی اور کشتی کے اندر تخلیق کے وقت رکھی گئیں ۔زمین میں بھی اور آسمان میں بھی ۔خشکی میں بھی اور تری میں بھی ۔ چاہے یہ کشتی بادبانوں سے چلے' بخارات سے چلے یا ایٹمی قوت سے چلے یا ان کے بھی علاوہ کسی اور قوت سے چلے جو اللہ نے اس کائنات میں رکھ دی ہیں اور انسان کو یہ توفیق بخشی ہے کہ وہ ان قوتوں کو کام میں لائے ۔اس لیے ان سب چیزوں کو اللہ کے معجزات اور اللہ کے دیئے ہوئے انعامات کے مضمون میں لایا گیا ہے ۔

اور اس قسم کی کئی آیات و معجزات اس کائنات میں جابجا بکھرے پڑے ہیں۔ انسان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ ان میں سے کسی معجزے اور انعام کا انکار کر سکے بشرطیکہ وہ سنجیدہ ہو۔

وَ یُرِیْکُمْ اٰیٰتِہٖ فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰہِ تُنْکِرُوْنَ (۴۰ : ۸۱) "اللہ اپنی یہ نشانیاں تمہیں دکھا رہا ہے' آخر تم اللہ کی کن کن نشانیوں سے انکار کرو گے"۔ ہاں بعض لوگ ہیں جو انکار کرتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو اللہ کی آیات میں جھگڑتے ہیں' بعض ایسے ہیں جو باطل دلائل لے کر آتے ہیں تاکہ ان کے ذریعے حق کو نیچا دکھائیں۔ لیکن ان سب میں سے کوئی بھی نیک نیت نہیں ہے یا اس کے اندر ٹیڑھ ہے یا کوئی مفاد ہے' یا کبر ہے یا اسے کوئی مغالطہ ہے یا کسی اور غرض کے لیے یہ کر رہا ہے۔

بعض لوگ اس لیے جھگڑتے ہیں کہ وہ فرعون اور دوسرے لوگوں کی طرح ذی جاہ اور سرکش اور ظالم ہیں' ان کو اپنی حکومت اور اقتدار کا خطرہ ہے' ان کو تخت و تاج کا خطرہ ہے' یہ تخت و تاج جن خاکوں پر قائم ہیں ان کو دعوت حق اڑا دیتی ہے' کیونکہ دعوت اسلامی کا نظریہ یہ ہے کہ الٰہ اور حاکم ایک ہوتا ہے۔

بعض لوگ اس لیے جھگڑتے ہیں کہ وہ مذہبی راہنما ہیں' بعض اس لیے جھگڑتے ہیں کہ وہ ایک خاص طرز کا نظام حکومت و معیشت چاہتے ہیں مثلاً اشتراکیت کے علم بردار' جب آسمانی عقائد و نظریات ثابت ہو جائیں تو ان کا نظریہ اڑ جاتا ہے۔ اسلام تو لوگوں کو زمین کے ساتھ نہیں چمٹاتا۔ پیٹ اور جسم کی خواہشات کا بندہ نہیں بناتا اور اللہ کی بندگی سے چھڑا کر کسی دوسرے نظریہ یا کسی دوسرے لیڈر کی بندگی میں داخل نہیں کرتا۔

بعض لوگ اس لیے جھگڑتے ہیں کہ وہ پاپائیت سے جان چھڑانا چاہتے ہیں جیسا کہ قرون وسطیٰ میں اہل کینسہ اور عوام کے درمیان ہوا۔ چونکہ عوام پاپائیت سے جان چھڑانا چاہتے ہیں' اس لیے انہوں نے اہل کینسہ کو ان کا الٰہ بھی واپس کر دیا۔ کیونکہ الٰہ کے نام سے انہوں نے لوگوں کو غلام بنا رکھا تھا۔

ان اسباب کے سوا اور بھی کئی اسباب ہیں' لیکن انسان کی فطری سوچ ان تمام اسباب کو مسترد کر دیتی ہے اور اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے جو اس کائنات کے وجود میں مستقلاً موجود ہے اور جس کی موجودگی کی نشاندہی کائنات کی یہ نشانیاں کرتی ہیں۔ اور آخر میں یہ زوردار تبصرہ:

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَ اَشَدَّ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِی الْاَرْضِ فَمَاۤ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ

مُشْرِكِيْنَ ﴿٨٤﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ ۹
قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٥﴾ ع ۷
۱۴

"پھر کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کو ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ ان سے تعداد میں زیادہ تھے' ان سے بڑھ کر طاقتور تھے' اور زمین میں ان سے زیادہ شاندار آثار چھوڑ گئے ہیں۔ جو کچھ کمائی انہوں نے کی تھی' آخر وہ ان کے کس کام آئی؟ جب ان کے رسول ان کے پاس بینات لے کر آئے تو وہ اسی علم میں مگن رہے جو ان کے اپنے پاس تھا' اور پھر اسی چیز کے پھیر میں آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو پکار اٹھے کہ ہم نے مان لیا اللہ وحدہ لاشریک کو اور ہم انکار کرتے ہیں ان سب معبودوں کا جنھیں ہم اس کا شریک ٹھیراتے تھے مگر ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان ان کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو سکتا تھا کیوں کہ یہی اللہ کا مقرر ضابطہ ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہا ہے اور اس وقت کافر لوگ خسارے میں پڑ گئے"۔

انسانی تاریخ میں گزشتہ اقوام کی تباہی کے ایام بہت ہیں اور بعض تو ایسے ہیں جس کے آثار آج بھی موجود ہیں اور ان کے مرثیہ خواں ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ زبانی روایات کے ذریعے ان کی کہانیاں محفوظ ہیں۔ بعض کی کہانیاں کتابوں کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ قرآن کریم بار بار ان ایام اللہ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس لیے کہ انسانیت جس لائن پر بڑھتی چلی آئی ہے اس میں جابجا حقائق موجود ہیں۔ پھر ان ایام اللہ کا اثر بھی انسان پر بہت گہرا ہوتا ہے۔ اور قرآن چونکہ خالق فطرت کی طرف سے نازل ہو رہا ہے اس لیے وہ فطرت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کرتا ہے۔ قرآن فطرت کی راہ و رسم سے خوب واقف ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ اس کی یہ مخلوق کس بات سے متاثر ہوتی ہے اور کس انداز سے اس کے دل میں بات اتاری جا سکتی ہے' اللہ کو پتہ ہے کہ انسانی دل کا کون سا دروازہ صرف ایک ہی دستک دینے سے کھل جاتا ہے اور کون سا دروازہ چند زوردار دستک دینے سے کھلتا ہے اور کون سا ہے جو زنگ آلود ہو گیا اور توڑے بغیر نہیں کھلتا۔

اللہ انسانوں سے پوچھتا ہے' انہیں انسانی تاریخ کی سیر کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے کہ ذرا کھلی آنکھوں سے انسانی تاریخ کے نشیب و فراز کو دیکھو۔ وادی وادی میں گھومو اور احساس کو تیز رکھو' اور قلب و نظر کو کھول کر چلو' دیکھو اور غور کرو' تم سے پہلے اس زمین پر کیا کیا ہوتا رہا ہے اور انسان پر کیا کیا مصائب ٹوٹے ہیں۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

( ۴۰ : ۸۲ ) "پھر کیا زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کو ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں"۔ قبل اس کے کہ ان کے انجام کو بتایا جائے' ان کے کچھ خدوخال بتائے جاتے ہیں اور ان کے حالات زندگی سے موازنہ کیا جاتا ہے تاکہ یہ عبرت آموزی مکمل ہو۔

كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ ( ۴۰ : ۸۲ ) "وہ ان سے تعداد میں

زیادہ تھے ' ان سے بڑھ کر طاقتور تھے اور زمین میں ان سے زیادہ شاندار آثار چھوڑ گئے ہیں"۔ کثرت تعداد' سیاسی قوت اور ترقی سب میں موجودہ لوگوں سے زیادہ تھے۔ ان میں سے کئی نسلیں تھیں جو عربوں سے پہلے گزری تھیں۔ بعض کے قصے تو رسول کو سنائے گئے اور بعض کو تاریخ کے قبرستان میں مدفون ہی چھوڑ دیا گیا اور بعض قصے عربوں کو معلوم تھے اور بعض کے آثار کو وہ شب و روز دیکھتے تھے۔

فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۸۲:۴۰) "جو کچھ کمائی انہوں نے کی تھی آخر وہ ان کے کس کام آئی"۔ نہ ان کی کثرت' نہ قوت اور نہ ترقی ان کو بچا سکی۔ حالانکہ وہ انہی چیزوں پر بھروسہ کیے ہوئے تھے اور مغرور تھے۔ بلکہ ان کی ہلاکت کا سبب یہی باتیں ہوئیں۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ (۸۳:۴۰) "جب ان کے رسول ان کے پاس بینات لے کر آئے تو وہ اس علم میں مگن رہے جو ان کے پاس تھا"۔ علم بغیر ایمان کے ایک عظیم فتنہ ہوتا ہے۔ یہ انسان کو اندھا کر دیتا ہے اور سرکش بنا دیتا ہے۔ اس قسم کے ظاہری اور سائنسی علوم لوگوں کو مغرور بنا دیتے ہیں کیونکہ ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ اپنے اس علم کی وجہ سے وہ اقتدار میں ہیں' بڑی بڑی قوتوں کو چلاتے ہیں اور بڑے بڑے خزانوں کے مالک ہیں۔ یوں وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور وہ ان وسعتوں کو بھول جاتے ہیں جن تک ابھی ان کے علم کو رسائی نہیں ہوئی ہے حالانکہ وہ وسعتیں اس کائنات میں موجود ہیں۔ ان قوتوں پر ابھی انہوں نے قابو نہیں پایا ہوتا ہے بلکہ ان کا تصور بھی وہ نہیں کر پاتے' ان کو تو وسعتوں کے صرف ایک معمولی کنارے تک رسائی ہوئی ہوتی ہے۔ یوں یہ بے ایمان صاحب علم پھول جاتا ہے اور آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس کا علم اسے بھلا دیتا ہے اور اس کا جہل اسے اپنی حقیقت بھلا دیتا ہے۔ اگر وہ یہ قیاس کر لیتا کہ اس کا علم تو بہت ہی تھوڑا ہے اور اس کے جہل کا دائرہ بہت وسیع ہے اور جس کا وہ اندازہ کرتا ہے وہ اس سے بہت تھوڑا ہے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تو وہ سر جھکا لیتا اور اپنی کبریائی کو تھوک دیتا اور یہ جو پھول رہا ہے اس میں ذرا کمی کر دیتا۔

بہرحال یہ لوگ جو اپنے موجودہ علم میں مگن ہو گئے تھے وہ یاد دہانی کرانے والوں کا مذاق اڑاتے رہے۔

وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۸۳:۴۰) "پھر اس چیز کے پھیرے میں آ گئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے"۔

جب انہوں نے اللہ کے عذاب کو دیکھا تو پردہ گر گیا اور ان کو معلوم ہو گیا کہ جس چیز پر ان کو غرور تھا وہ تو کچھ نہ تھی۔ اب انہوں نے اس بات کا اعتراف کر لیا جس کا وہ انکار کرتے تھے۔ اللہ کی وحدانیت کے قائل ہو گئے۔ اپنے شرکاء کا انکار کر دیا لیکن اب تو وقت چلا گیا تھا۔

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ

(۸۴:۴۰) فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا (۸۵:۴۰) "جب انہوں نے ہمارا

عذاب دیکھ لیا تو پکار اٹھے کہ ہم نے مان لیا اللہ وحدہ لاشریک کو اور ہم انکار کرتے ہیں ان سب معبودوں کا جنھیں ہم اس کا شریک ٹھیراتے تھے مگر ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان ان کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو سکتا تھا"۔ کیونکہ یہ اللہ کی سنت ہے کہ عذاب دیکھ لینے کے بعد ایمان قبول نہیں ہوتا اس لئے کہ اس وقت خوف کی توبہ ہوتی ہے۔ ایمان کی توبہ نہیں ہوتی۔

سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِهٖ (۴۰ : ۸۵) "کیونکہ یہی اللہ کا مقرر ضابطہ ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہا ہے"۔ اور اللہ کی سنت میں کوئی تغیر اور ترمیم نہیں ہوا کرتی۔ یہ اپنی مقرر راہ پر چلتی ہے۔

وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (۴۰ : ۸۵) "اس وقت کافر لوگ خسارے میں پڑ گئے"۔

--- ٥٥٥ ---

اس سخت منظر' یعنی منظر عذاب الہی پر یہ سورت ختم ہوتی ہے' جس میں یہ چیخ و پکار کرتے ہیں' جزع فزع کرتے ہیں اور معافیاں مانگتے ہیں' ایمان و یقین کا اعلان کرتے ہیں' سورت کا یہ خاتمہ سورت کی فضا اور موضوعات اور مضامین کے ساتھ متناسب ہے۔

اس سورت کے دوران ہم نے ایسے مسائل پر بھی بحث کی ہے جو خالص مکی سورتوں کے اہم مسائل ہیں' مثلاً مسئلہ توحید' مسئلہ معاد' مسئلہ وحی' لیکن یہ مسائل اس سورت کا اصل موضوع نہ تھے۔ اس کا اصل موضوع معرکہ حق و باطل تھا۔ ایمان و کفر تھا۔ اصلاح و سرکشی تھی۔ یہ اس سورت کے نمایاں موضوعات و مضامین تھے۔ اور اس سورت کے اہم خدوخال' اور تمام سورتوں کے مقابلے میں نمایت ہی نمایاں مقاصد .....

--- ٥٥٥ ---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ------ ۲۴

### سورۂ حم السجدۃ ۔ ۴۱

آیات ا--- تا--- ۴۶

# سورۃ حم السجدۃ ایک نظر میں

اسلامی نظریہ حیات اور اس کے اساسی عناصر اس سورت کا مرکزی مضمون ہے ۔یعنی مسئلہ الوہیت 'قیام قیامت اور وحی و رسالت ۔ ان مضامین کے ساتھ ایک مضمون یہ بھی اس سورت میں آتا ہے کہ دعوت اسلامی کا طریقہ کار کیا ہو گا اور داعی کے اخلاق کیسے ہونے چاہئیں ۔ اس سورت میں جو مضامین و مباحث بھی آئے وہ انہی مسائل کی تشریح و تفصیل ہیں ۔ ان موضوعات پر استدلال ہے اور آفاق اور انفس سے ان موضوعات پر دلائل جمع کیے گئے ہیں ۔ اس کے ساتھ جھٹلانے کے برے نتائج اور سابقہ جھٹلانے والوں کے برے انجام اور قیامت کے دن جھٹلانے والوں کے حالات اور یہ بیان کہ جن و انس میں سے مکذبین ان واضح حقائق کو تسلیم نہیں کرتے ۔ اور اللہ وحدہ کے سامنے نہیں جھکتے جبکہ زمین و آسمان اور شمس و قمر اور فرشتے سب کے سب اللہ کے سامنے جھکتے ہیں ۔ سجدہ کرتے ہیں 'خضوع و خشوع کرتے ہیں اور سر تسلیم خم کرتے ہیں اور مطیع فرمان رہتے ہیں ۔

سورت کے آغاز میں اللہ کی الوہیت کے بارے میں آتا ہے ۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ (۴۱ : ۶) "اے نبی 'ان سے کہو میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا' مجھے وحی کے ذریعہ سے بتایا جاتا ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے ۔ لہذا تم سیدھے اسی کا رخ اختیار کرو اور اس سے معافی چاہو ۔ اور تباہی ہے مشرکین کے لیے" ۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۱ : ۹) "اے نبی 'ان سے کہو 'کیا تم اس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھیراتے ہو 'جس نے زمین کو دو دنوں میں بنایا ۔ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے" ۔

عاد و ثمود کے بارے میں نقل کیا جاتا ہے کہ ان کے رسولوں نے بعینہ یہی بات ان سے کہی تھی ۔

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ (۴۱ : ۱۴) "کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو" ۔ اس قصے کے وسط میں آتا ہے ۔

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ (۴۱ : ۳۷) "سورج و چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا" ۔ اور سورت کے آخر میں ہے ۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَاءِي قَالُوا آذَنَّاكَ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيدٍ (۴۱ : ۴۷) "پھر جس روز وہ ان لوگوں کو پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک؟ یہ کہیں گے "ہم عرض کر چکے ہیں آج ہم میں سے کوئی اس کی گواہی دینے والا نہیں ہے"۔

مسئلہ آخرت کے بارے میں تو منکرین آخرت کو سب سے پہلے دھمکی ملتی ہے۔

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ (۴۱ : ۶) الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ (۴۱ : ۷) "تباہی ہے ان مشرکوں کے لیے جو زکوۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں"۔ اور سورت کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے۔

أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَاءِ رَبِّهِمْ أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ (۴۱ : ۵۴) "آگاہ رہو' یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں' سن رکھو وہ ہر چیز پر محیط ہے"۔ جبکہ قیامت کے مناظر میں بھی اس کے وقوع کو بطور حقیقت واقعہ پیش کیا گیا ہے بلکہ قیامت کے لیے ثبوت اور دلیل پیش کرنے کی نسبت اس کا منظر پیش کرنا زیادہ موثر طریقہ ہے۔

اور وحی و رسالت پر اس سورت میں کافی مواد موجود ہے' یوں لگتا ہے کہ یہ سورت کا اصل موضوع ہے' افتتاح یوں ہوتا ہے۔

حم (۴۱ : ۱) تَنزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ (۴۱ : ۲) كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۴۱ : ۳) بَشِيرًا وَنَذِيرًا فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ (۴۱ : ۴) وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِن بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ إِنَّنَا عَامِلُونَ (۴۱ : ۵) قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (۴۱ : ۶) "یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے' ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کھول کر بیان کی گئی ہیں' عربی زبان کا قرآن' ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں' بشارت دینے والا اور ڈرا دینے والا۔ مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے۔ کہتے ہیں جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہیں۔ ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں۔ اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا ہے۔ تو اپنا کام کر' ہم اپنا کام کیے جا رہے ہیں' کہہ دو میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا...." اور اس سورت کے درمیان آتا ہے کہ مشرکین نے قرآن کا استقبال یوں کیا۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ

(۴۱ : ۲۶) "یہ منکرین حق کہتے ہیں اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو شاید کہ

اسی طرح تم غالب آ جاؤ"۔ اس کے بعد بھی اس ردعمل کی تفصیلات آتی ہیں اور ان کے اقوال کا رد بھی کیا جاتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ (۴۱:۴۱) لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (۴۱:۴۲) مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ (۴۱:۴۳) وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ (۴۱:۴۴) "یہ وہ لوگ ہیں جن کے سامنے کلام نصیحت آیا تو انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زبردست کتاب ہے 'باطل نہ سامنے سے اس پر آ سکتا ہے نہ پیچھے سے یہ ایک حکیم و حمید کی نازل کردہ چیز ہے۔ اے نبی' تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں سے نہ کہی جا چکی ہو' بے شک تمہارا رب بڑا درگزر کرنے والا ہے 'اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا بھی دینے والا ہے۔ اگر ہم اس کو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے کیوں نہ اس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں۔ کیا ہی عجیب بات ہے کہ کلام عجمی ہے اور مخاطب عربی۔ ان سے کہو کہ یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت و شفا ہے مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے تو اس کے لیے یہ کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے۔ ان کا حال تو ایسا ہے جیسے ان کو دور سے پکارا جا رہا ہو"۔

طریقہ دعوت اور داعی کے اخلاق کے بارے میں کہا گیا ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۴۱:۳۳) وَلَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ (۴۱:۳۴) وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ (۴۱:۳۵) وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۴۱:۳۶) "اور اس شخص کی بات سے اچھی بات کس کی ہو گی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اور اے نبی نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو نیکی سے دفع کرو' جو بہترین ہو' تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے' یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں

اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو' تو اللہ کی پناہ مانگ لو' وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔

یہ مسائل گہرے شعوری دلائل اور اثر کرنے والے انداز کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں' اس کائنات میں جو بے شمار دلائل و نشانات پائے جاتے ہیں' ان کے دائرے کے اندر' پھر عالم نفس کے اندر جو نشانات ہیں' ان کے رنگ میں' پھر انسانی تاریخ کے سفر کے ساتھ جس میں گزرے ہوئے منکرین حق کے عبرتناک نشانات ہیں اور پھر ان مسائل کو مشاہد قیامت کی آہ و فغاں کی کے رنگ میں بھی لایا جاتا ہے جس کا انسان پر گہرا اثر ہوتا ہے اور اس سورت کے بعض مناظر تو منفرد قسم کے ہیں اور نہایت ہی خوفناک ہیں۔

اس کائنات کے مشاہد میں زمین و آسمان کی ابتدائی تخلیق کی کہانی جسے نہایت ہی تفصیل سے لیا گیا ہے۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۴۱:۹) وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (۴۱:۱۰) ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ (۴۱:۱۱) فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ اَوْحٰى فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَ حِفْظًا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (۴۱:۱۲) "اے نبیؐ' ان سے کہو' کیا تم اس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھیراتے ہو' جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا۔ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے' اس نے اوپر سے اس میں پہاڑ جما دیے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک انداز سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا۔ یہ سب کام چار دن میں ہو گئے۔ پھر وہ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ جو اس وقت محض دھواں تھا۔ اس نے آسمان اور زمین سے کہا' وجود میں آ جاؤ' خواہ تم چاہو' یا نہ چاہو"۔ دونوں نے کہا "ہم آ گئے فرمانبرداروں کی طرح"۔ تب اس نے دو دن کے اندر آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا۔ اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔ یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے"۔

ان نشانیوں ہی میں سے رات اور دن کی نشانی ہے' شمس و قمر کی نشانی ہے' ملائکہ کی عبادت و اطاعت کی نشانی ہے۔ زمین کی قانون قدرت کے سامنے اطاعت کی نشانی اور اس پر روئیدگی کی نشانی ہے۔

وَ مِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَ النَّهَارُ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَ لَا لِلْقَمَرِ وَ اسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۴۱:۳۷) فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا

فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ هُمْ لَا يَسْئَمُوْنَ (۴۱:۳۸) وَ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۴۱:۳۹) "اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند' سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو' بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو' جس نے انہیں پیدا کیا ہے اگر فی الواقع تم اسی کی عبادت کرنے والے ہو۔ لیکن اگر یہ لوگ غرور میں آکر اپنی ہی بات پر اڑے رہیں تو پرواہ نہیں' جو فرشتے تیرے رب کے مقرب ہیں وہ شب و روز اس کی تسبیح کر رہے ہیں اور کبھی نہیں تھکتے اور اللہ کی نشانیوں میں ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو زمین سونی پڑی ہوئی ہے۔ پھر جونہی کہ ہم نے اس پر پانی برسایا' یکایک وہ پھبک اٹھتی ہے اور پھول جاتی ہے۔ یقیناً جو خدا اس مری ہوئی زمین کو جلا اٹھاتا ہے وہ مردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔ یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

رہا نفس انسانی تو اس کی حقیقت کو بھی اس سورت میں کھولا گیا ہے اور انسانوں کے سامنے اسے صاف صاف کھلا اور واشگاف کر کے رکھ دیا ہے۔

لَا يَسْئَمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ وَ اِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوْسٌ قَنُوْطٌ (۴۱:۴۹) وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ (۴۱:۵۰) وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ (۴۱:۵۱) "انسان کبھی بھلائی کی دعا مانگتے نہیں تھکتا اور جب کوئی آفت اس پر آتی ہے تو مایوس و دل شکستہ ہوتا ہے' مگر جونہی سخت وقت گزر جانے کے بعد ہم اسے اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں' یہ کہتا ہے کہ "میں اس کا مستحق ہوں' اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کبھی آئے گی اگر میں واقعی اپنے رب کی طرف پلٹایا گیا تو وہاں بھی مزے کروں گا' حالانکہ کفر کرنے والوں کو لازماً ہم بتا کر رہیں گے کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں اور انہیں ہم بڑے گندے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ انسان کو جب ہم نعمت دیتے تو وہ منہ پھیرتا ہے اور اکڑ جاتا ہے اور اسے جب کوئی آفت چھو جاتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔

گزشتہ اقوام کی ہلاکتوں میں' قوم عاد اور قوم ثمود کے عذاب کو چنا گیا ہے۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ قَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ (۴۱:۱۵)

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ (۴۱ : ۱۶) وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۴۱ : ۱۷) وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ (۴۱ : ۱۸) "عاد کا حال یہ تھا کہ وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے "کون ہے ہم سے زیادہ زور آور" ان کو یہ نہ سوجھا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ زور آور ہے' وہ ہماری آیات کا انکار ہی کرتے رہے۔ آخر کار ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی تاکہ انہیں دنیا ہی کی زندگی میں ذلت اور رسوائی کا مزہ چکھا دیں اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی زیادہ رسواکن ہے۔ وہاں کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہو گا۔ رہے ثمود تو ان کے سامنے ہم نے راہ راست پیش کی مگر انہوں نے راستہ دیکھنے کے بجائے اندھا رہنا پسند کیا۔ آخر ان کے کرتوتوں کی بدولت ذلت کا عذاب ان پر ٹوٹ پڑا اور ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو ایمان لائے تھے اور گمراہی اور بد عملی سے پرہیز کرتے تھے۔

اس سورت کے نہایت ہی موثر مشاہد قیامت میں سے' بعض یہ ہیں :

وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ (۴۱ : ۱۹) حَتّٰى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۴۱ : ۲۰) وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۴۱ : ۲۱) "اور ذرا اس وقت کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف جانے کے لیے گھیر لائے جائیں گے۔ ان کے اگلوں کو پچھلوں کے آنے تک روک رکھا جائے گا۔ پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان' ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے "تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟" وہ جواب دیں گے ہمیں اس خدا نے گویائی دی جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے۔ اس نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا' اب اس کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو"۔ اور ایک وہ آیت جس میں دھوکہ دینے والوں پر ان لوگوں کا طیش جنہوں نے دھوکہ کھایا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ (۴۱ : ۲۹) "وہاں یہ کافر کہیں گے "اے ہمارے رب' ذرا ہمیں دکھا دے ان جنوں اور انسانوں کو جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا' ہم انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں گے تاکہ وہ خوب ذلیل و خوار ہوں"۔

۔۔ اس سورت میں اسلام کے بنیادی عقائد گہرے موثر دلائل کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ ان موثر دلائل و مناظر ہی سے اس سورت کی فضا' مزاج اور رنگ ڈھنگ کا پتہ بھی چلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سورت کے آغاز سے لے کر اختتام تک یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم زمین' آسمان اور دنیا و آخرت اور نفس انسانی کی گہرائیوں کی سیر کر رہے ہیں اور نہایت موثر مناظر و دلائل دیکھ رہے ہیں۔ اس سفر سے قلب و نظر کی تاروں سے تازہ بتازہ زمزمہ اٹھتا ہے۔

سورت میں دو ہی سبق ہیں اور یہ اپنے موضوعات اور ان پر دلائل و مناظر لے کر آگے بڑھتی ہے اور کڑیوں سے کڑیاں ملتی چلی جاتی ہیں۔ پہلا سبق ان آیات سے شروع ہوتا ہے جو نزول کتاب سے متعلق ہیں۔ کتاب کی نوعیت اور اس کے بارے میں مشرکین کا موقف بیان ہوا ہے۔ اس کے بعد زمین و آسمانوں کی تخلیق اور عاد و ثمود کے واقعات اور آخرت میں ان کے خلاف خود ان کے اعضا اور ان کی کھالوں کی شہادت کا منظر ہے' اس کے بعد یہ کہ دنیا میں وہ کس طرح گمراہ ہوئے' یوں کہ جن و انس کے کچھ ساتھی ان پر مسلط ہو گئے' انہوں نے ان کے اعمال کو ان کے لیے خوشنما بنا دیا' کفار کا یہ مشورہ کہ قرآن کو نہ سنو اور قیامت میں کافروں کی یہ خواہش کہ اللہ جن دو افراد نے ہمیں گمراہ کیا ذرا ان کو سامنے لائیے کہ ان کو روند ڈالیں۔ دوسری جانب اہل ایمان ہیں جن پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور جو اپنی دعوت پر استقامت سے گامزن ہیں۔ یہ فرشتے ان کو دنیا و آخرت میں خوشخبری دیتے ہیں۔ یہ اچھے ساتھی ہیں اور پھر دعوت اور داعی کے لیے ہدایات۔

دوسرے سبق کا آغاز گردش لیل و نہار اور گردش شمس و قمر سے ہوتا ہے' پھر ملائکہ عبادت گزار اور زمین اور اس کی سرسبزیاں۔ پھر کتاب الہی کا موضوع اور اس میں الحاد کرنے والے' کتاب موسیٰ اور اس میں اس کی قوم کا اختلاف اور آخرت میں اختلاف قوم موسیٰ کا فیصلہ وغیرہ مضامین آتے ہیں۔ اس کے بعد یہ کہ قیامت کا علم اللہ کو ہے۔ اور پھر اللہ کے علم کی وسعت کا عجیب بیان کہ تمام پھوٹنے والے پودوں' کلیوں' رحموں کی حالت اور ان میں پیدا ہونے والوں پر اللہ کا علم محیط ہے۔ قیامت کا منظر جہاں کافر اپنے شریک کیے ہوئے معبودوں کو تلاش کریں گے۔ نفس انسانی کی حالت اور انسان کی بے احتیاطیاں اور تکذیب کفر اور اس کے نتیجے میں ہلاکت اور آخر میں یہ وعدہ کہ اللہ انفس و آفاق میں اپنی نشانیوں کو عنقریب ظاہر کر دے گا!

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۴۱ : ۵۳) اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ (۴۱ : ۵۴) "عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھا دیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ فرمان واقعی برحق ہے کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔ آگاہ رہو' یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں۔ سن رکھو وہ ہر چیز پر محیط ہے۔ اس آخری تبصرے پر یہ سورت ختم ہوتی ہے۔

--- ooo---

# درس نمبر ۲۲۷ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۳۶

---

سُورَةُ حٰمٓ السَّجْدَةِ (۴۱) مَكِّيَّةٌ (۶۱)

اٰيَاتُهَا ۵۴ — رُكُوعَاتُهَا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ﴿۲﴾ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا
لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُونَ ﴿۳﴾ بَشِيرًا وَّنَذِيرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿۴﴾ وَ
قَالُوا قُلُوبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَ
بَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُونَ ﴿۵﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ
اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ ﴿۶﴾
الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُونَ ﴿۷﴾ اِنَّ الَّذِينَ اٰمَنُوا
۸ ع وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ﴿۸﴾
۱۵

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ح م' یہ خدائے رحمن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے' ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں' عربی زبان کا قرآن' ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں' بشارت دینے والا اور ڈرا دینے والا ہے۔ مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے۔ کہتے ہیں "جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں' ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک

ائل ہو گیا ہے تو اپنا کام کر ' ہم اپنا کام کیے جائیں گے"۔ اے نبی" ان سے کہو ' میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا۔ مجھے ں کے ذریعہ سے بتایا جاتا ہے کہ تمہارا خدا تو بس ایک ہی خدا ہے ' لہٰذا تم سیدھے اسی کا رخ اختیار کرو اور اس سے معافی چاہو۔ تباہی ہے ان مشرکوں کے لیے جو زکوۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں ' رہے وہ لوگ جنہوں نے مان لیا اور نیک اعمال کیے ' ان کے لیے یقیناً ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے"۔

حروف مقطعات کے بارے میں بات کئی سورتوں میں ہو چکی ہے اور اس افتتاح مکرر "حم" میں بھی وہی اشارہ ہے جس طرح قرآن کریم کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ بار بار ان حقائق کی طرف اشارہ کرتا ہے جو انسانی دل و دماغ پر اثر ڈالتے ہیں اور تکرار اس لیے کہ انسان کو بار بار کی یاد دہانی کی ضرورت ہے۔ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی نظر سے نصب العین اوجھل ہو جاتا ہے اور اس کے ذہن میں کوئی بھی شعوری حقیقت بٹھانے کے لیے ' اسے بار بار تنبیہہ کی ضرورت ہوتی ہے اور قرآن کا نازل کرنے والا اپنے تخلیق کردہ فطرت انسانی سے خوب واقف ہے۔ اور اس کے خصائص اور صلاحیتیں اسی نے عطا کی ہیں اس لیے وہ بار بار یاد دلاتا ہے ' وہ خالق قلب اور مصرف القلوب ہے۔

حٰمٓ (۴۱ : ۱) تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۴۱ : ۲) "یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے"۔ حم گویا سورت کا نام ہے یا جنس قرآن جو انہی حروف سے بنایا گیا ہے۔ حم مبتداء ہے اور تنزیل خبر ہے یعنی یہ ہیں حم (جن سے قرآن بنا ہے جو) رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل ہو رہا ہے۔

نزول کتاب کے وقت رحمٰن و رحیم کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ اس تنزیل کی صفات عالیہ رحمت الٰہیہ ہے۔ اور یہ کتاب اور حامل کتاب دونوں بطور رحمت اللعالمین آئے۔ یہ صرف ان لوگوں پر رحمت نہیں ہے جو ایمان لائیں اور اس کی اطاعت کریں۔ بلکہ غیروں کے لیے بھی رحمت ہے صرف انسانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام زندہ لوگوں کے لیے رحمت ہے کیونکہ اس کتاب نے ایک ایسا منہاج حیات دنیا کو دیا جس کی وجہ سے پوری دنیا متاثر ہوئی۔ انسانیت کو نئی زندگی ملی۔ اس کو تصورات دیئے ' اس کو علم دیا اور غرض اس قرآن نے انسانیت کے آگے بڑھنے کی سمت ہی بدل کر رکھ دی۔ قرآن کے رحیمانہ اثرات صرف اہل ایمان تک محدود نہ رہے بلکہ اس کے اثرات عالمی تھے اور اس وقت سے آج تک یہ اثرات جاری ہیں۔ جو لوگ انسانی تاریخ کا مطالعہ انصاف سے کرتے ہیں اور اس کا عام انسانی زاویہ سے مطالعہ کرتے ہیں اور اس مطالعہ میں انسانی سرگرمیوں کا پوری طرح احاطہ کرتے ہیں وہ اس حقیقت کو پاتے ہیں اور وہ اس نکتے پر مطمئن بھی ہوتے ہیں کہ قرآن رحمت اللعالمین ہے ' بعض منصف مزاج لوگوں نے اس بات کا اعتراف کر کے اس کو ریکارڈ بھی کرا دیا ہے۔

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۴۱ : ۳) "ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں ' عربی زبان کا قرآن ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں"۔ یعنی اغراض و مقاصد کے لحاظ سے ' لوگوں کی طبیعت اور سمجھ کے مطابق ' معاشروں اور زمانوں کے مطابق ' لوگوں کی نفسیات اور ان کی ضروریات کے مطابق اس کی آیات کو نہایت پختہ انداز میں مفصل بنایا گیا ہے۔ اور یہ اس کتاب کی امتیازی خصوصیت ہے اس زاویہ سے یہ کتاب مفصل اور محکم ہے۔ ان تمام پہلوؤں سے یہ کتاب مفصل ہے۔ پھر عربی زبان میں ہے۔

لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۴۱ : ۳) "ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں"۔ یعنی جن کے پاس علمی استعداد ہے وہ سمجھ سکتے ہیں اور کھرے کھوٹے میں تیز کر سکتے ہیں۔

اس قرآن کے نزول کا بڑا مقصد بشارت اور ڈراوا ہے۔

بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (۴۱ : ۴) "بشارت دینے والا اور ڈرانے والا"۔ یہ قرآن مومنین کو بشارت دیتا ہے اور مکذبین اور بدکاروں کو ڈراتا ہے اور پھر خوشخبری اور ڈراوے کے اسباب بھی بتاتا ہے۔ یہ اسباب وہ عربی مبین میں بتاتا ہے اور ان لوگوں کے سامنے پیش ہو رہا ہے جو عرب ہیں لیکن ان کی اکثریت اسے قبول نہیں کر رہی ہے۔

فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (۴۱ : ۴) "مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے"۔

اور یہ لوگ روگردانی اس لیے کرتے تھے اور نہ سنتے تھے اور اپنے دلوں کو روگردانی کر کے قرآن سننے سے بچاتے تھے۔ کیونکہ قرآن غضب کی تاثیر رکھتا ہے اس لیے جو جمہور عوام کو بھی اس بات پر ابھارتے تھے کہ نہ سنو جس طرح عنقریب اس کی تفصیلات آئیں گی۔

وَقَالُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱ : ۲۶) "منکرین حق کہتے ہیں اس قرآن کو نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو' شاید کہ اس طرح تم غالب آجاؤ"۔ بعض اوقات وہ سنتے تھے لیکن اس طرح جیسے کہ نہ سنتے ہوں' اس لیے قرآن کے ان پر جو اثرات پڑتے تھے' ہٹ دھری کی وجہ سے ان کا مقابلہ کرتے تھے گویا وہ بہرے ہیں' سنتے ہی نہیں۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ (۴۱ : ۵) "کہتے ہیں: جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں میں غلاف چڑھے ہوئے ہیں' ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا ہے' تو اپنا کام کر' ہم اپنا کام کیے جا رہے ہیں"۔ یہ بات وہ گہری ہٹ دھری اور عناد کی وجہ سے کہتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مایوس کرنے کے لیے کہتے تھے تاکہ آپ دعوت دینا بند کر دیں کیونکہ وہ آپ کی دعوت کا اثر خود اپنے دلوں میں پاتے تھے اور وہ بالارادہ اس موقف پر جمے ہوئے تھے کہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔

چنانچہ انہوں نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں' تمہاری بات تو ہمارے دلوں تک پہنچتی ہی نہیں۔ ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگے ہوئے ہیں' لہذا تمہاری بات ہم تک پہنچتی ہی نہیں۔ تمہارے اور ہمارے درمیان دبیز پردے حائل ہیں' اس لیے رابطے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں ہے۔ لہذا ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیں' ہمیں کوئی پرواہ نہیں ہے کہ تم کیا کرتے ہو' کیا کہتے ہو' کس سے ڈراتے ہو' کس کا وعدہ کرتے ہو' ہم اپنی راہ پر چلنے والے ہیں۔ تم چاہو تو اپنی راہ پر چلو' تمہاری جو مرضی ہے کرو۔ ہم نے سن کر نہیں دینا۔ جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو وہ لے ہی آؤ۔

ہمیں کوئی پرواہ نہیں ہے ۔

یہ تھے وہ حالات و مشکلات جن سے داعی اول صلی اللہ علیہ وسلم دوچار تھے ۔ لیکن اس کے باوجود آپ دعوت دیتے چلے جاتے تھے ۔ کبھی رکے نہیں تھے ۔ ان مایوس کن حالات سے کبھی آپ متاثر نہیں ہوئے ' کبھی آپ نے یہ نہیں سوچا کہ اتنا عرصہ ہو گیا ' اللہ کا وعدہ سچا نہیں ہوا اور نہ دشمنوں پر عذاب آیا ۔ آپ یہی کہتے کہ اللہ کے وعدے کا پورا ہونا میرے اختیار میں نہیں ہے ۔ میں تو ایک بشر ہوں ۔ اللہ کا پیغام میرے پاس آتا ہے اور میں تبلیغ کرتا ہوں ' لوگوں کو اللہ واحد کی طرف بلاتا ہوں اور جو مان لیں ' ان سے کہتا ہوں کہ اسی راستے پر جم جاؤ ' اور مشرکین کو انجام بد سے ڈراتا ہوں ا س کے بعد کے مراحل میرے اختیار میں نہیں ۔ میں تو ایک بشر اور مامور ہوں ۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ (۴۱ : ۶) " اے نبی " ان سے کہو ' میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا ۔ مجھے وحی کے ذریعہ سے بتایا جاتا ہے کہ تمہارا خدا تو بس ایک ہی خدا ہے ' لہٰذا تم سیدھے اسی کا رخ اختیار کرو اور اس سے معافی چاہو ۔ تباہی ہے ان مشرکوں کے لیے " ۔ کس قدر عظیم صبر ہے ! کس قدر برداشت ہے ! کیا عظیم ایمان ہے اور تسلیم و رضا ہے ! لیکن ایسی صورت حال کو صرف وہی داعی سمجھ سکتا ہے ' ایسے حالات پر وہی صبر کر سکتا ہے ' اس قسم کے حالات میں صرف وہی اپنے ماحول سے لاپرواہ ہو کر دعوت دیتے آگے بڑھ سکتا ہے اور اعراض ' تکذیب ' تکبر اور توہین آمیز سلوک کو برداشت کر سکتا ہے جو ایسے حالات سے دوچار ہو گیا ہو ' جس نے تجربہ کر لیا ہو کہ جلد بازی نہیں کرنی ' جس نے روگردانی کرنے والوں ' متکبرین اور سرکشوں کی مدافعت کی ہو ' جس نے دعوت کی راہ میں مشقت برداشت کی ہو ' اور جس نے دعوت کی راہ میں مشقت برداشت کرنے کا حوصلہ پایا ہو اور پھر ان مشکلات کے باوجود وہ ڈٹ گیا ہو ۔

ایسے ہی مقامات کی وجہ سے انبیاء و رسل کو بار بار ہدایت کی گئی ہے کہ صبر کریں ' کیونکہ دعوت کی راہ صبر کی راہ ہے ۔ طویل صبر ' اور صبر کی آزمائش سب سے پہلے اس خواہش میں ہوتی ہے ' جو بہت شدید ہوتی ہے کہ دعوت جلدی کامیاب ہو جائے ۔ نصرت جلدی آجائے ' نصرت کے نشانات بھی نہ ہوں لیکن داعی صبر ' استقامت اور تسلیم و رضا سے کام کیے جا رہا ہو ۔

اور ان مشکلات ' روگردانیوں اور کبر و لاپرواہی کے جواب میں رسول اللہ صرف یہ کہتے ہیں ۔

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ (۴۱ : ۶) الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۴۱ : ۷) " تباہی ہے ان مشرکوں کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں " ۔ اس مقام پر زکوٰۃ کے ذکر کی کوئی وقتی مناسبت ہوگی ' کسی روایت میں اس کا ذکر نہیں آیا ' کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور زکوٰۃ سن دو ہجری میں مدینہ میں فرض ہوئی ۔ اگرچہ اصولاً مکہ مکرمہ میں بھی معروف تھی ۔ مدینہ میں فرضیت کے ساتھ نصاب بھی مقرر ہو گیا ۔ اور اسے بطور معین فرض وصول کیا جانے لگا ۔ مکہ میں یہ ایک عام ' م ' تھا ۔ لوگ رضاکارانہ طور پر زکوٰۃ دیتے تھے ۔

اس کی کوئی حد نہ تھی اور ادائیگی دینے والے کے ضمیر پر چھوڑ دی گئی تھی ۔ کفر بالآخرۃ تو وہی کفر ہے جس کے نتیجے میں انسان دائمی تباہی کا مستحق ہو جاتا ہے ۔ بعض لوگوں نے اس آیت کی تفسیر میں زکوٰۃ سے مراد ایمان لانا اور شرک سے پاک ہونا لیا ہے ۔ یہ مفہوم بھی رد نہیں کیا جا سکتا' ایسے حالات میں اس کا احتمال ضرور ہے ۔

--- ○○○---

اب داعی حق ان کو یہ بتانے کے لیے کہ کفر و شرک کا ارتکاب کر کے وہ کس قدر عظیم جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں ۔ ان لوگوں کو اس کائنات کی سیر کراتے ہیں کہ ذرا تم زمین و آسمانوں پر مشتمل اس عظیم کائنات پر غور تو کرو' کہ تم اس کے مقابلے میں کس قدر چھوٹے ہو' کس قدر کمزور ہو' یہ سیر اس لیے کرائی جاتی ہے کہ ذرا وہ اللہ کی بادشاہت کو بھی دیکھ لیں جس کا وہ انکار کرتے ہیں کیونکہ انسان بھی فطرت کائنات کا ایک نہایت ہی حقیر جزء ہے اور تاکہ وہ ان کو بتائیں کہ اس دعوت کی طرف تم نہایت ہی تنگ زاویہ نظر سے دیکھ رہے ہو' تم صرف یہ دیکھ سکتے ہو کہ ہمچو ما دیگرے نیست ۔ تم تو صرف اپنے آپ کو اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو دیکھتے ہو اور تم یہ سوچتے ہو کہ محمد ابن عبداللہ کو اگر مان لیا تو وہ بلند مقام پر فائز ہو جائے گا ۔ تمہیں تو یہ تنگ نظری اس عظیم حقیقت کے دیکھنے سے روکے ہوئے ہے جو حضرت محمد ﷺ لے کر آئے ہیں' جس کی تفصیلات قرآن کریم میں درج ہیں ۔ یہ حقیقت جس کا تعلق آسمانوں' زمین' انسان' پوری انسانی تاریخ اور اس عظیم سچائی کے ساتھ ہے جو زمان و مکان سے وراء ہے ۔ اور جسے اس کائنات کے نقشے میں رکھا گیا ہے :

قُلْ اَىِٕنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۚ﴿۹﴾ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِیْنَ ﴿۱۰﴾ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآىِٕعِیْنَ ﴿۱۱﴾ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ اَوْحٰى فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ ۖۗ وَ حِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۱۲﴾

" اے نبی" ان سے کہو' کیا تم اس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا؟ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے ۔ اس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیئے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک انداز سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا ۔ یہ سب کام چار دن میں ہو گئے ۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا' جو اس وقت محض دھواں تھا ۔ اس نے آسمان اور زمین سے کہا "وجود میں آ جاؤ' خواہ تم چاہو یا نہ چاہو" ۔ دونوں نے کہا

''ہم آگئے فرمانبرداروں کی طرح''۔ تب اس نے دو دن کے اندر آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا۔ اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔ یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے''۔

اے پیغمبران سے کہو کہ تم جب کفر کرتے ہو اور لاپرواہی میں یہ عظیم بات کہہ جاتے ہو' یہ تو تم ایک بہت ہی بڑے جرم کا ارتکاب کرتے ہو' یہ نہایت ہی قبیح اور ناپسندیدہ فعل ہے' تم ایک ایسی ذات کا انکار کرتے ہو' جس نے زمین کو پیدا کیا' اس کے اندر پہاڑ پیدا کیے' ان کے اندر برکات پیدا کیں' اس زمین کے اندر رزق کی تمام ضروریات پوری پوری رکھ دیں' جس نے آسمانوں کو پیدا کیا اور یہ سب کام اس نے چار دنوں میں سرانجام دیئے اور تمام مانگنے والوں کے لیے ان کی ضروریات مہیا کر دیں جس نے آسمانوں کو پیدا کیا' منظم کیا' خصوصاً دنیا سے قریب والے آسمان کو خوب مزین کیا' زمین اور آسمان نے اس کے قوانین قدرت اور احکام کے سامنے سرتسلیم خم کر دیا' لیکن اے اہل زمین تم ہو کہ تم انکار کرتے ہو اور تکبر کرتے ہو۔

لیکن قرآن کی عبارت نے' قرآن کے انداز بیان کے مطابق ان مضامین کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ بات فوراً دل میں اتر جاتی ہے اور دل کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ ذرا نص قرآن کے الفاظ دوبارہ پڑھئے اور غور کیجئے۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۴۱ : ۹) وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (۴۱ : ۱۰) ''اے نبیؐ' ان سے کہو' کیا تم اس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھیراتے ہو' جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا۔ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے' اس نے اوپر سے اس میں پہاڑ جما دیئے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک انداز سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا۔ یہ سب کام چار دن میں ہو گئے''۔

یہاں زمین کی تخلیق کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اسے دو دنوں میں پیدا کیا گیا۔ زمین کی پیدائش کی مزید بات سے پہلے اس پر تبصرہ کر کے شرک کی نفی کی گئی اور بتایا گیا کہ

ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۴۱ : ۹) ''یہی جہاں والوں کا رب ہے''۔ تم اس رب کا انکار کر رہے ہو' اور اس کے ساتھ لوگوں کو شریک کر رہے ہو' جس زمین پر تم چل پھر رہے ہو' وہ تو اس نے بنائی ہے لہٰذا تکبر اور لاپرواہی تمہیں زیب نہیں دیتی۔ یہ تو بہت ہی قبیح فعل ہے۔ اس کے بعد پھر باقی بات۔

سوال یہ ہے کہ یہ دو دن کون سے دن ہیں' جس کے اندر زمین پیدا کی گئی اور جن دو دنوں میں پہاڑ پیدا کیے اور زمین کے اندر ضروریات زندگی پیدا کی گئیں اور یوں یہ چار دن ہو گئے؟

یہ ایام دراصل ایام اللہ ہیں اور ان کی طوالت کے بارے میں اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ ایام اس زمین کے ایام بہرحال

نہیں ہیں۔ کیونکہ زمین کے ایام تو وہ زمانی معیار ہے جو زمین کے پیدا ہونے اور اس کی گردش متعین ہونے کے بعد وجود میں آیا ہے۔ جس طرح اس زمین کے ایام ہیں۔ اور یہ گردش محوری اور سورج کے گرد سالانہ گردش کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں اسی طرح کواکب میں سے ہر ایک کے اپنے اپنے ایام ہیں۔ ستاروں کے اپنے ایام ہیں یہ زمین کے ایام سے مختلف ہیں۔ بعض زمین کے ایام سے چھوٹے اور بعض طویل ہیں۔

وہ ایام جن میں ابتداء زمین پیدا ہوئی' پھر اس میں پہاڑ پیدا ہوئے' پھر اس کے اندر حسب ضرورت رزق اور ضروریات رکھی گئیں' یہ کوئی اور ہی ایام تھے اور ان کا معیار بھی اور تھا۔ ہمیں اس کا علم نہیں ہے' لیکن اس قدر ضرور معلوم ہے کہ یہ ایام ان دنوں کے مقابلے میں بہت ہی طویل تھے۔

آج تک انسانی علم جہاں تک پہنچ سکا ہے' اس کے مطابق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے مراد وہ زمانے ہیں جن سے یہ زمین گزرتی رہی' یہاں تک کہ وہ اپنے موجودہ مدار میں ٹھہری' اس کا چھلکا سخت ہو گیا اور یہ زندگی کے قیام کے لیے قابل ہو گیا' جس زندگی کو ہم جانتے ہیں اور آج تک جو نظریات پیش ہوئے ہیں ان کے مطابق اس پر ہمارے زمین کے معیار ایام کے مطابق نو ہزار ملین سالوں کا وقت لگا۔

یہ بھی محض علمی نظریات ہیں اور ان نظریات کو تبصروں اور چٹانوں کے مطالعہ کے بعد مرتب کیا گیا ہے۔ قرآن کے مطالعہ میں ہم ان علمی نظریات کو آخری بات نہیں کہتے کیونکہ یہ فائنل تو ہیں نہیں۔ یہ نظریات ہیں اور ان میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ہم قرآن کو ان کا تابع تو نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر ان نظریات اور نص قرآنی کے درمیان قرب اور موافقت ہو تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نظریہ درست ہو سکتا ہے۔ اور ایسا نظریہ تشریح قرآن کا معاون بھی ہو سکتا ہے اور اس کے ذریعہ ہم قرآن کے مفہوم کے قریب جا سکتے ہیں۔

آج کل کے نظریات کے مطابق راجح قول یہی سمجھا جاتا ہے کہ زمین بھی کسی وقت ایک آگ کا گولا تھی جس طرح اس وقت سورج ہے اور گیس کی شکل میں تھی۔ اور یہ زمین بھی سورج ہی کا حصہ تھی' اس سے جدا ہو گئی' اس کے بارے میں سائنس دانوں کا اتفاق نہیں ہے کہ کیوں ہوئی اور کس طرح ہوئی البتہ اسے ٹھنڈا ہونے کے لیے طویل وقت لگا جبکہ اس کا پیٹ ابھی تک اسی حالت میں ہے۔ جہاں بڑے بڑے پہاڑ پگھل جاتے ہیں۔ اور کھولنے لگتے ہیں۔

"جب زمین کا چھلکا ٹھنڈا ہوا تو یہ سخت ہو گیا۔ پہلے پہل یہ سخت پتھر تھا اور پتھر کے پھر طبقے تھے۔ اوپر اور نیچے کے پتھر۔ اور نہایت ہی ابتدائی دور میں بخارات پیدا ہوئے جن کا ۲/۲حصہ ہائیڈروجن اور ۲/۱حصہ آکسیجن تھا۔ ان کے اتحاد کی وجہ سے زمین پر پانی پیدا ہو گیا۔

"ہوا اور پانی نے باہم تعاون کر کے چٹانوں کو توڑا اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کو ایک جگہ سے اٹھایا اور دوسری جگہ ڈھیر لگا دیا اور اس کی وجہ سے مٹی پیدا ہوئی جس میں فصل اگنا ممکن ہوا' اس طرح ہوا اور پانی نے پہاڑوں کو توڑا اور اونچی جگہوں کو پست کیا اور گڑھوں اور نیچی جگہوں کی بھرائی کا کام کیا۔ لہٰذا زمین کے اندر جو بھی چیز ہے یا ہونے والی ہے۔ اس میں ہمیں تعمیر و تخریب ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہیں"۔

"زمین کا اوپر کا حصہ جسے چھلکا کہہ سکتے ہیں' دائمی طور پر حرکت اور تغیر میں رہتا ہے۔ سمندر میں جب موجیں اٹھتی ہیں تو یہ چھلکا متاثر ہوتا ہے۔ سورج کی گرمی سے سمندر کا پانی بخارات بن جاتا ہے' آسمانوں کی طرف اٹھتا ہے' بادلوں کی

شکل اختیار کرتا ہے' زمین پر میٹھا پانی برساتا ہے ۔ موسلا دھار بارشیں ہوتی ہیں' سیلاب آتے ہیں' دریا بہتے ہیں' اور یہ اس زمین کے چھلکے کے اوپر چلتے ہیں اور اس میں اثرانداز ہوتے ہیں ۔یہ ایک پتھر اور چٹان پر یوں اثر انداز ہوتے ہیں کہ اسے ایک ، چٹان سے دوسری قسم کی چٹان میں بدل دیتے ہیں ۔ اور پھر یہ سیلاب اور دریا اسے اٹھاکر دوسری جگہ بھی لے جاتے ہیں اور صدیوں کے بعد پھر زمین کا چہرہ بدل جاتا ہے ۔ اور ہزاروں اور لاکھوں سالوں کے بعد وسیع تغیرات پیدا ہوتے ہیں' پھر پہاڑوں پر برف جمی ہے' یہ وہی کام کرتی ہے جو ہوا اور پانی کرتے ہیں اور سورج بھی زمین کی چھلکے پر ویسے ہی اثرات ڈالتا ہے جس طرح ہوا اور پانی ڈالتے ہیں ۔ یہ اسے گرم کرتا ہے ۔ پھر زمین کے اوپر زندہ جانور بھی زمین کے اس چہرے کو بدلتے رہتے ہیں اور آتش فشانی کا عمل بھی زمین پر تغیرات پیدا کرتا ہے ۔

"اس زمین کے چٹانوں کے بارے میں آپ کسی بھی جیالوجسٹ سے پوچھ سکتے ہیں' وہ چٹانوں کے بارے میں آپ کو بہت سی معلومات دے گا اور وہ اس کی تین بڑی اقسام بتائے گا --- مثلاً "ناری چٹانیں" (Igneous Rocks) جو زمین کے پیٹ کے پگھلے ہوئے مادے کی شکل میں باہر آئیں ۔ یہ مادہ پھر ٹھنڈا ہو گیا ۔ وہ آپ کو لاوا کی چٹان (Granites) بطور مثال پیش کرے گا اور پتھر دکھا کر آپ کو بتائے گا کہ اس کے اندر سفید' سرخ اور سیاہ چمکدار مادے ہیں ۔ یہ کیمیاوی مرکبات ہیں اور ان کا اپنا وجود ہے کیونکہ یہ مخلوط دھاتوں کے پتھر ہیں ۔ وہ یہ بتائے گا کہ تمام روئے زمین کا چھلکا انہی پتھروں سے بنا ہوا ہے ۔ جب یہ زمین تیار ہوئی بہت زمانہ پہلے' بارشیں شروع ہوئیں' زمین پر دریا بہے' یا برف پگھلی' طوفان چلے' سورج نے اثر دکھایا ۔ ان موثرات نے ان ناری چٹانوں کے اندر توڑ پھوڑ کا عمل کیا ۔ ان کے ملبے اور ان کے اندر کی کیمیاوی مواد سے یہ جدید چٹانیں تیار ہو گئیں اور لاوے کی ان چٹانوں سے کئی اور رنگ اور قسم کی چٹانیں تیار ہو گئیں ۔

"اب چٹانوں کی ایک دوسری اہم قسم ہے جس کو جیالوجی کی زبان میں گارے (Sedimentary Rocks) کی چٹانیں کہتے ہیں یہ وہ چٹانیں ہیں جو پانی' ہوا' سورج یا زندہ چیزوں کے عمل سے زمین کی اصلی سخت چٹانوں سے ٹوٹ پھوٹ کر بنیں اور ان کو Sedimentary اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اپنی اصلی جگہ میں نہیں ہوتی ہیں ۔ یہ اپنی اصلی چٹانوں سے ٹوٹ پھوٹ کر اور پانی' ہوا اور طوفان کی وجہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہیں اور وہاں گارے کی شکل میں جمع ہو کر جم جاتی ہیں"

"ان گارے کی چٹانوں کی مثال جیری پتھر ہیں جن سے پورا "مقطم" پہاڑ بنا ہوا ہے اس پہاڑ سے لئی قاہرہ پتھر توڑ کر اپنے مکانات بناتے ہیں ۔ ماہرین بتائیں گے کہ یہ کیلشیم کاربونیٹ (Calcium Carbonate) ہے اور یہ زمین سے زندہ چیزوں یا کیمیاوی عمل سے جدا ہوا' پھر ریت بھی اسی قسم کے پتھروں سے بنی ہوئی ہے نیز کیلشیم لیمڈ بھی اس قسم سے بنا ہے ۔ یہ بھی دوسری چٹانوں سے نکلا ہے ۔ مثلاً خشک گارے کے پتھر اور خشک بننے والی مٹی کے پتھر ۔ یہ تمام سابقہ اصول کے مطابق بنتے ہیں"

یہ سابقہ اصلی چٹانیں ہیں جن سے گارے کی (Sedimentary) چٹانیں بنیں جن کی اقسام مختلف ہیں ۔ تو معلوم ہوا کہ اصلی چٹانیں لاوے کی چٹانیں ہیں' جب زمین کی سطح جم گئی اور اس کی مائع حالت جاتی رہی اور یہ عمل بہت ہی پہلے ہوا' اس وقت سطح زمین پر لاوے کی چٹان کے سوا کچھ نہ تھا ۔ پھر بخارات اور پانی پیدا ہوا اور اس نے لاوے کی چٹان پر توڑ پھوڑ کا عمل شروع کیا ۔ اس میں ہوا اور مختلف قسم کی گیسوں نے بھی کام کیا ۔ سخت طوفانوں اور سورج کی گرمی نے بھی

لمداد دی ۔ یہ سب مراحل جمع ہوئے اور اپنے اپنے طبیعی اور مزاج کے مطابق کام کیا اور یہ لاوے کے پتھر مفید پتھروں کی شکل میں بدلے ۔ اب ان پتھروں سے عمارت بنتی ہیں ۔ معدنیات نکالی جاتی ہیں ۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس سخت لاوے کے پتھر ہی سے مٹی نکالی گئی 'جو سطح زمین پر مختلف مقامات پر جمع ہوئی اور یہی مٹی نباتات و حیوانات کے لیے تمہید بنی ۔

''لاوے کی چٹانیں کھیتی 'فصل اور آبپاشی کے لیے مفید نہیں ہے ۔ لیکن اس سے ' نرم و ملائم مٹی نکلتی ہے یا'' جیسی دوسری چٹانوں سے یہ مٹی جمع ہوتی ہے اور اس مٹی سے پھر نباتات و حیوانات پیدا ہوئے ۔ اور یوں اس زمین کے رئیس المخلوقات انسان کی پیدائش کے لیے راہ ہموار ہوئی ۔(۱)

یہ طویل سفر جس کا انکشاف علم جدید نے کیا ہے 'اس کی مدد سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ زمین و آسمان کی تخلیق میں جو ایام لگے ' زمین کی تخلیق 'اس کے اوپر پہاڑوں کی تنصیب 'اس کے اندر برکات و ضروریات کی تشکیل پر جو چار دن لگے ' یہ ایام اللہ کے چار دن تھے جن کی طوالت کا ہمیں علم نہیں کہ ان کی طوالت کا کیا معیار و مقیاس ہے ۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ وہ یقیناً ہماری اس زمین کے ایام نہ تھے ۔

اب ہم نص قرآنی کے ایک ایک فقرے پر غور کریں گے 'قبل اس کے کہ ہم زمین کے موضوع کو چھوڑ کر آسمان کی طرف چلیں :

وَ جَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا (۴۱ : ۱۰) ''اور اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیئے''۔ بعض اوقات ان پہاڑوں کے لیے رواسی کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے ۔ رواسی کے معنی لنگر انداز ہونے والی کشتی اور پہاڑ ہیں اور بعض جگہ پہاڑوں کو رواسی کہہ کر

اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ ''کہ تم ڈھلک نہ جاؤ''۔ یعنی زمین لنگر انداز ہے 'یہ پہاڑ اسے ایک جگہ ٹکاتے ہیں 'تاکہ انسان ڈھلک نہ جائیں ۔ ایک وقت ایسا تھا کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ زمین ایک جگہ جمی ہوئی ہے اور مستحکم بنیادوں پر ٹھہری ہوئی ہے ۔ اب ایسا وقت آگیا ہے کہ یہ زمین تو ایک کرہ ہے 'چھوٹی سی گیند جو فضا میں تیر رہی ہے اور کسی چیز کا سہارا نہیں لے رہی ہے ۔ جب انسانوں کو سب سے پہلے یہ بات بتائی گئی ہوگی تو وہ پریشان ہو کر دائیں بائیں دیکھ رہے ہوں گے کہ واقعی کہیں ہم گر نہ جائیں ۔ ڈھلک نہ جائیں ۔ یا ہم فضا کی گہرائیوں میں نہ اڑ جائیں ۔ اطمینان رکھو' اللہ نے اس کو فضا ہی میں تھامے رکھا ہے اور زمین و آسمان دونوں اپنی جگہ سے ہٹ یا پھسل نہیں سکتے ۔ اگر ان کا توازن کبھی بگڑ گیا تو پھر اللہ کے سوا کوئی اسے قائم بھی نہیں کر سکتا ۔ اطمینان کیجئے! اللہ نے جو قوانین فطرت کائنات میں جاری کیے ہیں وہ بہت ہی پختہ ہیں اور اللہ قوی و عزیز ہے ۔

ذرا پہاڑوں کا مزید مطالعہ درکار ہے ۔ ان کو اللہ نے ''رواسی'' کہا ہے ۔ یہ زمین کو باندھتے ہیں کہ وہ ڈھلک نہ جائے' جیسا کہ ظلال القرآن میں ہم نے دوسری جگہ یہ نکتہ بیان کیا کہ سمندروں کے اندر جو گہرائیاں ہیں اور زمین کے اوپر جو بلندیاں ہیں یہ دونوں حصوں کا توازن برابر کرتی ہیں ۔ یوں زمین کے دونوں حصے سمندری اور خشکی متوازن ہو

(۱) کتاب مع اللہ فی السماء

جاتے ہیں۔۔۔۔ایک سائنس دان کی سنئے !

" زمین کے اندر جو حادثہ ہوتا ہے اس کی سطح پر یا اندر 'اس کی وجہ سے زمین کا مادہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کو منتقل ہوتا ہے 'یہ اس کی گردش کو متاثر کرتا ہے ۔ اس میں صرف مد و جزر ہی واحد عامل نہیں ہے ۔ یعنی زمین کی رفتار میں کمی کے بارے میں 'یہاں تک کہ دریا ایک جگہ سے جو پانی دوسری جگہ کو منتقل کرتے ہیں اس کا بھی زمین کی رفتار پر اثر ہوتا ہے ۔ ہوائیں جو ادھر سے ادھر جاتی ہیں 'یہ بھی اثر انداز ہوتی ہیں ۔ سمندروں کے اندر کی سطح کا جگہ جگہ گرنا اور خشکی کی سطح کا جگہ جگہ سے اٹھنا بھی گردش زمین کی رفتار کو متاثر کرتا ہے اور یہ چیز بھی زمین کی گردش کی رفتار کو متاثر کرتی ہے کہ کسی جگہ سے زمین پھیلے یا سکڑے ۔اگرچہ یہ سکڑنا اور پھیلنا چند اقدام تک محدود کیوں نہ ہو"۔

غرض یہ حساس زمین 'جس کی حساسیت کے بارے میں ہم نے یہ مطالعہ کیا 'کیا بعید کہ اس کی رفتار کی تیزی میں یہ اونچے اونچے پہاڑ توازن قائم کرتے ہوں اور وہ اس کو غیر متوازن ہونے سے روکتے ہوں ۔یہی وجہ ہے کہ قرآن نے آج سے چودہ سو سال قبل یہ بات کہہ دی اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ "کہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے"۔

وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا ( ۴۱ : ۱۰ ) "اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس میں ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا" ۔یہ فقرہ ہمارے اسلاف کے ذہنوں میں یہ مفہوم منتقل کرتا ہو گا کہ فصلیں اگا دیں اور زمین کے اندر بعض مفید جمادات اور دھاتیں رکھ دیں مثلاً سونا چاندی اور لوہا وغیرہ۔ لیکن آج اللہ تعالیٰ نے انسان پر زمین کی جو برکات کھول دی ہیں اور جو صدیوں پہلے اس زمین میں رکھ دی گئی تھیں اور ہم ان سے استفادہ کرتے ہیں تو اس فقرے کا مفہوم بہت ہی وسیع ہو گیا ہے ۔

اب ہم نے دیکھ لیا کہ کس طرح ہوا کے عناصر نے تعاون کیا اور پانی تشکیل ہوا اور کس طرح پانی اور ہوا نے تعاون کیا اور سورج اور طوفانوں نے تعاون کیا اور مٹی کی تشکیل ہوئی جو قابل زراعت بن گئی ۔ اور پانی 'سورج 'ہواؤں کے باہم تعاون سے بارشیں برسیں 'یہ بارش ہی ہے جس کے ذریعہ سے تمام پانی فراہم ہوتے ہیں ۔ میٹھی نہروں کے ذریعے 'دریاؤں اور ندیوں کے ذریعے اور زمین کے اندر کے ذخیروں اور چشموں کے ذریعہ 'یہ سب برکات و ارزاق ہی تو ہیں ۔ اور پھر ہوا اور ہمارا اور تمام حیوانات کا نظام تنفس اور ہمارے جسم ۔

" زمین ایک کرہ اور گیند ہے ۔ اس کے اوپر چٹان کی ایک تہہ ملفوف ہے اور اس چٹان کی تہہ کے اکثر حصے کے اوپر پانی کی تہہ ہے جس سے یہ چٹان ملفوف ہے ۔ پھر اس پانی اور چٹان کی تہہ کے اوپر ایک ہوائی کرہ ہے جو دبیز گیس کی شکل میں دنیا کو ملفوف کیے ہوئے ہے ۔ یہ ہوائی کرہ سمندر کی طرح ہے ۔ اس کی سمندر کی طرح گہرائی ہے ۔ ہم انسان اور حیوان اور نباتات ہوا کے اس سمندر کی تہہ میں زندہ رہ رہے ہیں اور بڑے مزے سے رہ رہے ہیں"۔

"ہوا میں ہم سانس لیتے ہیں 'آکسیجن لیتے ہیں 'ہوا ہی سے نباتات اپنا جسم بناتے ہیں 'ہوا ہی سے کاربن لیتے ہیں بلکہ آکسائیڈ سے کاربن لیتے ہیں جسے اہل کیمیا کاربن ڈائی آکسائیڈ کہتے ہیں ۔ نباتات اپنا جسم کوئلے کے آکسائیڈ سے بناتے ہیں ۔ ہم نباتات کھاتے ہیں اور ہم حیوانات کو بھی کھاتے ہیں ۔ اور حیوانات نباتات کو کھاتے ہیں ۔ دونوں سے ہمارا جسم تیار ہوتا ہے ۔ ہوا میں نائٹروجن ہے 'یہ آکسیجن کو خفیف بناتی ہی ۔ ورنہ ہم سانس لیتے ہی جل جائیں ۔ پانی کے بخارات ہوا کے

اندر رطوبت پیدا کرتے ہیں۔ کچھ دوسری گیس ہیں جو قلیل مقدار میں پائی جاتی ہیں اور غیر مرتب ہیں۔ ان میں ہیلیم' نیون وغیرہ اور ہائیڈروجن گیس' یہ ہوا میں ابتدائی تخلیق کے وقت سے موجود ہیں۔ (۱)

وہ مواد جو ہم کھاتے ہیں اور اپنی زندگی میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں' جبکہ رزق اس مواد سے وسیع مفہوم رکھتا ہے جو صرف پیٹ میں جاتا ہے' یہ سب چیزیں اس اصلی مواد اور عناصر پر مشتمل ہیں جو یہ زمین اپنے پیٹ میں رکھتی ہے یا فضا میں رکھتی ہے۔ مثلاً چینی کیا چیز ہے۔ یہ کاربن ہائیڈروجن اور آکسیجن کا مرکب ہے اور پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن سے مرکب ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے کھانے اور پینے کی چیزوں کے بڑے مرکبات ہیں۔ نیز لباس اور آلات بھی انہیں عناصر سے بنتے ہیں' جو اس زمین کے اندر اللہ نے ودیعت کیے ہیں۔

یہ ہیں وہ امور جو اس زمین کی برکات اور اس کے اندر موجود ذرائع رزق کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کو چار دنوں یا چار طویل ادوار' یعنی ایام اللہ میں بنایا گیا جن کی مقدار ہمیں معلوم نہیں ہے۔

---ooo---

ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ (۴۱ : ۱۱) فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَحِفْظًا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ

(۴۱ : ۱۲) "پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا' جو اس وقت محض دھواں تھا۔ اس نے آسمان اور زمین سے کہا "وجود میں آ جاؤ' خواہ تم چاہو یا نہ چاہو"۔ دونوں نے کہا "ہم آ گئے فرمانبرداروں کی طرح"۔ تب اس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیئے' اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔ یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے"۔

استواء کا مفہوم یہاں ارادہ کرنا ہے۔ اور اللہ کی طرف سے قصد کرنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف اپنے ارادے کو متوجہ کر دے۔ ثم بعض اوقات ترتیب زمانی کے لیے نہیں ہوتا بلکہ معنوی ارتقاء کے لیے بھی آتا ہے۔ آسمان چونکہ انسانوں کو ارفع اور بلند نظر آتے ہیں اس لیے اس کے لیے ثم کا لفظ آیا۔

ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ (۴۱ : ۱۱) "پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ اس وقت محض دھواں تھا"۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ستاروں کی تخلیق سے قبل ایک حالت تھی جیسے "سدم" کی حالت ہوتی ہے اور یہ ایک قسم کا گیس تھا' جیسے دھواں ہوتا ہے۔

"سدم (Black Whole) میں جو گیس اور غبار ہوتا ہے وہ وہی ہوتا ہے' جو ستاروں کی تخلیق سے بچ گیا ہوتا

---

(۱) حوالہ سابق

ہے۔ نظریہ تخلیق کائنات یہ ہے کہ کہکشاں گیس اور غبار سے مرکب ہوتی ہے۔ جب یہ گیس اور غبار زیادہ کثیف ہو گئے تو اس کے نتیجے میں ستارے پیدا ہوئے۔ کچھ ملبہ رہ گیا۔ یہ بقیہ ملبہ سدم کی شکل اختیار کر گیا۔ اس وسیع کہکشاں میں اس کا جو حصہ باقی ہے وہ منتشر ہے۔ گیس اور غبار کی شکل میں۔ اس کی مقدار اتنی ہے جتنے ستارے بن گئے۔ یہ ستارے اس بقیہ گیس اور غبار کو اپنی طرف اپنی جاذبیت کے ذریعے کھینچتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس عمل سے آسمانوں کی صفائی ہو رہی ہے لیکن اس غبار کو جذب کرنے والے ستارے اس ہولناک فضا میں بہت تھوڑے ہیں۔ اور جن علاقوں کو اس سے صاف ہونا ہے وہ بہت ہی وسیع ہیں"۔

یہ بات صحیح ہو سکتی ہے کیونکہ یہ اس مفہوم سے زیادہ قریب ہے۔ جو اس آیت میں ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ (۴۱:۱۱) "پھر وہ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا اور وہ اس وقت دھواں تھا"۔ یہاں تک کہ اس سے آسمان بنائے اور ان میں دو ایام اللہ صرف ہوئے یعنی طویل عرصہ۔

اس کے بعد اب ہم اس حقیقت پر غور کریں گے۔

فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ (۴۱:۱۱) "اس نے آسمان اور زمین سے کہا: وجود میں آ جاؤ، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو"۔ دونوں نے کہا "ہم آ گئے فرمانبرداروں کی طرح"۔ اس آیت میں عجب اشارہ ہے اس قانون قدرت اور ناموس فطرت کی طرف جو اس کائنات میں چلایا گیا ہے اور اس کائنات کا تعلق اپنے خالق کے ساتھ اطاعت اور سر تسلیم خم کر دینے کا تعلق ہے۔ پوری کائنات اللہ کی مشیت اور حکم کے مطابق چل رہی ہے۔ یہاں صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جو اللہ کے ناموس کے سامنے مجبور ہو کر سر طاعت خم کرتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے۔ یہ انسان بھی یقینی طور پر اس ناموس فطرت کا مطیع فرمان ہے، اس سے نکل نہیں سکتا۔ یہ اس عظیم کائنات کا نہایت ہی معمولی پرزہ ہے۔ اور اس کائنات کے کلی قوانین اس پر بھی نافذ ہیں خواہ وہ راضی ہو یا نہ ہو، لیکن اس کائنات میں یہ انسان واحد ذات شریف ہے جو اللہ کی اطاعت اس طرح نہیں کرتا جس طرح ارض و سما کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اطاعت سے آزاد کرنا چاہتا ہے یا راہ حق سے انحراف چاہتا ہے جو مستقیم اور آسان ہے، لہٰذا وہ قوانین فطرت سے ٹکراتا ہے اور یہ بات لازمی ہے کہ یہ قوانین اس پر غالب آ کر اسے پاش پاش کر دیتے ہیں۔ اس وقت یہ پھر کر مطیع فرمان ہوتا ہے۔ ہاں اللہ کے وہ بندے جن کے دل، جن کا وجود، جن کی حرکات، جن کے تصورات، جن کا ارادہ، جن کی خواہشات اور جن کا رخ نوامیس فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو ایسے بندے پھر خوشی خوشی سے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور اس کائنات کے ساتھ ہمقدم ہو کر نہایت تعاون سے چلتے ہیں اور جس طرح یہ پوری کائنات اللہ کی سمت چلتی ہے۔ وہ بھی اسی سمت رواں دواں ہوتے ہیں۔ وہ کائناتی قوتوں کے ساتھ لڑتے ہیں، جب مومن اس مقام تک پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کے ہاتھوں معجزات کا صدور ہوتا ہے کیونکہ اس نے ناموس قدرت کے ساتھ اتحاد کر لیا ہے۔ اس کائنات کی عظیم قوتیں اس کی پشت پر آ جاتی ہیں۔ اور یہ عظیم قوت جب اللہ کی راہ میں چلتی ہے تو مطیع فرمان ہو کر چلتی ہے۔

ہم اگر اللہ کی اطاعت کرتے ہیں تو مجبور ہو کر کرتے ہیں۔ کاش کہ ہم خوشی سے مطیع فرمان ہوتے۔ کاش ہم بھی زمین و آسمان کی طرح خوشی سے اطاعت کرتے، رضا اور خوشی سے۔ اس حال میں کہ ہم روح کائنات کے ساتھ ہم

آہنگ ہو چکے ہوں اور نہایت خوشی اور خضوع و خشوع کے ساتھ لبیک کہتے ہوئے اور سر تسلیم ختم کرتے ہوئے اللہ رب العالمین کی طرف چلیں۔

بعض اوقات ہم سے بڑی مضحکہ خیز حرکات سرزد ہوتی ہیں' تقدیر کی گاڑی اپنی شاہراہ پر چلتی ہے' تیزی سے چلتی ہے۔ اپنی سمت پر چلتی ہے' یہ پوری کائنات اس کے ساتھ چلتی ہے۔ مستقل قوانین فطرت کے مطابق چلتی ہے۔ ہم آتے ہیں اور ہمارا یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ ہم تقدیر سے بھی آگے ہو جائیں یا تقدیر سے سست روی اختیار کر لیں حالانکہ ہم اس عظیم کائنات کا حصہ ہیں۔ ہم اپنی نفسیاتی کمزوریوں کی وجہ سے جب قافلہ کائنات سے الگ ہو جاتے ہیں تو ہمارے سفر کی سمت ہی بدل جاتی ہے اور یہ سمت اس لیے بدلتی ہے کہ ہم بے چین' جلد باز' لالچی' مطلب پرست اور ڈرپوک ہو جاتے ہیں۔ اور قافلہ ایمان اور قافلہ کائنات سے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں' ہم کبھی اس طرف ٹکراتے ہیں' کبھی ادھر لڑھکتے ہیں اور دردپاتے ہیں' ادھر گرتے ہیں' ادھر حادثہ کرتے ہیں' اور پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ جبکہ کائنات کی گاڑی اپنے راستے پر' اپنی مقررہ رفتار کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف جا رہی ہے۔ اور اسی طرح ہماری تمام قوتیں' تمام جدوجہد بے کار ہو جاتی ہیں لیکن جب ہمارے دل ایمان سے لبریز ہوں' ہم اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں' روح کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں' اس وقت ہمیں معلوم ہو گا کہ ہمارا کردار کس قدر حقیقی ہے۔ پھر ہم اپنے قدموں اور تقدیر کی رفتار کے درمیان توازن پیدا کر دیں گے۔ اور ہم مناسب وقت میں مناسب رفتار سے مناسب سمت کی طرف حرکت کریں گے۔ ہمارے ساتھ اس پوری کائنات کی قوت شامل ہوگی۔ اور ہم عملاً بہت عظیم کام کر سکیں گے' سوائے اس کے کہ ہم پر کبر و غرور کا اثر ہو' کیونکہ ہمیں تو اصل حقیقت معلوم ہوگی کہ جس قوت کے ذریعے ہم یہ کارہائے نمایاں کر رہے ہیں' اس کا سرچشمہ تو دراصل کوئی اور ہے۔ یہ ہماری ذاتی قوت نہیں ہے۔ ہماری قوت میں یہ برکت اس لیے پیدا ہو گئی کہ یہ اس کائنات کے اندر ودیعت کردہ اللہ کی قوت کے ساتھ یکجا ہو گئی ہے۔

کیا ہی سعادت مندی ہوگی' کیا رضامندی ہوگی' کس قدر راحت ہوگی اور کس قدر اطمینان ہو گا' کہ ہم اس کرۂ ارض پر جو اللہ کو لبیک کہنے والا ہے' اپنا یہ مختصر سفر اس خوشی میں' اس کرۂ ارض کی معیت میں طے کریں اور آخر کار رب تعالیٰ کے ہاں ایک بڑے سفر کے آغاز کے لیے پہنچ جائیں۔

وہ کیا عظیم امن و سلامتی ہوگی جب ہم ایک ایسی کائنات میں زندہ رہ رہے ہوں جو ہماری دوست ہو' سب کی سب اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والی ہو اور ہم بھی اللہ کے مطیع فرمان ہوں۔ ہم دونوں ہمقدم ہوں' دشمنی پر نہ ہوں' دوست ہوں' کیونکہ ہم اس کائنات کا حصہ ہیں اور اسی کے ہمہ رخ ہیں۔

قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ (۴۱ : ۱۱) "ہم آگئے فرمانبرداروں کی طرح"۔

فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ (۴۱ : ۱۲) "تب اس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیئے۔

وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (۴۱ : ۱۲) "اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا"۔ یہ

دو دن وہی ہو سکتے ہیں جن میں سدم سے ستارے تیار ہوئے یا جن میں ان کی تشکیل مکمل ہوئی۔ حقیقت اللہ ہی جانتا ہے۔ ہر آسمان کی طرف اس کے امور کی وحی کے معنی یہ ہیں کہ اس پر قوانین قدرت نافذ کر دیئے۔ اور ہدایت کر دی کہ یوں چلو، پھر آسمان کے حدود کیا ہیں تو اس کا تعین فی الحال ہم نہیں کر سکتے۔ دوری کا ایک درجہ ایک آسمان ہو سکتا ہے۔ ایک کہکشاں ایک آسمان ہو سکتی ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک دوری تک جس قدر کہکشاں ہیں وہ ایک آسمان ہوں یا اس کا اور سوم بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ بلندیاں سات ہیں۔

وَ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَ حِفْظًا (۴۱ : ۱۲) "اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے محفوظ کر دیا"۔ سماء دنیا کا بھی کوئی متعین مفہوم نہیں ہے، اس سے مراد قریب ترکہکشاں بھی ہو سکتی ہے جو ہمارے ہاں شمسی کہکشاں کے نام سے مشہور ہے اور جس کا قطر ایک لاکھ ملین نوری سال ہے۔ یا کوئی اور معیار ہو اللہ کے نزدیک جس پر لفظ سما کا اطلاق ہوا ہو۔ اس میں ستارے اور سیارے ہیں جو ہمارے لیے چراغ ہیں اور بہت خوبصورت ہیں۔

حفاظت کس چیز سے؟ شیطانوں سے۔ قرآن میں دوسری جگہ اس کی تصریح ہے۔ پھر شیاطین کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن کریم میں جو افعال ان کی طرف منسوب ہیں اور جو اشارے ہیں، ان کے بارے میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی حقیقت اور ماہیت کا علم اللہ کو ہے۔

ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۴۱ : ۱۲) "یہ سب کچھ ایک زبردست اور علیم ہستی کا منصوبہ ہے۔ کون ہے اللہ کے سوا جو اس عظیم اور ہولناک کائنات کو چلا سکتا ہے؟ صرف اللہ زبردست اور علیم و حکیم، اس کام کو کر سکتا ہے، جو ہر چیز سے باخبر ہے۔

--- ooo ---

ایک عظیم کائناتی سفر کے بعد اللہ کا انکار کرنے والوں کے موقف کی کیا وقعت رہ جاتی ہے اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتے ہیں ان کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے، جبکہ آسمان و زمین دونوں بیک زبان کہتے ہیں کہ ہم ہیں مطیع فرمان۔ لیکن انسان ہے اور کیا انسان؟ اس کائنات کے اعتبار سے ایک نہایت چھوٹی سی چیونٹی بلکہ جرثومہ، بے وقعت، جو زمین پر رینگتا ہے۔ یہ نہایت ہی لاپرواہی، غرور کے ساتھ کہتا ہے کہ میں نہ مانوں!--- کیا سزا ہونی چاہئے ایسے لوگوں کی، ایسے لاپرواہ متکبرین کی!

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ﴿۱۳﴾ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ قَالُوْا

مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ
وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ
لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى
وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَي الْهُدٰى
فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۲
وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸﴾ ۱۰ اع
۱۶

"اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اسی طرح کے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں' جیسا عاد و ثمود پر نازل ہوا تھا۔ جب خدا کے رسول ان کے پاس آگے اور پیچھے ہر طرف سے آئے اور انہیں سمجھایا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو' تو انہوں نے کہا "ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا' لہذا ہم اس بات کو نہیں مانتے جس کے لیے تم بھیجے گئے ہو"۔ عاد کا حال یہ تھا کہ وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے "کون ہے ہم سے زیادہ زور آور"۔ ان کو یہ نہ سوجھا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ زور آور ہے؟ وہ ہماری آیات کا انکار ہی کرتے رہے' آخر کار ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی تاکہ انہیں دنیا ہی کی زندگی میں ذلت و رسوائی کے عذاب کا مزہ چکھا دیں' اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی زیادہ رسوا کن ہے' وہاں کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہو گا۔ رہے ثمود' تو ان کے سامنے ہم نے راہ راست پیش کی مگر انہوں نے راستہ دیکھنے کے بجائے اندھا بنا رہنا ہی پسند کیا' آخر ان کے کرتوتوں کی بدولت ذلت کا عذاب ان پر ٹوٹ پڑا اور ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو ایمان لائے تھے اور گمراہی و بدعملی سے پرہیز کرتے تھے"۔

یہ فی الحقیقت ایک خوفناک ڈراوا ہے۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (۴۱ : ۱۳) "اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اسی طرح کے اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا عاد و ثمود پر نازل ہوا تھا"۔ یہ ڈراوا مشرکین کے جرائم اور نہایت ہی مکروہ بدکاریوں کے لیے نہایت مناسب تھا جس طرح کے غرور میں مشرکین مکہ مبتلا تھے' جس کا ذکر سورت کے آغاز میں ہوا' نیز وہ اس پوری کائنات کی روش اطاعت سے بھی پھرے ہوئے تھے' جس کا ذکر اس ڈراوے سے متصلاً پہلے ہوا۔

اس ڈراوے کے قصے کے بارے میں ابن اسحاق نے روایت کی ہے یزید ابن زیادہ سے انہوں نے محمد ابن کعب قرظی سے' انہوں نے کہا مجھے یہ بتایا گیا کہ عتبہ ابن ربیعہ نے' جو قریش کا ایک سردار تھا' ایک دن جبکہ وہ قریش کی محفل

میں بیٹھا ہوا تھا' اور رسول اللہ ﷺ مسجد الحرام میں اکیلے بیٹھے ہوئے تھے کہنے لگا سرداران قریش 'کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ میں محمد سے بات کروں اور ان کے سامنے کچھ تجاویز پیش کروں' شاید وہ ان میں سے بعض کو قبول کرلے - وہ جو چاہے ہم اس کو دے دیں اور وہ ہمیں معاف کر دے - یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت حمزہ اسلام لے آئے تھے - اور سرداران قریش نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں تو اضافہ ہو رہا ہے - وہ تو زیادہ ہو رہے ہیں بلکہ لوگ کثرت سے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں - اہل مجلس نے کہا ابوالولید یہ تو بہت اچھی بات ہے - آپ انھیں اور اس سے بات کریں - عتبہ اٹھا اور حضورؐ کے پاس گیا' یہ رسول اللہؐ کے پاس بیٹھا اور کہا' بھتیجے! تو ہم میں خاندانی مقام و مرتبہ کے اعتبار اور جاہ و نسب کے لحاظ سے ایک ممتاز مقام رکھتا ہے - تو نے اپنی قوم کو ایک بہت بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے - قوم کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا ہے - تو نے ان کے نظریات اور عقائد کی تضحیک بھی کی - ان کے دین اور الہوں پر نکتہ چینی کی - پھر تو نے ان آباو اجداد کی تکفیر کی جو چلے گئے ہیں - لہٰذا اب میری کچھ تجاویز سنو' ان پر غور کرو - اگر تم ان میں سے بعض تجاویز کو قبول کرو' تو آپؐ نے فرمایا ابو الولید آپ کہیں میں سنتا ہوں - تو اس نے کہا: ''بھتیجے تم نے جو تحریک چلا رکھی ہے اگر اس سے تمہاری غرض مال و دولت جمع کرنا ہے تو ہم تمہارے لیے مال و دولت کی بڑی مقدار جمع کرتے ہیں - یہاں تک کہ تم سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ گے' اگر تم اقتدار چاہتے ہو تو ہم تمہیں ایسے اختیارات کے ساتھ سردار بناتے ہیں کہ تمہاری مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہ ہو سکے گا - اور اگر سرداری سے بھی آگے تم بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تمہیں بادشاہ بنا دیتے ہیں - اور اگر یہ صورت ہے کہ جو تم پر آتا ہے وہ کوئی بیماری ہے جسے تم اپنے آپ سے دور نہیں کر سکتے ہو تو ہم تمہارے لیے بڑے بڑے طبیب لاتے ہیں اور اس میں بہت کچھ خرچ کرنے کے لیے تیار ہیں یہاں تک کہ تم تندرست ہو جاؤ' کیونکہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے پیچھے لگنے والا اس پر غالب ہو جاتا ہے اور اسے اس کا علاج کرانا پڑتا ہے - یہ تھی عتبہ کی تقریر جو اس نے کی - جب عتبہ فارغ ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی باتیں غور سے سن رہے تھے تو آپؐ نے فرمایا: آپ کی بات ختم ہوگئی تو اس نے کہا ''ہاں'' - حضورؐ نے فرمایا سنئے میری بات' تو اس نے بھی کہا بات کیجئے' حضورؐ نے فرمایا

حٰمٓ (۴۱:۱) تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ (۴۱:۲) كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۴۱:۳) بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (۴۱:۴)

''ح م' یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے' ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں' عربی زبان کا قرآن' ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں' بشارت دینے والا اور ڈرا دینے والا ہے - مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے'' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سورت اس کے سامنے پڑھتے رہے - عتبہ نے سنا تو وہ خاموش رہا اور اپنے ہاتھ اپنی پیٹھ کے پیچھے لگا کر ان پر ٹیک لی اور سنتا رہا یہاں تک کہ رسول اللہؐ سجدے کے مقام تک آئے' تو حضورؐ نے سجدہ فرمایا - اس کے بعد فرمایا: ابو الولید تم نے سن لیا - اب تم جانو اور تمہارا کام - عتبہ اٹھا اور اپنے ساتھیوں کی طرف گیا - انہوں نے ایک دوسرے سے کہا' ہم خدا کی

قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ابوالولید کا چہرہ وہ نہیں ہے جس کے ساتھ وہ گیا تھا۔ جب وہ ان کے پاس بیٹھا' تو انہوں نے پوچھا ابو الولید کیا خبر لائے ہو۔ تو اس نے کہا خبر یہ ہے کہ خدا کی قسم میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے' اپنی زندگی میں' میں نے ایسا کلام ہرگز نہیں سنا۔ خدا کی قسم یہ جادو نہیں ہے' یہ شعر نہیں ہے' یہ کہانت نہیں ہے۔ اے برادران قریش میری بات مانو اور یہ معاملہ میرے حوالے کر دو' اس شخص کو چھوڑ دو وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے' اسے کرنے دو' اسے اپنے حال پر چھوڑ دو' خدا کی قسم وہ جو کچھ کہتا ہے' آئندہ اس کی بڑی اہمیت ہوگی۔ اگر دوسری عرب اقوام نے اسے کچل دیا تو وہ تمہاری مصیبت کو ختم کر دیں گے تمہارے بغیر ہی۔ اور اگر یہ شخص عربوں پر غالب آ گیا تو اس کی بادشاہی تمہاری بادشاہی ہوگی۔ اس کی عزت تمہاری عزت ہوگی اور تم اس کے ذریعہ خوشحال ترین لوگ ہو جاؤ گے تو انہوں نے کہا "خدا کی قسم' ابو الولید تم پر اس نے اپنی باتوں سے جادو کر دیا۔ اس پر اس نے کہا کہ میری رائے تو یہی ہے' تم جو چاہو' کرو"۔

علامہ بغوی نے اپنی تفسیر میں ایک حدیث نقل کی ہے (محمد ابن فضل سے' انہوں نے اجلح سے) یہ اجلح ابن عبداللہ الکندی الکوفی ہیں۔ (اس آدمی کے بارے میں ابن کثیر نے کہا کہ یہ کسی قدر ضعیف ہے) اس نے زیال ابن حرملہ سے انہوں نے حضرت جابر ابن عبداللہؓ سے کہ جب حضورؐ اس آیت تک آئے۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (۴۱ : ۱۳) تو عتبہ نے آپؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور صلہ رحمی کا واسطہ دیا۔ اور یہ عتبہ اپنے گھر چلا گیا اور پھر قریش کی محفل میں نہ آیا اور اپنے آپ کو ان سے دور رہنے کے لیے گھر میں بند کر لیا۔

اس ذراوے کے اثرات کی ایک صورت آپ نے دیکھی کہ حضورؐ کی زبان سے ایک غیر مسلم نے اسے سنا اور وہ کانپ اٹھا۔ اس حدیث پر غور ابھی ختم نہیں ہوا ذرا رکئے' رسول اللہ کی تصویر دیکھئے' اس عظیم انسان کے آداب گفتگو دیکھئے۔ آپ کے اطمینان قلبی کو دیکھئے' آپ نے بڑے اطمینان سے عتبہ کے منہ سے نہایت گری ہوئی باتیں سنیں جن کی آپ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں ہے۔ لیکن آپ کا دل اپنے عظیم مقصد کو چھوڑ کر نیچے نہیں آتا۔ یہ چھوٹی چھوٹی پیش کشیں آپ کو گندی تجاویز محسوس ہوتی ہیں جن سے آپ کا نفس نفرت کرتا ہے لیکن حضورؐ نہایت ہی حلم کے ساتھ ان کو سنتے ہیں۔ شریفانہ انداز میں سنتے ہیں۔ آپ مطمئن' ٹھہرے ہوئے' سنجیدہ اور محبت کرنے والے کی طرح سنتے ہیں۔ آپ صبر سے عتبہ کو یہ گری ہوئی تجاویز پیش کرنے دیتے ہیں۔ جب وہ بات ختم کرتا ہے تو پھر بھی آپ جلدی نہیں کرتے نہایت ہی اطمینان کے ساتھ پوچھتے ہیں اور کے ساتھ۔ "ابو الولید تم فارغ ہو گئے"؟ وہ کہتا ہے ہاں۔ تو آپ فرماتے ہیں اچھا اب میری بات سنو۔ اور آپ اس وقت تک نہیں شروع کرتے جب تک وہ کہہ نہیں دیتا کہ سنائیے۔ اب حضور نہایت اطمینان' اعتماد اور بھرپور انداز میں شروع کرتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ایسی تصویر ہے جسے دیکھتے ہی دل میں ہیبت و احترام کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اعتماد و محبت پیدا ہوتی ہے۔ اور اطمینان ہو جاتا ہے کہ آپ ایک عظیم شخصیت ہیں' یہی وجہ ہے کہ آپ کے سامعین پر آپ چھا جاتے تھے' جو بھی آپ کی طرف آتا وہ مسحور ہو کر لوٹتا یا مبہوت ہو جاتا۔ اللہ نے سچ کہا کہ اللہ جانتا ہے کہ وہ منصب رسالت کس کے سپرد کرتا ہے --- اب ہم اس واقعہ کو چھوڑ کر نص قرآنی کی طرف آتے ہیں۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (۴۱:۱۳) "اگر یہ منہ موڑیں تو ان سے کہہ دیں کہ میں تم کو اسی طرح کے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا کہ عاد وثمود پر نازل ہوا تھا"۔ یہ ایک سفر ہے گزری ہوئی اقوام کے کھنڈرات کی سیر کے لیے۔ جبکہ اس سے قبل قرآن نے ہمیں آسمانوں کی وسعتوں کی سیر کرائی۔ یہ ایک ایسی سیر ہے جو خوف کے مارے دلوں کو ہلاکر رکھ دیتی ہے کہ کیسی کیسی اقوام کو اللہ نے تباہ کیا جو اس جہاں میں اپنے خیال کے مطابق بڑے بنے ہوئے تھے۔

اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ (۴۱:۱۴)

"جب خدا کے رسول ان کے پاس آگے اور پیچھے' ہر طرف سے آئے اور انہیں سمجھایا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو"۔ یہ وہی ایک کلمہ ہے جسے تمام انبیاء ورسل نے پیش کیا اور جس پر تمام ادیان حقہ کی عمارت تعمیر ہوئی۔

قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۴۱:۱۴) "تو انہوں نے کہا' ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا لہٰذا ہم اس بات کو نہیں مانتے' جس کے لیے تم بھیجے گئے ہو"۔ یہ بھی وہی اعتراض ہے جس کا سامنا تمام انبیاء ورسل نے کیا۔ حالانکہ انسانوں سے خطاب کرنے والے رسول کو انسان ہی تو ہونا چاہیے' جو ان کو جانتا ہو' اور جسے وہ جانتے ہوں' جس کے اندر لیڈرشپ کے حقیقی اوصاف وہ پائے جاتے ہوں۔ وہ انہی مشکلات میں رہتا ہو' جس میں وہ رہتے ہوں' لیکن عاد اور ثمود نے اپنے رسولوں کی دعوت کا انکار کر دیا۔ اور اس لیے کر دیا کہ وہ بشر کیوں ہیں۔ ان کی تجویز کے مطابق ملائکہ کیوں نہیں۔

یہاں تک تو عاد وثمود دونوں کی بات ایک تھی کہ دونوں پر عذاب ایک سخت کڑک دار آواز یا دھماکے سے آیا تھا۔ اب یہاں سے آگے ان کی ہلاکت کی تفصیلات الگ تھیں۔ اس لیے الگ الگ بیان کیا گیا۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً

(۴۱:۱۵) "عاد کا حال یہ تھا کہ وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے "کون ہے ہم سے زیادہ زور آور"۔ حق تو یہ ہے کہ انسان اللہ کے سامنے جھکے اور زمین میں استکبار نہ کرے۔ پھر انسان ذرا اللہ کی عظیم خلقت کے مقابلے میں اپنے آپ کو دیکھے' لہٰذا اس کرۂ ارض پر اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنا کسی استحقاق کے بغیر ہی ہوتا ہے۔ پھر استکبار کے بعد اظہار غرور بہت بڑا جرم ہے کہ ہچو ما دیگرے نیست۔

مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (۴۱:۱۵) ہر سرکش ڈکٹیٹر یہی کچھ سمجھتا ہے۔ یہ اس شعور کے تحت ایسا کرتا ہے کہ اب ہماری قوت کے برابر کوئی دوسری بڑی قوت نہیں ہے' لیکن یہ ڈکٹیٹر بھول جاتے ہیں۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً (۴۱:۱۵) "ان کو یہ نہ سوجھا کہ

جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے' وہ ان سے زیادہ زور آور ہے؟" غرض بادی النظر میں ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کو پیدا کرنے والی ذات بہرحال ان سے زیادہ قوت والی ہے' کیونکہ یہ خالق ہی ہے جس نے ان کو یہ محدود قوت فراہم کی ہے لیکن کوئی سرکش اس بات کو نہیں سمجھا کرتا۔

وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ (۴۱ : ۱۵) "وہ ہماری آیات کا انکار ہی کرتے رہے"۔ یہ لوگ اس منظر میں تھے' اپنے زور بازو کا مظاہرہ کر رہے تھے' اپنی قوت پر اترا رہے تھے کہ اچانک پردہ گرتا ہے اور ایک دوسرا منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس منظر میں یہ پوری طرح پٹے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کو ان کے قابل نفرت کبر و غرور کی مناسب سزا دے دی جاتی ہے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۴۱ : ۱۶) "آخر ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی تاکہ انہیں دنیا ہی کی زندگی میں ذلت و رسوائی کے عذاب کا مزہ چکھا دیں"۔ یہ نہایت ہی تیز رفتار' مسلسل چلنے والی ہوا تھی' جس نے ان لوگوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا' سخت سرد دنوں میں سخت سردی کے ساتھ آئی' یہ تباہی تو ان کے لیے دنیا کی زندگی میں شرمندگی تھی۔ ان لوگوں کے لائق سزا تھی یہ جو دنیا میں بڑے بنتے ہیں۔ تکبر کرتے اور لوگوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو اونچا سمجھتے ہیں۔ یہ تو تھی دنیا میں' لیکن آخرت میں بھی یہ لوگ بچ نہ سکیں گے۔

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ (۴۱ : ۱۶) "اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی رسواکن ہے' وہاں کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہو گا"۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (۴۱ : ۱۷) "رہے ثمود تو ان کو ہم نے سیدھا راستہ دکھایا مگر انہوں نے اس راستے پر چلنے کی بجائے اندھا بنا رہنا ہی پسند کیا"۔ اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ ناقہ کی نشانی کے بعد انہوں نے ہدایت قبول کر لی تھی۔ پھر مرتد ہو گئے اور کفر کی راہ اپنائی اور ہدایت پر اندھے پن کو ترجیح دے دی۔ اور ہدایت پا لینے کے بعد گمراہ ہونا اندھے پن کے مشابہ ہے۔

فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۴۱ : ۱۷) "آخر ان کے کرتوتوں کی بدولت ذلت کا عذاب ان پر ٹوٹ پڑا"۔ اور ذلت آمیز عذاب ان کے لیے مناسب تھا' یعنی صرف ہلاک ہی نہ کیے گئے بلکہ ان کی ارتداد کی وجہ سے اور ہدایت کے بعد ضلالت کی وجہ سے ان کو ذلیل بھی کیا گیا۔

وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ (۴۱ : ۱۸) "اور ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو ایمان لائے تھے اور بدعملی سے پرہیز کرتے تھے"۔ یہ سفر عاد و ثمود کی بربادی پر ختم ہوتا ہے اور یہ نہایت ہی ڈراؤنا سفر ہے۔ اس

میں قارئین کو بتایا گیا کہ اللہ کی قوت کا کیا عالم ہے ۔ اور اس کی بادشاہت کیسی ہے ۔ ان کی قوت کا اللہ کی قوتوں سے کوئی مقابلہ نہیں اور اللہ کی بادشاہت سے کوئی قلعہ نہیں بچا سکتا ۔ اور کوئی خود ساختہ بڑا اس بادشاہت میں نہیں رہ سکتا ۔

--- ooo ---

اب جبکہ فطرت کائنات کے اندر اللہ کی قوتوں کا مطالعہ کر لیا گیا ۔ انسانی تاریخ میں اللہ کے فیصلوں کو ہم نے دیکھ لیا کہ کتنی کتنی طاقتور تہذیبوں کو نیست و نابود کیا گیا ۔ اب اللہ ان کو بتاتا ہے کہ خود نفس انسانی پر اللہ کی بادشاہت کس طرح قائم ہے کہ خود اپنی ذات کی کسی چیز کے بھی وہ مالک نہیں ہیں ۔ اور اللہ کے اقتدار سے وہ اپنی ذات کی کوئی چیز بھی بچا کر نہیں رکھ سکتے ۔ یہاں تک کہ ان کے کان ' ان کی آنکھیں ' ان کا گوشت و پوست بھی اللہ کے مطیع فرمان ہیں اور جب قیامت کا دن آئے گا تو یہ سب خود انسان پر گواہ ہوں گے ۔ اس وقت انسان کی حیرانگی کا عالم کیا ہو گا ! ملاحظہ کیجئے :

وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿١٩﴾ حَتَّىٰ
إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُم بِمَا كَانُوا
يَعْمَلُونَ ﴿٢٠﴾ وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوا أَنطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي
أَنطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢١﴾ وَمَا كُنتُمْ
تَسْتَتِرُونَ أَن يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَٰكِن
ظَنَنتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٢٢﴾ وَذَٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي
ظَنَنتُم بِرَبِّكُمْ أَرْدَاكُمْ فَأَصْبَحْتُم مِّنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٢٣﴾ فَإِن يَصْبِرُوا فَالنَّارُ مَثْوًى
لَّهُمْ ۖ وَإِن يَسْتَعْتِبُوا فَمَا هُم مِّنَ الْمُعْتَبِينَ ﴿٢٤﴾

” اور ذرا اس وقت کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف جانے کے لیے گھیر لائے جائیں گے ۔ ان کے اگلوں کو پچھلوں کے آنے تک روک رکھا جائے گا ' پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے رہیں ۔ وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے ” تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی ؟ “ وہ جواب دیں گی ” ہمیں اسی خدا نے گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے ۔ اسی نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اب اسی کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو ۔ تم دنیا میں جرائم کرتے وقت جب چھپتے تھے تو تمہیں یہ خیال نہ تھا کہ کبھی تمہارے اپنے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہارے جسم کی کھالیں تم پر گواہی دیں گی ۔ بلکہ تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ تمہارے بہت سے اعمال کی اللہ کو بھی خبر نہیں ہے ۔ تمہارا یہی گمان جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا ' تمہیں لے ڈوبا اور اسی کی بدولت تم خسارے میں پڑ گئے “ ۔ اس حالت میں وہ صبر کریں (یا نہ کریں)

آگ ہی ان کا ٹھکانا ہوگی ' اور اگر رجوع کا موقع چاہیں گے تو کوئی موقع نہیں نہ دیا جائے گا"۔

یہاں اچانک قارئین کے سامنے ایک منظر آتا ہے ' انتہائی مصیبت کا منظر ہے ۔ اللہ کا اقتدار عروج پر ہے ۔ انسان کے اعضا اللہ کے حکم پر کلمہ حق کہتے ہیں ۔ یہ کس کے اعضا ہیں؟ اللہ کے دشمنوں کے اعضاء 'کیا ہے انجام اعدائے الٰہی کا ۔ یہ حشر کے میدان میں جمع ہیں ' آدم علیہ السلام سے لے کر اس جہاں پر آخری پیدا ہونے والا انسان تک حاضر ہیں ۔ ایک ریوڑ کی طرح جمع ہوں گے ۔ ان میں سے دشمنان خدا کو چلایا جائے گا کس طرف؟ آگ کی طرف 'جب حساب و کتاب شروع ہو گا ۔ ان کے خلاف ایسے گواہ آتے ہیں جن کے بارے میں ان کو توقع ہی نہ تھی ۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی زبان ان کا ساتھ نہیں دے رہی حالانکہ یہ ان کے حق میں جھوٹ بولتی تھی ' افتراء باندھتی تھی اور مذاق اڑاتی تھی ۔ ان کے کان ' ان کی آنکھیں اور ان کے چمڑے ان کے خلاف عدالت میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور تسلیم و رضا کے ساتھ اللہ کے ہاں گواہی دے رہے ہیں ' جو کچھ انہوں نے کیا ' پورا پورا بیان کر رہے ہیں ۔ یہ لوگ تو یہ سب باتیں اللہ سے چھپاتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اللہ انہیں دیکھ نہیں رہا ہے ۔ وہ اپنی نیتوں اور جرائم کو ہلکا سمجھتے ہیں اور چھپاتے ہیں لیکن اپنے اعضاء سے تو نہ چھپا سکتے تھے ۔ اعضاء تو ان کے ساتھ تھے ۔ یہ تو ان کا حصہ تھے ۔ یہ اعضاء ان باتوں کو کھول دیتے ہیں جن کے بارے ان کا خیال تھا کہ وہ خفیہ راز ہیں اور تمام لوگوں سے چھپے ہوئے ہیں ۔ رب العالمین سے بھی چھپے ہیں ۔ اللہ کی سلطنت اور اقتدار اعلیٰ کا یہ منظر اچانک ہمارے سامنے آتا ہے ۔ اور اقتدار الٰہی ہم سے ہمارے اعضاء بھی چھین لیتا ہے ۔

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ( ۴۱ : ۲۱ ) "وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟" تو وہ ان کو وہ حقیقت بتاتے ہیں جو ان سے پوشیدہ تھی ۔ اور یہ بات وہ بغیر کسی جھجک اور رکھ رکھاؤ کے بتاتے ہیں ۔

قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ ( ۴۱ : ۲۱ ) "وہ جواب دیں گے ہمیں اس خدا نے گویائی دی ہے 'جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے"۔ کیا وہی نہیں ہے جس نے زبانوں کو گویائی دی ۔ کیا وہ دوسرے اعضاء کو گویائی نہیں دے سکتا ۔ آج تو اس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے ' ہر چیز اب بولتی ہے ۔

وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ( ۴۱ : ۲۱ ) "اسی نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اب اسی کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو"۔ تخلیق بھی اسی کی ہے اور آخر کار رجوع بھی اس کی طرف ہو گا ۔ اس کے قبضہ قدرت سے کوئی باہر نہیں ہے ۔ اور نہ بھاگ سکتا ہے ۔ نہ اس دنیا میں اور نہ آخرت میں ۔

ان باتوں کا تو انہوں نے انکار کیا تھا ۔ اب خود ان کے اعضاء ان کا اقرار کر رہے ہیں ۔ اب اگلی آیت اعضاء کے کلام کی حکایت بھی ہو سکتی ہے اور اس پورے واقعہ پر تبصرہ بھی ہو سکتا ہے ۔

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ

( ۴۱ : ۲۲ ) "تم دنیا میں جرائم کرتے وقت جب چھپتے تھے تو تمہیں یہ خیال نہ تھا کہ کبھی تمہارے اپنے کان '

تمہاری آنکھیں اور تمہارے جسم کی کھالیں تم پر گواہی دیں گی"۔ تمہارے تو تصور میں بھی نہ تھا کہ یہ اعضاء تمہارے خلاف بغاوت کر دیں گے۔ اور تمہاری طاقت میں بھی یہ بات نہ تھی کہ تم کسی بھی طرح اللہ سے چھپا سکو اگر چاہو بھی۔

وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (۴۱: ۲۲) "بلکہ تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ تمہارے بہت سے اعمال کی اللہ کو بھی خبر نہیں ہے"۔ ناسمجھی نے تمہیں دھوکہ دے دیا۔ یہ نہایت ہی جاہلانہ اور بدکارانہ روش تھی جس نے تمہیں جہنم کے دھانے پر پہنچا دیا۔

وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ

(۴۱: ۲۳) "تمہارا یہی گمان جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا، تمہیں لے ڈوبا اور اسی کی بدولت تم خسارے میں پڑ گئے"۔

اور اب اس پورے منظر پر تبصرہ اور اس سے حاصل ہونے والا سبق:

فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۴۱: ۲۴) "اس حالت میں اگر وہ صبر کریں تو آگ ہی ان کا ٹھکانا ہے"۔ کیا سنجیدہ مزاح ہے۔ صبر اب آگ جہنم پر ہے۔ یہ وہ صبر نہیں ہے جس کے نتیجے میں انسان کو خوشی' اور حسن جزاء نصیب ہوتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس پر جزاء نار جہنم ہے کیونکہ اب تو قرار دیا جا چکا ہے کہ یہی ان کا ٹھکانا ہے۔

وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ (۴۱: ۲۴) "اگر رجوع کا موقعہ چاہیں گے تو کوئی موقعہ انہیں نہ دیا جائے گا"۔ نہ وہاں رضامندی ہے اور نہ وہاں توبہ کی گنجائش ہے۔ کیونکہ جو شخص معافی مانگتا ہے تو معافی تب ہوتی ہے جب ظلم و زیادتی کو زائل کر کے معافی طلب کی جائے۔ آج تو معافی اور ازالے کا دروازہ ہی بند ہو چکا ہے۔ اور اس لیے ان کے پاس کوئی موقعہ نہیں ہے۔

--- ○○○ ---

اب اگلی آیت میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کا اقتدار تو تمہارے دلوں پر بھی قائم ہے۔ جب تم زمین میں تھے اس وقت بھی تمہارے دل اللہ کے قبضہ قدرت میں تھے۔ جب تم اللہ کی نافرمانی کرتے تھے۔ جب اللہ کو تمہارے دلوں کا میلان فساد معلوم ہوا تو اللہ نے تمہارے دلوں پر ایسے ساتھی مسلط کر دیئے جو جنوں میں سے بھی تھے اور انسانوں میں سے بھی۔ یہ برائی کو تمہارے دل و دماغ کے لیے مزین کرتے تھے۔ یہ ساتھی ان کو اس قافلے میں ملا دیتے تھے جس کا انجام گھاٹے کا لکھا گیا تھا۔ یوں ان پر کلمہ عذاب اور فیصلہ عذاب صادق ہوا:

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاۗءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ

۲
ع ۷ وَالْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۵﴾

۱۷ "ہم نے ان پر ایسے ساتھی مسلط کر دیئے تھے جو انہیں آگے اور پیچھے ہر چیز خوشنما بنا کر دکھاتے تھے' آخر کار ان پر بھی وہی فیصلہ عذاب چسپاں ہو کر رہا جو ان سے پہلے گزرے ہوئے جنوں اور انسانوں کے گروہوں پر چسپاں ہو چکا تھا' یقیناً وہ خسارے میں رہ جانے والے تھے"۔

ذرا دیکھیں تو سہی کہ وہ کس حد تک اللہ کے قبضے میں ہیں' جس کی بندگی کرنے سے وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں۔ اور ان کے دل جو ان کے پہلوؤں میں ہیں' وہ ان کو عذاب اور برے انجام کی طرف لے جا رہے ہیں۔ جس کو اللہ گمراہ کرنا چاہے اس پر وہ ایسے ساتھی مسلط کر دیتا ہے جو اس کے دل میں وسوسہ اندازی کا کام کرتے ہیں اور اس کے ماحول میں جو بری چیز ہوتی ہے اس کو اس کے لیے مزین کرتے ہیں اور اس کے جو اعمال ہوتے ہیں اس کی نظروں میں اچھے بناتے ہیں' ان کو ان میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی اور انسان کے لیے سب سے بڑی بیماری یہ ہوتی ہے کہ اس کے برے اعمال اور اس کی گمراہی کے بارے میں اس کا احساس ختم ہو جائے۔ اپنی ذات کے ہر پہلو کے بارے میں وہ یہ دیکھنے لگے کہ وہ اچھا ہے۔ اس مقام پر جب انسان پہنچ جائے تو پھر وہ ہلاکت کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اس وجہ سے یہ لوگ اس گلے میں شامل ہو گئے جس نے ہلاکت کی طرف جانا تھا۔ یعنی ان گروہوں میں جن پر اللہ کا فیصلہ طے ہو چکا تھا' جنوں سے بھی اور انسانوں میں سے بھی کہ

اَنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ( ۴۱ : ۲۵ ) "کہ یقیناً وہ خسارہ میں رہ جائیں گے"۔

ان لوگوں کے جو ساتھی تھے ان کو گمراہ کرنے کے لیے' انہوں نے ان کو آمادہ کیا کہ قرآن کا مقابلہ اس طرح کرو کہ اسے نہ سنو' نہ سننے دو کیونکہ انہوں نے معلوم کر لیا تھا کہ اس کے اندر غضب کی تاثیر ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴿۲۶﴾

"یہ منکرین حق کہتے ہیں "اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو' شاید کہ اسی طرح تم غالب آجاؤ"۔

یہ وہ بات ہے جو قریش کے کبراء اپنے آپ کو اور جمہور عوام کو کہتے تھے۔ یہ لوگ قرآن کریم کی حیرت انگیز اثر آفرینی سے عاجز آ گئے تھے۔ یہ اثر ان پر بھی تھا اور عوام پر بھی تھا۔

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ ( ۴۱ : ۲۶ ) "اس قرآن کو ہرگز نہ سنو"۔ کیونکہ جس طرح وہ کہتے تھے یہ ان پر جادو کرتا ہے۔ ان کی سوچ پر غالب آ جاتا ہے اور ان کی زندگی کو خراب کر رہا ہے۔ باپ اور بیٹے کے درمیان تفرقہ کر دیتا ہے' خاوند اور بیوی کے درمیان جدائی کر دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن ایسی جدائیاں کر دیتا تھا لیکن اس لیے کہ خود اللہ نے ایمان اور کفر کے درمیان جدائی کر دی ہے' ہدایت اور ضلالت کے درمیان جدائی کر دی ہے' جو اسے مانتا تھا وہ خلوص سے مانتا تھا۔ اس لیے اس کے بعد وہ کسی اور تعلق کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ چنانچہ اس طرح جدائیاں ہو جاتی تھیں۔

وَ الْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱ : ۲۶) "اور اس میں خلل ڈالو' شاید کہ اس طرح تم غالب آ جاؤ"۔ یہ پاگلوں کی باتیں ہیں۔ لیکن وہ اس کے سوا کر کیا سکتے ہیں وہ تو عاجز آ چکے ہیں' وہ دلیل و برہان سے بات نہیں کر سکتے کہ انہیں کوئی دلیل و حجت دستیاب ہی نہیں ہے۔ اس لیے پاگل پنے پر اتر آئے ہیں اور جو شخص ایمان لانے پر آمادہ نہیں ہوتا وہ پھر اس پاگل پنے پر اتر آتا ہے۔

چنانچہ انہوں نے رستم و اسفند یار کے قصوں کے ذریعہ قرآن میں خلل ڈالنے کی کوشش کی۔ ابن نضر خصوصاً یہ کام کرتا تھا۔ اس طرح شور و شغب اور سیٹیاں بجانے کے ذریعے بھی وہ یہ کام کرتے تھے اور اپنے سجع اور رجز کے اشعار کے ذریعے بھی کرتے تھے لیکن یہ سب تدبیریں ہوا ہو گئیں اور قرآن غالب رہا۔ کیونکہ اس کے اندر غلبے کا راز تھا۔ وہ حق پر مشتمل تھا۔ اور سچائی ہمیشہ غالب ہوا کرتی ہے۔ اگرچہ اہل باطل لاکھ جتن کریں ان کی اس مکروہ بات کی تردید میں ان کو سخت ڈراوا دیا جاتا ہے۔

فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ؕ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۲۸﴾

"ان کافروں کو ہم سخت عذاب کا مزہ چکھا کر رہیں گے اور جو بدترین حرکات یہ کرتے رہے ہیں' ان کا پورا پورا بدلہ انہیں دیں گے۔ وہ دوزخ ہے جو اللہ کے دشمنوں کو بدلے میں ملے گی۔ اسی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کا گھر ہو گا۔ یہ ہے سزا اس جرم کی کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے"۔

آگے اب بہت جلد ہم انہیں آگ میں دیکھتے ہیں اور اب ان دو ساتھیوں پر ان لوگوں کی نفرت کی بوچھاڑ ہوتی ہے جنہوں نے ان کو دھوکہ دیا تھا' اور ان کے لیے ان کے ماحول کو مزین کر دیا تھا اور دھوکہ دے کر اس مقام تک انہیں لے آئے تھے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَاۤ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۲۹﴾

"وہاں یہ کافر کہیں گے کہ "اے ہمارے رب' ذرا ہمیں دکھا دے ان جنوں اور انسانوں کو جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا' ہم انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں گے تاکہ وہ خوب ذلیل و خوار ہوں"۔

یہ بہت سخت غصہ ہے۔ یہ لوگ اب انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں اور ان کے دلوں میں یہ خواہش ہے کہ۔

نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا ( ۴۱ : ۲۹ ) "ہم انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں"۔

لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ( ۴۱ : ۲۹ ) "تاکہ وہ خوب ذلیل و خوار ہوں"۔ لیکن پہلے تو تم دوست تھے ' گہرے یار تھے ' ان کے وسوسوں اور ان کی تزئین پر تم یقین کرتے تھے۔

--- ○○○---

یہ تو انجام تھا وسوسوں کا اور عوام کو گمراہ کرنے کا۔ لیکن لوگوں کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرنے والوں کا بھی ایک انجام اور اجر ہے۔ یہ مومن ہیں ' جنہوں نے اخلاص کے ساتھ کہہ دیا کہ بس اللہ ہمارا رب ہے ' پھر اپنی راہ پر استقامت اختیار کی یعنی ایمان لائے اور عمل صالح کیا۔ ایسے لوگوں پر اللہ پھر برے ساتھی مسلط نہیں کرتا۔ ان کے ساتھ ملائکہ ہوتے ہیں جو ہر وقت ان کے دلوں پر امن و اطمینان وحی کرتے رہتے ہیں اور ان کو جنت کی خوشخبری دیتے رہتے ہیں اور یہ فرشتے ان کے ساتھ دنیا اور آخرت دونوں میں محبت کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ
الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ
تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۰﴾ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا ۴
مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿۳۱﴾ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴿۳۲﴾ ع ۲

۱۸ "جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے ' اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے ' یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ "نہ ڈرو ' نہ غم کرو ' اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی۔ وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہو گی ' یہ ہے سامان ضیافت اس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے"۔

یعنی اللہ کو اپنا رب کہہ کر ' استقامت کے یہ معنی ہیں کہ اس اقرار کے تقاضے پورے کیے جائیں جس طرح ان کا حق ہے۔ ضمیر میں شعوری طور پر یہ عقیدہ بیٹھا ہوا ہو ' زندگی اور عمل میں اس پر گامزن ہو ' اس راہ میں اگر تکالیف آئیں تو ان کو برداشت کرے۔ اس معنے میں یہ دراصل بہت بڑا حکم ہے اور بھاری ذمہ داری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے ہاں پھر اس کا بہت بڑا اجر ہے کہ ملائکہ ان پر نازل ہوں گے اور ان کے ہمدم ہوں گے۔ ان کے دوست ہوں گے اور وہ جو باتیں کریں گے اللہ نے ان فرشتوں کی زبانی ان کو نقل کیا ہے۔

اَلَّا تَخَافُوْا ( ۴۱ : ۳۰ ) "نہ ڈرو" وَلَا تَحْزَنُوْا ( ۴۱ : ۳۰ ) "نہ غم کرو"۔ اور اس جنت کے لیے خوش ہو جاؤ۔ بشارت ہے تم کو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی۔ اس کے بعد یہ فرشتے پھر ان کے سامنے اس جنت کی تصویر کھینچتے ہیں جو انہیں ملنے والی ہے کہ "وہاں جو

کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے 'تمہاری ہو گی"--- پھر وہ مزید حسن و جمال اور عزت و استقبال کا ذکر کرتے ہیں :"یہ ہے سامان ضیافت اس ہستی کی طرف سے جو غفور و رحیم ہے"۔ یعنی یہ اللہ نے تمہاری ضیافت اور مہمانی کے لیے تیار کیا ہے۔ اب ان نعمتوں کے بعد اور کیا رہ جاتا ہے۔

--- ○○○---

اس سبق کا خاتمہ ایک داعی کے خدوخال اور حوصلہ افزائی پر ہوتا ہے۔ اس کی روح' اس کے الفاظ' اس کے آداب اور اس کی میٹھی میٹھی باتوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ ان باتوں کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے تمام داعیوں کو متوجہ کیا جاتا ہے۔ سورت کا آغاز اس مضمون سے ہوا تھا کہ پیغمبروں اور داعیوں کے ساتھ عوام الناس کا رویہ کس قدر ظالمانہ ہوتا ہے۔ اور وہ کس قدر گستاخی اور تکبر کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس لیے یہاں داعی کو بتایا جاتا ہے کہ آپ لوگوں کا منہاج دعوت یہ ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِىْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِىٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۳۵﴾ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۶﴾

"اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہو گی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اور اے نبی' نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی' وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا' مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو' وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔

دعوت اسلامی کا کام ایک بہت بڑا اور کٹھن کام ہے' داعی کو مخاطب کی پیچیدہ نفسیات کا' اس کی جہالت کا' اس کی عزت نفس' اس کے استکبار کا' اس کی خواہشات کا' اس کے مفادات کا اور اس کے مرتبہ و مقام کا سامنا ہوتا ہے۔ صرف اللہ وحدہ کی حاکمیت کی طرف دعوت دینا' ان میں سے بیشتر چیزوں کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ پھر یہ دعوت دینا اور ایک طبقاتی معاشرے میں دینا کہ سب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ برابر ہیں' ایسے حالات میں دعوت کی ذمہ داری اٹھانا حقیقت ہے کہ ایک بہت ہی مشکل کام ہے۔ لیکن مشکل ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ایک عظیم کام بھی تو ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ

۳۳) "اور اس شخص کی بات سے اور اچھی بات کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا میں مسلمان ہوں"۔ جو لوگ دعوت اسلامی کا کام لے کر اٹھتے ہیں ان کی دعوت اس عالم میں سب سے برگزیدہ دعوت ہے' ان کے کلمے آسمانوں کی طرف پاکیزہ کلمات کی صورت میں بلند ہوتے ہیں' لیکن داعی کی دعوت کے ساتھ اس کا عمل بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔ وہ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا ہو۔ اس کی ذات اس دعوت میں گم ہو جائے اور اس کے سب کام دعوت ہو جائیں اور اس کی تمام سرگرمیوں میں اس کا اپنا کچھ نہ ہو۔

اس کے بعد پھر داعی کو کوئی پرواہ نہیں ہوتی ہے کہ اس کی دعوت کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ کوئی انکار کرتا ہے' کوئی گستاخی کرتا ہے' کوئی تکبر کرتا ہے' بہرحال داعی ایک اچھا انداز لے کر ہی چلتا ہے۔ وہ تو بلند مقام پر ہوتا ہے۔ اس کا مخالف برائی لے کر آتا ہے۔ اس کا مخالف تو نہایت ہی گرے ہوئے مقام پر ہوتا ہے۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ (۴۱: ۳۴) "اے نبی' نیکی اور بدی یکساں نہیں"۔ اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ برائی کا جواب برائی سے دے۔ نیکی اور بدی کا اثر یکساں نہیں ہوتا۔ نہ دونوں کی قدر و قیمت یکساں ہے۔ داعی کو چاہئے کہ شر کا مقابلہ شر سے کرنے کی دلی رغبت کو ترک کر دے اور برائی کو صبر' معافی اور سنجیدگی کے ساتھ رد کرے۔ کرخت نفوس کو اعتماد اور نرمی پر آمادہ کرے۔ چنانچہ دشمن دوستی سے بدل جائے اور سختی نرمی میں بدل جائے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ

(۴۱: ۳۴) "تم بدی کو نیکی سے دفع کرو' جو بہترین ہو' تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے"۔ اسلام کا یہ اصول بسا اوقات نہایت ہی اچھے نتائج دیتا ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ سخت دشمنی دوستی میں بدل جاتی ہے اور غضب اور کینہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ تکبر' شرم و حیاء میں بدل جاتا ہے' بشرطیکہ کوئی اچھی بات کرنا جانتا ہو' اور سنجیدگی سے بات کر سکتا ہو' اور ایک نہایت ہی ہیجانی کیفیت کے سامنے مسکراہٹ سے بات کر سکتا ہو۔ ایک ایسے شخص کے سامنے نہایت ہی ٹھنڈے مزاج کا مظاہرہ کر سکتا ہو' جو آپے سے باہر ہو گیا ہو۔

اگر کسی ایسے شخص کا مقابلہ ایسے ہی انداز میں کیا گیا جس طرح اس کا ہے تو پھر کیا ہو گا۔ وہ مزید آپے سے باہر ہو گا' تکبر کرے گا اور سرکشی پر آمادہ ہو گا' حیا و شرم کا جامہ اتار پھینکے گا اور آپے سے باہر ہو کر آمادۂ جنگ ہو گا۔

لیکن اس میں ایک شرط ہے' وہ یہ کہ اس طرح کی شرافت کا مظاہرہ کرنے والا ایک بڑے دل اور بڑے مقام کا مالک ہو' وہ اس پوزیشن میں ہو کہ اگر اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہے تو دے سکے۔ برائی کا جواب دینے کی اگر قدرت ہو تو پھر شرافت کا اثر ہو گا۔ ورنہ "گدا اگر تواضع کند خوئے اوست"۔ یہ نہ ہو کہ اچھا رویہ اختیار کرنے کو کمزوری سمجھا جائے۔ اگر مخالف نے یہ سمجھ لیا کہ یہ کمزور ہے تو پھر وہ ہرگز احترام نہ کرے گا اور پھر اچھائی کا کوئی اثر نہ ہو گا۔

' پھر یہ بات بھی نوٹ کر لینا چاہئے کہ اس شرافت کا مظاہرہ شخصی دست درازی کے مواقع پر ہونا چاہئے۔ اگر کوئی اسلام اور اللہ کے اصولوں پر دست درازی کرتا ہے' یا کوئی اہل ایمان پر مظالم ڈھاتا ہے۔ لوگوں کو دین سے روکتا ہے' تو اس صورت میں ہر قسم کے ہتھیاروں سے مقابلہ ضروری ہے یا پھر اگر مقابلے کی صورت نہ ہو تو صبر کیا جا سکتا ہے۔ یہ نہ

ہو کہ ایک تو اسلام کی بیخ کنی کر رہا ہو اور دوسرا برائی کا بدلہ نیکی سے دے رہا ہو۔

یہ مقام 'کہ برائی کو نیکی کے ساتھ دفع کرنا' اور غیض و غضب کے مقام پر رواداری اور برداشت کرنا اور یہ فیصلہ کر سکنا کہ کہاں رواداری اور برداشت کرنا ہے اور کہاں برائی کو نیکی کے ساتھ دفع کرنا ہے ـ یہ ایک عظیم مرتبہ ہے ـ یہ مرتبہ و مقام ہر انسان کو نہیں مل سکتا ـ اس مقام پر وہی شخص فائز ہو سکتا ہے جسے صبر کی بڑی مقدار دی گئی ہو ـ یہ وہ مقام ہے جس پر اللہ کے خاص بندے اور صبر کرنے والے ہی فائز ہو سکتے ہیں ـ

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ مَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ (۴۱ : ۳۵) "اور یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہوتے ہیں" ـ یہ اس حد تک بلند درجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو ذاتی معاملات میں بھی کبھی غصے میں نہیں آتے تھے اور اگر غصے میں آتے تھے تو ان کے مقابلے میں کوئی کھڑا نہیں ہو سکتا تھا' آپ ؐ کو اور آپ ؐ کے ذریعہ ہر داعی کو یہ کہا جاتا ہے :

وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۴۱ : ۳۶)

"اور اگر شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو' وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے" ـ غصے میں کبھی اکساہٹ ہوتی ہے انتقام کی' برائی کی وجہ سے بعض اوقات انسان صبر کی کمی محسوس کرتا ہے یا شرافت میں تنگ دلی محسوس کرتا ہے ـ ایسے حالات میں اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھنا چاہئے ـ اس سے وہ سوراخ بند ہو جائے گا جو شیطان کرنا چاہتا تھا ـ

اللہ انسانی دل کا خالق ہے' وہ اس کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہے ـ وہ اس کی طاقت اور حد برداشت کو بھی جانتا ہے ـ اس کو معلوم ہے کہ شیطان کس سوراخ سے حملہ آور ہوتا ہے ـ یہ داعی کے قلب کو گھیرتا ہے اور اکساتا ہے ـ یہ اللہ ہی ہے جو بچانے والا ہے ـ کیونکہ یہ راستہ کٹھن ہے ـ یہ راہ بڑی دشوار گزار ہے 'نفس انسانی کے نشیب و فراز میں اور نفس انسانی کی پیچیدہ وادیوں میں داعی کو سفر کرنا ہوتا ہے تاکہ داعی گہرے نفسیاتی میلانات میں ہدایت اور قیادت کا حق ادا کر سکے ـ

---ooo---

# درس نمبر ۲۲۸ ایک نظر میں

اس سبق کا تعلق بھی اسلامی دعوت کے ساتھ ہے - یہ کائناتی نشانیوں سے شروع ہوتا ہے - اور گردش لیل و نہار کو ہمارے غور کے لیے پیش کرتا ہے اور شمس و قمر کو اس لیے پیش کرتا ہے کہ مشرکین میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو شمس و قمر کے پجاری تھے - حالانکہ یہ دونوں خدا کی مخلوقات میں سے ہیں - ان آیات کے باوجود یہ لوگ اللہ کی آیات سے انکار کرتے ہیں اور اس کی بندگی نہیں کرتے لیکن اللہ کے ہاں ایسی مخلوق ہے جو ہروقت اس کی بندگی میں لگی ہوئی ہے - پھر یہ پوری زمین بھی اللہ کی بندگی میں لگی ہوئی ہے' یہ مردہ ہو جاتی اور پھر اللہ سے فیض حیات لیتی ہے جیسا کہ انسان کو بھی زندگی اللہ نے دی ہے' لیکن انسان ہے کہ نافرمانی کرتا ہے - اللہ کی آیات کو الٹے معنی پہناتا ہے - قرآن کی آیات کے معنی بگاڑتا ہے' حالانکہ قرآن مجید صاف عربی میں ہے - اس کے بعد قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر سامنے آتا ہے - پھر خود س کی زندگی کو پیش کر کے یہ بتایا جاتا ہے کہ انسان ایک ضعیف مخلوق ہے - مال کا لالچی ہے اور جب کوئی مشکل پڑتی ہے تو جزع فزع کرتا ہے - اور سورت کے آخر میں انفس و آفاق کے دلائل و نشانات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں پر حق واضح ہو جائے اور ان کے دلوں کے شبہات دور ہو جائیں -

--- ○○○---

# درس نمبر ۲۲۸ تشریح آیات

## ۳۷ --- تا --- ۵۴

---

وَمِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۳۷﴾

"اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند۔ سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اگر فی الواقع تم اسی کی عبادت کرنے والے ہو"۔

یہ نشانیاں جن کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے' آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی ہیں' عالم بھی انہیں دیکھ سکتا ہے اور جاہل بھی' انسانی دل پر ان کے براہ راست گہرے اثرات بھی ہیں۔ اگرچہ انسان ان کی سائنسی حقیقت بالکل نہ جانتا ہو' کیونکہ انسان اور اس کائنات کے درمیان' سائنسی علم سے بھی زیادہ گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ دونوں کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ فطرت دونوں کی ایک ہے' ساخت ایک ہے' انسان اس کائنات کا حصہ ہے اور یہ کائنات انسان ہی کا حصہ ہے۔ دونوں کا مادۂ وجود ایک ہے' فطرت ایک ہے اور جس قانون قدرت کے مطابق انسان چلتا ہے' اس کے مطابق یہ کائنات بھی چلتی ہے۔ دونوں کا الٰہ ایک ہے۔ اس لیے انسان اس زمین و آسمان کے بارے میں ایک گہرا احساس اور گہرا فطری ادراک رکھتا ہے۔ اور یہ ادراک اسے گہری فطری منطق کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم صرف اس پر اکتفاء کرتا ہے کہ انسان کو اس کی طرف متوجہ کر دے اور اسے غفلت سے جگا دے اور یہ غفلت انسانوں پر اس لیے طاری ہو جاتی ہے کہ انہوں نے گردش لیل و نہار اور شمس و قمر کو دیکھتے دیکھتے اب ان کی کوئی اہمیت ان کے ہاں نہیں رہی ہے۔ ان کے دل و دماغ پر پردے آگئے ہیں' اس لیے قرآن انسان کو جگاتا ہے' ان کی سوچ کو صیقل کرتا ہے کہ ذرا ان معجزات پر غور کرو' یہ تمہاری دوست کائنات کا حصہ ہیں' تم لیل و نہار اور شمس و قمر کے ساتھ رہتے ہو۔

شمس و قمر کے حوالے سے ایک گمراہی اور فکری انحراف کی طرف بھی متوجہ کر دیا۔ بعض لوگ شمس و قمر کی پوجا کرتے

تھے تاکہ اس طرح وہ اللہ کا تقرب حاصل کرلیں 'کیونکہ شمس اللہ کی بہترین مخلوق ہے کے سامنے سجدہ کرنا اللہ کے سامنے سجدہ کرنا ہے ۔ قرآن نے یہاں حتمی طور پر اس انحراف کی تصحیح بھی کر دی اور عقائد کی آلودگی کو صاف بھی کر دیا۔ اگر تم فی الحقیقت اللہ ہی کی عبادت کرتے ہو تو پھر شمس و قمر کی عبادت نہ کرو'

وَ اسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ (۴۱ : ۳۷) "بلکہ اس خدا کی بندگی کرو 'جس نے ان کو پیدا کیا ہے"۔ مخلوق کو صرف خالق کی طرف متوجہ ہونا چاہئے 'اور شمس و قمر بھی تمہاری طرح اللہ ہی کے پیروکار ہیں ۔ اللہ نے ان دو شمس و قمر کو پیدا کیا ہے اور ان دو کے لیے یہاں جمع مونث کی ضمیر استعمال کی ہے ۔کیونکہ یہاں جنس ستاروں اور سیاروں کی طرف اشارہ ہے ۔ صرف یہ دو مراد نہیں اور پھر جمع مونث عاقل کی خبر ان کی طرف اس لیے راجع کی گئی ہے کہ یہ بھی تمہاری طرح اشخاص ہیں اور اللہ کی عبادت کرتے ہیں ۔

ان آیات و نشانات اور اس تبلیغ و بیان کے بعد بھی اگر وہ تکبر کرتے ہیں 'تو اس سے اللہ کی بادشاہت میں کوئی کمی بیشی اور کوئی تقدیم و تاخیر واقع نہیں ہوتی 'اللہ کے ہاں بے شمار مخلوقات اس کی عبادت میں لگی ہوئی ہیں ۔

فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ یُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ هُمْ لَا یَسْـَٔمُوْنَ ۩ ﴿۳۸﴾

"لیکن اگر یہ لوگ غرور میں آکر اپنی ہی بات پر اڑے رہیں تو پروا نہیں 'جو فرشتے تیرے رب کے مقرب ہیں وہ شب و روز اس کی تسبیح کر رہے ہیں 'اور کبھی نہیں تھکتے"۔

اس کا قریب الفہم مفہوم تو یہی ہے کہ اللہ کے پاس کی مخلوق سے مراد ملائکہ ہیں ۔ لیکن اللہ کے مقرب بندوں پر مشتمل کوئی اور مخلوق بھی اس سے مراد ہو سکتی ہے ۔ اللہ کی مخلوقات کے بارے میں تو ہم بہت کم جانتے ہیں ۔

وہ لوگ جو رب کے ہاں ہیں وہ ارفع و اعلیٰ مخلوق ہیں 'وہ زیادہ مکرم اور مثالی لوگ ہیں ۔ یہ اللہ کے مقابلے میں اس طرح کبر نہیں کرتے جس طرح زمین کی یہ کمزور مخلوق انسان کرتا ہے 'نہ وہ اس طرے میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہم اللہ کے مقربین ہیں اور نہ وہ رات اور دن کے کسی بھی وقت اللہ کی تسبیح کرنے سے رکتے یا تھکتے ہیں ۔

وَ هُمْ لَا یَسْـَٔمُوْنَ (۴۱ : ۳۸) "کبھی نہیں تھکتے"۔ لہٰذا اگر اہل زمین سب کے سب ہی اللہ کی بندگی چھوڑ دیں تو اللہ کی پرستش میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ذرا اس زمین کو تو دیکھیں جس میں وہ رہتے ہیں 'جس سے وہ پیدا ہوتے ہیں ۔ اور جس کی طرف لوٹا کر دفنائے جائیں گے ۔ یہ زمین جس کے اوپر یہ چیونٹیوں جیسے پھرتے ہیں ان کے کھانے پینے کا کوئی سامان بھی اس زمین کے سوا کہیں نہیں ہے ۔ یہ زمین بھی نہایت خشوع میں اللہ کے سامنے سہمی ہوتی ہے ۔ مردہ ہو جاتی ہے تو اللہ ہی اسے زندہ اور سرسبز و شاداب کر دیتا ہے ۔

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا

الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ۭ اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ اِنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾

''اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو زمین سونی پڑی ہوئی ہے' پھر جونہی کہ ہم نے اس پر پانی برسایا' یکایک وہ پھبک اٹھتی ہے اور پھول جاتی ہے۔ یقیناً جو خدا اس مری ہوئی زمین کو جلا اٹھاتا ہے وہ مردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔ یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''۔

ہر مقام پر قرآن کا انداز تعبیر قابل ملاحظہ ہے۔ زمین کا ''خشوع'' کی حالت میں ہونا سے مراد یہ ہے کہ بارش سے پہلے وہ سوئی ہوئی اور مردہ حالت میں تھی۔ جب بارش برسی تو وہ پھبک اٹھی' سرسبز و شاداب ہوگئی گویا اس نے شکر ادا کیا اور سجدے میں گر گئی کہ اسے زندگی مل گئی۔ جس سیاق میں یہ مثال آرہی ہے وہاں عبادت خشوع و خضوع اور حمد و ثنا اور تسبیح کا مضمون چل رہا ہے۔ چنانچہ زمین کی بھی یہی کیفیت دکھائی گئی گویا وہ بھی زندہ ہے اور اللہ کے حوالے سے وہ بھی شعور رکھتی ہے۔ مناسب ہے کہ میں اپنی ہی کتاب التصویر الفنی فی القرآن سے ایک صفحہ یہاں نقل کر دوں:

''قرآن نے بارش ہونے سے قبل زمین کی حالت کو بعض جگہ خاشعہ (سوئی ہوئی' مردہ' اور سہمی ہوئی) اور بعض جگہ ھامدہ (سوکھی' بجھی ہوئی' مردہ) کہا ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ محض طرز تعبیر کا تنوع ہے' لیکن دیکھنا یہ ہے کہ دونوں لفظ کس سیاق میں کس طرح استعمال ہوئے ہیں' یہ الفاظ قرآن نے دو مختلف سیاق و سباق میں استعمال کیے ہیں:

لفظ ھامدۃ سورۂ حج میں آیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْــــًٔا ۭ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ (۲۲: ۵) ''لوگو' اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے' پھر نطفے سے' پھر خون کے لوتھڑے سے' پھر گوشت کی بوٹی سے' جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھیرائے رکھتے ہیں' پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کو پھیر دیا جاتا' ۔ ۔ ۔ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے' پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر

قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی"۔

اور لفظ خاشعہ اس سیاق و سباق میں آیا ہے :

وَمِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۴۱:۳۷) فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ یُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا یَسْئَمُوْنَ (۴۱:۳۸) وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ اِنَّ الَّذِیْۤ اَحْیَاهَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۴۱:۳۹) "اور اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند۔ سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے' اگر فی الواقع تم اس کی عبادت کرنے والے ہو' لیکن اگر یہ لوگ غرور میں آکر اپنی ہی بات پر اڑے رہیں تو پروا نہیں' جو فرشتے تیرے رب کے مقرب ہیں وہ شب و روز اس کی تسبیح کر رہے ہیں اور کبھی نہیں تھکتے اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ دیکھتے ہو زمین سونی پڑی ہوئی ہے! پھر جونہی کہ ہم نے اس پر پانی برسایا' یکایک وہ پھبک اٹھتی ہے اور پھول جاتی ہے"۔

ان دونوں سیاق و سباق پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے ھامدہ اور خاشعہ کا ربط ظاہر ہو جاتا ہے۔ پہلے سیاق و سباق میں فضا اٹھانے' زندہ کرنے اور نکالنے کی ہے۔ تو اس کے ساتھ زمین کی حالت مردہ (ھامدہ) زیادہ مناسب ہے۔ مردنی کے بعد وہ حرکت میں آتی ہے' پھولتی ہے' اور ہر قسم کے خوش منظر نباتات کے جوڑے پیدا کرتی ہے (میں کہوں گا کہ لفظ زوج بھی یہاں نہایت معنی خیز ہے) دوسرے سیاق و سباق میں مضمون عبادت' خضوع و خشوع کا ہے' لہٰذا اس کے ساتھ زمین کی تصویر خاشعہ اور سہمی ہوئی زیادہ مناسب ہے۔ اور جب بارش ہوتی ہے تو وہ پھول اٹھتی ہے۔

یہاں اس دوسرے سیاق میں زمین کے پھبک اٹھنے اور پھول جانے کے بعد نباتات کے اگنے کا ذکر نہیں جبکہ پہلے سیاق میں ذکر ہے' کیونکہ یہاں عبادت کا موضوع ہے اور عبادت کے ساتھ نباتات کے اگنے کی کوئی مناسبت نہیں ہے کیونکہ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (۴۱:۳۹) کے لفظ کے بھی دونوں جگہ دو الگ مقاصد ہیں' یہاں دوسرے سیاق میں مطلب یہ ہے کہ زمین حرکت میں آئی جس طرح اس منظر میں تمام متحرک چیزیں عبادت کے لیے حرکت میں آتی ہیں۔ لہٰذا زمین کو بھی خشوع اور مردنی کی حالت میں نہ چھوڑا جائے۔ اس لیے یہاں وہ حرکت میں آئی کہ وہ دوسرے عبادت گزاروں کے ساتھ عبادت میں شریک ہو' اور منظر کے تمام اجزاء اس میں شریک ہو جائیں۔ یوں انداز بیان کی نہایت ہی باریک جزئیات کے تناسق کو بھی پیش نظر رکھتا ہے جبکہ پہلے سیاق میں اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (۴۱:۳۹) پیدائشی عمل کی حرکت کے لیے ہے"۔

اب ہم پھر سیاق کلام کی طرف آتے ہیں' اسی زمین کے احیاء کے استدلال سے یہ نتیجہ کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت

کے دن مردوں کو نکال لائے گا۔

اِنَّ الَّذِیْۤ اَحْیَاهَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۴۱:۳۹) "یقیناً جو خدا اس مری ہوئی زمین کو جلا اٹھاتا ہے وہ مردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔ یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ اس قسم کے مناظر سے قرآن میں بار بار یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ اسی طرح مردوں کو اٹھا لے گا اور اس سے اللہ کی بے پناہ قدرت پر بھی استدلال قرآن کریم میں بارہا کیا جاتا ہے۔ زمین کے اندر نباتاتی اور دوسری زندگیوں کے مناظر کو انسان بڑے قریب سے مشاہدہ کرتا ہے۔ عقل سے بھی پہلے یہ بوقلمونیاں دل کو متاثر کرتی ہیں۔ جب موت سے زندگی نمودار ہوتی ہے تو انسان اس قدرت کے کرشمے کو بڑی حیرت سے دیکھتا ہے اور انسان کے شعور میں اس کے اثرات بیٹھتے ہیں اور قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ عقل کی بجائے فطری شعور سے مخاطب ہوتا ہے۔

---ooo---

اب اس قدر تفصیلات کے بعد اور کائناتی شواہد و دلائل کے بعد اگر لوگ ان نشانیوں کو الٹے معنی پہناتا ہے یا قرآن کی آیات میں الحاد کرتے ہیں تو وہ تیار ہو جائیں اپنے انجام کے لیے۔ یہ لوگ اللہ کی واضح آیات کا انکار کرتے ہیں اور ان میں مغالطے ڈالتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا ؕ اَفَمَنْ یُّلْقٰى فِی النَّارِ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ یَّاْتِیْۤ اٰمِنًا یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝

"جو لوگ ہماری آیات کو الٹے معنی پہناتے ہیں وہ ہم سے کچھ چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ خود ہی سوچ لو کہ آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں جھونکا جانے والا ہے یا وہ جو قیامت کے روز امن کی حالت میں حاضر ہو گا؟ کرتے رہو جو کچھ تم چاہو' تمہاری ساری حرکتوں کو اللہ دیکھ رہا ہے"۔

یہ تہدید اگرچہ بالواسطہ اور مجمل ہے لیکن نہایت ہی خطرناک ہے۔

لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا (۴۱:۴۰) "وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں"۔ اللہ کے علم میں وہ بالکل سامنے ہیں۔ لہٰذا وہ جو الحاد کرتے ہیں' قرآن کے معنوں کو الٹے معنی پہناتے ہیں۔ اس پر ان کو سزا ہو گی۔ اگرچہ وہ مغالطے اور تاویلات کریں۔ اگرچہ وہ سمجھیں کہ ہم اللہ کے ہاتھوں چھوٹ جائیں گے۔ جس طرح وہ قرآن کے معانی میں مغالطہ ڈال کر اپنے آپ کو ذمہ داریوں سے آزاد کرتے ہیں۔ یا لوگوں کے سامنے بہانہ بنا لیتے ہیں۔

اس اجمالی ڈراوے کے بعد قدرے تصریح

أَفَمَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ خَيْرٌ أَمْ مَنْ يَأْتِي آمِنًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۴۱ : ۴۰) ”خود ہی سوچ لو کہ آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں جھونکا جانے والا ہے یا وہ جو قیامت کے دن امن کی حالت میں حاضر ہو گا“۔ یہ دھمکی کی تصریح ہے کہ آگ میں پھینکا جانا اور جزع فزع تمہارے انتظار میں ہے جبکہ مومن نہایت امن و اطمینان کے ساتھ آئیں گے۔

اس آیت میں ایک دوسری دھمکی بھی ہے۔

اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۴۱ : ۴۰) ”کرتے رہو جو تم چاہو' تمہاری ساری حرکتوں کو اللہ دیکھ رہا ہے“۔ کس قدر بدبخت ہے وہ شخص جسے ہر کچھ کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ وہ جس طرح چاہے اللہ کی آیات میں مغالطے ڈالے اور اللہ اس کے تمام کرتوتوں کو نوٹ کر رہا ہو۔

---ooo---

اب سیاق کلام انہی لوگوں کے بارے میں آگے بڑھتا ہے جو قرآن مجید کا انکار کرتے ہیں' جبکہ وہ ایک طاقتور اور غالب ہونے والی کتاب ہے' نہایت ہی محفوظ ہے۔ اس کے قریب بھی باطل نہیں پھٹک سکتا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ۝
لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ
حَمِيدٍ ۝ مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ
لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ ۝ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَقَالُوا لَوْلَا
فُصِّلَتْ آيَاتُهُ ۖ أَأَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ ۗ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءٌ ۖ
5 وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۚ أُولَٰئِكَ
۱۲ ع يُنَادَوْنَ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ ۝
19

”وہ لوگ جن کے سامنے کلام نصیحت آیا تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زبردست کتاب ہے۔ باطل نہ سامنے سے اس پر آسکتا ہے نہ پیچھے سے' یہ ایک حکیم و حمید کی نازل کردہ چیز ہے۔ اے نبی“ تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے' اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کو نہ کہی جا چکی ہو۔ بے شک تمہارا رب بڑا درگزر کرنے والا ہے' اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی ہے۔ اگر ہم اس کو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے: ”کیوں نہ اس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں؟ کیا ہی عجیب بات ہے کہ کلام عجمی ہے اور مخاطب عربی“۔ ان سے کہو' یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے' مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان

کے لیے یہ کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے - ان کا حال تو ایسا ہے جیسے ان کو دور سے پکارا جا رہا ہو"۔

آیت میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ذکر ربی کا انکار کرتے ہیں جبکہ وہ ان کے پاس آگیا ہے - لیکن یہ لوگ کون ہیں اور ان کا انجام کیا ہو گا' اس کا ذکر نہیں ہے - مبتداء ہے اور خبر نہیں ہے - گویا ان کا فعل اس قدر گھناؤنا ہے کہ اس پر منطبق کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں - بہت ہی بری حرکت یہ کر رہے ہیں --- ان لوگوں کے بارے میں کوئی خبر دینے کی بجائے یہ تفصیلات دے دی جاتی ہیں کہ وہ ذکر و نصیحت کیسی ہے جس کا وہ انکار کر رہے ہیں تاکہ ان کے اس فعل کی کراہت اور زیادہ سمجھی جائے۔

اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ (۴۱ : ۴۱) لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (۴۱ : ۴۲) "مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زبردست کتاب ہے - باطل نہ سامنے سے اس پر آ سکتا ہے نہ پیچھے سے' یہ ایک حکیم و حمید کی نازل کردہ چیز ہے"۔ باطل اس کتاب میں کس طرح داخل ہو سکتا ہے - یہ تو اللہ برحق کی طرف سے نازل شدہ ہے جو حق بیان کرتا ہے' اور یہ کتاب اس سچائی سے مربوط ہے جس کے اوپر آسمان و زمین قائم ہیں - یہ کتاب 'کتاب عزیز' ہے اور یہ محفوظ ہے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے لی ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵ : ۹) "بے شک ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"۔

جو شخص بھی قرآن پر تدبر کرتا ہے وہ اس سچائی کو پا لیتا ہے جس کو لے کر یہ نازل ہوئی ہے - اور جو نازل ہی اس لیے ہوئی ہے کہ اسے پڑھا جائے اور جو شخص بھی اسے پڑھے گا وہ یہ سچائی ایک طرف اپنی روح میں پائے گا اور دوسری طرف اس کے نصوص میں پائے گا - بڑی سادگی اور آسانی کے ساتھ قرآن سے ہر شخص سچائی حاصل کر سکتا ہے - یہ سچائی نہایت فطری' اطمینان بخش اور انسانی فطرت کے اندر موجود ہے - ہر قاری پر اس کتاب کا نہایت ہی گہرا اور عجیب اثر ہوتا ہے۔

اور پھر یہ کتاب۔

تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (۴۱ : ۴۲) "یہ حمید و حکیم کی نازل کردہ ہے"۔ اس کی تعبیر ہی میں حکمت پنہاں ہے - اس کے طریق نزول اور اس کی ہدایات سے حکمت عیاں ہے - لہذا جس رب تعالیٰ نے اسے نازل کیا ہے' وہ حمد کثیر کا مستحق ہے - یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بار بار حمد و ثنا کے لیے ابھارا گیا ہے۔

اب قرآن کو کتب سابقہ کے ساتھ مربوط کیا جاتا ہے - رسول اللہ اور تمام انبیائے سابقہ کے درمیان ایسا تعلق قائم کیا جاتا ہے کہ یہ ایک ہی محفل ہے' ایک ہی خاندان ہے' ان کی بات بھی ایک ہے' ان کی روح اور قلب بھی ایک ہیں - طریقہ دعوت بھی ایک ہے - یوں ہر ایک مسلمان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے درخت کا پتہ ہے جس کے اندر بے شمار پتے ہیں اور جس کی جڑیں گہری ہیں اور یہ کہ وہ ایک ایسی محفل کا ممبر ہے جو آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے :

مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّ ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ (۴۱ : ۴۳) "اے نبیؐ، تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے' اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کو نہ کہی جا چکی ہو۔ بے شک تمہارا رب بڑا درگزر کرنے والا ہے' اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی ہے"۔ ایک ہی وحی' ایک ہی رسالت' ایک ہی عقیدہ اور پوری تاریخ میں انسانوں کا اس کے مقابلے میں ایک ہی ردعمل رہا ہے۔ سب لوگوں نے تکذیب کی' سب نے ایک جیسا اعتراض کیا۔ لہٰذا تمام انبیاء کے درمیان ایک ہی پختہ رشتہ ہے' ایک ہی شجرۂ نسب ہے' ایک ہی خاندان ہے' دکھ اور درد بھی ایک ہے۔ تجربات بھی ایک ہی طرح کے ہیں اور مقاصد بھی ایک ہی جیسے اور راستہ بھی ایک اور طریقہ کار بھی ایک۔

انس و محبت کا کیا گہرا شعور ہے یہ! قوت' صبر اور گہری پختگی کا شعور۔ داعی کو یہ اشارہ دیا جا رہا ہے کہ آپ ایک ایسے راستے پر رواں ہیں جس پر آپ سے قبل نوح' ابراہیم' موسیٰ' عیسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رواں دواں رہے ہیں --- کس قدر اعزاز اور بلندی کا شعور دیا جا رہا ہے کہ اس راہ کے مصائب' اس کی ٹھوکریں' اس کے کانٹے اور مشکلات کو برداشت کرو کہ یہ راہ تو بہت بڑے لوگوں کی ہے۔ یہ تو انبیاء و صالحین کی راہ ہے اور اس شعور کے ساتھ داعی کی قوت برداشت میں اضافہ ہوتا ہے۔

اور یہ حقیقت ہے۔

مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ (۴۱ : ۴۳) "تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے' جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کو نہ کہی جا چکی ہو"۔ کہنے کو تو یہ ایک معمولی بات ہے لیکن اس حقیقت کو مومنین کے دل و دماغ میں بٹھانے کے کس قدر عظیم اثرات ہیں۔ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کام قرآن ہی کر سکتا ہے۔ وہ اس عظیم حقیقت کے بیج دلوں میں کاشت کرتا ہے اور رسولوں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے یہ بھی کہا گیا:

اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّ ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ (۴۱ : ۴۳) "بے شک تمہارا رب بڑا درگزر کرنے والا ہے اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی"۔ مغفرت کے ساتھ سزا بھی ہے تاکہ توازن قائم ہو جائے۔ انسان اگر کسی مغفرت کا امیدوار بھی ہو گا اور اس کے عقاب الیم سے ڈرنے والا بھی۔ نہ مایوس ہو اور نہ بے باک ہو حقیقت یہ ہے کہ توازن اسلامی تعلیمات کا بنیادی اصول ہے۔

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ اللہ کی یہ مہربانی ہے کہ اس نے عربی مبین میں' تمہاری زبان میں قرآن اتارا لیکن تمہاری ہٹ دھرمی' تمہارے مغالطے' تمہارے مجادلے اور پھر اس کتاب میں تحریفات قابل تعجب ہیں۔

وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْ لَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ءَ اَعْجَمِيٌّ وَّ عَرَبِيٌّ (۴۱ : ۴۴) "اگر ہم اس کو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے' کیوں نہ اس کی آیات کھول کر بیان کی

گئیں ۔ کیا ہی عجیب بات ہے کہ کلام عجمی ہے اور مخاطب عربی"۔ یہ لوگ ایک عربی قرآن کی طرف کان نہیں لگاتے' کیونکہ یہ اس کی بے پناہ تاثیر سے ڈرتے ہیں ۔ یہ عربی کلام ہے اور عربوں کی فطرت سے مخاطب ہوتا ہے' ان کی اپنی زبان میں ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں خلل ڈالو ۔ جب پڑھا جائے تو شور کرو' اسی طرح تم غالب ہو گے ۔ تو اگر یہ عجمی ہوتا تو پھر بھی یہ اس پر اعتراض کرتے کہ کیوں نہ قرآن عربی میں نازل ہوا' کیوں نہ مفصل اور فصیح زبان میں آیا اور اگر اس کا بعض حصہ عربی ہوتا اور بعض عجمی ہوتا تو پھر کہتے کہ عربی و عجمی' غرض ان کا مقصد ہر صورت میں اعتراض کرنا ہے ۔

اور اس بحث و جدال سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ جھگڑا صرف الفاظ اور زبان کے بارے میں ہے ۔ اور قرآن کی تعلیمات کے بارے میں نہیں ہے ۔ تعلیمات کے لحاظ سے یہ مومنین کے لیے ہدایت اور شفا ہے ۔ مومنین کے دل ہی اس کی حقیقت کو سمجھتے ہیں ۔ اس لیے وہ اس سے رہنمائی اور شفا پاتے ہیں ۔ رہے وہ لوگ جو ایمان ہی نہیں لاتے ان کے دل اندھے ہیں' ان تک قرآن کی روشنی ہی نہیں پہنچتی ۔ ان کے کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے ۔ وہ دلوں کے اندھے ہیں' لہٰذا ان کو اس کتاب میں سے کچھ بھی نہیں ملتا ۔ کیوں؟ یہ لوگ اس کتاب کے مزاج ہی سے بہت دور ہیں' اس کی آواز ہی کو نہیں سمجھتے ۔

قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ وَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّ هُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ (۴۱ : ۴۴) "ان سے کہو' یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے' مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے لیے یہ کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے ۔ ان کا حال تو ایسا ہے جیسے ان کو دور سے پکارا جا رہا ہو"۔ اس آیت کا اطلاق جن لوگوں پر ہوتا ہے وہ ہر زمان و مکان اور ہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں ۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ یہ قرآن ان کے نفوس میں اثر کرتا ہے اور ان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے ۔ مردوں کو زندہ کر دیتا ہے ۔ وہ اپنی ذات اور اپنے ماحول میں عظیم لوگ بن جاتے ہیں ۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے دل و دماغ پر یہ قرآن بہت بھاری لگتا ہے ۔ اور اگر ان کو سنایا جائے تو یہ ان کو اور اندھا اور بہرا کر دیتا ہے ۔ قرآن تو وہی ہے' دلوں کا فرق ہے ۔

--- ○○○---

قرآن کے حوالے سے حضرت موسیٰ اور ان کی کتاب اور اس کے بارے میں ان کی قوم کے اختلافات کو بھی بیان کر دیا جاتا ہے ۔ یہاں بطور نمونہ حضرت موسیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے کیونکہ اس سے پہلے تمام رسولوں کا ذکر مجموعی طور پر ہوا ۔ یہاں کتاب موسیٰ کے اختلافات کو بھی مجمل چھوڑ دیا گیا ہے ۔ اس سے قبل کہہ دیا گیا ہے کہ ان کا فیصلہ یوم عظیم یعنی قیامت کے دن ہو گا ۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝۴۵

"اس سے پہلے ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اس کے معاملے میں بھی یہی اختلاف ہوا تھا۔ اگر تیرے رب نے پہلے ہی ایک بات طے نہ کر دی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان فیصلہ چکا دیا جاتا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس کی طرف سے سخت اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں"۔

اور یہی فیصلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارے میں کیا گیا۔ قیامت میں اس کے بارے میں بھی فیصلہ ہو جائے گا' لوگ جس طرح چاہیں عمل کریں' قیامت میں جزاء و سزا ہوگی ان کے اعمال پر۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾

"جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے اچھا کرے گا' جو بدی کرے گا اس کا وبال اسی پر ہو گا' اور تیرا رب اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے"۔

رسالت محمدیؐ نے اعلان کر دیا کہ انسانیت اب بالغ ہو چکی ہے اور اس کے کاندھوں پر آزادی کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ اور ہر شخص کو اپنے کیے کا ذاتی طور پر ذمہ دار قرار دے دیا گیا ہے۔ اب ہو شخص جو راستہ چاہے اختیار کرے۔

وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۴۱ : ۴۶) "اور تیرا رب اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے"۔

---ooo---

آیات گزشتہ میں قیامت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اس میں اللہ کی جانب سے سب کے ساتھ انصاف کرنے کی طرف بھی اشارہ تھا کہ کوئی ظلم نہ ہو گا۔ اس لیے یہاں یہ بھی کہہ دیا گیا کہ قیامت کی گھڑی کا علم صرف اللہ وحدہ کو ہے۔ اس ضمن میں اللہ کے علم کی تصویر کشی بھی کر دی جاتی ہے کہ وہ ہر معاملے میں کتنی گہرائیاں اور تفصیلات رکھتا ہے۔ بعض مثالیں بھی دی جاتی ہیں۔ اس کے بعد قیامت کا ایک منظر بھی پیش کیا جاتا ہے جس میں مشرکوں سے سوال و جواب ہوتے ہیں :

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد پنجم

## پارہ ۔۔۔۔۲۵

-----------------------------

إِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَمَا تَخْرُجُ مِن ثَمَرَاتٍ مِّنْ أَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۚ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَائِي قَالُوا آذَنَّاكَ مَا مِنَّا مِن شَهِيدٍ ﴿٤٧﴾ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَدْعُونَ مِن قَبْلُ ۖ وَظَنُّوا مَا لَهُم مِّن مَّحِيصٍ ﴿٤٨﴾

"اس ساعت کا علم اللہ ہی کی طرف راجع ہوتا ہے' وہی ان سارے پھلوں کو جانتا ہے جو اپنے شگوفوں میں سے نکلتے ہیں' اسی کو معلوم ہے کہ کون سی مادہ حاملہ ہوئی ہے اور کس نے بچہ جنا ہے ۔ پھر جس روز وہ ان لوگوں کو پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک؟ یہ کہیں گے "ہم عرض کر چکے ہیں' آج ہم میں سے کوئی اس کی گواہی دینے والا نہیں ہے"۔ اس وقت وہ سارے معبود ان سے گم ہو جائیں گے جنہیں یہ اس سے پہلے پکارتے تھے' اور یہ لوگ سمجھ لیں گے کہ ان کے لیے اب کوئی جائے پناہ نہیں ہے"۔

قیام قیامت ایک ایسا غیب ہے جو مجہول اور مستقبل کے ضمیر میں گہرا پوشیدہ ہے ۔ اسی طرح شگوفوں میں سے جو پھل مستقبل میں بر آمد ہوتے ہیں ان کو بھی صرف اللہ جانتا ہے ۔ اسی طرح رحم میں حمل بھی غیب ہے' جو چھپا ہوا ہے ۔ یہ سب اللہ کے علم میں ہیں ۔ انسانی سوچ ان پھلوں کے پیچھے دوڑ رہی ہے جو پھولوں اور کلیوں سے نکلتے ہیں' ان بچوں کے پیچھے جو ماؤں کے رحم میں ہیں' ہماری سوچ اس وسیع زمین کے نشیب و فراز میں دوڑ رہی ہے اور لاتعداد پھولوں اور شگوفوں کے بارے میں سوچتی ہے ۔ پھر ہر مادہ کے رحم میں موجود بچے جن کی تعداد متعین کرنا انسان کے دائرہ قدرت میں نہیں ہے' تمام انسانوں' حیوانوں کی مادیاں' چرندوں پرندوں اور حشرات کی مادیاں ۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا راہوار خیال تھک کر گر پڑتا ہے ۔ اللہ کے علم کے حدود کا تصور بھی ممکن نہیں کہ وہ لامحدود ہے ۔

انسانوں میں سے گمراہوں کا ایک چھوٹا سا ریوڑ' ایک دن اس علم کا سامنا کرے گا اور اس علم کے دائرے سے تو کوئی چیز باہر نہ ہوگی ۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَائِي (۴۱ : ۴۷) "پھر جس روز وہ ان کو پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے شریک؟" اس وقت بھی کوئی جھگڑا' مجادلہ اور مغالطہ کام نہ دے گا' نہ زبان کی تحریف و تاویل چل سکے گی تو وہ پھر کیا کہہ سکیں گے اس کے سوا:

قَالُوا آذَنَّاكَ مَا مِنَّا مِن شَهِيدٍ (۴۱ : ۴۷) "یہ کہیں گے ہم عرض کر چکے ہیں' آج ہم میں سے کوئی اس کی گواہی دینے والا نہیں ہے"۔ اے اللہ ہم نے تو تجھے اطلاع کر دی ہے کہ آج تو ہم میں سے کوئی بھی

اس بات کا گواہ نہیں ہے۔

وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَدْعُونَ مِن قَبْلُ وَظَنُّوا مَا لَهُم مِّن

مَّحِيصٍ (۴۱ : ۴۸) "اس وقت وہ سارے معبود ان سے گم ہو جائیں گے جنہیں یہ اس سے پہلے پکارتے تھے اور یہ لوگ سمجھ لیں گے کہ ان کے لیے اب کوئی جائے پناہ نہیں ہے"۔

کیونکہ اب ان کو اپنے سابقہ دعویٰ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو گا کہ اس کی تصدیق کر سکیں۔ ان کے نفوس میں یہ بات گہرے طور پر بیٹھ گئی ہو گی کہ اب تو کوئی جائے فرار نہیں ہے۔ یہ ہو گی ان کی کربناک اور مدہوش کر دینے والی حالت اس دن۔ جب ایسی حالت آتی ہے تو انسان اپنا تمام ماضی بھول جاتا ہے' پھر اسے وہی حالات یاد ہوتے ہیں جو درپیش ہوتے ہیں۔

--- ○○○---

یہ کس قدر خوفناک دن ہے لیکن انسان اس کے بارے میں بالکل محتاط نہیں ہے۔ انسان ہر قسم کی بھلائی کے لیے بہت ہی حریص ہے۔ لیکن قیامت کی بھلائی کی وہ ذرا بھی فکر نہیں کرتا۔ انسان معمولی مصیبت پر جزع فزع کرنے لگتا ہے۔ لیکن قیامت کے ہولناک جزع فزع کا اسے خیال نہیں ہے۔ یہاں انسان کے نفس کی اندرونی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ تمام لباس اور پردے اتار دیئے جاتے ہیں اور ہر قسم کی ملمع کاری کو ہٹا کر نقش انسانی کا اصل رنگ دکھایا جاتا ہے۔

لَا يَسْأَمُ الْإِنسَانُ مِن دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِن مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوسٌ قَنُوطٌ ﴿٤٩﴾ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِن بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ هَٰذَا لِي وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِن رُّجِعْتُ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِي عِندَهُ لَلْحُسْنَىٰ ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ﴿٥٠﴾ وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُو دُعَاءٍ عَرِيضٍ ﴿٥١﴾

"انسان کبھی بھلائی کی دعا مانگتے نہیں تھکتا' اور جب کوئی آفت اس پر آ جاتی ہے تو مایوس و دل شکستہ ہو جاتا ہے' مگر جونہی کہ سخت وقت گزر جانے کے بعد ہم اسے اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں' یہ کہتا ہے کہ "میں اسی کا مستحق ہوں' اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کب آئے گی' لیکن اگر واقعی میں اپنے رب کی طرف پلٹایا گیا تو وہاں بھی مزے کروں گا"۔ حالانکہ کفر کرنے والوں کو لازماً ہم بتا کر رہیں گے کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں اور انہیں ہم بڑے گندے عذاب کا مزہ

چکھائیں گے ۔ انسان کو جب ہم نعمت دیتے ہیں تو وہ منہ پھیرتا ہے اور اکڑ جاتا ہے اور جب اسے کوئی آفت چھو جاتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے"۔

نفس انسانی کی یہ نہایت ہی سچی تصویر ہے ۔ نہایت ہی باریک خدوخال کو بھی اس میں نمایاں کیا گیا ہے ۔ وہ لوگ جو اللہ کی ہدایات پر ایمان نہیں رکھتے' جو لوگ ایمان رکھتے ہیں' وہ تو بالکل سیدھی راہ پر گامزن ہوتے ہیں' ان کا ایک ہی رنگ ڈھنگ ہوتا ہے ۔ لیکن گمراہ لوگوں کی نفسیات کیا ہیں' یکدم بدلنے والے' ضعیف الارادہ' دکھاوے کے شیدائی' مال کے لالچی' ناشکرے' خوشحالی میں مغرور اور بدحالی میں آہ و فغاں کرنے والے' غرض یہ نہایت ہی تفصیلی تصویر ہے ان لوگوں کی اور عجیب تصویر ہے ۔

انسان بھلائی کی دعا مانگتے نہیں تھکتا۔ وہ بڑے اصرار اور گڑگڑا کر دعائے خیر کرتا ہے ۔ اور دعا کرتے ہوئے نہیں تھکتا۔ لیکن شر اگر محض اس کو چھو کر بھی گزر جائے تو وہ تمام امیدیں کھو دیتا ہے' مکمل طور پر مایوس ہو جاتا ہے ۔ یہ خیال کرتا ہے کہ اس شر سے تو اب نکلنے اور بچنے کی کوئی امید نہیں ہے ۔ یوں وہ سمجھ لیتا ہے کہ سب اسباب و وسائل ختم ہو گئے ۔ اس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے' مغموم و متفکر ہو جاتا ہے ۔ اللہ کی رحمتوں اور مہربانیوں سے مایوس ہو جاتا ہے ۔ یہ اس لیے کہ اس کا اپنے رب پر بھروسہ نہیں ہوتا اور رب سے اس کا تعلق کمزور ہوتا ہے ۔

لیکن یہی انسان' جب اللہ اس پر اپنی رحمتیں اور مہربانیاں کرتا ہے' یہ مصیبت جاتی رہتی ہے' تو اللہ کی نعمتیں اسے بلاتا اور متکبر کر دیتی ہیں ۔ یہ شکر نہیں بجا لاتا۔ اب خوشحالی اسے آسمانوں پر چڑھا دیتی ہے ۔ وہ کہتا ہے یہ تو میرا حق ہے ۔ میں اپنی صلاحیت پر اس کا مستحق ہوا ہوں اور یہ حق دائمی ہے ۔ یہ شخص آخرت کو بھول جاتا ہے اور اسے بعید از امکان سمجھتا ہے ۔ کہتا ہے ۔

وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً (۴۱ : ۵۰) "میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کبھی آئے گی"۔ اب یہ اپنے آپ میں مست ہے ۔ اللہ پر احسان جتلاتا ہے ۔ اور یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ کے ہاں بھی میرا یہی مقام ہو گا حالانکہ اس کا کوئی مقام نہ ہو گا۔ یہ تو آخرت کا منکر اور کافر ہے ۔ اس کے باوجود یہ سمجھتا ہے کہ اگر اللہ کے ہاں چلا گیا تو وہاں بھی باعزت لوگوں میں شمار ہو گا۔

وَلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰی رَبِّیْٓ اِنَّ لِیْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰی (۴۱ : ۵۰) "لیکن اگر واقعی میں اپنے رب کی طرف پلٹایا گیا تو وہاں بھی مزے کروں گا"۔ یہ ہے بے جا غرور' اب نہایت ہی برمحل تنبیہ آتی ہے ۔

فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ (۴۱ : ۵۰)

"حالانکہ کفر کرنے والوں کو لازماً ہم بتا کر رہیں گے کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں اور انہیں ہم بڑے گندے عذاب کا مزہ چکھائیں گے"۔ یہ ہے انسان کہ جب اللہ اسے خوشحال بناتا ہے ۔ تو یہ سرکشی اختیار کرتا ہے ۔ منہ موڑتا ہے اور غرور کرتا ہے ۔ لیکن اگر اسے تکلیف پہنچتی ہے تو پھر گر جاتا ہے ۔ اپنے آپ کو ذلیل و خوار سمجھتا ہے ۔ حقیر و لاچار ہوتا ہے ۔ اور گڑگڑانے اور بلبلانے لگتا ہے' لمبی لمبی دعائیں کرتا ہے ۔

ذرا دیکھئے تو سہی ' قرآن کریم نے انسانی نفسیات کے چھوٹے بڑے عمل اور ردعمل کو کس باریکی سے ریکارڈ کیا ہے ۔ یہ اللہ کا کلام ہے جو خالق انسان ہے اور خود خالق بتا رہا ہے کہ یہ ہے حضرت انسان ۔کیونکہ خالق اپنی مخلوق کے کل پرزوں کو اچھی طرح جانتا ہے ' اللہ جانتا ہے کہ یہ ان نشیب و فراز میں پھرتا رہتا ہے ' الا یہ کہ اسے صراط مستقیم کی طرف پکڑ کر لے جایا جائے ۔تب وہ راہ راست پر چلتا ہے ۔

نفس انسانی کی اس نہایت ہی تنگی تصویر کے بعد اللہ ان سے پوچھتا ہے کہ تم اس وقت کیا کرو گے کہ جس کتاب کی تم تکذیب کرتے ہو ۔اگر یہ اللہ کی جانب ہی سے ہو اور تم اس عذاب کے مستحق ہو جاؤ جس سے تمہیں ڈرایا جا رہا ہے اور اس وقت تم تکذیب اور دشمنی کے عواقب و نتائج کا اپنے آپ کو مستحق کر لو ۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ۝۵۲

"اے نبی' ان سے کہو' کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر واقعی یہ قرآن خدا ہی کی طرف سے ہوا اور تم اس کا انکار کرتے رہے تو اس شخص سے بڑھ کر بھٹکا ہوا اور کون ہو گا جو اس کی مخالفت میں دور تک نکل گیا ہو؟"

قرآن ان کے سامنے ایک احتمال پیش کرتا ہے کہ اس قدر احتیاط تو کرو' لیکن انہوں نے کوئی احتیاط بھی نہ کی ۔

---ooo---

اس کے بعد اب قرآن کریم ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے کہ سوچیں ۔اور پھر اس وسیع کائنات کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ دیکھو اللہ نے اس میں کچھ نشانات اور تقدیرات طے کر رکھی ہیں 'جن کا ظہور مستقبل میں ہو گا ۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ
۶ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ۝۵۳ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ
۱۰ع لِّقَاۗءِ رَبِّهِمْ ۭ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ۝۵۴ۧ
۱

"عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے ' اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے ۔کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز ر ہے؟ آگاہ رہو' یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں ۔سن رکھو' وہ ہر چیز پر محیط ہے"۔

یہ آخری ضرب ہے اور آخری تبصرہ ہے--- اللہ اپنے بندوں کے ساتھ وعدہ فرماتا ہے کہ عنقریب تمہیں اس کائنات کے کچھ رازوں سے آگاہ کیا جائے گا' اسی طرح خود تمہارے نفس اور ذات کے اندر جو راز ہیں ان کے بارے میں تم پر انکشافات ہوں گے یعنی انفس و آفاق کے نشانات تمہیں دکھائے جائیں گے ۔اور یہ راز ہائے نہفتہ جب کھلیں گے

تو معلوم ہو گا کہ یہ کتاب برحق ہے۔ یہ کتاب اور یہ منہاج اور نظام زندگی ' اور یہ قول جو تمہیں بتایا جارہا ہے ' یہ سب سچے ہیں۔

فی الواقع اللہ کا وعدہ سچا تھا۔ گزشتہ چودہ سو سال سے اللہ نے انفس و آفاق کے کئی نشانات انسانوں پر ظاہر فرمائے ہیں۔ اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ انسان کی ذات کے بارے میں بھی عجیب و غریب انکشافات ہوئے ہیں۔ اور کائنات کے بارے میں بھی۔

پھر انسان بھی لگا ہوا ہے ' اس نے نزول قرآن کے وقت سے آج تک بہت سارے انکشافات کیے ہیں۔ اس کائنات کی وسعتیں بھی دور تک انسان نے دیکھ لیں اور اس کے لیے کھل گئیں اور نفس انسانی کے وسائل بھی اس پر واضح ہو گئے اور یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا۔

انسان نے بہت کچھ سیکھ لیا ہے ' اور دیکھ لیا ہے ' اگر انسان یہ بات معلوم کرے کہ کس طرح اس نے ان چیزوں کا ادراک کیا اور اللہ کا شکر ادا کرے تو یہ اس کے لیے بہتر ہو گا۔

مثلاً انسان نے معلوم کر لیا کہ وہ جس زمین کو کائنات کا مرکز سمجھتا تھا۔ یہ تو ایک حقیر سا ذرہ ہے جو سورج کے تابع ہے۔ اور انہوں نے معلوم کر لیا کہ یہ سورج اس کائنات کا ایک چھوٹا سا کرہ ہے۔ اور اس جیسے کئی سو ملین سورج ہیں۔ انہوں نے شمس و قمر اور ارض و سما کی حقیقت معلوم کر لی اور انہوں نے اپنے وجود کی اور نفس کی حقیقت بھی معلوم کر لی ہے۔

پھر انسان نے اس کائنات کے مادے میں سے بھی اکثر چیزوں کو معلوم کر لیا ہے کہ اس مادے کے اندر کیا عناصر ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہو کہ کوئی مادہ ہے۔ پھر انسان نے یہ دیکھ لیا کہ اس کائنات کا اصل مادہ ذرہ ہے۔ اس نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ یہ ذرہ شعاع کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ اس نے یہ دیکھ لیا کہ دراصل تو یہ پوری کائنات روشنی ہے۔ مختلف انداز کی روشنی جس سے مختلف شکل و صورت کی چیزیں بنتی ہیں۔

انسانوں نے اس چھوٹے سے کرے اور زمین کے بارے میں تو بہت کچھ جان لیا ہے کہ یہ گیند ہے اور گیند کی طرح ہے۔ یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ یہ اپنے گرد بھی گھومتا ہے اور سورج کے گرد بھی گھومتا ہے۔ انہوں نے اس کے براعظموں ' اس کے سمندروں اور اس کے دریاؤں کو معلوم کر لیا۔ اس کے اندرون تک گھس گئے اور اس کے پیٹ میں جو کچھ چھپا تھا اس کو بھی انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ کیا کیا قوتیں اس کے اندر ودیعت کردہ ہیں۔ پھر ان قوتوں میں سے فضا میں کون کون سی ہیں۔

انہوں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ ان کی اس زمین کو اس پوری کائنات کے ساتھ جس قانون قدرت نے مربوط کر دیا ہے وہ ایک ہی قانون ہے۔ اس کائنات میں تصرفات ہوتے ہیں ' ان میں سے بیشتر کو انسان نے دریافت کر لیا ہے۔ اب انسانوں میں سے کچھ اہل علم ایسے ہیں کہ انہوں نے ان قوانین سے معلوم کر لیا ہے کہ کوئی مقنن اور خالق ہے اور بعض ایسے ہیں کہ ان کے لیے ان کا یہ علم ہی وبال بن گیا۔ یہ ان ظاہری انکشافات کے اندر ہی گم ہو گئے۔ آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن آیات الہیہ کے اس عظیم انکشاف کے بعد انسانیت نے اب اللہ کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا ہے اور تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے کہ یہ حق ہے۔

انسان کی ذات اور اس کے نفس کے اندر علم کی فتوحات اس کائنات سے کم نہیں ہیں انسانوں نے انسانی جسم ' اس کی

ترکیب ' اس کے خصائص اور اس کے اسرار و رموز کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر لیا ہے ۔ اس کی بناوٹ ' اس کے اعضاء ' ان کے فرائض ' اس کے امراض ' اس کی غذا کے بارے میں وافر علوم جمع کر لیے ہیں ' انسانی اعمال اور حرکات کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم کر لیا ہے ۔ یہ تمام انکشافات دراصل آیات الٰہیہ کے بارے میں ہیں ۔ ان چیزوں کا خالق اس کے سوا کوئی نہیں ہے ۔

انسانی نفسیات کے بارے میں بھی انسان نے بہت کچھ جان لیا ہے ۔ یہ اگرچہ اس حد تک نہیں ہے جو نشانات جسم کے بارے میں انسان نے دریافت کر لیے ہیں ۔ کیونکہ انسان کی جدوجہد زیادہ تر انسانی جسم اور اس کی آلاتی حیثیت پر مرکوز ہے ۔ انسان کی عقل ' اس کی روح کی طرف ابھی زیادہ توجہ نہیں ہوئی ۔ لیکن نفس انسانی کے میدان میں بعض چیزوں کا انکشاف ہوا ' وہ بتاتا ہے کہ اس میدان میں بھی مستقبل میں بڑی فتوحات ہوں گی اور انسان مزید نشانات دیکھیں گے ---

ابھی تو انسان راستے ہی میں ہے ۔

اللہ کا وعدہ قائم ہے ۔

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۵۳:۴۱)

" عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے ' اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے " ۔ اور اس وعدے کا آخری حصہ کہ قرآن کتاب برحق ہے ' بیسویں صدی میں اس کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں ۔ ایمان کے قافلے مختلف راستوں سے جمع ہو رہے ہیں ۔ یہاں تک کہ خالص مادی علوم کے راستے سے بھی لوگ اسلام کی حقانیت کی طرف بڑھ رہے ہیں ۔ ہر طرف سے اسلامی افواج کا اجتماع ہو رہا ہے ۔ اگرچہ ماضی میں اس کرۂ ارضی پر مادیت و الحاد کی جو لہریں اٹھیں وہ بڑی سرکش تھیں ۔ لیکن اب یہ طوفان ختم ہو رہا ہے ۔ اگرچہ باد مخالف بڑی تند تھی ۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ صدی جس سے ہم گزر رہے ہیں ' ابھی ختم نہ ہو گی کہ مادیت و الحاد کے یہ طوفان ختم ہوں گے اور اللہ کا کلمہ حق ہو کر رہے گا ۔ (سید قطب ! آپ کی روح کو اللہ اطلاع کرے کہ اشتراکی روس ختم ہو گیا ہے ' جس کے ایک کتے نے آپ کو شہادت کے منصب پر فائز کیا ۔ اور یہ تو تھی مادیت اور امریکی الحاد کے خلاف بھی خدائی فوجیں لڑ رہی ہیں ' امید ہے کہ بہت جلد وہ بھی ختم ہو گا ۔ مترجم )

اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۵۳:۴۱) " کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے " ۔ اللہ نے یہ وعدہ علم و یقین کے ساتھ کیا ہے ۔ وہ دیکھ رہا ہے اور شاید عادل ہے ' اس لیے یہ سچا ہے ۔

اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗءِ رَبِّهِمْ (۵۴:۴۱) " آگاہ رہو یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں " ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ غلطیاں کرتے ہیں کیونکہ ان کو اللہ کی ملاقات پر پورا یقین نہیں ہے ۔ یہ نہایت ہی تاکید کی امر ہے ۔

اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ (۵۴:۴۱) " سن رکھو وہ ہر چیز پر محیط ہے " ۔ لہٰذا تم اس کی ملاقات سے کیسے بچ سکتے ہو ۔ تم مکمل طور پر اس کے گھیرے میں ہو ۔

۱۷ ستمبر ۱۹۹۴ء کراچی ڈیفنس کالونی

--- ○○○ ---

# فی ظلال القرآن

## جلد ---- پنجم

## پارہ ----- ۲۵

### سورۃ الشوریٰ ۔ ۴۲

آیات ا --- تا --- ۵۳

# سورۃ الشوریٰ ایک نظر میں

یہ سورت بھی تمام دوسری مکی سورتوں کی طرح نظریاتی مسئلے پر بحث کرتی ہے لیکن اس کے زیادہ تر مضامین وحی و رسالت کے مضمون کے ارد گرد گھومتے ہیں ۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس سورت کا مرکزی مضمون اور محور ہی وحی و رسالت ہے تو درست ہوگا ۔ اس سورت کا تانا بانا اسی موضوع سے ہے اور دوسرے موضوعات اسی مرکزی مضمون کے تابع ہیں ۔

اللہ کی وحدانیت کے مضمون کو یہ سورت مختلف پہلوؤں سے لیتی ہے اور اس موضوع پر بات کو بہت پھیلایا گیا ہے ۔ قیامت اور قیامت پر ایمان کا موضوع بھی ہے اور قیامت کے بعض مناظر بھی اس کے اندر بیان ہوئے ہیں ' جابجا اس سورت میں مومنین کی امتیازی صفات اور خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں اور یہ بھی ہے کہ کسی کو وافر مقدار میں رزق دینا اور کسی کے رزق میں تنگی کرنا اللہ کا کام ہے اور یہ کہ انسان کو خوشحالی اور مشکلات میں کس طرح کا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے ۔

اگرچہ مذکور متنوع مضامین بھی اس سورت میں ہیں لیکن وحی و رسالت اور ان سے متعلقہ مضامین اس سورت میں ممتاز ہیں اور سورت کا بڑا حصہ انہی پر مشتمل ہے اور دوسرے مضامین پر بھی انہی کا سایہ ہے ۔ یوں نظر آتا ہے کہ دوسرے مضامین بھی وحی و رسالت کے ثبوت کے لیے لائے گئے ہیں ۔

یہ مضامین اور ان کے ذیلی مضامین اس سورت میں اس طرح لائے گئے ہیں جو قابل غور اور قابل تدبر ہیں اور اس انداز پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے ۔ کیونکہ کئی پہلوؤں سے موضوعات کو دہرایا گیا ہے ' اگرچہ بعض آیات ایسی ہیں جن میں خالق کی وحدانیت ' رازق کی وحدانیت ' دلوں میں تصرف کی وحدانیت ' اور اچھے یا برے انجام عطا کرنے میں وحدانیت کے مضامین ہیں لیکن یہ اس وقت ہے جب وحی و رسالت بھیجنے والے کی وحدانیت کی بات آتی ہے ' جس میں وحدت وحی ' وحدت عقیدۂ توحید ' وحدت شریعت اور منہاج حیات اور سب سے آخر میں یہ اس نظریہ حیات کی روشنی میں انسانوں کی قیادت کی وحدت کے مضامین ۔

چنانچہ قاری کے ذہن میں توحید کے خطوط ابھرنا شروع ہوتے ہیں اور وہ واضح ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ مختلف پہلوؤں اور مختلف معانی کے لحاظ سے توحید کے اشارات ذہن میں ابھرتے ہیں ۔ سورت کے تمام مضامین سے اور مختلف قسم کے موضوعات سے ۔ مناسب ہے کہ بعض اجمالی اشارات یہاں دے دیئے جائیں ' تفصیلات بعد میں آئیں گی ۔

سورت کا آغاز حا ' میم ' عین ' سین اور قاف کے حروف مقطعات سے ہوتا ہے ۔ اور اس کے متصلاً یہ آیت ہے :

كَذَالِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ( ۴۲ : ۳ ) ”اسی طرح اللہ غالب و حکیم تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کی ... ی کرتا رہا ہے“ ۔ گویا وحی کا سرچشمہ اولین اور آخرین کے لیے ایک ہی رہا ہے ۔

اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ (۲ ۴ : ۳) "تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کی طرف"۔
اس کے بعد اللہ عزیز و حکیم کی صفات بیان کی گئی ہیں۔

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (۲ ۴ : ۴) "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے' اسی کا ہے۔وہ برتر اور عظیم ہے"۔اس میں یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ آسمانوں اور زمین کا مالک اللہ وحدہ ہے اور برتری اور عظمت کا مستحق وہی ہے اور صرف وہی ہے۔

صفت عزیز و حکیم کے بعد اب سیاق کلام اللہ وحدہ پر ایمان کے سلسلے میں اس کائنات کے ردعمل کو بھی پیش کرتا ہے۔اور یہ بتایا جاتا ہے جو لوگ شرک کرتے ہیں یہ پوری کائنات بھی ان کے اس فعل کو مسترد کرتی ہے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۲ ۴ : ۵) وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (۲ ۴ : ۶)
"قریب ہے کہ آسمان اوپر سے پھٹ پڑیں۔فرشتے اپنی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں اور زمین والوں کے حق میں درگزر کی درخواستیں کیے جاتے ہیں' آگاہ رہو حقیقت میں اللہ غفور و رحیم ہی ہے۔جن لوگوں نے اس کو چھوڑ کر اپنے کچھ دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں اللہ ہی ان پر نگران ہے' تم ان کے حوالہ دار نہیں ہو"۔گویا پوری کائنات ایمان اور شرک کے مسئلے میں لگی ہوئی ہے۔شرک اس قدر بڑا گھناؤنا فعل ہے کہ اس سے قریب ہے کہ آسمان ٹوٹ پڑیں اور جو لوگ اس برے فعل کا ارتکاب کرتے ہیں ان کے لیے فرشتے بھی استغفار کرتے ہیں کہ خدایا' ان کو اس فعل بد سے موڑ دے۔

اس کے بعد روئے سخن پہلی حقیقت کی طرف آتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ (۲ ۴ : ۷) "ہاں اسی طرح اے نبیؐ' یہ قرآن عربی ہم نے تمہاری طرف وحی کیا ہے تاکہ تم بستیوں کے مرکز (شہر مکہ) اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو' اور جمع ہونے کے دن سے ڈراؤ جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ایک گروہ کو جنت میں اور دوسرے گروہ کو دوزخ میں جانا ہے"۔

اس کے بعد فریق جنت اور فریق جہنم کی بات آگے بڑھتی' کہا جاتا ہے کہ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو تمام انسانوں کو ایک ہی فریق بنا دیتا لیکن اللہ کی مشیت کا یوں تقاضا ہوا کہ اس نے جسے چاہا اپنی رحمت میں داخل کر دیا اور یہ فیصلہ اللہ نے اپنے علم اور معرفت کی بنا پر کیا۔

وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۴۲ : ۸) "اور ظالموں کا کوئی ولی و مددگار نہیں ہے"۔ اور والی و مددگار تو اللہ ہی ہے۔

فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۴۲ : ۹) "ولی تو اللہ ہی ہے وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے"۔

اس کے بعد روئے سخن پھر پہلی حقیقت کی طرف پھر جاتا ہے یعنی وحی و رسالت کی طرف آتا ہے کہ لوگوں کے درمیان جو اختلافات ہیں تو انہی کے لیے اللہ نے یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کو معیار بنا کر اپنے مسائل حل کریں۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗ اِلَى اللّٰهِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ (۴۲ : ۱۰) "تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو' اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے' وہی اللہ میرا رب ہے' اس پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں"۔

وحدانیت خالق کے ثبوت کے لیے بات اب اللہ کی ربوبیت کے نظام میں داخل ہوتی ہے کہ وہ وحدہ خالق ہے' رب ہے اور متصرف فی الامور ہے۔ آسمانوں اور زمینوں کا نظام اس نے مقرر کیا ہے' رزق کی فراوانی اور تنگی بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (۴۲ : ۱۱) لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۴۲ : ۱۲) "آسمانوں اور زمین کا بنانے والا جس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے اور اس طرح جانوروں میں بھی جوڑے بنائے' اور اس طریقہ سے وہ تمہاری نسلیں پھیلاتا ہے' کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں' وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ آسمان اور زمین کی کنجیاں اس کے پاس ہیں' جسے چاہتا ہے' کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے' نپا تلا دیتا ہے' اسے ہر چیز کا علم ہے۔

اس کے بعد پھر پہلی حقیقت وحی الٰہی کی طرف :

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (۴۲ : ۱۳)

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (۴۲:۱۴) فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ (۴۲:۱۵)

"اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے' جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا' اور جسے اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے' اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں۔ اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ یہی بات ان مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف تم انہیں دعوت دے رہے ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے' اپنا کر لیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اس کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔ لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا' وہ اس کے بعد ہوا' کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ اگر تیرا رب پہلے ہی نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک وقت مقررہ تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا تو ان کا قضیہ چکا دیا ہوتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے اے محمد' تو اب اسی دین کی طرف دعوت دے اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے' اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ' اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو' اور ان سے کہو کہ اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے اس پر میں ایمان لایا"۔

غرض حقائق کے بیان کرنے میں یہ سورت اس نہج پر چلتی ہے اور یہ اس کے موضوعات ہیں۔ یہ فضا ہے اور یہ تمام امور وحی و رسالت کے ساتھ متعلق ہیں۔ جو اس سورت کا مرکزی موضوع ہے۔

اس سورت کے پہلے سبق کے اندر ترتیب اور ربط مضامین بالکل واضح ہے۔ مضمون جوں جوں آگے بڑھتا ہے' وحی و رسالت کے ساتھ اس کا تعلق واضح ہوتا جاتا ہے۔ مضمون کا کوئی نہ کوئی حصہ وحی و رسالت سے وابستہ نظر آتا ہے۔

دوسرا سبق بقیہ سورت پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز رزق کی فراوانی اور تنگی کے مضمون سے ہے۔ پھر باران رحمت' زمین و آسمان کی تخلیق اور زمین کے اندر قسم قسم کے حیوانات کا پھیلانا پہاڑوں جیسے بحری جہاز۔ پھر صفات مومنین اور ان کی جماعت' پھر وہ منظر جب ظالم قیامت کے دن عذاب دیکھیں گے۔

وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ (۴۲:۴۴) وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ (۴۲:۴۵)

"تم دیکھو گے کہ یہ ظالم جب عذاب دیکھیں تو کہیں گے اب پلٹنے کی بھی کوئی سبیل ہے' اور تم دیکھو گے کہ یہ جہنم کے سامنے جب لائے جائیں گے تو ذلت کے مارے جھکے جا رہے ہوں گے اور اس کو نظر بچا بچا کر کن انکھیوں

سے دیکھیں گے"۔

اس دن مومنین سربلند ہوں گے اور وہ ظالموں کے حالات پر یہ تبصرہ کریں گے ۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِیْنَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ

اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ فِیْ عَذَابٍ مُّقِیْمٍ (۴۲ : ۴۵) "اس وقت وہ لوگ جو ایمان لائے تھے کہیں گے کہ واقعی اصل زیاں کار وہی ہیں جنہوں نے آج قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو خسارے میں ڈالا ۔ خبردار رہو ظالم لوگ مستقل عذاب میں رہیں گے"۔

اس لیے لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ اپنے آپ کو اس قسم کے انجام بد سے بچاؤ ۔ قبل اس کے وقت ہاتھوں سے چلا جائے ۔

اِسْتَجِیْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ یَّوْمَئِذٍ وَّ

مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِیْرٍ (۴۲ : ۴۷) "مان لو اپنے رب کی بات قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس کے ٹلنے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے ۔ اس دن تمہارے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی اور نہ کوئی تمہارے حال کو بدلنے کی کوشش کرنے والا ہوگا"۔

اب یہاں آکر مضمون پھر پہلی حقیقت کی طرف مڑ جاتا ہے یعنی حقیقت وحی و رسالت کی طرف ' رسالت کا ایک پہلو یہاں لیا جاتا ہے ۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا اِنْ عَلَیْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (۴۲ : ۴۸) "اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو اے نبی ؐ ہم نے تم کو ان پر نگہبان بناکر تو نہیں بھیجا ہے ۔ تم پر تو صرف بات پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے ۔

اس کے بعد اب سیاق کلام اسی مضمون کے گرد گھومتا ہے ' براہ راست یا بالواسطہ ' دوران بیان وحی و رسالت کی طرف کسی نہ کسی شکل میں اشارہ آتا ہے ۔ یہاں تک کہ سورت کے آخر میں وحی و رسالت کے بارے میں یہ بیان آتا ہے ۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا

فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَكِیْمٌ (۴۲ : ۵۱) وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ رُوْحًا

مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ

نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۴۲ : ۵۲) صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ (۴۲ : ۵۳) "کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے روبرو بات کرے' اس کی بات یا تو وحی کے طور پر ہوتی ہے' یا پردے کے پیچھے سے یا پھر وہ کوئی پیغام بر بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ چاہتا ہے' وحی کرتا ہے' وہ برتر اور حکیم ہے اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے ۔ تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے' مگر اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں' اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں' یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو' اس خدا کے راستے کی طرف جو زمین اور آسمان کی ہر چیز کا مالک ہے ۔ خبردار رہو' سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں ۔

---ooo---

اس پوری سورت میں اگرچہ مرکزی مضمون وحی و رسالت ہے لیکن اس مضمون کو اس انداز میں پیش کرنے کا ایک خاص مقصد ہے' وہ یہ کہ مبشرین اور مبلغین کی ایک جدید قیادت متعین کی جائے جو اس آخری پیغام' اس آخری نبی اور اس آخری امت کے مشن کو آگے بڑھائے' یہ امت جو اسلام کے نہایت ہی مستحکم منہاج پر چل رہی ہے ۔

چنانچہ اس غرض کے لیے پہلا اشارہ سورت کے آغاز ہی میں ہے ۔

كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۲ : ۳) "اسی طرح اللہ غالب و حکیم تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کی طرف وحی کرتا رہا ہے"۔ تاکہ یہ بتا دیا جائے کہ تمام رسولوں کی طرف رسالت اللہ ہی وحی کرتا رہا ہے اور یہ آخری رسالت سابقہ رسالتوں کا تسلسل ہے اور اس کا مضمون پہلے سے طے شدہ ہے ۔

اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد یہی اشارہ آتا ہے ۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (۴۲ : ۷) "اور اسی طرح ہم نے اے نبیؐ' یہ قرآن عربی تمہاری طرف وحی کیا ہے تاکہ تم بستیوں کے مرکز (مکہ) اور اس کے گردو پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو" ۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قیادت کا مرکز مکہ ہے اور اس کی طرف بعد میں بھی اشارہ آئے گا۔

اور تیسرے اشارے میں ہے کہ رسالت بھی ایک ہے جس طرح پہلے اشارے میں ہے کہ رسالت اللہ کی طرف سے بھیجی گئی ہے اور اس کا سرچشمہ بھی ایک ہے ۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (۴۲ : ۱۳) "اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا۔ اور جسے تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں ۔ اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس

دین کو اور متفرق نہ ہو جاؤ" ۔ اس بیان کو جاری رکھتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ تفرق فی الدین اس وصیت کی مخالفت میں واقع ہوا' ان رسولان کرام کے متبعین نے یہ تفرق جہل کی وجہ سے اختیار نہ کیا بلکہ مانتے ہوئے حسد' ظلم اور دست درازی کی خاطر انہوں نے تفرق کیا۔

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ (۴۲ : ۱۴) "اور ان لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا وہ اس کے بعد ہوا کہ ان کے پاس علم آچکا تھا۔ اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے" ۔ اور یہی مضمون چلتا ہے کہ ان اختلاف کرنے والوں کے بعد جو لوگ آئے ان کا حال کیا تھا۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (۴۲ : ۱۴) "حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے' وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں" ۔ یعنی سابقہ کتب کے بارے میں۔

یہاں آکر یہ بات متعین ہو گئی کہ تمام انسانیت ذہنی انتشار اور شک میں مبتلا ہے اور بے رہبر ہے' اور کسی مستحکم دین پر نہیں ہے۔ آسمانی ہدایات اور کتب سابقہ میں سخت اختلاف ہو گئے اور بعض میں آنے والے تو اپنی کتابوں کے بارے میں سخت خلجان میں مبتلا ہو گئے اور ان کی کوئی قیادت بھی نہ رہی۔ لہٰذا ان حالات میں یہ آخری رسالت بھیجی جا رہی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے قائد ہیں اور ان کی ڈیوٹی یہ ہے۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ (۴۲ : ۱۵) "اس لیے اے محمدؐ' اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو' جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے' اسی پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو' اور ان سے کہہ دو "اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا' مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں' اللہ ہی ہمارا رب بھی اور تمہارا رب بھی" یہی وجہ ہے کہ درس دوم میں جماعت مسلمہ کی صفات کو لایا گیا ہے کہ اس جماعت نے اس کام کو لے کر اٹھنا ہے' تاکہ وہ انسانیت کی قیادت ایک مستحکم منہاج پر کرے۔

جب ہم ان باتوں کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوتا ہے' اس سورت کا سیاق' اس کا مرکزی موضوع اور دوسرے متعلقہ موضوعات ایک خاص سمت کی طرف واضح ہدف لے کر جا رہے ہیں۔ آیات کی تشریح کے دوران ہم ان اشارات کی تفصیلات دیں گے۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۲۹ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۲۴

---

سُوْرَةُ الشُّوْرٰى (۴۲) مَكِّيَّةٌ (۶۲)
اٰيَاتُهَا ۵۳ رُكُوْعَاتُهَا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ عٓسٓقٓ ﴿۲﴾ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳﴾
لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۴﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ
يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ
فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵﴾ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ
اَوْلِيَاۗءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ڮ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۶﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔

"ح م' ع س' ق ۔ اسی طرح اللہ غالب و حکیم تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے (رسولوں) کی طرف وحی کرتا رہا ہے ۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے اسی کا ہے' وہ برتر اور عظیم ہے ۔ قریب ہے کہ آسمان اوپر سے پھٹ پڑیں ۔ فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں' اور زمین والوں کے حق میں درگزر کی درخواستیں کیے جاتے ہیں ۔ آگاہ رہو' حقیقت میں اللہ غفور و رحیم ہی ہے ۔ جن لوگوں نے اس کو چھوڑ کر اپنے کچھ دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں' اللہ ہی ان پر نگراں ہے' تم ان کے حوالہ دار نہیں ہو" ۔

حروف مقطعات کے بارے میں کئی سورتوں کے آغاز میں بات ہو چکی ہے جسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے ۔ یہ حروف بتاتے ہیں کہ سورت کا آغاز ہو رہا ہے ۔ ان حروف کے بعد پہلا فقرہ یہ ہے ۔

كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۲ : ۳) "اسی طرح اللہ غالب و حکیم تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کی طرف وحی کرتا رہا ہے"۔ یعنی جس طرح تمہاری طرف وحی ہو رہی ہے اسی طرح اور اسی انداز میں ہم نے پہلے رسولوں کی طرف بھی وحی بھیجی ہے۔ یہ وحی الفاظ ' کلمات اور حروف تہجی پر مشتمل رہی ہے۔ وحی کا کلام الٰہی حروف سے بنایا گیا ہے۔ ان حروف سے لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کلمات کے معانی وہ سمجھتے ہیں لیکن اس وحی کی طرح وہ کلام پیش نہیں کر سکتے۔ حالانکہ جس مواد سے یہ کلام بنا ہے' وہ ان کے سامنے ہے اور دسترس میں ہے۔

دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ وحی ایک ہے' وحی کا مصدر و ماخذ ایک اللہ ہے جو عزیز و حکیم ہے۔ اور جن کی طرف وحی آتی ہے وہ ہر زمان و مکان کے رسول ہیں۔ رسول مختلف ہیں' زمان و مکان کا اختلاف ہو سکتا ہے لیکن وحی اور ہدایت ایک ہی ہے۔

اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ (۴۲ : ۳) "تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کی طرف"۔

یہ بہت لمبی کہانی ہے' زمانے کے نشیب و فراز اور تاریخ کی بے شمار کڑیوں پر مشتمل اس کے مختلف سلسلے ہیں البتہ وحی کا یہ ایک مستحکم و مستقل اصول و منہاج ہے اور اس کی کئی شاخیں ہیں۔

یہ بات اس انداز سے جب اہل ایمان کے دلوں میں بیٹھ جاتی ہے تو وہ اپنے اندر یہ شعور پاتے ہیں کہ وہ جس منہاج اور طریقے پر ہیں' یہ ایک مستقل' واحد طریقہ ہے اور اس کا سرچشمہ بھی واحد اللہ وحدہ ہے۔ اور یہ کہ ان کا سررشتہ بھی اللہ العزیز الحکیم ہے۔ اس طرح ان کے اندر یہ شعور بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایک تاریخی قافلہ حق کے ممبر ہیں جس کا آخری سرایا پہلا سرا زمان و مکان کے اندر دور تک چلا گیا ہے' یہ گویا اہل ایمان کا ایک خاندان ہے جس کا روحانی شجرۂ نسب انسانی تاریخ کے آغاز ہی سے شروع ہوتا ہے۔ آخر میں اس شجرے کی کڑیاں ملتی ہیں اور سب جاکر اللہ العزیز پر ملتے ہیں' جو قوی اور قادر مطلق ہے' جو حکیم ہے' جو اپنی حکمت و تدبیر کے ساتھ جس کی طرف چاہتا ہے' وحی کرتا ہے۔ لہٰذا تم اس واحد ثابت اور مستقل ربانی منہاج سے منتشر ہو کر ادھر ادھر پگڈنڈیوں پر کیوں جا رہے ہو کیونکہ یہ پگڈنڈیاں تو اللہ تک نہیں پہنچاتیں' ان کے جائے آغاز کا نہ پتہ اور نہ ان کے مقام انجام کا پتہ ہے اور نہ ان کا راستہ مستقیم ہے۔

اللہ جس نے تمام رسولوں کی طرف وحی فرمائی۔ اس کی مزید صفات بھی دی جاتی ہیں کہ وہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا واحد مالک ہے۔ اور وہی بلند اور عظیم ہے۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (۴۲ : ۴) "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے' اسی کا ہے' وہ برتر اور عظیم ہے"۔

بسا اوقات لوگوں کو یہ دھوکہ ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بھی مالک ہیں' محض اس لیے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ یہ چیزیں ان کے ہاتھوں میں ہیں۔ ان کے قبضہ قدرت اور کنٹرول میں ہیں۔ وہ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں ان سے خدمت لیتے ہیں لیکن یہ دراصل حقیقی ملکیت نہیں ہے۔ حقیقی ملکیت اللہ کی ہے۔ وہ اللہ ہے جو موجود

اور معدوم کرتا ہے ' زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے ـ یہ وہی ہے جو کسی بشر کو جو چاہتا ہے ' دیتا ہے ـ اور جس چیز سے چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے ـ جس وقت چاہتا ہے ان کے ہاتھ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ یکدم چلا جاتا ہے ـ اور اگر وہ چاہے تو جو چلا گیا ہے ' اس کا متبادل دے دے ـ مالک حقیقی تمام اشیاء میں اللہ ہے ـ وہ ان چیزوں کو اپنے قانون قدرت کے مطابق چلاتا ہے ـ اور یہ تمام اشیاء اس کے حکم پر لبیک کہتی ہیں ـ اس لحاظ سے زمین و آسمان میں جو چیز ہے ' وہ اللہ کی ہے اور اس لحاظ سے اللہ کے ساتھ اس ملکیت میں کوئی شریک نہیں ہے ـ

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (۴۲ : ۴) "وہ برتر اور عظیم ہے" ـ وہ صرف مالک ہی نہیں ہے ـ وہ مالک اعلیٰ بھی ہے ـ اور وہ بڑی عظمتوں والا ہے ' اور اس عظمت میں وہ منفرد ہے ـ وہ اس طرح برتر ہے کہ اس کے مقابلے میں ہر چیز کمتر ہے اور وہ اس معنی میں عظیم ہے کہ اس کے مقابلے میں ہر چیز بہت ہی چھوٹی ہے ـ

جب یہ حقیقت انسانوں کے ضمیر میں اچھی طرح بیٹھ گئی اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ اپنے نفوس کے لیے جو مال ' جو رزق اور جو روزگار طلب کرتے ہیں ' یہ انہوں نے کہاں سے طلب کرنا ہے یعنی یہ کہ زمین و آسمان میں جو چیزیں موجود ہیں ' ان کا مالک اللہ ہے ـ اور وہ مالک ہی کسی کو کوئی چیز دے سکتا ہے ـ پھر وہ برتر اور عظیم بھی ہے ـ اس سے اگر کوئی کچھ مانگتا ہے تو وہ اس کے سوال کو رد نہیں کرتا ـ جس طرح مخلوقات کے سامنے ہم ہاتھ پھیلاتے ہیں وہ نہ برتر ہیں اور نہ عظیم ہیں ' اس لیے ان کا سوالی محروم بھی ہو سکتا ہے ـ

اس کے بعد اس کائنات میں سے ایک ایسا منظر دکھایا جاتا ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس کائنات کا مالک صرف اللہ ہے اور برتری اور عظمت اللہ ہی کے لیے ہے کہ قریب ہے کہ یہ آسمان اللہ کی عظمت کے رعب کی وجہ سے اور بعض لوگوں کی کج روی اور بری باتوں کی وجہ سے پھٹ پڑیں پھر اللہ کی عظمت کا ایک مظہر یہ بھی یہاں لایا گیا ہے کہ ملائکہ ہر وقت اللہ کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور اہل زمین کے لیے مغفرت مانگتے رہتے ہیں کیونکہ اہل زمین کے انحراف اور بے راہ روی کو دیکھ کر وہ بھی سہم جاتے ہیں ـ

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۴۲ : ۵) "قریب ہے کہ آسمان اوپر سے پھٹ پڑیں ـ فرشتے اپنی رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں اور زمین والوں کے حق میں درگزر کی درخواستیں کیے جا رہے ہیں ـ آگاہ رہو ' حقیقت میں اللہ غفور و رحیم ہی ہے" ـ

سماوات وہ عظیم کائنات ہے جو ہمارے اوپر نظر آتی ہے ـ اس کرۂ ارض کی پشت پر ہم جہاں کہیں بھی ہوں اور ہمارے پاس اس کے بارے میں ابھی تک جو معلومات جمع ہوئی ہیں وہ اس کے ایک بالکل معمولی حصے کے بارے میں ہیں ـ آج تک جو معلومات دستیاب ہیں ان سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہمارے سورج جیسے ایک لاکھ ملین سورج مع اپنے لاتعداد توابع کے موجود ہیں ـ اور ایسے مجموعے یا گروپ کتنے ہیں؟ تقریباً ایک لاکھ ملین گروپ معلوم ہو چکے ہیں ـ یاد رہے کہ یہ سورج ہماری زمین سے ایک ملین گنا بڑا ہے ـ اور یہ لاکھوں اربوں سورج تو وہ ہیں جن کو ہم اپنی چھوٹی چھوٹی رصد

گاہوں کے ذریعے دیکھتے ہیں' یہ اس لامحدود فضائے کائنات (جسے ہم آسمان کہتے ہیں) کے اندر بکھرے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان طویل مسافتیں ہیں جو ہزار ہا ملین نوری سالوں کی دوری پر ہیں' جن کا حساب روشنی کی رفتار کے حساب سے کیا جاتا ہے یعنی ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ کے حساب سے۔

یہ آسمان جن کے بارے میں ہمارا علم بہت ہی محدود ہے' قریب ہے کہ پھٹ پڑیں' ہمارے اوپر اس فضا میں سے' کیوں؟ اللہ کے خوف سے' اللہ کی عظمت سے' اور اللہ کے جلال سے اور زمین کے ان لوگوں کی بدکاریوں کی وجہ سے ان کی غفلت اور نسیان کی وجہ سے جو انہوں نے اس رب ذوالجلال اور اس کائنات کے بارے میں روا رکھی ہوئی ہیں۔ قریب ہے کہ آسمانوں پر رعشہ طاری ہو جائے اور یہ ٹوٹ پڑیں اور اس مقام سے گر جائیں جہاں یہ ٹکے ہوئے ہیں۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ (۴۲:۵) "فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں اور زمین والوں کے حق میں درگزر کی درخواستیں کیے جاتے ہیں"۔ ملائکہ وہ مخلوق ہے جو مکمل طور پر اطاعت شعار ہے۔ یہ تمام مخلوقات میں سے بہتر مخلوق ہے' لیکن یہ مسلسل اپنے رب کی تسبیح کر رہے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کا رب کتنا برتر ہے۔ اور کتنا عظیم ہے۔ وہ باوجود اپنی مکمل اطاعت شعاری کے پھر بھی اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں حمد و ثنا میں اور اطاعت میں ان سے کوئی تقصیر نہ ہو جائے۔ جبکہ اہل زمین قصوروار بھی ہیں' ضعیف بھی ہیں۔ راہ راست سے منحرف بھی ہیں' پھر بھی احساس نہیں رکھتے چنانچہ ملائکہ اللہ کے غضب سے ڈرتے ہیں اور زمین میں جو معصیت ہوتی ہے' جو تقصیرات ہوتی ہیں' اس پر وہ اللہ کے غضب کے ڈر سے استغفار کرتے ہیں۔ یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں ملائکہ کے استغفار سے مراد اہل ایمان کے لیے استغفار ہو' جس طرح سورۂ غافر میں آیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (غافر:۷) "عرش الٰہی کے حامل فرشتے' اور وہ جو عرش کے گردوپیش حاضر رہتے ہیں' سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں"۔ اس حالت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فرشتے زمین پر معصیت کے ارتکاب سے بہت ڈرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اہل ایمان بھی اگر معصیت کریں تو فرشتے ڈرتے ہیں اور اس خوف کی وجہ سے وہ اللہ سے اہل زمین کے لیے معافی طلب کرتے ہیں اور وہ اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں تاکہ ان معصیتوں کی وجہ سے اللہ کا عذاب نہ آ جائے اور اس لیے کہ اللہ کی رحمت لوگوں پر آتی رہے۔ وہ امید کرتے ہیں کہ لوگوں کو معاف کیا جائے گا اور ان پر رحمت ہوگی۔

اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۴۲:۵) "آگاہ رہو حقیقت میں اللہ غفور و رحیم ہے"۔ اللہ کی صفات عزت اور حکمت کے ساتھ اور صفات علو اور عظمت کے ساتھ صفات مغفرت اور رحمت کو بھی یہاں جمع کیا گیا ہے تاکہ لوگ رب کی تمام صفات کو پیش نظر رکھیں۔

اس پیرے کے آخر میں 'ان صفات الٰہیہ کے بیان اور اس کائنات میں ان کے اثرات کے بیان کے بعد 'روئے سخن ان لوگوں کی طرف مڑ جاتا ہے ۔ جنہوں نے اللہ کے سوا کچھ اور سرپرست بھی بنا رکھے ہیں 'حالانکہ یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی سرپرست نہیں ہے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے معاملات سے اب دستکش ہو جائیں 'کیونکہ آپ کو ان کا حوالہ دار نہیں مقرر کیا گیا ۔ اللہ ہی دراصل ان پر نگران ہے اور مختار ہے ۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (۴۲ : ۶) "جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے کچھ دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں 'اللہ ہی ان پر نگران ہے 'تم ان کے حوالہ دار نہیں ہو" ۔ انسانی تصور میں ان کج خلق اور بدبختوں کی یہ تصویر آتی ہے کہ انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے سرپرستوں کے سامنے ہاتھ دراز کیے ہوئے ہیں اور ان سے کچھ مانگتے ہیں اور ان کے ہاتھ خالی ہیں 'وہاں تو ہوا کے سوا کچھ نہیں ۔ ان کی تصویر اور ان کے سرپرستوں کی تصویر نہایت ہی مکروہ 'حقیر اور بونی تصویر ہے ۔ اللہ کے قبضے میں ہیں یہ لوگ اور نہایت ہی چھوٹے ہیں ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہہ دیا گیا ہے کہ آپ ان کے معاملے سے بری الذمہ ہیں ۔ آپ ان کی پرواہ نہ کریں 'اللہ تعالیٰ ان کا بندوبست کرے گا ۔

اہل ایمان کے دلوں میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ جانی چاہئے اور اس معاملے میں ان کو مطمئن ہونا چاہئے 'ہر حال میں مطمئن ہونا چاہئے ۔ وہ لوگ جن کو سرپرست بنایا گیا ہے 'وہ اس کرۂ ارض پر برسر اقتدار اور اصحاب جاہ و مرتبہ ہوں یا دوسرے لوگ ہوں ۔ اصحاب اقتدار کے بارے میں تو اہل ایمان کو یوں مطمئن ہونا چاہئے کہ وہ جس قدر جبار و قہار بھی ہوں 'اگر ان کا اقتدار قرآن و سنت سے ماخوذ نہیں ہے تو پھر وہ اللہ کی گرفت میں ہیں 'اللہ نے انہیں احاطے میں لے رکھا ہے ۔ ان کے اردگرد پوری کائنات اللہ پر ایمان لانے والی ہے 'صرف وہی منحرف ہیں ۔ وہ ایک نہایت ہی موزوں زمزمے میں ایک کرخت آواز کی طرح ہیں ۔ اور اگر یہ سرپرست اہل اقتدار کے علاوہ اور پیر فقیر ہوں تو اہل ایمان پر ان کی ذمہ داری نہیں ہے کیونکہ اللہ کی مخلوق میں سے اگر کوئی غلط راہ اختیار کرتا ہے ۔ تو یہ ذمہ دار نہیں ۔ دین و عقائد میں زبردستی نہیں ہے 'ان پر صرف تبلیغ کی ذمہ داری ہے ۔ بندوں کے دلوں پر نگران اللہ ہی ہے ۔

چنانچہ مومنین کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی سیدھی راہ پر وحی الٰہی کی روشنی میں چلیں اور اگر دوسرے لوگ غلط عقائد اختیار کرتے ہیں تو ان پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے ۔ یہ غلط عقائد جو بھی ہوں 'وہ خود ذمہ دار ہیں ۔ اب ہم اس سورت کے پہلے موضوع یعنی وحی و رسالت کی طرف آتے ہیں :

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ۝ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ

فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَ الظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ۝۸ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ
١ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِیُّ وَ هُوَ یُحْیِ الْمَوْتٰی ۫ وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ
ع ٩ قَدِیْرٌ ۝۹ؒ

٢ ”ہاں اسی طرح اے نبیؐ ' یہ قرآن عربی ہم نے تمہاری طرف وحی کیا ہے ' تاکہ تم بستیوں کے مرکز (شہر مکہ) اور اس کے گردوپیش رہنے والوں کو خبردار کر دو ' اور جمع ہونے کے دن سے ڈرا دو جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ ایک گروہ کو جنت میں جانا ہے اور دوسرے گروہ کو دوزخ میں۔ اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی امت بنا دیتا ' مگر وہ جسے چاہتا ہے ' اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے ' اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے ' نہ مددگار۔ کیا یہ (ایسے نادان ہیں کہ) انہوں نے اسے چھوڑ کر دوسرے ولی بنا رکھے ہیں؟ ولی تو اللہ ہی ہے ' وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے ' اور وہ ہر چیز پر قادر ہے“۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (۴۲ : ۷) ”ہاں ' اسی طرح اے نبی یہ قرآن عربی ہم نے تمہاری طرف وحی کیا ہے“۔ تاکہ تم بستیوں کے مرکزی شہر مکہ کے لوگوں کو ڈراؤ۔ یہ فقرہ معطوف ہے ' اس فقرے پر جس سے سورت کا آغاز ہوا۔ یعنی كَذٰلِكَ يُوْحِيْ پر۔ سورت کے آغاز میں آنے والے اس كَذٰلِكَ سے مراد حروف مقطعات تھے۔ یہاں معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مناسبت حروف مقطعات اور قرآن عربی کی ہے۔ یہ مناسبت ظاہر ہے۔ یعنی یہ حروف عربی ہیں اور یہ قرآن عربی ہے۔ وحی نے ان حروف سے یہ قرآن بنایا ہے تاکہ وہ اپنا مقصد پورا کرے اور غرض و غایت کیا ہے۔

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (۴۲ : ۷) ”تاکہ تم بستیوں کے مرکز (شہر مکہ) اور اس کے گردوپیش رہنے والوں کو خبردار کر دو“۔ ام القریٰ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اس میں بیت اللہ ' اللہ کا پرانا گھر تھا۔ اللہ نے یہ پسند فرمایا کہ خانہ کعبہ اس آخری رسالت کا مرکز ہو اور اللہ نے اپنی آخری کتاب کے لیے عربی زبان کو منتخب کیا۔ یہ اس کی مصلحت تھی اور وہی اس کو جانتا ہے کہ کیوں۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ”اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کہاں رکھے“۔

آج جب ہم تاریخی واقعات کا جائزہ لیتے ہیں اور پوری تاریخ کو چھانتے ہیں ' اس وقت کے حالات اور تقاضوں کو دیکھتے ہیں۔ پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ دعوت کس طرح پھیلی اور کن خطوط پر آگے بڑھی اور اس نے کیا کیا نتائج پیدا کیے اور دنیا پر کیا کیا اثرات چھوڑے۔ آج جب ہم یہ جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ نے اس سرزمین کو اس مقصد کے لیے کیوں منتخب کیا تھا۔ اور تاریخ کے ایک خاص موڑ پر اس آخری رسالت کے لیے کیوں مکہ مکرمہ کو مرکز ٹھہرایا۔ جبکہ یہ آخری رسالت تھی بھی عالمی رسالت ' تمام انسانوں کے لیے تھی۔ اور جس کے عالمی خدوخال اس کے ابتدائی دنوں ہی سے عیاں تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے دور میں پورے کرۂ ارض کے آباد علاقوں کو چار شہنشاہوں نے باہم تقسیم کر رکھا تھا۔ رومی سلطنت جو پورے ایشیا کے ایک حصے ' اور افریقہ پر حکمران تھی۔ کسرائے فارس کی مملکت جس کا اقتدار ایشیا کے

ایک بڑے حصے 'افریقہ کے ایک حصے پر قائم تھا' مملکت ہند اور مملکت چین - یہ آخر الذکر دونوں شہنشاہتیں اپنے خول میں بند تھیں' ان کے اپنے عقائد تھے اور صرف چین و ہند کے باہم سیاسی روابط تھے' چونکہ چین و ہند کی مملکتیں اپنے ہی خول میں بند تھیں - اس لیے دنیا کے معاشروں پر حقیقی اثر قیصرروم اور کسرائے فارس ہی کی حکومتوں کو حاصل تھا -

اس دور میں دنیا میں دو مشہور سماوی دین تھے - یہودیت اور نصرانیت - یہ دونوں مذاہب اس پوزیشن تک پہنچ گئے تھے کہ یہ کسی نہ کسی حکومت اور مملکت کے زیر اثر ہو گئے تھے - ان ادیان پر حکومت کا اثر قائم ہو گیا تھا - کسی مملکت پر دین کا اثر نہ تھا بلکہ مملکت دین پر غالب تھی - یہ اس لیے کہ ان ادیان کے اندر تحریف و تغیر واقع ہو گیا تھا اور اہل دین بدعمل ہو گئے تھے -

یہودیوں پر تو کبھی رومی ظلم کرتے اور کبھی اہل فارس ان پر مظالم ڈھاتے - ان کی تو اس علاقے میں کوئی قابل ذکر پوزیشن نہ تھی - حالات نے یہودیت کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ صرف یہودیوں' یعنی بنی اسرائیل کا دین بن جائے اور خود اپنے اندر سکڑ جائے - ان کو نہ اس بات کی ضرورت تھی اور نہ خواہش تھی کہ وہ دوسری اقوام کو دین یہودیت میں لائیں -

جہاں تک موجودہ عیسائیت کا تعلق ہے' تو یہ مملکت روما کی پیداکردہ ہے - جس وقت عیسائیت وجود میں آئی تو مملکت روما' فلسطین' مصر' شام اور ان باقی حصوں پر برسراقتدار تھی جن میں مسیحیت خفیہ طور پر پھیل گئی تھی اور مملکت روما اس پر تشدد کر رہی تھی - اس دین کو ماننے والوں کا پیچھا کیا جاتا تھا - اور ان پر سختیاں کی جاتی تھیں - یہ تشدد اس قدر سخت تھا کہ ہزارہا لوگوں کو ظالمانہ طریقے پر ذبح کیا گیا - جب اس تشدد کا دور ختم ہوا اور قیصرروم خود دین مسیحیت میں داخل ہو گیا تو وہ اپنے ساتھ بت پرستانہ افسانے بھی لایا - چنانچہ یونان کے مذہبی دیومالائی فلسفے عیسائیت میں داخل ہو گئے اور عیسائیت کی سادہ شکل ہی کو بدل کر رکھ دیا گیا - لہٰذا اب سرکار کے سائے میں جو عیسائیت وجود میں آئی' وہ اس دین سے بالکل مختلف تھی جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتارا تھا بلکہ یہ ایک نئی چیز وجود میں آگئی - ہوا یوں کہ مملکت روم نے کلمہ تو پڑھ لیا مگر وہ مسیحیت سے متاثر نہ ہوئی - ادھر مسیحیت تشدد سے تو کنٹرول میں نہ آئی تھی' اب مکمل طور پر کنٹرول میں آگئی - اس سرکاری کنٹرول کی وجہ سے یہ دین مزید ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور اس طرح تشدد کا ایک دوسرا دور شروع ہوا' سرکاری مسیحیت نے دوسرے فرقوں کو کچلنا شروع کر دیا - کینہ تقسیم ہو گیا اور یہ خطرہ بھی پیدا ہو گیا کہ اس کے نتیجے میں مملکت روما منقسم ہو جائے - یوں ایک سرکاری فرقے نے دوسرے فرقوں کو کچلا اور دونوں کی حالت یہ ہو گئی کہ کوئی بھی حضرت عیسیٰ کے دین پر نہ رہا -

یہ وقت تھا جب اسلام نمودار ہوا - اسلام کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت جس انحراف' فساد' ظلم اور جاہلیت میں گرفتار ہے' اسے ان تاریکیوں سے نکالا جائے - اسلام نے چاہا کہ پوری انسانی زندگی کو اپنے کنٹرول میں لے' اور نہایت ہی روشنی اور صحیح راستے پر اس کی راہنمائی کرے - یہ ضروری تھا کہ اسلام پوری انسانیت کے اوپر اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کرے تاکہ انسانی زندگی میں وہ عظیم انقلاب لایا جا سکے - جو اسلام کے پیش نظر تھا - لہٰذا یہ ضروری تھا کہ اسلام کا آغاز کسی ایسے مقام سے کیا جائے جو آزاد ہو اور وہاں دنیا کی بڑی شہنشاہیتوں میں سے کوئی بھی برسراقتدار نہ ہو - اور اسلام کی ترقی اور نشوونما ایسے حالات میں ہو کہ اس پر کوئی ایسی مملکت مسلط نہ ہو' جو اس کے مزاج کے متضاد ہو - بلکہ اس علاقے پر اسلام خود ہی برسراقتدار ہو - ان مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر سوچا جائے تو مکہ مکرمہ' اس وقت کے حالات کے مطابق

آغاز اسلام کے لیے ایک بہترین مقام تھا' جہاں سے اسلام نے اپنا عالمی سفر شروع کیا کیونکہ ایک عالمی انقلاب اول روز سے اسلام کے پیش نظر تھا۔

جزیرۃ العرب میں ان دنوں کوئی منظم حکومت نہ تھی جس کے اپنے توانین ہوں' جس کی فوجیں ہوں' جس کی پولیس ہو' اور وہ پورے جزیرۃ العرب پر اقتدار رکھتی ہو۔ اور جو اپنے منظم ڈھانچے کے بل بوتے پر جدید نظریہ حیات کا مقابلہ کر سکتی ہو۔ اور جمہور عوام پوری طرح اس کے کنٹرول میں ہوں جیسا کہ اس وقت دنیا کی چار شہنشاہیتوں میں ایسا انتظام تھا۔

پھر جزیرۃ العرب میں ایسا واضح دین بھی نہ تھا' جس طرح یہودیت' عیسائیت تھی یا بکھری ہوئی بت پرستی تھی۔ تمام قبائل کے معتقدات اور ان کے طریقہ ہائے حیات مختلف تھے۔ پھر ان کے الہ بھی مختلف تھے۔ ملائکہ سے' جنوں سے' سیاروں اور ستاروں سے' اور بتوں سے' لیکن ان حالات کے باوجود خانہ کعبہ اور قریش کی دینی قیادت و سیادت پورے جزیرۃ العرب میں مسلم تھی۔ اگرچہ یہ قیادت باقاعدہ اقتدار اعلیٰ کی نہ تھی' نہ مکہ پر اور نہ بیرون مکہ پر۔ اس وجہ سے دین جدید کی مزاحمت حکومتی سطح پر نہ تھی۔ قریش نے دین جدید کا ایک حد تک مقابلہ ضرور کیا لیکن اگر اقتصادی وجوہات نہ ہوتیں' اور قریش کے سرداروں کے خاص مفادات کا مسئلہ نہ ہوتا تو اسلام کی جو مخالفت ام القریٰ میں ہوئی وہ بھی نہ ہوتی۔ جہاں تک عقائد و نظریات کا تعلق ہے' وہ جانتے تھے کہ ان کے عقائد پوچ ہیں اور ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

جزیرۃ العرب میں کسی سیاسی نظام کا نہ ہونا' یا کسی منظم دینی نظام کا نہ ہونا' اسلام کے مفاد میں تھا' ابتدائی ادوار میں اسلام کے اوپر کوئی خاص دباؤ نہ تھا۔ اگر کوئی ایسا نظام ہوتا تو وہ لازماً اسلام کے مزاج کے خلاف ہوتا اور وہ اسلام کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا۔

بلکہ کسی اجتماعی حکومتی اور دینی نظام کی عدم موجودگی میں' ایک طرح اسلام کی حمایت کا پہلو نکل آیا۔ اجتماعی نظام حکومت کی جگہ جزیرۃ العرب میں قبائلی نظام تھا اور اس قبائلی نظام میں خاندان کو اہمیت حاصل ہوتی۔ جب حضورؐ دعوت اسلامی لے کر اٹھے تو بنی ہاشم کی تلواریں آپ کے ساتھ تھیں اور جو قبائلی توازن قائم تھا وہ آپ کے حق میں تھا۔ کیونکہ بنو ہاشم باوجود اس کے کہ آپ کے دین کو قبول نہ کرتے تھے لیکن آپ کے حامی ضرور تھے۔ بلکہ آغاز اسلام میں جن جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا اور ان کا تعلق اہم قبائل سے تھا' ان پر لوگ کسی قسم کے تشدد سے ڈرتے تھے۔ ان کی اصلاح اور تادیبی کارروائی کا کام قبائل کے سپرد تھا۔ اسی طرح جن غلاموں پر تشدد ہوا ان پر بھی ان کے مالکان نے تشدد کیا' یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر ایسے غلاموں کو خریدتے اور آزاد کر دیتے۔ اس طرح ان پر سختی ختم ہو جاتی اور وہ حضرت ابوبکر کے موالی ہو جاتے۔ اب لوگ ان کے دین کے بارے میں زیادہ نہ چھیڑتے۔ اس صورت حال نے دین جدید کو ایک امتیازی شان دے دی۔ تمام غرباء اور غلام اس کی طرف لپکے۔

پھر عربوں کے اندر بہادری' ذاتی وقار' جوانمردی اور بھلائی پر خوشی سے آمادہ ہو جانے کی صفات بھی تھیں۔ یہ وہ صفات ہیں جو جدید دین کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے ضروری تھیں۔

ان باتوں کے علاوہ جزیرۃ العرب میں اس وقت وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو کسی تہذیب و ترقی کے لیے ضروری ہوتی ہیں اور ساکنان جزیرہ ان پر فخر کرتے تھے۔ جزیرۃ العرب میں قوت' قابلیت' شخصیات کے کافی ذخائر موجود تھے جو بے تاب تھے کہ ان کو کام میں لایا جائے۔ غیب کے قلب میں یہ سب کچھ موجود تھا۔ پھر اہل قریش پوری دنیا میں

گردیدہ اور گرم و سرد چشیدہ تھے۔ وہ ایک طرف قیصر روم کی مملکت میں سفر کرتے تھے دوسری جانب وہ کسریٰ فارس کے علاقوں میں سفر کرتے تھے اور انہوں نے اس وقت کی تہذیب و تمدن کے تمام تجربات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے تھے۔ اہل قریش کے سفر موسم گرما اور سفر موسم سرما کو قرآن کریم نے ہمیشہ کے لیے ریکارڈ بھی کر دیا ہے۔

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ (١٠٦:١) اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیْفِ (١٠٦:٢) فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ (١٠٦:٣) الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (١٠٦:٤)

"چونکہ قریش مانوس ہوتے ہیں' جاڑے اور گرمی کے سفروں سے' لہٰذا ان کو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا"۔ پھر تجربات کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے ہاں مختلف اسباب کے تحت جمع ہو گیا' تاکہ جزیرۃ العرب اسلامی انقلاب کی مہم کے لیے تیار ہو جائے۔ جب اسلام آیا تو اس نے ان تمام ذخائر اور صلاحیتوں کو اسلام کے حق میں استعمال کیا۔ عربوں کی طاقت اور جنگی صلاحیت جو صدیوں سے جمع ہو چکی تھی' وہ صلاحیت کھل گئی۔ اسلام کی کنجی سے یہ خزانے روبعمل ہو گئے۔ یہ تمام صلاحیتیں اسلام کا سرمایہ بن گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز اسلام ہی سے اسلام کو ایسی عظیم شخصیات مل گئیں جن کا ملنا کسی تحریک کے لیے بڑی خوش نصیبی ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام اس زاویہ نظر سے بہت بڑا مقام رکھتے ہیں' مثلاً حضرت ابوبکرؓ' حضرت عمرؓ' حضرت عثمانؓ' حضرت علیؓ' حضرت حمزہؓ' حضرت عباسؓ' حضرت ابوعبیدہؓ' حضرت سعدؓ' حضرت خالدؓ' حضرت معاذؓ' حضرت ابو ایوب انصاری وغیرہم۔ ساتھیوں کا یہ باصلاحیت گروپ جنہوں نے ابتداء ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا' ان کے دل اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیئے' انہوں نے اس دعوت کو اٹھایا۔ اس دعوت کے ذریعہ یہ باصلاحیت لوگ مزید بڑے لوگ بن گئے اور ان کی صلاحیتیں اور نکھر گئیں۔ لیکن ان کے اندر بنیادی قابلیت اسلام سے پہلے بھی موجود تھی۔

یہاں ہم تفصیلی اسباب نہیں لکھ سکتے کہ جزیرۃ العرب کو کیوں دعوت اسلامی کے لیے منتخب کیا گیا۔ کیوں اس دعوت کو آغاز میں بچا کر جزیرۃ العرب ہی میں اس کی نشو و نما کی گئی' اور کیوں ام القریٰ اور ماحول کو برتری دی گئی کہ بڑی مملکتیں اس کی طرف متوجہ ہی نہ ہوئیں' تو یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جزیرۃ العرب کو جدید رسالت کے لیے ایک پرورش گاہ بنانا چاہتا تھا۔ جس نے پوری انسانیت کو روشنی دینی تھی۔ اور پھر ام القریٰ کو منتخب کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے اٹھیں۔ بہرحال یہ بہت ہی طویل بحث ہو گی اور اس کے لیے ایک مستقل کتاب کے صفحات درکار ہیں۔ یہاں یہی اشارات کافی ہیں اور جن سے آگے بڑھ کر مزید اسباب بھی معلوم کیے جا سکتے ہیں' یہ تو ان اسباب کا ایک حصہ ہیں۔ جس طرح ہم کائنات میں سنن الٰہیہ کے سلسلے میں نئے اسباب معلوم کر رہے ہیں۔ اسی طرح ام القریٰ کے بارے میں مزید وجوہات غور و فکر کے بعد سامنے لائی جا سکتی ہیں۔

غرض یوں یہ قرآن ام القریٰ میں نازل ہوا' اس نے اس کے اردگرد کام شروع کیا اور جب پورا جزیرۃ العرب جاہلیت سے نکل کر اسلام میں داخل ہو گیا۔ اور عرب پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو گئے تو انہوں نے اسلام کے

جھنڈے بلند کر دیئے اور وہ اسلام کو لے کر شرق و غرب میں داخل ہو گئے اور انہوں نے جدید رسالت اور اس کے ذریعہ آیا ہوا نظام اسلام اور نظام شریعت تمام انسانوں کے سامنے پیش کیا۔جس طرح اسلام کا مزاج تھا۔جن لوگوں نے یہ جھنڈے بلند کیے وہ اس مقصد کے لیے صالح ترین لوگ تھے۔جنھوں نے اسے اٹھایا اور پوری دنیا میں پھیلا دیا۔جب وہ اسے لے کر اٹھے تو اسلام کی تولید و تشکیل ایک بہترین ماحول میں ہو چکی تھی۔

یہ بات کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے جزیرۃ العرب میں اسلام کے مکمل غلبے تک زندہ رکھا اور پورے جزیرۃ العرب کو مشرکین اور شرک کے آثار سے بھی پاک کر دیا گیا۔پھر اس دعوت کے لیے عربی زبان کو بھی محض اتفاق سے نہ چنا تھا بلکہ دنیا کی زبانوں میں یہ اس دعوت کے پھیلانے کے لیے نہایت ہی موزوں زبان تھی۔یہ ایک مکمل اور پختہ زبان تھی۔اس کے اندر وسعت کی بے پناہ صلاحیت تھی اور اس دعوت کے مقاصد کے لیے اس وقت اس سے زیادہ بہتر اور کوئی زبان نہ تھی۔اگر یہ کوئی اور زبان ہوتی یا اس زبان کی تشکیل اور ساخت میں کوئی جھول ہوتی تو اس کے لیے ممکن نہ ہوتا ہے کہ یہ زبان دعوت اسلامی کے مقاصد کو پورا کر سکتی اور نہ یہ زبان اس دعوت کو جزیرۃ العرب کے باہر پھیلا سکتی۔غرض جس طرح رجال عرب اس دعوت کا بوجھ اٹھانے کے لیے موزوں تھے اسی طرح ان کی زبان بھی موزوں تھی' (یہ زبان پھر قرب و جوار کے ملکوں کی زبان بن گئی)۔

غرض یہ وہ قدرتی سازگاریاں تھیں جو اس رسالت کے جزیرۃ العرب سے آغاز میں مضمر تھیں۔لیکن تمام وجوہات کے مقابلے میں اصل وجہ یہی ہے جو خود قرآن نے بتائی ہے۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ "اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کہاں رکھتا ہے"۔بہرحال غور و تدبر سے حکمت الٰہیہ کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ (۴۲ : ۷) "تاکہ تم بستیوں کے مرکز اور اس کے گردوپیش رہنے والوں کو خبردار کر دو' اور جمع ہونے کے دن سے ڈراؤ جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ایک گروہ کو جنت میں جانا ہے اور دوسرے گروہ کو دوزخ میں"۔قرآن کریم میں ڈراوے کا ذکر بہت آتا ہے۔بار بار مختلف طریقوں سے لفظ انذار آتا ہے۔اس سے مراد یوم قیامت سے ڈرانا ہے۔پوری دنیا کی تاریخ میں جس زمان و مکان میں انسان پیدا ہوئے اور فوت ہوئے۔اللہ تعالیٰ ایک دن سب کو جمع کرے گا اور پھر ان کی گروہ بندی ہو گی'

فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ (۴۲ : ۷) "ایک گروہ جنت میں جائے گا اور ایک جہنم میں"۔ جس طرح انہوں نے اس دنیا میں عمل کیا' جو دارالعمل ہے اور جو رویہ انہوں نے اپنی اس مختصر زندگی میں اختیار کیا۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ وَالظّٰلِمُوْنَ

مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيرٍ (۴۲ : ۸) ”اگر اللہ چاہتا ہے تو ان سب کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر وہ جسے چاہتا ہے ' اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے اور نہ مددگار“۔ اگر اللہ چاہتا تو انسانوں کی تخلیق ہی دوسرے انداز سے کرتا جس میں ان کا رویہ ایک جیسا ہوتا۔ ان کا انجام بھی ایک ہی ہوتا' یا سب جنتی ہوتے یا سب جہنمی ہوتے لیکن اللہ نے اس انسان کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ اور اس خلافت کا تقاضا یہ تھا کہ انسان ایسا ہو جیسا کہ وہ ہے۔ انسان کو خصوصی استعداد دی جائے ' اس استعداد کے ذریعہ وہ فرشتوں سے بھی ممتاز ہو اور شیاطین سے بھی ممتاز ہو۔ اور اللہ کی دوسری مخلوقات سے بھی ممتاز ہو۔ جن کی تخلیق کسی محدود مقصد کے لیے ہے اور ان کا ایک ہی رویہ ہے۔ اس استعداد کے ذریعہ بعض انسان ہدایت اور نور کی طرف آ جائیں 'عمل صالح کریں ' اور بعض لوگ گمراہی اور تاریکی کی طرف چلیں اور برے کام کریں۔ ہر انسان ان احتمالات میں سے ایک طرف جھک جائے جو اس کی طبیعت میں رکھے ہوئے ہیں اور پھر اس احتمال کے لیے جو انجام مقرر ہے اس سے دوچار ہو ' یعنی ایک فریق جنت میں جائے اور دوسرا دوزخ میں۔ اور اس طرح یہ بات حق بن جائے کہ۔

يُدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِي رَحْمَتِهِ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۴۲ : ۸)

”اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے اور نہ مددگار“۔ اور اللہ کی مشیت نے اپنا کام اپنے سابق علم کی وجہ سے کیا۔ انسان اس کی ہدایت کی وجہ سے اس کی رحمت کا مستحق ہوا اور ضلالت کی وجہ سے وہ گمراہی و عذاب کا مستحق ہو گیا۔

اس سے قبل یہ بات گزر گئی کہ بعض لوگوں نے اللہ کے سوا اور سرپرست بنا رکھے تھے۔ یہاں یہ فیصلہ دے دیا جاتا ہے کہ اللہ کے سوا تو کوئی ولی و مددگار نہ ہو گا۔ لہٰذا جن کو وہ ولی و مددگار پکڑتے ہیں تو ' یہ ایک فضول حرکت ہے ان کی جانب سے کیونکہ ان کا تو وجود ہی نہیں ہے۔ پھر پوچھا جاتا ہے :

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَآءَ (۴۲ : ۹) ”کیا انہوں نے اللہ کے سوا اور ولی و مددگار پکڑ رکھے ہیں؟“ یہ سوال استنکاری اس لیے ہے کہ ان کو متوجہ کر کے یہ فیصلہ دے دیا جائے کہ اللہ وحدہ ولی و مددگار ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور اس سے اس کی قدرت واضح ہوتی ہے۔ مردے کو حیات دینا یہ بہت بڑی قدرت ہے۔

فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى (۴۲ : ۹) ”اللہ ہی ولی و مددگار ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے“۔ اس کے بعد اس خصوصی قدرت کے مظہر یعنی احیائے موتیٰ کے بعد عام قدرت کا ذکر کیا جاتا ہے۔

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۴۲ : ۹) ”اور وہ ہر چیز پر قادر ہے“۔ اس کی قدرت صرف احیائے موتیٰ تک محدود نہیں۔

--- ○○○---

پھر روئے سخن اس سورت کے موضوع اول کی طرف مڑتا ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں اپنے تمام اختلافات کس معیار

پر رفع کیے جائیں گے۔ یہ وحی واحد معیار حق ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہے' یہ صراط مستقیم ہے اور مکمل اسلامی نظام زندگی آنے کے بعد تم نے تمام اختلافات اس کے مطابق ختم کرنے ہیں۔ اب یہ نہ ہو گا کہ ہر شخص ہوائے نفس کے مطابق چلے :

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿١٠﴾ فَاطِرُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا ۖ يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ ۚ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۖ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿١١﴾ لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١٢﴾

"تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو' اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔ وہی اللہ میرا رب ہے' اسی پر میں نے بھروسہ کیا' اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا' جس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے' اور اسی طرح جانوروں میں بھی (انہی کے ہم جنس) جوڑے بنائے' اور اس طریقہ سے وہ تمہاری نسلیں پھیلاتا ہے۔ کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں' وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے' آسمان اور زمین کے خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں' جسے چاہتا ہے کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے' اسے ہر چیز کا علم ہے۔

ان حقائق کو اس ایک پیراگراف میں پیش کرنے کا طریقہ بڑا عجیب ہے۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان حقائق کے درمیان ایک باریک اور خفیہ ربط موجود ہے۔ یہ کہ لوگوں کے درمیان جو اختلافات ہیں' ان کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲ : ۱۰) "تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو' اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے"۔ اور اللہ نے اپنا فیصلہ اس قرآن میں نازل کر دیا ہے اور اس قرآن نے دنیا و آخرت دونوں کے بارے میں فیصلے کر دیئے ہیں اور لوگوں کی زندگی کے لیے انفرادی اور اجتماعی منہاج اس کے اندر ضبط کر دیا ہے۔ ان کے نظام زندگی' ان کے نظام معیشت' ان کے نظام قانون' ان کے نظام سیاست اور ان کے نظام اخلاق و سلوک کے تمام امور قرآن کریم نے طے دیئے ہیں اور ان موضوعات پر کافی و شافی بیان دے دیا ہے۔ اس قرآن کو انسانی زندگی کا دستور العمل بنا دیا ہے۔ یہ تمام دنیا کے دساتیر سے زیادہ جامع و مانع ہے۔ اگر ان کے درمیان کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو اس کا حکم اس قرآن میں تیار ہے اور حاضر ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا ہے۔ اور آپ نے اس قرآن کی اساس پر نظام زندگی قائم کر کے بتا دیا ہے۔

اس ہدایت کے بعد اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر شروع ہوتی ہے کہ آپ نے اعلان کر دیا کہ آپ اپنے امور تمام کے تمام اللہ کے حوالے کرتے ہیں اور اس طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ یہ ہے رب تعالیٰ جس نے مجھے یہ کلیہ دیا ہے ۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (۴۲ : ۱۰) "یہی اللہ میرا رب ہے' اس پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں" ۔ یہ انابت اور یہ توکل اور یہ اقرار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہاں ریکارڈ کیا جاتا ہے تاکہ اس کا لوگوں پر ایک نفسیاتی اثر ہو کہ دیکھو یہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ کے نبی ہیں' وہ بھی شہادت دیتے ہیں کہ اللہ ہی ان کا رب اور حاکم ہے اور یہ کہ آپ اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں' اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی اور کی طرف رجوع نہیں کرتے ۔ لہٰذا دوسرے انسان اور مسلمان اپنے اختلافات میں کس طرح کسی اور کی طرف رجوع کر سکتے ہیں اور نبی جو ہدایت پر ہیں اپنے فیصلے اللہ ہی کی طرف لے جاتے ہیں ۔ لہٰذا تمام لوگوں کو بطریق اولیٰ اپنے فیصلے قرآن کی طرف لے جانے چاہئیں ۔ اور اس سے کسی جگہ بھی ایک لمحے کے لیے بھی ادھر ادھر نہیں ہونا چاہئے ۔ اور کس طرح وہ اپنے امور میں کسی دوسری جانب جا سکتے ہیں جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود بھی کسی دوسری طرف نہیں جاتے ۔ اللہ ہی کی طرف رجوع فرماتے ہیں کیونکہ رب بھی اللہ' والی بھی اللہ' کفیل بھی اللہ اور یہ اللہ ہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جدھر موڑنا چاہتا ہے' موڑتا ہے ۔

جب کسی مومن کے دل میں یہ حقیقت بیٹھ جاتی ہے تو اس کا راستہ روشن ہو جاتا ہے' اس کے سفر زندگی کے نشانات واضح ہو جاتے ہیں اس لیے وہ اپنے سفر میں ادھر ادھر دیکھتا ہی نہیں ۔ طمانیت کا ایک لبریز پیمانہ اس کے دل پر انڈیل دیا جاتا ہے اور اس کے مقامات قدم پر اعتماد بچھا دیا جاتا ہے ۔ اس لیے وہ نہ شک کرتا ہے' نہ تردد کرتا ہے' اور نہ حیرت زدہ ہوتا ہے ۔ اس کو یہ شعور مل جاتا ہے کہ اللہ اس کا حامی' نگہبان' محافظ اور اس کے قدموں کو درست رکھنے والا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس راستے کے راہی رہے ہیں ۔

جب مومن کے ضمیر میں اور شعور میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے تو اس کے نظام زندگی اور طرز زندگی کے بارے میں اس کا شعور اور اس کی سوچ بلند ہو جاتی ہے' اس لیے وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ اسلامی نظام زندگی کے سوا اور بھی کوئی قابل التفات منہاج ہو سکتا ہے ۔ نہ وہ یہ تصور کر سکتا ہے کہ اللہ کے حکم اور فیصلے کے سوا اور بھی کوئی حکم اور فیصلہ ہو سکتا ہے' جس کی طرف اختلاف کی صورت میں کوئی نگاہ بلند کر سکے ۔ جبکہ ہادی اور نبی بھی اپنے فیصلوں میں اللہ کی شریعت اور حکم کی طرف ہی دیکھتے ہیں ۔

اب ایک بار پھر اس حقیقت کو ذہن نشین کیا جاتا ہے تاکہ وہ اچھی طرح مومن کے شعور کی گہرائی تک اتر جائے ۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (۴۲ : ۱۱) "آسمانوں اور زمین کا بنانے والا جس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے اور اسی طرح جانوروں میں بھی جوڑے بنائے' اور اس طریقے سے وہ تمہاری نسلیں پھیلاتا ہے ۔ کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا

ہے"۔ اللہ قرآن کو نازل کرنے والا ہے کہ اس کا حکم تمہارے اختلافات کے اندر فیصل ہو۔وہی اللہ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے۔وہ آسمانوں اور زمین کا مدبر ہے۔ زمین اور آسمان میں جو قانون قدرت چلتا ہے' وہ زمین اور آسمان کے امور میں فیصلہ کن ہے۔لوگوں کی زندگیوں کے معاملات بھی دراصل اس کائنات ہی کا ایک حصہ ہیں' لہٰذا لوگوں کی زندگیوں میں قانون خداوندی کا اجراء دراصل لوگوں کی زندگیوں کو اس پوری کائنات کی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کر دے گا۔اس طرح تمام انسان اس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ اور ہم قدم ہو کر چلیں گے۔ جبکہ کائنات میں حکمرانی میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ لہٰذا انسان کی زندگی میں حکمرانی اس کی ہو گی۔

وہ اللہ جس کے حکم کی طرف لوگوں نے اپنے اختلافات میں رجوع کرنا ہے' وہ اللہ وہی ذات ہے جو تمہارا خالق ہے۔ تمہارے نفوس کو اسی نے بنایا ہے اور یہ اپنی مخلوق کو اچھی طرح جانتا ہے۔پھر۔

جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (۴۲ : ۱۱) "پھر تمہاری جنس ہی سے تمہارے لیے جوڑے بنائے"۔ اس طرح تمہاری زندگی کی بنیاد کی تشکیل ایک خاندان کی صورت میں ہوئی' لہٰذا وہی جانتا ہے کہ کس طرح یہ زندگی درست ہو سکتی ہے' اور انسان کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے' اللہ وہ ہے جس نے تمہاری تخلیق اس طرح کی جس طرح تمام دوسری زندہ مخلوق کو اس نے بنایا اور ان کے بھی جوڑے بنائے۔

وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا (۴۲ : ۱۱) "اور اسی طرح جانوروں میں بھی جوڑے بنائے"۔ تخلیق میں وحدت نظام اور تسلسل نوع' یہ ظاہر کرتا ہے کہ خالق ایک ہی ہے۔ تم اور مویشی اسی نظام کے مطابق تکاثر و تناسل کے عمل سے گزرتے ہو۔ جبکہ اللہ کی مثال اپنی مخلوقات میں سے نہیں ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۴۲ : ۱۱) "کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں"۔ انسانی فطرت اس اصول کو تسلیم کرتی ہے کیونکہ کوئی چیزیں اگر کسی نے بنائی ہیں تو خالق کسی طرح بھی ان کے مماثل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا انسانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے اس بے مثال خالق کے احکام ہی کی طرف لوٹیں۔ خصوصاً اس دنیا میں اپنے اختلافات کے معاملے میں۔ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف رجوع نہ کریں۔کیونکہ وہ بے مثال خالق و حاکم ہے۔ لہٰذا ایک مرجع کے سوا کوئی اور مرجع اور جائے فیصلہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ جیسا کوئی نہیں ہے۔

باوجود اس کے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کے مشابہ کوئی شئی اس دنیا میں نہیں ہے لیکن اللہ اور اس کی مخلوقات کے درمیان رابطہ باقی اور قائم ہے۔وہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے اور پھر دیکھنے اور سننے والے کی طرح فیصلے کرتا ہے۔ اور اللہ جس اختلافی معاملے میں فیصلہ کرتا ہے وہ پھر آخری فیصلہ ہوتا ہے۔وہ اس معنی میں کہ کنجیاں سب کائنات کی اسی کے ہاتھ میں ہیں اور اس وقت سے ہیں جب سے اس نے اس کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے اور اس کے لیے ایک ناموس فطرت بنا کر اس میں اسے رائج کر دیا ہے۔

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۴۲ : ۱۲) "آسمان اور زمین کے خزانوں کی کنجیاں اسی کے ہاتھ

میں ہیں"۔ لہٰذا انسانوں کے اختیارات بھی اسی کے ہیں کیونکہ انسان بھی اس کائنات کا حصہ ہیں۔ لہٰذا انسانوں کی کنجیاں بھی اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

پھر وہ اللہ ہی ہے جو انسانوں کے رزق کی کشادگی اور تنگی کے اختیارات رکھتا ہے۔ اور یہ رزق ان کو زمین و آسمان کے خزانوں سے دیتا ہے۔

يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (۲۱:۴۲) "جسے چاہتا ہے کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے' نپا تلا دیتا ہے"۔ وہ ان کا رازق ہے' وہ ان کا کفیل ہے' وہ ان کو کھانا دینے والا ہے' ان کو پالنے والا ہے لہٰذا وہ غیر اللہ کے متوجہ کیوں ہوتے ہیں کہ وہ ان کے درمیان فیصلے کرے۔ حق تو یہ ہے کہ لوگ فیصلوں کے لیے رازق اور کفیل کی طرف رخ کریں جو رزق اور دوسرے معاملات کی تدبیر کرتا ہے۔

اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲۱:۴۲) "اسے ہر چیز کا علم ہے"۔ فیصلہ وہی ذات کر سکتی ہے جو علم رکھتی ہے اور اسی کا فیصلہ عادلانہ بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ یوں اس پوری تقریر کے معانی نہایت ہی دقیق و لطیف انداز میں باہم مربوط اور متناسب ہیں تاکہ وہ انسانی قلب و عقل پر اثر انداز ہوں اور عقل و خرد کی تاروں پر ایسی چوٹ لگائیں کہ ان سے نہایت ہی گہرا' موزوں اور خوش آواز زمزمہ پیدا ہو۔

--- ○○○---

اب پھر وحی الٰہی کی طرف :

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا
الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ
اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿١٣﴾ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا
اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ
رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ
مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿١٤﴾ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ
كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾ وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِى اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۶﴾

"اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے' اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں' اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ یہی بات ان مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف (اے محمدؐ) تم انہیں دعوت دے رہے ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے' اپنا کر لیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔ لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا' وہ اس کے بعد ہوا کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا' اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ اگر تیرا رب پہلے ہی نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک وقت مقررہ تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے' وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ (چونکہ یہ حالت پیدا ہو چکی ہے) اس لیے اے محمدؐ اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو' اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اسی پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ' اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو' اور ان سے کہہ دو کہ: "اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا' مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ اللہ ایک روز ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔ اللہ کی دعوت پر لبیک کہے جانے کے بعد جو لوگ (لبیک کہنے والوں سے) اللہ کے معاملہ میں جھگڑے کرتے ہیں' ان کی حجت بازی ان کے رب کے نزدیک باطل ہے' اور ان پر اس کا غضب ہے اور ان کے لیے سخت عذاب ہے"۔

اس سورت کے آغاز میں آیا تھا۔

كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۲ : ۳) "اسی طرح اللہ غالب و حکیم تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کی طرف وحی کرتا رہا ہے"۔ یہ ایک اجمالی اشارہ تھا کہ وحی الٰہی کا سرچشمہ ایک ہے۔ اور اس وحی نے جو نظام پیش کیا ہے' یہ وہی ہے جو سابقہ رسولوں نے پیش کیا تھا' اور اس وحی کا رخ بھی اسی طرف ہے جس طرف سابقہ انبیاء کا تھا۔ اب اس اشارے کی تفصیلات دی جا رہی ہیں کہ اللہ نے مسلمانوں کے لیے جو نظام زندگی اور جو شریعت وضع کی ہے' وہ عمومی اصولوں میں وہی ہے جو حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو دی گئی تھی۔ سب کو حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کے واحد دین کو قائم

کرو' اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو' اور تمہارا فرض ہے کہ اللہ کے اس قدیم نظام زندگی پر جم جاؤ اور جو لوگ اس سے ادھر ادھر دیکھتے ہیں، محض خواہشات نفسانیہ پوری کرنے کے لیے تو ان کی طرف کوئی توجہ نہ کرو' اس دین کو غالب کرو' اور جو لوگ اس دین کے خلاف حجت بازیاں کرتے ہیں' ان کی حجت کو رد کر کے باطل کر دو' اور ان کو اللہ کے غضب اور شدید عذاب سے ڈراؤ۔

اس پیراگرف کے فقروں کے اندر بھی نہایت ہی لطیف ربط ہے جس طرح سابقہ پیراگراف کے فقروں میں ہم نے بیان کیا۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (۴۲ : ۱۳) ''اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے' اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں' اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ''۔ اس کے ساتھ اس حقیقت کو واضح کر دیا جاتا ہے جس کی تفصیلات ہم نے سورت کے آغاز میں دیں کہ ادیان کی جڑ ایک ہے۔ زمان و مکان کے لحاظ سے مختلف زمانوں میں اس کی نشوونما ہوئی۔ اس سے حس مومن میں ایسے تصورات و لمحات آتے ہیں کہ وہ سوچتا ہے کہ اس کا ماضی بہت طویل ہے اور اس کے سلف بہت ہی عظیم لوگ ہیں اور وہ ایسے عظیم لوگوں کا تابع اور پیروکار ہے۔ حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ' حضرت موسیٰؑ' حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اجمعین۔ یہ شعور پختہ ہوتا ہے کہ یہ دین ادیان سابقہ ہی کا تسلسل ہے اور یہ کہ وہ انبیاء و رسل کے راستے ہی پر رواں دواں ہے۔ اور اس راستے پر وہ نہایت خوشی سے چل رہا ہے۔ اگرچہ اس میں تھکاوٹ ہو' مشکلات ہوں اور اسے اپنے بے شمار مفادات قربان کرنے پڑیں۔ مومن کو یہ پختہ شعور حاصل ہوتا ہے کہ وہ عظیم لوگوں کے قافلے کا فرد ہے اور یہ قافلہ پوری انسانی تاریخ میں عظیم لوگوں کا قافلہ ہے۔

یہ کہ جو لوگ اللہ کے اس دین پر چلنے والے ہیں' ان کے درمیان دائمی امن و آشتی ہے۔ یہ ایک مستقل شریعت اور شاہراہ پر قائم ہیں۔ ان کے درمیان کوئی اختلاف اور دشمنی نہیں ہے بلکہ ان کے درمیان تو گہرے تعلقات و روابط ہیں۔ یہ تعلقات و روابط باہمی مزید تعلق اور مفاہمت کا تقاضا کرتے ہیں۔ یوں مومنین کا حال ان کے ماضی سے مربوط ہو جاتا ہے اور ان کا ماضی ان کے حال سے جڑ جاتا ہے اور وہ سب وہ ایک ہی راستے پر چل پڑتے ہیں۔

اگر اسلامی نظام اور شریعت جو اللہ نے مومنین اور مسلمین کے لیے مقرر کی ہے' وہی ہے جس کی وصیت اور تاکید حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو بھی اس سے قبل کی گئی تھی تو پھر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے متبعین باہم کیوں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین میں سے مختلف فرقے کیوں باہم دست و گریباں ہیں۔ پھر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے متبعین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں کے ساتھ کیوں عناد رکھتے ہیں۔ پھر وہ لوگ جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ دین ابراہیم پر ہیں یعنی مشرکین عرب تو ان کے لیے کیا جواز ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور وہ کیوں نبی آخر

الزمان کے جھنڈے تلے جمع نہیں ہوتے جن کی دعوت یہ ہے کہ تمام پیروکاران دین کو یہ وصیت کی گئی تھی کہ۔

اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ (۴۲: ۱۳) "دین کو قائم کرو اور اس میں فرقے نہ بنو"۔ اور کیوں اپنے فرائض ادا نہیں کرتے 'کیوں ایسا نہیں کرتے کہ وہ انحراف کو چھوڑ دیں۔کج روی سے توبہ کریں اور کیوں پھر یہ لوگ آخری نبی کے جھنڈے تلے صف واحد کی صورت میں کھڑے نہیں ہوتے۔کیونکہ حضرت نوح 'حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے بعد اب حضرت محمد کی باری ہے اور یہ امانت اب ان تک پہنچی ہے۔

مشرکین جو ام القریٰ میں بستے ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ وہ دین ابراہیمی پر ہیں وہ دعوت اسلامی کے مقابلے میں ایک معاند اور مخالف کے طور کھڑے ہیں۔یہ کیوں؟

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ (۴۲: ۱۳) "یہ بات ان مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف تم انہیں دعوت دے رہے ہو"۔ان کو یہ بات ناگوار ہے کہ ان میں سے محمد ابن عبداللہ پر وحی کیوں آئی۔حالانکہ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ وحی دو بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر نازل ہوگی۔

عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ یعنی ان دو گاؤں کے کبراء اور اہل اقتدار میں سے کسی پر نازل ہوتی۔ لیکن خود ان کی یہ بات بھی حقیقت واقعہ کے طور پر درست نہ تھی' حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے قول کے مطابق صادق و امین تھے۔اور آپ قریش کے ایک ممتاز قبیلے کے چشم و چراغ تھے۔آپ تو بے شک عظیم آدمی تھے۔

ان پر یہ نئی دعوت شاق گزرتی تھی کیونکہ اگر یہ کامیاب ہوتی ہے تو بت پرستی کا دور ختم ہو جاتا ہے۔بت اور بتوں کے افسانے ختم ہو جاتے ہیں اور اسی پر تو ان کی سیادت و قیادت قائم تھی۔ان کے ذاتی اور اقتصادی مفادلت انہی تصورات سے وابستہ تھے' لہٰذا انہوں نے شرک کو سینے سے لگا لیا اور خالص توحید پر مبنی دعوت ان پر بھاری تھی' جس کی طرف رسول بلاتے تھے۔

پھر ان پر یہ بات بھی گراں گزر رہی تھی کہ ان کے جو آباء و اجداد جاہلیت پر مرگئے ہیں وہ گمراہی پر گئے اور وہ کافر اور جہنمی تھے۔لہٰذا انہوں نے کہا اگر آباء جہنمی ہیں تو ہم بھی ہیں۔یوں وہ ضد میں آگئے اور غلط راہ عناد کی وجہ سے پکڑ لی۔اور عمداً اپنے آپ کو جہنم میں گرانے کے لیے تیار ہو گئے۔محض اس لیے کہ وہ اپنے آباء کو گمراہ قرار دینے کے لیے تیار نہ تھے۔

قرآن کریم ان کے اس موقف کی تردید یوں کرتا ہے کہ یہ اللہ کا اختیار ہے کہ جسے چاہے' چن لے۔اس طرح اللہ اپنی جانب صرف اسی کو متوجہ کرتا ہے جو اللہ کی پناہ میں آنا چاہے اور دھتکارے ہوئے لوگوں کو بذریعہ توبہ واپس کرتا ہے:

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (۴۲: ۱۳) "اللہ جسے چاہتا ہے' اپنا لیتا ہے اور جو اپنی طرف اسی کو راستہ دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے"۔تو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چن لیا۔ اور جو بھی اب اللہ کے بتائے ہوئے راستے کی طرف متوجہ ہوگا اللہ اسے ہدایت دے دے گا۔

اب روئے سخن مذکور بالا بڑے انبیاء کے متبعین کے موقف کی طرف پھرتا ہے ' جن کو اللہ نے ایک ہی دین دے کر بھیجا تھا اور انہوں نے قوم کے سامنے ایک ہی دین پیش کیا تھا مگر متبعین نے اس میں تفرقہ اختیار کر لیا :

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (۴۲ : ۱۴) "لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا ' وہ اس کے بعد ہوا کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا ' اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے ۔ اگر تیرا رب پہلے ہی نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک وقت مقررہ تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے ' وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں " ۔ ایک تو یہ کہ یہ اختلافات جہالت کی وجہ سے نہ تھے ۔ یہ وجہ نہ تھی کہ ان کو اس اصل حقیقت کا پتہ نہ تھا اور یہ پتہ نہ تھا کہ رسولوں کی تعلیم کا ماخذ کیا ہے بلکہ انہوں نے اچھی طرح جانتے بوجھتے شک کیا ۔ آپس کی دشمنی کی وجہ سے تفرقہ کیا ۔ بغض اور حسد کی وجہ سے یہ اختلافات ہوئے ۔ ظالمانہ خواہشات نے مجبور کیا کہ وہ تفرقہ کریں ۔ اور ناقابل کنٹرول خواہشات نفس نے ان کو مجبور کیا ۔ یہ تفرقہ اس لیے نہیں ہوا کہ ان کے پاس درست عقائد کے لیے کوئی دلیل نہ تھی یا جو نظام زندگی انہیں دیا گیا تھا ' اس میں سے ان کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا ۔ اگر وہ اپنے حقیقی عقیدے اور شریعت پر مخلصانہ طور پر قائم رہتے تو تفرقہ نہ کرتے ۔

یہ لوگ اس بات کے مستحق تھے کہ اللہ ان کو پکڑ لیتا اور ان پر جلدی اللہ کا عذاب آ جاتا ' ان کی سرکشی اور ان کے ظلم کی وجہ سے جو انہوں نے یہ تفریق کر کے دین حق کے ساتھ کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے تدبیر کائنات کے سلسلے میں پہلے سے ایک فیصلہ کر دیا تھا اور ان کو ایک مقررہ وقت تک مہلت دے دی گئی تھی ۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ (۴۲ : ۱۴) "اگر تیرا رب پہلے یہ نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک وقت مقرر تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا " ۔ اور اس طرح ان اختلافات میں حق ' حق ہو چکا ہوتا اور باطل باطل ہو چکا ہوتا اور معاملہ اس دنیا ہی کی زندگی میں ہی ختم ہو چکا ہوتا لیکن ان کو وقت معلوم تک مہلت دے دی گئی ہے ۔

وہ نسلیں جو ان ابنائے سابقین کے پہلے متبعین کی وارث بنیں جنہوں نے تفرقہ کیا تھا ۔ اور یہ کتاب ان کو ملی تو ان کو یہ کتاب اور یہ نظریہ یقینی انداز میں نہ ملا ۔ کیونکہ اختلافات کا ریکارڈ ان کے سامنے تھا اور اس سے کوئی جزمی اور قطعی بات سامنے نہ آتی تھی ۔ تمام فرقہ وارانہ اختلافات عمل ' غیر واضح اور پریشان کن تھے ۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (۴۲ : ۱۴) "اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے تھے " ۔ یوں ہوتا ہے عقیدہ تو اس مضبوط چٹان کی طرح ہوتا ہے جس کے ارد گرد سے زمین حرکت میں ہوتی ہے لیکن

وہ مضبوط ہوتا ہے۔اور ایک مومن اس راسخ چٹان پر مضبوطی سے جم جاتا ہے اور اسے کوئی زلزلہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا اور عقیدہ وہ ستارہ ہوتا ہے جو اپنی جگہ جما ہوا ہوتا ہے اور لہروں اور طوفانوں کے باوجود مومن کی نظر بلند افق پر اپنے ستارے پر ہوتی ہے جو سمت کا تعین کرتا ہے۔اس طرح ایک مومن راستہ نہیں بھولتا اگرچہ تاریک سمندروں میں ہو۔ لیکن جب عقیدہ اور نظریہ ہی مشکوک ہو جائے تو پھر کسی کی کوئی بات مستقل نہیں ہو سکتی۔نہ کسی بے عقیدہ شخص کی کوئی بات مستقل ہو سکتی ہے۔نہ ایسا شخص کسی بھی سمت پر مستقل رہ سکتا ہے۔نہ کسی راستے پر مطمئن ہو سکتا ہے۔

عقیدہ اور نظریہ ہوتا ہی اس لیے ہے کہ لوگوں کا نصب العین اور ان کی سمت متعین کرے اور پھر وہ دوسرے لوگوں کی اس راہ پر چلتے ہوئے قیادت کریں۔اگر وہ خود اضطراب اور شک میں پڑے ہوں تو وہ کسی کی قیادت نہیں کر سکتے۔ خفتہ را خفتہ کے کند بیدار۔۔۔ جب اس دنیا میں دین اسلام آیا تو امم سابقہ کے متبعین کی یہی حالت تھی۔مولانا ابو الحسن علی ندوی اپنی ”کتاب عالم اسلام میں مشرقیت و مغربیت کی کشمکش“ میں لکھتے ہیں :

”حقیقت یہ ہے کہ دوسرے بڑے ادیان کے لیڈر کھیلنے والوں اور کھلاڑیوں کے ہاتھ میں شکار ہیں اور ان پر تحریف کرنے والوں اور منافقوں کا اثر ہے۔یہ ادیان اپنی روح اور شکل گنوا بیٹھے ہیں۔اگر ان ادیان کے پہلے ماننے والوں کو اللہ اب زندہ کر دے تو وہ خود اپنے نام سے منسوب ان ادیان کو نہ پہچان سکیں۔چنانچہ کبھی تو یہ ادیان تہذیب و تمدن اور حکومت و سیاست عطا کرنے والے تھے۔اب وہاں سے بدنظمی، خلل اور اختلافات اور طوائف الملوکی ہوتی ہے، حکام بدعمل ہیں، اپنی ذات میں گم ہیں۔ان کے پاس اقوام اور دنیا کے لیے کوئی پیغام نہیں ہے۔مقاصد عالیہ کے اعتبار سے وہ مفلس ہیں۔ان کی زندگی کے سوتے خشک ہو چکے ہیں، ہدایات سماوی کی روشنی میں ان کے پاس کوئی راہ نہیں ہے، نہ کوئی مستقل اور محکم نظام زندگی ہے۔

مشہور امریکی مصنف جارج ایچ۔ڈنسن اپنی کتاب جذبات بحیثیت اساس تمدن (Emotion as the basis of civilisation) میں لکھتے ہیں :

”پانچویں صدی اور چھٹی صدی عیسوی میں اہل دین کی دنیا تباہی کے ایک گہرے گڑھے کے دہانے پر تھی۔کیونکہ جو نظریات تمدن کو جنم دینے میں مدد و معاون تھے، وہ ختم ہو چکے تھے اور اس وقت کے موجودہ ادیان کی جگہ لینے کے لیے کوئی نظریہ موجود نہ تھا۔اور یہ واضح طور پر نظر آنے لگا تھا کہ جس انسانی تہذیب کی تعمیر و ترقی پر چار ہزار سال گزرے تھے وہ ختم اور برباد ہونے والی ہے اور انسانیت دوبارہ جہالت، قبائلی نظام کے چنگل میں پھنسنے والی ہے، جس میں کوئی قانون و نظام نہیں ہوتا کیونکہ مسیحیت نے جو اجتماعی نظم و نسق قائم کیا تھا، اس کی عمارت گرنے ہی والی تھی۔اس لئے کہ عیسائیت فرقے فرقے ہو گئی تھی۔اس کے اندر کوئی اتحاد اور نظم نہ تھا۔اس دور میں تمدن کی مثال اس طرح تھی کہ وہ ایک عظیم درخت کی طرح تھی جس کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں اور اس کا سایہ تمام دنیا پر چھایا ہوا تھا، یہ درخت سخت طوفانوں کی زد میں نہایت کمزوری کی حالت میں کھڑا تھا اور ہلاکت اس کے دروازے پر دستک دے رہی تھی، کہ اس اثناء میں ایک شخص (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا ہو گیا“۔

یہ صورت حال اس لیے تھی کہ ادیان سماوی کے حاملین نے باہم سخت اختلافات شروع کر دیئے تھے، بعد اس کے کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا۔اور ادیان کے اصحاب اولین کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنے تھے ان کو ان کتابوں کی

صداقت کے بارے ہی میں شک تھا۔ ان وجوہات سے اور پوری دنیا میں انسانیت کی قیادت کے لیے کسی مرکز کے ناپید ہو جانے کی وجہ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا اور آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ سیدھے راستے پر چل پڑیں لوگوں کو دعوت دیں اور آپ کی واضح اور بین نظریات اور آپ کی مستحکم دعوت کے بارے میں لوگ ہو جائیں 'کہیں۔ آپ کسی کی طرف متوجہ نہ ہوں اور یہ اعلان کر دیں کہ یہ دعوت اور یہ نظام وہی ہے جو اللہ نے تمام انبیاء کو دیا تھا اور اس کے بارے میں وصیت کی تھی۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۴۲ : ۱۵) "(چونکہ یہ حالت پیدا ہو چکی ہے) اس لیے اے محمدؐ اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو 'اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اسی پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ 'اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو 'اور ان سے کہہ دو کہ :"اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا' مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ اللہ ایک روز ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے"۔

اب دعوت اسلامی گویا پوری انسانیت کے لیے نئی قیادت تھی۔ یہ ایک دانشمند' صحیح الفکر قیادت تھی جس کا نظام زندگی واضح تھا' جس کو یقین محکم حاصل تھا۔ یہ اللہ کی طرف بلاتی تھی اور اپنے مقصد کے لیے علی وجہ البصیرت کام کر رہی تھی اور بغیر کسی کج روی کے امر الٰہی پر گامزن تھی۔ اور وہ اپنے فیصلوں میں بدلتے ہوئے مقاصد اور بدلتی ہوئی خواہشات کے پیچھے نہ جاتی تھی۔ ایسی قیادت جس کا پیغام ایک تھا' جس کی کتاب ایک تھی' نظام و شریعت ایک تھا' جس کا ایمان ماخذ ایمان کی طرف راجع تھا۔ اور جس نے تمام انسانیت کو ایک اہم اصول کی طرف لوٹا دیا تھا۔

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ (۴۲ : ۱۵) "اور ان سے کہہ دو کہ اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں"۔ اس کے بعد یہ دعوت یہ تحریک دعوت حق کو لے کر دنیا میں سربلند ہوتی ہے اور اقتدار اعلیٰ حاصل کرتی ہے تاکہ وہ لوگوں کے درمیان عدل کرے۔

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (۴۲ : ۱۵) "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں"۔ یہ ایسی قیادت ہے جس کے پاس اقتدار بھی ہے اور یہ زمین میں عدل گستری کا اعلان کرتی ہے۔ (یہ بات حضورؐ اس وقت کر رہے ہیں جب دعوت اسلامی مکہ میں ہے اور داعی اور تحریک شعب ابی طالب میں محصور ہیں' ان پر مصائب کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں لیکن وہاں بھی دعوت اسلامی کا مزاج' چھا جانے والا مزاج بالکل واضح ہے) (مترجم)۔ یہ دعوت اعلان کرتی ہے کہ رب واحد ہے'

اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ (۴۲ : ۱۵) "اللہ ہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب بھی"۔ اور یہ اعلان بھی کیا جاتا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور جواب دہی انفرادی ہے۔

لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ (۴۲ : ۱۵) "ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے تمہارے لیے ہیں"۔ اس لیے اب فضول بحث و مباحثہ ختم ہونا چاہئے۔

لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (۴۲ : ۱۵) "ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں"۔۔

اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۴۲ : ۱۵) "اللہ ہم سب کو ایک روز جمع کرے گا۔ اور اسی کی طرف لوٹنا ہے"۔

یہ ایک آیت ہے لیکن یہ دعوت اسلامی کے مزاج کی وضاحت پوری طرح کر دیتی ہے۔ اس آیت کے فقرے بھی چھوٹے چھوٹے ہیں، لیکن وہ نہایت ہی دو ٹوک اور فیصلہ کن بات کرتے ہیں۔ یہ ایک دعوت ہے جس نے اپنی راہ پر گامزن رہنا ہے اور انسانوں کی خواہشات کا کوئی لحاظ نہیں رکھنا۔ اس نے اس کرۂ ارض پر اقتدار اعلیٰ پر خالص ہونا ہے تاکہ وہ عدل کر سکے۔ اس نے تمام انسانوں کو ایک سیدھی راہ دکھائی ہے جو صراط مستقیم ہے اور یہی راہ تمام رسولوں کی راہ رہی ہے۔

چنانچہ دعوت اسلامی کی اس رنگ میں وضاحت کرنے کے بعد اور اہل ایمان کے ایک گروہ کی جانب سے اس دعوت پر لبیک کہنے کے بعد، الجھنے والوں اور بے فائدہ مباحثہ کرنے والوں کی باتوں کی طرف التفات کرنے کا کوئی موقعہ نہیں رہا ہے۔ ان کی تمام دلیلیں باطل ہو چکی ہیں، ان کا کوئی وزن نہیں ہے، نہ اہمیت ہے۔ لہٰذا ان کے بارے میں اب فیصلہ کن بات کر دی جاتی ہے اور ان کو اللہ کی شدید دھمکی کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُحَاجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ (۴۲ : ۱۶) "اللہ کی دعوت پر لبیک کہے جانے کے بعد جو لوگ اللہ کے معاملے میں جھگڑتے ہیں، ان کی حجت بازی ان کے رب کے نزدیک باطل ہے اور ان پر اس کا غضب ہے اور ان کے لیے سخت عذاب ہے"۔ جو لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور ان کی حجت اللہ کے نزدیک ہی باطل ہے تو پھر ان کا جھگڑا باطل ہے اور ان کی دلیل کی کوئی حیثیت نہیں۔ زمین پر بھی ان کی دلیل مسترد ہے اور آخرت میں ان کو اللہ کے شدید غضب اور عذاب کا سامنا کرنا ہو گا۔ اور یہ فضول جھگڑے اور حجت بازی ان کے لیے موزوں سزا ہے جبکہ وہ دیکھتے بھی ہیں کہ نہایت ہی مخلص اور دانشمند لوگوں نے اس دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ لہٰذا ان کی یہ بحث اور مناظرہ حق کی وضاحت کے بعد ہے اور کچھ دوسرے مقاصد کے لیے ہے۔

اب سیاق کلام کا رخ پھر پہلے موضوع کی طرف۔

اَللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَ الْمِيْزَانَ ؕ وَمَا يُدْرِيْكَ

لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ ﴿١٧﴾ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا ۚ

وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ مِنْهَا وَيَعْلَمُونَ أَنَّهَا الْحَقُّ ۗ أَلَا إِنَّ الَّذِينَ يُمَارُونَ

فِي السَّاعَةِ لَفِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ﴿١٨﴾ اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ ۖ وَهُوَ الْقَوِيُّ ۲

الْعَزِيزُ ﴿١٩﴾ ع ۱۰

۳ "وہ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ یہ کتاب اور میزان نازل کی ہے اور تمہیں کیا خبر، شاید کہ فیصلے کی گھڑی قریب ہی آ لگی ہو۔ جو لوگ اس کے آنے پر ایمان نہیں رکھتے، وہ تو اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں، مگر جو اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یقیناً وہ آنے والی ہے۔ خوب سن لو، جو لوگ اس گھڑی کے آنے میں شک ڈالنے والی بحثیں کرتے ہیں وہ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں۔ اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے جسے جو کچھ چاہتا ہے، دیتا ہے اور وہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔ جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے، اس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں، اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے، اسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے"۔

اللہ نے ایک تو کتاب برحق نازل کی اور اس میں عدل نازل کیا۔ اس میزان عدل کے مطابق لوگوں کے اختلافات کے بارے میں حکم دینے اور فیصلہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ فیصلہ لوگوں کی خواہشات و دعاوی کے بارے میں ہو یا ان کی آراء کے بارے میں ہو یا عقائد و نظریات کے بارے میں۔ اور اللہ نے ایک نظام شریعت بھی نازل کیا جس کی اساس عادلانہ فیصلوں پر رکھی۔ قرآن نے عدل کے لیے میزان کا لفظ استعمال کیا۔ یعنی ایسا عدل کہ جس کے مطابق حقوق کا وزن کیا جا سکے۔ اعمال اور تصرفات کو تولا جا سکے۔

اب روئے سخن کتاب و میزان سے قیامت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور مناسبت مضمون واضح ہے کہ کتاب اور شریعت نے بھی لوگوں کے درمیان اس دنیا میں میزان لگا کر عدل کرنا ہے، اور آخرت میں بھی میزان لگا کر عدل و انصاف ہو گا۔ قیام قیامت چونکہ ایک غیب ہے اور اس کے قیام کی گھڑی کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ بہت ہی قریب ہو۔

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ (۴۲ : ۱۷) "اور تمہیں کیا معلوم کہ فیصلے کی گھڑی قریب آ لگی ہو"۔ اور لوگ اس سے غافل ہوں اور وہ ان کے قریب ہو۔ اور یہ آخری عدل و انصاف کا ترازو بھی نصب ہو جائے جہاں کسی عمل کو مہمل نہ چھوڑا جائے گا اور نہ کوئی کم ہو گا۔ یہاں قیامت کے بارے میں مومنین اور منکرین دونوں کی سوچ کو بتایا جاتا ہے۔

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ مِنْهَا وَيَعْلَمُونَ أَنَّهَا الْحَقُّ (۴۲ : ۱۸) "جو لوگ اس کے آنے پر ایمان نہیں رکھتے، وہ اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں، مگر جو اس پر

ایمان رکھتے ہیں وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ یقیناً آنے والی ہے"۔ ظاہر کہ جو اس پر ایمان نہیں لاتے ان کے دلوں پر اس کا خوف ہی نہیں ہے اور ان کو اندازہ نہیں ہے کہ وہاں انہیں کیا پیش آنے والا ہے۔ اس لیے وہ بطور مزاح اس کے آنے کا مطالبہ کرتے ہیں' یا اس کے لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اندھے ہیں اور ان کو نظر ہی نہیں آتا۔ رہے وہ لوگ جو ایماندار ہیں تو انہیں قیامت پر بھی یقین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس سے ڈرتے ہیں اور نہایت خوف اور ڈر سے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جب وہ آئے گی تو کیا ہوگا' وہ حق ہے۔ اس کا آنا حق ہے اور مومن اسے جانتا ہے کیونکہ مومن اور حق کے درمیان رابطہ ہے۔

اَلَآ اِنَّ الَّذِیْنَ یُمَارُوْنَ فِی السَّاعَةِ لَفِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ (۴۲: ۱۸) "خوب سن لو' جو لوگ اس گھڑی میں شک ڈالنے والی بحثیں کرتے ہیں' وہ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں"۔ انہوں نے گمراہی میں غلو کر لیا ہے۔ اور اس راہ پر بہت دور نکل گئے ہیں' اب ان کے لیے اس قدر دور نکلنے کے بعد واپسی ممکن نہیں ہے۔ اب آخرت' اس کے انکار اور اس کے بارے میں لاپرواہی اور اس سے ڈرنے کے مضمون سے روئے سخن اس دنیا میں لوگوں کے رزق کی بحث کی طرف مڑتا ہے جو اللہ کسی کو کم' کسی کو زیادہ دیتا ہے۔

اَللّٰهُ لَطِیْفٌۢ بِعِبَادِهٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ وَهُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ (۴۲: ۱۹) "اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے' جسے جو کچھ چاہتا ہے' دیتا ہے اور وہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے"۔ بظاہر آخرت اور بندوں کے رزق کے مضامین کے درمیان کوئی خاص مناسبت اور ربط نظر نہیں آتا۔ لیکن بعد کی آیت پڑھنے کے بعد ربط ظاہر ہو جاتا ہے۔

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِیْبٍ (۴۲: ۲۰) "جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے' اس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا"۔ بس اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے' جسے جو کچھ چاہتا ہے' دیتا ہے۔ صالح کو بھی دیتا ہے' برے کو بھی دیتا ہے' مومن کو بھی دیتا ہے' کافر کو بھی دیتا ہے' کیونکہ انسان خود اپنے رزق کا بندوبست نہیں کر سکتے' جب اللہ نے ان کو زندگی دی ہے تو زندگی کے بنیادی اسباب بھی دیے ہیں' اگر اللہ کافر' فاسق اور بدکار کو رزق نہ دیتا تو وہ اپنے رزق کا بندوبست تو خود نہ کر سکتے اور بھوک اور پیاس سے مر جاتے۔ جب وہ زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ رکھ کر مہلت دینے کا جو قانون مقرر فرمایا تھا' وہ پورا نہ ہوتا۔ اور یہ نہ ہو سکتا تھا کہ لوگ دنیا میں آزادانہ عمل کریں اور ان کے اعمال کا حساب آخرت میں ہو۔ اس لیے اللہ نے رزق کا معاملہ نیکی اور برائی کے دائرے سے باہر رکھا۔ ایمان و کفر کے ساتھ رزق کا تعلق نہیں ہے اور رزق کے معاملے کو انسانوں کی اجتماعی زندگی کے حالات پر رکھ دیا' پھر ان اجتماعی حالات میں بندوں کے طرز عمل پر رکھ دیا اور مال کو بھی لوگوں کے لیے فتنہ اور آزمائش بنا دیا جس پر جزاء و سزا کا دارومدار ٹھہرا۔

پھر آخرت اور دنیا کے لیے علیحدہ علیحدہ کھیت قرار دیا۔ ہر آدمی کو اختیار دے دیا کہ وہ دنیا کے کھیت میں محنت کرتا

ہے یا آخرت کے کھیت میں۔ جو شخص آخرت کے لیے کھیتی باڑی کرتا ہے اسے آخرت کی فصل ملے گی اور اللہ بطور انعام اس کے کھیت میں اضافہ کر دے گا اور اس کی نیت کی وجہ سے اس کام میں اس کے لیے اسباب فراہم کر دے گا۔ اس میں برکت دے گا۔ اس آخرت کی کھیتی میں اس کے لیے ضروریات دنیا کا بھی انتظام ہو گا۔ دنیا کے لیے بھی رزق اسے ملے گا۔ اس میں کوئی کمی نہ ہو گی۔ بلکہ یہی دنیا کا رزق ہی فلاح آخرت قرار پائے گا۔ جب وہ اس دنیا کے رزق کو اللہ کی راہ میں خرچ کرے اور اس میں ' اللہ کے حکم کے مطابق تصرف۔ انفاق فی سبیل اللہ کرے گا۔ اور جو شخص صرف دنیا کا کھیت چاہے تو اللہ اسے دنیا کا سازو سامان دے گا اور جو اس کے لیے لکھ دیا گیا ہو وہ اسے ملے گا۔ لیکن آخرت میں اس کا حصہ نہ ہو گا اس لیے کہ اس نے آخرت کی کھیت میں کام ہی نہیں کیا کہ وہاں اس کے لیے کوئی چیز منتظر ہو۔

اب ذرا طلبگاران کشت زار دنیا اور طلب گاران کشت زار آخرت پر ایک نگاہ ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ صرف دنیا کے کھیت میں کام کرنے والے بہت ہی احمق ہیں۔ جہاں تک دنیا کے رزق کا تعلق ہے تو اللہ دونوں فریقوں کو دیتا ہے۔ کیونکہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے رزق تو ہر کسی کو ملتا ہے جس قدر اس کے مقدر میں لکھا ہوا ہے۔ ہاں آخرت کے کھیت میں کام کرنے والے کے لیے آخرت کا حصہ صرف اس کا ہوتا ہے۔

صرف دنیا کے کھیت کا انتخاب کرنے والوں میں فقراء بھی ہوتے ہیں اور امراء بھی۔ یعنی جس کے پاس جس قدر دولت ہے ' اس معاشرے کے عام حالات کے مطابق جس میں وہ رہتا ہے ' اور اس کی ذاتی صلاحیت اور محنت کے مطابق۔ یہی حال ہے آخرت کے کھیت میں کام کرنے والوں کا کہ ان میں امراء بھی ہوں گے اور فقراء بھی۔ کیونکہ رزق کے معاملے میں مومن اور کافر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اختلاف تو یہاں ہو گا کہ کون کس کھیت کا انتخاب کرتا ہے ' فقط دنیا کا ' یا آخرت کا۔ احمق وہ ہے جو آخرت کے کھیت کو ترک کرتا ہے جس میں دنیا کا رزق بھی ہے اور آخرت کا بھی۔ اور جب وہ آخرت کے کھیت کو ترک کرتا ہے تو دنیا میں بھی اسے اسی قدر ملتا ہے جو مقدر ہے۔

غرض معاملہ اس سچائی کے مطابق اپنے انجام کو پہنچے گا جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل کی ہے۔ حق اور انصاف یہ ہے کہ تمام زندہ چیزوں کو رزق دیا جائے اور آخرت کا حصہ صرف ان لوگوں کے لیے ہو جنہوں نے آخرت کے لیے کام کیا اور جو آخرت کے لیے کام نہ کریں وہ آخرت میں محروم ہوں۔

--- ○○○ ---

اب پھر ایک سفر پہلے موضوع پر یعنی توحید و رسالت پر۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ ۖ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ ﴿٢٠﴾ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللَّهُ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۗ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢١﴾ تَرَى الظَّالِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا

كَسَبُوْا وَ هُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۲۲﴾ ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ وَ مَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۲۳﴾

"کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریک خدا رکھتے ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا؟ اگر فیصلے کی بات طے ہو گئی ہوتی تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا۔ یقیناً ان ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ تم دیکھو گے کہ یہ ظالم اس وقت اپنے کیے کے انجام سے ڈر رہے ہوں گے۔ اور وہ ان پر آکر رہے گا۔ بخلاف اس کے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں' وہ جنت کے گلستانوں میں ہوں گے' جو کچھ بھی وہ چاہیں گے اپنے رب کے ہاں پائیں گے' یہی بڑا فضل ہے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی خوشخبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جنہوں نے مان لیا اور نیک عمل کیے۔ اے نبی" ان لوگوں سے کہہ دو کہ "میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں' البتہ قرابت کی محبت ضرور چاہتا ہوں"۔ جو کوئی بھلائی کمائے گا' ہم اس کے لیے اس بھلائی میں خوبی کا اضافہ کر دیں گے۔ بے شک اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور قدر دان ہے"۔

پچھلے پیراگراف میں یہ کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کے لیے جو نظام زندگی اور شریعت تجویز کی تھی وہ وہی ہے جس کے بارے میں نوح' ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو تاکید کی گئی تھی۔ وہی بات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی وحی کی گئی۔ اب اس پیرے میں ان سے گرفت کے انداز میں پوچھا جاتا ہے کہ تم بتاؤ تمہاری شریعت اور قانون اور نظام اور نظریہ کا ماخذ کیا ہے؟ تمہاری شریعت کس نے بنائی ہے۔ یہ تم جس نظام کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہو' یہ تو تمام شریعتوں کے خلاف ہے۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ (۴۲ : ۲۱) "کیا کچھ لوگ ایسے شریک خدا ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا"۔ اللہ کی مخلوقات میں سے کسی کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اللہ کی شریعت اور قانون کے متضاد کوئی قانون بنانا چاہے وہ کوئی شخص بھی ہو۔ قانون سازی کا اختیار صرف اللہ وحدہ کو ہے کیونکہ اللہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس نے اس پوری کائنات کے لیے ایک نظام تجویز کر رکھا ہے اور انسان بھی اس کائنات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ اس لیے انسان کی زندگی کو ضابطے میں لانے کے لیے ایسا ہی قانون چاہئے جو قانون فطرت ہو۔ اللہ کے قوانین فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ اور یہ صرف اس وقت ہوتا ہے کہ جب قانون وہ ذات بنائے جو نظام فطرت کی موجد ہے۔ اللہ کے سوا

کوئی اور ذات یہ کام نہیں کر سکتی ـ اس میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے ـ لہٰذا کوئی شخص انسانوں کی قانون سازی پر' وہ اعتماد نہیں کر سکتا جو اللہ کے قانون پر کرتا ہے ـ

اگرچہ یہ وہ حقیقت ہے جو بداہت کی حد تک واضح ہے لیکن پھر بھی زیادہ لوگ اس کے بارے میں جھگڑتے ہیں یا ان کو اس پر یقین نہیں آتا ـ اور پھر بھی وہ جرات کرتے ہیں کہ اللہ کے قانون کے سواکسی اور اصول کے مطابق قانون سازی کریں ـ ان کا زعم یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے لیے بھلائی کر رہے ہیں' پھر وہ اپنے حالات کو ان قوانین کے مطابق ڈھالتے ہیں جو انہوں نے خود بنائے ہیں ـ گویا وہ اللہ سے زیادہ جانتے ہیں' زیادہ بہتر فیصلے کرنے والے ہیں' یا اللہ کے سوا ان کے کوئی اور الٰہ ہیں جو ان کے لیے ایسے قانون بناتے ہیں جس کا اللہ نے اذن نہ دیا ہو ـ اس قسم کے لوگ اللہ کے نزدیک گھاٹا اٹھانے والے ہیں اور اللہ کی ذات کے خلاف جرات کرتے ہیں ـ

اللہ نے انسانوں کے لیے ایسا قانون بنایا ہے جو انسان کی فطرت اور اس کائنات کے ناموس فطرت اور انسان کے مزاج کے مطابق ہے ـ یہی وجہ ہے کہ اس قانون کے مطابق انسانوں کا باہم تعاون اپنے اعلیٰ درجات تک پہنچ جاتا ہے اور اس کائنات کی دوسری قوتوں کے ساتھ بھی انسان کو تعاون حاصل ہو جاتا ہے ـ اللہ نے انسان کی پوری زندگی کے بارے میں قانون بنا دیا ہے ـ صرف جزئیات کا دائرہ چھوڑ دیا گیا جن کے بارے میں انسان نئے حالات کے مطابق خود قانون سازی کر سکتا ہے ـ لیکن یہ قانون سازی بھی اللہ کے جاری کردہ اصولی قوانین کے دائرے کے اندر کر سکتا ہے ـ اور اگر کسی معاملے میں انسانوں کے درمیان اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ بھی اللہ اور رسولؐ کے قانون کے مطابق طے کرنا ہوگا ـ کیونکہ اصول اسلامی شریعت میں طے کر دیئے گئے ہیں اور یہ اصول وہ ترازو ہیں جن کے مطابق تمام انسانوں نے اپنی آراء کو تولنا ہے ـ

یوں قانون سازی کا ماخذ طے ہو جاتا ہے اور حکم اللہ کے لیے مخصوص ہو جاتا ہے جو احکم الحاکمین ہے ـ اس کے سوا کوئی اگر اصول و دستور طے کرے گا وہ اسلامی شریعت سے بغاوت کرے گا ـ اللہ کے دین سے بغاوت کرے گا ـ اور اس وصیت اور تاکید کے خلاف چلے گا جو حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو کی گئی ـ اور اب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وہی شریعت نافذ کر دی گئی ـ

وَلَوْ لَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ (۲۱ : ۴۲) "اگر فیصلے کی بات طے نہ ہو گئی ہوتی تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا" ـ اللہ نے فیصلہ کی بات یوں کر دی ہے کہ لوگوں کو فیصلے کے دن تک مہلت دے جائے گی ـ اگر یہ بات طے نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اسی دنیا میں ان کا فیصلہ کر دیتا ـ اور اللہ کی شریعت کے مخالفین کو یہاں ہی پکڑ لیا جاتا ـ ان کا قضیہ جلدی ہی چکا دیا جاتا ـ لیکن اللہ نے مہلت دے دی ہے ـ

وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۱ : ۴۲) "اور ان ظالموں کے لیے یقیناً دردناک عذاب ہے" ـ یہ عذاب ان کے ظلم کی وجہ سے ان کا منتظر ہے اور اس سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو شخص اللہ کی شریعت کی مخالفت کرے ـ اور اللہ کے سوا دوسروں کی شریعت کی حمایت کرے ـ یہی وجہ ہے کہ ان ظالموں کو اب قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں پیش کیا جاتا ہے ـ یہ لوگ وہاں ڈرے ہوئے ہیں' سہمے ہوئے ہیں ـ عذاب جہنم ان کے سامنے ہے ـ

اس سے قبل تو وہ اس سے نہ ڈرتے تھے اور نہ خوف کھاتے تھے بلکہ مذاق اڑاتے تھے۔

تَرَى الظّٰلِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌ بِهِمْ (۴۲ : ۲۲) "تم دیکھو گے کہ یہ ظالم اس وقت اپنے کیے کے انجام سے ڈر رہے ہوں گے اور وہ ان پر آکر رہے گا"۔ قرآن کا انداز تعبیر بڑا عجیب ہے کہ یہ لوگ وہاں "اپنی کمائی" سے ڈر رہے ہوں گے۔ ان کی کمائی گویا ایک بلا ہو گی جس سے وہ ڈر رہے ہوں گے اور یہ بلا انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے کمائی اور دنیا سے وہ اپنے اس کارنامے (غیر اسلامی قانون سازی) پر بہت خوش تھے لیکن آج وہ اس سے خوفزدہ ہیں لیکن وَهُوَ وَاقِعٌ بِهِمْ (۴۲ : ۲۲) "اور وہ ان پر واقع ہونے والا ہے"۔

اور اس منظر کی دوسری جھلک مومنین کے بارے میں ہے' جو اس دن سے ڈرتے تھے لیکن آج وہ امن و عافیت سے ہیں اور بہت ہی خوشحال ہیں:

وَالَّذِينَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ (۴۲ : ۲۲) ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۴۲ : ۲۳) "بخلاف اس کے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں' وہ جنت کے گلستانوں میں ہوں گے' جو کچھ بھی وہ چاہیں گے اپنے رب کے ہاں پائیں گے' یہی بڑا فضل ہے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی خوشخبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جنہوں نے مان لیا اور نیک عمل کیے"۔

قرآن کی تعبیر بھی نہایت ہی خوش کن' نرم اور دھیمے انداز کی ہے۔ روضات الجنت جنتوں کے گلستان' کئی جنتیں اور کئی گلستان۔ "جو کچھ بھی وہ چاہیں گے اپنے رب کے ہاں پائیں گے"۔ بلا حدود و قیود۔ "یہی بڑا فضل ہے"۔ "یہ ہے وہ چیز جس کی خوشخبری اللہ اپنے بندوں کو دیتا ہے"۔ یہ حاضر خوشخبری ہے اور یہ سابقہ خوشخبری کے لیے مصداق ہے۔ خوشخبری کی فضا سے زیادہ فرحت بخش ہوتی ہے۔ جب کسی کو نعمت حاصل ہو تو خوشخبری دینے سے اس کا احساس اور تیز ہو جاتا ہے۔

نعمتوں کے اس نرم و نازک اور لطف و کرم کے اس بھرپور منظر کے دکھانے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ جو ہدایت میں پیش کر رہا ہوں اور جس سے تمہیں یہ نعمتیں ملیں گی اور جہنم سے دور ہو جاؤ گے یہ میں اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ تم میرے رشتہ دار ہو اور مجھے تم سے محبت ہے میرے لیے یہی اجر کافی ہے۔

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (۴۲ : ۲۳) "اے نبی ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں اس کام پر تم لوگوں سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ البتہ قرابت محبت کی وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ تم جہنم سے بچ جاؤ۔ جو کوئی بھلائی کمائے گا ہم اس کے لیے بھلائی میں خوبی کا اضافہ کر دیں گے۔ بے شک اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور قدر دان ہے"۔

جس مفہوم کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا بلکہ قرابت داری کی محبت مجھے

اس کام پر مجبور کر رہی ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت داری قریش کی ہر شاخ سے تھی اور آپ یہ کوشش فرماتے تھے کہ آپ کے رشتہ دار ہدایت پر آ جائیں ۔ آپ اس قرابت داری کی وجہ سے چاہتے تھے کہ یہ بھلائی ان کو مل جائے اور یہی وافر اجر ہے آپ کے لیے ۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ انداز تعبیر آیا ہے اسے پڑھنے کے بعد میرے خیال میں یہی معنی واضح ہے ۔ حضرت ابن عباس سے ایک تفسیر بھی مروی ہے ۔ یہاں میں اسے اس لیے نقل کرتا ہوں کہ وہ صحیح بخاری میں وارد ہے ۔ بخاری نے روایت کی ہے ۔ محمد ابن بشار سے انہوں نے محمد ابن جعفر سے انہوں نے شعبہ ابن عبدالملک ابن میسرہ سے انہوں نے طاؤس سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہ انہوں نے آیت اَلْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی (۲۳:۴۲) کے بارے میں پوچھا تو سعید ابن جبیر نے کہا "آل محمد کے رشتہ دار مراد ہیں" ۔ حضرت ابن عباس نے کہا تم نے جلدی کی ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ قریش کی کوئی شاخ نہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس میں رشتہ داری نہ ہو" ۔ اس کے بعد انہوں نے کہا معنی یہ ہے "الا یہ کہ میرے اور تمہارے درمیان جو قرابت داری ہے اس کا تعلق رکھو" ۔

اس حدیث کے مطابق معنی یہ ہو گا کہ تم میری قرابت داری کا لحاظ رکھتے ہوئے ' مجھے اذیت دینے سے باز آ جاؤ ۔ اور میں جو کچھ کہتا ہوں سنو اور نرم رویہ اختیار کرو ۔ یہی کافی اجر ہو گا ۔ بس یہی اجر میں تم سے چاہتا ہوں ' اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا ۔

حضرت ابن عباس کی تاویل ' سعید ابن جبیر کی تاویل سے زیادہ قریب الفہم ہے ۔ لیکن میں نے جو مفہوم اوپر بیان کیا ہے وہ زیادہ قریب اور زیادہ خوبصورت ہے ۔ واللہ اعلم ۔

بہرحال مفہوم جو بھی ہو مذکورہ باغات اور خوشخبریوں کے مناظر کے بعد اللہ فرماتا ہے کہ پیغمبر اس کام پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتے اور یہ بات تو بہت ہی بعید ہے کہ جن کو ہدایت کی جا رہی ہے وہ اس پر ان سے اجر طلب کریں ' لیکن یہ تو اللہ کے فضل و کرم ہیں کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ تجارتی حساب و کتاب نہیں کرتا ' نہ منصفانہ حساب کرتا ہے ۔ اللہ کا حساب مہربانی اور فضل والا ہے ۔

وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا (۲۳:۴۲) "جو بھلائی کمائے گا ہم اس کے لیے اس بھلائی میں خوبی کا اضافہ کر دیں گے" ۔ صرف یہ نہیں کہ ہدایت پر کوئی اجر نہیں لیا جاتا بلکہ مزید انعامات بھی دیئے جاتے ہیں ۔ اور اس کے بعد مغفرت کی جاتی ہے اگر کوئی غلطی ہو اور مزید یہ کہ اللہ کی طرف سے قدر کی جاتی ہے ۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (۲۳:۴۲) "بے شک اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور قدر دان ہے" ۔ اللہ معاف بھی کرتا ہے ' پھر خود شکریہ بھی ادا کرتا ہے ۔ کس کا شکریہ ادا کرتا ہے ۔ اپنے بندوں کا کہ وہ راہ راست پر آئے ' حالانکہ راہ راست پر آنے کی توفیق بھی اسی نے دی ۔ پھر مزید یہ کہ ان کی صفات میں اضافہ کرتا ہے ' برائی کو صاف کرتا ہے اور اس کے بعد قدر دانی بھی کرتا ہے ' کیا ہی مہربانیاں ہیں ! انسان کے لیے تو ایسا سلوک کرنا ممکن نہیں ۔ صرف اللہ کا شکر ادا کیا جا سکتا ہے اور توفیق قلب کی جا سکتی ہے ۔

اب روئے سخن پھر وحی الٰہی کی طرف !

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا‌ ۚ فَاِنۡ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخۡتِمۡ عَلٰى قَلۡبِكَ‌ ؕ وَيَمۡحُ اللّٰهُ الۡبَاطِلَ وَيُحِقُّ الۡحَـقَّ بِكَلِمٰتِهٖ‌ ؕ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ‏ ﴿۲۴﴾

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑ لیا ہے؟ اگر اللہ چاہے تو تمہارے دل پر مہر کر دے ـ وہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے فرمانوں سے حق کر دکھاتا ہے' وہ سینوں کے چھپے ہوئے راز جانتا ہے"۔

اب یہاں مشرکین کے آخری اعتراض کو لیا جاتا ہے ـ وحی کے بارے میں ان کا جو رویہ تھا اس پر یہ ان کی آخری دلیل تھی' اس سے قبل وحی کے مصدر اور سرچشمہ' وحی کے مزاج و ماہیت اور وحی کے اغراض و مقاصد کے مفصل بیان کے بعد اب یہ ان کا آخری سوال ہے ـ

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ( ۴۲ : ۲۴ ) "کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑ لیا ہے"۔ اور اصل وجہ یہ ہے کہ وہ قرآن کی تصدیق نہیں کرتے ـ کیونکہ ان کا زعم یہ ہے کہ یہ وحی نہیں ہے' اللہ کی طرف سے کوئی بات نہیں آرہی ـ

یہ سوال اس لیے پر درد ہے کہ اللہ کس طرح ایسے شخص کو اجازت دے سکتا ہے کہ وہ اللہ کی مملکت میں اللہ کے نام پر یہ فریب کرتا پھرے ـ اور یہ کہے کہ اس پر وحی آرہی ہے حالانکہ اس پر وحی نہ آرہی ہو ـ اللہ تو اس بات پر قادر ہے کہ ایسے کسی شخص کے دل پر مہر لگا دے اور وہ سرے سے کوئی بات ہی نہ کر سکے اور کسی اور ذریعہ سے اس باطل کا پول کھول دے ـ اور اس طرح اسے مٹا دے اور اصل بات کو واضح کر کے رکھ دے ـ

فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ وَ يَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَ يُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ

( ۴۲ : ۲۴ ) "اگر اللہ چاہے تو تمہارے دل پر مہر کر دے ـ وہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے فرمانوں سے حق کر دکھاتا ہے"۔ اللہ پر تو کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں آتی ہے ـ اگر اللہ کی جانب سے یہ باتیں نہ ہوتیں تو اللہ مٹا دیتا۔

اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ( ۴۲ : ۲۴ ) "بے شک وہ سینوں کے چھپے ہوئے راز جانتا ہے"۔

لہٰذا یہ ایک ایسا شبہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے ـ اور یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو اللہ کے علم کے خلاف ہے ـ اللہ کی قدرت کو یہ چیلنج ہے اور یہ اللہ کی سنت جاریہ کے خلاف ہے کیونکہ اللہ زمین میں حق کو ٹھہراتا ہے اور باطل کو مٹاتا ہے ـ لہٰذا یہ وحی برحق ہے ـ حضرت محمد صادق و امین ہیں اور جو اعتراضات و الزامات لگائے جاتے ہیں وہ غلط اور باطل ہیں ـ یوں وحی پر یہاں وقتی طور پر بات ختم ہوتی ہے ـ اور ایک دوسرا سبق شروع ہوتا ہے ـ

---ооо---

# درس نمبر ۲۳۰ ایک نظر میں

سورت کا یہ دوسرا حصہ انفس، و آفاق میں موجود دلائل ایمان کے بیان پر مشتمل ہے اور اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کی رحمت کے آثار کس طرح قدم قدم پر موجود ہیں ۔ اور لوگوں کو گھیرے ہوئے ہیں ۔ ان آثار کا تعلق ان کی زندگی اور ان کی معیشت کے ساتھ ہے ۔ اور پھر اس میں اہل ایمان کی صفات بیان کی گئیں کہ وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کیا کیا امتیازی خصوصیات رکھتے ہیں جبکہ پہلے حصے میں موضوع سخن زیادہ تر وحی و رسالت تھا ۔ اس سبق کے آخر میں وحی الہی کی شکلیں بیان کی گئی ہیں ۔ اس سورت کے دونوں حصوں میں ربط ظاہر ہے اللہ کے دلائل ایمان کا مقصد بھی یہی ہے کہ لوگ وحی و رسالت کے ساتھ منسلک ہو جائیں ۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۳ تشریح آیات

## ۲۵--- تا --- ۵۳

---

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُوا عَنِ السَّيِّئَاتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ﴿٢٥﴾ وَيَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَيَزِيدُهُمْ مِنْ فَضْلِهِ ۚ وَالْكَافِرُونَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ وَلَٰكِنْ يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ بِعِبَادِهِ خَبِيرٌ بَصِيرٌ ﴿٢٧﴾

"وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں سے درگزر فرماتا ہے' حالانکہ تم لوگوں کے سب اعمال کا اسے علم ہے ۔ وہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہے اور اپنے فضل سے ان کو اور زیادہ دیتا ہے ۔ رہے انکار کرنے والے' تو ان کے لیے سخت سزا ہے ۔ اگر اللہ اپنے سب بندوں کو کھلا رزق دے دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کا طوفان برپا کر دیتے' مگر وہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے' نازل کرتا ہے ۔ یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور ان پر نگاہ رکھتا ہے"۔

یہ بیان اس منظر کے بعد آتا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ قیامت کے دن ظالم ڈرے ہوئے ہوں گے' یہ خوف انہیں اپنے کرتوتوں کی بلائے ناگہانی سے ہو گا جو یقیناً آنے ہی والی تھی اور پھر اس منظر کے بعد کہ اہل ایمان جنات کے گلستانوں میں ہوں گے اور یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا' آپ جو پہنچا رہے ہیں' اللہ کی طرف سے پہنچاتے ہیں اور یہ کہ اللہ تو دلوں کے راز تک جانتا ہے"۔

ان حالات میں کہا جاتا ہے کہ مایوس نہ ہو جاؤ' تم جس گمراہی میں پڑے ہو' کسی بھی وقت تم اس سے باہر نکل کر سکتے ہو۔ قبل اس کے کہ آخری فیصلہ ہو جائے ۔ توبہ کا دروازہ کھلا ہے' اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے اور سیئات کو وہ معاف کرتا ہے ۔ لہٰذا ناامیدی اور معصیت ہی میں آگے بڑھنے پر تم مجبور نہیں ہو ۔ سابقہ گناہوں کے بارے میں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ اللہ جانتا ہے وہ سچی توبہ کو بھی جانتا ہے ۔ سابقہ گناہوں کو بھی جانتا ہے اور معاف کرتا ہے ۔ اس

خوبصورت طرز بیان کے درمیان بھی مومنوں اور کافروں کا انجام ذکر کیا جاتا ہے ' جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں وہ اپنے رب کی دعوت قبول کرتے ہیں اور رب پھر ان پر مزید فضل فرماتے ہیں ۔

وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ (۴۲ : ۲۶) "اور انکار کرنے والوں کے لیے شدید سزا ہے"۔ جبکہ توبہ کا دروازہ کھلا ہے اور ہر شخص اس عذاب شدید سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے ۔ اور جو توبہ کرے گا اسے مزید فضل الٰہی بطور انعام ملے گا۔

آخرت میں اللہ کا فضل بلاحساب ہو گا اس پر کوئی حد اور قید نہیں ہے ۔ رہا اس جہاں میں بندوں کے لیے رزق کا انتظام تو اس پر اللہ نے حدود و قیود رکھے ہوئے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کو جانتا ہے کہ ان کا ظرف کتنا ہے ۔ لامحدود فضل الٰہی کے وہ متحمل نہیں ہیں ۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ (۴۲ : ۲۷) "اگر اللہ اپنے سب بندوں کو کھلا رزق دے دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کا طوفان برپا کر دیتے ' مگر وہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے ' نازل کرتا ہے ۔ یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور ان پر نگاہ رکھتا ہے"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا رزق چاہے وہ جتنا بھی ہو ' آخرت کے فیض اور آخرت کے ارزاق کے مقابلے میں کفاف ہی ہے ۔ اللہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے ۔ اللہ ان پیراں پارسا کو خوب جانتا ہے کہ ان کو ایک حد تک ہی مالدار ہونا چاہئے ۔ اور اگر ان کے لیے رزق اسی طرح وسیع کر دیا جاتا جس طرح آخرت میں ہے تو یہ زمین پہ طوفان بدتمیزی مچا دیتے ۔ ان کا ظرف کم ہے ۔ یہ اپنے حدود میں نہیں رہ سکتے ۔ یہ ایک حد تک ہی مالداری برداشت کر سکتے ہیں ۔ اور اللہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے ۔ لہٰذا اس جہاں میں ان کے لیے رزق کو محدود کر دیا ہے ۔ ایک مقدار کے مطابق ' جو ان کے لیے برداشت کرنے کے قابل ہو اور جو اس زمین کی آزمائشوں میں کامیاب ہوں گے اور امتحان پاس کر لیں گے اور سلامتی کے ساتھ دار بقاء تک پہنچ جائیں گے ان کو اللہ کا فیض اور فضل کبیر وہاں بلاحدود و قیود ملے گا ۔

---○○○---

وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۸﴾

"وہی ہے جو لوگوں کے مایوس ہو جانے کے بعد مینہ برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے ' اور وہی قابل تعریف ولی ہے"۔

یہ ایک دوسرا انداز ہے جو ان کو یہ احساس دلاتا ہے کہ اس دنیا میں بندوں پر اللہ کے فضل و کرم کے کئی رنگ ہیں ۔

بعض اوقات سخت خشک سالی ہو جاتی ہے ' بارشیں بند ہو جاتی ہیں اور وہ زندگی کی پہلی ضرورت کی فراہمی سے بھی عاجز آ جاتے ہیں ' زندگی کی پہلی ضرورت پانی ہے ۔ حالت یہاں تک آ پہنچتی ہے کہ یہ مایوس ہونے لگتے ہیں ' اس کے بعد اللہ بارشیں برسا دیتا ہے ۔ ان کی حاجت پوری ہوتی ہے ۔ اللہ کی رحمت پھیل جاتی ہے ' زمین زندہ اور سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے ۔ بیج پھوٹنے لگتے ہیں ' نباتات اگنے لگتے ہیں ۔ فضا لطیف ہو جاتی ہے ۔ اور ہر طرف زندگی حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ چہرے کھل جاتے ہیں ' دل کھل جاتے ہیں ' امیدیں بڑھ جاتی ہیں اور امنگیں پوری ہوتی ہیں ۔ یاد رہے کہ مایوسی اور امید و رحمت کے درمیان بس چند لمحے ہوتے ہیں ۔ چند لمحوں میں اللہ کی رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں ۔ آسمانوں کے دروازے پانی کھول دیتے ہیں ۔

وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ (۲۸:۴۲) "اور وہی قابل تعریف ولی ہے"۔ وہ مددگار ' کفیل ہے اور اپنی ذات و صفات میں محمود ہے ۔

یہاں قرآن مجید نے بارش کے لیے غیث کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ جس میں امداد اور دادرسی کا مفہوم شامل ہے ۔ اس وقت امداد دینا جب لوگوں پر تنگی اور مصیبت ہو ' غیث ہے ۔ اسی طرح اس مدد کے نتائج کو رحمت کا نام دیا ۔

وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ (۲۸:۴۲) "اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے" اس سے تروتازگی ' سرسبزی ' امید اور خوشی کے معانی نکلتے ہیں ۔ جو نباتات کے پھوٹنے سے ' اور پھلوں کے نکلنے سے ظاہری طور پر رحمت کے پھیلاؤ کی شکل میں نظر آتے ہیں جب بھی طویل خشک سالی کے بعد باران رحمت کا نزول ہوتا ہے تو لوگوں کی خوشی ' جسم اور اعصاب کی تروتازگی اور قلب و شعور کا سرور قابل دید ہوتا ہے ۔ ایسی خشک سالی کے بعد جب زمین نباتات سے سبز سبز ہو جاتی ہے تو انسانی دلوں سے تمام پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں ۔ زمین مردنی کے بعد زندہ ہو جاتی ہے ۔

۲ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ

ع۱۰ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ

۴ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۰﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۳۱﴾

"اس کی نشانیوں میں سے ہے ۔ یہ زمین اور آسمانوں کی پیدائش ' اور یہ جاندار مخلوقات جو اس نے دونوں جگہ پھیلا رکھی ہیں ۔ وہ جب چاہے انہیں اکٹھا کر سکتا ہے ۔ تم لوگوں پر جو مصیبت بھی آئی ہے ' تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے ۔ اور بہت سے قصوروں سے وہ ویسے ہی درگزر کر جاتا ہے ۔ تم زمین میں اپنے خدا کو عاجز کر دینے والے نہیں ہو ' اور اللہ کے مقابلے میں تم کوئی حامی و ناصر نہیں رکھتے "۔

یہ نشانی ہر وقت انسانی نظروں کے سامنے ہے اور جب وحی آئی تو اس نے اس کی شہادت دی ۔ وحی نے تو انسوں

نے شک کیا اور جھگڑتے رہے لیکن آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی جو نشانی ہے اس میں تو کوئی شک نہیں' وہ تو قطعی الدلالہ ہے۔ یہ فطرت انسانی کو فطری زبان میں خطاب کرتی ہے۔ کوئی سنجیدہ گفتگو کرنے والا اس کے بارے میں کوئی اختلاف رائے نہیں رکھ سکتا۔ یہ نشانی یہ بتاتی ہے کہ جس ذات نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی ہے وہ انسان نہیں ہے۔ نہ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی اس نشانی کا خالق نظر آتا ہے۔ لہٰذا کسی خالق و مدبر کے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ اس کائنات کی ہولناک ضخامت' اس کی رفتار کی باریک اور دقیق یکسانی' اس کے نظام کا حیران کن تسلسل اور اس پوری کائنات کے اندر ایک ہی قانون طبیعت اور ناموس فطرت کا اجراء' ان سب امور کی کوئی عقلی توجیہہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ ایک ذات ہے جو اللہ العالمین ہے' جو اس کی تدبیر کر رہا ہے۔ رہی انسانی فطرت تو وہ براہ راست اس استدلال کو اور ان نشانیوں کو دیکھ پاتی ہے اور ان کا ادراک کر کے مطمئن ہو جاتی ہے۔ قبل اس کے کہ ایک بھی لفظ کسی خارجی ذریعہ سے سنے۔

آسمانوں اور زمین کی یہ بڑی نشانی اپنے اندر کئی نشانیاں رکھتی ہے۔

وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ (۴۲ : ۲۹) "اور یہ جاندار مخلوقات جو اس نے دونوں جگہ پھیلا رکھے ہیں"۔ اس کو چھوڑ دیجئے کہ آسمانوں میں زندگی ہے یا نہیں' ابھی تک ہمیں اس کا علم نہیں' البتہ اس زمین کے اندر زندگی کی جو رنگا رنگی ہے یہ ایک نہایت ہی عظیم نشانی ہے۔ یہ ایک ایسا راز ہے کہ ابھی تک اس کی ماہیت تک کوئی نہیں پہنچا ہے۔ یہ تو دور کی بات ہے کہ کوئی اسے پیدا کر سکے۔ یہ ایک پوشیدہ راز ہے کہ زندگی کہاں سے آتی ہے۔ کس طرح آتی ہے۔ اجسام کے اندر کس طرح مل جاتی ہے۔ آج تک حیات کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے جس قدر مساعی کی گئی ہیں اس راز کے دریافت کے تمام دروازے بند پائے گئے ہیں جو کچھ دریافت ہوا' وہ حیات کے بعد زندگی کی ترقی اور نشوونما کے بارے میں ہے۔ زندگی کی رنگا رنگی اور اس کے مقاصد اور حکمتوں کے بارے میں ہے۔ اور اس محدود دائرے میں بھی آراء اور نظریات کا بے حد اختلاف ہے۔ ظاہری زندگی کے پیچھے کیا ہے' وہ پردۂ راز کے پیچھے ہے۔ کوئی آنکھ وہاں تک نہیں دیکھ سکتی۔ کوئی قوت مدرکہ اس کا ادراک نہیں کر سکتی۔ یہ امر الٰہی ہے' اللہ کے سوا اس کو کوئی نہیں جانتا۔

یہ رنگا رنگ زندہ مخلوق جو سطح زمین کے اوپر ہے' سطح کے اندر ہے اور سمندروں کے اندر ہے اور لاانتہا فضاؤں میں ہے۔ ان میں سے انسان نہایت ہی معمولی حصے کے بارے میں جانتا ہے۔ رہی یہ کہ اس نہایت ہی وسیع اور ناقابل تصور وسعتوں والی کائنات میں اور کوئی زندہ مخلوق ہے یا نہیں اس کے متعلق ہمیں کوئی معلومات نہیں ہیں ہم تو زمین کے اوپر موجود اور مشہود حیات میں سے بھی نہایت ہی تھوڑے حصے کو معلوم کر سکے ہیں' یہ زندہ مخلوقات جو آسمانوں اور زمین میں ہے اسے اللہ جس دن چاہے گا' جمع کرے گا۔ کوئی ایک فرد بھی جو یہاں وجود کائنات کے بعد پیدا ہوا ہے' رہ نہ جائے گا یا غائب نہ ہو سکے گا۔

انسانوں کی حالت تو یہ ہے کہ اگر ان کے پنجروں سے پرندوں کی ایک ڈار اڑ جائے یا مکھیوں کے ایک چھتے سے ایک ڈار اڑ جائے تو وہ اسے جمع نہیں کر سکتے۔ رہے پرندوں کے ڈار' وہ کتنے ہیں' یہ صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ پھر مکھیوں' چیونٹیوں اور اسی طرح کے دوسرے حیوانات کے چھتے تو ان کے بارے میں بھی اللہ ہی جانتا ہے۔ اللہ ہی ان کو گن سکتا ہے۔ حشرات ارض' کیڑے مکوڑے اور جراثیم تو ان کی تعداد اور ان کی جگہ کو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ مچھلیوں اور

دوسرے حیوانات ' بحر تو ان کی تعداد اور اقسام کے بارے صرف اللہ ہی جانتا ہے ۔ پالتو اور جنگلی جانوروں کی اقسام و تعداد کہ کہاں کہاں بکھرے ہیں اس کا علم بھی صرف اللہ کو ہے اور پھر انسانوں کی آبادیاں اور گروہ اور اقوام و انواع سے اللہ ہی باخبر ہے کہ وہ کہاں کہاں رہتے رہے ہیں ' رہتے ہیں اور رہیں گے ۔ ان اقسام کے علاوہ بے شمار خلائق ہیں جو تعداد میں ان سے زیادہ اور جو زمین و آسمانوں میں مخفی ہیں ' ان کو بھی اللہ ہی جانتا ہے ۔ یہ اللہ ہی کی مخلوق ہے ۔ اللہ جب جمع کرے گا تو وہ ایک ہی لفظ کے ساتھ چشم زدن میں جمع کر دے گا ۔ ایک ہی آیت میں ان سب زندہ چیزوں کے بکھیرنے اور پھر جمع کرنے کے دونوں مناظر دکھا دیئے گئے ' قبل اس کے کہ فقرہ پوری طرح زبان سے ادا ہو جائے ۔ منظر پہلے ہی ذہن کے پردے پر آکر چلا جاتا ہے ۔ یہ قرآن کا مخصوص انداز ہے ۔

ان مناظر کے درمیان ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہارے اعمال کی وجہ سے اس جہاں میں تم پر وبال بھی آتے رہے ہیں ۔ یہ وبال پورے نہیں بلکہ ان کا ایک حصہ تم پر آتا ہے ' اکثر تو اللہ معاف کر دیتا ہے کیونکہ اللہ انسانوں کو ان کے اعمال کی پوری پوری سزا نہیں دیتا ۔ اکثر اعمال بد سے اللہ درگزر کر دیتا ہے ۔ اللہ ان کو یاد دلاتا ہے کہ تم تو بہت ہی عاجز و لاچار ہو ۔ تم اللہ کے کسی منصوبے کو تو نہیں روک سکتے ۔ تم تو اس کائنات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہو ۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ (۴۲ : ۳۰) وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْاَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيرٍ (۴۲ : ۳۱)

"تم لوگوں پر جو مصیبت بھی آئی ہے ' تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے ۔ اور بہت سے قصوروں سے وہ ویسے ہی درگزر کر جاتا ہے ۔ تم زمین میں اپنے خدا کو عاجز کر دینے والے نہیں ہو ' اور اللہ کے مقابلے میں تم کوئی حامی و ناصر نہیں رکھتے" ۔ پہلی آیت میں اللہ کے عدل کی تجلی ہے ' اور انسانوں پر اللہ کی رحمت کی تجلیات ہیں ۔ اس پر جو مصائب آتے ہیں اس کے اپنے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے آتے ہیں ۔ لیکن اللہ تو تمام بدکاریوں پر خود انہیں پکڑ پکڑ کر معاف کر دیتا ہے ۔ کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ انسان بہت ضعیف ہے ۔ اس کی فطرت کے رجحانات اور اس کا ماحول اسے بدکاری پر مجبور کرتا ہے ۔ اس لیے بہت سے گناہوں کو اللہ معاف کر دیتا ہے ۔ یہ اس کی رحمتیں اور مہربانیاں ہوتی ہیں ۔

دوسری آیت میں میں انسان کی کمزوری کا اظہار ہے کہ وہ زمین پر اللہ کے کسی منصوبے کو نہیں روک سکتا ۔ (اسی طرح وہ دعوت اسلامی کو نہیں روک سکتا) اس کا کوئی ولی و مددگار اللہ کے سوا نہیں ہے ۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے حقیقی ولی کی طرف لوٹ آئے ۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿٣٢﴾ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿٣٣﴾ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ﴿٣٤﴾ وَّ يَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿٣٥﴾

"اس کی نشانیوں میں سے ہیں یہ جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح نظر آتے ہیں ۔ اللہ جب چاہے 'ہوا کو ساکن کر دے اور یہ سمندر کی پیٹھ پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں ۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو کمال درجہ صبر و شکر کرنے والا ہو۔۔۔ یا (ان پر سوار ہونے والوں کے) بہت سے گناہوں سے درگزر کرتے ہوئے ان کے چند ہی کرتوتوں کی پاداش میں انہیں ڈبو دے ' اور اس وقت ہماری آیات میں جھگڑے کرنے والوں کو پتہ چل جائے کہ ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے"۔

پہاڑوں کی طرح دریاؤں میں چلنے پھرنے والے بحری جہاز اللہ کی نشانیوں میں سے مزید نشانیاں ہیں ۔ یہ نشانی بھی حاضر و مشہود ہے ۔ یہ نشانی ایسی ہے جو اللہ کی بنائی ہوئی نشانیوں میں سے کئی نشانیوں پر قائم ہے اور اس میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے ۔ یہ سمندر ' اللہ کے سوا کون ہے جس نے اسے بنایا؟ انسانوں نے اسے بنایا اور نام نہاد الہوں نے ۔ کون ہے جس نے اسے یہ گہرائی ' یہ کثافت اور یہ وسعت دی کہ وہ بڑی بڑی کشتیوں اور جہازوں کے اٹھانے کے قابل ہو گیا ۔ پھر جس مواد سے کشتیاں بنتی ہیں ' اس مواد میں ایسی خصوصیت کس نے رکھی کہ وہ سطح سمندر پر تیرتا پھرے اور پھر یہ ہوا جو اس وقت ان بحری جہازوں کو چلاتی تھی اور اس وقت کے مخاطب جانتے تھے اور ہمارے دور میں وہ تمام قوتیں جن کو اللہ نے انسانوں کے لیے مسخر کیا ہے اور وہ انہیں عظیم الجثہ جہازوں کے چلانے کے لیے کام میں لاتے ہیں ۔ یہ قوتیں کس نے پیدا کیں جو جدید سے جدید پہاڑوں جیسے جہازوں کو چلاتی ہیں ۔

اِنْ یَّشَاْ یُسْكِنِ الرِّیْحَ فَیَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ (۴۲ : ۳۳) "اللہ جب چاہے 'ہوا کو ساکن کر دے اور یہ سمندر کی پیٹھ پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں"۔ اور بعض اوقات یہ جہاز اس طرح کھڑے رہ جاتے تھے جیسے ان کے اندر کوئی زندگی نہیں ہے ۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۴۲ : ۳۳) "اس میں بڑی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو کمال درجے صبر و شکر کرنے والا ہو"۔ یعنی ان جہازوں کے چلانے میں اور ان کے کھڑے کرنے میں نشانیاں ہیں ۔ قرآن کریم میں بسا اوقات صبر اور شکر ساتھ ساتھ آتے ہیں ۔ صبر ابتلا پر ہوتا ہے اور شکر نعمتوں پر ہوتا ہے ' خوشی اور غم اور صبر اور شکر دونوں انسانی نفسیات میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۔

اَوْ یُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا (۴۲ : ۳۴) "یا ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں ڈبو دے"۔ ان کشتیوں کو پاش پاش کر دے یا ان کو غرق کر دے ' اس وجہ سے کہ لوگوں نے گناہوں اور معاصی کا ارتکاب کیا ۔ انہوں نے ایمان کی مخالفت کی حالانکہ اللہ کی تمام مخلوقات مومن ہے انسانوں میں سے بعض لوگ انکار کرتے ہیں ۔

وَیَعْفُ عَنْ كَثِیْرٍ (۴۲ : ۳۴) "اور اللہ بہت سے گناہوں سے درگزر کرتا ہے"۔ اس لیے وہ لوگوں کو قدم قدم پر ان کے ہر گناہ پر نہیں پکڑتا بلکہ درگزر فرماتا ہے اور معاف کر دیتا ہے ۔

وَّیَعْلَمَ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِیْصٍ (۴۲ : ۳۵) "اور اس وقت

ہماری آیات میں جھگڑا کرنے والوں کو پتہ چل جائے کہ ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے"۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو اپنے عذاب کے سامنے لاکھڑا کرتا' ان کی کشتیاں غرق کر دیتا اور وہ نجات نہ پا سکتے --- یوں ان کو یہ بات سمجھائی جاتی ہے کہ وہ اس دنیا کے جس سازو سامان اور کاروبار کے مالک ہیں' وہ بھی اللہ کی ہلاکت کی زد میں ہیں۔ لہذا دنیا میں کسی چیز کے لیے قرار و ثبات نہیں' ماسوائے تعلق باللہ کے۔

--- ○○○---

اس کے بعد ان کو ذرا اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ اس دنیا میں ان کو جو سازو سامان دیا گیا ہے' ذرا اس پر نگاہ ڈالیں کہ یہ کس قدر مختصر وقت کے لیے ہے۔ اور اصل باقی رہنے والی چیز اور دولت وہی ہے جو اللہ کے ہاں ذخیرہ کی گئی ہے۔ اور یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لاتے ہیں اور رب تعالیٰ پر توکل کرتے ہیں۔ یہ بیان آگے جاتا ہے اور اہل ایمان کی صفات گنواتا ہے جو ان کو ایک امت بنا دیتی ہیں' جس کے الگ خدوخال ہوتے ہیں اور وہ امت تمام امتوں سے ممتاز ہے۔

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ
خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۚ﴿۳۶﴾ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ
كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ
اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا
رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ وَجَزٰٓؤُا
سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۱﴾ اِنَّمَا
السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ
۴
۱۴ ان الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾

۵ "جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سرو سامان ہے اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔ وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں' جو بڑے

بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آ جائے تو درگزر کر جاتے ہیں' جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں' ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے' اس میں سے خرچ کرتے ہیں' اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں ---۔ برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے' پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے' اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جا سکتی' ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے' البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے' تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے"۔

اس سورت میں اس سے قبل قرآن مجید نے انسانیت کی حالت کی تصویر کشی کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اہل کتاب نے علم آ جانے کے باوجود باہم اختلافات کیے اور یہ اختلافات غلط فہمی اور جہالت پر مبنی نہ تھے۔ حالانکہ ان کے پاس کتاب الہیٰ صاف صاف آگئی تھی۔ بلکہ انہوں نے باہم یہ تفرقہ حسد اور دشمنی کی وجہ سے کیا۔ اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ عہد نوح' ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام سے لوگوں کے لیے وہ آسمانی دین اور ایک منہاج اور نظام زندگی مقرر کر دیا گیا تھا۔ اور یہ وصیت بھی کی گئی تھی کہ اسے قائم کرو۔ اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ جن لوگوں نے حسد اور دشمنی کی وجہ سے منہاج الہیٰ میں اختلاف کیا ان کے بعد جب کوئی کتاب ان کی اگلی نسلوں کو ملی تو ان اختلافات کی وجہ سے وہ سرے سے کتابوں کے بارے میں شک میں پڑ گئے۔ جب اہل کتاب اور اہل دین سماوی کا یہ حال ہو گیا تھا تو جن اقوام کے پاس کوئی کتاب یا کوئی دین ہی نہ تھا' ظاہر ہے کہ ان کی حالت تو ان سے بھی بدتر ہو گی۔

یہی وجہ ہے کہ انسانیت کو ایک صالح قیادت کی ضرورت تھی تاکہ وہ انسانوں کو ان اندھی جاہلیتوں سے نکالے اور ان کی رہنمائی کر کے ان کو ایک مضبوط رسی میں باندھ دے۔ اور ان کی رہنمائی ایک ایسے راستے کی طرف کرے جو اللہ تک پہنچاتا ہو جو اس وجود کا رب ہے۔

اس لیے اللہ نے یہ آخری کتاب عربی زبان میں اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری تاکہ ام القریٰ' مکہ مکرمہ اور اس کے ماحول میں رہنے والوں سے دعوت کا آغاز کرے اور ان کے اندر وہی دین قائم کرے جس کی سخت تاکید حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو کی گئی تھی تاکہ تمام ادیان حقہ کی کڑیاں باہم مل جائیں اور آغاز تاریخ سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی نہج' ایک منہاج' ایک ہی دین اور ایک ہی شریعت ہو اور ایک ایسی جماعت یہاں قائم کی جائے جو اس تاریخی دعوت کی محافظ ہو' اس کی قیادت کرے اور اس کرۂ ارض پر اس دعوت کو اللہ کی منشا کے مطابق برپا کر کے یہاں اس منہاج کو قائم کرے۔ اور یہ کام اس شکل و صورت میں ہو جو اللہ کو پسند ہو۔ لہٰذا زیر بحث آیات میں اس جماعت کے خدوخال بیان ہو رہے ہیں۔ جس نے یہ عظیم فریضہ سرانجام دینا ہے۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ آیات مکی ہیں اور مدینہ میں اسلامی نظام حکومت کے قیام سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔ لیکن ہم مکہ میں بھی تحریک اسلامی کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت دیکھتے ہیں۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲ : ۳۸) "اور اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشاورت کا قیام اسلامی سوسائٹی اور مسلمانوں کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ یہ اسلامی جماعت کی بنیادی خصوصیت ہے۔ جماعتی نظام شوریٰ پر قائم ہوتا ہے۔ یہی نظام جماعت سے آگے بڑھ کر پھر مملکت کا حصہ بن جاتا ہے۔ یعنی اسلامی معاشرے کی جان شورائیت ہے اور یہ اس کے اندر پھیلتی جاتی ہے۔ اس طرح اس جماعت کی دوسری خصوصیت یہ بتائی گئی ہے۔

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ (۴۲ : ۳۹) "جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو وہ اس کا مقابلہ کرتے ہیں"۔ باوجود اس کے کہ مکہ میں حکم یہی تھا کہ صبر کرو، اور زیادتی کا بدلہ زیادتی سے نہ دو، اور یہ حکم اس وقت تک کے لئے تھا جب ہجرت کے بعد قتال کی اجازت دے دی گئی اور یہ کہا گیا۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ (۲۲ : ۳۹)

"اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قادر ہے"۔ تو اس صفت کا ان مکی آیات میں ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ تحریک اسلامی کا مزاج یہی ہے کہ وہ زیادتی کے خلاف سینہ سپر ہو جاتی ہے اور اس سے پہلے اور بعد کے جو احکام ہیں وہ صبر کرنے اور رکے رہنے کے لیے ہیں۔ اور استثنائی احکام ہیں اور ایک متعین وقت تک کے لیے ہیں۔ یہاں اس مکی سورت میں چونکہ جماعت مسلمہ کی بنیادی صفات قلم بند کی جارہی تھیں اس لیے یہاں ذکر کر دیا کہ اگرچہ فی الوقت انتصار کی ممانعت تھی لیکن یہ صفت اہل ایمان کی بنیادی صفات میں سے ہے۔

بہرحال جماعت مسلمہ کی صفات کے ضمن میں ایسے امور کا ذکر جن پر عمل نہ ہو رہا تھا اور نہ جماعت کے ہاتھ میں کسی ملک کی عملی قیادت تھی اور جماعت ابھی مکہ میں مصائب برداشت کر رہی تھی، یہ اس لیے ہوا کہ اس جماعت نے پوری انسانیت کی قیادت کرنی تھی اور اسے اس لیے برپا کیا گیا تھا کہ وہ پوری انسانیت کو اندھیروں سے نکال کر نور اسلام میں لائے گی۔ لہٰذا جماعت مسلمہ کے اندر ان صفات کا پیدا ہونا اور جماعت کے لیے ان مقاصد کے لیے تیاری کرنا ضروری تھا۔ یہاں ان باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ جب اس کے ہاتھ میں اقتدار آئے تو وہ اس کی اہل ہو۔ لہٰذا ان صفات پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے کہ یہ کیا ہیں؟ ان کی حقیقت کیا ہے؟ اور انسانی معاشرے میں ان کی اہمیت کیا ہے۔

یہ ہیں ایک اسلامی جماعت کی صفات۔ ایمان، توکل، اجتناب کبائر اور فواحش، غصے کے وقت معافی، اللہ کی پکار پر لبیک کہنا، اقامت صلوٰۃ، ہر معاملے میں مشاورت، انفاق فی سبیل اللہ، ظلم و زیادتی کا مقابلہ، عفو، اصلاح اور صبر۔ یہ کیا ہیں اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ اور ان کی اہمیت کیا ہے۔ مناسب ہے کہ ان صفات کو قرآنی ترتیب کے مطابق بیان کریں۔

قرآن کریم لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طے کردہ مستحکم اور دائمی میزان کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے تاکہ وہ دائمی اور مستقل قدروں اور عارضی اور بدلنے والے حالات کے درمیان فرق و امتیاز کر سکیں۔ اور ان کی سوچ میں فرق نہ ہو ورنہ ان کی نگاہ میں ہر چیز کی حقیقی قدر و قیمت صحیح نہ رہے گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مومنین کی صفات کے بیان سے پہلے ایک مستقل میزان اور پیمانہ بیان کر دیا کہ ایک مسلم جماعت کی صفات کے لیے یہ پیمانہ ہے۔

فَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی (۴۲ : ۳۶)

"جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی"۔ اس زمین کا ساز وسامان بہت ہی پرکشش اور زرق وبرق ہے۔ کھانے پینے کے سامان، اولاد، شہوات، لذائذ، مرتبہ اور اقتدار وغیرہ اور بعض نعمتیں وہ ہیں جو اللہ نے اپنے بندوں کو زمین میں بطور مہربانی دی ہیں اور یہ اللہ کی جانب سے خالص بخشش ہیں۔ ان کو اللہ نے اس دنیا میں معصیت اور طاعت پر موقوف نہیں کیا ہے۔ اگرچہ اطاعت شعار کی اس قلیل بخشش میں برکت ہوتی ہے اور بدکار کے ہاتھ میں اگر بہت کچھ ہو تب بھی اس سے برکت چھن جاتی ہے۔

لیکن یہ سب امور باقی اقدار نہیں ہیں۔ یہ متاع اور اس زندگی کا سروسامان ہے۔ یہ سروسامان محدود وقت کے لیے ہے۔ یہ نہ کسی کا مرتبہ بلند کرتا ہے، نہ گراتا ہے۔ یہ اللہ کے نزدیک نہ شرافت وعزت کی دلیل ہے اور نہ کراہت اور ناپسندیدگی کی دلیل ہے۔ نہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایسے شخص سے اللہ راضی ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اللہ ناراض ہے۔ بس یہ اس زندگی، فانی زندگی کا سامان ہے اور اس کے مقابلے میں۔

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى (۴۲ : ۳۶) "جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی"۔ بہتر ہے اپنی قیمت کے اعتبار سے اور پائیداریوں کہ ہمیشہ رہنے والا ہے۔ لہٰذا اس فانی دنیا کا ساز وسامان بمقابلہ آخرت کچھ بھی نہیں ہے۔ بہت ہی محدود اور کم قیمت ہے اور چند روزہ ہے۔ ایک فرد کے لیے صرف اسی کی زندگی میں کار آمد ہے اور پھر ہر شخص سوچ لے کہ وہ کتنی عمر لے کر آیا ہے اور کتنی رہ گئی ہے۔ اور بمقابلہ ایام اللہ یہ تو بہت کم بلکہ لحات ہیں جس طرح چشم زدن۔

اس تمہیدی بیان اور اصل معیار نیک وبد کے بیان کے بعد اب اللہ ان مومنین کی صفات بیان فرماتا ہے جن کے لیے اللہ نے بہتر اور پائیدار انجام اپنے ہاں تیار کر رکھا ہے۔

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۴۲ : ۳۶) "اور اللہ کے ہاں جو ہے وہ بہتر اور پائیدار ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں"۔ ایمان وہ حقیقت ہے کہ جب یہ ذہن میں بیٹھ جائے تب ہی جا کر اس کے ذریعہ انسانوں کے لیے ممکن ہوتا ہے کہ وہ اس کائنات کی ہر چیز کی اصل "قدر" معلوم کر سکیں۔ صرف ایمان کے ذریعہ ہم اس کائنات کی حقیقت کا ادراک کر سکتے ہیں کہ اس کائنات کو اللہ العالمین نے بنایا ہے۔ اس حقیقت کے ادراک کے بعد ہی کوئی شخص اس کائنات کے ساتھ کوئی معاملہ کر سکتا ہے۔ اس طرح انسان اس کی حقیقت کو معلوم کر لیتا ہے۔ اس کے اندر پائے جانے والے قوانین قدرت کا حقیقی ادراک کر سکتا ہے اور اس طرح یہ انسان اپنی حرکت کو اس کائنات کی حرکت کے ساتھ ہم آہنگ کر سکتا ہے۔ پھر انسان اس کائنات کے کلی قوانین قدرت سے انحراف نہ کرے گا کیونکہ اس طرح یہ ہم آہنگی ختم ہو جائے گی اور یہ ہم آہنگی اس قدر اہم ہے کہ اس کے ساتھ انسان اس دنیا میں بھی اچھی زندگی بسر کر سکے گا۔ اور اس عظیم وجود کے ساتھ مل کر اپنے باری تعالیٰ اور خالق کی اطاعت اور تابعداری میں زندگی بسر کر سکے گا۔ یہ صفت ہر انسان کے لیے لازمی صفت ہے کہ وہ مومن ہو، لیکن جس جماعت نے پوری انسانیت کے اس سفر کی قیادت کرنی ہے اور جس نے پوری انسانیت کو خالق کائنات تک پہنچانا ہے اس کے اندر اس صفت کا بدرجہ اتم موجود ہونا ضروری ہے۔

اس ایمان کے نتائج کیا نکلتے ہیں؟ مومن کو نفسیاتی اطمینان اور نصب العین کا تعین حاصل ہو جاتا ہے۔ تردد' حیرت' خوف اور مایوسی اس کے قریب نہیں لگتی اور اس کرۂ ارض پر عام زندگی گزارنے کے لیے بھی یہ صفات اشد ضروری ہیں۔ لیکن یہ صفات اس جماعت کے لیے تو لابدی ہیں جس نے اس کٹھن راہ میں دوسرے انسانوں کی رہنمائی کرنی ہے۔

ایمان کو اہم قدروں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مومن خواہشات نفسانیہ' ذاتی اغراض' ذاتی مصلحتوں' مفادات کے حصول سے پاک ہو۔ تب جا کر وہ کسی اونچے مقاصد کے لیے کام کر سکے گا۔ اور یہ سوچے گا کہ اس کام میں اس کی ذات کی کوئی حصہ داری نہیں ہے۔ یہ تو صرف دعوت الی اللہ کی ڈیوٹی ہے۔ یہ عند اللہ اجر پا چکا ہے۔ اللہ کے ساتھ سودا ہو چکا ہے اور یہ شعور اس شخص کے لیے تو بہت ہی لازمی ہے جو قائد تحریک ہو' تاکہ وہ اس وقت مایوس نہ ہو جب ایک خود سر گروہ اس سے الگ ہو جائے یا اسے دعوت کی وجہ سے ایذا دی گئی ہو' اور اگر تمام عوام اس کے گرویدہ ہو جائیں اس کے مطیع ہو جائیں تو وہ مغرور نہ ہو جائے کیونکہ وہ تو ایک مزدور ہے' اس نے اجرت اللہ سے پہلے ہی لے لی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا پہلا گروہ' جماعت صحابہ کے اندر اس قسم کا ایمان پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے ایمان نے ان کے نفوس' ان کے اخلاق' ان کے طرز عمل میں ایک عجیب انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ ان کے دور میں پوری انسانیت کے اندر ایمان کی شکل ہی بگڑ گئی تھی۔ ایمان دب گیا تھا' بلکہ ایمان کا لوگوں کے اخلاق' ان کے طرز عمل اور ان کی نفسیات پر کوئی اثر ہی نہ رہا تھا۔ جب اسلام آیا تو اس نے ایمان کی ایک زندہ' موثر' فعال صورت دی۔ اور اس نے صحابہ کرام ؓ کی ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جنہوں نے اسلامی انقلاب کا بیڑا اٹھایا۔

---- ○○○----

سید ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب "مسلمانوں کے زوال کے عالمی اثرات" میں فرماتے ہیں:

"یہ ہے وہ ایمان جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اور اس میں ایمان کو اس جماعت کی صفت اول بتایا گیا ہے جو پوری انسانیت کی قیادت کے لیے اٹھائی گئی ہے جو اپنے ایمان کی وجہ سے انسانیت کی قیادت کرتی ہے۔ اس ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ایک مومن صرف اللہ پر توکل کرے"۔ لیکن قرآن مجید توکل علی اللہ کو بطور ایک مستقل عنوان ذکر کرتا ہے۔

وَعَلٰی رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۴۲: ۳۶) "اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں"۔ یہاں سیدھے سادے فقرے يَتَوَكَّلُوْنَ عَلٰی رَبِّهِمْ کی بجائے وَعَلٰی رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۴۲: ۳۶) کہا۔ یعنی بعد کے الفاظ کو مقدم یعنی جار مجرور کو مقدم کرنے سے حصر کے معنی پیدا ہوئے یعنی صرف اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں اور کسی پر نہیں کرتے۔ یہ بھی عقیدۂ توحید ہے اور عقیدۂ توحید کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ ان کا اللہ پر بھروسہ ہو۔ مومن کا اللہ کی ذات اور صفات پر ایمان ہوتا ہے۔ اس کا یقین ہوتا ہے کہ اس کائنات میں کوئی شخص اپنی مشیت سے کوئی کام نہیں کر سکتا۔ کوئی کام یہاں اللہ کے اذن کے بغیر واقع ہی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا مومن صرف اللہ پر بھروسہ کرتا ہے۔ کسی کام کے کرنے یا کسی کام کے نہ کرنے میں مومن صرف اللہ پر توکل کرتا ہے۔

ہر شخص کے لیے یہ شعور اس کی عملی زندگی میں لابدی ہے۔ کیونکہ اس طرح وہ ہر کسی کے سامنے سر اٹھا کے چلے گا۔ اور اس کا سر کسی کے سامنے نہ جھکے گا۔ وہ بہت مطمئن ہو گا' نہ کسی سے کوئی امید رکھے گا نہ اسے کسی کا خوف ہو گا

اگر مشکلات آجائیں تو پر جوش اور ثابت قدم ہو گا اور اچھے دن ہوں تو سنجیدہ رہے گا۔ نہ خوشحالی اور نہ ہی بدحالی اسے اپنی جگہ سے ہلا سکے گی۔ لیکن یہ شعور اسلامی انقلاب کے قائد کے لیے بہت ہی ضروری ہے کہ وہ اس راہ کے نشیب و فراز میں جم جانے اور اسلامی انقلاب لانے والی جماعت کے ہر فرد میں بھی یہ صفت ضروری ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ (۴۲ : ۳۷) "جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں"۔قلب کی طہارت' طرز عمل کا شفاف ہونا' خصوصاً بڑے گناہوں اور فحاشی کے کاموں سے' اسلامی معاشرے کی اساسی خصوصیت ہے اور یہ ایمان کے نمایاں آثار میں سے ہے۔ اور کسی صحیح قائد اور خصوصاً اسلامی دعوت کے لیے اٹھنے والی جماعت کے لیے تو یہ بہت ہی ضروری صفت ہے۔کوئی دل صاف اور شفاف نہیں رہ سکتا' اگر وہ گناہوں کا ارتکاب کر رہا ہو اور فحاشی کے کاموں میں حصہ دار ہو اور ان چیزوں سے اجتناب کرنے والا نہ ہو' اور کوئی فرد اور کوئی جماعت قیادت کے قابل نہیں' اگر اس کا دل صاف نہ ہو' اور معصیت اور فحاشی نے اس کے ایمان کو خود ختم کر دیا ہو اور اس کی شکل ہی بگڑی ہوئی ہو۔

پہلی جماعت مسلمہ کے دل میں ایمان اس قدر تیز احساس کے ساتھ' اس درجے تک بلند ہو گیا تھا' جس کی طرف محولہ بالا ص ۲۲ میں اشارہ کیا گیا اور اس طرح اس جماعت کو اس کے ایمان نے انسانی قیادت کے منصب پر فائز کر دیا تھا۔ اور انہوں نے ایسی قیادت کی کہ اس کی مثال نہ سابقہ قدیم تاریخ میں ملتی ہے اور نہ نئی تاریخ میں۔ اس قیادت کی مثال ایسی ہے جس طرح ایک تیر ہو اور جو ستارے کی طرف اشارہ کرتا ہو' اس جہان میں جہاں خواہشات کی جنگ برپا ہو اور نفسا نفسی کا عالم ہو۔

اللہ اس انسانی مخلوق کی کمزوریوں سے خوب واقف ہے' لہٰذا اللہ تعالیٰ نے قیادت کے لیے شرائط بھی معقول حد کے اندر رکھی ہیں۔ جن پر کوئی قیادت عمل کر سکے اور اس پر وہ اللہ کے ہاں موجود اجر پا سکے۔ اللہ نے جو معیار تجویز فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی جماعت اور اس کی لیڈر شپ کبائر گناہوں اور فواحش سے مجتنب ہو۔ رہے چھوٹے گناہوں کا ارتکاب تو وہ اللہ معاف کر دے گا۔کیونکہ اللہ انسانوں کی خامیوں حدود و قیود سے خوب واقف ہے۔ یہ اللہ کا فضل' اس کی مہربانی اور رحمت ہے' جو اس نے اس انسان پر کی ہے۔ مناسب ہے کہ ہم اللہ سے شرم کریں کیونکہ مہربانی سے انسان کے اندر حیا کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور عفو و درگزر کی وجہ سے عزت و احترام پیدا ہوتا ہے۔

وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (۴۲ : ۳۷) "اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کر جاتے ہیں"۔ یہ صفت اس کے بعد متصلاً آئی جب اس سے قبل اشارہ کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے چھوٹے گناہ معاف کر کے درگزر فرماتا ہے۔ لہٰذا بندوں کو بھی چاہئے کہ وہ آپس میں مہربانی اور درگزر کا سلوک روا رکھیں۔ چنانچہ مومنین کی صفات میں اس بات کو شامل کیا گیا کہ جب ان کو غصہ آئے تو وہ ایک دوسرے کو معاف کریں۔

اس معاملے میں بھی اسلام نفس انسانی کے ساتھ نہایت ہی احسان کرتا ہے۔ اسلام انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اللہ کو تو معلوم تھا کہ غصہ ایک ایسا انسانی رد عمل ہے جو انسان کی فطرت سے اٹھتا ہے۔ اور یہ غصہ سراسر شر بھی نہیں ہے۔ اللہ کے لیے' اللہ کے دین کی خاطر' سچائی کے لیے اور انصاف کی خاطر تو غصہ مطلوب ہے۔ اور

اس میں خیر ہے۔ لہٰذا اسلام نفس غصے کو جرم قرار نہیں دیتا۔ نہ اسے غلطی قرار دیتا ہے بلکہ اسلام انسانی مزاج اور فطرت میں غصے کو قبول کرتا ہے۔ اس لیے اسلام انسان اور اس کی فطرت کے درمیان کسی دینی حکم کی وجہ سے جدائی اور تفریق نہیں کرتا۔ ہاں اسلام یہ ہدایت ضرور دیتا ہے کہ انسان کو اپنے غصے پر قابو پانا چاہئے۔ اسے چاہئے کہ حتی الوسع عفو و درگزر سے کام لے اور یہ اس کی ایمانی صفات میں سے ایک مثالی صفت ہوگی۔ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات منقول ہے کہ آپ کبھی بھی ذاتی معاملات میں غصہ نہیں ہوئے۔ آپ کا غصہ اللہ کے لیے ہوتا تھا اور پھر آپ کے غصے کے سامنے کوئی طاقت ٹھہر نہ سکتی تھی۔ خیر یہ تو مقام محمدیؐ کے درجات و کمالات ہیں۔ عام مسلمانوں کو اللہ ان کی طاقت کے مطابق ہی حکم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ اس میں ان کو آزماتا ہے اور صرف یہ حکم دیتا ہے کہ اگر غصہ آجائے تو معاف کر دیں' اور اگر ممکن ہو سکے تو معاف کر دیں اور انتقام کے جذبات پر قابو پالیں بشرطیکہ معاملہ ذاتی حدود کے اندر ہو۔ اور دو افراد کے درمیان ہو۔

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ (۴۲ : ۳۸) "جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں"۔ وہ اپنے اور رب کے درمیان حائل ہونے والی رکاوٹوں کو دور کرتے ہیں اور نفس انسانی سے وہ باتیں محو کرتے ہیں جو توجہ الی اللہ سے مانع ہوں' یہ رکاوٹیں نفسانی خواہشات' جذبات و میلانات اور وہ رکاوٹیں جو انسان کے وجود اور اس کی ذات سے لگی ہوئی ہیں' جب انسان ذاتی خواہشات پر قابو پالے اور شخصی رکاوٹوں کو دور کرے تو پھر اس کے اور اس کے رب کے درمیان راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہ رب کے ہر حکم کی تعمیل کے لیے ہروقت تیار ہوتا ہے اور اللہ کے حکم کے سامنے ذاتی خواہشات کی کوئی رکاوٹ' رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اللہ کے احکام پر عمل کرنے کی یہ عمومی صفت ہے لیکن احکام الٰہی میں سے بعض کا یہاں خصوصی ذکر بھی کیا جاتا ہے۔

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۴۲ : ۳۸) "نماز قائم کرتے ہیں"۔ اسلام میں نماز کو ایک بہت بڑا مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ کلمہ طیبہ کے اقرار کے بعد پہلا حکم نماز کا آتا ہے۔ گویا نماز اللہ کے احکام کی پیروی کا آغاز ہوتا ہے۔ بندے اور اس کے رب کے درمیان تعلق کا نام نماز ہے۔ پھر یہ اس بات کا اظہار ہے کہ اسلام میں محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے۔ کسی کا سر دوسرے کے مقابلے میں بلند نہ ہو گا' کوئی کسی سے آگے نہ ہو گا۔ اور یہی پہلو ہے یعنی مساوات کا پہلو کہ نماز کے بعد بالعموم زکوٰۃ کا ذکر آتا ہے لیکن یہاں زکوٰۃ سے پہلے وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى (۴۲ : ۳۸) کا ذکر کیا تاکہ معلوم ہو کہ رائے ہر شخص کی برابر شمار ہوگی۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲ : ۳۸) "اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں"۔ انداز بیان ایسا ہے کہ ان کے تمام امور مشورے کے نتیجے میں ہوتے ہیں گویا ان کی پوری زندگی مشورے کے رنگ میں رنگی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا یہ ایک مکی آیت ہے اور یہ حکم اسلامی حکومت کے قیام سے بھی پہلے کا ہے۔ یہ رنگ گویا صرف حکومتی امور کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ایک اسلامی سوسائٹی کا عمومی طرز عمل ہے۔ اگرچہ حکومت اس وقت قائم ہی نہ ہوئی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں حکومت کی تنظیم دراصل اسلامی سوسائٹی کے خدوخال کا ایک منظم ظہور ہی ہے اور اسلامی سوسائٹی میں اسلامی حکومت بھی آتی ہے۔ لہٰذا اسلامی سوسائٹی' اسلامی حکومت کو بھی اسی نہج پر چلاتی ہے۔ جس طرح اس کے عمومی امور چلتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں آغاز ہی سے مشورے کا عمل جاری تھا۔ اور اس مشورے کا دائرہ حکومت اور حکومتی احکام سے بہت زیادہ وسیع تھا۔ یہ دراصل اسلامی سوسائٹی کی صفت ہے اور اس جماعت کی تو ممتاز صفات میں سے ہے جسے اللہ نے پوری انسانیت کی قیادت کے لیے برپا کیا ہے۔ اور قیادت کے لیے تو یہ بہت ہی اہم ہے۔

شوریٰ کی شکل و صورت کیا ہونی چاہئے تو اسلام نے اس کے لیے کوئی فولادی قالب نہیں تیار کیا۔ ہر زمان و مکان کے حالات میں اس کی مختلف شکل و صورت تیار ہو سکتی ہے تاکہ یہ صفت یعنی شورائیت اسلامی سوسائٹی میں بھی رائج ہو۔ اسلامی اداروں میں بھی مروج ہو' لیکن اس کی کوئی جامد شکل نہ ہو بلکہ شوریٰ کی روح ہر جگہ موجود ہو۔ یعنی یہ شورائیت دراصل الفاظ اور اشکال کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک صفت ہے جو ایمان کے نتیجے میں اسلامی سوسائٹی میں شورائی شعور اور طرز عمل پیدا کرتی ہے۔ بعض لوگ ایسے اسلامی اداروں کی بات کرتے ہیں جن کی تہہ میں ایمان نہ ہو یا ایمان کا ہونا ضروری نہ ہو تو وہ ایک فضول کام کر رہے ہیں۔ اور یہ کوئی سطحی بات نہیں ہے جس طرح پہلی نظر میں نظر آئے گی اور خصوصاً ان لوگوں کو نظر آئے گی جنہوں نے اسلامی نظریہ حیات میں ایمان کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ کیونکہ اسلامی نظریہ حیات اداروں اور تنظیمات میں منتقل ہونے سے قبل' اس کے اندر ایسی عقلی اور نفسیاتی حقیقتیں ہوتی ہیں جو انسانی سوچ اور انسان کی ذات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور اس کے بعد اسلام کے اجتماعی اداروں میں وہ اصول بن کر ایک متعین شکل اختیار کر کے سامنے آتی ہیں اور اس کے بعد پھر نصوص آتے ہیں اور وہ ان اشکال اور حالات کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ نصوص ان اصولوں کو منظم کر دیتے ہیں' ان کی تخلیق نہیں کرتے' ان کی تخلیق تو ایمان کی وجہ سے ہو چکی ہوتی ہے۔ لہٰذا اسلامی نظریہ حیات کی کسی شکل و صورت کے ظہور کے لیے کسی ملک میں اسلامی سوسائٹی اور مسلمانوں کا وجود ضروری ہے۔ اور ان مسلمانوں کا ایمان فعال اور بااثر ہو۔ اگر مسلمانوں کا وجود ہی نہ ہو تو محض اداروں کے قیام سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ محض ادارے ضرورت پوری نہ کر سکیں گے اور اس صورت میں کوئی ایسا نظام وجود میں نہ آسکے گا جسے اسلامی کہا جا سکے۔

جب مسلمان صحیح معنوں میں پائے جائیں گے اور ایمان اپنی حقیقت کے اعتبار سے وجود میں آجائے گا تو اسلامی نظام بذات خود وجود میں آجائے گا اور اس کی ایک اداراتی شکل خود بخود وجود میں آجائے گی جو ان مسلمانوں کی ضرورت ہوگی اور ان کی سوسائٹی کی ضرورت ہوگی اور صرف اس طرح اسلامی اصولوں کے خواب کی سچی تعبیر وجود میں آسکے گی۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۴۲ : ۳۸) "اور ہم نے ان کو جو رزق دیا اس سے خرچ کرتے ہیں"۔
یہ آیت بھی حکم فرضیت زکوٰۃ سے پہلے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ زکوٰۃ دو ہجری میں فرض ہوئی لیکن انفاق فی سبیل اللہ' عام حکم اسلامی جماعت کے لیے پہلے سے تھا۔ بلکہ اسلامی سوسائٹی کی تشکیل کے ساتھ ہی یہ حکم وجود میں آگیا تھا۔

دعوت اسلامی کے عمل کے لیے مال کی ضرورت ہے اور یہ مال بذریعہ انفاق حاصل ہو گا۔ انفاق کے ذریعہ انسانوں کے دل کنجوسی کی بری خصلت سے پاک ہوتے ہیں۔ جب انسانی جذبہ مال پر قابو پا لیتا ہے اور اپنی مملوکات کی بجائے اللہ پر بھروسہ

کرنا سیکھتا ہے' ایمان کے مفہوم کے نکھار کے لیے یہ سب امور ضروری ہیں۔ اور یہ بات تو اپنی جگہ ہے کہ انفاق کے بغیر کوئی اجتماعی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دعوت تو ایک جدوجہد ہے اور جدوجہد میں کارکنوں کی کفالت ضروری ہے تاکہ اجتماعی ضروریات پوری ہوں اور نتائج برآمد ہوں۔ بعض اوقات یہ تکافل ہمہ گیر ہو جاتا ہے کہ کسی کے لیے انفرادی دولت رکھنے کی اجازت ہی نہیں ہوتی۔ جب مہاجرین مکہ سے نکلے اور مدینہ میں انصار کے ساتھ مل کر جو نظام قائم ہوا یہ سب اسی اصول کے تحت تھا لیکن جب حالات معمول پر آگئے تو پھر زکوٰۃ کو رائج کر کے مواخات کے نظام کو منسوخ کر دیا گیا جو کلی تکافل تھا۔ بہرحال انفاق فی سبیل اللہ اس جماعت کی ممتاز خصوصیت ہے جسے اس مقصد کے لیے چنا گیا ہو یا اسے اس مقصد کے لیے قائم کیا گیا ہو کہ وہ کسی خطے میں اسلامی انقلاب برپا کرے۔

وَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ (۴۲ : ۳۹) "اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں"۔ مکی سورتوں میں اس صفت کا ذکر اپنے اندر خاص معنی رکھتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلامی جماعت مسلمہ کے اندر یہ طبیعی صفت ہوتی ہے کہ وہ زیادتی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ برائی کا مقابلہ کرنا ایک اہم فریضہ ہے کیونکہ اگر کوئی ظالم کے سامنے ہتھیار ڈال دے تو ظالم اور جری ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ظالم کا مقابلہ کرنا بہت ضروری ہے۔ اور ایک ایسی ملت جسے اٹھایا ہی اس لیے گیا ہو کہ لوگوں کے حقوق کی پاسبانی کرے' امر بالمعروف اس کا مشن ہو اور نہی عن المنکر اس کا فریضہ ہو' اس کے لیے تو برائی کا مقابلہ کرنا بہت ہی اہم ہے کیونکہ امت مسلمہ اور جماعت مسلمہ کا نصب العین یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی پر چھا جائے اور اس کے اندر سچائی کے ساتھ عدل و انصاف قائم کرے۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ "اور عزت اللہ' رسول اللہ ﷺ اور مومنین کے لیے ہے"۔ لہٰذا اسلامی جماعت کا مزاج' اس کے فرائض کی نوعیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ زیادتی کا مقابلہ کرے اور اس پر جو دست درازیاں کی جا رہی ہیں ان کی مدافعت کرے۔ مکہ میں حکم یہ تھا کہ رک جاؤ اور ہاتھ روک لو اور صبر کرو۔ نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو' وہاں یہ احکام مکہ کے مخصوص حالات کی وجہ سے تھے اور ابتدائی عرب مسلمانوں کی قدرے تربیت بھی مطلوب تھی کیونکہ عرب مزاجاً منتقم المزاج تھے' یہ اسلامی جماعت اور اسلامی سوسائٹی کے لیے مستقل احکام نہ تھے۔ مکہ میں بعض خصوصی اسباب کی وجہ سے یہ حکم دیا گیا تھا کہ ہر قیمت پر بقائے باہمی کے لیے امن اور سلامتی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

ا۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے خلاف سختی اور زیادتی کسی منظم حکومتی ادارے کی طرف سے نہ تھی جو اس وقت کی جماعت پر حکمران ہو کیونکہ جزیرۃ العرب کی سیاسی صورت حال غیر منظم قبائلی انداز کی تھی۔ وہاں مسلمانوں پر جو تشدد کیا جاتا تھا اگر کوئی مسلمان کسی قبیلے کا فرد تھا تو اس پر تشدد قبیلہ کرتا تھا اور قبیلے میں بھی اس کے قریبی رشتہ دار کے علاوہ کوئی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ مسلمانوں پر بحیثیت جماعت کوئی تشدد نہ ہوتا تھا۔ بعض اوقات آقا اپنے مسلمان غلاموں پر تشدد کرتے تھے اور مسلمان انہیں خرید کر آزاد کر دیتے تھے۔ اس لیے کوئی بھی اپنے غلاموں پر زیادہ تشدد کی جرأت نہ کرتا تھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ چاہتے تھے کہ مکہ میں گھر گھر کے اندر لڑائی شروع ہو جائے۔ ایک ہی گھر کے جو لوگ مسلمان ہوگئے ہیں وہ غیر مسلموں سے لڑنا شروع کر دیں۔ پھر مکہ میں نرمی دوسرے لوگوں کے دلوں کو زیادہ نرم کر دیتی تھی بہ نسبت سختی کے۔

پھر عرب معاشرہ ایک خوددار اور جوانمرد معاشرہ تھا۔ اس میں مظلوم کی حمایت میں لوگ اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ مسلمان جب اذیت برداشت کرتے تھے اور اپنے عقیدے پر جم جاتے تھے تو عربوں کی جوانمردی کے جذبات ان کے حق میں اٹھتے تھے۔ شعب ابی طالب میں محصوری کے دوران بالعموم اسی جذبے نے مسلمانوں کی مدد کی' جس میں بنی ہاشم سب محصور کر دیئے گئے تھے۔ اس محاصرے کے خلاف لوگوں کی ہمدردیاں' مسلمانوں کے حق میں ہو گئیں اور لوگوں نے اس معاہدے کے پرزے پرزے کر دیئے جو صحیفے میں تھا اور یوں یہ ظالمانہ معاہدہ ختم ہوا۔

پھر عربوں کے اندر یہ رواج تھا کہ وہ بات بات پر تلوار سونت لیتے تھے۔ وہ بڑے جذباتی تھے اور کسی نظم و نسق کے پابند نہ تھے۔ اسلامی جماعت میں جو تنظیم مطلوب تھی اس کا تقاضا تھا کہ اس جذباتیت کو ذرا دبایا جائے اور اسے کسی ہدف کا پابند کیا جائے۔ اور لوگوں کو اعصابی ضبط اور صبر کا عادی بنایا جائے۔ اور لوگوں کے اندر یہ شعور پیدا کیا جائے کہ نظریہ اور نصب العین ہر جذبے اور ہر مفاد پر مقدم ہیں۔ لہٰذا مکہ میں صبر اور مسلسل صبر کی تلقین کرنا اسلام کے منہاج تربیت کے لیے بہت ضروری تھا۔ اس طرح ایک مسلم کی شخصیت میں مطلوبہ توازن پیدا ہو گیا اور وہ صبر و ثبات کے ساتھ اپنے مقصد کے لیے آگے بڑھتے رہے۔۔۔ غرض یہ اور اس طرح کے دوسرے اسباب تھے جن کو اللہ اور رسول جانتے ہیں۔ ان کی وجہ سے مکہ مکرمہ میں اصبر کی تلقین ہوتی رہی لیکن اصلی ہدف تحریک اسلامی کا یہی تھا۔

وَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ (۴۲ : ۳۹) "وہ لوگ جب ان پر زیادتی ہو تو وہ مقابلہ کرتے ہیں"۔

اس اصول کو زندگی کا ایک دوسرا اصول عملاً رائج کرتا ہے' وہ ہے :

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (۴۲ : ۴۰) "برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے"۔ سزا کا یہ اصول ہے کہ جیسا جرم ہو' ویسی ہی سزا دی جائے تاکہ سرکشی اختیار نہ کرے۔ اگر کسی سرکش انسان کو کوئی روکنے والا نہ ہو تو وہ سرکشی اور ظلم میں بڑے اطمینان سے بہت آگے بڑھ جاتا ہے۔

یہ تو ہے مظلوم کا حق اور اصول عامہ۔ لیکن اگر کوئی اپنے اصلاح نفس یا جزائے خیر اور اخروی اجر کے لیے کسی کو معاف کرتا ہے یا جماعت مسلمہ کے خلاف اٹھنے والے جذبات کی وجہ سے معاف کرتا ہے تو اس قاعدے میں استثناء موجود ہے۔ لیکن معافی کو اس وقت معافی تصور کیا جائے گا جب کوئی شخص برائی کا جواب برائی کے ساتھ دینے پر قدرت رکھتا ہو۔ اس وقت عفو کا وزن بھی ہو گا اور دست درازی کرنے والے کی اصلاح بھی ہو گی کیونکہ دست درازی کرنے والا جب یہ سوچے گا کہ عفو اور درگزر محض احسان کی وجہ سے ہوئی ہے اور اس میں معاف کرنے والے کی کوئی کمزوری نہیں ہے۔ تو اس صورت میں وہ شرمندگی محسوس کرے گا' نادم ہو گا اور آئندہ حیا کرے گا۔ اور یہ سوچے گا کہ میرے مخالف نے میرے ساتھ شریفانہ سلوک کیا ہے۔ وہ اونچا آدمی ہے اور جو شخص انتقام لینے پر قادر ہو اور معاف کر دے تو اس کا دل بھی صاف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایسے حالات میں عفو و درگزر دونوں کے لیے مفید ہوتی ہے۔ لیکن اگر ایک شخص انتقام لینے سے عاجز ہو اور معاف کر دے تو پھر صورت یہ ہو گی' گدا گر تواضع کند خوئے اوست۔ لہٰذا ایسے عفو کو عفو کہنا ہی نہیں چاہئے کیونکہ وہاں عفو نہیں ہے' مجبوری ہے۔ اور یہ صورت حال ایک شرانگیز صورت حال ہے۔ اس کے نتیجے میں

ظلم کرنے والا اور جری ہوتا ہے۔ اور فساد اور پھیلتا ہے' یہ ہے مفہوم آیت۔

فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (۲۲ : ۴۰) "پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ پر ہے"۔

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (۴۲ : ۴۰) "اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا"۔ یہ پہلے قاعدے کی تاکید ہے کہ "برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے"۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ یا تو معاف کر دو یا اگر بدلہ لینا ہے تو برابر بدلہ لو اس میں حد سے نہ بڑھو۔۔ ایک دوسری تاکید اسی قاعدے کی :

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ (۴۲ : ۴۱) اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۴۲ : ۴۲) "اور جو لوگ ظلم کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جا سکتی۔ ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں' ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے"۔ لہٰذا جو شخص ظلم کے بعد مدافعت کرتا ہے اور برائی کا بدلہ اس کے مساوی لیتا ہے' تعدی نہیں کرتا تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ وہ تو اپنا قانونی حق استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے خلاف کسی کے پاس کوئی حجت نہیں ہے۔ نہ کسی کے لیے جائز ہے کہ اس کی راہ روکے۔ راہ تو ان لوگوں کی روکنی چاہئے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں' اور زمین میں بغیر استحقاق کے زیادتیاں کرتے ہیں۔ کیونکہ کسی ایسے ملک کی اصلاح نہیں ہو سکتی جب اس میں ایک ظالم لوگوں پر ظلم کر رہا ہو اور اس کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہ ہو۔ اس میں باغی ہو جو لوگوں پر مظالم ڈھا رہا ہو اور کوئی قوت ایسی نہ ہو جو اس کا ہاتھ روکے یا اس سے قصاص دلوا سکے۔ اللہ تعالیٰ بہرحال اس قسم کے ظالموں کو عذاب الیم کی دھمکی دیتا ہے۔ لیکن یہ لوگوں کا بھی فریضہ ہے کہ وہ ظالم کا ہاتھ پکڑیں۔

آخر میں پھر انفرادی حالات اور طاقت انتقام کے باوجود' توازن' اعتدال' ضبط نفس' صبر اور احسان کا رویہ اپنانے پر متوجہ کیا جاتا ہے۔ جب صبر اور احسان فی الواقعہ ایک درگزر ہو' ذلت نہ ہو' کوئی احسان ہو' مجبور نہ کر دیا گیا ہو۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۴۲ : ۴۳) "البتہ جو صبر سے کام لے اور درگزر کرے تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے"۔

اس پیراگراف کی تمام ہدایات و احکام نہایت ہی اعتدال اور میانہ روی پر مبنی ہیں۔ نفس انسانی کو ایک طرف کینہ اور غصے سے بچانے کی سعی کی گئی ہے' اور دوسری جانب کمزوری' ذلت اور ظلم و زیادتی سے بچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور ہر حال میں اللہ کی رضامندی کو پیش نظر رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ صبر بہرحال زاد راہ ہے۔

اور مومنین کی جو صفات یہاں دی گئی ہیں وہ اس انقلابی جماعت کی خصوصیات ہیں' جس نے پوری انسانیت کی

قیادت کرنی ہے' اور جس کے پیش نظر انعام اخروی اور رضائے الٰہی ہے اور یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائیں اور رب پر توکل کریں۔

یہ بیان کرنے کے بعد کہ صفات مومنین یہ ہیں اور ان کے لیے جو اخروی اجر ہے' وہ بہت بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ اب بطور تقابل تصویر کا دوسرا رخ بعض ظالموں کا انجام بھی یہاں دے دیا جاتا ہے۔ اور ان کے لیے ذلت اور خسران کا اعلان کیا گیا ہے۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۴﴾ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ۭ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴿۴۵﴾ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَاۗءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۶﴾

"جس کو اللہ ہی گمراہی میں پھینک دے اس کا کوئی سنبھالنے والا اللہ کے بعد نہیں ہے۔ تم دیکھو گے کہ یہ ظالم جب عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے اب پلٹنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟ اور تم دیکھو گے کہ یہ جہنم کے سامنے جب لائے جائیں گے تو ذلت کے مارے جھکے جا رہے ہوں گے اور اس کو نظر بچا بچا کر کن انکھیوں سے دیکھیں گے۔ اس وقت وہ لوگ جو ایمان لائے تھے کہیں گے کہ واقعی اصل زیاں کار وہی ہیں جنہوں نے آج قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو خسارے میں ڈال دیا۔ خبردار رہو' ظالم لوگ مستقل عذاب میں ہوں گے اور ان کے کوئی حامی و سرپرست نہ ہوں گے۔ جو اللہ کے مقابلے میں ان کی مدد کو آئیں جسے اللہ گمراہی میں پھینک دے اس کے لیے بچاؤ کی کوئی سبیل نہیں"۔

اللہ کے فیصلے کو رد نہیں کیا جا سکتا اور اللہ مشیت کی راہ کوئی روک نہیں سکتا۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ (۴۲ : ۴۴) "جس کو اللہ گمراہی میں پھینک دے' اس کا کوئی سنبھالنے والا اللہ کے بعد نہیں"۔ جب اللہ کے علم میں یہ بات آ جاتی ہے کہ یہ بندہ گمراہی کا مستحق ہے تو اللہ کا فیصلہ ہو جاتا ہے کہ یہ گمراہ ہو گا۔ اس کے بعد پھر کوئی ولی اسے ہدایت دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ نہ اس کی مدد یوم الحساب میں عذاب سے بچانے میں کر سکتا ہے۔ باقی آیت میں ایک منظر!

وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ (۴۲ : ۴۴)

وَتَرٰهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ (۲ ۴ : ۴ ۴) "تم دیکھو گے کہ یہ ظالم جب عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے اب پلٹنے کی کوئی سبیل ہے؟ اور تم دیکھو گے کہ یہ جہنم کے سامنے جب لائے جائیں گے' ذلت کے مارے جھکے جا رہے ہوں گے۔ اور اس کو نظریں بچا کر کن اکھیوں سے دیکھیں گے"۔ ظالم چونکہ سرکش اور باغی تھے تو اللہ تعالیٰ نے یوم الجزاء میں انہیں بقا ہر ذلت کی حالت میں رکھا۔ یہ عذاب دیکھتے ہیں تو ان کی بڑائی دھڑام سے گرتی ہے اور نہایت ہی ذلت اور انکسار سے باہم بات کرتے ہیں کہ کوئی راستہ ہے پلٹنے کا ہے۔ اس بے تابانہ مایوسی کے مکالمے اور اس ذلت و خواری کی حالت میں جب آگ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں تو حالت خشوع میں ہیں۔ تقویٰ اور احترام کی وجہ سے نہیں بلکہ ذلت اور خواری کی وجہ سے' وہ خود بھی سہمے ہوئے' جھکے ہوئے ہیں اور نظریں بھی نیچی ہیں۔ ذلت اور شرمندگی کی وجہ سے نظریں اٹھا کر نہ دیکھ سکیں گے۔

يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ (۴۲ : ۴۴) "اور نظریں بچا بچا کر کن اکھیوں سے دیکھیں گے"۔ یہ اس وقت نہایت ہی توہین آمیز حالت میں ہوں گے۔

اور اس وقت یہ معلوم ہو گا کہ یہ دن اہل ایمان کا ہے۔ وہ بات کرتے ہیں اور تبصرے کرتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

(۴۲ : ۴۵) "اس وقت وہ لوگ جو ایمان لائے تھے کہیں گے کہ واقعی اصل زیاں کار وہی ہیں جنہوں نے آج قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو خسارے میں ڈال دیا"۔ اور یہ کفار واقعی سب کچھ ہار گئے۔ اور یہ لوگ ذلت سے جھکے کھڑے ہیں وہ بھی باہم تبصرہ کرتے ہیں مگر یوں کہ کیا ایسی کوئی راہ ہے؟ ۔۔۔ اب ایک عام تبصرہ آتا ہے اس پورے منظر پر کہ یہ لوگ جن کو آگ پر پیش کیا گیا ہے ان کا انجام کیا ہو گا۔

اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ (۴۲ : ۴۵) وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ

يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ (۴۲ : ۴۶) "خبردار رہو' ظالم لوگ مستقل عذاب میں ہوں گے اور ان کے کوئی حامی و سرپرست نہ ہوں گے' جو اللہ کے مقابلے میں ان کی مدد کو آئیں اور جسے اللہ گمراہی میں پھینک دے اس کے لیے بچاؤ کی کوئی سبیل نہیں"۔ نہ کوئی مددگار ہے اور نہ نکلنے کا کوئی راستہ ہے۔ لہٰذا اب ان کے لیے عذاب مقیم ہی ہے۔

--- ○○○---

اس منظر کی روشنی میں حضورؐ کے معاندین اور مغرور مخاطبین کو اب نہایت ہی ہمدردی سے خطاب کیا جاتا ہے کہ اللہ کی بات کو قبول کر لو' قبل اس کے کہ اچانک تم پر یہ دن آ جائے' جس سے پھر کوئی پناہ تمہیں نہ ملے' کوئی مددگار نہ ملے جو اس برے انجام پر احتجاج کر سکے' اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ اگر یہ اس مخلصانہ تنبیہہ کو نہیں مانتے اور منہ موڑتے ہیں تو آپ کا فرض پورا ہو گیا۔ آپ کا فریضہ صرف یہ ہے کہ بات پہنچا دیں' آپ ان کی

ہدایت کے مکلف اور ذمہ دار نہیں نہ ان کے ٹھیکہ دار ہیں۔

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّ مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ۝ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ

"مان لو اپنے رب کی بات قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس کے ٹلنے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ اس دن تمہارے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی اور نہ کوئی تمہارے حال کو بدلنے کی کوشش کرنے والا ہوگا۔ اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو اے نبیؐ ہم نے تم کو ان پر نگہبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔ تم پر تو صرف بات پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے"۔

اس کے بعد انسان کے عمومی مزاج کو ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ انسان جو دعوت اسلامی اور سچائی کا مقابلہ کرتا ہے اور رسول برحق سے عناد رکھتا ہے اور اس طرح اپنے آپ کو اذیت و عذاب کا مستحق گردانتا ہے تو اس کی حالت یہ ہے کہ جب کسی اذیت میں یہ مبتلا ہو جاتا ہے تو اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی قوت برداشت جواب دے دیتی ہے۔ جزع فزع اور آہ و فغاں شروع کر دیتا ہے اور اگر اللہ کی کوئی نعمت مل جائے تو ہواؤں پر اڑنے لگتا ہے۔ اور حدود پار کر لیتا ہے جبکہ سختی میں مایوس اور کافر ہو جاتا ہے۔

وَ اِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ۝

"انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو اس پر پھول جاتا ہے، اور اگر اس کے اپنے ہاتھوں کا کیا دھرا کسی مصیبت کی شکل میں اس پر الٹ پڑتا ہے تو سخت ناشکرا بن جاتا ہے"۔ اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں انسانوں کے حصے میں خوشی آتی ہے یا غم آتا ہے، تنگی آتی ہے یا کشادگی نصیب ہوتی ہے، یہ سب امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ پس یہ بدبخت انسان جو بھلائی کا شیدائی ہے اور برائی اور سختی سے نفور ہے، اسے کیا ہو گیا ہے کہ یہ اس مالک سے دور رہا ہے جس کے ہاتھ میں اس کے سب امور ہیں اور ہر حال میں وہ خالق و مالک ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ۝ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ

وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيمًا ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝۵۰

"اللہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے ' جو کچھ چاہتا ہے ' پیدا کرتا ہے ' جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے ' جسے چاہتا ہے 'لڑکے دیتا ہے ' جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں ملا جلا کر دیتا ہے ' اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے ۔ وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قادر ہے"۔

اولاد کسی شخص پر فضل و کرم ہونے یا اس سے محروم ہونے کی بڑی نشانی ہے ۔ پھر اولاد انسانی نفس کے بہت ہی قریب پسندیدہ چیز ہے ۔ اولاد سے انسان کو بہت محبت ہوتی ہے ۔ اس لیے کسی پر اللہ کے فضل ہونے یا اس سے محروم ہونے کے حوالے سے یہ بہت ہی حساس اور قوی الاثر چیز ہے ۔ اس سورت میں رزق کے اعتبار سے خوشحالی اور بدحالی کی بات گزر چکی ہے ۔ یہاں اولاد کے حوالے سے بھی انسان کے نصیب کی بات کر دی تاکہ مال و اولاد دونوں کی بات ہو جائے 'کیونکہ اولاد بھی اللہ کی طرف سے ایک بہترین رزق ہے ۔ مال کی طرح بلکہ اس سے پیارا ۔

جہاں بھی اللہ کے ملک کی بات ہوتی ہے وہ ملک سماوات اور پوری زمین سے شروع ہوتی ہے ' مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ عام مالک ہے ۔ اسی طرح يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ( ۴۲ : ۴۹ ) "جو چاہتا ہے ' پیدا کرتا ہے"۔ تخلیق کا ذکر بھی یہاں نہایت مناسب اور معنی خیز ہے ۔ یہاں اولاد کو زندہ کرنے اور عطا کرنے کا مضمون ہے ۔ اس کے ساتھ صفت تخلیق کا ذکر مناسب ہے ۔ انسان کو بتایا گیا کہ تم جو پسند کرتے ہو ' ان کو بھی اللہ پیدا کرتا ہے اور جن کو تم ناپسند کرتے ہو ' ان کو بھی اللہ پیدا کرتا ہے ۔ وہی دینے والا اور وہی محروم کرنے والا ہے ۔

اب حالات داد و دہش اور حالات محرومیت کی تفصیلات ۔ اللہ جسے چاہتا ہے عورتیں دیتا ہے اور یہ لوگ عورتوں کو پسند نہ کرتے تھے (جس طرح آج بھی نہیں کیا جاتا) یہ تو اللہ ہے کہ کسی کو لڑکے 'کسی کو لڑکیاں اور کسی کو دونوں دیتا ہے ۔ اور کسی کو اس میٹھے پھل سے صاف صاف محروم کر دیتا ہے ۔ یہ سب حالات اللہ کی مشیت پر موقوف ہیں ۔ اس میں اللہ کے سوا کسی کا دخل نہیں ہے ۔ وہ اپنے علم و قدرت کے مطابق فیصلے کرتا ہے ۔

اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ( ۴۲ : ۵۰ ) "وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

--- ٥٥٥ ---

سورت کے خاتمہ پر موضوع اول سامنے آتا ہے جس پر اس پوری سورت میں بات ہوتی رہی ہے ۔ یعنی رسالت اور وحی کی حقیقت یہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ اس عمل میں بندے اور خدا کے درمیان رابطہ کس طرح ہوتا ہے ' اور اس کی صورتیں کیا کیا ہیں؟ اور یہ رابطہ رسول کریم کے ساتھ ہو چکا ہے اور اس کے نہایت ہی بلند مقاصد ہیں یہ کہ جو صراط مستقیم کی طرف آنا چاہے اسے لایا جائے ۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝۵۱ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ

رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ؕ مَا كُنۡتَ تَدۡرِىۡ مَا الۡكِتٰبُ وَلَا الۡاِيۡمَانُ وَلٰـكِنۡ جَعَلۡنٰهُ
نُوۡرًا نَّهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهۡدِىۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۙ﴿۵۲﴾ ۵
صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِىۡ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِيۡرُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۵۳﴾ ع اع ۱۰

"کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے روبرو بات کرے۔ اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے' یا پردے کے پیچھے سے' یا پھر وہ کوئی پیغام بر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے' وہ برتر اور حکیم ہے اور اسی طرح (اے نبیؐ) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔ تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے' مگر اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔ یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو' اس خدا کے راستے کی طرف جو زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے۔ خبردار رہو' سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں"۔ ۶

اس آیت میں یہ بات قطعی انداز میں کہہ دی گئی ہے کہ کوئی انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ آمنے سامنے ہو کر بات نہیں کر سکتا۔ حضرت عائشہؓ سے یہ مروی ہے: "جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے تو اس نے بہت بڑا افترا باندھا" (متفق علیہ) خدا کا مکالمہ بندوں کے ساتھ تین طریقوں سے سرانجام پاتا ہے۔ بذریعہ وحی' یہ وحی قلب نبی پر براہ راست ہوتی ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ یہ وحی ہے' یا پردے کے پیچھے سے' جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مکالمہ ہوا۔ لیکن جب آپ نے اللہ کو دیکھنے کی درخواست کی تو اس درخواست کو قبول نہ کیا گیا۔ اور پہاڑ نے بھی تجلیات الٰہیہ کو برداشت نہ کیا۔

وَخَرَّ مُوۡسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبۡحٰنَكَ تُبۡتُ اِلَيۡكَ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ

"اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا جب ہوش آیا تو بولا: پاک ہے تیری ذات میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والوں میں سے ہوں"۔ (۷ : ۱۴۳) یا پھر یہ طریقہ ہے کہ ایک پیغام لانے والا بھیج دے اور یہ فرشتہ ہوتا ہے جو اللہ کے حکم سے جو چاہے وحی کر دے۔ اور اس کی تفصیلات حضور اکرمؐ نے خود بتا دی ہیں۔ پہلا طریقہ یہ کہ فرشتہ آپ کے دل میں بات ڈال دے ماسوائے اس کے کہ آپ فرشتے کو دیکھیں۔ حضورؐ نے فرمایا "روح القدس نے میرے دل میں یہ بات پھونک دی کہ ہرگز کوئی نفس نہ مرے گا قبل اس کے کہ وہ اپنا رزق مکمل نہ کر دے' لہٰذا اللہ سے ڈرو اور نہایت ہی خوبصورت طریقے سے رزق کی تلاش کرو"۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فرشتہ ایک انسان کی شکل میں آپ سے بات کرتا اور آپ اس کی بات کو سمجھ لیتے۔ تیسری صورت یہ کہ وحی آپ پر گھنٹی کی آواز کی طرح آتی اور یہ طریقہ آپ کے لیے بہت سخت ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ سخت سردی کے دنوں میں بھی آپ کے ماتھے سے پسینہ ٹپکتا اور ایسی حالت میں اگر آپ سواری پر ہوتے تو اس پر اس قدر بوجھ ہوتا کہ سواری بیٹھ جاتی۔ آپ پر ایک بار ایسی حالت میں وحی آئی اور آپ کا سر مبارک زید ابن ثابت کی ران پر تھا۔ اس پر یہ اس قدر بھاری ہو گیا کہ قریب تھا کہ اس سے ان کی ران چورہ چورہ ہو جاتی۔ چوتھی صورت یہ تھی کہ آپ فرشتے کو اسی شکل میں دیکھتے جس میں اللہ نے اسے پیدا کیا ہے۔

اس وقت وہ جو چاہتا' وحی کر دیتا۔اور اس شکل میں فرشتہ صرف دو بار آیا ہے۔ جیسا کہ سورت نجم میں ذکر ہوا (زاد المعاد' ابن قیم الجوزیہ)

یہ ہیں وحی کی صورتیں' اور ان کے مطابق اللہ کے ساتھ حضور اکرمؐ کا رابطہ ہوتا رہا ہے۔

اَنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (۴۲ : ۵۱) "اللہ برتر اور حکیم ہے"۔وہ اپنی بلندیوں سے وحی کرتا ہے اور وہ اپنی حکمت سے جسے چاہتا ہے' چن لیتا ہے۔

میں یہاں ضرور کہوں گا کہ جب بھی میں نے کسی ایسی آیت یا حدیث پر غور کیا ہے جس میں بندے اور رب کے درمیان رابطے کا ذکر ہو' تو میرا رواں رواں کانپ اٹھا ہے کہ ایک ازلی ابدی ذات جو لازمان اور لامکان ہے' جس کو کسی جگہ میں محدود نہیں کیا جا سکتا' جس کی مثل کائنات میں کوئی چیز نہیں ہے اور فانی بندے کے درمیان اتصال کس طرح واقع ہو سکتا ہے جبکہ انسان ایک جگہ میں محدود ہے' ایک زمان تک محدود ہے۔اور مخلوقات کی دوسری حدود کا پابند ہے۔پھر یہ رابطہ معانی اور کلمات کی شکل کس طرح اختیار کرتا ہے اور ایک فانی محدود ذات کے اندر یہ قوت کس طرح ودیعت کر دی جاتی ہے کہ وہ ازلی و ابدی اور لامکان ذات کا کلام پا سکے۔جس کی کوئی مثال نہیں ہے' یہ کس طرح ممکن ہوا۔کیونکر ہوا؟

لیکن میں نے پھر لوٹ کر اپنے آپ سے پوچھا تم کیف سے سوال کرتے ہو؟ لیکن خود تمہارا یہ کیف بھی محدود' فانی' قاصر اور ایک حدود کے اندر ہے۔لیکن یہ حقیقت تو واقع ہو چکی ہے۔اور اس نے ایک شکل بھی اختیار کر لی۔اس کا ایک وجود ہمارے سامنے آگیا ہے اور تم اسے پا رہے ہو۔

لیکن اس کے باوجود یہ اچنبھا' یہ گھبراہٹ اور یہ خوف موجود ہے۔یہ نبوت تو بہت ہی عظیم امر ہے۔اور اس پیغام کے وصول کرنے کا وقت تو بہت ہی عظیم ہے۔ایک انسانی ذات ایک ذات عالی مقام کا پیغام وصول کرتی ہے۔بھائی! تم یہ کلمات پڑھتے ہو کیا تم میرے اس تصور میں میرے ساتھ شریک ہو؟ کیا تم میرے ساتھ اس امر عظیم کو سوچ رہے ہو؟ کہ یہ وحی وہاں سے آ رہی ہے۔نہیں میں کہتا ہوں کیا میں کہہ سکتا ہوں کہ "وہاں" سے اس دربار عالی میں تو "یہاں" اور "وہاں" نہیں ہے۔یہ نزول تو غیر مکان اور لازمان سے واقع ہے۔یہ تو جگہ مکان اور حدود سے پاک ہے۔جہت اور طرف تو اس بارگاہ میں نہیں۔انتہائی مطلق' ازلی ابدی ذات ہے' اللہ ذوالجلال ہے۔دوسری طرف ایک انسان ہے' نبی ہے' رسول ہے لیکن انسان ہے۔وہ حدود و قیود رکھتا ہے۔یہ وحی! یہ ایک عجیب رابطہ ہے۔معجزانہ رابطہ ہے۔یہ اللہ ہی ہے جو اسے ایک حقیقت واقعہ بنا سکتا ہے۔اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ یہ واقعہ کیسے متحقق ہوا۔بھائی! تم یہ کلمات پڑھ رہے ہو کیا تم ان خیالات کو پا رہے ہو جو میرے دل میں آتے ہیں اور میں انہیں کلمات کی شکل دے رہا ہوں۔میرا پورا وجود جس قدر رعب' کپکپی محسوس کرتا ہے اور میں اسے کلمات میں منتقل کر رہا ہوں' میں نہیں جانتا کہ اس کے لیے میں کیسے کلمات لا سکتا ہوں۔یہ واقعہ تو اپنی ماہیت کے اعتبار سے بہت ہی عظیم عجیب اور خارق عادت ہے۔جن صورتوں میں بار بار واقعہ ہوا۔لوگوں نے اسے محسوس کیا اور بارہا اس کے مناظر بھی دیکھے' رسول اللہؐ کے عہد میں آپ کے ساتھیوں نے۔حضرت عائشہؓ انسانی تاریخ کے اس عظیم واقعہ کو دیکھ رہی ہیں۔اور روایت کر رہی ہیں۔آپؐ فرماتے عائشہ! یہ ہیں جبرئیل' تم پر سلام کہتے ہیں۔آپ فرماتی ہیں وعلیہ السلام۔آپ فرماتی ہیں وہ دیکھتے ہیں جو ہم نہیں دیکھ سکتیں۔یہ ہیں زید

ابن ثابتؓ۔ اس وقت حضور کا سر مبارک ان کی ران پر ہے۔ وحی آتی ہے 'قریب ہے کہ ان کی ران کو پیس ڈالے۔ اور یہ دوسرے صحابہ کرام بارہا اس واقعہ کو دیکھتے ہیں اور پہچان جاتے ہیں آپ کے چہرۂ مبارک پر آثار وحی۔ آپ کو تنہا چھوڑ دیتے ہیں کہ وحی کی تلقی کا عمل پورا ہو جائے۔ آپ بھی واپس آتے ہیں اور وہ بھی واپس آتے ہیں۔

یہ کیا شخصیت ہے رسول خدا کی جو ذات علوی کے ساتھ یہ رابطہ رکھتے ہیں؟ آپ کا جوہر کیا ہے؟ آپ کی روح کیسی ہے کہ ایک ابدی کے ساتھ ازلی کے ساتھ آپ رابطہ ہو جاتا ہے۔ یہ اختلاط کیسے ہوتا ہے۔ یہ مسائل ہیں لیکن یہ حقیقت ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ واقعات ہمارے ادراک کے آفاق سے بہت دور ہیں 'بہت بلند ہیں۔

ہمارے نبی کی روح ایک انسانی روح ہے۔ یہ انسانی اور فانی روح کس طرح وحی اخذ کرتی ہے۔ تلقی اور ادراک کے دروازے کس طرح کھل جاتے تھے؟ کس طرح ان پر یہ فیضان ہوتا تھا۔ ان عجیب لمحات میں وجود رسول اور وجود کائنات کس طرح محسوس کرتا تھا۔ جس میں اللہ کی تجلیات آتی تھیں۔ اور یہ تجلیات کلمات کی شکل اختیار کرتی تھیں۔

پھر اللہ کی نگہبانیاں 'اللہ کی مہربانیاں اور اللہ کی عزت افزائیاں تو دیکھو! اللہ بہت ہی بلند 'بہت ہی بڑا اور وہ اس نہایت ہی چھوٹی 'کمزور اور بے بس مخلوق پر رحمتیں نازل کرتا ہے۔ یہ وحی اس کی اصلاح کے لیے ہے۔ اس کی راہ روشن کرنے کے لیے ہے۔ ان میں سے جو بے راہ ہو گئے۔ حیران ہیں ان کی راہنمائی کے لیے۔ انسان جو اللہ کے لیے اس سے بھی کم قیمت ہے جس طرح انسانوں کے لیے ایک مچھر۔ وہ اللہ کی مملکت میں اسی طرح ہے جس طرح پوری زمین کے مقابلے میں ایک مچھر۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے لیکن یہ انسان کی قوت مدرکہ کے تصور سے بہت ہی بلند و بالا ہے۔ ہم صرف اس افق عالی کی طرف دیکھ سکتے ہیں۔

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۵۲:۴۲) صِرَاطِ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ أَلَا إِلَى اللَّهِ تَصِيرُ الْأُمُورُ (۵۳:۴۲)

"اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔ تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے 'مگر اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔ یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو 'اس خدا کے راستے کی طرف جو زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے۔ خبردار رہو 'سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں"۔

وَكَذَٰلِكَ (اسی طرح) اس عجیب رابطے کے ذریعہ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ (۵۲:۴۲) "ہم نے تمہاری طرف وحی کی"۔ گویا وحی مذکور طریقے سے ہوئی۔ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اور رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا (۵۲:۴۲) "اپنے حکم سے ایک روح"۔ ہم نے تمہاری طرف وحی کی۔ یہ ایک روح ہے 'اس میں زندگی ہے۔ یہ انسانوں کو زندگی عطا کرتی ہے۔ یہ انسانوں کو آگے بڑھاتی ہے 'حرکت دیتی ہے اور نشوونما عطا کرتی ہے 'دلوں کو زندہ کرتی ہے اور عملی زاویہ سے لوگوں کو

زندہ کرتی ہے۔

مَاكُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ ( ۴۲ : ۵۲ ) "تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے"۔ یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذہنی کیفیت کی تصویر اللہ کھینچتا ہے۔ اور اللہ آپ کے بارے میں زیادہ علم رکھتا ہے۔ یہ اس وحی کے نزول و وصول سے پہلے کی بات ہے۔ اس نزول وحی سے قبل حضورؐ نے کتابوں کے بارے میں بھی سنا ہوا تھا۔ اور ایمان کے بارے میں بھی سنا ہوا تھا۔ اور جزیرۃ العرب میں یہ بات مشہور تھی کہ وہاں اہل کتاب ہیں اور ان کے پاس کتاب الٰہی ہے' اور ان کا یہ عقیدہ ہے۔ لہٰذا مراد یہ نہیں ہے کہ آپ نہ کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو جانتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے ضمیر کے اندر وحی کتاب اور ایمان کا وہ شعور نہ پاتے تھے۔ وحی الٰہی سے قبل آپ کے شعور میں یہ باتیں نہ تھیں جو وحی کے ذریعہ اب آپ لوگوں کو بتاتے ہیں۔

وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ ( ۴۲ : ۵۲ ) "مگر اس کو ہم نے روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں"۔ یہ ہے اس وحی کی ماہیت اور اس کی ذاتی خصوصیت۔ یہ روح' یہ وحی' یہ کتاب دراصل ایک نور ہے۔ یہ نور جب قلب کا حصہ بن جاتا ہے تو پھر یہ رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن یہ نور اسی شخص کے دل میں داخل ہوتا ہے جس کے بارے میں اللہ کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کے دل میں راہ پا سکتا ہے۔ اور یہ شخص اس کی طرف مائل ہے۔

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ( ۴۲ : ۵۲ ) "یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہو"۔ یہاں تاکید کے ساتھ وحی کی رہنمائی کی حیثیت کو واضح کیا جاتا ہے کہ یہ ایک عملی رہنمائی کا پروگرام ہے۔ اور ہدایت بھی اسی کو ملتی ہے۔ جس شخص کے بارے میں اللہ کی مشیت ہو۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ جس کے مقدر میں چاہے' لکھ دے۔ اور اللہ ہر مقدر اپنے پیشگی علم کی وجہ سے تحریر کرتا ہے۔ یہ علم صرف اللہ ہی کو ہوتا ہے۔ رسول کو بھی اس کا علم نہیں ہوتا۔ رسول تو حکم الٰہی سے تبلیغ پر مامور ہے۔ وہ کسی کے دل میں ہدایت نہیں ڈال سکتا۔ آپ اپنا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ کی مشیت کام کرتی ہے۔

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ( ۴۲ : ۵۲ )صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ( ۴۲ : ۵۳ ) "یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کر رہے ہو' اس خدا کے راستے کی طرف جو زمین و آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے"۔ یہ وحی ہدایت ہے اللہ کے راستے کی طرف۔ جہاں تمام راستے آکر ملتے ہیں اور یہ مالک کا راستہ ہے جو زمین و آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے جو اس راستے پر آگیا۔ اسے اس کائنات کے قوانین فطرت کی راہ بھی معلوم ہو گئی۔ اسے زمین و آسمان کی قوتوں کا پتہ بھی چل گیا' اسے آسمانوں اور زمینوں کی ارزاق کا بھی پتہ چل گیا۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زمین و آسمان سب اللہ کی راہ پر چل رہے ہیں۔ اللہ ہی ان کا مالک ہے' یہ سب اس کی طرف متوجہ ہیں اور تمام امور اسی کی طرف مڑتے ہیں۔

اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ (۴۲: ۵۳) "خبردار رہو' سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں"۔سب چیزیں اللہ پر جاکر منتہی ہوتی ہیں' وہاں سب امور جمع ہوں گے اور ان کے فیصلے ہوں گے۔ اور یہ نور اس راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو اللہ نے بندوں کے لیے پسند کیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ جڑنے کے لیے اس کی طرف آئیں اور اس کے نشانات پر مطیع فرمان ہوکر چلیں۔

یوں اس سورت کا خاتمہ ہوتا ہے۔اس کا آغاز وحی پر بات سے ہوا' اس کا آخری مضمون اور محور وحی تھا۔ابتدائی نبوتوں سے لے کر اس نے تمام نبوتوں کو لیا اور بتایا کہ یہ ایک ہی سلسلہ ہے۔ایک ہی نظام اور منہاج کی طرف دعوت ہے' راستہ بھی ایک ہے' طریقہ بھی ایک ہے۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت نے تمام انسانیت کی رہنمائی کرنی ہے اور اس کی قیادت جماعت مومنہ نے کرنی ہے۔اس نے لوگوں کو راہ راست پر لانا ہے۔یہ اس ذات کا راستہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔پھر اس سورت نے اس ابتدائی جماعت کی خصوصیات بھی بتائیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائی اور جس نے بھی یہ کام کرنا ہو' اس کے اندر یہ خصوصیات لازمی ہیں۔ان خصوصیات کے بغیر نہ قیادت ممکن ہے اور نہ اس امانت کا حق ادا کیا جاسکتا ہے۔یہ امانت جو اس منہاج کے مطابق آسمانوں سے زمین پر اتاری گئی۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ----- ۲۵

### سورۃ الزخرف ۔ ۴۳

آیات ۱--- تا--- ۸۹

# سورۂ الزخرف ایک نظر میں

اس سورت میں ان مشکلات اور مصائب کا ایک حصہ پیش کیا گیا ہے جن سے اس کے زمانہ نزول میں تحریک اسلامی دوچار تھی۔ اور وہ رکاوٹیں اور اعتراضات بھی اس میں نقل کیے گئے ہیں جن سے دعوت اسلامی کو سابقہ درپیش تھا۔ ان موضوعات کے ساتھ ساتھ یہ بھی اس سورت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مسائل کو قرآن مجید کس طرح حل کر رہا تھا۔ چاہے ان کا تعلق خیالات سے ہو یا عمل سے ہو۔ اور یہ کہ قرآن مجید بت پرستانہ عقائد اور افسانوں کی جگہ کس خوبصورتی کے ساتھ اپنے حقائق اور قرآنی اقدار کو لوگوں کے ذہن میں بٹھا رہا تھا۔ اور جاہلی اقدار کو ایک ایک کر کے ذہنوں سے محو کر رہا تھا۔ یہ جاہلی اقدار اس وقت تو ہر انسان کے ذہن میں بیٹھی ہوئی تھیں، مگر آج بھی ان کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ ہر زمان و مکان میں موجود رہی ہیں۔

جاہلیت کی بت پرستی اس بات کی قائل تھی کہ ان جانوروں میں جن کو اللہ نے بندوں کے لیے مسخر کیا ہے، ایک حصہ اللہ کا ہے اور ایک حصہ ان کے الہوں کا ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ (٦ : ١٣٦) "انہوں نے اللہ کے لیے خود اس کے پیدا کیے ہوئے کھیتوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ کے لیے ہے 'بزعم خود اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے۔ پھر وہ جو ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے' وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا اور مگر جو اللہ کے لیے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے"۔ اور انہی جانوروں کے بارے میں انہوں نے اور بے شمار خرافات اور افسانے بھی گھڑ رکھے تھے' سب کے سب نظریاتی انحراف سے پیدا ہوئے تھے۔ بعض جانور ایسے تھے جن پر سواری ممنوع تھی۔ بعض کے گوشت کو حرام کر دیا گیا تھا۔

وَقَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا (٦ : ١٣٨) "اور کہتے ہیں یہ جانور اور کھیت محفوظ ہیں' انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھلانا چاہیں' حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے۔ پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن کے اوپر یہ اللہ کا نام نہیں لیتے"۔

اس سورت میں اس قسم کے نظریاتی اور عقائد کی بے راہ روی کی اصلاح کی گئی ہے ۔ انسانی ذہن کو اصلی فطرت اور پہلی حقیقت کی طرف لوٹایا گیا ہے کہ تمام جانور اللہ کی مخلوق ہیں ۔ یہ حیات روئے زمین پر اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے ۔ یہ جانور بھی اس کا حصہ ہیں ۔ اور ان کی تخلیق بھی زمین و آسمان کی تخلیق کے ساتھ وابستہ ہے ۔ اللہ نے ان کو انسان کے لیے پیدا کیا ہے تاکہ انھیں استعمال کریں اور اپنے رب کی ان نعمتوں پر رب کا شکر ادا کریں ۔ یہ نہ کریں کہ اللہ کے لیے بعض لوگوں کو شریک بنائیں اور پھر اللہ کی چیزوں میں سے اپنے لیے اور اپنے شرکاء کے لیے حصے مقرر کریں ۔ حالانکہ وہ عقیدتاً اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ان چیزوں کا خالق صرف اللہ ہے ۔ لیکن اس عقیدے کے لازمی تقاضے سے پھر جاتے ہیں اور اس اقرار کا کوئی اثر ان کی زندگی میں نظر نہیں آتا ۔ اور وہ خرافات اور افسانوں کے قائل ہیں ۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ (۹)
اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۱۰)
وَالَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ (۱۱)
وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَ الْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ (۱۲)
لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَ تَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ
الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ (۱۳) وَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (۱۴)

(۴۳ : ۹ تا ۱۴) ”اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے ‘ تو وہ خود کہیں گے کہ ”انھیں اسی زبردست علیم ہستی نے پیدا کیا ہے“ ۔ وہی نا جس نے تمہارے لیے اس زمین کو گہوارہ بنایا ۔ اور اس میں تمہاری خاطر راستے بنا دیے تاکہ تم اپنی منزل مقصود کی راہ پا سکو ۔ جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعے سے مردہ زمین . . . ا اٹھایا ۔ اس طرح ایک روز تم زمین سے برآمد کیے جاؤ گے ۔ وہی جس نے یہ تمام جوڑے پیدا کیے اور جس نے تمہارے لیے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا ۔ تاکہ تم ان کی پشت پر چڑھو اور جب ان پر بیٹھو تو ن یاد کرو ‘ اور کہو کہ ”پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ۔ ورنہ ہم انھیں قابو میں ر . . . ت نہ رکھتے تھے ۔ اور ایک روز ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے“ ۔

. . . یہ جاہلیت کی بت پرستی کے یہ عقائد بھی تھے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں حالانکہ اپنے لیے وہ بیٹیوں کو پسند نہ کرتے تھے لیکن اللہ کے . . . ے بیٹیاں بناتے تھے ۔ اور اللہ کے سوا ان کی پوجا بھی کرتے تھے ۔ اور پھر یہ کہتے تھے کہ ہم جو ان کی عبادت کرتے ہیں تو اللہ کی مرضی اور مشیت سے کرتے ہیں ۔ اگر اللہ نہ چاہتا تو ہم ایسا نہ کرتے اور یہ افسانہ محض ان کی نظریاتی بگاڑ سے پیدا ہوا تھا ۔

اس سورت میں اللہ ان کے سامنے خود ان کے اقوال رکھتا ہے اور فطری منطق سے استدلال کرتا ہے کہ یہ خرافات

... یہ اوہام اور افسانے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ (۱۵) اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا
يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ (۱۶) وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ
وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (۱۷) اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ
مُبِيْنٍ (۱۸) وَجَعَلُوا الْمَلٰئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ
سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ (۱۹) وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ مَا لَهُمْ
بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (۲۰) اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ
مُسْتَمْسِكُوْنَ (۲۱) بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ
(۲۲) (۴۳: ۱۵ تا ۲۲) "ان لوگوں نے اس کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جزء بنا ڈالا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلا احسان فراموش ہے۔ کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لیے بیٹیاں انتخاب کیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اس خدائے رحمٰن کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کی ولادت کا مژدہ جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے' تو اس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔ کیا اللہ کے حصے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پالی جاتی ہے اور بحث و حجت میں اپنا مدعا اچھی طرح واضح بھی نہیں کر سکتی۔ انہوں نے فرشتوں کو' جو خدائے رحمٰن کے خاص بندے ہیں' عورتیں قرار دے لیا۔ کیا ان کے جسم کی ساخت انہوں نے دیکھی ہے؟ ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انہیں اس کی جوابدہی کرنی ہوگی۔ یہ کہتے ہیں 'اگر خدائے رحمٰن چاہتا تو ہم ان کو کبھی نہ پوجتے۔ یہ اس معاملہ کی حقیقت کو قطعی نہیں جانتے محض تیر تکے لڑاتے ہیں۔ کیا ہم نے اس سے پہلے کوئی کتاب ان کو دی تھی جس کی سند یہ اپنے پاس رکھتے ہوں۔ نہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں"۔

جب ان سے کہا جاتا کہ تم تو مورتیوں اور پتھروں اور درختوں کی پوجا کرتے ہو اور تم جن چیزوں کی پوجا کرتے ہو وہ تو جہنم کا ایندھن ہیں کہ جن معبودوں کی تم پوجا کرتے ہو تم اور وہ دونوں جہنم میں ہوں گے تو وہ اس واضح کلام کی تحریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پھر عیسیٰ ؑ کا کیا حال ہوگا' ان کی قوم نے تو ان کی بندگی کی ہے۔ کیا وہ آگ میں ڈالے جائیں گے' پھر وہ کہتے یہ مورتیاں تو فرشتوں کی نقل ہیں اور ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں کیا ان کو بھی جہنم میں ڈالا جائے گا۔ لہٰذا ہم ان کی عبادت کرتے ہوئے بہرحال نصاریٰ کی حالت سے بہتر ہیں جو عیسیٰ ؑ کی بندگی کرتے تھے۔ کیونکہ عیسیٰ ؑ بہرحال بشر تھے۔ اور ہمارے معبود فرشتے ہیں۔

اس سورت میں ان کے اس غلط مبحث کا بھی جواب دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین نے ان کے بعد جو ان کی بندگی شروع کی ہے تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے ۔ وہ بری الذمہ ہیں ۔

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ (٥٧) وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (٥٨) اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَ جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (٥٩) (٤٣: ٥٧ تا ٥٩) "اور جونہی ابن مریم کی مثال دی گئی، تمہاری قوم کے لوگوں نے اس پر غل مچا دیا اور لگے کہنے کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ؟ یہ مثال وہ تمہارے سامنے کج بحثی کے لیے لاتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ ۔ ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے لیے اپنی قدرت کا نمونہ بنا دیا ۔

ان کا زعم یہ تھا کہ وہ ملت ابراہیمی کے پیروکار ہیں ۔ لہٰذا وہ دوسرے اہل کتاب سے زیادہ ہدایت پر ہیں اور عقائد کے اعتبار سے افضل ہیں ۔ حالانکہ وہ اس بت پرستانہ جاہلیت میں گم کردہ راہ تھے ۔

چنانچہ اس سورت میں حضرت ابراہیم کی حقیقت بتائی گئی اور بتایا کہ ابراہیم کی ملت تو خالص توحید کی ملت تھی ۔ کلمہ توحید تو ابراہیم علیہ السلام کا کلمہ ہے ' انہی کی وراثت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اسی کلمے کو لے کر آئے ہیں لیکن انہوں نے اس کلمے کا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال اس طرح نہیں کیا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور ملت کو کرنا چاہیے تھا ۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ (٢٦) اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ (٢٧) وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (٢٨) بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ (٢٩) وَ لَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ (٣٠) (٤٣: ٢٦ تا ٣٠) "یاد کرو وہ وقت جب ابراہیم نے اپنے باپ اور قوم سے کہا تھا کہ تم جن کی بندگی کرتے ہو' میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ میرا تعلق صرف اس سے ہے جس نے مجھے پیدا کیا' وہی میری رہنمائی کرے گا" ۔ اور ابراہیم یہی کلمہ اپنے پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گیا تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں ۔ بلکہ میں انہیں اور ان کے باپ دادا کو متاع حیات دیتا رہا یہاں تک کہ ان کے پاس حق اور کھول کھول کر بیان کرنے والا رسول آگیا مگر جب وہ حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں" ۔

وہ اس حکمت کو نہ سمجھ سکے کہ اللہ نے کیوں رسول کو منتخب کر کے بھیجا ۔ ان کی نظروں میں زمین ہی کی معمولی کھوٹی

اور بے قیمت قدریں بیٹھ گئیں اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دنیا پرستوں میں سے ایک آدمی ہی سمجھا۔

اس سلسلے میں ایک رسول کے بارے میں ان کے اقوال' ان کے تصورات اور ان کی سوچ کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں اور ان کو بتایا گیا کہ رسالت کے بارے میں حقیقی سوچ کیا ہے اور یہ کہ رسول کے متعلق وہ جو سوچتے ہیں وہ محض دنیا داری کی سوچ ہے۔ بہت ہی گھٹیا قسم کی دنیا داری۔ اسلامی اقدار پر مبنی سوچ کی ایک جھلک ان کو دکھائی جاتی ہے۔

وَ قَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۳۱) اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۳۲) وَ لَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ (۳۳) وَ لِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ (۳۴) وَ زُخْرُفًا وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ (۳۵) (۴۳ : ۳۱ تا ۳۵) "کہتے ہیں کہ یہ قرآن دونوں بڑے شہروں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟ کیا تیرے رب کی رحمت یہ تقسیم کرتے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں ان کی گزر بسر کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے۔ اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں اور تیرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) اس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو سمیٹ رہے ہیں۔

یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم خدائے رحمٰن سے کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں اور ان کی سیڑھیاں جن سے وہ اپنے بالاخانوں پر چڑھتے ہیں اور ان کے دروازے اور ان کے تخت جن پر وہ تکیے لگائے بیٹھے ہیں سب چاندی اور سونے کے بنا دیتے۔ یہ تو محض حیات دنیا کی متاع ہے اور آخرت تیرے رب کے ہاں صرف متقین کے لیے ہے"۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ اور فرعون کے قصے کی ایک کڑی آتی ہے' فرعون بھی اسی طرح کی قدروں پر مست ہے۔ اللہ کے مقابلے میں کبر کرتا ہے۔ جن جھوٹی قدروں پر فرعون نے فخر کیا' ایسے فخر کرنے والوں کا انتظار بہت برا انجام کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۶) فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ (۴۷) وَ مَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا وَ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۴۸) وَ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَ السّٰحِرُ

ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ (۴۹) فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا
هُمْ يَنْكُثُوْنَ (۵۰) وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ
الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱) اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ وَّلَا
يَكَادُ يُبِيْنُ (۵۲) فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ
(۵۳) فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ (۵۴) فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا
انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۵۵) فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ (۵۶)

(۴۳: ۴۶ تا ۵۶) ”ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کے پاس بھیجا اور اس نے جاکر کہا کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں۔ پھر جب اس نے ہماری نشانیاں ان کے سامنے پیش کیں تو وہ ٹھٹھے مارنے لگے۔ ہم ایک پر ایک ایسی نشانی ان کو دکھاتے چلے گئے جو پہلے سے بڑھ چڑھ کر تھی اور ہم نے ان کو عذاب میں دھر لیا کہ وہ اپنی روش سے باز آئیں۔ ہر عذاب کے موقع پر وہ کہتے :اے ساحر اپنے رب کی طرف سے جو منصب تجھے حاصل ہے' اس کی بنا پر ہمارے لیے اس سے دعا کر' ہم ضرور راہ راست پر آجائیں گے 'مگر جونہی کہ ہم ان پر سے عذاب ہٹا دیتے وہ اپنی بات سے پھر جاتے تھے۔ ایک دن فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا ”لوگو کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟ میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل و حقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا؟ کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں نہ آیا۔ اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی۔ در حقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ۔ آخر کار جب انہوں نے ہمیں غضبناک کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کو اکٹھا غرق کر دیا اور بعد والوں کے لیے پیش رو اور نمونہ عبرت بناکر رکھ دیا“۔ غرض اس پوری سورت میں بت پرستی 'نظریاتی بگاڑ' دنیا کی جھوٹی قدروں پر بات کی گئی ہے اور بھرپور تنقید۔ اس سورت کے تین اسباق ہیں جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا جن کا اکثر مواد ہم نے یہاں دے دیا ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۲۳ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۲۵

---

سُوْرَةُ الزُّخْرُفِ (٤٣) مَكِّيَّةٌ (٦٣)
آيَاتُهَا ٨٩ رُكُوْعَاتُهَا ٧

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ۝١ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝٢ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝٣ وَاِنَّهٗ
فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝٤ اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ
قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ۝٥ وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ۝٦ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ
نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝٧ فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّمَضٰى مَثَلُ
الْاَوَّلِيْنَ ۝٨

اللہ کے نام سے جو بے انتا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ح۔م۔ قسم ہے اس واضح کتاب کی کہ ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم لوگ اسے سمجھو۔ اور در حقیقت یہ ام الکتب میں ثبت ہے ' ہمارے ہاں بڑی بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز کتاب۔ اب کیا ہم تم سے بیزار ہو کر یہ درس نصیحت تمہارے ہاں بھیجنا چھوڑ دیں صرف اس لیے کہ تم حد سے گزرے ہوئے ہو؟ پہلے گزری ہوئی قوموں میں بھی بارہا ہم نے نبی بھیجے ہیں 'کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی نبی ان کے ہاں آیا ہو اور انہوں نے اس کا مذاق نہ اڑایا ہو۔ پھر جو لوگ ان سے بدرجہا زیادہ طاقتور تھے 'انہیں ہم نے ہلاک کر دیا' پچھلی قوموں کی مثالیں گزر چکی ہیں"۔

سورت کا آغاز دو حروف حا اور میم سے ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد۔

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ( ٤٣ : ٢ ) کا عطف ہے۔ اللہ حا اور میم کی بھی قسم اٹھاتا ہے اور کتاب مبین کی بھی۔

حا اور میم بھی اسی کتاب کے حروف ہیں۔ یا کتاب مبین ان دو حروف کے جنس سے ہے۔ غرض یہ کتاب مبین حروف تہجی کے اعتبار سے ایسے ہی حروف تہجی سے مرکب ہے۔ یہ دو حروف اسی طرح کے حروف ہیں جس طرح کے حروف انسانی زبانوں میں ہوتے ہیں۔ یہ خالق کائنات کی نشانیاں ہیں جس نے انسان کو اس انداز سے پیدا کیا اور اس کو اس قسم کی آوازیں دیں۔ قرآن کے ساتھ ان حروف کا جب ذکر آتا ہے کہ تو اس کے بے شمار معانی اور بے شمار دلالات و اشارات ہوتے ہیں۔ قسم اس بات پر اٹھائی جاتی ہے کہ ہم نے قرآن مجید کو اس انداز پر بنایا عربی زبان میں۔

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۴۳ : ۳) ”ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم لوگ اسے سمجھو“۔ جب قرآن ان کی زبان میں ہے اور وہ اس کے معنی جانتے بھی ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ قرآن تو وحی الٰہی ہے لیکن اللہ نے اسے عربی زبان میں منتقل کیا کیونکہ قرآن کی دعوت کے لیے اللہ نے آغاز میں عربی معاشرے کو چنا اور سب سے پہلے اس دعوت کے حاملین عرب ہی رہے۔ اس حکمت کی بنا پر جس کی طرف ہم نے سورۂ شوریٰ میں اشارات کیے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس امانت اور اس زبان کی صلاحیتوں کو اچھی طرح جانتا تھا کہ امت عربیہ اور لسان عربی اس دعوت کو دوسری اقوام تک اچھی طرح منتقل کر سکتے ہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ اپنی رسالت کی امانت کو کہاں رکھے اور کہاں نہ رکھے۔

اس کے بعد یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس قرآن کا مقام و مرتبہ اللہ ازلی اور ابدی ذات کے ہاں کیا ہے؟

وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ (۴۳ : ۴) ”اور در حقیقت یہ ام الکتب میں ثبت ہے اور ہمارے ہاں بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز کتاب ہے“۔ ام الکتاب کیا ہے، اس کے لفظی معنوں میں ہم نہیں پڑتے کہ اس سے مراد لوح محفوظ ہے یا اللہ کا علم ازلی ہے کیونکہ ہمارے ادراک میں نہ تو لوح محفوظ کا۔ اور نہ اللہ کے علم ازلی کا پورا تصور ہے البتہ اس آیت سے ہمارے علم میں ایک اصولی حقیقت آتی ہے۔ جب ہم یہ آیت پڑھتے ہیں۔

وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ (۴۳ : ۴) ”یہ در حقیقت ام الکتب میں ثبت ہے اور ہمارے ہاں بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز کتاب ہے“۔ تو اس سے ہمارے ذہن میں یہ بات واضح طور پر آ جاتی ہے کہ اللہ کے علم میں اس کتاب کی بڑی وقعت ہے اور اسے بہت ہی اہم دستاویز سمجھا جاتا ہے۔ بس یہ اصولی اور کلی بات ہمارے لیے کافی ہے کہ قرآن ایک بلند مرتبت کتاب ہے اور حکیم ہے یعنی حکمت والی کتاب ہے۔ یہ دونوں صفات اس کتاب کو ایک ایسی شخصیت دیتی ہیں جس طرح زندہ انسان ہوتا ہے یعنی بلند اور حکیم کا۔ اور بالکل یہ بات اسی طرح ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے گویا اس میں زندگی ہے اور اس میں زندہ شخصیت کی صفات ہیں یہ کہ جو ارواح اس کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرتی ہیں یہ ان کے ہمقدم چلتی ہے۔ اور یہ اپنی بلندی اور حکمت کے بدولت انسانیت پر نگران ہے، اس کو ہدایت دیتی ہے، اس کی قیادت کرتی ہے، اپنی طبیعت اور اپنے خصائص کے مطابق، اور یہ انسانی فہم و ادراک میں وہ اقدار اور وہ تصورات بٹھاتی ہے جن پر ان دو صفات علی اور حکیم کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس حقیقت کو فیصلہ کن انداز میں طے کرنے کے بعد اب اس قوم کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے جن کی زبان

میں یہ علی و حکیم کتاب اتری ہے کہ اللہ نے ان کو کتنا بڑا اعزاز بخشا ہے اور یہ لوگ پھر بھی للہ کے اس فضل و کرم کو نہیں سمجھتے۔ اور پھر بھی اس خزانہ حکمت سے منہ موڑتے ہیں اور اس کی توہین کرتے ہیں۔ ان حالات میں یہ تو اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے پاس آنے والی اس حکمت و ہدایت پر مشتمل کتاب کا نزول ہی بند کر دیں' چنانچہ یہاں ان کی اس زیادتی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور سوالیہ انداز میں پوچھا جاتا ہے کہ کیا تمہاری اس زیادتی اور حد سے گزر کر زیادتی کی وجہ سے اس سرچشمہ ہدایت دانائی کو بند کر دیں۔

اَفَنَضۡرِبُ عَنۡكُمُ الذِّكۡرَ صَفۡحًا اَنۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّسۡرِفِيۡنَ (۴۳ : ۵) "اب کیا ہم تم سے بیزار ہو کر یہ درس نصیحت تمہارے ہاں بھیجنا بند کر دیں۔ صرف اس لیے کہ تم حد سے گزرے ہوئے ہو۔ یہ بات نہایت ہی عجیب لگتی ہے اور آیندہ بھی عجیب رہے گی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی قوم کو اس قدر اہمیت دی کہ اس کے لیے اس نے کتاب بھیجی۔ ان کی زبان میں بھیجی۔ اس کتاب نے ان کی فطرت کے عین مطابق وہ باتیں کیں جو ان کے دل میں تھیں' ان کی زندگی کی گہرائیوں تک چلی گئی' اور ان کے لیے ہدایت کا راستہ بیان کیا' پہلی اقوام کے عبرت آموز قصے بیان کیے' گزشتہ اقوام کے ساتھ سنت الہیہ نے جو سلوک کیا وہ بیان کیا گیا' لیکن اس نے اس کتاب کو نظرانداز کر دیا اور اعراض کر لیا! پھر بھی اللہ ان لوگوں کی فکر کرتا ہے حالانکہ وہ نہایت بلند' نہایت عظیم اور غنی بادشاہ ہے۔

اس آیت میں در حقیقت ایک خوفناک تہدید ہے کہ اگر اللہ چاہے تو اس سرچشمہ فیض و حکمت کو ختم کر دے اور تم پر ہونے والی اس مہربانی کو بند کر دے۔ کیونکہ تم اس عظیم حکیمانہ اور بلند مرتبہ کتاب کے ساتھ بہت ہی برا سلوک کر رہے ہو' اور تم سے ان اقوام جیسا سلوک کرے جو تم سے پہلے گزری ہیں۔

وَكَمۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ نَّبِىٍّ فِى الۡاَوَّلِيۡنَ (۴۳ : ۶) وَمَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ نَّبِىٍّ اِلَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ (۴۳ : ۷) فَاَهۡلَكۡنَاۤ اَشَدَّ مِنۡهُمۡ بَطۡشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الۡاَوَّلِيۡنَ (۴۳ : ۸)

"پہلے گزری ہوئی قوموں میں بھی بارہا ہم نے نبی بھیجے ہیں' کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی نبی ان کے ہاں آیا ہو اور انہوں نے اس کا مذاق نہ اڑایا ہو۔ پھر جو لوگ ان سے بدرجہا زیادہ طاقتور تھے' انہیں ہم نے ہلاک کر دیا' پچھلی قوموں کی مثالیں گزر چکی ہیں"۔ وہ اب اور کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں' اللہ نے ایسے رویہ پر تو ان سے زیادہ قوت گرفت رکھنے والی اقوام کو ہلاک کیا ہے جو انہی کی طرح رسولوں اور کتابوں کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔ کئی مثالیں موجود ہیں۔

بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کے وجود کا اعتراف کرتے تھے۔ یہ بھی اعتراف کرتے تھے کہ اللہ ہی ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا' لیکن ان اعترافات کے بعد پھر ان کے قدرتی نتائج کو قبول نہ کرتے تھے اور اپنی زندگی کے امور میں صرف اللہ کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو شریک کرتے تھے اور اللہ کے پیدا کردہ بعض جانوروں کو ان الہوں کے لیے مخصوص کرتے تھے اور یہ عقیدہ انہوں نے گھڑ لیا تھا کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور ملائکہ کے بت بنا کر یہ ان کو پوجتے تھے۔

قرآن مجید یہاں ان کے اعترافات کو پیش کر کے پھر اس کے فطری نتائج مرتب کرتا ہے اور پھر ان کو فطری استدلال

کے سامنے کھڑا کرتا ہے جس سے وہ بھاگتے تھے۔ قرآن کریم ان کے سامنے اللہ کی مخلوقات میں سے حیوانات اور کشتی کو بطور مثال پیش فرماتا ہے کہ ان میں تمہارے لیے کتنے فائدے ہیں اور اس کے مقابلے میں تمہارا رویہ کیا ہونا چاہئے مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کے بعد دوسرے پیراگراف میں یہ بتایا گیا کہ کیا جواز ہے کہ تم نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ﴿٩﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَجَعَلَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٠﴾ وَالَّذِي نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَنْشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَيْتًا كَذٰلِكَ تُخْرَجُونَ ﴿١١﴾ وَالَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ ﴿١٢﴾ لِتَسْتَوُوا عَلٰى ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُولُوا سُبْحٰنَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ ﴿١٣﴾ وَإِنَّا إِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ ﴿١٤﴾

”اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا تو یہ خود کہیں گے کہ ”انہیں اسی زبردست علیم ہستی نے پیدا کیا ہے“۔ وہی نا جس نے تمہارے لیے اس زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمہاری خاطر راستے بنا دیئے تاکہ تم اپنی منزل مقصود کی راہ پا سکو۔ جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو جلا اٹھایا، اسی طرح ایک روز تم زمین سے برآمد کیے جاؤ گے۔ وہی جس نے یہ تمام جوڑے پیدا کیے، اور جس نے تمہارے لیے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا تاکہ ان کی پشت پر چڑھو اور جب ان پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو اور کہو کہ ”پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ورنہ ہم انہیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے، اور ایک روز ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے“۔

عربوں کے اندر خدا پر یقین تھا، وہ ملت ابراہیمی پر تھے۔ لیکن عربوں کے اندر ملت ابراہیمی کی بگڑی ہوئی شکل رہ گئی تھی۔ اس میں بہت سی تبدیلیاں ہوگئی تھیں۔ توحید کی جگہ شرک اور دوسرے افسانے اس میں داخل ہوگئے تھے۔ بہرحال وجود باری کے وہ قائل تھے کیونکہ فطرت انسانی بہرحال اس کا انکار نہیں کر سکتی کہ ایک خالق ہے، جو اللہ ہے۔ کیونکہ کسی خالق کا انکار کوئی سلیم الفطرت انسان نہیں کر سکتا۔ اور کوئی معقول انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ عظیم اور ہولناک کائنات خالق کے بغیر پیدا ہوگئی۔ اس کائنات کو اللہ کے سوا کوئی اور پیدا بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اس عظیم کائنات کا خالق تو اس سے بھی عظیم اور طاقتور ہونا چاہئے لیکن وہ یہاں آکر رک جاتے تھے اور خود اپنے عقیدے کے لازمی تقاضوں کو تسلیم نہ کرتے تھے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ (۴۳ : ۹) ”اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ تو یہ خود کہیں گے کہ انہیں اسی زبردست علیم ہستی نے پیدا کیا ہے“۔ یہ

بات واضح ہے کہ یہ دو صفات عزیز و زبر دست اور علیم یہ کفار کا قول نہ تھا۔ وہ تو صرف اسی قدر مانتے تھے کہ وہ اللہ ہے۔ وہ اللہ کی وہ صفات نہ مانتے تھے جو اسلام اور قرآن نے پیش کیں۔ ایسی صفات جو ان کی زندگی پر مثبت اثر ڈالیں۔ جو ان کی زندگی اور اس کائنات کو بیک وقت عملاً چلائیں۔ وہ اللہ کو بس اس کائنات کا خالق مانتے تھے۔ خود اپنا خالق بھی اللہ کو مانتے تھے لیکن زندگی کو عملاً چلانے کے لیے پھر انہوں نے کچھ دوسری ہستیاں بنا رکھی تھیں۔ کیونکہ اللہ کی ایسی صفات سے متعارف نہ تھے جن کے بعد پھر انہیں شرک کی ضرورت نہ پڑے۔ اور عقیدہ شرک انہیں پوچ اور بے وقعت نظر آئے۔

قرآن مجید یہاں ان کو یہی تعلیم دیتا ہے کہ جس خدا کو تم خالق السموات والارض سمجھتے ہو۔ وہ العزیز بھی ہے اور العلیم بھی ہے۔ وہ قادر بھی ہے' وہ علیم و عارف بھی ہے۔ چنانچہ اللہ ان کے اس اعتراف کو بنیاد بنا کر ان کو درج ذیل اعترافات پر مجبور کرتا ہے۔ غرض ان کو ایک قدم آگے بڑھا کر ان کو یہ بتاتا ہے کہ تخلیق کے بعد اللہ نے تم پر یہ فضل کیا :

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَھْدًا وَّجَعَلَ لَکُمْ فِیْھَا سُبُلًا لَّعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ

"وہی نا جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمہاری خاطر راستے بنا دیے تاکہ تم اپنی منزل کی راہ پا سکو"۔ (۴۳ : ۱۰) یہ حقیقت کہ اللہ نے انسان کے لیے اس زمین کو گہوارہ بنایا اسے ہر دور کے انسان نے اپنے حدود علم کے مطابق سمجھا ہے اور اس کی تصویر بنائی ہے۔ جن لوگوں نے پہلی مرتبہ اس کو سنا ہو گا' انہوں نے بھی یہ سمجھا ہو گا کہ اللہ نے زمین کو اس قابل بنایا کہ وہ ان کے قدموں کے نیچے چلنے کے لیے موزوں ہے۔ پھر وہ زراعت کے لیے موزوں ہے۔ پھر وہ زندگی اور نباتات کے لیے موزوں ہے لیکن آج ہم اس بات کو کہ زمین تمہارے لیے گہوارہ بنا دی گئی ذرا زیادہ وسعت اور گہرائی کے ساتھ سمجھ رہے ہیں۔ جس حد تک ہم نے اس زمین کے بارے میں معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اس کی بعید و قریب تاریخ کے بارے میں معلومات فراہم کر لی ہیں بشرطیکہ ہمارے اپنے علوم کے بارے میں جو نظریات قائم ہوتے ہیں وہ ہوں بھی درست اور ہم جو اندازے اور تخمینے لگاتے ہیں وہ صحیح ثابت ہو جائیں۔ ہم سے بعد میں آنے والی نسلیں ان کے بارے میں ہم سے بھی زیادہ سمجھیں گی۔ یوں اس آیت کا مفہوم وسعت اختیار کرتا جائے گا۔ جس قدر ہم علم میں آگے بڑھیں گے' علم و معرفت کی فتوحات کی وسعت کے ساتھ ساتھ اس آیت کے معانی بھی وسیع ہوتے جائیں گے اور یوں انسانی جہالت کا پردہ دور ترجاتا رہے گا۔

ہم آج جانتے ہیں کہ یہ زمین انسان کے لیے کس قدر اچھا گہوارہ بنائی گئی ہے اور اس کے اندر انسان اپنے لیے زندگی کی کس قدر مختلف راہیں تلاش کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کرۂ ارض مختلف مراحل سے گزر کر یہاں تک یعنی اپنی موجودہ حالت تک پہنچی ہے اور انسان کے لیے گہوارہ بنائی گئی ہے۔ ان مراحل میں سے ایک مرحلہ یہ تھا کہ اس پوری زمین کی سطح ایک سخت چٹان کی طرح تھی۔ اس کے بعد اس پر جگہ جگہ مٹی جمع ہوئی اور اس میں نباتات اگنا شروع ہوئے اور اس کی سطح پر جو ہائیڈروجن گیس اور آکسیجن گیس موجود تھی' ان کے ملاپ سے پانی وجود میں آگیا۔ پھر اپنی گردش محوری کے نتیجے میں اس کے دن کے اندر اس قدر معتدل حرارت پیدا ہوئی کہ وہ حیوانات کی زندگی کے لیے مناسب ہو گئی۔ اور اس کی رفتار گردش محوری کو یوں رکھا گیا کہ اس کی سطح پر چیزوں کا کھڑا رہنا ممکن ہوا۔ انسان مکانات اور دوسری چیزیں بکھر کر ہوا میں نہیں اڑ گئیں۔

پھر اللہ نے اس زمین کے اندر کشش ثقل پیدا کی ۔ یوں ہوا کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آگیا جس کے اندر زندگی ممکن ہوئی ۔ اگر اس زمین کے اردگرد پائی جانے والی ہوا زمین کی جاذبیت سے چھوٹ جائے تو زمین پر کسی چیز کا زندہ رہنا ممکن نہ ہو' دوسرے اجرام فلکی کی سطح پر چونکہ جاذبیت نہیں ہے یا اس سے کمزور ہے تو وہاں حیات ممکن نہیں ہو سکی ۔ ان کرات سے ہوا چلی گئی ۔ مثلاً چاند کے اوپر کوئی ہوا نہیں ہے ۔ یہ جاذبیت اس قدر متوازن ہے کہ حرکت زمین کی وجہ سے اشیاء کو دور پھینکنے کا جو عمل پیدا ہوتا ہے اس کے اندر یہ توازن پیدا کر دیتی ہے ۔ یوں تمام اشیاء اور زندہ چیزیں بکھرنے اور اڑ جانے کے عمل سے محفوظ ہیں ۔ اور یہاں زمین کی سطح پر ان کا ٹھہرنا اور چلنا بالکل ممکن ہے ۔ اگر یہ جاذبیت موجودہ مقدار سے بڑھ جائے تو تمام زندہ اور مردہ چیزیں زمین کے ساتھ لپٹ جائیں ۔ انسانوں کے لیے قدم اٹھانا ممکن نہ ہو' یا بہت مشکل ہو اور اس کے لیے بہت ہی قوت صرف کرنی پڑے اور دوسری جانب سے انسان پر ہوا کا دباؤ بڑھ جائے تو انسان کو زمین کے ساتھ چپکا دے ۔ جس طرح ہم مچھروں اور مکھیوں کو پریشر کے ارتکاز سے ہاتھ لگائے بغیر ہلاک کر دیتے ہیں ۔ اور اگر یہ دباؤ اس سے کم ہو جائے جو ہے تو ہمارا سینہ اور ہماری شریانیں خون کے دباؤ کی وجہ سے پھٹ جائیں ۔

اور زمین کو گہوارہ بنانے اور اس کے اوپر راستوں کو ہموار کرنے کے سلسلے میں ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خالق ارض وسما نے اس زمین کے اندر ایسی موافق قوتیں ودیعت فرمائی ہیں جو سب کی سب مل کر اس زمین پر زندگی کو سہل بناتی ہیں ۔ اگر ان موافق حیات یا ممد حیات قوتوں میں سے ایک قوت بھی ناپید ہو جائے یا اس میں خلل واقع ہو جائے تو اس کرۂ ارض پر زندگی محال ہو جائے ۔ بعض تو وہ ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ۔ اور بعض اور ہیں ۔ مثلاً اللہ نے اس کرۂ ارض پر پانیوں کی مقدار کو اس قدر رکھا ہے جو سمندروں' دریاؤں کی شکل میں زمین کی سطح کے اوپر ہونے والے تمام مسموم گیسوں کو چوس لیتے ہیں اور زمین کی فضا کو آلودگی سے اس قدر صاف رکھا جاتا ہے کہ یہاں زندگی کا وجود ممکن ہوتا ہے ۔ پھر اللہ نے نباتات کو آکسیجن کے درمیان توازن کے قیام کا ذریعہ بنایا ۔ وہ آکسیجن جس کو انسان سانس کے ذریعہ لیتا ہے اور اس آکسیجن کے درمیان جس کو نباتات چھوڑتے ہیں ۔ اگر یہ توازن نہ ہوتا تو ایک عرصہ کے بعد انسان دم گھٹ کر مرجاتا ۔

یہ اور اس قسم کے دوسرے مفہوم و معانی اس آیت میں شامل ہیں ۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ الْاَرْضَ مَھْدًا وَّجَعَلَ لَکُمْ فِیْھَا سُبُلًا (۴۳ : ۱۰) "جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمہاری خاطر راستے بنائے" ۔ ہر دم اور ہر روز اس کے نئے نئے معانی منکشف ہو رہے ہیں اور یہ معانی اور مدلولات ان معانی پر اضافہ ہوتے جاتے ہیں جو اس آیت سے اس کے اول مخاطبین کرام سمجھتے تھے ۔ اور یہ سب اللہ حاکم سموات والارض کے علم کو بھی ظاہر کرتے ہیں اور اس کی قدرت کے بھی مظاہر ہیں ۔ جو زبردست ہے اور نہایت حکمت والا ہے ۔ یہ سب معانی ایک شعور رکھنے والے دل کو یہ دکھاتے ہیں کہ ایک خالق اور مدبر قوت موجود ہے جس قدر انسان کی نظر آگے بڑھتی ہے اور اس کی سوچ گہرائی تک جاتی ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ کوئی ایسی مخلوق نہیں جو آوارہ چھوڑ دی گئی ہو' اور یہ کہ اس نے کسی کے آگے جواب نہیں دینا ہے بلکہ انسان یہ یقین کر لیتا ہے کہ ایک زبردست قوت والے مدبر نے ان کو پکڑ رکھا ہے اور وہ اس کے تمام امور کا والی ہے' زندگی میں بھی' زندگی سے پہلے بھی اور زندگی کے بعد بھی ۔

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۴۳ : ۱۰) "تاکہ تم اپنی منزل مقصود پاسکو"۔ اس کائنات پر اس طرح گہرائی کے ساتھ غور کرنا' اور اس کے اندر پائے جانے والے نوامیس فطرت کا گہرا مطالعہ اس بات کا ضامن ہے کہ انسان کا دل و دماغ خالق کائنات کی طرف راہ لے۔ جس نے اس کائنات کے اندر اس قدر گہری تنظیم اور توازن رکھا ہے۔

زندگی کی نشوونما اور اس میں زندوں کے لیے سہولیات اور زمین کو ان کے لیے گہوارہ بنانے اور اس میں انسانوں کے لیے راستے بنانے کے بعد اب ایک قدم اور آگے :

وَالَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ

(۴۳ : ۱۱) "جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعہ مردہ زمین کو جلا اٹھایا اسی طرح ایک روز تم زمین سے برآمد کیے جاؤ گے"۔ وہ پانی جو آسمانوں سے نازل کیا جاتا ہے اسے تو ہر انسان دیکھتا ہے اور جانتا ہے لیکن اس منظر کو اکثر لوگ یونہی دیکھ کر گزر جاتے ہیں اور اس پر انہیں کوئی تعجب نہیں ہوتا اور اس کے احساس و شعور میں کوئی ارتعاش پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ وہ ہر وقت اور بسااوقات نزول باران رحمت دیکھتے رہے ہیں لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بارش کے قطروں کو نہایت ہی محبت' نہایت ہی دلچسپی اور نہایت مسرت سے دیکھتے تھے' اس لئے کہ آپ کو یہ پختہ شعور حاصل تھا کہ یہ اللہ کی طرف سے آ رہے ہیں اس لئے کہ آپ کا زندہ و بیدار قلب اچھی طرح دیکھ رہا تھا کہ یہ قطرے اللہ کی صفت کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ آپ ان میں دست قدرت کی کاریگری دیکھ رہے تھے۔ ان قطروں پر اس دل کو اسی طرح دیکھنا چاہئے جو اللہ تک پہنچا ہوا ہو اور اس کائنات کے اندر اللہ کے جاری کردہ نوامیس فطرت کو جانتا ہو۔ کیونکہ بارش کے یہ قطرے انہی قوانین قدرت کے نتائج ہیں۔ یہ نوامیس فطرت اس کائنات میں اللہ کی نظروں کے تحت اور اللہ کے دست قدرت کے ذریعہ ایک ایک قطرہ ہو کر گرتے ہیں۔ اس حقیقت کی ضرورت اور اس کے اثرات میں یہ سوچ کی نہیں لا سکتی کہ یہ پانی دراصل بخارات تھے جو زمین سے اوپر فضا میں جاکر ٹھنڈے ہو گئے اور فضاؤں میں ان کے اندر اس قدر کثافت پیدا ہو گئی کہ بارش ہو گئی۔ سوال یہ ہے کہ آخر زمین کو کس نے پیدا کیا۔ یہاں پانی کس نے بنایا۔ پھر ان پر حرارت کس نے مسلط کی اور پانی کی ساخت کس نے اس طرح بنائی کہ وہ حرارت سے بخار بن جائے۔ پھر بخارات کے اندر یہ خاصیت کس نے رکھی کہ وہ اوپر جائیں؟ اور اوپر پھر کثیف ہو جائیں۔ پھر یہ خصائص کس نے رکھے۔ یہ بخارات بجلیوں سے بھی بھر جائیں جو آپس میں ملیں تو پانی نیچے گر جائے اور پھر بجلی کیا چیز ہے؟ غرض وہ تمام خصائص طبیعت کیا ہیں جن سے مل کر بارش بنتی ہے۔

سائنس پڑھ کر دراصل ہم اپنے احساس کے پردوں کو اس قدر کثیف بنا دیتے ہیں کہ اس کائنات کے عجائبات کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہوتا حالانکہ ہمیں چاہئے تو یہ ہے کہ سائنس کے ذریعہ ہم اپنے احساسات کو مزید تیز کر دیں' اس قدر تیز کہ دل خوف خدا سے کانپ اٹھیں۔

وَالَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ (۴۳ : ۱۱) "جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا"۔ یہ پانی ایک اندازے کے اندر مقدر اور موزوں ہے' نہ زیادہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو غرق کر دے' نہ اس قدر

کم ہوتا ہے کہ زمین خشک ہو کر زندگی کے قابل ہی نہ رہے ۔ ہم یہ عجیب توازن اور مقدار دیکھ رہے ہیں ۔ اور آج اسے اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ توازن زندگی کی ضروریات کے لیے ضروری ہے اور یہ ارادۂ الٰہیہ سے قائم ہوا۔

فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا (۴۳ : ۱۱) "اور اس کے ذریعہ مردہ زمین کو جلا اٹھایا" ۔ انشا سے مراد احیاء ہے اور ہر قسم کی زندگی پانی کے بعد آتی ہے کیونکہ اللہ نے ہر چیز کو پانی سے زندہ کیا۔

كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ (۴۳ : ۱۱) "اس طرح تم ایک روز زمین سے برآمد کیے جاؤ گے" ۔ جس نے پہلی مرتبہ زندہ کیا وہ دوبارہ بھی زندہ کر سکتا ہے ۔ جس نے زندہ چیزوں کو پہلی مرتبہ مردہ زمین سے نکالا' اس طرح وہی قیامت کے دن میدان حشر میں سب زندہ انسانوں کو اگا کر نکال لائے گا ۔ جب ابتداء ہو گئی تو اعادہ اور تکرار مشکل نہیں رہتا ۔ اس میں اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے ۔

پھر یہ جانور جن کو یہ لوگ تقسیم کر کے کچھ اللہ کو دیتے ہیں اور کچھ اللہ کے سوا دوسرے شریکوں کو' وہ تو اللہ نے اس لیے نہیں پیدا کیے کہ تم اس طرح کی تقسیم کرو' یہ تو اس لیے تخلیق کیے گئے ہیں کہ یہ لوگوں کے لیے نعمت خداوندی کا کام کریں ۔ لوگ ان پر اس طرح سوار ہوں جس طرح کشتیوں پر سوار ہوتے ہیں اور ان کی اس تسخیر پر اللہ کا شکر ادا کریں ۔ اور اللہ کے انعامات کے مقابلے میں شکریہ ادا کریں ۔

وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَ الْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ (۴۳ : ۱۲) لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَ تَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ (۴۳ : ۱۳) وَ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (۴۳ : ۱۴) "وہی جس نے یہ تمام جو ڑے پیدا کیے اور جس نے تمہارے لیے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا ۔ تاکہ تم ان کی پشت پر چڑھو اور جب ان پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو' اور کہو کہ "پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ۔ ورنہ ہم انہیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے ۔ اور ایک روز ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے" ۔

اللہ نے زندگی کے تسلسل کو زوجیت کے اصول پر رکھا ہے ۔ تمام زندہ اشیاء جوڑے جوڑے ہیں ۔ یہاں تک کہ پہلا خلیہ بھی اپنے ساتھ تذکیر زنانیت کے خصائص لیے ہوئے ہوتا ہے' بلکہ سائنسی تحقیقات نے یہ بتا دیا ہے کہ پوری کائنات کا دارومدار ازواج پر ہے ۔ اگر ہم یہ تسلیم کریں کہ کائنات کی پہلی اکائی ذرہ ہے ۔ جو منفی الیکٹرون اور مثبت پروٹون سے مرکب ہے تو یہ بھی جوڑا ہے اور طبیعی تحقیقات اسی نہج پر آگے جاری ہیں ۔

بہرحال زندگی میں زوجیت کا نظام بالکل ظاہر ہے اور یہ اللہ ہی ہے جس نے تمام جوڑے پیدا کیے خواہ انسانوں کے ہوں یا حیوانوں کے :

وَ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَ الْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ (۴۳ : ۱۲) "اور جس نے تمہارے لیے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا"۔ یہاں اشارہ اسی طرف ہے کہ تمہیں خلیفۃ اللہ فی الارض بنایا اور اس زمین کی تمام قوتیں اور طاقتیں تمہارے لیے مسخر کیں۔ اس کے بعد ان کو متوجہ کرتے ہیں کہ ان نعمتوں کا شکر لازم ہے۔ اس مرتبے کے آداب بجالانا لازم ہے۔ اور جب بھی نعمت سامنے آئے' منعم کو یاد کرو' تاکہ دل خالق سے جڑے رہیں۔ زندگی کی ہر حرکت اور ہر سکون میں۔

لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَ تَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ (۴۳ : ۱۳) "اور جب ان پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو' اور کہو کہ "پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا۔ ورنہ ہم انہیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے"۔ ہم تو اللہ کی نعمتوں میں سے کسی ایک نعمت کے مقابلے میں نعمت کا بدلہ نعمت سے نہیں دے سکتے۔ ہم تو نعمتوں کے مقابلے میں صرف شکر کر سکتے ہیں۔ پھر وہ یاد کریں کہ زمین پر سے اپنی خلافت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے بعد انہوں نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ اور وہ ان کو ان کے تمام اعمال پر جزا دے گا جو انہوں نے فریضہ خلافت سرانجام دینے کے سلسلے میں کیے اور یہاں ان پر انعامات کیے اور پوری دنیا کو ان کے لیے مسخر کیا۔

وَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (۴۳ : ۱۴) "اور ایک روز ہم نے اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے"۔ یہ ہے منعم حقیقی کے حوالے سے ایک مسلمان کا رویہ اور طرز عمل۔ اللہ اس کے بارے میں ہمیں یاد دہانی فرماتا ہے کہ جب بھی کسی نعمت سے لطف اندوز ہو جاؤ تو رب کا شکر ادا کرو۔ کیونکہ تم ہر وقت اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہو لیکن نعمت اور شکر نعمت بھول جاتے ہو۔

یہ اسلامی آداب جو اللہ کی نعمتوں کے استعمال کے وقت سکھائے گئے ہیں' یہ محض رسومات نہیں کہ رسماً یہ دعا پڑھ لی جائے جب بھی کوئی کسی سواری پر سوار ہو یا کشتی پر سوار ہو' یا محض منتر کی طرح عبارات نہیں کہ ان کو پڑھ لیا جائے بلکہ ان عبارات کے معانی کو سمجھ کر ان کا شعور اپنے دل میں پیدا کرنا چاہئے۔ اللہ کی ذات کا تصور' بندے اور خدا کے تعلق کا تصور اور اللہ کی ان تمام نعمتوں کا تصور جو ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی ہیں اور جن قوتوں کو اللہ نے ہمارے لیے مسخر کیا ہے ان کے بارے میں یہ زندہ تصور کہ یہ تو اللہ کے بہت بڑے انعامات ہیں جو انسان پر ہوئے ہیں۔ جن کا کوئی بدلہ انسان اللہ کو نہیں دے سکتا وہ اللہ کے فضل و کرم کا بدلہ دینے پر تو قادر ہی نہیں۔ اس لیے وہ نعمتوں کا شکر ادا کریں اور اللہ کے ہاں حاضر ہونے سے ہر وقت ڈرتے رہیں کہ حساب و کتاب میں مارے نہ جائیں۔ یہ سب احساسات اس بات کے ضامن ہیں کہ انسان کا دل ہروقت بیدار رہے' حساس رہے اور اللہ کی نگرانی کا ہروقت خیال کرے۔ اور کسی بھی وقت اس پر غفلت اور نسیان کی حالت طاری نہ ہو۔

--- ooo ---

اور اس کے بعد یہ بات کہ فرشتوں کو انہوں نے اللہ کی بیٹیاں قرار دیا۔ یہ ان کا زعم تھا اور حقیقت کے مطابق ان کا

افسانوی عقیدہ تھا۔

وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا ۚ إِنَّ الْإِنسَانَ ۱
لَكَفُورٌ مُّبِينٌ ﴿١٥﴾ أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَأَصْفَاكُم بِالْبَنِينَ ﴿١٦﴾ وَإِذَا بُشِّرَ ۱۵ ع
أَحَدُهُم بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمَٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿١٧﴾ أَوَ ۷
مَن يُنَشَّأُ فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ﴿١٨﴾ وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ
هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَٰنِ إِنَاثًا ۚ أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ ۚ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْأَلُونَ ﴿١٩﴾
وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمَٰنُ مَا عَبَدْنَاهُم ۗ مَّا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا
يَخْرُصُونَ ﴿٢٠﴾ أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا مِّن قَبْلِهِ فَهُم بِهِ مُسْتَمْسِكُونَ ﴿٢١﴾ بَلْ قَالُوا إِنَّا
وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّهْتَدُونَ ﴿٢٢﴾ وَكَذَٰلِكَ مَا أَرْسَلْنَا
مِن قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ
أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ ﴿٢٣﴾ قَالَ أَوَلَوْ جِئْتُكُم بِأَهْدَىٰ مِمَّا وَجَدتُّمْ
عَلَيْهِ آبَاءَكُمْ ۖ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ﴿٢٤﴾ فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۖ فَانظُرْ ۲
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿٢٥﴾ ع ۱ ع
۸

"(یہ سب کچھ جانتے اور مانتے ہوئے بھی) ان لوگوں نے اس کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جز بنا ڈالا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلا احسان فراموش ہے۔ کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لیے بیٹیاں انتخاب کیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا؟ اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اس خدائے رحمٰن کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کی ولادت کا مژدہ جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔ کیا اللہ کے حصے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پالی جاتی ہے اور بحث و حجت میں اپنا مدعا پوری طرح واضح بھی نہیں کر سکتی؟ انہوں نے فرشتوں کو' جو خدائے رحمٰن کے خاص بندے ہیں' عورتیں قرار دے لیا۔ کیا ان کے جسم کی ساخت انہوں نے دیکھی ہے؟ ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انہیں اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ یہ کہتے ہیں "اگر خدائے رحمٰن چاہتا (کہ ہم ان کی

عبادت نہ کریں ) تو ہم کبھی ان کو نہ پوجتے"۔ یہ اس معاملے کی حقیقت کو قطعی نہیں جانتے' محض تیر تکے لڑاتے ہیں۔ کیا ہم نے اس سے پہلے کوئی کتاب ان کو دی تھی جس کی سند (اپنی اس ملائکہ پرستی کے لیے) یہ اپنے پاس رکھتے ہوں؟ نہیں' بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی نذیر بھیجا' اس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہر نبی نے ان سے پوچھا' کیا تم اسی ڈگر پر چلے جاؤ گے خواہ میں تمہیں اس راستے سے زیادہ صحیح راستہ بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انہوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس دین کی طرف بلانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو' ہم اس کے کافر ہیں۔ آخر کار ہم نے ان کی خبر لے ڈالی اور دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا"۔

قرآن مجید اس افسانوی عقیدے پر اس طرح حملہ آور ہوتا ہے کہ اس کا ہر طرف سے محاصرہ کر لیا جاتا ہے اور ان کی اپنی دنیا میں ہر طرف سے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے یہاں تک ان کے ذہنوں تک اس کے پہنچنے کی ہر راہ بند کر دی جاتی ہے۔ اور پھر قرآنی استدلال خود ان کی منطق اور ان کے مسلمات کی اساس پر ہے اور یہ دلائل ان کی زندگی کے واقعات پر ہیں۔ نیز قرآن مجید ان کے سامنے اقوام سابقہ کی مثال بھی پیش کرتا ہے کہ جس نے بھی یہ عقیدہ اختیار کیا ہے ہم نے اس سے عبرت آموز انتقام لیا ہے۔

آغاز اس عقیدے کی کمزوری سے کیا جاتا ہے اور یہ کہ خدا کے نزدیک یہ ایک عظیم گناہ ہے اور صریح کفر ہے۔

وَ جَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ (۴۳ : ۱۵) "ان لوگوں نے اس کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جزء بنا ڈالا حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلا احسان فراموش ہے"۔ فرشتے تو اللہ کے بندے ہیں اور ان کو اللہ کی بیٹیاں کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ ان کو اللہ کی صفت عبودیت سے محروم کر دیا گیا۔ اور ان کو اللہ کی قریبی رشتہ داری کا مقام دے دیا گیا۔ حالانکہ وہ ساری مخلوقات کی طرح مخلوق ہیں۔ اور اللہ کے بندے ہیں۔ کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ ہم ان کو اللہ کی بندگی کے بجائے کوئی اور صفت دیں۔ اور ان کا اور ان کے رب کا کوئی اور تعلق جتائیں۔ جبکہ اللہ کی تمام مخلوقات اس کے بندے بندیاں ہیں۔ لہٰذا جو لوگ اس قسم کے دعوے کرتے ہیں وہ بلاشبہ کفر کا ارتکاب کرتے ہیں۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ (۴۳ : ۱۵) "بے شک انسان کھلا احسان فراموش ہے"۔

اس کے بعد ان کے خلاف ان کے عرف اور ان کی ذہنیت سے دلیل دی جاتی ہے اور اس طرح یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ ان کا دعویٰ کس قدر غلط اور اللہ کے حق میں کس قدر توہین آمیز ہے کہ تم فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے ہو۔

اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّ اَصْفٰكُمْ بِالْبَنِيْنَ (۴۳ : ۱۶) "کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لیے بیٹیاں انتخاب کیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا؟"۔ اگر اللہ نے اولاد پیدا ہی کرنی تھی تو یہ کیسے ہوا کہ خود تو بیٹیاں پیدا کیں اور تم کو بیٹوں سے نوازا۔ اور کیا ان کے لیے ایسی بات کہنا مناسب ہے کہ خود وہ بیٹی پیدا ہونے سے بہت سخت کبیدہ

خاطر ہوتے ہیں ۔

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ

( ۴۳ : ۱۷ ) "اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اس خدائے رحمٰن کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کی ولادت کا مژدہ جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے" ۔ کیا ادب ' احترام اور انسانیت کا تقاضا یہ نہ تھا کہ جس اولاد کی پیدائش سے وہ خود کبیدہ خاطر ہوتے ہیں اس کی نسبت رحمٰن کی طرف نہ کریں ۔ خود تو یہ لوگ لڑکیاں ہونے پر اس قدر خفا ہوتے ہیں کہ چہرے سیاہ ہو جاتے ہیں اور کسی کو منہ نہیں دکھاتے اور ولادت کو چھپاتے پھرتے ہیں اور قریب ہوتا ہے کہ اس غم کی وجہ سے مر ہی جائیں ۔ کیا وہ کمزور مخلوق جو زیورات میں پلتی ہے اور نہایت ہی ناز اور نخرے میں زندہ رہتی ہے اور اپنا مافی الضمیر بھی پیش نہیں کر سکتی اور نہ جنگ و قتال میں حصہ لیتی ہے ' اس کی نسبت خدا کی طرف کرتے ہیں ' جبکہ خود اپنے لیے ایسی اولاد چاہتے ہیں جو تیز و طرار ہو اور جنگ کے موقعے پر گھوڑ سوار ہو ۔

غرض قرآن یہاں ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر بحث کرتا ہے اور ان کو شرمندہ کرتا ہے کہ جس اولاد کو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے ہو وہ اللہ کے لیے پسند کرتے ہو ۔ اگر تم نے یہ حماقت کرنی ہی تھی تو تم اللہ کے لیے ایسی نسبت کرتے جسے تم خود بھی اپنے لیے پسند کرتے ہو اگر یہ کفر تم نے کرنا ہی تھا ۔ اب ان کے اس افسانوی عقیدے کو اس دوسرے زاویہ سے گھیرا جاتا ہے ۔ دعویٰ یہ ہے کہ فرشتے لڑکیاں ہیں ۔ آخر کس بنیاد پر وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں ۔

وَ جَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَ يُسْئَلُوْنَ ( ۴۳ : ۱۹ ) "انہوں نے فرشتوں کو جو خدائے رحمٰن کے خاص بندے ہیں ' عورتیں قرار دیا کیا ان کے جسم کی ساخت انہوں نے دیکھی ہے ۔ ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انہیں اس کی جوابدہی کرنی ہو گی" ۔ کیا جب فرشتے پیدا کیے جا رہے تھے تو یہ لوگ وہاں موجود تھے کہ وہ بیٹیاں ہیں کیونکہ جو شخص ایک دعویٰ کرتا ہے اس کے پاس چشم دید شہادت ہونی چاہئے جو اس کے دعوے کو ثابت کرے ۔ وہ یہ دعویٰ تو نہ کرتے تھے اور نہ کر سکتے تھے کہ انہوں نے فرشتوں کے جسم کی ساخت دیکھی ہے ۔ لیکن باوجود اس کے کہ انہوں نے یہ ساخت نہیں دیکھی پھر بھی یہ دعویٰ کرتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں لہٰذا اب اس جھوٹی شہادت کے نتائج برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں ۔

سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَ يُسْئَلُوْنَ ( ۴۳ : ۱۹ ) "ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انہیں اس کی جواب دہی کرنی ہو گی" ۔

اس کے بعد ان کی اس افترا پردازی پر مزید بحث کی جاتی ہے اور اس کے لیے وہ جو جھوٹے دلائل لاتے تھے ان کا رد کیا جاتا ہے ۔

وَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ

"وہ کہتے ہیں کہ اگر خدائے رحمٰن چاہتا تو ہم کبھی ان کو نہ پوجتے' یہ اس معاملے کی حقیقت کو قطعی نہیں جانتے ۔ محض تیر تکے لڑاتے ہیں"۔ جب ان کو قوی دلائل کے ذریعہ سے ہر طرف سے گھیرا جاتا ہے ۔ اور ان کا یہ افسانوی عقیدہ ان کے سامنے تہس نہس ہو جاتا ہے تو پھر وہ نظریہ مشیت الٰہی کا سہارا لیتے ہیں یہ کہ اللہ دراصل فرشتوں کی عبادت پر خوش ہے ۔ اگر اللہ راضی نہ ہوتا تو ان کے لیے یہ عبادت کرنا ممکن ہی نہ ہوتا ۔ اللہ سختی سے ہمیں منع کر دیتا ۔

یہ دراصل ایک دھوکہ ہے' یہ درست ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی مشیت سے واقع ہوتی ہے لیکن اللہ کی مشیت کے دائرے میں تو یہ بات بھی ہے کہ انسان ہدایت بھی لے سکتا ہے اور گمراہی کا راستہ بھی لے سکتا ہے اور اللہ نے انسان پر یہ فریضہ قرار دیا ہے کہ وہ ہدایت اختیار کرے اور اس پر اللہ راضی ہوتا ہے ۔ اور اگر انسان گمراہ اور کافر ہو تو اللہ ناراض ہوتا ہے ۔ اگرچہ اللہ کی مشیت نے اسے ہدایت و گمراہی دونوں کے قابل بنایا ہے ۔

وہ مشیت الٰہیہ کے نظریہ سے دھوکہ دیتے ہیں ۔ خود ان کا بھی یہ عقیدہ نہیں ہے کہ اللہ نے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ لوگ فرشتوں کی پوجا کریں ۔ یہ یقین وہ تو نہیں رکھتے ۔

مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (۴۳ : ۲۰) "یہ اس معاملے کی حقیقت کو نہیں جانتے محض تیر تکے اڑاتے ہیں"۔ اور اوہام و خرافات پر یقین کرتے ہیں ۔

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ (۴۳ : ۲۱) "کیا ہم نے ان سے پہلے کوئی کتاب ان کو دی تھی جس کی سند یہ اپنے پاس رکھتے ہیں"۔ اور ان کا دعویٰ اس کتاب کے نصوص پر مبنی ہے ۔ اور اپنی یہ عبادت انہوں نے اس کتاب سے اخذ کی ہے ۔ اور اس کے دلائل ان کے پاس موجود ہیں؟ یوں ان لوگوں کے لیے نقلی دلیل کی راہ بھی بند کر دی جاتی ہے ۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ عقائد و نظریات' واہی تباہی باتوں اور اندھیرے میں تیر تکے چلانے سے ثابت نہیں ہوتے' محض ظن و تخمین سے عقائد ثابت نہیں ہوتے ۔ عقائد تو اللہ کی کتابوں سے صریح طور پر ثابت ہوتے ہیں ۔

اب آخر میں بتایا جاتا ہے کہ ان کے پاس اپنے اس افسانوی عقیدے پر واحد دلیل جو مبنی شہادت پر مبنی نہیں ہے اور کسی کتاب سے بھی ماخوذ نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ :

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۴۳ : ۲۲)

"نہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں"۔ یہ ایک نہایت مضحکہ خیز استدلال ہے ۔ پھر دلیل کے اعتبار سے بھی یہ ایک گری ہوئی بات ہے ۔ یہ محض نقالی اور تقلید ہے اور اس پر کوئی غور و فکر انہوں نے نہیں کیا ہے ۔ اور صحیح استدلال اور منطقی انداز میں اس پر غور نہیں کیا ۔ ان کی مثال ایک ریوڑ کی طرح ہے جسے ہانکنے والا جس طرف چاہتا ہے' لے جاتا ہے ۔ کوئی پوچھتا نہیں کہ اس طرف ہمیں کیوں چلایا جا رہا ہے' ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں؟

اسلام فکری آزادی کا بھی ایک پیغام ہے اور شعور و نظریہ کی کی آزادی کی ایک تحریک ہے ۔ اسلام اس قسم کی جامد تقلید کو تسلیم نہیں کرتا ۔ وہ گناہ اور گمراہی کو محض اس لیے برداشت نہیں کرتا کہ ہمارے آباؤ اجداد ایسا کرتے تھے ۔ ہر

کام' ہر سند اور ہر بات پر دلیل چاہئے۔ ہر اقدام سے پہلے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد اسے علم و یقین پر مبنی خود مختاری دی گئی ہے۔

آخر میں بتایا جاتا ہے کہ اس قسم کے افسانوی عقائد جنہوں نے اختیار کیے اور محض نقالی اور جامد تقلید کی راہ اختیار کی ایسے لوگوں کا انجام تاریخ میں کیا ہوا' جن کے سامنے حقیقت بیان کر دی گئی اور ان کا یہ بہانہ بھی ختم کر دیا گیا کہ ہم تک توصیح بات ہی نہیں پہنچی اور پھر بھی انہوں نے حقیقت کو تسلیم کرنے سے منہ موڑا۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (۲۳:۴۳) قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۲۴:۴۳) فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۲۵:۴۳) ”اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی نذیر بھیجا' اس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہر نبی نے ان سے پوچھا' کیا تم اسی ڈگر پر چلے جاؤ گے خواہ میں تمہیں اس راستے سے زیادہ صحیح راستہ بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انہوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس دین کی طرف بلانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو' ہم اس کے کافر ہیں۔ آخر کار ہم نے ان کی خبر لے ڈالی اور دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا"۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ تمام روگردانی کرنے والوں کی دلیل و مزاج ایک ہوتے ہیں۔ یہ کہ "ہم نے اپنے باپ دادا کو اس طریقہ پر پایا اور ہم ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں"۔ بس نقالی آنکھیں بند کر کے' عقل اندھی ہو جاتی ہے جو لوگ غور و فکر کے بغیر تقلید کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے سامنے جو بات پیش کی جاتی ہے وہ تقلیدی نظریات و اعمال سے زیادہ معقول کیوں نہ ہو۔ اس کی پشت پر دلائل و شواہد کا انبار کیوں نہ ہو۔ ایسی فطرت کے لوگوں کو ہلاک کرنا ہی بہتر ہے جو آنکھ نہیں کھولتے کہ دیکھیں' دل نہیں کھولتے کہ سمجھیں دماغ نہیں کھولتے کہ دلائل کا وزن کریں۔

اس قسم کے لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے اور ان کے سامنے اسے پیش کیا جاتا ہے کہ سمجھ کر اس سے بچیں اور اس راہ کے انجام سے خبردار ہوں۔

--- ooo---

# درس نمبر ۲۳۲ ایک نظر میں

قریش کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اور یہ دعویٰ برحق تھا۔ پھر ان کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ وہ ملت ابراہیمی پر ہیں اور ان کی یہ بات غلط تھی۔ حضرت ابراہیم نے تو عقیدۂ توحید کا اعلان نہایت کھل کر کیا تھا۔ جس کے اندر کوئی التباس اور پیچیدگی نہ تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنے باپ کو چھوڑا' اپنی قوم کو چھوڑا' اس سے پہلے ان کو قتل کرنے اور جلانے کی سعی کی گئی۔ اور ان کی شریعت بھی عقیدۂ توحید پر قائم تھی اور اسی کی انہوں نے اپنی اولاد کو تاکید کی تھی۔ اس لیے ابراہیم علیہ السلام کی دعوت اور شریعت میں شرک کا شائبہ تک نہ تھا۔

اس سبق میں قرآن اپنے مخاطبین کو خود ان کی تاریخ کی سیر کراتا ہے تاکہ ان کے دعوے کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ اس کے بعد رسالت محمدی پر ان کے اعتراضات کو پرکھا جارہا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۴۳:۳۱) "کہتے ہیں یہ قرآن دو شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نازل نہیں ہوا"۔ ان کے اس قول کی تردید یوں کی جاتی ہے کہ ان کی سوچ میں بہت بڑی کجی ہے۔ کیونکہ اسلام جن قدروں پر مبنی ہے' ان کے اعتبار سے یہ سوچ ہی غلط ہے کہ دعوت اسلامی کی زمام کسی بڑے آدمی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہ جھوٹی قدریں ہیں اور یہی اسلام کی طرف آنے میں ان کے لیے رکاوٹ بن رہی ہیں۔ انہی باطل سوچوں نے ان کو حق و ہدایت سے دور رکھا ہوا ہے۔ اس فیصلے کے بعد ان کو یہ اطلاع بھی کر دی جاتی ہے کہ اس گمراہی کی اصل علت اور وجہ یہ ہے کہ شیطان ان کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اس درس کے آخر میں رسول اللہ کی طرف توجہ کر کے آپ کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپ ان سے منہ موڑ لیں' ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں' آپ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ کسی اندھے کو بینا کر دیں' کسی بہرے کو شنوائی دے دیں۔ یہ اندھے اور بہرے ہوگئے ہیں۔ اور ان کو ضرور سزا ملے گی خواہ آپ کی زندگی میں اللہ ان سے انتقام لے یا آپ کے بعد وہ اس سے دوچار ہوں۔ آپ کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ کو جو پیغام دیا گیا ہے' آپ اس کو مضبوطی سے پکڑیں۔ یہی پیغام تمام انبیاء کو دیا گیا تھا۔ سب کلمہ توحید لے کر آئے تھے۔

وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ (۴۳:۴۵) "تم سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے تھے' ان سب سے پوچھ دیکھو کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے تھے کہ ان کی بندگی کی جائے"۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کا ایک حلقہ پیش کیا جاتا ہے۔ فرعون کلیم کے قصے کا وہ حصہ جس میں وہی جھوٹی قدریں سامنے آتی ہیں جو اہل مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پیش کیں گویا یہ ایک تیار استدلال ہے' بنا بنایا اور تاریخ کے ہر مرحلے میں اسے دہرایا جاتا ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۳۲ تشریح آیات

## ۲۶ --- تا --- ۵۶

---

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖۤ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۶﴾
اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ﴿۲۷﴾ وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾

"یاد کرو وہ وقت جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ "تم جن کی بندگی کرتے ہو' میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا تعلق صرف اس سے ہے جس نے مجھے پیدا کیا' وہی میری رہنمائی کرے گا"۔ اور ابراہیم یہی کلمہ اپنے پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گیا تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں"۔

دعوت توحید جسے یہ لوگ انوکھا سمجھتے ہیں' یہ دراصل ان کے باپ کی دعوت ہے' یہ وہ دعوت ہے جو انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے سامنے پیش کی اور ان کے باطل عقائد کی تردید کی۔ اور اس میں انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کے موروثی عقائد کو ترک کیا اور موروثی راہ و رسم پر نہ چلے۔ محض اس لیے کہ آباء و اجداد یہی کچھ کرتے چلے آئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے' اس معاملے میں ان کے مقابلے میں برات کے اظہار میں کوئی لگی لپٹی بات نہیں کی بلکہ نہایت ہی صاف الفاظ اور شفاف عمل میں ان کی تردید کی' جس طرح قرآن نقل کرتا ہے :

اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ (۴۳ : ۲۶) اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ

(۴۳ : ۲۷) "بے شک میں ان سے بری الذمہ ہوں جن کی تم بندگی کرتے ہو' میرا تعلق صرف اس سے ہے جس نے مجھے پیدا کیا وہی میری رہنمائی کرے گا"۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اظہار برات اور پھر اس اعلان سے کہ میں صرف اس خدا کی بندگی کروں گا جو میرا خالق ہے' یہ معلوم ہوتا ہے کہ نمرودی معاشرہ بھی بالکل خدا کا منکر نہ تھا بلکہ وہ اللہ کے سوا اور الہوں کو اللہ کے ساتھ شریک قرار دیتے تھے۔ اور ان کی بندگی کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ان سے برات کا اظہار کیا۔ اس لاتعلقی کے اظہار سے آپ نے خالق کائنات کو مستثنیٰ کیا۔ اور اللہ کی یہاں آپ نے وہ صفت بیان کی جو صرف اللہ کے لیے عبادت کا استحقاق ثابت کرتی ہے۔ یہ کہ وہ پیدا کرنے والا ہے۔ لہٰذا بندگی اور حکم بھی اسی کا چلنا

چاہئے اور آپ نے اس یقین کا اظہار کیا کہ اللہ انہیں ہدایات دے گا کہ وہ کیا کریں کیونکہ خالق اپنی مخلوق کی راہنمائی کا انتظام بھی کرتا ہے اور اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کس طرح ہدایت دے۔ یہ کلمہ جس کے اوپر زندگی قائم ہے جس کے اوپر یہ پوری کائنات قائم ہے اور جس پر شہادت دے رہی ہے' یہ حضرت ابراہیم نے کہا۔

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۴۳ : ۲۸) "اور ابراہیم یہی کلمہ پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گیا تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں"۔ اس کرۂ ارض پر کلمہ توحید کے اقرار اور رواج میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا بڑا حصہ ہے۔ آپ ہی کے بعد یہ کلمہ تمام نسلوں میں رائج ہوا۔ اور یہ رواج آپ کی اولاد کے ذریعے ہوا۔ آپ کی اولاد سے بے شمار رسول بھیجے گئے۔ تین رسول تو اولوالعزم رسول تھے۔ حضرت موسیٰ' حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ آج دنیا میں ایک ارب سے زیادہ لوگ ایسے پائے جاتے ہیں' جو مختلف بڑے ادیان کے پیروکار ہیں جو اپنے باپ کے کلمہ توحید پر کاربند ہیں۔ اس نے اس کلمے کو اپنی اولاد میں باقی رکھا۔ اگرچہ ان میں سے بھی گمراہ ہونے والے گمراہ ہوئے لیکن یہ کلمہ باقی رہا۔ کبھی یہ بالکل ناپید نہیں ہوا' اور اس کے قدم مضبوط رہے' کبھی کسی نے اسے جڑ سے اکھاڑ کر نہیں پھینکا اور نہ اس کے ساتھ باطل کا امتزاج ہوا ہے تاکہ لوگ اللہ کی طرف لوٹیں کیونکہ اللہ ہی نے ان کو پیدا کیا ہے' لہٰذا ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کو تو پہچانیں۔ اور اس سچائی کی طرف لوٹیں اور اسے سینے سے لگائیں۔

ابراہیم علیہ السلام سے پہلے بھی کلمہ توحید سے انسانیت واقف تھی لیکن زمین کے اوپر کلمہ توحید کو قرار و ثبات حضرت ابراہیم کے بعد نصیب ہوا۔ آپ سے پہلے حضرت نوح' حضرت ہود' حضرت صالح اور شاید حضرت ادریس علیہم السلام نے کلمہ توحید پیش کیا لیکن ان رسولوں کو ایسے جانشین نہ ملے جو ان کے بعد کلمہ توحید کو باقی رکھتے اور اس کے مطابق زندگی گزارتے اور جو اس کے لیے زندہ رہتے۔ لیکن جب یہ کلمہ حضرت ابراہیم نے پیش فرمایا تو آپ کے بعد اس کا تسلسل قائم ہو گیا۔ اور رسولوں کا بھی ایک غیر منقطع سلسلہ چل نکلا۔ چنانچہ آپ کی اولاد میں سے آخری بیٹے اور آپ کے ساتھ زیادہ مشابہ (۱) حضرت محمد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے' اور انہوں نے کلمہ توحید کو اس کی کامل اور شامل صورت میں پیش کیا جس نے پوری زندگی کو اس کلمے کے اردگرد گھما دیا۔ اور انسان کی ہر سرگرمی میں اس کو اثرانداز کر دیا۔

یہ تھی توحید کی کہانی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ادھر جن کے بارے میں اہل قریش یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ دین ابراہیم پر ہیں اور اس کلمے کو ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں وراثت میں باقی رکھا اور حضرت ابراہیم سے ادھر یہ کلمہ نسلاً بعد نسل نقل ہوتا رہا۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف نسبت کرنے والے اس کلمے کے مقابلے میں کیا ردعمل اختیار کرتے ہیں۔

زمانے گزر گئے۔ اللہ نے نسلاً بعد نسل ان کو زندگی کے خوب سازوسامان دیئے' بہت زیادہ دور چلے جانے کے بعد

(۱) حضورؐ نے فرمایا مجھ پر سب انبیاء پیش کیے گئے' حضرت موسیٰ علیہ السلام اہل شنوءہ کے مردوں جیسے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ ترین افراد جو میں نے دیکھے ان میں سے عروہ ابن مسعود ہیں۔ اور میں نے ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا تو وہ تمہارے ساتھی کے زیادہ مشابہ تھے۔

انہوں نے ملت ابراہیمی کو بھلا دیا۔ اور ان عربوں کے اندر کلمہ توحید انوکھا ہو گیا۔ اب جبکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آئے ہیں تو انہوں نے اس کا بہت ہی برا استقبال کیا اور اسے بھی لال زمین اور دنیا پرستوں کی قدروں کے پیمانوں سے ناپنا شروع کر دیا اور خود ان کے پیمانے بھی بدل گئے۔

بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ
وَ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۹﴾ وَ لَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ
وَّ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ
الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ
مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ
بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَ لَوْ لَاۤ اَنْ
يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ
فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ لِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾
وَ زُخْرُفًا ؕ وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ
۳
لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾ ع۱۰

۹ ”(اس کے باوجود جب یہ لوگ دوسروں کی بندگی کرنے لگے تو میں نے ان کو مٹا نہیں دیا) بلکہ میں انہیں اور ان کے باپ دادا کو متاع حیات دیتا رہا' یہاں تک کہ ان کے پاس حق' اور کھول کھول کر بیان کرنے والا رسول آ گیا۔ مگر جب وہ حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں 'یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟ کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں ان کی گزر بسر کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں' اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں اور تیرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) اس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو (ان کے رئیس) سمیٹ رہے ہیں۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم خدائے رحمٰن سے کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں' اور ان کی سیڑھیاں جن سے وہ اپنے بالاخانوں پر چڑھتے ہیں اور ان کے دروازے اور ان کے تخت جن پر وہ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں' سب چاندی اور سونے

کے بنا دیتے ۔ یہ تو محض حیات دنیا کی متاع ہے اور آخرت تیرے رب کے ہاں صرف متقین کے لیے ہے"۔
اب سیاق کلام میں روئے سخن اچانک اہل مکہ کی طرف پھر جاتا ہے ' اسے اضراب کہتے ہیں اور یہ انداز عربوں میں رائج تھا۔

بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ (۲۹:۴۳)
"بلکہ میں انہیں اور ان کے باپ دادا کو متاع حیات دیتا رہا یہاں تک کہ ان کے پاس حق ' اور کھول کھول کر بیان کرنے والا رسول آگیا"۔ گویا یوں کہا گیا کہ چھوڑو حضرت ابراہیم کی بات کو ' ان لوگوں کے ساتھ مناسبت اور نسبت ہی کیا رہ گئی ہے ۔ ہمیں ان کے شب و روز کو دیکھنا چاہئے ۔ ان کے حالات ' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات سے تو ملتے نہیں ۔ ان لوگوں کے حالات یہ ہیں کہ ان کو اور ان کے آباو اجداد کو خوب سامان زندگی دیا گیا ' ان کو طویل مہلت دی گئی ' یہاں تک کہ وہ سچائی اس قرآن کی شکل میں آئی اور اس کے ساتھ ایک نہایت ہی کھول کر بات سمجھانے والا رسول بھی آ گیا جو ان پر یہ سچائی پیش کرتا ہے اور نہایت ہی وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے ۔

وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۳۰:۴۳) "مگر جب وہ حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں"۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جادو میں سچائی کا شائبہ تک نہیں ہوتا ' یہ بات بالکل واضح ہے ۔ یہ تو ان کا محض ایک دعویٰ اور الزام تھا اور اس کے بارے میں سب سے پہلے خود ان کو یقین تھا کہ یہ الزام غلط ہے ۔ کیونکہ کبراء قریش اس حد تک جہاندیدہ تھے کہ ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی کہ قرآن کریم کلام حق ہے ' یہ جو الزامات وہ لگاتے تھے ۔ وہ جمہور عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے وہ ایسا کرتے تھے ۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ یہ تو جادو ہے اور اس کے بعد یہ جو اعلان کرتے تھے کہ ہم اس کا انکار کرتے ہیں ۔ یہ بات کو پکی کرنے کے لیے اعلان کرتے تھے ۔

اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۳۰:۴۳) "اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں"۔ جمہور عوام کو وہ اس سے یہ تاثر دیتے تھے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا انہیں پورا پورا یقین ہے ۔ اس طرح وہ ان کو یہ اشارہ دیتے تھے کہ ہمارے پیچھے چلتے رہو اور ہمارے مطیع فرمان رہو اور ہر قوم سے سردار جمہور عوام کو اس طرح دھوکہ دیتے ہیں ' یہ نہ ہو کہ وہ ان کے دائرہ اختیار سے نکل جائیں اور کلمہ توحید کو قبول کرلیں ۔ کیونکہ جب کلمہ توحید کا اقتدار قائم ہوتا ہے ' تمام گردن کش گر جاتے ہیں ۔ پھر تو صرف اللہ کی بندگی ہوتی ہے اور لوگ اللہ ہی سے ڈرتے ہیں ۔
اس کے بعد قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ انہوں نے کھری اور کھوٹی قدروں کے درمیان کس طرح ملاوٹ کر دی ہے ۔ وہ یہ اعتراض کرتے ہیں اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی منتخب کیا ہے کہ وہ یہ پیغام پہنچائیں ۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۳۱:۴۳) "اور وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟" دو گاؤں سے ان کی مراد مکہ

اور طائف ہے ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی ایک شاخ سے تھے ۔ پھر بنی ہاشم کی ایک شاخ کے فرد تھے ۔ اور یہ لوگ عربوں میں سے برتر لوگ تھے جبکہ آپ کی ذات بھی اخلاق عالیہ کے لحاظ سے ممتاز تھی ۔ بعثت سے پہلے آپ صادق و امین اور اعلیٰ اخلاق کے مالک انسان کے طور پر مشہور تھے ۔ لیکن آپ اپنے قبیلے کے سربراہ نہ تھے ۔ نہ کسی خاندان کے رئیس تھے اور اس دور میں لوگ انہی چیزوں پر فخر کرتے تھے کہ کوئی قبیلے یا کسی شاخ کا سربراہ ہو ۔ معترضین کا اعتراض یہی تھا ۔

وَ قَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۴۳ : ۳۱) "کہتے ہیں یہ قرآن ان دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر نازل کیوں نہ کیا گیا" ۔ حالانکہ یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس کی رسالت اور دعوت کے لیے کون موزوں ہے اور یہ منصب کس کو دیا جائے ۔ لہٰذا اللہ نے اہل ترین شخص کا انتخاب کر لیا ۔ اللہ کا منشا یہ نہ تھا کہ اس رسالت کو خارجی اسباب میں سے کوئی سہارا ملے ' اس کی قوت اس کے خارج سے نہ ہو بلکہ اس کے اندر سے ہو ۔ لہٰذا اس نے اس کے لیے ایسی شخصیت کا انتخاب کیا جس کی بڑی خصوصیت اس کے اخلاق تھے ۔ اس دعوت کا مزاج ہی یہ ہے اور یہ اس کی بالکل ممتاز خصوصیت ہے ۔ اس لیے کسی قبیلے کے سردار کا انتخاب نہیں کیا گیا ۔ نہ کسی خاندان کے سربراہ کو اس کے لیے منتخب کیا گیا ۔ نہ کسی صاحب جاہ و مرتبہ کا انتخاب ہوا ۔ نہ ایک بہت بڑے مالدار کا یوں انتخاب ہوا تاکہ آسمانوں پر سے نازل ہونے والی اس دعوت کی اصل اقدار کسی ایسی قدر سے ملتبس نہ ہو جائیں جس کا تعلق اس دنیا پرستی سے ہو اور اس دعوت کے اندر دنیا پرستی کے خلیات میں سے کوئی خلیہ داخل نہ ہو جائے جو اس دعوت کی حقیقت کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں رکھتا ۔ اور دعوت اسلامی کی ذاتی قوت کے سوا کوئی اور خارجی سبب اس پر اثر انداز نہ ہو ۔ نہ کوئی طالع آزما اس کے قریب آئے اور نہ کوئی پاکباز اس سے دور ہو ۔

لیکن اس قوم پر دنیا پرستی کا غلبہ تھا ' اس لیے جو لوگ آسمانی دعوت کی نوعیت کو سمجھتے نہ تھے ۔ وہ اس قسم کے اعتراضات کیا کرتے تھے ۔

وَ قَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۴۳ : ۳۱) "یہ قرآن ان دو شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا" ۔

لہٰذا قرآن نے اللہ کی اس عظیم رحمت پر ان کے اس سطحی اعتراض کو رد فرما دیا ' یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ اپنی رحمت کے لیے جو چاہے ' اختیار کر لے ' جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے انہوں نے دنیا پرستی اور جاہلیت کی اقدار اور اللہ کی آسمانی مقدروں کو ملا دیا ہے ۔ اور وہ اپنی دنیا پرستی کی آنکھوں سے اس دعوت اسلامی کو دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ دعوت خدا پرستی اور آخرت کے حساب سے دی جا رہی ہے ۔

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ

خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (۴۳ : ۳۲) "کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں ان کی گزربسر کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں ۔ اور تیرے رب کی رحمت اس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو یہ سمیٹ رہے ہیں" ۔ یعنی تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ اب نبوت بھی خود تقسیم کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کو اللہ کی رحمت اور نبوت سے واسطہ کیا ہے؟ اصل پوزیشن ان کی یہ ہے کہ یہ کسی چیز کے مالک نہیں ہیں ' خود اپنے رزق کے بھی یہ مالک نہیں ہیں ' یعنی اس دنیا کی مختصر زندگی کے لیے بھی ان کا رزق ان کے اختیار میں نہیں ہے ۔ یہ بھی ہم ان پر تقسیم کرتے ہیں ۔ یہ ہم اپنی حکمت اور تدبیر سے تقسیم کرتے ہیں اور یہ ہماری تقسیم اس زمین کی تعمیر و ترقی کے لیے ہے ۔

اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے رزق لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق دیا جاتا ہے ۔ زندگی کے حالات کے مطابق دیا جاتا ہے اور معاشرے کے افراد کے باہم تعلقات کے مطابق دیا جاتا ہے ۔ مختلف عوامل کے مطابق افراد معاشرہ کے درمیان اس کی تقسیم ہوتی ہے ۔ ہر معاشرے میں نظام تقسیم رزق مختلف ہوتا ہے ۔ ہر زمانے میں اس کے اندر تبدیلیاں آتی ہیں ۔ ہر سوسائٹی دوسری سے مختلف ہوتی ہے ۔ اور اس میں عمومی حالات اور افراد معاشرہ کے باہم تعلقات پر دارومدار ہوتا ہے ۔ لیکن ہر دور اور ہر معاشرے میں تقسیم رزق میں جو بات موجود رہی ہے ' وہ یہ رہی ہے کہ رزق کی تقسیم میں فرق رہا ہے ۔ یہاں تک کہ ایک مصنوعی معاشروں میں بھی تقسیم رزق میں فرق ہے ' جن کا مقصد ہی پیداوار بڑھانا اور مساویانہ تقسیم کرنا ہے ۔

تفاوت رزق کے اسباب مختلف معاشروں میں مختلف رہے ہیں ۔ لیکن مقدار رزق کے اختلاف میں اختلاف ناپید کبھی نہیں ہوا ۔ یہاں تک کہ جن مصنوعی معاشروں کے اندر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مکمل مساوات ہے وہاں بھی رزق مختلف ہوتا ہے اور وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ (۴۳ : ۳۲) "اور کچھ لوگ کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے" ۔

اور تمام معاشروں میں فرق مراتب رزق کے اسباب تو مختلف رہے ہیں لیکن حکمت یہی رہی ہے ۔

دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (۴۳ : ۳۲) "تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں" ۔ یعنی بعض لوگ دوسروں کو اپنا ماتحت کر کے ان سے خدمات لیں ' اس دنیا میں جب معیشت کی گاڑی چلتی ہے تو بعض لوگ خدمات فروخت کرتے ہیں اور بعض خریدتے ہیں ۔ یوں بعض بعض کے لیے مسخر ہو جاتے ہیں ' یہاں تسخیر کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک طبقہ برتر ہو اور دوسرا کمتر ہو یا ایک فرد دوسرے کا غلام ہو ۔ اگر یہ لیا جائے تو یہ اس لفظ کا بہت ہی سادہ مفہوم ہو گا ۔ یہ اللہ کے دائمی اور بلند کلام کی سطح تک نہیں پہنچتا ۔ اللہ کے فرمان کا مفہوم کسی تغیر سے بالا ہے ' اگرچہ انسانی سوسائٹی کے حالات میں جس قدر تبدیلی واقع ہو جائے ' یہ ایسا مفہوم نہیں ہے کہ جانے والے حالات میں اور ہو اور آنے والے حالات میں اور ہو ۔ حقیقی مفہوم یہ ہے کہ تمام انسان ایک دوسرے کے لیے مسخر ہیں اور زندگی اور معیشت کا چکر سب کو گھماتا ہے ۔ اور ہر حال اور ہر صورت میں لوگ ایک دوسرے کے محتاج و مجبور ہیں ۔ ہر ایک کے وسائل رزق متعین ہیں ' کسی کے ذرائع کشادہ ہیں اور کسی کے محدود ہیں ۔ کوئی اس کام میں لگا ہوا کہ دولت

جمع کرے' اس سے خود بھی کھائے اور وہ دوسروں کو بھی دے اور دونوں ایک دوسرے کے لیے مسخر ہیں ـ اور دونوں کے وسائل رزق میں جو فرق ہے اس نے دونوں کو ایک دوسرے کے لیے محتاج اور مسخر بنا دیا ہے ـ اور زندگی خصوصاً معاشی زندگی کے چکر میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں' مزدور انجینئر کا محتاج ہے اور انجینئر مالک کا محتاج ہے ـ انجینئر اور مزدور دونوں مالک کے محتاج ہیں' مالک انجینئر اور مزدور دونوں کا محتاج ہے ـ اور ہر ایک اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس کرۂ ارض پر فریضہ خلافت الٰہیہ کے پورا کرنے میں لگا ہوا ہے اور مسخر ہے ـ اور یہ سب نظام رزق میں تعاون کی وجہ سے قائم ہوا ہے ـ کسی کو خدمات درکار ہیں اور کسی نے بیچنی ہیں ـ

بعض ایسے لوگ جو خود ساختہ نظریات کے داعی ہیں وہ اس آیت کو پیش نظر رکھ کر اسلام اور اسلام کے اقتصادی نظام پر بہت سے اعتراضات کرتے ہیں اور پھر بعض مسلمان اس آیت کے سامنے شف شف کرتے ہیں اور ان کا انداز یوں ہوتا ہے کہ وہ گویا اسلام پر یہ ایک الزام ہے اور وہ اس کا رد کرتے ہیں کہ اسلام رزق کے معاملے میں فرق مراتب کا قائل نہیں ہے اور یہ کہ رزق میں فرق مراتب اسلام پر تہمت ہے ـ

میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ اہل اسلام' اسلام کے بارے بالکل کھل کر اور صاف صاف بات کریں ـ وہ ان خود ساختہ نظریات سے متاثر ہوئے بغیر اور دفاعی انداز اختیار کیے بغیر صاف صاف کہہ دیں کہ رزق میں فرق مراتب ایک حقیقت ہے جسے اسلام روا رکھتا ہے اور لوگ ہمیشہ وسائل رزق کے معاملے میں مختلف ہوتے ہیں ـ

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی حالت طبیعی اور حالت نفسی اسی تفاوت پر قائم ہے ـ لوگوں کو خالق کائنات کی طرف سے مختلف درجوں کی صلاحیتیں دی گئی ہیں ـ ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق کام کر سکتا ہے اور یہ تفاوت اور فرق مراتب اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہر شخص نے اس کرۂ ارض پر فریضہ خلافت الٰہیہ کی ادائیگی میں بالکل ایک جدا کردار ادا کرنا ہے ـ اگر سب لوگ اس طرح پیدا کیے گئے ہوتے جس طرح پریس سے ایک اشتہار چھپتا ہے یا کتاب کا ایک نسخہ تیار ہوتا ہے تو اس دنیا میں زندگی کی یہ اجتماعی صورت نہ ہوتی اور کئی ضروری کام یونہی رہ جاتے جن کے سرانجام دینے کے لیے کوئی قابل آدمی نہ ہوتا کیونکہ ان کے لیے کوئی قابل آدمی ہی نہ ملتا ـ جس اللہ نے زندگی پیدا کی ہے اور اس کے لیے بقا کا انتظام فرمایا ہے اس نے ہر شخص کے لیے ایک کردار رکھا ہے اور ہر عمل کے لیے ایک شخص' ہر کسے را بہر کارے ساختند' پھر ہر شخص کی کارکردگی کی وجہ سے اس کے رزق میں بھی فرق ہوتا ہے' اگر فرق مراتب نہ کنی زندیقی' یہ ہے اصل قاعدہ ـ رہا یہ کہ مختلف اہلیت کے لوگوں کے رزق کے اندر کس قدر فرق ہو تو یہ ہر نظام' ہر معاشرے اور ہر ملک کے اپنے حالات پر موقوف ہوتا ہے ـ لیکن یہ فطری اصول کسی جگہ رد نہیں کیا جا سکتا کہ فرق مراتب ہو اور اس طرح زندگی نشو و نما پائے ـ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے مصنوعی نظامہائے معیشت کے پیروکاروں نے جنہوں نے مساوات کے بلند بانگ دعوے کیے' مزدور' انجینئر اور مینجر کی تنخواہوں کے اندر مساوات قائم نہ کی اور نہ کر سکے ـ حالانکہ انہوں نے اپنے نظام کو بروئے کار لانے کے لیے بڑے سے بڑا تشدد کیا لیکن آخر کار یہ لوگ اللہ کے ابدی اصول کے سامنے شکست کھا گئے ـ کیونکہ اللہ کا قانون اس کائنات کے اندر موجود نہایت ہی مستحکم ناموس زندگی پر مبنی ہے (سید قطب' اے کاش آپ زندہ ہوتے اور ان مصنوعی مذاہب کو روس میں دھڑام سے گرتے دیکھتے!) اور جس نظام کی نشاندہی اللہ نے اس دنیا کی زندگی کے لیے کی ہے اسی میں اللہ کی رحمت ہے ـ

وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۴۳ : ۳۲) "تیرے رب کی رحمت اس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو یہ جمع کرتے ہیں" ۔ اور یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ اپنی اس رحمت کے لیے جس کو چاہے ' چن لے 'کیونکہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کس منصب کے لیے کون اہل ہے ۔ پھر اللہ کی رحمت کا تعلق اس دنیا میں پائے جانے والے نظام معیشت کی اہلیت پر نہیں ہے ۔ یہ تو دنیاوی اقدار ہیں ۔ اللہ کے نزدیک یہ کوئی بہت بڑا کمال نہیں ہے کہ کوئی بہت بڑی دولت جمع کر دے کیونکہ دولت کے جمع کرنے میں نیکوکاروں اور بدکاروں کے لیے برابر کے مواقع ہیں اور اچھوں اور بروں کے لیے اس میں برابر مواقع ہیں لیکن اللہ کی رحمت (نبوت) کے لیے تو بہت ہی ممتاز ترین لوگوں کا انتخاب کیا جاتا ہے اور اس کام کو اللہ ہی جانتا ہے ۔

اللہ کے نزدیک یہ دنیا اور اس کی دولت اس قدر حقیر اور اس قدر بے وقعت ہے کہ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سب لوگ کافر ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ یہاں کافروں پر دولت کی بارش کر دیتا ۔ لیکن اندیشہ یہ تھا کہ یہ دولت لوگوں کے لیے فتنہ بن جائے گی اور انہیں ایمان کی راہ سے روک دے گی ۔

وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ (۴۳ : ۳۳) وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ (۴۳ : ۳۴) وَزُخْرُفًا وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ (۴۳ : ۳۵) "اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم خدائے رحمٰن سے کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں ' اور ان کی سیڑھیاں جن سے وہ اپنے بالاخانوں پر چڑھتے ہیں اور ان کے دروازے اور ان کے تخت جن پر وہ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں ' سب چاندی اور سونے کے بنا دیتے ۔ یہ تو محض حیات دنیا کی متاع ہے اور آخرت تیرے رب کے ہاں صرف متقین کے لیے ہے" ۔

اللہ جانتا ہے کہ اس کی مخلوق ضعیف ہے اور وہ دنیا کے مال و دولت سے کس قدر متاثر ہو جاتی ہے ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ اپنی اس عظیم رحمت کا انکار کرنے والوں کو اس حقیر و ذلیل دنیا سے مالا مال کر دیتا ' ان کے مکانات ' ان کی چھتیں اور ان کے دروازے اور ان کا فرنیچر سب سونے چاندی کے ہو جاتے ۔ ان کے گھروں کے بڑے بڑے گیٹ ہوتے ۔ جن تختوں پر وہ بیٹھے ان کے بڑے بڑے تکیے ہوتے اور یہ سونے چاندی اور دوسری قیمتی دھاتوں کے ہوتے ۔ یہ دنیائے دنی سب کی سب ان کفار کے حوالے کر دی جاتی ۔

وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۴۳ : ۳۵) "یہ تو سب حیات دنیا کی متاع ہے" ۔ یعنی زائل ہونے والا ساز و سامان ' جو اس دنیا کی حدود سے آگے جاتا ہی نہیں ۔ یہ دنیا بھی کم قیمت اور مختصر اور اس پر انسان کی زندگی بھی مختصر ۔

وَ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ (۴۳ : ۳۵) ”اور آخرت تیرے رب کے ہاں صرف متقین کے لیے ہے“۔ اور یہ لوگ اللہ کے نزدیک اپنے تقویٰ کی وجہ سے مکرم ہیں۔ لہٰذا اس نے ان کے لیے وہ انعامات تیار کر رکھے جو بہت ہی باعزت اور قیمتی ہیں۔ اور وہ اس دنیا کے فانی متاع کے مقابلے میں زیادہ باقی رہنے والے بیش قیمت ہیں۔ اور اللہ ان کو قیامت میں رحمٰن کے کافروں کے مقابلے میں بہت ہی امتیازی شان دے گا اور رہے یہ کافر تو ان کو اللہ متاع حیات اس حساب سے دیتا ہے جس طرح حیوانات کو چارہ دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حیات دنیا کا یہ سازوسامان جس کی مثال اللہ نے یہاں دی' اس دنیا کے بہت سے لوگوں کی نظروں کو چکاچوند کر دیتا ہے۔ اور جب اہل ایمان فساق و فجار کے ہاتھ میں یہ مال و دولت دیکھتے ہیں اور پھر دیکھتے ہیں کہ اللہ کے نیک بندوں کے ہاتھ ان سے خالی ہیں یا وہ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ عسرت' سختی اور تنگی ترشی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور یہ فساق و فجار اپنی دولت کے بل بوتے پر' قوت و سطوت اور اقتدار پر ہیں تو وہ فتنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ یہ فتنہ لوگوں پر بہت اثر کرتا ہے لیکن اللہ یہ تعلیم دیتا ہے کہ یہ چیزیں نہایت ہی حقیر' عارضی اور کم قیمت ہیں۔ اور اللہ نے اپنے ہاں متقین کے لیے جو کچھ تیار کر رکھا' وہ ناقابل تصور ہے۔ یہ نیک لوگوں کے لیے ہے۔ اس طرح قلب مومن اس حالت پر مطمئن ہو جاتا ہے جو اللہ نے ابرار کے لیے اختیار کیا ہے یا فجار کے لیے اختیار کیا ہے۔

ان لوگوں کا اعتراض یہ تھا کہ اللہ نے نبوت کے لیے ایسے شخص کا انتخاب کیا ہے جس کے پاس دولت دنیا نہیں ہے۔ وہ لوگوں کی قدروقیمت کا اندازہ ان کے اقتدار' ان کے مال' اور ان کے مرتبے سے لگاتے ہیں۔ ان کو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اللہ کے ہاں تو یہ چیزیں حقیر اور فانی ہیں۔ یہ تو اللہ کی شریر ترین مخلوق کے پاس بہت زیادہ ہوتی ہیں اور اللہ کے مبغوض ترین لوگوں کے پاس زیادہ ہوتی ہیں۔ لہٰذا مال و دولت اللہ کے ہاں قرب' مرتبہ اور رضائے الٰہی کی دلیل نہیں ہے۔

یوں قرآن کریم ہرچیز کو اپنی جگہ اور صحیح مقام پر رکھتا ہے۔ اور اللہ کے قوانین بابت تقسیم رزق بیان کرتا ہے کہ اس دنیا میں دولت کی تقسیم کا یہ نظام ہے۔ اور یہ وضاحت کرتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اس سلسلے میں کیا قدریں ہیں اور یہ تمام باتیں اس حوالے سے کی گئیں کہ ان لوگوں کو رسالت محمدی پر اس زاویہ سے اعتراض تھا کہ اللہ نے مکہ اور طائف کے رؤسا کو چھوڑ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا دیا جو دولت کے اعتبار سے ایک عام آدمی تھے۔

یوں' اس مناسبت سے امارت اور غربت کے بارے میں' اسلامی نظام معیشت کے لیے بنیادی اور کلی قواعد وضع کر دیئے گئے' جن کے اندر کوئی تبدیلی نہ ہوگی اور کوئی تغیر ممکن نہ ہوگا۔ زندگی کی بوقلمونیاں' نظام کا اختلاف' نظریات کا اختلاف' معاشروں اور سوسائٹیوں کا اختلاف کوئی چیز بھی ان قواعد کو متاثر نہ کرے گی۔ کیونکہ زندگی کی بعض مستقل قدریں ہیں اور یہ زندگی ان کے دائرے کے اندر ہی حرکت کرتی ہے۔ وہ اس کے دائرے سے خارج نہیں ہو سکتی۔ جن لوگوں کو بدلتے ہوئے حالات اس طرف سے اندھا کر دیتے ہیں کہ وہ زندگی کی ان مستقل قدروں کو دیکھ سکیں' وہ اللہ کے اس مستقل معاشی اصول اور معاشی کلیہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ (انہدام روس کے بعد سمجھ لیا ہے) اسلامی نظام دراصل ثبات اور تغیر کے درمیان ایک حسین امتزاج ہے۔ اس کے معاشی نظام میں بدلنے والے اصول بھی ہیں اور ناقابل تغیر بھی ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو اس حقیقت کو نہیں سمجھتے' وہ یہی خیال کرتے ہیں کہ زندگی کی ترقی میں تغیر و تبدل ہی اصل چیز ہے۔ یہ تغیر اور انقلاب اشیاء کی حقیقت میں بھی آتا ہے اور شکل میں بھی آتا ہے اور ان لوگوں کا زعم یہ ہے کہ اس تغیر اور تبدیلی کے

ساتھ مستقل اور ثابت اصول نہیں چل سکتے ۔ یہ لوگ اس بات کے منکر ہیں کہ تبدل و تغیر کے سوا اور کوئی مستقل قانون معیشت بھی ہو سکتا ہے ۔ وہ کہتے ہیں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں ۔ یہ لوگ صرف تغیر کے قانون کو تسلیم کرتے ہیں ۔ رہے ہم مسلمان تو ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اس پوری کائنات میں ثبات اور تغیر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں اور ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۔ اور اس دنیا کی بعض چیزوں میں ثبات بطور ایک مستقل قدر موجود ہے اور اس کی بڑی مثال تو یہی مسئلہ موضوع بحث ہے ۔ لوگوں کے درمیان تقسیم رزق میں تفاوت ایک مستقل اصول ہے اور نسبت تفاوت میں فرق و امتیاز بہرحال ہوتا ہی رہتا ہے ۔ یہ نسبت ہر ملک اور ہر معاشرے اور ہر زمانے میں بدل سکتی ہے ۔ خود موضوع زیر بحث میں دونوں مثالیں موجود ہیں کہ ثبات و تغیر تقسیم معیشت میں موجود ہے ۔ اور تفاوت مستقل ہے اور نسبت تفاوت متغیر ہے ۔

--- ○○○---

جب یہ بیان کر دیا گیا کہ اللہ کے نزدیک اس دنیا کا مال و متاع کوئی چیز نہیں ہے اور یہ ایک حقیر سامان چند روزہ ہے ۔ اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ فساق و فجار کو جو دولت دی جاتی ہے یہ ان کی کرامت اور شرافت کی دلیل نہیں ہے ۔ اور آخرت کے تمام مزے متقین کے لیے ہیں ۔ تو یہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو دنیا میں دولت دی گئی اور وہ اللہ کو یاد نہیں کرتے اور وہ ان عبادات سے منہ پھیرے ہیں جن کے نتیجے میں آخرت میں نعمتیں ملیں گی تو ایسے لوگوں کا انجام کیا ہو گا ۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾ وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾

"اور جو شخص رحمٰن کے ذکر سے تغافل برتتا ہے ' ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور وہ اس کا رفیق بن جاتا ہے ۔ یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہ راست پر آنے سے روکتے ہیں ' اور وہ اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں ۔ آخر کار جب یہ شخص ہمارے ہاں پہنچے گا تو اپنے شیطان سے کہے گا "کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کا بعد ہوتا تو بدترین ساتھی ہے " اس وقت ان لوگوں سے کہا جائے گا کہ جب تم ظلم کر چکے تو آج یہ بات تمہارے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہے کہ تم اور تمہارے شیاطین عذاب میں مشترک ہیں "۔

العشی کے معنی ہوتے ہیں نظر کا دیکھ نہ سکنا ' بالعموم یہ حالت اس وقت ہوتی ہے جب تیز روشنی سے آنکھیں دوچار ہوں ' جس میں آنکھوں کو کھولنا ممکن نہ ہو ۔ نیز عشی کی وجہ سے شام کے اندھیرے میں کمزور نظر کے لوگ صحیح طرح معلوم نہیں کر سکتے ۔ اور ایک خاص بیماری کی وجہ سے بھی یہ ہوتا ہے ۔ یہاں مقصد غفلت اور اللہ کی یاد سے منہ موڑنا اور دل سے یہ شعور محو کر دینا کہ اللہ دیکھ رہا ہے ۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ (۴۳ : ۳۶) "جو شخص رحمٰن کے ذکر سے تغافل برتتا ہے' ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور وہ اس کا رفیق بن جاتا ہے"۔ اللہ کی مشیت نے فطرت انسان میں یہ بات رکھ دی ہے کہ جب بھی اس کا دل ذکر الٰہی سے غافل ہوا اس کی طرف ایک شیطان راہ پا لیتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ لگ جاتا ہے' ہروقت اس کے دل میں وسوسے ڈالتا ہے۔ اور اس کے لیے برائی کو خوبصورت بناتا رہتا ہے۔ یہ شرط اور اس کا جواب دونوں مل کر اللہ کے نظام مشیت کی خوبصورت تعبیر کرتے ہیں۔ اللہ کی سنت کے مطابق سبب آتے ہی نتیجہ سامنے آجاتا ہے۔ یہی فیصلہ پہلے سے اللہ کے علم کے مطابق طے ہوتا ہے اور اسے قضا و قدر کہتے ہیں۔ اور شیطانی برے دوستوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے انسانی برے دوستوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ یوں یہ انسان خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔

وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۴۳ : ۳۷) "اور یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہ راست پر آنے سے روکتے ہیں اور وہ اپنی جگہ یہ سوچتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں"۔ ایک دوست کی طرف سے ایک دوست کے ساتھ یہ نہایت ہی برا سلوک ہے کہ وہ دوست کو سیدھے راستے سے روک کر غلط راہ پر ڈال دے اور پھر اسے مسلسل غافل رکھے کہ وہ انسانی دوست کبھی یہ سوچ بھی نہ سکے کہ وہ غلطی پر ہے بلکہ اسے یہ تسلی دیتا رہے کہ وہ سیدھی راہ پر جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ برے انجام کے ساتھ متصادم ہو جاتا ہے۔

یہاں انداز تعبیر کے لیے فعل مضارع استعمال ہوا ہے' مطلب یہ ہے کہ ہر عمل جاری ہے۔ لَيَصُدُّوْنَهُمْ "وہ روکتے ہیں"۔ يَحْسَبُوْنَ "وہ گمان کرتے ہیں"۔ اور دیکھا جا سکتا ہے بلکہ دوسرے لوگ دیکھ رہے ہیں اس تماشہ کو' جبکہ وہ خود اسے تمہیں دیکھ رہے جو جہنم کی طرف رواں ہیں لیکن انجام سے بے خبر اور جس راہ پر وہ جا رہے ہیں' اچانک ہی وہ انجام بد تک پہنچ جائیں گے۔

حَتّٰىٓ اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ

(۴۳ : ۳۸) "آخر کار جب یہ شخص ہمارے ہاں پہنچے گا تو اپنے شیطان سے کہے گا "کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کا بعد ہوتا' تو بدترین ساتھی نکلا"۔

چشم زدن میں ہم دنیا سے آخرت میں چلے جاتے ہیں' ہماری اس زندگی کا دفتر لپیٹ لیا جاتا ہے اور یہ اندھا پن اس کو شیطان کی رفاقت میں آخری انجام تک پہنچا دیتا ہے۔ یہاں اب ہوش آجائے گا' جس طرح شرابی کا نشہ اترتا ہے اور اندھے پن اور مدہوشی کے بعد یہ نظریں اٹھا کر دیکھیں گے۔ اب یہ شخص اپنے ساتھی کو غور سے دیکھے گا جو اسے یہ یقین دہانیاں کرا رہا تھا کہ میں تو آپ کو صحیح راہ پر لے جا رہا ہوں' لیکن تھا وہ بربادی و ہلاکت کا راہبر۔ اس لیے وہ جل بھن کر اسے کہے گا۔

يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ (۴۳ : ۳۸) "کاش میرے اور تیرے درمیان شرق و مغرب کا بعد ہوتا"۔ کاش کہ ہم ملتے ہی نہ اور ہمارے درمیان یہ دوریاں ہوتیں اور پھر قرآن مجید کہتا ہے۔

فَبِئْسَ الْقَرِیْنُ (۴۳:۳۸) "یہ تو بہت ہی برا ساتھی ہے"۔ اب دونوں کی حالت پر مایوس کر دینے والا تبصرہ۔ اور پھر اس منظر پر پردہ گرتا ہے۔

وَلَنْ یَّنْفَعَکُمُ الْیَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّکُمْ فِی الْعَذَابِ مُشْتَرِکُوْنَ (۴۳:۳۹) "اور اس وقت ان لوگوں سے کہا جائے گا کہ جب تم ظلم کر چکے تو آج یہ بات تمہارے لیے کچھ نافع نہیں ہے کہ تم اور تمہارے شیطان عذاب میں مشترک ہیں"۔ عذاب سب کے لیے برابر ہے اور اس کو باہم تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

---ooo---

اب روئے سخن ان لوگوں سے پھر جاتا ہے۔ ان لوگوں کو اس بری حالت میں چھوڑ کر کہ ایک دوسرے کو ملامت کریں، الزامات کی بوچھاڑ کریں، برا بھلا کہیں، خطاب رسول اللہ سے شروع ہو جاتا ہے کہ آپ ان لوگوں کے اس انجام بد سے پریشان نہ ہوں اور ان کے اعراض اور کفر کی پرواہ بھی نہ کریں جو حق آپ کی طرف آ رہا ہے اس پر جم جائیں اور سچائی قدیم زمانے سے مسلسل آ رہی ہے اور ہر رسول نے اسی کو پیش کیا ہے۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِی الْعُمْیَ وَمَنْ كَانَ فِیْ ضَلٰلٍ
مُّبِیْنٍ ﴿۴۰﴾ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اَوْ نُرِیَنَّكَ الَّذِیْ
وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَیْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِیْٓ اُوْحِیَ اِلَیْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰی
صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۴۳﴾ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۴۴﴾
وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ۴
اٰلِهَةً یُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾ ع ۱۰

"پھر کیا اے نبی، تم بہروں کو سناؤ گے؟ یا اندھوں اور صریح گمراہی میں پڑے ہوئے لوگوں کو راہ دکھاؤ گے؟ اب تو ہمیں ان کو سزا دینی ہے خواہ ہم تمہیں دنیا سے اٹھا لیں، یا تم کو آنکھوں سے ان کا وہ انجام دکھا دیں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے، ہمیں ان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ تم بہرحال اس کتاب کو مضبوطی سے تھامے رہو، جو وحی کے ذریعہ سے تمہارے پاس بھیجی گئی ہے، یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب تمہارے لیے اور تمہاری قوم کے لیے ایک بہت بڑا شرف ہے اور عنقریب تم لوگوں کو اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ تم سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے تھے ان سب سے پوچھ دیکھو، کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے تھے کہ ان کی بندگی کی جائے؟" ۱۰

قرآن کریم میں یہ مثال بار بار دہرائی جاتی ہے ۔ یہ رسول اللہؐ کو تسلی دینے کے لیے آتی ہے ۔ اور اس کے ذریعہ ہدایت و ضلالت کی حقیقت بھی بتائی جاتی ہے اور اس سلسلے میں اللہ کی مشیت اور قضا و قدر کا جو نظام ہے اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ کسی بھی رسول کے فرائض میں یہ شامل نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو ہدایت پر لے آئے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ انسانوں میں سے ایک اعلیٰ ترین جدوجہد کرنے والے انسان یعنی رسول کے کام کی حدود کہاں ختم ہوتی ہیں اور قدرت الٰہیہ اور نظام مشیت کہاں تک ہے ۔ اور اس سے عقیدہ توحید کی طرف اشارہ 'بہت ہی لطیف اشارہ کہ وہی کچھ ہوتا جو منظور خدا ہوتا ہے ۔

اَفَاَنۡتَ تُسۡمِعُ الصُّمَّ اَوۡ تَهۡدِی الۡعُمۡیَ وَ مَنۡ كَانَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ (۴۳ : ۴۰)
"اے نبیؐ کیا تم بہروں کو سناؤ گے ' یا اندھوں اور صریح گمراہی میں پڑے ہوئے لوگوں کو راہ راست دکھاؤ گے ؟" وہ تو نہ بہرے تھے اور اندھے تھے لیکن بہروں اور اندھوں کی طرح تھے اور گمراہی میں دور چلے گئے تھے ' اور ان پر دعوت اور پکار کا کوئی اثر نہ ہو رہا تھا ۔ نہ وہ دلائل ہدایت کو سمجھتے تھے حالانکہ رسول اللہؐ کی ڈیوٹی تو یہ تھی کہ جو سنتا ہے اسے سمجھائیں اور جو دیکھنا چاہے اسے راہ راست دکھائیں ۔ جب انہوں نے اپنے یہ اعضا ہی معطل کر دیئے ہیں اور انہوں نے اپنے دل و دماغ کی آنکھیں ہی بند کر دی ہیں تو رسول اللہؐ ان کو ہدایت کس طرح دے سکتے ہیں ۔ پھر اگر یہ گمراہ ہوتے ہیں تو رسول اللہؐ پر کیا ذمہ داری ہے ۔ آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا --- اب اللہ کا کام ہے کہ ادائیگی فرض کے بعد ان کے ساتھ کیا کرتا ہے ۔

فَاِمَّا نَذۡهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنۡهُمۡ مُّنۡتَقِمُوۡنَ (۴۳ : ۴۱) اَوۡ نُرِیَنَّكَ الَّذِیۡ وَعَدۡنٰهُمۡ فَاِنَّا عَلَیۡهِمۡ مُّقۡتَدِرُوۡنَ (۴۳ : ۴۲) "اب تو ہمیں ان کو سزا دینی ہے ' خواہ تمہیں دنیا سے اٹھالیں ' یا تم کو آنکھوں سے ان کا وہ انجام دکھا دیں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے ' ہمیں ان پر پوری قدرت حاصل ہے"۔ بہرحال ان دونوں صورتوں میں سے ایک ضرور پیش آئے گی ۔ اگر اللہ نے نبی کو اٹھا لیا تو اللہ اس کے مکذبین سے انتقام لے گا اور اگر آپ کے ہوتے ہوئے وہ بات وجود میں آگئی جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے تو اللہ اس پر قادر ہے کہ جس بات سے وہ ڈرا رہا ہے ' اس کو وجود میں لائے ۔ وہ تو اللہ کو کسی صورت میں شکست نہیں دے سکتے ۔ دونوں حالات میں معاملہ اللہ کی قدرت اور مشیت کے اختیار میں ہے ' اللہ ہی اس دعوت کا مالک ہے ۔ رسول تو پیغام پہنچانے والا ہے ۔

فَاسۡتَمۡسِكۡ بِالَّذِیۡۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡكَ اِنَّكَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (۴۳ : ۴۳) "تم بہرحال اس کتاب کو مضبوطی سے تھامے رہو جو وحی کے ذریعہ سے تمہارے پاس بھیجی گئی ہے ' یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو"۔ آپ جس کام میں لگے ہوئے ہیں ' اس پر جم جائیں اور اپنے راستے پر چلیں ان لوگوں نے جو رویہ اختیار کیا یا آئندہ کریں گے اس کی کوئی پرواہ نہ کریں ۔ اپنے راستے پر پوری طرح مطمئن ہو کر چلیں ۔ آپ تو یقیناً سیدھے راستے پر ہیں ۔ یہ راستہ آپ کو نہ ادھر ادھر لے جائے گا ' نہ اس میں ٹیڑھ ہے اور نہ وہ اپنی منزل سے دور لے جاتا ہے ۔

پھر جس عقیدے اور نظریہ کی آپ تبلیغ کرتے ہیں وہ اس پوری کائنات کی حقیقت کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور اللہ کے اس عام قانون کے ساتھ ہم آہنگ ہے جس پر یہ پوری کائنات قائم ہے ۔ یہ نظریہ اس کائنات کے ناموس اکبر کی لائن پر ہے ۔ اس سے جدا نہیں ہوتا اور نہ اس سے منقطع ہوتا ہے ۔ اور یہ راستہ اپنے راہ رو کو ٹھیک اپنے خالق تک پہنچاتا ہے اور یہ اس قدر سیدھا ہے کہ سفر بھی نہایت ہی خوشگوار رہتا ہے ۔

آپ کو تاکید کی جاتی ہے کہ آپ اس حقیقت پر جمے رہیں اور آپ کے بعد آپ کی امت کے جو داعی ہوں گے آپ کا عمل ان کے لیے مشعل راہ ہو گا اگرچہ اس راہ کے منحرفین کے ہاتھوں ان کو اذیتیں کیوں نہ مل رہی ہوں ۔

وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْئَلُوْنَ (۴۳ : ۴۴) "اور حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب تمہارے لیے اور تمہاری قوم کے لیے ایک بہت بڑا شرف ہے اور عنقریب تم لوگوں کو اس کی جوابدہی کرنی ہو گی"۔ یہاں اس آیت کے دو مفہوم ہیں کہ یہ قرآن تمہارے اور تمہاری قوم کے لیے نصیحت ہے اور تم سے جلد ہی قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔ لہٰذا اس نصیحت اور یاد دہانی کے بعد تمہارے پاس کوئی حجت نہ رہے گی۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ یہ قرآن تمہارے اور تمہاری قوم کے لیے ایک شرف اور شہرت ہے اور یہ وہ مفہوم ہے جو واقع ہو گیا۔

جہاں تک رسول اللہ کا تعلق ہے تو اربوں ہونٹ آپ پر درود و سلام بھیجتے ہیں اور رات دن اور صبح و شام آپ کو عاشقانہ انداز میں یاد کرتے ہیں اور اس طرح حضور کی بعثت سے لے کر قیامت تک اربوں لوگ آپ پر درود و سلام پڑھتے رہیں گے ۔

رہی حضور کی قوم تو جب قرآن آیا تو دنیا میں ان کا نام و نشان نہ تھا۔ اور اگر کچھ تھا تو زندگی کی کتاب پر ایک حاشیے کی شکل میں ' ایک کونے میں ۔ یہ یہی قرآن ہے جس کے ذریعے انسانی تاریخ میں عربوں کا ایک عظیم کردار متعین ہوا۔ یہ قرآن ہی تھا جس کی وجہ سے ربع مسکوں ان کے زیر نگیں رہا۔ جب تک انہوں نے قرآن کو سینے سے لگا رکھا تھا اور جب انہوں نے قرآن کو چھوڑا تو دنیا نے ان کو چھوڑ دیا' وہ دوبارہ حقیر ہو گئے اور پھر ان کو قافلہ انسانیت کی لائن میں سب سے پیچھے پھینک دیا۔ لیکن جب قرآن انہوں نے سینے سے لگایا ہوا تھا تو وہ قافلہ سالار تھے --- اور یہ ایک عظیم ذمہ داری تھی' قیادت انسانیت کی ذمہ داری اور اس کے بارے میں اللہ عنقریب تم سے جواب دہی کرے گا کہ کیوں تم نے اس منصب کو چھوڑا۔ وَسَوْفَ تُسْئَلُوْنَ (۴۳ : ۴۴) "اور جلد ہی تم سے پوچھا جائے گا"۔ یہ آخری مفہوم زیادہ جامع و مانع ہے ۔ میں اسی کی طرف مائل ہوں ۔

وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ

(۴۳ : ۴۵) "تم سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے تھے ان سب سے پوچھ دیکھو کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے کہ ان کی بندگی کی جائے؟" اس حقیقت کو قرآن یہاں نہایت ہی منفرد انداز میں پیش کرتا ہے ۔ اس صورت میں کہ رسول اللہ سابقہ رسولوں سے پوچھ لیں ۔

أَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُعْبَدُوْنَ (۴۳ : ۴۵) "کیا ہم نے خدائے رحمن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے تھے کہ ان کی بندگی کی جائے"۔ اور پھر اس سوال کا جواب ہر رسول کی طرف سے قطعی انکار ہے۔ استفہام انکاری کی یہ صورت نہایت ہی عجیب اور موثر ہے۔ اور یہ اسلوب نہایت ہی پر تاثیر ہے 'یعنی تاریخ سے پوچھو۔

رسول اللہ اور انبیائے سابقین کے درمیان تو زمان و مکان کے طویل فاصلے ہیں۔ پھر موت و حیات کے فاصلے بھی بہت طویل ہیں 'آپ زندہ ہیں اور انبیائے سابقہ فوت ہو گئے ہیں لیکن یہ تمام فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ پوری انسانی تاریخ میں رسالت تو ایک ہے 'پیغام ایک ہے اور کلمہ توحید بھی ایک ہے۔ اگرچہ زمان و مکان بعید ہیں۔ حیات اور موت کے درمیان دبیز پردے ہیں لیکن وحدت نبوت ان تمام دوریوں اور پردوں کو مٹا دیتی ہے۔ مردے اور زندہ ایک ہو جاتے ہیں۔ ماضی و حال ایک ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے قرآن کریم کا انداز تعبیر جو لطیف اور عجیب ہے۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے برادر دیگر انبیائے کرام اور اللہ کے ساتھ ان کے ربط کو دیکھا جائے تو یہاں قریب و بعید کے فاصلے ختم ہو جاتے ہیں۔ اللہ کے ہاں یہ پردے چشم زدن میں دور ہو جاتے ہیں اور تمام رکاوٹیں اور فاصلے دور ہو کر حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔ حضور پھر سوال کرتے ہیں اور انبیاء جواب دیتے ہیں جیسا کہ لیلۃ المعراج میں ہوا۔

ایسے مقامات پر چاہئے کہ ہم اپنی زندگی کے معمولات اور عادات کو اہمیت نہ دیں کیونکہ یہ مالوفات جو ہم دیکھتے ہیں کہ سبب کے بعد مسبب آتا ہے۔ یہ اللہ کے حوالے سے کوئی کلی قواعد نہیں ہیں۔ ہم تو اس کائنات کے بعض آثار ہی کو دیکھ سکتے ہیں اور اس کائنات کے طبیعی حالات کے بھی ایک نہایت ہی معمولی حصے تک پہنچ سکے ہیں۔ کئی ایسے حقائق ہیں جو ہماری ساخت 'ہمارے حواس اور ہمارے مرتب کردہ نتائج سے وراء ہیں۔ جب نفس انسانی ان مالوفات اور طبیعیات کے دائرے سے نکل جاتا ہے اور اسے تجرد حاصل ہو جاتا ہے تو پھر ایک مجرد حقیقت تک انسان کا پہنچنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ یہ ادراک پھر اس سے آسان تر ہوتا ہے جس طرح کوئی اپنے ہی جسم سے کسی دوسرے جسم کو چھو کر ادراک کرے۔

---ooo---

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے حوالے سے کہ کبرائے قریش نے آپ کی نبوت پر اعتراض کیا۔ آپ کو کیوں منتخب کیا گیا ہے۔ اور پھر آپ کے انتخاب پر ان کا اعتراض صرف دنیا کی کھوٹی اور جھوٹی قدروں کی بنا پر کیا گیا' حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حصے کی ایک کڑی لائی جاتی ہے جس میں یہ بتایا گیا کہ آپ کی قوم نے جس طرح اپنے آپ کو بڑا سمجھا 'اسی طرح فرعون نے بھی موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا سمجھا تھا۔ جس طرح انہوں نے کہا۔

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۴۳ : ۳۱) "یہ قرآن ان دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہیں اتارا گیا"۔ اسی طرح فرعون نے بھی اپنی قوت 'حکومت اور مال و دولت پر گھمنڈ کیا تھا اور نہایت فخریہ انداز میں پوچھا تھا:

اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۴۳ : ۵۱)

"لوگو 'کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے 'اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا"۔ اور وہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں جو اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا وہ محض اپنے دنیاوی مرتبہ و مقام کی بنا پر اور مال و دولت

کی بنا پر تھا حالانکہ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ بندے اور نبی تھے ۔ لیکن وہ دنیاوی اعتبار سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا :

اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ ھٰذَا الَّذِیْ ھُوَ مَھِیْنٌ وَّلَا یَکَادُ یُبِیْنُ (۴۳ : ۵۲) "میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل و حقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا" ۔ اور فرعون کی تجویز اور اہل قریش کی تجویز کس قدر مماثل ہیں ۔

فَلَوْلَآ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَھَبٍ اَوْجَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِکَةُ مُقْتَرِنِیْنَ (۴۳ : ۵۳)

"کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن نہ اتارے گئے یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں نہ آیا" ۔ یہ ایک نسخہ ہے جو بار بار پیغمبروں کے خلاف آزمایا جا رہا ہے ۔ بنی بنائی دلیل ہے جو ہر نبی کے خلاف استعمال ہو رہی ہے ۔

اس کے بعد یہ بیان کیا جاتا ہے کہ عوام جن کو فرعون نے ذلیل کر کے رکھا ہوا تھا اور پوری طرح دھوکے میں رکھا ہوا تھا کس طرح فرعون کی بات پر لبیک کہتے ہیں ۔ حالانکہ عوام اور فرعون کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حیران کن معجزات پیش کیے تھے ۔ پھر ان لوگوں پر اور آزمائشیں بھی آئی تھیں اور یہ لوگ دو ڑ کر آتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام سے دعا کراتے تھے اور اللہ ان مصیبتوں سے ان کو نجات دیتا تھا ۔

جب معجزات اور تبلیغ کے ذریعہ ان پر حجت تمام ہو گئی تو ان کا انجام یہ ہوا ۔

فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْھُمْ فَاَغْرَقْنٰھُمْ اَجْمَعِیْنَ (۴۳ : ۵۵) فَجَعَلْنٰھُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ (۴۳ : ۵۶) "آخر کار جب انہوں نے ہمیں غضبناک کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کو اکٹھا غرق کر دیا اور بعد والوں کے لیے پیش رو اور نمونہ عبرت بنا کر رکھ دیا" ۔

اور دیکھیے 'یہ ہیں بعد میں آنے والے' نہ عبرت پکڑتے اور نہ نصیحت لیتے ہیں ۔ اس پیراگراف کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ رسالت اور دعوت ایک رہی ہے ۔ تمام رسولوں کا منہاج کار ایک رہا ہے 'راستہ ایک رہا ہے ۔ اس طرح سرکشوں اور کبراء زمانہ کا رویہ بھی سچائی کے ردعمل میں ایک ہی رہا ہے ۔ انہوں نے ہمیشہ دنیا کی کھوٹی اور جھوٹی قدروں کے زاویہ سے پیغمبروں کو دیکھا اور ہمیشہ جمہور عوام کا رویہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے جن کو کبراء ذلیل کر کے رکھتے ہیں اور پوری انسانی تاریخ اس کی داستان ہے ۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۶﴾ فَلَمَّا جَآءَھُمْ بِاٰیٰتِنَآ اِذَا ھُمْ مِّنْھَا یَضْحَکُوْنَ ﴿۴۷﴾

"ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کے پاس بھیجا اور اس نے جا کر کہا کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں ۔ پھر جب اس نے ہماری نشانیاں ان کے سامنے پیش کیں تو وہ ٹھٹھے مارنے لگے" ۔

حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان یہ پہلی ملاقات ہے اور اس کا ذکر بطور تمہید ہوا ۔ اصل مقصد یہ ہے کہ اس

قصے' کا متعلقہ حصہ پیش کیا جائے' متعلقہ حصہ یہ ہے کہ جس طرح قریش نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراضات کیے' ویسے ہی فرعون نے بھی کیے تھے' جس طرح یہ اعتراضات دنیائے دنی کے جھوٹے معیار کے حوالے سے تھے اسی طرح فرعون نے بھی اپنی برتری کے لیے دنیاوی معیار پیش کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی کہا کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں اور تمام رسولوں نے کہا کہ ہم رسول ہیں' یہاں حضرت موسیٰ کے معجزات کی طرف اور ان کے مقابلے میں فرعونیوں کے ردعمل کی طرف بھی صریح اشارہ۔

اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ (۴۳ : ۴۷) "وہ ٹھٹھے مارنے لگے"۔ اور ہمیشہ جاہلوں کا یہی انداز ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان آزمائشوں کی طرف اشارہ آتا ہے' جن کی تفصیلات دوسری سورتوں میں دے دی گئی ہیں۔ یہ آزمائشیں پے درپے ان پر آئیں اور یہ حضرت موسیٰ کے ہاں فریادی ہوئے اور آپ کی دعاؤں سے وہ آزمائشیں دور ہوئیں۔

وَمَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ۡ وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ وَقَالُوْا يٰۤاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ۝

"ہم ایک پر ایک ایسی نشانی ان کو دکھاتے چلے گئے جو پہلی سے بڑھ چڑھ کر تھی' اور ہم نے ان کو عذاب میں دھر لیا کہ وہ اپنی روش سے باز آئیں۔ ہر عذاب کے موقع پر وہ کہتے 'اے ساحر' اپنے رب کی طرف سے جو منصب تجھے حاصل ہے' اس کی بنا پر ہمارے لیے اس سے دعا کر' ہم ضرور راہ راست پر آجائیں گے مگر جوں ہی کہ ہم ان پر سے عذاب ہٹا دیتے وہ اپنی بات سے پھر جاتے تھے"۔

یوں یہ مسلسل معجزات جو حضرت موسیٰ کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے جا رہے تھے ذریعہ ایمان نہ بنے۔ حالانکہ ایک سے ایک بڑا معجزہ ظاہر ہو رہا تھا۔ یہ بات قرآن کریم کے اس اصول کی تصدیق کرتی ہے جو قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے کہ جو دل ہدایت کے قابل ہی نہ ہو اس کو معجزات کے ذریعہ بھی ہدایت نہیں ملتی اور یہ کہ کوئی رسول بہرے کو سنا نہیں سکتا اور اندھے کو راہ نہیں دکھا سکتا۔

یہاں قرآن کریم فرعون اور اس کے درباریوں سے جو بات نقل کرتا ہے اس میں عجیب بات یہ ہے جو وہ کہتے ہیں۔

وَقَالُوْا يٰاَيُّهَا السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ

(۴۳ : ۴۹) "اے ساحر' اپنے رب کی طرف سے جو منصب تجھے حاصل ہے' اس کی بنا پر ہمارے لیے اس سے دعا کر' ہم ضرور راہ راست پر آجائیں گے"۔ یہ ایک مصیبت میں گرفتار ہیں رب موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ دعا کراتے ہیں کہ یہ مصیبت ٹل جائے لیکن اس کے ساتھ حضرت موسیٰ کو "اے جادوگر" سے خطاب کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں۔

ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ (۴۳:۴۹) "اپنے رب کی طرف سے جو منصب تجھے حاصل ہے، اس کی بنا پر ہمارے لئے اس سے دعا کر"۔ حالانکہ حضرت موسیٰ تو ان کو کہتے تھے کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں۔ یہ نہ کہتے تھے کہ میں صرف اپنے رب کی طرف سے رسول ہوں۔ لیکن اصل بات یہ تھی نہ ان معجزات نے ان کے دل پر اثر کیا تھا اور نہ رسول کے کلام نے ان پر اثر کیا تھا۔ وہ یہ غلط کہتے تھے کہ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ (۴۳:۴۹) "ہم ضرور راہ راست پر آجائیں گے"۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (۴۳:۵۰) "مگر جونہی کہ ہم ان پر سے عذاب ہٹا دیتے وہ اپنی بات سے پھر جاتے"۔ لیکن بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ معجزات کے نتیجے میں جمہور عوام کے دلوں پر اثر ہو جاتا ہے اور ان کے دھوکہ کھائے ہوئے دماغوں میں بعض اوقات بات آجاتی ہے۔ اب فرعون دبدبہ شاہی اور اقتدار کے رنگ میں آتا ہے۔ زیب و زینت اور اقتدار کے کروفر میں۔ اور جمہور کے سامنے اپنی سطحی منطق پیش کرتا ہے۔ اور عوام کو متاثر کرنے کی سعی کرتا ہے۔ غلامی کی ذہنیت رکھنے والے عوام کے سامنے جن کا خمیر ظلم اور جبر کے دور میں بالعموم بدل جاتا ہے، وہ چکنی چپڑی باتیں کرتا ہے اور ان کے سامنے کروفر کے ذریعے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِىْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِىْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِىْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴿۵۲﴾ فَلَوْلَآ اُلْقِىَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴿۵۳﴾

"ایک روز فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا، "لوگو، کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے، اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟ میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل و حقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا؟ کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے؟ یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں نہ آیا؟""

مصر کی بادشاہت، مصر کی نہریں فرعون کے زیر انتظام تھیں اور جمہور عوام کو نظر آتی تھیں۔ یہ ان کی آنکھوں کو چکاچوند کر دیتی تھیں۔ اس لیے لوگ دھوکہ کھا جاتے تھے۔ رہی آسمانوں اور زمین کی بادشاہت جس میں مصر ایک ذرہ ہے، تو اس کو سمجھنے کے لیے مومن دلوں کی ضرورت ہوتی ہے، جو اس بات کو سمجھ سکیں اور اللہ کی بادشاہت اور مصر کی بادشاہت کے درمیان موازنہ کر سکیں۔

رہے غلامی کے خوگر عوام جن کا ہر دور میں استحصال کیا جاتا ہے تو ان کو قریب کی دنیاوی چمک دمک متاثر کر دیتی ہے اس لیے ان کی نظریں، ان کے دل اور ان کے دماغ اللہ کی بلند حکومت اور بادشاہت کو سمجھنے کے لیے سربلند ہی نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ فرعون نے ان عوام کے غافل اور سطحی دلوں کے سامنے ترقیات کا زرق برق نقشہ پیش کیا اور کہا۔

اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ ھٰذَا الَّذِیْ ھُوَ مَھِیْنٌ وَّلَا یَکَادُ یُبِیْنُ (۴۳ : ۵۲) ''میں بہتر ہوں یا یہ جو ذلیل و حقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا''۔ یہاں ذلت سے اس کی مراد یہ تھی کہ یہ نہ امیر ہے' نہ صاحب اقتدار اور نہ اس کے پاس نظر آنے والی مالی پوزیشن ہے۔ لفظ ام سے وہ اشارہ بنی اسرائیل کی غلام قوم کی طرف کرتا ہے اور ''اپنی بات کھول کر بیان نہیں کر سکتا'' اس طرف کہ مصر سے جانے سے پہلے آپ کی زبان میں لکنت تھی۔ یہ پہلے کی بات تھی ورنہ اب لکنت نہ تھی۔ حضرت موسیٰ نے دعا فرمائی تھی۔

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ ''اے میرے رب میرے سینہ کو کھول دے' میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے' اور میری زبان میں لکنت ہے' اسے کھول دے تاکہ وہ میری بات کو سمجھیں''۔ اس وقت آپ کی زبان کا عقدہ کھل گیا تھا اور آپ اب بات بیان کر سکتے تھے۔

اور جمہور عوام کا ظاہر ہے کہ فیصلہ یہی ہو گا کہ فرعون جو مصر کا بادشاہ ہے' مصر میں نہریں اس نے جاری کر رکھی ہیں۔ وہ موسیٰ علیہ السلام سے بہتر ہو گا۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس تو حق بات' نبوت کا پیغام' نجات کی دعوت اور دردناک عذاب سے بچنے کی راہ تھی۔

فَلَوْلَآ اُلْقِیَ عَلَیْہِ اَسْوِرَۃٌ مِّنْ ذَھَبٍ (۴۳ : ۵۳) ''کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے''۔ یہ ہے ذہنیت وڈیروں کی۔ اس دنیا کا حقیر سازوسامان' نبوت کی حقانیت کے لیے بطور علامت تجویز ہو رہا ہے۔ سونے کے کنگن' ان معجزات سے بھاری ہو گئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوئے۔ مطلب یہ تھا کہ اسے مصر کا اقتدار کیوں نہیں دیا گیا۔ کیونکہ مصر کے بادشاہ کی تاج پوشی کے موقعہ پر سونے کے کنگن اتارے جاتے تھے۔ یہ ان کی رسم تھی۔ یوں وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ رسول کو مقتدر اعلیٰ ہونا چاہئے اور یہ میں ہوں۔

اَوْ جَآءَ مَعَہُ الْمَلٰٓئِکَۃُ مُقْتَرِنِیْنَ (۴۳ : ۵۳) ''یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں نہ آیا''۔ یہ بھی ایک اعتراض تھا' جس کا تعلق اس دنیا کی چمک دمک سے تھا۔ اور عوام پر اثر انداز ہوتا تھا۔ یہ بھی ایک بنا بنایا اعتراض ہے جو ہر رسول پر کیا گیا۔

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَہٗ فَاَطَاعُوْہُ ۭ اِنَّھُمْ کَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝

''اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی' درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ''۔ جمہور عوام کو ڈکٹیٹروں کی طرف سے خفیف و حقیر سمجھنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے وہ پہلے تو عوام سے ہر بات کو چھپا کر رکھتے ہیں۔ ان سے حقائق کو چھپاتے ہیں تاکہ وہ بھول جائیں۔ اور ان کے بارے میں وہ دوبارہ کھوج ہی نہ لگائیں۔ ان کے دل و دماغ کو اس قدر متاثر کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت عوام کے ذہنوں پر چھا جاتی ہے۔ اس کے بعد پھر ان کے لیے عوام کو ہلکا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ مطیع ہو جاتے اور جدھر چاہتے ہیں' ادھر جاتے ہیں۔

لیکن کوئی ڈکٹیٹر عوام کو اس قدر ہلکا نہیں بنا سکتا جب تک وہ خود فاسق و فاجر نہ ہوں اور بے راہ روی نہ کرتے

ہوں۔ انہوں نے اللہ کی رسی نہ پکڑی ہو۔ معاملات کو ایمان کے ترازو سے نہ تولتے ہوں، رہے مومن تو نہ ان کو کوئی ہلکا سمجھ سکتا ہے، نہ ان کو دھوکہ دے سکتا ہے، اور نہ ان کو کھلونا بنایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ عوام الناس نے فسق و فجور کی وجہ سے فرعون کا ساتھ دیا۔

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ (۴۳ : ۵۴) "اس نے اپنی قوم کو ہلکا بنا دیا، پس انہوں نے اس کی اطاعت کر لی اور یہ لوگ ایک فاسق قوم کے فرد تھے"۔

اب ان کی آزمائش، ان کو ڈرانے اور سمجھانے کا مرحلہ ختم ہوتا ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ یہ قوم ایمان لانے والی نہیں ہے۔ فتنہ عام ہو گیا ہے، جمہور عوام فرعون کے پیچھے لگ گئے ہیں اور فرعون بہت ہی سرکش، متکبر، مغرور ہے اور عوام اللہ کے بین معجزات کے مقابلے میں بالکل اندھے ہو گئے ہیں، ان کو یہ روشنی نظر ہی نہیں آتی۔ اب اللہ کے عذاب کا فیصلہ ان پر آ جاتا ہے۔

فَلَمَّا آسَفُونَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۵۵﴾ فَجَعَلْنَاهُمْ ۵

۱۱ع سَلَفًا وَمَثَلًا لِلْآخِرِينَ ﴿۵۶﴾

۱۱

"آخر کار جب انہوں نے ہمیں غضب ناک کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کو اکٹھا غرق کر دیا اور بعد والوں کے لیے پیش رو اور نمونہ عبرت بنا کر رکھ دیا"۔

یہاں اللہ کا قرآن ذات باری کے غضب اور انتقام اور تباہی مچانے والے اقدام کو پیش کرتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے غضب کے نتیجے میں اس کی قوت جو کام کرتی ہے وہ تاریخ میں مثال ہوتی ہے۔

فَلَمَّا آسَفُونَا (۴۳ : ۵۵) "جب انہوں نے ہمیں غضب ناک کر دیا"۔ یعنی بہت زیادہ ناراض کر دیا۔

انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ (۴۳ : ۵۵) "ہم نے ان سے انتقام لیا اور سب کو اکٹھا غرق کر دیا"۔ فرعون، اس کے سرداروں اور لشکر کو۔

یہی لوگ تھے جو حضرت موسیٰ کے تعاقب میں ہلاک ہوئے، ان کو پیشوا بنا دیا کہ ہر ظالم یہی کام کرے اور اسی انجام تک پہنچے۔

وَمَثَلًا لِلْآخِرِينَ (۴۳ : ۵۶) "اور نمونہ عبرت پچھلوں کے لیے"۔ یعنی ان لوگوں کے لیے جو فرعون کے بعد ایسے کام کرنے والے تھے اور جو ان کے قصے کو معلوم کر کے اس سے عبرت حاصل کرنے والے تھے۔

---ooo---

حضرت موسیٰ کے قصے کی یہ کڑی یہاں ختم ہوتی ہے۔ یہ کڑی ان حالات کے مشابہ تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو

بمقابلہ قریش درپیش تھے ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ مومنین نے سخت بے جگری سے ان کا مقابلہ کیا۔اس قصے کے ذریعہ عرب کے مشرکین کو تنبیہہ کی جاتی ہے کہ تم جس طرح کے اعتراضات کرتے ہو' یہی اعتراضات فرعون اور اس کی قوم نے کیے تھے اور ان کا یہ انجام ہوا تھا۔

اس طرح اس قصے میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں' وہ قصہ فرعون و موسیٰ اور حالات موجودہ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل قریش کے حالات پر پوری طرح منطبق ہوتے ہیں' اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سورت میں بیان کردہ حالات میں قصے کی اس کڑی کو کیوں لایا گیا ہے' پھر اس طرح یہ قصہ الہی منہاج تربیت کے مطابق مسلمانوں کے لیے بہترین ذریعہ تربیت بھی ہے۔

---ooo---

اب قصہ موسیٰ علیہ السلام کی اس کڑی سے بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصے کی ایک کڑی کی طرف منتقل ہوتی ہے۔اور یہ کڑی اس نکتے پر لائی گئی ہے کہ مشرکین فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھ کر ان کی عبادت کرتے تھے اور پیروکاران مسیح ان کو خدا کا بیٹا سمجھ کر ان کی بندگی کرتے ہیں اور یہ اس سورت کا آخری سبق ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۳۲ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا آخری سبق ہے اور اس کا موضوع بھی عربوں کے افسانوی عقائد ہیں' یہ کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں' اس لیے ہم ان کی بندگی کرتے ہیں' یہاں ایک استدلال نقل کیا جاتا ہے جو مشرکین مکہ اپنے واہی تباہی عقائد کی مدافعت میں پیش کیا کرتے تھے ۔ یہ استدلال وہ اس نیت سے نہ کرتے تھے کہ وہ سچائی کے متلاشی تھے' یہ محض دکھاوا اور دھوکہ تھا۔

جب ان سے کہا گیا کہ تم اور جن بتوں کی تم بندگی کرتے ہو' وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے ۔ مراد تو یہ تھی کہ جن بتوں کی پوجا کرتے ہو' خواہ وہ فرشتوں کے نام سے ہیں یا کسی اور کے نام کے ۔ مراد یہ نہ تھی کہ جن کے نام سے تم بتوں کو منسوب کرتے ہو' وہ بھی جہنم میں ہوں گے ۔ غرض ان سے جب یہ کہا گیا کہ عابد و معبود دونوں جہنم میں ہوں گے ۔ جب ان سے یہ کہا گیا تو بعض لوگوں نے عیسیٰ ابن مریم کی مثال دی کہ بعض گمراہ عیسائی ان کی بندگی کرتے تھے ۔ یہ ان کی طرف سے محض ایک کج بحثی تھی ۔ پھر وہ کہتے تھے کہ جب اہل کتاب حضرت عیسیٰ کی بندگی کرتے ہیں تو ان سے ہم بہتر ہیں کہ ہم فرشتوں کی بندگی کرتے ہیں ۔ یہ استدلال بناء الباطل علی الباطل کی بہترین مثال تھا۔

اس بنا پر یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصے کی ایک کڑی لائی جاتی ہے ۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی حقیقت کیا ہے ۔ آپ کی دعوت کیا تھی ۔ اور ان سے پہلے بنی اسرائیل میں کیا اختلافات تھے اور ان کے بعد کیا اختلافات پیدا ہوئے ۔

اس کے بعد تمام بدعقیدہ اور مشرکانہ خیالات رکھنے والوں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ اچانک قیامت آ جائے گی اور پھر حالت کیا ہوگی؟ اس کے بعد قیامت کے مناظر میں سے ایک طویل منظر پیش کیا جاتا ہے جس میں ایک جھلک ان نعمتوں کی ہے جو متقین کے لیے تیار کی گئی ہیں اور ایک جھلک اس دردناک عذاب کی ہے جو مجرمین کے لیے تیار کیا گیا ہے ۔

اس سبق میں فرشتوں کے بارے میں عربوں کے اس افسانے کو بھی رد کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں ۔ اللہ پاک ان باتوں سے بری ہے جو یہ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ اس مناسبت سے اللہ کی بعض صفات کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے ۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ زمین و آسمان اور دنیا و آخرت کا مطلق مالک ہے اور سب لوگوں نے اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے ۔

اور آخر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ ان کو نظرانداز کر دیں' ان سے منہ پھیر لیں اور ان کو کرنے دیں جو کرتے ہیں ۔ عنقریب ان کو اپنا انجام معلوم ہو جائے گا اور یہ ایک ایسی بالواسطہ دھمکی ہے جو ان لوگوں کے لیے مناسبت ہے جو محض دکھاوے کے لیے کٹ حجتی کرنے میں' احقاق حق کے لیے بات نہیں کرتے ۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۳۳ تشریح آیات

## ۵۷--- تا --- ۸۹

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ۝٥٧
وَقَالُوا ءَأٰلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ ۚ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ
خَصِمُونَ ۝٥٨ إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِبَنِي
إِسْرَاءِيلَ ۝٥٩ وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلٰئِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ ۝٦٠ وَإِنَّهُ
لَعِلْمٌ لِلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُونِ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝٦١ وَلَا
يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝٦٢ وَلَمَّا جَاءَ عِيسٰى بِالْبَيِّنٰتِ
قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ۖ
فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝٦٣ إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ
مُسْتَقِيمٌ ۝٦٤ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ
يَوْمٍ أَلِيمٍ ۝٦٥

"اور جونہی کہ ابن مریم کی مثال دی گئی' تمہاری قوم کے لوگوں نے اس پر غل مچا دیا اور لگے کہنے کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ؟ یہ مثال وہ تمہارے سامنے محض کج بحثی کے لیے لائے ہیں' حقیقت یہ ہے کہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ۔ ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے لیے اسے اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنا دیا۔ ہم چاہیں تو تم کو فرشتے بنا دیں جو زمین میں تمہارے جانشین ہوں اور وہ (یعنی ابن مریم) دراصل قیامت کی ایک نشانی ہے' پس تم اس میں شک نہ کرو اور میری بات مان لو' یہی سیدھا راستہ ہے' ایسا نہ ہو شیطان تم کو اس سے

روک دے کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے ۔ اور جب عیسیٰ صریح نشانیاں لیے ہوئے آیا تھا' اس نے کہا تھا کہ "میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں' اور اس لیے آیا ہوں کہ تم پر بعض ان باتوں کی حقیقت کھول دوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو' لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی ۔ اسی کی تم عبادت کرو' یہی سیدھا راستہ ہے" ۔ مگر (اس کی اس صاف تعلیم کے باوجود) گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا' پس تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ایک دردناک دن کے عذاب سے" ۔

ابن اسحاق نے سیرۃ میں لکھا ہے کہ جس طرح مجھ تک یہ بات پہنچی 'حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں ولید ابن مغیرہ کے پاس بیٹھے تھے 'نضر ابن الحارث بھی آیا اور وہ بھی ان کے پاس بیٹھ گیا ۔ مجلس میں قریش کے کئی اور لوگ بھی بیٹھے تھے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ بات کی ۔ نضر ابن حارث نے کچھ اعتراض کیا' تو حضورؐ نے اس کو خاموش کرا دیا ۔ اس کے بعد ان پر یہ آیت پڑھی ۔

انَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ (۲۱ : ۹۸)

"تم اور جن بتوں کی تم پوجا کرتے ہو' جہنم کا ایندھن ہیں ۔ تم اس جہنم میں پہنچنے والے ہو...." ۔ رسول اللہ اس مجلس سے اٹھ گئے اور عبداللہ ابن الزبعری تمیمی آیا اور مجلس میں بیٹھ گیا تو ولید ابن مغیرہ نے کہا : "خدا کی قسم نضر ابن الحارث کا کھڑا ہونا تھا کہ عبدالمطلب کے بیٹے اٹھ کر چلے گئے ۔ محمد کا خیال یہ ہے کہ ہم اور ہمارے سب معبود جہنم کا ایندھن ہیں ۔ اس پر عبداللہ ابن الزبعری نے کہا' خدا کی قسم اگر مجھے ملے تو میں اس کے ساتھ جھگڑا کروں گا ۔ تم محمد سے پوچھو کیا وہ تمام معبود جن کی عبادت کی جاتی ہے' اپنے عبادت کرنے والوں کے ساتھ جہنم میں ہوں گے ۔ ہم تو ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں ۔ یہودی عزیر کی عبادت کرتے ہیں اور نصاریٰ مسیح ابن مریم کی عبادت کرتے ہیں تو ولید اور اہل مجلس' عبداللہ ابن زبعری کی بات سے بے حد متاثر ہوئے ۔ انہوں نے سمجھا کہ اس نے خوب دلیل پیش کی اور مباحثہ کیا ۔ یہ بات رسول اللہ کے سامنے ذکر ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا : "جس نے اس بات کو پسند کیا کہ وہ اللہ کے سوا پوجا جائے تو بے شک وہ ان لوگوں کے ساتھ جہنم میں ہوگا جنہوں نے اسے پوجا ۔ یہ لوگ دراصل شیطان کی عبادت کرتے ہیں جس نے ان کو ان بزرگوں کی بندگی کا حکم دیا ہے" ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔

انَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ (۲۱ : ۱۰۱) "رہے وہ لوگ جن کے بارے میں ہماری طرف سے بھلائی کا فیصلہ پہلے ہو چکا ہوگا تو وہ یقیناً اس سے دور رکھے جائیں گے" ۔ یعنی حضرت عیسیٰ' حضرت عزیر اور ان کے ساتھ پوجے جانے والے دوسرے احبار اور رہبان ۔ جو اللہ کی عبادت پر قائم رہے اور ان کی وفات کے بعد لوگوں نے ان کی عبادت شروع کر دی اور ان کو ارباب من دون اللہ بنا دیا ۔ اور یہ جو عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں بات کی گئی کہ ان کی بھی من دون اللہ عبادت کی جاتی ہے اور ولید اور دوسرے اہل مجلس اس سے متاثر ہوئے تو اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ۔

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ (۴۳ : ۵۷) "جب ابن مریم کی

مثال دی گئی تو تمہاری قوم نے اچانک غل مچا دیا" ۔یصدون کے معنی ہیں یَصُدُّوْنَ عَنْ اَمْرِکَ یعنی تمہاری دعوت سے روکتے رہیں....."۔

علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں لکھا ہے کہ جب رسول اللہؐ نے قریش کے سامنے یہ آیت پڑھی اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (۲۱ : ۹۸) "تم اور تمہارے معبود جہنم کا ایندھن ہوں گے اور سب نے اس میں جانا ہے"۔ تو اس پر اہل قریش سخت برہم ہوئے۔ عبداللہ ابن زبعری نے پوچھا محمدؐ' یہ حکم صرف ہمارے معبودوں اور ہمارے بارے میں ہے یا دوسری ملتوں کے بارے بھی ہے۔ آپ نے فرمایا "یہ تمہارے لیے تمہارے الہوں کے لیے اور تمام اقوام کے لیے ہے"۔ تو اس نے کہا' رب کعبہ کی قسم میں نے تمہیں شکست دے دی۔ کیا تم یقین نہیں کرتے کہ عیسیٰ ابن مریم نبی ہیں اور تم ان کے اور ان کی والدہ کے بارے میں اچھی باتیں کرتے ہو' اور تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ نصاریٰ ان کی عبادت کرتے ہیں اور عزیر کی بھی یہودی بندگی کرتے ہیں' ملائکہ کی بھی بندگی کی جاتی ہے۔ اگر یہ سب لوگ جہنم میں ہوں گے تو ہم بھی اپنے الہوں کے ساتھ جہنم میں جانے کے لیے تیار ہیں۔ اس پر وہ بہت ہنسے اور خوش ہوئے۔ حضورؐ خاموش ہو گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی :

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى (۲۱ : ۱۰۱) "رہے وہ لوگ جن کے بارے میں ہماری طرف سے بھلائی کا فیصلہ ہو چکا ہو گا"۔ اور یہ آیت بھی نازل ہوئی جس کے معنی یہ ہیں کہ جب عبداللہ ابن الزبعری نے عیسیٰ ابن مریم کی مثال دی اور رسول اللہؐ کے ساتھ مباحثہ کیا کہ نصاریٰ بھی تو عیسیٰ کی عبادت کرتے ہیں تو اچانک تمہاری قوم اہل قریش نے شور و غل مچانا شروع کر دیا۔ اور یہ انہوں نے اس لیے کیا کہ وہ اس دلیل پر بہت خوش ہوئے۔ کیونکہ رسول اللہؐ کو زبعری نے خاموش کر دیا تھا۔ جس طرح بعض اوقات بے دلیل لوگ جب بحث میں ہار جاتے ہیں اور اچانک ان کو کوئی دلیل مل جاتی ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ لفظ یصدون کے معنی تو ہیں شور کرنا۔ لیکن جنہوں نے اسے یصدون (حرف صاد پر پیش کے ساتھ) پڑھا ہے تو اس کے معنی ہوں گے کہ وہ حق سے منہ موڑتے ہیں' اعراض کرتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یصدون الصدید سے ہے جس کے معنی مقابلہ اور کٹ جانے کے ہیں۔ یصدون اور یصدون دونوں طرح آتا ہے جس طرح یعکف اور یعکف آتا ہے۔

وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ (۴۳ : ۵۸) "ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ"۔ مطلب یہ ہے کہ کیا تمہارے نزدیک ہمارے الہ عیسیٰ سے اچھے اور بہتر نہیں؟ اگر عیسیٰ جہنم کا ایندھن ہیں تو پھر ہمارے الہوں کا معاملہ آسان ہے۔

یہ تھی صاحب کشاف کی روایت' معلوم نہیں انہوں نے کس سے اخذ کی ہے لیکن اپنے عمومی مضمون میں یہ ابن اسحاق کی روایت کے ساتھ متفق ہے۔

دونوں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس جدل و جدال میں محض ظاہری اور لفظی کج بحثی سے کام لیتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کہتا ہے۔

بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (۴۳: ۵۸) "حقیقت یہ ہے کہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ"۔ یہ جھگڑتے ہیں اور تنقید کرنے میں بہت ماہر ہیں' مناظرہ باز ہیں۔ ان کو پہلے سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور رسول اللہ کی مراد کیا' اس کے بعد وہ مفہوم کو توڑ مروڑ کر اپنی مراد پر لاتے ہیں اور پھر اعتراض کرتے ہیں اور الفاظ کے عموم کو لے کر اعتراض کرتے ہیں حالانکہ ان کے اندر وہ پورے قرآن کی تعلیمات سے خود اختصاص پیدا کر سکتے تھے اور اس قسم کے عمومی اعتراضات وہی عائد کرتا ہے جو مخلص نہ ہو اور پوری طرح چالاک ہو' جس کی سوچ درست نہ ہو' مکابرہ کرنے والا ہو اور ہر وقت شبہات' الفاظ کے ہیر پھیر اور کسی جگہ پر نقب زنی کرنے کا متلاشی ہو۔ اس لیے حضور اکرمؐ نے ہمیشہ ایسی گفتگو سے منع فرمایا ہے جس میں محض دکھاوا ہو' حقیقت نہ ہو' اور جس میں صاحب کلام ہر صورت میں اپنی بات کو غالب کرنا چاہتا ہو۔

ابن جریر نے' ابو کریب سے انہوں نے احمد ابن عبدالرحمن سے انہوں نے عبادہ ابن عبادہ سے' انہوں نے جعفر سے انہوں نے قاسم سے اور انہوں نے حضرت ابو امامہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکلے اور لوگ قرآن کریم میں مباحثہ اور مناظرہ کر رہے تھے۔ آپ کو بہت شدید غصہ آیا۔ گویا آپ کے چہرۂ مبارک پر سرکہ ڈال دیا گیا ہو۔ (ترش روئی کا اظہار کیا) اس کے بعد آپ نے فرمایا" قرآن کے بعض حصوں کو بعض دوسرے حصوں سے نہ ٹکراؤ' کیونکہ لوگ گمراہ تب ہوئے جب ان کے اندر مذہبی جھگڑے اور اختلافات شروع ہو گئے"۔ اس کے بعد آپ نے پڑھا۔

مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (۴۳: ۵۸) "یہ مثال وہ تمہارے سامنے محض کج بحثی کے لیے لائے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت ہی جھگڑالو لوگ ہیں"۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک دوسرا احتمال بھی ہے۔

وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ (۴۳: ۵۸) "اور وہ کہنے لگے کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ؟" میں یہ اشارہ ہے کہ ان کے افسانوی عقائد کے مطابق وہ ملائکہ کی پوجا کرتے تھے ان کا خیال یہ تھا کہ ان کی یہ پوجا نصاریٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پوجا سے بہتر ہے۔ کیونکہ ملائکہ اپنے مزاج کے اعتبار سے اور ان کے افسانوی خیال کی رو سے خدا کے زیادہ قریب ہیں۔ اس پر یہ تبصرہ۔

مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (۴۳: ۵۸) "یہ مثال وہ تمہارے سامنے محض کج بحثی کے لیے لائے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت ہی جھگڑالو لوگ ہیں"۔ اور جس طرح پہلے گزرا یہ ابن الزبعری پر رد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نصاریٰ کی عبادت مسیح کی مثال لانا یہاں باطل ہے۔ نصاریٰ کا عمل حجت نہیں ہے کیونکہ وہ تو توحید سے پھر گئے ہیں جس طرح مشرکین توحید سے پھر گئے ہیں۔ لہٰذا دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ سب کے سب گمراہ ہیں۔ بعض مفسرین نے اس طرف اشارہ کیا ہے اور یہ بھی ایک قریب الفہم تفسیر ہو سکتی ہے۔ اور اس کے بعد حضرت عیسیٰ کے بارے میں جامع تبصرہ۔

اِنْ ھُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْهِ وَ جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۴۳ : ۵۹) "ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے لیے اسے اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنا دیا"۔ اور وہ الٰہ نہیں جس کی عبادت کی جائے' جس طرح نصاریٰ کا ایک گروہ گمراہ ہوا اور اس نے ان کی بندگی شروع کر دی۔ وہ تو ایک بندۂ خدا ہیں ان پر اللہ کا انعام ہو گیا' اور اگر بعض لوگوں نے ان کی بندگی کی ہے تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے ان کو رسالت اور معجزات دے کر بنی اسرائیل کے لئے نمونہ قدرت الٰہیہ بنایا گیا تھا اور بنی اسرائیل کو چاہئے تھا کہ وہ ان کی پیروی کرتے اور ہدایت حاصل کرتے مگر وہ گمراہ ہو گئے۔

اب بات ان کے عقائد بابت ملائکہ کے موضوع کی طرف آتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ فرشتے تو تمہاری طرح اللہ کی مخلوق ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اس زمین میں تمہارا جانشین فرشتوں کو بنا دیں یا بعض لوگوں کو فرشتے بنا دیں جو زمین میں جانشین ہو جائیں۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِی الْاَرْضِ یَخْلُفُوْنَ (۴۳ : ۶۰) "اگر اللہ چاہتا تو ملائکہ کو تمہارا خلیفہ بنا دیتا"۔ یہ سارے معاملات اللہ کی مشیت پر موقوف ہیں۔ اپنی مخلوق کے بارے میں جو چاہے' کر دے لیکن مخلوق میں سے کوئی اللہ سے نسب نہیں جوڑ سکتا۔ اور نہ اللہ سے مل سکتا ہے سوائے خالق و مخلوق کے تعلق سے یا عبد و معبود کے تعلق سے یا غلام اور مالک کے تعلق سے۔

اس کے بعد کچھ فیصلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق کہ وہ ایک تو قیامت کی نشانی ہیں۔ اس قیامت کی جس کی یہ تکذیب کرتے ہیں یا ان کو اس کے آنے میں شک ہے۔

وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَ اتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ (۴۳ : ۶۱) وَ لَا یَصُدَّنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (۴۳ : ۶۲) "اور ابن مریم دراصل قیامت کا علم ہے بس تم اس میں شک نہ کرو' اور میری بات مان و۔ یہی سیدھا راستہ ہے' ایسا نہ ہو کہ شیطان تم کو اس سے روک دے' وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"۔ قیامت سے قبل نزول عیسیٰ علیہ السلام کے موضوع پر کئی احادیث آئی ہیں۔ یہ قیامت سے قدرے پہلے زمین پر اتریں گے۔ اور اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔

وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ (۴۳ : ۶۱) "اور وہ قیامت کا علم ہے"۔ یعنی ان کے آنے سے قرب قیامت کا علم ہو جائے گا اور دوسری قرات یہ ہے۔

وَ اِنَّهٗ لَعَلَمٌ لِّلسَّاعَةِ (۴۳ : ۶۱) "اور وہ قیامت کی نشانی ہے"۔ دونوں معنی صحیح ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ قریب ہے کہ تمہارے اندر ابن مریم بطور ایک منصف حاکم نازل ہوں' وہ صلیب کو توڑیں گے' خنزیر کو قتل کریں گے' لوگوں پر جزیہ عائد کریں گے اور مال تقسیم کریں گے یہاں تک کہ کوئی لینے والا نہ ہو گا' حالت یہ ہو گی کہ ایک سجدہ دنیا و مافیہا

سے بہتر ہو گا (متفق علیہ 'ابو داؤد' مالک)۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' میری امت میں سے ایک گروہ قیامت تک حق پر لڑتا رہے گا اور قیامت تک غالب رہے گا یہاں تک کہ عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے' مسلمانوں کے امیران سے کہیں گے' آپ ہمیں نماز پڑھائیں' وہ کہیں گے' نہیں۔ تم میں سے بعض بعض کے امراء ہوں گے' اللہ نے اس امت کو یہ اعزاز بخشا ہے"۔ (مسلم)

یہ ایک غیب ہے' اور اس کی اطلاع ہمیں صادق و امین صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اور اس طرف قرآن کریم نے بھی اشارہ کیا ہے' لہٰذا اس بارے میں کوئی انسان کوئی اور بات نہیں کر سکتا صرف وہی بات حق ہے جو ان دو سچے ذرائع سے آئی ہے اور ہمارے لیے سچے مصادر قیامت تک یہی ہیں۔

فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (۴۳ : ۶۱) "پس تم اس میں شک نہ کرو اور میری بات مانو' یہی سیدھا راستہ ہے"۔ یہ لوگ قیامت میں شک کرتے تھے۔ قرآن کریم انہیں دعوت دیتا ہے کہ اس پر یقین کرو' حضور اکرمؐ کی زبانی ان کو دعوت یقین دی جاتی ہے کہ تم میری اطاعت کرو اور میں تمہیں سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔ جو بالکل سیدھا اور منزل مقصود تک پہنچنے والا ہے۔ اور اس پر چلنے والے کبھی گمراہ نہیں ہوتے۔

یہ بتایا جاتا ہے کہ جو لوگ صراط مستقیم سے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں اور راندۂ درگاہ ہوتے ہیں' وہ شیطان کے اثر سے ہوتے ہیں' لہٰذا شیطان کے مقابلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ اس بات کے مستحق ہیں کہ آپ کی اطاعت کی جائے۔

وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۴۳ : ۶۲) "ایسا نہ ہو کہ شیطان تم کو اس سے روک دے' وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"۔ قرآن کریم اس مسلسل معرکہ کی طرف بار بار اشارہ کرتا ہے جو اولاد آدم اور شیطان کے درمیان حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے جاری ہے۔ یہ معرکہ جنت سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے۔ اور اس شخص سے بڑا احمق اور غافل اور کون ہو سکتا ہے جسے بار بار متنبہ کیا جائے کہ گھات میں دشمن بیٹھا ہے اور اس نے تمہارا ارادہ کر رکھا ہے اور یہ شخص اس کے برعکس دشمن کا مطیع فرمان بن جائے۔

اسلام نے تو انسان کو حکم دیا کہ وہ اپنی پوری زندگی میں شیطان کے خلاف اس دوامی جنگ میں برسرپیکار رہے اور اس کے ساتھ اس قدر عظیم مال غنیمت کا وعدہ کیا ہے جو کسی بشر کے تصور سے باہر ہے۔ اسلام نے انسانی جنگ کا رخ اس معرکہ خیر و شر کی طرف پھیر دیا جس کی وجہ سے انسان صحیح انسان بنتا ہے اور جس کی وجہ سے تمام مخلوقات میں سے انسان کو ایک ممتاز مخلوق بنایا گیا ہے اور ایک خاص مزاج دیا گیا ہے اور یہاں انسان کا سب سے بڑا نصب العین یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے کھلے دشمن شیطان پر غالب آجائے' یوں وہ شر' خباثت اور ہر قسم کی گندگی پر غالب آجائے اور زمین میں خیر کی بنیادیں رکھ دے جن میں لوگ ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں گے اور پاکیزہ زندگی گزاریں گے۔

اس نصیحت کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مزید معلومات کہ وہ کیا پیغام لے کر آئے تھے اور ان سے پہلے بنی اسرائیل کے باہم اختلافات کیا تھے اور بعد میں کیا ہوتا رہا۔

وَلَمَّا جَآءَ عِيسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ (۴۳:۶۳) إِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ (۴۳:۶۴) فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ (۴۳:۶۵) ''اور جب عیسیٰ صریح نشانیاں لیے ہوئے آیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور اس لیے آیا ہوں کہ تم پر بعض ان باتوں کی حقیقت کھول دوں جن میں اختلاف کر رہے ہو' لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو' حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا بھی ۔ اس کی تم عبادت کرو ۔ یہی سیدھا راستہ ہے مگر گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا ۔ پس تباہی ہے ان لوگوں لیے جنہوں نے ظلم کیا ایک دردناک دن کے عذاب کی''۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کے سامنے واضح نشانیاں لے کر آئے تھے ۔ یہ نشانیاں وہ معجزات بھی تھے جن کا صدور آپ کے ہاتھوں پر ہوا ۔ اور وہ کلمات اور تقاریر بھی تھیں جو آپ نے لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لیے کیں ۔ آپ نے اپنی قوم سے کہا:

قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ (۴۳:۶۳) ''میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں'' اور جسے حکمت دی گئی وہ گویا خیر کثیر کا مالک بن گیا ۔ وہ لغزش اور بے راہ روی سے امن میں ہو گیا ۔ تفریط اور تقصیر سے محفوظ ہو گیا ۔ اور صحیح راستے پر اس کے قدم نہایت ہی توازن اور روشنی میں اٹھنے لگے اور آپ ان کے پاس اس لیے بھی خصوصی طور پر آئے تھے کہ اس وقت مذہبی گروہوں میں جو بہت بڑا تفرقہ پیدا ہو گیا تھا آپ اسے دور کریں ۔ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں ان کے فقہاء نے بے حد اختلاف شروع کر دیا تھا ۔ وہ فرقے فرقے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے ۔ آپ نے قوم کو اس طرف بلایا کہ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور آپ نے عقیدۂ توحید تو بڑی وضاحت' بلا ریب اور بغیر کسی التباس اور پیچیدگی کے بیان کیا ۔

إِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ (۴۳:۶۴) ''بے شک اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے لہٰذا اسی کی بندگی کرو''۔ نہ آپ نے یہ دعویٰ کیا کہ آپ اللہ ہیں اور نہ یہ دعویٰ کیا کہ آپ ابن اللہ ہیں اور آپ نے اپنے کلام میں کسی جگہ ماسوائے تعلق رب اور بندہ اور خالق و مخلوق' اللہ کے ساتھ کسی اور تعلق کا اشارہ تک نہیں کیا ۔ صرف یہی کہا کہ میں رسول ہوں' صراط مستقیم دے کر بھیجا گیا ہوں' جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے' نہ کوئی پھسلن ہے اور نہ کج روی ۔ لیکن جو لوگ حضرت عیسیٰ کے بعد آئے وہ بھی اسی طرح ٹکڑے اور پارٹیاں بن گئے جس طرح آپ سے پہلے کے لوگ ٹکڑے اور پارٹیاں تھے ۔ یہ اختلافات انہوں نے محض ظلم کرتے ہوئے کیے' اختلافات کے لیے نہ کوئی جواز تھا' اور نہ شبہ تھا ۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ (۴۳ : ۶۵) "پس تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ایک دردناک دن کے عذاب کی"۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ اس دور میں بنی اسرائیل رومیوں سے تنگ تھے ان کو انتظار تھا کہ نجات دہندہ آئے گا اور ہمیں چھڑائے گا لیکن جب وہ آیا تو انہوں نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا اور اس کی دشمنی پر اتر آئے اور انہوں نے اسے سولی پر چڑھانے کی سعی کی۔

جب آپ تشریف لائے تو اس وقت بنی اسرائیل ٹکڑے ٹکڑے تھے' اہم فرقے چار تھے :

(۱) صدوقی فرقہ : یہ صدوق کی طرف منسوب تھے' وہ اور اس کے خاندان کے لوگ ہیکل سلیمانی کے کاہن تھے۔ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے زمانے سے وہ اس منصب پر تھے۔ شریعت کے مطابق ضروری تھا کہ ان کا نسب ہارون علیہ السلام تک پہنچے جو حضرت موسیٰ کے بھائی پیغمبر تھے کیونکہ ہارون علیہ السلام کی اولاد ہی ہیکل کی متولی تھی۔ یہ لوگ اپنے فرائض کے مطابق عبادات کی ظاہری صورت پر بہت زور دیتے تھے۔ اور کسی قسم کی بدعت کے سخت مخالف تھے جبکہ اپنی شخصی زندگی میں بہت عیاش تھے اور زندگی کے مزے لیتے تھے اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ قیامت نہیں ہے۔

(۲) فریسیوں کا فرقہ : یہ صدوقیوں کے سخت خلاف تھے۔ ان کو اعتراض یہ تھا کہ یہ لوگ مذہبی رسومات اور عبادات کی ظاہری شکل پر بہت زور دیتے ہیں اور قیامت اور حساب و کتاب کے منکر ہیں۔ یہ نہایت ہی متقی اور صوفی قسم کے لوگ تھے۔ اگرچہ بعض کے اوپر علمی غرور چھایا ہوا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کا علمی غرور پسند نہ تھا۔ نیز آپ کو ان کی لفاظی بھی پسند نہ تھی۔

(۳) تیسرا فرقہ سامریوں کا تھا' یہ فرقہ یہودیوں اور اشوریوں پر مشتمل تھا۔ اور یہ عہد قدیم کی صرف پانچ کتابوں کو مانتا تھا۔ باقی کتب کو بعد کے اضافے سمجھتا تھا۔ یہ پانچ کتابیں موسوی کتب کے نام سے مشہور ہیں جبکہ دوسرے فرقے ساری کتب کو مانتے تھے۔

(۴) ان کو آسین یا اسینین کہتے تھے۔ یہ لوگ بعض فلسفیانہ افکار سے متاثر تھے۔ اور یہ لوگ دوسرے فرقوں سے علیحدہ رہتے تھے۔ اور اپنے آپ کو نہایت سختی اور تقشف میں رکھتے تھے اور ان کی جماعت بھی تنظیم میں بہت سخت تھی۔

ان چار مشہور فرقوں کے علاوہ بھی بہت سے انفرادی فرقے تھے۔ غرض بنی اسرائیل کے اندر نظریات اور طرز عمل کا سخت اختلاف و انتشار تھا۔ جن پر رومی شہنشاہیت کا سخت دباؤ تھا۔ اور پوری قوم سخت ذلت اور غلامی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ یہ منظر تھا جس میں ایک نجات دہندہ کی پیش گوئی کتابوں میں کی گئی تھی کہ وہ آئے گا اور ہمیں نجات دلائے گا۔ جب حضرت مسیح عقیدۂ توحید کے ساتھ بھیجے گئے اور انہوں نے اعلان کر دیا۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ (۴۳ : ۶۴) "کہ اللہ میرا بھی رب ہے' اور تمہارا بھی رب ہے' لہٰذا اس کی عبادت کرو"۔ اور اس کے ساتھ انہوں نے ایسی شریعت پیش کی جس میں رواداری اور روحانی اصلاح پر اور عبادات کی ظاہری صورت کی بجائے عبادات کے روحانی پہلو پر زور دیا گیا تھا تو ان فقہاء اور فریسیوں نے آپ کا مقابلہ کیا کیونکہ یہ لوگ عبادات کی ظاہری شکلوں ہی پر زور دیتے تھے۔

ان لوگوں کے بارے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کہا' ان میں سے آپ کے بعض اقوال نہایت ہی موثر ہیں "شاگردیہ لوگ بڑے بڑے بھاری بوجھ باندھتے ہیں اور لوگوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کو اپنے کاندھوں پر اٹھائیں اور خود اپنی انگلی بھی آگے نہیں بڑھاتے کہ اس بوجھ کو جگہ سے ہلا دیں ـ وہ جو کام بھی کرتے ہیں' اس لیے کرتے ہیں کہ لوگ اسے دیکھیں ـ اور اپنے کپڑوں کے دامن لمبے کرتے ہیں اور دعوتوں میں اول مقام پر بیٹھتے ہیں اور جلسوں میں پہلی جگہ پر بیٹھنا پسند کرتے ہیں اور بازاروں میں پھر کر سلام وصول کرتے ہیں اور یہ پسند کرتے ہیں کہ انہیں پکارا جائے' "سیدی سیدی" کہہ کر جہاں بھی وہ جائیں"۔

اور فریسیوں اور فقیہوں سے کہتے ہیں "اے اندھے قائدین! تم مچھر چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو' تم پیالے اور تھالی کے ظاہری حصے کو خوب صاف کرتے ہو لیکن ان کے اندر گندگی اور بدکاری ہوتی ہے' اے لکھنے والے مفتیان کرام اور دکھاوا کرنے والے فقہاء' تمہاری مثال یوں ہے جس طرح ایک چونا گچ کی سفید قبر' جس کا ظاہری حصہ خوبصورت اور ملمع شدہ ہے اور اندر بوسیدہ ہڈیاں ہیں"۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان کلمات کو پڑھو اور خود اپنے دور کے علماء اور مفتیان کرام کو دیکھو' کیا یہی الفاظ ان پر صادق نہیں آتے' دین کی تحریف کرنے والے' رسومات کے پجاری' ظاہر پرست اور دکھاوا کرنے والے۔

اس کے بعد حضرت مسیح اپنے رب کے پاس چلے گئے ـ اس طرح آپ کے پیروکاروں کے اندر اختلافات پیدا ہو گئے ـ یہ اس طرح فرقے فرقے اور ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے ـ بعض نے خود ان کو الٰہ بنا دیا ـ بعض نے اللہ کا بیٹا بنا لیا ـ بعض نے ثالث ثلاثہ کہا اور وہ کلمہ توحید ان سے گم ہوگیا جس کی دعوت لے کر آپ اس لئے تشریف لائے تھے کہ یہ لوگ اپنے رب کی طرف لوٹ آئیں اور دین اللہ کے لیے خالص کر دیں ـ

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ

(۴۳ : ۶۵) "مگر گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا پس تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ایک دردناک عذاب کے دن کی"۔ مشرکین عرب آئے اور انہوں نے حضور اکرم ؐ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مجادلہ شروع کر دیا ـ اس وجہ سے کہ پیروکاران مسیح نے آپ کے بعد گل کھلائے تھے اور آپ کے بارے میں بے شمار افسانے گھڑ لیے تھے ـ

---ooo---

جب ظالموں اور مشرکوں کے لیے ہلاکت کی خوشخبری دے دی گئی تو اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہونے والے ظالم احزاب کو اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان احزاب کے غلط نظریات کی اساس پر مباحثہ اور مناظرہ کرنے والے ظالمین کو قیامت کے ایک منظر میں دکھایا جاتا ہے اور اس منظر میں ایک جھلک مومنین متقین کو بھی دکھائی جاتی ہے جو جنت کے گلستانوں میں نہایت ہی عزت سے ہوں گے ـ

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا

يَشْعُرُوْنَ ﴿٦٦﴾ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٧﴾ يٰعِبَادِ ع
لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿٦٨﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا ۱۲
مُسْلِمِيْنَ ﴿٦٩﴾ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ﴿٧٠﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ
بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ
وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٧١﴾ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٧٢﴾
لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٧٣﴾ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ
خٰلِدُوْنَ ﴿٧٤﴾ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿٧٥﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ
كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٧٦﴾ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴿٧٧﴾

"کیا یہ لوگ اب بس اسی چیز کے منتظر ہیں کہ اچانک ان پر قیامت آ جائے اور انہیں خبر بھی نہ ہو؟ وہ دن جب آئے گا تو متقین کو چھوڑ کر باقی سب دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔ اس روز ان لوگوں سے جو ہماری آیات پر ایمان لائے تھے اور مطیع فرمان بن کر رہے تھے' کہا جائے گا کہ "اے میرے بندو' آج تمہارے لیے کوئی خوف نہیں اور نہ تمہیں کوئی غم لاحق ہو گا۔ داخل ہو جاؤ جنت میں تم اور تمہاری بیویاں' تمہیں خوش کر دیا جائے گا"۔ ان کے آگے سونے کے تھال اور ساغر گردش کرائے جائیں گے اور ہر من بھاتی اور نگاہوں کو لذت دینے والی چیز وہاں موجود ہو گی۔ ان سے کہا جائے گا "تم اب یہاں ہمیشہ رہو گے۔ تم اس جنت کے وارث اپنے ان اعمال کی وجہ سے ہوئے ہو جو تم دنیا میں کرتے رہے۔ تمہارے لیے یہاں بکثرت فواکہ موجود ہیں جنہیں تم کھاؤ گے"۔ رہے مجرمین' تو وہ ہمیشہ جہنم کے عذاب میں مبتلا رہیں گے' کبھی ان کے عذاب میں کمی نہ ہو گی' اور وہ اس میں مایوس پڑے ہوں گے۔ ان پر ہم نے ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔ وہ پکاریں گے "اے مالک' تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کر دے تو اچھا ہے"۔ وہ جواب دے گا "تم یوں ہی پڑے رہو گے"۔

یہ منظر یوں شروع ہوتا ہے کہ قیامت اچانک برپا ہو جاتی ہے۔ جب وہ اس سے غافل اور لاپرواہ تھے۔ ان کو توقع نہ تھی کہ اچانک قیامت آ جائے گی۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۴۳:۶۶) "کیا یہ لوگ بس اسی چیز کے منتظر ہیں کہ اچانک ان پر قیامت آ جائے اور انہیں خبر بھی نہ ہو"۔

اور جب یہ آ جاتی ہے تو دنیا کے تمام حالات کو بدل کر رکھ دیتی ہے' دنیا کی تمام باتیں بدل جائیں گی اور یہ بہت بڑا حادثہ ہو گا۔

اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ (۴۳:۶۷) "متقین کو چھوڑ کر باقی سب دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے"۔ ان کی دوستی کے سرچشمے ہی سے ان کی دشمنی پھوٹے گی۔ اس دنیا میں وہ شر پر مجتمع تھے اور وہ گمراہی میں ایک دوسرے کے مشیر تھے۔ آج وہ ایک دوسرے پر ملامت کرنے والے ہوں گے اور اس شر اور گمراہی کی ذمہ داری وہ ایک دوسرے پر ڈال رہے ہوں گے۔ کبھی تو وہ یاران ہمدم تھے اور آج وہ ایک دوسرے سے الجھنے والے مخالف۔ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ (۴۳:۶۷) "ماسوائے متقین کے"۔ ان کی دوستی باقی ہو گی کیونکہ وہ دوستی ہدایت پر تھی' باہم خیر خواہی پر تھی' اور انجام کار ان کو نجات ملی۔

جہاں دوست باہم جھگڑیں گے اور الجھیں گے پوری کائنات سے آواز ہو گی اور یہ اللہ کریم کی جانب سے ہو گی اور متقین کے لیے ہو گی:

یٰعِبَادِ لَاخَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (۴۳:۶۸) اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ کَانُوْا مُسْلِمِیْنَ (۴۳:۶۹) اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَ اَزْوَاجُکُمْ تُحْبَرُوْنَ

(۴۳:۷۰) "اس روز ان لوگوں سے جو ہماری آیات پر ایمان لائے تھے اور مطیع فرمان بن کر رہے تھے' کہا جائے گا کہ "اے میرے بندو' آج تمہارے لیے کوئی خوف نہیں اور نہ تمہیں کوئی غم لاحق ہو گا۔ داخل ہو جاؤ جنت میں تم اور تمہاری بیویاں' تمہیں خوش کر دیا جائے گا"۔ یعنی تم اس قدر خوش ہو گے کہ سرور اور خوشی تمہارے پہلوؤں اور چہروں کو ڈھانپ لے گی یوں نظر آئے گا کہ تم پر ایک خوبصورت چادر بچھی ہوئی ہے۔

اب ہمارا تخیل کچھ اور عجیب چیز دیکھتا ہے۔ سونے اور چاندی کے تھال اور پیالے ان پر پھرائے جا رہے ہیں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جنت میں ان کے لیے وہ کچھ ہے جنہیں ان کا نفس چاہتا ہے اور نفوس جو کچھ چاہتے ہیں ان کے علاوہ آنکھیں جو کچھ چاہتی ہیں' وہ بھی ہے اور یہ سب ضیافتیں ان کی کمال درجے کی عزت اور تکریم کے لیے ہوں گی۔

یُطَافُ عَلَیْھِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَھَبٍ وَّ اَکْوَابٍ وَ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْهِ الْاَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْاَعْیُنُ (۴۳:۷۱) "ان کے آگے سونے کے تھال اور ساغر گردش کرائے جائیں گے اور ہر من بھاتی اور نگاہوں کو لذت دینے والی چیز وہاں موجود ہو گی"۔

اور ان نعمتوں کے علاوہ' وہ چیز ہو گی جو ان سے بھی بڑی اور افضل ہے۔ یہ کہ اللہ خود مخاطب ہو کر ان کی عزت افزائی کرے گا اور یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہو گا۔

وَ اَنْتُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ (۴۳:۷۱) وَ تِلْکَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ اُوْرِثْتُمُوْھَا بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۳:۷۲) لَکُمْ فِیْھَا فَاکِھَةٌ کَثِیْرَةٌ مِّنْھَا تَاْکُلُوْنَ (۴۳:۷۳) "تم اب یہاں ہمیشہ

رہو گے، تم اس جنت کے وارث اپنے ان اعمال کی وجہ سے ہوئے ہو، جو تم دنیا میں کرتے رہے ۔ تمہارے لیے یہاں بکثرت فواکہ موجود ہیں جنہیں تم کھاؤ گے"۔

اور ان مجرمین یاران دنیا کا کیا حال ہے جنہیں ہم ابھی لڑتے جھگڑتے چھوڑ آئے ہیں :

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ (۴۳ : ۷۴) "رہے مجرمین تو وہ ہمیشہ جہنم کے عذاب میں مبتلا رہیں گے"۔ جہنم کا عذاب ایک دائمی عذاب ہے اور یہ نہایت ہی شدید اور اعصاب شکن عذاب ہوتا ہے، مسلسل ہوتا ہے اور ایک منٹ کے لیے بھی ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ اور اس میں ان کے لیے امید کی کوئی چنگاری نہ ہو گی اور نہ دور دور رہائی کا کوئی نشان ہو گا۔ اور یہ بدبخت اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ (۴۳ : ۷۵) "کبھی ان کے عذاب میں کمی نہ ہو گی اور وہ اس میں مایوس پڑے ہوں گے"۔ یہ کام انہوں نے خود اپنے خلاف کیا اور اپنے آپ کو اس ہلاکت خیز گھاٹ پر اتارا۔ یہ خود ظالم ہیں اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے، مظلوم نہیں ہیں۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ (۴۳ : ۷۶) "ان پر ہم نے ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے رہے"۔ اب اس منظر میں دور سے ایک چیخ اٹھتی ہے۔ ایک ایسی دردناک پکار جس میں مایوسی، تنگ دلی اور کربناکی کی تمام علامات موجود ہیں۔

وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ (۴۳ : ۷۷) "اور پکاریں گے اے مالک، تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کر دے تو اچھا ہے"۔ یہ چیخ نہایت دور سے جہنم کی تہوں سے اٹھتی ہے۔ جس کے دروازے بھی اب بند ہو چکے ہیں۔ یہ انہی مجرمین اور ظالمین کی آواز ہے۔ اب ان کی یہ پکار نجات کے لیے نہیں، نہ کسی امداد کے لیے ہے، یہ تو اب جہنم میں مایوس پڑے ہوئے ہیں، اب ان کی تجویز یہ ہے کہ اللہ ہمیں نیست و نابود کر دے، فوراً ختم کر دے تاکہ ہم آرام کر لیں۔ اور بہت سی آرزوئیں آرزوئیں ہی رہتی ہیں۔ لیکن اس پکار میں غضب کی تنگی اور بے تابی اور کربناکی ہے۔ اس فریاد و فغاں کے پیچھے ہمیں ایسے لوگ نظر آتے ہیں جن کی حالت عذاب نے خراب کر دی ہے۔ ہوش ٹھکانے نہیں رہے، درد کی حد ہو گئی اور یہ ان کی طاقت برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔ اس لیے آخر میں مجبور ہو کر یہ چیخ بے ساختہ نکل گئی۔

يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ (۴۳ : ۷۷) "اے مالک، تیرا رب ہمارا کام تمام ہی کر دے تو اچھا ہے"۔

لیکن اس پکار کا جواب نہایت ہی مایوس کن اور توہین آمیز ہے اور بغیر کسی لحاظ کے اور بغیر اس کے کہ ان کی کربناک پکار کو کوئی اہمیت دی گئی ہو۔

قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ (۴۳ : ۷۷) "وہ جواب دے گا، تم یونہی پڑے رہو گے"۔ اب رہائی کی کوئی امید نہیں ہے۔ نہ موت ہے اور نہ تم نیست و نابود کیے جاؤ گے۔ تم نے اب یہاں ہی ٹھہرنا ہے۔

اب سچائی کو ناپسند کرنے والوں اور منہ موڑنے والوں اور اس انجام تک پہنچنے والوں کو اس کربناک منظر کے متصلاً بعد خطاب کیا جاتا ہے اور نہایت ہی سنجیدہ اور تعجب خیز انداز میں کہا جاتا ہے اور اس حیرت انگیز فضا میں ان کو ڈرایا جاتا ہے ۔

لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۸﴾ اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ۭ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۸۰﴾

"ہم تمہارے پاس حق لے کر آئے تھے مگر تم میں سے اکثر کو حق ہی ناگوار تھا۔ کیا ان لوگوں نے کوئی اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ اچھا تو ہم بھی پھر ایک فیصلہ کیے لیتے ہیں۔ کیا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم ان کی راز کی باتیں اور ان کی سرگوشیاں سنتے نہیں ہیں؟ ہم سب کچھ سن رہے ہیں اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں"۔

یہ ہے وہ اصل بات ۔ اصل حق کی کراہیت اور ناگواری اس بات سے مانع تھی کہ وہ اسے قبول کریں۔ یہ بات مانع نہیں تھی کہ وہ سچائی کا ادراک نہ کر سکے تھے ۔رسول اللہ کی سچائی میں ان کو کوئی شک ہی نہ تھا۔ انہوں نے کبھی آپ کی طرف جھوٹ منسوب ہوتے نہ دیکھا تھا۔ جب ایک شخص لوگوں کے ساتھ جھوٹ کا معاملہ نہیں کرتا تو وہ اپنے اللہ پر جھوٹ کس طرح باندھ سکتا ہے ۔اور جھوٹا دعوائے نبوت کیسے کر سکتا ہے ۔

دنیا میں جو لوگ بھی حق کے خلاف جنگ کرتے ہیں ' وہ حق سے لاعلم نہیں ہوتے ' اصل بات یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کو پسند نہیں کرتے ۔کیونکہ حق ان کی خواہشات نفسانیہ کے خلاف ہوتا ہے ' ان کی شہوات سے متصادم ہوتا ہے اور ایسے لوگ اخلاقی لحاظ سے اس قدر کمزور ہوتے ہیں کہ اپنی خواہشات اور اپنی حاجتوں کو دبا نہیں سکتے ۔اس کے مقابلے میں وہ سچائی پر وار کرنے میں بڑے جری ہوتے ہیں اور سچائی کے داعیوں کے ایسے لوگ جانی دشمن ہوتے ہیں ' اپنی خواہشات اور چاہتوں کے مقابلے میں ان کی یہ کمزوری سچائی اور سچائی کے حاملین کے خلاف قوت کے استعمال کا ذریعہ بن جاتی ہے ۔تو پھر حقیقی قوت کا مالک اور جبار و قہار بھی ان کو دھمکی دیتا ہے ۔اور فرماتا ہے کہ میں ان کی تمام خفیہ اور ظاہری سازشوں سے باخبر ہوں۔

اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ (۴۳ : ۷۹) اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ بَلٰى وَ رُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ (۴۳ : ۸۰) "کیا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم ان کی راز کی باتیں اور ان کی سرگوشیاں سنتے نہیں ہیں؟ ہم سب کچھ سن رہے ہیں اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں"۔ حق کے مقابلے میں باطل پر ان کا اصرار ہے تو اللہ کو بھی اصرار ہے کہ ان کے باطل کے مقابلے میں حق کا بول بالا کر کے رہے گا۔ ان کی تدابیر اور ان کی سازشوں کے مقابلے میں اللہ کا علم کام کر رہا ہے جو راز کو بھی جانتا ہے اور

سرگوشیوں سے بھی باخبر ہے۔ اللہ خالق اور عزیز و علیم ہے اور اس کے مقابلے میں آنے والے ضعیف انسان ہیں' اس لیے یہ کچھ نہ کر سکیں گے۔

---ooo---

اس خوفناک ڈراوے کو چھوڑ کر رسول کریمؐ کو ایک ایسی بات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو آخری بات ہے کہ یہ ان سے کہہ دیں اور پھر ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں تاکہ اس انجام تک پہنچ جائیں جس کی تصویر تم نے ابھی دیکھی ہے۔

قُلْ إِن كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِينَ ﴿٨١﴾ سُبْحَانَ رَبِّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿٨٢﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ﴿٨٣﴾

"ان سے کہو' اگر واقعی رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے عبادت کرنے والا میں ہوتا"۔ پاک ہے آسمانوں اور زمین کا فرماں روا' عرش کا مالک' ان ساری باتوں سے جو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اچھا' انہیں اپنے باطل خیالات میں غرق اور اپنے کھیل میں منہمک رہنے دو' یہاں تک کہ یہ اپنا وہ دن دیکھ لیں جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے"۔

یہ لوگ فرشتوں کی عبادت اس تصور پر کرتے تھے کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اگر اللہ کی اولاد ہوتی تو اس کے ساتھ جان پہچان اور اس کی بندگی کا حق دار سب سے پہلے نبی ہوتا۔ کیونکہ انسانوں میں سے خدا کے قریب نبی اور رسول ہی ہوتے ہیں۔ اور پھر اللہ کی بندگی اور اطاعت میں بھی وہ سب سے آگے ہوتے ہیں اور اگر کوئی اولاد ہوتی تو اس کی عزت بھی سب سے پہلے نبی کرتے۔ لہٰذا ان لوگوں کا یہ تصور اور زعم ہی محض افسانہ ہے۔ اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور اس قسم کی صفات کی اللہ کی طرف نسبت کرنا اس کے شایان شان نہیں ہے' وہ پاک ہے۔

سُبْحَانَ رَبِّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ (۸۲:۴۳) "پاک ہے آسمان اور زمین کا فرماں روا' عرش عظیم کا مالک ان ساری باتوں سے جو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں"۔

جب انسان ان آسمانوں اور زمین پر غور کرتا ہے' ان کے نظام پر غور کرتا ہے' ان کی رفتار اور آثار کے اندر غایت درجہ ہم آہنگی دیکھتا ہے' اور اس نظام کے پیچھے جب بلند اور عظیم قوت کی عظمت کو دیکھتا ہے اور پھر اس پورے نظام پر اس کے قبضے اور کنٹرول کو دیکھتا ہے' جس کی طرف رب العرش کا لفظ اشارہ کرتا ہے تو انسان کے ذہن سے اس قسم کے افسانوی خیالات و خرافات خود بخود محو ہو جاتے ہیں۔ اور یہ غور کرنے والا انسان خود اپنی فطرت کے ذریعہ یہ معلوم کر لیتا ہے کہ ایسی ذات بے مثال ہی ہو سکتی ہے۔ اس کی کوئی مثال نہیں ہو سکتی جس طرح مخلوق کی اولاد ہوتی ہے اور نسلیں چلتی ہیں۔ یہ اللہ کے لائق نہیں ہے۔ وہ اس سے پاک ہے۔ اس قسم کے عقائد اس سوچ کے بعد خود بخود لغو نظر آتے ہیں۔ یہ فضول کلام اور ناجائز جسارت ہے۔ اس لیے کلام کرنا ہی فضول ہے۔ مناسب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو اپنے حال

پر چھوڑ دیا جائے ۔

فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّى يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ (۴۳:۸۳)

"انہیں اپنے باطل خیالات میں غرق اور اپنے کھیل میں منہمک رہنے دو یہاں تک کہ یہ اپنا وہ دن دیکھ لیں جن کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے"۔ اور وہ دن کیسا ہو گا' اس کی ایک تصویر تو ابھی انہوں نے دیکھ لی ہے ۔

--- ○○○---

ان لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دینے کے بعد اللہ کی تعریف اور حمد میں کچھ باتیں کی جاتی ہیں' یہ بتانے کے لیے کہ اس عظیم کائنات کا رب ایسا ہوتا ہے ۔ یہ ہیں اس کی صفات :

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ﴿٨٤﴾ وَتَبَارَكَ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٥﴾ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٨٦﴾

"وہی ایک آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی خدا' اور وہی حکیم و علیم ہے ۔ بہت بالا و برتر ہے جس کے قبضے میں زمین اور آسمانوں اور ہر اس چیز کی بادشاہی ہے جو زمین و آسمان کے درمیان پائی جاتی ہے' اور وہی قیامت کی گھڑی کا علم رکھتا ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو ۔ اس کو چھوڑ کر یہ لوگ جنہیں پکارتے ہیں وہ کسی شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے' الا یہ کہ کوئی علم کی بناء پر حق کی شہادت دے"۔

یہ ہے زمین و آسمان میں صرف ایک ہی الوہیت کا اعلان' جو وحدہ لاشریک ہے' وہ جو کام بھی کرتا ہے حکمت کی بنا پر کرتا ہے اور اپنے بے قید علم کے مطابق کرتا ہے ۔ پھر یہاں لفظ تبارک کا استعمال ہوا ہے یعنی برکتوں والا ہے اور اس کے بارے میں یہ لوگ جو تصورات رکھتے ہیں' ان سے بہت بلند ہے' وہ زمین و آسمانوں اور ان کے اندر تمام مخلوقات کا رب اور مالک ہے ۔ وہی قیامت کے دن کا جاننے والا ہے اور اس کی طرف لوٹنا ہے ۔ اس دن ان الہوں میں سے کوئی بھی نہ ہو گا ۔ سب غائب ہوں گے جن کو یہ پکارتے ہیں ۔ کیونکہ یہ لوگ کہتے تھے ہمارے یہ رب دراصل ہمارے سفارشی ہیں اور وہاں تو سفارش اس کی چلے گی جس کو پیشگی اجازت دے دی جائے گی' اور ظاہر ہے جن کو پیشگی اجازت ملے گی وہ معاندین حق اور دشمنان اسلام کی سفارش کرنے سے رہے ۔

اب یہاں ان کے سامنے وہ بات رکھی جاتی ہے جس میں وہ نہ شک کرتے تھے اور نہ جھگڑتے تھے ۔ یہ کہ اللہ ہی ہمارا خالق ہے ۔ سوال یہ کیا جاتا ہے جب اللہ خالق ہے تو پھر کیوں دوسروں کو اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہو۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٨٧﴾

"اور اگر تم ان سے پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو یہ خود کہیں گے کہ اللہ نے ۔ پھر کہاں سے یہ دھوکا کھا رہے ہیں"۔ یعنی جس سچائی کو ان کی فطرت تسلیم کرتی ہے اس سے وہ کیوں منہ موڑتے ہیں اور ایک طرف ہو کر نکل جاتے ہیں ۔

سورت کے آخر میں حضور اکرمؐ کی فریاد کو لایا جاتا ہے جو آپ کرتے تھے کہ میری قوم کفر' عناد اور ایمان نہ لانے پر تلی ہوئی ہے ۔ یہاں اس فریاد کو لا کر اس کی قسم اٹھائی جاتی ہے ۔

وَقِيلِهِ يٰرَبِّ إِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ ۸۸
ع ۲۲ وَقُلْ سَلٰمٌ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿٨٩﴾
۱۳

"قسم ہے رسولؐ کے اس قول کی کہ اے رب 'یہ وہ لوگ ہیں جو مان کر نہیں دیتے' اچھا' اے نبیؐ ان سے درگزر کرو اور کہہ دو کہ سلام ہے تمہیں' عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"۔

اس انداز تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریاد دور رس ہے 'اس کے گہرے نتائج نکلنے والے ہیں' اسے سن لیا گیا' اور عالم بالا اس کے نتیجے میں کچھ عظیم اقدامات کر رہا ہے ۔ لہٰذا اے نبیؐ آپ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں اور ان کی کارروائیوں اور ریشہ دوانیوں کی کوئی پرواہ نہ کریں' مطمئن رہیں' نہایت امن سلامتی اور شرافت کے ساتھ اپنی راہ پر چلتے رہیں ۔ اس میں بھی درپردہ ایمان نہ لانے والوں کو سخت دھمکی دی جا رہی ہے ۔ اس دن کے سلسلے میں جب سب چھپے ظاہر ہوں گے ۔ "اے نبیؐ ان سے درگزر کرو اور کہہ دو سلام ہے تمہیں' عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ---- پنجم

## پارہ ----- ۲۵

### سورۃ الدخان ـ ۴۴

آیات ۱--- تا--- ۵۹

# سورۃ الدخان ایک نظر میں

اس سورت کی آیات چھوٹی ہیں اور آیات کے مقفی اور مسجع ردیف اور فواصل ایک دوسرے کے قریب ہیں' ان میں زور دار قسم کی تصویر کشی ہے جس کے تمام رنگ نہایت اشاراتی ہیں ۔ یوں نظر آتا ہے کہ گم گشتہ راہ انسانیت کے دل و دماغ کی تاروں پر زور دار چوٹیں لگائی جارہی ہیں ۔

پوری سورت میں سیاق کلام متحد اور مربوط ہے ۔ جس کا محور اور عمود ایک ہے ۔ تمام تاریں اسی ایک عمود سے ملتی ہیں' خواہ قصص ہوں' قیامت کے مناظر ہوں یا تاریخ کی ہلاک کردہ اقوام کی بربادیوں کے مناظر ہوں یا اس وسیع و عریض کائنات کے مناظر ہوں ۔ توحید' رسالت اور قیامت پر براہ راست بات چیت ہے' یہ سب چیزیں انسان کے مردہ دلوں کو زندہ کرنے والی ہیں اور اس کے اندر زندہ اور متحرک ایمان پیدا کرنے والی ہیں اور پورے قرآن کا مقصد یہ ہے کہ مردہ دلوں کے اندر زندہ اور متحرک ایمان پیدا کیا جائے ۔

آغاز یوں ہوتا ہے کہ یہ قرآن ایک مبارک رات میں نازل ہوا جس کے اندر اللہ بڑے بڑے فیصلے فرماتا ہے اور اللہ کا بندوں پر بڑا کرم تھا کہ اس نے یہ کتاب نازل فرمائی ۔ اور ان کو قبل از وقت خبردار کر دیا ۔ اور یہ نازل کرنے اور کرم کرنے والا کون ہے؟ آسمانوں کا رب اور زمین کا رب ۔ اور ان کے درمیان کا بھی رب ۔ جو اولین اور آخرین کا رب ہے ۔ اور جو زندہ کرنے والا اور مارنے والا رب ہے ۔

روئے سخن یکلخت پھر جاتا ہے ۔ یہ ایک نہایت ہی دل لگتا انداز ہے ۔

بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ يَلْعَبُونَ (٤٤ : ٩) "بلکہ یہ اپنے شک میں پڑے کھیل رہے ہیں" ۔ اور اس شک پر بھی ان کو خوفناک دھمکی دی جاتی ہے ۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ (٤٤ : ١٠) يَغْشَى النَّاسَ هَٰذَا عَذَابٌ

أَلِيمٌ (٤٤ : ١١) "اچھا انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا' یہ ہے دردناک سزا" ۔ اب یہ لوگ اس عذاب کے دور کرنے کی دعائیں کرتے ہیں لیکن یہ تو ایسا دن ہے کہ جب آتا ہے تو پھر ٹلتا نہیں ۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ تصویر تو تم نے دیکھ لی ہے یہ عذاب گو آیا نہیں ہے تو کیا تم اس فرصت کو غنیمت نہیں سمجھتے ۔ بجائے اس کے کہ یہ رب کے سامنے پہنچ جائیں ۔ کیوں نہ ابھی سے تیاری شروع کر دیتے ۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنتَقِمُونَ (٤٤ : ١٦) "جس روز ہم بڑی ضرب لگائیں

گے وہ دن ہو گا جب ہم تم سے انتقام لیں گے"۔

یہ ایک شدید ضرب ہے سوئے ہوئے دلوں پر کہ آ رہا ہے وہ دن جس کی پکڑ سخت ہو گی ' شدید عذاب ہو گا اور اللہ کا انتقام ہو گا۔ اس کے بعد فرعون اور اس کے سرداروں کی ہلاکت کا منظر جب ان کے پاس ایک رسول کریم آیا اور اس نے ان کو پکارا۔

اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ (۴۴:۱۸) وَّ اَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ (۴۴:۱۹) "اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو۔ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو"۔ انہوں نے سننے سے انکار کر دیا اور یہ شریف رسول ان سے مایوس ہو گیا۔ اس تکبر' غرور کے بعد پھر ان کی ہلاکت نہایت ہی توہین آمیز انداز سے ہوئی۔

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ (۴۴:۲۵) وَّ زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِیْمٍ (۴۴:۲۶) وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِیْهَا فٰكِهِیْنَ (۴۴:۲۷) كَذٰلِكَ وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ (۴۴:۲۸) فَمَا بَكَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِیْنَ (۴۴:۲۹)

"کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے' کتنے ہی عیش کے سروسامان جن میں وہ مزے کر رہے تھے' ان کے پیچھے دھرے رہ گئے' یہ ہوا ان کا انجام اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنا دیا۔ پھر نہ آسمان ان پر رویا' نہ زمین' اور ذرا سی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی"۔

جب یہ منظر عروج پر تھا تو انہیں متوجہ کیا گیا کہ پھر بھی تم لوگ آخرت کی تکذیب کرتے ہو' اور تم ایسی باتیں کرتے ہو۔

اِنْ هِیَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِیْنَ (۴۴:۳۵) فَاْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۴۴:۳۶) "ہماری پہلی موت کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے بعد ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں۔ اگر تم سچے ہو تو اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو"۔ تاکہ قوم تبع کا انجام انہیں بتایا جائے اور یہ بتایا جائے کہ تم ان سے کچھ اچھے لوگ نہیں ہو کہ اس برے انجام سے بچ کر نکل جاؤ۔

بعث بعد الموت کا ربط زمین و آسمان کی تخلیق کی اسکیم سے ہے۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ (۴۴:۳۸) مَا خَلَقْنٰهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۴۴:۳۹) "یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم

نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دیں ۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ مانتے نہیں ہیں ۔

اس کے بعد ان کو یوم الفصل کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ ( ٤٤ : ٤٠ ) "یہ سب کے لیے طے شدہ ہے" ۔ اور پھر اس کے بعد شجرۂ زقوم کی بابت اور بدکاروں کے رگیدنے کی بابت اور پھر ان کو رگید کر جنم میں پھینکنے اور اوپر سے گرم پانی انڈیلنے کی بابت ایک خوفناک منظر ہے اور اس میں کفار کو خوب ذلیل و خوار کیا جاتا ہے ۔

ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ( ٤٤ : ٤٩ ) اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ( ٤٤ : ٥٠ ) "چکھ اس کا مزا، بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تو، یہ وہی چیز ہے جس کے آنے میں تم لوگ شک رکھتے تھے" ۔

پھر اس منظر کے ساتھ ہی ایک منظر آتا ہے جس کے اندر اللہ کی نعمتیں اسی طرح گہری ہیں جس طرح پچھلے منظر کا عذاب گہرا تھا اور یہ اس پوری سورت کی فضا کو جاری رکھتے ہوئے، جس میں نہایت ہی موثر مناظر دیے گئے ہیں ۔

جس طرح سورت کا آغاز قرآن مجید کے موضوع سے ہوا ۔ اس طرح انجام میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے ۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ( ٤٤ : ٥٨ ) "اے نبی، ہم نے اس کتاب کو تمہاری زبان میں سہل بنا دیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں" ۔

غرض یہ ایک ایسی سورت ہے جو انسانی دل و دماغ پر آغاز سے اختتام تک حملہ آور ہے ۔ اس کا اثر تیز اور مسلسل ہے جس طرح یہ تدبر کی تاروں کو چھیڑتی ہے ۔ نغمہ اور زمزمہ دیتی ہے ۔ اسی طرح اس کے مناظر، تصاویر اور ان کے مختلف رنگ، تیز رنگ اور مسلسل نظارے انسان کو اس جہاں کی سیر کراتے ہیں اور اسے اللہ کے نشانات ارض و سما میں دکھاتے ہیں ۔ یعنی جنت اور جہنم کے مناظر، ماضی اور حال کے مناظر علاوہ ازیں موت و حیات کے مناظر اور اس کائنات میں موثر قوانین فطرت بھی سب کے سب موجود ہیں اس لئے اپنے اختصار کے ساتھ یہ سورت بھی اس جہاں کا ایک مطالعاتی سفر ہے ۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۳۴ تشریح آیات

## ۱--- تا--- ۵۹

سُوْرَةُ الدُّخَانِ (۴۴) مَكِّيَّةٌ (۶۴)
اٰيَاتُهَا ۵۹ رُكُوْعَاتُهَا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ﴿۳﴾
فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ﴿۴﴾ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ۚ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۵﴾ رَحْمَةً
مِّنْ رَّبِّكَ ۚ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶﴾ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۘ
اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۷﴾ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ
الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”ح۔م۔' قسم ہے اس کتاب مبین کی کہ ہم نے اسے ایک بڑی خیر و برکت والی رات میں نازل کیا ہے' کیونکہ ہم لوگوں کو متنبہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ وہ رات تھی جس میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے۔ ہم ایک رسول بھیجنے والے تھے 'تیرے رب کی رحمت کے طور پر' یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے' آسمانوں اور زمین کا رب اور ہر اس چیز کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہے' اگر تم لوگ واقعی یقین رکھنے والے ہو۔ کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے' وہی زندگی عطا کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ تمہارا رب اور تمہارے ان اسلاف کا رب جو پہلے گزر چکے ہیں“۔

آغاز دو حروف سے ہوتا ہے حا۔ میم۔ اور دونوں کی قسم اٹھائی جاتی ہے او ... مبین کی بھی قسم اٹھائی جاتی ہے جو ایسے ہی حروف تہجی سے مرکب ہے۔ ان کے بارے میں سورتوں کے آغاز میں ہم بارہا بات کر چکے ہیں۔ پھر ان حروف

کی بھی اسی طرح قسم اٹھائی گئی جس طرح کتاب مبین کی قسم اٹھائی گئی۔ کتاب مبین کی اہمیت مسلم مگر ان حروف کی اہمیت کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر حرف بھی ایک معجزہ اور نشانی ہے اور ہر حرف انسان کی زبان کی ساخت کی نشانی ہے اور پھر کس انداز سے زبان اپنے مخرج سے اس حرف و صوت کو نکالتی ہے' پھر ان حروف کے مخارج کی ترتیب پھر ہر حرف کے نام اور اس کی آواز کے درمیان ایک رمز و اشارہ اور ان حروف اور کلمات کے ذریعہ انسان عظیم حقائق تک پہنچتا ہے۔ اور علوم کو مرتب کرتا ہے۔ یہ اس قدر عظیم کام ہے کہ اگر ہم اس پر سنجیدگی سے غور کریں اور اپنی عادت اور مانوسیت کو ایک طرف پھینک دیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ ایک حرف کس قدر عظیم چیز ہے اس لیے ان کی قسم اٹھائی گئی۔ وہ چیز کیا ہے جس کے لئے یہ قسم اٹھائی گئی ہے' وہ ہے وہ عظیم حادثہ جو ایک مبارک رات میں واقع ہوا یعنی نزول قرآن

إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ فِى لَيْلَةٍ مُّبَٰرَكَةٍ ۚ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ (۴۴ : ۳) فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ (۴۴ : ۴) أَمْرًا مِّنْ عِندِنَآ ۚ إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ (۴۴ : ۵) رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْعَلِيمُ (۴۴ : ۶) "ہم نے اسے ایک بڑی خیر و برکت والی رات میں نازل کیا ہے' کیونکہ ہم لوگوں کو متنبہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ وہ رات تھی جس میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے۔ ہم ایک رسول بھیجنے والے تھے' تیرے رب کی رحمت کے طور پر' یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے"۔

اور مبارک رات جس میں قرآن نازل ہوا' وہ رات ہے جس میں قرآن کریم کا نزول شروع ہوا اور یہ رمضان المبارک کی راتوں میں سے ایک رات ہے' جس کے بارے میں تصریح ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ ٱلَّذِىٓ أُنزِلَ فِيهِ ٱلْقُرْءَانُ "رمضان المبارک کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا"۔ قرآن مجید سب کا سب تو نہ اس رات کو نازل ہوا ہے اور نہ سب کا سب رمضان المبارک میں نازل ہوا ہے لیکن اس زمین پر اس کے آنے کا آغاز رمضان المبارک میں ہوا اور پھر اس مبارک رات میں ہوا۔ لیلۃ القدر یا لیلہ مبارکہ کے بارے میں یہی کافی ہے۔ واللہ اعلم!

یہ رات فی الواقع مبارک ہے جس میں انسانیت کے لیے رحمت خداوندی کا یہ عظیم دروازہ کھلا اور جہاں اسلامی نظام زندگی انسانوں کی زندگی میں جاگزیں ہونا شروع ہوا جس کے اندر انسان روح فطرت سے شناسا ہوا' جس کی نہایت ہی خوبصورت ترجمانی قرآن مجید میں کی گئی ہے۔ فطرت انسانی اس نظام کے لیے لبیک کہتی ہے اور خوشی خوشی اسے قبول کرتی ہے اور یوں دوامی فطرت انسانی کے مطابق ایک ایسا نظام قائم ہو جاتا ہے جو فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق اور اس کائنات کے بھی عین مطابق ہوتا ہے جس میں انسان رہ رہا ہے۔ یہ نظام اس قدر پاک و صاف اور بلا تکلف اور بغیر کسی تکلیف کے قائم ہوتا ہے اور اس نظام کے زیر سایہ انسان رہتا تو زمین پر ہے لیکن وہ ہوتا آسمانوں پر ہے۔

صحابہ کرامؓ اور پہلے انسان جن پر یہ قرآن نازل ہوا' وہ اسی آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ایک عرصہ تک اللہ کے ساتھ مربوط اور موصول زندگی گزارتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو فی الفور بتاتا تھا کہ تمہارے دلوں میں یہ یہ تصورات آتے

ہیں ' اور یہ کہ میں دیکھ رہا ہوں اور ان کو بھی یقین تھا کہ اللہ دیکھ رہا ہے ۔ اور اللہ ہمارا نگران ہے ' ہمارے دل کے ہر میلان اور ہر وسوسے اور پھر ہمارے جسم کی ہر حرکت کو وہ جانتا ہے ۔ یہ لوگ اپنے معاملات میں سب سے پہلے اسی کے ہاں پناہ لیتے تھے اور ان کو یقین تھا کہ اللہ قریب بھی ہے اور سننے والا بھی ہے اور دعاؤں کو قبول کرنے والا بھی ہے ۔

یہ برگزیدہ گروہ چلا گیا اور اس کے بعد قرآن کریم ایک کھلی کتاب کی حیثیت سے رہ گیا ' جو انسانوں کے دل کے ساتھ مربوط تھا ۔ یہ انسان پر اس طرح اثر کرتا رہا جو کسی جادوگر کے لیے بھی ممکن نہ تھا ۔ لیکن یہ اثر ان لوگوں پر ہوتا جو اس قرآن کو پڑھ کر اس لیے اپنے دل کھولتے ۔ تاہم انسان کے قلب و نظر بعض اوقات یوں بدل جاتے ہیں کہ یہ تغیر و انقلاب بعض اوقات افسانہ نظر آتے ۔ انسان ان پر یقین ہی نہیں کر سکتا ۔

یہ قرآن بطور ایک نظام زندگی باقی رہا ۔ اس کا نظام کامل ' واضح اور نہایت ہی پاکیزہ ''انسانیت'' دینے والا تھا ۔ اور قرآنی نظام زندگی جہاں بھی قائم رہا ' جس معاشرے میں رہا ' جس زمانے میں رہا ایک مثالی نظام رہا ۔ جہاں قرآنی نظام زندگی قائم ہوا اور جس زمانے میں قائم ہوا ' اس الٰہی نظام کی روشنی میں ایک ممتاز انسانی زندگی سامنے آئی اور اس کے اندر انسانی زندگی کے تمام خصائص موجود رہے ۔ اور یہ خصوصیت صرف اسلامی نظام زندگی کی ہے کہ جہاں یہ قائم ہوتا ہے وہاں ایسی اعلیٰ معیاری زندگی اور معاشرہ وجود میں آتا ہے اور یہ ایسا معاشرہ ہوتا ہے جس کے قیام میں کسی انسانی جدوجہد کا دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ اس نظام کی برکت اور قدرت الٰہیہ سے وجود میں آتا ہے ۔

انسان جو ادارے بناتے ہیں وہ انہی جیسے انسانوں کے لیے مفید ہو سکتے ہیں ۔ اور مخصوص زمان و مکان میں چل سکتے ہیں لیکن اللہ نے جو ادارے اور قوانین بنائے ہیں ان کے اندر صفت دوام رکھ دی ہے ۔ ان کے اندر انتہائی حسن و کمال رکھ دیا گیا ہے اور ایسی صلاحیت رکھ دی ہے جو ہر زمان و مکان کی قید سے وراء ہے جن میں اصل حقیقت اپنی جگہ موجود ہوتی ہے ۔ اور ہر زمان و مکان کے اعتبار سے اس کی عجیب صورت پذیری ہوتی رہتی ہے ۔

اس قرآن کو اللہ نے اس مخصوص رات میں اتارا تاکہ لوگوں کو متنبہ کیا جائے ۔

إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ ( ۴۴ : ۳ ) ''کیونکہ ہم لوگوں کو متنبہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے'' ۔ اس لئے کہ اللہ کو معلوم تھا کہ یہ انسان بڑا غافل ہے اور تنبیہ کا محتاج ہے ۔

یہ رات جس میں قرآن کریم نازل ہوا ' اس نزول قرآن کی وجہ سے فیصلے والی اور حق و باطل کے درمیان فرق کی جانے والی رات قرار پائی :

فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ( ۴۴ : ۴ ) ''یہ وہ رات تھی جس میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے'' ۔ اس رات میں اس قرآن کے ذریعہ ہر معاملے کا فیصلہ کر دیا گیا ۔ ہر تنازعے کا فیصلہ ۔ اس رات کو حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کر دیا گیا ' باطل مٹا دیا گیا ' حدود مقرر کر دیئے گئے ۔ اور اس زمین پر انسان کے سفر کے لیے نشانات طے کر دیئے گئے اور یہ امور قیامت تک کے لیے طے ہو گئے ۔ لہٰذا ایسے تمام اصول طے کر دیئے گئے جن کے اوپر اس دنیا میں انفرادی اور اجتماعی زندگی قائم ہوتی ہے جس طرح اس کائنات [illegible] کے لیے اللہ نے تمام اصول اس کے اندر ودیعت کر دیئے ہیں ۔

(مولانا مودودی کا جو ترجمہ میں نے دیا ہے اس سے اس مذکورہ تفسیر کا فرق واضح ہے ۔کیونکہ سید قطب "یفرق" کو فَرَّقَ کے معنوں میں لے رہے ہیں جو درست معلوم نہیں ہوتا۔ (مترجم))

اور یہ فیصلے اللہ کے ارادے سے ہوئے کیونکہ اللہ کی مشیت یہ تھی اور یہ رہی ہے کہ رسولوں کو بھیجا جائے تاکہ وہ کلام الٰہی کو بیان کریں اور اس کے مطابق فیصلے کریں۔

اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ( ٤٤ : ٥ ) "ہم ایک رسول بھیجنے والے تھے"۔ اور رسول کا بھیجنا اللہ کی رحمتوں کے تقاضے سے تھا۔ قیامت میں اللہ لوگوں پر رحمت کرنا چاہتا تھا۔

رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ( ٤٤ : ٦ ) "تیرے رب کی رحمت کے طور پر یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے"۔ قرآن کے نزول سے جس طرح اللہ کی رحمت کا ظہور ہوا' اس طرح کسی اور رحمت کا ظہور نہیں ہوا۔ یہ قرآن نہایت آسانی کے ساتھ اور سرعت کے ساتھ دلوں میں بیٹھ جاتا ہے اور انسان اس کے ردعمل کے طور پر اس طرح خودکار طریقے سے عمل کرتا ہے جس طرح انسان کے جسم میں خون دوڑتا ہے اس طرح یہ بشر ایک نہایت ہی سنجیدہ اور شریف انسان بن جاتا ہے اور انسانی معاشرہ ایک خوبصورت خواب کی طرح نظر آتا ہے۔ اور یہ خواب ایک عملی خواب ہوتا ہے جو آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔

یہ نظریہ حیات جو قرآن مجید نے پیش کیا' اپنی جامعیت اور ہم آہنگی کے زاویہ سے 'ایک ایسا خوبصورت عقیدہ ہے کہ انسان بے ساختہ اس کے ساتھ محبت کرنے لگتا ہے۔ دل اس کے ساتھ اٹک جاتے ہیں۔ یہ نظریہ نہ صرف یہ کہ خیر و صلاح پر مبنی ہے۔ اس کے اندر کمال اور جامعیت بھی موجود ہے بلکہ یہ چیزیں اس میں اس قدر ترقی کرتی ہیں کہ پرکشش خوبصورتی کے مقام تک چلی جاتی ہیں۔ یہ خوبصورتی اس قدر کامل اور جامع ہے کہ اس عقیدے اور نظام کا ایک ایک جزء نہایت ہی خوبصورت ہے۔ پھر اس کا جزئی اور کلی حسن و کمال اس کائنات کے جزئی اور کلی حسن و کمال کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

یہ قرآن مجید رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ( ٤٤ : ٦ ) "تیرے رب کی طرف سے بطور رحمت کے نازل ہوا"۔ اور اس مبارک رات میں نازل ہوا۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ( ٤٤ : ٦ ) "یقیناً وہی سننے اور جاننے والا ہے"۔ وہ سنتا اور جانتا ہے۔ اللہ جو کلام اور جو احکام نازل کرتا ہے وہ علم و معرفت کی بنا پر نازل کرتا ہے۔ وہ لوگوں کے اقوال و افعال کو جانتا ہے اور ایسے اصول و قوانین نازل کرتا ہے جو ان کے لیے مفید ہیں اور جن کے ذریعے ان کی اصلاح ہوتی ہے۔

اللہ ہی وہ ذات ہے جو اس کائنات کا نگہبان ہے اور اس کا اور اس کے اندر تمام چیزوں کا محافظ ہے۔

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ( ٤٤ : ٧ ) "آسمانوں اور زمین کا رب اور ہر اس چیز کا رب جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے' اگر تم واقعی یقین رکھتے ہو"۔ اس لیے وہ لوگوں

کے لیے جو کلام و نظام نازل کرتا ہے وہ ان کی تربیت کے لیے کرتا ہے جس طرح اس کائنات میں اس کی ربوبیت چلتی ہے ' انسان بھی اسی کا حصہ ہے اور انسان بھی اللہ کے قوانین فطرت کا ایک حصہ ہے اور یہاں ایمان اور ایقان کی طرف جو اشارہ کیا ہے تو وہ اس لیے کہ ان کے عقائد نہایت مضطرب ' اور ڈانواں ڈول تھے کیونکہ ایک طرف تو وہ آسمانوں اور زمین کو اللہ کی مخلوق سمجھتے تھے ۔ دوسری جانب انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے ارباب بھی بنا رکھے تھے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اللہ کا تصور نہایت مجمل ' غیر واضح ' سطحی اور پختگی سے بہت دور تھا ۔ حالانکہ اللہ واحد الٰہ ہے جو موت و حیات کا مالک ہے اور اولین اور آخرین سب کا رب ہے ۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ (٤٤ : ٨) ''کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے وہی زندگی عطا کرتا ہے ' وہی موت دیتا ہے ' تمہارا رب اور تمہارے اسلاف کا رب جو گزر چکے ہیں''۔
زندہ کرنا اور مارنا تو دونوں ایسی باتیں ہیں جن کو تمام انسان دیکھتے ہیں اور یہ بھی ان کو معلوم ہے کہ یہ کام اللہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا ۔ اس کے لیے تو معمولی فکر و تدبر کی ضرورت ہے ۔ موت کا منظر اور حیات کی کہانی دونوں انسانی قلب پر بہت ہی قریب سے اثر انداز ہوتے ہیں ۔ ان سے انسان کا دل متاثر اور منفعل ہونے کے لیے تیار ہو جاتا ہے ۔ اور پھر وہ حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا تذکرہ قرآن میں بہت ہوتا ہے ۔ اور انسانی قلب اور دماغ کو اس طرف بار بار متوجہ کیا جاتا ہے اور مومنین کے دلوں کو بار بار اس کا غسل دیا جاتا ہے ۔

--- ○○○ ---

اس حد تک قرآن کے مخاطبین کو متاثر کرنے اور جوش دلانے اور حق کو قبول کرنے پر آمادہ کرنے کے بعد اب روئے سخن اچانک پھرتا ہے ۔ اور تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا جاتا کہ اس عظیم کتاب کی اس سعی کے بعد ان لوگوں کی حالت کیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں ان لوگوں کی جو تصویر پیش کی گئی ہے اسے ایسا نہیں ہونا چاہئے ۔ لیکن یہ لوگ اس قدر سنگ دل ہیں کہ اس قدر سنجیدہ کوششوں کے باوجود وہ ابھی تک اس تحریک کو مذاق ہی سمجھتے ہیں ۔

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ﴿۹﴾ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۰﴾ يَّغْشَى النَّاسَ ۭ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ﴿۱۵﴾ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۱۶﴾

''مگر فی الواقع ان لوگوں کو یقین نہیں ہے بلکہ یہ اپنے شک میں پڑے کھیل رہے ہیں ۔ اچھا ' انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا ' یہ ہے دردناک سزا ۔ (اب کہتے ہیں کہ)

"پروردگار' ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے' ہم ایمان لاتے ہیں" ۔ان کی غفلت کہاں دور ہوتی ہے؟ ان کا حال تو یہ تھا کہ ان کے پاس رسول مبین آگیا ۔پھر بھی یہ اس کی طرف ملتفت نہ ہوئے اور کہا کہ "یہ تو سکھایا پڑھایا باؤلا ہے" ۔ہم ذرا عذاب ہٹانے والے ہیں (اگر ہٹا دیں تو) تم لوگ پھر وہی کچھ کرو گے جو پہلے کر رہے تھے ۔جس روز ہم بڑی پکڑ دھکڑ کریں گے وہ دن ہوگا جب ہم تم سے انتقام لیں گے" ۔

فرماتے ہیں کہ یہ تو اس قدر حکیمانہ اور عظیم الشان نظریہ اور نظام کے مقابلے میں غیر سنجیدہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور ان نشانیوں میں شک کرتے ہیں جو ثابت شدہ ہیں لہٰذا ان کا صحیح علاج یہی ہے کہ ان کو اس دن کے لیے چھوڑ دیا جائے جو بہت ہی سخت اور اعصاب شکن ہوگا ۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ (٤٤ : ١٠) يَّغْشَى النَّاسَ هٰذَا عَذَابٌ أَلِيْمٌ (٤٤ : ١١) رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُوْنَ (٤٤ : ١٢) "اچھا انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا ۔یہ ہے دردناک سزا" "پروردگار ہم پر سے عذاب ٹال دے' ہم ایمان لاتے ہیں" ۔

سلف صالحین کے درمیان آیت دخان کی تفسیر میں اختلاف رہا ہے ۔بعض نے یہ کہا کہ یہ قیامت کے دن کا دھواں ہے' یہ دھمکی جو دی گئی کہ اس کا انتظار کرو' یہ ویسی ہی ہے جس طرح قرآن کریم میں دوسرے مقامات پر عذاب قیامت کے انتظار کے لئے کہا جاتا ہے اور یہ تو آنے ہی والا ہے ۔لوگ بھی انتظار کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انتظار فرمایا لیکن بعض لوگوں کا خیال یہ تھا کہ یہ واقعہ عملاً گزر گیا ہے ۔جس طرح قرآن نے دھمکی دی ہے اور پھر جب آیا تو مشرکین حضورؐ کے پاس آئے ۔آپ نے دعا فرمائی اور یہ عذاب دور ہو گیا ۔یہاں ہم دونوں اقوال اور ان کی سند نقل کرتے ہیں اور اس کے بعد اپنا تبصرہ کریں گے ۔

سلیمان ابن مہران الاعمش نے روایت کی ہے ۔ابوالضحیٰ مسلم ابن صبیح سے انہوں نے مسروق سے' یہ کہتے ہیں کہ میں ابواب کندہ کے پاس کوفہ کی ایک مسجد میں داخل ہوا' ایک شخص اپنے ساتھیوں کے سامنے یہ بیان کر رہا تھا ۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ (٤٤ : ١٠) "اچھا انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا" ۔کیا آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ دھواں کیا ہے؟ یہ ایک دھواں ہے جو قیامت کے دن آئے گا ۔اس سے منافقین اور کفار اندھے اور بہرے ہو جائیں گے ۔اور مومنین پر صرف اس قدر اثر ہو گا جس طرح زکام ہو جاتا ہے ۔اس نے کہا کہ ہم ابن مسعودؓ کے پاس آئے ۔یہ بات ہم نے ان سے ذکر کی ۔اس وقت یہ تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے' پریشان ہو کر اٹھ بیٹھے ۔انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے تمہارے نبی سے کہا:

قُلْ مَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا' اور نہ ہی مجھے تمہاری ہدایت کا مکلف بنایا گیا ہے" ۔یہ بھی بہت بڑے علم کی دلیل ہے کہ اگر کسی کو کوئی بات معلوم نہ ہو تو کہے'

واللہ اعلم! اس کے بارے میں' میں تمہیں اصل بات بتاتا ہوں۔ جب قریش نے کسی صورت میں اسلام قبول نہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ اے اللہ ان پر ایسے سال لے آیا جو یوسف علیہ السلام کے دور میں مصر میں آئے تھے۔ چنانچہ ان پر جہد و مشقت اور بھوک اور پیاس کے دن آگئے یہاں تک کہ انہوں نے ہڈیاں کھانا شروع کر دیں۔ اور مردار بھی کھانے لگے۔ ایسے حالات ہوگئے کہ وہ آسمان کی طرف نظریں اٹھاکر دیکھتے اور انہیں دھواں ہی دھواں نظر آتا اور بعض روایات میں الفاظ یہ ہیں کہ ایک شخص آسمان کی طرف نظریں اٹھاتا اور اسے فضا یوں نظر آتی جس طرح دھواں ہو' اور یہ بدحالی کی وجہ سے۔ اس کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ (٤٤ : ١٠) يَّغْشَى النَّاسَ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (٤٤ : ١١) "انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا۔ یہ ہے دردناک سزا"۔ لوگ رسول اللہؐ کے پاس آئے اور آپ سے کہا گیا رسول خدا آپ اللہ سے مضر عربوں کے لیے دعا مانگیں' کیونکہ یہ ہلاک ہونے والے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے باران رحمت کی دعا مانگی اور بارش ہوئی۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ (٤٤ : ١٥) "ہم ذرا عذاب ہٹا دیتے ہیں' تم لوگ پھر وہی کچھ کرو گے جو پہلے کر رہے تھے"۔ حضرت ابن مسعودؓ نے مزید کہا کیا یہ ہو سکتا ہے کہ قیامت کے دن ان پر سے عذاب اٹھایا جائے۔ غرض جب ان کو پھر خوشحالی ملی تو وہ اسی پرانی روش کی طرف لوٹ آئے۔ تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ (٤٤ : ١٦) "جس روز ہم بڑی ضرب لگائیں گے وہ دن ہو گا جب ہم تم سے انتقام لیں گے"۔ اس سے مراد یوم بدر ہے۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ پانچ چیزیں گزریں: دھواں' روم' شق قمر' بطشہ الکبریٰ اور لزام۔ یہ حدیث صحیحین میں مروی ہے۔ امام احمد نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ ترمذی اور نسائی نے بھی کتاب التفسیر میں دی ہے۔ ابن جریر اور ابن ابو حاتم نے اعمش سے متعدد طرق سے نقل کی ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن مسعود سے ایک جماعت نے اتفاق کیا ہے کہ دخان کا واقعہ چلا گیا ہے۔ مثلاً مجاہد' ابو العالیہ' ابراہیم نخعی' ضحاک اور عطیہ عوفی اور یہی تفسیر ابن جریر نے اختیار کی ہے۔

لیکن دوسرے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ دخان کا واقعہ گزرا نہیں ہے بلکہ یہ قیامت کی علامات میں سے ہے جس طرح ابو سریح حذیفہ ابن اسید الغفاریؓ کی حدیث میں آتا ہے۔ انہوں نے کہا ہم پر رسول اللہ آئے 'عرفہ سے ہو کر آئے اور ہم قیامت کا تذکرہ کر رہے تھے تو رسول اللہؐ نے فرمایا"قیامت اس وقت تک برپا نہ ہوگی جب تک دس نشانیاں نہ ظاہر ہو جائیں: (۱) سورج کا مغرب سے طلوع' (۲) دخان' (۳) دابہ' (۴) یاجوج و ماجوج کا خروج' (۵) عیسیٰ ابن مریم کا خروج' (۶) دجال' (۷) تین چاند گرہن' (۸) مشرق میں زمین کا دھنسنا' (۹) مغرب میں زمین کا دھنسنا' (۱۰)

جزیرۃ العرب میں زمین کا دھنسنا۔ایک آگ عدن کی گہرائیوں سے نکلے گی۔یہ لوگوں کو چلائے گی یا لوگوں کو اٹھائے گی جہاں یہ رات کو ہوں گے وہیں یہ بھی ہوگی جہاں یہ دن کو آرام کریں گے' یہ بھی آرام کرے گی۔(مسلم)

علامہ ابن جریر نے روایت کی ہے۔محمد ابن عوف سے انہوں نے محمد ابن اسماعیل ابن عیاش سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے ضمضم ابن زرعہ سے انہوں نے سریح ابن عبید سے اور انہوں نے حضرت مالک اشعریؓ سے کہ وہ فرماتے ہیں' فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شک تمہارے رب نے تمہیں تین باتوں سے ڈرایا ہے۔دھواں جو مسلمان کو زکام کی طرح متاثر کرے گا اور کافر پر اثر یہ ہو گا کہ وہ اس سے پھول جائے گا اور وہ اس کی ہر سننے کی جگہ سے نکلے گا۔دوسری دابتہ للارض اور تیسرا دجال۔اس حدیث کو طبرانی نے ہاشم ابن یزید سے نقل کیا ہے۔اور اس نے محمد ابن اسماعیل ابن عیاش سے اسی متن کے ساتھ (ابن کثیر نے کہا یہ سند جید ہے)

ابن جریر نے روایت کی ہے' یعقوب سے' انہوں نے ابن علیہ سے انہوں نے ابن جریج سے انہوں نے عبداللہ ابن ابوملیکہ سے' انہوں نے نے کہا کہ میں ایک دن سویرے حضرت ابن عباسؓ کے پاس گیا' تو انہوں نے فرمایا کہ میں آج رات صبح تک بالکل نہیں سویا۔میں نے پوچھا یہ کیوں! آج ایک دمدار ستارہ طلوع ہوا تو مجھے یہ خوف لاحق ہو گیا کہ شاید دھوئیں کا وقت آگیا' اس وقت سے میں صبح تک نہیں سویا۔ابن ابو حاتم نے اپنے باپ سے' انہوں نے ابن عمر سے انہوں نے سفیان سے انہوں نے عبداللہ ابن ابو یزید سے' عبداللہ ابن ابوملیکہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے' اسی طرح روایت کی ہے۔

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں۔یہ سند حضرت ابن عباس تک صحیح ہے' جو اس امت سے بڑے عالم ہیں اور ترجمان القرآن ہیں۔اور یہی قول اپنایا ہے' صحابہ و تابعین میں سے ان لوگوں نے جنہوں نے ان سے اتفاق کیا ہے۔اور اس سلسلے میں کئی مرفوع اور حسن احادیث بھی انہوں نے پیش کی ہیں جن سے پوری تسلی ہو جاتی ہے کہ یہ دھواں جس کا یہاں ذکر ہے یہ ان نشانیوں میں سے ہے جن کا انتظار ہے اور قرآن کریم کا ظاہری مفہوم بھی یہی ہے۔اللہ نے فرمایا:

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ (۴۴ : ۱۰) "انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا"۔یعنی دھواں بالکل واضح ہو گا اور اسے ہر شخص دیکھ سکے گا اور حضرت ابن مسعود نے جو روایت کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسانی تخیل تھا اور لوگ بھوک اور مشقت کی وجہ سے دھواں دیکھ رہے تھے۔پھر يَغْشَى النَّاسَ (۴۴ : ۱۱) "وہ لوگوں پر چھا جائے گا"۔یعنی ان کو ڈھانپ کر اندھا کر دے گا۔اگر یہ ایک خیالی معاملہ تھا اور صرف اہل مکہ نے اسے محسوس کیا تھا تو پھر یغشی الناس کا لفظ استعمال نہ ہوتا۔پھر آگے ہے۔

هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۴۴ : ۱۱) "یہ ہے دردناک عذاب"۔یعنی ان سے یہ کہا جائے گا' بطور سرزنش و ملامت کے جس طرح دوسری جگہ ہے۔

يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا (۵۲ : ۱۳) هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ

(۵۲ : ۱۴) "جس دن انہیں دھکے مار مار کر نار جہنم کی طرف چلایا جائے گا اس وقت ان سے کہا جائے گا' یہ وہی

آگ ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے"۔

ہو سکتا ہے کہ وہ خود ایک دوسرے سے یہ بات کہیں گے کہ یہ عذاب الیم ہے اور اس کے بعد آیت۔

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ (۱۲:٤٤) "پروردگار' ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے' ہم ایمان لاتے ہیں"۔ یعنی کافر یہ کہیں گے جب انہوں نے دیکھ لیا کہ عذاب الٰہی آگیا اور یہ تو سزا ہے۔ تو وہ سوال کریں گے کہ اے رب اس عذاب کو ٹال دے' جس طرح دوسری جگہ اللہ نے فرمایا:

وَلَوْ تَرٰی اِذْ وُقِفُوْا عَلَی النَّارِ فَقَالُوْا یٰلَیْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُکَذِّبَ بِاٰیٰتِ رَبِّنَا وَنَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۲۷:٦) "کاش تم اس وقت کی حالت دیکھ سکتے جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے' اس وقت وہ کہیں گے کاش کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں پھر واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں"۔ اور اسی طرح اس آیت میں بھی یہی مضمون ہے۔

وَاَنْذِرِ النَّاسَ یَوْمَ یَاْتِیْهِمُ الْعَذَابُ فَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَا اَخِّرْنَا اِلٰی اَجَلٍ قَرِیْبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَالَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ

"اے نبی اس دن سے تم انہیں ڈرا دو جبکہ عذاب انہیں آلے گا۔ اس وقت یہ ظالم کہیں گے کہ اے ہمارے رب' ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے' ہم تیری دعوت کو لبیک کہیں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے"۔ کیا تم وہی لوگ نہیں ہو جو ابھی سے پہلے قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ہم پر تو کبھی زوال آنا ہی نہیں ہے"۔ زیر بحث آیت سے اگلی آیت میں اللہ فرماتا ہے۔

اَنّٰی لَهُمُ الذِّکْرٰی وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِیْنٌ (۱۳:٤٤) ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ (۱٤:٤٤) "ان کی غفلت کہاں دور ہوتی ہے ان کا حال تو یہ تھا کہ ان کے پاس رسول امین آیا تھا۔ یہ اس کی طرف ملتفت نہ ہوئے اور کہا "یہ تو سکھایا پڑھایا باؤلا ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ وہ کس طرح یاددہانی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں' ہم نے ان کی طرف رسول بھیجا' جس نے واضح طور پر ان کے سامنے دعوت پیش کی۔ ان کو ڈرایا' اس کے باوجود انہوں نے منہ پھیر لیا۔ اور انہوں نے اس کی کوئی بات نہ مانی بلکہ تکذیب کی اور کہا کہ یہ تو سکھایا ہوا مجنون ہے۔

اس کی مثال بھی قرآن کریم میں ہے۔

یَوْمَئِذٍ یَّتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰی لَهُ الذِّکْرٰی (۲۳:۸۹) "اس دن انسان کو سمجھ آئے گی اور اس وقت اس کے سمجھنے کا کیا حاصل"۔ اور اسی طرح ایک دوسری آیت میں ہے۔

وَ لَوْ تَرٰی اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّکَانٍ قَرِیْبٍ (٣٤ : ٥١) وَّ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ وَ اَنّٰی لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّکَانٍ بَعِیْدٍ (٣٤ : ٥٣) "کاش تم دیکھ سکو' انہیں اس وقت جب یہ لوگ گھبرائے پھر رہے ہوں گے اور کہیں بچ کر نہ جا سکیں گے بلکہ قریب ہی سے پکڑے جائیں گے۔ اس وقت یہ کہیں گے کہ ہم اس پر ایمان لے آئے حالانکہ اب دور نکلی ہوئی چیز کہاں ہاتھ آسکتی ہے۔ مذکورہ بالا آیت نمبر ۱۲ کے بعد یہ آیت آتی ہے :

اِنَّا کَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِیْلًا اِنَّکُمْ عَآئِدُوْنَ (٤٤ : ١٥) "ہم عذاب ذرا ہٹا دینے والے ہیں مگر تم پھر وہی کرو گے جو پہلے کر رہے تھے"۔ اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اگر ہم عذاب کو ہٹا دیں اور تمہیں پھر دنیا میں لوٹا دیں تو تم نے پھر وہی کچھ کرنا ہے جو پہلے کیا' یعنی کفر و تکذیب اور اس کی مثال دوسری آیات میں بھی ہے۔

وَ لَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَ کَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ (٢٣:٧٥)

"اگر ہم ان پر رحم کریں اور وہ تکلیف جس میں آج یہ مبتلا ہیں' دور کر دیں تو یہ اپنی سرکشی میں بالکل ہی بہک جائیں گے"۔ اور جس طرح دوسری آیت میں ہے :

وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ اِنَّهُمْ لَکٰذِبُوْنَ (٦ : ٢٨) "اگر انہیں سابق زندگی کی طرف بھیجا جائے تو پھر وہی سب کچھ کریں جس سے انہیں منع کیا گیا اور وہ تو ہیں ہی جھوٹے"۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے 'ہم تم سے عذاب کو عملاً روکے رکھتے ہیں یا روکے رکھنے والے ہیں حالانکہ تم سرکشی اور گمراہی میں بڑھتے چلے جاتے ہو۔ کیونکہ کشف عذاب کے لیے لازمی نہیں ہے کہ عملاً ان پر عذاب آبھی گیا ہو۔ دوسری جگہ اللہ نے فرمایا :

اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا کَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰی حِیْنٍ (١٠ : ٩٨) "ماسوائے قوم یونس کے کہ وہ جب ایمان لائے تو ہم نے اس پر سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ٹال دیا تھا اور اس کو ایک مدت تک زندگی سے بہرہ مند ہونے کا موقعہ دے دیا تھا"۔ حالانکہ ابھی عذاب نے ان کو چھوا نہیں تھا بلکہ عذاب کے اسباب فراہم ہو گئے تھے۔ قتادہ نے تو یہ معنی لیے ہیں کہ تم عذاب الٰہی کی طرف لوٹنے والے ہو' آگے آیت ہے۔

یَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْکُبْرٰی اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ (٤٤ : ١٦) "جس روز ہم بڑی دھکڑ کریں گے وہ دن ہو گا جب ہم تم سے انتقام لیں گے"۔ حضرت ابن مسعودؓ نے اس کی تفسیر بدر کبریٰ سے کی ہے اور یہ قول کچھ دوسرے لوگوں نے بھی اختیار کیا ہے جنہوں نے ابن مسعود کے ساتھ اتفاق رائے کیا ہے۔ اور یہی تفسیر حضرت ابن عباس سے بھی مروی ہے۔ ان سے یہ روایت عوفی نے نقل کی ہے اور یہی رائے حضرت ابی ابن کعب کی ہے اور اس کا احتمال

بھی ہے لیکن ظاہر بات یہی ہے کہ اس سے بھی مراد یوم القیامہ ہے ۔ اگرچہ یوم بدر کفار کے لیے بھی بڑی پکڑ کا دن تھا۔ ابن جریر نے روایت کی ہے 'یعقوب سے انہوں نے ابن علیہ سے انہوں نے خالد حذاء سے انہوں نے عکرمہ سے کہ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا "ابن مسعودؓ فرماتے ہیں بطشۃ الکبریٰ سے بدر کا دن مراد ہے ۔ میری رائے یہ ہے کہ یہ قیامت کا دن ہے"۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے ۔ حسن بصری اور عکرمہ بمطابق صحیح روایت اسی کے قائل ہیں"۔ یہاں ابن کثیر کا کلام ختم ہوا۔

ہم یہاں حضرت ابن عباس کا قول اختیار کرتے ہیں کہ دخان قیامت کے دن ہو گا۔ اور اس کی تفسیر علامہ ابن کثیر نے بہت اچھی کی ہے ۔ یہ کفار کے لیے تہدید اور ڈراوا ہے اور اس کے نظائر قرآن کریم میں بہت ہیں ۔ جن کے مطابق یہی مفہوم دوسرے مقامات پر بھی دہرایا گیا ہے ۔ اس طرح مفہوم یہ ہو گا یہ لوگ شک کرتے ہیں اور کھیل کود میں مصروف ہیں 'ان کو چھوڑ دیں اور اس دن کا خوفناک دن کا انتظار کریں 'جب آسمان سے دھواں آئے گا' تمام لوگوں کو ڈھانپ لے گا اور یہ کہا جائے گا کہ یہ ہے عذاب الیم ۔ اور پھر ان کی فریاد کی تصویر کشی کی گئی کہ اے ہمارے رب' اس عذاب کو ہم سے دور کر دے ہم ایمان لاتے ہیں اور ان کی اس درخواست کو رد کر دیا جاتا ہے کہ اس کی منظوری محال ہے کیونکہ وقت چلا گیا ہے ۔ اب یہ نصیحت بھی پا سکتے ہیں' ان کے پاس تو رسول مبین آگیا تھا اور یہ اس وقت یہ کہتے ہوئے منہ موڑ گئے تھے کہ یہ سکھایا ہوا جادوگر ہے ۔ اسے یہ سب کچھ ایک عجمی غلام سکھا رہا ہے ۔ اور یہ باطل ہے ۔

اس منظر میں جہاں یہ لوگ عذاب کے ٹلنے کی درخواست کرتے ہیں' ان سے بطور جملہ معترضہ یہ کہا جاتا ہے کہ دیکھو ابھی تو تم دنیا میں ہو ۔ فرصت کے قلیل لمحات موجود ہیں اور ابھی تو عذاب سے بچے ہوئے ہو' ایمان لے آؤ' تمہیں ڈرایا جا رہا ہے کہ تم ہی ہو گے جو آخرت میں ایمان لانے پر آمادہ ہو گے مگر وہاں ایمان قبول نہ ہو گا۔ ابھی تو تم امن و عافیت میں ہو اور یہ امن و عافیت دائمی نہیں ہے ۔ تم ہمارے سامنے آنے والے (عائدون) ہو۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى (٤٤ : ١٦) "جس دن یہ دھواں ہو گا جس کی تصویر کشی قرآن کر رہا ہے اور پکڑ دھکڑ ہو گی تو اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ (٤٤ : ١٦) "تو ہم انتقام لیں گے"۔ تمہاری اس لاپرواہی کا' تمہاری اس بہتان طرازی کا' جو تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے ہو اور کہتے ہو' مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ (٤٤ : ١٤) "سکھایا پڑھایا مجنون ہے"۔ حالانکہ وہ صادق و امین ہے ۔

اس طرح تمام آیات کی تفسیر درست ہو جاتی ہے ۔ ہمارے خیال کے مطابق ۔ واللہ اعلم !

---- ooo----

اس کے بعد قرآن مجید ان کو تاریخ کی ایک وادی میں لے جاتا ہے ۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کا ایک مختصر حصہ ہے اور اس کا خاتمہ اس زمین پر ایک عظیم پکڑ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى (٤٤ : ١٦) کا نمونہ ہے ۔ اس سے قبل جس کا نمونہ ان کو دخان کی نقشہ کشی میں بتا دیا گیا تھا۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ

كَرِيمٌ ﴿١٧﴾ أَنْ أَدُّوا إِلَيَّ عِبَادَ اللَّهِ ۖ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٨﴾ وَأَنْ
لَا تَعْلُوا عَلَى اللَّهِ ۖ إِنِّي آتِيكُمْ بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ ﴿١٩﴾ وَإِنِّي عُذْتُ
بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَنْ تَرْجُمُونِ ﴿٢٠﴾ وَإِنْ لَمْ تُؤْمِنُوا لِي فَاعْتَزِلُونِ ﴿٢١﴾ فَدَعَا رَبَّهُ
أَنَّ هَٰؤُلَاءِ قَوْمٌ مُجْرِمُونَ ﴿٢٢﴾ فَأَسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا إِنَّكُمْ مُتَّبَعُونَ ﴿٢٣﴾ وَاتْرُكِ
الْبَحْرَ رَهْوًا ۖ إِنَّهُمْ جُنْدٌ مُغْرَقُونَ ﴿٢٤﴾ كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿٢٥﴾ وَزُرُوعٍ
۱ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ﴿٢٦﴾ وَنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ ﴿٢٧﴾ كَذَٰلِكَ ۖ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ ﴿٢٨﴾
ع ۲۵ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنْظَرِينَ ﴿٢٩﴾ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِي
۱۴ إِسْرَائِيلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِينِ ﴿٣٠﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَالِيًا مِنَ الْمُسْرِفِينَ ﴿٣١﴾
وَلَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٣٢﴾ وَآتَيْنَاهُمْ مِنَ الْآيَاتِ مَا فِيهِ بَلَاءٌ مُبِينٌ ﴿٣٣﴾

"ہم ان سے پہلے فرعون کی قوم کو اسی آزمائش میں ڈال چکے ہیں' ان کے پاس ایک نہایت شریف رسول آیا اور اس نے کہا کہ "اللہ کے بندو! سب کچھ میرے حوالے کرو" یا "اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو' میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو۔ میں تمہارے سامنے (اپنی ماموریت کی) صریح سند پیش کرتا ہوں اور میں اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے چکا ہوں' اس سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو۔ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے باز رہو"۔ آخر کار اس نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ لوگ مجرم ہیں۔ (جواب دیا گیا) "اچھا تو راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ۔ تم لوگوں کا پیچھا کیا جائے گا۔ سمندر کو اس کے حال پر کھلا چھوڑ دے۔ یہ سارا لشکر غرق ہونے والا ہے"۔ کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔ کتنے ہی عیش کے سروسامان' جن میں وہ مزے کر رہے تھے' ان کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا ان کا انجام' اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنا دیا۔ پھر نہ آسمان ان پر رویا' نہ زمین اور ذرا سی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی۔ اس طرح بنی اسرائیل کو ہم نے سخت ذلت کے عذاب' فرعون سے نجات دی جو حد سے گزر جانے والوں میں فی الواقع بڑے اونچے درجے کا آدمی تھا' اور ان کی حالت جانتے ہوئے ان کو دنیا کی دوسری قوموں پر ترجیح دی' اور انھیں ایسی نشانیاں دکھائیں جن میں صریح آزمائش تھی"۔

اس وادی کے دروازے ہی پر یہ خوفناک اعلان لکھا ہوا ہے کہ یاد رکھو' کسی قوم کی طرف رسول کا بھیجا جانا اس کی آزمائش ہوتی ہے۔ مکذبین کو یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ وقت بہت تھوڑا ہے' اس میں تم تکذیب بھی کر سکتے ہو' تکبر اور

غرور بھی کر سکتے ہو۔ رسول کو ایذا بھی دے سکتے ہو' مومنین پر ظلم و ستم بھی ڈھا سکتے ہو لیکن آخر میں غرور کا سر نیچا ہوتا ہے اور تم جو رسول اللہ کو طیش دلاتے ہو' ان کا پیمانہ صبر لبریز کرتے ہو' لیکن آپؐ بدستور صبر کا پیکر بنے ہوئے ہیں اور تمہاری ہدایت ہی کے امیدوار ہیں' اس کا انجام برا بھی ہو سکتا ہے اور تم فرعون کی طرح سخت پکڑ میں بھی آ سکتے ہو۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ (۴۴ : ۱۷) "ہم اس سے قبل فرعون کی قوم کو اس آزمائش میں ڈال چکے ہیں"۔ ان کو نعمتیں دے کر اور بادشاہت دے کر اور زمین میں نہایت ہی تمکنت دے کر آزما چکے ہیں۔ اور پھر خوشحالی' دولت کے اسباب اور سربلندی میں ان کو طویل مہلت بھی دی گئی :

وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ (۴۴ : ۱۷) "اور ان کے پاس ایک نہایت ہی شریف رسول آیا"۔ اور یہ بھی آزمائش کا ایک پہلو تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم نے ان سے کیا بات تسلیم کرنے کے لیے کہا تھا۔ آپ نے ان سے کوئی بات یا کوئی چیز اپنے لیے طلب نہ کی تھی۔ آپ ان کو اللہ کی طرف بلاتے تھے اور آپ کا مطالبہ یہ تھا کہ ہر بات اللہ کے لیے ادا کرو اور کوئی چیز بخل کر کے اللہ کے مقابلے میں اپنے لیے نہ رکھو۔

اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ (۴۴ : ۱۸) وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۴۴ : ۱۹) وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ (۴۴ : ۲۰) وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ (۴۴ : ۲۱) کہ "اللہ کے بندو! سب کچھ میرے حوالے کر دو" یا "اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو' میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو۔ میں تمہارے سامنے (اپنی ماموریت کی) صریح سند پیش کرتا ہوں اور میں اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے چکا ہوں' اس سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو۔ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے باز رہو"۔ یہ ہے وہ مختصر دعوت جسے رسول کریم یعنی حضرت موسیٰؑ لے کر آئے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ تم کلی طور پر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دو' پوری ادائیگی کرو' اور سب کچھ اللہ کے لیے دے دو' جس کے تم بندے ہو' بندوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اللہ کے مقابلے میں سرکشی کریں۔ یہ اللہ کی دعوت ہے اور ایک شریف رسول لے کر تمہارے پاس آیا ہے اور اس کے پاس رسول ہونے کی سند بھی ہے۔ ایک مضبوط اور قوی دلیل ہے۔ اگر کھلے دل سے غور کیا جائے تو ایسے براہین پر یقین آنا چاہئے۔ آپ ان کے تشدد کے مقابلے میں اللہ کی پناہ لیتے ہیں کہ وہ آپ کو پکڑ کر رجم کر دیں۔ اگر وہ ایمان کا انکار کرتے ہیں اور رسول سے الگ ہوتے ہیں تو آپ ان کو یہ پیشکش کرتے ہیں کہ میں بھی تم سے علیحدہ ہو جاؤں گا۔ اور یہ ایک نہایت ہی منصفانہ بات ہے کہ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو میری راہ نہ روکو۔

اس آیت کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے۔

اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ (۴۴ : ۱۸) "کہ اللہ کے بندوں (بنی اسرائیل) کو میرے حوالے کر دو"۔

اور ان کو تشدد اور ظلم کا نشانہ نہ بناؤ ۔ دوسری جگہ تصریح آئی ہے ۔

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ "یہ کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دو"۔ لیکن سرکشوں نے کبھی بھی کسی کے معقول اور منصفانہ مطالبات نہیں مانے ۔ سرکش سچائی کو آزاد دیکھنا پسند نہیں کرتے کہ وہ سہولت کے ساتھ عوام تک پہنچ جائے' چنانچہ ہر سرکش سچائی کو اپنی گرفت میں لینا پسند کرتا ہے اور کبھی اس کے ساتھ مصالحت نہیں کرتا۔ کیونکہ سرکشوں اور سچائی کے درمیان اگر صلح ہو جائے تو پھر سچائی تو چھانے لگتی ہے ۔ اور عوام کے دل و دماغ کو فتح کرتی چلی جاتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ باطل اہل حق پر ہاتھ ڈالتا ہے ۔ اہل حق کو رجم کرتا ہے ۔ وہ حق کو الگ بھی رہنے نہیں دیتا کہ وہ صحیح سلامت اور آرام سے رہے ۔

یہاں سیاق کلام میں قصے کی کئی کڑیوں کو مختصر کر کے پیش کیا گیا ہے تاکہ قارئین کو جلد انجام تک پہنچایا جائے' جبکہ آزمائش انتہا کو پہنچ جائے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام محسوس کر دیں کہ یہ لوگ دعوت کو ہرگز قبول کرنے والے نہیں ہیں ۔ اور نہ اس کے لیے تیار ہیں کہ ہمیں گوارا کر کے اپنا کام کرنے دیں ۔ اور آپ کو معلوم ہو جائے کہ ان کی مجرمانہ ذہنیت بہت ہی گہری اور ٹھوس ہے اور ان کی اصلاح کی کوئی امید نہیں ہے ۔ اور وہ اس ذہنیت کو چھوڑنے والے نہیں ہیں ۔ یہاں آکر پھر آپ اپنے رب کے ہاں آخری پکار کرتے ہیں اور مکمل طور پر اس کی پناہ میں آجاتے ہیں ۔

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ( ٤٤ : ٢٢ ) "آخر کار انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ لوگ مجرم ہیں"۔ آخر ایک رسول اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہے کہ وہ اپنی جدوجہد کی پوری کمائی لے کر اپنے رب کے دربار میں پیش کر دے اور اسے اللہ کے سامنے رکھ دے اور اگلا اقدام اللہ پر چھوڑ دے ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے بارے میں جو تبصرہ اور رپورٹ کی تھی' اللہ نے اسے قبول کر لیا کہ یہ درست ہے کہ یہ لوگ فی الواقع مجرم ہیں ۔

فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ( ٤٤ : ٢٣ ) وَ اتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ( ٤٤ : ٢٤ ) "اچھا تو راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑو تم لوگوں کا پیچھا کیا جائے گا۔ سمندر کو اس کے حال پر چھوڑ دے ۔ یہ سارا لشکر غرق ہونے والا ہے"۔ السری اس سفر کو کہتے ہیں جو رات کے وقت ہو' اس کے بعد "لیلا" کا لفظ منظر کو دوبارہ ذہن میں لاتا ہے کہ اللہ کے کچھ بندے بنی اسرائیل رات کے وقت سفر میں ہیں ۔ یہ لفظ اس وقت رازداری کی فضا کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے ۔ کیونکہ ان کا یہ شبینہ سفر دراصل تھا ہی فرعون سے خفیہ اور حکومت کی لاعلمی سے تھا۔ "الرہو" کے معنی ہوتے ہیں سکون کے ۔ یہاں اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ اور آپ کی قوم گزر جائیں اور اپنے پیچھے سمندر کو سکون کی حالت میں چھوڑ دیں ۔ ایسی ہی حالت پر جس میں آپ اس سے گزرے تاکہ فرعون اور اس کی فوج دھوکہ کھا کر تمہارا پیچھا کرے اور اس طرح اللہ کا حکم پورا ہو جائے ۔

اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ( ٤٤ : ٢٤ ) "یہ سارا لشکر غرق ہونے والا ہے"۔ یوں اللہ کی تقدیر کا فیصلہ اسباب ظاہریہ کے مطابق پورا ہوا' اور یہ اسباب بھی درحقیقت اللہ کے فیصلے ہی کا حصہ ہوتے ہیں ۔

یہاں سیاق کلام میں فرعون کی غرقابی کے واقعات کو مجمل چھوڑ دیا گیا ہے کیونکہ بطور فیصلہ یہ کہہ دیا گیا کہ یہ غرق ہونے والا لشکر ہے۔ اب اس منظر کو چھوڑ کر اس پر تبصرہ کیا جاتا ہے اور یہ تبصرہ بھی ایک زبردست منظر ہے جو سرکش اور متکبر فرعون اور اس کے سرداروں کی زبوں حالی کی داستان ہے۔ یہی لوگ تھے جو اسے ظلم اور سرکشی پر آمادہ رکھتے تھے۔ ان کا ہلاک و برباد کرنا' اللہ کے لئے کس قدر سہل رہا۔ اپنی اس حیثیت کے ساتھ وہ غرور کرتا تھا۔ اور اس کے یہ پیروکار اس پر نثار ہوتے تھے۔ حالانکہ یہ سب لوگ اس قدر چھوٹے اور اس قدر معمولی تھے کہ اس کائنات نے ان کی غرقابی کا کوئی احساس ہی نہ کیا۔ فرعون سے سب کچھ چھین لیا گیا اور کوئی رونے والا نہ تھا۔ کسی نے بھی اس کی اس بربادی پر مرثیہ نہ لکھا' نہ زمین نے' نہ آسمان نے۔

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ (۲۵:۴۴) وَّ زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ (۲۶:۴۴) وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ (۲۷:۴۴) كَذٰلِكَ وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (۲۸:۴۴) فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ (۲۹:۴۴)

"کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔ کتنے ہی عیش کے سروسامان' جن میں وہ مزے کر رہے تھے' ان کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا ان کا انجام' اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنا دیا۔ پھر نہ آسمان ان پر رویا' نہ زمین اور ذرا سی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی"۔ اس منظر میں وہ انعامات بھی دکھائے گئے ہیں جن میں وہ داد عیش دیتے تھے۔ باغات' چشمے' قسم قسم کی زراعت' بڑے بڑے محل' جہاں ان کو بڑا اعزاز ملا ہوا تھا۔ ان نعمتوں میں کھاتے پیتے اور داد عیش دیتے تھے اور مسرور اور مست تھے۔

اس کے بعد ان سے یہ سب کچھ چھین لیا جاتا ہے اور دوسری اقوام کو ان کا وارث بنا دیا جاتا ہے اور دوسری جگہ یوں کہا گیا ہے۔

كَذٰلِكَ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ "یونہی' اور وارث بنا دیا ہم نے ان چیزوں کا بنی اسرائیل کو"۔ بنی اسرائیل تو فرعون کی بادشاہت کے وارث نہ بنائے گئے تھے لیکن فلسطین میں ان کو زبردست عروج نصیب ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ اسی قسم کی نعمتوں کا ان کو وارث بنایا گیا جیسی فرعونیوں سے چھینی گئی تھیں۔

پھر کیا ہوا' فرعون اور اس کے سردار نیست و نابود ہو گئے۔ ایک وقت تھا کہ اس زمین پر وہ لوگوں کی آنکھ کا تارا تھا اور لوگوں کے دلوں میں ان کا بے حد رعب تھا' یا یہ وقت ہے کہ ان کے نیست و نابود ہونے پر کوئی آنکھ نہیں روئی۔ نہ آسمان کو اس کا احساس ہوا اور نہ زمین کو' نہ ان کو مہلت ملی اور ان کے معاملے کو اٹھا کر رکھا گیا۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ (۲۹:۴۴) "نہ آسمان ان پر رویا اور نہ زمین اور ذرا سی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی"۔ یہ ایک ایسا انداز تعبیر ہے جو ان کی کسمپرسی اور دنیا کی بے وفائی اور آنکھیں پھیر لینے کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ سرکش اور مغرور لوگ اس دنیا سے چلے گئے اور ان کے لیے رونے والی آنکھ نہ

زمین و آسمان میں کوئی نہ تھا' جو ان پر تاسف کا اظہار کرتا' وہ اس طرح چلے گئے جس طرح کوئی چیونٹیوں کو روند ڈالے۔ جبکہ وہ اس قدر جبار و قہار تھے کہ انسانوں کو چیونٹیوں کی طرح روندتے چلے جاتے تھے۔ یہ کیوں ہوا' اس لیے کہ یہ اس کائنات سے منقطع تھے۔ یہ پوری کائنات مسلم تھی اور یہ کافر تھے' یہ خبیث' دھتکارے ہوئے اور شریر لوگ تھے اور یہ پوری کائنات ان سے نفرت کرتی تھی۔ اس دنیا کے ڈکٹیٹر اگر ان باتوں کو سمجھتے اور ان ہدایات کو اپناتے جو ان آیات میں ہیں تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ وہ اس کائنات میں کتنے ہلکے ہیں اور اللہ کے ہاں وہ کس قدر ہلکے ہیں۔ اور ان کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ اس زمین پر نہایت ہی تنہا' دھتکارے ہوئے اور پوری کائنات اور خالق کائنات سے کٹے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں' یہ کیوں اس لیے کہ وہ ایمانی رابطوں سے کٹے ہوئے اور مجرم ہیں۔

اور ان کے ان برے دنوں کے مقابلے میں اہل ایمان کی عزت اور تکریم :

وَ لَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ (۴۴: ۳۰) مِنْ فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ (۴۴: ۳۱) وَ لَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۴۴: ۳۲) وَ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ (۴۴: ۳۳) "اس طرح بنی اسرائیل کو ہم نے سخت ذلت کے عذاب' فرعون سے نجات دی جو حد سے گزر جانے والوں میں فی الواقع بڑے اونچے درجے کا آدمی تھا' اور ان کی حالت جانتے ہوئے ان کو دنیا کی دوسری قوموں پر ترجیح دی' اور انہیں ایسی نشانیاں دکھائیں جن میں صریح آزمائش تھی"۔

یہاں توہین آمیز عذاب سے بنی اسرائیل کی نجات کا ذکر ہے۔ جبکہ یہ عذاب دینے والے جباروں کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ جو کبر و غرور کرنے والے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والے تھے۔

مِنْ فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ (۴۴: ۳۱) "فرعون سے جو حد سے گزرنے والوں میں فی الواقع اونچے درجے کا آدمی تھا"۔

اس کے بعد اس بات کا ذکر ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو دوسری قوموں پر ترجیح دی اور ان کی حقیقت کو جانتے ہوئے دی۔ ان کی اچھائی بھی ہماری نظروں میں تھی اور ان کا شر بھی ہماری نظروں میں تھا۔ اس لیے ان کو اپنے دور میں تمام اقوام پر سربلند کر دیا' کیونکہ اللہ کو معلوم تھا کہ اپنے زمانے کی اقوام میں یہ اعلیٰ و افضل اور برتر ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض اوقات اپنی نصرت' اور امداد سے اس قوم کو بھی نوازتا ہے جو اپنے اہل زمانہ سے افضل ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ لوگ ایمان و یقین میں اعلیٰ معیار تک نہ پہنچے ہوئے ہیں۔ بشرطیکہ ان کی قیادت اچھی ہو اور ان کو ہدایت' علم اور بصیرت کے ساتھ اور ثابت قدمی کے ساتھ بلندی کی طرف لے جا رہی ہو۔

وَ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ (۴۴: ۳۳) "اور انہیں ایسی نشانیاں دیں جن میں صریح آزمائش تھی"۔ اس طرح ان نشانیوں کے ذریعہ ان کو آزمایا گیا۔ جب ان کا امتحان اور ان کی آزمائش پوری ہو گئی اور ان کی

خلافت اور اقوام عالم پر ترجیح کا زمانہ ختم ہو گیا تو ان کے انحراف اور گمراہی کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا گیا اور ان پر دوسری اقوام کو مسلط کر دیا گیا' پھر ان کو بار بار ملک بدری کا سامنا کرنا پڑا اور ان پر ذلت اور خواری لکھ دی گئی اور ان کو کہہ دیا گیا کہ جب بھی تم حد سے بڑھے اور سرکشی اختیار کی تو تمہیں ذلیل و خوار کیا جائے گا۔ یہ حالت تمہاری قیامت تک ہو گی۔

---ooo---

فرعون اور اس کے سرداروں کی ہلاکت خیز سفر کے مشاہدات کے بعد جس میں حضرت موسیٰ اور آپ کی قوم کو نجات دی گئی اور اس کے بعد ان کو آزمایا گیا۔ اب دوبارہ مشرکین کے عقیدہ بعث بعد الموت کی طرف بات کا رخ ہوتا ہے۔ یہ لوگ مرنے کے بعد اٹھائے جانے میں شک کرتے تھے بلکہ انکار کرتے تھے۔ اس موضوع کو دوبارہ اس زاویہ سے لیا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد اٹھایا جانا اس کائنات کے اصل نقشے کا حصہ ہے کیونکہ یہ حق ہے اور اس کائنات کا وجود ہی حق پر ہے اور حق کا تقاضا ہے کہ موت کے بعد لوگوں کو اٹھایا جائے۔

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ ﴿٣٤﴾ إِنْ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِينَ ﴿٣٥﴾
فَأْتُوا بِآبَائِنَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣٦﴾ أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ
أَهْلَكْنَاهُمْ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿٣٧﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا
لَاعِبِينَ ﴿٣٨﴾ مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾ إِنَّ يَوْمَ
الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٤٠﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَنْ مَوْلًى شَيْئًا وَلَا هُمْ ۲
يُنْصَرُونَ ﴿٤١﴾ إِلَّا مَنْ رَحِمَ اللَّهُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿٤٢﴾ ع۱۳

”یہ لوگ کہتے ہیں ”ہماری پہلی موت کے سوا اور کچھ نہیں' اس کے بعد ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔ 15
اگر تم سچے ہو تو اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو“۔ یہ بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور اس سے پہلے کے لوگ؟ ہم نے ان کو اسی بنا پر تباہ کیا کہ وہ مجرم ہو گئے تھے۔ یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دی ہیں۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے' مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ ان سب لوگوں کے اٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت فیصلے کا دن ہے' وہ دن جب کوئی عزیز قریب اپنے کسی عزیز قریب کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ کہیں سے انہیں کوئی مدد پہنچے گی' سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم کرے' وہ زبردست اور رحیم ہے“۔

مشرکین عرب یہ کہتے تھے 'بس ہماری یہی موت ہے' جس سے ہم دوچار ہوں گے۔ اس کے بعد نہ زندگی ہے اور نہ حشر و نشر ہے اور اس کو وہ ”پہلی“ اس معنی میں کہتے تھے کہ حشر و نشر کا جو ڈراوا ہمیں سنایا جا رہا ہے اس سے یہ پہلی ہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ یہی موت ہے اور اس پر سب کچھ ختم ہونے والا ہے۔ یوں کہ ان کے آباء و اجداد بس ایک ہی بار مر گئے۔ اور ان میں سے کوئی بھی اس جہاں میں واپس نہیں آیا۔ نہ کبھی کوئی اٹھایا گیا اور ان کا مطالبہ ہی یہ ہوتا تھا کہ اگر

نشور حق ہے تو لاؤ ہمارے آباء کو۔

لیکن اس مسئلے پر وہ حشر و نشر کی حکمت پر غور نہ کرتے تھے اور یہ بھی محسوس نہ کرتے تھے کہ حشر اور نشر انسانی نشوونما کا ایک مرحلہ ہے۔ اس کی ایک خاص حکمت ہے اور ایک متعین مقصد ہے۔ وہ یہ کہ زندگی کے پہلے مرحلے میں کس نے کیا کیا۔ جو اچھے لوگ ہیں اور جنہوں نے دنیا کی زندگی کے اس مرحلے میں اچھا رویہ اختیار کیا ان کو اچھا بدلہ دیا جائے اور جن لوگوں نے یہاں برا رویہ اختیار کیا ان کو اس کا بدلہ دیا جائے اور نہایت ہی پاک اور خالص زندگی دی جائے' اگر اچھوں کو جزائے خیر نہ دی جائے اور بروں کو مناسب سزا نہ دی جائے تو یہ حق بات نہ ہوگی۔ اس حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس پوری زمین پر موجودہ مرحلہ حیات ختم ہونے کے بعد حشر و نشر ہو اور حساب و کتاب ہو۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ کائنات کی اس پوری سکیم کو ختم کر کے' محض چند لوگوں کے مطالبے پر چند افراد یا ایک گروہ کے حشر و نشر کا ڈرامہ کیا جائے اور ان کے مطالبے کو پورا کیا جائے جبکہ ان کو موت کے بعد اٹھائے جانے پر یقین بھی نہیں ہے جس کی اطلاع ان کو تمام رسولوں نے بالاتفاق دی ہے۔ اور اس زندگی پر اچھی طرح غور و فکر کرنے سے بھی عقل اس کا تقاضا کرتی ہے اس طرح اللہ کے نظام تخلیق میں بھی اگر غور کیا جائے تو انسان قیام قیامت پر یقین کر سکتا ہے۔

قبل اس کے کہ ان کو اس پوری کائنات کے اساسی نقشے پر غور و فکر کی دعوت دی جائے۔ ان کے دل و دماغ کو ایک ایسے تاریخی واقعہ کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے' جس کے وقوع سے وہ اچھی طرح باخبر تھے' یعنی قوم تبع اور ملوک حمیر کے واقعات۔ یہ تاریخ اس وقت کے لوگوں کو اچھی طرح معلوم تھی اس لیے اس کی طرف مختصر اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ ذرا ان کے دلوں کے اندر خدا کی پکڑ کا ڈر تازہ ہو جائے۔

اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَّ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اَهْلَكْنٰهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ

(۴۴ : ۳۷) "یہ بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور اس سے پہلے کے لوگ؟ ہم نے ان کو اسی بنا پر تباہ کیا کہ وہ مجرم ہو گئے تھے"۔ اس یاد دہانی کی فضا میں اور کانپتے ہوئے دلوں اور اللہ کی پکڑ کے تصور کی اس فضا میں ان کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ اس پوری کائنات کی تخلیق کا نقشہ کیا ہے۔ اس کائنات کے اندر بالارادہ نہایت ہی گہری سچائی رکھی گئی ہے اس کا تقاضا بھی یہ ہے کہ حشر و نشر لابدی ہے۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۴۴ : ۳۸) مَا خَلَقْنٰهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۴ : ۳۹) اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۴۴ : ۴۰) يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۴۴ : ۴۱) اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۴۴ : ۴۲) "یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دی ہیں۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے' مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ ان

سب کے اٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت فیصلے کا دن ہے ' وہ دن جب کوئی عزیز قریب اپنے کسی عزیز قریب کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ کہیں سے انہیں کوئی مدد پہنچے گی ' سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم کرے ' وہ زبردست اور رحیم ہے"۔ یہ ایک نہایت ہی لطیف اشارہ ہے کہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان جو مخلوقات پیدا کی گئی ہیں ' اس کے اور مسئلہ حشر و نشر کے درمیان ایک لطیف ربط ہے اور انسانی فطرت اس کا ادراک اس وقت کر سکتی ہے جب وہ اس کائنات کی تخلیق پر گہرا غور و فکر کرے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کا جو نقشہ اور اسکیم ہے۔ وہ نہایت پیچیدہ اور گہری ٹیکنالوجی پر مبنی ہے۔ اس کے اندر تمام باریکیاں ایک مقصد اور ارادے کے ساتھ رکھی گئی ہیں۔ یہ تخلیق بڑی مربوط ہے۔ اور اس کے اندر ہر چیز ایک مقدار مطلوب کے مطابق ہے ' نہ اس میں کمی ہوتی ہے اور نہ اضافہ ہوتا ہے۔ ہر چیز اپنے ماحول کے اندر پوری طرح فٹ ہے۔ جس چیز کو جس شکل و صورت میں پیدا کیا گیا ہے ' اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس طرح ضروری ہے اور یہ بات بعید از امکان ہے کہ اس قدر پیچیدہ ٹیکنالوجی محض بخت و اتفاق سے پیدا ہو گئی ہو اور اس پوری کائنات میں جو ہولناک حد تک عظیم ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان تمام باتوں پر اچھی طرح غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کا بھی کوئی بڑا مقصد ہے اور وہ صرف اس صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ حشر و نشر کو تسلیم کیا جائے۔ یہ کائنات حق پر قائم ہے ' اس میں کوئی چیز باطل نہیں ہے ' اس کا ایک انجام ہے جو ابھی واقع نہیں ہوا۔ یہ انجام اور مقصد صرف موت سے پورا نہیں ہوتا کیونکہ موت تو اس دنیا کا انجام ہے۔ اس دنیا کے مختصر سفر کا اختتام ہے۔ اور حشر و نشر تو محض منطقی حوالے سے بھی ضروری ہے کیونکہ جب تخلیق سچائی پر ہے تو نیکی اور بدی کا فیصلہ بھی سچائی پر ہونا چاہئے۔ انسان کے اندر آغاز حیات سے صلاح و فساد کی صلاحیت رکھی گئی ہے۔ اور وہ یہاں یا صلاح اختیار کرتا ہے یا فساد لہٰذا اسے صلاح کا انعام اور فساد کی سزا ملنی چاہئے۔

یہ کہ انسان کو نیکی اور بدی کی صلاحیت دی گئی ہے اور یہ کہ اللہ نے انسان کو اس طرح عبث نہیں پیدا کیا ہے ' لہٰذا نیک اور بد کا متعین انجام ضروری ہے اور یہ انجام اس دنیا کی مختصر زندگی کے بعد ہونا چاہئے۔ لہٰذا حشر و نشر اس کائنات کی تخلیق کے نقشے کے اندر موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کہنے کے بعد کہ کائنات کو عبث نہیں پیدا کیا گیا ' قیامت کا ذکر آتا ہے۔

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۴۴ : ۴۰) يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۴۴ : ۴۱) اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۴۴ : ۴۲)

"ان سب لوگوں کے اٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت فیصلے کا دن ہے ' وہ دن جب کوئی عزیز قریب اپنے کسی عزیز قریب کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ کہیں سے انہیں کوئی مدد پہنچے گی ' سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم کرے ' وہ زبردست اور رحیم ہے"۔

قیامت کی یہ بات اپنی ماقبل کی باتوں اور آیات سے نہایت مربوط طور پر یہاں لائی گئی ہے۔ حکمت اور حق کا تقاضا یہ ہے کہ ایک یوم الفصل ہو ' جس میں لوگوں کے باہم فیصلے بھی چکائے جائیں اور ضلالت و ہدایت کے فیصلے بھی کئے جائیں ' نیکی کو عزت بخشی جائے اور برائی اور شر کو سزا دی جائے ' اور لوگ تمام ارضی سہاروں سے بے نیاز ہوں ' عزیز و

، اقارب کا وہاں کوئی آسرا نہ ہو۔ وہ اکیلے اکیلے وہاں جائیں جس طرح خالق نے انہیں پیدا کیا ہے۔ خالق وہاں ان کو اس کی جزاء دے جو انہوں نے کمایا۔ کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہو کوئی ان پر رحم کرنے والا نہ ہو 'بس صرف اللہ' قادر مطلق' عزیز و رحیم ہی کا بھروسہ اور فضل ہو۔ کیونکہ اسی نے ان کو اس زمین پر لاکر کام میں لگایا اور وہی ہے جو ان کو سزا دے گا۔ اور یہاں ان کے بسائے جانے اور اٹھائے جانے کے درمیان جو مختصر زندگی ہے 'یہ ابتلا اور آزمائش کی زندگی ہے۔

یوں اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کے اصلی نقشے میں اور زمین و آسمان کی ساخت کے انداز میں سچائی ودیعت کردہ ہے اور واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کا ایک مقصد ہے۔

--- ○○○---

ان باتوں کے بعد اب قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر' سرکشوں کی سزا اور اطاعت کیشوں کے لیے انعام' یہ ایک نہایت ہی خوفناک اور شدید منظر ہے اور اس پوری سورت کی فضا کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ ﴿٤٣﴾ طَعَامُ الْأَثِيمِ ﴿٤٤﴾ كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ﴿٤٥﴾ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ ﴿٤٦﴾ خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ ﴿٤٧﴾ ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ ﴿٤٨﴾ ذُقْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ﴿٤٩﴾ إِنَّ هَٰذَا مَا كُنتُم بِهِ تَمْتَرُونَ ﴿٥٠﴾ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ ﴿٥١﴾ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿٥٢﴾ يَلْبَسُونَ مِن سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿٥٣﴾ كَذَٰلِكَ وَزَوَّجْنَاهُم بِحُورٍ عِينٍ ﴿٥٤﴾ يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ آمِنِينَ ﴿٥٥﴾ لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ۖ وَوَقَاهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ﴿٥٦﴾ فَضْلًا مِّن رَّبِّكَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٥٧﴾

"زقوم کا درخت گناہ گار کا کھاجا ہو گا' تیل کی تلچھٹ جیسا' پیٹ میں وہ اس طرح جوش کھائے گا جیسے کھولتا ہوا پانی جوش کھاتا ہے۔ "پکڑو اسے اور رگیدتے ہوئے لے جاؤ اور اس کو جہنم کے بیچوں بیچ اور انڈیل دو اس کے سر پر کھولتے پانی کا عذاب۔ چکھ اس کا مزا' بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تو۔ یہ وہی چیز ہے جس کے آنے میں تم لوگ شک رکھتے تھے۔ خدا ترس لوگ امن کی جگہ میں ہوں گے۔ باغوں اور چشموں میں' حریر و دیبا کے لباس پہنے' آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ یہ ہوگی ان کی شان۔ اور ہم گوری گوری آہو چشم عورتیں ان سے بیاہ دیں گے۔ وہاں وہ اطمینان سے ہر طرح کی لذیذ چیزیں طلب کریں گے۔ وہاں موت کا مزہ وہ کبھی نہ چکھیں گے۔ بس دنیا میں جو موت آچکی' سو آچکی۔ اور اللہ اپنے فضل سے ان کو جہنم کے عذاب سے بچا دے گا' یہی بڑی کامیابی ہے"۔

یہ منظر زقوم کے درخت کے پیش کرنے سے شروع ہوتا ہے اور یہ بدکاروں کی خوراک ہو گا۔ اور یہ اس قدر کڑوا ہو گا جس طرح تیل کی تلچھٹ کڑوی ہوتی ہے۔ یہ جہنمیوں کی خوراک کی خوفناک تصویر کشی ہے اور یہ تلچھٹ پیٹ میں یوں جوش مارے گا جس طرح پتیلے میں پانی کھولتا ہے۔ ان بدکاروں کے پیٹ میں، جو برتری دکھاتے تھے رب پر اور اس کے رسولؐ امین پر۔ فرمان الٰہی یوں ان "شرفاء" کے لیے صادر ہوتا ہے۔

خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰی سَوَآءِ الْجَحِیْمِ (٤٤:٤٧) ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِیْمِ (٤٤:٤٨) "پکڑو اسے اور رگیدتے ہوئے لے جاؤ اس کو جہنم کے بیچوں بیچ اور انڈیل دو اس کے سر پر کھولتے پانی کا عذاب"۔ یعنی پکڑو اسے سخت بے دردی کے ساتھ۔ کس کر باندھو اسے اور پھر رگیدتے ہوئے جہنم کی طرف لے جاؤ، کوئی نرمی اور کوئی باعزت گرفتاری نہ ہو۔ اور ان کے سروں پر اس قدر سخت گرم پانی انڈیل دو کہ ان کو بھون کر رکھ دے، اس سختی، کھینچنے، دھکیلنے، رگیدنے گرم پانی سے جلانے اور داغ دینے کے ساتھ جہنم کے اندر گراؤ اور پھر یہ بھی کہہ دو:

ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ (٤٤:٤٩) "چکھ اس کا مزا، بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تو"۔ جو لوگ عزت اور شرافت کے بغیر عزیز و کریم بنتے ہیں ان کی سزا ایسی ہی ہے۔ تم اللہ اور رسول اللہؐ کے مقابلے میں یہی کچھ کرتے تھے۔ تم اس دن میں شک کرتے تھے اور مذاق اڑاتے تھے اور ٹھٹھے کرتے تھے۔

اس منظر میں ایک طرف تو پکڑ دھکڑ، باندھنا اور داغنا ہے اور گرم پانی گرانا ہے اور دوسری طرف وہ حقیقی شریف و کریم لوگ ہیں جو متقین تھے، جو ہر وقت اس دن سے ڈرتے تھے۔ یہ لوگ نہایت ہی امن کے مقام میں کھڑے ہیں، نہ ڈر ہے اور فریاد و فغاں ہے، نہ کھینچا تانی ہے اور نہ دھکم پیل ہے، اور نہ ان پر سختی اور گرم پانی گرانا ہے۔ بلکہ وہ نہایت ہی بہتر پوزیشن میں ہیں۔ باغات میں جہاں ہر طرف چشمے بہہ رہے ہیں۔ یہ نرم و باریک ریشم اور موٹے ریشم کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں وہ ایک دوسرے کے بالمقابل تکیوں پر بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ شریک محفل ہیں۔ پھر ان کو وہاں ایسی بیویاں دی جائیں گی جو نہایت ہی خوبصورت آنکھوں والی ہوں گی۔ یوں یہ نعمت اور فرحت تمام ہو گی اور وہ جنت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مقیم ہوں گے جو بھی وہاں چاہیں گے، ملے گا۔

یَدْعُوْنَ فِیْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِیْنَ (٤٤:٥٥) "وہاں وہ اطمینان سے ہر طرح کی لذیذ چیزیں طلب کریں گے"۔ یعنی ان کو ان نعمتوں کے ختم ہونے کا کوئی اندیشہ نہ ہو گا، نہ موت ہو گی جبکہ ایک بار وہ مر چکے۔ اور اس کے سوا کوئی اور موت ہو گی ہی نہیں۔ مشرکین تو یہ کہتے تھے کہ یہی پہلی موت ہے اور حشر و نشر نہ ہو گا، اس کے جواب میں ہے کہ ٹھیک ہے یہی پہلی موت ہے لیکن حشر و نشر ہو گیا، اب کوئی موت نہیں ہے، اگرچہ تم موت چاہتے ہو۔ اور اللہ نے اہل ایمان کو جہنم سے بچالیا، محض اپنے فضل و کرم سے کیونکہ نجات تو اللہ کے فضل و کرم پر موقوف ہے۔

فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (٤٤:٥٧) "اور اللہ اپنے فضل سے ان کو موت

سے بچائے گا' یہی بڑی کامیابی ہے"۔اور نہایت ہی عظیم کامیابی!

اس شدید منظر کے بعد اب سورت کا خاتمہ اس بات پر ہوتا ہے جس سے اس کا آغاز ہوا تھا کہ یہ قرآن اور یہ رسالت اللہ کی طرف سے نعمت عظمیٰ ہے اور اس نعمت کا انکار اور رسول کی تکذیب کے نتائج سے متنبہ کیا جاتا ہے۔

۳

۵۸ فَإِنَّمَا يَسَّرْنَٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۵۸﴾ فَارْتَقِبْ إِنَّهُم مُّرْتَقِبُونَ ﴿۵۹﴾ ع ۳

۱۶ "اے نبی" ہم نے اس کتاب کو تمہاری زبان میں سہل بنا دیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔اب تم بھی انتظار کرو' یہ بھی منتظر ہیں"۔

یہ اس سورت کا خاتمہ ہے' اس میں اس پوری سورت کی فضا اور اس کے موضوع بحث کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے۔یہ خاتمہ اس کے آغاز اور اس میں بحث کی جو لائن اختیار کی گئی ہے اس کے مطابق ہے۔آغاز ذکر کتاب' نزول کتاب اور غرض نزول یعنی ڈرانے اور نصیحت کرنے سے ہوا تھا۔اور اس کے سیاق میں اس عذاب کی تشریح کی گئی تھی۔جو ان مکذبین کے انتظار میں ہے۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنْتَقِمُونَ (۴۴ : ۱۶) "جس دن یہ بڑی ضرب لگائیں گے' وہ دن ہو گا جب ہم تم سے انتقام لیں گے"۔اب یہ خاتمہ یوں ہے کہ ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ رسول کریم کی زبانی قرآن مجید تمہارے لیے آسان کر دیا گیا ہے جو عربی زبان میں ایک عربی بولنے والے رسول پر نازل کیا گیا ہے۔تم اس کو سمجھ سکتے ہو' وہ آپ کو سمجھا سکتے ہیں' اگر تم نے اسے تسلیم نہ کیا تو ایک نہایت ہی خوفناک انجام تمہارے انتظار میں ہے۔

فَارْتَقِبْ إِنَّهُمْ مُرْتَقِبُونَ (۴۴ : ۵۹) "تم بھی انتظار کرو' یہ بھی منتظر ہیں"۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ----- ۲۵

### سورۃ الجاثیہ ۔ ۴۵

آیات ۱--- تا--- ۳۷

# سورۃ الجاثیہ ایک نظر میں

یہ بھی مکی سورت ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ مکہ میں مشرکین نے دعوت اسلامی کا استقبال کس طرح کیا اور دعوت اسلامی کی آیات و دلائل کا مقابلہ کس انداز سے کیا۔ دعوت اسلامی کے حقائق اور مسائل اور نظریات کے مقابلے میں ان کا ردعمل کیا رہا۔ غرض انہوں نے بغیر کسی شرم و حیا کے اور واضح سچائی کو دیکھتے ہوئے اور بین دلائل کو سنتے ہوئے بھی پوری طرح اپنی خواہشات کی پیروی کی۔ پھر یہ سورت تصویر بھی دکھاتی ہے کہ قرآن مجید نے ان سنگدل اور ہوا و ہوس کے پیچھے سرپٹ دوڑنے والے لوگوں کی اصلاح کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے۔ ایسے لوگوں کی اصلاح کی خاطر جن کے دل پردوں اور غلافوں میں لپٹے ہوئے تھے اور ہدایت قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایسے لوگوں کے سامنے قرآن کریم نے نہایت ہی گہرے اثر والے دلائل اور نہایت ہی فیصلہ کن براہین پیش کیے۔ ان کو عذاب الٰہی سے ڈرایا' ان کے سامنے جنت کی تصویر پیش کی۔ اللہ کے سنن گنوائے اور اس کائنات میں چلنے والے نوامیس فطرت بتائے۔

اس سورت کی آیات اور اس کے مناظر کے درمیان ہمیں اس قسم کے کردار بھی نظر آتے ہیں جن کو گمراہی پر اصرار ہے' جو حق کے مقابلے میں ناحق ڈٹے ہوئے ہیں' دعوت اسلامی کے ساتھ سخت عناد رکھتے ہیں' اللہ کے حق میں اور اللہ کے کلام کے حق میں نازیبا باتیں کرتے ہیں۔ یہ آیات ایسے لوگوں کی تصویر حقیقی رنگ میں پیش کرتی ہیں اور ان کو مناسب سرزنش کرتی ہیں۔ اللہ کے عذاب الیم و عظیم سے ڈراتی ہیں اور نہایت ہی توہین آمیز انجام کے بارے میں بتاتی ہیں۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ (۷) يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۸) وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْئَاْ اِتَّخَذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (۹) مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْئًا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۰) (۴۵: ۷ تا ۱۰) "تباہی ہے ہر اس جھوٹے بداعمال شخص کے لیے جس کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں' اور وہ ان کو سنتا ہے' پھر پورے غرور کے ساتھ اپنے کفر پر اس طرح اڑا رہتا ہے کہ گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں۔ ایسے شخص کو دردناک عذاب کا مژدہ سنا دو اور ہماری آیات میں سے کوئی بات جب اس کے علم میں آتی ہے تو وہ اس کا مذاق بنا لیتا ہے۔ ایسے سب لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔ ان کے آگے جہنم ہے جو کچھ بھی انہوں نے دنیا میں کمایا ہے اس میں سے کوئی چیز ان کے کام نہ آئے گی۔ نہ ان کے وہ سرپرست ہی ان کے کچھ کام آئیں گے جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے اپنا ولی بنا رکھا تھا ان

کے لیے بڑا عذاب ہے۔

اس سورت میں ہم ایک ایسے گروہ سے بھی ملتے ہیں جن کا تصور اور جن کے اندازے بالکل غلط ہیں۔ غالباً یہ اہل کتاب ہیں۔ یہ لوگ خالص ایمان کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے' نہایت بدکار لوگ ہیں یہ اور ان کے مقابلے میں اہل ایمان نہایت ہی اچھے لوگ ہیں لیکن وہ اس فرق کو نہیں سمجھتے۔ قرآن کریم انہیں سمجھاتا ہے کہ ایسے دونوں گروہوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے پیمانوں کے مطابق بہت بڑا فرق ہے اور ان کو بتایا جاتا ہے کہ ان کا نظریہ اور ان کے یہ فیصلے کس قدر غلط ہیں' اللہ کے پیمانوں کے مطابق تمام معاملے اس میزان عدل کے مطابق ہوتے ہیں جس کو اس پوری کائنات کے لیے ریڑھ کی ہڈی بنایا گیا ہے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۲۱) وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۲۲) (۴۵ : ۲۱ تا ۲۲) "کیا وہ لوگ جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے' یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے کہ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے گا؟ بہت برے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں۔ اللہ نے تو آسمان اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ ہر متنفس کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے' لوگوں پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا"۔

ایک کردار ایسا بھی ہمارے سامنے آتا ہے جو صرف نفس کے قاضی کے فیصلے مانتا ہے۔ گویا اس کا الٰہ اس کے اندر ہے اور یہ اسی کا مطیع فرمان ہے۔ ایسے کرداروں کی ایک انوکھی تصویر کھینچی گئی ہے۔ یہ شخص اپنی اس روش پر خوب اتراتا ہے۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۴۵ : ۲۳) "پھر کبھی تو نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اللہ کے بعد اب اور کون ہے جو اسے ہدایت دے کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے"۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ قیامت کے منکر ہیں اور وہ حشر و نشر کے بارے میں پوری طرح شک میں مبتلا ہیں۔ اور نہایت ہی ہٹ دھرمی کے ساتھ اس قسم کی دلیل طلب کرتے جس کا مظاہرہ اس دنیا میں زمین پر نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم ایسے لوگوں کے سامنے بھی ایسے دلائل پیش کرتا ہے جو موجود ہیں۔ یہ نہایت ہی دل پذیر دلائل ہیں لیکن یہ لوگ ان سے منہ موڑتے ہیں۔

وَقَالُوْا مَاهِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیَا وَ مَا یُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ (۲۴) وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲۵) قُلِ اللّٰهُ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یَجْمَعُكُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ

(۲٦) (٤٥: ٢٤ تا ٢٦) "یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے۔ یہیں ہمارا مرنا اور جینا ہے۔ اور گردش ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو۔ در حقیقت اس معاملہ میں ان کے پاس کوئی علم نہیں۔ یہ محض گمان کی بنا پر باتیں کرتے ہیں اور جب ہماری واضح آیات انہیں سنائی جاتی ہیں تو ان کے پاس کوئی حجت اس کے سوا نہیں ہوتی کہ اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو۔ اے نبی ' ان سے کہو اللہ ہی تمہیں زندگی بخشتا ہے۔ پھر وہی موت دیتا ہے پھر وہی تم کو قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں مگر اکثر لوگ جانتے نہیں"۔

ہو سکتا ہے کہ یہ سب لوگ ایک ہی گروہ ہوں اور یہی گروہ یہ سب باتیں کرتا ہو اور قرآن کریم جگہ جگہ ' ان کی بات کرتا ہو ' لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مختلف گروہ ہوں اور مکہ میں اپنی اپنی جگہ میں کام کرتے ہوں اور ان میں بعض اہل کتاب بھی ہوں۔ اگرچہ اہل کتاب مکہ میں بہت ہی قلیل تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اشارہ انہی اہل کتاب کی طرف ہو اور اہل مکہ کو نصیحت کے لیے یہ بات کی جا رہی ہو۔ اگرچہ وہ مکہ میں موجود نہ ہوں۔

بہرحال قرآن کریم نے ان لوگوں کی یہ صفات دے کر یہاں ان کی تردید کی۔ اور اس سورت میں ان کے بارے میں مفصل بات کی۔ قرآن کریم نے ان کے سامنے آفاق اور انفس کے دلائل بھی پیش کیے اور ان کو قیامت کے دن سے ڈرایا اور یہ بھی بتایا کہ ذرا تاریخ انسانی کے جھروکوں میں سے دیکھو کہ مکذبین کس انجام سے دوچار ہوتے رہے۔

ان کے سامنے قرآن مجید نے نہایت ہی سادہ اور پر تاثیر اسلوب میں بات پیش کی :

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۳) وَ فِیْ خَلْقِكُمْ وَ مَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (٤) وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (٥) تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَ اٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ (٦) (٤٥: ٣ تا

٦) "حقیقت یہ ہے کہ آسمان اور زمین میں بے شمار نشانیاں ہیں ' ایمان لانے والوں کے لیے۔ اور تمہاری اپنی پیدائش میں اور ان حیوانات میں جن کو اللہ پھیلا رہا ہے ' بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں اور شب و

روز کے فرق و اختلاف میں اور اس رزق میں جسے اللہ آسمانوں سے نازل فرماتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو جلا اٹھاتا ہے اور ہواؤں کی گردش میں 'بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں ۔ یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جو ہم تمہارے سامنے ٹھیک ٹھیک بیان کر رہے ہیں ۔ آخر اللہ اور اس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے"۔

اور یہ دلائل و نشانات اللہ ان کے سامنے اپنے انعامات میں سے کسی نہ کسی شکل میں پیش فرماتا ہے 'جن کو انہوں نے بھلا دیا ہے تاکہ وہ انہیں یاد کریں اور ان پر غور کریں ۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۱۲) وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۳) (۴۵: ۱۲ تا ۱۳) "وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو 'اور شکر گزار ہو ۔ اس نے زمین و آسمان کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ۔ سب کچھ اپنے پاس سے ۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں"۔

پھر اللہ نے ان کے سامنے ان حالات کا خوبصورت نقشہ بھی رکھ دیا ہے اس دن کا جس کا یہ انکار کرتے ہیں اور جس میں ان کو گہرا شک ہے ۔

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یَوْمَئِذٍ یَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ (۲۷) وَ تَرٰی كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِیَةً كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤی اِلٰی كِتٰبِهَا اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۸) هٰذَا كِتٰبُنَا یَنْطِقُ عَلَیْكُمْ بِالْحَقِّ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۹) فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِیْ رَحْمَتِهٖ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِیْنُ (۳۰) وَ اَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اَفَلَمْ تَكُنْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰی عَلَیْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ (۳۱) وَ اِذَا قِیْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ السَّاعَةُ لَا رَیْبَ فِیْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِیْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ (۳۲) وَ بَدَا لَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ (۳۳) وَ قِیْلَ الْیَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا

نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّن نَّاصِرِينَ (٣٤) ذَلِكُم بِأَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا وَغَرَّتْكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ (٣٥) (٤٥: ٢٧ تا ٣٥) ”اور جس روز قیامت کی گھڑی آکھڑی ہوگی اس دن باطل پرست خسارے میں پڑ جائیں گے۔ اس دن ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا دیکھو گے۔ ہر گروہ کو پکارا جائے گا کہ آئے اور اپنا نامہ اعمال دیکھے۔ ان سے کہا جائے گا 'آج تم لوگوں کو تمہارے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کر رہے تھے۔ یہ ہمارا تیار کیا ہوا اعمال نامہ ہے 'جو تمہارے اوپر ٹھیک ٹھیک شہادت دے رہا ہے' جو کچھ بھی تم کرتے تھے 'اسے ہم لکھواتے جا رہے تھے۔ پھر جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تھے۔ انہیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا اور یہی صریح کامیابی ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا۔ کیا میری آیات تم کو نہیں سنائی جاتی تھیں مگر تم نے تکبر کیا اور مجرم بنے رہے اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہوتی ہے۔ ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں۔ یقین ہم کو نہیں ہے"۔ اس وقت ان پر ان کے اعمال کی برائیاں کھل جائیں گی اور وہ اس چیز کے پھیر میں آجائیں گے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے اور ان سے کہہ دیا جائے گا کہ "آج ہم بھی اس طرح تمہیں بھلائے دیتے ہیں جس طرح تم اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے تمہارا ٹھکانا اب دوزخ ہے۔ اور کوئی تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ یہ تمہارا انجام اس لیے ہوا کہ تم نے اللہ کی آیات کا مذاق بنا لیا تھا اور تمہیں دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا تھا۔ لہٰذا آج نہ یہ لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے کہا جائے گا کہ معافی مانگ کر اپنے رب کو راضی کرو"۔

اس طرح اللہ نے منصفانہ جزاء و سزا اور ہر شخص کی انفرادی ذمہ داری کے اصول میں کوئی شک نہیں رہنے دیا اس لیے یہ بتایا گیا کہ یہ اصول اس کائنات کے وجود میں بہت ہی گہرا ہے۔ اس اصول پر یہ کائنات قائم ہے۔ اس آیت میں کہا گیا:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ إِلَى رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ (٤٥: ١٥)

”جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے کرے گا اور جو برائی کرے گا وہ آپ ہی اس کا خمیازہ بھگتے گا۔ پھر جانا تو سب کو رب ہی کی طرف ہے“۔

اور جو لوگ بدکاریاں کرتے ہیں اور پھر یہ زعم رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے ہاں مومنین ہی کی طرح ہوں گے جو نیک کام کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے۔

وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزَى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (٤٥: ٢٢) ”اللہ نے تو آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ ہر متنفس کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے اور لوگوں پر ظلم نہ کیا جائے“۔

یہ پوری سورت ایک ہی ٹکڑا ہے لیکن ہم نے تشریح کی سہولت کے لیے اسے دو شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس کا

آغاز حروف مقطعات حاء میم سے ہوتا ہے۔ پھر قرآن کریم کے نزول کی طرف اشارہ ہے۔

تَنْزِيلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۴۵ : ۲) ”کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست اور حکیم ہے“۔ اور اس کا خاتمہ بھی حمد الہٰی اور اللہ کی عام ربوبیت سے بیان ہوتا ہے۔ نیز اللہ کی پاکی اور عظمت کے بیان پر ہوتا ہے اور یہ حمد و ثنا اور عظمت اور تمجید ان لوگوں کے خیالات کے مقابلے میں بیان کی گئی جو اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے ہیں اور ٹھٹھے مارتے ہیں۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۵ : ۳۶) وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۵ : ۳۷) ”پس تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو زمین اور آسمانوں کا مالک ہے اور سارے جہاں والوں کا پروردگار ہے۔ زمین و آسمانوں میں بڑائی اسی کے لیے ہے اور وہی زبردست اور دانا ہے“۔

اس سورت کا انداز بیان سورت دخان کے مقابلے میں سہل، دھیما، واضح اور گہرا اور سنجیدہ ہے جبکہ سورۂ دخان نہایت پرشوکت اور شدید اور رعب دار انداز میں تھی۔ جس میں قلب و ضمیر اور دل و دماغ پر شدید ضربات لگائی گئی تھیں۔ اللہ تمام دلوں کا خالق ہے۔ قرآن کا نازل کرنے والا ہے، بعض اوقات اصلاح کے لیے سخت انداز اختیار کرتا ہے اور بعض اوقات نہایت ہی نرم و نازک، درشتی و نرمی بہم در بہ است۔ موقع و محل اور حالات کے مطابق۔ اللہ لطیف و خبیر ہے اور عزیز و حکیم ہے۔ اب تفصیلات تشریح۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۳۵ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۲۳

سُوْرَةُ الْجَاثِيَةِ مَكِّيَّةٌ (۴۵) (۶۵)
اٰيَاتُهَا ۳۷ رُكُوْعَاتُهَا ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ح م۔اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست اور حکیم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں بے شمار نشانیاں ہیں ایمان لانے والوں کے لیے۔ اور تمہاری اپنی پیدائش میں' اور ان حیوانات میں جن کو اللہ (زمین میں) پھیلا رہا ہے' بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں اور شب و روز کے فرق و اختلاف میں' اور اس رزق میں جسے اللہ آسمان سے نازل فرماتا ہے' پھر اس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو جلا اٹھاتا ہے' اور ہواؤں کی گردش میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں"۔

حا۔میم کے بعد' یہ آتا ہے کہ یہ کتاب اللہ عزیز اور حکیم کی طرف سے ہے اور اس کتاب کا مصدر اور منبع اللہ کی ذات ہے اور دوسرا اشارہ اس میں یہ ہے کہ یہ معجز کتاب انہی حروف سے بنائی گئی ہے۔ جیسا کہ حروف مقطعات کے بارے میں ہماری رائے ہے اور یہ کہ یہ چیلنج ہے ان کو کہ تم ان حروف سے ایسی کتاب نہیں بنا سکتے۔ لہٰذا حا میم دلیل ہے تنزیل الکتب پر کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ زبردست قدرت والا ہے اور اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا اور حکیم ہے جس نے اس پوری کائنات کو حکمت سے بنایا اور تمام معاملات اس ذات کے حکم سے طے ہوتے ہیں۔ یہ ایک

ایسا تبصرہ ہے جو سورت کی فضا کے ساتھ مناسب ہے 'جس میں طرح طرح کے نفوس اور ان کی ذہنیت دکھائی گئی ہے۔

قبل اس کے کہ لوگوں کے سامنے 'اس کتاب کے حوالے سے ان کا موقف رکھا جائے 'ان کو ان آیات و نشانات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو اس کائنات میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔یہ آیات اور یہ نشانیاں اس بات کے لیے کافی تھیں کہ یہ لوگ ایمان لاتے اور یہ لوگ اپنے دلوں کو اگر ان کی طرف متوجہ کرتے تو ان کے دل کھل جاتے اور اس کتاب کے نازل کرنے والے عظیم اللہ کی طرف ان کا احساس تیز ہو جاتا جو اس کائنات کا ایک عظیم خالق ہے۔

اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۴۵ : ۳) "حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں بے شمار نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں"۔اور وہ نشانیاں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں وہ کسی چیز تک محدود نہیں ہیں 'کسی حال تک محدود نہیں ہیں 'اس کائنات کی جس چیز کو بھی انسان دیکھے اور مطالعہ کرے تو دل گواہی دیتا ہے کہ یہی پہلو ایک معجزہ ہے گویا "جا اینجا است"۔سوال یہ نہیں ہے کہ نشانی کہاں ہے 'سوال یہ ہے کہ کون سی چیز نشانی نہیں ہے؟

ذرا دیکھو ان آسمانوں اور ان کے اندر تیرنے والے عظیم الجثہ اجرام فلکی کو 'پھر اس کی طویل و عریض وسعتوں کو 'یہ اس طرح پھیلے ہوئے ہیں جس طرح ذرات اور رائی کے دانے 'بمقابلہ اس فضا اور خوفناک حد تک عریض و طویل فضا کے نیز یہ نہایت ہی خوبصورت ہیں۔

پھر ذرا اس بات کو دیکھو کہ ان اجرام کی گردش اپنے اپنے مدار میں کس قدر تسلسل کے ساتھ قائم ہے۔نہایت ہی خوبصورت ہم آہنگی کے ساتھ 'انسان یہ چاہتا ہے کہ دیکھتا ہی رہ جائے اور اس کے ملاحظے سے جی بھرتا ہی نہیں۔بعض گردشیں کروڑوں سالوں میں مکمل ہوتی ہیں اور ایک سیکنڈ کا فرق نہیں پڑتا۔

اور یہ زمین جسے انسان بہت ہی طویل و عریض سمجھتا ہے 'یہ ایک نہایت ہی چھوٹا سا ذرہ ہے 'بمقابلہ ان بڑے ستاروں کے (صرف مشتری اس سے ایک ہزار گنا زیادہ بڑا ستارہ ہے) پھر یہ ذرہ یعنی زمین 'اس وسیع فضائے کائنات کے اندر تیر رہی ہے۔اگر اللہ کی قدرت نہ ہوتی جس نے اسے تھام رکھا ہے اور اپنے مدار میں بند کر رکھا ہے تو یہ اس فضائے بسیط میں اپنی راہ گم کر دیتی لیکن اللہ کی قدرت کا یہ کمال ہے کہ اس کائنات کا ذرہ بھی یہاں گم نہیں ہو سکتا۔

پھر وہ سازو سامان جو اللہ نے اس زمین میں 'اس کے ایک خاص مقام اور نظام کی وجہ سے ودیعت کیا اور جس کی وجہ سے اس کے اوپر زندگی ممکن ہوئی 'اس کا تو ہر ہر پہلو ایک نشانی ہے۔اس سازو سامان کی ہر چیز کے اپنے اپنے خواص 'نہایت باریک بینی کے ساتھ' بڑی کثرت اور ہم آہنگی کے ساتھ یہاں جمع کیے گئے ہیں۔اگر کسی ایک چیز کی خاصیت و ماہیت شمہ برابر بدل جائے تو زندگی کا پورا نظام خلل پذیر ہو جائے یا سرے سے ختم ہو جائے۔غرض اس زمین کی ہر زندہ شے ایک علیحدہ نشانی ہے۔ہر چیز کا ایک ایک جزء اور ایک ایک عضو ایک الگ نشانی ہے۔اس معاملے میں عظیم الجثہ اشیاء اور ذرہ برابر کی اشیاء نشانی ہیں۔ایک عظیم درخت سے ایک چھوٹا سا پتہ اٹھا لو 'اس کائنات کی پہنائیوں میں ایک چھوٹا سا نباتاتی پودا لے لو اور تجربہ کرو 'اپنے جسم اور اپنی شکل کے اعتبار سے یہ ایک نشانی ہے۔رنگ میں بھی اور چھوٹے پن میں بھی۔اپنے مقاصد کے لیے بھی نشانی اور اپنے جسم میں بھی نشانی۔انسان یا حیوان کے جسم کا ایک بال ہی لے لو 'یہ

بھی ایک نشانی ہے' اس کی ترکیب' اس کا رنگ نشانی ہے' ہر پرندے کا ہر ایک نشانی ہے' اس کا مادہ ترکیب' اس کے مقاصد' اور اس کی ہم آہنگی۔ اگر انسان اس زمین و آسمان میں چشم بصیرت کے ساتھ دیکھے تو اسے نشانات الٰہیہ کا اژدہام نظر آئے اور انسان اعلان کر دے کہ اس کی فکر و نظر سے یہ تمام نشانات وراء ہیں۔

لیکن یہ نشانیاں کس کے لیے ہیں؟ خود یہ آیات بتا دیتی ہیں' یہ نشانیاں کس کے سامنے پردہ اٹھنگند ہوتی ہیں۔ ان کا احساس کس کو ہو سکتا ہے لِّقَوْمٍ يُّوقِنُوْنَ (۴۵ : ۴) "ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں"۔ جو مومن ہیں اور مومن ہی نور ربی سے دیکھتا ہے۔

پس ایمان ہی وہ قوت ہے جو دلوں کے دروازے کھولتا ہے' پھر انسان پکار سنتا ہے' کوئی روشنی دلوں کو اندر آکر منور کر سکتی ہے' کوئی تازہ باد نسیم کے جھونکے دنیائے دل پر تر و تازگی بکھیر سکتے ہیں اور ایمان ہی کی وجہ سے انسان' اس کائنات میں ہر طرف بکھری ہوئی نشانیاں دیکھ سکتا ہے' یہ ایمان ہی ہے جو دلوں کو ایسی فرحت بخش تازگی عطا کرتا ہے اور ان کے اندر رقت اور لطافت پیدا کرتا ہے' جس کے نتیجے میں یہ دل وہ اشارات وصول کرتے ہیں جو اس کائنات میں سے ہر طرف سے آ رہے ہیں' جو یہ بتاتے ہیں کہ یہ اشارے دست قدرت کی طرف سے ہیں اور دست قدرت جن جن چیزوں کو بناتی ہے ان کے اندر یہ اشارات موجود ہوتے ہیں۔ اللہ کی پیدا کردہ ہر چیز معجز ہے اور مخلوق اس کی نقل بھی نہیں کر سکتی۔ اب اس کائنات کی طویل اور دور دراز وادیوں سے واپس لا کر انسان کو اس کی اپنی ذات کی طرف لایا جاتا ہے' جو اس کے قریب ہے۔ اور وہ جانور جو انسان کے قریب ہیں ان پر غور و فکر کی دعوت!

وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۴۵ : ۴) "اور تمہاری اپنی پیدائش میں اور ان حیوانات میں جن کو اللہ زمین میں پھیلا رہا ہے بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں"۔ انسان کو یہ عجیب ساخت عطا کرنا' پھر اسے ایسی عجیب خصوصیات عطا کرنا' اور نہایت ہی گہرے' لطیف اور پیچیدہ فرائض اس کے حوالے کرنا جن میں سے ہر ایک معجزانہ ہے۔ جسم انسانی کے ایسے اندرونی معجزات ہیں کہ رات اور دن دیکھتے دیکھتے وہ ہمارے لئے عجوبے ہی نہیں رہے۔ اس لیے کہ ہمارے اندر اور ہمارے قریب ہیں لیکن صرف ایک عضو کا تجزیہ کیا جائے تو انسان کا سر چکرا جاتا ہے اور انسان اس پیچیدہ ترکیب کی ہولناکیوں سے مبہوت رہ جاتا ہے۔

زندگی' چاہے وہ اپنی سادہ ترین صورت میں کیوں نہ ہو وہ تو ایک معجزہ ہے۔ امیبا جس کا ایک ہی خلیہ ہوتا ہے اور امیبا سے بھی چھوٹی زندگی بھی معجزہ ہے۔ رہا انسان تو اس کی زندگی تو بہت ہی پیچیدہ اور سخت اور عجیب و غریب ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے بھی وہ نہایت ہی پیچیدہ اور معجزاتی ہے۔ عضوی ترکیب سے اس کی نفسیات زیادہ پیچیدہ ہیں۔

اور وہ مخلوقات جو اس زمین پر ہر طرف رینگتی ہے' اور جس کی لاتعداد انواع و اقسام ہیں' بے شمار جسم اور اشکال ہیں جن کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے۔ اس زندگی میں سے چھوٹی سے چھوٹی چیز اور بڑی سے بڑی چیز سب اپنی اپنی جگہ معجزاتی ہیں' یہ اپنی عمر اور جنس کے اعتبار سے بھی معجزاتی شان رکھتی ہیں۔ اور یہ قدرتی طور پر اپنی نوع کی حفاظت کرتی ہیں اور کوئی نوع دوسری انواع کو فنا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اور دست قدرت نے ان انواع و اقسام کی تعداد اپنے پاس رکھی ہوئی ہے کسی میں کمی کرتا ہے اور کسی میں اضافہ۔ اور ہر ایک کو اس کے خصائص دیتا ہے اور قوت و صلاحیت دیتا ہے۔ اس

طرح حیوانات کے تمام انواع و اقسام کی آبادی کے اندر ایک توازن قائم رہتا ہے۔

گدھ اور باز جارح اور مضر پرندے ہیں اور ان کی عمر بھی لمبی ہے لیکن ان کی آبادی بہت کم ہے اور بہت کم انڈے دیتے ہیں۔ اگر گدھ اور باز چڑیوں کی طرح ہوتے تو ذرا سوچ لیں کہ اس دنیا میں شاید چھوٹے بڑے کسی پرندے کی نسل نہ ہوتی۔

حیوانات میں سے شیر درندہ جانور ہیں' اگر ان کی نسل ہرنوں اور بھیڑ بکریوں کی طرح زیادہ ہوتی تو وہ جنگلات میں کوئی حیوانی مواد نہ چھوڑتا۔ لیکن یہ قدرت ہے جس نے ان کی نسل کو محدود رکھا ہے اور وہ مطلوبہ تعداد ہی میں ہوتے ہیں جبکہ ہرن اور بھیڑ اور بکریاں زیادہ ہوتی ہیں کیونکہ قدرت کو معلوم ہے کہ ان کی زیادہ ضرورت ہے۔

ایک مکھی ایک ہی زندگی میں لاکھوں انڈے دیتی ہے لیکن اس کی زندگی زیادہ سے زیادہ دو ہفتے ہوتی ہے۔ اگر ایک مکھی کی عمر طبیعی کئی ماہ یا سال ہوتی تو تمام انسانی جسموں کو ڈھانپ دیتیں' آنکھوں کو کھا جاتیں لیکن دست قدرت نے ان پر ایک قدرتی بند بھی رکھا ہے اور اس کی عمر کو محدود کر دیا ہے۔

یونہی' ہر چیز اور ہر نوع کی یہ حالت ہے۔ اللہ کی تدبیر اور تقدیر انسانوں اور حیوانات میں اپنا کام کرتی ہے اور ہر چیز کے اندر ایک قسم کی نشانی ہے۔ اور یہ نشانی پکار پکار کہتی ہے کہ اللہ کی آیات میں غور و تدبر کرو اور یہ آیات لِّقَوْمٍ يُّوقِنُوْنَ (۴۵ : ۴) "ان لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں"۔

یقین ایسی حالت ہے جو دلوں کو تیار اور مائل اور متاثر کرنے والی حالت ہے' تاکہ وہ احساس کریں' متاثر ہوں اور اللہ کی طرف مائل ہوں۔ ایمان و یقین دلوں کو ثابت' برقرار اور مطمئن کر دیتا ہے۔ ایسے دل بڑے ٹھہراؤ سے اس کائنات پر غور کرتے ہیں اور اس سے حقائق اخذ کرتے ہیں۔ ان میں سے بے چینی' پریشانی' بے ثباتی ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے دلوں کو اگر اس دنیا میں کم کچھ ملے تب بھی وہ اس سے بڑے نتائج اور آثار حاصل کرتے ہیں۔

اس کے بعد اپنی ذات اور اپنے ارد گرد کے حیوانات سے انہیں اس پوری کائنات کے مظاہر کی طرف لے جایا جاتا ہے۔ اس کائنات سے ان کے لیے اور دوسرے زندوں کے لیے جو اسباب حیات پیدا کیے جاتے ہیں اور فراہم کیے گئے ہیں ذرا ان پر بھی غور کرو۔

وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ

بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۴۵ : ۵) "اور شب و روز کے فرق و اختلاف میں اور اس رزق میں جسے اللہ آسمانوں سے نازل فرماتا ہے۔ پھر اس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو جلا اٹھاتا ہے' ہواؤں کی گردش میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں"۔ گردش لیل و نہار وہ منظر ہے جس کے بار بار کی تکرار کی وجہ سے اس کی جدت انسانوں کے ذہن سے محو ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی پہلی مرتبہ ان کو دیکھے یا پہلی مرتبہ رات کو دیکھے تو یہ ایک عجیب منظر ہے جو دل شاعرانہ احساس رکھتے ہیں وہ اس جدت کو سمجھتے ہیں اور گردش لیل و نہار کو اس کائنات کا ایک حیران کن نظام سمجھتے ہیں۔

انسانوں کے علم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس کائنات کے بعض مظاہر کے بارے میں تو اب انسانوں نے وسیع

معلومات حاصل کر لی ہیں ۔ اب انسان جانتے ہیں کہ گردش لیل و نہار دراصل زمین کی گردش محوری سے پیدا ہوتی ہے جو یہ سورج کے سامنے کرتی ہے اور یہ گردش چوبیس گھنٹوں میں مکمل ہوتی ہے لیکن اس علم کے مطابق بھی یہ انوکھا منظر اور عجوبہ ابھی ختم نہیں ہے کیونکہ یہ کرۂ زمین ہوا کے اندر معلق ہے اور ایک خاص رفتار کے ساتھ چل رہا ہے اور وہ کسی چیز کا سہارا نہیں لے رہا ہے ۔ اللہ نے اسے تھام رکھا ہے اور وہ ایک سیکنڈ بھی اپنی رفتار کم نہیں کرتا ۔ اور یہ رفتار ایسی ہے کہ تمام زندہ مخلوقات اس کے اوپر بڑے آرام سے رہ رہی ہے اور یہ مخلوق اس فضا میں معلق گولے کے اوپر ٹکی ہوئی ہے جو فضا میں گردش پر ہے ۔

اب انسان کا علم قدرے اور وسعت اختیار کرتا ہے کہ اس گردش محوری کے اثرات اس زمین کے اوپر اور تمام زندہ مخلوقات پر کیا ہیں ۔ انسان نے معلوم کیا کہ ان اوقات کو اس طرح رات اور دن میں تقسیم کرنے ہی سے اس کرۂ ارض پر زندگی ممکن بنائی گئی ہے ۔ اگر گردش لیل و نہار نہ ہوتے یا اس اندازے اور اس نظام اور رفتار سے نہ ہوتے تو اس زمین کی سطح پر موجود ہر چیز بدل جاتی اور خصوصاً انسانی زندگی ختم ہو جاتی ۔ چنانچہ یوں اس علم کے بعد معلوم ہوا کہ گردش لیل و نہار اللہ کی نشانیوں میں سے بہت اہم نشانی ہے ۔

وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۴۵ : ۵) "اور اس رزق میں جسے اللہ آسمانوں سے نازل فرماتا ہے ۔ پھر اس کے ذریعہ سے مردہ زمینوں کو جلا اٹھاتا ہے"۔ رزق سے بھی تو پانی مراد ہوتا ہے جو آسمانوں سے آتا ہے جس طرح قدیم مفسرین نے اس سے یہی سمجھا ہے لیکن آسمانوں سے آنے والا صرف پانی بہت وسیع ہے ۔ آسمانوں سے جو شعاعیں نکلتی ہیں وہ زمین کو زندہ کرنے میں پانی سے کوئی کم موثر نہیں ہیں بلکہ ان شعاعوں ہی کے اثر سے حکم الٰہی سے پانی پیدا ہوتا ہے ۔ سورج کی حرارت ہی پانی کو بخارات میں بدلتی ہے ۔ اور یہ بخارات کثیف ہو کر بارش کی شکل اختیار کرتے ہیں اور نہریں اور چشمے بہتے ہیں ۔ اور اس سے زمین مردہ ہونے کے بعد زندہ ہو جاتی ہے 'پانی سے بھی اور حرارت سے بھی ۔

وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ (۴۵ : ۵) "اور ہواؤں کی گردش میں"۔ یہ ہوائیں شمالاً و جنوباً چلتی ہیں ' شرقاً اور غرباً چلتی ہیں ' سیدھی اور ٹیڑھی چلتی ہیں 'گرم اور سرد چلتی ہیں ۔ اس نہایت ہی پیچیدہ نظام کے مطابق جو دست قدرت نے اس کائنات کی تخلیق کے اندر رکھ دیا ہے اور اس کی ہر چیز کو حساب و مقدار سے رکھا ہے اور اس میں کوئی چیز اتفاق اور مصادفت پر نہیں چھوڑا' پھر ہواؤں کے چلنے کا زمین کی گردش محوری سے گہرا تعلق ہے ۔ اور ان کا تعلق گردش لیل و نہار سے بھی ہے اور اس رزق سے بھی ہے جو آسمانوں سے نازل ہوتا ہے ۔ غرض حرارت 'ہوا اور رات اور دن کا نظام سب مل کر یہاں کام کرتے ہیں اور ان میں آیات و نشانات ہیں ۔ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۴۵ : ۵) "ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں"۔ کیونکہ اس میدان میں عقل ہی کام کر سکتی ہے ۔

--- ○○○---

یہ تو ہیں اس کائنات کی بعض نشانیاں جن کی طرف اشارہ کیا گیا' ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں ۔ پھر ان لوگوں کے لیے جو یقین کرتے ہیں اور پھر ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں ۔ یہ آیات ان کی طرف اشارہ کرتی

ہیں ۔ یہ اشارات دلوں کو چھوتے ہیں' ان کو جگاتے ہیں اور یہ آیات الہیہ انسانی فطرت سے براہ راست مخاطب ہوتی ہیں کیونکہ فطرت انسانی اور اس کائنات کے درمیان براہ راست فطری رابطہ ہے ۔ اور اس رابطے کو قرآن کا طرز استدلال ہی زندہ اور تازہ کر سکتا ہے ۔ جو لوگ ان آیات فطرت کو تسلیم نہیں کرتے ۔ ان سے کوئی توقع نہیں ہے کہ وہ کسی اور چیز کو تسلیم کریں گے جن لوگوں کو قرآن کریم کے یہ اشارات اور آیات نہیں جگا سکتیں' ان کو کوئی اور آواز نہیں جگا سکتی خواہ وہ جس قدر تیز آواز ہو ۔ ذرا سنئے :

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝۶

"یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جنہیں ہم تمہارے سامنے ٹھیک ٹھیک بیان کر رہے ہیں ۔ اب آخر اللہ اور اس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے"۔

کوئی کلام' کلام الہی کی طرح فصیح نہیں اور کوئی تخلیق مخلوقات الہیہ کی طرح بدیع نہیں ہے ۔ کوئی حقیقت بھی وجود باری کی طرح ثابت نہیں ہے ۔ پس ان دلائل واقعیہ کے بعد وجود باری واضح اور یقینی ہے ۔ لہذا ان دلائل کے بعد بھی اگر کوئی ایمان نہیں لاتا تو اسے دھمکی دینے اور خبردار کرنے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے ۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝۷ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۸ وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْئَا ۨ اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹ مِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْئًا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَاۗءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۰

"تباہی ہے ہر اس جھوٹے بداعمال شخص کے لیے جس کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں' اور وہ ان کو سنتا ہے' پھر پورے غرور کے ساتھ اپنے کفر پر اس طرح اڑا رہتا ہے کہ گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں ۔ ایسے شخص کو دردناک عذاب کا مژدہ سنا دو ۔ ہماری آیات میں سے کوئی بات جب اس کے علم میں آتی ہے تو وہ ان کا مذاق بنا لیتا ہے ۔ ایسے سب لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے ۔ ان کے پیچھے جہنم ہے جو کچھ بھی انہوں نے دنیا میں کمایا ہے اس میں سے کوئی چیز ان کے کسی کام نہ آئے گی' نہ ان کے وہ سرپرست ہی ان کے لیے کچھ کر سکیں گے جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے اپنا ولی بنا رکھا ہے ان کے لیے بڑا عذاب ہے"۔

جیسا کہ ہم نے اس سورت کے مقدمے میں بھی وضاحت کی کہ مکہ میں مشرکین نے جس طرح دعوت اسلامی کا استقبال کیا' اس کی تصویر کشی ان آیات میں کی گئی ہے ۔ انہوں نے اپنے باطل موقف پر اصرار کیا ۔ ایسی سچی دعوت کا ایک لفظ بھی سننے سے انکار کیا جو حق پر مبنی تھی اور جو اپنی ذات میں واضح تھی ۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب تھی ۔ انہوں نے اس حقیقت کے ماننے میں اس قدر ہٹ دھرمی سے کام لیا کہ یوں نظر آتا تھا کہ گویا یہ دعوت ان کے ہاں اذہان تک پہنچی ہی نہیں ہے بلکہ الٹا وہ اللہ کے معاملے میں گستاخ ہوگئے ۔ اور قرآن کی جو آیات ان تک پہنچی ان سے منہ موڑنے لگے قرآن کریم نے ان کے اس رویے کی نہایت شدید مذمت کی ہے ۔ اور سخت دھمکی دی ہے ان کے لیے سخت بربادی ہے اور ان کو شدید توہین آمیز اور دردناک عذاب سے دوچار ہونا ہوگا ۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ (۴۵ : ۷) "تباہی ہے ہر اس جھوٹے بداعمال شخص کے لیے" ۔ ویل' یعنی ہلاک ہے ۔ افاک' بہت بڑا جھوٹا جو جھوٹ باندھنے میں مہارت رکھتا ہو ۔ بہت زیادہ گناہ کاریاں اور بدکاریاں سمیٹنے والا ۔ یہ دھمکی ہر اس شخص کے لیے ہے جس میں یہ صفات موجود ہیں ۔ یہ اللہ قہار و جبار کی دھمکی ہے جو ہلاک کرنے اور برباد کرنے پر قدرت رکھتا ہے جس کی دھمکی اور ڈراوا اور تہدید بالکل سچی ہوتی ہے ۔ اس لیے اس فقرے میں جو دھمکی دی گئی' وہ بہت ہی خوفناک ہے ۔

ایسے افاک جھوٹے اور بداعمال اور بدکار کی صفت و علامت کیا ہے؟ یہ کہ وہ باطل پر اصرار کرتا ہے' سچائی کے مقابلے میں جھکنے کی بجائے اور اکڑتا ہے' اللہ کی نشانیوں کو تسلیم کرنے کی بجائے منہ موڑتا ہے اور شریفانہ رویہ اختیار نہیں کرتا بلکہ گستاخی کرتا ہے ۔

يَسْمَعُ آيَاتِ اللَّهِ تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا (۴۵ : ۸) "جس کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور وہ ان کو سنتا ہے پھر پورے غرور کے ساتھ اپنے کفر پر اڑا رہتا ہے کہ گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں" ۔ یہ نہایت ہی قابل نفرت تصویر ہے ۔ اگرچہ یہ مشرکین مکہ کے ایک گروہ کی تصویر ہے جو اس وقت ایسا تھا' مگر ہر نظام جاہلیت میں یہ تصویر اسی طرح دہرائی جاتی ہے ۔ آج بھی ہے اور کل بھی ہوگی ۔ اس زمین پر کتنے ہی ایسے لوگ ہیں اور نام نہاد مسلمانوں میں سے کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جن پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور وہ ان کو سنتے ہیں مگر اپنے موقف پر اڑ جاتے ہیں اور غرور میں منہ موڑ لیتے ہیں کیونکہ وہ ان کی خواہشات کے موافق اور ان کے مالوفات سے ہم آہنگ نہیں ہوتیں اور یہ آیات باطل پر تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں اور یہ اس شر کی تائید نہیں کرتیں جس پر وہ مصر ہوتے ہیں اور یہ آیات اس سمت پر نہ خود چلتی ہیں اور نہ لوگوں کو چلاتی ہیں جس سمت پر وہ جا رہے ہیں ۔

فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۴۵ : ۸) "ایسے شخص کو دردناک عذاب کا مژدہ سنا دو" ۔ خوشخبری تو کسی اچھے کام پر ہوتی ہے ۔ یہاں ان کے لیے بطور استہزاء خوشخبری کا لفظ استعمال ہوا ہے ۔ اگر کوئی ڈرانے والے اور متنبہ کرنے والے کی بات نہیں مانتا تو پھر اگر ہلاکت آتی ہے تو آنے دو' وہ خود ہلاکت طلب کرتا ہے ۔

وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰیٰتِنَا شَیْئًا اتَّخَذَھَا ھُزُوًا (۴۵ : ۹) "ہماری آیات میں سے جب کوئی چیز اس کے علم میں آتی ہے' تو وہ ان کا مذاق بنا لیتا ہے"۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہ اللہ کی آیات اور ان کا سرچشمہ ذات باری ہے۔ یہ رویہ اس کی جانب سے شدید جسارت ہے۔ یہ تصویر بھی جس طرح جاہلیت اولیٰ میں تھی اسی طرح آج بھی موجود ہے۔ اور بے شمار لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں' ان میں سے بھی ایسے لوگ ہیں جو آیات الٰہیہ کے ساتھ مذاق کرتے ہیں اور وہ ان آیات اور ان پر ایمان لانے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور ان لوگوں کو بھی جو عوام الناس کی زندگیوں کو ان آیات کے مطابق ڈھالتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ لَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ (۴۵ : ۹) "ان سب لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے"۔ اہانت ان کے لیے موزوں سزا ہے کیونکہ یہ بھی تو اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ آیات الٰہیہ ہیں۔

یہ قیامت کا توہین آمیز عذاب حاضر ہے' اگرچہ قیامت کا برپا ہونا قدرے بعد میں ہے۔

مِنْ وَّرَآئِھِمْ جَھَنَّمُ (۴۵ : ۱۰) "ان کے پیچھے جہنم ہے"۔ لفظ "ان کے پیچھے جہنم ہے" کا ایک خاص مقصد ہے یعنی یہ اسے دیکھ نہیں سکتے کہ انہوں نے قیامت کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اس سے ڈرتے اور بچتے اس لیے نہیں کہ یہ غافل ہیں اور اس لیے وہ اس کے اندر گرنے والے ہیں۔

وَلَا یُغْنِیْ عَنْھُمْ مَّا كَسَبُوْا شَیْئًا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ

(۴۵ : ۱۰) "جو کچھ انہوں نے دنیا میں کمایا ہے اس میں سے کوئی چیز ان کے کسی کام نہ آئے گی' نہ ان کے وہ سرپرست ہی ان کے لیے کچھ کر سکیں گے جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے اپنا ولی بنا رکھا ہے"۔ یعنی دنیا میں انہوں نے جو کام کیے یا جو ان کی ملکیت تھی' وہ انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکے گی۔ ان کے اعمال اگرچہ اچھے ہوں وہ تو اکارت جائیں گے ۔ کیونکہ ایمان کے بغیر عمل مقبول ہی نہیں۔ اور قیامت میں ان کی ملکیت زائل ہو جائے گی کوئی نہ ان کے پاس ہو گی اور نہ فائدہ دے گی۔ اور ان کے دوست اور یار یا معبود' جو اللہ کے سوا انہوں نے بنا رکھے تھے' وہ وہاں ان کے لیے نہ نقصان پہنچا سکیں گے اور نہ نفع ۔ نہ کسی کو سفارش کی اجازت ہو گی۔

وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (۴۵ : ۱۰) "ان کے لیے بڑا عذاب ہے"۔ یہ عذاب توہین آمیز بھی ہو گا جیسا کہ پہلے کہا گیا اور عظیم بھی ہو گا۔ توہین آمیز اس لیے کہ یہ آیات کا مذاق اڑاتے تھے' اور عظیم اس لیے کہ جرم بڑا ہے۔

یہ پیراگراف یہاں ختم ہوتا ہے جس میں آیات الٰہیہ کے ساتھ مذاق کرنے کی مذمت وارد ہے۔ ان کے مقابلے میں استکبار کرنے کا ذکر' ان آیات سے لوگوں کو روکنے کا ذکر ہے۔ خاتمہ پر ان آیات کی حقیقت بیان کی جاتی ہے اور ان کے منکرین کی سزا کا دوبارہ ذکر کر دیا جاتا ہے۔

ھٰذَا ھُدًى ۚ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَھُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِیْمٌ ﴿۱۱﴾ ۱۱ع

۱۷

"یہ قرآن سراسر ہدایت ہے' اور ان لوگوں کے لیے بلا کا دردناک عذاب ہے جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا"۔

اس قرآن کی حقیقت بس یہ ہے کہ یہ ایک رہنمائی ہے۔ خالص ہدایت 'صاف صاف ہدایت ۔ایسی ہدایت جس میں ضلالت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ اس لیے اس قسم کی آیات کا جو لوگ انکار کرتے ہیں' وہ اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ ان کو دردناک عذاب سے دوچار کر دیا جائے۔ الیم کے معنی میں شدت الم اور ایذا رسانی کے معنی ظاہر ہیں۔ رجز کے معنی ہیں عذاب شدید۔ اور جس عذاب کی انہیں دھمکی دی جارہی ہے' وہ الیم بھی ہے اور شدید بھی۔ یعنی اس کی شدت اور اس کا الم دونوں مکرر و مشدد ہیں۔ تاکید بعد تاکید ہے اور جو لوگ واضح خالص اور صریح ہدایت کا انکار کرتے ہیں ان کے لیے ایسا عذاب ہی ہونا چاہئے۔

--- OOO---

اس شدید دھمکی اور سخت ڈراوے کے بعد اب پھر ان کے دلوں کو باد نسیم کی طرح نرم بات سے راہ راست پر لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور وہ انعامات دوبارہ یاد دلائے جاتے ہیں جو اس کائنات میں ان کے لیے مسخر کر دیئے گئے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴿۱۲﴾ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ﴿۱۳﴾

"وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکر گزار ہو۔ اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا' سب کچھ اپنے پاس سے ---- اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں"۔

اللہ کی یہ چھوٹی سی مخلوق انسان پر اللہ کے بڑے کرم ہیں کہ اس نے اس کے لیے اس کائنات کی عظیم مخلوقات کو مسخر کر دیا ہے۔ اور ان مخلوقات سے یہ مختلف طریقوں سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ سمجھایا ہے کہ اس کائنات کا قانون فطرت کیا ہے؟ جس کے مطابق یہ کائنات چلتی ہے اور اس کے خلاف نہیں جا سکتی۔ اگر اللہ کی جانب سے انسان کو اس قدر علمی صلاحیت نہ دی گئی ہوتی تو اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ ان کائناتی قوتوں کو اس طرح مسخر کر کے ان سے اس طرح استفادہ کرتا بلکہ اس کے لیے ان قوتوں کے اندر زندہ رہنا بھی مشکل ہو جاتا کیونکہ انسان ایک چھوٹا سا کیڑا ہے اور فطرت کی قوتیں نہایت ہی عظیم القوت 'عظیم الجثہ اور بڑے بڑے افلاک ہیں۔

سمندر ان بڑی قوتوں میں سے ایک ہے جسے انسان نے مسخر کر لیا ہے۔ انسان کو اللہ نے اس کی ساخت اور خصوصیات کا علم دیا اور انسان نے معلوم کیا کہ کشتی اس عظیم اور سرکش سمندر کے اوپر چل سکتی ہے اور اس کی بپھری ہوئی جبار موجوں کے ساتھ ٹکرا سکتی ہے اور اسے ان سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

لِتَجۡرِیَ الۡفُلۡكُ فِیۡهِ بِاَمۡرِهٖ (۴۵: ۱۲) "تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں"۔ اللہ ہی ہے جس نے سمندر کو یہ خصوصیات دیں اور کشتی کے مواد کو تیرنے کی خصوصیات دیں۔ فضا کے دباؤ' ہواؤں کی تیزی اور زمین کی کشش کی خصوصیات پیدا کیں اور وہ دوسرے خصائص اس میں رکھے جن کی وجہ سے بحری سفر آسان ہوا اور انسان کو اس کام کا علم دیا کہ وہ سمندری مخلوق سے نفع اٹھائے اور دوسرے فوائد بھی حاصل کرے۔

وَلِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِهٖ (۴۵: ۱۲) "اور تم اس کا فضل تلاش کرو"۔ مثلاً سمندر میں شکار' زیب و زینت کا سامان' تجارت' معلوماتی سفر' تجربات' مشقیں' ورزش اور تفریح وغیرہ۔ غرض وہ سارے فوائد جو یہ چھوٹا سا انسان سمندروں سے حاصل کرتا ہے۔

غرض اللہ نے انسان کے لیے کشتی اور سمندر دونوں کو مسخر کیا کہ وہ اللہ کے فضل کی تلاش کرے۔ پھر اللہ کا شکر کرے کہ اللہ نے یہ فضل و کرم' یہ انعامات اور یہ تسخیر اور یہ علم اسے دیا۔

وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ (۴۵: ۱۲) "اور تم شکر گزار ہو"۔ اللہ تعالیٰ پھر اس قرآن کے ذریعہ انسان کو ہدایت کرتا ہے کہ اس ذات باری کی وفاداری کرو' اس سے تعلق قائم کرو' اور یہ بات معلوم کرو کہ تمہارے اور اس کائنات کے درمیان ایک تعلق ہے اور وہ یہ کہ تم اس کا حصہ ہو اور ایک ناموس فطرت کے تحت چل رہے ہو اور تم دونوں کا رخ اللہ ہی کی طرف ہے۔

سمندروں کی تسخیر کے خصوصی ذکر کے ساتھ یہ پوری کائنات بھی بالعموم تمہارے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ زمین اور آسمانوں کے درمیان پائے جانے والی تمام قوتیں' نعمتیں اور مفید چیزیں جو اس کے لیے فرائض منصب خلافت کی ادائیگی میں مفید و معاون ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مِّنۡهُ (۴۵: ۱۳) "اس نے زمین اور آسمان کی ساری ہی چیزیں تمہارے لیے مسخر کر دیں' سب کچھ اپنے پاس سے"۔ اس کائنات میں جتنی چیزیں بھی ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہیں اور اسی کی ہیں۔ وہی ان کا پیدا کرنے والا اور مدبر ہے۔ اس نے ان کو مسخر کر رکھا ہے۔ اور ان پر اس چھوٹی سی مخلوق کو مسلط کر دیا ہے۔ انسان جسے اللہ نے اس کائنات کے مزاج اور اس کے قوانین کو سمجھنے کی قوت دی اور وہ اپنی قوت اور طاقت سے کہیں بڑی قوتوں کو مسخر کرتا ہے۔ یہ سب کام اللہ کا فضل و کرم ہے۔ اس انسان پر اور جو لوگ تفکر اور تدبر سے کام لیتے ہیں ان کے لیے اس میں آیات و نشانات ہیں بشرطیکہ وہ اپنی اس عقل سے یہ فائدہ بھی اٹھائیں کہ اس کائنات اور اس انسان کا ایک پیدا کرنے والا بھی ہے جس نے اسے یہ سب کچھ دیا ہے اپنے کرم خاص سے :

اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَكَّرُوۡنَ (۴۵: ۱۳) "اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں"۔ یہ فکر اور یہ تدبر اس وقت تک صحیح' جامع اور گہرا نہ ہو سکے گا جب تک وہ ان قوتوں' مسخر شدہ قوتوں کے پیچھے اس بڑی قوت کی طرف جھانکنے کی کوشش نہ کرے گا' جس نے ان تمام قوتوں کو پیدا کیا

اور جس نے انسان کو پیدا کیا اور پھر انسان کو ان رازوں سے آگاہ کیا کہ ان کا راز یہ ہے اور ان کا قانون قدرت یہ ہے۔ اور فطرت کائنات اور فطرت انسان ایک ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان یہ تعلق ہے۔ اس تعلق کا یہ نتیجہ ہے کہ انسان کو علم حاصل ہوا' اسے قوت اور کنٹرول حاصل ہوا' اس نے ان قوتوں کو مسخر کر کے اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا۔ اگر یہ تعلق نہ ہوتا تو انسان کو ان چیزوں سے کچھ بھی حاصل نہ ہوتا۔

---ooo---

جب بات یہاں تک پہنچی ہے اور ایک مومن اس کائنات کے قلب تک جا پہنچتا ہے۔ اسے شعور حاصل ہو جاتا ہے کہ قوت کا حقیقی سرچشمہ کیا ہے' یہ کہ اس کائنات کے اسرار و رموز کی آگاہی دراصل قوت کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ اب مومنین کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ شرافت' اخلاق عالیہ' وسعت قلبی اور رواداری اختیار کریں اور جو ضعیف' ناتواں اور جاہل لوگ اس خزانے اور اس بھرپور خزانہ علم و معرفت سے محروم ہیں' ان پر رحم کریں' ان کے ساتھ ہمدردی کریں کہ یہ لوگ ان عظیم حقائق سے محروم ہیں۔ جو اللہ کے نوامیس فطرت کو نہیں دیکھتے' جو تاریخ میں سنن الٰہیہ کو تلاش نہیں کرتے جو اس کائنات کے اسرار و رموز سے واقف نہیں اور اس لیے وہ اس خالق کی عظمت سے بھی بے خبر ہیں۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۫ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۵﴾

"اے نبیؐ' ایمان لانے والوں سے کہہ دو کہ جو لوگ اللہ کی طرف سے برے دن آنے کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے' ان کی حرکتوں پر درگزر سے کام لیں تاکہ اللہ خود ایک گروہ کو اس کی کمائی کا بدلہ دے۔ جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے کرے گا' اور جو برائی کرے گا وہ آپ ہی اس کا خمیازہ بھگتے گا۔ پھر جانا تو سب کو اپنے رب ہی کی طرف ہے"۔

اہل ایمان کو ہدایت کی گئی ہے کہ جو لوگ اللہ کے عذاب سے نہیں ڈرتے' ان سے درگزر کرو اور ان کے ساتھ دشمنی کی بجائے ہمدردی کا رویہ اختیار کرو۔ اور شریفانہ اور اخلاق عالیہ کا رویہ اختیار کرو۔ درگزر کرو اور ان پر رحم کرو کہ وہ مساکین ہیں۔ وہ علم و ہدایت اور قوت اور رحمت کے اصل سرچشمے سے محروم ہیں۔ یہ ایمان ہی کا سرچشمہ ہے جو انسان کو غنی' قوی اور رحیم و کریم بنا دیتا ہے۔ انسان اسی پر بھروسہ کرتا ہے' مطمئن ہوتا ہے اور مشکل اوقات میں اس کے سامنے سربسجود ہوتا ہے اور اس کے سہارے آہ و فغاں کرتا ہے۔ پھر یہ لوگ ان قوانین فطرت اور سنن الٰہیہ سے بھی ناواقف ہیں جن کے نتیجے میں انسان کو ہر قسم کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ اہل ایمان چونکہ ایمان کے خزانے تک رسائی حاصل کر چکے ہیں اور اس کے ذریعہ ان کو مادی اور روحانی اطمینان حاصل ہے اور وہ ایک برتر پوزیشن میں ہیں اس لیے ان کے شایان شان یہ ہے کہ وہ عفو و درگزر سے کام لیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس درگزر کے نتیجے میں اہل ایمان کا رویہ یہ ہوگا کہ وہ تمام معاملات اللہ کے حوالے کر

دیں گے جو محسن کو اس کے احسان کی جزاء دے گا اور بدکار کو اس کی بدکاریوں پر سزا دے گا۔ عفو و درگزر کی بجائے اگر اہل ایمان ان بیچاروں کے ساتھ سختی کا رویہ اختیار کرتے ہیں تو وہ اس نیکی سے محروم ہو جائیں گے بشرطیکہ اس عفو و درگزر کی پالیسی کے نتیجے میں امن و امان کو خطرہ لاحق نہیں ہوتا' اور لوگ حدود اللہ پر دست درازی میں جری نہیں ہو جاتے ہوں۔

لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۴۵ : ۱۴) "تاکہ اللہ خود ایک گروہ کو اس کی کمائی کا بدلہ دے"۔ اور اس کے بعد یہ بھی تصریح کر دی جاتی ہے کہ جزاء و سزا میں ہر شخص اپنے کئے کا ذمہ دار ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو اللہ کے سامنے حاضری دینے کے وقت کی فکر کرنی چاہئے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ إِلَى رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ

(۴۵ : ۱۵) "جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے کرے گا اور جو برائی کرے گا وہ آپ ہی اس کا خمیازہ بھگتے گا۔ پھر جانا تو سب کو اپنے رب ہی کی طرف ہے"۔ یوں ایک مومن کا سینہ فراخ ہوتا ہے۔ اس کی سوچ بلند ہوتی ہے۔ وہ انفرادی مشکلات بھی برداشت کرتا ہے اور احمقوں کی حماقتیں بھی برداشت کرتا ہے اور اندھے اور محروم لوگوں کے طرز عمل کو بھی برداشت کرتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ کمزور ہوتا ہے اور اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دے سکتا۔ یہ برداشت وہ تنگ دلی سے نہیں بلکہ وسعت قلبی سے کرتا ہے۔ کیونکہ وہ مضبوط کردار اور کھلے دل کا مالک ہوتا ہے۔ اور اس نے ان محروم لوگوں کے لیے بھی ہدایت کی مشعل اٹھا رکھی ہوتی ہے۔ اس نے بیماروں کے لیے شفایابی کا تریاق اٹھا رکھا ہوتا ہے۔ اور وہ اس پر اجر کا طالب صرف اللہ سے ہوتا ہے اور آخرت میں ہوتا ہے۔ اور آخر کار تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور ہدایت اور رہنمائی کا سرچشمہ بھی اللہ ہی ہے۔ اور اس کی طرف لوٹنا ہے۔

--- ○○○ ---

اب انسانیت کے لیے مومن قیادت کے کردار کے موضوع پر بات ہوتی ہے۔ یہ قیادت اب اسلامی جماعت کی شکل میں وجود میں لائی گئی ہے۔ اس سے پہلے یہ بنی اسرائیل کے ہاتھ میں تھی۔ ان کو کتاب دی گئی۔ حکومت دی گئی' نبوت دی گئی مگر انہوں نے اختلافات شروع کر دیئے۔ اور ان سے یہ قیادت اور منصب لے کر اے محمدؐ اب آپ کو دے دیا گیا ہے۔ اس وقت آپ مکہ میں تھے۔ اور دعوت اسلامی نہایت ہی مشکل دور سے گزر رہی تھی لیکن آدم علیہ السلام سے ادھر اس کا مزاج' اس کی نوعیت اور مقاصد اور مہم ایک ہی رہی ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿١٦﴾ وَآتَيْنَاهُمْ بَيِّنَاتٍ مِنَ الْأَمْرِ ۖ فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١٧﴾ ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى

شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹﴾ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۲۰﴾

"اس سے پہلے بنی اسرائیل کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی تھی ۔ ان کو ہم نے عمدہ سامان زیست سے نوازا' دنیا بھر کے لوگوں پر انہیں فضیلت عطا کی' اور دین کے معاملہ میں انہیں واضح ہدایات دے دیں ۔ پھر جو اختلاف ان کے درمیان رونما ہوا' وہ (ناواقفیت کی وجہ سے نہیں بلکہ) علم آجانے کے بعد ہوا اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے ۔ اللہ قیامت کے روز ان معاملات کا فیصلہ فرما دے گا جن میں وہ اختلافات کرتے رہے ہیں ۔ اس کے بعد اب اے نبی ؐ' ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے ۔ لہٰذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے ۔ اللہ کے مقابلے میں وہ تمہارے کچھ بھی کام نہیں آ سکتے ۔ ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور متقیوں کا ساتھی اللہ ہے ۔ یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں 'سب لوگوں کے لیے اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے جو یقین لائیں"۔

اسلام سے قبل تحریک اسلامی کی قیادت بنی اسرائیل کے پاس تھی ۔ آسمانی ہدایت اور عقیدہ کے حامل یہی تھے ۔ اور اللہ نے اس دور کے لیے یہ مشن ان کے سپرد کر دیا تھا ۔ کیونکہ انسانیت کے لیے ہر دور میں آسمانی رہنمائی کی ضرورت رہی ہے ۔ اس لئے کہ زمین کے اندر جو بھی قائدین رہے ہیں وہ خواہشات نفسانیہ کے پیروکار' جاہل اور تقصیرات سے پر رہے ہیں اس لیے وہ انسانوں کے لیے جو قانون اور شریعت بناتے رہے ہیں ۔ وہ ایسی ہی پر تقصیر رہی ۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ انسانوں کو پیدا کیا ہے ۔ اس لیے اللہ کی شریعت ہی ایسی ہو سکتی ہے جو جہل' ذاتی خواہشات اور تقصیرات سے پاک ہو سکتی ہے ۔ اس لئے کہ سب لوگ اللہ کے بندے ہیں ۔ اللہ کسی کا حامی اور کسی کا مخالف نہیں ہے ۔ اور اللہ جہل قصور اور خواہشات سے پاک ہے ۔ وہ زیادہ جانتا ہے اور لطیف و خبیر ہے ۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ (۴۵ : ۱۶) "اس سے پہلے بنی اسرائیل کو ہم نے کتاب' حکم اور نبوت عطا کی تھی"۔ تورات ان کو دی گئی جس میں اللہ کی شریعت تھی ۔ اور اس میں یہ احکام تھے کہ شریعت کو قائم کرو اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی نبوت اور حکومت ان میں جاری رہی کہ شریعت کو قائم کرو اور ان کے اندر دوسری اقوام کے مقابلے میں بے شمار نبی بھیجے گئے ۔

وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ (۴۵ : ۱۶) "ان کو ہم نے عمدہ سامان زیست سے نوازا"۔ ان کی حکومتیں اور ان کی نبوتیں ارض مقدس تک محدود رہیں ۔ یہ سرزمین فرات اور نیل کے درمیان ایک پاک سرزمین تھی ۔

وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۴۵ : ۱۶) "اور دنیا بھر کے لوگوں پر ان کو ہم نے فضیلت عطا کی"۔ اس مرکزی مقام پر ربانی ہدایت کے حامل ہونے کے ناطے اس وقت یہ تمام عالم پر برتر قوم تھے اور ان کی افضیلت کی بڑی دلیل یہ تھی کہ وہ حاملین شریعت تھے اور ان کو حکومت اور نبوت دی گئی تھی۔

وَ اٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ (۴۵ : ۱۷) "اور دین کے معاملے میں انہیں واضح ہدایات دے دیں"۔ جو شریعت انہیں دی گئی وہ دو ٹوک اور حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والی تھی۔ اس میں کوئی بات ناقابل فہم، پیچیدہ، ٹیڑھی اور صحیح راہ سے منحرف نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے اس شریعت کے اندر جو اختلافات کیے اور فرقے بنے اس کا کوئی جواز نہ تھا۔ انہوں نے جو تفرقہ کیا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ شریعت اور دین سمجھے نہ تھے یا یہ کہ وہ جاہل تھے اور انہیں صحیح بات اور حق معلوم نہ تھا۔

فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ (۴۵ : ۱۷) "پھر جو اختلافات ان کے درمیان واقع ہوئے وہ جانتے ہوئے کیے گئے۔ ان کے درمیان حد درجہ حسد اور بغض پیدا ہو گیا تھا۔ اور باہم نزاع اور ایک دوسرے پر مظالم ڈھاتے ہوئے یہ اختلافات کیے گئے، باوجود اس بات کے کہ وہ صحیح بات جانتے تھے"۔

بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ (۴۵ : ۱۷) "اس بنا پر ہوا کہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے"۔ یوں زمین پر ان کی قیادت ختم ہو گئی اور اللہ نے ان کو جو خلافت ارضی عطا کی تھی ان سے چھین لی گئی اور اختلافات کا آخری فیصلہ تو اللہ کرے گا۔

اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۴۵ : ۱۷) "اللہ قیامت کے روز ان معاملات کا فیصلہ فرمائے گا جن میں وہ اختلافات کرتے رہے ہیں"۔

اس کے بعد اللہ نے رسالت جدیدہ کو خلافت ارضی کا مقام عطا فرمایا، جو قوم کو اللہ کی شریعت کی طرف لوٹائے گی اور تمام معاملات میں اللہ کی قیادت اور برتری قائم کرے گی۔ اور دنیا میں اللہ کی شریعت کے مطابق نظام قائم کرے گی، بندوں کی خواہشات کے مطابق نہیں۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

(۴۵ : ۱۸) "اس کے بعد اب اے نبی، ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ پر قائم کیا لہٰذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو، جو علم نہیں رکھتے"۔ یوں یہ معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے یا تو اللہ کی شریعت ہو گی یا ان لوگوں کی خواہشات ہوں گی جو نہیں جانتے۔ تیسری کوئی صورت نہیں ہے۔ یا تو سیدھی اور مستقیم شریعت اور شاہراہ ہے اور یا پھر لوگوں کی بدلتی ہوئی خواہشات ہیں۔ اور ان کے درمیان تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ جو قوم شریعت کو چھوڑتی ہے، وہ اپنی خواہشات کی پوجا کرتی ہے کیونکہ شریعت کے سوا جو بھی ہے وہ ان لوگوں کی ہوا و ہوس ہے

جو نہیں مانتے ۔

اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات سے ڈراتا ہے کہ آپ ان لوگوں کی خواہشات کی اطاعت نہ کریں جو نہیں جانتے ۔ اگر آپ نے یہ کام کیا تو یہ لوگ اللہ کے مقابلے میں آپ کو کوئی فائدہ نہ دے سکیں گے ۔ یہ لوگ تو ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کرتے ہیں ۔ اگر اللہ کے دین اور شریعت کو نہ ماننے والے یہ لوگ ایک دوسرے کے جگری دوست بھی بن جائیں اور ایکا بھی کرلیں تو بھی یہ آپ کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے ۔ کیونکہ اے پیغمبر آپ کے مولیٰ تو اللہ ہے ۔

اِنَّهُمْ لَنْ یُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا وَ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَ اللّٰهُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ (۴۵ : ۱۹) "اس کے بعد اے نبی ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے ۔ لہٰذا تم اس پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے ۔ اللہ کے مقابلے میں وہ تمہارے کچھ بھی کام نہیں آسکتے ۔ ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور متقیوں کا ساتھی اللہ ہے"۔

یعنی ایک طرف شریعت ہے جو علم و حکمت پر مبنی ہے اور دوسری جانب خواہشات نفسانیہ ہیں جو جہالت پر مبنی ہیں اور جاہلیت ہیں ۔ ایک داعی کو چاہئے کہ وہ شریعت کا اتباع کرے اور ساری ذاتی خواہشات کو چھوڑ دے ۔ داعی کا فرض ہے کہ وہ شریعت سے ادھر ادھر نہ ہو کیونکہ ذاتی خواہشات رکھنے والے لوگ اللہ کے مقابلے میں کوئی مدد نہیں دے سکتے ۔ وہ تو داعی کے مخالف ہوتے ہیں اور سب مل کر مخالفت کرتے ہیں اور وہ شریعت کی مخالفت میں ایک دوسرے کے ممد و معاون ہوتے ہیں ' لہٰذا داعی کو ظالموں اور جاہلوں سے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہئے ۔ پھر یہ کہ یہ ظالم کسی داعی کی مدد بھی نہیں کرسکتے کیونکہ یہ تو ان کی خواہشات کے خلاف ہے لیکن وہ اس قدر کمزور ہوتے ہیں کہ وہ سچے داعی کو نقصان بھی نہیں پہنچا سکتے ۔ کیونکہ داعی کا والی وارث اللہ ہوتا ہے اور جس کا والی وارث اللہ ہو ' اس کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا ۔ لو انسان ضعیف کمزور ہوتے ہیں ' جن کی کوئی قوت نہیں ہوتی جبکہ اللہ کے دوست مسلمان ہوتے ہیں اور وہ قوی ہوتے ہیں ۔

اس فیصلہ کن بیان پر مزید تبصرہ یہ ہے کہ قرآن دو ٹوک اور فیصلہ کن باتیں کرتا ہے اور قرآن کی ان دو ٹوک باتوں سے یقین نصیب ہوتا ہے جو انسان کو بصیرت اور ہدایت دیتا ہے ۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَ هُدًی وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (۴۵ : ۲۰) "یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں سب لوگوں کے لئے اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے جو یقین لائیں"۔ قرآن کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ یہ لوگوں کے لیے بصیرت ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کے اندر گہری بصیرت ہے اور روشنی ہے ۔ قرآن بذات خود بصیرت اور روشنی ہے جس طرح بصیرت اور روشنی انسانوں کے لیے دیکھنے اور سمجھنے کا ذریعہ ہوتے ہیں تو قرآن بذات خود بصیرت و ہدایت ہے اور یہ بذات خود رحمت ہے ' لیکن قرآن کے اندر یہ صفات تب نظر آئیں گی اور اس سے یہ فوائد تب حاصل ہوں گے جب کسی کے اندر ذوق یقین پیدا ہو ۔ انسان کے اندر اس قدر یقین ہو جائے جس کے اندر شک کا شبہ ہی نہ ہو ۔ اس کے اندر کوئی بے چینی نہ ہو ' اور دل میں کوئی خلش نہ ہو ۔ جب قلب کو یقین حاصل ہو جائے اور اسے پورا وثوق حاصل ہو جائے تو اس کے اندر پھر کوئی تزلزل نہیں ہوتا ۔ وہ پھر شف شف نہیں کرتا ۔ ادھر ادھر نہیں ڈولتا ' اس

کی راہ پھر واضح ہو جاتی ہے۔ اسے اپنی منزل دور افق پر بلند نظر آتی ہے۔ اس کا مقصد متعین ہو جاتا ہے۔ طریق کار متعین اور استوار ہو جاتا ہے۔ اب پھر قرآن اس کے لیے نور بصیرت بن جاتا ہے' ہدایت بن جاتا ہے اور رحمت بن جاتا ہے بشرطیکہ یقین محکم ہو۔

اس بیان کے بعد کہ ظالم ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اللہ متقین کے ولی ہیں۔ اور یہ کہ قرآن مجید متقین کے لیے نور بصیرت ہے اور یقین کرنے والوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جو لوگ برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور جو لوگ نیک کام کرتے ہیں' یعنی مومن ان کے درمیان بنیادی فرق ہے اور اللہ کے ہاں دونوں کا ایک مقام نہیں ہو سکتا۔ نہ دونوں کا ایک جیسا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ اللہ کے ترازو میں دونوں کے درمیان فرق ہے۔ اللہ نے آسمانوں اور زمین کے اس نظام کو حق اور عدل پر قائم کر رکھا ہے۔ اور اس کائنات کے نقشے میں سچائی بنیادی اور اساسی عنصر ہے۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ ۲
كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (۲۱) ۱۰ع
وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ ۱۸
لَا يُظْلَمُونَ (۲۲)

"کیا وہ لوگ جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے کہ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے؟ بہت برے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں۔ اللہ نے تو آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ ہر متنفس کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے' لوگوں پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا"۔

ہو سکتا ہے کہ یہاں بدکاروں سے مراد اہل کتاب ہوں جنہوں نے اپنی کتاب سے روگردانی کی اور برائیوں کا ارتکاب کیا۔ اور سمجھتے یہی رہے کہ وہ حقیقی مومن ہیں بلکہ وہ اپنے آپ کو اہل ایمان کے برابر سمجھتے ہیں جبکہ وہ برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور مومنین نیکیوں کے کام کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ دونوں گروہ اللہ کے ہاں برابر ہو سکتے ہیں' خواہ اس دنیا کا معاملہ ہو یا آخرت کا موازنہ ہو؟ اور اس سے مراد عام اصول بیان کرنا بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کے پیمانوں کے مطابق نیک کام کرنے والے برے کام کرنے والے آپس میں برابر نہیں ہو سکتے' نہ اس دنیا میں نہ آخرت کے حساب و کتاب میں۔ مومنین کا پلڑا یہاں بھی بھاری ہو گا اور آخرت میں بھی بھاری ہو گا۔ اور یہ اصول اللہ کی اس کائنات کے نقشے میں ریڑھ کی ہڈی کا مقام رکھتا ہے۔ اس پوری کائنات کی تخلیق حق پر ہوتی ہے۔ شریعت کی تشکیل بھی حق پر ہوتی ہے۔ جس چیز کے ساتھ یہ کائنات قائم ہے' وہ توازن اور اعتدال ہے اور اسی اصول پر انسانی زندگی بھی قائم ہے یعنی عدل و انصاف جس کا اظہار اچھے کام کرنے والوں اور برے کام کرنے والوں کے درمیان فرق کر کے کیا گیا۔ اور ہر شخص کو اس کے کیے کی جزا و سزا دی گئی اگر وہ نیک ہو یا گمراہ ہوا۔ تاکہ تمام لوگوں کے ساتھ انصاف کیا جا سکے۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۴۵ : ۲۲) "اور لوگوں پر ہرگز ظلم نہ کیا جائے گا"۔ یہ مفہوم کہ اس کائنات کی تخلیق کے اصل نقشے میں حق بنیادی چیز ہے۔ اور یہ کہ جس طرح کائنات کے اندر حق ہے' اسی طرح شریعت کے اندر حق ہے اور یہ کہ یوم الحساب میں اسی حق پر حساب و کتاب ہو گا۔ یہ مفہوم اور مضمون قرآن میں باربار آتا ہے کیونکہ یہ اسلامی تصور حیات کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ تمام شاخیں اس اصول پر مبنی ہیں۔ انسانی نفس ' آفاق کائنات اور اسلامی شریعت سب اس سچائی پر مبنی ہیں۔ یہی ہے "کائنات ' حیات اور انسان اور انسان اسلام کی نظر میں" میری الگ کتاب کا موضوع۔ یہ ان شاء اللہ جلد پیش ہو گی۔

--- ○○○---

اب اس عظیم اصول کے بالمقابل اور شریعت کے بالمقابل لوگوں کی خواہشات ہوتی ہیں جو بدلتی رہتی ہیں۔ ان خواہشات کو لوگ اپنا الٰہ بنا لیتے ہیں' ایسے لوگ گمراہی میں اس قدر دور چلے جاتے ہیں کہ ان کی ہدایت کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۲۳

"پھر کیا تم نے کبھی اس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟ اللہ کے بعد اب اور کون ہے جو اسے ہدایت دے؟ کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے؟"

انسان جب اسلام کا عظیم اصول اتباع شریعت ترک کر دیتا ہے تو پھر اس کی جو حالت ہوتی ہے قرآن کریم اس کی خوب تصویر کشی کرتا ہے۔ یہ شخص اپنی بدلتی ہوئی خواہشات کے تابع ہے۔ یہ اپنی خواہشات کے سامنے سجدہ ریز ہے اور ان کا مطیع فرمان ہے۔ اس کے تصورات ' اس کے احکام ' اس کی سوچ اور اس کی حرکات ' اس کی خواہشات کے زاویہ سے ہوتی ہیں۔ یہ ان کو اس طرح پوجتا ہے جس طرح کوئی کسی بت کو پوجتا ہے۔ یہ خواہشات کے اشارات کے پیچھے دوڑتا ہے۔ قرآن ایسے لوگوں کی یہ تصویر کشی بڑی ناپسندیدگی سے کرتا ہے۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (۴۵ : ۲۳) "پھر کیا تم نے کبھی اس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا"۔ کیا تم نے ایسے شخص کو دیکھا ہے؟ یہ شخص ایک ایسی عجیب مخلوق ہے جو تماشا کے قابل ہے کہ اس کا تماشا دیکھا جائے۔ یہ شخص اللہ کے سامنے اپنے آپ کو ضلالت کا مستحق ثابت کر دیتا ہے۔ اب اللہ ایسے شخص پر ہدایت کی رحمت نازل ہی نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کے دل میں ہدایت کی جگہ ہی باقی نہیں رہی ہے اس لئے کہ وہ

اپنی خواہش کو ہر وقت پوجتا رہتا ہے۔

وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (۴۵ : ۲۳) "اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا ہے"۔ اس کے دو معنی ہیں :ایک یہ کہ اللہ نے علم کے مطابق جانتے ہوئے اسے ضلالت میں پھینک دیا۔ اس لیے کہ یہ ضلالت کا مستحق ہو گیا تھا۔ یا یہ کہ وہ اپنے طور پر عالم ہونے کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا گیا۔ اور اس کے علم و معرفت نے اس کو اس بات سے نہ روکا کہ وہ اپنی خواہشات کو الٰہ بنائے۔ یوں پھر اللہ نے اسے بھی ڈھیل دے دی اور گمراہی میں پھینک دیا۔

وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (۴۵ : ۲۳) "اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا"۔ لہذا وہ تمام روشن دان بند ہو گئے جن سے روشنی اندر آتی تھی اور وہ مدرکات بے کار ہو گئے جن کے ذریعہ سے ہدایت کسی شخص کے دل و دماغ میں داخل ہو سکتی تھی۔ اور انسان نے خواہشات نفسانیہ کو اس طرح قبول کرنا شروع کر دیا کہ حصول ہدایت کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔

فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ (۴۵ : ۲۳) "اللہ کے بعد اب اور کون ہے جو اسے ہدایت دے"۔ ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے۔ اللہ کے سوا اور تو کوئی کسی کی ہدایت اور ضلالت کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ یہ تو اللہ کا خصوصی اختیار ہے اس میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اللہ کے مختار رسولوں کو بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی کو ہدایت دے دیں۔

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۴۵ : ۲۳) "کیا تم لوگ سبق نہیں لیتے"۔ جس نے سبق لیا وہ ہوشمند رہا اور متنبہ ہو گیا۔ اور وہ ہوائے نفس کے پھندے سے آزاد ہو گیا اور ایک واضح اور مستقل منہاج پر گامزن ہو گیا جس پر چلنے والے کبھی گمراہ نہیں ہوتے۔

---ooo---

# درس نمبر۲۳۶ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا آخری پیراگراف ہے ۔اس میں آخرت کے حساب و کتاب اور حشر و نشر کے بارے میں مشرکین کے عقائد و خیالات کا جائزہ لیا گیا ہے ۔اس پر تردید کے لیے خود ان کے وجود کو پیش کیا گیا ہے کہ آخر تم موجود ہو اور کوئی تمہیں اٹھائے ہوئے ہے ۔اس سے تو تم انکار نہیں کر سکتے ہو۔اس کے بعد قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر پیش کیا جاتا ہے کہ قیام قیامت کا وقت تو اگرچہ معلوم نہیں ہے لیکن وہاں تمہارے ساتھ یہ کچھ ہونے والا ہے اور یہ منظر نہایت ہی موثر کلمات میں پیش کیا جاتا ہے ۔

سورت کا خاتمہ الحمدللہ پر ہوتا ہے کہ اللہ واحد ہے' وہ رب ہے ' تمام جہان والوں کا رب ہے ۔اس کی عظمت اور اس کی کبریائی بہت ہی بڑی ہے اور تمام آسمانوں اور زمینوں میں وہ منفرد ہے ۔کوئی اس کے مقابل کھڑا نہیں ہو سکتا۔ کوئی اس کی بادشاہت میں دست درازی نہیں کر سکتا اور وہ عزیز و حکیم ہے ۔

---○○○---

# درس نمبر ۲۳۶ تشریح آیات

## ۲۴ --- تا --- ۳۷

وَ قَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

۳ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَ

ع ۵ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

۱۹

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ "زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے 'یہیں ہمارا مرنا اور جینا ہے اور گردش ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو" ۔ درحقیقت اس معاملہ میں ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے ۔ یہ محض گمان کی بنا پر یہ باتیں کرتے ہیں اور جب ہماری واضح آیات انہیں سنائی جاتی ہیں تو ان کے پاس کوئی حجت اس کے سوا نہیں ہوتی کہ اٹھا لاؤ ہمارے باپ داداکو اگر تم سچے ہو ۔ اے نبی" ان سے کہو اللہ ہی تمہیں زندگی بخشتا ہے 'پھر وہی تمہیں موت دیتا ہے 'پھر وہی تم کو اس قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں 'مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں" ۔

قیامت کے بارے میں ان کا نظریہ اس قدر کوتاہ بینی پر مبنی تھا کہ ان کے نزدیک زندگی بس یہی تھی جسے وہ اس زمین پر گزرتی دیکھ سکتے تھے ۔ ایک نسل ہے جو پیدا ہوتی ہے اور گزرتی چلی جاتی ہے ۔ بظاہر موت کوئی چیز نہیں ہے سوائے اس کے کہ وقت گزرتا ہے اور ہم مرتے ہیں اور زمانہ لپیٹتا چلا جاتا ہے ۔ گویا یہ زمانہ ہے جو تمام فیصلے کرتا ہے اور ان پر موت طاری کرتا ہے اور وہ مرجاتے ہیں ۔

یہ ایک سطحی نظریہ تھا ۔ صرف ظاہری حالات کو دیکھ کر اسے اختیار کیا گیا تھا' زندگی کے پیچھے جو اسرار ورموز تھے ان کو تلاش کرنے کی اس میں کوشش ہی نہیں کی گئی تھی ۔ سوال یہ تھا کہ زندگی کہاں سے آگئی؟ اور کون ہے جو زندگی واپس لے لیتا ہے ۔ موت کچھ متعین دنوں کے بعد تو نہیں آجاتی کہ انہوں نے زمانے کے ساتھ موت کو وابستہ کر دیا ۔ بچے بھی بوڑھوں کی طرح مرتے ہیں اور صحت مند لوگ بھی تو مرتے ہیں ۔ جس طرح بیمار لوگ مرتے ہیں ۔ ضعیف لوگوں کی

طرح بنے کئے بھی مرتے ہیں۔ لہٰذا اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو زمانے کا تعلق موت و حیات سے نہیں ہے۔ بشرطیکہ کوئی موت کی حقیقت کو جاننا چاہے۔ چنانچہ کہا گیا:

وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۴۵:۲۴) "درحقیقت اس معاملے میں ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ یہ محض گمان کی بنا پر باتیں کرتے ہیں"۔ یہ محض ظن و تخمین کے پائے چوبین پر چل رہے ہیں۔ ان کے خیالات بجھے ہوئے ہیں اور ان کے نقوش دھندلے ہیں۔ گہرے غور و فکر پر مبنی نہیں ہیں' نہ کسی علم پر مبنی ہیں۔ اس، کائنات کے حقائق کا ادراک ان کو نہیں۔ موت و حیات کے جو حالات انسان پر طاری ہوتے ہیں' یہ ان کے صرف سطحی اسباب دیکھتے ہیں۔ حقیقی اسباب نظروں سے اوجھل ہیں۔ انہوں نے صرف اس قدر معلوم کیا ہے کہ زیادہ دن گزرنے کے بعد انسان کمزور ہوتا ہے اور مرجاتا ہے۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۴۵:۲۵) "اور جب ہماری واضح آیات انہیں سنائی جاتی ہیں تو ان کے پاس کوئی حجت اس کے سوا نہیں ہوتی کہ اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو"۔ ان کی یہ بات بھی نہایت سطحی سوچ پر مبنی ہے اور اس سے پہلے انہوں نے اس کائنات کے قوانین فطرت کا مطالعہ نہیں کیا۔ اس دنیا میں اللہ نے حیات و ممات کے لیے جو نظام تحریر کیا ہے اور ان کے جو اسرار و رموز مقررہ کیے ہیں' ان پر انہوں نے گہرے انداز میں نہیں سوچا۔ اس کے اندر گہری حکمت کارفرما ہے۔ لوگ اس جہاں میں آتے ہیں اور آتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ کے نظام میں ان کو یہاں فرصت عمل مہیا کی جا رہی ہے۔ مرنے کے بعد ان کو ایک مقرر وقت پر دوبارہ اٹھایا جائے گا اور یہاں انہوں نے جو کچھ کیا' اس پر ان کو حساب و کتاب دینا ہو گا۔ لہٰذا حشر و نشر ت پہلے اللہ کے نظام کے مطابق انہیں یہاں نہیں اٹھایا جا سکتا۔ قیامت کے مقررہ دن سے پہلے یہاں ان کا اٹھانا حکمت آزمائش کے خلاف ہے۔ بعض لوگ یہ تجویز کرتے ہیں کہ ہر پرچہ قبل از وقت آؤٹ کر دیا جائے۔ لیکن اللہ کا اپنا کام اور نظام ہے اور اس کی اپنی حکمت اور اسکیم ہے۔ جس کے اوپر یہ پوری کائنات قائم ہے۔ لہٰذا اس احمقانہ تجویز کے مطابق اللہ کی پوری اسکیم کو نہیں بدلا جا سکتا۔ یہ قرآنی استدلال کا کوئی معقول جواب دینے کی بجائے بس یہ کہتے ہیں:

ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۴۵:۲۵) "کہ اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو"۔ سوال یہ ہے کہ اللہ وقت مقررہ سے پہلے ان کے باپ دادا کو کیوں اٹھا لائے۔ اس میعاد سے قبل جو اس نے اس پوری کائنات کے لیے مقرر کر رکھی ہے؟ محض اس لیے کہ ان کو یہ یقین آجائے کہ اللہ مردوں کو دوبارہ اٹھا سکتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ کیا اللہ اپنی سنت کے مطابق ان کی آنکھوں کے سامنے ہر لمحہ اور ہر لحظہ زندگی کو اٹھا نہیں رہا ہے۔

قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ (۴۵:۲۶)

"ان سے کہو کہ اللہ تمہیں زندگی بخشتا ہے۔ پھر وہی تمہیں موت دیتا ہے۔ پھر وہی تم کو اس قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے"۔ یہی تو وہ معجزہ ہے جسے وہ اپنے آباؤ اجداد کے لے آنے میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ ان کی آنکھوں کے سامنے واقع نہیں ہو رہا ہے۔ بعینہ وہی معجزہ۔ اللہ ہی تو ہے جو انسان کو پیدا کیے جا رہا ہے۔ وہی تو ہے جو مارتا ہے۔ آخر میں اس میں کیا انوکھی بات ہے کہ اللہ قیامت کے دن دوبارہ جمع کرے گا۔ اس میں آخر کیوں وہ شک میں گرفتار ہو رہے ہیں۔ جس چیز سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے۔ اس کی نظیر خود ان کی زندگی ہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۵:۲۶) "مگر اکثر لوگ جانتے نہیں"۔ اللہ زمین و آسمان کی ہر چیز کو کنٹرول کرنے والا ہے۔ وہ ہر چیز کو بنانے والا ہے۔ وہ دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے، اگر اس نے پہلے پیدا کیا ہے اور تم مانتے ہو کہ کیا ہے

لیکن اللہ ان کے سامنے منطقی دلائل کی بجائے ایک منظر پیش فرماتا ہے:

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿٢٧﴾ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٨﴾

"زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے، اور جس روز قیامت کی گھڑی آ کھڑی ہو گی اس دن باطل پرست خسارے میں پڑ جائیں گے۔ اس وقت تم ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا دیکھو گے۔ ہر گروہ کو پکارا جائے گا کہ آئے اور اپنا نامہ اعمال دیکھے۔ ان سے کہا جائے گا: "آج تم لوگوں کو ان اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے رہے تھے"۔

آیت میں پہلے تو ان کے انجام کا فیصلہ جلدی سے بتا دیا گیا کہ اس دن یہ لوگ عظیم خسارے سے دوچار ہوں گے لیکن فیصلہ سننے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عظیم اور وسیع و عریض میدان ہے۔ اس میدان میں اولین اور آخرین تمام امتیں جمع ہیں۔ جو شخص کبھی اس کرۂ ارض پر زندہ رہا ہے۔ تھوڑی عمر ملی ہو یا زیادہ، یہ سب موجود ہیں۔ مجرمین گھٹنوں کے بل گرے ہیں۔ گروہ در گروہ جمع ہیں۔ اور حساب کی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ منظر بہت ہی خوفناک ہے کہ تمام انسان اگلے اور پچھلے ایک ہی میدان میں جمع ہوں گے۔ پھر یہ خوفناک اس لیے بھی ہو گا کہ لوگوں کی ہیئت کذائی خوفناک ہو گی کہ سب گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہوں گے۔ پھر یہ خوفناک اس لیے بھی ہو گا کہ سخت حساب و کتاب ہونے والا ہو گا۔ اور پھر یہ اس لیے بھی خوفناک ہو گا کہ اللہ جبار و قہار کا دربار ہو گا۔ جو حقیقی منعم اور فضل و کرم کرنے والا ہے۔ جس کے فضل و کرم کا شکر ادا نہیں کیا گیا اور نہ اس کے فضل و کرم کو لوگوں نے پہچانا ہے۔

اس کے بعد اس بدحال گروہ مجرمین سے کہا جائے گا جن کا منہ خشک ہو گا اور سانس　　ہی ہو گی:

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٩﴾

"یہ ہمارا تیار کرایا ہوا اعمال نامہ ہے جو تمہارے اوپر ٹھیک ٹھیک شہادت دے رہا ہے ' جو کچھ بھی تم کرتے تھے اسے ہم لکھواتے جا رہے تھے "۔

اب ان کو معلوم ہو گا کہ اس اعمال نامے سے کوئی چھوٹی بڑی شے رہ نہیں گئی ۔ اس لیے کہ ہر چیز اللہ کے علم کے مطابق لکھی گئی ہے جس سے کوئی چیز غائب نہیں ہو سکتی ۔

اس کے بعد ان اقوام و ملل کی تقسیم ہو گی ' مختلف رنگ و نسل کے لوگوں کو صرف دو حصوں میں بانٹ دیا جائے گا ۔ تمام اقوام و ملل کے لوگ اب دو طبقے ہوں گے ۔ ایک گروہ اور طبقہ اہل ایمان کا ہو گا اور ایک اہل کفر کا ہو گا ۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک صرف دو پارٹیاں ہیں اور دو جھنڈے ہیں ۔ حزب اللہ اور حزب الشیطان ۔ اس کے علاوہ تمام ملتیں ' تمام فرقے اور مذاہب ختم ہوں گے ۔ تمام آبادی دو گروہ ہو جائے گی ۔

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِي رَحْمَتِهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ﴿٣٠﴾

"پھر جو لوگ ایمان لائے تھے اور نیک عمل کرتے رہے تھے ' انہیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا اور یہی صریح کامیابی ہے "۔

اب یہ گروہ اس طویل انتظار سے نجات پائے گا ۔ قلق اور اضطراب دور ہو گا ۔ آیت میں ان کے انجام کو جلدی سے نہایت سادہ انداز میں بیان کر دیا ۔ اور یہ لوگ گئے اپنے اصل مقام کی طرف ۔

لیکن ہماری نظریں اچانک کیا دیکھتی ہیں کہ ایک دوسرا گروہ ہمارے سامنے ہے اور ان کو طویل الفاظ میں سرزنش کی جاتی ہے ۔ ان کو شرمندہ کیا جاتا ہے اور ان کے برے اعمال و افعال ان کو یاد دلائے جاتے ہیں ۔

وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا أَفَلَمْ تَكُنْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُجْرِمِينَ ﴿٣١﴾ وَإِذَا قِيلَ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيهَا قُلْتُمْ مَا نَدْرِي مَا السَّاعَةُ إِنْ نَظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ ﴿٣٢﴾

"اور جن لوگوں نے کفر کیا ( ان سے کہا جائے گا ) "کیا میری آیات تم کو نہیں سنائی جاتی تھیں ؟ مگر تم نے تکبر کیا اور مجرم بن کر رہے اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہوتی ہے ' ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں ' یقین ہم کو نہیں ہے "۔

اب ذرا دیکھو ' کیا حال ہے ؟ اور تمہیں کس قدر یقین آ رہا ہے ۔ قدرے وقفے کے بعد اب ان کی ذہنی دنیا کے حالات کہ اب ان پر چودہ طبق روشن ہیں :

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٣٣﴾

"اس وقت ان پر ان کے اعمال کی برائیاں کھل جائیں گی اور وہ اسی چیز کے پھیر میں آ جائیں گے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے"۔

اس کے بعد دوبارہ ان کو شرمندہ کیا جاتا ہے اور یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اب ان کو پوچھنے والا کوئی بھی نہ ہو گا اور ان کا بہت ہی دردناک انجام ہو گا۔

وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٣٤﴾ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ

"اور ان سے کہہ دیا جائے گا کہ "آج ہم بھی اسی طرح تمہیں بھلائے دیتے ہیں جس طرح تم اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے۔ تمہارا ٹھکانا اب دوزخ ہے اور کوئی تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ یہ تمہارا انجام اس لیے ہوا ہے کہ تم نے اللہ کی آیات کا مذاق بنا لیا تھا اور تمہیں دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا تھا"۔

اب ان کے آخری انجام کے اعلان پر پردہ گرتا ہے، جہنم میں ان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے، نہ ان سے کوئی عذر طلب کیا جاتا ہے اور نہ معافی کی درخواستیں طلب کی جاتی ہیں۔

فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿٣٥﴾

"لہٰذا آج نہ یہ لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے کہا جائے گا کہ معافی مانگ کر اپنے رب کو راضی کرو"۔ گویا ان الفاظ کے ساتھ ہی ہم کرخت آوازیں سنتے ہیں اور جہنم کے دروازے ان پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیے جاتے ہیں۔ اب یہ منظر یہاں ختم ہوتا ہے اور اس حالت میں کوئی تغیر اور تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

اس مقام پر اللہ کی حمد و ثنا کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ اس تمہید اور منظر کے بعد سورت کے آخری کلمات نہایت ہی موثر ہیں۔

۴ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٦﴾ وَلَهُ الْكِبْرِيَاۗءُ
اا ع فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۠ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٣٧﴾

۲۰ "پس تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو زمین اور آسمانوں کا مالک اور سارے جہان والوں کا پروردگار ہے۔ زمین اور

آسمانوں میں بڑائی اسی کے لیے ہے اور وہی زبردست اور دانا ہے"۔

اللہ کی بڑائی اور اللہ کی عظمت کا اعلان ہوتا ہے۔ آسمانوں میں بھی وہ بڑا ہے اور زمین میں بھی وہی بڑا ہے۔ انسانوں کا بھی وہ حاکم ہے اور جنوں کا بھی وہ حاکم ہے۔ وحوش و طیور کا بھی وہی خالق ہے' غرض جو کچھ اس کائنات میں ہے وہ اللہ کا ہے سب کے سب ایک ہی رب کی نگرانی میں ہیں۔ اللہ ہی ہے جو مدبر کائنات ہے اور رب کائنات ہے۔

اللہ کی ثنا اور کبریائی کی آواز بلند ہوتی ہے۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ اس کائنات میں بڑائی صرف اللہ ہی کی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہر بڑا چھوٹا ہو جاتا ہے اور جبار یہاں گھٹنوں کے بل جھکا ہوا ہے۔ ہر سرکش یہاں سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔ رب مطلق اور اکبر مطلق کے سامنے۔

اس کبریائی' اس ربوبیت' اس قدرت اور اس حکمت اور اس تدبیر کے ساتھ غالب قرار پاتا ہے۔

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۴۵ : ۳۷) "وہ زبردست اور دانا ہے"۔ الحمدللہ رب العلمین!

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ------ ۲۶

# سورۂ احقاف ایک نظر میں

یہ سورت مکی ہے اور اس کا موضوع اسلامی عقیدہ ہے ۔ یعنی اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت پر ایمان لانا کہ وہ واحد ہے اور پروردگار ہے ۔ وہ اس پوری کائنات اور اس میں پائے جانے والی مخلوقات کا رب ہے اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور آپؐ سے پہلے بھی کئی رسول گزرے ہیں ' آپؐ پر یہ قرآن نازل ہوا ہے اور یہ ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو پہلے نازل ہوئیں ۔ اور یہ کہ مرنے کے بعد اٹھایا جائے گا اور پھر حساب و کتاب ہو گا اور یہ حساب و کتاب ان اعمال کی بنیاد پر ہو گا جو لوگوں نے اس دنیا میں کیے 'اچھے یا برے ۔

یہ وہ بنیادی تصورات ہیں جن پر اسلام کی عمارت قائم ہے ۔ اس لیے تمام مکی قرآن میں اللہ نے ان پر مفصل بحث کی ہے اور مدینہ میں بھی ان ہی کی بنیاد پر مفصل ہدایات دی گئی ہیں ۔ مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی تھی ' اسلامی سوسائٹی قائم تھی اور مدینہ میں بھی جو ہدایات دی گئیں ' جو قوانین بنائے گئے ' ان مباحث کے دوران بھی جابجا ان امور کی طرف اشارہ کیا جاتا رہا کیونکہ اسلام کے تمام قوانین ' اخلاق ' آداب ' اور اوارے اسلامی نظریہ حیات پر مبنی ہیں ۔ چنانچہ خالص قانونی اور دستوری مباحث کے درمیان بھی ایمان ' توحید اور رسالت کی بات ہوتی رہتی ہے ۔

چنانچہ یہ سورت ہر اسلوب اور ہر انداز سے ' یہ عقیدہ ' دلوں میں بٹھانا چاہتی ہے ۔ ہر زاویہ سے ' ہر میدان میں تکوینی ' نفسیاتی اور تاریخی دلائل سے مسلح ہو کر یہ اسلامی عقائد کی بات کرتی ہے بلکہ یہ سورت اسلامی عقائد کو اس پوری کائنات کی حقیقت بتلاتی ہے ۔ یہ عقیدہ صرف انسانوں کا نہیں ہے ' یہ جنوں کا بھی ہے ۔ ایک طرف اس عقیدے پر کائنات شاہد ہے دوسری طرف اہل کتاب میں سے بعض حق پرست بھی اس پر شہادت دیتے ہیں ۔

یہ سورت انسانوں کو آسمان اور زمین کی سیر کراتی ہے ۔ قیامت کے مناظر میں لے جاتی ہے اور انسان کو انسانی تاریخ میں قوم عاد مکہ کے اردگرد بستیاں اور ان کی ہلاکت اور زمین و آسمان کے دوسرے نشانات بتاتی ہے کہ جس طرح قرآن حق بات کی شہادت دیتا ہے اسی طرح یہ کائنات اور تاریخی واقعات بھی حقیقت کی شہادت دیتے ہیں ۔

اس سورت کے چار حصے ہیں ۔ پورہ سورت کی عمارت گویا چار ستونوں پر کھڑی ہے اور ایک ہی مربوط عمارت ہے ' پہلا سبق حروف حا ۔ میم سے شروع ہوتا ہے جس طرح اس سے پہلے کی چھ سورتوں کا آغاز انہی حروف سے ہوا ہے ۔ اور ہر جگہ ان حروف کے بعد وحی اور کتاب الہی کے نزول کی بحث ہے ۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۴۶ : ۲) "اس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے" ۔ اور اس کے بعد متصلاً کتاب کائنات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کائنات کو حق پر پیدا کیا گیا ہے ۔ اور اللہ کی تدبیر نے اسے صحیح صحیح اندازوں سے پیدا کیا ہے ۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَھُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّی (۴۶ : ۳)

"ہم نے زمین و آسمان کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں' برحق پیدا کیا ہے اور ایک مدت خاص کے تعین کے ساتھ پیدا کیا ہے"۔ مگر یہ لوگ اس حقیقت سے منہ موڑے ہوئے ہیں کہ یہ قرآن جو پڑھی جانے والی وحی و کتاب ہے اور یہ کائنات جو دیکھی جانے والی کھلی کتاب ہے' دونوں سچائی پر مشتمل ہیں۔

وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ (۴۶ : ۳) "مگر یہ کافر لوگ اس حقیقت سے منہ موڑے ہوئے ہیں جس سے انہیں خبردار کیا گیا ہے"۔

اس کے بعد قوم کے عقائد شرکیہ پر سخت تنقید کی جاتی ہے کہ لوگ حق آنے کے بعد دوسرے الہوں کو پکارتے ہیں جن کی الوہیت پر کوئی سند نہ کتاب کائنات میں موجود ہے اور نہ کتب سماوی میں سے کسی منقول روایت میں

قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَرُوْنِیْ مَا ذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَھُمْ شِرْکٌ فِی السَّمٰوٰتِ اِیْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ ھٰذَآ اَوْ اَثٰرَۃٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ

(۴۶ : ۴) "اے نبیؐ ان سے کہو کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا ہے کہ وہ ہستیاں ہیں کیا جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو؟ ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی کہ زمین میں انہوں نے کیا پیدا کیا ہے یا آسمانوں کی تخلیق 'تدبیر میں ان کا کیا حصہ ہے اس سے پہلے آئی ہوئی کتاب یا علم کا کوئی بقیہ تمہارے پاس ہو تو وہی لے آؤ اگر تم سچے ہو"۔ اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ جن کو تم پکارتے ہو' اگر قیامت تک بھی کوئی کھڑا پکارتا رہے تو وہ نہیں سن سکتے اور نہ جواب دے سکتے ہیں بلکہ قیامت میں تو جو بہت ہی اعصاب شکن دن ہو گا یہ معبود صاف منکر ہوں گے۔

اس کے بعد یہ بات آتی ہے کہ یہ لوگ دعوت اسلامی کا استقبال کس انداز سے کرتے ہیں۔

ھٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (۴۶ : ۷) "کہ یہ کھلا جادو ہے"۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ کہتے ہیں یہ اللہ پر افترا ہے۔ رسول اللہ کو کہا جاتا ہے کہ ان کو ایسے انداز سے جواب دیں جو ایک نبی کے شایان شان ہوتا ہے' یعنی خدا خوفی اور خدا پرستی کے ساتھ تمام امور اللہ کے سپرد کر دیں' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰہُ قُلْ اِنِ افْتَرَیْتُہٗ فَلَا تَمْلِکُوْنَ لِیْ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا ھُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِیْضُوْنَ فِیْہِ کَفٰی بِہٖ شَھِیْدًا بَیْنِیْ وَ بَیْنَکُمْ وَھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (۴۶ : ۸) قُلْ مَا کُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَ مَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَ لَا بِکُمْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ وَ مَآ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۴۶ : ۹) "کیا ان کا کہنا یہ ہے کہ رسولؐ نے اسے خود گھڑ لیا ہے ان سے کہو کہ اگر میں

نے اسے خود گھڑ لیا ہے تو مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے ـ جو باتیں تم بناتے ہو اللہ ان کو خوب جانتا ہے ـ میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لیے کافی ہے ـ وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے ـ ان سے کہو "میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں، میں نہیں جانتا کہ کل تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے اور میرے ساتھ کیا ـ میں تو صرف وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں ایک صاف صاف خبردار کرنے والے کے سوا کچھ نہیں ہوں"ـ

اور ان کے سامنے بعض ایسے لوگوں کی مثال بطور حجت پیش کی جاتی ہے جنہوں نے دعوت اسلامی کو قبول کیا اور وہ بنی اسرائیل میں سے تھے ـ جب انہوں نے دیکھا کہ قرآن میں وہی باتیں ہیں جو تورات میں تھیں، وہ تو ایمان لے آئے اور تم نے کفر اختیار کر لیا ـ

فَاٰمَنَ وَ اسْتَكْبَرْتُمْ (٤٦ : ١٠) "وہ تو ایمان لے آیا اور تم گھمنڈ میں پڑے رہے" ان پر تنقید کی جاتی ہے کہ تم تکذیب پر اصرار کر کے اپنے اوپر ظلم کرتے ہو حالانکہ اہل کتاب میں سے جو لوگ اہل علم تھے وہ ایمان لائے ـ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (٤٦ : ١٠) "اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا"ـ

اس اصرار کے لیے وہ جو وجوہات بیان کرتے تھے اور بہانہ تراشیاں کرتے تھے ان کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے ـ مثلاً وہ کہتے تھے ـ

لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَاۤ اِلَيْهِ (٤٦ : ١١) "اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت نہ لے جاتے"ـ جب انہوں نے اس ہدایت کو قبول نہیں کیا اور مخالف صف میں ہیں تو یہ اور کیا کہیں گے ـ

وَ اِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَاۤ اِفْكٌ قَدِيْمٌ (٤٦ : ١١) "چونکہ انہوں نے اس سے ہدایت نہ پائی اس لیے یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے"ـ

یہاں حضرت موسیٰ کو دی جانے والی کتاب تورات کا ذکر کر کے کہا جاتا ہے کہ قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے اور قرآن کا مشن اور دعوت یہ ہے ـ

لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ بُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ (٤٦ : ١٢) "تاکہ ظالموں کو متنبہ کر دے اور نیک روش اختیار کرنے والوں کو بشارت دے"ـ اور اس خوشخبری کی تفصیلات پر یہ سبق ختم ہوتا ہے، ان لوگوں کے لیے جنہوں نے تصدیق کی اور پھر جم گئے ـ

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۴۶ : ۱۴) "یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے 'پھر اس پر جم گئے 'ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم 'ایسے لوگ جنت میں جانے والے ہیں 'جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے 'اپنے اعمال کے بدلے جو وہ دنیا میں کرتے رہے"۔

دوسرے سبق میں عقائد کے زاویہ سے انسانی فطرت کے دو نمونے پیش کیے گئے ہیں 'ایک سلیم الفطرت اور مستقیم الفطرت اور دوسرا کجی اختیار کرنے والا ابتدائے آفرینش سے ان دونوں نمونوں کو دکھایا جاتا ہے جو والدین کے زیر سایہ پلتے ہیں اور جب وہ بلوغ اور سن رشد کو پہنچتے ہیں تو پھر وہ خود مختارانہ تصرفات کرتے ہیں۔ پہلا نمونہ تو اللہ کی نعمتوں کا شعور رکھتا ہے 'والدین کے ساتھ حسن سلوک اٹھتا ہے اور اللہ کا ذکر و شکر کرنے کی طرف راغب ہوتا ہے 'توبہ کرنے والا 'اطاعت شعار 'خضوع و خشوع کرنے والا۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ (۴۶ : ۱۶) "اس طرح کے لوگوں سے ہم ان کے بہترین اعمال قبول کرتے ہیں اور ان کی برائیوں سے درگزر کر جاتے ہیں۔ یہ جنتی لوگوں میں شامل ہوں گے۔ اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جا رہا ہے"۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو والدین کے نافرمان ہیں جس طرح وہ رب کے نافرمان ہیں اور آخرت کے منکر ہیں۔ یہ ہیں دو اقسام کے لوگ۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ (۴۶ : ۱۸) وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِمَّا عَمِلُوا وَلِيُوَفِّيَهُمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۴۶ : ۱۹) "یہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے۔ ان سے پہلے جنوں اور انسانوں کے جو ٹولے ہو گزرے ہیں 'انہی میں یہ بھی شامل ہوں گے۔ بے شک یہ گھاٹے میں رہ جانے والے لوگ ہیں"۔

اس سبق کا خاتمہ قیامت کے مناظر میں سے ایک نہایت ہی تیزی سے گزر جانے والی جھلک سے کیا جاتا ہے جس میں ان لوگوں کا انجام دکھایا جاتا ہے۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ (۴۶ : ۲۰) "پھر جب یہ کافر آگ کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا "تم اپنے حصے کی نعمتیں 'اپنی دنیا کی زندگی ختم کر چکے اور ان کا لطف تم نے اٹھا لیا۔ اب جو تکبر تم زمین

میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں ان کی پاداش میں آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا"۔

تیسرا سبق قوم عاد کی ہلاکت کے بارے میں ہے 'جب انہوں نے اپنے پیغمبر کو رد کر دیا۔ یہاں ان کے قصے سے وہ کڑی لی جاتی ہے جن میں وہ اس ہوا سے امیدیں باندھے ہوئے ہیں جو بانجھ ہے 'جس سے وہ توقع کرتے ہیں کہ بارش لے کر آرہی ہے اور اس کے نتیجے میں ہر طرف زندگی پھوٹ نکلے گی' حالانکہ وہ ہلاکت اور بربادی کی حامل تھی۔ اور وہ دراصل وہ عذاب تھا جس کے لیے وہ شور مچاتے تھے کہ جلدی آئے۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۴:۴۶) تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (۲۵:۴۶) "پھر جب انہوں نے اس عذاب کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے "یہ بادل ہے جو ہم کو سیراب کر دے گا"--- "نہیں بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے' یہ ہوا کا طوفان ہے جس میں دردناک عذاب چلا آرہا ہے۔ اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گا"۔ آخر کار ان کا حال یہ ہوا کہ ان کے رہنے کی جگہوں کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں"۔ قوم عاد کے اس برے انجام سے ان کے دلوں کو متاثر کر کے یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ اس بات کو وہ نوٹ کریں کہ عاد کے لوگ اہل قریش سے زیادہ مالدار اور قوت والے تھے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَلَاۤ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۲۶:۴۶) "ان کو ہم نے وہ کچھ دیا تھا جو تم لوگوں کو نہیں دیا۔ ان کو ہم نے کان' آنکھیں اور دل سب کچھ دے رکھے تھے' مگر نہ وہ کان ان کے کام آئے' نہ آنکھیں' نہ دل' کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔ اور اسی چیز کے پھیر میں وہ آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے"۔

آخر میں ان کو ان بستیوں کی ہلاکت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو مکہ کے ماحول میں ہیں' اور ان کے ان معبودوں کی کمزوری کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے اور ان کے قرآنی دلائل کی بناء پر ان خداؤں کی حقیقت کے ظاہر ہو جانے کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے' جن کو وہ پوجتے ہیں۔

چوتھے سبق میں قرآن کے بارے میں جنات کے ردعمل کی ایک کہانی ہے۔ اللہ کے رسول نے ان کو قرآن سنایا۔ وہ متاثر ہوئے' اور گواہی دی کہ یہ کلام سچا ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۳۰:۴۶) "تصدیق

کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی۔ رہنمائی کرنے والی ہے حق اور راہ راست کی طرف"۔ جب یہ لوگ اپنی قوم کی طرف لوٹتے ہیں تو ان کو ڈراتے ہیں اور ایمان کی دعوت دیتے ہیں۔

يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۴۶ : ۳۱) وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءُ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۴۶ : ۳۲) "اے ہماری قوم کے لوگو' اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کر لو' اور اس پر ایمان لے آؤ' اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا' اور تمہیں عذاب الیم سے بچا دے گا' اور جو کوئی اللہ کے داعی کی بات نہ مانے وہ نہ زمین میں کوئی بل بوتا رکھتا ہے کہ اللہ کو زچ کر دے اور نہ اس کے کوئی حامی و سرپرست ہیں کہ اللہ سے اس کو بچالیں۔ ایسے لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں"۔ اور جنوں کی اس تقریر میں اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ اس کائنات کی کتاب مفتوح میں بھی یہ حقیقت پائی جاتی ہے کہ اللہ پیدا کرنے' مارنے اور پھر دوبارہ پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۴۶ : ۳۳) "اور کیا ان لوگوں کو یہ سجھائی نہیں دیتا کہ جس خدا نے یہ زمین و آسمان پیدا کیے اور جن کو بناتے ہوئے وہ نہ تھکا' وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ مردوں کو جلا اٹھائے' کیوں نہیں' یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

یہاں اب کفار کا وہ منظر پیش کیا جاتا ہے جب ان کو آگ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اس وقت وہ ان باتوں کا اقرار کریں گے جن کا یہاں انکار کرتے تھے۔ لیکن وہاں اقرار و یقین کا فائدہ کیا ہو گا۔

اس کے بعد رسول اللہ کو تلقین کی جاتی ہے کہ آپ صبر کریں اور ان کے لیے عذاب طلب کرتے ہیں جلدی نہ فرمائیں۔ ایک مختصری مہلت ہے جو انہیں دی جا رہی ہے۔ یہ عذاب جلدی ان کو آلے گا۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ بَلٰغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (۴۶ : ۳۵)
"پس اے نبی' صبر کرو' جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو جس روز یہ لوگ اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے تو انہیں یوں معلوم ہو گا جیسے دنیا میں ان کی ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے تھے۔ بات پہنچا دی گئی۔ اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہو گا"۔ یہ ہے یہ سورت مختصراً۔

اب آیات کی تفصیلی تشریح۔

# درس نمبر ۲۲۷ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۱۴

سُوْرَةُ الْاَحْقَافِ (۴۶) مَكِّيَّةٌ (۶۶)
اٰيَاتُهَا ۳۵ رُكُوْعَاتُهَا ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ح 'م' اس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے۔ ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں 'برحق' اور ایک مدت خاص کے تعین کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ مگر یہ کافر لوگ اس حقیقت سے منہ موڑے ہوئے ہیں جس سے ان کو خبردار کیا گیا ہے"۔

یہ اس سورت کا پہلا زمزمہ ہے کہ یہی عربی حروف تہجی ہیں جنہیں تم استعمال کرتے ہو اور انہی سے یہ کلام بنا ہے جو عربوں کے مروج اسالیب کلام سے معجزہ ممتاز ہے۔ اس لیے یہ کلام الٰہی ہے اور ایک زبردست حکمت والی ذات کا کلام ہے اور اس کتاب میں جو سچائی ہے' اس سچائی پر یہ کائنات بھی بنی ہے' جسے تم دیکھتے ہو۔ یہ کلام بھی اس کا بنایا ہوا ہے اور یہ پیچیدہ کائنات بھی اس کی بنی ہوئی ہے۔ یہ کائنات بھی ایک کتاب ہے جسے کھلی آنکھیں اور کھلے دل پڑھ سکتے ہیں۔

دونوں کتابوں کا کلام حق پر مبنی ہے۔ یہ کتاب ایک زبردست اور حکیم ہستی الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۴۶ : ۲) کا کلام ہے۔ اس لیے یہ کتاب مظہر قدرت الٰہیہ ہے اور مشتمل پر حکمت الٰہیہ ہے۔ اور زمین و آسمان کی تخلیق بھی اسی حق پر ہے۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى (۴۶ : ۳)

"ہم نے زمین و آسمان کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں' برحق اور ایک مدت خاص کے تعین کے ساتھ

پیدا کیا ہے"۔ ۔ س عرصے میں وہ مقصد پورا ہو گا جو اس مخلوق کے پیدا کرنے سے مطلوب ہے۔ اور اللہ نے اس کائنات اور اس کے اندر پائی جانے والی مخلوقات کے بارے میں جو اندازے رکھے تھے وہ ظاہر ہوں گے۔

یہ دونوں کتابیں کھلی ہیں۔ تمہاری نظروں کے سامنے ہیں' اللہ کی قدرتوں کی کہانیاں بتا رہی ہیں۔ اللہ کی حکمتوں پر گواہ ہیں' اور اللہ کی تدبیر اور تقدیر ان سے عیاں ہے اور یہ کائناتی کتاب اس پڑھی جانے والی وحی کی کتاب کی تائید کرتی ہے اور اس میں جو ڈراوا اور جو خوشخبری ہے اس کی بھی تائید یہ کائنات کرتی ہے لیکن۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ (۴۶ : ۳) "مگر یہ کافر لوگ اس حقیقت سے منہ موڑ رہے ہیں جس سے ان کو خبردار رکھا گیا ہے"۔ اور ان کا یہ رویہ قابل تعجب ہے کیونکہ منزل کتاب اور نظارہ دکھانے والی کتاب دونوں کتابیں پکار پکار کر ان کو دعوت دے رہی ہیں۔

یہ کتاب جو نازل کی گئی ہے یہ بتاتی ہے کہ اللہ ایک ہے' وہ ہر چیز کا رب ہے کیونکہ وہی خالق ہے' ہر چیز کی تدبیر کرنے والا ہے' ہر چیز کو ایک اندازے سے پیدا کرنے والا ہے اور یہ کتاب کائنات ان سب چیزوں کی تصدیق کر رہی ہے۔ اس کائنات کے نظام کا پوری طرح ہم آہنگ ہونا اور اس کی حرکات کا نہایت ہی منضبط ہونا اس بات پر گواہ ہے کہ اس کا ایک ہی بنانے والا' چلانے والا اور مدبر کرنے والا ہے۔ جس نے ہر چیز کو بنایا اور بڑی مہارت سے ہر چیز کو بنایا۔ چنانچہ ہر پیدا کردہ چیز اور اس کی ماہیت اور وجود اور اس کی رفتار کی ایک ہی ساخت اور طرز ہے۔ لوگ پھر کس بنیاد پر متعدد الہوں کے قائل ہیں؟ یہ بات حیرت انگیز ہے۔ آخر ان لوگوں کے الہوں نے کیا بنایا ہے اور وہ کیا کرتے ہیں؟ یہ کائنات جو اللہ کی بنائی ہوئی ہے یہ تو تمہارے سامنے کھلی کتاب ہے۔ اس میں تمہارے خود ساختہ معبودوں کا کیا حصہ ہے؟ اس مخلوقات میں سے اگر کوئی ایک قسم کی مخلوق بھی انہوں نے بنائی ہے تو دعویٰ کرو اور بتاؤ!

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۭ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَاۗىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَاۗءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ هُوَ
أَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ ۖ كَفَىٰ بِهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۖ وَهُوَ الْغَفُورُ
الرَّحِيمُ ﴿٨﴾ قُلْ مَا كُنتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ۖ
إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٩﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن كَانَ
مِنْ عِندِ اللَّهِ وَكَفَرْتُم بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّن بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِ
فَآمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿١٠﴾ وَقَالَ الَّذِينَ ع ۱
كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ ۚ وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ
فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ ﴿١١﴾ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ
وَهَٰذَا كِتَابٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنذِرَ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَبُشْرَىٰ
لِلْمُحْسِنِينَ ﴿١٢﴾

"اے نبیؐ، ان سے کہو، "کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا بھی کہ وہ ہستیاں ہیں کیا۔ جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو؟ ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی کہ زمین میں انہوں نے کیا پیدا کیا ہے؟ یا آسمانوں کی تخلیق و تدبیر میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ اس سے پہلے آئی ہوئی کتاب یا علم کا کوئی بقیہ (ان عقائد کے ثبوت میں) تمہارے پاس ہو تو وہی لے آؤ اگر تم سچے ہو۔ آخر اس شخص سے زیادہ بہکا ہوا انسان اور کون ہو گا جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دے سکتے بلکہ اس سے بھی بے خبر ہیں کہ پکارنے والے ان کو پکار رہے ہیں، اور جب تمام انسان جمع کیے جائیں گے اس وقت وہ اپنے پکارنے والوں کے دشمن اور ان کی عبادت کے منکر ہوں گے"۔

ان لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں اور حق ان کے سامنے آ جاتا ہے تو یہ کافر لوگ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ کیا ان کا کہنا یہ ہے کہ رسولؐ نے اسے خود گھڑ لیا ہے۔ ان سے کہو "اگر میں نے اسے خود گھڑ لیا ہے، تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے، جو باتیں تم بناتے ہو، اللہ ان کو خوب جانتا ہے، میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لیے کافی ہے، اور وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے"۔

ان سے کہو "میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں، میں نہیں جانتا کہ کل تمہارے ساتھ کیا ہونا ہے اور میرے ساتھ کیا، میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے

کے سوا اور کچھ نہیں ہوں"۔ اے نبیؐ ان سے کہو "دکبھی تم نے سوچا بھی کہ اگر یہ کلام اللہ ہی کی طرف سے ہو اور تم نے اس کا انکار کر دیا (تو تمہارا کیا انجام ہو گا؟) اور اس جیسے ایک کلام پر تو بنی اسرائیل کا ایک گواہ شہادت بھی دے چکا ہے ۔وہ ایمان لے آیا اور تم اپنے گھمنڈ میں پڑے رہے ۔ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا"۔

جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ ایمان لانے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت نہ لے جا سکتے تھے ۔چونکہ انہوں نے اس سے ہدایت نہ پائی اس لیے اب یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے ۔حالانکہ اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت بن کر آچکی ہے اور یہ کتاب اس کی تصدیق کرنے والی زبان عربی میں آئی تاکہ ظالموں کو متنبہ کر دے اور نیک روش اختیار کرنے والوں کو بشارت دے دے"۔

اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین فرماتا ہے کہ آپ اپنی قوم کے سامنے یہ کائناتی شہادت پیش کریں ۔یہ کائنات ایک کھلی کتاب ہے ۔اس کتاب میں تو بحث و مناظرہ نہیں کیا جا سکتا' وہ سامنے موجود ہے ۔جو انسانی فطرت کو خطاب کرتی ہے ۔اس کی منطق اور اس کا انداز گفتگو بھی فطری ہے ۔اس کتاب کائنات اور فطرت انسانی کے درمیان گہرا ربط بھی موجود ہے ۔اس کو نہ دبایا جا سکتا ہے اور نہ اس میں کوئی کسی کو دھوکہ دے سکتا ہے ۔یہ فطری سوال ہے ۔

اَرُونِیْ مَا ذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ (۴۶ : ۴) "ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی زمین میں انہوں نے کیا پیدا کیا ہے؟" یہ ممکن نہ تھا اور نہ ہے کہ انسانوں کے خود ساختہ ان معبودوں میں سے کسی نے خواہ وہ پتھر ہوں' درخت ہوں' جن ہوں یا فرشتے' زمین میں سے کوئی حصہ یا کوئی چیز پیدا کی ہے ۔فطری سوچ' حقیقت واقعہ' اور ہر چیز بذات خود یہ پکار پکار کہتی ہے کہ کچھ بھی نہیں ۔انہوں نے تو کچھ بھی پیدا نہیں کیا۔

اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ (۴۶ : ۴) "یا آسمانوں کی تخلیق و تدبیر میں ان کا کوئی حصہ ہے"۔کوئی انسان یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ ان مذکورہ معبودوں کا آسمانوں میں کوئی حصہ یا شرکت ہے ۔آسمانوں کے اندر ایک سطحی نظر بھی بتا دیتی ہے کہ خالق کائنات کس قدر عظیم ہے اور پھر یہ کہ وہ واحد ہے ۔ایک ہی نظر میں ایک معقول انسان تمام گمراہیوں اور افسانوں کو جھٹک کر پھینک دیتا ہے ۔اللہ تو انسان کا خالق ہے ۔وہ جانتا ہے کہ اس کائنات پر ایک گہری نظر ہی انسان کی کایا پلٹ دیتی ہے ۔اس لیے اللہ بار بار انسان کو متوجہ کرتا ہے ۔کائنات کی اس کھلی کتاب پر نگاہ تو ڈالو ۔اس کے نظام پر غور کرو' اور تمہارے دل و دماغ پر اس کائنات سے جو سگنل آتے ہیں' ان سے پوچھ لو کہ وہ کیا شہادت دیتے ہیں ۔

اس کے بعد بعض نہایت ہی گمراہ درجے کے انسانوں کی راہ بند کرنے کے لیے اور ان پر حجت تمام کرنے کے لیے ایک سوال کیا جاتا ہے ۔بعض اوقات زیادہ گمراہی میں آگے بڑھ کر کوئی یہ زعم بھی کر سکتا ہے کہ ہمارے پاس شرک کی نقلی دلیل ہے یا کوئی اور بہانہ کر سکتا ہے حالانکہ دراصل اس کے پاس کوئی حجت و دلیل نہیں ہے ۔اس لیے قرآن مجید ایسے لوگوں کا ناطقہ بند کرنے کے پہلے ہی مطالبہ کر دیتا ہے کہ لاؤ اگر کوئی حجت و دلیل تمہارے پاس ہے اور پھر قرآن مجید ان کو استدلال کا طریقہ بھی بتا دیتا ہے کہ کوئی فیصلہ کرنے کے لیے صحیح طریق کار کیا ہوا کرتا ہے ۔

ايْتُونِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۴۶ : ۴) "اس سے پہلے آئی ہوئی کتاب یا علم کا کوئی بقیہ تمہارے پاس ہو تو وہی لے آؤ اگر تم سچے ہو"۔ یا تو اللہ کی کوئی سچی کتاب پیش کرو۔ یا کتب سماوی میں سے کوئی اثر تمہارے پاس باقی ہو اسے لے آؤ۔ قرآن سے قبل جس قدر کتب سماوی بھی نازل ہوئی ہیں وہ تو قرآن کی تائید میں شہادت دیتی ہیں کہ اللہ وحدہ خالق ہے اور وہی کائنات کا مدبر ہے اور اس میں تمام چیزوں کو ایک قدر اور انداز سے پیدا کرنے والا ہے۔ ان کتابوں میں سے کوئی ایک کتاب بھی متعدد الہہ کے خرافات کو تسلیم نہیں کرتی۔ یا یہ کہ زمین و آسمان میں سے کوئی چیز ان الہوں نے بنائی ہو یا وہ کسی چیز کے بنانے میں شریک ہوں کوئی علم یا اثر یا نص کتب سماوی میں نہیں ہے۔

قرآن کریم ان کے سامنے اس کائنات کی شہادت بھی پیش کرتا ہے۔ کائنات کی شہادت تو فیصلہ کن شہادت ہوتی ہے۔ یوں قرآن مجید ان کے عقائد کو حجت و دلیل سے محروم کر دیتا ہے۔ اور ان کو یہ بھی سکھا دیتا ہے کہ بحث و دلیل کا صحیح اندازہ کیا ہوتا ہے اور یہ سب باتیں ایک ہی آیت میں سکھا دی جاتی ہیں جس کے الفاظ اگرچہ بہت تھوڑے ہیں لیکن زور دار اور فیصلہ کن ہیں۔

اس کے بعد قرآن کریم ان کے سامنے یہ نکتہ پیش کرتا ہے کہ جن چیزوں کو تم الہ بناتے ہو' اور پھر پکارتے ہو' ان کی تو کوئی حقیقت ہی نہیں ہے' یہ تو تمہاری اس پکار کو سنتے ہی نہیں' اس دنیا میں تم اگر ساری زندگی ان کو پکارتے رہو اور قیامت میں تو بھی وہ صاف صاف انکار کر دیں گے۔ لہٰذا اپنی اس حرکت پر ذرا غور تو کرو۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ (۴۶ : ۵) وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ (۴۶ : ۶) "آخر اس شخص سے زیادہ بہکا ہوا انسان اور کون ہو گا جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دے سکتے بلکہ اس سے بھی بے خبر ہیں کہ پکارنے والے ان کو پکار رہے ہیں' اور جب تمام انسان جمع کیے جائیں گے اس وقت وہ اپنے پکارنے والوں کے دشمن اور ان کی عبادت کے منکر ہوں گے"۔

بعض لوگ ایسے تھے جو بتوں کو بذات خود الہ مانتے تھے۔ اور بعض ان کو فرشتوں یا نیک لوگوں کی شبیہ سمجھتے ہوئے الہ مانتے تھے۔ بعض درختوں کو الہ مانتے تھے' بعض فرشتوں اور شیطان کو الہ مانتے۔ ان میں سے کوئی بھی پکارنے والے کی پکار کا جواب نہ دے سکتا تھا' یا اگر پکار سنتا تھا تو کوئی فائدہ نہ دے سکتا تھا' پتھر اور درخت تو نہ کچھ سن سکتے تھے اور نہ جواب دے سکتے تھے۔ فرشتے بھی مشرکین کی اس حرکت پر کوئی جواب نہ دیتے تھے۔ شیاطین تو بہرحال ان کو مزید گمراہ کرنے کے لیے وسوسہ اندازیاں کرتے تھے۔ جب قیامت کا دن ہو گا اور لوگ اٹھائے جائیں گے تو یہ تمام الہ جو پوجے جاتے تھے' یہ اپنے گمراہ عبادت گذاروں کی عبادت کا انکار کر دیں گے۔ یہاں تک کہ شیطان جس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرے' وہ یہ کہے گا۔

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۴ : ۲۲) "اور جب فیصلہ چکا دیا جائے گا تو شیطان کہے گا" حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کیے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کیے ان میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا۔ میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں۔ میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تم کو دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ اب مجھے ملامت نہ کرو' اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں' نہ تم میری۔ اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا' میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ ایسے ظالموں کے لیے تو دردناک سزا یقینی ہے"۔

یوں قرآن مجید ان کو خود اپنے دعوئ اور اپنے خیالات کے سامنے پیش کرتا ہے کہ ان دعووں کا انجام دنیا اور آخرت میں کیا ہونے والا ہے۔ جبکہ اس سے قبل ان کو کائنات کی نشانیاں بتائی گئیں کہ یہ شرک کے عقائد کا انکار کرتی ہیں۔ دونوں صورتوں میں جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کا الہ صرف ایک اللہ العالمین ہے اور خود مشرکین کی دنیا اور آخرت کی بھلائی بھی اسی میں ہے کہ وہ اپنے ان خیالات پر نظر ثانی کریں۔

قرآن مجید یہاں ان بت پرستوں پر تنقید کرتا ہے جو ایسے بتوں کو پکار رہے تھے جو ان کو کوئی نفع یا نقصان نہ دے سکتے تھے۔ نزول قرآن کے وقت ایسے روایتی زندہ اور مردہ معبود موجود تھے۔ لیکن یہ آیت صرف ان بتوں تک محدود نہیں ہے' جو ایک خاص زمان و مکان میں ایک خاص شکل میں پکارے جاتے تھے اور ان سے امیدیں وابستہ کی جاتی تھیں۔ آیت بہت وسیع ہے اور اس میں وہ سب معبود شامل ہیں جو اللہ کے سوا کسی بھی زمان و مکان میں پائے جائیں گے۔ جن کو عوام پکارتے ہیں اور جن سے امید وابستہ کرتے ہیں اور جو ان کو کوئی نفع و نقصان نہیں دے سکتے۔ کیونکہ نفع و نقصان پہنچانے والا تو اللہ ہی ہے۔ غرض شرک اس سادہ صورت اور شکل تک محدود نہیں ہے جو نزول قرآن کے وقت عربوں میں پائی جاتی تھی۔ کئی ایسے لوگ ہیں جو اللہ کے ساتھ اصحاب اقتدار کو شریک کرتے ہیں۔ افسران کو شریک کرتے ہیں' بڑے بڑے سرمایہ داروں کو شریک کرتے ہیں' ان سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں' ان کو پکارتے ہیں' لیکن یہ سب کے سب بہت ہی عاجز اور کمزور ہیں اور یہ کوئی فائدہ نہیں دے سکتے۔ وہ تو خود اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کو پکارنا شرک ہے' ان سے امیدیں وابستہ کرنا بھی شرک ہے۔ ان سے ڈرنا بھی' شرک ہے۔ لیکن یہ شرک ذرا شرک خفی ہے اور اکثر لوگ غیر شعوری طور پر اس میں مبتلا ہوتے ہیں۔

--- ○○○---

اس کے بعد اس پر بحث ہوتی ہے کہ رسول اللہ اور آپ کی سچی دعوت کے بارے میں ان کا موقف کیا ہے۔ شرک کے بارے میں ان کے خیالات کا جائزہ تو خوب لیا گیا۔ اب بتایا جاتا ہے کہ وحی اور دعوت اسلامی کے بارے میں ان کا

موقف کس قدر غلط اور غیر معقول ہے۔

وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ هٰذَا سِحْرٌ
مُّبِیْنٌ (۷) اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ اِنِ افْتَرَیْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِیْ مِنَ اللّٰهِ شَیْــٴًـا هُوَ اَعْلَمُ بِمَا
تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ كَفٰی بِهٖ شَهِیْدًۢا بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (۸) قُلْ مَا كُنْتُ
بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِكُمْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ وَمَاۤ اَنَا
اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۹) قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ كَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ
بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَ اسْتَكْبَرْتُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۱۰)
وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَیْرًا مَّا سَبَقُوْنَاۤ اِلَیْهِ وَ اِذْ لَمْ یَهْتَدُوْا بِهٖ
فَسَیَقُوْلُوْنَ هٰذَاۤ اِفْكٌ قَدِیْمٌ (۱۱) وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤی اِمَامًا وَّ رَحْمَةً وَهٰذَا
كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِیًّا لِّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَ بُشْرٰی لِلْمُحْسِنِیْنَ (۱۲)

(۴۶ : ۷ تا ۱۲) ''ان لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں اور حق ان کے سامنے آ جاتا ہے تو یہ کافر لوگ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ کیا ان کا کہنا یہ ہے کہ رسولؐ نے اسے خود گھڑ لیا ہے۔ ان سے کہو ''اگر میں نے اسے خود گھڑ لیا ہے' تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے' جو باتیں تم بناتے ہو' اللہ ان کو خوب جانتا ہے' میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لیے کافی ہے' اور وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے''۔

ان سے کہو ''میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں' میں نہیں جانتا کہ کل تمہارے ساتھ کیا ہونا ہے اور میرے ساتھ کیا' میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں''۔ اے نبیؐ ان سے کہو ''کبھی تم نے سوچا بھی کہ اگر یہ کلام اللہ ہی کی طرف سے ہو اور تم نے اس کا انکار کر دیا (تو تمہارا کیا انجام ہو گا؟) اور اس جیسے ایک کلام پر تو بنی اسرائیل کا ایک گواہ شہادت بھی دے چکا ہے۔ وہ ایمان لے آیا اور تم اپنے گھمنڈ میں پڑے رہے۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا''۔

جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ ایمان لانے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت نہ لے جا سکتے تھے۔ چونکہ انہوں نے اس سے ہدایت نہ پائی اس لیے اب یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت بن کر آ چکی ہے

اور یہ کتاب اس کی تصدیق کرنے والی زبان عربی میں آئی تاکہ ظالموں کو متنبہ کر دے اور نیک روش اختیار کرنے والوں کو بشارت دے دے"۔

بات کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی آیات اور اس کی دعوت ایسی ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ بڑی واضح ' دل لگتی اور کھلی باتیں ہیں لیکن یہ لوگ اس قدر ذلیل اور ضدی اور کم بخت ہیں کہ یہ اس سچائی کے بارے میں یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ

هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ( ٤٦ : ٧ ) "یہ کھلا جادو ہے"۔ حالانکہ دعوت اسلامی اور جادو کی نوعیت اور موضوع ہی مختلف ہے۔ ایک نبی اور جادوگر کے مقاصد ہی مختلف ہیں۔ یوں ان کے اس غلط موقف پر حملہ کیا جاتا ہے جس کے لیے نہ دلیل ہے اور نہ وجہ جواز ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بہت ہی واضح ہے اور آیات بینات پر مشتمل ہے۔

اس کے بعد ان کے ایک دوسرے اعتراض کو لیا جاتا ہے جو وہ کیا کرتے تھے کہ یہ قرآن اپنی طرف سے گھڑا ہوا ہے اور اللہ کی طرف منسوب ہے اور ایک افترا ہے۔ اس شبہے کو قرآن استفہام اور سوالیہ انداز میں پیش کرتا ہے کہ یہ بھی کوئی سوال ہے یا کوئی معقول انسان ایسی بات سوچ سکتا ہے؟

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰهُ ( ٤٦ : ٨ ) "کیا ان کا کہنا یہ ہے کہ رسول نے اسے خود گھڑ لیا ہے"۔ یعنی کیا وہ اس قدر جری ہو گئے ہیں کہ ایسی بات بھی کرتے ہیں حالانکہ اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

آپ سے کہا جاتا ہے کہ اس سوال کا جواب اس طرح دیں جس طرح ایک پیغمبر کی شان ہوتی ہے۔ اس لیے کہ یہ سوال بہت ہی لایعنی ہے۔ اس جواب سے اظہار ہو کہ آپ کو اپنے فرائض کا اچھی طرح شعور ہے ' آپ کو اپنے رب کا بھی اچھی طرح شعور ہے۔ آپ کو اس کائنات کی حقیقی قدروں اور حقیقی قوتوں کا پورا احساس ہے۔

قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ( ٤٦ : ٨ ) "ان سے کہو 'اگر میں نے اسے خود گھڑ لیا ہے تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے ۔ جو باتیں تم بناتے ہو اللہ ان کو خوب جانتا ہے۔ میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لیے کافی ہے اور وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے"۔ ان سے کہہ دو میں کیوں افترا باندھوں؟ کس کے مفاد کے لیے یہ افترا باندھوں؟ کن مقاصد کے لیے میں ایسا کروں؟ کیا اس لیے کہ تم مجھ پر ایمان لاؤ اور میری اطاعت کرو لیکن تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟

قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ( ٤٦ : ٨ ) "اگر میں نے اسے خود گھڑ لیا ہے تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے"۔ میرے افترا کی وجہ سے وہ لازماً میرا مواخذہ کرے گا۔ لہذا اگر تم میرے ساتھ ہو اور مجھ پر ایمان لاؤ تو اس میں مجھے کیا فائدہ ہو گا۔ افترا پر جب اللہ مجھ سے مواخذہ کرے گا تو تم اس وقت کیا کر سکتے ہو۔ تم تو بہت ہی عاجز اور کمزور ہو۔ میری کیا مدد کرو گے۔

یہ ایک ایسا جواب ہے جو نبی کے شایان شان ہے جو اللہ سے ہدایات لیتا ہے اور جسے اللہ کے سوا اس کائنات میں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اسے صرف اللہ ہی کی قوت نظر آتی ہے ۔ نیز یہ ایک منطقی اور معقول تردید بھی ہے ۔ اگر کوئی ذرا اپنی عقل کو کام میں لائے ۔ ان کو جواب دے کر اس پر آپ یہ اضافہ بھی کر دیتے ہیں ۔

هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ (۴۶ : ۸) "جو باتیں تم بناتے ہو اللہ ان کو خوب جانتا ہے"۔ یعنی جو تم کرتے اور کہتے ہو ۔ اور جن باتوں کو اللہ جانتا ہے ان پر وہ ضرور تمہیں سزا دے گا۔

كَفَىٰ بِهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ (۴۶ : ۸) "میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لیے کافی ہے"۔ اللہ گواہی بھی دے گا اور فیصلہ بھی کر دے گا اور اللہ کی گواہی اور اس کا فیصلہ کافی ہیں ۔

وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (۴۶ : ۸) "وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے"۔ وہ تم پر مہربان ہوتا ہے اور اپنی مہربانی سے تمہیں ہدایت دے دیتا ہے۔ اور تم نے جو گمراہیاں کیں انہیں بخش دیتا ہے ۔ کیونکہ ایمان کے بعد سابقہ اعمال معاف کر دیئے جاتے ہیں ۔

یہ ایسی تردید ہے جس میں ان کے لیے دھمکی اور ڈراوا بھی ہے ۔ ان کے لیے حوصلہ افزائی اور ایمان کا لالچ بھی ہے ۔ غرض ہر طریقے سے اللہ کی کوشش ہے کہ انسانوں کے دل بدل جائیں ۔ انسان کے جسم کی تار تار کو چھیڑا جاتا ہے کہ شاید نغمہ ایمان بر آمد ہو جائے ۔ سامعین کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ معاملہ بہت اہم ہے اور یہ لوگ جو احمقانہ باتیں کرتے ہیں یہ محض بچگانہ باتیں ہیں ' محض دعوے کرتے چلے جا رہے ہیں ۔ داعی اعظم کے دل میں جو بات ہے اور جس کی وہ دعوت دے رہے ہیں وہ بہت ہی عظیم ہے ۔ اس کی اہمیت اور عظمت کا ان کو کوئی شعور نہیں ۔

وحی پر ان کے اعتراض کا ایک دوسرے زاویہ سے بھی جواب دیا جاتا ہے ۔ یہ کہ وحی ایک ایسا واقعہ ہے جس کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں ۔ لاکھوں افراد اسے مانتے ہیں ۔ آخر اس میں عجوبے کی کیا چیز ہے کہ یہ اسے جادو یا افترا کہتے ہیں ۔ یہ کوئی عجیب و غریب چیز تو نہیں ہے ۔

قُلْ مَا كُنتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ (۴۶ : ۹) "ان سے کہو میں تو نرالا رسول تو نہیں ہوں ۔ میں نہیں جانتا کہ کل تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے اور میرے ساتھ کیا ۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں"۔

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی پہلے رسول نہ تھے ۔ آپ ؐ سے پہلے کئی رسول گزرے تھے ۔ آپ ؐ کا معاملہ بھی انہی کی طرح ہے ۔ انہوں نے کوئی ایسا دعویٰ نہ کیا تھا ۔ پہلے بھی کئی انسانوں کو رسول بنا کر بھیجا گیا تھا ۔ اللہ کو معلوم ہوتا ہے کہ کون رسالت کے لیے اہل ہے ۔ اس کو یہ منصب دے دیا جاتا ہے ۔ اور وہ بے کم و کاست پھر تبلیغ شروع کر دیتا ہے ۔ یہی ہے رسالت کی حقیقت اور ماہیت ۔ رسول کا دل جب سرچشمہ رسالت سے مل جاتا ہے تو پھر اللہ سے رسالت کی کوئی

دلیل طلب نہیں کرتا اور نہ اپنے لیے کوئی خصوصیت طلب کرتا ہے ۔ پیغام ملتے ہی اپنا کام شروع کر دیتا ہے ۔ جو بات اس تک پہنچتی ہے اس کی تبلیغ شروع کر دیتا ہے ۔

وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ (۴۶ : ۹) "مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ کل میرے ساتھ کیا اور تمہارے ساتھ کیا ہونا ہے ۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے" ۔ رسول رسالت کے کام کو اس لیے شروع نہیں کرتا کہ وہ غیب جانتا ہے یا وہ جانتا ہے کہ اس کا' اس کی قوم کا اور اس کی دعوت کا انجام کیا ہو گا ۔ وہ تو اللہ کے اشاروں اور ہدایات کے مطابق کام کرتا ہے ۔ اسے اللہ پر بڑا بھروسہ ہوتا ہے' وہ اللہ کے ارادوں کا تابع ہوتا ہے اور اللہ کی ہدایات پر عمل کرتا ہے ۔ ایک ایک قدم اللہ کے حکم سے اٹھاتا ہے لیکن مستقبل اسے معلوم نہیں ہوتا ۔ تمام راز اللہ کے ہاں ہوتے ہیں اور رسول مستقبل کے راز معلوم کرنے کے لیے بے چین بھی نہیں ہوتا کیونکہ اس کا دل مطمئن ہوتا ہے اور بارگاہ رب العزت کے آداب میں سے یہ بات بھی ہے کہ وہ اسی علم پر اکتفا کرے جو اسے دے دیا گیا ہو اور مستقبل کے پردوں کے پیچھے جھانکنے کی کوشش نہ کرے ۔ رسول تو ہمیشہ اپنے فرائض کی حدود پر کھڑا ہوتا ہے ۔

وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۴۶ : ۹) "میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا کچھ نہیں" ۔ اللہ کے دربار میں پہنچنے والوں کے یہی آداب ہوتے ہیں اور عارف باللہ لوگوں کا یہی اطمینان ہوتا ہے ۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر عمل کرتے ہیں اور دعوت دیتے چلے جاتے ہیں اس لیے نہیں کہ وہ دعوت کا انجام دیکھتے ہیں ۔ اس لیے بھی نہیں کہ دعوت کا مستقبل روشن ہوتا ہے' یا وہ اس کے نتیجے میں چھوٹی یا بڑی کامیابی پاتے ہیں ۔ پس وہ اس کام کو اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ان کا فرض ہوتا ہے اور بس ۔ وہ اپنے رب سے کوئی دلیل بھی نہیں مانگتے کیونکہ دلیل تو ان کے دل میں ہوتی ہے ۔ وہ اللہ سے کچھ مراعات بھی نہیں مانگتے ۔ اس سے بڑی رعایت یا اعزاز کیا ہو سکتا ہے کہ ان کو اس کام کے لیے چنا گیا ۔ وہ اس باریک خط سے سو تر بھر آگے نہیں بڑھتے جو ان کے لیے کھینچ دیا گیا ہے اور وہ انہی نقوش پر قدم رکھتے ہیں جو ان کے لیے کھینچ دیا گیا ۔

اس کے بعد ایک قریبی شہادت کی طرف ان کو متوجہ کیا جاتا ہے ۔ یہ شہادت اہل کتاب کی ہے' جو نزول وحی سے اچھی طرح واقف ہیں ۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ وَکَفَرْتُمْ بِہٖ وَشَہِدَ شَاہِدٌ مِّنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی مِثْلِہٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَکْبَرْتُمْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۴۶ : ۱۰) "ان سے کہو' کبھی تم نے سوچا بھی کہ اگر یہ کلام اللہ ہی کی طرف سے ہو اور تم نے اس کا انکار کر دیا (تو تمہارا کیا انجام ہو گا؟) اور اس جیسے ایک کلام پر تو بنی اسرائیل کا ایک گواہ شہادت بھی دے چکا ہے ۔ وہ ایمان لے آیا اور تم اپنے گھمنڈ میں پڑے رہے ۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا"

یہ ممکن ہے کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہو کہ بنی اسرائیل میں سے کسی شخص یا کسی گروہ نے قرآنی تعلیمات کو تورات اور دوسری کتابوں کے مماثل پاتے ہوئے ایمان لے آیا ہو کیونکہ کتب سماوی پر ایمان لانے والے لوگ جانتے تھے کہ یہ کتاب وہی بات کرتی ہے جو ان کتابوں میں ہے۔ بعض روایات میں تو آتا ہے کہ یہ آیت عبداللہ ابن سلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن اس کی راہ میں یہ مانع ہے کہ وہ مدینہ میں مسلمان ہوئے تھے اور یہ سورت مکی ہے۔ ایسی روایات بھی ہیں کہ یہ آیت مدنی ہے کیونکہ یہ عبداللہ ابن سلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے جبکہ ایسی روایات بھی ہیں کہ یہ مکی ہے اور اس کا عبداللہ ابن سلام کے واقعہ سے تعلق نہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مکہ کے کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہو 'مکہ میں اہل کتاب میں سے کوئی شخص ایمان لایا ہو اگرچہ یہاں اہل کتاب بہت ہی کم تھے اور مکی حالات میں ان کے ایمان لانے کی بہت ہی اہمیت ہو کیونکہ مشرکین امی تھے اور ایسے معاشرے میں اہل کتاب کے ایمان لانے کی اہمیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل کتاب کی شہادت کی طرف قرآن نے کئی مقامات میں اشارہ کیا ہے اور مشرکین کی تردید کے لیے اسے پیش کیا جو بغیر دلیل اور ثبوت کے اور بغیر علم و ہنر کے اور بغیر کسی کتاب اور سماوی روایات کے قرآن کی تکذیب کرتے تھے۔

لیکن سمجھنے کی بات یہاں یہ ہے کہ قرآن کریم نے یہاں احتمالی اسلوب استدلال پیش کیا ہے۔ "تم نے بھی سوچا کہ اگر یہ کلام اللہ ہی کی طرف سے ہو اور......" اس طرز استدلال کی غرض یہ ہے کہ مشرکین کے اصرار کے اندر تزلزل پیدا کیا جائے۔ ان کے اصرار کی شدت کو کم کیا جائے۔ ان کے عناد کو ٹھنڈا کیا جائے۔ ان کے اندر ذرا خوف اور احتیاط پیدا کی جائے کہ اس تکذیب میں اتنا آگے نہ بڑھو۔ اور یہ استدلال کیا جائے کہ تم تو نہیں مانتے لیکن اگر سچ نکلے تو پھر..... تو تمہارا انجام بہت ہی برا ہو گا۔ لہٰذا اس فرض اور احتمال ہی کو مدنظر رکھ کر احتیاط کرو کہ اگر یہ سچ نکلا تو تم پر وہ تمام عذاب آ جائیں گے جن سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں ڈراتے ہیں۔ لہٰذا حضورؐ کی تکذیب کرنے میں ذرا تامل کرو۔ اور اس دعوت پر غور و فکر کرو 'قبل اس کے کہ تم اس قدر خطرناک انجام سے دوچار ہو جاؤ یا احتمال پیدا ہو جائے ایسے انجام کا خصوصاً ایسے حالات میں کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص یا گروہ نے یہ شہادت بھی دے دی ہو کہ اس کتاب کی نوعیت کلام الٰہی جیسی ہے۔ اور اس طرح وہ ایمان لایا۔ اور جب یہ کتاب سب سے پہلے تمہارے لیے آئی' تمہاری زبان میں آئی' تمہارے آدمی کے ذریعہ آئی تو تم تکبر کرتے ہو اور انکار کرتے ہو' یہ واضح ظلم ہے۔ واضح حق کو چھوڑ کر آگے بڑھ جانا ہے اور اس صورت میں تمہارے سب اعمال ضائع ہوں گے اور اللہ کا عذاب آ جائے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۴۶ : ۱۰) "ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیتا"۔ غرض قرآن لوگوں کو سمجھانے کے لیے ہر طریقہ اختیار کرتا ہے۔ مختلف اسالیب کلام اختیار کرتا ہے تاکہ انسانوں کے دلوں کے شکوک دور کرے اور مختلف راستوں سے اپنی دعوت لوگوں کے دلوں تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے۔ قرآن نے جو مختلف اسالیب اختیار کیے ہیں' ان میں آنے والے داعیوں کے لیے سامان عبرت اور رہنمائی ہے۔ باوجود اس کے کہ خدا و رسولؐ دونوں کے ہاں یقیناً قرآن حق تھا' اللہ کا کلام تھا اور اس میں شک اور احتمال کی کوئی بات نہ تھی۔ لیکن لوگوں کو سمجھانے کے لیے یہ اسلوب بھی اپنایا گیا کہ ممکن ہے اسی طرح شدت مخالفت کم ہو جائے۔

آگے مضمون جاری ہے کہ قرآن کے بارے میں اور دین اسلام اور اسلامی نظام کے بارے میں وہ جو کہتے تھے ان کا جائزہ۔ وہ اپنی تکذیب اور کفر کی ایک اور وجہ جواز بھی پیش کیا کرتے تھے۔ یہ متکبر اور بزعم خود اونچے درجے کے لوگوں کی بات ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ (۴۶ : ۱۱) "جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ ایمان لانے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت نہ لے جا سکتے تھے۔ چونکہ انہوں نے اس سے ہدایت نہ پائی اس لیے اب یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے"۔

آغاز اسلام میں 'اسلام کی طرف فقرا اور غلام لپکے تھے۔ اس لیے کبرا اور مستکبرین اس کو اچھا نہ سمجھتے تھے۔ ان کی نظروں میں یہ بات کھٹکتی تھی اور وہ یہ کہتے تھے اگر یہ دین کوئی اچھا دین تھا تو یہ لوگ کیا ہم سے زیادہ جاننے والے اور ہشیار تھے اور نہ ہمارے مقابلہ میں یہ پہل کر سکتے تھے۔ کیونکہ ہم ان سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں' زیادہ باشعور ہیں اور ان کے مقابلے میں نیک و بد کی زیادہ تمیز رکھتے ہیں۔

لیکن یہ معاملہ ایسا نہیں تھا۔ یہ کبراء جو اسلام کو قبول نہ کرتے تھے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اس میں شک کرتے تھے یا جاہل تھے اور ان کو خبر نہ تھی کہ قرآن مجید سچائی ہی سچائی ہے۔ یا یہ کہ اس میں خیر نہیں ہے بلکہ تکبر کی وجہ سے وہ ایسا کرتے تھے اور یہ لوگ قبولیت حق کو اپنے سے فروتر کام سمجھتے تھے۔ پھر وہ یہ سمجھتے تھے کہ موجودہ اجتماعی نظام میں ان کو سوسائٹی میں جو مقام حاصل ہے یہ نہ رہے گا' جو مفادات ان کو حاصل ہیں وہ نہ رہیں گے۔ پھر یہ بھی ایک وجہ تھی کہ آباؤ اجداد کے طریق کار کے بارے میں وہ یہ خیال کرتے تھے کہ یہ ایک قابل فخر رویہ ہے لیکن جو لوگ اسلام کی طرف پہلی ہی آواز پر لپکے ان کی راہ میں یہ موانع نہ تھے جن کی وجہ سے کبراء رک گئے تھے۔

ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ بڑے لوگ حق کو قبول نہیں کرتے۔ کبر اور غرور کی وجہ سے ان کے لیے حق کے سامنے جھکنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ فطرت کی آواز پر لبیک نہیں کہتے۔ اور وہ حجت کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ کبر و غرور ان کو ڈکٹیٹ کراتا ہے کہ ہٹ دھرمی کرو اور نہ مانو۔ جھوٹے عذرات تراشو۔ باطل سے باطل جھوٹا دعویٰ کرو' یہ بڑے لوگ کبھی بھی اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتے۔ یہ لوگ اپنی ذات کو زندگی کا محور بنانے کی فکر میں ہوتے ہیں اور جس طرح وہ اپنے موجودہ معاشرے میں محور ہوتے ہیں اسے جاری رکھنا چاہتے ہیں۔

وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ (۴۶ : ۱۱) "چونکہ انہوں نے اس سے ہدایت نہ پائی اس لیے یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے"۔ ہاں' اگر "ان" لوگوں نے ہدایت قبول نہیں کی تو پھر لازماً سچائی میں کوئی نقص ہو گا۔ کیونکہ بڑے لوگوں سے تو غلطی کا صدور ممکن نہیں! لیکن یہ لوگ اپنی نظر میں اور جمہور عوام کی نظروں میں اپنے آپ کو وہ جو باور کراتے تھے کہ وہ ایک معصوم اور غلطی سے پاک قسم کی مخلوق ہیں۔

بہرحال وحی کے سلسلے میں یہ پیراگراف اور مطالعاتی سفر کتاب موسیٰ کی طرف ایک اشارے پر ختم ہوتا ہے کہ قرآن

سابقہ کتب سماوی کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے ۔ خصوصاً تورات اور قرآن کے درمیان گہری مماثلت ہے ۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مشن تو تورات ہی کا تکملہ تھا ۔ اس سے پہلے بنی اسرائیل کے ایک گواہ کی طرف بھی اشارہ ہو چکا ہے ۔

وَمِنْ قَبْلِهِ كِتٰبُ مُوْسٰى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ (۴۶ : ۱۲) "حالانکہ اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت بن کر آچکی ہے اور یہ کتاب اس کی تصدیق کرنے والی زبان عربی میں آئی ہے تاکہ ظالموں کو متنبہ کر دے اور نیک روش اختیار کرنے والوں کو بشارت دے دے" ۔ قرآن کریم نے سابقہ کتب سماوی کے ساتھ اپنے تعلق کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے خصوصاً تورات کی طرف اس لیے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب تو اس کا تکملہ تھی اور ان کا مشن تورات ہی کا تسلسل تھا ۔ اصل دستور و قانون تو تورات ہی میں تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ اسے امام اور رحمت کا لقب دیا گیا جب کہ ہر رسالت اس زمین اور اہل زمین کے لیے رحمت ہوتی ہے ۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا (۴۶ : ۱۲) "اور یہ کتاب تصدیق کرنے والی زبان عربی میں ہے" ۔ یہ تصدیق ان اصل کتابوں اور اصل تعلیمات کی کرتی ہے جن کے اوپر تمام ادیان سماوی قائم ہیں ۔ یہ کتاب اس نظام کی تصدیق کرتی ہے جس کے مطابق تمام اہل دین چلتے رہے ۔ اور یہ کتاب اس صراط مستقیم کی تصدیق کرتی ہے جو انسانوں کو اللہ تک پہنچاتا ہے ۔

اور عربی کتاب جس طرح وہ تھی ' یہاں اس لیے کہا گیا کہ اہل عرب پر اس احسان کا اظہار کر دیا جائے کہ ان کی زبان میں یہ کتاب اتری ۔ اور ان کو یاد دلایا گیا کہ تم پر تو اللہ کا خصوصی کرم ہوا ہے ۔ اور خاص مہربانی اور عنایت ہوئی ہے کہ تم کو اس دعوت کا حامل بنایا اور تمہاری زبان کو یہ اعزاز بخشا کہ اس میں قرآن عظیم نازل ہوا ۔ مقصد صرف زبان نہ تھی بلکہ یہ تھا ۔

لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ (۴۶ : ۱۲) "تاکہ ظالموں کو متنبہ کر دے اور نیک روش اختیار کرنے والوں کو بشارت دے دے" ۔

اس پہلے سبق کے آخر میں محسنین کی جزا کی تصویر کھینچی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ قرآن کریم تمہارے لیے یہ خوشخبری لاتا ہے ۔ بشرطیکہ وہ توحید مطلق اور ربوبیت کا اعلان کر دیں اور پھر اس پر جم جائیں اور اس کے تقاضے پورے کریں ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۳﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

"یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے 'پھر اس پر جم گئے ' ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے - ایسے لوگ جنت میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اپنے ان اعمال کے بدلے جو وہ دنیا میں کرتے رہے ہیں"۔

یہ کہ انہوں نے ربنا اللہ کہہ دیا - یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے جو انہوں نے کہہ دی - یہ محض ایک عقیدہ بھی نہیں ہے بلکہ یہ ایک مکمل نظام زندگی کا اقرار ہے - زندگی کی تمام سرگرمیوں کا نام ہے ربنا اللہ - اللہ ہی ہمارا رب ' ہماری سوچ میں بھی ' ہمارے نظریات میں بھی ' ہمارے اعمال میں بھی اور اس دنیا میں ہمارے پورے تعلقات میں بھی -

اللہ ہی ہمارا رب ہے ' لہٰذا ہم اسی کی بندگی کریں گے ' اسی سے ڈریں گے ' اسی پر بھروسہ کریں گے اور اسی کا رخ کریں گے - اللہ ہی ہمارا رب ہے ' لہٰذا تمام وسائل و ذرائع اسی کے ہیں اور اس کے سوا کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور نہ کسی اور سے کوئی طمع و لالچ جائز ہے -

اللہ ہی ہمارا رب ہے ' لہٰذا ہر سرگرمی ' ہر سوچ اور ہر تقدیر اسی کی طرف ہے ' اور ہر چیز میں اسی کی رضا مطلوب ہے - اللہ ہی ہمارا رب ہے ' لہٰذا فیصلے بھی وہی کرے گا ' شریعت اور قانون بھی اسی کا ہو گا اور ہدایت اور رہنمائی بھی اسی کی ہو گی - اللہ ہی ہمارا رب ہے ' لہٰذا اس کائنات میں جو لوگ ہیں جو اشیاء ہیں وہ ہمارے ساتھ مربوط ہیں اور ان کے ساتھ ہمارا رابطہ ہے - کیونکہ ان کا رب بھی اللہ ہی ہے - اللہ ہی ہمارا رب ہے تو نظام زندگی بھی اسی سے اخذ کریں گے - یہ محض الفاظ ہی نہ ہوں گے محض عقیدہ ہی نہ ہو گا ' بلکہ ایک ربانی نظام ہو گا -

ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (۴۶ : ۱۳) "اور پھر اس پر جم گئے" - یہ دوسری شرط ہے - یہ اس طرح کہ وہ اسلامی نظام کو قبول کرنے کے بعد اس پر جم گئے - ان کا دل اور ان کا نفس اس پر مطمئن ہو گیا ' ان کے خیالات اور تصورات اس پر جم گئے ' ہر قسم کا اضطراب اور شک ختم ہو گیا ' تمام دوسری دلچسپیاں اور تمام کشش ختم ہو گئیں ؛ تمام میلانات اور رجحانات ختم ہو گئے - یہ بات یاد رہے کہ دنیا کی دلچسپیاں متنوع اور جاذب ہوتی ہیں اور کسی نظام اور طریق کار پر جم جانا بڑا ہی مشکل کام ہے ' جگہ جگہ انسانوں کے لیے پھسلنے کے مقامات ہوتے ہیں اور رکاوٹیں ہوتی ہیں اور ہر طرف سے اپنی طرف کھینچنے کے لیے آوازیں اٹھتی ہیں -

رَبُّنَا اللّٰہُ (۴۶ : ۱۳) "اللہ ہی ہمارا رب ہے" کہنے کے بعد پورا نظام زندگی اپنانا ہوتا ہے اور اس پر جم جانا ہوتا ہے اور جن لوگوں کو اللہ نے معرفت حق اور استقامت علی الحق عطا کر دی وہ بہت ہی بڑے اور مختار لوگ ہوتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے حق میں یہ فیصلہ صادر ہوا -

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۴۶ : ۱۳) "ان کے لیے نہ خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے" - وہ کیوں ڈریں اور کیوں پریشان ہوں - جس نظام کو انہوں نے اپنایا ہے وہ اللہ تک پہنچانے والا ہے اور اس پر جم جانا اللہ کی طرف سے ضمانت ہے -

أُولَٰئِكَ أَصْحَٰبُ ٱلْجَنَّةِ خَٰلِدِينَ فِيهَا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ (۴۶ : ۱۴) "ایسے لوگ جنت میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے" ۔ اپنے ان اعمال کے بدلے جو دنیا میں وہ کرتے رہے" ۔ یہاں یعملون کا لفظ ربنا اللہ کی توضیح کرتا ہے ۔ اور نظام منہاج پر استقامت کے معنی متعین کرتا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ جنت میں ہمیشہ رہنا تمہارے اعمال اور تمہاری استقامت کی وجہ سے ہے ۔ یعنی "اللہ ہی ہمارا رب ہے" کے منہاج اور اس پر استقامت سے عمل اور مسلسل عمل سامنے آئے اور وہ اس پر جم جائیں ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دین میں اعتقادات اور تصورات محض الفاظ ہی نہیں ہوتے کہ کوئی صرف کلمہ طیبہ کے الفاظ کہہ دے ' بلکہ کلمہ طیبہ ایک طریق زندگی ہے ۔ اگر کلمہ محض الفاظ ہی ہوں ایک طرز زندگی نہ بنے تو وہ ارکان اسلام والا کلمہ نہ ہوگا ۔ آج لاکھوں لوگ کلمہ طیبہ کی شہادت محض زبانی تو دیتے ہیں مگر یہ کلمہ ان کے ہونٹوں سے آگے نہیں بڑھتا اور یہ کلمہ ان کی زندگی کے اوپر کوئی اثر نہیں ڈالتا ' نہ اس کے اندر کوئی تغیر پیدا کرتا ہے ۔ کلمہ پڑھنے کے بعد وہ اسی طرح جاہلانہ زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح دوسرے بت پرست کرتے ہیں ' جبکہ اپنے ہونٹوں سے وہ دن رات یہ کلمہ پڑھتے رہتے ہیں ' یہ الفاظ ہی ہوتے ہیں ' ان کی زندگیوں میں اس کا مفہوم نہیں ہوتا ۔

لا الہ الا اللہ ' یا ربنا اللہ ' اللہ ہی ہمارا رب ہے ' یا اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے ۔ یہ تو دراصل زندگی گزارنے کا ایک طریقہ اور منہاج ہے ۔ یہ مفہوم ہر مسلمان کو اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھالینا چاہئے تاکہ وہ پھر اس نظام کو تلاش کرے جس کی طرف ان کلمات میں اشارہ کیا گیا ہے اور وہ اس نظام پر غور کرے اور اسے قائم کرنے کی فکر کرے ۔

--- ooo---

# درس نمبر ۲۳۸ ایک نظر میں

یہ سبق انسانی فطرت کے موضوع پر ہے کہ جب انسان صحیح فطرت پر ہوتا ہے تو وہ کس طرح ہوتا ہے اور جب اس کی فطرت بگڑ جائے تو اس کے شب و روز کیا ہوتے ہیں۔ آغاز اس نصیحت سے کیا جاتا ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو' اسلامی اخلاق و آداب اور خصوصاً والدین کے بارے میں وصیت قرآن کریم میں اسلامی عقیدے کو اپنانے کے ساتھ متصلاً آتی ہے۔ اس لیے کہ ایمان کے تعلق کے بعد اسلام والدین اور اولاد کے اچھے تعلق کو اہمیت دیتا ہے۔ ایمان کے بعد ایک مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے۔ اسلام لانے اور عقیدۂ توحید اپنانے کے بعد فوراً والدین کے ساتھ حسن سلوک کو کیوں لایا جاتا ہے؟ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام احترام والدین کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اسلام اور قرآن یہ بتانا چاہتے ہیں کہ باپ اور بیٹے کے درمیان جو قوی تعلق ہے۔ یہ سب سے مضبوط تعلق ہے لیکن اسلامی تعلق اور اخوت خونی رشتوں سے بھی برتر ہے۔

اس سبق میں دو نمونے دیئے گئے ہیں' ایک نمونہ یہ ہے کہ والدین اور اولاد کے درمیان خونی رشتہ بھی ہے اور اس کے بعد نظریاتی رشتہ بھی ہے تو دونوں کے درمیان یہ تعلق ہدایت یافتہ تعلق ہوگا اور دونوں اللہ تک پہنچ کر جنت کے مستحق ہوں گے۔ دوسرے نمونے میں نسب کا رشتہ ایمان کے رشتے سے جدا ہو جاتا ہے۔ یہ آپس میں نہیں ملتے۔ اس صورت میں خون کے رشتے کے باوجود اولاد جہنم کی مستحق ہوتی ہے اور پھر قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر بھی پیش کیا جاتا ہے اور اس میں فسق اور استکبار کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۳۸ تشریح آیات

## ۱۵ --- تا --- ۲۰

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ
كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ
سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ
وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي ۖ إِنِّي تُبْتُ
إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۱۵﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا
وَنَتَجَاوَزُ عَن سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ ۖ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا
يُوعَدُونَ ﴿۱۶﴾

"ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے ۔ اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا ' اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے ۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری طاقت کو پہنچا اور چالیس سال کا ہو گیا تو اس نے کہا "اے میرے رب ' مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں ' اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو ' اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سکھ دے ' میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور تابع فرمان (مسلم) بندوں میں سے ہوں ۔ اس طرح کے لوگوں سے ہم ان کے بہترین اعمال کو قبول کرتے ہیں اور ان کی برائیوں سے درگزر کر جاتے ہیں ۔ یہ جنتی لوگوں میں شامل ہوں گے اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جاتا رہا ہے"۔

یہ وصیت جنس انسان کے لیے ہے ۔ اور یہ انسانیت کی بنیاد پر ہے ۔ اس وصیت کے لیے انسان کے علاوہ کسی اور صفت کی ضرورت کو نہیں لایا گیا ۔ اور احسان کے ساتھ بھی کوئی قید اور شرط نہیں لگائی ۔ والد کا محض والد ہونا ہی یہ فرض کر دیتا ہے کہ اس کے ساتھ احسان کیا جائے ۔ والد ہونے کے ساتھ کوئی اور صفت ضروری نہیں ہے ۔ اور یہ وصیت اس اللہ نے فرمائی جو انسان کا خالق ہے اور یہ وصیت شاید صرف انسان ہی کو کی گئی ۔ مخلوقات کی دوسری اصناف کو شاید یہ حکم

نہیں دیا گیا۔ آج تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ دوسرے حیوانات' پرندوں اور حشرات الارض کو اس قسم کی کوئی ہدایت ہو۔ ہاں یہ بات حیوانات کی فطرت میں بھی دیکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش کریں۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ وصیت صرف انسان کو ہے اور یہ ہے بھی خاصہ انسان۔

قرآن کریم میں بھی اس حکم کا تکرار ہے جو بطور وصیت کیا گیا اور احادیث میں بھی اس کی سخت تاکید آئی ہے۔ البتہ والدین کو اپنی اولاد کے بارے میں بہت ہی کم وصیت کی جاتی ہے۔ اگر کوئی ہدایت ہے تو بعض حالات کے بارے میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کی پرورش 'والدین کی فطرت کے اندر ہی رکھ دی گئی ہے۔ والدین خود بچے کی پرورش کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کو اس کام کے لیے ابھارنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ والدین بچوں کے لیے اس قدر قربانیاں دیتے ہیں کہ بعض اوقات والدین بچوں پر اپنی جان بھی قربان کر دیتے ہیں۔ رنج و الم تو معمولی بات ہے اور اسی سلسلے میں وہ ان سے کوئی عوض طلب نہیں کرتے۔ نہ ان سے طالب شکر ہوتے ہیں۔ لیکن نوجوان نسل پیچھے کو کم ہی دیکھتی ہے۔ کیونکہ ان سے اس قسم کی قربانی کا' مطالبہ خود ان کی اولاد کرتی ہے اور یونہی زندگی کی گاڑی چلتی رہتی ہے۔

لیکن اسلام نے اپنی فطری تعلیمات کی رو سے سوسائٹی کی پہلی اکائی خاندان کو مقرر کیا ہے۔ خاندان ہی وہ گہوارہ ہے جس میں ناتواں بچے پرورش پاتے ہیں اور بڑے ہوتے ہیں۔ اس گہوارے سے بچے محبت' تعاون' باہم کفالت اور خاندان کی تعمیر و تربیت حاصل کرتے ہیں۔ جس بچے کو کسی خاندان کی تربیت نہیں ملتی وہ اپنی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو سے ناقص ہوتا ہے۔ اگرچہ خاندان کے دائرہ سے باہر اس کو ضروریات زندگی وافر مقدار میں میسر ہوں۔ اور اس کی تعلیم و تربیت کا اچھا انتظام کیا گیا ہو۔ ایسے بچے میں سب سے بڑی جو کمی ہوتی ہے وہ محبت کے شعور کی کمی ہوتی ہے۔ یہ بات علمائے نفسیات کے ہاں ثابت ہو چکی ہے کہ ہر بچہ زندگی کے پہلے دو سال صرف اپنی ماں کی گود میں رہنا چاہتا ہے۔ اور وہ اس میں کسی اور کی شرکت نہیں قبول کرتا۔ دنیا میں بچوں کی پرورش کے جو مصنوعی ادارے بنائے گئے ہیں ان میں سب سے پہلے تو ماں مفقود ہوتی ہے۔ کیونکہ وہاں کام کرنے والی عورت یعنی نرس کو تو کئی بچے سنبھالنے پڑتے ہیں۔ ان بچوں کا پھر ایک دوسرے کے ساتھ حسد ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ مصنوعی مشترکہ ماں پر باہم مقابل ہوتے ہیں' یوں بغض و عناد ان کی ابتدائی زندگی سے ان میں پروان چڑھتا ہے اور جس ننھے دل میں نفرت پیدا ہو جائے۔ اس میں پھر محبت پیدا نہیں ہوتی۔ پھر بچے کے اوپر ایک عرصے تک ایک ہی نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کی شخصیت میں ثبات پیدا ہو جائے۔ اور یہ بات صرف ایک خاندان ہی میں پیدا ہو سکتی ہے۔ رہے بچوں کی پرورش کے مصنوعی ادارے تو ان میں بچہ ایک ہی مضبوط نگران سے محروم ہوتا ہے کیونکہ مصنوعی ماؤں کی ڈیوٹیاں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ اس لیے ان کی شخصیت کے اندر بھی انتشار ہوتا ہے۔ اور وہ مضبوط شخصیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے اداروں کے جو تجربات سامنے آ رہے ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے بچوں کی پرورش کے لیے خاندان کی نرسری کو جو ضروری قرار دیا ہے اس کے اندر بڑی گہری حکمت ہے اور بچوں کی تربیت کا فطری طریقہ وہی ہے جو اسلام نے تجویز کیا ہے' جو ہر قسم کے نقص سے پاک ہے۔

اور قرآن یہاں اس ماں کے کردار کو قلمبند کرتا ہے۔ ماں کی مشقتیں' ماں کی محبتیں اور ماں کی جدوجہد اور نہایت ہی کریمانہ انداز اور شریفانہ برتاؤ۔ اللہ نے اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ احسان کرنے کی جو وصیت کی ہے' اس کی تعمیل میں

اولاد اگر رات دن لگی رہے تو بھی وہ ماں کے احسان کو پورا نہیں کر سکتی۔

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (۱۵:۴۶)

"اس کی ماں نے مشقت اٹھاکر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھاکر ہی اس کو جنا' اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے"۔

اللہ نے ماں کی مشقتوں کے لیے جن الفاظ کا انتخاب کیا ہے ان کا تلفظ ہی مشقت کا اظہار کر دیتا ہے۔ الفاظ کی آواز اور ترنم ہی سے جہد و مشقت اور تھکاوٹ ظاہر ہوتی ہے۔

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا (۱۵:۴۶) "ماں نے مشقت اٹھاکر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھاکر ہی اسے جنا"۔ جس طرح تھکا ماندہ آدمی لمبی لمبی سانس بھرتا ہے۔ مشکل سے سانس لیتا ہے' تھکا ہوا ہوتا ہے۔ یہی ہوتی ہے حمل کی تصویر خصوصاً آخری دنوں میں اور وضع حمل اور اس کی مشکلات اور اس کے آلام تو ہر کسی کو معلوم ہیں۔

آج کل علم جنین بہت آگے بڑھ گیا ہے اور حمل کے تمام مراحل اور اس کے اندر ہونے والی عملیات سے انسان واقف ہو چکا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں ان تمام عملیات میں کس قدر مشقت اٹھاتی ہے اور قربانی دیتی ہے --- عورت کے انڈے کے ساتھ جب مادہ منویہ کا جرثومہ ملتا ہے تو یہ رحم مادر کی دیواروں سے چپکنے کی سعی کرتا ہے اور رحم کی دیوار سے چپکتے ہی اس کی دیوار کو کھانا شروع کر دیتا ہے کیونکہ اس کے اندر کھانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ رحم کی دیواروں کو دیمک کی طرح چاٹنا شروع کر دیتا ہے۔ جس جگہ کو یہ کھانا شروع کرتا ہے' وہاں ماں کا خون جمع ہوتا ہے اور ایک چھوٹا سا حوض بن جاتا ہے اور یہ انڈا جس کے اندر جرثومہ ہوتا ہے اور یہ جرثومہ دونوں خون کے اس حوض میں ہوتے ہیں اور خون کے اندر ماں کے جسم کا خلاصہ ہوتا ہے۔ اس خون کو یہ چوستا ہے اور بڑھتا رہتا ہے اور رحم کی دیواروں کو یہ چاٹتا رہتا ہے اور خون پیتا رہتا ہے۔ اور مادۂ حیات حاصل کرتا ہے۔ یہ ماں کھانا کھاتی ہے' پانی پیتی ہے اور خوراک ہضم کر کے اس انڈے اور اس جرثوے کے لیے تازہ خون تیار کرتی ہے اور اس خونخوار جرثوے کو خوراک مہیا کرتی ہے۔ ایک ایسا وقت آتا ہے کہ بچہ کی ہڈیاں بننا شروع ہوتی ہیں اور اس وقت پھر وہ زیادہ خون چوسنا شروع کر دیتا ہے۔ ایسے حالات میں بعض اوقات والدہ کو کیلشیم کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اس دور میں عورت ہڈیوں کا گودا اس بچے کو فراہم کرتی ہے تاکہ اس بچے کا جسمانی ڈھانچہ تیار ہو' اس عظیم جدوجہد کا یہ ایک قلیل حصہ ہے۔ پھر وضع حمل کا مرحلہ آتا ہے۔ یہ نہایت ہی پر مشقت اور کربناک عمل ہے۔ لیکن ماں کے اندر جو بے پناہ محبت ہوتی ہے اپنے بچے کے لیے' اس کی وجہ سے یہ سب کچھ وہ برداشت کرتی ہے کیونکہ یہ تقاضائے فطرت ہے۔ یوں ماں اس چھوٹے بچے کو زندگی دیتی ہے اور خود پگھلتی جاتی ہے۔ اس کے بعد دودھ پلانے اور پھر پالنے پوسنے کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے گوشت اور خون کا نچوڑ دودھ کی شکل میں اسے دیتی ہے۔ اور اپنے دل' دماغ اور اعصاب کی پوری قوت صرف کر کے اسے پالتی ہے۔ لیکن ان تمام مشقتوں کو وہ خوشی خوشی قبول کرتی ہے۔ نہایت محبت اور رحیمانہ انداز میں۔ کبھی نہیں تھکتی' کبھی بچے سے نفرت نہیں کرتی' ان تمام مشقتوں کا صلہ یہ ماں صرف یہ چاہتی ہے کہ اس کا بچہ صحیح و سالم ہو اور بڑھتا ہی چلا

جائے ۔پس یہی صلہ ہے جو وہ چاہتی ہے ۔

اس طویل جدوجہد اور مشقت اور قربانی کا صلہ کوئی ماں کو دے سکتا ہے ۔کوئی خواہ کتنی ہی جدوجہد کرے ' ماں کی خدمت میں ' اس کا صلہ کوئی نہیں دے سکتا۔ اگر کوئی کتنی ہی جدوجہد بھی کرے وہ بھی قلیل ہوگی ۔

ایک شخص طواف کرتے ہوئے اپنی ماں کو اٹھائے ہوئے تھا اور وہ رسول اللہؐ کے سامنے آیا تو کہہ دیا کہ حضورؐ میں نے اس کا حق ادا کر دیا تو آپؐ نے فرمایا "نہیں صرف ایک بار سانس لینے کے برابر بھی نہیں" ۔ (البزار)

اب قرآن مجید اس انسان کو والدین کے ساتھ احسان کی وصیت اور ماں کی بے مثال مشقتوں اور قربانیوں کے مرحلے سے گزار کر اسے سن رشد میں لے جاتا ہے ۔اب یہ مضبوط ' توانا اور دانشمند ہے ۔ اور اس کی فطرت درست ہے اور اس کا دل ہدایت یافتہ ہے ' اور یہ ہے قرآن کا انسان مطلوب ۔

حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰى وَالِدَیَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَ اِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (۴۶ : ۱۵) "یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری طاقت کو پہنچا اور چالیس سال کا ہو گیا تو اس نے کہا "اے میرے رب ' مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں ' اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو ' اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سکھ دے ' میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور تابع فرمان (مسلم) بندوں میں سے ہوں"۔

انسان سن رشد کو ۳۰ اور ۴۰ کے درمیان پہنچ جاتا ہے ۔ چالیس سال رشد و ہدایت کی انتہا ہوتے ہیں اس میں انسان کی تمام قوتیں مکمل ہو جاتی ہیں اور انسان تدبر اور تفکر میں مکمل ہو جاتا ہے ۔ اب یہ تکمیل کے مراحل طے کر جاتا ہے ۔ اور اس کے اندر ٹھیراؤ پیدا ہو جاتا ہے ۔ اس سن میں پھر جو مستقیم الفطرت ہو ' وہ اس زندگی سے ذرا بلند ہو کر سوچتا ہے ۔ اور پھر وہ پوری انسانیت کے انجام پر بھی غور کرتا ہے ۔

قرآن مجید ایک ایسی شخصیت کی ذہنی واردات کو یہاں قلم بند کرتا ہے ' جو فطرت سلیمہ کی مالک ہو ' اس مرحلے میں جہاں انسان عمر کا ایک حصہ پیچھے چھوڑ چکا ہے اور اگلی عمر میں پھر وہ متوجہ الی اللہ ہوتا ہے اگر مستقیم الفطرت ہو ۔

رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰى وَالِدَیَّ (۴۶ : ۱۵)

"اے میرے رب ' مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں"۔ یہ ایک ایسے دل کی دعا ہے جو اپنے رب کی نعمتوں کا شعور رکھتا ہے کہ یہ انعامات جو تو نے مجھ پر کیے اور مجھ سے پہلے میرے والدین پر کیے اور مسلسل اگلے وقتوں سے یہ انعامات ہو رہے ہیں ۔ان کے مقابلے میں ہماری قوت شکر بہت کم ہے ۔ اے اللہ آپ ہی ہمیں توفیق دیں اور ضبط دیں کہ ہم یہ شکر بجا لا سکیں ۔ یہ نہ ہو کہ میں ادھر ادھر ہو کر انتشار میں اپنی قوتیں ہی ضائع کر دوں اور اصل کام یعنی شکر الٰہی بجا لانے کو ایک طرف چھوڑ دوں ۔

وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ (۴۶ : ۱۵) ''اور یہ کہ نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو''۔ یہ دوسری دعا ہے یہ شخص اللہ کی مدد طلب کرتا ہے کہ وہ عمل صالح کر سکے ۔وہ اپنے کمال اور احسان کو رضائے ربی کے کام میں استعمال کرے کیونکہ رضائے الہی اس کا بڑا مقصد ہے ۔رضائے الہی کے حصول ہی کے لیے تو اس کی پوری جدوجہد ہے۔

وَ اَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ (۴۶ : ۱۵) ''اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سکھ دے''۔ یہ تیسری دعاء ہے ۔ ہر صالح آدمی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی صالحیت اس کی اولاد میں منتقل ہو اور اس کا دل مطمئن ہو کہ اس کی اولاد میں ایسے لوگ ہیں جو اس کے بعد اللہ کی بندگی اور اس کی رضامندی کے طالب ہوں گے ۔نیک اولاد بندۂ صالح کی پہلی تمنا ہوتی ہے اور خزانوں اور دولت کے مقابلے میں وہ نیک اولاد کو ترجیح دیتا ہے ۔ زندگی کی ہر آرائش و زیبائش سے زیادہ اسے نیک اولاد پسند ہوتی ہے اور یہ دعا والدین سے اولاد کی طرف جارہی ہے کہ آنے والی نسلوں میں بھی اللہ کی بندگی ہوتی رہے۔ اور یہ جو دعائیں اور درخواستیں وہ کر رہا ہے ان کی منظوری کے لیے اس کے پاس سفارش یہ ہے کہ میں توبہ کرتا ہوں اور سر تسلیم خم کرتا ہوں۔

اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَ اِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (۴۶ : ۱۵) ''میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور میں تابع فرمان بندوں میں سے ہوں''۔ یہ ہیں ایک معیاری بندۂ صالح کی صفات اپنے رب کے حوالے سے جس کی فطرت سیدھی اور سلیم ہو۔ ایسے بندوں کے ساتھ اللہ کا تعلق پھر کیسا ہوتا ہے اس کی وضاحت بھی قرآن نے کر دی ہے ۔

--- ○○○---

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ نَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ فِیْۤ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِیْ كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ (۴۶ : ۱۶) ''اس طرح کے لوگوں سے ہم ان کے بہترین اعمال کو قبول کرتے ہیں اور ان کی برائیوں سے درگزر کر جاتے ہیں۔ یہ جنتی لوگوں میں شامل ہوں گے اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جاتا رہا ہے''۔

اللہ کے ہاں جزاء اعمال حسنہ پر ہے اور گناہوں کو معاف کر دیا جاتا ہے اور جنت کے اصل مستحقین کے ساتھ ایسے لوگ جا ملیں گے اور یہ اللہ کا وعدہ ہے نہ سچا وعدہ ہے ۔یہ وعدہ دنیا میں کیا گیا تھا اور اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

--- ○○○---

اور اس اچھے نمونے کے بالمقابل فسق و فجور اور گمراہی کا مآل بھی ملاحظہ ہو۔

وَ الَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَاۤ اَتَعِدٰنِنِیْۤ اَنْ اُخْرَجَ وَ قَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ ۚ وَ هُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰهَ وَیْلَكَ اٰمِنْ ۖۗ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚۖ فَیَقُوْلُ مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ

فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ 
وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ وَيَوْمَ
يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَي النَّارِ ۭ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَ
اسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي
۲
الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ۝ ع ۱۰ ع ۲

۲ ” اور جس شخص نے اپنے والدین سے کہا: ” اف 'تنگ کر دیا تم نے 'کیا تم مجھے یہ خوف دلاتے ہو کہ میں مرنے کے بعد قبر سے نکالا جاؤں گا؟ حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی نسلیں گزر چکی ہیں (ان میں سے تو کوئی اٹھ کر نہ آیا) ماں اور باپ اللہ کی دہائی دے کر کہتے ہیں ” ارے بدنصیب! مان جا' اللہ کا وعدہ سچا ہے“ مگر وہ کہتا ہے ” یہ سب اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں ۔ یہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے ۔ ان سے پہلے جنوں اور انسانوں کے جو ٹولے (اسی قماش کے) ہو گزرے ہیں' انہی میں یہ بھی جا شامل ہوں گے ۔ بے شک یہ گھاٹے میں رہ جانے والے لوگ ہیں ۔ ” دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے درجے ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں تاکہ اللہ ان کے کئے کا پورا پورا بدلہ ان کو دے ۔ ان پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا ۔“ پھر جب یہ کافر آگ کے سامنے لاکھڑے کیے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا: ” تم اپنے حصے کی نعمتیں اپنی دنیا کی زندگی میں ختم کر چکے اور ان کا لطف تم نے اٹھا لیا' اب جو تکبر تم زمین میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں' ان کی پاداش میں آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا“ ۔

والدین مومن ہیں اور لڑکا نافرمان ہے ۔ وہ سب سے پہلے ان کی نیک روش کا انکار کرتا ہے ۔ وہ نہایت ہی کرخت ' جارح اور قابل نفرت انداز میں ان سے مخاطب ہوتا ہے ۔

اُفٍّ لَّكُمَآ (۴۶ : ۱۷) ” اف 'تنگ کر دیا تم نے “ اور اس کے بعد پورے دین کی بنیاد ہی کا انکار کر دیتا ہے یعنی آخرت کا ۔ اور ان الفاظ میں :

اَتَعِدٰنِنِيْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ (۴۶ : ۱۷) ” کیا تم مجھے یہ خوف دلاتے ہو کہ میں مرنے کے بعد قبر سے نکالا جاؤں گا' حالانکہ مجھ سے پہلے نسلیں گزر چکی ہیں “ ۔ یعنی وہ چلے گئے اور ان میں سے کوئی ایک بھی تو واپس نہیں آیا ۔ حالانکہ قیامت کا تو وقت طے شدہ ہے اور لوگوں کا اٹھایا جانا اس طرح ہو گا کہ سب کو اکٹھا اٹھایا جائے گا' لیکن ایک ایک آدمی کو نہیں ۔ یہ بات تو اس کو کسی نے بھی نہ کی تھی کہ ایک ایک آدمی کو یا ایک ایک نسل کو اٹھایا جائے گا ۔ یہ کوئی مزاح تو ہے نہیں ۔ یہ تو آخری حساب ہو گا اور سب کا ہو گا ۔

والدین اس کے منہ سے یہ کفر سنتے ہیں' اس کی ان باتوں سے پریشان ہو جاتے ہیں' یہ اللہ کا بھی گستاخ ہے اور ان

کے ساتھ بھی گستاخانہ رویہ رکھتا ہے ۔ وہ سخت پریشان ہو جاتے ہیں ۔ مارے خوف کے کانپ اٹھتے ہیں ۔

وَهُمَا يَسْتَغِيثَانِ اللَّهَ وَيْلَكَ آمِنْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ (۴۶ : ۱۷) "ماں اور باپ اللہ کی دہائی دے کر کہتے ہیں "ارے بد نصیب مان جا' اللہ کا وعدہ سچا ہے" ۔ ان والدین کی باتوں سے ان کا خوف اور پریشانی ٹپکی پڑتی ہے' جبکہ یہ نافرمان بدبخت کفر و انکار پر مصر ہے ۔

فَيَقُولُ مَا هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (۴۶ : ۱۷) "مگر وہ کہتا ہے یہ سب اگلے وقتوں کی فرسودہ باتیں ہیں" ۔ اور اللہ پھر ایسے لوگوں کے انجام کو جلد ہی ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے ۔

---ООО---

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ (۴۶ : ۱۸) "یہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے ۔ ان سے پہلے جنوں اور انسانوں کے جو ٹولے (اسی قماش کے) ہو گزرے ہیں' انہی میں یہ بھی جا شامل ہوں گے ۔ بے شک یہ گھاٹے میں رہ جانے والے لوگ ہیں" ۔

ایسے لوگ اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ اللہ کی عدالت سے ان کے خلاف فیصلہ صادر ہو جائے کیونکہ یہ منکر اور جھٹلانے والے ہیں اور اس قسم کے بہت سے لوگ موجود بھی ہیں اور گزر بھی گئے ہیں ۔ انسانوں میں سے بھی ہیں اور جنوں میں سے بھی ہیں ۔ اور ان کے بارے میں اللہ نے جو فیصلہ کر دیا ہے' وہ نافذ ہو کر رہے گا ۔ اللہ کے فیصلے نافذ ہوتے ہیں ۔

إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ (۴۶ : ۱۸) "بے شک یہ لوگ گھاٹے میں رہ جانے والے ہیں" ۔ اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہو گا کہ انسان دنیا میں ایمان و یقین سے محروم ہو جائے اور آخرت میں اللہ کی رضامندی اور جنت سے محروم ہو جانے اور پھر دائمی طور پر عذاب جہنم میں گرفتار ہو جائے ۔

---ООО---

اوپر اجمالاً یہ بتا دیا گیا اہل ہدایت کو جزا ملے گی اور اہل ضلالت کو سزا' اب یہاں بتایا جاتا ہے کہ حساب میں کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہوگی ۔

وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا وَلِيُوَفِّيَهُمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۴۶ : ۱۹)

"دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے درجے ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں تاکہ اللہ ان کے کیے کا پورا پورا بدلہ ان کو دے ۔ ان پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا" ۔

ہر فرد کا اپنا اپنا ستام ہے اور ہر فرد کی اپنی اپنی کمائی ہے ۔ اور ہر فرد کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ ملے گا ۔ جن دو نمونوں کا اوپر ذکر ہوا ۔ لوگوں میں بالعموم پائے جاتے ہیں ۔ لیکن یہاں قرآن مجید نے ان کا تعین دو کرداروں اور دو

افراد کی طرح کیا ہے اور یہ انداز اچھی طرح ذہن نشین ہوتا ہے ۔ یوں گویا ایک متعین مثال کو بیان کیا جا رہا ہو ۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ آیات بعض متعین افراد کے بارے میں وارد ہوئی ہیں لیکن ان میں سے کوئی روایت بھی صحت کے درجے میں نہیں ہے ۔ مناسب یہی ہے کہ ان دونوں کو دو کرداروں کا بیان یا دو نمونے سمجھا جائے ۔ دونوں نمونوں کے بیان کے بعد قرآن کریم نے جو تبصرہ دونوں پر الگ الگ کیا ہے 'وہ عام ہے ۔ پہلے نمونے کے بعد وہ یہ تبصرہ آیا ہے ۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ (۴۶ : ۱۶) "اس طرح کے لوگوں سے ہم ان کے بہترین اعمال قبول کرتے ہیں اور ان کی برائیوں سے درگزر کر جاتے ہیں ۔ یہ جنتی لوگوں میں شامل ہوں گے ۔ اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جاتا رہا ہے" ۔ اور دوسرے کردار پر تبصرہ یہ ہے ۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ (۴۶ : ۱۸) "یہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے ۔ ان سے پہلے جنوں اور انسانوں کے جو ٹولے (اس قماش کے) ہو گزرے ہیں ۔ انہی میں یہ بھی شامل ہوں گے بے شک یہ گھاٹے میں رہ جانے والے لوگ ہیں" ۔ اور پھر دونوں فرقوں پر جو عام تبصرہ ہے ۔

وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِمَّا عَمِلُوا وَلِيُوَفِّيَهُمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۴۶ : ۱۹)

"دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے درجے ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں تاکہ اللہ ان کے کیے کا پورا پورا بدلہ ان کو دے ۔ ان پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا" ۔ ان سب سے معلوم ہوتا ہے ان آیات میں دو متعین افراد کی طرف اشارہ نہیں بلکہ دو عام کرداروں کا تذکرہ ہے جو ہر زمان و مکان میں پائے جاتے ہیں ۔

--- ○○○ ---

اب ان کو قیامت کے ایک منظر کے سامنے کھڑا کر کے اس کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے کہ یہ ہوگا وہ دن جس کا تم انکار کرتے ہو ۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ (۴۶ : ۲۰) "پھر جب یہ کافر آگ کے سامنے لا کھڑے کیے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا "تم اپنے حصے کی نعمتیں اپنی دنیا کی زندگی میں ختم کر چکے اور ان کا لطف تم نے اٹھا لیا 'اب جو تکبر تم زمین میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں 'ان کی پاداش میں آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا" ۔

یہ اسکرین پر سے بڑی تیزی سے گزر جانے والی ایک جھلک ہے ۔ گو ایک فیصلہ سنا دیا گیا لیکن دیکھنے والا گہرے غوروفکر میں ڈوب جاتا ہے ۔ یہ منظر اس وقت کا ہے جب آگ میں ڈالے جانے سے قبل وہ جہنم کے اوپر لائے جائیں گے ۔ اس وقت ان کو بتا دیا جائے گا جس طرح مجرم کو سزا سے قبل سنا دیا جاتا ہے ۔

اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِىْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَ اسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا (۴۶ : ۲۰) "تم اپنے حصے کی نعمتیں اپنی دنیا کی زندگی میں ختم کر چکے اور ان کا لطف تم نے اٹھا لیا" ۔ دنیا میں ان کو اللہ نے بہت سی پاکیزہ چیزیں دی تھیں لیکن انہوں نے دنیا کی عیش و عشرت ہی میں سب کچھ لٹا دیا اور آخرت کے لیے کچھ بھی باقی نہ چھوڑا ۔ انہوں نے آخرت کا کوئی خیال نہ رکھا ۔ اس طرح دنیا ہی میں چر چگ گئے جس طرح جانور چر چگ جاتے ہیں ۔ اور کل کا خیال نہیں کرتے ۔ نہ اللہ کا شکر ادا کیا ۔ نہ حرام سے بچے اور نہ کوئی نیک کام کیا ۔ ان کے اس رویہ کی وجہ سے اللہ نے ان کو دنیا ہی دے دی اور آخرت میں محروم کر دیا ۔ ان کی بڑی غلطی یہ تھی کہ دنیا کے ان مختصر لمحات کے عیش کے لیے انہوں نے آخرت کی نہ ختم ہونے والی طویل زندگی کو بھلا دیا جس کی طوالت کا تصور بھی انسان نہیں کر سکتا ۔

فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ (۴۶ : ۲۰) "اب جو تکبر تم زمین میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں ان کی پاداش میں آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا" ۔ اس دنیا میں جو شخص بھی تکبر کرتا ہے وہ ناحق ہی کرتا ہے ۔ تکبر اور کبریائی صرف اللہ کی چادر ہے ۔ بڑائی کا حق اللہ کے بندوں کو نہیں ہے ۔ نہ کم نہ زیادہ اور یہ توہین آمیز سزا اسی تکبر کے بدلے میں ہے اور جو لوگ فسق و فجور اختیار کرتے ہیں وہ بھی تکبر کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں اسی لیے ان کو بھی توہین آمیز سزا دی جائے گی کیونکہ عزت تو اللہ ' رسول اللہ اور مومنین کے لیے مخصوص ہے ۔

یہ سبق انسانوں کے یہ دو ماڈل پیش کر کے یہاں ختم ہوتا ہے جس میں منکرین آخرت ' بدکاروں اور مستکبرین فی الارض کے لیے توہین آمیز سزا کا اعلان کیا گیا ہے ۔ اسے پڑھ کر فطرت سلیمہ رکھنے والے لوگ خدا خوفی پر آمادہ ہو کر سیدھی اور محفوظ راہ لیتے ہیں ۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۳۹ ایک نظر میں

یہ سبق گزشتہ دو اسباق سے بالکل مختلف موضوع پر ہے ۔گزشتہ اسباق میں انسانی قلب و نظر کو جن زاویوں سے لیا گیا تھا اس سبق میں ان سے مختلف بالکل ایک نیا پہلو لیا گیا ہے اس سبق میں مشرکین مکہ کو وادی احقاف کی سیر کرائی جاتی ہے کہ یہ وادی اور دوسری وادیاں جو تباہ ہوئیں وہ مکہ کے ارد گرد واقع تھیں ۔اور یہ لوگ ان واقعات سے پوری طرح باخبر تھے جو قوم عاد اور ان کے رسول حضرت ہود علیہ السلام کو پیش آئے ۔انہوں نے بھی اپنے رسول سے وہی سلوک کیا تھا جو یہ حضرت نبی کریمؐ سے کر رہے ہیں ۔انہوں نے بھی یہی اعتراضات کیے تھے جو یہ کر رہے ہیں ۔اور حضرت ہود نے بھی آداب نبوت کے حدود و قیود کے اندر ان کو جوابات دیئے تھے' لیکن اہل مکہ کو معلوم ہے کہ ان پر اللہ کا کیسا سخت عذاب آیا ۔ان کی قوت اس عذاب کا مقابلہ نہ کر سکی ۔حالانکہ اہل مکہ سے وہ زیادہ قوی الجثہ تھے ۔ان کی دولت اور ثروت ان کو کوئی فائدہ نہ دے سکی ۔حالانکہ وہ ان سے زیادہ دولت مند تھے ۔وہ انہی کی طرح آنکھیں' کان اور دل و دماغ رکھتے تھے مگر انہوں نے ان سے فائدہ نہ اٹھایا ۔ان کے مقابلے میں وہ ذہنی لحاظ سے بھی اونچے تھے اور انہوں نے جو الٰہ بنا رکھے تھے وہ بھی ان کی مدد کو نہ پہنچ سکے ۔

غرض مشرکین مکہ کو خود اپنے اسلاف کے انجام کے سامنے کھڑا کر کے قرآن ان کا نقشہ ان کے سامنے پیش کرتا ہے ۔اور بتاتا ہے کہ رسالت کا یہ ایک ہی سلسلہ اور شجرہ ہے' ایک ہی دعوت ہے اور سنت الٰہیہ بھی ایک ہے ۔انہوں نے انکار کیا ۔ہلاک ہوئے' تم انکار کرتے ہو' ہلاکت کے مستحق بنتے ہو ۔عقیدۂ توحید کوئی نیا گھڑا ہوا عقیدہ نہیں ہے' یہ دعوت نوح علیہ السلام سے ادھر تاریخ میں چلی آ رہی ہے ۔زمان و مکان کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے ۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۳۹ تشریح آیات

## ۲۱ --- تا --- ۲۸

---

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ۭ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ
النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖٓ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ
اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۲۱ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ
فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۲۲ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ڮ وَ
اُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝۲۳ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا
مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ
رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۲۴ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى
اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۲۵ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ
مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ڮ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ
سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ
اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۲۶ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ

الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ۭ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾

"ذرا انہیں عاد کے بھائی (ہود) کا قصہ سناؤ جب کہ اس نے احقاف میں اپنی قوم کو خبردار کیا تھا اور ایسے خبردار کرنے والے اس سے پہلے بھی گزر چکے تھے اور اس کے بعد بھی آتے رہے ... کہ "اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو' مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔ انہوں نے کہا "کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں بہکا کر ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دے؟ اچھا تو لے آ' اپنا وہ عذاب جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے اگر واقعی تو سچا ہے۔ اس نے کہا "اس کا علم تو اللہ کو ہے' میں صرف وہ پیغام تمہیں پہنچا رہا ہوں جسے دے کر مجھے بھیجا گیا ہے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔ پھر جب انہوں نے اس عذاب کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے "یہ بادل ہے جو ہم کو سیراب کر دے گا" ... "نہیں' بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے۔ یہ ہوا کا طوفان ہے جس میں دردناک عذاب چلا آرہا ہے' اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گا"۔ آخر کار ان کا حال یہ ہوا کہ ان کے رہنے کی جگہوں کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔ ان کو ہم نے وہ کچھ دیا تھا جو تم لوگوں کو نہیں دیا ہے۔ ان کو ہم نے کان' آنکھیں اور دل' سب کچھ دے رکھے تھے' مگر نہ وہ کان ان کے کسی کام آئے' نہ آنکھیں' نہ دل۔ کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے' اور اسی چیز کے پھیر میں وہ آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ تمہارے گردوپیش کے علاقوں میں بہت سی بستیوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں۔ ہم نے اپنی آیات بھیج کر بار بار طرح طرح سے ان کو سمجھایا' شاید کہ وہ باز آجائیں۔ پھر کیوں نہ ان ہستیوں نے ان کی مدد کی جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہوئے معبود بنا لیا تھا؟ بلکہ وہ تو ان سے کھوئے گئے' اور یہ تھا ان کے جھوٹ اور ان بناوٹی عقیدوں کا انجام جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے"۔

احقاف' حقف کی جمع ہے جس کے معنی ریت کے بلند ٹیلے کے ہیں' اہل عاد کے مکانات جزیرۃ العرب کے جنوب میں حضرموت کے علاقے میں بلند ٹیلوں پر تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی عاد کی کہانی سنائیں اور یہ بتائیں کہ ان کے بھائی ہود نے بھی اسی طرح اپنی قوم کو ڈرایا تھا۔ یہ اس لیے کہ حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت کے مقابلے میں قوم عاد کا ردعمل ایسا ہی تھا جس طرح اہل قریش آپ کی دعوت کی تکذیب کر رہے ہیں جس طرح آپ ان میں سے ہیں اسی طرح حضرت ہود بھی عاد ہی میں سے تھے۔ یہ لوگ ذرا سنبھلیں کہ دعوت حق کی تکذیب کے ویسے ہی نتائج بھی ہو سکتے ہیں۔ عاد کا علاقہ قریش کے قریب تھا اور ان کے واقعات سے وہ باخبر بھی تھے۔

عاد کے بھائی ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو ڈرایا' حضرت ہود بھی رسولوں میں سے کوئی پہلے رسول نہ تھے۔ ان سے پہلے بھی کئی اقوام میں رسول آچکے تھے۔

وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ (۴۶ : ۲۱) ''اور ایسے خبردار کرنے والے ان سے پہلے بھی گزر چکے تھے اور اس کے بعد بھی آتے رہے''۔ زمان و مکان کے اعتبار سے ان کے قریب بھی تھے اور ان سے دور بھی تھے۔ کیونکہ لوگوں کو انجام بد سے ڈرانے کا سلسلہ اللہ نے اپنی مخلوق کے لیے جاری رکھا' دعوت و رسالت زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ یہ کوئی عجیب و غریب اور غیر معمولی بات تو نہ تھی۔

اور ان کو اس چیز اور اس دعوت اور اسی بات سے ڈراؤ جس سے تمام رسول ڈراتے رہے۔

أَلَّا تَعْبُدُوٓا۟ إِلَّا ٱللَّهَ إِنِّىٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۴۶ : ۲۱) ''کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو' مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ ہے''۔ اللہ کی بندگی کرو' یعنی عقیدہ بھی توحید کا رکھو اور پوری زندگی میں اطاعت بھی اللہ کے احکام کی کرو' اور اگر تم اس دعوت کی مخالفت کرو گے تو اس کے نتیجے میں دنیا و آخرت کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اشارہ یوم عظیم کے عذاب کی طرف ہے۔ یوم عظیم کا اطلاق قرآن مجید میں قیامت پر ہوتا ہے کہ قیامت کی خوفناکیاں عظیم و شدید ہیں۔

توجہ الی اللہ کی اس دعوت اور عذاب الٰہی سے ڈرانے کا انجام کیا ہوا۔

---ooo---

قَالُوٓا۟ أَجِئْتَنَا لِتَأْفِكَنَا عَنْ ءَالِهَتِنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ

(۴۶ : ۲۲) ''انہوں نے کہا ''کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں بہکا کر ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دے؟ اچھا تو لے آ' اپنا وہ عذاب جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے اگر واقعی تو سچا ہے''۔

انہوں نے اپنے بھائی پر بدگمانی کی اور الٹا ان کو چیلنج دے دیا کہ لاؤ وہ عذاب جس سے ڈراتے ہو اور اس کے ساتھ انہوں نے ان کا مذاق بھی اڑایا۔ اور باطل پر اصرار کیا۔ حضرت ہود ایک نبی کی طرح یہ سب باتیں برداشت کرتے ہیں۔ کوئی بڑا دعویٰ نہیں کرتے اور اپنے حدود میں رہتے ہوئے کہتے ہیں۔

---ooo---

قَالَ إِنَّمَا ٱلْعِلْمُ عِندَ ٱللَّهِ وَأُبَلِّغُكُم مَّآ أُرْسِلْتُ بِهِۦ وَلَٰكِنِّىٓ أَرَىٰكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ (۴۶ : ۲۳) ''اس نے کہا ''اس کا علم تو اللہ کو ہے' میں صرف وہ پیغام تمہیں پہنچا رہا ہوں جسے دے کر مجھے بھیجا گیا ہے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو''۔

میں تو تمہیں عذاب سے ڈراتا ہوں کیونکہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہیں ڈراؤں۔ مجھے کیا معلوم کہ عذاب کب آئے گا اور عذاب کیسا ہو گا۔ ان امور کا علم تو اللہ کے پاس ہے۔ میں تو اللہ کی طرف سے صرف پیغام پہنچانے والا ہوں۔ میں اللہ کے ساتھ علم اور قدرت میں شریک نہیں ہوں۔

وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ (۴۶ : ۲۳) "مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو"۔ بہت ہی کم عقل نظر آرہے ہو' اس سے بڑی حماقت اور کیا ہوگی کہ ایک بھائی اور ناصح مشفق ڈرا رہا ہے اور جواب میں وہ چیلنج دیتے ہیں۔

حضرت ہود اور ان کی قوم کے درمیان دعوت اسلامی کے سلسلے میں طویل مکالمہ اور مجادلہ ہوا تھا۔ یہاں قرآن کریم اسے مختصر کر دیتا ہے کیونکہ یہاں جلد جلد ان کے سامنے انجام بد پیش کرنا ہے' تاکہ ان کے چیلنج اور جلد بازی کا جواب دیا جا سکے۔

---ooo---

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۴) تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (۲۵) (۴۶ : ۲۴ — ۲۵) "پھر جب انہوں نے اس عذاب کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے "یہ بادل ہے جو ہم کو سیراب کر دے گا"۔۔۔ "نہیں' بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے۔ یہ ہوا کا طوفان ہے جس میں دردناک عذاب چلا آرہا ہے' اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گا"۔ آخرکار ان کا حال یہ ہوا کہ ان کے رہنے کی جگہوں کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں"۔

روایت میں آتا ہے کہ ان کو شدید گرمی نے آلیا۔ بارش رک گئی اور خشکی اور سخت گرمی کی وجہ سے علاقہ آگ اور دھواں بن گیا۔ اس کے بعد بادل کا ایک ٹکڑا آیا۔ یہ لوگ بہت خوش ہوئے اور ان لوگوں نے وادیوں میں نکل کر اس بادل کا استقبال کیا۔ سمجھتے تھے کہ بس اب بارش ہوگی۔

قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (۴۶ : ۲۴) "یہ بادل ہے جو ہم کو سیراب کر دے گا"۔
اور لسان الحال نے ان کو یہ جواب دیا۔

بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۴۶ : ۲۴) تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا (۴۶ : ۲۵) "نہیں بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے۔ یہ ہوا کا طوفان ہے جس میں دردناک عذاب چلا آرہا ہے۔ اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گا"۔ یہ نہایت تیز چلنے والی ہوا ہے۔ اور اس قدر سخت اور بے قابو ہے جس طرح کوئی سرکش جابر ہوتا ہے۔

مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ (۵۱ : ۴۲) "جس چیز پر بھی وہ گزر گئی اسے بوسیدہ کر کے رکھ دیا"۔ قرآن کی اس آیت میں ہوا کو ایک زندہ مخلوق کی طرح بتایا گیا ہے گویا وہ سنتی ہے اور

اسے حکم دیا جاتا ہے کہ ان کو نیست و نابود کر کے رکھ دو۔

تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِأَمْرِ رَبِّهَا (۴۶: ۲۵) "اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کرنے والی" یہ ہے وہ کائناتی حقیقت جس کا شعور قرآن کریم بار بار انسانوں کو دیتا ہے ـ یوں کہ یہ کائنات بھی اسی طرح زندہ ہے جس طرح ہم زندہ ہیں ـ اس کی تمام قوتیں شعور رکھتی ہیں ـ یہ تمام اشیاء اللہ کے احکام لیتی ہیں اور بجالاتی ہیں ـ انسان بھی ان قوتوں میں سے ایک قوت ہے ـ جب وہ ایمان لے آئے اور اس کا قلب معرفت الٰہی کے لیے کھل جائے تو پھر وہ بھی اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائناتی قوتوں سے پیغام لے سکتا ہے ـ ان کے ساتھ ہمقدم ہو کر چل سکتا ہے ـ اور یہ قوتیں بھی اس کے ساتھ چل سکتی ہیں ـ یہ چیزیں بھی مومن کے ساتھ اس طرح ہمقدم ہو کر چلتی ہیں، لیکن اس ہم آہنگی کی صورت وہ نہیں ہوتی جو زندہ انسانوں کی ہوتی ہے ـ درحقیقت گو ہر چیز زندہ ہے لیکن اس کی زندگی اس طرح نہیں جس طرح کی زندگی کے ہم عادی ہیں ـ ہم صرف زندگی کی ظاہری صورتیں ہی دیکھ سکتے ہیں اور اس ظاہر بینی کی وجہ سے باطن صورتیں ہم نہیں دیکھ سکتے ـ جن لوگوں کی چشم بصیرت کھل جاتی ہے ـ وہ دیکھ سکتے اگرچہ ہماری یہ آنکھیں ان کو نہیں دیکھ سکتیں۔

بہرحال اس ہوا کو جو حکم دیا گیا اس نے وہ پورا کر دیا ـ اس نے ہر چیز کو نیست و نابود کر دیا۔

فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰٓ إِلَّا مَسَٰكِنُهُمْ (۴۶: ۲۵) "آخر کار ان کا حال یہ ہوا کہ ان کے رہنے کی جگہوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا" ـ رہے وہ، ان کے مویشی، ان کے مال و اسباب تو ان میں سے کوئی چیز نہ رہی ـ خالی خولی مکانات و محلات رہ گئے ـ کوئی زندہ شخص ان میں نہ تھا۔

كَذَٰلِكَ نَجْزِى ٱلْقَوْمَ ٱلْمُجْرِمِينَ (۴۶: ۲۵) "اس طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں"۔ یہ سنت جاریہ ہے اور مجرموں پر نافذ ہونے والی تقدیر الٰہی ہے۔

--- ○○○ ---

تباہی کے اس نقشے کو دیکھنے والوں کی طرف ایک نکتہ توجہ! کہ دیکھو حضرت ہود کی قوم کی طرح تم بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہی سلوک کر رہے ہو۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّٰهُمْ فِيمَآ إِن مَّكَّنَّٰكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَأَبْصَٰرًا وَأَفْـِٔدَةً فَمَآ أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ أَبْصَٰرُهُمْ وَلَآ أَفْـِٔدَتُهُم مِّن شَىْءٍ إِذْ كَانُوا۟ يَجْحَدُونَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا۟ بِهِۦ يَسْتَهْزِءُونَ (۴۶: ۲۶) "ان کو ہم نے وہ کچھ دیا تھا جو تم لوگوں کو نہیں دیا ہے ـ ان کو ہم نے کان، آنکھیں اور دل سب کچھ دے رکھے تھے مگر نہ وہ کان ان کے کسی کام آئے، نہ آنکھیں، نہ دل ـ کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے، اور اسی چیز کے پھیر میں وہ آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے"۔

یہ لوگ جن کو اللہ کی قوتوں میں سے ایک معمولی قوت ہوا نے نیست و نابود کر دیا، ان کو ہم نے وہ قوت دی جو

اے اہل قریش ، تم کو نہیں دی گئی ۔ قوت ، مال ، علم اور سازوسامان میں وہ تم سے زیادہ تھے ۔ اسی طرح سننے ، دیکھنے اور سوچنے کی قوت بھی ان میں تم سے زیادہ تھی ۔ قرآن کریم قوت مدرکہ کو کبھی دل کہتا ہے ، کبھی دماغ کہتا ہے اور کبھی عقل کہتا ہے ۔ سب سے مراد قوت مدرکہ ہوتی ہے ۔ یعنی ان کے یہ حواس بڑے ترقی یافتہ تھے مگر انہوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا ۔ انہوں نے راہ ہدایت دیکھنے میں ان کو معطل کر دیا ۔

اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ( ۴۶ : ۲۶ ) "کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے" ۔ اور جب انسان آیات الٰہیہ کا انکار کر دے تو اس کے حواس معطل ہو جاتے ہیں اور اس کا احساس روشنی اور نور اور ادراک ختم ہو جاتا ہے ۔

وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ( ۴۶ : ۲۶ ) "اور اسی چیز کے پھیر میں وہ آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے" ، یعنی عذاب الٰہی اور مصیبت ۔

اس واقعہ سے قرآن ہر صاحب سمع و بصر اور قلب کو جو سبق دینا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی قوت والا اپنی قوت پر مغرور نہ ہو ، کوئی مالدار شخص اپنے مال پر مغرور نہ ہو ، کوئی صاحب علم اپنے علم پر مغرور نہ ہو ۔ اس لیے کہ اللہ کی ان کائناتی قوتوں میں سے یہ ایک ہی قوت تھی جسے اللہ نے ان زبردست قوت والے ، مال والے اور علم والے لوگوں پر مسلط کیا اور انہیں ختم کر کے رکھ دیا ۔ اور وہ یوں رہ گئے کہ صرف عالیشان ، مکانات ہی رہ گئے اور بس ۔ اور جب اللہ کی پکڑ آتی ہے تو یہی ہوتا ہے ۔

ہوا ایک ایسی قوت ہے جو مسلسل کام کرتی ہے اور یہ اللہ کے کائناتی نظام کے مطابق چلتی ہے ۔ اللہ جس وقت چاہے اسے بربادی پر مامور کر دے ۔ عام طور پر تو وہ تعمیر کا کام کرتی ہے لیکن جب اللہ چاہے تو وہ ہلاک کرنا شروع کر دیتی ہے ۔ تمام کائناتی قوتیں جو ایک ڈگر پر کام کرتی نظر آتی ہیں ان کا سبب ان کے اندر یہی امر ربی ہے اور جب امر ربی دوسرا حکم دے تو یہ دوسرا کام کرتی ہیں جو کوتاہ نظر انسانوں کو خارق عادت نظر آتا ہے ۔ نظام اسباب پیدا کرنے والا اللہ ہے ۔ وہ ہر چیز کو ، ہر حرکت کو ، ہر حادثہ کو ، ہر رجحان کو ، ہر شخص کو اور ہر کام کو اپنے احکام اور اپنے نقشے کے مطابق چلاتا ہے ۔ اور جس جگہ بھی وہ کام ہوتا ہے اس کی تقدیر کے مطابق ہوتا ہے ۔ اگرچہ ہمیں وہ کام خارق عادت نظر آئے ۔

ہوا بھی دوسری کائناتی قوتوں کی طرح اپنا مقررہ وظیفہ سرانجام دیتی ہے ۔ اسی طرح انسانی قوت اور دوسری کائناتی قوتیں جو انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہیں وہ کائناتی نقشے کے مطابق کام کرتی ہیں ۔ جونہی انسان حرکت میں آتا ہے یہ قوتیں بھی اس کے ہم قدم ہو کر حرکت کرتی ہیں ۔ یوں وہ اسکیم اپنا کام کرتی ہے جو اللہ نے اس دنیا کے لیے مقرر کی ہے ۔ انسان کو جو ارادے کی آزادی دی گئی ہے تو وہ اس کائناتی نظام کے فریم ورک کے اندر ہے ۔ جسے اس کائنات کا ناموس کلی کہا جاتا ہے جسے نظام قضا و قدر کہا جاتا ہے ۔ اور جسے سنت الٰہیہ کہا جاتا ہے جس کے اندر کوئی تغیر اور اضطراب نہیں ہوتا ۔

---()()---

اب اس سبق کا خاتمہ ایک عام تبصرے پر ہوتا ہے جس میں عاد کے سوا دوسری بستیوں کا بھی ذکر ہے جو مکہ کے ارد گرد زمانہ ماقبل میں ہلاک ہوئیں ۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَ صَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۲۷) فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ وَ ذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَ مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۴۶ : ۲۸) ”تمہارے گردوپیش کے علاقوں میں بہت سی بستیوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں۔ ہم نے اپنی آیات بھیج کر بار بار طرح طرح سے ان کو سمجھایا' شاید کہ وہ باز آجائیں۔ پھر کیوں نہ ان ہستیوں نے ان کی مدد کی جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہوئے معبود بنالیا تھا؟ بلکہ وہ تو ان سے کھوئے گئے' اور یہ تھا ان کے جھوٹ اور ان بناوٹی عقیدوں کا انجام جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے“۔

جزیرۃ العرب میں کئی بستیوں کو ہلاک کیا گیا تھا' جنہوں نے رسولوں کی تکذیب کی تھی۔ احقاف میں عاد ہلاک ہوئے۔ یہ جنوب میں تھے اور ثمود حجر میں ہلاک ہوئے جو شمال میں تھے اور سبا یمن میں ہلاک ہوئے اور اہل مدین شام کی راہ میں تھے۔ اسی طرح ذرا مزید شمال میں لوط کی بستیاں تھیں اور اہل عرب ان کی کہانیوں سے بھی واقف تھے اور ان بستیوں سے گزرتے رہتے تھے۔

ان آیات میں اللہ نے ان کی طرف ان کے انجام کی طرف اشارہ کیا کہ شاید مکہ کے مکذبین باز آجائیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے ان کو بار بار سمجھایا مگر وہ باز نہ آئے۔ اور اپنی گمراہی میں بڑھتے ہی چلے گئے۔ تب ان پر ہمارے عذاب آئے' قسم قسم کے عذاب۔ ان کے بارے میں بعد کے آنے والے ان کی کہانیاں ایک دوسرے کو سناتے رہے۔ عرب کے موجودہ مشرک بھی ان کو سنتے اور جانتے ہیں اور صبح و شام ان بستیوں میں سے گزرتے رہتے ہیں اور ان کے آثار ابھی تک قائم ہیں لیکن اے کاش کہ وہ عبرت لیتے۔

یہاں اب قرآن مجید مشرکین مکہ کو ایک حقیقت واقعہ بتاتا ہے۔ اللہ نے ان سے پہلے بھی مشرکین کو ہلاک کیا اور ان کو نیست و نابود کر دیا اور ان میں سے ایک شخص بھی زندہ نہ رہا۔ لیکن وہ جن معبودوں کو پکارتے تھے اور یہ گمان کرتے تھے کہ یہ ان کو اللہ کے قریب تر لاتے ہیں تو ان ہستیوں نے کیوں نہ اللہ کے غضب کو کم کر کے ان کو ہلاکت سے بچایا۔

فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً (۴۶ : ۲۸) ”پھر کیوں نہ ان ہستیوں نے ان کی مدد کی جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہوئے معبود بنالیا تھا“۔

نہ صرف یہ کہ ان ہستیوں نے ان کی مدد نہ کی بلکہ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ (۴۶ : ۲۸) ”بلکہ وہ تو ان سے کھوئے گئے“۔ اور انہوں نے ان لوگوں کو اکیلا چھوڑ دیا' اور ان کو ان معبودوں تک پہنچنے کا راستہ بھی معلوم نہ ہوا تاکہ وہ ان کو پکڑیں اور اللہ کے عذاب سے بچنے میں ان کی مدد لیں۔

وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَ مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۴۶ : ۲۸) ”اور یہ تھا ان کا جھوٹ اور ان بنیادی عقیدوں کا انجام جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے“۔ یہ جھوٹ اور افتراء ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کا یہ انجام ہے۔ اور یہ ان معبودان باطل کی حقیقت ہے۔ اور اس شرک اور عبادت کا یہ انجام ہے کہ یہ لوگ نیست و نابود کر دیئے گئے۔ لہٰذا مکہ کے ان مشرکوں کو جو ان معبودوں کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ انہیں خدا کے قریب کریں گے' اپنے اس فعل کے بارے میں سوچ لینا چاہئے کہ اس کا انجام کیا ہوگا اور ایسے عقائد کا انجام تاریخ میں کیا ہوتا رہا ہے۔

# درس نمبر ۲۴۰ ایک نظر میں

اس سورت کا یہ آخری سبق ہے اس سورت کے موضوع کی وضاحت کے لیے یہ ایک نئی وادی میں سفر ہے ۔ ایک واقعہ کہ جنوں نے قرآن کی دعوت کو سنا ۔ تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ خاموشی سے سنو ۔ اور سن کر یہ طے کیا کہ ہم ایمان لاتے ہیں ۔ وہ ایمان لائے اور اپنی قوم میں جاکر انہوں نے دعوت دین کے کام کا آغاز کر دیا ۔ اپنی قوم کو عذاب جہنم سے ڈراتا اور جنت کی خوشخبری دینا شروع کر دیا ۔ اور انہوں نے اپنی قوم کو متنبہ کیا کہ اگر تم نے منہ موڑا اور گمراہی اختیار کی تو نتائج اچھے نہیں ہوں گے ۔

جنوں کی خبر کو یہاں اس انداز سے پیش کرنا اور یہ دکھانا کہ قرآن مجید کا ان کے دلوں پر کس طرح اثر ہوا اور انہوں نے ایک دوسرے سے کہا خاموش ہو کر سنو' پھر جس گہرے تاثر کے ساتھ انہوں نے قرآن مجید کی تعلیمات کو اپنی قوم کے سامنے پیش کیا ۔ یہ سب امور انسانی دلوں کو متاثر کرنے والے ہیں کیونکہ اصل میں تو قرآن انسانوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ جنوں کے تاثرات جس طرح قرآن نے قلم بند کیے ہیں' وہ بہت ہی پرتاثیر انداز ہے ۔ خصوصاً جبکہ جن بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ٹھیک موسیٰ علیہ السلام کے بعد یہ تعلیمات آرہی ہیں ۔ قرآن کا اشارہ یہ ہے کہ اس حقیقت کو جنوں نے تو پا لیا مگر انسان اس سے غافل ہیں کہ قرآن جو دعوت دے رہا ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد پہلی دعوت ہے ۔ چنانچہ یہ بات پوری سورت کے مضمون کے ساتھ گہرا ربط اور مناسبت رکھتی ہے ۔ پھر جنوں نے بھی اس کائنات کی کھلی کتاب کی نشانیوں کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تعلیمات قرآنی کی تصدیق خلق سموات و ارض سے ہو سکتی ہے ۔ اور یہی تخلیق کائنات دوبارہ تخلیق پر بھی شاہد عادل ہے ۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس پر انسانوں نے ہمیشہ بحث اور جدال کیا ہے ۔

مسئلہ حشر و نشر کے حوالے ہی سے ایک منظر پیش کیا جاتا ہے کہ یہ ہوگی قیامت ۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ (۴۶ : ۳۴) "جس روز یہ کافر آگ کے سامنے لائے جائیں گے"۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وصیت کی جاتی ہے کہ ان کی ایذا رسانیوں پر صبر کریں اور ان پر عذاب لانے کے لیے جلدی نہ فرمائیں اور ان کو چھوڑ دیں ۔ قیامت کی گھڑی قریب ہے ۔ اور جس دن برپا ہوگی تو وہ کہیں گے ہم تو دنیا میں ایک گھڑی بھر ہی رہے' بس ہلاکت سے قبل تبلیغ ہی کی گئی ۔

---OOO---

# درس نمبر ۲۴۰ تشریح آیات

## ۲۹ --- تا --- ۳۵

---

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا
حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ
اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى
الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۰﴾ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ
لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۱﴾ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ
فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ
مُّبِيْنٍ ﴿۳۲﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ
بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يُّحْيِۦ الْمَوْتٰى ۭ بَلٰٓي اِنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۳﴾ وَ
يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَي النَّارِ ۭ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ۭ
قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۴﴾ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ
مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۭ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا
اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ۭ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ الربع ع ون ۴

”اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے ) جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں۔

جب وہ اس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو انہوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔ انہوں نے جا کر کہا "اے ہماری قوم کے لوگو' ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے' تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی' رہنمائی کرتی ہے حق اور راہ راست کی طرف۔ اے ہماری قوم کے لوگو' اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کر لو اور اس پر ایمان لے آؤ' اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں عذاب الیم سے بچا دے گا"۔ اور جو کوئی اللہ کے داعی کی بات نہ مانے وہ نہ زمین میں خود کوئی بل بوتا رکھتا ہے کہ اللہ کو زچ کر دے' اور نہ اس کے کوئی ایسے حامی و سرپرست ہیں کہ اللہ سے اس کو بچا لیں۔ ایسے لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور کیا ان لوگوں کو یہ سجھائی نہیں دیتا کہ جس خدا نے یہ زمین اور آسمان پیدا کیے اور ان کو بناتے ہوئے وہ نہ تھکا' وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ مردوں کو جلا اٹھائے؟ کیوں نہیں' یقیناً وہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے۔ جس روز یہ کافر آگ کے سامنے لائے جائیں گے' اس وقت ان سے پوچھا جائے گا "کیا یہ حق نہیں ہے؟" یہ کہیں گے "ہاں' ہمارے رب کی قسم (یہ واقعی حق ہے)"۔ اللہ فرمائے گا "اچھا تو اب عذاب کا مزہ چکھو اپنے اس انکار کی پاداش میں جو تم کرتے رہے تھے۔ پس اے نبیؐ' صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے' اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو۔ جس روز یہ لوگ اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے تو انہیں معلوم ہو گا کہ جیسے دنیا میں دن کی ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے تھے۔ بات پہنچا دی گئی' اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہو گا؟"

جنوں نے نہایت خشوع اور خضوع کے ساتھ قرآن کو سنا اور اس کے بعد انہوں نے جو تبصرہ کیا اور قرآن نے یہاں اسے نقل کیا' اس میں اسلامی نظریہ حیات کی تمام بنیادی باتیں آگئی ہیں۔ یعنی وحی الٰہی کی تصدیق' تورات اور قرآن کے تصورات میں وحدت' یہ اعتراف کہ ہم ایمان لاتے ہیں اور تصدیق کرتے ہیں' اور آخرت پر ایمان اور ان اعمال کی تصدیق جو جنت کو لے جانے والے ہیں اور ان اعمال کی تصدیق جو جہنم کو لے جانے والے ہیں۔ یہ اعتراف کہ اللہ پوری کائنات کا خالق ہے' وہی مخلوقات کا ولی ہے۔ اور یہ کہ تخلیق کائنات سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ یہی وہ مضامین ہیں جو اس پوری سورت میں لیے گئے ہیں اور سورت کے تمام اسباق کا موضوع ہیں۔ اور یہی موضوعات جنوں کی زبانی' جو انسانوں کے مقابلے میں ایک الگ مخلوق ہے' دوبارہ لائے گئے۔

ان آیات کی تشریح سے پہلے دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے' یہ کہ جن کیا ہیں اور یہ کہ یہ واقعہ کہاں اور کب ہوا۔ قرآن مجید کی طرف سے یہ ذکر کرنا کہ جنوں کے کچھ لوگوں نے قرآن کو سنا اور اس کے بعد یہ کہا اور یہ کیا' جنوں کے وجود کے لیے بس یہی کافی شافی دلیل ہے۔ اور نہ اس واقعہ کے بارے میں کچھ مزید کہنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات ثابت ہونے کے بعد کہ جن اس قابل ہیں کہ رسول خدا کی زبانی عربی قرآن کو سنیں اور عربی زبان کو سمجھیں۔ اور یہ کہ وہ ایک مخلوق ہیں جو ایمان اور کفر کے قابل ہیں' ہدایت اور ضلالت کے قابل ہیں' جنوں کی حقیقت اور انہیں ایک مخلوق ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جب اللہ ایک حقیقت کی تصدیق کر دے تو اس کے بعد اس مخلوق کی حقیقت کو مزید ثابت کرنا ایک بے معنی حرکت ہے۔ لیکن یہاں کلام کرنے کا ہمارا مقصد یہ ہے کہ انسانی تصور میں اس کی وضاحت ہو جائے۔

ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی اس کائنات میں' رازوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ اس کے اندر ایسی مخلوقات موجود ہیں جن

کی حقیقت ' صفات اور اثرات سے ہم بالکل واقف نہیں ـ اور ہم جن قوتوں اور رازوں کے اندر رہتے ہیں ـ ان میں سے صرف چند رازوں اور بھیدوں سے ابھی تک ہم واقف ہوئے ہیں ـ بہر حال آئے دن ہم ان بھیدوں کے انکشافات کرتے رہتے ہیں ـ اور اللہ کی مخلوقات میں سے بعض مخلوق کے بارے میں دریافت کر لیتے ہیں ـ بعض کی ذات معلوم کر لیتے ہیں ـ بعض کی صفات ہمیں معلوم ہو جاتی ہیں ـ اور بعض چیزوں کے تو صرف ہمارے ارد گرد آثار ہی پائے جاتے ہیں ـ

ابھی تک ہم نے اس کائنات کی شاہراہ پر ' جس کے اندر ہم رہتے ہیں ' اس کے رازوں کو معلوم کرنے کے سلسلے میں چند قدم ہی لیے ہیں ـ اس کائنات میں ہمارے آباء و اجداد رہ کر چلے گئے اور ہماری اولاد ان کی اولاد آنے والی ہے ـ ان سب لوگوں کو اس کائنات کے ایک چھوٹے سے ذرے کے اوپر رہنا ہے ـ اگر اس پوری کائنات کے حجم اور وزن کا تصور کیا جائے تو اس حجم اور وزن میں اس زمین کی حیثیت ایک ذرے کے برابر بھی نہیں ہے ـ

آج تک جو معلومات ہم فراہم کر سکے ہیں ' اگر ان معلومات کو آج سے صرف پانچ سو سال پہلے کی حالت کے مقابلے میں دیکھا جائے تو ہم جنوں سے بھی زیادہ بڑے بڑے عجائبات دریافت کر سکے ہیں ـ آج ہم ایٹم کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں ـ اگر آج سے پانچ سو سال پہلے کوئی ایسی باتیں کرتا تو لوگ کہتے کہ یہ مجنون ہے ـ یا کم از کم اسے جنات کے مقابلے میں زیادہ عجیب و غریب بات سمجھا جاتا ـ

ہمارا علم و ادراک ہمارے انسانی حدود و ادراک کے محدود دائرے کے اندر ہے اور ادراک کی یہ قوت ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس زمین پر وہ مقاصد پورے کرنے کے لیے دی گئی ہے جن کو ہم نے زمین کے اوپر منصب خلافت کے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں یہاں حاصل کرنا تھا ـ صرف اس محدود دائرے میں کہ زمین کی قوتیں ہمارے لیے مسخر ہوں ' ہمارے تابع ہوں تاکہ وہ فرائض ہم بحسن و خوبی ادا کر سکیں ـ ہمارے جس قدر انکشافات ہیں وہ اس دائرہ فرائض کے اندر ہیں اور ہم جس قدر بھی آگے بڑھ جائیں ہم اسی دائرے کے اندر ہی رہیں گے ـ یعنی اس دائرے کے اندر ہی رہیں گے جو اللہ نے ہمارے یہاں قیام اور خلافت ارضی کے لیے مقرر اور مقدر کر دیا ہے ـ نہ اس سے ہم آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ ہمیں اس کی کوئی ضرورت ہے ـ

مستقبل میں ہم مزید انکشافات کریں گے ـ ہم بہت کچھ جانیں گے ' اس قدر ہمارے علوم میں اضافہ ہو گا کہ ایٹم کے راز ہمارے لیے بچوں کا کھیل بن جائے گا ـ لیکن ان انکشافات کے باوجود ہم اس محدود دائرے کے اندر ہی رہیں گے جو اللہ نے ہمارے لیے مقدر کر دیا ہے ـ انسانی دائرے کے اندر رہیں گے ـ جس کے بارے میں اللہ نے فرمایا :

وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا "اور تمہیں جو علم دیا گیا ہے وہ بہت ہی قلیل ہے" ـ یعنی ان اسرار اور مخفیات کے مقابلے میں جو تمہارے علم سے باہر ہیں ـ صرف خالق کائنات ہی ان غائب باتوں کو جانتا ہے ـ کیونکہ اللہ کا علم غیر محدود ہے ـ اور انسانوں کا علم اور اس کے ذرائع علم محدود رہیں ـ

وَلَوْ اَنَّ مَا فِى الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ "اگر زمین میں جس قدر درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر کو سات اور سمندر سیاہی

بن کر مدد کے لیے آ پہنچیں تو اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں"۔

اگر بمقابلہ علم الہٰی ہماری حالت یہ ہے تو ہم صرف اپنی لاعلمی کی بنا پر بالجزم نہ کسی بات کی نفی کر سکتے ہیں اور نہ اثبات۔ نہ ان کا تصور کر سکتے ہیں اور نہ عدم تصور۔ یہ بہرحال اللہ کی کائنات کے غائب علاقوں کی باتیں ہیں اور کائنات کی ان قوتوں اور ان اسرار میں سے ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ہے۔ اسی بنا پر ایسی کسی شے کے بارے میں ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے ہیں جو ہمارے علم سے باہر ہے۔ جبکہ ابھی تک ہمیں خود اپنی ذات سے متعلق مکمل اسرار و رموز کا پتہ نہیں ہے کہ ہماری روح اور ہماری قوت مدرکہ کے حالات کیا ہیں۔ حقیقت جن تو بڑی بات ہے۔ بعض ایسے راز بھی ہو سکتے ہیں جن کا ہمارے لیے انکشاف مقدر ہی نہ کیا گیا ہو۔ مثلاً وہ تمام حقائق جن کے وجود کی قرآن نے اطلاع دی ہے' یا آثار بتائے ہیں کیونکہ ان حقائق کا جاننا ہمارے لیے ضروری نہیں ہے اس لئے کہ اس زمین پر انسان نے جو فریضہ ادا کرنا ہے اس کے لیے اس کی کوئی افادیت نہیں ہے۔

اگر اللہ نے اپنے کلام کے ذریعہ ہمیں کچھ اسرار بتا دیئے ہیں' اور ان تک ہم اپنے تجربات کے ذریعے نہیں پہنچے تو ہمارا فرض یہ ہے کہ جس قدر علم اللہ نے دے دیا ہے (بذریعہ اطلاع) ہم شکر اور تسلیم و رضا کے ساتھ اسے قبول کر لیں۔ ہم اس کے بارے میں اسی قدر عقیدہ رکھیں جس قدر اللہ نے بتا دیا ہے۔ نہ اس میں کمی کریں اور نہ اس میں اضافہ کریں۔ اور یہ کہیں کہ اس سلسلے میں حقیقت جاننے والے نے ہمیں اسی قدر بتایا ہے' اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں بتایا۔ دوسرا کوئی ذریعہ علم بھی نہیں ہے اور اس میدان میں ہمارا تجربہ بھی نہیں ہے۔

قرآن کریم کی ان آیات سے اور سورت جن کی آیات سے (اور راجح بات یہ ہے کہ سورت جن بھی اسی واقعہ کے بارے میں ہے) اور ان نصوص سے جو قرآن کریم میں جگہ جگہ جنوں کے بارے میں وارد ہیں اور ان احادیث سے جو جنوں کے بارے میں وارد ہیں اور صحیح ہیں۔ ہمیں جو حقائق معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔

ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مخلوق ہے جسے جن کہا جاتا ہے۔ یہ مخلوق آگ سے پیدا شدہ ہے۔ کیونکہ قرآن نے ابلیس کے بارے میں یہ کہا ہے۔

اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ "میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے اور اسے مٹی سے پیدا کیا ہے"۔ اور یہ بھی قرآن بتاتا ہے کہ ابلیس جنوں میں سے تھا۔

اِلَّآ اِبْلِیْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ "ماسوائے ابلیس کے یہ جنوں سے تھا۔ تو اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی"۔ غرض ابلیس کی ماہیت جنوں سے ہے۔

اس مخلوق کی خصوصیات انسانوں سے مختلف ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ آگ سے ہی ہے۔ یہ کہ وہ لوگوں کو دیکھتے ہیں اور لوگ انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ "بے شک وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھتا ہے' جبکہ تم ان کو نہیں دیکھ رہے"۔ اور یہ کہ انسانوں کی طرح ان کی بھی سوسائٹیاں اور قبیلے ہیں۔ جس طرح آیت سابقہ میں قبیلے کا ذکر

ہوا۔ اور یہ کہ یہ جن اسی زمین پر بستے ہیں اور بس سکتے ہیں۔ لیکن ان کی آبادیاں کہاں ہیں۔ اس کا ہمیں علم نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ نے جب آدم اور ابلیس سے کہا کہ تم جنت سے نکلو اور زمین پر جاؤ تو الفاظ یہ تھے :

اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ "اترو، تم میں سے بعض بعض دوسروں کے دشمن ہیں اور تمہیں حق ہو گا کہ زمین میں ٹھہرو اور ایک وقت تک متاع حیات کا بھی"۔

وہ جن جو سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کر دیئے گئے تھے، وہ آپ کے لیے کام بھی کرتے تھے، یہاں ان کو زندہ رہنے کی قدرت بھی دی گئی ہو گی تب ہی وہ کام کرتے ہوں گے۔ یہ کہ جن اس کرۂ ارض سے باہر بھی رہ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنوں کی یہ بات نقل کی ہے۔

وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّ شُهُبًا (۸) وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا (۹) (۷۲ : ۸ – ۹)

"اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو دیکھا کہ وہ پہریداروں سے پٹا پڑا ہے اور شہابوں کی بارش ہو رہی ہے، اور یہ کہ پہلے ہم سن گن لینے کے لیے آسمانوں میں بیٹھنے کی جگہ پا لیتے تھے مگر اب جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے لیے ایک شہاب ثاقب لگا ہوا پاتا ہے"۔

یہ کہ یہ جن انسانوں کو متاثر کر کے گمراہ کر سکتے ہیں اور مسلمانوں میں سے اللہ کے بندوں پر تو ان کا اثر نہیں ہوتا۔ البتہ گمراہ لوگوں پر وہ اثرات ڈال سکتے ہیں کیونکہ

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ "اس نے کہا بس تیری عزت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا، ماسوائے ان میں، تیرے مخلص بندوں کے"۔ اس قسم کی تمام دوسری آیات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں، البتہ یہ معلوم نہیں ہے کہ شیطانوں اور جنوں کی وسوسہ اندازی کس طرح ہوتی ہے۔ اور یہ کہ یہ جن انسانوں کی آواز سنتے ہیں۔ ان کی زبان کو سمجھتے ہیں کیونکہ جنوں کے ایک گروہ نے قرآن سنا، اس کو سمجھا اور اس سے متاثر ہوئے۔

اور یہ کہ انسانوں کی طرح جن بھی ہدایت اور گمراہی کے قابل ہیں۔ کیونکہ جنوں نے خود یہ اعتراف کیا۔

وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا (۱۴) وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (۱۵) (۷۲ : ۱۴، ۱۵) "اور یہ کہ ہم میں سے کچھ مسلم ہیں اور کچھ حق سے منحرف تو جنہوں نے اسلام اختیار کر لیا۔ انہوں نے نجات کی راہ ڈھونڈ لی اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں"۔ اور یہ کہ پھر وہ اپنی قوم کی طرف گئے اور ان کو ڈرانے لگے اور ان کو دعوت ایمان دینے لگے۔ جبکہ انہوں نے خود ایمان قبول کر لیا۔ اور ان کو معلوم ہو گیا کہ ان کی قوم دولت ایمان سے محروم ہے۔

یہ باتیں تو جنوں کے بارے میں یقینی ہیں۔ اور یہی ان کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اور اس پر ہم جو اضافہ کریں گے اس پر ہمارے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی۔ رہا وہ واقعہ جس کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جس کی طرف راجح روایات کے مطابق سورت جن بھی اشارہ کر رہی ہے۔ تو اس بارے میں متعدد روایات وارد ہیں۔

امام بخاری نے مسدد سے ' مسلم نے شیبان ابن فرخ سے انہوں نے ابو عوانہ سے اور امام احمد نے اپنی سند میں کہا: عفان سے انہوں نے ابو عوانہ سے ' ابوبکر بیہقی نے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں ابو الحسن علی ابن احمد ابن عبدان سے انہوں نے احمد ابن عبید الصفار سے انہوں نے اسماعیل قاضی سے ' انہوں نے مسدد سے انہوں نے ابو عوانہ سے انہوں نے ابو بشر سے انہوں نے سعید ابن جبیر سے کہ ابن عباس سے فرماتے ہیں: "رسول اللہؐ نے جنوں پر کلام الٰہی نہیں پڑھا۔ اور نہ ان کو دیکھا ہے۔ حضورؐ اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت کے ساتھ عکاظ کی طرف جارہے تھے۔ اس وقت شیاطین اور آسمانوں کی خبروں کے درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی اور ان پر شہاب ثاقب کی بارش کر دی گئی۔ تو شیاطین اپنی قوم کی طرف واپس آگئے قوم نے کہا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تو انہوں نے کہا ' ہمارے اور آسمانوں کی خبروں کے درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی ہے۔ اور ہم پر شہاب ثاقب چھوڑے گئے۔ تو انہوں نے کہا کہ تمہارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان جو رکاوٹ ڈال دی گئی ہے اس کی کوئی وجہ ہوگی تو چاہئے کہ زمین کے مشرق اور مغرب کے درمیان پھیل جاؤ اور دیکھو کہ وہ کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ رکاوٹ ڈال دی گئی ہے ' چنانچہ یہ بھی مشرق و مغرب میں پھیل گئے یعنی اطراف عالم میں ' وہ معلوم کرنے لگے کہ وہ کیا سبب ہے جس کی وجہ سے ہمارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان پابندی لگ گئی۔ تو وہ گروہ جو تہامہ کی طرف جا رہا تھا ' وہ لوگ رسول اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس وقت آپ نخلہ میں تھے اور عکاظ کے بازار کی طرف جارہے تھے۔ حضورؐ اس وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز فجر پڑھ رہے تھے۔ جب ان جنوں نے قرآن سنا تو متوجہ ہو کر سننے لگے۔ تو انہوں نے کہا خدا کی قسم یہ ہے وہ حقیقی سبب جس کی وجہ سے تم پر آسمانوں کی خبریں لینے پر پابندی لگ گئی ہے۔ جب یہ لوگ اپنی قوم کی طرف لوٹے تو انہوں نے یہ رپورٹ دی۔ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۱) یَّهْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (۲) (۷۲: ۱، ۲) "اے ہماری قوم کے لوگو ' ہم نے ایک بڑا عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس لیے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے"۔ رسول اللہ کو اطلاع دی گئی۔

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ (۷۲: ۱) "اے نبیؐ کہو میری طرف وحی بھیجی گئی کہ جنوں کے ایک گروہ نے قرآن کو غور سے سنا"۔ حضورؐ کی طرف دراصل جنوں کے اقوال وحی کیے گئے۔

امام مسلم ' ابو داؤد اور ترمذی نے علقمہ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کہا میں نے حضرت ابن مسعود سے پوچھا کہ جنوں کی رات تم میں سے کوئی حضورؐ کے ساتھ تھا۔ انہوں نے کہا: رات ہم میں سے کوئی بھی حضورؐ کے ساتھ نہ تھا۔ ہوا یوں کہ ایک رات ہم حضورؐ کے ساتھ تھے کہ حضورؐ غائب ہو گئے۔ تو ہم نے پہاڑیوں اور وادیوں میں آپؐ کو تلاش کرنا شروع کیا۔ ہم نے کہا کہ حضورؐ کو کوئی چیز لے اڑی یا آپؐ کو اچک لیا گیا۔ ہم نے یہ رات بہت ہی بری طرح گزاری۔

جب صبح ہوئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضور حرا کی طرف سے چلے آرہے ہیں۔ ہم نے کہا حضورؐ ہم نے رات کو آپؐ کو تلاش کیا اور آپؐ کو نہ پایا۔ اس وجہ سے ہم نے یہ رات اس قدر تکلیف میں گزاری جس قدر کوئی تکلیف سے کوئی رات گزار سکتا ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا: میرے پاس جنوں کا ایک شخص دعوت لے کر آیا تھا۔ میں اس کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے ان پر قرآن پڑھا تو یہ سن کر ہم نے کہا حضورؐ ہمارے ساتھ تشریف لے چلیں اور ہمیں ان کے آثار بتائیں اور ان کی آگ کے آثار بتائیں۔ اور جنوں نے آپؐ سے اپنی خوراک کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: "ہر وہ ہڈی جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو جو تمہارے ہاتھ آئے اور جس پر زیادہ گوشت ہو وہ تمہاری خوراک ہے۔ اور ہر مینگنی یا لید تمہارے جانوروں کے لیے ہے"۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا "لہٰذا ان دونوں چیزوں کے ساتھ استنجا نہ کرو، کہ یہ تمہارے بھائیوں کی خوراک ہے"۔

ابن اسحاق اور ابن ہشام نے جنوں کے واقعہ کو حضورؐ کے سفر طائف کے بعد نقل کیا ہے۔ حضورؐ نے طائف جا کر بنی ثقیف سے مدد چاہی۔ یہ آپ کے چچا ابوطالب کی موت کے بعد کا واقعہ ہے۔ اس وقت آپؐ پر اور مسلمانوں پر مکہ میں بہت ہی تشدد ہو رہا تھا۔ بنی ثقیف نے آپؐ کی دعوت کو برے انداز میں رد کر دیا اور جب آپؐ واپس ہونے لگے تو بچوں اور نادانوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا۔ یہاں تک کہ آپؐ کے دونوں پاؤں مبارک پتھروں سے لہولہان ہو گئے۔ اور آپؐ نے اس موقعہ پر یہ گہری اور موثر دعا فرمائی۔ "اے اللہ میں تجھ ہی سے اپنی قوت کی کمزوری کی شکایت کرتا ہوں، اپنی قلت تدبیر کی شکایت کرتا ہوں، اور لوگوں پر اپنی کمزوری کی شکایت کرتا ہوں، اے ارحم الراحمین، تو کمزوروں کا رب ہے، اور میرا رب ہے، تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کسی ایسے شخص کے جو مجھ پر حملہ آور ہو؟ تو نے میرا معاملہ کسی دشمن کے حوالے کر دیا ہے؟ لیکن اے اللہ، اگر تو ناراض نہیں ہے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔ لیکن تیرا دامن تو میرے لیے بہت وسیع ہے۔ میں تیرے چہرے کی روشنی میں پناہ لیتا ہوں جس نے تمام تاریکیوں کو روشن کر دیا ہے۔ اور اس نور کی وجہ سے دنیا و آخرت اچھی ہو جاتی ہے۔ اس بات سے کہ مجھ پر تیرا غضب ہو یا مجھ پر تیرا عذاب آجائے۔ تجھے اختیار ہے کہ تو مجھے مشقت میں ڈالے جب تک تو راضی نہ ہو۔ تیرے سوا کوئی قوت اور جائے پناہ نہیں ہے۔

کہتے ہیں اس کے بعد رسول اللہ مکہ کی طرف لوٹنے لگے۔ جب آپ بنی ثقیف کی طرف سے کسی بھلائی سے مایوس ہو گئے۔ جب رات آپ نخلہ میں آئے تو رات کو آپ نماز کے لیے اٹھے تو اس وقت جنوں کا ایک گروہ آپؐ کے پاس سے گزرا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ حضورؐ نے ان کی تعداد سات بتائی جو دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے حضورؐ کی بات توجہ سے سنی۔ جب حضورؐ نماز سے فارغ ہوئے تو یہ جن اپنی قوم کی طرف چلے گئے اور ان کو ڈرانے لگے۔ یہ خود ایمان لائے تھے اور جو کچھ انہوں نے سنا، اسے قبول کر چکے تھے۔ اللہ نے یہ کہانی حضورؐ پر نازل فرمائی۔

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ (۴۶ : ۲۹) "اور جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں"۔

وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۴۶ : ۳۱) "اور تمہیں عذاب الیم سے بچائے گا"۔ اور سورۃ جن میں فرمایا قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ ---- الی آخرہ (۷۲ : ۱) علامہ ابن کثیر نے روایت ابن

اسحاق پر یوں تبصرہ کیا ہے "یہ تو صحیح ہے لیکن ان کا کہنا کہ جنوں کے ساتھ خطاب بھی اسی رات کو ہوا۔ یہ بات قابل بحث ہے کیونکہ جنوں کا قرآن مجید سننا آغاز وحی کے زمانے میں تھا جس طرح حضرت ابن عباس کی روایت میں ہے۔ اور حضورؐ کا سفر طائف تو اس وقت ہوا جب آپ کے چچا محترم حضرت ابو طالب فوت ہو گئے تھے۔ اور یہ وفات ہجرت سے ایک یا دو سال قبل ہوئی تھی۔ واللہ اعلم!

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات ہیں' ہم سمجھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس کی روایت سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے۔ کیونکہ یہ روایت پوری طرح نصوص قرآن کے ساتھ متفق ہے۔

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ (۷۲ : ۱) "اے پیغمبرؐ کہہ دے کہ میری طرف یہ وحی آئی ہے کہ جنوں میں سے کچھ لوگوں نے قرآن کو غور سے سنا"۔ یہ آیت قطعاً بتاتی ہے کہ اس واقعہ کا علم حضور اکرمؐ کو اس طرح ہوا کہ آپؐ پر وحی نازل فرمائی۔ اور یہ کہ آپؐ نے جنوں کو دیکھا نہ تھا۔ اور نہ آپؐ کو یہ احساس ہوا کہ جن سن رہے ہیں۔ پھر اسناد کے اعتبار سے بھی یہ روایت سب سے قوی ہے۔ اور ابن اسحاق کی روایت بھی اس کے ساتھ متفق ہے۔ جس طرح قرآن مجید نے ہمیں جنوں کی صفات میں بتایا کہ اِنَّهُ يَرٰكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ "یہ اور اس کا قبیلہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے جبکہ تم انہیں نہیں دیکھ رہے"۔ میں سمجھتا ہوں اس حادثہ کی تحقیق میں اس قدر بات کافی ہے۔

---ooo---

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا

فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ (۴۶ : ۲۹) "اور وہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں۔ جب وہ اس جگہ پہنچے تو انہوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے"۔ یہ اللہ کی ایک خاص تدبیر تھی کہ اس نے جنوں کو قرآن کی طرف موڑ دیا۔ محض کوئی اتفاقی بات نہ تھی۔ ان کی تقدیر میں یہ تھا کہ جن بھی نبی آخر الزمان کی رسالت سے اسی طرح خبردار ہو جائیں جس طرح وہ حضرت موسیٰ کی رسالت سے خبردار تھے اور ان میں سے ایک فریق آگ سے بچ جائے جسے شیطان اور جنوں کے لیے تیار کیا گیا ہے اور انسانی شیاطین کے لیے بھی۔

قرآن کریم نے ان کی تعداد کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سننے والے جنوں کی تعداد تین سے دس تک تھی اور قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ ان کے پردہ احساس پر قرآن کے کیا اثرات نیچے یعنی خوشی' اچھا تاثر' خضوع اور خشوع۔

فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا (۴۶ : ۲۹) "اب وہ اس جگہ پہنچے (جہاں تم پڑھ رہے تھے) تو انہوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ"۔ یوں اس پورے عرصے میں وہ بڑی خاموشی سے سنتے رہے۔

فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ (۲۹:۴۶) "پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے"۔ یہ اثر بھی ان پر اس لیے ہوا کہ انہوں نے قرآن کو نہایت غور سے سنا تھا۔ خاموش ہو کر سنا اور آخر تک سنتے رہے۔ جب تلاوت ختم ہوئی تو وہ فوراً اپنی قوم کے پاس گئے اور ان کے شعور نے وہ بات اپنا لی تھی جو اگر کسی کے شعور میں داخل ہو جائے تو وہ خاموش نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کی تبلیغ اور لوگوں کے ڈرانے کے کام میں شف شف کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہے کہ جب کسی شخص کے احساس میں ایک نئی بات بیٹھ گئی ہو۔ اور اس کے احساسات کو ایک نہایت ہی موثر' غالب اور چھا جانے والے نظریہ نے اپنی گرفت میں لے لیا ہو' تو وہ فوراً حرکت میں آجاتا ہے' ہر جگہ اسی کی بات کرتا ہے اور بڑے اہتمام کے ساتھ دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔

قَالُوْا يٰقَوْمَنَاۤ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ وَ اِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۳۰:۴۶) "اور انہوں نے جا کر کہا' اے ہمارے قوم کے لوگو' ہم نے ایک کتاب سنی ہے' جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے۔ تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی' رہنمائی کرتی ہے حق اور راہ راست کی طرف"۔ وہ بڑی جلدی سے اپنی قوم کی طرف لوٹے' اور جاتے ہی انہوں نے ان کے سامنے تقریر شروع کر دی کہ برادران قوم ہم نے ایک نئی کتاب سنی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اور اپنے اصولوں میں یہ موسیٰ کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کتب سماوی سے واقف تھے کیونکہ قرآن آیات اور بنیادی تعلیمات سنتے ہی ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ دونوں کی تعلیمات ایک ہیں انہوں نے قرآن کا جو حصہ سنا تھا ضروری نہیں ہے کہ اس میں کتاب موسیٰ کی تعلیمات ہوں۔ البتہ انہوں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ دونوں کتابوں کا مزاج اور سرچشمہ ایک ہے۔ یہ جنوں کی شہادت جو انسانی تعصبات اور موثرات سے دور ہیں اور قرآن کا کچھ حصہ سننے پر انہوں نے یہ تبصرہ کر دیا' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ایک برحق کتاب ہے۔ اور کتب سابقہ کی مصدق ہے۔ یہ ایک اہم شہادت ہے۔

قرآن سننے کے بعد ان کے شعور میں جو بات بیٹھ گئی اور ان کے دل و دماغ نے جس حقیقت کو پالیا وہ یہ تھی کہ

يَهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ وَ اِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۳۰:۴۶) "یہ حق اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے"۔ یہ نہایت ہی اہم بات ہے جو انہوں نے کی کیونکہ قرآن سے پہلا تاثر یہی ملتا ہے کہ یہ کتاب برحق ہے اور دوسرا یہی ملتا ہے کہ یہ سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جو شخص بھی بصیرت رکھتا ہو وہ قرآن کو پڑھ کر یہ دونوں باتیں محسوس کرتا ہے۔ اگر اس کی روح بغض و عناد' کبر اور خواہشات نفسانیہ کی رسیوں میں جکڑی ہوئی نہ ہو۔ چنانچہ قرآن کریم کا ایک حصہ سنتے ہی ان لوگوں نے اس راز کو پا لیا اور اپنی قوم کے سامنے پہلی تقریر میں یہی حقیقت بیان کر دی جو ان کے احساسات کی سچی تعبیر تھی۔

اس کے بعد انہوں نے جو باتیں اپنی قوم سے کہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس دعوت پر مطمئن ہو گئے ہیں اور اب ان پر فرض ہے کہ وہ ایک ایک فرد تک اس دعوت کو پہنچا دیں۔

يَقَوْمَنَآ اَجِيبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُجِرْكُمْ مِّنْ

عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۴۶ : ۳۱) "اے ہماری قوم کے لوگو' اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کر لو اور اس پر ایمان لے آؤ' اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں عذاب الیم سے بچائے گا"۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ کتاب جو نازل کی گئی ہے' اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ جن و انس دونوں کے لیے دعوت ہے اور اسے پوری زمین کے لوگوں تک پہنچنا چاہئے۔ اور اس کتاب کو سنتے ہی انہوں نے اس بات کو پا لیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم داعی الی اللہ ہیں۔ اس لیے انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا "اے ہماری قوم' داعی الی اللہ کی دعوت کو قبول کرو اور ان پر بھی ایمان لاؤ" انہوں نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ ایمان اور عمل صالح کے نتیجے میں بخشش نصیب ہوتی ہے اور اللہ کے عذاب سے بچا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے جو کچھ سمجھا اس کی تعلیم دے دی۔

ابن اسحاق کی روایت یہ ہے کہ اس پر جنوں کی بات ختم ہو گئی ہے لیکن سیاق کلام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگلی دو آیات بھی جنوں کے کلام کا حصہ ہیں۔ خصوصاً یہ آیت

وَ مَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ اُولٰٓئِكَ فِيْ

ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۴۶ : ۳۲) "اور جو کوئی اللہ کے داعی کی بات نہ مانے وہ نہ زمین میں خود کوئی بل بوتا رکھتا ہے کہ اللہ کو زچ کر دے اور نہ اس کے کوئی ایسے حامی اور سرپرست ہیں کہ اللہ سے اس کو بچا لیں۔ ایسے لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں"۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان جنوں کے ڈراوے کا یہ ایک قدرتی حصہ ہے جو انہوں نے اپنی قوم کو دیا کیونکہ انہوں نے ان کو دعوت ایمان اور قبولیت حق دی۔ لہٰذا ڈراوے کے بعد قوی احتمال اس کا ہے کہ وہ اپنی قوم کو اس بات سے ڈرائیں کہ اگر انہوں نے اس بات کو قبول نہ کیا تو انجام کیا ہو گا۔ اور جو قبول نہ کرے گا وہ اللہ کو عاجز نہ کر سکے گا کہ اللہ اس پر سزا و جزاء کا نظام نافذ کرے۔ اور اسے عذاب الیم دے۔ اور پھر قیامت میں ایسا شخص کوئی دوست و یار ایسا نہ پائے گا جو اس کی مدد کر سکے۔ اور یہ کہ نہ ماننے والے گمراہی کے راستے میں پھر بہت دور تک چلے جائیں گے۔

اسی طرح کی آیت میں بھی زیادہ احتمال یہ نظر آتا ہے کہ یہ بھی کلام جن ہے۔ یہ ان لوگوں پر تعجب ہے جو اللہ کی اس دعوت کو قبول نہیں کرتے۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ قیامت سے بچ جائیں گے اور یہ کہ نہ قیامت ہے اور نہ جزاو سزا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى

اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۴۶ : ۳۳) "اور کیا ان لوگوں کو یہ سجھائی نہیں دیتا کہ جس خدا نے یہ زمین اور آسمان پیدا کیے اور ان کو بناتے ہوئے وہ نہ تھکا' وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ مردوں کو جلا اٹھائے؟ کیوں نہیں' یقیناً وہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے"۔ یہ ایک طرح توجہ دلاتا ہے اس کائنات کی کھلی کتاب کے مطالعہ کی طرف' جس کا تذکرہ سورت کے آغاز میں بھی ہوا تھا۔ بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ ایک نکتہ قرآن مجید

میں براہ راست بھی ہوتا ہے ۔ پھر وہی بات ایک قصے میں بھی آجاتی ہے ' اس طرح بتا دیا جاتا ہے کہ یہ قصہ اس لئے لایا گیا اور سیاق کلام میں مناسبت آجاتی ہے ۔

یہ کتاب پہلے تو یہ بتاتی ہے کہ یہ عظیم کائنات 'جس کے تصور سے سر چکرا جاتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی خالق ضرور ہے ۔ ذرا دیکھو تو سہی ...... یہ آسمان اور زمین اور ان کے اندر رنگا رنگ مخلوقات جو دیکھتے ہی بتا رہی ہیں کہ اللہ کے لیے تمام مخلوقات کو دوبارہ پیدا کر دینا کوئی مشکل بات نہیں ہے ۔ اور یہ کہ اللہ کی یہ کائناتی اسکیم یہ بتاتی ہے کہ دوبارہ حشر ہو گا ۔ اور یہاں بات کو بطور استفہام لانے سے تاکید مزید ہو جاتی ہے اور استفہام کا جواب ہاں میں ہے ۔ اس لیے آخر میں یہ فقرہ آتا ہے ۔

اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۴۶ : ۳۳) "یقیناً وہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے"۔ لہٰذا اللہ دوسری قدرتوں کے ساتھ تمام مخلوقات کو دوبارہ پیدا کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے ۔ اور آخر میں دوبارہ اٹھائے جانے کے اصل مقصد کو نہایت ہی مشخص انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ حساب و کتاب یوں ہو گا ۔

---ooo---

وَیَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (۴۶ : ۳۴) "جس روز یہ کافر آگ کے سامنے لائے جائیں گے ' اس وقت ان سے پوچھا جائے گا "کیا یہ حق نہیں ہے؟" یہ کہیں گے "ہاں' ہمارے رب کی قسم (یہ واقعی حق ہے)"۔ اللہ فرمائے گا "اچھا تو اب عذاب کا مزہ چکھو اپنے اس انکار کی پاداش میں جو تم کرتے رہے تھے"۔

اس منظر کو پیش کرنے کے لیے تمہیدی کلمات ۔

وَیَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ (۴۶ : ۳۴) "جس روز یہ کافر آگ کے سامنے لائے جائیں گے"۔ یہ الفاظ آتے ہی قاری سوچتا ہے کہ اگلا لفظ کیا ہو گا 'کیا قصہ ہو گا 'قصہ نہیں آتا اور اسکرین پر مکالمہ آجاتا ہے ۔

اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ (۴۶ : ۳۴) "کیا یہ حق نہیں؟" اچانک اس سوال سے گویا ان لوگوں پر برق ناگہانی گر جاتی ہے جو قیامت کا مذاق اڑاتے تھے اور قیامت کے جلدی لانے کا مطالبہ ہر پیغمبر سے کرتے تھے ۔ آج ان کی گردن حق کے سامنے جھک گئی ہے جس کا وہ انکار کرتے تھے ۔ نہایت شرمندگی سے جواب دیتے ہیں ۔

قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا (۴۶ : ۳۴) "ہاں 'اور ہمارے رب کی قسم" اب تو وہ بڑی شرافت سے قسم ربی اٹھاتے ہیں ۔ لیکن دنیا میں اللہ کو رب ہی تو نہ مانتے تھے ۔ نبیوں کو نہ مانتے تھے ۔ آج تو رب کے نام کو قسم کے لیے استعمال کر رہے ہیں ۔ اس پر جواب نہیں دیا جاتا 'کوئی تبصرہ نہیں ہوتا ' حقارت آمیز انداز میں فیصلہ ان پر پھینک کر گفتگو ختم کر دی جاتی ہے ۔

قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ (٤٦: ٣٤) اللہ فرمائے گا "اچھا تو عذاب کا مزہ چکھو اپنے اس انکار کی پاداش میں جو تم کرتے تھے"۔ اختصار کے ساتھ۔ جیسا کہ کوئی عدالت مختصری آرڈر شیٹ لکھتی ہے۔ "جرم ظاہر ہے ملزم معترف ہے 'جہنم میں جاوے"۔ یہاں اس منظر کو تیزی سے گزارنا بھی مقصود ہے 'کیونکہ بات فیصلہ کن ہے۔ بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے منکر تھے اب معترف ہیں لہٰذا مزا چکھیں جہنم کا۔

---()()()---

جن لوگوں نے کفر کیا' ان کے فیصلے' دو ٹوک فیصلے کے اس منظر اور اہل ایمان' جنات کے منظر کے بعد' اور اس سورت کے آخر میں جس میں کافروں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے بہت کچھ کہا' اور قرآن کریم کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا' اب حضور اکرم ؐ کو آخری ہدایت دی جاتی ہے کہ آپ صبر کریں' جلد بازی نہ کریں۔ آپ نے تو اس سورت کے مناظر میں دیکھ لیا کہ ان کا کیا انجام ہونے والا ہے اور یہ بہت ہی قریب ہے۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ بَلَاغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ

(٤٦: ٣٥) "پس اے نبیؐ صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے' اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو۔ جس روز یہ لوگ اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے تو انہیں معلوم ہو گا کہ جیسے دنیا میں دن کی ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے تھے۔ بات پہنچا دی گئی' اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہو گا؟"

اس آیت کا ہر لفظ ہمارے لیے زاد راہ ہے۔ ہر کلمے اور ہر لفظ کے پیچھے تصاویر' چھاؤں' معانی' اشارات اور فیصلوں اور قدروں کا ایک ذخیرہ ہے۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ (٤٦: ٣٥) "پس اے نبیؐ صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو"۔ یہ حضور اکرم ؐ کو ہدایت ہو رہی ہے اس دور میں آپ پر ظلم اور زیادتیوں کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ پوری قوم آپ ؐ کے اور مسلمانوں کے خلاف تشدد میں لگی ہوئی تھی۔ آپ ؐ نے بطور یتیم نشوونما پائی تھی اور ابتدائی دور ہی میں ایک ایک کر کے حامیوں اور اولیاء سے محروم کر دیئے گئے تھے۔ باپ گئے' ماں گئیں' دادا گئے اور آخر میں چچا گئے۔ پھر آپ ؐ کی وفادار بیوی گئیں اور آپ ؐ اللہ اور اللہ کی دعوت کے لیے فارغ ہو گئے۔ اس طرح اللہ کے سوا ہر سہارے سے محروم ہو گئے۔ آپ ؐ کو بمقابلہ اجنبیوں کے اپنے رشتہ داروں سے زیادہ اذیت ملی۔ آپ ؐ نے ایک ایک فرد سے ملاقات کی' ایک ایک قبیلے سے ملاقات کی کہ میری مدد کرو' لیکن ہر بار آپ ؐ منفی جواب کے ساتھ لوٹے۔ بعض لوگوں نے تو مذاق اڑایا۔ بعض نے تو آپ ؐ کے پیچھے اوباش لگا دیئے یہاں تک کہ آپ ؐ کے پاؤں لہولہان ہو گئے۔ لیکن آپ نے مذکورہ بالا دعا سے زیادہ کچھ نہ کہا۔ اس لیے یہاں آپ ؐ کو رب ذوالجلال کی طرف سے تسلی کی ضرورت تھی۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ (۴۶ : ۳۵) "پس اے نبی ؐ صبر کرو جس طرح اولوا العزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو"۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بہت ہی دشوار گزار راستہ ہے۔ دعوت اسلامی کا راستہ بہت ہی مشکل اور بہت ہی تلخ ہے۔ اس کے لیے تو ذات محمدی کی ضرورت ہے، جو ہر طرف سے کٹ جائے، دعوت کے لیے یکسو ہو جائے۔ پختگی اور ثبات میں، باطن کی صفائی اور شفافی میں رب کی ہدایت پر چلے۔ اللہ کے احکام کے مطابق صبر و ثبات کا مظاہرہ کرے اور دعوت کے مخالفین سے انتقام یا ان کے انجام بد کے لیے شتابی نہ کرے۔

لیکن راستے کی مشقتوں اور زخموں کے لیے مرہم کی بھی ضرورت ہے۔ مشکلات کے لیے صبر ایوبی چاہئے۔ تلخیوں کے لیے ایک میٹھا گھونٹ بھی چاہئے اور یہ میٹھا گھونٹ اللہ کی سربند رحمت کا۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ (۴۶ : ۳۵) "پس اے نبی ؐ صبر کرو جس طرح اولوا العزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کر"۔ وقت بہت تھوڑا رہ گیا ہے جس طرح ایک دن کا ایک گھنٹہ یا گھڑی بھر۔ آخرت سے پہلے تمام زمانہ بھی دراصل ایک گھڑی ہی ہے۔ اس پورے مکان و زمان کے نقوش انسانی ذہن کے پردے پر اتنے بھی نہ رہیں گے جس طرح دن کے چند لمحات کے نقوش، پھر یہ اپنے انجام کو پہنچنے والے ہیں یہ ابدی دنیا کے دروازے پر ہیں۔ صرف اس قدر وقت ہے کہ ہلاکت سے قبل ان تک پیغام پہنچ جائے۔

بَلٰغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُونَ (۴۶ : ۳۵) "بات پہنچا دی گئی! اب نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہو گا"۔ نہیں، کیونکہ اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ لہذا ہر داعی کو صبر کرنا چاہئے اور یہ صبر ایک مختصر وقت کے لیے ہے۔ پھر اللہ کے وعدے کے مطابق ہی فیصلہ ہو گا کہ فاسق ہی ہلاک ہوں گے۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ------ ۲۶

### سورۃ محمد ۔ ۴۷

آیات ۱--- تا--- ۳۸

# سورۂ محمدؐ ایک نظر میں

یہ مدنی سورت ہے اور اس کا ایک نام دوسرا بھی ہے وہ ہے ''سورہ قتال'' کیونکہ اس کا موضوع اور محور دراصل قتال ہے ۔ قتال کی صورتیں اور اس کے حالات اور اس کے انداز تعبیر اور صوتی اثرات سب میں قتال کا رنگ غالب ہے ۔

اس کے مضمون کا آغاز ہی ان لوگوں کے تعارف سے ہوتا ہے جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے اور ان لوگوں کے تعارف سے جو ایمان لائے ۔ کفار پر تنقید کی گئی ہے ۔ اور اہل ایمان کی تعریف کی گئی ہے ۔ اور یہ اعلان کہ اللہ اہل کفر کا دشمن ہے اور اہل ایمان کا دوست ہے ۔ اور اس بات کی اللہ کے ہاں بڑی اہمیت ہے ۔ پس گویا یہ اعلان ہے کہ اللہ اپنے اور اپنے دین کے دشمنوں کے ساتھ بر سر جنگ ہے ۔ آغاز ہی میں

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (١) وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ (٢) ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اتَّبَعُوْا الْبَاطِلَ وَ اَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّبَعُوْا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ (٣) (٤٧ : ١ تا ٣)

''جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا' اللہ نے ان کے اعمال کو رائیگاں کر دیا ۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور اس چیز کو مان لیا جو محمد پر نازل ہوئی ہے ۔ اور ہے وہ سراسر حق ان کے رب کی طرف سے .... اللہ نے ان کی برائیاں ان سے دور کر دیں اور ان کا حال درست کر دیا ۔ یہ اس لیے کہ کفر کرنے والوں نے باطل کی پیروی کی اور ایمان لانے والوں نے حق کی پیروی کی جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے ۔ اس طرح اللہ لوگوں کو ان کی ٹھیک ٹھیک حیثیت بتائے دیتا ہے''۔

کافروں کے ساتھ اس اعلان جنگ کے متصلاً بعد اہل ایمان کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان کے خلاف جنگ شروع کر دو' یہ حکم نہایت ہی زوردار اور سخت الفاظ میں ہے اور اس میں جنگ کے اندر مخالفین کو خوب کچل دینے کے بعد گرفتار کرنے اور گرفتار شدگان کے احکام بتائے گئے ہیں ۔

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوْا الْوَثَاقَ

فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (۴۷ : ۴) "پس جب کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں اڑانا ہے' یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو' اس کے بعد احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کرو تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے"۔

اس حکم کے بعد حکمت قتال کا بیان ہے۔ مسلمانوں کو قتال پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ جو لوگ شہید ہوئے وہ نہایت ہی باعزت لوگ ہیں' اللہ تعالیٰ ان کا اکرام کرے گا۔ اور جو لوگ یہ جنگ صرف اللہ کی خاطر لڑتے ہیں ان کے ساتھ اللہ کی مدد شامل حال ہوتی ہے۔ اور اللہ کافروں کو ہلاک کر کے ان کے اعمال کو ضائع کر دیتا ہے۔

ذٰلِكَ ۛ وَ لَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ (۴۷ : ۴) سَيَهْدِيْهِمْ وَ يُصْلِحُ بَالَهُمْ (۴۷ : ۵) وَ يُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ (۴۷ : ۶) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (۴۷ : ۷) وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (۴۷ : ۸)

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (۴۷ : ۹) "یہ ہے تمہارے کرنے کا کام' اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا مگر تاکہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ آزمائے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے۔ اللہ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہ کرے گا۔ وہ ان کی راہنمائی فرمائے گا' ان کا حال درست کر دے گا اور ان کو اس جنت میں داخل کر دے گا جس سے وہ ان کو واقف کرا چکا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا۔ رہے وہ لوگ' جنہوں نے کفر کیا ہے' تو ان کے لیے ہلاکت ہے۔ اور اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا ہے کیونکہ انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جسے اللہ نے نازل کیا ہے لہٰذا اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دئے"۔

یہاں کفار کو شدید دھمکی دی جاتی ہے اور اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ مومنین کا والی و ناصر ہے۔ اور اہل کفر کا کوئی ناصر و مددگار نہیں' وہ یکہ و تنہا چھوڑ دئے گئے ہیں۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۫ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا (۴۷ : ۱۰) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (۴۷ : ۱۱) "کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہ تھے کہ ان لوگوں کا انجام دیکھتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں' اللہ نے ان کا سب کچھ ان پر الٹ دیا اور ایسے ہی نتائج ان کافروں کے لیے مقدر ہیں۔ یہ اس لیے کہ ایمان لانے والوں کا حامی و ناصر اللہ ہے اور کافروں کا حامی و ناصر کوئی نہیں"۔

اس کھلے اعلان جنگ اور زبردست دھمکی کے بعد ایمان اور کفر کے متعلق دوسرے اہم امور لیے جاتے ہیں۔ دنیا اور آخرت میں اہل ایمان کے شب و روز اور اہل کفر کے حالات بیان کیے جاتے ہیں۔ مومنین کو دنیا و آخرت میں طیب متاع حیات دیا جاتا ہے اور کافروں کو کہا جاتا ہے کہ دنیا میں تو وہ حیوانوں کی طرح کھاتے ہیں۔ کوئی اعلیٰ مقصد ان کے سامنے نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ

(۴۷ : ۱۲) "ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو اللہ ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور کفر کرنے والے بس دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں' جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں اور ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے"۔ جبکہ اہل ایمان کی جنتوں میں پسندیدہ پینے کی چیزیں ہوں گی' پانی تازہ اور صاف' تازہ دودھ' لذیذ شراب' صاف شدہ شہد بڑی مقدار میں اور کثرت سے نہروں کی شکل میں۔ پھر مختلف قسم کے پھل اور اللہ کی مغفرت اور رضامندی۔ آخر میں پوچھا جاتا ہے۔

كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِى النَّارِ وَ سُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ (۴۷ : ۱۵) "کیا یہ شخص ان لوگوں کی طرح ہے جو جہنم میں رہیں گے اور جنہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دے گا"۔ جب سورت کے آغاز میں کافروں کے ساتھ یہ باتیں ہو گئیں اور مومنوں اور کافروں کا تعلق اور انجام صاف صاف بتا دیا گیا تو پھر منافقین کے ساتھ بھی چند باتیں ضروری تھیں۔ مدینہ میں یہ لوگ یہودیوں کے ساتھ مل کر نئی اٹھنے والی اسلامی جماعت اور حکومت کے لیے شدید خطرہ بن رہے تھے۔ یہ لوگ ان مشرکین مکہ کے مقابلے میں زیادہ خطرناک تھے جو باہر سے اسلام کے خلاف برسر پیکار تھے۔ خصوصاً غزوۂ بدر کے بعد اور غزوۂ احزاب سے پہلے کے دور میں جبکہ یہودیوں کی قوت کا زور توڑ دیا گیا تھا اور منافقین کی مرکزی قوت بھی کمزور ہو گئی تھی جیسا کہ ہم نے سورت احزاب میں تفصیلات دے دی ہیں۔

اس سورت میں منافقین کے ساتھ مکالمے کا خاص رنگ ہے۔ آغاز ہی سے سخت حملے اور جنگ کا انداز ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ کی مجلس میں باتوں کو غور سے نہیں سنتے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ در حقیقت یہ گمراہ ہیں۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ حَتّٰۤى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ (۴۷ : ۱۶)

"اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمہاری بات سنتے ہیں اور پھر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان لوگوں سے جنہیں علم کی نعمت بخشی گئی ہے' پوچھتے ہیں کہ ابھی ابھی انہوں نے کیا کہا تھا؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے ٹھپہ لگا دیا ہے اور یہ اپنی خواہشات کے پیرو بنے ہوئے ہیں"۔

ایسے لوگوں کو دھمکی دی جاتی ہے کہ کیا یہ قیامت کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہاں تو ان کے ہوش ٹھکانے نہ ہوں گے۔

فَهَلْ يَنظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا فَاَنّٰى لَهُمْ

اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰهُمْ (۱۸:۴۷) "اب کیا یہ لوگ قیامت ہی کے منتظر ہیں کہ وہ اچانک ان پر آ جائے؟ اس کی علامات تو آ چکی ہیں جب وہ خود آ جائے گی تو ان کے لیے نصیحت قبول کرنے کا کون سا موقعہ رہ جائے گا"۔

اس کے بعد منافقین کی حالت کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے کہ جب قتال کا حکم آتا ہے تو ان کی پریشانی 'بزدلی اور ہلکا پن واضح ہو کر سامنے آ جاتا ہے' کیونکہ یہ تو دکھاوے کے مسلمان ہیں۔ حکم قتال سے اصلی اور نقلی مسلمانوں کے درمیان امتیاز ہوتا ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيْهَا

الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ

(۲۰:۴۷) "جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ کوئی سورت کیوں نہیں نازل کی جاتی مگر جب ایک پختہ سورت نازل کر دی گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی' وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو"۔

ایک بار پھر ان منافقین کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اطاعت اختیار کریں 'معروف طریقہ اپنائیں اور جب کسی معاملے کا عزم بالجزم ہو جائے تو مناسب تو یہ ہے کہ یہ اپنے وعدوں میں سچے ہوں ورنہ ان کے خلاف بھی اعلان جنگ ہو گی۔

فَاَوْلٰى لَهُمْ (۲۰:۴۷) طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ

لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (۲۱:۴۷) فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ

تُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ (۲۲:۴۷) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَ اَعْمٰى

اَبْصَارَهُمْ (۲۳:۴۷) "ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ اطاعت کریں اور معروف باتیں کریں اور اب جب قطعی حکم دے دیا گیا ہے تو اس وقت یہ اللہ سے اپنے عہد میں سچے نکلتے تو انہی کے لیے بہتر ہوتا۔ اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا کچھ اور توقع کی جا سکتی ہے کہ تم الٹے منہ پھر گئے تو زمین میں فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے۔ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کو اندھا اور بہرہ بنا دیا"۔

بتایا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے شیطان کی رفاقت اختیار کر لی ہے' یہ یہودیوں کی سازشوں میں شریک ہیں اور موت کے وقت ان کے ساتھ فرشتوں کا سلوک بہت سخت ہو گا اور دنیا میں بھی ان کے راز فاش ہوں گے۔ یہ بطور سازش اسلامی معاشرے کے فرد بنے ہوئے ہیں اور مفادات حاصل کر رہے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ وَ اَمْلٰى لَهُمْ (۴۷ : ۲۵) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ (۴۷ : ۲۶) فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ (۴۷ : ۲۷) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (۴۷ : ۲۸) اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ (۴۷ : ۲۹) وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ وَ لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ (۴۷ : ۳۰) وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَ الصّٰبِرِيْنَ وَ نَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ (۴۷ : ۳۱) ”حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہدایت واضح ہو جانے کے بعد اس سے پھر گئے ' ان کے لیے شیطان نے اس روش کو سہل بنا دیا ہے۔ اور جھوٹی توقعات کا سلسلہ ان کے لیے دراز کر رکھا ہے۔ اسی لیے انہوں نے اللہ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنے والوں سے کہہ دیا کہ بعض معاملات میں ہم تمہاری مانیں گے اللہ ان کی یہ خفیہ باتیں خوب جانتا ہے۔ پھر اس وقت کیا حال ہو گا جب فرشتے ان کی روحیں قبض کریں گے اور ان کے منہ اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے انہیں لے جائیں گے؟ یہ اسی لیے تو ہو گا کہ انہوں نے اس طریقے کی پیروی کی جو اللہ کو ناراض کرنے والا ہے اور اس کی رضا کا راستہ اختیار کرنا پسند نہ کیا۔ اسی بنا پر اس نے ان سب کے اعمال ضائع کر دیے۔ کیا وہ لوگ جن کے دل میں بیماری ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اللہ ان کے دلوں کی کھوٹ ظاہر نہیں کرے گا۔ ہم چاہیں تو انہیں تم کو آنکھوں سے دکھا دیں اور ان کے چہروں سے تم ان کو پہچان لو گے مگر ان کے انداز کلام سے تو تم ان کو جان ہی لو گے۔ اللہ تم سب کے اعمال سے خوب واقف ہے۔ ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہے“۔

اس سورت کے تیسرے سبق میں روئے سخن پھر مشرکین مکہ لکل قریش اور یہودیوں کی طرف ہے اور ان پر تنقید کی گئی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ شَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا وَ سَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ (۴۷ : ۳۲) ”جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اور رسولؐ سے جھگڑا کیا جبکہ ان پر راہ راست واضح ہو چکی تھی۔ درحقیقت وہ اللہ کا کوئی نقصان بھی نہیں کر سکتے بلکہ اللہ ہی ان کا سب کیا کرایا غارت کر دے گا“۔

اور اہل ایمان کو بھی ڈرایا جاتا ہے کہ یہ نہ ہو کہ نافرمانی کی وجہ سے ان کے اعمال بھی غارت ہو جائیں ۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ (۳۳:۴۷) اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (۳۴:۴۷) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو ۔ کفر کرنے والوں اور خدا سے روکنے والوں اور مرتے دم تک کفر پر جمے رہنے والوں کو تو اللہ ہرگز معاف نہ کرے گا"۔

مسلمانوں کو جنگ کے وقت ثابت قدم رہنے کی تلقین کی جاتی ہے ۔

فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ وَ لَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ (۳۵:۴۷) "پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو' تم ہی غالب رہنے والے ہو' اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا"۔

بتایا جاتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کا سازوسامان کچھ حقیقت بھی نہیں رکھتا اور حسب توفیق خرچ کرو' اللہ نے تم پر مہربانی کر کے یہ فرض نہیں کیا کہ اپنا پورا مال خرچ کر دو 'کیونکہ اللہ کو معلوم تھا کہ وہ انسانوں کی کنجوسی سے واقف ہے ۔ اگر اللہ سب کا سب مال طلب فرماتا تو تم دل تنگی اور کنجوسی اختیار کرتے ۔

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَ لَا يَسْئَلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ (۳۶:۴۷) اِنْ يَّسْئَلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَ يُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ (۳۷:۴۷) "یہ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل تماشا ہے ۔ اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ کی روش پر چلتے رہو تو اللہ تمہارے اجر تم کو دے گا' اور وہ تمہارا مال تم سے نہ مانگے گا اور اگر وہ کہیں تمہارے مال تم سے مانگ لے اور سب کا سب تم سے طلب کر لے تو تم بخل کرو گے اور وہ تمہارے کھوٹ ابھار لائے گا"۔

اور سورت کا خاتمہ مسلمانوں کو سخت تنبیہ پر ہوتا ہے ۔ اگر تم نے بخل کیا اور اپنے مال اللہ کی جنگ میں خرچ نہ کیا تو پھر تم معزول!

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ وَ مَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اللّٰهُ الْغَنِيُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۳۸:۴۷) "دیکھو' تم لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو'

اس پر تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو بخل کر رہے ہیں حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے۔ اللہ غنی ہے' تم ہی اس کے محتاج ہو۔ اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے"۔

---ooo---

غرض سورت کے آغاز سے آخر تک مسلسل جنگی ماحول اور حق و باطل کی کشمکش ہے۔ ہر فقرے سے یہ بات پھوٹتی ہے کہ باطل کا سر پھوڑ کر رکھ دو۔ آیات کے خاتمے پر آواز کی شوکت یہ تاثر دیتی ہے کہ گویا توپ کے گولے برس رہے ہیں۔ الفاظ بھی بھاری اور رعب دار ہیں مثلاً۔

اَعْمَالَهُمْ ، بَالَهُمْ ، اَمْثَالَهُمْ ، اَهْوَاءَهُمْ ، اَمْعَاءَهُمْ اور جب الفاظ نرم بھی ہوں تو یوں نظر آتا ہے کہ کسی میدان جنگ میں تلواریں چمک رہی ہیں مثلاً اَوْزَارَهَا ، اَمْثَالُهَا اَقْفَالُهَا ۔ جس طرح اس سورت کے الفاظ سخت پرشوکت اور آرمی کمانڈز جیسے ہیں اسی طرح اس کے اندر پیش کردہ مناظر بھی سخت ہیں مثلاً قتل و مقاتلہ کے بارے میں کہا گیا ہے : فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ (۴۷ : ۴) "پس جب کافروں کے ساتھ تمہارا آمنا سامنا ہو تو گردنیں اڑا دو"۔ اور خوب قتل کرنے کے بعد گرفتاری کے لیے یہ الفاظ ہیں : حَتّٰى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ (۴۷ : ۴) "اور جب خوب کچل دو تم ان کو تب رہے سے قیدیوں کو جکڑ کر باندھو"۔ اور کافروں کے لیے بددعا بھی نہایت ہی سخت الفاظ میں ہے : فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (۴۷ : ۸) "ہلاک ہو جائیں اور ان کے اعمال کو اللہ اکارت کر دے"۔ سابقہ اقوام کی ہلاکت بھی اسی طرح دھماکہ خیزی کے ساتھ بیان ہوئی۔ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا (۴۷ : ۱۰) "اللہ نے ان کا سب کچھ ان پر الٹ دیا اور ایسے ہی نتائج ان کافروں کے لئے مقدر ہیں" اور جہنم میں ان کی حالت یہ ہو گی۔ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ (۴۷ : ۱۵) "اور انہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا"۔

اور منافقین کی بزدلی اور ان کے خوف و ہراس کو جبکہ انہوں نے قتال کا حکم سنا یوں بیان کیا گیا۔ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ (۴۷ : ۲۰) "وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے ان پر حالت موت چھا گئی" اور اگر مسلمان بھی جہاد سے منہ موڑیں تو اللہ ان کو ان سخت الفاظ میں دھمکی دیتا ہے۔ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷ : ۳۸) "اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے"۔

یوں اس سورت کے مضامین و موضوعات' اس کے الفاظ' فوجی انداز گفتگو' سخت قسم کے مناظر اور قتال اور جنگ کے دوٹوک احکام اس سورت کی فضا اور اس کے ماحول کو سخت دوٹوک اور شدید بنا دیتے ہیں۔ (۱)

(۱) میں جب بھی سورت محمد کو پڑھتا تو اس کا منفرد انداز محسوس کرتا لیکن سید صاحب نے اس کا سبب نہایت احسن انداز میں پیش کیا۔ (مترجم)

# درس نمبر ۲۴۲ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۱۵

---

سُورَةُ مُحَمَّدٍ (۴۷) مَدَنِيَّةٌ (۹۵)
آیاتها ۳۸ — رکوعاتها ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۱ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ
كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝۲ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا
الْبَاطِلَ وَ اَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ
لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ۝۳

"جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا' اللہ نے ان کے اعمال کو رائیگاں کر دیا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور اس چیز کو مان لیا جو محمد پر نازل ہوئی ہے۔ اور ہے وہ سراسر حق ان کے رب کی طرف سے .... اللہ نے ان کی برائیاں ان سے دور کر دیں اور ان کا حال درست کر دیا۔ یہ اس لیے کہ کفر کرنے والوں نے باطل کی پیروی کی اور ایمان لانے والوں نے حق کی پیروی کی جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے۔ اس طرح اللہ لوگوں کو ان کی ٹھیک ٹھیک حیثیت بتائے دیتا ہے"۔

سورت کا افتتاح یوں ہے جس طرح کوئی فوج حملہ آور ہو جاتی ہے' کوئی مقدمہ نہیں' کوئی تمہید نہیں۔ اعلان ہو جاتا ہے کہ کافر بظاہر جو اچھے کام کر رہے ہیں وہ کالعدم ہیں جنھوں نے کفر کیا ہے' اللہ کی راہ پر چلنے سے رکے ہیں اور دوسروں کو روکا ہے۔ اعلان ہوتا ہے کہ ان کے یہ اعمال کالعدم (void) ہیں لیکن یہ اعلان نہایت ہی موثر' عام فہم اور مشخص انداز میں ہے۔ ان کے اعمال راستہ گم کر گئے ہیں اور اس وجہ سے ہلاک اور ضائع ہو گئے' یوں کہ گویا یہ زندہ

انسان یا حیوان ہیں اور انہوں نے راستہ گم کر دیا ہے' بہت دور نکل گئے ہیں اور ہلاک ہو گئے ہیں' یہ مفہوم اور یہ نقشہ بتاتا ہے کہ گویا یہ اعمال لوگوں سے یا مویشیوں کے گلے سے الگ ہو گئے اور لوگ ان اعمال سے الگ ہو گئے اور دونوں کا انجام ہلاکت پر ہوا۔

یہ جن اعمال کے گم ہونے کا اعلان ایک فوجی فرمان کی شکل میں ہوا ہے۔ ان سے مراد وہ اعمال خیریہ ہیں جو ایمان، جہاد کے رنگ سے محروم ہیں اور کرنے والوں کی غرض نیکی ہے لہٰذا اعمال صالحہ کی قدر و قیمت ایمان اور نظریہ جہاد کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ اس قسم کے اعمال جو بظاہر نیکی کے اعمال ہوتے ہیں لیکن ان کی تہہ میں داعیہ نیکی کا نہیں ہوتا۔ بعض اوقات داعیہ بھی نیکی کا ہوتا ہے لیکن ایمان پر مبنی نہیں ہوتا۔ اس طرح بغیر ایمان کے ایک عارضی' سرسری جذبہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے کچھ اعمال صادر تو ہو جاتے ہیں لیکن ثبات و دوام سے محروم ہوتے ہیں' وہ کسی مضبوط اور واضح منہاج اور نظریہ پر مبنی نہیں ہوتے۔ اور زندگی کے طویل منصوبے سے باہر ہوتے ہیں۔ اس کائنات کے اندر پوشیدہ ناموس الٰہی سے مربوط نہیں ہوتے۔ اس لیے باطل ہوتے ہیں۔ لہٰذا اعمال کے لیے ایمان ضروری ہے تاکہ یہ اعمال اس سے بندھے ہوئے ایک صحیح رخ پر جا رہے ہوں اور عمل کرنے والا اس ایمانی داعیہ سے عمل کر رہا ہو اور یہ عمل اس کائناتی نظام سے بھی مربوط ہو' جو انسان کو اس کائنات سے جوڑتا ہے۔ اور اس طرح اس کائنات میں ہر عمل کا ایک مقصد اور ایک اثر ہوتا ہے۔ اور وہ ایک منزل تک جاتا ہے۔

اور دوسری طرف

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (۴۷ : ۲) "اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور اس چیز کو مان لیا جو محمدؐ پر نازل ہوئی ہے۔ اور ہے وہ سراسر حق ان کے رب کی طرف سے"۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۴۷ : ۲) میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا شامل ہے لیکن یہاں اس کا ذکر علیحدہ بطور تاکید کیا گیا ہے تاکہ اس کی صفت میں یہ جملہ لایا جائے۔

وَ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (۴۷ : ۲) اور سابق ایمان کی تاکید مزید ہو جائے اور عمل صالح کا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ایمان زندہ ہے' موجود ہے اور فعال ہے۔

كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ (۴۷ : ۲) "اللہ نے ان کی برائیاں ان سے دور کر دیں"۔ یہ خبر ہے الذین کی۔ اور کفار کے اعمال کو ضائع کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ اعمال بظاہر خیریہ تھے۔ اور ایمان نہ ہونے اور کفر کے وجود نے ان کو ضائع کر دیا جبکہ مومنین کے سیئات کو بھی دور کر دیا گیا اور وہ بخش دیے گئے۔ یہ مکمل مقابلہ ہے کہ کفر سے نیک اعمال ضائع ہونے اور ایمان سے برے اعمال فنا ہوتے ہیں۔ یہ ہے اہمیت ایمان کی۔

وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ (۴۷ : ۲) "اور ان کا حال درست کر دیا"۔ کسی کا حال درست کر دینا' ایک بڑی نعمت

ہے جو ایمان کے نتیجے اور اثر میں کیا جاتا ہے ـ خوشحال اور فارغ البال ہونا اطمینان ' آرام ' اللہ کی سلامتی اور رضامندی کا مظہر ہوتا ہے ـ جب انسان اندر سے مطمئن ہو تو اس کا شعور ' اس کی سوچ اور اس کا قلب اور ضمیر اور اس کے افکار اور اعصاب اور اس کا پورا نفس نہایت اچھی طرح کام کرتے ہیں ـ اور وہ امن و سلامتی کی زندگی بسر کرتا ہے ـ قلبی اطمینان سے اور کوئی بڑی نعمت نہیں ہے ـ یہ ایک افق ہے ' جو نہایت روشن ہے اور صاف و شفاف ہے اور یہاں تک رسائی صرف اہل ایمان کو حاصل ہوتی ہے ـ

یہ کہ کافروں کے اعمال ضائع کر دیئے اور مومنین کی برائیاں معاف کر دیں یہ کسی دوستی یا رشتہ داری کی بناء پر نہیں ' محض اتفاق کے طور پر بھی نہیں بلکہ ایک موثر اور متعین اصول کے مطابق ایسا کیا گیا ـ اس ناموس فطرت کے مطابق جس کے اوپر یہ کائنات قائم ہے ـ یہ ناموس حق ہے جو اساس تخلیق ہے اور جس کے مطابق اللہ نے زمین و آسمان بنائے ہیں ـ

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ (۴۷ : ۳) "اور یہ اس لیے کہ کفر کرنے والوں نے باطل کی پیروی کی اور ایمان لانے والوں نے اس حق کی پیروی کی جو ان کے رب کی طرف سے آیا" ـ جہاں تک باطل کا تعلق ہے اس کی جڑیں اس کائنات کے اندر دور تک نہیں ہوتیں ' اس لیے وہ تباہ ہو جاتا ہے اور جو شخص بھی باطل کا پیرو ہوتا ہے یا باطل کا نتیجہ ہوتا ہے وہ ضائع ہونے والا ہوتا ہے اور کافر چونکہ باطل کے پیروکار ہوتے ہیں اس لیے ان کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اور ان میں سے کوئی مفید چیز باقی نہیں رہتی ـ اور حق چونکہ مستقل ہوتا ہے ' آسمان و زمین بھی اس پر قائم ہیں ' اس کی جڑیں اس کائنات میں بہت دور تک چلی جاتی ہیں ـ اس لیے وہ باقی ہوتا ہے اور مومن چونکہ اس کے پیروکار ہوتے ہیں ـ اس لیے ان کو بھی دوام حاصل ہوتا ہے اور اللہ ان کی کوتاہیوں کو معاف کرتا ہے اور ان کی اصلاح حال فرماتا ہے ـ

یہ ایک واضح اور طے شدہ معاملہ ہے اور متعین اصولوں پر اور متعین اسباب پر قائم ہے لہٰذا اس میں کوئی اتفاقی امر نہیں ہے یا محض تک پر مبنی نہیں ہے ـ

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ (۴۷ : ۳) "اسی طرح اللہ لوگوں کو اس کی ٹھیک ٹھیک حیثیت بتا دیتا ہے" ـ یعنی ایسے اصول اللہ بتا دیتا ہے جس کے مطابق وہ اپنے نفس اور اعمال کو تولتے ہیں اور وہ ان معیاروں کو جانچتے ہیں جن کے مطابق وہ اپنے معاملات چلاتے ہیں اور قیاس اور پیمانوں میں خود مختار نہیں ہیں ـ

یہ اصول تو پہلی آیت میں طے کر دیا گیا ' اس کے بعد اہل ایمان کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ وہ حق کے پیروکار ہیں اور اس حق کا قیام اور غلبہ اس کرۂ ارض پر ضروری ہے ـ حق کی فطرت میں غلبہ ہے ـ اس نے لوگوں کی زندگی کے پیمانے طے کرنے ہیں ' لوگوں کی زندگی کو حق کے اصولوں کے مطابق ڈھالنا ہے ' اور کافر چونکہ باطل پر ہیں ' اس لیے باطل اور اہل باطل دونوں کے آثار کا مٹنا ضروری ہے ـ

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰىٓ إِذَآ
أَثْخَنْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَإِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ
أَوْزَارَهَا ۚۛ ذٰلِكَ ۛؕ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ
بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ أَعْمَالَهُمْ ﴿۴﴾ سَيَهْدِيهِمْ
وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ﴿۵﴾ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ﴿۶﴾ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا إِنْ
تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ ﴿۷﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَ
أَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ﴿۸﴾ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَرِهُوا مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ ﴿۹﴾ أَفَلَمْ
يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ
۱ عَلَيْهِمْ ۫ وَلِلْكٰفِرِينَ أَمْثَالُهَا ﴿۱۰﴾ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِينَ اٰمَنُوا وَأَنَّ الْكٰفِرِينَ لَا
۱۱ع مَوْلٰى لَهُمْ ﴿۱۱﴾
۵

"پس جب ان کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے' یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو' اس کے بعد (تمہیں اختیار ہے) احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کر لو' تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے ـ یہ ہے تمہارے کرنے کا کام ـ اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا' مگر (یہ طریقہ اس نے اس لیے اختیار کیا ہے) تاکہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے آزمائے ـ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے ـ اللہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا ـ وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا' ان کا حال درست کر دے گا اور ان کو اس جنت میں داخل کرے گا جس سے وہ ان کو واقف کرا چکا ہے ـ اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا ـ رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے' تو ان کے لیے ہلاکت ہے اور اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا ہے ـ کیونکہ انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جسے اللہ نے نازل کیا ہے' لہٰذا اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے ـ کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہ تھے کہ ان لوگوں کا انجام دیکھتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ اللہ نے ان کا سب کچھ ان پر الٹ دیا' اور ایسے ہی نتائج ان کافروں کے لیے مقدر ہیں ـ یہ اس لیے کہ ایمان لانے والوں کا حامی و ناصر اللہ ہے اور کافروں کا حامی و ناصر کوئی نہیں"۔

اس آیت میں کافروں کے ساتھ ملاقات سے مراد جنگ کا آمنا سامنا ہے ـ محض ملاقات نہیں ہے ـ اس سورت کے

نزول تک جزیرۃ العرب میں بعض لوگ مسلمانوں کے ساتھ بر سر جنگ تھے اور بعض کے ساتھ صلح کا معاہدہ تھا۔ سورہ برات ابھی نازل نہ ہوئی تھی جس کے نتیجے میں مشرکین کے ساتھ معاہدے ختم کر دیئے گئے تھے۔ اس طرح کہ جو معاہدے متعین وقت کے لیے تھے ان کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ وہ اپنے وقت تک رہیں گے اور جن کے اندر کوئی وقت متعین نہ تھا' ان کے معاہدین کو چار ماہ کا عرصہ دے دیا گیا۔ اور یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ اس کے بعد جزیرۃ العرب میں جہاں بھی کوئی مشرک پایا جائے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ جزیرۃ العرب اسلام کا مرکز تھا اور اسے صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص کرنا ضروری تھا۔ جزیرۃ العرب کے اندر مشرکین . . تو اسلام قبول کرنا تھا یا ملک بدر ہونا تھا۔ اور یہ اصول دوسرے علاقوں کے لیے نہیں ہے' دوسرے اسلامی مقامات میں مشرکین بطور اقلیت جزیہ دے کر رہ سکتے ہیں۔

نیز گردنیں مارنے کا حکم بھی اس وقت ہے جب وہ اسلام قبول نہ کریں۔ گردنیں اڑانیں کا حکم قتل کی عملی صورت ہے اور یہ اس سورت کی فضا کے ساتھ مناسب لفظ ہے۔

حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ (۴ : ۴۷) "یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو"۔ اثخان کے معنی ہیں شدید قتل یعنی کچل دینا۔ یعنی دشمن کی قوت کو ختم کر کے رکھ دینا۔ قوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا کہ آئندہ اس میں حملے کی طاقت نہ رہے۔ جب وہ اس پوزیشن میں چلا جائے تب قیدیوں کو گرفتار کرنا شروع کیا جائے۔ لیکن اگر دشمن کا سرکچلا نہ گیا ہو تو دشمن کو قید کرنا شروع نہ کیا جائے۔

اس تفسیر کے مطابق اس آیت اور انفال کی اس آیت کے درمیان کوئی اختلاف نہ ہو گا جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو سرزنش کی گئی تھی کہ انہوں نے غزوۂ بدر میں بہت سے لوگوں کو قیدی بنا لیا حالانکہ مناسب تھا کہ انہیں قتل کر دیا جاتا' جیسا کہ بعض مفسرین نے سمجھا ہے۔ سورہ انفال میں کہا گیا۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۶۷) لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۶۸) (۸ : ۶۷، ۶۸) "کسی نبی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کا فائدہ چاہتے ہو' حالانکہ اللہ کے پیش نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے لکھا نہ جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی"۔

لہٰذا دشمن کی قوت کو کچلنا تو سب سے پہلے ہے تاکہ دشمن آئندہ اسلامی مملکت پر حملہ نہ کر سکے اور اس کے بعد قید کا معاملہ ہو گا۔ کیونکہ جنگ کا مقصد ہی یہ ہے کہ اسلامی ریاست پر حملہ آور ہونے والی قوت کو ختم کر دیا جائے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ مسلمانوں کی قوت افرادی اعتبار سے کم ہو اور مشرکین تعداد میں زیادہ ہوں۔ اس دور کے جنگی حالات میں دشمن کے سپاہی کو ختم کر دینا جنگ کی حکمت عملی میں بہت ہی اہم تھا۔ اور یہی حکم اب بھی رہے گا اگر یہ مقصد

اس پر موقوف ہو کہ دشمن کی قوت کو کچلنا قتل شدید کے بغیر ممکن نہ ہو اور اس کے بغیر ے دوبارہ سے روکا نہ جا سکتا ہو۔ اس کے بعد لوگوں کو قید کرنے کا حکم پھر یہ ہے اور یہ واحد نص ہے جو قیدیوں کے ضابطے کا تعین کرتی ہے۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷ : ۴) ''اس کے بعد تمہیں اختیار ہے احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کرو''۔ یعنی بعد میں جنگی قیدیوں کا مصرف یہ ہے کہ یا تو ان قیدیوں کو بطور احسان چھوڑ دو' یا فدیے کا معاملہ کرو یعنی مسلمان قیدیوں کے بدلے میں چھوڑ دو یا کوئی مالی تاوان جنگ لے کر چھوڑ دو' یا کوئی اور اجرت عمل لے لو۔ جیسا کہ بدر کے قیدیوں سے کچھ کام لیے گئے۔

اس آیت میں قیدیوں کے مصرف کے لیے کوئی تیسری صورت نہیں۔ یعنی قیدیوں کو قتل کرنا یا غلام بنانا یعنی مشرکین کے قیدیوں کے معاملے میں۔ لیکن اس کے بعد ہوا یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء نے بعض قیدیوں کو غلام بنایا اور بعض کو متعین حالات میں قتل کیا۔

میں اس آیت کی تشریح کے بارے میں امام جصاص حنفی کی تشریح نقل کرتا ہوں' درمیان میں جہاں مجھے کچھ کہنا ہے لکھوں گا اور اس کے بعد وہ مطلب بیان کروں گا جو میرے خیال میں درست ہے۔ جصاص کہتے ہیں :

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ (۴۷ : ۴) ''پس جب کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو گردنیں مارنا ہے''۔ آیت کا ظاہری مفہوم متقاضی ہے کہ کفار کے ساتھ کوئی دوسرا معاملہ تب جائز ہے جب ان کی قوت کو اچھی طرح کچل دیا جائے اور اس کے مماثل حکم دوسری جگہ ہے۔

مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَهٗ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ (۸ : ۶۷) ''نبی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں حتیٰ کہ وہ زمین میں دشمن کی قوت کو کچل دے''۔ (اور یہ بات درست ہے کیونکہ دونوں آیات کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے (قطب)۔

روایت بیان کی محمد ابن جعفر ابن محمد ابن حکم نے جعفر ابن محمد ابن یمان سے انہوں نے ابو عبید سے انہوں نے عبداللہ ابن صالح سے انہوں نے معاویہ ابن صالح سے انہوں نے علی ابن طلحہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے کہ آیت۔

مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَهٗ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ (۸ : ۶۷) یوم بدر کے بارے میں ہے۔ اس وقت مسلمان قلیل تھے۔ جب وہ زیادہ ہو گئے اور ان کی قوت زیادہ ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت نازل کی۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷ : ۴) اللہ نے نبی اور مسلمانوں کو اختیار دے دیا کہ اگر چاہیں تو قتل کر دیں' چاہیں تو غلام بنالیں' چاہیں تو فدیہ لے لیں۔ ابو عبید نے ان الفاظ میں شک کیا ہے (اگر چاہیں تو غلام بنالیں) (غلام بنانا چونکہ خود حضرت ابن عباس سے نقل ہونے میں بھی مشکوک ہے۔ اس لیے ہم اسے ترک کرتے ہیں۔ رہا

قتل کرنا تو اس آیت سے جواز قتل معلوم نہیں ہوتا کیونکہ آیت احسان کرنے یا فدیہ لے کر چھوڑ دینے کے بارے میں منصوص ہے۔

روایت کی ہے جعفر ابن محمد نے ابو عبید سے انہوں نے ابو مہدی اور حجاج سے ' دونوں نے سفیان سے وہ کہتے ہیں کہ میں نے سدی سے سنا کہ وہ اس آیت کی تفسیر یہ بیان کرتے تھے :

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷ : ۴) "اس کے بعد احسان کرو یا فدیہ کا معاملہ کرو"۔ کہ یہ آیت منسوخ ہوگئی ہے اور اس کو سورہ توبہ کی آیت۔

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (۹ : ۵) "مشرکین کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ" نے منسوخ کر دیا ہے ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ یہ آیت۔

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ (۴۷ : ۴) اور آیت۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ (۸ : ۶۷) اور آیت۔

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ (۸ : ۵۷) [1] یہ سب احکام ثابت اور موجود ہو سکتے ہیں اور منسوخ نہ ہوں گے۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ مشرکین کو خوب قتل کرو اور قیدی نہ بناؤ۔ الا یہ کہ وہ خوب ذلیل ہو جائیں اور ان کی قوت ٹوٹ جائے۔ یہ اس وقت تھا جب مسلمانوں کی تعداد کم تھی۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ یہ حکم قائم رہے اور ایسے حالات میں اس پر عمل کیا جائے جس طرح آغاز اسلام میں مسلمانوں کی حالت تھی۔ (میرا خیال یہ ہے کہ مشرکین جہاں ملیں ان کو قتل کرو۔ یہ حکم صرف جزیرۃ العرب کے مشرکین کے لیے تھا' جبکہ یہ آیت عام ہے ' یعنی آیت زیر بحث۔ جب دشمن کی قوت کو کچل دیا جائے تو پھر قیدی بنانا جائز ہو گا۔ اس پر خلفاء نے رسول اللہؐ کے بعد عمل کیا اور سورہ برات کے نزول کے بعد بھی عمل ہوا۔ انہوں نے بعض مخصوص حالات کے سوا کسی قیدی کو قتل نہیں کیا۔ رہی یہ آیت

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷ : ۴) "اس کے بعد احسان کرو یا فدیہ لو"۔ بظاہر عبارت کا مفہوم یہی ہے کہ دو میں سے ایک چیز کر سکتے ہو یعنی یا احسان کرو اور قیدیوں کو رہا کر دو اور یا پھر فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ اس سے قیدیوں کے قتل کے جواز کی نفی ہوتی ہے اور سلف صالحین کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ روایت ہے حجاج ابن مبارک ابن فضالہ سے انہوں نے حسن سے روایت کی کہ انہوں نے قیدی کے قتل کو مکروہ سمجھا اور کہا کہ اس پر احسان کرو یا فدیہ کا معاملہ

[1] "پس یہ لوگ اگر تمہیں لڑائی میں مل جائیں تو ان کی ایسی خبر لو کہ ان کے بعد دوسرے جو لوگ ایسی روش اختیار کرنے والے ہوں ان کے حواس باختہ ہو جائیں"۔

کرو۔ حدیث بیان کی جعفر نے ابو عبید سے انہوں نے ہیثم سے انہوں نے اشعث سے 'کہ میں نے عطا سے پوچھا قیدی کے قتل کا کیا مسئلہ ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ یا احسان کر کے چھوڑ دو یا فدیہ کا معاملہ کرو۔ یہی بات میں نے حسن سے پوچھی تو انہوں نے کہا اس کے ساتھ وہی معاملہ ہو گا جو حضورؐ نے بدر کے قیدیوں سے فرمایا کہ یا تو احسان کر کے چھوڑ دیا یا فدیہ لیا۔ حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ عظمائے اصطخر کا ایک رئیس قیدی ان کے حوالے کیا گیا کہ اسے قتل کر دیں 'تو انہوں نے اسے قتل کرنے سے انکار کر دیا۔ اور یہ آیت پڑھی۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷ : ۴) اسی طرح مجاہد اور محمد ابن سیرین سے بھی یہی روایت ہے کہ انہوں نے قیدیوں کے قتل کو ناپسند کیا۔ سدی سے یہ روایت آئی ہے کہ یہ آیت

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷ : ۴) منسوخ ہے فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (۹ : ۵) نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اسی قسم کی روایت ابن جریج سے بھی منقول ہے۔ روایت کی جعفر نے 'ابو عبید سے انہوں نے حجاج سے اور انہوں نے ابن جریج سے 'انہوں نے کہا کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ حضورؐ نے عقبہ ابن ابو معیط کو بدر کے دن باندھ کر قتل کیا۔ نضر ابن حارث کو بھی بدر کے دن قتل کیا گیا۔ اور احد کے دن ابو عزہ شاعر۔ قید کیے جانے کے بعد قتل ہوا اور بنو قریظہ کو قتل کیا گیا جب وہ سعد ابن معاذ کے فیصلے پر ہتھیار ڈال کر اسیر ہو گئے تو سعد ابن معاذ نے فیصلہ دیا کہ ان کو قتل کر دیا جائے اور ان کی اولاد کو غلام بنا لیا جائے۔ ان میں سے صرف زبیر ابن باطا پر احسان کیا گیا اور خیبر کا بعض علاقہ تو مصالحت سے فتح ہوا اور بعض علاقہ بزور شمشیر فتح ہوا اور ابو الحقیق کے ساتھ یہ شرط طے ہوئی کہ کچھ چھپائے گا نہیں۔ جب اس کی خیانت ظاہر ہو گئی کہ اس نے چھپایا ہے تو اسے قتل کر دیا گیا۔

حضورؐ نے مکہ کو فتح کیا اور حکم دیا کہ ہلال ابن خطل 'مقیس ابن حبابہ اور عبداللہ ابن ابو السرح اور دوسروں کو قتل کر دیا جائے۔ آپ نے فرمایا: "یہ اگر کعبہ کے پردوں کے ساتھ بھی لٹک رہے ہوں تو انہیں قتل کرو"۔ اہل مکہ پر احسان کیا۔ ان کے اموال کو مال غنیمت نہ بنایا۔ صالح ابن کیسان سے روایت ہے انہوں نے محمد ابن عبدالرحمٰن سے 'انہوں نے اپنے والد عبدالرحمٰن ابن عوف سے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر الصدیق کو یہ کہتے سنا: "کاش فجاءۃ جب میرے پاس لایا گیا تو میں اسے نہ جلاتا یا تو اسے آزادانہ قتل کر دیتا یا اسے کامیابی سے رہا کرتا" ابو موسیٰ نے السوس کے ایک زمیندار کو پناہ دینے کے بعد قتل کر دیا۔ ہوا یوں کہ اسے امان دے دی گئی کہ فلاں فلاں لوگوں کو قتل نہ کیا جائے گا لیکن اس معاہدے میں وہ اپنا نام لکھنا بھول گیا۔ یوں وہ قتل ہو گیا۔ یہ احادیث و آثار ہیں جو حضور اکرمؐ سے اور صحابہ سے تواتر کے ساتھ آئے ہیں کہ قیدیوں کو رکھا بھی جا سکتا ہے اور قتل بھی کیا جا سکتا ہے اور اس پر بڑے شہروں کے فقہاء کا اتفاق ہے۔ (اس قتل کا جواز آیت سے نہیں لیا جاتا' صرف رسول اللہؐ کے عمل اور بعض صحابہ کے عمل سے لیا جاتا ہے۔ لیکن جن حالات میں قیدیوں کو قتل کیا گیا ہے 'ان کا مفصل مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ قتل ہوئے 'ان کے قتل کی مخصوص وجوہات تھیں۔ یہ وجوہات جنگ اور قیدی بن جانے کے علاوہ تھیں۔ نضر ابن حارث اور عقبہ ابن ابو معیط مکہ میں حضور اکرمؐ کی ہجو کرتے تھے۔ اور آپ کو اور دعوت اسلامی کے حاملین کو اذیت دیتے تھے۔ یہی مسئلہ ابو عزہ شاعر کا تھا۔ بنو قریظہ نے تو حضرت سعد ابن معاذ کا فیصلہ پیشگی قبول کر لیا تھا۔ غرض تمام حالات میں متعین اسباب نظر آتے

ہیں ۔ اس لیے ان حالات میں اس آیت سے ہٹ کر عمل کیا گیا ۔ یعنی آیت من اور فداء سے ) ۔

اور قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنے میں بھی اختلاف ہوا ۔ ہمارے ساتھیوں (احناف) سب کی رائے یہ ہے کہ قیدیوں کو مال کے بدلے نہ چھوڑا جائے گا اور نہ ہی قیدی غلاموں کو دارالحرب میں کسی کے ہاتھ فروخت کیا جائے گا کہ وہ دوبارہ اسلام کے خلاف جنگ کریں ۔ امام ابو حنیفہ کی رائے تو یہ ہے کہ ایسے قیدیوں کو مسلمان قیدیوں کے بدلے بھی رہا نہ کیا جائے تاکہ وہ اسلام کے خلاف کبھی جنگ نہ کر سکیں ۔ امام یوسف اور محمد فرماتے ہیں کہ مسلمان قیدیوں سے مشرکین قیدیوں کا تبادلہ ہو سکتا ہے ۔ امام ثوری ' امام اوزاعی کا بھی یہی قول ہے ۔ امام اوزاعی نے کہا ہے کہ عورتوں اور بچوں کو بھی اہل دارالحرب کے ہاتھوں فروخت کیا جا سکتا ہے ۔ ہاں غلام مردوں کو فروخت نہ کیا جائے گا ۔ امام مزنی نے امام شافعی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ امام کو اختیار ہے کہ بطور احسان چھوڑ دے یا فدیہ کے بدلے چھوڑ دے ۔ جو لوگ مال یا مسلمان قیدیوں کے بدلے کافر قیدیوں کی رہائی کے جواز کے قائل نہیں ان کی دلیل یہ ہے ۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷ : ۴) آیت کے ظاہری الفاظ یہی مفہوم دیتے ہیں کہ مال کے بدلے یا مسلم قیدیوں کے بدلے رہائی جائز ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدریوں کو مال کے بدلے رہا فرمایا ۔ اور مال کے بدلے رہائی پر دلیل اس حدیث سے دی جاتی ہے جو ابن مبارک نے معمر سے روایت کی ہے ' انہوں نے ایوب سے ' انہوں نے ابو قلابہ سے ' انہوں نے ابوالمہلب سے ' اور انہوں نے حضرت عمران ابن حصین سے کہ قبیلہ ثقیف نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ساتھیوں کو قید کر لیا تھا ۔ اور مسلمانوں نے ...... بنی عامر ابن صعصعہ قبیلے سے ایک شخص کو قید کر لیا تھا ۔ اس قیدی کے پاس سے حضور ؐ گزرے ۔ یہ بندھا ہوا تھا ۔ اس نے حضور ؐ کو پکارا کہ میرا قصور کیا ہے حضور ؐ نے فرمایا تمہارے ساتھیوں کے جرم کی وجہ سے تم پکڑے گئے ہو ۔ قیدی نے کہا کہ میں تو مسلم ہوں یہ سن کر آپ ؐ نے فرمایا اگر یہ بات تم اس وقت کہتے جب آزاد تھے تو تم پوری طرح کامیاب ہوتے ۔ اس کے بعد حضور ؐ چلے گئے ۔ اس نے دوبارہ پکارا ۔ حضور ؐ متوجہ ہوئے ۔ اس نے کہا میں بھوکا ہوں ۔ تو حضور ؐ نے فرمایا ہاں یہ تمہاری ضرورت ہے ۔ اس کے بعد حضور ؐ نے اس کو ان دو مسلمانوں کے بدلے رہا کر دیا ۔ جن کو ثقیف نے قید کر لیا تھا ۔ (ہمارے خیال میں جو لوگ فدیہ کے طور پر قیدیوں کو رہا کرنے کے قائل ہیں ان کے دلائل مضبوط ہیں ' بمقابلہ ان دلائل کے جو امام جصاص نے فدیہ بالمال یا مسلمان قیدیوں کے تبادلہ کے خلاف دیئے ہیں

امام جصاص نے حنفیہ کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے بات ختم کی ہے ۔ یہ کہ آیت زیر بحث میں احسان اور فدیے کا ذکر ہے تو یہ آیت درج ذیل آیت سے منسوخ ہے ۔

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ (۹ : ۵)

" مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ ' اور انہیں پکڑو ' اور گھیرو ' اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھو ' پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو " ۔ اور یہی روایات ہم نے سدی ' ابن جریج سے نقل کی ہیں ۔ اور اللہ

کا قول ۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَ رَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَ هُمْ صَاغِرُونَ (۹ : ۲۹) "جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ۔ اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے ۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں" ۔

دونوں آیات کا حکم یہ ہے کہ کفار سے جنگ کرو ' یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں اور مالی اور غیر مالی فدیہ اس کے منافی ہے ۔ اہل تفسیر اور تابعین آثار اس بات پر متفق ہیں کہ سورہ توبہ سورہ محمد کے بعد نازل ہوئی ہے ۔ لہٰذا سورہ توبہ کا حکم اس حکم کا ناسخ ہوگا جو سورۂ محمد میں ہے ۔ (اس سے قبل ہم کہہ چکے ہیں کہ مشرکین قتل ہوں گے یا اسلام لائیں گے یہ حکم صرف مشرکین مکہ کا ہے ۔ یہ ان کے ساتھ مخصوص حکم ہے ۔ رہے غیر مشرکین عرب تو ان سے جزیہ قبول کرنا بھی جائز ہے ۔ جس طرح اہل کتاب سے ' اور جزیہ قبول کرنے سے پہلے یہ لوگ مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہو سکتے ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ جب جزیہ قبول کرنے سے پہلے قید ہو سکتے ہیں تو ان قیدیوں کے احکام کیا ہوں گے ؟ ہم کہتے ہیں ان پر امام احسان بھی کر سکتا ہے ' فدیہ مال بھی لے سکتا ہے اور قیدیوں کے ساتھ تبادلہ بھی ہو سکتا ہے ' اگر ان کی قوم بدستور قوی ہو اور وہ جزیہ تسلیم نہ کرے ' اگر جزیہ قبول کرلیں تو پھر وہ رہا ہوں گے ۔ یہ تو دوسری حالت ہے ۔ لہٰذا جب تک کفار جزیہ تسلیم نہیں کرتے ' اس وقت تک آیت زیر بحث کا حکم جاری رہے گا) ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ واحد قرآنی آیت ہے جو قیدیوں کا حکم بتاتی ہے ۔ اور دوسری آیت کا تعلق اس موضوع سے نہیں ہے ۔ لہٰذا قیدیوں کے مسئلے میں اصل ماخذ قانون یہی آیت تصور ہوگی اور اس کے خلاف جو واقعات ہوئے ہیں وہ مخصوص حالات میں ہوئے ' جو وقتی حالات تھے ۔ بعض قیدیوں کو ان کے دیگر انفرادی جرائم کی وجہ سے قتل کیا گیا ۔ اور اس قسم کی صورت پیش آنے کے آئندہ بھی امکانات ہو سکتے ہیں ۔ ان کو ان اعمال اور جرائم کی وجہ سے پکڑا گیا تھا جو قید سے بھی پہلے کے تھے ۔ محض برسرپیکار ہونے اور قیدی ہونے کی وجہ سے نہیں ۔ مثلاً کوئی شخص جاسوسی میں پکڑا جاتا ہے تو وہ جنگی قیدی تصور نہ ہوگا ' جاسوس تصور ہوگا ۔ یہ قید تو مجرم کو قبضے میں رکھنے کے لیے ہے ۔

رہا قیدی کو غلام بنانے کا مسئلہ تو وہ اس وقت ایک عالمی مسئلہ تھا ۔ اس کے بارے میں ہم نے ظلال القرآن میں بارہا بحث کی ہے ۔ یہ اس وقت کی ایک عام جنگی حکمت عملی تھی ۔ اس لیے اسلام اس وقت ہر حالت میں یک طرفہ طور پر اس پر عمل نہ کر سکتا تھا ۔ یعنی فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷ : ۴) پر ۔ جبکہ اسلام کے دشمن مسلمانوں کو قید کر کے غلام بنا رہے تھے ۔ اس لیے حضورؐ نے بعض حالات میں جنگی قیدیوں کو غلام بنایا ' بعض حالات میں احسان کر کے قیدیوں کو چھوڑ دیا ' بعض کو فدیہ میں تبادلہ کر دیا ۔ بعض سے مالی تاوان وصول کیا اور بعض حالات میں جنگی قیدیوں کو غلام بھی بنایا گیا کیونکہ یہ فیصلے اور اقدامات اس وقت کے بین الاقوامی قانون کے مطابق ہوتے تھے اور ضروری تھے ۔

اگر ہیں ایسا ہو گیا (اور ہمارے دور میں ہو گیا ہے) کہ تمام بین الاقوامی قوتوں نے قیدیوں کو غلام نہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تو اس وقت اسلام بھی اس مثبت قاعدے کی طرف رجوع کرے گا اور وہ یہ ہے۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷ : ۴) کہ یا بطور احسان قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے یا بطور فدیہ تاکہ وہ حالات ختم کر دیئے جائیں جن میں قیدیوں کو غلام بنایا جاتا تھا کیونکہ اسلام میں غلامی کا ادارہ ضروری نہیں ہے اور نہ کوئی بنیادی اصول ہے۔

یہ وہ رائے ہے جو نص قرآنی سے قطعی طور پر معلوم ہوتی ہے اور ان تمام حالات اور واقعات سے بھی یہی معلوم ہوتی ہے جو اسلام کے ابتدائی دور میں نمودار ہوئے۔ اور صحیح رائے وہی ہوتی ہے جس کی طرف اللہ کسی کو توفیق دے۔ لیکن یہ بات ذہن میں اچھی طرح رکھنا چاہئے کہ نصوص قرآنی سے یہ رائے بادی النظر میں ثابت ہوتی ہے اور قرون اولیٰ میں جو واقعات پیش آئے اور جو حالات تھے ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، یہ بات نہیں ہے کہ اسلام پر ادارۂ غلامی کو جائز رکھنے کا کسی نے الزام لگایا ہے اور میں اس کی نفی کرتا ہوں اور اسلام کا دفاع کرتا ہوں۔ میں اس قسم کے دفاع کا قائل نہیں ہوں۔ اگر میرا خیال یہ ہوتا کہ اسلام غلامی کو جائز سمجھتا ہے تو میں اعلان کر دیتا کہ یہ درست ہے اور انسانیت کی بھلائی اسی میں ہے کہ غلامی کے ادارے کو جائز رکھا جائے اور کوئی انسان جو انسان ہو اور اس کے اندر اسلامی آداب کا ذرا سا شعور بھی ہو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآن تو یہ کہتا ہے لیکن میری رائے یہ ہے۔ اور میری رائے قرآن سے زیادہ معقول ہے۔

یہ قوانین و ہدایات یعنی قتال اگر دنیں اڑانا سختی سے قیدیوں کو باندھنا اور قیدیوں کے لیے یہ اصول، اس وقت تک ہیں۔

حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (۴۷ : ۴) "تاآنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے"۔ اور اسلام اور اس کے دشمنوں کے درمیان جنگ ختم ہو جائے۔ یہ کلی قاعدہ ہے اور جہاد قیامت تک کے لیے چلنے والا ادارہ ہے۔ جس طرح رسول اللہ نے فرمایا:

حَتّٰی تَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا جب تک اللہ کا کلمہ بلند نہیں ہو جاتا۔

--- ооо---

اللہ نے یہ جہاد اس لیے نہیں فرض کیا کہ وہ لوگوں سے کافروں کے مقابلے میں کوئی مدد لینا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کفار کو تو براہ راست ہی ختم کر سکتا ہے۔ یہ نظام تو اس لیے تجویز ہوا ہے کہ اللہ اپنے بعض بندوں کو دوسروں کے مقابلے میں آزمانا چاہتا ہے۔ اس آزمائش ہی پر ان کے درجات کا آخرت میں فیصلہ ہو گا۔

ذٰلِكَ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ (۴) سَيَهْدِيْهِمْ وَ يُصْلِحُ بَالَهُمْ (۵) وَ يُدْخِلُهُمُ

الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ (۴۷ : ۶) "یہ ہے تمہارے کرنے کا کام ۔ اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا' مگر (یہ طریقہ اس نے اس لیے اختیار کیا ہے) تاکہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے آزمائے ۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے ۔ اللہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا ۔ وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا' ان کا حال درست کر دے گا اور ان کو اس جنت میں داخل کرے گا جس سے وہ ان کو واقف کرا چکا ہے"۔

یہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکا' اس قسم کے لوگ ہر زمان و مکان میں پائے جاتے ہیں' خدا کے دین کے باغی' سرکش اور مفسدین جو ظلم اور تکبر کے جامہ میں سامنے آتے ہیں اور اپنے آپ کو اور اپنے متبعین کو بہت قوت والے دکھاتے ہیں ۔ یہ مٹھی بھر لوگ ہیں اور یہ لوگ اس چھوٹے سے ذرے کے اوپر رہتے ہیں جسے عرف عام میں زمین کہا جاتا ہے ۔ جو اس کائنات کے عظیم کروں' دیو ہیکل اجسام' ستاروں اور سیاروں کے درمیان فی الواقع ایک ذرہ ہی ہے ۔ ان کے علاوہ دوسرے جہاں بے شمار کہکشاں اور بلیک ہول ہیں جن کی تعداد صرف اللہ ہی جانتا ہے اور جو اس وسیع اور ہولناک کائنات میں تیرتے پھرتے ہیں اور بکھرتے چلے جاتے ہیں ۔ ان کے مقابلے میں یہ زمین ایک ذرہ ایک چھوٹا سا رائی کا دانہ ہی تو ہے ۔ ان تمام جہانوں کے اندر یہ ہولناک نظم و نسق اور جمع وتفریق صرف اللہ نے قائم کر رکھی ہے ۔ اس لیے قوتوں کا مالک تو اللہ ہی ہے ۔

دنیا کے یہ ڈکٹیٹر اور ان کے متبعین بلکہ یہ پوری زمین اور اس کی پوری آبادی' اس کائنات کی نسبت میں اس طرح ہیں جس طرح اہل زمین کی نسبت نہایت ہی چھوٹے قسم کی چیونٹیوں کا دس بارہ ارب کا چھتا بلکہ یہ نسبت اگر تناسب کے حسابی قاعدے سے ظاہر کی جائے تو (زمین : کائنات = زمین : ذرہ) بھی نہیں ہے ۔ پوری زمین اور اس کی آبادی کائنات کے مقابلے میں ذرے سے بھی کم ہے ۔ اور اللہ کی قوتیں تو کائنات سے بھی وسیع ہیں ۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ!

اللہ تعالیٰ مومنین کو حکم دیتا ہے کہ ان دشمنان اسلام کی گردنیں اڑاؤ اور اچھی طرح کچل کر ان کو خوب باندھو ۔ یہ احکام اس لیے دیئے گئے ہیں کہ مومنین دست قدرت کے لیے آلہ بن جائیں ۔ اگر اللہ چاہتا تو براہ راست اور علانیہ کافروں سے انتقام لے لیتا ۔ جس طرح اللہ نے بعض اقوام کو طوفان' کڑک دار آواز اور نیست و نابود کر دینے والی ہواؤں وغیرہ کے ذریعہ تباہ کیا' بلکہ اللہ تو کن فیکون کے ذریعہ بغیر ان اسباب کے بھی انتقام لے سکتا ہے ۔ لیکن اللہ اپنے مومن بندوں کے لیے بہتری چاہتا ہے ۔ ان کو آزماتا ہے ۔ ان کو تربیت دیتا ہے ۔ ان کی اصلاح کرتا ہے ۔ اور ان کے لیے نیکیوں کے اسباب فراہم کرتا ہے ۔

اللہ مومنین کو آزماتا ہے اور اس آزمائش میں مومنوں کے قلوب میں بہترین جذبات کو ابھارتا ہے اور اس سے اچھا جذبہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ کسی انسان کے لیے وہ عقیدہ اس کی جان سے عزیز ہو جائے جس پہ وہ ایمان لایا ہے ۔ اور انسان اپنے اس عزیز عقیدے کے لیے جہاد کرے' مارے اور مارا جائے ۔ اور اس کی حالت یہ ہو کہ وہ دین کے معاملے میں کوئی مسالمت اور رواداری نہ کرے ۔ دین کے بغیر زندہ نہ رہ سکے اور اس دین کے سوا کسی اور طریقے کے مطابق زندگی نہ گزار سکے ۔

اور اللہ تعالیٰ مومنین کی تربیت یوں فرماتا ہے کہ ان کے دلوں سے اس فانی دنیا کی تمام خواہشات اور تمام رغبتیں نکال دیتا ہے' حالانکہ انسان کے لیے ایسی خواہشات کو دل سے نکال دینا بڑا مشکل ہوتا ہے ۔ اس طرح ان کے دلوں سے کمزوری دور ہو جاتی ہے' نقص کمال میں بدل جاتا ہے ۔ ہر قسم کا کھوٹ نکل جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ اگر ان کی تمام

خواہشات ترازو کے ایک پلڑے میں ہوں اور دوسرے پلڑے میں صرف دعوت جہاد ہو اور اللہ کی رضامندی کی طلب ہو تو اللہ کی رضامندی اور جہاد کا پلڑا بھاری نکلتا ہے۔ اللہ اس بات کو ظاہر کر دیتا ہے کہ ان نفوس کو اختیار دیا گیا تو انہوں نے دین کو اختیار کیا' ان کو تربیت دی گئی تو انہوں نے حق کو جان لیا' وہ بغیر سوچے سمجھے کوئی قدم نہیں اٹھاتے بلکہ خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے ہیں۔

اور اللہ مومنین کی اصلاح کرنا چاہتا ہے' جہاد فی سبیل اللہ اللہ کی تکالیف اور موت سے بار بار آنکھیں ملانے کی وجہ سے ان کے ذہن سے موت کا خوف ہی دور ہو جاتا ہے۔ حالانکہ موت کا ڈر لوگ اپنے نفوس سے اور اپنے اخلاق اور اپنی اقدار سے بڑے تکلفات کے بعد نکالتے ہیں اور بڑی مشقتیں اٹھاکر وہ اپنے دل سے موت کا ڈر نکالتے ہیں لیکن جو شخص ' مجاہد فی سبیل اللہ ہو وہ ہروقت موت سے آنکھیں ملاتا رہتا ہے اور وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ موت سے دو چار ہو گیا یا بچ گیا۔ اور اللہ کی راہ میں مرنے کی ہربار فکر کرنا' ارادہ کرنا' خصوصاً شدید خطرات کے لمحات میں انسانی جسم کے اندر بجلی کی ایک لہر دوڑا دیتا ہے اور جو شخص ایسے مراحل سے بچ کر نکل آئے تو وہ بالکل ایک جدید روح اور پاک و صاف شخصیت لے کر آتا ہے۔ جہاد میں شریک ہونے والے شخص یعنی غازی کی شخصیت ہی نرالی ہوتی ہے۔

پھر یہ جہاد پوری انسانی جماعت کی اصلاح کا ذریعہ ہے۔ جب انسانوں کی قیادت ان مجاہدین کے ہاتھ آ جاتی ہے جن کے نفوس تمام دنیاوی آلائشوں اور آلودگیوں سے پاک ہوتے ہیں۔ اور جن کی نظروں میں دنیا کی سب چمک دار چیزیں ہیچ ہوتی ہیں بلکہ خود دنیا کی اس پوری زندگی کو بھی وہ حقیر سمجھتے ہیں جبکہ وہ موت کے کنوؤں میں کود جاتے ہیں۔ اور دنیا کی کوئی چیز بھی 'کوئی دل فریبی بھی ان کی نظروں کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی اور وہ صرف رضائے الہی کے طالب ہوتے ہیں۔ جب دنیا کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو' تو لوگوں کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے اور دنیا کی بھی۔ اور شرو فساد ختم ہو کر دنیا امن و امان کے دامن میں پناہ لیتی ہے' اس لیے کہ انہوں نے یہ بلند مقاصد اپنے خون کی قیمت پر حاصل کیے ہیں اور یہ ذاتی مفادات کے لیے نہیں بلکہ رضائے الہی کے لیے حاصل کیے ہیں۔

پھر یہ اللہ کی توفیق اور سہولت ہوتی ہے' جسے وہ جس خوش قسمت کو چاہے' مہیا کر دیتا ہے تاکہ وہ اللہ کی رحمتوں کو بغیر حساب کے لپیٹے۔ اور جو ازلی بد بخت ہوتے ہیں ان کو بھی اللہ کی طرف سے ایک راہ میسر ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں انہیں اللہ کا غضب اور عذاب ملتا ہے' ہرکسے را بہرکارے ساختند' اور جس نیک بخت کو یہ حصہ مل گیا اور اللہ اسی کو دیتا ہے جس کا اندرون اس کے لیے تیار ہو۔ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں مرنے مارنے والوں کا انجام کیا ہے۔

وَ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَلَنْ یُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ (۴۷ : ۴) "جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے' اللہ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہ کرے گا"۔

سَیَهْدِیْهِمْ وَ یُصْلِحُ بَالَهُمْ (۴۷ : ۵) وَ یُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ (۴۷ : ۶)

"وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا ان کا حال درست کرے گا اور ان کو اس جنت میں داخل کرے گا جس سے وہ ان کو واقف کرا چکا ہے"۔ ان کے اعمال ضائع نہ کرے گا۔ یہ اس بات کے بالمقابل ہے جو کفار کے معاملے میں کہی گئی کہ ان کے اعمال ضائع ہوں گے۔ اس لیے کہ مومنین کے اعمال مضبوط اور اصلی درخت سے جڑے ہوئے ہیں اور یہ درخت ہے

سچائی کا درخت - یہ اعمال اس حق اور سچائی سے صادر ہوتے ہیں - یہ اعمال حق کی حمایت میں ہوتے ہیں - حق کی سمت میں ہوتے ہیں - اس لیے یہ باقی ہوتے ہیں اور دوام کی صفت رکھتے ہیں کیونکہ حق لازوال ہے -

شہداء کی حقیقت قابل غور ہے - اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے دوسری جگہ میں فیصلہ دے دیا ہے -

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ "اور جو اللہ کے راستے میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں"۔ لیکن یہاں ان کو ایک دوسرے پہلو سے پیش کیا جاتا ہے کہ انہوں نے جس راستے میں متاع حیات قربان کی اس راستے میں وہ مسلسل آگے ہی بڑھ رہے ہیں - وہ ہدایت خلوص 'صفائی اور اطاعت کی راہ ہے -

سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ (۴۷ : ۵) "اللہ ان کی رہنمائی فرمائے گا اور ان کا حال درست کر دے گا"۔ وہ اپنے رب اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ' وہ اب بھی ان کی رہنمائی کر رہا ہے - یعنی شہادت کے بعد بھی وہ درجات عالیہ طے کر رہے ہیں اور ان کے حالات درست کیے جا رہے ہیں اور ان کی روح زمین کی آلودگیوں سے پاک ہو رہی ہے - ان کو ملاء اعلیٰ میں جو مقام حاصل ہے ' اس مقام کی مناسبت سے ان کو مزید تربیت دی جا رہی ہے - اور وہ صاف و شفاف بنائے جا رہے ہیں - یہ ایک مسلسل زندگی ہے - صرف اہل زمین کی نظروں میں یہ منقطع ہو گئی ہے - اہل زمین شہادت کے درجات کو دیکھ نہیں پاتے اس زاویے سے اندھے ہیں 'جب کہ یہ شہداء حضرات عالم بالا میں بدستور درجات بلند کے مدارج طے کر رہے ہیں - ہدایت 'صفائی ' اشراق اور شفافی میں مزید انوار ربی حاصل کر رہے ہیں ....... اور سب سے آخر میں!

وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ (۴۷ : ۶) "وہ ان کو اس جنت میں داخل کر دے گا جس سے وہ ان کو واقف کر چکا ہے"۔ احادیث میں شہداء کے بارے میں آتا ہے کہ ان کو جنت میں ان کی جائے قیام دکھائی جاتی ہے - امام احمد نے روایت فرمائی ہے - زید ابن نمر دمشقی سے انہوں نے ابو ثوبان سے ' انہوں نے اپنے والد ثوبان سے انہوں نے مکحول سے انہوں نے کثیر ابن مرہ سے انہوں نے قیس جذامی سے اور انہوں نے ایک ایسے شخص سے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صحبت حاصل تھی وہ فرماتے ہیں کہ آپ ؐ نے فرمایا : شہید کے خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی اسے چھ درجات حاصل ہو جاتے ہیں ' اس کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں ' وہ دیکھ لیتا ہے کہ جنت میں اس کی جائے قیام کیا ہے ' خوبصورت آنکھوں والی حوریں اس کے نکاح میں دے دی جاتی ہیں - وہ قیامت کے عظیم خوف سے محفوظ ہو گا - عذاب قبر سے مامون ہو گا - اور اسے ایمان کا جامہ پہنایا جائے گا - یہ حدیث صرف امام احمد نے نقل کی ہے -

ایک دوسری حدیث اسی مفہوم کی بھی مروی ہے - اس میں بھی تصریح ہے کہ شہید اپنی جائے قیام کو پہلے ہی دیکھ لے گا (ترمذی)- یہ ہے اہل جنت کے لیے ان کی جائے قیام کی معرفت اور یہی ان کے لیے رہنمائی ہے اور یہی ان کا اصلاح حال ہے - اس جہاں کو چھوڑ کر وہ نہایت ہی بلند زندگی گزارتے ہیں -

--- ○○○---

جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کے اس اعزاز' ان سے اللہ کی رضامندی' ان کی اس نگہبانی اور بلند مقامات کی اس فضا میں اہل ایمان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اللہ کے لیے یکسو ہو جائیں اور اسلامی نظام کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں۔ ان سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ وہ تمہاری مدد کرے گا اور اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں کے لیے تو ہلاکت ہی مقدر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (٧) وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (٨) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (٩) (٤٧ : ٧ تا ٩) "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے' تو ان کے لیے ہلاکت ہے اور اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جسے اللہ نے نازل کیا ہے' لہٰذا اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے"۔

مومن اللہ کی مدد کس طرح کرتے ہیں؟ تاکہ وہ اپنی شرط پوری کر دیں اور اللہ جواب میں ان کی نصرت کرے اور ان کو ثابت قدم کر دے۔ اللہ کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے لیے مخلص ہو جائیں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں' نہ ظاہری شرک اور نہ خفی شرک۔ اور وہ اللہ کے مقابلے میں کسی شخص پر اور کسی شے پر بھروسہ نہ کریں اور اللہ ان کے لیے ان کی ذات اور تمام محبوب چیزوں سے محبوب ہو جائے اور انسان کی خواہشات' میلانات' مرغوبات' اس کی حرکات و سکنات' اس کے غلیانات اور اس کی تمام سرگرمیوں میں اللہ حاکم ہو جائے۔ یہ ہے نفوس انسانی کی طرف سے اللہ کی نصرت۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے انسانی زندگی کے لیے ایک شریعت اور نظام زندگی تجویز کیا ہے اور یہ نظام اس زندگی اور اس کائنات کے لیے ایک خاص تصور پر تشکیل پایا ہے۔ اللہ کی نصرت یوں ہوتی ہے کہ اس کے نظام کی نصرت کی جائے اور پوری زندگی میں انسان اس نظام کو نافذ کر دے۔ یہ ہے اللہ کی نصرت ہماری حقیقی زندگی میں۔

یہاں دو فقرے بہت ہی اہم ہیں' ان پر غور ضروری ہے۔

وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ "جو اللہ کے راستے میں قتل ہوئے"۔ دوسرا یہ کہ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ "اگر تم اللہ کی مدد کرو"۔ ان دونوں حالات میں' یعنی قتل ہونے میں اور نصرت میں یہ ضروری ہے کہ یہ اللہ کی راہ میں ہو۔ یہ ایک نہایت ہی واضح قابل توجہ نکتہ ہے لیکن جب کسی نظریہ پر صدیاں گزر جاتی ہیں تو اس کی اصل صورت مسخ ہو جاتی ہے۔ لوگ شہادت اور جہاد کے الفاظ تو بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں لیکن ان کا حقیقی مفہوم اور شرائط ان کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔

کوئی جہاد نہیں ہے' کوئی جنت نہیں ہے' کوئی شہادت نہیں ہے۔ مگر صرف اس وقت کہ وہ صرف اللہ کے لیے ہو۔ اللہ کی راہ میں ہو۔ صرف اللہ کے لیے رکا ہو' اللہ کے نظام کی مدد کے لیے مرتا ہو' اور اس نظام کو اپنی ذات اور اپنے منہاج حیات میں نافذ کرتا ہو۔

کوئی جہاد' کوئی شہادت اور کوئی جنت نہیں' الا یہ کہ یہ سب کچھ اللہ کا کلمہ بلند کرنے سے۔ یہ ہو اور اس لیے ہو کہ اللہ کا نظام لوگوں کی زندگیوں میں غالب ہو۔ ان کے اخلاق و طرز عمل میں نافذ ہو' ان کے احوال اور قوانین اور دستور

میں نافذ ہو۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو نمائش شجاعت کے لیے لڑتا ہے' یا حمیت جاہلیہ کے لیے لڑتا ہے یا ریاکاری کے لیے لڑتا ہے۔کیا یہ فی سبیل اللہ ہیں۔تو حضورؐ نے فرمایا کہ جس نے جنگ کی محض اس لیے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو تو صرف وہ فی سبیل اللہ ہے" (شیخین و ترمذی اور نسائی)۔

اسلامی جہاد کا نہ کوئی اور جھنڈا ہے' نہ کوئی اور مقصد ہے۔اللہ کے لیے جو لڑتا ہے وہ بس اللہ ہی کے لیے لڑتا ہے۔اس لیے جو شہید ہوتا ہے' وہ وہی ہے جو اسی کے لیے شہید ہوتا ہے۔صرف ایسے شہداء کے لیے جنت کا وعدہ ہے۔صرف یہی جھنڈا اور یہی مقصد مقبول ہے۔وہ نہیں جو صدیوں گزر جانے کے بعد کوئی نئے جھنڈے بن گئے' کچھ نئے مقاصد سامنے آگئے اور کچھ نئے نام رکھ لیے گئے!

داعیان حق کو اس واضح بات کو سمجھ لینا چاہئے اور ہمارے معاشروں کے اندر جہاد و قتال کے تصور میں جو انحراف واقع ہو گیا ہے اس کا خیال رکھنا اور اسے درست کرنا چاہئے۔نئے بتوں اور ان کے نئے جھنڈوں کے لیے بھی جہاد کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔اس لئے وہ اپنے عقیدے اور جہاد کے مفہوم کو واضح اور شفاف رکھیں۔

میں دوبارہ کہتا ہوں کہ جہاد صرف وہی ہے جو اللہ کے کلمے کے بلند کرنے کے لیے ہو۔انسانی نفس میں کلمے کی بلندی' انسانی ضمیر میں اس کلمے کی بلندی اخلاق اور طرز عمل میں اس کلمے کی بلندی' نظم مملکت اور اداروں میں کلمے کی بلندی' تعلقات اور روابط میں اللہ کے کلمے کی بلندی اور زندگی کے ہر موڑ اور ہر رخ میں کلمۃ اللہ کی بلندی اور سربلندی۔اس کے سوا جو نعرہ ہے وہ اللہ نہیں ہے' وہ شیطان کے لیے ہے۔اس کے سوا کسی مقصد کے لیے نہ شہادت ہے' نہ جنت ہے' نہ اللہ کی نصرت ہے' نہ ثابت قدمی ہے۔محض دھوکہ اور فریب ہے۔بچئے دور جدید کی بت گری سے اور آزری سے۔

اگر دوسرے لوگوں کے لیے جو داعی الی اللہ نہیں اس قسم کا صاف ستھرا تصور جہاد و قتال مشکل ہے' تو داعیان حق کو تو اپنے خیالات اور اپنا شعور' ان غلط تصورات سے صاف کرنا چاہئے۔داعیان اسلام کو تو دور جدید کے نعروں سے دور رہنا چاہئے جو بہرحال فی سبیل اللہ نہیں ہیں۔

تو یہ تو اللہ کی طرف سے ایک شرط ہے اپنے بندوں پر' جسے اللہ کی جانب سے لازم کیا ہے' تو اس کے مقابلے میں اللہ نے اپنے اوپر یہ لازم کیا ہے کہ وہ ایسے بندوں کی مدد کرے گا۔وہ ان کے قدم مضبوط کر دے گا۔یہ اللہ کا وعدہ ہے اور وہ اپنے وعدے کے خلاف کبھی نہیں کرتا۔اگر کچھ عرصے کے لیے بظاہر نصرت خداوندی آتی ہوئی نظر نہ آئے تو اس کے بھی کچھ دوسرے اسباب ہوتے ہیں۔نصرت اور قدم جمانے سے قبل ان کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔(مزید دیکھئے تفسیر انَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ (سورہ حج کی تشریح) یہ اللہ نے فیصلہ کرنا ہے کہ آیا اس کے بندوں نے شرط پوری کر دی ہے یا نہیں۔

اب میں چاہتا ہوں کہ ہم جواب شرط کے کلمات پر بھی غور کر لیں۔ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ "وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا"۔سب سے پہلے تو انسان کی سوچ ادھر جاتی ہے کہ نصرت سے پہلے ہی قدم جما دیئے جاتے ہیں۔اور قدم جمانے کے بعد ہی نصرت آتی ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔لیکن یہاں نصرت آنے کے بعد قدم جمانے میں ایک دوسری حالت اور ایک دوسرے مفہوم کی طرف بھی اشارہ ہے۔یعنی جب اللہ کی نصرت آ جائے اور مومنین غالب ہو جائیں تو اس کے بعد قدم جمانا مطلوب ہے۔اور یہ بہت ہی مشکل کام ہے۔کفر و ایمان کا معرکہ اللہ کی

نصرت اور فتح آجانے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا۔ حق و باطل کی کشمکش پھر بھی جاری رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی ذات اور عملی زندگی میں نصرت کی الگ ذمہ داریاں ہیں۔ کبر و غرور سے اجتناب' سستی اور وھن (کمزوری) سے اجتناب بہت سے لوگ مشکلات برداشت کرتے ہیں لیکن نصرت اور فتح کے بعد کم لوگ قدم جما سکتے ہیں۔ اور یہاں شاید اسی کی طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم!

وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَأَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ (۸ : ۴۷) "وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے' تو ان کے لیے ہلاکت ہے' اور اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا ہے"۔ یہ نصرت اور ثابت قدمی کے بالکل متضاد حالت ہے۔ اللہ کی طرف سے بدبختی کی دعا دراصل اعلان ہلاکت ہے' اور ناکامی اور نامرادی کا اعلان ہے اور اعمال کے ضائع ہونے کا مطلب ہے' ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ (۹ : ۴۷) "کیونکہ انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جسے اللہ نے نازل کیا ہے۔ لہذا اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے"۔ اس سے اس بات کی بہت اچھی تصویر کشی ہوتی ہے کہ ان کے دلوں میں قرآن کریم کے بارے میں کس قدر کراہت ہے۔ اور اللہ کی شریعت اور نظام کو وہ کس قدر ناپسند کرتے ہیں اور یہی کراہت ہی ان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ کفر کریں' مسلمانوں سے دشمنی رکھیں اور جنگ و جدال اور تنازعات رکھیں۔ ۔ ۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگوں کی اسلام کے بارے میں ذہنی حالت یہی ہوتی ہے۔ وہ اسلام کو نہایت ہی مکروہ سمجھتے ہیں اور اس سے متصادم ہوتے ہیں اگرچہ یہ بہترین اور مستحکم نظام ہے' لیکن ان لوگوں کو پسند نہیں ہوتا۔ یہ اس قسم کے لوگ ہیں جو ہر زمان و مکان میں پائے جاتے ہیں۔ اور آپ ان سے مل سکتے ہیں۔ جب آپ ایسے لوگوں سے ملیں گے تو ان کے منہ اور رویہ سے اسلام کے خلاف نفرت کا لاوا پھوٹ رہا ہو گا۔ بعض لوگوں کو تو اس قدر الرجی ہوتی ہے کہ محض اسلام کے ذکر ہی سے ان کو بچھو کاٹنے شروع کر دیتے ہیں۔ اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی معاملے میں اور کسی مکالمے میں اسلام کا ذکر ہی نہ آئے۔ آج ہمارے دور میں ایسے بہت سے لوگ ملتے ہیں اور ان کا یہ طرز عمل کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

ایسے لوگوں کی سزا کیا ہے؟ یہ کہ اللہ نے ان کے تمام اعمال کو باطل کر دیا اور اعمال کے لیے حبط کے لفظ کا استعمال قرآن مجید کا مخصوص انداز ہے جس میں وہ کسی مفہوم کو نہایت ہی حسی انداز دے دیتا ہے۔ "حبوط" کا لفظی معنی ہے کسی جانور کا زہریلی گھاس کھا کر پھول جانا' اس پھولنے سے جانور گھنٹوں میں ہلاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کفار کے اعمال بھی پھول جاتے ہیں' بظاہر وہ بہت ہی بڑے بڑے نظر آتے ہیں لیکن انجام ہلاکت و بربادی ہوتا ہے۔ یہ ایک تصویر ہے' ایک حرکت ہے جس میں ان لوگوں کی حالت کو بتایا گیا ہے جو اسلام سے نفرت کرتے ہیں اور اپنے بڑے بڑے کاموں پر مغرور ہوتے ہیں اور یہ اعمال پھولے ہوئے ہوتے ہیں جس طرح جانور زہریلی گھاس کھا کر پھول جاتا ہے۔

--- ooo ---

اس کے بعد انہیں اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ ذرا پیچھے مڑ کر تاریخ کو پڑھیں اور غور کریں۔ یہ بات ذرا شدت سے کہی جاتی ہے۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ دَمَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلِلْكَافِرِينَ أَمْثَالُهَا (۱۰:۴۷) "کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہ تھے کہ ان لوگوں کا انجام دیکھتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ اللہ نے ان کا سب کچھ ان پر الٹ دیا' اور ایسے ہی نتائج ان کافروں کے لیے مقدر ہیں"۔

یہ ایک خوفناک اور خشمگیں نظر ہے۔ اس میں نہایت ہی ہیجان اور شور و فغاں ہے۔ ان لوگوں کا منظر جن کو چشم زدن میں نیست و نابود کر کے رکھ دیا گیا۔ ان کے تمام آثار مٹا دیئے گئے۔ ملبے کے ڈھیر لگا دیئے گئے ہیں اور وہ ملبے کے ان ڈھیروں کے نیچے کراہ رہے ہیں۔ یہ منظر جسے اس انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ یہاں اس کا اس طرح پیش کرنا ہی مقصود ہے۔ انداز بیان سے ان اقوام کی تباہی' بستیوں کا ملبہ بن جانا اور توڑ پھوڑ کا اظہار ہوتا ہے۔

اس قسم کے خوفناک منظر کو پیش کر کے اور الفاظ کے ذریعہ اسکرین پر توڑ پھوڑ دکھا کر حاضرین کو کہا جاتا ہے کہ تمہارا جو رویہ ہے اس کے نتیجے میں کچھ ایسا ہی منظر تمہارے انتظار میں ہے۔

وَلِلْكَافِرِينَ أَمْثَالُهَا (۱۰:۴۷) "ایسے ہی نتائج ان کافروں کے لیے مقدر ہیں"۔ اس قسم کے نتائج کفار کے انتظار میں کیوں ہیں؟ اور اہل ایمان کی نصرت اس انداز میں کیوں ہے؟ یہ اللہ کا دائمی اصول ہے۔

---ooo---

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَأَنَّ الْكَافِرِينَ لَا مَوْلَىٰ لَهُمْ (۱۱:۴۷) "یہ اس لیے کہ ایمان لانے والوں کا حامی و ناصر اللہ ہے اور کافروں کا حامی و ناصر کوئی نہیں"۔

جس کا آقا اللہ ہو اور وہ اس کا مددگار ہو تو وہ اس کے لیے کافی ہے۔ یہ شخص کسی کا محتاج نہ ہوگا' ہر کسی سے بے نیاز ہو جائے گا۔ ایسے شخص پر اگر مشکل حالات بھی آتے ہیں تو اسے سمجھنا چاہئے کہ اس کی آزمائش ہو رہی ہے۔ اور اس آزمائش کے بعد خیر ہی خیر ہے۔ یہ آزمائش اور یہ مشکلات اس لیے نہیں کہ اللہ نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے بھی نہیں کہ اللہ نے اپنے بندوں کی مدد کرنے کا جو وعدہ کیا ہے اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ بلکہ یہ ایک بندۂ مومن کی آزمائش ہوتی ہے۔ اور جس کا آقا اللہ نہ ہو تو اس کا کوئی آقا اور ناصر نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہ تمام جنوں اور تمام انسانوں کو آقا بنالے۔ آخرکار انسانوں پر بھروسہ کرنے والا نامراد ہوتا ہے اگرچہ دنیا کی تمام قوتیں اس کی حمایت پر مرکوز ہوں۔

---ooo---

اب ان لوگوں کے سازوسامان جنہوں نے ایمان قبول کیا اور ان لوگوں کے سازوسامان کے درمیان موازنہ کیا جاتا ہے جنہوں نے کفر کیا۔ یہ دونوں گروہ جو اس وقت باہم برسرپیکار ہیں ان کے درمیان فرق کیا ہے؟ اور ان کے سازوسامان کے درمیان فرق کیا ہے؟

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴿١٢﴾ وَ

كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴿۱۳﴾
اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۴﴾
مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ
لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ڬ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ
مُّصَفًّى ۭ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ
فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ﴿۱۵﴾

”ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو اللہ ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں' اور کفر کرنے والے بس دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں' جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں اور ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے۔ اے نبی' کتنی ہی بستیاں ایسی گزر چکی ہیں جو تمہاری اس بستی سے بہت زیادہ زور آور تھیں جس نے تمہیں نکال دیا ہے۔ انہیں ہم نے اس طرح ہلاک کر دیا کہ کوئی ان کا بچانے والا نہ تھا۔ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف و صریح ہدایت پر ہو' وہ ان لوگوں کی طرح ہو جائے جن کے لیے ان کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہے اور وہ اپنی خواہشات کے پیرو بن گئے ہیں۔ پرہیز گار لوگوں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ اس میں نہریں بہہ رہی ہوں گی' نتھرے ہوئے پانی کی' نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسے دودھ کی جس کے مزے میں ذرا فرق نہ آیا ہو گا' نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسی شراب کی جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہو گی' نہریں بہہ رہی ہوں گی صاف شفاف شہد کی۔ اس میں ان کے لیے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے بخشش۔ (کیا وہ شخص جس کے حصہ میں یہ جنت آنے والی ہے) ان لوگوں کی طرح ہو سکتا ہے جو جہنم میں ہمیشہ رہیں گے اور جنہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دے گا؟“

وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے بعض اوقات اس زمین پر بھی بہت اچھا کھاتے پیتے ہیں لیکن اللہ مومنین کے اس حصے کے درمیان جو ان کو جنت کی صورت میں ملنے والا ہے اور کافروں کے اس تمام سروسامان کے درمیان موازنہ کرتا ہے جو ان کو اس دنیا اور آخرت دونوں میں ملنے والا ہے۔

مومنین کا حصہ رسدی یہ ہے کہ ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور ان کو یہ مقام عزت اللہ عطا کرے گا۔ لہٰذا مومنین کا یہ سازوسامان اور یہ اکرام بہت ہی بڑا ہے۔ یہ بارگاہ عزت میں ہے۔ یہ اللہ کے ہاں ان کا مقام ہے اور یہ ایمان و تقویٰ اور عمل و صلاح کی بنا پر ہے۔ یہ اونچی جنتوں میں اونچے رب تعالیٰ کی طرف سے بلند ایمان اور اعلیٰ اعمال کے بدلے ہو گا سب کچھ بلند!

اس کے مقابلے میں کافروں کا سازوسامان یوں ہے جس طرح مویشی چر چگ رہے ہیں۔

وَ يَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ (۴۷ : ۱۲) "جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں"۔ یہ ان کی بہت ہی خستہ اور گری ہوئی حالت ہے' اس کے اندر انسانیت کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی نہیں ہے۔ اس میں یوں نظر آ رہا ہے کہ کچھ حیوان ہیں جو منہ مار رہے ہیں اور حیوانی اور سخت قسم کی خوراک کھا رہے ہیں اور اس میں پاک و صاف اور اچھے اور برے کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ پس یہ ایک چارہ ہے جو یہ کھا رہے ہیں۔ اس کے لیے کوئی ضابطہ حلال و حرام نہیں۔ اس میں خدا کے خوف کی کوئی بات نہیں۔ نہ عدالت ضمیر سے کوئی پابندی عائد ہے۔

حیوانیت کا خاصہ صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ کھائے اور پئے۔ اگرچہ کھانے پینے میں حیوانوں نے نہایت ہی اعلیٰ ذوق بنا لیا ہو اور مختلف قسم کے استعمال کی اشیاء میں بہت ترقی کر لی ہو۔ جیسا کہ آج کل کے بہت سے نو دولتیے اس کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات مقصود نہیں ہے۔ اصل انسانی خصوصیت یہ ہے کہ انسان ایک ارادے کا مالک ہو' اس کی زندگی گزارنے کی کچھ قدریں ہوں' اللہ کے ہاں جو طیب اور پاک خوراک ہو یعنی رزق حلال وہ اسے اختیار کرے۔ وہ ایسے ارادے کا مالک ہو جس کے اوپر انسانی شہوات کا دباؤ نہ ہو۔ اور نہ ہی وہ مقصد پیش نظر ہو کہ "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"۔ اور وہ اس زندگی کو مویشیوں کی طرح صرف دسترخوان ہی نہ سمجھتا ہو۔ اور عیش و عشرت ہی اس کے نزدیک زندگی نہ ہو۔ جو جائز و ناجائز کے حدود و قیود سے پاک ہو۔ بلکہ انسان اور حیوان کے درمیان تو فرق ہی یہ ہے کہ انسان ایک صاحب ارادہ مخلوق ہے۔ اس کا اس جہاں میں ایک خاص مقصد ہے اور ایک خاص شعور حیات ہے جو غیر مبہم اصولوں پر قائم ہے اور یہ اصول اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہیں۔ اگر انسان ان باتوں کو گم کر دے تو گویا اس نے مقام انسانیت کو گم کر دیا ہے۔ اور وہ صرف حیوان رہ گیا ہے۔ کیونکہ انسانی خصوصیات میں سے اعلیٰ خصوصیت اس نے گم کر دی ہے۔

---ooo---

اب ایک موازنہ ان بستیوں کے درمیان جو ہلاک ہوئیں اور اس بستی کے درمیان جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکال دیا۔

وَ كَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ أَخْرَجَتْكَ أَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ

(۴۷ : ۱۳) "اے نبیؐ' کتنی ہی بستیاں ایسی گزر چکی ہیں جو تمہاری اس بستی سے بہت زیادہ زور آور تھیں جس نے تمہیں نکال دیا ہے۔ انھیں ہم نے اس طرح ہلاک کر دیا کہ کوئی ان کا بچانے والا نہ تھا"۔

یہ وہ آیت ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ یہ مکہ اور مدینہ کے درمیان اس وقت نازل ہوئی جب آپ ہجرت کا سفر فرما رہے تھے اس میں رسول اللہؐ کو تسلی دی گئی ہے۔ کیونکہ اپنا ملک ہمیشہ کے لیے چھوڑنا ایک مشکل کام ہے اور اس میں تسلی دی گئی کہ بظاہر تو یہ لوگ بڑے جبار نظر آتے ہیں' دعوت اسلامی کی راہ روکے ہوئے ہیں' اہل ایمان پر تشدد کرتے ہیں یہاں تک کہ انھوں نے ان کو اپنے گھروں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا ہے اور وہ دولت ایماں لے کر جا رہے ہیں لیکن در اصل یہ جبار بہت ہی کمزور ہیں۔

---ooo---

اب دونوں فریقوں کے درمیان مزید موازنہ کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ مومنین کو جنتیں عطا

کرے گا' جہاں نہریں بہتی ہیں' اس دنیا میں ان کو نصرت اور عزت بخشے گا' اور کفار کا کوئی آقا نہیں ہے' ان کا کوئی ناصر نہیں ہے وہ دنیا میں ہلاک ہوں گے اور آخرت میں خوار ہوں گے' اور ہمیشہ جہنم میں ہوں گے ـ یہ کیوں؟

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ

(٤٧ : ١٤) "بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف و صریح ہدایت پر ہو' وہ ان لوگوں کی طرح ہو جائے جن کے لیے ان کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہے اور وہ اپنی خواہشات کے پیرو بن گئے ہیں" ـ

یہ ہے وہ فرق دونوں گروہوں کے درمیان' دونوں کی طرز زندگی اور مقصد زندگی دونوں میں فرق ہے ـ جو اہل ایمان ہیں وہ

عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (٤٧ : ١٤) " اپنے رب کی طرف سے صاف ہدایت پر ہیں"۔ وہ حق کو جانتے ہیں اور انہوں نے اسے پہچان لیا ہے ـ وہ حق کے سرچشمے تک پہنچ گئے ہیں اور ان کے پاس جو حق آ رہا ہے وہ اس پر جمے ہوئے ہیں ـ وہ کسی دھوکے میں ہیں اور نہ گمراہی میں ـ اور کفار ایک بڑے دھوکے میں پڑے ہیں ـ شیطان نے ان کے لیے ان کے برے اعمال خوشنما بنا دیے ہیں ـ پھر ان کے اعمال کے بارے میں ان کو کوئی یقین بھی نہیں ہے کہ وہ کہاں سے ہدایات لیتے ہیں ـ

وَ اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ (٤٧ : ١٤) "وہ اپنی خواہشات کے پیروکار ہیں"۔ کوئی ضابطہ نہیں ہے ـ کوئی اصول نہیں ہے جس پر جائز و ناجائز کا تعین ہو' اور کوئی روشنی ان کے پاس نہیں جس کے ذریعہ وہ حق و باطل کی تمیز کریں ـ

---ooo---

یہ دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟ ان کے حالات' طرز زندگی اور سمت سفر سب جدا ہیں ـ اس لیے ممکن نہیں کہ وہ ایک پیمانے کے مطابق ناپے اور تولے جا سکیں ـ اور دونوں کا ایک ہی انجام ہو ـ یہی وجہ ہے کہ دونوں کے درمیان فرق و امتیاز ہے ـ دونوں کا انجام بھی مختلف ہے ـ

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى وَ لَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَ سُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ (٤٧ : ١٥) "پرہیزگار لوگوں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ اس میں نہریں بہہ رہی ہوں گی' نتھرے ہوئے پانی کی' نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسے دودھ کی جس کے مزے میں ذرا فرق نہ آیا ہو گا' نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسی شراب کی جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہو گی' نہریں بہہ رہی ہوں گی صاف شفاف

شہد کی ۔ اس میں ان کے لیے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے بخشش ۔ (کیا وہ شخص جس کے حصہ میں یہ جنت آنے والی ہے) ان لوگوں کی طرح ہو سکتا ہے جو جہنم میں ہمیشہ رہیں گے اور جنہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دے گا؟"

جنت کی خوشیوں اور جہنم کے عذاب کی یہ نہایت ہی محسوس تصویر اور منظر قرآن کریم میں بار بار آتا ہے ۔ ان کے ساتھ ساتھ کبھی معنوی اور مجرد خالص خوشیوں کا ذکر بھی آتا ہے ۔ کئی جگہ اس قسم کی خوشیوں کا ذکر بھی ہے جن کے اندر حسیات کا حصہ کم ہے ۔ یہ

اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے ۔ وہ انسان کو خوب جانتا ہے ۔"من خوب می شناسم پیران پارسا را" ۔ اللہ کو معلوم ہے اور سب سے زیادہ معلوم ہے کہ انسان کے دلوں پر زیادہ اثر کس چیز کا ہوتا ہے ۔ ان کی تربیت کس طرح ممکن ہے ۔ ان کے لیے کون سی نعمتیں بہتر ہیں اور ان کے لیے کون سی مناسب ہیں ۔ پھر انسانوں کے بھی کئی مدارج ہیں 'نفوس انسانی کے بھی کئی رنگ ہیں ۔ مختلف مزاج ہیں ۔ یہ سب انسان ہیں ۔ انسانیت میں برابر ہوتے ہوئے بھی رنگ ' مزاج اور خواہشات میں اختلاف ہے ۔ اس لیے اللہ نے اپنے فضل و کرم اور انعامات میں بھی تنوع رکھا ہے ۔ اور ہر کسی کو اس کی خواہش کے مطابق دیا ہے اور دے گا ۔ وہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے ۔

انسانوں میں سے ایسے بھی ہیں جن کی اصلاح کے لیے نتھرے ہوئے پانی کی نہریں ' دودھ کی نہریں جن کا ذائقہ بدلا ہوا نہ ہو ۔ عسل مصفی کی نہریں ' اور لذیذ شراب کی نہریں مناسب ہیں ' کہ ان کی خواہش ہے ۔ پھر یہ لوگ اس قسم کے پھل کو پسند کرتے ہیں 'پھر رب کی مغفرت ' لہٰذا اللہ نے ایسے ہی لوگوں کی تربیت کے لیے ان کی خواہشات کے مطابق یہ انعامات رکھے ہیں ۔ اور انہی کے بارے میں ہے ۔

لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَآءُونَ یہی ان کے لیے مناسب ہیں ۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اللہ کی بندگی ان انعامات کے شکر کی وجہ سے کرتے ہیں جو لاتعداد ہیں 'بعض ایسے ہیں جو اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ کی بندگی کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں 'یا پھر وہ اس بات سے شرم محسوس کرتے ہیں کہ اللہ ان کو ایسی حالت میں دیکھے جسے وہ ناپسند کرتا ہے ۔ ایسے لوگ اللہ کی بندگی پر جنت کی لالچ نہیں رکھتے ۔ اور دوزخ کے ڈر سے نہیں کرتے ۔ ایسے لوگوں کو انعامات کی پرواہ نہیں ہوتی ۔ نہ سزا کا خوف ہوتا ہے ۔ ایسے لوگوں کی تربیت اور جزاء کے لیے بھی اللہ نے ایک معیار رکھا ہے ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا "جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان کے لیے خدائے رحمٰن محبت پیدا کر دے گا" ۔ اور ان کو یہ یقین بھی ہو گا ۔

فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ "یہ سچائی کے مقام پر صاحب اقتدار بادشاہ کے پاس" کرسی نشین ہوں گے ۔ روایات میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر نماز پڑھتے تھے کہ پاؤں مبارک سوج جاتے تھے ۔ حضرت عائشہ ؓ نے فرمایا کہ آپ اس قدر عبادت کرتے ہیں حالانکہ آپ کے تو اگلے پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے گئے ہیں ۔ آپ ؐ نے فرمایا" عائشہ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ ہوں" ۔ (مسلم)

رابعہ عدویہ فرماتی ہیں 'اگر نہ جنت ہوتی اور نہ آگ ہوتی تو کیا کوئی اللہ کی عبادت نہ کرتا اور کوئی اللہ نہ سے ڈرتا؟ انہی سے سفیان ثوری نے ان کے ایمان کی حقیقت پوچھی تو انہوں نے جواب دیا "میں نے اللہ کی بندگی اس کی آگ کی ڈر کی وجہ سے نہیں کی اور نہ اس کی جنت کی لالچ کی وجہ سے کی کہ میں ایک برے مزدور کی طرح بن جاؤں کہ محض لالچ میں کام کروں"۔

بہرحال انسانوں میں سے بعض کا یہ رنگ ہے اور بعض کا وہ رنگ ۔ اور اللہ نے دونوں کے لیے مانشاؤں کے مطابق انعامات رکھے ہوئے ہیں ۔ جو ان کے مزاج کے مطابق ہیں ۔ اور جن سے ان کی تربیت ہوتی ہے ۔

یہ بات نظر آتی ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کی جوں جوں تربیت کی 'اس کی ساتھ ساتھ وسائل تربیت بھی زیادہ لطیف ہوتے گئے اور مسلمانوں کے بدلتے ہوئے ذوق کے مطابق تبدیل ہوتے رہے کیونکہ انسان اپنی تاریخ میں انسانیت کے مختلف مدارج پر رہا ہے ۔

بہرحال جزاء کی بھی دو قسمیں ہیں ۔ یہ نہریں قسما قسم کے پھلوں کے ساتھ اور اللہ کی مغفرت اور رضامندی کے ساتھ اور دوسری قسم :

كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ (۴۷ : ۱۵) "ان لوگوں کی طرح جو جہنم میں رہیں گے اور جنہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دے گا"۔ عذاب کی یہ صورت نہایت ہی حسی اور سخت ہے ۔ یہ صورت اس سورت کی فضا کے ساتھ بہت ہی مناسب ہے ۔ کیونکہ یہ سورہ قتال ہے ۔ پھر جس قوم کی تربیت ہو رہی ہے وہ نہایت ہی سخت اور اجڈ اور ہٹ دھرم ہے ۔ یہ اس دنیا میں بھی اس قدر گمن ہے کہ ماسوائے کھانے پینے کے اس کے سامنے کوئی اور اونچا نصب العین نہیں ہے ۔ فضا ایسی ہے کہ سامان معیشت بھی حسی ہے ۔ اس قوم کا مزاج بھی جانوروں کی طرح حسیات ہی کو دیکھتا ہے ۔ اس لیے ان کے لیے سزا بھی ایسی ہی سخت ہے ۔ گرم ترین پانی ان کو اس طرح پلایا جائے گا کہ نہ صرف یہ کہ منہ جل جائے گا بلکہ آنتیں تک کٹ جائیں گی اور دنیا میں یہ لوگ تھے بھی جانوروں کی طرح سخت ۔

کس طرح یہ لوگ ایمان والوں کی طرح ہو سکتے جو نہایت مہذب ہیں ۔ یہاں یہ پہلا مطالعہ ختم ہوتا ہے ۔ جو سورت شروع ہوتے ہی ان لوگوں پر ایک تنقیدی حملے کی شکل میں شروع ہوا تھا ۔ اور یہ اس طرح جاری رہا جس طرح دو کیمپوں کے درمیان جنگ جاری ہوتی ہے ۔ آخر تک یہ کشمکش سخت الفاظ میں ہوتی رہی ہے ۔

--- ooo---

# درس نمبر ۲۴۲ ایک نظر میں

یہ سبق منافقین کے بارے میں ہے' اس میں بتایا گیا ہے کہ ان کا موقف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے بارے میں کیا تھا؟ قرآن کے بارے میں کیا تھا؟ پھر مسلمانوں پر جہاد فرض ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں وہ کیا سوچتے تھے؟ یاد رہے کہ یہ جہاد صرف اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے تھا؟ پھر یہ کہ مدینہ کے ارد گرد پھیلے ہوئے مخالف اسلام یہودی قبائل کے ساتھ ان کے خفیہ تعلقات ان مقاصد کے لیے تھے۔ یہ کہ ان خفیہ سازشوں کی وجہ سے یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے۔

تحریک نفاق مدینہ کی پیداوار ہے۔ مکہ میں اس کا وجود ہی نہ تھا۔ کیونکہ مکہ میں ایسے حالات ہی نہ تھے جن میں کسی کو منافق بننے کی ضرورت پیش آتی مکہ میں مسلمان دبے ہوئے تھے۔ لہٰذا کسی کو منافق بننے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جب اللہ نے مدینہ میں اوس اور خزرج کے ذریعہ اسلام کو عزت بخشی اور مدینہ کے اکثر خاندانوں میں اسلام پھیل گیا۔ اکثر لوگ مسلمان ہو گئے تو بعض ایسے لوگ بھی دیکھا دیکھی مسلمان ہو گئے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہ کرتے تھے کہ آپ اور اسلام یہاں قوت پکڑیں۔ یہ لوگ مسلمان تو ہو گئے لیکن ان کے دل اسلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی سے بھرے ہوئے تھے۔ اور وہ اس آرزو میں بیٹھ گئے تھے کہ حالات گردش میں آئیں اور اس نئی قوت پر ضرب لگائی جائے۔ ان کا سربراہ عبد بن ابی بن سلول تھا۔ یہ مشہور زمانہ منافق تھا۔

مدنی دور کے آغاز میں یہودی مدینہ میں ایک زبردست فوجی' اقتصادی اور تنظیمی قوت رکھتے تھے۔ یہ لوگ بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبے کو پسند نہ کرتے تھے۔ نہ آپ کے دین اور آپ کے متبعین کو پسند کرتے تھے۔ یہودیوں کا یہاں اس پوزیشن میں موجود ہونا بھی منافقین کے لیے ایک سہارا تھا۔ اور اس مشترکہ دشمنی نے ان کو جلد ہی ایک دوسرے کا دوست بنا دیا۔ لہٰذا یہ دونوں قوتیں ہر موقعہ پر مسلمانوں کے خلاف سازشیں تیار کرتیں۔ اگر مسلمانوں پر مشکل حالات ہوتے تو یہ اپنی منافقت اور بغض و عداوت کا اظہار کر دیتے۔ اور اگر مسلمان اچھی حالت میں ہوتے تو یہ خفیہ اور اندھیروں میں ان کے خلاف سازشوں کا تانا بانا تیار کرتے۔ مدینہ کے دس سالہ عہد حکومت میں پانچ سالوں تک یہ اسلام کے لیے بہت بڑا خطرہ بنے رہے۔

مدینہ میں جس قدر سورتیں نازل ہوئی ہیں ان میں تواتر کے ساتھ منافقین کی سازشوں' عداوتوں اور ان کے نفاق کا ذکر ہے۔ اور یہ بھی مذکور ہے کہ یہ لوگ یہودیوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ اور ان سے ہدایات لیتے ہیں اور بعض سازشوں میں شریک ہیں۔ یہ سبق ان میں سے ایک ہے جس میں یہودیوں اور منافقین کے اشتراک کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۲۴۲ تشریح آیات

## ۱۶ --- تا --- ۳۱

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰۤى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ
عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۫ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۶﴾ وَ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا
زَادَهُمْ هُدًى وَّ اٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴿۱۷﴾ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ
بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴿۱۸﴾ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ
۲ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ
ع ۸ مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰىكُمْ ﴿۱۹﴾ وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ لَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ
۶ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ
اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ؕ فَاَوْلٰى لَهُمْ ﴿۲۰﴾ طَاعَةٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۫
فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۫ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴿۲۱﴾ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ
تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ تُقَطِّعُوْۤا اَرْحَامَكُمْ ﴿۲۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ
اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَ اَعْمٰۤى اَبْصَارَهُمْ ﴿۲۳﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ
اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾

”ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمہاری بات سنتے ہیں اور پھر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان

لوگوں سے جنہیں علم کی نعمت بخشی گئی ہے۔ پوچھتے ہیں کہ ابھی ابھی انہوں نے کیا کہا تھا؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے ٹھپہ لگا دیا ہے اور یہ اپنی خواہشات کے پیرو بنے ہوئے ہیں۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے ہدایت پائی ہے' اللہ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور انہیں ان کے حصے کا تقویٰ عطا فرماتا ہے۔ اب کیا یہ لوگ بس قیامت ہی کے منتظر ہیں کہ وہ اچانک ان پر آ جائے؟ اس کی علامات تو آ چکی ہیں۔ جب وہ خود آ جائے گی تو ان کے لیے نصیحت قبول کرنے کا کون سا موقع باقی رہ جائے گا؟ پس اے نبیؐ' خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے اور معافی مانگو اپنے قصور کے لیے بھی اور مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی۔ اللہ تمہاری سرگرمیوں کو بھی جانتا ہے اور تمہارے ٹھکانے سے بھی واقف ہے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی جاتی (جس میں جنگ کا حکم دیا جائے) مگر جب ایک پختہ سورت نازل کر دی گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو۔ ان کے لیے بہتر یہ ہے کہ اطاعت کریں اور صحیح باتیں کریں۔ مگر جب قطعی حکم دے دیا گیا اس وقت وہ اللہ سے اپنے عہد میں سچے نکلتے تو انہی کے لیے اچھا تھا۔ اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا کچھ اور توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر تم الٹے منہ پھر گئے تو زمین میں پھر فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے؟ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کو اندھا اور بہرہ بنا دیا۔ کیا ان لوگوں نے قرآن پر غور نہیں کیا' یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں؟"

مِنْهُمْ (ان میں سے) کا اشارہ کافروں کی طرف بھی ہو سکتا ہے کیونکہ درس سابق میں کافروں سے بحث تھی اور درحقیقت منافقین بھی کافر ہی تھے۔ اگرچہ چھپے ہوئے کافر تھے۔ اللہ نے یہاں ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے ان کو کافروں میں شمار کیا ہے کہ ان کافروں میں سے بعض منافقین ہیں۔

اور یہ اشارہ مسلمانوں کی طرف بھی ہو سکتا ہے یعنی مسلمانوں میں سے بعض منافقین ہیں۔ کیونکہ منافقین باقاعدہ نماز بھی پڑھتے تھے اور اسلام بظاہر ان کو مسلمان سمجھ کر ان کے ساتھ معاملہ کرتا تھا۔ لیکن دونوں صورتوں میں یہ منافق ہی تھے۔ آیت میں ان کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ ان میں تھیں اور یہ پورا سبق ان کے بارے میں ہے۔

یہ لوگ مجلس میں یوں بیٹھے ہوئے کہ گویا ہمہ تن گوش ہیں اور اچھی طرح بات سن رہے ہیں لیکن درحقیقت یہ سن نہیں رہے ہوتے تھے۔ بلکہ "بر زبان تسبیح و در دل گاؤ خر" کا مصداق ہوتے اور اگر سنتے بھی تو ان کے دل کو بات لگتی ہی نہ تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اہل علم سے طنزاً پوچھتے ہوں کہ بتایئے جناب ابھی کیا کہا صاحب نے۔ یعنی ہمارے پلے تو کوئی بات پڑی نہیں ہے۔

اس سے ان کی مراد یہ اشارہ بھی تھا کہ ہم تو ان باتوں کی کوئی زیادہ پرواہ نہیں کرتے لیکن اہل علم حضرت کی باتوں کا ایک ایک لفظ یاد کرتے ہیں۔ الفاظ بھی اور معانی بھی۔ صحابہ کرام کا طریقہ بھی یہ تھا کہ وہ حضورؐ کے الفاظ اور معانی دونوں کو یاد کرتے تھے۔ اور یہ لوگ یعنی منافقین ان الفاظ اور معانی کو بطور مزاح دہراتے تھے۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ نہایت بدفطرت' اسلام کے معاند' اندھے اور اسلام کے ترقی پذیر حالات پر جل بھن گئے تھے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ (۴۷ : ۱۶) "یہ وہ لوگ

ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے ٹھپہ لگا دیا ہے - یہ اپنی خواہشات کے پیرو بنے ہوئے ہیں" - یہ تو تھا منافقین کا حال - رہا اہل ہدایت کا حال تو وہ اس کے برعکس تھا۔

---○○○---

وَ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّ اٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ (۴۷ : ۱۷) "رہے وہ لوگ جنہوں نے ہدایت پائی ہے ' اللہ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور انہیں ان کے حصے کا تقویٰ عطا فرماتا ہے"۔

اس آیت میں واقعات کی جو ترتیب ہے ' وہ قابل توجہ ہے - جو ہدایت پر ہیں وہ خود ہدایت کی راہ لیتے ہیں تو اللہ ان کو مزید ہدایت کی توفیق دیتا ہے اور ان کو ہدایت میں مزید گہرائی بخشا ہے ۔

وَّ اٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ (۴۷ : ۱۷) "اور انہیں ان کے حصے کا تقویٰ عطا کرتا ہے"۔ تقویٰ ایک قلبی حالت کا نام ہے جس کے نتیجے میں انسان ہر وقت اللہ سے ڈرتا رہتا ہے - اس کو شعور ہوتا ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے - اللہ کے غضب سے انسان ڈرتا ہے - اللہ کی رضا کا متلاشی ہوتا ہے - اور اس بات سے وہ اپنے آپ کو بچاتا ہے کہ اللہ اسے بری حالت میں دیکھے - یہ تیز احساس ہی تقویٰ ہے - یہ اللہ اس شخص کو عطا کرتا ہے جس سے اللہ راضی ہو اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان راہ ہدایت لینے میں رغبت رکھتا ہے - تو اللہ مزید ہدایت دے کر اسے تقویٰ کا مقام دیتا ہے غرض ہدایت کی خواہش ' پھر اللہ کی طرف سے مزید ہدایت اور پھر اللہ کا تقویٰ اور ذرہ مدارج ہیں جو نفاق ' غفلت اور خواہشات نفس کی پیروی کے بالمقابل ہیں ۔

---○○○---

اب بات ان لوگوں کی طرف آتی ہے جو منافق ہیں ' اندھے ہیں ' غافل ہیں ' جو مجلس رسول سے ایسی حالت میں نکلتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے سنا اس سے کوئی نفع نہیں اٹھایا - ہدایت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا - ان کے دلوں کے اندر خدا کا کوئی خوف پیدا نہ ہوا - چنانچہ یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ حساب و کتاب کا دن بہت ہی جلدی آنے والا ہے ۔

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ (۴۷ : ۱۸) "اب کیا یہ لوگ بس قیامت ہی کے منتظر ہیں کہ وہ اچانک ان پر آ جائے؟ اس کی علامات تو آ چکی ہیں - جب وہ خود آ جائے گی تو ان کے لیے نصیحت قبول کرنے کا کون سا موقع باقی رہ جائے گا؟"

ان آیات میں منافقین کو ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ جگایا جاتا ہے اور گریبان سے پکڑ کر ان کو اس طرح جھنجھوڑا جاتا ہے جس طرح کسی نشے میں دھت شخص کو کھینچا جاتا ہے - یعنی یہ غافل لوگ جو رسول اللہ ؐ کی مجلس میں جاتے ہیں اور وہاں سے کچھ ہدایت لیے بغیر ' کچھ یاد کیے بغیر ' کچھ نصیحت پکڑے بغیر ' کورے کے کورے واپس ہوئے - یہ بدبخت اب کس چیز کا انتظار کرتے ہیں ۔

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً (۴۷ : ۱۸) "کیا یہ لوگ بس قیامت ہی کے منتظر

ہیں کہ اچانک آ جائے" ـ اور ان کے حالات یہ ہوں کہ یہ غفلت اور لاپرواہی میں ' اور فسق و فجور میں غرق ہوں ـ
اگر یہ لوگ قیامت ہی چاہتے ہیں تو

فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا (۴۷ : ۱۸) "اس کی علامات تو آ چکی ہیں" ـ یہ آخری رسالت قیامت کی بڑی نشانی ہے ـ یہ رسالت دراصل اعلان ہے کہ اب قیامت جلد ہی آنے والی ہے ـ حضور اکرمؐ نے فرمایا: بعثت انا و الساعة کھاتین "میں اور قیامت ان دو کی طرح مبعوث ہوئے ہیں" ـ آپ نے اپنی دو انگلیوں سبابہ اور درمیانی انگلی کو جوڑ کر اشارہ فرمایا (متفق علیہ) ـ حضور اکرمؐ سے ادھر اگر زمانہ لوگوں کو زیادہ طویل ہوتا ہوا نظر آتا ہے تو اللہ کے ایام ہمارے ایام کے مقابلے میں بہت ہی طویل ہوتے ہیں ـ اللہ کے حساب میں قیامت کی نشانی آ گئی ہے ـ اور بڑی نشانی یہ آخری رسالت ہے ـ اور یہ کسی عقلمند شخص کی روش نہیں ہو سکتی کہ مصیبت آئے اور وہ سویا ہوا ہو ـ اور وہ پھر بچاؤ کی کوئی تدبیر نہ کر سکے ـ

فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰهُمْ (۴۷ : ۱۸) "جب وہ آ جائے گی تو ان کے لیے نصیحت قبول کرنے کا کون سا موقعہ باقی رہ جائے گا" ـ یہ نہایت ہی قوت سے جھنجھوڑنے کے مترادف ہے کہ جاگو ' خطرہ سر پر ہے اور سختی کے ساتھ گریبان سے پکڑ کر ہلانا ' اس سورت کے سخت انداز کے بھی مناسب ہے ـ

---ooo---

اب روئے سخن حضور اکرمؐ اور آپ کے ہدایت یافتہ ' متقی اور متلاشیان ہدایت ساتھیوں کی طرف پھر جاتا ہے کہ وہ ہدایت کے لیے ایک دوسری راہ بھی اپنائیں ـ علم و معرفت ' توبہ و استغفار ' اللہ کا خوف اور خشیت اختیار کریں اور آخری وقت کا انتظار کریں ـ اللہ تمہاری دنیا و آخرت کے انجام سے اچھی طرح واقف ہے ـ

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰىكُمْ (۴۷ : ۱۹) "پس اے نبیؐ خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے ' اور معافی مانگو اپنے قصور کے لیے بھی اور مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی ـ اللہ تمہاری سرگرمیوں کو بھی جانتا ہے اور تمہارے ٹھکانے سے بھی واقف ہے" ـ

یہاں آپ کو اور مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ تمہاری ملت جس نظریہ پر قائم ہے اس کو سمجھو وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ ' معبود اور حاکم نہیں ہے ـ

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (۴۷ : ۱۹) "پس اے نبیؐ خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی اور عبادت کے مستحق نہیں" ـ اس حقیقت کو ذہن میں تازہ کرتے ہوئے پھر دوسری ہدایات یہ ہیں ـ

وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ (۴۷ : ۱۹) "اپنے قصور کے لیے معافی مانگو" ـ حالانکہ حضورؐ کے تو اگلے پچھلے

گناہ معاف تھے؟ لیکن ایک باشعور' متقی اور حساس بندے کی یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ ہروقت اپنی مساعی کو کمزور سمجھتا ہے ۔ اگرچہ وہ اطاعت الہٰی میں بہت جدوجہد کرتا ہو ۔ حضورؐ جانتے تھے کہ استغفار اور ذکر' شکر ہے اور اللہ کی مغفرت کا مزید شکر ہے ۔ اور پھر آپ کے منصب و مقام پر بعد میں جو لوگ آنے والے تھے' ان کے لیے یہ ہدایت ہے اور عام مسلمانوں کے لیے یہ رہنمائی ہے کہ جب حبیب خدا کو یہ ہدایت ہے کہ مغفرت طلب کرو' جبکہ وہ بخش دیئے گئے ہیں تو دوسروں کو تو ہروقت استغفار کرنا چاہئے ۔ نیز حضورؐ اپنے لیے اور مومنین و مومنات کے لیے استغفار کرتے تھے ۔ اس لیے مسلمانوں کے دلوں میں محبت رسول کا شعور تازہ رہتا ہے کہ رسول کریمؐ کی وجہ سے ان پر اللہ کی رحمت ہو رہی ہے ۔ اور حضور اکرمؐ مومنین اور مومنات کے لیے مغفرت طلب کر رہے ہیں ۔ پھر ان ہدایات کے سلسلے کی آخری بات ۔

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰكُمْ (۱۹:۴۷) "اللہ تمہاری سرگرمیوں کو بھی جانتا ہے اور تمہارے ٹھکانے سے بھی واقف ہے"۔ اس سے دل مومن کو اطمینان بھی نصیب ہوتا ہے اور اس کے دل میں یہ تصور بھی پیدا ہوتا ہے کہ اللہ ہماری چلت پھرت سے بھی واقف ہے اور انجام سے بھی واقف ۔ اطمینان یہ کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے اور خوف یہ کہ اللہ ہرحالت میں ہم کو جانتا ہے' اس سے چھپ کر ہم کوئی نافرمانی نہیں کر سکتے ۔ یہ ہے اسلامی تربیت کہ اللہ کے بارے میں تیز احساس رکھو' ہروقت اس سے ڈرتے رہو اور ہروقت انتظار میں رہو کہ وہ کیا فیصلہ کرتا ہے ۔

---ooo---

اب روئے سخن ایک نہایت ہی حساس موقف کی طرف آتا ہے ۔ اس وقت تک پالیسی یہ تھی کہ جہاد و قتال سے رکو لیکن اب اللہ نے جہاد کا حکم دے دیا ۔ یہ منافقین پر ایک ضرب تھی ۔ وہ سخت دہشت زدہ ہوگئے کیونکہ اب تو ان کے لیے چھپ کر رہنا مشکل ہو گیا تھا ۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اب اگر وہ نفاق پر رہے اور اخلاص کے ساتھ اسلام قبول نہ کیا تو ان کا اندرون ظاہر ہو جائے گا ۔ کیونکہ جب جہاد کا فیصلہ ہو گا تو جنگ میں جانا ہو گا یا پیچھے رہنا ہو گا ۔

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ لَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاَوْلٰى لَهُمْ (۲۰) طَاعَةٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (۲۱) فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ تُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ (۲۲) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَ اَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ (۲۳) اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۲۴) (۴۷ : ۲۰ — ۲۴) "جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی جاتی (جس میں جنگ کا حکم دیا جائے) مگر جب ایک پختہ سورت نازل کر دی

گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو۔ ان کے لیے بہتر یہ ہے کہ اطاعت کریں اور صحیح باتیں کریں۔ مگر جب قطعی حکم دے دیا گیا اس وقت وہ اللہ سے اپنے عہد میں سچے نکلتے تو انہی کے لیے اچھا تھا۔ اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا کچھ اور توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر تم الٹے منہ پھر گئے تو زمین میں پھر فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے؟ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کو اندھا اور بہرہ بنا دیا۔ کیا ان لوگوں نے قرآن پر غور نہیں کیا' یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں؟"

اہل ایمان' کسی نئی سورت کے نزول کا مطالبہ کرتے تھے' یا تو اس لیے کہ ان کے دلوں میں ہر وقت یہ شوق رہتا تھا کہ وہ نئی نئی ہدایات لیتے رہیں۔ کیونکہ ان کو قرآن سے بے حد محبت تھی۔ وہ ہر نئی سورت میں علم و انس کا ایک نیا سامان اپنے لیے پاتے تھے۔ اور اس سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ نئے حالات میں مسلمان جہاد فی سبیل اللہ کی ہدایات اور اجازت چاہتے تھے کہ اسلام کے لیے لڑ مرنے کی ہدایات ان کو دی جائیں۔

لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ (۴۷ : ۲۰) "کوئی سورت کیوں نہیں نازل کی جاتی"۔

فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ (۴۷ : ۲۰) "مگر جب پختہ سورت نازل کر دی گئی"۔ اور اس قدر مفصل کہ اس میں کسی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور۔

وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ (۴۷ : ۲۰) "جس میں جنگ کا ذکر کیا گیا"۔ جس میں پھر کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی اور جو لوگ قتال سے پیچھے رہتے ہیں' یا جہادی کاموں میں پیچھے رہتے ہیں' ان کی مذمت بھی کر دی گئی تو بیمار دلوں والے لوگ یعنی منافقین کی حالت غیر ہونے لگی اور وہ پردے کرنے لگے جن کے پیچھے چھپ کر یہ سازشیں کرتے تھے۔ ان کی جزع و فزع' شور و فغاں اور سہمے اور ڈرے ہوئے ہونا یہاں تک کہ مارے خوف کے ان پر غشی کا طاری ہونا قابل دید تھا۔ قرآن کریم نے یہاں ان لوگوں کی تصویر یوں کھینچی ہے کہ گویا وہ ہیں سامنے اسکرین پر۔

رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ

(۴۷ : ۲۰) "تو تم نے دیکھا کہ جن لوگوں کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو"۔ یہ اس قدر خوبصورت انداز تعبیر ہے کہ انسان اس کی نقل نہیں اتار سکتا۔ نہ کسی اور عبارت میں نہ کسی اور زبان میں اس طرز تعبیر کو اپنا سکتا ہے۔ خوف و ہراس کی یہ لمبی تصویر ہے کہ کپکپی اور خوف سے بھی آگے بڑھ کر ان لوگوں پر گویا غشی کی حالت طاری ہو رہی ہے۔ اور خیال میں ان لوگوں کی پھر عجیب و غریب حرکات سامنے آتی ہیں۔ اور وہ تمام نفوس و شخصیات کی تصاویر ذہن میں آ جاتی ہیں جن کو پختہ ایمان نصیب نہ ہو' جس کی فطرت پکی نہ ہو اور جن کے اندر اس قدر جذبہ جہاد نہ ہو جس کی وجہ سے وہ خطرے کا مقابلہ کر سکیں۔ یہ لوگ مریض اور منافق ہوتے ہیں۔

یہ لوگ اس قدر ذلت' گراوٹ اور شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں کہ دوبارہ ان کو ایمان کی دعوت از سرنو دی

جاتی کہ ایمان ہی حقیقی زادِ راہ ہے جس سے ارادے جواں ہوتے ہیں اور جس سے پاؤں مضبوط ہوتے ہیں۔

فَاَوْلٰی لَھُمْ (۴۷ : ۲۰) طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰه لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ (۴۷ : ۲۱) "ان کے لیے بہتر یہ ہے کہ اطاعت کریں اور صحیح باتیں کریں۔ مگر جب قطعی حکم دے دیا گیا اس وقت وہ اللہ سے اپنے عہد میں سچے نکلتے تو انہی کے لیے اچھا تھا"۔ ہاں جس شرمندگی میں وہ مبتلا ہیں اس کے مقابلے میں ان کے لیے یہی اچھا تھا۔ وہ حیران ہیں کہ کیا کریں۔ پریشان ہیں کہ کیا ہو گا۔ اب ان کا نفاق تو چھپ نہ سکے گا۔ ان کے لیے بہتر پالیسی اب یہ ہے۔

طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ (۴۷ : ۲۱) "وہ اطاعت کریں اور سیدھا رویہ اختیار کر کے بات کریں"۔ اللہ کے احکام کو اب نفاق کے بجائے دل سے قبول کر لیں۔ اور اللہ پر یقین کر کے اس کے احکام کو مان لیں۔ اور اس قسم کی باتیں کریں جو سچی ہوں اور سچے دل سے ہوں۔ اور پختہ ضمیر کے مطابق ہوں اور یہ ان کے لیے اب نئے حالات میں زیادہ مفید ہو گا جبکہ اب احکام قطعی ہو گئے ہیں۔ اب تو انہوں نے یا جہاد میں جانا ہے یا پیچھے رہنا ہے۔ لہٰذا عزیمت اور شعور کے ساتھ جہاد کرو۔ اس طرح ان کے دل مضبوط ہوں گے' ان کا عزم پختہ ہو جائے گا۔ قدم مضبوط ہوں گے' جہاد ان کو مشقت اور بیگار نہ نظر آئے گا۔ اور جنگ ان کے لیے ایک ایسی بلائے ناگہانی نہ ہو گی جس نے منہ کھولا ہوا ہے۔ جنگ میں گئے نہیں کہ اس بلا کے منہ میں پڑے نہیں۔ اگر سچے دل سے جہاد کریں گے تو دو بھلائیوں میں ایک بھلائی تو بہرحال ملے گی۔ یا تو خطرے سے نجات اور فتح ملے گی اور یا شہادت اور جنت ملے گی۔ اور یہ دوسری صورت زیادہ بہتر ہو گی۔ یہ ہے وہ زادِ راہ یعنی حقیقی ایمان جس کے نتیجے میں عزائم جوان اور پاؤں مضبوط اور جزع و فزع مفقود ہو جاتے ہیں اور انسان کو اطمینان اور قرار و ثبات ملتا ہے۔

اب ان کو نہایت سختی سے جہاد سے پیچھے رہنے کا انجام بتایا جاتا ہے کہ اگر انہوں نے اسلام سے منہ موڑ لیا تو انہیں معلوم ہے کہ اسلام سے قبل ان کی حالت کیا تھی۔ تم نے نفاق کے ساتھ اسلام قبول کیا ہے اس میں کتنے فائدے ہیں؟

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ (۴۷ : ۲۲) "اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا اور کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ تم الٹے منہ پھر گئے تو زمین میں پھر فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے"۔ یعنی تم سے تو یہی توقع ہے۔ ذرا سابقہ حالات کی روشنی میں دیکھو کہ اگر اسلام سے منہ موڑو گے تو سابقہ حالت کی طرف لوٹ کر ایک دوسرے کے اور اپنے ہی بھائیوں کے گلے کاٹو گے جس طرح اسلام سے قبل تھے۔ اسلام سے روگردانی سے ڈرانے کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی حقیقی صورت حال کیا ہے' اگر یہ اپنی موجودہ پوزیشن پر ہی ڈٹے رہے جس طرح کہ نظر آتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ (۴۷ : ۲۳) اَفَلَا

يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۲٤:٤٧) "یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کو اندھا اور بہرہ بنا دیا۔ کیا ان لوگوں نے قرآن پر غور نہیں کیا' یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں؟" یہ لوگ نفاق کی بیماری میں بدستور مبتلا ہیں۔ درحقیقت وہ اس دعوت سے حقیقتاً منہ موڑ رہے ہیں جس میں وہ بظاہر داخل ہو چکے ہیں اور اس پر ان کا یقین بھی نہیں ہے۔ اس لئے

فَاَصَمَّهُمْ وَ اَعْمٰى اَبْصَارَهُمْ (۲۳:٤٧) "اللہ نے ان کو بہرا اور اندھا بنا دیا ہے"۔ ان کی قوت سماعت تو موجود ہے اور قوت باصرہ بھی موجود ہے لیکن انہوں نے کانوں اور آنکھوں کو معطل کر دیا ہے یا سمع و بصر کے نتیجے میں جو ادراک حاصل ہوتا ہے اس کو معطل کر دیا ہے۔ گویا ان کے یہ حواس اپنا فریضہ منصبی ادا نہیں کر رہے۔ قرآن نہایت ہی سرزنش کے انداز میں پوچھتا ہے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (۲٤:٤٧) "کیا یہ قرآن پر غور نہیں کرتے"۔ یوں کہ ان کی آنکھوں کے پردے زائل ہو جائیں کان سننے لگیں اور ان تک قرآن کے نور کی رسائی ہو' ان کے پردۂ شعور پر ارتعاش ہو' ان کے دلوں کے اندر جوش و خروش پیدا ہو' ان کا ضمیر مخلص ہو جائے اور ان کے اندر ایک ایسی زندگی آ جائے جو قرآن کے نور سے منور ہو' اور وہ اس سے ہدایت اخذ کریں۔

اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۲٤:٤٧) "یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں"۔ یہ قفل ان کے دلوں تک قرآن کے نور کو جانے نہیں دیتے۔ ان کے دل اس طرح بند ہیں جس طرح دروازے بند ہونے کی صورت میں انسان' ہوا یا کوئی چیز اندر نہیں جا سکتی اور نہ روشنی جا سکتی ہے۔

---○○○---

منافقین کے حالات ابھی جاری ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ایمان لانے کے بعد ان کے منہ موڑنے کے اسباب کیا ہیں؟ ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ یہودی سازش میں شریک ہو گئے ہیں اور انہوں نے ان کے ساتھ وعدہ کر لیا ہے کہ وہ جو سازش تیار کریں گے یہ ان کی اطاعت کریں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ
الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ وَ اَمْلٰى لَهُمْ ﴿۲۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا
نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿۲۶﴾ فَكَيْفَ اِذَا
تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ
اَسْخَطَ اللّٰهَ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۲۸﴾ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ ع ۹

قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ
فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۰﴾
وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَا۠ اَخْبَارَكُمْ ﴿۳۱﴾

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہدایت واضح ہو جانے کے بعد اس سے پھر گئے ان کے لیے شیطان نے اس روش کو سہل بنا دیا ہے اور جھوٹی توقعات کا سلسلہ ان کے لیے دراز کر رکھا ہے۔ اسی لیے انہوں نے اللہ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنے والوں سے کہہ دیا کہ بعض معاملات میں ہم تمہاری مانیں گے۔ اللہ ان کی یہ خفیہ باتیں خوب جانتا ہے۔ پھر اس وقت کیا حال ہو گا جب فرشتے ان کی روحیں قبض کریں گے اور ان کے منہ اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے انہیں لے جائیں گے؟ یہ اسی لیے تو ہو گا کہ انہوں نے اس طریقے کی پیروی کی جو اللہ کو ناراض کرنے والا ہے اور اس کی رضا کا راستہ اختیار کرنا پسند نہ کیا۔ اسی بنا پر اس نے ان کے سب اعمال ضائع کر دیے۔ کیا وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے' یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اللہ ان کے دلوں کے کھوٹ ظاہر نہیں کرے گا؟ ہم چاہیں تو انہیں تم کو آنکھوں سے دکھا دیں اور ان کے چہروں سے تم ان کو پہچان لو۔ مگر ان کے انداز کلام سے تو تم ان کو جان ہی لو گے۔ اللہ تم سب کے اعمال سے خوب واقف ہے۔ ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہیں"۔

قرآن کریم نے ایمان لانے اور ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد ان کی جانب سے ایمان کو ترک کرنے کے عمل کو نہایت ہی حسی انداز میں پیش کیا ہے۔ یعنی واپسی اور الٹے پاؤں پھرنے کا عمل' اور اس کے اسباب یہ بتائے ہیں کہ شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ اندازی کی اور ان کے لیے اس برے کام کو خوبصورت بنا دیا یعنی ظاہری حرکت کہ ایک شخص الٹے پاؤں پھر رہا ہے اور معنوی حرکت اس انداز تعبیر میں دونوں نظر آتی ہیں جبکہ یہ منافق اپنی جانب سے اپنے ان اعمال کو اچھی طرح چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شیطان ان پر کس طرح مسلط ہو گیا اور کس طرح وہ ان کو مرتد بنانے میں کامیاب ہو گیا حالانکہ آغاز میں یہ لوگ ایمان لا چکے تھے' تو وجہ یہ تھی:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ (۴۷ : ۲۶) "اسی لیے انہوں نے اللہ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنے والوں سے کہہ دیا کہ بعض معاملات میں ہم تمہاری مانیں گے"۔ مدینہ میں یہودی تھے اور وہ نزول قرآن کے پہلے مخالف تھے کیونکہ ان کو توقع تھی کہ آخری رسول بھی یہودی ہو گا۔ رسالت کا خاتمہ ان پر ہو گا۔ یہ لوگ کافروں پر مکمل فتح کی توقع اس رسول کے دور میں کرتے تھے اور کافروں کو اس امر سے ڈراتے بھی تھے کہ جب نبی آخر الزمان آئے گا تو وہ پوری دنیا پر غالب ہو گا۔ اور پوری دنیا میں ان کو غلبہ حاصل ہو گا۔ اور پھر یہودیوں کی مملکت قائم ہو گی۔ لیکن اللہ نے آخری رسول ابراہیم علیہ السلام کی اس نسل سے بھیجا جو یہودی نہ تھی اور حضور اکرمؐ جب مدینہ ہجرت کر کے آئے تو انہوں نے اس ہجرت کو بھی پسند نہ کیا کیونکہ اس کی وجہ سے ان کا رہا سہا اثر رسوخ بھی ختم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اول روز سے یہ لوگ رسول اللہؐ

کے خلاف جمع ہو گئے تھے اور آپؐ کے خلاف خفیہ سازشوں کی جنگ شروع کر دی تھی۔ کیونکہ بظاہر وہ میدان جنگ میں تو حضور اکرمؐ کے خلاف نہ جنگ کر سکتے تھے اور نہ اس کا کوئی جواز تھا۔ اس طرح یہودیوں کے ساتھ ہر وہ شخص شامل ہو گیا جو حضورؐ سے دشمنی رکھتا تھا۔ تمام منافقین ان سازشوں میں شریک ہو گئے اور یہ جنگ ان کے اور رسول اللہؐ کے درمیان چلتی رہی اور آخر کار حضور اکرمؐ نے ان کو جزیرۃ العرب سے جلاوطن کر دیا۔

یہ منافقین جو ہدایت پانے کے بعد منافق ہو گئے تھے انہوں نے یہودیوں کو یہ یقین دہانی کرائی کہ۔

سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ (۴۷ : ۲۶) "بعض معاملات میں ہم تمہاری اطاعت کریں گے"۔ اور راجح بات یہ ہے کہ یہ یقین دہانی خفیہ سازشوں کے سلسلے میں تھی جو وہ اسلام اور رسول اللہ کے خلاف تیار کرتے رہتے تھے۔

وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِسْرَارَهُمْ (۴۷ : ۲۶) "اللہ ان کی یہ خفیہ باتیں خوب جانتا ہے"۔ یہ نہایت ہی دھمکی آمیز تبصرہ ہے بلکہ دھمکی ہے کہ کریں یہ اپنی سازشیں، ہم جانتے ہیں ان کا سب کچھ۔ اللہ کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں اور اللہ کی قوت کے مقابلے کی کوئی قوت نہیں۔

---ooo---

یہ زندگی مختصر ہے اور آخر کار ہمارا لشکر جب پہنچے گا اور ان سے امانت حیات وصول کرے گا تو

فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ (۴۷ : ۲۷) "پھر اس وقت کیا حال ہو گا جب فرشتے ان کی روحیں قبض کریں گے اور ان کے منہ اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے انہیں لے جائیں گے؟"

یہ نہایت ہی خوفزدہ کرنے والا اور توہین آمیز منظر ہے۔ جب ان کی موت کا وقت ہو گا یہ بے بس ہوں گے۔ اس زمین پر سے رخصت ہو رہے ہوں گے اور دوسری حیات کا آغاز ہو رہا ہو گا۔ اور اس نئی زندگی کا آغاز یوں ہو رہا ہے کہ فرشتے ان کے منہ پر بڑی بے دردی سے تھپڑ مار رہے ہیں اور چوتڑوں پر ڈنڈے رسید کر رہے ہیں۔ حالانکہ بذات خود موت کا وقت نہایت ہی دردناک ہوتا ہے۔ خوف اور کرب کا وقت ہوتا ہے۔ لیکن یہ چونکہ الٹے پاؤں پھرے ہیں اس لیے ان کو چوتڑوں پر سزا مل رہی ہے۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

---ooo---

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اتَّبَعُوا مَا أَسْخَطَ اللَّهَ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ

(۴۷ : ۲۸) "یہ اسی لیے تو ہو گا کہ انہوں نے اس طریقے کی پیروی کی جو اللہ کو ناراض کرنے والا ہے اور اس کی رضا کا راستہ اختیار کرنا پسند نہ کیا۔ اسی بنا پر اس نے ان کے سب اعمال ضائع کر دیئے"۔

یعنی انہوں نے خود اپنے لیے یہ انجام پسند کیا ہے۔ انہوں نے خود اس طریقے کو اپنایا جو اللہ کو ناراض کرنے والا طریقہ ہے۔ یعنی نفاق، معصیت اور اللہ کے دشمنوں اور اللہ کے دین کے دشمنوں اور اللہ کے رسول کے دشمنوں کے ساتھ مل کر سازشیں کرنا۔ انہوں نے خود اللہ کی رضامندی کو ناپسند کیا۔ اور اس کے حصول کی کوشش نہ کی بلکہ انہوں نے

وہ کام کیا جس سے اللہ ناراض ہوتا ہے اور غضب میں آتا ہے یوں اللہ نے ان کے تمام اعمال کو (حبط) کر دیا۔ جن پر وہ مست تھے اور جن کو وہ ناپسند کرتے تھے اور اپنے ان اعمال کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ ہم ان کے بہت ہی ماہر ہیں ۔ یہ مومنین کے خلاف سازشیں کرتے تھے اور یوں بظاہر ان کی یہ سازشیں غبارے کی طرح پھولی ہوئی ہوتیں اور طوفان کی طرح آتیں لیکن چشم زدن میں ختم ہو جاتیں۔

---ooo---

آخر میں کہا جاتا ہے کہ اللہ ستار ہے' لیکن تم جو کچھ کر رہے ہو کہ اپنے اوپر اسلام کا جھوٹا لبادہ اوڑھے ہوئے ہو' اس کو اللہ اتار سکتا ہے اس لیے اب بھی باز آ جاؤ۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ (۲۹) وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ (۳۰) وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَ الصّٰبِرِيْنَ وَ نَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ

(۳۱) (۴۷ : ۲۹ تا ۳۱) ''کیا وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے' یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اللہ ان کے دلوں کے کھوٹ ظاہر نہیں کرے گا؟ ہم چاہیں تو انہیں تم کو آنکھوں سے دکھا دیں اور ان کے چہروں سے تم ان کو پہچان لو۔ مگر ان کے انداز کلام سے تو تم ان کو جان ہی لو گے ۔ اللہ تم سب کے اعمال سے خوب واقف ہے ۔ ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہیں''۔

منافقین کو اپنی فنی مہارت پر پورا اعتماد تھا۔ اور وہ بالعموم اپنی سازشوں کو مسلمانوں سے چھپانے میں کامیاب رہتے تھے ۔ قرآن مجید ان کو بتاتا ہے کہ یہ ان کی بہت ہی احمقانہ سوچ ہے ۔ آخر خدا ہر چیز کو جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے تمام بھیدوں کو کھول سکتا ہے ۔ اور مسلمانوں کو بتا سکتا ہے کہ تمہارے دلوں میں ان کے خلاف کس قدر بغض بھرا ہوا ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ (۴۷ : ۳۰) ''ہم چاہیں تو انہیں تم کو آنکھوں سے دکھا دیں اور ان کے چہروں سے تم ان کو پہچان لو''۔ اگر ہم چاہیں تو ان کی ایک ایک شخصیت تم کو بتا دیں' یہاں تک کہ تم ایک ایک کو ان کی علامات سے پہچان لو۔

یہ آیت اس سے پہلے کی ہے جب اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کے نام بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیئے تھے لیکن بہرحال ان کے لہجے' چالاکی' پیچ دار باتوں اور آپ کے خطاب سے غلط استدلال کرنے کی عادت کی وجہ سے آپ ان کو جانتے تھے ۔

وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ (۴۷ : ۳۰) ''مگر ان کے انداز کلام سے تو تم جان ہی لو گے''۔

بات اب صرف اللہ کے علم پر آکر رکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اعمال کو بھی جانتا ہے اور ان کے محرکات کو بھی جانتا ہے۔

وَ اللّٰہُ یَعْلَمُ اَعْمَالَکُمْ (۴۷ : ۳۰) "اللہ تم سب کے اعمال سے خوب واقف ہے"۔ اس سے کوئی بات مخفی نہیں رہتی۔ اب اللہ اسلامی سوسائٹی کو صاف کرنے کے لیے آزمائش کا اعلان فرماتا ہے۔ یہ آزمائش پوری امت کی ہوگی۔ اس آزمائش کے نتیجے میں صابر اور مجاہد جدا ہو کر ایک طرف آ جائیں گے اور ان کی خبریں عام ہو جائیں گی اور اسلامی صف میں کوئی مشکوک آدمی نہ رہے گا اور منافقین اپنی منافقت نہ چھپا سکیں گے۔ وہ تو بہت ہی ضعیف لوگ ہیں۔

وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجٰھِدِیْنَ مِنْکُمْ وَ الصّٰبِرِیْنَ وَ نَبْلُوَا اَخْبَارَکُمْ

(۴۷ : ۳۱) "ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہے"۔ اللہ تو تمام نفوس کے خفیہ خزانوں سے بھی واقف ہے۔ اور زیر زمین معدنیات سے بھی واقف ہے۔ اور انسانوں کی خفیہ اور چھپائی ہوئی باتوں کو بھی جاننے والا ہے۔ اور جو معاملات ہونے والے ہیں' ان کو اس طرح جانتا ہے جس طرح وہ عملاً ہو چکے ہوں۔ اب اللہ مزید مجاہدین اور صابرین کو کس طرح جاننا چاہتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اللہ انسانوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا ہے جس قدر ان کی قوت' ان کی طبیعت اور ان کی استعداد کے مطابق کیا جا سکتا ہے۔ انسان اس طرح نہیں جانتے جس طرح اللہ جانتا ہے۔ لہذا یہ علم اور ظہور انسانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جانیں کہ مجاہدین اور صابرین کون ہیں؟ اور پھر ان کو اس علم و ظہور سے نفع ہو۔

آزمائش خواہ مشکلات میں ہو یا خوشحالی میں' نعمتوں میں ہو یا مشقتوں میں ہو' ہاتھ کھلے کرنے میں ہو یا معیشت کی تنگی میں ہو' خوشی میں ہو یا غم میں ہو' اس آزمائش کی وجہ سے نفوس کے اندر کی خفیہ صلاحیتیں کھل کر سامنے آ جاتی ہیں۔ آزمائش کی وجہ سے لوگوں پر صلاحیتوں کا اظہار ہو جاتا ہے۔ یہاں اللہ کے علم سے مراد وہ ظہور ہے جو لوگوں کو ابتلا میں ڈالنے سے ہو جاتا ہے۔ اور لوگوں کی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آ جاتی ہیں۔ (اللہ کے لیے یہ کوئی نیا علم نہیں ہوتا' لوگوں کے لیے نیا ہوتا ہے) اور اسے لوگ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ابتلا کے بعد لوگوں کی قابلیت کا معلوم ہو جانا' جسے لوگ سمجھ سکیں' لوگوں کے شعور اور ان کی شخصیت پر اس کا اثر ہوتا ہے اور یوں اللہ کی حکمت اپنا کام کرتی ہے۔

لیکن اللہ کا حکم یہی ہے کہ انسان آزمائش طلب نہ کرے اور یہ دعا کرے کہ اللہ اپنی آزمائشوں سے بچائے اور عافیت اور رحمت میں رکھے۔ لیکن اگر آزمائش آ جائے تو صبر کرے اور اس کو معلوم ہو کہ اس میں اللہ کی حکمت کام کر رہی ہے اور انسان اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کی مشیت کے حوالے کر دے اور اللہ پر بھروسہ کرے کہ آزمائش کے بعد اللہ کی رحمت اور عافیت نصیب ہوگی۔

ایک بڑے عابد اور صوفی حضرت فضیل رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب ان پر یہ آیت پڑھی جاتی تھی تو وہ روتے تھے اور یہ دعا کرتے تھے۔ اللھم لا تبلنا فانک ان بلوتنا فضحتنا وھتکت استارنا وعذبتنا "اے اللہ' ہمیں آزمائش میں نہ ڈال' اگر تو نے ہمیں آزمائش میں ڈالا تو ہمیں شرمندہ کر دے گا' ہماری پردہ دری کر دے گا اور ہمیں عذاب میں مبتلا کر دے گا"۔

--- ○○○ ---

# درس نمبر ۲۴۳ ایک نظر میں

یہ سبق اس سورت کا آخری سبق ہے ۔ اس کا آغاز ہوتا ہے اس آیت سے

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ شَآقُّوْا الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى (۴۷ : ۳۲) ''جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اور رسول سے جھگڑا کیا جبکہ ان پر راہ راست واضح ہو چکی تھی ....'' یہ کون لوگ ہیں؟ زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جن سے متعلق اس سورت کے آغاز میں بھی اسی انداز سے بات کی گئی تھی یعنی مشرکین مکہ 'کیونکہ یہی لوگ ہیں جنہوں نے دعوت اسلامی کے مقابلے میں متکبرانہ رویہ اختیار کیا' رسول اللہؐ سے جھگڑتے ہوئے اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے آخر تک روکتے رہے ۔ البتہ یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد عام کفار ہوں اور اس عتاب میں ہر وہ شخص آتا ہے جو کافر ہے اور یہ رویہ اپنائے ہوئے ہے ' خواہ وہ مشرک ہے ' یہودی ہے یا منافق ۔ ظاہراً یہ کام کر رہا ہے یا خفیہ کر رہا ہے ۔ سب کو یہ دھمکی دی گئی ہے کہ تم کچھ بھی نہ کر سکو گے لیکن پہلا مفہوم زیادہ مناسب ہے ۔

بہرحال اس دوسرے اور آخری سبق میں باقی باتوں کے مخاطب مسلمان ہیں ۔ ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال کو جاری رکھیں ۔ اور اس میں کوئی دیر نہ کریں اور یہ تجویز بھی نہ دیں کہ کفار کے ساتھ امن و سالمیت کا رویہ مزید اختیار کیا جائے ۔ کیونکہ کفر نے ظلم کی انتہا کر دی ہے ۔ اور یہ مصالحت کسی بھی مصلحت کے پیش نظر نہیں ہونی چاہئے ۔ کسی کمزوری کی وجہ سے 'کسی رشتہ داری کی وجہ سے 'کسی مفاد کی وجہ سے 'کسی مالی تاوان کے ڈر کی وجہ سے ۔ جہاں تک مالی تاوان کا تعلق ہے اللہ اسی قدر مال کا مطالبہ فرماتا ہے جس قدر انسان کی استطاعت میں ہو ۔ اللہ نے انسان کے فطری بخل کو اس سلسلے میں مدنظر رکھا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ اس دعوت کی ذمہ داریاں نہ ادا کریں گے تو اللہ تعالیٰ اس کی ذمہ داری کسی اور پر ڈال دے گا ۔ اور کوئی دوسری جماعت اٹھا دے گا ۔ جو یہ ذمہ داریاں بحسن و خوبی ادا کریں گے ۔ اور جو اس کی اہمیت کو سمجھیں گے ۔ یہ ایک نہایت ہی خوفناک دھمکی ہے اور اس سورت کے مضامین اور فضا کے ساتھ لگا کھاتی ہے ۔ اور اس وقت مومنین کے صفوں میں جو حالات پائے جاتے تھے ' یہ دھمکی ان کا بہترین علاج بھی تھی ۔ کیونکہ اس وقت منافقین کے علاوہ بھی ایسے لوگ تھے جو عافیت پسند تھے جبکہ مسلمانوں کی اکثریت فدائی 'مخلص ' بہادر اور مشہور تھی اس بارے میں روایات بھری پڑی ہیں ۔ اجازت قتال کے وقت چونکہ ہر قسم کے لوگ موجود تھے اور قرآن کریم ان کی تربیت کر کے ان کو اعلیٰ مراتب تک لے جا رہا تھا اس لئے یہاں یہ انداز تعبیر اختیار کیا گیا ۔

---○○○---

# درس نمبر ۲۴۳ تشریح آیات

## ۳۲ ---تا--- ۳۸

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَشَاقُّوا الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا
تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا وَسَيُحْبِطُ أَعْمَالَهُمْ ﴿٣٢﴾ يَا أَيُّهَا
الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ ﴿٣٣﴾ إِنَّ
الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ
لَهُمْ ﴿٣٤﴾ فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَ
لَنْ يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ ﴿٣٥﴾ إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا
يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ وَلَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ ﴿٣٦﴾ إِنْ يَسْأَلْكُمُوهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوا وَ
يُخْرِجْ أَضْغَانَكُمْ ﴿٣٧﴾ هَا أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنْكُمْ
مَنْ يَبْخَلُ وَمَنْ يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَفْسِهِ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ ۴
۱۰ ع الْفُقَرَاءُ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ﴿٣٨﴾
۸

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اور رسول سے جھگڑا کیا جبکہ ان پر راہ راست واضح ہو چکی تھی' درحقیقت وہ اللہ کا کوئی نقصان بھی نہیں کر سکتے' بلکہ اللہ ہی ان کا سب کیا کرایا غارت کر دے گا ۔ اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کر لو ۔ کفر کرنے والوں اور راہ خدا سے روکنے والوں اور مرتے دم تک کفر پر جمے رہنے والوں کو تو اللہ ہرگز معاف نہ کرے گا ۔ پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو ۔ تم ہی غالب رہنے والے ہو ۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا ۔

یہ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور تماشا ہے ۔ اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ کی روش پر چلتے رہو تو اللہ تمہارے اجر تم کو دے گا اور وہ تمہارے مال تم سے نہ مانگے گا۔ اگر کہیں وہ تمہارے مال تم سے مانگ لے اور سب کے سب تم سے طلب کر لے تو تم بخل کرو گے اور وہ تمہارے کھوٹ ابھار لائے گا۔ دیکھو' تم لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو ۔ اس پر تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو بخل کر رہے ہیں ' حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے ۔ اللہ تو غنی ہے ' تم ہی اس کے محتاج ہو ۔ اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے"۔

یہ اللہ کا فیصلہ ہے ۔ نہایت ہی تاکیدی فیصلہ ۔ اللہ کا وعدہ ہے جو واقع ہونے والا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا' اسلام کی راہ روک کر کھڑے ہو گئے ۔ سچائی کے راستے میں وہ جم کر بیٹھ گئے کہ لوگوں تک یہ سچ بات پہنچنے نہ پائے ۔ اپنی قوت ' اپنا مال اور اپنے تمام وسائل اس میں جھونک دیئے کہ اسلام پھیلنے نہ پائے ۔ پھر وہ ہر مقام پر رسول اللہ سے جھگڑنے لگے ۔ آپ کی زندگی میں آپ کی مخالفت کی ۔ آپ کے لائے ہوئے نظام زندگی کی مخالفت کی اور آپ کی صفوں کی مخالف صفوں میں کھڑے ہو گئے یا جنہوں نے حضورؐ کی وفات کے بعد دین اسلام کی مخالفت کی ۔ اسلامی نظام زندگی اور نظام شریعت کی مخالفت کی ۔ اور سنت نبویؐ اور دعوت اسلامی پر قائم لوگوں کی مخالفت کی ۔ اور یہ انہوں نے اس حال میں کی ۔

مِنْ بَعْدِمَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى (۴۷ : ۳۲) "جبکہ ان پر راہ راست واضح ہو چکی تھی"۔ اور ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ حق ہے ۔ لیکن یہ لوگ ہوائے نفس اور عناد کی وجہ سے اندھے ہو گئے ۔ اور مفادات اور مصلحتوں نے ان کو آخرت کے مفاد کے مقابلے میں دنیا کے مفادات کی طرف مائل کر دیا

اللہ کا تاکیدی فیصلہ ان لوگوں کے بارے میں یہ ہے اور یہ فیصلہ یقیناً نافذ ہونے والا ہے کہ ۔

لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا (۴۷ : ۳۲) "درحقیقت یہ اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے"۔ یہ لوگ اس قدر کمزور اور حقیر ہیں کہ یہ اللہ کو کوئی نقصان پہنچا سکتے ہی نہیں ' لہٰذا مقصود اس کی نفی کرنا نہیں ہے ۔ مقصود یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کے دین ' اللہ کے نظام شریعت اور اللہ کے داعیوں کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے ۔ وہ اللہ کے قوانین قدرت اور نظام فطرت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے ۔ اگرچہ وہ بہت ہی زور آور ہوں ۔ اگرچہ وہ ایک وقت تک بعض کمزور مسلمانوں کو ایذا دیتے رہے ہوں ۔ انجام ان کا کیا ہو گا؟

وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ (۴۷ : ۳۲) "بلکہ اللہ ہی ان کا سب کیا کرایا غارت کر دے گا"۔ یوں ان کی تمام سازشیں ختم ہو کر رہ جائیں گی اور نیست و نابود ہوں گی 'جس طرح ایک ہٹا کٹا بیل زہریلی گھاس چرنے کے بعد پھول جاتا ہے اور پھر ڈھیر ہو جاتا ہے ۔

اس فضا میں جس کے اندر ان لوگوں کو دھمکی دی گئی جنہوں نے کفر کیا' اسلام کی راہ روکی اور رسول اللہؐ اور دین کے داعیوں کے ساتھ دشمنی کی' خود مسلمانوں کو بھی متنبہ کیا جاتا ہے کہ اللہ اور رسول اللہؐ کی اطاعت کریں اور اپنے اعمال کافروں کی طرح ضائع نہ کریں ۔

---ooo---

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ (۴۷ : ۳۳) "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کر لو"۔

اس سخت ہدایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت مسلمہ کے اندر بھی ایسے لوگ تھے جو مکمل اطاعت سے گریزاں تھے یا یہ کہ ان پر مکمل اطاعت ذرا بھاری تھی اور بعض قربانیاں ان کو حد سے زیادہ لگ رہی تھیں لیکن اس وقت ایک قوی دشمن کے مقابلے میں یہ ضروری تھیں جس نے اسلام کی راہ روک رکھی تھی۔ اور یہ قوتیں اس وقت ہر طرف سے اسلام پر حملہ آور تھیں۔ اور ان مسلمانوں کے ان قوتوں کے ساتھ تجارتی' برادری اور رشتہ داری کے تعلقات بھی تھے۔ اور اس وقت ان سب تعلقات کو کاٹ دینا ان کو مشکل معلوم ہوتا تھا۔ جس طرح اسلامی دعوت اور نظریہ کا تقاضا تھا کہ اب یہ تمام تعلقات کٹ جائیں۔

سچے مسلمانوں پر ان ہدایات کا بڑا شدید اثر ہوا تھا۔ وہ ایک بار تو ان دھمکیوں کے نتیجے مین کانپ اٹھے تھے اور وہ ہر وقت ڈرتے تھے کہ شاید ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جس سے ان کے اعمال ہی اکارت جائیں۔

امام احمد ابن نصر المروزی نے کتاب الصلوٰۃ میں روایت کی ہے۔ ابو قدامہ سے' انہوں نے وکیع سے' انہوں نے ابو جعفر رازی سے انہوں نے ربیع ابن انس سے' اور انہوں نے ابو العالیہ سے' جو کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء یہ خیال کرتے تھے کہ لا الٰہ الا اللہ پڑھ لینے کے بعد کوئی گناہ مضر نہیں ہے جبکہ شرک کے ساتھ کوئی عمل مفید نہیں ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ (۴۷ : ۳۳) "اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو"۔ اس کے بعد وہ ڈرنے لگے کہ کوئی گناہ دوسرے اعمال کو برباد نہ کر دے۔

حضرت عبداللہ بن المبارک سے منقول ہے کہ بکر ابن معروف نے' مقاتل ابن حیان سے' انہوں نے نافع سے' اور انہوں نے حضرت ابن عمر سے' روایت کی ہے' وہ کہتے ہیں: "ہم رسول اللہ ؐ کے ساتھی یہ خیال کرتے تھے نیکیاں سب کی سب مقبول ہوں گی' یہاں تک کہ آیت۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ (۴۷ : ۳۳) "اطاعت کرو اللہ کی' اور اطاعت کرو رسول اللہ ؐ کی اور تم اپنے اعمال ضائع نہ کرو"۔ نازل ہوئی' تو ہم نے سوچا کہ وہ کیا چیز ہے جو ہمارے اعمال کو ضائع کر دے گی۔ تو ہم نے کہا کہ کبائر اور موجبات اور فواحش ہوں گے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی'۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ "اللہ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اور اس کے سوا کسی کے جو گناہ چاہے' معاف کر دے"۔ جب یہ آیت نازل

ہوئی تو ہم نے ایسا کہنا چھوڑ دیا تاہم کبائر گناہوں کے ارتکاب کرنے والوں کے انجام سے ڈرتے تھے۔ فواحش کے مرتکبین سے ڈرتے تھے اور جو ان سے بچتا ہو' اس کے انجام کے بارے میں پرامید تھے۔

ان نصوص سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سچے مسلمان ان نصوص کو کس طرح لیتے تھے۔ وہ کس طرح مضطرب اور چوکنے ہو جاتے تھے۔ وہ کس طرح کانپ اٹھتے تھے اور ڈرتے رہتے تھے' وہ کس طرح محتاط رہتے کہ وہ کہیں ان کی زد میں نہ آ جائیں۔ وہ کس طرح ہر وقت سوچتے رہتے تھے کہ ان کی زندگی نصوص الٰہی کے مطابق ہو' اور وہ اس تیز احساس کے ساتھ آیات الٰہیہ کو لیتے تھے' اس لیے وہ اس انداز کے مسلمان تھے۔

---ooo---

اگلی آیت میں بتایا جاتا ہے کہ جو لوگ رسول اللہؐ سے دشمنی کرتے ہیں اور آپ کی اطاعت سے دور ہو جاتے ہیں اور ایسے رویے پر اصرار کرتے ہیں اور اس دنیا سے کافر ہو کر مرجاتے ہیں ان کا انجام کیا ہو گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (۴۷ : ۳۴) "کفر کرنے والوں اور راہ خدا سے روکنے والوں اور مرتے دم تک کفر پر جمے رہنے والوں کو تو اللہ ہرگز معاف نہ کرے گا"۔

مغفرت کے لیے اس دنیا میں ہر کسی کو مہلت دے دی گئی ہے۔ اور توبہ کا دروازہ کافروں اور گناہگاروں پر اس وقت تک کھلا ہے جب تک سکرات موت شروع نہیں ہو جائے۔ جب روح حلقوم تک آن پہنچے تو اس وقت خالص آخری لمحات میں توبہ کا دروازہ بند ہوتا ہے اور اس وقت موقعہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔

---ooo---

اس قسم کی آیات جس طرح کافروں اور منافقین کو خطاب کر رہی ہیں۔ اس طرح خود مسلمانوں کو بھی دعوت دے رہی ہیں۔ یہ آیات کافروں کو متنبہ کرتی ہیں کہ کوتاہیوں کا تدارک کرو' توبہ کرو قبل اس کے کہ سکرات شروع ہو جائیں اور مسلمانوں کو ان آیات کا خطاب یوں ہے۔ کہ تم ان اسباب اور ان راہوں سے دور رہو جو تمہیں اس انجام تک پہنچا سکتی ہیں۔ اس آیت میں مسلمانوں اور کافروں دونوں کو خطاب یوں ہے کہ اگلی آیت میں دعوت اور جہاد میں سستی کو اس آیت پر مرتب کیا گیا ہے کہ اس انجام سے بچو اور سستی نہ کرو۔

فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ وَ لَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ

(۴۷ : ۳۵) "پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو۔ تم ہی غالب رہنے والے ہو۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا"۔

یہ ہے وہ بات جس سے مسلمانوں کو ڈرایا جا رہا ہے۔ ان کے سامنے ان کافروں کا انجام رکھا جاتا ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑتے تھے تاکہ مسلمان اس کے تصور سے بھی ڈریں۔ اس ڈراوے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے

کہ اس وقت مسلمانوں میں ایسے لوگ موجود تھے جو جہاد کی مسلسل مشقتوں کو ایک بھاری حکم سمجھتے تھے۔ اور ان کے عزم میں کمزوری تھی۔ اور یہ لوگ امن و عافیت چاہتے تھے تاکہ جنگ کی مشقتوں سے آرام میں رہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں میں سے بعض کی مشرکین کے ساتھ رشتہ داریاں بھی ہوں یا ان کے ساتھ مالی معاملات میں شراکت ہو' اس زاویہ سے یہ لوگ امن اور صلح کو پسند کرتے ہوں کیونکہ انسان ہمیشہ انسان رہا ہے اور قرآن کریم ان بشری اور فطری کمزوریوں کا علاج اپنے انداز سے کر رہا ہے۔ اور قرآن مجید نے اس طرح جو تربیت جاری رکھی تو اس کے نتیجے میں دور اول میں ایک معجزانہ گروہ تیار ہو گیا۔ لیکن ان مساعی اور کامیابیوں کے باوجود اس بات کی نفی نہیں کی جا سکتی کہ جماعت مسلمہ کی صفوں میں کمزور لوگ ہوں۔ خصوصاً ایسے ابتدائی مدنی دور میں چنانچہ اس آیت میں بعض ایسی ہی کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ قرآن کریم کس طرح لوگوں کو لیتا تھا۔ ہمیں بھی چاہئے کہ قرآنی انداز کے مطابق دور جدید کے لوگوں کی تربیت کریں۔

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ

(۴۷ : ۳۵) "پس تم بودے نہ بنو' اور صلح کی درخواست نہ کرو' تم ہی غالب رہنے والے ہو' اللہ تمہارے ساتھ ہے' اور تمہارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا"۔

تم چونکہ غالب ہو اس لیے صلح کی درخواست نہ کرو' تم اعتقاد اور تصور حیات کے اعتبار سے بلند ہو' تم خدا سے تعلق کے زاویہ سے بھی بلند ہو' تمہارا آقا بلند ہے' نظام زندگی' مقاصد زندگی اور مقصود زندگی کے اعتبار سے بھی تم بلند ہو' شعور' اخلاق اور طرز عمل کے اعتبار سے تم بلند ہو۔ قوت' مرتبے اور ذریعہ نصرت کے اعتبار سے بھی تم بلند ہو۔ تمہاری پشت پر بہت بڑی قوت ہے واللہ معکم۔ تمہارے ساتھ تو اللہ ہے۔ تم اکیلے تو نہیں ہو' تم ایک نہایت ہی بلند اور جبار اللہ تعالیٰ کے زیر تربیت ہو جو قادر مطلق ہے۔ وہ تمہارا مددگار ہے اور ہر وقت حاضر و ناظر ہے اور تمہارے ساتھ ہے۔ وہ تمہاری مدافعت کرتا ہے تمہارے اعداء کی حیثیت کیا ہے' جب کہ تمہارے ساتھ اللہ ہے۔ تم جو کچھ خرچ کرتے ہو' اور جو کچھ کرتے ہو اور تمہیں جو مشقتیں پہنچتی ہیں۔ ان کا حساب رکھا جا رہا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی ضائع نہیں ہوتی۔

وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ (۴۷ : ۳۵) "اور تمہارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا"۔ اللہ تمہارے اعمال میں کوئی کٹوتی نہ کرے گا کہ اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہ ہو اور اس کا معاوضہ تمہیں نہ ملے۔

نیز کمزوری دکھانے اور صلح چاہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اعلیٰ ہو' وہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کا ایک ذرہ بھی ضائع نہ ہو گا لہٰذا تم مکرم' ماجور اور منصور ہو۔

---ooo---

یہ تو ہے پہلا نتیجہ اور دوسرا یہ کہ ان کو بتا دیا جاتا ہے کہ امن و عافیت تم جس دنیا کے لیے طلب کرتے ہو' اس کی حیثیت کیا ہے؟ ٹھیک ہے اس میں تمہیں بعض قربانیاں تو دینی ہوں گی' لیکن آخرت میں کامل اجر تمہیں ملیں گے اور تم

سے تمہارے مال بھی طلب نہ کرے گا۔

اِنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَہْوٌ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا یُؤْتِکُمْ اُجُوْرَکُمْ وَ لَا یَسْئَلْکُمْ اَمْوَالَکُمْ (۴۷ : ۳٦) "یہ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور تماشا ہے ۔ اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ کی روش پر چلتے رہو تو اللہ تمہارے اجر تم کو دے گا اور وہ تمہارے مال تم سے نہ مانگے گا"۔

اگر ہماری اس دنیاوی زندگی کے پیچھے کوئی اعلیٰ اور ارفع مقصد نہ ہو تو وہ یقیناً لہو و لعب ہے ۔ اگر اس دنیا میں اسلام کے اعلیٰ مقاصد اور اسلامی نظام کے قیام کے ارفع مقاصد نہ ہوں تو پھر کچھ بھی نہیں ہے ۔ اسلام کا مقصد زندگی اس دنیا کو آخرت کی کھیتی بنا دیتا ہے ۔ اور اس میں اللہ کی خلافت کے حقوق کو اچھی طرح ادا کرنا ہی قیامت میں اچھے نتائج پیدا کرتا ہے ۔ آیت کا دوسرا فقرہ اس کی طرف اشارہ کرتا ہے :

وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا یُؤْتِکُمْ اُجُوْرَکُمْ (۴۷ : ۳٦) "اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ کی روش پر چلو تو اللہ تمہارے اجر تم کو دے گا"۔ اس دنیا میں ایمان لانا اور تقویٰ اختیار کرنا ہی اس کو لہو و لعب کے دائرے سے نکال دیتا ہے ۔ اور اسے ایک سنجیدہ مقام عطا کرتا ہے اور اسے حیوانی سامان تعیش سے ذرا بلند مقام دیتا ہے ۔ دنیا کا نظام پھر نظام خلافت راشدہ بن جاتا ہے اور یہ عالم بالا کے ساتھ پیوستہ ہوتا ہے ۔ جب اسلامی نظام اور قانون شریعت نافذ کر دیا جائے تو پھر مومن کی اس دنیا کی زندگی بھی لہو و لعب کے دائرے سے نکل کر ایک عبادت بن جاتی ہے اور مومن کو اس کی تمام سرگرمیوں پر آخرت میں اجر ملتا ہے ۔ لیکن باوجود اس کے اللہ لوگوں سے یہ مطالبہ نہیں فرماتا کہ وہ اپنے تمام اموال خرچ کر دیں ۔ اسلام دوسرے فرائض اور واجبات میں بھی لوگوں کو مشقت میں نہیں ڈالتا ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو خوب جانتا ہے کہ انسان فطرتاً تھڑ دلا ہے ۔ اس لیے اللہ نے لوگوں پر ان کی طاقت کے مطابق بوجھ ڈالا ہے ۔ اس لیے اللہ نے لوگوں پر رحم کرتے ہوئے انہیں یہ حکم نہیں دیا کہ وہ سب مال خرچ کر دیں ورنہ ان کے دل کا کھوٹ ظاہر ہو جاتا ۔

---ooo---

اِنْ یَّسْئَلْکُمُوْھَا فَیُحْفِکُمْ تَبْخَلُوْا وَ یُخْرِجْ اَضْغَانَکُمْ (۴۷ : ۳۷) "اگر کہیں وہ تمہارے مال تم سے مانگ لے اور سب کے سب تم سے طلب کر لے تو تم بخل کرو گے اور وہ تمہارے کھوٹ ابھار لائے گا"۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ کے احکام کس قدر حکیمانہ ہیں ، جس طرح اس سے اللہ کی رحمت اور مہربانیوں کا اظہار ہوتا ہے کہ دین اسلام میں جو فرائض و واجبات مقرر کیے گئے ہیں وہ فطرت کے عین مطابق ہیں اور اس میں انسانوں کی بشری کمزوریوں اور انسانی استعداد کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ اس لیے کہ اسلام ایک ربانی نظام زندگی ہے ۔ اور یہ انسانوں کے لیے ایک ربانی نظام تجویز کرتا ہے ۔ یہ نظام ایک ربانی نظام اس زاویہ سے ہے کہ اس کے قواعد اللہ نے بنائے ہیں اور یہ انسانی اس لحاظ سے ہے کہ اس میں انسان کی استعداد ، قوت اور ماحول کو مدنظر رکھا گیا ہے ۔ اللہ ہی ہے جس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور اللہ ہی ہے جو ان کے لیے نظام تجویز کرتا ہے کیونکہ وہ اپنی مخلوق سے اچھی طرح واقف ہے اور وہ لطیف و خبیر ہے ۔

---○○○---

آخر میں ان کی واقعی صورت حالات ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے کہ ان حالات میں انفاق فی سبیل اللہ کی ضرورت ہے۔ قرآن اپنے خوبصورت انداز میں ان کے دلوں کے بخل کا علاج کرتا ہے۔ جس طرح قرآن نے جانی قربانی کے سلسلے میں ان کی تربیت کی۔

هَٰأَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنكُم مَّن يَبْخَلُ ۖ وَمَن يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَن نَّفْسِهِ ۚ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاءُ ۚ وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم (۴۷ : ۳۸) "دیکھو، تم لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو۔ اس پر تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو بخل کر رہے ہیں۔ حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ در حقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے۔ اللہ تو غنی ہے، تم ہی اس کے محتاج ہو۔ اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے"۔

قرآن کریم اس وقت کے معاشرے کا نقشہ نہایت ہی خوبصورتی سے کھینچتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ ہر معاشرے میں مالی انفاق کی دعوت کے سلسلے میں بعض لوگوں کا طرز عمل دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ بعض مالی اعتبار سے بخل کرتے ہیں، بعض ایسے ہوتے ہیں جو فیاض ہوتے ہیں۔ یہی صورت حالات ابتدائی اسلامی معاشرے کی تھی جس کو روایات میں اچھی طرح قلم بند کیا گیا ہے اور قرآن کریم نے بھی دوسرے مقامات پر تفصیلات دی ہیں۔ اسلام نے اس میدان میں معجزانہ مثالیں پیش کی ہیں۔ لوگوں نے جو دوستی اور جوانمردی میں بے پناہ قربانیاں دیں لیکن ان مثالوں کے باوجود مالی لحاظ سے بخل پایا جاتا ہو گا، بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جو جان تو دیتے ہوں گے لیکن ان کے لیے مال دینا مشکل ہو گا۔

یہی وہ کنجوسی ہے جس کا علاج قرآن مجید اس آیت میں کر رہا ہے۔

وَمَن يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَن نَّفْسِهِ (۴۷ : ۳۸) "حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے"۔ کیونکہ اللہ کی راہ میں جو لوگ خرچ کر رہے ہیں وہ دراصل خود انہی کے بینک میں جمع ہو رہا ہے۔ اور یہ بچت دراصل ان کو اس وقت کام آئے گی جہاں پر کچھ بھی آمدن نہ ہو گی۔ جب ان کو زمین سے اٹھایا جائے گا اور ان کے پاس ان کی مملوکات میں سے کچھ بھی نہ ہو گا۔ لہٰذا وہاں یہی کمائی اور بچت ان کے کام آئے گی۔ اس لیے آج اگر وہ اس مد میں خرچ کرنے سے بخل کرتے ہیں تو یہ بخل وہ خود اپنے خلاف کر رہے ہیں۔ وہ اپنی بچتوں میں کمی کر رہے ہیں اور خود اپنا مال کم کر رہے ہیں اور خود اپنے آپ کو محروم کر رہے ہیں۔

اور اللہ جو ان سے انفاق فی سبیل اللہ کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ بھی خود ان کی بھلائی کے لیے ہوتا ہے۔ یہ انہی کے لیے زیادہ بچت ہوتی ہے انہی کا خزانہ اور ذخیرہ بڑھتا ہے۔ اللہ کو اس مال سے کچھ فائدہ نہیں ہے اور نہ اللہ کو ایسے کسی مال کی ضرورت ہے۔

وَ اللّٰهُ الْغَنِیُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (۴۷ : ۳۸) "اللہ غنی ہے اور تم اس کے محتاج ہو"۔ وہی ہے' جس نے تمہیں یہ مال دیا ہے۔ اس مال سے جو تم اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہو اللہ اسے تمہارے ہی لیے جمع کرتا ہے۔ اس دنیا میں جو کچھ تمہیں دیا ہے' اس کا وہ کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ وہ آخرت میں تمہارے جمع کیے ہوئے مال سے بھی غنی ہے۔ تم اس دنیا میں بھی فقراء اور اس کے محتاج ہو اور آخرت میں بھی فقراء اور اس کے محتاج ہو۔ اس دنیا میں جو تمہیں رزق اور نعمتیں درکار ہیں' تم ان کے محتاج ہو۔ اور اجر آخرت میں بھی محتاج ہو۔ یہ تو اللہ ہی ہے جو یہاں اور وہاں دونوں جگہ تم پر فضل کرتا ہے اور تم اس کا کوئی صلہ نہیں دے سکتے ہو' تم یہاں بھی محتاج ہو اور وہاں بھی۔

اس لیے بخل اور کنجوسی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ تمہارے پاس جو دولت ہے وہ بھی اسی کی دی ہوئی ہے اور آخرت میں وہ جو اجر دے گا وہ بھی اس کا فضل ہو گا۔ اس لیے تم جو خرچ کرتے ہو وہ بھی اللہ ہی کا فضل ہے۔

اور آخری اور دو ٹوک بات کہ اللہ نے جو تمہیں اپنی دعوت کے لیے چنا ہے۔ یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے اور تمہارے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ اگر تم نے اپنے آپ کو اس کا اہل نہ بنایا اور اس کی ذمہ داریاں پوری نہ کیں تو اللہ تمہارے انتخاب کو واپس لے لے گا۔ اور کسی دوسری قوم کو اس کام کے لیے منتخب کر دے گا۔ اور یہ اس قوم پر اللہ کا احسان ہو گا اور وہ اس انتخاب کی قدر کریں گے!

وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ (۴۷ : ۳۸) "اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے"۔ جن لوگوں نے ایمان کا مزہ چکھا ہے' ان کے لیے تو یہ بہت ہی خوفناک دھمکی ہے کہ تمہیں ہٹا کر کسی دوسری قوم کے لے آیا جائے گا۔ اس شخص کے لیے یہ بہت ہی بڑی دھمکی ہے جس کو احساس ہو کہ دعوت اسلامی اور خیر امت کی ذمہ داری سپرد کر کے اللہ نے ان کو بہت بڑا اعزاز بخشا ہے کیونکہ جو شخص اللہ کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے اسے اللہ نے عظیم امانت سپرد کی ہے۔ وہ اس زمین پر اللہ کی سند اور سہارے سے چلتا ہے۔ اس کے وجود میں اللہ کا نور ہے۔ وہ آتا ہے اور جاتا ہے اور اس پر اپنے آقا کی علامات ہیں۔

اگر کسی نے ایمان کی مٹھاس کو چکھ لیا ہو اور پھر اس سے سلب کر لیا جائے تو یہ خسارہ وہی محسوس کر سکتا ہے' یہ بے عزتی وہی محسوس کر سکتا ہے جس نے دربار کبریائی میں باریابی پائی ہو' اعزاز پایا ہو اور پھر اسے دھتکار دیا جائے اور اس کے پیچھے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ بلکہ ایسے واصلین حق کی زندگی تو جہنم بن جاتی ہے جو حق تعالیٰ تک پہنچ چکے ہوں اور پھر دور ہو جائیں اور ان کے سامنے پردے حائل ہو جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان ایک بہت بڑی عطا ہے۔ اس کی قیمت کی کوئی چیز اس کائنات میں نہیں ہے۔ اور یہ پوری انسانی زندگی اور پوری زمین کی دولت اس کے مقابلے میں ہیچ ہے جب ترازو کے ایک پلڑے میں ایمان ہو اور دوسرے میں یہ پوری کائنات ہو۔

اس لیے یہ دھمکی اتنی بڑی دھمکی ہے جو مومن کو دی جا سکتی ہے اور یہ دھمکی' ذرا غور کیجئے' اللہ کی طرف سے ہے!

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ------ ۲۶

### سورۃ الفتح ـ ۴۸

آیات ۱--- تا--- ۲۹

# سورۃ الفتح ایک نظر میں

یہ مدنی سورت ہے اور یہ صلح حدیبیہ کے بعد ۶ ہجری کو نازل ہوئی۔ اس میں اسی اہم واقعہ اور اس کی تفصیلات پر تبصرہ ہے۔ اس سورت میں اس وقت جماعت مسلمہ کے جو حالات تھے وہ بیان کیے گئے ہیں۔ قرآنی ترتیب کے مطابق اس سے پہلی سورت 'سورت محمد' ہے لیکن سورت محمد اس سے تین سال پہلے نازل ہوئی تھی۔ اور اس عرصہ میں مدینہ میں اسلامی سوسائٹی میں اور مسلمانوں کے حالات میں کافی تبدیلیاں واقع ہوگئی تھیں۔ جماعت مسلمہ کے موقف اور اس کے مخالفین کے موقف میں بھی تبدیلیاں ہوگئی تھیں۔ جماعت کی تربیت اور اس کی نفسیاتی اور ایمانی کیفیت میں بڑے ہی تغیرات ہوگئے تھے۔ جماعت مسلمہ ایمانی اور اخلاقی لحاظ سے نہایت پختہ اور گہرے ادراک کی حامل ہوگئی تھی۔

اس سے قبل کہ ہم اس سورت کے مضمون اور اس کی فضا پر بحث کریں مناسب ہے کہ اس واقعہ کی تفصیلات دے دی جائیں جس کے بارے میں یہ نازل ہوئی ہے تاکہ ہم بھی اس فضا میں زندہ رہیں جس میں مسلمان زندہ رہتے تھے اور ان پر یہ سورت نازل ہو رہی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ خانہ کعبہ میں داخل ہو رہے ہیں اور مسلمان بھی آپ کے ساتھ ہیں' سر منڈائے ہوئے یا بال کٹوائے ہوئے۔ ہجرت کے بعد مشرکین مکہ نے خانہ کعبہ میں مسلمانوں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اور یہ داخلہ حرام مہینوں میں بھی ممنوع تھا حالانکہ ان کا احترام ایام جاہلیت میں بھی سب عرب کرتے تھے۔ ان مہینوں میں لوگ اسلحہ اتار دیتے تھے۔ ان ایام میں جنگ اور قتال کو بہت ہی برا سمجھتے تھے' خصوصاً مسجد حرام سے کسی کو روکنا تو بہت ہی بڑا جرم تھا۔ جن لوگوں نے ایک دوسرے سے قصاص لینا ہوتا تھا وہ بھی اس حرمت کے سائے میں اکٹھے پھرا کرتے تھے۔ ایک شخص اپنے باپ اور بھائی کے قاتل کو بھی ملتا اور وہ اس پر تلوار نہ اٹھاتا۔ اور نہ اسے مسجد حرام سے روکتا۔ لیکن مسلمانوں کے معاملے میں انہوں نے اپنی نہایت ہی پختہ روایات کو بھی توڑ دیا۔ اور رسول اللہؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو ہجرت کے بعد چھ سال تک بیت اللہ سے روکے رکھا۔ یہ ۶ ہجری تھا کہ رسول اللہؐ نے یہ خواب دیکھا۔ آپؐ نے اپنا خواب صحابہ کرام کے سامنے بیان کر دیا۔ اس لیے وہ بہت خوش ہوئے اور ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔

ہمارے لیے ابن ہشام اعلیٰ ترین ذریعہ ہیں۔ انہوں نے جس طرح اس واقعہ کی تصویر کھینچی ہے وہ بخاری شریف کی روایت اور امام احمدؒ کی روایت سے متفق بھی ہے۔ علامہ ابن حزم نے جوامع السیرۃ میں جو روایات دی ہیں ان سے بھی متفق ہے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں' اس کے بعد (یعنی غزوۂ بنی المصطلق اور اس کے بعد کے واقعہ افک کے بعد) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں رمضان اور شوال کا مہینہ رہے۔ اور ذوالقعدہ کے مہینے میں عمرہ کے لیے نکلے۔ آپ کا ارادہ جنگ کا نہ تھا۔ اور مدینہ کے ارد گرد تمام دیہاتی عربوں کو بھی حکم دیا کہ وہ آپ کے ساتھ عمرہ کے لیے چلیں۔ آپؐ کو قریش

سے اندیشہ تھا کہ وہ رکاوٹ ڈالیں گے ۔ جنہوں نے اس مقصد کے لیے تیاریاں بھی کر لی تھیں کہ آپ ؐ کو بیت اللہ میں داخل نہ ہونے دیں گے ۔ اکثر دیہاتی اس سفر میں شریک نہ ہوئے ' اور آپ ؐ کے ساتھ مہاجرین اور انصار ہی نکلے ۔ اور بعض وہ لوگ بھی تھے جو دوسرے عرب قبائل سے ساتھ ہو لیے تھے ۔ آپ ؐ نے ہدی کا جانور بھی لیا۔ عمرے کا احرام باندھا تاکہ لوگ یہ یقین کر لیں کہ حملے کا ارادہ نہیں ہے اور یہ کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ آپ بیت اللہ کا احترام کرتے ہیں اور صرف زیارت کعبہ کے لیے نکلے ہیں ۔ ابن اسحاق نے کہا کہ حضرت جابر ابن عبداللہ فرمایا کرتے تھے کہ حدیبیہ میں ہماری تعداد ۱۴۰۰ تھی ۔

زہری کہتے ہیں کہ جب یہ قافلہ عسفان کو پہنچا (یہ مکہ اور مدینہ کے درمیان دو مراحل سفر پر ہے ) تو حضور ؐ کو بشر ابن سفیان الکعبی ملے ۔ انہوں نے اطلاع دی کہ قریش کو آپ کے قافلے کا پتہ لگ گیا ہے ۔ اور انہوں نے اپنے ساتھ کنواریوں اور بچوں والیوں کو بھی نکال لیا ہے ۔ انہوں نے شیروں کی کھالیں پہن رکھی ہیں اور وادی ذی طوی میں خیمہ زن ہیں اور وہ اللہ کے ساتھ پختہ عہد کیے ہوئے ہیں کہ آپ کو مکہ میں داخل ہونے نہ دیں گے ۔ اور یہ ہیں خالد ابن ولید جسے انہوں نے اپنے سواروں کے ساتھ کراع الغمیم تک بھیج دیا ہے ۔ (یہ عسفان سے آٹھ میل آگے ایک بستی ہے ) اس پر حضور ؐ نے فرمایا ''ہلاکت ہے قریش کے لیے 'کھا گئی ان کو جنگ ان کا کیا بگڑتا اگر وہ مجھے اور دوسرے عربوں کو لڑنے کے لئے چھوڑ دیتے ' اگر مجھے دوسرے عرب مار لیتے تو یہی ان کا مقصد تھا ' اور اگر مجھے اللہ عربوں پر غالب کر دیتا تو یہ لوگ بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہوتے ۔ اور اگر وہ اسلام میں داخل نہ ہوتے تو اگر وہ لڑتے تو ان کے پاس ''قوت'' تو ہوتی ۔ قریش غلط سوچ رہے ہیں ۔ خدا کی قسم میں جہاد کرتا رہوں گا ' اس نظام کے لیے جس کے لیے مجھے بھیجا گیا ہے ۔ یہاں تک کہ اللہ مجھے غالب کر دے یا میری یہ گردن کٹ جائے پھر حضور ؐ نے فرمایا ''کون ہے جو ہمیں اس راستے سے علیحدہ کسی دوسرے راستے پر لے جائے جس میں یہ لوگ نہ ہوں؟''

ابن اسحاق کہتے ہیں مجھے عبداللہ ابن ابوبکر نے بتایا کہ قبیلہ اسلم کے ایک شخص نے کہا حضور ؐ میں لے جاؤں گا ۔ کہتے ہیں یہ ان کو سخت اور پتھریلے راستے سے لے گیا اور یہ راستہ پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتا تھا ۔ جب لوگ اس کے ساتھ چلے تو یہ راستہ لوگوں کے لیے بڑا دشوار ثابت ہوا ۔ جب یہ وادی سے گزر کر آخر میں ہموار زمین کی طرف نکلے تو رسول اللہ نے لوگوں سے کہا پڑھو۔

نَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَنَتُوْبُ اِلَيْهِ ''ہم اللہ سے معافی چاہتے ہیں اور اس کی طرف لوٹتے ہیں'' ۔ تو لوگوں نے یہ دعا پڑھی تو حضور ؐ نے فرمایا ''ایسا ہی ایک مرحلہ تھا کہ بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ تم ایسی دعا پڑھو تو انہوں نے انکار کر دیا تھا'' (یہاں رسول اللہ کا اشارہ اس طرف سے جو قرآن کریم میں آیا ہے ۔

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ (۵۸)

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ (۵۹) (۲ : ۵۸ ، ۵۹) ''دیگر بستی کے دروازے سے سجدہ ریز ہو کر داخل ہونا اور کہتے جانا حطہ حطہ ہم تمہاری خطاؤں سے درگزر کریں گے ۔ اور نیکوکاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے ' مگر جو بات ان سے کہی گئی تھی ' ظالموں نے اسے بدل کر کچھ اور کر دیا) ۔

ابن شہاب زہری نے کہا ہے کہ رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ اب دائیں جانب سے 'حمض کے پیچھے سے ثنیۃ المرار کی راہ سے مکہ کے نچلے علاقے میں حدیبیہ کے مقام پر اترو' چنانچہ یہ لشکر اسی راہ سے چلا۔ جب قریش کے سواروں نے لشکر اسلام کے غبار کو دیکھا کہ یہ تو دوسرے راستے سے نکل گیا ہے تو وہ قریش کی طرف تیزی سے لوٹے۔ رسول اللہ جب ثنیۃ المرار سے گزر رہے تھے تو آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی۔ تو لوگوں نے کہا کہ "اونٹنی اڑ گئی"۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "اڑی نہیں اور نہ اس کی ایسی عادت ہے لیکن دراصل اسے اس ذات نے روک لیا ہے جس نے ہاتھی کو مکہ سے روکا تھا۔ آج قریش اگر مجھے کسی ایسی بات کی دعوت دیں جس میں وہ صلہ رحمی کے طالب ہوں تو میں ان کی بات مان لوں گا"۔ اور بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ "وہ کوئی ایسی بات مجھ سے طلب کریں جس کا مقصد اللہ کی حرمتوں کو بچانا ہے تو میں ضرور ان کی بات مانوں گا"۔ اس کے بعد لوگوں سے فرمایا کہ یہاں قیام کر لو' تو لوگوں نے کہا حضورؐ یہاں تو پانی نہیں ہے۔ جس کے اوپر ہم قیام کریں۔ حضورؐ نے ترکش سے ایک تیر نکالا اور اسے اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو دیا۔ وہ شخص وہاں کے حوضوں میں سے ایک حوض میں گیا اور وہ تیر وہاں گاڑ دیا اور وہاں سے صاف پانی نکل آیا۔

جب حضورؐ اطمینان سے اتر گئے تو ان کے پاس بدیل ابن ورقہ الخزاعی آیا اور ان کے ساتھ خزاعہ کے دوسرے کچھ لوگ بھی تھے۔ انہوں نے حضورؐ سے باتیں کیں اور آپؐ سے پوچھا کہ آپؐ کے آنے کا مقصد کیا ہے۔ تو آپؐ نے ان کو بتایا کہ میرے آنے کا مقصد لڑنا نہیں ہے۔ میں صرف زیارت کعبہ کے لیے آیا ہوں اور اللہ کی حرمتوں کا احترام کرتا ہوں۔ اس کے بعد آپ نے ان سے بھی وہ بات کی جو بشر ابن سفیان سے کی تھی۔ یہ لوگ واپس ہوئے اور قریش سے کہا' اے قوم قریش تم محمدؐ کے معاملے میں جلد بازی سے کام لے رہے ہو' محمدؐ جنگ کے لیے نہیں آئے۔ وہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں' قریش نے ان پر الزام لگایا اور برا بھلا کہا۔ قریش نے کہا کہ درست ہے کہ وہ جنگ کے لیے نہیں آیا لیکن ہم زبردستی مکہ میں داخل ہونے نہ دیں گے اور ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ عرب یہ کہیں کہ محمدؐ آیا اور زبردستی مکہ میں داخل ہو کر چلا گیا۔

خزاعہ کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت ہی مخلصین میں سے تھے۔ ان لوگوں نے حضورؐ سے معاہدہ امن اور دوستی بھی کر لیا تھا (بعد میں ان کے احوال آئیں گے) ان میں مسلمان تھے یا مشرک تھے' وہ مکہ میں ہونے والی کسی کارروائی کو حضورؐ سے نہ چھپاتے تھے۔ اس کے بعد قریش نے حضورؐ کے پاس مکرز ابن حفص ابن الاخیف' بنو عامر ابن لوئی کے بھائی کو بھیجا۔ جب رسول اللہؐ نے اسے آتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: "یہ ایک غدار شخص ہے"۔ جب یہ رسول اللہؐ کے پاس آیا تو اس کے ساتھ بھی رسول اللہؐ نے وہی باتیں کی تھیں جو بدیل اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ کیں۔ یہ واپس ہوا اور اس نے بھی مشرکین کو رپورٹ دے دی۔ اس کے بعد قریش نے حلیس ابن علقمہ یا ابن زبان کو بھیجا۔ یہ ان دنوں حبش والوں کے سردار تھے۔ (حبش ایک جگہ ہے جہاں بن الحارث ابن عبد مناۃ ابن کنانہ رہتے ہیں) جب اسے حضورؐ نے دیکھا تو فرمایا: "یہ ایک ایسی قوم کا فرد ہے جو عبادت گزار ہیں تو قربانی کے جانور ہی اس کے سامنے کر دو کہ یہ اچھی طرح دیکھ لے"۔ جب اس نے دیکھا کہ قربانی کے جانور وادی میں سیلاب کی طرح آ رہے ہیں۔ وہ بہت متاثر ہوا اور رسول اللہؐ سے ملنے سے قبل ہی واپس ہو گیا۔ ان جانوروں کا احترام کرتے ہوئے او ۔ قریش کو حالات بتائے تو انہوں نے اسے کہا' بیٹھو تم دیہاتی ہو' تمہیں کیا پتہ ہے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھے عبداللہ ابن ابوبکر نے بتایا کہ حلیس اس بات پر بہت غصہ ہوا اور کہا اے اہل قریش 'ہم نے اس پر نہ تمہارے ساتھ حلف اٹھایا ہے اور نہ معاہدہ کیا ہے کہ ہم بیت اللہ سے ایسے لوگوں کو روکیں گے جو بیت اللہ کا احترام کرتے ہوئے آئیں ۔ پھر اس نے کہا خدا کی قسم یا تو تم محمدؐ کو اس کام کے لیے چھوڑو گے جس کے لیے وہ آیا ہے یا میں حبش کے لوگوں کو اس طرح لے کر چلا جاؤں گا جس طرح ایک آدمی چلا جاتا ہے' یعنی پوری طرح ۔ تو انہوں نے اسے کہا 'خاموش رہو' ہمیں چھوڑو کہ ہم اپنے لیے کوئی راستہ طے کرلیں ۔

زہری کہتے ہیں اس کے بعد انہوں نے عروہ ابن مسعود ثقفی کو حضورؐ کے پاس بھیجا۔ اس نے کہا اہل قریش ! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم حضرت محمدؐ کے پاس جس کو بھی بھیجتے ہو اور وہ واپس آکر صحیح بات کرتا ہے تو تم اسے برا بھلا کہتے ہو اور گالیاں دیتے ہو ۔ تم جانتے ہو کہ تم میرے والد کی جگہ پر ہو اور میں تمہارا بیٹا ہوں ۔ (اس کی ماں عبد شمس سے تھی) تم پر جو مصیبت آئی ہوئی ہے' وہ میں نے سن لی ہے ۔ اس لیے میں نے اپنی قوم میں سے ان لوگوں کو جمع کیا جو میری بات مان رہے تھے اور تمہاری مدد کے لیے میں آیا ہوں ۔ تو انہوں نے کہا 'تو نے سچ کہا اور ہمارا تجھ پر یقین ہے ۔ یہ گیا اور رسول اللہؐ کے پاس آپؐ کے سامنے بیٹھا اور کہا محمدؐ تو مختلف لوگوں کو جمع کر کے لایا ہے کہ ان سے اپنے انڈے پھوڑ دے ۔ یہ ہیں قریش جن کے ساتھ کنواریاں اور بچوں والیاں نکلی ہیں اور انہوں نے شیروں کے چمڑے پہنے ہوئے ہیں ۔ وہ حلف اٹھا رہے ہیں کہ تمہیں زبردستی شہر میں داخل ہونے نہ دیں گے ۔ اور خدا کی قسم میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ لوگ کل تم کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے ۔ حضرت ابوبکر حضورؐ کے سر پر کھڑے تھے ۔ انہوں نے اسے دھکایا [1] اور کہا : کیا ہم رسول اللہؐ کو چھوڑ دیں گے ؟ اس نے کہا حضورؐ یہ کون ہے ؟ تو آپؐ نے فرمایا یہ ابن ابوقحافہ ہیں ۔ تو اس نے کہا خدا کی قسم اگر اس کا مجھ پر ایک احسان نہ ہوتا تو میں اس کو جواب دے دیتا' لیکن یہ بات اس کے بدلے رہ گئی ۔

اس کے بعد وہ رسول اللہؐ کی داڑھی مبارک پکڑ کے بات کرنے لگا اور مغیرہ ابن شعبہ رسول اللہؐ کے سر پر کھڑے تھے اور لوہے میں ڈوبے ہوئے تھے یہ شخص جب بھی حضورؐ کی داڑھی مبارک کو پکڑتا حضرت مغیرہ ابن شعبہ اس کے ہاتھ کو جھٹک دیتے اور کہتے 'رسول اللہؐ کے چہرۂ مبارک سے ہاتھ روک ورنہ یہ تمہارے جسم کے ساتھ نہ ہو گا ۔ وہ کہتا تم پر تباہی ہو' تم کس قدر سخت اور کرخت ہو ۔ اس پر حضورؐ متبسم ہوئے ۔ عروہ نے کہا کہ محمدؐ یہ کون ہیں آپ نے جواب دیا یہ تمہارے بھائی مغیرہ ابن شعبہ ہیں ۔ اس پر عروہ نے کہا "اے غدار ! تمہارے چوتڑوں کو تو میں نے کل ہی دھویا ہے"۔

ابن ہشام کہتے ہیں کہ اس کا واقعہ یہ ہے کہ مغیرہ ابن شعبہ نے اسلام سے قبل بنی مالک ابن ثقیف کے تیرہ آدمی قتل کیے تھے ۔ اس طرح ثقیف کے دونوں قبائل کے درمیان ہیجان پیدا ہو گیا تھا ۔ بنی مالک مقتولین کی قوم تھے اور بنی احلاف مغیرہ کی قوم تھے ۔ عروہ نے مقتولین کو ۱۳ دیتیں دیں اور اس شر کو فرو کر دیا ۔

ابن اسحاق کہتے ہیں زہری نے یہ کہا ہے کہ حضورؐ نے اس کے ساتھ بھی وہی بات کی جو دوسروں کے ساتھ کی تھی اور کہا کہ میں جنگ کے لیے نہیں آیا ۔ یہ شخص حضورؐ کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا لیکن اس نے اندازہ کر لیا کہ صحابہ کرام

---

(۱) اصل روایت میں ایسا فقرہ ہے کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرت ابوبکر صدیق نے یہ کہا ہو گا کیونکہ آپ نہایت ہی مہذب گفتگو کرتے تھے ۔

حضورؐ سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ جب آپؐ وضو کرتے ہیں تو یہ لوگ وضو کے پانی کو اچک لیتے ہیں۔ اور اگر آپ تھوکتے ہیں تو یہ اسے بھی اچک لیتے ہیں۔ آپ کے بالوں میں سے کوئی بال اگر گرتا ہے تو یہ اس کو بھی محفوظ کر لیتے ہیں۔ یہ شخص قریش کے پاس گیا اور رپورٹ دی۔ "اہل قریش میں کسریٰ کے دربار میں بھی گیا ہوں' اور اس کی حکومت دیکھی ہے۔ اور قیصر کے پاس بھی اور اس کی حکومت بھی دیکھی ہے اور نجاشی کو بھی اس کی مملکت میں دیکھا ہے' خدا کی قسم محمد اپنی قوم میں جس طرح ہیں' اس طرح میں نے کوئی بادشاہ اپنے متبعین میں نہیں دیکھا۔ میں نے ان کے ساتھ ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ وہ کسی حال میں بھی ان کو کسی دشمن کے سپرد کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم کیا کرتے ہو"۔

ابن اسحاق کہتے ہیں مجھے بعض اہل علم نے بتایا کہ رسول اللہؐ نے خراش ابن امیہ خزاعی کو بلایا اور انہیں قریش کے پاس بھیجا۔ آپ نے ان کو سواری کے لیے اونٹ دیا جسے ثعلب کہا جاتا تھا تاکہ وہ قریش کے شرفاء تک وہ بات پہنچا دیں کہ وہ کیوں آئے ہیں۔ انہوں نے حضور اکرمؐ کے اونٹ کی ٹانگیں کاٹ دیں اور چاہا کہ اسے قتل کر دیں لیکن حبش کے لوگوں نے ان کو منع کر دیا۔ انہوں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ واپس ہوئے اور رسول اللہؐ کو اطلاع دی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں مجھے بعض ایسے لوگوں نے بتایا جن کو میں متہم نہیں کرتا' بروایت عکرمہ موٹی ابن عباس سے' انہوں نے حضرت ابن عباس سے کہ قریش نے چالیس ہزار افراد بھیجے یا پچاس ہزار۔ ان کو کہا کہ تم رسول اللہؐ کے لشکر کے اردگرد چکر لگاؤ اور ان کے لیے محمدؐ کے ساتھیوں میں سے کسی کو پکڑ لاؤ' یہ سب کے سب پکڑے گئے اور رسول اللہؐ کے پاس لائے گئے اور آپؐ نے سب کو معاف کر دیا اور جانے دیا۔ انہوں نے رسول اللہؐ کے لشکر پر تیر بھی برسائے اور پتھر بھی مارے۔

اس کے بعد آپؐ نے حضرت عمر ابن الخطاب کو بلایا کہ ان کو اشراف قریش کے پاس بطور سفیر بھیجیں۔ انہوں نے فرمایا حضورؐ میں یہ خطرہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ مجھے جان سے مار دیں گے اور مکہ میں اس وقت بنی عدی ابن کعب میں سے کوئی بھی نہیں ہے جو میری حفاظت کرے۔ قریش کو یہ معلوم ہے کہ میں ان کا کس قدر دشمن ہوں اور ان پر میں نے کس قدر سختیاں کی ہیں۔ ہاں' میں ایک ایسے شخص کو تجویز کرتا ہوں جو میرے مقابلے میں زیادہ موزوں ہے۔ یہ ہیں عثمان ابن عفان۔ رسول اللہؐ نے ان کو بلایا اور ان کو بھیجا کہ وہ قریش کو سمجھا دیں کہ میں لڑائی کے لیے نہیں آیا۔ اور میں صرف عمرے کے لیے آیا ہوں اور بیت اللہ کا احترام کرتا ہوں۔

ابن اسحاق نے بیان کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ گئے۔ ان کو وہاں ابان ابن سعید ابن العاص ملے۔ مکہ میں داخل ہوتے ہوئے یا پہلے' اس نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کو اس وقت تک پناہ دے دی کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا دیں۔ حضرت عثمان گئے اور ابو سفیان اور قریش کے زعماء کو ملے۔ اور رسول اللہؐ کا پیغام پہنچا کہ مجھے یہ پیغام دے کر بھیجا گیا ہے۔ جب حضرت عثمان پیغام سے فارغ ہوئے تو انہوں نے کہا کہ اگر تم طواف کرنا چاہتے ہو' تو کر لو۔ تو انہوں نے کہا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے طواف نہ کر لیں۔ قریش نے ان کو اپنے ہاں روک لیا۔ رسول اللہؐ اور مسلمانوں تک یہ اطلاع پہنچ گئی کہ حضرت عثمان کو قتل کر دیا گیا ہے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عبداللہ ابن ابی بکر نے مجھے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ خبر سنی تو فرمایا ہم اس وقت

تک یہاں سے نہ ہلیں گے جب تک ان سے لڑ نہیں لیتے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بیعت کے لیے بلایا یہ بیعت الرضوان تھی' ایک درخت کے نیچے ۔ لوگ کہتے تھے کہ رسول اللہ ؐ نے ان سے موت پر بیعت لی اور جابر ابن عبد اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ؐ نے ہم سے موت پر بیعت نہیں لی تھی بلکہ یہ بیعت لی تھی کہ ہم بھاگیں گے نہیں ۔ رسول اللہ نے لوگوں سے بیعت لی ۔ ان میں سے ایک شخص بھی نہ رہا ۔ سوائے ایک شخص جد ابن قیس کے جو بنو سلمہ سے تھا ۔ حضرت جابر ابن عبد اللہ فرماتے تھے کہ میں اسے اب بھی دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنی اونٹنی کے پہلو کے ساتھ چمٹا ہوا ہے ۔ یوں کہ لوگوں کو نظر نہ آئے ۔ اس کے بعد رسول اللہ کے پاس خبر آئی کہ حضرت عثمان کے بارے میں جو اطلاع آئی تھی وہ غلط تھی ۔

ابن ہشام کہتے ہیں اور مجھے ایک میرے معتمد ذریعہ نے بتایا ہے اور انہوں نے اس شخص سے جس کے پاس سند تھی یہ بات نقل کی ۔ انہوں نے ابن الوطیکہ سے' اور انہوں نے ابن عمر سے روایت کی کہ رسول اللہ ؐ نے حضرت عثمان کے لیے بیعت کی اور اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے پر مارا اور کہا یہ عثمان کے لیے ہے ۔

ابن اسحاق نے کہا' زہری کہتے ہیں کہ اس کے بعد قریش نے قبیلہ بنو عامر کے سہیل ابن عمرو کو بھیجا کہ تم جاؤ اور محمد ﷺ سے مصالحت کر لو اور صلح میں یہ شرط ضرور ہو کہ وہ اس سال چلا جائے تاکہ عرب یہ باتیں نہ کریں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) زبردستی مکہ میں داخل ہو گیا ۔ سہیل آئے' جب رسول اللہ ؐ نے اسے آتے ہوئے دیکھا تو آپ ؐ نے کہہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ صلح چاہتے ہیں کیونکہ انہوں نے سہیل کو بھیجا ہے ۔ جب سہیل ابن عمرو رسول اللہ ؐ کے پاس پہنچے تو اس نے رسول اللہ ؐ سے گفتگو کی اور بہت طویل بات کی' ایک دوسرے کے ساتھ مذاکرات ہوئے اور صلح کی بات ہونے لگی ۔

جب تمام معاملات طے ہو گئے اور ماسوائے لکھے جانے کے اور کوئی بات باقی نہ رہی تو عمر ابن الخطاب کود کر اٹھے' حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور کہا "ابوبکر کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول خدا نہیں" ۔ انہوں نے کہا : ہاں ۔ کیا ہم مسلمان نہیں ؟ انہوں نے کہا : ہاں ۔ آخر ہمارے دین میں ہم پر ذلت کیوں مسلط کی جا رہی ہے ؟ تو حضرت ابوبکر نے فرمایا : عمر! تم آپ ؐ کے طریقے پر قدم رکھو ۔ بس حضور ؐ کے نقش قدم پر چلو ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ رسول خدا ہیں ۔ حضرت عمر نے فرمایا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ رسول اللہ ؐ ہیں ۔ اس کے بعد وہ رسول اللہ کے پاس آئے اور کہا : رسول خدا کیا آپ رسول اللہ ؐ نہیں ؟ تو آپ ؐ نے فرمایا "ہاں" ۔ اور کہا : کیا ہم مسلمان نہیں ہیں ؟ تو فرمایا : "ہاں" ۔ کیا وہ مشرکین نہیں ہیں ؟ تو آپ ؐ نے فرمایا : "ہاں" ۔ تو انہوں نے کہا کہ پھر ہمارے دین میں ہمیں اس ذلت سے کیوں دوچار کیا جاتا ہے ۔ حضور ؐ نے فرمایا : "میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں ۔ میں اللہ کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کر رہا ۔ اس لیے اللہ مجھے کبھی بھی ضائع اور برباد نہیں کرے گا" ۔ حضرت عمر کہا کرتے تھے کہ میں نے اس دن جو حرکت کی' اس کی معافی کے لیے میں آج تک روزے بھی رکھتا ہوں ۔ صدقہ بھی دیتا ہوں' نمازیں بھی پڑھتا ہوں' غلاموں کو بھی آزاد کرتا ہوں' ان باتوں کی ڈر کی وجہ سے جو میں نے کیں' جبکہ یہ باتیں کرتے وقت میں یہ خیال کرتا تھا کہ میں درست کر رہا ہوں ۔

اس کے بعد حضور ؐ نے حضرت علی ؓ ابن ابی طالب کو بلایا ۔ اور فرمایا' لکھو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" تو سہیل نے کہا ہمیں اس کی خبر نہیں البتہ لکھو بسمك اللهم تو حضور ؐ نے فرمایا اچھا لکھو بسمك اللهم اس کے بعد فرمایا لکھو "یہ وہ ہے جس پر محمد رسول اللہ اور سہیل ابن عمر کے درمیان مصالحت ہوئی" ۔ اس پر سہیل نے کہا کہ اگر میں یہ شہادت دیتا کہ آپ رسول اللہ ہیں تو میں آپ کے ساتھ لڑتا کیوں ؟" آپ اپنا نام اور اپنے والد کا نام لکھیں ۔ رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ

لکھو "یہ وہ صلح ہے جو محمد ابن عبداللہ اور سہیل ابن عمر کے درمیان طے ہوئی کہ لوگوں کے درمیان دس سال تک جنگ نہ ہوگی' لوگ ان سالوں میں امن سے رہیں گے' ایک دوسرے پر حملہ نہ کریں گے' یہ کہ قریش میں سے کوئی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمد کے پاس آئے گا تو وہ اسے واپس کر دے گا۔ اور جو شخص محمد سے قریش کی طرف آئے گا وہ اسے واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔ اور ہمارے درمیان ایک "مقفل برتن" ہے یعنی ایک دوسرے پر حملہ نہ ہو گا اور اس میں کوئی خفیہ چوری نہ ہوگی اور نہ خیانت ہوگی' یہ کہ قبائل میں جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ معاہدہ کرے کر سکے گا' اور جو قریش کے ساتھ معاہدہ کرے' کر سکے گا۔ (اس پر خزاعہ کے لوگ اٹھے اور کہا ہم محمدؐ کے ساتھ ہیں اور بنوبکر اٹھے اور انہوں نے کہا ہم قریش کے عہد میں ہیں)۔ اور اس سال تم واپس ہو گے اور مکہ میں داخل نہ ہو گے اور جب اگلا سال ہو گا تو ہم مکہ سے نکل آئیں گے اور تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں داخل ہو گے اور تین دنوں تک رہ سکو گے۔ اور تمہارے پاس وہی اسلحہ ہو گا جو ایک عام سوار کے پاس ہوتا ہے۔ تلواریں نیام میں ہوں گی اور اس کے سوا کوئی اور ہتھیار نہ ہو گا۔

رسول اللہ اور سہیل ابن عمر دستاویز تیار کر رہے تھے کہ ابوجندل ابن سہیل ابن عمر زنجیروں میں بندھے ہوئے پہنچ گئے۔ یہ مشرکین کے ہاتھ سے حضور اکرمؐ سے ملنے کے لیے نکل آئے تھے۔ حضورؐ کے ساتھی جب اس مہم پر نکلے تھے تو انہیں فتح کا پورا پورا یقین تھا کیونکہ رسول اللہؐ کی خواب سے انہوں نے یہی سمجھا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ صلح طے ہو گئی اور اب ہم نے عمرے کے بغیر واپس ہونا ہے اور رسول اللہؐ نے صلح کی جو شرائط تسلیم کی ہیں وہ یہ ہیں تو لوگوں پر غم کے پہاڑ ٹوٹ گئے اور قریب تھا کہ لوگ مر جاتے۔ جب سہیل نے ابو جندل کو دیکھا تو اٹھے اور اس کے منہ پر مارا اور گریبان سے پکڑ لیا اور پھر کہا: محمد اس کے آنے سے قبل یہ معاہدہ ہمارے درمیان طے نہ ہو گیا تھا؟ حضورؐ نے فرمایا ٹھیک ہے' طے ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ اسے گریبان سے پکڑ کر باندھ رہا تھا تاکہ اسے قریش کی طرف واپس بھیج دے اور ابوجندل چیخ رہا تھا' اے مسلمانو' کیا مجھے مشرکین کی طرف لوٹا دیا جائے گا کہ وہ مجھے اذیت دیں۔ اس پر مسلمانوں کی صفوں میں جو غم اور غصہ تھا وہ اور زیادہ ہو گیا۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا "ابو جندل صبر کرو اور برداشت کرو' ان شاء اللہ تمہارے لیے اور تمہارے ساتھ جو دوسرے ضعیف مسلمان ہیں ان کے لیے اللہ کوئی نہ کوئی راہ نکال لے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آپس میں صلح کر لی ہے۔ ہم نے بھی منظوری دے دی ہے اور انہوں نے بھی دے دی ہے۔ اور ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ ہم غداری کریں"۔ حضرت عمر ابن الخطاب اٹھے اور ابو جندل کے پاس کھڑے ہو گئے اور کہا "ابو جندل صبر کرو' یہ مشرک ہیں اور مشرکین کا خون کتے کے خون کے برابر ہے"۔ حضرت عمرؓ اپنی تلوار کا دستہ اس کے قریب کر رہے تھے۔ کہتے ہیں حضرت عمرؓ کی خواہش یہ تھی کہ ابو جندل یہ تلوار مجھ سے چھین لیں اور اپنے باپ کا کام ختم کر دیں۔ لیکن انہوں نے اپنے باپ کو ترجیح دی اور معاملہ نافذ ہو گیا۔ اور ابو جندل سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ کا کوئی خیال نہیں کیا البتہ حضورؐ کے عہد کا احترام کیا۔

جب یہ دستاویز تیار ہوئی تو اس پر مشرکین اور مومنین میں سے کئی لوگوں نے گواہ کے طور پر دستخط کیے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ' عمر ابن الخطابؓ' عبدالرحمن ابن عوف' عبداللہ ابن سہیل ابن عمر' سعد ابن ابو وقاص' محمد ابن مسلمہ' مکرز ابن حفص' (یہ اس وقت مشرک تھے) اور علی ابن ابی طالب اس دستاویز کے کاتب حضرت علی تھے۔

زہری کہتے ہیں کہ جب معاہدے کا معاملہ ختم ہوا تو حضورؐ نے حکم دیا کہ قربانیاں کرو اور بال کٹواؤ۔ کہتے ہیں خدا کی قسم کوئی شخص نہ اٹھا۔ یہاں تک کہ حضورؐ نے تین بار یہ احکام صادر کیے۔ جب کوئی نہ اٹھا تو حضورؐ ام سلمہ کے کمرے میں آئے اور ان کے سامنے یہ بات کی کہ لوگوں کی حالت تو یہ ہو گئی ہے۔ حضرت ام سلمہ نے کہا اے اللہ کے نبیؐ آپؐ اس کو پسند کرتے ہیں؟ آپؐ نکلیں، کسی سے بات نہ کریں، یہاں تک اپنے ہدیہ کو قربان کر دیں، اور اپنے حجام کو بلائیں کہ وہ بال مونڈ دے۔ رسول اللہؐ نکلے، کسی سے کوئی بات نہ کی، آپؐ نے اپنے ہاتھ سے جانور کو ذبح کیا اور اپنے حجام کو بلایا اور اس نے آپؐ کے بال کاٹے۔ جب انہوں نے دیکھا تو سب اٹھے اور قربانیاں کرنے لگے اور ایک دوسرے کے سر مونڈنے لگے۔ حالت یہ تھی کہ کہیں وہ ایک دوسرے کے سر کاٹ کر قتل نہ کر دیں۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عبداللہ ابن نجیح نے بیان کیا مجاہد سے، ابن عباس ابن عباس سے کہ حدیبیہ کے دن بعض لوگوں نے سر منڈوا لیے اور بعض نے بال چھوٹے کر دیئے تو رسول اللہ نے فرمایا منڈوانے والوں پر اللہ رحم کرے اس پر لوگوں نے کہا کہ بال چھوٹے کرنے والوں کو یا رسول اللہ؟" تو آپؐ نے دوبارہ کہا اللہ منڈوانے والوں پر رحم کرے۔ انہوں نے پھر پوچھا کہ بال چھوٹے کرنے والوں پر، تو رسول اللہؐ نے فرمایا اور بال چھوٹے کرنے والوں پر۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا حضورؐ آپ نے صرف منڈوانے والوں کے لیے کیوں رحم کی درخواست کی تو حضورؐ نے فرمایا انہوں نے کوئی شک نہیں چھوڑا۔

زہری کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہیں سے قافلہ کو واپس ہونے کا حکم دیا یہاں تک کہ آپ مکہ اور مدینہ کے درمیان تھے کہ سورت الفتح نازل ہوئی۔

امام احمد رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی سند سے روایت کی ہے مجمع ابن حارثہ انصاری سے۔ یہ قرآن کریم کے قاریوں میں سے ایک تھے۔ انہوں نے کہا ہم حدیبیہ کے موقعہ پر حاضر تھے۔ جب ہم حدیبیہ سے لوٹے تو اچانک دیکھتے ہیں کہ لوگ اونٹ دوڑا رہے ہیں۔ لوگوں نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ تو لوگوں نے کہا کہ رسول اللہؐ پر وحی آگئی ہے، ہم بھی لوگوں کے ساتھ گھوڑے تیز دوڑا کر آگے بڑھے۔ کراع الغمیم کے پاس رسول اللہؐ اپنی سواری پر تھے اور لوگ آپ کے ارد گرد جمع ہو گئے تو آپؐ نے ان پر یہ سورت پڑھی۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا (۴۸ : ۱) "اے نبی، ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی"۔ رسول اللہ کے ساتھیوں میں سے ایک شخص نے کہا رسول خدا کیا یہ فتح ہے؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں، اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، یہ البتہ فتح ہے"۔

امام احمد نے، اپنی سند کے ساتھ، عمر ابن الخطابؓ سے روایت کی ہے، انہوں نے کہا کہ ہم رسول اللہؐ کے ساتھ ایک سفر میں تھے، میں نے حضور سے کسی چیز کے بارے میں تین بار پوچھا تو آپ نے جواب نہ دیا۔ تو میں نے کہا تجھے تیری ماں روئے اے ابن خطاب، تو نے رسول اللہ پر اصرار کیا اور بار بار دہرایا۔ تین بار اور آپ نے جواب نہ دیا۔ کہتے ہیں میں اپنی سواری پر چڑھ گیا اور اپنے اونٹ کو حرکت دی۔ تو میں ڈر کی وجہ سے آگے چلا گیا۔ اس ڈر کی وجہ سے کہ شاید میرے بارے میں کوئی آیت نہ نازل ہو جائے۔ اچانک ایک شخص پکار رہا تھا اے عمرؓ تو میں واپس ہوا اور مجھے یقین تھا کہ میرے بارے میں کوئی آیت نازل ہو گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آج رات مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی

ہے جو مجھے دنیا اور مافیہا سے زیادہ محبوب ہے ۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (۴۸ : ۱) لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ

"اے نبی ؐ ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی تاکہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرما دے"۔ (۴۸ : ۲)
(امام بخاری، ترمذی، نسائی)۔

--- ○○○---

یہ تھی وہ فضا جس میں یہ سورت نازل ہوئی، اس فضا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی ہدایات اور الہامات پر مطمئن تھے ۔ اس لیے آپ نے تمام فیصلے اور ارادے ترک فرما کر عالم بالا کی ہدایات پر عمل کیا اور ہر قدم اور ہر مرحلہ پر آپ عالم بالا کی ہدایات کے مطابق فیصلے فرماتے رہے اور یہ الہام آپ کو قدم قدم پر ہوتا رہا اور کوئی جدا کرنے والا آپ کو اس سے جدا نہ کر سکا، خواہ وہ مشرکین میں سے ہو یا آپ کے ساتھیوں میں سے ہو جو آغاز میں اس صلح پر راضی نہ تھے ۔ کیونکہ اس میں مشرکین کی ضد اور ہٹ دھرمی کو قبول کیا گیا تھا ۔ اس کے بعد اللہ نے ان کے دلوں کو اطمینان عطا کر دیا تو وہ رضامندی، یقین اور قبولیت اور گہری اور عمیق قبولیت کی طرف لوٹ آئے جبکہ بعض صحابہ کرام تو آغاز ہی میں ایسے ہی مقام پر تھے ۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیق ؓ ۔ آپ کی روح نے کسی بھی وقت روح رسول ؐ سے جدائی اختیار نہیں کی ۔ آپ کو ہمیشہ ہر معاملے میں مکمل اطمینان رہا ۔ اور ایک لمحے کے لیے بھی یہ اطمینان آپ سے جدا نہیں ہوا ۔

یہی وجہ ہے کہ سورت کا آغاز رسول اللہ کے لیے بشارت کے ساتھ ہوا اور اس بشارت کی وجہ سے حضور ؐ بہت خوش تھے ۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (۴۸ : ۱) لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَ يُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ يَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا (۴۸ : ۲) وَّ يَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا

"اے نبی ؐ ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی تاکہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے اور تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کر دے ۔ اور تمہیں سیدھا راستہ دکھائے اور تم کو زبردست نصرت بخشے"۔ (۴۸ : ۳)

اور اس آغاز کے بعد مومنین کے لیے اللہ کے اس احسان کا ذکر کیا، کہ ان پر بھی اطمینان کا نزول ہوا ۔ ان کے ایمان کا اعتراف کیا گیا اور ان کو بھی مغفرت اور ثواب کی بشارت دی گئی اور یہ کہ آسمانوں کے لشکر اللہ کے اختیار میں ہیں اور وہ تحریک اسلامی کی پشت پر ہیں ۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۴۸ : ۴) لِّيُدْخِلَ

الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ يُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ كَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا (۴۸ : ۵) "وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل کی تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ وہ ایک ایمان اور بڑھالیں ۔ زمین و آسمان کے سب لشکر اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ علیم و حلیم ہے ۔ تاکہ مومن مردوں اور عورتوں کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسی جنتوں میں داخل فرمائے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی اور ان کی برائیاں ان سے دور کر دے ۔ اللہ کے نزدیک یہ بڑی کامیابی ہے"۔ اور منافقین اور منافقات اور مشرکین اور مشرکات کے لیے اللہ کا عذاب اور غضب تیار ہے ۔

وَّ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ لَعَنَهُمْ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا (۴۸ : ۶) "اور ان منافق مردوں اور عورتوں' اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے جو اللہ کے متعلق برے گمان رکھتے ہیں ۔ برائی کے پھیر میں وہ خود ہی آگئے ' اللہ کا غضب ان پر ہو' اور اس نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے جہنم مہیا کر دی جو بہت ہی برا ٹھکانا ہے"۔

اس کے بعد رسول اللہؐ کی بیعت کی طرف اشارہ ہے کہ جو آپؐ کی بیعت کریں گے وہ اللہ کی بیعت ہو گی ۔ اور ان کے دل اس راہ سے براہ راست اللہ سے مربوط ہو گئے ہیں ۔ اور اب وہ اَللّٰہُ حَیٌّ وَّ لَایَمُوْتُ کے ساتھ متعلق ہیں ۔ گویا انہوں نے اللہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا ۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا (۴۸ : ۸) لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ وَ تُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (۴۸ : ۹) اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ وَ مَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (۴۸ : ۱۰) "اے نبیؐ ہم نے تمہیں شہادت دینے والا' بشارت دینے والا اور خبردار کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ 'اے لوگو' تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ' اور اس کا ساتھ دو' اس کی تعظیم اور توقیر کرو' اور صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو ۔ اے نبی جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے ' ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا' اب جو اس عہد کو توڑے گا تو اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہو گا اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا"۔

اس بیعت اور اس سے پیچھے رہنے کے بارے میں اور حدیبیہ میں مومنین پر تبصرے سے بھی ان دیہاتیوں پہ تبصرہ

سخت ہے جو سرے سے اس سفر میں اہل ایمان کے ساتھ ہی نہ نکلے ـ اللہ تعالیٰ ان کے عذرات کو پیش کرنے سے پہلے ہی رد کر دیتا ہے ـ اور یہ بھی فرماتا ہے کہ ان کے دلوں میں تو بہت کچھ بدگمانیاں تھیں کہ رسول اللہؐ اور مومنین تو واپس آنے والے ہی نہیں ـ اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ مستقبل میں ان کے ساتھ رویہ کیا ہونا چاہئے نیز یہ کہ عنقریب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوں گی اور بہت کچھ غنائم ملیں گے اور پھر ان کے منہ سے رال ٹپکے گی جو پیچھے رہ گئے تھے ـ

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَ اَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۴۸ : ۱۱) بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِىْ قُلُوْبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا (۴۸ : ۱۲) وَ مَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا (۴۸ : ۱۳) وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۴۸ : ۱۴) سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۴۸ : ۱۵) قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۴۸ : ۱۶)

"اے نبیؐ" بدوی عربوں میں سے جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے تھے اب وہ آکر ضرور تم سے کہیں گے کہ ہمیں اپنے اموال اور بال بچوں کی فکر نے مشغول کر رکھا تھا' آپ ہمارے لیے مغفرت کی دعا فرمائیں ' یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ بات کرتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتی ' ان سے کہنا ' اچھا یہی بات ہے تو کون تمہارے معاملے میں اللہ کے فیصلے کو روک دینے کا کچھ اختیار رکھتا ہے ـ اگر وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا نفع بخشنا چاہے تمہارے اعمال سے تو اللہ ہی باخبر ہے ' بلکہ تم نے یوں سمجھا کہ رسول اللہ اور مومنین اپنے گھر والوں میں ہرگز پلٹ کر نہ آسکیں گے اور یہ خیال تمہارے دلوں کو بہت بھلا لگا اور تم نے بہت برے گمان کیے اور تم سخت

بد باطن لوگ ہو"۔ اللہ اور اس کے رسول ؐ پر جو لوگ ایمان نہ رکھتے ہوں ایسے کافروں کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک اللہ ہی ہے ' جسے چاہے معاف کر دے اور جسے چاہے سزا دے۔ اور وہ غفور و رحیم ہے۔ جب تم مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے جانے لگو گے تو یہ پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ تم سے ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو' یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے فرمان کو بدل دیں ' ان سے صاف کہہ دینا کہ "تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے۔ اللہ پہلے ہی فرما چکا ہے"۔ یہ کہیں گے کہ "نہیں بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کر رہے ہو"۔ بلکہ یہ لوگ صحیح بات کو کم ہی سمجھتے ہیں۔ ان پیچھے چھوڑ جانے والے بدوی عربوں سے کہنا کہ عنقریب تمہیں ایسے لوگوں سے لڑنے کے لئے بلایا جائے گا جو بڑے زور آور ہیں۔ تم کو ان سے جنگ کرنی ہوگی یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر تم نے حکم جہاد کی اطاعت کی تو اللہ تمہیں اچھا اجر دے گا۔ اور اگر تم پھر اسی طرح منہ موڑ گئے جس طرح پہلے موڑ چکے ہو تو اللہ تم کو دردناک سزا دے گا"۔

یہاں ضروری تھا کہ پیچھے رہنے والوں میں معذور لوگوں کی بات بھی سامنے آ جائے۔ اور ان لوگوں کی بات بھی آ جائے جن پر جہاد فرض ہی نہ تھا یعنی وہ عاجز تھے اور یہ بھی عذر تھا۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا (۴۸ : ۱۷) "ہاں اگر اندھا' لنگڑا اور مریض جہاد کے لیے نہ آئے تو کوئی حرج نہیں' جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرے گا' اللہ اسے ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور جو منہ پھیرے گا اسے وہ دردناک عذاب دے گا"۔

مخلفین اور معذورین پر تبصرے کے بعد اب مومنین' ان کے موقف' ان کے خلجانات پر بحث ہے۔ ان کی حوصلہ افزائی اور عزت افزائی کی گئی ہے۔ ان بشارتیں دی گئی ہیں۔ یہ لوگ جن کا ایمان قوی تھا اور جنہوں نے اپنا سب کچھ اللہ پر فروخت کر دیا تھا۔ اس پیراگراف میں اللہ تعالیٰ ان نفوس قدسیہ کی اصل حقیقت روشن فرماتا ہے۔ اعلان فرماتا ہے کہ اللہ ان سے راضی ہے' ان پر احسان کرنے والا ہے اور ان کو ثابت قدم کرنے والا ہے۔ اور اللہ ان کو متعین طور پر بتاتا ہے کہ ان لوگوں سے اللہ راضی ہو گیا ہے۔ وہ سب جو ایک درخت کے نیچے بیعت رضوان میں شریک ہوئے' ان کے دلوں میں جو کچھ تھا' وہ بھی بتا دیا۔ اور ان سے راضی ہو گیا۔ اور یہ فیصلہ کر دیا کہ عنقریب تم پر فتوحات کھلنے والی ہیں' اور اموال غنیمت کے دروازے کھلنے والے ہیں۔ اور یہ ایک کائناتی فیصلہ ہے' یہ ایک عظیم حادثہ ہے جس پر یہ پوری کائناتی قوتیں گواہ ہیں۔ اس واقعہ سے دنیا متاثر ہوئی ہے اور انتظار میں ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا (۴۸ : ۱۸) وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (۴۸: ۱۹) وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهِ وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُونَ آيَةً لِلْمُؤْمِنِينَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا (۴۸: ۲۰) وَأُخْرَىٰ لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا (۴۸: ۲۱) وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوُا الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا (۴۸: ۲۲) سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا

(۴۸: ۲۳) "اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے' ان کے دلوں کا حال اس کو معلوم تھا۔ اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی' ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی اور بہت سے مال غنیمت انہیں بخش دیا' جسے وہ عنقریب حاصل کریں گے۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے۔ اللہ تم سے کثرت اموال کا وعدہ کرتا ہے۔ جنہیں تم حاصل کرو گے۔ فوری طور پر تو یہ فتح اس نے تمہیں عطا کر دی اور لوگوں کے ہاتھ تمہارے خلاف اٹھنے سے روک دیا تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی بن جائے اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشے۔ اس کے علاوہ دوسری اور غنیمتوں کا بھی وہ تم سے وعدہ کرتا ہے۔ جس پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے ہو' اور اللہ نے ان کو گھیر رکھا ہے' اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ کافر لوگ اس وقت تم سے لڑ گئے ہوتے تو یقیناً پیٹھ پھیر جاتے اور کوئی حامی و مددگار نہ پاتے' یہ اللہ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آ رہی ہے۔ اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے"۔

مسلمانوں کو بتایا جاتا ہے کہ جو افراد مسلمانوں کو اذیت دینے آئے تھے' اللہ نے ان کو گرفتار کرا دیا اور یہ بھی بتایا کہ جن لوگوں نے مسجد حرام سے لوگوں کو روکا ہے' ان کا عمل بادی النظر میں غلط تھا۔ انہوں نے قربانی کے جانوروں کو اپنی جگہ تک پہنچنے نہ دیا۔ یہ بھی ان کی غلطی تھی' پھر اس سال مسلمانوں کو لڑائی سے روک دینے میں حکمت ہے۔ اور یہ مصالحت جو مسلمانوں کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ اس پر اللہ نے ان کو راضی کر دیا اور ان کے دلوں پر سکینت نازل کر دی۔ اور یہ سب ان حکمتوں کی وجہ سے تھا جن کو اللہ تو دیکھ رہا تھا مگر ان کو نظر نہ آئی تھیں۔ اور یہ حکمتیں فتح مکہ اور غلبہ دین تھا اور یہ عمل اللہ کی تدابیر سے ممکن ہوا۔

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا (۴۸: ۲۴) هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا أَنْ يَبْلُغَ مَحِلَّهُ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُؤْمِنَاتٌ لَمْ تَعْلَمُوهُمْ أَنْ تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبَكُمْ مِنْهُمْ مَعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِي

رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (٤٨ : ٢٥) اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (٤٨ : ٢٦) لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا (٤٨ : ٢٧) هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا

(٤٨ : ٢٨) ”وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیئے' حالانکہ وہ ان پر تمہیں غلبہ عطا کر چکا تھا' اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہی لوگ تو ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور ہدی کے اونٹوں کو ان کی قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا۔ اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد و عورت موجود نہ ہوتے جنہیں تم نہیں جانتے اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ نادانستگی میں تم انہیں پامال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا' (تو جنگ نہ روکی جاتی' روکی وہ اس لئے گئی) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کر دے۔ وہ مومن الگ ہو گئے ہوتے تو (اہل مکہ میں سے) جو کافر تھے' ان کو ہم ضرور سخت سزا دیتے۔ جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ حمیت بٹھالی تو اللہ نے اپنے رسولؐ اور مومنوں پر سکینت نازل فرمائی اور مومنوں کو تقویٰ کی بات کا پابند رکھا کہ وہی اس کا زیادہ حق دار اور اس کے اہل تھے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا' جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا' ان شاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے اور اپنے سر منڈاؤ گے اور بال ترشواؤ گے اور تمہیں کوئی خوف نہ ہو گا۔ وہ اس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے' اس لیے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے یہ قریبی فتح تم کو عطا فرما دی۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے“۔

اور سورت کا خاتمہ ہوتا ہے انسانوں کے اس مجموعے کی تعریف پر جسے اس مقصد کے لیے اٹھایا گیا ہے جس کی مخصوص صفات ہیں اور ان صفات کی طرف توریت اور انجیل میں بھی اشارہ موجود ہے کہ اس جماعت کو کامیابی اور مغفرت نصیب ہو گی۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا

سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (۴۸ : ۲۹) "محمد اللہ کے رسول ہیں ' اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں ـ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلب میں پاؤ گے ـ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں ـ جن سے الگ پہچانے جاتے ہیں ـ یہ ہے ان کی صفت تورات میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی ـ پھر اس کو تقویت دی پھر وہ گدرائی پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوئی ـ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تا کہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں ـ اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے"۔

یوں اس سورت کے نصوص کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے اور یہ سورت اس فضا میں زندہ نظر آتی ہے جس میں یہ نازل ہوئی ـ اور اس طرح واقعات کی صحیح تصویر بھی سامنے آتی ہے ـ قرآن کا انداز بیان دراصل تاریخی تسلسل کا نہیں ہے بلکہ وہ تربیتی ہدایات کے انداز میں بات کرتا ہے ـ ایک انفرادی واقع کے حوالے سے اصولی بات کی جاتی ہے اور ایک خاص پالیسی کو عالم گیر اصول میں بیان کیا جاتا ہے ـ یہ قرآن کریم کا منفرد طریقہ ہے ـ

اس سورت کی فضا ' مضامین اور اس سے ماقبل ترتیب مصحف میں پائے جانے والی سورت محمد کی فضا اور مضامین پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سورت محمد کے نزول کے بعد تین سالوں میں جماعت اسلامی کے شب و روز میں کس قدر تبدیلی واقع ہو گئی تھی ـ یاد رہے کہ راجح رائے یہی ہے کہ سورت محمد اور سورت فتح کے نزول میں تین سال کا فاصلہ ہے ـ ان تین سالوں میں قرآن کریم نے اس جماعت کی جو تربیت کی اور جس طرح وہ قرآن کے زیر سایہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے گزری ' اس کے نتیجے میں یہ جماعت اس مقام تک پہنچ گئی جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ہے ـ

سورت فتح کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم ایک نہایت ہی پختہ کار اور پختہ سوچ والی جماعت کو دیکھ رہے ہیں ـ اس نے اسلامی عقیدے کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے ـ اس کا ایمانی معیار بہت اونچا ہو گیا ہے ـ اس جماعت کے افراد اب اسلامی دعوت اور اسلامی نظام کے غلبے کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہیں ـ اور اب وہ فضا نہیں ہے جو سورت محمد کی تھی کہ اسے جہاد بالمال اور جہاد بالنفس میں حصہ لینے کے لیے اکسایا جا رہا تھا ـ بلکہ اب یہ جماعت غلبہ اسلام کے لیے یہ سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار ہے ـ اور اس کی تیزی اور جذبے کو کنٹرول کرنے کے لیے اسے لگام دی جا رہی ہے ' ٹھنڈا کیا جا رہا ہے کہ ذرا رک کر 'صلح کر لو' اس میں مصلحت ہے ـ

اب یہاں اسے ایسی آیت کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ سورت محمد میں تھی ـ

فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ

(۴۷: ۳۵) "پس بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو' تم ہی غالب رہنے والے ہو۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا" ۔ اور پھر ایسی ہدایات کی بھی ضرورت نہیں تھی ۔

هٰاَنْتُمْ هٰوُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ وَ مَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اللّٰهُ الْغَنِیُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ (۴۷: ۳۸) "دیکھو تم لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو' پس تم میں سے بعض لوگ بخل کر رہے ہیں حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ در حقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے ۔ اللہ تو غنی ہے ۔ تم ہی اس کے محتاج ہو' اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے ۔

نیز یہاں اب اس جماعت کو جہاد پر ابھارنے کی بھی اس طرح ضرورت نہ تھی جس طرح سورت محمد میں ضرورت تھی' وہاں ان کو آمادہ کیا گیا تھا کہ جہاد میں تمہارے لیے بڑا اعزاز ہے اور نہ ہی یہ کہنے کی ضرورت تھی کہ جہاد میں تمہاری آزمائش ہو رہی ہے ۔

ذٰلِكَ وَ لَوْ یَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَ لٰكِنْ لِّیَبْلُوَا۟ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ وَ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَلَنْ یُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ (۴۷: ۴) سَیَهْدِیْهِمْ وَ یُصْلِحُ بَالَهُمْ (۴۷: ۵) وَ یُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ (۴۷: ۶) "اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا مگر تاکہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے آزمائے' اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے' اللہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا ۔ وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا' ان کا حال درست کر دے گا اور ان کو اس جنت میں داخل کر دے گا جس سے وہ ان کو واقف کرا چکا ہے" ۔

اب یہاں کا نقشہ بالکل مختلف ہے ۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دل میں سکون کی ایک کیفیت نازل فرمائی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے اندر حدیبیہ کے موقعہ پر کفار سے ٹکرا جانے کا جو جوش تھا' اسے فی الحال ٹھنڈا کیا جائے ۔ اب ان کے جوش انتقام اور غیرت کو ٹھنڈا کیا جا رہا تھا اور اللہ کے احکام اور رسول اللہ کی حکیمانہ پالیسی پر انہیں مطمئن کیا جا رہا تھا کیونکہ اس وقت صلح اور نرمی ہی میں مصلحت تھی ۔ یہاں اب لوگوں نے جوش و خروش سے بیعت رضوان کی' اس کی تعریف ہو رہی ہے ۔ اور یہاں اب مسلمانوں کی جماعت کی وہ تعریف ہے جو اس سورت کے آخر میں ہے ۔

ہاں ایک بات اس اصول کے خلاف نظر آئے گی کہ بیعت رضوان کی تعریف کی گئی ہے ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ وَ مَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا (۴۸: ۱۰)

"اے نبی" جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے 'ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا' اس کی عہد شکنی کا وبال ان کی اپنی ذات پر ہو گا۔ اور جو اس عہد کو وفا کرے گا' جو اس نے اللہ سے کیا ہے' اللہ عنقریب اس کو اجر عطا کرے گا"۔ اس میں دراصل جہاد پر ابھارنے سے زیادہ مجاہدین کی تکریم اور بلند مرتبے کا اظہار ہے کہ یہ عہد انہوں نے دراصل اللہ سے کیا تھا۔ اور اس عہد کو توڑنے کا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو مدینہ کے گرد جہاد سے رہ گئے تھے۔ اسی طرح منافقین اور منافقات کی مذمت بھی ایک عمومی بات ہے جو اس دور کے ہر سورت میں ہے لیکن یہاں سورت محمد کی طرح مستقل نہیں ہے۔ سورت محمد کے دور میں یہ منافقین اور یہودی گٹھ جوڑ رکھتے تھے تو جس طرح مسلمانوں کے نفوس کے اندر تبدیلی آگئی تھی' اسی طرح خارجی حالات میں بھی کافی تبدیلی آگئی تھی۔

اسی طرح اس سورت کی فضا سے معلوم ہوتا ہے کہ اب مسلمانوں کی قوت بمقابلہ مشرکین بہت زیادہ ہے۔ یہاں آنے والی فتوحات کی طرف صریح اشارات ہیں۔ پھر یہ پیشن گوئیاں ہیں کہ آئندہ جو فتوحات اور اموال غنیمت آنے والے ہیں' حدیبیہ کی مہم سے پیچھے رہنے والے ان کے اندر بہت دلچسپی لیں گے اور معذرتیں کریں گے' لیکن وہ اب محروم ہیں اور یہ کہ یہ دین ہی غالب ہو گا۔ ان سب امور سے معلوم ہوتا ہے کہ سورت محمد کی فضا سے یہاں سورت فتح کی فضا بہت ہی مختلف ہے۔

لوگوں کی نفسیاتی تربیت' جماعت مسلمہ کے شب و روز اور مدینہ کے ماحول کی مجموعی حالت میں اب ایک واضح تبدیلی نظر آتی ہے۔ جو لوگ قرآنی آیات و نصوص سے سیرت نبوی کا مطالعہ کرتے ہیں' ان کو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے۔ یہ تبدیلی قرآنی منہاج تربیت اور نبوی تربیت کا نتیجہ ہے۔ قرآن و سنت کی تربیت کے نتیجے میں یہ جماعت اب اس پوری دنیا کی منفرد جماعت ہے۔ اس تبدیلی میں ان انسانی جماعتوں کی لیڈرشپ کے لیے بھی اشارات ہیں کہ اس کو تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے کہ اگر کارکنوں میں نقص' ضعف' ماضی کے اثرات' جس دور میں کارکن ہوں' اس دور کی کمزوریاں ہوں' یا اس دنیا کے مفادات' گوشت و پوست کی ضروریات سے وہ متاثر ہوں تو انہیں برداشت کرنا چاہئے۔ یہ سب باتیں اس منفرد جماعت کے اندر بھی ابتدائی دور میں تھیں لیکن برداشت' حکمت' صبر اور تربیت نے لوگوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ یاد رہے کہ مختلف ادوار کے مختلف تجربات بھی تبدیلی اور تربیت میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ مختلف واقعات میں تربیت کے مختلف مواقع ہوتے ہیں۔ یوں اخلاقی' تربیتی اور انضباطی معیار بتدریج نہایت بڑھ جاتا ہے اور مادی خواہشات شفاف ہوتی چلی جاتی ہیں' اسی طرح خاندانی اور روایاتی کمزوریاں دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ماضی سے انسان اپنے ساتھ جو کمزوریاں لاتا ہے' وہ بھی دور ہو جاتی ہیں۔ اور دلوں کا افق وسیع اور اعلیٰ ہوتا جاتا ہے۔ یوں نصب العین بلند ہوتا ہے اور نیچے دیکھنے والے دور افق میں' بلندیوں پر روشنیاں دیکھتے ہیں۔ یاد رہے کہ ہمارے لیے رسول اللہ کی سیرت میں بہترین نمونہ ہے۔ اور قرآن کا منہاج تربیت ہمارے لیے ایک صراط مستقیم ہے۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۲۴۴ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۱۷

سُوْرَةُ الْفَتْحِ (۴۸) مَدَنِيَّةٌ (۱۱۱)
اٰيَاتُهَا ۲۹　　رُكُوْعَاتُهَا ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ﴿١﴾ لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ
وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ﴿٢﴾ وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا
عَزِيزًا ﴿٣﴾

"اے نبی ؐ ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی تاکہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے اور تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کر دے اور تمہیں سیدھا راستہ دکھائے اور تم کو زبردست نصرت بخشے"۔

اس سورت کا آغاز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ایک فضل و کرم کے ذکر سے ہوتا ہے۔ کہ آپ ؐ کو فتح مبین بھی عطا کر دیا گیا ہے اور آپ کے اگلے اور پچھلے سب ذنوب معاف کر دیئے گئے۔ آپ ؐ پر اپنی نعمتیں تمام ہو گئیں' آپ ؐ کو مستقل ہدایت نامہ دے دیا گیا اور ایک زبردست نصرت اور فتح بھی دے دی گئی۔ اور یہ ہے صلہ اس گہرے اطمینان اور صبر کا جن کے ساتھ آپ نے ہدایات الہیہ پر عمل کیا۔ اور اس بات کا کہ آپ نے اللہ کی جانب سے وحی اور الہامات و ہدایات پر پورا پورا عمل کیا۔ اپنی تمام خواہشات اور ارادوں کو ترک کر دیا اور اللہ کی نگرانی پر پورا پورا بھروسہ کیا۔ آپ نے ایک خواب دیکھا' اس کے مطابق آپ حرکت میں آگئے۔ آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی اور لوگ چیخے کہ "قصواء" نے چلنے سے انکار کر دیا۔ اڑ گئی۔ لیکن آپ ؐ نے اس سے کوئی اور اشارہ لیا۔ "قصواء اڑ نہیں گئی اور نہ اس کی یہ عادت ہے لیکن اسے اس ذات نے روک لیا ہے جس نے مکہ سے ہاتھی کو روکا تھا۔ اگر قریش آج کوئی بھی ایسا منصوبہ مجھے دیں جس میں صلہ رحمی کی درخواست ہو تو میں منظور کر دوں گا"۔ حضرت عمر ابن الخطاب آپ سے نہایت ہی جوش میں پوچھتے ہیں "کیا ہمیں اپنے دین میں ذلت نہیں دی جا رہی ہے؟" آپ ؐ جواب دیتے ہیں "میں اللہ کا بندہ ہوں' رسول ہوں' میں اس کے حکم کی مخالفت نہیں کر سکتا اور ان شاء اللہ وہ مجھے ضائع نہیں کرے گا"۔ یہ تو رہی صلح کی بات لیکن جب اطلاع

آتی ہے کہ حضرت عثمانؓ قتل ہوگئے ہیں تو آپؐ فرماتے ہیں "ہم اس وقت تک ڈٹے رہیں گے جب تک قوم سے انتقام نہ لے لیں"۔ لوگوں کو بیعت کے لیے بلایا جاتا ہے۔ یہ بیعت' بیعت الرضوان قرار پاتی ہے اور اس سے ان لوگوں کو بھلائی نصیب ہوتی ہے اور یہ ان کے لیے رتبہ بلند تھا جنھوں نے اس میں حصہ لیا۔

یہ سورت دراصل فتح عظیم تھی۔ اور صلح حدیبیہ بھی دراصل فتح عظیم تھی' کیونکہ اس کے نتیجے میں بے شمار فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔ یہ دعوت اسلامی کے زاویہ سے بھی فتح تھی۔ امام زہری کہتے ہیں اس سے قبل اسلام کو جو فتوحات ملی تھیں یہ ان سے بڑی فتح تھی۔ اس سے قبل یہ تھا کہ لوگ جہاں بھی ملتے جنگ ہوتی۔ جب صلح ہوگئی اور حالت جنگ ختم ہوگئی اور لوگوں کو ایک دوسرے کی جانب سے امن نصیب ہوگیا' ملنا جلنا آزاد ہوگیا تو انہوں نے اسلام کے موضوع پر بحث و مکالمہ شروع کر دیا۔ اسلام کے بارے میں جس شخص نے معقول گفتگو کی وہ اسلام میں داخل ہوگیا۔ صلح حدیبیہ اور فتح کے درمیان دو سالوں میں اس قدر لوگ مسلمان ہوگئے کہ ان کی تعداد سابقہ تمام عرصے کے مسلمانوں کے برابر تھی یا زیادہ تھی۔

ابن ہشام کہتے ہیں کہ زہری کی بات پر دلیل یہ ہے کہ جابر بن عبداللہ کے قول کے مطابق حضور اکرمؐ حدیبیہ کی مہم پر چودہ سو افراد لے کر نکلے تھے لیکن ٹھیک دو سال بعد جب مکہ پر حملہ ہوا تو آپ کے ہم رکاب دس ہزار زائد افراد تھے۔ اور اس عرصہ میں خالد ابن ولید اور عمرابن العاص رضی اللہ عنہما مسلمان ہوئے۔

زمین پر یہ فتح یوں تھی کہ مسلمان قریش کے شر سے محفوظ ہوگئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو موقعہ مل گیا کہ جزیرۃ العرب کو یہودیوں کے باقی خطرات سے پاک فرمادیں۔ بنی قینقاع' بنی النضیر اور بنو قریظہ کو اس سے قبل ختم کر دیا گیا تھا۔ یہ خطرہ اب خیبر کے محفوظ قلعوں میں موجود تھا۔ کیونکہ خیبر کے یہ قلعے شام کے راستے میں واقع تھے۔ چنانچہ حدیبیہ کے بعد اللہ نے خیبر کا علاقہ بھی مسلمانوں کو دے دیا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے علاقے اور غنائم کو صرف ان لوگوں میں تقسیم کیا جو حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے ان کے علاوہ کسی کو کچھ نہ دیا۔

یہ مدینہ کے مسلمانوں اور مکہ کے قریش کی طویل جنگ میں مسلمانوں کی فتح تھی۔ استاذ محمد دروزہ اپنی کتاب سیرۃ الرسول میں فرماتے ہیں :

"اس میں شک نہیں کہ یہ صلح جسے قرآن کریم نے فتح قرار دیا اسے ہر مفہوم میں مسلمانوں کی فتح سمجھنا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے سیرۃ النبی کے فیصلہ کن واقعات میں شمار کرنا چاہئے۔ یہ واقعہ اسلام کی تاریخ میں اسلام کی قوت اور استحکام کا سبب بنا۔ ایک بڑا مفید واقعہ تو وہ بہرحال تھا ہی۔ اس صلح کے ذریعہ قریش نے پہلی مرتبہ اسلامی حکومت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کو تسلیم کیا اور مسلمانوں کو انہوں نے اپنے برابر کی قوت تسلیم کیا بلکہ قریش نے اسلامی حکومت کا دفاع کیا۔ اس سے پہلے دو سالوں میں قریش نے دو مرتبہ مدینہ پر حملہ کیا اور جنگ احزاب تو حدیبیہ سے ایک سال قبل ہوتی تھی جس میں قریش بے شمار احزاب کو لے کر مدینہ پر چڑھ آئے تھے تاکہ مومنین اور اسلام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ اور غزوۂ احزاب کے درمیان اہل ایمان کی صفوں میں بے حد اضطراب پیدا ہوگیا تھا اور ایک عام بے چینی سی پیدا ہوگئی تھی کیونکہ مدینہ پر حملہ کرنے والوں کی تعداد بہت ہی زیادہ تھی اور جنگ احزاب کا پورے عالم عرب پر اثر تھا کیونکہ تمام عرب اہل قریش کی پیروی کرتے تھے اور وہ قریش کے سخت موقف سے متاثر ہوتے تھے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ مدینہ کے اردگرد کے دیہاتی اور منافق یہ پیش گوئیاں کرتے تھے کہ اس جنگ سے مسلمان کسی صورت میں صحیح سالم واپس نہ آسکیں

گے اور وہ ہر قسم کا سوئے ظن رکھتے تھے ۔ تو اس صورت میں اس فتح کی اہمیت اور ظاہر ہو جاتی ہے اور اس کے اثرات دور رس ثابت ہوتے ہیں"۔

"بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو الہام تھا' وہ درست تھا اور یہ کہ قرآن کریم نے بھی اس کی تائید کر دی ۔ اور اس صلح کی وجہ سے مسلمانوں کو بہت ہی عظیم مادی معنوی اور دعوتی فوائد حاصل ہوئے ۔ نیز جنگی اور سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی پوزیشن بہت ہی مضبوط ہو گئی ۔ قبائل کی نظروں میں مسلمان ایک مضبوط قوت بن گئے اور واپس ہوتے ہی مدینہ کے گرد کے جو قبائل پیچھے رہ گئے تھے وہ آکر عذرات پیش کرنے لگے ۔ مدینہ کے اندر منافقین کی آواز دبنے لگی اور وہ کمزور ہو گئے ۔ اور ہر طرف سے عرب وفود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آنا شروع ہو گئے اور یہودیوں کی قوت کو خیبر اور اس کے آس پاس کے علاقوں سے ہٹا دیا گیا ۔ یہ لوگ شام کے راستے پر پھیلے ہوئے تھے ۔ حضور اکرمؐ کے لیے ممکن ہو گیا کہ آپ نجد' یمن اور بلقا جیسے دور دراز علاقوں میں فوجی مہمات ارسال کریں ۔ اور ٹھیک دو سال بعد حضورؐ نے مکہ کو دس ہزار کے لشکر کے ساتھ فتح کیا ۔ یہ فیصلہ کن فتح تھی کہ جب اللہ کی مدد آئی اور فتح مکمل ہوئی اور لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگے"۔

میں یہ کہتا ہوں کہ ان تمام پہلوؤں کے سوا ایک دوسرا پہلو ہے جس کے زاویہ سے یہ فتح عظیم تھی ۔ اس سے اسلام کے لئے لوگوں کے دل و دماغ فتح ہو گئے ۔ اس کے نتیجے میں بیعت الرضوان کا واقعہ پیش آیا جس میں مسلمانوں نے موت اور عدم فرار پر بیعت کی اور اللہ نے اعلان کر دیا کہ درخت کے نیچے جن لوگوں نے بیعت کی ان سے اللہ راضی ہو گیا ہے ۔ اور قرآن میں اس اعلان کا اندراج ہو گیا اور پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی لیڈرشپ اور انقلابی جماعت کے خدوخال اور اوصاف کو اس سورت میں اس فتح کے نتیجے میں قلم بند کر دیا گیا۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (۴۸ : ۲۹) "محمد' اللہ کے رسول ہیں' اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں ۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلب میں پاؤ گے ۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں ۔ جن سے الگ پہچانے جاتے ہیں ۔ یہ ہے ان کی صفت تورات میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی ۔ پھر اس کو تقویت دی پھر وہ گدرائی پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوئی ۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں ۔ اس گروہ کے لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں' اللہ نے ان سے مغفرت اور

بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے"۔

میں کہتا ہوں اسلامی دعوت کی تاریخ میں یہ بہت ہی بڑی فتح ہے جو کسی جماعت کو حاصل ہوئی۔ اس کے آثار کافی دیر تک اسلامی تاریخ میں نکلتے رہے۔

پھر اس کے نتیجے میں سورت فتح نازل ہوئی۔ جس پر حضور اکرمؐ بہت ہی خوش تھے۔ حضورؐ پر اللہ کی رحمتوں کی بارش یوں ہوئی کہ اگلے پچھلے قصور معاف ہوئے اور آپؐ کے ساتھی مومنین پر یہ فیض ہوا کہ اللہ ان سے راضی ہوا۔ حضورؐ کو مکمل ہدایت دی گئی اور عظیم نصرت دی گئی اور پھر جماعت اہل ایمان کو تورات ' انجیل اور قرآن کا سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا "گزشتہ رات مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی جو اس تمام دولت سے زیادہ قیمتی ہے جس پر کبھی سورج طلوع ہوا ہے"۔ اور آپ نے رب تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ ان نعمتوں پر آپؐ اور طویل ترین نمازیں پڑھتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ نماز پڑھنے کے لیے اٹھتے تو آپ کے پاؤں سوج جاتے۔ حضرت عائشہؓ نے آپؐ سے عرض کیا کہ اللہ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے ہیں تو آپؐ کیوں اس قدر تکلیف کرتے ہیں اس پر حضورؐ نے فرمایا "اے عائشہ! کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں"۔

یہ افتتاح تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ تھا۔ اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اس فتح کے ذریعے مسلمانوں پر کس قدر انعامات کیے گئے اور اللہ نے اپنے دست قدرت سے کس طرح ان کے دلوں پر سکینہ اتارا۔ اور آخرت میں ان کے لیے یہ بخشش اور فوز عظیم کے انعامات ہوں گے۔

هُوَ الَّذِيٓ اَنۡزَلَ السَّكِيۡنَةَ فِيۡ قُلُوۡبِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لِيَزۡدَادُوۡۤا اِيۡمَانًا مَّعَ اِيۡمَانِهِمۡ‌ؕ وَ لِلّٰهِ جُنُوۡدُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ۙ‏ لِّيُدۡخِلَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا وَيُكَفِّرَ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ‌ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنۡدَ اللّٰهِ فَوۡزًا عَظِيۡمًا ۙ‏ وَّيُعَذِّبَ الۡمُنٰفِقِيۡنَ وَ الۡمُنٰفِقٰتِ وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ وَ الۡمُشۡرِكٰتِ الظَّآنِّيۡنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوۡءِ‌ؕ عَلَيۡهِمۡ دَآئِرَةُ السَّوۡءِ‌ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ وَلَعَنَهُمۡ وَاَعَدَّ لَهُمۡ جَهَنَّمَ‌ؕ وَسَآءَتۡ مَصِيۡرًا‏ ۝ وَلِلّٰهِ جُنُوۡدُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا‏ ۝

وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل فرمائی تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ وہ ایک ایمان اور بڑھالیں۔ زمین اور آسمانوں کے سب لشکر اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ علیم و حکیم ہے۔ (اس نے یہ کام اس لیے کیا ہے) تاکہ مومن مردوں اور عورتوں کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسی جنتوں میں داخل فرمائے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور ان کی برائیاں ان سے دور کر دے..... اللہ کے نزدیک یہ بڑی کامیابی ہے۔ اور ان منافق مردوں اور عورتوں اور

مشرک مرد و عورتوں کو سزا دے جو اللہ کے متعلق برے گمان رکھتے ہیں ۔ برائی کے پھیر میں وہ خود ہی آگئے ' اللہ کا غضب ان پر ہوا اور اس نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے جہنم مہیا کر دی جو بہت ہی برا ٹھکانا ہے ۔ زمین اور آسمان کے لشکر اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ زبردست اور حکیم ہے"۔

سکینہ کا لفظ ایک معنوی تعبیر اور تصویر اور پرتو پر دلالت کرتا ہے ۔ جب کسی قلب پر سکینہ نازل ہو تو وہ مطمئن ' خوش ' اور پروقار ہوتا ہے ۔ اسے یقین ' بھروسہ اور ثبات حاصل ہوتا ہے ۔ جس کے نتیجے میں وہ سر تسلیم خم کر دیتا ہے ۔ اور اللہ کے ہر حکم پر راضی ہوتا ہے ۔ اور ایسا شخص پھر نہایت باوقار ہوتا ہے ۔

اس واقعہ پر مسلمانوں کے دل کئی وجوہات سے جوش میں آجاتے تھے اور ان پر مختلف قسم کے تاثرات کا دباؤ تھا۔ ایک تو لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کی تعبیر یہ کر رکھی تھی کہ آپ مسجد حرام میں اسی سال داخل ہوں گے ۔ پھر یہ کہ قریش نے یہ شرط رکھ دی کہ آپؐ اس سال واپس ہو جائیں اور اگلے سال عمرہ کریں اور حضورؐ نے اس شرط کو قبول کر لیا۔ حالانکہ انہوں نے احرام باندھ لیا تھا اور ہدی کے جانوروں کے گلے میں شعار باندھ لیا تھا۔ اور یہ امور ایسے تھے جو بعض جذباتی لوگوں کے لیے ناقابل برداشت تھے ۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ' حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور وہ اس وقت سخت جوش میں تھے کہ کیا ہمیں یہ نہ بتایا گیا تھا کہ ہم بیت اللہ کو جائیں گے اور طواف کریں گے ۔ ابوبکرؓ جن کا دل حضور اکرمؐ کے ساتھ دھڑکتا تھا' نے فرمایا کیا آپؐ نے یہ فرمایا تھا کہ اسی سال تم عمرہ کرو گے ؟ تو انہوں نے کہا اس سال کا تو نہیں کہا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا :"پس تم آؤ گے اور طواف کرو گے"۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو چھوڑا اور حضور اکرمؐ کے پاس پہنچے اور حضورؐ سے کہا :"کیا آپ نے نہ بتایا تھا کہ ہم بیت اللہ کو جائیں گے اور طواف کریں گے ؟" حضورؐ نے فرمایا" درست ' لیکن کیا میں نے یہ کہا تھا کہ تم اسی سال عمرہ کرو گے ؟" تو حضرت عمرؓ نے فرمایا" نہیں"۔ حضورؐ نے فرمایا" بے شک تم آؤ گے اور طواف کرو گے"۔ یہ باتیں تھیں جو دلوں میں لاوے کی طرح ابل رہی تھیں ۔

پھر مومنین قریش کی شرائط پر بھی سخت برہم تھے ۔ یہ کہ اگر کوئی مسلمان اپنے ولی کی اجازت سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آجاتا ہے تو اسے تو واپس کر دیا جائے گا لیکن اگر کوئی مسلمان ' مسلمانوں کی اجازت کے بغیر مکہ چلا جاتا ہے تو اسے واپس نہ کیا جائے گا۔ پھر انہوں نے اپنی جاہلیت کی وجہ سے بسم اللہ الرحمن الرحیم کا نام کٹوا کر بسمک اللھم کر دیا۔ پھر انہوں نے آپ کے نام سے رسول اللہ کا لفظ کٹوا دیا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ نے سہیل کے کہنے کے مطابق (رسول اللہ) کا لفظ کاٹنے سے انکار کر دیا۔ رسول اللہ نے اسے خود محو کر دیا اور کہا" اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں رسول ہوں"۔

مسلمانوں کی بہادری ' دینی حمیت اور جذبہ جہاد اور مشرکین کے ساتھ لڑنے کا جذبہ تو اس اجتماعی بیعت سے ظاہر ہے جو انہوں نے کی ۔ لیکن معاملہ چونکہ اچانک صلح ' امن اور واپسی پر منتج ہو گیا اس لیے مسلمان اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کر سکتے تھے ۔ اس لیے ان کی طرف سے جذبات کا اظہار ہوا۔ اس طرح رسول اللہؐ کے فرمان کے باوجود انہوں نے قربانیاں نہ کیں ' سر نہ منڈوائے ' باوجود اس کے کہ حضورؐ نے تین مرتبہ احکام صادر فرمائے ۔ حالانکہ وہ حضورؐ کے احکام پر مرمٹنے والے تھے ۔ عروہ ابن مسعود ثقفی نے قریش کو جو رپورٹ دی اس سے مسلمانوں کی حالت ظاہر تھی اور اب حالت یہ ہے کہ جب حضورؐ نے قربانی ذبح کر دی اور سر منڈوایا تب جاکر انہوں نے جانور ذبح کیے اور سر منڈوائے ۔

غرض ان کو اس واقعہ نے سخت ہلا مارا تھا۔اب جب کہ وہ اطاعت کی طرف آگئے تو پھر بھی دہشت زدہ تھے۔

یہ لوگ مدینہ سے عمرہ کی نیت سے نکلے تھے۔جنگ لڑنے کا تو ارادہ ہی نہ تھا۔نہ نفسیاتی لحاظ سے اور نہ مادی لحاظ سے وہ جنگ کے لیے تیار تھے۔لیکن جب قریش نے سخت موقف اختیار کیا' پھر یہ خبر آئی کہ حضرت عثمانؓ قتل کر دیئے گئے ہیں۔پھر قریش نے کچھ لوگ بھیجے جنہوں نے مسلمانوں کے لشکر پر تیر اور پتھر پھینکے۔جب رسول اللہ ؐ نے جنگ پر بیعت چاہی تو وہ تہہ دل سے تیار ہو گئے۔لیکن اس بیعت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مسلمانوں کے اندر جنگی حالت اچانک نہ آئی تھی۔یہ جنگی حالت بالکل اچانک تھی یہ لوگ جنگ کے لیے نکلے نہ تھے۔اس وجہ سے بھی مسلمانوں کے دلوں کے اندر جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔یہ چودہ سو تھے۔اور قریش اپنے گھروں میں تھے اور ان کے ساتھ اطراف مکہ کے مشرکین بھی معاون و مددگار تھے۔

جب انسان ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر اس آیت پر غور کرتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۴۸ : ۴) "وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل کی" تو انسان لفظ اور مفہوم دونوں کی خوبصورتی اور مٹھاس کو محسوس کرتا ہے اور اس وقت جو صورت حالات تھی وہ بھی پوری طرح ذہن میں بیٹھ جاتی ہے اور اچھی طرح محسوس ہوتی ہے کہ اس سکینت کی ٹھنڈک نے کس طرح جلنے والے دلوں کو فوراً سکون بخشا ہو گا اور کس طرح ان کو بحال کر دیا ہو گا۔

چونکہ اللہ کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کے دلوں کی حالت کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ جو جوش ہے وہ جوش ایمان ہے' جو محبت اور غیرت ہے وہ حمیت اسلامی اور غیرت ایمانی ہے۔کسی مفاد یا جاہلیت کے لیے نہیں ہے۔اس لیے اللہ نے یہ سکینت نازل کی۔

لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ (۴۸ : ۴) "تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ وہ ایک ایمان اور بڑھا لیں"۔طمانیت وہ درجہ ہے جو ایمان کے جوش و خروش کے بعد آتا ہے۔اس میں بھرپور اعتماد ہوتا ہے۔کوئی بے چینی نہیں ہوتی' ایسی رضامندی ہوتی ہے جو اعتماد و یقین پر مبنی ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس بات کو نمایاں کیا جاتا ہے کہ نصرت اور غلبہ نہ تو ناممکن ہے۔اور نہ ہی مشکل ہے۔اگر اللہ کی حکمت کا تقاضا ہوتا تو یہ اللہ کے لیے بہت ہی آسان ہے۔آج جو کچھ ہو رہا ہے' یہی اللہ کی حکمت کا تقاضا ہے۔اللہ کی افواج لاتعداد ہیں' ان پر کوئی قوت غالب نہیں آ سکتی۔لیکن اللہ نے غلبے کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا (۴۸ : ۴) "زمین اور آسمانوں کے لشکر اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے"۔یہ اللہ کی حکمت ہے اور اس کا علم ہے جو معاملات کو اپنی مرضی سے چلاتے ہیں۔

اور اس علم اور حکمت ہی کا تقاضا تھا کہ۔

أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ (۴۸ : ۴) لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَعَ إِيمَانِهِمْ (۴۸ : ۴)
"جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل کی تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ وہ ایک ایمان اور بڑھا لیں"۔ تاکہ ان کے لیے اللہ نے جو بڑی کامیابی مقدر رکھی ہے' وہ پوری ہو جائے۔

لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَكَانَ ذَٰلِكَ عِندَ اللَّهِ فَوْزًا عَظِيمًا (۴۸ : ۵) "تاکہ مومن مردوں اور عورتوں کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسی جنتوں میں داخل فرمائے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور ان کی برائیاں ان سے دور کر دے۔ اللہ کے نزدیک یہ بڑی کامیابی ہے"۔

اگر اس بات کو اللہ فوز عظیم قرار دیتا ہے تو یہ فی الواقع فوز عظیم ہے۔ اپنی حقیقت میں فوز عظیم ہے۔ یہ ایک عظیم کامیابی ہے' ان لوگوں کے خیال میں جن کو وہ ملی ہے' اللہ کی تقدیر کے مطابق اور اللہ کے پیمانوں کے مطابق۔ اس وقت مسلمان بہت خوش تھے ان فتوحات پر جو اللہ نے ان کے لیے لکھ دی تھیں۔ جب انہوں نے اس سورت کا یہ آغاز سنا تو وہ ان فتوحات کی امید کرتے تھے۔ ان کے انتظار میں تھے اور ان کو علم ہو گیا تھا کہ اللہ رسول اللہؐ پر کیا کیا مہربانیاں کرنے والا ہے۔ اور اس میں ان کا جو حصہ ہے اس کے لیے وہ انتظار میں تھے۔ اور آپ سے پوچھتے رہتے تھے اور جب انہوں نے سنا اور جانا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

---ooo---

اس کے بعد اللہ کی حکمت کا ایک دوسرا پہلو سامنے آتا ہے' جو اللہ نے اس واقعہ میں رکھا ہوا تھا یہ کہ منافقین اور منافقات کو سزا دے اور مشرکین اور مشرکات سے ایسے کاموں کا صدور ہو اور وہ سزاؤں کے مستحق ہو جائیں۔

وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ الظَّانِّينَ بِاللَّهِ ظَنَّ السَّوْءِ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا (۶) وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (۴۸ : ۷) "اور ان منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے جو اللہ کے متعلق برے گمان رکھتے ہیں۔ برائی کے پھیر میں وہ خود ہی آ گئے' اللہ کا غضب ان پر ہوا اور اس نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے جہنم مہیا کر دی جو بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ زمین اور آسمان کے لشکر اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ زبردست اور حکیم ہے"۔

اس آیت میں اللہ نے مشرکین اور مشرکات' منافقات اور منافقین کو صفت سوء ظن میں شریک کیا ہے اور اس صفت میں کہ ان کو یقین نہ تھا کہ اللہ مومنین کی امداد کرے گا۔ اس لیے اللہ نے ان کو اس سزا میں بھی شریک رکھا کہ ان پر برائی کا پھیر آ گیا اور یہ خود ہی گھیرے گئے۔ اور یہ برائی ان پر پڑنے والی ہے۔ اور ان سب پر اللہ کا غضب ہے اور سب پر اللہ کی لعنت ہے اور ان سب کا انجام بھی برا ہے اور یہ اس میں شریک ہیں۔ یہ اس لیے کہ نفاق ایک بہت ہی ذلیل حرکت ہے۔ یہ شرک

کے برابر ہے بلکہ شرک سے بھی بری ہے اور گری ہوئی حرکت ہے ـ اور مسلمانوں کو اذیت دینے میں ان منافقین اور منافقات کا کردار مشرکین اور مشرکات سے کم نہیں ہے ـ اگرچہ دونوں کی اذیتوں کا دائرہ اور نوعیت مختلف ہے ـ

اللہ تعالیٰ نے منافقین و منافقات اور مشرکین و مشرکات کی اہم صفت یہ قرار دی ہے کہ یہ اللہ کے بارے میں بدگمانیاں کرتے ہیں ـ ایک مومن اپنے رب کے ساتھ حسن ظن رکھتا ہے اور ہمیشہ اللہ سے خیر چاہتا ہے ـ اور خیر کی توقع کرتا ہے خواہ اس کے حالات اچھے ہوں یا وہ مشکلات میں ہو ـ وہ اپنے ایمان کو مضبوط کرتا ہے کہ دونوں حالات میں اللہ سے بھلائی چاہتا ہے ـ اس لیے کہ اس کا دل اللہ کے ساتھ جڑا ہوتا ہے ـ اور اللہ بھلائی کے چشمہ کو کبھی بند نہیں فرماتا ـ جب انسان کا قلب واصل باللہ ہو تو وہ اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے اور براہ راست اس کا ذائقہ محسوس کرتا ہے ـ رہے منافق اور مشرک تو ان کو تعلق باللہ کی نعمت حاصل نہیں ہوتی ـ اس لیے وہ اس حقیقت کو محسوس نہیں کرتے اور نہ اسے اپنے اندر پاتے ہیں ـ پس وہ اللہ کے ساتھ سوء ظن کرتے ہیں اور صرف ظاہری امور کو دیکھ کر فیصلے کرتے ہیں اور اپنے احکام کو ظاہری امور پر مبنی کرتے ہیں ـ جب کوئی ظاہری علامات ان کو نظر آتی ہیں تو وہ توقع کرتے ہیں کہ ان پر بھی مصیبت آگئی اور مسلمانوں پر بھی ـ ان کو اللہ کی تقدیر اور تدبیر پر کوئی بھروسہ نہیں ہوتا ـ حالانکہ اللہ کی تقدیر اور تدبیر بعض اوقات نظروں سے اوجھل ہو کر کام کرتی ہیں ـ

اس آیت میں اللہ نے اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کی مختلف انواع و اقسام کو جمع کیا ' ان کا حال بیان کیا اور یہ بتایا کہ ان کے لیے کس قدر برا انجام ہے اور آخر میں بتایا کہ ان کا سوء ظن غلط ہے ـ اللہ کی قدرت وسیع اور حکمت دور رس ہے ـ

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۴۸ : ۷) "زمین و آسمان کے لشکر اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ زبردست و حکیم ہے" ـ لہٰذا ان دشمنان اسلام کی کوئی بات اللہ کو عاجز نہیں کر سکتی ' ان کی کوئی سرگرمی اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے ـ وہ تو زمین و آسمان کی قوتوں کا مالک ہے اور عزیز و حکیم ہے ـ

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رخ کیا جاتا ہے کہ آپ کا فرض منصبی کیا ہے ـ اور اس سلسلے میں اہل ایمان کے فرائض کیا ہیں ـ آپ نے ان تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا ـ وہ ایمان لا چکے ' بیعت الرضوان میں براہ راست اللہ سے بیعت بھی کر چکے ـ یہ عہد انہوں نے براہ راست اللہ سے کیا ہے ـ اس لیے یہ نہایت ہی عظیم مقام ہے جس تک وہ پہنچ گئے ہیں ـ یاد رکھیں کہ اس بیعت اور عقد کی ذمہ داریاں بھی عظیم ہیں ـ

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًاۙ۝لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ
وَ تُوَقِّرُوْهُ ؕ وَ تُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا۝اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ
اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ۱
اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا۝سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ ع۱۰
۹

مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَ اَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ
مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ
ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۭ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۱﴾ بَلْ ظَنَنْتُمْ
اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ
قُلُوْبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚ وَ كُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَ مَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ
وَ رَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۭ
يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۴﴾ سَيَقُوْلُ
الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ
يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ
بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ۭ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵﴾ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ
الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ
فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ
يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶﴾

اے نبیؐ، ہم نے تم کو شہادت دینے والا، بشارت دینے والا اور خبردار کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ اے لوگو، تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کا (یعنی رسول کا) ساتھ دو، اس کی تعظیم و توقیر کرو اور صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو۔ اے نبیؐ بدوی عربوں میں سے جو لوگ پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے اب وہ آکر ضرور تم سے کہیں گے کہ "ہمیں اپنے اموال اور بال بچوں کی فکر نے مشغول کر رکھا تھا، آپ ہمارے لیے مغفرت کی دعا فرمائیں"۔ یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں۔ ان سے کہنا "اچھا، یہی بات ہے تو کون تمہارے معاملہ میں اللہ کے فیصلے کو روک دینے کا کچھ بھی اختیار رکھتا ہے۔ اگر وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا نفع بخشنا چاہے؟ تمہارے اعمال سے تو اللہ ہی باخبر ہے۔ (مگر اصل بات وہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو) بلکہ تم نے یوں سمجھا کہ رسول اور مومنین اپنے گھر والوں میں ہرگز پلٹ کر نہ آسکیں گے اور یہ خیال تمہارے دلوں کو بہت بھلا لگا اور تم نے بہت برے گمان کیے اور تم

سخت بد باطن لوگ ہو۔ اللہ اور اس کے رسولؐ پر جو لوگ ایمان نہ رکھتے ہوں ایسے کافروں کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک اللہ ہی ہے' جسے چاہے معاف کرے اور جسے چاہے سزا دے' اور وہ غفور و رحیم ہے۔ جب تم ما ل غنیمت حاصل کرنے کے لیے جانے لگو گے تو یہ پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ تم سے ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے فرمان کو بدل دیں۔ ان سے صاف کہہ دینا کہ "تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے' اللہ پہلے ہی یہ فرما چکا ہے"۔ یہ کہیں گے کہ "نہیں' بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کر رہے ہو"۔ (حالانکہ بات حسد کی نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ صحیح بات کو کم ہی سمجھتے ہیں۔ ان پیچھے چھوڑے جانے والے بدوی عربوں سے کہنا کہ "عنقریب تمہیں ایسے لوگوں سے لڑنے کے لیے بلایا جائے گا جو بڑے زور آور ہیں۔ تم کو ان سے جنگ کرنی ہوگی یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر تم نے حکم جہاد کی اطاعت کی تو اللہ تمہیں اچھا اجر دے گا' اور اگر تم پھر اسی طرح منہ موڑ گئے جس طرح پہلے موڑ چکے ہو تو اللہ تم کو دردناک سزا دے گا"۔

اے نبیؐ' جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہوگا' اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے' اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا"۔

رسول اللہؐ ان تمام لوگوں پر گواہ ہیں جن کی طرف آپ کو بھیجا گیا ہے۔ آپ شہادت دیں گے کہ جو پیغام آپ کو دے کر بھیجا گیا تھا آپ نے وہ لوگوں تک پہنچا دیا ہے اور یہ کہ لوگوں کا ردعمل یہ رہا ہے۔ اور ان میں سے بعض مومن ہوئے۔ بعض نے کفر اختیار کیا اور بعض نے منافقت کا رویہ اختیار کیا۔ بعض لوگوں نے اصلاح قبول کی اور بعض بدستور مفسد رہے تو حضورؐ نے جس طرح رسالت کا حق ادا کیا اور پیغام پہنچایا اسی طرح حضورؐ شہادت بھی دیں گے کیونکہ حضورؐ مبشر ہیں' خوش خبری دینے والے ہیں' اچھے انجام اور اللہ کی مغفرت کی اور اچھے انجام کی ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے اطاعت کی اور ڈرانے والے ہیں کافروں' منافقوں اور مفسد نافرمانوں کو کہ ان کا انجام برا ہوگا۔ ان پر اللہ کا غضب ہوگا' لعنت ہوگی اور سخت سزا ہوگی۔

یہ تو ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض منصبی۔ اس کے بعد مومنین سے خطاب ہے کہ رسالت کے حوالے سے تمہارے فرائض کیا ہیں؟ یہ کہ اللہ اور رسول اللہؐ پر ایمان لاؤ' اس کے بعد ایمان کے تقاضے پورے کرو' اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں اللہ اور رسولؐ کی مدد کرو' رسول اللہ کا غایت درجہ احترام کرو' اور صبح و شام اللہ کی تسبیح و تحمید کرو' یعنی پورے دن اللہ کی بندگی کرو کیونکہ دن کے دونوں اطراف کا ذکر کر کے اس سے مراد پورا دن لیا گیا ہے۔ یعنی ہر وقت اللہ سے جڑے رہو۔ یہ ہے ایمان کا ثمرہ اور پھل جس کی ہر مومن سے توقع کی جاتی ہے اور رسول کو شاہد' مبشر اور نذیر اسی لیے بنا کر بھیجا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ آپ لوگوں کے اور اللہ کے درمیان رابطہ قائم کر کے ایسی بیعت اور ایسا معاہدہ کرا دیں کہ آپؐ کے چلے جانے کے بعد بھی یہ رابطہ قائم رہے۔ جب لوگ رسول اللہؐ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کریں تو گویا انہوں نے اللہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (۴۸ : ۱۰) "اے نبیؐ جو تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے ' ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا" ۔ یہ بات مسلمانوں اور رسول اللہؐ کے درمیان ہونے والی بیعت کو بہت ہی نازک اور ذمہ دارانہ بناتی ہے کہ لوگوں کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہے اس عقد میں اللہ کا بھی ہاتھ تھا۔ اللہ یہ بیعت لینے والا تھا اور بیعت کرنے والوں کے ہاتھ کے اوپر اللہ کا ہاتھ تھا اور اللہ کی ذات! کس قدر عظیم ذات ہے اللہ ' اللہ جو صاحب جلال و اکرام ہے! اس کا ہاتھ!

اس شعور اور تصور سے انسان کے دل سے اس عہد کو توڑنے کا خیال ہی نکل جاتا ہے ۔ چاہے رسول اللہ اس دنیا سے اٹھ ہی کیوں نہ جائیں ۔ اللہ تو بہرحال حاضر ہے ۔ وہی تو اس عہد کا اصلی فریق ہے اور وہی نگران ہے ۔

فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ (۴۸ : ۱۰) "جو شخص اس عہد کو توڑے گا' اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ذات پر ہو گا" ۔ اسی کو خسارہ ہو گا ۔ اس کے درمیان اور اللہ کے درمیان جو سودا ہوا ہے ۔ اس میں فائدے میں رہنے والی پارٹی تو وہ خود ہے ۔ اللہ تو دونوں جہانوں سے بے نیاز ہے ۔ لہذا اگر یہ عہد توڑے گا تو نقصان اسی کو ہو گا ۔ یہ اللہ کے غضب اور اللہ کی سزا کا مستحق ہو گا ۔ کیونکہ اللہ نقض عہد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا' اللہ تو وفائے عہد کرنے والوں اور وفاداروں کو پسند کرتا ہے ۔

وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا (۴۸ : ۱۰) "اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا" ۔ علی الاطلاق اجر عظیم ہو گا ۔ تفصیلات کے سوا ہی ۔ کیونکہ اللہ عظیم ہے جو یہ عہد کر رہا ہے ۔ لہذا اس کا اجر بھی عظیم ہے ۔ یہ اللہ کے حساب سے عظیم ہے ۔ انسان تو اس اجر اور اس اجر کے عطا کرنے والے کی عظمت کا تصور بھی نہیں کر سکتا ۔ انسان نہ اللہ کی عظمت کا تصور کر سکتا ہے نہ اللہ کے عظیم پیمانوں کا تصور کر سکتا ہے کیونکہ انسان خود بھی چھوٹا ہے اور اس کا تصور بھی چھوٹا ہے ۔

جب بات بیعت کی حقیقت پر ہو رہی تھی اور وفاداری اور بے وفائی تک پہنچی تو ان لوگوں کا ذکر شروع ہوا' جنہوں نے اس موقعہ پر بے وفائی کی ۔ یعنی مدینہ کے اردگرد دیہات میں رہنے والے لوگ ۔ جنہوں نے رسول اللہؐ کے ساتھ سفر حدیبیہ میں نکلنے سے اس لیے انکار کیا کہ ان کو اللہ کے ساتھ بدظنی تھی اور اس موقعہ پر جو مومنین جا رہے تھے ان کے بارے میں ان کو توقع تھی کہ وہ مصیبت میں گرفتار ہوں گے اور نقصان اٹھائیں گے جو قریش کے پاس ان کے گھروں کو جا رہے تھے ۔ اس سے قبل یہ قریش مسلسل دو سال مدینہ میں جا کر مسلمانوں کے ساتھ لڑتے رہے تھے ۔ ان کے بارے میں اس سورت میں حضورؐ کو پیشگی اطلاع کر دی گئی ہے کہ جب آپ اور آپ کے رفقاء صحیح سلامت مدینہ پہنچیں گے تو ان لوگوں کے عذرات کیا ہوں گے ۔ ان کا خیال تو یہ تھا کہ مسلمان واپس ہی نہ ہوں گے حالانکہ قریش نے مسلمانوں کے ساتھ دس سالہ صلح کر لی ۔ اگرچہ شرائط بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھیں ۔ لیکن دراصل قریش نے اپنے موقف سے پسپائی اختیار کی ۔ انہوں نے حضور اکرمؐ اور مسلمانوں کو اپنے مساوی تسلیم کیا' صلح کر کے دشمنی سے اپنے آپ کو چھڑا لیا ۔ بہرحال یہاں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے عدم خروج کے اصل اسباب بھی بتا دیتا ہے اور ان لوگوں کو حضور اکرمؐ اور مسلمانوں کے سامنے عریاں کر کے رکھ دیا جاتا ہے ۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس جنگ میں آپ کے ساتھ' جو نکلے ہیں' ان کے لیے اچھا

مستقبل ہے ۔ وہ یہ کہ مستقبل میں ان کو نہایت ہی وافر مقدار میں اموال غنیمت ' فتوحات اور کامیابیاں ملیں گی اور یہ لوگ جو اس مہم سے پیچھے رہ گئے تھے یہ ان سے محروم ہوں گے ۔ مستقبل کی آسان مہمات میں یہ اعراب چاہیں گے کہ آپ کے ساتھ جنگ کے لیے نکلیں تاکہ اموال غنیمت میں اپنا حصہ پائیں ۔ آپ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ آسان مہمات میں اب ان کی پیشکش کو قبول نہ فرمائیں ۔ اور ان آنے والی مہمات میں صرف ان لوگوں کو لے جائیں جو حدیبیہ میں شریک تھے ۔ یہاں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اگر تم سچے طور پر جہاد کرنے والے ہو تو تمہیں سخت طاقتور دشمن کے ساتھ لڑنے کے لیے موقعہ دیا جائے گا اگر فی الواقع تم جنگ کرنا چاہتے ہو اس وقت پھر نکلنا ۔ وہاں اللہ تمہارا جو حصہ ہو گا ' دے گا ۔ اگر انہوں نے اس وقت اطاعت کی تو اجر عظیم کے مستحق ہوں گے ۔

---ooo---

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَ اَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْلَنَا
يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًآ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ
ضَرًّا اَوْ اَرَادَبِكُمْ نَفْعًا بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۱۱) بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ
يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ
السَّوْءِ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا (۱۲) وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ
سَعِيْرًا (۱۳) وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ
وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۱٤) سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ
لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ
مِنْ قَبْلُ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۵) قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ
مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْيُسْلِمُوْنَ فَاِنْ
تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا
(۱٦) (٤٨: ۱۱ تا ۱٦) "اے نبی ؐ بدوی عربوں میں سے جو لوگ پیچھے چھوڑ دیئے گئے تھے اب وہ آکر ضرور تم سے کہیں گے کہ "ہمیں اپنے اموال اور بال بچوں کی فکر نے مشغول کر رکھا تھا ' آپ ہمارے لیے مغفرت کی دعا

فرمائیں"۔ یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں۔ ان سے کہنا "اچھا' یہی بات ہے تو کون تمہارے معاملہ میں اللہ کے فیصلے کو روک دینے کا کچھ بھی اختیار رکھتا ہے۔ اگر وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا نفع بخشنا چاہے؟ تمہارے اعمال سے تو اللہ ہی باخبر ہے۔ (مگر اصل بات وہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو) بلکہ تم نے یوں سمجھا کہ رسول اور مومنین اپنے گھر والوں میں ہرگز پلٹ کر نہ آسکیں گے اور یہ خیال تمہارے دلوں کو بہت بھلا لگا اور تم نے بہت برے گمان کیے اور تم سخت بدباطن لوگ ہو۔ اللہ اور اس کے رسولؐ پر جو لوگ ایمان نہ رکھتے ہوں ایسے کافروں کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک اللہ ہی ہے' جسے چاہے معاف کرے اور جسے چاہے سزا دے' اور وہ غفور و رحیم ہے۔ جب تم مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے جانے لگو گے تو یہ پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ تم سے ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے فرمان کو بدل دیں۔ ان سے صاف کہہ دینا کہ "تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے' اللہ پہلے ہی یہ فرما چکا ہے"۔ یہ کہیں گے کہ "نہیں' بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کر رہے ہو"۔ (حالانکہ بات حسد کی نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ صحیح بات کو کم ہی سمجھتے ہیں۔ ان پیچھے چھوڑے جانے والے بدوی عربوں سے کہنا کہ "عنقریب تمہیں ایسے لوگوں سے لڑنے کے لیے بلایا جائے گا جو بڑے زور آور ہیں۔ تم کو ان سے جنگ کرنی ہوگی یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر تم نے حکم جہاد کی اطاعت کی تو اللہ تمہیں اچھا اجر دے گا' اور اگر تم پھر اسی طرح منہ موڑ گئے جس طرح پہلے موڑ چکے ہو تو اللہ تم کو دردناک سزا دے گا"۔

قرآن کریم نے یہاں صرف ان لوگوں کے اقوال نقل کر کے ان کی تردید پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس بہترین موقعہ پر ان کی گہری نفسیات کو لیا ہے۔ ان کے دلوں کے اندر اٹھنے والے وساوس اور خیالات کو لیا ہے۔ اور پھر اس کے لیے علاج تجویز کیا ہے۔ ان کے اندر جو اخلاقی بیماریاں تھیں' یہاں ان کی تشخیص کی گئی تاکہ ان کا مناسب علاج کیا جائے۔ جو حقائق ہیں وہ باقی رہیں اور اسلامی تصور حیات کے اصل الاصول واضح کر کے باقی رکھے جائیں۔

مدینہ کے اردگرد کے جو دیہاتی' باوجود دعوت کے' حدیبیہ کے موقعہ پر رہ گئے تھے وہ قبائل غفار' مزینہ' اشجع اور اسلم وغیرہ تھے۔ قرآن کہتا ہے ان کا عذر یہ ہوگا۔

شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَ اَهْلُوْنَا (۴۸ : ۱۱) "ہمیں اپنے اموال اور بال بچوں کی فکر نے مشغول رکھا"۔
اور یہ تو کوئی عذر نہیں ہے۔ ہمیشہ ہر کسی کا مال اور اولاد اور اہل و عیال تو ہوتے ہی ہیں' اگر ایسے عذرات مقبول ہوں تو پھر کوئی شخص بھی نظریاتی کام اور اپنے عقیدے اور دعوت اسلامی کی ذمہ داریوں کے لیے کوئی وقت نہ پائے گا۔ اور دوسری بات وہ یہ کہیں گے۔

فَاسْتَغْفِرْ لَنَا (۴۸ : ۱۱) "آپ ہمارے لیے مغفرت کی دعا فرمائیں"۔ لیکن پھر اس میں بھی سچ نہیں ہے۔ بتایا جاتا ہے۔

يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ (۴۸ : ۱۱) "یہ لوگ اپنی زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں

جو دلوں میں نہیں ہوتیں"۔

اس موقعہ پر ان کو بتایا جاتا ہے کہ اللہ کا ایک نظام قضا و قدر ہے اور اسے کوئی بھی روک نہیں سکتا۔جنگ سے پیچھے رہ جانا تقدیر کو نہیں روک سکتا۔ نہ کسی اقدام کو روکا جا سکتا ہے۔اللہ کی قدرت کے اندر تم لوگ گھرے ہوئے ہو۔وہ جس طرح چاہتا ہے 'تصرف کرتا ہے اور وہ ہر چیز سے خبردار ہے۔وہ علم کے مطابق تصرفات کرتا ہے۔

قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا بَلْ كَانَ

اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۴۸ : ۱۱) "ان سے کہنا "اچھا' یہی بات ہے تو کون تمہارے معاملہ میں اللہ کے فیصلے کو روک دینے کا کچھ بھی اختیار رکھتا ہے۔اگر وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا نفع بخشنا چاہے؟ تمہارے اعمال سے تو اللہ ہی باخبر ہے"۔

اس سوال ہی میں بتا دیا کہ ایک سچے مومن کا رویہ کیا ہونا چاہئے' اسے چاہئے کہ وہ اللہ کے فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔اللہ کے احکام کی فوراً تعمیل کرے اور اس میں لیت و لعل نہ کرے۔کیونکہ توقف کرنے اور لیت و لعل کرنے سے نہ کوئی نقصان رفع ہو سکتا ہے اور نہ نفع موخر ہو سکتا ہے۔اور عذرات گھڑنا اس سے مخفی نہیں ہے۔اللہ جزاء و سزا اپنے علم کے مطابق دیتا ہے۔اس لیے عذرات گھڑنے سے اس کے ہاں کوئی اثر نہیں ہوتا۔یہ نہایت ہی بروقت ہدایت ہے۔مناسب فضا میں ہے اور یہی قرآن کا طریقہ ہے کہ وہ نہایت ہی مناسب وقت پر ٹوک دیتا ہے۔

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰۤى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ

قُلُوْبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَ كُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا (۴۸ : ۱۲) "بلکہ تم نے یوں سمجھا کہ رسول اور مومنین اپنے گھر والوں میں ہرگز پلٹ کر نہ آسکیں گے اور یہ خیال تمہارے دل کو بہت بھلا لگا اور تم نے بہت برے گمان کیے اور تم سخت بد باطن لوگ ہو"۔یوں اللہ ان لوگوں کو عریاں کر کے چھوڑ دیتا ہے۔ان کی نیت اور دلوں کا حال ان کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔انہوں نے جو اندازے لگا رکھے تھے وہ بھی ان کو بتا دیئے گئے۔اللہ کے بارے میں ان کے دلوں میں جو سوئے ظن تھا وہ بھی بتا دیا۔ان کا خیال یہ تھا کہ رسول اللہ اپنے ساتھیوں کو موت کے منہ میں دھکیل رہے ہیں۔لہٰذا مدینہ کو واپس آنے والے نہیں ہیں۔کیونکہ یہ لوگ ان لوگوں کے منہ میں جا رہے ہیں جنہوں نے ان کے گھر مین آکر ان سے جنگ کی ہے اور انہوں نے مدینہ میں آکر رسول اللہؐ کے ساتھیوں کو قتل کیا ہے۔ان کا اشارہ احد اور احزاب کی طرف تھا۔ان لوگوں نے اللہ کی قوتوں اور اللہ کی مہربانیوں کا حساب نہ لگایا تھا کہ اللہ اپنے مخلص بندوں پر کیا کیا کرم کرتا ہے۔نیز انہوں نے معاملات کو سیکولر طریقے سے سوچا تھا اور ان کے دل اسلامی نظریہ حیات سے خالی تھے' ان کے نزدیک فرض اور ڈیوٹی تو کوئی چیز ہی نہ تھی۔حالانکہ اسلامی نظریہ کے کچھ تقاضے تھے اور ان کے لیے ہر قربانی ہیچ سمجھی جانی چاہئے تھی۔پھر رسول اللہؐ کی اطاعت اور آپ کی معیت کو نفع و ضرر' نفع و نقصان کے حساب و کتاب سے برتر ہونا چاہئے تھا۔یہ تو وہ فریضہ تھا جسے نتائج کی پرواہ کیے بغیر ان کو ادا کرنا چاہیے تھا۔

بہرحال انہوں نے بدگمانیاں کیں اور بدظنی اور بدگمانی ان کے لیے خوشنما بنا دی گئی ـ ان کو اس بدگمانی کے علاوہ کچھ نظر ہی نہ آتا تھا ـ انہوں نے اس بدظنی کے سوا کسی دوسرے واقعہ یا کسی دوسرے رخ کے بارے میں سوچا ہی نہیں اور نہ ان ہی جانب سے سوء ظن تھا ـ یہ اس لیے پیدا ہوا تھا کہ ان کے دل برے تھے ـ ان کو یہاں "قوم بور" کہا گیا ہے ـ یہ عجیب انداز تعبیر ہے ـ "بور" اس زمین کو کہتے ہیں جو بنجر ہو اور اس میں کوئی روئیدگی نہ ہو ـ نہ کوئی درخت اور پھل ہوں، نہ کوئی سبزی فصل ہو ـ جس دل میں حسن ظن کی سرسبزی نہ ہو، پھر اللہ کے بارے میں پر امید نہ ہو اور اس کے اندر کوئی حسن ظن نہ ہو، تو وہ بنجر ہے، وہ مردہ ہے اور آخر کار اس نے برباد اور تباہ ہوتا ہے ـ

جماعت مومنہ کے بارے میں آج بھی بعض لوگ اس انداز سے سوچتے ہیں ' اس قسم کے لوگ جس طرح مدینہ کے ارد گرد بستے تھے، جن کے دل خشک تھے اور ان میں زندگی کی روح نہ تھی ـ جب لوگ دیکھتے ہیں کہ باطل پرستوں کا پلڑا بھاری ہے اور دنیا کی زیادہ قوتیں اہل شر اور اہل باطن کے ساتھ ہیں ـ نیک لوگ تعداد میں بہت کم ہیں ' یا وسائل کے لحاظ سے غریب ہیں ' یا مرتبہ اور مال و دولت کے اعتبار سے کم ہیں ـ یہ دیہاتی ' بدوی اور اس قسم کے لوگ ہر زمان و مکان میں یہی کچھ سوچتے ہیں ـ ایسے لوگوں کی سوچ کچھ یوں ہوتی ہے کہ اہل ایمان یا اسلام کے چاہنے والوں کا مقابلہ چونکہ بڑی قوتوں سے ہے اور یہ قوتیں بظاہر بہت ہی پھولی ہوئی ہیں لہذا ان مٹھی بھر اسلام والوں کی خیر نہیں ہے ـ لہذا مناسب یہی ہے کہ ان سے دور رہا جائے ـ ایسے لوگ ہر وقت یہ توقع رکھتے ہیں کہ آج یا کل ان کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا ـ اور یہ دعوت ہی ختم ہو جائے گی ـ اس لیے وہ بطور احتیاط اس راہ سے جدا دوسرے راستے پر چلتے ہیں ـ لیکن اللہ اس قسم کے لوگوں کے سوء ظن کو ہمیشہ ناکام بنا دیتا ہے اور اللہ اپنے فضل و کرم کے حالات کو تبدیل فرماتا ہے اور اپنی تدابیر سے اپنے بندوں کے لیے راہ ہموار کر دیتا ہے ـ اللہ اپنے پیمانوں سے ناپتا ہے ' جو حقیقی پیمانے ہیں ـ اور جو اللہ کے قوی ہاتھ میں ہیں ـ وہ بعض لوگوں کو گراتا ہے اور بعض کو اٹھاتا ہے اور کافرین ' منافقین اور اللہ کے بارے میں سوئے ظن رکھنے والوں کو اس کا کوئی علم نہیں ہوتا ـ اور اس قسم کے لوگ ہر دور اور ہر زمانے میں ہوتے ہیں ـ

اصل ترازو ایمان کا ترازو ہے ـ اللہ تعالیٰ ان بدوی مسلمانوں کو کہتا ہے کہ اس ترازو سے تولو ' اور اس ترازو کے مطابق ہی اعمال کی جزاء تجویز فرماتا ہے ' اللہ کی رحمت اس ترازو کے ساتھ ہے ـ فرصت کے لمحات قلیل ہیں ' اللہ کی رحمت اور مغفرت کو حاصل کرو اور فائدہ اٹھاؤ!

وَ مَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَاِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا (۴۸ : ۱۳) وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۴۸ : ۱۴)

"اللہ اور اس کے رسولؐ پر جو لوگ ایمان نہ رکھتے ہوں ایسے کافروں کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے ـ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک اللہ ہی ہے ' جسے چاہے معاف کرے اور جسے چاہے سزا دے ' اور وہ غفور و رحیم ہے" ـ یہ لوگ اپنے اموال اور اہل و اولاد کا عذر پیش کرتے تھے ـ تو سوال یہ ہے کہ یہ جہنم جو کافروں کے لیے تیار رکھی ہوئی ہے ' اس میں مال و اولاد کیا فائدہ دیں گے ' اگر وہ اللہ اور رسول اللہؐ پر ایمان نہ

لائے ۔ غرض ترازو کے دو پلڑے ہیں ۔ ایک ایمان کا دوسرا کفر و نفاق اور سوء ظن کا' ان میں ان کو ایک کو قبول کر لینا چاہئے ۔ اللہ جو تمہیں ڈراتا ہے وہ آسمانوں اور زمین کی قوتوں کا مالک ہے ۔ وہ عذاب بھی دے سکتا ہے اور معاف بھی کر سکتا ہے ۔

اللہ لوگوں کو جزا یا سزا ان کے اعمال پر دیتا ہے ۔ لیکن اس کی مشیت مطلق و آزاد ہے ۔ اس پر کوئی قید نہیں ہے ۔ یہ بات یہاں اس لیے بتا دی گئی کہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات بیٹھ جائے کہ اللہ ہرچیز پر قادر ہے اور اعمال پر جزاء بھی اسی نے طے کی ہے ۔ اللہ کی رحمت اور مغفرت سب کے لیے قریب ہے ۔ مناسب ہے کہ لوگ اسے طلب کریں ۔ قبل اس کے کہ اللہ کے عذاب کا فیصلہ صادر ہو جائے' اور یہ فیصلہ ظاہر ہے انہی لوگوں کے لیے ہو گا جو اللہ اور رسول اللہؐ پر ایمان نہ لائیں گے ۔

اس کے بعد اللہ ان اموال غنیمت کی طرف اشارہ فرماتا ہے جو مومنین کے لیے مقدر ہو چکے ہیں ۔ اور یہ ان لوگوں کی بدگمانیوں کے بالکل متضاد صورت حالات ہوگی اور انداز کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات بہت ہی قریب وقت میں رونما ہونے والے ہیں ۔

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۴۸ : ۱۵) "جب تم مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے جانے لگو گے تو یہ پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ تم سے ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو ۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے فرمان کو بدل دیں ۔ ان سے صاف کہہ دینا کہ "تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے' اللہ پہلے ہی یہ فرما چکا ہے" ۔ یہ کہیں گے کہ "نہیں' بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کر رہے ہو" ۔ (حالانکہ بات حسد کی نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ صحیح بات کو کم ہی سمجھتے ہیں" ۔ اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد فتح خیبر ہے ۔ ممکن ہے فتح خیبر ہی ہو ۔ اگر مراد خیبر نہ بھی ہو لیکن مراد یہی ہے کہ عنقریب مسلمان کسی مہم پر جائیں گے اور یہ لوگ کہیں گے کہ ہمیں بھی جانے دو ۔

مفسرین نے خیبر کا نام اس لیے لیا ہے کہ خیبر کا واقعہ صلح حدیبیہ کے متصلاً بعد میں ہوا ۔ کیونکہ فتح خیبر محرم ۷ ہجری میں ہوا ۔ یعنی صلح حدیبیہ کے دو ماہ بعد ۔ اور اس میں اموال غنیمت بھی بہت ملے تھے اور خیبر کے قلعے جزیرۃ العرب میں یہودیوں کی آخری پناہ گاہ تھے ۔ بعض بنو نضیر اور بنو قریظہ بھی یہاں آکر پناہ گیر ہو گئے تھے حالانکہ ان کو جزیرۃ العرب سے خارج کر دیا گیا تھا ۔

مفسرین نے یہ بات تواتر سے کہی ہے کہ حدیبیہ کی مہم پر جانے والوں کے ساتھ اللہ کا عہد تھا کہ خیبر کے اموال غنیمت میں ان کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو گا ۔ لیکن اس بارے میں کوئی نص وارد نہیں ہے ۔ شاید وہ عملی واقعات سے یہ اصول اخذ کر رہے ہیں ۔ حضور اکرمؐ نے ان کو اہل حدیبیہ کے لیے مخصوص کر دیا تھا ۔ اور اس مہم میں آپ نے کسی اور کو ساتھ نہ لیا تھا ۔

بہر حال اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا کہ آپؐ پیچھے رہنے والے اعراب کی اس پیشکش کو رد کر دیں جب وہ آپؐ کے ساتھ قریب کے آسان اموال غنیمت کے لیے جانا چاہیں۔ اور یہ فیصلہ دے دیا کہ ان کا نکلنا اللہ کے حکم کے خلاف ہے اور پیشگی اطلاع دے دی کہ جب آپؐ ان کی پیشکش کو رد کریں گے تو وہ الزام لگائیں گے کہ تم ہمارے ساتھ حسد کرتے ہو۔ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا "بلکہ تم حسد کرتے ہو"۔ تم اس مہم میں اس لیے نہیں لے جاتے کہ تم ہمیں اموال غنیمت نہیں دینا چاہتے۔ ساتھ ہی پھر فوراً یہ کہہ دیا کہ یہ لوگ اللہ کی حکمت کو نہیں جانتے' یہ کم فہم ہیں۔ اللہ کی حکمت یہ ہے کہ پیچھے رہنے والوں کو ذرا محرومیت سے دوچار کیا جائے اور مطیع فرمان بندوں کو ذرا انعامات دیئے جائیں تاکہ ان کی اطاعت شعاری کا انعام انہیں ملے۔ کیونکہ انہوں نے ایسے حالات میں اطاعت کی جب سامنے موت ہی موت نظر آ رہی تھی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے کہتا ہے کہ ان پیچھے رہ جانے والوں سے کہہ دیں کہ تمہارے لیے ایک اور امتحان کا مقام ابھی باقی ہے۔ عنقریب ایک مہم ایک زبردست قوم کے خلاف بھیجی جائے گی اور تمہیں اس میں بلایا جائے گا۔ اور یہ لوگ اسلام کی وجہ سے تمہارے ساتھ لڑیں گے۔ اگر اس امتحان میں تم کامیاب ہو گئے تو تمہارے لیے بھی اجر ہو گا۔ اگر اس آخری امتحان میں بھی تم معصیت پر جمے رہے تو پھر تم ہمیشہ کے لئے عذاب الیم کے مستحق ہو جاؤ گے۔

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۴۸:۱۶) "ان پیچھے چھوڑے جانے والے بدوی عربوں سے کہنا کہ "عنقریب تمہیں ایسے لوگوں سے لڑنے کے لیے بلایا جائے گا جو بڑے زور آور ہیں۔ تم کو ان سے جنگ کرنی ہو گی یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر تم نے حکم جہاد کی اطاعت کی تو اللہ تمہیں اچھا اجر دے گا' اور اگر تم پھر اسی طرح منہ موڑ گئے جس طرح پہلے موڑ چکے ہو تو اللہ تم کو دردناک سزا دے گا"۔

اس کی تفسیر میں بھی اختلاف ہے کہ یہ لوگ کون ہیں جن کو اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ "بڑے زور آور ہیں" کہا گیا ہے کہ یہ لوگ رسول اللہؐ کے زمانے میں تھے یا خلفاء راشدین کے زمانے میں تھے۔ قریب بات یہ ہے کہ یہ رسول اللہ ہی کے دور میں تھے اور مقصد یہ تھا کہ مدینہ کے ماحول میں جو بدوی عرب تھے' ان کے ایمان کو آزمایا جائے۔

اہم بات یہ نہیں ہے کہ یہ کون تھے اہم یہ ہے کہ قرآن کا انداز تربیت کیا ہے؟ قرآن بیمار دلوں کا علاج کس طرح کرتا ہے۔ کس طرح قرآن ہدایات دیتا ہے' کس طرح عملاً آزماتا ہے۔ یہ بات اس سے معلوم ہوتی ہے کہ پکے مسلمانوں کے سامنے ان بدوی لوگوں کی فکری حالت کو ظاہر کیا جاتا ہے کہ خود ان پر بھی اور مسلمانوں پر ان کی حالت کھل جائے۔ اور پھر ان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ایمان اور عمل میں ٹھوس رویہ اختیار کرو' اور اعلیٰ قدروں کو اپناؤ۔

چونکہ معاملہ آزمائش کا تھا اس لیے اللہ نے تمام مسلمانوں کے لیے خروج لازمی کر دیا۔ اور ان لوگوں کو متعین کر کے بتا دیا کہ حقیقی عذر کیا ہے۔ اگر اس کے مطابق کوئی جہاد سے رہ گیا تو اسے کوئی سزا نہ ہو گی نہ گناہ ہو گا۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ

لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ ۲
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾ النصف ۷ ع

۱۰ "ہاں اگر اندھا اور لنگڑا اور مریض جہاد کے لیے نہ آئے تو کوئی حرج نہیں۔ جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا اللہ اسے ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور جو منہ پھیرے گا اسے وہ دردناک عذاب دے گا"۔

اندھا اور لنگڑا تو دائمی اعتبار سے معذور ہیں اور وہ جہاد کے لیے نہیں نکل سکتے اور بیمار وقتی طور پر معذور ہوتا ہے۔ جب تک کہ وہ تندرست نہیں ہوتا' وہ معذور رہتا ہے۔

اصل بات تو اطاعت اور معصیت کی ہے اور جذبہ اطاعت اور نیت معصیت ایسے امور ہیں جن کا تعلق دل اور نفسیات سے ہے۔ ظاہری اشکال اور ظاہری عذرات سے نہیں ہے۔ جو شخص اللہ اور رسول اللہؐ کی اطاعت کرتا ہے اس کی جزاء جنت ہے اور جو منہ پھیرے گا اسے یاد رکھنا چاہئے کہ عذاب الیم اس کے انتظار میں ہے۔ ہر کسی کو چاہئے کہ وہ جہاد اور اس کی مشقتوں کو' جہاد کے اجر کو پیچھے بیٹھے رہنے کو اور اس کی راحتوں کو تولے' ان کا باہم موازنہ کرے اور اسے ان میں سے جو بات پسند ہو' اسے اختیار کرے۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۲۴۵ ایک نظر میں

یہ پورا سبق مومنین کی باتوں پر مشتمل ہے ۔ مومنین کے ساتھ مکالمہ ہے ۔ اس مجموعے کے ساتھ مکالمہ جس نے درخت کے نیچے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی ' اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی ۔ اللہ حاضر تھا اور اس کا گواہ تھا ' اور اس بیعت کی تصدیق و توثیق کرنے والا تھا اور بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ تھا ۔ صحابہ کرامؓ کا وہ گروہ جنہوں نے اپنے کانوں سے سنا کہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ کو یہ فرما رہا ہے :

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا (۴۸ : ۱۸) "اللہ ان مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے ۔ ان کے دلوں کا حال اس کو معلوم تھا ' اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی" ۔ یہ ان مومنین کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہے اور ان کے ساتھ مکالمہ ہے ۔ اور ان کو خوشخبری ہے کہ اللہ نے ان کے لیے بہت ہی قیمتی غنائم جمع کر رکھے ہیں ۔ بہت سی فتوحات ان کو نصیب ہونے والی ہیں اور اس سفر میں بھی اللہ ان کا حامی و مددگار رہا اور آئندہ بھی رہے گا ۔ اور اللہ نے اپنی سنت کے مطابق ان کے لیے مسلسل فتوحات رکھی ہوئی ہیں اور اللہ کی سنت کبھی بدلتی نہیں ہے ۔ اس میں کفار پر تنقید بھی ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے کیوں اس موقعہ پر صلح کو ترجیح دی اور یہ کہ رسولؐ نے جو خواب دیکھا تھا وہ سچا تھا کہ مسلمان مسجد حرام میں داخل ہوں گے ۔ اور یہ نہایت ہی پرامن انداز میں داخل ہوں گے اور ان کا دین بہرحال غالب ہو کر رہے گا ۔

یہ سبق اور یہ سورت اس ممتاز اور منفرد جماعت صحابہ کے خدوخال پر ختم ہوتی ہے ۔ جنہوں نے رسول اللہ کے ہمرکاب انقلابی کام کیا ۔ اور تورات اور انجیل کے حوالے سے ان کے اوصاف بیان ہوئے اور آخر میں اعلان ہوا کہ وہ مغفرت اور اجر کریم کے مستحق ہو گئے ہیں ۔

--- ooo ---

# درس نمبر ۲۴۵ تشریح آیات

## ۱۸ --- تا --- ۲۹

---

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿١٨﴾ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٩﴾

"اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے دلوں کا حال اس کو معلوم تھا اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی' ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی اور بہت سا مال غنیمت انہیں عطا کر دیا جسے وہ (عنقریب) حاصل کریں گے۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے"۔

میں آج چودہ سو سال بعد اسلامی تاریخ کے افق پر' ان مقدس لمحات کو دیکھ رہا ہوں جن میں یہ پوری کائنات دیکھ رہی ہے کہ عالم بالا سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ اطلاع آ رہی ہے۔ اور مسلمانوں کو یہ باتیں بتائی جا رہی ہیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ اس کائنات کے ان صفحات کو پڑھ سکوں اور اس کائنات کے ضمیر میں ان لمحات کے اندر جو کچھ پوشیدہ تھا اسے دیکھ سکوں۔ کیونکہ یہ پوری کائنات اس وقت اللہ کے اس قول کے ساتھ ہم قدم تھی کہ یہ متعین لوگ جو اس وقت زمین کے اس متعین ٹکڑے پر موجود ہیں اور درخت کے نیچے بیعت کر رہے ہیں' یہ زمین کا نمک ہیں۔

میں اپنی چشم بصیرت کے ساتھ ان سعادت مند ان زمین کے حالات کو دیکھنا چاہتا ہوں' جنہوں نے اپنے کانوں کے ساتھ اور ذاتی طور پر اپنی شخصیت کے ساتھ' یہ بات سنی کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتا ہے کہ "میں ان سے راضی ہو گیا"۔ پھر اس مقام کا بھی تعین کر دیا جاتا ہے جہاں وہ تھے' درخت کے نیچے اور اس بیعت کا بھی تعین کر دیا جاتا ہے۔

اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (۴۸:۱۸) "جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے"۔ یہ آیات انہوں نے اپنے سچے نبی کی زبان سے خود سنیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو مژدہ سنایا گیا۔

یا اللہ! ان مقدس ہستیوں نے ان لمحات کو کس طرح گزارا' اور ان ارشادات ... رح سنا' جن میں ذات باری بذات خود ہر شخص کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اے فلاں اے فلاں' تم سے میں راضی ہوں' تم ہو جس نے درخت

کے نیچے بیعت کی۔ تمہارے دل کی بات میں جانتا تھا۔ میں نے تم پر پھر سکینت نازل کی۔

ہم میں سے ایک شخص یہ آیت پڑھتا ہے :-

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا "اللہ ولی اور دوست ہے ' ان لوگوں کا جو ایمان لائے"۔ تو وہ اپنے آپ کو سعادت مند سمجھتا ہے۔ وہ اپنے دل میں امید کرتا ہے کہ میں بھی ان شاء اللہ اس آیت کے عمومی مفہوم میں شامل ہوں یا پھر کوئی پڑھتا ہے یا سنتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ "بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔ اس لیے وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور اپنے دل میں کہتا ہے۔ ان شاء اللہ میں بھی ان صبر کرنے والوں میں سے ہوں' لیکن وہ لوگ خود سن رہے ہیں اور خدا کے پیغمبر انھیں سنا رہے ہیں' ایک ایک سن رہا ہے کہ اللہ کی مراد اس سے ہے' اور وہ اس سے بات کر رہا ہے۔ اس تک پیغام بھیج رہا ہے کہ وہ اس سے راضی ہو گیا ہے۔ اس کے نفس میں جو کچھ تھا' اسے جانتے ہوئے بھی اس سے راضی ہو گیا۔

یااللہ کس قدر عظیم اعزاز ہے یہ!

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا (۴۸ : ۱۸) "اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا' جب وہ درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے' ان کے دلوں کا حال اللہ کو معلوم تھا' اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی۔ ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی"۔ اللہ نے جان لیا کہ ان کے دل میں' اس کے دین کے لیے جوش و خروش ہے' اپنی ذات کے لیے نہیں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ سچے دل سے بیعت کر رہے تھے۔ اللہ جانتا تھا کہ ان کے دلوں کے اندر جنگ کے سلسلے میں جو خیالات اٹھتے ہیں وہ ان کو پی رہے ہیں اور ضبط کر کے رسول اللہ کے احکام کی تعمیل کر رہے ہیں کہ رسول اللہ کے پیچھے ایک مطیع فرمان مسلم کی طرح کھڑے ہوں گے۔

فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ (۴۸ : ۱۸) "اللہ نے ان پر سکینت نازل کر دی"۔ یہ ایک عجیب لفظ اور انداز ہے۔ سکینہ نازل ہو رہا ہے۔ سکون' ٹھہراؤ' وقار اور ثابت قدمی یہ ان پر نازل ہو رہے تھے۔ اس وقت ایسے حالات میں دوڑ دھوپ 'گرمی' غیرت اور دوسرے تاثرات کی وجہ سے لوگوں کے اندر بے چینی ہو گی' جسے ٹھنڈک' اطمینان اور مسرت سے بدل دیا گیا۔

وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا (۴۸ : ۱۸) "اور ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی"۔ یہ صلح بذات خود فتح تھی' اس سے کئی دوسری فتوحات کا آغاز ہوا۔ فتح خیبر تو فوراً ہی ہوئی اور مفسرین کی یہ اغلب رائے ہے کہ اس سے مراد فتح خیبر ہے۔

وَّ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا (۴۸ : ۱۹) "اور بہت سا مال غنیمت انہیں عطا کر دیا جسے وہ عنقریب

حاصل کریں گے' یا تو فتح کے ساتھ یہ اموال ملے اگر مراد فتح خیبر ہو' یا فتح کے بعد ملنے والے اموال غنیمت ۔ اگر ہم خود اس صلح ہی کو فتح قرار دیں کیونکہ اس مصالحت کی وجہ سے مسلمان کئی دوسری فتوحات کے لیے فارغ ہو گئے ۔

وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۴۸ : ۱۹) "... اللہ زبردست اور حکیم ہے" ۔ یہ تمام آیات کا نتیجہ ہے یعنی اللہ کی رضا' فتح اور بے شمار اموال غنیمت کے وعدے میں اللہ کی قوت' قدرت اور حکمت و تدبیر کارفرما ہے ۔ اور قوت اور حکمت ہی سے اللہ اپنے وعدے پورے کرتا ہے ۔

اس اعلان کے بعد کہ اللہ کی ذات ان بیعت کرنے والوں سے راضی ہو گئی ہے' اب بات کا رخ خود مومنین کی طرف مڑ جاتا ہے' اب وہ مخاطب ہیں ۔ صلح' فتح' ہدایت اور غنیمت ہر بات کی جاتی ہے جو انہیں دی جا رہی ہے :

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۝ وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ښ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝

اللہ تم سے بکثرت اموال غنیمت کا وعدہ کرتا ہے جنہیں تم حاصل کرو گے ۔ فوری طور پر تو یہ فتح اس نے تمہیں عطا کر دی اور لوگوں کے ہاتھ تمہارے خلاف اٹھنے سے روک دیئے' تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی بن جائے اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشے ۔ اس کے علاوہ دوسری اور غنیمتوں کا بھی وہ تم سے وعدہ کرتا ہے جن پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے اور اللہ نے ان کو گھیر رکھا ہے' اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ یہ کافر لوگ اگر اس وقت تم سے لڑ گئے ہوتے تو یقیناً پیٹھ پھیر جاتے اور کوئی حامی و مددگار نہ پاتے ۔ یہ اللہ کی سنت ہے ۔ جو پہلے سے چلی آ رہی ہے اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے" ۔

یہ ایک صریح خوشخبری ہے اللہ کی طرف سے' اس کو مومنین نے سنا' اس پر انہوں نے خوب یقین کیا اور انہوں نے جان لیا کہ ان کے لیے بہت کچھ تیار کر لیا گیا ہے اور اس کے بعد وہ زندہ رہے اور ان آیات کا مصداق چشم سر دیکھتے رہے ۔ کیونکہ یہ اللہ کا وعدہ تھا اور اللہ کے وعدے کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوتی ۔ یہاں اللہ فرماتا ہے کہ فوری طور پر تو یہ فتح تمہیں عطا کر دی ۔ اس سے مراد صلح حدیبیہ ہو سکتی ہے' جیسا کہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ حدیبیہ ہی فتح اور غنیمت تھی اور جیسا کہ پہلے ہم نے بیان کیا صلح حدیبیہ درحقیقت فتح تھی اور جن حالات میں یہ فتح ہوئی' انہوں نے بھی

اس کو مسلمانوں ہی کی فتح بتایا اور اس سے مراد فتح خیبر بھی ہو سکتی ہے جیسا کہ مجاہد سے مروی ہے کیونکہ حدیبیہ کے بعد یہ قریب ترین مال غنیمت تھا جو مسلمانوں کو ملا۔ زیادہ راجح بات یہ ہے کہ خود صلح حدیبیہ کو فتح کہا گیا ہے۔

اللہ نے بتایا کہ تم پر اللہ کا یہ بہت ہی بڑا احسان ہے کہ اس نے لوگوں کو روک دیا کہ وہ تم پر ہاتھ ڈالیں۔ ان میں مشرکین مکہ بھی تھے اور دوسرے لوگ بھی تھے جو بروقت اس انتظار میں تھے کہ مسلمان کسی چکر میں پھنس جائیں اور ہم بھی حملہ کر دیں۔ اس وقت بہرحال مسلمان قلیل تعداد میں تھے۔ اور دوسرے لوگ بہت زیادہ تھے لیکن انہوں نے اپنی بیعت کو پورا کر دیا اور اپنی ذمہ داریوں کو ادا کیا۔ اس لیے اللہ نے ان سے لوگوں کے ہاتھ روکے اور انہیں امن میں رکھا۔

وَلِتَكُونَ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ (۴۸ : ۲۰) "اور تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی بن جائے"۔ یہ واقعہ جسے آغاز میں انہوں نے بہت ہی ناپسند کیا تھا اور ان کے دلوں پر وہ بھاری پتھر کی طرح تھا' اللہ بتاتا ہے کہ یہ ان کے لیے ایک معجزہ ہو گا۔ آنے والے دنوں میں وہ اس کے نتائج دیکھیں گے اور ان لوگوں نے جو رسول اللہؐ کی اطاعت کی اور سر تسلیم خم کیا' ناپسند کرتے ہوئے بھی' تو اس کی انہیں جزاء ملے گی وہ جان لیں گے کہ یہ تو بہت ہی عظیم واقعہ تھا۔ اور جو جزاء ملے گی وہ بہت ہی بڑی ہوگی اور ان کے دلوں میں سکون' اطمینان اور یقین انڈیل دیا جائے گا۔

وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا (۴۸ : ۲۰) "اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشے گا"۔ تمہاری اطاعت' تمہاری فرمانبرداری اور تمہارے صدق نیت کی وجہ سے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جامع انعام کا اعلان کر دیا۔ انہیں مال غنیمت بھی ملے گا اور انہیں ہدایت بھی نصیب ہوگی۔ لہٰذا ہر طرف سے ان کے لیے خیر ہی خیر ہوگی۔ اور یہ بھلائی اور خیر اس معاملے میں ہوگی جسے وہ پسند ہی نہ کرتے تھے۔ اور ایک بھاری پتھر سمجھتے تھے۔ یوں ان کو پیشگی اطلاع دی جاتی ہے کہ اللہ نے ان کے لیے جو پسند کیا ہے وہی اصل پسند ہے۔ اس طرح ان کو تربیت دی جاتی ہے کہ ہر حال میں اطاعت اور حکم کی بجا آوری کرو۔

ان انعامات و مفادات کے علاوہ کچھ دوسرے مفادات کا بھی یہاں اعلان کیا جاتا ہے اور یہ مفادات وہ اپنے قوت بازو سے حاصل نہ کر سکتے تھے لیکن اللہ نے اپنی قدرت اور تدبیر سے وہ چیزیں انہیں عطا کر دیں۔

وَأُخْرَىٰ لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا

(۴۸ : ۲۱) "اس کے علاوہ دوسری اور غنیمتوں کا بھی وہ تم سے وعدہ کرتا ہے جن پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے۔ اور اللہ نے ان کو گھیر رکھا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ اس کے "علاوہ" کے بارے میں روایات میں اختلاف ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ ہے؟ یا فتح خیبر ہے؟ یا قیصر و کسریٰ کی مملکتوں کی فتوحات ہیں؟ یا اس سے وہ تمام فتوحات مراد ہیں جو صلح حدیبیہ کے بعد مسلمانوں کو نصیب ہوتی رہیں؟

زیادہ مناسب یہی ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ ہو کیونکہ یہ صلح حدیبیہ کے بعد ہوا اور اس فتح کے اسباب صلح حدیبیہ ہی نے فراہم کیے۔ یہ صلح صرف دو سال تک جاری رہ سکی۔ اس کے بعد مشرکین مکہ نے اس عہد کو توڑ دیا۔ اس طرح

اللہ نے اس فتح کی راہ ہموار کر دی اور مکہ مکرمہ بغیر جنگ کے فتح ہو گیا۔ یہ مکہ ہی تھا جو مسلمانوں کے خلاف لشکر کشی کیا کرتا تھا اور مسلمانوں کے گھر کے اندر آکر لڑتا تھا اور حدیبیہ کے وقت بھی اسی نے مسلمانوں کو بغیر عمرہ واپس کر دیا۔ اللہ نے اسے گھیر لیا اور بغیر جنگ کے یہ قبضے میں آگیا۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا (۴۸ : ۲۱) "اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ یہ بھی دراصل ایک درپردہ خوشخبری تھی۔ اس وقت اللہ نے اسے ظاہر نہیں کیا تھا اور ان غیبی امور میں سے تھا جو ابھی ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ یہاں اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا تاکہ لوگ مطمئن اور پر امید ہوں اور خوش ہوں۔

---○○○---

یہاں تک اللہ نے ان کو موجودہ غنیمت کے لیے بھی خوشخبری دے دی اور اس کے بعد کی آنے والی غنیمتوں کی خوشخبری بھی دے دی گئی اور مسلمان ان کا انتظار کرنے لگے' ان خوشخبریوں کے ساتھ ساتھ ایک بڑی خوشخبری یہ بھی دے دی گئی کہ اب ان شاء اللہ مسلمان فتح مند اور کامران رہیں گے۔ اس سال جو صلح طے کرائی گئی' وہ اس لئے نہیں کرائی گئی کہ مسلمان کمزور تھے یا یہ کہ مشرکین بہت قوی تھے لیکن بعض حکمتوں کی وجہ سے یہ صلح طے کرائی گئی اگر اس بار بھی اہل مکہ سے جھڑپ ہو جاتی تو بھی یہ ہزیمت اٹھاتے' کیونکہ اللہ کی حکمت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ جب مسلم اور کافر کا کسی فیصلہ کن مقام پر مقابلہ ہو جائے تو مسلم فتح یاب ہوں۔

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۲۲)
سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۲۳) (۴۸ : ۲۲ تا ۲۳) "یہ کافر لوگ اگر اس وقت تم سے لڑ گئے ہوتے تو یقیناً پیٹھ پھیر جاتے اور کوئی حامی و مددگار نہ پاتے۔ یہ اللہ کی سنت ہے۔ جو پہلے سے چلی آرہی ہے اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے"۔

یوں مومنین کی فتح اور کفار کی شکست کو اللہ اس سنت کے مربوط فرماتا ہے جو اس کائنات میں جاری ہے جس کے اندر کوئی تغیر نہیں ہوا کرتا۔ کس قدر عظیم سکینت ہے یہ؟ کس قدر عظیم بھروسہ ہے یہ؟ کس قدر ثابت قدمی ان مومنین کو دی جا رہی تھی کہ وہ اللہ کے کلام میں اس کے نبی کی زبانی اپنی فتح اور کفار کی شکست کی خوشخبریاں سن رہے ہیں۔

اللہ کی سنت تو کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ ہاں اس کی سنت کے مطابق فتح میں دیر ضرور ہو سکتی ہے۔ کیونکہ فتح کے اسباب کا تعلق مومنین کی تیاری اور تربیت سے ہوتا ہے اور ان کی تیاری اور اچھی طرح تربیت کا علم اللہ ہی کو ہوتا ہے۔ یا ان حالات کی آمد پر ہوتا ہے جن میں مومنین کے لیے نصرت اور فتح کے اسباب و حالات فراہم ہو جائیں اور کافروں کی ہزیمت یقینی ہو جائے تاکہ فتح کی اہمیت اور اثر وسیع ہو جائے' یا دوسری وجوہات بھی ہو سکتی ہیں جن کو اللہ جانتا ہے۔ بہرحال سنت الٰہیہ کے مطابق فتح حق کی ہوتی ہے اور اللہ کی سنت کبھی بدلتی نہیں۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۴۸ : ۲۳) "اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے" اب اللہ

فرماتا ہے کہ یہی حکمت تھی کہ وادی مکہ میں اللہ نے کافروں کو توفیق نہ دی کہ وہ مسلمانوں پر ہاتھ ڈالیں اور مسلمانوں کو بھی توفیق نہ دی کہ وہ مشرکین مکہ پر اس وقت ہاتھ ڈالیں جب وہ ان کے قابو میں آگئے تھے ۔ یہ ان چالیس آدمیوں کی طرف اشارہ ہے ۔ چالیس ہوں یا کم و بیش ۔ جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے آئے تھے ۔ یہ پکڑے گئے اور رسول اللہ نے معاف کر دیا ۔

وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴿۲۴﴾ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۭ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَاۗءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـــُٔـوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۲۵﴾ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَ
م عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ۭ وَكَانَ
ن۹ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۲۶﴾
۱۱

"وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیے ' حالانکہ وہ ان پر تمہیں غلبہ عطا کر چکا تھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے دیکھ رہا تھا ۔ وہی لوگ تو ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور ہدی کے اونٹوں کو ان کی قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا ۔ اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد و عورت موجود نہ ہوتے جنہیں تم نہیں جانتے ' اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ نادانستگی میں تم انہیں پامال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا (تو جنگ نہ روکی جاتی ۔ روکی وہ اس لیے گئی) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کر لے ۔ وہ مومن الگ ہو گئے ہوتے تو (اہل مکہ میں) جو کافر تھے ان کو ہم ضرور سخت سزا دیتے ۔ (یہی وجہ ہے کہ) جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ حمیت بٹھالی تو اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں پر سکینت نازل فرمائی اور مومنوں کو تقویٰ کی بات کا پابند رکھا کہ وہی اس کے زیادہ حق دار اور اس کے اہل تھے ۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔

یہ ایک واقعہ تھا جو ہو چکا تھا اور سامعین اسے خوب جانتے تھے ۔ اللہ اس انداز میں اس کا ذکر فرما رہا ہے کہ بتائیں کہ جو واقعات بھی ہوئے ان میں اللہ کی تدبیر اور تقدیر کام کر رہی تھی ' اور اس سے قرآن مجید ان کے دلوں میں اس احساس

کو گھرا کر رہا تھا کہ اللہ کا ہاتھ ان کے لیے تدبیر کر رہا ہے' ان کی قیادت اللہ کے رسول کے ذریعہ اللہ کے ہاتھ میں ہے' اور اللہ ان کے میلانات کو بھی کنٹرول کرتا ہے تاکہ وہ اللہ کے لیے ہو جائیں۔ اپنے نفوس کو اللہ کے سپرد کر دیں اور انھیں احکام الٰہی میں کوئی تردد نہ رہے۔ بالکل ادھر ادھر نہ دیکھیں اور پوری طرح اسلام میں داخل ہو جائیں۔ اپنے احساسات' اپنے جذبات' اپنا رخ اور اپنی تمام سرگرمیاں اللہ کے حوالے کر دیں اور یہ یقین کر لیں کہ تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور یہ کہ خیر وہی ہے جسے اللہ اختیار کرے اور یہ کہ وہ اللہ کی قدرت اور مشیت کے مطابق چل رہے ہیں۔ چاہے وہ کوئی بات اختیار کریں یا اسے رد کر دیں اور اللہ بہرحال مسلمانوں کی بھلائی چاہتا ہے' تو اب اگر وہ اللہ کے احکامات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں تو یہ بھلائی بڑی آسانی کے ساتھ حاصل ہو جائے گی۔ اللہ علیم و بصیر ہے۔ ظاہر اور پوشیدہ سب کو جانتا ہے وہ علم و بصیرت کے ساتھ ان کے لیے راہ تجویز کرتا ہے۔ وہ ان کو ہرگز برباد ہونے نہیں دیتا۔ نہ اللہ کسی ایسی چیز کو ان سے روکتا ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔

وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا (۴۸ : ۲۴) "اور جو کچھ تم کر رہے ہو' اللہ اسے دیکھ رہا ہے"۔

---ooo---

اب اللہ مسلمانوں کے مخالف کیمپ پر تبصرہ فرماتا ہے کہ اللہ کے پیمانے کے مطابق ان کے شب و روز کیا ہیں؟ اور اللہ ان کی کارروائیوں کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے؟ وہ مومنین کو مسجد حرام سے روک رہے ہیں اور یہ کہ اللہ مسلمانوں کو کس نگاہ سے دیکھ رہا ہے اور ان کے دشمنوں کو کس نگاہ سے!

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۲۵) اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۲۶) (۴۸ : ۲۵ تا ۲۶) "وہی لوگ تو ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور ہدی کے اونٹوں کو ان کی قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا۔ اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد و عورت موجود نہ ہوتے جنہیں تم نہیں جانتے' اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ نادانستگی میں تم انھیں پامال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا (تو جنگ نہ روکی جاتی۔ روکی وہ اس لیے گئی) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے

داخل کر لے ۔ وہ مومن الگ ہو گئے ہوتے تو (اہل مکہ میں) جو کافر تھے ان کو ہم ضرور سخت سزا دیتے ۔ (یہی وجہ ہے کہ) جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ حمیت بٹھالی تو اللہ نے اپنے رسولؐ اور مومنوں پر سکینت نازل فرمائی اور مومنوں کو تقویٰ کی بات کا پابند رکھا کہ وہی اس کے زیادہ حق دار اور اس کے اہل تھے ۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے "۔

اللہ کے بیانوں کے مطابق وہ بلاشک کافر ہیں ' اس لیے وہ اس مکروہ لقب کے مستحق ہیں ۔

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۴۸ : ۲۵) "وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا"۔ اللہ تعالیٰ یہ لقب ان کو عطا کرتا ہے کہ گویا کافر ہی اہل مکہ ہیں ۔ چونکہ یہ صفت کفر میں کانوں تک غرق ہیں ' اس لیے یہ لوگ اللہ کے ہاں مکروہ ترین مخلوق ہیں ' اس لیے کہ اللہ کفر کو نہایت ہی مکروہ سمجھتا ہے ۔ پھر دوسرا برا فعل جو یہ کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ اہل ایمان کو مسجد حرام سے روک رہے ہیں اور قربانی کے جانوروں کو بھی روک رہے ہیں کہ ان کو اپنے محل ذبح تک لے جایا جائے ۔

وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ الْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ (۴۸ : ۲۵)

"تم کو مسجد حرام سے روکا اور ہدی کے اونٹوں کو ان کی قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا"۔ یہ کام اسلام میں بھی گناہ کبیرہ ہے اور جاہلیت میں بھی گناہ تھا ۔ اور ابراہیم علیہ السلام سے ادھر جزیرۃ العرب میں جس قدر ادیان بھی گزرے ان سب میں یہ گناہ کبیرہ افعال تھے ۔ ان کے عرف ' ان کے عقیدہ اور مسلمانوں کے دین کے مطابق یہ مکروہ کام تھے ۔ اس لیے اللہ نے مسلمانوں کو ان پر حملہ کرنے سے اس لیے نہیں روکا کہ ان کے یہ جرائم کہیں چھوٹے تھے ' ہرگز نہیں ۔ بلکہ اس کی کوئی اور حکمت تھی ۔ اللہ مہربانی فرماتے ہوئے اس حکمت کا انکشاف فرماتا ہے ۔

وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (۴۸ : ۲۵) "اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد و عورت نہ ہوتے جنہیں تم نہیں جانتے اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ نادانستگی میں تم انہیں پامال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا (تو جنگ نہ روکی جاتی) مکہ میں بعض ضعیف اور کمزور مسلمان رہ گئے تھے جنہوں نے ابھی تک ہجرت نہ کی تھی ۔ اور انہوں نے مشرکین کے درمیان رہتے ہوئے اپنے اسلام کو خوف کے مارے چھپا رکھا تھا ۔ اگر جنگ شروع ہو جاتی اور مسلمان مکہ پر حملہ آور ہو جاتے اور وہ نہ جانتے کہ کون مسلم ہے اور کون کافر ہے ' ممکن تھا کہ یہ مسلمان ان ضعیف مسلمانوں کو روند کر قتل کر دیتے ۔ اور پھر کافر یہ کہتے کہ مسلمانوں نے مسلمانوں کو بھی معاف نہ کیا ۔ یوں مسلمانوں کو ان مسلمانوں کی دیت دینا پڑتی جن کو انہوں نے خطا کے طور پر قتل کر دیا تھا ۔ پھر ایک حکمت یہ بھی تھی کہ آج جو کافر مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے اور ہدی کے جانوروں کو جائے ذبح سے روک رہے ہیں ' انہی میں سے بعض لوگ عظیم مسلمان بننے والے ہیں ۔ اور اللہ کی رحمتوں میں داخل ہونے والے ہیں اور اللہ ان سب کو جانتا تھا ۔ اگر اس وقت یہ لوگ جدا ہوتے تو اللہ ضرور اجازت دے دیتا لیکن ابھی تک اللہ نے ان کو جدا نہ کیا تھا ۔ اس لیے اللہ نے اس موقعہ پر کافروں کو اس مار سے بچا لیا ۔

لِيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (۴۸ : ۲۵)
"جنگ (روکی اس لیے گئی) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کر لے ۔ وہ مومن الگ ہو گئے ہوتے تو (اہل مکہ سے) جو کافر تھے ان کو ہم ضرور سخت سزا دیتے" ۔ یوں اللہ اس منفرد جماعت مسلمہ کو اپنی حکمتوں کے بعض پہلو بتاتا ہے' جو اللہ کی تدبیر' تقدیر اور ہدایات کی پشت پر ہیں ۔

ان لوگوں کی ظاہری حالت جنھوں نے کفر کیا' اور ان کے ظاہری اعمال بتانے کے بعد اب ان کے نفوس کی اندرونی حالت کا تذکرہ ۔

اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ (۴۸ : ۲۶) "یہی وجہ ہے کہ جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ حمیت بٹھالی" ۔ وہ کسی نظریہ یا کسی نظام کے لیے نہیں لڑ رہے تھے بلکہ یہ کبر' فخر' سرکشی اور ہٹ دھرمی کے پرجوش حامی تھے ۔ اس حمیت ہی کی وجہ سے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کر رہے تھے ۔ آپ کو مسجد حرام کی زیارت سے بھی روک رہے تھے اور قربانی کے جانوروں کو بھی انھوں نے روکے رکھا جن کو آپ اس مقصد کے لیے لائے تھے تاکہ وہ قربانی کی جگہ تک جائیں اور وہاں قربانی کیے جائیں اور یہ حرکت کر کے یہ لوگ ہر عقیدے اور ہر رواج کو پامال کر رہے تھے ۔ محض اس لیے کہ عرب یہ نہ کہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم زبردستی مکہ میں داخل ہو گئے ۔ محض اس جاہلی غرور کی خاطر وہ اس قدر مکروہ فعل کا ارتکاب کر رہے تھے جو خود ان کے ہاں بھی نہایت ہی مکروہ فعل تھے ۔ پھر یہ خود بیت اللہ کی حرمت کو پامال کر رہے تھے اور جس پر ان کی پوری معیشت کا دارومدار تھا ۔ نیز ان لوگوں نے اشہر الحرام کا احترام بھی توڑ دیا جو ان کے ہاں بھی محترم تھے اور اسلام میں بھی محترم تھے ۔ یہی حمیت تھی جس کی وجہ سے یہ لوگ ان تمام لوگوں کو برا بھلا کہتے رہے جنھوں نے ان کو مشورہ دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عمرہ کرنے سے نہ روکو ۔ پھر اسی حمیت جاہلیہ کی وجہ سے سہیل ابن عمر نے کہا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کی جگہ بسمک اللھم لکھو ۔ اور پھر اس نے لفظ رسول اللہ" کٹوا کر محمد ابن عبداللہ لکھوایا ۔ یہ سب امور اسی سرکشی اور پرغرور جاہلیت کے سرچشمے سے نکل رہے تھے ۔

اللہ نے ان کے نفوس کے اندر یہ جاہلی حمیت اس لیے رکھ دی تھی کیونکہ اللہ کو معلوم تھا کہ یہ لوگ بہت ہی کرخت اور سرکش ہیں ۔ مسلمانوں کو اللہ نے اس حمیت جاہلیت سے بچایا اور اس کی جگہ سکینہ اور خدا خوفی نے لے لی ۔

فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَ

كَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا (۴۸ : ۲۶) "اور مومنوں پر سکینت نازل کی اور مومنوں کو تقویٰ کی بات کا پابند رکھا کہ وہی اس کے زیادہ حق دار اور اس کے اہل تھے" ۔ سکینہ وقار اور ٹھہراؤ کی حالت کو کہا جاتا ہے جس طرح تقویٰ کے معنی محتاط اور متواضع انداز کے ہیں ۔ اور یہ دونوں صفات اس مومن میں پائی جاتی ہیں جو اپنے رب سے جڑا ہوا ہوتا ہے ۔ اور اس تعلق پر مطمئن ہوتا ہے اور وہ اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اور اپنی ہر حرکت میں اللہ سے ڈرتا ہے ۔ اس لیے وہ تکبر اور سرکشی سے دور رہتا ہے ۔ اور جب اللہ حکم دے کہ ذرا رک جاؤ' ٹھنڈے ہو جاؤ تو وہ اطاعت کرتا ہے ۔ نہایت

رضامندی اور اطمینان کے ساتھ ۔

یہی وجہ ہے کہ مومنین اس بات کے مستحق تھے کہ وہ اہل تقویٰ کی بات کریں ۔ اور وہ اس کے مستحق بھی تھے اور یہ مومنین کی ایک نئی تعریف ہے جبکہ اس سے قبل جو کہا گیا کہ ان پر سکینت نازل کی گئی ' یہ بھی ان کے لیے ایک اعزاز تھا۔ کیونکہ سکینت کے اندر وقار اور تقویٰ دونوں شامل ہیں ۔ تو یہ اس لیے نازل ہوا کہ وہ اللہ کے پیمانوں کے مطابق اس کے وہ اہل تھے ۔ اور اس کی شہادت خود اللہ دیتا ہے ۔ مسلمانوں پر اللہ کی طرف سے گواہی کہ وہ اس بات کے مستحق ہیں ایک دوسرا اعزاز ہے اور یہ اللہ کی طرف سے آیا ہے ۔

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۴۸ : ۲۶) "اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔

--- ooo---

یہ بات پہلے گزر گئی ہے کہ بعض مومنین جو مدینہ سے رسول اللہ کا خواب سن کر نکلے تھے ان پر اس امر کا بہت برا اثر ہوا تھا کہ وہ اس سال مسجد حرام میں داخل نہ ہو سکے ۔ اور انہیں مسجد حرام سے لوٹا دیا گیا۔ یہاں اس خواب کی صداقت کی تصدیق کی جاتی ہے کہ یہ خواب اللہ کی طرف سے تھا اور یہ سچا تھا۔ اور یہ واقع ہونے والا ہے بلکہ اس سے بڑا واقعہ پیش آنے والا ہے ۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ
الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ ۙ
لَا تَخَافُوْنَ ۗ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾
هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ ۗ
وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۲۸﴾ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۗ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى
الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ
وَ رِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۗ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي
التَّوْرٰىةِ ۛۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۛۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ
فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ
الْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ

۴
۳۰ ع
اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۲۹﴾
۱۲

فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا۔ ان شاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے ' اپنے سر منڈواؤ گے اور بال ترشواؤ گے ' اور تمہیں کوئی خوف نہ ہو گا۔ وہ اس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے اس لیے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے اس نے یہ قریبی فتح تم کو عطا فرما دی۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں ' اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود ' اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہے ان کی صفت توراۃ میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی ' پھر اس کو تقویت دی ' پھر وہ گدرائی ' پر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے"۔

رہی یہ بشارت کہ یہ مسجد حرام میں پرامن داخل ہوں گے اور سر منڈوائیں گے اور بال ترشوائیں گے اور بے خوف و خطر عمرہ ادا کریں گے تو یہ ایک سال بعد ہو گیا تھا۔ اور صلح حدیبیہ کے دو سال بعد تو بطریق اکمل ہو گیا تھا جب مکہ ہی فتح ہو گیا اور پورے کے پورے اللہ کا دین اور اسلامی نظام نافذ ہو گیا۔ لیکن اللہ اہل ایمان کو اسلامی آداب بھی سکھاتا ہے اور یوں فرماتا ہے کہ

لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ (۴۸ : ۲۷) "کہ ان شاء اللہ تم مسجد حرام میں داخل ہو گے"۔ مسجد حرام میں داخل ہونا تو حتمی ہے کیونکہ اللہ نے اطلاع دے دی ہے لیکن مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اللہ کی مشیت کو اپنے شعور کا حصہ بنا لیں اور اسے بے قید سمجھیں تاکہ یہ بات ان کے دلوں میں بیٹھ جائے کہ ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ اور اسے اہل ایمان اپنی سوچ کا حصہ بنا دیں کہ قرآن بھی بار بار اس کا ذکر کرتا ہے اور تمام فیصلوں کو اللہ کی مشیت کے تابع قرار دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جہاں اللہ کے وعدے مذکور ہیں وہاں بھی وہ مشیت الہیہ کے ساتھ مشروط ہیں۔ حالانکہ اللہ کبھی اپنے وعدوں کے خلاف نہیں کرتا لیکن اللہ کی مشیت ہر قید سے آزاد ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے دل میں اس حقیقت کو بٹھا لیں تاکہ ان کی فکر کی اساس ان شاء اللہ پر ہو۔

اب یہ وعدہ کس طرح حقیقت بنا۔ روایات میں آتا ہے کہ جب سن سات ہجری میں ذوالقعدہ کا مہینہ آیا یعنی صلح حدیبیہ کے بعد تو حضور اکرمؐ مکہ کی طرف عمرے کے لیے نکلے۔ آپ کے ساتھ سب اہل حدیبیہ تھے۔ ذوالحلیفہ سے آپ نے احرام باندھا۔ ہدی کے جانور ساتھ لیے۔ جس طرح پہلے سال یہاں سے ہی آپ نے احرام باندھا تھا اور جانور ساتھ لیے تھے اور آپ اور آپ کے صحابہ کرام تلبیہ کرتے ہوئے چل پڑے۔ جب حضور اکرمؐ مر الظہران کے قریب ہوئے تو محمد ابن مسلمہ کو گھوڑوں اور اسلحہ کے ساتھ آگے بھیج دیا۔ جب مشرکین نے انہیں دیکھا تو وہ بہت ہی مرعوب ہو گئے۔ ان

کا خیال یہ ہوا کہ شاید رسول اللہ ان سے لڑنا چاہتے ہیں ۔ اور آپ نے ان کے درمیان ہونے والے عہد کو توڑ دیا جو یہ تھا کہ دس سال تک جنگ نہ ہوگی ۔ یہ لوگ گئے اور اہل مکہ کو خبردار کر دیا جب رسول اللہ تشریف لائے اور مرالظہران میں اترے ۔ تو تمام اسلحہ 'تیر' نیزے بطن ماجج کی طرف بھیج دیئے اور وہاں سے مکہ کی طرف اس حال میں روانہ ہوئے کہ تلواریں نیام میں تھیں ۔ جس طرح ان کے ساتھ طے ہوا تھا ۔ جب آپ راستے میں تھے تو قریش نے مکرز ابن حفص کو بھیجا اس نے آکر حضورؐ سے کہا کہ ہم نے تو آپ کے بارے میں یہ نہیں سنا کہ آپ نے کبھی عہد توڑا ہے ۔ تو آپؐ نے فرمایا' آپ کا مطلب کیا ہے ۔ تو اس نے کہا کہ آپ اسلحہ لے کر آئے ہیں ۔ نیزے 'تیر وغیرہ تو آپ نے فرمایا یہ بات نہیں ہے وہ تو ہم نے ماجج کی طرف بھیج دیئے ہیں تو اس نے کہا درست ہے آپ کے بارے میں ہماری معلومات یہی ہیں کہ آپ نیک اور متقی ہیں نیز وفائے عہد کرنے والے ہیں ۔

کفار کے رؤساء مکہ سے نکل گئے تاکہ ان کی نظریں رسول اللہؐ پر نہ پڑیں ۔ وہ آپ کو دیکھنا بھی گوارا نہ کر سکتے تھے ۔ رہے عام اہل مکہ مرد اور عورتیں اور بچے تو وہ راستوں اور کوٹھوں پر بیٹھ گئے اور رسول اللہ اور آپ کے ساتھیوں کو دیکھتے رہے ۔ حضورؐ مکہ میں داخل ہوئے' آپ کے رفقاء آپ کے آگے آگے تھے 'سب تلبیہ پڑھ رہے تھے 'جس قدر جانور تھے ان کو ذی طوی بھیج دیا گیا ۔ حضورؐ اپنی ناقہ قصواء پر سوار تھے جس پر آپؐ حدیبیہ کے دن بھی سوار تھے ۔ عبداللہ ابن رواحہ انصاری نے زمام تھام رکھی تھی اور ناقہ کو چلا رہے تھے ۔

یوں آپؐ کی خواب سچی ہوئی ۔ اللہ کا وعدہ پورا ہوا اور اگلے سال فتح مکہ بھی ہو گیا اور اللہ کا دین مکہ پر بھی غالب ہو گیا ۔ اور اس کے بعد پورے جزیرۃ العرب میں غالب ہو گیا اور اب آخری خوشخبری یوں پوری ہوئی :

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ كَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا (۴۸ : ۲۸) "وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے" ۔ دین اسلام صرف جزیرۃ العرب ہی میں غالب نہ ہوا بلکہ پوری دنیا میں غالب ہوا ۔ اور یہ عمل صرف نصف صدی کے اندر اندر پورا ہو گیا ۔ یہ دین کسریٰ کی پوری مملکت پر غالب ہو گیا اور قیصر کی مملکت کے بھی بڑے حصے کو فتح کر لیا ۔ ہند اور چین میں بھی غالب ہو گیا ۔ پھر جنوبی ایشیا اور ملایا میں غالب ہوا اور انڈونیشیا میں غالب ہوا اور یہی دنیا تھی جو اس دور میں آباد تھی ۔ یعنی چھٹی صدی اور ساتویں صدی عیسوی میں ۔ لیکن اللہ کا دین آج تک تمام ادیان پر غالب ہے ۔ اگرچہ دنیا کے ان حصوں میں جہاں مسلمانوں کو سیاسی غلبہ حاصل تھا' مسلمان پسپا ہو گئے ۔ خصوصاً یورپ اور بحر ابیض کے جزائر سے ۔ اور مسلمان مشرق و مغرب میں اٹھنے والی نئی قوتوں کے مقابلے میں پسپا ہو گئے ۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ دین حق یعنی دین اسلام بحیثیت دین آج بھی تمام ادیان پر غالب ہے ۔ یہ دین اپنی ذات' اپنی ماہیت اور اپنی ذاتی صلاحیتوں اور خوبیوں کی وجہ اپنے ماننے والوں کی مدافعت بغیر تلوار کے کرتا ہے اور بغیر کسی سیاسی قوت کی پشت پناہی کے یہ دین آگے بڑھ رہا ہے ۔ کیونکہ اس دین کی فطرت میں نوامیس فطرت کے ساتھ ہم رنگی ہے اور قوانین فطرت اس کائنات میں اللہ کے ودیعت کردہ حقیقی اصول ہیں ۔ پھر اس دین میں عقل' روح اور جسم سب کی

ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ انسانی تعمیر و ترقی 'سوسائٹی کی ضروریات ' فرد کی ضروریات سب کو مد نظر رکھا گیا ہے ۔ ایک جھونپڑی کے باشندے اور ایک محل اور کوٹھی کے باشندے سب کی ضروریات کو اس دین میں پورا کیا گیا ہے ۔

دوسرے مذاہب کے پیرو کار اگر اس دین پر تعصب سے پاک نظروں کے ساتھ غور کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ بہت بڑی قوت والا دین ہے ۔ اور یہ آج بھی انسانیت کی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے اور اس ترقی یافتہ دور میں کسی بھی ترقی یافتہ سوسائٹی کی ضروریات کو یہ دین نہایت ہی استقامت کے ساتھ پوری کر سکتا ہے ۔

وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (۴۸ : ۲۸) "اور اس پر اللہ کی گواہی کافی ہے" ۔ غرض بعثت نبی کی بعد ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ اللہ کا یہ وعدہ سیاسی لحاظ سے سچا ثابت ہو گیا اور یہ دین تمام دنیا پر غالب ہو گیا اور اپنی ذات کے اعتبار سے یہ اب بھی تمام ادیان پر غالب ہے ۔ بلکہ تمام دوسرے ادیان دنیا سے ختم ہو گئے اور یہی ایک دین ہے جو اپنی ذاتی صلاحیت کی وجہ سے قائم و دائم ہے اور اپنی عملیت کے لحاظ سے یہ ہر وقت قابل عمل ہے ۔

آج صرف اس دین کے ماننے والے اس حقیقت کے ادراک سے محروم ہیں کہ یہ دین اسلام اپنی ذات کے اعتبار سے غالب ہے ۔ جبکہ اس دین کے دشمن اس بات کو جانتے ہیں اور اس سے بہت ڈرتے ہیں اور اپنی سیاسی پالیسی میں دین اسلام کی اس خطرناکی کو پیش نظر رکھتے ہیں ۔

---ooo---

اب ہم اس سورت کے خاتمہ کی طرف آ رہے ہیں ۔ اس میں قرآن نے صحابہ کرام کی وہ تصویر کشی کی ہے جو اس وقت عملاً موجود تھی اور یہ جماعت محترمہ جس کے بارے میں پہلے آ چکا ہے کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور اس جماعت کے ایک ایک فرد تک اللہ کی خوشنودی کی اطلاع کر دی گئی 'یہ کون لوگ تھے ؟ تو سنئے !

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (۴۸ : ۲۹) "محمد اللہ کے رسول ہیں ' اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں ۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود' اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے ۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں ۔ یہ ہے ان کی صفت تورات میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی 'پھر اس کو تقویت دی 'پھر وہ گدرائی ' پر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی ۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تا

کہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے"۔

یہ ایک زبردست تصویر ہے۔قرآن کریم نہایت ہی انوکھے انداز میں یہ تصویر کشی کرتا ہے۔اس جماعت کی نمایاں جھلکیاں یہاں دی گئی ہیں۔ان کے ظاہری حالات' ان کے پوشیدہ روحانی حالات' ان کے باہم تعلقات' ان کے کفار کے ساتھ تعلقات'۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (۴۸ : ۲۹) "کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں"۔اور اللہ کی بندگی اور پرستش کرتے ہوئے۔

تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا (۴۸ : ۲۹) "تم دیکھو گے انہیں رکوع و سجود میں"۔اور ان کی قلبی حالت اور خواہش اور فکر کیسی ہے۔ان کی دلچسپیاں کیا ہیں۔

يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا (۴۸ : ۲۹) "اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول ہیں"۔اور ان کے ظاہری خدوخال اور نشانات کیا ہیں' چہرے مہرے کیسے ہیں۔

سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (۴۸ : ۲۹) "سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں"۔ اور تورات و انجیل میں بھی ان کی یہی صفات بتائی گئی ہیں۔ (۱) كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ (۴۸ : ۲۹) "ایک کھیتی کی طرح جس نے پہلے کونپل نکالی"۔ (۲) فَاٰزَرَهٗ (۴۸ : ۲۹) "پھر اسے تقویت دی"۔ (۳) فَاسْتَغْلَظَ (۴۸ : ۲۹) "پھر وہ گدرائی"۔ (۴) فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ (۴۸ : ۲۹) "پھر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی"۔ (۵) يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (۴۸ : ۲۹) "کاشت کرنے والے کو وہ خوش کرتی ہے"۔
(۶) لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (۴۸ : ۲۹) "تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں"۔

یہاں سب سے پہلے اس صفت محمدی کو ثابت اور موکد کیا جاتا ہے جس کا انکار سہیل ابن عمرو نے کیا تھا کہ آپؐ کے نام کے ساتھ رسول اللہ کا لفظ نہ لکھیں یعنی محمد رسول اللہؐ (محمد اللہ کے رسول ہیں) اور اس کے بعد صحابہ کرام کی یہ انوکھی اور عجیب تصویر شروع ہو جاتی ہے' نہایت ہی انوکھے انداز میں۔

مومنین کے حالات تو مختلف ہوتے ہیں لیکن ان جھلکیوں میں جو صفات دی گئی ہیں یہ تمام مومنین کی زندگی میں ہوتی ہیں اور یہ ان کی زندگی کے بنیادی نکات ہیں۔انہی نکات سے اس تصویر کے خطوط ابھرتے ہیں جو نہایت ہی خوبصورت اور چمک دار ہیں۔یہاں اللہ نے جو جھلکیاں دی ہیں' ان میں ان باتوں کو بہت نمایاں کیا گیا ہے جن سے اس جماعت کی عزت افزائی ہو۔لہٰذا وہ نکات اور وہ خطوط یہاں نمایاں ہیں جن کے ذریعہ عالم بالا میں انہیں اعزاز ملا ہے۔

ان کے معزز اور مکرم ہونے کی پہلی جھلکی اور رنگ یہ ہے کہ یہ لوگ۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (۴۸ : ۲۹) "کافروں پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں"۔ یہ کافروں پر بہت ہی سخت ہیں حالانکہ اس وقت کافروں میں ان کے آباء' بھائی' قریبی رشتہ دار اور دوست موجود تھے۔ لیکن انہوں نے ایسے تمام رشتوں کو یکدم کاٹ کر رکھ دیا۔ اور وہ آپس میں رحم دل ہیں حالانکہ ان کے درمیان صرف دینی اخوت ہے۔ لہٰذا ان کی شدت بھی اللہ کے لیے ہے اور ان کی نرمی بھی اللہ کے لیے ہے۔ یہ ہے نظریاتی حمیت' اسلامی حمیت' دینی غیرت۔ لہٰذا وہ اپنے نفس کے لیے کچھ نہیں چاہتے۔ اور نہ ان کے نفوس کے لیے اس دین میں کچھ ہے۔ یوں وہ اپنے جذبات اور اپنی محبتوں کو اپنے تعلقات اور طرز عمل کو اپنے نظریات اور عقائد کی اساس پر استوار اور تعمیر کر رہے ہیں۔ وہ نظریاتی دشمنوں پر سخت اور نظریاتی دوستوں کے لیے ریشم کی طرح نرم ہیں۔ وہ انانیت اور خواہشات نفسانیہ سے مجرد ہو گئے ہیں۔ اللہ کے سوا کسی اور کے لیے کسی اور تعلق کے لیے وہ مشتعل ہی نہیں ہوتے۔

اب دوسری جھلکی' ان کے تکریم اور ان کا شرف ان کی رکوع و سجود میں ہے۔ جب وہ عبادت کرتے ہیں تو رکوع و سجود میں ہوتے ہیں اور تم انہیں ہمیشہ اس حالت میں پاؤ گے گویا یہ صفت ان کی دائمی صفت ہے اور عبادت میں رکوع و سجود مکمل حالت ہے' اور ان کے ذہنوں میں بھی یہی حالت ہے اور ان کے جسم بھی بروقت رکوع و سجود میں ہیں گویا ان کی پوری زندگی اور پورا وقت اسی کام میں گزرتا ہے۔

ان کی جو تیسری جھلکی دکھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی باطنی' ان کی روحانی اور ان کی نفسیات کی حالت کیا ہے۔

يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (۴۸ : ۲۹) "تم ان کو اللہ کے فضل اور خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے"۔ یہ ان کے شعور کی دائمی حالت ہے۔ ان کا دل جن باتوں میں ہروقت مشغول رہتا ہے' ان کے اندر ہروقت جو شوق اٹھتے ہیں وہ یہی ہیں کہ کسی طرح اللہ راضی ہو جائے' اللہ کی رضا اور اس کے فضل کی طلب کے سوا ان کا اور کوئی مشغلہ اور دلچسپی ہی نہیں ہے۔

اور چوتھی خوبی یہ کہ ان کی عبادات ان کے فیچرز اور ان کے خدوخال میں ظاہری طور پر نظر آتی ہیں۔

سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ (۴۸ : ۲۹) "ان کے سجود کے اثرات ان کے چہروں میں موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں"۔ یعنی ان کے چہرے میں نور' روشنی اور چمک نظر آئے گی۔ اور ان کا چہرا صاف و شفاف ہو گا۔ اور یہ ان کی صاف' زندہ اور روح پرور عبادت کی وجہ سے۔ اس سیماھم سے مراد وہ معروف نشان (محراب) نہیں ہے جو بعض لوگوں کے ماتھے پر پڑ جاتا ہے (جب وہ سجدے میں ماتھا رگڑتے ہیں) مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ (۴۸ : ۲۹) کے لفظ سے ذہن میں یہ نشانی آجاتی ہے۔ اثرالسجود سے مراد اثرالعبادہ ہے۔ کیونکہ سجدہ عبادت اور بندگی اور اطاعت کا درجہ کمال ہوتا ہے اور اس میں انسان عاجزی اور اطاعت کی کمال حالت میں ہوتا ہے۔ اس حالت کا اثر انسان کے چہرے پر بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ عبادت گزاروں کے چہروں پر سے کبر' غرور اور مستی دور ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ شریفانہ تواضع' صاف و شفاف طرز عمل' پروقار نور اور تقویٰ کا دھیما پن آجاتا ہے جس سے مومن کا چہرہ نہایت ہی خوبصورت نظر آتا ہے جبکہ اس کے چہرے پر مایوسی بالکل نہیں ہوتی اور وہ خوش اور مطمئن نظر آتا ہے۔

یہ روشن تصویر جو ان جھلکیوں میں نظر آتی ہے یہ کوئی نئی تصویر نہیں ہے۔ یہ ان کے لیے نظام قضا و قدر میں لکھی

ہوئی ہے ۔ لوح محفوظ میں درج ہے ۔ اور اسی وجہ سے اس کا تذکرہ توریت میں بھی آیا ہے اور انسانوں کو ان کے بارے میں خوشخبری دی گئی ہے ۔ قبل اس کے وہ اس زمین پر پیدا ہوں ۔

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ (۴۸ : ۲۹) "یہ ہے ان کی صفت تورات میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے"

اللہ نے ان دو سابقہ کتابوں میں حضرت محمدؐ اور آپؐ کے رفقاء کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ

كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ (۴۸ : ۲۹) "ایک کھیتی کی طرح ہیں جس نے پہلے کونپل نکالی" ۔ وہ اس طرح بڑھے جس طرح فصل ابتداء میں کونپلیں نکالتی ہے ' تروتازہ ہوتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ بڑھتی اور قوی ہوتی ہے ۔

فَاٰزَرَهٗ (۴۸ : ۲۹) "پھر اس کو تقویت دی" ۔ یعنی اس کونپل نے اسے مضبوط کیا ۔ یا نال نے اس کو مضبوط کیا ۔

فَاسْتَغْلَظَ (۴۸ : ۲۹) "پھر وہ مضبوط سے مضبوط ہو گئی" یعنی وہ نال اور فصل ۔

فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ (۴۸ : ۲۹) "پھر وہ تنے پر کھڑی ہو گئی" ۔ یعنی وہ فصل اپنی نال ' تنے یا ڈنڈی پر کھڑی ہو گئی ' اب اس میں نہ کمزوری ہے اور نہ جھکاؤ ' مضبوط ہے اور سیدھی ہے ۔

یہ تو ہے فصل کی ذاتی صورت حالات ۔ لیکن کسان کے نفس پر اس کے کیا اثرات ہیں ۔ ماہرین پر اس کے کیا اثرات ہیں جو بڑھنے والے کو بھی جانتے ہیں اور مرجھانے والے کو بھی جانتے ہیں ۔ پھلدار کو بھی جانتے اور بے پھل کو بھی ۔ تو ایسے لوگوں کے دل میں مسرت دوڑ جاتی ہے ۔

يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (۴۸ : ۲۹) "کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے" ۔ اور بعض قراتوں میں الزراع کی جگہ الزارع (بونے والا) آیا ہے ۔ اور مراد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اس بڑھنے والی ' قوی ' تروتازہ اور فرحت بخش فصل کے کسان ہیں ۔ پھر کفار کے دلوں پر اس کے اثرات کیا ہوتے ہیں ؟ وہ غصہ اور جھنجلاہٹ ۔

لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (۴۸ : ۲۹) "تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں" ۔ آخر میں کفار کے غصے کا ذکر کر کے قرآن نے اشارہ کر دیا کہ کہیں اس کو لوگوں کی فصل پر ہی چسپاں نہ کرو ۔ اس سے مراد اللہ والوں کی فصل ہے ۔ اور رسول اللہ کی فصل ہے اور یہ ان لوگوں کی فصل ہے جو دست قدرت کے آلات ہیں اور کفار کے لیے پریشانی کا باعث ۔

یہ مثال بھی کوئی نئی مثال نہیں ہے کہ کتاب تقدیر کے صفات میں درج ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ذکر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمین پر آنے اور مبعوث کیے جانے سے بھی پہلے اس کا ذکر تورات اور انجیل میں موجود ہے ۔ اور انجیل میں تو اس کی تصریح موجود ہے کہ محمد اور اس کے ساتھی آئیں گے ۔

یوں اللہ اپنی لازوال کتاب میں اس جماعت کی صفات کو قلم بند فرماتا ہے ۔ یعنی جماعت صحابہ کی ۔ یوں اس کائنات

کے مرکز میں یہ جماعت قائم ہوتی ہے۔ پوری کائنات اس کے ساتھ چلتی ہے اور یہ جماعت باری تعالیٰ سے اپنی یہ تعریف سنتی ہے۔ اور پھر آنے والی نسلوں کے لیے ان کی صفت بطور نمونہ ریکارڈ کر دی جاتی ہے تاکہ آئندہ کی نسلیں بھی اس معیار کو قائم کرنے کی سعی کریں تاکہ ایمان اپنے اعلیٰ درجات میں قائم ہو۔

جماعت صحابہ کی اس صفت اور تکریم کے بعد پھر اعلان ہوتا ہے کہ ان کے لیے اجر عظیم ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا

"اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں اللہ نے ان سے مغفرت اور اجر کا وعدہ فرمایا ہے" (۴۸ : ۲۹)۔ اس جماعت کی صفات کے بعد اب یہ ایک عمومی اعلان ہے اور اس اعلان کے مستفید ہونے والوں میں ظاہر ہے کہ وہ سب سے پہلے داخل ہیں۔ مغفرت اور اجر عظیم۔ یہی ایک اعلان ہی ان کے لیے بڑا اعزاز ہے اور ان کے لیے تو اللہ کی رضامندی ہی بڑا اجر ہے لیکن اللہ کا فضل و کرم بلاقیود اور بلاحدود ہے اور اللہ کی بخشش بے انتہا و لامحدود ہے۔

میں ایک بار پھر چشم خیال کو کھول کر اس جماعت مکرمہ کو دیکھ رہا ہوں جس کے دل سعید ہیں۔ جو اللہ کے یہ فیوض رحمت اور اعزاز و اکرام اور عظیم اجر کے وعدے پا رہے ہیں۔ ان کو سنایا جا رہا ہے۔ یہ اعلان کہ اللہ کی کتابوں میں 'اللہ کے بیانوں میں 'اور اللہ کے ایوانوں میں ان کے لیے یہ ہے' یہ ہے۔ حدیبیہ سے یہ واپس ہو رہے ہیں اونٹوں کی رفتار کے گرد و غبار میں یہ سورت سنتے ہیں 'اب یہ ان کی روح اور ان کی زندگی ہے۔ ان کے کانوں اور ارواح میں یہ اتر رہی ہے۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور مسکراتے ہیں اور ان کا وجود ہی اللہ کا مجسم فضل و کرم ہے...... میں چشم تصور سے ان کو دیکھ کر ذرا ان کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔ ذرا مجھے بھی ان کے ساتھ چند قدم چلنے دو' لیکن جو شخص ان کی راہ پر نہیں چلا وہ اس جشن فتح میں کیا شریک ہو سکتا ہے؟ نہیں وہ دور ہی سے دیکھتا رہے گا...... اللہ! تو ہی کسی کو یہ اعزاز بخش سکتا ہے کہ وہ دور سے نجات کو نہ دیکھے بلکہ اس جشن میں کود پڑے۔ اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں اس جشن میں کودنے کے لیے بے تاب ہوں!

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ----- پنجم

## پارہ ----- ۲۶

## سورۃ الحجرات ۔ ۴۹

آیات ۱--- تا--- ۱۸

# سورۃ الحجرات ایک نظر میں

یہ سورت صرف اٹھارہ آیات پر مشتمل ہے۔ لیکن اپنے مضامین کے اعتبار سے ایک عظیم سورت ہے۔ اس میں نظریات ' دستور و قانون اور انسانی وجود کے بارے میں نہایت ہی اہم مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جو انسان کے دل و دماغ کے لیے نہایت ہی وسیع آفاق اور وسیع دنیا کے دروازے کھولتے ہیں۔ نہایت گہرے تصورات اور نہایت عظیم معانی اس کا موضوع ہیں۔ اس کے ان موضوعات میں تخلیق و تنظیم ' تربیت و تہذیب ' دستور و قانون اور ہدایات و رہنمائی کے مسائل لیے گئے ہیں۔ یہ مسائل اس قدر گہرے ' وسیع اور ہمہ گیر ہیں کہ ان کے بیان کے لیے موجودہ آیات کے مقابلے میں سیکڑوں آیات درکار ہیں۔ لیکن یہاں دریا کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے یا دریا بحباب اندر۔

یہ سورت دو باتوں کو نہایت کھول کر بیان کرتی ہے اور یہ دو باتیں نہایت اہم 'بہت عظیم اور غور و فکر کے لائق ہیں :

پہلی بات یہ کہ سورت ایک بلند ' پاکیزہ اور سلیم الفطرت ماحول اور اونچے معاشرے کے نشانات وضع کرتی ہی۔ یہ وہ اصول اور قوانین بیان کرتی ہے اور وہ طرز زندگی متعین کرتی ہے جس کے اوپر یہ ماحول اور یہ معاشرہ قائم کیا جانا مطلوب ہے۔ وہ اصول و مبادی جس کے اوپر اس سوسائٹی نے قائم ہونا ہے اور پھر جن کے مطابق اس ماحول اور اس سوسائٹی کی حفاظت کی جانی ہے۔ ایک ایسی سوسائٹی جو اللہ کی بنائی ہوئی ہو ' جو اللہ کی طرف رخ کیے ہوئے ہو اور جسے صحیح معنوں میں ایک الٰہی سوسائٹی کہا جا سکتا ہو۔ ایک ایسی سوسائٹی جس کا دل صاف ہو ' جس کے تصورات پاکیزہ ہوں ' جس کی زبان پاک ہو اور جس کی سیرت اور جس کا اندرون پاک ہو ' ایک ایسی دنیا اور سوسائٹی جو اللہ کے ساتھ کچھ آداب کو ملحوظ رکھے ' جو رسول اللہ ؐ کے ساتھ بھی کچھ آداب قائم رکھی ہو ' اپنی ذات کے ساتھ بھی اس کے آداب ہوں اور دوسروں کے ساتھ بھی آداب ہوں جس کے ضمیر میں بھی آداب ہوں ' جس کے اعضا بھی مودب ہوں۔ پھر اس سوسائٹی نے اپنے حالات کے لیے منظم قوانین بنا رکھے ہوں ' اور اس کا نظم و نسق ایسا ہو جو اسے بچاتا ہو ' اور یہ قوانین اور یہ تنظیمی ادارے انہی آداب پر مبنی ہوں ' انہی آداب سے پھوٹتے ہوں ' ان آداب کے ساتھ ہم آہنگ ہوں ' وہ اس سوسائٹی کی روحانی دنیا اور ظاہری دنیا کے لیے کافی ہوں۔ اس کا شعور اور اس کے قوانین ہم آہنگ ہوں۔ اسے آگے جانے اور ترقی کرنے اور اس کے دائرہ ممنوعات کے درمیان بھی توازن ہو؟ اس کے احساسات اور اقدامات متوازن ہوں اور یہ پوری کی پوری اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی اعلیٰ ' ارفع اور پاک و صاف سوسائٹی کا قیام نہ تو فقط روحانی تطہیر پر چھوڑا گیا ہے اور نہ ہی فقط قانون سازی اور انتظامی اداروں کے حوالے کیا گیا ہے ' بلکہ اس کی روحانی تطہیر ' اس کا قانون و دستور اور اس کے انتظامی ادارے سب مل کر کام کرتے ہیں۔ یہ سوسائٹی نہ تو ایک فرد کی سوچ کے تابع ہے اور نہ ہی حکومت کے اداروں کی سوچ کے حوالے ہے۔ بلکہ اس میں افراد ' حکومت دونوں مل کر اپنے اپنے فرائض باہم تعاون سے ادا کرتے ہیں ربانی ہدایات کی روشنی میں۔

یہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جس کے اندر اللہ اور رسول اللہ کے بارے میں کچھ لازمی آداب ہیں ۔ بندے کو اللہ کے سامنے اور اللہ کے رسول کے سامنے کچھ آداب بھی ملحوظ رکھنے ہوتے ہیں ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۴۹ : ۱) "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول کے آگے پیش قدمی نہ کرو' اور اللہ سے ڈرو' اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔ کوئی انسان امرونہی میں اللہ سے آگے نہ بڑھے ۔ اللہ پر کوئی فیصلہ اور ڈگری نافذ نہ کرے ۔ اور اللہ جو حکم دے اور جس سے روکے اس سے تجاوز نہ کرے' وہ اپنے خالق کے مقابلے میں اپنی رائے اور اپنے ارادے پر زور نہ دے ۔ اس سے ڈرے' اور اس سے حیا کرے اور نہایت ہی ادب سے اس کی بارگاہ میں رہے ۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں بھی وہ کچھ ظاہری آداب بھی ملحوظ رکھے ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۴۹ : ۲) اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۴۹ : ۳) اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۴۹ : ۴) وَ لَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۴۹ : ۵) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو' اور نہ نبی سے اونچی آواز سے بات کرو' جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو ۔ جو لوگ رسول خدا کے ہاں بات کرتے ہوئے اپنی آواز پست رکھتے ہیں' وہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے ۔ ان کے لیے مغفرت ہے اور اجر عظیم ہے ۔ اے نبیؐ جو لوگ تمہیں حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر بے عقل ہیں ۔ اگر وہ تمہارے برآمد ہونے تک صبر کرتے تو انہی کے لیے بہتر تھا ۔ اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے"۔

یہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جس میں افعال اور اقوال کو اچھی طرح جانچا جاتا ہے' کوئی بات اگر سنی جائے تو اس کی تحقیق کی جاتی ہے' سنتے ہی فیصلہ نہیں کر دیا جاتا اور یہ بات خدا سے ڈرنے پر رکھی گئی ہے ۔ اور کسی حکم سے پہلے رسول اللہؐ سے مشورہ ضروری ہے ۔ اور رسول اللہ سے مشورہ بھی اس وقت کیا جائے جب آپ مشورے طلب فرمائیں' خواہ مخواہ مفت مشورے نہ دیا کریں ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (۴۹ : ۶) وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ (۴۹ : ۷) فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۴۹ : ۸) "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیماں ہو' خوب جان رکھو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے۔ اگر وہ بہت سے معاملات میں تمہاری بات مان لیا کرے تو تم خود ہی مشکلات میں مبتلا ہو جاؤ۔ مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے لیے دل پسند بنا دیا اور کفر اور فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل اور احسان سے راست رو ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے"۔

یہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جو اپنے وجود کی حفاظت کے لیے ایک انتظامی مشینری رکھتی ہے۔ اس کے ذریعہ اس کے اندر واقع ہونے والے اختلافات کو دور کیا جاتا ہے' فتنوں کو فرو کیا جاتا' بے چینیاں دور کی جاتی ہیں اور لوگوں کی خواہشات کو کنٹرول کیا جاتا ہے کہ اگر ان کا علاج نہ کیا جائے تو سوسائٹی تباہ ہو جائے۔ ایسے موقع پر یہ سوسائٹی اسلامی اخوت کے اصولوں کے مطابق اپنے مسائل حل کرتی ہے اور خالص عدل و اصلاح کے نقطہ نظر سے کام کرتی ہے۔ خدا خوفی اور اللہ کی رحمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (۴۹ : ۹) إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (۴۹ : ۱۰) "اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو' کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو' امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے"۔

یہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جس کے افراد ایک دوسرے کے بارے میں نیک جذبات اور خواہشات اور شعور رکھتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ ایک بہترین طرز عمل اختیار کرنے کے بھی کچھ آداب ہیں جن کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ وَ لَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ وَ مَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۴۹ : ۱۱) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو، نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں"۔

اس سوسائٹی کا شعور پاک، اس کے اندر لوگوں کی عزت محفوظ، لوگوں کی خلوتیں محفوظ، کسی پر شک کرنا گناہ، کسی کے خلاف تجسس کرنا گناہ، لوگوں کا امن، عزت، شرافت مکمل طور پر محفوظ، ان معاملات میں کوئی کسی کو چھیڑ نہیں سکتا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ٘ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا وَ لَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ (۴۹ : ۱۲) "اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو، اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو، اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے اور رحیم ہے"۔

یہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جس کی اساس مطلق انسانیت پر ہے۔ جس میں اقوام اور اجناس محض تعارف کے لیے ہیں اور وہ یہ تمام انسان ایک آدم کی اولاد ہیں۔ یہ سوسائٹی باقی تمام خواہشات اور رنگ و نسل کے شوائب سے پاک ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (۴۹ : ۱۳) "اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا باخبر ہے"۔

یہ سورت اسلامی سوسائٹی کے نشانات اور اس کے خدوخال کے تعین کے ساتھ مخصوص ہو جاتی اگر اسلام اور ایمان کے حدود کے تعین کو بھی نہ لیا جاتا۔ کیونکہ اس سوسائٹی کے قیام کی دعوت لوگوں کو ایمان کے عنوان سے دی گئی۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا...... ایمان کے حوالے ہی ان کو پکارا گیا تاکہ جواب دیں اور لبیک کہتے ہوئے اس سوسائٹی کو

قائم کریں۔ اس لئے کہ کون بدبخت ایسا ہو گا جو اللہ کی جانب سے یہ میٹھی آواز سنے گا۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا...... اور لبیک نہ کہے گا۔ اس آواز کو سن کر حیاء آ جاتی ہے اور پھر اس پیاری آواز کے بعد اس راہ میں ہر مشقت آسان ہو جاتی ہے۔ ہر دل سننے کے لیے دوڑتا ہے اور عمل کے لیے اٹھتا ہے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۴:۴۹) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۱۵:۴۹) قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ

(۱۶:۴۹) "یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے' ان سے کہو' تم ایمان نہیں لائے' بلکہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے" ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری اختیار کرو تو وہ تمہارے اعمال کے اجر میں کوئی کمی نہ کرے گا۔ یقیناً اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے۔ پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔ اے نبیؐ ان سے کہو کہ کیا تم اللہ کو اپنے دین کی اطلاع دے رہے رہو حالانکہ اللہ زمین و آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔

اور سب سے آخر میں یہ سورت بتاتی ہے کہ دین اسلام لوگوں کے لیے اللہ کا بہت ہی بڑا انعام ہے اور ایمان تو جسے مل جائے اس کے لیے اللہ کی نعمت ہے۔ لیکن یہ نعمت اللہ صرف ان کو دیتا ہے جو اس کے مستحق ہوں۔

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۷:۴۹) اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۱۸:۴۹) "یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان سے کہو' اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو بلکہ اللہ تم پر اپنا احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی طرف ہدایت دی' اگر تم واقعی سچے ہو۔ اللہ زمین و آسمان کی ہر پوشیدہ چیز کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ سب کچھ اس کی نگاہ میں ہے"۔

دوسری بڑی بات جو اس پوری سورت سے ظاہر ہوتی ہے اور ان حالات سے معلوم ہوتی ہے جن میں یہ سورت

اور اس کی آیات نازل ہوئیں یہ ہے کہ قرآن کریم نے اسلامی جماعت کی تربیت کے لیے کس قدر عظیم جدوجہد کی ۔ اور یہ جدوجہد مسلسل کی جاتی رہی اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح ہر مرحلے میں کس قدر عظیم حکمت کے ساتھ اس جماعت کے نک سک درست کیے ۔ جس کے نتیجے میں اس کرۂ ارض پر اس قدر پاکیزہ سوسائٹی وجود میں آئی جو نہایت ہی باوقار' پاکباز اور صحت مند سوسائٹی تھی ۔ اور ایسی سوسائٹی انسانی تاریخ میں ایک ہی بار اس کرۂ ارض پر وجود میں آئی ۔ اس کے بعد اس قسم کی سوسائٹی کا تصور بھی کسی نے پیش نہیں کیا یا نہ کوئی ایسی سوسائٹی کا ناول بھی لکھ سکا ہے ۔

لیکن یہ سوسائٹی پاک صاف 'صحت مند 'نظریاتی' ایماندار اور خالص انسانی بنیادوں پر' انسانی تاریخ کے ایک دور میں' زمین کے ایک خطے میں وجود میں آئی ۔ یہ اچانک وجود میں نہیں آئی تھی ۔ نہ یہ بطور اتفاق وجود میں آئی تھی ۔ یہ نہ راتوں رات وجود میں آئی تھی' نہ یہ کسی طبعی حالات کی وجہ سے اچانک مشروم (ایک قسم کی خودرو گھاس) کی طرح وجود میں آگئی تھی بلکہ یہ نہایت ہی تدریجی طور پر اور ایک پودے کی طرح نمودار ہوئی اور بڑھتے بڑھتے تدریج کے ساتھ وہ پودا درخت بن گیا جس کی شاخیں بلند اور جڑیں زمین میں گہری تھیں اور اس نے اپنی نشوونما کے لیے ضروری وقت بھی لیا اور اس کے لیے نہایت ہی گہری اور مسلسل جدوجہد بھی کرنا پڑی ۔ اور اس سلسلے میں راتوں کی نیند حرام کی گئی 'طویل صبر کیا گیا' بصیرت افروز محنت کی گئی ۔ لوگوں کے اخلاق کو سنوارا گیا ۔ لوگوں کو ہدایات دی گئیں اور وہ آگے بڑھائے گئے ۔ ان کو قوت دی گئی اور ثابت قدم رہنے کی تلقین کی گئی ۔ عملی تجربات کیے گئے ۔ کڑے سے کڑے امتحانات سے گذارے گئے ۔ اور آزمائشوں اور مشکلات سے انہیں گزارا گیا ۔ اور تجربوں اور آزمائشوں سے عبرت لی گئی ۔ اور اس پورے عرصے میں یہ سوسائٹی اللہ کی مسلسل نگرانی میں رہی جو علیم و خبیر ہے ۔ اور اسے اس عظیم امانت کے اٹھانے کے لیے تیار کیا گیا اور زمین پر اللہ کی مشیت کو روبعمل لانے کے لیے تیار کیا گیا اور پھر یہ کہ ان حضرات کے اندر کچھ مخصوص خصوصیات بھی تھیں جن کی وجہ سے تاریخ انسانیت میں انہوں نے یہ مقام حاصل کیا ۔ اور یہ حقیقت وجود میں آئی ۔ آج شاہراہ تاریخ انسانی پر ہمیں یہ سوسائٹی دور سے نظر تو آتی ہے مگر ایک خواب کی طرح!!

--- ooo---

# درس نمبر ۲۴۶ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۱۸

سُوْرَةُ الْحُجُرٰتِ (۴۹) مَدَنِيَّةٌ (۱۰۶) اٰيَاتُهَا ۱۸ رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱﴾ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ
النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ
وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا
حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵﴾ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى
مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۶﴾

اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسولؐ کے آگے پیش قدمی نہ کرو اور اللہ سے ڈرو' اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو' اور نہ نبیؐ کے ساتھ اونچی آواز سے بات کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ جو لوگ رسولؐ خدا کے حضور بات کرتے ہوئے اپنی آواز پست رکھتے ہیں وہ در حقیقت وہی لوگ

ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے 'ان کے لیے مغفرت ہے اور اجر عظیم ـ اے نبیؐ! جو لوگ تمہیں حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر بے عقل ہیں ـ اگر وہ تمہارے برآمد ہونے تک صبر کرتے تو انہی کے لیے بہتر تھا' اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے ـ اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو ـ

سورت کا آغاز ہی نہایت ہی محبوب آواز سے ہوتا ہے ـ

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا (۴۹ : ۱) "اے ایمان والو" یہ اللہ کی طرف سے پکار ہے 'ان لوگوں کو جو اللہ پر ایمان بالغیب لانے والے ہیں اور یہ پکار کر اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے دلوں کے اندر جوش و خروش پیدا فرماتا ہے 'کیونکہ اللہ سے مومنین کا تعلق' تعلق ایمان ہے ـ اہل ایمان کے اندر یہ شعور ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے ہیں ـ انہوں نے اللہ کے جھنڈے اٹھا رکھے ہیں اور اس چھوٹے سے سیارے پر یہ لوگ اللہ کے بندے' اللہ کے کارکن اور اس کی فوج ہیں اور ان کو اللہ نے یہاں کسی مقصد کے لیے بھیجا ہے اور اسی لیے اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان کی محبت پیدا کر دی ہے اور ایمان کو ان کے لیے محبوب بنا دیا ہے اور اس فوج میں اللہ نے ان کو بھرتی کر کے ان پر احسان کیا ہے ـ لہٰذا ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ اس موقف پر کھڑے رہیں جہاں اللہ نے ان کے کھڑے کرنے کا حکم دیا ہے اور اللہ کے سامنے وہ یوں کھڑے ہوں جس طرح عدالت میں ایک شخص فیصلے کے انتظار میں کھڑا ہوتا ہے یا ایک ماتحت فوجی اپنے افسر سے ہدایات کے لیے کھڑا ہوتا ہے ـ وہی کرتا ہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے اور اس کام کے لیے تیار ہوتا ہے جس کا اسے حکم دیا جاتا ہے ـ پوری طرح سر تسلیم خم کرتے ہوئے ـ

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۴۹ : ۱) "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول کے آگے پیش قدمی نہ کرو' اور اللہ سے ڈرو' اور وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے" ـ اے ایمان والو' اللہ اور رسول اللہ کے سامنے اپنی مرضی کی تجاویز نہ پیش کرو' نہ اپنے نفوس کے بارے میں نہ اپنے ماحول کی زندگی کے بارے میں اور اللہ اور رسولؐ کا فیصلہ کرنے سے قبل کسی معاملہ پر اپنا فیصلہ خود صادر نہ کرو' اور کسی معاملے میں اللہ اور رسولؐ کا فیصلہ ہو تو اس میں اپنے فیصلے صادر نہ کرو ـ

قتادہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ اپنی ان خواہشات اور تجاویز کا اظہار کرتے تھے کہ کیا ہی اچھا ہو کہ فلاں فلاں معاملے میں احکام آ جائیں ـ اگر اس طرح ہو جائے تو بہت بہتر ہو ـ تو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی ان تجاویز کو ناپسند فرمایا ـ عوفی کہتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ اور رسول اللہؐ کے سامنے باتیں کرنے سے روک دیا گیا ـ مجاہد کہتے ہیں کہ رسول اللہ سے خواہ مخواہ فتویٰ نہ مانگا کرو' خود اللہ جو چاہے نازل فرما دے ـ ضحاک کہتے ہیں 'اللہ اور رسول اللہؐ' اور اصول دین اور قوانین شریعت کو چھوڑ کر اپنے فیصلے نہ کرو' اور علی ابن طلحہ نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ قرآن و سنت کے خلاف نہ کہو ـ

یہ اللہ اور رسول اللہؐ کے معاملے میں فکری اور نظریاتی آداب ہیں ـ اللہ سے ہدایات لینے کرنے اور نافذ کرنے کے یہ آداب ہیں کہ جو حکم آئے اس کی تعمیل کرو اور باقی کے بارے میں خاموش رہو ـ یہی اصول دین اور شریعت کا بہترین

روّیہ ہے ۔ یہ خدا خوفی اور اس کی اس حقیقت پر مبنی ہے کہ اللہ تو سب کچھ دیکھ رہا ہے اور یہ سب باتیں اس مختصر سی آیت میں بتا دی گئی ہیں۔

یوں مسلمانوں کا اللہ اور رسول اللہؐ کے ساتھ تعلق تھا۔کوئی شخص اللہ اور رسول اللہؐ کے سامنے اپنی تجویز نہ دیتا تھا۔کوئی رسول اللہؐ کے سامنے کسی رائے کا اظہار نہ کرتا تھا۔جب تک آپؐ رائے طلب نہ فرمائے۔کوئی بھی کسی معاملے یا حکم میں فیصلہ اس وقت تک نہ کرتا تھا جب تک وہ اللہ اور رسول اللہؐ کے اقوال کی طرف رجوع نہ کرلیتا۔

امام احمد 'ابوداؤد' اور ترمذی نیز ابن ماجہ نے نقل کیا ہے کہ حضورؐ جب حضرت معاذ ابن جبل کو یمن کا گورنر بنا کر بھیج رہے تھے تو ان سے پوچھا کہ تم فیصلہ کس طرح کرو گے انہوں نے عرض کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ تو فرمایا کہ اگر اللہ کی کتاب میں حکم نہ ہو تو عرض کیا کہ سنت رسول اللہ کے ساتھ' آپؐ نے فرمایا اگر سنت میں بھی کوئی ہدایت نہ پاؤ تو انہوں نے کہا میں اپنی رائے کے مطابق اجتہادی فیصلہ کروں گا۔یہ سن کر حضورؐ نے ان کے سینے پر ضرب لگائی اور فرمایا خدا کا شکر ہے کہ اللہ نے رسول خدا کے نمائندے کو وہ توفیق دی جو رسول اللہؐ کی خواہش تھی۔

اور دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ ان سے پوچھ رہے تھے کہ آج کون سا دن ہے جس میں تم ہو۔اور وہ جگہ کون سی ہے جہاں تم ہو۔وہ سب جانتے تھے لیکن وہ سب جواب دیتے ہیں کہ اللہ اور رسول اللہ بہت زیادہ جانتے ہیں اور یہ وہ اس لیے کہتے تھے کہ کہیں ان کا قول اللہ اور رسولؐ سے پیش قدمی نہ ہو جائے۔

ابوبکرہ نقیع ابن الحارث رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آتا ہے کہ حجتہ الوداع کے موقعہ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا :یہ کون سا مہینہ ہے؟ ہم نے کہا اللہ اور رسول اللہ زیادہ جانتے ہیں۔حضورؐ خاموش ہوگئے اور ہم نے یہ خیال کیا شاید مہینے کا نام بدل گیا ہے اور حضورؐ کوئی دوسرا نام لیں گے۔تو حضورؐ نے فرمایا کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے ہم نے کہا ہاں' رسول خداؐ یہ ذوالحجہ ہے۔آپؐ نے فرمایا یہ کون سا شہر ہے؟ ہم نے کہا اللہ اور رسول خدا زیادہ جانتے ہیں تو حضورؐ خاموش ہو گئے اور ہمارا خیال ہوا کہ شاید حضور بلد حرام کا نام بدل دیں گے۔آپ نے فرمایا کیا یہ بلد حرام نہیں ہے؟ تو ہم نے کہا کہ ہاں۔تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ کون سا دن ہے؟ تو ہم نے کہا اللہ اور رسول اللہؐ زیادہ جانتے ہیں۔آپ خاموش ہوگئے اور ہم نے کہا کہ شاید حضورؐ اس کا نام بدل دیں گے آپ نے فرمایا کیا یہ یوم النحر نہیں ہے؟ ہم نے کہا ہاں...

یہ تھی صورت حال جناب نبویؐ میں صحابہ کرامؓ کے ادب اور احترام کی۔نہایت احتیاط' تقویٰ' خشیت۔یہ آیات نازل ہونے کے بعد ان کے اندر یہ ادب اور احترام پیدا ہوا تھا۔کیونکہ ان آیات میں کہا گیا کہ اللہ سے ڈرو اور اللہ سمیع وعلیم ہے۔

دوسرا ادب و احترام یہ تھا کہ حضور اکرمؐ کے ساتھ گفتگو میں آداب نبوت کو ملحوظ رکھو۔نہایت احترام سے اور دلی احترام سے بات کرو۔تمہاری حرکات اور تمہاری آواز سے احترام ظاہر ہو۔آپ کی شخصیت نور آپ کی مجلس اور گفتگو نہایت ہی ممتاز ہو۔اللہ تعالیٰ نہایت ہی پسندیدہ انداز میں ان کو ڈراتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۴۹ : ۲) ''اے لوگو جو

ایمان لائے ہو' اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو' اور نہ نبی سے اونچی آواز سے بات کرو' جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو" ۔ ایمان لانے والوں سے خطاب کر کے اس بات کا اظہار کر دیا کہ تمہارا وقار ایمان سے ہے اور ایمان تمہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے ۔ نبی کی بارگاہ میں ذرا بھی بے احتیاطی سے اعمال غارت ہو جائیں گے اور تمہارے اعمال اسی طرح بے اثر ہو جائیں جس طرح ہنا کٹا جانور زہریلی گھاس سے آناً فاناً ختم ہو جاتا ہے ۔ تمہیں پتہ بھی نہ ہو گا اور اعمال ضائع ہو چکے ہوں گے ۔

صحابہ کرامؓ کے دلوں کے اندر اس محبوب اور پیاری آواز نے وہ اثر کر لیا تھا جس کی مثال نہیں ملتی ۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں: بشر ابن صفوان سے' انہوں نے نافع ابن عمر سے انہوں نے 'ابن ابوملیکہ سے وہ کہتے ہیں کہ قریب تھا کہ صحابہ میں سے دو برتر مقام کے لوگ ابوبکر اور عمر ہلاک ہو جائیں ۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے باہم تکرار کی جب بنو تمیم کا وفد آیا تھا ۔ یہ نو ہجری کی بات ہے ایک نے کہا کہ اقرع ابن حابس کو امیر بنائیں یہ اشجع کے موالی میں سے تھا' دوسرے صاحب نے ایک دوسرے شخص کے بارے میں کہا' مجھے نام یاد نہیں ہے (دوسری روایت میں 'قعقاع ابن معبد آیا ہے) حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا' تم تو میرے خلاف ہی کرتے ہو ۔ حضرت عمرؓ نے کہا میرا ارادہ آپ کی مخالفت کا نہ تھا ۔ اس معاملے میں ان کی آوازیں بلند ہو گئیں ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۴۹ : ۲) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو' اور نہ نبی سے اونچی آواز سے بات کرو' جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو" ۔ ابن الزبیرؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت عمرؓ حضورؐ سے اس قدر آہستہ بات کرتے کہ آپ کو پوری طرح نہ سناتے اور حضورؐ ان سے دوبارہ پوچھتے ۔ اور حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو انہوں نے کہا اے رسول خدا میں آپ سے صرف کانا پھوسی میں بات کروں گا ۔

امام احمد روایت کرتے ہیں سلیمان ابن مغیرہ سے انہوں نے ثابت سے انہوں نے حضرت انس ابن مالک سے وہ کہتے ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُ عْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۴۹ : ۲) "اے لوگو جو یمان لائے ہو' اپنی بی کی آواز سے بلند نہ کرو' اور نہ نبی سے اونچی آواز سے بات کرو' جس طرح تم آپس میں ایک ے سے کرتے ہو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو" ۔ تو ثابت ابن قیس ن الشماس نہایت اونچی آواز والے تھے وہ کہنے لگے "میں ہی تھا جو رسول اللہؐ پر اپنی آواز بلند کرتا تھا ۔ میں ہی جہنمی ہوں اور

میرے ہی اعمال گئے" وہ گھر میں نہایت ہی مغموم ہو کر بیٹھ گئے ۔ تو رسول اللہؐ نے محسوس کیا کہ یہ شخص نہیں آ رہے ہیں ۔ بعض لوگ ان کے پاس ہو گئے کہ آپ کی غیر حاضری کو رسول اللہ نے محسوس کیا ہے ۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ کی آواز سے تو میری آواز بلند ہوتی ہے اور میں ہی اونچی آواز سے باتیں کیا کرتا تھا ۔ میرے تو اعمال ہی ضائع ہو گئے ۔ لازماً میں جہنمی ہوں ۔ یہ لوگ حضورؐ کے پاس آئے ۔ آپؐ کو اطلاع دی کہ وہ تو یہ کہتے ہیں ۔ تو حضورؐ نے فرمایا نہیں "وہ تو اہل جنت میں سے ہیں"۔ حضرت انس فرماتے ہیں وہ ہم میں پھرتے اور ہم یہ سمجھتے کہ یہ جا رہا ہے جنتی!

غرض "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو" کے محبت آمیز انداز گفتگو کے ساتھ مومنین کو جو کال دی گئی اس سے وہ کانپ اٹھے اور آیندہ کے لیے جناب رسالت میں نہایت خاموشی سے سہم کر بیٹھتے کہ کہیں ان کے اعمال ضائع نہ ہو جائیں ۔ اور ان کو اس کا شعور ہی نہ ہو کیونکہ شعوری طور پر تو وہ بہت محتاط تھے لیکن ان کو زیادہ ڈر اس بات کا تھا کہ غیر شعوری حالت میں ان کا نقصان نہ ہو جائے ۔ اس لیے وہ بہت ڈر گئے تھے ۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کی خدا خوفی اور رسول اللہؐ کے ہاں ان کے ان آداب کا اظہار نہایت ہی عجیب پیرائے میں کیا ہے ۔

إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ (۴۹ : ۳) "جو لوگ رسول خداؐ کے ہاں بات کرتے ہوئے اپنی آواز کو پست رکھتے ہیں وہ در حقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے ۔ ان کے لیے مغفرت ہے اور اجر عظیم ہے"۔

تقویٰ اور خدا خوفی اللہ کی ایک عظیم بخشش ہے ۔ اللہ ہی اس اعزاز اور نعمت کے لیے دلوں کا انتخاب کرتا ہے ۔ اس امتحان اور اختیار اور خلوص اور طہارت قلبی کے بعد پھر ان دلوں کو تقویٰ دیا جاتا ہے ' لہذا یہ نعمت انہی دلوں کو دی جاتی ہے جو اس کے لیے تیار ہوں اور یہ ثابت ہو جائے کہ یہ دل تقویٰ کے مستحق ہیں اور جو لوگ اپنی آوازیں رسول اللہؐ کے ہاں نیچی رکھتے ہیں ایسے لوگوں کو تقویٰ کے لیے منتخب کیا گیا اور اس انعام کے ساتھ یعنی تقویٰ عطا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو مغفرت بھی دی جاتی ہے ۔

انتہائی ڈراوے کے بعد یہ ایک گہری ترغیب ہے ۔ اس طرح اللہ اپنے مختار بندوں کے دلوں کو تربیت فرماتا ہے اور ان کو اس عظیم کام کے لیے تیار کرتا ہے اور اسی انداز تربیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے آغاز میں جماعت صحابہ کو تیار فرمایا تھا ۔ یہ لوگ ہدایت پر تھے اور روشنی کے حامل تھے ۔

امیر المومنین عمر ابن الخطابؓ سے روایت ہے کہ آپ نے مسجد نبویؐ میں دو آدمیوں کی آواز سنی ' ان کی آوازیں بلند ہو گئیں ۔ وہ آئے اور انہوں نے فرمایا : کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم کہاں ہو؟ اس کے بعد ان سے کہا تم کہاں سے آئے ہو ' انہوں نے کہا ہم اہل طائف سے ہیں ۔ یہ سن کر حضرت عمر نے فرمایا اگر تم اہل مدینہ سے ہوتے تو میں تمہاری خوب خبر لیتا ۔

علمائے امت نے اس بات کو سمجھا اور فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس بلند آواز سے بات کرنا منع ہے جبکہ آپ کی زندگی میں مسجد نبوی میں اونچی آواز سے بات کرنا ممنوع تھی ۔ ہر حال میں ممنوع تھا بوجہ احترام ۔

اس کے بعد ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا جو ۹ ہجری کو پیش آیا۔ فتح مکہ کے بعد ہر طرف سے وفود آرہے تھے۔ بنی تمیم کا ایک وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آیا۔ یہ لوگ خالص خشک دیہاتی تھے۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرات کے سامنے جن میں ازواج مطہرات بھی تھیں کھڑے ہو کر پکارا 'محمد' ذرا باہر آیئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس طریقے کو ناپسند فرمایا کیونکہ یہ طریقہ نہایت اجڈ اور پریشان کن تھا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۴۹ : ۴) وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۴۹ : ۵)

"اے نبیؐ جو لوگ تمہیں حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔ اگر وہ تمہارے برآمد ہونے تک صبر کرتے تو انہی کے لیے بہتر تھا۔ اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے"۔ اللہ نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ ان میں سے اکثر عقلمند نہیں ہیں۔ اور ان کی اس حرکت کو ان کے لیے مکروہ کر دیا کیونکہ وہ اسلامی آداب کے خلاف تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کے مقام کے ساتھ جس قدر احترام کا تعلق ہونا چاہئے تھا' یہ اس کے خلاف تھا۔ آپ مسلمانوں کے قائد اور مربی تھے اور خدا کے نبی تھے۔ اس لیے ان سے کہا گیا کہ ان کے لیے مناسب تھا کہ صبر کرتے اور انتظار کرتے تا آنکہ حضورؐ اپنے معمول کے مطابق باہر نکل آتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو توبہ و استغفار کرنے اور اللہ کی طرف رجوع کی ترغیب دی۔

مسلمانوں نے ان آداب کو خوب سمجھا۔ انہوں نے رسول اللہ کی شخصیت سے آگے بڑھ کر ہر استاد اور ہر عالم دین کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا۔ ایسی شخصیات کو انہوں نے گھروں کے اندر پریشان نہ کیا۔ اور ان کے نکلنے کا انتظار کیا۔ کبھی اساتذہ کے گھروں کے اندر گھسنے کی کوشش نہ کی۔ ایک اور مشہور راوی اور عالم ابو عبید کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے کسی عالم کا دروازہ کبھی نہیں کھٹکھٹایا۔ ہمیشہ انتظار کیا کہ وہ نکل آئیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ (۴۹ : ٦) "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو"۔

اہل ایمان کو پہلی پکار یہ تھی کہ تم نے رہنمائی کہاں سے لینی ہے اور تمہاری قیادت کہاں ہے۔ دوسری پکار۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ یہ تھی کہ اس قیادت کے حقوق اور ملنے کے آداب یہ ہیں۔ یہ دونوں باتیں تو اس سورت کی بیشتر ہدایات اور آداب اور قوانین کی بنیاد تھیں۔ کیونکہ مسلمانوں کو یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ ہدایت و ارشاد کا سرچشمہ کہاں ہے۔ اور یہ بھی بتانا ضروری تھا کہ مرشد اور قائد کا احترام اور مقام کیا ہے تاکہ قائد کا بھی احترام ہو اور جو ہدایات وہ دیتا ہے ان کو بھی سنجیدگی سے لیا جائے۔ یہ تیسری پکار اور ہدایت اس لیے ہے کہ اس جدید سوسائٹی میں خبروں کے سلسلے میں پالیسی کیا ہو گی اور خبر سن کر ایک عام آدمی کا رد عمل کیا ہونا چاہئے؟ تو یہ کہا گیا کہ یہ خبر بھی قائد کے

پاس جانی چاہئے اور ہر خبر کی تفتیش اور تحقیق ہونی چاہئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا

عَلٰي مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ (۴۹ : ۶) "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو" ۔ یہاں فاسق کی تخصیص اس لیے کی گئی ہے کہ فاسق پر بدگمانی کی جا سکتی ہے اور یہ تخصیص اس لیے کر دی گئی کہ لوگ اسلامی جماعت میں قابل اعتماد لوگوں کے تصرفات و اقدامات پر بھی شک نہ کریں ۔ اور معلومات کے سلسلے میں اعتبار کے بجائے شک ایک اصول نہ بن جائے کیونکہ ایک اسلامی جماعت میں اصول تو یہی ہو گا کہ اس کے ارکان کی خبروں پر اعتبار کیا جائے گا اور ان پر عمل ہو گا ۔ رہا وہ شخص جو فاسق ہے تو اس کی خبروں کی تصدیق ضروری ہو گی کیونکہ اس پر شبہ کیا جا سکتا ہے ۔ یوں ایک اسلامی جماعت میں خبروں کے اعتبار اور عدم اعتبار لینے یا نہ لینے کے بارے میں ایک معتدل قاعدہ بن جائے گا ۔ کسی فاسق کی خبر پر فوراً عمل نہ ہو گا ۔ یہ نہ ہو کہ کسی پر کوئی زیادتی ہو جائے ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ جلد بازی کی وجہ سے ہو جائے گی ۔ اور بعد میں اسلامی سوسائٹی کو نادم ہونا پڑے ۔ ایسا کام کر لیا جائے جس سے اللہ ناراض ہو' کیونکہ یہ ایک ایسے فعل کا مصدر ہو جائے گا جو حق اور عدل کے پیمانوں پر پورا نہ اترتا ہو ۔

ابن کثیر نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت ولید ابن عقبہ ابن ابومعیط کے بارے میں نازل ہوئی ہے ۔ ان کو رسول اللہ نے بنی المصطلق کے پاس زکوٰۃ کی وصولی کے لیے بھیجا ۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ مجاہد اور قتادہ نے یوں کہا ہے کہ رسول اللہؐ نے ولید ابن عقبہ کو بنی المصطلق کی طرف بھیجا کہ ان کو صدقہ دیں ۔ انہوں نے اسے قبول کیا ۔ وہ واپس آئے اور کہا کہ بنی المصطلق جمع ہو رہے ہیں کہ آپؐ سے جنگ کریں اور بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ اسلام سے بھی مرتد ہو گئے ہیں ۔ رسول اللہ نے خالد ابن ولیدؓ کو بھیجا اور حکم دیا کہ معاملے کی تحقیق کریں اور جلد بازی نہ کریں ۔ وہ گئے اور ان کی آبادی کے قریب رات کو پہنچے ۔ انہوں نے اپنے جاسوس بھیجے جب وہ واپس آئے تو انہوں نے اطلاع دی کہ یہ لوگ تو پختہ مسلمان ہیں اور انہوں نے اذان دی اور نماز پڑھی ۔ صبح کے وقت ان کے پاس حضرت خالد بن ولیدؓ آئے تو پسندیدہ بات دیکھی جس پر انہیں تعجب ہوا ۔ حضرت خالد واپس ہوئے اور رسول اللہؐ کو اطلاع دی ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔ قتادہ کہتے ہیں حضور اکرمؐ فرماتے ہیں "تحقیق اللہ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے" ۔ نیز دوسرے سلف صالحین نے بھی یہ لکھا ہے ' مثلاً ابن ابولیلی' یزید ابن رومان' ضحاک' مقاتل ابن حیان وغیرہ نے کہ یہ آیت ولید ابن عقبہ کے بارے نازل ہوئی' واللہ اعلم ! (اختتام اقتباس از ابن کثیر)

لیکن آیت کا مفہوم عام ہے ۔ اصول یہ ہے کہ فاسق آدمی کی بات کی تحقیق و تفتیش کی جائے گی ۔ رہے صالح لوگ تو ان کی باتوں پر عمل ہو گا کیونکہ ایک مومن جماعت کے اندر یہ اصول ہے کہ ہر شخص کی بات پر اعتبار ہو گا ماسوائے فاسق کے ۔ اور صالح آدمی کی بات پر اعتبار ہی تفتیش و تحقیق کا ذریعہ ہے ۔ رہی یہ بات کہ ہر معاملے میں شک کیا جائے اور ہر خبر کو جھوٹا تصور کیا جائے الا یہ کہ وہ ثابت ہو جائے تو یہ اسلامی سوسائٹی کا اصول نہیں ہے ورنہ کسی بھی سوسائٹی میں کوئی اجتماعی کام چل ہی نہ سکے گا ۔ اسلام زندگی کو معمول کے مطابق چلنے دیتا ہے ۔ وہ احتیاطی تدابیر بے شک اختیار کرتا ہے مگر

اس لیے کہ زندگی کا معمول چلتا رہے ۔ اس لیے نہیں کہ زندگی معطل ہو کر رہ جائے ۔ یہ ہے نمونہ اسلامی اصول کا کہ خبروں کے اخذ و رد میں اس کا اصول کیا ہے ۔

یہ ممکن ہے کہ ولید ابن عقبہ نے ابتدا میں جو اطلاعات فراہم کیں ' ان کے نتیجے میں بعض لوگوں نے بنی المصطلق کو سخت سزا دینے کی تجویز کی ہوگی ۔ یہ اس لیے کہ اس وقت دین اسلام کے لیے بے حد جوش اور جذبہ پایا جاتا تھا اور اس لیے بھی کہ زکوٰۃ کا انکار کر دینا بہت بڑا جرم تھا ۔ چنانچہ اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ تمہارے اندر رسول اللہ ابھی موجود ہیں اور رسول اللہ کی موجودگی کو ذرا سمجھنے کی کوشش کرو کیونکہ آپ ؐ کا تو خدا سے رابطہ قائم ہے ۔

وَاعْلَمُوٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ
الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ
اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ
وَنِعْمَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا
فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى
تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ
اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَ ۱
اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ ۱۰ع

خوب جان رکھو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے ۔ اگر وہ بہت سے معاملات میں تمہاری بات مان لیا کرے تو تم خود ہی مشکلات میں مبتلا ہو جاؤ ۔ مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے لیے دل پسند بنا دیا اور کفر و فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا ۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل و احسان سے راست رو ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے ۔ اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے ۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۔ مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں ' لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو ' امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا " ۔ ۱۳

وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ( ۴۹ : ۷ ) " خوب جان رکھو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے " ۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ حضور ؐ اس وقت موجود تھے لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ

ایک عظیم حقیقت ہے۔ کیا کوئی یہ بات تصور کر سکتا ہے کہ آسمان کا زمین کے ساتھ دائمی رابطہ ہو جائے اور یہ رابطہ ہر وقت بحال رہے اور لوگوں کو نظر آئے۔ اور ہم یہ کہیں کہ ارادۂ الٰہی اہل زمین کے لیے متوجہ ہے۔ لوگوں کو ان کے حالات بتائے جا رہے ہیں۔ ان کی خفیہ باتیں ان کو بتائی جا رہی ہیں۔ ان کی ظاہری باتوں سے ان کو خبردار کیا جا رہا ہے اور ان کی غلطیوں کو فوراً درست کیا جاتا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنے دل کی بات چھپاتا ہو لیکن آسمان سے اطلاع آ جاتی ہے کہ یہ سوچا جا رہا ہے۔ اللہ رسول اللہ کو فوراً بتا دیتا ہے اور ہدایت کر دیتا ہے کہ یہ ہدایات میرے بندوں کو دے دو' حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی بات ہے۔ یہ ایک بہت بڑی خبر ہے اور یہ ایک عظیم حقیقت ہے۔ بعض اوقات ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ کو اپنے درمیان چلتا پھرتا پاکر' بعض لوگ اس طرف متوجہ نہ ہوں۔ اس لیے ان کو متوجہ کیا جا رہا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ (۹ ۴ : ۷) "خوب جان رکھو کہ تمہارے درمیان رسول اللہ موجود ہیں"۔ اس کو جانو' اور اس کی قدر کرو' یہ تو ایک عظیم معاملہ ہے۔

اور رسول اللہ کی موجودگی کو جانو' اس کے تقاضے یہ ہیں کہ رسول اللہ کی جانب سے کوئی فیصلہ آنے سے پہلے ہی فیصلے نہ کرتے پھرو۔ کیونکہ رسول اللہ کے فیصلے وحی یا الہام پر مبنی ہیں۔ اور اللہ کی ہدایات پر رسول اللہ جو فیصلے فرماتے ہیں انہی میں خیر و برکت ہے۔ اور اگر رسول اللہ تمہاری ہی باتوں کے پیچھے چلیں تو تم اپنی نادانی سے اپنے آپ کو مشکلات میں مبتلا کر دو گے کیونکہ رسول اللہ کے فیصلے اللہ کے الہام پر مبنی ہیں۔ اور اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ بندوں کی بہتری کس میں ہے۔ رسول اللہ کی موجودگی تو بڑی رحمت ہے۔ آپ کی تدبیر اللہ کی تدبیر ہے اور آپ کا کہا' اللہ کا کہا ہے۔

لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ (۹ ۴ : ۷) "اگر وہ بہت سے معاملات میں تمہاری بات مان لیا کریں تو تم خود ہی مشکلات میں مبتلا ہو جاؤ گے"۔ اس معاملے میں تمہارے لیے مشورہ ہے کہ اپنے امور کو اللہ اور رسول اللہ کے حوالے کر دو اور پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ اور اللہ کی تقدیر کے آگے اور اللہ کی تدبیر کے سامنے سر تسلیم خم کر دو' اللہ کے احکام کو مانو اور اللہ کے سامنے اپنی تجاویز مت رکھو۔

اس کے بعد ان کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ تم کو ایمان کی جو نعمت دی گئی ہے' اس کی قدر کرو' یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے ایمان کو محبوب بنایا' تمہارے دلوں میں ایمان کو خوبصورت بنا دیا' تم نے اسے قیمتی جانا' تمہارے دل اس سے لگ گئے' اور کفر کو تمہارے دلوں کے لیے مکروہ بنا دیا۔ فسق و معصیت کو تم ناپسند کرنے لگے۔ یہ اللہ کی بڑی ہی رحمت اور کرم تھا۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ (۹ ۴ : ۷) فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹ ۴ : ۸) "مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے لیے دل پسند بنا دیا اور کفر اور فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل و احسان سے راست رو ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے"۔

اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کے دلوں کو ایمان کے لیے کھول دینا' ان کے دلوں کو ایمان کے ساتھ متحرک کر دینا' ان کے دلوں کے لیے ایمان کو حسین بنا دینا کہ وہ اس کی طرف لپکیں' اور ایمان کے کمالات و جمالات دیکھ سکیں' یہ دراصل ان بندوں پر بہت ہی بڑا فضل و کرم ہے اور بہت ہی بڑی نعمت ہے ۔ اس کے مقابلے میں ہر نعمت ہیچ ہے ۔ یہاں تک کہ انسان کی زندگی اور اس کا وجود بھی ہیچ ہے ۔ انسان کا وجود اور اس کی پوری زندگی بھی ایمان کے مقابلے میں کم قیمت ہے اور ادنیٰ ہے ۔ عنقریب یہ آیت آنے والی ہے ۔

بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ (۹ ٤ : ۱۷) "بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ تمہیں اس نے ایمان کی طرف ہدایت کی" ۔ مفصل بات وہاں آئے گی' ان شاء اللہ !

جو بات یہاں فکر و نظر کے لیے دامن کش ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو یاد دلا رہا ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے اس بھلائی کا ارادہ کیا ۔ اور یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے دلوں سے یہ شر نکالا ۔ یعنی کفر' فسق اور معصیت کا شر ۔ اور یہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے فضل و کرم سے تمہیں راہ راست پر لگایا ہے ۔ اور یہ سب کام اللہ نے اپنے علم و حکمت کی بنا پر کیا اور یہ اطمینان دلایا کہ اس کے نتیجے میں تمہارے لیے خیر اور برکت ہوگی ۔ اس لیے تم جلد بازی نہ کرو' اللہ اور رسول اللہؐ کے سامنے تجاویز نہ رکھو اور حکم سے پہلے جوش و خروش نہ دکھاؤ کیونکہ اللہ ہی تمہارے لیے بہتر فیصلے کرتا ہے ۔ اور ابھی تک تو رسول تمہارے اندر موجود ہیں ۔ لہٰذا اپنے معاملات ان کی موجودگی میں اپنے ہاتھ میں نہ لو ۔ یہی مقصد ہے اس تبصرے سے جو اس حکم پر کیا گیا کہ تم اپنے لیے مشکلات پیدا کر لوگے ۔

انسان بہت ہی جلد بازی کرتا ہے ۔ اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے اقدامات سے آگے کیا ہے ۔ انسان اپنے نفس اور دوسروں کی بھلائی کے لیے تجاویز مرتب کرتا رہتا ہے لیکن اس کا علم اس قدر محدود ہے کہ وہ یہ نہیں جانتا کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے ۔

وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهٗ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا "اور انسان شر کی دعا اس طرح کرتا ہے جس طرح کہ خیر کی دعا کی جاتی ہے اور انسان بہت بڑا جلد باز ہے" ۔ اگر انسان اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اسلام میں پورا پورا داخل ہو جائے' اللہ کی پسند کو اپنی پسند بنا لے اور اس بات پر مطمئن ہو جائے کہ اس کے لیے اللہ جس چیز کو پسند کرتا ہے وہ اس کی اپنی پسند سے افضل ہے ۔ وہ اس کے لیے زیادہ مفید اور خیر و برکت لانے والی ہے ' تو انسان راحت اور سکون محسوس کرے ۔ اور اس زمین پر اس کی یہ مختصر زندگی نہایت ہی اطمینان اور خوشی سے گزرے لیکن یہ اللہ کا ایک عظیم احسان ہوتا ہے ۔ اور وہ جس پر چاہتا ہے یہ احسان کرتا ہے ۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۹) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ

اِخوۃٌ فَاَصلِحُوا بَینَ اَخَوَیکُم وَ اتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُم تُرحَمُونَ (۱۰) (۴۹ : ۹ تا

۱۰) ”اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں' لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو' امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا“۔

یہ ایک عملی قانون ہے اور یہ خود اسلامی معاشرے کو جھگڑوں' خصومات اور خانہ جنگی سے بچانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ نہ ہو کہ لوگ ذاتی مفادات اور محض جذبات کے تحت لڑائیاں شروع کر دیں۔ اور یہ قانون اس مناسبت سے بنایا گیا ہے کہ اس سے قبل ایک فاسق کی خبر کے نتیجے میں خود مومنین میں سے ایک گروہ کے خلاف جنگ کے مواقع پیدا کیے گئے تھے۔ مقصد یہ ہے کہ تنازعات سے قبل بھی تفتیش کی جائے کہ غلط خبروں پر تنازعہ نہ شروع ہو اور اگر ہو جائے تو پھر یہ قانون ہے۔

بعض روایات میں اس آیت کے نزول کا سبب بھی متعین حادثہ بتایا جاتا ہے یا یہ کہ بغیر کسی مخصوص واقعہ کے اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات کے لیے قانون بنا دیا ہو۔ بہرحال اسلامی سوسائٹی کو بچانے کے لیے یہ نہایت ہی مضبوط قانون ہے۔ اس کے ذریعہ اسلامی سوسائٹی اور اسلامی حکومت انتشار اور فرقہ بندی اور خانہ جنگی سے محفوظ رہتی ہے اور اجتماعی تصادم کے وقت عدل و انصاف کے قیام کی راہ تجویز کی گئی ہے کہ اصلاح اور انصاف کے ذریعہ اس قسم کے مسائل کو حل کرنے کی تجویز دی گئی ہے۔ اور اس میں بھی خدا خوفی' اللہ کی رحمت کی طلب کو اصل مقصد بنایا گیا ہے۔

ہر آیت کسی مخصوص واقعہ کے سبب نازل ہوئی ہے۔ یا محض فرضی حالت کے لیے یہ قانون بنایا گیا ہو' بہرحال دونوں فریقوں کے بر سرپیکار ہونے کے باوجود دونوں کو مومن کہا گیا ہے اور اس احتمال کے باوجود یہ کہا گیا ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے پر دست درازی کرنے والا ہو۔ بلکہ اس احتمال کے باوجود کہ بعض اوقات دونوں دست درازی کرنے والے ہوں۔

اس صورت میں جو لوگ غیر جانبدار ہوں ان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ دونوں کے درمیان اصلاح کریں۔ اگر اصلاح کے بعد بھی زیادتی کرنے والا گروہ باز نہ آئے اور حق بات یا حق کے فیصلے کے آگے نہ جھکے یا دونوں کی زیادتی کا تعین ہونے کے باوجود دونوں حکم تسلیم نہ کریں یا صلح کو رد کریں تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ باغی اور نافرمان گروہ کے خلاف یا دونوں کے خلاف لڑیں اور ان کے خلاف اس وقت تک جنگ جاری رکھیں جب تک کہ دونوں اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کر دیتے۔ اللہ کا حکم یہ ہے کہ اہل ایمان کے درمیان کسی صورت میں بھی جھگڑا نہ ہو۔ اور جن باتوں میں ان کا اختلاف ہو اور جن کی وجہ سے جنگ شروع ہوئی ہو ان میں وہ اللہ کے احکام کے سامنے جھکیں۔ اگر باغی اللہ کے حکم کو قبول کریں' اور مومنین دونوں کے درمیان مصالحت کرا لیں اور یہ عدل اور انصاف پر مبنی ہو اور اللہ کی اطاعت کی طلب' رضا کے حصول کے لیے ہو تو

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (۹ : ۴۹) "اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔ اور اس قانون کے بعد یہ نصیحت و تبصرہ کہ سب مومن بھائی ہیں کہ اہل ایمان کے درمیان اخوت اور رابطہ قائم ہونا چاہئے۔ یہ اسلامی اخوت ہی ہے جس نے تمہیں ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھا کیا ہے اور صدیوں کی لڑائیوں کے بعد تمہیں باہم الفت بخشی ہے۔ اس لیے اللہ سے ڈرو۔ اسی وجہ سے تم رحمت خداوندی کے سزاوار ہو سکتے ہو۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (۴۹ : ۱۰) "مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو، اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا"۔ اس اخوت کا تقاضا یہ ہے کہ جماعت مسلمہ کے درمیان محبت، سلامتی، تعاون اور اتحاد اصل الاصول ہو اور خلاف و اختلافات اور جنگ و جدال شاذ و نادر ہی ہوں اور اس اصول کے قیام کے لیے دوسرے مسلمانوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے والے مومنین کے خلاف لڑیں یہاں تک کہ وہ انصاف کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ یہ اسلامی سوسائٹی کا اصل الاصول ہے۔ یہ ایک نہایت ہی اہم اقدام ہے اور فیصلہ کن انداز میں ہے۔

اس اصول کا تقاضا یہ ہے کہ جب مسلمان باغیوں کے خلاف جنگ کریں گے تو کسی زخمی کو قتل نہ کریں گے، کسی قیدی کو قتل نہ کریں گے۔ اور معرکہ ترک کیے جانے اور اسلحہ پھینک دینے کے بعد کسی کو سزا نہ دی جائے گی۔ اور باغیوں کے اموال غنیمت میں نہ لئے جائیں گے۔ کیونکہ باغی فریق کے خلاف جنگ کا مقصد یہ ہے کہ انہیں انصاف کے اصولوں پر کیے جانے والے فیصلوں کا پابند کرنا اور اخوت اسلامی کا قیام بحال کرنا ہے۔

اسلامی دستور کا اصل الاصول تو یہ ہے کہ تمام اسلامی علاقوں میں ایک ہی امامت یا خلافت ہو، اور اگر کسی ایک امام کی بیعت ہو جائے تو دوسرے کو قتل کرنا لازمی ہے۔ اور دوسرے امام اور اس کے ساتھیوں کو باغی تصور کیا جانا چاہئے۔ اور تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ پہلے امام کی طرف سے لڑیں گے۔ اس اصول پر حضرت علیؓ نے واقعہ جمل میں اور واقعہ صفین میں باغیوں کے ساتھ جنگ کی اور آپ کے ساتھ صحابہ میں سے جلیل القدر صحابیوں نے حصہ لیا۔ بعض صحابہ کرامؓ نے اس معرکہ میں شرکت نہ کی۔ مثلاً سعد، محمد ابن سلمہ، اسامہ ابن زید اور ابن عمرؓ یا تو اس لیے کہ ان کے ذہنوں میں حق واضح نہ تھا۔ یعنی اس واقعہ میں خود ان کا اپنا ذہن صاف نہ تھا کہ حق کدھر ہے۔ اس لیے انہوں نے اسے فتنہ سمجھا یا اس لیے جس طرح امام جصاص فرماتے ہیں "یا اس لیے کہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ امام کے ساتھ جو فوج ہے، وہ کافی ہے۔ اس کو ان کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے انہوں نے جائز سمجھا کہ وہ بیٹھ جائیں"۔ پہلا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور اس پر ان کے وہ اقوال بھی دلالت کرتے ہیں، جو ان سے مروی ہیں، جیسا کہ بعد میں حضرت ابن عمرؓ کی ایک روایت بتاتی ہے کہ وہ سخت نادم تھے کہ انہوں نے امام کے ساتھ مل کر جنگ نہ کی۔

اس اصول کے اپنی جگہ ہوتے ہوئے بھی ہر قسم کے حالات میں اس قرآنی قاعدے پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایسے استثنائی حالات جن میں عالم اسلام کے مختلف دور دراز علاقوں میں مختلف امامتیں قائم ہوں۔ ایسے حالات استثنائی ہوتے ہیں اور اسلام کے قانون ضرورت کے تحت متعدد امامتیں تصور ہوتی ہیں تو مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر ایک امام کے

ساتھ مل کر باغیوں کے خلاف لڑیں اگر یہ باغی امام کے خلاف بغاوت کریں یا اگر کوئی ایک گروہ دوسرے گروہ کے ساتھ ایک حکومت کے اندر لڑے اور حکومت کو دونوں تسلیم کرتے ہوں۔ اسی طرح مسلمانوں کا یہ بھی فرض ہے کہ اگر باغیوں نے اپنی امامت قائم کر لی ہو جبکہ متعدد امامتیں برائے ضرورت موجود ہوں تو وہ امام کے ساتھ مل کر ان کے خلاف لڑیں۔ اور اس باغی گروہ کے خلاف سب اکٹھے ہو جائیں۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کے سامنے جھک جائے۔ اس طرح یہ آیت ہر قسم کے حالات میں اپنا فیصلہ دیتی ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ یہ نظام جو یہاں تجویز کیا گیا ہے تحکیم اور ثالثی کا نظام ہے اور یہ اس لیے ہے کہ فریقین حکم الہی کے سامنے جھک جائیں۔ یہ نظام قرآن نے اس قسم کے تمام انسانی نظاموں سے پہلے تجویز کیا ہے۔ اور یہ ایک مکمل نظام ہے اور یہ ہر قسم کے عیب اور نقص سے پاک ہے۔ اور اس سلسلے میں انسانوں نے جو نظام بھی بنائے ہیں ان سب میں کئی قسم کے عیب اور غلطیاں ہیں۔ اسلام نے جو نظام تجویز کیا ہے' وہ پاکیزہ' منصفانہ اور نہایت اصولی ہے کیونکہ اس نظام کے تحت فیصلے اللہ کے قانون کے مطابق کیے جاتے ہیں۔ اس میں کسی کی غرض یا کوئی ذاتی خواہش کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ نہ اس میں کوئی نقص اور قصور ہے۔ لیکن بدبخت انسانیت اب بھی ٹھوکریں کھاتی گرتی پڑتی غلط راہوں پر جا رہی ہے حالانکہ اس کے سامنے شاہراہ موجود ہے۔

---

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُونُوا۟ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّن نِّسَآءٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا۟ بِٱلْأَلْقَٰبِ ۖ بِئْسَ ٱلِٱسْمُ ٱلْفُسُوقُ بَعْدَ ٱلْإِيمَٰنِ ۚ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴿١١﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱجْتَنِبُوا۟ كَثِيرًا مِّنَ ٱلظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ ٱلظَّنِّ إِثْمٌ ۖ وَلَا تَجَسَّسُوا۟ وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿١٣﴾

"اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ

عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ـ ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں ـ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو ـ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے ـ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں"ـ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں ـ تجسس نہ کرو ـ اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے ـ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو' تم خود اس سے گھن کھاتے ہو ـ اللہ سے ڈرو' اللہ بڑا توبہ کرنے والا اور رحیم ہے ـ لوگو' ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو ـ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے ـ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے"ـ

قرآن کریم اسلامی نظام حیات کے ذریعہ جو فاضلانہ سوسائٹی قائم کرنا چاہتا ہے اس کے اندر بہت ہی بلند معیار کے آداب و اخلاق ہوتے ہیں ـ اس میں ہر فرد کو عزت نفس حاصل ہوتی ہے اور کوئی فرد کسی فرد کی ہتک عزت نہیں کر سکتا ـ فرد کی یہ عزت سوسائٹی کی عزت کی وجہ سے ہے ـ کیونکہ ایک فرد کی ہتک عزت پوری انسانی سوسائٹی کی ہتک عزت ہے ـ اس لئے کہ انسانی جماعت نفس واحد ہے اور اس کی عزت ایک ہی عزت ہے ـ ایک انسان کی تذلیل پوری انسانیت کی تذلیل ہے ـ

اس آیت میں قرآن کریم 'انہی میٹھے بولوں سے' مسلمانوں کو پکارتا ہے ـ "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو" ـ پھر ان کو اس بات سے منع کرتا ہے کہ کوئی گروہ دوسرے گروہ سے مزاح کرے ـ نہ مرد دوسرے مردوں سے مزاح کریں ـ ہو سکتا ہے جن سے مزاح کیا جاتا ہے وہ دوسروں سے اچھے ہوں ـ نہ عورتیں دوسری عورتوں سے مزاح کریں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جن سے مزاح کیا جا رہا ہے 'اللہ کے پیمانوں میں وہ مزاح کرنے والیوں سے بہتر ہوں ـ

اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ دنیا کی ظاہری قدریں اور بھلائیاں اور برتریاں جو بعض مرد یا بعض عورتیں اپنے اندر رکھتے ہیں ـ یہ دراصل حقیقی برتریاں نہیں ہیں جن کے ساتھ اللہ کے ہاں لوگوں کو تولا جاتا ہے ـ اللہ کے ہاں کچھ اور قدریں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ مزاح کرنے والوں کی نظروں سے وہ اوجھل ہوں' صرف اللہ انہیں جانتا ہو اور ان کے ساتھ اللہ ان بندوں کا وزن مقرر کرتا ہو ـ بعض اوقات امراء فقراء سے مزاح کرتے ہیں' ایک قوی ضعیف سے' ایک مضبوط نوجوان ایک ضعیف سے' ایک ذہین ایک غبی سے' ایک صاحب اولاد بے اولاد سے' ایک مضبوط یتیم سے' ایک خوبصورت عورت بدصورت سے' ایک جوان عورت بوڑھی سے' ایک معتدل عورت بگڑی ہوئی شکل والی سے' ایک امیر عورت غریب سے' لیکن یہ چیزیں تو اس عارضی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں کیونکہ اللہ کے ترازو میں یہ چیزیں بالکل بے وزن ہیں ـ

لیکن قرآن کریم صرف ان ہدایات و اشارات پر ہی اکتفاء نہیں کرتا ـ بلکہ ایمانی اخوت کے جذبہ کو بھی ابھارتا ہے کہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں وہ ایک ہی جسم و جان ہیں' ان میں سے کوئی دوسرے پر طعن کرتا ہے تو وہ خود اپنے اوپر طعن کرتا ہے ـ

وَ لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۴۹ : ۱۱) "اور اپنے ہی نفوس پر طعن نہ کرو" ـ لمز عیب جوئی کو کہتے ہیں لیکن لمز کے

تلفظ میں ایک ترنم اور ایک رنگ ہے ۔ یہ معنوی عیب جوئی نہیں بلکہ جسمانی مار ہے اور آنکھوں سے بھی اشارہ ہے ۔

لوگوں کو ایسے ناموں سے پکارنا جن کو وہ پسند نہیں کرتے اور ان ناموں کے ساتھ پکارے جانے کو مزاح سمجھتے ہیں ۔ اس سے بھی اسلام منع کرتا ہے ۔ مومن کا مومن پر یہ حق ہے کہ وہ اسے اس نام سے نہ پکارے جسے وہ پسند نہ کرے یا اسے ہتک سمجھے ۔ مومنین کے آداب میں یہ شامل ہے کہ وہ دوسرے مومنین کو ایسے ناموں سے نہ پکاریں ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کے زمانے کے کئی نام اور لقب بدل دیئے تھے ۔ حضورؐ نے اپنے تیز احساس سے اور اپنے مہربان دل سے محسوس کیا کہ یہ لوگ ان ناموں کو پسند نہیں کرتے ' جن کے معنی خراب تھے یا جن سے مذمت نکلتی تھی ۔

اس آیت نے پہلے تو یہ اشارہ کیا کہ اللہ کے ترازو میں حقیقی وزن کن باتوں کا ہے ۔ اس کے بعد اسلامی اخوت کے شعور کو اجاگر کیا بلکہ اسلامی وحدت کے شعور کو جوش دلایا ۔ اس کے بعد اب ایمانی شعور کو ابھارا گیا اور مومنین کو ڈرایا گیا کہ تم سے کہیں ایمانی شعور گم نہ ہو جائے ۔ مزاح ' طعن و تشنیع اور برے ناموں سے ایک دوسرے کو پکارنے سے تم فاسق نہ بن جاؤ ۔

بِئْسَ الاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ( ۴۹ : ۱۱ ) " ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے " ۔ ان آداب کو ملحوظ نہ رکھنا ایک قسم کا ارتداد ہے اور یہ ظلم ہے اور ظلم شرک ایک ہی چیز ہوتے ہیں ۔

وَ مَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ( ۴۹ : ۱۱ ) " اور جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں " ۔ یہ ہیں اسلام کے فاضلانہ معاشرے کے آداب و اخلاق اور اس کے خدوخال ۔

---○○○---

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَ لَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ ( ۴۹ : ۱۲ ) " اے لوگو جو ایمان لائے ہو ' بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں ۔ تجسس نہ کرو ۔ اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے ۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا ؟ دیکھو ' تم خود اس سے گھن کھاتے ہو ۔ اللہ سے ڈرو ' اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے " ۔

یہ آیت اس فاضلانہ معاشرہ کی حفاظت کے لیے ایک دوسری باڑ ہے ۔ جس میں ایک فرد کی آزادی اور اس کی عزت محفوظ ہوتی ہے ' اسی طرح ان کو یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے شعور اور اپنے ضمیر کا اظہار کس طرح کریں گے ۔ اور دوسروں کے بارے ان کی سوچ آئندہ کیا ہوگی ۔ یہ نہایت ہی موثر انداز میں بیان ہوا ہے ۔

اس کا آغاز بھی اس پیاری آواز سے ہوتا ہے " اے لوگو ' جو ایمان لائے ہو " ۔ اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ دوسروں کے بارے میں بہت زیادہ گمان اور برے گمان کرنے سے باز رہو ۔ کسی کے بارے میں اپنے فیصلے شکوک و شبہات پر نہ کرو ۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے ۔

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (۴۹ : ۱۲) "کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں"۔ زیادہ زور بعض الظن پر ہے۔ یعنی بعض گمان گناہ ہوتے ہیں یعنی بدگمانی گناہ ہے۔ کیونکہ کوئی یہ معلوم تو نہیں کر سکتا کہ میرا کون سا ظن صحیح اور کون سا غلط ہے لہٰذا کسی پر کوئی بدگمانی نہیں کرنا چاہئے۔

لہٰذا مسلمانوں کو ایک دوسرے کے بارے میں اچھا گمان ہی رکھنا چاہئے اور ہر قسم کے شکوک و شبہات سے دلوں کو صاف رکھنا چاہئے۔ اور جس سوسائٹی میں ایک دوسرے کے خلاف شکوک و شبہات نہ ہوں اس میں لوگوں کے دل ایک دوسرے سے صاف ہوتے ہیں۔ کوئی کسی پر شک نہیں کرتا۔ ہر شخص دوسرے سے مطمئن ہوتا ہے اور ایسے معاشرے میں زندگی کس قدر خوشی سے گزرتی ہے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن اسلام کے روشن معاشرے میں یہ اصول صرف انفرادی تعامل ہی میں مروج نہیں ہے' بلکہ یہ اجتماعی معاملات میں بھی ایک اہم اصول ہے۔ اور اس سے لوگوں کے حقوق کی حفاظت ہوتی ہے۔ اسلام کے پاکیزہ معاشرے میں کسی کو محض شک اور شبے کی بنیاد پر نہیں پکڑا جاتا' نہ شبہات کی بنیاد پر مقدمے قائم کیے جاتے ہیں۔ شک کی بناپر لوگوں کو جیلوں میں نہیں ٹھونسا جاتا۔ بلکہ شک کی بنیاد پر کسی کو دائرہ تفتیش میں لانا بھی جرم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم نے بدگمانی شروع کر دی تو پھر کوئی تفتیش نہیں ہے"۔ (طبرانی) یعنی اگر کوئی تفتیش بھی کرتا ہے تو لوگوں کو بے گناہ سمجھ کر تفتیش شروع کرو' ان کی آزادی بحال ہو' ان کے حقوق محفوظ ہوں۔ ان کا اعتبار و وقار بحال ہو۔ کسی کو اس وقت پکڑا جائے جب اچھی طرح معلوم ہو کہ اس نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ محض تفتیش اور شک کے لیے کسی کو ہراساں نہیں کیا جا سکتا۔

سبحان اللہ' کیا مقام بلند ہے جہاں تک یہ آیت انسانی آزادیوں' انسانی حقوق' انسانی اعتماد و اعتبار' اور انسانی وقار کو پہنچاتی ہے۔ اس مقام تک آج کے نام نہاد مہذب اور جمہوری معاشرے بھی نہیں پہنچ سکتے جہاں تک اسلام نے عملاً ایک سوسائٹی کے ضمیر کو پہنچایا' پھر یہ معیار عملاً ایک سوسائٹی میں قائم کیا اور آج سے چودہ سو سال قبل۔ اسی اصول کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے شک کے دائرے کو اور محدود کیا جاتا ہے۔

وَّلَا تَجَسَّسُوْا (۴۹ : ۱۲) "تجسس نہ کرو"۔ بسا اوقات تجسس بدگمانی ہی کے نتیجے میں ہوتا ہے اور بعض اوقات لوگوں کے راز معلوم کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اور لوگوں کی کمزوریاں معلوم کرنے کے لیے۔ قرآن کریم اس گھٹیا حرکت کو اخلاقی نقطہ نظر سے لیتا ہے۔ اور لوگوں کے دلوں کو اس قسم کے برے خیالات سے پاک کرتا ہے کہ کوئی کسی کے خفیہ حالات معلوم کرے اور اس کی کمزوریوں کے ٹوہ میں لگا رہے کیونکہ اخلاقی تطہیر میں اس کے مقاصد یہی ہیں کہ لوگوں کی پوشیدہ کمزوریوں کو نہ اچھالا جائے۔

لیکن یہ اصول محض اخلاقی ضابطے سے بھی آگے جاتا ہے۔ اس کا تعلق اجتماعی پاکیزگی اور قانونی اور انتظامی معاملات سے بھی ہے۔ اسلام میں لوگوں کی بعض آزادیاں' بعض عزتیں اور بعض شرافتیں ایسی ہیں کہ ان پر کسی صورت میں دست درازی جائز نہیں ہے۔

اسلام کے فاضلانہ معاشرے میں لوگوں کی جان' ان کی چار دیواری' ان کے راز' ان کی خفیہ کمزوریاں محفوظ ہوتے

ہیں ۔ کسی وجہ سے بھی کوئی کسی کی جان 'کسی کے گھر 'کسی کے رازوں اور کسی کی کمزوریوں پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ یہاں تک کہ اسلام میں ادارۂ تحقیق و تفتیش جرائم کو بھی یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ تجسس کرے ۔ اسلام لوگوں کے ساتھ ان کے ظاہری حالات کے مطابق برتاؤ کرتا ہے اور کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کے گھر کے اندر گھس کر اندرونی حالت معلوم کرے ۔ اسلام ظاہری جرائم اور خلاف ورزیوں ہی پر پکڑتا ہے ۔ کسی کو ظن یا توقع پر نہیں پکڑا جاتا کہ ان لوگوں نے جرم کیا ہے یا کرنے والے ہیں ۔ اسلام میں پکڑ دھکڑ 'ارتکاب جرم کے بعد ہے ۔ اس طرح گرفتاری کے لیے دوسرے تحفظات ہیں جو ہر جرم کے لیے علیحدہ ہیں ۔

امام ابوداؤد نے روایت کی ہے 'ابوبکر ابن شیبہ سے انہوں نے ابومعاویہ سے انہوں نے اعمش سے انہوں نے زید ابن وہب سے 'وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود آئے ۔ ان سے کہا گیا یہ فلاں ہے اور اس کی داڑھی سے شراب کے قطرے گر رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ہمیں تو تجسس سے منع کیا گیا ہے ۔ ہاں اگر کوئی چیز ہم پر ظاہر ہوگئی کہ اس کا ارتکاب کیا گیا ہے تو ہم پکڑتے ہیں ۔ اور مجاہد نے کہا کہ تجسس نہ کرو 'لوگوں کو ان کے ظاہری افعال پر پکڑو ۔ جو بات اللہ نے چھپا دی ہے اسے چھپا رہنے دو ۔

امام احمد نے دجین کاتب عقبہ سے روایت کی ہے 'وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عقبہ سے کہا کہ ہمارے بعض پڑوسی شراب پیتے ہیں ۔ میں ان کے خلاف پولیس کو بلانے والا ہوں کہ ان کو پکڑ لیں تو حضرت عقبہ نے کہا کہ ایسا نہ کرو 'بلکہ ان کو نصیحت کرو اور دھمکی دو ۔ کہتے ہیں انہوں نے ایسا کیا 'وہ باز نہ آئے تو دجین پھر ان کے پاس آئے کہ میں نے تو انہیں روکا وہ نہ رکے ۔ اب تو میں ان کے لیے پولیس بلانے ہی والا ہوں ۔ اس کو عقبہ نے کہا 'تم ہلاک ہو جاؤ! ایسا نہ کرو 'میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے "جس نے ایک مومن کی پردہ پوشی کی اس نے گویا ایک زندہ درگور کی ہوئی لڑکی کو قبر سے نکال لیا" ۔ (ابوداؤد سجستانی)

سفیان ثوری نے راشد ابن سعد سے 'انہوں نے حضرت معاویہ ابن ابوسفیان سے 'روایت کی ہے وہ کہتے ہیں میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا "تم اگر لوگوں کی خفیہ باتوں کی ٹوہ میں لگو گے تو ان کو برباد کر دو گے یا قریب ہے کہ ان کو برباد کر دو" ۔ اس پر حضرت ابوالدرداء نے کہا یہ ایک بات ہے جو حضرت معاویہؓ نے حضورؐ سے سنی 'اللہ اسے اس کے ذریعہ نفع دے ۔ (ابوداؤد)

اس طرح قرآن کریم کی یہ آیت اسلام کے سیاسی نظام کی ایک دستوری دفعہ بن گئی اور محض اخلاقی اور روحانی اصلاح پر مشتمل ایک وعظ ہی نہ رہی بلکہ یہ لوگوں کے بنیادی حقوق اور ان کی شخصی آزادیوں کے لیے ایک تحفظ بن گئی اور اسلامی قانون اور دستور میں ان کے حقوق کا ایسا تحفظ کیا گیا کہ دور اور قریب سے اور کسی بھی بہانے سے ان پر دست درازی ممکن ہی نہ رہی ۔

یہ دور رس حقوق کہاں؟ یہ بلند افق کہاں؟ اور وہ حقوق کہاں جن پر آج کی مغربی جمہوری حکومتیں بغلیں بجاتی ہیں ۔ وہ کہاں؟ اور وہ بھی چودہ سو سال کے بعد ۔ اس کے بعد ایک عجیب انداز گفتگو میں اور نہایت ہی انسانی اور اخلاقی اسلوب میں قرآن کریم غیبت اور بدگوئی کی ممانعت کرتا ہے ۔

وَ لَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ

(۴۹ : ۱۲) ''اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو' تم خود اس سے گھن کھاتے ہو''۔ ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔ اس کے بعد ایک ایسا منظر پیش کیا جاتا ہے کہ اس سے نہایت سنگدل آدمی بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ ایک بھائی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھا رہا ہے۔ یہ منظر دکھا کر کہا جاتا ہے۔ اگر تم نے اس منظر کو ناپسند کیا ہے تو پھر تم نے غیبت کو بھی ناپسند کیا۔

اس آیت میں جو جو چیزیں ممنوع قرار دی گئیں ان پر ایک جامع تبصرہ۔ یعنی بدگمانی' تجسس اور غیبت کہ خدا سے ڈرو اور اشارہ اس طرف کہ اگر کسی نے ایسی غلطی کی ہے تو معافی مانگو اور طلب مغفرت کرو۔

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ (۴۹ : ۱۲) ''اللہ سے ڈرو' اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے''۔ یہ آیت جماعت مسلمہ کی زندگی میں خون کی طرح دوڑتی ہے اور اس سوسائٹی میں تمام بنیادی حقوق کی محافظ بن جاتی ہے۔ اور انسانی خیالات و تصورات کے لیے ایک انداز فکر بن جاتی ہے۔ اور اسلامی اخلاق کے لیے طرز عمل بن جاتی ہے اور قرآن ہی کے انداز میں حضور اکرمؐ بدظنی' تجسس اور غیبت کے تصور اور تخیل ہی سے لوگوں کو ڈراتے ہیں۔

امام ابوداؤد نے روایت کی ہے قعنبی سے انہوں نے عبدالعزیز ابن محمد سے انہوں نے عبد سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے' وہ کہتے ہیں' کہ حضورؐ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ غیبت کی حقیقت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''تم اپنے بھائی کا تذکرہ اس طرح کرو کہ وہ اسے ناپسند کرے'' تو کہا گیا کہ اگر میں ایسی بات کروں جو اس میں فی الواقعہ ہو' تو آپؐ نے فرمایا اگر اس میں وہ بات ہے جو تم کرتے ہو تو تم نے غیبت کی اور اگر اس میں وہ بات نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان باندھا (ترمذی' احمد)

امام ابوداؤد نے روایت کی' مسدد سے' انہوں نے یحییٰ سے' انہوں نے سفیان سے' انہوں نے علی ابن اقمر سے' انہوں نے ابوحذیفہ سے' اور انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے' وہ کہتی ہیں' میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا' آپ کے لیے صفیہ کی یہ یہ باتیں کافی ہیں (مسدد نے کہا ان کا مقصد ان کی کوتاہیوں سے تھا) اس پر حضورؐ نے فرمایا: ''تم نے ایسی بات کی ہے اگر تم اسے سمندر میں ملاؤ تو اس کا رنگ بدل جائے''۔ حضرت عائشہؓ نے کہا ''اور میں نے ان کے سامنے ایک انسان کی باتیں کیں تو آپؐ نے فرمایا'' میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ میں کسی انسان کی حکایت کروں اور مجھے یہ' یہ ملے''۔

امام ابوداؤد نے حضرت انس ابن مالک سے روایت کی ہے' کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: ''جب مجھے معراج کا سفر کرایا گیا تو میں کچھ لوگوں کے پاس سے گزرا' ان کے ناخن تانبے کے ہیں جن سے وہ اپنے منہ اور سینے نوچ رہے ہیں۔ میں نے کہا: ''یہ کون لوگ ہیں جبرائیل! فرمایا' یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی بے عزتی کرتے ہیں''۔

جب ماعز اور غامدیہ نے زنا کا اعتراف کر لیا اور رسول اللہؐ نے ان دونوں کے رجم کے احکام دے دیئے' کیونکہ انہوں نے اقرار کیا' پھر اقرار پر اصرار کیا اور کہا کہ ہمیں پاک کر دیں۔ حضورؐ نے ایک شخص کو سنا جو دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ کیا تو نے ان دونوں کو نہیں دیکھا کہ ان دونوں کے گناہ کو اللہ نے چھپایا لیکن ان کے نفوس نے ان کو تب چھوڑا کہ

کتوں کی طرح پتھروں سے ہلاک کر دیئے گئے ۔ اس کے بعد حضورؐ آگے گئے ۔ راستے میں ایک گدھے کی لاش پڑی ہوئی تھی آپ نے فرمایا کہ "فلاں فلاں کہاں ہیں؟" ان دونوں سے کہا اترو' اور اس مردار گوشت کھاؤ"۔ تو انہوں نے کہا' رسول خدا اللہ آپ کو معاف کرے کیا مردار گدھے کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے؟ تو رسول اللہؐ نے فرمایا" یہ تم نے جو اپنے بھائی کا گوشت کھایا' ابھی' یہ تو اس سے مشکل کام تھا۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' یہ شخص تو اس وقت جنت کی نہروں میں ڈبکیاں لے رہا ہے"۔ (ابن کثیر)

اس قسم کی مسلسل تربیت کے ذریعے ہی اسلامی سوسائٹی کی تطہیر کی جاتی رہی اور وہ پاک ہو کر ایک بلند مقام تک پہنچی ۔ یہ ایک انسانی خواب تھا جو اسلامی تاریخ ہی میں حقیقت بنا۔

---ooo---

اہل ایمان کو اس میٹھی آواز سے بار بار پکارنے کے بعد' اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ان کو انسانیت کے روشن افق پر' انسان کے نفسیاتی آداب کے زاویہ سے' اجتماعی آداب کے حوالے سے بنیادی انسانی حقوق کے حوالے سے انسانی عزت' آبرو' آزادی کی ضمانتوں اور گارنٹی کے حوالے سے نہایت ہی بلندیوں تک پہنچا کر' ان کی حساسیت کو نہایت تیز کر کے اور خدا خوفی اور خشیت الٰہی کے ہتھیاروں سے لیس کرنے کے بعد اب روئے سخن پوری انسانیت کی طرف ہے۔ پوری انسانیت' مختلف رنگوں' مختلف نسلوں' مختلف زبانوں اور مختلف علاقوں کے لوگوں کی طرف دیکھو تمہاری اصل تو ایک ہے' تمہاری اصل قدریں بھی ایک ہیں ۔ اور انہی قدروں کی بدولت صحابہ کرامؓ کی یہ جماعت ان بلندیوں تک پہنچی ۔

---ooo---

يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْٓا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (۹ ۴ : ۱۳) "لوگو' ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے ۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے"۔

اے لوگو' مختلف اقوام اور مختلف رنگ کے لوگو! مختلف اقوام و قبائل کے لوگو! تمہاری اصلیت تو ایک ہے ۔ لہٰذا آپس میں اختلافات نہ کرو' آپس میں جھگڑے نہ کرو اور الگ الگ راہوں پر نہ چلو۔ اے لوگو' تمہیں جو پکار رہا ہے وہ تو وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے ۔ تمہیں اس نے ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے ۔ وہ تمہیں بتاتا ہے کہ اس نے کیوں تم کو اقوام و قبائل میں تقسیم کیا ہے؟ یہ اس لیے نہیں کہ تم ایک دوسرے کے گلے کاٹو اور جنگیں لڑو' یہ تو محض تعارف اور جوڑ کے لیے ہے' رہا زبان اور رنگ کا اختلاف' طبیعت اور مزاج کا اختلاف' قابلیت اور استعداد کا اختلاف تو یہ ایسے اختلافات اور ایسی رنگارنگی ہے جنکی وجہ سے نزاع اور جنگ بلاجواز ہے بلکہ ان چیزوں کو باہم ذمہ داریاں سرانجام دینے کے لیے موجب تعاون ہونا چاہیے ۔ نیز ان اختلافات کے ذریعہ سوسائٹی کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں ۔ اللہ کے ترازو میں تو رنگ و نسل' زبان اور وطن کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے ۔ اسلام میں تو واحد میزان میں تمام قدروں کو لایا جاتا ہے

اور اسی کے مطابق حسن و قبح کے اصولوں کا تعین کیا جاتا ہے وہ یہ ہے ۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ (۴۹ : ۱۳) "تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے"۔ اور معزز در حقیقت ہے ہی وہی شخص جو اللہ کے نزدیک معزز ہے ۔ اللہ اپنے علم اور خبرداری کی بنا پر تمہارا وزن کرتا ہے ۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (۴۹ : ۱۳) "بے شک اللہ علیم و خبیر ہے"۔

یوں تمام امتیازات ختم کر دیئے جاتے ہیں ' تمام جھوٹی قدریں ختم کر دی جاتی ہیں ۔ ایک ہی پیمانہ ایک ہی قدر کے ساتھ رہ جاتا ہے کہ انسانیت کی میزان اور خدا خوفی کی قدر اور ان کے سوا سب کچھ ہیچ ۔

یوں اس کرۂ ارض پر یہ سب نزاع اور جھگڑے مٹ جاتے ہیں اور وہ تمام گھٹیا مقاصد اور اہداف ختم کر دیئے جاتے ہیں جن کے اوپر لوگ اس طرح جھپٹتے ہیں جس طرح کتے ہڈی پر ۔ اس طرح لوگوں کے درمیان الفت و محبت کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں ۔ اللہ سب کا الٰہ قرار پاتا ہے ۔ تمام ایک ہی اصل سے پیدا ہوتے ہیں اور ایک ہی انسانی جھنڈا رہ جاتا ہے ۔ جس کے نیچے تمام لوگ کھڑے رہ جاتے ہیں یعنی اللہ ﷻ کا جھنڈا ہے اور اسلام نے یہ جھنڈا واحد انسانی جھنڈا ' آج سے چودہ سو سال قبل اس لیے بلند کیا ہے تاکہ انسانیت کو رنگ ' نسل ' قوم اور وطن کے شیطانی جھنڈوں سے نجات دی جا سکے ۔ رنگ کی عصبیت ' نسل کی عصبیت ' زمین کی عصبیت ' قبیلے کی عصبیت اور خاندان کی عصبیت سے نجات دی جائے ۔ یہ سب عصبیتیں جاہلیت سے نکلی ہیں اور جاہلیت کے فروغ کے لیے ہیں ۔ یہ مختلف رنگوں اور لباسوں میں آتی ہیں اور یہ مختلف ناموں سے آتی ہیں لیکن یہ سب ننگی جاہلیت کی اقسام ہیں ۔ ان پر کوئی اسلامی لباس نہیں ہے ۔

اسلام نے عصبیت جاہلیت کی تمام اقسام کے خلاف جہاد کیا تاکہ وہ اپنا عالمی انسانی نظام رب العالمین کے جھنڈے کے نیچے ' نہ نسل کے جھنڈ کے نیچے قائم کرے ۔ یہ سب کھوٹے جھنڈے ہیں اسلام ان کو نہیں پہچانتا ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :"تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے ' جو لوگ اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرتے ہیں ۔ وہ اس حرکت سے باز آجائیں ورنہ اللہ کے لیے یہ بات بہت آسان ہے کہ تمہیں گبریلے سے ہلکا کر دے ۔ (البزار) اور عصبیت جاہلیہ کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا"اسے چھوڑ دو یہ گندہ ہے"۔ (مسلم)

یہ ہے وہ اصول جس پر اسلامی نظام قائم ہے جو ایک عالمی انسانی نظام ہے اور جو عالمی انسانی سوسائٹی بناتا ہے ۔ اسلام نے یہ سوسائٹی اور نظام آج سے چودہ سو سال قبل قائم کیا جبکہ انسانیت ابھی تک اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرتی ہے کیونکہ انسانیت نے ابھی تک اس معاشرے کی طرف اسلام کے صراط مستقیم سے چلنا نہیں شروع کیا ۔ یعنی اللہ رب العالمین کے جھنڈے کے نیچے کھڑی ہو کر ۔ یہی وہ واحد جھنڈا ہے عقیدۂ توحید کا جھنڈا جس کے نیچے پوری انسانیت کھڑی ہو سکتی ہے ۔

---ooo---

اب اس سورت کے آخر میں ایمان کی حقیقت اور اس کی اہمیت بیان کی جاتی ہے اور یہ ان اعراب کی تردید میں بیان کی جاتی ہے جو ایمان کا دعویٰ کرتے تھے ۔ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان جتلاتے تھے کہ ہم مسلمان ہوئے ہیں اور اس احسان کے بارے میں نہ سوچتے تھے کہ اللہ نے دعوت ایمان بھیج کر لوگوں پر کس قدر احسان کیا ۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا
وَ لَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَا یَلِتْكُمْ
مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ
اللّٰهِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِیْنِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا
فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۶﴾ یَمُنُّوْنَ عَلَیْكَ اَنْ
اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ
لِلْاِیْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ ۲
اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ ع ۸

۱۴ "یہ بدوی کہتے ہیں کہ "ہم ایمان لائے"۔ ان سے کہو 'تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ "ہم مطیع ہو گئے"۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اگر تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری اختیار کر لو تو وہ تمہارے اعمال کے اجر میں کوئی کمی نہ کرے گا' یقیناً اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا۔ اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔ اے نبی ﷺ ان (مدعیان ایمان) سے کہو 'کیا تم اللہ کو اپنے دین کی اطلاع دے رہے ہو؟ حالانکہ اللہ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان سے کہو 'اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو' بلکہ اللہ تم پر اپنا احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی اگر تم واقعی اپنے (دعوائے ایمان میں) سچے ہو۔ اللہ زمین اور آسمانوں کی ہر پوشیدہ چیز کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ سب اس کی نگاہ میں ہے"۔

یہ آیات بنو اسد کے دیہاتی مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم "ایمان لائے" ہیں۔ یہ انہوں نے اس وقت کہا جب وہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بات بھی کہی کہ حضور ﷺ ہم نے تو اسلام قبول کر لیا لیکن آپ ﷺ کے ساتھ ہم کبھی نہیں لڑے جبکہ دوسرے عربوں نے آپ کے ساتھ لڑائیاں لڑیں تو اللہ نے ان کو بتایا کہ تمہارے ذہنوں کے اندر جو بات بیٹھی ہوئی ہے' وہ غلط ہے کہ تم نے اسلام قبول کر لیا۔ اسلامی حکومت کے سامنے سرتسلیم خم کر دیا ہے' لیکن ابھی تمہارے دل مرتبہ ایمان تک نہیں پہنچے۔ اس سے معلوم ہوا کہ

حقیقت ایمان ابھی ان کے دلوں میں نہیں بیٹھی تھی ۔ اور ان کی ارواح نے ابھی جام ایمان نوش نہیں کیا تھا ۔

قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۴۹ : ۱۴)

"ان سے کہو' تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہوگئے ۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے" ۔

لیکن اس کے باوجود اللہ نے فرمایا کہ تمہارے اعمال پر تمہیں پوری پوری جزا دی جائے گی اور تمہارے اعمال کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو گا ۔ یہ اسلام جو ابھی تک دلوں کے اندر داخل ہو کر قلوب کے اندر نہیں پہنچا کہ وہ پختہ اور قابل اطمینان ایمان بن جائے' یہ اس بات کے لیے کافی ہے کہ ان اچھے اعمال پر انہیں جزائے خیر دی جائے اور وہ کفار کے اعمال کی طرح ضائع نہ ہوں ۔ اور اللہ کے ہاں ایسے مسلمانوں کے اجر میں کمی نہ ہوگی جب تک وہ مطیع فرمان اور سر تسلیم خم کرنے والے رہتے ہیں ۔

وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا (۴۹ : ۱۴) "اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی فرمان برداری اختیار کر لو تو وہ تمہارے اعمال کے اجر میں کوئی کمی نہ کرے" ۔ کیونکہ اللہ بہت ہی رحیم و کریم ہے ۔ وہ اپنے بندوں سے اسلام اور ایمان کی راہ میں پہلا قدم ہی قبول کرتا ہے ۔ اطاعت اور تسلیم ہی سے راضی ہو جاتا ہے اور اس کے بعد دل میں خود بخود ایمان اور اطمینان آ جاتا ہے ۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۴۹ : ۱۴) "بے شک اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے" ۔ اس کے بعد حقیقی ایمان بتا دیا ۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۴۹ : ۱۵) "حقیقت میں مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے ۔ پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا' وہی سچے لوگ ہیں" ۔

ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ اور رسول پر دل سے یقین ہو جائے ۔ ایسا یقین جس کے ساتھ دل میں کوئی شک اور خلجان باقی نہ رہے ۔ ایسا یقین جو مستحکم ہو' جس کے اندر کوئی تزلزل اور اضطراب نہ ہو' جس کے اندر کوئی خلش یا شک نہ ہو ۔ جس میں قلب و شعور میں کوئی تزلزل نہ ہو' اور جس کے نتیجے میں جہاد بالنفس اور جہاد بالمال کے اعمال پیدا ہوں' دل جب ایمان کی شیرینی کو چکھ لے اور اس پر مطمئن اور پختہ ہو جائے' تو اس کا اخراج اعمال و جوارح سے ہوتا ہے ۔ عملی دنیا میں اس کا ظہور ہوتا ہے ۔ مومن کی سعی یہ ہوتی ہے کہ وہ ایمان جو اس کے احساس و شعور کے اندر اور اس کے باطن میں بیٹھا ہے وہ انسان کے ارد گرد ماحول کے معاملات میں بھی ظاہر ہو ۔ ایمان کی جو حسی تصویر انسان کے قلب میں ہوتی ہے اور اس کی عملی صورت جو مومن کے ماحول میں ہوتی ہے ان کے درمیان تو فرق و امتیاز نہیں کیا جا سکتا ۔ اگر ایسی صورت ہو تو پھر ایک شخص کے مومن کو ہر وقت اذیت ہوتی رہتی ہے ۔ اس لیے وہ جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کے لیے میدان میں آ جاتا ہے اور یہ مومن کے انفرادی ایمان کا تصور اور طوفان ہے جو عملی شکل اختیار کرتا ہے اس لیے کہ مومن اس طرح اپنے دین کی تصویر کو

عمل میں لانا چاہتا ہے تاکہ یہ تصور واقعی تصویر بن جائے۔ اس لیے مومن کی جنگ اس کے ماحول سے ایک مومن کا خالص ذاتی معاملہ ہے۔ یہ نہ ہو مومن کے دین میں کچھ اور ہو اور اس کے ماحول میں کچھ اور ہو' یہ دہری زندگی وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ بھی اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا ہے کہ ایمان کو دل سے نکال دے اور جدھر ہوا چلتی ہے ادھر چلنے لگے اس لئے ایک شخص کے مومن ہوتے ہی اس کی اس کے ماحول کے ساتھ جنگ شروع ہو جاتی ہے جسے جہاد کہا جاتا ہے۔ اور یہ جہاد اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک مومن کے گرد پھیلی ہوئی اس جاہلیت کو ختم نہیں کر دیا جاتا۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۴۹ : ۱۵) "ایسے ہی لوگ سچے ہیں"۔ یہ اپنے عقیدے اور نظریہ میں سچے ہیں اگر وہ کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں لیکن ان کے دل کا ایمان مسلح ہو کر ان کے ماحول کے ساتھ نہیں ٹکراتا جو زندگی کی عملی صورت میں ایمان سے متضاد ہے تو سمجھو کہ ایمان نہیں ہے۔ عقیدے اور نظریات میں ایسا شخص سچا نہیں ہے۔

اس آیت میں لفظ انما کے ساتھ حصر قابل ملاحظہ ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا (۴۹ : ۱۵) "حقیقت میں تو مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے۔ پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا"۔ غرض ایمان صرف عبارت ہی نہیں ہے۔ ایمان مجرد شعوری حالت کا نام بھی نہیں ہے اور یہ اس حالت کے اندر کوئی رد و بدل بھی نہیں ہے جو نفس کے اندر ہوتی ہے۔ ایمان کے بعد لَمْ يَرْتَابُوْا (۴۹ : ۱۵) "پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا"۔ اور اس کے ساتھ اس آیت کی حصر بھی درج ذیل آیت کے مشابہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا "وہ لوگ جنہوں نے کہا' ہمارا رب اللہ ہے اور اس کے بعد انہوں نے استقامت اختیار کی"۔ یہ کہنے کے بعد کہ اللہ ہمارا رب ہے 'کوئی شک نہ کرنا اور استقامت اختیار کرنا' اس طرف اشارہ ہے کہ بعض اوقات نفس مومن پر' مختلف تجربات اور مختلف مشکلات کے نتیجے میں اور بعض شدید آزمائشوں کے نتیجے میں 'شکوک و اضطرابات پیدا ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز میں بعض اوقات انسانوں پر سخت شدائد آتے ہیں لیکن ایک سچے مومن کے دل میں کوئی اضطراب اور کوئی شک پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ثابت قدم رہتا ہے۔ اور اس کے اندر کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا اپنے خدا پر پورا پورا بھروسہ ہوتا ہے اور وہ سیدھی راہ پر پوری استقامت کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور وہ آگے ہی بڑھتا رہتا ہے۔

اس انداز میں بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اہل ایمان کو اس بات پر متنبہ کر دیا جائے کہ اس راہ میں بہت سی مشکلات' مقامات لغزش اور مقامات خطرہ موجود ہیں تاکہ ایک مومن اپنے عزم کو پختہ کر لے 'اپنی تیاری خوب کرے اور سیدھا سیدھا چلے۔ اور جب افق پر دھند چھا جائے تو اسے شک نہ ہونے لگے اور وہ طوفانوں اور آندھیوں کی نذر نہ ہو جائے۔

اس کے بعد یہی بیان جاری رکھتے ہوئے ان کو بتایا جاتا ہے کہ اللہ تو تمہارے دلوں اور نیتوں سے بھی واقف ہے۔ یہ تو اللہ ہی ہے جو تمہیں تمہارے دلوں کی باتیں بتاتا ہے اور اللہ تم سے علم حاصل نہیں کرتا

قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۹ ۴ : ۱ ٦) "اے نبی ان سے کہو کیا تم اللہ کو اپنے دین کی اطلاع دے رہے ہو؟ حالانکہ اللہ زمین اور آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔ انسان اپنے علم کے بارے میں لمبے چوڑے دعوے کرتا ہے حالانکہ وہ خود اپنے نفس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ وہ اپنے آپ کی شعوری دنیا کے بارے میں بھی پوری معلومات نہیں رکھتا۔ اور نہ اسے اپنے نفس کی پوری حقیقت معلوم ہے اور نہ شعور اور لاشعور کی۔ انسان یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کی عقل کس طرح کام کرتی ہے۔ کیونکہ انسان جب کوئی کام کرتا ہے تو اس وقت وہ خود اپنے دماغ کا ملاحظہ (observation) نہیں کر سکتا۔ اور جب وہ اپنے نفس کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کا وہ کام رک جاتا ہے جو وہ کر رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا ملاحظہ کے لیے کوئی چیز ہی نہیں رہتی۔ اور جب انسان کسی کام میں لگا ہوتا ہے اس وقت وہ نگرانی نہیں کر سکتا۔ اس لیے انسان خود اپنی ذات کی حقیقی معرفت سے بھی عاجز ہے۔ اور اس کے معلوم کرنے سے بھی عاجز ہے کہ انسانی دماغ کس طرح کام کرتے ہیں۔ حالانکہ یہی تو وہ چیز ہے جس پر انسان نازاں ہے۔

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ (۹ ۴ : ۱ ٦) "حالانکہ اللہ زمین اور آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے"۔ حقیقی علم اللہ کے پاس ہے ہم تو صرف ظاہری علم جانتے ہیں، جبکہ اللہ ہر چیز کی ماہیت اور حقیقت سے واقف ہے۔ اور اللہ کا علم شامل، محیط اور لامحدود ہے اور ازلی اور ابدی ہے۔

وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۹ ۴ : ۱ ٦) "اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔ یعنی ہر چیز جس پر چیز کا اطلاق ہوتا ہے۔ وہ علم محیط رکھتا ہے۔ یہ بیان کرنے کے بعد کہ تم ایمان کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکے ہو اور نہ تم نے اس کی حقیقت کا ادراک کیا ہے، روئے سخن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے کہ یہ لوگ آپ پر اپنے اسلام کا احسان رکھتے ہیں ان کا احسان جتلانا ہی اس بات کی شہادت ہے کہ وہ حقیقت ایمان کا ادراک نہیں کر سکے۔ اور انہوں نے ابھی تک ایمان کی مٹھاس کو چکھا نہیں ہے۔

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۹ ۴ : ۱ ۷) "یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے، ان سے کہو اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی اگر واقعی تم سچے ہو"۔

انہوں نے یہ احسان جتلایا تھا کہ وہ اسلام لائے ہیں اور ان کا زعم یہ تھا کہ وہ مومن ہیں، جواب یہ آیا کہ اپنے اسلام کا احسان نہ جتلاؤ۔ اگر تم دعوائے اسلام و ایمان میں سچے ہو تو احسان اللہ کی جانب سے ہے۔

یہ جو اللہ نے ان کی تردید میں آیت نازل کی ہے یہ ایک عظیم حقیقت کو ظاہر کرتی ہے۔ جس سے بڑے بڑے لوگ غافل ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ اس پر قدرے غور کریں۔ بعض اہل ایمان بھی اس سے غافل ہوتے ہیں۔

اہل زمین پر اللہ نے [illegible] ت کیے ہیں ان میں سے ایمان سب سے بڑا احسان ہے۔ سب سے بڑا احسان تو خود انسان کا وجود اور اس [illegible] کو سمجھا جا سکتا ہے۔ نیز انسان کی زندگی کے لوازمات اور مقدمات اور ضروریات کو سمجھا جا

سکتا ہے مثلاً صحت ' سازوسامان اور زندگی لیکن ایمان ان میں سب سے بڑی نعمت ہے ۔

یہ وہ احسان ہے جو انسان کی پوری زندگی کو بامقصد ' بامعنی اور ممتاز بنا دیتا ہے اور ایمان کی وجہ سے انسان کا کردار اس زمین میں بہت ہی حقیقی اور ممتاز ہو جاتا ہے ۔

ایمان کی وجہ سے انسان کے اندر پہلی تبدیلی یہ واقع ہوتی ہے ' بشرطیکہ ایمان کی حقیقت انسان کے ذہن میں بیٹھ جائے کہ ایک مومن انسان کا تصور کائنات بہت ہی وسیع ہو جاتا ہے کیونکہ اس تصور کی وجہ سے انسان اس کائنات کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے اور اس کے اندر انسان کا ایک کردار متعین ہو جاتا ہے اور اس کے ماحول میں جو بھی چیزیں ہیں ' انسان اشخاص واقعات ان سب کی قدریں اس کے ہاں متعین ہو جاتی ہیں اور وہ اس سیارۂ زمین پر اپنے اس مختصر سے سفر کو نہایت ہی اطمینان سے طے کرتا ہے اور اللہ تک پہنچ جاتا ہے ۔وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات سے مانوس ہوتا ہے اور اپنے خالق کے ساتھ مانوس ہوتا ہے ' جو اس کا بھی خالق ہے اور اس کائنات کا بھی خالق ہے ' اسے اپنی اہمیت اور عظمت کا بھی شعور ہوتا ہے اور یہ کہ وہ اپنا کردار اس طرح ادا کر سکتا ہے کہ اللہ اس سے راضی ہو ' اور وہ اس کائنات کی مخلوقات اور انسانوں کے لیے باعث خیروبرکت بن سکتا ہے ۔

انسان کے تصور میں ایک دوسرے پہلو سے بھی وسعت آتی ہے کہ وہ زمان و مکان کے حدود سے باہر نکل جاتا ہے ۔ اپنی چھوٹی سی ذات کے حدود سے بھی باہر آجاتا ہے اور اس کائنات کی وسعتوں میں چلا جاتا ہے ۔جس کے اندر اللہ نے بے پناہ قوتیں رکھی ہوئی ہیں ۔ اور بے حد اسرار چھپے ہوئے ہیں اور انسان اس قدر آگے بڑھ جاتا ہے کہ وہ بھی ایک طرح لامحدود ہو جاتا ہے ۔

چونکہ انسان اپنی جنس کے اعتبار سے انسانیت کا ایک فرد ہوتا ہے ' وہ ایک ہی اصل کی طرف لوٹتا ہے اس لئے انسان نے ابتداء میں اپنی انسانیت اللہ کی روح سے لی ہے اور یہ اسے خدا نے اپنی روح ایک مٹی کے ڈھانچے میں پھونک کر عطا کی ہے اور اسی نفخ روح کی وجہ سے یہ انسان عالم بالا کے نور کے ساتھ جڑ جاتا ہے اور یہ نور زمین و آسمان کے حدود کے اندر محدود نہیں ہے ۔یہ ان سے بھی وراء ہے جس کی نہ انتہا ہے اور نہ ابتدا ہے اور مکان و زمان کے حدود میں مقید نہیں ہے ۔یہی نور اور روح ہے جس کی وجہ سے انسان ' انسان ہے ۔جب ایک انسان کے نفس کے اندر یہ بات بیٹھ جاتی ہے تو سب سے پہلے کوئی انسان خود اپنی ہی نظر میں بلند ہو جاتا ہے ۔یہ تصور انسان کو خود اس کے اپنے احساسات کے اندر مکرم بناتا ہے اور اسے نہایت ہی روشنی اور آفاقیت کا شعور دیتا ہے ۔اس کے قدم تو زمین پر چلتے ہیں لیکن اس کی روح ' اس کے سرچشمے سے جا ملنے کے لیے پھڑپھڑاتی ہے جس نے اسے ابتدا میں روح اور نور سے نوازا اور جس نے اسے یہ عجیب رنگ حیات دیا ۔

اور یہ شخص اپنی امت اور گروہ کے اعتبار سے امت مسلمہ کا ایک فرد ہوتا ہے ۔ یہی وہ واحد امت ہے جو تاریخ کے نشیب و فراز میں ' زمانوں سے ایک معزز قافلے کی صورت میں جادہ پیما ہے ۔اس کی قیادت کبھی نوح ' کبھی ابراہیم ' کبھی موسیٰ ' کبھی عیسیٰ اور کبھی محمد علیہم السلام کے ہاتھ میں رہی ۔انسان کے لیے یہی کافی ہے کہ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ وہ اس پاک شجر کی ایک شاخ ہے جس کی جڑیں تاریخ کی گہرائیوں تک ۔ ۔۔۔ تک چلی گئی ہیں اور جس کی شاخیں آسمانوں کے اندر بہت دور تک جا چکی ہیں ۔یہی تصور ہی انسان کو ایک بلند ذوق حیات عطا کرنے کے لیے کافی

ہے ' جسے یہ مل جائے وہ زندگی کے نئے احساسات لے لیتا ہے اور اس کی اس زندگی کے اندر ایک دوسری زندگی پیدا ہو جاتی ہے ' اور اس کو یہ زندگی اس کے اس نظریاتی نسب نامہ سے ملتی ہے ۔

نہیں ' ابھی انسانی تصور رک نہیں گیا ' یہ اپنی ذات ' اپنی امت ' اپنی انسانیت سے بھی آگے بڑھ کر اپنی روح کے اندر اس پوری کائنات کو بھی سمیٹ لیتا ہے کہ یہ تو اس ذات نے تخلیق کی ہے جس نے انسان کو بنایا ہے ' جس نے اسے روح بخشی ہے ۔ اور جس کی وجہ سے وہ کائنات کا دولہا بن گیا ہے ۔ پھر اس کا ایمان اسے بتاتا ہے کہ یہ کائنات بھی ایک زندہ وجود رکھتی ہے ۔ یہ زندہ ایٹم سے پیدا شدہ ہے ۔ اس کی ہر چیز میں ایک روح ہے ۔ اس پوری کائنات کی بھی روح ہے ۔ اور انسانوں کی ارواح اور اس کائنات کی عظیم روح دراصل دونوں باری تعالیٰ کی طرف متوجہ ہیں ۔ یہ سب کی سب اللہ کو پکارتی ہیں ۔ اس کی تسبیح کرتی ہیں ' اللہ کی حمد و ثنا اور اس کی اطاعت میں لگی ہوئی ہیں اور پوری طرح اللہ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں ' یوں انسان اس عظیم کائنات کے کل کا ایک جزو بن جاتا ہے ۔ یہ نہ اس سے جدا ہے اور نہ اس سے الگ ہے ۔ یہ اللہ سے صادر ہے اور اپنی روح سے اس کی طرف متوجہ ہے ۔ اور آخرت میں بھی اس نے اسی کی طرف جانا ہے ۔ لہٰذا یہ انسان اپنی محدود ذات سے بڑا ہے ۔ وہ اس قدر بڑا ہے جس قدر وہ اس کائنات کی بڑائی کا تصور ذہن میں جما سکتا ہے ۔ وہ اپنے ماحول کی تمام ارواح سے مانوس ہے ۔ اور پھر وہ اس روح سے مانوس ہے جو اللہ نے اس کے اندر پھونکی ہے اس نکتے پر آکر وہ سوچتا ہے کہ وہ اس پوری کائنات سے متحد ہو سکتا ہے خواہ وہ کائنات کس قدر طویل و عریض کیوں نہ ہو اور اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس میں کارہائے نمایاں سرانجام دے ۔ اور بڑے بڑے واقعات کا سبب بنے اور ہر چیز کو متاثر کرے اور اس سے متاثر ہو ۔ پھر اس کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اس قوت سے استفادہ کرے جس نے اس کی تخلیق کی ' اور اس کے پورے ماحول میں پھیلی ہوئی کائنات کی تخلیق کی ۔ وہ عظیم قوت جو نہ کمزور ہوتی ہے ' نہ کم ہوتی ہے اور نہ غائب ہوتی ہے ۔ یعنی اللہ الکبیر المتعال ۔

اسی وسیع تصور کے پیمانے میں ' پھر یہ انسان تمام اشیاء ' تمام واقعات ' تمام اشخاص ' تمام اقدار ' تمام اہتمامات ' تمام مقاصد ' اور تمام منازل کو ایک بالکل جدید پیمانے کے ساتھ تولتا ہے ' اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات میں اس کا حقیقی کردار کیا ہے ۔ اس کائنات میں اس کا مقصد وجود کیا ہے ؟ اور اس کائنات میں وہ اللہ کی اقدار میں سے ایک قدر ہے ۔ اس لیے اللہ جس طرف چاہے اسے موڑ دے جس طرح چاہے اسے استعمال کرے ۔ یوں وہ پھر اسی سفر زندگی کو ' اس سیارے پر طے کرتا ہے ' ثابت قدمی کے ساتھ ' واضح بصیرت کے ساتھ اور مانوس ضمیر کے ساتھ ۔

جب انسان اس زاویہ سے اپنے ماحول میں پائے جانے والی اس کائنات کی حقیقت کو پا لیتا ہے ۔ پھر وہ یہ بات متعین کر لیتا ہے کہ اس دنیا میں اس کا کردار کیا ہے ؟ اور اس کردار کو ادا کرنے کے لیے اسے یہاں کیا کیا قوتیں دی گئی ہیں تو اس علم و معرفت سے اسے اطمینان ' سکون اور خوشی حاصل ہوتی ہے ۔ کہ اس کے ماحول میں جو کچھ ہو رہا ہے ' اور اسے جو کچھ پیش کر رہا ہے ' اس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ اس کا محرک کون ہے یا خود وہ کہاں سے آ رہا ہے ؟ اور کیوں آیا ہے ؟ کہاں جا رہا ہے ؟ ... وہاں اسے کیا ملنے والا ہے ۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اس کا مقصد زندگی کیا ہے ' اور اسے جو کچھ پیش آ رہا ہے وہ اس کا مقدر ہے ۔ اور ہو کر رہنا ہے ۔ اور یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے ۔ اور یہ کہ چھوٹے بڑے کاموں پر اسے جزا ملے گی ۔ وہ عبث نہیں پیدا کیا گیا ۔ نہ وہ شتر بے مہار ہے ' نہ وہ اکیلا جائے گا ۔

اس تصور اور شعور سے انسانی زندگی قلق ' بے چینی ' حیرت ' استعجاب اور لاعلمی (بابت آغاز و انجام) کی پریشانی سے نجات پا لیتی ہے ۔ نہ اسے راستے کی بے چینی ہوتی ہے اور نہ وہ اپنے آنے اور جانے سے پریشان ہوتا ہے ۔ ذرا عمر خیام کو سنئے وہ پریشان ہے :

"مجھے جامہ حیات ' میرے پوچھے بغیر پہنا دیا گیا ' اس حیات کے دوران میں مختلف باتیں سوچتا رہا ' عنقریب جامہ حیات مجھ سے اتار لیا جائے گا اور مجھے معلوم نہیں ہے کہ میں کیوں آیا اور مجھے جانا کہاں ہے ؟"

پس ایک مومن نہایت ہی قلبی اطمینان سے یہ یقین رکھتا ہے اور بڑی خوش دلی سے یہ اطمینان رکھتا ہے اور ایک ہشاش و بشاش چہرے کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ اسے عمر کا جامہ دست قدرت نے پہنایا ہے ۔ وہ دست قدرت علیم و قدیر کے طور پر اس کائنات میں متصرف ہے ۔ اور وہ ہاتھ جس نے اسے جامہ حیات پہنایا ہے وہ زیادہ محکم اور رحیم و کریم ہے ۔ لہذا اس کے ساتھ کسی مشورے کی کوئی ضرورت نہ تھی ۔ کیونکہ انسان وہ سوچ پیش نہیں کر سکتا جس قدر علیم و قدیر سوچ سکتا ہے اور انسان کو علیم و قدیر نے جامہ حیات اس مقصد کے لیے پہنایا ہے کہ اس نے اس کائنات میں ایک کردار ادا کرنا ہے ۔ یہ اس کائنات کے اندر موجود چیزوں سے متاثر ہو گا اور ان کو متاثر کرے گا اور اس نے جو کردار ادا کرنا ہے وہ اس کردار سے ہم آہنگ ہے جو اس دنیا میں تمام اشیاء ادا کر رہی ہیں ۔ زندہ ہوں یا غیر زندہ ' ابتداء سے انتہا تک ۔

پس ایک مومن جانتا ہے کہ وہ کیوں آیا ہے ' اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس نے جانا کہاں ہے ؟ اور وہ کسی فکری انتشار میں گرفتار نہیں ہوتا ۔ بلکہ وہ اپنا یہ سفر اور اپنا یہ کردار نہایت اطمینان سے ادا کرتا ہے ۔ نہایت یقین کے ساتھ ' نہایت وثوق کے ساتھ ۔ کبھی تو یہ مومن درجہ ایمان میں اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ اپنا یہ کردار اس قدر خوشی اور انبساط کے ساتھ ادا کرتا ہے کہ اس تحفہ حیات کی خوبصورتی کا شعور رکھتا ہے ' اور اسے ایک عظیم عطیہ سمجھتا ہے ۔ اور اس عمر اور جامہ عمر کو خلعت شاہی سمجھتا ہے ۔ وہ بادشاہ جو لطیف و خبیر اور جو جمیل اور ودود و رحیم ہے اور جو کردار یہاں ادا کرنا ہے ' چاہے جس قدر مشقت کا باعث بن جائے وہ اسے ادا کر کے رب ذوالجلال کے ہاں پہنچ سکتا ہے ۔

اور اس قسم کا پریشان کن شعور صرف ایمان کی وجہ سے غائب ہو جاتا ہے ' اس قسم کے شعور کے اندر میں بھی ایک عرصے تک گرفتار رہا ہوں ۔ نہایت ہی کربناک پریشانیوں میں ' اس زمانے میں جب مجھے قرآن کے سایہ عاطفت میں آنے کی توفیق نہ ملی تھی ۔ اور اس زمانے میں کہ اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر ابھی اپنے سایہ عاطفت کے اندر مجھے داخل نہ کر دیا تھا ۔ یہ شعور میری روح میں موجود تھا اور میں نے "آزردہ دل ' آزردہ کند انجمن را" کے بموجب یہ شعور پوری کائنات کو اڑھا دیا تھا ۔

وقف الکون حائرا ابن یمضی

ولماذا وکیف لو شاء یمضی

عبث ضائع وجھد غبین

ومصیر مقنع لیس یرضی

(یہ پوری کائنات انگشت بدنداں ہے کہ یہ کہاں جا رہی ہے 'کیوں جا رہی ہے اور کس طرح جا رہی ہے ' اگر وہ جانا چاہے تو عبث جدوجہد ہے اور فانی دنیا ہے اور جب موت کا نقارہ بج جائے تو چاہے نہ چاہے ' جانا ہے ) ۔

آج میں جانتا ہوں 'اور اللہ کے فضل و کرم سے جانتا ہوں کہ کوئی جدوجہد ضائع نہیں ہے' یہ کیے کی جزا و سزا ہے ۔ کوئی جدوجہد اکارت نہیں جاتی ہے ۔ اور انجام مرضی کے مطابق ہے اور عادل اللہ اور شفیق و رحیم رب کے پاس جانا ہے ۔ اور یہ کہ یہ کائنات یہاں رکی نہیں رہے گی ۔ اس کائنات کی روح رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہے اور اس کی حمد و ثناء کر رہی ہے اور یہ اس کی مرضی کے مطابق چل رہی ہے ۔ اور اس کے اس قانون کے مطابق چل رہی ہے جو اس کے لیے اس نے تیار کیا ہے اور نہایت ہی تسلیم و رضا اور اطاعت امر کے ساتھ جاری ہے ۔

میں سمجھتا ہوں فکر و شعور کی دنیا میں بھی انسان کے لیے یہ بہت بڑی دولت ہے اور جسمانی اور اعصابی لحاظ سے بھی اور حسن کارکردگی' جدوجہد اور تاثیر اور تاثر اس کے علاوہ ہیں ۔

ایمان جس طرح انسانی جسم و روح کے لیے ایک قوت مجتمعہ ہے' اسی طرح وہ ایک اقدامی قوت بھی ہے ۔ جونہی کسی دل میں ایمان جاگزیں ہوتا ہے وہ عملی جدوجہد کی شکل میں پھر جسم سے باہر آتا ہے ایمان کی جو صورت ذہن میں ہوتی ہے ۔ وہ ایمان کی اس صورت کے ساتھ ہمقدم ہوتی ہے جو خارج میں عملی دنیا میں ہوتی ہے اور انسان کی قوائے متحرکہ پر ایمان قابض ہو جاتا ہے اور اسے ایمانی راستے کی طرف بڑھاتا ہے ۔

"یہ ہے وہ راز جس کی وجہ سے نفس کے اندر عقیدے کی قوت مضمر ہے اسی طرح ایک مومن ہونے کی وجہ سے نفسیاتی قوتوں میں اضافے کا راز بھی یہی ہے ۔ نظریہ کی وجہ سے دنیا میں جو عجائبات و معجزات صادر ہوتے ہیں اور ہوتے رہے ہیں ان کا راز یہی ہے ان معجزات کی وجہ آئے دن زندگی کا چہرہ بدل جاتا ہے ۔ یہ ایمان اور نظریہ ہی ہے جس کے لیے لوگ یہ فانی زندگی بھی قربان کر دیتے ہیں اور اس زندگی میں قدم رکھتے ہیں جو کبھی فانی نہیں ہوتی اور ایک نہایت ہی ضعیف اور چھوٹا شخص بھی ایک بادشاہ' ایک ڈکٹیٹر کے سامنے سر اٹھا کر چلتا ہے اور آگ اور لوہے کی قوتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اور پھر وہ وقت آتا ہے کہ ایمان کے سامنے بار و شکست کھا جاتی ہے ۔ یہ صرف ایک انسان نہیں ہوتا جو ان عظیم قوتوں کو شکست دے دیتا ہے بلکہ وہ ایک عقیدہ ہوتا ہے جو ان قوتوں کو پاش پاش کر دیتا ہے بلکہ یہ وہ عظیم ایمانی قوت کا سرچشمہ ہے جس سے انسانی روح قوت حاصل کرتی ہے ۔ یہ سرچشمہ کبھی خشک نہیں ہوتا' کبھی اس میں کمی نہیں آتی' یہ کبھی کمزور نہیں ہوتا" ۔ (۱)

"یہ معجزانہ تغیرات جو ایک نظریہ' ایک فرد اور ایک سوسائٹی کے اندر رونما کرتا ہے' کوئی ایسا نظریہ نہیں کر سکتا جو خرافات اور افسانوں پر قائم ہوتا ہے' جو ناقابل فہم ہو یا محض خوف اور حیرانگی اور تخیلاتی ہو بلکہ وہ عقیدہ کر سکتا ہے جو قابل فہم اور مضبوط اصولوں پر مبنی ہو ۔ حقیقی دینی عقیدہ وہ ہوتا ہے جو انسان کو اس کائنات کی ظاہری اور باطنی قوتوں کے ساتھ یکجا کر دے اور انسان کی روح کے اندر اعتماد اور اطمینان پیدا کر دے ۔ اور اس کے اندر ایک ایسی قوت پیدا کر دے جس کے ساتھ وہ تمام ناپائیدار اور زائل ہونے والی باطل قوتوں کا مقابلہ کرے ۔ اور اسے یقین ہو کہ آخر کار وہ فتح یاب ہو گا ۔ یہ اعتماد اسے اللہ کی ذات سے حاصل ہو ۔ اور یہ عقیدہ ایسا ہو جو انسان کو یہ بتاتا ہو کہ وہ اپنے ماحول کے واقعات سے' ماحول کی تمام چیزوں اور تمام لوگوں کے ساتھ متعلق ہے ۔ یہ عقیدہ انسان کو اس کی منزل بھی دکھائے اور اس کا

---

(۱) کتاب عالمی سلامتی کا باب عقیدہ اور زندگی

انجام بھی بتائے - اس کی پوری قوتوں کو مجتمع کرے اور ایک رخ پر ڈال دے - یہ ہے عقیدے کی قوت کا راز - کہ وہ تمام قوتوں کو مجتمع کر کے ایک محور کے گرد گھما دیتا ہے - ان کو ایک سمت عطا کرتا ہے - انسانوں کو ان کا ہدف معلوم ہوتا ہے اور وہ اپنے اس نصب العین کی طرف نہایت قوت ' یقین اور اعتماد سے بڑھتے ہیں - (۱)

غرض عقیدے اور نظریات کی قوت میں یوں بھی اضافہ ہو جاتا ہے کہ یہ اس طرف جاتے ہیں جس طرف یہ پوری کائنات جاتی ہے - پوری کائناتی قوتیں جاتی ہیں ' ظاہری یا باطنی ہوں - کیونکہ کائنات کے اندر جتنی بھی قوتیں ہیں وہ ایمان کے راستے پر چل رہی ہیں - یوں ایک مومن کے لیے یہ کائناتی قوتیں رفیق سفر ہوتی ہیں اور اس طرح یہ ایمانی قوت اور کائناتی قوتیں مل کر باطل پر حملہ آور ہوتی ہیں ' اگرچہ باطل بظاہر بڑی قوت نظر آئے اور آنکھوں کی چکاچوند کر دینے والی ہو لیکن ایمانی قوت سے وہ پاش پاش ہو کر رہے گی -

اللہ نے ہم سے کہا : يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۴۹ : ۱۷) "یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا - ان سے کہو اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت کی ' اگر تم واقعی سچے ہو" - یہ ہے وہ عظیم دولت جس کا مالک بھی اللہ ہے اور جس کا بخشنے والا بھی اللہ ہے - اور اللہ دولت ایمان اسی کے حوالے کرتا ہے جس کے بارے میں اسے علم ہوتا ہے کہ یہ اس فضل عظیم کا مستحق ہے -

اللہ نے سچ کہا ' جو شخص ان حقائق و علوم کے ساتھ دوستی کرلے اور یہ معانی اور یہ شعور اسے حاصل ہو جائے اور ان کے اندر وہ زندہ ہو اور وہ اس کے اندر اس چھوٹے سے سیارے پر معمولی حالات میں مختصر زندگی گزار رہا ہو اس نے گویا کچھ بھی نہیں کھویا اور جو شخص اس دولت سے محروم ہو گیا ' وہ اگر ناز و نعم کی زندگی بھی بسر کرے ' اس طرح زیادہ کھائے پیے جس طرح مویشی بہت سا کھاتے اور پیتے ہیں ' تو وہ جان لے کہ اس سے یہ مویشی اچھے ہیں جو اپنی فطرت کے اعتبار سے خالق کریم کے مطیع فرمان ہیں -

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۴۹ : ۱۸)

"اللہ زمین و آسمان کی ہر پوشیدہ چیز کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو ' وہ اس کی نگاہ میں ہے" - جو اللہ زمین و آسمانوں کے غیب سے واقف ہے ' جو ضمیروں کی بات جانتا ہے ' جو انسانی شعور سے بھی واقف ہے ' جو دیکھ رہا ہے کہ لوگ کرتے کیا ہیں - وہ صرف وہ باتیں ہی نہیں جانتا جو لوگوں کی زبان سے نکلتی ہیں بلکہ ان شعوری جذبات سے بھی واقف ہے جو دلوں میں جوش مارتے ہیں ' ان اعمال سے بھی واقف ہے جو ان دلی جذبات کے نتیجے میں عمل میں آتے ہیں -

یہ ہے گیارہ آیات پر مشتمل یہ عظیم سورت ' یہ مومنین کے لیے نہایت ہی اہم نشانات راہ تجویز کرتی ہے اور نہایت ہی اعلیٰ اور پاکیزہ نشانات نیز انسانی شعور و ضمیر کی گہرائیوں میں نہایت ہی عظیم اصول اور حقائق کی نشاندہی کرتی ہے -

--- ○○○---

(۱) کتاب عالمی سلامتی کا باب عقیدہ اور زندگی

# فی ظلال القرآن

## جلد ---- پنجم

## پارہ ----- ۲۶

### سورۂ ق ـ ۵۰

آیات ۱--- تا--- ۴۵

# سورۂ ق ایک نظر میں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کو عید اور جمعہ کے خطبات میں پڑھا کرتے تھے اور یہ سورت اکثر خطبہ جمعہ کا موضوع ہوا کرتی تھی ۔ جبکہ بہت بڑے مجمعے ہوا کرتے تھے اور نہایت ہی شاندار اجتماعات ۔

یہ سورت نہایت ہی ڈرانے والی سورت ہے ۔ معنوی اعتبار سے بھی نہایت موثر ہے اور انداز تعبیر کے اعتبار سے بھی بہت زور دار ہے ۔ اس کے سائے گہرے ' تصاویر کے رنگ تیز اور آیات کے فواصل واضح ہیں ۔ یہ سورت نفس انسانی کے نشیب و فراز میں دور دراز تک اتر جاتی ہے ۔ نفس انسانی حالت خطرہ میں مضطرب ہو اور بے ساختہ حرکات کر رہا ہو یا پوشیدگی اور تنہائی کی حالت میں ہو ' یا زینت محفل ہو یا باطن میں متفکر ہو ' ہر حال میں یہ سورت اس کی نگرانی کرتی ہے ۔ انسان کی ولادت سے اس کی وفات تک ' بعث و حشر تک اور یوم الحساب سے آخری انجام تک یہ اس کا تعاقب کرتی ہے ۔ غرض نہایت ہی سخت نگرانی کی کیفیت ہے اور یہ نگرانی بہت ہی تفصیلی اور ڈراؤنی اور ہمہ جہت ہے ۔ اور اس ضعیف انسانی مخلوق پر پوری طرح چھائی ہوئی ہے ۔ یہ انسان ہر وقت اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے اور اس نگرانی کے دائرہ سے اس کا کوئی چھوٹا بڑا معاملہ خارج نہیں ہے ۔ اس کی حرکات و سکنات پوری طرح نوٹ ہو رہی ہیں ' نہ کم نہ زیادہ ۔ اس کا ہر وسوسہ ریکارڈ ہو رہا ہے اور اس کی ایک ایک سانس کا حساب ہو رہا ہے ' ہر لفظ ٹیپ ہوتا ہے اور ہر حرکت کا حساب لگایا جاتا ہے ۔ پھر یہ نگرانی اس قدر کامل ' شامل اور جامع ہے کہ اس کا دائرہ دلوں کے وسوسوں تک وسیع ہو جاتا ہے ۔ تمام اعضاء پر یہ نافذ ہے ۔ بغیر حجاب اور بغیر پردے کے ۔ کوئی پردہ جس قدر بھی دبیز ہو ' اس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتا ۔ غرض تنہائی اور محفل میں عمل اور حرکت میں نیت اور وساوس میں یہ انسان اللہ کی نگرانی اور رقابت کے تحت ہے ۔ ہر وقت اور ہر حال میں ۔

یہ پورا قرآن ان حقائق کی تعلیم دیتا ہے اور یہ ہر مسلمان کو معلوم ہیں لیکن اس سورت کو پڑھ کر یوں نظر آتا ہے کہ شاید یہ سب مضامین پہلی بار آ رہے ہیں ۔ انسانی احساس اچانک چونک اٹھتا ہے ۔ نفس انسانی لرز اٹھتا ہے ۔ اور یہ سورت اسے اس قدر جھنجھوڑتی ہے کہ اس پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے ۔ اور انسان تعجب کے ساتھ ساتھ خائف بھی ہو جاتا ہے ۔ اور یوں لگتا ہے کہ انسان سویا ہوا تھا اور جاگ اٹھا اور گہری غفلت سے ہوش میں آ گیا ۔

ان امور کے علاوہ اس میں زندگی کی متنوع صورتیں ' موت کی مختلف شکلیں ' گل سڑ جانا ' دوبارہ اٹھایا جانا ' حشر کی حشر سامانیاں ' قیام قیامت کو دل میں بٹھانا ' احساس کو اس کے لیے ہر وقت تیار کرنا ' غرض وہ عظیم حقائق لائے ہیں جو آسمان و زمین میں درخشاں ہیں ۔ بارشیں اور زمین کی سرسبزیاں ' کھجوریں اور پھل غرض تمام اہم مناظر و حقائق اس سورت میں ہیں جو

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ (۵۰ : ۸) ''آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں ہر اس بندے کے لیے جو حق کی طرف رجوع کرنے والا ہو''۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا سورت کی تلخیص اور پھر اس پر تبصرہ بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ اس قسم کی زور دار اسلوب بیان رکھنے والی سورت کے حقائق' معانی' تصاویر اور رنگوں کے شیڈز (Shades) کو بیان کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ اور انسان کے لیے ممکن نہیں کہ خود قرآنی انداز اور اسلوب میں اس پر کچھ کہہ سکے جبکہ قرآنی عبارات خود ان باتوں کو بطریق احسن بتا رہی ہوں اور ایسے حالات میں کسی تبصرے اور تعریف اور دیباچے کے مقابلے میں براہ راست سورت کا اثر انسانی فطرت' ضمیر اور احساس پر زیادہ ہوتا ہے۔ مناسب یہی ہے کہ ہم براہ راست تفسیر آیات شروع کر دیں۔ اللہ معاون و مددگار ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۴۷ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا پہلا سبق ہے ۔ اس کا موضوع مسئلہ بعث بعد الموت ہے ۔ مشرکین مکہ اس کا انکار کرتے تھے بلکہ جو لوگ بعث بعد الموت کے قائل تھے وہ ان کی جانب سے یہ عقیدہ رکھنے پر تعجب کرتے تھے ۔ لیکن قرآن صرف ان کے اس غلط خیال ہی کو موضوع بحث نہیں بناتا ۔ بعد ۔ نط انکار پر بحیثیت مجموعی تنقید کرتا ہے اور ان کی اصلاح کر کے اور ان کی کج فکری کو درست کر کے ان کو سچائی کی راہ کی طرف لوٹانے کی کوشش کرتا ہے ۔ قرآن کریم کی سعی یہ ہے کہ ان کے غافل دلوں کو جھنجھوڑے اور خوب جگائے تاکہ وہ اس کائنات کے اندر جو عظیم حقائق ہیں ' ان کو سمجھنے کے لیے اپنے دل کے دروازے کھولیں ۔ اس لیے قرآن کریم محض منطقی انداز مناظرہ میں ان کے ساتھ موضوع بعث بعد الموت پر کوئی مباحثہ نہیں کرتا ۔ وہ صرف ان کے مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے ۔ ان کے زنگ آلود دماغ کو صیقل کرتا ہے کہ وہ غور و فکر سے کام لیں ۔ وہ ان کے وجدان کو چھوتا ہے تاکہ اس کے اندر احساس تیز ہو اور وہ اپنے ماحول کے اندر پائے جانے والے حقائق سے براہ راست متاثر ہو سکے ۔ یہ ایک ایسا سبق ہے جس سے وہ لوگ خوب استفادہ کر سکتے ہیں جن کا کام دلوں کی اصلاح کرنا ہو ۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۲۴۷ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۱۵

آیاتها ۴۵ سُوْرَۃُ قٓ مَکِّیَّۃٌ (۳۴) رکوعاتها ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝١ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ
الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝٢ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝٣
قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝٤ بَلْ كَذَّبُوْا
بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝٥ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ
كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝٦ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا
فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝٧ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ
عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝٨

"ق' قسم ہے قرآن مجید کی ۔ بلکہ ان لوگوں کو تعجب اس بات پر ہوا کہ ایک خبردار کرنے والا خود انہی میں سے ان کے پاس آگیا ۔ پھر منکرین کہنے لگے :"یہ تو عجیب بات ہے 'کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہو جائیں گے (تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے )؟ یہ واپسی تو عقل سے بعید ہے ۔ (حالانکہ ) زمین ان کے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے وہ سب ہمارے علم میں ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے ۔ بلکہ ان لوگوں نے تو جس وقت حق ان کے پاس آیا اسی وقت اسے صاف جھٹلا دیا ۔ اسی وجہ سے اب یہ الجھن میں پڑے ہوئے ہیں ۔ اچھا 'تو کیا انہوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا' اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے ۔ اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ جمائے اور اس کے اندر ہر طرح کی خوش منظر نباتات اگا دیں ۔ یہ ساری چیزیں

آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں ہراس بندے کے لیے جو (حق کی طرف) رجوع کرنے والا ہو"۔

سورت کا آغاز حرف ق اور قرآن مجید کی قسم سے ہوتا ہے' مطلب یہ کہ یہ قرآن مجید تو ایسے ہی حروف سے مرکب ہے اور لفظ قرآن کا پہلا حرف ہی قاف ہے۔

---o o o---

یہاں اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا کہ کس بات پر قسم اٹھائی جارہی ہے۔ یہ قسم کلام کے آغاز میں ہے۔اس کا پہلا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے کلام کا آغاز قسم سے کر رہا ہے' لہٰذا بیدار ہو جاؤ' معاملہ غیر معمولی ہے۔ اللہ اور قسم' لہٰذا معاملہ خطرناک ہے۔شاید اس آغاز کا مقصد یہی ہے کیونکہ بجائے اس کے کہ بعد میں وہ بات ذکر کی جائے جس کے لیے قسم اٹھائی جارہی ہے' حرف اضراب "بل" کو لایا گیا ہے۔کیونکہ قسم نے مخاطب پر خوب اثر ڈال دیا۔اس لیے اب ان کے تعجب اور بعث بعد موت کو ایک "انہونی بات سمجھنے" کے موضوع کو لیا جاتا ہے' اس انداز میں کہ گویا مشرکین کے سامنے جب رسول اللہ ؐ نے دوبارہ اٹھائے جانے کی بات کی تو انہوں نے اس کا یوں انکار کر دیا گویا کفار کے نزدیک یہ ایک نئی بات ہے۔

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ (۲) ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ (۵۰: ۲ تا ۳) "بلکہ ان لوگوں کو تعجب اس بات پر ہوا کہ ایک خبردار کرنے والا خود انہی میں سے ان کے پاس آگیا۔پھر منکرین کہنے لگے :"یہ تو عجیب بات ہے' کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک ہو جائیں گے (تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے)؟ یہ واپسی تو عقل سے بعید ہے"۔

کیا یہ بات قابل تعجب ہو سکتی ہے کہ ایک ڈرانے والا ان میں سے آگیا۔اس میں تو کوئی تعجب نہیں بلکہ یہ تو بالکل ایک قدرتی بات ہے اور فطرت سلیمہ اسے بڑی سادگی اور خوشی خوشی قبول کرتی ہے۔یہ نہایت ہی معقول بات ہے کہ لوگوں کا مصلح اپنی قوم میں سے ہو' لوگوں کے احساسات میں' ان کے ساتھ شریک ہو' انہی جیسا شعور رکھتا ہو' ان کی زبان بولتا ہو' ان کی زندگی اور ان کی دوڑ دھوپ اور غم درد میں شریک ہو' ان کے میلانات اور جذبات کو جانتا ہو' ان کی طاقت اور حد برداشت سے واقف ہو تاکہ وہ انہیں بتلائے کہ جس شرک' ظلم اور بدعملی میں وہ مبتلا ہیں' اس کے نتیجے میں بہت ہی برا انجام ان کے انتظار میں ہے اور تاکہ ان کو سکھائے کہ انہوں نے کس طرح سیدھا راستہ اختیار کرنا ہے۔اور جدید دعوت کو اگر وہ قبول کر لیں تو انہیں اپنے اندر کیا کیا تبدیلیاں لانی ہوں گی۔اور ان تبدیلیوں اور فرائض اور ذمہ داریوں میں وہ پہلا شخص ہوگا اور ان کے ساتھ شامل ہوگا۔

ان کو خود رسالت پر تعجب تھا۔پھر جو رسول آیا اس نے اپنی دعوت میں سے عقیدہ بعث بعد الموت پر زیادہ زور دینا شروع کر دیا۔کیونکہ اسلامی نظام کا دارومدار ہی آخرت کی جواب دہی کے عقیدے پر ہے۔آخرت کی جوابدہی کے عقیدے ہی کے تمام مطلوبہ اعمال تقاضے ہیں۔مسلم کا پہلا فریضہ ہی یہ ہے کہ وہ حق پر قائم ہو اور باطل کو نیچا دکھائے۔وہ خیر کو لے کر اٹھے اور شر کا خاتمہ کر دے۔اس کی پوری سرگرمی اللہ کی بندگی ہو۔وہ ہر حرکت میں اللہ کی طرف متوجہ ہو' اور تمام اعمال پر اس کے لیے جزاء ضروری ہے۔کبھی تو یہ جزاء دنیا ہی میں ملتی ہے لیکن پوری جزاء صرف آخرت ہی میں مل سکتی ہے۔ہر انسان کا آخری حساب وکتاب آخرت میں ہوگا۔لہٰذا عالم آخرت نہایت منطقی اور ضروری

ہے ۔ لوگوں کو اٹھایا جانا ضروری ہے کہ وہ زندگی کا حساب دیں ۔ جب کسی کے ذہن سے آخرت کی جوابدہی کا احساس ہی ختم ہو جائے تو اس شخص کی زندگی سے وہ تمام اعمال و اخلاق ناپید ہو جاتے ہیں جو اس عقیدے پر مبنی ہوں ۔ ایسا شخص کم از کم ایک مسلمان ہرگز نہیں ہو سکتا۔

لیکن ان لوگوں نے اس مسئلے کو اس زاویہ سے نہیں دیکھا۔ انہوں نے بالکل ایک دوسرے زاویہ سے اور بالکل ایک سادہ نقطۂ نظر سے دیکھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے موت و حیات کی حقیقت پر بالکل غور نہیں کیا اور نہ انہوں نے اللہ کے نظام قضا و قدر کے کسی پہلو پر غور کیا۔ اس لیے وہ اس کے قائل ہوئے ۔

ءَ اِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ ( ۵۰ : ۳ ) "کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہو جائیں گے ! یہ واپسی تو عقل سے بعید ہے "۔ ان کی نظروں میں مسئلہ یہ ہے کہ مرنے اور خاک ہو جانے کے بعد زندگی کا دوبارہ پیدا ہونا مستبعد ہے اور یہ ایک نہایت ہی سادہ نظریہ ہے ۔ کیونکہ ایک دفعہ جب مردہ مٹی میں زندگی ڈال دی گئی ہے تو دوبارہ مٹی میں اسی طرح زندگی ڈالنا کیا مشکل کام ہے جبکہ یہ معجزہ ان کے سامنے ہر لحظہ رو بعمل ہوتا رہتا ہے ۔ اور اس کائنات کے ہر پہلو میں ہو رہا ہے ۔ اس سورت میں قرآن کریم نے ان کو اس نکتے کی طرف متوجہ کیا ہے ۔

لیکن قبل اس کے کہ زندگی کی اس نمائش گاہ کے بارے میں ہم قرآن مجید کے اشارات اور تکوینی دلائل پر کوئی بات کریں ۔ مناسب ہے کہ مرنے اور مٹی ہونے کی طرف انہوں نے جو اشارہ کیا اور جسے قرآن نے نقل کر کے اس پر تبصرہ کیا' اس پر ذرا غور کریں ۔

ءَ اِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ( ۵۰ : ۳ ) "کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہو جائیں گے "۔ ہاں ہم مر جائیں اور مٹی بھی ہو جائیں گے جو بھی قرآن کے ان الفاظ کو پڑھتا ہے جو قرآن نے کفار کے منہ سے لیے ہیں' وہ اپنی ذات پر نگاہ ڈالتا ہے اپنے اردگرد دوسرے زندہ اشیاء کو دیکھتا ہے ۔ اور وہ موت اور مٹی ہونے کے عمل پر ضرور غور کرتا ہے بلکہ جب وہ زندہ ہوتا ہے اور پھر رہا ہوتا ہے تو بھی وہ محسوس کرتا ہے کہ شاید مٹی ہونے کا عمل اس کے جسم میں جاری ہو چکا ہے ۔ غرض موت کے سوا اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا تصور انسان کا دل ہلا نہ دیتا ہو اور پھر قبر میں مٹی ہو جانے کے تصور ہی سے انسان کانپنے لگتا ہے ۔

---ooo---

اس پر جو تبصرہ قرآن کرتا ہے وہ اس اثر کو مزید گہرا کر دیتا ہے ۔ وہ سوچتا ہے کہ زمین اس جسم کو آہستہ آہستہ کھاتی ہے ۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ( ۵۰ : ۴ ) "(حالانکہ) زمین ان کے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے وہ سب ہمارے علم میں ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے "۔

انداز تعبیر ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ زمین کو زندہ اور متحرک کر دیا گیا ہے اور وہ ان اجسام کو کھا رہی ہے جو اس کے منہ میں آہستہ آہستہ غائب ہو رہے ہیں ۔ اور یہ زمین ان اجسام کو کھا رہی ہے ' نہایت آہستگی کے ساتھ ۔ اور پھر ان کے اجسام کو یوں دکھایا گیا ہے کہ وہ تسلسل کے ساتھ کھائے جا رہے ہیں ۔ زمین ان کے جسم کے جس حصے کو کھاتی ہے ' اسے اللہ جانتا

ہے اور وہ لکھا جا رہا ہے کہ وہ حصہ کہاں ہے ۔ اس لیے ان کے جسم کے ذرے ' مرنے کے بعد کہیں گم نہیں ہو جاتے ۔ رہی یہ بات کہ اس مٹی میں روح کس طرح ڈال دی جائے گی تو یہ بات تو ایک بار ہو چکی ہے ۔ اور ان کے ارد گرد جو لاتعداد زندہ اشیاء پیدا کی جا رہی ہیں اور جن کی کوئی انتہا نہیں ہے ان کو تو وہ دیکھ رہے ہیں ۔

یوں دلوں کو اس قدر تیز احساس دلایا جاتا ہے یہاں تک کہ یہ دل پگھل جاتے ہیں اور نرم ہو جاتے ہیں اور ان کے اندر احساس کو اس قدر تیز کر دیا جاتا ہے کہ وہ بات کو جلدی مانتے ہیں ۔ یہ بطور تمہید اصل مقصود بالذات بات کہنے سے پہلے کیا جاتا ہے ۔

---ooo---

اس کے بعد ان کی شخصیت کا تجزیہ کر کے بتایا جاتا ہے اور وہ اصل سبب بتایا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ واہی اعتراضات وہ کرتے ہیں یہ کہ انہوں نے سچائی کا مضبوط پلیٹ فارم چھوڑ دیا ہے ' ان کے پاؤں کے نیچے زمین ہی نہیں ہے ۔ اس لیے یہ کسی موقف پر جم ہی نہیں سکتے ۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ (۵۰ : ۵) "بلکہ ان لوگوں نے تو جس وقت حق ان کے پاس آیا اسی وقت اسے صاف جھٹلا دیا ۔ اسی وجہ سے اب یہ الجھن میں پڑے ہوئے ہیں" ۔

یہ بھی ایک نہایت منفرد انداز تعبیر ہے ۔ جو لوگ مستقل سچائی کو ترک کرتے ہیں تو پھر ان کے قدم کسی جگہ نہیں جم سکتے ۔

سچائی ایک ایسا نقطہ ہے جس پر وہ شخص قائم ہوتا ہے جو سچائی پر ایمان لاتا ہے ۔ اس کے بعد اس کے قدموں میں کوئی لغزش نہیں ہوتی ۔ اس روش میں اضطراب نہیں ہوتا کیونکہ اس کے قدموں کے نیچے زمین مضبوط ہوتی ہے ۔ اس میں کوئی زلزلہ نہیں آتا اور نہ اس کا کوئی حصہ زمین میں دھنستا ہے جبکہ اس کے ماحول کے دوسرے افراد ڈانواں ڈول ' مضطرب ' بے ثبات اور دولت یقین سے محروم ہوتے ہیں ۔ نہ ان میں کوئی مضبوط کردار ہوتا ہے اور نہ وہ مشکلات برداشت کر سکتے ہیں ۔ جس نے بھی حق سے تجاوز کر لیا اور ادھر ادھر ہو گیا ' وہ پھسل گیا ۔ اور ثبات و قرار سے محروم ہو گیا ۔ اور اسے کبھی اطمینان نہ ہو گا ۔ وہ ہر وقت شک ' پریشانی اور بے چینی میں مبتلا رہے گا ۔

پھر جو شخص سچائی کو چھوڑ دے تو ہر طرف سے خواہشات نفس کی آندھیاں چلنا شروع ہو جاتی ہیں ۔ میلانات و خواہشات ' بدلتی ہوئی خواہشات ' اسے کسی ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتیں ۔ حیران و پریشان ' افتاں و خیزاں کبھی ادھر دوڑتا ہے ' کبھی ادھر بھاگتا ہے ۔ جہاں کھڑا ہوتا ہے وہاں مطمئن نہیں ہوتا ۔ پاگلوں کی طرح کبھی دائیں ' کبھی بائیں ' کبھی آگے کبھی پیچھے دوڑتا رہتا ہے ۔ اس کے لیے کوئی جائے امن و قرار نہیں ہوتی ۔

یہ ایک عجیب انداز بیان ہے کہ وہ "امر مریج" میں پھنسا ہوا ہے ۔ ایسی حالت میں جس میں الجھن ہو اور وہ فیصلہ نہ کر سکتا ہو اور دائمی خلجان میں گرفتار ہو ۔ انداز بیان ایسا ہے کہ ایسے شخص کی اندرونی کیفیات کو اس کی حرکات ظاہر کر رہی ہیں اور لوگ اسے دیکھ رہے ہیں ۔

---ooo---

مضمون یہ چل رہا تھا کہ یہ لوگ بعث بعد الموت اور حشر و نشر کے قائل نہ تھے ۔ اس کے لیے بتایا گیا تھا کہ اس کے لیے یہی ثبوت کافی ہے کہ اس کائنات کی بنیاد حق پر ہے جو اس کے اندر جما ہوا ہے اور پہاڑ کی طرح بلند نظر آتا ہے ۔ لہذا اب یہاں اس کائنات کے اندر پائے جانے والے حق کے بعض مناظر پیش کیے جاتے ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ ذرا آسمانوں اور زمین پر غور کرو ' زمین کے اندر جمے ہوئے پہاڑوں کو دیکھو ۔ آسمانوں سے برسنے والی بارشوں کو دیکھو ' بلندیوں تک بڑھنے والے کھجور کے درختوں کو دیکھو ' باغات و نباتات کو دیکھو ' یہ سب حق کی علامات ہیں ۔ جس طرح یہ چیزیں مستقل ہیں ' حق بھی مستقل ہے ۔ نہایت ہی خوبصورت انداز تعبیر میں سچائی کی یہ مثالیں ۔

اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَ زَیَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ( ۵۰ : ۶ ) "اچھا ' تو کیا انہوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا ؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا ' اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے "۔

یہ آسمان اس کائنات کی کتاب کا ایک صفحہ ہے ۔ یہ کتاب اس سچائی پر گواہ ہے جس کا یہ لوگ انکار کرتے ہیں ۔ یہ دیکھتے نہیں کہ اس کائنات میں کس قدر بلندی ' ثبات اور قرار ہے ۔ اور پھر ان آسمانوں میں زیب و زینت اور کمال و جمال ہے اور ان کے نظام میں کوئی خلل اور کوئی اضطراب نہیں ہے ۔ ثبات اور کمال و جمال آسمان کی صفت ہے اور یہ صفات یہاں انداز بیان کے اندر بھی ایک ہم آہنگی پیدا کرتی ہیں کیونکہ حق میں بھی کمال و جمال اور ثبات و قرار ہوتا ہے ۔ چنانچہ آسمانوں کے لیے جمعیت ' خوبصورتی ' دوام اور سوراخوں اور دراڑوں سے پاک ہونے کی صفات لائی گئی ہیں ۔

---ooo---

ایسی ہی صفات زمین کے لیے استعمال ہوئی ہیں کیونکہ زمین بھی اس کائنات کی کتاب کا ایک ورق ہے ۔ اور اسے بھی ثبات اور کمال و جمال اور قرار حاصل ہے ۔ زمین کو آسمان کے بالمقابل لایا گیا ہے ۔

وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِیْجٍ ( ۵۰ : ۷ ) "اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ جمائے اور اس کے اندر ہر طرح کی خوش منظر نباتات اگا دیں "۔

زمین کا بچھایا ہوا ہونا ' پہاڑوں کا جما ہوا ہونا اور نباتات کا خوبصورت ہونا ' تمام صفات کمال و جمال دکھانے والی چیزیں ہیں اور بادی النظر میں یہ صفات نظر آتی ہیں ۔ آسمان کی خوبصورت اور طویل و عریض تعبیر ' اور بچھی ہوئی زمین اور بلند و بالا پہاڑوں کے مناظر دکھا کر ان لوگوں کے دل و دماغ کو ایک نکتے کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے ۔

تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ( ۵۰ : ۸ ) "یہ ساری چیزیں آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں ہر اس بندے کے لیے جو ( حق کی طرف ) رجوع کرنے والا ہو "۔

یہ بصیرت عطا کرنے والی باتیں ہیں ۔ بصارت دینے والی باتیں ہیں اور دلوں کو قبولیت حق کے لیے کھولنے والی باتیں

ہیں۔ اس مطالعہ سے انسانی دل و دماغ اور انسانی روح اس کائنات کے ساتھ جڑ جاتی ہے اور اس حکمت، ترتیب اور کمال تخلیق کو پالیتی ہے جو اس کے اندر موجود ہے اور پھر جن لوگوں کا دل اپنے معبود کی طرف مائل ہوتا ہے وہ اپنے رب کے کمالات کو دیکھ کر لوٹ جاتا ہے۔

یوں انسانی دل اور اس عظیم اور خوبصورت کائنات کے درمیان اتحاد و اتصال پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان کتاب کائنات کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کائنات سے متعارف ہوتا ہے اور انسانی دل اور انسانی سوچ پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ اور انسانی زندگی پر یہ تعلق اور رابطہ اثر انداز ہوتا ہے اور یہ وہ رابطہ ہے جو قرآن سائنس اور معرفت الہی کے درمیان پیدا کرتا ہے۔ یعنی اس معرفت کے درمیان جو انسان رکھتا ہے اور اس حقیقت کے درمیان جو سائنسی علم رکھتا ہے اور ہمارے دور میں علم کا جو سائنسی مناہج مروج ہے اس میں یہ حقیقت نہیں ہے یہ رابطہ نہیں ہے۔ یوں اللہ نے انسانوں اور اس کائنات کے درمیان جس کے اندر وہ رہتے ہیں ایک تعلق پیدا کیا تھا اور جدید دور کے اہل علم اور سائنس دانوں نے یہ تعلق کاٹ دیا ہے۔ انسان اس کائنات کا حصہ ہے اور جب تک وہ اس کائنات کا ہمدم نہیں ہو گا اس وقت تک اس کی زندگی نہ مستحکم ہو سکتی ہے نہ مستقیم۔ اور جب تک اس کے دل کی دھڑکن اور اس کائنات کی حرکت کے اندر ہم آہنگی نہ ہو گی، وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ستاروں اور سیاروں، آسمانوں اور فضاؤں، نباتات اور حیوانات اس کائنات اور اس کی وسعتوں کے اندر انسان جس قدر بھی نئی دریافت کرے۔ وہ دریافت دل سے ہم آہنگ ہو۔ اور انسان اس نئی دریافت کردہ دنیا کا دوست ہو اور اس طرح وہ اس نتیجے تک پہنچے کہ انسان اور اس کائنات کا آخری خالق اور سبب اللہ تعالیٰ ہے۔ جب تک علم، دریافت اور معرفت کی آخری منزل، خالق کی منزل تک نہ پہنچ سکے اسے سمجھا جائے کہ وہ علم ناقص ہے۔ ایسی ہر تحقیق اور ایسی ہر تحقیق کا ہر نتیجہ بانجھ ہے، بے مقصد ہے اور انسان کے لیے غیر مفید ہے۔

یہ کائنات سچائی کی کھلی کتاب ہے جسے ہر زبان میں پڑھا جاتا ہے اور ہر ذریعہ سے اس کا ادراک کیا جاتا ہے۔ اسے ایک خیمے اور جھونپڑی کا باشندہ بھی پڑھ سکتا ہے اور نہایت ہی تعلیم یافتہ اور محلات میں رہنے والا بھی پڑھ سکتا ہے۔ ہر شخص اپنے قوت ادراک کے مطابق اسے پڑھتا ہے۔ "ہر کسے از ظن خود شد یار من" اسے اپنی صلاحیت کے مطابق اس کے اندر حق نظر آتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اسے اس نیت سے پڑھ رہا ہو کہ وہ حق اور سچائی تک پہنچ جائے۔ یہ کتاب ہر حال میں قائم ہے اور ہر کسی کے سامنے کھلی ہے۔

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ (۵۰ : ۸) "یہ ساری چیزیں آنکھیں کھولنے والی اور نصیحت دینے والی ہیں ہر اس شخص کے لیے جو سچائی کا متلاشی ہو"۔ لیکن جدید سائنسی علوم کو اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ ان سے یہ تبصرہ اور آنکھیں کھول دینے کی صلاحیت کو ختم کر دیا گیا ہے۔ انسان کے دل اور اس کی روح کا تعلق اس کائنات سے کاٹ دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ علم ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن کے دل اندھے ہیں۔ اور ان کے سروں پر نام نہاد سائنسی انداز فکر سوار ہے۔ اور یہ سائنسی انداز یہ ہے کہ کائنات کا تعلق انسان کی روح سے کاٹ دیا جائے۔

لیکن کائنات کا ایمانی مطالعہ ان لوگوں کے نام نہاد سائنسی انداز میں بہرحال کوئی کمی نہیں کرتا بلکہ وہ اس پر یہ اضافہ کرتا ہے کہ یہ کائناتی حقائق ایک دوسرے سے بھی مربوط ہیں اور پھر یہ حقائق ایک حقیقت کبریٰ سے بھی مربوط ہیں اور ان حقائق کو

اس حقیقت کبریٰ سے مربوط کرکے پھر تمام حقائق کو انسانی ادراک اور انسانی شعور اور انسانی روح کے ساتھ یوں پیوست کرتا ہے کہ یہ انسان کو متاثر کریں۔ انسان کی زندگی کو متاثر کریں۔ یہ محض خشک معلومات ہی نہ ہوں جو ذہنوں میں دفن ہوں اور عملی زندگی میں ان کا کوئی مقصد نہ ہو بلکہ ان کو عملی زندگی پر ایمان کے راستے سے اثر انداز ہونا چاہئے اور ہماری تمام تحقیقات اور انکشافات کو ایمان کے راستے سے حقیقت کبریٰ سے جڑ کر انسان کی عملی زندگی پر اثر انداز ہونا چاہئے۔

اس طرح اس نکتے کی طرف توجہ مبذول کرانے کے بعد اب بحث اس کتاب کائنات کے اندر آگے بڑھتی ہے۔ پیش نظر یہ مضمون ہے کہ موت کے بعد حشر و نشر ہوگا اور حساب و کتاب ہوگا۔

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ
الْحَصِيْدِ ۝ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ
بَلْدَةً مَّيْتًا ۭ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ
وَثَمُوْدُ ۝ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ۝ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ
تُبَّعٍ ۭ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ۝ اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ۭ بَلْ هُمْ ١
فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ ١٥ع
١٥

اور آسمان سے ہم نے برکت والا پانی نازل کیا‘ پھر اس سے باغ اور فصل کے غلے اور بلند و بالا کھجور کے درخت پیدا کر دیئے جن پر پھلوں سے لدے ہوئے خوشے تہ بہ تہ لگتے ہیں۔ یہ انتظام ہے بندوں کو رزق دینے کا۔ اس پانی سے ہم ایک مردہ زمین کو زندگی بخش دیتے ہیں۔ (مرے ہوئے انسانوں کا زمین سے) نکلنا بھی اسی طرح ہو گا۔ ان سے پہلے نوح کی قوم‘ اور اصحاب الرس اور ثمود اور عاد‘ اور فرعون‘ اور لوط کے بھائی‘ اور ایکہ والے اور تبع کی قوم کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں۔ ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور آخر کار میری وعید ان پر چسپاں ہو گئی۔ کیا پہلی بار کی تخلیق سے ہم عاجز تھے؟ مگر ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں”۔

آسمانوں سے جو پانی نازل ہوتا ہے وہ مردہ زمین کو زندہ کرنے سے بھی پہلے مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے اور اس کا نزول ہی دلوں پر بہت ہی اچھا اثر ڈالتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ چھوٹے بچے ہی بارش سے خوش ہوتے ہیں اور اس کے لیے دوڑتے ہیں اس میں اچھلتے کودتے ہیں بلکہ معمر لوگ جن کے اندر احساس جمال ہو وہ بھی بارش کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور ان کے دل بھی بارش میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ بچے تو ہوتے ہی چھوٹے ہیں۔

یہاں بارش کے پانی کو ماء مبارک کہا گیا ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مختلف قسم کے پھلوں کے باغات اور کٹنے والی کھیتیاں تیار فرماتا ہے اور اسی کے ذریعہ کھجوروں کے اونچے درخت اور ان کے پختہ پھلوں اور خوبصورت درختوں کو اگایا جاتا ہے۔

وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ (۵۰ : ۱۰) "بلند و بالا کھجور کے درخت پیدا کر دیئے ہیں جن پر پھلوں سے لدے ہوئے خوشے تہ بہ تہ لگتے ہیں"۔ خوشوں کے لیے تہ بہ تہ کی صفت لائی گئی۔ اس سے بلند و بالا درخت کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ جس کے اوپر تہ بہ تہ خوشے لگے ہوئے نظر آئیں۔ مضمون اور معنی کے اعتبار سے بھی یہ الفاظ مناسب ہیں کیونکہ بات حق و سچائی کی ہو رہی ہے۔ حق بلند و بالا بھی ہوتا ہے اور خوبصورت بھی اور اس کا بول بھی بالا ہونا چاہئے۔

اور انسان پر یہ مہربانیاں کر کے ' انسانی دل کے اندر ممنونیت پیدا کی جا رہی ہے کہ دیکھو یہ شفاف پانی ' یہ باغ و راغ ' یہ کھیت اور حیوانات اور یہ آسمانوں سے باتیں کرنے والے پھلوں سے لدے کھجور کے درخت ' یہ سب کچھ۔

رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ (۵۰ : ۱۱) "یہ انتظام ہے بندوں کو رزق دینے کا"۔ اس رزق کے اسباب اللہ کہاں سے چلا کر لاتا ہے۔ پھر نباتات اگاتا ہے ' پھر ثمرات لگاتا ہے ' یہ سب کچھ بندوں کے لیے۔ اور اللہ ہی صبح آتا ہے اور اس کا پورا پورا شکر ادا کرنے کی قدرت ہی یہ بندے نہیں رکھتے۔

اور اب یہ کہ یہ پوری کائنات اس ہدف کی طرف بڑھ رہی ہے۔

وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ (۵۰ : ۱۱) "اور اس پانی سے ہم ایک مردہ زمین کو زندگی بخش دیتے ہیں (مرے ہوئے انسانوں کا زمین سے نکلنا بھی اسی طرح ہو گا"۔ یہ عمل تمہارے ماحول میں رات دن دہرایا جا رہا ہے ' تم اس کے عادی ہو گئے ہو۔ دیکھتے ہو لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے اور پھر بھی تم اعتراض کرتے ہو۔ اگر تم غور کرتے تو تمہیں اپنا اعتراض عجیب لگتا۔ جس طرح موجودہ زمین پر لوگ پیدا ہو رہے ہیں۔ اسی سہولت سے دوبارہ اٹھا لیے جائیں گے۔ قرآن کا انداز کیا ہی شاندار ہے۔ پہلے دلائل دے کر بعد دعویٰ ' کہ کائنات سے مختلف قسم کے دلائل اور موثرات کی ایک طویل فہرست دے کر آخر میں کہتا ہے کہ "یوں"۔ اور اس انداز سے انسان بہت متاثر ہوتا ہے۔

--- ooo---

اب انسانی تاریخ کے طویل ریکارڈ سے کچھ عبرتیں اور نصیحتیں ' اس سے قبل پورے دلائل دیئے گئے تھے وہ اس کائنات کی کھلی کتاب سے تھے۔ اب کتاب تاریخ کے اوراق الٹیے! اور دیکھئے کہ جن لوگوں نے آخرت کی جوابدہی کا انکار کیا ان کا انجام کیا ہوا۔ اپنے رویے پر ذرا غور کرو۔ انہوں نے بھی اسی طرح تکذیب کی جس طرح تم کر رہے ہو اور ان پر جو عذاب آیا کیا تم پر ایسا عذاب نہیں آ سکتا؟

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ (۱۲) وَعَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ (۱۳) وَّ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ (۱۴) اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (۵۰ : ۱۲ تا ۱۴)

''ان سے پہلے نوح کی قوم' اور اصحاب الرس اور ثمود اور عاد' اور فرعون' اور لوط کے بھائی' اور ایکہ والے اور تبع کی قوم کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں ۔ ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور آخر کار میری وعید ان پر چسپاں ہوگئی ۔کیا پہلی بار کی تخلیق سے ہم عاجز تھے؟ مگر ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں''۔

رس کے معنی ہیں کنواں' وہ کنواں جس کا منہ پتھروں سے بنا ہوا ہو' اور ایکہ کے معنی ہیں درختوں کا جھنڈ ۔ اصحاب الایکہ غالباً قوم شعیب ہے ۔ اصحاب الرس کی تفصیلات قرآن میں وارد نہیں ہیں ۔ تبع حمیری بادشاہوں کا لقب ہے ۔ اور باقی اقوام جن کی طرف اشارہ کیا ہے وہ مشہور ہیں ۔

یہ بات واضح ہے کہ یہاں اس سرسری اشارے سے مقصد ان اقوام کی تفصیلات دینا نہیں ہے ۔ بلکہ صرف یہ بیان کرنا ہے کہ ان کو ہلاک کیا گیا ۔ جب انہوں نے رب العالمین کے رسولوں کی تکذیب کی ۔ قابل توجہ یہ فقرہ ہے ۔

كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ (۵۰ : ۱۴) ''ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا آخر کار میری وعید ان پر چسپاں ہوگئی'' ۔ اس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ رسول بھی ایک ہیں ۔ ان کے منصب کی نوعیت بھی ایک ہے اور ان کا مقصد بھی ایک رہا ہے حالانکہ سب کے سب نے رسولوں کو نہ جھٹلایا تھا ۔ بلکہ ایک رسول کو جھٹلایا لیکن ایک رسول کو جھٹلانا بھی دراصل سب کو جھٹلانا ہے ۔ رسول سب بھائی ہیں اور رسالت ایک ہی شجرۂ نسب ہے جس کی جڑیں دور تک تاریخ میں چلی گئی ہیں اور اس شجرے کی ہر شاخ دراصل اس کی خصوصیات کی تلخیص ہے ۔ اور اس کی ایک صورت ہے اور جس نے ایک شاخ کو چھوا گویا اس نے پورے سلسلے کو پکڑ لیا ۔ فَحَقَّ وَعِيْدِ (۵۰ : ۱۴) ''پس ان پر میری وعید چسپاں ہوگئی'' ۔ جس کی تفصیلات سامعین کو معلوم ہیں ۔

ان اقوام پر عذاب الٰہی تکذیب کی وجہ سے آیا اور تکذیب انہوں نے قیامت کی ہی کی تھی ۔ تو اللہ کا سوال ۔

اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ (۵۰ : ۱۵) ''کیا پہلی بار کی تخلیق سے ہم عاجز تھے'' ۔ یعنی ان کے سامنے کیا یہ شہادت موجود نہ تھی ۔ تخلیق چونکہ موجود تھی اس لیے جواب نہ دیا ۔

بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (۵۰ : ۱۵) ''بلکہ ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے تھے'' ۔ یہ دیکھتے نہ تھے کہ ان کے سامنے یہ عمل موجود ہے ۔ شہادت موجود ہے لہٰذا ان کا علاج یہی تھا جو ہوا ۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۴۸ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا دوسرا سبق ہے ۔ اس میں بھی بعث بعد الموت کی بحث ہے جس طرح پہلے حصے کا موضوع بھی یہی تھا ۔ تکذیب کرنے والوں کے سامنے کچھ مزید موثر دلائل رکھے گئے ہیں ۔ لیکن یہ دلائل ذرا دھمکی آمیز انداز میں ہیں اور خوفناک مناظر پر مشتمل ہیں ۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے جس طرح سورت کے آغاز میں تھا ۔ پھر سکرات موت کا ذکر ہے ' پھر حساب و کتاب اور ہر کسی کے اعمال نامے کی پیشی کا ذکر ہے اور پھر جہنم کا منہ کھلا ہو گا اور جب بھی اس میں اس کی انسانی خوراک کی کوئی قسط پھینکی جائے گی تو وہ منہ چاٹ کر اور اسے چکھ کر کہے گی ۔

هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ( ۵۰ : ۳۰ ) "کیا اور بھی ہے"۔ غرض یہ ایک ہی سفر ہے ' پیدائش سے شروع ہوتا ہے ۔ موت کے سکرات سے گزرتا ہے اور حساب و کتاب پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے ۔ یہ زندگی کا طویل سفر ہے ' باہم متصل اور مربوط ۔ اور اس منظر میں اسے مسلسل کڑیوں کی شکل میں قلم بند کیا گیا ہے جس کے اندر کوئی کڑی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہے ۔ نہ کوئی کسی کڑی یا مرحلے سے بچ کر نکل سکتا ہے ۔ اور انسان اس سفر کے آغاز سے انتہا تک اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے ۔ کسی جگہ یا مرحلے میں وہ اللہ سے آزاد نہیں ہے ۔ ہر وقت اللہ کی نگرانی میں ہے ۔ اس سورت میں اس سفر کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ خوفناک بھی ہے اور حیران کن بھی کہ ایک انسان اللہ قہار و جبار کے قبضہ قدرت میں سفر کے مراحل طے کر رہا ہے ' وہ اللہ جو دلوں کے تمام بھیدوں کو جاننے والا ہے ۔ انسان کیا کر سکتا ہے جب اسے بلانے والا وحدہ لاشریک ہے ' نہ بھولتا ہے ' نہ سوتا ہے اور نہ کسی چیز سے غافل رہتا ہے ۔ انسان تو اس وقت بھی بے حد ہراساں ہو جاتا ہے جب اسے احساس ہو کہ اس کے پیچھے کسی ارضی حکومت کی سی آئی ڈی لگی ہوئی ہے ۔ زمین والوں کی حکومت کیا ہو گی اور ان کے جاسوس کیا ہوں گے ۔ اگر کوئی خفیہ پولیس نگری کر بھی رہی ہے تو انسان کی ظاہری حرکت کی نگرانی کر رہی ہے ۔ وہ اس پولیس سے گھر میں چھپ جاتا ہے جب وہ اپنے گھر کے اندر آکر اپنے پیچھے دروازہ بند کرے یا وہ اپنا منہ بند کر دے اور منہ سے لفظ تک نہ نکالے ۔ لیکن اللہ جبار و قہار کی نگرانی بڑی سخت ہے ۔ انسان جہاں بھی ہو ' جس حال میں بھی ہو اس کے کارندے ہر وقت لکھ رہے ہیں اور وہ دلوں کے بھیدوں تک کو جانتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی نگرانی کڑی نگرانی ہے ۔

--- ooo ---

# درس نمبر ۲۴۸ تشریح آیات

## ۱۶--- تا--- ۳۵

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚۖ وَ
نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿١٦﴾ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ
وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ﴿١٧﴾ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿١٨﴾ وَ
جَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿١٩﴾

"ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔ ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں' (اور ہمارے اس براہ راست علم کے علاوہ) دو کاتب اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہر چیز ثبت کر رہے ہیں۔ کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگراں موجود نہ ہو۔ پھر دیکھو' وہ موت کی جان کنی حق لے کر آ پہنچی' یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا"۔

آیت کے آغاز میں ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ (۵۰ : ۱۶) "ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے"۔ یہاں اس عبارت کے ایک ضمنی مفہوم کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ یہ کہ کسی بھی چیز مشینری یا آلے کا بنانے والا اس کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ اس کا خالق نہیں ہوتا کیونکہ آلات اور مشینری کا مادہ تو اس نے نہیں بنایا اور اس کی تشکیل اور ترکیب میں بھی کوئی اضافہ نہیں کیا۔ جبکہ اللہ خالق بھی ہے موجد بھی اور انسان کو جوڑنے والا بھی ہے۔ یہ آغاز سے انتہا تک اللہ کے دست قدرت سے نکلا ہوا ہے۔ اس لیے اللہ اس کی حقیقت اور اس کے اسرار و رموز سے خوب واقف ہے۔ اس کے ماضی' حال اور مآل سے وہ آگاہ ہے۔

وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ (۵۰ : ۱۶) "اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں"۔ یوں انسان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی ہر چیز اللہ کے سامنے ظاہر ہے۔ اس کے اور خالق کے درمیان پردہ نہیں ہے۔ اس کے دل کی خفیہ ترین امنگوں سے بھی خالق واقف ہے۔ اور یوم الحساب کے لیے تو ہر طرح کی تیاری

ہو رہی ہے جس کا وہ منکر ہے ۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۵۰ : ۱۶) "اور ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں"۔ اس شہ رگ سے جس میں اس کا خون دوڑ رہا ہے ۔ یہ اللہ کے قبضہ ملکیت کی ایک تصویر ہے ۔ اور اللہ کی براہ راست نگرانی ہے ۔ جب انسان اس حقیقت کا تصور کرتا ہے تو اس کا رواں رواں کانپ اٹھتا ہے ۔ اگر انسان صرف اسی آیت کے مفہوم کو مستحضر رکھے تو وہ کبھی ایسی بات نہ کرے جس سے اللہ ناراض ہو بلکہ انسان غیر پسندیدہ خیالات کو اپنے دل ہی میں نہ لائے ۔ صرف یہی آیت اس بات کے لیے کافی ہے کہ انسان ہروقت محتاط رہے ' ہر وقت خائف رہے اور ہروقت حساب و کتاب کے لیے بیدار رہے ۔ قرآن کریم مزید اس نگرانی کی تشریح یوں کرتا ہے کہ انسان کی پوری زندگی ' ہر حرکت ' سونا ' کھانا ' پینا ' خاموش رہنا ' بات کرنا ' غرض سفر زندگی پورے کا پورا دو فرشتوں کے درمیان کٹ رہا ہے ۔ یہ فرشتے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے ہیں ۔ یہ اس کے ہر لفظ کو اس کے منہ سے نکلتے ہی ریکارڈ کر لیتے ہیں ۔

اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ (۵۰ : ۱۷) مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (۵۰ : ۱۸) "دو کاتب اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہیں ۔ ہر چیز ثبت کر رہے ہیں ۔ کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگران موجود نہ ہو"۔ یعنی جو نگران ہے وہ حاضر باش ہے ۔ یعنی عتید رقیب کی صفت ہے ۔ یہ مفہوم نہیں ہے جس طرح ذہن میں آتا ہے کہ دو نگرانوں میں سے ایک کا نام رقیب ہے اور دوسرے کا عتید ہے ۔ سوال یہ ہے کہ یہ کس طرح ریکارڈ کرتے ہیں ؟ اس سلسلے میں انسان کو اپنے تخیلات پیش نہ کرنا چاہئے ۔ یہ غیبی امور ہیں اور ان کو اسی طرح قبول کرنا چاہئے جس طرح قرآن میں مذکور ہیں ۔ مفہوم پر ہمارا ایمان ہے اور کیفیت کا ہمیں پتہ نہیں ہے ۔ اگر کیفیت کا پتہ لگ بھی جائے تو کوئی فائدہ نہیں ہے ۔ پھر بعض کیفیات ہمارے تجربات کے دائرے ہی میں نہیں ہوتیں اور ہم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے ۔

آج دور جدید میں ریکارڈنگ کے وہ طریقے ہم نے دیکھ لیے ہیں جن کا تصور بھی ہمارے آباء و اجداد نہ کر سکتے تھے ۔ ان طریقوں سے انسان کی ہر حرکت اور ہر لفظ ریکارڈ کیا جاتا ہے ۔ آڈیو ' وڈیو ' ٹیپ ' سینما کی ریل ' اور ٹیلی ویژن کے ٹیپ (اور اب کمپیوٹر اور اس کا نیٹ ورک ) یہ توسعت آگئی ہے انسانی دائرہ ریکارڈ میں ۔ جہاں اللہ اور اس کے عملے کا تعلق ہے تو ان کے پاس ایسے ذرائع اور ایسے طریقے ہو سکتے ہیں جن کا ہم ابھی تک تصور ہی نہیں کر سکتے ۔ بس اللہ نے جو اطلاع کر دی ہے اس پر یقین کرو ۔

ہمیں چاہئے کہ ہم اس حقیقت کے دائرے کے اندر زندہ رہیں جس کی تصویر کھینچ دی گئی ہے ۔ اور اس شعور کو تازہ کریں کہ ہم جو بات بھی کرتے ہیں جس فعل کا ارتکاب بھی کرتے ہیں ۔ ہمارے دائیں بائیں اللہ کے کارندے بیٹھے ہوئے ہیں اور لکھ رہے ہیں تاکہ یہ ریکارڈ قیامت میں ہمارے خلاف پیش ہو یا ہمارے حق میں پیش ہو ۔ اور یہ حساب ایسا ہے کہ اس سے کوئی بات نہیں چھوٹتی ۔

اور ہمیں چاہئے کہ اس حقیقت کو ذہن میں تازہ رکھتے ہوئے زندگی بسر کریں - بس یہی ہمارے لیے کافی ہے اس کی کیفیت ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو - جس شکل و صورت میں بھی ہو یہ ریکارڈ تیار ہو رہا ہے - اور ہم کسی طرح اس سے بچ کر نہیں نکل سکتے - اللہ نے پیشگی اطلاع ہمیں دے دی ہے تاکہ ہم اس کا خیال رکھیں - رہی یہ بات کہ اس کی کیفیت کیا ہے تو یہ ایک عبث جدوجہد ہوگی - جن لوگوں نے اس قرآن اور اس کے حقائق اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات سے فائدہ اٹھایا' ان کا انداز اور طریقہ یہی تھا کہ شعور کو پختہ کرو اور عمل کرو فقط -

امام احمد نے روایت کی' ابو معاویہ سے' انہوں نے محمد ابن عمر ابن علقمہ لیثی سے انہوں نے اپنے والد سے' انہوں نے ان کے دادا سے اور انہوں نے حضرت بلال ابن حارث مزنی سے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک آدمی ایک لفظ بولتا ہے جو اللہ کی رضامندی کا لفظ ہوتا ہے - اسے یہ یقین نہیں ہوتا کہ اس لفظ پر اللہ اس سے اپنی رضامندی لکھ دیتا ہے تاقیامت - اور ایک دوسرا شخص ایک لفظ بولتا ہے جو اللہ کی ناراضگی کا سبب ہوتا ہے اور اس کو یقین نہیں ہوتا کہ یہ لفظ کہاں تک پہنچ گیا - اللہ قیامت تک اس شخص سے ناراضگی لکھ دیتا ہے" کہتے ہیں کہ علقمہ کہا کرتے تھے کہ کتنی ایسی باتیں ہیں جن کے کہنے سے میں بلال ابن حارث کی حدیث کی وجہ سے رک گیا - (ترمذی' نسائی' ابن ماجہ) -

امام احمد سے روایت ہے کہ وہ سکرات الموت میں فریاد کر رہے تھے انہوں نے سنا کہ یہ فریاد بھی لکھی جارہی ہے تو خاموش ہوگئے اور ان کی روح پرواز کرگئی - یوں یہ حضرات قرآنی ہدایات کو لیتے تھے - اور یوں تھی ان کی زندگی -

---○○○---

یہ تو ہیں کتاب زندگی کے صفحات اور آخری صفحہ اس دنیا کی زندگی کا الٹایا جا رہا ہے -

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ (۵۰ : ۱۹) "پھر دیکھو' وہ موت کی جان کنی حق لے کر آپہنچی' یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا" -

موت وہ حقیقت ہے جس سے اللہ کی تمام مخلوقات ڈرتی ہے - اور ہر شخص موت کا تصور اپنے ذہن سے محو کرنے کی کوشش کرتا ہے - لیکن یہ کس طرح ممکن ہے - موت ایک ایسا طلبگار ہے جو مطالبے سے تھکتا نہیں - یہ اپنی رفتار سے انسان کے قریب ہوتی رہتی ہے - اور اس کے قدموں کی رفتار کبھی سست نہیں پڑتی - اور اس کے مقررہ وقت میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی - موت کے آخری لمحات جنہیں سکرات الموت کہا جاتا ہے - اس کے تصور ہی سے انسان کے اعضا کانپ اٹھتے ہیں - یہ موت کا منظر اسکرین پر ابھی پیش ہو رہا ہے کہ سوال ہوتا ہے -

ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ (۵۰ : ۱۹) "یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا" - انسان ابھی تک تو زندہ ہے اس دنیا میں ہے لیکن وہ اس سوال کو سن رہا ہے - لیکن جب وہ حقیقتاً جان کنی کے لمحات میں ہوگا اور اس وقت وہ یہ سوال سنے گا تو حالت کیا ہوگی - حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب آپ ؐ پر سکرات الموت طاری ہوئے تو آپ ؐ اپنے چہرۂ مبارک سے پسینہ پونچھ رہے تھے اور فرماتے تھے -

"سبحان اللہ فی الواقعہ جان کنی کے لمحات ہوتے ہیں" - آپ یہ کہہ رہے تھے حالانکہ آپ الرفیق الاعلیٰ کی طرف

رواں تھے اور اللہ کے لقاء کے مشتاق تھے دوسروں کی حالت کیا ہوگی؟

یہاں آیت میں ایک لفظ قابل توجہ ہے ۔

وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ (۵۰ : ۱۹) "اور موت کی جان کنی حق لے کر آ پہنچی"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان جب آخری لمحات میں ہوتا ہے تو اسے عالم آخرت نظر آ جاتا ہے ۔ تمام حجابات ہٹ جاتے ہیں' اب یہ جن باتوں سے جاہل تھا وہ اسے معلوم ہو جاتی ہیں ۔ وہ بھی اس کے سامنے آ جاتی ہیں جن کا وہ انکار کیا کرتا تھا ۔ لیکن اب تو وقت گزر جاتا ہے ۔ اب دیکھنا تو مفید نہیں رہتا ۔ اب علم و فضل اور حقائق کا ادراک کس کام کا! کیونکہ اب توبہ کا دروازہ بند ہو چکا ہے ۔ ایمان لانا اب مفید نہیں ہے ۔ یہ وہ سچائی تھی جس کی وہ تکذیب کرتے تھے اور اس کے بارے میں سخت خلجان میں تھے ۔ اب جبکہ انہوں نے اسے پا لیا ہے اور تصدیق کر رہے ہیں تو یہ ادراک اور تصدیق ان کے کسی کام کی نہیں ہے ۔

--- ○○○ ---

اب سکرات الموت سے ذرا آگے میدان حشر میں حساب و کتاب کی ہولناکیاں!

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيدِ ﴿٢٠﴾ وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَ
شَهِيدٌ ﴿٢١﴾ لَّقَدْ كُنتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ
الْيَوْمَ حَدِيدٌ ﴿٢٢﴾ وَقَالَ قَرِينُهُ هَٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيدٌ ﴿٢٣﴾ أَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ
كَفَّارٍ عَنِيدٍ ﴿٢٤﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيبٍ ﴿٢٥﴾ الَّذِي جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ
فَأَلْقِيَاهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيدِ ﴿٢٦﴾ قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا أَطْغَيْتُهُ وَلَٰكِن كَانَ
۲ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ﴿٢٧﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ إِلَيْكُم بِالْوَعِيدِ ﴿٢٨﴾
۱۴ع مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿٢٩﴾

۱۶ "اور پھر صور پھونکا گیا' یہ ہے وہ دن جس کا تجھے خوف دلایا جاتا تھا ۔ ہر شخص اس حال میں آ گیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانک کر لانے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا ۔ اس چیز کی طرف تو غفلت میں تھا' ہم نے وہ پردہ ہٹا دیا جو تیرے آگے پڑا ہوا تھا اور آج تیری نگاہ خوب تیز ہے ۔ اس کے ساتھی نے عرض کیا یہ جو میری سپردگی میں تھا' حاضر ہے ۔ حکم دیا گیا پھینک دو جہنم میں ہر کٹے کافر کو جو حق سے عناد رکھتا تھا' خیر کو روکنے والا اور حد سے تجاوز کرنے والا تھا' شک میں پڑا ہوا تھا اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو خدا بنائے بیٹھا تھا ۔ ڈال دو اسے سخت عذاب میں ۔ اس کے ساتھی نے عرض کیا "خداوندا' میں نے اس کو سرکش نہیں بنایا بلکہ یہ خود ہی پرلے درجے کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا۔ جواب میں ارشاد ہوا

"میرے حضور جھگڑا نہ کرو ، میں تم کو پہلے ہی انجام بد سے خبردار کر چکا تھا۔ میرے ہاں بات پلٹی نہیں جاتی اور میں اپنے بندوں پر ظلم توڑنے والا نہیں ہوں"۔

یہ ایک ایسا منظر ہے کہ اس کا ذہن میں تازہ کرنا ہی کافی ہے۔ اگر یہ تازہ کر لیا جائے تو اس زمین کی پوری زندگی احتیاط ، ڈر اور انتظار میں کٹ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کس طرح عیش کر سکتا ہوں جب کہ سینگ والے نے سینگ منہ کے ساتھ لگایا ہوا ہے اور اپنے ماتھے کو جھکایا ہوا اور انتظار میں ہے کہ اسے حکم دیا جائے۔ صحابہ کرامؓ نے فرمایا پس ہم کیا کہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہو۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل لوگوں نے کہنا شروع کر دیا حسبنا اللہ ونعم الوکیل (ترمذی)

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ (۵۰ : ۲۱) "ہر شخص اس حال میں آگیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانک کر لانے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا"۔ وہ آیا ، وہ جس کا حساب کیا جا رہا ہے ، جسے سزا ہونے والی ہے۔ ایک چلا کر لانے والا ہے اور ایک شہادت دینے والا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں لکھنے والے اور دنیا میں اس کی حفاظت کرنے والے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اور فرشتے ہوں۔ لیکن پہلی تفسیر راجح ہے۔ عدالت میں پیشی کا یہ بہترین طریقہ ہے لیکن یہ اللہ جبار کی عدالت ہے۔ ایسے مشکل وقت میں اسے یہ کہا جائے گا۔

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (۵۰ : ۲۲) "اس چیز کی طرف سے تو غفلت میں تھا۔ ہم نے وہ پردہ ہٹا دیا جو تیرے آگے پڑا ہوا تھا ، اور آج تیری نگاہ خوب تیز ہے"۔ آج تیری نظر بڑی تیز ہے اور پردوں کو پار کر کے بھی دیکھ رہی ہے۔ کام کرنے کی جگہ میں تو نے غفلت برتی۔ تو نے اس وقت کا خیال ہی نہ رکھا۔ یہ ہے وہ انجام جس کی تو توقع ہی نہ رکھتا تھا۔ آج دیکھتا جا۔ آج تیری نظر تیز ہے۔

اب اس کا ساتھی آگے بڑھتا ہے۔ راجح یہ ہے کہ یہ وہ گواہ ہے جس کے پاس اس کا اعمال نامہ ہے۔

وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ (۵۰ : ۲۳) "اس کے ساتھی نے عرض کیا ، یہ جو میری سپردگی میں تھا حاضر ہے تیار"۔ عتید کے معنی ہیں حاضر ، تیار۔ یعنی اب کوئی نئی چیز تیار نہیں کرنی ہے پہلے سے تیار ہے۔

یہاں اب اس ریکارڈ کو پڑھا نہیں جاتا ہے پس عدالت سے جلدی کے ساتھ ڈگری صادر ہوتی ہے اور نافذ ہوتی ہے۔ فوراً بارگاہ رب العزت سے اس سابق اور شہید کو حکم دیا جاتا ہے۔

اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ (۵۰ : ۲۴) مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبٍ (۵۰ : ۲۵) الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ۔ (۵۰ : ۲۶)

دو حکم دیا گیا ' پھینک دو جہنم میں ہر کٹے کافر کو جو حق سے عناد رکھتا تھا۔ خیر کو روکنے والا اور حد سے تجاوز کرنے والا ' شک میں پڑا ہوا تھا اور اللہ کے سوا کسی دوسرے کو خدا بنائے بیٹھا تھا ' ڈال دو اسے سخت عذاب میں "۔

ان صفات کے ذکر سے ' اس مشکل وقت کی مشکلات میں گرفتار لوگوں کے خوف و ہراس میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پہلے سے مشکل میں گرفتار مجرموں پر اللہ جبار و قہار کے غضب کا ڈر پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام صفات اس بات کی مستحق ہیں کہ مجرم کو زیادہ سے زیادہ سزا دی جائے۔ سخت کافر ' عناد رکھنے والا ہر بھلائی سے روکنے والا ' ہر معاملے میں حد سے گزرنے والا اور غایت درجے کا شکی جس نے اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہ بنا رکھے ہیں اور ان صفات کو گنوانے کے بعد پھر تاکید امر فَأَلْقِيَاهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيدِ (۵۰ : ۲۶) " ڈال دو اسے سخت عذاب میں " یعنی جہنم کے عذاب میں جو شدید ہی ہو گا۔

اس مقام پر اس شخص کے ساتھی بھی خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور کانپ اٹھتے ہیں اور جلدی سے اپنے بارے میں کسی الزام کے سائے کو رد کرتے ہیں ' محض اس بنا پر کہ یہ اس جہنمی کا ساتھی تھا۔

قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا أَطْغَيْتُهُ وَلَكِنْ كَانَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ (۵۰ : ۲۷) " اس کے ساتھی نے عرض کیا خداوندا ' میں نے اس کو سرکش نہیں بنایا بلکہ یہ خود ہی پرلے درجے کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا "۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ساتھی وہ نہ ہو جس کا ذکر پہلے ہوا۔ جس نے اس مجرم کے کاغذات پیش کیے۔ بلکہ اس سے مراد وہ شیطان ہو جو اس کے ساتھ اسے گمراہ کرنے کے لیے لگا ہوا تھا۔ اور اب وہ یہ س لیپنے آپ کو بری الذمہ کرنے میں لگا ہوا ہے اور پورے قرآن مجید میں ایسے مشاہد اور مکالمے موجود ہیں جن میں گمراہ کرنے والے شیاطین اپنی برات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسا کہ یہاں ہے لہٰذا یہ بھی بعید از امکان نہیں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ قرین سے مراد اعمال نامہ تیار کرنے والا فرشتہ ہو اور اس ہولناک احکام الٰہی سے ڈر گیا ہو اور اپنی برات کا اظہار کر رہا ہو اور یہ بیان کر رہا ہو کہ بے شک میں تو اس بدبخت کا ساتھی تھا ' لیکن اس کی گمراہی میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے ' اس طرح اس بری الذمہ شخص کا اپنی برات ظاہر کرنا اس بات پر دلالت ہو گی کہ اس خوفناک اور کربناک منظر کو دیکھ کر فرشتے ساتھی نے یہ کہا۔[1]

غرض اب آخری حکم آ جاتا ہے اور بات ختم ہو جاتی ہے :

قَالَ لَا تَخْتَصِمُوا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ إِلَيْكُمْ بِالْوَعِيدِ (۵۰ : ۲۸) مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ (۵۰ : ۲۹) " ارشاد ہو گا ' میرے حضور جھگڑا نہ کرو میں تم کو پہلے ہی انجام بد سے خبردار کر چکا تھا "۔ میرے ہاں بات پلٹی نہیں جاتی اور میں اپنے بندوں پر ظلم توڑنے والا نہیں ہوں "۔ لہٰذا یہ جھگڑنے کی جگہ نہیں ہے۔ اس سے قبل تمہیں بار بار خبردار کر دیا گیا تھا کہ ہر عمل پر جزاء و سزا ملے گی ' تمام اعمال لکھ دیئے

(۱) اس دوسری توجیہ سے اگلا فقرہ مانع ہے ' " میرے حضور جھگڑا نہ کرو " نیز فرشتہ کس طرح یہ سوچ سکتا ہے کہ میں غلطی میں نہ پکڑا جاؤں۔ (مترجم)

گئے ہیں ۔اب ان کے اندر کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے ۔ ہر کسی کو اس کے اعمال نامے کے مطابق بدلہ ملے گا۔ کسی پر ظلم نہ ہو گا کیونکہ جزا دینے والا حاکم عادل ہے ۔

اس پر حساب و کتاب کا یہ منظر اپنی تمام ہولناکیوں اور شدت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے لیکن ابھی یہ بحث ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کا ایک خوفناک پہلو ابھی باقی ہے ۔

یَوۡمَ نَقُوۡلُ لِجَہَنَّمَ ہَلِ امۡتَلَاۡتِ وَ تَقُوۡلُ ہَلۡ مِنۡ مَّزِیۡدٍ ﴿۳۰﴾ وَ اُزۡلِفَتِ الۡجَنَّۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ غَیۡرَ بَعِیۡدٍ ﴿۳۱﴾ ہٰذَا مَا تُوۡعَدُوۡنَ لِکُلِّ اَوَّابٍ حَفِیۡظٍ ﴿۳۲﴾ مَنۡ خَشِیَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَیۡبِ وَ جَآءَ بِقَلۡبٍ مُّنِیۡبِۣ ﴿۳۳﴾ ادۡخُلُوۡہَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِکَ یَوۡمُ الۡخُلُوۡدِ ﴿۳۴﴾ لَہُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ فِیۡہَا وَ لَدَیۡنَا مَزِیۡدٌ ﴿۳۵﴾

”وہ دن جبکہ ہم جہنم سے پوچھیں گے کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا اور کچھ ہے؟ اور جنت متقین کے قریب لے آئی جائے گی 'کچھ بھی دور نہ ہو گی ۔ ارشاد ہو گا ”یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا' ہر اس شخص کے لیے جو بہت رجوع کرنے والا' اور بڑی نگہداشت کرنے والا تھا' جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرتا تھا' اور جو دل گرویدہ لیے ہوئے آیا ہے ۔ داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی کے ساتھ“ ۔وہ دن حیات ابدی کا دن ہو گا۔وہاں ان کے لیے وہ سب کچھ ہو گا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ان کے لیے ہے“۔

یہ پورا منظر ہی سوال و جواب کا منظر ہے 'یہاں مکالمے کے لیے جہنم کو پیش کیا جاتا' یوں یہ عجیب و غریب اور خوفناک منظر ہے ۔تمام کفار معاند 'بھلائی سے روکنے والے 'حد سے گزرنے والے اور قیامت میں شک کرنے والے موجود ہیں ۔یہ سب جہنم میں کثرت سے پھینکے جا رہے ہیں اور جہنم میں ان کے ڈھیر لگ جاتے ہیں ۔اس کے بعد جہنم سے کہا جاتا ہے کہ کیا تم بھر گئی ہو اور کیا یہ لوگ تمہارے لیے کافی ہیں لیکن وہ بڑی سختی سے جوش میں آکر اور جلتے ہوئے کہے گی ۔

هَلْ مِنْ مَّزِيْد (۵۰ : ۳۰) (کیا اور کچھ ہے؟) اس طرح جس طرح بھوکا خونخوار منہ کھولے ہوئے کوئی درندہ ہوتا ہے ۔کیا ہی خوفناک منظر ہے یہ!

---○○○---

اور دوسری طرف ایک دوسرا خوبصورت منظر ہے 'پر محبت 'جس میں ہر کوئی راضی ہے 'سب متقی ایک جگہ جمع ہیں ' جنت ان کے قریب کر دی گئی ہے اور ہر طرف سے مرحبا مرحبا کی صدائیں ہیں ۔

وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْد (۳۱) هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظ (۳۲) مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ (۳۳) اِدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ

ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ (٣٤) لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (٥٠ : ٣١ تا ٣٥) "اور جنت متقین کے قریب لے آئی جائے گی' کچھ بھی دور نہ ہوگی۔ ارشاد ہوگا "یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا' ہر اس شخص کے لیے جو بہت رجوع کرنے والا' اور بڑی نگہداشت کرنے والا تھا' جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرتا تھا' اور جو دل گرویدہ لیے ہوئے آیا ہے۔ داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی کے ساتھ"۔ وہ دن حیات ابدی کا دن ہوگا۔ وہاں ان کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ان کے لیے ہے"۔

اس منظر کے مکالمات میں ہر کلمے میں تکریم اور عزت افزائی ہے۔ جنت کو اہل ایمان کے قریب کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس تک پہنچنے کے لیے ان کو کوئی سفر نہیں کرنا پڑتا بلکہ جنت خود چل کر آتی ہے ان کے قدموں میں۔

غَيْرَ بَعِيْدٍ (٥٠ : ٣١) "کچھ دور نہ ہوگی"۔ اور دوسری نعمتوں کے علاوہ اللہ کی رضامندی ہوگی اور کہا جائے گا۔

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ (٥٠ : ٣٢) مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ (٥٠ : ٣٣) "یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہر اس شخص کے لیے جو رجوع کرنے والا اور بڑی نگہداشت کرنے والا تھا' جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرتا تھا اور جو دل گرویدہ لیے ہوئے آیا ہے"۔ تو عالم بالا سے ان کی یہ تعریف کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اللہ کے پیمانے کے مطابق یہ اس کی طرف رجوع کرنے والے ہیں اور اپنے نفس کی پوری طرح حفاظت کرتے ہیں' یہ رحمان سے ڈرنے والے ہیں اور انہوں نے اسے کبھی دیکھا نہ تھا۔ اللہ کی طرف ان کے دل لگے ہوئے ہیں اور وہ اس کے مطیع فرمان ہیں۔

اس کے بعد اعلان ہوتا ہے کہ سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ اور کبھی بھی اس سے تم نے نکلنا نہیں ہے۔

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ (٥٠ : ٣٤) "داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی کے ساتھ"۔ وہ دن حیات ابدی کا دن ہوگا۔

پھر عالم بالا میں ان کی عزت افزائی کے لیے اعلان ہوگا کہ یہ ہیں وہ لوگ جن کے لیے ان کے رب کے نزدیک اور بہت کچھ ہے اور وہ غیر محدود ہے۔

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (٥٠ : ٣٥) "وہاں ان کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ہے ان کے لیے"۔ وہ جس قدر چاہیں اللہ کے انعامات کی انتہا تک نہیں جا سکتے اور اللہ کے ہاں جو مزید ہے وہ لامحدود ہے۔

---000---

# درس نمبر۲۴۹ایک نظر میں

یہ اس سورت کا آخری سبق ہے ۔ گویا یہ آخری زمزمہ ہے اور نہایت ہی زوردار آواز میں بتایا جاتا ہے کہ سفر انسانی تاریخ میں امم سابقہ کے ساتھ کیا ہوتا رہا ہے ۔ اس میں کائنات کی ایک جھلک بھی ہے اور حشر و نشر کے بارے میں بھی ایک منظر پیش کیا گیا ہے اور قرآن کے بارے میں بھی ہدایت ہے کہ آپ کام جاری رکھیں ۔ قلب و نظر کے لیے بھی کئی ہدایات ہیں' اس سبق میں ۔

یہ تمام جھلکیاں اس پوری سورت میں بھی گزری ہیں لیکن آخر میں یہ ایک نئے رنگ کے ساتھ دہرائی گئی ہیں ۔ نہایت تیزی کے ساتھ نکتہ وار' انہی باتوں کو دہرایا گیا ہے لیکن ایک نئے ذوق اور نئے انداز میں اور یہی قرآن کا اعجاز ہے کہ وہ ایک ہی بات کو جب ایک ہی سورت میں دہراتا ہے تو وہ نئی معلوم ہوتی ہے ۔ پہلے کہا گیا ۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ (۵۰:۱۲) وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ (۵۰:۱۳) وَّ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ (۵۰:۱۴) "ان سے پہلے نوح کی قوم' اصحاب الرس اور ثمود' اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائی اور ایکہ والے اور تبع کی قوم کے لوگ جھٹلا چکے ہیں' ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور آخر کار میری وعید ان پر چسپاں ہوگئی"

اور یہاں کہا گیا

---ooo---

# درس نمبر ۲۴۹ تشریح آیات

## ۳۶ --- تا --- ۴۵

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُم بَطْشًا فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِن مَّحِيصٍ ﴿٣٦﴾

"ہم ان سے پہلے بہت سی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو ان سے بہت زیادہ طاقتور تھیں اور دنیا کے ملکوں کو انہوں نے چھان مارا تھا۔ پھر کیا وہ کوئی جائے پناہ پا سکے؟"

جس حقیقت کی طرف اشارہ مطلوب تھا وہ یہ ہے لیکن یہاں بالکل جدید انداز میں ہے اور پہلی آیت میں جو انداز ہے اس سے بالکل مختلف۔ یہاں اقوام کی ایک صفت کا اضافہ کر دیا گیا کہ انہوں نے پوری دنیا میں نقب لگا کر اسے چھان مارا تھا۔ وہ ہر طرف دوڑتے پھرتے تھے۔ اسباب حیات تلاش کرتے تھے لیکن جب ان کو پکڑ آگیا تو پھر کیا کوئی جائے فرار تھی؟

هَلْ مِن مَّحِيصٍ (۵۰ : ۳۶) "پھر کیا وہ کوئی جائے پناہ پا سکے"۔ نہیں! پیش ہے ایک اضافہ اور جس سے بات اور جاندار ہو جاتی ہے:

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ﴿٣٧﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِن لُّغُوبٍ ﴿٣٨﴾ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ ﴿٣٩﴾ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ ﴿٤٠﴾ وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِن مَّكَانٍ قَرِيبٍ ﴿٤١﴾ يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوجِ ﴿٤٢﴾ إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ ﴿٤٣﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ذَٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ ﴿٤٤﴾ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا

۳

۱۶ع يَقُولُونَ وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ

۱۷

"اس تاریخ میں اس بات کا سبق ہے ہر اس شخص کے لیے جو دل رکھتا ہو' یا جو توجہ سے بات کو سنے۔ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کر دیا اور ہمیں کوئی تکان لاحق نہ ہوئی۔پس اے نبی' جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو' اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے اور رات کے وقت پھر اس کی تسبیح کرو اور سجدہ ریزیوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی۔اور سنو' جس دن منادی کرنے والا (ہر شخص کے) قریب ہی سے پکارے گا' جس دن سب لوگ آوازۂ حشر کو ٹھیک ٹھیک سن رہے ہوں گے' وہ زمین سے مردوں کے نکلنے کا دن ہو گا۔ہم ہی زندگی بخشتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں اور ہماری طرف ہی اس دن سب کو پلٹنا ہے جب زمین پھٹے گی اور لوگ اس کے اندر سے نکل کر تیز تیز بھاگے جا رہے ہوں گے۔یہ حشر ہمارے لیے بہت آسان ہے۔اے نبیؐ' جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں انہیں ہم خوب جانتے ہیں' اور تمہارا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے۔بس تم اس قرآن کے ذریعہ سے ہر اس شخص کو نصیحت کر دو جو میری تنبیہہ سے ڈرے۔

امم سابقہ کے عروج و زوال میں بہت بڑی نصیحت ہے لیکن یہ صرف اس شخص کے لیے ہے جو دل و دماغ رکھتا ہو' تاریخ امم جس دل کو حرکت نہیں دے سکتی وہ مردہ ہے' یا وہ شخص دل و دماغ رکھتا ہی نہیں ہے۔بلکہ نصیحت حاصل کرنے اور عبرت لینے کے لیے تو یہ بھی کافی ہے کہ انسان خاموشی سے داستان عروج و زوال امم سن لے۔یہ داستان خود ہی بتا دے گی۔سچ یہ ہے کہ یہ ایک عظیم حقیقت ہے۔نفس انسانی پر امم ماضیہ کے قصص کا بہت ہی بڑا اثر ہوتا ہے۔اس سلسلے میں معمولی سی بیداری اور معمولی سی قلبی کشادگی ہی یادوں اور تصورات سے اثر لیتی ہے اور انسان پر بہت اثر ہوتا ہے اور اس میں بہت سی تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔

اس سے قبل اس کائنات کی کتاب سے یہ صفحہ الٹا گیا تھا۔

أَفَلَمْ يَنظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِن فُرُوجٍ (۵۰:۶) وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ (۵۰:۷) "کیا انہوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے۔اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ جمائے اور اس کے اندر ہر طرح کے خوش منظر نباتات اگا دیں"۔اور یہاں یوں ہے۔

---ooo---

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِن لُّغُوبٍ (۵۰:۳۸) "ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کر دیا

اور ہمیں کوئی تکان لاحق نہ ہوئی"۔

تو پہلی بات پر یہاں ایک مزید حقیقت کا اضافہ کر دیا گیا۔

وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (۵۰: ۳۸) "اور ہمیں کوئی تکان لاحق نہیں ہوئی"۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ اللہ نے اس عظیم کائنات کو نہایت آسانی کے ساتھ پیدا کر دیا۔ مردوں کا زندہ کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ان ہولناک آسمانوں کے مقابلے میں تو یہ ایک بہت چھوٹا کام ہے۔ ایک مزید ہدایت بطور سبق آموزی۔

---ooo---

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ (۳۹) وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (۵۰: ۳۹ تا ۴۰) "پس اے نبی' جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو' اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے اور رات کے وقت پھر اس کی تسبیح کرو اور سجدہ ریزیوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی"۔

سورج کا طلوع و غروب اور غروب کے بعد رات کا منظر' یہ سب آسمان اور زمین کے مناظر اور حرکات کے ساتھ منسلک ہیں۔ تسبیح و ثنا اور رکوع و سجود کو ان کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے اور تلقین یہ کی گئی ہے کہ ان لوگوں کی باتوں پر صبر کرو' کیونکہ یہ ناحق حشر و نشر اور دوبارہ زندہ کرنے کو جھٹلاتے ہیں۔ یہاں گویا رات اور دن کے تکرار میں ایک نئی بات داخل کی گئی۔ حمد و ثنا اور رکوع اور سجود کو بھی اس کائنات کے مناظر سے منسلک کیا گیا ہے۔ یوں جب بھی رکوع و سجود ہو گا یہ کائناتی مناظر بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہوں گے۔ سورج کے طلوع و غروب اور رات آنے کے مناظر۔

---ooo---

ایک دوسرا ٹچ جو اس کائنات کے صفحات کے ساتھ مربوط ہے۔ یعنی صبر کرو' تسبیح کرو اور سجدے کرو اس حال میں کہ آپ' ایک عظیم حادثہ اور ایک عظیم واقعہ کے انتظار میں ہوں۔ جو گردش لیل و نہار کے کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔ اور اس سے غافل وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کے دل غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور یہ وہ بات ہے جو اس سورت کا عمود اور محور ہے اور اصلی موضوع۔

وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ (۴۱) يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ (۴۲) اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ (۴۳) يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ (۵۰: ۴۱ تا ۴۴) "اور سنو' جس دن منادی کرنے والا (ہر شخص کے) قریب ہی سے پکارے گا' جس دن سب لوگ آوازۂ حشر کو ٹھیک ٹھیک سن رہے ہوں گے' وہ زمین سے مردوں کے نکلنے کا دن ہو گا۔ ہم ہی زندگی بخشتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں اور ہماری طرف ہی اس دن

سب کو پلٹنا ہے جب زمین پھٹے گی اور لوگ اس کے اندر سے نکل کر تیز تیز بھاگے جا رہے ہوں گے ۔ یہ حشر ہمارے لیے بہت آسان ہے"۔

یہ ایک نیا اور پر تاثیر منظر ہے ۔ اس دن کا منظر جو بہت ہی مشکل دن ہو گا ۔ ایک دوسری جگہ اس منظر کی تعبیر ایک دوسرے انداز میں کی گئی ۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ (۲۰:۵۰) وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ (۲۱:۵۰) "اور پھر صور پھونکا گیا یہ ہے وہ دن جس کا تجھے خوف دلایا جاتا تھا ۔ ہر شخص اس حال میں آگیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانک کر لانے والا اور ایک گواہی دینے والا ہے"۔

اور یہاں نفخ صور کے ساتھ ایک چیخ کا ذکر بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی خروج کا منظر سامنے آتا ہے ۔ اور پھر زمین پھٹ رہی ہے اور لوگ اس سے نکلے چلے آ رہے ہیں ۔ یہ تمام مخلوقات جو آغاز حیات سے اس سفر کے انتہا تک اس زمین میں دفن ہوئے تھے ۔ یہ سب قبریں پھٹ پڑیں گی اور جن میں جو بھی جس قدر لوگ بھی دفن ہوئے تھے ، نکلے چلے آئیں گے ۔ معری کہتا ہے :

رب قبر صار قبرا مرارا
ضاحك من تزاحم الاضداد
دفين على بقايا دفين
في طويل الآجال والآماد

(کتنی ہی قبریں ہیں ، جو بار بار قبریں بنی ہیں ان کے اندر جو متضاد قسم کے لوگ دفن ہوتے چلے آ رہے ہیں ان پر وہ مسکرا رہی ہیں ۔ ایک مردے کو دوسرے کے جسم کے بقایا جات پر دفن کیا جاتا ہے ، طویل زمانوں سے اور قدیم زمانوں سے"۔

تمام چیزیں زمین کے پھٹنے کے بعد خود بخود نکلتی چلی آئیں گی ۔ ٹوٹے ہوئے جسم ، ہڈیاں ، ذرات جو زمین کی فضاؤں میں ہوں یا زمین کی وادیوں میں بہہ کر جہاں بھی ٹھہرے ہوں جن کی جگہ اللہ ہی جانتا ہے ، جمع ہوتے چلے آئیں گے ، یہ ایک ایسا منظر ہے کہ ہمارے خیال کی گرفت سے برتر ہے ۔

اس پر تاثیر منظر کے سایہ ہی میں اس حقیقت کو سامنے لایا جا رہا ہے جس کا وہ انکار کرتے تھے ۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ (۴۳:۵۰) "ہم ہی زندگی بخشتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں اور ہماری طرف ہی ان سب کو پلٹنا ہے"۔ اور

ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ (۴۴:۵۰) "اور یہ حشر ہمارے لیے بہت آسان ہے"۔ اور اس حقیقت کے اظہار کا یہ بہترین وقت و مقام تھا۔

---OOO---

اس منظر کے زیر سایہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ ثابت قدمی سے اپنے کام کو جاری رکھیں۔ ان کے جدال اور جھگڑوں' ہٹ دھرمی اور جھٹلانے کی پرواہ نہ کریں۔ جو حقیقت ان کے سامنے پیش کی جا رہی ہے' وہ واضح ہے اور اگر چشم بصیرت ہو تو دیکھی جا سکتی ہے۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (۵۰ : ۴۵) "اے نبیؐ جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں انہیں ہم خوب جانتے ہیں' اور تمہارا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے۔ بس تم اس قرآن کے ذریعہ سے ہر اس شخص کو نصیحت کر دو جو میری تنبیہ سے ڈرے"۔

جو باتیں یہ بنا رہے ہیں ہم ان کو خوب جانتے ہیں اور تمہاری تسلی کے لیے بس یہی کافی ہے کہ ہم جانتے ہیں اور ہمارے جاننے کے کچھ نتائج بھی ہوں گے۔ یہ بہت ہی خوفناک دھمکی ہے۔

وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ (۵۰ : ۴۵) "تمہارا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے"۔ کہ آپ ایمان اور تصدیق پر کسی کو مجبور کر دیں۔ اس میں آپ کا کوئی اختیار نہیں ہے"۔ اختیارات ہمارے پاس ہیں۔ ہم نگرانی کر رہے ہیں اور ان کے ذمہ دار ہیں۔

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (۵۰ : ۴۵) "بس تم اس قرآن کے ذریعے ہر اس شخص کو نصیحت کرو' جو میری تنبیہ سے ڈرے"۔ قرآن بذات خود ایک عظیم قوت ہے۔ یہ دلوں کو ہلا مارتا ہے۔ ذہنی دنیا میں زلزلہ برپا کر دیتا ہے۔ اس کے سامنے سنگ دل سے سنگدل شخص نہیں ٹھہر سکتا۔ قرآن کے حقائق کا سامنا کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ قرآن عجیب انداز میں اثر انداز ہوتا ہے۔

جب ایسی سورتیں لوگوں پر پڑھنے کے لیے اور پیش کرنے کے لیے موجود ہیں تو کسی جبار کی کیا ضرورت ہے جو لوگوں کی گردنیں مروڑ کر مسلمان بنائے۔ قرآن کے اندر وہ قوت ہے جو بڑے بڑے جباروں کے اندر نہیں ہے۔ اس کے ذریعہ دلوں پر وہ ضربات لگ سکتی ہیں' جو ڈکٹیٹروں اور جباروں کے کوڑوں کے ذریعہ نہیں لگائی جا سکتی (صدق اللہ العظیم)

نوٹ :۔ پارہ ۲۶ کا نظر ثانی رہ گئی تھی۔ یہ نظر ثانی آج مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۹۶ء بوقت ۵۲۔ ۳ شب ختم ہوئی' اس طرح تقریباً بتیس سال کے عرصے میں یہ کام ختم ہوا۔ اے اللہ اسے اپنے دین کی سربلندی کے لیے مفید بنا دے اور میرے لیے موجب اجر بنا دے۔ آمین۔ سید معروف شاہ شیرازی

---OOO---

# تفسیر فی ظلال القرآن

سید قطب شہیدؒ

ترجمہ

سید معروف شاہ شیرازی

| | | | |
|---|---|---|---|
| جلد اول | پارہ | ۱ تا ۴ | ۲۵۰ روپے |
| جلد دوم | پارہ | ۵ تا ۸ | ۳۷۵ روپے |
| جلد سوم | پارہ | ۹ تا ۱۲ | ۳۲۵ روپے |
| جلد چہارم | پارہ | ۱۳ تا ۱۹ | ۳۲۵ روپے |
| جلد پنجم | پارہ | ۲۰ تا ۲۶ | ۳۷۵ روپے |
| جلد ششم | پارہ | ۲۷ تا ۳۰ | زیر طبع |

# فی ظلال القرآن

سید قطب شہیدؒ

ترجمہ

سید معروف شاہ شیرازی

جلد ششم

پارہ ۲۷ تا ۳۰

ادارہ منشورات اسلامی
بالمقابل منصورہ ملتان روڈ، لاہور

# جملہ حقوق محفوظ ہیں


| | | |
|---|---|---|
| تفسیر | ------- | فی ظلال القرآن |
| مصنف | ------- | سید قطب شہید ؒ |
| مترجم | ------- | سید معروف شاہ شیرازی |
| ناشر | ------- | سید عارف شیرازی |
| جلد ششم | ------- | پارہ ۲۷ تا ۳۰ |
| تعداد | ------- | ۱۱۰۰ |
| مطبع | ------- | عبد محمد پرنٹرز لاہور |
| ھدیہ | ------- | ۳۷۵ روپے |
| اشاعت اول | ------- | جولائی ۱۹۹۷ء |


---○○○---

# عرض ناشر

**شہید اسلام سید قطب** ؒ ۔ سید قطب کا شمار امت مسلمہ کی ان چند برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریک دور میں روشنی کے چراغ جلائے اور اسلامی نظام زندگی کی کھیتی کو اپنے خون سے سینچا۔

سید قطب ؒ ۱۹۰۲ء میں مصر کے ایک صوبہ "اسیوط" کے ایک گاؤں "موشاء" میں پیدا ہوئے ۔ والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ دونوں عربی النسل تھے ۔ سید قطب ؒ اپنے والدین کے سب سے بڑے لڑکے تھے ۔

آپ نے ثانوی تعلیم "تجہیزیہ دارالعلوم" نامی ایک اسکول میں حاصل کی ۔اس اسکول میں طلباء کو دارالعلوم میں داخلہ کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہوکر آپ ۱۹۲۹ء میں قاہرہ کے دارالعلوم میں داخل ہوئے ۔ ۱۹۳۳ء میں آپ نے بی ۔اے کی ڈگری اور ڈپلومہ ان ایجوکیشن حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے محکمہ تعلیم میں بحیثیت انسپکٹر تعلیم ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۵۲ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران ۱۹۵۳ء میں آپ اخوان المسلمون سے متعارف ہوئے ۔اور ۲ جولائی ۱۹۵۴ء میں آپ کو اخوان کے شعبہ نشرواشاعت کے اخبار "الاخوان المسلمون" کا ایڈیٹر مقرر کیا۔

شہید اسلام سید قطب ؒ ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک جیل میں رہے اور اگست ۱۹۶۴ء میں مرحوم عبدالسلام عارف صدر عراق کی کوشش سے رہا ہوئے ۔ رہا ہوتے ہی پوری دنیا کے نوجوانوں نے آپ کی طرف رجوع کیا اور آپ کا لٹریچر جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیلنے لگا۔ چنانچہ لادین مغرب پرست کمیونسٹ اور سوشلسٹ عناصر چیخ اٹھے اور بیک وقت ماسکو اور واشنگٹن سے ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ چنانچہ آپ کو ایک سال بعد اگست ۱۹۶۵ء میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور ایک سال بعد ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء میں آپ کو شہید کر دیا گیا۔

سید قطب اخوان المسلمون میں آنے سے پہلے خالص ادبی کام کرتے رہے ۔ لیکن تحریک اخوان المسلمون میں شامل ہونے کے بعد اسلامی انقلاب' اور تحریک اسلامی' ان کا خاص موضوع رہا۔

**تفسیر فی ظلال القرآن** ۔ مصنف نے فی ظلال القرآن میں قرآن پاک کی اثرانگیزی جس نے عرب کی کایا پلٹ دی تھی' کی راہ میں حائل پردوں کو چاک کر دیا ہے ۔اس کے ذریعے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والا اس تحریک کے ساتھ جا کھڑا ہوتا ہے جو ہبوط آدم علیہ السلام کے وقت سے روئے زمین پر برپا ہوئی اور انبیا علیہم السلام کی قیادت میں چلتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک آپہنچی۔ آپ صلعم کے بعد بھی یہ تحریک زندہ ہے اور قیامت تک جاری رہے گی ۔ قاری توحید و رسالت اور آخرت کے عقیدے کو قافلے کے ایک رفیق اور تحریک کے ایک کارکن کی حیثیت سے سنتا اور سمجھتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان کو امت کے ایک فرد کی حیثیت سے پڑھ کر اس سے سبق لیتا ہے ۔

فی ظلال القرآن میں علمی موشگافیوں اور فقہی باریکیوں سے ہٹ کر قرآن پاک کے اصل مقصد اور دعوتی رنگ کو اختیار کیا گیا ہے ۔ اس کے لئے جو زبان استعمال کی گئی ہے ۔ وہ سید کا ہی حصہ ہے اور اسے بلاشبہ الہامی زبان کہا جا سکتا ہے ۔ اپنے اس رنگ میں یقیناً یہ ممتاز ترین تفسیر ہے ۔ تفسیر کیا ہے ایک دعوت عمل اور دعوت انقلاب ہے 'الفاظ اور معنی کا دریا ہے ۔ جس میں تحقیق' علمی' وجدانی' اور ادبی نکات جابجا موجود ہیں ۔ پورے ذخیرہ تفاسیر میں یہ پہلی تفسیر ہے ۔ جو خود قرآن کے اسلوب بیان میں لکھی گئی ہے ۔ دوسری تفاسیر بالعموم منطقی انداز بیان میں لکھی گئی ہیں اور فی ظلال القرآن قرآنی اور انقلابی انداز بیان میں ہے ۔ اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ یہ اختلافی مسائل اور اسرائیلیات سے خالی ہے ۔ اسلام کا جامع تصور لئے ہوئے' اس کے احیاء کا طریقہ کار نمایاں کرتی ہے ۔ غرض اخلاص' روح ایمان' عمل صالح اور دعوت انقلاب اس کی نمایاں خصوصیات ہیں ۔ پندرہ پارے جیل سے باہر اور بقیہ

جیل میں لکھے گئے ہیں۔ عربی میں اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

**مترجم سید معروف شاہ شیرازی** ۔ سید معروف شاہ شیرازی ۸ ا اپریل ۱۹۳۲ء کو ضلع مانسہرہ کے ایک گاؤں ہروڑی میں پیدا ہوئے ' ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ ہی میں حاصل کی حصول علم کا شوق بچپن ہی سے انتہائی زیادہ تھا جس کی وجہ سے سرحد اور پنجاب کے مختلف دینی مدارس اور معروف علماء کرام سے تعلیم حاصل کرتے رہے ' پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۵۲ء میں منشی فاضل اور ۱۹۵۳ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور اگلے ہی سال مشہور دینی درس گاہ جامعہ اشرفیہ لاہور سے دورہ حدیث کر کے سند فراغت حاصل کی ' جبکہ ۱۹۶۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا ' اور بعد میں ۱۹۶۷ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔

درس نظامی پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۵ تا ۱۹۶۵ء گورنمنٹ ہائی سکول بٹل میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے لیکن بعد میں اس پیشہ کو ترک کر کے تصنیف و تالیف اور صحافت کے شعبہ سے منسلک ہو گئے ۔ ایک سال تک ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی کے ایڈیٹر رہنے کے بعد اپنا رسالہ " اسوہ " راولپنڈی سے نکالنا شروع کیا لیکن بعد میں کراچی منتقل ہونے کی وجہ سے کراچی سے "اسوہ ڈائجسٹ" کے نام سے یہی رسالہ شائع کرتے رہے ۔

اس دوران ادارہ معارف اسلامی کراچی میں ریسرچ اسکالر کے طور پر کام کرتے ہوئے مختلف عربی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا جو " اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو " "اسلام میں جرم و سزا" (دو حصے) "حسن البناء شہید کی یادداشتیں" اور "نشانات راہ" کے ناموں سے شائع ہوئیں ۔

لیکن ۱۹۷۰ء میں ناسازی طبع کی بناء پر کراچی سے آبائی علاقہ میں منتقل ہو گئے اور وہاں ضلع مانسہرہ کی تحصیل بٹگرام میں وکالت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے اور ۱۹۹۲ء تک اسی پیشہ سے منسلک رہے ۔ پیشہ وکالت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس دوران "سیرت القرآن" حصہ اول دوم "اسلامی انقلاب کا منہاج" "اسلام اور جمہوریت ججوں اور جرنیلوں کے زیر سایہ" "مدارس عربیہ اور اسلامی انقلاب" "سید مودودی کے فکری کام کا ایک جائزہ" "جماعت اسلامی انصاف کے دروازے پر" اور انگریزی کی کتاب "The Shape Of Basic Organs in Islamic State" ادارہ منشورات اسلامی منصورہ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئیں ۔

گزشتہ ۲۹ سال میں دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ سید قطب شہید کی تفسیر فی ظلال القرآن کے اردو ترجمے کا کام بھی جاری رہا جو اکتوبر ۱۹۹۵ء میں مکمل ہوا۔

سید معروف شاہ شیرازی دوران تعلیم ہی سید مودودی " سے متعارف ہوئے اور اکثر عصری مجالس میں حاضر رہتے تھے ' تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ مولانا مودودی " کے ساتھ بھی رہے ' جبکہ مولانا مودودی " اکثر انہیں مسکین شاہ صاحب کے نام سے یاد فرماتے تھے ' ۱۹۶۲ء میں جماعت اسلامی کے رکن بنے اور ہمیشہ تحریکی سرگرمیوں میں مصروف رہے ' قومی اتحاد کی تحریک کے دوران ہری پور جیل میں بھی رہے ۔ موصوف آجکل نائب امیر جماعت اسلامی ضلع مانسہرہ کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں اور جماعت اسلامی صوبہ سرحد کی شوریٰ کے بھی منتخب رکن ہیں ۔

فی ظلال القرآن کے ترجمہ کے بعد موصوف اپنی زیر تکمیل کتب " حرمت سود " "تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل" "کتاب نکاح" "تحریکات اسلامیہ" "غربت اسلام کی نظر میں" "مغلیہ دور حکومت میں سرحد کے صوفیاء کرام کا کردار" کی تکمیل میں مصروف ہیں ۔

الحمد ہللہ اب تفسیر فی ظلال القرآن کی آخری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ قرآن کی اس خدمت کو قبول فرمائے ' عوام الناس کی فلاح کا ذریعہ اور میرے لئے توشہ آخرت بنا دے ۔ آمین ثم آمین (سید عارف شیرازی)

# جلد ششم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

# فہرست جلد ششم

## پارہ نمبر۔ ۲۷-------- الذّٰریٰت ۔ ۵۱



## سورۃ الطّور ۔ ۵۲



## سورۃ النجم ۔ ۵۳



## سورۃ القمر ۔ ۵۴



## سورۃ الرحمٰن ۔ ۵۵



## سورۃ الواقعۃ ۔ ۵۶

## سورۃ الحدید ـ ۵۷



## پارہ ـ ۲۸ ــــ سورۃ المجادلہ ـ ۵۸



## سورۃ الحشر ـ ۵۹



## سورۃ الممتحنۃ ـ ۶۰



## سورۃ الصف ـ ۶۱



## سورۃ الجمعۃ ـ ۶۲



## سورۃ المنافقون ـ ۶۳



## سورۃ التغابن ـ ۶۴

## سورۃ التکویر ــ ۸۱



## سورۃ الانفطار ــ ۸۲



## سورۃ المطففین ــ ۸۳



## سورۃ الانشقاق ــ ۸۴



## سورۃ البروج ــ ۸۵



## سورۃ الطارق ــ ۸۶



## سورۃ الاعلیٰ ــ ۸۷



## سورۃ الغاشیۃ ــ ۸۸

## سورۃ الفجر ۔ ۸۹



## سورۃ البلد ۔ ۹۰



## سورۃ الشمس ۔ ۹۱



## سورۃ اللیل ۔ ۹۲



## سورۃ الضحیٰ ۔ ۹۳



## سورۃ الم نشرح ۔ ۹۴



## سورۃ التین ۔ ۹۵



## سورۃ العلق ۔ ۹۶



## سورۃ القدر ۔ ۹۷

## سورۃ البینة ـ ۹۸



## سورۃ الزلزال ـ ۹۹



## سورۃ العدیت ـ ۱۰۰



## سورۃ القارعة ـ ۱۰۱



## سورۃ التکاثر ـ ۱۰۲



## سورۃ العصر ـ ۱۰۳



## سورۃ الھمزۃ ـ ۱۰۴



## سورۃ الفیل ـ ۱۰۵



## سورۃ قریش ـ ۱۰۶

## سورۃ الماعون ـ ۱۰۷



## سورۃ الکوثر ـ ۱۰۸



## سورۃ الکافرون ـ ۱۰۹



## سورۃ النصر ـ ۱۱۰



## سورۃ اللھب ـ ۱۱۱



## سورۃ الاخلاص ـ ۱۱۲



## سورۃ الفلق ـ ۱۱۳



## سورۃ الناس ـ ۱۱۴



---ООО---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ــ ۲۶

## سورۃ الذّٰریٰت ۔ ۵۱

## ۱ ــ تا ــ ۳۰

# سورۃ الذّٰریٰت ایک نظر میں

اس سورت کی ایک خاص فضا ہے' اس کا آغاز کلام چار قوتوں کے ذکر سے ہوتا ہے ۔ ان قوتوں کا تعلق امرالٰہی سے ہے ۔ ان کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا گیا ہے جن کا مفہوم مبہم ہے ۔ پہلی ہی نظر میں انسان کے پردہ احساس پر یہ تاثر نمودار ہوتا ہے کہ یہ امور سری ہیں جن پر اللہ تعالیٰ قسم اٹھا رہا ہے ۔

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا (١) فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا (٢) فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا (٣) فَالْمُقَسِّمٰتِ أَمْرًا (٤) اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ (٥) وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ (٦) (٥١ : ١ تا ٦) "قسم ہے ان ہواؤں کی جو گرد اڑانے والی ہیں' پھر پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھانے والی ہیں' پھر سبک رفتاری سے چلنے والی کشتیوں کی قسم اور پھر ایک بڑے کام کی تقسیم کرنے والوں کی قسم' حق یہ ہے کہ جس چیز کا تمہیں خوف دلایا جارہا ہے وہ سچی ہے اور جزائے اعمال ضروری پیش آنی ہے"

ذاریات' حاملات' جاریات اور مقسمات کے کوئی متعارف مفہوم نہیں ہے ۔ ان الفاظ کا مفہوم اشاراتی ہے اور ان مفہوم کے بارے سوالات اٹھ سکتے ہیں ۔ خود ان الفاظ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر اجمال اور غموض ہے اور شاید اس سورۃ کی فضا کے ساتھ اس قسم کے الفاظ لانا مقصود تھا ۔

اس پہلی قسم کے متصلا بعد دوسری قسم ہے ۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ (٥١ : ٧) "قسم ہے مختلف شکلوں والے آسمان کی اور اس قسم کا جواب یا مقسم علیہ یہ حقیقت ہے"۔

اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ (٥١ : ٨) "تمہاری بات ایک دوسرے سے مختلف ہے" یعنی تمہاری باتیں نہ مستقل ہیں اور نہ باہم مربوط اور متناسب ہیں ۔ یہ محض ظن و تخمین پر مبنی ہیں ۔ علم اور یقین پر مبنی نہیں ۔

لیکن اس مجمل اسلوب کے ساتھ آغاز کے بعد اس سورۃ' اس پوری سورۃ کا ہدف اور مقصد ایک ہی ہے اور بالکل واضح ہے ۔ یہ کہ انسانی قلب کو عالم بالا سے منسلک کر دیا جائے اور انسان کا دل اس پوشیدہ امر سے مربوط ہو جائے جسے اللہ نے مخفیہ رکھا ہے ۔ غرض زمین کی آلائشوں سے انسان کو پاک کرنا اور ان تمام بندشوں سے اسے آزاد کرنا جو اس کے سامنے اخلاص' اللہ کی بندگی اور اللہ کی طرف مکمل فرار کے معاملے میں رکاوٹ بنتے ہیں اور اسے اس کے لئے پوری طرح تیار کرنا کہ وہ اس آیت پر لبیک کہے ۔

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ( ۵۱ : ۵۰ ) "پس دوڑو اللہ کی طرف" اس سورۃ کا ہدف ہے کہ تمام لوگ اللہ کے بندے بن جائیں جس طرح کہا گیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ( ۵۱ : ۵۶ ) "اور میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے نہیں پیدا کیا کہ وہ میری بندگی کریں" انسان کے لئے اس دنیا میں سب سے بڑا مسئلہ اس کی معیشت کا ہے کہ اسے رزق تلاش کرنا ہوتا ہے اور قدرت نے ہر شخص کا رزق مقدر کر کے اسے خفیہ رکھا ہے۔ اس سورۃ کا ایک اہم مضمون یہ ہے کہ انسان کو فکر معاش کی غلامی سے آزاد کر دیا جائے۔ اسے یہ یقین دلایا جائے کہ اللہ نے رزق کے سلسلے میں ہر کسی کے لئے جو حصہ مقرر کر دیا ہے وہ ضرور اسے ملے گا۔ لہٰذا دل کو صرف تلاش معاش کا اسیر ہی نہ بناؤ بلکہ عالم بالا سے تعلق پیدا کرو۔ اس نکتے کی طرف اس سورۃ میں بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔ براہ راست یا بالواسطہ' مثلاً۔

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ( ۵۱ : ۲۲ ) "آسمان ہی میں تمہارا رزق بھی ہے اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے"۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ( ۵۱ : ۵۸ ) "اللہ تو خود ہی رزاق ہے' بڑی قوت والا اور زبردست" اور کبھی اشارہ کیا گیا ہے مثلاً اپنے بندوں کا حال بیان کرتے ہوئے کہا گیا۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ( ۵۱ : ۱۹ ) "ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لئے" ابراہیم علیہ السلام کی صفات بیان کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مہمانوں کے لئے پورا بچھڑا بھون کر تیار کیا حالانکہ وہ تعداد میں کم تھے۔ مہمانوں کے پہنچتے ہی وہ جلدی سے تیار کر لائے حالانکہ ابھی محض علیک سلیک ہوا تھا۔ حال احوال بھی نہ پوچھا تھا۔

یوں دل کو زمین کی رکاوٹوں سے آزاد کرایا جاتا ہے اسے رزق کی پریشانی سے بھی آزاد کیا جاتا ہے اور اس کی توجہ کو عالم بالا کی طرف پھیرا جاتا ہے۔ اس کی دلچسپیاں عالم بالا کے ساتھ منسلک ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے خالق کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کے سامنے پھر کوئی زمینی رکاوٹ نہیں رہتی اور وہ دوڑ کر اللہ کی طرف چلا جاتا ہے۔ تمام موضوعات و مسائل کی غرض و غایت یہی ہے جو اس سورۃ میں لئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز قدرے مجمل اور ناقابل فہم کلمات سے کیا گیا۔ اس لئے آسمان سے قسم کھائی گئی اور مجمل الفاظ میں بھی اشارہ آسمانی قوتوں کی طرف کیا گیا۔

سورۃ کے آغاز میں خدا سے تعلق رکھنے والے متقین کی تصویر کشی بھی کی گئی اور ان کی صفات بھی گنوائی گئیں کہ وہ کس قسم کے لوگ ہیں جو قرآن کو مطلوب ہیں۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ( ۱۵ ) اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ( ۱۶ ) كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ( ۱۷ ) وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ

يَسْتَغْفِرُوْنَ(۱۸)وَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ(۱۹)(۵۱:۱۵ تا ۱۹) "بے شک متقی لوگ اس روز باغوں اور چشموں میں ہوں گے جو کچھ ان کا رب انہیں دے اسے خوشی خوشی لے رہے ہوں گے' وہ اس دن کے آنے سے پہلے نیکو کار تھے۔ راتوں کو کم ہی سوتے تھے۔ پھر وہ رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے اور ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لئے" یہ اللہ کی طرف نظریں بلند رکھنے کی صورت ہے۔ اللہ کے لئے خالص ہونے کی تصویر ہے۔ رات کو اس کی عبادت میں مشغولیت نظر آتی ہے تو صبح کو ہونٹوں پر استغفراللہ ہے اور رات اور دن مال کمانے کی بجائے وہ خرچ کرتے ہیں۔ سائل اور محروم کو اپنے ساتھ حصہ دار بھتے ہیں۔ یوں ان پر جمع مال کا کوئی دباؤ نہیں ہے۔

اسی حوالے کے ساتھ متوجہ کیا جاتا ہے کہ زمین میں صرف رزق ہی تلاش نہ کرو' آیات الٰہیہ کی تلاش بھی کرو۔ دل کو آسمانوں سے اٹکا دو کہ تمہارا رزق آسمانوں میں ہے۔ صرف زمین کے قریبی اسباب اس لئے تمہیں دھوکہ نہ دے دیں۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ(۲۰)وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ(۲۱)وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ(۲۰)(۵۱:۲۰ تا ۲۲) "زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لئے اور خود تمہارے اپنے وجود میں بھی ہیں۔ کیا تم کو سوجھتا نہیں؟ آسمان ہی میں ہے تمہارا رزق اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے"

اسی غرض کے لئے یہاں اشارہ کیا گیا کہ اللہ نے آسمان کو بڑا وسیع بنایا ہے اور زمین کو بطور فرش بچھایا ہے اور اس کے اندر ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے گئے ہیں۔ یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں اس لئے اللہ کی طرف دوڑو

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ(۴۷)وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ(۴۸)وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ(۴۹)فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ(۵۰)(۵۱:۴۷ تا ۵۰) "آسمانوں کو ہم نے اپنے زور سے بنایا اور ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں۔ زمین کو ہم نے بچھایا ہے اور ہم بڑے اچھے ہموار کرنے والے ہیں اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں۔ شاید کہ تم اس سے سبق لو۔ بس دوڑو اللہ کی طرف میں تمہارے لئے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں۔"

اور اسی مقصد یعنی تعلق بالسماء کے لئے سورۃ کے آخر میں صاف صاف بتایا گیا کہ جنوں اور انسانوں کی تخلیق کا مقصد کیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ(۵۶) مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ(۵۷)اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ(۵۱:۵۸) "میں نے جنوں اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری بندگی کریں ۔ میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں ۔ اللہ تو خود ہی رزاق ہے ۔ بڑی قوت والا اور زبردست" عرض قلب و خرد کی تاروں پر مسلسل ایک ہی ضرب ہے ۔ ایک ہی مضراب ہے لیکن اس سے متعدد نغمات نکلتے ہیں اور ان کے اثرات اور ان کی آوازوں میں یہی صدا ہے کہ دوڑو' دوڑو اللہ کی طرف جو آسمانوں میں ہے ۔

اس سورۃ میں حضرت ابراہیم اور حضرت لوط کے قصے کی بھی ایک جھلک موجود ہے ۔ قصہ موسیٰ اور قصہ عاد اور قصہ ثمود اور قصہ نوح کی طرف بھی سرسری اشارات موجود ہیں ۔ ابراہیم کے قصے میں بھی مال و اولاد کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا کہ رزق و اولاد آسمانوں میں ہے ۔ کس طرح حضرت ابراہیم اور اس کی بیوی کو غیر متوقع طور پر اولاد دی گئی اور باقی قصص میں اس آنے والی عظیم حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس پر آغاز سورۃ میں قسمیں کھائی گئیں ۔

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ(۵۱:۵) "تم سے جو وعدہ کیا جارہا ہے وہ یقیناً سچا ہے" اور سورۃ کے آخر میں بھی اس کی طرف دھمکی آمیز اشارہ ہے ۔

فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ(۵۱:۵۹) "پس جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حصے کا بھی ویسا ہی عذاب تیار ہے جیسے لوگوں کو ان کے حصے کا مل چکا ہے ۔ اس لئے یہ لوگ مجھ سے جلدی نہ مچائیں ۔" جیسا کہ اس سے قبل بھی ان کو ایسی ہی دھمکی دی گئی کہ ان کا رویہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سابقہ لوگوں کا رہا ہے ہمیشہ یہی بات سب کرتے رہے ہیں ۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ(۵۱:۵۲) اَتَوَاصَوْا بِهٖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ(۵۱:۵۳) "یونہی ہوتا رہا ہے ان سے پہلے قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون ہے ۔ کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کرلیا ہے ؟ نہیں بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں ۔"

یوں اس سورۃ کے تمام قصص سورۃ کے محور کے ساتھ مربوط ہیں یعنی اس مقصد کے لئے کہ دلوں کو اللہ کی بندگی کے لئے خالص کردیا جائے ۔ اس راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کردیا جائے اور اسے آسمان کے ساتھ جوڑ دیا جائے اور ایمان و یقین دل میں یوں بیٹھ جائے کہ تمام پردے دور ہو جائیں ۔ تمام رکاوٹیں خود بخود راستے سے ہٹ جائیں ۔ تمام دوسرے مسائل رکاوٹ نہ بنیں اور انسانی روح پھڑپھڑاتی ہوئی اس بلند افق کی طرف اڑ جائے ۔

# درس نمبر ۲۵۰ تشریح آیات

## ۱ ـــ تا ـــ ۶۰

سُوْرَۃُ الذّٰرِیٰتِ مَکِّیَّۃٌ (۵۱) (۶۷) اٰیَاتُھَا ۶۰ رُکُوْعَاتُھَا ۳

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا ﴿۱﴾ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ﴿۲﴾ فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا ﴿۳﴾ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ﴿۴﴾
اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ﴿۵﴾ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ﴿۶﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

"قسم ہے ان ہواؤں کی جو گرد اڑانے والی ہیں' پھر پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھانے والی ہیں' پھر قسم ہے سبک رفتاری کے ساتھ چلنے والی کشتیوں کی' پھر ایک بڑے کام (بارش) کی تقسیم کرنے والوں کی' حق یہ ہے کہ جس چیز کا تمہیں خوف دلایا جارہا ہے وہ سچی ہے اور جزائے اعمال ضرور پیش آنی ہے"۔

یہ سرسری اور مختصر آیات و ضربات ہیں۔ ایسے الفاظ کے ساتھ جن کا مفہوم واضح نہیں ہے جیسا کہ ہم نے کہا پر وہ احساس پر ایک خاص تاثر چھوڑتی ہیں۔ دل کو ایک نہایت ہی اہم بات سے جوڑ دیتی ہیں اور ایسے معاملے کی طرف متوجہ کرتی ہیں کہ جو توجہ کا مستحق ہے۔ جن لوگوں نے قرآن کریم کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سنا ان کو بھی ان الفاظ کا مفہوم ایک دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت پیش آئی کہ ذاریات' حاملات' جاریات اور مقسمات کا مفہوم کیا ہے۔

علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں' شعبہ ابن الحجاج نے روایت کی' سماک ابن خالد ابن عرعرہ سے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ سے سنا نیز روایت کی شعبہ نے قاسم ابن ابوبزہ سے' انہوں نے ابو طفیل سے' انہوں نے بھی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا اور ان کے علاوہ بھی کئی لوگوں کے ذریعہ حضرت علی ابن ابوطالب رضی اللہ عنہ سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ کوفہ میں ممبر پر چڑھے اور کہا' تم قرآن کی کسی آیت کے بارے میں مجھ سے پوچھو یا سنت رسول ؐ کے بارے میں مجھ سے پوچھو تو میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔ ابن کواء کھڑا ہوا اور دریافت کیا امیر المومنین کہ اللہ کے کلام

الذاریات ذروا.... کے کیا معنی ہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا "ہوا" تو اس نے پوچھا فالحاملات وقرا کے معنی؟ تو انہوں نے فرمایا "بادل" تو اس نے پوچھا فالجاریات یسرا کے معنی تو آپ نے فرمایا "کشتیاں" اس نے کہا فالمقسمات امرا؟ تو انہوں نے فرمایا "فرشتے"۔ ایک شخص صبیغ ابن عسل تمیمی حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور حضرت عمر سے ان الفاظ کے معنی پوچھے' تو حضرت عمر نے بھی حضرت علی کی طرح جواب دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ شاید وہ دشمنی اور عناد کی بنا پر سوال کر رہا ہے تو آپ نے اسے سزا دی اور حکم دیا کہ وہ لوگوں کے پاس نہ بیٹھے۔ یہاں تک کہ اس نے توبہ کی اور سخت قسموں کے ساتھ حلف اٹھایا کہ آپ نے جو محسوس کیا ہے میرے دل میں وہ بات نہ تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان الفاظ کے مدلول اور معنیٰ کا احتمال اہل عناد اور دشمنان اسلام کو یہ موقع دے رہا تھا کہ وہ ان کے بارے میں لوگوں سے سوال کرتے پھریں۔ اگر کوئی محسوس کرتا تو وہ کہتے ہم تو صرف معنی پوچھتے تھے۔ یہی تفسیر ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ مجاہد' سعید ابن جبیر' حسن' قتادہ' سدی وغیرہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ ابن جریر اور ابن ابو حاتم نے اس کے علاوہ کوئی اور تفسیر نقل نہیں کی۔ (ابن کثیر)

اللہ تعالیٰ ان ہواؤں کی قسم اٹھاتا ہے جو گرد اڑاتی ہیں جو بیجوں کو ادھر ادھر اڑاتی ہیں اور جو پھولوں پر گرد کو اڑاتی ہیں اور بادلوں کو اڑاتی ہیں۔ نیز دوسری چیزوں کو اڑاتی ہیں جو انسان کے علم میں ہوں یا نہ ہوں اور پھر قسم ہے ان بادلوں کی جو پانی کے بوجھ کو اٹھائے ہوئے ہیں اور پھر جہاں اللہ کا حکم ہوتا ہے برس جاتے ہیں۔ پھر ان کشتیوں کی قسم جو بڑی سہولت سے چلتی ہیں۔ یہ سطح سمندر پر تیر رہی ہوتی ہیں کہ ان کے مواد میں اور پانی میں اللہ نے ایسی خصوصیات ودیعت کی ہیں اور اس کائنات میں اللہ نے ایسی خصوصیات رکھ دی ہیں جو ان کشتیوں کی رفتار کو آسان کرتی ہیں پھر ملائکہ کی قسم جو اللہ کے احکام کو تقسیم کرتے ہیں۔ یہ اللہ کے پیغام کو تقسیم کرتے ہیں۔ یہ اللہ کا پیغام اس کی مرضی سے تقسیم کرتے ہیں۔ یہ پیغامات مختلف معاملات کے متعلق ہوتے ہیں اور پوری کائنات میں تقسیم ہوتے ہیں۔

ہوا' بادل' سفینے اور فرشتے اللہ کی مخلوقات میں سے مخلوق ہیں۔ اللہ ان کو اپنی قدرت کا سبب اور آلہ بناتا ہے۔ یہ اللہ کی مشیت کا ایک پردہ ہیں اور ان کے ذریعہ اللہ زمین پر اپنی مرضی چلاتا ہے۔ اللہ ان چیزوں کے ساتھ قسم اس لئے اٹھاتا ہے کہ یہ بہت ہی اہم چیزیں ہیں اور انسانوں کو اس طرف متوجہ ہونا چاہئے اور ان کے پیچھے جو قوتیں کام کرتی ہیں ان پر غور کریں اور پھر انسان ان چیزوں پر غور کریں کہ اللہ نے کس طرح ان کو پیدا کیا ہے وہ ان کے ذریعے سے اس دنیا میں کیا کیا تصرفات کرتا ہے اور اپنی اس تقدیر کو پردے سے باہر لاتا جاتا ہے جو اس نے پہلے سے طے کر رکھی ہے۔ یہاں اس سورۃ میں ان چیزوں کا تذکرہ ایک مخصوص انداز میں کیا گیا ہے اور اس لئے کیا گیا ہے کہ انسانی دل و دماغ ان کے اسرار و رموز کو جان سکیں اور پھر ان چیزوں کو کرشمہ قدرت قرار دے کر تعلق باللہ قائم کریں۔

پھر ان چیزوں کا رزق کے ساتھ ایک گونہ تعلق بھی ہے اور اس سورۃ کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ انسان کو اس رزق کی فکر سے ذرا نکلنا بھی چاہئے کہ رزق بھی آسمانوں میں مقرر ہے۔ ان چیزوں میں سے ہواؤں' بادلوں اور کشتیوں کا تعلق تو رزق سے بالکل ظاہر ہے۔ اب فرشتے جو رزق تقسیم کرتے ہیں تو من جملہ اور احکام کے وہ احکام رزق بھی تقسیم کرتے ہیں لہٰذا ان تمام چیزوں کا تعلق رزق سے زیادہ واضح ہو جاتا ہے جس کا تذکرہ اس سورۃ میں کئی جگہ آیا ہے۔

جس غرض کے لئے اللہ ان چار امور پر قسم اٹھاتا ہے وہ یہ ہے کہ ۔

اِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ (۵) وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ (۵۱ : ۶) "جس چیز کا تمہیں خوف دلایا جارہا ہے وہ سچی ہے اور جزائے اعمال ضرور پیش آئی ہے ۔" اللہ نے لوگوں کے ساتھ یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ احسان کے بدلے احسان کرے گا اور برائی کا بدلہ برائی سے دے گا ۔ اس دنیا میں تو اس نے تمہیں مہلت حساب دی ہے لیکن آخرت میں کوئی مہلت نہ ہوگی لہذا وہاں حساب لازمی ہوگا ۔ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ (۵۱ : ۶) "جزائے اعمال ضرور پیش آئی ہے" لہذا یہ وعدہ سچا ہے دنیا کا ہو یا آخرت کا ۔ اور جو وعدہ اس نے کئے ہیں ان میں رزق کا بھی وعدہ ہے ۔ رزق وہ دے گا کسی کو زیادہ کسی کو تھوڑا ۔ اپنی مشیت کے مطابق ۔ یہ وعدہ بھی سچا ہے جس طرح اللہ تمام معاملات میں سچا ہے ۔ لہذا اللہ نے لوگوں کے ساتھ جو وعدہ کیا ہے وہ سچا ہے اور وہ پورا ہوگا جس طرح اللہ چاہتا ہے اور جس وقت وہ چاہے گا ایسا ہوگا ۔ اللہ کی جانب سے اس پر کسی قسم کی ضرورت نہ تھی لیکن اللہ اپنی بعض مخلوقات کی قسم اس لئے اٹھاتا ہے کہ لوگ ان چیزوں کی طرف متوجہ ہوں جیسا کہ پہلے بھی کیا گیا' اور ان چیزوں کے اندر جو کمال تخلیق ہے اور ان کی تدبیر میں قدرت الہیہ جس طرح کام کر رہی ہے اس پر غور و فکر کریں اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کریں کہ اللہ کا وعدہ حشر و نشر برحق ہے کیونکہ اللہ کی اس تخلیق اور اس کے اس نظام کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ حشر و نشر ہو اور اس میں اچھائی اور برائی اور صلاح اور فساد پر لوگوں کا محاسبہ ہو کیونکہ اس کائنات کی ساخت کا یہ تقاضا ہے کہ یہ عبث نہیں ہے ۔ نہ اتفاقاً وجود میں آئی ہے ۔ یوں یہ مخلوق جس کی قسم اٹھائی گئی ہے یہ اس قسم کی وجہ سے حشر و نشر پر ایک دلیل و برہان بن جاتی ہے اور انسان اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور انسانی احساس و شعور اس پر غور کرتا ہے ۔ یہ قرآن مجید کی تعلیم و تربیت کا ایک انداز ہے ۔ قرآن مجید انسانی فطرت کو کائناتی زبان میں براہ راست خطاب کرتا ہے اور یہ خطاب نہایت موثر ہوتا ہے ۔

---ooo---

اور یہی مفہوم اور مقصد ہے دوسری قسم کا :

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝ يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ۝

"قسم ہے بنے ہوئے آسمان کی' (آخرت کے بارے میں) تمہاری بات ایک دوسرے سے مختلف ہے اس سے وہی برگشتہ ہوتا ہے جو حق سے پھرا ہوا ہے"۔

یہاں اللہ آسمان کی قسم اٹھاتا ہے جس کی بناوٹ محکم اور مرتب ہے ۔ اس طرح جس طرح زرہ کے حلقے نہایت ترتیب سے بنے ہوئے ہوتے ہیں بعض اوقات آسمانوں میں بادلوں کی یہی صورت ہوتی ہے کہ یہ بادل زرہ کی طرح بنے ہوئے نظر آتے ہیں اس طرح پیچدار نظر آتے ہیں جس طرح پانی کی لہریں یا ریت کی لہریں جن پر ہوا ایک ہی رفتار سے چل رہی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ آسمانوں کے اندر جتنے مدار ہیں وہ مراد ہوں کیونکہ یہ مدار ایسے ہیں کہ اگر ان کو رنگ

دار لکیروں سے ظاہر کیا جائے تو وہ زرہ کے حلقوں کی طرح نظر آئیں ۔ اس نہایت ہی اچھے طریقے سے بنے ہوئے آسمان کی قسم اٹھا کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قیامت کے بارے میں تمہاری باتیں یکساں نہیں ۔ تمہارے دلائل میں اضطراب ہے ۔ ان میں نہ مضبوطی ہے اور نہ قرار ہے بلکہ یہ تمہاری باتیں حیرانی اور پریشانی کی عکاسی کرتی ہیں جو چاہے ان باتوں سے پھر جائے اور جو چاہے ان پر جما رہے ۔ نہ صرف یہ کہ ان میں کوئی قرار و ثبات نہیں بلکہ ہمیشہ حیرت اور قلق اور بے یقینی پر مشتمل باتیں ہیں اور باطل موقف ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے ۔ متزلزل اور متغیر اور آئے دن بدلنے والا ۔ باطل ہمیشہ سرگرداں رہتا ہے ۔ اس کے سامنے نہ نشانات راہ ہوتے ہیں اور نہ روشنی ہوتی ہے جس میں وہ راہ پر صحیح طرح چل سکے ۔ پھر باطل کا کوئی اصول بھی نہیں ہوتا ۔ وہ ڈولتا رہتا ہے کیونکہ اس کی کوئی مضبوط اساس نہیں ہوتی اور نہ اس کا کوئی متعین پیمانہ ہوتا ہے ۔ اگر اہل باطل کبھی کسی بات پر مجتمع بھی ہو جائیں تو بھی ایک عرصے کے بعد وہ باہم لڑ پڑتے ہیں اور ان کے درمیان اختلافات اور دشمنیاں قائم رہتی ہیں ۔

اہل باطل کا اضطراب ' ان کا اختلاف اور ان کے متذبذب خیالات اس وقت اور اچھی طرح ظاہر ہو جاتے ہیں جب ان کو نظام سماوی کے رنگ میں دیکھا جائے جو نہایت ہی مضبوط ہے اور جس کے حلقے ایک دوسرے سے پیوست ہیں اور مرتب ہیں ۔

یہی بیان آگے جاری ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ محض ظن و تخمین بلکہ وہم کی دنیا میں بستے ہیں ۔ آخرت کے بارے میں ان کے خیالات حق و یقین سے ماخوذ نہیں ہیں ۔ حق تو بالکل عیاں ہے لیکن اس موضوع پر ان کے افکار پریشاں ہیں ۔ اس کے بعد ان کے افکار پریشان کا ایک ایسا منظر پیش کیا جاتا ہے جسے آنکھیں اس طرح دیکھ رہی ہیں جس طرح اسکرین پر چل رہا ہو ۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ﴿۱۱﴾ يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۲﴾ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ﴿۱۳﴾ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ۭ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۴﴾

"مارے گئے قیاس و گمان سے حکم لگانے والے جو جہالت میں غرق اور غفلت میں مدہوش ہیں ۔ پوچھتے ہیں آخر وہ روز جزاء کب آئے گا؟ وہ اس روز آئے گا جب یہ لوگ آگ پر تپائے جائیں گے ۔ (ان سے کہا جائے گا) اب چکھو مزا اپنے فتنے کا' یہ وہی چیز ہے جس کے لئے تم جلدی مچا رہے تھے" ۔

خَرَصَ کے معنی ظن 'گمان ' اندازے کے ہیں ' یعنی ایسی سوچ جو کسی گہرے اور یقینی معیار پر مبنی نہ ہو اور جس کا کوئی صغری کبری نہ ہو ۔ ایسے لوگوں کے لئے اللہ بددعا فرماتا ہے کہ وہ قتل ہوں اور اللہ کی طرف سے بددعا کے معنی ہیں "بس قتل ہوئے" ۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ (۵۱ : ۱۰) "مارے گئے قیاس و گمان سے حکم لگانے والے" اور ان کی ذرا مزید وضاحت کی جاتی ہے۔

الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ (۵۱ : ۱۱) "جو جہالت میں غرق اور غفلت میں مدہوش ہیں" ان کے افکار باطل خیالات سے لبالب ہیں اور یہ اوہام میں مدہوش ہیں' نہ ہوش میں آتے ہیں اور نہ جاگتے ہیں۔ انداز تعبیر ایک خاص رنگ اور تصور دے رہا ہے۔ ان کی تصویر کچھ ایسی بنتی ہے۔ وہ غفلت میں سوئے ہوئے ہیں یا بے ہوش ہیں' مست پڑے ہیں اور انہیں اپنے ماحول کے بارے میں کوئی احساس نہیں ہے اور وہ کوئی فکر بھی نہیں کرتے اور ان کے ذہن اور دماغ کام نہیں کر رہے جس طرح نشے میں ہوں۔ اس لئے کہ ایک واضح بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن کہ ہر ہوشمند شخص اسے دیکھتے ہی سمجھ لے اور ان کی حالت یہ ہے۔

یَسْئَلُوْنَ اَیَّانَ یَوْمُ الدِّیْنِ (۵۱ : ۱۲) "پوچھتے ہیں آخر وہ روز جزا ہو کب آئے گا" وہ جس طرح پوچھتے ہیں اس سے ان کا مقصد طلب علم یا طلب معرفت نہیں ہے بلکہ وہ منکر ہیں' جھٹلاتے ہیں اور اسے ایک ناممکن بات سمجھ کر پوچھتے ہیں کیونکہ "ایان" کے لفظ کو ایسے ہی مواقع پر بولا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن اپنے انداز میں قیامت کی ایک جھلک جلدی سے دکھا دیتا ہے کہ دیکھو یہ ہے جس کو تم ناممکن سمجھتے ہو۔ وہ اس طرح اس میں جل جاتے ہیں جس طرح کسی دھات کو جلا کر اس کی حقیقت معلوم کی جاتی ہے۔

یَوْمَ هُمْ عَلَی النَّارِ یُفْتَنُوْنَ (۵۱ : ۱۳) "جب یہ لوگ آگ پر تپائے جائیں گے" اور پھر اس منظر ہی میں انہیں شرمندہ بھی کیا جاتا ہے جس سے ان کے رنج میں اضافہ ہوتا ہے جبکہ وہ تو پہلے سے مشکل میں ہیں۔

ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ (۵۱ : ۱۴) "اب چکھو مزا اپنے فتنے کا' یہ وہی چیز ہے جس کی تم جلدی مچا رہے تھے" .... اس سوال کا مناسب جواب یہی تھا اور مدہوشی اور گہری نیند میں سوئے ہوئے غافلوں کے لئے اس منظر میں یہ تختی نہایت ہی موزوں اور مطابق حال ہے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ان کے لئے بد دعا کی' نہایت سخت انداز میں قتل مارے گئے اور آگ پر ان کو اس طرح تپایا جائے گا جس طرح کسی دھات کو تپایا جاتا ہے کہ اس سے کھوٹ نکالا جائے۔

اب ذرا فریق مقابل' ذرا دوسرے پلیٹ فارم پر جائیں اور کتاب کا دوسرا صفحہ الٹیں' وہاں دوسرا فریق کھڑا ہے جو وہم و گمان کی بات نہیں کرتا جس کی باتوں میں تزلزل نہیں ہے۔ یہ متقی ہیں متکبر نہیں۔ یہ جاگ رہے ہیں' عبادت گزار ہیں' استغفار کرنے والے ہیں اور اپنی عمر مدہوشیوں میں ضائع نہیں کرتے۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۱۵﴾ اٰخِذِیْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ
اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِیْنَ ﴿۱۶﴾ كَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَهْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾

وَ بِالۡاَسۡحَارِ ہُمۡ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ ﴿۱۸﴾ وَ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ ﴿۱۹﴾

"البتہ متقی لوگ اس روز باغوں اور چشموں میں ہوں گے ' جو کچھ ان کا رب انہیں دے گا اسے خوشی خوشی لے رہے ہوں گے ۔ وہ اس دن کے آنے سے پہلے نیکو کار تھے ' راتوں کو کم ہی سوتے تھے ' پھر وہی رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے ' اور ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لئے"۔

یہ گروہ گروہ متقین ہے ۔ یہ جاگنے والے ہیں ۔ یہ شدید احساس رکھتے ہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے ۔ وہ اپنے نفس کے بارے میں بھی حساس ہیں ۔ یہ لوگ ۔

فِی جَنّٰتٍ وَّعُیُوۡنٍ (۵۱ : ۱۵) "باغوں اور چشموں میں ہوں گے" اور ۔

اٰخِذِیۡنَ مَاۤ اٰتٰہُمۡ رَبُّہُمۡ (۵۱ : ۱۶) "جو کچھ ان کا رب انہیں دے گا اسے خوشی خوشی لے رہے ہوں گے" رب کے فضل ' اس کے انعامات وصول کر رہے ہوں گے ان اعمال کے بدلے جو انہوں نے حیات دنیا میں کیے ۔ انہوں نے اس کی عبادت اس طرح کی گویا اسے دیکھ رہے ہیں اور یہ یقین کرتے ہوئے کہ وہ دیکھ رہا ہے اور ۔

اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِکَ مُحۡسِنِیۡنَ (۵۱ : ۱۶) "وہ اس دن کے آنے سے پہلے نیکوکار تھے اور ان کی نیکی کی تصویر بھی بڑی دلکش ہے ' نہایت ہی چمکدار اور حساس :

کَانُوۡا قَلِیۡلًا مِّنَ الَّیۡلِ مَا یَہۡجَعُوۡنَ (۱۷) وَ بِالۡاَسۡحَارِ ہُمۡ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ

(۵۱ : ۱۸) "راتوں کو کم سوتے تھے ' پھر وہی رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے" وہ رات کے پچھلے حصے میں جاگ رہے ہوتے ہیں جبکہ لوگ سوتے ہیں ۔ وہ اپنے رب کی طرف توبہ و استغفار کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں ' اللہ سے رحم کی درخواست کرتے ہیں ' وہ بہت کم اونگھتے ہیں اور بہت کم سوتے ہیں ۔ رات کے اندھیروں میں وہ اپنے رب کے ساتھ ہمکلام ہوتے ہیں ۔ ان کے پہلو اپنے بستروں سے دور ہو جاتے ہیں اور اللہ کی طرف دیکھنے کا شوق انہیں ہلکا کر دیتا ہے اور نیند ان کے جسم کو بوجھل نہیں کر سکتی ۔

امام حسن بصری کہتے ہیں ۔

کَانُوۡا قَلِیۡلًا مِّنَ الَّیۡلِ مَا یَہۡجَعُوۡنَ (۵۱ : ۱۷) "یعنی وہ مشقت سے قیام لیل کرتے ہیں ' وہ رات کو کم سوتے ہیں اور انہوں نے عمل میں رات بسر کی اور اپنے قیام کو صبح تک طویل کیا ۔ یہاں تک کہ استغفار صبح کے وقت ہوا ۔

قتادہ احنف ابن قیس سے نقل کرتے ہیں ۔

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ (۵۱:۱۷) یعنی وہ کم سوتے تھے اور پھر انہوں نے کہا کہ میں اس آیت والوں میں سے نہیں ہوں۔

حسن بصری فرماتے ہیں کہ احنف ابن قیس فرمایا کرتے تھے میرے اعمال اہل جنت کے اعمال کے مقابلے میں پیش کیے گئے تو معلوم ہوا کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے اور ہمارے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ چونکہ ہم ان کے اعمال تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ وہ لوگ تھے جو رات کو کم سوتے تھے اور میں نے اپنے اعمال جہنمیوں کے اعمال پر پیش کیے تو اہل جہنم میں کوئی بھلائی نہ تھی۔ انہوں نے اللہ کی کتاب کو جھٹلایا۔ حشر و نشر کو جھٹلایا' میں دیکھا کہ وہ لوگ بھی ہم سے اچھے ہیں جنہوں نے کچھ تو اچھے کام کیے تھے اور کچھ برے کیے تھے۔

عبدالرحمٰن ابن زید ابن اسلم نے کہا بنی تمیم کے ایک شخص نے میرے باپ سے کہا "ابو اسامہ' ایک صفت ہے جو ہم میں نہیں ہے اللہ نے ایک ایسی قوم کا ذکر کیا ہے۔

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ (۵۱:۱۷) "جو راتوں کو کم سوتے تھے" اور ہم تو ایسے ہیں کہ راتوں کو کم اٹھتے ہیں۔ تو میرے باپ رضی اللہ عنہ نے کہا خوش خبری ہے اس شخص کے لئے جو اونگھا تو سو گیا اور جو جاگا تو استغفار کیا اور اللہ سے ڈرا۔

یہ ہے وہ حالت جس کے لئے تابعین' ایسے تابعین جو ایمان و یقین میں بہت بڑے مراتب رکھتے ہیں' آرزو مند ہیں اور وہ اپنے آپ کو اس سے فروتر سمجھتے ہیں۔ بہرحال امت میں کچھ لوگ اللہ نے اس مقام کے لئے چن رکھے ہیں جو ان آیات کا حق ادا کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے وہ اللہ کے ہاں محسنین کی لسٹ میں درج ہیں۔ یہ تو ہے ان کا تعلق اپنے رب کے ساتھ 'لوگوں کے ساتھ ان کا تعلق کیا ہے' وہی تعلق جو ایک نیک آدمی کے لائق ہے۔

وَفِىْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۵۱:۱۹) "اور ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لئے" وہ اپنے اموال میں اس سائل کا حصہ بھی رکھتے ہیں جو مانگتا ہے اور اسے دے دیا جاتا ہے اور اس محروم کا بھی حق مقرر کرتے ہیں جو خاموش رہتا ہے 'حیا کرتا ہے اور محروم رہ جاتا ہے۔ وہ ان دونوں قسم کے لوگوں کے لئے اپنے اموال میں حق رکھتے ہیں۔ وہ خود اس حق کو اپنے اوپر فرض کر لیتے ہیں اور یہ حق غیر محدود ہے متعین نہیں۔

یہ اشارہ سورۃ کے محور کے ساتھ ہم آہنگ ہے جس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ رزق آسمانوں میں ہے تاکہ انسانوں کا دل کنجوسی 'بخل اور رات اور دن جمع مال میں مشغولیت سے ذرا آزاد ہو جائے اور یہ سورۃ کے اس اہم حصے کے لئے تمہید ہے جبکہ یہ متقین اور محسنین کی تصویر کا آخری رنگ بھی ہے۔

وَفِى الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَفِىْٓ اَنْفُسِكُمْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ

ا فِى السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ

ع ۲۳ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴿۲۳﴾ ۱۸

"زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لئے اور خود تمہارے اپنے وجود میں ہیں۔ کیا تم کو سوجھتا نہیں؟ آسمان ہی میں ہے تمہارا رزق بھی اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے۔ پس قسم ہے آسمان اور زمین کے مالک کی' یہ بات حق ہے۔ ایسی ہی یقینی جیسے تم بول رہے ہو"۔

اس آیت کے ذریعے انفس و آفاق میں موجود نشانیوں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ تمہارے لئے رزق کے جو ذرائع مقرر کر دیئے ہیں وہ آسمان سے مقرر ہیں اور اللہ اپنی ذات کی قسم اٹھا کر فرماتا ہے یہاں ذات باری کو رب سماء اور ارض کہا گیا جن کا ذکر اس سبق میں ہو چکا ہے اور جواب قسم یہی اہم سوال ہے یعنی حشر و نشر۔

وَفِیْ الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ(۵۱ : ۲۰)وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ(۵۱ : ۲۱) "زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لئے اور خود تمہارے وجود میں ہیں کیا تم کو سوجھتا نہیں" یہ چھوٹا سا سیارہ جس کے اوپر ہم رہتے ہیں یہ ایک بہت بڑی نمائش گاہ ہے۔ ان آیات و عجائبات کے لئے جو اس میں اللہ نے رکھے ہیں۔ اس نمائش گاہ میں اس دنیا کے عجائبات میں سے بہت ہی کم ابھی تک نمائش کے لئے رکھے جاسکے ہیں۔ آئے دن نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں اور نئے نئے عجائبات ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ اسی قسم کی ایک نمائش گاہ خود ہماری ذات ہے۔ نفس انسانی' اس کی پراسرار نفسیاتی دنیا' اس حضرت انسان کے اندر بھی اس کائنات کے اسرار موجود ہیں۔ صرف زمین کے اسرار نہیں بلکہ پوری کائنات کے اسرار۔

ان دو نمائش گاہوں کی طرف ان آیات میں مختصر اشارہ ہے کہ ان دونوں نمائش گاہوں کے دروازے تمہارے لئے کھولے جارہے ہیں لیکن فائدہ اسی شخص کو ہوگا جو ان کو دیکھنا چاہے اور جو یقین کرنا چاہے اور اپنی زندگی کی نعمتوں اور خوشیوں سے بھرنا چاہے جو علم و معرفت اور دانائی اور عبرت حاصل کرنا چاہے جن سے اس کا دل زندہ ہوگا اور عمر زیادہ ہوگی۔

اللہ نے اپنا یہ کلام اس طرح بنایا ہے کہ اس کی مخلوقات میں سے ہر سطح کے لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ہر صورت حال اور ہر قسم کے معاشروں کے لئے وہ رہنما ہے۔ ہر شخص' ہر نفس اور ہر سطح کی عقل و ادراک کے لئے اس کلام میں ہدایت اور دلچسپی اور علم ہے۔ ہر شخص اپنی عقلی قوت ہاضمہ کے مطابق اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ جوں جوں انسان علم و معرفت میں ارتقائی منازل طے کرتا ہے' جوں جوں اس کا دائرہ ادراک وسیع ہوتا ہے' اس کی معلومات بڑھتی ہیں' اس کے تجربات آگے بڑھتے ہیں اور وہ نفس اور کائنات کے اسرار حاصل کرتا ہے تو اس کا حصہ اس قرآن میں بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس کے علوم قرآنی میں اضافہ ہوجاتا ہے اور اس کی زاد راہ اور اس کا رزق اس قرآن میں بڑھ جاتا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے "جس کے عجائبات ختم نہیں ہوتے اور زیادہ استعمال سے یہ پرانا نہیں ہوتا۔" یہ وہ الفاظ ہیں جو اس کے بارے حضور اکرمؐ نے فرمائے کیونکہ اس کے اسرار و رموز سے زیادہ واقف حضورؐ ہی ہیں۔ یہ زندہ تجربہ تھا جو آپ کو قرآن کے بارے میں ہوا اور جس کو آپ نے ان الفاظ میں بیان کیا ﷺ

جن لوگوں نے پہلی مرتبہ قرآن کو سنا تھا انہوں نے اس کائنات میں پائے جانے والے دلائل و نشانات کو اور خود ان کے نفوس کے اندر جو دلائل و نشانات تھے ان کو اس وقت کے علم و معرفت کے مطابق سمجھا تھا۔ ان کے بعد آنے والی

نسلوں نے بھی اپنے علم و معرفت اور اپنے تجربات کے مطابق ان آیات کو سمجھا اور بیان کیا۔ آج ہم بھی اپنا حصہ پا رہے ہیں جس قدر علم و معرفت اور جس قدر تجربات و انکشافات ہمارے سامنے آج تک آچکے ہیں' آج ہم تک جو علوم اور تجربات پہنچے ہیں وہ اس عظیم کائنات اور انسان کے پر پیچ نفس کے آیات و نشانات میں سے بہت ہی قلیل حصہ ہیں۔ ہم سے بعد میں آنے والی نسلوں کو ہمارے مقابلے میں زیادہ آیات و نشانات ملیں گے۔ اس کائنات میں بھی اور نفس انسانی میں بھی اور قیامت تک اس نمائش گاہ عالم اور نمائش گاہ نفس انسانی میں نئے نئے عجائبات برائے نمائش رکھے جاتے رہیں گے۔

یہ زمین 'زندگی کے لئے تیار شدہ سیارہ' جو زندگی کا گہوارہ ہے اور جسے زندگی کی تمام ضروریات سے لیس کیا گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس عظیم اور ہولناک کائنات میں یہ واحد سیارہ ہے جسے حیات کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں ایک جگہ رکے ہوئے ستارے بھی ہیں اور مداروں میں چلنے والے سیارے بھی ہیں۔ ان میں سے جو ہمیں معلوم ہیں ان کی تعداد اربوں میں ہے اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس کائنات کا جو حصہ معلوم ہے وہ نسبتاً بہت ہی کم ہے۔ اس میں کئی ملین کہکشاں ہیں اور ہر کہکشاں کے کروڑہا ستارے ہیں اور ان کے کواکب ہیں جو ان ستاروں کے ارد گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔

ان سیاروں میں سے صرف یہ زمین ہی ایک سیارہ ہے جسے اس پر موجود زندگی کے لئے عجیب خصوصیات دی گئی ہیں۔ ان میں سے ہر خصوصیت ایک نشانی ہے۔ اگر ان خصوصیات میں سے ایک خصوصیت بھی ختم ہو جائے یا اس کے اندر کچھ رد و بدل ہو جائے تو زمین کے اوپر سے ہر قسم کی زندگی کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ اگر اس زمین کا حجم بدل جائے 'بڑی ہو جائے یا چھوٹی' اگر سورج سے اس کا فاصلہ بدل جائے 'کم ہو جائے یا زیادہ' اگر سورج کا حجم بدل جائے اور اس کا درجہ حرارت بدل جائے اور یہ زمین اپنے محور پر جس طرح جھکی ہوئی ہے اگر اس کے اس جھکاؤ میں کوئی تغیر واقع ہو جائے اگر اس کی گردش محوری میں یا سورج کے گرد اس کی سالانہ گردش میں کمی بیشی آجائے اگر چاند کا حجم متغیر ہو جائے یا زمین سے قریب یا دور ہو جائے۔ اگر زمین کے اندر تری اور خشکی کی نسبت بدل جائے' غرض اگر' اگر' اگر.... اور ہزار ہا اگر' اگر ان ہزار ہا موافقات اور سہولیات میں سے کوئی ایک بھی بدل جائے تو اس سیارے پر سے اس خوبصورت زندگی کا نام و نشان ہی ختم ہو جائے۔

کیا یہ ایک چیز نشانی نہیں 'کیا یہ سب چیزیں نشانات نہیں جو بتاتی ہیں کہ ایک ذات ہے جس نے ان کو منظم کیا ہے' فراہم کیا ہے۔

اور خوراک اور رزق کی مختلف اقسام جو اس زمین پر رہنے والی اور بسنے والی مخلوقات کے لئے اللہ نے فراہم کی ہیں۔ یہ مخلوقات سطح زمین کے اوپر رہتی ہوں' فضا میں تیر رہی ہوں' یا پانی میں تیر رہی ہوں یا زمین کے غاروں میں رہتی ہوں یا اس کے پہاڑوں میں رہتی ہوں یا اس کی وادیوں اور بستیوں میں اندر رہتی ہوں' سب کے لئے خوراک تیار ہے۔ بعض کی مرکب ہے اور بعض کی بسیط شکل میں ہے۔ بہرحال یہ ان زندہ چیزوں کے وجود کے لئے قابل قبول ہے اور ان لاتعداد زندہ اشیاء کی ضروریات پوری کرتی ہے جس طرح زندہ مخلوقات لاتعداد انواع و اقسام کی ہیں اسی طرح ان کی خوراک بھی لاتعداد و انواع و اقسام کی ہے۔ یہ انواع خوراک جو زمین کے اندر ہیں جو بہتی اور چلتی ہیں جو ہوائیں ہیں جو سطح زمین پر اگتی ہیں جو سورج سے آرہی ہیں جو دوسرے جہانوں سے آرہی ہیں جو تمہیں معلوم ہی نہیں لیکن یہ ہر قسم کی خوراک ان زندہ اشیاء کے لئے ہر طرف سے چلی آرہی ہے اور بڑی مقدار میں چلی آرہی ہے۔ اللہ کی مشیت اور اس کی تدبیر کے مطابق یہ

ایک عظیم خزانہ اور اسٹور ہے جو ان لاتعداد انواع و اقسام کے کھانے والوں کے لئے سپلائی پوری کراتا ہے ۔ یہ ہے ربانی سٹور الرزاق کا انتظام ۔

پھر اس زمین کے مناظر و مشاہد کی رنگارنگی ' جہاں تک بھی نظر جاسکتی ہو جہاں جہاں بھی قوم جاسکے ہوں یہ بھی اپنی جگہ عجائبات ہیں جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتے ۔ یہ تنگ گڑھے اور کشادہ نالے ' وادیاں اور پہاڑ ' سمندر اور بحیرے ' نہریں اور نالیاں اور باغات کے ٹکڑے ٹکڑے ' انگور اور کھجور ' اکہرے اور دوہرے ' یہ سب مناظر اور مشاہد ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنانے والے کے کمالات کا یہ عجوبہ ہیں ۔ ان میں مسلسل تغیرات ہوتے رہتے ہیں اور یہ کسی وقت بھی ایک حالت میں نہیں ہوتے ۔ انسان ایک زمین پر گزرتا ہے تو وہ خشک اور قحط زدہ نظر آتی ہے یہ بھی ایک منظر ہے اور پھر کیا دیکھتا ہے کہ وہ سرسبز اور نعمتوں اور چارہ سے بھری ہوتی ہے تو یہ بھی ایک منظر ہے ۔ کبھی نہایت ہی سرسبزی اور شاداں ہوتی ہے ۔ یہ ایک منظر ہے ۔ کبھی وہ دیکھتا ہے کہ تمام زمین زرد اور خشک ہوگئی اور فصل کٹنے والی ہے ۔ یہ بھی ایک منظر ہوتا ہے اور وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوتا ہے بالکل ادھر ادھر نہیں گیا ہوتا ہے ۔

وہ تمام مخلوقات جو اس زمین کو آباد کر رہی ہیں مثلاً زندہ مخلوقات نباتات و حیوانات ' مچھلیاں اور پرندے چوپائے اور حشرات اور انسان قرآن نے ان کا تذکرہ ایک ہی آیت میں کیا ہے ۔

یہ مخلوقات جن کی انواع و اقسام کی تعداد کا بھی پوری طرح ہمیں علم نہیں ہے یہ تو دور کی بات ہے کہ ایک نوع کے افراد گنے جاسکیں ۔ یہ تو محال ہے ۔ ان میں سے ہر نوع کی مخلوقات ایک امت ہے اور ان کا ہر ایک فرد ایک عجوبہ ہے ۔ ہر حیوان ' ہر پرندہ ' ہر چرندہ اور ہر کیڑا ' ہر پودا نہیں بلکہ ہر پودے کی ہر شاخ اور ہر شاخ کا ہر پتہ اور ہر شاخ کا ہر پھول اور ہر پھول کی ہر پتی یہ اللہ کی ایک نمائش گاہ ہے جس کے عجائبات ختم نہیں ہوتے ۔

اگر انسان بیان کرنے لگے بلکہ تمام انسان بیک وقت بیان کرنے لگیں وہ غور کریں اور لکھیں اور بیان کریں کہ اس زمین میں کیا کیا نشانات الٰہیہ ہیں اور کیا کیا عجائبات ہیں تو نہ ان کی بات ختم ہو اور نہ ہی عجائبات و اشارات ختم ہوں ۔ قرآن کی یہ آیت تو صرف اس قدر بیان کرتی ہے کہ انسان کا دل و دماغ غور و فکر کے لئے بیدار ہو جائے اور اس عظیم الشان نمائش میں جو چیزیں قدرت نے رکھی ہیں ان کو دیکھیں اور روشنی میں لائیں سمجھیں اور سمجھائیں ۔ ہنسیں اور ہنسائیں اور یوں اس کرہ ارض پر اپنے اس مختصر سفر کو خوشگوار بنائیں ۔

لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ ان عجائبات کا ادراک وہی کر سکتا ہے اور ان کے ذریعے زندگی کے اس مختصر سفر کو وہی خوشگوار بنا سکتا ہے جس کا دل یقین سے بھر چکا ہو ۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ( ۵۱ : ۲۰ ) "اور زمین میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین کرتے ہیں" یہ یقین ہی ہے جو آنکھوں کو بینائی فراہم کرتا ہے تو وہ دیکھتی ہیں ۔ یہ ایمان ہی ہے جو زمین کے ان مظاہر قدرت کو زندگی دیتا ہے اور وہ اپنے اسرار اور رموز بتاتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ ان کی پشت پر دست قدرت کی کیا کیا کارستانیاں ہیں ۔ بغیر ایمان کے یہ سب مناظر و مشاہد مردہ پڑے رہتے ہیں ۔ جامد ہو جاتے ہیں اور مفہوم سے خالی ہوتے ہیں ۔ یہ ایمان سے خالی دل سے ہمکلام نہیں ہوتے ۔ وہ اس کے ساتھ ہمقدم ہو کر نہیں چلتے ۔ کئی ایسے انسان ہیں جو اللہ کی اس

نمائش گاہ میں چلتے پھرتے ہیں لیکن انہیں اس میں نظر کچھ نہیں آتا۔ ان کو یہ کائنات زندہ اور گویا نظر نہیں آتی۔ وہ اس کی زبان نہیں سمجھتے کیونکہ ان کے دلوں کو ایمان کے لمس سے زندگی نہیں بخشی۔ ان کے لئے ان کا ماحول زندہ نہیں ہے۔ بعض ایسے لوگوں میں بڑے بڑے علماء اور سائنس دان بھی ہو سکتے ہیں۔

یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا "مگر وہ اس دنیا کی زندگی کے صرف چھلکے کے عالم ہیں" رہی اس دنیا کی اندرونی حقیقت تو وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہے کیونکہ کوئی بھی دل اس کائنات کی حقیقت کو ایمان کی کنجی سے کھول سکتا ہے کوئی بھی آنکھ صرف ایمان کی روشنی سے ان حقائق کو دیکھ سکتی ہے۔ صدق اللہ العظیم . . . . .

اب ان عجائبات میں سے دوسرا عجوبہ۔

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱ : ۲۱) "اور خود تمہارے وجود میں ہیں کیا تمہیں سوجھتا نہیں" یہ حضرت انسان تو عجائبات عالم میں سے ایک عظیم عجوبہ ہے لیکن اس کی قسمت کیا ہے۔ اس کا مقام کیا ہے اور اس کی ذات کے اندر کیا اسرار و رموز ہیں۔ اس سے وہ غافل ہے اور غافل اس وجہ سے ہے کہ وہ ایمان و یقین کی نعمت سے محروم ہے۔

یہ انسان اپنی جسمانی ساخت میں بھی عجوبہ ہے۔ جسم کے اسرار میں عجوبہ ہے۔ روحانی دنیا میں عجوبہ ہے۔ نفسیات کا تو عالم ہی جدا ہے۔ غرض اپنے ظاہر میں اور اپنے باطن میں عجوبہ ہے۔ یہ انسان اس کائنات کا عناصر کا نمونہ ہے اور پوری کائنات کے اسرار و رموز اس کے اندر پوشیدہ ہیں۔

وتزعم انك جرم صغیر
و فیك انطوی العالم الاکبر

"تو سمجھتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا جرثومہ ہے .... لیکن تیرے اندر ایک عظیم جہاں آباد ہے۔"

جب انسان خود اپنی ذات اور اپنے نفس کے عجائبات دیکھتا ہے تو حیران اور ششدر رہ جاتا ہے۔ اس کے اعضاء کی تشکیل اور تقسیم، پھر اس کے اعضاء کے فرائض اور ان کے انداز عمل، مثلاً ہضم اور خوراک حاصل کرنے کا عمل، سانس لینے کا عمل اور جلانے کا عمل، دل اور شریانوں میں خون دوڑنے کا عمل، اعصابی نظام اور اس کا پورے جسم کو چلانا، غدود اور ان کا جسم کو چلانا اور بڑھانا، پھر ان تمام چیزوں کا باہم اتحاد و اتفاق اور ہم آہنگی اور ان کا پوری طرح ہمسفر اور ہمقدم ہونا، پھر عجائبات کے اندر جو تفصیلی عجائبات ہیں اور ہر جز کے اندر جو خارق عادت معجزات ہیں ان میں سے ہر ایک محیرالعقول ہے۔

پھر انسان کی روحانی طاقتیں، جن میں سے کچھ تو معلوم ہیں اور کچھ مجہول ہیں۔ اس کا اشیاء کا ادراک کرنا اور پھر ادراک کا میکانزم، پھر مدرکات کا حفظ کرنا اور اسکے بعد ان کو یاد کر لینا، یہ معلومات اور ذہن کے خزانوں میں ان کی تصاویر، یہ کہاں ہوتی ہیں اور کس طرح محفوظ ہوتی ہیں۔ یہ تصاویر اور یہ تمثیلات اور یہ مشاہد اور ان کے نقوش یہ کس طرح نقش ہوتے ہیں اور کس طرح یہ تصاویر بنائی جاتی ہیں۔ یہ تو ہیں ان قوتوں کے وہ پہلو جو ہمیں معلوم ہیں۔ لیکن وہ قوتیں جو ہمیں معلوم نہیں تو وہ بہت ہی بڑی ہیں۔ بہت ہی بڑی۔ کبھی کبھی ان کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ذہن

انسانی پر ایک ایسا اشراق اور ایک ایسی روشنی ڈالی جاتی ہے اور اس کے اندر ایک ایسی چمک پیدا ہوتی ہے کہ انسان پر عالم غیب دور تک کھل جاتا ہے لیکن یہ لحات کم ہوتے ہیں۔

پھر جنس انسان کے وہ اسرار و رموز جو اس کے قواعد تناسل کے سلسلے کے اندر پائے جاتے ہیں۔ایک نہایت ہی چھوٹا خلیہ جس کے اندر جنس انسانی کے تمام خصائص موجود ہوتے ہیں اور اس کے اندر ماں اور باپ اور دونوں اطراف کے قریبی اجزاء کے خصائص بھی موجود ہوتے ہیں ۔یہ تمام خصائص اس نہایت ہی چھوٹے سے خلیے کے اندر کہاں اور کس طرح رکھے ہوئے ہوتے ہیں اور کس طرح یہ ہر خلیہ ان تمام خصائص کے ساتھ خود کار انداز میں اپنی زندگی کے سفر کا آغاز کرتا ہے کہ اس کے اندر جنس انسانی کے تمام خصائص موجود ہوتے ہیں اور یہ پوری طرح جنس انسانی کا اعادہ ایک دوسرے فرد کی شکل میں کرتا ہے ؟!!

وہ لحات جن میں ایک بچہ اس زمین پر زندگی شروع کرتا ہے 'ماں سے جدا ہوتا ہے اور اپنے نفس پر اعتماد کر کے زندگی بسر کرنا شروع کرتا ہے اور اس کے قلب اور پھیپھڑوں کو حرکت کرنے کی اجازت دی جاتی ہے ۔ان لحات پر قدرے غور کرنے ہی سے انسان حیران کیا دہشت زدہ ہو جاتا ہے اور عقل دنگ رہ جاتی ہے ۔نفس انسانی حیرت و استعجاب سے بھی بھر جاتا ہے اور پھر ایمان بھی بھر جاتا ہے ۔یہ ایک ایسا منظر ہے کہ انسان کے دل و دماغ حیرت کے باعث کام چھوڑ دیتے ہیں۔ انسان ششدر رہ جاتا ہے۔

پھر وہ وقت بھی دیکھنے کے قابل ہوتا ہے کہ بچہ ٹوٹی پھوٹی زبان میں باتیں شروع کرتا ہے پھر کلمات و عبارات بناتا ہے بلکہ صرف گفتگو پر غور کیجئے ۔اس زبان سے ٹکڑے آوازیں نکالنا اور پھر گلے سے آوازیں یہ بھی ایک عجوبہ ہے ۔اس چیز کا انوکھا پن ہمیں اس لئے نظر نہیں آتا کہ یہ ہروقت یہ باتیں کرتے ہی رہتے ہیں لیکن اگر انسان ایک لحظہ اس پر غور کرے تو محض انسان کی یہ قدرت کہ وہ اظہار مافی الضمیر کرتا ہے ۔یہی ایک عجوبہ ہے اور قدرت الٰہیہ پر ایک بدیہی اور ایک کافی دلیل ہے۔

غرض انسان کی زندگی کا کوئی جزوی واقعہ بھی ایک معجزہ ہے اور انسان اس سے متعجب ہو سکتا ہے اور یہی مراد ہے درج ذیل فقرے سے۔

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱ : ۲۱) "اور خود تمہارے اپنے وجود میں بھی کیا تمہیں سوجھتا نہیں" جنس انسان کا ایک ایک فرد بھی ایک جہان ہے ۔ ہر فرد ایک آئینہ ہے جس میں یہ تمام عالم نظر آتا ہے اور ہر فرد کے وجود میں گویا اس پوری دنیا کا ظہور بار بار ہوتا ہے ۔ ہر شخص اپنے ابنائے جنس میں اپنی شکل اپنے خد و خال 'اپنی عقل' اپنے علم' اپنے مدرکات' اپنی روح اور اپنے شعور کے اعتبار سے بالکل جدا ہے ۔ ہر شخص کے ذہن میں اس کائنات کا جو تصور ہے وہ دوسرے افراد سے مختلف ہے ۔اب دیکھئے کہ اس خدائی نمائش گاہ میں لاکھوں افراد ہیں اور ہر فرد ایک علیحدہ نمونہ ہے اور ہر فرد کا مزاج بالکل الگ ہے اور ویسا شخص دوبارہ پیدا نہیں ہوتا ۔اس شخص کے اندر یہ پوری کائنات گزر جاتی ہے اور اس کی صورت کی نقل نہیں کی جاسکتی ۔یہاں تک کہ انگلیوں کی لکیریں بھی دنیا میں ہر شخص کی جدا ہوتی ہیں اور انہیں دہرایا نہیں جاسکتا۔گزرے ہوئے زمانوں میں بھی جو لوگ گزرے ہیں ان میں سے بھی کسی شخص کی انگلیوں کی

لیکھیں دہرائی نہیں جاسکتیں۔

جنس انسانی کے عجائبات میں سے بہت سے عجائبات ایسے ہیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور ہماری آنکھیں ان کو دیکھ رہی ہیں۔

وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱ : ۲۱) "اور تمہارے اپنے وجود میں بھی کیا تم دیکھتے نہیں"

اور انسانی آنکھیں جن عجائبات کو بھی دیکھیں یہ عالم غیب کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہم نشانات ہیں ایک بنانے والے خالق کے۔

نفس انسانی کے اندر جو عجائبات اور معجزات ہیں ان کو ایک کتاب میں قلم بند نہیں کیا جاسکتا۔ آج تک جو عجائبات ہمیں معلوم ہوچکے ہیں اور جن کا انکشاف ہوگیا ہے ان کے لئے بھی کئی جلدیں درکار ہیں اور اس سلسلے میں جو مجہول ہیں ' ماضی کے تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت زیادہ ہیں۔ قرآن کریم نے ان کو گنوایا نہیں ہے۔ ہاں قرآن کریم نے دل و دماغ کو جھنجوڑا ضرور ہے کہ جاگو اور غور و فکر کرو' احساس کرو اور اللہ کے اس عجائب گھر میں آنکھیں کھول کر چلو' غور و فکر کرو اور اس کائنات سے بھی پہلے اپنے نفس میں غور و فکر کرو' تم جس طرح آفاق سے غافل ہو اس طرح اپنی ذات سے بھی غافل ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے خوشگوار لمحات وہی ہوتے ہیں جن میں انسان اپنی تخلیق اپنی خصوصیات اپنے خد و خال اپنی حرکات اور اپنی عادات پر غور کرے اور ایک عابد بندے کی طرح اللہ کے اس عجائب گھر کی سیر کرے اور دیکھے کہ اللہ کس قدر برکت والا ہے لیکن انسان ہے کہ ایک طویل عمر اس عجائب گھر میں گزار رہا ہے اور بغیر احساس کے گزار رہا ہے۔

اس طرح احساس عطا کرکے قرآن مجید انسان کو بالکل ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ ایک جدید شعور' ایک جدید سوچ' ایک جدید زندگی اور یہ شعور پسندیدہ متاع حیات ہے کہ اس دنیا کی کوئی بھی نعمت اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔

تامل اور ادراک کے اس اسلوب کے ساتھ قرآن انسان کی تربیت کرتا ہے لیکن اس تربیت کا بنیادی نکتہ ایمانی ہے۔ اگر ایمان نہ ہو تو قرآن جو کچھ انسان کو دینا چاہتا ہے وہ اسے اخذ نہیں کر سکتا۔ ایمان ہی انسان کو اس متاع حیات کے لائق بناتا ہے۔ یہ نہایت ہی اونچا اور برتر اور عالم بالا کا متاع حیات ہے۔ انسان کے پاؤں زمین پر ہوتے ہیں اور اس کا شعور عالم بالا میں ہوتا ہے۔

پہلے انسان کو اس کائنات کی جھلک دکھائی گئی' پھر اسے اس کے نفس کے عجائبات کی ایک جھلک دکھائی گئی' اب یہاں بتایا جاتا ہے کہ انسان کا رزق اس کی تقسیم اور اس کا حصہ رسدی بھی آسمانوں سے تقسیم ہوتا ہے اور تمہاری آخری منزل بھی آسمانوں ہی میں ہے۔

وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ (۵۱ : ۲۲) "آسمان ہی میں ہے تمہارا رزق بھی اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے۔" بظاہر یہ ایک عجیب ہدایت اور توجہ مبذول کرنے کا ایک اشارہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اسباب رزق زمین میں ہیں انسان ان اسباب کے اندر جد و جہد کرتا اور اس سعی اور جہد کے نتیجے میں بھی رزق کا انتظام کرتا ہے لیکن قرآن انسان کی نظروں کو آسمانوں کی طرف پھیرتا ہے۔ عالم ظاہر سے عالم غیب کی طرف لے جاتا ہے تاکہ

وہ وہاں سے اپنے نصیبہ رزق کی امید کرے ۔ رہی یہ بات کہ زمین اور اس کے اندر اسباب رکھے گئے تو یہ تو یقین کرنے والوں کے لئے آیات ہیں ۔ ان آیات و نشانات کو دیکھ کر انسان اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تاکہ اللہ سے بہتر رزق کا امیدوار ہو اور زمین کے بوجھ اور زمین کی پستیوں سے وہ آزاد ہو ۔ اس طرح رزق کے اسباب ظاہرہ سے بھی آزاد ہو ۔ یہ نہ ہو کہ یہ ظاہری اسباب انسان اور خالق الاسباب کے درمیان حائل ہو جائیں اور وہ ان ظاہری اسباب ہی کے اندر گم ہو جائے ۔

دل مومن اس ہدایت کو ایک حقیقت کے طور پر لیتا ہے ۔ اسے سمجھتا بھی ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ اس ہدایت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ زمین اور زمین کے اسباب سے صرف نظر کر دیا جائے ۔ اس لئے کہ انسان زمین کے اسباب کو کام میں لانے اور یہاں زمین کے اوپر فریضہ خلافت الٰہیہ کے تقاضے پورے کرنے کا مکلف ہے ۔ مقصد یہ ہے کہ وہ دل کو اسباب ارض کے ساتھ نہ باندھ دے اور اس زمین کی تعمیر اور ترقی میں مصروف ہو کر خدا کو نہ بھلا دے بلکہ اس کا رویہ یہ ہو کہ وہ زمین میں کام کر رہا ہو اور اس کی نظریں آسمانوں پر ہوں ۔ وہ اسباب کو کام میں لائے مگر یقین یہ کرے کہ وہ اسباب اس کے فرائض نہیں ہیں بلکہ رازق آسمانوں میں ہے اور یہ اللہ کا وعدہ ہے اور ہوتا وہی ہے جو اللہ نے فرمایا ۔

یوں ایک مومن کا دل ان اسباب کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے جو زمین میں ہیں بلکہ وہ ان اسباب کے ذریعے ہی آسمانوں کی بادشاہت تک پہنچتا ہے ۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ ان اسباب کے اندر بھی عجائبات ہیں جو خالق اسباب کی نشاندہی کرتے ہیں تو وہ انہی کے ذریعہ خدا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے ۔ اگرچہ اس کے پاؤں زمین پر انہی اسباب کے اندر ہوتے ہیں لیکن اس کی نظریں آسمان پر ہوتی ہیں ۔ یہی طریقہ ہے جو اللہ نے انسان کے لئے پسند کیا ہے اور یہی طریقہ اللہ نے اپنے ان بندوں کے لئے تجویز کیا ہے جن کو اس نے مٹی سے پیدا کیا ۔ ان میں اپنی روح پھونکی اور انہیں اس جہاں کی تمام مخلوقات پر فضیلت دے دی ۔

ایمان ایک وسیلہ اور سبب ہے اس بات کا کہ انسان بہترین حالات زندگی میں ہو جب انسان ایمان کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ اس حالت میں ہوتا ہے جس میں اسے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ۔ یہ اللہ کی اس فطرت پر ہوتا ہے جس پر اللہ نے اسے پیدا کیا ہے ۔ انسان پر حالت فساد اور حالت گمراہی بعد میں طاری ہوتی ہے ۔

ان تین جھلکیوں کی طرف متوجہ کرنے کے بعد یعنی زمین کی نشانیوں نفس کی نشانیوں اور آسمانوں کی نشانیوں کی طرف متوجہ کرنے کے بعد اللہ اپنی ذات کی قسم اٹھا کر یقین دلاتا ہے کہ یہ باتیں اسی طرح سچ ہیں جس طرح تمہاری باتیں ۔

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ (۵۱ : ۲۳) "پس قسم ہے آسمان اور زمین کے مالک کی 'یہ بات حق ہے' ایسی ہی یقینی جیسے تم بول رہے ہو ۔" یہ بات کہ وہ بیٹھے ہوئے مصروف گفتگو ہیں 'ایک حقیقت ہے ۔ اس میں شک نہیں ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے نہ اس میں کوئی کلام ہے ۔ اسی طرح یہ کلام ایک یقینی کلام ہے اور اللہ سب سے زیادہ سچائی والا ہے ۔

اصمعی نے ایک عجیب بات نقل کی ہے اور علامہ زمخشری نے کشاف میں اسے نقل کیا ہے ۔ روایت کی صحت کے بارے میں تحفظ رکھتے ہوئے ہم اسے یہاں اس لئے نقل کرتے ہیں کہ بات بڑی عجب ہے ۔ کہتے ہیں "میں بصرہ کی جامع مسجد سے واپس آ رہا تھا کہ ایک دیہاتی اپنے سواری کے اونٹ پر نمودار ہوا ۔ اس نے کہا "تمہارا تعلق کس قبیلے سے

ہے ۔" میں نے کہا "بنی اصمع سے" اس نے کہا "تم کہاں سے آئے ہو" میں نے کہا "ایک ایسی جگہ سے جس میں رحمان کا کلام پڑھا جاتا ہے ۔" اس نے کہا تو مجھ پر پڑھئے! تو میں نے پڑھا۔

والذاریات ........ جب میں یہاں تک پہنچا۔

وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ (۵۱ : ۲۲) "آسمانوں ہی میں ہے تمہارا رزق بھی اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے۔" اس نے کہا بس یہ کافی ہے ۔ وہ کھڑا ہوا اور اپنے اونٹ کو ذبح کر دیا اور راستے پر جو آتا جاتا ان پر تقسیم کرتا جاتا۔ اس نے اپنی تلوار اور تیر کو زمین پر دے مارا اور توڑ دیا اور چلا گیا۔ جب میں ہارون الرشید کے ساتھ صبح کے وقت طواف کرنے لگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہی شخص میرے ساتھ نرم آواز سے گفتگو کر رہا ہے ۔ میں نے اسے پہچان لیا کہ یہ تو وہی اعرابی ہے ۔ یہ دبلا پتلا اور زرد رنگ کا ہے ۔ تو اس نے سلام کیا جب میں اس جگہ تک پہنچا۔

وَمَا تُوْعَدُوْنَ (۵۱ : ۲۲) تک تو اس نے پکار کر کہا۔ حقیقت ہے کہ ہمارے رب نے ہمارے ساتھ جو وعدہ کیا تھا ہم نے اسے پا لیا ہے ۔ پھر اس نے کہا کہ اس کے سوا اور بھی کوئی بات ہے تو میں نے پڑھا۔

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّہٗ لَحَقٌّ (۵۱ : ۲۳) "پس قسم ہے آسمان اور زمین کے مالک کی یہ بات حق ہے" اس شخص نے آواز بلند کیا اور کہا یا سبحان اللہ! کون تھا جس نے رب ذوالجلال کو اس قدر غصہ دلایا کہ اسنے حلف اٹھایا؟ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بات کی تصدیق نہ کی ۔ یہاں تک کہ رب کو قسم اٹھانے پر مجبور کیا۔ یہ بات اس نے تین بار کہی اور اس کی روح پرواز کر گئی ۔" یہ ایک عجیب کہانی ہے ۔ صحیح ہوگی یا نہ ہوگی لیکن ہم نے اسے یہاں اس لئے نقل کیا ہے کہ رب ذوالجلال کی قسم کی وجہ سے اس بات کی اہمیت اور زیادہ ہوتی ہے جس پر قسم اٹھائی گئی جبکہ بغیر حلف اور قسم کے بھی وہ عظیم حقیقت ہے ۔

---ooo---

یہ تو تھا اس سورۃ کا پہلا حصہ ' دوسرے حصے میں حضرت ابراہیم ' حضرت لوط ' حضرت موسیٰ ' عاد قوم ہود 'ثمود قوم صالح اور حضرت نوح علیہم السلام کے قصص کی طرف مختصر اشارات ہیں ۔ یہ حصہ بھی ماقبل اور مابعد سے مربوط ہے ۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿۲۶﴾ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ

عَقِيْمٌ ۝ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝

"اے نبیؐ، ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تمہیں پہنچی ہے؟ جب وہ اس کے ہاں آئے تو کہا آپ کو سلام ہے۔ اس نے کہا "آپ لوگوں کو بھی سلام ہے .... کچھ ناآشنا سے لوگ ہیں۔" پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گیا اور ایک "بھنا ہوا" موٹا تازہ بچھڑا لا کر مہمانوں کے آگے پیش کیا۔ اس نے کہا آپ حضرات کھاتے نہیں؟ پھر وہ اپنے دل میں ان سے ڈرا۔ انہوں نے کہا ڈریئے نہیں اور اسے ایک ذی علم لڑکے کی پیدائش کا مژدہ سنایا۔ یہ سن کر اس کی بیوی چیختی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے اپنا منہ پیٹ لیا اور کہنے لگی 'بوڑھی' بانجھ' انہوں نے کہا "یہی کچھ فرمایا ہے تیرے رب نے۔ وہ حکیم ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔"

اس دوسرے حصے میں بھی نبیوں کی تاریخ سے آیات الٰہیہ کا ذکر ہے جس طرح پہلے حصے میں آیات تکوینی اور آیات و نفس کا ذکر ہوا تھا اور یہ بھی اللہ کے سچے وعدے تھے اور انہوں نے حقیقت کا روپ اختیار کیا جس طرح پہلے حصے میں اللہ کے سچے وعدے کا ذکر تھا۔

بات کا آغاز حضرت ابراہیم کے مہمانوں کے بارے میں ایک سوال سے ہوتا ہے۔

هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ (۱ ۵ : ۲ ۴) "اے نبی کیا ابراہیم ....... کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تمہیں پہنچی ہے؟" اس سوال میں اس بات کی طرف اشارہ ہے یا ذہنوں کو اس حکایت کے لئے تیار اور متوجہ کرنا ہے اور مہمانوں کے لئے "مکرمین" کا لفظ استعمال ہوا ہے یا تو وہ اللہ کے نزدیک مکرم اور معزز تھے یا اس طرف اشارہ ہے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمان تھے اور انہوں نے ان کی تکریم کی۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کس قدر کریم اور سخی تھے اور کس طرح مہمان نوازی پر مال لٹاتے تھے۔ ادھر سے مہمان آتے ہیں ان کو سلام کرتے ہیں اور وہ بھی سلام کرتے ہیں۔ آپ ان مہمانوں کو پہچانتے نہیں اور علیک سلیک کے بعد اہلیہ کو جا کر کھانا تیار کرنے کا حکم دیتے ہیں اور یہ کھانا بھی آناً فاناً تیار ہوتا ہے اور جلدی ایک وافر مقدار میں ایک بھنا ہوا بچھڑا مہمانوں کے سامنے حاضر ہے جو دسیوں آدمیوں کے لئے کافی ہے۔

فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ (۵۱:۲۶) فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ (۵۱:۲۷) "پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گیا اور ایک بھنا ہوا موٹا تازہ بچھڑا مہمانوں کے آگے پیش کیا۔" حالانکہ روایات کے مطابق ان کی تعداد تین تھی۔ ان کے لئے تو ایک بازو ہی کافی تھا۔

قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ (۱ ۵ : ۲ ۷) "اس نے کہا آپ حضرات کھاتے نہیں؟" یہ سوال انہوں نے تب کیا جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کھانے کی طرف نہیں بڑھ رہے اور نہ کوئی ایسے آثار ہیں کہ وہ کھانا کھائیں گے۔

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً (۱ ۵ : ۲ ۸) "پھر وہ دل میں ان سے ڈرا" یا تو اس لئے کہ آنے والا اجنبی اگر

کھانا نہیں کھاتا تو اس کی نیت خراب ہے ۔ وہ کوئی شر یا خیانت کرنے کی نیت سے آیا ہے یا یہ کہ حضرت ابراہیم نے ان فرشتوں کے اندر کوئی عجیب علامات دیکھ لیں ۔ جب انہوں ان سے ان کے چہرے پر خوف کے آثار دیکھے تو انہوں نے اپنا تعارف کرا لیا ۔ ان کو اطمینان دلایا اور آپ کو ایک بیٹے کی بشارت دی ۔

قَالُوْا لَا تَخَفْ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ (۵۱ : ۲۸) "انہوں نے کہا ڈرو نہیں اور اسے ایک ذی علم لڑکے کی پیدائش کا مژدہ سنایا ۔" یہ بشارت حضرت اسحاق کے بارے میں تھی جو ان کی بانجھ بیوی سے پیدا ہوئے تھے ۔

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ (۵۱ : ۲۹) "یہ سن کر ان کی بیوی چیختی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے اپنا منہ پیٹ لیا اور کہنے لگی بوڑھی بانجھ" اس نے یہ خوشخبری سن لی تھی ۔ اچانک یہ خوشخبری ! اس کی تو چیخ نکل گئی اور عورتوں کی عادت کے مطابق اس نے اپنا چہرہ پیٹ لیا اور یہ کہہ دیا میں بوڑھی ہوں بانجھ ہوں تو یہ سب امور اس کے لئے خوشگوار حیرت کا باعث ہوئے اور درحقیقت وہ بانجھ تھی اور یہ خبر اس کے لئے اچانک خوشی کی خبر تھی جس کی وہ کسی طرح توقع نہ کرتی تھی لیکن وہ یہ بات بھول گئی کہ یہ خوشخبری تو فرشتے دے رہے ہیں تو فرشتوں نے اسے متوجہ کیا کہ یہ تو قدرت الہیہ ہے اور اس جہاں میں تمام امور علم الٰہی کے مطابق رونما ہوتے ہیں ۔

قَالُوْا كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ (۵۱ : ۳۰) "انہوں نے کہا "یہی کچھ فرمایا ہے تیرے رب نے وہ حکیم ہے اور سب کچھ جانتا ہے ۔" یعنی اللہ جس چیز کو کہہ دے کہ ہو جا تو ہو جاتی ہے اور اللہ نے ایسا کہہ دیا ہے تو اس کے بعد اب شک کی گنجائش کیا ہے ۔ کسی کام کا عادی ہونا اور اس کام کا آنکھوں کے سامنے ہوتے رہنا ایسی باتیں ہیں جو انسانی ادراک کو بیڑیاں پہنا دیتا ہے اور اشیاء کے بارے میں انسان کا تصور محدود ہو جاتا ہے ۔ پھر جب انسان اس عادی اور روٹین کے طریق کار سے کوئی مختلف بات دیکھتا ہے تو وہ ششدر رہ جاتا ہے اور وہ تعجب کرتا ہے کہ یہ کیسے ہوگیا ۔ بعض اوقات پھر وہ کبر کرتے ہوئے اس کا انکار کر دیتا ہے لیکن اللہ کی مشیت تو اپنی راہ لیتی ہے ۔ وہ لوگوں کی مالوفات کی پابند نہیں ہے ۔ انسان کا دائرہ ادراک اور اس کا دائرہ امور عادیہ بہت محدود ہے جبکہ اللہ کی قدرتیں بہت ممدود (پھیلی ہوئی) ہیں ۔

---000---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ۔۔ ۲۷

| | |
|---|---|
| سورۃ الذّٰریٰت ۔ ۵۱ | آیات ۳۱ ۔۔ تا ۔۔ ۶۰ |
| سورۃ الطّور ۔ ۵۲ | آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۴۹ |
| سورۃ النجم ۔ ۵۳ | آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۶۲ |
| سورۃ القمر ۔ ۵۴ | آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۵۵ |
| سورۃ الرحمٰن ۔ ۵۵ | آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۷ |
| سورۃ الواقعۃ ۔ ۵۶ | آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۹۶ |
| سورۃ الحدید ۔ ۵۷ | آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۲۹ |

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝

”ابراہیم نے کہا ”اے فرستادگان الہٰی کیا مہم آپ کو درپیش ہے؟“ انہوں نے کہا ”ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسا دیں جو آپ کے رب کے ہاں حد سے گزر جانے والوں کے لئے نشان زدہ ہیں۔“ پھر ہم نے ان سب لوگوں کو نکال لیا جو اس بستی میں مومن تھے اور وہاں ہم نے ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔ اس کے بعد ہم نے وہاں بس ایک نشانی ان لوگوں کے لئے چھوڑ دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہوں“۔

جب حضرت ابراہیم نے اپنے مہمانوں کی حقیقت معلوم کرلی تو وہ پوچھنے لگے کہ ان کا مشن کیا ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ (۵۱ : ۳۱) ”انہوں نے کہا اے فرستادگان الہٰی آپ کو کیا مہم درپیش ہے۔“ تو انہوں نے جواب دیا۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ (۵۱ : ۳۲) ”ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں“ یہ قوم لوط کے لوگ تھے جیسا کہ دوسری سورتوں میں تصریح ہے۔

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ (۵۱ : ۳۳) مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ (۵۱ : ۳۴) ”تاکہ اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسا دیں جو آپ کے رب کے ہاں حد سے گزر جانے والوں کے لئے نشان زدہ ہیں۔“ یہ مٹیالے پتھر تیار شدہ اور نشان زدہ تھے اور اللہ نے ان کو مسرفین کے لئے تیار کیا تھا اور یہ مسرف قوم لوط کے لوگ تھے جنہوں نے حدود سے تجاوز کرلیا تھا۔ وہ فطرت کی راہ سے تجاوز کرکے غیر فطری عمل کرتے تھے۔ جو حق اور دین کے خلاف راستہ تھا۔ ان پتھروں کے بارے میں کوئی بات اس سے مانع نہیں ہے کہ وہ آتش فشانی کے عمل کے نتیجے میں برسنے والے پتھر ہوں کیونکہ گرم لاوا جب ہوا میں اڑتا ہے تو وہ پتھر بن جاتا ہے اور یہ رب تعالیٰ کی طرف سے مسلط ہوتا ہے اور اس کے قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کے مطابق کام کرتا ہے اور اسی شخص پر جاکر پڑتا ہے جس کے بارے میں حکم الہٰی ہو اور ہر پتھر کے لئے اللہ نے اپنے علم سے زمان و مکان مقرر کر دیا ہے کہ اس نے اسی جگہ فلاں کو کرلینا ہے اور ہر پتھر کو فرشتوں کے ذریعہ اللہ نے پھینکنا طے کر دیا ہے پھر ہمیں فرشتوں کی حقیقت کا بھی تو پوری طرح علم

نہیں ہے اور یہ بھی ہمیں معلوم نہیں کہ اس کائنات کے ساتھ فرشتوں کا تعلق کیا ہے پھر جن قوتوں کو ہم جانتے ہیں اور جن کے انکشافات ہمارے سامنے ہوتے رہتے ہیں اور ہم ان قوتوں کے اپنی جانب سے نام رکھتے رہتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے؟ ہماری کیا مجال ہے کہ ہم اللہ کی اس اطلاع پر اعتراض کریں کہ اس نے اپنی بعض قوتوں کو بعض مسرفین پر مسلط کر دیا اور کسی خاص جگہ ایسا کر دیا۔ ہمیں بہرحال اللہ تعالیٰ کی اس اطلاع پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کائنات کے بارے میں ہماری معلومات بہت ہی محدود ہیں اور مفروضوں پر مبنی ہیں بلکہ وہ نظریات ہیں اور بالکل ان چیزوں کی سطحی تاویلات ہیں۔ ابھی تک بہت کم معلومات ہیں جو حقائق بن سکے ہیں۔ غرض یہ آتش فشانی کے عمل میں پتھر ہوں یا اور پتھر ہوں۔ بہرحال وہ دست قدرت کا کرشمہ تھے۔ ان کی تخلیق کا عمل تھے اور وہ کیسے تھے یہ بھی ایک غیب ہے۔

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۵۱: ۳۵) "پھر ہم نے ان سب لوگوں کو نکال لیا جو اس بستی میں مومن تھے" تاکہ وہ نجات پالیں، ان کے لئے یہ اللہ کی حمایت تھی۔

فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۵۱: ۳۶) اور وہاں ہم نے ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا" یہ نبی زمان حضرت لوط کا گھر تھا جیسا کہ دوسری جگہ تفصیلات آتی ہیں۔ ماسوائے اہلیہ لوط علیہ السلام باقی لوگ نجات پا گئے۔

وَتَرَكْنَا فِيْهَا اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (۵۱: ۳۷) "اس کے بعد ہم نے وہاں بس ایک نشانی ان لوگوں کے لئے چھوڑ دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے تھے" جو لوگ عذاب سے ڈرتے ہیں وہی نشانیاں بھی دیکھ سکتے ہیں اور ان کو سمجھ سکتے ہیں اور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ رہے دوسرے لوگ تو وہ اندھے ہوتے ہیں۔ ان کو اس پوری کائنات میں اللہ کی نشانیاں نظر نہیں آتیں نہ زمین میں نہ ان کے نفوس میں اور نہ تاریخ میں۔

اب دوسری نشانی قصہ حضرت موسیٰ میں۔ اس قصے کی طرف بھی ایک سرسری اشارہ ہے کیونکہ یہاں انبیاء کی تاریخ سے نشانات راہ گنوا کر بتاتے ہیں۔

وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيْمٌ ۝ وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ۝ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ۝ وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ۝ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ۝ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا

۲

۲۳ ع فٰسِقِيْنَ ﴿۴۶﴾

۱

"اور تمہارے لئے نشانی ہے موسیٰ کے قصے میں جب ہم نے اسے صریح سند کے ساتھ فرعون کے پاس بھیجا تو وہ اپنے بل بوتے پر اکڑ گیا اور بولا یہ جادوگر ہے یا مجنون ہے۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا اور سب کو سمندر میں پھینک دیا اور وہ ملامت زدہ ہو کر رہ گیا۔ اور (تمہارے لئے نشانی ہے) عاد میں ' جبکہ ہم نے ان پر ایک ایسی بے خیر ہوا بھیج دی کہ جس چیز پر بھی وہ گزر گئی اسے بوسیدہ کر کے رکھ دیا۔ اور (تمہارے لئے نشانی ہے) ثمود میں جب ان سے کہا گیا تھا کہ ایک خاص وقت تک مزے کر لو مگر اس تنبیہ پر بھی انہوں نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی۔ آخر کار ان کے دیکھتے دیکھتے اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب نے ان کو آلیا۔ پھر نہ ان میں اٹھنے کی سکت تھی اور نہ وہ اپنا بچاؤ کر سکتے تھے۔ اور ان سب سے پہلے ہم نے نوح کی قوم کو ہلاک کیا کیونکہ وہ فاسق لوگ تھے"۔

وہ صریح دلیل اور سند جس کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا' وہ صریح اور قاطع دلیل تھی اور وہ عظیم الشان رعب تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت میں تھا اور موسیٰ اور ہارون کے ساتھ ذلت باری تھی جو سنتی تھی اور دیکھتی تھی لیکن فرعون غرور کر کے منہ پھیر گیا اور اس نے واضح سچائی دیکھتے ہوئے بھی اور قاطع دلیل دیکھتے ہوئے بھی پہلو تہی سے کام لیا۔ اس نے حضرت موسیٰ خدا کے نبی کو کہا کہ وہ ساحر اور مجنون ہے حالانکہ انہوں نے اس کو ایسے معجزات دکھا دیئے تھے جن کے سامنے وہ لوگ لاجواب ہو گئے تھے۔ اس طرز عمل سے معلوم ہو گیا کہ جب کوئی ہدایت کے لئے تیار نہ ہو تو اسے بڑے سے بڑا معجزہ بھی ہدایت پر لانے کے لئے کارگر نہیں ہو سکتا اور نہ کسی ایسی زبان کو خاموش کرایا جا سکتا ہے جو باطل پر مصر ہو۔

یہاں سیاق کلام میں اس قصے کی تفصیلات نہیں دی جاتیں بلکہ یہاں اس کا فقط انجام دے دیا جاتا ہے جو اس قصے سے بطور نشانی اور تاریخی سبق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی ہے۔

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيْمٌ (۵۱ : ۴۰) "آخر کار ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا اور سب کو سمندر میں پھینک دیا اور وہ ملامت زدہ ہو کر رہ گیا" یعنی اس نے جو سرکشی کی اور حق کو جھٹلایا اس کی وجہ سے وہ ملامت کا مستحق ہو کر رہ گیا۔

انداز تعبیر میں واضح طور پر یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کو اور اس کے لشکروں کو براہ راست اللہ نے پکڑا اور دریا میں پھینک دیا۔ یہ پہلو اس لئے اجاگر کیا گیا کہ حضرت موسیٰ کے قصے میں نشانی کا پہلو ظاہر ہو جائے کیونکہ یہاں آفاق وانفس اور تاریخ سے اللہ کی نشانیوں کو گنوایا جا رہا ہے۔ تاریخ سے رسولوں کے قصص دراصل نشانات راہ ہیں۔

---ooo---

اور پھر ایک دوسری تاریخی نشانی قوم عاد پر ایک نظر

وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ (۴۱) مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ (۵۱ : ۴۲) "اور (تمہارے لئے نشانی ہے) عاد میں ' جبکہ ہم نے ان پر ایک ایسی بے خیر ہوا بھیج دی کہ

جس چیز پر بھی وہ گزر گئی اسے بوسیدہ کر کے رکھ دیا"۔

اور قوم عاد پر جو ہوا بھیجی گئی اسے یہاں عقیم (بانجھ) کہا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ اس ہوا میں نہ پانی تھا نہ خیر کی کوئی چیز جو سبب حیات ہو جیسا کہ اس ہوا سے قوم عاد توقع کرتی تھی۔ اس کے برعکس اس میں تباہی اور ہلاکت ہی تھی۔ یہ ہوا جس چیز کو بھی لگتی اسے مردہ کر دیتی تھی۔ اس طرح جس طرح کوئی مردہ بوسیدہ ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ ہوا ان کائناتی قوتوں میں سے ایک قوت ہے اور یہ اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے اور اللہ کے لشکروں کو اللہ ہی جانتا ہے۔ ان لشکروں کو اللہ اپنی مشیت اور ناموس کے دائرے کے اندر بھیجتا ہے اور ان لشکروں کے کام کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ یہ لشکر جس پر جاتے ہیں اللہ کے ارادے سے اس کے مقرر وقت پر جاتے ہیں کسی کو ہلاک و تباہ کر دیتے ہیں اور کسی کو زندہ و تابندہ کر دیتے ہیں لہٰذا ایسے مقامات پر کسی کو ان سطحی اور سادہ اعتراضات کا کوئی حق نہیں ہے کہ ہوا تو کائناتی نظام کے مطابق چلتی ہے اور یہ ادھر اور ادھر طبیعاتی عوامل و اسباب کے مطابق چلتی ہے ہم کہتے ہیں کہ یہ طبعی نظام اور کائناتی عوامل بھی خالق ہی چلاتا ہے وہ اپنی تدبیر اور تقدیر کے ساتھ کسی کو تباہ اور کسی کو زندہ کر دیتا ہے۔ یہ عوامل اس نے پیدا کئے اور اسباب اسی کے ہیں اور طبعیاتی اصول اسی نے وضع کئے ہیں اور انہی کے ساتھ وہ ان عوامل کو کسی پر مسلط کرتا ہے اگر کوئی خالق کائنات کو مانتا ہے تو پھر ایسے اعتراضات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

---ooo---

اور تیسری نشانی قوم ثمود کی

وَفِىْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ (۴۳) فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (۴۴) فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّ مَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ (۴۵) (۵۱ : ۴۱ تا ۴۵) "اور (تمہارے لئے نشانی ہے) ثمود میں جب ان سے کہا گیا تھا کہ ایک خاص وقت تک مزے کر لو مگر اس تنبیہ پر بھی انہوں نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی۔ آخر کار ان کے دیکھتے دیکھتے اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب نے ان کو آلیا۔ پھر نہ ان میں اٹھنے کی سکت تھی اور نہ وہ اپنا بچاؤ کر سکتے تھے"۔

اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ (۵۱ : ۴۳) "ایک خاص وقت تک مزے کر لو" سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کو تین دنوں کی مہلت دی گئی تھی یعنی قتل ناقہ کے بعد جیسا کہ دوسری جگہ ہے۔

قَالَ تَمَتَّعُوْا فِىْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ پھر صالح نے ان کو خبردار کر دیا کہ بس اب تین دن اپنے گھروں میں اور رہ لو" اور اس سے مراد وہ وقت بھی ہو سکتا ہے یعنی رسالت کرنے سے قتل ناقہ تک کا وقت جبکہ انہوں نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کرتے ہوئے ناقہ کو قتل کر دیا اور ان کی ہلاکت کا فیصلہ ہو گیا۔

قوم لوط پر پتھروں کی بارش ہوئی ان کے بارے میں ہم نے جو کچھ کہا ہے وہی بات اس ہوا کے بارے میں بھی ہے جو قوم عاد پر بھیجی گئی اور وہی بات اس چیخ کے بارے میں بھی ہے جو قوم ثمود پر آئی۔ یہ تمام کائناتی قوتیں ہیں جو اللہ کی تدبیر

سے کنٹرول ہوتی ہیں۔ یہ اللہ کی مشیت اور اس کے قوانین کے مطابق چلتی ہیں اور اپنے قوانین کے دائرے کے اندر اللہ جس قوم پر چاہتا ہے ان کو بطور عذاب مسلط کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ قوتیں وہی کام کرتی ہیں جو اللہ ان کے حوالے کرتا ہے اور اللہ کے لشکر لاتعداد اور بے مثال ہیں۔

وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ (۵۱ : ۴۶) "اور ان سب سے پہلے ہم نے نوح کی قوم کو ہلاک کیا کیونکہ وہ فاسق لوگ تھے"۔

یہ قصہ نوح کی طرف نہایت ہی سرسری اشارہ ہے۔ بغیر تفصیلات کے اور بغیر اضافوں کے کہ ذرا قوم نوح کو بھی یاد کرلو' جہاں قوم نوح کے قصے میں (فی نوح) کی بجائے (قوم نوح) کے الفاظ آئے ہیں اصل عبارت یوں ہے۔

اُذْكُرْ قَوْمَ نُوْحٍ کہ قوم نوح کا تذکرہ بھی کردے اور اس کے بعد آیات کا آغاز ہوتا ہے۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا کو اس پر عطف کیا گیا ہے تو قوم نوح کی نشانی ایک تاریخی نشانی ہے اور آسمان کی نشانی تکوینی نشانی ہے۔ یہاں دونوں کو باہم حرف عطف کے ذریعے مربوط کر دیا گیا اور ان دونوں کے ذریعے اس پیراگراف کو اس سورۃ کے تیسرے پیراگراف سے مربوط کر دیا گیا۔

وَ السَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۝ وَ الْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ۝ وَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَ لَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ۝ وَّ ذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّ مَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۝ فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ

۳ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ ۝ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ

۱۴ع يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ۝

۲

"آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس کی وسعت رکھتے ہیں ۔ زمین کو ہم نے بچھایا ہے اور ہم بڑے اچھے ہموار کرنے والے ہیں اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں ۔ شاید کہ تم اس سے سبق لو ۔ پس دوڑو اللہ کی طرف میں تمہارے لئے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں ۔ اور نہ بناؤ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود ' میں تمہارے لئے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والوں ہوں ۔ یونہی ہوتا رہا ہے ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون ۔ کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کر لیا ہے ؟ نہیں بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں ۔ پس اے نبی ' ان سے رخ پھیر لو تم پر کچھ ملامت نہیں ۔ البتہ نصیحت کرتے رہو کیونکہ نصیحت ایمان لانے والوں کے لئے نافع ہے ۔ میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں ۔ میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں ۔ اللہ تو خود ہی رزاق ہے بڑی قوت والا اور زبردست ۔ پس جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حصے کا بھی ویسا ہی عذاب تیار ہے جیسا انہی جیسے لوگوں کو ان کے حصے کا مل چکا ہے ' اس کے لئے یہ لوگ مجھ سے جلدی نہ مچائیں ۔ آخر کو تباہی ہے کفر کرنے والوں کے لئے اس روز جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے" ۔

اب روئے سخن پھر اس کائنات کی نمائش گاہ کی طرف لوٹ جاتا ہے جس کے ساتھ اس سورۃ کا افتتاح ہوا تھا ۔ اس کائنات میں قلب و نظر کے جلا کے لئے کئی تصاویر ہیں تو اب اس کائنات کے البم سے ایک نئی تصویر آپ کے سامنے لائی جاتی ہے اور اس کے ذریعے اس نمائش گاہ کائنات میں اللہ کی نشانیوں کو تلاش کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے ۔ یوں حضرت نوح کے قصے کی نشانی اب زمین و آسمان کی تصویری کہانیوں کے ساتھ مل جاتی ہے اور اس کے بعد پھر انسانوں کو بلند آواز سے پکارا جاتا ہے کہ دوڑو اللہ کی طرف ! خالص نظریہ توحید کے ساتھ ۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (۵۱ : ۴۷) "آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا اور ہم بہت ہی وسعت رکھتے ہیں ۔" للاید سے مراد قوت ہے ۔ ہولناک وسیع اور عریض آسمانوں کی تخلیق اور ان کو ضبط میں رکھنے ہی سے اللہ کی عظیم قوت ظاہر ہے ۔ آپ آسمان کے لفظ سے جو بھی مراد لیں خواہ آپ اس سے سیاروں کے مدارات لیں یا اس سے آپ مراد ستاروں کے مجموعے کہکشاں کو لیں جس میں کئی ملین ستارے ہوتے ہیں یا آپ اس سے مراد بلند فضاؤں کے وہ طبقات لیں جن کے اندر یہ ستارے اور سیارے بکھرے ہوئے ہیں یا اس کے علاوہ اس لفظ کا کوئی بھی مفہوم لیں بہرحال یہ کرشمہ قدرت الٰہیہ ہے ۔

اسی طرح وسعت سے مراد بھی یہی سیارے ہیں جو بڑے بڑے حجم والے ہیں اور ملین کی تعداد میں ہیں اور یہ اس ہولناک اور سر چکرانے والی وسیع فضائے کائنات میں بکھرے پڑے ہیں جس طرح ذرات بکھرے ہوئے ہیں بس یہی وسعت ہے ۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وسعت سے مراد وہ خزانے ہوں جو اللہ نے انسانوں کے رزق اور خوراک کے لئے رکھے ہوئے ہیں اور یہ خزانے آسمانوں میں ہیں ۔ اس سورۃ میں یہاں آسمان سے مراد صرف وہ ہو گا جو اللہ کے ہاں ہے لیکن قرآن کا انداز تعبیر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے اندر کسی لفظ کے مفہوم کی طرف ایک اشارہ ہوتا ہے ۔ تعبیر اس مفہوم کا سایہ

ڈالا جاتا ہے اور یہ بالا ارادہ ہوتا ہے تاکہ انسانی شعور اس سے تاثر لے۔

ایک اشارہ یہاں بچھائی ہوئی زمین کی طرف بھی آتا ہے۔

وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ (۵۱ : ۴۸) "اور زمین کو ہم نے بچھایا ہے اور ہم بہت اچھے ہموار کرنے والے ہیں" اللہ نے اس زمین کو تیار کیا کہ یہ زندگی کے لئے ایک گہوارہ ثابت ہو جس طرح اس سے قبل ہم نے تفصیل دے دی ہے۔ فرش انسان کے لئے آرام اور راحت کا سبب ہوتا ہے۔ زمین کو اس طرح تیار کردہ ' ہموار کردہ اور سہولتوں کا اور زندگی کا گہوارہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے فرش سے تعبیر کیا گیا۔ اس کی ہر چیز کو نہایت ہی گہرائی سے زندگی کی کفالت کے لئے تیار کیا گیا ہے۔

فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ (۵۱ : ۴۸) "ہم بڑے اچھے ہموار کرنے والے ہیں"۔

وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۵۱ : ۴۹) "اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے شاید کہ تم اس سے سبق لو" یہ ایک عجیب حقیقت ہے جو اس زمین کی تخلیق کا بنیادی اصول بتاتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہی اصول پوری کائنات میں بھی کارفرما ہو کیونکہ انداز تعبیر میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ صرف زمین کے اندر ہی یہ اصول کارفرما ہے۔ یہ اصول تخلیق میں زوجیت اور جوڑے کا اصول' زندہ چیزوں میں زوجیت کا اصول تو بالکل ظاہر و باہر ہے لیکن "شئی" کے لفظ کا اطلاق دوسری چیزوں پر بھی ہوتا ہے تو معنی یہ ہوئے کہ تمام اشیاء بھی زوجیت کے اصول پر تخلیق کردہ ہیں۔

جب ہم اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ ہم چودہ سو سال سے اس آیت کو پڑھ رہے ہیں اور زوجیت کے اصول کی اس قدر ہمہ گیری کا تصور اس وقت نہ تھا جو اب ہو گیا ہے ' اس وقت تو زندہ چیزوں میں بھی یہ اصول اس قدر ہمہ گیر متصور نہ تھا چہ جائیکہ کوئی تمام اشیاء کے اندر زوجیت کا تصور کرتا۔ اگر ہم یہ حقیقت سوچ لیں تو پھر ہمارے سامنے ایک عجوبہ آجاتا ہے اور یہ ہمیں بتایا ہے کہ اس پوری کائنات کی ہر چیز زوجیت کے اصول پر ہے۔

یہ آیت ہمیں یہ حقیقت بھی بتاتی ہے کہ دور جدید کے تمام انکشافات ہمیں حقیقت کبریٰ کے بہت قریب کرتے جا رہے ہیں۔ تمام تحقیقات اس پر متفق ہوتی جا رہی ہیں کہ کائنات کی تخلیق ذرے سے ہوتی ہے اور ذرہ دو کہربائی جوڑوں سے مرکب ہے۔ مثبت اور منفی لہٰذا جدید طبیعی تحقیقات اس حقیقت کے ثبوت کی طرف جا رہی ہیں۔

عبارت اور الفاظ کے لحاظ سے چھوٹے اور مختصر اور مفہوم کے اعتبار سے بڑے اور محیرالعقول اشارات کی روشنی میں آسمان کی دوریوں ' زمین کے اطراف و اکناف اور مخلوقات کے انفس کے مکالمے اور مشاہدے کی روشنی میں اب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو نہایت ہی بلند آواز سے پکارتا ہے کہ دوڑو خالق ارض و سماء کی طرف ' خالص ہو کر ' تمام بوجھ اپنے کاندھوں سے پرے پھینک کر ' ہلکی روح ' بے قید دل کے ساتھ اور توحید کے جھنڈے ہاتھوں میں لئے ہوئے دوڑ پڑو۔

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۵۱ : ۵۱) "اور نہ بناؤ اللہ

کے ساتھ کوئی دوسرا معبود 'میں تمہارے لئے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں"۔ اللہ کی طرف آنے کو فرار سے تعبیر کرنا در حقیقت ایک عجیب اور معنی خیز تعبیر ہے ۔ یہ بتاتی ہے کہ اس زمین میں انسانوں کو کس طرح ناجائز طور پر برباد کر دیا گیا۔ کس طرح اسے پابندیوں میں جکڑ دیا گیا ہے کس طرح اسے بیڑیاں پہنا کر جیلوں کے گڑھوں میں بند کر دیا گیا ہے جنہوں نے انسانوں کو اس زمین کے ساتھ چپکا دیا ہے' اس پر گرا دیا ہے اور اس کو قسم قسم کے بندھنوں سے باندھ دیا گیا ہے۔ خصوصاً رزق اور مال و دولت کی لالچ کے ذریعے اور اپنے حصے کا رزق حاصل کرنے کے لئے ظاہری اسباب رزق میں انسانوں کو منہمک کر دیا گیا ہے ۔ اس لئے انسانوں کو ان بندھنوں سے چھڑانے کے لئے بھی نہایت ہی زور دار دعوت اور بلند آواز کے ساتھ پکار کی ضرورت تھی اور الفاظ کے استعمال میں بھی ایسا لفظ لیا گیا کہ شدت سے بھاگو' اور بھاگو بھی اللہ کی طرف بغیر کسی کو شریک ٹھہرائے ہوئے اور حجت تمام کرنے کے لئے کہا گیا۔

اِنِّیْ لَکُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۵۱:۵۱) "میں تمہارے لئے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں" دونوں آیات کے اندر اس بات کا تکرار تاکید مزید پر دلالت کرتا ہے ۔ پہلی آیت میں بھی کہا گیا۔

اِنِّیْ لَکُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۵۱:۵۱) یہ تکوینی آیات اور نشانات آسمانوں کی نشانیوں' زمین کی نشانیوں' تخلیق کی نشانیوں اور ان کے ساتھ رسولوں کی تاریخ کے نشانات یہ ایک مسلسل بیان تھا نشانات الٰہیہ کے لئے اور۔

وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰهَا (۵۱:۴۷) بھی انہی کا نتیجہ تھا۔ اس لئے اب رسولوں کی تاریخی نشانیوں پر ایک تبصرہ آتا ہے اور آپ کو تسلی دی جاتی ہے۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ (۵۲) اَتَوَاصَوْا بِهٖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (۵۳) فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ (۵۴) وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ (۵۵) (۵۱:۵۲ تا ۵۵)

"یونہی ہوتا رہا ہے ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون ۔ کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کر لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں ۔ پس اے نبیؐ ان سے رخ پھیر لو تم پر کچھ ملامت نہیں۔ البتہ نصیحت کرتے رہو کیونکہ نصیحت ایمان لانے والوں کے لئے نافع ہے"۔

تمام رسولوں کے مخالفین اور مکذبین کی فطرت ایک ہی رہی ہے ۔ گمراہوں نے ہمیشہ رسولوں کی دعوت کے مقابلے میں یکساں ردعمل کا اظہار کیا۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ (۵۱:۵۲)

"یونہی ہوتا رہا ہے ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا

مجنون" جس طرح مشرکین مکہ کہہ رہے ہیں ۔ گویا اگلے پچھلے کافروں نے آپس میں مشورہ کر لیا ہو ۔ انہوں نے آپس میں مشورہ تو نہیں کیا مگر سرکشی ، گمراہی ، ظلم کا مزاج ہی ایک ہوتا ہے ۔ اس لئے اگلے پچھلے اس روش پر جمع ہو گئے ہیں ۔

منکرین کے مسلسل ایک ہی موقف سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہی ہے کہ رسول ﷺ ان لوگوں کی تکذیب کی کوئی پرواہ نہ کریں ۔ ان لوگوں نے اس رویہ پر گویا اتفاق کر لیا ہے لہذا رسول ﷺ اس پر ملامت زدہ نہیں ہیں ۔ ان کو چاہئے کہ کوئی پرواہ نہ کریں ۔ وہ تو محض یاد دہانی کرانے والے ہیں اور یاد دہانی وہ جاری رکھیں ۔ اگرچہ لوگ اعتراض کریں اور منہ موڑیں ۔

وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۵۱ : ۵۵) "البتہ نصیحت کرتے رہو کیونکہ نصیحت ایمان لانے والوں کے لئے نافع ہے ۔" اور دوسروں کے لئے نافع نہیں ہے کیونکہ انہوں نے انکار کا فیصلہ کر لیا ہے ۔ تذکیر اور دعوت رسولؐ کے فرائض میں سے ہے اور ایمان لانا نہ لانا رسول کے فرائض سے باہر ہے ۔ یہ اللہ کا کام ہے جو آسمان اور زمین اور انسانوں کا خالق ہے ۔ اب اس سورۃ میں عقل و خرد کے تاروں پر آخری ضرب لگائی جاتی ہے اور اس میں فرار الی اللہ کے معنی کی وضاحت کی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ زمین کے بوجھوں اور گراوٹوں سے نجات کس طرح مل سکتی ہے ۔ وہ یوں کہ انسان اور جن جس مقصد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں وہ فریضہ ادا کریں ۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۶) مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ (۵۷) اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (۵۸) (۵۱ : ۵۶ تا ۵۸) "میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں ۔ میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں ۔ اللہ تو خود ہی رزاق ہے بڑی قوت والا اور زبردست" ۔

یہ چھوٹی سی آیت دراصل ایک عظیم حقیقت پر مشتمل ہے ۔ یہ اس کائنات کی وہ عظیم حقیقت ہے کہ جہاں انسان کی زندگی اس پر عمل کرنے کے سوا درست نہیں ہو سکتی ۔ خواہ وہ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی ہو یا عالمی زندگی اور ہر دور میں یہ حقیقت اپنی جگہ سچی رہی ہے اور رہے گی ۔

یہ عظیم حقیقت عالم انسانیت کے نہایت اہم گوشے اور خفیہ معانی پر کھلتی ہے اور یہ معانی اور گوشے وہ ہیں جن پر پوری اجتماعی زندگی قائم ہے ۔

اس کا پہلا پہلو یہ ہے کہ جن و انس کے وجود کا خاص مقصد ہی یہ ہے اللہ کی بندگی کی جائے ۔ اس مقصد کے لئے اللہ نے چند فرائض مقرر فرمائے ہیں جس نے یہ فرائض ادا کئے گویا اس نے مقصد زندگی پا لیا اور جس کسی نے ان فرائض میں کوتاہی کی یا ان سے منہ موڑا تو اس نے گویا مقصد زندگی ہی گم کر دیا اور وہ شخص بے مقصد اور بے کار ہو گیا اور اس کی زندگی بے معنی ہو گئی اور اسکی کوئی قدر و قیمت نہ رہی کیونکہ صرف اسی مقصد کے ذریعے ہی زندگی بامعنی ہو سکتی ہے ۔ یہ شخص اس ناموس فطرت سے نکل آیا جس کے لئے اسے اللہ نے پیدا کیا تھا اور یہ گویا بالکل ضائع ہو گیا جس طرح ہر وہ چیز

جو اپنا فرض منصبی ادا کرنا چھوڑ دے وہ بے کار ہو جاتی ہے کیونکہ مقصد زندگی ہی در حقیقت کسی شخص کے بقاء کا ضامن ہوتا ہے۔ مقصد وجود پورا نہ کرنے والی چیز اگر زندہ رہے یا موجود بھی وہ ردی ہو جاتی ہے۔ یہ مقصد زندگی جو جن و انس کو ناموس فطرت سے مربوط کرتا ہے وہ کیا ہے؟ یہ عبادت اللہ کی بندگی یعنی ایک بندہ ہو گا اور ایک اس کا رب ہو گا۔ بندہ بندگی کرے گا اور اس کا رب معبود ہو گا اور بندے کی پوری زندگی کو اس مقصد کے مطابق استوار ہونا ضروری ہے۔ گویا عبد نے معبود کی مکمل بندگی کرنی ہے۔

یہاں آکر پھر اس عظیم حقیقت کا دوسرا پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ بندگی سے مراد پوری زندگی میں بندگی ہے اور بندگی سے مراد صرف مراسم عبودیت یا پرستش کے طریقے نہیں ہیں بلکہ اس کا مفہوم بہت وسیع ہے کیونکہ جن اور انسان اپنی پوری زندگی رات اور دن صرف عبادت میں نہیں گزارتے۔ اللہ نے لوگوں کو اس بات کا مکلف نہیں بنایا کہ وہ رات اور دن بندگی اور پرستش کریں بلکہ اللہ نے ان کو مختلف قسم کی زندگی گزارنے کا مکلف بنایا ہے۔ جنوں کی سرگرمیوں کا تو ہمیں علم نہیں ہے لیکن انسانوں کی سرگرمیوں کا ہمیں علم ہے۔ قرآن مجید نے انسان کی تخلیق کی سکیم بتائی ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً "جب اللہ نے فرشتوں سے کہا کہ میں انہیں میں خلیفہ بنانے والا ہوں" لہٰذا زمین میں فریضہ خلافت ادا کرنا بھی انسان کی ذمہ داری ہے اور خلافت کی ذمہ داری میں مختلف قسم کی سرگرمیاں شامل ہیں یعنی زمین کی قوتوں میں تصرف کرنا' اس کے اندر پوشیدہ ذخائر کو تلاش کرکے انسانیت کی خدمت کے لئے استعمال کرنا' زمین کے اوپر انسانی زندگی کو ترقی دینا' اس طرح خلافت کی ذمہ داریوں میں سے یہ بھی ہے کہ جو لوگ مسلمان ہوں وہ اللہ کی شریعت قائم کریں اور جس طرح کائنات میں اللہ کی مرضی چلتی ہے اسی طرح انسان کی اختیاری زندگی میں بھی اللہ کی مرضی کو نافذ کیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ فعل عبادت جو انسان کا مقصد زندگی ہے وہ زیادہ وسیع اور جامع مفہوم رکھتا ہے اور اس سے مراد صرف مراسم عبودیت نہیں ہیں اور زمین پر اللہ کی خلافت کے فرائض سرانجام دینا بھی عبادت میں شامل ہے لہٰذا اسلامی عبادت کے دو پہلو ہیں۔

1۔ پہلا یہ کہ اللہ کی بندگی کا مفہوم ذہن میں پوری طرح بیٹھ جائے۔ یہ شعوری اقرار کہ ایک بندہ ہے جو بندگی کرتا ہے اور ایک رب ہے جس کی بندگی کی جاتی ہے اور اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک طرف سے بندگی اور غلامی ہے اور دوسری جانب آقا و خالق ہے۔ ادھر عبد ادھر معبود ہے۔ رب واحد ہے اس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں اور اس کے سوا جس قدر مخلوق ہے وہ سب کے سب عابد اور غلام ہیں۔

2۔ دوسرا پہلو اس حقیقت عظمیٰ کا یہ ہے کہ انسان اپنی ہر قلبی حرکت اور توجہ اور اپنی جسمانی حرکت اور اس کا رخ زندگی کے ہر موڑ میں اللہ کی طرف پھیر دے۔ صرف اللہ کی طرف متوجہ ہو اور اللہ کے سوا ہر شعور کو اپنے دل سے نکال دے اور اللہ کی بندگی کے سوا ہر حرکت اپنی زندگی سے خارج کر دے۔

ان دو پہلوؤں سے عبادت کا مفہوم پوری طرح وجود میں آتا ہے اور ہر عمل ایک عبادت بن جاتا ہے اور بندگی کے مراسم اس طرح بن جاتے ہیں جس طرح کوئی اس زمین کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہو اور پھر زمین کی تعمیر و ترقی کا کام جہاد

فی سبیل اللہ بن جائے گا اور جہاد فی سبیل اللہ یوں ہوتا ہے جس طرح ایک انسان مشکلات میں صبر کرے ۔ (یعنی زندگی کی ہر حرکت اور ہر کام عبادت بن جاتا ہے ۔) اور یہ تمام کام وہ مقصد پورا کر رہے ہوں گے جس کے لئے اللہ نے جن و انس کو پیدا کیا ہے اور جس مقصد کو پوری کائنات پورا کر رہی ہے ۔

جب یہ نظریہ اور عقیدہ کسی ذہن میں بیٹھ جائے تو وہ یہ یقین کر لیتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں کس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے ۔ وہ اس لئے یہاں آیا ہے کہ زندگی کے اس مختصر حصے میں وہ اس فریضہ کو ادا کرے ۔ اللہ کی بندگی ' اللہ کی پرستش اور بس اس کے سوا اس کا کوئی مقصد نہ ہو ۔ اس سے اس کا کوئی مفاد وابستہ نہ ہو ۔ فقط اطاعت اور اس کا جو اجر وہ چاہتا ہو وہ صرف یہ ہو کہ اللہ اس سے راضی ہو ۔ اسے اس بات پر اطمینان ہو ۔ وہ اپنے عمل اور اپنے حالات پر مطمئن ہو کہ اللہ اس سے راضی ہے ۔ رہی افرادی جزا تو وہ اللہ کا ایک فضل و کرم ہو گا ۔

اگر ایک شخص اس مقام تک پہنچ جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ در حقیقت وہ اللہ کی طرف دوڑ گیا ہے ۔ اس نے اس زمین کی گراوٹوں ' اس کی رکاوٹوں اور اس کی تمام دامن گیریوں کو عبور کر کے اور ہر چیز سے اپنے آپ کو چھڑا کر اللہ کی طرف فرار اختیار کر لیا ہے ۔ وہ اس آزادی کے ذریعے زمین کی تمام پابندیوں سے آزاد ہو گیا اور اللہ کے لئے وقف ہو گیا اور وہ اس کائنات کے اصل مقام پر پہنچ گیا یعنی اللہ کی بندگی کے مقام پر جس کے لئے اللہ نے اسے پیدا کیا تھا ۔ اب یہ اپنے صحیح مقام پر جا کر کھڑا ہو گیا ۔ اس نے اپنا مقصد وجود پورا کر دیا ۔ لہذا عبادت الہی کے تقاضوں میں سے یہ تقاضا بھی ہے کہ انسان اس زمین کے اوپر فرائض خلافت ارض بھی پورے کرے ۔ یہاں اپنی ذمہ داریاں ادا کرے ۔ اس زمین کے ثمرات سے آخری حد تک استفادہ کرے لیکن اس حال میں کہ وہ ان سے اپنے ہاتھ بھی جھاڑ رہا ہو اور اس کا دل اس زمین کی دھوکہ دینے والی اور پرکشش چیزوں سے آزاد و بے نیاز ہو ۔ یوں کہ اس دنیا کے ثمرات اور لذات وہ صرف اپنی ذات کے لئے نہ سمیٹ رہا ہو بلکہ اسے فریضہ حیات کے طور پر عبادت کے طور پر اور فرار الی اللہ کے طور پر کر رہا ہو اور بقدر ضرورت کر رہا ہو ۔

اس تصور اور اس عظیم حقیقت کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ ہے کہ انسان اعمال کے نتائج پر نظر نہیں رکھتا بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ وہ یہ اعمال کس نیت سے کر رہا ہے ۔ نتائج چاہے جو ہوں انسان نتائج کا ذمہ دار نہیں ہے ۔ وہ تو صرف امتثال امر اور عبادت کا ذمہ دار ہے کیونکہ اس کا اجر اس کے اعمال کے نتائج نہیں بلکہ اس کا اجر یہ ہے کہ وہ بندگی کر رہا ہے یا نہیں کر رہا ۔

اس حقیقت عظمیٰ کو پا لینے کے بعد فرائض ' واجبات اور اعمال کے بارے میں انسان کا نقطہ نظر یکلخت بدل جاتا ہے ۔ وہ ہر کام میں یہ دیکھتا ہے کہ وہ فریضہ عبادت پورا کر رہا ہے یا نہیں ۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس نے عبادت کر لی تو اس کا کام ختم ہو گیا ۔ اب نتائج چاہے جو ہوں سو ہوں کیونکہ کاموں کے نتائج اس کے فرائض میں داخل نہیں ہوتے نہ اس کی طاقت میں یہ بات ہے کہ وہ نتائج پیدا کر سکے کیونکہ نتائج تو اللہ کی مشیت اور تقدیر کے مطابق نکلتے ہیں ۔ وہ اس کی جدوجہد اس کی نیت اس کا عمل تو تقدیر الہی کا ظہور ہوتے ہیں ۔

جب انسان اس معنی میں جدوجہد کرے اور نتائج سے ہاتھ جھاڑ لے اور یہ شعور پا لے کہ اس نے اپنے حصے کا کام کر دیا ہے اور یہ کہ اس کی جزا اللہ پر ہے کیونکہ اس کا کام تو یہ تھا کہ اللہ کے حکم کو مانو ۔ لہذا اب اس دنیا کے حوالے سے

اس کی کوئی آرزو ہی نہیں رہتی ـ وہ اس دنیا میں کسی مقصد کے لئے کسی سے کوئی پرخاش نہیں رکھتا اور نہ اس دنیا کی اغراض میں سے کسی غرض کے لئے اس کے دل میں کوئی چاہت ہوتی ہے ـ اس نے اپنی طاقت کے مطابق جدوجہد کر لی ـ اس دنیا میں اپنی ذمہ داریاں ادا کر دیں اور اپنے حصے کے فرائض پورے کر دیئے اور اس دنیا کے نتائج اور اغراض سے بھی اپنے ہاتھ جھاڑ لئے اور اپنی جدوجہد کے ثمرات کے حصول کی آرزو بھی دل سے نکال دی کیونکہ جب اس نے بندگی کر دی تو اس کا ثمر اسے حاصل ہو گیا ـ رہے ذاتی مفادات تو یہ اس کا مقصد ہی نہ تھا ـ

قرآن کریم اس قسم کے احساسات کو غذا دیتا ہے ـ ایسے تصورات کو تقویت دیتا ہے ـ انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ رزق کا غم مت کرو، رزق کی ذمہ داری اللہ پر ہے ـ اللہ نے اپنے بندوں کے رزق کی ذمہ داری لی ہوئی ہے ـ اللہ خود بھی کسی رزق اور طعام کا محتاج نہیں ہے ـ اس نے یہ انتظامات بندوں کے لئے تو کئے ہیں ـ اللہ تعالیٰ لوگوں کو محتاجوں اور غریبوں پر انفاق کے جو احکام دیتا ہے وہ بھی خود ان کے مفاد میں ہیں ـ

مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ (۵۷) اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (۵۱ : ۵۸) "میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں ـ اللہ خود ہی رزاق ہے بڑی قوت والا اور زبردست ہے ـ"

اس دنیا میں فرائض خلافت ادا کرتے ہوئے ایک مومن کے اندر صرف حصول رزق کا داعیہ نہیں ہوتا بلکہ یہ داعیہ اللہ کی بندگی کا داعیہ ہوتا ہے اور عبادت تب پوری ہوتی ہے جب انسان اس جہاں میں امر الٰہی کو تسلیم کرتے ہوئے پوری جدوجہد کرے ـ اس لئے یہاں ایک مومن کی جدوجہد کے پیچھے اللہ کی بندگی اور اطاعت کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے اور اس جذبے میں اس دنیا کے مفادات میں سے کوئی مفاد بھی نہیں ہوتا کیونکہ اس دنیا میں اونچے مقاصد کے لئے جدوجہد ایک عظیم بلند فعل ہے اور یہ کسی بلند تصور اور جذبہ کے تحت ہی ہو سکتا ہے ـ

آج انسانیت اگر اس رزق بلند سے محروم ہے تو وہ اس لئے محروم ہے کہ جس طرح دور اول کے مسلمان قرآن کی تعلیمات کے سایہ میں زندگی بسر کرتے تھے یہ لوگ نہیں کر رہے اور انہوں نے اپنے اصول زندگی قرآنی دستور سے اخذ نہیں کئے ـ

جب کوئی انسان اور کوئی سوسائٹی اس افق تک بلند ہو جاتی ہے یعنی بندگی اور غلامی کے افق تک اور اس پر جم جاتی ہے تو اس کی عزت نفس کسی بھی خسیس ذریعہ سے کوئی بلند مقصد حاصل کرنے سے انکار کر دیتی ہے ـ اگرچہ یہ مقصد اسلام کی سربلندی ہو اور اسلام کے غلبہ کا مقصد ہو کیونکہ خسیس ذرائع اللہ کی بندگی کے پاک مقصد کو ختم کر دیتے ہیں ـ نیز جب کوئی اس مقام تک پہنچ جائے تو وہ نفس کو منزل تک پہنچانے کی فکر نہیں کرتا بلکہ وہ اس فکر میں مبتلا ہوتا ہے کہ ہم نے اپنا فریضہ پورا کر دیا ہے یا نہیں ـ یعنی اللہ کی بندگی کے مفہوم اور حقیقت کبریٰ کو پاتے ہوئے ـ جہاں تک حصول مقاصد کا تعلق ہے تو یہ تو اللہ کے حوالے ہیں ـ اللہ نے اپنی تقدیر میں جس طرح کے نتائج طے کر رکھے ہیں وہ پس پردہ تقدیر ظاہر ہو جائیں گے ـ لہٰذا ہمیں یہ نہیں چاہئے کہ ہم نتائج حاصل کرنے کے لئے غلط ذرائع اختیار کریں جبکہ نتائج کا ظہور اللہ کے ہاتھ میں ہے اور یہ ایک مومن کے ذمہ داری میں نہیں ہے جو صرف اللہ کی بندگی کرنے والا ہے ـ

بندہ عبادت گزار کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے 'اس کا نفس برقرار ہوتا ہے۔ اس کا دل تمام حالات میں صحیح و سلامت ہوتا ہے۔ چاہے اسے اپنے عمل کے ثمرات نظر آرہے ہوں یا نہ آرہے ہوں۔ یہ نتائج اس کی نیت اور عمل کے مطابق ہوں یا اس کے برعکس نکل رہے ہوں کیونکہ عبادت کے اس مفہوم کے مطابق اس نے اپنا کام کر دیا ہے۔ اس کی جزاء کی ضمانت اللہ نے دے دی ہے۔ اب وہ خوش و خرم ہے۔ اس کے بعد عملاً کیا ہوتا ہے یہ اس کے دائرہ فرائض سے خارج ہے کیونکہ اس نے یہ بات بیان کی ہے کہ وہ بندہ ہے لہٰذا وہ اپنے شعور اور فکر کے اعتبار سے یا اپنی تجاویز اور مطالبات کے لحاظ سے عبدیت کی حدود سے آگے نہیں جاسکتا۔ اس کو معلوم ہوگیا ہے کہ اللہ رب ہے۔ اس لئے یہ ان کاموں میں دلچسپی نہیں لیتا جو رب العلمین کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔ اس کے جذبات یہاں آکر رک جاتے ہیں تو اللہ اس سے راضی ہو جاتا ہے اور وہ اللہ سے راضی ہو جاتا ہے۔

یہ ہیں بعض پہلو اس عظیم حقیقت کے جس کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ نہایت ہی مختصر آیت ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۱ : ۵٦) "میں نے جن و انس کو اس کے سوا کسی اور کام کے لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری بندگی کریں"۔ یہ حقیقت اگر کسی کے دل و دماغ میں بیٹھ جائے تو وہ اس شخص کی زندگی کا نقشہ بدل دیتی ہے۔

آخر میں اس حقیقت کی روشنی میں ظالموں کو ڈرایا جاتا ہے جو ایمان نہیں لاتے' قیامت کی تکذیب کرتے ہیں اور اس کے آنے میں شتابی کرتے ہیں۔ اس زبردست ڈراوے پر سورت ختم ہوتی ہے۔

فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ (۵۹) فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ (۵۱ : ٦۰) "پس جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حصے کا بھی ویسا ہی عذاب تیار ہے جیسا انہی جیسے لوگوں کو ان کے حصے کا مل چکا ہے' اس کے لئے یہ لوگ مجھ سے جلدی نہ مچائیں۔ آخر کو تباہی ہے کفر کرنے والوں کے لئے اس روز جس کا انہیں خوف دلایا جارہا ہے"۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ۔۔ ۲۷

## سورۃ الطور ۔ ۵۲

## ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۴۹

# سورۃ طور ایک نظر میں

یہ سورۃ انسانی قلب پر ایک پر تاثیر اور گہرا حملہ ہے اس میں ان شکوک و شبہات اور باطل خیالات کا پیچھا کیا گیا ہے جو دل پر ہمیشہ حملہ آور ہوتے ہیں۔ جو خفیہ طور پر گھس کر دل کے اندر چھپ جاتے ہیں۔ اس سورۃ میں ہر باطل دلیل کی سختی سے تردید ہے۔ ہر عذر کا معقول جواب ہے جس کے بہانے کوئی انسان جادہ حق سے ادھر ادھر بھٹک سکتا ہے اور راہ ایمان سے ٹیڑھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا زبردست حملہ ہے کہ کوئی دل اس کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتا اگر وہ پتھر نہ ہو گیا ہو۔ یہ سورۃ اس تیزی سے دلوں کا تعاقب کرتی ہے کہ یقین آنے اور تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہتا۔

اس حملے میں الفاظ اور عبارات کے ہتھیار بھی استعمال ہوئے ہیں۔ معانی و مدلولات بھی استعمال ہوئے ہیں۔ تصاویر اور پرتو بھی شامل ہیں۔ آیات کے سجع اور مقفی خاتمے اور ان کا زبردست ترنم سب کے سب شامل ہیں۔ سورۃ کے آغاز سے اختتام تک یوں نظر آتا ہے کہ مسلسل گولہ باری ہو رہی ہے۔ اس قسم کے دھماکے ہو رہے ہیں کہ گویا بجلی کی کڑک ہے۔ ایسی جھلکیاں اور ایسے رنگ ہیں کہ گویا پردہ احساس پر ارتعاش پیدا کرنے کے لئے مسلسل شدید کوڑے برسائے جا رہے ہیں۔ آغاز سے انجام تک انسان کے دل و دماغ کو ذرا مہلت بھی نہیں دی جاتی۔

سورۃ کے آغاز میں زمین اور آسمان کے مقدسات کی قسم کھائی گئی ہے۔ بعض مقدس چیزیں کھلی ہیں اور بعض پردہ غیب میں ہیں۔

وَالطُّوْرِ (١) وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ (٢) فِىْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (٣) وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ (٤) وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ (٥) وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ (٦) (٥٢: ١ تا ٦) "قسم ہے طور کی اور ایک کھلی کتاب کی جو رقیق جلد میں لکھی ہوئی ہے اور آباد گھر کی اور اونچی چھت کی اور موجزن سمندر کی۔"

یہ قسم کس بات پر ہے۔ ایک نہایت ہی خوفناک امر پر جس کے تصور سے دل کانپ اٹھتا ہے۔ احساسات مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اس کی لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تعبیرات ہولناک ہیں۔ ایک ایسے منظر کی شکل میں جس کو دیکھ کر انسان کے قدم جم نہیں سکتے۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ (٧) مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ (٨) يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا (٩) وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا (١٠) (٥٢: ٧ تا ١٠) "کہ تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے جسے کوئی دفع کرنے والا نہیں۔ وہ اس روز واقع ہو گا جب آسمان بری طرح ڈگمگائے گا اور پہاڑ اڑے اڑے پھریں گے۔"

اور اس خوفناک منظر کے درمیان ہم ایک تنبیہ جھڑکی آتی ہے جو دلوں کو ڈرا دیتی ہے اور وہ مرعوب ہو جاتے ہیں - ہلاکت و بربادی اور خوف و ہراس ہے -

فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۱۱) الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ (۱۲) يَوْمَ
يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا (۱۳) هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ (۱۴)
اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ (۱۵) اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا سَوَآءٌ
عَلَيْكُمْ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶) (۵۲: ۱۱ تا ۱۶) "تباہی ہے اس روز

ان جھٹلانے والوں کے لئے جو آج کھیل کے طور پر اپنی حجت بازیوں میں لگے ہوئے ہیں جس دن انہیں دھکے مار مار کر جہنم کی طرف چلایا جائے گا - اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی آگ ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے - اب بتاؤ یہ جادو ہے یا تمہیں سوجھ نہیں رہا ہے؟ جاؤ اب جھلسو اس کے اندر - تم خواہ صبر کرو یا نہ کرو - تمہارے لئے یکساں ہے تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جارہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے -"

یہ تو تھا حملہ اور تعاقب لیکن اس کے بالمقابل ایک دوسرا رنگ اور دوسرا منظر بھی ہے جن لوگوں نے پہلا خوفناک منظر دیکھا انہیں امید دلانے کے لئے امن اور نعمتوں سے بھرا ہوا ایک منظر دیکھ لیجئے - متقی لوگوں کے شب و روز اور ان کے اعزاز کے لئے ہونے والے انتظامات نہایت وسیع پیمانے پر عیش و عشرت کے لئے بھی دیکھ لیجئے - یہ ایک طویل منظر ہے - اس کی تفصیلات فرعیات تک دی جارہی ہیں - کئی رنگ کی تیاریاں جس کے نتیجے میں احساس اور روح دونوں میں ایک جوش پیدا ہوتا ہے - اس سے قبل تو ہولناک منظر دیکھا تھا اب ایک ایسا منظر جسے دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں -

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ (۱۷) فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ وَ وَقٰهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ
الْجَحِيْمِ (۱۸) كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۹) مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ
وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (۲۰) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ
وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (۲۱) وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّ
لَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ (۲۲) يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ (۲۳) وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ
غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ (۲۴) وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَ
لُوْنَ (۵۲: ۲۵) قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ (۵۲: ۲۶) فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰنَا
عَذَابَ السَّمُوْمِ (۵۲: ۲۷) اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ (۵۲: ۲۸) (۵۲:

(۵۲: ۱۷ تا ۲۸) "متقی لوگ وہاں باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے لطف لے رہے ہوں گے ان چیزوں سے جو ان کا رب انہیں دے گا اور ان کا رب انہیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے گا۔ ان سے کہا جائے گا کھاؤ اور پیو مزے سے اپنے ان اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔ وہ آمنے سامنے بچھے ہوئے تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے اور ہم خوبصورت آنکھوں والی حوریں ان سے بیاہ دیں گے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور ان کی اولاد بھی کسی درجہ ایمان میں ان کے نقش قدم پر چلی ہے ان کی اس اولاد کو بھی ہم ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان کے عمل میں کوئی گھاٹا ان کو نہ دیں گے۔ ہر شخص اپنے کسب کے عوض رہن ہے۔ ہم ان کو ہر طرح کے پھل اور گوشت، جس چیز کو بھی ان کا جی چاہے گا خوب دیئے چلے جائیں گے۔ وہ ایک دوسرے سے جام شراب لپک لپک کر لے رہے ہوں گے جس میں نہ یاوہ گوئی ہو گی، نہ بدکرداری اور ان کی خدمت میں وہ لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ان کی خدمت کے لئے مخصوص ہوں گے۔ ایسے خوبصورت جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے حالات پوچھیں گے۔ یہ کہیں گے کہ ہم پہلے اپنے گھروں میں ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے آخر کار اللہ نے ہم پر فضل فرمایا اور ہمیں جھلسا دینے والی ہوا کے عذاب سے بچا لیا۔ ہم پچھلی زندگی میں اس سے دعائیں مانگتے تھے۔ وہ واقعی بڑا ہی محسن اور رحیم ہے۔"

اس سورۃ کے حصہ اول میں ہم نے عذاب کے گلتے ہوئے کوڑے بھی دیکھ لئے۔ دوسرے حصے میں نعمتوں اور رحمتوں کے مناظر بھی دیکھ لئے۔ اب تیسرا حصہ آتا ہے اس میں ان تخیلات اور سوالات کا پیچھا ہو رہا ہے۔ شبہات اور مغالطہ اندازیوں کو لیا جاتا ہے۔ حجت بازیوں اور جھوٹے عذرات کو رد کیا جاتا ہے اور حقائق کو صاف ستھرا کر کے سادہ اور سخت انداز میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ ایسے منطقیانہ اور واضح انداز میں جس کے اندر کوئی تاویل ممکن نہیں ایسے سیدھے انداز میں جس میں کوئی پیچ وخم نہیں۔ یوں اہل باطل کی گردنیں یقین اور تسلیم کرتے ہوئے جھک جاتی ہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ یہ گردنیں مروڑ دی جاتی ہیں۔ اس حصے میں آغاز خطاب نبی ﷺ سے ہے کہ آپ یاد دہانی کراتے رہیں۔ اگرچہ ان لوگوں کا رویہ آپ کے ساتھ درست نہیں ہے اور ان کی سرزنش اس قسم کی سیدھی سیدھی باتوں سے کی جاتی ہے۔

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ (۲۹) اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (۳۰) قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ (۳۱) اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (۳۲) اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (۳۳) فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ (۳۴) اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ (۳۵) اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ (۳۶) اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ (۳۷) اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۳۸) اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ (۳۹) اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا

فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ (۴۰) اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ (۴۱) اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ (۴۲) اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۴۳) (۵۲: ۱۹ تا ۴۳) "پس اے نبی ؐ تم نصیحت کیے جاؤ اپنے رب کے فضل سے نہ تم کاہن ہو نہ مجنون۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے جس کے حق میں ہم گردش ایام کا انتظار کر رہے ہیں؟ ان سے کہو اچھا انتظار کرو' میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ کیا ان کی عقلیں انہیں ایسی ہی باتیں کرنے کے لئے کہتی ہیں۔ یا درحقیقت یہ عناد میں حد سے گزرے ہوئے لوگ ہیں۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ اگر یہ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو اس شان کا ایک کلام بنا لائیں۔ کیا یہ کسی خالق کے بغیر خود پیدا ہوگئے ہیں یا زمین و آسمان کو انہوں نے پیدا کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ یقین نہیں رکھتے۔ کیا تیرے رب کے خزانے ان کے قبضے میں ہیں؟ ان پر انہی کا حکم چلتا ہے؟ کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر یہ عالم بالا کی سن گن لیتے ہیں۔ ان میں سے جس نے سن گن لی ہو وہ لائے کوئی کھلی دلیل۔ کیا اللہ کے لئے تو ہیں بیٹیاں اور تم لوگوں کے لئے ہیں بیٹے۔ کیا تم ان سے کوئی اجر مانگتے ہو کہ یہ زبردستی پڑی ہوئی چٹی کے بوجھ تلے دب جاتے ہیں؟ کیا ان کے پاس غیب کے حقائق کا کوئی علم ہے کہ اس کی بنا پر یہ لکھ رہے ہوں؟ کیا یہ کوئی چال چلنا چاہتے ہیں؟ اگر یہ بات ہے تو کفر والوں پر ان کی چال الٹی ہی پڑے گی۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود رکھتے ہیں؟ اللہ پاک ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔"

ان مسلسل سوالات اور اس آتش بار گولہ باری کے بعد جس نے باطل کو تس نس کر کے رکھ دیا' معاندین اور مکابرین اور ہٹ دھرمی کرنے والوں کو مشکل میں ڈال دیا اور ہراس زبان کو خاموش کر دیا جو حق سے برگشتہ ہوگئی تھی۔ ان کارگزاریوں کے بعد اب ان کے عناد' ہٹ دھرمی اور ضد کی ایک محسوس تصویر پیش کی جاتی ہے۔

وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ (۵۲: ۴۴) "یہ لوگ آسمان کے ٹکڑے بھی گرتے دیکھ لیں تو کہیں گے یہ بادل ہیں جو امڈے چلے آرہے ہیں" حالانکہ آسمان کے ٹکڑے میں (اگر وہ گرے) اور بادلوں کے تہ بر تہ ڈھیر میں فرق بالکل واضح ہے لیکن یہ لوگ حق میں رخنہ اندازی کے لئے ہر شبہ تلاش کر لیتے ہیں۔

اب ان پر آخری گولہ پھینکا جاتا ہے۔ زبردست تہدید کہ تمہیں ایک ایسے عذاب کے سامنے پیش ہونا ہوگا جو خوفناک ہوگا۔

فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ (۵۲: ۴۵) يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۵۲: ۴۶) "اے نبی ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو یہاں تک کہ یہ اپنے اس دن کو پہنچ جائیں جس میں یہ مار گرائے جائیں گے جس دن نہ ان کی کوئی اپنی چال ان کے کسی کام آئے گی نہ کوئی

ان کی مدد کو آئے گا۔" نیز ان کو یہ دھمکی بھی دی جاتی ہے کہ قیامت کے عذاب سے پہلے بھی ان پر عذاب الٰہی آسکتا ہے۔

وَاِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۵۲ : ۴۷)

"اور اس وقت کے آنے سے پہلے بھی ظالموں کے لئے ایک عذاب ہے مگر ان میں سے اکثر جانتے نہیں۔"

سورۃ کا خاتمہ ایک نہایت ہی نرم اور خوش آئند ضرب پر ہوتا ہے۔ رخ رسول اللہ کریم کی طرف ہے کہ یہ لوگ آپ کے بارے میں کہتے ہیں۔

شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ (۵۲ : ۳۰) "یہ شاعر ہے اور ہم اس کے بارے میں گردش ایام کا انتظار کر رہے ہیں۔" اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کاہن اور مجنون ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تسلی دیتا ہے۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْیُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِیْنَ تَقُوْمُ (۵۲ : ۴۸) وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ (۵۲ : ۴۹) اے نبی اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو، تم ہماری نگاہ میں ہو۔ تم جب اٹھو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو رات کو بھی اس کی تسبیح کیا کر، اور تارے جب پلٹتے ہیں اس وقت بھی۔"

یہ ایک آخری ضرب ہے بلکہ تھپکی ہے اور اس سے مقصود نبی ﷺ کو ان اذیتوں پر تسلی دینا ہے جو آپ کو معاندین کی طرف سے مل رہی ہیں جن پر اس سورۃ میں اس قدر زور دار حملے کئے گئے اور ان کو دور تک بلکہ جہنم کے دھانے تک بھگایا گیا۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۵۱ تشریح آیات

## ۱ ـ ـ تا ـ ـ ۴۹

آیاتها ۴۹ ـ سُوْرَةُ الطُّوْرِ مَكِّيَّةٌ (۵۲) (۷۶) ـ رکوعاتها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَ الطُّوْرِ ﴿۱﴾ وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ﴿۲﴾ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ﴿۳﴾ وَّ الْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ ﴿۴﴾ وَ
السَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ﴿۵﴾ وَ الْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ﴿۶﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ
مِنْ دَافِعٍ ﴿۸﴾ یَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ﴿۹﴾ وَّ تَسِیْرُ الْجِبَالُ سَیْرًا ﴿۱۰﴾ فَوَیْلٌ
یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۱۱﴾ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ خَوْضٍ یَّلْعَبُوْنَ ﴿۱۲﴾ یَوْمَ یُدَعُّوْنَ اِلٰى
نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ﴿۱۳﴾ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَفَسِحْرٌ هٰذَاۤ اَمْ
اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْۤا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَیْكُمْ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ
مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”قسم ہے طور کی اور ایک ایسی کھلی کتاب کی جو رقیق جلد میں لکھی ہوئی ہے اور آباد گھر کی اور اونچی چھت کی اور موجزن سمندر کی کہ تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے جسے کوئی دفع کرنے والا نہیں۔ وہ اس روز واقع ہو گا جب آسمان بری طرح ڈگمگائے گا اور پہاڑ اڑائے اڑے پھریں گے۔ تباہی ہے اس روز ان جھٹلانے والوں کے لئے جو آج کھیل کے طور پر اپنی حجت بازیوں میں لگے ہوئے ہیں جس دن انہیں دھکے مار مار کر نار جہنم کی طرف لے چلا جائے گا اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ ”یہ وہی آگ ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ اب بتاؤ' یہ جادو ہے یا تمہیں سوجھ نہیں رہا ہے؟ جاؤ اب جھلسو اس کے اندر تم خواہ صبر کرو یا نہ کرو' تمہارے لئے یکساں ہے تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے جیسے تم

عمل کر رہے تھے۔"

یہ مختصر آیات اور زمزمہ خیز مسجع آیات اور ان آیات کے آخری الفاظ کی صوتی ہم آہنگی ' پوری سورۃ میں جاری ہے۔ پہلی آیت میں ایک لفظ پھر دو الفاظ ' پھر آہستہ آہستہ الفاظ کی تعداد کا بڑھتے چلے جانا ' یہاں تک کہ پیراگراف کے آخر میں الفاظ کی تعداد ۱۲ کلمات تک پہنچ جاتی ہے اور الفاظ بدستور پر شوکت اور زور دار رہتے ہیں۔

والطور (قسم ہے طور کی) طور ہر اس پہاڑ کو کہتے ہیں جس میں درخت ہوں۔ واضح قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہی کوہ طور ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں مشہور ہے اور جس پہاڑ پر تورات کی تختیاں نازل ہوئی تھیں۔ اس لئے کہ یہاں فضا مقدس مقامات کی ہے اور ان کی اللہ تعالیٰ قسم اٹھاتا ہے اور یہ قسم بھی ایک عظیم امر پر ہے۔

وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ (۵۲ : ۲) فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۵۲ : ۳) "ایسی کتاب کی قسم جو رقیق جلد میں لکھی ہوئی ہے" زیادہ قریب بات یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت موسیٰ کی کتاب ہے جو تختیوں پر لکھی ہوئی تھی۔ اس تفسیر کے مطابق طور کے ساتھ مناسبت پوری ہو جاتی ہے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ مراد لوح محفوظ ہے۔ اس لئے کہ اس کے بعد البیت المعمور کی قسم ہے اور السقف المرفوع کی قسم ہے اور یہ مفہوم بھی ممکن ہے۔

البیت المعمور (آباد گھر کی قسم) اس سے مراد کعبۃ اللہ بھی ہو سکتا ہے واضح یہ ہے کہ مراد وہ بیت المعمور ہے جو فرشتوں کی عبادت کی جگہ ہے کیونکہ صحیح احادیث میں اور حدیث اسراء میں آتا ہے "اس کے بعد مجھے بیت المعمور کی طرف اٹھایا گیا۔ اس میں ہر دن ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی واپس نہیں ہوتا۔" یعنی یہ فرشتے وہاں اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور وہ اس کا اسی طرح طواف کرتے ہیں جس طرح اہل زمین ' زمین کے کعبہ کا طواف کرتے ہیں۔

وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ (۵۲ : ۵) "اور قسم ہے اونچی چھت کی" اس سے مراد آسمان ہے۔ سفیان ثوری کی یہی رائے ہے اور ابوالاحوص نے سماک ابن خالد ابن عرعرہ سے انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہی رائے نقل کی ہے۔ سفیان ثوری کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت علی نے یہ آیت پڑھی۔

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ "اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا اور یہ لوگ اس کی نشانیوں سے منہ پھیر رہے ہیں۔"

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ (۵۲ : ۶) "اور قسم ہے موجزن سمندر کی" یعنی بھرے ہوئے سمندر کی۔ سمندر کا ذکر آسمان کے مقابلے میں زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہ بہت وسیع ہے۔ بھرا ہوا ہے اور طویل و عریض ہے۔ یہ ایک ایسی نشانی ہے جس میں خوبصورتی بھی ہے اور اس میں عظمت اور خوف بھی ہے اور یہ مذکورہ بالا دوسری نشانیوں کے ساتھ زیادہ نصیحت آموز ہے۔ المسجور کا معنی وہ جس میں آگ لگی ہوئی ہو۔ دوسری سورۃ میں کہا گیا۔

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ "جب سمندروں کو بھڑکایا جائے گا" اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد یعنی۔

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ (۶:۵۲) سے مراد آگ کا کوئی سمندر ہو جیسا کہ۔

الْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ سے مراد ایک غیبی عبادت گاہ ہے۔ ان عظیم چیزوں کی قسم اٹھا کر جس عظیم حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے اور جس کے لئے اب ذہن تیار ہو گیا ہے وہ ہے۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ (۷:۵۲) مَّا لَهُ مِنْ دَافِعٍ (۸:۵۲) "کہ تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے جسے کوئی دفع کرنے والا نہیں ہے۔"

یہ عذاب یقیناً ہونے والا ہے اور اسے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ ان دونوں آیات کا اثر اور ان کا حکم دونوں فیصلہ کن ہیں۔ الفاظ کے ترنم سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ واقع ہونے والا ہے اور اس میں کوئی دوسری بات ممکن نہیں ہے اور اس سے کوئی بچانے والا نہیں ہے۔ جب یہ اثر انسان کے پردہ احساس پر پڑتا ہے اور براہ راست پڑتا ہے تو یہ دل کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی حالت بدل کر رکھ دیتا ہے۔ حافظ ابوبکر ابن ابی الدنیا نے نقل کیا ہے اپنے باپ سے انہوں نے موسیٰ ابن داؤد سے' انہوں نے صالح مری سے' انہوں نے جعفر ابن زید عبدی سے وہ کہتے ہیں حضرت عمر ایک رات مدینہ میں گشت کے لئے نکلے' وہ مسلمانوں کے گھروں میں سے ایک گھر کے پاس سے گزرے' دیکھا تو ایک شخص نماز میں کھڑا ہے۔ حضرت عمر کھڑے ہو گئے اور اس کی تلاوت سننے لگے۔ اس شخص نے سورۃ طور پڑھنا شروع کی۔ جب یہاں تک پہنچا۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ (۷:۵۲) مَّا لَهُ مِنْ دَافِعٍ (۸:۵۲) "کہ تیرے رب کا عذاب واقع ہونے والا ہے جسے کوئی دفع کرنے والا نہیں۔" تو حضرت عمر نے فرمایا رب کعبہ کی قسم یہ حق ہے حضرت عمر اپنے گدھے سے اتر گئے اور ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور کچھ دیر بیٹھے رہے۔ پھر وہ اپنے گھر کی طرف لوٹ گئے۔ پورا ایک ماہ لیٹ گئے۔ لوگ ان کی عیادت کرتے لیکن معلوم نہ تھا کہ آپ کو کیا بیماری لاحق ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو یہ سورۃ اس سے پہلے بھی سنی تھی اور بار بار سنی تھی۔ انہوں نے خود بھی اسے پڑھا تھا۔ نماز میں پڑھایا تھا۔ رسول اللہ ہمیشہ مغرب کی نماز میں اسے پڑھا کرتے تھے اور حضرت عمر اسی بات کو جانتے تھے اور اسی طرح آپ بھی مغرب میں اس سورۃ کو پڑھتے۔ اسوہ رسول پر عمل کرتے ہوئے لیکن اس دن ان پر اس کا بہت اثر ہو گیا کیونکہ ان کا دل اس تاثر کے لئے کھلا تھا۔ ان کے احساسات اس دن اثرات قبول کرنے کے لئے تیار ہوں گے اس لئے ان معانی نے ان کے دل میں نفوذ کر لیا اور ان پر اس طرح اثر انداز ہوئے جس طرح اس روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ جب یہ آیات اپنے پورے وزن' پوری شدت اور پوری حقیقت کے ساتھ براہ راست ان کے دل میں اتریں۔ بعض اوقات دلوں پر ایسے اثرات پڑا کرتے ہیں۔ یہ دراصل وقت کی بات ہوتی ہے۔ ایک خاص وقت میں یہ اثرات دلوں کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں اور یہ اس وقت اترتے ہیں جب وہ براہ راست دلوں کو مس کر لیں۔ ان لمحات میں دل ان آیات کو اپنے اصل سرچشمے سے لے لیتے ہیں جس طرح قلب رسول پر ان کا الہامی اثر تھا اس طرح سننے والے کے دل پر اثر ہو جاتا ہے۔ قلب رسول پر تو ہر بار یہ ہوتا تھا اور اللہ نے قلب رسول کو یہ صلاحیت دی تھی بعض اوقات دوسرے

لوگوں پر بھی یہ معجزانہ اثر ہو جاتا ہے جس طرح حضرت عمرؓ پر ہو گیا۔

اب اس عظیم اور خوفناک حقیقت کے بعد ایک خوفناک منظر:

يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا (۵۲:۹) وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا (۵۲:۱۰) "وہ اس روز واقع ہو گا جب آسمان بری طرح ڈگمگا رہا ہو گا اور پہاڑ اڑے اڑے پھریں گے" یہ آسمان جو ٹھہرا ہوا ہے اور نہایت پختگی سے تعمیر شدہ ہے۔ یہ اچانک اضطراب میں مبتلا ہو گا اور اس طرح الٹ پلٹ ہو گا جس طرح سمندر میں امواج اٹھتی بیٹھتی ہیں۔ یہ امواج ادھر سے ادھر جاتی ہیں اور ان کے اندر کوئی قرار نہیں ہوتا اور پھر اس زمین پر پائے جانے والے پہاڑ جو اونچے اور پختہ جمے ہوئے ہیں یہ اس طرح ہلکے ہو جائیں گے کہ وہ اڑنے لگیں گے اور ان سے ثبات و قرار ختم ہو جائے گا۔ یہ منظر ایک ہوشربا اور پریشان کن منظر ہے اور یہ ایک ایسے ہولناک صورتحال کی نشاندہی کرتا ہے کہ جس میں آسمان اور پہاڑ بھی ہل جائیں تو اس قدر خوفناک منظر میں اور ہولناک صورتحال میں یہ ضعیف انسان کیا ٹھہر سکے گا۔

غرض اس قسم کے خوفناک اور ہولناک حالات میں مکذبین کو ایک ایسی بات بتائی جاتی ہے جو ان کو بہت زیادہ خائف کر دینے والی ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کی جانب سے ان کو بددعا دی جاتی ہے اور اللہ کی بددعا تو گویا فیصلہ ہوتا ہے تباہی کا۔ جس بات کی بددعا دی گئی گویا وہ واقع ہو گئی۔ اللہ کو کوئی روکنے والا نہیں ہے اس فیصلے سے اور یہ ہو گئی عملاً

فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۵۲:۱۱) الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ (۵۲:۱۲)

"تباہی ہے اس روز مکذبین کے لئے جو آج کھیل کے طور پر اپنی حجت بازیوں میں لگے ہوئے ہیں" یہ تباہی اس دن آئے گی جس دن آسمان ڈگمگائے گا اور پہاڑ اڑ رہے ہوں گے۔ یہ خوفناک منظر اور یہ خوفناک بربادی۔ یہ ان جھٹلانے والوں کا حصہ ہے جو لگے ہوئے تھے اپنی حجت بازیوں میں۔

سب سے پہلے تو یہ صفت منطبق ہوتی ہے مشرکین مکہ کے افکار پر اور ان کے تصورات اور معتقدات پر جو نہایت سطحی اور بچگانہ تھے اور ان کی پوری اس زندگی پر یہ صفت منطبق ہے جو ان تصورات اور معتقدات کی اساس پر قائم تھی۔ قرآن کریم نے کئی مقامات پر اس پر تبصرہ کیا ہے کہ یہ ایک کھیل ہے جس میں کوئی سنجیدگی نہیں ہے۔ یہ اس کھیل میں اس طرح مصروف ہیں جس طرح حوض میں لوگ نہانے کے لئے اترتے ہیں اور اچھلتے کودتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ پانی میں تیر کر کسی ہدف کی طرف بڑھیں یا کنارے پر لگ جائیں۔ ان کا مقصد صرف حوض میں اچھلنا کودنا ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کریم اس لفظ کا اطلاق قرآنی نظریات کے علاوہ تمام نظریات پر کرتا ہے اور قرآنی طریقہ زندگی کے علاوہ تمام دوسرے اسلوب ہائے زندگی پر کرتا ہے کہ یہ کھیل تماشا ہے اور یہ ایک بڑی حقیقت ہے جو قرآن کریم نے واضح کی ہے اور اسے وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو قرآنی نظریات کے علاوہ تمام نظریات کا گہرا جائزہ لے اور وہ یہ جائزہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظریہ کائنات کی روشنی میں لے۔ کسی بھی گہرے جائزے سے معلوم ہو گا کہ تمام لوگوں کے نظریات اور معتقدات افسانے ہیں بلکہ بڑے بڑے فلسفے انسانی تاریخ کے وہ بڑے فلسفیانہ تصورات جن پر انسان ناز کرتے ہیں، وہ بھی بچوں کا کھیل معلوم ہوتے ہیں۔ اسلامی تصور حیات اور عقائد میں جو حقائق نہایت ہی سادگی، قوت، صفائی اور سنجیدگی سے بیان کئے گئے اور خصوصاً وہ باتیں جو قرآن میں بیان کی گئی ہیں وہ سب فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور وہ فطرت کے

ساتھ بغیر کسی مشکل سے ملتی جلتی ہیں کیونکہ قرآن کا مطالعہ فطرت نہایت حقیقت پسندانہ ہے۔ اس سے اس کائنات کے عجوبے کی بھی خوبصورت تفسیر ہوتی ہے اور اس تفسیر کے مطابق اس کے خالق کائنات کے ساتھ تعلق کی بھی تشریح ہوتی ہے اور یہ سب تصورات اور تشریحات حقیقت پسندانہ بھی ہیں۔

جب میں فلاسفہ کے خیالات پڑھتا' بڑے بڑے فلاسفہ کے خیالات دیکھتا ہوں کہ اس کائنات کے عجوبے کے حل میں وہ تھک کر چور چور ہوگئے اور وہ اس کی صحیح تفسیر نہ کرسکے نہ ہی کائنات کے مختلف حقائق کو باہم مربوط کرسکے۔ ان کے خیالات اس طرح معلوم ہوتے ہیں جس طرح ایک بچہ ریاضی کا کوئی مشکل مسئلہ حل کرنے کی سعی کرے۔ یہ اس لئے کہ میرے سامنے اس مسئلے کا قرآنی حل موجود تھا جو واضح' صاف' سہل فطری اور دلچسپ تر تھا جس میں کوئی ٹیڑھ نہ تھی نہ پیچیدگی تھی اور نہ تذبذب۔ قرآن نے اس کائنات کی جو تشریح کی ہے وہ اس طرح ہے جس طرح ایک شخص اپنی بنائی ہوئی مشینری کی تشریح کرتا ہے۔ رہے فلاسفہ تو وہ اس کائنات میں سے چند جزوی حقائق لے کر ان کو کل پر منطبق کرتے ہیں اس لئے وہ بری طرح فیل ہوجاتے ہیں اور ان کے تصورات تضادات کا شکار ہوجاتے ہیں۔

جب ہم ان فلاسفہ کے تصورات کا مقابلہ قرآن سے کرتے ہیں تو یہ عبث کھیل' غلط بحث کا بھونڈا نمونہ پیش کرتے ہیں اس لئے کہ قرآنی نظریات مکمل پختہ اور مطابق فطرت اور مطابق حقیقت ہوتے ہیں اور قرآن کے مقابلے میں ان کے خیالات ناپختہ' محال اور متناقض ثابت ہوجاتے ہیں۔

جب انسان عظیم فلاسفہ کے نظریات پڑھتا ہے تو انسان کے تصورات میں تمام مسائل میں اضطراب پیدا ہوجاتا ہے۔ گمراہانہ تصورات سے وہ متاثر ہوتا ہے۔ دراصل یہ تصورات مسئلہ کائنات کے حل کے لئے انسانی کوششیں ہیں اور اس کے بعد جب انسان قرآنی آیات پر غور کرتا ہے جو اس موضوع پر ہوتی ہیں تو اس کے ذہن میں آہستہ آہستہ روشنی داخل ہوتی ہے۔ اس کا قرار و ثبات اس کی طرف لوٹ آتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اپنی جگہ پر درست رکھی ہوئی ہے۔ ہر بات اپنی جگہ پر ہے۔ ہر حقیقت اپنی جگہ بیٹھی ہوئی ہے اور کسی چیز میں کوئی اضطراب نہیں ہے۔ انسان فی الفور محسوس کرلیتا ہے کہ وہ حقیقت تک پہنچ گیا۔ اسے آرام اور سکون نصیب ہوتا ہے۔ اس کا دل آرام اور قرار پکڑتا ہے۔ عقل مطمئن ہوجاتی ہے۔ ہر قسم کی الجھنیں دور ہوجاتی ہیں۔ تمام مسائل حل ہوجاتے ہیں کیونکہ وہ ایک واضح حقیقت تک پہنچ چکا ہوتا ہے۔

عقائد کے بعد جب لوگ ان عقائد پر اپنی عملی زندگی استوار کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ کھیل کود میں مصروف ہیں کیونکہ ان کی زندگی کی ترجیحات اسلامی ترجیحات کے مطابق بچگانہ کھیل نظر آتی ہیں۔ اسلام انسان کو جس قدر بلند ترجیحات دیتا ہے اس کے مقابلے میں یہ دوسرے فلسفے جو ترجیحات متعین کرتے ہیں وہ نہایت حقیر معمولی اور بیکار معلوم ہوتی ہیں۔ اسلام جب ان لوگوں کی مشغولیات کو دیکھتا ہے پھر یہ دیکھتا ہے کہ ان کی نظروں میں ان مشغولیات کی اہمیت کیا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ ان میں وہ سراسر غرق ہیں اور اس سلسلے میں ان کی گفتگو کو سنتا ہے جو ان کی نظروں میں ایسی ہوتی ہے جیسا کہ وہ کسی بڑے کائناتی مسئلہ پر بحث کررہے ہیں' اسلام اس قسم کے لوگوں پر جب نظر ڈالتا ہے تو یہ لوگ اسے بچوں کے پارک میں کھیلتے ہوئے بچے نظر آتے ہیں جو گڑیوں اور کھلونوں سے کھیل رہے ہوتے ہیں جن کو وہ حقیقی اشیاء سمجھتے ہیں اور ان کھلونوں کے ساتھ وہ ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ گویا وہ حقیقی اشخاص ہیں۔

اسلام جس طرح اس پوری کائنات کے بارے میں ایک ارفع اور برتر تصور دیتا ہے اس طرح وہ اس کائنات

میں انسان کو اعلیٰ اور برتر ترجیحات بھی دیتا ہے۔ اسلام انسانوں کو بتاتا ہے کہ ان کے اور اس کائنات کے وجود کی علت اور سبب کیا ہے اور ان کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ وہ یہ سوالات اس طرح قدرتی طور پر حل کرتا ہے کہ ان کے جواب کو ہر شخص سمجھ سکے کیونکہ یہ سوالات ہر شخص کے ذہن میں اٹھتے ہیں کہ وہ کہاں سے آیا؟ کیوں آیا ہے اور اس نے کہاں جانا ہے؟

اسلام نے ان سوالات کا جو جواب دیا ہے اس جواب سے خود اس کا وجود اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی اس وسیع کائنات کے وجود کا صحیح تصور ذہن میں آتا ہے کیونکہ انسان دوسری مخلوقات سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ ان ہی مخلوقات میں سے وہ ایک مخلوق ہے جہاں سے دوسری مخلوقات آتی ہیں۔ وہاں سے وہ بھی آیا ہے۔ ان سب چیزوں کے وجود کا سبب ایک ہے۔ جہاں وہ دوسری مخلوقات جائے گی یہ بھی جائے گا لہٰذا اسلام کا جواب ایک مکمل جواب ہے اور یہ کائنات اور انسان دونوں باہم مربوط ہیں اور تمام مخلوق پھر خالق سے مربوط ہے۔

اس کائنات کی قرآنی تشریح کا عکس پھر انسانی ترجیحات پر پڑتا ہے اور یہ ترجیحات اس تصور کی سطح تک بلند ہو جاتی ہیں۔ یوں ایک مسلم کے شعور میں دوسرے لوگوں کی ترجیحات بہت ہی حقیر نظر آتی ہیں جو اپنے تصورات کے مطابق اپنے اعلیٰ فرائض میں مشغول ہوتا ہے اور یہاں اپنے مقصد وجود کے مطابق کام کرتا ہے۔ ان اعلیٰ تصورات اور اعلیٰ ترجیحات کی روشنی میں ایک مسلم کو دوسرے لوگ بچوں کے کھیل میں مصروف نظر آتے ہیں۔

ایک مسلم کی زندگی ایک عظیم زندگی ہے۔ اس لئے کہ اس کے مقاصد اونچے ہیں اور یہ مسلم اس عظیم کائنات کے ساتھ مربوط ہے۔ وہ اس عظیم کائنات کے وجود میں موثر ہے۔ یہ حقیقت اس حقیقت سے زیادہ عزیز ہے کہ ایک انسان اپنی زندگی کو عبث اور بے مقصد کاموں میں ضائع کرے جس طرح دوسرے لوگ ضائع کرتے ہیں۔ مسلم کی ترجیحات کے مقابلے میں اکثر لوگوں کی ترجیحات و مصروفیات عبث نظر آتی ہیں۔ محض مقاصد زندگی کی بلندی کی وجہ سے اور اس کائنات کے تصور کی بلندی کی وجہ سے جو لوگ اس کائنات کے بارے میں ایسا تصور رکھتے ہیں جس طرح بچے کھیل رہے ہوتے ہیں ان کے لئے ہلاکت ہے۔

يَوْمَ يُدَعُّونَ إِلَىٰ نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا (۵۲ : ۱۳) "جس دن انہیں دھکے مار مار کر جہنم کی طرف چلایا جائے گا۔" یہ بھی ایک نہایت ہی پر آشوب منظر ہے۔ الدع کے معنی ہوتے ہیں پیچھے کی طرف دھکیلنا۔ یہ ایک ایسی حرکت ہے جو ان لوگوں کے حالات کے عین مطابق ہے جو تصور کائنات کے بارے میں طفلانہ تصورات رکھتے ہیں جو سنجیدہ نہیں ہوتے اور جو اپنے اردگرد میں چلنے والے معاملات پر غور نہیں کرتے۔ یوں ان کو چلایا جائے گا جہنم کی طرف مگر پیٹھ پر بھی دھکے مار مار کر۔

اس طرح دھکیل دھکیل کر جب ان کو جہنم کے کنارے پہنچا دیا جائے گا تو کہا جائے گا۔

هَٰذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ (۵۲ : ۱۴) "یہ وہی آگ ہے جسے تم جھٹلاتے تھے۔"
یہ لوگ ابھی اسی حالت میں ہوں گے ادھر سے دھکے ادھر آگ، مجبور و مقہور تو ان کو بطور سرزنش اور گوشمالی یہ کہا جائے گا۔ اشارہ ہو گا ان کے ماضی کی طرف۔

أَفَسِحْرٌ هَٰذَا أَمْ أَنْتُمْ لَا تُبْصِرُونَ (۵۲ : ۱۵) "یہ جادو ہے یا تمہیں سوجھ نہیں رہا ہے" یہ لوگ دنیا میں قرآن کے بارے میں کہتے تھے یہ جادو ہے۔ طنزاً کہا جاتا ہے کیا یہ آگ بھی محض جادو ہے یا حقیقت ہے اور ایک خوفناک حقیقت ہے یا صورت یہ ہے کہ تم اس آگ کو اسی طرح نہیں دیکھ رہے ہو جس طرح تم قرآن کو نہ دیکھتے تھے۔

جب یہ سزا یہ سرزنش اور گوشمالی ختم ہوتی ہے تو جلدی انہیں سنجیدگی سے مایوس کر دیا جاتا ہے۔

اصْلَوْهَا فَاصْبِرُوا أَوْ لَا تَصْبِرُوا سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ

(۵۲ : ۱۶) "جاؤ، اب جھلسو اس کے اندر تم خواہ صبر کرو یا نہ کرو، تمہارے لئے یہ یکساں ہے تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے۔" اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ خواہ کوئی صبر کرے یا نہ کرے عذاب جاری رہے گا۔ کوئی اسے روکنے والا نہیں ہے۔ اگر صبر کرے تو وردوہی اگر نہ کرے تو وردوہی۔ جہنم میں رہنا اپنا مقدر ہے خواہ چیخے یا چپ ہو جائے۔ یہ اس لئے کہ یہاں تو جزاء و سزا اعمال پر ہے جو کچھ ہو چکا اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ ان الفاظ پر یہ منظر اب ختم ہوتا ہے اور یہاں یہ پہلا حصہ بھی ختم ہوتا ہے۔

اس سورۃ کا دوسرا حصہ بھی فکر انگیز ہے لیکن اس میں نرم خوشحالی اور عیش و عشرت ہے خصوصاً پہلے منظر کے بعد جس میں سخت عذاب کا ذکر تھا۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَعِيمٍ ﴿١٧﴾ فَاكِهِينَ بِمَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ وَ
وَقَاهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ﴿١٨﴾ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾
مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ سُرُرٍ مَصْفُوفَةٍ ۖ وَزَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ ﴿٢٠﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَ
اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ
مِنْ شَيْءٍ ۚ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ ﴿٢١﴾ وَأَمْدَدْنَاهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَلَحْمٍ مِمَّا
يَشْتَهُونَ ﴿٢٢﴾ يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْسًا لَا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ ﴿٢٣﴾ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ
غِلْمَانٌ لَهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَكْنُونٌ ﴿٢٤﴾ وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٢٥﴾
قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ﴿٢٦﴾ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ ۱
السَّمُومِ ﴿٢٧﴾ إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوهُ ۖ إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ ﴿٢٨﴾ ع ۲۸
۳

متقی لوگ وہاں باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے لطف لے رہے ہوں گے ان چیزوں سے جو ان کا رب انہیں دے گا اور ان کا رب انہیں دوزخ کا عذاب سے بچالے گا۔ ان سے کہا جائے گا کھاؤ اور پیو مزے سے اپنے ان اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔ وہ آمنے سامنے بچھے ہوئے تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے اور ہم خوبصورت آنکھوں والی حوریں ان سے بیاہ دیں گے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انکی اولاد بھی کسی درجہ ایمان میں ان کے نقش قدم پر چلی ہے ان کی اس اولاد کو بھی ہم (جنت میں) ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان کے عمل میں کوئی گھاٹا ان کو نہ دیں گے۔ ہر شخص اپنے کسب کے عوض رہن ہے۔ ہم ان کو ہر طرح کے پھل اور گوشت جس چیز کو بھی ان کا جی چاہے گا خوب دیئے چلے جائیں گے وہ ایک دوسرے سے جام شراب لپک لپک کر لے رہے ہوں گے جس میں نہ یاوہ گوئی ہوگی نہ بدکرداری اور ان کی خدمت میں وہ لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو انہی (کی خدمت) کے لئے مخصوص ہوں گے ایسے خوبصورت جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے (دنیا میں گزرے ہوئے) حالات پوچھیں گے۔ یہ کہیں گے کہ ہم پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے آخر کار اللہ نے ہم پر فضل فرمایا اور ہمیں جھلسا دینے والی ہوا کے عذاب سے بچالیا۔ ہم پچھلی زندگی میں اسی سے دعائیں مانگتے تھے وہ واقعی بڑا ہی محسن اور رحیم ہے۔

یہ منظر نعمتوں کے قریب ہے جو روز ازل سے ان لوگوں کے شعور میں رچی بسی تھیں جن سے مخاطب ہے۔ لہذا یہ منظر لوگوں کے لئے ان کے پاکیزہ اور حسی التذاذ کے اعتبار سے بہت ہی پرکشش ہے اور یہ مناظر اس سخت اور ہولناک عذاب کے عین مقابل ہیں اور متضاد ہیں جو اوپر خشک اور طفلانہ دلوں کے بارے میں پیش کئے گئے تھے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ (۱۷) فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ (۵۲ : ۱۸) "متقی لوگ وہاں باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ لطف لے رہے ہوں گے ان چیزوں سے جو ان کا رب انہیں دے گا اور ان کا رب انہیں دوزخ کے عذاب سے بچالے گا۔" اس جہنم سے بچالینا ہی بہت بڑی کامیابی ہے جس کے مناظر بھی ابھی پیش کئے گئے اور یہاں تو اس بچاؤ کے ساتھ نعمتیں بھی ہیں۔ جنات نعیم بھی ساتھ ہیں یہاں وہ اللہ کی نعمتوں سے لذت حاصل کریں گے۔

ان نعمتوں اور لذتوں کے ساتھ ساتھ پھر استقبال اور تکریم بھی۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓــًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵۲ : ۱۹) "کھاؤ اور پیو مزے سے اپنے ان اعمال کے صلے میں جو تم کر رہے تھے" یہ کہ عالم بالا سے ان کو پکارا جائے گا بذات خود ایک بلند مرتبہ و اعزاز یہ کہا جائے گا کہ تم اس کے مستحق ہو۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ (۵۲ : ۲۰) "وہ آمنے سامنے بچھے ہوئے تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے" یہ تختے آمنے سامنے بچھے ہوں گے۔ بڑی اچھی ترتیب کے ساتھ اور اس میں دوسری لذتوں کے علاوہ اپنے بھائیوں سے وہ ملیں گے۔

وَزَوَّجْنٰهُم بِحُورٍ عِينٍ (۲۰:۵۲) "اور خوبصورت آنکھوں والی حوریں ان کو بیاہ دیں گے" اور یہ وہ اعلیٰ ترین نعمت ہے جس کا کوئی انسان تصور کر سکتا ہے۔

اب ان کا یہ اعزاز ایک قدم اور آگے جاتا ہے۔ ان کی مومن اولاد بھی ان کے ساتھ جمع کر دی جاتی ہے اور وہ بھی ان نعمتوں میں شریک ہوتے ہیں اور یہ ان پر عنایات مزید ہیں۔ اگر چہ اولاد کے اعمال معیار کے اعتبار سے ان متقین سے کم ہی ہوں لیکن اگر اولاد مومن ہے تو اسے آباء سے ملا دیا جائے گا اور آباء کے درجات میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ ہر شخص وہاں اپنے اعمال کا ذمہ دار اور حقدار ہوگا۔ یہ اصول اپنی جگہ رہے گا لیکن یہ اللہ کا فضل ہوگا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُم بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُم مِّنْ عَمَلِهِم مِّن شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ (۲۱:۵۲) "جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور ان کی اولاد بھی کسی درجہ ایمان میں ان کے نقش قدم پر چلی ہے انکی اس اولاد کو بھی ہم ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان کے عمل میں کوئی گھاٹا ان کو نہ دیں گے۔ ہر شخص اپنے کسب کے عوض رہن ہے۔"

یہ منظر جاری ہے۔ جنت کی نعمتوں کا بیان ہو رہا ہے۔ یہ نعمتیں قسم قسم کی ہیں۔ پھل آرہے ہیں، قسم قسم کے گوشت چلے آرہے ہیں جو بھی وہ چاہیں وہ وہاں ایک دوسرے سے جام شراب لے رہے ہوں گے۔ یہ شراب دنیا کی شراب نہ ہوگی جس کے استعمال کے بعد لوگ یاوہ گوئی کرتے ہیں یا فحش حرکات کرتے ہیں بلکہ یہ مصفیٰ اور پاک شراب ہوگی۔

لَّا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ (۲۳:۵۲) "جس میں نہ یاوہ گوئی ہوگی اور نہ بدکرداری" وہ یہ جام شراب ایک دوسرے سے چھین رہے ہوں گے اور ایک دوسرے کو پکڑا رہے ہوں گے تاکہ زیادہ محبت و لذت حاصل ہو اور جب یہ اس قسم کی لذتوں کے اندر ہوں گے تو ان پر خوبصورت چاند جیسے مکھڑے والے لڑکے پھر رہے ہوں گے۔ پاک اور صاف اور تر و تازہ۔

كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ (۲۴:۵۲) "ایسے خوبصورت جیسے چھپائے ہوئے موتی" جن کی وجہ اس مجلس کا لطف روحانی اور جسمانی اعتبار سے دوچند ہو جائے گا۔ اس منظر اور مجلس کی تکمیل کے لئے ان کی باہم گفتگو بھی پیش کی جاتی ہے۔ ان کے ماضی پر ان کا تذکرہ بھی دیا جاتا ہے اور وہ جس مقام تک پہنچ چکے ہیں اس کے اسباب بھی گنوائیں گے کہ کس وجہ سے وہ اس امن، رضامندی، امن و محبت اور وسیع سامان زندگی تک پہنچے ہیں۔ یوں وہ اپنے دلوں میں وہاں بھی اپنی اس حالت کے اسباب گنوا رہے ہوں گے اور اس منظر میں اہل دنیا کو بتایا جاتا ہے کہ اس مقام تک پہنچنے کا یہ راستہ ہے۔

وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ (۲۵) قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ (۲۶) فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُومِ (۲۷) إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلُ نَدْعُوهُ إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ (۲۸) (۲۵:۵۲ تا ۲۸) "یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے (دنیا میں گزرے

ہوئے ) حالات پوچھیں گے ۔ یہ کہیں گے کہ ہم پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے ۔ آخر کار اللہ نے ہم پر فضل فرمایا اور ہمیں جھلسا دینے والی ہوا کے عذاب سے بچالیا ۔ یہ پچھلی زندگی میں اس سے دعائیں مانگتے تھے ۔ وہ واقعی بڑا ہی محسن اور رحیم ہے ۔"

راز یہ ہے کہ انہوں نے اس دن سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کی ۔ وہ اللہ کی ملاقات سے ڈرتے تھے ۔ اللہ کے سامنے حساب و کتاب کا انہیں ڈر تھا ۔ وہ اپنے اہل و عیال میں تھے لیکن ڈرتے تھے ۔ بظاہر وہ اس دنیا کے جھوٹے امن و عافیت میں تھے لیکن انہوں نے اپنے آپ کو دھوکہ نہ دیا ۔ اس جہاں میں لہو ولعب کا مشغلہ جاری تھا مگر وہ اس میں شریک نہ ہوئے ۔

اللہ نے ان پر احسان کیا اور ان کو سخت گرم ہوا کے عذاب سے بچایا ۔ اس ہوا کو السموم اس لئے کہا گیا کہ یہ سم اور زہر کی طرح جسم میں حرارت داخل کرتی تھی جو نیش زن تھی اور اس عذاب سے اللہ نے ان کو محض اپنے فضل و کرم سے بچایا کیونکہ اللہ نے جان لیا کہ یہ لوگ ڈرنے والے ' محتاط اور خضوع و خشوع والے ہیں اور ان کو معلوم ہے کہ یہ ان کی صفات ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ عمل کے ذریعے کوئی بھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا ۔ اگر اس کے ساتھ اللہ کا فضل و کرم نہ ہو کیونکہ عمل تو صرف یہ شہادت ہے کہ صاحب عمل نے جدوجہد کی اور اللہ کے ہاں جو انعامات ہیں ان کی خواہش کی ۔ یہ بات اللہ کے فضل کی اہلیت ہے اور اللہ سے ڈرنے اور خائف ہونے کے ساتھ وہ اپنی مشکلات میں اللہ ہی کو پکارتے تھے ۔

اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ( ۵۲ : ۲۸ ) "ہم پچھلی زندگی میں اس سے دعائیں مانگتے تھے اور اللہ کی ان صفات کو جانتے تھے کہ وہ البر اور العظیم ہے ۔

اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ( ۵۲ : ۲۸ ) وہ واقعی بڑا محسن اور رحیم ہے " یہ ہے راز ان لوگوں کے جنت تک پہنچنے کا یہ مباحثہ کرتے ہیں یہ کامیاب لوگ دارالنعیم میں فی الواقع مکرم لوگ ہیں ۔

---ooo---

اس سورۃ کے پہلے پیراگراف میں ہم نے اچھی طرح جان لیا کہ عذاب الٰہی کیا ہوگا اور دوسرے پیراگراف میں ہم نے اللہ کی انعامات کے بارے میں جان لیا ۔ یوں حقائق معلوم کرنے کے لئے ہمارا احساس خوب تیز ہو گیا چنانچہ سیاق کلام نہایت تیزی سے ' مختصر جملوں اور زوردار الفاظ میں نفس انسان کے پردہ احساس کے سامنے حقائق پیش کرنا شروع کرتا ہے ۔ نفس کے اندر جو وسوسے آتے ہیں ان کا تعاقب کیا جاتا ہے اور یہ حقائق سوالات کے ذریعے ذہن انسانی پر اتارے جاتے ہیں جن کا انداز سرزنش کا ہے ۔ چیلنج کا ہے اور بہت زوردار ہے ۔ ان سوالات اور چیلنجوں کے سامنے انسان نہیں ٹھہر سکتا ہے ۔

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ۝۲۹ اَمْ يَقُوْلُوْنَ
شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝۳۰ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ

الْمُتَرَبِّصِينَ ﴿٣١﴾ أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَحْلَامُهُم بِهَٰذَا ۚ أَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ ﴿٣٢﴾ أَمْ
يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ ۚ بَل لَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٣﴾ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا
صَادِقِينَ ﴿٣٤﴾ أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ﴿٣٥﴾ أَمْ خَلَقُوا السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضَ ۚ بَل لَّا يُوقِنُونَ ﴿٣٦﴾ أَمْ عِندَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ أَمْ هُمُ
الْمُصَيْطِرُونَ ﴿٣٧﴾ أَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَسْتَمِعُونَ فِيهِ ۖ فَلْيَأْتِ مُسْتَمِعُهُم بِسُلْطَانٍ
مُّبِينٍ ﴿٣٨﴾ أَمْ لَهُ الْبَنَاتُ وَلَكُمُ الْبَنُونَ ﴿٣٩﴾ أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُم مِّن مَّغْرَمٍ
مُّثْقَلُونَ ﴿٤٠﴾ أَمْ عِندَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ ﴿٤١﴾ أَمْ يُرِيدُونَ كَيْدًا ۖ فَالَّذِينَ
كَفَرُوا هُمُ الْمَكِيدُونَ ﴿٤٢﴾ أَمْ لَهُمْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٤٣﴾ وَإِن
يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا يَقُولُوا سَحَابٌ مَّرْكُومٌ ﴿٤٤﴾

"پس اے نبیؐ تم نصیحت کیے جاؤ' اپنے رب کے فضل سے نہ تم کاہن ہو اور نہ مجنون۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص شاعر ہے جس کے حق میں ہم گردش ایام کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان سے کہو اچھا انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ کیا ان کی عقلیں انہیں ایسی ہی باتیں کرنے کے لئے کہتی ہیں؟ یا درحقیقت یہ عناد میں حد سے گزرے ہوئے لوگ ہیں؟ کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے اگر یہ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو اسی شان کا ایک کلام بنا لائیں۔ کیا یہ کسی خالق کے بغیر خود پیدا ہو گئے ہیں؟ یا یہ خود اپنے خالق ہیں یا زمین اور آسمانوں کو انہوں نے پیدا کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ یقین نہیں رکھتے۔ کیا تیرے رب کے خزانے ان کے قبضے میں ہیں؟ یا ان پر انہی کا حکم چلتا ہے؟ کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر یہ عالم بالا کی سن گن لیتے ہیں؟ ان میں سے جس نے سن گن لی ہو وہ لائے کوئی کھلی دلیل۔ کیا اللہ کے لئے تو ہیں بیٹیاں اور تم لوگوں کے لئے ہیں بیٹے؟ کیا تم ان سے کوئی اجر مانگتے ہو کہ یہ زبردستی پڑی ہوئی چٹی کے بوجھ تلے دبے جاتے ہیں؟ کیا ان کے پاس غیب کے حقائق کا علم ہے کہ اس کی بنا پر لکھ رہے ہوں؟ کیا یہ کوئی چال چلنا چاہتے ہیں؟ اگر یہ بات ہے تو کفر کرنے والوں پر ان کی چال الٹی ہی پڑے گی۔ کیا اللہ کے سوا یہ کوئی اور معبود رکھتے ہیں؟ اللہ پاک ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ آسمان کے ٹکڑے بھی گرتے ہوئے دیکھ لیں تو کہیں گے یہ بادل ہیں جو امڈے چلے آ رہے ہیں"۔

نبی ﷺ کو ہدایت کی جاتی ہے آپ یاددہانی کیے جائیں اور ان لوگوں کی بدسلوکی سے متاثر نہ ہوں اور ان لوگوں کی جانب سے جو اتہامات لگائے جا رہے ہیں ان کی کوئی پرواہ نہ کریں۔ وہ کبھی یہ الزام لگاتے تھے کہ آپ "کاہن" ہیں۔

کبھی وہ کہتے تھے کہ آپ مجنون ہیں اور یوں وہ درپردہ ایسے الزامات لگاتے تھے جو ان کے درمیان مشہور تھے کہ کاہن اور مجنون دراصل شیاطین سے ہدایات لیتے ہیں اور شیاطین بعض لوگوں کو خبط میں مبتلا کر کے مجنون کر دیتے ہیں۔ گویا ان دونوں صفات کی پشت پر ان کے نزدیک شیطان کام کرتا تھا اور یہ لوگ اسی وجہ سے حضور اکرمؐ پر یہ الزامات عائد کرتے تھے۔ پھر وہ نبی ﷺ پر ساحر اور جادوگر ہونے کا الزام لگاتے تھے۔ یہ وہ اس لئے لگاتے تھے کہ وہ قرآن کریم کے فصیح و بلیغ انداز کے سامنے ششدر رہ گئے تھے۔ یہ قرآن اس قدر معجز تھا کہ اس قسم کا کلام کبھی انہوں نے دیکھا تھا نہ سنا تھا۔ اپنی جگہ یہ اپنے آپ کو قادر الکلام سمجھتے تھے۔ اپنی دینی بیماری کی وجہ سے یہ لوگ چونکہ اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ قرآن کو اللہ کا کلام تسلیم نہیں کریں گے۔ اس لئے وہ اس کلام کے بارے میں کوئی نہ کوئی تاویل کرنے پر مجبور تھے۔ کبھی کہتے ہیں حضور کو یہ کلام جن سکھاتے ہیں۔ حضور کاہن ہیں جو جنوں سے یہ کلام لیتے ہیں۔ یا جادوگر ہیں جو جنوں سے جادو سیکھتے ہیں یا شاعر ہیں اور خیالات جن ان پر القاء کرتے ہیں یا آپ مجنون ہیں اور شیطان نے آپ کو چھو لیا ہے اور یہ باتیں آپ سے کراتا ہے جو عجیب ہیں۔

یہ باتیں نہایت ہی جھوٹی بری اور شرمسار کنندہ اور پریشان کن ہیں لیکن اللہ تعالیٰ رسول اللہ کو تسلی دیتا ہے کہ آپ ذرا بھی ان کی پرواہ نہ کریں۔ آپ پر تو فضل و کرم ہے۔ آپ نہ کاہن ہیں اور نہ مجنون ہیں۔

فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ (۵۲ : ۲۹) ”اپنے رب کے فضل سے آپ نہ تم کاہن ہو اور نہ مجنون“ اس کے بعد ان کے اس قول پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ حضور اکرمؐ پر شاعر ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (۵۲ : ۳۰) ”کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے جس کے حق میں ہم گردش ایام کا انتظار کر رہے ہیں“ انہوں نے یہ بات کہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو یوں تسلی دیتے تھے یعنی اس تحریک کے مقابلے میں صبر کرو اور اپنے دین پر ثابت قدم رہو۔ اپنے وقت پر یہ شخص مرجائے گا۔ یوں ہماری جان چھوٹ جائے گی۔ ایک دوسرے کو کہتے کہ صبر کرو کہ یہ مرجائے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ سے کہا جاتا ہے کہ آپ ان کو ذرا دھمکی آمیز انداز میں کہہ دیں اچھا۔

قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ (۵۲ : ۳۱) ”ان سے کہو اچھا انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں“ اور تمہیں جلدی معلوم ہو جائے گا کہ اچھا انجام کس کا ہونے والا ہے اور کس کو فتح و کامرانی نصیب ہوتی ہے۔

قریش کے اکابر کو کہا جاتا تھا کہ یہ ذوی الاحلام ہیں اشارہ اس طرف تھا کہ یہ بہت عقلمند ہیں اور معاملات بڑی دانشمندی سے چلاتے ہیں۔ قرآن مجید ان کے ساتھ ان کی اس دانشمندی پر سنجیدہ مزاح کرتا ہے کہ ان کا طرز عمل تو عقل و دانش کے سراسر منافی ہے۔ پوچھا جاتا ہے کہ حضرت محمد کے بارے میں ان کی رائے اور وحی و رسالت کا انکار کیا ان کی وہ دانشمندی ہے بلکہ یہ سرکش ہیں اور ان کی عقل جس بات کو تسلیم کرتی ہے یہ لوگ اس سے سرتابی کرتے ہیں۔

اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (۵۲ : ۳۲) "کیا ان کی عقلیں انہیں ایسی ہی باتیں کرنے کے لئے کہتی ہیں؟ یا دراصل یہ عناد میں حد سے گزرے ہوئے لوگ ہیں" پہلے سوال میں مزاح ہے اور دوسرے سوال میں ایک ذلیل حرکت کا الزام ہے اور ان لوگوں کا جو موقف ہے اس پر ان میں سے کوئی ایک بات چسپاں ہے۔

رسول اللہ کے بارے میں ان کی زبانیں اس قدر دراز تھیں کہ انہوں نے یہ الزام لگایا کہ آپ یہ کلام اپنی جانب سے بناتے ہیں۔ اس پر بھی ایک سوال کیا جاتا ہے جو ناپسندیدگی کا اظہار ہے۔ اگر وہ ایسا کہتے ہیں تو یہ ان کو نہیں کہنا چاہئے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ (۵۲ : ۳۳) "کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ خود گھڑ لیا ہے" اور اس کے بعد جلد ہی اصل حقیقت بتا دی جاتی ہے۔

بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (۵۲ : ۳۳) "اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے" ان کے دلوں کو شعور ایمان حاصل نہیں ہے۔ یہی بے شعوری ہے جو ان کے منہ سے یہ بات کہلواتی ہے اور یہ قول یہ لوگ تب ہی کہتے ہیں کہ ایمان کی نعمت سے یہ لوگ محروم ہیں۔ اگر یہ قرآن کی حقیقت کا ادراک کر لیتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ یہ انسان کا بنایا ہوا کلام نہیں ہے اور اس کے حامل صادق و امین ہیں۔

چونکہ اس کلام کی حقیقت ان کی عقل کے ادراک سے باہر ہے اور وہ اسے پا نہیں سکتے تو ان کو یہ چیلنج دیا جاتا ہے کہ اگر ایسا کلام اپنی جانب سے گھڑا جا سکتا ہے تو ذرا گھڑ لائیں۔

فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ (۵۲ : ۳۴) "اگر یہ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو اسی شان کا کلام بنا لائیں" قرآن کریم میں اس چیلنج کو بار بار دہرایا گیا ہے اور منکر اس کو قبول کرنے سے عاجز رہے ہیں بلکہ نہایت بے بس رہے ہیں اور اسی طرح قیامت تک لوگ اس سے عاجز رہیں گے۔ قرآن کریم میں ایک راز ہے جو شخص بھی اس کی آیات کو پہلی بار پڑھتا ہے وہ ان کے اندر یہ خصوصیت پاتا ہے۔ چاہے اس کو اس کے اعجاز کی وجوہات معلوم ہوں یا نہ ہوں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ قرآن کی عبارت میں ایک خاص قوت ہے۔ صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معانی اور تعبیرات کے علاوہ بھی قرآن کریم میں ایک خاص چیز ہے۔ قرآن مجید کو سنتے ہی اس کی یہ خصوصیت ذہن پر اثر کرتی ہے۔ بعض لوگ اسے واضح طور پر پاتے ہیں اور بعض اسے ذرا اجمال اور غموض کے ساتھ لیکن ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ قرآن کی یہ خصوصیت کیا ہے اور اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ اس کا تعین کرنا مشکل ہے۔ یا یہ اثر قرآن کے معانی کا ہے یا قرآن مجید کی صورتوں و مناظر کا ہے یا یہ اثر کلامی ہے کہ انہی لغات سے بنائے ہوئے دوسرے کلاموں اور قرآن میں یہ فرق ہے یا یہ سب امور مجتمع طور پر اعجاز فراہم کرتے ہیں یا یہ کوئی ایسی چیز ہے جو ان سے بھی ماوراء ہے۔

یہ ایک راز ہے جو ہر قرآنی آیت میں پوشیدہ ہے جو بھی قرآنی آیات کو پڑھتا ہے وہ یہ راز محسوس کرتا ہے۔ اس کے بعد ہر کوئی اپنے ظرف کے مطابق اس کے اسرار و رموز تلاش کرتا ہے اور یہ تدبر اور غور و فکر سے معلوم ہوتے ہیں اور پورے قرآن میں موجود ہیں۔

مثلاً یہ اعجاز اس کامل اور صحیح تصور کے اعتبار سے بھی ہے جو قرآن عقل و خرد کو دیتا ہے۔ وجود انسانی کی حقیقت کا تصور اس کائنات میں وجود کا تصور اور اس حقیقت "اولی" کا تصور جس سے تمام حقائق پھوٹتے ہیں یعنی اللہ کا تصور۔

پھر اس کے طریقے اور اسلوب میں بھی اعجاز ہے جس کے مطابق قرآن مجید انسان کے تصورات کی تعمیر کرتا ہے۔ قرآن کریم انسان کو فطری انداز سے خطاب کرتا ہے اور اسکا انداز تخاطب بھی مخصوص ہے۔ تمام زبانوں کے انسانی اسالیب کلام میں یہ انداز نہیں ہے۔ قرآن کریم انسانی دل اور عقل و خرد کو ہر پہلو سے پھیرتا ہے۔ اس کے اندر صالح افکار ہر جانب سے داخل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ انسان کے ساتھ اس طرح معاملہ کرتا ہے جس طرح ایک پوری طرح خبردار ذات کسی کے ساتھ کرتی ہے۔

قرآن کریم جو ہدایات دیتا ہے ان ہدایات کے اندر ایک زبردست جامعیت ہے۔ توازن ہے اور مکمل ہم آہنگی ہے اور یہ پورا کلام ایک ہی سطح اور ایک ہی معیار کا ہے۔ انسانی کلاموں میں یہ بات ہرگز نہیں پائی جاتی۔ انسانی کلام ایک حال پر نہیں ہوتے ایک سطح پر نہیں ٹھہرتے اور ہر پہلو سے معیار کو قائم نہیں رکھ سکتے اور توازن قائم کرنا تو ان کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی معاملے میں کوئی زیادتی نہ ہو کوئی نقص نہ ہو۔ کوئی افراط و تفریط نہ ہو اور مکمل ہم آہنگی ہو اور کلام میں کسی جگہ تعارض یا تضاد نہ ہو نہ اصول میں نہ فروع میں۔

یہ ظاہری امور جن کا ادراک کیا جاسکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ خفیہ معجزانہ اثر جس کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا اس بات کے دلائل ہیں کہ یہ معجزانہ کلام ہے اور یہ چیزیں مل کر قرآن کو صفت اعجاز دیتی ہیں۔ قرآن کی صفت اعجاز وہ چیز ہے جس میں کوئی شخص اب کلام نہیں کر سکتا جس کے حواس بحال ہوں جو محترم ہو جو حقیقت پسند ہو اور جو قرآن کا مطالعہ قوت گہرائی اور وضاحت سے کرتا ہو اور قرآن مجید کا مطالعہ قلب سلیم کے ساتھ کرتا ہو۔

فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ (۵۲ : ۳۴) "اگر یہ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو اس شان کا ایک کلام بنا لائیں۔" دوسرا سوال خود ان کے وجود کی حقیقت کے بارے میں ہے۔ خود ان کے اپنے وجود کی حقیقت یہ تو ایک حقیقت ہے جس سے وہ انکار نہیں کر سکتے کہ وہ ہیں اور قرآن کے بغیر بھی اگر وہ عقلمند ہیں تو وہ اس کی کوئی تفسیر کریں گے۔ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ ایک خالق ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے اس کی تعبیر ہم اللہ سے کرتے ہیں۔ وہ بذاتہ موجود ہے اور یہ انسان مخلوق ہیں۔

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ (۵۲ : ۳۵) "کیا یہ کسی خالق کے بغیر پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود اپنے خالق ہیں" ان کا وجود کسی چیز کے بغیر اسی طرح ہونا فطرت کی منطق کے خلاف ہے اور اس نکتے پر کسی قلیل یا کثیر جدل و جدال کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات کہ یہ خود اپنے آپ کے خالق ہیں تو اس کا کوئی قائل نہ تھا نہ وہ لوگ اس کے قائل تھے اگر یہ دونوں باتیں فطری استدلال کے خلاف ہیں تو پھر تیسری صورت وہی رہ جاتی ہے جس کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے کہ یہ سب اللہ کی مخلوق ہیں اور اس تخلیق میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ لہذا ربوبیت' عبادت اور اطاعت میں بھی اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ نہایت سادہ اور فطری حقیقت ہے۔

ان کے تصور کو ذرا آسمانوں کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے کیا اس وسیع کائنات کی انہوں نے تخلیق کی ہے۔ یہ کائنات خود بھی اپنی خالق نہیں ہے جس طرح یہ اپنے نفوس کے خود خالق نہیں۔

أَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بَل لَّا يُوقِنُونَ (۵۲ : ۳۶) "یا زمین و آسمانوں کو انہوں نے پیدا کیا ہے ـ اصل بات یہ ہے کہ یہ یقین نہیں رکھتے" یہ لوگ بھی اور ہر عقلمند شخص جو فطری انداز میں سوچتا ہو اس بات کا قائل نہیں ہو سکتا کہ زمین اور آسمانوں نے خود اپنے آپ کو پیدا کیا یا بغیر خالق کے پیدا ہوئے یا خود انہوں نے یعنی کسی انسان نے ان کو پیدا کیا ہے ـ یہ سوالات ہیں جن کا جواب ہر کسی کو دینا ہے اور ان کا حال تو یہ تھا کہ جب ان سے یہ سوال کیا جاتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ اللہ نے پیدا کیا ہے لیکن یہ حقیقت ان کے ادراک میں اس قدر واضح نہ تھی کہ وہ ان کے دلوں اور ان کی سوچ اور ان کے طرز عمل میں کوئی تغیر پیدا کرے اور وہ کوئی واضح عقیدہ اپنائیں ـ

بَل لَّا يُوقِنُونَ (۵۲ : ۳۶) "اصل بات یہ ہے کہ یہ یقین نہیں رکھتے" اب تخلیق سے ذرا نیچے آکر ذرا کم درجے کا سوال کیا جاتا ہے چلو تم اپنے آپ کے اس کائنات کے خالق تو نہیں ہو تو کیا تم زمین کے خزانوں کے حوالدار ہو ـ کیا تم لوگوں کے معاملات کے اختیاری ہو ـ اللہ ہی ہے جو کسی کو تھوڑا کسی کو زیادہ دیتا ہے ـ وہی مدبر اور متصرف ہے اور یہی تفسیر قابل عمل ہے اور دل لگتی ہے ـ اسی صورت حالات کی جو اس جہان میں چلتی ہے جب اللہ کے خزانوں کے مالک یہ نہیں اور زمین کے معاملات ان کے اختیار میں نہیں تو پھر اللہ کے سوا اور کون ہے؟

اب ایک درجہ اور نیچے آکر ان سے بات کی جاتی ہے ـ کیا تم قرآن کو منجانب اللہ نہیں سمجھتے تو اللہ کے ہاں تمہاری رسائی کا کوئی ذریعہ ہے جس سے تمہیں معلوم ہو گیا کہ قرآن وہاں سے نہیں ہے ـ

أَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَسْتَمِعُونَ فِيهِ فَلْيَأْتِ مُسْتَمِعُهُم بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ (۵۲ : ۳۸) "کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر یہ عالم بالا کی سن گن لیتے ہیں؟ ان میں سے جس نے سن گن لی ہو وہ لائے کوئی کھلی دلیل ـ" حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور ان کی طرف وحی آتی ہے اور یہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور یہ لوگ تکذیب کرتے ہیں ـ کیا ان کے پاس عالم بالا کے معلومات کا کوئی ذریعہ ہے؟ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی نہیں کی جاتی اور سچائی اور ہے لہذا اس قسم کی سن گن رکھنے والا کوئی دلیل لے آئے ـ ایسی دلیل کہ وہ بذات خود اپنی قوت اپنے اندر رکھتی ہو جس کے نتیجے میں انسان تصدیق کرنے پر مجبور ہو جائے ـ اس میں اشارہ ہے ان دلائل کی طرف جو قرآن دیتا ہے کہ یہ دلائل دراصل سلطان مبین ہیں اور دل و دماغ کو فوراً قبضے میں لیتے ہیں ـ اور ان کے مقابلے میں یہ لوگ عناد اور ہٹ دھرمی کرتے ہیں ـ

اب اللہ کے بارے میں ان کے اس قول کو لیا جاتا ہے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور یہ خطاب براہ راست مشرکین مکہ سے کیا جاتا ہے اور یہ ان کو زیادہ شرمندہ اور ذلیل کرنے کے لئے ہے ـ

أَمْ لَهُ الْبَنَاتُ وَلَكُمُ الْبَنُونَ (۵۲ : ۳۹) "کیا اللہ کے لئے تو بیٹیاں ہیں اور تم لوگوں کے لئے ہیں بیٹے" ان کے خیال میں بیٹیاں بیٹوں سے کم درجے کی مخلوق تھیں ـ یہاں تک کہ جب کسی کو بتایا جاتا کہ اس کے ہاں بچی پیدا ہوئی ہے تو وہ غم پریشانی اور ناپسندیدگی کی وجہ سے سیاہ رو ہو جاتا تھا لیکن اپنے ان خیالات کے باوجود وہ اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت میں شرم محسوس نہ کرتے تھے ـ یہاں اللہ خود ان کے رواج اور رسم کے مطابق ان پر اعتراض کرتا ہے

تاکہ وہ ذرا اپنے اس دعویٰ پر شرم محسوس کریں حالانکہ ان کا یہ خیال بھی غلط اور قابل اصلاح تھا۔

نبی ﷺ ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے ۔ اسے وہ ایک بڑا بوجھ محسوس کرتے تھے حالانکہ آپ دعوت خالص فی سبیل اللہ دیتے تھے ۔ کوئی اجر طلب نہ فرماتے تھے نہ ان پر کوئی ٹیکس لگانا چاہتے تھے ۔ ان کو چاہئے تو یہ تھا کہ اس مفت تعلیم کی وجہ سے حضور کے ساتھ احسان کرتے اور اگر قبول نہ کرتے تھے تو بھی شریفانہ انداز میں اسے قبول نہ کرتے ۔ لہذا ان کا رویہ بالکل بے جواز ہے ۔

اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ (۵۲ : ۴۰) "کیا تم ان سے کوئی اجر مانگتے ہو کہ یہ زبردستی پڑی ہوئی چٹی کے بوجھ تلے دبے جاتے ہیں" یعنی یہ اس مالی بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتے جو تم ان پر ڈال رہے ہو ۔ تو اگر واقعہ یہ ہے کہ نہ تو اجرت طلب ہو رہی ہے اور نہ تم پر کوئی بوجھ ڈالا جا رہا ہے تو پھر تمہارا رویہ کس قدر قبیح اور ذلیلانہ ہے ۔ تمہیں اپنے رویہ پر سوچ کر شرمندہ ہونا چاہئے ؟

اس کے بعد دوبارہ ان کے سامنے ان کے وجود اور اس کائنات میں ان کے حالات کو پیش کیا جاتا ہے کہ یہ بندے ہیں اور ان کے کچھ حدود ہیں ۔ اس کائنات میں ان پر بہت ہی امور مخفی ہیں اور کچھ تھوڑے ہی امور ایسے ہیں جن کے بارے میں وہ جانتے ہیں باقی امور سب راز ہیں اور ان کو اس کائنات کا مالک ہی جانتا ہے ۔ عالم غیب کا دائرہ بہت وسیع ہے ۔ یہ اس کے اندر نہیں جا سکتے کیونکہ یہ بندے ہیں ۔

اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ (۵۲ : ۴۱) "کیا ان کے پاس غیب کے حقائق ہیں کہ اسکی بنا پر یہ لکھ رہے ہیں" ان کو معلوم ہے کہ ان کے پاس غیب کا علم نہیں ہے اور نہ وہ غیب کے علم سے لکھ رہے ہیں نہ ان کو اس پر قدرت ہے کہ غیب میں وہ کوئی فیصلے لکھیں ۔ یہ اللہ ہی ہے جو غیب کی کتابوں میں بندوں کی تقدیر لکھتا ہے ۔

جو ذات غیب جانتی ہے وہی تدبیر امور کر سکتی ہے ۔ تقدیروں کے فیصلے کر سکتی ہے ۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ وہ غیب نہیں جانتے اور غیب کے ذخائر میں وہ کچھ بھی ثبت نہیں کر سکتے ۔ اس لئے وہ آپ کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے ۔ نہ یہ لوگ آپ کے مستقبل میں تصرف کر سکتے ہیں نہ کوئی سازش کر سکتے ہیں ۔

اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ (۵۲ : ۴۲) "کیا یہ کوئی چال چلنا چاہتے ہیں اگر یہ بات ہے تو کفر والوں پر ان کی چال الٹی پڑے گی ) یعنی اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب ہے اس کی تدبیر ان کو گھیر لے گی اور اللہ کی تدبیریں ان پر پڑیں گی کیونکہ اللہ بہت ہی بہترین تدبیریں کرنے والا ہے ۔

اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ (۵۲ : ۴۳) "کیا اللہ کے سوا یہ کوئی اور معبود رکھتے ہیں" جو ان کو بچانے والا ہے اور اللہ کے عذاب سے وہ ان کو بچا لے گا ۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۵۲ : ۴۳) "اللہ پاک ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں" اللہ کے بارے میں وہ جو تصورات رکھتے ہیں وہ باطل ہیں ۔

رد شرک پر اب یہ حملہ اختتام پذیر ہوتا ہے جو ایک منظم حملہ تھا اور جس کا ہر قدم دوسرے قدم پر منظم تھا جس کے ہر فقرے کا بہت بڑا اثر ہوا۔ اس حملے میں ان تمام شبہات تمام دلائل اور تمام خیالات کو رد کر دیا گیا اور وہ بے بس کر کے رکھ دیئے گئے اور یہ بات ثابت کر دی گئی کہ یہ لوگ حقیقت کا انکار کرنے والے ہیں۔ عناد کرنے والے ہیں۔ واضح حق میں شک کرنے والے ہیں اور دور دراز کے شبہات کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں بلکہ یہ لوگ ہٹ دھرمی کر رہے ہیں۔

وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ (۵۲:۴۴) "یہ لوگ آسمان کے ٹکڑے بھی گرتے دیکھ لیں تو کہیں گے کہ یہ بادل ہیں جو امنڈے چلے آرہے ہیں" مطلب یہ ہے کہ اگر ان پر عذاب بھیجا جائے اور یہ اسے دیکھ لیں کہ وہ ایک آسمان کے ٹکڑے کی شکل میں آرہا ہے اور ان پر گرنے ہی والا ہے اور اس سے وہ ہلاک ہونے والے ہیں تو پھر بھی یہ کہیں گے کہ سحاب مرکوم (کہ یہ بادل ہے جو امنڈتا چلا آرہا ہے) اور اس میں پانی ہے جو ان کے لئے سبب حیات ہوگا۔ یہ بطور ہٹ دھرمی ایسا کہیں گے۔ یہ کسی صورت میں بھی حق کو تسلیم کرنے والے نہیں ہیں۔ اگر چہ ان کے سروں پر تلوار لٹک رہی ہو۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں اس میں اشارہ قوم عاد کے واقعہ کی طرف ہے کہ جب انہوں نے دیکھا کہ طوفان باد و باراں آرہا ہے تو کہا۔

عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (یہ بادل ہے جو بارش برسائے گا) اور وہاں ان کو یہ جواب دیا گیا تھا۔

بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا "بلکہ یہ تو وہ چیز ہے جس کی تم جلدی مچا رہے تھے ایک ہوا جس کے اندر دردناک عذاب ہے یہ اللہ کے حکم سے ہر چیز کو نیست و نابود کرنے والی ہے"۔

ان کے عناد اور ہٹ دھرمی کی اس تصویر کشی کے بعد اگرچہ ان کے سروں پر لٹکتی ہوئی تلوار کی طرح عذاب بھی آجائے' روئے سخن اب نبی ﷺ کی طرف پھر جاتا ہے تاکہ ان کے معاملے سے ہاتھ جھاڑ کر ان کو اس انجام سے دوچار ہونے کے لئے چھوڑ دیں جس کا ذکر اس سورۃ کے آغاز میں آیا ہے۔ اور اللہ کی طرف سے ایک سے ایک سخت عذاب ان کے انتظار میں ہے اور اللہ کے احکام کا انتظار کریں جو زبردست ہے اور جو آپ کا نگہبان ہے اور ہر وقت آپ پر نظر رکھتا ہے اور اللہ کی تعریف کے ساتھ اس کی حمد کرو۔ صبح کے وقت جب اٹھو اور رات کے وقت جب اٹھو اور اس وقت جب ستارے غائب ہو جائیں۔

فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ۝ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ

۲

۲۱ع وَاِدۡبَارَ النُّجُوۡمِ ﴿۴۹﴾

۴

"پس اے نبی ؐ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو یہاں تک کہ یہ اپنے اس دن کو پہنچ جائیں جس میں یہ مار گرائے جائیں گے جس دن نہ ان کی اپنی کوئی چال ان کے کسی کام آئے گی نہ کوئی ان کی مدد کو آئے گا اور اس وقت کے آنے سے پہلے بھی ظالموں کے لئے ایک عذاب ہے مگر ان میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں"۔

اے نبی ؐ اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو' تم ہماری نگاہ میں ہو تم جب اٹھو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو' رات کو بھی اس کی تسبیح کیا کرو اور ستارے جب پلٹتے ہیں اس وقت بھی۔

یہ مخالفین پر ایک نیا تنقیدی حملہ ہے۔ اس کا آغاز ایک شدید دھمکی اور تہدید سے ہوتا ہے کہ جب صور پھونکا جائے گا تو یہ سب لوگ مار گرائے جائیں گے اور یہ واقعہ حشر و نشر اور قیامت میں اٹھانے سے قدرے پہلے ہوگا۔ اس دن ان کی کوئی تدبیر ان کے کام نہ آئے گی۔ آج تو یہ لوگ تحریک اسلامی کے خلاف کچھ نہ کچھ تدابیر کرتے ہیں لیکن اس دن کوئی تدبیر ان کے کام نہ آئے گی۔ قیامت سے پہلے بھی ان پر عذاب آنے والا ہے لیکن ان کو پتہ نہیں ہے۔

اس آخری دھمکی کے بعد مکذبین کے معاملے سے یہ حملہ فارغ ہو جاتا ہے۔ اس سے قبل اس سورت نے ان کا خوب تعاقب کیا اور سخت حملے ان پر کئے اور آخر میں کہہ دیا کہ قریبی عذاب بھی ان کے انتظار میں ہے اور دور کا عذاب بھی ان کے انتظار میں ہے۔ اب روئے سخن نبی کریم ﷺ کی طرف ہے جن پر زیادتیاں کرنے والے زیادتی کرکے طرح طرح کی باتیں آپ کے خلاف بناتے تھے۔ آپ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ صبر کریں۔ یہ مشکلات دور ہونے والی ہیں۔ یہ مکذبین خود عذاب سے دوچار ہونے والے ہیں دعوت کا راستہ دشوار گزار ہے اور طویل ہے اور اس پر صبر ہی کرنا طریقہ دعوت ہے۔ انجام اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔ فیصلہ اسی نے کرنا ہوتا ہے۔

وَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ ( ۵۲ : ۴۸ ) "آپ اپنے رب کے فیصلے تک صبر کریں" لیکن صبر کے حکم کے ساتھ ساتھ آپ کو ایک زبانی اعزاز بھی دیا جاتا ہے۔ اللہ کی عنایت کے لئے آپ مستحق قرار پاتے ہیں۔ آپ کو ایسی محبت دی جاتی ہے کہ اس دست محبت سے آپ کے تمام الم اور تھکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں اور یہ فرمایا جاتا ہے کہ مشکلات پر صبر اللہ کے نزدیک بہت ہی محبوب اور پسندیدہ امر ہے اور یہی اس اعزاز کا ذریعہ اور نسبت ہے۔

• صۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعۡيُنِنَا ( ۵۲ : ۴۸ ) "اے نبی اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو' تم ہماری نگاہ میں ہو" کیا ہی خوبصورت تعبیر ہے اور کیا ہی بہترین تصویر ہے اور کس قدر بڑا اعزاز ہے۔

یہ وہ مقام اعزاز ہے جس تک کوئی انسان نہیں پہنچ سکا۔ پورے قرآن میں اس مقام کو اس قدر خوبصورت انداز میں نہیں دکھایا گیا یہاں تک کہ دوسرے نبیوں کے لئے ایسی ہی ہدایات کے موقع پر بھی کوئی ایسی خوبصورت تعبیر نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا گیا۔

• اَنَا اخۡتَرۡتُكَ فَاسۡتَمِعۡ لِمَا يُوۡحٰى "اور میں نے آپ کو چن لیا ہے لہٰذا جو آپ کی طرف وحی کی جاتی

ہے اے سفو" اور یہ بھی کہا گیا تھا۔

وَ اَلْقَیْتُ عَلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ "اور میں نے اپنی طرف سے تم پر ایک محبت ڈال دی تاکہ تمہاری پرورش میری آنکھوں کے سامنے ہو۔" اور دوسری جگہ کہا گیا۔

وَ اصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِیْ "میں نے تجھے اپنے لئے بنایا ہے" یہ سب تعبیرات بتاتی ہیں کہ حضرت موسیٰ ؑ کا مرتبہ نہایت ہی بلند تھا لیکن اس کے مقابلے میں حضور اکرم کے لئے جو الفاظ استعمال ہوئے وہ یہ ہیں۔

فَاِنَّكَ بِاَعْیُنِنَا ( ۵۲ : ۴۸ ) "تم ہماری نگاہ میں ہو" یہ ایک ایسا انداز ہے جس میں خصوصی اعزاز نظر آتا ہے۔ خصوصی محبت نظر آتی ہے۔ اس میں ایسے رنگ ہیں جو نہایت ہی لطیف اور حسین ہیں۔ انسانی تعبیرات پیش کرنے سے عاجز ہے۔ ہمارے لئے یہ کافی ہے کہ ہم ان رنگوں میں زندگی بسر کریں اور صرف اس طرف اشارہ کر دیں۔

اس محبت کے ساتھ دائمی ربط کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِیْنَ تَقُوْمُ (۵۲ : ۴۸) وَ مِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ( ۵۲ : ۴۹ ) "تم جب اٹھو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو، رات کو بھی اس کی تسبیح کیا کرو اور ستارے جب پلٹتے ہیں اس وقت بھی۔" رات دن سونے سے اٹھتے وقت، رات کے وقت اور صبح کو جب ستارے ڈوب جاتے ہیں۔ یہ وہ اوقات ہیں جن میں اس محبت کے تعلق سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اللہ کی تسبیح ایک زاد راہ ہے۔ محبت الٰہی ہے اور دلوں کی مناجات ہے پھر محبت کرنے والے دل سے ہو تو اس کے کیا کہنے؟

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ـــ ۲۷

## سورۃ النجم ـ ۵۳

## ۱ ـــ تا ـــ ۶۲

# سورۃ النجم ایک نظر میں

یہ سورت اپنی عبارت کے لحاظ سے اپنے اندر نظم اور موسیقی رکھتی ہے اور نغمہ پرور ہے ۔اس کی لفظی ساخت میں نغمہ سرایت کئے ہوئے ہے اور اسکی آیات کے آخر میں جو سجع اور قافیہ ہے وہ بہت ہی موزوں اور نغمہ بار ہے ۔اس سورۃ کی موسیقی اور اس کا ترنم اس کے آغاز سے انتہا تک نظر آتا ہے ۔بعض مقامات تو ایسے ہیں جن میں صاف نظر آتا ہے کہ قافیہ کی خاطر ایک لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے یا قافیہ والے لفظ کو ترجیح دی گئی ہے تاکہ ترنم اور اس کا اثر جاری رہے لیکن معانی اور مفہوم اپنی جگہ ٹھیک ٹھیک ادا کئے گئے ہیں مثلاً ۔

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى (۱۹) وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى (۵۳ : ۲۰) "اب ذرا بتاؤ ' تم نے کبھی اس لات اور عزیٰ اور تیسری ایک دیوی منات کی حقیقت پر غور کیا ہے ۔" اگر یہاں صرف یہ کہا جاتا ۔

وَمَنٰوةَ الْاُخْرٰى (۵۳ : ۲۰) تو آیات کا وزن ٹوٹ جاتا اور اگر یہ کہا جاتا ۔

وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ (۵۳ : ۲۰) تو قافیہ اور آیت کے آخری سجع کا اثر ختم ہو جاتا اور معنوی اعتبار سے بھی ہر لفظ کی ایک معنوی اہمیت ہے لہذا وزن اور قافیہ کی رعایت بھی یہاں ملحوظ نظر آتی ہے ۔اسی طرح اس کے بعد کی آیت میں لفظ اِذًا کو کس خوبصورتی کے ساتھ بڑھایا گیا ہے ۔

تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى (۵۳ : ۲۲) "یہ تو پھر بڑی دھاندلی کی تقسیم ہے" یہاں اذن کا لفظ وزن کے لئے ضروری تھا ۔اگرچہ عبارت میں فنی ادائیگی مطلب کے لئے ضروری نہ تھا ۔

سروں کی یہ موزونیت اپنے اندر ایک خاص موسیقی کا رنگ لئے ہوئے ہے ۔ آواز اس طرح رواں ہے جس طرح لہریں اٹھ رہی ہیں یا ندی کا بہاؤ ہے ۔ خصوصاً سورۃ کے پہلے پیراگراف اور آخری پیراگراف میں ۔ پہلے پیراگراف میں جن تصاویر اور جن سایوں کا ذکر ہے وہ عالم بالا کی پھڑ پھڑاتی تصاویر ہیں جبکہ آخری پیراگراف میں بھی عالم بالا کی فضا اور حساسیت ہے اور درمیانی پیراگرافوں میں بھی یہ موزونیت حسب ضرورت ہے اور ان دونوں پیراگرافوں کے قریب قریب ہے ۔

پہلے پیراگراف کی تصاویر اور رنگ ڈھنگ کا تعلق عالم بالا کے نورانی واقعات کے ساتھ ہے کیونکہ اس پیراگراف میں عالم بالا کے مناظر بیان ہوتے ہیں ۔ روح الامین کی حرکات و تصرفات جبکہ وہ رسول اللہ کے سامنے آتے ہیں چنانچہ تصاویر ' حرکات ' مشاہد اور ان کی روحانی فضا موزوں سروں میں دیر تک چلتی ہے اور اس پیراگراف میں الفاظ کی موزونیت اور ترنم اور ہم آہنگی بہت ہی عجیب ہے ۔

یہ رنگ و بو پوری سورۃ کی فضا پر چھائی ہوئی ہے اور دوسرے پیروں میں بھی اس کے آثار موجود ہیں اور سب سے آخر میں نہایت ہی موثر اشارات ہیں جن کے سامنے انسان وجود کا ذرہ ذرہ کانپ اٹھتا ہے اور لبیک کہنے کے لئے تیار ہوتا ہے ۔ اس سورت کا موضوع وہی ہے جو بالعموم مکی سورتوں کا ہوتا ہے ۔ اسلامی عقیدہ اور نظریہ اور اس کے اساسی عناصر ۔ یعنی وحی ' رسالت ' وحدانیت اور آخرت ۔ یہ سورت ایک متعین زاویہ سے ان موضوعات کو لیتی ہے مثلاً وحی کی صداقت اور اس کی پختگی ' عقیدہ شرک اور اس کی کمزوری اور اس کے اساس کی کمزوری اور افسانوی حیثیت ۔

پہلے حصے میں حقیقت وحی ' وحی کا مزاج ' وحی کی نوعیت اور وحی سے متعلق دو مناظر اور ان مناظر کی شکل میں وحی کا ثبوت اور اس کی صحت اور وقعیت اور یہ تاکید کہ حضور ﷺ نے یہ وحی جبرائیل سے حاصل کی ۔ آپ نے ان کو دیکھا اور اللہ کی آیات کبریٰ کو دیکھا ۔

دوسرے پیراگراف میں مشرکین کے خود ساختہ الہوں کا ذکر ہے ۔ لات ' منات اور عزیٰ کا ۔ پھر فرشتوں کے بارے میں ان کے جو واہی خیالات تھے اور جو افسانے انہوں نے تصنیف کر رکھے تھے ان کی طرف اشارات ہیں کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور اس قسم کے عقائد کا ماخذ ان کے ہاں محض ظن و گمان تھا جو حق کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا جبکہ رسول اللہ ﷺ ان کو جس بات کی دعوت دے رہے تھے وہ یقینی ' ثابت اور آپ کی دیکھی ہوئی تھی ۔

تیسرے پیراگراف میں حضور کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ آپ ان لوگوں سے منہ موڑ لیں جو لوگ ہر حال میں سرکشی پر تلے ہوئے ہیں اور جن کی ترجیحات میں بھی دنیا اور اسکی زندگی ہے جو بس اس دنیا کے کنارے تک سوچتے ہیں اور اس سے آگے کچھ نہیں جانتے ۔ یہاں آخرت کا نقشہ بیان کیا جاتا ہے جو کہ اعمال پر مبنی ہے ۔ اللہ کے پورے علم پر ہے اور اللہ ان کے تمام اعمال کو اس وقت سے جانتا ہے جب یہ ماؤں کے پیٹ میں جنین تھے ۔ وہ خود ان کے اپنے اپنے بارے میں علم سے بھی ان کے بارے میں زیادہ جانتا ہے ۔ لہٰذا ان کا حساب و کتاب علم و یقین پر ہو گا ' ظن و تخمین سے نہ ہو گا اور اس طرح ان کا تصفیہ ہو گا ۔

آخری پیراگراف میں اسلامی نظریہ حیات کے اصول لئے گئے ہیں اور کہا گیا ہے کہ تمام رسولوں کے ہاں یہی اصول دعوت رہے ہیں ۔ یہ کہ ہر شخص اپنے اعمال کا حقدار و ذمہ دار ہے ۔ حساب و کتاب صحیح ہو گا ۔ منصفانہ ہو گا اور تمام لوگ آخر کار رب تعالیٰ کے سامنے جائیں گے اور یہ کہ اس دنیا میں اللہ ہی اپنی مخلوق میں تصرفات کرتا ہے ۔ یہاں امم سابقہ کی طرف بھی اشارات ہیں اور آخری نغمہ ہے ۔

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْأُوْلٰى (٥٦) أَزِفَتِ الْآزِفَةُ (٥٧) لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ (٥٨) أَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ (٥٩) وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ (٦٠) وَأَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ (٦١) فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (٥٣ : ٦٢) ع (السجدة) (٥٣ : ٥٥ تا ٦٢) " یہ ایک تنبیہ ہے پہلے آئی ہوئی تنبیہات میں سے ۔ آنے والی گھڑی قریب آ لگی ہے ۔ اللہ کے سوا کوئی اس کو ہٹانے والا نہیں ۔ اب کیا یہی وہ باتیں ہیں جن پر تم اظہار تعجب کرتے ہو ؟ ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو اور گا بجا کر انہیں ٹالتے ہو ۔ جھک جاؤ اللہ کے آگے اور بندگی کرو "

# درس نمبر ۲۵۲ تشریح آیات

## ۱ ــ تا ــ ۶۲

سُورَةُ النَّجْمِ (۵۳) مَكِّيَّةٌ (۲۳) آیاتها ۶۲ رکوعاتها ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ﴿١﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ﴿٢﴾ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ﴿٣﴾
إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ﴿٤﴾ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ﴿٥﴾ ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ ﴿٦﴾ وَهُوَ
بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ﴿٧﴾ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ ﴿٨﴾ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ ﴿٩﴾ فَأَوْحَىٰ
إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ﴿١٠﴾ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ﴿١١﴾ أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ﴿١٢﴾
وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ ﴿١٣﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ ﴿١٤﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَىٰ ﴿١٥﴾
إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَىٰ ﴿١٦﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ﴿١٧﴾ لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ
رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ ﴿١٨﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"قسم ہے تارے کی جب کہ وہ غروب ہوا۔ تمہارا رفیق نہ بھٹکا ہے نہ بہکا ہے۔ وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا۔ یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔ اسے زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے۔ جو بڑا صاحب حکمت ہے۔ وہ سامنے آکھڑا ہوا جبکہ وہ بالائی افق پر تھا۔ پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہوگیا۔ یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔ تب اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو وحی بھی اسے پہنچانی تھی۔ نظر نے جو کچھ دیکھا' دل نے اس میں جھوٹ نہ ملایا۔ اب کیا تم اس چیز پر اس سے جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے؟ اور ایک مرتبہ پھر اس

نے سدرۃ المنتہی کے پاس اس کو اترتے دیکھا جہاں پاس ہی جنت الماوی ہے ۔ اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا نگاہ نہ چندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی اور اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں" ۔

اس پیراگراف میں ہم نہایت ہی بلند روشن اور پھڑپھڑانے والے افق پر ہیں جہاں حضرت محمد ﷺ کے قلب مبارک نے چند خوبصورت اور نورانی لمحات عالم بالا کے ساتھ گزارے ۔ ایک نہایت ہی نرم' دھیمی موجوں پر مشتمل اور ترکیب پانے والے ترنم میں ۔ ہم ان پرکیف لمحات کے رنگ ڈھنگ اور اشارات سنتے ہیں ۔ الفاظ ان کی موسیقیت اور ماحول سب ہی پرکیف ہیں ۔

یہ واردات قلب محمد ﷺ کے وہ لمحات ہیں جن میں آپ کی نظروں کے سامنے سے تمام حجابات ہٹا دیئے گئے ہیں اور آپ عالم بالا سے ہدایات اور وحی لے رہے ہیں' دیکھ رہے ہیں اور سن رہے ہیں ۔ آپ کا قلب حفظ کر رہا ہے ۔ یہ لمحات کیسے تھے اس کا صحیح احساس تو صیقل شدہ قلب محمدؐ ہی کو ہو گا لیکن اللہ کا کرم کہ اس نے ہم بندوں کے لئے اس واردات کو الفاظ میں بیان کر دیا ۔ نہایت ہی موثر انداز میں ایسی موسیقی کے ساتھ جو پانی کی طرح بہتی ہے جس میں تلمیحات کے رنگ ڈھنگ اور ماحول اور اشارات کو ہماری طرف منتقل کیا گیا ہے ۔ یہ اس صیقل شدہ دل کا سفر تھا اور عالم بالا کی وسعتوں میں تھا ۔ ایک ایک قدم کی تصویر ہماری نظروں میں آ رہی ہے ۔ ایک ایک منظر' ایک ایک قدم اور اس انداز میں کہ گویا ہم ابھی دیکھ رہے ہیں ۔

آغاز ایک قسم سے ہوتا ہے ۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى (۵۳ : ۱) "قسم ہے تارے کی جب غروب ہو" ستارہ غروب ہوتا ہے زمین کے قریب ہو کر اس کی قسم ہے اور جس بات پر قسم ہے وہ یہ ہے کہ حضرت جبریل یوں تھے ۔

وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى (۵۳ : ۷) ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى (۵۳ : ۸) فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (۵۳ : ۹) فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (۵۳ : ۱۰) "جبکہ وہ بالائی افق پر تھا پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہو گیا ۔ یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ فاصلے پر رہ گیا ۔ تب اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو وحی بھی اس نے پہنچائی" تو ستارے کی حرکت اور حضرت جبرائیل کی حرکت کے درمیان نہایت ہم آہنگی اور یکرنگی ہے ۔ یوں اس منظر میں ماحول' حرکت اور موزونیت ابتدا ہی سے چلتی ہیں ۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى (۵۳ : ۱) "قسم ہے ستارے کی جب غروب ہو" کی تفسیر میں مختلف تفسیریں نقل کی گئی ہیں ۔ زیادہ قریب الفہم یہ تفسیر ہے کہ اس سے شعریٰ ستارہ مراد ہے کیونکہ بعض عرب اسے پوجتے تھے اور بعد میں اس سورۃ میں اس کا ذکر بھی آیا ہے ۔

وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى (۵۳ : ۴۹) "اور وہی شعریٰ کا رب ہے" پرانے لوگ شعریٰ ستارے کو بہت اہمیت دیتے تھے ۔ یہ مشہور ہے کہ پرانے مصری یہ کہتے تھے کہ جب شعریٰ اعلیٰ افلاک کو عبور کرے تو نیل میں پانی کا

طوفان آجاتا تھا۔اس لئے وہ شعریٰ کو دیکھتے رہتے تھے اور اسکی حرکت کو نوٹ کرتے تھے ۔ ایرانیوں اور عربوں دونوں کی روایات میں اس کے بے شمار افسانے مشہور ہیں۔ لہٰذا یہاں ستارے سے مراد یہی شعریٰ ہے اور یہاں قسم اور مقسم علیہ کے درمیان ہم رنگی بھی مقصود ہے جو اس ستارے کے غروب سے ظاہر ہے۔پھر یہاں یہ اشارہ بھی دینا مقصود ہے کہ ستارہ اگر بہت بڑا ہی کیوں نہ ہو' وہ غروب اور غائب ہونے والا ہے ۔معبود تو وہ ہونا چاہئے جسے زوال و غروب نہ ہو۔یہ تو تھی قسم جس بات پر قسم اٹھائی گئی ہے وہ یہ ہے ۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى (۵۳ : ۲) وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (۵۳ : ۳) اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (۵۳ : ٤) "تمہارا رفیق نہ بھٹکا ہے نہ بہکا ہے۔وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا۔یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل ہوجاتی ہے ۔" تمہارا ساتھی صحیح راہ پر ہے وہ گمراہ نہیں ہوا۔وہ صراط مستقیم پر ہے۔کسی ٹیڑھی راہ پر نہیں چل رہا ہے۔وہ مخلص ہے' مطلب پرست نہیں ہے۔وہ حق کی تبلیغ کر رہا ہے نہ وہم پرست ہے نہ افترا پرداز ہے اور نہ بدعتی ہے اور نہ وہ جسے تمہیں جو تبلیغ کر رہا ہے اس میں اس کے ہوائے نفس کا کوئی دخل ہے۔وہ وہی کچھ کہتا ہے جو وحی ہوتی ہے اور وہ صادق و امین ہے۔اس لئے وہ سچ کی تبلیغ کرتا ہے۔

اس وحی کے حاملین معلوم ہیں اس کا طریقہ کار متعین ہے اور اس کو لانے والوں کو حضور نے خود دیکھا ہے اپنی آنکھوں سے۔یہ محض کوئی موہوم بات نہیں ہے نہ آپ کو کسی غیبی قوت نے دھوکہ دے دیا ہے۔

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى (۵) ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى (٦) وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى (۷) ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى (۸) فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (۹) فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى (۱۰) مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (۱۱) اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى (۱۲) وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى (۱۳) عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (۱٤) عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (۱۵) اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى (۱٦) (۵۳ : ۵ تا ۱٦) "اسے زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے جو بڑا صاحب حکمت ہے۔وہ سامنے آکھڑا ہوا جبکہ وہ بالائی افق پر تھا پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہوگیا یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔تب اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو وحی بھی اسے پہنچانی تھی۔نظر نے جو کچھ دیکھا دل نے اس میں جھوٹ نہ ملایا۔اب کیا تم اس چیز پر اس سے جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے۔"

یہ شدید القویٰ اور ذو مرہ (یعنی قوت والے) کون ہیں؟ یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ وحی سکھائی ہے جسے وہ آپ ؐ کو پہنچا رہے ہیں۔یہی راہ ہے اور یہی سفر ہے اور اس راہ و رسم کے تمام منازل اور مقامات واضح ہیں۔اعلیٰ افق پر وہ سیدھے سیدھے کھڑے تھے۔حضور اکرم ؐ نے انہیں دیکھا۔یہ آغاز وحی

کا منظر ہے۔جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل علیہ السلام کو اس صورت میں دیکھا جس پر اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے۔ یہ بہت ہی عظیم خلقت والے ہیں۔جب حضورؐ کو نظر آئے تو پورے افق پر چھائے ہوئے تھے۔وہ آہستہ آہستہ حضورؐ کے قریب آتے گئے۔وہ بہت قریب آگئے۔دو کمانوں کے فاصلے سے بھی قریب۔تو اس قریب کی حالت میں انہوں نے حضورؐ کی طرف وحی فرمائی جو کچھ انہوں نے وحی کرنا تھا۔کر دیا "جو کچھ وحی کرنا تھا" یہ اجمال دراصل وحی کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔یعنی جبرائیل علیہ السلام کا ظہور تو دور افق اعلیٰ پر ہوا لیکن وحی کی تلقین انہوں نے نہایت ہی قریب آکر کی اس لئے اس کی تلقی اور اخذ میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

حضرت محمد ﷺ نے حضرت جبرائیل کو ایسی حالت میں دیکھا ہے کہ وہ بہت ہی یقینی حالت ہے۔اس دیکھنے میں کوئی اشتباہ نہ تھا نہ غلط فہمی کا کوئی احتمال تھا اور نہ شک اور بحث کی گنجائش ہے۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (۱۱) اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى (۵۳ : ۱۲) "نظر نے جو دیکھا دل نے اس میں جھوٹ نہ ملایا۔اب کیا تم اس چیز پر اس سے جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے" نہ صرف نظر سے دیکھا ہے آپ نے بلکہ دل سے بھی دیکھا ہے اور نظر میں تو فریب نظر ہو سکتا ہے لیکن دل میں فریب ممکن نہیں ہے۔ آپ نے دیکھا اور آپ کے قلب نے یقین کیا کہ یہ فرشتہ ہے۔حامل وحی ہے 'اللہ کا فرستادہ ہے۔آپؐ کی طرف تاکہ آپ کو وحی دے اور آپ تبلیغ کریں اور یہ جھگڑا اب ختم ہے کیونکہ آپ کے قلب نے اس حقیقت پر یقین کر لیا ہے اور آپ صادق و امین ہیں۔

پھر محمد ﷺ نے اس فرشتے کو صرف ایک ہی مرتبہ نہیں دیکھا۔دوسری بار بھی دیکھا ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى (۱۳) عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (۱۴) عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (۱۵) اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى (۱۶) مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (۱۷) لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (۱۸) (۵۳ : ۱۳ تا ۱۸) "اور ایک مرتبہ پھر اس نے سدرۃ المنتہی کے پاس اس کو اترتے دیکھا جہاں پاس ہی جنت الماوی ہے۔اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا نگاہ نہ چندھائی نہ حد سے متجاوز ہوئی اور اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں"

یہ واقعہ واضح روایات کے مطابق شب معراج میں پیش آیا۔حضرت جبرائیل علیہ السلام آپؐ کے قریب آئے اور وہ اس ہیئت اور خلقت میں تھے جس پر اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے۔اس وقت یہ سدرۃ المنتہی کے پاس تھے۔سدرہ ایک درخت ہے۔بیری کا درخت۔المنتہی کے معنی یہ ہیں کہ جہاں کوئی حد آکر ختم ہوتی ہے اور وہیں جنت الماوی ہے۔یہ وہ حد ہے جہاں تک شب معراج کو آپ کی سواری گئی۔جہاں جاکر حضور اکرم اور جبرائیل علیہ السلام کی رفاقت ختم ہوئی۔ جہاں جبرائیل جاکر رک گئے اور حضرت محمد ﷺ اس سے بھی آگے گئے۔اس مقام تک جو عرش ربی کے زیادہ قریب تھا۔ بہرحال یہ سب باتیں وہ ہیں جن کا تعلق عالم بالا اور عالم غیب سے ہے۔اس کی حقیقت اللہ کو معلوم ہے یا اللہ کے بندے

المصطفیٰ کو معلوم ہے ۔ بس اسی قدر ہمیں روایات سے معلوم ہوتا ہے ۔ اگر کوئی روایت نہ ہو تو یہ اس سلسلے میں عقل کے گھوڑے نہیں دوڑا سکتے ۔ اس موضوع پر انسان وہی کچھ معلوم کر سکتا ہے جو اسے اللہ تعالیٰ سے ملے ۔ جو ملائکہ کا بھی خالق ہے جو انسان کا بھی خالق ہے اور دونوں کے خصائص کو وہ خوب جانتا ہے ۔

البتہ یہاں اللہ تعالیٰ سدرۃ المنتہیٰ کے کچھ حالات بتا دیئے ہیں تاکہ بات یقینی ہو جائے ۔ اس سفر کو یقینی اور تاکیدی بنانے کے لئے ۔

اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى (۵۳ : ۱۶) "اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا" اسکی تفصیلات نہیں دی گئیں اور نہ تعین کیا گیا ہے کہ وہ کیا چھا رہا تھا ۔ وہ اس قدر عظیم اور ہولناک چیز تھی کہ اس کا بیان مشکل ہے اور اس کا تعین کرنا مشکل ۔ غرض وہ ایک عظیم حقیقت تھی ۔

اور یہ مشاہدات بھی حق اور یقینی ہے ۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (۵۳ : ۱۷) "نگاہ نہ چندھائی نہ حد سے متجاوز ہوئی" یہ نہ تھا کہ نظر پکا چوند ہو گئی اور وہ اچھی طرح نہ دیکھ سکی ۔ نہ یہ ہوا کہ نظر آگے بڑھ گئی اور ہدف کو دیکھ نہ سکی بلکہ یہ مشاہدات واضح ' صاف اور ایک حقیقت اور ٹھوس شکل میں تھے جن میں کوئی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں تھی اور ان مشاہدات میں صرف یہ باتیں نہ تھیں جو بتائی گئی ہیں بلکہ آپ کو اپنے رب کی بہت عظیم عظیم دوسری نشانیاں بھی بتائی گئیں اور اس کائنات کی حقیقت آپ کو بالکل کھول کر براہ راست دکھائی گئی ۔

لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وحی وصول کرنے کا معاملہ ایک مشاہدہ ہے ۔ حقیقی طور پر آپ نے عالم بالا کو دیکھا ہے ۔ آپ یقین محکم سے یہ بات فرماتے ہیں ۔ براہ راست آپ کا عالم بالا سے رابطہ ہے ۔ یہ علم اور معرفت نہایت ٹھوس اور یقینی ہے ۔ آپ نے حسی طور پر یہ رابطے قائم کئے ہیں ۔ یہ سفر بھی حسی اور حقیقی ہے اور یہ تفصیلات جو دی جا رہی ہیں یہ حقیقی ہیں تمثیلات نہیں ہیں اور تمہارے صاحب کی دعوت ایسے یقینی مشاہدات پر مبنی ہے اور تم جو انکار کر رہے ہو تو ان باتوں کا کر رہے ہو جو آپ کی دیکھی ہوئی ہیں اور نزول وحی میں شک کر رہے ہو اور تمہارے صاحب کے بارے میں تم اچھی طرح جانتے ہو' اسے صادق و امین مانتے ہو وہ تم میں کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں ۔ تمہارا رب قسم اٹھا کر اس کی تصدیق اور توثیق کرتا ہے اور یہ تفصیلات دیتا ہے کہ اس وحی کی کیفیت کیا رہی اور یہ پیغام کس کے ہاتھوں پہنچ رہا ہے اور کہاں جبرائیل اور محمد ﷺ کی ملاقات ہوئی اور سدرہ پر جو کچھ تھا تو وہ تھا ہی ....

غرض یہ تو یقینی امر ہے جس کی طرف محمد ﷺ بلا رہے ہیں ۔ اب ذرا تم غور کرو کہ تمہارے تخیلات اور مفتریات اور الٰہ کیسے لوگ ہیں اور ان کی افسانوی حقیقت کیا ہے تم جو لات ' منات اور عزیٰ کی عبادت کرتے ہو ان کی الوہیت کا ثبوت کیا ہے ۔ تم جو دعویٰ کرتے ہو کہ لات منات اور عزیٰ ملائکہ ہیں تو ان کو کس نے دیکھا ہے ؟ کیا ثبوت ہے کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں ۔ کیا ثبوت ہے کہ اللہ کے ہاں ان کی سفارش چلے گی ؟ دلیل و حجت بھی تو لاؤ ؟ آخر تمہارے ان اوہام و خرافات اور کہانیوں اور افسانوں کی کیا دلیل ہے ۔ کوئی عقلی یا نقلی دلیل ۔

أَفَرَءَيْتُمُ اللَّٰتَ وَالْعُزَّىٰ ﴿١٩﴾ وَمَنَوٰةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ ﴿٢٠﴾ أَلَكُمُ
الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنثَىٰ ﴿٢١﴾ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ ﴿٢٢﴾ إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا
أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا
تَهْوَى الْأَنفُسُ ۖ وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ الْهُدَىٰ ﴿٢٣﴾ أَمْ لِلْإِنسَانِ مَا تَمَنَّىٰ ﴿٢٤﴾ ۱
فَلِلَّهِ الْآخِرَةُ وَالْأُولَىٰ ﴿٢٥﴾ وَكَم مِّن مَّلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا ۲۵ ع
إِلَّا مِن بَعْدِ أَن يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَن يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ ﴿٢٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ۵
بِالْآخِرَةِ لَيُسَمُّونَ الْمَلَائِكَةَ تَسْمِيَةَ الْأُنثَىٰ ﴿٢٧﴾ وَمَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِن
يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۖ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ﴿٢٨﴾ فَأَعْرِضْ عَن
مَّن تَوَلَّىٰ عَن ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴿٢٩﴾ ذَٰلِكَ مَبْلَغُهُم مِّنَ
الْعِلْمِ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدَىٰ ﴿٣٠﴾ ربع
وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا وَ
يَجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَى ﴿٣١﴾ الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ
إِلَّا اللَّمَمَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۚ هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَ ۲
إِذْ أَنتُمْ أَجِنَّةٌ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ ۖ فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ ﴿٣٢﴾ ۲۷ ع
۶

"اب ذرا بتاؤ تم نے کبھی اس لات اور اس عزیٰ اور تیسری ایک دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا ہے؟ کیا بیٹے تمہارے لئے ہیں اور بیٹیاں خدا کے لئے؟ یہ تو پھر بڑی دھاندلی کی تقسیم ہوئی۔ دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ محض وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشات نفس کے مرید بنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔ کیا انسان جو کچھ چاہے اس کے لئے وہی حق ہے؟ دنیا اور آخرت کا مالک تو اللہ ہی ہے۔ آسمانوں

میں کتنے ہی فرشتے موجود ہیں ۔ان کی شفاعت کچھ بھی کام نہیں آ سکتی ۔ جب تک کہ اللہ کسی ایسے شخص کے حق میں اس کی اجازت نہ دے جس کے لئے وہ کوئی عرض داشت سننا چاہے اور اس کو پسند کرے مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ فرشتوں کو دیویوں کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں حالانکہ اس معاملہ کا کوئی علم انہیں حاصل نہیں ہے وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا ۔پس 'اے نبیؐ' جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے اسے اس کے حال پر چھوڑ دو ۔ ان لوگوں کا مبلغ علم بس یہی کچھ ہے ۔ یہ بات تیرا رب ہی زیادہ جانتا ہے کہ اس کے راستے سے کون بھٹک گیا ہے اور کون سیدھے راستے پر ہے اور زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک اللہ ہی ہے ۔تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے اور ان لوگوں کو اچھی جزا سے نوازے جنہوں نے نیک رویہ اختیار کیا ہے جو بڑے بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں ۔ الا یہ کہ کچھ قصور ان سے سرزد ہو جائے ۔ بلاشبہ تیرے رب کا دامن مغفرت بہت وسیع ہے ۔ وہ تمہیں اس وقت سے خوب جانتا ہے جب اس نے زمین سے تمہیں پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں ابھی جنین ہی تھے ۔پس اپنے نفس کی پاکی کے دعوے نہ کرو ۔وہی بہتر جانتا ہے کہ واقعی متقی کون ہے"۔

لات ایک سفید پتھر تھا جس پر نقش و نگار تھے ۔ طائف میں اس کے اوپر ایک مکان اور درگاہ بنی ہوئی تھی جو طائف میں تھی اور اس کے اوپر پجاری متعین تھے ۔ اس درگاہ کے ارد گرد ایک بڑی چار دیواری تھی اور اہل طائف اس کا بہت احترام کرتے تھے یعنی فخر کرتے تھے ماسوائے قریش کے کہ ان کے پاس کعبہ تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ لات کا لفظ مونث ہے اللہ کا جو اس سے پاک ہے ۔

اور عزیٰ ایک درخت تھا جس کے اوپر بھی ایک عبادت گاہ بنی ہوئی تھی اور پردے تھے اور یہ نخلہ کے مقام پر تھی جو مکہ اور طائف کے درمیان تھی ۔اس کی تعظیم قریش بھی کرتے تھے جس طرح احد کے دن ابو سفیان نے کہا ۔

لَنَا الْعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ "ہمارا عزیٰ ہے اور تمہارا کوئی عزیٰ نہیں" تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ جواب دو ۔

اَللّٰہُ مَوْلٰنَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ "اللہ ہمارا مولیٰ ہے اور تمہارا کوئی مولیٰ نہیں ہے" اور العزیٰ عزیز کی مونث بتلائی جاتی ہے ۔

مناۃ کا بت قدید کے قریب مشلل میں تھا جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے ۔ خزاعہ 'اوس اور خزرج اس کی تعظیم کرتے تھے اور قدید یا مشلل سے مکہ کے لئے احرام باندھتے تھے ۔مناۃ کے احترام میں ۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت بت تھے جن کو عرب میں پوجا جاتا تھا مگر یہ تین بڑے آستانے تھے ۔

کہا جاتا ہے کہ یہ تینوں نام تین ملائکہ کے نام تھے جنہیں عرب اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے اور اسی وجہ سے یہ ان کی عبادت کرتے تھے اور جس طرح اصول ہے کہ چلتے چلتے یہ تینوں بذات خود معبود ہو گئے اور جمہور عوام نے اللہ کو بھلا کر ان بتوں کو بذات خود معبود مطلق سمجھ کر پوجنا شروع کر دیا ۔کم ہی لوگ اس قسم کے تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ ان کی عبادت اس وجہ سے ہے کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں ۔

ان معبودوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے نہایت ہی تعجب انگیز انداز میں کیا جس طرح کہ عبارت سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے۔

اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی (۱۹) وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی (۵۳ : ۲۰) "اب ذرا بتاؤ تم نے کبھی اس لات اور اس عزیٰ اور تیسری ایک دیوی مناۃ کی حقیقت پر غور کیا ہے؟" تعجب لفظ افرءیتم (ذرا بتاؤ کیا تم نے سوچا ہے؟) سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس فعل کو نہایت ہی مضحکہ خیز سمجھتا ہے لیکن اس تعجب کے اظہار کے بعد ان پر یہ تنقید کی جاتی ہے کہ یہ اللہ کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں اور اپنے لئے بیٹے۔

اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَلَہُ الْاُنْثٰی (۵۳ : ۲۱) تِلْکَ اِذًا قِسْمَۃٌ ضِیْزٰی (۵۳ : ۲۲) "کیا بیٹے تمہارے لئے ہیں اور بیٹیاں خدا کے لئے ہیں۔یہ تو پھر بڑی دھاندلی کی تقسیم ہوئی" اس سے یعنی ان بتوں کے تعجب خیز ذکر کے بعد یہ تنقید بتائی ہے کہ یہ تینوں بت دراصل فرشتوں کے ناموں کے رمز تھے جن کو وہ اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔ان کی حالت اپنے ہاں یہ تھی کہ وہ اپنے گھروں میں بیٹیوں کی ولادت کو سخت مکروہ سمجھتے تھے لیکن اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرنے میں شرم محسوس نہ کرتے تھے حالانکہ وہ فرشتوں کے بارے میں کچھ زیادہ نہ جانتے تھے اور نہ معلومات تھیں ان کو کہ جن کی بنا پر وہ یوں کہتے ہوں۔

اللہ تعالیٰ خود ان کے تصورات اور ان کے افسانوی عقائد کی رو سے ان پر تنقید فرماتا ہے بلکہ ان کا تمسخر اڑاتا ہے کہ کیا خوب کہی۔

اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَلَہُ الْاُنْثٰی (۵۳ : ۲۱) "کیا بیٹے تمہارے لئے اور بیٹیاں خدا کے لئے" یہ تقسیم تو غیر منصفانہ ہے۔اپنا حصہ تم نے کیا رکھا ہے اور اللہ کا حصہ کیا رکھا ہے۔

تِلْکَ اِذًا قِسْمَۃٌ ضِیْزٰی (۵۳ : ۲۲) "یہ تو پھر بڑی دھاندلی کی تقسیم ہے" جبکہ حقیقت پسند نظر سے دیکھا جائے تو اس تصور کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔عقل و دانش کے زاویہ سے دیکھا جائے تو کوئی عقلی و نقلی دلیل اس پر نہیں ہے۔

اِنْ ھِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَھْوَی الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَھُمْ مِّنْ رَّبِّھِمُ الْھُدٰی (۵۳ : ۲۳)

"دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں۔اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ محض وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشات نفس کے مرید بنے ہوئے ہیں حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔"

یہ نام لات 'مناۃ اور عزیٰ وغیرہ کو معبود کہنا' ان کو فرشتے کہنا' فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہنا یا فرشتوں کو عورتیں کہنا' یہ

سب الفاظ ہیں لیکن جن معانی کے لئے یہ لوگ ان کو بولتے ہیں وہ تو سرے سے ہیں ہی نہیں نہ اس قسم کے دعاوی پر کوئی حجت ہے ۔ اللہ نے ایسی کسی بات کی تصدیق نہیں کی ہے ۔ لہذا ان دعاوی پر کوئی دلیل نہیں ہے ۔ حقیقت کا اپنی جگہ ایک وزن ہوتا ہے ۔ حقیقت کی اپنی جگہ قوت ہوتی ہے ۔ رہا باطل تو وہ ضعیف اور ہلکا ہوتا ہے کمزور ہوتا ہے اور اس کے اندر گرفت کی قوت نہیں ہوتی ۔

اس آیت کے نصف میں ان کو ان کے اوہام و خرافات میں غرق چھوڑ دیا جاتا ہے ۔ ان سے مکالمہ ختم کر دیا جاتا ہے اور ان سے نظر پھیر دی جاتی ہے ۔ یوں کہ وہ گویا مکالمہ کے اندر تھے ہی نہیں ۔ اب وہ غائب کر دیئے جاتے ہیں اور ان پر تبصرہ ہوتا ہے ۔

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ (۲۳:۵۳) "حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ محض ظن و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشات نفس کے مرید بنے ہوئے ہیں ۔" لہذا ان کے پاس نہ حجت ہے نہ علم ہے اور نہ یقین ہے ۔ ان کے عقائد محض ظن و تخمین پر مبنی ہیں ۔ ان کی خواہشات ان کی دلیل ہیں حالانکہ عقائد و نظریات میں ظن اور خواہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا ۔ اس میں حقیقت یقین اور ہوا و ہوس سے پاک اور غرض اور مطلب سے دور اور پاک رویہ درکار ہے جبکہ ان کے پاس محض ظن ، خواہش اور اغراض دنیاوی کے سوا کچھ بھی نہیں ۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (۲۳:۵۳) "حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے" لہذا اب تو ان کے پاس یہ عذرات بھی نہیں رہے ۔

معاملہ اگر خواہشات نفسانیہ تک پہنچ جائے اور خواہشات پر فیصلے ہونے لگیں تو انسان کی کوئی کل سیدھی نہیں رہ سکتی ۔ پھر ہدایت کا اور تبلیغ کا کوئی فائدہ نہیں رہتا کیونکہ ہدایت کو رد کرنے کی وجہ یہ نہیں رہتی کہ ان کو معلوم نہ تھا بلکہ یہ ہوتی ہے کہ وہ چاہتے یہ تھے ۔ پہلے انہوں نے خواہش نفس کے تحت فیصلے کر لئے ہیں اب وجہ جواز تلاش کر رہے ہیں جب نفس انسانی یہاں تک گر جائے تو پھر اس کے لئے ہدایت مفید ہی نہیں ہوتی ۔ دلیل کا اثر ہی نہیں ہوتا ۔ اس وجہ سے اللہ تحت ناپسندیدگی کے ساتھ سوال سوال فرماتا ہے ۔

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى (۲۴:۵۳) "کیا انسان جو کچھ چاہے اس کے لئے وہی حق ہے" یوں کہ وہ جو چاہے حقیقت بن جائے ۔ اس کی خواہشات واقعہ بن جائیں لیکن معاملہ ایسا نہیں ہے ۔ حق حق ہوتا ہے اور واقعہ واقعہ ہوتا ہے ۔ کوئی جس قدر بھی چاہے اس کی چاہت سے واقعات اور حقائق نہیں بدل سکتے ۔ انسان تباہ ہی تمناؤں کے ہاتھ سے ہوتا ہے اور ہلاکت کے گڑھے میں پڑتا ہی خواہشات نفس سے ہے ۔ اس لئے خواہشات اور تمنائیں حقیقت نفس الامری کو بدل نہیں سکتیں ۔ دنیا اور آخرت کے حقائق میں تغیر و تبدل کوئی نہیں کر سکتا ۔ یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں جو حق ہے ۔

فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى (۲۵:۵۳) "دنیا و آخرت کا مالک تو اللہ ہی ہے" یہاں اللہ تعالیٰ نے دنیا سے آخرت کا ذکر پہلے کیا تاکہ لفظ اولیٰ سورت کے انداز گفتگو اور قافیہ کے مطابق ترنم پیدا کر دے جبکہ معنوی اعتبار سے بھی اہمیت آخرت

کی ہے ۔ قرآن کا انداز ہی ایسا ہے کہ مراعات لفظی کے نتیجے میں معنی میں فرق نہیں پڑتا کیونکہ کلام کا کمال و جمال تو اس میں ہے کہ وہ لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے مقتضی الحال کے مطابق ہو اور نہایت ہی برمحل اور موزوں ہو۔

جب آخرت اور دنیا کے تمام معاملات میں اختیار اللہ کا ہے تو مشرکین کے یہ جو خیالات ہیں کہ وہ فرشتوں کی بندگی اس لئے کرتے ہیں کہ ان کو اللہ کے قریب کر دیں یہ بالکل باطل ہیں ۔ فرشتوں کو تو سفارش کا اختیار ہی نہیں ہے ۔ قیامت میں سفارش کا اختیار صرف ان لوگوں کو ہو گا جن کو اللہ کی طرف سے اذن ہو گا۔

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ

لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى (۵۳ : ۲۶) "آسمان میں کتنے ہی فرشتے موجود ہیں ۔ ان کی شفاعت کچھ بھی کام نہیں آسکتی جب تک کہ اللہ کسی ایسے شخص کے حق میں اس کی اجازت نہ دے جس کے لئے وہ کوئی عرضداشت سننا چاہے اور اس کو پسند کرے ۔" لہٰذا ان کا دعویٰ بے بنیاد ہے اس سے پہلی آیات میں بھی ان کا بطلان ثابت کر دیا گیا ہے اور عقائد کو ہر قسم کے شبہات اور ملاوٹ سے پاک قرار دیا گیا ہے ۔ صحیح عقیدہ یہ ہے کہ دنیا و آخرت دونوں میں فیصلے کا اختیار اللہ کو ہے اور انسان کی تمنائیں اور خواہشات حق میں تبدیلی نہیں لا سکتیں ۔ سفارش کی اجازت اللہ کے اذن کے بغیر نہ ہو گی ۔ لہٰذا آخری فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہو گا۔

اس پیراگراف کے آخر میں مشرکین کے اوہام کو آخری بار رد کیا جاتا ہے کہ فرشتوں کے بارے میں مشرکین کے خیالات کسی اصل پر قائم نہیں ہیں ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى (۲۷) وَمَا لَهُمْ بِهٖ

مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا (۵۳ : ۲۸) "مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ فرشتوں کو دیویوں کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں حالانکہ اس معاملہ کا کوئی علم انہیں حاصل نہیں ہے ۔ وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔"

یہ آخری تبصرہ بھی بتاتا ہے کہ لات منات اور عزیٰ کا تعلق اس افسانہ سے تھا جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دینے کے متعلق انہوں نے گھڑ رکھا تھا ۔ یہ ایک بے بنیاد افسانہ تھا ۔ محض ظن و تخمین اور سنی سنائی باتوں پر مبنی تھا کیونکہ ان کے پاس ایسا کوئی ذریعہ علم ہی نہ تھا کہ وہ فرشتوں کی حقیقت کو سمجھیں ۔ فرشتوں کی نسبت اللہ کی طرف کرنا تو باطل محض تھا ۔ وہم کے سوا اس پر کوئی دلیل ہی نہ تھی اور سچائی اوہام اور افسانے سے ثابت نہیں ہوتی ۔ حق اور سچائی کو وہ چھوڑ چکے ہیں لہٰذا اس متاع گم گشتہ کی جگہ اور کوئی چیز لے ہی نہیں سکتی۔

---ooo---

جب اہل شرک کے عقائد کو یہاں تک لے لیا گیا کہ عقائد شرکیہ اس قدر بے اصل ہیں اور جو لوگ شرک کرتے ہیں اور آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرتے ہیں اور فرشتوں کو بیٹیاں کہتے ہیں ان کے عقائد

ظن اور وہم پر مبنی ہیں تو اب نبی ﷺ کو کہا جاتا کہ آپ ان لوگوں کو نظرانداز کر دیں ۔ ان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں ۔ اللہ نیکو کاروں اور بدکاروں کو اچھا جانتا ہے ۔ وہ اہل ہدایت اور اہل ضلالت دونوں کو جزا اور سزا دے گا۔ اس کے ہاتھ میں زمین و آسمان کے اختیارات ہیں۔ دنیا آخرت کے امور ہیں ۔ وہ سب کے ساتھ حساب عدل سے کرے گا۔ کسی پر ظلم نہ کرے گا اور جو لوگ گناہوں پر اصرار نہیں کرتے اللہ ان کی چھوٹی موٹی غلطیاں معاف کرتا ہے ۔ وہ نیتوں اور رازوں کو جانتا ہے کیونکہ وہ انسانوں کا خالق ہے اور اپنی مخلوق کو وہ دوسروں کے مقابلے میں اچھا جانتا ہے ۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِکْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا (۲۹) ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰی (۳۰) وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی (۳۱) اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی (۳۲) ع (۵۳: ۲۹ تا ۳۲) "پس اے نبیؐ ، جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے اسے اس کے حال پر چھوڑ دو ۔ ان لوگوں کا مبلغ علم بس یہی کچھ ہے ۔ یہ بات تیرا رب ہی زیادہ جانتا ہے کہ اس کے راستے سے کون بھٹک گیا ہے اور کون سیدھے راستے پر ہے اور زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک اللہ ہی ہے ۔ تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے اور ان لوگوں کو اچھی جزا سے نوازے جنہوں نے نیک رویہ اختیار کیا ہے جو بڑے بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں ۔ الا یہ کہ کچھ قصور ان سے سرزد ہو جائے ۔ بلاشبہ تیرے رب کا دامن مغفرت بہت وسیع ہے ۔ وہ تمہیں اس وقت سے خوب جانتا ہے جب اس نے زمین سے تمہیں پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں ابھی جنین ہی تھے ۔ پس اپنے نفس کی پاکی کے دعوے نہ کرو ۔ وہی بہتر جانتا ہے کہ واقعی متقی کون ہے"۔

اعراض اور روگردانی کرنے کا حکم ان لوگوں کے لئے دیا گیا ہے جو اللہ کی یاد سے اعراض و روگردانی کرتے ہیں ۔ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور صرف حیات دنیا چاہتے ہیں ۔ رسول اللہ ﷺ سے کہا جاتا ہے کہ ان مشرکین کو چھوڑ دیں جن کے عقائد اور رویہ کا بیان اس سورۃ کے ابتدا میں ہوا اور جن کے اوہام و خرافات پر مبنی عقائد کا رد کیا گیا۔

رسول اللہ کے بعد یہ خطاب ہر مسلم داعی کو ہے جس کو اس قسم کے لوگوں سے واسطہ ہو جو اللہ کی یاد سے غافل ہوں جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہ لاتے ہوں اور جن کا نقطہ نظر محض سیکولر ہو ۔ دنیا سے آگے وہ دیکھنے والے ہی نہ ہوں ۔ آخرت کا حساب و کتاب ان کی نظروں میں نہ ہو اور وہ دیکھتے ہوں کہ بس ان کا مقصد وجود صرف اس دنیا کی زندگی ہے ۔ "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" اور وہ اس دنیا میں اپنی زندگی کو اسی انداز پر استوار کرتے ہوں وہ انسان کے شعور کو

اس بات سے الگ کر دیتے ہیں کہ ایک ایسا الہ بھی ہے جو لوگوں کے امور کا مدبر ہے اور یہ کہ وہ الہ اس دنیا کی مختصر زندگی کے بعد اعمال کا حساب و کتاب لے گا اور ہمارے دور میں مادیت اور الحاد کے پیروکار ایسے ہی لوگ ہیں۔

جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ ایسے لوگوں میں دلچسپی نہیں لے سکتے جو آخرت سے غافل ہیں اور نہ ایسے لوگوں کے ہمقدم زندگی بسر کر سکتے ہیں جو آخرت کے منکر ہیں کیونکہ دونوں قسم کے لوگوں کے منبع زندگی اس قدر متضاد ہوتے ہیں کہ یہ ایک دوسرے کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکتے کیونکہ زندگی کے نکات میں سے وہ باہم کسی نکتے پر بھی متفق نہیں ہو سکتے۔ ان کی زندگی کی قدریں اور پیمانے ہی الگ ہوتے ہیں۔ اہداف مختلف ہوتے ہیں، تصورات مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون بھی نہیں کر سکتے۔ وہ اس زمین پر ایک جگہ کوئی سرگرمی نہیں رکھ سکتے کیونکہ ان کی زندگی کے پیمانے، قدریں اور مقاصد مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی دوڑ دھوپ کا منہاج مختلف ہوگا اور غرض و غایت جدا ہوگی۔ جب دونوں کے درمیان کوئی یکسانیت اور یکجہتی نہیں ہے تو ایک دوسرے میں دلچسپی کیا ہوگی؟ اگر کوئی مومن ایسے لوگوں میں دلچسپی لیتا ہے جو اللہ کے ذکر سے منہ موڑتے ہیں اور سوائے حیات دنیا کے اور کچھ نہیں چاہتے تو وہ ایک سراسر ایک عبث کام کرتا ہے اور وہ بے مصرف اپنی قوت کو خرچ کر رہا ہے۔

پھر اعراض اور روگردانی سے ایک اور غرض بھی ہے یہ کہ جو لوگ اللہ پر ایمان نہ لانے پر تلے ہوئے ہوں ان کو نظرانداز کرنا، ان کو اہمیت نہ دینا بھی اپنی جگہ ایک مقصد ہے جو لوگ صرف دنیا کے بندے ہوں ان کو اس لئے نظرانداز کیا جاتا ہے کہ وہ ہیں ہی اس قابل کہ ان کو نظرانداز کیا جائے۔ وہ حق سے دور ہیں۔ حق کے ادراک کے اہل نہیں۔ یہ پردوں کے پیچھے کھڑے ہیں ان کے اور حقیقت کے درمیان حجاب ہے۔ یہ اس دنیا کے دائرے اور حدود سے باہر نکل نہیں سکتے۔

ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ (۵۳ : ۳۰) "ان کا مبلغ علم بس یہی ہے" یہ پہنچ بہت ہی معمولی ہے۔ اگرچہ بظاہر وہ بہت بڑے پہنچ والے نظر آئیں۔ یہ کوتاہ دست ہیں۔ اگرچہ ان کے ہاتھ لمبے نظر آئیں وہ گمراہ ہیں اگرچہ تیزی سے فاصلے طے کر رہے ہوں۔ اس لئے کہ جو شخص اپنے دل کے احساس اور عقل کے لحاظ سے اس دنیا میں قید ہو وہ کولہو کے بیل کی طرح اس میں چکر کاٹے گا، آگے نہیں بڑھ سکے گا حالانکہ ان کی نظروں کے سامنے یہ عظیم کائنات پڑی ہے۔ اس کائنات نے اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا اور اس دنیا کا خود بخود وجود میں آنا ایک ایسا نظریہ ہے جو بداہتہً غلط ہے پھر یہ دنیا عبث بھی پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کا کوئی خالق ہے اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہی دنیا ہے اور یہی زندگی ہے تو اس طرح یہ تخلیق عبث ثابت ہوتی ہے لہٰذا اس دنیا پر جس حیثیت سے بھی غور کیا جائے۔ ایمان لانا لازمی قرار پاتا ہے اور ایمان کا یہ حصہ بھی لازمی قرار پاتا ہے کہ آخرت میں حشر و نشر لازمی ہے ورنہ یہ عظیم اور محیرالعقول کائنات کا عبث پیدا ہونا لازم ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ جو شخص ذکر الٰہی سے منہ موڑتا ہے اور صرف دنیا کے کاموں میں مشغول رہتا ہے اس کو نظرانداز کرنا ضروری ہے۔ یہ اعراض اس لئے ضروری ہے کہ اپنے اہتمام، توجہ اور محنت کو بے محل کاموں میں نہیں صرف کرنا چاہئے اور جن لوگوں کی دلچسپیاں صرف اس دنیا تک ہی محدود ہوں ان کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے بھی ان کی طرف سے منہ

موڑنا ضروری ہے ۔ اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ایسے لوگوں سے منہ موڑ دو اس لئے ہمیں چاہئے کہ ایسے لوگوں کو نظر انداز کر دیں کیونکہ اطاعت امر ضروری ہے ۔ ایسا نہ ہو کہ یہودیوں کی طرح ہم کہیں ۔ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا اللہ ہمیں اس رویہ سے بچائے ۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى (۵۳ : ۳۰) "یہ بات تیرا رب ہی زیادہ جانتا ہے کہ اس کے راستے سے کون بھٹک گیا ہے اور کون سیدھے راستے پر ہے ۔" اللہ اس بات کو خوب جانتا ہے کہ یہ لوگ گمراہ ہیں ۔ اس لئے اللہ نے نبی اور ان کے ساتھیوں کے لئے یہ مناسب نہ سمجھا کہ وہ اپنے آپ کو گمراہ لوگوں کے ساتھ فضول مصروف رکھیں یا ان کے ہم محفل ہوں یا ان کے دوست بنیں نہ ان کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ جانتے بھی ہوں کہ یہ شخص گمراہ ہے اور اس کی سرگرمیاں صرف دنیا تک محدود ہیں ۔ وہ حقیقت کا ادراک کرنے کی کوشش یا ارادہ نہیں کرتا اور جان بوجھ کر ایمان نہیں لاتا ۔ آخرت پر ایمان نہیں لاتا اور اسکی تمام دلچسپیاں اس دنیا کی مختصر زندگی تک محدود ہیں ۔ ایسے شخص پر محنت کریں ۔

وہ علم جو ان کوتاہ بینوں اور گمراہوں کو حاصل ہوتا ہے وہ بظاہر عوام الناس کی نظروں میں بہت بڑا نظر آتا ہے وہ لوگ جن کا دل 'قوت مدرکہ اور احساس عامی ہوتا ہے اس لئے ان کو عملی زندگی میں وہ موثر نظر آتا ہے لیکن ان لوگوں کا یہ علم ان سے گمراہی کی صفت دور نہیں کر سکتا نہ ان سے صفت جہالت اور کوتاہ بینی کو دور کر سکتا ہے ۔ اس لئے کہ اس کائنات اور اس کے خالق کے درمیان رابطہ اور انسانی عمل اور اس کی جزاء و سزا کے درمیان رابطہ دونوں ایسی حقیقتیں ہیں جو ہر علم کے لئے ضروری ہیں اور ان دونوں حقیقتوں سے خالی جو علم بھی ہو گا وہ سطحی ہو گا اور وہ انسانی زندگی میں پوری طرح موثر نہ ہو گا نہ اسے ترقی دے سکے گا اور نہ اسے بلند کر سکے گا ۔ ہر علم کی قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ انسانی نفس پر اثر انداز ہو اور اسکی وجہ سے ایک انسان اور انسان کے درمیان ادبی رابطہ قائم ہو ۔ ورنہ تمام علوم صرف ٹیکنالوجی قرار پائیں گے ۔ انسانیت کا تنزل شمار ہوں گے ۔ علوم کا ٹیکنیکل پہلو جس قدر آگے بڑھتا ہے ان کا انسانی پہلو اس قدر گرتا ہے ۔

انسان کا یہ شعور کہ اس کا ایک خالق ہے اور اس خالق نے اسے پیدا کیا ہے اور اس کائنات کو بھی پیدا کیا ہے اور یہ انسان اور یہ کائنات ایک ہی انداز تخلیق رکھتے ہیں ۔ انسان کے شعور حیات اور شعور ماحول کو بدل کر رکھ دیتا ہے ۔ انسان کے وجود کی ایک قیمت نمودار ہوتی ہے اور انسان کا مقصد وجود زیادہ جامع اور ارفع ہو جاتا ہے اور اس کا وجود اس کے محدود خاندان سے بلند ہو جاتا ہے ۔ اس کا وجود اسکی قوم سے بڑا اور ارفع ہو جاتا ہے ۔ اس کا وجود اس کے وطن سے زیادہ قیمتی ہو جاتا ہے ۔ انسان طبقاتی کشمکش سے بالا ہو جاتا ہے اور اس قسم کی تمام تشکیلات اور اجتماعیتوں سے بالا ہو جاتا ہے ۔

پھر انسان کا یہ شعور کہ اس کا خالق آخرت میں اس سے حساب لے گا اور اس کو جزاء و سزا دے گا' انسان کے جذبات 'انسان کے مقاصد' انسان کے پیمانے اور قدریں بدل دیتا ہے ۔ انسان کے تصورات کا انداز ہی بدل جاتا ہے ۔ انسان کا انجام اس کے اخلاق کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے ۔ یوں انسان کی قوت اور اس کی فعالیت میں اضافہ ہوتا ہے کیونکہ اس کی ہلاکت یا اس کی نجات اس کی نیت اور عمل میں جواب دہی کے احساس پر موقوف ہو گا ۔ یوں انسانی شخصیت کے اندر "انسانیت" قوی ہو گی کیونکہ انسان کے اندر یہ شعور ایک نگران کی طرح بیدار ہوتا ہے ۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ آخری

حساب و کتاب ابھی باقی ہے۔ غرض اللہ پر ایمان لانا اور آخرت پر ایمان لانا ایک بہت ہی اہم اور بڑا مسئلہ ہے اور انسانی زندگی میں اس کی بنیادی اہمیت ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ انسان کے لئے یہ مسئلہ روٹی کپڑے اور مکان سے زیادہ اہم ہے۔اگر یہ عقیدہ اور شعور ہو گا تو یہ مخلوق "انسان" ہو گا اگر نہ ہو گا تو یہ محض جانور ہو گا۔

جب معیار بدل جائیں ' مقاصد بدل جائیں ' ہدف بدل جائے اور زندگی کے سب تصورات بدل جائیں تو پھر انسان اور انسان کے درمیان کوئی مابہ الاشتراک امر نہیں رہتا۔ باہم تعامل اور تعاون نہیں رہتا بلکہ باہم تعارف بھی نہیں رہتا اور لوگ ایک دوسرے کو سمجھ بھی نہیں سکتے ' چہ جائیکہ وہ باہمی انصاف کر سکیں۔

یہی وجہ ہے کہ ایک مومن باللہ اور ایک خالص دنیا پرست ' مفاد پرست کے درمیان کوئی صحبت شرکت ' تعاون اور لین دین نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ہے اصل بات اور حقیقت اس کے سوا اور جو بات بھی کوئی کرے گا وہ محض دکھاوا ہو گا اور امر الٰہی کے خلاف بات ہوگی۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِکْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا (۲۹:۵۳) "پس اے نبیؐ جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں اسے اس کے حال پر چھوڑ دے۔"

وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ یَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی (۳۱:۵۳) "اور زمین و آسمان کی ہر چیز کا مالک اللہ ہی ہے تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے اور ان لوگوں کو اچھی جزا سے نوازے جنہوں نے نیک رویہ اختیار کیا" یہ کہ اللہ زمین و آسمانوں کی تمام چیزوں کا مالک ہے۔ اس سے آخرت کے عقیدے میں قوت اور تاثیر پیدا ہوتی ہے کیونکہ جس نے آخرت پر حساب و کتاب کو مقدر کیا ہے وہی مالک ہے زمین اور آسمانوں کا۔ لہٰذا وہ جزاو سزا پر قدرت رکھتا ہے۔ یہ کام صرف اسی کا ہے اور وہی ان کے اسباب کا بھی مالک ہے اور اس حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ مکمل اور عادلانہ جزاء و سزا دے۔

لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ یَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی (۳۱:۵۳) "تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے اور ان لوگوں کو اچھی جزا سے نوازے جنہوں نے نیک رویہ اختیار کیا"

اس کے بعد ان لوگوں کا تعین کر دیا جاتا ہے جنہوں نے نیک عمل کئے اور جن کو جزائے حسن دی جاتی ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (۳۲:۵۳) "جو بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں اور یہ کہ کچھ قصور ان سے سرزد ہو جائے۔" بڑے گناہوں سے مراد بڑی نافرمانیاں '

فواحش سے مراد بھی بڑے گناہ ہیں لیکن خصوصاً وہ جن کے اندر فحاشی ہو۔"اللمم" کے بارے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ استثنا منقطع ہے۔(استثنا منقطع وہ ہے جہاں استثناکردہ چیز اس مجموعے کی فرد نہ ہو جس سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔) کیونکہ لمم چھوٹے گناہوں کو کہا جاتا ہے یعنی چھوٹے چھوٹے اعمال' امام احمد نے روایت کی ہے' عبدالرزاق سے انہوں نے معمر سے انہوں نے ابن طاؤس سے انہوں نے اپنے والد سے انہوں نے حضرت ابن عباس ؓ سے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے لمم کے ساتھ زیادہ مشابہت کرنے والی کوئی چیز اس سے بڑھ کر نہیں دیکھی جو حضرت ابو ہریرہ نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے۔ رسول اللہ ؐ فرماتے ہیں "جب اللہ تعالیٰ نے ابن آدم پر زنا کا جرم لکھ دیا تو وہ اسے پائے گا یعنی اس کی سزا اسے لازماً ملے گی' آنکھ کا زنا نظر ہے زبان کا زنا بات ہے اور نفس کی تمنا اور اشتہا ہوتی ہے اور انسان کے اندام نہانی اس کی تصدیق کرتے ہیں یا تکذیب" (صحیحین)

ابن جریر نے روایت کی ہے' محمد ابن عبدالاعلیٰ سے انہوں نے ابن ثور سے انہوں نے معمر سے انہوں نے اعمش سے انہوں نے ابوالضحیٰ سے کہ ابن مسعود ؓ نے فرمایا "آنکھ کا زنا نظر ہے ہونٹوں کا زنا بوسہ لینا ہے' ہاتھ کا زنا پکڑنا ہے' پاؤں کا زنا چل کر جانا ہے اور انسانی اعضا اس کی تکذیب کرتے ہیں یا تصدیق۔ اگر اس کا فرج آگے بڑھا تو یہ زانی ہوا ورنہ لمم کا مرتکب۔ یہی بات مسروق اور شعبی نے کہی ہے۔

عبدالرحمٰن ابن نافع کہتے ہیں (ان کو ابن لبابہ طائفی بھی کہتے ہیں) میں نے ابو ہریرہ سے "لمم" کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا بوسہ دینا' دیکھنا' آنکھ سے اشارہ کرنا' ہاتھ لگانا اور جب فریقین کے اعضائے نہانی باہم مل جائیں اور غسل واجب ہو جائے تو یہ زنا ہے۔ یہ تو ہیں ایک دوسرے کے ساتھ ملتے جلتے اقوال لمم کے بارے میں لیکن کچھ دوسرے اقوال بھی ہیں۔

علی ابن طلحہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے الا اللمم یعنی ماسوائے اس کے جو گزر گیا یہی قول زید ابن اسلم کا ہے۔ علامہ ابن جریر روایت کرتے ہیں ابن مثنیٰ سے وہ محمد ابن جعفر سے وہ شعبہ سے وہ منصور سے وہ مجاہد سے انہوں نے الا اللمم کا معنی یہ کہا کہ وہ شخص جو گناہوں کا ارتکاب کرے اور پھر چھوڑ دے۔

ابن جریر نے روایت کی ہے سلیمان ابن جبار سے انہوں نے ابو عاصم سے انہوں نے زکریا سے انہوں نے ابن اسحاق سے انہوں نے عمر ابن دینار سے انہوں نے عطا سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے۔

الَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (۵۳ : ۳۲) "وہ لوگ جو بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں اور یہ کہ کچھ قصور ان سے سرزد ہو جائیں" انہوں نے کہا اس سے مراد وہ شخص ہے جو فحاشی کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر توبہ کر لیتا ہے اور رسول اللہ ؐ نے فرمایا۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| ان | تغفر اللّٰهُمَّ | تغفر | جما |
| و ای | عبدلك | ما | الما |

"اے اللہ اگر آپ معاف کریں تو سب کچھ معاف کر دیں اور آپ کا کون سا ایسا بندہ ہے جس نے کوئی قصور نہیں

کیا" اس طرح امام ترمذی نے روایت کی ہے احمد ابن عثمان بصری سے انھوں نے ابو عاصم النبیل سے اور اس کے بعد انھوں نے کہا یہ حدیث صحیح حسن اور غریب ہے اور صرف زکریا ابن اسحاق کے واسطہ سے ہم تک پہنچی ہے۔ بزاز نے بھی کہا ہے کہ یہ حدیث متصل صرف اس سند کے ساتھ ہے۔

ابن جریر نے روایت کی، محمد ابن عبداللہ ابن بزیع سے انھوں نے یزید ابن زریع سے انھوں نے یونس سے انھوں نے حسن سے انھوں نے ابو ہریرہؓ سے (میں سمجھتا ہوں اس نے اس روایت کو حضورؐ تک پہنچایا) اس آیت کے بارے میں۔

الَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (۵۳: ۳۲) "جو لوگ بڑے بڑے گناہوں اور کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں اور یہ کہ کچھ قصور ان سے سرزد ہو جائے) یہاں مراد یہ ہے کہ وہ زنا کا مرتکب ہو جائے اور پھر توبہ کرے اور چھوڑ دے یا وہ چوریاں کرے اور پھر چھوڑ دے اور وہ شراب پیئے اور ترک کر دے تو اس کے بعد کہا کہ یہ ہے المام اور ارتکاب۔ اس قسم کی روایت حسن سے بھی مروی ہے لیکن موقوف روایت ہے...... غرض یہ روایات کا دوسرا مجموعہ ہے اور یہ لمم کا بالکل ایک دوسرا مفہوم بتاتا ہے۔

ہمارے خیال کے مطابق یہ آخری رائے اس کے بعد آنے والی آیت کے زیادہ مناسب ہے۔

اِنَّ رَبَّکَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ (۵۳: ۳۲) "بے شک تیرے رب کا دامن مغفرت بہت ہی وسیع ہے" اللہ کے مغفرت کے دامن کی وسعت کے ذکر کے ساتھ مناسب یہی ہے کہ لمم سے مراد گناہ کبیرہ اور فواحش کا ارتکاب ہو۔ پھر توبہ ہو جائے اور استثنا متصل ہو اور محسنین ہی وہ لوگ ہوں جنھوں نے کبائر گناہوں کا ارتکاب کیا ہو یا فواحش کا ارتکاب کر لیا ہو اور اس کے بعد وہ جلدی سے توبہ کر کے تائب ہو گئے ہوں اور انھوں نے اصرار نہ کیا ہو جیسا دوسری جگہ آتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَکَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ

وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ (۳: ۱۳۵)

"اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معا اللہ انھیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو اور وہ کبھی دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔" اور ان لوگوں کو قرآن کریم نے متقین کہا اور ان کے ساتھ مغفرت اور جنت کا وعدہ فرمایا جن کی وسعت زمین اور آسمانوں سے زیادہ ہے لہٰذا یہ مفہوم اللہ کی رحمت اور مغفرت کے زیادہ قریب ہے کیونکہ اللہ وسیع المغفرت ہے۔

اور خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اللہ کی منصفانہ جزاو سزا اللہ کے وسیع علم پر مبنی ہے۔

هُوَ اَعْلَمُ بِکُمْ اِذْ اَنْشَاَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ

اُمَّهٰتِكُمْ (۵۳ : ۳۲) "اور وہ تمہیں اس وقت سے خوب جانتا ہے جب اس نے زمین سے تمہیں پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں ابھی جنین ہی تھے ۔" تمہارے تمام ظاہری اعمال کو جانتا ہے ۔ یہ علم ہر ثابت حقیقت کے ساتھ وابستہ ہے جسے یہ لوگ نہیں جانتے اور اللہ ہی ہے جو اپنی مخلوق کے بارے میں جانتا ہے ۔ اللہ اس وقت بھی جانتا تھا جب یہ نہ تھے اور وہ ان کو زمین سے پیدا کر رہا تھا ۔ پھر جب یہ ماؤں کے پیٹوں میں جنین تھے اور اس دنیا میں انہوں نے آنکھ ہی نہ کھولی تھی ۔ اللہ ظاہری علم سے پہلے حقیقی علم بھی رکھتا تھا عملاً ان کے وجود میں آنے سے بھی پہلے ۔

جس ذات کے علم کی نوعیت یہ ہو تو انسان اگر اس ذات کو اپنے بارے میں کوئی معلومات دیتا ہے تو یہ نہایت گستاخی ہے کیونکہ یہ گویا اللہ کو اپنی حقیقت دکھاتا ہے اور اللہ کے سامنے یہ کہتا ہے کہ میں یہ ہوں اور یوں ۔

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (۵۳ : ۳۲) "پس اپنے نفسوں کی پاکی نہ بیان کرو وہی بہتر جانتا ہے کہ واقعی متقی کون ہے ۔"

اللہ کو اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ تم اللہ کو اپنے نفوس کے بارے میں اطلاع کرو یا اللہ کے سامنے اپنے اعمال کا مول تول کرو ، اللہ کا علم کامل ہے اس کی جزا و سزا منصفانہ ہے ۔ اللہ کا فیصلہ آخری فیصلہ ہے تمام امور اسی کی طرف لوٹتے ہیں ۔

اب آخری پیراگراف آتا ہے ۔ یہ پیرا نہایت ہی نغمہ بیز ہے اور یہ پہلے پیراگراف کے مماثل ہے ۔ یہ اسلامی نظریہ حیات کے اساسی عناصر کو بیان کرتا ہے جس طرح حضرت ابراہیم ﷺ نے اسلامی نظریہ حیات اور دین حنیف کے لئے طے کئے تھے ۔ اس میں انسانوں کا تعارف خالق تعالیٰ سے کرایا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کی مشیت تمہاری زندگی میں فعال ہے ۔ تخلیق کر رہی ہے اور نہایت ہی موثر ہے اور اللہ کی مشیت کے آثار ایک ایک کر کے گنوائے جاتے ہیں اور نہایت ہی موثر انداز میں جو انسانی وجدان کے ساتھ پیوست ہو جاتے ہیں اور انسان اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ کانپ اٹھتا ہے ۔ جب یہ پیرا آخر میں پہنچتا ہے تو پڑھنے والے کے احساسات پوری طرح متاثر ہوتے ہیں اور انسان پر کپکپی طاری ہوتی ہے اور رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور وہ سرشار ہو کر لبیک کہنے کے لئے تیار ہوتا ہے ۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ۝ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ۝ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ۝ اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ۝ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ۝ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۝ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ۝ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝

مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿۴۶﴾ وَ اَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ﴿۴۷﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَ
اَقْنٰى ﴿۴۸﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿۴۹﴾ وَ اَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ۨالْاُوْلٰى ﴿۵۰﴾ وَ ثَمُوْدَاۡ فَمَاۤ
اَبْقٰى ﴿۵۱﴾ وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَ اَطْغٰى ﴿۵۲﴾ وَ الْمُؤْتَفِكَةَ
اَهْوٰى ﴿۵۳﴾ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾ هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ
النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴿۵۶﴾ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴿۵۷﴾ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿۵۸﴾ اَفَمِنْ
هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَ تَضْحَكُوْنَ وَ لَا تَبْكُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَ اَنْتُمْ ۳
سٰمِدُوْنَ ﴿۶۱﴾ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَ اعْبُدُوْا ﴿۶۲﴾ السجدۃ ع ۳۰

"پھر اے نبیؐ تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جو راہ خدا سے پھر گیا اور تھوڑا سا دے کر رک گیا۔ کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھ رہا ہے؟ کیا اسے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں اور اس ابراہیم کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں جس نے وفا کا حق ادا کر دیا؟" "یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کے لئے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی پھر اس کی پوری جزا اسے دی جائے گی اور یہ کہ آخر کار پہنچنا تیرے رب ہی کے پاس ہے اور یہ کہ اسی نے ہنسایا اور اسی نے رلایا ہے اور یہ کہ اسی نے موت دی اور اسی نے زندگی بخشی اور یہ کہ اسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا۔ ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے اور یہ کہ دوسری زندگی بخشنا بھی اسی کے ذمہ ہے اور یہ کہ اسی نے غنی کیا اور جائیداد بخشی اور یہ کہ وہی شعریٰ کا رب ہے اور یہ کہ اسی نے عاد اولیٰ کو ہلاک کیا اور ثمود کو ایسا مٹایا کہ ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا اور ان سے پہلے قوم نوح کو تباہ کیا کیونکہ وہ تھے ہی سخت ظالم و سرکش لوگ اور اوندھی گرنے والی بستیوں کو اٹھا پھینکا' پھر چھا دیا ان پر وہ کچھ جو (تم جانتے ہی ہو کہ) کیا چھا دیا۔ پس اے انسان' اپنے رب کی کن کن نعمتوں میں تو شک کرے گا؟ یہ ایک تنبیہہ ہے پہلے آئی ہوئی تنبیہات میں سے۔ آنے والی گھڑی قریب آ لگی ہے۔ اللہ کے سوا کوئی اس کو ہٹانے والا نہیں۔ اب کیا یہی وہ باتیں ہیں جن پر تم اظہار تعجب کرتے ہو؟ ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو؟ اور گا بجا کر انہیں ٹالتے ہو؟ جھک جاؤ اللہ کے آگے اور بندگی بجا لاؤ۔

کون ہے یہ شخص۔

اَلَّذِیْ تَوَلّٰی (۳۳) وَ اَعْطٰی قَلِیْلًا وَّ اَکْدٰی (۵۳ : ۳۴) "جو راہ خدا سے پھر گیا اور تھوڑا سا دے کر رک گیا" اور اللہ تعالیٰ اس کی روش کو تعجب انگیز قرار دیتا ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ ایک متعین

شخص تھا جس نے اللہ کی راہ میں تھوڑا سا خرچ کیا اس کے بعد وہ خرچ کرنے سے رک گیا۔ اس لئے کہ وہ فقیر نہ ہو جائے۔ کشاف میں علامہ زمخشری نے اس کا تعین کیا ہے کہ یہ حضرت عثمان ابن عفان ﷺ ہیں لیکن حضرت عثمان ﷺ کا جو مقام و مرتبہ تھا اور انہوں نے تحریک اسلامی کی راہ میں جو کچھ خرچ کیا' بغیر کسی توقف اور بغیر کسی حساب کے وہ معلوم ہے اور ان کا جو عقیدہ تھا وہ بھی معلوم ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور کوئی دوسرا شخص ذمہ داری نہیں لے سکتا ہے اور جس روایت کا علامہ زمخشری نے ذکر کیا ہے وہ اسلام کے اس بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ روایت یہ ہے کہ حضرت عثمان کار خیر میں خرچ کرتے تھے۔ عبداللہ ابن سعد ابن ابو سرح نے کہا جس طرح تم خرچ کر رہے ہو اسی طرح تو تمہارے پاس کچھ نہ رہے گا۔ یہ حضرت عثمان کے رضاعی بھائی تھے۔ حضرت عثمان نے کہا کہ میں نے بہت گناہ کئے ہیں اور میں اللہ کی راہ میں خرچ کر کے معافی چاہتا ہوں تو عبداللہ نے کہا مجھے اپنی ناقہ اس کے کجاوے کے ساتھ دے دو اور میں تمہارے تمام گناہ اپنے سر لیتا ہوں چنانچہ اس کو انہوں نے ناقہ دے دی اس سودے پر انہوں نے گواہ بھی ٹھہرائے اور حضرت عثمان انفاق سے رک گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ روایت ظاہرا باطل ہے کیونکہ یہ قرآنی اصول کے خلاف ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد ایک متعین شخص ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے مراد ہو لوگوں کا ایک نمونہ جو اس قسم کے ہوتے ہیں مثلاً وہ لوگ جو اسلامی نظریہ حیات کی راہ میں خرچ کریں اور پھر رک جائیں تو اللہ کے نزدیک ایسا شخص قابل تعجب ہے۔ ایسے شخص کی طرف اشارہ کر کے قرآن مجید صحیح تصورات کی توضیح کرتا ہے۔

اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى (۳۵:۵۳) "کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھ رہا ہے۔" غیب کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے اور اللہ کے سوا کسی کو غیب کا علم نہیں ہوتا۔ لہٰذا عالم غیب میں انسان کے لئے جو کچھ پوشیدہ ہے انسان اس سے مامون نہیں ہو سکتا۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ وہ ہر وقت نیک عمل کرتا رہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرتا رہے اور پوری زندگی میں محتاط رہے اور اپنے اعمال کو تسلسل دے۔ یہ نہ ہو کہ کچھ تھوڑا سا انفاق کرے پھر چھوڑ دے اور غیب مجہول کے دفاع میں اس کو یہی ضمانت حاصل ہے کہ وہ احتیاط کرے اپنے عمل کو جاری رکھے اور مسلسل رکھے اور اللہ کی مغفرت کا امیدوار ہو اور دعا کرے کہ اس کے اعمال قبول ہوں۔

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى (۲۶:۵۳) وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى (۳۷:۵۳) "کیا اسے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں اور اس ابراہیم کے صحیفوں میں بیان ہوئی جس نے وفا کا حق ادا کر دیا" یہ سیدھا دین وہ ہے جو تمام پیغمبروں کے ہاں ایک ہی رہا ہے اور اس کے اصول اور بنیادیں ایک ہی رہی ہیں۔ تمام رسولوں کی کتابیں اور دعوتیں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔ اگرچہ زمان و مکان کا اختلاف ہے۔ یہی اصول صحف موسیٰ میں تھے۔ یہی ملت ابراہیمی کے اصول تھے۔ حضرت ابراہیم وہ تھے جنہوں نے بہت بڑی وفاداری کا ثبوت دیا۔ ہر چیز کو پورا پورا ادا کیا۔ مطلقاً وفادار تھے۔ یہاں وفا کا ذکر اکدیٰ کے مقابلے میں ہوا۔ اکدیٰ انقطاع کو کہتے ہیں۔ اس کے مقابلے وفّی کا لفظ تشدید سے آیا ہے تاکہ قافیہ اور ترنم میں فرق نہ آئے۔ سوال یہ ہے کہ صحف ابراہیم میں کیا تھا؟

أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۳۸:۵۳) "یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا"، کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا نہ اپنے نفس کا بوجھ وہاں ہلکا کیا جاسکے گا اور نہ دوسرے کا بوجھ لے کر اسے بری الذمہ کیا جاسکے گا۔ لہذا کوئی نہ کسی دوسرے کا بوجھ اٹھا سکتا ہے اور نہ دوسرے پر ڈال سکتا ہے۔

وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۳۹:۵۳) "اور یہ کہ انسان کے لئے کچھ نہیں مگر وہ جس کی اس نے سعی کی"، یعنی انسان کے حساب میں وہی لکھا جائے گا جو اس نے کیا۔ اس کے اعمال کے ساتھ دوسروں کے اعمال نہ لکھے جائیں گے نہ اس کے اعمال سے کمی کر کے کسی دوسرے کی کمی پوری کی جائے گی اور یہ دنیاوی زندگی فرصت عمل ہے تاکہ وہ عمل کرے اور جدوجہد کرے۔ جب مرگیا تو اس کا فرصت عمل ختم ہو جائے گا اور اس کے اعمال کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ ہاں صرف وہ اعمال رہ جائیں گے جن کے بارے میں حدیث میں نص وارد ہے۔

اذا مات الانسان انقطع عمله الا من ثلاث من ولد صالح يدعوله او صدقة جارية من بعده او علم ينتفع به "جب انسان مرجائے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ ماسوائے تین شعبوں کے اس کا صالح بیٹا ہو اور وہ اس کے لئے اس کے بعد دعا کرتا ہو۔ یا اس نے کوئی صدقہ جاریہ کیا ہو یا اس نے کوئی علمی کام کیا ہو جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہوں" (مسلم) یہ تینوں شعبے دراصل اس شخص کے اعمال جاریہ ہیں۔ اس حدیث سے امام شافعیؒ اور آپ کے متبعین یہ مسئلہ نکالتے ہیں کہ قرات قرآن کا ثواب مردوں کو نہیں پہنچتا کیونکہ یہ قرات ان کے عمل اور کسب سے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلے میں امت کو کوئی ہدایت نہیں فرمائی نہ اس کی تاکید فرمائی نہ کسی نص میں یا اشارے میں اس کی ہدایت فرمائی۔ صحابہ کرام میں سے بھی کسی صحابی سے یہ منقول نہیں ہے کہ انہوں نے قرآن پڑھ پڑھا کر ایصال ثواب کیا ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو وہ کس طرح اس سے پیچھے رہ سکتے تھے۔ پھر عبادات اور ایصال ثواب کے مسائل ایسے ہیں جن میں قرآن و سنت کے نصوص پر اکتفا کرنا چاہئے۔ ایسے معاملات میں رائے اور قیاس کی گنجائش نہیں ہے۔ رہی دعا و صدقہ تو اس پر اجماع ہے کہ اس کا ثواب مردوں کو پہنچتا ہے۔ (ابن کثیر)

وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ (۴۰:۵۳) ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَىٰ (۴۱:۵۳) "اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی پھر اس کی پوری جزا اسے دی جائے گی" لہذا کسی انسان کی سعی، اس کے کسی عمل اور کسب کو ضائع نہ کیا جائے گا اور کوئی چیز اللہ کے علم اور اس کے ترازو سے چھوٹ نہ جائے گی۔ ہر شخص کو اس کی جدوجہد کا پورا پورا اجر دیا جائے گا نہ کمی ہوگی اور نہ ظلم ہوگا۔

یوں انفرادی ذمہ داری کا اصول طے کر دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ یقین دہانی بھی کر دی جاتی ہے کہ مکمل انصاف ہوگا۔ یوں انسان کے لئے انسانی قیمت متعین ہوگی کہ وہ ایک عقلمند، ذمہ دار، قابل اعتماد مخلوق ہے اور خود مختار ہے۔ یہ ایک مکرم مخلوق ہے۔ اس کے لئے عمل کی فرصت فراہم ہوگی اور پھر وہ اس موقعہ پر جو عمل کرے گا اس پر اسے جزاو سزا ہوگی اور ای جزاو سزا میں مکمل انصاف ہوگا۔ اس کے ساتھ یہ مطلق انصاف ہوگا اس میں کسی کی خواہش نفس کا دخل نہ ہوگا اور نہ کسی جہالت کی وجہ سے کوئی حقیقت شمار سے رہ جائے گی۔

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی (۵۳ : ۴۲) "اور یہ کہ آخر کار پہنچنا تیرے رب ہی کے پاس ہے" لہذا کوئی اور راستہ نہیں ہے جو بھی راستہ ہے اس کی انتہا اللہ کے دربار پر ہوتی ہے ۔ اللہ کے سوا کوئی اور جائے پناہ نہیں ۔ صرف اس کی پناہ گاہ ہے یا جنتوں میں ہے اور یا دوزخ میں ہے ۔ اس حقیقت کا اثر انسانی شعور انسانی تصور اور انسانی عمل پر بہت ہی گہرا ہوتا ہے ۔ جب انسان یہ محسوس کرے گا کہ آخر کار اسے اللہ کے پاس جانا ہے اور یہی ہر چیز کا انجام ہے ۔ ہر فرد بشر کا انجام ہے تو انسان محسوس کرتا ہے کہ اللہ کے حضور حاضری کے سوا تو کوئی چارہ نہیں لہذا وہ اپنے طرف عمل اور اپنے نفس کو اس کے لئے تیار کرتا ہے اور اس معاملے میں وہ سب کچھ کرتا ہے جو اس کے استطاعت میں ہو اور اس کا قلب ونظر اپنے آخری انجام کے ساتھ متعلق ہوتے ہیں اور اس کی نظریں آخری انجام پر لگی ہوتی ہے ۔

انسانی سوچ کو اس آخری انجام اور آخری منزل تک پہنچا کر اسے پھر دنیا کے معاملات کی طرف واپس لایا جاتا ہے کہ اس دنیا میں بھی تمام امور اللہ کی مشیت کے مطابق طے ہوتے ہیں ۔ اگرچہ انسان مختار ہے اور ذمہ دار ہے ۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰی (۵۳ : ۴۳) "اور یہ کہ اس نے ہنسایا اور اسی نے رلایا" اس آیت کے ضمن میں بہت ہی بڑے حقائق آتے ہیں اور اس آیت میں حکمت و دانش کے کئی رنگ ہیں کئی تصاویر ہیں ۔ پہلا معنی تو یہ ہے کہ اللہ نے انسان کے اندر ہنسنے اور رونے کی صلاحیت رکھی ۔ یہ دونوں صفات اسی انسان کی تخلیق کے رازوں میں سے راز ہیں ۔ انسان کو معلوم نہیں کہ وہ کس طرح روتا ہے اور ہنستا ہے ۔ انسان کی پیچیدہ تخلیق میں کس طرح ان دونوں متضاد صفات اور تاثرات کو ایک جگہ رکھ دیا گیا ہے ۔ انسان کی نفسیاتی پیچیدگیاں اس کی عضویاتی پیچیدگیوں سے کم نہیں ہیں اور اس کے اندر کی عضویاتی اور نفسیاتی جذبات اور موثرات ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہیں اور اس کے اعضاء اور نفسیاتی عمل رونے اور ہنسنے کے عمل میں باہم اشتراک سے کام کرتے ہیں ۔

اس نے ہنسایا اور رلایا یعنی بیک وقت انسان روتا بھی ہے اور ہنستا بھی اور اللہ نے اسباب فراہم کر دیے اور ان دونوں صفات کو ایک پیچیدہ راز قرار دیا کہ بعض اسباب پر انسان رونے لگتا ہے اور بعض پر ہنسنے لگتا ہے ۔ آج ایک چیز اسے رلاتی ہے اور کل اسی کی وجہ سے وہ ہنستا ہے اور آج وہ ہنستا ہے اور کل اسی کی وجہ سے روتا ہے ۔ یہ نہیں ہے کہ اسے جنون لاحق ہوتا ہے نہ وہ بھول جاتا ہے بلکہ نفسیاتی حالات ایسے ہوتے ہیں ۔ نفسیاتی حالات میں تبدیلی ہوتی ہے ۔ بعض اقدار ' بعض اسباب ' بعض تقریبات اور بعض محرکات ایسے ہوتے ہیں جو کبھی رلاتے ہیں اور کبھی ہنساتے ہیں اور انسانی شعور ایک ہی حالت میں نہیں رہتا ۔

یہ بھی ایک رنگ ہوتا ہے کہ ایک ہی واقعہ سے ایک فریق روتا ہے اور دوسرا اس واقعہ سے ہنستا ہے ۔ ایک ہی واقعہ کا اثر دونوں پر الگ الگ ہوتا ہے ۔ یہ ہوتے ہیں حالات موثرات اور کسی ایک واقعہ کے بارے میں نفسیاتی رد عمل ۔ ایک ہی واقعہ پر ایک ہی شخص کبھی روتا ہے کبھی ہنستا ہے ۔ آج کسی واقعہ پر وہ خوش ہے ہنستا ہے لیکن کل اسی واقعہ کے برے نتائج سامنے آتے ہیں تو روتا ہے ۔ اس وقت اسکی تمنا ہوتی ہے کہ کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا ۔ کئی ایسے لوگ ہیں جو اس دنیا میں رات اور دن ہنستے ہیں اور قیامت میں روئیں گے ۔

یہ ہیں مختلف نقشے ' مختلف حالات اور مختلف موسم اور اس آیت سے ہم ہزار ہا نفسیاتی کیفیات کا اخراج کر سکتے ہیں ۔

یہ حس و شعور کی بات ہے ۔جس قدر کوئی زیادہ نفسیاتی تجربے کرے گا اسے معلوم ہو گا کہ ہر تجربے کے بعد جو نفسیاتی صورت حال پیدا ہوتی ہے اس سے انسان ہنستا ہے یا روتا ہے ۔یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ وہ چند الفاظ کے اندر ایک ایسا آئینہ پیش کرتا ہے کہ اس میں جو چاہے جہاں چاہے اپنی صورت دیکھے ۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا (۵۳ : ۴۴) "اور یہ کہ اس نے موت دی اور زندگی بخشی" اسی طرح اس آیت سے بھی موت و حیات کی لاتعداد صورتیں نکلتی ہیں اور انسان اپنے احساس کو تیز کر کے گنوا سکتا ہے ۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ اللہ نے موت و حیات کو پیدا کیا جیسا کہ دوسری سورت میں کہا ہے ۔

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ "جس نے موت و حیات کو پیدا کیا" موت و حیات دونوں کا تکرار انسانی سوسائٹی میں ہوتا رہتا ہے لہٰذا ہر کوئی موت و حیات کو جانتا ہے لیکن اگر انسان موت و حیات کا راز معلوم کرنا چاہے تو یہ بہت ہی سربستہ راز ہو جاتے ہیں ۔ موت کی حقیقت کیا ہے اور حیات کا راز کیا ہے؟ تو انسان ان کی حقیقت کی تعبیر اپنے الفاظ میں نہیں کر سکتا نہ ان کی کوئی شکل و صورت متعین کر سکتا ہے ۔ ایک زندہ انسان کے ڈھانچے میں حیات کس طرح داخل ہو گئی ۔ یہ ہے کیا اور کہاں سے آتی ہے اور اس انسانی ڈھانچے کے روئیں روئیں میں کس طرح آگئی ۔ یہ کس طرح اس زندہ انسان یا زندہ کائنات میں سرایت کر گئی؟ اور موت کیا ہے؟ کس طرح یہ زندگی نکلی اور موت آگئی ۔ یہ ایک راز ہے اور پس پردہ ہے اور اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔

اس نے زندہ کیا اور مارا' اس سے موت و حیات کی کئی ملین صورتیں سامنے آتی ہیں ۔ اس زمین میں زندہ چیزوں کے کئی جہاں ہیں ۔ایک لمحے میں کئی کئی ملین چیزیں مرتی ہیں اور کئی کئی ملین زندہ ہوتی ہیں ان میں زندگی داخل ہوتی ہے اور اس راز کو آج تک صرف اللہ ہی جانتا ہے ۔کئی ایسی اموات ہیں جو دوبارہ زندگیوں کا باعث اور سبب بنتی ہیں ۔ صدیوں سے یہ صورتیں ظاہر ہوتی چلی آئی ہیں ۔جب انسان صدیوں کا تصور کرتا ۔ انسان کی پیدائش سے بھی پہلے کے زمانے سے تو یہاں موت و حیات کی کئی قسمیں جاری ہیں ۔

یہ تصاویر کی لاانتہا تعداد ہے جو نمودار ہوتی ہے ۔ ان مختصر کلمات سے یہ تصاویر ظاہر ہوتی ہیں اور انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ انسان اپنے اوپر کنٹرول اور ضبط نہیں کر سکتا اور اس پر عجیب اثر ہوتا ہے ۔

وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى (۵۳ : ۴۵) مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى (۵۳ : ۴۶) "اور اس نے نر اور مادے کا جوڑا پیدا کیا ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے" یہ بھی ایک عظیم حقیقت ہے جو اس دنیا میں ہر لمحے میں واقع ہوتی ہے چونکہ یہ عظیم واقعہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے ۔ اس لئے انسان اسے بھول جاتا ہے حالانکہ یہ ایک ایسا معجزہ اور عجوبہ ہے جو تمام تخیلاتی عجوبوں سے زیادہ عجیب ہے ۔

ایک نطفہ' ایک بوند جو گرتی ہے جو انسانی جسم کا ایک لیسدار مادہ ہے اور یہ اسی قدر زیادہ ہے جس طرح پسینہ ' آنسو اور دوسرے مواد ۔ ایک وقت گزرنے کے بعد یہ کیا سے کیا بن جاتا ہے پھر یہ مرد اور عورت کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ مذکر و

مونث بن جاتا ہے اور یہ معجزہ کس طرح رونما ہوتا ہے ۔ اگر یہ واقع نہ ہوتا تو ہم اس کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتے تھے ۔ یہ انسان جو ایک قوی اور شدید اور سخت باڑی رکھتا ہے ۔ یہ کہاں تھا؟ یہ اس سیال نطفے میں کہاں چھپا ہوتا تھا بلکہ اس نطفے کے کئی ملین اجزاء میں سے یہ ایک تھا ۔ اس کی ہڈیاں کہاں تھیں ۔ گوشت کہاں تھا جلد اور رگیں کہاں تھیں ۔ بال اور ناخن کہا تھے اور اس کی خصوصیات اور صلاحیتیں کہاں تھیں اور اس کے اخلاق اور اس کا مزاج کہاں تھا ۔ ایک مائیکروسکوپ سے دیکھا جانے والا خلیہ جس کے ساتھ اور کئی ملین ایسے خلیے موجود ہیں اور یہ سب ایک ہی نطفے میں ہیں جو بوند کی شکل میں نکلتا ہے ۔ اس خلیے میں خصوصاً مذکر و مونث کا نقشہ کیا تھا ۔ آخر کار یہ نقشہ جنین کے اندر ظاہر ہوا ۔

کوئی ایسا ذی عقل انسان نہیں ہو سکتا جو اس عظیم حقیقت پر تدبر کرے اور پھر وہ ششدر نہ رہ جائے ۔ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ اس عظیم معجزے کا کوئی انکار کر دے اور غرور و سرکشی کر کے یہ کہے ”بھائی یہ اسی طرح ہوتا ہے بس جائیے والسلام“ اور یہ کام یونہی ہو گیا فقط ”اسی طرح مرد و عورت پیدا ہو گئے اور بس ، ہم زیادہ نہیں جانتے“ یا کوئی زیادہ تعلیم یافتہ بننے کی کوشش کرے اور کہے کہ یہ واقعات اس طرح ہوئے کیونکہ اس مواد میں از روئے فطرت یہی استعداد تھی اور تمام زندہ چیزوں کے اندر تناسل کی یہ صلاحیت ہے لیکن اس کا جواب پھر سوال اور تشریح کا محتاج ہے ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ استعداد کس نے ودیعت کر دی اور یہ جذبہ کس نے ہر چیز کو دیا کہ وہ خود کار طریقے سے حفظ نوع اور تسلسل حیات کے لئے کام کرے ۔ پھر یہ قوت ان چیزوں کو کس نے دی کہ وہ ایک ضعیف حالت سے تومند حالت تک پہنچیں ۔ یہ راستہ کس نے بتایا اور یہ خواہش کس نے رکھی اور ہر چیز کے اندر اس کے نوع کے خواص کس نے رکھے اور ان کے اندر اس نوع کی چیزوں کو دوبارہ پیدا کرنے کے خواص کس نے رکھے ۔ ظاہر ہے کہ ایک قوت مدبرہ ہے جو اپنے ارادے اور حکم اور اذن سے ان معاملات کو چلا رہی ہے اور ہر چیز کو ایک متعین راہ اور طریقے پر چلاتی ہے ۔

اور پھر اس پہلی پیدائش سے جو ناقابل انکار حقیقت ہے ۔ اللہ انسان کو دوسری پیدائش کی طرف متوجہ فرماتا ہے ۔

وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى (۵۳ : ٤٧) ”اور یہ کہ دوسری زندگی بخشنا بھی اس کے ذمہ ہے“

دوسری زندگی تو ایک غیب ہے لیکن پہلی زندگی دوسری پر دلیل ہے ۔ دلیل یوں ہے کہ جب پہلی بار ایک قوت نے انسان کو پیدا کیا تو دوسری بار بھی وہ پیدا کر سکتی ہے ۔ وہ ذات جس نے زوجین کو ایک نطفے سے پیدا کیا اور یہ تمہارا مشاہدہ ہے ۔ اس بات پر قادر ہے کہ ان ہڈیوں اور مٹی کو دوبارہ جمع کر کے تمہیں اٹھا دے کیونکہ ہڈیوں اور مٹی کو جمع کرنا نطفے کے پانی کے اندر موجود ایک خلیے سے بڑھا کر پیدا کرنے سے مشکل نہیں ہے ۔ یہ کام دوبارہ بھی واقع ہو سکتا ہے مثلاً وہ تدبیر جس کے نتیجے میں ایک نطفہ نہایت ہی چھوٹے جرثومے سے ایک طویل راہ سے گزر کر ایک مکمل مرد اور عورت کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ اسی تدبیر کے ذریعے سے اللہ قیامت میں سب کو اٹھائے گا تاکہ ہر کسی کو اس کے کئے کے مطابق جزاو سزا دے ۔ کیونکہ دوبارہ اٹھانے کا مقصد زندگی کی تکمیل ہے جو یہاں مکمل نہ تھی ۔ عالم آخرت میں ہر چیز اپنے کمال کو پہنچے گی لہذا ضروری ہے کہ اس میں تخلیق کی ٹیکنالوجی بھی اس دنیا کی تخلیق سے زیادہ پیچیدہ ہو ۔ لہذا پہلی تخلیق کی دلالت دوسری تخلیق پر دو طرح کی ہے ایک یہ کہ دوسری تخلیق ممکن ہے اور دوسری یہ ہے کہ وہ ضروری ہے کہ وہاں مکمل جزاو سزا مل سکے اور ادھوری زندگی مکمل ہو ۔ اور اس زندگی میں اور دوسری زندگی دونوں میں اللہ جسے چاہے غنی اور مالدار بنا دے ۔

وَ اَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰی وَ اَقْنٰی (۵۳:۴۸) "اور یہ کہ اس نے غنی کیا اور جائیداد بخشی" اس نے دنیا میں جس کو چاہا مختلف پہلوؤں سے غنی بنا دیا۔ مال کے لحاظ سے غنی' صحت کے لحاظ سے غنی' اولاد کے لحاظ سے غنی' فکر کے لحاظ سے غنی اور اللہ کے تعلق کے لحاظ سے غنی اور یہ سب سے بڑا غنی ہوتا ہے اور جسے وہ چاہے گا آخرت میں غنی کر دے گا۔

اسی طرح جو جائیداد وہ چاہے دیدے' یہاں دیدے یا آخرت میں دیدے۔ لوگ تو فقرا اور محتاج ہیں۔ یہ غنی اور مالدار اللہ ہی کے خزانوں سے ہو سکتے ہیں۔ وہ دولت دیتا ہے اور وہی جائیداد دیتا ہے۔ یہ تو وہ بات ہے جسے وہ عملاً پاتے ہیں اور ان کے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جن کو اللہ نے دیا اس لئے انہیں جگایا جاتا ہے کہ اللہ ہی کے خزانہ عامرہ کی طرف نظریں اٹھاؤ۔ اللہ کے سوا دوسرے خزانے ہیچ اور خالی ہیں۔

وَ اَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی (۵۳:۴۹) "اور وہی شعریٰ کا بھی رب ہے" شعریٰ وہ ستارہ ہے جو سورج سے بیس گنا بڑا ہے اور وہ سورج سے بھی دور کئی ملین دور ہے۔ عربوں میں بعض لوگ اس ستارے کو پوجتے تھے۔ بعض لوگ اسے ایک ذی شان ستارے کے طور پر دیکھتے تھے۔ لہٰذا یہاں یہ تاکید کرنا کہ اللہ شعریٰ کا بھی رب ہے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے خصوصاً ایسی سورت میں جس میں ستارے کی قسم اٹھائی گئی ہے اور جس میں عالم بالا کے سفر کا ذکر ہو اور جس میں عقیدہ توحید اور رد شرک موضوع ہو۔

یہاں آکر انفس اور آفاق کا یہ طویل مطالعاتی سفر ختم ہوتا ہے اور اس کے بعد اب انسانی تاریخ کی وادی میں ہم داخل ہوتے ہیں۔ انسانی تاریخ اور اس کے عبرت آموز آثار کو تو قرآن بہت اہمیت دیتا ہے۔

وَ اَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا۟ الْاُوْلٰی (۵۰) وَ ثَمُوْدَا۟ فَمَاۤ اَبْقٰی (۵۱) وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَ اَطْغٰی (۵۲) وَ الْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰی (۵۳) فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰی (۵۴) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰی (۵۵) (۵۳: ۵۰ تا ۵۵) "یہ کہ اسی نے عاد اولیٰ کو ہلاک کیا اور ثمود کو ایسا تباہ کیا کہ اس میں سے کسی کو نہ چھوڑا اور ان سے پہلے قوم نوح کو تباہ کیا کہ وہ تھے ہی سخت ظالم اور سرکش لوگ اور اوندھی گرنے والی بستیوں کو اٹھا کر پھینکا پھر چھا دیا ان پر وہ جو (تم جانتے ہو کہ) کیا چھا دیا۔ پس اے انسان اپنے رب کی کن کن نعمتوں میں تو شک کرے گا"

یہ ایک سرسری نظر ہے جس میں ایک ایک امت پر مختصر نگاہ ڈالی جاتی ہے اور اس کے انجام کو دکھا کر انسانی شعور کو چٹکی دی جاتی ہے کہ وہ بیدار ہو۔

عاد' ثمود اور قوم نوح کو تو قرآن کے قاری جانتے ہیں اور کئی جگہ یہ قصص مذکور ہیں۔ موتفکہ کا لفظ افک بمعنی بہتان اور ضلالت سے ہے۔ (وہ بستیاں جو الٹ دی گئیں' لوط کی قوم کی بستیاں تھیں۔) ان بستیوں کے بارے میں یہ کہ ان بستیوں پر چھا گیا جو چھا گیا اس میں عذاب کو زیادہ خوفناک اور عظیم دکھانے کے لئے نام نہیں لیا گیا یعنی بربادی' آتش فشانی کے ذریعے جو بربادی بھی آپ تصور کر سکتے ہیں وہ ان پر چھا گئی لہٰذا بیان کی ضرورت نہیں۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰی (۵۳ : ۵۵) "اپنے رب کی کن نعمتوں میں تو شک کرے گا" کیا یہ تباہیاں اللہ کے انعامات تھے؟ تو یہ اللہ کا فضل و کرم تھا کہ اس نے شر اور برائی کو برباد کر دیا۔ حق کو باطل پر گرایا اور اس کا بھیجا نکالا اور وہ ختم ہو گیا۔ کیا بعد میں آنے والوں کے لئے اس میں عبرت نہیں؟ وہی فضل و کرم ہے اور اس میں شک نہیں ہے اور نہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ خطاب ہر شخص کو ہے۔ ہر دل کو ہے۔ یہ اس شخص کے لئے جو اللہ کے کاموں پر غور کرتا ہے تو اسے مصیبتوں میں بھی اللہ کا فضل و کرم نظر آتا ہے۔

انفس و آفاق کے دلائل و شواہد گنوانے کے بعد اور انسانی تاریخ کے اہم عبرت آموز واقعات کی طرف سرسری اشارہ کرنے کے بعد آخری ضرب عقل و خرد کے تاروں پر، آخری مضراب لیکن ذرا سخت گویا یہ ایک سخت پکار ہے، چلا کر کہ خطرہ قریب ہے خبردار۔

هٰذَا نَذِیْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰی (۵۶) اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ (۵۷) لَیْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ (۵۸) (۵۳ : ۵۶ تا ۵۸) "یہ تنبیہ ہے پہلے آئی ہوئی تنبیہات میں سے۔ آنے والی گھڑی قریب آلگی ہے۔ اللہ کے سوا کوئی اس کو ہٹانے والا نہیں ہے۔" یہ رسول جس کی رسالت اور جس کے ڈراوے میں تم شک کرتے ہو۔ یہ انہیں رسولوں میں سے ہے جنہوں نے اسی طرح اپنی اقوام کو ڈرایا اور یہ سخت معیبت اور کھڑکھڑا دینے والی گھڑی ہے یا وہ اس دنیا ہی کا کوئی عذاب ہے اور جس کو ٹالنا ممکن نہیں سوائے اس کے کہ اللہ ٹال دے۔

لَیْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ (۵۳ : ۵۸) "اللہ کے سوا اس کو کوئی ہٹانے والا نہیں ہے۔" تم پر تو خوفناک عذاب آنے والا ہے بہت قریب ہے۔ ڈرانے والے ناصح اور صادق و امین تمہیں ڈرا رہے ہیں۔ چیخ چیخ کر لیکن تم غفلت ہی میں آگے ہی جا رہے ہو تمہیں اندازہ نہیں کہ مشکل وقت ہے تم باز نہیں آتے ہو۔

اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِیْثِ تَعْجَبُوْنَ (۵۹) وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ (۶۰) وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ (۶۱) (۵۳ : ۵۹ تا ۶۱) "اب کیا یہی باتیں ہیں جن پر تم اظہار تعجب کرتے ہو، ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو؟ اور گا بجا کر انہیں ٹالتے ہو۔" یہ تو ایک سنجیدہ گفتگو ہے اور لوگوں پر عظیم فرائض عائد کرتی ہے اور یہ گفتگو ایک مکمل نظام حیات کی گفتگو ہے تو تمہیں اس پر تعجب کیا ہو رہا ہے اور تم ہنستے کیوں ہو۔ یہ تو دو ٹوک سنجیدہ بات ہے اور جس کے یہ عظیم نتائج و ذمہ داریاں ہیں۔ اس زمین پر لوگوں کی جو زندگی ہے اس پر ان کو جواب دینا ہے۔ تمہیں تو اس کی فکر کرنی چاہئے۔ ہنسنے کا مقام نہیں رونے کا مقام ہے۔ ایک ہولناک اور خوفناک موقع آنے والا ہے جہاں کرب عظیم ہوگا۔ اب ایک آخری چیخ۔ ایک پوری آواز سے پکار جو دلوں کو ہلا دیتی اور کانوں کو پھاڑ دیتی ہے کہ لوگو، جہنم سے بچو، تدارک کرو اپنے آپ کو بچاؤ۔

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (۵۳ : ۶۲) ع (السجدۃ) "جھک جاؤ اللہ کے آگے اور بندگی بجا

لاؤ" یوں اس انداز میں یہ بلند آواز دی جاتی ہے اور ایک طویل تمہید کے بعد یہ چیخ ہے جس سے دل دہل جاتے ہیں اور سخت سے سخت اعصاب کے اندر بھی ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کفار نے اس کو سن کر سجدہ کر لیا۔ سجدہ ریز ہو گئے حالانکہ وہ مشرک تھے۔ وہ وحی میں شک کرتے تھے۔ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہر وقت وہ جھگڑتے رہتے تھے۔

انہوں نے ان حالات میں سجدہ کیا کہ وہ اس پوری سورت کے اندر خوفناک انجام کو سن چکے تھے۔ حضور اکرم ﷺ ایک پرسوز انداز میں تلاوت فرما رہے تھے۔ حرم میں مسلم اور مشرک سب بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے سجدہ کیا۔ مسلمانوں نے سجدہ کیا تو مشرکین بھی بے ساختہ گر پڑے۔ وہ اس پرتاثیر کلام الٰہی کے مقابلے میں ٹھہر نہ سکے۔ شیطان بھی ان کو روک نہ سکا۔ جب ان پر سے یہ اثر ختم ہوا تو وہ اس اثر کو بھی بھول گئے اور اس بات کو بھی بھول گئے کہ انہوں نے سجدہ کیا ہے۔

روایات تواتر ہیں کہ اس سورت کو سن کر مشرکین نے سجدہ کیا۔ اس کے بعد لوگوں نے اس واقعہ کی تاویل اور تجزیہ اپنے اپنے خیال کے مطابق کیا ہے حالانکہ یہ عجیب واقعہ نہ تھا۔ یہ تو قرآن مجید کی تاثیر کا ایک نمونہ تھا جس کے سامنے ایک بار تو سخت سے سخت دل بھی گھائل ہو جاتا ہے۔

---ooo---

یہ واقعہ جس کے بارے میں روایات تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں، مشرکین مکہ کے سجدے کا واقعہ ہے۔ میں بھی سمجھتا تھا کہ اس پر تبصرہ ضروری ہے اور اس کا تجزیہ کرنا چاہئے لیکن اس کے بعد مجھے اس واقعہ کا ایک شعوری تجربہ بھی ہوا اور میں نے اپنے دل میں اس پر غور کیا اور مجھے معلوم ہوا کہ اس کا اصل سبب کیا تھا۔

اور میں نے اس سے قبل، یہ ذیلی روایات پڑھ رکھی تھیں جو "حدیث غرانیق" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ حدیث ابن سعد نے طبقات میں، ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں اور بعض مفسرین نے آیت ۲۲ : ۵۲ کی تفسیر میں نقل کی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِه فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِه وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۲۲ : ۵۲) "اے نبی، تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول بھیجا ہے نہ نبی کہ جب اس نے تمنا کی، شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ اس طرح شیطان جو کچھ خلل اندازیاں کرتا ہے اللہ انکو مٹا دیتا ہے اور انہی آیات کو پختہ کر دیتا ہے۔ اللہ علیم ہے اور حکیم ہے۔" ان روایات کے بارے میں علامہ ابن کثیر نے فرمایا کہ ان میں سے کوئی روایت بھی سند صحیح کے ساتھ روایت نہیں ہوئی۔ ان میں سے مفصل ترین، رسول اللہ پر افترا میں کثیر اور خرافات میں کم سے کم آلودہ روایت ابن ابو حاتم کی روایت ہے۔ کہتے ہیں روایت بیان کی موسیٰ ابن الاموسیٰ کوفی نے، محمد ابن اسحاق شیبی سے، انہوں نے محمد ابن فلیح سے، انہوں نے موسیٰ ابن عقبہ سے، انہوں نے ابن شہاب سے، وہ کہتے ہیں سورت النجم نازل ہوئی۔ مشرکین ان دنوں کہتے تھے کہ اگر یہ شخص ہمارے الہٰوں کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کر دے تو ہم اسے اور اس کے ساتھیوں کو تسلیم کر لیں لیکن یہ شخص اپنے دین کے دوسرے مخالفوں کا مثلاً یہود و نصاریٰ کا ذکر ان الفاظ میں نہیں کرتا جن میں یہ ہمارے الہٰوں کا ذکر

کرتا ہے ۔ ہمیں تو یہ سب دشنام کرتا ہے ۔ یہ وہ دور تھا کہ حضور اکرم اور آپ کے ساتھیوں کو سخت اذیتیں دی جا رہی تھیں اور آپ ان کی گمراہی کی وجہ سے نہایت ہی پریشان رہتے تھے ۔ تو آپ یہ تمنا کرتے تھے کہ یہ لوگ ہدایت پر آجائیں ۔ جب اللہ نے سورت النجم نازل کی اور اس میں یہ آیت آئی ۔

اَفَرَاَیْتَ الَّذِیْ تَوَلّٰی (۵۳:۳۳) وَاَعْطٰی قَلِیْلًا وَّاَکْدٰی (۵۳:۳۴) تو شیطان نے ان آیات سے متصلاً بعد اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کر دیئے ۔

انهن الغرانيق العلٰى و ان شفاعتهن لترتجى "اور بے شک یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں اور ان کی سفارش کی توقع کی جاتی ہے" ۔

یہ شیطان نے اپنی جانب سے سجع ملایا تھا ۔ یہ الفاظ مکہ میں ہر مشرک نے سن لئے اور ان کے دل میں بیٹھ گئے اور اس کی وجہ سے ان کی زبانیں خاموش ہو گئیں اور انہوں نے ان الفاظ کے آنے پر ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رجوع کر کے اپنے سابق دین پر آگیا ہے ۔ جب رسول اللہ سورت کے آخر تک پہنچے تو آپ نے سجدہ کیا اور محفل میں جو مسلم اور مشرک بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے سجدہ کر لیا ۔ ولید ابن مغیرہ بوڑھا آدمی تھا ۔ اس نے زمین سے مٹی اٹھائی اور اس پر سجدہ کر دیا ۔ دونوں فریقوں نے تعجب کیا کہ حضور کے ساتھ تمام لوگ کس طرح سجدہ ریز ہو گئے ۔ مسلمانوں کو تعجب یوں ہوا کہ مشرکین نے سجدہ کر لیا حالانکہ وہ ایمان نہیں لائے تھے ۔ بغیر ایمان و تصدیق کے سجدہ کر لیا ۔ مسلمانوں نے وہ الفاظ نہ سنے تھے جو شیطان نے ادا کر دیئے تھے اور جن کو مشرکین نے سن لیا تھا ۔ تو مشرکین مطمئن ہو گئے کہ شیطان حضور کی تمنا میں یہ بات ڈال دی اور مشرکین کے کانوں میں یہ بات ڈال دی کہ یہ الفاظ حضورؐ نے پڑھے ہیں تو انہوں نے اپنے الہوں کی تعظیم میں سجدہ کیا ۔ یہ بات لوگوں کے اندر بہت ہی مشہور ہو گئی اور شیطان نے اسے یوں پھیلا دیا کہ حبشہ تک پہنچ گئی ۔ جہاں بعض مومنین آباد تھے یعنی عثمان ابن مظعون اور ان کے ساتھی ۔ ان کو بتایا گیا کہ اہل مکہ مسلمان ہو گئے ہیں اور انہوں نے رسول اللہ کے ساتھ نماز پڑھی ہے اور ان کو یہ بات بھی پہنچی کہ ولید ابن مغیرہ نے ہاتھ میں مٹی لے کر اس پر سجدہ کیا ۔ ان کو بتایا گیا کہ اب مکہ میں مسلمان پر امن ہیں چنانچہ حبشی مہاجرین جلدی سے لوٹے ۔ اس دوران اللہ نے اس شیطانی حرکت کے (اثرات) کو منسوخ کر دیا تھا اور اپنی آیات کو محکم کر دیا تھا اور افترا سے بچا لیا تھا اور اللہ نے فرمایا ۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ ..... جب اللہ نے اپنا فیصلہ دے دیا اور شیطانی سجع کو منسوخ کر دیا تو مشرکین بھی اپنی گمراہی اور دشمنی کی طرف لوٹ گئے اور انہوں نے پھر از سر نو مسلمانوں پر تشدد شروع کر دیا ۔

بعض روایات ایسی ہیں جن میں مذکورہ بالا عبارت (غرانیق) کو حضور اکرم کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور یہ وجہ بیان کی ہے کہ (نعوذ باللہ) حضور چاہتے تھے کہ کسی طرح لوگ مسلمان ہو جائیں اور قریش کے ساتھ کسی طرح مصالحت ہو جائے ۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے پڑھتے ہی ان روایات کا انکار کیا ہے کیونکہ ان کو تسلیم کرنے کے بعد عصمت انبیاء اور وحی کی حفاظت پر یقین نہیں رہ سکتا اور یہ روایات نہایت لغو ہیں اور قرآن مجید میں تحریف کے امکان کی راہ کھولتی ہیں

لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود سورت کی عبارت بھی ان الفاظ کے متحمل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے ان الفاظ کو شیطان کے الفاظ قرار دیا ہے وہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اس سورت کے الفاظ کے ساتھ ادا ہوئے ہوں اور مشرکین نے اس سے وہ تاثر لیا ہو جس کا ان روایات میں ذکر ہے کیونکہ مشرکین عرب تھے۔ وہ عربی زبان خوب سمجھتے تھے۔ جب انہوں نے (غرانیق) والی عبارت سنی اور اس کے بعد پھر متصلاً انہوں نے یہ آیت سنی۔ اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَلَہُ الْاُنْثٰی (۲۱) تِلْکَ اِذًا قِسْمَۃٌ ضِیْزٰی (۲۲) اِنْ ھِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ (۵۳: ۲۳) "کیا بیٹے تمہارے لئے ہیں اور بیٹیاں خدا کے لئے؟ یہ تو پھر بڑی دھاندلی کی تقسیم ہوئی۔ دراصل یہ کچھ نہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔" کیا وہ اس عبارت کا مفہوم بھی نہ سمجھے اور اس کے بعد انہوں نے سنا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ لَیُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِکَۃَ تَسْمِیَۃَ الْاُنْثٰی (۲۷) وَمَا لَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (۵۳: ۲۸) "مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ فرشتوں کو دیویوں کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں حالانکہ اس معاملہ کا کوئی علم انہیں حاصل نہیں ہے۔ وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان حق کی جگہ کچھ کام نہیں دے سکتا۔" اور اس سے قبل وہ یہ بھی سنتے ہیں۔

وَکَمْ مِّنْ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُھُمْ شَیْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰہُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرْضٰی (۵۳: ۲۶) "آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں ان کی شفاعت کچھ کام نہیں آسکتی جب تک کہ اللہ کسی ایسے شخص کے حق میں اس کی اجازت نہ دیدے جس کے لئے وہ کوئی عرضداشت سننا چاہے اور اس کو پسند کرے" یہ مشرکین جو عرب تھے اور کلام کو اچھی طرح سمجھتے تھے وہ کس طرح رسول اللہ کے ساتھ سجدہ کر سکتے تھے کیونکہ اس سورت میں تو یہ کلام درست ہی نہیں رہتا۔ ان کے بتوں کی تعریف اور یہ کہ ان کی شفاعت قبول ہوگی۔ یہ تو تسلیم شدہ ہی نہیں رہتی۔ وہ اس قدر غبی تو تھے نہیں جس طرح یہ لوگ غبی تھے جنہوں نے یہ روایات نقل کی ہیں یا تصنیف کی ہیں جن کو آج کل مستشرقین ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں یا جہالت کی وجہ سے مطلب براری کے لئے۔

جہاں تک مشرکین کے سجدے کی بات ہے تو یہ درست ہے اور یہ کسی اور وجہ سے ہوا ہوگا۔ اس طرح مہاجرین بھی حبشہ سے کسی اور وجہ سے لوٹے ہوں گے۔ یہاں ہم مہاجرین کی واپسی کی تحقیق تو نہیں کر سکتے کہ وہ واپس آئے اور پھر دوبارہ حبشہ کو چلے گئے۔ ہاں یہاں مشرکین کے سجدے کی بات ضروری ہے۔

میں ایک عرصہ تک غور کرتا رہا کہ مشرکین نے یہ بے ساختہ سجدہ کیوں کیا۔ میرے ذہن میں ایک احتمال یہ آتا ہے کہ

ایسا ہوا ہوگا۔ روایات میں آتا ہے کہ مہاجرین حبشہ دو یا تین ماہ کے بعد حبشہ سے واپس آگئے تھے۔ یہ بھی محتاج توجیہ نقل ہے۔ بہرحال میں اس نکتے پر غور ہی کر رہا تھا کہ مجھے ایک شعور اور عملی تجربے سے گزرنا پڑا جس کی طرف اس سے قبل میں نے اشارہ بھی کیا ہے۔

ایک دفعہ ہم بعض دوستوں کے ساتھ رات کو گھوم رہے تھے کہ ہم نے قریب ہی ایک قاری کی قرات سنی۔ یہ سورت نجم پڑھ رہا تھا۔ ہم خاموش ہوگئے اور قرآن مجید سننے لگے۔ قاری کی آواز بھی بہت ہی خوبصورت تھی اور اس کی قرات بھی بہت ہی اچھی تھی۔

میں اس قاری کے ساتھ چلتا رہا۔ میرا تصور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عالم بالا کی سیر کرتا رہا۔ پھر جبرائیل علیہ السلام کی ملاقات جو ان سے فرشتوں کی اصل صورت میں تھی۔ یہ تجربہ بھی حضور اکرم کے لئے عجیب ہوگا۔ پھر ہم سدرۃ المنتہیٰ اور جنت الماوی کی طرف گئے میں اور اپنے خیال اور تخیل کے ساتھ جا رہا ہوں اور قاری صاحب تلاوت کر رہے ہیں۔ یہ میرا سفر جاری ہے جہاں تک میرا تصور' میرا خیال اور میرا شعور میرا ساتھ دے رہا ہے۔

اس کے بعد میرے احساسات ان تصورات پر مرکوز ہوگئے جو مشرکین فرشتوں کے بارے میں رکھتے تھے۔ ان کی بندگی' ان کا خدا کی اولاد ہونا' ان کی مونث ہونا پھر نطفے سے انسان کی تخلیق کا منظر' ماؤں کے پیٹوں میں جنین کے مناظر اور اللہ کے علم کا احاطہ کا تصور جس قدر میرے لئے ممکن تھا۔

پھر آخری پیراگراف پڑھا گیا اور مجھ پر اثرات پے در پے تھے کہ وہ جہاں جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے ایک وسیع کائنات ہے' پھر حساب و کتاب کے مناظر' پھر یہ منظر کہ انسان جو راہ بھی لے اس کی انتہا پر اللہ سے ملاقات ہوگی۔ اس کے بعد اس جہاں میں ہر طرف رونے والے روتے ہیں اور ساتھ ہی ہنسنے والے ہنستے ہیں۔ اربوں مخلوق زندہ ہوتی ہے تو اربوں فنا ہوتی ہے اور نطفہ یعنی مائیکروسکوپی نقطہ کہاں سے چلتا ہے اور سفر کرتے کرتے کس طرح مذکر اور مونث کی شکل اختیار کر کے ایک قوی ہیکل انسان بن جاتا ہے پھر میرا خیال ان بستیوں میں جاتا ہے جو ہلاک کر دی گئیں جو الٹا دی گئیں اور ان پر ویرانی چھا جاتی ہے یا جو کچھ چھا جاتا ہے۔

اور پھر قاری آخری پکار تلاوت کرتا ہے۔

هٰذَا نَذِيرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْأُولَىٰ (٥٦) أَزِفَتِ الْآزِفَةُ (٥٧) لَيْسَ لَهَا مِن دُونِ اللَّهِ كَاشِفَةٌ (٥٣: ٥٨) "یہ ایک تنبیہ ہے پہلے آئی ہوئی تنبیہات میں سے۔ آنے والی گھڑی قریب آلگی ہے۔ اللہ کے سوا کوئی اس کا ہٹانے والا نہیں ہے۔"

اور اس کے بعد آخری آواز آتی ہے اور میرا پورا بدن کانپ اٹھتا ہے اس خوفناک لاجوابی کے بعد

أَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ (٥٩) وَتَضْحَكُونَ وَلَا تَبْكُونَ (٦٠) وَأَنتُمْ سَامِدُونَ (٥٣: ٦١) "کیا یہی وہ باتیں ہیں جن پر تم اظہار تعجب کرتے ہو؟ ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو اور گا بجا

کر انہیں ٹالتے ہو۔"

اور آخر میں جب میں نے قاری صاحب سے سنا۔

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (۵۳ : ۶۲) (السجدۃ تلاوت) "جھک جاؤ اللہ کے آگے اور بندگی بجالاؤ" تو میرا دل کانپ اٹھا۔ میرے اعصاب جواب دے گئے اور میری حالت ایسی ہوگئی کہ میں جسمانی اعتبار سے نڈھال ہوگیا اور میرے اوپر کپکپی طاری ہوگئی اور میرے لئے کھڑا ہونا مشکل ہوگیا۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور باوجود کوشش کے میں آنسو روک نہ سکا۔

اس وقت مجھے یقین ہوگیا کہ مشرکین مکہ نے جو بے ساختہ سجدہ کیا وہ مجبور تھے کہ ایسا کریں۔ اور اس کا سبب قرآن مجید کا وہ اثر ہے جو ہر شخص پر ہوتا ہے اور کوئی شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس سورت کے اندر جو لفظی ترنم ہے اور جو معنوی سحر آفرینی ہے وہ جسم کے اندر زلزلہ پیدا کر دیتی ہے۔

یہ پہلی بار نہ تھا کہ میں نے سورت نجم سنی ہو یا پڑھی ہو لیکن اس بار مجھ پر اس کا یہ اثر ہوا میرے اندر اس قدر رد عمل پیدا ہوا یہ ہے قرآن مجید کا راز۔ اس کے رد عمل میں کچھ لمحات ہوتے ہیں کہ ایک آیت یا سورت انسان سنتا ہے تو وہ فوراً لبیک کہتا ہے۔ یہ لمحات انتظار کرنے سے نہیں ملتے۔ کچھ لمحات ہوتے ہیں جن میں انسان قوت کے اصل سرچشمے سے مل جاتا ہے اور اس وقت اس پر اثر ہوتا ہے اور وہ کیا سے کیا بن جاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس دن سامعین قرآن کو اس قسم کے لمحات نصیب ہوگئے تھے۔ پھر پڑھنے والے حضرت محمد ﷺ تھے۔ آپ نہایت گہرے خلوص سے پڑھتے تھے۔ آپ کی ذات ان حالات کے اندر خود شریک تھی جو اس سورت میں بیان ہوئیں۔ آپ کی ذات، آپ کی تلاوت اور آپ کا خلوص اس کے اندر گھل مل گیا تھا۔ ان سب چیزوں کے اثر میں سامعین کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ سجدہ ریز ہوگئے اور جب آپ نے پڑھا۔

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (۵۳ : ۶۲) (السجدۃ تلاوت) تو بے ساختہ سب سجدے میں گر گئے۔ آپ بھی گر گئے، مسلمان بھی گر گئے اور کفار بھی گر گئے۔

یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ تم اپنا تجربہ اور اپنی واردات کو بیان کر رہے اور تم تو مسلمان ہو۔ تم اس قرآن پر ایمان رکھتے ہو اور تمہارے دل میں قرآن کا ایک مقام و اثر ہے۔ یہ مشرکین تو سرے سے مومن ہی نہ تھے اور قرآن کے منکر تھے تو انہوں نے کس طرح سجدہ کر لیا۔

لیکن دو باتیں ایسی ہیں جن سے یہ شبہ دور ہو جاتا ہے ایک تو یہ کہ سورت کی تلاوت حضرت محمد ﷺ خود فرما رہے تھے جنہوں نے اس قرآن کو براہ راست اس کے سرچشمے سے لیا تھا اور آپ کی زندگی قرآن سے عبارت تھی اور آپ کو قرآن کے ساتھ اس قدر لگاؤ تھا کہ اگر آپ کسی گھر سے قرآن کی آواز سنتے تو آپ کے قدم بوجھل ہو جاتے اور آپ سننے لگتے۔ اپنے گھر میں بھی اگر وہ سنتے تو دروازے میں کھڑے ہوجاتے اور اندر تب جاتے جب تلاوت ختم ہوتی اور پھر اس سورت میں تو آپ کے وہ لمحات ذکر ہوئے جو آپ نے عالم بالا میں گزارے۔ روح الامین کے ساتھ گزارے اور آپ نے انہیں اپنی اصلی صورت میں دیکھا جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں ایک قاری سے سن رہا تھا۔ اس لئے دونوں میں بہت

بڑا فرق ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ان مشرکین کے دل قرآن کے عظیم تاثیرات سے کس طرح بچ سکتے تھے جبکہ وہ براہ راست حضرت محمد ﷺ سے سن رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ خدا کا کلام ہے البتہ وہ محض عناد میں مبتلا تھے اور یہ ضد اور عناد بھی مصنوعی تھے۔ آنے والے دو واقعات یہ بتائیں گے کہ وہ حضرت محمد ﷺ سے بہت ہی متاثر تھے۔ آپ کی روحانی اور اخلاقی قوتوں کے معترف تھے اس لئے ان کا متاثر ہو کر سجدے میں گر جانا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔

ابن عساکر نے عتبہ ابن ابولہب کے حالات زندگی میں لکھا ہے محمد ابن اسحاق سے، انہوں نے عثمان ابن عروہ سے، انہوں نے ابن الزبیر سے، انہوں نے اپنے والد سے انہوں نے ہبار بن الاسود سے وہ کہتے ہیں ابولہب اور اس کے بیٹے عتبہ شام جانے کے لئے تیار ہوئے۔ میں نے بھی ان کے ساتھ تیاری کی۔ ان کے بیٹے عتبہ نے کہا خدا کی قسم میں محمد ﷺ کے پاس جاؤں گا اور اس کو اس کے رب کے بارے میں اذیت دوں گا۔ یہ نبی ﷺ کے پاس آیا اور کہا اے محمد ﷺ "میں اس شخص کو تسلیم نہیں کرتا جو قریب ہوا اور لٹکا یہاں تک وہ دو کمانوں کے برابر تھا یا قریب تھا۔" تو نبی ﷺ نے فرمایا "اے اللہ اس پر اپنے کتوں میں سے کسی کتے کو مسلط فرما دے" عتبہ واپس ہوا۔ باپ نے پوچھا کہ بیٹے تم نے اسے کیا کہا۔ اس نے واقعہ دہرایا تو اس نے پھر پوچھا کہ اس نے تمہیں کیا جواب دیا۔ تو اس نے بتایا کہ انہوں نے یہ بددعا کی کہ اے اللہ اس پر اپنے کتوں میں سے کسی کتے کو مسلط کر دے تو ابولہب نے کہا بیٹا خدا کی قسم میں اس کی بددعا کے بارے میں تم سے بے فکر نہیں۔ بہرحال ہم چلے یہاں تک کہ ہم ابراہ میں اترے۔ یہ سدہ میں ہے۔ ہم ایک راہب کے گرجے میں جا کر اترے۔ اس نے کہا اہل عرب تم اس راستے سے کیوں آگئے ہو یہاں تو شیر اس طرح پھرتے ہیں جس طرح بھیڑ بکریاں پھرتی ہیں۔ ابولہب نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ دیکھو میں بوڑھا ہوں اور میرا تم پر حق ہے اور اس شخص نے میرے بیٹے کے بارے میں اللہ کے ہاں بددعا کی ہے۔ میں اس سے بہت ڈرتا ہوں لہٰذا اپنے سامان کو اس گرجے میں جمع کرو اور میرے بیٹے کو سامان کے اوپر سلا دو اور اس کے بعد سامان کے ارد گرد تم سو جاؤ۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ رات کو ایک شیر آیا۔ اس نے ہمارے منہ سونگھے۔ اس کو ایک شکار نہ ملا۔ یہ شیر چھلانگ لگا کر سامان کے اوپر چڑھ گیا۔ عتبہ کا منہ سونگھا اس کے بعد اسے خوب دبوچا۔ خوب دبوچا اور اس کے بعد اس کا سر پھوڑ دیا۔ ابولہب نے کہا میں نے بھی کہا تھا کہ یہ محمد ﷺ کی بددعا سے بچ نہیں سکتا۔

یہ واقعہ تو ابولہب کے ساتھ ہوا۔ جو آپ کے شدید ترین مخالفین میں سے تھا اور مخالف ہی نہیں بلکہ مخالفین کا سرخیل تھا۔ آپ کے خلاف لوگوں کو جمع کرتا تھا۔ اور قرآن کریم میں بھی اس کے خلاف بددعا قیامت تک ثبت کر دی گئی ہے۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (۱) مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ (۲) سَيَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (۳) وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (۴) فِیْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (۵) (۱۱۱ : ۱ تا ۵) "ٹوٹ گئے ہاتھ ابولہب کے اور نامراد ہو گیا وہ۔ اس کا مال اور جو کچھ اس

نے کمایا وہ اس کے کسی کام نہ آیا۔ ضرور وہ شعلہ بار آگ میں ڈالا جائے گا اور اس کی جورو بھی لگائی بجھائی کرنے والی' اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہوگی" اور یہ تھا اس کا حقیقی شعور محمد ﷺ کے بارے میں اور حضرت محمد ﷺ کی بددعا سے وہ کس قدر کانپ گیا تھا اور اسے اپنے بیٹے کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تھی۔

دوسرا واقعہ عتبہ ابن ابو ربیعہ کا ہے اس کو قریش نے حضرت محمد ﷺ کے ہاں بھیجا کہ آپؐ سے بات کرے کہ اس تحریک سے باز آجائیں جس نے قریش کے اندر تفریق ڈال دی ہے اور آپ ان کے الہوں پر تنقید کرتے ہیں۔ قریش اس کے لئے تیار ہیں کہ اگر آپ سربراہی چاہیں' مال چاہیں' عورتیں چاہیں' آپ کو دے دیں۔ جب عتبہ ابن ابو ربیعہ نے بات ختم کر دی تو حضور ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تمہاری بات ختم ہوگئی تو اس نے کہا ہاں ختم ہوگئی تو حضورؐ نے کہا پھر میری بات سنو' تو اس نے کہا اچھا کرو تو آپ نے سورت تلاوت کی :۔

حٰمٓ (۱) تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۲) كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۳) بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (۴۱ : ۴) "یہ خدائے رحمان و رحیم کی طرف سے نازل کردہ ایسی کتاب ہے جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں۔ عربی زبان کا قرآن ان لوگوں کے جو علم رکھتے ہیں بشارت دینے والی اور ڈرانے والی مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے" آپ پڑھتے گئے یہاں تک کہ آپ نے پڑھا۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (۴۱ : ۱۳) "اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اس طرح کے اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا عاد و ثمود پر نازل ہوا۔" اس مقام پر عتبہ اٹھا اور حضور کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بہت خوفزدہ ہوگیا اور حضرت نبی ﷺ سے درخواست کی کہ اپنے بھائیوں پر رحم کرو۔ یہ قریش کے پاس واپس ہوا اور ان کے سامنے یہ پورا واقعہ بیان کیا اور ان سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ محمد ﷺ جو بات کہتا ہے وہ جھوٹ نہیں ہوتا۔ اس لئے میں ڈر گیا تھا کہ تم پر عذاب نہ آجائے۔

یہ اس شخص کا حال تھا جس نے اسلام قبول نہ کیا تھا۔ اس کا خوف اور تاثر ظاہر ہے باوجود اس کے کہ یہ لوگ سخت ہٹ دھرمی اور ضد میں انکار پر تلے ہوئے تھے۔

یہی صورت اس وقت پیش آئی جب ان لوگوں نے حضرت محمد ﷺ کے منہ مبارک سے جب سورت نجم سنی تو وہ اس قدر متاثر ہوئے اور ایسے حال میں مبتلا ہوئے کہ وہ رک نہ سکے اور حضور ﷺ اور مسلمانوں کے ساتھ سجدہ ریز ہوگئے کیونکہ بعض لمحات ایسے ہوتے ہیں کہ قرآن کا انسان پر زبردست اثر ہوتا ہے تو انہوں نے بے ساختہ سجدہ کرلیا۔ اس میں نہ کوئی غرانیق کی بات تھی اور نہ کوئی اور بات تھی مثلاً شیطان کی دخل اندازی کی اور جو روایات بھی اس سلسلے میں ہیں وہ سب خود ساختہ ہیں۔

---o-o-o---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ـــ ۲۷

## سورۃ القمر ـ ۵۴

## ا ـــ تا ـــ ۵۵

# سورۃ القمر ایک نظر میں

یہ سورت آغاز سے اختتام تک ایک خوفناک اور سخت حملہ ہے اور اس میں مکذبین کے لئے انجام بد سے سخت ڈراوا ہے کہ تمہارا انجام بہت ہی برا ہونے والا ہے جبکہ مومنین اور تصدیق کرنے والوں کے لئے نہایت پختہ اطمینان کا سامان ہے اور یہ سورت کئی مسلسل حلقوں میں منقسم ہے۔ ہر حلقہ جھٹلانے والوں کی سزا کا ایک منظر ہے۔ ہر حلقے کے آخر میں انسانی احساس کو خوب جھنجھوڑا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ (٥٤: ١٦) "دیکھ کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات" اور اس دباؤ اور جھنجھوڑنے کے بعد احساس کو ذرا آزاد چھوڑ کر کہہ دیا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ (٥٤: ١٧) "ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا ہے پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا۔"

اس سورت کے موضوعات وہی ہیں جو تمام مکی سورتوں میں وارد ہیں۔ آغاز میں قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر ہے اور آخر میں بھی مناظر قیامت میں سے ایک منظر ہے اور ان کے درمیان کے حصے میں قوم نوح' قوم عاد' قوم ثمود' قوم لوط' فرعون اور اس کے سرداروں کی ہلاکتیں ہیں۔ یہ سب موضوعات ہیں جن سے مکی سورتیں بھری ہوئی ہیں اور مختلف شکل و صورت میں یہ واقعات بیان ہوئے ہیں۔

لیکن اس سورت میں انہی موضوعات کو ایک بالکل نئے انداز میں لیا گیا ہے۔ اس طرح کہ یہاں یہ پوری طرح جدید نظر آتی ہے۔ البتہ یہ سورت ذرا درشت لہجے میں نہایت فیصلہ کن انداز میں ان موضوعات کو لیتی ہے۔ انسان پر خوف طاری ہو جاتا ہے اور انسان کو اپنے اردگرد تباہی ہلاکت' قرع و نزع اور توڑ و پھوڑ اور خوف و ہراس کی فضا نظر آتی ہے۔ انسان کو یہ خوف طاری ہو جاتا ہے کہ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

اس سورت کا مخصوص ترین حصہ یہ ہے کہ اس کا ہر حلقہ ایک دردناک' دہشت ناک عذاب پر مشتمل ہے اور جسے تکذیب کرنے والے دیکھ رہے ہیں۔ وہ بذات خود ان مناظر میں موجود ہیں۔ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ اللہ کے عذاب کے کوڑے برس رہے ہیں جونہی یہ مکذبین ایک عذاب سے نکلتے ہیں ابھی ان کا سانس پھولا ہوا ہوتا ہے کہ وہ عذاب کے دوسرے حلقے کے سامنے کھڑے ہیں اور پہلے منظر سے پھر یہ دوسرا منظر زیادہ ہولناک اور خوفناک ہے یہاں تک کہ اس سورت کے یہ ساتوں حلقے ایسی ہی خوفناک فضا میں ختم ہوتے ہیں اور مکذبین کا گلا گھٹنے لگتا ہے۔ ایسے ہی حالات میں سورت کا آخری منظر آ جاتا ہے۔ اس کا رنگ ڈھنگ مختلف ہے۔ یہاں امن اطمینان اور سکون ہے۔ یہ منظر متقین اور خدا

خوفی رکھنے والوں کا منظر ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ (٥٤) فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ (٥٤: ٥٥) "نافرمانی سے پرہیز کرنے والے یقیناً باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے سچی فرحت کی جگہ بڑے ذی اقتدار بادشاہ کے قریب" اور یہ پر سکون منظر ان مناظر کے بعد آتا ہے جن میں ہولناکیاں موجوں کی طرح امڈتی چلی آتی ہیں ۔ ہلا مارنے والے خوف و ہراس میں اور نہایت ہی توہین آمیز عذاب میں۔

يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ (٥٤: ٤٨) "جس روز یہ منہ کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے ۔ اس روز ان سے کہا جائے گا کہ چکھو جہنم کی لپٹ کا مزہ۔"

ذرا دیکھئے ' دونوں مناظر کا فرق ' دونوں کے مقام و مرتبہ کا فرق ' دونوں گروہوں کے رنگ ڈھنگ کا فرق اور دونوں کے انجام کا فرق۔

---()---

# درس نمبر ۲۵۳ تشریح آیات

## ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۵۵

آیاتہا ۵۵ سُورَةُ الْقَمَرِ (۵۴) مَكِّيَّةٌ (۳۷) رکوعاتہا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ ﴿١﴾ وَ اِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَ يَقُوْلُوْا سِحْرٌ
مُّسْتَمِرٌّ ﴿٢﴾ وَ كَذَّبُوْا وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ وَ كُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ﴿٣﴾ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ
مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ﴿٤﴾ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ﴿٥﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ
يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ﴿٦﴾ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ
الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ﴿٧﴾ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ
هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ﴿٨﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا مگر ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں منہ موڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو چلتا ہوا جادو ہے۔ انہوں نے (اس کو بھی) جھٹلا دیا اور اپنی خواہشات نفس ہی کی پیروی کی۔ ہر معاملہ کو آخر کار ایک انجام پر پہنچ کر رہنا ہے۔ ان لوگوں کے سامنے (پچھلی قوموں کے) وہ حالات آچکے ہیں جن میں سرکشی سے باز رکھنے کے لئے کافی سامان عبرت ہے اور ایسی حکمت جو نصیحت کے مقصد کو بدرجہ اتم پورا کرتی ہے مگر تنبیہات ان پر کارگر نہیں ہوتیں۔ پس اے نبی ؐ ان سے رخ پھیر لو جس روز پکارنے والا سخت ناگوار چیز کی طرف پکارے گا لوگ سہمی ہوئی نگاہوں کے ساتھ اپنی قبروں سے اس طرح نکلیں گے گویا وہ بکھری ہوئی ٹڈیاں ہیں۔ پکارنے والے کی طرف دوڑے جا رہے ہوں گے اور وہی منکرین (جو دنیا میں اس کا انکار کرتے تھے) اس وقت کہیں گے کہ یہ دن تو بڑا کٹھن ہے"۔

یہ ایک خوبصورت اور آنکھیں چندھیا دینے والا منظر ہے جس میں ایک عظیم کائناتی حادثہ دکھایا گیا ہے اور یہ اس سے بھی عظیم تر حادثہ کی تمہید ہے۔

اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ( ۵۴ : ۱ ) "قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا" یہ عظیم خبر ہے اور زبردست تمہید ہے ان لوگوں نے پہلا حادثہ تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اب بس دوسرے عظیم حادثہ ہی کے منتظر تھے۔

واقعہ شق قمر اور اس کے عام طور پر دیکھے جانے کے بارے میں روایات تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ تمام روایات اس پر متفق ہیں کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ البتہ اس وقت اس کی شکل کس طرح تھی اس کے اجمال اور تفصیل کا فرق روایات میں موجود ہے۔

حضرت انس ابن مالک کی روایت۔امام احمد نے روایت کی' معمر سے انہوں نے قتادہ سے انہوں نے انس ابن مالک سے وہ کہتے ہیں کہ اہل مکہ نے نبی ﷺ سے معجزہ طلب کیا تو مکہ میں دو بار چاند پھٹ پڑا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ( ۵۴ : ۱ ) "قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند ٹکڑے ہو گیا"
امام بخاری نے روایت کی عبداللہ ابن عبدالوہاب سے انہوں نے بشر ابن مفضل سعید ابن ابوعروہ سے انہوں نے قتادہ سے 'انہوں نے انس ابن مالک سے وہ کہتے ہیں "اہل مکہ نے رسول ﷺ سے مطالبہ کیا کہ آپ کوئی معجزہ دکھائیں۔ تو آپ نے ان کو دکھایا کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور دونوں کے درمیان حرا تھا۔" اس روایت کو بخاری اور مسلم نے دوسری اسناد سے بھی قتادہ اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے حضرت جبیر بن مطعم کی روایت امام احمد نے **محمد ابن کثیر سے کی ہے۔** انہوں نے سلیمان ابن کثیر سے انہوں نے حصین ابن عبدالرحمن سے 'انہوں نے محمد ابن جبیر ابن مطعم سے 'انہوں نے اپنے والد حضرت جبیر بن مطعم سے۔ وہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک ٹکڑا ایک پہاڑ پر نظر آتا تھا اور دوسرا اس پہاڑ پر تو کفار نے کہا محمد ﷺ نے ہم پر جادو کر دیا ہے۔ اگر اس نے ہم پر جادو کیا ہے تو یہ دنیا کے سب انسانوں پر تو جادو نہیں کر سکتا۔ یہ روایت اس طریقے سے صرف امام احمد ہی نے کی ہے۔ امام بیہقی نے اپنی کتاب الدلائل میں بواسطہ محمد ابن کثیر' اس کے بھائی سلیمان ابن کثیر سے 'اور انہوں نے حصین ابن عبدالرحمان سے روایت کی ہے اور ابن جریر اور بیہقی نے دوسرے طریقوں اور سندوں کے ساتھ حضرت جبیر ابن مطعم ﷺ سے نقل کی ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس ﷺ کی روایت۔امام بخاری نے روایت کی۔ یحییٰ ابن کثیر سے انہوں نے بکر سے 'انہوں نے جعفر سے 'انہوں نے عراک ابن مالک سے 'انہوں نے عبید اللہ ابن عبداللہ ابن عتبہ سے 'انہوں نے حضرت ابن عباس سے وہ کہتے ہیں حضور اکرم کے زمانے میں چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا واقعہ پیش آیا۔" امام بخاری نے اور امام مسلم نے ایک سابقہ سند کے ذریعہ بواسطہ عراک ابن عباس سے روایت کی اور امام ابن جریر نے ایک دوسری سند سے بواسطہ علی ابن ابو طلحہ 'حضرت ابن عباس سے روایت کی۔ یہ اس طرح ہوا کہ ہجرت سے قبل چاند پھٹ گیا یہاں تک کہ لوگوں نے دیکھا کہ وہ دو ٹکڑے ہے۔ عوفی نے بھی حضرت ابن عباس سے اسی طرح نقل کیا۔ طبرانی نے ایک دوسری سند سے بواسطہ

عکرمہ 'حضرت ابن عباس روایت کی۔ انہوں نے فرمایا رسول اللہ کے زمانے میں چاند تاریک ہو گیا تھا۔" تو اہل مکہ نے کہا ..... محمد ﷺ نے چاند پر بھی جادو کر دیا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (١) وَإِنْ يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُسْتَمِرٌّ (٥٤ : ٢) حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت۔ حافظ ابوبکر بیہقی کہتے ہیں ابو عبداللہ الحافظ اور احمد ابن الحسن قاضی نے جردی سے روایت کی دونوں نے 'ابو العباس اصم سے 'انہوں نے عباس ابن محمد دوری سے 'انہوں نے وهب ابن جریر سے انہوں نے شعبہ سے 'انہوں نے اعمش سے 'انہوں نے مجاہد سے 'اور انہوں نے عبداللہ ابن عمر ﷺ سے ' اس آیت کی تفسیر میں۔

اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (٥٤ : ١) کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ کے زمانے میں ہوا تھا۔ یہ دو ٹکڑے ہوا تھا ایک پہاڑ سے پیچھے تھا اور ایک آگے تھا۔" اس پر نبی ﷺ نے فرمایا۔

اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ (اے اللہ ..... گواہ رہنا) اس طرح اس روایت کو مسلم اور ترمذی نے شعبہ سے انہوں نے اعمش سے اور انہوں نے مجاہد سے نقل کیا ہے۔

عبداللہ ابن مسعود ﷺ کی روایت: امام احمد فرماتے ہیں۔ روایت کی سفیان ابن ابونجیح نے' مجاہد سے' انہوں نے ابو معمر سے' انہوں نے حضرت ابن مسعود سے' وہ فرماتے ہیں' رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ کفار نے اچھی طرح اسے دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اشہدوا (گواہ رہو) امام بخاری اور امام مسلم نے سفیان ابن عیینہ سے یہی روایت کی ہے اور انہوں نے اعمش سے انہوں نے ابراہیم سے' انہوں نے ابو معمر عبداللہ ابن صخیرہ سے' انہوں نے حضرت ابن مسعود سے' امام بخاری کہتے ہیں کہ امام ابو داؤد طیالسی نے یہ روایت کی' ابو عوانہ سے انہوں نے مغیرہ سے انہوں نے ابو الضحیٰ سے' انہوں نے مسروق سے انہوں نے حضرت عبداللہ ابن مسعود سے انہوں نے فرمایا رسول اللہ کے زمانے میں چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ قریش نے کہا یہ ابن ابو کبشہ کا جادو ہے۔ کہتے ہیں کہ لوگوں نے کہا دیکھو جو لوگ سفر پر ہیں وہ آجائیں کیونکہ محمد ﷺ پوری دنیا کے لوگوں پر تو جادو نہیں کر سکتا چنانچہ اس کے بعد جو سفر پر تھے وہ آئے اور انہوں نے بھی اس کی تصدیق کی۔ امام بیہقی نے دوسرے طریقوں سے بھی اسے روایت کیا ہے مسروق سے' انہوں نے عبداللہ ابن مسعود سے' مفہوم اسی سے ملتا جلتا ہے۔

یہ ہیں متواتر روایات مختلف اسناد اور طرق سے کہ یہ واقعہ ہوا اور مکہ میں اس کی جگہ بھی بتا دی گئی۔ ماسوائے ایک روایت کے جس میں منیٰ کا ذکر ہے باقی روایات مکہ کے بارے میں ہیں۔ حضور کے زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا اور ہجرت سے قبل پیش آیا۔ اکثر روایات میں آتا ہے کہ یہ دو ٹکڑے ہو گیا اور یہ ایک روایت میں آتا ہے کہ یہ چاند گرہن ہو گیا تھا۔ بہرحال واقعہ جو بھی ہو روایات سے ثابت ہے اور روایات زمان و مکان کی تحدید بھی کرتی ہیں اور شق قمر کی ہیئت کا تعین بھی کرتی ہیں۔

یہ ایسا واقعہ تھا کہ قرآن کریم نے اسے بطور دلیل قیامت مشرکین کے سامنے پیش کیا۔ کوئی ایسی روایت مشرکین سے منقول نہیں ہے کہ انہوں نے نفس واقعہ کا انکار کیا ہو۔ لہذا یہ واقعہ اسی طرح ہوا ہو گا اور اس قدر لوگوں نے دیکھا ہو گا کہ ان کے لئے نفس واقعہ کو جھٹلانا ممکن نہ رہا ہو گا۔ اگرچہ بطور کبر اور غرور ہو۔ اگر ان کے لئے اس کی تکذیب کی کوئی بھی صورت وہتی تو وہ ضرور کرتے۔ کفار سے جو روایات اور تبصرے منقول ہیں وہ یہ ہیں کہ محمد ﷺ نے جادو کر دیا ہے لیکن خود ان میں سے دانشمند لوگوں نے کہا۔ ذرا تحقیق کرو اور مسافروں سے تحقیق کرنے کے بعد ان کو معلوم ہو گیا کہ یہ جھوٹ نہیں ہے کیونکہ اگر اہل مکہ کو محمد ﷺ مسحور کر سکتے تو وہ پوری دنیا کو تو مسحور نہیں کر سکتے اور جب انہوں ان سے مسافروں سے پوچھا جو مکہ کے باہر سے آئے تھے تو انہوں نے بھی تصدیق کی۔

اب بات یہ رہ گئی کہ آیا مشرکین نے رسول اللہ ﷺ سے کسی نشانی کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کے جواب میں شق قمر کا معجزہ رونما ہو گیا۔ یہ روایت دراصل قرآن کی نص صریح سے متصادم ہے۔ مدلول یہ ہے کہ نبی ﷺ کو ویسے معجزات نہیں دیئے گئے جس طرح انبیائے سابق کو دیئے گئے تھے اور اس کا ایک متعین اور خاص سبب تھا۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ "اور ہم کو نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ ان سے پہلے کے لوگ انہیں جھٹلا چکے ہیں" مطلب یہ ہے کہ اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ حضور کو وہ معجزات نہیں دیئے گئے جن کا مطالبہ ہوا تھا۔

کفار نے جب بھی حضور سے معجزات کا مطالبہ کیا ہے تو جواب یہی دیا گیا کہ معجزات پیش کرنا آپ کے فرائض میں شامل نہیں ہے اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک بشر اور رسول ہیں اور ہر جگہ صرف قرآن کریم ہی کو آپ کے لئے معجزہ قرار دیا گیا اور اسی جیسی کوئی سورت یا کتاب لانے کا چیلنج دیا گیا۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (۸۸) وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (۸۹) وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا (۹۰) اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا (۹۱) اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (۹۲) اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (۹۳) (۱۷: ۸۸ تا ۹۳) "کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے چاہے وہ سب ایک

دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔ ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر اکثر لوگ انکار ہی پر جمے رہے اور انہوں نے کہا "ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک تو ہمارے لئے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ نہ جاری کر دے یا تیرے لئے کھجوروں اور انگوروں کا باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے یا تو آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے یا خدا اور فرشتوں کو رو در رو ہمارے سامنے لے آئے یا تیرے لئے سونے کا ایک گھر بن جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں۔" اے نبی ان سے کہو "پاک ہے میرا پروردگار کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں" لہٰذا یہ کہنا کہ شق قمر کا معجزہ کفار کے مطالبہ کے جواب میں آیا تھا' قرآن مجید کی متعدد نصوص کے بھی خلاف ہے اور اس رجحان کے بھی خلاف ہے کہ اس دنیا میں آخری رسالت انسانیت کے سامنے صرف قرآن پیش کرے اور یہ کہ قرآن کا اعجاز ہی اس کا معجزہ ہو اور قرآن کے ذریعہ انسان کے دل و دماغ کو ان آیات و معجزات کی طرف متوجہ کیا جائے جو انفس میں موجود ہیں جو آفاق میں بکثرت موجود ہیں اور جو انسانی تاریخ میں بکثرت ہیں اور سخت عبرت آموز بھی ہیں۔ باقی نبی ﷺ کے ہاتھ پر جو معجزات صادر ہوئے اور جن کی تصدیق صحیح روایات نے کی ہے تو وہ بطور اعزاز نبی ﷺ کو دیئے گئے بطور دلائل نبوت نہیں دیئے گئے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ معجزہ شق قمر صادر ہوا۔ نص قرآنی نے اس کی تصدیق کی ہے۔ روایات متواترہ میں اس کی تصدیق ہوئی اور جس جگہ اور جس زمانے میں صادر ہوا اس کا بھی تعین ہو گیا اور جس انداز میں ہوا اس کی تفصیلات بھی موجود ہیں لیکن جن روایات میں اس کی علت بیان کی گئی ہے اس کے بارے میں ہم خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ بس یہی کہتے ہیں کہ شق قمر دلالت کرتا ہے قرب قیامت پر اور اسی میں ہمارے لئے عبرت ہے کہ ہم چوکنے ہو جائیں۔ جاگیں اور اس کی تیاری کریں اس عظیم گھڑی کی۔ لہٰذا شق قمر ایک کائناتی معجزہ تھا اور قرآن نے انسانوں کو اس کی طرف متوجہ کیا ہے جس طرح قرآن مجید دوسرے تکوینی معجزات کی طرف متوجہ کرتا ہے اور جس طرح دوسرے معجزات کے مقابلے میں ان کا رویہ قابل تعجب ہے۔ اسی طرح اس معجزے سے بھی انہوں نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔

خارق عادت معجزات' انسانیت کے ابتدائی دور ہیں۔ بے شک انسانوں کو متاثر کرتے تھے جس دور میں انسانیت نے اس قدر علمی ترقی نہ کی تھی کہ وہ اس کائنات میں قائم اور بکھرے ہوئے معجزات کو سمجھ سکیں اور ان سے متاثر ہوں۔ گزرے ہوئے نبیوں کے ہاتھوں جن معجزات کا صدور ہوا اور انسانیت ان سے متاثر ہوئی تو یہ اس دور کی بات ہے جب انسانیت عقلی بلوغ کے درجے کو نہ پہنچی تھی لیکن آج اس کائنات میں ایسے ایسے معجزات انسانیت کو معلوم ہو چکے ہیں جو ان معجزات سے بڑے معجزات ہیں۔ اگرچہ ان لوگوں کو وہ متاثر نہیں کرتے جو وہی ابتدائی احساسات رکھتے ہیں اور جو عقلی بلوغ کے درجے تک نہیں پہنچے۔

فرض کیجئے کہ چاند کا دو ٹکڑے ہونا معجزہ تھا تو چاند بذات خود بھی تو ایک معجزہ ہے۔ یہ سیارہ اپنے اس حجم' موجودہ وضع' شکل' طبیعت' گردش کی منازل' دورے' اس کے آثار' زمین کی زندگی پر اس کے اثرات اور فضا میں اس کا اس طرح تیرنا بغیر کسی سہارے کے کیا یہ ایک عظیم معجزہ نہیں ہے جو ہر وقت قائم اور دائم اور ہمارے مشاہدے میں ہے اور ہم اس کے بارے میں ہر وقت سوچ سکتے ہیں۔ اس سے اثر لیتے ہیں۔ کیا قدرت الہیہ پر اس سے بڑی اور کوئی دلیل چاہئے۔

کون ہے جو نفس چاند کے معجزے سے انکار کر سکتا ہے ۔ ماسوائے اس شخص کے جو ہٹ دھرم اور ضدی ہو ۔

قرآن نے تو انسان کو اس کائنات کے سامنے کھڑا کر دیا اور یہ مشاہدہ کرایا کہ اس کائنات کے اندر عظیم معجزات ہر وقت قائم اور دائم ہیں ۔ قرآن انسان کو ان معجزات کے ساتھ دائماً جوڑنا چاہتا ہے ۔ یہ نہیں کہ شق قمر کی طرح کوئی چیز ہزار ہا سال میں ایک بار دکھا دی جائے اور اس کو بھی ایک ہی زمانے کے لوگ دیکھ لیں ۔ قرآن کہتا ہے کہ دیکھو اس کائنات کو اگر دیدہ عبرت نگاہ رکھتے ہو ۔

یہ پوری کائنات معجزات کا ایک منظر نامہ ہے ۔ جو آنکھوں کے سامنے رہتا ہے غائب نہیں ہوتا اور یہ سب معجزے دیکھو اور دیکھتے چلے جاؤ ۔ اس میں چھوٹے معجزات بھی ہیں اور بڑے بھی اور یہ معجزات شہادت دے رہے ہیں ۔ ان کی شہادت سنو ۔ یہ عجیب شہادت ہے اسے ریکارڈ کرو ۔ یہ نہایت ہی خوبصورت شہادت ہے اس میں جمال بھی ہے اور کمال بھی ہے اور یہ تو انسان کو نہ صرف یہ کہ فیصلے پر پہنچاتی ہے بلکہ دہشت زدہ اور ششدر کر دیتی ہے اور اس کے نتیجے میں بہت ہی پختہ ایمان پیدا ہوتا ہے ۔ نہایت گہرا اور سنجیدہ ۔

اس سورت کے آغاز میں یہ اشارہ آتا ہے کہ قیامت قریب آگئی ہے اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا ہے جس سے انسان پر گہرا اثر پڑتا ہے کیونکہ قیام قیامت اور چاند کا ٹکڑے ہونا بہت ہی بڑے واقعات ہیں ۔ قرآن بتاتا ہے کہ تم نے یہ ایک عظیم حادثہ تو دیکھ ہی لیا ہے اسی طرح قیام قیامت بھی ہو گا ۔

شق قمر کے بعد صرف قیامت کے بارے میں امام احمد نے روایت کی ہے حسین سے 'انہوں نے محمد ابن مطرف سے 'انہوں نے ابو حازم سے 'اور انہوں نے حضرت سہیل ابن سعد سے وہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ''میں اور قیامت اس طرح ساتھ ساتھ بھیجے گئے ہیں ۔'' آپ نے درمیان انگلی اور سبابہ کو جوڑ کر اشارہ کیا (متفق علیہ)

باوجود اس حقیقت کہ قیامت کی گھڑی قریب آگئی ہے اور نہایت ہی اثر انگیز واقعہ بھی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اور مختلف شکلوں میں انہوں نے اللہ کی نشانیاں بھی دیکھ لی ہیں لیکن ان لوگوں کے دلوں میں عناد کوٹ کوٹ بھرا ہوا تھا ۔ وہ گمراہی کی راہ پر اصرار کر رہے تھے ۔ وہ ڈراوے سے متاثر ہوتے تھے اور نہ اس کائنات میں بکھری ہوئی نشانیوں سے متاثر ہوتے تھے جو نصیحت کے لئے کافی ہیں اور انسان کو جھٹلانے سے روک سکتی ہیں لیکن ان لوگوں نے ان سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا ۔

وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (٢) وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ (٣) وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ (٤) حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ (٥٤ : ٥) ''مگر ان کا حال یہ ہے کہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں' منہ موڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو چلتا ہوا جادو ہے ۔ انہوں نے جھٹلا دیا اور اپنی خواہشات نفس کی پیروی کی ۔ ہر معاملے کو آخر کار ایک انجام پر پہنچ کر رہنا ہے ۔ ان لوگوں کے سامنے وہ حالات آچکے ہیں جن میں سرکشی سے باز رکھنے کے لئے کافی سامان عبرت ہے اور ایسی حکمت جو نصیحت کے مقصد کو بدرجہ اتم پورا کرتی ہے مگر تنبیہات ان پر کارگر نہیں ہوتیں''

شق قمر کو بھی دیکھ کر انہوں نے اعراض کر لیا اور انہوں نے شق قمر کے بارے میں بھی وہی بات کہی جو قرآن کی آیات کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ نہایت ہی موثر جادو ہے۔ ایک نشانی تو وہ کہتے ہیں جادو ہے اور مسلسل نشانیوں کو کہتے ہیں کہ یہ مسلسل جادو ہے جس کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ یہ لوگ نشانات الہیہ پر غور کرنے سے منہ موڑ رہے ہیں۔ وہ نشانیوں کی دلالت اور شہادت سے بھی منہ موڑتے ہیں۔ یہ انکار وہ محض خواہش نفس سے مجبور ہو کر کرتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ ان کے پاس کوئی حجت ہے یا اسلام کے حق میں حجت نہیں۔ یہ بھی نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات پر غور کر لیا ہے۔

وَكُلُّ أَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ (٥٤ : ٣) "ہر معاملہ کو آخر کار ایک انجام پر پہنچ کر رہنا ہے" اس عظیم کائنات میں ہر چیز اپنے مقام پر رکھی ہوتی ہے اور وہ اپنی جگہ پر پختہ ہے۔ نہ ہلتی ہے اور نہ اس کے اندر اضطراب ہے۔ اس کائنات کا ہر معاملہ ثبات و قرار پر مبنی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بدلتی ہوئی خواہشات کے مطابق اصول بھی بدلتے ہیں اور بادشاہوں کی نازک مزاجیوں کی طرح اصول اور قوانین بھی بدل جاتے ہیں۔ یوں بھی نہیں ہے کہ یہاں معاملات بخت و اتفاق کے مطابق طے ہوتے ہیں۔ ہر چیز اپنی جگہ اور اپنے زمان اور وقت پر رونما ہوتی ہے۔ انسان کو دیکھنا چاہئے کہ اس کے ماحول میں زمان و مکان میں' واقعات و حادثات میں ایک ترتیب ہے اور یہ ترتیب اور اصول ہر چیز میں نظر آتا ہے۔ آسمانوں کی گردش میں' زندگی کے طریقوں میں' حیوانات اور نباتات کے بڑھنے میں' تمام اشیاء اور مواد میں بلکہ خود ان کے جسم کے وظائف و فرائض میں ان کے اعضا کی کارکردگی میں ایک ترتیب ہے اور ان کو ان چیزوں پر کوئی کنٹرول حاصل نہیں ہے۔ یہ قیامت و قرار ان کو گھیرے ہوئے ہے اور ان کے گرد تمام اشیاء کو بھی اپنے لپیٹ میں لئے ہوئے ہے اور ان کے آگے اور پیچھے ہر طرف نظر آتا ہے' صرف یہ انسان ہیں کہ یہ مضطرب ہیں اور اپنی خواہشات کے مطابق کبھی ادھر جاتے ہیں اور کبھی ادھر۔

وَلَقَدْ جَآءَهُم مِّنَ الْأَنبَآءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ (٥٤ : ٤) "ان لوگوں کے سامنے وہ حالات آچکے ہیں جن میں سرکشی سے باز رکھنے کے لئے کافی سامان عبرت ہے۔" ان کے پاس اس کائنات کی آیات کے بارے میں قرآن نے کافی خبریں پھیر پھیر کر بیان کی ہیں۔ ان کے پاس اہم سابقہ کے مکذبین کی خبریں بھی آچکی ہیں۔ ان کے پاس مناظر قیامت کی شکل میں آخرت کی خبریں بھی آچکی ہیں۔ ان سب امور میں عبرت آموزی' رکاوٹ' خطرے کی علامات موجود ہیں اور ان کے اندر ایسی حکیمانہ باتیں بھی ہیں جو سیدھی دل میں اترنے والی ہیں اور اچھی ہدایات ہیں لیکن جو دل اندھے ہو چکے ہیں وہ آیات کو نہیں دیکھ پاتے اور ان خبروں سے فائدہ نہیں اٹھائے نہ خبروں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ ڈراوے سے وہ ڈرتے ہیں۔

حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ (٥٤ : ٥) "اور ایسی حکمت جو نصیحت کے مقصد کو بدرجہ اتم پورا کرتی ہے مگر تنبیہات ان پر کارگر نہیں ہوتیں۔" ایمان ہی وہ نعمت ہے جس کی وجہ سے قلب انسانی ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

ان کی روگردانی اور کفر پر اصرار کی اس قدر تصویر کشی کرنے کے بعد اور یہ جتا دینے کے بعد کہ یہ خبروں سے بھی

مستفید نہیں ہوتے ان کے لئے ڈراوے میں بھی فائدہ نہیں۔ رسول ﷺ کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپ بھی ان سے روگردانی کرلیں اور ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ وہ دن جلدی ہی آنے والا ہے شق قمر اس دن کی علامت تھی' یہ دن بہت قریب ہے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَى شَيْءٍ نُكُرٍ (٦) خُشَّعًا أَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُنْتَشِرٌ (٧) مُهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ يَقُولُ الْكَافِرُونَ هَذَا يَوْمٌ عَسِرٌ (٥٤ : ٨) "پس اے نبیؐ ان سے رخ پھیرلو' جس روز پکارنے والا ایک سخت ناگوار چیز کی طرف پکارے گا' لوگ سہمی ہوئی نگاہوں کے ساتھ اپنی قبروں سے اس طرف نکلیں گے گویا وہ بکھری ہوئی ٹڈیاں ہیں۔ پکارنے والے کی طرف دوڑے جارہے ہوں گے اور وہی منکر بھی اس وقت کہیں گے یہ دن تو بڑا کٹھن ہے۔"

یہ اس دن کے مناظر میں سے ایک منظر ہے۔ اس کی ہولناک اور اسکی یہ شدت اس سورت کے موضوع و مضامین اور فضا کے مناسب ہے اور قیامت کے قریب آنے کی تمہید کے لئے بھی مناسب ہے پھر اس خبر کے بھی مناسب کہ چاند دو ٹکڑے ہوگیا اور سورت کے اندر پائے جانے والے ترنم سے بھی ہم آہنگ ہے۔

یہ منظر بہت تیز چلتا ہے اور فضا کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ صاف نظر آنے والا اور حرکت سے بھرپور جس کی حرکات اور انداز بھی متوازن ہیں۔ لوگ گروہ درگروہ قبروں سے نکل رہے ہیں یوں جس طرح ٹڈی دل بکھر جاتا ہے۔ یہ منظر ٹڈی دل کی نسبت سے اور بھی واضح ہوجاتا ہے۔ یہ گروہ ڈر کے مارے سہمے ہوئے ہے۔ ذلت اور خوف کے مارے نظریں نیچی نیچی ہیں۔ پکارنے والے کی طرف دوڑ رہے ہیں کہ کیا آفت آگئی ہے۔ معلوم نہیں کہ کیا ہونے والا ہے۔ سخت بے اطمینانی ہے' انتہائی برے انجام سے دوچار ہونے کے لئے جانے والے بس یہی کہہ سکے۔

هَذَا يَوْمٌ عَسِرٌ (٥٤ : ٨) "یہ تو بڑا کٹھن دن ہے" اور یہ اس شخص کا قول ہے نہایت کربناک اور تھکے ہوئے شخص کی بات ہے جو گویا سولی پر چڑھنے کے لئے بوجھل قدموں کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ ہے وہ دن جو آیا ہی چاہتا ہے لیکن یہ لوگ غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ڈراوے سے منہ موڑ رہے ہیں۔ حق کی تکذیب کرتے ہیں۔ اے پیغمبر آپ بھی ان سے منہ موڑلیں اور چھوڑیں انہیں ان کے انجام کے لئے جو نہایت ہی خوفناک ہے۔

سورت کا آغاز اس قدر خوفناک انداز اور زوردار لہجے میں کرنے کے بعد اور قیامت کا ایک خوفناک منظر پیش کرنے کے بعد اب انسانی تاریخ کے کچھ مناظر دیئے جاتے ہیں۔ جن لوگوں پر اس طرح کی قیامت ٹوٹی جو اوپر کے منظر میں دکھائی گئی۔ یہ اقوام بھی ایسا ہی رویہ اختیار کئے ہوئے تھیں جس طرح اہل مکہ نے اختیار کررکھا ہے۔ آغاز قوم نوح علیہ السلام سے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَازْدُجِرَ ۝ فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ ۝ فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ

مُّنْهَمِرٍ ﴿١١﴾ وَّ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰۤى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴿١٢﴾ وَحَمَلْنٰهُ
عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّ دُسُرٍ ﴿١٣﴾ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴿١٤﴾ وَلَقَدْ
تَّرَكْنٰهَاۤ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿١٥﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿١٦﴾ وَلَقَدْ
يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿١٧﴾ كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ
نُذُرِ ﴿١٨﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿١٩﴾ تَنْزِعُ
النَّاسَ ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿٢٠﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿٢١﴾ وَلَقَدْ
۲۲ع يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿٢٢﴾

۸ ”ان سے پہلے نوح کی قوم جھٹلا چکی ہے ۔ انہوں نے ہمارے بندے کو جھوٹا قرار دیا اور کہا کہ یہ دیوانہ ہے اور وہ بری طرح جھڑکا گیا ۔ آخر کار اس نے اپنے رب کو پکارا کہ ”میں مغلوب ہو چکا اب تو ان سے انتقام لے ۔“ تب ہم نے موسلا دھار بارش سے آسمان کے دروازے کھول دیئے اور زمین کو پھاڑ کر چشموں میں تبدیل کر دیا اور یہ سارا پانی اس کام کو پورا کرنے کے لئے مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا اور نوح کو ہم نے ایک تختوں اور کیلوں والی پر سوار کر دیا جو ہماری نگرانی میں چل رہی تھی ۔ یہ تھا بدلہ اس شخص کی خاطر جس کی ناقدری کی گئی تھی ۔ اس کشتی کو ہم نے ایک نشانی بنا کر چھوڑ دیا ۔ پھر کوئی ہے نصیحت قبول کرنے والا؟ دیکھ لو کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات ۔ ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا ہے ۔ پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟ عاد نے جھٹلایا تو دیکھ لو کہ کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات ۔ ہم نے ایک پیہم نحوست کے دن سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی ۔ جو لوگوں کو اٹھا اٹھا کر اس طرح پھینک رہی تھی جیسے وہ جڑ سے اکھڑے ہوئے کھجور کے تنے ہوں ۔ پس دیکھ لو کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھی میری تنبیہات ۔ ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا ہے ۔ پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا“؟

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ ( ۵۴ : ۹ ) ”ان سے پہلے نوح کی قوم نے جھٹلایا“ انہوں نے آیات الٰہی کو بھی جھٹلایا اور رسالت کو بھی ۔

فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا ( ۵۴ : ۹ ) ”انہوں نے ہمارے بندے کو جھوٹا قرار دیا“ یعنی نوح کو ۔

وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ ( ۵۴ : ۹ ) ”اور کہا کہ یہ دیوانہ ہے “ جس طرح قریش نے نبی ﷺ کو کہا کہ مجنوں ہے اور انہوں نے حضرت نوح کو دھمکی دی کہ ہم تمہیں رجم کر دیں گے اور مزاح کر کے اذیت دی اور انہوں نے آپ سے مطالبہ کیا کہ ہم پر تنقید کرنے سے باز آجاؤ اور آپ کو سخت دھمکیاں اور جھڑکیاں دیں ۔

وَازْدُجِرَ (٥٤ : ٩) "اور بری طرح جھڑکا گیا" حالانکہ مناسب یہ تھا کہ وہ خود باز آتے اور ان کی اطاعت کرتے۔

اس نوبت تک پہنچ کر حضرت نوح رب تعالیٰ کی طرف دست بدعا ہوتے ہیں کیونکہ اللہ ہی نے ان کو اس مہم پر بھیجا تاکہ آپ اللہ کو وہ رپورٹ دے دیں کہ قوم نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا ہے اور یہ کہ میں نے اس قدر جدوجہد کی ہے اور اب میری قوت نے جواب دے دیا ہے۔ حضرت نے اس وقت اللہ کو پکارا جب نہ کوئی حیلہ رہا اور نہ طاقت رہی۔ انہوں نے تمام حربے آزمائے۔

فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ (٥٤ : ١٠) "آخر کار اس نے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہو چکا ہوں اب تو ان سے انتقام لے" میری طاقت ختم ہو گئی۔ میں نے اپنی پوری جدوجہد کر دی۔ قوتیں جواب دے گئیں اور یہ تیرا کام ہے اور انکار اور کفر مجھ پر غالب آگیا۔ لہٰذا تو ہی مدد کر۔ اے اللہ اب تو ہی ان سے انتقام لے۔ اپنی دعوت کا بدلہ لے۔ سچائی کا ساتھ دے۔ اپنے نظام کی مدد تو ہی کر حکم تیرا ہے جدوجہد تیرے لئے ہے میرا کردار اب ختم ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا یہ کہنا تھا اور رسول خدا کی طرف سے معاملہ رب تعالیٰ کے سپرد کرنا تھا جو جبار و قہار ہے کہ دست قدرت نے اپنا کام شروع کر دیا اور اس زمین کو ان سے صاف کر دیا گیا۔ عذاب الٰہی کا چکر یوں چلنا شروع ہوا کہ تمام طبیعی قوتوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔

فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُنْهَمِرٍ (١١) وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاءُ

عَلَى أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ (٥٤ : ١٢) "تب ہم نے موسلا دھار بارش سے آسمان کے دروازے کھول دیئے اور زمین کو پھاڑ کر چشموں میں تبدیل کر دیا اور وہ سارا پانی اس کام کو پورا کرنے کے لئے مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا"

یہ ایک عظیم کائناتی حرکت ہے جو بہت ہی بھرپور ہے لیکن اس عظیم کائناتی عمل اور حرکت کی تصویر چند الفاظ میں کھینچی گئی ہے۔ الفاظ بڑی خوبصورتی سے چنے گئے ہیں اور اس پورے عمل کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ سب عمل قدرت الٰہیہ کا ہے۔

فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ (٥٤ : ١١) "ہم نے آسمان کے دروازے کھول دیئے" قاری محسوس کرتا ہے کہ دست قدرت خود آسمانوں کے دروازے کھولتی ہے۔

بِمَاءٍ مُنْهَمِرٍ (٥٤ : ١١) "موسلا دھار بارش سے" یعنی ایسی بارش جس میں پانی بہت برس رہا ہو۔ اسی قوت اور اسی حرکت سے۔

وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا (٥٤ : ١٢) "اور زمین کو پھاڑ کر چشموں میں تبدیل کر دیا" زمین کو پھاڑنے اور چشموں کے پھوٹنے کا منظر یوں نظر آتا ہے کہ گو ہر جگہ سے فوارے چھوٹ گئے۔ ہر طرف چشمے ہی چشمے نظر آنے لگے۔

اب زور زور سے آسمانوں سے گرنے والا پانی' اور زمین سے ابلنے والا پانی آپس میں مل گئے۔

فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ (۵۴ : ۱۲) "اور وہ سارا پانی اس کام کو پورا کرنے کے لئے مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا" یعنی دونوں کا کام یہ تھا کہ طے شدہ کام کو پورا کر لیا جائے۔ دونوں پانی دست قدرت کے تحت کام کر رہے تھے۔

اس پانی نے طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ زمین کو ڈھانپ لیا گیا اور زمین پر انسانوں کی شکل میں جو گندگی تھی اسے صاف کر دیا گیا۔ اللہ کا پیغمبر تو اس تطہیر سے مایوس ہو گیا تھا۔ اس کے خیال میں یہ لوگ لاعلاج ہو گئے تھے لیکن اللہ کا مشفقانہ دست قدرت پہنچ گیا۔ رسول کی دعا قبول ہوئی۔ پوری کائنات حرکت میں آگئی اور رسول اور اس کے ساتھیوں کو نجات مل گئی۔

وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ (۱۳) تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ (۵۴ : ۱۴) "اور نوح کو ہم نے ایک تختوں اور کیلوں والی پر سوار کر دیا جو ہماری نگرانی میں چل رہی تھی۔ یہ تھا بدلہ اس شخص کی خاطر جس کی ناقدری کی گئی۔" اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بہت بڑی کشتی تھی۔ یہ تختوں اور میخوں والی تھی۔ کشتی کی صفات بیان کی گئی ہیں اور موصوف کا نام نہیں لیا گیا۔ اس کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے پھر یہ کہا گیا کہ یہ کشتی اللہ کی نگرانی میں چلتی ہے۔ اس پر اللہ کی نظر ہے۔

جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ (۵۴ : ۱۴) "اس شخص کے بدلہ کی خاطر جس کی ناقدری کی گئی" اس کی دعوت کا انکار کیا گیا بلکہ الٹا اس کو تمسخر کیاں دی گئی۔ ان لوگوں نے نبی پر مظالم ڈھائے۔ یہ اس کی سزا ہے۔ انہوں نے نبیؑ کے ساتھ مذاق کیا۔ اللہ نے اسے یہ اعزاز دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے جس شخص کو اللہ کی راہ میں بے بس کر دیا جائے اس کی حمایت میں اللہ کی قوتیں کس طرح کام کرتی ہیں اور جو شخص اپنا کام پورا کر کے اور اپنی پوری قوت لگا کر جب معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہے تو پھر اللہ کس طرح بدلہ لیتا ہے۔ اس کائنات کی پوری قوتیں اس کی نصرت میں اٹھ جاتی ہیں اور ان قوتوں کی پشت پر اللہ اپنی قدرت اور جبروت کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔

اس ہولناک انتقام کے منظر کے اختتام پر اور اس فیصلہ کن انجام پر ان لوگوں کو متوجہ کیا جاتا ہے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا کہ ذرا ان واقعات سے عبرت لو' یہ اس لئے کہ شاید وہ متاثر ہو کر دعوت حق کو قبول کر لیں۔

وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۴ : ۱۵) "اس کشتی کو ہم نے ایک نشانی بنا کر چھوڑ دیا۔ پھر کوئی ہے نصیحت قبول کرنے والا" یہ واقعہ اپنے تمام حالات کے ساتھ ہم نے تاریخ کے ریکارڈ پر باقی رکھا تاکہ آنے والوں کے لئے ایک نشانی ہو۔

فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۴ : ۱۵) "پھر ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا) جو نصیحت قبول کرے۔ دلوں کو

ڈگانے کے لئے ایک سوال کہ کیا تھا عذاب اور کیا انجام ہوا ڈرائے جانے والوں کا۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ ( ٥٤ : ١٦ ) "دیکھ لو کیا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات"
بہرحال ایسا ہی ہوا جس طرح قرآن نے تصویر کشی کی ہے۔ یہ ایک سخت تباہ کن عذاب تھا جس نے تمام مجرموں کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا اور ڈرانے والے کا ڈراوا سچا ہوگیا یہ ہے قرآن کا انداز بیان نہایت سہل ' قابل فہم ' پڑھنے والے کے لئے خوب جاذبیت کا حامل تاکہ ہر کوئی پڑھے اور تدبر کرے۔ سادہ سچائی کی جاذبیت کا حامل 'فطرت کے مطابق اور 'ہر طبیعت کے لئے پرجوش 'جس کے عجائبات ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ اسے بار بار پڑھئے ہر بار نیا نظر آئے گا۔ جب بھی کوئی اس پر تدبر کرے اسے ایک نیا مفہوم اور نیا نکتہ ملے گا۔ جس قدر اس کے ساتھ کوئی شخص انسانی صحبت اختیار کرے اس کی محبت میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ( ٥٤ : ١٧ ) "ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنایا ہے پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا"

یہ ہے وہ سبق جو ہر پیراگراف کے آخر میں دہرایا جاتا ہے۔ ہر مصور منظر کے بعد ' ہر منظر کے بعد قرآن انسان دل کے ساتھ گفتگو کرتا ہے اور اسے نصیحت قبول کرنے ' دانش حاصل کرنے 'تدبر کرنے کے لئے کہتا ہے۔ ہر تاریخی انجام بد کے بعد جس سے مکذبین دوچار ہوئے۔

---

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ (١٨) اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِىْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (١٩) تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ (٢٠) فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ (٢١) وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ( ٥٤ : ١٨ تا ٢٢ ) "عاد نے جھٹلایا تو دیکھ لو کہ کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات۔ ہم نے ایک پیہم نحوست کے دن سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی۔ جو لوگوں کو اٹھا اٹھا کر اس طرح پھینک رہی تھی جیسے وہ جڑ سے اکھڑے ہوئے کھجور کے تنے ہوں۔ پس دیکھ لو کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات۔ ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا ہے۔ پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا"؟

یہ دوسرا پیراگراف ہے اور اقوام سابقہ پر عذاب آنے کا دوسرا منظر ہے۔ قوم نوح کے بعد ہلاکت کا یہ بڑا واقعہ تھا۔ سب سے پہلے قوم نوح ہلاک ہوئی اور اس کے بعد قوم عاد۔

پہلے یہ بتایا جاتا ہے عاد نے بھی تکذیب کی لیکن آیت ختم ہونے سے پہلے ہی ایک خوفناک سوال کر دیا جاتا ہے۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ (٥٤: ١٨) "میرا عذاب کیسا تھا اور تنبیہات کیسی تھیں" اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ ان کا انجام یوں ہوا' ہولناک اور خوفناک۔

اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (٥٤: ١٩) تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ (٥٤: ٢٠) "ہم نے ایک پیہم نحوست کے دن سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی۔ جو لوگوں کو اٹھا اٹھا کر اس طرح پھینک رہی تھی جیسے جڑ سے اکھڑے ہوئے کھجور کے تنے۔"

رِيْحًا صَرْصَرًا (٥٤: ١٩) کے معنی ہیں سخت سرد ہوا۔ الفاظ کا ترنم ہی نوعیت بتا رہا ہے۔ نحس یعنی منحوس اور اس سے بڑی نحوست کس قوم کو کیا نصیب ہوگی جو عاد کو نصیب ہوئی۔ یوں منظر تھا کہ جس طرح سخت ہوا ت کھجور کے تنے جڑوں سے اکھڑ کر زمین پر آجاتے ہیں اور درخت بری طرح گرا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ لوگ میدانوں میں پڑے ہوئے تھے۔

منظر نہایت خوفناک ہے۔ ہوا سخت ہے اور یہ ہوا جو عادیوں پر بھیجی گئی تھی یہ اللہ کے لشکروں میں ایک لشکر تھا۔ اس کائنات کی قوتوں میں سے ایک قوت۔ اللہ کی تخلیق کردہ قوت' اللہ کے قانون قدرت کے عین مطابق چلنے والی قوت' ایسی قوت جسے اللہ جس پر چاہے مسلط کر دے۔ یہ قوت صحراؤں میں چل رہی ہے اور یہ جب عاد کی بستیوں تک پہنچتی ہے تو ان کا وہ حال بنا دیتی ہے جو اوپر لکھا گیا۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ (٥٤: ٢١) "دیکھ لو میرا عذاب کیا تھا اور میری تنبیہات کیسی ہوتی ہیں" اور آخری فقرہ بھی وہی حسب دستور۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (٥٤: ٢٢) "ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان کر دیا پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا" صلائے عام ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ۝ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۝ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ۝ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ۝ اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ۝ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ۝ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ۝ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ

إِنَّآ أَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ صَيۡحَةً وَٰحِدَةً فَكَانُواْ كَهَشِيمِ ٱلۡمُحۡتَظِرِ ﴿٣١﴾ وَلَقَدۡ يَسَّرۡنَا ٱلۡقُرۡءَانَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِن مُّدَّكِرٍ ﴿٣٢﴾

''ثمود نے تنبیہات کو جھٹلایا اور کہنے لگے۔ایک اکیلا آدمی جو ہم ہی میں سے ہے 'کیا اب ہم اس کے پیچھے چلیں؟ اس کا اتباع ہم قبول کرلیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم بہک گئے ہیں اور ہماری عقل ماری گئی ہے۔کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص تھا جس پر خدا کا ذکر نازل کیا گیا؟ نہیں بلکہ یہ پرلے درجے کا جھوٹا اور لالچی ہے۔ (ہم نے اپنے پیغمبر سے کہا) ''کل ہی انہیں معلوم ہوا جاتا ہے کہ کون پرلے درجے کا جھوٹا اور لالچی ہے۔ہم اونٹنی کو ان کے لئے فتنہ بنا کر بھیج رہے ہیں۔اب ذرا صبر کے ساتھ دیکھ کہ ان کا کیا انجام ہوتا ہے۔ان کو جتا دے کہ پانی ان کے اور اونٹنی کے درمیان تقسیم ہوگا اور ہر ایک اپنی باری کے دن پانی پر آئے گا۔'' آخر کار ان لوگوں نے اپنے آدمی کو پکارا اور اس نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور اونٹنی کو مار ڈالا۔پھر دیکھ لو کہ کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات۔ہم نے ان پر بس ایک ہی دھماکہ چھوڑا اور وہ باڑے والے کی روندی ہوئی باڑھ کی طرح بھس ہوکر رہ گئے۔ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا ہے۔اب ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا''؟

قبیلہ ثمود جزیرہ عرب میں عاد کے بعد نمودار ہوا۔یہ بھی عاد کی طرح قوت اور شوکت میں بے مثال تھا۔ہاں عادی جنوب میں تھے اور ثمود شمال میں تھے۔ثمود نے بھی رسول کی تکذیب اسی طرح کی جس طرح عاد نے کی تھی حالانکہ ثمود کو عاد کے انجام کا اچھی طرح علم تھا کیونکہ وہ جزیرہ عرب کے جنوب میں تھے۔

فَقَالُوٓاْ أَبَشَرًا مِّنَّا وَٰحِدًا نَّتَّبِعُهُۥٓ إِنَّآ إِذًا لَّفِي ضَلَٰلٍ وَسُعُرٍ (٢٤) أَءُلۡقِيَ ٱلذِّكۡرُ عَلَيۡهِ مِنۢ بَيۡنِنَا بَلۡ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٞ (٢٥) سَيَعۡلَمُونَ غَدٗا مَّنِ ٱلۡكَذَّابُ ٱلۡأَشِرُ

(٥٤: ٢٦) ''اور کہنے لگے ایک اکیلا آدمی جو ہم میں سے ہے کیا اب ہم اس کے پیچھے چلیں؟ اس کا اتباع ہم قبول کریں تو معنی یہ ہوں گے کہ ہم بہک گئے ہیں اور ہماری عقل ماری گئی ہے۔کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص تھا جس پر خدا کا ذکر نازل کیا گیا؟ نہیں بلکہ یہ پرلے درجے کا جھوٹا اور لالچی ہے۔''

یہ وہی شبہ ہے جو پوری تاریخ میں تمام مکذبین کے دلوں میں خلجان پیدا کرتا رہا ہے۔

أَءُلۡقِيَ ٱلذِّكۡرُ عَلَيۡهِ مِنۢ بَيۡنِنَا (٥٤: ٢٥) ''کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص تھا جس پر خدا کا ذکر نازل کیا گیا'' یہ ان کی کھوکھلی اور بے حقیقت کبریائی تھی اور جس شخص کے اندر اس قسم کا کبر ہو وہ بھی حقیقت کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔وہ بات کو نہیں دیکھتا۔اس کو دیکھتا ہے کہ کہنے والا کون ہے۔

أَبَشَرًا مِّنَّا وَٰحِدًا نَّتَّبِعُهُۥٓ (٥٤: ٢٤) ''ایک اکیلا آدمی جو ہم میں سے ہے کیا ہم اب اس کے پیچھے

چلیں ؟ "

آخر اس میں کیا قباحت ہے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے ایک اکیلے شخص کو چن لے ۔ اللہ تو خوب جانتا ہے کہ رسالت کی امانت کہاں رکھے اور پھر اس کے اوپر ذکر نازل کرے ۔ اس کو ہدایات دے اور نصیحت کی باتیں اس پر نازل کرے ' اللہ خالق ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے بندوں میں سے اس امانت کی استعداد اس نے کس کو دی ہے ۔ پھر ذکر نازل کرنے والا بھی اللہ ۔ یہ سوال ایک بے حقیقت سوال ہے اور وہی تباہی ہے جو نہایت گمراہ لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے ۔ ایسے لوگ جو کسی دعوت کے بارے میں یہ نہیں سوچتے کہ اس میں صدق و سچائی کس قدر ہے ۔ وہ دعوت دینے والے کو دیکھتے ہیں کہ دو بستیوں میں سے یہ کتنا بڑا آدمی ہے ۔ اگر کسی چھوٹے آدمی کی بات مانی گئی تو وہ چھوٹا بڑا بن جائے گا اور یہ چھوٹے رہ جائیں گے ۔

یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ ہمیشہ یہ کہتے ہیں ۔

اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ اِنَّآ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ( ۵۴ : ۲۴ ) "ایک اکیلا آدمی جو ہم میں سے ہے اس کے پیچھے چلیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم بہک گئے ہیں اور ہماری عقل ماری گئی ہے یا ہم جنم رسید ہوگئے ۔" اگر ہم سے یہ منکر فعل واقع ہوگیا ۔ جب عقل ماری جاتی ہے تو انسان ہدایت کو ضلالت سمجھتا اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ گویا بہت زیادہ تعداد والی جہنموں میں داخل ہوگا ۔ (سعر جمع سعیر ہے) حالانکہ دعوت قبول کرکے وہ ایمان کے سایہ میں آجاتا لیکن سمجھتا ہے کہ اگر ایمان لایا تو جہنموں میں داخل ہوگا ۔

یہی وجہ ہے کہ جس رسول کو اللہ نے ان کی رہنمائی کے لئے بھیجا تھا اس کے بارے میں انہوں نے کہا کہ وہ جھوٹا اور لالچی ہے ۔

بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ( ۵۴ : ۲۵ ) "بلکہ وہ جھوٹا اور لالچی ہے" کذاب جھوٹا ' اشر شدید لالچی اور اس تبلیغ سے وہ اقتدار اور مرتبہ چاہتا ہے ۔ ہر داعی پر ہمیشہ یہی الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ دعوت اسلامی کے بہانے مفادات کے حصول کے لئے جدوجہد کرتا ہے اور یہ ان اندھوں کا موقف ہوتا ہے جو نیک لوگوں کے جذبات اور ان کے قلبی محرکات سے واقف نہیں ہوتے ۔

بات ابھی تک حکایتی اور قصے کے انداز سے چلتی ہے کہ اچانک معاملہ خطاب کا آجاتا ہے ۔ اور یوں نظر آتا ہے کہ گویا واقعات ابھی جاری ہیں ۔ اس لئے بتایا جاتا ہے کہ عنقریب کیا ہونے والا ہے اور ان کو مستقبل میں ہونے والے واقعات کی دھمکی دی جاتی ہے ۔

سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ( ۵۴ : ۲۶ ) "کل ہی انہیں معلوم ہو جائے گا کہ پرلے درجے کا جھوٹا اور لالچی کون ہے ۔" یہ قصص کے بیان کا ایک قرآنی طریقہ ہے ۔ یہ انداز قصے میں جان ڈال دیتا ہے کہ بجائے محض قصہ پارینہ کے تخیل کے زور سے اس قصے کو ایک منظر نامے کی شکل میں تبدیل کر دیا جاتا ہے ۔ اب یہ قصہ نہیں رہتا بلکہ حال اور مستقبل کے واقعات بن جاتا ہے ۔

سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْأَشِرُ (٥٤ : ٢٦) "کل ہی وہ جان لیں گے کہ جھوٹا اور لاپٹی کون ہے" کل یہ حقیقت کھل جائے گی اور یہ چھوٹ نہیں سکیں گے اور یہ مصیبت بتا دے گی کہ کون جھوٹا ہے اور جھوٹوں کی سزا کیا ہے۔

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ (٢٧) وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ

بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ (٥٤ : ٢٨) "ہم اپنی اونٹنی کو ان کے لئے فتنہ بنا کر بھیج رہے ہیں۔ اب ذرا صبر کے ساتھ دیکھ کہ ان کا کیا انجام ہوتا ہے۔ ان کو جتا دے کہ پانی ان کے اور اونٹنی کے درمیان تقسیم ہوگا اور ہر ایک اپنی باری کے دن پانی پر آئے گا۔" اب پڑھنے والے انتظار میں ہیں کہ ہوتا کیا ہے۔ ناقہ بھیج دی جاتی ہے۔ یہ ان کے لئے آزمائش ہے اور ان کے لئے امتحان ہے کہ کون کامیاب ہوتا ہے اور کون ناکام اور رسول وقت بھی انتظار میں ہے کہ کیا ہوتا ہے اور اللہ کے حکم کے مطابق وہ صبر کرتا ہے۔ اس وقت تک کہ امتحان کا نتیجہ سامنے آجائے۔ نبی کو یہ ہدایت دے دی جاتی ہے کہ پانی ان کے اور ناقہ کے درمیان تقسیم ہے۔ یہ ناقہ لازماً مخصوص ناقہ تھی۔ تقسیم یوں تھی کہ ایک دن کا پورا پانی ناقہ کے لئے تھا اور دوسرے دن کا ان کے لئے۔ ناقہ اپنے دن آئے گی اور یہ لوگ اپنے دن آئیں گے۔ وہ اپنے دن پئے گی اور یہ لوگ اپنے دن پانی لیں گے۔

اب سیاق کلام پھر حکایتی اور قصے کا انداز لے لیتا ہے اور اس کے بعد یہ واقعات یوں آتے ہیں۔

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ (٥٤ : ٢٩) "آخر کار انہوں نے اپنے آدمی کو پکارا اور اس نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور اونٹنی کو مار ڈالا۔" اور یہ شخص ان مفسدین میں سے ایک تھا جو اس شہر میں فساد کی جڑ تھے۔ سورت نمل میں ان کے بارے میں آیا ہے۔

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (٢٧ : ٤٨) "اور شہر میں نو جتھے دار تھے جو ملک میں فساد پھیلاتے تھے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔" اور سورت شمس میں کہا گیا۔

اِذِ انْبَعَثَ اَشْقٰهَا (٩١ : ١٢) "جب ان میں ایک بدبخت اٹھا"

بعض روایات میں آتا ہے کہ اس شخص نے شراب پی لی تاکہ وہ اس کام کو بے باکی سے کر سکے، اور اس ناقہ کو قتل کر دے جو اللہ نے بطور نشانی بھیجی تھی اور رسول اللہ نے ان کو ڈرا دیا تھا اور متنبہ کر دیا تھا کہ اگر تم نے اسے گزند پہنچایا تو تم پر عذاب الٰہی آجائے گا۔ اس طرح فتعاطی کے معنی بیڑا اٹھانے کی بجائے شراب پینے کے ہوں گے۔

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ (٥٤ : ٢٩) "انہوں نے اپنے آدمی کو بلایا اس نے یہ ذمہ لے لیا یا شراب پی کر اسے قتل کر دیا۔" یہ امتحان ہو گیا اور ان پر عذاب نازل ہو گیا۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ (۵٤: ۳۰) "پھر دیکھ لو کہ کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات" یہ سوال تعجب انگیز اور خوف پیدا کرنے کے لئے ہے اور یہ عذاب کے ذکر سے بھی پہلے کیا جاتا ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ (۵٤: ۳۱) "ہم نے ان پر بس ایک ہی دھماکہ چھوڑا اور وہ باڑے والے کی روندی ہوئی باڑھ کی طرح بھس ہو کر رہ گئے" قرآن کریم نے اس چیخ اور دھماکے کی تفصیلات نہیں دی ہیں ۔ اگرچہ دوسری جگہ سورت فصلت میں تفصیل آتی ہے کہ ۔

فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (۴۱: ۱۳) "تو کہہ دو کہ میں تمہیں اسی طرح اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا کہ عاد و ثمود پر نازل ہوا"۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صاعقہ صیحہ کی صفت ہو یعنی کڑاکے دار آواز ۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صیحہ اور صاعقہ ایک ہی حقیقت کے لئے استعمال ہوں یعنی اچانک ٹوٹ پڑنے والا عذاب اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صیحہ صاعقہ کی آواز ہو یا صاعقہ آواز کا اثر ہو ۔ آواز دی کس طرح اس کا ہمیں علم نہیں ہے ۔

بہرحال ان پر ایک کڑاکے دار اور دھماکہ خیز آواز آئی اور ان کو ختم کر کے رکھ دیا ۔ یہ اس طرح ہو گئے کھشیم المحتظر (وہ باڑ والے کی روندی ہوئی باڑ کی طرح بھس ہو کر رہ گئے) المحتظر وہ شخص جو خطیرہ یا باڑہ بناتا ہے اور یہ باڑہ وہ خشک کانٹے دار لکڑیوں سے بناتا ہے یہ لوگ اس طرح ہو گئے جس طرح خشک بوسیدہ لکڑیاں جو ٹوٹ پھوٹ کر بھس بن گئی ہوں تشبیہ یوں ہے کہ باڑے والا اپنے مویشیوں کے لئے لکڑیوں اور درختوں کی شاخیں جمع کرتا ہے کہ شاخیں مویشی کھاتے ہیں اور خشک ہو جاتی ہیں اور ان کو مویشی روندتے ہیں تو وہ بھوسے کی طرح پس جاتی ہیں تو یہ قوم اس طرح ہو گئی جس طرح باڑے والے کی جھاڑیاں کھائی ہوئی اور روندی ہوئی ۔ صرف ایک ہی ربانی چیخ سے ۔

یہ سخت دردناک و خوفناک منظر ہے اور یہ ان لوگوں کے جواب میں ہے جو مفسد تھے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھتے تھے چنانچہ ان متکبرین کو پیس ڈالا گیا ۔

اس دردناک و خوفناک منظر کے بعد لوگوں کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ اللہ کی آیات سے نصیحت حاصل کریں اور تدبر کریں اور اس مقصد کے لئے قرآن بہترین گائیڈ ہے ۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵٤: ۳۲) "ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنایا ہے ۔ اب ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا" اس پر پردہ گرتا ہے اور منظر پر روندا ہوا بھس پڑا ہے ۔ آنکھوں کے لئے ایک منظر اور دل کے لئے ایک عبرت ۔ یہ قرآن پکار پکار کر بلا رہا ہے نصیحت لینے والوں اور فکر و تدبر کرنے والوں کو ۔

---○○○---

اب جب دوبارہ پردہ اٹھتا ہے تو تاریخ کا وہ ورق الٹا جاتا ہے جو جزیرہ عرب کے قریب ہے 'قوم لوط کا منظر:

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍ بِالنُّذُرِ ﴿٣٣﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ
لُوْطٍ ؕ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ﴿٣٤﴾ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ﴿٣٥﴾
وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿٣٦﴾ وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ
فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿٣٧﴾ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ
۲ مُّسْتَقِرٌّ ﴿٣٨﴾ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿٣٩﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ
ع۱۸ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿٤٠﴾
۹

””لوط کی قوم نے تنبیہات کو جھٹلایا اور ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا اس پر بھیج دی ۔ صرف لوط کے گھر والے اس سے محفوظ رہے ۔ ان کو ہم نے اپنے فضل سے رات کے پچھلے پہر بچا کر نکال دیا ۔ یہ جزا دیتے ہیں ہم ہر اس شخص کو جو شکر گزار ہوتا ہے ۔ لوط نے اپنی قوم کے لوگوں کو ہماری پکڑ سے خبردار کیا مگر وہ ساری تنبیہات کو مشکوک سمجھ کر باتوں میں اڑاتے رہے ۔ پھر انہوں نے اسے اپنے مہمانوں کی حفاظت سے باز رکھنے کی کوشش کی ۔ آخر کار ہم نے ان کی آنکھیں موند دیں کہ چکھو اب میرے عذاب اور میری تنبیہات کا مزا ۔ صبح سویرے ایک اٹل عذاب نے ان کو آلیا ۔ چکھو مزا اب میرے عذاب کا اور میری تنبیہات کا ۔ ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا ہے ۔ پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا“؟

قوم لوط کا قصہ دوسرے مقامات پر مفصل مذکور ہے ۔ یہاں اس قصے کی تفصیلات دینا مطلوب نہیں ہے بلکہ یہ عبرت دلانا مقصود ہے کہ تکذیب کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے ۔ یہ کہ اللہ کا سخت عذاب آتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز ہی تنبیہات الٰہیہ کی تکذیب کے ذکر سے ہوتا ہے ۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍ بِالنُّذُرِ ( ۵۴ : ۳۳ ) ”قوم لوط نے تنبیہات کو جھٹلایا“ اور اس کے بعد متصلاً عذاب الٰہی کا ذکر ہوتا ہے ۔

اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ( ۳۴ ) نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ( ۵۴ : ۳۵-۳۴ ) ”اور ہم نے اس پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی ۔ صرف لوط کے گھر والے اس سے محفوظ رہے ۔ ان کو ہم نے اپنے فضل سے رات کے پچھلے پہر بچا کر نکال لیا ۔ یہ جزا دیتے ہیں ہم ہر اس شخص کو جو شکر گزار ہوتا ہے ۔“

الحاصب وہ ہوا جو پتھروں کو اڑا کر پھینک دیتی ہو اور دوسری جگہ آیا ہے کہ ان پر مٹی کے پتھر پھینکے گئے تھے ۔ لفظ

حاصب کی آواز ہی ایسی ہے جس سے پتھر پھینکے جانے کی آواز آتی ہے ۔ اس میں شدت اور سختی ہے جو اس وقت منظر اور فضا کے مناسب ہے ۔ اس عذاب سے صرف لوط علیہ السلام کے خاندان کے لوگ بچے ۔ ماسوائے ان کی اہلیہ کے اور بچنے والے اس لئے بچے کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرتے تھے اور اللہ شکر کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتا ہے ۔ ان کو اللہ عذاب سے نجات دیتا ہے اور وہ خوفناک حادثات کے درمیان سے بھی بچ کر نکل آتے ہیں ۔

قرآن نے یہاں تک اس قصے کے دو اطراف بیان کر دیئے ۔ ان کی طرف سے جھٹلانا اور اللہ کی طرف سے عذاب شدید' یہ یہاں اصل مقصد تھا ۔ اب قصے کے دونوں اطراف کے درمیان کی بعض ضروری تفصیلات ۔ قرآن کریم کا یہ بھی ایک خاص انداز بیان ہے ۔ اس انداز سے قرآن کریم بعض اشارات دیتا ہے اور تفصیلات یہ ہیں :

وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ (۳۶) وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ (۳۷) وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ

( ۵۴ : ۳۸ ) "لوط نے اپنی قوم کو ہماری پکڑ سے خبردار کیا مگر وہ ساری تنبیہات کو مشکوک سمجھ کر باتوں میں اڑاتے رہے ۔ پھر انہوں نے اسے اپنے مہمانوں کی حفاظت سے باز رکھنے کی کوشش کی ۔ آخر کار ہم نے ان کی آنکھیں موند دیں کہ چکھو اب میرے عذاب اور میری تنبیہات کا مزہ ۔ صبح سویرے ایک اٹل عذاب نے ان کو آلیا ۔" حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں کو اس منکر سے ایک طویل عرصے تک منع کیا لیکن انہوں نے یقین نہ کیا ۔ ہمیشہ شک میں مبتلا رہے اور ایک دوسرے کی طرف شک ہی کو منتقل کرتے رہے اور ایک دوسرے سے شک ہی اخذ کرتے رہے اور نبی کے ساتھ جھگڑتے ہی رہے اور ان کی بدتمیزی اس حد تک پہنچ گئی کہ خود لوط علیہ السلام کے ہاں جب مہمان' فرشتے آئے تو انہوں نے ان کو ان کا دفاع کرنے سے روک دیا ۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ خوش شکل لڑکے ہیں تو ان کے گندے جذبات جوش میں آگئے ۔ انہوں نے حضرت لوط کو گھیر لیا اور مقصد یہ تھا کہ اس کے مہمانوں کے ساتھ بدتمیزی کریں ۔ انہوں نے سنجیدگی اور شرم و حیا کے جامے تار تار کر دیئے اور انہوں نے اپنے نبی کی عزت کا بھی خیال نہ رکھا حالانکہ انہوں نے ان کو بار بار اس فعل بد کے انجام بد سے ڈرایا تھا ۔

اس مقام پر اب دست قدرت مداخلت کرتی ہے ۔ فرشتے اس عذاب کے برپا کرنے کے لئے حرکت میں آتے ہیں جس کے لئے انہیں بھیجا گیا تھا ۔

فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ ( ۵۴ : ۳۷ ) "ہم نے ان کی آنکھیں موند دیں" اور وہ اس طرح ہوگئے کہ نہ کسی چیز کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ انسانوں کو ۔ اب نہ وہ لوط کو گھیر سکتے ہیں نہ مہمانوں کو پکڑ سکتے ہیں ۔ یہ کہ قوم لوط کو اندھا کر دیا گیا تھا ۔ اس کا ذکر صرف یہاں آیا ہے ۔ پوری وضاحت کے ساتھ دوسری جگہ یہ ہے ۔

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ "لوط' ہم تیرے رب کے فرستادہ ہیں یہ لوگ تیری طرف نہیں پہنچ سکتے ۔" یہاں پر تفصیل دے دی کہ وہ فرشتوں اور لوط علیہ السلام تک اس لئے نہ پہنچ سکتے تھے کہ ان کو

اندھا کر دیا گیا تھا۔

اب تک تو بات بطور حکایت ہو رہی تھی ' اچانک آنکھوں کے سامنے ایک منظر آتا ہے اور جن پر عذاب آیا ہے ان سے مخاطب ہو رہا ہے۔

فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذُرِ ( ٥٤ : ٣٧ ) "چکھو اب میرے عذاب اور میری تنبیہات کا مزہ" یہ ہے وہ عذاب جس سے تمہیں ڈرایا جارہا تھا اور یہ ہیں وہ تنبیہات جن میں تم شک کر رہے تھے۔

ان کی آنکھیں شام کو موند دی گئیں اور صبح تک وہ یونہی رہے کیونکہ اللہ نے ان کے لئے عذاب صبح کے وقت مقرر کیا ہوا تھا۔

وَلَقَدْ صَبَّحَهُم بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ( ٥٤ : ٣٨ ) "صبح سویرے ہی ایک اٹل عذاب نے ان کو آلیا" اور یہ وہی عذاب تھا جس کا جلد سے تذکرہ اوپر کر دیا گیا۔ یہ وہ سخت ہوا تھی جس نے مٹی کے پتھروں کی بارش ان پر کر دی تھی اور اس نے زمین کو اس گندگی اور فساد سے پاک کر دیا۔

اب پھر انداز بیان میں فرق آتا ہے۔ منظر کو یوں پیش کیا جاتا ہے کہ گویا ابھی کا واقعہ ہے اور جن کو عذاب دیا گیا ان سے خطاب شروع ہے۔

فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذُرِ ( ٥٤ : ٣٩ ) "چکھو اب میرے عذاب اور میری تنبیہات کا مزہ" اور آخر میں وہی سبق۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ( ٥٤ : ٤٠ ) "ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا ہے پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا"

یہ کڑیاں اب جزیرہ عرب کے باہر سے بھی ایک منظر پیش کر کے ختم ہوتی ہیں۔ ایک مختصر اشارہ فرعون کے انجام کی طرف :-

وَلَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿٤١﴾ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كُلِّهَا فَأَخَذْنَاهُمْ
أَخْذَ عَزِيزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿٤٢﴾ أَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ أُولَٰئِكُمْ أَمْ لَكُم بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿٤٣﴾
أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُّنتَصِرٌ ﴿٤٤﴾ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ﴿٤٥﴾ بَلِ
السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ ﴿٤٦﴾ إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ﴿٤٧﴾
يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ ﴿٤٨﴾ إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ

خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿٤٩﴾ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ﴿٥٠﴾ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ
٣ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿٥١﴾ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ﴿٥٢﴾ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿٥٣﴾
١٥ع اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ﴿٥٤﴾ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿٥٥﴾

١٠ "اور آل فرعون کے پاس بھی تنبیہات آئی تھیں مگر انہوں نے ہماری ساری نشانیوں کو جھٹلا دیا۔ آخر کو ہم نے انہیں پکڑا جس طرح کوئی زبردست قدرت والا پکڑا کرتا ہے۔ کیا تمہارے کفار کچھ ان لوگوں سے بہتر ہیں؟ یا آسمانی کتابوں میں تمہارے لئے کوئی معافی لکھی ہوئی ہے؟ یا ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ہم ایک مضبوط جتھا ہیں' اپنا بچاؤ کرلیں گے؟ عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے بلکہ ان سے نمٹنے کے لئے اصل وعدے کا وقت تو قیامت ہے اور وہ بڑی آفت اور زیادہ تلخ ساعت ہے۔ یہ مجرم لوگ درحقیقت غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور ان کی عقل ماری گئی ہے۔ جس روز یہ منہ کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے' اس روز ان سے کہا جائے گا کہ اب چکھو جہنم کی لپٹ کا مزا۔ نافرمانی سے پرہیز کرنے والے یقیناً باغوں اور نہروں میں ہوں گے۔ سچی عزت کی جگہ' بڑے ذی اقتدار بادشاہ کے قریب"۔

فرعون کے قصے کا آغاز و انجام اس قدر اختصار کے ساتھ دیا جاتا ہے۔ فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس ڈرانے والے آتے ہیں۔ وہ نشانیاں پیش کرتے ہیں۔ وہ ان تمام نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں اور اللہ نے ان کو اس طرح پکڑا جس طرح ایک حقیقی اقتدار رکھنے والا پکڑتا ہے۔ عزت اور اقتدار کی طرف اشارہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان کو نہایت ہی سختی سے پکڑا گیا اور اشارہ اسی طرف ہے کہ فرعون بڑی عزت' قوت اور اقتدار اعلیٰ کی باتیں کرتا تھا جبکہ یہ سب امور اللہ کو حاصل ہیں۔ اللہ کے سامنے اس کی باطل عزت نہ رہی' اس کا جھوٹا اقتدار اعلیٰ گر گیا اور حقیقی مقتدر اعلیٰ نے اسے خوب پکڑا اور بڑی شدت اور عبرت آموزی سے پکڑا جس طرح انہوں نے مصر میں سختی' ظلم اور قہاری و جباری سے غریبوں پر ظلم شروع کر رکھا تھا۔ اسی طرح اللہ نے ان کو بھی نابود کر دیا۔ اب اس آخری منظر پر پردہ گرتا ہے۔ یہ فرعون جبار کا منظر اور اس کی ایک جھلک ہے۔

انسانی تاریخ میں منکرین کے عذاب کے مناظر میں سے یہ آخری منظر تھا۔ تمام منکرین کی یاد قارئین کے ذہنوں میں تازہ ہے اور سننے والوں اور یہ دیکھنے والوں کا احساس ابھی ان نقوش سے منقش ہے کہ اہل مکہ کو خطاب شروع ہو جاتا ہے۔ ان کو تنبیہہ کی جاتی ہے کہ تم بھی اسی طرح نیست و نابود ہو سکتے ہو اگر تم باز نہ آئے بلکہ تمہاری جو حرکتیں ہیں ان کا تقاضا تو یہ ہے کہ تم پر اس سے بھی بھیانک عذاب آئے:-

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ (٤٣) اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ
جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ (٤٤) سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ (٤٥) بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ
وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ (٤٦) اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ (٤٧) يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ

فِى النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ (۴۸) اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (۴۹) وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ (۵۰) وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۱) وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِى الزُّبُرِ (۵۲) وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ (۵۳) (۵۴ : ۴۳ تا ۵۵) "کیا تمہارے کفار کچھ ان لوگوں سے بہتر ہیں؟ یا آسمانی کتابوں میں تمہارے لئے کوئی معافی لکھی ہوئی ہے؟ یا ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ہم ایک مضبوط جتھا ہیں 'اپنا بچاؤ کر لیں گے؟ عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے بلکہ ان سے نمٹنے کے لئے اصل وعدے کا وقت تو قیامت ہے اور وہ بڑی آفت اور زیادہ تلخ ساعت ہے۔ یہ مجرم لوگ در حقیقت غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور ان کی عقل ماری گئی ہے۔ جس روز یہ منہ کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے 'اس روز ان سے کہا جائے گا کہ اب چکھو جہنم کی لپٹ کا مزہ۔

ہم نے ہر چیز ایک تقدیر کے ساتھ پیدا کی ہے اور ہمارا حکم بس ایک ہی حکم ہوتا ہے اور پلک جھپکاتے وہ عمل میں آجاتا ہے۔ تم جیسے بہت سوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں پھر ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟ جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ سب دفتروں میں درج ہے اور ہر چھوٹی بڑی بات لکھی ہوئی موجود ہے۔

یہ دنیا اور آخرت دونوں کے عذابوں سے ڈراوا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس سے نکل بھاگنے کا کوئی راستہ اور سوراخ نہیں ہے اور نہ بھاگنے یا بچ جانے کی کوئی امید ہو سکتی ہے۔ نہ حساب و کتاب میں کوئی چابکدستی دکھائی جا سکتی ہے اور اس طرح سزا سے بچا جا سکتا ہے۔

تم نے دیکھ لیا امم سابقہ کے جھٹلانے والوں پہ کیا گزری۔ آخر تمہارے پاس کیا گارنٹی ہے کہ تم اسی انجام سے دوچار نہ ہو گے۔

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ (۵۴ : ۴۳) "تمہارے کفار کچھ ان لوگوں سے بہتر ہیں" امم سابقہ کے جو کفار اسی طرح نیست و نابود ہوئے تم ان سے کس پہلو میں اچھے ہو۔

اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِى الزُّبُرِ (۵۴ : ۴۳) "یا آسمانی کتابوں میں تمہارے لئے کوئی معافی لکھی ہوئی ہے؟" اور جس پر یہ منزل صحیفے گواہ ہیں کہ تم کفر اور تکذیب کے انجام سے بری الذمہ ہو جاؤ گے۔ نہ یہ بات ہے اور نہ وہ ہے۔ نہ تم ان سے اچھے ہو اور نہ ان صحیفوں میں تمہاری برات لکھی ہوئی ہے۔ بس یہی صورت ہے کہ تم بھی اسی انجام سے دوچار ہو جاؤ جس سے وہ دوچار ہوئے جس طرح اللہ نے مقدر فرمایا ہے۔

اب یہ خطاب عام کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس میں ان کے معاملے پر سخت تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ (۵۴ : ۴۴) "یا ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ہم ایک مضبوط جتھا ہیں اور اپنا بچاؤ کر لیں گے" جب وہ دیکھتے تھے کہ کفار مکہ ایک بڑی جمعیت ہیں تو ان کے حوصلے بڑھ جاتے تھے اور اپنی قوت پر

غرور میں مبتلا ہو کر کہتے تھے کہ ہم ہی غالب رہیں گے اور نہ ہم پر کوئی غالب ہو سکتا ہے اور نہ ہمیں کوئی قوت شکست دے سکتی ہے۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ (٥٤ : ٤٥) "عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے۔" لہٰذا ان کی جمعیت انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکے گی۔ ان کی قوت ان کے لئے مددگار ثابت نہیں ہوگی۔ یہ اعلان چونکہ اللہ قہار و جبار کا تھا اس لئے ایسا ہی ہوا اور ایسا ہی ہونا تھا۔

مسلم و بخاری نے ابن عباس کی روایت نقل کی فرمایا کہ حضور اکرم بدر کے دن آپ کے لئے بنائے ہوئے ایک چبوترے میں تھے اور دعا کر رہے تھے 'اے اللہ میں تجھ کو تیرے وعدے اور عہد کا واسطہ دیتا ہوں۔ اگر تو چاہے تو آج کے بعد تیری بندگی اس زمین پر نہ ہوگی" حضرت ابوبکر نے آپ کو ہاتھ سے پکڑا اور کہا یارسول اللہ آپ کے لئے یہی کافی ہے آپ نے رب تعالیٰ کے سامنے بہت زاری کرلی ہے۔ آپ نکلے اور زرہ میں ڈوبے ہوئے تھے اور آپ کہہ رہے تھے۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ (٥٤ : ٤٥) "عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے۔"

ابن ابوحاتم کی روایت میں عکرمہ سے نقل ہے۔ انہوں نے کہا جب یہ آیت نازل ہوئی۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ (٥٤ : ٤٥) "عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے۔" تو حضرت عمر نے فرمایا کہ کونسا جتھا یعنی کونسا جتھا شکست کھائے گا۔ عمر کہتے ہیں جب بدر کا دن آیا تو میں نے دیکھا رسول اللہ زرہ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور یہی آیت پڑھ رہے ہیں۔ "عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔" تو اس وقت میری سمجھ میں بات آئی کہ اس سے کونسی جمعیت مراد ہے۔ یہ تو تھی دنیا کی ہزیمت لیکن یہ آخری ہزیمت نہ تھی اور نہ ہی یہ شدید اور تلخ عذاب ہے چنانچہ اس دنیاوی شکست کے بعد اب آخری شکست کی طرف بات پھر جاتی ہے۔

بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَى وَأَمَرُّ (٥٤ : ٤٦) "بلکہ ان سے نمٹنے کے لئے اصل وعدے کا وقت تو قیامت ہے اور وہ بڑی آفت اور زیادہ تلخ ساعت ہے۔" اس عذاب سے جو انہوں نے دیکھا ہے یا اس زمین کی زندگی میں دیکھیں گے یا ان تمام عذابوں سے زیادہ تلخ جو اس سورت میں بیان ہوئے ہیں مثلاً طوفان نوح' باد صرصر' سخت آواز اور پتھروں کی بارش والی ہوا اور فرعون کی زبردست غرقابی۔

اب تفصیلاً بتایا جاتا ہے کہ قیامت کا عذاب کس طرح سخت شدید اور تلخ ہوگا اور تفصیلات قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں بتائی جاتی ہے :۔

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ (٤٧) يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى

وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ (٥٤ : ٤٨) "یہ مجرم لوگ در حقیقت غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور ان کی عقل ماری گئی ہے۔ (یا گمراہی اور آگ میں ہیں) جس روز یہ منہ کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے۔ اس روز ان سے کہا جائے گا کہ اب چکھو جہنم کی لپٹ کا مزا۔" یعنی وہ گمراہی میں ہیں جہاں عقل اور روح کی سزا ہوتی ہے اور جہنم میں ہیں جہاں جسم اور جلد کو سزا ہوتی ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ کہتے تھے اور ان جیسے سب لوگوں نے بھی کہا ہے۔

اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ (٥٤ : ٢٤) "کیا ہم میں سے ایک اکیلے شخص کی ہم تابعداری شروع کر دیں۔ اگر ایسا کریں تو گویا ہم بہک گئے اور کئی آگوں میں پڑ گئے۔" اب ان کو معلوم ہو گا کہ گمراہی اس اتباع میں ہے یا انکار میں ہے اور آگ اتباع رسول میں ہے یا مخالفت رسول میں ہے۔

نہایت ہی سختی، حقارت سے منہ کے بل آگ میں گرا دیا جائے گا۔ یہ اس لئے کہ دنیا میں وہ استکبار اور غرور کے ساتھ کام کرتے تھے اور قوت کے بل بوتے پر فیصلے کرتے تھے۔ اب یہاں جسمانی عذاب کے ساتھ ساتھ ان کو روحانی اور نفسیاتی عذاب بھی دیا جائے گا۔ یوں سرزنش کر کے۔

ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ (٥٤ : ٤٨) "چکھو جہنم کی آگ کی لپٹ"

اس خوفناک اور کپکپا دینے والے منظر کے سایہ میں اب روئے سخن تمام لوگوں کی طرف پھر جاتا ہے۔ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کی طرف تاکہ ان کے دلوں میں اللہ کی حکمت و تدبیر اور اللہ کی تقدیر اور فیصلوں کی حقیقت بیٹھ جائے۔

یہ دنیا ہو یا آخرت ہو، اس دنیا کا عذاب ہو یا آخرت کا عذاب ہو، اس سے قبل کی رسالتیں اور تنبیہات ہوں یا قرآن اور نبی آخر الزمان ہوں، یہ پوری کائنات یا اس کا انتظام و انصرام ہو یا یہ چھوٹی چیز ہو یا بڑی چیز ہو، یہ سب کی سب ایک اندازے اور ایک سکیم کے مطابق اللہ کی حکمت کے مطابق پیدا کئے گئے ہیں۔ کوئی چیز بھی بے مقصد، اتفاقاً، عبث اور بے سوچے سمجھے پیدا نہیں کی گئی۔

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (٥٤ : ٤٩) "ہم نے ہر چیز تقدیر کے ساتھ پیدا کی ہے۔" ہر چیز، چھوٹی ہو یا بڑی ہو، بولنے والی ہو یا خاموش، متحرک ہو یا ساکن، گزری چیز یا حاضر، معلوم چیز یا مجہول، اللہ نے ہر چیز کو ایک اندازے سے پیدا کیا ہے۔

یہ تقدیر اس کی حقیقت طے کرتی ہے۔ اس کی صفت طے کرتی ہے۔ اس کی مقدار طے کرتی ہے۔ اس کا زمانہ طے کرتی ہے۔ اس کا مکان طے کرتی ہے۔ اس کے ماحول کے ساتھ اس کے روابط طے کرتی ہے۔ اس کائنات میں اس کے اثرات طے کرتی ہے۔

یہ قرآنی آیت چند مختصر الفاظ پر مشتمل ہے لیکن یہ آیت ایک عظیم اور محیر العقول حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس آیت کے مفہوم میں یہ پوری کائنات شامل ہے۔ اس حقیقت کو انسان کا دل تب ہی پا سکتا ہے جب وہ اس پوری کائنات کو ذہن میں رکھے۔ وہ اس کائنات کے ساتھ ہمقدم ہو۔ اس سے حقائق اخذ کرے اور یہ محسوس کرے کہ یہ کائنات باہم تناسب اور نہایت ہی دقت کے ساتھ باہم مربوط مخلوق ہے۔ اس کی ہر چیز ایک مقدار کے مطابق پیدا کی گئی

ہے - تب اس حقیقت کا ایک سایہ اور ایک خاکہ ذہن میں بیٹھ جائے گا۔ صرف ایک چیز کو ذہن میں رکھنے سے یہ تصور نہیں آسکتا۔

جدید سائنس نے اس حقیقت کے بعض نہایت ہی معمولی شعبوں کا احاطہ کیا ہے - یہ علم جدید سائنس نے اپنے محدود وسائل کے مطابق فراہم کیا ہے - سائنس نے معلوم کر لیا ہے کہ ستاروں کے درمیان فاصلے ایک متعین مقدار کے مطابق ہیں - سیارے اور ان کے حجم اور ستاروں اور سیاروں کے گروپ یعنی کہکشاں اور ان کی ایک دوسرے کے ساتھ کشش' یہ مقداریں اور فاصلے اس قدر متعین ہوگئے ہیں کہ سائنس دانوں نے ایسے ستاروں کے فاصلے بھی متعین کر دیئے ہیں جن کو انہوں نے دیکھا نہیں ہے کیونکہ کشش اور ہم آہنگی کا تقاضا یہ تھا کہ ان ستاروں کو اس قدر دور ہونا چاہئے کیونکہ جس نظام کو جس تدبیر و تقدیر کے ساتھ انہوں نے دیکھا ہے' اس نظام کے مطابق ان کا فاصلہ اس قدر دور ہونا چاہئے - اس کے بعد جب انہوں نے تیز دور بینوں سے مشاہدہ کیا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے تقدیر کے مطابق یعنی اندازہ کے مطابق جو فاصلے طے کئے تھے وہ درست نکلے - غرض ان اجرام فلکی کو اس عظیم فضا میں ایسے متعین فاصلوں سے رکھنا جن کے اندر کوئی تغیر اور تبدل نہیں ہو رہا ہے اور کوئی اضطراب نہیں - اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ نے ہر چیز کو ایک مقررہ قدر یا مقدار یا تقدیر کے ساتھ بنایا ہے -

یہ زمین جس کے اوپر ہم رہتے ہیں' اس کے اندر پائے جانے والے رزق اور تقدیر کا علم تو اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس کی موجودہ حالت اور ہیئت اور نسبت کے اندر اگر ذرا بھی تبدیلی کی جائے تو اس زمین پر جس قدر متنوع زندگی پائی جاتی ہے اس کے اندر زبردست خلل واقع ہو جائے یا سرے سے زندگی ہی ختم ہو جائے - اس زمین کا حجم اور اس کا ڈھیر اور اس کی سورج سے دوری اور اس کا حجم اس کا درجہ حرارت اور اپنے محور پر زمین کا جھکاؤ' اس کی گردش محوری کی رفتار' چاند کا زمین سے فاصلہ' چاند کا حجم اور اس کا مواد اور زمین کی تقسیم پانی اور خشکی میں اور اس کی نسبت غرض یہ اور اسی قسم کی دوسری ہزاروں نسبتیں ایسی ہیں جن کو دست قدرت نے برابر مقدر کیا ہے - ان میں اگر ذرا بھی تبدیلی ہو جائے تو تمام موجودہ نظام بدل جائے اور زمین پر سے زندگی فوراً ختم ہو جائے اور وہ ضوابط جو زندگی کو کنٹرول کرتے ہیں ان کے درمیان توازن کا ادراک اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ زندہ اشیاء اور ان کے ماحول کے درمیان توازن اور تمام اشیاء کا ایک دوسرے کے ساتھ توازن اس حد تک پہنچا ہوا ہے اور انسانوں کو معلوم ہو گیا جس طرح اس آیت کے اندر پائی جانے والی حقیقت کی طرف اشارات اچھی طرح ملتے ہیں - چنانچہ عوامل حیات اور بقائے حیات کے عوامل اور موت اور فنا کے عوامل کے درمیان نسبت بھی معاشرے میں متعین ہے اور جب کوئی زندہ مخلوق اپنے حدود سے تجاوز کر جاتی ہے تو زندگی کو کنٹرول کرنے والے قدرتی ضوابط خود اسے چیک کرتے ہیں تاکہ جس قدر زندہ مخلوق ہو' ان کی ضروریات کو پورا کیا جاسکے -

یہاں اس طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ بعض زندہ اشیاء کا بعض دوسری زندہ اشیاء کے ساتھ بھی تعلق اور توازن ہے - زمین کے اندر موجود توازن کی طرف ہم اس سے قبل اشارہ کر چکے ہیں - (سورت فرقان)

وہ پرندے جو چھوٹے پرندوں کا شکار کر کے غذا حاصل کرتے ہیں' وہ قلیل التعداد ہیں - اس لئے کہ یہ بہت کم انڈے دیتے ہیں - پھر بہت کم بچے دیتے ہیں اور پھر یہ محدود اور متعین علاقوں میں زندہ رہتے ہیں اور دوسرے پرندوں

کے مقابلے میں ان کی عمر طویل ہوتی ہے ۔ اگر طویل عمر کے ساتھ ساتھ ان کے بچے بھی زیادہ ہوتے اور یہ ہر علاقے میں زندہ رہ سکتے تو وہ دنیا سے تمام چھوٹے پرندوں کو ختم کر دیتے اور چھوٹے پرندوں کی نسلیں ختم ہو جاتیں یا ان کی تعداد اس قدر قلیل ہو جاتی کہ جس مقصد کے لئے اللہ نے ان کو پیدا کیا تھا یعنی لوگوں کا شکار اور کھانا اور دوسرے بے شمار مقاصد جو زمین پر وہ سرانجام دیتے ہیں' کسی نے کیا خوب کہا ہے'

| | | | |
|---|---|---|---|
| بغاث | الطیر | اکثرھا | فراخا |
| وام | الصقر | مقلاۃ | نزور |

(بغاث آبی پرندہ' کے بچے بہت ہوتے ہیں لیکن شاہین کی ماں بہت کم اور تھوڑے بچے دیتی ہے ۔) یہ بھی اللہ کی حکمت اور تقدیر ہے جیسا کہ ہم نے دیکھا تاکہ قدرتی نظام بگڑ نہ جائے تاکہ پرندوں کی پیدائش اور ان کی بقا اور گوشت خور پرندوں کے ذریعہ ان کے فنا میں توازن پیدا ہو ۔

مکھی کئی ملین انڈے دیتی ہے لیکن اس کی عمر صرف دو ہفتے ہوتی ہے ۔ اگر یہ کئی سال تک زندہ ہوتی اور انڈے اسی نسبت سے دیتی تو مکھیاں تھوڑے ہی عرصہ میں سطح زمین کو ڈھانپ لیتیں اور کئی دوسرے زندہ جانور بلکہ انسانی بھی محروم ہو جاتے یا ان کی زندگی سطح ارض پر مشکل ہو جاتی لیکن قدرت کا نظام توازن کام کر رہا ہے اور یہ توازن اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔ اگر کسی چیز کی نسل زیادہ ہے تو عمر کم رکھی گئی ہے اور اگر نسل کم ہے تو عمر زیادہ دی گئی ہے اور یہ چیز ہم حیات کے تفصیلی مکانے میں پیش کرنا چاہتے ہیں ۔

وہ حیوانات جو مائیکروسکوپ سے نظر آتے ہیں' تمام زندہ چیزوں سے تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں اور پھیلاؤ میں بڑی کثرت سے پھیلتے ہیں اور بہت زیادہ نقصان دہ ہوتے ہیں لیکن یہ زندگی کو قائم رکھنے میں بہت کمزور اور عمر کے لحاظ سے بہت کم ہوتے ہیں ۔ یہ ملین اور بلین کے حساب سے تو سردی سے مرجاتے ہیں ۔ گرمی سے مرجاتے ہیں' سورج کی شعاعوں سے مرجاتے ہیں' جراثیم کش ادویات وغیرہ سے اور دوسرے اسباب و ذرائع سے اور یہ چیزیں انسانوں اور حیوانوں کی ایک محدود تعداد کو نقصان دے سکتی ہیں ۔ اگر یہ چیزیں طاقتور ہوتیں یا زیادہ عمر پاتیں تو زندہ چیزوں اور انسانوں کے لئے خطرہ بن جاتیں ۔

اللہ نے ہر زندہ چیز کو اپنے دشمنوں سے بچاؤ کے لئے ہتھیار دیئے ہیں اور یہ ہتھیار حسب ضرورت ہر چیز کے لئے الگ ہے ۔ مثلاً کسی کو تعداد میں کثرت کا اسلحہ دیا گیا ہے' کسی کو گرفت کی قوت دی گئی ہے اور کسی کو کیا کسی کو کیا ۔

چھوٹے سانپوں کو زہر دیا گیا ہے یا بڑی سرعت سے بھاگنے کا ہتھیار ۔ ناگوں کو بڑے بڑے عضلاتی ہتھیار دیئے گئے ۔ اس لئے ان میں زہر شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اور گبریلا اپنے آپ کو بچانے سے عاجز ہوتا ہے ۔ اس لئے ایک ایسا مادہ دیا گیا ہے جو داغ دیتا ہے اور بدبودار ہوتا ہے' جو بھی اسے چھوتا ہے اس پر وہ یہ مواد بکھیر دیتا ہے ۔ اس طرح وہ دشمنوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے ۔

وہ انڈہ جس میں مادہ منی کا جرثومہ داخل ہو جاتا ہے' رحم مادر کے ساتھ چمٹ جاتا ہے ۔ یہ رحم مادر کو کھانا شروع کر دیتا ہے اور اپنے ارد گرد رحم مادر میں ایک گڑھا بنا دیتا ہے جو خون سے بھر جاتا ہے اور یہ اس میں زندہ رہتا ہے اور خون کو چوستا رہتا ہے اور وہ نالی جو رحم مادر سے بچے کی ناف سے ملتی ہے' وضع حمل تک خون دیتی رہتی ہے اور یہ اس مقصد

کے لئے پیدا کی جاتی ہے۔ یہ نالی نہ لمبی ہوتی ہے اور نہ چھوٹی ہوتی ہے اور اس مقدار میں اس کی لمبائی مقدر ہے کہ مقصد کو اچھی طرح پورا کرتی ہے۔

حمل کے آخری دنوں میں پستانوں کے اندر ایک مواد بننا شروع ہوتا ہے اور وضع حمل کے بعد زردی مائل مواد (دودھ) نکلتا ہے۔ اللہ کی صنعت کی کاریگریوں کو دیکھو کہ اس کے اندر وہ مواد ہوتا ہے جو بچے کو متعدی امراض سے بچاتا ہے اور بچے کی پیدائش کے دوسرے دن دودھ نکلنا شروع ہوتا ہے اور قدرت کا انتظام دیکھئے کہ دودھ میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا ہے۔ ایک سال کے بعد یہ ڈیڑھ لیٹر تک پہنچ جاتا ہے حالانکہ ابتدائی دنوں میں اس کی مقدار کم ہوتی ہے۔ صرف یہ اعجاز نہیں ہے کہ بچے کے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ دودھ بھی بڑھتا ہے بلکہ دودھ کی ترکیب میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ آغاز میں یہ محض پانی اور شکر ہوتا ہے اور اس کے بعد اس میں دوسرے ضروری مادے زیادہ ہوتے جاتے ہیں اور پھر اس میں تیل بھی آتا ہے بلکہ ہر دن کا دودھ دوسرے دن سے مختلف ہوتا ہے اور یہ بچے کی ضروریات نشوونما کے مطابق۔

انسان کی نشوونما میں بے شمار مشینیں کام کرتی ہیں۔ انسان کے فرائض' اس کے طریقہ عمل میں بہت سے عوامل لگے ہوئے ہیں جو اس کی زندگی کو بچانے اور صحت کے محافظ اور یہ فیکٹریاں جو انسانی جسم کے اندر لگی ہوئی ہیں' ان کے بارے میں عجیب اور حیران کن معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دست قدرت نے کس قدر باریک نظام وضع کیا ہے اور اس کی تدبیریں ہو رہی ہیں اور جن سے صاف صاف نظر آ رہا ہے کہ اللہ کا نظام کام کر رہا ہے۔ ہر فرد' ہر عضو کے لئے یہ عوامل کام کرتے ہیں بلکہ ہر خلیے کے لئے کام ہو رہا ہے اور اللہ کی نظر سے کوئی چیز غائب نہیں ہے۔ ہم یہاں انسانی جسم کی ساخت اور اس کے پیچیدہ نظام کی تفصیلات تو نہیں دے سکتے لیکن بطور نمونہ ہم صرف ایک نظام کی طرف مختصر اشارہ کرتے ہیں۔ یہ سخت غدودوں کا نظام ہے "یہ جسم کے اندر چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں ہیں جو جسم کو ضروری کیمیاوی مواد فراہم کرتی ہیں۔ ان کی قوت یہ ہے کہ اس کے ایک ہزار بلین اجزاء میں سے ایک جزو بھی اس قدر مواد پیدا کرتا ہے جو جسم انسان کے لئے بہت اہم ہوتا ہے اور اس کا نظام اس طرح بنایا گیا کہ ایک غدود کا مواد دوسرے غدود کے مواد کے لئے لازمی جزو ہوتا ہے اور ان کے بارے میں آج تک جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ان کا نظام نہایت ہی پیچیدہ ہے اور اگر ان میں کسی ایک غدود میں خلل واقع ہو جائے تو انسانی جسم میں عمومی تباہی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ خلل ایک مختصر وقت کے لئے ہو۔

رہے حیوانات تو ان کی انواع اور اقسام کے اعتبار سے ان کے دفاعی نظام اور ہتھیار مختلف ہیں اور ان کو حسب ضرورت قوت دی گئی ہے۔

چیتوں' شیروں' درندوں اور دوسرے پھاڑ کھانے والے جانوروں کو ایسے منہ دیئے گئے ہیں جو شکار کو پکڑ سکتے ہیں۔ تمام ایسے جانور جن کا گزارہ دوسرے جانوروں کے شکار پر ہے ان کو اس مقصد کے لئے ناخن' تیز دانت اور مضبوط جبڑے دیئے گئے ہیں اور حملہ کرنے میں چونکہ وہ اعصاب اور عضلات سے کام لیتے ہیں' لہٰذا ان کے پاؤں کے عضلات بہت سخت ہوتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں کے ناخن بہت سخت اور مضبوط ہوتے ہیں اور ان کے معدے کے اندر اس قسم کے تیزابی لعاب ہوتے ہیں جو گوشت اور ہڈیوں کو مختصر وقت میں ہضم کر کے رکھ دیتے ہیں۔

اسی طرح پرندوں اور پالتو جانوروں کے نظام ہاضمہ کو اس کی خوراک کے مطابق بنایا گیا ہے مثلاً وہ حیوانات جو چر کر گزارہ کرتے ہیں ان کا نظام ہضم بالکل مختلف ہے۔ ان کے منہ نسبتاً کھلے ہیں اور یہ جانور قوی اور مضبوط ناخن نہیں رکھتے۔ اسی طرح ان کے پھاڑ کھانے والے قوی دانت بھی نہیں۔ اس کے مقابلے میں ان کے دانت ایسے ہیں جو گھاس کو کاٹنے والے اور پیسنے والے ہیں۔ یہ گھاس اور نباتات کو بڑی سرعت سے کھاتے ہیں اور جلد ہی اسے نگل لیتے ہیں۔ یوں وہ انسان کے لئے وہ خدمات سرانجام دیتے ہیں جن کے لئے ان کو پیدا کیا گیا ہے۔ دست قدرت نے ایک عجیب نظام ہضم دیا ہے جو گھاس کھاتے ہیں وہ اوجھ میں جمع ہوتا ہے۔ جب اس حیوان کا یومیہ کام ختم ہوتا ہے اور یہ آرام کرتا ہے تو اس کا تمام کھانا ایک خالی جگہ چلا جاتا ہے جسے "ٹوپی" کہا جاتا ہے۔ یہاں سے یہ دوبارہ منہ میں جاتا ہے۔ اب اسے دوبارہ خوب چبایا اور پیسا جاتا اور یہ تیسرے درجے میں جاتا ہے جسے ام تلافیف کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد چوتھے درجے میں جسے رنفحہ کہا جاتا ہے۔ یہ طویل نظام ہضم صرف حیوان کے لئے بنایا گیا ہے کیونکہ جس قدر چرنے والے اور جگالی والے حیوانات ہیں ان کا شکار کیا جاتا ہے لہٰذا ان کو ضرورت ہوتی ہے کہ وہ جلدی سے خوراک سٹور کرلیں اور پھر آرام سے جاکر ہضم کرلیں۔ جدید علوم نے اس بات کو دریافت کیا ہے جگالی کا عمل ان حیوانات کی زندگی کے لئے ضروری ہے کیونکہ وہ گھاس جو جلدی ہضم نہیں ہوتی اس لئے کہ نباتات کے تمام خلیوں پر سلیلوز کا پردہ ہوتا ہے اور ان کو ہضم کرنے کے لئے بہت ہی طویل وقت درکار ہوتا ہے۔ اگر جگالی کا نظام نہ ہو اور ان کے معدے میں ایک خاص سٹور نہ ہو تو ان کو چراگاہ میں طویل وقت گزارنا پڑے۔ ممکن ہے کہ ان کو پورا دن گھاس کے ہضم کرنے میں لگ جائے اور پھر بھی وہ خوراک پوری نہ کرسکتا اور پورا دن خوراک کھانے اور چبانے ہی میں لگا رہتا۔ جلدی سے گھاس کھاتا اور پھر اس کا سٹور کرلیتا اور پھر جگالی کرتا ہے جبکہ سٹور میں وہ کافی نرم ہوچکا ہوتا ہے تو اس طرح حیوانات کے کئی مقاصد پورے ہوجاتے ہیں۔ وہ اچھا کام بھی کرسکتے ہیں اور ان کی غذا بھی پوری طرح ہضم ہوجاتی ہے۔ یہ ہیں باری تعالیٰ کی تدابیر۔

وہ پرندے جو گوشت کھاتے ہیں مثلاً الو، شکرہ ان کی چونچ کمان کی طرح ہوتی ہے اور تیز ہوتی ہے اور گوشت نوچنے کی صلاحیت رکھتی ہے جبکہ آبی جانور مثلاً بطخ اور مرغابی کو چوڑی چونچ دی گئی ہے تاکہ وہ پانی اور کیچڑ میں اپنی خوراک تلاش کریں اور ان کی چونچ میں ایسے چھوٹے چھوٹے ابھار ہوتے ہیں جو دانت کی طرح ہوتے ہیں اور کیڑوں وغیرہ کے کاٹنے میں مدد دیتے ہیں۔

ایسے مرغیاں اور کبوتر اور باقی پرندے تو وہ زمین سے دانے اٹھاکر کھاتے ہیں اس لئے ان کو چھوٹی چونچ اور باریک سر دیئے گئے ہیں۔ وہ چھوٹے سے چھوٹا دانہ بھی اٹھا لیتے ہیں جبکہ بگلے کی چونچ طویل ہوتی ہے اور اس کے نیچے ایک تھیلا ہوتا ہے جو جراب کی طرح ہوتا ہے۔ یہ شکاری کے جال کا کام کرتا ہے کیونکہ اس کی خوراک ہی مچھلی ہوتی ہے۔

ہدہد اور ریوفران کی چونچ تیز اور لمبی ہوتی اور یہ کیڑے مکوڑے کھانے اور تلاش کرنے کے لئے موزوں ہوتی ہے کیونکہ یہ چیزیں زمین کے نیچے ہوتی ہیں۔ سائنس نے معلوم کرلیا ہے کہ کس پرندے کی چونچ پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اس کی خوراک کیا ہے۔

یہ بیان اب طویل ہوتا جارہا ہے۔ ہم فی ظلال القرآن کے اختیار کردہ منہاج دائرہ سے نکل رہے ہیں۔ اگر ہم تمام انواع و اقسام کے جانوروں اور مویشیوں پر کلام کریں تو بات بہت طویل ہوجائے۔ صرف ایک چیز کو لے لیں "امیبا" جس

کا ایک ہی خلیہ ہوتا ہے ' ذرا ملاحظہ کیجئے کہ دست قدرت نے اس کی ضروریات کو کس طرح پورا کیا ہے اور اس کے لئے بھی ضروریات کا پورا پورا انتظام کر دیا ہے ۔ " ایسا ایک نہایت ہی باریک جسم والا حیوان ہے ۔ یہ حوضوں ' نالیوں اور پانی کی تہہ میں بیٹھے ہوئے پتھروں میں ہوتا ہے ۔ یہ آنکھوں سے نہیں دیکھتا ہے ۔ یہ ایک ڈھیلا ڈھالا جاندار ہے ۔ حالات اور ضروریات کے مطابق یہ شکل بدل دیتا ہے ۔ جب یہ حرکت کرتا ہے تو یہ اپنے جسم کے بعض اجزاء مطلوب مقام تک پہنچنے کے لئے آگے پہنچنے کے لئے آگے بڑھاتا ہے ۔ یہ زائد اجزاء چھوٹے پاؤں کہلاتے ہیں ۔ اگر اسے کوئی غذا ملے تو وہ ان چھوٹے ایک یا دو پاؤں سے پکڑ لیتا ہے ۔ اس پر یہ ہضم کرنے والا ایک سیال پھینکتا ہے اور اس کے بعد حسب ضرورت کھا لیتا ہے ۔ باقی کو دور پھینک دیتا ہے ۔ یہ پانی سے آکسیجن لے کر پورے جسم کے ساتھ سانس لیتا ہے ۔ ذرا سوچئے کہ ایک ایسا حیوان جو سرے سے دیکھتا ہی نہیں ' وہ زندہ رہتا ہے ' حرکت کرتا ہے ' غذا حاصل کرتا ہے ' سانس لیتا ہے ' اپنے فضلات نکالتا ہے اور جب وہ جوان ہوتا ہے تو دو حصوں میں بٹ جاتا ہے اور اس سے دو مختلف قسم کے حیوان بن جاتے ہیں بالکل جدید "

نباتات میں بھی زندگی محیرالعقول ہے ۔ انسان اور حیوان اور پرندے کے عجائبات سے وہ بھی کسی طرح کم نہیں ہیں اور دست قدرت کی کارستانی ان حیوانات کے مقابلے میں نباتات کے اندر کسی طرح بھی کم نہیں ہے ۔ یہ ہے مفہوم اس آیت کا ۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا " اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور نہایت پورے پورے اندازہ سے پیدا کیا ۔ "

یہ کہ اللہ نے ہر چیز کو ایک مقدر کے مطابق پیدا کیا ہے ۔ یہ ایک بہت ہی عظیم اصول ہے ۔ یہ بہت ہی ہمہ گیر ہے مثلاً اس کائنات کی ہر حرکت اس کے واقعات ' حادثات خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے ' وہ اللہ کی تقدیر اور تدبیر کے مطابق چلتے ہیں ۔ انسانی تاریخ کی ہر حرکت ' نفس انسانی کی ہر حرکت ' سانس لینا اور خارج کرنا ' مقدر ہے ۔ ہر نفس کا وقت ' مقام اور ماحول مقرر و مقدر ہے اور اس کی زندگی اس کائنات کی حرکت کے ساتھ مربوط ہے اور اسی طرح حساب و کتاب کے اندر ہے جس طرح بڑے بڑے واقعات دائرہ حساب میں ہوتے ہیں ۔

اور ایک صحرا میں ایک اکیلا درخت کھڑا ہے ۔ یہ تقدیر نے کھڑا کیا ہے اور اس کی کوئی ضرورت ہوگی ۔ یہ درخت بھی کوئی فریضہ منصبی ادا کر رہا ہوگا اور یہ بھی اس پوری کائنات کے نظام کے ساتھ مربوط ہے ۔ یہ چیونٹی جو زمین پر چل رہی ہے اور یہ ذرہ جو ہوا میں اڑ رہا ہے اور یہ خلیہ جو پانی میں تیر رہا ہے یہ بھی انہیں اجرام فلکی کی طرح مقدر ہے اور کسی کے حکم سے اڑ رہا ہے ۔

اللہ کی تقدیر زمان میں بھی چلتی ہے ' مکان میں بھی چلتی ہے ' مقدار بھی مقدر ہے صورت بھی مقدر ہے اور تمام حالات اور تمام اصول مقدر ہیں ۔

اللہ کا نظام قضا و قدر کس طرح کام کرتا ہے مثلاً حضرت یعقوب ایک دوسری عورت سے نکاح کرتے ہیں اور ان سے یوسف اور بن یامین پیدا ہوتے ہیں ۔ کسی نے اس کے بارے میں خیال کیا ہے کہ یہ بظاہر ایک شخصی فیصلہ تھا لیکن اس کے

پیچھے دست قدرت کام کر رہا تھا تاکہ برادران یوسف ان کے ساتھ حسد کریں' ان کو اندھے کنویں میں ڈال دیں ۔ وہاں سے ان کو قافلہ پکڑ لے ۔ مصر میں فروخت کر دے 'مصر میں عزیز مصر کا گھر ہے ۔ اس کی بیوی انہیں ورغلانے کی کوشش کرے ۔ آپ بلند اور برتر ثابت ہوں ۔ جیل میں بھیج دیئے جائیں ۔ یہ کیوں؟ تاکہ جیل میں شاہی ملازمین سے ملیں ان کے سامنے خواب کی تعبیر بیان کریں ۔ یہ کیوں؟ ابھی تک تو ان واقعات کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا ۔ سوال اٹھ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ حضرت یوسف تو بے گناہ جیل میں عذاب جھیل رہے ہیں پھر یعقوب علیہ السلام کا کیا قصور ہے ۔ وہ کیوں جل رہے ہیں؟ وہ رنج و الم سے کیوں بینائی کھو بیٹھے ہیں اور یوسف علیہ السلام کو یہ تکالیف کیوں دی جا رہی ہیں ۔ جسمانی اور روحانی تکالیف' پورے پچیس سال گزرنے کے بعد پہلا جواب آتا ہے کہ تقدیر اسے مصر کی حکومت کے لئے تیار کر رہی تھی تاکہ مصر اور اس کے ملحقہ ممالک کو قحط سے بچایا جا سکے' پھر کس لئے؟ اس لئے کہ وہ اپنے والدین اور بھائیوں کو مصر بلا لائیں پھر اس لئے کہ ان کی نسل سے قوم بنی اسرائیل پروان چڑھے تاکہ فرعون ان پر مظالم ڈھائے اور ان کے لئے موسیٰ علیہ اسلام کو بھیجا جائے ۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ اس کرہ ارض پر وہ واقعات رونما ہوں ۔ جو حضرت یوسف کے کنویں میں ڈالنے کے بعد رونما ہوئے ۔ ان واقعات کے اثرات اس دنیا میں آج بھی موجود ہیں اور دنیا کے واقعات پر اثرانداز ہو رہے ہیں ۔

پھر ایک دوسرا واقعہ یعقوب علیہ السلام کے دادا ابو الانبیاء حضرت ابراہیم مصر جاتے ہیں ۔ مصری عورت ہاجرہ سے نکاح کرتے ہیں ۔ یہ بھی کوئی انفرادی مسئلہ نہ تھا ۔ یہ اور اس سے قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں جو واقعات رونما ہوئے جن کے نتیجے میں انہوں نے وطن چھوڑا' عراق سے کنعان وہاں سے مصر وہاں سے ہاجرہ کا لانا' اسماعیل علیہ السلام کا پیدا ہونا' ان کو بیت اللہ میں آباد کرنا تاکہ حضرت محمد ﷺ پیدا ہوں' ابراہیم کی نسل سے' اس جزیرہ عرب میں جو اس کرہ ارض پر بہترین مکان ہے اور دعوت اسلامی کا مرکز ہے تاکہ اس کے نتیجے میں تاریخ انسانیت میں ایک عظیم حادثہ رونما ہو ۔

یہ بھی اللہ کی تقدیر ہے اور اس کا پچھلا سرا دست قدرت کے ہاتھ میں ہے ۔ ہر حادثہ ہر واقعہ وہاں سے ہی نمودار ہوتا ہے ۔ آغاز بھی وہاں سے' انجام بھی وہاں' ہر قدم' ہر تغیر میں دست قدر کا ہاتھ ہے ۔..... یہ اللہ کی تقدیر کا نظام ہے' یہ نافذ ہے' جامع و شامل ہے' باریک اور گہری ۔

انسان اس کے بالکل قریبی سرے کو دیکھ رہا ہے لیکن اسے اسباب کی دراز رسی کا دوسرا سرا نظر نہیں آتا اور بعض اوقات یہ رسی بہت دراز ہو جاتی ہے ۔ زمانے گزر جاتے ہیں' دور دراز تک ہم نکل جاتے ہیں' ہمیں تقدیر و تدبیر کا سلسلہ نظر نہیں آتا ۔ ہمیں سمجھ نہیں آتا کہ

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ پروانے کا ناحق خون ہو گا

کس طرح ہو گا؟ اس پر لوگ جلدی مچاتے ہیں' شور کرتے ہیں نئی نئی تجاویز لاتے ہیں ۔ یہ لوگ دراصل اپنے آپ کو عذاب میں ڈال رہے ہیں ۔ نظام قضا و قدر پر دست درازی کرتے ہیں ۔

اللہ صاف صاف فرماتا ہے کہ اس نے ہر چیز کو ایک اندازے سے پیدا کر رکھا ہے ۔ لوگوں کو چاہئے کہ وہ نتائج اس پر

چھوڑ دیں جو نتائج کا مالک ہے اور آرام سے کام کریں ۔ وہ اللہ کے نظام 'قضا و قدر سے ہم آہنگ ہو کر چلیں ۔ نہایت انس و محبت سے اپنے حصے کا کام کریں اور نہایت ثابت قدمی اور اللہ پر بھروسے کے ساتھ قدر بڑھاتے چلے جائیں ۔

جہاں تک اللہ کے انقلاب کا تعلق ہے تو وہ پلک جھپکتے ہی نمودار ہو سکتا ہے ۔ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے ۔

وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ( ٥٤ : ٥٠ ) "ہمارا حکم بس ایک ہی حکم ہوتا ہے اور پلک جھپکائے وہ عمل میں آجاتا ہے ۔" صرف ایک اشارہ اور ایک ہی کلمہ تمام کام مکمل کر دیتا ہے ۔ چھوٹا کام بھی اور بڑا انقلاب بھی ۔ اللہ کے لئے تو کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہے ۔ یہ انسانی تقدیرات ہیں جن میں بڑے اور چھوٹے کام ہیں ۔ اللہ کے ہاں نہ زمان ہے نہ مکان ہے اور نہ پلک جھپکنا ہے ۔ وہاں تو کن فیکون ہے ۔ یہ انسانوں کو سمجھانے کے لئے بڑے اور چھوٹے اور مختصر وقت کی مثالیں دی گئی ہیں ۔ زمان کیا ہے 'انسان کا ایک چھوٹا سا تصور جو وہ اس زمین کے گردش محوری اور سالانہ سے پیمائش کرتا ہے ۔ اللہ کے ہاں زمانے کا یہ تصور نہیں ہے ۔ یہ تو بہت ہی محدود تصور ہے ۔

ایک لفظ ۔ جو اس پوری کائنات کو وجود میں لاتا ہے ۔ ایک لفظ ہے جو اس میں تغیرات پیدا کرتا ہے ۔ ایک لفظ ہے جو اس کو نابود کر دے گا ۔ ایک لفظ ہے جو ہر چیز کو وجود بخشتا ہے ۔ ایک لفظ ہے جو حیات کو پھیلاتا ہے ۔ ایک لفظ ہے جو موت دیتا ہے اور ایک لفظ ہو گا جو دوبارہ اٹھا دے گا ۔ ایک لفظ سے حشر و نشر برپا ہو گا اور حساب و کتاب ہو گا ۔ ایک لفظ ایک ارادہ 'کسی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہوتی کسی زمان و مکان کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ بس قدرت ہے تقدیر ہے اور ہر چیز اللہ کے لئے آسان ہے ۔

اور یہی ایک لفظ تھا جس کے ذریعہ ہم زمانوں کو ہلاک کر کے لپیٹ چکے ہیں ذرا تاریخ پر نگاہ ڈالو ۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ( ٥١ ) وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ( ٥٢ ) وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ( ٥٤ : ٥٣ ) "اور تم جیسے بہت سوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں 'پھر ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا ؟ جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ سب دفتروں میں درج ہے اور یہ چھوٹی بڑی بات لکھی ہوئی موجود ہے ۔" یہ ہیں مکذبین کی بربادیاں جن کی طرف اسی سورت میں اشارات موجود ہیں ۔ کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا ؟ جو نصیحت حاصل کرے اور عبرت پکڑے ۔

ان کی ان بربادیوں پر ہی ان کا حساب و کتاب ختم نہیں ہو گیا بلکہ ایک آنے والا حساب ہے جس سے کوئی ذرہ برابر فعل بھی نہیں بچ سکتا ۔

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ( ٥٤ : ٥٢ ) "انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہے دفتروں میں درج ہے" وہ دفتروں میں سطور کی شکل میں درج ہے یوم الحساب کے لئے تیار شدہ چٹھا ہے ۔

وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ( ٥٤ : ٥٣ ) "ہر چھوٹی بڑی بات لکھی ہوئی موجود ہے ۔" کوئی چیز اس میں سے بھول کر نہیں رہتی ۔

اب روئے سخن متقین کی طرف پھر جاتا ہے ۔ یہ صفحہ بالمقابل ہے مکذبین کا ۔ نہایت ہی خوشحالی کی تصویر ہے ۔ ان

کی امن و اطمینان میں اور کیف و سرور میں اور عزت و عظمت میں ۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ (٥٤) فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ (٥٥) (٥٤ : ٥٤ – ٥٥) "نافرمانی سے پرہیز کرنے والے یقیناً باغوں اور نہروں میں ہوں گے ۔ سچی عزت کی جگہ ' بڑے ذی اقتدار بادشاہ کے قریب"۔

مجرمین تو گمراہی اور آگ میں تھے ۔ تو متقین چشموں اور نہروں میں ہیں ۔ مجرموں کو منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں پھینکا جائے گا توہین آمیز طریقے پر اور پھر سرزنش کے طور پر کہا جائے گا۔

ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ "چکھو آگ کا مساس" جبکہ مومنین جنات اور نہروں میں ہیں اور عزت کی جگہوں میں ذی اقتدار بادشاہ کے پاس ہیں ۔ پورا تقابل ہے دونوں کے درمیان ۔

الفاظ کا استعمال بھی دلچسپ ہے ۔ جنات و نہر میں ایک تو مفہوم نہایت مکمل ہے کہ باغ اور نہریں جن سے نعمتیں اور آسانیاں ظاہر ہوتی ہیں ۔ لفظ نہر لفظ سقر کے ساتھ ہم وزن ہونے کے ساتھ نہایت ہی نرم ادائیگی بھی رکھتا ہے یعنی نرم ' سہل التلفظ لفظ سے اشارہ اس طرف مطلوب ہے کہ ان کو ہر قسم کی سہولیات میسر ہیں ۔ قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ معنی کے علاوہ تلفظ سے بھی مفہوم ظاہر ہوتا ہے جس طرح سقر سے سختی ظاہر ہوتی ہے ۔

جسم اور زبان کی نعمتوں کے علاوہ وہاں قلب و روح کی غذا کا انتظام بھی ہو گا اور وہ ہو گا مقتدر اعلیٰ کا قرب ۔

فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ (٥٤ : ٥٥) "سچی عزت کی جگہ بڑے ذی اقتدار بادشاہ کے قریب ۔" یہ مستقل اطمینان کی جگہ ہے ۔ نہایت ہی قابل عزت قرب ہے ۔ وہ قرب کے اندر محبت محسوس کریں گے ۔ مطمئن ہوں گے ۔ یہ اس لئے کہ دنیا میں یہ لوگ اللہ سے ڈرنے والے تھے ہر وقت اللہ کی مرضی کے منتظر تھے اور اللہ کا نظام یہ ہے کہ وہ کسی دل میں دو ڈر جمع نہیں کرتا کہ کوئی دنیا میں اللہ سے ڈرے اور پھر قیامت میں بھی اللہ سے ڈرے ۔ جو یہاں ڈرے گا وہاں مطمئن اور مسرور ہو گا اور اس خوفناک اور ہولناک میدان میں امن و سکون محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ اہل ایمان اعزاز و تکریم بھی پائیں گے ۔

یہاں یہ نغمہ نہایت دھیما نغمہ ختم ہوتا ہے ۔ متقین یہاں پرامن سایہ میں ہیں اور یہ سورت جس کی تمام کڑیاں خوفناک دھماکے کی صورت میں تھیں 'پکڑ دھکڑ تھی ' اس کا یہ آخری منظر مومنین کے پرسکون حالات و مناظر پر ختم ہوتا ہے جس میں ان کا جسم اور قلب و روح سب کے سب پرسکون اور مطمئن نظر آتے ہیں ۔ یہ ہے انداز علیم و حکیم کا ۔ جو بات کی جاتی ہے وہ دلوں کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے کیونکہ اللہ لطیف و خبیر ہے اور اسی نے ہر چیز کو ایک اندازے سے بنایا ہے اور وہ ہر چیز کے ساتھ معاملہ کرنا اچھی طرح جانتا ہے ۔

---()()()---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ــ ۲۷

## سورۃ الرحمٰن ـ ۵۵

## ا ــ تا ــ ۷۸

# سورۂ رحمٰن ایک نظر میں

یہ مکی سورۃ ہے اور اس کا طرز تعبیر بھی بالکل ممتاز ہے ۔ اس کا موضوع پوری کائنات ہے ' خصوصاً کائنات کے اندر اللہ کی پیدا کردہ نعمتیں اور سہولیات حیات ۔ اللہ کی پیدا کردہ خوبصورت اشیاء ' انوکھی اشیاء اور انسان کے لئے فراہم کردہ نعمتیں ۔ پھر اس کائنات کا انتظام و انصرام نیز لوگوں کو ذات باری کی طرف متوجہ کرنا ' اس کا اصل ہدف ہے ۔ اس سورۃ میں خطاب جن و انس کو ہے اور دونوں کے خلاف اس پوری کائنات کو بطور شہادت پیش کیا گیا کہ تم اس کائنات کی کس کس شہادت کا انکار کر سکتے ہو ۔ یہ موجودات تمہارے سامنے ہیں ۔ بار بار چیلنج دیا جاتا ہے کہ تم اس کائنات کی کس چیز اور کس نعمت کے پہلوئے شہادت کا انکار کر سکتے ہو ۔ یوں اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کی اہم چیزوں کو اس نمائش گاہ میں لاتا ہے اور اس سے آخرت پر استدلال فرماتا ہے ۔

یہ سورۃ ایک اعلان اور فرمان ہے ۔ اس اعلان کی آواز بازگشت اور اس کا نغمہ جاتی پہلو ' اس کی آیات کا قافیہ ' غرض ان تمام امور پر پوری سورۃ کے اندر زمزمہ سرا ہیں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ' ان کی آواز بلند اور دور تک جانے والی ہے ۔ سورۃ کا مطلع ایک آیت ہے اور یہ آیت ایک لفظ ہے لیکن اس پہلے لفظ کے تلفظ ہی سے آنے والی باتوں کا انتظار ہونے لگتا ہے ۔

اَلرَّحْمٰنُ ( ۵۵ : ۱ ) یہ ایک لفظ مبتدا ہے ۔ نہایت مہربان ۔ اس لفظ ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اعلان اور فرمان آنے والا ہے اور مقصد اس کے بعد اللہ کی رحمتوں اور مہربانیوں کا بیان شروع ہوتا ہے ۔

یہ پوری سورۃ ایک نمائش ہے ۔ اللہ کی رحمتوں کی یہ نمائش تعلیم القرآن سے شروع ہوتی ہے کہ تعلیم قرآن انسان پر اللہ کے احسانات میں سے ایک بڑا احسان ہے ۔ پھر کہا جاتا ہے کہ انسان کی تخلیق اور انسان کو بیان کرنے کی صلاحیت عطا کرنا عنایات الٰہیہ میں سے بہت بڑی عنایت ہے ۔

اس کے بعد وہ عنایات الٰہیہ آتی ہیں جو بزبان حال بتاتی ہیں کہ اللہ کی عنایات کیا کیا ہیں ۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ( ۵۵ : ۵ ) اور وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ ( ۵۵ : ۶ ) سب عنایات ہیں ۔ اونچی چھت والا آسمان اور حق و باطل کا فیصلہ کرنے والی میزان ' زمین اور اس کے اندر مختلف قسم کے پھل اور حیوانات ' انگور و کھجور اور دانہ بھی اور بھوسہ بھی ۔ جن و انس ' مشرقین و مغربین ' دو دریا اور ان کے درمیان پردے اور ان کے اندر چلنے والی مخلوق اور کشتیاں اور ان سے نکلنے والے سامان اور جب یہ تمام قابل ذکر چیزیں دکھا دی گئیں تو پھر ان کے فنا کا منظر بھی دکھایا جاتا ہے ۔ نہ صرف یہ بلکہ پوری مخلوق کو فنا کر دیا جاتا ہے اور صرف اللہ ذوالجلال و الاکرام باقی رہتا ہے کیونکہ

تمام مخلوق اس کے تصوف میں ہے اور تمام امور اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔
اس فنائے مطلق اور بقائے مطلق کے سایہ میں جن و انس کو ایک زبردست چیلنج دیا جاتا ہے۔ نہایت ہی خوفناک۔

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ (۳۱) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۲) يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (۳۳) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۴) يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ (۳۵) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۶:۵۵) (۵۵: ۳۱ تا ۳۶) (اے زمین کے بوجھو' عنقریب ہم تم سے باز پرس کرنے کے لئے فارغ ہوئے جاتے ہیں تم اپنے رب کے کن کن احسانات کو جھلاتے ہو۔ اے گروہ جن و انس اگر تم زمین و آسمان کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو' نہیں بھاگ سکتے۔ اس کے لئے بڑا زور چاہئے۔ اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو تم جھٹلاؤ گے؟ تم پر آگ کا شعلہ چھوڑ دیا جائے گا جس کا تم مقابلہ نہ کر سکو گے۔ اے جن و انس' تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کا انکار کرو گے؟)

اس وجہ سے پھر انجام بھی بتا دیا جاتا ہے کہ جب تم بھاگ نہیں سکتے تو پھر انجام کے لئے تیار ہو جاؤ کہ جب قیامت برپا ہوگی تو آسمان سرخ ہو جائے گا۔ مجرموں کو عذاب دیا جائے گا اور متقین کا بہترین انجام ہو گا اور اس اچھے انجام کی پوری تفصیلات اور اس نمائش گاہ عالم کا انجام اس فقرے پر۔

تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِى الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (۵۵:۷۸) (بڑی برکت والا ہے تیرے رب جلیل وکریم کا نام) آکر ختم ہوتا ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۵۴ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۷۸

سورۃ کا آغاز ہوتا ہے۔

الرَّحْمٰنُ (۵۵ : ۱) یہ مطلع ہے اس کا لفظ اور معنی دونوں مقصود ہیں۔ اس لفظ کا ترنم اور اس کی موسیقی سب مطلوب ہیں۔

الرَّحْمٰنُ (۵۵ : ۱) یہ گنگناتی 'ترنم' بے قید آواز اطراف کائنات میں گونج اٹھی ہے!! پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

الرَّحْمٰنُ (۵۵ : ۱) دور تک چلے جانے والی یہ نہایت ہی بلند آواز! اس کائنات کے اطراف و اکناف میں ایک گونج پیدا کر دیتی ہے۔ یہ تمام موجودات سے مخاطب ہے۔ ہر موجود کے کانوں سے ٹکراتی ہے۔ زمین و آسمان کی فضاؤں کو گونج سے بھر دیتی ہے۔ ہر کان اور ہر دل تک پہنچ جاتی ہے۔

الرَّحْمٰنُ (۵۵ : ۱) کی آواز تھی اور پھر خاموشی۔ بیت ختم' پوری فضا خاموش 'ہمہ تن گوش کہ کیا ہے خبر کیا ہے اگلا حکم۔ اس عظیم گونج کے بعد کیا ہو گا فرمان شاہی!؟ اور اس کے بعد جو خبر آئی ہے تو تمام کائنات کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ کس قدر عظیم فرمان ہے یہ!

سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ (۵۵) مَدَنِيَّةٌ (۹۷) اٰیَاتُهَا ۷۸ رُكُوْعَاتُهَا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلرَّحْمٰنُ ۝۱ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝۲ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝۳ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ۝۴ اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ
بِحُسْبَانٍ ۝۵ وَّ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ ۝۶ وَ السَّمَآءَ رَفَعَهَا وَ وَضَعَ الْمِیْزَانَ ۝۷
اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ ۝۸ وَ اَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ ۝۹ وَ

الْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ ﴿١٠﴾ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْأَكْمَامِ ﴿١١﴾ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ﴿١٢﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿١٣﴾ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿١٤﴾ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِن مَّارِجٍ مِّن نَّارٍ ﴿١٥﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿١٦﴾

''نہایت مہربان (خدا) نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔ سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں اور تارے اور درخت سب سجدہ ریز ہیں۔ آسمان کو اس نے بلند کیا اور میزان قائم کر دی۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو' انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو۔ زمین کو اس نے سب مخلوقات کے لئے بنایا۔ اس میں ہر طرح کے بکثرت لذیذ پھل ہیں۔ کھجور کے درخت ہیں جن کے پھل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ طرح طرح کے غلے ہیں جن میں بھوسا بھی ہوتا ہے اور دانہ بھی۔ پس اے جن و انس' تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ انسان کو اس نے ٹھیکری جیسے سوکھے سڑے گارے سے بنایا اور جن کو آگ کی لپٹ سے پیدا کیا۔ پس اے جن و انس' تم اپنے رب کے کن کن عجائب قدرت کو جھٹلاؤ گے؟''

رحمان کے انعامات کے بیان میں یہ پہلا پیرگراف ہے اور اس اعلان عام کی یہ پہلی خبر ہے اور پہلی نعمت:

علم القرآن (اس نے قرآن کی تعلیم دی) اور قرآن کی تعلیم کی شکل میں اللہ نے اپنے بندوں پر عظیم رحمت فرمائی۔ قرآن جو نوامیس فطرت کا ترجمان ہے۔ یہ اہل زمین کے لئے آسمان کا منہاج ہے اور یہ منہاج اہالیان زمین کو ناموس فطرت سے ملاتا ہے اور یہ ان کے عقائد' ان کے تصورات' ان کے پیمانوں' ان کی قدروں' ان کے اداروں' ان کے حالات کو نہایت ہی مضبوط بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ انہی بنیادوں پر جن پر یہ پوری کائنات قائم ہے' یہ دستور ان کی سہولتیں اطمینان اور ناموس فطرت کے ساتھ مفاہمت اور ہم آہنگی عطا کرتا ہے۔

قرآن انسانوں کے حواس اور ان کے شعور کو اس پوری کائنات کے لئے کھولتا ہے کہ دیکھو کیا ہی خوبصورت ہے یہ کائنات اور قرآن ان کو اس کا مشاہدہ یوں کراتا ہے کہ گویا انسانیت نے کائنات کو پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ وہ دیکھتے رہے تھے لیکن یہ ایک نیا مطالعہ ہے۔ انہوں نے خود اپنی ذات کا بھی از سر نو مطالعہ کیا۔ انہوں نے اپنے اردگرد کائنات کو پڑھنا شروع کیا بلکہ قرآن نے اس پورے کائناتی ماحول کو ایک زندگی عطا کر دی اور یہ ماحول انسان کے ساتھ ساتھ چلنا شروع ہو گیا ہے۔ اب انسان اس کائنات کے مظاہر کا دوست بن گیا۔ ساتھی بن گیا اور وہ ہمقدم ہو کر چل رہے ہیں اور اس زمین پر انسان کا یہ سفر نہایت خوشگواری سے چلنے لگا۔

اس قرآن نے انسان کے ذہن نشین کرا دیا کہ انسانو! تم اس کائنات میں اللہ کے خلفاء ہو۔ رحمان کے خلفاء ہو۔ اللہ کے نزدیک تم بہت مکرم ہو۔ تمہیں اللہ نے یہ قرآن ایک عظیم امانت دی ہے۔ وہ امانت کہ زمین و آسمانوں اور پہاڑوں نے اس کے اٹھانے سے معذرت کر لی تھی۔ قرآن تمہیں جو اعلیٰ انسانیت عطا کرتا ہے اس کی قدر و قیمت کو سمجھو اور یہ فہم و ادراک صرف قرآن کے ذریعہ ممکن ہے۔ ایمان کی راہ سے ممکن ہے۔ ایمان ہی تمہاری روح میں یہ جذبہ' یہ ہدایت

پھونک سکتا ہے اور صرف قرآن کے ذریعے سے تم اللہ کی عظیم نعمت حاصل کر سکتے ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق اور اسے وجود بخشنے کی نعمتوں سے بھی پہلے تعلیم کا ذکر کیا کیونکہ علم قرآن کے ذریعہ ہی انسان انسان بن سکتا ہے ۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ (۵۵ : ۳) عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۵۵ : ۴) (انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا) ہم یہاں انسان کی تخلیق کی نعمت پر کلام نہیں کرتے ۔ جلد ہی سورۃ میں یہ بیان آئے گا ۔ یہاں اصل مقصود تعلیم بیان ہے ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان بات کرتا ہے ۔ مافی الضمیر کی تعبیر کرتا ہے ۔ بیان کرتا ہے ایک دوسرے کی بات سمجھتا ہے اور پھر انسان باہم تعاون کرتے ہیں ۔ یہ کام چونکہ ہروقت ہمارے درمیان ہوتا رہتا ہے اس لئے اللہ کی اس نعمت عظمیٰ کو ہم نے بھلا دیا ہے ورنہ ذرا بھی غور کیا جائے تو یہ ایک عجوبہ ہے ۔ قرآن ایسی کئی نعمتوں کی یاد دہانی کراتا ہے ہمیں جگاتا ہے ۔

انسان کیا چیز ہے؟ اس کی اصلیت کیا ہے؟ اسے یہ بیان کس طرح سکھا دیا جاتا ہے؟ انسان کی حیثیت تو یہ ہے کہ یہ ایک خلیہ ہے جو باپ کے مادہ منویہ میں ہوتا ہے ۔ یہ رحم مادر میں ایک نہایت ہی سادہ شکل میں زندگی کا آغاز کرتا ہے ۔ یہ بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے 'کمزور ہوتا ہے ۔ یہ اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ یہ صرف آلات کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے ' نہ یہ نظر آتا ہے اور نہ یہ اظہار کر سکتا ہے ۔

یہ خلیہ جلد ہی جنین کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ اس جنین میں خلیوں کی تعداد پھر کئی ملین ہو جاتی ہے ۔ ہڈی کے خلیے ' نرم ہڈیوں کے خلیے ' عضلات کے خلیے ' اعصاب کے خلیے اور جلد کے خلیے ۔ پھر اعضا بنتے ہیں اور ان اعضاء کے حیران کن کام اور صلاحیتیں سننا ' دیکھنا ' چکھنا ' سونگھنا اور چھونا اور پھر شعور اور الہام ۔ یہ سب خلیے اور یہ سب خواص اس ایک خلیے سے بن گئے جو ایک سادہ خلیہ تھا ' نہایت چھوٹا جو نہ نظر آتا تھا اور نہ اظہار کر سکتا تھا ۔

یہ کیسے ہوا؟ کہاں سے آیا؟ یہ رحمان سے آیا ہے ' یہ رحمان کی مصنوعات میں سے ایک ہے ۔

ذرا غور کیجئے کہ اس مخلوق کو اللہ نے کس طرح بیان سکھایا ۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ (۱۶ : ۷۸) (اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حال میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے ۔ اس نے تمہیں کان دیئے ' آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیئے اس لئے کہ تم شکر گزار ہو)

حقیقت یہ ہے کہ بات کرنے کے اعضا ہی وہ عجوبہ ہیں جن کے عجائبات ختم نہیں ہو سکتے ۔ زبان ' ہونٹ ' جبڑے ' دانت ' ہوا کی نالی ' حنجرہ اور پھیپھڑے سب اس میں شریک ہوتے ہیں ۔ یہ تمام اعضاء آواز نکالنے میں شریک ہوتے ہیں اور اعضا کا یہ فعل بیان کی بنیاد بنتا ہے ۔ اس پیچیدہ عمل میں یہ اعضاء ایک میکانیکی پہلو دکھاتے ہیں ۔ اس کے بعد پھر ان اعضاء کا رابطہ دماغ ' قوت سماعت اور پورے اعصابی نظام سے ہوتا ہے ۔ اس کے بعد عقل سے اس کا تعلق ہوتا ہے اور عقل کیا چیز ہے ' اس کے بارے میں ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ اس کا نام "عقل" ہے ۔ اس کی ماہیت اور حقیقت کا ہمیں علم نہیں ہے بلکہ یہ عقل کس طرح کام کرتی ہے ہم اس کے بارے میں بھی نہیں جانتے ۔

ایک بات کرنے والا جب ایک لفظ بولتا ہے تو کس طرح بولتا ہے؟ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے کئی مراحل 'کئی درجے

اور کئی آلات ہیں اور بعض چیزیں ابھی تک معلوم نہیں ۔

پہلے یہ شعور سامنے آتا ہے کہ اس مقصد کے لئے یہ لفظ بولنا چاہئے ۔ یہ شعور عقل 'قوت مدرکہ یا روح سے حسی آلات کی طرف آتا ہے ۔ یہ کس طرح آتا ہے اس کا ہمیں علم نہیں ۔ دماغ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ اعصاب کے ذریعے یہ حکم دیتا ہے مذکورہ بالا آلات کو کہ اس لفظ کا تلفظ کیا جائے ۔ یہ لفظ بذات خود کیا چیز ہے ۔ یہ وہ آواز ہے جو اللہ نے ہر انسان کو سکھائی اور اس کے معنی سکھائے ۔ اب یہاں پھیپھڑے ہوا کی ایک مقدار ایک نالی کے ذریعہ ہوائی نالی کی طرف منتقل کرتے ہیں ۔ پھر یہ ہوا گلے کی طرف آتی ہے ۔ یہاں تاروں کا وہ نظام ہے جو آواز پیدا کرتا ہے ۔ یہ نظام انسانوں کے بنائے ہوئے صوتی آلات کے تاروں سے بہت ہی مختلف اور پیچیدہ ہے ۔ نہ اس نظام کے ساتھ انسان کے بنائے ہوئے آلات مشابہت کر سکتے ہیں جو آواز پیدا کرتے ہیں ۔ اس کے بعد حنجرہ میں آواز پیدا ہوتی ہے اور اس کے بعد جس طرح عقل چاہتی ہے اس آواز کی تشکیل ہوتی ہے ۔ اونچی آواز' نرم آواز' دھیمی آواز' تیز آواز' موٹی آواز' سخت آواز' نرم آواز' پتلی آواز' غرض قسم قسم کی آواز بھی ۔ پھر حنجرہ کے ساتھ زبان' ہونٹ' جبڑے اور دانت کام کرتے ہیں ۔ مختلف اطراف کے دباؤ کے نتیجے میں پھر حروف بنتے ہیں اور جہاں سے وہ نکلتے ہیں وہ ان کا مخرج ہوتا ہے ۔ زبان کے اندر یہ کمال ہے کہ وہ ہر حرف کو زبان کے ایک حصے سے نکالتی ہے جس کا خاص اثر ہوتا ہے ۔ زبان دباؤ کو اس حصے پر مرکوز کر دیتی ہے ۔ اسی طرح حروف کی آواز میں ایک خاص ترنم پیدا ہوتا ہے ۔

یہ تمام آلات صرف ایک لفظ کی ادائیگی کا انتظام کرتے ہیں ۔ اس کے بعد پھر عبارت موضوع' افکار' احساسات' سابقہ اور نئے' غرض یہ نظام ""نظام بیان"" بذات خود ایک معجزہ ہے ۔ یہ بیان انسانی جسم کے اندر رکھ دیا گیا ہے ۔ یہ رحمان کی صفت ہے اور رحمان کا فضل ہے ۔

اب اس کائنات کی نمائش گاہ میں دست قدرت کے بنائے ہوئے دو اور عجوبے ۔

الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (۵۵ : ۵) (سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں) شمس و قمر کی بناوٹ ان کی حرکت اور ہم آہنگی کو دیکھ کر انسان حیران اور ششدر رہ جاتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عظیم نظام ہے اور منظم کی عظمت پر دال ہے اور اس نظام کے اندر گہرے حقائق پوشیدہ ہیں اور اس سے نکلنے والے نتائج دور رس ہیں ۔

سورج اجرام فلکی میں سے کوئی بہت بڑا کرہ نہیں ہے ۔ اس فضائے کائنات کے اندر جس کے حدود کا تعین انسان نہیں کر سکا' کئی ملین ستارے ہیں جن میں سے بہت سے سورج سے بڑے ہیں اور زیادہ حرارت والے ہیں ۔ زیادہ تیز روشنی والے ہیں ۔ بعض تو بیس گنا بڑے اور زیادہ گرم ہیں اور جن کی روشنی سورج کی روشنی سے پچاس گنا تیز ہے ۔

شعری یمانی سورج سے بیس گنا بھاری ہے اور اس کی روشنی سورج کی روشنی سے پچاس گنا زیادہ ہے ۔ سماک رامح سورج کے حجم سے اسی گنا بڑا حجم رکھتا ہے اور اس کی روشنی آٹھ ہزار گنا زیادہ تیز ہے ۔ سہیل کا حجم سورج سے دو ہزار پانچ صد مرتبہ بڑا ہے ۔ اسی طرح اور ستارے اور سیارے ۔

لیکن ہمارے لئے سورج ہی زیادہ اہم ہے یعنی ہم زمین کے باشندوں کے لئے کیونکہ یہ زمین اور اس کی یہ حالت اور

انسان کی زندگی سورج کی حرارت کی مرہون منت ہے اور اس میں سورج کی جاذبیت کو بھی بڑا دخل ہے۔

اس طرح چاند جو اس زمین کا ایک چھوٹا سا سیارچہ ہے لیکن اسے بھی اس زمین کی زندگی میں اہمیت حاصل ہے۔ سمندروں کے اندر مدوجزر اسی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

سورج کا حجم 'اس کا درجہ حرارت 'ہم سے اس کا بعد 'اس کا اپنے مدار میں چکر لگانا 'اس طرح چاند کا حجم 'اس کی ہم سے دوری اور اپنے مدار میں گردش یہ سب امور نہایت ہی باریک حساب اور پیمانوں سے بنائے ہوئے ہیں اور زمین کی زندگی پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ بمقابلہ دوسرے ستاروں اور سیاروں کے۔ شمس و قمر کے بعض حسابات ہم یہاں درج کرتے ہیں کہ زمین کے حوالے سے ان کے ان حسابات میں ذرا بھی فرق آئے تو دوررس نتائج نکلیں۔

سورج زمین سے ۵ لاکھ ۹۲ میل دور ہے۔ اگر یہ اس سے قریب تر ہوتا تو زمین جل جاتی اور تمام پانی بخارات میں بدل جاتا اور بخارات فضا میں بلند ہو جاتے اور اگر یہ ذرا اور دور ہوتا تو تمام چیزیں منجمد ہو جاتیں۔ ہم تک سورج کی جو حرارت پہنچتی ہے 'وہ اس کی حرارت کے دو ملین حصوں میں سے ایک حصہ پہنچتی ہے اور ہماری موجودہ زندگی کے لئے یہی معمولی حرارت کافی ہے۔ اگر شعریٰ اپنی موجودہ ضخامت اور حرارت کے ساتھ سورج کی جگہ ہوتا تو پورا کرہ ارض جل کر راکھ ہو جاتا اور پانی بخارات بن کر فضا آسمانی میں بکھر جاتا۔

اسی طرح چاند کا حجم اور ہم سے بعد ایک حساب سے رکھا گیا ہے۔ اگر یہ اس سے ذرا بھی بڑا ہوتا تو سمندر کے اندر اس قدر طوفان آتے کہ زمین بار بار ڈوبتی رہتی۔ اسی طرح اگر یہ ہم سے قریب ہو جاتا یعنی جہاں ہے تو بھی زمین پر طوفان مچا دیتا لیکن جہاں اللہ نے اسے رکھ چھوڑا ہے اس سے بال برابر ادھر ادھر نہیں ہوتا۔

سورج اور چاند کی جاذبیت زمین کے لئے ایک مقدار کے ساتھ متعین ہے اور ان کی رفتار کو بھی ایک نہایت ہی مضبوط حساب سے رکھا گیا ہے اور ہمارا یہ پورا کہکشاں اور مجموعہ شمسی بحساب بیس ہزار میل فی گھنٹہ ایک ہی سمت میں چل رہا ہے اور اس راہ میں وہ کسی دوسرے ستارے سے نہیں ٹکرایا اور اس رفتار کے کئی ملین سال ہوگئے ہیں اور فضائے کائنات ختم نہیں ہوئی۔

اس وسیع فضائے آسمانی کے اندر کوئی ستارہ اپنے مدار سے ایک بال برابر بھی ادھر ادھر نہیں ہوتا اور ان کے درمیان جو توازن اور ہم آہنگی رکھی گئی ہے 'اپنے حجم کے لحاظ سے یا حرکت کے لحاظ سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ سچ فرمایا ذات باری نے۔

الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (۵۵ : ۵) (سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں)

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ (۵۵ : ۶) (تارے اور درخت سب سجدہ ریز ہیں) سابقہ اشارہ یہ تھا کہ اس کائنات کی تخلیق و تشکیل میں ایک مضبوط حساب رکھا ہوا ہے اور یہ اشارہ اسی طرف ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ کی ذات کے ساتھ مربوط ہے۔ یہ کہ یہ باری تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق چلتی ہے اور اس کی مطیع فرمان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات پوری طرح اللہ کی مطیع فرمان ہے جس طرح بندہ اور غلام مطیع ہوتا ہے اور اس کے لئے خالق نے جو ضوابط رکھے ہیں 'ان کو تسلیم کرتی ہے۔ ستارے اور درخت اس بندگی اور اطاعت کا نمونہ ہیں۔ بعض نے ستارے کا یہ مفہوم

لیا ہے کہ اس سے وہ ستارہ مراد ہے جو آسمان میں ہے جبکہ بعض نے شجر سے مراد وہ گھاس لی ہے جو تال پر کھڑی نہ ہو۔ مراد جو بھی ہو' بہرحال آیت کا مفہوم وہی ہے کہ تمام چیزوں کی اطاعت اور بندگی کا رخ اللہ کی طرف ہے۔

غرض یہ کائنات ایک ایسی مخلوق ہے جس کی ایک روح اور اسی روح کی شکلیں اور مظاہر اور درجے مختلف ہوتے ہیں۔ کسی چیز میں کیسی روح ہے اور کسی میں کسی دوسری نوعیت کی روح لیکن درحقیقت روح کائنات ایک ہی ہے۔

قلب بشری نے روح کائنات کا ادراک بہت پہلے کر لیا تھا اور یہ کہ یہ پوری کائنات اپنی اس روح کے اعتبار سے خالق کی طرف متوجہ ہے۔ ہر شخص کو بذریعہ الہام لدنی اس حقیقت کا ادراک کرایا گیا تھا لیکن جب انسان نے اس روح کو اپنے حواس سے معلوم کرنے کی سعی کی تو اس حقیقت' اس الہامی حقیقت کو غبار آلود کر دیا گیا اور یہ انسانی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ جب بھی اس حقیقت کو عقل کے پائے چوبیں سے معلوم کرنے کی سعی کی گئی یہ بھاگ گئی۔

حال ہی میں انسان نے کائنات کی تخلیق میں علامات وحدت کا ایک حصہ تلاش کر لیا ہے لیکن موجودہ مادیت زدہ انسانیت روح کائنات تک نہیں پہنچ سکی جو ایک زندہ روح ہے اور اس تک روحانی اندازہی میں پہنچنا چاہئے اور پہنچا جا سکتا ہے۔

سائنس دان اپنے کام کا آغاز اس سے کرتے ہیں کہ ذرہ تخلیق کی پہلی اکائی ہے اور وہ صرف شعاع یا نور سے مرکب ہے اور یہ کہ حرکت اصول کائنات ہے اور کائنات کے تمام اجسام اور افراد کے درمیان مابہ الاشتراک حرکت ہے۔

سوال بلکہ سوالات یہ ہیں کہ یہ کائنات حرکت کرکے جا کہاں رہی ہے۔ یہ تو کائنات کی صفت ہوئی اور خاصیت ہوئی۔ قرآن کریم یہ اطلاع دیتا ہے کہ یہ کائنات اپنے خالق کی طرف رخ کئے ہوئے ہے اور یہی حقیقی حرکت ہے۔ ظاہری حرکت دراصل روح کائنات کی حرکت کی ایک تعبیر ہے اور قرآن کریم اس روح کائنات کی حرکت کی تعبیر ایسے الفاظ میں کرتا ہے۔

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ (۵۵ : ۶) (تارے اور درخت سجدہ ریز ہیں) بعض آیات میں اس کی تعبیریوں کی گئی ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (۱۷ : ۴۴) (اس کی پاکی تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیز بھی بیان کر رہی ہیں جو آسمان و زمین میں ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں۔) اور دوسری جگہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيْحَهُ (۲۴ : ۴۱) (کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمان اور زمین میں ہیں اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اڑ رہے ہیں۔ ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے۔)

جب انسان اس حقیقت پر غور کرتا ہے کہ پوری کائنات سجدہ ریز ہے اور اللہ کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہے تو

انسانی قلب کو حق تعالیٰ تک پہنچنے کا بہت بڑا زادراہ ملتا ہے۔ وہ اپنے ماحول کو زندہ سمجھتا ہے۔ اس سے محبت کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہمقدم ہو کر اللہ کی طرف فرار اختیار کرتا ہے۔ یہ سوچ روح کائنات سے یہ ہم نشینی انسان کو اس کائنات کا دوست بنا دیتی ہے۔

یہ نہایت ہی دور رس اشارہ ہے اور بہت ہی گہرا ہے۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ (٧) اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ (٨) وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (٥٥ : ٩) (آسمان کو اس نے بلند کیا اور میزان قائم کر دی۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو' انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو) یہاں آسمان کی طرف شارہ ہے' قرآن کے دوسرے اشارات کی طرح یہ بھی غافل دلوں کو جگانے کے لئے ہے اور اس کو اس طرف متوجہ کرنا مطلوب ہے کہ آسمان کو رات اور دن تم دیکھتے ہو تم اس کی اہمیت نہ کھو دو۔ اس پر غور کرو' اس کی عظمت اس کے جمال اور اس کی صفت میزانیت پر غور کرو کہ اس کے مدار اور رفتار میں بال برابر فرق نہیں آتا اور اس کے ذریعہ قدرت والے کی قدرتوں کو دیکھو۔

آسمان سے مراد جو بھی ہو' یہاں حکم دیا جاتا ہے کہ ذرا اوپر کو دیکھو' تمہارے اوپر ایک ہولناک فضا ہے۔ بہت بلند بہت دور' بلا حدود و قیود' اس فضا کے اندر ہزار ہا ملین عظیم الجثہ اجرام فلکی تیر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی دو آپس میں نہیں ملتے۔ ان کا کوئی مجموعہ دوسرے مجموعات سے متصادم نہیں ہوتا۔ ان مجموعات کی تعداد میں ایک ایک مجموعے کی تعداد بعض اوقات ایک ہزار ملین تاروں تک پہنچ جاتی ہے۔ ہمارے نظام شمسی کو جس مجموعے کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس میں ہمارے سورج جیسے اجرام بھی ہیں اور اس سے ہزار ہا گنا بڑے بھی ہیں۔ فقط ہمارے سورج کا قطر ۱/۳ ۱ ملین کلومیٹر ہے اور یہ سب ستارے اور یہ سب مجموعے اس کائنات کے اندر نہایت ہی خوفناک تیزی کے ساتھ حرکت پذیر ہیں لیکن یہ سب اس عظیم اور محیر العقول وسیع فضائے کائنات میں اس طرح ہیں جس طرح زمین کی فضا میں ذرات تیر رہے ہیں جو ایک دوسرے سے دور دور چلتے ہیں اور ان کے اندر کوئی تصادم نہیں ہوتا۔ (اور اگر ہو جائے تو؟)

اللہ نے اس آسمان کو جس طرح بلند کیا ہے اور ہولناک حد تک وسیع کیا ہے اور اس کے لئے ایک فطری میزان تجویز کیا ہے اسی طرح تمہارے لئے بھی ایک میزان حق تجویز کیا ہے۔ یہ ثابت' مضبوط اور جما ہوا ہے اور یہ میزان قدروں کی پیمائش اور وزن کے لئے ہے۔ افراد کی قدر' واقعات کی قدر' اشیاء کی قدر تاکہ ہر کسی کا وزن اور قدر متعین ہو جائے اور ان میں خلل واقع نہ ہو اور لوگ جہالت' عناد اور خواہشات کے مطابق اچھے برے کا فیصلہ نہ کرتے پھریں۔ اس میزان کو فطرت کے اندر بھی رکھا ہوا ہے اور دعوت اسلامی کے اندر بھی رکھا ہوا ہے جسے تمام رسول لے کر آئے ہیں اور آخر میں یہ قرآن کی شکل میں آیا ہے

اللہ نے میزان قائم کر دیا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ :

اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ (٥٥ : ٨) "تم میزان میں خلل نہ ڈالو" کمی بیشی نہ کرو اور

وَ اَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ "اور انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو" میزان حق حقدار کو دینے اور انصاف کرنے کے لئے قائم ہوتا ہے لہذا نہ حد سے آگے جاؤ نہ پیچھے رہو۔

اس طرح زمین کے اندر موجود حق اور میزان اور انسانوں کی زندگی کے اندر موجود حقوق میں حق تجی ولد رسید کے مطابق اسلامی نظام اور کائنات کے نظام کے درمیان توازن اور ہم آہنگی پیدا ہوگی۔ یوں آسمانوں سے نزول وحی اور آسمانوں کی رفعت اور بلندی دونوں کے درمیان اللہ کا میزان کام کرتا ہے اور یوں یہ دونوں مفہوم انسانی احساس پر سایہ فگن ہوتے ہیں۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵: ۱۰) فِيهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ (۵۵: ۱۱) وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ (۵۵: ۱۲) (زمین کو اس نے مخلوقات کے لئے بنایا۔ اس میں ہر طرح کے بکثرت پھل ہیں' کھجور کے درخت ہیں جن کے پھل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ طرح طرح کے غلے ہیں جن میں بھوسا بھی ہوتا ہے اور دانہ بھی) اس زمین میں بس کر اور رہ رہ کر ہمیں یہ چیزیں نظر نہیں آتیں۔ اس زمین کے حالات و اطوار کو دیکھ کر اور اپنے حالات و احوال کو ہروقت دیکھ دیکھ کر ہم اس کی کوئی چیز انوکھی نہیں پاتے جو دراصل عجوبہ ہوتی ہے اور دست قدرت کی عجب کارستانی ہوتی ہے اور زمین پر جس طرح ہمیں سکون و قرار سے رکھا گیا ہے' اس کی ٹیکنالوجی کا ہمیں پورا شعور نہیں ہوتا اور جس طرح ہمیں یہاں قرار سے رکھا گیا ہے اس کے معنی کو ہم نے سمجھا ہی نہیں ورنہ ہم اللہ کی قدرت اور عظمت کا کچھ تصور کرتے۔ ہاں کبھی کبھی جب آتش فشانی ہوتی ہے یا کوئی شدید زلزلہ آتا ہے تو ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین کانپتی ہے۔ تب ہمیں قدرے اضطراب ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے مطیع ہونے کا مفہوم کیا ہے۔

انسانوں کا تو یہ فریضہ ہے اور ان کے لئے یہ بات شایان شان ہے کہ وہ ہروقت اس بات کو ذرا یاد رکھیں۔ یہ زمین جس کے اوپر وہ چلتے دوڑتے ہیں' اگر اس کی طرف قدرے توجہ کریں تو ان کو نظر آئے کہ یہ تو ایک ذرہ ہے جو اس ہولناک اور محیر العقول وسیع تر فضا میں تیر رہا ہے۔ یہ اس مطلق بے قید' بے حد فضا میں ہے۔ یہ ذرہ خود اپنے گرد بھی ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا ہے اور سورج کے گرد یہ ساٹھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا ہے جبکہ یہ زمین یہ سورج اور اپنے مجموعہ ستارگان جو کئی ملین میں بحساب بیس ہزار میل فی گھنٹہ کسی سمت میں جا رہے ہیں جس کا ہمیں علم نہیں۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ یہ برج جبار کی طرف جا رہے ہیں۔

ہاں اگر انسان اس بات پر غور کریں کہ وہ ایک چھوٹے سے ذرے پر سوار ہیں اور یہ ذرہ اس فضا میں اس تیزی سے دوڑ رہا ہے اور یہ اس فضا میں لٹک رہا ہے اور کوئی ستون اور سہارا نہیں ہے صرف دست قدرت نے اسے یوں رکھا ہوا ہے تو وہ ہروقت اللہ کا خوف اپنے دلوں کے اندر پائیں۔ کانپتے رہیں اور تھرتھراتے رہیں اور صرف اس ذات کی طرف متوجہ ہوں جس نے اسے ایسا رکھا ہوا ہے اور اس نہایت تیز رفتار گھوڑے پر یہ یوں چل پھر رہے ہیں۔

اللہ نے تو اس خوف کے لئے اس میں اسباب حیات مہیا کر دیئے ہیں۔ یہ اس میں کھاتے پیتے ہیں جبکہ یہ انہیں لئے ہوئے اپنے گرد بھی دوڑ رہی ہے اور سورج کے گرد بھی دوڑ رہی ہے اور نظام شمسی کے مجموعے کے ساتھ بھی دوڑ رہی ہے

اور پھر اسی زمین کے اندر اللہ نے ہمارا رزق' میوے اور فواکہ پیدا کر رکھے ہیں اور کھجور کے اونچے اونچے درخت جن کے پھل غلافوں میں بند ہوتے ہیں۔

کم اس تھیلے کو کہتے ہیں جن کے اندر سے کھجور کا پھل باہر آتا ہے کس قدر خوبصورت ہوتا ہے وہ اور پھر دوسرے خوشے دار فصل اور دانے جن کے اوپر بھوسہ ہوتا ہے اور اسے ہٹا کر دانے نکال کر انسانوں کے لئے اور بھوسہ مویشیوں کے لئے ہوتا ہے۔ یہاں ریحان کا ذکر بھی کیا جاتا ہے کہ بعض نباتات خوشبودار ہوتے ہیں اور یہ زمین کے اندر مختلف قسم کے نباتات ہوتے ہیں جو خوشبودار ہوتے ہیں اور ان خوشبودار نباتات میں سے کچھ انسانوں کی خوراک ہیں اور کچھ حیوانوں کی خوراک اور بعض محض خوشبوئیں ہیں جو انسانوں کے لئے متاع حیات ہیں۔

اللہ کے ان انعامات کے ذکر کے بعد یعنی تعلیم القرآن' تعلیم البیان 'شمس و قمر کا منظم دوران' آسمان کی بلندیاں اور آسمانوں کا میزان اور اہل زمین کا میزان اور زمین کا لوگوں کے لئے برقرار رکھنا اور اس کے اندر کے میوہ جات' پھل اور خوشبوئیں ظاہر و باطن کے لحاظ سے خوبصورت' ان انعامات و احسانات کو گنوا کر جن و انس دونوں مکلف مخلوقوں کو خطاب کیا جاتا ہے۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۵ : ۱۳) (پس اے جن و انس اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے) یہ سوال شہادت قائم کرنے کے لئے ہے۔ ورنہ کوئی جن اور انسان فی الواقع اللہ کی نعمتوں کی تکذیب نہیں کر سکتا۔

---○○○---

جن و انس پر اللہ نے اپنے احسانات اور انعامات اس کائنات کے حوالے سے تو گنوا دیئے' اب خود اپنی ذات کے حوالے سے کچھ حقائق۔ ذرا اپنی ذات ہی پر غور کرو :

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (۵۵ : ۱۴) وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (۵۵ : ۱۵) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۵ : ۱۶) "انسان کو اس نے ٹھیکری جیسے سوکھے سڑے گارے سے بنایا اور جن کو آگ کی لپٹ سے پیدا کیا۔ پس اے جن و انس' تم اپنے رب کے کن کن عجائب قدرت کو جھٹلاؤ گے؟"

پیدا کرنا اور ایجاد کرنا' اصول نعمت میں سے ہے۔ وجود اور عدم کے درمیان جو فاصلے ہیں ان کو ان پیمانوں میں سے کسی پیمانے کے ساتھ نہیں ناپا جا سکتا جو انسان کے ادراک میں ہیں۔ اس لئے کہ انسانوں کی دسترس میں جو پیمانے ہیں یا جن کا ادراک ان کی عقلوں نے کر لیا ہے وہ ایسے پیمانے ہیں جو ایک موجود اور دوسرے موجود کے درمیان فرق کرنے کے پیمانے ہیں۔ رہی یہ بات کہ موجود اور غیر موجود کے درمیان کیا فرق ہے اور کس قدر فاصلے ہیں۔ ان کو انسان نہیں جان سکتا۔ یہی حال جنوں کا بھی ہے۔ ان کے پیمانے بھی مخلوقات کے پیمانے ہیں۔

جب اللہ انسانوں اور جنوں کو یاد دلاتا ہے کہ میں تمہیں عدم سے وجود میں لایا ہوں تو یہ ایک ایسی نعمت ہے جو حد ادراک سے ماوراء ہے۔ اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ انسان کی تخلیق کس مواد سے ہوئی اور جنوں کی تخلیق کس مواد سے ہوئی۔ انسان کو اللہ نے۔

صَلْصَال (۵۵ : ۱۴) سے بنایا' صَلْصَال (۵۵ : ۱۴) اس مٹی کو کہتے ہیں جو سوکھ جائے اور جب اس پر ضرب لگائی جائے تو اس سے آواز صلصلہ نکلے۔ ہو سکتا ہے کہ جس وقت انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا اس کی پیدائش کے مراحل میں سے یہ ایک مرحلہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ انسان کے مادہ تخلیق اور مٹی کے مادہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

"جدید سائنس نے تو یہ بات ثابت کر دی ہے کہ جسم انسانی کے اندر وہی مواد ہے جو مٹی کے اندر ہے۔ انسان کاربن' آکسیجن' ہائیڈروجن' فاسفورس' گندھک' کیلشیم' پوٹاشیم' سوڈیم کلورائیڈ' میگنیشیم' آئرن' مینگنیز' تانبے' لیڈ' فلورین' کوبالٹ' زنک' سلیکان اور المونیم سے مرکب ہے اور یہی وہ عناصر ہیں جن سے زمین بنی ہوئی ہے۔ اگرچہ ایک انسان اور انسان کے اندر ان کی نسبت مختلف ہوتی ہے اور انسان اور مٹی کے اندر بھی نسبت کا اختلاف ہے۔ البتہ عناصر و اصناف ایک ہی ہیں۔" (اللہ اور سائنس' صفحہ ۱۸۰)

لیکن سائنس نے جو بات کی ہے یہ لازمی نہیں ہے کہ آیت کی تفسیر بھی وہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ قرآن کی مراد یہی ہو جو سائنس نے ثابت کیا ہے یا وہ ہو جو سائنس دانوں کو بھی معلوم نہ ہو اور کچھ اور ہو۔ یا اس سے دوسرے معنوں میں انسان کو خالی مخلوق کہا گیا ہو اور طین اور صلصال کے کچھ اور ہی معانی مراد ہوں۔

ہم نے جس چیز کا بڑی شدت سے انتباہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ کسی آیت کو ان مفہومات تک محدود نہیں کرنا چاہئے جو جدید سائنس نے دریافت کئے ہیں کیونکہ انسانی انکشافات صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی ہو سکتے ہیں اور تغیر اور تبدل قبول کرتے ہیں۔ جوں جوں انسان کے وسائل علم بڑھتے ہیں انسانی نظریات میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ بعض مخلص لوگ قرآنی آیات کو بہت جلد سائنسی مفہومات کے مطابق بنانے کی سعی کرتے ہیں' خواہ یہ مفاہیم تجرباتی ہوں یا فرضی ہوں اور ان کی نیت یہ ہوتی ہے کہ قرآن کا اعجاز ثابت کیا جائے۔ اس لئے کہ قرآن سائنس کے خلاف ہو یا موافق ہو وہ اپنی جگہ معجزہ ہے۔ قرآن کے نصوص کا مفہوم بہت ہی وسیع ہے اور اس کو کسی ایک وقت کے انکشافات تک محدود نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ انکشافات ہر وقت اپنے اندر غلطی کا احتمال رکھتے ہیں بلکہ بعض اوقات سرے سے نظریات باطل ہو جاتے ہیں۔ جدید سائنسی معلومات سے ہم صرف اس قدر استفادہ کر سکتے ہیں کہ ہم ان کے ذریعہ آیات کے مفہوم و مدلول کو اپنے تصور میں وسیع کر دیتے ہیں بشرطیکہ وہ ان مفہومات کی طرف اشارہ کر رہی ہوں جن کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے لیکن کبھی ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ قرآن کا مفہوم وہی ہے جس تک ہمارے انکشافات پہنچ گئے ہیں۔ جواز اس قدر ضرور ہے کہ ہم کہیں کہ یہی وہ چیز ہے جس کی طرف قرآن نے بھی اشارہ کیا ہے۔

رہی یہ بات کہ جنوں کو آگ کی لپٹ سے تخلیق کیا گیا ہے تو یہ مسئلہ انسانوں کے حدود علم سے باہر ہے۔ جنوں کے صرف وجود کی اطلاع قرآن نے دی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ آگ سے پیدا کئے گئے ہیں۔ مارج کے معنی آگ کے

شعلوں کی وہ لپٹ ہے جو زبان کی طرح ہوتی ہے اور یہ ہوا سے بنتی ہے اور جن اسی زمین پر انسانوں کے ساتھ رہتے ہیں جن اور ان کی نسل کس طرح رہتی ہے اس کا ہمیں علم نہیں۔ یقینی بات یہی ہے کہ ان پر لازم ہے کہ وہ قرآن اور شریعت پر عمل کریں جیسا کہ اس سے قبل ہم نے۔

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ (اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تیری طرف جنوں کے کچھ افراد کو پھیر دیا اور وہ قرآن سننے لگے) کی تفسیر میں کہا ہے اور جنوں اور انسانوں دونوں کو اس آیت میں خطاب کیا گیا ہے کہ اللہ کی کن کن انعامات کی تم تکذیب کرو گے۔ دونوں کی اللہ نے تخلیق کی اور تخلیق کرنا اور وجود بخشا وہ نعمت ہے جس پر تمام نعمتوں کا دارومدار ہے۔ چنانچہ اس پورے پیراگراف پر یہ شہادت قائم کی جاتی ہے۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۵: ۱۶) (پس اے جن و انس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کی تکذیب کرو گے) ان شہادتوں کے قلم بند ہو جانے کے بعد اب تکذیب کا کونسا مقام ہے!

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۸﴾
مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿۱۹﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾ وَ
لَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾ كُلُّ ۲۵ ع
مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۲۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۸﴾

"دونوں مشرق اور دونوں مغرب، سب کا مالک و پروردگار وہی ہے۔ پس اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟ دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔ پس اے جن و انس، تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے؟ ان سمندروں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔ پس اے جن و انس، تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے؟ اور یہ جہاز اسی کے ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اونچے اٹھے ہوئے ہیں، پس اے جن و انس، تم اپنے رب کے کن کن احسانات کو جھٹلاؤ گے؟ ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔ پس اے جن و انس، تم اپنے رب کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے؟"

یہ اشارہ انسان کو اللہ کے شعور کے فیض میں غرق کر دیتا ہے جس طرف بھی کوئی توجہ کرے جس طرف بھی التفات

کرے۔ اور جس قدر بھی ہمارا مشاہدہ اس کائنات میں دور تک جاتا ہے جہاں بھی ہم جائیں وہاں مشرق ہیں اور مغرب ہیں۔ اللہ کی ربوبیت ہے۔ اس کی مشیت ہے اور اس کا اقتدار اعلیٰ ہے۔ جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔ تیرا نور ہے۔ تیری ہدایت ہے۔

مشرقین اور مغربین یعنی "مشرق اور مغرب" ان سے مراد سورج کے طلوع اور غروب ہونے کے مقامات بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ شمس و قمر کی حیثیت انعام الٰہی پہلے آچکی ہے اور اس سے مراد سورج کے مختلف مقامات طلوع اور غروب بھی ہو سکتے ہیں یعنی جو گرمیوں اور سردیوں میں چلتے رہتے ہیں۔

یہ اشارہ قلب و نظر پر جس طرح سایہ فگن ہے وہ قابل التفات ہے۔ مشرق و مغرب کی طرف متوجہ ہونا' ان مظاہر طلوع اور غروب سے اللہ کی شان پانا' یہ سوچنا کہ دست قدرت ان افلاک کو کس طرح گھما رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نور ربی ان آفاق میں جگہ جگہ موجود ہے۔ مشرق و مغرب کے اس تدبر اور تامل کے بعد قلب و نظر جو سبق' جو عبرت لے کر لوٹیں گے جو شعور لے کر آئیں گے اس کے فیوض سے ہمارے جسم و روح بھر جائیں گے۔

مشرقین کی ربوبیت اور مغربین کی ربوبیت' اللہ کے احسانات میں سے ایک اہم احسان ہے۔ مشرقین اور مغربین اللہ کی نشانیاں بھی ہیں اور نعمتیں بھی ہیں کیونکہ طلوع و غروب ہی سے اس زمین پر انسانوں اور جنوں کی زندگی ممکن ہے۔ اگر طلوع و غروب نہ ہوں اور یہ نظام خلل پذیر ہو جائے تو انسان اور جنات کا زندہ رہنا محال ہو جائے۔ اس لئے کہا گیا۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵ : ۱۸) (تم اپنے رب کے کن کن عجائبات قدرت کو جھٹلاؤ گے)

---()()()---

بالائی کائنات کی وسعتوں سے اب زمین اور اس کے اندر کی انعامات اور احسانات کی طرف' زمین کے اندر اللہ تعالیٰ نے خشکی اور تری کو ایک اندازے کے مطابق بنایا ہے اور خشکی اور تری میں اللہ نے انسان کے لئے بہت کچھ پیدا کیا ہے۔ ایک مقدار کے مطابق۔

مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ (۱۹) بَیْنَھُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ (۲۰) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۲۱) یَخْرُجُ مِنْھُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ (۲۲) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۲۳) وَلَہُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِی الْبَحْرِ کَالْاَعْلَامِ (۲۴) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵ : ۲۵) ع

"دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔ پس اے جن و انس' تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے؟ ان سمندروں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔ پس اے جن و انس' تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے؟ اور یہ جہاز اسی کے ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اونچے اٹھے ہوئے ہیں' پس اے جن و انس' تم اپنے رب کے کن کن احسانات کو جھٹلاؤ گے؟"

یہاں جن دو دریاؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ میٹھا سمندر اور کھارا سمندر ہیں ۔ کھارے دریا سے مراد سمندر اور بڑے اور گہرے پانی ہیں اور میٹھے سے مراد چھوٹے دریا ہیں ۔ یہ باہم ملتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنے حدود مقررہ سے آگے نہیں بڑھتا ۔ ہر ایک اپنے حدود سے تجاوز نہیں کرتا اور ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے ۔

زمین کے اس کرہ پر پانیوں کی یہ تقسیم اتفاقاً نہیں ہوگئی ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر نے گہرے اور باریک اندازے سے کی رکھی ہے ۔ کڑوا پانی سطح زمین کے ۳/۴ حصہ پر پھیلا ہوا ہے ۔ صرف ۱/۴ خشکی ہے اور یہ خطے ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہیں ۔ اس قدر وسیع نمکین پانی سطح زمین کے لئے بہت ہی ضروری ہے تاکہ وہ زمین کو صاف رکھے اور زندگی کے نشوونما کے لئے وہ قابل رہے ۔

"زمین سے مسلسل گیسیں نکل رہی ہیں ۔ زمانوں سے نکل رہی ہیں اور ان میں سے اکثر زہریلی ہیں لیکن ہوا ان گیسوں سے ملوث نہیں ہوتی ۔ تیز ہوا کے اندر پائے جانے والی وہ نسبت بھی نہیں بدلتی جو انسان کے وجود کے لئے ضروری ہے ۔ اس توازن کو برقرار رکھنے کا ضامن پانی کا وہ عظیم ذخیرہ ہے یعنی سمندر" (۱)

اس عظیم ذخیرہ آب پر جب سورج چمکتا ہے تو اس سے بخارات اٹھتے ہیں اور انہی بخارات سے بادل اور بارشیں بن کر خشکی پر میٹھے پانی کے دریا بہتے ہیں ۔ سمندر ' حرارت شمسی اور اعلیٰ فضا کی سردی اور دوسرے فلکیاتی عوامل مل کر بارش بناتے ہیں اور ان سے میٹھا سمندر بنتا ہے ۔

اس میٹھے پانی ہی پر انسانوں ' حیوانوں اور نباتات کی زندگی موقوف ہے ۔ تمام دریا جاکر سمندروں میں گرتے ہیں اور زمین کا نمک بہاکر یہ سمندر میں لے جاتے ہیں لیکن یہ سمندر کے پانیوں کو خراب نہیں کرسکتے ۔ جتنے بھی دریا ہیں ان کی سطح سمندر کی سطح سے بلند ہوتی ہے ۔ اس لئے سمندر بھی ان دریاؤں پر کوئی دست درازی نہیں کرسکتا کیونکہ یہ دریا سمندر ہی میں گرتے ہیں ۔ ان دریاؤں کے چلنے کے جو راستے ہیں ان پر نمکین پانی دست درازی نہیں کرتا نہ نمکین پانی ان صاف پانیوں کو اپنے کام سے روک سکتا ہے ۔ دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے لہٰذا دو سمندروں کا ذکر اور ان کے درمیان پردے کا ذکر کوئی قابل تعجب بات نہیں ہے ۔ "پس اے جن و انس تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے ۔"

اس کے بعد سمندروں میں موجود اللہ کے احسانات کا ذکر ' خصوصاً وہ چیزیں جو ان کی عملی زندگی کے قریب تھیں ۔

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ (۵۵ : ۲۲) (ان سمندروں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں)

موتی (لولو) دراصل حیوان ہے ۔ "سمندر کے اندر جو موتی ہیں وہ سمندروں کی عجیب ترین چیزوں میں سے ہیں ۔ یہ حیوان سیپی میں ہوتا ہے اور یہ سیپی چونے کے مواد سے بنی ہوتی ہے اور یہ سمندروں کی گہری تہوں میں اتر جاتی ہے ۔ یہ سیپی اسے خطرات سے بچاتی ہے ۔ یہ حیوان دوسرے زندہ حیوانوں سے اپنی ساخت اور طریقہ حیات کے لحاظ سے بالکل مختلف ہے ۔ اس کے پاس ایک باریک جال ہوتا ہے جس طرح شکاری کا جال ہوتا ہے ۔ یہ جال نہایت ہی عجیب انداز سے

(۱) "انسان اکیلا نہیں ہے" از اے کریسی موریسون ' صدر سائنس اکیڈمی ' نیویارک

بنا ہوا ہوتا ہے ۔ یہ دراصل ایک فلٹر کا کام کرتا ہے جو پانی ' ہوا اور غذا کو تو اندر جانے دیتا ہے لیکن ریت 'کنکریوں وغیرہ کو صاف کرتا جاتا ہے ۔ اس جال کے نیچے اس حیوان کے منہ ہوتے ہیں ۔ ہر منہ کے چار ہونٹ ہوتے ہیں ۔ جب کبھی ریت کا کوئی ذرہ یا کوئی کنکر اس کے منہ میں داخل ہو جائے یا کوئی مضر حیوان اس سیپی میں داخل ہو جائے تو یہ حیوان فوراً اس پر ایک مادہ پھینکتا ہے جس سے یہ ریت کنکری یا حیوان ڈھانپ لیا جاتا ہے ۔ اس طرح یہ چیز ایک موتی بن جاتی ہے ۔ ریت کا ذرہ یا کنکر کی مقدار جس قدر بڑی ہوگی اس قدر موتی بڑا ہو گا ۔ (۱)

"مرجان (مونگا) بھی اللہ کی مخلوقات میں سے ایک عجیب مخلوق ہے ۔ یہ سمندروں کے اندر تقریباً ۵ ء ۲ میٹر کی گہرائی تک میں رہتا ہے ۔ اس کا نچلا حصہ کسی پتھر یا لکڑی سے چسپاں ہوتا ہے اور اس کا منہ اس کے جسم کے بالائی حصے میں ہوتا ہے ۔ اس کے جسم کے ساتھ کچھ زائد حصے بھی ہوتے ہیں جن کو وہ اپنے شکار اور خوراک میں استعمال کرتا ہے ۔ جب یہ زوائد کسی شکار کو پکڑتے ہیں (یہ شکار اکثر باریک حیوانات پر مشتمل ہوتا ہے ۔ مثلاً پانی کے مچھر) تو شکار فوراً شل ہو جاتا ہے اور یہ مرجان کے ساتھ چمٹ جاتا ہے ۔ یہ زوائد یعنی ہاتھ پاؤں سکڑتے ہیں اور اس شکار کو منہ کی طرف قریب کرتے ہیں اور یہاں سے یہ شکار مرجان کے منہ میں داخل ہوتا ہے ۔ ایک باریک نالی کے ذریعے جس طرح انسان کی خوراک کی نالی کی طرح ہوتی ہے ۔"

"یہ حیوان نسل کشی کے ذریعے بڑھتا ہے ۔ یہ انڈے دیتا ہے ۔ ان انڈوں سے جنین پیدا ہوتے ہیں اور یہ جنین پر پتھروں اور جھاڑیوں سے چپک کر مستقل حیوان کے طور پر بڑھتے ہیں اور یہ گویا ایک مستقل حیوان بن جاتے ہیں ۔"

"خالق کائنات کی قدرتوں کے نشانات میں سے ایک یہ ہے کہ مرجان کا حیوان ایک دوسرے طریقے سے بھی پھیلتا ہے یعنی ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے ذریعہ اور اس کے جو اجزاء اصل سے جدا ہوتے ہیں وہ اصل کے ساتھ ہی مل کر رہتے ہیں ۔ یوں مرجان کا درخت بن جاتا ہے جس کی لمبی لمبی شاخیں ہوتی ہیں اور جوں جوں یہ شاخوں کی شکل اختیار کرتے ہیں یہ شاخیں باریک ہو جاتی ہیں ۔ مرجان جب درخت کی شکل اختیار کرتے ہیں تو اس کی لمبائی ۳۰ سینٹی میٹر تک ہوتی ہے ۔ زندہ مرجانی جانور کئی رنگوں کے ہوتے ہیں ۔ سمندر میں زرد ' نارنگی ' سرخ 'ازرق ' بھورے 'لونگ کے رنگ کے ۔"

"سرخ مرجان وہ گول اور مضبوط حصہ ہوتا ہے جو جانور کے مرجانے کے بعد رہتا ہے اور بڑی بڑی چٹانیں ان کی نوآبادیات ہوتی ہیں ۔"

"ان نوآبادیات میں سے مشہور ترین مرجانی پتھروں کا وہ سلسلہ ہے جو عظیم مرجانی پردے کے نام سے مشہور ہے جو شمال مشرقی آسٹریلیا میں واقع ہے اور اس چٹانی سلسلے کی لمبائی ایک ہزار تین سو پچاس میل ہے اور اس کی چوڑائی پچاس میل ہے اور یہ پردہ انہی باریک مرجانی جانوروں کا مرکب ہے ۔ (۲)

ان موتیوں اور مونگوں سے وہ زیورات بنائے جاتے ہیں جو نہایت شاندار اور قیمتی ہوتے ہیں ۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر احسان رکھتا ہے کہ تم پر میرے یہ یہ احسانات ہیں اور ان کے ذکر کے بعد پھر یاددہانی کا فقرہ دہرایا جاتا ہے ۔

(۱) "اللہ اور جدید سائنس" ص ۱۰۵ (۲) "اللہ اور جدید سائنس" ص ۱۰۵

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵ : ۲۳) (اے گروہ جن و انس تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

اس کے بعد بات کشتی کی طرف آتی ہے جو سمندروں میں چلتی ہے۔ یہ کشتی بعض اوقات اتنی بڑی ہوتی ہے جیسے سمندر میں کوئی پہاڑ ہو۔

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلٰمِ (۵۵ : ۲۴) (اور یہ جہاز اسی کے ہیں جو سمندروں میں پہاڑوں کی طرح اونچے اٹھے ہوئے ہیں)

اور یہ اونچے اٹھے ہوئے جہاز اللہ سبحانہ تعالیٰ کی قدرت کے نمونے ہیں کیونکہ سمندروں میں یہ اللہ کی قدرت سے چلتے ہیں۔ گہرے سمندروں اور امواج کے تھپیڑوں میں انہیں صرف اللہ ہی حفاظت دیتا ہے۔ یہ اللہ ہی کی نگرانی اور نگہبانی ہے کہ یہ پانیوں کے اوپر تیرتے رہتے ہیں۔ یہ جہاز اس وقت بھی اور آج بھی اللہ کی عظیم نعمتوں میں سے تھے اور ہیں۔ ان جہازوں نے لوگوں کی ضروریات نقل و حمل میں 'سفر میں' سہولیات کی منتقلی میں اور تجارت اور کمائی میں اس قدر اہم کردار ادا کیا ہے کہ اس کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵ : ۲۵) ع (پس اے جن و انس تم اپنے رب کے کن کن احسانات کی تکذیب کرو گے)

---

اب یہاں اس دکھائی دینے والی کائنات کے صفحات کو لپیٹ دیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے تمام فنا ہونے والی مخلوقات کے صفحات لپیٹ لئے جائیں گے۔ یہ تمام انسان اور ان کی شکلیں ختم کر دی جائیں گی۔ صفحہ ہستی کو تمام زندہ مخلوق سے صاف کر دیا جائے گا اور صرف اللہ ذوالجلال و ذوالاکرام کی ذات رہ جائے گی۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (۲۶) وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (۲۷) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵ : ۲۸) "ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔ پس اے جن و انس تم اپنے رب کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے؟"

اس آیت کے سایہ میں انسان کی سانس رک جاتی ہے۔ آواز دھیمی ہو جاتی ہے اور انسان کے اعضا رک جاتے ہیں۔ پوری کائنات کی ہر زندہ چیز پر سایہ چھا جاتا ہے۔ ہر قسم کی حرکت بند ہو جاتی ہے۔ زمین و آسمان کی وسعتوں پر نور ربی چھا جاتا ہے۔ انسانی نفوس اور انسانی اعضاء پر جلال ربی کا انعکاس ہو جاتا ہے۔ زمان و مکان میں اللہ کے سوا کوئی اور نہیں ہوتا اور پوری کائنات پر اللہ کا جلال و وقار چھا جاتا ہے۔

انسانی تعبیر اس صورت حال کے بیان سے عاجز ہے۔ قرآن نے جو کچھ کہہ دیا اس پر اضافہ ممکن نہیں ہے۔ یہ بات فضا پر ایسی خاموشی طاری کر دیتی ہے جس میں خشوع اور ذات باری تعالیٰ کا خوف ہو' اللہ کی جلالت کا سایہ ہو اور پوری فضا سہمی سی ہو۔ ایسی فضا جس پر فنا طاری ہو۔ موت کا سکوت ہو۔ کسی طرف کوئی حرکت نہ ہو۔ کوئی شور و شغب نہ ہو۔

حالانکہ ابھی ابھی یہ کائنات زندہ اور متحرک تھی ۔ یہ آیت دائمی بقا کی تصویر کشی ہی کرتی ہے ۔ یہ دائمی بقا کی ایک تصویر انسان کو دیتی ہے حالانکہ انسان دائمی بقا کے تجربے سے واقف نہیں ہے لیکن اس آیت میں اسے نہایت ہی گہری بقا بتائی جاتی ہے ۔ یعنی بقائے ذوالجلال و الاکرام ۔

بقاو دوام اور فنا و سکون کی اس تصویر کشی کے بعد وہی تبصرہ ۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵ : ۲۸) ”پس اے جن و انس تم اپنے رب کے کن کن صفات حمیدہ کو جھٹلاؤ گے“

یہ بھی ایک نعمت ہے بلکہ نعمتوں کی اساس ہے کیونکہ تمام نعمتوں کا سرچشمہ ذات باری ہے ۔ تمام مخلوقات اس سے اپنا وجود اور اسباب حیات پاتی ہیں اور یہ اسباب ' ناموس کائنات اور خصائص کائنات کی فراہم کردہ ہیں اور اس طرح انسانی زندگی کے مشن اور قدریں بھی اسی ذات باری کی وضع کردہ ہیں ۔ وہ حی ہے اور باقی ہے اور تمام مخلوقات کا خالق ہے ۔ وہ محافظ ہے لہٰذا وجود اور نعمات زندگی سب کی سب اس سرچشمہ سے ماخوذ ہیں ۔ اس دنیا کا نظام درست نہیں ہو سکتا جب فنائے دنیا اور بقائے ذوالجلال کی حقیقت کو تسلیم نہ کر لیا جائے ۔

اللہ کے بقائے دوام اور مخلوق کے فنائے لازم کے تصور سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ تمام مخلوق اللہ کے در پر سوالی ہے اور وہ ذوالجلال دائم اور باقی کسی کا محتاج نہیں ہے ۔ وہ صمد ہے ۔

یَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ ﴿۲۹﴾
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۰﴾ سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَیُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾ یُرْسَلُ عَلَیْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾ فَبِاَیِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾

”زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں سب اپنی حاجتیں اسی سے مانگ رہے ہیں ۔ ہر آن وہ نئی شان میں ہے ۔ پس اے جن و انس ' تم اپنے رب کی کن کن صفات حمیدہ کو جھٹلاؤ گے ؟ اے زمین کے بوجھو ' عنقریب ہم تم سے بازپرس کرنے کے لئے فارغ ہوئے جاتے ہیں ۔ (پھر دیکھ لیں گے کہ) تم اپنے رب کے کن کن احسانات کو جھٹلاتے ہو ۔ اے گروہ جن و انس اگر تم زمین اور آسمانوں کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو ۔ نہیں بھاگ سکتے ۔ اس کے لئے بڑا زور چاہئے ۔ اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو تم جھٹلاؤ گے ؟ (بھاگنے کی کوشش کرو گے تو) تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑ

دیا جائے گا جس کا تم مقابلہ نہ کر سکو گے ۔ اے جن و انس ' تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کا انکار کرو گے ؟"

زمین اور آسمانوں میں جو مخلوقات ہیں وہ اس بقائے دوام کے سوالی ہیں کیونکہ سوال کی جگہ ہی وہ ہے ۔ اس کے سوا دوسری کوئی درگاہ نہیں ہے اور اس کے سوا کسی سے کوئی سوال اس لئے عبث ہے کہ غیر خود محتاج ہے محتاج محتاج کی کیا مدد کر سکتا ہے ۔ ...

اللہ تعالیٰ کی ہر آن کی شان ہے ۔ یہ وجود جو لا حدود ہے ۔ سب کا سب اس کی مشیت ' اس کی تصویر اور اس کی تدبیر سے چل رہا ہے ۔ یہ تدبیر پوری کائنات میں رواں دواں ہے اور ہر فرد علیحدہ علیحدہ بھی اس تقدیر اور مشیت میں پر دیا ہوا ہے ۔ پھر انسانی فرد کے اندر اس کا ایک ایک رواں بھی اس تقدیر کے دائرہ میں مقدر ہے ۔ ہر چیز کو اللہ تخلیق عطا کرتا ہے ۔ اسے اس کا مقصد تخلیق دیتا ہے اور پھر وہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنا فریضہ ادا کر رہی ہے یا نہیں ۔

یہ تقدیر ہر آنے والے پودے اور گرنے والے پتے کا پیچھا کرتی ہے ۔ زمین کی تاریکیوں میں دور کہیں کوئی دانہ پڑا ہے تو وہ بھی مقدر ہے ۔ خشک و یابس ' سمندر اور ان کی مچھلیاں ' کیڑے اور ان کے سوراخ ' حشرات اور ان کے ٹھکانے یہ تمام جانور ان کے مقامات رہائش غاروں میں ' گھونسلوں میں ' ہر انڈا اور ہر بچہ اور ہر پر اور ہر پر کا ایک ایک ریشہ اور ہر جسم کا ہر خلیہ مقدر ہے ۔

اور صاحب تدبیر کسی ایک ہی کے اندر مصروف نہیں ہوتا اور نہ ایک کی تدبیر دوسرے سے غافل کر لیتی ہے ۔ وہ بیک وقت سب کا مدبر ہے اور ان ہی حالات میں زمین کے معاملات جس میں جن و انس بھی ہیں کہ ہر وقت اس کی تم پر نظر ہے اور یہ بہت بڑی نعمت ہے ۔ تقدیر بھی ایک نعمت ہے ۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵ : ۳۲) "پس اے جن و انس تم اپنے رب کے کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"

فنا کے بعد بقا اور تمام مخلوقات کا واحد باقی کی طرف رخ کرنا ' تمام انسانوں کے معاملات کا اس کے نظام قضا و قدر کے اندر منضبط ہونے کے مسائل طے کرنے کے ساتھ ہی اس کائنات کی نعمتوں کا بیان ختم ہوتا ہے اور جن و انس کے سامنے اللہ کے انعامات و احسانات رکھنے اور گنوانے اور ثابت کرنے کے بعد اب ان کو ایک شدید دھمکی دی جاتی ہے ۔ یہ نہایت ہی ہولناک اور خوفناک دھمکی اور ڈراوا ہے ۔ یہ خوفناک دھمکی بطور تمہید دی گئی ۔ اس کے بعد قیامت کے جو مناظر آ رہے ہیں وہ بہت زیادہ ہولناک ہیں ۔

سَنَفْرُغُ لَکُمْ اَیُّهَ الثَّقَلٰنِ (۳۱) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۳۲) یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (۳۳) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۳۴) یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ (۳۵) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵ : ۳۶) (۵۵ : ۳۱ تا ۳۶) "اے زمین کے بوجھو ' عنقریب ہم تم سے باز پرس

کرنے کے لئے فارغ ہوئے جاتے ہیں ۔ (پھر دیکھ لیں گے کہ) تم اپنے رب کے کن کن احسانات کو جھٹلاتے ہو ۔ اے گروہ جن و انس اگر تم زمین اور آسمانوں کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو ۔ نہیں بھاگ سکتے ۔ اس کے لئے بڑا زور چاہئے ۔ اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو تم جھٹلاؤ گے ؟ (بھاگنے کی کوشش کرو گے تو) تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا جس کا تم مقابلہ نہ کر سکو گے ۔ اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کا انکار کرو گے ؟"

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ (۵۵ : ۳۱) (اے زمین کے بوجھو، عنقریب ہم تم سے باز پرس کرنے کے لئے فارغ ہو جائیں گے) یہ کس قدر ہولناک دھمکی ہے ! کوئی انس اور جن اس کے مقابلے میں کیا ٹھہرے گا ۔ اس دھمکی کے مقابلے میں تو پہاڑ اور چٹانیں بھی نہیں ٹھہر سکتیں ۔ نہ ستارے اور افلاک ٹھہر سکتے ہیں !

اللہ جل جلالہ، القوی القادر، القہار والجبار، بزرگ و برتر، دھمکی دے رہا ہے کہ میں تم سے حساب و کتاب لینے والا ہوں اور یہ کس کو انسان اور جن جیسی ضعیف و ناتواں مخلوق کو اور دھمکی نہایت ہی غضب اور انتقام کے انداز میں ہے ۔

یہ ایک بہت بڑا معاملہ ہے ۔ یہ تصور اور احتمالات سے بھی زیادہ خوفناک ہے اور اللہ تعالیٰ تم سے مشغول نہیں ۔ انسانی محاورے میں بات ہو رہی ہے ۔ اس دھمکی کو اس طرح مزید خوفناک بنا دیا گیا ہے ۔ صرف تصور ہی سے وجود نابود ہو جاتا ہے کیونکہ انسانی وجود تو اس ہی کلمہ سے پردۂ عدم سے وجود میں آیا کن فیکون ہو گیا اور ہلاک و برباد اور نیست و نابود کرنا تو پلک جھپکنے سے بھی کم وقت لگتا ہے ۔ اگر احساس ہو تو جن و انس کی حالت کیا ہو گی ۔ جب ذوالجلال والاکرام ان کو یہ دھمکی دے رہا ہے غضب و انتقام کی دھمکی !

اس ہولناک دھمکی میں بھی سوال وہی ہے ۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵ : ۳۲) (پس اے جن و انس تم اپنے رب کے کن کن احسانات کا انکار کرو گے ؟)

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (۵۵ : ۳۳) (اے گروہ جن و انس، اگر تم زمین اور آسمان کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو، نہیں بھاگ سکتے ۔ اس لئے کہ اس کے لئے بڑا زور چاہئے) کس طرح تم نکل سکتے ہو؟ کہاں سے تم بھاگ سکتے ہو؟ اس کے لئے تو بڑی قوت چاہئے اور قوت اللہ کے پاس ہے اور پھر وہی سوال ۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵ : ۳۴) "پس اے جن و انس تم اپنے رب کے کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے "

آخر ان کے پاس کیا چیز رہ گئی ہے کہ وہ جھٹلائیں ! محض زبانی کلامی بات سے کیا بنتا ہے ؟

لیکن تابڑ توڑ حملہ جاری ہے ۔ مزید دھمکی آ رہی ہے اور تباہی والا انجام ان کے سامنے ہے ۔

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ (۵۵:۳۵) ”تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا جس کا تم مقابلہ نہ کر سکو گے“ اگر تم نے نکلنے کی کوشش کی بھی تو تمہاری کوشش ناکام ہوگی۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۵:۳۶) ”پس اے جن و انس تم اپنے رب کے کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔“ یہ خوف و ہراس کا وہ منظر ہے جس کا تصور انسان کر ہی نہیں سکتا۔ ہر مخلوق کے لئے یہ ناقابل برداشت ہے۔ خوف و ہراس کی ایسی چند ہی مثالیں ہیں جو صرف قرآن نے دی ہیں۔ یہ انسانی تصور سے بالا ہیں۔ اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم۔

قرآن نے ایک جگہ کہا۔ فَذَرْنِیْ وَ الْمُكَذِّبِیْنَ اُولِی النَّعْمَةِ (چھوڑ دو مجھے اور ان کھاتے پیتے جھٹلانے والوں کو) دوسری جگہ ذَرْنِیْ وَ مَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ”چھوڑ دو مجھے اور جسے میں نے اکیلا پیدا کیا تھا“ اور یہ آیت۔

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَیُّهَ الثَّقَلٰنِ (۵۵:۳۱) ”اے جن و انس، تم زمین کا بوجھ بن چکے ہو، ذرا مجھے فارغ ہو لینے دو“ اس قسم کی خوفناک دھمکیاں انسانی تصور سے بالا ہیں۔

اب یہاں سے سورۃ کے آخر تک قیامت کے مناظر ہیں کہ قیامت سے پہلے اس کائناتی نظام میں کیا کیا انقلاب آ جائے گا۔ پھر حساب و کتاب کس طرح ہوگا اور پھر جزاء و سزا کیسی ہوگی۔

ان مناظر کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس سورۃ کے آغاز کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہیں اور ان باتوں سے جو کائنات کے بارے میں اس سورۃ میں کی گئی ہیں۔

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾ فَبِاَیِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾ فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾ فَبِاَیِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾ یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَ
الْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُكَذِّبُ بِهَا ۲
الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَ بَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾ ۲۰ع

۱۲ ”پھر (کیا بنے گا اس وقت) جب آسمان پھٹے گا اور اے جن و انس (اس وقت) تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟ اسی روز کسی انسان اور کسی جن سے اس کا گناہ پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی، پھر (دیکھ لیا جائے گا کہ) تم دونوں گروہ اپنے رب کے کن کن احسانات کا انکار کرتے ہو۔ مجرم وہاں اپنے چہروں سے پہچان لئے جائیں گے اور انہیں پیشانی کے بال اور پاؤں پکڑ پکڑ کر گھسیٹا جائے گا۔ اس وقت تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے۔ اس وقت کہا جائے گا یہ وہی جہنم ہے جس کو مجرمین جھوٹ قرار دیا کرتے تھے۔ اسی جہنم اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان وہ گردش کرتے رہیں

گے ۔ پھر اپنے رب کے کن کن قدرتوں کو تم جھٹلاؤ گے ؟"

وَرْدَةً یعنی سرخ تیل کی طرح یعنی بہہ جائے گا۔ قیامت کے دن سے قبل کائنات میں ہونے والے تغیر کے بارے میں جس قدر آیات آئی ہیں ان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ افلاک کے موجودہ نظام میں مکمل ابتری آجائے گی اور نظام سماوات پر تمام کرے موجودہ نظام کی گرفت سے چھوٹ جائیں گے جیسا کہ اس آیت میں ہے اور مثلاً ۔

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا (٤) وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (٥) فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْبَثًّا

(٦) (٥٦ : ٤ تا ٦) (زمین اس وقت یکبارگی ہلا ڈالی جائے گی اور پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے کہ پراگندہ غبار رہ جائیں گے) اور انہی آیات میں سے یہ بھی ہے ۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ (٧) وَ خَسَفَ الْقَمَرُ (٨) وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ (٩)

(٧٥ : ٧ تا ٩) (پھر جب دیدے پتھرا جائیں گے اور چاند بے نور ہو جائے گا اور چاند اور سورج ملا کر ایک کر دیئے جائیں گے) اور انہی میں سے ۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (١) وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ (٢) وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (٣) وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (٤) وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (٥) وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (٦) وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (٧) وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ (٨)

(٨١ : ١ تا ٨) "جب سورج لپیٹ لیا جائے گا' جب تارے بکھر جائیں گے اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے اور جب دس مہینے کی حاملہ اونٹنیاں اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گی اور جب جنگلی جانور سمیٹ کر اکٹھے کر دیئے جائیں گے اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے" اور اسی طرح ہے ۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (١) وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (٢) وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ (٣)

(٨٢ : ١ تا ٣) "جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب تارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے ۔"

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (١) وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (٢) وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ (٣) وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ (٤) وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (٥) (٨٤ : ١ تا ٥) (جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے گا اور اس کے لئے حق یہی ہے اور جب زمین پھیلا دی جائے گی اور

جو کچھ اس کے اندر ہے اسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی ) یہ اور دوسری سب آیات اس عظیم حادثے کی طرف اشارہ کر رہی ہیں جو اس کائنات میں واقع ہو گا اور اس کی حقیقت صرف اللہ ہی جانتا ہے اور اس آیت کی مراد بھی یہی ہے ۔

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (۵۵:۳۷) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا

تُكَذِّبٰنِ (۵۵:۳۸) "پھر جب آسمان پھٹے گا اور سرخ ہو گا اور تیل کی طرح بہہ نکلے گا تو اے جن وانس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"۔

---ooo---

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ (۳۹) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ

(۴۰) (۵۵: ۳۹ — ۴۰) "اس روز کسی انسان اور کسی جن سے اس کا گناہ پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی' پھر (دیکھ لیا جائے گا کہ) تم دونوں گروہ اپنے رب کے کن کن احسانات کا انکار کرتے ہو۔"

قیامت کے مقامات میں سے یہ بھی ایک مقام ہو گا اور اس میں مختلف مقامات ہوں گے ۔ بعض جگہ بندوں سے ان کے کام کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی ۔ بعض مقامات میں کسی سے کوئی پوچھ گچھ نہ ہوگی ۔ بعض جگہ مجرم اپنے بارے میں جھگڑ رہے ہوں گے اور اپنے کرتوتوں کی ذمہ داری شرکاء پر ڈالیں گے ۔ بعض مقامات ایسے ہوں گے کہ وہاں بولنے کی کوئی اجازت نہ ہوگی ۔ نہ جھگڑنے کی اجازت ہوگی ۔ قیامت کا دن طویل ہو گا اور اس میں طرح طرح کے موقف ہوں گے ۔

ایک موقف یہ ہو گا کہ اس میں کسی سے کچھ بات نہ پوچھی جائے گی جبکہ لوگوں کی صفات اور اعمال بالکل واضح ہوں گے اور ان کے چہرے سیاہ ہوں گے اور طے ہو گا کہ جہنمی ہے اور بعض کے چہرے سفید ہوں گے اور طے ہو گا کہ گرین چینل والا ہے اور یہ صفات ان کے چہروں اور حالات سے عیاں ہوں گی ۔ کیا اس وقف کا کوئی انکار کر سکتا ہے ۔

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ (۴۱) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ

رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۴۲) (۵۵: ۴۱ — ۴۲) "مجرم وہاں اپنے چہروں سے پہچان لئے جائیں گے اور انہیں پیشانی کے بال اور پاؤں پکڑ پکڑ کر گھسیٹا جائے گا ۔ اس وقت تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے"۔

یہ ایک سخت منظر ہے اور توہین آمیز بھی کہ جب ماتھوں اور پیشانی کے بالوں سے اور پاؤں سے پکڑ کر کھینچے جائیں گے یعنی ماتھے اور پاؤں اکٹھے ہوں گے اور اس حالت میں جہنم رسید ۔ کیا ایسے حالات میں تکذیب ہوگی ۔

یہ منظر پیش نظر ہے ۔ لوگوں کو پاؤں اور سر کے بالوں سے پکڑ پکڑ کر جہنم میں پھینکا جا رہا ہے اور جو لوگ اس منظر کو دیکھ رہے ہیں وہ بھی گویا جہنم کے کنارے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں ۔ ان سے بھی کہا جاتا ہے ۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ (۵۵ : ۴۲) ”اس وقت کہا جائے گا یہ وہی جہنم ہے جس کو مجرمین جھوٹ قرار دیا کرتے تھے۔“ یہ ہے تمہاری نظروں کے سامنے ' تم دیکھ رہے ہو۔

يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ (۵۵ : ۴۴) ”اسی جہنم اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان وہ گردش کرتے رہیں گے۔“ اب یہ مجرم جہنم اور انتہائی کھولتے گرم پانی کے درمیان گردش کر رہے ہیں دیکھ لو ان کو۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۵ : ۴۵) ”پھر اپنے رب کے کن کن قدرتوں کو تم جھٹلاؤ گے؟“
یہ تو تھی صورت عذاب جہنم کی اور اب ذرا جنتیوں کا ذکر بھی ہو جائے۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾ ذَوَاتَآ
اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ﴿۵۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾ فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾
مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۢ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ۭ وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِاَيِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾ فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ
لَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾ فَبِاَيِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾

”اور ہر اس شخص کے لئے جو اپنے رب کے حضور پیش ہونے کا خوف رکھتا ہو' دو باغ ہیں ' اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ہری بھری ڈالیوں سے بھرپور' اپنے رب کے کن کن انعامات کو جھٹلاؤ گے؟ دونوں باغوں میں دو چشمے رواں' اپنے رب کے کن کن انعامات کو جھٹلاؤ گے؟ دونوں باغوں میں ہر پھل کی دو قسمیں ' اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ جنتی لوگ ایسے فرشوں پر تکیے لگا کے بیٹھیں گے جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے اور باغوں کی ڈالیں پھلوں سے جھکی پڑ رہی ہوں گی۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ان نعمتوں کے درمیان شرمیلی نگاہوں والیاں ہوں گی جنہیں ان جنتیوں سے پہلے کبھی کسی انسان یا جن نے نہ چھوا ہو گا۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ایسی خوبصورت جیسے ہیرے اور موتی' اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟“

قرآن کی جس قدر سورتیں اب تک گزری ہیں ان میں پہلی بار دو باغوں کا ذکر ہے اور یہ دو باغ بھی جنت کے اندر ہی ہوں گے جو بہت ہی وسیع اور بڑی جگہ ہو گی لیکن یہاں دو باغوں کا خصوصی ذکر محض ان کے عالیشان ہونے کے ناطے سے

ہے ۔ سورۃ واقعہ میں یہ بات آنے والی ہے کہ اہل جنت کے دو فریق ہوں گے ۔ پہلے السابقون المقربون ہوں گے اور اصحاب الیمین ہوں گے ۔ دونوں فریقوں کے لئے نعمتیں ہوں گی ۔ یہ دو باغ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو اعلیٰ مرتبے کے لوگوں کے لئے ہوں گے اور یہ وہی لوگ ہیں جن کو السابقون الاولون کہا گیا ہے اور ان دو باغات سے کم درجے کے بھی دو اور باغ ہوں گے اور یہ باغ شاید السابقون اولون کے بعد کے لوگوں کے لئے ہوں گے اور یہ شاید اصحاب الیمین میں سے ہوں گے ۔ بہرحال ہمیں ان دو باغوں کی طرف دیکھنا چاہئے اور ان میں کچھ دیر کے لئے رہنا چاہئے ۔

---()()()---

ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ(٤٨)فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ(٤٩)فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ(٥٠)فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ(٥١) فِیْهِمَا مِنْ کُلِّ فَاکِهَةٍ زَوْجٰنِ(٥٢)فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ(٥٣)مُتَّکِئِیْنَ عَلٰی فُرُشٍ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ(٥٤)فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ(٥٥)(٥٥:٤٨ تا ٥٥)

"ہری بھری ڈالیوں سے بھرپور' اپنے رب کے کن کن انعامات کو جھٹلاؤ گے ؟ دونوں باغوں میں دو چشمے رواں ' اپنے رب کے کن کن انعامات کو جھٹلاؤ گے ؟ دونوں باغوں میں ہر پھل کی دو قسمیں ' اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے ؟ جنتی لوگ ایسے فرشوں پر تکئے لگا کے بیٹھیں گے جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے اور باغوں کی ڈالیں پھلوں سے جھکی پڑ رہی ہوں گی ۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے ؟"

ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ(٥٥:٤٨) (ہری بھری ڈالیوں سے بھرپور) افنان 'افنان' چھوٹی ڈالیاں 'تازہ' نرم اور سرسبز و شاداب 'عینٰن تجریٰن (دو باغوں میں دو چشمے رواں) پانی بہت زیادہ اور بڑی سہولت سے لیا جا سکتا ہے ۔

فِیْهِمَا مِنْ کُلِّ فَاکِهَةٍ زَوْجٰنِ(٥٥:٥٢) (دونوں باغوں میں ہر پھل کی دو قسمیں) یعنی متنوع اور ہر قسم کے پھل ' وافر مقدار میں ۔ اہل جنت کس حال میں ہوں گے ۔

مُتَّکِئِیْنَ عَلٰی فُرُشٍ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ (٥٥:٥٤) "جنتی لوگ ایسے فرشوں پر تکئے لگائے بیٹھے ہوں گے جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے" استبرق ریشمی مخمل جو دبیز ہو گا ۔ اگر ان کے استر ایسے ہوں گے تو ان کے ظاہری غلاف تو نہایت ہی خوبصورت ہوں گے ۔

وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ(٥٥:٥٤) "اور باغوں کی ڈالیں پھلوں سے جھکی پڑ رہی ہوں گی" یعنی اگر کوئی پھل توڑنا چاہے تو اسے کسی مشقت کا سامنا کرنا نہ ہو گا ۔

لیکن انہی باتوں پر جنت کی نعمتیں ختم نہیں ہوتیں بلکہ اس سے بھی لطیف تر انعامات ہوں گے :

فِيهِنَّ قَٰصِرَٰتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ (٥٦) فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (٥٧) كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ (٥٨) فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (٥٩) (٥٥: ٥٦ تا ٥٩) "ان نعمتوں کے درمیان شرمیلی نگاہوں والیاں ہوں گی جنہیں ان جنتیوں سے پہلے کبھی کسی انسان یا جن نے نہ چھوا ہوگا۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ایسی خوبصورت جیسے ہیرے اور موتی، اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟"

قَٰصِرَٰتُ الطَّرْفِ (٥٥: ٥٦) "شرمیلی نگاہوں والیاں" پاکیزہ شعور رکھنے والیاں ہوں گی۔ ان کی نظریں جھکی ہوں گی اور وہ اپنے مالکوں کے سوا کسی اور کی طرف دیکھنے والیاں نہ ہوں گی۔

لَمْ يَطْمِثْهُنَّ (٥٥: ٥٦) "ان کو چھوا نہ ہوگا" نہ انسان نے نہ جن نے۔

كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ (٥٥: ٥٨) "ہیرے اور موتی کی طرح خوبصورت" چمکدار اور نرم و نازک۔

یہ ہے جزاء ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب کے مقام اور مرتبے سے ڈرتے تھے اور جنہوں نے اس کی عبادت اس طرح کی جیسا کہ گویا رب کو دیکھ رہے ہوں اور اس شعور کے ساتھ کہ وہ انہیں دیکھ رہا ہے۔ یوں وہ مرتبہ احسان تک پہنچ گئے جس طرح رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسی طرح وہ اپنی جزا از جانب رحمان پا گئے۔

هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَٰنِ إِلَّا الْإِحْسَٰنُ ﴿٦٠﴾ فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٦١﴾ وَمِن دُونِهِمَا جَنَّتَانِ ﴿٦٢﴾ فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٦٣﴾ مُدْهَآمَّتَانِ ﴿٦٤﴾ فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٦٥﴾ فِيهِمَا عَيْنَانِ نَضَّاخَتَانِ ﴿٦٦﴾ فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٦٧﴾ فِيهِمَا فَٰكِهَةٌ وَنَخْلٌ وَرُمَّانٌ ﴿٦٨﴾ فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٦٩﴾ فِيهِنَّ خَيْرَٰتٌ حِسَانٌ ﴿٧٠﴾ فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٧١﴾ حُورٌ مَّقْصُورَٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴿٧٢﴾ فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٧٣﴾ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿٧٤﴾ فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٧٥﴾ مُتَّكِـِٔينَ عَلَىٰ رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿٧٦﴾

۲

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝ ۲۲ ع

۱۳

"نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ پھر اے جن و انس اپنے رب کے کن کن اوصاف حمیدہ کا تم انکار کرو گے؟ اور ان دو باغوں کے علاوہ دو باغ اور ہوں گے۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ گھنے سرسبز و شاداب باغ۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ دونوں باغوں میں دو چشمے فواروں کی طرح ابلتے ہوئے' اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ان میں بکثرت پھل اور کھجوریں اور انار' اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ان نعمتوں کے درمیان خوب سیرت اور خوبصورت بیویاں' اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ خیموں میں ٹھہرائی ہوئی حوریں' اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ان جنتیوں سے پہلے کبھی کسی انسان یا جن نے ان کو نہ چھوا ہو گا۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ وہ جنتی سبز قالینوں اور نفیس و نادر فرشوں پر تکئے لگا کے بیٹھیں گے' اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟"

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (۵۵ : ۶۰) "نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے" انعام اور احسان کی اس نمائش گاہ کے ہر فقرے کے بعد یہ تعقیب آتی تھی "اے جن و انس اللہ کے کن کن احسانات کا تم انکار کرو گے" یہ احسان کا بدلہ احسان سے تھا۔

اب دوسرا فریق جس کو دو باغ ملیں گے۔

وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ (۵۵ : ۶۲) "اور ان دو باغوں کے علاوہ دو باغ اور ہوں گے" اور ان کے اوصاف سابقہ باغوں سے ذرا کم ہوں گے۔ یہ دو باغ۔

مُدْهَآمَّتٰنِ (۵۵ : ۶۴) "گھنے' سرسبز اور شاداب باغ" یعنی ایسے سبز جو سیاہی مائل ہوں گے کیونکہ وہ گھنے ہوں گے۔

فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ (۵۵ : ۶۶) "ان میں دو چشمے فواروں کی طرح ابلتے ہوں گے" یعنی پانی کو اوپر کی طرف پھینک رہے ہوں گے۔ چشمے سے پانی ابلنا جاری پانی سے ذرا کم درجے کا ہوتا ہے۔

فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ (۵۵ : ۶۸) "ان میں بکثرت پھل اور کھجوریں اور انار ہوں گے" اور مزید

فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ (۵۵ : ۵۲) "ہر پھل کا جوڑا ہو گا" جس طرح پہلے کہا گیا۔

فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ (۵۵ : ۷۰) "ان میں خوب سیرت اور خوبصورت پریاں ہوں گی"۔

خیرت اور خیّرات دونوں سے مراد اچھی سیرت ہے۔

حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ (۵۵ : ۷۲) "خیموں میں ٹھہرائی ہوئی حوریں ہوں گی ۔" خیموں میں رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بدوی لوگوں کو ان کے ذوق بداوت کے مطابق سوغتیں ہوں گی ۔ مقصورات کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ شرمیلی اور نظریں جھکانے والیاں ہوں گی یا وہاں ٹھہرائی ہوئی ہوں گی ۔

لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ (۵۵ : ۷۴) "ان جنتیوں سے پہلے بھی کسی انسان یا جن نے ان کو نہ چھوا ہو گا ۔"

اور ان جنتوں کے لوگ تو ان کے حالات یوں ہوں گے ۔

مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ (۵۵ : ۷۶) "وہ جنتی سبز قالینوں اور نفیس اور نادر فرشوں پر تکئے لگائے بیٹھیں گے ۔"

رفرف فرش عبقری عبقر کے بنے ہوئے ' مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو خصوصاً عربوں کے قریب الفہم کرنے کے لئے ۔ عبقر جنوں کی وادی کو کہتے ہیں اور ہر عجیب چیز کو وہ عبقری کہتے تھے لیکن پہلے باغ والوں کے تکیوں کا استر استبرق کے بنے ہوئے تھے ۔ لہذا پہلے دو باغوں والوں دوسرے دو باغوں والوں کے رتبے میں فرق ہو گا اور ان تمام صفات و کمالات کے بعد یہ فقرے "اے انس و جن تم اپنے رب کے کن کن انعامات کو جھٹلاؤ گے ؟"

---ooo---

اس کائنات میں اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ اور مخلوقات میں اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ اور آخرت میں اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ اس سورۃ کا موضوع تھا ۔ اب اس کے آخر میں آخری سبق اور آخری نتیجہ کہ اللہ کی تسبیح کرو ' اللہ کی برکتوں کا اعتراف کرو کہ وہی ہے جو ہر زندہ کو موت دیتا ہے اور وہی اکیلا قائم رہے گا ۔

تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (۵۵ : ۷۸) "بڑی برکت والا ہے تیرے رب جلیل وکریم کا نام ۔"

سورۃ رحمٰن کا یہ بہترین خاتمہ ہے ۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ـــ ۲۷

## سورۃ الواقعة ـ ۵٦

## ۱ ـــ تا ـــ ۹٦

# سورۃ الواقعہ ایک نظر میں

واقعہ سورۃ کا نام بھی ہے اور اس سورۃ کا موضوع بھی ہے ۔ اس مکی سورۃ کا مرکزی مضمون اور محور ہی بعث بعد الموت ہے ۔ قرآن کی تکذیب کرنے والے اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے اس میں شک کرتے ہوئے یہ کہتے تھے ۔

أَءِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا ءَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ (٥٦ : ٤٧) أَوَآبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ (٥٦ : ٤٨) ''کیا جب ہم مرگئے اور مٹی ہوگئے اور ہڈیاں ہوگئے کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور ہمارے پہلے اباء بھی ۔''

یہی وجہ ہے کہ سورۃ کا آغاز ہی صفت قیامت سے ہوتا ہے اور اس کی صفت ایسے لفظ سے بیان کی گئی ہے جو ہر قسم کی بات کو ختم کر دیتا ہے اور ہر قسم کے شک کو ختم کر دیتا ہے اور اس کے اندر مستحکم یقین پیدا کر دیتا ہے ۔ قرآن اسے (الواقعہ) کہتا ہے ۔

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (٥٦ : ١) لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ (٥٦ : ٢) ''جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آئے گا تو کوئی اس کے وقوع کو جھٹلانے والا نہ ہوگا''

پھر اس دن کے واقعات ایسے بیان کئے جاتے ہیں جو اسے تمام دوسرے دنوں سے ممتاز کر دیتے ہیں ۔ جہاں لوگوں کی قدریں بدل جائیں گی ۔ حالات زمین بدل جائیں گے اور ہولناکیاں اس زمین کی شکل ہی بدل دیں گی ۔ جس طرح قدریں بدل جائیں گی اسی طرح زمین بھی بدل جائے گی ۔

خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (٥٦ : ٣) إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا (٥٦ : ٤) وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (٥٦ : ٥) فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْبَثًّا (٥٦ : ٦) وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً (٥٦ : ٧) ''وہ تہ و بالا کر دینے والی آفت ہوگی ۔ زمین اس وقت یکبارگی ہلا ماری جائے گی اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے ۔ تم لوگ اس وقت تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے ۔''

اس کے بعد ان تین گروہوں کی تفصیلات ہیں یعنی السابقون الاولون 'اصحاب المیمنہ اور اصحاب المشئمہ ۔ اور ان تینوں کا جو انجام ہو گا وہ بڑی تفصیل سے دیا گیا ہے ۔ احساس میں یہ بات اس طرح بیٹھ جاتی ہے کہ گویا یہ واقعہ ہو گیا ہے ۔ اس میں اب شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور یہ ہیں اس واقعہ کی تفصیلات جو تمہارے سامنے بیان ہو رہی ہیں ۔

مکذبین جس چیز کی تکذیب کر رہے تھے اسے انہوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا اور اپنا انجام بھی اور اہل ایمان کا انجام

وہاں عذاب الیم کی تفصیلات دینے کے بعد ان کے بارے میں یہ اعلان ہو گا۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ(٤٥)وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ(٤٦)وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ اَىِٕذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ(٤٧)اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ(٤٨) (٥٦: ٤٥ تا ٤٨) "یہ وہ لوگ ہوں گے جو اس انجام کو پہنچنے سے پہلے خوشحال تھے اور گناہ عظیم پر اصرار کرتے تھے۔ کہتے تھے "کیا جب ہم مرکر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائے گا تو پھر اٹھا کھڑے کئے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے جو پہلے گزر چکے ہیں۔" اس وقت تو عذاب حاضر ہو گا اور یہ دنیا قصہ پارینہ ہوگی۔ وہاں ان کی یہ تلخ یادیں ان کو زیادہ ذلیل کرنے کے لئے یاد کرائی جائیں گی اور یہ بتایا جائے گا کہ تم نے دنیا میں یہ ذلت اختیار کر رکھی تھی کہ تم محض خوشحالی کی وجہ سے تکذیب پر اصرار کر رہے تھے۔

اس کے ساتھ ہی سورۃ کا پہلا دور ختم ہوتا ہے اور دوسرا دور اسلامی نظریہ حیات کے متعلق ہے اور اس میں زیادہ زور عقیدہ حشر و نشر پر ہے کیونکہ اس سورۃ کا اصل موضوع ہی قیامت ہے۔ یہ دوسرا موضوع نہایت ہی موثر انداز میں ہے اور اس دوسرے دور کا مواد بھی ایسی چیزوں سے لیا گیا ہے جو لوگوں کے زیر مشاہدہ تھیں۔ ایسے مشاہدات اور تجربات جن سے ہر انسان گزرتا ہے۔ چاہے وہ جس سوسائٹی اور جس سطح کا ہے اور علمی اعتبار سے اس کا جو درجہ بھی ہے' مثلاً ان کی پیدائش کا نظام ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ منی کے ایک ایسے قطرے کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں جو رحم مادر میں گرتا ہے پھر ان کی موت اور ان کی جگہ دوسروں کی پیدائش اور اس سے یہ استدلال کہ اسی طرح تمہیں دوسری بار پیدا کیا جائے گا اور یہ دوسری پیدائش بھی اسی طرح ہوگی جس طرح پہلی پیدائش ہوتی ہے۔

پھر ان کے مشاہدے کے لئے کھیتی باڑی کے مشاہدات پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ بھی زندگی کی ایک تصویر ہے اور نباتات کی تخلیق' اللہ کی قدرتوں میں سے ایک اہم نمونہ ہے۔ اگر اللہ نہ چاہتا تو نہ یہ نباتات پیدا ہوتے اور نہ ان کے اندر دانے پیدا ہوتے۔

پھر وہ میٹھا پانی جس کے ذریعے پوری زندگی انسانوں' حیوانوں اور نباتات کی پروان چڑھتی ہے۔ یہ پانی اللہ کے حکم اور اللہ کی قدرت پر موقوف ہے۔ اگر اللہ نہ چاہے تو بادلوں سے یہ پانی برسے ہی نہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو اسے کھاری بنا دیتا' نہ اس سے نباتات اگتے اور نہ یہ زندگی کے لئے مفید ہوتا۔

پھر ذرا آگ کو دیکھو' جسے تم جلاتے ہو' اس کی ذرا اصلیت پر نگاہ ڈالو۔ یہ درختوں کے ذریعے جلتی ہے اور اس آگ کو دیکھ لو یہی ہے نمونہ نار جہنم۔

یہ تمام مشاہدات انسانوں کے روز مرہ مشاہدات ہیں لیکن انسان ان پر غور نہیں کرتا۔ قرآن کریم ان کے بارے میں انسان کے احساسات جگاتا ہے۔

اس دور میں مسئلہ قرآن اور کلام الٰہی بھی زیر بحث لایا جاتا ہے۔ جو اس واقعہ کا بیان کر رہا ہے اور ڈرا رہا ہے۔

چنانچہ مقامات ستارہ گان کی قسم کھا کر کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم ایک عظیم امر ہے ' یہ ایک نہایت بلند پایہ کتاب ہے اور اس کو وہی لوگ چھو سکتے ہیں جو پاک ہوں اور یہ رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ کتاب ہے ۔

اس کے بعد ایک نہایت ہی حساس مشاہدہ ان کے سامنے رکھا جاتا ہے ۔ یہ نہایت ہی جذباتی مشاہدہ ہوتا ہے ۔ انسانی روح حلق تک آپہنچتی ہے اور تمہارا کوئی محبوب اس دنیا کے اس کنارے کھڑا ہوتا ہے اور اس کے تمام محبان ہاتھ بندھے ہوئے بے بس اس کے اردگرد کھڑے ہوتے ہیں ۔ کچھ کرنے سے لاچار ہوتے ہیں ۔ ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے ۔ اس کے جسم میں کیا ہو رہا ہے اور تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں ۔ اس کی جان کنی ہوتی ہے اور وہ اگلے سفر کے بارے میں دیکھ رہا ہوتا ہے لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکتا ۔ اشارہ بھی نہیں کر سکتا ۔

سورۃ کا خاتمہ ایک سچی خبر سے ہوتا ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کی تسبیح کرو ۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ (۹۵) فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (۵۶ : ۹۶) "یہ سب کچھ قطعی حق ہے ' پس اے نبی ' اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو ۔" یوں سورۃ کا آغاز اور انجام ایک ہو جاتا ہے ۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۵۵ تشریح آیات

## ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۹۶

آیاتها ۹۶ — سُورَةُ الْوَاقِعَةِ (۵۶) مَكِّيَّةٌ (۴۶) — رکوعاتها ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿١﴾ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ﴿٢﴾ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ﴿٣﴾ إِذَا رُجَّتِ
الْأَرْضُ رَجًّا ﴿٤﴾ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ﴿٥﴾ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنبَثًّا ﴿٦﴾ وَكُنتُمْ أَزْوَاجًا
ثَلَاثَةً ﴿٧﴾ فَأَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ مَا أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ﴿٨﴾ وَأَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ مَا
أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ﴿٩﴾ وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ ﴿١٠﴾ أُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ ﴿١١﴾ فِي جَنَّاتِ
النَّعِيمِ ﴿١٢﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ ﴿١٣﴾ وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ ﴿١٤﴾ عَلَىٰ سُرُرٍ مَّوْضُونَةٍ ﴿١٥﴾
مُّتَّكِئِينَ عَلَيْهَا مُتَقَابِلِينَ ﴿١٦﴾ يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ﴿١٧﴾ بِأَكْوَابٍ وَ
أَبَارِيقَ وَكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ﴿١٨﴾ لَّا يُصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُنزِفُونَ ﴿١٩﴾ وَفَاكِهَةٍ
مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ ﴿٢٠﴾ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ﴿٢١﴾ وَحُورٌ عِينٌ ﴿٢٢﴾ كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ
الْمَكْنُونِ ﴿٢٣﴾ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٢٤﴾ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا ﴿٢٥﴾
إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا ﴿٢٦﴾

”جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا تو کوئی اس کے وقوع کو جھٹلانے والا نہ ہوگا۔ وہ تہ و بالا کر دینے والی آفت ہوگی۔ زمین اس وقت یکبارگی ہلا ڈالی جائے گی اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے۔ تم لوگ اس وقت تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے ' دائیں بازو والے ' سو دائیں بازو والوں (کی خوش

کا کیا کہنا اور بائیں بازو والے 'تو بائیں بازو والوں (کی بد نصیبی) کا کیا ٹھکانا اور آگے والے تو پھر آگے والے ہی ہیں ۔ وہی تو مقرب لوگ ہیں ۔ نعمت بھری جنتوں میں رہیں گے ۔ اگلوں میں سے بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے کم ۔ مرصع تختوں پر تکئے لگائے آمنے سامنے بیٹھیں گے ۔ ان کی مجلسوں میں ابدی لڑکے شراب چشمہ جاری سے لبریز پیالے اور کنٹر اور ساغر لئے دوڑتے پھرتے ہوں گے ۔ نہ ان کو اس سے جدا کیا جائے گا اور نہ وہ ختم ہو گا اور وہ ان کے سامنے طرح طرح کے لذیذ پھل پیش کریں گے کہ جسے چاہیں چن لیں اور پرندوں کے گوشت پیش کریں گے کہ جس پرندے کا چاہیں استعمال کریں اور ان کے لئے خوبصورت آنکھوں والی حوریں ہوں گی 'ایسی حسین جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی ۔ یہ سب کچھ ان اعمال کی جزا کے طور پر انہیں ملے گا جو وہ دنیا میں کرتے رہے تھے ۔ وہاں وہ کوئی بے ہودہ کلام یا گناہ کی بات نہ سنیں گے ۔ جو بات بھی ہو گی ٹھیک ٹھیک ہو گی ۔"

اس پیراگراف میں ایک نہایت ہی اہم بات ایک خوفناک انداز میں بیان کی گئی ہے اور یہ اسلوب ارادۃً اختیار کیا گیا ہے ۔ عبارت کے الفاظ اور مفہوم کے درمیان پوری طرح ہم آہنگی اور یکجہتی ہے ۔ دو بار بات کا آغاز اذا شرطیہ سے ہوتا ہے دونوں بار شرط ہے اور جواب شرط نہیں ہے ۔ مثلاً ۔

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (۱) لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ (۲) خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (۳) (۵٦ : ۱ تا ۳) "جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا تو کوئی اس کے وقوع کو جھٹلانے والا نہ ہو گا' وہ تہہ و بالا کر دینے والی آفت ہو گی ۔" یہاں یہ نہیں بتایا جاتا کہ جب یہ واقعہ ہو گا جو سچا ہو گا اور تہہ و بالا کر دینے والا ہو گا لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ پھر اس وقت کیا ہو گا ۔ ایک دوسری بات شروع کر دی جاتی ہے کہ ۔

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا (٤) وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (٥) فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْبَثًّا (٦) (۵٦ : ٤ تا ٦) "اور جب زمین یکبارگی ہلا ڈالی جائے گی اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے ۔" اور دوبارہ یہ نہیں بتایا جاتا کہ جب یہ ہولناک واقعہ پیش ہو گا تو پھر کیا ہو گا ۔ یہ خوفناک صورتحال ایک مقدمہ ہے ۔ آغاز ہے اور انجام کا ذکر ہی نہیں کیا جاتا کیونکہ نتائج اس قدر ہولناک ہوں گے کہ الفاظ میں اس کا بیان ممکن نہیں ہے ۔

پھر اس واقعہ اور اس بوجھ کا پریشر ہو گا تو انسانی احساس کے اندر ارتعاش اور تزلزل پیدا ہونا متوقع ہو گا اور سیاق کلام میں اس توقع کو عملی شکل عطا کرتا ہے ۔

خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (۵٦ : ۳) "یہ واقعہ تہہ و بالا کرنے والا ہو گا" یہ بعض ان قدروں کو بلند کر دے گا جو دنیا میں گری ہوئی سمجھی جاتی تھیں اور ان کو نیست کر دے گا جو یہاں بلند تھیں کیونکہ یہ زمین تو دار الفناء تھی ۔ جہاں اقدار اور پیمانوں کا اصل حقیقی نظام و مقام کو خلل پذیر ہو جاتا ہے اور پھر اللہ کے پیمانوں کے مطابق وہاں درست ہو گا ۔

اس کے بعد اس زمین کے اندر ایک خوفناک بھونچال ہو گا ۔ زمین کو لوگ زمین مساکن اور رکی ہوئی سمجھتے ہیں یہ زمین

پوری کی پوری ہلا دی جائے گی ۔ اس عظیم واقعہ کو ایسے انداز میں بیان کیا گیا کہ احساسات میں اس کی جو شکل ہے تعبیر بھی ویسی ہے ۔ زمین کی اس بھرپور حرکت کے بعد اب مضبوط اور اونچے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر اڑ رہے ہیں اور یہ ریزے اور ذرے فضائے کائنات میں بکھر رہے ہیں ۔

وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (۵) فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا (۶) (۵۶: ۵ تا ۶) "اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے ۔"

اس خوف کا کیا عالم ہو گا کہ زمین بسلسل ہل رہی ہوگی اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور غبار کے ذرات کی طرح فضائے آسمان میں بکھر جائیں گے ۔ کتنے ہی جاہل ہیں وہ لوگ جو اپنے آپ کو اس خطرے سے دوچار کرتے ہیں ۔ اس طرح کہ وہ آخرت کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں ۔ زمین اور پہاڑوں کا یہ حشر ہو گا تو انسان کیا کر سکیں گے ۔

---ooo---

سورۃ کا آغاز اس خوفناک فضا میں ہوتا ہے ۔ انسانی احساس و شعور پر ڈر چھا جاتا ہے ۔ یہ ہو گا وہ عظیم واقعہ جس کا کافر انکار کرتے ہیں ۔ مشرکین اسے جھٹلاتے ہیں ۔ یہ ہے اس سورۃ کا پہلا منظر جس میں زمین متزلزل، پہاڑ ریزہ ریزہ اور تمام چیزوں کو زیر و زبر کر دیا جائے گا ۔

وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً (۷) فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ (۸) وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ (۹) وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ (۱۰) (۵۶: ۷ تا ۱۰)

"تم لوگ اس وقت تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے ' دائیں بازو والے ' سو دائیں بازو والوں (کی خوش نصیبی) کا کیا کہنا اور بائیں بازو والے ' تو بائیں بازو والوں (کی بدنصیبی) کا کیا ٹھکانا اور آگے والے تو پھر آگے والے ہی ہیں ۔"

قیامت میں لوگوں کے تین گروہ ہوں گے ۔ قرآن مجید کے دوسرے مشاہد میں لوگوں کے دو ہی اقسام اور گروہ بتائے گئے ہیں لیکن یہاں تین درجے بتائے گئے ہیں ۔ پہلے دائیں بازو والے ان کو اصحاب المیمنہ کہا گیا ہے اور ان کے بارے میں محض سوال کر دیا گیا ۔ یہ محض ان کی گرانقدری کے لئے ۔

فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ (۵۶: ۸) "دائیں بازو والے ' کیا عظیم ہیں وہ دائیں بازو والے ۔" اسی انداز میں دوسرے گروہ بائیں بازو والوں کا ذکر ہے اور اس کے بعد تیسرے فریق السابقون کا ذکر ہے اور ان "السابقون کو ان کی صفات سے ذکر کیا جاتا ہے ۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ (۵۶: ۱۰) "آگے والے تو پھر آگے ہی والے ہیں ۔" جس طرح کہا جاتا کہ وہ تو وہ ' فلاں تو فلاں ہیں ' بس ان کا نام لینا ہی ان کے مرتبہ و مقام کا اظہار کر دیتا ہے ۔

اس کے بعد پھر ان کی جی بھر کر تعریف کی جاتی ہے کہ ان کے لئے عالم بالا میں کیا کیا تیاریاں کی گئی ہیں ۔ اگرچہ جنت

کی تیاریوں کا تصور بھی نہیں ہو سکتا لیکن اہل زمین کے تجربے کے مطابق کچھ یوں ہیں۔

أُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ (١١) فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ (١٢) ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ (١٣) وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ (١٤) عَلَىٰ سُرُرٍ مَّوْضُونَةٍ (١٥) مُّتَّكِئِينَ عَلَيْهَا مُتَقَابِلِينَ (١٦) يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ (١٧) بِأَكْوَابٍ وَأَبَارِيقَ وَكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ (١٨) لَّا يُصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُنزِفُونَ (١٩) وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ (٢٠) وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ (٢١) وَحُورٌ عِينٌ (٢٢) كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ (٢٣) جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (٢٤) لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا (٢٥) إِلَّا قِيلًا سَلَامًا

سَلَامًا (٢٦) (٥٦: ١١ تا ٢٦) "وہی تو مقرب لوگ ہیں۔ نعمت بھری جنتوں میں رہیں گے۔ اگلوں میں سے بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے کم۔ مرصع تختوں پر تکیے لگائے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ ان کی مجلسوں میں ابدی لڑکے شراب چشمہ جاری سے لبریز پیالے اور کنٹر اور ساغر لئے دوڑتے پھرتے ہوں گے۔ نہ ان کو اس سے جدا کیا جائے گا اور نہ وہ ختم ہو گا اور وہ ان کے سامنے طرح طرح کے لذیذ پھل پیش کریں گے کہ جسے چاہیں چن لیں اور پرندوں کے گوشت پیش کریں گے کہ جس پرندے کا چاہیں استعمال کریں اور ان کے لئے خوبصورت آنکھوں والی حوریں ہوں گی' ایسی حسین جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔ یہ سب کچھ ان اعمال کی جزا کے طور پر انہیں ملے گا جو وہ دنیا میں کرتے رہے تھے۔ وہاں وہ کوئی بے ہودہ کلام یا گناہ کی بات نہ سنیں گے۔ جو بات بھی ہوگی ٹھیک ٹھیک ہوگی۔"

ان پر جو انعامات الہیہ ہوں گی ان میں سے بڑی نعمت کے ذکر سے آغاز ہوتا ہے جو سب سے زیادہ نمایاں اور بلند ہے۔ رب تعالیٰ کے قرب کی نعمت۔

أُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ (٥٦: ١١) فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ (٥٦: ١٢) "وہی تو مقرب لوگ' نعمت بھری جنتوں میں رہیں گے۔" اور اللہ کا قرب تو وہ اعزاز ہے جس کے مقابلے میں تمام جنتیں ہیچ ہیں۔ یہ تو بہت ہی قیمتی نصیبہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ لوگ ہیں کون۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ (٥٦: ١٣) وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ (٥٦: ١٤) "اگلوں میں سے بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے کم" یہ محدود تعداد کے لوگ ہوں گے۔ نہایت پاک لوگ' اگلوں میں سے یہ زیادہ ہوں گے۔ روایات میں اختلاف ہے کہ یہ لوگ کون ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ وہ ایمان کی طرف پہلے لپکنے والے عالی مقام لوگ ہیں جو

اسلام سے پہلے کی امتوں میں سے کسی نبی کی دعوت پر پہلے آئے اور آخرین وہ ہوں گے جو اسلام کی طرف پہلے لپکے اور جنہوں نے اسلام کی راہ میں آزمائش برداشت کیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اولین اور آخرین امت محمدیہ میں سے ہیں۔ پس اولین صدر اول کے لوگ ہیں اور آخرین بعد کے ادوار میں آنے والے لوگ ہیں۔ اس قول کو علامہ ابن کثیر نے ترجیح دی ہے۔ حسن اور ابن سیرین سے بھی اس کی ترجیح کے سلسلے میں روایات نقل کی ہیں۔ ابو حاتم نے روایت کی ہے 'حسن ابن محمد ابن صباح سے انہوں نے عفان سے انہوں نے عبداللہ ابن بکر المزنی سے 'کہ میں نے سنا کہ حسن جب اس آیت۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ (۱۰) اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ (۵۶ : ۱۱) "اور آگے والے تو پھر آگے والے ہی ہیں وہی تو مقرب لوگ ہیں" تلاوت کی تو انہوں نے کہا کہ سابقون تو اس جہاں سے چلے گئے 'اے اللہ ہمیں اصحاب الیمین سے بنا دے۔ اس کے بعد انہوں نے روایت کی 'اپنے والد سے' انہوں نے ابو الولید سے' انہوں نے السری ابن یحیٰ سے 'کہ حسن نے پڑھا۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ (۱۰) اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ (۱۱) ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ (۵۶ : ۱۳) تو انہوں نے فرمایا زیادہ تر وہ لوگ جو اس دنیا سے چلے گئے ہیں اور روایت کی میرے سامنے میرے والد نے 'عبدالعزیز سے' انہوں نے ابن مغیرہ المنقری سے' انہوں نے ابوہلال سے' انہوں نے محمد ابن سیرین سے کہ انہوں نے آیت۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ (۱۳) وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ (۵۶ : ۱۴) "اگلوں سے بہت اور پچھلوں سے قلیل" وہ کہتے تھے (یا یہ امید رکھتے تھے) کہ وہ سب اس امت سے ہوں گے۔

یہ تفصیلات دینے کے بعد کہ یہ لوگ کون ہوں گے 'اب ان نعمتوں کی تفصیلات دی جا رہی ہیں جو جنتوں میں ان کے لئے تیار ہیں اور اللہ نے ان کو اس شکل میں دیا ہے جس میں یہ سوچ بھی سکیں اور سمجھ بھی سکیں اور لطف اندوز بھی ہو سکیں اور ان نعمتوں کے علاوہ وہاں اور نعمتیں بھی ہوں گی جن کے ادراک اور استعمال کے لئے اس وقت وہ تیار ہوں گے اور وہ ایسی نعمتیں ہیں جو کسی آنکھ نے نہیں دیکھیں' کسی کان نے نہیں سنیں اور کسی انسان کے دل میں ان کا تصور ہی نہیں آیا۔

عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ (۵۶ : ۱۵) "مرصع تختوں پر" جن کے اندر نہایت ہی قیمتی موتی اور دھاتیں لگی ہوں گی۔

مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ (۵۶ : ۱۶) "تکیہ لگائے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔" نہایت آرام سے اور بے فکری سے۔ کوئی غم نہیں' کوئی مشکل نہیں' نعمتوں میں ڈوبے ہوئے نہایت اطمینان سے۔ ان نعمتوں کے چلے جانے اور ختم ہو جانے کا تو کوئی خوف نہیں اور ایک دوسرے کے آمنے سامنے محو گفتگو ہوں گے۔

يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ (۵۶: ۱۷) "ان کی مجلس میں "ابدی لڑکے" دوڑتے پھریں گے ۔" زمانہ ان کی صحت پر اثر انداز نہ ہو گا' ان کی جوانی اور نہ ان کی تروتازگی پر اثر انداز ہو گا جبکہ زمین پر مرور زمانہ کے ساتھ لڑکپن چلا جاتا تھا ۔ اور یہ کیا لئے ہوئے پھریں گے ؟

بِأَكْوَابٍ وَّأَبَارِيقَ وَكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ (۵۶: ۱۸) "شراب چشمہ جاری سے لبریز پیالے اور کنٹر اور ساغر لئے" اور یہ صاف شراب ہوگی ۔

لَّا يُصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُنزِفُونَ (۵۶: ۱۹) "جسے نہ ان سے جدا کیا جائے گا اور نہ وہ ختم ہوگی ۔" یعنی نہ ان کو اس سے جدا کیا جائے گا اور نہ وہ ان کے سامنے ختم ہوگی کیونکہ وہاں تو ہر چیز دوام کے لئے ہے اور کسی چیز کے ختم ہونے کا خطرہ نہیں ہے ۔

وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ (۲۰) وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ (۵۶: ۲۱) "اور وہ ان کے سامنے طرح طرح کے لذیذ پھل پیش کریں گے جسے چاہیں چن لیں اور پرندوں کے گوشت پیش کریں گے جس پرندے کا چاہیں ۔" وہاں تو کوئی چیز نہ ممنوع ہوگی اور نہ کوئی ایسی چیز وہاں ہوگی جسے اہل جنت پسند نہ کریں ۔

وَحُورٌ عِينٌ (۲۲) كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ (۵۶: ۲۳) "اور ان کے لئے خوبصورت آنکھوں والی حوریں ہوں گی' ایسی حسین جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی ۔" چھپے ہوئے موتی جن کو سنبھال کر رکھا جاتا ہے بوجہ قیمتی ہونے کے نہ ان کو چھوا جاتا ہے اور نہ ان پر نظر لگتی ہے ۔ اس لئے نہ کسی ہاتھ نے ان کو استعمال کیا اور نہ آنکھ نے دیکھا اور ان کھلی آنکھوں والی حوروں کی اس تعریف میں حسی اور معنوی اشارات ہیں اور یہ سب انعامات کیوں دیئے جارہے ہیں ۔

جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۵۶: ۲۴) "یہ سب کچھ ان اعمال کی جزا کے طور پر انہیں ملے گا جو دنیا میں کرتے رہے تھے ۔" یہ بدلہ ہے اس عمل کا جو انہوں نے دار العمل میں کیا ۔ ایسا بدلہ جو نہایت ہی پورا ہے ۔ کمال درجے کا ہے اور اس میں وہ تمام کمیاں پوری کر دی گئی ہیں جو دار الفنا میں تھیں اور اس کے بعد وہ نہایت آرام اور سکون سے وہاں رہیں گے ۔ نہایت بلندی اور پاکیزگی میں ۔ کوئی لغو بات وہاں نہ ہوگی ۔ کوئی بدل اور مواخذہ نہ ہو گا ۔

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا (۵۶: ۲۵) "وہاں کوئی بے ہودہ کلام یا گناہ کی بات وہ نہ سنیں گے جو بات بھی ہوگی ٹھیک ٹھیک ہوگی ۔" ان کی پوری زندگی سلامتی ہوگی ۔ ہر طرف سے ان پر سلام کی شبنم آئے گی ۔ سلام ہی سلام ہو گا ۔ اس خوبصورت ماحول میں ملائکہ کی طرف سے سلامت مبارک ہوگی اور پھر رحمان کی طرف سے سلام ہو گا ۔ لہذا پوری فضا سلام ہی سلام ہوگی ۔

اس برگزیدہ فریق کی بات یہاں ختم ہوتی ہے ۔ اس کے بعد اصحاب الیمین ۔

وَ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴿٢٧﴾ فِيْ سِدْرٍ
مَّخْضُوْدٍ ﴿٢٨﴾ وَّ طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿٢٩﴾ وَّ ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴿٣٠﴾ وَّ مَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴿٣١﴾ وَّ فَاكِهَةٍ
كَثِيْرَةٍ ﴿٣٢﴾ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّ لَا مَمْنُوْعَةٍ ﴿٣٣﴾ وَّ فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿٣٤﴾ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ ١
اِنْشَآءً ﴿٣٥﴾ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴿٣٦﴾ عُرُبًا اَتْرَابًا ﴿٣٧﴾ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٣٨﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ ٢٨ ع
الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٩﴾ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿٤٠﴾ وَ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿٤١﴾ ١٤
فِيْ سَمُوْمٍ وَّ حَمِيْمٍ ﴿٤٢﴾ وَّ ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿٤٣﴾ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ﴿٤٤﴾ اِنَّهُمْ
كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَ كَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ﴿٤٦﴾ وَ كَانُوْا
يَقُوْلُوْنَ ۙ اَىِٕذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿٤٧﴾ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿٤٨﴾
قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿٤٩﴾ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿٥٠﴾ ثُمَّ
اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿٥١﴾ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿٥٢﴾ فَمَالِـُٔوْنَ
مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿٥٣﴾ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿٥٤﴾ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿٥٥﴾
هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿٥٦﴾

"اور دائیں بازو والے' دائیں بازو والوں (کی خوش نصیبی) کا کیا کہنا۔ وہ بے خار بیریوں اور تہ بر تہ چڑھے ہوئے کیلوں اور دور تک پھیلی ہوئی چھاؤں اور ہر دم رواں پانی اور کبھی ختم نہ ہونے والے اور بے روک ٹوک ملنے والے بکثرت پھلوں اور اونچی نشست گاہوں میں ہوں گے۔ ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انہیں باکرہ بنا دیں گے' اپنے شوہروں کی عاشق اور عمر میں ہم سن' یہ کچھ دائیں بازو والوں کے لئے ہے۔ وہ اگلوں میں سے بھی بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے بھی بہت۔ اور بائیں بازو والے' بائیں بازو والوں (کی بدنصیبی) کا کیا پوچھنا' وہ لو کی لپٹ اور کھولتے ہوئے پانی اور کالے دھوئیں کے سائے میں ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہو گا نہ آرام دہ۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو اس انجام کو پہنچنے سے پہلے خوشحال تھے اور گناہ عظیم پر اصرار کرتے تھے۔ کہتے تھے "کیا جب ہم مر کر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں گے تو پھر اٹھا کھڑے کئے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے

جو پہلے گزر چکے ہیں؟" اے نبی ' ان لوگوں سے کہو ' یقیناً اگلے اور پچھلے سب ایک دن ضرور جمع کئے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر کیا جا چکا ہے پھر اے گمراہو اور جھٹلانے والو ' تم زقوم کے درخت کی غذا کھانے والے ہو۔ اسی سے تم پیٹ بھرو گے اور اوپر سے کھولتا ہوا پانی تونس لگے ہوئے اونٹ کی طرح پیو گے۔ یہ ہے (ان بائیں بازو والوں ) کی ضیافت کا سامان روز جزا میں"۔

اور دائیں بازو والے وہ ہیں جن کی طرف سورۃ کے آغاز میں اشارہ ہوا تھا۔ میمنہ والے۔ ان کی توضیحات کی تفصیلات ذرا موخر کر دی گئیں کیونکہ پہلے سابقین اولین کی مراعات کا ذکر مطلوب تھا۔ ان کے بارے میں وہی مبالغہ اور اظہار عظمت بذریعہ اجمال ما اصحاب الیمین (کیا ہی لوگ ہیں وہ)

ان لوگوں کے لئے بھی مادی اور محسوس انعامات ' یہ وہ چیزیں ہیں جو کسی بدوی معاشرے میں اہم ہوتی ہیں اور ان کے لئے قابل فہم ہوتی ہیں۔ جن کو وہ سمجھتے اور برتتے ہیں۔

یہ لوگ فی سدر مخضود (بے خار بیریوں میں ہوں گے ) السدر بیری کے درخت کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کانٹے ہوں گے لیکن وہاں اس کو کانٹوں سے صاف کر دیا گیا ہو گا یعنی مخضود ہوں گے وہ درخت۔

وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ( ٥٦ : ٢٩ ) "تہ بر تہ چڑھے ہوئے کیلوں" طلح حجاز کے درختوں میں سے ایک درخت ہے۔[1]

کانٹے دار اور بڑا لیکن یہ درخت یہاں منضود ہے یعنی مرتب ہے یا کھانے کے لئے تیار ہے بغیر مشقت کے کھایا جا سکتا ہے۔

وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ( ٣٠ ) وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ( ٥٦ : ٣١ ) "اور دور تک پھیلی ہوئی چھاؤں اور ہر دم رواں پانی۔" بدوی لوگوں کے لئے یہ اہم سہولیات ہیں۔ ایک دیہاتی کے خواہشات کی دوڑ یہی تھی۔

وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ( ٥٦ : ٣٢ ) لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ( ٥٦ : ٣٣ ) "اور کبھی ختم نہ ہونے والے اور بے روک ٹوک پھل۔" ان کو مجمل چھوڑ دیا گیا اور سابقہ انواع کی طرح متعین نہیں کیا گیا۔ جو اہل بادیہ کے ہاں مرغوب تھیں۔

وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ( ٥٦ : ٣٤ ) "اونچی نشست گاہیں۔" یہاں ان کی نرمی اور ان کی ترتیب کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ یہاں صرف یہ ہے کہ اونچی نشست گاہیں۔

اونچے کے دو معنی ہوتے ہیں ' مادی اور معنوی ' دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم ہیں۔ اونچا مکان ہو تو وہ پاک

---

(1) طلح کے معنی ببول ' کیکر اور کیلا تینوں آتے ہیں۔ مولانا مودودی " کا ترجمہ منضود کے ساتھ زیادہ مناسب ہے جس کے معنی تہ بر تہ اور ترتیب کئے ہوئے ہیں یا ڈھیر کے ہوتے ہیں۔

بھی ہوگا اور وہاں گندگی نہ جمع ہوگی اور معنوی رفعت بھی ناپاکی سے دوری ہے ۔ اونچی نشست گاہوں میں پھر بیٹھا ہوا کون ہے؟ اس لئے یہاں بیویوں کا ذکر ہوتا ہے ۔

اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً (۵۶ : ۳۵) "ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر پیدا کریں گے ۔" اگر ابتداء انہیں پیدا کیا گیا تو وہ حوریں ہیں اور اگر انہیں نئے سرے سے پیدا کیا گیا ہے تو یہ وہ بیویاں ہیں جو دنیا میں تھیں اور اب جوان بنا کر اٹھائی گئی ہیں ۔

فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا (۵۶ : ۳۶) "اور ان کو باکرہ بنا دیں گے ۔" یعنی ان کو کسی انسان نے چھوا تک نہ ہوگا ۔ عربا (شوہروں پر عاشق) شوہروں کے ساتھ محبت کرنے والیاں ۔ اترابا (عمر میں ہم سن) برابر درجے کی ۔ بحساب ماہ و سال اور بحساب شباب اور قوت 'لاصحاب الیمین (یہ کچھ دائیں بازو والوں کے لئے ہے) یعنی یہ تمام چیزیں ان کے لئے مخصوص ہیں تاکہ وہ ان کے اونچے فرشوں کے ساتھ مناسب ہوں اور یہ اصحاب الیمین کون ہیں ۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ (۳۹) وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ (۵۶ : ۴۰) "وہ اگلوں میں سے بھی بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے بھی بہت ہوں گے ۔" ان کی تعداد السابقین للاولین سے زیادہ ہوگی جو مقربین ہوں گے اور یہ اس اعتبار سے جو ہم نے اولین اور آخرین کا بیان کیا ہے ۔

---OOO---

اب یہاں بات اصحاب الشمال تک آجاتی ہے ۔ اس سے پہلے سورۃ کے آغاز میں ان کو اصحاب المشئمۃ کہا گیا ہے ۔

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ (۴۱) فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ (۴۲) وَّ
ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ (۴۳) لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ (۴۴) اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ
(۴۵) وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ (۴۶) وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ اَئِذَا مِتْنَا
وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ (۴۷) اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ (۴۸) قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ
وَالْاٰخِرِيْنَ (۴۹) لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (۵۰) ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا
الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ (۵۱) لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ (۵۲) فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا
الْبُطُوْنَ (۵۳) فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ (۵۴) فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ (۵۵)
هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ (۵۶) (۵۶ : ۴۱ تا ۵۶) "اور بائیں بازو والے ' بائیں بازو والوں (کی

کا کیا پوچھنا' وہ لو کی لپٹ اور کھولتے ہوئے پانی اور کالے دھوئیں کے سائے میں ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہوگا نہ آرام دہ۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو اس انجام کو پہنچنے سے پہلے خوشحال تھے اور گناہ عظیم پر اصرار کرتے تھے۔ کہتے تھے "کیا جب ہم مرکر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں گے تو پھر اٹھا کھڑے کئے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے جو پہلے گزر چکے ہیں؟" اے نبی' ان لوگوں سے کہو' یقیناً اگلے اور پچھلے سب ایک دن ضرور جمع کئے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر کیا جا چکا ہے پھر اے گمراہو اور جھٹلانے والو' تم زقوم کے درخت کی غذا کھانے والے ہو۔ اسی سے تم پیٹ بھرو گے اور اوپر سے کھولتا ہوا پانی تونس لگے ہوئے اونٹ کی طرح پیو گے۔ یہ ہے (ان بائیں بازو والوں) کی ضیافت کا سامان روز جزا میں۔"

وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ (۵۶:۲۷) لمبی چھاؤں میں اور بہتے ہوئے پانیوں کے پاس تھے۔۔ وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ (۴۱) فِيْ سَمُوْمٍ وَّ حَمِيْمٍ (۴۲) وَّ ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ (۴۳) لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ (۴۴) (۵۶:۴۱ تا ۴۴) وہ لو کی لپٹ اور کھولتے ہوئے پانی اور کالے دھوئیں کے سائے میں ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ آرام دہ۔ ہوا ایسی گرم ہوگی جس طرح آگ کے شعلے۔ وہ مساموں میں پہنچ کر جسم کو بھون ڈالے گی اور پانی اس قدر گرم ہوگا کہ وہ ٹھنڈک نہیں پہنچائے گا اور نہ پیاس بجھائیگا سایہ ہوگا مگر وہ دھویں کا سایہ ہوگا جس سے گلا گھٹ جائے گا اور اسے سایہ محض بطور مزاح کہا گیا ہے۔ سایہ نہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ آرام دہ ہوگا۔ یہ تو گرم سایہ ہوگا اس میں آرام اور ٹھنڈک نہ ہوگی۔ وہ اس قدر سخت ہوگا کہ اس سے گلا گھٹ جائے گا۔ آرام تو دور کی بات ہے اور یہ تان جو ہیں ان کے لئے ٹھیک سزا ہے کیونکہ۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ (۵۶:۴۵) "یہ لوگ اس انجام کے پہنچنے سے پہلے سخت خوشحال تھے۔" مترفین کے لئے یہ خشک روٹی کس قدر تکلیف دہ ہوگی۔

وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ (۵۶:۴۶) "اور یہ گناہ عظیم پر اصرار کرتے تھے۔" الحنث کے معنی ہیں الذنب یہاں مراد شرک ہے۔ اس میں اشارہ ہے اس حلف کی طرف جو اللہ نے انسانی فطرت سے لیا تھا کہ وہ اللہ وحدہ پر ایمان لائیں گے اب انہوں نے اس عہد کو توڑ لیا اور حانث ہو گئے۔

وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ (۴۷) اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ (۵۶:۴۸) "اور کہتے تھے کیا جب ہم مرکر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائے گا تو پھر اٹھا کھڑے کئے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے جو گزر چکے ہیں۔" یہ لوگ یوں تھے۔ گویا یہ دنیا اب نہیں ہے۔ یہ لوگ میدان حشر میں کھڑے ہیں۔ دنیا ماضی پارینہ ہے اور یہ اب وہاں عذاب کے سامنے کھڑے ہیں۔

یہ اس لئے کہ دنیا کا تو ایک مختصر وقت ہے ۔ اتنا ہی جتنا پلک جھپکنے کا وقت لگتا ہے ۔ اصل وقت ' حاضر وقت تو آخرت کا وقت ہے جہاں دوام ہے ۔

سیاق کلام اب پھر ہمیں دنیا میں لاتا ہے کہ ان کے سوال کا جواب دیا جائے ۔

قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ (٤٩) لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰی مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (٥٦ : ٥٠) "اے نبی ان سے کہو یقیناً اگلے اور پچھلے سب ایک دن ضرور جمع ہونے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر کیا جا چکا ہے ۔"

اس کے بعد اب سیاق کلام دوبارہ ان کی طرف مڑ جاتا ہے جو مکذبین تھے اور بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے عذاب کی تصویر کیا ہے ۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ اَیُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ (٥١) لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ (٥٦ : ٥٢) "پھر اے گمراہو اور جھٹلانے والو' تم زقوم کے درخت کی غذا کھانے والے ہو۔" اور زقوم کے درخت کے بارے میں انسان صرف اسی قدر جانتے ہیں جس قدر اللہ نے قرآن میں بتایا ہے کہ اس کا پھل اس طرح ہے جس طرح شیطان کا سر اور شیطان کا سر تو کسی نے دیکھا نہیں ہے لیکن احساس کے اندر جو بری صورت کی سری ہو سکتی ہے وہ شیطان کا سر ہے اور اس طرح یہ پھل بھی ۔ لفظ زقوم کا تلفظ بھی یہ بتاتا ہے کہ وہ کرخت کانٹے دار قسم کی کوئی بدصورت اور بدذائقہ چیز ہو کہ ہاتھوں میں لیتے ہی کانٹے چبھ جائیں گے ۔ حلق کو زخمی کر دے گا اور یہ ہے بمقابلہ ان بیریوں کے جن کے کانٹے صاف ہیں اور ان کیلوں کے جو تہ بر تہ میزوں پر رکھے ہوئے ہیں ۔ اور باوجود اس کے کہ وہ ؤس شیاطین کی طرح ہوں گے ۔ یہ اس کو کھائیں گے ۔

فَمَالِئُوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ (٥٦ : ٥٣) "اسی سے تم پیٹ بھرو گے ۔" اس لئے کہ بھوک سخت مجبور نے والی چیز ہے اور مجبوری سب کچھ کراتی ہے اور یہ کرخت کانٹے دار خوراک پھر مجبور کرتی ہے کہ پانی استعمال کرو کہ نیچے اترے اور پیٹوں کو بھرے اور پانی ۔

فَشٰرِبُوْنَ عَلَیْهِ مِنَ الْحَمِیْمِ (٥٦ : ٥٤) "اوپر سے کھولتا ہوا پانی ۔" ایسا گرم جو پیاس نہ بجھائے اور ٹھنڈک اس میں نہ ہو ۔

فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِیْمِ (٥٦ : ٥٥) "تونس لگے ہوئے اونٹ کی طرح پیو گے ۔" اونٹ کو جب تونس بیماری لگ جاتی ہے تو وہ پانی پیتا رہتا ہے اور سیر نہیں ہوتا ۔

هٰذَا نُزُلُهُمْ یَوْمَ الدِّیْنِ (٥٦ : ٥٦) "یہ ہے ان کا سامان ضیافت روز جزا میں ۔" حالانکہ قیام و نزول

راحت اور آرام کے لئے ہوتا ہے لیکن اصحاب الشمال کا نزول اجلال جنم میں ایسا ہو گا جس میں نہ راحت ہوگی اور نہ قرار ہو گا۔ یہ سب ان کی ضیافت اس دن کی جس کے بارے میں وہ شک میں پڑے ہوئے تھے۔ اس کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے اور قرآن کی تصدیق کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ دوسری طرف شرک بھی کرتے تھے اور اس دن کے ڈراوے سے بھی نہ ڈرتے تھے۔

یہاں آکر سب فریقوں کا انجام ختم ہو جاتا ہے جبکہ یہ عظیم واقعہ ہو گا جو اوپر نیچے کر دینے والا ہو گا اور اس پر اس سورۃ کا پہلا دور ختم ہوتا ہے۔

رہا دوسرا دور تو اس میں اسلامی نظریہ حیات کو مکمل طور پر لیا گیا ہے۔ اگرچہ اس میں واضح پہلو قضیہ حشر و نشر ہی ہے۔ اس دوسرے دور سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نسانی فطرت کو کس خوبصورتی کے ساتھ خطاب کرتا ہے۔ دلائل کس طرح بیان کرتا ہے اور کس قدر سادگی کے ساتھ لوگوں کی نفسیات کے اندر اتر جاتا ہے حالانکہ موضوع سخن نظریات و فلاسفی کے اعلیٰ مضامین ہوتے ہیں۔

قرآن کا کمال یہ ہے کہ وہ آسمانوں کے ان امور سے جو روئے زمین میں چلتے رہتے ہیں' ایسے نکات اخذ کرتا ہے جو کائنات کا عظیم مسئلہ قرار پاتے ہیں۔ وہ پا افتادہ حقائق و مناظر سے نوامیس فطرت اخذ کرتا ہے۔ ان سے ایک نظریہ حیات تشکیل کرتا ہے اور ان واقعات کو مرکز فکر و نظر بنا دیتا ہے جن سے روحانی زندگی میں ترقی و شعور کی بیداری' حواس کی تیزی پیدا ہوتی ہے اور جن مظاہر کو انسان رات اور دن دیکھتے ہیں اور ان پر سے غافلوں کی طرح گزر جاتے ہیں' ان کے بارے میں انسانی شعور کو بیدار کرتا ہے اور انسان کو بتاتا ہے کہ تم تو معجزات کے اندر ڈوبے ہوئے ہو جو تمہارے اردگرد رات دن ہوتے رہتے ہیں۔

قرآن لوگوں کو چند محدود معجزات کے حوالے نہیں کرتا جو کسی محدود زمان و مکان کے اندر پائے گئے ہوں بلکہ وہ خود ان کے نفس میں معجزات ان کو دکھاتا ہے۔ ان کے ماحول میں پائے جانے والے معمول کے واقعات میں سے معجزات تلاش کر لیتا ہے۔ ان کے قریب جو کائناتی مظاہر ہیں' ان سے دور ان کو نہیں لے جاتا کہ وہ انہیں پیچیدہ فلاسفی میں الجھاتا ہے یا محض عقلی فرائض پر کلام کرتا ہے یا ان سے سائنسی تجربات کا مطالبہ کرتا ہے جو ہر شخص نہیں کر سکتا۔ اسلام کوئی ایسا فلسفہ الٰہیات لوگوں کے لئے نہیں تجویز کرتا۔ قرآن کا انداز مختلف ہے۔

لوگوں کے نفوس اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔ لوگوں کے اردگرد جو مظاہر فطرت ہیں وہ بھی اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔ اللہ نے اس جہان میں جو جو چیز پیدا کی ہے' وہ معجزہ ہے۔ یہ اللہ کا قرآن ہے۔ اس لئے وہ انہیں انہی معجزات کی طرف لے جاتا ہے جو ان کی ذات میں ہیں۔ جو ان کے ماحول میں ہیں۔ وہ ایسے معجزات ان کو سمجھاتا ہے جن کو وہ رات دن دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ ان کو دیکھتے ہیں لیکن ان مظاہر کا اعجازی پہلو ان کی نظروں سے اوجھل ہے کیونکہ رات دن انہوں نے اس عمل کو دیکھتے دیکھتے اسے ایک معمول کا عمل سمجھ لیا ہے۔ قرآن انہی واقعات کے بارے میں ان کی آنکھیں کھولتا ہے۔ بتاتا ہے ان سب قدرت الٰہیہ کا راز کیا ہے۔ ان کے اندر کس قدر وحدت پائی جاتی ہے اور کس طرح یہ قدرت الٰہیہ تمہارے نفسوں میں کام کر رہی ہے جس طرح اس کائنات کے اندر کام کر رہی ہے جو ان کے ماحول میں ہے جس کے اندر دلائل ایمان' براہین حقیقت موجود ہیں۔ اس طرح اسلام ان چیزوں کو انسان کی فطرت کے سامنے کھولتا ہے اور ان کی فطرت کو جگاتا ہے۔

قرآن کریم اس سبق میں یہی انداز اختیار کرتا ہے ۔ سب سے پہلے ان کے سامنے وہ دلائل اعجاز پیش کئے جاتے ہیں جو خود ان کی تخلیق میں ہیں ۔ پھر وہ جو ان کے فصلوں میں ہیں جن کو وہ رات دن بوتے ہیں جو پانی وہ پیتے ہیں کیا یہ کم اعجاز ہے ۔ یہ آگ جو وہ جلاتے ہیں ۔ یہ آگ تو صبح و شام تمہارے چولہوں میں جلتی ہے پھر تمہارے سامنے تمہارے رشتہ داروں کی اموات ہوتی ہیں ۔ یہ عالم آخرت کے سفر پر جاتے ہیں ۔ ہر شخص کو یہ وقت پیش آتا ہے اور ہر زندہ کو قدرت قادرہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے جس سے کوئی فرار ممکن نہیں ہے ۔ تمام حیلے اور تمام بہانے ختم ہو جاتے ہیں ۔

قرآن نے جس انداز سے فطرت سے خطاب کیا ہے یہ انداز بذات خود دلائل اعجاز میں سے ہے کہ قرآن خالق کی طرف سے ہے ۔ قرآن کا سرچشمہ وہی ہے جس سے یہ کائنات صادر ہوئی چنانچہ قرآن دنیا کی زندگی کے سادہ مظاہر اور اشکال سے عظیم حقائق نکال کر فطری آواز میں انسان کے سامنے رکھ دیتا ہے ۔ ایک ذرہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پوری کائنات کی پہلی اکائی ہے اور خلیہ جو زندگی کا پہلا مادہ ہوتا ہے ۔ ذرہ بذات خود معجزہ ہے اور خلیہ حیات بذات خود معجزہ ہے ۔ یہاں قرآن کریم نہایت ہی سادہ مظاہر سے دینی عقائد اخذ کرتا ہے ۔ ایسے مظاہر سے جو ہر انسان کے تجربے میں ہوتے ہیں ۔ نسل انسانی ' زراعت ' پانی ' آگ ' موت ہر انسان ان اشیاء کے ساتھ عملی معاملہ رکھتا ہے ۔ غار کے رہنے والے بھی ،منین کی زندگی سے واقف ہیں اور تھے ۔ نباتات کے اگنے سے واقف تھے ۔ بارش سے واقف تھے ۔ آگ جلاتے تھے اور موت کی گھڑی ان پر آتی تھی ۔ ان مشاہد کے میٹریل سے قرآن ایک عظیم الشان عقیدہ اور نظریہ اور فلسفہ تشکیل دیتا ہے ۔ اس لئے کہ قرآن ہر انسان کی کتاب ہے اور یہ مشاہدات وہ ہیں جن سے ہر انسان دوچار ہوتا ہے ۔ یہ عظیم کائناتی حقائق ہیں لیکن پیش پا افتادہ یہ اعلیٰ اسرار ہیں لیکن ہر شخص کے سامنے کھلے ' اس پوری بحث میں ایک اشارہ دوررس بھی ہے وہ ہے ستارے کے محل وقوع کی طرف جو مطالعہ فطرت کا موضوع ہے اور ایک عام انسان اور ایک بہت بڑے سائنس داں مواقع النجوم کا مشاہدہ کرتے ہیں ۔

مواقع النجوم سے مراد کائنات کی انجینئرنگ ہے اور یہ بہت بڑا راز بھی ہے اور پیش پا افتادہ بھی ہے ۔ پھر حیاتیات و نباتات دونوں معجزات ہیں ۔ پھر پانی تو اصل حیات ہے اور آگ اور اب بجلی تو تہذیب کی پہلی علامت ہے ۔

موجود اور منظور چیزوں کو اس انداز سے دیکھنا مطالعہ کرنا اور ان سے فکر و عقیدہ اور نظریہ و نظام اخذ کرنا انسان کا طریقہ علم و تعلیم نہیں رہا ہے ۔ انسانوں نے جب بھی ان مسائل پر بحث کی ہے انہوں نے ان کائناتی مواد اور مظاہر کو سامنے بھی نہیں رکھا ہے اور جب انہوں نے کبھی اسے دیکھنے کی کوشش بھی کی ہے تو اسے پیچیدہ بنا دیا ہے اور اس قدر سادگی سے نہیں لیا جس طرح قرآن نے لیا ہے بلکہ انسان نے ان سادہ مظاہر کو بھی ایک پیچیدہ فلسفیانہ مسئلہ بنا کر اسے چیستان بنا دیا ہے اور دنیا کے عوام کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

لیکن اللہ نے اپنی کتاب میں ایک فطری انداز اختیار کیا ہے یعنی اونچے مسائل کے لئے بھی ایسا میٹریل استعمال کیا جو عوام کے لئے قابل فہم ہو جس سے جو نتائج بھی اخذ کئے گئے وہ لوگوں کے لئے قریب الفہم ہو گئے جس طرح اللہ نے اس کائنات کی تخلیق کے اندر حیاتیاتی تسلسل نہایت سہولت سے قائم کیا ہے اسی طرح اس کائنات سے سادہ انداز میں اللہ العلمین کو ثابت کیا ہے ' ذرا ملاحظہ فرمائیں ۔

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَرَءَيْتُمْ
مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ
الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا
تَحْرُثُوْنَ ﴿۶۳﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا
فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿۶۵﴾ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۶۷﴾ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ
الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿۶۸﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿۶۹﴾ لَوْ
نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴿۷۱﴾ ءَاَنْتُمْ
اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ ﴿۷۲﴾ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا
لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿۷۳﴾

"ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے پھر کیوں تصدیق نہیں کرتے؟ کبھی تم نے غور کیا' یہ نطفہ جو تم ڈالتے ہو' اس سے بچہ تم بناتے ہو یا اس کے بنانے والے ہم ہیں؟ ہم نے تمہارے درمیان موت کو تقسیم کیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تم جیسے اور لوگ لے آئیں اور کسی ایسے جہان میں تمہیں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے۔ اپنی پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہی ہو' پھر کیوں سبق نہیں لیتے؟ کبھی تم نے سوچا' یہ بیج جو تم بوتے ہو' ان سے کھیتیاں تم اگاتے ہو یا ان کے اگانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو ان کھیتوں کو بھس بنا کر رکھ دیں اور تم طرح طرح کی باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تو الٹی چٹی پڑ گئی بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھوٹے ہوئے ہیں۔ کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا' یہ پانی جو تم پیتے ہو' اسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اس کے برسانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا کر رکھ دیں' پھر کیوں تم شکرگزار نہیں ہوتے؟ کبھی تم نے خیال کیا یہ آگ جو تم سلگاتے ہو' اس کا درخت تم نے پیدا کیا ہے یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اس کو یاد دہانی کا ذریعہ اور حاجت مندوں کے لئے سامان زیست بنایا ہے۔ پس اے نبیؐ اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔"

پیدائش اور موت اور انتہا' حیات اور موت' ایک ایسا واقعہ ہے جس کے تجربے سے ہر شخص خود بھی گزرتا ہے اور لوگوں کی زندگی میں بھی مشاہدہ کرتا ہے۔ آخر وہ کیا وجہ ہے کہ وہ تصدیق نہ کریں کہ اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اس

حقیقت کا انسان پر اس قدر دباؤ ہے کہ انسان کے لئے خدا پر ایمان لانے کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے۔

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ (٥٦ : ٥٧) "ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے پھر کیوں تصدیق نہیں کرتے ہو"

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ (٥٨) ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ (٥٦ : ٥٩) "کبھی تم نے غور کیا' یہ نطفہ جو تم ڈالتے ہو' اس سے بچہ تم بناتے ہو یا اس کے بنانے والے ہم ہیں۔" تخلیق یا تناسل میں انسان کا کردار یہی ہے کہ وہ نطفہ رحم زوجہ میں ڈال دے۔ پھر دونوں کا کردار ختم ہو جاتا ہے۔ (ٹیوب بے بی نے یہ بھی ختم کر دیا ہے) اب یہ کمزور پانی رب تعالیٰ کے زیر نگرانی کام کرتا ہے۔ صرف دست قدرت اس کی تخلیق اور تربیت اور بڑھوتری میں کام کرتا ہے۔ اس کو شکل دیتا ہے۔ روح دیتا ہے اور پہلے لحظہ سے لے کر تمام مراحل معجزات ہی معجزات ہیں۔ ہر مرحلے میں ایسا خارق العادت معجزہ رونما ہوتا ہے جس میں اللہ کے سوا کسی کا کوئی کردار نہیں۔ بشر تو آج تک اسی طریقہ تخلیق و تناسل کی حقیقت تک بھی نہیں پہنچ سکا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ معجزہ کیسے ہوتا ہے۔ اس میں ان کی شرکت کا تو تصور بھی نہیں؟

اس قدر سوچ تو ہر انسان کو حاصل ہوتی ہے اور اس معجزے کو سمجھنے اور اس سے متاثر ہونے کے لئے اسی قدر کافی ہے لیکن اس خلیے کا اس قدر قصہ کہ جب یہ نطفہ رحم مادر میں رکھا گیا اور اس سے ایک مکمل انسان بن گیا۔ یہ کہانی تخیلات سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ اگر یہ قصہ عملاً وقوع پذیر نہ ہوتا رہتا اور یہ انسان اسے شب و روز دیکھتا نہ رہتا تو عقل انسانی کبھی اس کی تصدیق نہ کرتی۔

یہ خلیہ پھر تقسیم ہونا شروع ہوتا ہے۔ پھر بڑھتا رہتا ہے اور تھوڑا ہی عرصہ گزرتا ہے کہ اس ایک خلیے کی جگہ کئی ملین خلیے نمودار ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک خلیہ دوسرے خلیوں سے ممتاز خصوصیات رکھتا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک خلیہ ایک خاص پہلو تخلیق کرتا ہے۔ بعض ہڈیوں کے خلیے ہوتے ہیں۔ بعض عضلات کے خلیے ہوتے ہیں۔ بعض جلدی خلیات ہوتے ہیں۔ ان خلیوں سے آنکھیں بنتی ہیں۔ ان خلیوں سے زبان بنتی ہے اور ان خلیوں سے غدود بنتے ہیں۔ غدودوں کے خلیے زیادہ مخصوص نوعیت رکھتے ہیں۔ ہر خلیہ جانتا ہے کہ اس نے کہاں جاکر کام کرنا ہے۔ مثلاً آنکھ کے خلیے غلطی سے پیٹ میں یا پاؤں میں نہیں چلے جاتے لیکن اگر ان کو مصنوعی طور پر پشت کے اوپر لے جایا جائے تو یہ وہاں آنکھ بنا دیں گے لیکن ان کو اللہ کی طرف سے جو حکم اور الہام ہوتا ہے وہ آنکھ ہی کی جگہ مجتمع ہوتے ہیں اور وہیں آنکھ بناتے ہیں۔ اسی طرح کان کے خلیے پاؤں میں نہیں جاتے تاکہ وہاں جاکر وہ کان بنا دیں۔ یہ سب خلیے اللہ کے حکم اور الہام کے مطابق اس انسان کو بہترین تقدیم اور نقشے کے مطابق بناتے ہیں۔ ان کی نظروں کے پیچھے اور اس تشکیل میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

یہ ہے انسان کی ابتداء' رہی انسان کی انتہا تو وہ بھی اس سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ اگرچہ انسان اسے روز دیکھتے دیکھتے اس سے اثر نہیں لیتا۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ (٦٠) عَلَىٰ أَنْ نُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ

وَنُنْشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ (٥٦ : ٦١) "ہم نے تمہارے درمیان موت کو تقسیم کیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تم جیسے اور لوگ لے آئیں اور کسی ایسے جہاں میں تمہیں دوبارہ پیدا کر دیں جس کو تم نہیں مانتے ۔"

یہ موت جس تک تمام زندہ مخلوق سفر کر کے پہنچتی ہے یہ کیا ہے؟ کس طرح واقع ہوتی ہے؟ اس کی کس قدر طاقت ہے کہ اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اللہ کی تقدیر ہے۔ اس لئے اس سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا۔ اس سے کوئی آگے نہیں جاسکتا۔ یہ ایک حلقہ اور کڑی ہے اس تخلیق کے سلسلے میں جس نے پورا ہونا ہے۔

اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا ہے اور تمہیں اس زمین سے نابود کر کے اس کی تعمیر و ترقی کے لئے دوسرے لوگوں کو وہ لا سکتا ہے کیونکہ جس نے موت مقرر کی زندگی کے بارے میں بھی اسی نے طے کیا ہے۔ اس نے جن لوگوں کی موت کا فیصلہ کیا اتنے ہی لوگ اور وہ لاتا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے تاکہ قیامت تک جنہوں نے آنا ہے آئیں اور جب وقت مقرر آجائے گا تو پھر قیامت برپا ہوگی۔

وَنُنْشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ (٥٦ : ٦١) "اور تمہیں اس میں پیدا کریں جسے تم نہیں جانتے ۔" ایک ایسے عالم میں جس کو تم نہیں جانتے اور اس کے بارے میں تمہاری معلومات صرف ان معلومات تک محدود ہیں جو تم کو اللہ دیتا ہے اور جب تمہیں اس نامعلوم جہاں (آخرت) میں پیدا کر دیا جائے گا تو تب قافلہ انسانیت اپنے منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔۔۔۔۔ یہ تو ہے دوسری پیدائش اور۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ (٥٦ : ٦٢) "اپنی پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہی ہو پھر کیوں سبق نہیں لیتے؟" اور یہ دوسری پیدائش بہت ہی قریب ہے اور اس میں کوئی بات قابل تعجب نہیں ہے۔

اس سادگی اور اس سہل انداز میں قرآن کریم پہلی پیدائش اور دوبارہ پیدائش کے مسئلہ کو پیش کرتا ہے۔ ہمیں ایک ایسے طریقہ استدلال سے دوچار کرتا ہے جسے ہم جانتے ہیں اور جس کا ہم کوئی انکار بھی نہیں کر سکتے کیونکہ یہ منطق بدیہیات پر مبنی ہے اور انسانوں کے مشاہدات پر مبنی ہے اور جس میں کوئی پیچیدگی اور کوئی تجرید نہیں ہے، نہ فلسفہ ہے اور نہ ذہنی تھکاوٹ ہے اور کوئی ایسی بحث نہیں جو وجدان تک پہنچتی ہو۔

یہ ایک بالکل جدید طریقہ ہے جو بدیع السموت اور قرآن کے نازل کرنے والے نے اختیار کیا ہے۔

---()()()---

ایک بار پھر نہایت سادہ اور سہل الفہم انداز میں، ان کے سامنے ان کے روز مرہ کی چیزیں پیش کی جاتی ہیں اور ان میں سے ان کو ایک معجزانہ پہلو دکھایا جاتا ہے۔ وہ دیکھ رہے ہوتے ہیں اور اس سے غافل ہوتے ہیں۔

أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ (٦٣) أَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ (٦٤) لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ

حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ (٦٥) إِنَّا لَمُغْرَمُونَ (٦٦) بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ (٦٧) (٥٦ : ٦٤ تا

”کبھی تم نے سوچا یہ بیج جو تم بوتے ہو' ان سے کھیتیاں تم اگاتے ہو یا ان کے اگانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو ان کھیتوں کو بھس بنا کر رکھ دیں اور تم طرح طرح کی باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تو الٹی چٹی پڑ گئی بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھوٹے ہوئے ہیں۔“

یہ زرعی پودے ان کے سامنے اگتے ہیں اور اپنی فصل دیتے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس میں ان کا کردار کیا ہے۔ یہ لوگ ہل چلا کر اس میں دانے یا بیج ڈال دیتے ہیں۔ جسے اللہ نے پیدا کیا۔ اس کے بعد ان کا کردار ختم ہو جاتا ہے اور دست قدرت ان پر عمل پیرا ہوتی ہے اور معجزانہ انداز میں یہ پودا تکمیل کے مراحل طے کرتا ہے۔

یہ بیج یا یہ دانہ اپنی نوع کو دہرانے کا عمل شروع کرتا ہے اور یہ اپنی راہ اس طرح طے کرتا ہے کہ گویا یہ عقلمند اور خبردار چیز ہے اور اپنی راہ پر سیدھا سیدھا گامزن ہے اور مراحل طے کر رہا ہے۔ انسان تو اپنے کام میں غلطی کر سکتا ہے لیکن یہ بیج کوئی غلطی نہیں کرتا۔ یہ اس طریق کار کے مطابق کام کرتا ہے جو اللہ نے اس کے لئے وضع کیا ہے۔ وہ بھی اپنے مقررہ ہدف کو خطا نہیں کرتا کیونکہ اسے دست قدرت چلا رہی ہوتی ہے اور یہ ایک عجیب سفر ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا سفر ہے کہ اگر روز و شب ہمارے سامنے دہرایا نہ جاتا تو عقل اس کی تصدیق نہ کرتی اور جہان اس کا تصور نہ کر سکتا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کون سی عقل یہ باور کر سکتی ہے کہ گندم کے اس چھوٹے سے دانہ میں ڈالی پتے اور دانے سب کچھ موجود ہیں یا کھجور کی گٹھلی میں اس قدر بلند درخت موجود ہے۔

اگر یہ چیزیں ہمارے سامنے رات دن دہرائی نہ جاتیں تو عقل انہیں تسلیم نہ کرتی اور کوئی خیال ان چیزوں کی طرف جاتا ہی نہیں لیکن چونکہ سب لوگوں کے سامنے یہ قصہ دہرایا جاتا ہے اور یہ سفر صبح و شام طے ہوتا رہتا ہے اس لئے لوگ اسے مانتے ہیں اور کون ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہو کہ ماسوائے دانہ بونے کے اس کا اس عمل میں کوئی اور کردار ہے۔

لوگ کہتے ہیں ہم نے فصل اگائی اور ہم نے اتنی پروڈکشن دی حالانکہ ان سب امور میں ان کا کردار بہت ہی محدود ہے۔ رہا وہ پوراعمل جو بیج یا دانہ طے کرتا ہے اور وہ معجزہ کہ ایک چھوٹے سے بیج کے قلب سے ایک عظیم درخت وجود میں آتا ہے تو یہ تو سب کچھ خالق کی صفت ہے۔ اگر ایسا اللہ نہ چاہتا تو کوئی دانہ یہ معجزہ نہ دکھاتا۔ یہ قصہ یوں سرے تک نہ پہنچتا اور اگر اللہ چاہتا تو قبل اس کے کہ دانہ دے اسے بھس بنا دیتا۔ یہ تو اللہ کی مشیت ہے۔

اگر ایسا ہوتا تو لوگ اس پر عبرتناک تبصرے کرتے۔ انا لمغرمون (ہم پر تو چٹی چڑھ گئی) نقصان ہو گیا بلکہ یہ کہیں بل نحن محرومون (بلکہ ہم تو محروم اور بد نصیب ہیں) لیکن یہ اللہ کا فضل کہ وہ ان کو پھل دیتا ہے اور یہ دانے دورہ مکمل کرتے ہیں۔ انسانی زندگی بھی ایسی ہی ہے۔ انسانی خلیہ بھی یہی کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ کی قدرت انسان پیدا کرتی ہے۔ کیا مشکل ہے کہ دوبارہ اللہ اسی زمین سے انسان کو برآمد نہیں کر سکتا... آخرت کی دوبارہ پیدائش میں آخر کیا چیز تمہیں انوکھی لگتی ہے۔

---()()---

اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ (٦٨) ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ (٦٩) لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ (٧٠) (٥٦: ٦٨ تا

"کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا' یہ پانی جو تم پیتے ہو' اسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اس کے برسانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا کر رکھ دیں' پھر کیوں تم شکر گزار نہیں ہوتے؟"

یہ پانی تو زندگی کی اصل بنیاد ہے اور پانی کے سوا زندگی نشوونما ہی نہیں پا سکتی ۔ اس طرح اللہ نے اسے مقدر کیا ہے ۔ اس پانی کی تخلیق میں انسان کا کردار کیا ہے ۔ اس کا کردار بس یہ ہے کہ انسان اسے حلق سے اتار دے ۔ یہ کہ اس کے عناصر کس نے بنائے' اسے بادلوں سے کس نے اتارا ۔ اسے ندیوں میں کس نے بہایا ۔ اسے میٹھا کس نے بنایا ۔

لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا ( ۵۶ : ۷۰ ) "اگر ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا کر رکھ دیں ۔" بس ہوا کو یہ حکم دینا ہے کہ بادلوں میں پانی کے ساتھ نمکیات بھی لاؤ ۔ پھر وہ نہ آدمیوں کے کام آئے نہ فصلوں کے ۔ کوئی پروڈکشن نہ دے ۔ آخر وہ کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے ۔

قرآن کے ابتدائی مخاطبین کے لئے پانی صرف بادلوں سے آتا تھا ۔ براہ راست' یہ ان کے لئے زندگی کا بڑا مواد تھا ۔ وہ اس کو بہت اہمیت دیتے تھے ۔ اور اس کے متعلق بات سے ان کے دل کانپ اٹھتے تھے ۔ بارش کے بارے میں ان کے تمام دو اشعار نے ان کے اس شعور کو لازوال بنا دیا ہے لیکن انسان کی تمام تر مادی ترقیات نے پانی کی قیمت میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ وہ جس قدر علمی تحقیقات اور تجزیہ کرنے میں اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور سائنس دان محسوس کرتے ہیں کہ حیات اور اس کی نشوونما میں پانی کا بڑا کردار ہے ۔ لہذا پانی اہم ہے چرواہے کے لئے بھی اور ایک عظیم جدید صنعت کار کے لئے بھی اور ایک سائنس دان کے نزدیک بھی ۔

---

اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِىْ تُوْرُوْنَ ( ۷۱ ) ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ ( ۷۲ ) نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ( ۷۳ ) ( ۵۶ : ۷۱ تا ۷۳ ) "کبھی تم نے خیال کیا یہ آگ جو تم لگاتے ہو' اس کا درخت تم نے پیدا کیا ہے یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اس کو یاد دہانی کا ذریعہ اور حاجت مندوں کے لئے سامان زیست بنایا ہے ۔"

انسان کی زندگی میں آگ کا وجود انسان کے لئے بہت بڑی نعمت ثابت ہوئی اور انسان نے اپنی تمدنی زندگی کا آغاز ہی آگ سے کیا ہے لیکن صبح و شام آگ جلانا اس کے لئے تو ایک معمول کی بات ہے ۔ سوال یہ ہے کہ اس میں انسان کا کردار کتنا ہے ۔ بس انسان آگ جلاتا ہے لیکن جلنے کا عمل کس نے پیدا کیا اور جلنے کے عمل میں استعمال ہونے والا ایندھن کس نے بنایا ۔ درخت کس نے پیدا کئے ۔ اس کے بارے میں اس سے قبل تفصیلی بات ہم کر چکے ہیں ۔ یہاں اس کے درخت" میں ایک اشارہ ہے کہ عرب ایک درخت کی شاخ کو دوسری سے رگڑ کر آگ پیدا کرتے تھے اور یہ وہ طریقہ ہے جو شاید آج بھی پسماندہ علاقوں میں رائج ہے ۔ یہ انداز ان کے تجربات میں تھا اس لئے قرآن نے اس طرف اشارہ کر دیا ۔ رہا آگ کا معجزہ اور سائنس دانوں کے نزدیک اس کا راز تو یہ ایک دوسری اہم بحث ہے اور اس آگ کی مناسبت سے

آخرت کی آگ ۔

نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً ( ٥٦ : ٧٣ ) "ہم نے اس کو یاددہانی کا ذریعہ بنایا۔" یعنی آخرت کی آگ کی یاددہانی کا اور ہم نے اس کو۔

وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ( ٥٦ : ٧٣ ) "حاجت مندوں مسافروں کے لئے سامان زیست بنایا ہے۔" مقوین کے معنی مسافر ہیں۔ مخاطبین کے نفوس پر اس کا بہت اثر تھا کیونکہ ان کے سامنے ان کا ایک زندہ تجربہ پیش کیا گیا۔

جب اس حد تک اسرار و رموز فاش کر دیئے گئے جن سے دلائل ایمان روز روشن کی طرح سامنے آگئے۔ اور لوگوں کے لئے قابل فہم۔ تو اب اشارہ کرنا لازم ہوگیا کہ یہ سب کچھ فراہم کرنے والا کون ہے؟ کیا ایک عظیم خالق اور رب کی موجودگی کا سوال تمہارے ذہنوں میں پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کی طرف فطرت متوجہ ہوتی ہے اور فطرت انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اللہ کی تسبیح کریں اور اس حقیقت کو زندہ کریں اور دلوں کو اس سے متاثر کریں۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ( ٥٦ : ٧٤ ) "پس اے نبی اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔"
اب روئے سخن مکذبین کی طرف پھیر کر سخت انداز میں قرآن کو اس کائنات سے مربوط کیا جاتا ہے۔

۲

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿٧٤﴾ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿٧٥﴾ وَ ع ٣٢
١٥ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿٧٦﴾ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿٧٧﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿٧٨﴾ لَّا
يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿٧٩﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٠﴾ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ
مُّدْهِنُوْنَ ﴿٨١﴾ وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿٨٣﴾
وَ اَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿٨٥﴾
فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿٨٦﴾ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٨٧﴾ فَاَمَّآ اِنْ
كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿٨٨﴾ فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ ۙ وَّ جَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿٨٩﴾ وَ اَمَّآ اِنْ كَانَ
مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٩٠﴾ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٩١﴾ وَ اَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ

۳ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۹۲﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۹۳﴾ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴿۹۴﴾ اِنَّ هٰذَا
۲۱ع لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۹۵﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۹۶﴾
۱۶

"پس میں قسم نہیں کھاتا تاروں کے مواقع کی اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے کہ یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے ۔ ایک محفوظ کتاب میں ثبت جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا ۔ یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے ۔ پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم بے اعتنائی برتتے ہو اور تم نے تکذیب کو اپنا رزق بنالیا ہے ۔ اب اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو اور اپنے اس خیال میں سچے ہو تو جب مرنے والے کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے اس وقت اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے ؟ اس وقت تمہاری بہ نسبت ہم اس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے ۔ پھر وہ مرنے والا اگر مقربین میں سے ہو تو اس کے لئے راحت اور عمدہ رزق اور نعمت بھری جنت ہے اور اگر وہ اصحاب یمین میں سے ہو تو اس کا استقبال یوں ہوتا ہے کہ سلام ہے تجھے تو اصحاب الیمین میں سے ہے اور اگر وہ جھٹلانے والے گمراہ لوگوں میں سے ہو تو اس کی تواضع کے لئے کھولتا ہوا پانی ہے اور جہنم میں جھونکا جاتا ہے ۔ یہ سب کچھ قطعی حق ہے ' پس اے نبی ' اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو ۔"

اس دور میں مخاطبین ستاروں کے مواقع اور محل وقوع کے بارے میں زیادہ نہ جانتے تھے ۔ صرف اس قدر جو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اس پر قسم اٹھائی ۔

وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ( ۵۶ : ۷۶ ) "اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے ۔" لیکن آج ہم کس قدر جانتے ہیں کہ یہ کس قدر عظیم قسم ہے ۔ ہمارا علم مخاطبین اول کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے ۔ اگرچہ ہمارا موجودہ علم بھی بہت قلیل ہے اور ہم مواقع النجوم کی عظمت کا پورا تصور بھی نہیں کر سکتے ۔

ستاروں کے مواقع کے بارے میں جو قلیل علم حاصل ہوا ہے یہ ہماری نہایت ہی چھوٹی چھوٹی رصد گاہوں کے ذریعہ حاصل ہوا ہے ۔ جن کی نظر کی حدود بہت ہی محدود ہیں ۔ ان رصد گاہوں کے ذریعے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ یہ ہیں کہ ستاروں کے مختلف مجموعوں میں سے یہ مجموعہ ایک ہے جس کو نظام شمسی کہتے ہیں ۔ اس میں ایک ارب ستارے ہیں اور ستاروں کے دوسرے مجموعے کتنے ہیں ان کی تعداد معلوم نہیں ہے اور ان کی حدود کا تعین نہیں ہے ۔

" سائنس دان کہتے ہیں کہ ستارے اور سیارے جن کی تعداد ان بلین ستاروں سے زیادہ ہے ' ان کو صرف سادہ نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا ۔ ان کو صرف دوربینوں اور رصد گاہوں کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے اور ان کو دیکھے بغیر یہ مشینیں اور آلات بھی ان کو محسوس نہیں کر سکتے ۔ یہ سب اس تاریک اور نامعلوم فضائے آسمانی میں تیر رہے ہیں اور کوئی احتمال اس بات کا نہیں ہے کہ کسی ایک ستارے کے مقناطیسی دائرے کے اندر دوسرا ستارہ آ جائے یا کسی دوسرے ستارے کے ساتھ متصادم ہو جائے جس طرح اس بات کا احتمال نہیں ہے کہ بحر ہنڈیشن میں چلنے والی کشتی بحر مردار میں چلنے والی کشتی کے ساتھ متصادم ہو جائے جبکہ وہ دونوں ایک ہی سمت میں ایک ہی سرعت کے ساتھ چل رہی ہوں ۔ جس طرح یہ احتمال بعید

ہے اسی طرح دو ستاروں کا ٹکرانا محال ہے۔[1]

ہر ستارے کو اپنے قریبی ستارے سے اس فاصلے پر رکھا گیا ہے اور اس حکمت اور تدبیر سے رکھا گیا ہے اور ان تمام ستاروں کی کشش کو اس طرح متوازن رکھا گیا ہے کہ وہ اس لامتناہی فضا میں پھرنے اور تیرنے والے کھربوں ستاروں کے ساتھ متوازن ہے۔ یہ تو ہے ایک پہلو عظمت محل وقوع ستارگان کا۔ لیکن اگر چہ عظمت کا ہمارا تصور اس وقت کے مخاطبین قرآن سے بہت زیادہ ہے لیکن اگلی نسلوں کا جو تصور ہو گا وہ ہمارے اس وسیع تصور کو بھی محدود سمجھیں گی۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ (٥٦ : ٧٥) "پس میں قسم نہیں کھاتا ہوں تاروں کے مواقع کی۔" یہ بات تو بہت واضح ہے اور روشن ہے اور قسم کی محتاج نہیں ہے۔

وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ (٥٦ : ٧٦) "اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے۔" قسم کی طرف یہ اشارہ اور پھر قسم نہ کھانا ایک اسلوب ہے۔ ایک زیادہ موثر اور دل نشین انداز اور اس سے بات زیادہ پختگی سے ذہن میں بیٹھ جاتی ہے کیونکہ اس پر قسم کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ (٧٧) فِىْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ (٧٨) لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (٧٩) تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (٥٦ : ٨٠) "یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب میں ثبت، جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔ یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔"

فِىْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ (٥٦ : ٧٨) "کتاب محفوظ میں۔" اور اس کی تفسیر بعد کی آیت کر رہی ہے۔

لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (٥٦ : ٧٩) "جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔" مشرکین کا الزام تھا کہ اسے شیاطین نے نازل کیا ہے۔ یہ ان کے الزام کی تردید ہے کیونکہ شیطان اس کتاب کو مس نہیں کر سکتا جو اللہ کے علم میں ہے اور اس کی حفاظت میں ہے۔ اسے پاک فرشتے لے کر نازل ہوتے ہیں۔

اس آیت کی یہ سب سے اچھی تفسیر ہے کیونکہ (لا) نافیہ ہے یعنی یہ فعل ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ناہیہ نہیں ہے کہ تم ایسا نہ کرو کیونکہ اس دنیا میں پاک اور نجس دونوں قرآن کو چھوتے رہتے ہیں۔ مومن اور کافر بھی چھوتے ہیں لہذا اس لحاظ سے نفی متحقق ہی نہیں ہے بلکہ یہ معنی زیادہ قریب ہے اور کفار کے الزام کے جواب میں یہی معنی درست ہے کہ مطہر سے مراد فرشتے ہوں کیونکہ کتب سماوی شیطان کی دسترس سے باہر ہوتی ہیں۔

اور اس کے بعد کی آیت۔

---

(1) اللہ اور سائنس ۔ ص ۳۳

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۵۶ : ۸۰) "یہ رب العالمین کی نازل کردہ ہے۔" شیاطین کی نازل کردہ نہیں ہے۔ اس کی تائید کرتی ہے۔

اگر مروی احادیث اس کا دوسرا مفہوم بتاتی ہیں کہ قرآن کو کوئی نہ چھوئے مگر پاک شخص لیکن علامہ ابن کثیر نے کہا ہے "یہ قیمتی نکتہ ہے الزہری نے اس طرح پڑھا ہے لیکن اس تفسیر کو نہیں لینا چاہئے۔ اس حدیث کو دارقطنی نے عمر ابن حزم عبداللہ ابن عمر اور عثمان ابن ابوالعاص سے مسند طور پر روایت کیا ہے لیکن اس کی سب سندوں میں کلام کی گنجائش ہے۔"

اس کے بعد اس سورۃ کا آخری پیرا آتا ہے۔ یہ عقل و خرد کے تاروں پر آخری مضراب ہے۔ اس میں اس لمحے کا تذکرہ ہے جس کے بارے میں سوچ کر انسان کے اعضاء کانپ جاتے ہیں۔ یہ ہے لحہ موت جس میں کوئی کلام نہیں ہے اور پھر انسان واپس نہیں آتا ہے نہ اس لمحے سے کوئی بچ سکتا ہے۔

اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ (۸۱) وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ (۸۲) فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ (۸۳) وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ (۸۴) وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ (۸۵) فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ (۸۶) تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۸۷) (۵۶ : ۸۱ تا ۸۷) "پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم بے اعتنائی برتتے ہو اور تم نے تکذیب کو اپنا رزق بنالیا ہے۔ اب اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو اور اپنے اس خیال میں سچے ہو تو جب مرنے والے کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے اس وقت اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے؟ اس وقت تمہاری بہ نسبت ہم اس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے۔"

کیا تم اس کتاب کی باتوں میں شک کرتے ہو اور اس لئے کہ یہ تمہیں یہ کہتی ہے کہ تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ تم قرآن اور اس کے بیان کردہ قصص آخرت کی تکذیب کرتے ہو اور قرآنی عقائد و تصورات کی تکذیب کرتے ہو۔

وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ (۵۶ : ۸۲) "کہ تم تکذیب کو اپنا رزق بنا رہے ہو" اور اس کو توشہ آخرت بنا رہے ہو اور زندگی بھی تم اس تکذیب پر بسر کرتے ہو یا یہ تمہاری خوراک بن گئی ہے۔ کس قدر گندی خوراک ہے یہ۔

جب تمہاری روح حلقوم تک آجاتی ہے اور تم دنیا اور آخرت کے کنارے اور دوراہے پر کھڑے ہوئے ہو تو تم کیا کرنے والے ہوتے ہو' تم کر ہی کیا سکتے ہو .... پھر قرآن کا انداز تصویر کشی آتا ہے اور اس موقع کی بہترین تصویر کشی کی جاتی ہے۔ یہ تصویری جھلکیوں کے انداز میں ہے اور مختصر جھلکیوں میں سب کچھ دکھا دیا جاتا ہے۔

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ (۸۳) وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ (۸٤) وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ (۸۵) (٥٦: ۸۳ تا ۸۵) "تو جب مرنے والے کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے۔ اس وقت تمہاری بہ نسبت ہم اس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے" یہ ایسی تصویر کشی ہے کہ ان الفاظ۔

بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ (٥٦: ۸۳) کے اندر سے سکرات الموت کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ہمیں نظر آتا ہے چہرے کے نیچے کھچے جا رہے ہیں 'سختی اور شدت نظر آرہی ہے۔ پھر۔

وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ (٥٦: ۸٤) سے نظر آتا ہے کہ اس کے ارد گرد بھی اقرباء عاجز و لاچار کھڑے ہیں۔

اب روح اس دنیا سے پرواز کر گئی ہے اور میت نے سب کچھ پیچھے دنیا میں چھوڑ دیا ہے۔ یہ جدید اور نئی دنیا میں قدم رکھ رہا ہے۔ اب اس کے پاس صرف وہی کچھ ہے جو کمایا ہے۔ باقی خیرو شر پر اب اسے کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ وہاں اس جدید دنیا میں یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے لیکن پیچھے مڑ کر کسی کو کچھ بتا نہیں سکتا۔ وہ اپنے ماحول سے جدا ہو چکا ہے۔ ایک جسم پڑا ہے جسے ناظرین دیکھ رہے ہیں لیکن انہیں بھی نہیں پتہ کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ یہاں آکر انسان کی قدرت اور انسان کے علم کے حدود ختم ہو جاتے ہیں۔ اس مقام پر آکر انسان اعتراف کرتے ہیں کہ وہ عاجز و لاچار ہیں۔ وہ بہت ہی محدود قوت کے مالک ہیں۔ اب کوئی جدال نہیں رہتا۔۔۔ یہاں آکر اس منظر پر پردہ گر جاتا ہے 'کچھ نظر نہیں آتا 'کچھ معلوم نہیں اور منظر پر کوئی حرکت نظر نہیں آتی۔

اب صرف قدرت الٰہیہ ہی ہوتی ہے۔ علم الٰہی ہی ہوتا ہے۔ تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور اس امر میں اب کوئی شبہ نہیں رہتا بلکہ شبہ کا شائبہ تک نہیں رہتا نہ جدل ہے اور نہ حیلہ۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ (٥٦: ۸۵) "اس وقت تمہاری بہ نسبت ہم اس کے قریب ہوتے ہیں لیکن تم نہیں دیکھ سکتے۔" یہاں اب منظر پر شان باری ہے۔ اللہ کا خوف چھا جاتا ہے۔ اللہ تو ہر وقت حاضر و ناظر ہے لیکن قرآن کا یہ کمال ہے کہ وہ انسان کے خوابیدہ شعور کو جگا دیتا ہے چنانچہ مجلس موت پر اللہ کے شعوری حضور سے فضا زیادہ ہولناک ہو جاتی ہے جبکہ تمام لوگ ڈرے ہوئے سہمے ہوئے اور عاجز ہیں اور الوداع الوداع کا ماحول ہے۔

اسی فضا میں ایک چیلنج آتا ہے نہایت ہی کپکپانے والی 'پر تاسف 'پر فغاں محفل میں اور سخت حسرتناک ماحول میں اللہ کی طرف سے ایک چیلنج آتا ہے۔

فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ (۸٦) تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۸۷) (٥٦: ۸٦ ـ ۸۷) "اب اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو۔ اپنے خیال میں سچے ہو تو اس

وقت اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لاتے ۔" اگر بات اس طرح ہے جس طرح تم کہتے ہو کہ کوئی جزاء و سزا نہیں ہے اور تم آزاد ہو تو روح جب حلقوم کو آجائے تو وہاں سے لوٹا دو کیونکہ وہ تو حساب و کتاب دینے جارہی ہے اور تمہارے ہوتے ہوئے جارہی ہے تم بے بس کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہو وہ تو ایک بڑی ذمہ داری کا جواب دینے جارہی ہے اور تم خاموش اور بے بس کھڑے ہو۔

اب تمام حجتیں ختم ہو جاتی ہیں ۔ ہر دلیل رد ہو جاتی ہے ۔ ہر حیلہ اور ہر بہانہ ختم ہوتا ہے اور اس حقیقت کا دباؤ انسانی جسم اور عقل پر اور زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ دفاع کی قوت نہیں رکھتا ۔ اسے تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا الا یہ کہ وہ ہٹ دھرمی پر اتر آئے ۔

---

اب تھوڑا سا تبصرہ اس روح پر ہوتا ہے جو پرواز کر گئی ہے ۔ یہ حلقوم تک آئی' اس نے اس فانی زندگی پر آخری نظر ڈالی اور باقی رہنے والی دنیا پر نظر ٹکا دی اور اس میدان کی طرف سفر کر گئی ۔ جس میں ہر شخص سے باز پرس ہوگی جس کی یہ مکذبین تکذیب کر رہے ہیں :۔

فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (۸۸) فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ وَّ جَنَّتُ نَعِيْمٍ (۸۹) وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ (۹۰) فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ (۹۱) وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ (۹۲) فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ (۹۳) وَّ تَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ (۹۴) (۵۶: ۸۸ تا ۹۴) "پھر وہ مرنے والا اگر مقربین میں سے ہو تو اس کے لئے راحت اور عمدہ رزق اور نعمت بھری جنت ہے اور اگر وہ اصحاب یمین میں سے ہو تو اس کا استقبال یوں ہوتا ہے کہ سلام ہے تجھے تو اصحاب الیمین میں سے ہے اور اگر وہ جھٹلانے والے گمراہ لوگوں میں سے ہو تو اس کی تواضع کے لئے کھولتا ہوا پانی ہے اور جہنم میں جھونکا جاتا ۔"

سورۃ کے آغاز میں مقربین کے انعامات کا ذکر ہو گیا ہے ان کے لئے روح اور راحت ہے ۔ راحت ' رزق حسن اور نعمتوں والی جنت ۔ ان الفاظ ہی سے ان نعمتوں کی لطافت ظاہر ہے ۔ میٹھی راحت ' نرم اور نازک سہولیات اور محبت و اعزاز ۔

وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ (۵۶: ۹۰) "اگر وہ اصحاب یمین میں سے ہو ۔" تو ان کی طرف روئے سخن براہ راست ہوتا ہے ۔ اصحاب الیمین اسے خوش آمدید کہتے ہیں اور اس وقت یہ سلام کس قدر خوبصورت ہوگا ۔ اس کی روح ابھی نکلی ہی نہیں کہ سلام سنائی دیتا ہے ۔ ایسا جانیوالا مطمئن ہو کر جاتا ہے اور آنے والے زمانہ کی طرف مشتاق ہوتا ہے ۔

وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ (۹۲) فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ (۹۳) وَّ تَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ (۵۶: ۹۴) "اگر وہ جھٹلانے والے گمراہ لوگوں سے ہو تو اس کی تواضع کے لئے کھولتا ہوا پانی ہے اور جہنم

میں جھونکا جاتا ہے ۔" کیا ہی بری تواضع ہے ۔ گرم پانی اور عذاب جہنم ۔ وہ دور سے دیکھ رہا ہے کہ اسے اس جہنم میں جانا ہے ۔ روح قبض ہونے کے ساتھ ہی ۔

---()()---

اب بات انتہا کو پہنچ گئی ہے ۔ خاتمہ نہایت ہی نرم دھیمے آواز میں ۔ نہایت نیچی سروں میں ۔

إِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ (۹۵) فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (۹٦) (۵٦: ۹۵ تا ۹٦) "یہ سب کچھ قطعی حق ہے پس اے نبی "اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو ۔"

یہ آخری پر سوز تلقین ہے ۔ سچائی کے پلڑے میں وزن ڈالا جاتا ہے ۔ قلب مومن نے حق الیقین کر لیا ہے کہ واقعہ حق ہے اور ہونے والا ہے ۔ سورۃ ختم ہوتی ہے اور حکم دیا جاتا ہے ۔ "رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو" اور اسی سے نماز میں سبحان ربی العظیم جاری ہوا ۔

---()()---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ـــ ۲۷

## سورۃ الحدید ـ ۵۷

## ۱ ـــ تا ـــ ۲۹

# سورۃ الحدید ایک نظر میں

یہ پوری سورۃ ایک اسلامی جماعت کو دعوت ہے کہ وہ اپنے اندر حقیقت ایمان پیدا کرے۔ وہ حقیقت جس کے ساتھ وہ جماعت مسلم کے نفوس کو دعوت دین کے لئے خالص کر دے۔ اس طرح کہ وہ اس دعوت پر سب کچھ قربان کریں اور اس کی راہ میں کسی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ نہ جانی قربانی سے اور نہ مالی قربانی سے۔ تحریک کے کارکن اپنے دلوں کو تمام خلجانات اور تمام وسوسوں سے پاک کریں۔ یہ وہ مقام ہے جس پر پہنچ کر انسانی نفوس زمین پر رہتے ہوئے بھی ربانی بن جاتے ہیں۔ ان کے پیمانے اللہ کے پیمانے ہو جاتے ہیں اور ان کی وہ قدریں جن کو وہ اہم سمجھتے ہیں اور جن کے حصول کے لئے وہ ایک دوسرے سے آگے ہوتے ہیں وہ قدریں قرار پائیں جو اللہ کے ترازو میں وزن دار ہوں۔ پھر یہی وہ حقیقت ہے جو ذات باری کا شعور عطا کرتی ہے چنانچہ ذات باری کی یاد سے دل خضوع و خشوع اختیار کر لیتے ہیں اور وہ ہر اس رکاوٹ اور ہر اس جاذب نظر چیز کو دیکھ کر کانپ جاتے ہیں جو انہیں فرار الی اللہ سے روکنے والی ہو۔

اسی حقیقت کی اساس پر یہ سورۃ جماعت مسلمہ کو دعوت دیتی ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں مالی قربانی دے یعنی اللہ کی راہ میں جانی اور مالی قربانی دو۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِیْرٌ (۷) وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۸) هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (۹) وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (۱۰) (۵۷: ۷ تا ۱۰) "ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن میں اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔ جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور مال خرچ کریں گے ان کے لئے بڑا اجر ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے حالانکہ رسول

تمہیں اپنے رب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے اور وہ تم سے عہد لے چکا ہے۔ اگر تم واقعی ماننے والے ہو۔ وہ اللہ ہی تو ہے جو اپنے بندے پر صاف صاف آیتیں نازل کر رہا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق و مہربان ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ حالانکہ زمین و آسمان کی میراث اللہ ہی کے لئے ہے۔ تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا۔ ان کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔"

اس عظیم حقیقت کی اساس پر ایک اسلامی جماعت کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ خضوع اور خشوع کے ساتھ اللہ کو یاد کرے اور اس سچائی کا پاس رکھے اور اس کی اطاعت کرے اور انفاق فی سبیل اللہ بھی اس خدا خوفی کے نتیجے میں ہو اور اس کا داعیہ ایمانی حقیقت کے نتیجے میں پیدا ہو جو اس راہ میں ایمان کی پہلی حقیقت ہے۔ سب اعمال اسی سے پھوٹیں۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۵۷ : ۱۶) "کیا ایمان لانے والوں کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور اس کے نازل کردہ حق کے آگے جھکیں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی پھر ایک لمبی مدت ان پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہوگئے اور آج ان میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں۔"

سچائی کے ترازو میں دنیا اور آخرت دونوں کی قدر اور وزن دکھا دیا جاتا ہے اور جماعت اسلامی کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اس پلڑے میں اپنا وزن ڈالے جو قابل ترجیح ہو اور ان قدروں کو اختیار کرے جو باقی رہنے والی ہوں۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۱۷) اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ (۱۸) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۱۹) اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ

وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (۲۰) سَابِقُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۲۱) (۵۷: ۱۷ تا ۲۱) ”خوب جان لو کہ اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ ہم نے نشانیاں تم کو صاف دکھا دی ہیں۔ شاید کہ تم عقل سے کام لو۔ مردوں اور عورتوں میں سے جو لوگ صدقات دینے والے ہیں اور جنہوں نے اللہ کو قرض حسن دیا ہے، ان کو یقیناً کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لئے بہترین اجر ہے اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔ ان کے لئے ان کا اجر اور ان کا نور ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہے وہ دوزخی ہیں۔ خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک کھیل اور دل لگی ہے اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال اور اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی۔ اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہوگئے۔ پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہوگئی پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے۔ دنیا کی زندگی ایک دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں۔ دوڑو اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس کی جنت کی طرف س کی وسعت آسمان اور زمین جیسی ہے جو مہیا کی گئی ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہوں۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔“

اس سورت کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عظیم حقیقت کی طرف عمومی دعوت کے علاوہ یہ سورۃ اس وقت کے ایک عملی مسئلے کو بھی حل کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور یہ عملی مسئلہ اس وقت ۴ ھ سے لے کر فتح مکہ کے بعد کے زمانے تک مدینہ کی اسلامی سوسائٹی میں موجود تھا۔

اس دور میں اسلامی سوسائٹی میں ایک طرف تو سابق مہاجرین و انصار تھے جنہوں نے سچائی کی راہ میں جانی و مالی انفاق کی ایسی مثال پیش کی جس کو پوری انسانی تاریخ دہرانہ سکی۔ انہوں نے اپنے نفوس کے اندر ایمان کی حقیقت پیدا کی۔ انہوں نے جان و مال کی قربانی کی لازوال مثالیں پیش کیں۔ نہایت خلوص کے ساتھ اور کامل للہیت کے ساتھ۔ انہوں نے راستے کی تمام رکاوٹوں کو اور تمام پرکشش مواقع کو اپنے راہ سے ہٹایا اور اللہ تک پہنچ گئے۔

اس ممتاز اور یگانہ روزگروہ کے ساتھ ساتھ اسلامی جماعت میں ایسے لوگ بھی تھے جو ایمان کے ان مدارج تک پہنچے ہی نہ تھے۔ جن پر یہ گروہ پہنچ چکا تھا۔ خصوصاً فتح مکہ اور اسلامی غلبہ کے بعد لوگ اسلام میں فوج در فوج داخل ہوگئے تھے اور ان میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے ایمان کی حقیقت کا پوری طرح ادراک نہ کیا تھا اور نہ انہوں نے طویل ایمانی زندگی گزاری تھی اور نہ ہی ایمان کے لئے انہوں نے قربانیاں دی تھیں جس طرح یہ مذکورہ بالا خالص اور مخلص لوگ تھے۔

یہ نئے مسلمان ایسے تھے جن کے لئے انفاق فی سبیل اللہ ایک مشکل کام تھا اور اسلامی نظریہ کی طرف سے جان و مال کا انفاق کے جو تقاضے تھے ان کے لئے ان کا پورا کرنا مشکل تھا اور دنیاوی زندگی اور مال و متاع ان کی آنکھوں کو چکا چوند

کر رہا تھا۔ اس لئے وہ دنیا کی زندگی کے دھوکے اور جاہلیت سے باہر نہ نکل سکتے تھے۔

اس سورت میں زیادہ تر خطاب ایسے ہی لوگوں کو ہے جیسا کہ ہم نے اس سے قبل اس کے نمونے پیش کئے تاکہ ایسے لوگوں کو روحانی طور پر صاف کر کے ان کو ان گراوٹوں اور ان پرکشش چیزوں کی کشش کے دائرے سے نکالا جائے اور ان کو ان لوگوں کی سطح تک بلند کیا جائے جو ایمان کے درجہ کمال تک پہنچے ہوئے تھے۔ وہ درجہ جس میں اگر کوئی پہنچ جائے تو اس کے نزدیک زمین کی قدریں بے وزن ہو جاتی ہیں اور یہ ایمانی جذبہ ایمانی حرارت سے تمام رکاوٹوں کو پگھلا کر رکھ دیتا ہے۔

اس دور میں ایک دوسرا طبقہ بھی تھا۔ یہ ان دونوں گروہوں سے جدا تھا۔ یہ لوگ منافقین تھے۔ یہ اسلامی معاشرے میں گھل مل گئے تھے۔ ان کا ظاہری وجود تو نہ تھا بالخصوص اس وقت کے بعد جب اسلام جزیرہ عرب میں غالب ہو گیا اور منافقین سب زیر زمین چلے گئے اور اپنے بلوں میں گھس گئے۔ البتہ اسلام ظاہر کرنے کے باوجود ان کے دل نفاق سے آلودہ تھے۔ یہ مسلمانوں کے خلاف کسی بھی فتنے کے اٹھنے کے انتظار میں تھے۔ فتنے ان کو بہا کر لے گئے تھے۔ یہ سورۃ ان کی تصویر کشی کرتی ہے جبکہ قیامت کے دن ان کو مومنین سے جدا کر دیا جائے گا۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَى نُورُهُم بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِم بُشْرَاكُمُ الْيَوْمَ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (۱۲) يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِن نُّورِكُمْ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا فَضُرِبَ بَيْنَهُم بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِن قِبَلِهِ الْعَذَابُ (۱۳) يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُن مَّعَكُمْ قَالُوا بَلَى وَلَكِنَّكُمْ فَتَنتُمْ أَنفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ حَتَّى جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ وَغَرَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ (۱۴) فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنكُمْ فِدْيَةٌ وَلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مَأْوَاكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلَاكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۱۵) (۵۷: ۱۲ تا ۱۵) "اور اس دن جب تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا۔ (ان سے کہا جائے گا) "آج بشارت ہے تمہارے لئے" جنتیں ہوں گی جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ اس روز منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہو گا کہ وہ مومنوں سے کہیں گے "ذرا ہماری طرف دیکھو تاکہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھائیں" مگر ان سے کہا جائے گا "پیچھے ہٹ جاؤ اپنا نور کہیں اور تلاش کرو" پھر ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہو گا۔ اس دروازے کے اندر رحمت ہو گی اور باہر عذاب۔ وہ مومنوں سے پکار پکار کر کہیں گے "کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟" مومن جواب دیں گے "ہاں مگر تم نے اپنے آپ کو خو

فتنے میں ڈالا' موقع پرستی کی' شک میں پڑے رہے اور جھوٹی توقعات تمہیں فریب دیتی رہیں' یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آگیا اور آخر وقت تک وہ بڑا دھوکے باز (شیطان) تمہیں اللہ کے معاملہ میں دھوکہ دیتا رہا۔ لہٰذا آج تم سے نہ کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے جنہوں نے کھلا کھلا کفر کیا۔ تمہارا ٹھکانا جہنم ہے۔ وہی تمہاری خبرگیری کرنے والی ہے اور یہ بدترین انجام ہے۔"

اور ان لوگوں کے علاوہ جزیرہ عرب میں بعض یہودی و نصاری بھی موجود تھے۔ یہ سورت ان کے سابقہ کرتوتوں اور موجودہ حالات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسوقت جو صورت حال تھی اس کے مطابق جس طرح بعض مسلمانوں کو اس سے ڈرایا گیا تھا کہ وہ اہل کتاب کی طرح سنگ دل نہ ہو جائیں۔

كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ (۵۷ : ۱۶)

"اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی پھر ایک لمبی مدت ان پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہوگئے اور آج ان میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں۔" اور یہ اشارہ خصوصاً یہودیوں کی طرف تھا جبکہ نصاریٰ کی طرف سورۃ کے خاتمہ کے قریب اشارہ ہے۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۵۷ : ۲۷) "ان کے بعد ہم نے پے در پے رسول بھیجے اور ان کے بعد عیسیٰ ابن مریم کو مبعوث کیا اور ان کو انجیل عطا کی اور جن لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کرلی۔ ہم نے اسے ان پر فرض نہ کیا تھا مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انہوں نے آپ ہی بدعت نکالی اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہوئے تھے ان کا اجر ہم نے ان کو عطا کیا مگر ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔"

اس سورۃ کا مقصد یہ تھا کہ دلوں کے اندر حقیقت ایمانی پیدا کی جائے اور اس حقیقت کے نتیجے میں انسانی شخصیت میں جو خضوع و خشوع اور خدا خوفی' خلوص و تجرد' جذبہ جہاد اور جذبہ قربانی پیدا ہوتا ہے یہ اس سورۃ کا اصل محور اور ہدف تھا۔ تو اس سورۃ میں آغاز سے انتہا تک نہایت ہی موثر انداز میں نفوس کے اندر یہی حقیقت بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ ابتدائی اسلامی معاشرے میں اس حقیقت کو دلوں میں بٹھانے کی اشد ضرورت تھی جس طرح ہر اسلامی معاشرے میں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔

سورۃ کا پہلا پیراگراف ان موثرات کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کے اندر انسان کے دلوں کے سامنے اللہ کی یہ صفات پیش کی گئی ہیں کہ اللہ وحدہ اس کائنات کا اللہ ہے لہٰذا اسی کی تسبیح کرو' وہ اس کائنات کا مقتدر اعلیٰ ہے اور آخر کار تمام

چیزوں نے اسی کی طرف لوٹنا ہے اور اللہ تمام لوگوں کے دلوں کی باتوں سے واقف ہے اور تمام چیزیں اس کی عبادت کرتی ہیں۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (١) لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (٢) هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (٣) هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (٤) لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (٥) يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (٦) (٥٧ : ١ تا ٦) "اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو زمین و آسمانوں میں ہے اور وہی زبردست و دانا ہے۔ زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک وہی ہے۔ زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وہی اول بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ اس کے علم میں ہے جو زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمانوں سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو جو کام بھی تم کرتے ہو اسے وہ دیکھ رہا ہے۔ وہی زمین و آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے اور تمام معاملات' فیصلے کے لئے اس کی طرف رجوع کئے جاتے ہیں۔ وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔"

سورۃ کا یہ پہلا پیراگراف ہی اس بات کے لئے کافی ہے کہ اسے پڑھ کر دل دہل جائیں اور ان کے اندر خوف خدا تقویٰ اور ارتعاش پیدا ہو جائے جس طرح یہ اس بات کے لئے کافی ہے کہ دلوں کے اندر اللہ کے لئے خلوص کی رغبت پیدا ہو جائے۔ اللہ سے التجا کی جائے اور اللہ کے راستے میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے اور تمام بوجھ اتار پھینکے جائیں جو اس دعوت کے قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور انسان اللہ کی راہ میں قربانی دینے کے لئے جانی اور مالی کنجوسی سے نجات پالے لیکن اس مطلع کے علاوہ پوری سورۃ کے اندر بھی جگہ جگہ ایسی موثر آوازیں ہیں جو اسی غرض کی نوید ہیں۔ مثلاً مومنین اور مومنات کی ایک نہایت ہی روشن تصویر کھینچی گئی ہے۔

يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (٥٧ : ١٢) "ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف چل رہا ہوگا۔" اور وہ تصویر جس میں اس دنیا کے مال و متاع کو نہایت ہی حقیر بتلایا گیا ہے اور آخرت کی قدروں کو

اہمیت دی گئی ہے اس طرح دلوں کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ اس دنیا کے تمام امور اللہ کی مشاء سے طے پاتے ہیں اور اس پوری کائنات کو اللہ گھیرے ہوئے ہے۔

مَآ اَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِي كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۲۲) لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۲۳) الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۲۴) (۵۷: ۲۲ تا ۲۴) ’’کوئی مصیبت ایسی نہیں جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پہ نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب (یعنی نوشتہ تقدیر) میں لکھ نہ رکھا ہو۔ ایسا کرنا اللہ کے لئے بہت آسان کام ہے (یہ سب کچھ اس لئے ہے) تاکہ جو کچھ نقصان بھی تمہیں ہو اس پر تم دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ بھی اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جاؤ۔ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل پر اکساتے ہیں۔ اب اگر کوئی روگردانی کرتا ہے تو اللہ بے نیاز ہے اور ستودہ صفات ہے۔‘‘ تاکہ نفس انسانی قرار پکڑے اور اس کو جو خیر و شر پیش ہو اس پر مطمئن ہو۔ یہی اللہ کا راستہ ہے لہٰذا غم پر جزع فزع نہ ہو اور خوشی پر تکبر نہ ہو۔ یوں ایک مسلم خوشی اور غم دونوں کے مقابلے میں سنجیدہ ردعمل ظاہر کرتا رہے اور وہ اللہ کے ساتھ کسی سبب کو کسی حال کو اور کسی حادثہ کو شریک نہ کرے کہ ان کی وجہ سے یوں ہوا اور ووں ہوا۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور تقدیر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔

اس سورۃ میں ’ جیسا کہ ہم نے آغاز بحث میں کہا دو پیراگراف ہیں۔ دونوں اپنے موضوع اور محور کے گرد گھومتے ہیں۔ اب تفصیل آیات اور تشریحات :۔

---○○○---

# درس نمبر ۲۵۶ تشریح آیات

## ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۵

سُوْرَةُ الْحَدِيْدِ (۵۷) مَدَنِيَّةٌ (۹۴)
اٰيَاتُهَا ۲۹ رُكُوْعَاتُهَا ۴
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ
وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۳ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ
وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ
مَا كُنْتُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۴ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِلَى
اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۵ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۭ وَهُوَ
عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۶

”اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو زمین اور آسمانوں میں ہے اور وہی زبردست اور دانا ہے ۔ زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک وہی ہے ' زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۔ وہی اول بھی ہے اور آخر بھی ' اور ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے ۔ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا ۔ اس کے علم میں ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے ۔ وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو جو کام بھی تم کرتے ہو اسے وہ دیکھ رہا ہے ۔

وہی زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے اور تمام معاملات فیصلے کے لئے اس کی طرف رجوع کیے جاتے ہیں ۔ وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے ۔"

یہ ایک طے شدہ اور نہایت ہی اشاراتی مطلع اور آغاز کلام ہے جو براہ راست دلوں کو اپنی گرفت میں لیتا ہے اور ہمیں خوب جھنجھوڑتا ہے' خوب دباتا ہے اور ان کو لے کر ہر طرف گھماتا ہے ۔ اس کائنات کی سیر کراتا ہے ۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ہر طرف اللہ ہی اللہ ہے ۔ یہ دل اللہ ہی کو محسوس کرتے ہیں ۔ اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ ان کو نظر نہیں آتی ۔ اللہ کے سوا کوئی جائے فرار نظر نہیں آتی ۔ اللہ کے دائرہ علم سے وہ نہیں نکل سکتے ۔ اللہ کی طرف رجوع کے سوا کوئی جائے قرار نہیں ہے اور جہاں بھی وہ جاتے ہیں اللہ کا وجہ کریم نظر آتا ہے ۔

اس مطلع میں خصائص ربوبیت پر بحث کی گئی ہے جو اس کائنات میں فعال' موثر اور اس کی خالق ہے ۔ ہر چیز کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے ۔ ہر چیز پر وہ محیط ہے ۔ ہر چیز کی علیم ہے ۔ یہ ذات اس پوری کائنات کی پیدا کرنے والی ہے ۔ انسان کے دلوں کے رازوں کو جاننے والی ہے ۔ دلوں کے خفیہ رازوں کو جانتی ہے اور وہ اس پوری کائنات اور پوری انسانیت کی نگران ہے ۔

اس سورۃ کا آغاز یوں تعریف ذات باری سے ہوتا ہے اور یہ پوری کائنات اللہ کی تسبیح کرنے لگتی ہے ۔ زمین و آسمان کی ہر چیز گنگنا رہی ہے اور ہر دل جو ہدایت کے لئے کھلا ہے' وہ اسے خود سن رہا ہے ۔ اگر اس پر حجاب پڑا ہوا نہ ہو ۔ اس آیت کو اپنے ظاہر مفہوم سے بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اللہ کا فرمان ایسا ہی ہے اور ہم اس کائنات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے' اس لئے اللہ جو کچھ فرماتا ہے اس کائنات کے خصائص بعینہ ویسے ہیں جس طرح ہمیں اللہ نے بتائے ہیں ۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۷ : ۱) تو اس کے معنی یہی ہیں کہ "اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو زمین اور آسمانوں میں ہے ۔" اس لئے اس میں کوئی تبدیلی اور تغیر نہیں ہے ۔ لہذا ہمیں یقین کر لینا چاہئے کہ آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے اس کی ایک روح ہے اور یہ روح کائنات اپنے خالق کی تسبیح کرتی ہے اور یہی وہ مفہوم ہے جس کی تصدیق صحیح آثار و احادیث میں بیان کی گئی ہے ۔ جیسا کہ بعض اہل دل کے تجربات بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں جس وقت یہ دل اپنی صفائی اور اشراق کی حالت میں ہوتے ہیں اور وہ اس حقیقت سے متصل اور مربوط ہو جاتے ہیں جو اشیاء میں چھپی ہوتی ہے جو ان تمام چیزوں اور ان کی شکلوں کے پیچھے ہے یعنی روح کائنات ۔

قرآن کریم میں ہے ۔

يَا جِبَالُ اَوِّبِي مَعَهُ وَالطَّيْرُ لہذا پہاڑ اور پرندے حضرت داؤد کے لئے یکساں تھے اور حدیث میں آیا ہے امام مسلم نے جابر ابن سمرہ کی روایت نقل فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔

ان بمكه حجرا كان ليسلم علي ليالي بعثت و اني لاعرفه الان "مکہ میں ایک پتھر ہے جو مجھ پر ان دنوں سلام کہتا تھا جب مجھے نبی بنا کر بھیجا گیا تھا اور وہ مجھے اب بھی معلوم ہے ۔"

امام ترمذی نے اپنی سند سے 'حضرت علی ابن ابو طالب سے روایت کی ہے "میں رسول اللہ کے ساتھ مکہ میں تھا' ہم مکہ کے اطراف میں سے ایک طرف میں نکل گئے ۔ رسول اللہ کے سامنے جو درخت اور پتھر پہاڑ بھی آیا اس نے کہا السلام علیک یا رسول اللہ" کہا اور امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ حضرت انس ابن مالک سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ایک کھجور کے تنے کے پہلو میں خطبہ دیا کرتے تھے ۔ جب انہوں نے حضور کے لئے منبر بنا لیا اور حضور نے اس پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا تو کھجور کے تنے نے اس طرح فریاد کی جس طرح اونٹنی فریاد کرتی ہے ۔ رسول اللہ منبر سے اترے اور اس پر ہاتھ پھیرا تو وہ خاموش ہو گیا ۔

اس حقیقت کے اظہار میں خود قرآن کی آیات صریح ہیں ۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ (۲۴ : ۴۱) "کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں' اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اڑ رہے ہیں؟ ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے ۔" اور دوسری جگہ ہے ۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ (۲۲ : ۱۸) "کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کے آگے سر بسجود ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں' سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان ۔"

وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ "کوئی چیز ایسی نہیں ہے اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو ۔" لہذا اس قسم کی نصوص کی تاویل کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ خصوصاً اس مقصد کے لئے کہ ہم ان آیات کو ایسے اصول موضوعہ کے ساتھ موافق کر دیں جو قرآن سے ماخوذ نہیں ہیں ۔ اس لئے کہ اس دنیا کے تمام موضوعات کو اس قرآن کے ساتھ مطابق ہونا چاہئے جو یقیناً خالق کی طرف سے نازل ہوا ہے اور ہمارے بنائے ہوئے اصول شکی ہیں اور ہمارے بنائے ہوئے ہیں ۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۵۷ : ۱) (اور وہ زبردست اور دانا ہے) زمین و آسمان کی مخلوقات اس کی تسبیح اس لئے کرتی ہے کہ وہ زبردست اور دانا ہے اور اس کی حکمت انتہائی حکمت ہے قائل ہے وہ اپنی قوت قاہرہ کے ذریعہ تمام اشیاء پر حاوی ہے اور اس نے ہر چیز کو اپنی حکمت کے مطابق تخلیق کیا ہے ۔

ابھی اس افتتاحی آیت کا فیض عام جاری تھا اور ہم پوری کائنات کے ساتھ جشن تسبیح میں مصروف تھے کہ سیاق کلام میں کائنات بالا کا ایک نیا سفر شروع ہو گیا ۔

لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۵۷ : ۲)

"زمین اور آسمان کی سلطنت کا مالک وہی ہے' زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے اور ہرچیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

آسمان اور زمین کی ہرچیز نے تسبیح کی ہے اللہ کی' جو مالک سموت والارض ہے اور اس کی ملکیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ پس یہ تسبیح ہے از جانب غلام بحق آقا۔ یہ مالک کوئی دنیاوی مالک نہیں ہے۔ یہ تو موت و حیات کا بھی مالک ہے۔ وہ موت و حیات کا بھی خالق ہے۔ اس نے ہر زندہ کے لئے حیات اور ہر مرنے والے کے لئے موت مقدر کر دی ہے۔ لہذا حیات و ممات اس کی تقدیر کے مطابق ہوتے ہیں۔

حیات ابھی تک تو راز ہے اس کا سرچشمہ بھی اللہ کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ آج تک کوئی اللہ کے سوا اور کوئی سرچشمہ حیات نہیں بتا سکا نہ کوئی اس کی کیفیت آمد بتا سکا ہے اور یہ تو بڑی باتیں ہیں آج تک انسان حیات و ممات کی حقیقت بھی نہیں سمجھ سکے کہ یہ کیا ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ ہی حیات دیتا ہے۔ ہر زندہ چیز کو حیات اللہ ہی دیتا ہے۔ کوئی شخص آج تک اس کا انکار نہیں کر سکا اور نہ اس کی ضد کو ثابت کر سکا ہے۔ اس طرح موت بھی ایک راز ہے جس کے اوپر پردے ہیں۔ کوئی شخص موت کی طبیعت اور ماہیت کو بھی نہیں جانتا۔ کوئی شخص موت کو پیدا نہیں کرتا کیونکہ جو حیات نہیں دے سکتا وہ اسے سلب بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سب چیزیں اللہ کی ملکیت مطلقہ ہیں۔ اس لئے زمین و آسمان میں جو چیزیں بھی ہیں ان کو حیات بھی وہی دیتا ہے اور ان کو ممات بھی وہی دیتا ہے۔

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۵۷ : ۲) "اور وہ ہرچیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ وہ ہرچیز پر قادر ہے بغیر حدود و قیود کے۔ اس کی مشیت مطلق ہے کسی حد و قید کے اندر محدود و مقید نہیں ہے۔ اس کی مشیت کا رابطہ ہرچیز سے ہوتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے' ہوتا ہے۔ انسانی عقل اللہ کی قدرت پر اگر کوئی بندش لگاتی ہے خواہ جس رنگ میں ہو اور جس قسم کی ہو' جس انداز کی ہو وہ باطل ہے۔ وہ عقل بشری کی پیداکردہ سوچ ہے جو بذات خود محدود ہے۔ اور اللہ کی مشیت نے اس کائنات کے لیے جو قوانین قدرت اور نوامیس فطرت مقرر کیے ہیں۔ وہ اللہ کی مشیت مطلقہ میں داخل ہیں کہ وہ بلاحدود و قیود کام کر رہی ہے۔ کیونکہ اللہ کی مشیت ان نوامیس فطرت کو آزادی سے اختیار کرتی ہے۔ اور ان قوانین قدرت کو اللہ کبھی کبھی توڑتا بھی ہے۔

قرآن کریم نے اس نکتے کو بہت اہمیت دی ہے۔ بار بار اس بات کی تصریح کی جاتی ہے کہ اللہ ہرچیز پر قادر ہے اور یہاں تک کہ وہ خود اپنے بنائے ہوئے قوانین قدرت کے اجراء کو بھی روک سکتا ہے۔ تاکہ یہ حقیقت واضح ہو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اس میں کسی شے کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ اللہ نے اہل جنت کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور اہل جہنم کے ساتھ یہ وعدہ کیا کہ وہ جہنم میں رہیں گے اور یہ وعدہ اللہ کی مشیت کے نتیجے میں صادر ہوا ہے لیکن اللہ نے اپنی آزادی کو اس عہد کے دائرے سے ہی خارج رکھا ہے اور مستثنیٰ کیا ہے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ "وہ اس میں ہمیشہ کے لیے رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے"۔ جہاں بھی اس قسم کی بات آئی وہاں الا ماشاء اللہ کے الفاظ آئے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ خود اپنے فیصلوں کا پابند نہیں ہے۔ اس سلسلے میں عقلی گھوڑے

دو ڑانا جائز نہیں ہے۔ قرآن ہی اصل سرچشمہ ہے۔

اس آیت کے ذریعہ اس پوری کائنات پر اللہ کے اقتدار اعلیٰ اور مطلق مشیت کو ثابت کیا گیا ہے چونکہ وہ قادر مطلق ہے اس لیے اس کی تسبیح بھی ہر چیز کرتی ہے۔

اللہ کے اقتدار بے قید کے ثبوت اور اس کے فیضان عام سے اس کائنات کے جام جام کو لبالب کر دینے کے بعد اب ایک دوسری عظیم حقیقت سامنے لائی جاتی ہے۔ یہ کہ اللہ کے سوا باقی چیزوں کا وجود ہی اصلی نہیں ہے۔ موجود حقیقی اور واجب الوجود صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی تمام عالم کو محیط ہے اور وہی ہر چیز کا علیم ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۵۷ : ۳) "وہی اول ہے اور آخر بھی ہے اور ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے" وہ اول یوں ہے کہ اس سے ماقبل کوئی چیز نہیں ہے۔ آخر یوں ہے کہ اس کے بعد کوئی چیز نہ ہوگی وہ ظاہر ہے یعنی اس کے اوپر کوئی چیز نہیں ہے اور وہ باطن ہے یعنی اس سے نیچے کوئی شئی نہیں ہے۔

اول اور آخر کے الفاظ حقیقت زمانیہ کا استیعاب کرتے ہیں اور ظاہر اور باطن حقیقت مکانیہ کا استیعاب کرتے ہیں۔ مطلقاً ہر زمانے میں وہ موجود ہے اور مطلقاً ہر مکان میں وہ موجود ہے۔ اور کسی زمان و مکان میں قید نہیں ہے۔ اس تصور کے مطابق صرف وہی ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں ہے اور ہمارا قلب اور ہمارا تصور بھی اسی سے وجود لفظ کرتا ہے۔ لہذا وجود الٰہی ہی حقیقی وجود ہے اور اللہ ہی حق ہے اور اللہ ہی حقیقت ہے اور کوئی حقیقت ہے تو وہ اللہ سے مستفاد ہے۔ نہ کسی اور کے پاس ذاتی حقیقت ہے اور نہ ذاتی وجود ہے' اس پوری کائنات میں۔

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۵۷ : ۳) "اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔ وہ حقیقی اور کامل علم رکھتا ہے۔ اس لیے کہ تمام اشیاء کی حقیقت تو ادھر ہی سے آئی ہوئی ہے لہذا اللہ کے ذاتی علم میں ہے۔ اور اللہ کا علم ایسا ہے کہ اس کی حقیقت' اس کی نوعیت اور اس کی صفات میں کوئی بھی شریک نہیں۔ کسی اور کے پاس ایسا علم نہیں ہے۔ چاہے مخلوق کو جس قدر ظاہری معلومات بھی ہوں۔

جب کسی دل میں یہ حقیقت بیٹھ جاتی ہے تو اسے پھر اللہ کی ذات کے سوا کسی اور چیز کی پرواہ ہی نہیں رہتی۔ کوئی چیز یہاں تک کہ انسانی قلب و عقل کوئی حقیقت اور کوئی وجود نہیں رکھتے مگر وہی جو اس حقیقت کبریٰ نے عطا کیا ہوتا ہے۔ ہر چیز وہم ہے' جانے والی ہے۔ صرف اللہ ہی باقی رہنے والا ہے۔ اور وہی ایک حقیقی وجود ہے۔

جب کوئی دل اس حقیقت کو اپنے اندر بٹھالے تو وہ اس حقیقت تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ وہ ایک نہایت ہی بلند مرتبہ سکون و قرار تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن جب تک وہ اس رتبہ حصول الی الحقیقت پر فائز نہیں ہو جاتا اسے چاہئے کہ وہ اس آیت پر تدبر کرتا رہے اور یہ کوشش کرتا رہے کہ وہ اس کے مدلول اور حقیقت تک پہنچ جائے' اس آیت کا مفہوم ہی بڑی حقیقت ہے۔

اہل تصوف نے اسی حقیقت' عظیم حقیقت کو پکڑ لیا۔ انہوں نے اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا اور اس میں انہوں نے کئی کئی راستے نکالے۔ بعض نے کہا کہ وہ اس کائنات کی ہر چیز میں اللہ کو دیکھتے ہیں۔ بعض نے کہا انہوں نے دیکھا کہ ہر چیز

کے پیچھے اللہ کھڑا ہے ۔ بعض نے کہا کہ اس نے اللہ کو دیکھا ہے اور اس کائنات میں تو اسے اللہ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر ہم الفاظ کی کمی بیشی اور الفاظ کی تنگ دامانی کو نظرانداز کر دیں تو یہ سب اقوال اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں ' لیکن متصوفین پر جو تنقید کی جا سکتی ہے ۔ وہ صرف یہ ہے انہوں نے اس تصور کو اپنے اوپر اس قدر طاری کر دیا ہے کہ عملی زندگی کو معمل کر دیا ۔ جبکہ اسلام کا متوازن انداز یہ تھا کہ انسان کے دل و دماغ اس حقیقت کو اخذ کریں' اس کے اندر رہیں اور بسیں لیکن وہ اس کرۂ ارض پر فریضہ خلافت بھی ادا کریں جس کے لیے اللہ نے ان کی تخلیق کی ہے ۔ اور اس کے تمام تقاضے پورے کریں جن میں سے بڑی چیز یہ ہے کہ وہ اس کائنات میں وہ نظام زندگی قائم کریں جو اللہ نے اس قرآن میں نازل فرمایا ہے ۔ اس خیال سے کہ اس عظیم حقیقت کے تصور ہی کے مطابق اس دنیا میں انسان کو اپنی زندگی بسر کرنی ہے ۔ یہ نظام فطرت انسانی کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔ کائنات کی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہے جس طرح اللہ نے اسے پیدا کیا ہے اور جس طرح اس نے قرآن کو بطور ہدایت نامہ بھیجا ہے ۔

---ooo---

اس عظیم حقیقت کو قلب میں بٹھانے کے بعد اب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس حقیقت کبریٰ کا ظہور اس کائنات میں کیونکر ہوا؟

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (٤) لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (٥) یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَهُوَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (٦) (٥٧: ٤ تا ٦) "وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ اس کے علم میں ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو' جو کام بھی تم کرتے ہو' اسے وہ دیکھ رہا ہے ۔ وہی زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے اور تمام معاملات فیصلے کے لیے اسی کی طرف رجوع کیے جاتے ہیں ۔ وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے"۔

زمین و آسمان کی تخلیق کی حقیقت' عرش پر استوا کی حقیقت اور پوری مخلوقات کا احاطہ اور کنٹرول اور ان تمام اشیاء کا علم اور یہ حقیقت کہ اللہ ہر چیز کے ساتھ موجود ہے جہاں بھی وہ ہو ۔ اور یہ کہ تمام امور کا مرجع اللہ کی طرف ہے ' اور یہ کہ وہ اس پوری کائنات میں متصرف ہے ۔ اور یہ کہ وہ دلوں کے رازوں اور سوچوں کو بھی جاننے والا ہے ۔ یہ سب حقائق اسی بڑی حقیقت سے نکلے ہوئے ہیں جس کا اوپر ذکر ہوا۔ لیکن ان چیزوں کو دوبارہ اس کائناتی جزئیات کے ساتھ متعلق کر کے ذکر کرنے کا قلب پر اثر ہوتا ہے اور اس پر قدرت الٰہیہ کا پرتو پڑتا ہے ۔ یہ آسمان اور یہ زمین اور یہ عظیم

کائنات جب انسانی سوچ کا مرکز بنتے ہیں تو اپنی عظمت اور جلالت کے باعث 'اپنی خوبصورتی اور نظام کے باعث 'اپنے پیچیدہ نظم و نسق کے باعث 'اپنی منظم حرکات کے باعث 'اپنے تسلسل کی وجہ سے یہ انسانی قلب و نظر کو بے حد متاثر کرتے ہیں ۔ پھر یہ مخلوقات بھی انسانوں جیسی مخلوق ہیں لہٰذا انسانی دل ان کے ساتھ ایک قسم کا انس اور محبت رکھتا ہے 'جب انسان کا دل و دماغ اس عظیم کائنات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہیں تو فکر و نظر کی تاروں پہ ضربات پڑتی ہیں اور ان سے نئے نئے فکری زمزمے نکلتے ہیں ۔ انسان ان کی طرف کان دھرتا ہے 'بڑے غور سے سنتا ہے 'مسحور ہو جاتا ہے ۔ یہ نغمے اسے کیا پیغام دیتے ہیں کہ اللہ جس نے ان کو پیدا کیا ہے 'اس نے اس کو بھی پیدا کیا ہے ۔ یہ سب چیزیں اللہ کی تسبیح کرتی ہیں اور انسان بھی اللہ کی تسبیح کرتا ہے ۔ یہ چیزیں بتاتی ہیں کہ ہم نے بھی اپنا وجود خالق کائنات سے لیا ہے اور تم نے بھی ۔ لہٰذا اس کائنات میں صرف وہی ایک حقیقت ہے جو اہم ہے ۔

یہ چھ دن کیا ہیں ؟ ان کی حقیقت بھی صرف اللہ ہی جانتا ہے ۔ ہمارے دنوں کی حقیقت ہی کیا ہے ؟ یہ تو سورج کے سامنے زمین کی گردش محوری کا نتیجہ ہیں ۔ اور یہ سورج اور یہ زمین تو اللہ کے ایام کے بعد وجود میں آئے ہیں ۔ لہٰذا یہ وہ ایام نہیں ہیں جن میں اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ۔ لہٰذا اس کو بھی اللہ پر چھوڑ دیں جب چاہے گا ہمیں بتا دے گا ۔

اور یہ عرش الٰہی 'ہم اس پر اس طرح ایمان لاتے ہیں جس طرح اللہ نے اس کا تذکرہ کیا ہے اور اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں ۔ رہی یہ بات کہ اللہ نے عرش پر استوا حاصل کیا تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس سے مراد اس کائنات پر مکمل کنٹرول ہے ۔ کیونکہ قرآن مجید نے یہ بات واضح طور پر کہہ دی ہے کہ اللہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل نہیں ہوتا ۔ اس لیے کبھی ایسا نہ تھا کہ وہ کسی وقت عرش پر نہ ہو اور بعد میں متمکن ہوا ہو ۔ اور یہ بات کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور ہمیں اس کی کیفیت معلوم نہیں ہے 'یہ ایک ایسی بات ہے جو ۔

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (۵۷ : ۴) "پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا" کی تشریح نہیں کرتا ۔ لہٰذا اسے اس کائنات کے اقتدار اعلیٰ اور کنٹرول سے کنایہ کہنا چاہئے اور اس قسم کی تفسیر سے اس اصول کی خلاف ورزی نہیں ہوتی جو ہم نے ابھی بیان کیا ہے ۔ کیونکہ اس کنایہ میں ہم نے اپنا کوئی خیال پیش نہیں کیا بلکہ قرآن کی ایک طے شدہ حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ مبہم ہے ۔ اور اس تصور کی طرف اشارہ کیا ہے جو ذات باری خود دیتا ہے ۔

تخلیق اور کنٹرول اور مکمل علم کے ساتھ 'یہ آیت اس حقیقت کو ایک ایسی تصویری انداز میں پیش کرتی ہے کہ قلب و نظر اس میں گم ہو جاتے ہیں 'یہ تصویر بہت وسیع ہے 'بلکہ یہ تصویر مسلسل حرکت میں ہے 'یہ حرکت کسی بھی وقت رکتی نہیں ہے ۔ یہ محض تصوراتی تصویر نہیں ہے اور نہ شعلہ خیال ہے بلکہ ایک موثر اشاراتی رنگ ہے جو انسانی دل و دماغ کے ہر پہلو کو بھر دیتا ہے 'اس سے انسان کے دل دھڑکتے ہیں 'خیال کی لہریں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں اور فکر کے سوتے پھوٹتے رہتے ہیں ۔ ذرا غور سے پڑھئے :

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا

(۵۷ : ۴) "اس کے علم میں ہے جو زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے '

اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے"۔ ہر لمحہ زمین کے اندر جاندار اور بے جان چیزوں کی بے شمار تعداد داخل ہوتی ہے۔ اور اسی طرح ہر لحظہ زمین سے۔ لاتعد ولاتحصی زندہ اور غیر زندہ اشیاء نکلتی ہیں۔ آسمان سے جو بارشیں برستی ہیں جو شعاعیں یہاں مختلف ستاروں سے پہنچتی ہیں' شہاب ثاقب جو گرتے ہیں' فرشتے جو اترتے ہیں راز اور اقدار جو اترتی ہیں اور جو چیزیں آسمانوں میں چڑھتی ہیں' جو نظر آتی ہیں اور جو نظر نہیں آتیں جن کی تعداد کا علم صرف اللہ کو ہے۔ غرض یہ مختصر سی آیت ایک مسلسل حرکت کی طرف خیال کو پھیرتی ہے جو کبھی منقطع نہیں ہے اور ان بڑے بڑے واقعات کی طرف اشارہ کرتی ہے جن کی تعداد معلوم نہیں ہے۔ اور انسان کا خیال مسلسل اس حرکت کے ساتھ چپک جاتا ہے کیونکہ زمین میں ہر وقت چیزیں داخل ہو رہی ہیں۔ اور آسمان کی طرف ہر وقت چیزیں چڑھ رہی ہیں۔ اس طرح انسان اللہ کے علم کی وسعت سے متاثر رہتا ہے۔ جب انسان ان لاتعداد چیزوں کو دیکھتا ہے اور شمار نہیں کر سکتا۔

اگر کوئی دل اس حقیقت کی طرف دائما التفات رکھے تو وہ اللہ کی معیت میں زندگی بسر کر سکتا ہے۔ وہ اس کی مملکت میں سیر کر سکتا ہے' جبکہ اس کا جسم اپنی جگہ برقرار ہو گا' وہ اس کائنات کی وادیوں کی سیر کر سکتا ہے اور وہ نہایت حساسیت اور صاف و شفاف سوچ کے ساتھ نہایت خوف و تقویٰ کی حالت میں ملکوت سماوات میں گھوم پھر سکتا ہے۔

ابھی پڑھنے والا ان خیالات کے ساتھ زمین و آسمان کی وادیوں میں گھوم رہا تھا کہ قرآن نے اس کا دامن پکڑ لیا کہ ذرا اپنی ذات کی وادی میں بھی سیر کرو' جب وہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ اپنی ذات کی وادیوں میں گھومتا ہے تو باری تعالیٰ کو وہاں بھی موجود پاتا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے وہ جانتا ہے اور وہ بہت قریب ہے شہ رگ سے بھی زیادہ!

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۵۷: ۴) "وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو جو کام بھی تم کرتے ہو اسے وہ دیکھ رہا ہے"۔ یہ کوئی مجاز نہیں ہے' یہ ایک حقیقت ہے۔ اللہ ہر کسی کے ساتھ موجود ہے۔ ہر چیز کے ساتھ موجود ہے۔ ہر وقت موجود ہے۔ ہر مکان میں موجود ہے۔ وہ بندوں کے ہر عمل سے خبردار ہے اور دیکھتا ہے اگر کوئی صرف اس حقیقت کو دل میں بٹھا لے تو یہ ایک عظیم حقیقت ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ ایک پہلو سے انسان کو سراسیمہ کر دیتی ہے اور ایک پہلو سے انسان کو امید اور محبت عطا کرتی ہے۔ بس یہی ایک حقیقت اگر کسی انسان کے قلب میں بیٹھ جائے تو اسے بلند کرنے اور پاک و صاف کرنے کے لیے یہ کافی ہے۔ انسان اس دنیا کی تمام دلچسپیوں اور مطلب پرستیوں سے دامن چھڑا کر اللہ کا ہو جاتا ہے اور پھر وہ ہر معاملے میں بہت محتاط' خشیت اور خوف خدا سے سرشار اور ہر گندگی میں پڑنے سے رک جاتا ہے کیونکہ اس کو اللہ سے حیا آتی ہے۔ اب وادی ملکوت السموات والارض کی سیر ایک دوسرے زاویہ سے۔ یہ سیر ذرا اس سیر سے مختلف قسم کی ہے جو پہلے مذکور ہوئی۔

لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ (۵۷: ۵) "وہی زمین و آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے اور تمام معاملات فیصلے کے لیے اس کی طرف رجوع کیے جاتے ہیں"۔ سماوات اور ارض کا ذکر پہلے تخلیق کے سلسلے میں ہوا اور حیات و ممات کے نقطہ نظر سے ہوا۔ اور قضا و قدر کے زاویہ سے ہوا۔ یہاں اس زاویہ سے کہ ان کے فیصلے اللہ بادشاہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ جب اللہ ہی مالک ہے تو فیصلے کرنا بھی اس کے اختیار میں ہے۔

جب انسان میں یہ شعور پختہ ہو جائے تو پھر وہ ہر معاملے میں اللہ کی رضا دیکھتا ہے۔ اپنے کاموں کے آغاز میں بھی اور انتہا میں بھی وہ دیکھتا ہے کہ اللہ کی مرضی کیا ہے۔ یہ شعور انسان کو غیر اللہ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور ہر معاملے میں اللہ کا نیاز مند کر دیتا ہے اور اسے تنہائی میں اور سوسائٹی میں ہر جگہ اللہ کی راہ پر گامزن کر دیتا ہے۔ اس کی حرکت اور سکون' اس کا مشورہ اور اس کی سوچ سب اللہ کی نگرانی میں ہوتی ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ اسے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں اور اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔

اس سورہ کا یہ پہلا پیراگراف ایک ایسی حرکت پر ختم ہوتا ہے جو اس کائنات میں دست قدرت کا مظہر ہے' جو انسانی ضمیر کی گہرائیوں تک اترتی ہے۔

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ هُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۵۷ : ۶) "وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے"۔ رات کا دن میں داخل ہونا اور دن کا رات میں داخل ہونا ایک مسلسل حرکت ہے' لیکن یہ نہایت ہی لطیف حرکت ہے' بظاہر پر سکون نظر آتی ہے۔ اس کے معنی چاہے یہ ہوں کہ رات اور دن چھوٹے بڑے ہوتے رہتے ہیں' رات کا ایک حصہ دن کو دیا جاتا ہے یا دن کا ایک حصہ چھوٹا کر کے رات کو دیا جاتا ہے' یا طلوع و غروب کے وقت ان کا باہم تداخل مراد ہو' لیکن یہ ایک مسلسل لطیف حرکت ہے۔ اور دلوں کے اندر ایک حرکت ہے۔ اور یہ خیال کی حرکت ہے۔ اور یہ ہر وقت دل میں ہوتی ہے۔ دلوں والی ہے' یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہے۔ یہ انسانی شعور کہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے' جو رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے' نہایت ہی لطیف شعور ہے۔ اور یہ شعور کہ اللہ دلوں کے لطیف ترین اور مخفی تصورات کو بھی جانتا ہے' ایک عظیم چیز ہے!

---○○○---

اس سورت کا یہ پہلا پیراگراف انسانی احساس کو اس قدر تیز کر دیتا ہے کہ اب وہ ہدایات لینے کے لیے تیار ہے۔ لہٰذا اب اسلامی جماعت کو حکم دیا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اور مناسب وقت میں انفاق فی سبیل اللہ کا مظاہرہ کرو۔ یہ ہدایت ایسے حالات میں دی جاتی ہے کہ انسان کا اندرونی اور اس کے قلب کی طرف جانے والے تمام راستوں کے دروازے کھلے ہیں' اس کا شعور بیدار ہے' وہ سننے کے لیے بے تاب ہے۔ چنانچہ ابھی حالت میں یہ پکار آتی ہے۔ لیکن یہ بھی اپنے اندر نہایت اثر انداز ہونے والے دلائل' اور جھنجھوڑنے والی تنبیہات کے ساتھ آتی ہے۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝ وَ مَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَ قَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ
اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹﴾ وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ
الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ
وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۰﴾ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ ع ۱۰
اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَ لَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۱﴾ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ ۱۷
الْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾ يَوْمَ
يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ
ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ
الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا
بَلٰى وَ لٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَ تَرَبَّصْتُمْ وَ ارْتَبْتُمْ وَ غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى
جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّ لَا
مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾

"ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔ جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور مال خرچ کریں گے ان کے لیے بڑا اجر ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے حالانکہ رسول تمہیں اپنے رب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے اور وہ تم سے عہد لے چکا ہے۔ اگر تم واقعی ماننے والے ہو۔ وہ اللہ ہی تو ہے جو اپنے بندے پر صاف صاف آیتیں نازل کر رہا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے۔ تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد

کریں گے وہ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے۔ جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے۔ ان کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے۔ اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض 'تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے اور اس کے لیے بہترین اجر ہے۔ اس دن جب کہ تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا۔ (ان سے کہا جائے گا کہ) آج بشارت ہے تمہارے لیے جنتیں ہوں گی جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی' جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔ اس روز منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہو گا کہ وہ مومنوں سے کہیں گے ذرا ہماری طرف دیکھو تاکہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھائیں۔ مگر ان سے کہا جائے گا'' پیچھے ہٹ جاؤ' اپنا نور کہیں اور تلاش کرو۔'' پھر ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہو گا۔ اس دروازے کے اندر رحمت ہو گی اور باہر عذاب۔ وہ مومنوں سے پکار پکار کر کہیں گے "کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے''؟ مومن جواب دیں گے۔'' ہاں' مگر تم نے اپنے آپ کو خود فتنے میں ڈالا' موقع پرستی کی' شک میں پڑے رہے' اور جھوٹی توقعات تمہیں فریب دیتی رہیں' یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آگیا' اور آخر وقت تک وہ بڑا دھوکے باز (شیطان) تمہیں اللہ کے معاملہ میں دھوکا دیتا رہا۔ لہٰذا آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے جنہوں نے کھلا کھلا کفر کیا تھا۔ تمہارا ٹھکانا جہنم ہے' وہی تمہاری خبرگیری کرنے والی ہے اور یہ بدترین انجام ہے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ اب ان دلوں سے مخاطب ہے جن کو خود اس نے پیدا کیا ہے۔ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ ان دلوں میں بات داخل کرنے کی راہیں کیا ہیں۔ کیونکہ ان کے حالات سے اللہ اچھی طرح باخبر ہے۔ خفیہ ترین خیالوں سے بھی اللہ باخبر ہے۔ اللہ کو معلوم ہے کہ دلوں میں ایمان کس طرح بیٹھتا ہے۔ دل غیر ایمانی شوائب سے کس طرح پاک ہوتا ہے اور یہ ایمان پھر کس طرح عملی زندگی میں ایک بڑے درخت کی طرح اگتا ہے' اور انسان انفاق فی سبیل اللہ اور اللہ کے راستے میں کس طرح بڑھ کر جان تک قربان کر دیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جو انسانی قوت سے بہت بڑا ہے' اور اس کے حصول کے لیے بہت بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ اپنی مخلوق کو تربیت دینے کے لیے اس قسم کے دلائل اور موثرات اور ہدایات دیتا ہے۔ پوری کائنات کے حقائق اس کے سامنے پیش کرتا ہے کہ حضرت انسان ان سے متاثر ہو' اور دنیا کی تمام چیزوں کو اللہ کے ترازو سے تولے اور ناپے۔ اللہ بار بار اور قدم قدم پر انسان کی تربیت کے لیے یہ انتظام فرماتا ہے۔ اور صرف یہ نہیں کہ سیدھا سادا حکم دے دیا جائے کہ اہل ایمان درج ذیل باتوں پر عمل کریں۔ قرآن نہ اس قسم کا خشک سرکلر جاری کرتا ہے نہ خشک قانون بناتا ہے بلکہ وہ ہر جگہ اطمینان بخش دلائل دیتا ہے۔ ہر وقت انسانی سوچ کی تاروں کو چھیڑتا ہے۔ انسانوں کی تربیت کے لیے قرآنی انداز اور منہاج اس قابل ہے کہ اسلامی انقلاب کے داعی اس پر بہت غور کریں۔ اسے سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ اس سورت کے آغاز میں جو موثر دلائل اور اشارات دیئے گئے تھے وہ دلوں پر گہرے اثرات چھوڑنے والے تھے۔ ان کو پڑھ کر سخت سے سخت دل موم ہو جاتے ہیں اور نہایت ہی خوابیدہ اور مدہوش شعور بھی جاگ اٹھتا ہے۔ لیکن قرآن کریم انہیں دوسرے پیرے میں بھی ان کو مسلسل جھنجھوڑتا ہے اور ایما اور تلقین جاری ہے۔ ہدایات اور ارشادات بھی جاری ہیں اور ساتھ ساتھ دلائل و اشارات بھی جاری ہیں۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ (۵۷ : ۷) "ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے"۔

یہاں اس آیت کے مخاطب مسلم ہیں بلکہ نہایت قدیم اور دور اول کے مومن ہیں۔ لیکن ان کو بھی کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور رسول اللہ پر۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے دلوں کے اندر حقیقت ایمانیہ پیدا کرو' یہ ایک گہری ہدایت ہے اور گہرا نکتہ ہے کیونکہ بلایا تو اس طرف جا رہا ہے کہ اللہ کی راہ میں انفاق کرو' لیکن اس سے پہلے ہی یہ اشارہ دے دیا کہ اپنے دلوں کے اندر حقیقت ایمانی پیدا کرو' اور اس انفاق کے حکم کے بعد بھی ایک اشارہ اور ہدایت کہ تم جو کچھ خرچ کر رہے ہو وہ اپنے مال سے نہیں خرچ کر رہے' یہ تو اللہ کا مال ہے اور اس نے تمہاری نگرانی اور خلافت میں دے دیا ہے۔ کیونکہ ابھی تمہیں یہ سمجھایا گیا ہے کہ۔

لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ "زمین و آسمانوں کی بادشاہت اور ملکیت اسی کی ہے"۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے انسانوں کو اس زمین پر ایک محدود خلافت اور نیابت دی ہے۔ زندہ کرنے اور مارنے والا تو وہ ہے۔ یوں اس نے تمہیں زمین میں نسلا بعد نسل خلیفہ بنایا ہے۔

سورت کے آغاز میں جو اصولی باتیں بیان کی گئی تھیں' یہ ہدایات ان کے ساتھ مربوط ہو جاتی ہیں۔ اور یہ سب تصورات اب مل کر اہل ایمان کو قائل کرتے ہیں کہ وہ مالک جس نے تمہیں اس زمین پر' اس کے خزانوں پر خلیفہ بنایا ہے' تمہیں اس نے سب کچھ دیا ہے' بتاؤ وہ اپنی ہی دولت کا ایک حصہ تم سے مانگ رہا ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا' دو گے اللہ کو کچھ' دیکھو اللہ ہی دینے والا ہے' اس کے خزانوں میں کمی نہیں ہے۔ تم کیوں ہاتھ کھینچے ہوئے ہو' یہ تو اسی کا ہے؟

فقط اس پر بھی بات ختم نہیں ہے کہ دلائل دیئے' قائل کیا اور نہایت فمائش اور محض امید پر' بلکہ اس کے بعد ایک اور موثر خطاب آتا ہے کہ اس انفاق کا ایک نہایت ہی بڑا معاوضہ بھی تمہیں ملے گا۔ اس کا فضل و کرم بھی تم پر ہو گا۔

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَھُمْ اَجْرٌ کَبِیْرٌ (۵۷ : ۷) "جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور مال خرچ کریں گے ان کے لیے بڑا اجر ہے"۔ اب کون ہے جو ایمان کا دامن چھوڑ کر پیچھے رہ سکتا ہے۔ کون ہے جو انفاق سے پیچھے رہ سکتا ہے' اور کون ہے جو اپنے آپ کو اس فضل و کرم سے محروم کر سکتا ہے؟

لیکن ابھی بات یہاں بھی ختم نہیں ہے اب ان چٹکیوں اور دلائل' ہدایات و اشارات کے بعد ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وقت کو بھی دیکھو' حالات کی نزاکت کا احساس بھی کرو' اس وقت کے حالات پیش کر کے کہا جاتا ہے کہ وقت کا تقاضا کیا ہے۔

وَمَا لَکُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ الرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّکُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۸) ھُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِہٖ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَ اِنَّ اللّٰہَ بِکُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (۹) (۵۷ : ۸ - ۹) "تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ

پر ایمان نہیں لاتے حالانکہ رسول تمہیں اپنے رب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے اور وہ تم سے عہد لے چکا ہے۔ اگر تم واقعی ماننے والے ہو۔ وہ اللہ ہی تو ہے جو اپنے بندے پر صاف صاف آیتیں نازل کر رہا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے 'اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے"۔

آخر ایمان کی راہ میں رکاوٹ کیا ہے؟ ایمان تو وہ لا چکے ہیں ایمان لانے کا حق یہاں مطلوب ہے۔ پھر دعوت ذات رسول کی طرف سے ہے' جن کے ہاتھ پر تم بیعت کر چکے ہو' پختہ وعدہ کر چکے ہو۔ اور پھر آسمانوں سے آیات بینات کی پے درپے موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ یہ آیات تمہیں اندھیروں' شک اور حیرانی سے نکال رہی ہیں۔ ہدایت و یقین اور اطمینان کی روشنی تمہیں دی جا رہی ہے۔ ایسے حالات میں جن میں تم پر رحمتوں کی بارشیں ہو رہی ہیں۔

نبی آخر الزمان کا کسی قوم میں موجود ہونا' ان کا اللہ کی زبان و کلام میں گفتگو فرمانا کلام اللہ پڑھ پڑھ کر سنانا تو تمہارے اور اللہ کے درمیان خود تمہارے مخصوص معاملات کے بارے میں نہایت ہی براہ راست رابطہ پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہ اس قدر عظیم نعمت ہے جس کا تصور نہ پہلے کسی نے کیا اور نہ بعد میں ہو سکے گا۔ آج ہم چودہ سو سال کی دوری سے جب اسے سوچتے ہیں' تو یہ دور' وحی کا دور' حیات رسول کا دور فی الواقع عظیم نعمتوں کا دور تھا' خوشیوں کا دور تھا' نیک بختیوں کا دور تھا' کیا ہی دور تھا' اللہ جل جلالہ' بذات خود رسول اللہ کی زبانی اپنے بندوں کو بتا رہا ہے۔ نہایت رحمت' محبت اور کرم کے ساتھ 'لو یہ کام کرو' دیکھو اس سے بچو' یہ ہے راہ اس پر چلو' یہ دیکھو تم غلط ہو گئے ہو' یہ ہے میری رسی اسے پکڑو اور نکل آؤ گڑھوں سے 'کنوؤں سے' توبہ کرو' توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔

این درگہ ما درگہ نا امیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

آؤ دور تک نہ چلے جاؤ غلط راہوں پر' میری رحمت سے مایوس نہ ہو' وہ تو اس قدر وسیع ہے کہ سب کائنات اس میں ڈوب جاتی ہے۔ اے فلاں تو نے یہ کہا ہے' یہ غلط ہے۔ اے فلاں تو نے یہ سوچا ہے' یہ غلط ہے۔ یہ تو گناہ ہے۔ فلاں فلاں کاموں کا تو نے ارتکاب کیا ہے یہ غلط ہے۔ آؤ' توبہ کرو اور میری رحمت میں داخل ہو جاؤ۔ اے فلاں وہ فلاں فلاں چیزیں تمہیں روک رہی ہیں ان کو اتار پھینکو' فلاں تو نے یہ سوال کیا ہے یہ ہے جواب اس کا۔ اور یہ کام جو تو نے کیا ہے اس کا یہ وزن ہے۔

یہ لوگ جو اللہ کے ساتھ رہتے ہیں' جو اس کی مخلوق ہیں' جن کو اللہ تلقین فرماتا ہے جن کے ساتھ یوں ہمکلام ہوتا ہے۔ یہ اپنے اندر تیز احساس رکھتے ہیں کہ اللہ ان کے ساتھ ہے اور وہ اللہ کے ساتھ ہیں۔ یہ حقیقت ہے اور یہ واقعہ ہے رات کی تاریکیوں میں بھی اللہ ان کی فریادیں سن رہا ہے۔ اور ان کو قبول کرتا ہے۔ قدم قدم پر ان کی رہنمائی کرتا ہے اور ان کی طرف متوجہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بات اس شخص کی سوچ سے بھی بلند ہے جو اس کے اندر نہ رہا ہو۔ اس لیے آج ہم بھی کہہ سکتے کہ وہ یوں تھے۔ لیکن ان آیات میں سب سے پہلے جن لوگوں کو خطاب کیا گیا وہ ایسے ہی حالات میں زندہ رہ رہے تھے۔ اور ان لوگوں کو اس قسم کی تربیت یاد دہانی اور اکساہٹ کی ضرورت تھی۔ لیکن اب اگر کوئی اس قسم کے تصور کو اپنے ذہنوں میں جمائے اور بسائے ہوئے ہے ہمارے اس گئے گزرے دور میں تو یہ اس فضل سے بھی بڑا فضل ہے۔ یہ

بات زیادہ قابل قدر ہے کہ دور صحابہ سے دور پندرھویں صدی میں یہ تصور کرتا ہو۔

بخاری شریف کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اپنے صحابہ سے کہا کہ تمہارے نزدیک کون سا مومن قابل تعجب اور صاحب فضل و کرم ہے' تو صحابہ کرام نے فرمایا فرشتے؟ تو حضورؐ نے فرمایا"وہ کیونکر ایمان نہ لائیں گے وہ ہیں ہی اپنے رب کے پاس"۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ پھر"انبیاء"۔ تو آپ نے فرمایا:"وہ کس طرح ایمان نہ لائیں جبکہ وحی ان پر نازل ہو رہی ہے"۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ پھر"ہم لوگ"۔ تو حضورؐ نے فرمایا: "تم کیوں ایمان نہ لاؤ' جبکہ میں تمہارے درمیان ہوں؟ بلکہ ایمان کے لحاظ سے افضل ترین لوگ وہ ہیں جو تمہارے بعد ہوں گے' ان کے پاس صحیفے ہوں گے اور وہ ان کے اندر پائی جانے والی تعلیمات پر ایمان لائیں گے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا کہ صورت حال میں بہت فرق ہے۔ ان لوگوں کے ہاں ایمان کے اشارات' اسباب اور دلائل بہت زیادہ تھے۔ عجیب و غریب تھے۔ بلکہ اگر وہ ایمان نہ لاتے تو قابل تعجب بات ہوتی۔ اس کے باوجود ان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ ایمان کو اپنے نفوس کے اندر حقیقت بناؤ' اگر مومن ہو تو۔

اب موجبات ایمان اور دلائل ایمان سے آگے' دلائل انفاق اور موجبات انفاق کی طرف' مگر قدرے تاکید کے ساتھ اور تکرار کے ساتھ۔

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

(۵۷ : ۱۰) "آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے"۔ اس میں اسی حقیقت کو دہرایا گیا ہے جو پہلے بیان ہوئی۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ "اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اور تمام امور فیصلے کے لیے اللہ ہی کی طرف رجوع ہوتے ہیں"۔ اللہ کی میراث' اس کا اقتدار اعلیٰ اور بادشاہت ہے اور جس کا اقتدار اعلیٰ ہے فیصلے بھی اسی کے ہیں اور جو اختیارات اللہ نے ان کے لیے دیئے ہیں وہ سب جلدی اسی کی طرف واپس ہو جائیں گے۔ اس لیے جب اللہ تمہیں دعوت انفاق دے رہا ہے اور یہ مال تو اسی کا ہے' اور اسی نے اس میں تصرف کے اختیارات تمہیں دیئے ہیں۔ اور یہ اسی کی طرف لوٹنے والا ہے لہٰذا بخل اور کنجوسی کے لیے کوئی جواز نہیں رہتا' اس خطاب میں بس یہی حقیقت ہے۔

مثلی بھر السابقون الاولون نے اللہ کی راہ میں جو کچھ ان کے بس میں تھا' خرچ کیا۔ یہ مہاجرین و انصار کے پاکیزہ لوگ تھے اور انہوں نے نہایت ہی مشکل دور میں یہ خرچ کیا۔ نہایت ہی شدید مشکلات کے دور میں انہوں نے مالی قربانی دی اور اس زمانے میں خرچ کیا جبکہ اسلام ہر طرف سے خطرات میں گھرا ہوا تھا۔ فتح مکہ یا حدیبیہ سے قبل کے زمانے میں اسلام کے دوست اور معاون قلیل تھے۔ دشمن زیادہ تھے۔ اور اس دور میں ان لوگوں نے جو خرچ کیا اس پر ان کو کوئی دنیاوی امید اور لالچ بھی نہ تھی۔ نہ وہ خرچ کسی کو دکھانے کے لیے کرتے تھے۔ یہ سب خرچ جذبہ خیر پر مبنی تھا۔ جس خیر کو انہوں نے اختیار کر لیا تھا۔ یہ خرچ وہ اپنے اس نظریہ کے لیے کر رہے تھے جس انہوں نے تمام دنیاوی مفادات کو چھوڑ

چھاڑ کر اختیار کر لیا تھا۔ انہوں نے زیر سامال خرچ کیا۔ بعض نے اس مقدار میں مال خرچ کیا جو السابقون الاولون نے فتح سے قبل کیا تھا۔ اس پر قرآن کی آیات نازل ہوئیں ان میں تصریح کی گئی۔ مقدار کے اعتبار سے تمہارا خرچ ان کے خرچ کے برابر ہو سکتا ہے یا زیادہ بھی ہو سکتا ہے لیکن اللہ کے ترازو میں سابقون کا خرچ قابل ترجیح ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے جس ایمانی جذبہ سے خرچ کیا اس میں فرق ہے۔

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ

أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا (۵۷ : ۱۰) "تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے۔ جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے۔ ان کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے"۔ ایک شخص وہ ہے جو اس وقت خرچ کرتا ہے اور جہاد کرتا ہے' جب ہر طرف سے نظریہ پر حملے ہوتے ہیں' اس نظریہ کے ماننے والے اور دوست قلیل ہیں۔ اور کسی منفعت کا کوئی نشان تک نہیں ہے۔ نہ اقتدار ہے اور نہ سہولیات ہیں' اور ایک شخص اس وقت خرچ کرتا ہے اور جہاد کرتا ہے جب نظریہ حیات پر امن ہے' اس کے انصار بہت ہیں اور نصرت' غلبہ اور فتح اور مفادات متوقع ہیں تو دونوں کے درمیان بہت فرق ہے۔ پہلا شخص صرف اللہ سے لو لگائے ہوئے ہوتا ہے' وہ مخلص ہے اور اس کے اخلاص میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسے اللہ پر گہرا بھروسہ ہے اور صرف اللہ پر اطمینان ہے۔ یہ شخص اسباب ظاہری اور دنیاوی مفادات سے دور ہے۔ اس کو اس خیر اور بھلائی پر صرف اس کا عقیدہ آمادہ کر رہا ہے اور یہ دوسرا شخص جو بھلائی کرتا ہے اس کے لیے اس کے نظریہ کے سوا دوسرے دواعی بھی اس نیکی پر آمادہ کرنے کے لیے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی نیت صاف بھی ہو پھر بھی دوسرے عوامل ملحوظ ہیں۔

امام احمد نے روایت کی ہے۔ احمد ابن عبد الملک سے انہوں نے زہیر سے' انہوں نے حمید الطویل سے' انہوں نے انس سے کہتے ہیں کہ حضرت خالد ابن ولید اور عبد الرحمن ابن عوف کے درمیان کچھ باتوں کا تبادلہ ہو گیا۔ خالد نے عبد الرحمن سے کہا: "تم لوگوں پر اس لیے دست درازی کرتے ہو کہ کچھ دن تم ان سے پہلے اسلام لے آئے ہو' ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ اس بات کا تذکرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا تو آپ نے فرمایا" میرے ان ساتھیوں کو چھوڑ دو' اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' کہ اگر تم احد کے برابر سونا خرچ کرو (یا کہا کہ پہاڑوں کے برابر سونا خرچ کرو) تو بھی تم ان کے اعمال تک نہیں پہنچ سکتے۔۔۔۔ صحیح میں ہے۔

لا تسبوا اصحابی فو الذی نفسی بیدہ لو انفق احدکم مثل احد ذھبا ما بلغ مد احدھم او نصیفہ [1] "میرے ساتھیوں کو گالیاں نہ دو۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' اگر تم میں کوئی احد

---

(۱) معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں اصحابی کا خاص مفہوم ہے۔ ان کے بارے میں حضورؐ نے سخت تنبیہ فرمائی ہے۔ یہ لوگ دراصل سابقون اولون ہیں۔ حضور اکرمؐ اپنے اور دیگر صحابہ اور مومنین سے کہتے تھے۔ دعوا لی اصحابی" میرے ساتھیوں کو میرے ہی لیے چھوڑ دو" اس سے صحبت خاصہ مراد ہے۔ ایک بار حضرت ابوبکر صدیق کے بارے میں کہا دعوا لی صاحبی" میرے اس ساتھی کو میرے لیے چھوڑ دو۔"

جیسا سونا خرچ کرے تو نہ ان کی مد کو پہنچ سکتا اور نہ نصف مد کو (مد پیمانہ تقریبا دو کلو)

لیکن بعد میں آنے والوں کو بھی مایوس نہیں کیا گیا۔ سب کے لیے اونچا مقام ہے۔ اچھا وعدہ ہے۔

وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (۵۷ : ۱۰) "اور اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں۔"

اگر چہ ان کے درمیاں درجات کے اعتبار سے تفاوت تھا لیکن وہ سب اچھے اور عدول تھے۔

لیکن یہ تفاوت ' اور سب کے لیے جزائے حسن کے وعدے سب کے سب اللہ کے علم سے مشروط ہیں سب کے احوال سے اللہ اچھی طرح باخبر ہے۔ یہ اللہ ہی ہے کہ وہ جانتا ہے کہ ان کے ان اعمال کے پیچھے کیا داعیہ تھا۔ حقیقی علم تو اللہ ہی رکھتا ہے۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۵۷ : ۱۰) "جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔"

یہ ایک ایسا چ اور ایک ایسی چٹکی ہے جس سے دل بیدار ہو جاتے ہیں کہ ظاہری اعمال اپنی جگہ پر ہیں اور دنیا کے فیصلے تو اپنی جگہ پر ہیں لیکن اللہ کے فیصلے اللہ کے علم پر ہوں گے۔ خبردار وہاں وزن اللہ کے پیمانوں سے ہو گا۔

---

ایمان اور انفاق فی سبیل اللہ کے لیے ایک دوسرا مرحلہ 'ایک دوسرا محرک اور نیا ولولہ:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ (۱۱) يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۲) يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ (۱۳) يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (۱۴) فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَاْوٰىكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلٰىكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۱۵) (۵۷ : ۱۱ تا ۱۵) "کون ہے جو اللہ کو قرض دے ؟ اچھا قرض ' تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے اور اس کے لیے بہترین اجر ہے۔ اس دن جب کہ تم مومن مردوں اور عورتوں

کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا۔ (ان سے کہا جائے گا کہ) آج بشارت ہے تمہارے لیے جنتیں ہوں گی جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی' جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔ اس روز منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہو گا کہ وہ مومنوں سے کہیں گے ذرا ہماری طرف دیکھو تاکہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھائیں۔ مگر ان سے کہا جائے گا" پیچھے ہٹ جاؤ' اپنا نور کہیں اور تلاش کرو۔" پھر ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہو گا۔ اس دروازے کے اندر رحمت ہو گی اور باہر عذاب۔ وہ مومنوں سے پکار پکار کر کہیں گے" کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے"؟ مومن جواب دیں گے۔" ہاں مگر تم نے اپنے آپ کو خود فتنے میں ڈالا' موقع پرستی کی' شک میں پڑے رہے' اور جھوٹی توقعات تمہیں فریب دیتی رہیں' یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آگیا' اور آخر وقت تک وہ بڑا دھوکے باز (شیطان) تمہیں اللہ کے معاملہ میں دھوکا دیتا رہا۔ لہٰذا آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے جنہوں نے کھلا کھلا کفر کیا تھا۔ تمہارا ٹھکانا جہنم ہے' وہی تمہاری خبرگیری کرنے والی ہے اور یہ بدترین انجام ہے۔"

یہ رب ذوالجلال کی طرف سے ایک زبردست پکار' ایک زبردست موثر اشارہ اللہ اپنے فقیر اور محتاج بندوں سے کرتا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا (۵۷: ۱۱) "کون ہے جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض"

تاکہ صرف یہ تصور کہ ایک مسلم فقیر ہے اور اللہ کی طرف ہر وقت محتاج ہے اور رب ذوالجلال اس سے قرض مانگ رہا ہے' اس بات کے لئے کافی ہے کہ وہ اٹھ کر اللہ کی راہ میں خرچ کرے' کیونکہ لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ نفع بخش کاروبار میں سرمایہ لگاتے ہیں۔ لوگ چونکہ فقیر ہیں اور اللہ کو دیا ہوا قرضہ محفوظ ہے' اس کی واپسی یقینی ہے' پھر یہ ان کے لئے ایک باعث عزت بات بھی ہے کہ وہ اللہ کو قرض دے رہے ہیں۔ عموماً لوگ نفع بخش کاروبار میں رقم لگاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ تو کئی گنا بڑھا کر اسے واپس کرتا ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ لوگ اس کاروبار میں سرمایہ نہ لگائیں۔

اللہ تعالیٰ ان کو صرف اچھے جذبات تک ہی نہیں لے جاتا بلکہ وعدہ فرماتا ہے کہ اس قرض حسن پر تمہیں کئی گنا اضافہ کر کے دے گا۔ بشرطیکہ وہ قرض حسن ہو اور صرف اللہ کے لئے دیا ہو اور کئی گنا اضافے کے ساتھ پھر اللہ کے ہاں مزید اجر بھی ملے گا۔

فَيُضٰعِفَهُ لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيمٌ (۵۷: ۱۱) "تاکہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے اور اس کے لئے بہترین اجر ہے"۔ اور اس اجر کا نقشہ قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر پیش کر کے بتایا جاتا ہے۔ قیامت کے دن یہ اجر دیا جائے گا اور یہ بہت ہی قابل قدر اجر ہو گا۔

یہ منظر قرآن کریم کے مناظر میں سے بالکل ایک نیا منظر ہے۔ اس منظر کی تصویر کشی اس طرح کی گئی ہے کہ اسے حرکت اور مکالمات سے بھرپور انداز میں بالکل ایک زندہ منظر بنا دیا گیا ہے۔ آج جب ہم قرآن کریم کو پڑھتے ہیں تو ہماری نظروں کے سامنے پوری تصویر آجاتی ہے۔ مومنین اور مومنات ہمیں سخت تاریکی میں چلتے نظر آتے ہیں لیکن ان کے سامنے اور ان کے دائیں جانب ہمیں ایک لطیف نور اور چمک نظر آتی ہے۔ یہ نور خود ان اہل ایمان کا نور ایمانی ہے اور یہ ان کے چہروں سے پھوٹ رہا ہے۔ ان مومنین اور مومنات کے اجسام سے یہ نور پھوٹ رہا ہے اور اس نور کی روشنی میں

یہ اس دن کی تاریکی میں آگے بڑھ رہے ہیں' یہ وہی نور ہے جو جاہلیت کے اندھیروں میں اللہ نے ان کو دیا تھا اور اس کی روشنی میں وہ چلتے تھے' اب یہ نور ان کی ارواح کے ذریعہ ان کی خاکی جسم پر غالب آگیا ہے - یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے اجسام کے خاکی اجزاء سے یہ نور چمک رہا ہو کہ جدید سائنس کی تحقیقات بھی اسی طرف جاری ہیں کہ مادہ ایٹم سے بنا ہے اور ایٹم دراصل نور اور "شعاعیں" ہے - یوں گویا یہ نور پھر حقیقی نور ہو گا -

اب اس منظر میں مومنین اور مومنات کو مبارک سلامت دی جاتی ہے -

بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ

الْعَظِيْمُ (۵۷ : ۱۲) "آج ہے خوش خبری تمہارے لئے "جنتیں ہوں گی" - نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے - یہی ہے بڑی کامیابی -

لیکن مبارک سلامت کے اس منظر پر ابھی یہ ختم نہیں ہے - ادھر سے منافقین اور منافقات کا گروہ بھی گرتا پڑتا چلا آرہا ہے - یہ حیران و پریشان اور کس مپرسی کی حالت میں ہے' یہ لوگ مومنین اور مومنات کے ساتھ لپٹ جاتے ہیں اور کہتے ہیں -

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ

(۵۷ : ۱۳) "اس روز منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہو گا کہ وہ مومنوں سے کہیں گے ذرا ہماری طرف دیکھو تاکہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھائیں" - مومنین اور مومنات کا گروہ جدھر بھی دیکھتا ہے ادھر نور ہی نور ہے' جو لطیف و شفاف ہے' لیکن اس نور سے منافق مرد اور منافق عورتوں کا گروہ کس طرح استفادہ کر سکتا ہے' انہوں نے تو پوری زندگی جہالت کی تاریکی میں بسر کی ہے - ایک نامعلوم آواز اس موقعہ پر پکارتی ہے -

قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا (۵۷ : ۱۳) "مگر ان سے کہا جائے گا پیچھے ہٹ جاؤ ایک نور کہیں اور تلاش کرو" - معلوم ہوتا ہے کہ یہ آواز ان کی تذلیل اور ان کے ساتھ مزاح کے لئے بلند ہو گی - اور ان کو یہ یاد دہانی مطلوب ہو گی کہ دنیا میں تم کیا کرتے تھے رات کے اندھیروں میں اپنی منافقانہ پالیسی پر کرتے رہتے تھے - کہ واپس جاؤ دنیا میں اور وہاں اپنا نور تلاش کرو - واپس جاؤ کیونکہ یہ نور تو دنیا سے آیا ہے - دنیا کے عمل سے یہ نور حاصل ہوتا ہے - آج تو تم دار الجزاء میں ہو یہاں کیا تلاش کرتے ہو -

اس مرحلے میں اچانک مومنین اور مومنات کے گروہ اور منافقین اور منافقات کے گروہ کی درمیان جدائی کر دی جاتی ہے - کیونکہ یہ جدائی کا دن ہے - دنیا میں تو یہ لوگ اسلامی صفوں میں گھس گئے تھے -

فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ

الْعَذَابُ (۵۷ : ۱۳) "پھر ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہو گا' اس

دروازے کے اندر رحمت ہوگی اور باہر عذاب"۔ یہ ایک ایسی دیوار ہوگی جس کے اس پار نظر تو نہ آئے گا لیکن آواز سنائی دے گی۔ اب منافقین کا گروہ مومنین کو پکارے گا۔

يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ (۵۷ : ۱٤) "وہ انہیں پکار کر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے"۔ اب ہم کیوں جدا ہو رہے ہیں۔ دنیا میں تو ہم تمہارے ساتھ ایک ہی جگہ زندہ رہے تھے۔ ایک ہی سطح پر اور یہاں بھی ہم ایک ہی جگہ تمہارے ساتھ اٹھائے گئے ہیں۔

قَالُوا بَلٰى (۵۷ : ۱٤) "وہ کہیں گے ہاں" معاملہ تو ایسا ہی ہے۔

وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ أَنْفُسَكُمْ (۵۷ : ۱٤) "مگر تم نے اپنے آپ کو خود فتنے میں ڈالا"۔ تم نے اپنے آپ کو ہدایت سے توڑ لیا۔

وَتَرَبَّصْتُمْ (۵۷ : ۱٤) "موقع پرستی کی"۔ تم نے عزم کر کے فیصلہ کن انداز میں حق کا راستہ اختیار نہ کیا۔

وَارْتَبْتُمْ (۵۷ : ۱٤) "شک میں پڑے رہے"۔ تمہیں یقین کی وہ دولت نہ دی گئی جس کے ذریعے تم آتش نمرود میں کود جاتے۔

وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ (۵۷ : ۱٤) "اور جھوٹی توقعات تمہیں دھوکہ دیتی رہیں"۔ تم نے یہ سوچا کہ اسی طرح تذبذب منافقت اور لالچ کو دونوں جانب سے پکڑنے میں کامیابی ہے۔

حَتّٰى جَآءَ أَمْرُ اللّٰهِ (۵۷ : ۱٤) "یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آگیا"۔

وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُورُ (۵۷ : ۱٤) "اور آخر تک وہ بڑا دھوکہ باز تمہیں اللہ کے معاملے میں دھوکہ دیتا رہا"۔ یہ شیطان تھا۔ تمہیں نئی نئی لالچیں دیتا اور تمناؤں کی دنیا میں بساتا۔ اب مومنین ان کو مزید یاد دلاتے ہیں اور فیصلہ سناتے ہیں گویا آج فیصلہ ان کے ہاتھ میں۔

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مَأْوٰكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلٰكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۵۷ : ۱۵) "لہذا آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا۔ نہ ان لوگوں سے جنہوں نے کھلا کھلا کفر کیا۔ تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے۔ وہی تمہاری خبرگیری کرنے والی ہے اور یہ بدترین انجام ہے"۔

یہ شاید دربار مقتدر اعلیٰ سے اعلان ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جواب ہوگا۔

اس منظر کی فنی ہم آہنگی کو دیکھا جائے تو اس کے لئے نور کے انتخاب میں ایک خاص حکمت ہے۔ کیونکہ یہ بات منافقین اور منافقات کے گروہ کے بارے میں ہے اور منافقین اور منافقات کے گروہ کا اصل کردار ہی یہ ہوتا ہے کہ اپنے باطن کو چھپاتے ہیں اور ان کے ضمیروں میں جو بات چھپی ہوتی ہے اس کے مقابلے میں کچھ اور ظاہر کرتے ہیں۔ وہ نفاق کی کارروائیاں ہمیشہ اندھیروں میں کرتے ہیں۔ اندھیرا چھپاتا ہے اور روشنی دکھاتی ہے۔ گویا دو کردار بھی متضاد ہیں ایمان اور نفاق اور دو رنگ بھی متضاد ہیں نور اور ظلمت۔ اور ان دونوں چیزوں سے منظر نہایت خوب بنتا ہے۔ ایمان کو روشن دکھایا گیا ہے اور نفاق کو تاریک۔ مومن نور میں سفر کر رہے ہیں اور منافق اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ معانی کو منظر کی روشنیوں کے ذریعہ بھی ظاہر کر دیا گیا۔" (۱)

کون ہے جو اس دن نور کا طلب گار نہ ہو گا اور اس کا مشتاق نہ ہو گا۔ کون ہے جو اس کے بعد بھی انفاق فی سبیل اللہ سے گریز کرے گا۔ اس قدر موثر دلائل ' مفادات اور اچھے انجام کے باوجود.... یہ ہے قرآن کا انداز تعلیم و تربیت ' قرآن نہایت تسلسل اور مستقل مزاجی سے مومنین کی تربیت کر رہا ہے۔ اور ایک ماہر کی طرح اور علیم و خبیر استاد کی طرح بڑی حکمت سے ہدایات اور سبق طلبہ کے ذہن میں یوں اتارتا ہے کہ وہ فوراً عمل کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد دوسرا سیشن آتا ہے اس میں بھی مسلسل پکار ہے اور اسی انداز میں اور اسی طرز پر جماعت مسلمہ کو عمل پر ابھارا جاتا ہے۔

---(o)---

(۱) مشاہد القیامۃ

# درس نمبر ۲۵۷ ایک نظر میں

اس سبق میں بھی اس سورت کے ہر موضوع اور محور ہی کو لیا گیا ہے ' یعنی نفس کے اندر حقیقت ایمان اگر نا تاکہ اس کے نتیجے میں اللہ کی راہ میں مخلصانہ انفاق پر نفس آمادہ ہو جائے اور اس میں تقریباً ویسے ہی دلائل ایمان اور موثرات اور تنبیہات ہیں جیسا کہ پہلے حصے میں تھے البتہ وہاں سورت کا آغاز نہایت زور ار تھا۔

یہ سبق مومنین کو ایک نرم سے عتاب کے ساتھ شروع ہوتا ہے وہ مومنین جو ابھی تک اس مقام تک انہیں پہنچے جس تک انہیں پہنچانا مطلوب ہے ' یہاں ضمیں کہا جاتا ہے کہ انہیں ان اہل کتاب کی طرح نہیں ہونا چاہئے جو سنگ دل تھے اور فاسق تھے ۔ ان کو ڈرایا جاتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم بھی کہیں ان کی طرح نہ ہو جاؤ ۔ البتہ دلوں کو زندہ کرنے والا اللہ ہی ہے جس طرح وہ زمین کو زندہ کرتا ہے ۔

اس اسابت کے بعد اب دوبارہ دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اسی طرح ہے جس طرح کوئی کسی نفع بخش کاروبار میں رقم لگاتا ہے ۔ اللہ آخرت میں کئی گنا کر کے دیتا ہے اور اجر کریم بھی دیتا ہے جیسا کہ پہلے سبق میں کہا گیا تھا ۔ لہذا اس نفع بخش روبار کے ذریعہ جنت کماؤ جو بہت وسیع ہے ۔

اگلی آیات میں دنیاوی اقدار اور اخروی اقدار کا مقابلہ کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ دنیا تو ایک کھیل کود ہے صحیح زندگی آخرت کی ہے لہذا اہل ایمان کو چاہئے کہ آخرت کی طرف دوڑیں ۔

اب دوبارہ ان کو آخرت سے دنیا میں لایا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ دنیا کے معاملات اللہ کے حکم سے چلتے ہیں لہذا برے حالات یا اچھے حالات اللہ کے حکم سے آتے ہیں انفاق سے کوئی غریب نہیں ہوتا لہذا کہا جاتا ہے کہ تمہیں دنیا کی کوئی چیز انفاق سے روک نہ دے ۔ اس کے بعد ان کے سامنے دعوت اسلامی کی ایک تاریخ پیش کی جاتی ہے ' بتایا جاتا ہے کہ یہ ایک ہی دعوت ہے ' ایک ہی پیغام ہے ' ایک ہی صراط مستقیم ہے ' ہر عہد میں جو لوگ اس سے منہ موڑتے ہیں وہ فاسق ہیں ۔ اہل کتاب نے یہی کام کیا جس طرح پہلے سبق میں بھی یہی کہا گیا ۔ اس کے بعد ان کو پکارا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو ایمان لاؤ تاکہ وہ تمہیں دوگنا اجر اور رحمت دے اور تمہارے چہروں پر نور پیدا کر دے ۔ اور تم پر فضل و کرم کر دے ۔ لہذا اللہ کا فضل و کرم اہل کتاب کے ساتھ مخصوص نہیں ہے ۔ اللہ بڑے فضل والا ہے ۔

یوں یہ سورت اپنے آغاز و انجام دونوں سے باہم مربوط اور متناسب ہو جاتی ہے اور اس کی سب کڑیاں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں ۔ عقل و خرد کے تاروں پر مسلسل ضربات لگتی ہیں اور ان میں تنوع بھی ہے اور تکرار بھی ہے تاکہ اس کا دلوں پر گہرا اثر ہو ۔ اور دل مومن ایک ضرب کے بعد دوسری ضرب سے گرماتا رہے ۔

---()()()---

# درس نمبر ۲۵۷ تشریح آیات

## ۱۶ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۲۹

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ ۖ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ﴿١٦﴾ اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١٧﴾

"کیا ایمان لانے والوں کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور ان کے نازل کردہ حق کے آگے جھکیں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی' پھر ایک لمبی مدت ان پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور آج ان میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں؟ خوب جان لو کہ اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے 'ہم نے نشانیاں تم کو صاف دکھا دی ہیں 'شاید کہ تم عقل سے کام لو"۔

یہ مولائے کریم و رحیم کی طرف نہایت ہی موثر پکار ہے کہ اب تک تو تمہارے دل اللہ کے خوف اور خشوع و خضوع سے بھر جانا چاہئے تھا۔ تم پر تو اللہ کا بہت بڑا فضل ہو چکا ہے۔ تمہارے اندر ایک رسول موجود ہے' جو تمہیں ایمان کی طرف بلا رہا ہے۔ اس رسول پر آیات بینات نازل کی گئی ہیں تاکہ تمہیں تاریکیوں سے روشنیوں کی طرف لائیں۔ اور تمہیں اس نے اس کائنات میں اور تمہاری تخلیق میں آیات بھی بتا دی ہیں۔

یہ ایک ایسا عتاب ہے جس میں محبت ہے۔ ہمدردانہ عنایت ہے۔ جوش دلایا جاتا ہے اور شعور دیا جاتا ہے کہ اللہ بڑا جلیل القدر رب ہے۔ اس کا ذکر خضوع و خشوع کے ساتھ کرو' اور اللہ کی جانب سے جو سچائی آرہی ہے اسے نہایت عزت و احترام اور اطاعت اور سپردگی کے ساتھ لو' البتہ سوال میں یہ تاثر نمایاں ہے کہ تمہاری رفتار سست ہے۔

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ

(۵۷:۱۶) "کیا ایمان لانے والوں کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل ذکر سے پگھلیں۔ اور ان کے

نازل کردہ حق کے آگے جھکیں"۔ اس طرح ابھارنے اور سست روی پر عتاب کرنے کے ساتھ ان کو لبیک نہ کہنے اور سست روی اختیار کرنے کے برے انجام سے بھی ڈرایا جاتا ہے کہ جب دلوں کو ساتھ ساتھ صاف نہ کیا جاتا رہے تو وہ زنگ آلود ہو جاتے ہیں اور ان کے اندر سنگدلی پیدا ہو جاتی ہے، یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ذکر الٰہی سے غافل ہو جائیں اور جب وہ حق کے سامنے جھکنا بھول جائیں:

وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُونَ (۵۷ : ۱۶) "اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ایک لمبی مدت ان پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور آج ان میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں"۔ جب دل سخت ہو جائیں تو پھر اگلا مرحلہ فسق اور فجور کا ہوتا ہے۔

انسانی دل بہت جلد بدل جاتا ہے۔ انسان بہت جلد بھول جاتا ہے۔ جب وہ صاف شفاف اور روشن ہوتا ہے تو اس سے نور کی لہریں اٹھتی ہیں۔ اور موتی کی طرح چمکتا ہے۔ اور جب اس پر زیادہ وقت گزر جائے یاد دہانی اور تربیت ختم ہو جائے تو وہ سخت ہو جاتا ہے زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اسے مسلسل یاد دہانی اور تربیت کی ضرورت پڑتی ہے کہ اس کے اندر خضوع و خشوع پیدا ہو۔ اسے بار بار کھٹکھٹانا چاہئے تاکہ وہ نرم اور صاف ہوتا رہے اور ہر وقت بیدار رہنا چاہئے کہ وہ سنگدل اور گندہ نہ ہو جائے۔

لیکن اگر کوئی دل بجھ گیا، پتھر بن گیا، سخت ہو گیا، گندہ ہو گیا تو مایوسی کی ضرورت نہیں ہے، وہ از سرنو زندہ ہو سکتا ہے، اس میں از سرنو حیات داخل ہو سکتی ہے، وہ از سرنو اللہ کے سامنے جھک سکتا ہے، اللہ تو قدرتوں والا ہے، وہ تو مردہ زمین کو از سرنو زندہ کر دیتا ہے۔ ایک مردہ زمین دیکھتے دیکھتے زندگی سے بھرپور اور تروتازہ ہو جاتی ہے۔ سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے میوہ جات اور پھل دینے لگتی ہے یہی حال دلوں کا ہے۔

اعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۵۷ : ۱۷) "خوب جان لو کہ اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے"۔ اور قرآن کے اندر وہ چیز ہے جو دلوں کو موت کے بعد پھر زندہ کرتی ہے۔ اس کے اندر وہ مواد موجود ہے جو غذا دیتا ہے، جو سیراب کرتا ہے اور جو گرماتا ہے۔

قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۵۷ : ۱۷) "ہم نے نشانیاں تم کو صاف صاف دکھا دی ہیں، شاید کہ تم عقل سے کام لو"۔

اس زندہ کر دینے والی چٹکی کے بعد، اور اس بالواسطہ عتاب کے بعد، اور اس ڈراوے کے بعد دوبارہ انفاق فی سبیل اللہ پر ابھارا جاتا ہے۔

إِنَّ الْمُصَّدِّقِينَ وَ الْمُصَّدِّقٰتِ وَ أَقْرَضُوا اللّٰهَ
قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَ لَهُمْ أَجْرٌ كَرِيمٌ ﴿١٨﴾ وَ الَّذِينَ اٰمَنُوا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖٓ
أُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ ۖ وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَ نُورُهُمْ ۖ ۲
وَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَآ أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ الْجَحِيمِ ﴿١٩﴾ اِعْلَمُوٓا أَنَّمَا الْحَيٰوةُ ع ۹
الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّ زِينَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَ الْأَوْلَادِ ۖ ۱۸
كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ
حُطٰمًا ۖ وَ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۙ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ ۖ وَ مَا
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ﴿٢٠﴾ سَابِقُوٓا إِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ
عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْأَرْضِ ۙ أُعِدَّتْ لِلَّذِينَ اٰمَنُوا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۖ ذٰلِكَ
فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ ۖ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿٢١﴾ مَآ أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ
فِي الْأَرْضِ وَ لَا فِيٓ أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَّبْرَأَهَا ۖ إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ
يَسِيرٌ ﴿٢٢﴾ لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۖ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ
فَخُورِ ﴿٢٣﴾ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَ يَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۖ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ
الْحَمِيدُ ﴿٢٤﴾

" مردوں اور عورتوں میں سے جو لوگ صدقات دینے والے ہیں اور جنہوں نے اللہ کو قرض حسن دیا ہے ، ان کو یقیناً کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لئے بہترین اجر ہے ۔ اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں ، ان کے لئے ان کا اجر اور ان کا نور ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہے وہ دوزخی ہیں ۔ خوب جان لو یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے ۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہوگئے ۔

پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو"۔ پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کی برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے۔ دنیا کی زندگی ایک دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں۔ دوڑو اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین جیسی ہے 'جو مہیا کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہوں۔ یہ اللہ کا فضل ہے 'جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے' اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ کوئی مصیبت ایسی نہیں جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب "یعنی نوشتہ تقدیر" میں لکھ نہ رکھا ہو۔ ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان کام ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے تاکہ جو کچھ بھی نقصان تمہیں ہو اس پر تم دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جاؤ۔ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں 'جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل کرنے پر اکساتے ہیں۔ اب اگر کوئی روگردانی کرتا ہے تو اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے"۔

صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں صدقہ لینے والوں پر اپنی برتری نہیں جتلاتے اور اس سودے میں یہ لوگ فریق ہی نہیں ہوتے۔ ان کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس سے بلند اور برتر شعور اور کیا ہو سکتی ہے کہ صدقہ دینے والا یہ سمجھے کہ وہ غنی اور حمید ذات کو قرض دے رہا ہے۔ اور وہ اس کائنات کے مالک کے ساتھ سودا کر رہا ہے۔ اور یہ کہ وہ جو کچھ خرچ کر رہا ہے وہ دوگنا تگنا ہو کر ملے گا۔ اور کئی گنا لوٹانے کے بعد اجر کریم بھی دیا جائے گا۔

صدیقین کا مقام بہت ہی بلند مقام ہے احادیث نبوی میں اس کی خوب تشریح کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ مقام بہت بلند ہے لیکن اس کے حصول کے مواقع ہر کسی کے لئے کھلے ہیں 'یہ چند افراد یا کسی طبقے تک محدود نہیں ہے 'جو بھی اللہ اور رسول پر صحیح ایمان پیدا کرے۔ اور اس مقام بلند کا طلب گار ہو وہ اسے پا سکتا ہے 'اللہ کے فضل پر کوئی حد بندی نہیں ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ (۵۷ : ۱۹) "اور جو لوگ اللہ اور رسولوں پر ایمان لائے ہیں وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق ہیں"۔ یہ اس دین کی خاصیت اور امتیازی بات ہے کہ یہ سب انسانوں کے لئے ایک کھلا راستہ ہے۔ یہ ایک بلند افق ہے جس کی طرف سب کی نظریں لگی رہنی چاہیں۔ یہاں کسی کا ٹھیکہ نہیں ہے اور نہ یہ مقامات کچھ مخصوص لوگوں کو ملتے ہیں۔ اسلام میں ہر شخص عمل کرکے اعلیٰ درجات تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا دین ہے جس میں کسی ایسے طبقے کی گنجائش نہیں ہے۔ جسے کوئی پیدائشی برتری حاصل ہو۔

امام مالک اپنی کتاب موطا میں روایت کرتے ہیں صفوان ابن سلیم سے 'جنہوں نے عطا ابن یسار سے 'انہوں نے ابو سعید خدری سے 'کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل جنت دیکھیں گے کہ بلند بالا خانوں والوں کو 'یہ اونچے ہوں گے 'جیسا کہ تم روشن ستارے کو دور مشرقی اور مغربی افق میں دیکھتے ہو 'اس لئے کہ بلندی درجات میں بہت فرق ہوگا۔ صحابہ کرام نے پوچھا رسول خدا یہ انبیاء کے منازل ہوں گے جن تک کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکے گا۔ تو فرمایا ہاں "خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یہ کچھ لوگ ہوں گے جو اللہ پر ایمان لائے اور جنہوں نے مرسلین کی تصدیق کی"...... یہ ہے ایمان کی پختگی اور اللہ کے دین پر فدا ہونے کا مقام؟ وہ بعد میں آتا ہے۔

وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ (۵۷:۱۹) "اور شہدا ہیں ان کے لئے ان کا اجر اور ان کا نور ہے"۔ شہدا کی بات تو قرآن میں بار بار آئی ہے۔ احادیث نبوی بھی ان کے بارے میں متواتر ہیں۔ یہ اس دین کے چوکیدار ہوتے ہیں اور کوئی دین چوکیداری کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور کسی جگہ جہاد کے بغیر دین کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔ جہاد کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عقیدہ محفوظ ہو' دعوت اسلامی کے لئے راہ آزاد ہو' اہل ایمان اور اہل شریعت کو فساد سے محفوظ رکھا جائے' یہی وجہ ہے کہ صرف شہدا فی سبیل اللہ ہی اس اونچے مقام کے شہداء ہیں' وہ رب کے قریب ہوں گے۔ اور وہ رب کے پاس ہوں گے۔ عند ربھم ان کا اعزاز ہے۔

"صحیحین میں روایت ہے کہ شہدا کی روحیں سبز پرندوں کی شکل میں جنت میں ہوتی ہیں اور وہ جہاں چاہتی ہیں چگتی ہیں۔ اس کے بعد وہ ان طاقوں میں آکر ٹھہرتے ہیں۔ اللہ ان پر ظاہر ہوگا اور فرمائے گا تم کیا چاہتے ہو' وہ کہیں گے ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں دوبارہ دنیا کی طرف لوٹایا جائے اور ہم پھر تیری راہ میں جنگ کریں جس طرح پہلی مرتبہ جنگ کی۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ دنیا کی طرف نہ لوٹیں گے۔" اور شیخین اور دوسروں نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے فرماتے ہیں فرمایا رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے "جو کوئی جنت میں داخل ہو جائے وہ دنیا کی طرف لوٹنا پسند نہ کرے گا اگرچہ یہاں اس کے لئے بہت کچھ ہو' ماسوائے شہید کے' وہ یہ چاہے گا کہ دنیا کی طرف لوٹایا جائے اور دس مرتبہ اللہ کی راہ میں قتل ہوتا رہے کیونکہ وہ شہیدوں کی عزت دیکھ چکا ہوگا۔"

یہ باتیں سن کر دور اول کے مسلمانوں کے لئے جان کی کوئی اہمیت نہ رہتی تھی۔ وہ مسلمان جن کو مقام شہادت کا پتہ لگ جاتا تھا۔

امام مالک نے یحییٰ ابن سعید سے روایت کی ہے کہ ایک بار رسول اللہ جہاد کے لئے لوگوں کو آمادہ فرما رہے تھے۔ اور آپ جنت کا ذکر فرما رہے تھے۔ انصار کا ایک آدمی سن رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں کھجوروں کے کچھ دانے تھے جنہیں وہ کھا رہا تھا۔ تو اس نے کہا "میں تو دنیا کا لالچی ہوں گا' اگر میں بیٹھ گیا اور یہ کھجوریں کھاتا رہا یہاں تک کہ میں ان سے فارغ ہو جاؤں۔ اس نے یہ کھجوریں پھینک دیں اور تلوار اٹھائی اور کفار پر حملہ کر دیا یہاں تک کہ وہ قتل ہو گیا۔ اس شخص کے نام کے بارے میں روایت ہے کہ وہ عمیر ابن الہمام تھا۔"

جب صدیقوں کا یہ مقام ہے اور شہدا کا یہ مقام ہے تو کافرین اور مکذبین کا مقام بھی بتا دیا جاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۵۷:۱۹) "اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہ دوزخی ہیں"۔ کون ہے جو اس اعزاز اور اس مرتبے کو چھوڑ سکتا ہے اور یہ پسند کر سکتا ہے کہ وہ جہنم والوں میں سے ہو جائے۔ اب ایک تیسری چٹکی بھری جاتی ہے۔ یہ دعوت ایمان اور دعوت انفاق اور دعوت شہادت کے بعد ہے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ ان مقامات بلند سے اگر کوئی چیز روک سکتی ہے تو وہ حب الدنیا ہے جبکہ دنیا نہایت حقیر' نہایت معمولی اور نہایت ہلکی چیز ہے۔ اور اس کے مقابلے میں آخرت بہت قیمتی ہے۔ ایک بہترین تمثیل!

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا وَفِى الْاٰخِرَةِ

عذابٌ شدیدٌ وّ مغفرۃٌ مّن اللّٰہ و رضوانٌ و ما الحیوۃُ الدُّنیا الّا متاعُ الغُرُور (۲۰:۵۷)
"خوب جان لو یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسری سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے ۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہوگئے ۔ پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہوگئی ۔ پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے ۔ اس کی برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے ۔ دنیا کی زندگی ایک دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں"۔

اس دنیا کی زندگی کو اگر دنیا کے پیمانوں سے ناپا تولا جائے ' تو ظاہری نظروں میں وہ ایک عظیم امر نظر آتا ہے ۔ اور بہت ہی بڑا مسئلہ ہے لیکن اس دنیا کو اگر پوری کائنات کے زاویہ سے دیکھا جائے اور آخرت کے میزان کے مطابق اسے تولا جائے تو وہ ایک بہت ہی معمولی چیز ہے ۔ یہاں قرآن کریم جتاتا ہے کہ یہ دنیا آخرت کے مقابلہ بازیچۂ اطفال ہے ۔ کیونکہ اصل جہاں تو آخرت ہے جہاں انسانوں کو اس دنیا کے انجام پر جانا ہے ۔

کھیل 'تماشا' زینت 'برتری جتانا' اور ہر چیز میں کثرت حاصل کرنا دنیا کی تمام بھرپور جدوجہد اور تمام مصروفیات کے پیچھے اس کی یہ ہے اس دنیا کے اس تمام کھیل کو قرآن اپنے مخصوص انداز میں ایک منظر کی شکل میں پیش کرتا ہے ۔

کمثل غیث اعجب الکفّار نباتہ (۲۰:۵۷) "اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشتکار خوش ہوگئے"۔ کفار سے مراد یہاں کاشتکار ہیں ۔ کفر کا لغوی معنی چھپانا ہے ۔ اور لغوی اعتبار سے کاشتکار کو کفار کہا جاتا ہے کہ وہ بیج کو زمین میں چھپاتا ہے لیکن یہاں اشارہ کفر کی طرف بھی ہے کہ وہ دنیاوی زندگی پر خوش ہوتا ہے ۔

ثمّ یھیجُ فترٰہ مُصفرًّا (۲۰:۵۷) "پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ زرد ہوگئی"۔ اور کٹنے کے لئے تیار ہوگئی ۔ کیونکہ اس سرسبزی کے لئے ایک وقت مقرر ہے اور بہت جلدی وہ کٹنے کے وقت کو پہنچ جاتی ہے ۔

ثُمّ یکُونُ حُطامًا (۲۰:۵۷) "پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے"۔ اب اسکرین پر یہ حرکت اور دوڑ دھوپ ختم ہوجاتی ہے ۔ فصل کٹنے کے منظر کے ساتھ حیات دنیا کا منظر بھی ختم ہوجاتا ہے ۔

رہی آخرت تو اس کی شان ہی الگ ہے ۔ آخرت کی شان یہ ہے کہ اس کا خیال رکھا جائے اور اسے اہمیت دی جائے ۔ اور اس کو پیش نظر رکھ کر تیاری کی جائے ۔

وفی الاٰخرۃ عذابٌ شدیدٌ وّ مغفرۃٌ مّن اللّٰہ ورضوانٌ (۲۰:۵۷) "اس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے"۔ آخرت اس طرح چند لمحات میں گزرنے والی نہیں ہے جس طرح یہ دنیا چند لمحات میں گزر جاتی ہے ۔ یہ دنیا کی طرح نہیں ہے کہ ایک دانہ ہے ۔ وہ اگا اور پھر بھس بن گیا ۔ اور ختم بلکہ آخرت میں تو حساب و کتاب ہے اور پھر دوام ہے ۔ لہٰذا اس کا انجام یہ ہونا چاہئے ۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (۵۷ : ۲۰) "اور دنیا کی زندگی ایک دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں"۔ اس سامان زندگی کی کوئی ذاتی حقیقت نہیں ہے۔ یہ دھوکہ ہے۔ یہ انسان کو لہو ولعب میں مشغول رکھتا ہے۔ اور اس کی زندگی بالآخر دھوکے کا شکار ہوتی ہے۔

انسان اگر سنجیدگی سے تلاش حقیقت کرنے نکلے تو یہ زندگی ایک دھوکہ ہی ہے۔ لیکن زندگی کو اسلام اور قرآن نے جس معنی میں متاع غرور کہا ہے اسے اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ قرآن کا منشا یہ نہیں ہے کہ دنیا کے معاملات سے انسان لاتعلق ہو جائے اور ترک دنیا کرلے۔ نہ اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ دنیا کی تعمیر و ترقی میں دلچسپی نہ لی جائے۔ اور یہاں انسان نے اللہ کے نائب ہونے کے حوالے جو ذمہ داری ادا کرنی ہے اسے ادا نہ کرے۔ بلکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ دنیا کی قدر و قیمت اور اس کی حقیقت کے بارے میں انسانی شعور کو درست کیا جائے۔ اور انسان کو بتایا جائے کہ اس دنیا کی حقیقی قدر و قیمت کیا ہے۔ وہ یہ کہ دنیا ایک زائل ہونے والی اور ہر انسان سے رہ جانے والی ایک عارضی جگہ ہے۔ اس کی جاذبیت اور اس کی اہمیت بھی اسی قدر ہونا چاہئے۔ جن لوگوں سے یہ سورت مخاطب تھی وہ پہلے مومن تھے اور ان کے ذمہ کچھ ایمانی تقاضے تھے اور دنیا کے بارے میں ان کا تصور اور شعور درست کرنا ضروری تھا تاکہ وہ ایمانی فرائض سرانجام پاسکیں۔ ہر مومن اپنے عقیدے اور نظریہ کے حوالے سے اس تصور کا محتاج ہے۔ اگر مومن نے اپنے عقیدے اور نظریہ حیات کو یہاں قائم کرنا ہے تو اسے اپنے دل کو اس دنیا سے متعلق صاف کرنا ہوگا۔

چنانچہ اسلام ان کو ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا ایک نیا میدان دیتا ہے۔ وہ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا حقیقی میدان ہے۔ وہ مقصد جس کا تعلق ان کے انجام سے متعلق ہے۔ اور جس کا تعلق عالم بقا اور دار آخرت سے ہے۔

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۵۷ : ۲۱) "دوڑو اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین جیسی ہے، جو مہیا کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہوں۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے"۔

یہ مقابلہ سامان لہو ولعب جمع کرنے میں نہیں ہے، یہ بہت سامال جمع کرنے کا بھی نہیں ہے یہ ان لوگوں کا مقابلہ ہے جنہوں نے اپنی گردن سے دنیا کی غلامی کا طوق اتار پھینکا ہے، اور انہوں نے لہو ولعب کا میدان بچوں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اور ان کی نظریں کسی اونچے افق پر ہیں۔ اور ان کا ہدف اس دنیا سے بھی ذرا آگے ہے۔

وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۵۷ : ۲۱) "اس جنت کی طرف جس کا عرض اور وسعت آسمان اور زمین جیسی ہے"۔

بعض مفسرین نے، اس زمانے میں جب اس کائنات کی وسعتوں کے بارے میں ہماری معلومات محدود تھیں یہ رائے

اختیار کی تھی کہ اس آیت سے مراد مجازاً بہت زیادہ وسعت ہے ' اسی طرح ان لوگوں نے بعض احادیث نبوی کو بھی مجازاً محمول کیا تھا۔ اسی طرح وہ حدیث جس میں کہا گیا ہے کہ جنت میں بالا خانوں والوں کو اہل جنت اس قدر بلند دیکھیں گے جس طرح ایک چمکدار تارا افق پر نظر آتا ہے 'مشرق میں یا مغرب میں' اس سے مراد بھی اہل تفسیر زیادہ بلندی لیتے تھے لیکن آج انسانوں کی بنائی ہوئی نہایت ہی چھوٹی دور بینیں اس کائنات کی جو وسعت ہمیں بتاتی ہیں وہ محیرالعقول اور سر چکرا دینے والی ہے 'جنت کی وسعت کے بارے میں احادیث ' اور وہ احادیث جن میں بالا خانے افق کے ستاروں جیسے بلند نظر آئیں ' ایسے حقائق نظر آتے ہیں جو عقل کے بہت قریب بلکہ مشاہدے کے بہت ہی قریب ہیں اور اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ قرآنی آیات یا احادیث جو جنت کی وسعت کے بارے میں ہیں ان کو مجاز پر محمول کیا جائے۔

جنت میں اس طویل و عریض مملکت میں ہر وہ شخص پہنچ سکتا ہے جو اس کا ارادہ کرے۔ ہر شخص اسے آگے بڑھ کر حاصل کر سکتا ہے لیکن اس کا بیعانہ اللہ اور رسولوں پر ایمان لانا ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۵۷ : ۲۱) "یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے"۔

اللہ کا فضل بے حد و حساب اور اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ فضل ان تمام لوگوں کے لئے کھلا ہے جو اس میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ لہٰذا لوگوں کو چاہئے کہ اللہ کے اس فضل کے حصول میں ایک دوسرے سے آگے بڑھیں۔ اس محدود الاطراف زمین ہی میں نہیں بلکہ اللہ کی لامحدود کائنات میں۔

ایک نظریاتی شخص کا فریضہ ہے کہ وہ اس عظیم کائنات کے ساتھ معاملہ کرے اور اپنے نفس ' اپنے نقطہ نظر ' اپنے تصور ' اپنی ترجیحات اور اپنے شعور کو اس تنگ اور محدود دنیا کے اندر محدود نہ کرے ' جب تک نظریاتی لوگ اپنے نقطہ نظر کو وسیع نہ کریں گے وہ اسلامی نظریہ حیات کی کوئی قابل قدر خدمت نہ کر سکیں گے۔ اس لئے کہ اسلامی نظریہ حیات لوگوں کی حقارتوں ' ذلتوں اور خود غرضیوں سے متصادم ہوتا ہے۔ اور وہ لوگوں کی گمراہی اور کج روی کے ساتھ بھی متصادم ہوتا ہے۔

پھر باطل قوت ہر وقت ایک نظریاتی شخص کا مقابلہ کرتی ہے اور وہ چونکہ زمین کے ایک حصے پر قابض ہوتی ہے اس لیے اس کے مقابلے میں وہی شخص کھڑا ہو سکتا ہے جس کا معاملہ ایک عظیم کائنات سے ہو اور اس زمین سے زیادہ وسیع تر نقطہ نظر رکھتا ہو۔ اور وہ اس فانی دنیا سے آگے باقی دنیا میں کچھ مقاصد و اہداف رکھتا ہو یعنی رضائے الٰہی۔

اس زمین کے مقاصد اور معیار کبھی بھی ایک نظریاتی شخص کے لیے اعلیٰ مقاصد اور نصب العین نہیں ہو سکتے ان کی اہمیت ایک مومن کے لیے اسی قدر ہوتی ہے ' جس قدر زمین کی حیثیت بمقابلہ کائنات ہوتی ہے۔ یہ پوری زمین نہ ازلی ہے اور نہ ابدی ہے۔ زمین اور اللہ کی کائنات کے درمیان کوئی نسبت ہی نہیں ہے ' زمین چھوٹی اور اس کے مقاصد بہت چھوٹے ہیں۔

چنانچہ ایک مومن کا نقطہ نظر بہت ہی وسیع اور بہت ہی بلند ہوتا ہے۔ اگرچہ زمین بہت خوب صورت طویل و عریض نظر آئے۔ اس لیے نظریاتی شخص اس حقیقت سے معاملہ کرتا ہے جو لامحدود ہوتی ہے اور زمین پر حدود و قیود وارد ہوتی

ہے ' وہ اس حقیقت سے مقابلہ کرتا ہے جو ازلی اور ابدی موجود ہے ۔ اور یہ عظیم حقیقت عالم آخرت کے وسیع میدان میں ہوتی ہے ۔ اس دنیا کی بعض حقیر قدروں میں اگر کمی بیشی ہو بھی جائے تو ایمانی قدروں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ جن لوگوں کے پیش نظر ان اعلیٰ قدروں کا حصول ہوتا ہے وہ اللہ کے مختار بندے ہوتے ہیں اور اس دنیا کی محدود قدروں سے آزاد ہوتے ہیں ۔

اب چوتھی چٹکی آتی ہے ۔ یہ ایک گہرا احساس دلاتی ہے ' اس بات کا اس دنیا میں جو کچھ بھی پیش آتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے ۔

مَآ اَصَابَ مِن مُّصِیبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیٓ اَنفُسِکُمْ اِلَّا فِی کِتٰبٍ مِّن قَبْلِ اَن نَّبْرَاَھَا
اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیرٌ (۲۲) لِّکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ
وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۲۳) الَّذِینَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ
مَن یَتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیدُ (۲۴) (۵۷ : ۲۲ تا ۲۴) "کوئی مصیبت ایسی نہیں جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب "یعنی نوشتہ تقدیر" میں لکھ نہ رکھا ہو ۔ ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان کام ہے ۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے تاکہ جو کچھ بھی نقصان تمہیں ہو اس پر تم دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جاؤ ۔ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں ' جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل کرنے پر اکساتے ہیں ۔ اب اگر کوئی روگردانی کرتا ہے تو اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے" ۔

اس کائنات میں جو واقعہ بھی پیش آتا ہے ' وہ اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ اللہ نے پہلے سے قلم بند کر لیا ہے ۔ اور اس کائنات کے منصوبے اور نقشے میں متعین اور محسوب ہے ۔ اس میں محض بخت واتفاق کا کوئی امکان نہیں ہے ۔ اس پوری کائنات کی تخلیق سے بھی پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے کامل اور شامل علم کے ذریعے ایسا کر لیا ہے ۔ اور بہت ہی تفصیل کے ساتھ سب کچھ قلم بند کر دیا ہے ' یہ اللہ کے علم میں تھا ۔ اللہ کے علم میں کوئی ماضی حال اور مستقبل نہیں ہے ۔ یہ زمان و مکان کے فاصلے اور حدیں اللہ کے علم پر حاوی نہیں ہیں ' یہ تو ہم اپنے محدود علم کے ذریعے ان چیزوں کو اس طرح زمان و مکان کے قید میں دیکھتے ہیں ۔ ہم تو ان حدود و قیود کے بغیر نہیں دیکھ سکتے ۔ پھر ہم حقیقت مطلقہ کا ادراک ہی نہیں کر سکتے ' ہاں بعض اوقات انسانوں کی قوت مدرکہ کو ایک ایسی چمک حاصل ہو جاتی ہے جس وقت ہماری سطح حقیقت مطلقہ سے جڑ جائے ' ہم اشیاء کی حقیقت کو اس عادی طریقے سے جان سکتے ہیں جس ذریعہ حواس ' رہا اللہ تعالیٰ جو حقیقت مطلقہ ہے اور وہ اس کائنات کی ہر چیز کو بلا حدود و قیود جانتا ہے ۔ یہ کائنات اور اس کے اندر واقعات اپنی آغاز سے انتہا تک اللہ کے علم میں ہیں ۔ یہ علم مطلق ہے اور بلا حدود و قیود ہے ۔ اور اللہ کے نقشے میں ہر ایک چیز اور واقعہ کا ایک مقام ہے جو اللہ کے علم میں ہے ' لہٰذا ہر واقعہ جسے انسان خیر سمجھتا ہے یا شر سمجھتا ہے ' زمین پر وہ واقع ہوتا ہے ۔ اور انسانوں کی زندگیوں میں

وہ پیش آتا ہے یہ اللہ کی کتاب میں ثبت ہے۔

اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۵۷ : ۲۲) "ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے"۔

اس کا فائدہ کیا ہے؟ اس حقیقت کا فائدہ یہ ہے کہ ایک انسان جسے اس دنیا کے واقعات پر خوشی بھی ہوتی ہے اور پریشانی بھی ہوتی ہے وہ اسے منجانب اللہ سمجھیں اور اس دنیا میں سکون اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ اگر کوئی ناگوار چیزیں دیکھیں تو حسرتوں سے اپنے آپ کو فنا نہ کر دیں اور اگر کوئی فرحت بخش واقعات دیکھیں تو آپے سے باہر نہ ہو جائیں اور جس طرح حقیقت ہے یہ سمجھیں کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔

لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ (۵۷ : ۲۳) "تاکہ جو کچھ بھی نقصان تمہیں ہو اس پر تم دل شکستہ نہ ہو' اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جاؤ"۔

لہٰذا نظر کا آفاقی ہو جانا اور اپنا معاملہ عظیم کائنات سے کرنا' ازل اور ابد سوچنا' اور جو کچھ پیش آتا ہے اسے کتاب تقدیر کا فیصلہ سمجھنا' ان سب چیزوں سے نفس انسانی وسعت اختیار کر لیتی ہے انسان بڑا ہوتا ہے' ثابت قدم ہوتا ہے' اور واقعات وحادثات کا ڈٹ کر فیصلہ کرتا ہے اور حرکت کائنات کے دوران اسے جو کچھ پیش آتا ہے نفس انسانی اس سے کامیابی سے گزرتا ہے۔

جب انسان اپنے آپ کو اس عظیم کائنات سے علیحدہ کر لیتا ہے تو اسے پیش آنے والے واقعات کے نتیجے میں جزع وفزع لاحق ہوتی ہے۔ وہ نہایت ہلکے پن کا مظاہرہ کرتا ہے۔ لیکن جب کوئی انسان یہ عقیدہ رکھتا ہے اور یہ بات اس کے ذہن میں بیٹھی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ اور یہ واقعات اور تصادم' اسی طرح ہیں۔ جس طرح ایک عظیم کائنات میں ذرات باہم ٹکراتے بھی ہیں اور وہ اپنی مقصد بھی پورا کرتے ہیں اور ایک وسیع نقشے کے مطابق کام بھی کرتے ہیں' اور یہ نقشہ ازل سے تیار ہے اور یہ سب افراد ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ تو پھر اسے یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ جو برا ہونا ہی تھا اس لیے نہ وہ محرومی پر پریشان ہوتا ہے اور نہ وہ کچھ ملنے پر آپے سے باہر آتا ہے۔

لیکن یہ مقام کہ کوئی بندہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دے چند ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ رہے تمام مسلمان تو ان کو یہ عقیدہ آلام ومصائب کی تلخیوں سے نکال دیتا ہے اور اس طرح ان کو خوشحالی میں اترانے سے روکتا ہے۔ اور دونوں حالات میں ایک مومن متوازن الطبع ہوتا ہے' حضرت عکرمہ نے کیا خوب کہا۔

"ہر آدمی خوش بھی ہوتا ہے اور مغموم بھی' خوشی کو شکر میں بدل دو اور غم کو صبر میں"۔

یہ ہے اسلام کا معتدل نقطہ نظر۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ (۵۷ : ۲۳) الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (۵۷ : ۲۴) "اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑے لوگ سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل پر اکساتے ہیں"

مسئلہ تقدیر، فخر و مباہات اور بخل کے مضامین کے درمیان ربط کیا ہے؟ یہ کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسے جو کچھ پیش آتا ہے وہ اللہ کی طرف سے آتا ہے، وہ ہرگز کبر و غرور اور فخر و مباہات پیش نہیں کرتا۔ اور نہ داد و دہش میں کمی کرتا ہے اور نہ بخل کرتا ہے اور نہ بخل کی دعوت دیتا ہے۔ اور جو لوگ اس حقیقت کا شعور نہیں رکھتے اور نہ اس پر ایمان رکھتے ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ ان کا اپنا کمال ہے، اس لئے وہ فخر و غرور کرتے ہیں اس کے بعد وہ نیکی کی راہوں میں خرچ نہیں کرتے کیونکہ ایسا شخص یہ سوچ لیتا ہے کہ اگر یہ غریب لوگ اہل ہوتے تو وہ بھی کما لیتے۔

وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۵۷: ۲۴) "اور اگر کوئی روگردانی کرتا ہے تو اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔" جو خرچ کرتا ہے وہ اپنے لئے ہی توشۂ آخرت تیار کرتا ہے اور جو اللہ کی بات مانے گا بھلا اس کا ہوگا۔ اللہ کہتا ہے، وہ اپنے محتاج بندوں کا محتاج نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات میں محمود ہے اور بے نیاز ہے اسے نہ لوگوں کی تعریف کی ضرورت ہے اور نہ تائید کی۔

---ooo---

اب آخر میں سورت کا آخری پیراگراف آتا ہے۔ یہ مختصراً اس دنیا میں رسولوں کی لیک لائن کا ذکر کرتا ہے۔ اسلامی نظریہ حیات کی تاریخ حضرت نوح علیہ السلام سے ادھر کہ اس دنیا میں اس کی غرض و غایت کیا تھی اور آخر میں حضرت عیسیٰ، انجیل کا نزول اور امت عیسیٰ کے خدوخال:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ
النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ ۳
يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ جَعَلْنَا ع ۱۶
فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ ۱۹
قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ
وَ جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا
كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ
اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَ

۳ يَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ
۳ ع فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝
۲۰

ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا' اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں' اور لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہیں۔ یہ اس لئے کیا گیا ہے کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔ ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور ان دونوں کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھ دی۔ پھر ان کی اولاد میں سے کسی نے ہدایت اختیار کی اور بہت سے فاسق ہو گئے۔ ان کے بعد ہم نے پے در پے اپنے رسول بھیجے اور ان سب کے بعد عیسیٰ ابن مریم کو مبعوث کیا اور اس کو انجیل عطا کی' اور جن لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا۔ اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کر لی' ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا' مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انہوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہوئے تھے ان کا اجر ہم نے ان کو عطا کیا' مگر ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاؤ' اللہ تمہیں رحمت کا دہرا حصہ عطا فرمائے گا اور تمہیں وہ نور بخشے گا جس کی روشنی میں تم چلو گے' اور تمہارے قصور معاف کر دے گا' اللہ بڑا معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔ (تم کو یہ روش اختیار کرنی چاہیے) تاکہ اہل کتاب کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کے فضل پر ان کا کوئی اجارہ نہیں ہے۔ اور یہ کہ اللہ کا فضل اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے' جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے' اور وہ بڑے فضل والا ہے"۔

رسالت کی حقیقت ایک ہی ہے' تمام رسالتوں کا پیغام ایک تھا۔ رسول مختلف ادوار میں لیکر آئے۔ اکثر رسولوں کو معجزات دیئے گئے۔ بعض رسولوں کو کتابیں بھی دی گئیں قرآن کہتا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (۲۵ : ۵۷) "ان کے ساتھ کتاب نازل کی" رسول بھی ایک تھے اور کتاب بھی ایک تھی۔ اور دعوت بھی ایک تھی لہٰذا رسالت کی نوعیت ایک ہی ہے۔

یہ کتاب کے ساتھ المیزان کیا ہے؟ ہر نبی اس لئے آیا ہے کہ انسانوں کو ایک میزان دے جس پر وہ اپنے حسن و قبح کو تولیں۔ اور اپنے اعمال کو اس میزان کے مطابق درست کریں اعمال' واقعات اور انسانوں کا وزن اس میزان پر ہو۔ اس کے مطابق لوگوں کی زندگی درست ہو' مختلف خواہشات کا سمت درست ہو' اور مختلف مزاجوں کے درمیان اعتدال پیدا ہو۔ اور باہم ٹکراؤ والی مصلحتوں کا فیصلہ ہو۔ ایک ایسا میزان ہو جو کسی کا طرفدار نہ ہو' یہ میزان حق ہو' کسی کے ساتھ ظلم نہ کرتا ہو' یہ اللہ کا میزان ہو جو سب کا رب ہے۔

یہ میزان جو اللہ نے رسولوں پر اتارا یہ انسانیت کے لئے ان تمام بے اعتدالیوں کے خلاف ایک ضمانت ہے جن میں انسانیت مبتلا ہوتی رہتی ہے' تمام اضطرابات' تمام انتشار اور تمام طوفان جس سے انسانیت دوچار ہوتی رہتی ہے۔ جہاں

خواہشات کے تصادم برپا ہوتے ہیں ۔ جہاں جذبات کے طوفان اٹھتے ہیں جہاں ضد و عناد کے غبار آندھیوں کی شکل اختیار کرتے ہیں ۔ جہاں انسان فرعون بن جاتے ہیں ۔ یہ میزان ضروری تھا کہ سب اس کے سامنے جھکیں ۔ اور اس میزان کے سامنے ہر کسی کو انصاف ملے ۔ عدل ملے ۔

لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷ : ۲۵) "تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں" غرض اس میزان کے بغیر جو اللہ کے تجویز کردہ نظام زندگی اور نظام قانون کے مطابق ہوتا ہے 'لوگ کبھی عدل و انصاف نہیں پا سکتے ۔ اگر کبھی لوگ عدل پا بھی لیں وہ عدل کو قائم نہیں رکھ سکتے ۔ ان کی خواہشات کی وجہ سے اور ان کی جہالتوں کی وجہ سے جلدی عدل کا میزان ان کے ہاتھوں سے گر جاتا ہے ۔

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ

بِالْغَیْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (۵۷ : ۲۵) "اور لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہیں ۔ یہ اس لئے کیا گیا ہے کہ معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے ۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے ۔" لوہے کو آسمانوں سے اتارنے کی تعبیر لی ہے جیسے دوسرے مقامات پر آیا ہے ۔

وَاَنْزَلَ لَکُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ "اور اس نے جو مویشیوں کے آٹھ جوڑے تمہارے لئے اتارے" دونوں جگہ مقصد یہ ہے کہ اللہ نے اشیاء کی تخلیق اس مقصد کے لئے کی ہے گویا ان کی تخلیق تقدیر الٰہی کے مطابق ہے ۔ پھر یہاں آیت کی فضا کی مناسبت اور ہم آہنگی کے قیام کی وجہ سے بھی نزول کا مادہ استعمال کیا گیا کیونکہ پہلے نزول کتاب اور نزول میزان کا ذکر تھا ۔ اس طرح یہاں فرمایا کہ نزول حدید بھی اس کائنات کے لئے اہم ہے ۔
لوہا اتارا گیا ہے ۔

فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ (۵۷ : ۲۵) "جس میں بڑا زور ہے" مثلاً لوہے کے اندر ہی جنگ اور سلامتی مضمر ہے ۔

وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷ : ۲۵) "لوگوں کے لئے منافع ہیں" آج تک انسانی تہذیب و تمدن لوہے کی برکت سے ہے ۔ اور پھر ۔

وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ (۵۷ : ۲۵) "یہ اس لئے کیا گیا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے" یہ اشارہ جہاد و قتال کی طرف ہے ۔ یہ یہاں اس لئے لایا گیا ہے کہ جہاد بالمال اور جہاد بالنفس اسلحہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا ۔
یہاں جو کہا گیا کہ اللہ اپنے لوگوں کو ظاہر کرنا چاہتا ہے جو کہ اللہ اور اس کی رسولوں کی غائبانہ مدد کرتے ہیں ۔ تو بتایا

جاتا ہے کہ اللہ اور رسول اللہ کی نصرت کے معنی کیا ہیں۔ تو اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی دعوت اور نظام کی مدد کرتے ہیں جہاں تک ذات باری تعالیٰ کا تعلق ہے تو وہ تو۔

اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (۵۷ : ۲۵) "اللہ بہت ہی قوی اور غالب ہے" یہاں کہا گیا کہ رسالت اپنی حقیقت ' اپنی کتاب اور اپنی دعوت کے اعتبار سے ایک ہی ہے ' اور یہ رسالتوں کا میزان اور شریعت بھی ایک ہے۔ اب یہاں بتایا جاتا ہے کہ رسول بھی ایک ہیں یہ نوح ابراہیم کی اولاد سے ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِیْمَ وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ

(۵۷ : ۲۶) "اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور ان دونوں کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھ دی" رسولوں کا ایک ہی شجرہ نسب ہے جس کی شاخیں ایک ہی جڑ کے ساتھ پیوستہ ہیں۔ انسانیت کے آغاز ہی سے یہ شجرہ چلا ہے۔ نوح علیہ السلام سے 'پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ' اور ان کے بعد پھر انسانوں کے پھیلنے کے ساتھ رسالتیں بھی پھیل گئیں۔ لیکن جن نسلوں میں یہ نبوت اور کتاب چلتی رہی وہ نسلیں ایک جیسی نہ تھیں۔

فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۵۷ : ۲۶) "پھر ان کی اولاد میں کسی نے ہدایت اختیار کی اور بہت سے فاسق ہو گئے" یہ نہایت ہی مختصر تبصرہ طویل انسانی تاریخ پر۔

اور اس طویل تاریخ کی آخری کڑی نبوت محمدی سے پہلے یہ رہی۔

ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰۤی اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّیْنَا بِعِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ (۵۷ : ۲۷) "اس کے بعد ہم نے پے درپے رسول بھیجے اور ان سب کے بعد عیسیٰ ابن مریم کو مبعوث کیا" یعنی نوح اور ابراہیم کی اولاد میں پے درپے رسول بھیجے اور ان میں سے آخری کڑی عیسیٰ ابن مریم کی تھی۔ یہاں حضرت عیسیٰ کے پیروکاروں کی ممتاز صفت بھی بیان کر دی جاتی ہے۔

وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً (۵۷ : ۲۷) "اور جن لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا" یہ ترس اور رحم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ آپ نے لوگوں کی روحانی تربیت پر زور دیا۔ اور ظاہر ہے کہ روحانی تربیت اور روحانی صفائی کے نتیجے میں ترس اور رحم بیدار ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا صحیح اتباع کیا وہ رحم دل ہوتے تھے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی عیسائیوں کی اس صفت کی طرف اشارہ ہے۔ ابتدائی دور کے عیسائیوں نجاشی اور وفد نجران کے لوگوں کا رویہ بھی اسلام کے ساتھ ہمدردانہ رہا۔ اور اسی طرح دوسرے متفرق افراد بھی ان میں دار الاسلام آئے اور اسلام قبول کیا۔ جب تک وہ عیسیٰ علیہ السلام کے صحیح متبعین میں سے رہے۔

قرآن کریم یہاں مسیح علیہ السلام کے متبعین کی ایک دوسری صفت کو بھی بیان کرتا ہے لیکن اس پر ایک خوبصورت

تنقید بھی کرتا ہے ۔

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ (۲۷:۵۷) "اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کرلی ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا ۔ مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انہوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی تھی" راجح تفسیر یہ ہے کہ تاریخ مسیحیت میں جو رہبانیت نظر آتی ہے وہ مسیح کے بعض پیروکاروں نے اختیار کرلی تھی ۔ اور یہ انہوں نے اللہ کی رضا جوئی کے لئے اختیار کرلی تھی ۔ یہ انہوں نے زندگی کی آلودگیوں سے دوری کے لئے اختیار کرلی تھی اللہ نے اسے ان پر فرض نہ کیا تھا ۔ لیکن جب انہوں نے اسے اختیار کرلیا ۔ اپنے اوپر واجب کرلیا تو پھر ان کا فرض تھا کہ وہ اس کا حق ادا کرتے ۔ اور پاکیزگی ' بلندی ' عفت ' قناعت اور ذکر و فکر کے جو تقاضے وہ رکھتی تھی اسے یہ پورا کرتے ۔ کیونکہ انہوں نے رضائے الٰہی کے لئے اسے ایجاد کیا تھا ۔

لیکن ہوا یوں کہ یہ رہبانیت محض رسم ہو کر رہ گئی اسم سے خالی ہوگئی ۔ لوگوں نے اسے پیشہ بنالیا اور حقیقی روح سے خالی ہوگئی ۔ چند رہبان کے سوا کسی نے اس کا جو حق ادا نہ کیا ۔

فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۲۷:۵۷) "اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا ۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہوئے تھے ان کا اجر ہم نے ان کو عطا کیا ۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں ۔" اللہ کا قانون یہ نہیں ہے کہ لوگوں کی ظاہری شکلوں کو دیکھ کر فیصلہ کرے ۔ نہ رسم و رواج کو دیکھے ۔ اللہ لوگوں کی نیت کو دیکھتا ہے لوگوں کے اعمال کو دیکھتا ہے ۔ وہ نیت اور عمل پر فیصلے کرتا ہے ۔ اور کسی کی نیت اس سے پوشیدہ نہیں ہے ۔ وہ تو دلوں کی بات جانتا ہے ۔

---○○○---

اب آخری پکار ان لوگوں کے نام ہے جو ایمان لائے ہیں ۔ اور دین اور رسالت کی تاریخ اور امم اسلامیہ کی کڑیوں میں سے آخری کڑی ہے اور جنہوں نے اب قیامت تک انبیا کی دعوت کا بوجھ اٹھانا ہے ۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۸) لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۲۹) (۵۷:۲۸ - ۲۹) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاؤ' اللہ تمہیں رحمت کا دہرا حصہ عطا فرمائے گا اور تمہیں وہ نور بخشے گا جس کی روشنی میں تم چلو گے ' اور تمہارے قصور معاف کر دے گا' اللہ بڑا معاف کرنے والا اور مہربان ہے ۔ (تم کو یہ روش

اختیار کرنی چاہئے) تاکہ اہل کتاب کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کے فضل پر ان کا کوئی اجارہ نہیں ہے۔ اور یہ کہ اللہ کا فضل اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے' جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے' اور وہ بڑے فضل والا ہے"۔

یہ ایمان والوں کو آواز دی جارہی ہے۔ ان کے محبوب نام سے دی جارہی ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۵۷: ۲۸) "اے ایمان لانے والے لوگو!" یہ ان کے دل کی آواز ہے' دل پر چسپاں ہونے والی آواز ہے۔ ایمان کو زندہ کرنے والی آواز ہے۔ یہ یاد دہانی ہے کہ ایمان کا حق ادا کرو' اور تمہارا رب جو تمہیں پکار رہا ہے اس کے ساتھ تمہارا تعلق ایمانی تعلق ہے۔ اس لئے تمہیں اس نام سے پکار رہا ہے۔ ایمان کے حوالے سے اللہ دعوت دیتا ہے کہ اس سے ڈرو اور رسول پر ایمان لاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایمان کا حق کوئی خاص مفہوم مراد ہے۔ یعنی حقیقت ایمان اور آثار خود اپنے اندر پیدا کرو۔

اتَّقُوا اللّٰہَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِہٖ یُؤْتِکُمْ کِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِہٖ (۵۷: ۲۸) "اللہ سے ڈرو' اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ' اللہ تمہیں اپنی رحمت کا دہرا حصہ عطا فرمائے گا" یہ بھی عجیب انداز ہے۔ اللہ کی رحمت کا تجزیہ تو نہیں ہو سکتا جس کو پہنچ گئی پوری پوری پہنچ گئی۔ اس کے حصے بخرے کہاں ہوتے ہیں۔ دراصل یہاں محدود انسانی ذہن کے مطابق بات ہو رہی ہے کہ تمہیں دو حصے ملیں گے۔

وَیَجْعَلْ لَّکُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِہٖ (۵۷: ۲۸) "تمہیں وہ نور بخشے گا جس کی روشنی میں تم چلو گے" یہ وہ ربانی تحفہ ہوتا ہے جو ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں۔ اور رسول پر بھی ایمان لاتے ہیں۔ اس بخشش سے دل نرم ہو جاتے ہیں۔ اور پردوں کے پیچھے سے اصل حقیقت کو دیکھ لیتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی راہ پر سیدھے جاتے ہیں۔ گمراہ نہیں ہوتے۔

وَ یَغْفِرْ لَکُمْ وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۵۷: ۲۸) "اور تمہارے قصور معاف کر دے گا۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور مہربان ہے" بہرحال انسان تو انسان ہے' جس قدر بھی نور اسے حاصل ہو اس سے غلطی سرزد ہو سکتی ہے۔ اس کو مغفرت کی بروقت ضرورت ہے اور اللہ غفور الرحیم ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ تاکہ اللہ کی رحمت کا دہرا حصہ تمہیں ملے۔ یہ کہ یہ نور تمہیں ملے جس کی روشنی میں تم سفر زندگی طے کرو' اور اللہ کی رحمت اور مغفرت تمہارے شامل حال ہو جائے اور تمہاری خطائیں معاف ہوں۔

لِئَلَّا یَعْلَمَ اَھْلُ الْکِتٰبِ اَلَّا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَ اَنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ (۵۷: ۲۹) "تاکہ اہل کتاب کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کے فضل پر ان کا اجارہ نہیں ہے اور یہ کہ اللہ کا فضل اس کی اپنے ہاتھ میں ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے" اہل کتاب یہ گھمنڈ رکھتے تھے کہ وہ اللہ کی برگزیدہ

قوم ہیں اور وہ اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا "وہ کہتے ہیں کہ یہودی بن جاؤ یا نصاریٰ بن جاؤ تمہیں ہدایت مل جائے گی" تو اللہ تعالیٰ مومنین کو دعوت دیتا ہے کہ اللہ کی رحمت 'اس کی جنت 'اس کی مغفرت اور اس کی انعامات کے مستحق ہو جاؤ اور میں تم پر ان چیزوں کی بارش کروں گا تب اہل کتاب کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ تو زعم باطل میں مبتلا ہیں۔ اور ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ مسلمانوں پر ہو گیا ہے۔ یہ کسی کے اجارے میں نہیں دے دیا گیا اور نہ محدود کر دیا گیا ہے۔

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۵۷ : ۲۹) "اور اللہ بڑے فضل والا ہے"۔

غرض یہ ایک ایسی دعوت ہے جس میں مسلمانوں کو مقابلے کی دعوت دی گئی۔ کہ تم تقویٰ ار طہارت اور نیکی کی راہ میں آگے بڑھ جاؤ۔ اس پر یہ سورت ختم ہوتی ہے اور سورت کا خاتمہ اور آغاز باہم مل جاتے ہیں۔ کیونکہ اس پوری سورت میں یایھا الذین امنو اکی پکار ہے۔ کہ رب کے سامنے خضوع و خشوع اختیار کرو 'رب کے احکام بجالاؤ' مالی 'بدنی اور روحانی فرائض پورے کرو۔

قرآن کریم جس انداز میں قلب انسانی کو خطاب کرتا ہے یہ سورت اس کا بہترین نمونہ ہے۔ پر اثر انداز میں انسانوں کو نیکیوں پر ابھارا جاتا ہے 'اس سورت کا آغاز انجام اور سیاق کلام سب انسانوں کو عمل صالح پر آمادہ کرنے والے ہیں۔ اس کی تصاویر 'ماحول اور اثر آفرینیاں قابل دید ہیں 'دعوت اسلامی کا کام کرنے والوں کے لئے اس میں درس عبرت ہیں۔ اس میں اشارات ہیں کہ لوگوں کو کس اسلوب میں خطاب کیا جائے اور کس انداز میں جوش دلایا جائے '........ یہ اللہ کا درس ہے۔ جس نے ہمارے دل بنائے ہیں اور جو ہر چیز کا خالق ہے۔ داعیوں کو چاہئے کہ وہ اس ربانی درسگاہ سے سیکھ کر نکلیں تاکہ ان کی دعوت کامیاب ہو۔

---000---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ــ ۲۸

## سورۃ المجادلۃ ـ ۵۸

۱ ــ تا ــ ۲۲

# سورۃ المجادلہ ایک نظر میں

اس سورت میں بلکہ اس پورے پارے میں مدنی دور کی تاریخ اسلام اور سیرۃ النبی کے واقعات و موضوعات پر بحث ہے ۔ مدینہ میں اٹھنے والی اسلامی جماعت اور اسلامی سوسائٹی کی تربیت اور اصلاح اور اس مقصد کے لیے تیاری جس کے لیے اسے برپا کیا گیا ہے ۔ یہ اس سورت کے موضوعات ہیں ۔ تحریک کے سامنے جو ہدف تھا وہ ایک عالمی بلکہ کائناتی ہدف تھا ۔ اور یہ ہدف اس تحریک کے لیے اللہ نے اپنی کائناتی اسکیم میں ازل سے مقرر کر رکھا تھا ۔ مختصر الفاظ میں وہ ہدف یہ تھا کہ ان لوگوں کے سامنے اس زندگی کا کامل اور شامل ' جامع اور مانع تصور حیات پیش کیا جائے ۔ پہلے اس تصور کو جماعت مسلمہ کے ذہنوں میں بٹھایا جائے اور پھر اس تصور کی بنیاد پر ایک عملی نظام قائم کیا جائے ۔ اس کے بعد یہ جماعت اس نظام کو لے کر اٹھے اور پوری دنیا پر چھا جائے اور اس نظام کو غالب کر دے ۔ یہ چونکہ ایک عظیم مقصد تھا اس لیے اس کے لیے ایک عظیم تیاری کی ضرورت تھی ۔

وہ ابتدائی مسلمان جن کو اس مقصد کے لیے تیار کیا جا رہا تھا ' وہ عظیم لوگ تھے ۔ ان میں انصار اور مہاجرین کے سابقون اولون تھے جن کا ایمان پختہ تھا ' جدید نظریہ کے بارے میں جن کا تصور مکمل ہو گیا تھا ' ان کے نفوس اس کے لیے مخلص ہو گئے تھے ' وہ اس بات کو پا گئے تھے کہ ان کے وجود کی حقیقت کیا ہے اور اس عظیم کائنات کی حقیقت کیا ہے ۔ ان کا وجود اس کائنات کی حقیقت میں مکمل حل ہو گیا تھا ۔ یوں وہ اس کائنات میں اللہ کی تقدیر بن گئے تھے ۔ ان کے اندر کوئی ٹیڑھ پن باقی نہ رہی تھی ۔ وہ اس کائنات کے ساتھ چلتے تھے اور اس کائنات کی رفتار سے ایک قدم بھی پیچھے نہ رہتے تھے ۔ ان کے دلوں کے اندر اللہ کے سوا کوئی آرزو نہ تھی ۔ وہ ایسے تھے جیسا کہ اس سورت میں ان کے بارے میں کہا گیا ہے ۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِیْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَ اَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَ یُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ( ۵۸ : ۲۲ ) " تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں ' وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے ' خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے

ہوں یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخش دی ہے ۔ وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے ۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے ۔ وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں ۔ خبردار رہو ' اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں"۔

لیکن یہ السابقون الاولون جماعت اسلامی کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر کم تھے ۔ خصوصاً ان ادوار میں جب اسلام ایک پر شوکت قوت تھی اور لوگ اس سے ڈرتے تھے ۔ یہاں تک کہ فتح مکہ سے پہلے بھی اس میں ایسے لوگ آگئے تھے جن کی تربیت مکمل نہ تھی ۔ اور جنہوں نے اسلامی فضا میں کوئی زیادہ وقت نہ گزارا تھا۔ جس طرح اس میں منافقین بھی داخل ہو گئے تھے ' محض مفادات کی خاطر جبکہ ان کے دلوں میں بیماری تھی ' وہ موقع کی تلاش میں تھے اور وہ اسلامی بلاک اور اسلام کے بالمقابل قوی تر بلاکوں کے درمیان مذبذب تھے ۔ ان مخالف محاذوں میں مشرکین کا محاذ بھی تھا اور یہودیوں کا محاذ بھی تھا ۔

اس عظیم کردار کے لیے مسلمانوں کو تیار کرنے کی خاطر ایک عظیم تربیت کی ضرورت تھی ۔ اس کے لیے بڑی محنت اور پتہ مار کام کرنے کی ضرورت تھی ' اور یہ کام نہایت تدریج کے ساتھ کیا جانا ضروری تھا ۔ یہ تربیتی کام چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی ضروری تھا اور بڑے بڑے معاملات میں بھی ضروری تھا ۔ اسلام نے جو تحریک شروع کی تھی وہ ایک ہمہ گیر تعمیری تحریک تھی ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس تحریک کے سربراہ تھے ۔ پہلے ان نفوس کی تعمیر کی جاتی تھی جن سے اسلامی سوسائٹی کی عمارت بنی تھی ۔ اس سوسائٹی کو اسلامی نظام حیات کے نظریہ اور اصولوں پر استوار ہونا تھا اس طرح کہ یہ نفوس اس نظام کو پہلے سمجھیں اور پھر اسے ٹھوس عملی شکل دیں اور پھر اسے زندہ اور متحرک شکل میں زمین کے کونے کونے میں منتقل کر دیں ۔ وہ محض نعرہ یا محض کتاب نہ ہو بلکہ ایک عملی حقیقت ہو ۔

اس سورت اور اس پارے میں اس ہمہ گیر تربیت اور تعمیر کا خوب مشاہدہ ہو گا اور حیات نو کی تعمیر کے لیے جدوجہد کے نمونے بھی ملیں گے اور تعمیر اخلاق کے لیے اسلامی منہاج بھی ملے گا ۔ جذبات ' واقعات اور لوگوں کی عادات کا مطالعہ بھی ہو گا ' اور اسلام اور اسلام کے دشمنوں ' مشرکین ' منافقین اور یہودیوں کے درمیان مسلسل کشمکش کی جھلکیاں بھی نظر آئیں گی ۔

اس سورت میں ہم مشاہدہ کریں گے کہ اس جماعت پر کس طرح اللہ کی طرف سے مسلسل مہربانیاں ہو رہی ہیں ۔ اللہ اپنی نگرانی میں اس جماعت کو بنا رہا ہے ۔ اپنے ٹھوس منہاج کے مطابق اس کی تربیت فرما رہا ہے ۔ اسے یہ شعور اور احساس بھی دیا جا رہا ہے کہ اللہ کا فضل تمہارے شامل حال ہے ۔ اس جماعت کے دل میں یہ یقین پیدا کیا جا رہا ہے کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے ۔ اور وہ مشکل ترین حالات میں تمہارا مددگار ہے ۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے معاملات کو بھی وہ دیکھ رہا ہے ۔ تمہاری خفیہ نیتوں کو بھی وہ دیکھ رہا ہے ۔ اور تمہارے سب معاملات میں وہ تمہیں تمہارے دشمنوں کی سازشوں سے بچا رہا ہے ' خواہ خفیہ سازشیں ہوں ' خواہ ظاہری ہوں ۔ تم اس کی نگرانی اور حفاظت میں ہو اور اس نے تمہیں اپنے جھنڈے تلے لے لیا ہے ' اپنے سایہ میں لے لیا ہے ۔ وہ تمہارے اخلاق ' تمہاری عادات ' تمہارے رسم و رواج کی اصلاح و تربیت کر رہا ہے ۔ ایسی تربیت جو کہ اللہ والی جماعت کے اور حزب اللہ کے لائق ہو ' جو اللہ کی نگرانی میں ہو ۔ اور جو اللہ

کے جھنڈے بلند کیے ہوئے ہو اور اسی نام سے معروف ہو۔

چنانچہ اس سورت کا آغاز اس عجیب دور کی ایک تصویر سے ہوتا ہے' اس تصویر میں آسمان اور زمین کے درمیان' عالم بالا اور انسانوں کے درمیان براہ راست رابطہ نظر آتا ہے۔ یہ رابطہ بالکل ظاہر اور محسوس ہے۔ عالم بالا اسلامی سوسائٹی کے روز مرہ کے معاملات میں شریک ہے۔ اور یہ شرکت بالکل عیاں ہے۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ (۱:۵۸) "اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملہ میں تم سے تکرار کر رہی ہے اور اللہ سے فریاد کیے جاتی ہے۔ اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے۔ وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے"۔ یوں نظر آتا ہے کہ ایک چھوٹے سے خاندان کے روز مرہ کے معاملات میں سے ایک معاملہ میں عالم بالا سے مداخلت ہوگئی۔ اس خاندان کے لیے بڑی مشکل صورت حالات پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے معاملے میں اللہ کا فیصلہ آ جاتا ہے۔ اللہ نے اس عورت کی گفتگو سن لی تھی' جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تکرار کر رہی تھی۔ حضرت عائشہ نے بھی یہ باتیں نہ سنی تھیں حالانکہ وہ آپ سے قریب تھیں۔ یہ ایک ایسی تصویر ہے جس سے اللہ کا وجود' اللہ کا قرب' اللہ کی مہربانی اور اللہ کی نگرانی اس پوری فضا پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس کے بعد ایک نہایت ہی تاکیدی ہدایت اور تبصرہ آتا ہے۔ جو لوگ اللہ کے دشمن ہیں' اور یہ جماعت مسلمہ کے دشمن ہیں اور وہ اس کے اندر اس کی صفوں میں شامل ہیں' ان کے لیے عذاب الیم ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں میں ان لوگوں سے مواخذہ اس ریکارڈ کے مطابق کیا جائے گا' جو اللہ نے ان کے اعمال کے متعلق تیار کیا ہے۔ یہ خود یہ سب کچھ کر کے اسے بھول جائیں گے۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۶:۵۸) "اللہ ہر چیز پر گواہ ہے"۔ اس کے بعد تاکید مزید یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ ہر قسم کی نجویٰ کو سن رہا ہے۔ تمام وہ لوگ جو نجویٰ کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اکیلے ہیں' اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ جہاں بھی ہوں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔

ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۷:۵۸) "پھر قیامت کے روز وہ ان کو بتا دے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔ یہ بھی ایک تصویر ہے جو دکھاتی ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے اور اسے سب کچھ معلوم ہے۔

یہ تمہید تھی ان لوگوں کو تنبیہہ کرنے کے لیے جو چھپ چھپ کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ اس سے ان کو پریشان' غمگین اور خوفزدہ کرنا مطلوب ہے۔ اور ان کو یہ دھمکی دینا مطلوب ہے کہ ان کی تمام کارستانیاں اللہ کو معلوم ہیں۔ اللہ دیکھ رہا ہے کہ تمہارے مشورے گناہ' دست درازی اور رسول اللہ کی نافرمانی میں ہیں' اور اللہ اس پر تمہیں پکڑنے والا ہے اور عذاب دینے والا ہے۔ اس مناسبت سے مسلمانوں کو بھی ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ صرف نیک

کاموں میں نجویٰ کر سکتے ہیں ۔ جن کا تعلق تربیت نفوس اور اپنے معاملات کی بھلائی ہو ۔

تربیت اور تہذیب کے کچھ مزید اصول دیتے ہوئے مسلمانوں کو آداب مجلس رسول سکھائے جاتے ہیں ' کہ رسول کی مجلس میں رسول کی اطاعت کریں اور اچھا رویہ اختیار کریں ۔ اسی طرح مجالس علم اور ذکر میں بھی یہی رویہ اختیار کریں ۔ رسول اللہ سے سوال کرنے کے آداب اور ایسے معاملات میں بہت ہی سنجیدگی اختیار کرنے کے آداب ۔

باقی سورۃ میں ان منافقین کے رویوں پر تبصرہ ہے جو یہودیوں کے ساتھ محبت رکھتے ہیں ۔ ان کے ساتھ مل کر اسلامی تحریک کے خلاف سازشیں کرتے ہیں اور مسلمانوں اور رسول اللہ کے سامنے جھوٹی قسمیں کھا کر اپنی صفائی کرتے ہیں ۔ یہ قسمیں کھانے والے جھوٹے ہیں ۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ۔ یہ لوگ اپنی قسموں کی آڑ میں اللہ کے عذاب سے بچنا چاہتے ہیں ' جس طرح دنیا میں قسموں کے ذریعہ رسول اللہ اور مسلمانوں کی ناراضگی سے بچنا چاہتے ہیں ۔ فیصلہ سنا دیا جاتا ہے کہ جو اللہ اور رسول اللہ سے دشمنی کرتا ہے اللہ نے لکھ دیا ہے کہ وہ ذلیل لوگوں میں سے ہو گا ۔ اور ایسے لوگ آخرکار سخت خسارے میں رہیں گے ۔ جس طرح اللہ نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ اور اس کے رسول غالب رہیں گے ۔ یہ بات اللہ نے ان کی حیثیت کو کم کرنے کے لیے بیان کی ہے کیونکہ بعض نادان مسلمان اب بھی ان لوگوں کو اہمیت دیتے تھے ۔ اس لیے وہ ایسے منافقوں کے ساتھ تعلقات قائم رکھے ہوئے تھے ۔ مقصد یہ تھا کہ ایسے لوگوں کے تعلق کا مرکز اور محور اسلامی سوسائٹی ہو جائے ۔ اور اس طرح اسلامی صفیں مکمل طور پر ان منافقین سے ممتاز ہو جائیں ۔ وہ صرف اللہ کی مہربانی پر بھروسہ کریں اور صرف اس بات پر اطمینان کریں کہ اس جماعت اور امت کو اللہ نے کسی عظیم مقصد کے لیے اٹھایا ہے اور اس کی تربیت اللہ انہی اہداف کو پیش نظر رکھ کر کر رہا ہے اور ان کو نہ صرف اس دنیا میں بلکہ پوری کائنات میں ایک مقصد کے لیے تیار کر رہا ہے ۔

اس سورت کے آخر میں حزب اللہ کی خوبصورت تصویر ' یہ تصویر السابقون الاولون کی تھی جو مدینہ کی گلیوں میں چلتی پھرتی تھی ' مہاجرین میں بھی تھی اور انصار میں سے بھی ۔ اور اس دور میں مسلمانوں کی اکثریت کو یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ وہ اس مقام بلند تک پہنچنے کی کوشش کریں جس تک ابھی وہ نہیں پہنچے ۔ ان کو بتانا مقصود تھا کہ تمہارا آئیڈیل منافق نہیں بلکہ یہ لوگ ہیں ۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۵۸ : ۲۲) "تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں ' وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہو...."۔

---o0o---

# درس نمبر ۲۵۸ تشریح آیات

## ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۲۲

سُوْرَةُ الْمُجَادَلَةِ (۵۸) مَدَنِيَّةٌ (۱۰۵)
آيَاتُهَا ۲۲ — رُكُوعَاتُهَا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ
وَ اللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝۱ اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ
مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ
مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَ زُوْرًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۲ وَ الَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ
نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ
ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۳ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ
شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ
مِسْكِيْنًا ؕ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ۝۴

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملہ میں تم سے تکرار کر رہی ہے اور اللہ سے فریاد کیے جاتی ہے۔ اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے' وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار

کرتے ہیں ان کی بیویاں ان کی مائیں بنیں ہیں ' ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے ۔ یہ لوگ ایک سخت ناپسندیدہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں ' اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے ۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اپنی اس بات سے رجوع کریں جو انہوں نے کہی تھی ' تو قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں ' ایک غلام آزاد کرنا ہوگا ۔ اس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے ' اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے ۔ اور جو شخص غلام نہ پائے وہ دو مہینے کے پے درپے روزے رکھے قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں ۔ اور جو اس پر بھی قادر نہ ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے ۔ یہ حکم اس لیے دیا جارہا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ ۔ یہ اللہ کی مقرر کی گئی ہوئی حدیں ہیں ' اور کافروں کے لیے دردناک سزا ہے "۔

جاہلیت کا یہ قانون تھا کہ مرد کسی وجہ سے بیوی سے ناراض ہو جاتا تو اسے یہ کہہ دیتا " تو میرے لیے اس طرح ہے جس طرح میری ماں کی پیٹھ "۔ اس فقرے سے نہ عورت طلاق ہوتی تھی اور نہ وہ اس کے ساتھ تعلق زناشوئی قائم کر سکتا تھا ۔ یوں یہ عورت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معلق رہ جاتی تھی ۔ یہ دوسرے مظالم کے علاوہ ایک ظلم تھا جس میں کوئی عورت زمانہ جاہلیت میں مبتلا ہو جاتی تھی ۔

جب اسلام ظہور پذیر ہوا تو اسلامی سوسائٹی میں ظہار کا یہ پہلا واقعہ پیش آیا جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے ۔ ابھی تک اسلامی قانون ظہار نافذ نہ ہوا تھا ۔ امام احمد روایت کرتے ہیں ۔ سعد ابن ابراہیم اور یعقوب سے ' یہ دونوں لئی سے ' وہ محمد ابن اسحاق سے ' وہ معمر ابن عبداللہ ابن حنظلہ سے ' وہ یوسف ابن عبداللہ ابن سلام سے ' وہ خولہ بنت ثعلب رضی اللہ عنہا سے وہ کہتی ہیں : " خدا کی قسم سورہ مجادلہ کی ابتدائی آیات میرے اور اوس ابن الصامت کے بارے میں نازل ہوئیں ۔ میں ان کی بیوی تھی ۔ یہ بہت بوڑھے اور سخت مزاج تھے ۔ ایک دن وہ آئے میں نے کسی معاملے میں ان کے ساتھ تکرار کر لیا ۔ انہیں بہت غصہ آیا تو انہوں نے مجھے کہا تو مجھ پر ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ ۔ اس کے بعد وہ چلے گئے ۔ اور لوگوں کی محفل میں کچھ دیر تک رہے ۔ پھر واپس آگئے ۔ تو کیا دیکھتی ہوں کہ یہ میرے ساتھ تعلق زناشوئی کرنا چاہتے ہیں ۔ میں نے کہا خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں خولہ کی جان ہے ' تم میرے قریب نہیں آسکتے ۔ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ تو کہہ دیا ہے ۔ اب یہ معاملہ رسول اللہ کے پاس جائے گا ۔ اور جب تک اللہ اور رسول اللہ کا کوئی حکم نہیں آجاتا تم میرے قریب نہیں آسکتے ۔ تو انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا اور میں نے انہیں روکا جس طرح ایک عورت بوڑھے شخص کو روک لیتی ہے ۔ غرض میں انہیں اپنے سے پرے پھینک دیا ۔ اس کے بعد میں اپنی بعض پڑوسنوں کے پاس گئی اور ان سے کپڑے عاریتاً مانگے ۔ پھر میں رسول اللہ کے پاس پہنچ گئی ۔ میں آپ کے سامنے بیٹھ گئی ۔ تو میں نے آپ کے سامنے پورا ماجرہ سنایا اور میں نے شوہر کی بداخلاقی کی شکایت بھی کی ۔ تو رسول اللہ کہنے لگے " وہ تمہارا چچازاد بوڑھا ہے ۔ اس کے بارے میں اللہ سے ڈرو "۔ خدا کی قسم میں اصرار کرتی ہی رہی یہاں تک کہ قرآن مجید نازل ہو گیا ۔ رسول اللہ پر فوراً ایک حالت طاری ہو گئی ۔ جو عموماً آپ پر نہ ہوتی تھی ۔ اس کے بعد آپ سے یہ حالت دور ہو گئی تو مجھے آپ نے فرمایا " خولہ ' اللہ نے تمہارے اور تمہارے خاوند کے بارے میں قرآن نازل کر دیا ہے "۔ اس کے بعد آپ ؐ نے مجھے یہ آیات سنائیں ۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِیْٓ اِلَى اللّٰهِ وَ اللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ (۱) اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ وَ اِنَّهُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَ زُوْرًا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ (۲) وَ الَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (۳) فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا فَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْكِیْنًا ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۴) (۵۸ : ۱ تا ۴) ”اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملہ میں تم سے تکرار کر رہی ہے اور اللہ سے فریاد کیے جاتی ہے۔ اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے ' وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں ان کی بیویاں ان کی مائیں نہیں ہیں ' ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے۔ یہ لوگ ایک سخت ناپسندیدہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں ' اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اپنی اس بات سے رجوع کریں جو انہوں نے کہی تھی ' تو قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں ' ایک غلام آزاد کرنا ہو گا۔ اس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے ' اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ اور جو شخص غلام نہ پائے وہ دو مہینے کے پے درپے روزے رکھے قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ اور جو اس پر بھی قادر نہ ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ یہ حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ یہ اللہ کی مقرر کی گئی ہوئی حدیں ہیں ' اور کافروں کے لیے دردناک سزا ہے“۔

کہتی ہیں مجھے رسول اللہ نے بتایا کہ اس کو حکم دیں کہ وہ ایک غلام آزاد کر دے۔ تو میں نے حضور سے عرض کی ”اس کے پاس کیا ہے کہ وہ غلام آزاد کرے“ تو آپ نے فرمایا ”پھر وہ مسلسل دو ماہ تک روزے رکھے“۔ تو میں نے کہا کہ : ”خدا کی قسم وہ تو بوڑھا آدمی ہے۔ وہ دو ماہ کے مسلسل روزے نہیں رکھ سکتا“۔ تو آپؐ نے فرمایا ”پھر وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے فی مسکین ایک وسق کھجوریں دے۔“ کہتی ہیں میں نے کہا رسول خدا ' خدا کی قسم اس کے پاس یہ بھی نہیں ہے۔ تو رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ”میں اسے کھجور کی ایک ”عرق“ (ساٹھ صاع) دے دوں گا“۔ تو میں نے کہا ”حضور ﷺ ایک عرق میں دے دوں گی“۔ تو اس پر حضور ﷺ نے فرمایا ”تو نے ٹھیک رویہ اختیار کیا اور احسان کیا ' لہٰذا جاؤ اور اس کی طرف سے صدقہ کرو ' اور اس کے بعد اپنے چچازاد کے ساتھ اچھا رویہ اختیار کرو“۔ کہتی ہیں ”میں نے ایسا ہی کیا“۔ (اس روایت کو امام ابو داؤد نے کتاب الطلاق میں نقل کیا ہے)۔

یہ حالات تھے جن میں حضور اکرم اور ایک عورت کے درمیان گفتگو ہوئی اور اس بارے میں پھر سات آسمانوں کے اوپر سے حکم آیا تاکہ اس عورت کو اس کا حق دیا جائے اور اس کے اور اس کے خاوند کے دلوں کو سکون دیا جائے اور اس قسم کے معاملات ' روز مرہ معاملات میں مسلمانوں کے لیے ضابطہ وضع کر دیا جائے ۔

یہ وہ حالات ہیں ' جن سے قرآن کی ایک سورت کا آغاز ہو رہا ہے ۔ قرآن اللہ کی ایک دائمی اور لازوال کتاب ہے اور اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ کے ساتھ پوری کائنات ہم رکاب ہو جاتی ہے ۔ سورت کا آغاز یوں ہوتا ہے ۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا (۵۸ : ۱) " اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملے میں تم سے تکرار کر رہی تھی " ۔ تو اللہ مسلمانوں کی ایک عام عورت کے معاملات کی طرف بھی متوجہ ہے ۔ اس عظیم کائنات ' ناپیدا کنار کائنات کے انتظام و انصرام نے اللہ کو ان معاملات سے مشغول نہ کر دیا تھا ' نہ کسی اہم معاملے نے اللہ کو اس سے باز رکھا ۔

یہ بہت ہی اہم معاملہ ہے کہ اس طرح کے ایک چھوٹے سے روز مرہ کے معاملے میں اللہ کی مداخلت ہو جائے اور پوری جماعت مسلمہ یہ شعور لے کہ اللہ ان کے ساتھ ہے ' ان کے حالات میں ' ان کے معاملات میں کسی بڑے معاملے میں یا چھوٹے معاملے میں ' روز مرہ کے معاملے میں یا دائمی اور بڑے مسئلے اور مسائل میں ۔ حالانکہ اللہ بہت ہی بڑا ' برتر ' جلیل القدر ' جبار اور متکبر ہے ۔ تمام آسمان اور زمین اسی کے ہیں اور وہ غنی ہے اور اپنی ذات میں محمود ہے ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ' تعریفیں ہیں اس ذات کے لیے جو تمام آوازوں کو سنتا ہے ' رسول اللہ سے تکرار کرنے والی کا نام خولہ تھا ' وہ آئی گھر کے ایک کونے میں وہ رسول اللہ سے بات کر رہی تھی اور میں اس کی باتیں نہ سن سکتی تھی ' اللہ نے یہ آیت نازل کی ۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْٓ اِلَى اللّٰهِ (۵۸ : ۱) " اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملے میں تم سے تکرار کر رہی تھی اور اللہ سے فریاد کیے جاتی تھی " ۔ (بخاری)

خولہ کی روایت میں ' جسے خویلہ تصغیر اور تذلیل کے لیے کہا گیا ہے ' یہ بات ہے کہ یہ حادثہ ' اس میں اس عورت کی کارروائی ' رسول اللہ تک پہنچنا ' تکرار کرنا ' قرآن کا نازل ہونا ' ان سب باتوں سے اس زندگی کا ایک نقشہ سامنے آجاتا ہے جو انسانی تاریخ کی یہ منفرد سوسائٹی گزار رہی تھی ۔ یہ عجیب دور تھا ' لوگوں کا رابطہ براہ راست عالم بالا سے قائم تھا ۔ وہ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کی ہدایات کے منتظر رہتے تھے ۔ گویا سب لوگ عیال اللہ تھے ۔ لوگوں کی نظریں عالم بالا پر اس طرح لگی ہوئی تھیں جس طرح ایک بچہ ہر وقت ماں باپ کی طرف دیکھتا رہتا ہے ۔

قرآن کے اندر اس واقعہ کی جو روایت ہے اس سے جو سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ عالم بالا کی طرف سے مسلسل ہدایت اور تربیت بھی ہو رہی ہے اور ساتھ ساتھ قانون سازی بھی ۔ قرآن اپنے اسلوب کے مطابق قانون بنا رہا تھا ۔ یہ بصورت لکٹ خشک قانون سازی نہیں ہے ۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَ اللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ (۵۸ : ۱) ''اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملے میں تم سے تکرار کر رہی تھی اور اللہ سے فریاد کیے جاتی تھی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے اور وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے''۔ یہ نہایت ہی موثر آغاز ہے۔ دیکھو تم دونوں جو باتیں کر رہے ہو' اکیلے نہیں ہو۔ تمہارے ساتھ اللہ موجود ہے۔ وہ سن رہا ہے۔ اس نے عورت کی بات سن لی۔ اپنے خاوند کے بارے میں تکرار اور اللہ سے شکایت۔ اللہ کو تو سب کچھ معلوم ہے' وہ دیکھتا اور سنتا ہے۔ یہ تھے حالات اس حادثہ کے جس میں دونوں کے ساتھ ثالث اللہ تھا--- یہ سب باتیں چٹکیاں اور دل کے تاروں پر مضراب ہیں۔

اور اس کے بعد اصل مسئلے کو لیا جاتا ہے :

اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۭ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰۗئِیْ وَلَدْنَهُمْ ۭ وَ اِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَ زُوْرًا ۭ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ (۵۸ : ۲) ''تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں ان کی بیویاں ان کی مائیں نہیں ہیں' ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے۔ یہ لوگ ایک سخت ناپسندیدہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں' اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے''۔

مسئلے کا حل نہایت ہی گہرائی سے کر دیا گیا۔ ایام جاہلیت میں ظہار کا جو قانون مروج تھا وہ تھا ہی بے بنیاد' بیوی ماں تو ہوتی نہیں کہ وہ ماں کی طرح حرام ہو جائے۔ ماں تو صرف وہ ہوتی ہے جس نے جنا۔ ایک لفظ کہنے سے نہ بیوی ماں بن جاتی ہے نہ حرام ہو جاتی ہے۔ یہ نہایت ہی ناپسندیدہ کلمہ ہے۔ حقیقت اس کی منکر ہے۔ سچائی اس کی منکر ہے' لہٰذا معاشرے کے اندر سوشل معاملات حقیقت پسندانہ اور حق اور حقائق پر قائم ہونا مناسب ہیں۔ آئندہ مناسب یہ ہے کہ سوشل معاملات واضح اور متعین ہوں۔ مجمل' مضطرب اور پیچیدہ نہ ہوں اور سابقہ معاملات اور حادثات اللہ نے معاف کر دیئے۔

وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ (۵۸ : ۲) اصل مسئلے کے سلسلے میں فیصلہ دینے کے بعد اب قانون سازی یوں کی جاتی ہے :

وَ الَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۭ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ۭ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۵۸ : ۳) ''جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اپنی اس بات سے رجوع کریں جو انہوں نے کہی تھی' تو قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں' ایک غلام آزاد کرنا ہو گا۔ اس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے' اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے کئی کفاروں میں غلام کی آزادی کی تجویز رکھی ہے۔ یہ اسلام نے دنیا سے غلامی کو ختم کرنے کے لیے

ایک تدبیر کی تھی۔ کیونکہ اس دور میں جنگ کے بین الاقوامی قوانین میں غلامی کو جائز رکھا گیا تھا۔ اسلام نے بہرحال اس کے ختم کرنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کیں۔ یہاں آیت۔

ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا (۵۸ : ۳) "پھر وہ اس بات سے رجوع کریں جو انہوں نے کہی تھی" کے مفہوم میں بہت سے اقوال وارد ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ دوبارہ مجامعت کا ارادہ کرلیں جسے انہوں نے بذریعہ ظہار اپنے اوپر حرام کر دیا ہے۔ یہ مفہوم سیاق کلام کے زیادہ قریب ہے۔ لہٰذا غلام کا آزاد کرنا 'اس مجامعت سے قبل ہوگا۔ اس پر نصیحت

ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ (۵۸ : ۳) "اس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے"۔ کفارہ ایک قسم کی یاد دہانی اور تازیانہ عبرت ہے کہ دوبارہ یہ حرکت نہ کرو 'کیونکہ یہ رسم نہ حق ہے اور نہ معروف طریقہ ہے۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۵۸ : ۳) "اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے"۔ اللہ کو اس کی حقیقت معلوم ہے۔ واقعات سے بھی وہ خبردار ہے اور تمہاری معاشرت سے بھی وہ خبردار ہے۔

یہ نصیحت اور عبرت آموزی قانون ظہار کی تکمیل سے پہلے آگئی۔ نفوس کی تربیت کے لیے اور اس لیے کہ اللہ جو قانون بنا رہا ہے وہ اپنے علم اور اپنی حکمت کے مطابق بنا رہا ہے۔ وہ ظاہر سے بھی خبردار ہے اور باطن سے بھی۔ اب اس کے بعد حکم کو مکمل کیا جاتا ہے۔

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا (۵۸ : ۴) "اور جو شخص غلام نہ پائے وہ دو مہینے کے پے در پے روزے رکھے قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ اور جو اس پر بھی قادر نہ ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے"۔

اب اس قانون کے توضیحی بیان اور مسلمانوں کو ہدایت کے لیے یہ تبصرہ آتا ہے۔

ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۵۸ : ۴) "یہ حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ"۔ وہ تو پہلے سے مومن ہیں؟ لیکن یہ بیان کہ یہ کفارات اور جرمانے اور ان کے حالات کو اللہ کے احکام و قوانین سے مربوط کرنے سے ایمان میں قوت اور اضافہ ہوتا ہے۔ عملی زندگی ایمان کے ساتھ مربوط ہوتی ہے اور عملی زندگی پر ایمان کا کنٹرول قائم ہوتا ہے۔

وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۵۸ : ۴) "یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں"۔ یہ حدیں اللہ نے اس لیے قائم کی ہیں کہ لوگ ان حدوں سے آگے نہ بڑھ جائیں۔ اور جو شخص ان کا خیال نہیں رکھتا اور ان سے اِدھر ہی رک کر نہیں رہتا اس کے غضب کا مستحق ہوتا ہے۔

وَ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۵۸ : ۴) "اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے"۔ کیونکہ وہ ظلم کرتے ہیں' اللہ کو چیلنج کرتے ہیں' ایمان نہیں لاتے۔ اللہ کی حدود پر نہیں رکتے' جس طرح اہل ایمان رکتے ہیں۔

یہ آخری عبارت وَ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۵۸ : ۴) "اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے"۔ سابقہ آیت کے خاتمے کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور آنے والی آیت کا سابق آیت کے ساتھ رابطہ بھی قائم کر دیتی ہے۔ جس کا موضوع یہ ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی کرتے ہیں وہ ذلیل ہو کر رہیں گے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ قَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌۚ﴿۵﴾ یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ
ا اللّٰهُ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَ نَسُوْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ
ع ۶ شَیْءٍ شَهِیْدٌ۠﴿۶﴾
ا

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ اسی طرح ذلیل و خوار کر دیئے جائیں گے جس طرح ان سے پہلے کے لوگ ذلیل و خوار کیے جا چکے ہیں۔ ہم نے صاف صاف آیات نازل کر دی ہیں' اور کافروں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔ اس دن (یہ ذلت کا عذاب ہونا ہے) جب اللہ ان سب کو پھر سے زندہ کر کے اٹھائے گا۔ اور انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ وہ بھول گئے ہیں مگر اللہ نے ان کا سب کیا دھرا گن گن کر محفوظ کر رکھا ہے اور اللہ ایک ایک چیز پر شاہد ہے"۔

پہلے پیراگراف میں یہ بتایا گیا تھا کہ اللہ اہل اسلام کے ساتھ کس قدر مہربانی کرنے والا ہے اور جماعت مسلمہ کے مسائل حل کرنے کے لیے وہ ہر وقت تیار ہے۔ یہ دوسرا پیراگراف کافروں کی سرکوبی کے لیے ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور رسول اللہ کی دشمنی پر اتر آئے ہیں یعنی وہ مسلمانوں کی حدود پر متضاد اور مخالفانہ موقف اختیار کرتے ہیں اور محاذ آرائی کرتے ہیں۔ پہلے چونکہ حدود اللہ کا ذکر ہے اور حدود پر جو جھگڑتا ہے وہ دشمن ہوتا ہے یعنی سرحدوں پر جو لڑتا ہے اس لیے یہاں ایسے دشمنان اسلام کا ذکر کر دیا گیا۔ جو رسول اللہ کے مقابلے میں حد پر کھڑے ہیں اور مقابلے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس سے دو متقابل فریقوں کی ایک تصویر دی گئی جو حدود پر لڑتے ہیں۔ اس سے کافروں کے اس فعل کی قباحت اور گھناؤنے پن کا اظہار مقصود ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ اپنے خالق اور رازق سے لڑنے نکل آئے ہیں اور انہوں نے اللہ کی حدوں پر اپنی شیطانی افواج جمع کر رکھی ہیں۔

یہ لڑنے والے محاذ آرائی کرنے والے۔

كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۵۸ : ۵) "اسی طرح ذلیل و خوار کر دیئے جائیں گے جس طرح ان سے پہلے کے لوگ ذلیل و خوار کیے جا چکے ہیں"۔ راجح بات یہ ہے کہ یہ ایسے لوگوں کے لیے بددعا ہے اور اللہ

کی طرف سے بد دعا دراصل حکم الٰہی ہی ہوتا ہے۔کیوں کہ اللہ تو فعال لما یرید ہے۔کبت کے معنی قہر نازل ہونے اور ذلیل کرنے کے ہیں۔پہلے لوگوں سے مراد یا تو وہ ہیں جو گزر چکے 'انبیائے سابقہ کی امتیں۔جن کو اللہ نے اسی جرم میں پکڑ لیا ان سے مراد وہ مشرکین اور یہود نہیں جن کو مسلمانوں کے ذریعہ اللہ نے ذلیل کر دیا تھا' ان آیات کے نزول سے پہلے' مثلاً غزوۂ بدر میں۔

وَ قَدْ اَنْزَلْنَآ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ (۵۸ : ۵) "ہم نے تو صاف صاف آیات نازل کر دی ہیں"۔اس آیت میں ان لوگوں کے انجام کو مفصل اور جدا کر کے بیان کیا ہے جو اللہ اور رسول سے دشمنی کرتے ہیں۔دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔یہ اس لیے کہ یہ انجام جو ان آیات میں بیان ہوا ہے وہ لوگ اس انجام تک کسی جہالت کی وجہ سے نہیں پہنچ رہے یا اس لیے اس انجام تک نہیں پہنچ گئے کہ ان کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔بلکہ ان کو بات بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھا دی گئی تھی۔اس کے بعد ان کا اخروی انجام نہایت ہی سبق آموز انداز میں لایا جاتا ہے تاکہ اہل ایمان کی اصلاح اور تربیت ہو۔

وَ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ (۵) یَوْمَ یَبْعَثُھُمُ اللّٰہُ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُھُمْ بِمَا عَمِلُوْا اَحْصٰہُ اللّٰہُ وَ نَسُوْہُ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ (۵۸ : ۶) "اور کافروں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔اس دن (یہ ذلت کا عذاب ہوتا ہے) جب اللہ ان سب کو پھر سے زندہ کر کے اٹھائے گا۔اور انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔وہ بھول گئے ہیں مگر اللہ نے ان کا سب کیا دھرا گن گن کر محفوظ کر رکھا ہے اور اللہ ایک ایک چیز پر شاہد ہے"۔

یہاں یہ توہین آمیز عذاب' ان کے تکبر کے بدلے' ان کو دیا جائے گا۔جب لوگوں کو اللہ اٹھائے گا تو ان نام نہاد بڑوں کو اللہ عوام کے سامنے توہین آمیز عذاب دے گا۔یہ وہ عذاب ہو گا جو حق پر دیا جائے گا۔اور ان کا مفصل اعمال نامہ اس کی پشت پر ہو گا جسے یہ اس دن بڑی بے پرواہی سے بھول جائیں گے۔حالانکہ اللہ نے اسے یوں تیار کیا ہو گا کہ اس میں سے کوئی چیز بھی باقی نہ رہی ہوگی کیونکہ اللہ تو سب کچھ جانتا ہے۔

وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ (۵۸ : ۶) "اور اللہ ہر ایک چیز پر گواہ ہے"۔

یہاں رعایت اور فضل و کرم' اور جنگ اور انتقام کی دونوں تصاویر آمنے سامنے ہیں۔اللہ کا علم اور موجودگی ہر جگہ ہے۔وہ رعایت امداد اور مہربانی کے لیے بھی حاضر ہے اور وہ جنگ اور انتقام اور دشمنوں کو عذاب دینے کے لیے بھی حاضر ہے۔لہٰذا اللہ کے حضوری اور موجودگی پر اہل ایمان مطمئن ہو جائیں اور کافر اور دشمن خوفزدہ ہو جائیں۔

یہ کہ اللہ ہر چیز پر شاہد ہے۔اب یہاں اس کی ایک زندہ تصویر پیش کی جاتی ہے۔یہ اس قدر موثر ہے کہ قلب و شعور کی تاروں میں اضطرابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَا

يَكُونُ مِن نَّجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَ
لَا أَدْنَىٰ مِن ذَٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا ۖ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا
عَمِلُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۷) أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نُهُوا
عَنِ النَّجْوَىٰ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَيَتَنَاجَوْنَ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ
وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ وَإِذَا جَاءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللَّهُ وَ
يَقُولُونَ فِي أَنفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ بِمَا نَقُولُ ۚ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ
يَصْلَوْنَهَا ۖ فَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۸) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا
بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا
اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ (۹) إِنَّمَا النَّجْوَىٰ مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ الَّذِينَ
آمَنُوا وَلَيْسَ بِضَارِّهِمْ شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (۱۰)

”کیا تم کو خبر نہیں ہے کہ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا اللہ کو علم ہے؟ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تین آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہو اور ان کے درمیان چوتھا اللہ نہ ہو' یا پانچ آدمیوں میں سرگوشی ہو اور ان کے اندر چھٹا اللہ نہ ہو۔ خفیہ بات کرنے والے خواہ اس سے کم ہوں یا زیادہ' جہاں کہیں بھی وہ ہوں' اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر قیامت کے روز وہ ان کو بتا دے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنہیں سرگوشیاں کرنے سے منع کر دیا گیا تھا پھر بھی وہ وہی حرکت کیے جاتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا؟ یہ لوگ چھپ چھپ کر آپس میں گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں کرتے ہیں' اور جب تمہارے پاس آتے ہیں تو تمہیں اس طریقے سے سلام کرتے ہیں جس طرح اللہ نے تم پر سلام نہیں کیا ہے اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہماری ان باتوں پر اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا؟ ان کے لیے جہنم ہی کافی ہے۔ اسی کا وہ ایندھن بنیں گے۔ بڑا ہی برا انجام ہے ان کا۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم آپس میں پوشیدہ بات کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی باتیں نہیں بلکہ نیکی اور تقویٰ کی باتیں کرو اور اس خدا سے ڈرتے رہو جس کے حضور تمہیں حشر میں پیش ہونا ہے۔ کانا پھوسی تو ایک شیطانی کام ہے' اور وہ اس لیے کی جاتی ہے کہ ایمان لانے والے لوگ اس سے رنجیدہ ہوں' حالانکہ بے اذن خدا وہ انہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتی' اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے“۔

آیت کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ اللہ کا علم اس کائنات کے بارے میں جامع و مانع ہے اور ہر چیز کو شامل ہے۔ انسانی فکر اس پوری کائنات کے اندر ' آسمان کی دوریوں میں اور زمین کے اطراف میں ہر چیز تک چھوٹی ہو یا بڑی ظاہر ہو یا خفیہ معلوم ہو یا مجہول ہو ' نہیں پہنچ سکتی جبکہ ہر چیز اللہ کے علم میں ہوتی ہے۔ یہ آیت انسانی فکر کو یوں دور تک لے جاتی ہے۔

اس کے بعد پھر ہماری فکر خود مخاطبین کے قلوب تک جا پہنچتی ہے۔ ہر شخص کا قلب خزانہ خیالات ہے۔ اس کے بعد لوگوں کے خفیہ ترین مشورے دو' تین ' چار یا پانچ یا کم و بیش آدمی جہاں اور جس محفل میں ہوں ' وہاں تک لے جائی جاتی ہے۔

مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى

مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ( ۵۸ : ۷ ) "کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تین آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہو اور ان کے درمیان چوتھا اللہ نہ ہو' یا پانچ آدمیوں میں سرگوشی ہو اور ان کے اندر چھٹا اللہ نہ ہو۔ خفیہ بات کرنے والے خواہ اس سے کم ہوں یا زیادہ' جہاں کہیں بھی وہ ہوں' اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے"۔

یہ بذات خود حقیقت ہے لیکن جن خوبصورت الفاظ میں اسے بیان کیا گیا ہے ان کی وجہ سے وہ بہت زیادہ موثر ہو جاتی ہے۔ ایسے انداز میں کہ کبھی تو انسان کا دل کانپ اٹھتا ہے اور کبھی اسے نہایت اطمینان ہوتا ہے کہ اللہ جل جلالہ بھی ہمارے ساتھ موجود ہے۔ جب بھی کوئی تین افراد الگ ہوئے کہ کوئی بات کریں تو فوراً یہ شعور ان کے اندر زندہ ہو جائے گا کہ ہمارے اندر اللہ چہارم ہے اور جب بھی کوئی پانچ جمع ہوں گے تو وہ محسوس کریں گے چھٹا اللہ ہے۔ غرض دو ہوں یا اور زیادہ' اللہ موجود ہوتا ہے۔

یہ ایک ایسی صورت حال ہے کہ انسان کا دل اس کے مقابلے میں کھڑا نہیں ہو سکتا' کانپ اٹھتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اہل ایمان کے لیے یہ ایک مانوس بات ہے' یہ ان کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں کیونکہ اہل ایمان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ حاضر و ناظر ہے لیکن یہ منظر نہایت خوفناک بھی ہے۔

هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ( ۵۸ : ۷ ) "اللہ ان کے ساتھ ہے وہ جہاں کہیں بھی ہوں"۔

ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ( ۵۸ : ۷ ) "پھر قیامت کے روز ان کو بتا دے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے"۔ یہ ایک دوسری متزلزل کرنے والی چٹکی ہے' محض اللہ کا موجود ہونا اور تمام باتوں کو سننا بھی ایک خوفناک بات ہے لیکن یہ کہ ان باتوں کا بعد میں حساب و کتاب بھی دینا ہے' یہ اور زیادہ ہولناک بات ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ نجویٰ کرنے والوں کا مقصد یہ ہو کہ ان کا نجویٰ خفیہ رہ جائے۔ قیامت میں اس نجوی کی کارروائی کھلی عدالت میں پیش ہوگی اور سب لوگ وہاں حاضر ہوں گے کیونکہ وہ تو یوم المشہود ہے۔

اب خاتمہ بھی اسی بات پر ہوتا ہے' جس سے آغاز ہوا تھا۔

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۵۸ : ۷) "اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔ یوں علم الٰہی کی حقیقت اور جامعیت دلوں میں بٹھائی جاتی ہے۔ ایک ہی آیت میں مختلف اسالیب سے یہ کام ہوتا ہے اور یہ اسالیب اس حقیقت کو دلوں میں بہت گہرا کر دیتے ہیں اور اسی بات کو دل کے اندر مختلف راہوں اور دروازوں سے بٹھاتے ہیں۔

---ooo---

یہ حقیقت کہ اللہ حاضر و ناظر ہے اور مذکور بالا آیات میں اس کو دلوں میں نہایت ہی خوفناک طریقے سے بٹھایا گیا۔ یہ دراصل منافقین کو ایک سخت دھمکی دینے کے لیے بطور تمہید لائی گئی ہے۔ یہ منافقین رسول اللہ اور جماعت مسلمہ کے خلاف رات دن نجویٰ کرتے رہتے تھے، سازشیں تیار کرتے تھے۔ مدینہ میں ان کی کثرت تھی، دھمکی کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ان کا موقف بہت عجیب ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۵۸ : ۸) "کیا تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنہیں سرگوشیاں کرنے سے منع کر دیا گیا تھا پھر بھی وہ وہی حرکت کیے جاتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا؟ یہ لوگ چھپ چھپ کر آپس میں گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں کرتے ہیں، اور جب تمہارے پاس آتے ہیں تو تمہیں اس طریقے سے سلام کرتے ہیں جس طرح اللہ نے تم پر سلام نہیں کیا ہے اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہماری ان باتوں پر اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا؟ ان کے لیے جہنم ہی کافی ہے۔ اسی کا وہ ایندھن بنیں گے۔ بڑا ہی برا انجام ہے ان کا"۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں منافقین کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منصوبہ نہایت روادارانہ اور ان کے ساتھ آپ کا رویہ نہایت ہی ہمدردانہ تھا۔ آپ ان کو یہی نصیحت فرماتے ہیں کہ اخلاص کے ساتھ اسلام کو قبول کر لیں۔ اور آپ ان کو بار بار نجویٰ، سازشوں اور خفیہ تدابیر سے روکتے تھے۔ اور منافقین یہ کام یہودیوں کے ساتھ مل کر کرتے تھے۔ بلکہ یہ تمام کام مشرکین اور منافقین یہودیوں کے اشاروں پر کرتے تھے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلصانہ رویہ کے باوجود انہوں نے اپنی ان سازشون اور خفیہ تدابیر اور نجویٰ کے کام کو اور تیز کر دیا۔ اور اس کے لیے انہوں نے ایسے ذرائع اور تدابیر بھی شروع کر دیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی نافرمانی کی جائے۔ اور مسلمانوں کے معاملات اور اسلامی نظام میں فساد برپا کر کے خلل ڈالا جائے۔

یہ لوگ اپنے کام میں اس قدر تیز اور جری ہو گئے تھے کہ انہوں نے اسلامی حکومت کے احکامات میں فساد ڈالنے کے ساتھ ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ علیک سلیک کے اندر بھی فساد پیدا کر دیا تھا۔ اور السلام علیکم کے معنی میں بھی تبدیلی کر دی تھی۔

وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ (۵۸ : ۸) "اور جب تمہارے پاس آتے ہیں تو تمہیں اس طریقے سے سلام کرتے ہیں جس طرح اللہ نے تم پر سلام نہیں کیا ہے"۔ یہ منافقین اور یہودی السلام علیکم کی جگہ السام علیکم کہتے تھے۔ یعنی یہ کہ تم پر موت آجائے۔ اسی طرح انہوں نے کچھ دوسرے الفاظ بھی گڑھ لیے تھے جن کا ظاہر تو اچھا تھا مگر باطن میں وہ ان سے غلط مراد لیتے تھے اور پھر وہ کہتے تھے کہ اگر یہ نبی برحق ہوتا تو اسے ہماری ان باتوں کا علم ہوتا یا ان مجالس کا علم ہوتا جن میں ہم اس کے خلاف تدابیر اور سازشیں کرتے ہیں۔

اس سورت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ بھی جو یہ اپنے دلوں میں سوچتے تھے اور وہ بھی جو سازشیں وہ اپنی مجلسوں میں کرتے تھے۔ کیونکہ سورت کے آغاز میں بتا دیا گیا کہ جو عورت اپنے خاوند کے بارے میں تکرار کر رہی تھی اس کی باتیں اللہ نے سن لیں۔ اور یہ کہ اگر تین آدمی نجویٰ کریں تو چوتھا اللہ ہوتا ہے' اگر چار کریں تو پانچواں اللہ ہوتا ہے نیز ان کے نفوس میں جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی اللہ کو معلوم ہے۔ اور اس کے بعد ان کی باتوں کی یہ تردید کر دی گئی۔

حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۵۸ : ۸) "ان کے لیے جہنم ہی کافی ہے۔ اسی کا وہ ایندھن بنیں گے۔ بڑا ہی برا انجام ہے ان کا"۔

ان کی خفیہ سازشوں کا انکشاف' ان کے نجویٰ کا انکشاف خصوصاً جبکہ حضور کی جانب سے ممانعت کے باوجود انہوں نے کیا' پھر وہ جو دلوں میں کہتے تھے کہ اگر یہ سچا نبی ہے تو اسے ہماری یہ کارروائیاں معلوم ہونی چاہئیں۔ ان باتوں کا انکشاف' غرض یہ سب انکشافات اس بات کی دلیل ہیں کہ زمین و آسمان کی ہر بات کا اللہ کو علم ہے اور اللہ ہر نجویٰ میں موجود ہیں' وہ خفیہ تماع کا شاہد ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں منافقین کے لیے تو خوفناک تھیں کہ ان کے تمام امور طشت ازبام ہو چکے ہیں جبکہ اہل ایمان کے لیے اطمینان اور بھروسے کا باعث بنیں۔

---ooo---

اب خطاب اہل ایمان کو ہو رہا ہے "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو" کہ تم منافقین کی طرح نجویٰ نہ کرو' گناہ کی باتوں میں' دشمنی کی باتوں میں' رسول کی نافرمانی میں' بلکہ جو بات بھی کرو خدا خوفی کے ساتھ کرو' اس قسم کا نجویٰ دراصل شیطان کے اشارے سے ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ شیطان مومنین کو پریشان کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اس قسم کا نجویٰ مومنین کے لائق نہیں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۹) اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۱۰) (۵۸ : ۹ – ۱۰) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم آپس میں پوشیدہ بات کرو

تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں نہیں بلکہ نیکی اور تقویٰ کی باتیں کرو اور اس خدا سے ڈرتے رہو جس کے حضور تمہیں حشر میں پیش ہونا ہے۔ کانا پھوسی تو ایک شیطانی کام ہے' اور وہ اس لیے کی جاتی ہے کہ ایمان لانے والے لوگ اس سے رنجیدہ ہوں' حالانکہ بے اذن خداوہ انہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتی' اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے''۔

معلوم ہوتا ہے ابتدائی زمانے میں جب کہ لوگوں میں ابھی تک اسلامی جماعت کا صحیح شعور اور احساسات پیدا نہ ہوئے تھے' بعض مسلمان اجتماعی معاملات میں اپنی قیادت کے ساتھ مشورہ کیے بغیر ہی' باہم اجتماعی مشورہ شروع کر دیتے تھے۔ یہ لوگ ابھی اسلامی تنظیم کی روح سے واقف نہ تھے' جس کے مطابق سب سے پہلے ہر مشورہ بصورت تجویز پہلے قیادت کے سامنے آنا چاہئے اور اسلامی قیادت کے علاوہ کوئی نجویٰ نہیں ہونا چاہئے۔ معلوم ہوتا ہے اس دور میں بعض مسلمان اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے' جب ایسے مشورے کرتے تھے تو اس سے پیچیدگیاں پیدا ہوتی تھیں اور اس سے جماعت مسلمہ کو تکلیف پہنچتی تھی اگرچہ مشورہ کرنے والوں کی ایسی نیت نہ ہوتی تھی۔ لیکن ان لوگوں کی طرف سے محض ایسے مسائل اٹھا دینا ہی جماعت کے لیے ایذا کا باعث بن جاتا اور اس سے اجتماعی پالیسی کی نافرمانی ہو جاتی۔

یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان کو لقب ایمان سے پکارا جاتا ہے' جو ان کی جدید اجتماعیت کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا (۵۸ : ۹) ''اے لوگو' جو ایمان لائے ہو''۔ ایسے مشورے نہ کرو جو گناہ ہوں' اور حدود سے متجاوز ہوں' اور جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معصیت لازم آتی ہو۔ اور یہ بھی بیان کر دیا جاتا ہے کہ اہل ایمان کن امور پر مشورہ کر سکتے ہیں۔

وَ تَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَ التَّقْوٰی (۵۸ : ۹) ''بلکہ نیکی اور تقویٰ کی باتوں پر مشورے کرو''۔ نیکی اور تقویٰ کے بارے میں وسائل وتدابیر اختیار کرنے کے لیے بے شک تم مشورے کرو' البر: یعنی عام بھلائی' التقویٰ: بیداری اور اللہ کو حاضر و ناظر سمجھتے ہوئے ڈرنا۔ اس قسم کا تقویٰ صرف بھلائی ہی سکھاتا ہے۔ پھر صراحت کے ساتھ ان کو کہا جاتا ہے کہ ' اس اللہ سے ڈرو جس کی طرف تم نے پلٹ کر جانا ہے۔ وہ وہاں تمہارے سب کیے پر تم سے حساب لے گا۔ وہ اس پورے ریکارڈ کو تیار کرنے والا اور اس پر گواہ بھی ہو گا۔ چاہے جس قدر بھی تم چھپاؤ اور خفیہ رکھو۔

امام احمد نے روایت کی ہے بنر اور عفان سے' ان دونوں نے ہمام سے' انہوں نے قتادہ سے' انہوں نے صفوان ابن محرز سے' یہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمر کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا' کہ ایک شخص نے ان سے پوچھا: ''تم نے نجویٰ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا سنا کہ قیامت میں اس کے بارے میں کیا ہو گا؟ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ کہتے سنا کہ: ''اللہ ایک مومن کے قریب ہو گا۔ اس پر اپنے دونوں ہاتھ یوں رکھے گا کہ وہ لوگوں سے چھپ جائے گا۔ اور اس کے گناہوں کا اس سے اقرار لے گا اور کہے گا تمہیں فلاں فلاں گناہ معلوم ہیں' تمہیں فلاں فلاں گناہ معلوم ہیں' تمہیں فلاں فلاں گناہ معلوم ہیں۔ یہاں تک کہ جب اس کے پورے گناہ اسے یاد دلا دیئے اور اقرار لے لیا' اور اس شخص نے یہ سوچ لیا کہ اب تو وہ مارا گیا تو اس کے بعد اللہ فرمائے گا اچھا' دنیا میں تو میں نے ان گناہوں کو چھپا دیا تھا اور آج میں تمہارے لیے ان سب کو معاف کرتا ہوں۔ اس کے بعد اللہ اس کو اس کی نیکیوں کا اعمال نامہ

دے گا۔ رہے کفار اور منافقین تو ان کے خلاف پیش ہونے والے گواہ کہیں گے ' اے رب یہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا' لعنت ہے ظالموں پر۔ (بخاری)

اس کے بعد مومنین کو نجویٰ' افواہیں پھیلانے اور خفیہ سازشوں سے منع کیا جاتا ہے۔ جماعت سے الگ خفیہ طور پر کوئی مشورہ نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ اہل ایمان اس جماعت کا حصہ ہیں' ان کی مصلحت اور جماعت کی مصلحت ایک ہے۔ ان کو کسی معاملے میں جماعت سے جدا نہیں ہونا چاہئے۔ اور ان سے کہا جاتا ہے کہ مومنین جب دیکھیں کہ کچھ لوگ الگ کانا پھوسی کر رہے ہیں' اور الگ مشورے ہو رہے ہیں تو اس طرح اہل ایمان کو شک' پریشانی اور حزن و ملال ہو گا اور بداعتمادی کی فضا پیدا ہو گی۔ شیطانی کاوش ہی یہ ہے کہ وہ اس قسم کے نجویٰ کرنے والوں کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے تا کہ وہ نجویٰ کر کے جماعت مسلمہ کو پریشان کریں حالانکہ وہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۵۸ : ۱۰) "کانا پھوسی تو ایک شیطانی کام ہے' اور وہ اس لیے کی جاتی ہے کہ ایمان لانے والے لوگ اس سے رنجیدہ ہوں' حالانکہ بے اذن خدا وہ انہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتی' اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے"۔ کوئی مومن اللہ کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کرتا۔ کیونکہ اللہ کے سوا کسی پر بھروسہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اور نہ کوئی ایسی ہستی ہے۔

احادیث میں آتا ہے کہ ایسے حالات میں کانا پھوسی نہیں کرنا چاہئے جس کی وجہ سے شکوک و شبہات پیدا ہوں اور مسلمانوں کا باہم اعتماد مجروح ہو اور دلوں کے اندر اندیشے پیدا ہوں۔

اعمش حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت کرتے ہیں: "اگر تم تین ہو تو پھر تم سے کوئی دو تیسرے کے سوا الگ ہو کر مشورہ نہ کرے' کیونکہ اس بات سے وہ دل گیر ہو گا"۔ یہ اسلامی جماعت کے بہترین آداب ہیں۔ اور اگر ایسے آداب کو ملحوظ رکھا جائے تو شکوک و شبہات کی گنجائش ہی نہ رہے گی۔ ہاں اگر راز رکھنے کی مصلحت درپیش ہو' یا کسی کی پردہ داری مطلوب ہو' یا کسی مخصوص شخص کے معاملات میں بات ہو رہی ہو یا کسی عمومی بحث میں پردہ داری مطلوب ہو تو پھر بند کمرے میں بات کرنے کی کوئی ممانعت بھی نہیں ہے۔ اور ایسی صورت مشورہ جماعت کے قائدین کے درمیان ہوا کرتی ہے۔ لیکن کوئی اکٹھ ایسا نہ ہو کہ جسے جماعت اندر جماعت کہا جا سکے یا جو جماعت کے علم کے بغیر ہو۔ اس قسم کے نجویٰ سے قرآن اور سنت نے منع کیا ہے اور اس قسم کے نجویٰ سے جماعتوں کے اندر افتراق اور ان کی صفوں میں شکوک پیدا ہوتے ہیں اور یہ وہ بیماری ہے جس کو شیطان بڑے اہتمام سے پھیلاتا ہے تاکہ ایمان والوں کے درمیان عدم اطمینان پھیلا دے۔ اور اللہ نے یہاں فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ جماعت مسلمہ کو کبھی نقصان نہیں دے سکتا۔ اس لیے کہ مومنین کی جماعت کا نگران' نگہبان اور چوکیدار اللہ بذات خود ہے اور اللہ ہر نجویٰ میں حاضر و موجود ہوتا ہے۔ اور ایسے مشوروں میں جو سازشیں ہوتی ہیں اللہ ان کو مومنین کے لیے بے ضرر بنا دیتا ہے۔

اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۵۸ : ۱۰) "اللہ کے اذن کے سوا"۔ جہاں بھی کوئی حتمی اور جزمی وعدہ اور فیصلہ ہو

وہاں اس قسم کی استثناہوتی ہے' اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اللہ خود اپنے فیصلوں کا پابند نہیں ہے لہٰذا اللہ جو چاہے کرے' اگر اللہ چاہے کہ مسلمانوں کو تکلیف پہنچے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۵۸ : ۱۰) "اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے"۔ اللہ ہی بچانے والا اور حامی ہے۔وہی قوی اور عزیز ہے' وہی علیم و خبیر ہے' وہی شاہد اور حاضر ہے' اور اس کائنات میں وہی کچھ ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔اور اللہ نے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ وہ مومنوں کو بچائے گا تو اس کے بعد مومنوں کے لیے کیا کمی رہ جاتا ہے اس لیے وہ بے فکر ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد اہل ایمان کو ایک دوسرا اجتماعی ادب سکھایا جاتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِى الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ
لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا
نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَىْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ
اَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا
بَيْنَ يَدَىْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا
۲
ع ۲ الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾
۲

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم سے کہا جائے کہ اپنی مجلس میں کشادگی پیدا کرو تو جگہ کشادہ کر دیا کرو' اللہ تمہیں کشادگی بخشے گا اور جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو۔تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے' اللہ ان کو بلند درجے عطا فرمائے گا' اور جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ کو اس کی خبر ہے۔اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم رسول سے تخلیہ میں بات کرو تو بات کرنے سے پہلے کچھ صدقہ دو' یہ تمہارے لیے بہتر اور پاکیزہ تر ہے۔البتہ اگر تم صدقہ دینے کے لیے کچھ نہ پاؤ تو اللہ غفور و رحیم ہے۔کیا تم ڈر گئے اس بات سے کہ تخلیہ میں گفتگو کرنے سے پہلے تمہیں صدقات دینے ہوں گے؟ اچھا' اگر تم ایسا نہ کرو---اور اللہ نے تم کو اس سے معاف کر دیا---تو نماز قائم کرتے رہو' زکوۃ دیتے رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو۔تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے"۔

بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان آیات کے نزول کا بھی منافقین کے ساتھ تعلق ہے۔ان سے پھر ان آیات اور ماقبل کی آیات کے درمیان ربط واضح ہو جاتا ہے۔قتادہ کہتے ہیں کہ یہ آیات مجالس ذکر کے بارے نازل ہوئی ہیں۔منافقین کا رویہ یہ تھا کہ جب یہ کسی شخص کو مجلس رسول میں آتا دیکھتے تو اپنی جگہ جم کر بیٹھ جاتے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے

یہ حکم دیا کہ نئے آنے والوں کو مجلس میں جگہ دیا کرو۔

مقاتل ابن حیان نے کہا کہ یہ جمعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم صفہ میں تھے' جگہ تنگ تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین اور انصار میں سے اہل بدر کا بہت اکرام کرتے تھے۔ اہل بدر میں سے کچھ لوگ آئے اور ان سے پہلے جگہ بھر چکی تھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد کھڑے ہو گئے اور کہا۔

السلام علیکم ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا۔ اس کے بعد انہوں نے وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کو سلام کیا۔ انہوں نے بھی سلام کا جواب دیا۔ یہ لوگ کھڑے رہے کہ شاید یہ لوگ ان کے لیے مجلس میں وسعت پیدا کریں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معلوم کر لیا کہ وہ کیوں کھڑے ہیں؟ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ناگوار گزری۔ تو آپ کے ارد گرد مہاجرین و انصار میں سے جو غیر بدری لوگ تھے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا فلاں تم اٹھ جاؤ' فلاں تم اٹھ جاؤ' یوں ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اٹھاتے رہے جب تک تمام بدریوں کے بیٹھنے کی جگہ نہیں ہو گئی۔ یہ بات ان لوگوں پر بہت ہی گراں گزری جو اٹھائے گئے تھے۔ ان کے چہروں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کراہت دیکھ لی۔ اس پر منافقین نے کہا کہ کیا تم کو یہ یقین نہیں ہے کہ تمہارے "صاحب" لوگوں کے درمیان انصاف کرتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا ہمیں تو اس طرح کا اٹھانا منصفانہ معلوم نہیں ہوتا۔ کچھ لوگوں نے نبی کا قرب چاہا اور قریب بیٹھ گئے۔ اور آپؐ نے ان کو اٹھا دیا اور پھر دیر تک بیٹھے رہے۔ ہم تک یہ بات پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے اس شخص پر رحم کیا جس نے اپنے بھائی کے لیے مجلس میں جگہ بنائی۔ اس کے بعد اگر کوئی آتا تو وہ لوگ جگہ دینے کے لیے جلدی سے اٹھ جاتے۔ اور لوگ ایک دوسرے کے لیے مجالس میں جگہ بناتے اور یہ آیت جمعہ کے دن نازل ہوئی۔

اگر یہ روایت درست ہے تو یہ ان احادیث کے منافی نہیں ہے جن میں یہ آیا ہے کہ مجلس سے کسی شخص کو اٹھا کر دوسرے کو نہ بٹھایا جائے۔ جیسا کہ صحیحین کی روایت میں ہے "کوئی شخص کسی شخص کو مجلس سے اس لیے نہ اٹھائے کہ اس کی جگہ خود بیٹھ جائے لیکن طریقہ یہ ہے کہ مجالس کے اندر وسعت اور کشادگی پیدا کرو" اور اسی طرح دوسری احادیث کے بھی یہ خلاف نہیں ہے جن کا مضمون یہ ہے کہ بعد میں آنے والا وہاں بیٹھ جائے جہاں مجلس ختم ہوتی ہے اور لوگوں کی گردنوں کے اوپر چڑھ کر آگے نہ بڑھے تاکہ وہ ممتاز جگہ بیٹھ جائے۔

آیت کا مضمون یہ ہے کہ پہلے بیٹھے ہوئے لوگ آنے والے کے لیے جگہ بنائیں۔ جس طرح آیت میں یہ بھی ہے کہ اگر منتظمین کسی کو کہیں کہ وہ اپنی نشست چھوڑ دے تو اسے چاہئے کہ وہ چھوڑ دے۔ لیکن یہ حکم منتظم اور قیادت سے صادر ہونا چاہئے' باہر سے آنے والے کی جانب سے نہیں۔

غرض یہاں یہ ہے کہ انسانی نفوس کے اندر وسعت پیدا کی جائے' قبل اس کے کہ مجالس کے اندر وسعت پیدا کی جائے۔ اگر دل کے اندر وسعت پیدا ہو جائے تو پھر وہ برداشت کرے گا اور مجلس میں آنے والے بھائیوں کو نہایت ہی محبت اور نہایت ہی خوش اخلاقی کے ساتھ بٹھائے گا اور ان کا استقبال کرے گا اور نہایت خوشی اور رضامندی سے ان کے لیے جگہ بنائے گا۔

لیکن اگر قیادت یہ سمجھتی ہو کہ کسی خصوصیت یا مخصوص حالات کی وجہ سے جگہ خالی کرنا ضروری ہے تو طیب نفس اور

خوشی خوشی سے جگہ خالی کر دینا چاہئے۔ لیکن اصول اپنی جگہ وہی رہے گا کہ پیچھے آنے والا پیچھے رہے 'گردنوں پر سوار ہو کر آگے نہ بڑھے۔ یا کسی دوسرے کو اٹھا کر اس کی جگہ خود نہ بیٹھے۔ یہ تو رواداری ہے اور انتظامی حکم ہے جو فیصلہ کن ہے اور اسلام بہرحال بہترین آداب سکھاتا ہے۔

ہر حکم دینے کے بعد اسلامی نظام تربیت کا یہ اصول ہے کہ وہ لوگوں کے شعور کی اصلاح کرتا ہے۔ یہاں بھی کہا جاتا ہے کہ اگر تم مجالس میں اور دلوں میں وسعت پیدا کرو گے تو اللہ تمہارے لیے وسعت پیدا کر دے گا۔

فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ (۵۸ : ۱۱) "تو جگہ کشادہ کر دیا کرو' اللہ تمہیں کشادگی بخشے گا"۔ اور وہ لوگ جو اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں اور رسول اللہ یا قیادت کی اطاعت کرتے ہیں تو اللہ ان کو رفعت مقام عطا کرے گا۔

وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ

(۵۸ : ۱۱) "اور جب کہا جائے کہ اٹھ جاؤ 'تو اٹھ جایا کرو' تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے 'اللہ ان کو بلند درجے عطا فرمائے گا"۔ یہ ہوگی ان کی تواضع کی جزاء اور تعمیل حکم اور ڈسپلن کا اجر۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں قریب مقام حاصل کرنا بھی دراصل حصول علم کے لیے ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ یہ آیت ان کو سکھاتی ہے کہ جو ایمان وسعت قلبی سکھائے ' اطاعت امر سکھائے 'اور وہ علم جو دل کی تہذیب عطا کرے 'اور وہ دل وسیع ہو جائے اور مطیع فرمان ہو جائے تو ایسے علم اور متعلم کے درجات اللہ کے ہاں بلند ہو جاتے ہیں اور یہ جو درجہ عطا ہوا یہ اس وجہ سے ہوا کہ انہوں نے رسول کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے مجلس میں اپنا درجہ چھوڑ دیا۔ لہٰذا اللہ نے اپنے ہاں درجہ دے دیا۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۵۸ : ۱۱) "اور جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ کو اس کی خبر ہے"۔ لہٰذا اللہ علم اور معرفت کی بنا پر ہر کام پر مناسب جزا دے گا اور اللہ کو یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے کاموں کے پیچھے کیا داعیہ رکھا ہے۔

یوں قرآن کریم انسانی نفوس کی تہذیب اور اخلاقی تربیت کرتا ہے اور انسانوں کو وسعت قلبی ' رواداری ' اطاعت امر سکھاتا ہے۔ اس طرح کہ وہ ناگوار کام کو بھی ذوق و شوق سے کریں۔ دین اسلام محض خشک دفعات پر مشتمل کوئی قانون نہیں ہے۔ یہ تو ایک شعور 'ایک نظریہ 'ایک احساس اور ضمیر کے اندر ایک ملکہ ہے جو عمل پر ابھارتا ہے۔

اب قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے ایک دوسرا ادب اہل ایمان کو سکھاتا ہے۔

---ooo---

معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تنہائی میں گفتگو کرنے والوں کی بہت کثرت ہو گئی تھی اور ہر فرد اپنے انفرادی معاملات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو چاہتا تھا۔ اور اس کے ذاتی معاملات میں ہدایات اور مشورے چاہتا تھا۔ اور اس دور میں رسول اللہ کی اجتماعی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں اور آپ کا وقت بہت ہی قیمتی تھا۔ اور آپ کے ساتھ تنہائی میں گفتگو ایک بہت ہی اہم اور سنجیدہ مسئلہ بن گیا تھا۔ یہ تو کسی نہایت ہی اہم مسئلے ہی میں ہو سکتا تھا' لیکن لوگ تھے کہ اس اعزاز کے لیے ٹوٹ پڑے تھے۔ چنانچہ اللہ نے تنہائی میں وقت کا مطالبہ کرنے والوں کو کنٹرول

کرنے کے لیے مالی تاوان عائد کر دیا۔ اور یہ مالی تاوان جماعت کے اجتماعی کاموں کے لیے تھا۔ یوں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وقت کا ایک حصہ ایسے لوگوں کو دے دیتے کیونکہ آپ کا پورا وقت اجتماعی معاملات کے لیے وقف تھا۔ یہ تاوان یوں تھا کہ جو شخص تنہائی میں وقت چاہتا وہ پہلے صدقہ کرے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۸ : ۱۲) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم رسول سے تخلیہ میں بات کرو تو بات کرنے سے پہلے کچھ صدقہ دو، یہ تمہارے لیے بہتر اور پاکیزہ تر ہے۔ البتہ اگر تم صدقہ دینے کے لیے کچھ نہ پاؤ تو اللہ غفور و رحیم ہے"۔

اس آیت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمل کیا۔ آپ کے پاس ایک دینار تھا۔ آپ نے اسے دروپوں مین تبدیل کیا۔ آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جس وقت الگ کوئی مشورہ کرتے تو ایک درہم کا صدقہ کر دیتے لیکن مسلمانوں پر یہ امر بہت ہی شاق گزرا۔ اللہ کو تو پہلے سے معلوم تھا۔ جو مقصد اس امر سے تھا وہ پورا ہو گیا تھا۔ لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوقات کس قدر قیمتی ہیں۔ اس لیے اللہ نے یہ حکم واپس لے لیا۔ دوسری آیت آگئی۔

---ooo---

اور ان کو متوجہ کر دیا کہ عبادات اور اللہ کی فرمان برداری کرو۔

ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

(۵۸ : ۱۳) "کیا تم ڈر گئے اس بات سے کہ تخلیہ میں گفتگو کرنے سے پہلے تمہیں صدقات دینے ہوں گے؟ اچھا، اگر تم ایسا نہ کرو --- اور اللہ نے تم کو اس سے معاف کر دیا --- تو نماز قائم کرتے رہو، زکوۃ دیتے رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو۔ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے"۔

ان دونوں آیات اور ان کے شان نزول میں وارد احادیث کے فلسفے سے معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بڑے معاملات میں مسلمانوں کی تربیت کے لیے اور اسلامی جماعت کو تیار کرنے کے لیے کس قدر جدوجہد کی گئی۔

اب سیاق کلام منافقین کی طرف پھرتا ہے۔ یہ لوگ یہودیوں کے ساتھ گہری دوستی اور راہ و رسم رکھتے تھے۔ ان کے بعض حالات کھولے جاتے ہیں اور ان کو دھمکی دی جاتی ہے کہ تمہارے سب کرتوت اب چھپے نہیں رہے اور تمہارا انجام بہت ہی برا ہونے والا ہے۔ دعوت اسلامی تمہاری تمام سازشوں کے باوجود اب کامیابی کی راہ پر گامزن ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مَا هُمْ مِنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ
وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿١٤﴾ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ إِنَّهُمْ
سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٥﴾ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ
فَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿١٦﴾ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ
شَيْئًا ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١٧﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا
فَيَحْلِفُونَ لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ ۖ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ أَلَا إِنَّهُمْ
هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿١٨﴾ اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنْسَاهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ
حِزْبُ الشَّيْطَانِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿١٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ
يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ ﴿٢٠﴾ كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَ
رُسُلِي ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٢١﴾ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ
أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ ۖ وَ
يُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ
وَرَضُوا عَنْهُ ۚ أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٢٢﴾ ۳ ۹ع ۳

’’کیا تم نے دیکھا ان لوگوں کو جنھوں نے دوست بنایا ہے ایک ایسے گروہ کو جو اللہ کا مغضوب ہے؟ وہ نہ تمھارے ہیں نہ ان کے ' اور وہ جان بوجھ کر جھوٹی بات پر قسمیں کھاتے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے ' بڑے ہی برے کرتوت ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے جس کی آڑ میں وہ اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں ' اس پر ان کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔ اللہ سے بچانے کے لیے نہ ان کے مال کچھ کام آئیں گے نہ ان کی اولاد۔ وہ دوزخ کے یار ہیں ' اسی میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ جس روز اللہ ان سب کو اٹھائے گا ' وہ اس کے سامنے بھی اسی طرح قسمیں کھائیں گے جس طرح تمھارے سامنے کھاتے ہیں اور اپنے نزدیک یہ سمجھیں گے کہ اس سے ان

کا کچھ کام بن جائے گا۔ خوب جان لو' وہ پرلے درجے کے جھوٹے ہیں۔ شیطان ان پر مسلط ہو چکا ہے اور اس نے خدا کی یاد ان کے دل سے بھلا دی ہے۔ وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو' شیطان کی پارٹی والے ہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔ یقیناً ذلیل ترین مخلوقات میں سے ہیں وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے۔ فی الواقع اللہ زبردست اور زور آور ہے۔ تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے' خواہ وہ ان کے باپ ہوں' یا ان کے بیٹے' یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے۔ وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو' اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں"۔

یہ منافقین پر ایک تنقیدی حملہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ ایک ایسی قوم سے دوستی کر رہے ہیں جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقین مسلمانوں کے خلاف نہایت گہری چالیں چلتے تھے اور مسلمانوں کے شدید ترین دشمنوں یعنی یہودیوں کے ساتھ مل کر یہ سازشیں تیار کرتے تھے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا اقتدار مستحکم ہو گیا تھا۔ کیونکہ جب ان پر رسول اللہ اور مسلمان تنقید کرتے تھے اور ان سے باز پرس کرتے تھے تو یہ لوگ جھوٹی قسمیں کھاتے تھے۔ حالانکہ رسول اللہ اور مسلمان جو بات کرتے تھے وہ اللہ کی طرف سے فراہم کردہ انکشافات پر مبنی ہوتی تھی۔ جب وہ حلف اٹھاتے تھے تو وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ وہ اپنی قسموں کی آڑ میں اپنے آپ کو اس مواخذے سے بچاتے تھے۔ کیونکہ ان کی تمام سازشیں اسلامی حکومت کی طرف سے قابل مواخذہ تھیں۔

اتَّخَذُوٓا اَیۡمَانَہُمۡ جُنَّۃً (۵۸ : ۱۶) "انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے"۔ اس طرح وہ اپنی سازشیں جاری رکھے ہوئے ہیں اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

ان آیات کے درمیان اللہ نے ان کو بار بار دھمکی دی۔

اَعَدَّ اللّٰہُ لَہُمۡ عَذَابًا شَدِیۡدًا اِنَّہُمۡ سَآءَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (۵۸ : ۱۵) "اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے' بڑے ہی برے کرتوت ہیں جو یہ کر رہے ہیں"۔ اور آگے ہے :

فَلَہُمۡ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ (۵۸ : ۱۶) "اس پر ان کے لیے ذلت کا عذاب ہے"۔ آگے ہے :

لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡہُمۡ اَمۡوَالُہُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ شَیۡئًا اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ (۵۸ : ۱۷) "اللہ سے بچانے کے لیے نہ ان کے مال کچھ کام آئیں گے نہ ان کی اولاد۔ وہ دوزخ کے یار ہیں اسی میں ہمیشہ رہیں گے"۔

اور ان آیات میں روز قیامت ان کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ بہت ہی بھدی اور توہین آمیز ہے۔ وہ جس طرح دنیا

میں جھوٹی قسمیں اٹھاتے ہیں اسی طرح وہ اللہ کے ہاں بھی قسمیں اٹھاتے نظر آتے ہیں۔

یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا فَیَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا یَحْلِفُوْنَ لَكُمْ (۸ ۵ : ۱۸) "جس روز اللہ ان کو اٹھائے گا' وہ اس کے سامنے بھی اسی طرح قسمیں کھائیں گے جس طرح تمہارے سامنے کھاتے ہیں"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفاق ان کی گھٹی میں پڑ گیا ہے۔ قیامت میں بھی یہ ان کے ساتھ رہے گا۔ اور اللہ ذوالجلال کے سامنے بھی یہ جھوٹی قسمیں اٹھانے کی جرات کریں گے۔ حالانکہ اس وقت ان کو معلوم ہو گا کہ اللہ تو دل کی باتیں بھی جانتا ہے۔

وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰی شَیْءٍ (۸ ۵ : ۱۸) "اور اپنے نزدیک یہ سمجھیں گے کہ اس سے ان کا کچھ کام بن جائے گا"۔ حالانکہ وہ ہوا میں لٹک رہے ہیں ان کے پاؤں تلے تو زمین نہیں ہے۔۔۔۔ حقیقی جھوٹے ہیں یہ لوگ۔

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (۸ ۵ : ۱۸) "وہ پرلے درجے کے جھوٹے ہیں"۔

ان کی ان حرکات کا سبب یہ ہے کہ شیطان ان پر پوری طرح چھا گیا ہے۔

فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ (۸ ۵ : ۱۹) "اس نے اللہ کی یاد ان کے دل سے بھلا دی ہے"۔ اور جو دل اللہ کو بھلا دیتا ہے وہ بگڑ جاتا ہے اور شر کے لیے خالص ہو جاتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّیْطٰنِ (۸ ۵ : ۱۹) "یہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں"۔ اور شیطان کی پارٹی خالص اس کے لیے کام کرتی ہے' اس کے جھنڈے تلے چلتی ہے۔ اس کے نام سے کام کرتی ہے۔ اس کے مقاصد پورے کرتی ہے۔ یہ پارٹی خالص شر ہے اور خالص خسارے میں پڑے گی۔

اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّیْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۸ ۵ : ۱۹) "خبردار! شیطان کی پارٹی والے خسارے میں رہنے والے ہیں"۔ یہ بہت ہی شدید اور سخت تنقیدی حملہ ہے جو ان منافقین پر کیا گیا۔ یہ طویل تنقیدی حملہ اس لیے کیا گیا کہ وہ رات دن نہایت ہی خطرناک سازشوں میں مصروف تھے۔ رات دن یہودیوں سے مل کر مسلمانوں کے خلاف تدابیر سوچتے تھے۔ اس تنقیدی حملے سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو خوب اطمینان ہوا ہو گا اور آئندہ بھی ہو گا کہ ان کی جانب سے اللہ خود تدابیر کرتا ہے۔

---○○○---

یہ منافقین یہودیوں کے ہاں پناہ لیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ یہودی ایک قابل لحاظ قوت ہیں' ان سے لوگ ڈرتے ہیں اور امیدیں بھی انہی سے وابستہ ہیں۔ اور یہ لوگ اسی غرض سے ان سے مشورہ اور معاونت طلب کرتے ہیں۔ اس لیے اللہ ان کو یہودیوں سے مایوس فرماتا ہے اور کہتا ہے کہ ان یہودیوں پر تو ذلت اور شکست لکھ دی گئی ہے۔ اور اللہ بھی غالب ہے اور اس کا رسول بھی غالب رہے گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِی الْاَذَلِّیْنَ (۲۰) كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (۲۱) (۸ ۵ : ۲۰ – ۲۱) "یقیناً ذلیل ترین مخلوقات میں سے ہیں وہ لوگ

جو اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرتے ہیں ۔ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے ۔ فی الواقع اللہ زبردست اور زور آور ہے"۔

یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے جو سچا ہو کر رہا ہے ۔ اور آئندہ بھی سچا ہو کر رہے گا ۔ اگرچہ بظاہر اس سچے وعدے کے حالات مخالف نظر آئیں ۔

عملاً جو جزیرۃ العرب میں جو ہوا' وہ یہی تھا کہ ایمان اور توحید غالب آ گئے ۔ کفر اور شرک مغلوب ہوئے اور جزیرۃ العرب میں اسلامی نظریہ حیات غالب ہو گیا ۔ اور کفر اور شرک کے ساتھ ایک طویل کشمکش کے بعد اور رکاوٹوں کو دور کرنے کے بعد پوری انسانیت عقیدۂ توحید کے سامنے سرنگوں ہوئی ۔ اگرچہ دنیا کے بعض علاقوں میں شرک اور کفر نے ایک عارضی وقت کے لیے غلبہ حاصل کر لیا ۔ جس طرح آج ملحد اور بت پرست حکومتوں میں شرکیہ عقائد کا کسی نہ کسی جگہ غلبہ ہے لیکن عقیدۂ توحید پوری دنیا میں غالب رہا ہے ۔ نیز الحاد اور شرک مسلسل زوال پذیر ہیں ۔ اس لیے کہ شرک اپنے مختلف مظاہر کے ساتھ اس قابل ہی نہیں ہے کہ وہ دنیا میں باقی رہے ۔ اور جدید سائنس نے انسانیت کو عقیدۂ توحید پر بہت سے جدید دلائل بھی فراہم کر دیے ہیں لہٰذا ایمان اور توحید مسلسل ترقی میں ہے ۔ اور شرکیہ عقائد و نظریات سکڑ رہے ہیں ۔

ایک مومن تو اللہ کے وعدے کو ایک حقیقت سمجھتا ہے ۔ اگر کسی زمانے میں ایک محدود نسل یا محدود قطعہ زمین اس کے خلاف نظر آئے تو اسے یقین کرنا چاہئے کہ وہ صورت حال عارضی ہے اور بدلنے والی ہے ۔ اور یہ عارضی غلبہ کفر بھی کسی حکمت کے تحت ہو گا ۔ اور شاید اس لیے کہ اہل ایمان اسے اپنی ایمانی غیرت کے لیے ایک چیلنج سمجھیں اور اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں تاکہ وہ اللہ کے وعدے کے مطابق مغلوب ہو ۔

آج ہمارے دور میں ایمان کے دشمن' ہر طرف سے اہل ایمان کے خلاف جنگ آزما ہیں اور ہر طرف سے حملہ آور ہیں اور انہوں نے ایمان کے خلاف ایک نہ ختم ہونے والی جنگ شروع کر رکھی ہے ۔ ہر طرف سے پکڑ دھکڑ' سازشیں اور مسلسل اور متنوع سازشیں اسلام اور ایمان کے خلاف ہو رہی ہیں ۔ اس طرح کہ مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا ہے' ملک بدر کیا جا رہا ہے' ان کو قسم قسم کی اذیتیں دی جا رہی ہیں' ان کے ذرائع رزق بند کیے جا رہے ہیں' اور ان پر ہر قسم کی ذلت مسلط کر رکھی ہے ۔ اس کے باوجود اہل ایمان کے دل ایمان سے بھرے ہوئے ہیں ۔ ان کو گرنے سے بچایا جاتا ہے اور وہ غالب اقوام کے اندر پگھل کر ختم نہیں ہوتے ۔ اور وہ یہ مشکلات برداشت کر کے بھی ایسے مواقع کے انتظار میں ہیں کہ کفر پر حملہ آور ہوں اور اسے پاش پاش کر کے رکھ دیں ۔ ایک طویل عرصے سے مسلمان اس صورت حال سے دوچار ہیں لیکن ان کا ایمان مضبوط ہے اور وہ جدوجہد میں مصروف ہیں تو اس سے نظر آتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول غالب ہو کر رہیں گے اور اس سلسلے میں ان کو کوئی طویل انتظار بھی نہ کرنا پڑے گا ۔

لہٰذا مومن کو اپنے دل میں یہ شک نہیں لانا چاہئے کہ ایمان غالب رہے گا ۔ اللہ کا وعدہ ایک حقیقت ہے اور اس نے جلد یا بدیر حقیقت کا روپ اختیار کرنا ہے اور جو لوگ اللہ و رسول اللہ اور اسلام کے دشمن ہیں وہ ذلیل ہو کر رہیں گے اور اللہ اور رسول ہی غالب رہیں گے ۔ یہ بات ہوتی ہے اور ہو کر رہے گی ۔ لیکن بظاہر حالات ایسے ہوا کرتے ہیں' جو اس کے خلاف نظر آتے ہیں ۔

اور آخر میں وہ اصول جس پر مسلمانوں کو جم کر رہنا چاہئے ۔ یہ اٹل اصول ہے اور یہ ایمان کے سچے ہونے اور

جھوٹے دعوائے ایمان کے لیے ایک ترازو ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَ يُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸ : ۲۲) "تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے' خواہ وہ ان کے باپ ہوں' یا ان کے بیٹے' یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے۔ وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو' اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں"۔

یہ حزب اللہ اور حزب الشیطان کے درمیان مکمل جدائی ہے۔ تمام تعلقات اور تمام کششوں کو چھوڑ کر جماعت مسلمہ کے لیے یکسو ہو جانا چاہیے۔ اور ایک ہی رسی' ایمانی رسی کو پکڑ کر باہم مضبوط ہو جانا چاہیے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (۵۸ : ۲۲) "تم کبھی نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے"۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے دل میں دو دل نہیں رکھے۔ کوئی انسان اپنے دل میں دو محبتیں نہیں رکھ سکتا۔ یعنی اللہ اور رسول کی محبت بھی ہو اور اللہ اور رسول کے دشمنوں کی محبت بھی ہو۔ یا تو ایمان ہو گا یا "لا ایمان" ہو گا۔ یہ دونوں ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ (۵۸ : ۲۲) "خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے ہوں یا ان کے بھائی ہوں' یا ان کے اہل خاندان ہوں"۔ جب ایمان کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں تو پھر خون اور رشتہ داری کے روابط کٹ جاتے ہیں۔ اگر دو جھنڈوں کے درمیان کشمکش نہ ہو تو پھر خون اور رشتہ داری کے روابط رکھے جا سکتے ہیں اور دو جھنڈوں سے مراد اللہ کا جھنڈا اور شیطان کا جھنڈا ہیں۔ اگر حزب اللہ اور حزب الشیطان کے درمیان جنگ برپا نہ ہو اور حالت جنگ میں والدین اور رشتہ دار حزب الشیطان کے طرفدار نہ ہوں تو شریعت والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھے روابط رکھنے کی اجازت دیتی ہے۔ لیکن اگر جنگ دشمنی اور مقابلہ اور مخاصمت

جاری ہو تو پھر اسلام حکم دیتا ہے کہ تمام رشتے کاٹ دو۔ اور صرف ایک ہی رسی اور مضبوط رسی کو تھام لو یعنی ایمان کی رسی۔ ابو عبیدہ نے بدر کے دن اپنے باپ کو قتل کر دیا۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبدالرحمن کے قتل کا ارادہ کر لیا تھا۔ مصعب ابن عمیر نے اپنے بھائی عبید ابن عمر کو قتل کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ 'حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ 'حضرت علی رضی اللہ عنہ 'حضرت عبیدہ اور حارث نے اپنے قریبی رشتہ داروں اور خاندان کے لوگوں کو قتل کر دیا۔ انہوں نے خون اور رشتہ داری کا کوئی خیال نہ رکھا۔ اور دین اور نظریہ کو اہمیت دی۔ یہ وہ اعلیٰ معیار تھا جس تک اسلام نے نظریاتی روابط کو پہنچایا۔

اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ (۵۸ : ۲۲) "یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا"۔ یہ ان کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو مضبوط کر دیا۔ رحمان نے اپنے ہاتھ سے ان کے دلوں میں لکھ دیا' لہٰذا اب یہ ان کے دلوں سے نہ مٹ سکتا ہے اور نہ اسے زوال ہو سکتا ہے۔ نہ بجھ سکتا ہے اور نہ اس کے اندر کوئی پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے۔

وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (۵۸ : ۲۲) "اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی"۔ انہوں نے راہ ایمان اور اسلامی انقلاب لانے کا جو عزم کر رکھا ہے وہ اسی روحانی قوت سے ہی کیا اور ان کی روح جس طرح منور ہوئی وہ اسی قوت اشراق اور تائید ایزدی سے منور ہوئی۔ یہی روح ان کو اس نور اور اشراق کے اصل سرچشمے سے جوڑتی ہے۔

وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا (۵۸ : ۲۲) "وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا' جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔ اور یہ ہے جزاء اس بات کی کہ وہ اللہ کے لیے خالص ہو گئے اور اپنے روابط انہوں نے صرف ایمان کے تعلق پر قائم کیے اور انہوں نے اس فانی دنیا کے تمام اغراض اور تمام دشمنیوں کو پس پشت ڈال دیا۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (۵۸ : ۲۲) "اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے"۔ یہ نہایت ہی روشن' خوبصورت' راضی اور مطمئن تصویر ہے' جس کی ذریعہ ایک سچے مومن کو' ایک نہایت ہی بلند مقام پر رکھا گیا ہے' وہ نہایت ہی پسندیدہ اور محبت آمیز تصویر کہ ان کا رب ان سے راضی ہے' وہ رب سے راضی ہیں۔ تمام دنیا سے کٹ کر وہ اللہ کے ساتھ ہو گئے ہیں' اللہ نے انہیں اپنی حفاظت میں لے لیا ہے۔ ان کے لیے وسیع باغات تیار کر لیے ہیں' ان کو بتا دیا ہے کہ وہ ان سے راضی ہے' اس لیے اس قرب کی وجہ سے ان کو بھی انس و اطمینان حاصل ہو گیا ہے۔

اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ (۵۸ : ۲۲) "وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں"۔ یہ اللہ کی پارٹی ہیں۔ یہ اللہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوئے ہیں' یہ اللہ کی قیادت میں جمع شدہ ہیں۔ اللہ کی ہدایات کے مطابق گامزن ہیں۔ اس کے نظام کو قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ کا دست قدرت ان کے ذریعہ کام کرتا ہے' اور یہ اللہ کی تقدیر ہیں۔

اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸ : ۲۲) "خبردار رہو' اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے

والے ہیں"۔ سوال یہ ہے کہ اللہ کا مددگار فلاح نہیں پائے گا تو اور کون ہے جو فلاح پائے گا۔ یوں پوری انسانیت دو پارٹیوں میں تقسیم ہے۔ایک حزب اللہ اور دوسری حزب الشیطان۔ دو ہی جھنڈے ہیں۔ اللہ کا جھنڈا' شیطان کا جھنڈا۔ اگر کوئی اللہ کی پارٹی میں ہو گا تو اللہ کے جھنڈے کے نیچے ہو گا اور اگر شیطان کے جھنڈے کے نیچے ہو گا تو وہ شیطان کی پارٹی میں ہو گا۔ اور باطل پرست ہو گا۔ یہ دو متضاد صفات اور متضاد پارٹیاں ہیں۔

کوئی نسب نہیں ہے 'کوئی رشتہ دار نہیں ہے 'کوئی رشتہ دار اور قرابت دار نہیں ہے 'کوئی وطن اور نسل نہیں ہے۔ کوئی عصبیت اور قومیت نہیں ہے۔ بس صرف عقیدہ' عقیدہ اور ایمان ہے۔ جو شخص حزب اللہ کی طرف مائل ہو گیا' اور حق کے جھنڈوں کے نیچے کھڑا ہو گیا' وہ اور تمام لوگ جو اس جھنڈے کے نیچے کھڑے ہیں اللہ کی راہ میں بھائی بھائی ہیں۔ وہ مختلف اوطان میں ہیں۔ مختلف اقوام و قبائل میں ہیں۔ مختلف نسلوں اور قبیلوں میں ہیں لیکن وہ بھائی بھائی ہیں کیونکہ وہ اللہ کی پارٹی ہیں۔ اور حزب اللہ ایک ایسا رابطہ ہے جس کے تحت تمام امتیازات پگھل جاتے ہیں۔ اور جس پر شیطان مسلط ہوا اور وہ باطل کے جھنڈے تلے کھڑا ہو گیا تو وہ حزب اللہ کے افراد میں سے کسی کا بھائی اور رشتہ دار نہیں ہے۔ نہ کسی زمین میں' نہ کسی نسل میں' نہ کسی قوم میں' نہ کسی رنگ میں' نہ کسی رشتہ داری میں۔ کیونکہ اہل حق کے درمیان پہلا رابطہ قائم ہو گیا ہو عقیدے کا رابطہ ہے' یہ دوسرے رابطے تو اس کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

000

اس آیت کے اشارات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں ایسے لوگ تھے جو خون' قرابت داری' مفادات اور دوستی کے رشتوں کو اہمیت دیتے تھے۔ اس آیت میں ایسے ہی لوگوں کی تربیت کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ اس آیت میں فیصلہ کن اور دوٹوک اسلامی رشتوں کے استوار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جبکہ یہی آیت یہ بتاتی ہے کہ اسلامی جماعت کے اندر ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے پہلے ہی ان دنیاوی رشتوں کو کاٹ دیا تھا۔ وہ اسلامی رابطوں ہی کے قائل تھے اور اسلام کے ہدف کو انہوں نے پورا کر لیا تھا۔

اور یہ اس سورت کا مناسب خاتمہ ہے 'جس کا آغاز اس مضمون سے ہوا تھا کہ اللہ اپنی اس جماعت کے افراد کی ایک ایک ضرورت کو پورا کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ ایک نہایت ہی غریب اور فقیر گھرانے کے مسائل بھی وہ حل کرتا ہے۔ ایک غریب عورت جو حضور اکرم کے ساتھ تکرار کر رہی تھی اور اپنے بارے میں اور اپنے خاوند کے بارے میں شکایات کر رہی تھی۔ اللہ نے اس کے مسائل حل کیے۔

لہٰذا اس جماعت کا تمام روابط سے کٹ کر اللہ کا ہو جانا ایک قدرتی امر ہے جو ان کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کو پوری کرتا ہے 'ایک قدرتی اور مناسب بات ہے۔ نیز ایک ایسی جماعت جسے اللہ اپنی حزب کہتا ہے' اور جسے اس کائنات میں اللہ نے ایک نہایت ہی اہم کردار کے لیے اٹھایا ہے اس کا یوں اللہ کے لیے کٹ جانا ایک طبعی امر ہے۔

---000---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ۲۸

## سورۃ الحشر--- ۵۹

## ۱--- تا --- ۲۴

# سورۃ الحشر ایک نظر میں

یہ سورت واقعہ بنی نضیر کے بارے میں نازل ہوئی ہے ۔ بنی نضیر یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا اور یہ واقعہ سن چار ہجری میں پیش آیا ۔ اس سورت میں اس واقعہ کی کیفیت اور اسباب پر تبصرہ کیا گیا ہے ۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس واقعہ کے بعد جماعت مسلمہ کے اندر کیا کیا تبدیلیاں اور انتظامات کیے گئے ۔ ان باتوں کو قرآن کے خاص انداز بیان کے مطابق لیا گیا ہے اور ان واقعات پر سبق آموز تبصرہ کیا گیا ہے اور جماعت مسلمہ کو عملی واقعات سے دوچار کر کے اس کی زندہ تربیت کی گئی ہے ۔ اور واقعات پر تبصرے کے دوران مناسب ہدایات بھی دی گئی ہیں ۔

قبل اس کے کہ ہم قرآنی آیات کی تفسیر پیش کریں ' مناسب ہے کہ وہ ہدایات یہاں دے دیں جو اس واقعہ کے بارے میں وارد ہیں ۔ تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ قرآن کے بیان کا انداز روایات کے انداز سے کس قدر مختلف ہے ۔ قرآن کریم کس طرح واقعات کے پس منظر کو لیتا ہے اور دور تک ان کے اسباب اور محرکات پر بحث کرتا ہے ۔ چنانچہ واقعات بھی بیان ہو جاتے ہیں اور ان کے ماحول میں ان کے جو اسباب ہوتے تھے وہ بھی بیان ہوتے ہیں اور جو اسباب ان واقعات کے مقابلہ میں زیادہ اصولی ہوں انہیں بھی لیتا ہے ۔ ایک واقعہ تو ایک متعین زمان و مکان میں ہوتا ہے ۔ قرآن کریم اس کی تہہ میں پائے جانے والے اصول بھی لیتا ہے ۔

یہ سن چار ہجری کے ابتدائی دنوں کی بات ہے ' زمانہ غزوۂ احد کے بعد اور غزوۂ احزاب سے پہلے کا ہے ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دس بڑے رفقاء کے ساتھ دیار بنی نضیر میں گئے ۔ ان میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ' حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے ۔ مسلمانوں کے ہاتھوں سے دو افراد ناحق قتل ہو گئے تھے ۔ میثاق مدینہ کے مطابق اس کی دیت میں بنی نضیر نے بھی حصہ دینا تھا ۔ بنی نضیر نے حضور کا بے حد گرم جوشی سے استقبال کیا ۔ اور وعدہ کیا کہ وہ اپنا حصہ ادا کریں گے ۔ لیکن اندر اندر سے وہ اپنے ہاں یہ مشورے کرنے لگے کہ یہ بہترین موقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیا جائے ۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محلے کی ایک دیوار کے سائے میں تشریف فرما تھے ۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا جس پوزیشن میں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بیٹھے ہیں اس میں تم ان کو کبھی نہ پاؤ گے ۔ کون ہے جو گھر کے اوپر چڑھ کر ایک بہت بڑا پتھر ان کے سر پر دے مارے اور ہمیں ہمیشہ کے لیے ان سے نجات دے دے ۔ عمر ابن جحاش ابن کعب اس کام کے لیے تیار ہو گیا ۔ اس نے کہا میں یہ کام کرتا ہوں ۔ یہ اوپر چڑھا ' پتھر پھینکنے کے لیے ' اور اللہ نے رسول اللہ کو بذریعہ الہام بتا دیا کہ یہودی تو اس قسم کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے ' گویا قضائے حاجت کے لیے جا رہے ہیں ۔ جب حضور دیر تک غائب ہو گئے تو آپ کے ساتھیوں نے محسوس کیا کہ آپ نے بہت دیر لگا دی ہے ۔ چنانچہ وہ اس محلے سے نکلے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھنے لگے ۔ تو معلوم ہوا کہ آپ تو مدینہ تشریف لے گئے ہیں اور مدینہ میں پہنچ چکے ہیں ۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ بنو نضیر کے ساتھ جنگ کی تیاری کی جائے' کیونکہ ان کی جانب سے خیانت ظاہر ہوگئی تھی اور وہ معاہدۂ امن میثاق انہوں نے توڑ دیا تھا۔ اس سے قبل بنی نضیر کے کعب ابن اشرف نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کی تھی اور دشمنوں پر چڑھانے کی سعی کی تھی اور کعب اور بنی نضیر کے کچھ لوگوں نے کفار قریش کے ساتھ رابطے کیے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف معاہدے کیے تھے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور بنی نضیر کے درمیان عہد قائم تھا۔ اس کے نتیجے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محمد ابن مسلمہ کو اجازت دی کہ وہ کعب ابن الاشرف کو قتل کر دیں۔

جب انہوں نے محلہ بنی نضیر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی تو پھر ان کے ساتھ معاہدے کے قیام کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور اسلامی اصول کے مطابق۔

وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ

(۸ : ۵۸) "اگر تمہیں کسی قوم سے عہد میں خیانت کرنے کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو اعلانیہ اس کے آگے پھینک دو"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیاری کی اور محلہ بنو نضیر کا محاصرہ کر لیا۔ اور ان کو تین دن کی مہلت دے دی۔ بعض روایات میں دس دن کی مہلت کا ذکر ہے کہ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑوس چھوڑ دیں اور محلے سے نکل جائیں۔ ان کو یہ اجازت ہوگی کہ وہ اپنے مال ساتھ لے جائیں اور اپنے کھیتوں پر اور باغوں پر اپنے جانشین یا مختار کار مقرر کریں لیکن منافقین مدینہ جن کا سرخیل عبداللہ ابن ابی ابن سلول تھا' ان کو پیغام بھیجا کہ یہ شرائط قبول نہ کرو' مقابلہ کرو اور ان کو یقین دلایا کہ ڈٹ جاؤ اور رو کے رکھو' ہم تمہیں ان کے سپرد نہ کریں گے۔ اگر تمہارے ساتھ لڑائی ہوئی تو ہم تمہارے ساتھ لڑیں گے' اور اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے۔

اسی بارے میں یہ آیات۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا وَّ اِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۱) لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ (۱۲) لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۱۳) (۵۹ : ۱۱ تا ۱۳) "تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنہوں نے منافقت کی روش اختیار کی' یہ اپنے کافر اہل کتاب بھائیوں سے کہتے ہیں "اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے اور تمہارے بارے میں ہم کسی کی بات نہ مانیں گے۔ اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری

مدد کریں گے"۔ مگر اللہ گواہ ہے کہ یہ لوگ قطعی جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ ہرگز نہ نکلیں گے۔ اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی ہرگز مدد نہ کریں گے۔ اور اگر یہ ان کی مدد کریں بھی تو پیٹھ پھیر جائیں گے اور پھر کہیں سے کوئی مدد نہ پائیں گے۔ ان کے دلوں میں اللہ سے بڑھ کر تمہارا خوف ہے۔ اس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ بوجھ نہیں رکھتے"۔

چنانچہ یہودی قلعہ بند ہوگئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان کے باغات کو کاٹنا شروع کر دو' اور ان کو آگ لگا دو' تو انہوں نے پکارا محمد تم تو فساد سے روکتے تھے اور اب جو لوگ فساد کرتے ہیں تم ان کی معاونت کرتے ہو۔ آخر تم باغات کو کیوں جلاتے ہو اور باغات کو کٹواتے کیوں ہو۔ ان کی اس بات کی تردید میں یہ آیات۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ (۵۹ : ۵) "تم لوگوں نے کھجوروں کے جو درخت کاٹے یا جن کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا' یہ سب اللہ ہی کے اذن سے تھا تاکہ فاسقوں کو ذلیل و خوار کرے۔

جب یہ محاصرہ ۲۶ شب و روز تک طول کھینچ گیا تو یہودیوں کو منافقین کے وعدوں کی سچائی میں شک ہونے لگا۔ ان کے دلوں کے اندر سخت خوف پیدا ہوگیا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان کو جلاوطن کر دیں اور ان کو قتل نہ کریں' جیسا کہ اس سے قبل بنی قینقاع کو جلاوطن کیا گیا تھا (اس کی تفصیلات ہم نے سورہ احزاب گیارہویں پارے میں بیان کر دی ہیں) اس شرط پر کہ وہ اونٹوں پر جو سامان لے جاسکتے ہیں لے جائیں ماسوائے اسلحہ کے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس شرط کو قبول کر لیا۔ انہوں نے اپنے وہ اموال لے لیے جو لوٹ لے جا سکتے تھے۔ چنانچہ وہ لوگ خود اپنے گھر کو گراتے تھے اور دروازوں کی لکڑیوں کو بھی اونٹوں پر لاد کر منتقل کرتے تھے۔ یا اپنی لکڑیوں اور گھروں کو خراب کر دیتے کہ مسلمانوں کے ہاتھ نہ لگیں۔ مسلمانوں نے صرف بعض دیواروں کو گرا دیا جن کے اندرون وہ قلعہ بند ہوگئے تھے۔ اس بارے میں اس سورت کی یہ آیات وارد ہیں۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ (۲) وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ (۳) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۴) (۵۹ : ۲ تا ۴) "وہی ہے جس نے اہل کتاب کافروں کو پہلے حشر کے لئے

ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ تمہیں ہرگز گمان نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے اور وہ بھی یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ان کی گڑھیاں انہیں اللہ سے بچالیں گی مگر اللہ ایسے رخ سے ان پر آیا جدھر ان کا خیال بھی نہ گیا تھا۔ اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو برباد کر رہے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی برباد کروا رہے تھے۔ بس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو' اگر اللہ نے ان کے حق میں جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی تو دنیا ہی میں انہیں عذاب دے ڈالتا۔ اور آخرت میں تو ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے ہی۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کیا اور جو اللہ کا مقابلہ کرے اللہ اس کو سزا دینے میں بہت سخت ہے"۔

ان میں سے بعض لوگ تو خیبر کو چلے گئے' بعض لوگ شام کو چلے گئے اور ان کے سرداروں میں سے جو خیبر کو گئے تھے ان میں سے سلام ابن ابوالحقیق تھا اور کنانہ ابن الربیع ابن ابوالحقیق تھا اور حی ابن اخطب جن کا ذکر غزوۂ احزاب کے محرکین میں آتا ہے اور بنی قریظہ کے حالات میں بھی۔ جن کی تفصیلات سورہ احزاب میں ہیں۔ بعض کا ذکر فتح خیبر میں بھی آتا ہے۔ سورہ فتح۔

بنی نضیر کا جو مال رہ گیا تھا' اسے فے قرار دیا گیا تھا اور یہ خالص اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر تصرف فنڈ تھا کیونکہ یہ اموال مسلمانوں کے گھوڑے یا اونٹ دوڑانے سے حاصل نہ ہوئے تھے۔ ان اموال کو رسول اللہ نے مہاجرین میں تقسیم کر دیا اور انصار میں سے کسی کو بھی حصہ نہ دیا' ماسوائے دو افراد کے جو غریب تھے۔ سہل ابن حنیف اور ابو دجانہ سماک ابن خرشہ۔ یہ اس لیے کہ مہاجرین مکہ میں سب کچھ چھوڑ آئے تھے' اور خالص اسلام کی خاطر مدینہ آگئے تھے۔ اور انصار نے ان کو اپنے گھر میں اور مالوں میں شریک کر لیا تھا۔ نہایت حسن سلوک اور سچی برادری کے طور پر' اور نہایت ہی اعلیٰ درجہ کے ایثار کے طور پر۔ جب بنی نضیر جلاوطن ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کے اندر ان کا علاقہ تقسیم کر کے حالات کو فطری انداز کی طرف لوٹا دیا تاکہ فقراء کے لیے بھی ایک فنڈ قائم ہو جائے۔ اور دولت صرف اغنیاء کے اندر ہی تقسیم نہ ہوتی رہے۔ اس دولت میں سے انصار کے صرف ان دو فقیروں کو حصہ دیا گیا۔

بنی نضیر کے اموال کی تقسیم کے بارے میں بعض لوگوں نے اعتراضات کیے اور یہ اعتراضات منافقین کی طرف سے تھے۔ اس لیے ان کا یہ جواب دیا گیا:

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۶:۵۹) "اور جو مال اللہ نے ان کے قبضے سے نکال کر اپنے رسول کی طرف پلٹا دیئے وہ ایسے مال نہیں ہیں جن پر تم نے گھوڑے اور اونٹ دوڑا دیئے ہیں بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے' تسلط عطا فرما دیتا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے کہا' اگر تم چاہتے ہو تو میں مہاجرین کو تمہارے ساتھ شریک کر کے تمہارے اموال میں ان کو شریک کر دوں اور تمہیں اس غنیمت میں شریک کر دوں اور اگر تم چاہو تو تمہارے مال اور تمہارے مکانات مہاجرین تمہارے لیے خالی کر دیں اور تمہیں غنیمت سے کچھ نہ ملے۔ اس پر انصار نے کہا "ہم اپنے مال اور شہر بھی ان کے ساتھ تقسیم کرتے ہیں اور غنیمت بھی ان کو دیتے ہیں۔ اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۸) وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَ لَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۹) (۵۹ : ۸ – ۹) ”ان غریب مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں ۔ یہی راست باز لوگ ہیں جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لاکر دارالہجرت میں مقیم تھے ۔ یہ لوگ ان سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچالیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں“۔

یہ ہے وہ واقعہ جس کے بارے میں یہ سورت نازل ہوئی ۔ اس سورت کی آیات اسی سے متعلق ہیں جن میں اس سورت کا خاتمہ بھی ہے جس میں خطاب ان لوگوں کو ہے جو ایمان لائے ' جنہوں نے اس واقعہ کو دیکھا اور جو ان کے بعد آئے ۔ یہ قرآن کریم کا ایک خاص انداز ہے کہ وہ کسی جزئی واقعہ پر ایک کلی اور اصولی انداز میں تبصرہ کرتا ہے ۔ پھر اس واقعہ سے سبق آموز اصول اخذ کرتا ہے اور اس کو بڑے اصولوں سے جوڑ دیتا ہے ۔ پھر پوری سورت کے آخر میں اللہ کی صفات کا ذکر کیا جاتا ہے ۔ اور یہ وہ صفات ہیں جو اس کائنات میں نہایت ہی فعال ہیں اور اس کائنات کا واقعات انہی کے زیر اثر رونما ہوتے ہیں ۔ اور ان صفات کی حقیقت کے ادراک کی وجہ سے ایک ایسا ایمان وجود میں آتا ہے جو حقائق کو سمجھتا ہے اور جو اس کائنات پر بصیرت افروز نظر رکھتا ہے ۔

سورت کا آغاز بھی اس سے ہوتا ہے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور خاتمہ بھی اس حقیقت پر ہوتا ہے ۔ یوں آغاز و اختتام میں توافق اور تناسب پیدا ہوتا ہے ۔ یہ آغاز و اختتام سورت کے موضوع ' دعوت تقویٰ اور خضوع و خشوع اور اللہ کی تدبیر میں غور و فکر کے موضوعات کے لیے موزوں ہے ۔

اب ذرا نصوص پر تفصیلی گفتگو کہ ان نصوص نے واقعہ کی تصویر کشی کس طرح کی اور اس حادثہ سے نفوس کو کیا تربیت دی گئی ۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۵۹ تشریح آیات

## ۱ ۔ ۔ تا ۔ ۔ ۲۴

سُورَةُ الْحَشْرِ (۵۹) مَدَنِيَّةٌ (۱۰۱)
اٰيَاتُهَا ۲۴ رُكُوعَاتُهَا ۳
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱﴾ هُوَ
الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ
مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ
اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ
بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۲﴾ وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ
اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاۗءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ﴿۳﴾
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ ﴿۴﴾

اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔

" اللہ ہی کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے ' اور وہی غالب اور حکیم ہے ۔ وہی ہے جس نے اہل کتاب کافروں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کیا ۔ تمہیں ہرگز یہ گمان نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے ' اور وہ بھی یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ان کی گڑھیاں انہیں اللہ سے بچالیں گی ۔ مگر اللہ ایسے رخ سے ان پر آیا جدھر ان کا خیال بھی نہ گیا تھا ۔ اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے گھروں کو برباد کر رہے تھے اور

مومنوں کے ہاتھوں بھی برباد کروا رہے تھے ۔پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو! اگر اللہ نے ان کے حق میں جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی تو دنیا ہی میں وہ انہیں عذاب دے ڈالتا' اور آخرت میں تو ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے ہی۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کا مقابلہ کیا' اور جو بھی اللہ کا مقابلہ کرے اللہ اس کو سزا دینے میں بہت سخت ہے"۔

سورت کا آغاز اس حقیقت سے ہوتا ہے اور یہ ایک عظیم حقیقت ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور یہ اللہ کی پاکی اور بڑائی بیان کرتے ہوئے اس ایک اللہ کی طرف توجہ ہے ۔یہ ان لوگوں کے افراد کی کہانی جنہوں نے اہل کتاب ہونے کے باوجود کفر کیا۔ نقض عہد کیا۔ ذرا دیکھو کس طرح ان کے گھروں سے اس ذات نے ان کو نکالا ۔ اور جو لوگ رات اور دن اللہ کی تمید کرتے ہیں وہ سب کچھ ان کو عطا کر دیا۔ اور فی الواقعہ ۔

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۵۹ : ۱) "وہی غالب و حکیم ہے"۔وہ اس قسم کے اسباب فراہم کرتا ہے جن سے اس کے دوستوں کی امداد ہوتی ہے اور ایسے اسباب پیدا کرتا ہے کہ دشمن اپنے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں۔ وہ تقدیر و تدبیر کرنے میں بہت بڑا حکیم ہے ۔

---OOO---

اس کے بعد اس حادثہ کا بیان یوں ہوتا ہے :

هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنْتُمْ أَنْ يَخْرُجُوا وَظَنُّوا أَنَّهُمْ مَانِعَتُهُمْ حُصُونُهُمْ مِنَ اللَّهِ فَأَتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُمْ بِأَيْدِيهِمْ وَأَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ (۲) وَلَوْلَا أَنْ كَتَبَ اللَّهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ (۳) ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَمَنْ يُشَاقِّ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۴) (۵۹ : ۲ تا ۴) "وہی ہے جس نے اہل کتاب کافروں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔تمہیں ہرگز یہ گمان نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے' اور وہ بھی یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ان کی گڑھیاں انہیں اللہ سے بچالیں گی۔مگر اللہ ایسے رخ سے ان پر آیا جدھر ان کا خیال بھی نہ گیا تھا۔اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے گھروں کو برباد کر رہے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی برباد کروا رہے تھے ۔پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو!

اگر اللہ نے ان کے حق میں جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی تو دنیا ہی میں وہ انہیں عذاب دے ڈالتا' اور آخرت میں تو ان

کے لیے دوزخ کا عذاب ہے ہی ۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کا مقابلہ کیا' اور جو بھی اللہ کا مقابلہ کرے اللہ اس کو سزا دینے میں بہت سخت ہے"۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ ہی تھا جس نے پہلے حشر یا ہلے میں اہل کتاب کے کافروں کو ان کے گھروں سے نکال دیا۔ درحقیقت ہر چیز کا فاعل اللہ ہی ہوتا ہے لیکن اس آیت میں براہ راست نسبت بھی اللہ ہی کی طرف کی گئی ہے ۔ اور بردۂ احساس پر یہ بات آئی ہے کہ اس مہم کی قیادت ہی اللہ کر رہا تھا۔ اور گویا اس مہم میں دست قدرت کسی پردے میں نہ تھا۔ اور ان نکالے ہوئے لوگوں کو ایسی سرزمین کے لیے نکالا کہ جہاں سے ان کو اٹھایا جائے گا۔ لہٰذا یہ لوگ مدینہ کی طرف اب کبھی واپس نہ ہوں گے اور ان کا حشر ہی اب جلاوطنی کی سرزمین سے ہو گا۔

اللہ کا براہ راست ان کو نکالنا اور ان کو دوسری سرزمین کی طرف پھیلانا درج ذیل آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے ۔

مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ (۵۹ : ۲) "تمہیں ہرگز گمان نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے اور وہ بھی یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ان کی گڑھیاں انہیں اللہ سے بچالیں گی"۔ نہ تم ان کی جلاوطنی کی توقع رکھتے تھے اور نہ وہ جلاوطنی کے وقوع کو تسلیم کرتے تھے ۔ وہ اپنے قلعوں میں اور فوجی قوت کے لحاظ سے اس قدر مضبوط تھے کہ تم ان کے نکلنے کی توقع ہی نہ کرتے تھے اور وہ اس قدر مغرور ہو گئے تھے کہ اس قوت کی وجہ سے وہ خدا کو بھی بھول گئے ۔

فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا وَ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (۵۹ : ۲) "مگر اللہ ایسے رخ سے ان پر آیا جدھر ان کا خیال بھی نہ گیا تھا۔ اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا"۔ اللہ ان پر ان کے دلوں کے اندر سے حملہ آور ہوا۔ ان کے قلعے جیسے تھے ویسے ہی رہے ۔ ان کے دلوں میں اللہ نے خوف ڈال دیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے قلعوں کے دروازے کھول دیئے ۔ اللہ کی قدرت نے دکھایا کہ وہ اپنے آپ پر بھی کنٹرول نہیں رکھتے ۔ ان کے دل بھی ان کے کنٹرول میں نہیں اور وہ اپنے ارادوں اور اپنے منصوبوں کے بھی مالک نہیں رہے ۔ ارادوں اور منصوبوں پر بھی قائم نہ رہ سکے ۔ چہ جائیکہ وہ قلعوں میں بند رہیں ۔ انہوں نے باقی تو ہر قسم کے دفاعی انتظامات کر رکھے تھے ' البتہ ایک انتظام رہ گیا تھا کہ ان کے دل بھی مضبوط ہوں ۔ اس طرف سے وہ غافل تھے ۔ اللہ نے ان کی ہمتوں کو پاش پاش کر دیا۔ یہی ہوتا ہے کہ جب اللہ کسی کام کو کرتا ہے ۔ اللہ کو معلوم تھا کہ کہاں سے حملہ کیا جائے ۔ وہ ہر چیز کا عالم ہے اور وہ ہر چیز پر خبردار ہے ۔ لہٰذا نہ کسی سبب کی ضرورت پیش آئی اور نہ کسی ظاہری وسیلے کی ضرورت پیش آئی جو عوام الناس کے ذہنوں میں ہوتے ہیں ۔ اسباب و وسائل بھی تو اللہ کے پیدا کردہ ہوتے ہیں ۔ جب اللہ کوئی چیز چاہتا ہے تو اس کے اسباب چشم زدن میں سامنے آجاتے ہیں ۔ جس طرح نتائج اور انجام اس کے ہاتھ میں ہیں ۔ اسی طرح اسباب و وسائل بھی اسی کے ہاتھ میں ہیں ۔ اللہ کے لیے نہ اسباب و وسائل مشکل ہیں اور نہ نتائج اور انجام ۔ وہ تو عزیز و حکیم ہے ۔

اہل کتاب کے کافر اپنے قلعوں میں خود قلعہ بند ہوئے لیکن اللہ نے ایسے زاویہ سے حملہ کیا جس کی وہ توقع ہی نہ کرتے تھے اور نہ اس نوبت کی ۔ انہوں نے قلعہ بندی کی ہوئی تھی ۔ انہوں نے اپنے گھروں اور قلعوں کے دفاع کا انتظام کیا تھا مگر ہوا یوں کہ وہ اپنے ہاتھوں سے گھروں اور قلعوں کو خراب کرتے رہے اور مومنین کو بھی وہ موقعہ دیتے تھے کہ

ان کو خراب کریں۔

يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَ اَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ (۵۹ : ۲) "وہ اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے گھروں کو خراب کر رہے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی برباد کر رہے تھے"۔ اس آیت پر ان اہل کتاب کافروں کی کہانی ختم ہوگئی۔ کس قدر عبرت آموز انداز میں اور کس قدر تصویر کشی کے انداز میں اور منظر بھی ایسا کہ حرکت سے بھرپور۔ اللہ ان پر ان کے قلعوں کے پیچھے سے حملہ آور ہوتا ہے اور وہ خود اپنے قلعوں کو گرانا شروع کر دیتے ہیں اور مومنین بھی خراب کرتے ہیں اور وہ بھی خراب کرتے ہیں۔

اب اس منظرنامے پر پہلا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں:

فَاعْتَبِرُوْا يٰاُولِي الْاَبْصَارِ (۵۹ : ۲) "پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو"۔ یہ تبصرہ نہایت ہی برمحل ہے' اس کے لیے دل بالکل تیار ہیں اور ہر پڑھنے والا بھی حیران ہے کہ اس قدر منصوبے اور یہ دفاع!

اگلی آیت میں یہ بات بتائی جاتی ہے کہ اللہ نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آخرت سے پہلے' اس دنیا ہی میں' ان کو ذلیل و خوار کیا جائے گا۔ ان کی بچنے کی کوئی صورت تھی ہی نہیں۔

وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ (۵۹ : ۳) "اگر اللہ نے ان کے حق میں جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی تو دنیا ہی میں وہ انہیں عذاب دے ڈالتا۔ اور آخرت میں تو ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے ہی"۔ لہٰذا اللہ کا عذاب ان پر آنا ہی تھا۔ جس طرح کہ ان پر آگیا اگر یہ صورت اللہ نے لکھ نہ دی ہوتی تو دوسری صورت میں آتا۔ یہ عذاب دنیا بھی ان کے لیے طے تھا اور قیامت کا عذاب تو بہرحال مقدر ہے' کیوں؟

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ مَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۵۹ : ۴) "یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کیا اور جو بھی اللہ کا مقابلہ کرے اللہ اس کو سزا دینے میں بہت سخت ہے"۔ المشاقہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کی طرف اور اس کی سائیڈ لینے کی بجائے جانب مخالف میں چلے گئے ہیں۔ اللہ کی جانب یہ تھی کہ وہ رسول اللہ کی طرف ہو جاتے۔ کیونکہ یہی اللہ کی طرف تھی۔ آیت کے آخر میں یہ کہا کہ جو اللہ کا مقابلہ کرتا ہے تو اس میں ضمناً رسول کا مقابلہ بھی آ جاتا ہے۔ یہ عجیب اور مضحکہ خیز منظر ہے کہ کمزور بندے رب ذوالجلال کے مقابلے پر اتر آئیں اور اللہ کے مقابلے میں قلعہ بند ہوں۔ یہ نہایت ہی خوفناک منظر ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ انسانوں میں کمزور مخلوق اللہ کے غضب کو دعوت دے۔ اللہ تو شدید غضب والا ہے۔

یہاں ایک اہم بات ہے بنی نضیر کے بارے میں۔

الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ (۵۹ : ۲) "وہ لوگ جو اہل کتاب میں سے کافر ہوتے ہیں"۔ اور اس سورت میں اس کی بار بار تکرار آئی ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے اللہ کے دین کا انکار کر دیا ہے جو اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا تھا۔ یہودی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کا انتظار کیا کرتے تھے۔ یہاں ان کے لیے کفر کی صفت کا ذکر اس لیے ضروری تھا کہ یہی کفر ان کی اس سزا کا سبب تھا اور یہ بھی بتانا مقصود تھا کہ مسلمان ان کے خلاف جو ایکشن لے رہے ہیں اس کا اخلاقی جواز موجود ہے کہ یہ بھی دوسرے کافروں کی طرح کافر ہیں۔ اور اس وجہ سے ان پر یہ عذاب آیا۔ لہٰذا۔

الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ (۵۹ : ۲) کا فقرہ بہت ہی بامقصد ہے۔

اس کے بعد اہل ایمان کو بعض واقعات پر مطمئن کیا جاتا ہے کہ ایک تو یہ کفر کرنے والے تھے، دوسرے یہ رسول اور اللہ سے دشمنی کرنے والے تھے، اس لیے جنگی ایکشن کے دوران ان کے جو باغات کاٹے گئے یا جلائے گئے، یا چھوڑے گئے، تو اس کے بارے میں اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ اللہ کے حکم سے ایسا ہوا۔ اور یہودی اس سلسلے میں جو پروپیگنڈہ کرتے ہیں مومنین کو اس سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ۝ وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۝ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۝ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۝ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ

فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوْتُوْا وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ
خَصَاصَةٌ ؕ۫ وَ مَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَۚ﴿۹﴾ وَ الَّذِیْنَ
جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا
بِالْاِیْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّكَ رَءُوْفٌ ۱
ع ۱۰ الربع رَّحِیْمٌ۠﴿۱۰﴾

۴ ”تم لوگوں نے کھجوروں کے جو درخت کاٹے یا جن کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا' یہ سب اللہ ہی کے اذن سے تھا۔ اور (اللہ نے یہ اذن اس لیے دیا) تاکہ فاسقوں کو ذلیل و خوار کرے۔ اور جو مال اللہ نے ان کے قبضے سے نکال کر اپنے رسول کی طرف پلٹا دیئے' وہ ایسے مال نہیں ہیں جن پر تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑائے ہوں' بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے' تسلط عطا فرما دیتا ہے' اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسول ؐ کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسول ؐ اور رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ جو کچھ رسول ؐ تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رک جاؤ۔ اللہ سے ڈرو' اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ (نیز وہ مال) ان غریب مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول ؐ کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں۔ یہی راست باز لوگ ہیں (اور وہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے) جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لاکر دارالہجرت میں مقیم تھے۔ یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان (مہاجرین) کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔ (اور وہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے) جو ان اگلوں کے بعد آئے ہیں' جو کہتے ہیں کہ ”اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی بغض نہ رکھ' اے ہمارے رب' تو بڑا مہربان اور رحیم ہے“۔

لِّیْنَةٍ (۵۹ : ۵) کھجور کے بہترین درختوں کو کہتے ہیں۔ یہ اس وقت کی بہترین قسم تھے جسے سب جانتے تھے۔ مسلمانوں نے یہودیوں کے باغات میں سے بعض کو کاٹا تھا۔ بعض کو چھوڑ دیا تھا۔ ان کے دلوں میں ایک خلجان تھا' یعنی کاٹنے پر' اور چھوڑنے پر۔ جبکہ اس سے قبل اور اس کے بعد مسلمانوں کے لیے جنگی ضابطہ یہی رہا کہ تحریق اور بربادی سے گریز کیا جائے۔ اس لیے اس واقعہ میں جو کچھ ہوا اس کی استثنائی حالت کے لیے یہ آیت آئی تاکہ مسلمانوں کے دل مطمئن ہو جائیں۔ آیت نے کہہ دیا کہ اگر باغات جلانے کو تم نے چھوڑا ہے اور اس سے اجتناب کیا ہے تو یہ بھی اللہ کا

اذن تھا اور اگر کاٹ کر جلایا ہے تو یہ بھی اذن الٰہی تھا۔ کیونکہ اس مہم کی نگرانی اللہ براہ راست کر رہا تھا۔ اس لیے اللہ نے مسلمان لشکریوں سے ایسا کروایا۔ ان کے ہاتھوں تقدیر کو ظاہر کیا۔ لہٰذا یہ سب کارروائیاں اس کی مرضی سے ہوئیں۔ ان سے اللہ ان فاسقوں کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے پیارے باغات گر رہے تھے اور جل رہے تھے اور جو چھوڑے گئے تھے وہ بھی ان کے لیے باعث حسرت تھے کہ چھوڑ کر جا رہے تھے۔ اللہ کی مشا تھی کہ دونوں طرح ان کو حسرت سے دوچار کرے۔

جن مومنین کے دل میں خلجان تھا کہ یہ تخریب و تحریق کیوں ہوئی' ان کو اطمینان ہوا' ان کو تسلی ہوگئی کہ یہ تو اللہ کی مشا تھی۔ اللہ جو چاہتا ہے' کرتا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ تو دست قدرت کے آلات محض تھے۔

---ooo---

اس سورہ کا یہ دوسرا پیراگراف بھی ایک نہایت ہی اہم مسئلے کو لیتا ہے کہ اس واقعہ میں جو اموال ہاتھ لگے اور حضور کی طرف پلٹے یا ایسے ہی واقعات بعد کے زمانے میں پیش آئیں تو ان کا حکم کیا ہے۔ یعنی وہ اموال جو جنگ اور قتال کے بغیر ہاتھ آ جائیں۔ یا ایسے واقعات جن میں قدرت الٰہیہ نے مسلمانوں کے لیے اموال فراہم کیے۔ اور مسلمانوں نے اس میں کوئی زیادہ جنگی کارروائی نہ کی ہو۔

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (٦) مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (٧) لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (٨) وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (٩) وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (١٠) (٥٩: ٦ تا ١٠) "اور جو مال اللہ نے ان کے قبضے سے نکال

کر اپنے رسول کی طرف پلٹا دیئے' وہ ایسے مال نہیں ہیں جن پر تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑائے ہوں' بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے' تسلط عطا فرما دیتا ہے' اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسولؐ کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسولؐ اور رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ جو کچھ رسولؐ تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رک جاؤ۔ اللہ سے ڈرو' اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ (نیز وہ مال) ان غریب مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں۔ یہی راست باز لوگ ہیں (اور وہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے) جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا کر دارالہجرت میں مقیم تھے۔ یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان (مہاجرین) کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔ (اور وہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے) جو ان اگلوں کے بعد آئے ہیں' جو کہتے ہیں کہ "اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی بغض نہ رکھ' اے ہمارے رب' تو بڑا مہربان اور رحیم ہے"۔

ان آیات میں فے کا حکم بیان ہوا یا فے جیسے دوسرے اموال کا۔ نیز ان آیات میں امت مسلمہ اور اسلامی سوسائٹی کی ایک نہایت ہی اہم صفت اور اس کی دائمی حالت کو بیان کیا گیا ہے جو امت مسمہ کی امتیازی صفت رہی ہے اور امت کی پوری تاریخ میں اس کی امتیازی شان رہی ہے۔ یہ امت کی وہ خصوصیت رہی ہے جس کو اس نے مضبوطی سے پکڑے رکھا ہے۔ کسی دور میں بھی خدا کے فضل سے امت سے یہ صفت جدا نہیں ہوئی ہے۔ یہ صفت امت مسلمہ کی کسی نسل' کسی قوم' کسی شخص مسلم سے ایک طویل اسلامی تاریخ میں کبھی جدا نہیں ہوئی ہے۔ پھر اس دنیا میں جن جن علاقوں میں مسلمان ہیں ان میں سے کسی علاقے میں بھی مسلمانوں سے یہ صفت الگ نہیں ہوئی ہے اور یہ وہ عظیم حقیقت ہے اور اس پر گہرا غور کرنا چاہئے۔

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۶:۵۹) "اور جو مال اللہ نے ان کے قبضے سے نکال کر اپنے رسول کی طرف پلٹا دیئے' وہ ایسے مال نہیں ہیں جن پر تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑائے ہوں' بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے' تسلط عطا فرما دیتا ہے' اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

اَوْجَفْتُمْ (۶:۵۹) ایجاف سے ہے۔ ایجاف کے معنی ہیں گھوڑے کو تیزی سے دوڑانا۔ رکاب کے معنی اونٹ کے ہیں۔ مسلمانوں کو بتایا جاتا ہے کہ بنو نضیر نے اپنے پیچھے جو مال چھوڑے ہیں انہوں نے اس پر گھوڑے نہیں دوڑائے اور نہ اونٹوں پر تیز سفر کر کے انہوں نے اسے حاصل کیا ہے۔ لہذا ان اموال کا حکم مال غنیمت کا نہیں ہے۔ مال

غنیمت میں تو مجاہدین کا ۵/ ۴ حصہ ہوتا ہے ۔ اور ۵/ ا حصہ اللہ ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور رشتہ داروں ' یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کا ہوتا ہے ۔ جب کہ جنگ بدر کے اموال غنائم کے بارے میں اللہ نے فیصلہ کیا۔ اس فے کا حکم یہ ہے کہ یہ سب کا سب اللہ رسول اللہ ' رشتہ داروں ' یتیموں ' مساکین اور مسافروں کا ہے ۔ اور اس میں تصرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے اور آیت میں جن رشتہ داروں کا ذکر ہے ' ان سے مراد رسول اللہ کے قرابت دار ہیں ۔ اس لیے کہ صدقات ان کے لیے جائز نہ تھے اور زکوۃ میں ان کا حصہ نہ تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی دولت نہ تھی جسے ورثاء پالیتے اور ان میں فقراء بھی تھے ' جن کی کوئی آمدن نہ تھی ۔ اس لیے ان کے لیے غنائم کے خمس میں حصہ رکھا گیا تھا جیسا کہ فے اور فے کی قسم کے اموال میں ان کا حصہ رکھا گیا تھا ۔ رہے دوسرے لوگ تو ان کے احکام معروف و معلوم ہیں اور یہ فنڈز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تصرف خاص میں تھے ۔

یہ تو تھا فے کا حکم جو ان آیات میں بیان کیا گیا ہے ۔ لیکن ان آیات میں اس حکم اور ان حالات پر اکتفا نہیں کیا گیا جن میں یہ حکم جاری ہوا بلکہ یہاں ایک دوسری حقیقت کا بھی اظہار کر دیا گیا ہے ۔

وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ (۵۹ : ۶) "بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے تسلط عطا کرتا ہے" ۔ لہٰذا یہ اللہ کی تقدیر کا ایک حصہ ہے ۔ جس کا ظہور ہو گیا۔

وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۵۹ : ۶) "اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے" ۔

یوں رسولوں کا معاملہ تقدیر الٰہی کا اظہار قرار پاتا ہے اور اللہ کی تقدیر کے چکروں میں رسولوں کا مقام بھی متعین کیا جاتا ہے کہ رسولوں کا ظہور اور غلبہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہوتی ۔ دست قدرت یہ کام کرتا ہے ۔ اگرچہ رسول بشر ہیں لیکن وہ اللہ کے ساتھ براہ راست مربوط ہوتے ہیں ۔ اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اپنے نظام قضاو قدر کا ظہور کرتا ہے اور رسول جو کام کرتے ہیں وہ اذن الٰہی سے کرتے ہیں اور اللہ کے ہاں وہ مقدر ہوتا ہے ۔ وہ اپنی خواہش کے مطابق حرکت بھی نہیں کرتے ۔ وہ کوئی کام اپنی مرضی یا اپنے مفادات سے نہیں کرتے ۔ وہ جنگ ' جہاد یا امن ' مصالحت یا مخاصمت صرف اللہ کے حکم سے کرتے ہیں اور وہ اللہ کی تقدیر کا ظہور ہوتا ہے اور اللہ کی تقدیر ان کے تصرفات اور ان کی حرکات سے ظاہر ہوتی ہے ۔ اور وہ جو کچھ کرتے ہیں وہ اللہ کا فعل ہوتا ہے اور اللہ ہر کام پر قدرت رکھتا ہے ۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۵۹ : ۷) "جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسولؐ کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسولؐ اور رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے ۔ جو کچھ رسولؐ تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رک جاؤ ۔ اللہ سے ڈرو ' اللہ سخت سزا دینے والا

ہے"۔

یہ آیت اس حکم کو بتا رہی جس کا ذکر ہم نے پہلے کر دیا ہے۔ اس حکم کی علت بیان کرتے ہوئے اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اس کی وجہ دراصل اسلام کے نظام اقتصادی کا ایک عظیم اصول ہے۔

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (۵۹ : ۷) "تاکہ وہ تمہارے مالداروں کے درمیان میں گردش نہ کرتا رہے"۔ اور اس کی علت کے بیان میں اسلام کے دستوری نظام کا ایک دوسرا اعلیٰ ترین اصول بیان کر دیا۔

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (۵۹ : ۷) "جو کچھ رسول تمہیں دے، وہ لے لو، اور جس چیز سے وہ تمہیں روک دے اس سے رک جاؤ"۔ اگرچہ یہ دو اصول فے کی تقسیم کے ضمن میں وارد ہیں لیکن اسلام کے اقتصادی نظام اور اسلام کے دستوری نظام میں یہ بہت اہم اصول ہیں اور ان دونوں ہی پر دراصل اسلام کا اقتصادی اور دستوری نظام قائم ہے۔

پہلا قاعدہ اسلام کا اقتصادی اصل الاصول ہے اور اسلام کے اقتصادی نظریات اس پر مبنی ہیں۔ اسلام انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے لیکن انفرادی ملکیت پر یہ ایک پابندی اور چیک ہے۔ یعنی اسلام انفرادی ملکیت کو اس قدر وسیع آزادی نہیں دیتا کہ کچھ محدود مالدار لوگ ہی دراصل تمام دولت اور مفادات کو اپنی طرف سرمایہ کے زور سے کھینچ لیں۔ اور مال چند چوٹی کے لوگوں کے درمیان گردش کرے۔ اس لیے ہر وہ صورت حال جس کے اندر دولت صرف امراء کے درمیان گردش کرتی وہ اسلام کے نظریہ اقتصاد کے خلاف ہے۔ اور یہ اجتماعی عدل کے بھی خلاف ہے۔ اسلامی سوسائٹی کے اندر اجتماعی اور معاشی روابط اس طرح تشکیل پاتے ہیں کہ اس میں دولت چند محدود لوگوں ہی کے اندر گردش نہیں کرتی۔

اسلام نے اپنا اقتصادی نظام ان اصولوں کی بنیاد پر قائم کیا۔ اس نے زکوٰۃ فرض کی' یہ اڑھائی فیصد اصل سرمایہ اور منافع دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ اور ۱۰/ ۱ یا ۲۰/ ۱ تمام زرعی پیداواروں پر عائد ہوتا ہے۔ اسی طرح مویشیوں میں اور ان خزانوں میں جو زمین سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ شرح دراصل بہت ہی بڑی شرح ہے۔ پھر مجاہدین کے لیے ۵/ ۴ حصہ رکھا ہے۔ خواہ فقیر ہوں یا غنی ہوں' جبکہ فے صرف فقراء کے لیے رکھا ہے۔ اسی طرح اسلام نے زمین کی پیداوار کے اندر مالک اور مضارع کو شریک قرار دیا ہے اور امام کو یہ اختیار دیا کہ وہ لوگوں کی ضرورت سے زائد اموال ان سے لے کر فقراء میں تقسیم کر دے۔ اور اگر بیت المال کو ضرورت ہو تو لوگوں کے اموال میں بیت المال کا حصہ مقرر کر دے۔ پھر اسلام نے ذخیرہ اندوزی کو حرام قرار دیا' ربا کو حرام قرار دیا اور ربا اور ذخیرہ اندوزی دونوں ہی اصل ذرائع ارتکاز دولت ہیں۔ غرض اسلام کا اقتصادی نظام اسی عظیم قاعدے پر قائم ہے کہ دولت چند اغنیاء کے اندر ہی گردش نہ کرے بلکہ تمام فقراء تک اس کا پھیلاؤ ہو۔ اور یہ قاعدہ انفرادی ملکیت پر حاوی ہے۔

اس طرح اسلام انفرادی ملکیت کی اجازت دیتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ سرمایہ دارانہ نظام نہیں ہے۔ نہ سرمایہ دارانہ نظام اسلامی نظام سے ماخوذ ہے کیونکہ ربا اور ذخیرہ اندوزی کے سوا کوئی سرمایہ دارانہ نظام نہیں ہوتا۔ اسلامی نظام ایک خاص نظام ہے جو اللہ علیم و خبیر کی طرف سے ہے۔ یہ الگ پیدا ہوا' الگ چلا' اور آج بھی وہ تمام دوسرے اقتصادی نظاموں سے الگ تھلگ ہے۔ یہ ایک منفرد' متوازن' عادلانہ اور تمام حقوق و واجبات کا خیال رکھنے والا نظام ہے۔ اور یہ

نظام اس کائنات کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے ۔ اس لیے کہ اس کائنات کا خالق اللہ ہے ' انسان کا خالق اللہ ہے اور اس اقتصادی نظام کا خالق بھی اللہ ہے ۔

دوسرا اصول اسلام کے دستوری نظام کا ہے کہ شریعت کا ماخذ خدا اور رسول اور قرآن اور سنت ہیں ۔

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (۵۹ : ۷) "جو کچھ رسول تمہیں دے ' وہ لے لو ' اور جس چیز سے وہ تمہیں روکے اس سے رک جاؤ"۔ اسلامی دستور اور قوانین کا یہ اصل الاصول ہے ۔ اسلام کا قانونی نظام اس سے لیا گیا ہے کہ شریعت من جانب اللہ ہے اور اللہ کی جانب سے رسول لے کر آیا ہے ۔ اور یہ قرآن اور سنت سے عبارت ہے ۔ پوری امت مسلمہ معہ امام وقت مل کر بھی ان تعلیمات کی خلاف ورزی کے مجاز نہیں جو قرآن و سنت میں ہیں ۔ اگر کوئی خلاف قرآن اور سنت قانون بنائے گا تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہ ہوگی کیونکہ اس قسم کا قانون اپنے پہلے جواز ہی کو کھو بیٹھتا ہے ۔ یہ نظریہ تمام انسانی دساتیر اور قانون سازی کے نظریات سے یکسر مختلف ہے ۔ کیونکہ ان نظریات کے مطابق قوم قانون سازی کا سرچشمہ ہوتی ہے ۔ یوں کہ کوئی قوم جو قانون چاہے ' اپنے لیے بنا سکتی ہے ۔ اور جو قوم جو چاہے دستور و قانون بنا دے ۔ لہٰذا اسلامی دستور نظام اقتدار کا سرچشمہ قرآن و سنت ہیں ۔ جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا ہے ۔ امام امت کا نائب ہے ۔ نہ امام اور نہ قوم رسول اللہ کی لائی ہوئی شریعت محمدی کی مخالفت کے مجاز ہیں ۔

اب اگر کوئی مسئلہ قرآن و سنت میں نہ ہو تو اسے قرآن و سنت کے دوسرے اصولوں کی روشنی میں یوں حل کیا جائے گا کہ اس سے قرآن و سنت میں موجود کسی اصول کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو ۔ یہ اصول شریعت کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ بھی ایک شرعی اصول ہے ۔ لہٰذا ہر صورت میں سرچشمہ قانون قرآن اور سنت ہیں ۔ اور دوسرے قوانین و قواعد اسی وقت معتبر ہوں گے جب وہ قرآن اور سنت کے کسی مسلمہ قاعدے کے خلاف نہ ہوں ۔ امت کا اقتدار اس قاعدے کے اندر محدود ہے ۔ یاد رہے کہ امام امت بھی اسی قاعدے کا پابند ہے ۔ یہ ایک منفرد نظام قانون ہے اور کسی انسانی سوسائٹی کے ہاں اس قسم کا کوئی قانونی نظام نہیں ہے ۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں قانونی نظام بھی نظام کائنات کی طرح ایک فطری نظام ہوتا ہے ۔ جس طرح کائنات کے لیے اللہ نے نظام فطرت وضع کیا ہے ۔ اسی طرح انسانوں کے لیے اللہ نے نظام شریعت وضع کیا ہے تاکہ انسان کا بنایا ہوا قانون نظام فطرت سے ٹکرا نہ جائے اور جو قانون بھی آج تک انسانوں کے بنائے ہیں وہ نظام فطرت سے ٹکرائے ہیں ۔

ان دونوں اصولوں کو اس آیت میں اللہ سے مربوط کیا گیا ہے اور لوگوں کو دعوت دی ہے کہ ان کی اطاعت میں وہ اللہ سے ڈریں ۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۵۹ : ۷) "اللہ سے ڈرو ' اللہ سخت سزا دینے والا ہے"۔ یہ وہ بڑی ضمانت ہے جو اسلامی قانون کو حاصل ہے ' اس لیے اسے توڑنے کی کوئی بھی کوشش نہیں کرتا ۔ نہ اس سے بھاگنے کی کوئی گنجائش ہے ۔ کیونکہ مومنین کو علم ہے کہ اللہ تو دیکھتا ہے ۔ اعمال سے خبردار ہے ۔ تمام لوگوں کو اسی طرف لوٹنا ہے ' اور اگر خلاف ورزی کی گئی تو وہ سخت عذاب دینے والا ہے ۔ ان کو معلوم ہے کہ مال کو پھیلانا ہے اور اسے

دولتمندوں کے درمیان ہی گردش نہیں دیتا ہے۔ اور شریعت کے جو احکام خدا اور رسولؐ نے دیئے ہیں انہوں نے انہیں لیتا ہے اور جس چیز سے منع کیا ہے اس سے منع ہوتا ہے اور اس سلسلے میں کوئی سستی اور کوئی تساہل نہیں کرتا ہے کیونکہ انہوں نے اللہ کے سامنے جانا ہے۔

اب رسول اللہ نے اس فے کو مہاجرین میں تقسیم کیا اور صرف دو غریب انصاریوں کو اس مین شریک فرمایا۔ یہ ایک خاص اقدام تھا اور اس کا مقصد یہی تھا کہ دولت صرف دولت مندوں میں جمع نہ ہو جائے۔

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (۵۹ : ۷) "تاکہ وہ مالداروں کے درمیان ہی گردش نہ کرتا رہے"۔ حکم تو عام تھا کہ وہ فقراء کے لیے ہے خواہ مہاجر ہوں یا انصار یا بعد میں آنے والے ہوں' چنانچہ اگلی آیات میں اس پر بات ہوتی ہے۔

قرآن کریم احکام محض ایک خشک لکٹ کی طرح بیان نہیں کرتا۔ وہ اسے زندہ اور عام بیان کے انداز میں دیتا ہے۔ وہ ایک زندہ حکم ہوتا ہے زندہ انسانوں پر نافذ ہوتا ہے اور حکم کے اندر ہی اس کے اخلاقی پہلو اور اسباب بھی دیئے جاتے ہیں۔

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۵۹ : ۸) "ان غریب مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں۔ یہی راست باز لوگ ہیں"۔

یہ ایک ایسی تصویر ہے جس میں مہاجرین کے خدوخال اچھی طرح ثبت کر دیئے گئے ہیں وہ اپنے گھروں اور مال سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ ان کو مشرکین کی اذیت اور ان کی سختی نیز رشتہ داروں اور اہل خاندان کی طرف سے سرد مہری کی وجہ سے گھر بار چھوڑنا پڑا اور ان کا کوئی قصور اس کے سوا نہ تھا کہ وہ کلمہ طیبہ کے قائل تھے اور صرف اللہ کو رب جانتے تھے۔

يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا (۵۹ : ۸) "یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں"۔ ان کا اعتماد صرف اللہ پر ہے۔ صرف اس کے بھروسہ پر جی رہے ہیں اور ان کو یقین ہے کہ اس کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ اور اس کے باوجود وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع میں لگے ہوئے ہیں۔

وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (۵۹ : ۸) "اللہ اور اس کے رسول کی حمایت پر کمربستہ ہیں"۔ اپنے دلوں کے ساتھ' اپنی تلواروں کے ساتھ۔ اور پھر نہایت ہی مشکل حالات میں انہوں نے یہ فریضہ سرانجام دیا۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۵۹ : ۸) "یہی راست باز لوگ ہیں"۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے زبان سے کلمہ ایمان ادا کیا اور پھر اپنے عمل سے اس کی تصدیق کی۔ وہ اللہ کے ساتھ سچے تھے کہ انہوں نے اللہ کو اختیار کیا۔ رسول اللہ کے ساتھ سچے تھے کہ انہوں نے ان کی اطاعت کی۔ اور وہ سچائی کے ساتھ بھی مخلص تھے کیونکہ ان کی صورت میں

سچائی چلتی پھرتی نظر آتی تھی ۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۹:۵۹) "جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لاکر دارالہجرت میں مقیم تھے ۔ یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان (مہاجرین) کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں ۔ خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں ۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچالیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں"۔

یہ ہے انصار کی ایک خوبصورت تصویر جس کے اندر ان کے اہم خدوخال نہایت ہی نمایاں کر کے دکھائے گئے ہیں ۔ یہ مجموعہ صفات اگر عملاً مدینہ میں واقع نہ ہوا تھا اور عملاً اپنے انتہاؤں تک نہ گیا ہوتا تو لوگ اسے افسانہ سمجھتے اور لوگ کہتے یہ بہترین تخیل ہے ۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۹:۵۹) "جو لوگ ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ایمان لاکر دارالہجرت میں مقیم تھے"۔ یعنی مدینۃ الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ۔ میں یہ انصار تھے جو ایمان لاکر یہاں مقیم تھے ۔ اسی طرح انہوں نے ایمان کو بھی یہاں مقیم کر دیا تھا ۔ گویا مدینہ منزل ایمان و یقین تھا ۔ یہ ایک نہایت ہی خوبصورت اشاراتی تعبیر ہے ۔ انصار نے ایمان کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا یہ اس کی بہترین تصویر ہے ۔ یہ ایمان کا گھر تھا' یہ ایمان کا وطن تھا' یہاں مومنین کے دل لگے ہوئے تھے اور یہاں ان کے قلوب اور روح کو سکون ملتا تھا ۔ یہاں لوٹ کر وہ مطمئن ہوتے تھے جس طرح ایک شخص گھر آکر مطمئن ہوتا ہے لہٰذا مدینہ دار الایمان تھا ۔

يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا

(۹:۵۹) "یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے"۔ تاریخ انسانی میں کوئی ایسا اجتماعی واقعہ نہیں ہے کہ کسی قوم نے مہاجرین کا اس طرح استقبال کیا ہو جس طرح انصار نے مدینہ میں مہاجرین کا کیا ۔ نہایت محبت' ایثار' سخاوت' مروت کے ساتھ ۔ انہوں نے ان کو اپنے مال میں شریک کیا ۔ مکانوں میں ٹھہرایا اور ان کی تمام ذمہ داریاں قبول کیں ۔ روایات میں آتا ہے کہ کوئی مہاجر کسی انصاری کے گھر بذریعہ نامزدگی نہیں ٹھہرا بلکہ ہر شخص پر قرعہ اندازی ہوئی ۔ کیونکہ جب کوئی مہاجر آتا تو کئی لوگ آجاتے کہ ہمارے ہاں ٹھہرے گا ۔

وَلَا يَجِدُوْنَ فِي صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوْتُوْا (۹:۵۹) "جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے"۔ یعنی جن صورتوں کے اندر مہاجرین کو زیادہ دیا گیا۔ یہاں نے سب کا سب ان کے لیے مخصوص کر دیا گیا تو اس کی وجہ سے وہ اپنے دلوں میں حاجت محسوس نہیں کرتے ۔ یہاں تنگی یا حسد کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس سے ان کے دلوں کی پاکیزگی کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے دلوں کے اندر کوئی ضرورت' حاجت یا کوئی چیز بھی وہ نہیں محسوس کرتے ۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۹:۵۹) "اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں"۔ ایک آدمی خود محتاج ہو پھر بھی دوسروں کو ترجیح دے تو یہ بہت بلند مقام ہے اور انصار اس میدان میں اس قدر آگے بڑھے کہ ان کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ہے۔ اور تاریخ کے ہر دور اور ہر واقعہ میں انہوں نے نہایت ہی بلند کرداری کا مظاہرہ کیا۔ اس قدر بلند کرداری کا جس کی نظیر کوئی پیش نہ کر سکا۔

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۹:۵۹) "حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں"۔ دل کی تنگی ایک نفسیاتی بیماری ہے۔ یہ ہر بھلائی کے دروازے کو بند کر دیتی ہے کیونکہ کسی نہ کسی صورت میں مالی تاوان کا مطالبہ کرتی ہے۔ جذبات کو دبانے کا مطالبہ کرتی ہے اور محنت صرف کرنے کا مطالبہ کرتی ہے اور بعض اوقات بھلائی کے راستے میں جان تک دینے کا مطالبہ ہوا کرتا ہے۔ کوئی بخیل کبھی نیکی کا کام نہیں کر سکتا' وہ تو ہر وقت لینے کی فکر میں ہوتا ہے۔ دنیا کچھ بھی نہیں ہے اور جو شخص دل کی تنگی سے بچ گیا' اس کے سامنے سے گویا ایک بڑی رکاوٹ دور کر دی گئی اور وہ نیکی کے کاموں میں خرچ کرتے ہوئے۔ داد و دہش کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ إِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۰:۵۹)

"جو ان اگلوں کے بعد آئے ہیں' جو کہتے ہیں کہ "اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی بغض نہ رکھ' اے ہمارے رب' تو بڑا مہربان اور رحیم ہے"۔

یہ تیسری تصویر ہے جو نہایت پاکیزہ' راضی برضا اور سمجھنے والے لوگوں کی تصویر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مہاجرین و انصار کے بعد آئے۔ اس آیت کے نزول کے وقت وہ تو مدینہ میں موجود نہ تھے؟ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے ازلی علم میں آچکے تھے جو زمان و مکان کے حدود سے وراء ہے اور یہ دنیا میں بعد میں آنے والے تھے۔ اللہ نے پیشگی ان کی صفات بیان کر دی کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ سلف صالحین کے لئے طلب مغفرت کرتے ہیں اور وہ تمام مومنین کے لیے اپنے دل صاف رکھنے والے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ان کے دل

صاف ہوں۔کیونکہ دونوں کے درمیان ایمانی رشتہ موجود ہے ۔ دونوں پر اللہ کی رحمت ہوئی ہے کہ ان کو مومن بنایا ہے ۔ اور اللہ تو رؤف رحیم ہے ۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کا چہرہ کس قدر روشن ہے اور وہ اس کائنات میں کس قدر روشنی بکھیرنے والی امت ہے ۔اس کا رشتہ ایمانی اس قدر مضبوط ہے کہ اس کا آغاز اس کے انجام سے منسلک ہے اور بندھا ہوا ہے ۔ اور اس کا آخری حصہ اول حصے سے بندھا ہوا ہے ۔وہ ایک دوسرے کے ضامن 'کفیل' محب اور رحم کرنے والے ہیں ۔ اور بلالحاظ قوم ونسب' اور بلالحاظ دوری زمان و مکان وہ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں ۔ یہ امت مسلمہ مسلمانوں کے شعور پر مسلسل چھائی رہی ۔ یوں اہل ایمان قیامت تک گزشتہ لوگوں۔

الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ ( ۵۹ : ۱۰ ) کو یاد کرتے رہیں اور اس امت کو مسلمان اس طرح یاد کرتے ہیں جس طرح کوئی اپنے بھائیوں کو یاد کرتا ہے ' نہایت اعزاز' عزت اور محبت میں 'قدماء نے آنے والوں کا خیال رکھا اور آنے والے اگلوں کو یاد کرتے ہیں ۔ یہ سب ایک صف ہیں 'ایک ہی رجمنٹ ہیں 'اور زمانے گزر گئے ہیں ۔ ایک ہی جھنڈا ہے ۔ ایک ہی ہدف ہے ۔ ایک ہی افق ہے ۔ اور ان کا ایک ہی رب ہے جو رؤف و رحیم ہے ۔

یہ ایسی روشن تصویر ہے جس سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں ۔ لیکن وہ ایک زندہ حقیقت کی طرح کھڑی ہے ۔ اور یہ امت انسانیت کے لیے ایک بہترین مثال ہے ۔ایک نہایت شریفانہ کریمانہ مثال پوری انسانیت کے لیے ۔ ایسی خوبصورت مثال جس حد تک کوئی تصور کر سکتا ہے ۔ یہ تصویر اس وقت بہت ہی خوبصورت لگتی ہے جب ہم اپنے دور کی ایک امت کے ساتھ اس کا تقابلی مطالعہ کریں ۔ ہمارے دور کی یہ امت کارل مارکس کی انجیل "کیپٹل" کی اساس پر وجود میں آئی ہے ۔ یہ ایک ایسی امت ہے جس کے دلوں میں بغض و عداوت جوش مارتی ہے ۔ طبقات ایک دوسرے کے خلاف لڑتے اور کشت و خون کرتے نظر آتے ہیں اس امت کے تصور کے مطابق انسانی تاریخ جنگ اور کشمکش اور نفرت کی تصویر ہے اور پھر اس امت کو تمام اہل دین کے ساتھ نفرت ہے ۔

زرا دوبارہ امت محمدیہ اور امت کارل مارکس کے درمیان تقابل کیجئے ۔امت محمدیہ انسانیت کو اس کے اعلیٰ مراتب تک بلند کرتی ہے ۔ جبکہ یہ دوسری امت انسانیت کو ذلت کی انتہائی پستیوں تک گراتی ہے ۔امت محمدیہ کی تصویر یہ ہے کہ زمان و مکان کی حدود سے ماوراء 'نسل اور وطن کی حدبندیوں سے آزاد نسب اور خاندان کے محدود دائروں سے باہر' تمام انسانوں کو ایک دوسرے کا ضامن 'کفیل' دوست اور واقف کار بناتی ہے اور سب کو ایک اونچے ہدف کی طرف بلند کرتی ہے اور ہدف ہے اللہ کی بندگی ۔--- ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز--- جن کے دل صاف ہیں اور اگلوں پچھلوں کے درمیان کوئی دشمنی نہیں ہے ایک دوسرے کے ہمدرد ہیں اور ایک دوسرے کے حوالے سے دل صاف ہیں ۔

جبکہ دوسری تصویر یہ ہے کہ اس میں لوگ ایک دوسرے کو ذبح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں' بعض دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں' ان کا استحصال کرتے' سازشیں کرتے ہیں اس کے مقابلے میں دوسرے ان سے بغض 'حسد اور نفرت کرتے ہیں ۔ پوری انسانی تاریخ عبارت ہے' اظہار نفرت سے ۔ یہاں تک کہ عبادت گاہوں میں بھی نفرت ہے ۔ ان کے نزدیک نماز بھی دراصل ایک جال ہے ۔ اور مذہب ایک دھوکہ ہے جس کے ذریعہ مالدار لوگ غریبوں کا استحصال کرتے

ہیں ۔ اور ان دو تصاویر کو دیکھتے ہوئے اس آیت کو پھر پڑھئے :

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (۵۹ : ۱۰) "اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی بغض نہ رکھ ' اے ہمارے رب ' تو بڑا مہربان اور رحیم ہے" ۔ یہ ہے قافلہ ایمان اور یہ ہے دعائے اہل ایمان ۔ یہ نہایت ہی معزز قافلہ ہے اور یہ نہایت ہی کشادہ آدمی کی دعا ہے ۔

اس خوبصورت تصویر کشی اور اسے نہایت ہی بلند مقام پر نور کے فریم میں نصب کرنے کے بعد ' اب مضمون اس موضوع پر آتا ہے جس کے بارے میں یہ سورت نازل ہوئی ہے ۔ اب یہاں ایک دوسرے گروہ کی کریہہ تصویر سامنے آتی ہے ۔ یہ ہے گروہ منافقین :

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا
مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا
وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿١١﴾ لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا
يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ وَلَئِنْ قُوتِلُوا لَا يَنْصُرُونَهُمْ وَلَئِنْ نَصَرُوهُمْ لَيُوَلُّنَّ
الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ﴿١٢﴾ لَأَنْتُمْ أَشَدُّ رَهْبَةً فِي صُدُورِهِمْ مِنَ اللَّهِ ذَٰلِكَ
بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿١٣﴾ لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرًى مُحَصَّنَةٍ أَوْ مِنْ
وَرَاءِ جُدُرٍ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ذَٰلِكَ
بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٤﴾ كَمَثَلِ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاقُوا وَبَالَ
أَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٥﴾ كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا
كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِنْكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦﴾ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا ۲
أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيهَا وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ﴿١٧﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ع ۲

اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾

"تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنہوں نے منافقت کی روش اختیار کی ہے؟ یہ اپنے کافر اہل کتاب بھائیوں سے کہتے ہیں "اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے' اور تمہارے معاملہ میں ہم کسی کی بات ہرگز نہ مانیں گے' اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے"۔ مگر اللہ گواہ ہے کہ یہ لوگ قطعی جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ ہرگز نہ نکلیں گے' اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی ہرگز مدد نہ کریں گے اور اگر یہ ان کی مدد کریں بھی تو پیٹھ پھیر جائیں گے اور پھر کہیں سے کوئی مدد نہ پائیں گے۔ ان کے دلوں میں اللہ سے بڑھ کر تمہارا خوف ہے' اس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ یہ کبھی اکٹھے ہو کر (کھلے میدان میں) تمہارا مقابلہ نہ کریں گے' لڑیں گے بھی تو قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر۔ یہ آپس کی مخالفت میں بڑے سخت ہیں۔ تم انہیں اکٹھا سمجھتے ہو مگر ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ ان کا یہ حال اس لیے ہے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں یہ انہی لوگوں کے مانند ہیں جو ان سے تھوڑی ہی مدت پہلے اپنے کیے کا مزا چکھ چکے ہیں۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ان کی مثال شیطان کی سی ہے کہ پہلے وہ انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر' اور جب انسان کفر کر بیٹھتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری الذمہ ہوں' مجھے تو اللہ رب العالمین سے ڈر لگتا ہے۔ پھر دونوں کا انجام یہ ہونا ہے کہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائیں' اور ظالموں کی یہی جزا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے ڈرو' اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو' اللہ یقیناً تمہارے ان سب اعمال سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں خود اپنا نفس بھلا دیا' یہی لوگ فاسق ہیں۔ دوزخ میں جانے والے اور جنت میں جانے والے کبھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ جنت میں جانے والے ہی اصل میں کامیاب ہیں"۔

یہاں ان باتوں کا ایک ریکارڈ پیش کر دیا جاتا ہے جو اس واقعہ کے بارے میں یہودیوں اور منافقین مدینہ کے درمیان ہوتی رہیں۔ منافقین نے ان کے ساتھ جو جو معاہدے کیے وہ پورے نہ کیے اور یہودیوں کو اس طرح ذلیل کر کے رکھ دیا۔ اللہ ان پر حملہ آور ہوا اور ان کو اس قدر مرعوب کر دیا کہ انہوں نے وہ کام اپنے ہاتھوں سے کیا جو مومنین نے کرنا تھا۔ لیکن قرآن کریم اس ریکارڈ کو پیش کرتے وقت ہر آیت میں ایک عظیم حقیقت سے بھی مسلمانوں کو آگاہ کرتا ہے۔ جو ان کے دل میں بیٹھ جاتی ہے' جو ان کے دلوں کے اندر ایک گہرا تاثر پیدا کرتی ہے' اور ان کے دل و دماغ میں ایمان گہرا ہو جاتا ہے۔ ان کے علم میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ان کی اخلاقی تربیت پختہ ہو جاتی ہے۔

پہلی حقیقت یہ قلم بند کی گئی کہ یہودی اور منافقین بھائی بھائی ہیں ۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ

(۵۹: ۱۱) "تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنھوں نے منافقت کی روش اختیار کی ہے ۔ یہ اپنے کافر اہل کتاب بھائیوں سے کہتے ہیں" ۔ تو یہ اہل کتاب کافر تھے اور منافقین ان کے بھائی تھے ۔ اگرچہ انہوں نے اسلام کی چادر اوڑھ رکھی تھی ۔

پھر منافقین کی یہ تاکید شدید جو انہوں نے اپنے بھائیوں سے کی ۔

لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ

(۵۹: ۱۱) "اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے' اور تمہارے معاملہ میں ہم کسی کی بات ہرگز نہ مانیں گے' اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے" ۔ لیکن اللہ ان کی حقیقت کو خوب جانتا ہے ۔ وہ ان کی قرارداد سے بالکل مختلف قرار دیتا ہے اور ان کی تاکیدات کے برعکس موکد حقیقت بتاتا ہے ۔

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۱) لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا

لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ (۱۲) (۵۹: ۱۱ ۔

۱۲) "مگر اللہ گواہ ہے کہ یہ لوگ قطعی جھوٹے ہیں ۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ ہرگز نہ نکلیں گے' اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی ہرگز مدد نہ کریں گے اور اگر یہ ان کی مدد کریں بھی تو پیٹھ پھیر جائیں گے اور پھر کہیں سے کوئی مدد نہ پائیں گے" ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جس کی شہادت اللہ نے دی تھی ۔ انہوں نے جو فیصلے کیے تھے اور جن کا اعلان کیا تھا ان میں سے ایک پر بھی عمل نہ کیا ۔

اس کے بعد اللہ مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے جو ان منافقین اور ان اہل کتاب کافروں کے دلوں میں خوب بیٹھی ہوئی ہے ۔

لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۵۹: ۱۳)

"ان کے دلوں میں اللہ سے بڑھ کر تمہارا خوف ہے' اس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ بوجھ نہیں رکھتے" ۔ ان کی حالت یہ ہے کہ یہ اللہ کے مقابلے میں مومنین سے زیادہ ڈرتے ہیں ۔ اگر یہ اللہ سے ڈرتے تو پھر اللہ کے کسی بندے سے نہ ڈرتے کیونکہ خوف اور خشیت تو ایک ہوتی ہے ۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی اللہ سے بھی ڈرے اور لوگوں سے بھی ڈرے ۔ عزت صرف اللہ کی ہے ۔ اور تمام دوسری مخلوق اللہ کے مقابلے میں کوئی عزت اور غلبہ نہیں رکھتی ۔ تمام دوسری مخلوقات اللہ کے احکام کے تابع ہے ۔ قرآن کہتا ہے ۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا "زمین میں جو چیز بھی چلنے والی ہے اس کی چوٹی اللہ کے ہاتھ میں ہے"۔ اس لیے جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ کسی اور سے نہیں ڈرتا۔ لیکن جو لوگ اس حقیقت کو نہیں پاتے وہ ماسوائے اللہ سے ڈرتے ہیں اور وہ دوسری قوتوں سے اللہ کی نسبت زیادہ ڈرتے ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۵۹ : ۱۳) "یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے"۔ اس کے بعد ان کے دلوں میں قائم ایک دوسری حقیقت کو بیان کیا جاتا ہے جو سابقہ حقیقت ہی کا نتیجہ ہے یعنی مسلمانوں کے خوف کا۔ یہ حقیقت بھی ان منافقین اور کافرین کے دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے۔

لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ (۵۹ : ۱۴) "یہ کبھی اکٹھے ہو کر (کھلے میدان میں) تمہارا مقابلہ نہ کریں گے 'لڑیں گے بھی تو قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر۔ یہ آپس کی مخالفت میں بڑے سخت ہیں۔ تم انہیں اکٹھا سمجھتے ہو مگر ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ ان کا یہ حال اس لیے ہے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں"۔

یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ منافقین اور اہل کتاب کی جو تصویر قرآن کریم نے کھینچی ہے وہ ابھی تک سچی ہے۔ منافقین اور کافر اہل کتاب جب بھی جہاں بھی ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئے ہیں تو یہ صورت سامنے ہو کر آگئی۔ حال ہی میں اخوان اہل ایمان اور یہودیوں کے درمیان فلسطین کی سرزمین پر جو جھڑپیں ہوئیں ان میں یہودی کسی جگہ بھی کھل کر میدان میں نہ آئے اور وہ اپنی آبادیوں اور حلقوں میں چھپ کر ہی لڑتے رہے اور جب کبھی وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر آئے تو وہ چوہوں کی طرح پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔ یوں نظر آتا تھا کہ شاید یہ آیت انہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ان حقائق کے علاوہ ان کی نفسیاتی جھلکیاں بھی عجیب ہیں۔

بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ (۵۹ : ۱۴) "یہ آپس کی مخالفت میں شدید ہیں"۔

تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى (۵۹ : ۱۴) "تم انہیں اکٹھا سمجھتے ہو اور ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں"۔ جبکہ اس کے مقابلے میں مومنین کی حالت یہ ہے کہ وہ صدیوں کے آنے والے اپنے سابقہ لوگوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ زمان و مکان کی دوریوں کے باوجود وہ ایمان کی رسی میں بندھے ہوئے ہیں۔ اور اس راہ میں جنس وطن اور خاندان رکاوٹ نہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ (۵۹ : ۱۴) "ان کا یہ حال اس لیے ہے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں"۔ بعض اوقات ظاہری حالات دھوکہ دیتے ہیں۔ اہل کتاب آپس میں نہایت متحد و متفق نظر آتے ہیں اور ایک دوسرے کے کفیل و مددگار نظر آتے ہیں اور حمایت بھی کرتے ہیں جس طرح منافقین ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو جاتے

ہیں ۔ لیکن آسمان سے یہ سچی خبر آتی ہے کہ یہ لوگ ایسے نہیں ہیں جیسے نظر آتے ہیں ۔ یہ محض ان کا خارجی منظر ہے ۔ کبھی کبھی ان کا یہ پردہ اتر جاتا ہے اور ان کی حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ یہ اندر سے کس قدر پھٹے ہوئے ہیں ۔ اور قرآن کریم کی سچائی ثابت ہوتی ہے ۔ ایک ہی محاذ اور ایک ہی بلاک کے اندر وہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے ہیں ۔ دراصل یہ اپنی اپنی مصلحتوں کے لیے جدوجہد کر رہے ہوتے ہیں ۔ متضاد خواہشات رکھتے ہیں' ان کی پالیسیاں باہم متصادم ہوتی ہیں ۔ جب بھی مومنین نے صداقت سے کام کیا ہے اور جب بھی ان کے دل اللہ کی ذات پر جمع ہوئے ہیں' ان کے مقابلے میں کفار اور منافقین کے محاذ میں دراڑیں پڑگئی ہیں اور ان کے دل باہم بکھر گئے ہیں ۔ اور بظاہر ان کا اتحاد خواب پریشاں بن گیا ہے اور جب بھی مومنین نے صبر کیا ہے اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا تو انہوں نے دیکھا کہ کافروں کے درمیان جو ظاہری اتحاد اور بندش نظر آتی ہے وہ کھل گئی ہے اور ان کا اتحاد پارہ پارہ ہوگیا ہے اور نظر آگیا ہے کہ ان کے درمیان شدید اختلافات ہیں' شدید دشمنی ہے اور وہ ایک دوسرے کے خلاف سازشیں اور دشمنیاں کر رہے ہیں ۔ اور ان کے دل ایک دوسرے سے بالکل جدا (شتی) — ہیں ۔

کفار اور منافقین کو مسلمانوں پر اس وقت غلبہ ہو جاتا ہے اور وہ نقصان بھی پہنچا دیتے ہیں جب مسلمانوں کے دل ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں ۔ اس وقت پھر وہ مسلمانوں کی تمثیل نہیں پیش کرتے جو سابقہ آیت میں ذکر ہوتی ہے بلکہ وہ نام کے مسلمان ہوتے ہیں ورنہ مومنین کے مقابلے میں منافقین کے بارے میں قرآن نے کہا ۔

بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ (۵۹ : ۱۴) "آپس میں ان کی مخالفت شدید ہے" ۔

تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى (۵۹ : ۱۴) "تم انہیں اکٹھے سمجھتے ہو مگر ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں" ۔ قرآن کریم مومنین کے دلوں یہ حقیقت اچھی طرح بٹھاتا ہے تاکہ ان کے دلوں میں سے کافروں کا رعب نکل جائے ۔ اور وہ ان سے نہ ڈریں کیونکہ ان کی حقیقت واقعی یہی ہے اور ایسی ہی ہے ۔ اس لیے یہ مسلمانوں کی تربیت ہے اور یہ ایک ثابت حقیقت پر مبنی ہے ۔ اگر مسلمان قرآنی تعلیمات کو سنجیدگی سے لیں تو ان کے دشمنوں کے معاملات ان کے لیے آسان ہو جائیں اور ان کے دل متحد ہو جائیں ۔ اور ان کے مقابلے میں دنیا کی کوئی قوت ہی نہ ٹھہر سکے ۔

جو لوگ اللہ پر صحیح طرح ایمان لا چکے ہیں ان کو چاہئے کہ اپنی حقیقت اور اپنے دشمنوں کی طبیعت کو اچھی طرح سمجھیں ۔ اور اگر انہوں نے اپنی حقیقت کو پالیا تو نصف معرکہ سر ہوگیا ۔ اور اس حقیقت کی طرف قرآن کریم ایک واقعہ کی شکل میں اشارہ کرتا ہے اور یہ حقیقت قرآن نے بطور تمثیل اور سبق ذکر کی ہے ۔ اور اس کے بعد پھر اس واقعہ کا تجزیہ کیا اور دلائل دیئے تاکہ وہ لوگ جنہوں نے وہ واقعہ دیکھا تھا وہ عبرت پکڑیں ۔ اور بعد کے آنے والوں کے لیے بھی وہ ایک عبرت آموز واقعہ بن جائے ۔ قرآن نے یہ اشارہ ان لوگوں کے سامنے کیا ہے جو اس حقیقت سے باخبر تھے ۔ واقعہ بنی نضیر پہلا واقعہ نہ تھا ۔ اس سے قبل بنی قینقاع کا واقعہ ہوگیا تھا ۔ اسی کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے :

كَمَثَلِ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۵۹ : ۱۵)

"یہ انہی لوگوں کے مانند ہیں جو ان سے تھوڑی ہی مدت پہلے اپنے کیے کا مزا چکھ چکے ہیں۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔ واقعہ بنی قینقاع غزوۂ بدر کے بعد اور غزوۂ احد سے قبل ہوا تھا۔ ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان عہد تھا۔ جب مسلمانوں نے بدر میں مشرکین پر غلبہ پا لیا تو یہودیوں کو یہ بات بہت ہی بری لگی۔ اور انہوں نے مسلمانوں کی اس عظیم فتح کو دل سے قبول نہ کیا اور جل بھن گئے۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ مدینہ میں مسلمان جس قدر قوت پکڑتے ہیں اس قدر ان کی اہمیت گھٹتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ جو باتیں کرتے تھے رسول اللہ کو ان کی رپورٹیں ملتی رہتی تھیں کہ یہ کسی شر کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بارہا نصیحت کی اور غداری کے انجام سے ڈرایا۔ تو انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کا بدواخت جواب دیا جس کے اندر ایک دھمکی مضمر تھی۔ انہوں نے کہا "محمد' تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم تمہاری قوم قریش کی طرح ہیں۔ تم اس بات پر مغرور نہ ہو کہ تم نے ایک ایسی قوم سے جنگ کی جن کو جنگ کا تجربہ نہ تھا اور تم نے ان کو مار لیا۔ ہم ایسے ہیں کہ اگر خدا کی قسم تم نے ہم سے لڑائی کی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کیسے لوگ ہیں"۔

اس کے بعد انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک عرب خاتون کچھ سامان لے کر آئی اور اسے فروخت کیا۔ یہ سامان اس نے بازار بنی قینقاع میں فروخت کیا۔ اس کے بعد وہ ایک سنار کے پاس بیٹھ گئی تو انہوں نے اس کے ساتھ برائی کا ارادہ کر لیا اور کہا کہ وہ چہرہ کھولے' اس نے انکار کر دیا۔ سنار نے شرارت کر کے اس کی چادر کا پچھلا حصہ اس کی پیٹھ کے ساتھ باندھ دیا۔ جب وہ اٹھی تو اس کی شرمگاہ ننگی ہو گئی۔ یہ اس کے ساتھ ہنسے۔ اس نے فریاد کی۔ ایک مسلمان شخص اٹھا اور اس نے سنار کو قتل کر دیا۔ تمام یہودی جمع ہوئے۔ اور انہوں نے مسلمان کو قتل کر دیا۔ چنانچہ مسلمانوں نے مسلمانوں کو پکارا۔ اس پر مسلمانوں کو بہت ہی غصہ آیا۔ چنانچہ ان کے اور بنی قینقاع کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔

رسول اللہ نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے رسول اللہ کے فیصلے پر ہتھیار ڈال دیئے کہ آپ جو فیصلہ کریں' اس پر رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی ابن سلول ان کی طرفداری میں کھڑا ہو گیا۔ کیونکہ بنی قینقاع اور خزرج کے درمیان ایک معاہدہ تھا۔ لیکن اصل حقیقت یہ تھی کہ یہ منافقین دراصل کفار اہل کتاب کے بھائی تھے۔ بڑی کشمکش کے بعد رسول اللہ راضی ہو گئے کہ ان کو قتل کرنے کے بجائے جلاوطن کر دیا جائے اور یہ کہ وہ اپنے ساتھ اموال اور سامان لے جائیں ماسوائے اسلحہ کے۔ اور یہ لوگ شام کو چلے گئے۔

یہ واقعہ تھا جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے کہ یہ بنی نضیر بھی بنی قینقاع کی طرح ہیں اور منافقین ان کے بھائی ہیں اور ان کے بھی بھائی تھے۔ منافقین نے اپنے بھائی کافر اہل کتاب کو دھوکہ دیا کہ وہ مقابلہ کریں' ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ لیکن ان کا یہ انجام ہوا اور انہوں نے کوئی ساتھ بھی نہ دیا۔ یہاں ان کی ایک دائمی تمثیل دی جاتی ہے کہ منافقین جو کچھ کرتے ہیں بعینہ وہی شیطان کرتا ہے اور جو لوگ شیطان کی سنتے ہیں ان کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّي بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۶) فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ

(۱۷) ''ان کی مثال شیطان کی سی ہے کہ پہلے وہ انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر' اور جب انسان کفر کر بیٹھتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری الذمہ ہوں' مجھے تو اللہ رب العالمین سے ڈر لگتا ہے۔ پھر دونوں کا انجام یہ ہونا ہے کہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائیں' اور ظالموں کی یہی جزا ہے''۔

شیطان انسانوں کے ساتھ جو سلوک کرتا ہے وہی سلوک منافقین اہل کتاب کافروں کے ساتھ کرتے ہیں۔ لیکن انسان ہیں کہ پھر اس کے کہے پر چلتے ہیں۔ یہ ایک دائمی حقیقت ہے اور قرآن کریم اس عارضی واقعہ کے حوالے سے اسے یہاں بیان کر دیتا ہے کہ اس طرح اس جزئی واقعہ سے بھی ایک دائمی اور کلی نصیحت و حکمت اخذ کی جائے اور یوں بات کا دائرہ وسیع ہو جائے۔ اور بات صرف ایک جزئی واقعہ تک محدود نہ رہے۔ قرآن کا یہ انداز ہے کہ قرآن دائمی' اور اعلیٰ حقائق کو بھی ایک جزء کے حوالے سے بیان کرتا ہے۔ کیونکہ محض کلی اور اصولی باتیں خشک فلسفہ بن جاتی ہیں۔ اور انسانی شعور اور دل و دماغ پر ان کا وہ اثر نہیں ہوتا جس طرح ایک مثال اور واقعہ کی صورت میں ہوتا ہے۔ یہ ہے فرق قرآن کے انداز بیان کا اور فلاسفہ اور مدرسین کے انداز بیان کا۔ فلاسفہ صرف فارمولوں کی شکل میں بات کرتے ہیں۔

اس مثال پر بنی نضیر کا قصہ ختم ہوتا ہے اور اس قصے کے درمیان قرآن نے اس قدر حقائق ہدایات اور تصاویر بیان کیں اور ان کی وجہ سے اس جزوی قصے کو آفاقی بنا دیا گیا یا اعلیٰ حقائق کو اس قصے کی شکل میں پیش کیا گیا۔ اور یہ واقعہ ادھر زمین پر چلتا رہا اور ادھر انسانی ضمیر کے اصلاح کا کام کرتا رہا۔ یوں یہ واقعہ ایک واقعہ سے زیادہ درس حکمت اور موجب ہدایت اور عبرت بن گیا۔ انداز بیان اس واقعہ اور ان حقائق کا اللہ کی کتاب میں کچھ اور ہے اور انسان اسے جس طرح بیان کرتے ہیں وہ کچھ اور ہے۔

بنی نظیر کے واقعہ کا یہ بیان' اس پر تبصرے اور اس کے ضمن میں عظیم حقائق کا بیان اور ہدایات کے بعد اب روئے سخن اہل ایمان کی طرف پھر جاتا ہے اور خطاب اس پیارے لفظ اور پیاری صفت سے کیا جاتا ہے ''اے اہل ایمان'' تاکہ وہ اسے جلدی سے قبول کر لیں۔ سہولت سے عمل پیرا ہوں۔ ان سے کہا جاتا ہے تقویٰ کی راہ اختیار کرو' یہ دیکھو کہ کل یوم الحشر کے لیے تم نے کیا تیاری کی ہے' اللہ کو بھول نہ جاؤ جس طرح پہلے لوگوں نے بھلا دیا' تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا۔ اور ان کا برا انجام ہوا اور وہ جہنمی ہو گئے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۱۸) وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۱۹) لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ (۲۰) (۵۹:۱۸ تا ۲۰) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے ڈرو' اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو' اللہ یقیناً تمہارے ان سب اعمال سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں خود اپنا نفس بھلا دیا' یہی لوگ فاسق ہیں۔ دوزخ میں

جانے والے اور جنت میں جانے والے کبھی یکساں نہیں ہو سکتے ۔جنت میں جانے والے ہی اصل میں کامیاب ہیں"۔

تقویٰ کیا چیز ہے ؟ یہ ایک قلبی حالت ہے جس کی طرف اس لفظ کا پرتو ہی اشارہ کر رہا ہے ۔ لیکن الفاظ کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ تقویٰ کی حالت کی تصویر کشی کر سکیں ۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جس میں دل بیدار اور حساس ہوتا ہے ' اور اللہ کا تیز شعور رکھتا ہے ' اور یہ شعور ہر حالت میں ہوتا ہے ۔ انسان اللہ سے خائف 'بہت محتاط اور اس بات سے حیا کرنے والا ہوتا ہے کہ اللہ اسے ایسے حال میں پائے جو اللہ کو پسند نہیں ہے کیونکہ اللہ تو ہر لمحہ دیکھ رہا ہوتا ہے اس لیے اللہ سے کوئی بچ نہیں سکتا۔

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (۵۹ : ۱۸) " ہر شخص دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے"۔ یہ ایسی تعبیر ہے جس کا مفہوم اس کے الفاظ سے بہت زیادہ وسیع ہے اور ان الفاظ کو سن کر ہی انسانی تصور کے سامنے ایک کتاب کے صفحات کھلنے لگتے ہیں ۔جس کے اندر اس کے پورے اعمال درج ہیں ' ان میں تمام اعمال چھوٹے بڑے درج ہیں تو انسان سوچتا ہے کہ اس نے اس کتاب کے صفحات میں اندراج کے لیے کیا تیاریاں کی ہیں ۔بس یہ تصور ہی اس کے سامنے اپنی کمزوریاں لے آتا ہے اور کئی تقصیرات اور معاصی اس کے سامنے آ جاتے ہیں 'اگر چہ اس نے نیکیاں ہی کی ہوں ' اور راہ حق میں جدوجہد بھی کی ہے ۔ لیکن اگر اس کی نیکیاں کم ہو گئیں تو کیا ہو گا ۔ بہرحال یہ چند الفاظ اگر انسان کے پیش نظر رہیں تو وہ کبھی بھی غافل نہیں ہو سکتا ۔وہ ہروقت اپنے اعمال پر نظر رکھے گا۔

یہ شعور دینے کے بعد مومنین کو مزید بیدار کیا جاتا ہے ۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۵۹ : ۱۸) "اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ یقیناً تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے"۔ اسی طرح قلب مومن کا احساس تیز ہو جاتا ہے ۔ وہ ڈرتا ہے اور معصیت کرتے ہوئے اللہ سے حیا کرتا ہے کیونکہ اللہ تو انسان کے تمام اعمال سے خبردار ہے"۔

اس آیت میں جس یاد دہانی اور بیداری کی دعوت دی گئی ' اس کی مناسبت سے اگلی آیت میں ان کو ڈرایا جاتا ہے کہ وہ اس طرح نہ ہوں ۔

كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ (۵۹ : ۱۹) "ان لوگوں کی طرح نہ ہوں جو اللہ کو بھول گئے تھے تو اللہ نے انہیں اپنا نفس بھلا دیا تھا"۔ یہ عجیب حالت ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بھلا دے لیکن یہ ہے حقیقت ۔ اس لیے کہ جو شخص اللہ کو بھلا دیتا ہے ' وہ اس دنیا میں اس طرح ہوتا ہے جس طرح حیوان چرتے پھرتے ہیں ۔ یوں وہ اپنی حیثیت انسانی کو بھلا دیتا ہے ' اور اس حقیقت سے پھر ایک دوسری حقیقت لازم آتی ہے ۔ وہ یوں کہ وہ اپنے آپ کو بھلا کر اپنی طویل زندگی کے لیے کوئی سامان نہیں تیار کرتا ۔ اور کل کے لیے اس کی کوئی تیاری نہیں ہوتی ۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۵۹ : ۱۹) "یہی لوگ فاسق ہیں"۔ یہ جادۂ حق سے منحرف اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں ۔ اس لیے اگلی آیت میں آتا ہے کہ ایسے لوگ جہنمی ہیں ۔ اور مومنین چونکہ اہل جنت ہیں اس لیے ان کو

چاہئے کہ وہ ان لوگوں کے راستے کے برعکس دوسرا راستہ اختیار کریں کیونکہ دونوں کے راستے ہی جدا ہیں ۔

لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ

( ۵۹ : ۲۰ ) "دوزخ میں جانے والے اور جنت میں جانے والے کبھی یکساں نہیں ہو سکتے ۔ جنت میں جانے والے ہی اصل میں کامیاب ہیں" ۔ نہ دونوں کے حالات برابر ہوں گے نہ مزاج برابر ہو گا ۔ نہ راستہ اور نہ راستے پر چلنے کا طریقہ ۔ نہ جنت اور نہ منزل ۔ غرض ان کی کوئی چیز یکساں نہیں ہو سکتی ۔ ان کے راستے ہی جدا ہیں اور یہ راستے اس طرح جدا ہیں کہ کسی مقام پر باہم نہیں ملتے ۔ ان کی سمت جدا ہے ' اس کا خط جدا ہے ' نہ سیاست میں ' نہ صف میں اور نہ دنیا اور نہ آخرت میں ۔

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ( ۵۹ : ۲۰ ) "جنت میں جانے والے ہی اصل میں کامیاب ہیں" ۔ یہاں اہل جنت کا انجام بتا دیا جاتا ہے اور اہل جہنم کو بھلا دیا جاتا ہے کہ ان کا انجام تو معلوم ہے گویا وہ بھلا دیئے گئے گم ہو گئے ۔

اب قلب و نظر کی تاروں پر آخری اور شدید ضرب جس سے انسان کپکپا جاتا ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ اے دل مومن اگر پہاڑوں پر یہ قرآن اتارا جاتا تو وہ بھی پاش پاش ہو جاتے ۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰي جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ
خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ
الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ هُوَ
اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ
۳ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ
ع ۷ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝
۶

"اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے ۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لیے بیان کرتے ہیں کہ وہ (اپنی حالت) پر غور کریں ۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ' غائب اور ظاہر ہر چیز کا جاننے والا ' وہی رحمٰن اور رحیم ہے ۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ وہ بادشاہ ہے نہایت مقدس ' سراسر سلامتی ' امن دینے والا ' نگہبان ' سب پر غالب ' اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا ' اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا ۔ پاک ہے اللہ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو

نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔اس کے لیے بہترین نام ہیں۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے' اور وہ زبردست اور حکیم ہے"۔

یہ ایک تمثیل ہے لیکن ایک حقیقت کو بطول مثال پیش کیا گیا ہے۔ یہ قرآن ایک عظیم وزن رکھتا ہے۔اس کے اندر بہت بڑی قوت ہے' بے پناہ اثر کا مالک ہے' اور اس کے مقابلے میں کوئی چیز ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔جس پر اس کا وزن پڑے تو متزلزل ہو جاتا ہے' پاش پاش ہو جاتا ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب پہلی مرتبہ اسے پڑھا تو وہ پاش پاش ہو گئے اور جب وہ ایک رات سننے والے سے سن رہے تھے۔

وَالطُّوْرِ (۱) وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ (۲) فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۳) وَّالْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ (۴) وَ السَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ (۵) وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ (۶) اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ (۷) (۵۲ : ۱ تا ۷) "قسم ہے طور کی اور ایک لکھی کتاب کی جو رقیق جلد میں لکھی ہوئی ہے اور آباد گھر کی' اور اونچی چھت کی' اور موجزن سمندر کی' کہ تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے جسے کوئی دفع کرنے والا نہیں"۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔اس کے بعد وہ گھر کو واپس آئے اور اس قدر غم زدہ ہو گئے کہ لوگ ایک ماہ تک ان کی عیادت کرتے رہے۔

بعض ایسے لمحات آتے ہیں کہ انسان کا دل قرآنی معارف کے لیے کھل جاتا ہے تو قرآن کا اثر اس قدر تیز ہوتا ہے کہ انسان ہلا مارا جاتا ہے اور اس پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور انسان کے اندر اس قدر تغیرات اور تبدیلیاں آ جاتی ہیں جس طرح مقناطیس اور بجلی کا اثر لوہے اور جسم پر ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی شدید اثر ہوتا ہے۔

اللہ خالق الجبال بھی ہے اور منزل القرآن بھی۔اللہ کا فرمان ہے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ

(۵۹ : ۲۱) "اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے"۔جن لوگوں نے قرآن کریم کی اس نوعیت کے اثرات کو اپنے جسم میں محسوس کیا ہے وہی اس حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں لیکن ان کا ذوق اور ان کا احساس الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اور اس سورت کے آخر میں خدائے رحمن و رحیم کی تعریف اور تسبیح آتی ہے' جب انسان کی ذات پر قرآن کریم کا کسی قدر اثر ہو جاتا ہے تو وہ تسبیح کرنے لگتا ہے اور یہ اسمائے حسنیٰ ایسے ہیں جن کے آثار کائنات میں واضح نظر آتے ہیں کیونکہ اللہ کے اسمائے صفات کائنات کے مظاہر اور اس کی حرکت میں نظر آتے ہیں :

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (۲۲) هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ

الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۲۳) هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۲۴) (۵۹ : ۲۲ تا ۲۴) "وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں' غائب اور ظاہر ہر چیز کا جاننے والا' وہی رحمٰن اور رحیم ہے ۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ وہ بادشاہ ہے نہایت مقدس ' سراسر سلامتی' امن دینے والا' نگہبان' سب پر غالب' اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا' اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا ۔ پاک ہے' اللہ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے ۔ اس کے لیے بہترین نام ہیں ۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے ' اور وہ زبردست اور حکیم ہے"۔

اللہ کی اس تسبیح کے تین ٹکڑے ہیں اور ہر ایک کا آغاز عقیدۂ توحید سے ہوتا ہے ۔

هُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یا هُوَ اللّٰهُ سے ہوتا ہے ۔ اللہ کے اسماء میں سے ہر اسم کا اثر اس کائنات میں صاف نظر آتا ہے یا انسانی زندگی میں نظر آتا ہے ۔ دکھانا یہ ہے کہ اللہ کی ذات فعال ہے ۔ اور اللہ کی فعالیت کا تعلق اس کائنات اور انسانوں کی زندگیوں سے ہے ۔ یہ کوئی منفی صفات نہیں اور نہ اس زندگی کے عملی پہلو سے جدا ہیں ۔ یہ صفات ہمارے ماحول' ہمارے احوال اور ہمارے مظاہر میں ہمارے ساتھ ہیں ۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (۵۹ : ۲۲) "اللہ وہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے"۔ لہذا اسی کے الہ ہونے کا عقیدہ رکھو' اسی کی عبادت کرو' اور اسی کی طرف رخ کر کے پکارو ۔ تخلیق سے لے کر موت تک تمہاری زندگی کے اندر وہی موثر اور فعال ہے اور اسی عقیدے پر مکمل اسلامی نظام فکر اور نظام عمل قائم ہے ۔ لوگوں کے آپس کے تعلقات' لوگوں کے عام زندہ مخلوق کے ساتھ تعلق اور لوگوں کے اس کائنات کے ساتھ تعلق کو عقیدۂ توحید کی اساس پر استوار کیا گیا ہے ۔

عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ (۵۹ : ۲۲) "غائب اور ظاہر ہر چیز کا جاننے والا ہے"۔ اس سے یہ شعور پیدا کرنا مطلوب ہے کہ اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے ۔ ظاہر اور خفیہ سب اس پر ظاہر ہے ۔ تو انسان کو یہ شعور تازہ رکھنا چاہیے کہ وہ دیکھ رہا ہے اس کے بعد جو کچھ بھی کرنا چاہے' کرے ۔ کیونکہ انسان یہاں اکیلا زندہ نہیں رہ رہا ہے ۔ اگرچہ انسان تنہائی میں ہو ۔ اگر انسان اپنے اندر یہ کیفیت پیدا کرے تو اس کا قلب نہ غافل ہو سکتا ہے نہ سو سکتا ہے ۔

هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (۵۹ : ۲۲) "وہی رحمٰن و رحیم ہے"۔ ان صفات کے تصور سے انسان مطمئن اور خوش ہوتا ہے اور خوف کے ساتھ امید بھی ہوتی ہے ۔ ہیبت کے ساتھ طمانیت بھی آتی ہے ۔ مومنین کے تصورات کے مطابق اللہ ہر وقت انسانوں کا پیچھا ہی نہیں کر رہا ہے بلکہ نگرانی بھی کر رہا ہے ۔ وہ ہر وقت لوگوں کو سزا اور عذاب ہی نہیں دے رہا بلکہ ان کو ہدایت بھی دے رہا ہے ۔ ان کو شتر بے مہار نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ اللہ ان کی رہنمائی کرتا ہے اور

معاونت بھی کرتا ہے ۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ( ۵۹ : ۲۳ ) "وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں" ۔ اس دوسری تسبیح میں بھی اس عقیدے یا کلمہ شہادت کو دہرایا گیا کیونکہ یہ اصل الاصول ہے ۔

اَلْمَلِكُ ( ۵۹ : ۲۳ ) "وہ بادشاہ ہے" ۔ یہی معبود جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے یہی بادشاہ بھی ہے ۔ جب بادشاہ بھی وہی ہے تو پھر لازم ہے کہ سارے معاملات میں صرف اسی کی طرف رجوع ہو ۔ کوئی اور بادشاہ پھر نہ ہو گا ۔ لہٰذا کوئی شخص دو بادشاہوں کو تسلیم نہیں کر سکتا ۔ اللہ نے کسی آدمی کے اندر بیک وقت دو دل پیدا نہیں کیے ۔

اَلْقُدُّوْسُ ( ۵۹ : ۲۳ ) "نہایت مقدس" ۔ یہ لفظ انتہائی پاکی کو ظاہر کرتا ہے ۔ طہارت مطلقہ ۔ اللہ قدوس ہے تو اللہ کے بندوں کا دل بھی پاک ہونا چاہئے تاکہ اس کے اندر اللہ کی پاک تعلیمات بیٹھ سکیں اور وہ فیوض و برکات کے نزول کے اہل ہو سکے ۔ اور وہ اللہ کی پاکی بیان کر سکے ۔

اَلسَّلٰمُ ( ۵۹ : ۲۳ ) "سراسر سلامتی" ۔ السلام سے امن ' سلامتی ' اور اطمینان کا نزول ہوتا ہے اور یہ پوری کائنات سلامتی سے بھر جاتی ہے ۔ قلب مومن اپنے رب کی طرف سے مطمئن ہو جاتا ہے ۔ ایک اللہ کے جوار رحمت میں امن سے ہوتا ہے ۔ پھر اس کائنات میں وہ آفات و بلیات سے بھی اپنے آپ کو امن میں پاتا ہے ۔ اس کی بے اطمینانیاں ' بےچینیاں اور تمام تھکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں اور وہ اس کائنات کی ہر چیز کا دوست بن جاتا ہے ۔

اَلْمُؤْمِنُ ( ۵۹ : ۲۳ ) "امن دینے والا" ۔ امن و سلامتی دیتا ہے ۔ اس صفت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی اہمیت کیا ہے ' مومن ہو کر انسان اللہ کی صفات میں سے ایک صفت میں شریک ہو جاتا ہے ' یوں صفت ایمان کے بعد وہ زمین کی مخلوق نہیں رہتا بلکہ عالم بالا کی طرف بلند ہو جاتا ہے ۔

اَلْمُهَيْمِنُ ( ۵۹ : ۲۳ ) "نگہبان" ۔ اللہ کی صفات کے تصور کا یہ نیا زاویہ ہے ۔ سابقہ صفات القدوس السلام المومن ایسی صفات ہیں جو ذات سے متعلق ہیں لیکن مہیمن کی صفت پوری کائنات سے متعلق ہے اور اس سے اللہ کی نگرانی اور بادشاہت کا اظہار ہوتا ہے ۔

اسی طرح اگلی صفات ۔

اَلْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ( ۵۹ : ۲۳ ) "سب پر غالب ' اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا ' بڑا ہو کر رہنے والا" ۔ یہ ایسی صفات ہیں جس سے اللہ کی گرفت ' غلبے اور جبر کا اظہار ہوتا ہے ۔ جس سے ایسی برتری ' قوت ' غلو کا اظہار ہوتا ہے جس کے اور کوئی شریک نہ ہو ۔ اور در حقیقت اللہ کی ذات و صفات میں کوئی شریک بھی نہیں ہے ۔ صرف وہی عزیز ہے ' صرف وہی جبار ہے ' صرف وہی متکبر ہے ۔ ان صفات کا اطلاق اس کے سوا کسی پر نہیں ہو سکتا ۔

یہی وجہ ہے کہ سورت کا اختتام یوں ہے :

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۵۹ : ۲۳) "پاک ہے اللہ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں"۔ اور آخری تسبیح جو بہت ہی طویل ہے :

هُوَ اللّٰهُ (۵۹ : ۲۴) "وہی ہے معبود" اور اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔

الْخَالِقُ الْبَارِئُ (۵۹ : ۲۴) "تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اسے نافذ کرنے والا"۔ خلق کا مفہوم ہے : منصوبہ بنانا اور پورا انتظام تقدیر تیار کرنا۔ اور باری کے معنی پھر اس منصوبے کو مسلسل نافذ کرتے چلے جانا۔ یہ دونوں صفات باہم متصل ہیں۔ ان میں فرق بھی لطیف ہے۔

الْمُصَوِّرُ (۵۹ : ۲۴) "صورت گری کرنے والا"۔ یہ صفت بھی سابقہ دونوں صفات سے مربوط ہے۔ یعنی منصوبہ، پھر تخلیق اور پھر تصویر اور خدوخال کا تعین۔ ہر چیز کی صورت اور سیرت کا تعین۔ ہر چیز کو اس کے خواص عطا کرنا۔

یہاں ان صفات کا مسلسل لانا، جن کے اندر بہت کم فرق ہے اور جو تخلیق ہی کے مختلف مراحل ہیں، یہ اشارہ دیتا ہے کہ کسی بھی تخلیق کے کام میں یہی تدریج کارفرما ہوتی ہے۔ یہ اشارہ انسانوں کو دیا جا رہا ہے۔ انسانی تصورات کے مطابق پہلے نقشہ تخلیق، پھر تخلیق اور پھر تصویر ہوتی ہے ورنہ اللہ کے ہاں تو نہ درجات ہیں اور نہ مراحل ہیں۔ وہاں تو کُنْ فَيَكُوْنَ ہے۔ ہم انسان ان امور کو اپنے دائرہ ضرورت میں لاکر سمجھتے ہیں اور ہماری قدرت اور طاقت بہت چھوٹی ہے۔

لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (۵۹ : ۲۴) "اس کے بہترین نام ہیں"۔ یہ نام بذات خود اچھے ہیں۔ ان کو اچھا کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی اچھا کہے تو اچھے ہوں۔ یہ اسمائے حسنیٰ انسانوں کے دلوں پر حسن کے فیوض کرتے ہیں۔ ان پر غور و تدبر کر کے اور ان صفات کو اپنے اندر پیدا اور ان سے ہدایت لے کر انسان کمال حاصل کر سکتا ہے کیونکہ اللہ ان صفات کے ساتھ متصف ہونا پسند کرتا ہے تو یہ پسندیدہ صفات ہیں، اوصاف حمیدہ ہیں۔ لہٰذا انسان کو ان درجات میں بلند ہوتے رہنا چاہئے۔

اسمائے حسنیٰ کے ساتھ اللہ کی تسبیح، پاکی اور یاد کا یہ طویل سلسلہ اب اس پوری کائنات کی وسعتوں میں پھیل جاتا ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز یہ فیوض لے رہی ہے لہٰذا تم بھی ان تسبیحات سے اشارات لو اور فیوض حاصل کرو۔

يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۵۹ : ۲۴) "ہر چیز جو آسمان اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے"۔ یہ ہے وہ منظر جو ان صفات کے ذکر کے بعد ایک متوقع منظر ہے۔ تمام اشیاء اس میں شریک ہیں۔ سورت کا آغاز و اختتام بھی باہم مل جاتا ہے اور آغاز میں بھی اللہ کی پاکی اور انجام میں اس کی تسبیح سبحان اللہ وبحمدہ۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ـــ ۲۸

## سورۃ الممتحنۃ ـ ۶۰

## ۱ ـــ تا ـــ ۱۳

# سورۃ الممتحنۃ ایک نظر میں

یہ سورت بھی اس تربیتی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو مدینہ میں اسلامی سوسائٹی کی تنظیم اور اسلامی حکومت کی تشکیل اور تربیت کے لیے ہو رہی تھی۔ اس سلسلہ تربیت اور اس اسلامی منہاج کی یہ ایک کڑی ہے 'جس کے ذریعہ اللہ اپنا ایک پسندیدہ نظام زندگی' اس دنیا میں پوری انسانیت کے لیے بطور نمونہ قائم کر کے دکھانا چاہتا تھا۔ ایسا نمونہ جو عملاً کسی سوسائٹی میں نافذ ہو' اور اس کے مخصوص فیچر ہوں' الگ شخصیت ہو اور الگ خدوخال ہوں۔ جہاں تک انسانیت کی عملی صورت حال ہے تو وہ کبھی کبھار اس تک پہنچ جاتی ہے۔ کبھی اس سے پیچھے رہتی ہے 'لیکن یہ معیار اس کے سامنے ہو' اس کا ہدف ہو اور وہ اس ٹارگٹ کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہے کہ ایک دن ایسا نظام بھی قائم رہا۔ ہم بھی ایسا کر کے رہیں گے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا' اس قسم کے نظام کے قیام کے لیے ایک مرحلہ دار تیاری اور جدوجہد کی ضرورت تھی۔ وہ واقعات جو جماعت کے اندر واقع ہوتے تھے' یا جماعت کے ساتھ متعلق ہوتے تھے وہ اس تیاری کے لیے بنیادی عنصر کا کام دیتے تھے۔ یہ مواد علم الٰہی میں طے شدہ تھا اور ان واقعات کی بنیاد پر تبصرہ' توضیح اور تشریح اور تجزیہ ان پر مزید وضاحت کے لیے ہوتا اور یوں جماعت کی تربیت کا کام جاری تھا۔

مدینہ کی عملی زندگی کی پے درپے امواج اور واقعات و حادثات کے اضطراب میں یہ تربیت پایہ تکمیل کو پہنچی اور یہ جماعت تیار ہوئی جس نے اسلامی نظام حیات کو عملاً دنیا میں رائج کرنا تھا۔ یہ جماعت عملی زندگی سے کہیں الگ تھلگ نہ تھی۔ یہ اس معاشرے کے اندر رہ کر تربیت پا رہی تھی۔ البتہ اپنے عقیدے اور تصور کے اعتبار سے اور اپنی نفسیاتی تشکیل کے اعتبار سے' اور اپنے افکار اور تصورات کے لحاظ سے اس وقت کی پوری دنیا سے خصوصاً جزیرۃ العرب کے جاہلی تصورات سے' بالکل الگ ہوگئی تھی اور اس مسلسل تربیت کے ذریعے اس کو اپنے اس ممتاز نظریہ حیات میں عمداً الگ کیا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی فکری دنیا میں کوئی ایسی بات نہ ہوئی جو جدید اسلامی اور ایمانی فکر سے اجنبی ہو۔ لیکن یہ لوگ جو دینی اور فکری اعتبار سے معاشرہ سے الگ تھلگ تھے' وہ عملی لحاظ سے اسی معاشرے کے اندر رہتے تھے۔ بلکہ ان کو ہر روز نئے نئے حادثات اور واقعات کی بھٹی میں تپا کر اور بار بار آزمائشوں سے گزار کر اور دھات کی طرح بار بار گرم کر کے صاف کیا جا رہا تھا۔ ان پر مختلف اطراف سے اثر انداز ہونے والے عوامل کے اثرات ڈال کر آزمایا جاتا تھا۔ کیونکہ اللہ جس نے ان نفوس کو پیدا کیا تھا وہ جانتا تھا کہ صرف ایک بار کی کیفیت 'ایک بار کا تسلیم کر لینا اور جوش میں کسی بات کو اپنا لینا مکمل تربیت کے لیے کافی نہ تھا۔ اللہ کو علم تھا کہ ماضی کے جمع شدہ افکار' ماضی کی دلچسپیاں اور میلانات' پھر انسان کی فطری کمزوریاں' پھر انسان پر اثر انداز ہونے والے حالات' انسان کی عادت کی مجبوریاں ایسی رکاوٹیں ہیں کہ جنہیں صرف ایک ہی نشست میں دور نہیں کیا جا سکتا' انہیں بار بار آزمانے اور تپانے کی ضرورت ہے۔ بار بار کی نصیحت اور یاد دہانی کی

ضرورت ہے ۔ چنانچہ اللہ کے نظام تقدیر کے مطابق ایک ایک واقعہ پردۂ تقدیر کے پیچھے سے نمودار ہوتا رہا اور اس کی روشنی میں ان کی آزمائش ' نصیحت اور عبرت آموزی ہوتی رہی اور بار بار ہدایات دی جاتی رہیں ۔

رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہروقت بیدار رہتے تھے اور بصیرت افروز الہام بھی ان کی مدد کر رہا تھا اور ہروقت ' واقعات و حادثات پیش آتے رہتے تھے اور ان کی روشنی میں آپ اس جماعت کو ہدایات دیتے رہتے تھے ۔ وحی و الہام بھی اپنا کام کر رہے تھے ۔ اس طرح اللہ کی عین نگرانی میں اس جماعت کو بنایا جا رہا تھا ۔

لِتُصْنَعَ عَلَى عَيْنِي یہ سورت بھی اس تیاری کا ایک حصہ ہے ۔ اس کا اور اس جیسی تمام دوسری سورتوں کا مقصد یہ ہے کہ قلب مومن کے اندر ایک ربانی دنیا کی تخلیق کی جائے ۔ اس دنیا کا محور صرف ایمان ہو ۔ مسلمان اس ایمان کے محور کے گرد گھوم رہے ہوں ۔ ان سب کے ہاتھ میں ایک ہی رسی مضبوط تھامی ہوئی ہو ' ان کے نفوس عصبیت جاہلیہ سے پاک ہوں ۔ ہر قسم کی عصبیت سے جو قوم نسل ' خاندان اور زمین کے تصورات پر بنی ہوتا کہ ان تمام تصورات اور تعلقات کو ختم کر کے اس کی جگہ ایک ہی رابطہ قائم کر دیا جائے ' یعنی ایمانی تعلق ' ایک ہی پارٹی ہو یعنی حزب اللہ اور ایک ہی جھنڈا ہو یعنی اسلامی جھنڈا ۔

اسلام جس قسم کی دنیا وجود میں لانا چاہتا ہے وہ ربانی اور انسانی دنیا ہے ۔ اس معنی میں ربانی کہ وہ اپنی تمام ہدایات اللہ کے احکام ' اللہ کی ہدایات اور شریعت سے اخذ کرے اور اپنے شعور اور عمل میں وہ اللہ کی سمت کی طرف متوجہ ہو ۔ اور انسانی اس مفہوم میں کہ اس کی لپیٹ میں تمام جنس انسانی آ جائے ۔ ایمانی عقائد و نظریات کی حدود میں اور اس ربانی اور انسانی دنیا سے اسلام نسلی ' وطنی اور لسانی عصبیت کو یکسر ختم کرنا چاہتا ہے ۔ اور ان کے علاوہ وہ تمام چیزوں کو مٹانا چاہتا ہے جس کے ذریعہ انسان اور انسان کے درمیان فرق کیا جا سکے ۔ یہی وہ بلند دنیا ہے جس میں کوئی انسان صحیح انسانی زندگی بسر کر سکتا ہے جس میں شرافت اور روحانیت کا اجتماع ہو سکتا ہے ۔

اس دنیا کے قیام کی راہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں قائم ہیں ۔ عربی معاشرے میں یہ رکاوٹیں تھیں اور آج کے اس مہذب اور ترقی یافتہ معاشرے میں بھی گھرانے کے تعصبات ' خاندانی تعصبات ' قوم کے تعصبات ' نسل کے تعصبات اور زمین و وطن کے تعصبات سب ان میں شامل ہیں ۔ ان کے علاوہ بعض دوسری رکاوٹیں بھی ہیں ۔ انسان کے ذاتی مرغوبات ' انسان کی خواہشات ' حرص ' لالچ ' کنجوسی ' دولت کی بھوک ' پھر ذاتی برتری اور نفسیاتی الجھنیں اور اسی قسم کی دوسری رکاوٹیں ۔ اس لیے اسلام کے یہ پیش نظر تھا کہ وہ ان تمام رکاوٹوں کو عبور کرے ۔ اور علاج کے سلسلے میں ' یہ سورت بھی ایک علاج ہے ' اور ان تربیتی کڑیوں میں سے یہ بھی ایک کڑی ہے ' جو پہلے جماعت مسلمہ کی تربیت کے لیے اختیار کی گئیں ۔

مسلمانوں میں ابھی بعض لوگ ایسے تھے ' جنہوں نے اگرچہ اپنا علاقہ ' اپنا گھر ' اپنا مال اور اپنے اہل و عیال اور اپنا خاندان مکہ میں چھوڑ دیا تھا لیکن ان کے دل ابھی تک مکہ کے ان لوگوں اور چیزوں کے ساتھ لٹکے ہوئے تھے ۔ ان لوگوں نے قریش کے ہاتھوں نہایت دکھ اور درد سہے تھے لیکن ابھی تک بعض لوگوں کی یہ خواہش تھی کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان صلح ہو جائے اور یہ جھگڑا ختم ہو جائے ' جس میں دونوں طرف سے لوگ اپنے بھائیوں کو قتل کر رہے ہیں ۔ اس

لیے ایسے لوگ موجود تھے جو چاہتے تھے کہ یہ خصومت ختم ہو جائے۔

اللہ کا منشا یہ تھا کہ اس قسم کے دلوں سے اس قسم کے تعلقات اور ہمدردیوں کا صفایا ہو جائے۔ اور وہ اپنے دین' عقیدے' نظریات اور نظام کے لیے یکسو ہو جائیں۔ اللہ جانتا تھا کہ ان تعلقات اور میلانات میں سے بعض انسانی فطرت کے بہت قریب تھے' پھر ان میں سے بعض جاہلیت کے تہ بہ تہ افکار کی وجہ سے ابھی باقی تھے جو دلوں کے اندر بیٹھے ہوئے تھے پھر یہ لوگ عرب تھے' جن کے اندر قبیلے کی عصبیت' خاندان کی عصبیت گھرانے کی عصبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ چنانچہ قرآن کریم ہر روز کسی نہ کسی واقعہ کے ضمن میں ان کے دلوں کو صاف کرنے میں لگا ہوا تھا جو بھی واقعہ ہوتا کوئی سورت اس کا تجزیہ کرتی اور اس سے سبق نکالتی تاکہ یہ تربیت اور یہ علاج قابل فہم ہو جائے۔ اور محض نظریاتی تربیت کے بجائے عملی تربیت ہو۔

روایات میں ایک متعین واقعہ بھی نقل ہوا ہے جس کے بارے میں اس سورت کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ ممکن ہے کہ یہ آیات اسی واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہوں لیکن نصوص کا مفہوم اور مراد ایک اصول کی شکل میں ہوتا ہے اور ان کا اطلاق عام ہوتا ہے' زمان و مکان کا پابند نہیں ہوتا' نالہ پابند نے نہیں ہے۔

اس حادثہ کے بارے میں روایت ہے۔ حضرت حاطب ابن ابو بلتعہ مہاجرین میں سے تھے' اور اہل بدر سے تھے' مکہ میں ان کی اولاد اور مال تھا۔ یہ اہل قریش میں سے نہ تھے بلکہ عثمان کے حلفا میں سے تھے۔ جب رسول اللہ نے عزم کیا کہ مکہ پر حملہ کیا جائے۔ کیونکہ اہل مکہ نے معاہدہ حدیبیہ کو توڑ دیا تھا' تو حضورؐ نے مسلمانوں کو اس جنگ کے لیے تیاری کا حکم دے دیا۔ حضورؐ نے دعا کی اے اللہ اہل مکہ کو ہماری تیاریوں کی خبر نہ ہو۔

اللھم عم علیھم خبرنا حضورؐ نے اپنے صحابہ میں سے ایک جماعت کے سامنے اپنے ارادے کا اظہار کر دیا۔ ان میں سے حاطب بھی تھے۔ حاطب نے ایک خط لکھا اور ایک مشرک عورت کے ہاتھ اسے اہل مکہ کے لیے بھیجا کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارادہ ہے۔ یہ عورت مزینہ قبیلہ کی تھی اور مدینہ میں مانگنے کے لیے آئی تھی۔ اس اطلاع سے حضرت حاطب کی غرض یہ تھی کہ ان کے ہاں ان کا تعلق ہو جائے۔ چنانچہ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع کر دی کہ آپ کی دعا منظور ہے اور اس خط کی اطلاع دے دی۔ حضورؐ نے اس عورت کے پیچھے آدمی روانہ کیے اور اس سے خط لے آئے۔

امام بخاری اور امام مسلم نے حصین ابن عبدالرحمن سے انہوں نے سعد ابن عبدہ سے' انہوں نے عبدالرحمن سلمی سے انہوں نے حضرت علی سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے' ابو مرصد اور زبیر ابن العوام کو تیز رفتار گھوڑوں پر بھیجا۔ تم جاؤ اور مقام روضہ خاخ میں مشرکین کی ایک عورت جا رہی ہے' اس کے پاس حاطب ابن ابو بلتعہ کا ایک خط ہے جو مشرکین مکہ کے نام ہے۔ ہم نے اس عورت کو اسی مقام پر پایا۔ جہاں رسول اللہ نے فرمایا تھا۔ یہ اپنے اونٹ پر سوار تھی۔ ہم نے اسے کہا نکالو خط۔ تو اس نے کہا میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ ہم نے اونٹ کو بٹھایا اور خوب ڈھونڈا' خط نہ تھا۔ ہم نے کہا کہ رسول اللہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے' خط نکالو ورنہ ہم تجھے ننگا کر دیں گے۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ لوگ سنجیدہ ہیں تو وہ ازار باندھنے کی جگہ کی طرف جھکی اور اس نے ایک کپڑے سے خط نکالا۔ اس نے ازار بند کی جگہ اسے باندھ رکھا تھا۔ ہم خط لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا' اللہ کے رسول ﷺ اس نے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ خیانت کی ہے' براہ کرم مجھے

چھوڑیں کہ اس کی گردن تن سے جدا کر دوں۔ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا' تم نے جو کچھ کیا اس پر تمہیں کس چیز نے مجبور کیا ہے۔ حضرت حاطب نے کہا' خدا کی قسم مجھے کچھ بھی نہیں ہے' میں اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والا ہوں' میں چاہتا تھا کہ اہل قریش کے ہاں میرا ایک احسان ہو' جس کے ذریعہ اللہ میرے بچوں اور مال کی حفاظت کا بندوبست کر دے۔ اور اے پیغمبر .......... آپ کے سب ساتھیوں کا مکہ میں کوئی نہ کوئی رشتہ دار ایسا ہے جو ان کے مال اور بچوں کی جان کی حفاظت کرتا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ شخص سچ کہتا ہے' اس کے بارے میں کوئی بری بات نہ کرو' حضرت عمرنے فرمایا اس نے اللہ' رسول اللہ .......... اور مومنین کے ساتھ خیانت کا ارتکاب کیا ہے۔ تو حضورؐ مجھے اجازت دیں کہ میں اس کی گردن اڑا دوں۔ حضورؐ نے فرمایا: کیا یہ بدری نہیں ہے؟ حضورؐ نے مزید کہا شاید اللہ اہل بدر کے پاس آیا اور ان کو کہہ دیا کہ جو چاہو کرو' تمہارے لیے تو جنت واجب ہو گئی ہے۔ یا یہ فرمایا کہ تم معاف کر دیئے گئے ہو۔ اس پر حضرت عمرکی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور فرمایا اللہ اور رسول اللہ ...... زیادہ جانتے ہیں۔ امام بخاری کی کتاب المغازی میں اس روایت پر یہ اضافہ کیا ہے۔ تو اللہ نے یہ سورت نازل کی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ (۶۰:۱) "اے لوگ جو ایمان لائے ہو' میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ' تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو"۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ جو لوگ بھیجے گئے تھے وہ علی' زبیر اور مقداد تھے۔

یہاں ہم قرآن کے سایہ کی حدود سے آگے نہ نکلیں گے' اگر ہم قدرے کھڑے ہو کر اس واقعہ پر غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ مربی اعظم حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس طرح کے واقعات اور حادثات میں جماعت کو کس طرح تربیت دیتے تھے اور کیسے فیصلے فرماتے تھے۔ لہٰذا اس واقعہ پر قدرے غور کی ضرورت ہے۔

۱۔ سب سے پہلے یہ کہ حضرت حاطب کا فعل قابل غور ہے۔ آپ مسلم اور مہاجر تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جن کے سامنے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ راز کھول دیا تھا۔ اس فعل پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نفس انسانی کے اندر بھی نشیب و فراز ہوتے ہیں۔ مختلف چیزیں انسانوں پر اثرانداز ہوتی ہیں' نفس انسانی جس قدر ترقی مراحل سے گزرے' جس قدر کمال و جمال کا حامل ہو' اس کے اندر کمزور اور ضعیف مقامات ہوتے ہیں۔ یہ اللہ ہی ہے جو انسانوں کو لغزشوں سے بچاتا ہے۔

۲۔ اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور تحمل بھی نظر آتا ہے۔ آپ نہایت ہی دھیمے انداز میں پوچھتے ہیں کہ یہ کام کرنے پر تم کیوں مجبور ہو گئے' آپ کی تفتیش نہایت کھلے دل سے ہے اور آپ نہایت ہی مہربانی سے پوچھتے ہیں۔ حالانکہ ان سے غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ آپ الہامی ذریعہ سے معلوم کر لیتے ہیں کہ اُن کا جواب درست ہے' اور صحابہ کرام کو روک دیتے ہیں کہ ان کے بارے میں کچھ نہ کہا جائے۔

صدق لا تقولوا الا خیراً پس یہ فیصلہ ہو گیا۔ یوں آپ نے ان کی مدد کی اور انہیں اس غلطی سے نکلنے کے

لیے بہت دی۔ آپ نے ان کا پیچھا نہ کیا اور نہ دوسروں سے کہا ہے کہ ان کا پیچھا کرو۔ جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اسلام کی ننگی تلوار ہیں۔ سچے اور دو ٹوک فیصلہ کرنے والے۔ "اس نے اللہ' رسول اللہ ........... اور مومنین کے ساتھ خیانت کی ہے' اجازت دیجئے کہ اس کی گردن اڑا دوں"۔ حضرت عمر صرف گناہ کو دیکھ رہے ہیں اور اپنے جوش ایمانی سے مغلوب ہیں۔ لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے ایک وسیع فریم ورک میں دیکھتے ہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اسے اپنے وسیع علم' نفس انسانی کی مجموعی حقیقت' اور ہر پہلو سے حالات پر نظر رکھتے ہیں اور ان وسیع معلومات کے ساتھ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رؤف ورحیم ہونا بھی اپنی جگہ ہے۔ اور آپ ایسے مربی ہیں کہ ہر پہلو آپ کی نظر میں ہے' اس لیے آپ کا رویہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مختلف ہے۔

۳۔ پھر حضرت حاطب کے الفاظ' وہ نہایت کمزور پوزیشن میں ہیں' لیکن اس زمین کے اسباب اور اللہ کی تقدیر کے بارے میں ان کا تصور مومنانہ ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

اردت ان تکون لی عند القوم ید "یعنی میں نے یہ ارادہ کیا کہ اس قوم میں یا کوئی ہاتھ ہو جو میرے مال اور اولاد کو بچائے"۔ اصل میں بچانے والا تو اللہ ہے۔ یہ ذریعہ یا ہاتھ کو بچانے والا نہیں ہوتا۔ اس کے ذریعہ اللہ بچاتا ہے۔ اس تصور کو وہ اپنی باقی بات میں بیان کرتا ہے۔

ولیس احد من اصحابك الا له هناك من عشیرته من یدفع الله به عن اهله وماله "آپ کے ساتھیوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کے وہاں کوئی رشتہ دار نہ ہوں' جن کے ذریعہ اللہ اس کے مال اور اہل وعیال کو بچاتا ہے"۔ اللہ ان کے تصور میں موجود ہے کہ بچاتا اللہ ہی ہے' چاہے وہ جس کے ذریعے بچائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے کلام میں گہری سچائی کو پایا۔ اس لیے آپ نے حکم دیا کہ یہ سچ کہتے ہیں' ان کے بارے میں ماسوائے کلمہ خیر کے اور کچھ نہ کہو۔

۴۔ اس حادثے میں اللہ کی تقدیر اپنی جگہ کام کر رہی ہے کہ حاطب ان چند محدود افراد میں سے تھے جن کو حملے کا راز بتایا گیا تھا۔ یہ چند گنے چنے لوگوں میں سے تھے مگر ان سے کمزوری سرزد ہوگئی۔ دست قدرت اس نقصان سے مسلمانوں کو بچاتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مقصود یہ تھا کہ یہ بات کھل جائے اور اس کا بندوبست کر دیا جائے۔ پھر دوسرے لوگوں کی طرف سے بھی اس واقعہ کو کوئی مسئلہ نہیں بنایا گیا۔ کہ یہ کیوں ایسے ہوا۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ دیکھیے جی ایسے لوگوں کو راز بتایا جاتا ہے جو چھپاتے ہی نہیں' بلکہ خیانت کرتے ہیں اور ہمیں نہیں بتایا جاتا۔ اگر ہمیں بتایا جاتا تو ہم حفاظت کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان اپنی قیادت کا کس قدر احترام کرتا ہے۔ وہ حسن ظن میں کس قدر متواضع ہوتا ہے اور جس بھائی سے غلطی ہو جائے اس کے ساتھ رویہ کیا رکھتا ہے۔

یہ واقعہ متواتر احادیث میں آتا ہے۔ البتہ یہ کہ یہ آیات اس واقعہ کے بارے میں نازل ہوئیں۔ یہ صرف بخاری شریف کی ایک ہی روایت میں ہے اور بخاری کی روایت بھی درست ہے' لیکن قرآن کی نص کا مضمون عام ہے' اور نہایت وسیع ہے۔ اور ایک وسیع دائرۂ عمل کو اپنے اندر لیتا ہے۔ حضرت حاطب کے واقعہ نے بھی بہت وسیع۔

یہ قرآن کا انداز ہے کہ قرآن ایک جزئی واقعہ کے نتیجے میں ایک اصول وضع کر دیتا ہے۔

اس دور میں لوگوں کے باہم تعلقات کی نوعیت بدل رہی تھی۔رشتہ داری' چھوٹی چھوٹی عصبیتیں' لوگوں کی موروثی عادات اور محدود مقامی وابستگیاں ٹوٹ رہی تھیں اور ان کی جگہ عالمی انسانی تصورات لے رہے تھے۔

نفوس انسانی کے سامنے نئی تصاویر بن رہی تھیں۔جدید قدریں پروان چڑھ رہی تھیں' جدید پیمانے اور ترازو لگ رہے تھے۔زندگی' کائنات' اور انسان کے بارے میں جدید تصورات آ رہے تھے۔زمین کے اوپر انسان کے نئے مقاصد ترجیح پا رہے تھے اور وجود انسانی اور مقاصد انسانی اور اہداف و منازل از سر نو متعین ہو رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ اس نئی جماعت کو ایک فصل کی طرح بو رہا تھا اور چھوٹے چھوٹے پودوں کی شکل میں یہ فصل اگ رہی تھی۔ اور یہ کام اللہ اور رسول اللہ کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔اللہ اس جماعت کو سکھا رہا تھا کہ تمہاری تخلیق کا مقصد کیا ہے۔ان کو بتایا جا رہا تھا کہ تمہارے اردگرد کے لوگ تمہیں مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ان کو بتا رہا تھا کہ تم میری پارٹی ہو' تمہارے ذریعہ سے میں نے یہاں بہت بڑا انقلاب برپا کرنا ہے۔دنیا کی تقدیر بدلنی ہے۔اس لیے تمہیں خاص خصوصیات اور صفات اور علامات دی جا رہی ہیں۔تم اللہ کے جھنڈے بلند کرو گے اور ان علامات' خصوصیات اور جھنڈوں سے تمہاری پہچان ہوگی۔دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔لہٰذا تم اللہ کے لیے خالص ہو جاؤ۔اس کے دل بن جاؤ' صرف اللہ اور اللہ کے حوالے سے تعلقات رکھو۔رابطے کے تمام دوسرے طریقوں کو کاٹ دو۔عمل میں بھی اور فکر و شعور میں بھی۔

یہ پوری سورت اسی رخ پر چل رہی ہے۔یہاں تک کہ اس کے آخر میں مومنات و مہاجرات کے بارے میں جو قانون آیا ہے' وہ بھی صرف تعلق ایمانی کے رخ ہی پر ہے۔ان سے بیعت ایمان لی جاتی ہے۔اور ان کے اور ان کے خاوندوں کے درمیان جدائی کر دی جاتی ہے۔اسی طرح مومنین اور ان کی کافر بیویوں کے درمیان بھی جدائی کر دی جاتی ہے۔یہ دراصل نظریاتی اور جدید روابط ہی کی ایک شکل ہے' جو اس سورت کا موضوع ہے۔

سورت کا خاتمہ بھی اسی پر ہے' جس پر آغاز ہوا کہ اللہ کے دشمنوں کے ساتھ دوستی مت کرو۔جب کہ ان پر اللہ کا غضب ہے۔خواہ وہ مشرک ہوں یا یہودی ہوں۔یوں اسلامی رابطے کے سوا تمام روابط کو ختم کر دیا جاتا ہے۔مسلمانوں کے درمیان صرف ایمان کا رابطہ رہ جاتا ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۶۰ تشریح آیات

## ۱ ـ ـ تا ـ ـ ۱۳

سُورَةُ الْمُمْتَحِنَةِ مَدَنِيَّةٌ (۶۰) (۹۱)
اٰیاتُہا ۱۳ رکوعاتُہا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ
بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِيَّاكُمْ اَنْ
تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ؕ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۖۗ
تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۖۗ وَ اَنَا اَعْلَمُ بِمَاۤ اَخْفَيْتُمْ وَ مَاۤ اَعْلَنْتُمْ ؕ وَ مَنْ يَّفْعَلْهُ
مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱﴾ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّ يَبْسُطُوْۤا
اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۲﴾ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ
وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ ۚۛ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚۛ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو‘ اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضا جوئی کی خاطر (وطن چھوڑ کر گھروں سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو‘ حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں اور ان کی روش یہ ہے کہ رسول کو اور خود تم کو صرف اس قصور پر جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب‘ اللہ پر ایمان لائے ہو‘ تم چھپا کر ان کو دوستانہ پیغام بھیجتے ہو‘ حالانکہ جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور جو علانیہ کرتے ہو‘ ہر چیز کو میں خوب جانتا ہوں۔ جو شخص بھی تم میں سے ایسا کرے وہ یقیناً راہ راست سے بھٹک گیا۔ ان کا رویہ تو یہ ہے کہ اگر تم پر قابو پا جائیں تو تمہارے ساتھ دشمنی کریں اور ہاتھ اور زبان سے

تمہیں آزار دیں ۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کسی طرح کافر ہو جاؤ ۔ قیامت کے دن نہ تمہاری رشتہ داریاں کسی کام آئیں گی نہ تمہاری اولاد ۔ اس روز اللہ تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا اور وہی تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے " ۔

سورت کا آغاز نہایت ہی محبوب آواز سے ہوتا ہے جہاں بھی اس آواز سے مسلمانوں کو خطاب کیا جاتا ہے اس کے اندر گہرے اشارات ہوتے ہیں ۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ( ۶۰ : ۱ ) " اے لوگو جو ایمان لائے ہو " ۔ یہ آواز اس رب کی جانب سے ہے جس پر وہ ایمان لا چکے ہیں ۔ ان کو اہل ایمان کے نام سے پکارا جاتا ہے 'کہ تمہارے ایمان کے کچھ تقاضے ہیں ۔ تم نہایت ہی خطرناک موڑ پر کھڑے ہو ' تمہارے اردگرد دشمن سازشوں کے جال بن رہے ہیں ۔ اور تم پر بہت بڑی ذمہ داری ڈالی گئی ہے اپنائیت کے انداز میں ۔ اللہ اپنے دشمنوں کو ان کا دشمن اور ان کے دشمنوں کو اپنے دشمن سے تعبیر کرتا ہے ' تاکہ مسلمانوں کے اندر یہ شعور ہو کہ وہ اللہ کے سپاہی ہیں ۔ اسی کی طرف ہی ان کو جانا ہے ۔ اللہ کا دشمن ان کا دشمن ہے ۔

لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْھِمْ بِالْمَوَدَّۃِ ( ۶۰ : ۱ ) " میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ 'کہ تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو " ۔ یہاں مومنین کو یہ شعور دیا جاتا ہے کہ وہ میرے ہیں اور میری طرف آنے والے ہیں ۔ اس لیے میں تمہارے دشمنوں کا دشمن ہوں ۔ لہٰذا وہ ایسے لوگ ہیں جو اللہ کی طرف منسوب ہیں ' جو اس زمین پر اللہ کے جھنڈے بلند کرنے والے ہیں ۔ وہ اللہ کے محبوب اور دوست ہیں ۔ لہٰذا ان کے شایان شان یہ بات نہیں ہے کہ وہ اللہ کے دشمنوں کے ساتھ دوستی کریں ۔ یہاں ان کو یاد دلایا کہ ذرا سوچو تو سہی کہ یہ دشمن تمہارے خلاف کیا کچھ کرتے رہے ہیں ۔ تمہارے دین اور تمہارے رسول کے بارے میں ان کا رویہ کیا رہا ہے ۔ یہ جنون کی حد تک تم پر مظالم کرتے رہے ۔

وَقَدْ کَفَرُوْا بِمَا جَآءَکُمْ مِّنَ الْحَقِّ یُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِیَّاکُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ رَبِّکُمْ ( ۶۰ : ۱ ) " حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں اور ان کی روش یہ ہے کہ رسول کو اور خود تم کو صرف اس قصور پر جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب ' اللہ پر ایمان لائے ہو " ۔ آخر ان جرائم کے بعد ان کے ساتھ دوستی اور محبت کی کیا بنیاد رہ گئی ہے ۔ انہوں نے سچائی سے کفر کیا ۔ رسول اللہ کو اپنے گھر اور شہر سے نکالا ۔ مومنین کو نکالا اور ان کا اس کے سوا کوئی جرم نہ تھا کہ وہ اللہ رب العالمین پر ایمان لائے تھے ۔ مسلمانوں کو وہ باتیں یاد دلائی جا رہی ہیں جن کا تعلق ان کے عقیدے سے ہے ۔ اس عقیدے ہی کی وجہ سے ان کے ساتھ مشرکین نے جنگ کی تھی اور اس عقیدے کے سوا اس مسلسل جنگ کی اور کوئی وجہ نہ تھی ۔ بتایا جاتا ہے کہ مسئلہ ہی ایمان کا تھا ۔ جس پر اس قدر جنگیں اور دشمنیاں ہوئیں ۔ یہ عقائد کی جنگ ہے ' نظریات کی جنگ ہے ۔ صرف یہ مسئلہ ہے کہ انہوں نے سچائی سے انکار کیا ' انہوں نے رسول کو اور ایمان کی وجہ سے مسلمانوں کو نکالا ۔

جب یہ مسئلہ واضح ہے اور ظاہر ہے تو ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ اب تو ان کے ساتھ مروت و محبت کا کوئی جواز ہی

نہیں ہے۔ بشرطیکہ تم صرف اس مقصد کے لیے آئے ہو' اگر کسی کا کوئی اور مقصد ہے تو وہ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۶۰ : ۱) سے مخاطب نہیں ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِیْ سَبِیْلِیْ وَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِیْ (۶۰ : ۱) "اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضاجوئی کی خاطر نکلے ہو"۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک شخص جہاد کے لیے آیا ہو اور اللہ کی رضا کی خاطر مہاجر ہوا ہو اور پھر اسے اس کے ایمان کی وجہ سے نکالا گیا ہو اور وہ ایسے لوگوں سے محبت کرے جنہوں نے اسے نکالا ہو اور وہ اس کے اور اللہ کے دشمن ہوں۔

اس کے بعد ان کو اس بات سے ڈرایا جاتا ہے جو ان کے دلوں میں خفیہ طور پر بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ کہ وہ اللہ کے دشمنوں کی محبت اپنے دلوں میں رکھتے ہیں' حالانکہ اللہ سے تو کوئی امر پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ تو خفیہ اور علانیہ سب چیزوں کو جانتا ہے۔

تُسِرُّوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ اَنَا اَعْلَمُ بِمَاۤ اَخْفَیْتُمْ وَ مَاۤ اَعْلَنْتُمْ (۶۰ : ۱) "تم چھپا کر ان کو دوستانہ پیغام بھیجتے ہو حالانکہ جو تم چھپا کر کرتے ہو' اور جو علانیہ کرتے ہو ہر چیز کو میں خوب جانتا ہوں"۔

اس کے بعد ان کو ذرا شدید انداز میں دھمکی دی جاتی ہے۔ اس قدر شدید کہ ایک مومن کا دل دہل جاتا ہے۔

وَ مَنْ یَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ (۶۰ : ۱) "جو شخص بھی تم میں سے ایسا کرے گا وہ یقیناً راہ راست سے بھٹک گیا"۔ مومن نے سب قربانیاں تو ایمان کی خاطر دی ہیں۔ اگر ایمان ہی کو خطرہ لاحق ہو گیا تو اس کے سوا اس کے لیے کیا اور خطرہ ہو سکتا ہے؟

ان دونوں تخویفات اور تنبیہات کے بعد دوبارہ اہل ایمان کو بتایا جاتا ہے کہ یہ کفار تمہارے بارے میں کیا کچھ سوچتے ہیں اور منصوبے بناتے ہیں۔

اِنْ یَّثْقَفُوْكُمْ یَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّ یَبْسُطُوْۤا اِلَیْكُمْ اَیْدِیَهُمْ وَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ (۶۰ : ۲) "ان کا رویہ تو یہ ہے کہ اگر تم پر قابو پا جائیں تو تمہارے ساتھ دشمنی کریں اور ہاتھ اور زبان سے تمہیں آزار دیں"۔ وہ جب بھی مسلمانوں کے خلاف کوئی موقعہ پاتے ہیں' اپنے کینے اور دشمنی کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ جس قدر اذیت مومنین کو دے سکتے ہیں' دیتے ہیں۔ یہ ہاتھوں سے اذیت ہو' یا زبانوں سے اذیت ہو' ہر طریقے اور ہر سبیل سے وہ اس کام کے لیے تیار ہیں --- اور سب سے بڑی بات اور سب سے خوفناک بات یہ ہے :

وَ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ (۶۰ : ۲) "اور وہ تو چاہتے ہیں کہ تم کسی طرح کافر ہو جاؤ"۔ صحیح مومنین کے لیے یہ تمام اذیتوں سے بڑی اذیت ہے۔ ہر جسمانی' لسانی اور روحانی اذیت سے ان کے لیے یہ بڑی اذیت ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ ان کے ہاتھ سے نہایت ہی قیمتی خزانہ چلا جائے گا۔ ایمان کا خزانہ اور وہ مرتد ہو جائیں گے اور یہ ان کے

ساتھ سب سے بڑی دشمنی ہوگی۔

اس خزانے کی قدر و قیمت اسی شخص کو معلوم ہے' جو کفر کے بعد مومن ہوا ہے' جس نے گمراہی کے بعد نور ہدایت دیکھا ہو۔ اور اب وہ اپنے تصورات' اپنے افکار' اپنے شعور کے ساتھ ایمانی زندگی بسر کر رہا ہو' نہایت اطمینان کے ساتھ۔ ایسا شخص کسی صورت میں بھی اپنی سابقہ حالت کی طرف نہیں لوٹ سکتا۔ ایسا شخص کفر کو اس طرح ناپسند کرتا ہے جس طرح وہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے۔ پس مومنین کا دشمن وہ ہے جو انہیں دوبارہ کفر کی جہنم میں ڈال دینا چاہتا ہے جبکہ اللہ نے ان کو توفیق دے دی ہے کہ وہ جنت ایمانی میں زندگی بسر کریں۔ یہ ایمانی زندگی کو بھرپور اور بامعنی بنا دیتا ہے جبکہ کفر کی زندگی خالی اور بے معنی ہوتی ہے۔ یوں قرآن کریم تدریج کے ساتھ بتاتا ہے کہ مسلمانوں اور اللہ کے دشمن اہل ایمان کو دوبارہ کافر بنانا چاہتے ہیں' یہ ان کی اصولی اسکیم ہے' اور اسی لیے تو تم مکہ سے بھاگ نکلے ہو۔ یاد رکھو۔

وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ (٦٠ : ٢) "اور وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کسی طرح دوبارہ کافر ہو جاؤ"۔

---ooo---

یہ تھا پہلا دور' جس کے اندر متعدد حقائق ہدایات اور بیداری کے لیے تیز چٹکیاں تھیں۔ اس کے بعد ایک دور جس کے اندر ایک ہی تیز احساس دے دیا گیا ہے کہ یہ قرابت داریاں' جو انسان کو خفیہ دوستی پر مجبور کرتی ہیں' اور دوٹوک نظریاتی موقف کو بھلا دیتی ہیں یہ بالکل مفید نہیں ہیں۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (٦٠ : ٣) "قیامت کے دن نہ تمہاری رشتہ داریاں کسی کام آئیں گی نہ تمہاری اولاد۔ اس روز اللہ تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا اور وہی تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے"۔

مومن نیکی کرتا ہے اور آخرت کا اجر چاہتا ہے۔ وہ دنیا میں بوتا ہے اور آخرت میں کاٹے گا۔ اور اس پر یہ بات اثرانداز ہوتی ہے کہ جب آخرت میں ایمان اور عقیدے کا تعلق نہ ہوگا تو رشتہ داری کا تعلق بھی کٹ جائے گا' تو اس طرح اس دنیا کی مختصر زندگی میں اس کے دل سے اس رشتہ داری اور قرابت داری کے تعلقات کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ اور وہ ایسے تعلق کو اہمیت دینے لگتا ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں مفید ہوتا ہے اور قائم رہتا ہے اور وہ نظریاتی اور ایمانی تعلق ہوتا ہے۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ (٦٠ : ٣) "قیامت کے دن تمہاری رشتہ داریاں اور اولاد تمہارے کسی کام نہ آئے گی"۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی طرف تم لپکتے ہو اور تمہارے دل ان سے متعلق ہیں اور یہ تعلقات تمہیں مجبور کرتے ہیں کہ تم اپنے دشمنوں کے ساتھ دوستی کرو' تاکہ تم ان تعلقات کو بچا سکو۔ جب کہ حضرت حاطب نے اپنی اولاد اور مال کی خاطر یہ کیا۔ جس طرح دوسروں کے دل اپنی اولاد اور مال کے لیے جوش مارتے ہیں' تو

یہ چیزیں بھی تمہیں کوئی نفع نہ دیں گی۔ قیامت کے دن تو یَفْصِلُ بَیْنَکُمْ "اس روز اللہ تمہارے درمیان جدائی کر دے گا"۔ کیونکہ رشتہ داری اور قرابت داری کی رسی اس دن ٹوٹ جائے گی' اس دن صرف اللہ کی رسی کام کرے گی۔

وَ اللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (۶۰:۳) "اور وہی تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے"۔ وہ ظاہر' باطن اور نیت تک سے واقف ہے۔

اب تیسرا پیراگراف آتا ہے۔ اس میں امت مسلمہ کو اس امت کے سرچشمے' حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف لے جایا جاتا ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم سے ادھر ایک ہی قافلہ ہے' اور ایک ہی امت ہے' تاریخ کی طویل وادیوں میں یہ قافلہ چلا آ رہا ہے۔ اس قافلے کا سامان' سامان ایمان ہے۔ یہ قافلہ ہر قسم کے تعلقات سے برات کرتا ہے' ماسوائے تعلقات عقیدہ کے۔ یہی امت ہے جو حضرت ابراہیم سے چلی۔ یہ ابو الانبیاء تھے اور دین حنیف کے داعی۔ وہ قابل تقلید ہیں' نہ صرف عقیدے میں' بلکہ سیرت اور انداز تبلیغ میں بھی۔ ان کو بھی یہی قرابت داری اور رشتہ داری کا مسئلہ درپیش تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھی مومنین ان رشتہ داریوں اور علاقوں کو چھوڑ کر چلے گئے اور انہوں نے صرف اپنا عقیدہ اپنا لیا۔

قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِھِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْکُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ۫ کَفَرْنَا بِکُمْ وَ بَدَا بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰھِیْمَ لِاَبِیْہِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَکَ وَ مَآ اَمْلِکُ لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ ؕ رَبَّنَا عَلَیْکَ تَوَکَّلْنَا وَ اِلَیْکَ اَنَبْنَا وَ اِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ۝ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَۃً لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ اغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْھِمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ ؕ وَ مَنْ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ

ع ٦ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۝

"تم لوگوں کے لیے ابراہیم ع اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا "ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو' قطعی بیزار ہیں۔ ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہو گئی اور بیر پڑ گیا۔ جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ"۔ مگر ابراہیم ﷺ کا اپنے باپ سے یہ کہنا (اس سے مستثنیٰ ہے) کہ "میں آپ کے لیے مغفرت کی درخواست ضرور کروں گا'

اور اللہ سے آپ کے لیے کچھ حاصل کر لینا میرے بس میں نہیں ہے" (اور ابراہیم ﷺ و اصحاب ابراہیم ﷺ کی دعا یہ تھی کہ) "اے ہمارے رب ' تیرے ہی اوپر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کر لیا اور تیرے ہی حضور ہمیں پلٹنا ہے ۔ اے ہمارے رب ہمیں کافروں کے لیے فتنہ نہ بنا دے ۔ اور اے ہمارے رب ' ہمارے قصوروں سے درگزر فرما ' بے شک تو ہی زبردست اور دانا ہے"۔

انہی لوگوں کے طرز عمل میں تمہارے لیے اور ہر اس شخص کے لیے اچھا نمونہ ہے جو اللہ اور روز آخر کا امیدوار ہو ۔ اس سے کوئی منحرف ہو تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے"۔

ایک مسلم جب تاریخ پر نظر ڈالتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی ایک طویل تاریخی نسب نامہ اور شجرۂ ایمان ہے ۔ یہ ماضی کی تاریخ میں بہت دور تک پھیلا ہوا ہے ' دور حضرت ابراہیم علیہ السلام تک ۔ نہ صرف یہ کہ وہ اپنے عقائد و نظریات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیروکار ہے بلکہ اہل ایمان اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دعوتی تجربات بھی ایک ہی جیسے ہیں اس لیے ایک مومن یہ شعور رکھتا ہے کہ اس کے پاس تجربات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے ۔ نہ صرف وہ تجربات جن سے وہ گزر رہا ہے بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تجربات بھی اس میں شامل ہیں ۔ قافلہ ایمان جو اب مکہ میں ہے ' یہ تو ماضی کی تاریخ زمان و مکان میں بہت دور تک چلا ہے ۔ کئی وادیاں اس نے طے کی ہیں ۔ یہ صرف اسی جھنڈے تلے چلتا رہا ہے اور ایسے ہی حالات سے گزرا ہے جن سے وہ گزر رہے ہیں ' یہ کوئی نیا معاملہ نہیں ہے کہ گویا صرف تم ان مشقتوں سے دوچار ہو گئے ہو ۔ آج اگر مومنین کا تعلق اپنے دشمنوں سے کٹ گیا تو کیا بات ہے ۔ وہ ایک ایسے نظریہ کی ایک شاخ ہے جس کی نہایت ہی سایہ دار شاخیں تاریخ کی فضا میں ' دور تک پھیلی ہوئی ہیں ۔ یہ وہ درخت ہے جس کا پودا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لگایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اس تجربے سے گزرے تھے ' جس سے مدینہ میں مسلمان گزر رہے تھے اور حضرت ابراہیم میں اہل ایمان کے لیے اسوۂ حسنہ ہے ۔

اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (۶۰ : ۴) "تم لوگوں کے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا "ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو ' قطعی بیزار ہیں ۔ ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہو گئی اور بیر پڑ گیا ۔ جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ"" ۔ اس میں انہوں نے اپنی قوم ' ان کے معبودوں ' اور ان کی عبادت سے بیزاری کا اظہار کر دیا ۔ دوسرے الفاظ میں ان کا کفر کیا اور اللہ پر ایمان لائے اور یہ عداوت اور بغض اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک وہ قوم اللہ وحدہ پر ایمان نہ لائے ۔ یہ دوٹوک ' فیصلہ کن اور پختہ قطع تعلق تھا ' جس کے بعد فریقین کے درمیان سے ہر قسم کے روابط کٹ گئے ' ماسوائے تعلق ایمان کے ۔ یہی فیصلہ اہل ایمان کا فیصلہ ہے اور یہی قرارداد ان اہل ایمان کی ہے جو مدینہ میں ہیں ۔ اور ایسا ہی ہونا چاہئے جس طرح امت ابراہیمی نے فیصلہ کیا۔

بعض مومنین یہ دیکھتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام نے باوجود قطع تعلق کے اپنے والد کے لیے استغفار کیا حالانکہ وہ مشرک تھے ۔اس میں بعض مسلمانوں کے لیے دبے ہوئے جذبات ابھرانے کی راہ تھی ۔ جو وہ اپنے مشرک بھائیوں کے لیے رکھتے تھے ۔چنانچہ قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس استغفار کی توضیح کر دی ۔کیونکہ انہوں نے باپ سے کہا تھا۔

لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ ( ٦٠ : ٤ ) "میں تمہارے لیے ضرور استغفار کروں گا" ۔ یہ بات انہوں نے اس وقت کہہ دی 'جب ان کے والد نے شرک پر اصرار نہ کیا تھا ۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت اپنے والد کے ایمان کے بارے میں توقع رکھتے تھے ۔

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ اَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ "جب یہ بات کھل گئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو انہوں نے اس سے بیزاری کا اعلان کر دیا" ۔ جیسا کہ دوسری سورت میں آیا ہے ۔

یہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سارا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا تھا اور توکل اور یکسوئی کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے ۔

وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَ اِلَيْكَ اَنَبْنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ( ٦٠ : ٤ ) "اور اللہ سے آپ کے لیے کچھ حاصل کر لینا میرے بس میں نہیں ہے" (اور ابراہیم ﷺ و اصحاب ابراہیم ﷺ کی دعا یہ تھی کہ) "اے ہمارے رب 'تیرے ہی اوپر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کر لیا اور تیرے ہی حضور ہمیں پلٹنا ہے" ۔یوں اللہ کے سامنے مطلق سپردگی کا اعلان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت کا خاصہ ہے ۔ اور اس کی طرف یہاں اہل ایمان کے دلوں کو متوجہ کیا جاتا ہے کیونکہ قرآن کا یہ انداز ہے کہ وہ کسی بھی قصے کی ایک ہی کڑی کو لے کر اس کا تجزیہ کرتا ہے اور اہل ایمان کو اس طرف متوجہ کرتا ہے ۔اور اس کڑی کے اندر مسلمانوں کے لیے جو سبق 'نصیحت 'حکمت اور دانائی کی قابل تقلید مثال ہوتی ہے 'اسے واضح کر دیتا ہے ۔

اس قصے کے دوران حضرت ابراہیم کی دعا کا یہ حصہ بھی اہم ہے ۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ( ٦٠ : ٥ ) "اے ہمارے رب ہمیں کافروں کے لیے فتنہ نہ بنا دے" ۔ ان کافروں کو ہم پر مسلط نہ کر 'کہ یہ تسلط ان کافروں کے لیے فتنہ ہو جائے 'وہ یہ کہیں کہ اگر مسلمان حق پر ہوتے اور ان کا ایمان ان کو بچا سکتا 'تو ہم ان پر کس طرح غالب ہو جاتے ۔ اور یہی شبہات ہر دور میں اہل ایمان کے دلوں میں بھی پیدا ہوتے ہیں 'جب اہل باطل اور اہل کفر اہل ایمان پر غالب ہو جاتے ہیں ۔اور باغی اور سرکش اہل ایمان پر غالب ہوتے ہیں اور اس میں بھی اللہ کی حکمت ہوتی ہے ۔اور یہ غلبہ ایک وقت کے لیے ہوتا ہے ۔ مومن ان ابتلاؤں پر صبر کرتا ہے ۔لیکن ایسے حالات میں بھی اہل ایمان کو دعا کرنا چاہئے کہ وہ ان کو ایسی آزمائشوں میں نہ ڈالے ۔

وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ( ٦٠ : ٥ ) "اور اے ہمارے رب ہمارے قصوروں سے درگزر فرما" ۔ یہ دعا حضرت

ابراہیم خلیل اللہ کر رہے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ کی بندگی کا جو اعلیٰ مقام ہے۔ اس تک پہنچنا مشکل ہے اور اللہ کی نعمتوں اور احسانات کے برابر اللہ کی بندگی کوئی بشر نہیں کر سکتا جو اللہ کی پاکی اور جلالت شان کے برابر ہو۔ اس لیے آپ یہ دعا کرتے ہیں کہ آپ کے بعد آنے والوں کے لیے یہ نمونہ ہو۔

آپ کی دعا، آپ کا رجوع الی اللہ، آپ کے استغفار، آپ کی تعریف رب کا خاتمہ یوں ہے:

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۶۰:۵) "بے شک تو ہی زبردست اور دانا ہے"۔ تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور تیرے سب کام حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کے اس طرز عمل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں تمہارے لیے ایک بہترین نمونہ ہے جنہوں نے مشکل ترین حالات میں رجوع الی اللہ کیا اور اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۶۰:۶) "انہی لوگوں کے طرز عمل میں تمہارے لیے اور ہر اس شخص کے لیے اچھا نمونہ ہے جو اللہ اور روز آخر کا امیدوار ہو۔ اس سے کوئی منحرف ہو تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے"۔

لہٰذا ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے ساتھی صرف اس شخص کے لیے نمونہ ہیں جو اللہ سے امیدوار ہو اور آخرت کی جواب دہی کے لئے فکر مند ہو۔ صرف ایسے ہی لوگوں کے دلوں میں حضرت ابراہیم کے تجربات کی قدر ہو سکتی ہے۔ اور وہ ان کے لیے نمونہ اور اسوہ ہو سکتے ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر کوئی رہنمائی پا سکتا ہے۔ لہٰذا جن لوگوں کے مقاصد اللہ اور آخرت ہوں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نمونے کو دیکھیں۔ یہ اشارہ ہے اہل ایمان کو۔

لیکن جو اسلامی نظام کی پرواہ نہیں کرتے اور جو قافلہ ابراہیمی کے راستے سے ادھر ادھر جانا چاہتے ہیں۔ جو شخص اس شجرۂ نسب سے دور جانا چاہتا ہے، تو اللہ کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۶۰:۶) "اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے"۔ اس سفر سے اب ہم واپس ہو رہے ہیں، اہل ایمان نے اپنی تاریخ کا مطالعہ کر لیا۔ اب وہ زمین پر اپنی یادیں لے کر واپس ہو گئے۔ امم سابقہ میں ان کے لیے جو سبق آموز تجربات تھے وہ انہوں نے جمع کر لیے اور امم سابقہ میں سے جو لوگ ایسے ہی حالات سے گزرے تھے انہوں نے کیا فیصلے کیے تھے اور انہوں نے پا لیا کہ جس راہ پر وہ چل رہے تھے یہ تو ایسی راہ ہے جس پر پہلے بھی لوگ چلتے رہے ہیں۔ وہ پہلے لوگ نہیں ہیں جنہوں نے یہ کام کیا۔

قرآن کریم اس تصور کو قافلہ اہل اسلام کے دلوں میں خوب بٹھا رہا ہے تاکہ یہ قافلہ چلتا رہے۔ اور وہ یہ محسوس نہ کرے کہ وہ اکیلا ہے یا انوکھا ہے۔ اگرچہ موجودہ نسل میں وہ اکیلا ہے۔ یوں اسے سہارا ملتا ہے اور اس راہ پر چلنے میں مشقت کم ہو جاتی ہے۔ یوں کہ راہ اگرچہ دشوار گزار ہے۔ لیکن کئی لوگ پہلے بھی چلتے رہے ہیں اور انہی گھاٹیوں سے ہو کر گزرے ہیں۔

---ooo---

مکہ و مدینہ کے درمیان جو جنگی صورت حالات جاری تھی اور جس کے اندر بھائی بھائی سے کٹ گیا تھا اور لوگ اس صورت حال کو بہت ہی بھاری سمجھتے تھے ۔ اب ان کو امید کی ایک کرن دکھائی جاتی ہے کہ یہ صورت حالات اہل مکہ کی ضد کی وجہ سے ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ بالآخر یہ لوگ بھی اسی قافلہ میں شریک ہو جائیں گے ۔ اسی جھنڈے کو اٹھالیں ۔ یوں ممکن ہو گا کہ بھائی بھائی کا باہم تعلق بھی بحال ہو جائے گا اور اب مزید تخفیف کی جاتی ہے اور ایک بین الاقوامی قانون کا مستقل قاعدہ بیان کر دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان مقاطعت اور عداوت اور دشمنی ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اسلام کے دشمن ہیں ۔ اور اگر کوئی اسلام کی دشمنی ترک کر دے تو پھر ہر مسلمان کو اجازت ہے کہ جس کے ساتھ نیکی کرنا چاہے اور وہ مستحق ہے اس کے ساتھ نیکی کرے ۔ اور باہم منصفانہ اور عادلانہ روابط قائم کیے جائیں ۔

عَسَى اللَّهُ أَن يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِينَ عَادَيْتُم
مِّنْهُم مَّوَدَّةً ۚ وَاللَّهُ قَدِيرٌ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٧﴾ لَّا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ
الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَ
تُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴿٨﴾ إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ
قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَن
تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٩﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا
جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ ۖ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ ۖ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ
مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۖ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۖ
وَآتُوهُم مَّا أَنفَقُوا ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَن تَنكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۚ
وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْأَلُوا مَا أَنفَقْتُمْ وَلْيَسْأَلُوا مَا أَنفَقُوا ۚ ذَٰلِكُمْ
حُكْمُ اللَّهِ ۖ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٠﴾ وَإِن فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ
إِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَآتُوا الَّذِينَ ذَهَبَتْ أَزْوَاجُهُم مِّثْلَ مَا أَنفَقُوا ۚ وَاتَّقُوا
اللَّهَ الَّذِي أَنتُم بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿١١﴾ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ

عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّ لَا يَسْرِقْنَ وَ لَا يَزْنِيْنَ وَ لَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ
وَ لَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَ لَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ
مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا ۲
يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴿۱۳﴾ النصف ع ۷
۸

"بعید نہیں کہ اللہ کبھی تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان محبت ڈال دے جن سے آج تم نے دشمنی مول لی ہے۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور وہ غفور و رحیم ہے۔ اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے۔ اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے۔ اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں"۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو (ان کے مومن ہونے کی) جانچ پڑتال کر لو' اور ان کے ایمان کی حقیقت تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو۔ نہ وہ کفار کے لیے حلال ہیں اور نہ کفار ان کے لیے حلال۔ ان کے کافر شوہروں نے جو مہر ان کو دیئے تھے وہ انہیں پھیر دو۔ اور ان سے نکاح کر لینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ تم ان کے مہر ان کو ادا کر دو۔ اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رہو۔ جو مہر تم نے اپنی کافر بیویوں کو دیئے تھے وہ تم واپس مانگ لو۔ اور جو مہر کافروں نے اپنی مسلمان بیویوں کو دیئے تھے انہیں وہ واپس مانگ لیں۔ یہ اللہ کا حکم ہے' وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔ اور اگر تمہاری کافر بیویوں کے مہروں میں سے کچھ تمہیں کفار سے واپس نہ ملے اور پھر تمہاری نوبت آئے تو جن لوگوں کی بیویاں ادھر رہ گئی ہیں ان کو اتنی رقم ادا کر دو جو ان کے دیئے ہوئے مہروں کے برابر ہو۔ اور اس خدا سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔ اے نبیؐ' جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی' چوری نہ کریں گی' زنا نہ کریں گی' اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی' اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی' اور کسی امر معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی' تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو' یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ' جن پر اللہ نے غضب فرمایا ہے' جو آخرت سے اسی طرح مایوس ہیں جس طرح قبروں میں پڑے ہوئے کافر مایوس ہیں"۔

اسلام سلامتی کا دین ہے' محبت کا عقیدہ ہے۔ وہ ایک ایسا نظام ہے جو پوری دنیا کو اپنے سایہ عاطفت میں لینا چاہتا

ہے ۔ اور پوری دنیا میں اپنا منہاج قائم کرنا چاہتا ہے ۔ وہ لوگوں کو اللہ کے جھنڈوں کے نیچے جمع کرتا ہے اور ان کو باہم متعارف بھائی بناتا ہے ۔ اس سلسلے میں اگر کوئی رکاوٹ ہے تو وہ یہ ہے کہ اسلام کے دشمن اپنی معاندانہ کارروائیاں کرتے ہیں ۔ وہ اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں ۔ اگر مخالفین اسلام' اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ دشمنی ترک کر دیں تو اسلام کو کسی کے ساتھ دشمنی میں دلچسپی نہیں ہے ۔ اسلام از خود کوئی دشمنی پیدا نہیں کرتا ۔ وہ دشمنی اور جنگی حالت میں بھی انسانی نفوس کے اندر انس و محبت کے اسباب قطع نہیں کرتا ۔ وہ منصفانہ معاملہ کرتا ہے اور ہر وقت اس امید میں رہتا ہے کہ تمام لوگ اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں ۔ اسلام کبھی بھی کسی کو ہدایت اور راہ راست پر آ جانے سے مایوس نہیں کرتا ۔

اس قطعے کی پہلی آیت میں اس امید کا ذکر ہے' جو کبھی بھی ناامیدی سے مغلوب نہیں ہوتی ۔ یہ آیت ان لوگوں کے دلوں کے لیے مرہم ہے جن پر اسلام اور کفر کی اس جنگ کو مسلط کیا گیا تھا اور مجبوراً ان کو اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ بائیکاٹ کرنا پڑ رہا تھا ۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً (۶۰ : ۷) "بعید نہیں کہ اللہ کبھی تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان محبت ڈال دے جن سے آج تم نے دشمنی مول لی ہے" ۔ اللہ کی طرف سے امید کا اظہار گویا قطعی اشارہ ہے کہ جلد ہی یہ دشمنی ختم ہو جائے گی ۔ جن مومنین نے اسے سنا ہو گا ان کو یقین ہو گیا ہو گا ۔ اس کے بعد جلد ہی مکہ فتح ہو گیا تھا اور سب اہل مکہ مسلمان ہو گئے تھے اور سب ایک جھنڈے کے نیچے آ گئے تھے ۔ اور ان تمام دشمنیوں اور عنادوں کے دفاتر لپیٹ لیے گئے تھے اور اہل مکہ اور اہل مدینہ بھائی بھائی بن گئے تھے ۔

وَ اللّٰهُ قَدِيْرٌ (۶۰ : ۷) "اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے" ۔ جو چاہتا ہے 'کرتا ہے ۔

وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۶۰ : ۷) "اور اللہ غفور و رحیم ہے" ۔ جو سابقہ زمانے میں اور حالت کفر میں کسی سے شرک ہو گیا' اس کو بخشنے والا ہے ۔ سابقہ زمانے کے گناہوں کو معاف کرنے والا ہے ۔

جب تک اللہ کا وعدہ پورا نہیں ہو جاتا' جس کے بارے میں اوپر کی آیت میں امید دلائی گئی تھی' اللہ نے ان لوگوں کے ساتھ تعلقات مودت قائم کرنے کی اجازت دے دی' جو دین کے معاملے میں مسلمانوں سے برسر جنگ نہیں تھے' جنہوں نے مسلمانوں کو اپنے گھروں سے نہیں نکالا تھا ایسے لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے پر جو پابندی سمجھی جاتی تھی اسے رفع کر دیا گیا کہ ایسے کفار کے ساتھ بھی عدل کرو اور ان کا کوئی حق اگر تمہارے دائرہ اختیار میں ہے تو اسے ادا کرو' لیکن جو لوگ دین کے معاملے میں تم سے لڑ رہے ہیں' انہوں نے تمہیں گھروں سے نکالا ہے' یا تمہارے نکالنے میں معاونت کی ہے' تو ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی موالات نہیں ہے' اور جو لوگ ایسے لوگوں سے موالات کرتے ہیں وہ ظالم ہیں ۔ ظلم کے معانی میں سے ایک معنی شرک بھی ہے ۔ آیت ۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ پیش نظر ہونی چاہئے ۔ مومنین کے لیے یہ شدید تہدید ہے ۔ اس لیے انہیں اس

قسم کے تعلقات قائم کرتے ہوئے بہت محتاط رہنا چاہئے کہ کہیں سب کچھ نہ گنوا دیں۔

یہ اصول جو غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کے سلسلے میں وضع کیا گیا ہے' یہ اس دین کے مزاج کے مطابق ہے اور نہایت ہی منصفانہ بین الاقوامی قانون ہے۔ یہ خالص انسانی نقطہ نظر سے ہے بلکہ اس کو اس پوری کائنات کے نظام کو پیش نظر رکھ کر بنایا گیا ہے۔ کیونکہ یہ پوری کائنات ایک ہی الٰہ واحد کی بنائی ہوئی ہے۔ یہ پوری کائنات رب واحد کی طرف متوجہ ہے اور پوری کائنات اللہ کے منصوبے اور نظام اور نقشے کے مطابق چل رہی ہے۔ اگرچہ اس میں لوگوں کے درمیان اختلافات ہیں اور وہ باہم منقسم ہیں۔

یہ اصول اسلام کے بین الاقوامی قانون کا اساسی اصول ہے جس کے مطابق لوگوں کے درمیان امن و سلامتی کی حالت اصلی اور مستقل حالت ہے' اور اس حالت کے اندر تغیر جارحیت اور دفاع جارحیت کی وجہ سے آجاتا ہے۔ یا اس وجہ سے آتا ہے کہ دو اقوام کے درمیان معاہدہ ہو' اور ان میں سے ایک معاہدے کو توڑ دے یا خیانت کے امکانات پیدا ہو جائیں یا کوئی قوت آزادی اعتقاد یا آزادی اظہار رائے اور دعوت اسلامی کی راہ میں مزاحم ہو جائے۔ اور یہ بھی دراصل ایک جارحیت ہے۔ ان حالات کے علاوہ اسلام امن و سلامتی' محبت' نیکی اور عدل کے احکام دیتا ہے۔

یہ قاعدہ اسلامی نظریہ حیات کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ اسلام انسان اور انسان کے درمیان فرق و امتیاز صرف عقیدے کی بنیاد پر کرتا ہے۔ ایک مومن اگر کسی دوسری قوم کے ساتھ جنگ کرتا ہے تو محض اپنے عقیدے کی وجہ سے کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جنگ کی کوئی اور وجہ نہیں ہے۔ اسلام صرف دعوت کی آزادی اور رائے کی آزادی کے لیے لڑتا ہے۔ اس کے علاوہ فقط وہ اسلامی نظام کے قیام اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے لڑتا ہے۔

یہ توجیہ اور تفسیر اس پوری سورت کے رخ کے ساتھ بھی موافق ہے جس کے اندر عقائد و نظریات کی اہمیت سے بحث ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اہل ایمان صرف نظریاتی جھنڈے کے نیچے لڑ سکتے ہیں۔ اس لیے جو شخص اس محاذ میں ان کے ساتھ کھڑا ہوا تو وہ ان میں سے ہے۔ اور جس نے اس نکتے پر ان سے جنگ کی تو وہ ان کا دشمن ہے۔ جس شخص نے ان کے ساتھ امن کی حالت کو برقرار رکھا اور ان کو ان کے عقائد پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے عقائد کی طرف لوگوں کو بلائیں اور ان کی راہ روکنے کی کوشش نہ کی اور لوگوں کو زبردستی اسلامی عقائد قبول کرنے سے روکا تو وہ مسالم ہے اور اسلام ان کے ساتھ نیکی اور سماجی تعلق قائم کرنے سے نہیں روکتا۔

اصل بات یہ ہے کہ ایک مسلم اس کرۂ ارض پر اپنے عقیدے کی خاطر زندہ ہوتا ہے۔ اس کا مسئلہ اس کا نظریہ اور اس کے ماحول کے ساتھ اس کا مسئلہ بھی یہی نظریہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے مصلحت اور مفادات پر کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ وہ کسی عصبیت کے لیے جہاد نہیں کرتا مثلاً رنگ' نسل' زبان اور علاقے کی عصبیت۔ اسلام میں جنگ اگر ہے تو صرف نظریات کے لیے ہے۔ اس لیے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو' اور اسلامی نظام کے لیے جنگ ہے۔

اس کے بعد سورہ توبہ نازل ہوئی۔ جس میں ہے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۹ : ۱) "اللہ اور رسول کی طرف سے مشرکین سے بیزاری کا اعلان ہوتا ہے"۔ اس کے ذریعہ جزیرۃ العرب میں مشرکین کے ساتھ معاہدات ختم کر

دیئے گئے ۔جن لوگوں کے معاہدے میں میعاد مقرر نہ تھی ان کو چار ماہ کی مہلت دے دی گئی اور جن کے ساتھ میعاد مقرر تھی ان کے ساتھ معاہدے کی مدت طے کی گئی ۔ لیکن امن کے وہ معاہدات جو جزیرۃ العرب کے مشرکین کے ساتھ تھے اور جنہیں منسوخ کیا گیا وہ اس لیے کہ مشرکین عرب بار بار معاہدے توڑ رہے تھے ۔جب انہیں فائدہ ہوتا تو معاہدے پر عمل کرتے 'اور جب نقصان ہوتا تو توڑ دیتے ۔اس لیے ایسے لوگوں کے لیے اسلام نے ایک دوسرا بین الاقوامی قاعدہ بنایا ۔

وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ

"اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت کا خطرہ ہو تو علانیہ ان کا معاہدہ ان کے سامنے پھینک دو' بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کو محبوب نہیں رکھتا"۔ اور یہ ضرورت اس وقت اس لیے بھی پیش آئی تھی تاکہ اسلام کے پایہ تخت اور مرکز کو محفوظ کر دیا جائے ۔ اس وقت مرکز اسلام جزیرۃ العرب تھا ۔ اور اس کو ان لوگوں سے پاک کرنا ضروری تھا' جو مسلمانوں کے بارے میں ہر وقت انتظار میں رہتے تھے 'کہ کوئی موقعہ ملے اور وہ حملہ آور ہوں ۔ مشرکین اور اہل کتاب معاہدین بار بار عہد توڑتے تھے ۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ چونکہ دشمنی کی حالت ہوا کرتی ہے' اس لیے ایسے حالات میں اگر فریقین حالت جنگ پر ہوں تو دونوں کے لیے مفید ہے ۔ خصوصا ایسے حالات میں جبکہ قیصر اور کسریٰ کی عظیم مملکتوں نے اسلامی مملکت کے خلاف افواج جمع کرنا شروع کر دی تھیں ۔ اور دونوں نے اسلام کو اپنے لیے خطرہ سمجھ لیا تھا ۔ دونوں نے جزیرۃ العرب کے ساتھ ساتھ عربی ریاستوں کا رخ جزیرۃ العرب کی طرف پھیر دیا تھا ۔ لہٰذا اسلامی بلاک کی اندرونی تطہیر ضروری ہو گئی تھی تاکہ متوقع بیرونی جارحیت کا موثر مقابلہ کیا جا سکے ۔

---ooo---

یہ نوٹ یہاں کافی ہے ۔ اب سیاق سورت کی طرف آتے ہیں ۔ اب مومنات مہاجرات کی بات ۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ وَ اٰتُوْهُمْ مَّاۤ اَنْفَقُوْا وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَ سْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقُوْا ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۶۰: ۱۰) وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَاۤ اَنْفَقُوْا وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (۶۰: ۱۱) (۶۰: ۱۰ — ۱۱) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو (ان کے مومن ہونے کی) جانچ پڑتال کر لو' اور ان کے ایمان کی

حقیقت تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے ۔ پھر جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو ۔ نہ وہ کفار کے لیے حلال ہیں اور نہ کفار ان کے لیے حلال ۔ ان کے کافر شوہروں نے جو مہر ان کو دیئے تھے وہ انہیں پھیر دو ۔ اور ان سے نکاح کر لینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ تم ان کے مہر ان کو ادا کر دو ۔ اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رہو ۔ جو مہر تم نے اپنی کافر بیویوں کو دیئے تھے وہ تم واپس مانگ لو ۔ اور جو مہر کافروں نے اپنی مسلمان بیویوں کو دیئے تھے انہیں وہ واپس مانگ لیں ۔ یہ اللہ کا حکم ہے' وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے ۔ اور اگر تمہاری کافر بیویوں کے مہروں میں سے کچھ تمہیں کفار سے واپس نہ ملے اور پھر تمہاری نوبت آئے تو جن لوگوں کی بیویاں ادھر رہ گئی ہیں ان کو اتنی رقم ادا کر دو جو ان کے دیئے ہوئے مہروں کے برابر ہو ۔ اور اس خدا سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو"۔

ان آیات کے شان نزول کے بارے میں آیا ہے کہ صلح حدیبیہ کی عبارت یوں تھی : "یہ کہ نہیں آئے گا ہم سے کوئی شخص تمہاری طرف جو تمہارے دین پہ ہو' تو تم اسے ہماری طرف لوٹاؤ گے"۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان ابھی حدیبیہ کے نشیبی علاقے میں تھے کہ کچھ مومن عورتیں آئیں' یہ ہجرت کا مطالبہ کر رہی تھیں اور دار الاسلام آنا چاہتی تھیں ۔ قریش آگئے' کہ ان کو مطابق معاہدہ واپس کریں ۔ معاہدہ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاہدے میں عورتوں کے بارے میں کچھ بھی نہ تھا ۔ یہ تو آیات نازل ہوئیں' جنہوں نے مہاجر عورتوں کو لوٹانے سے منع کر دیا ۔ کیونکہ عورتیں کمزور تھیں اور ان کو ان کے دین کے بارے میں فتنے میں مبتلا کیا جا سکتا تھا ۔

ان کی ہجرت کے ساتھ ہی اس سلسلے کے بین الاقوامی احکام بھی نافذ ہوگئے ۔ یہ قانون سازی بھی نہایت ہی منصفانہ انداز پر کی گئی اور اس میں فریق مخالف کی زیادتیوں کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا ۔ کیونکہ اسلام داخلی اور خارجی معاملات میں کوئی قانون انتقامی جذبات پر نہیں بناتا ۔

اس سلسلے میں اسلام نے پہلے اقدام یہ کیا کہ ان عورتوں کے حالات کو دیکھا جائے کہ آیا وہ کس مقصد کے لیے ہجرت کر رہی ہیں ؟ یہ نہ ہو کہ وہ اپنے سابق خاوندوں سے جان چھڑانا چاہتی ہوں' یا کسی منفعت کی طلب گار ہوں' یا یہ نہ ہو کہ وہ دار الاسلام میں کسی محبوب کے پیچھے تو نہیں جا رہی ہیں ۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ان سے حلف لیا جاتا تھا کہ وہ خاوند کی دشمنی میں تو نہیں نکل آئیں ۔ یہ بھی حلف لیا جاتا تھا کہ مکہ سے تنگ آکر مدینہ کی زمین کی طرف تو نکل آنا نہیں چاہتیں ۔ یہ حلف لیا جاتا تھا کہ دنیا کے کسی اور مفاد کے لیے تو نہیں آگئیں ۔ اور یہ حلف لیا جاتا تھا کہ وہ اللہ اور رسول کی محبت کے سوا کسی اور جذبہ کے تحت تو نہیں آگئیں ؟ حضرت عکرمہ کہتے ہیں کہ حلف میں یہ بھی تھا کہ تم صرف اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں آ رہی ہو' مسلمانوں میں سے کسی شخص کے ساتھ تمہیں محبت تو نہیں ہے' یا تم اپنے خاوند سے بھاگنا تو نہیں چاہتی ہو ؟

یہ ہوتا تھا ان کا امتحان ۔ ان کے ظاہری حالات پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے حلفیہ بیان پر اکتفا کیا جاتا تھا ۔ رہا یہ معاملہ کہ ان کے دلوں میں کیا ہے تو اس سے صرف اللہ خبردار ہے ۔ انسان کے لیے کوئی راہ نہیں ہے کہ وہ دلوں کے راز جان سکے ۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ( ۶۰ : ۱۰ ) "ان کی حقیقت ایمان تو اللہ ہی جانتا ہے"۔ پھر اگر وہ اس مضمون کا

اقرار بذریعہ بیان حلفی کر دیں تو پھر۔

فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ (۶۰: ۱۰) "تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو، نہ وہ کفار کے لیے حلال ہیں نہ کفار ان کے لیے حلال ہیں"۔

اصل میں اعلیٰ تعلق آ گیا ہے۔ ایمانی تعلق اور اس نے تمام دوسرے تعلقات کاٹ دیئے ہیں۔ اس لیے اب کوئی ایسا تعلق باقی نہیں رہا ہے کہ اس جدائی کو جوڑ سکے۔ میاں بیوی کا تعلق تو ایسا تعلق ہے کہ اس میں دو افراد ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں، جڑ جاتے ہیں اور ایک مستقل اور دائمی تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ جب زوجین کے درمیان ایمانی اتحاد نہ ہو تو زوجیت کے حقوق پورے کرنا ممکن نہیں ہے۔ ایمان دل کی اعلیٰ زندگی کا نام ہے اور اس کی جگہ کوئی جذبہ قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ اگر ایمان کا تعلق نہ ہو تو میاں بیوی کے درمیان اتحاد اور ہم آہنگی ممکن نہیں ہے۔ نہ فریقین کے درمیان انس پیدا ہو سکتا ہے نہ یگانگت۔ جبکہ میاں بیوی کے درمیان محبت، باہم شفقت اور انس و سکون ضروری ہے۔

ابتدائی زمانہ ہجرت میں یہ حکم نہ آیا تھا۔ مومنہ عورت اور کافر مرد کے درمیان تفریق نہ کی جاتی تھی۔ نہ مومن مرد اور کافرہ عورت کے درمیان تفریق کی جاتی تھی۔ اس لیے کہ اس دور میں اسلامی نظام معاشرت اور اسلامی سوسائٹی ابھی مستحکم نہ تھی۔ لیکن صلح حدیبیہ یا فتح حدیبیہ کے بعد، زیادہ تر روایات کے مطابق یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ اب مومن اور کافر کے درمیان ازدواجی تعلق قائم نہ رہے۔ ازدواجی تعلق صرف مومن اور مومنات کے درمیان ہو۔ جیسا کہ عملی صورت یہ ہو گئی تھی کہ صرف ایمان کا رابطہ رہ گیا تھا اور مدینہ طیبہ میں صرف ایمانی تعلق تھا۔ اللہ اور رسول کا تعلق رہ گیا تھا، باقی تمام قسم کے تعلقات کاٹ دیئے گئے تھے۔ بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیئے گئے تھے۔

لیکن اس تفریق کے بعد پھر نقصان رسیدہ فریق کے لیے منصفانہ قانون سازی کی گئی۔ اگر کسی کافر خاوند کی بیوی کی جدائی کا حکم صادر ہوتا ہے تو اس نے بیوی کو جو مہر دیا تھا، یا دوسرے اخراجات اٹھائے تھے وہ واپس کرنے ہوتے تھے۔ اسی طرح اگر کسی کافر عورت کو مسلم مرد سے جدا کیا تو مسلم مرد نے جو مہر دیا اور نفقہ دیا وہ اسے واپس کر دیا جاتا تھا۔

اب مومنات مہاجرات کے ساتھ مومنین کا نکاح جائز قرار دیا گیا بشرطیکہ وہ ان کو مہر ادا کر دیں۔ اس میں ایک فقہی اختلاف ہے کہ آیا ان عورتوں کو عدت گزارنی تھی یا نہیں۔ صرف حاملہ عورتوں کو عدت گزارنی تھی یعنی جب تک وضع حمل نہ ہو جائے۔ اگر عدت ہے تو کیا یہ مطلقہ عورت کی عدت ہے یعنی تین طہر یا حیض۔ یا یہ کہ ایک حیض آنے کے ساتھ اور رحم پاک ہونے کا تیقن کافی ہے۔ (کتب فقہ دیکھیں)

وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا (۶۰: ۱۰)

"ان کے کافر شوہروں نے جو مہر ان کو دیئے تھے وہ انہیں پھیر دو۔ اور ان سے نکاح کر لینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ تم ان کے مہر ان کو ادا کر دو۔ اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رہو۔ جو مہر تم نے اپنی کافر بیویوں کو دیئے تھے وہ تم واپس مانگ لو۔ اور جو مہر کافروں نے اپنی مسلمان بیویوں کو دیئے تھے انہیں وہ واپس مانگ لیں"۔ اس کے بعد اللہ

تعالیٰ ان تمام احکام پر عمل کا ضامن اور چوکیدار مقرر کرتا ہے جو ہر مسلم کے دل میں ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے' اللہ سے ڈرو۔

ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۶۰ : ۱۰) "یہ اللہ کا حکم ہے' وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے"۔ یہ واحد ضمانت ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ کوئی دھوکہ' حیلہ یا نقض عہد نہ کرے گا' کیونکہ اللہ کے احکام تو علیم و خبیر کے احکام ہیں۔ اور یہ اس حاکم کے احکام ہیں جو دلوں کے بھیدوں کو بھی جانتا ہے۔ یہ احکام نہایت قوی اور قدرتوں والے حاکم کے ہیں۔ ایک مسلمان کے ضمیر میں بس یہی رابطہ کافی ہے اور وہ جانتا ہے کہ یہ حکم کہاں سے آیا ہے اس لیے وہ ان احکام پر چلتا ہے اور ان کا خیال رکھتا ہے۔ کیونکہ مومن کو یقین ہوتا ہے کہ اس نے اللہ کے سامنے جانا ہے۔

اب اگر مسلمانوں نے اپنی بیویوں کو مہر وغیرہ دیا ہو اور وہ بیویاں دارالکفر میں رہ گئی ہوں جہاں وہ اس قانون کے مطابق جدا ہو گئی ہوں اور ان کے اہل خانہ یا اولیاء نے مومن مسلمانوں کے حق کو واپس نہ کیا ہو' جیسا کہ بعض حالات میں عملاً ایسا ہوا۔ تو امام وقت ان کے نقصان کی تلافی اس فنڈ سے کر دے گا جو ان کافروں کی ملکیت ہو گا جن کی بیویاں دارالاسلام کو آگئی ہوں یا ان رقومات سے ادائیگی کر دی جائے گی جو کفار کے ہاں سے مال غنیمت مسلمانوں کو ملا۔

وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا (۶۰ : ۱۱) "اور اگر تمہاری کافر بیویوں کے مہروں میں سے کچھ تمہیں کفار سے واپس نہ ملے اور پھر تمہاری نوبت آئے تو جن لوگوں کی بیویاں ادھر رہ گئی ہیں ان کو اتنی رقم ادا کر دو جو ان کے دیئے ہوئے مہروں کے برابر ہو"۔

اور اس حکم اور اس پر عمل کرنے کو بھی ایمان سے جوڑ دیا جاتا ہے کیونکہ اسلام میں ہر حکم اللہ سے مربوط ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (۶۰ : ۱۱) "اور اس خدا سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو"۔ اللہ پر ایمان لانے والوں کے لیے یہ بہت ہی موثر یاد دہانی ہے۔

یوں یہ احکام زوجین کے درمیان ایک حقیقت پسندانہ فسخ نکاح کرتے ہیں۔ اور یہ جدائی اسلامی تصور حیات کے مطابق ہے۔ اسلام ازدواجی رشتوں کے لیے ایک الگ تصور رکھتا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ اسلامی صفیں دوسری صفوف سے مکمل طور پر جدا اور ممتاز ہوں۔ اور اسلام کی پوری زندگی اسلامی نظریہ حیات پر استوار ہو۔ اور ایمان کے محور کے ساتھ وہ مربوط ہو۔ اور ایک ایسی انسانی سوسائٹی تشکیل پائے جس کے اندر نسل' رنگ' زبان' نسب اور زمین اور علاقوں کی بنیادوں پر کوئی اجتماعی نظام نہ ہو۔ اور صرف ایک ہی جھنڈا ہو جس کے مطابق لوگوں کے درمیان تفریق ہو۔ یعنی وہ پارٹی جو اللہ والوں کی ہے۔ وہ حزب اللہ ہے اور وہ پارٹی جو شیطان کی ہے جسے حزب الشیطان کہا جاتا ہے۔

---ooo---

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بتایا جاتا ہے کہ یہ عورتیں جو مہاجر ہو گئی ہیں ان سے کن باتوں پر

بیعت لی جائے گی۔ یہ عورتیں یا وہ عورتیں جو اسلام میں داخل ہونا چاہتی ہیں ان کی بیعت یہ ہوگی :

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْــًٔا وَّ لَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَلَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ( ۶۰ : ۱۲ ) "اے نبیؐ ' جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی' چوری نہ کریں گی' زنا نہ کریں گی' اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی' اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی' اور کسی امر معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی' تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو' یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے"۔

یہ باتیں جن پر عورتوں سے بیعت لی گئی ہے' یہ اسلامی نظریہ حیات کے بنیادی عناصر ہیں اور اجتماعی زندگی کے بھی یہ اساسی اصول ہیں۔

۱۔ یہ کہ وہ اللہ کے ساتھ مطلقاً کسی کو شریک نہ کریں گی۔ ۲۔ سرقہ نہ کریں گی۔ ۳۔ زنا سے اجتناب کریں گی۔ ۴۔ اولاد کو قتل نہ کریں گی۔

جاہلیت میں رواج تھا کہ عورتوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ نیز اس میں جنین کو قتل کرنا بھی شامل ہے۔ جس کا سبب کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ جنین کی امین ہیں۔

وَ لَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ ( ۶۰ : ۱۲ ) "اور اپنے ہاتھوں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی"۔ اس کا مفہوم حضرت ابن عباس نے یہ بتایا ہے کہ وہ اپنے خاوندوں کے علاوہ کسی اور کی اولاد کو ان خاوندوں کے ساتھ نہ ملائیں گی۔ یہی رائے مقاتل کی ہے۔

یہ تحفظ زنا سے ارتکاب سے بچنے کی بیعت کے بعد ایک لازمی ہدایت ہے۔ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ عورتیں کئی مردوں سے تعلقات زناشوئی قائم کرتی تھیں۔ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تھا وہ اسے اس شخص کا قرار دے دیتیں جس کے ساتھ وہ مشابہت رکھتا۔ بعض اوقات یہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ بچے کا الحاق کرا دیتیں حالانکہ ان کو اس کا باپ معلوم ہوتا تھا۔

لیکن آیت کے عمومی الفاظ میں تمام ایسے حالات آتے ہیں جن میں بہتان تراشی ہوتی ہو۔ ابن عباس اور مقاتل نے اسے جو مخصوص کیا ہے تو اس لیے کہ اس وقت ایسے حالات موجود تھے جو حرمت زنا کے حکم سے ختم ہو رہے تھے لیکن موجود حاملہ عورتوں کو تو بچوں کے الحاق کا فیصلہ بہرحال کرنا ہی تھا)۔

وَلَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ ( ۶۰ : ۱۲ ) "اور کسی معروف امر میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی"۔

اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اطاعت ہے ۔ ہر اس معاملے میں جو آپ ان سے کہیں اور ظاہر ہے کہ حضورؐ تو معروف کا حکم ہی دیں گے ۔ لیکن یہاں معروف کے لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ اس لیے کہ یہ ایک دستوری دفعہ ہے ۔ اسلامی دستور میں یہ بنیادی قاعدہ ہے کہ حکمرانوں کی اطاعت معروف کے دائرے کے اندر محدود ہے ۔ صرف ان کاموں میں حکمرانوں کی اطاعت لازمی ہے جو شریعت اسلامیہ کے مطابق ہوں ۔ اسلام میں مطلق اطاعت کا کوئی اصول نہیں ہے ۔ اسلامی دستور کے مطابق قانون سازی اور حکمرانی کے اختیارات کا سرچشمہ اسلامی شریعت ہے ۔ امام وقت کا ارادہ نہیں ہے نہ قوم کا ارادہ نہ اکثریتی یا اجتماعی کسی اصول کو قانون کا درجہ دے سکتا ہے جو شریعت کے خلاف ہو ۔ لہذا قوم اور قوم کا امام دونوں اسلامی شریعت کے پابند ہیں ۔

جب ان عورتوں نے یہ بیعت کر لی تو تب وہ مومنات ہوں گی ۔ اور تب ان کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغفرت کی دعا کریں گے کہ اللہ ان کے سابقہ گناہوں کو معاف کرے ۔

إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱۲:٦٠) "بے شک اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے"۔ وہ کوتاہیوں کو معاف کرنے والا ہے ۔

---ooo---

آخر میں یہ اثر انگیز تبصرہ :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوا مِنَ الْآخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَابِ الْقُبُورِ (۱۳:٦٠) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو ' ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ ' جن پر اللہ نے غضب فرمایا ہے ' جو آخرت سے اسی طرح مایوس ہیں جس طرح قبروں میں پڑے ہوئے کافر مایوس ہیں"۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ اس قوم سے مراد یہودی ہیں ' جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے ۔ اور اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ قرآن کریم میں کئی جگہ اس قوم کے لیے یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں ' لیکن یہ آیت عام بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے مفہوم میں وہ لوگ بھی آ جائیں جو مشرکین ہیں اور جن کا تذکرہ اس پوری سورت میں ہوا ہے اور اللہ کی تمام دشمن اس سے مراد ہوں ۔ کیونکہ اللہ کے سب دشمن آخرت سے مایوس ہیں اور وہ آخرت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ۔ اور ان کو تشبیہ ان کفار سے دی گئی ہے جو قبروں میں ہیں ۔ ان کو تو معلوم ہو چکا ہے کہ انہوں نے کفر اور شرک کا ارتکاب کیا ۔ اب وہ دائمی جہنمی ہیں ۔ دنیا کی مہلت ختم ہے ۔ اب حشر میں صرف حساب ہونا ہے اور انہوں نے جہنم میں گرنا ہے ۔

یہ آخری پکار پوری سورت کی پکاروں کو اور پوری سورت کی دعوتوں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے ۔ اس طرح سورت کا خاتمہ اور آغاز ایک ہی مضمون سے ہوا کہ مَغْضُوبٌ عَلَيْهِمْ کو دوست نہ بناؤ اور اس خاتمے کے اندر سورت کی تمام آواز کو جمع کر دیا گیا ۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ۔۔ ۲۸

## سورۃ الصّف ۔ ٦١

## ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۴

# سورۃ الصّف ایک نظر میں

اس سورت کے پیش نظر دو باتیں ہیں - یہ نہایت اساسی باتیں اور پوری سورۃ میں بہت ہی واضح طور پر کہی گئی ہیں - ان کے علاوہ بھی بعض اشارات ہیں لیکن یہ سب اشارات بھی انہی دو امور کے ساتھ ملحق ہیں -

پہلی بات یہ ہے کہ تمام اہل ایمان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ دین اسلام دراصل اللہ کا آخری دین ہے' یہی دین مختلف شکلوں میں' انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں اس وقت کے حالات کے مطابق جاری اور نافذ رہا ہے - رسولوں اور ان کے ساتھ اٹھنے والی جماعتوں کی زندگیوں میں اس کے تجربے ہوتے رہے ہیں - اس دین کی تمام سابقہ شکلیں دراصل اس آخری دین اور نظام کے لیے تمہید اور تیاری تھیں - کیونکہ اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت آخری رسالت ہو' اور آپ کا دین آخری دین ہو - اور اسے تمام دینوں پر غالب کر دیا جائے -

اس سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا ذکر کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جن لوگوں کی طرف بھیجا گیا تھا انہوں نے ان کو اذیت دی' رسالت کا انکار کیا' گمراہ ہو گئے اور یہ لوگ اللہ کے دین کے امین اور محافظ نہ بنے -

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۶۱ : ۵) "اور یاد کرو موسیٰ کی وہ بات جو اس نے اپنی قوم سے کہی تھی کہ "اے میری قوم کے لوگو' تم کیوں مجھے اذیت دیتے ہو' حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں" - پھر جب انہوں نے ٹیڑھ اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے' اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا" - یوں حضرت موسیٰ کی قوم بھی اس دین کی قیم نہ رہی' اور اس امانت کو سنبھالنے سے انہوں نے انکار کر دیا' ان کے دل ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے بھی ان کو مزید ٹیڑھا کر دیا - چونکہ انہوں نے بالارادہ گمراہی اختیار کر لی' اس لیے اللہ نے بھی ان کو گمراہ کر دیا اور اللہ فاسقین کو کبھی ہدایت نہیں دیتا -

اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا تذکرہ ہوتا ہے اور یہ رسالت بھی دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی رسالت کی وسیع شکل تھی - حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی تورات کی تصدیق کی - اور آپ نے آخری نبی کے آنے کے لیے راہ ہموار کی - اور آخری رسول کے آنے کی بشارت دی - آپ نے پہلے کتابی دین' دین موسیٰ اور آخری کتابی دین' دین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپس میں ملا دیا -

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ

التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (۶۱ : ۶) "اور یاد کرو عیسیٰ ابن مریم کی وہ بات

جو اس نے کہی تھی کہ "اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں' تصدیق کرنے والا ہوں اس تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہو گا" ۔ گویا عیسیٰ علیہ السلام اس لیے تشریف لائے تھے کہ دین الہیٰ کی امانت جو تورات کی شکل میں تھی' اسے نبی آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد کر دیں اور آپ کے بارے میں خوشخبری بھی دیں ۔

اور اللہ کے علم اور تقدیر میں یہ بات مقرر تھی کہ ان تمام مراحل اور مدارج سے گزر کر 'اس کا دین ایک مستقل اور مکمل شکل میں زمین پر غالب آ جائے اور یہ رسول آخر الزمان ﷺ کے ہاتھوں ۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۶۱ : ۹) "اللہ وہی تو ہے' جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے ' خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو" ۔

یہ اس سورت کا پہلا ہدف ہے اور اسی کے اوپر دوسرا ہدف مبنی ہے ۔ وہ یہ کہ جب ایک مومن کے اندر یہ شعور پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ دین اس کے ہاتھ میں ایک امانت ہے اور اس امانت کے بارے میں اللہ کا حکم یہ ہے کہ اسے تمام ادیان پر غالب کرنا ہے 'تو ایک مسلم کا یہ شعور پھر اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اٹھے اور اس کو غالب کرنے کے لیے' اس دین کی راہ میں جدوجہد کرے ۔ جیسا کہ اللہ کا ارادہ ہے کہ اسے غالب کیا جائے ۔ اور اس سلسلے میں پھر ایک مومن کے قول اور فعل میں تضاد نہیں ہونا چاہیے ۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ بڑی بری بات ہے کہ پہلے تو تم جہاد کی خواہش کرتے تھے اور جب جہاد فرض ہو گیا تو تم منہ موڑ رہے ہو ۔ جیسا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں پر یہ حالت طاری ہو گئی تھی اور اس سلسلے میں بعض روایات بھی ہیں ۔ چنانچہ سورت کے آغاز میں پوری کائنات کی طرف سے تسبیح کے ذکر کے بعد یہ آتا ہے کہ اللہ یہ چاہتا ہے :

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۲) كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۳) اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ (۴) (۶۱ : ۲ تا ۴) "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں ۔ اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں" ۔

اس کے بعد سورت کے وسط میں ان کو کہا جاتا ہے ۔ دنیا و آخرت میں نفع بخش تجارت کیا ہے ۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ (۱۰) تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۱) يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۲) وَ اُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِيْبٌ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۳) (۶۱ : ۱۰ تا ۱۳)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمہیں عذاب الیم سے بچائے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے ۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ابدی قیام کی جنتوں میں بہترین گھر تمہیں عطا فرمائے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو' وہ بھی تمہیں دے گا' اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی حاصل ہو جانے والی فتح ۔ اے نبی اہل ایمان کو اس کی بشارت دے دو"۔

سورت کا خاتمہ ایک پکار پر ہوتا ہے جو اہل ایمان کو ہے کہ وہ اللہ کے مددگار بن جائیں 'جس طرح عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں کو پکارا تھا کہ کون ہے تم میں سے میرا مددگار' باوجود اس کے کہ بنی اسرائیل نے تکذیب کر دی تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دشمنی پر اتر آئے تھے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ (۶۱ : ۱۴)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کے مددگار بنو' جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں کو خطاب کر کے کہا تھا: "کون ہے اللہ کی طرف دعوت میں میرا مددگار؟" حواریوں نے جواب دیا "ہم ہیں اللہ کے مددگار" ۔ اس وقت بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے گروہ نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلے میں تائید کی اور وہی غالب ہو کر رہے"۔

یہ دونوں لائنیں اس سورت میں بالکل واضح ہیں۔ اور تمام آیات کا مقصد یہی ہے۔ اب صرف یہ بات رہ جاتی ہے کہ رسالت کی تکذیب کرنے والوں پر تنقید اور تنبیہہ آ جائے اور اس قسم کی تنبیہات ہمیشہ قرآن میں آتی رہتی ہیں۔ یہاں کہا جاتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کے بعد بھی ان لوگوں نے تکذیب کی' حالانکہ رسول کے مقصد' رسالت کی تاریخ اور طریقہ کار سب کی وضاحت کر دی گئی۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۶) وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُوَ يُدْعٰىٓ اِلَى الْاِسْلَامِ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۷) يُرِيْدُوْنَ

لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (٨) (٦١: ٦ تا ٨)

"مگر جب وہ ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انہوں نے کہا یہ تو صریح دھوکہ ہے' اب بھلا اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹے بہتان باندھے حالانکہ اسے اسلام کی دعوت دی جارہی ہو۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔ یہ لوگ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا پھیلا کر رہے خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔

ان ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا یہ دین اس کرۂ ارض پر اللہ کا آخری دین ہے۔ اور انسانوں کو درست عقیدہ عطا کرنا' اور درست فکرونظر دینا اب دین اسلام کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ جب کسی مسلم کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ وہ اس فریضے کا مکلف ہے۔ اس کا فرض ہے کہ دعوت و جہاد کے ذریعہ لوگوں تک اس آخری دین کو پہنچائے۔ اور اسی بات کو اللہ پسند کرتا ہے۔ پھر مسلم کا یہ بھی فرض ہے کہ اس کے دین میں اس کا راستہ بالکل واضح ہو اور اپنے دین اور اس کے قیام کے لیے جہاد کے معاملے میں اس کے افکار گنجلک نہ ہوں اور وہ شف شف نہ کرتا ہو۔ نہ وہ اس سیدھے راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے اختیار کرتا ہو۔ کیونکہ اللہ نے یہی راستہ اختیار کیا ہے کہ اللہ کے دین کے قیام کے لیے صف بستہ ہو جاؤ اور جہاد کرو۔

اسی دوران مسلمانوں کے اخلاق' ان کے مزاج اور ان کے ضمیر اور سوسائٹی میں ان کے طرز عمل کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسے ہرگز وہ بات نہیں کہنا چاہئے جو وہ کر نہیں سکتا۔ اور نہ اس کے قول اور عمل میں تضاد ہو' نہ ان کے ظاہر و باطن میں فرق ہو' اس کی گھر کے اندر اور باہر کی زندگی یکساں ہو' اور اپنے ہر حال میں اسے اللہ کے لیے خالص ہونا چاہئے۔ اپنے قول اور فعل میں سچا ہو' اس کے قدم اور اس کا راستہ صاف ہو۔ وہ اپنے دوسرے بھائیوں کا ہمدرد ہو اور سب لوگ اس طرح ہوں جس طرح بنیان مرصوص۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۶۱ تشریح آیات

## ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۴

سورۃ الصف (۶۱) مدنیۃ (۱۰۹) آیاتہا ۱۴ رکوعاتہا ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲﴾ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿۴﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے' اور وہ غالب اور حکیم ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔ اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"۔

اللہ عزیز و حکیم کی تسبیح پوری کائنات کر رہی ہے۔سورت کے آغاز میں یہ بات لا کر اہل ایمان کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ تمہارا دین اس پوری کائنات کا دین ہے۔ اور یہ دین توحید ہے۔ اور تم اس کے امین ہو۔ اور کافرین اور مشرکین کا موقف غلط ہے اور وہ اس دین کی روشنی کو بجھانا چاہتے ہیں۔ اللہ تمہیں دعوت دے رہا ہے کہ اس دین اور اس رسول کی نصرت کرو اور اللہ نے اس دین کا غلبہ مقرر کر رکھا ہے۔ اگرچہ کافر اور مشرک تو اس کو ختم کرنا چاہتے ہیں' لیکن اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ان کے علی الرغم اسے غالب کرنا چاہتا ہے۔ اس آغاز کا مفہوم یہ ہے کہ یہ پوری کائنات کا دین ہے اور پوری کائنات کی امانت ہے۔ اور جس نظریہ کے لیے تم نے جہاد کرنا ہے وہ پوری کائنات کا نظریہ ہے اور اس دین کا ظہور اور غلبہ دراصل اک قدرتی امر ہے' اور اللہ عزیز و حکیم کی منشا اور تقدیر ہے۔

اس کے بعد بعض مومنین کی جانب سے کمزوری کے اظہار پر عتاب کیا جاتا ہے 'کہ دین کے معاملے میں جہاد سے جو شخص منہ موڑے گا' اسے اللہ بہت ہی ناپسند کرتا ہے اور اسے قابل شرم قرار دیتا ہے 'خصوصاً ان لوگوں کی جانب سے جو ایمان لائے ہیں جب کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کو اللہ بہت پسند کرتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (٢) كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (٣) اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (٤) (٦١: ٢ تا ٤) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔ اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"۔

علی ابن طلحہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ مسلمانوں میں سے بعض لوگ ایسے تھے کہ فرضیت جہاد سے پہلے کہتے تھے کہ اللہ ہمیں کوئی ایسا عمل بتا دے 'جو اسے بہت ہی محبوب ہو' ہم اس پر عمل کریں۔ اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع دی کہ اللہ کے نزدیک محبوب ترین عمل تو بے شک ایمان لانا ہے لیکن اس کے بعد ان لوگوں کے خلاف جہاد کرنا اللہ کو محبوب ہے جو ایمان نہیں لاتے اور اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں اور ایمان کا اقرار نہیں کرتے۔ جب جہاد کا یہ حکم نازل ہوا تو بعض مسلمانوں نے اسے پسند نہ کیا اور اسے انہوں نے ایک بھاری حکم سمجھا' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (٢) كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (٣) (٦١: ٢ - ٣) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں"۔ امام ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اس قول کو اختیار کیا ہے۔

لیکن امام ابن کثیر نے کہا ہے: "جمہور نے کہا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مسلمانوں نے یہ تمنا کی کہ جہاد فرض ہو جائے 'جب جہاد فرض ہو گیا تو بعض لوگوں نے اسے پسند نہ کیا اور دوسری جگہ بھی اس کے بارے میں آیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (٧٧) اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ

وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (٧٨)(٤ : ٧٧ - ٧٨) ”تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو' اور زکوۃ دو' اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسے ڈر رہے ہیں جیسا کہ خدا سے ڈرنا چاہئے' یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر' کہتے ہیں خدایا' یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی؟ ان سے کہو' دنیا کا سرمایہ زندگی تھوڑا ہے اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر بھی نہ کیا جائے گا۔ رہی موت تو جہاں بھی تم ہو وہ بہرحال تمہیں آکر رہے گی' خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو“۔

قتادہ اور ضحاک نے کہا کہ یہ ان لوگوں کی سرزنش کے لیے نازل ہوئی ہے جو کہتے تھے کہ ہم نے قتل کیا' تیر مارا' تلوار چلائی' اور یہ یہ کیا اور دراصل انہوں نے ایسا نہ کیا تھا۔

آیت کے سیاق کلام اور اس میں قتال کے ذکر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جمہور مفسرین کی بات درست ہے۔ یہی رائے ابن جریر نے بھی اختیار کی ہے۔ لیکن قرآنی آیات کا مفہوم بالعموم شان نزول کے واقعات سے وسیع ہوتا ہے۔ بلکہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم عمومی مفہوم لیتے ہیں۔ خصوصی واقعہ نزول کا لحاظ نہیں رکھتے۔ ہاں جس واقعہ میں آیت نازل ہوئی اس کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔۔۔ آغاز یوں ہوتا ہے کہ کسی واقعہ یا واقعات پر عتاب ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (٦١ : ٢) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں“۔ اور اس کی انتہا اس پر ہوتی ہے کہ اللہ کے نزدیک یہ فعل بہت ہی برا ہے۔

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (٦١ : ٣) ”اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں“۔

المقت وہ ناپسندیدہ بات جو اللہ کے نزدیک بہت ہی ناپسندیدہ ہے۔ وہ اس کو بہت برا سمجھتا ہے اور یہ اللہ کہتا ہے جو تمہارا رب ہے۔

اور تیسری آیت میں وہ بات واضح طور پر بتا دی جس کے بارے میں انہوں نے کہا کہ ہم کریں گے مگر پھر بھی انہوں نے اس سلسلے میں کوتاہی کی۔ اور وہ ہے جہاد و قتال۔ اور قرار دیا جاتا ہے کہ جو لوگ صف بستہ قتال کرتے ہیں وہ بہت ہی محبوب لوگ ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (٦١ : ٤)

”اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں“۔ صرف قتال ہی نہیں' بلکہ قتال اللہ کی راہ میں ہو' اور یہ قتال منظم ہو' سوسائٹی کی صفوں کے اندر تنظیم کے بعد ہو' اور یہ قتال ہو بھی نہایت ہی جم کر لڑنے کی صورت میں۔

---ooo---

جیسا کہ ہم نے اس پارے کی متعدد سورتوں میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ قرآن کریم کے پیش نظر یہ بات تھی کہ

ایک ایسی امت کی تعمیر کی جائے جو اس زمین پر قرآن کی امانت کی حامل ہو۔ قرآنی منہاج زندگی قائم کرنا اس کا منشا ہو' اور قرآنی شریعت کو ایک مکمل نظام کی شکل میں پیش کرے۔ اس مقصد کے لیے ایک جماعت اور ایک سوسائٹی بنانا ضروری تھا۔ اور اسی جماعت کو ایک عملی جماعت بنانا ضروری تھا' اور یہ سب کام ایک ساتھ کرنے ضروری تھے۔ یاد رہے کہ اسلامی نظام کا مزاج یہ ہے کہ اس میں فرد کی قیمت جماعت میں ہے' تنہا کچھ نہیں۔ اسلام اپنے وجود کو ایک باہم مربوط اور منظم جماعت کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے' جس کا ایک نظام ہو' جس کا ایک ہدف ہو' اور اس ہدف کے اردگرد اس کے تمام افراد گھومتے ہوں۔ یوں کہ یہ نظام ہر ایک کے ضمیر میں' ہر ایک کے عمل میں' پھر اس کرۂ ارض پر کسی امت کی عملی شکل میں نافذ ہو اور زمین کے اوپر اس عملی سوسائٹی کی شکل میں' ایک ایسی سوسائٹی ایک ایسی امت جو عملاً متحرک ہو اور اپنے تمام کام اس نظام کے حدود اور فریم ورک میں کرتی ہو۔

اسلام' اگرچہ فرد کی اصلاح اور ایک فرد کی نیت کی اصلاح اور ضمیر کی اصلاح پر بہت زور دیتا ہے اور انفرادی ذمہ داری کا اصول بھی اسلام ہی نے عطا کیا ہے' لیکن اسلام افراد کا دین نہیں ہے' کہ ایک ایک فرد عبادت خانے میں جاکر اپنی اپنی عبادت کرے۔ اس طرح اسلام کسی ایک فرد کی ذات میں حقیقت نہیں بن سکتا' نہ کسی ایک منفرد شخص کی ذات میں بھی حقیقت نہیں بن سکتا۔ نہ اسلام اس صورت میں آیا ہے کہ وہ ایک شخص کی زندگی میں گوشہ نشین ہو کر رہے' بلکہ اسلام کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کی زندگی پر حکمران ہو' زندگی کے اندر تصرف کرے' اس پر کنٹرول کرے' اور لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی اور سرگرمیوں پر حاوی ہو۔ اس لیے کہ انسان انفرادی طور پر زندہ نہیں رہتے بلکہ اجتماعی طور پر زندہ رہتے ہیں اور اسلام چونکہ انسانوں پر حکمرانی کے لیے آیا ہے اس لیے وہ ایک اجتماعی نظام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے آداب' اس کے قواعد' اس کے ارادے' یہاں تک کہ اس کی عبادات بھی اجتماعی ہیں۔ اگر اسلام کا کوئی حکم کسی فرد کے لیے ہے تو بھی وہ ایک ایسے انسان کے لیے ہے جو سوشل ہے اور ایک جماعت کے اندر رہتا ہے' اس میں اٹھتا بیٹھتا ہے اور اس جماعت میں اپنے دین کا امین ہے' ایک نظام کا حامل ہے' اور اس کا فرض ہے کہ اس نظام کو لوگوں کے اندر نافذ کرے۔

جب سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوت کا آغاز کیا' اسلامی معاشرہ قائم ہونا شروع ہو گیا۔ اسلامی جماعت کی تشکیل شروع ہو گئی اور رسول اللہ ﷺ اس جماعت کے قائد قرار پائے۔ یہ جماعت ایسی تھی جس کی جماعتی ذمہ داریاں تھیں' جو اپنے ماحول سے بالکل ممتاز تھی۔ اس کو ایسے آداب سکھائے جاتے تھے کہ ان کا ایک سرا اگر ایک فرد انسان کے ضمیر میں ہوتا تھا تو دوسرا سرا ایک جماعت سے متعلق ہوتا تھا اور یہ اسلامی اجتماعی سوسائٹی اس وقت بھی تھی جب ابھی مدینہ میں اسلامی حکومت قائم نہ ہوئی تھی بلکہ مدینہ کی اسلامی حکومت قائم بھی مکہ کی اسلامی جماعت کے ذریعہ سے ہوئی تھی۔

ہم جب ان آیات پر غور کرتے ہیں تو دینی عقائد کے اوپر جو اخلاقی نظام ان میں استوار کیا جاتا ہے وہ ایک اجتماعی ضرورت بھی ہے اور یہ اخلاق ایک اجتماعی نظام ہی کی شکل میں ظاہر ہو سکتے ہیں اور یہ نظام ایسا ہے کہ اسے نافذ کرنے کے لیے ایک انتظامیہ کی ضرورت ہے۔

پہلی دو آیات میں اس بات پر گرفت کی گئی ہے کہ یہ بات ایک مسلمان اور مومن کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ ایک بات کہے اور پھر اس پر عمل نہ کرے۔ یہ ایک مسلمان اور مومن کی شخصیت کی بنیادی صفت ہے۔ سچائی اور

استقامت اور راست بازی ۔ اس کا باطن اور ظاہر ایک ہو ۔ اس کا قول اور فعل یکساں ہوں اور یہ بات صرف مسئلہ جہاد تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک مومن کو ہر معاملے میں ایسا ہونا چاہئے ۔

یہ کہ مسلم کا ظاہر و باطن ایک ہونا چاہئے اور قول و فعل یکساں ہونا چاہئے ۔ ایک ایسی بات ہے جس پر قرآن نے بہت ہی تاکید کی ہے اور اس مضمون کو بار بار بیان کیا ہے ۔ یہودیوں کے بارے میں کہا گیا ۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ( ۲ : ۴۴ ) ”تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو ۔ کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے“ ۔ اور منافقین پر تنقید کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے :

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ( ۲۰۴ ) وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ( ۲۰۵ ) ( ۲ : ۲۰۴ ) ”انسانوں میں سے کوئی تو ایسا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے ‘ مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمن حق ہوتا ہے ۔ جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے ‘ تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے ‘ کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے ۔ حالانکہ اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا“ ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”منافق کی علامتیں تین ہیں ‘ جب بات کرے تو جھوٹ بولے ‘ جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے ‘ اور جب اس پر امانت کا اعتماد کیا جائے تو خیانت کرے“ ۔ ( متفق علیہ )

اس مضمون کی احادیث بہت ہیں ‘ آگے جو حدیث ہم ذکر کر رہے ہیں ‘ وہ اس سلسلے میں شدید ترین اور سخت ترین ہدایت ہے ۔ امام احمد نے عبداللہ ابن عامر ابن ربیعہ سے روایت کی ۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے گھر آئے ۔ اس وقت میں بچہ تھا ۔ میں گھر سے باہر جانے لگا کہ کھیلوں ۔ میری ماں نے مجھے کہا عبداللہ ! ادھر آؤ میں تمہیں کچھ دیتی ہوں ۔ میری ماں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم نے اسے کیا دینے کا ارادہ کیا ہے ؟ تو اس نے کہا کھجور کا دانہ ۔ تو حضورؐ نے فرمایا اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہارے خلاف ایک جھوٹ لکھ دیا جائے گا ۔ اور یہی وجہ ہے کہ امام احمد ابن حنبل سفر کر کے ایک شخص کے پاس ایک حدیث نقل کرنے گئے اور یہ سفر کافی طویل تھا تو آپ نے اس شخص کو دیکھا کہ وہ تھیلی پکڑے ہوئے ہے اور اپنے خچر کو یہ باور کرا رہا ہے کہ اس میں خوراک ہے ‘ حالانکہ وہ خالی تھی تو امام احمد نے اس شخص سے روایت کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اس نے اپنے خچر کے ساتھ جھوٹ بولا ۔

یہ تھی اسلام کی اخلاقی تعمیر ۔ اور یہ تھا ایک مسلمان کے لیے اخلاقی معیار ۔ اور یہ تھے وہ لوگ جن کو اسلامی نظام حیات کا امین بنایا گیا تھا ۔ یہی معیار ہے جسے قائم کرنا اس سورت کا مقصد و محور ہے اور یہ اسلامی جماعت کی تربیت کا ایک اہم نکتہ ہے جسے اللہ اسلامی منہاج کو درست کرنے کے لیے اٹھاتا ہے ۔

جب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں جو اس سورت کا محور اور موضوع ہے یعنی جہاد فی سبیل اللہ۔تو اس سے پہلے ہم کئی موضوعات اپنے سامنے پاتے ہیں تاکہ ہم ان پر غور کریں اور اس سے عبرت لیں۔

سب سے پہلے تو ہمارے سامنے حضرت انسان کا نفس آتا ہے اور اس نفس پر ضعف کے لمحات آتے ہیں۔ صرف اللہ ہی اسے اس ضعف سے بچا سکتا ہے اور دائمی یاد دہانی اور دائمی تربیت کی ضرورت پیش آتی ہے۔روایات میں آتا ہے کہ یہ نہایت ہی ابتدائی مہاجرین میں سے کچھ لوگ تھے جن کی خواہش تھی کہ ان کو قتال کی اجازت دی جائے۔یہ لوگ اہل مکہ میں تھے اور ان کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ مکہ ہی میں لڑنا چاہتے تھے لیکن اس وقت ان کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ ہاتھوں کو روکے رکھیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں۔لیکن جب ان پر جہاد فرض کیا گیا اور وہ بھی مدینہ میں اور مناسب وقت پر 'تو ان میں سے بعض لوگ ایسے تھے کہ وہ لوگوں سے ایسے ڈرنے لگے جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہئے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ڈرنے لگے۔اور انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ۔

وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (٤ : ٧٧) اے اللہ تو نے ہم پر قتال کیوں فرض کر دیا۔ذرا اور ہمیں مہلت دی ہوتی"۔یا یہ مدینہ ہی کی ایک جماعت تھی اور محبوب ترین اعمال کے بارے میں پوچھتی تھی اور جب بتایا گیا کہ محبوب ترین عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے تو انہوں نے اس کو ناپسند کیا۔

یہی ایک واقعہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے کہ نفس انسانی بہت کمزور ہے اور اسے رات دن مسلسل تربیت و تذکیر اور یاد دہانی کی ضرورت ہے۔خصوصاً جبکہ اس کو مشکل ترین ٹارگٹ دیا جا رہا ہو۔یہ تربیت اس لیے ضروری ہے کہ یہ اپنی راہ پر درست چلتی رہے 'اپنی کمزوریوں پر قابو پائے اور دور افق بلند پر اس کی نظریں ہوں۔نیز اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کبھی بھی کوئی مشکل ٹارگٹ لینے کے لیے ایک مسلم کو بے تاب نہیں ہونا چاہئے۔جبکہ چاہت دین ہو تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔اگر ہم اللہ کے سامنے تجاویز پیش کریں اور اللہ وہ حالات پیش کر دے تو شاید ہم ثابت قدم نہ رہ سکیں۔دیکھئے یہ مسلمانوں کی پہلی جماعت ہے اور اس میں بھی ایسے لوگ ہیں جن پر گرفت ہو رہی ہے کہ کیوں تم ایسی باتیں کرتے ہو جن پر عمل نہیں کرتے۔یہ سخت عتاب ہے اور خوفناک گرفت ہے۔

دوسری بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے 'جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں 'اس طرح جس طرح وہ بنیان مرصوص ہیں۔اللہ اپنے راستے میں لڑنے کے لیے کس قدر زوردار انداز سے مسلمانوں کو آمادہ کرتا ہے لیکن ریکارڈ یہ بتاتا ہے کہ یہ تاکید بعض لوگوں کی اس نفسیاتی حالت کو دور کرنے کے لیے کی گئی جو جنگ کو پسند نہ کرتے تھے اور اسے اور موخر کرنا چاہتے تھے۔اور جنگ سے پسپائی اختیار کر رہے تھے۔اس لیے یہاں ان کو سختی سے آمادہ کیا گیا۔لیکن اس مخصوص سبب نزول کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ آیت مخصوص حالات کے لیے ہے بلکہ اسلام کی یہ عام پالیسی ہے کہ لوگوں کو بروقت جنگی حالات کے لیے آمادہ رکھا جائے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ اسلام خواہ مخواہ جنگی جنون پیدا کرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی وہ جنگ کو ایک محبوب چیز سمجھتا ہے۔اسلام جنگ کو اس لیے فرض قرار دیتا ہے کہ حالات اسے مجبور کر دیتے ہیں۔پھر اسلام جن مقاصد کے لیے جنگ کرتا ہے

وہ بلند مقاصد ہیں۔ اسلامی جنگ اس لیے ہوتی ہے کہ اسلامی ممالک کے اندر اللہ کے آخری منہاج زندگی کو نافذ اور قائم کیا جائے۔ یہ اسلامی منہاج زندگی اگرچہ ایک فطری منہاج ہے لیکن اسلام انسانی نفوس پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس منہاج کے معیار تک بلند کریں تاکہ اس اعلیٰ معیار پر یہ نظام قائم رہ سکے۔ لیکن یہ بھی ایک عملی حقیقت ہے کہ ہمیشہ اس کرۂ ارض پر ایسی قوتیں رہی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی اس دنیا میں قدم نہ جما سکے۔ اس لیے کہ دنیا کے جس قدر غیر اسلامی نظام ہیں ان کے کچھ مفادات و امتیازات ہوتے ہیں' یہ نظام بعض کھوٹی اور جھوٹی قدروں پر قائم ہوتے ہیں' جب بھی دنیا میں اسلامی نظام قائم ہوا ہے ایسی قوتوں کے مفادات ختم ہو گئے ہیں۔ یہ باطل نظامہائے زندگی انسانی نفوس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور انسانوں کو انسانی سطح سے نیچے گرا کر اور ان کے اندر اخلاقی بگاڑ پیدا کر کے' اور ان کو حقیقت سے جاہل رکھ کر اسلامی نظام کی مخالفت میں لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ اور یوں عوام الناس اپنی جہالت کی وجہ سے اسلام کی راہ روکنے لگتے ہیں۔ شر کا زور ہوتا ہے اور باطل پھولا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور شیطان کی چالیں بہت گہری ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حاملین ایمان اور اسلامی منہاج حیات کے محافظین اور پاسداروں کے لیے اعلیٰ اخلاقی معیار تجویز کرتا ہے تاکہ وہ شر اور شیطان کے ایجنٹوں کا اچھی طرح مقابلہ کر سکیں۔ ان کی اخلاقی حالت مضبوط ہو' وہ دشمنوں کے خلاف لڑ سکیں۔ اور وہ ہر وقت ایسی جنگ کے لیے تیار ہوں جو ان پر اسلام کے دشمن مسلط کر دیں۔ یہی ایک ضمانت ہے جس کی وجہ سے دعوت اسلامی کی راہ نہیں رکتی۔ جس کے ذریعہ سے اسلامی نظام قائم رہتا ہے۔ لوگوں کو اظہار رائے کی آزادی ملتی ہے۔ اور وہ اپنی مرضی کا نظام قائم کر سکتے ہیں۔

پھر یہ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد و قتال کرتے ہیں نہ اپنی ذات کے لیے لڑتے ہیں اور نہ ہی کسی رنگ کی عصبیت کے لیے لڑتے ہیں۔ نہ نسلی' نہ لسانی' نہ علاقائی اور نہ خاندانی عصبیت کے لیے۔ صرف اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔ اس لیے لڑتے ہیں کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" وہ جو صرف اس لیے لڑتا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو تو وہ اللہ کے راستے میں لڑتا ہے"۔

کلمۃ اللہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے احکام و مقاصد کے لیے اور اللہ کا ارادہ بھی یہی ہے کہ جس طرح یہ پوری کائنات اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور اللہ کے قانون قدرت کے مطابق چلتی ہے اسی طرح انسان بھی اللہ کے بھیجے ہوئے آخری اور مکمل نظام زندگی اور شریعت الٰہیہ کے مطابق چلے۔ اور یوں یہ پوری کائنات اور اس کے اندر پائے جانے والے سب انسان اللہ کے قانون کے مطابق چلیں۔ اور اللہ کے سوا کسی کا قانون اور شریعت نہ چلے۔

یہ ضروری تھا کہ بعض افراد نظام شریعت کی راہ روکیں' بعض طبقات اسلامی نظام کو قائم ہونے نہ دیں۔ بعض حکومتیں اسے اپنے لیے خطرہ سمجھیں اور اس کے سوا بھی چارہ نہ تھا کہ اسلام ان رکاوٹوں کو عبور کرے اور ان کا مقابلہ کرے۔ اور یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں پر جہاد و قتال فرض کیا گیا تاکہ اسلامی نظام کو قائم کیا جا سکے اور اسے قائم رکھا جا سکے۔ اور زمین کے اوپر اللہ کا کلمہ بلند ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ ان لوگوں کو محبوب سمجھتا ہے' جو اس کے راستے میں صف بندی سے لڑتے ہیں گویا وہ بنیان مرصوص ہیں۔

یہ ہے وہ حالت جس پر ہمیں بہت زیادہ غور کرنا چاہیے۔

الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِه صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ( ۶۱ : ۴ ) "جو اللہ کی راہ میں صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"۔ اگر مجاہدین اس حالت میں نہ ہوں تو شاید محبوب نہ ہوں۔ یہ ہر فرد کو بھی حکم ہے اور اجتماعی لحاظ سے بھی حکم ہے۔ یعنی ان کو اس طرح ہونا چاہئے کہ ان کی ایک مضبوط نظام والی جماعت ہو۔ اس لیے کہ جو قوتیں اسلام کی راہ میں روکتی ہیں وہ جماعتی اور اجتماعی قوت کی شکل میں ہوتی ہیں۔ اور اس کے خلاف پوری قوتوں کو جمع کرتی ہیں۔ لہٰذا اسلامی قوتوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے مقابلے میں جمع ہو کر نکلیں اور ملت واحد کی شکل میں آئیں۔ ایک پختہ دیوار کی شکل میں اور نہایت ہی منظم شکل میں نکلیں۔ ہم آہنگی سے نکلیں۔ لہٰذا یہ صورت کہ ایک انسان اکیلا اللہ کی بندگی کرے' اکیلا جہاد کرے' اکیلا زندگی بسر کرے' یہ ایسی صورت ہے' جو اس دین کے مزاج ہی کے خلاف ہے' حالت جہاد کے جو تقاضے ہوتے ہیں ان کے خلاف ہے اور اس کے بعد پوری زندگی کو کنٹرول کرنے کی جو صورت ہوتی ہے' اس کے خلاف ہے۔

یہ تصویر جو مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ یہاں پیش فرماتا ہے یہ دراصل مسلمانوں کے دین کی تصویر ہے۔ یہ تصویر دکھاتی ہے کہ مسلمانوں کے نشانات راہ کیا ہیں اور قرآن کریم ان کے لیے اجتماعی نظام کفالت و حمایت کس طرح تجویز کرتا ہے۔

صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ( ۶۱ : ۴ ) "ایک صف کی شکل میں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"۔ ایک ایسی دیوار جس کی اینٹیں ملی ہوئی ہیں' باہم پیوست ہیں اور ہر اینٹ اپنا فریضہ ادا کر رہی ہے اور ہر اینٹ اپنے مقام پر کھڑی ہے اور اپنا فریضہ ادا کر رہی ہے۔ اگر ایک اینٹ بھی نکال لی جائے تو پوری عمارت گر سکتی ہے۔ اسی طرح اگر اینٹ آگے ہو جائے' پیچھے ہو جائے یا اوپر والی اینٹ نیچے والی اینٹ سے جدا ہو جائے تو دیوار میں سوراخ ہو سکتا ہے۔ یہ سب باتیں جماعت کے افراد کے باہمی ربط کو متعین کرتی ہیں۔ جو ایک ہی سمت میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ یعنی وہ شعوری طور پر بھی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوں' فکر و نظر میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ ہمقدم ہوں' نظام میں بھی منظم ہوں جس طرح تسبیح کے دانے اور ہدف بھی ایک ہو۔

---ooo---

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ اسلامی انقلاب کا منہاج تمام دعوتوں میں ایک ہی رہا ہے۔ آدم علیہ السلام سے ادھر:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِىْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ؕ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۞ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِىْۤ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ

يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ
مُبِينٌ ﴿٦﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعَىٰ إِلَى الْإِسْلَامِ ۚ
وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٧﴾ يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ
۱ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ﴿٨﴾ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ
۹ ع وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ﴿٩﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
۹ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿١٠﴾ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ
وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ
لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١١﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي
مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١٢﴾
وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا ۖ نَصْرٌ مِنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٣﴾ يَا أَيُّهَا
الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنْصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ
أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ ۖ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ ۖ فَآمَنَتْ طَائِفَةٌ مِنْ
۲ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرَتْ طَائِفَةٌ ۖ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ
۵ ع فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ ﴿١٤﴾
۱۰

"اور یاد کرو موسیٰ ...... کی وہ بات جو اس نے اپنی قوم سے کہی تھی کہ "اے میری قوم کے لوگو' تم کیوں مجھے اذیت دیتے ہو' حالاں کہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں؟" پھر جب انہوں نے ٹیڑھ اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے' اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ اور یاد کرو عیسیٰ ابن مریم کی وہ بات جو اس نے کہی تھی کہ "اے بنی اسرائیل' میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں' تصدیق کرنے والا اس تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے' اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہو گا۔ مگر جب وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انہوں نے کہا یہ تو صریح دھوکا ہے۔ اب بھلا اس شخص سے بڑا

ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹے بہتان باندھے ' حالانکہ اسے اسلام (اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دینے) کی دعوت دی جا رہی ہو؟ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا یہ لوگ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں ' اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا پھیلا کر رہے گا خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو ' میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمہیں عذاب الیم سے بچا دے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر ' اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا ' اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ' اور ابدی قیام کی جنتوں میں بہترین گھر تمہیں عطا فرمائے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔ اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو ' وہ بھی تمہیں دے گا ' اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح۔ اے نبی اہل ایمان کو اس کی بشارت دے دو۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو ' اللہ کے مددگار بنو ' جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں کو خطاب کر کے کہا تھا: "کون ہے اللہ کی طرف (بلانے) میں میرا مددگار؟" اور حواریوں نے جواب دیا تھا: "ہم ہیں اللہ کے مددگار"۔ اس وقت بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے گروہ نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلے میں تائید کی اور وہی غالب ہو کر رہے"۔

بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰ کو ایذا دینا ' جبکہ آپ ان کو اور اس ملت کو فرعون کے مظالم سے چھڑانے والے تھے ' آپ ان کے رسول اور قائد تھے اور معلم تھے ' ایک ایسی داستان کی طرف اشارہ ہے جو مسلسل ان کو دی جانے والی ایذا پر مشتمل ہے۔ آپ نے اس قوم کو درست کرنے کے لیے جو مشقتیں اٹھائیں اور دشوارگزار مراحل سے گزرے ' وہ انتھک جدوجہد ہے۔ اور قرآن کریم نے اس کی خوب تفصیلات دی ہیں ' جن کو پڑھ کر ایک شخص تسلیم کر لیتا ہے کہ یہ ان تھک جدوجہد تھی اور آپ اولوالعزم رسولوں میں سے تھے۔

ان کی حالت یہ تھی یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو ذلت سے نجات دینے کی جدوجہد کر رہے تھے اور فرعون کی گرفت اور جباری و قہاری کا مقابلہ کر رہے تھے لیکن یہ لوگ اس ذلت میں بھی امن وچین سے رہنا پسند نہیں کرتے تھے اور اس حالت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تنقید کرتے تھے۔ وہ اس ان تھک جدوجہد پر یہ تبصرہ کرتے تھے۔

أُوذِينَا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا (۷ : ۱۲۹) "ہمیں اذیت دی گئی قبل اس کے کہ آپ ہمارے پاس آئیں اور اس کے بعد بھی جبکہ آپ آگئے"۔ گویا وہ آپ کی رسالت میں اپنے لیے کوئی خیر نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ وہ اپنی اذیت کی وجہ اس رسالت کو سمجھتے تھے۔

لیکن جونہی اللہ نے فرعون کو غرق کیا اور بنی اسرائیل کو نجات دی اور یہ سب منظر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ' نجات پاتے ہی انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت توحید کو ترک کرنے کا ارادہ کر لیا اور قوم فرعون کی طرح ' شرک کرنے کا ارادہ کیا۔

فَأَتَوْا عَلَىٰ قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَىٰ أَصْنَامٍ لَهُمْ قَالُوا يَا مُوسَى اجْعَلْ لَنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ

اٰلِھَةٌ (۷:۱۳۸) "پھر وہ چلے اور راستے میں ایک ایسی قوم پر ان کا گزر ہوا جو اپنے چند بتوں کی گرویدہ بنی ہوئی تھی۔ کہنے لگے "اے موسیٰ ہمارے لیے بھی کوئی ایسا معبود بنا دے جیسے ان کے لیے معبود ہیں"۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کی ملاقات کے لیے پہاڑ پر گئے جہاں سے انہیں تورات کی تختیاں دی گئیں' ان کے جاتے ہی سامری نے انہیں گمراہ کر دیا۔

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى

فَنَسِيَ (۲۰:۸۸) "اور ان کے لیے سامری نے ایک بچھڑے کی مورت بنا کر نکال لایا جس سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ لوگ پکار اٹھے یہی ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا۔ موسیٰ اسے بھول گیا"۔

پھر انہوں نے اس طعام پر اعتراضات شروع کر دیے جو انہیں صحرا میں من اور سلویٰ کی شکل میں ملتا تھا اور کہا

يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ

مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا (۲:۶۱) "اے موسیٰ ...... ہم ایک ہی کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ اپنے رب سے دعا کر کہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار ساگ' ترکاری' گیہوں' لہسن پیاز اور دال وغیرہ پیدا کرے"۔

اس کے بعد جب ان کو گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تو وہ بہانہ سازی اور گستاخی کرنے لگے۔ یہ گستاخی نبی کے حق میں بھی تھی اور رب تعالیٰ کے حق میں بھی۔ کہنے لگے: اپنے رب کو پکارو کہ وہ کیسی ہو' اس کا رنگ کیسا ہو۔

فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ (۲:۷۱) "پھر انہوں نے اسے ذبح کیا ورنہ وہ ایسا کرتے نہ معلوم ہوتے تھے"۔

اس کے بعد انہوں نے سبت کو بطور یوم تعطیل خود مطالبہ کیا اور پھر اس کی خلاف ورزی کی۔ پھر ان کو حکم دیا گیا کہ اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے۔ تو انہوں نے ذلیل و خوار ہو کر ارض مقدس میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنْ

يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ (۵:۲۲) "انہوں نے کہا اے موسیٰ وہاں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں۔ ہم وہاں ہرگز نہ جائیں گے' جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں' ہاں اگر وہ نکل گئے تو ہم داخل ہونے کے لیے تیار ہیں اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اصرار کیا تو ان کا جواب یہ تھا:

قَالُوْا يٰمُوْسٰى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ

فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (۵ : ۲۲) "اے موسیٰ، ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے، جب تک وہ وہاں موجود ہیں۔ بس تم اور تمہارا رب دونوں جاؤ اور لڑو۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں"۔

اس کے علاوہ بار بار کی نافرمانیوں، سوالات، سرکشی اور ذاتی تہمتوں کے ذریعہ ان لوگوں نے بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اذیت دی۔ جن کی تفصیلات احادیث میں آتی ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول نقل کرتا ہے جو محبت بھرے لہجے میں ان سے ایک گلہ ہے۔

یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ (۶۱ : ۵) "اے میری قوم کے لوگو، تم کیوں مجھے اذیت دیتے ہو حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں"۔ اور ان کو اس بارے میں شک نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن ان کی یہ بات گلہ ہے جس میں عتاب بھی ہے اور نصیحت بھی ہے۔

لیکن جب انہوں نے اصلاح و استقامت کی تمام کوششوں کو نظرانداز کر دیا تو اللہ نے ان کے دلوں کو مزید ٹیڑھا کر دیا۔ اور ان کے یہ دل ہدایت کے لیے قابل ہی نہ رہے۔ یہ گمراہ ہو گئے اور اللہ نے بھی ان کے لیے ضلالت لکھ دی۔

---○○○---

وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ (۶۱ : ۵) "اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا"۔ یوں دین پر ان کی استقامت ختم ہو گئی اور ان سے محافظین دین کا منصب چلا گیا اور وہ اسی طرح ٹیڑھی راہ اور گمراہی پر رہے۔

اس کے بعد عیسیٰ ابن مریم تشریف لائے اور انہوں نے بنی اسرائیل سے کہا:

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ (۶۱ : ۶) "اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں"۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میں اللہ ہوں، اور نہ یہ کہا کہ میں اللہ کا بیٹا ہوں، نہ یہ کہا کہ وہ اللہ کے اقانیم میں سے ایک اقنوم ہیں۔

مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (۶۱ : ۶) "تصدیق کرنے والا ہوں اس تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے۔ اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہو گا"۔ یوں صریح الفاظ میں رسالت کی تصویر پیش کی جاتی ہے کہ سلسلہ رسالت ایک ہی ہے اور ہر رسول کے بعد جو دوسرا رسول آتا ہے وہ سابقہ رسول کی رسالت کی تصدیق کرتا ہے۔ یوں اس ایک ہی رسالت کے حلقے زمین و آسمان کے درمیان اور زمین کی طویل تاریخ کے اوپر پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور یہی تصویر اللہ کے منہاج حق کے لائق ہے۔ یہ ایک ہی دین اور ایک ہی منہاج ہے۔ اور اس شکل و صورت مختلف لوگوں کے لیے مختلف رہی ہے کیونکہ انسان مختلف ادوار میں علم، تجربات اور استعداد کے لحاظ سے مختلف رہا، اس لیے شریعت کی شکل بھی مختلف رہی ہے، لیکن نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو عقلی

اعتبار سے ایک بالغ امت دی گئی ' اس لیے آپ کو ایک آخری اور مکمل شریعت دی گئی ۔ ایک پختہ عقل امت کو مکمل شریعت دی گئی ۔ اس دین نے انسانی عقل سے اپیل کی ۔ اور عقل کے کام کے لیے ایک وسیع دائرہ عمل چھوڑ دیا تاکہ اس کے اندر وہ کام کرے ' لیکن پوری انسانیت کے لیے ایک دائرہ کار بہرحال متعین کر دیا گیا تاکہ اس کے اندر وہ کام کرے اور اس دائرے کا تعین انسان کی قوت اور استعداد کو دیکھتے ہوئے خالق کائنات نے خود کیا ۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے انجیل میں احمد کی پیش گوئی موجود تھی ۔ آج جو اناجیل رائج ہیں ان میں ہو یا نہ ہو ۔ کیونکہ یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ موجودہ اناجیل ' بعد کے ادوار میں لکھی گئی ہیں ' اور جن حالات میں لکھی گئی ہیں وہ بھی معلوم ہیں ۔

قرآن کریم جب جزیرۃ العرب میں نازل ہوا اور یہود و نصاریٰ نے بھی پڑھا ۔ جس میں تھا ۔

اَلنَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰاةِ وَالْاِنْجِیْلِ "نبی امی جسے وہ اپنے ہاں تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں" ۔ تو ان میں سے بعض مخلص علماء نے اس کا اقرار بھی کیا جیسا کہ عبداللہ ابن سلام نے ۔ اس لیے کہ یہ لوگ اس آیت کے چھپانے کا سخت اہتمام کرتے تھے ۔

پھر تاریخی روایات متواتر ہیں کہ یہودی اس نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا انتظار کرتے تھے اور وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ اس کا زمانہ قریب آگیا ہے ۔ اسی طرح نصاریٰ میں سے بعض اہل توحید جو جزیرۃ العرب میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے موجود تھے ' انہوں نے بھی اس کی تصدیق کی ۔ لیکن یہودی یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ یہ نبی آخر الزمان ان میں سے ہو گا جب اللہ نے اسے حضرت ابراہیم کی اولاد کی دوسری شاخ بنی اسماعیل سے بھیج دیا ' انہوں نے اس کو بہت ناپسند کیا ۔ اور اس کے ساتھ جنگ شروع کر دی ۔

بہرحال نص قرآنی بذات خود اس معاملے میں قطعی ہے ۔ اور قرآن ہی ایک معتمد علیہ ذریعہ ہے ' جس کے اندر کوئی تحریف نہیں ہوتی ' جبکہ تورات اور انجیل کا حال تو سب کو معلوم ہے ۔

---

چنانچہ اکثر تفسیری اقوال کے مطابق درج ذیل آیات اس بارے میں ہیں کہ یہود و نصاریٰ نے اس پیغمبر کا استقبال کس طرح کیا جس کی بشارت خود ان کی کتابوں میں دی گئی تھی ۔ ان آیات میں ان کے رویے کی سخت مذمت کی گئی ' کہ انہوں نے اس دین کا استقبال کرنے کے بجائے ' اس کے خلاف سازشیں شروع کر دیں حالانکہ اللہ کا فیصلہ یہی ہے کہ یہ دین تمام ادیان پر غالب ہو گا اور یہی آخری دین ہے ۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (۶) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ یُدْعٰۤی اِلَی الْاِسْلَامِ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۷) یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۸) هُوَ الَّذِیْۤ

اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ

(۹) (۶۱: ۶ تا ۹) "مگر جب وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انہوں نے کہا یہ تو صریح دھوکا ہے۔ اب بھلا اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹے بہتان باندھے 'حالانکہ اسے اسلام (اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دینے) کی دعوت دی جا رہی ہو؟ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا یہ لوگ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں 'اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا پھیلا کر رہے گا خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔

بنی اسرائیل اس دین جدید کے مقابلے میں صف آرا ہو گئے۔ دشمنی' سازشیں اور گمراہ کن پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ اور ہر قسم کے اوچھے ہتھیار اس کے مقابلے میں لے کر آ گئے اور اس دین کے خلاف انہوں نے جو جنگ شروع کی وہ آج تک ختم نہیں ہوئی۔ انہوں نے سب سے پہلے اس پر یہ الزام لگایا۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (۶۱: ۶) "جب وہ ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انہوں نے کہا یہ تو صریح جادو ہے"۔ جس طرح ان لوگوں نے کہا جو کتابوں کو نہ جانتے تھے' نہ بشارتوں کو جانتے تھے۔ اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کا رویہ ایک ہی جیسا رہا۔ بلکہ اہل کتاب اسلامی محاذ کے اندر بھی سازشیں شروع کر دیں۔ مہاجرین اور انصار کو لڑانے کی کوشش کی۔ اور انصار کے دو قبائل اوس اور خزرج کو لڑانے کی کوشش کی۔ کبھی انہوں نے مشرکین مکہ سے ایکا کر کے اس نئے دین کے خلاف جنگ کی اور کبھی انہوں نے منافقین مدینہ کے ساتھ اتحاد کر کے اس کے خلاف لڑنے کی سعی کی۔ اور انہوں نے مدینہ اور عالم اسلام پر ہر حملہ آور کی مدد کی۔ مثلاً غزوہ احزاب میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے جھوٹے الزامات لگا کر بھی اس میں حصہ لیا۔ جبکہ افک کے واقعہ کو انہوں نے عبداللہ ابن ابی ابن سلول کے ذریعہ خوب اچھالا اور فتنہ عثمان میں بھی انہوں نے عبداللہ ابن سبا کے ذریعہ کام کیا۔ پھر سیرت کی کتابوں میں انہوں نے منظم سازش کے ذریعہ اسرائیلیات کو داخل کیا۔ جب وہ قرآن کے اندر جعلی آیات داخل ہونے سے عاجز ہو گئے تو انہوں نے تفسیر' سیرت اور احادیث کے اندر وضعی احادیث داخل کرنے کی سعی کی۔

یہ جنگ 'اسلام کے خلاف' آج تک ختم نہیں ہوئی۔ آج تک عالمی یہودیت' عالمی عیسائیت اور صیہونیت اسلام کے خلاف رات دن سازشوں میں مصروف ہے۔ یہ ہر طرف سے اسلام پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور لوگوں کو بھی اسلام کے خلاف جنگ پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس جنگ میں چودہ سو سال سے نہ جنگ بندی ہوئی ہے' نہ صلح ہوئی ہے 'کسی دور میں بھی نہیں۔ مشرق میں جا کر انہوں نے صلیبی جنگیں لڑیں۔ مغرب میں اندلس میں انہوں نے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دیا۔ اور مشرق اوسط میں انہوں نے ہمیشہ اسلامی خلافت کے خلاف جنگ کی۔ یہاں تک کہ ترکی کی خلافت کو انہوں نے تباہ کیا اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ اس کے بعد بھی ان کی یہ جنگ ختم نہ ہوئی اور انہوں نے جعلی "ہیرو" اسلام اور عالم اسلام کے لیے پیدا کیے اور ان کے ذریعہ انہوں نے اسلام کے خلاف اپنی انتقامی پیاس کو بجھایا۔ جب انہوں نے اسلام کی آخری نشانی خلافت اسلامیہ ترکیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہا تو انہوں نے ترکی میں ایک عظیم ہیرو پیدا کیا اور اس

کے اندر اس قدر ہوا بھری کہ وہ بہت بڑا زعیم بن گیا۔ اس کے بعد اس کے مقابلے میں اتحادیوں کی فوجوں نے پسپائی اختیار کی، جنہوں نے آستانہ کو فتح کر لیا تھا تاکہ اس شخص کو بہت بڑا فاتح بنا کر پیش کیا جا سکے۔ ایک ایسا فاتح جو خلافت اسلامیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکے۔ اس نے ترکی کو عالم اسلام سے جدا کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ ترکی لادینی ریاست ہے۔ اس کا دین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب بھی یہودی اسلام پر ضرب لگانا چاہیں وہ عالم اسلام کے لیے اس قسم کے لیڈر پیدا کرتے ہیں۔ جب بھی وہ صحیح اسلامی تحریکات پر ضرب لگاتے ہیں، وہ مسلمان ممالک میں اس قسم کے لیڈر پیدا کرتے ہیں ان کے ذریعہ یہ ان ممالک میں اسلامی حمیت اور اسلامی عصبیت کے علاوہ ہر عصبیت پیدا کرتے ہیں، اسلامی جھنڈوں کے علاوہ ہر جھنڈا بلند کرتے ہیں۔

يُرِيدُونَ لِيُطْفِـُٔوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (۶۱: ۸) "یہ لوگ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں، اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پھیلا کر رہے گا خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔ قرآن کی یہ آیت ایک عظیم حقیقت کا اظہار کر رہی ہے۔ اور اس حقیقت کو ایک ایسی تصویری انداز میں پیش کیا گیا جس سے انسان کو ان لوگوں کی حالت پر بے اختیار ہنسی آتی ہے وہ اپنے منہ سے یہ الزام لگاتے تھے کہ یہ کھلا جادو ہے، اور اس کے خلاف یہ سازشیں کرتے تھے اور خفیہ منصوبے بنا کر اسے ختم کرنا چاہتے تھے اور اس جدید دین کا قصہ ہی تمام کرنا چاہتے تھے، اس لیے اللہ نے ان کے منصوبوں کے مقابلے میں ان کی یہ مایوس کن تصویر کھینچی کہ وہ اللہ کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں۔ اللہ کا نور اور یہ ضعیف اور حقیر!!

وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (۶۱: ۸) "اور اللہ اپنے نور کو پوری طرح پھیلا کر رہے گا، اگرچہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار گزرے"۔ اللہ کا وعدہ سچا ہوا۔ اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اپنے نور کو پوری طرح پھیلا دیا۔ اس نے ایک اسلامی جماعت، نہایت ہی زندہ و تابندہ اسلامی جماعت کھڑی کر دی۔ اور اسے اسلامی نظام زندگی نہایت ہی واضح نشانات کے ساتھ دیا۔ اور اس کے حدود و قیود متعین کیے۔ نسلوں تک یہ نظریہ لوگوں کی عملی زندگی میں زندہ اور متحرک رہا، صرف کتابوں میں نہیں، اللہ نے اسے عالم واقعہ میں غالب کیا۔ اللہ پاک نے اس نور کو مکمل کیا، مسلمانوں کا دین مکمل ہوا، مسلمانوں پر اپنی نعمتوں کو تمام کیا۔ اور ان کے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔ ان کے لیے اس دین کو محبوب بنا دیا، وہ اس کے لیے لڑتے رہے، حالت یوں ہو گئی کہ اگر کسی مسلمان کو آگ میں ڈال دیا جائے تو وہ اسے پسند کرے گا مگر کفر کی طرف لوٹنا پسند نہ کرتا تھا۔ چنانچہ دین کی صورت لوگوں کے دلوں میں مکمل ہو گئی۔ اور آپ کے بعد بھی یہ صورت حال کبھی کبھی پیدا ہوتی رہتی ہے اور قائم رہتی ہے۔ باوجود کہ اس کے کہ ہر طرف سے مسلمانوں کے خلاف سازشیں، سٹے اور پکڑ دھکڑ شروع ہے۔ باوجود ہر طرف کے حملوں کے اسلام ہر کربلا کے بعد زندہ ہوتا ہے اس لیے کہ اسلام اللہ کا نور ہے اور اللہ کے نور کو انسانی کوششیں ختم نہیں کر سکتیں۔ نہ آگ اور لوہا اس کو ختم کر سکتا ہے۔ اگرچہ عالم اسلام کے مصنوعی لیڈر جو یہودیوں اور نصرانیوں کے خود ساختہ لیڈر ہیں۔ بعض اوقات یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اسلام کو ختم کر دیا ہے اور اس کا

نور بجھا دیا ہے ۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا اللہ کا فیصلہ یہ تھا کہ نور خدا پھیل جائے اور دین غالب ہو ۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۶۱ : ۹) "وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو" ۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اسلامی نظام زندگی ہدایت ہے اور دین حق ہے ۔ یہ ایک فیصلہ کن بات ہے اور اس پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا ۔ اللہ کا ارادہ پورا ہو گیا اور یہ دین تمام ادیان پر غالب ہو گیا ہے ۔ یہ دین اپنی ذات اور اپنی تشکیل کے لحاظ سے واحد دین ہے ' اس کے مقابل کا کوئی دین نہیں ہے ۔ مثلاً دنیا کے بت پرستانہ ادیان کے اندر تو مقابلے کی کوئی بات ہی نہیں ہے ۔ رہے کتابی دین تو یہ اسی سلسلے کا آخری اور مکمل دین ہے ' اور اللہ کے نظام کا یہ آخری ایڈیشن ہے ۔ یہ اپنی مکمل اور اعلیٰ صورت میں ہے ۔

سابقہ کتب سماوی کے اندر بے شمار تحریفات کر دی گئی ہیں ' ان کی شکل بدل گئی ہے اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں اور ان میں وہ اضافے ہو گئے ہیں جو ان میں نہ تھے ۔ ان کے اندر کانٹ چھانٹ کر دی گئی ہے ۔ پھر وہ اس حالت تک پہنچ گئی ہیں کہ وہ آج جدید دور کی زندگی کی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتیں ۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ان کے اندر تحریف نہیں ہوئی تو بھی وہ سابقہ ایڈیشن ہیں جبکہ دین اسلام اللہ کے نظام کا آخری اور تازہ ترین نسخہ ہے جس کے اندر جدید ترقی یافتہ زندگی کے تمام مسائل حل کر دیئے گئے ہیں ۔ سابقہ ادیان اللہ کی اسکیم کے مطابق ایک محدود وقت کے لیے آئے تھے ۔

اللہ کا یہ وعدہ نفس دین اور اس کی نوعیت اور اس کے احکام و مواد کے اعتبار سے تو پورا ہوا کہ دین اسلام کے مقابلے کا کوئی دین نہیں ہے لیکن یہ نظام عملی زندگی میں بھی ایک غالب نظام رہا ہے ۔ ایک بار تو یہ دین غالب ہو کر رہا ہے ۔ یہ اس کرۂ ارض پر اس قدر غالب ہوا کہ تمام ادیان ' تمام اقوام تقریباً ایک سو سال تک اس کے زیر نگیں رہے ۔ اس کے بعد بھی یہ دین وسط ایشیا اور وسط افریقہ میں سیلاب کی طرح پھیل گیا ۔ یہاں تک کہ ابتدائی جہادی جدوجہد کے ذریعہ اس کے اندر جس قدر لوگ داخل ہوئے اس کے بعد محض تبلیغی جدوجہد کے ذریعہ اپنی ذاتی قوت سے یہ دین پانچ گنا علاقے اور آبادی میں پھیل گیا ۔ آج بھی یہ دین بغیر حکومتی قوتوں کے پھیل رہا ہے ۔ حالانکہ یہودی اور صیہونی سازش نے اہل دین کے سیاسی نظام ' نظام خلافت کو ختم کر دیا ہے ۔ یہ نظام ان لوگوں نے ترکی میں اس ہیرو کے ہاتھوں ختم کرایا جسے اس مقصد کے لیے انہوں نے خود گھڑا تھا ۔ اور باوجود اس کے کہ پورے عالم اسلام میں اس دین کے خلاف رات دن سازشیں ہو رہی ہیں اور پورے عالم اسلام میں یہودیوں کے ہاتھوں نصب کردہ "ہیرو" عالم اسلام میں اٹھنے والی اسلامی تحریکات کچل رہے ہیں لیکن یہ اللہ کا چراغ ہے اور پھونکوں سے اسے بجھایا نہیں جا سکتا ۔

غرض باوجود اپنوں اور غیروں کی سازشوں کے یہ دین انسانی تاریخ میں اب بھی اہم کردار سرانجام دے رہا ہے اور پہلے بھی اس نے ادا کیا ہے ۔ اور انسانی سازشیں اس کی راہ نہیں روک سکتیں ۔ کیونکہ اللہ کے مقابلے میں انسان کی قوت کوئی قوت نہیں ہے ۔ اگرچہ وہ بہت گہری چال چلیں کیونکہ اللہ بھی گہری چال چلتا ہے ۔

یہ آیات اس وقت اہل ایمان کے حوصلے بڑھا رہی تھیں جب قرآن کے ابتدائی سامعین یہود و نصاریٰ کی کوششوں اور سازشوں کے علی الرغم غلبہ دین کی جدوجہد کر رہے تھے اس وقت بھی دین کو تو اللہ غالب کر رہا تھا ' مسلمان تو دست

قدرت کے لیے ایک پردہ اور بہانہ تھے۔ اور آج بھی یہ آیات ان لوگوں کے لیے ایک حوصلہ پیدا کر رہی ہیں جو غلبہ دین کا کام کر رہے ہیں اور آئندہ بھی غلبہ دین کے لیے اٹھنے والی تحریکات کے لیے یہ آیات مشعل راہ ہوں گی اور وہ دن دور نہیں ہے کہ ایک بار پھر یہ دین غالب ہو کر رہے گا۔

---ooo---

اسلامی نظریہ حیات کے تسلسل کے بیان کے بعد' اور اس وعدے کے بعد کہ اس دین کو غالب ہو کر رہنا ہے۔ اگرچہ کافر اس کے خلاف سازشیں کریں' اب روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے۔ اس وقت کے مسلمانوں کو بھی خطاب ہے۔ اور اس کے بعد قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو بھی یہ خطاب ہے کہ مسلمانو' اس دین کی رو سے ایک بہترین تجارت تمہیں بتائی جا رہی ہے' یہ تجارت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۱۰) تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۱) يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۲) وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۳) (۶۱: ۱۰ تا ۱۳)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمہیں عذاب الیم سے بچا دے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر' اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا' اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی' اور ابدی قیام کی جنتوں میں بہترین گھر تمہیں عطا فرمائے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔ اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو' وہ بھی تمہیں دے گا' اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح۔ اے نبی اہل ایمان کو اس کی بشارت دے دو"۔

ذرا انداز تعبیر پر غور فرمائیں۔ بعض چیزوں کو باہم ملایا گیا' بعض کو اپنی جگہ سے دور رکھا گیا ہے۔ استفہام اور جواب استفہام کے درمیان ایک فاصلہ رکھا گیا ہے۔ بعض چیزوں کو مقدم کیا گیا ہے اور بعض کو موخر کر دیا گیا ہے' ان سب امور کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ پکار اور یہ آواز اچھی طرح لوگوں کے دلوں کے اندر اتر جائے اور اسالیب تعبیر کے تمام ذرائع استعمال کر کے بات کو دلوں تک بلکہ دلوں کی تہوں تک اتارا جائے۔

دیکھیے پکار کا آغاز۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۶۱: ۱۰) سے ہے' اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اور اس کے بعد اللہ ان سے

پوچھتا ہے کہ بتاؤں تمہیں ایسی تجارت؟ اس سے سامعین کے دلوں میں بھرپور شوق پیدا کیا جاتا ہے۔

هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۱۰:۶۱) "میں بتاؤں تمہیں وہ تجارت جو تمہیں عذاب الیم سے نجات دے دے؟"

اب کون ہے جو اس قسم کی تجارت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بے تاب نہ ہو گا۔ لیکن یہاں آیت ختم ہو جاتی ہے اور درمیان میں فصل آ جاتی ہے۔ استفہام اور جواب استفہام کے درمیان آیت ختم ہو کر وقف آ جاتا ہے اور سامع کے دل میں اگلی آیت سننے کے لیے بے تابی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جواب آتا ہے جبکہ سامعین بے تاب تھے۔

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۱۱:۶۱) "ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر"۔ وہ تو اللہ اور رسول پر ایمان لا چکے تھے۔ اور وہ جب جواب سنتے ہیں تو ان کے دل روشن ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ جواب شرط تو پہلے سے ان کے اندر موجود ہے۔

وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ (۱۱:۶۱) "اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے"۔ اور یہی اس سورت کا مضمون اور محور ہے۔ اس انداز میں یہ آ رہا ہے' بار بار تکرار کے ساتھ' اس طرح اسے مضمون کے اندر بار بار دہرایا جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اللہ کو معلوم تھا کہ انسان کو تربیت دینے کے لیے بار بار کی یاد دہانی کی ضرورت ہے۔ مختلف انواع و دلائل اور مختلف قسم کی تائید و تاکید کے ساتھ تاکہ اس قدر پر مشقت فرائض کی ادائیگی کے لئے نفس انسانی تیار ہو جائے۔ کیونکہ اس قسم کے پر مشقت فرائض کی ادائیگی کے بغیر نہ اسلامی منہاج یہاں زندہ رہ سکتا ہے اور نہ اس کو بچایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اس تجارت پر مزید تبصرہ کیا جاتا ہے اور اس تجارت کی تعریف و تحسین کی جاتی ہے۔

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۱:۶۱) "یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو"۔ اس لیے کہ انسان کسی بھلائی کی طرف تب ہی لپکتا ہے جب اسے علم ہو کہ بھلائی یہ ہے۔ اس کے بعد اگلی آیات میں اس بھلائی اور تجارت کی مزید تفصیلات دی جاتی ہیں۔ کیونکہ اجمال کے بعد تفصیلات کا اثر بہت ہوتا ہے۔ اس طرح بات احساس میں مستقلاً بیٹھ جاتی ہے۔

يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (۱۲:۶۱) "اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا"۔ اس تجارت اور بھلائی کی یہ ایک بات ہی کافی ہے۔ اگر اس کے بعد کوئی اور کیا چاہے گا کہ اس کے گناہ معاف ہو جائیں یا اپنے لیے اور کیا ذخیرہ کرے گا۔ لیکن اللہ کے فضل و کرم کی حدود نہیں ہوتیں اس لیے۔

وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ

"اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی' اور ابدی قیام کی جنتوں میں بہترین گھر تمہیں عطا فرمائے گا"۔ اس سے بڑی تجارت اور کیا ہے کہ ایک مجاہد اپنی اس مختصر زندگی میں جہاد کرے' وہ اپنی جان دے دے اور اس کے عوض اسے یہ باغات اور ابدی زندگی ملے اور بہترین مکانات اور نعیم مقیم میں رہے۔ اور یہ عظیم حقیقت ہے کہ یہی بڑی کامیابی ہے۔

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (۶۱ : ۱۲) "یہ ہے عظیم کامرانی"یہاں آکر اس نہایت ہی نفع بخش تجارت کا سودا ختم ہو گیا۔ فی الواقعہ یہ تو بہت بڑا نفع ہے۔ کہ ایک مومن مختصر دنیا دے کر ابدی آخرت لے لے۔ اگر کوئی ایک روپے کی تجارت کرکے دس کما لے تو بازار میں اس کا چرچا ہو جاتا ہے' لیکن اس شخص کا حال کیا ہو گا کہ وہ اس دنیا کی محدود زندگی میں جہاد کرے اور دنیا کا محدود متاع دے دے اور آخرت کا لامحدود زمانہ مزے کرے اور آخرت کا متاع وعیش حاصل کرے' جو لامحدود اور لامقطوع ہے۔

یہ سودا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت عبداللہ ابن رواحہ رضی اللہ عنہ کے درمیان ہوا تھا۔ یہ عقبہ کی رات کو ہوا تھا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ آپ ﷺ اپنے لیے جو چاہیں' شرائط رکھ لیں۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ رب کے لیے میں یہ شرائط عائد کرتا ہوں کہ تم اس کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اور اپنے لیے میں یہ شرط عائد کرتا ہوں کہ تم میرا دفاع اس طرح کرو گے جس طرح تم اپنے مال اور جان کا دفاع کرتے ہو"۔ تو انہوں نے کہا کہ اگر ہم نے ایسا کیا تو ہمیں کیا ملے گا۔ تو آپ نے فرمایا۔

(الجنۃ) تو انہوں نے کہا اس سودے میں بہت بڑا فائدہ ہو گیا ہمیں' نہ ہم اس سودے کو منسوخ کرتے ہیں اور نہ فریق دوئم کی درخواست اس سلسلے میں مانتے ہیں۔

لیکن اللہ کا فضل تو بہت عظیم ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ انسانی نفوس اس جہاں میں بھی کچھ چاہتے ہیں۔ انسان کی محدود ساخت چاہتی ہے کہ اس جہاں میں بھی کچھ مزا ملے تو اللہ تعالیٰ ان کو خوشخبری دیتا ہے کہ اس جہاں میں بھی تمہیں فتح مبین اور غلبہ دین حاصل ہو گا۔ اور اسلامی نظام زندگی قائم ہو کر رہے گا۔ اور تمہاری نسل کے اندر ہو کر رہے گا۔

وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا ۖ نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ (۶۱ : ۱۳) "اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو' وہ بھی تمہیں دے گا۔ اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح۔ اے نبی' اہل ایمان کو اس کی بشارت دے دو"۔

یہ سودا یہاں شرح منافع کی انتہاؤں کو چھو لیتا ہے۔ اور یہ منافع اللہ ہی دے سکتا ہے۔ وہ اللہ جس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہے' وہ اللہ جس کی رحمت کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ رحمتیں کیا ہیں' مغفرت گناہ' باغات' بہترین مکانات' جن کے اندر نہ ختم ہونے والی نعمتیں ہوں گی اور اس سودے کا منافع صرف آخرت ہی میں نہیں بلکہ ان کی ایک قسط یہاں دنیا میں بھی دی جائے گی۔ اللہ کی نصرت اور غلبہ دین اور فتح مبین۔ کون ہے جو ایسی تجارت نہ کرے گا یا اس میں تامل کرے گا۔ یا اس سے پہلوتہی کرے گا۔

اس ترغیب اور تلقین کے بعد نفس انسانی کے تصور کا منظر آتا ہے۔ یہ تصور انسان کے لیے بہت اہم ہے۔ جو شخص اس کائنات اور اس کی اندر اس زندگی کا ایمانی تصور رکھتا ہو' اور وہ اپنے دل میں یہ تصور رکھتے ہوئے زندگی بسر کر رہا ہو' اس تصور کے وسیع آفاق اور حدود بھی رکھتا ہو' اس کے بعد یہ شخص اگر ایسی زندگی کے بارے میں سوچے جو ایمان سے خالی ہے۔ جو نہایت ہی محدود تنگ اور چھوٹی زندگی ہے' جس کی سطح بہت گری ہوئی ہے۔ جس کی اہم ترین باتیں نہایت ہی حقیر ہیں۔ تو اس قسم کا دل جس نے ایمان کی یہ وسعتیں دیکھی ہوئی ہیں وہ اس قدر محدود اور حقیر زندگی میں ایک منٹ کے لیے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ ایک منٹ بھی اس جہاد اور جدوجہد میں شرکت سے تاخیر نہ کرے گا' جس کا مقصد اس طرح کی وسعت والی زندگی کو اس کرۂ ارض پر قائم کرنا ہے' تاکہ اس میں وہ بھی زندہ رہے' اور لوگ بھی زندہ رہیں۔ اور پھر صورت یہ ہے کہ وہ اس جہاد اور جدوجہد پر کوئی اجر بھی طلب نہ کرتا ہو۔ کیونکہ یہ زندگی اور یہ نظام بذات خود ہی ایک مقصد اور اجر ہے۔ یہ نظریہ جہاد جو دل کو خوشی اور فرحت سے بھر دیتا ہے' اسے کون ترک کر سکتا ہے اور اس کے سوا کون زندہ رہ سکتا ہے۔ ایسا شخص دوڑ کر اس جہاد میں کود پڑتا ہے۔ آتش نمرود ہو تو بھی کود پڑتا ہے' جو بھی نتیجہ ہو' کود پڑتا ہے۔

لیکن دیکھیے اللہ کو معلوم ہے کہ نفس انسانی بہت ضعیف ہے' کسی وقت بھی اس کے جوش و خروش میں کمی آ سکتی ہے۔ اور یہ کہ جہاد میں تیزی کسی بھی وقت کند ہو سکتی ہے اور امن کوشی اور سلامت پسندی انسان کو بھی گری ہوئی زندگی گزارنے پر آمادہ کر سکتی ہے۔ اس لیے قرآن کریم ایک ہی اسلوب پر بات کر کے ختم نہیں کر دیتا۔ وہ نفس انسانی کو تیار کرنے کے لیے ہر پہلو سے سعی کرتا ہے۔ ہر قسم کے موثرات' دلائل' شواہد اور مثالیں دیتا ہے۔ بار بار پکارتا ہے اور انسان کو صرف ایمان اور افراد کے حوالے نہیں کر دیتا' نہ ہی صرف ایک بار حکم دے دیتا ہے جس طرح ایک سرکاری افسر سرکلر جاری کر دیتا ہے۔

---ooo---

چنانچہ سورت کا خاتمہ ایک نئی پکار سے ہوتا ہے۔ اس پکار کا نیا رنگ ہے۔ ایک جدید دلیل' ایک موثر مثال اور ایک نئے پہلو سے آمادگی اور اکسانا۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ فَآمَنَت طَّائِفَةٌ مِّن بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرَت طَّائِفَةٌ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَى عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ (۶۱ : ۱۴)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کے مددگار بنو' جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں کو خطاب کر کے کہا تھا: "کون ہے اللہ کی طرف (بلانے) میں میرا مددگار؟" اور حواریوں نے جواب دیا تھا: "ہم ہیں اللہ کے مددگار"۔ اس وقت بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے گروہ نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلے میں تائید کی اور وہی غالب ہو کر رہے"۔

حواری کون تھے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگرد۔ یہ تعداد میں ۱۲ تھے۔ یہ ہروقت آپ کے ساتھ ہوتے تھے اور آپ سے تعلیمات لیتے تھے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے آپ کے اٹھائے جانے کے بعد آپ کی وصیتوں اور آپ کی تعلیمات کو پھیلایا۔

آیت کا مقصد ان کے حالات زندگی بیان کرنا نہیں ہے بلکہ انہوں نے دعوت کے حوالے سے جو موقف اختیار کیا' اسے پیش کرنا ہے' لہٰذا ہم بھی یہاں اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ (۱۴:۶۱) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کے مددگار بنو"۔ کس قدر بلند مقام تک اللہ اپنے مجاہد بندوں کو لے جاتا ہے۔ انسان کے لیے اس سے بڑا مقام اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ کا معاون ہو جائے۔ اس صفت میں اتنی بڑی عزت افزائی ہے جو جنت اور اس کی نعمتوں سے بھی بڑی ہے۔ اللہ کے انصار بن جاؤ!

كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (۱۴:۶۱) "جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں کو خطاب کر کے کہا تھا: "کون ہے اللہ کی طرف (بلانے) میں میرا مددگار؟" اور حواریوں نے جواب دیا تھا: "ہم ہیں اللہ کے مددگار"۔ تو انہوں نے اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کر دیا اور یہ مقام عزت پایا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کے فرائض منصبی میں یہ بات شامل تھی کہ آپ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بشارت دیں اور دین آخیر کے بارے میں خوشخبری دیں۔ لہٰذا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متبعین اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ اس کام کے لیے آگے بڑھیں۔ جس طرح حواریوں نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ یہی اس حوالے میں آمادہ کرنے اور اکسانے والی بات ہے۔ اور پھر کیا ہوا انجام؟

فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ (۱۴:۶۱) "اس وقت بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے گروہ نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلے میں تائید کی اور وہی غالب ہو کر رہے"۔

اس آیت کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو لوگ حضرت مسیح کی نفس رسالت پر ایمان لائے تھے یعنی مسیحی چاہے ان کے عقائد درست ہوں یا بعد میں مشرک ہو گئے ہوں اور ان کے عقائد میں شدید انحرافات آگئے ہوں' ان کو اللہ نے ان لوگوں پر غالب کر دیا جو حضرت عیسیٰ کی رسالت ہی کو نہ مانتے تھے۔ یعنی یہودیوں پر جس طرح تاریخ شاہد ہے اور دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ لوگ جو ان کی رسالت پر ایمان لائے اور عقیدۂ توحید اور بشریت رسول پر بھی قائم رہے تو اللہ نے ان اہل توحید کی حجت اور برہان کے لحاظ سے تائید کی بمقابلہ ان لوگوں کے جو مشرک ہو گئے اور جنہوں نے حضرت مسیح کو الٰہ مانا' ان کی والدہ کو الٰہ مانا یا روح القدس کو الٰہ مانا' اور پھر ان اہل توحید کی تائید دین اسلام کے عقیدۂ توحید سے بھی ہوئی اور دین مسیح' دین اسلام کی شکل میں غالب ہو گیا' تو یہ دوسری تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

اس اشارہ اور اس واقعہ سے مراد عبرت یہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ۔یہ کہ مومنین کو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار کرنا جو اس سورت کا محور ہے ۔کیونکہ مومنین ہی اللہ کے دین کے قیام کے ذمہ دار ہیں ۔یہی وارث ہیں رسالت آخرہ کے ۔یہی وہ لوگ ہیں جن کو اس عظیم مقصد کے لیے نکالا گیا ہے ۔ان کو چاہئے کہ وہ اٹھیں اور اپنا فریضہ حیات پورا کریں ۔"جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا :کون ہے اللہ کی طرف بلانے میں میرا مددگار ۔ اور حواریون نے جواب دیا تھا :"ہم ہیں اللہ کے مددگار"۔اور آخرت کی نصرت اور فتح انہی لوگوں کی ہوتی ہے جو للہ کے مددگار اور اس کے دین کے خادم ہوتے ہیں۔

یہ اس سورت کی آخری پکار ہے ۔آخری چٹکی اور آخری اکساہٹ ہے ۔اس کا اپنا رنگ اور الگ ذائقہ ہے ۔اور یہ مثال اس سورت کے مضمون کے ساتھ نہایت ہی مناسب ہے ۔ایک تاریخی مثال اور تاریخی رنگ ۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ـــ ۲۸

## سورۃ الجمعة ـ ٦۲

## ا ـــ تا ـــ ١١

# سورۃ الجمعۃ ایک نظر میں

یہ سورت 'سورۃ الصف کے بعد نازل ہوئی ۔ موضوع اور محور وہی ہے جو سورہ صف کا ہے ۔ البتہ یہ اس موضوع کو ایک نئے پہلو اور ایک نئے انداز میں لے رہی ہے ۔ اور اس میں بالکل جدید دلائل دیئے گئے ۔ یہ سورت مدینہ کی جماعت مسلمہ کے ذہن میں یہ بات بٹھاتی ہے کہ دعوت اسلامی کو پھیلانے کے لیے ' اللہ نے جس جماعت کا انتخاب کیا ہے ' یہ آخری جماعت ہے ۔ اور یہ اس کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے ۔ اور اس پر خدا کا بہت بڑا فضل ہے کہ خاتم الانبیاء کو یہ خاتم الامم امت دی گئی ۔ پھر نبی آخرالزمان ' خاتم الانبیاء کا ' ایک امی امت عربوں کے اندر بھیجا جانا ' اللہ کا بہت بڑا کرم ہے اور اس کی قدر کرنی چاہئے ۔ پھر جب لوگوں کو اللہ نے یہ توفیق دی کہ وہ رسول کریم کی دعوت کو قبول کریں ' تو ان کو چاہئے کہ وہ اس امانت کو اٹھائیں اور اس کی ذمہ داریاں پوری کریں ۔ اور یہ احساس بھی کرنا چاہئے کہ ان کی ایک تاریخ ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی منشا یہ ہے کہ یہ بیج جو یہاں بویا گیا ہے ' یہ بڑھ جائے اور دور تک پھیل جائے ۔ جبکہ بنی اسرائیل جو اہل کتاب اور تعلیم یافتہ تھے ' انہوں نے اس امانت کو اٹھانے سے انکار کر دیا ہے اور انہوں نے ایک طویل عرصہ تک عالم بالا سے تعلق رکھنے کے باوجود ' اب اس تعلق کو توڑ دیا ہے ۔ اور ان کی مثال یوں ہے کہ تورات کو اٹھائے پھرتے ہیں لیکن اس طرح جس طرح گدھے پر کتابیں لاد دی جائیں ۔ وہ تورات کی تعلیمات کو سمجھتے ہیں اور نہ ان پر عمل کرتے ہیں ۔

یہ ہے وہ اصل موضوع اور محور جو اس سورت میں لیا گیا ہے ۔ اور یہ ہیں وہ باتیں جو اس سورت کے ذریعہ ' مسلمانوں کے دلوں میں بٹھانے کی سعی کی گئی ہے ۔ خصوصاً وہ لوگ جو اس وقت مدینہ طیبہ میں موجود تھے ۔ اور یہ وہ لوگ تھے جن کو یہ ڈیوٹی دی گئی تھی کہ تم نے اسلامی نظام حیات کو مدینہ میں عملاً برپا کرنا ہے اور ان تحریکات کی طرف بھی اس میں اشارہ کیا گیا جو مدینہ کی جماعت کے بعد یہ ذمہ داری قبول کریں گی ' وہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہوں گی ۔

اس سورت میں مدینہ کی جماعت مسلمہ کے بعض عملی حالات کو بھی لیا گیا ہے اور عملی ہدایات دی گئی ہیں ۔ خصوصاً جماعت کی نفسیاتی تربیت کے سلسلے میں ' اس سے بعض دینی اور اخلاقی کمزوریاں دور کرنا بھی مطلوب تھیں ۔ کسی جماعت کی ذہنی اور نفسیاتی تطہیر کوئی آسان کام نہیں ہے ۔ جذبات ' میلانات ' رکاوٹیں ' لالچ ' دنیاوی مفادات ' عرب کلچر کی موروثی عادات ' اور رسم و رواج ' خصوصاً دولت سمیٹنے کی عادات اور وہ تمام باتیں جو اس عظیم مشن اور عظیم بار امانت اٹھانے کی راہ میں حائل تھیں ۔ ان کو دور کرنا ایک مشکل کام تھا ۔ اس سلسلے میں ایک متعین واقعہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ ایک دن خطبہ جمعہ دے رہے تھے کہ تجارتی قافلوں میں سے ایک قافلہ پہنچ گیا ۔ جونہی اعلان ہوا کہ قافلہ آگیا ہے ' لوگ خطبہ جمع چھوڑ کر قافلے پر ٹوٹ پڑے ' اور خریداری کے کام میں لگ گئے ۔ خصوصاً قافلوں میں جو لہو ولعب ہوتے ہیں ' ایام جاہلیت کے رواج کے مطابق کہ قافلوں کے ساتھ دف بجانے والے اور دوسرے گانے بجانے والے بھی ہوتے تھے ' سب لوگ چلے گئے اور رسول اللہ کو کھڑا چھوڑ دیا ۔ صرف ۱۲ آدمی رہ گئے ' جن میں حضرت ابوبکر

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما موجود تھے۔اور آپ کی باتیں سنتے رہے' جیسا کہ روایات میں آتا ہے۔ہو سکتا ہے کہ لوگوں کی تعداد پوری طرح منضبط نہ کی جا سکی ہو۔بہرحال لوگوں نے یہ حرکت بہرحال کی 'جس پر قرآن کریم میں تنبیہ کی گئی۔

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں لوگوں کی تربیت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور قرآن کو کس قدر محنت کرنی پڑی اور ان محنتوں کے بعد ہی جا کر وہ لوگ اس مقام تک پہنچے جس تک پہنچے۔ایک، تو یہ حال کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر چلے جائیں اور ایک یہ کہ پھر وہ تاریخ اسلام کو کیا بلکہ پوری انسانی تاریخ میں ایک منفرد جماعت بن جائیں۔اس سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ اس قسم کی جماعت کی تعمیر و تشکیل کا کام کس قدر دشوار ہے' جس پر عظیم امانت کے اٹھانے کا دباؤ ڈالنا مطلوب ہو' آئندہ بھی کوئی ایسی جماعت تیار کرنا چاہے' اور اسلامی نظام زندگی کو عملاً برپا کرنے کا مقصد اس کے پیش نظر ہو تو اسے انہی خطوط پر تربیتی جدوجہد کرنی ہوگی۔

اس سورت میں یہودیوں کو ایک چیلنج بھی دیا گیا ہے 'کہ آؤ موت کی تمنا کریں اس شخص کے لیے یا اس گروہ کے لیے جو باطل پر ہو۔یہ اس لیے کہ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ تمام لوگوں کے مقابلے میں اللہ کے زیادہ محبوب اور دوست ہیں' اور یہ کہ وہ اللہ کی برگزیدہ قوم ہیں' اور یہ کہ ان کے علاوہ کسی قوم میں کوئی رسول کس طرح آ سکتا ہے۔یہ اس قسم کے لمبے چوڑے دعوے کرتے تھے' قرآن کریم نے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ ان کو اچھی طرح یقین ہے کہ وہ بر سر باطل ہیں' اس لیے وہ ہرگز اس چیلنج کو قبول کرنے کی ہمت نہ کریں گے' اور بتایا جاتا ہے کہ یہ موت سے بہت بھاگتے ہیں' لیکن یہ جہاں بھی ہوں' موت ان تک رسائی حاصل کرے گی اور ان کو میدان حشر میں اٹھایا جائے گا اور وہاں ان کو پورا پورا اعمال نامہ بتا دیا جائے گا کہ یہ کیا کرتے رہے ہیں۔یہ بات اگرچہ یہودیوں کو خطاب کر کے کہی گئی ہے لیکن اشارۃً مومنین کے لیے بھی یہی ہے کہ وہ بھی ایسے نہ بن جائیں' جو لوگ اس دنیا میں دعوت دین کی امانت کے حامل بنا دیئے گئے ہیں' ان کو چاہئے کہ وہ اس سلسلے میں اپنے فرائض ادا کریں' اگرچہ ان کی جان بھی اس راہ میں چلی جائے۔

یہ ہے اصل تجارت کہ کوئی اس منزل کی راہ و رسم سے واقف ہو۔اور تجارت کا یہ مضمون سورہ صف کے مضمون سے ملتا ہے۔وہاں تجارت بتا دی گئی ہے جو ایک مسلمان نے کرنی ہے' اور یہاں وہ تجارت بتائی گئی ہے' جس سے دور بھاگنا ہے۔دونوں جگہ تجارت کے الگ الگ پہلو ہیں۔قرآن کا اسلوب دونوں جگہ ایک ہے جو تاثرات دینے میں دونوں جگہ الگ ہیں۔اگرچہ مقصد ایک ہے۔دونوں سورتیں ایک ہی سمت میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ذرا تفصیلات دیکھئے!

---ooo---

# درس نمبر ۲۶۲ تشریح آیات

## ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۱

سُورَةُ الْجُمُعَةِ (۶۲) مَدَنِيَّةٌ (۱۱۰) اٰيَاتُهَا ۱۱ رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے --- بادشاہ ہے نہایت مقدس ' زبردست اور حکیم"۔

اس آغاز میں بتایا جاتا ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔ لیکن یہ کائنات جو تسبیح کر رہی ہے اس میں سے جن چیزوں کا انتخاب کیا گیا ہے وہ اس سورت کے موضوع اور محور کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ اور اس کے ساتھ گہرا ربط رکھتی ہیں۔ سورت کا نام جمعہ ہے۔ اس میں یہ تعلیم ہے کہ جمعہ کی اہمیت کیا ہے' اس دن تمام امور سے فارغ ہو کر اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور جمعہ کی نماز کے وقت لہو و لعب اور محنت و تجارت چھوڑ کر' اللہ کے ذکر کی طرف آنا چاہئے۔ لوگ جمعہ کو چھوڑ کر اور خطبہ جمعہ چھوڑ کر جس مال تجارت کی طرف بھاگے ہیں' اس کا مالک تو اللہ ہے' جو بادشاہ مطلق ہے۔ دنیا کا یہ مال اس کے اختیار میں ہے اور وہ "القدوس" ہے۔ وہ مقدس ہے اور پاک ہے اور پوری کائنات اس کی پاکی اور تقدیس بیان کر رہی ہے۔ جبکہ یہ لوگ اس کی تقدیس چھوڑ کر لہو و لعب اور تجارت کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ وہ "العزیز" ہے' یہودیوں کو جو دعوت مباہلہ دے رہا ہے' وہی غالب ہے' وہ سب لوگوں کو اٹھا کر ان سے حساب و کتاب کا انتظام کرتا ہے۔ اور وہ "الحکیم" ہے۔ جس نے عربوں جیسی ناخواندہ قوم سے ایک رسول اٹھایا جو آیات پڑھ کر سناتا ہے' علم و دانش سکھاتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم خطبہ جمعہ کا مقصود ہے۔ غرض جو صفات یہاں آغاز میں لائی گئی ہیں' سورت کا مضمون بھی انہی کی سمت پر ہے۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۲﴾ وَّ
اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۗ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳﴾ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ
يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۴﴾ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ
ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۗ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵﴾ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا
اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۶﴾ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۷﴾
ا قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ
ع ٨ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸﴾

اا "وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا' جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے' ان کی زندگی سنوارتا ہے' اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے' حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے اور (اس رسول کی بعثت) ان دوسرے لوگوں کے لیے بھی ہے جو ابھی ان سے نہیں ملے ہیں۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے۔ یہ اس کا فضل ہے' جسے چاہتا ہے دیتا ہے' اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ جن لوگوں کو توراۃ کا حامل بنایا گیا تھا مگر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا' ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا ہے۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ان سے کہو "اے لوگو جو یہودی بن گئے ہو' اگر تمہیں یہ گھمنڈ ہے کہ باقی سب لوگوں کو چھوڑ کر بس تم ہی اللہ کے چہیتے ہو تو موت کی تمنا کرو۔ اگر تم اپنے اس زعم میں سچے ہو"۔ لیکن یہ ہرگز اس کی تمنا نہ کریں گے اپنے ان کرتوتوں کی وجہ سے جو یہ کر چکے ہیں' اور اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ان سے کہو "وہ جس موت سے تم بھاگتے ہو' وہ تو تمہیں آکر رہے گی۔ پھر تم اس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو پوشیدہ و ظاہر کا جاننے والا ہے' اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔

کہا گیا ہے کہ عربوں کو امی اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ لوگ بالعموم لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مہینہ تو یوں ہے' یوں ہے اور یوں ہے اور دس انگلیوں کے ساتھ تین بار اشارہ کیا اور فرمایا ہم ایک امی امت ہیں' ہم حساب اور کتاب نہیں کرتے"۔ (جصاص) یہ بھی کہا گیا ہے جو لکھا پڑھا نہیں ہے اسے امی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اس حال میں ہے جس طرح ماں سے پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ لکھنا پڑھنا تو بعد میں سیکھنے

سے ہوتا ہے۔

اور ممکن ہے اسی اس لیے کہا گیا ہو کہ یہودی دوسری اقوام کو "گویم" کہتے تھے۔ عبرانی زبان میں گویم اقوام کو کہتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہم تو اللہ کی پسندیدہ قوم ہیں اور دوسرے لوگ عام اقوام یعنی امم ہیں۔ یوں وہ عربوں کو امی کہتے تھے۔ امی کا یہ مفہوم کہ وہ امہ کی طرف منسوب ہے زیادہ موزوں نظر آتا ہے بجائے اس کے کہ وہ ام کی طرف منسوب ہیں۔

یہودیوں کا یہ پختہ خیال تھا کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے مبعوث ہو گا اور ان کے اندر جو اختلافات ہیں' ان کو وہ ختم کر دے گا۔ اور دنیا میں جو دوسری اقوام کے مقابلے میں شکست کھا گئے ہیں ان کو فتح نصیب ہو گی اور ذلت کے مقابلے میں ان کو عزت حاصل ہوگی اور وہ اس نبی کی برکت سے عربوں پر فتح کی دعا کیا کرتے تھے۔

حکمت ربانی کا تقاضا یہ ہوا کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عربوں سے پیدا ہو۔ یعنی امیین غیر الیہود میں سے' (گویم) میں سے۔ اس لیے کہ یہ بات اللہ کے علم میں تھی کہ یہودیوں میں سے وہ صلاحیت ختم ہو چکی ہے' جو پوری انسانی قیادت کے لیے درکار تھی' جیسا کہ اس سورت کے دوسرے پیراگراف میں آرہا ہے۔ اور جس طرح سورہ صف میں گزرا کہ یہ لوگ گمراہ ہوگئے ہیں۔ اور انہوں نے فکر ونظر کی کوتاہی اور ٹیڑھ پن کو اپنا لیا تھا۔ اور انہوں نے اپنی طویل تاریخ میں اللہ کی امانت کے حوالے سے جو کچھ کیا اس کے پیش نظر اب وہ اس قابل نہیں ہے کہ آخری امانت ان کے سپرد کی جائے۔

اس علاقے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی ایک مرکز دعوت بنایا تھا اور دعوت کا آغاز بیت اللہ کے سایہ میں حضرت خلیل اللہ اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا تھا۔

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۱۲۷) رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (۱۲۸) رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ یُزَكِّیْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۱۲۹) (۲ : ۱۲۷ – ۱۲۹) "اور یاد کرو' ابراہیم اور اسماعیل کو جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے' تو دعا کرتے جاتے تھے۔ اے ہمارے رب' ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے۔ تو سب کچھ سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم بنا اور ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو' ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما۔ تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے رب ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو! جو انہیں تیری آیات سنائے' ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوار دے تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے"۔

غیب کے پردوں کے پیچھے یہ دعا موجود تھی' صدیاں پیچھے' اللہ کے ہاں محفوظ تھی' یہ درخواست ضائع نہیں ہوئی تھی

اور یہ اس لیے رکھی گئی تھی کہ اللہ نے اس کے لیے اپنی حکمت کے مطابق جو وقت مقرر کیا تھا' وہ ابھی نہ آیا تھا۔ جب اس کی حکمت کے مطابق مقرر کردہ وقت آگیا تو اللہ نے دعا منظور فرمائی اور رسول بھی آیا اور دعا کی منظوری بھی ہوگئی کیونکہ اللہ کے نظام قضا و قدر میں ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے' نہ آگے ہوتا ہے اور نہ پیچھے ہوتا ہے۔

غرض یہ درخواست اللہ کے نظام قضا و قدر کے مطابق حقیقت بن گئی۔ یہ درخواست انہی الفاظ میں یہاں منظور کی جاتی ہے جن میں حضرت ابراہیم نے کی تھی۔ حضرت ابراہیم کے الفاظ تھے :

رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۲:۶۲)

یہاں تک کہ حضرت ابراہیم نے اللہ کی حمد اور صفت میں یہ فرمایا تھا۔

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ یہی الفاظ یہاں بھی دہرائے گئے۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۶۲:۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے خود ان کے بارے میں جب پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں۔ حضرت عیسیٰ کی بشارت ہوں۔ اور جب میری ماں کو حمل ٹھہرا تو انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان سے ایک نور نکلا ہے' جس کی وجہ سے شام کے علاقہ بصری کے محلات روشن ہو گئے''۔ (روایت ابن اسحاق جس کی سند کو ابن کثیر نے جید کہا ہے۔)

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۶۲:۲) ''وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا' جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے' ان کی زندگی سنوارتا ہے' اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے' حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے''۔ اور یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے امیوں میں خود انہی میں سے ایک رسول اٹھایا اور اسے کتاب دے کر انہیں بھی اہل کتاب بنا دیا۔ پ ان میں ایک رسول بنایا اور اس کی وجہ سے ان کا مقام و مرتبہ بھی بلند ہوگیا۔ انہیں امیت اور اہمیت سے نکالا۔ یعنی ان پڑھ ہونے کے بجائے تعلیم یافتہ بنا دیا اور عوامی قوم (گوئیم) ہونے کے بجائے ممتاز قوم بنا دیا۔ ان کے حالات بدل دیئے اور وہ پوری دنیا کے ممتاز لوگ بن گئے۔

وَيُزَكِّيْهِمْ (۶۲:۲) ''ان کی زندگیوں کو پاک کرتا ہے''۔ اسلام جو کچھ انہیں سکھاتا تھا وہ تزکیہ اور تطہیر ہی تھی۔ ضمیر و شعور کی تطہیر' عمل اور طرز عمل کی تطہیر' خاندانی زندگی کی تطہیر' اجتماعی زندگی کی تطہیر' اور نظریات کی ایسی تطہیر کہ تمام شرکیہ عقائد نکال کر صرف ایک عقیدہ توحید دے دیا۔ تمام باطل تصورات ختم کر کے صرف صحیح اور برحق عقیدہ توحید عطا کر دیا۔ افسانوی افکار و عقائد کے بجائے واضح اور یقینی عقائد دے دیئے۔ اسی طرح اخلاقی طوائف الملوکی سے نجات دے کر ایمانی اخلاق کی سطح پر ان کو پہنچا دیا۔ معیشت سے ناپاک سودی نظام کی جگہ عادلانہ رزق حلال کا طریقہ

بتایا۔ غرض ایک ہمہ گیر تطہیر کا انتظام کیا۔ اور ایک فرد' ایک جماعت اور ظاہر و باطن سب کی تطہیر کر دی۔ انسان کو اس زمینی زندگی اور زمینی تصورات سے بلند کر کے ایک ایسے نورانی مقام تک بلند کر دیا جو ربانی مقام ہے۔ اس مقام پر انسان کا معاملہ اللہ سے ہو گیا۔ یوں انسان اپنے آپ کو زمین کی ایک عاجز مخلوق سمجھنے کے بجائے ایک علوی مخلوق بن گیا۔

وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (٦٢ : ٢) "اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے"۔ یہ رسول ان کو کتاب کی تعلیم دیتا ہے جس کی وجہ سے یہ امی بھی اہل کتاب ہو گئے۔ انہیں حکمت سکھاتا ہے اور اس پوری دنیا کے حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ تمام اشیا کی قیمت متعین کرنے میں صحیح اندازہ کرتے ہیں' ان کی روح صحیح فیصلے کرتی ہے۔ وہ صحیح عمل اختیار کرتے ہیں اور اس سے بڑی دانائی اور نہیں ہے۔

وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (٦٢ : ٢) "حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے"۔ یہی جاہلیت جس کی تعریف حضرت جعفر ابن ابو طالب نے حبشہ کے نجاشی کو بتایا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب قریش مکہ نے نجاشی کے پاس ایک سفارت بھیجی' جو عمر ابن العاص اور عبداللہ ابن ابو ربیعہ پر مشتمل تھی۔ تاکہ وہ اس کے سامنے مہاجرین مسلمانوں کی بھیانک تصویر کھینچیں اور اس کے ہاں اس کے موقف کو غلط رنگ میں پیش کریں تا کہ وہ ان کو اپنی مہمانی اور اپنے ہاں امانت سے نکال دے' تو اس موقعہ پر حضرت جعفر نے فرمایا :

"بادشاہ وقت' ہم ایک جاہل قوم تھے' بتوں کو پوجتے تھے' مردار کھاتے تھے' فحاشی کرتے تھے' صلہ رحمی نہ کرتے تھے' پڑوسیوں کا کوئی خیال نہ رکھتے تھے' ہم میں سے زور آور کمزور کو کھا جاتا تھا' ایسے حالات میں تھے کہ اللہ نے ہم میں ایک رسول بھیج دیا۔ اس نے دعوت دی کہ ہم ایک ہی خدا کو پکاریں اور اس کی بندگی کریں' ہم اس کے نسب کو جانتے ہیں' اس کی صداقت سے واقف ہیں' اس کی امانت اور عفت کے معترف ہیں۔ اس نے دعوت دی کہ ہم صرف اللہ وحدہ کو پکاریں اور اس کے علاوہ ہم جو پتھروں' بتوں کی بندگی کرتے تھے' انہیں ترک کر دیں۔ وہ کہتا ہے تم سچ کہو' امانت ادا کرو' صلہ رحمی کرو' پڑوسی کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرو' اور حرام چیزوں اور خون ریزی سے بچو' اس نے ہمیں ہر قسم کے فواحش سے روک دیا ہے' جھوٹ سے روک دیا ہے۔ یتیم کا مال کھانے سے روک دیا ہے۔ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے روک دیا ہے۔ حکم دیا ہے کہ اللہ کی بندگی کریں اور کسی اور کو اس کے ساتھ شریک نہ کریں۔ وہ ہمیں نماز' روزہ اور زکوۃ کا حکم دیتا ہے"۔

باوجود اس کے کہ وہ جاہلیت اور گمراہی میں کانوں تک ڈوبے ہوئے تھے اللہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اس نظریہ کے اٹھانے کے قابل ہیں۔ اس کے امین ہوں گے اور ان کے اندر صلاحیتیں موجود ہیں اور جدید دعوت کے لیے ضروری صلاحیت وہ رکھتے ہیں۔ جبکہ یہودیوں کی فطرت میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے اور مصری غلامی نے ان کو ناقابل اصلاح بنا دیا ہے۔ ان کی نفسیات میں الجھن کجی اور انحراف پیدا ہو گیا ہے۔ اس لیے اب ان کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ نہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں درست ہوئے اور نہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد یہ لوگ درست ہوئے' یہاں تک کہ اللہ نے ان پر لعنت اور غضب لکھ دیا اور وہ اس دنیا میں اللہ کے دین کے حامل نہ رہے اور قیامت تک ان سے یہ اعزاز چھن گیا۔

پھر اللہ کو اس بات کا بھی علم تھا کہ اس زمانے میں جزیرۃ العرب ہی دعوت اسلامی کے لیے بہترین مرکز کا کام کر سکتا

تھا۔ اور پوری انسانیت کو جاہلیت کی گمراہی سے نجات دے سکتا تھا۔ کیونکہ دونوں بڑی شہنشاہیتوں نے تہذیب و تمدن کو بگاڑ دیا تھا۔ ان کی حکومت کو گھن لگ گیا تھا اور اندر سے ان کو کھوکھلا کر دیا تھا اور حالت یہ تھی جس پر ڈینسن یہ تبصرہ کرتا ہے۔

"پانچویں اور چھٹی صدی میں دین دار دنیا ہلاکت اور بربادی کے قریب جا پہنچی تھی کیونکہ وہ عقائد و نظریات جو کسی تہذیب و تمدن کو جنم دیا کرتے ہیں وہ گر گئے تھے' اور ان گرے ہوئے نظریات کی جگہ لینے کے لیے کوئی دینی نظریہ موجود نہ تھا۔ یوں نظر آتا تھا کہ جس تہذیب و تمدن کی تعمیر میں 'انسانیت کو چار ہزار سال تک محنت کرنی پڑی' وہ ٹوٹنے والا ہے اور اس کا شیرازہ بکھرنے ہی والا ہے۔ اور انسانیت ایک بار پھر جہالت کے دور میں واپس جانے والی ہے۔ کیونکہ پوری دنیا میں قبائل ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے نظر آتے تھے۔ پوری دنیا میں کوئی قانون اور کوئی نظام نہ تھا۔ انسانی تمدن ایک وسیع درخت کی طرح تھا جس کی وسیع شاخیں پوری دنیا پر سایہ فگن تھیں لیکن یہ درخت جھک گیا تھا اور گھن نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ ایسے ہی ہمہ گیر فساد کے اندر ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے تمام انسانیت کو پھر سے مجتمع کر دیا"۔ یہ شخص تھے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم' اور یہ صورت حال انسانیت کی' تو ایک یورپین مصنف کے نقطہ نظر سے تھی' لیکن اسلامی زاویہ نگاہ سے وقت اس سے تاریک تر تھی۔

اللہ تعالیٰ نے شبہ جزیرۃ العرب سے اس بدوی امت کو اٹھایا۔ وہ قرآن و سنت لے کر اٹھی' اس کے اندر صلاحیت موجود تھی۔ سب سے پہلے اس نے اپنی اصلاح کی' اور پھر پوری دنیا کی تقدیر بدل دی۔ اللہ نے اس بدوی قوم کو رسول دیا۔ کتاب دی' رسول اور کتاب نے ان کو پاک کر دیا اور ان کو حکمت اور دانائی دی' اگرچہ پہلے وہ گمراہ تھے۔

وَّ اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۶۲: ۳) "اور ان دوسرے لوگوں کے لیے بھی ہے جو ابھی ان سے نہیں ملے ہیں' اللہ زبردست اور حکیم ہے"۔ یہ آخرون کون ہیں ان کے بارے میں متعدد روایات آئی ہیں۔

امام بخاری نے روایت کی ہے' عبدالعزیز ابن عبداللہ سے' انہوں نے سلیمان ابن بلال سے' انہوں نے ثور سے' انہوں نے ابو الغیث سے' انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے یہ فرماتے ہیں "ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ پر سورہ جمعہ نازل ہوئی۔

وَّ اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ (۶۲: ۳) "اور ان دوسرے لوگوں کے لیے بھی ہے جو ان سے نہیں ملے"۔ تو صحابہ کرامؓ نے پوچھا اللہ کے رسول وہ کون ہیں تو حضورؐ نے ان کے سوال کا جواب نہ دیا' یہاں تک کہ تین بار آپ سے پوچھا گیا۔ ہم میں سلمان فارسی بھی موجود تھے۔ تو حضورؐ نے اپنا دست مبارک سلمان فارسی پر رکھا اور پھر کہا "اگر ایمان ثریا کے اندر بھی ہو تو ان لوگوں سے بعض لوگ یا ایک شخص اسے پالے گا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں اہل ایران شامل ہیں۔ اس لیے مجاہد کہتے ہیں اس سے مراد عجمی لوگوں میں وہ سب ہیں' جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تصدیق کی۔

ابن ابو حاتم نے روایت کی' اپنے والد سے' انہوں نے ابراہیم ابن علاء زبیری سے' انہوں نے ولید ابن مسلم سے' انہوں نے ابو محمد عیسیٰ ابن موسیٰ سے' انہوں نے ابو حازمؒ' انہوں نے سہل ابن سعد ساعدی سے' وہ کہتے ہیں رسول اللہ نے

فرمایا میری امت کے بعض لوگوں کی پشتوں میں ایسے مرد اور عورتیں ہوں گی جو جنت میں بغیر حساب داخل ہوں گے اور اس کے بعد آپ نے پڑھا۔

وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (۶۲ : ۳) یعنی محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد آئندہ آنے والے لوگ۔ دونوں اقوال کی گنجائش ہے یعنی وہ لوگ جو عرب کے علاوہ ہیں اور وہ لوگ جو مسلمان ہو گئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دور میں اور ان کی اولاد جو بعد میں پیدا ہو گی۔ ان آیات اور روایات میں اشارہ ہے کہ یہ امت آئندہ زمانوں اور زمین کے تمام حصوں میں مسلسل رہنے والی امت ہے، اور اس نے اس ذمہ داری کو قیامت تک پورا کرنا ہے۔ اس آخری دین کی حامل یہ امت آخر زمانے تک رہے گی۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۶۲ : ۳) "اور اللہ زبردست اور حکیم ہے"۔ وہ قوی ہے، اور کسی امت کو مختار بنانے کی قدرت رکھتا ہے اور وہ حکیم ہے اور اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کس منصب کے لیے چنے گئے۔ اور متقدمین اور متاخرین میں سے لوگوں کو درجے دینا بھی اس کا فضل و کرم ہے۔

---ooo---

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۶۲ : ۴) "یہ اس کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے"۔

اللہ کی جانب سے کسی امت، کسی جماعت، کسی فرد کو اس کام کے لیے چن لینا کہ وہ اس عظیم امانت کا حامل ہو، اور اللہ کے نور اور فیض کا سرچشمہ ہو، اور ایسا مرکز ہو، جس پر زمین و آسمان ملتے ہوں، یہ اختیار و انتخاب اللہ کا بہت بڑا فضل و کرم ہوتا ہے۔ اس سے بڑا فضل کہ اگر مومن اپنی جان اور مال اور اس دنیا کا سب کچھ بھی دے دے تو وہ اس سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس راہ میں جدوجہد، مشکلات، جہاد غرض سب مشقتوں سے زیادہ قیمتی اور اہم۔

اللہ تعالیٰ مدینہ کی اسلامی جماعت اور ان کے بعد آنے والے لوگوں، اور اسی راہ پر چلنے والوں کو یاد دلاتا ہے کہ یہ بہت بڑا فضل و کرم ہے تم پر، کہ اس نے تمہیں اس عظیم مقصد کے لیے منتخب کیا ہے۔ تمہارے اندر رسول بھیجا ہے، جو تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور علم و حکمت کا یہ سرمایہ آنے والی نسلوں کے لیے جمع کرتا ہے، اور پہلی جماعت اسلامی کے کارہائے نمایاں بطور نمونہ اور مثال قائم کرتا ہے۔ اللہ مسلمانوں کو یاد دلاتا ہے کہ یہ ہے عظیم فضل الٰہی جس کے مقابلے میں تمام دنیاوی و اخروی انعامات ہیچ ہیں، جبکہ اس کے فرائض کی ادائیگی کے دوران ہر قسم کی مالی اور جانی قربانیاں بھی ہیچ ہیں بمقابلہ اس اعزاز اور فضل کبیر کے۔

اس کے بعد اللہ ان کو یہ یقین دہانی کراتا ہے کہ یہودیوں کا دور اس کرۂ ارض پر سے ختم ہو گیا ہے۔ اب وہ حاملین امانت الٰہیہ نہیں رہے۔ نہ ان کے دلوں میں یہ بات ہے اور نہ ان کے کردار میں یہ بات ہے کیونکہ اس امانت کو اٹھانے والے دل فقیہ، صاحب ادراک، مخلص اور باعمل دل ہوتے ہیں۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰۃَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْھَا کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۶۲ : ۵) "جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا تھا مگر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا' ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہیں ۔ اس بھی زیادہ بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا ہے ۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا"۔

بنی اسرائیل کو توریت دی گئی اور وہ نظریہ اور شریعت کی امانت کے حامل بنے ۔ لیکن انہوں نے ۔

لَمْ یَحْمِلُوْھَا (۶۲ : ۵) "انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا" ۔ کیونکہ اس امانت کو ادراک تفقہ اور فہم و فراست اور حکمت و دانائی کے ساتھ اٹھایا جا سکتا ہے ۔ انہوں نے ضمیر کی دنیا میں اور عمل کی دنیا میں اس ذمہ داری کو قبول کرنا چھوڑ دیا تھا اور قرآن نے جس طرح بنی اسرائیل کی سیرت کا ریکارڈ پیش کیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس امانت کی کوئی قدر نہ کی ۔ وہ صرف ایک بوجھ اٹھا رہے تھے ۔ اس امانت اور دین کے مقاصد پورے نہ کر رہے تھے ۔

یہ نہایت ہی حقیر تصویر ہے' ان کو جو یہاں قرآن کریم نے کھینچی ہے' لیکن یہ تصویر ان کی حقیقت کا اظہار نہایت ہی عمدہ طریقے سے کرتی ہے ۔

بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۶۲ : ۵) "اس سے بھی زیادہ بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا' ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیتا"۔

اور جن لوگوں کو یہ آخری امانت دی گئی ہے' وہ اگر یہی رویہ اختیار کرتے ہیں تو ان کی مثال بھی ایسی ہی ہے وہ سب لوگ جن کو دینی امانت دی گئی اور وہ اس کا حق ادا نہیں کرتے ۔ ان کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ مسلمان جن پر صدیاں گزر گئیں اور وہ مسلمانوں کے صرف نام اٹھائے ہوئے ہیں' ان کے اندر مسلمانوں کے اعمال نہیں ہیں' خصوصاً وہ لوگ جو قرآن اور کتب اسلامی کو پڑھتے ہیں اور وہ فرائض ادا نہیں کرتے جو ان میں ہیں ۔ یہ سب لوگ ایسے ہی ہیں جس طرح گدھے پر کتابیں لدی ہوئی ہوں ۔ ہمارے دور میں ایسے لوگ بہت ہیں ۔ مسئلہ کتابوں اور تدریس و تعلیم کا نہیں ہے بلکہ مسئلہ عمل اور ذمہ داریاں اٹھانے کا ہے ۔

یہودیوں کا زعم یہ تھا اور اب بھی ان کے اندر یہ زعم موجود ہے کہ وہ اللہ کی مختار قوم ہیں' پسندیدہ اور برگزیدہ! اور یہ کہ وہ اللہ کے محبوب ہیں بمقابلہ تمام دوسری اقوام کے ۔ جبکہ دوسری اقوام گویم ہیں یا ای ہیں یا امی ہیں ۔ لہٰذا ان پر اپنے دین کے احکام پر عمل کرنا لازمی نہیں ہے ۔ یہ گویم کے لیے ہے ۔

وَقَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ اگر ہم دوسری اقوام کے لوگوں پر کوئی زیادتی کریں تو ہم پر مواخذے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے دعوے وہ کرتے تھے ۔ جن پر کوئی دلیل نہ تھی ۔ یہاں اللہ ان کو دعوت مباہلہ دیتا ہے ۔ دعوت مباہلہ ان کو بھی دی گئی اور نصاریٰ کو بھی ۔

---ooo---

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ(٦) وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ(٧)قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ(٨) (٦٢ : ٦ تا ٨) "ان سے کہو" اے لوگو جو یہودی بن گئے ہو' اگر تمہیں یہ گھمنڈ ہے کہ باقی سب لوگوں کو چھوڑ کر بس تم ہی اللہ کے چہیتے ہو تو موت کی تمنا کرو۔ اگر تم اپنے اس زعم میں سچے ہو"۔ لیکن یہ ہرگز اس کی تمنا نہ کریں گے اپنے ان کرتوتوں کی وجہ سے جو یہ کر چکے ہیں' اور اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ان سے کہو "جس موت سے تم بھاگتے ہو' وہ تو تمہیں آکر رہے گی۔ پھر تم اس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو پوشیدہ و ظاہر کا جاننے والا ہے' اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔

مباہلہ کے معنی یہ ہیں کہ فریقین آمنے سامنے کھڑے ہو جائیں اور دونوں مل کر دعا کریں کہ اے اللہ ہم دونوں میں سے جو بر سرِ باطل ہے' اسے ہلاک کر دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن جن لوگوں کو مباہلہ کے لیے دعوت دی وہ ڈر کر سامنے نہیں آئے۔ کسی نے بھی حضور اکرم کی دعوت مباہلہ قبول نہیں کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے دل ہی دل میں اسلام کی حقانیت کے قائل تھے۔ وہ جانتے تھے کہ رسول اللہ سچے ہیں اور یہ دین حقیقی دین ہے۔

امام احمد نے روایت کی ہے اسماعیل ابن یزید زرقی سے' انہوں نے ابو یزید سے' انہوں نے فرات سے' انہوں نے عبدالکریم ابن مالک جزری سے' انہوں نے عکرمہ سے' انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہ ابوجہل ملعون نے یہ کہا کہ اگر میں نے محمد کو خانہ کعبہ میں دیکھا تو میں اس پر حملہ کر دوں گا یہاں تک کہ میں اس کی گردن دبا دوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر اس نے ایسا کیا ہوتا تو فرشتے اسے علانیہ پکڑ لیتے اور اگر یہودی موت کی تمنا کرتے تو وہ مر جاتے۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ جہنم میں ان کے مقامات کیا ہیں اور جن لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت مباہلہ دی تھی اگر وہ نکلتے تو جب واپس آتے تو نہ ان کا مال ہوتا اور نہ ان کے اہل و عیال موجود ہوتے۔ (بخاری' ترمذی)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آیت ان کے لیے مباہلے کا چیلنج نہ ہو' محض چیلنج ہو۔ کیونکہ ان کا زعم تھا کہ وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اللہ کے محبوب اور دوست ہیں تو کیوں نہیں جلدی کرتے کہ اللہ کے ہاں انعامات پائیں۔ دوست تو دوست کی ملاقات کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔

اس کے بعد ان کے اس دعوے پر تبصرہ کیا گیا کہ یہ جھوٹے ہیں اور جو دعویٰ کر رہے ہیں ان میں وہ سچے نہیں ہیں۔ ان کو یہ یقین نہیں ہے کہ انہوں نے دنیا میں آخرت کے لیے کوئی اچھا عمل کیا ہے' جس پر ان کو اجر و ثواب ملنے والا ہے۔ انہوں نے تو برے کام ہی آگے بھیجے ہیں' جن کی وجہ سے وہ موت سے بہت ڈرتے ہیں۔ اور جس شخص کے پاس

زاد راہ نہ ہو' وہ سفر پر نہیں نکلتا۔

وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ (۶۲ : ۷) "لیکن یہ ہرگز اس کی تمنا نہ کریں گے اپنے ان کرتوتوں کی وجہ سے جو یہ کر چکے ہیں اور اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے"۔

اب آخری دور میں موت کی حقیقت ان کو بتا دی جاتی ہے۔ یہ جو موت سے ڈرتے ہیں اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ موت تو ایک قطعی امر ہے اور اس سے کوئی ڈر نہیں ہے۔ کوئی مفر نہیں ہے' موت کے بعد تو اللہ کی طرف جانا ہے' اور پھر اللہ کے ہاں حساب و کتاب دینا ہے' جس میں کوئی شک نہیں ہے۔

قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَى عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۶۲ : ۸) "ان سے کہو" جس موت سے تم بھاگتے ہو' وہ تو تمہیں آکر رہے گی۔ پھر تم اس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو پوشیدہ و ظاہر کا جاننے والا ہے' اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔

یہ ایک توجہ دلاؤ نوٹس ہے' مسلمانوں کو' اور غیر مسلموں سب کو کہ ایک حقیقت کو اپنے دل و دماغ میں تازہ کر لو۔ اور لوگ اس اٹل حقیقت کو بھول جاتے ہیں' یا بھلانے کی کوشش کرتے ہیں' موت تو آنے والی ہے۔ یہ زندگی ختم ہونے والی ہے۔ اس دنیا میں تم جس قدر اس سے بھاگو' تم موت کے منہ میں پہنچ جاؤ گے۔ لہٰذا کوئی جائے پناہ اللہ کے سوا نہیں ہے' وہاں حساب و کتاب دینے سے کوئی بھاگنے کی جگہ نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

طبری نے اپنی معجم میں معاذ ابن محمد ھذلی کی حدیث روایت کی ہے۔ یونس سے' انہوں نے حسن سے' انہوں نے حضرت سمرۃ سے' مرفوع صورت میں کہ "جو شخص موت سے بھاگتا ہے' اس کی مثال لومڑی جیسی ہے جس سے زمین اپنا قرضہ مانگ رہی تھی' تو وہ بھاگنے لگی یہاں تک کہ بھاگتے بھاگتے تھک گئی اور اس کے لیے بھاگنا ممکن نہ رہا تو وہ اپنے سوراخ میں جا گھسی تو وہاں زمین نے اس سے کہا:" اے لومڑی میرا قرضہ؟"

اب اس سورت کا آخری مقطع آتا ہے اور یہ جمعہ کی نماز کے بارے میں ہے' یہ اس موقعہ کی نسبت سے جو واقعہ ہوا شاید ایسا واقعہ ایک سے زائد مرتبہ ہوتا ہو گا کیونکہ الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہوتا رہتا تھا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٩﴾ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٠﴾ وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا

انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ۚ قُلْ مَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ ۲
التِّجَارَةِ ۚ وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿١١﴾ ع ۳
۱۲

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو' یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو' شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔ اور جب انہوں نے تجارت اور کھیل تماشا ہوتے دیکھا تو اس کی طرف لپک گئے اور تمہیں کھڑا چھوڑ دیا۔ ان سے کہو' جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے۔ اور اللہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے''۔

جمعہ کی نماز بغیر جماعت کے نہیں ہو سکتی' اس میں یہ بات لازمی ہے کہ مسلمان اس میں جمع ہوں اور خطبہ جمعہ سنیں اور اس خطبے میں مسلمانوں کو دینی تعلیم دی جائے۔ یہ مسلمانوں کا ایک دینی اور تنظیمی اجتماع ہے' جس میں دین اور دنیا اور آخرت سب کو ایک ہی سلسلہ اجتماع میں جمع کر دیا گیا ہے اور یہ سب امور عبادت کا حصہ ہیں۔ نماز جمعہ سے اسلام کا اجتماعی نظریہ اور نظام بڑی خوبی سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں بے شمار احادیث وارد ہیں جن میں جمعہ کی فضیلت' اس کی تیاری' غسل' کپڑوں کی صفائی اور خوشبو لگانے کی ہدایات دی گئی ہیں۔

صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

اذا جاء احدکم الجمعة فلیغتسل ''جب تم میں سے کوئی جمعہ کو آئے تو اسے چاہئے کہ وہ غسل کرے''۔

اصحاب سنن اربعہ نے اوس ابن اوس ثقفی کی حدیث نقل کی ہے۔ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سنا اور جس نے جمعہ کے دن غسل کیا اور خوشبو لگائی' اگر اس کو دستیاب ہو' اور اچھے کپڑے پہنے' پھر وہ مسجد کی طرف نکلا اور اگر نماز (نفل) پڑھنا چاہا' پڑھے اور مسجد میں کسی کو اذیت نہ دی۔ اس کے بعد وہ مسجد میں بیٹھا' یہاں تک کہ امام نکلا اور اس نے نماز پڑھائی تو یہ جمعہ اگلے جمعے تک کے گناہوں کا کفارہ ہو گا''۔

اس پیراگراف کی پہلی آیت میں کہا گیا ہے کہ اذان سنتے ہی تمام معاشی سرگرمیاں موقوف کر دو۔

يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ (۶۲ : ۹) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو''۔ یعنی زندگی کی تمام سرگرمیاں بند کر دو' اور ذکر الٰہی میں مصروف ہو جاؤ۔

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۶۲ : ۹) ''یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو''۔
اس میں یہ اشارہ ہے کہ زندگی کی تمام دلچسپیوں کو ترک کر کے ذکر الٰہی میں تھوڑا سا وقت گزارو' یہاں معاشی سرگرمیاں چھوڑ کر۔

وَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ (۶۲ : ۹) "اللہ کے ذکر کی طرف سعی کرو" کا مطلب یہ ہے کہ جمعہ سے پہلے ذکر و فکر میں مشغول ہو جاؤ ۔ خالص ذکر الٰہی ۔ اور اپنا تعلق اس وقت میں عالم بالا کے ساتھ جوڑ دو ۔ اس طرح تمہیں قلبی تطہیر نصیب ہوگی اور اس ذکر کے نتیجے میں دل پر عالم بالا کی معطر خوشبو اور معطر باد نسیم کے جھونکے اثر چھوڑیں گے ۔ اور پھر تلاش معاش میں بھی ذکر الٰہی اور فضل الٰہی :

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (۶۲ : ۱۰) "پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو ۔ اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو ' شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے" ۔

یہ ہے اسلامی نظام کا توازن ۔ یعنی زمین پر ضروریات زندگی کا توازن ۔ مثلاً کام کاج اور تلاش معاش اور روح کو ذکر الٰہی میں مشغول کرنا اور ایک وقت کے لیے تلاش معاش کی سرگرمیوں سے نکل کر عزلت نشیں ہو کر ذکر و فکر میں مشغول ہونا ' قلبی زندگی کے لیے یہ ضروری ہے اور اس قلبی اور روحانی بالیدگی کے بغیر کوئی شخص اس عظیم امانت کا حق ادا نہیں کر سکتا جو ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے اور ذکر الٰہی تلاش معاش کے دوران بھی ضروری ہے ۔ اور تلاش معاش کے اندر بھی اگر ذکر و فکر ہو تو یہ تلاش معاش عبادت بن جاتا ہے لیکن تلاش معاش کے دوران ذکر و فکر کے علاوہ ایک وقت صرف ذکر و فکر کے لیے خالص بھی ضروری ہے ۔ جس میں اور کوئی کام نہ ہو جس طرح ان دو آیات میں اشارہ ہے ۔

حضرت عراک ابن مالک رضی اللہ عنہ جب جمعہ کی نماز پڑھتے تھے تو مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر یہ فرماتے ہیں ۔ اے اللہ میں نے آپ کی پکار کی تعمیل کر دی اور فرض نماز ادا کر دیا اور اب میں مسجد سے نکل رہا ہوں جس طرح تو نے حکم دیا ہے ' اے اللہ مجھے اپنا فضل نصیب کر ۔ آپ خیر الرازقین ہیں (ابن ابوحاتم) ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ حکم الٰہی کو کس سنجیدگی سے لیا کرتے تھے ۔ کس قدر سادگی سے ' کیونکہ ان کے دل میں شعور تھا کہ ' قرآن اللہ کے احکام پر مشتمل ہے اور مسلمانوں نے اس کی تعمیل کرنی ہے ۔

صحابہ کرام کا یہ سادہ ادراک ' سنجیدہ طرز عمل اور نہایت ہی سادگی سے رب تعالیٰ سے ہمکلامی ہی وہ عوامل تھے جن کی وجہ سے وہ اس قدر بلند مقام تک پرواز کر گئے ' حالانکہ وہ جاہلیت سے نکل کر آئے تھے ' اور جاہلیت کی عادات اور میلانات ان کو ہر وقت اپنی طرف کھینچتے تھے ۔ اور جاہلیت کی ایک عادت کا نمونہ اس سورت کی آخری آیات میں پیش کیا جاتا ہے ۔

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَۃً اَوْ لَھْوَا انْفَضُّوْا اِلَیْھَا وَتَرَکُوْکَ قَآئِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ مِّنَ اللَّھْوِ وَمِنَ التِّجَارَۃِ وَاللّٰہُ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ (۶۲ : ۱۱) "اور جب انہوں نے تجارت اور کھیل تماشا ہوتے دیکھا تو اس کی طرف لپک گئے اور تمہیں کھڑا چھوڑ دیا ۔ ان سے کہو ' جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے ۔ اور اللہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے" ۔ حضرت جابر سے روایت ہے کہ ایک بار جب ہم نبی

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک قافلہ آگیا' جس میں کھانے کا سامان تھا۔ لوگ قافلے کی طرف لپک گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دو آدمی رہ گئے۔ ان میں حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما تھے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا (۱۱:۶۲) "اور جب انہوں نے تجارت اور کھیل تماشا ہوتے دیکھا تو اس کی طرف لپک گئے اور تمہیں کھڑا چھوڑ دیا"۔

آیت میں اشارہ ہے کہ اللہ کے پاس جو کچھ ہے' وہ اس لہو اور تجارت سے بہتر ہے اور یہ بھی یہاں صراحت کے ساتھ بتایا کہ اللہ بہترین رزق دینے والوں میں سے ہے۔

وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۱۱:۶۲) "اللہ بہتر رزق دینے والا ہے"۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بدوی عربی معاشرے کی تعلیم و تربیت کے لیے اسلام نے کس قدر جدوجہد کی' اور کس طرح ان لوگوں سے صحابہ کی وہ جماعت تیار کر دی جس نے انسانی تاریخ میں ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔ پوری انسانی تاریخ میں جس کی مثال نہیں ہے اور ان کی زندگیوں میں ان لوگوں کے لیے ایک نمونہ ہے جو زمانہ ملاحد میں دعوت اسلامی کا کام کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے کس قدر صبر و مصابرت سے کام لیا' اور اسلامی انقلاب کی راہ میں پیش آنے والی کمزوریوں' نقائص' واماندگیوں اور لغزشوں پر کس طرہ صبر کیا اور ان کو دور کیا۔ آج ہم بھی اسی طرح اپنی اصلاح کر سکتے ہیں۔ یہ نفس انسانی اپنے اندر خیر کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور شر کی بھی۔ اس کے اندر یہ صلاحیت بھی ہے کہ روحانی قوت اور روحانی اور قلبی صفائی کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچ جائے جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ لیکن اس کے لیے صبر و ثبات' فہم و ادراک' ثابت قدمی اور استقامت اور مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ گھبرا کر انسان نصف راستے سے واپس ہو جائے۔ واللہ المستعان

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ــــ ۲۸

## سورۃ المنافقون ـ ۶۳

## ۱ ــ تا ــ ۱۱

# سورۃ المنافقون ایک نظر میں

اس سورت کا جو نام رکھا گیا ہے وہی اس کا موضوع ہے ۔ منافقین کا ذکر صرف اس سورت میں نہیں ہوا اور نہ ان کے حالات اور ان کی سازشیں صرف اس ایک سورت تک محدود ہیں ۔ مدینہ میں نازل ہونے والی ہر سورت میں ان کا ذکر صراحۃ یا اشارۃ موجود ہے ۔ لیکن اس سورت کا بڑا حصہ انہی کے بارے میں ہے ۔ اس میں ان سے متعلق بعض واقعات اور ان کے اقوال پر تبصرہ کیا گیا ہے ۔

اس میں ان کے اخلاق ' ان کے جھوٹ ' ان کی سازشوں اور ان کے داؤ پیچ پر تنقید کی گئی ہے جو وہ اسلام کے خلاف کرتے تھے ۔ ان کے دل مسلمانوں کے خلاف بغض و عداوت اور سازشوں سے بھرے ہوئے تھے ۔ وہ نہایت بزدل ' اندھے ' اور بے بصیرت تھے ۔

اس سورت میں انہی کی بحث ہے ۔ صرف آخر میں مسلمانوں کو متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اندر ان منافقین جیسی صفات پیدا نہ ہونے دیں ۔ اگرچہ ان صفات کا سبب نفاق سے بہت دور کا تعلق ہے اور نفاق کی کم از کم صفت یہ ہے کہ انسان اللہ کے لیے مخلص نہ ہو ' اور اپنے مال اور اولاد کی وجہ سے انسان اللہ کی یاد سے غافل ہو جائے ۔ اور پھر اس پر مزید یہ کہ اللہ کی راہ میں انفاق نہ کرے ' یہاں تک کہ ایک ایسا وقت آئے جس میں انفاق فی سبیل اللہ مفید ہی نہ رہے ۔

تحریک نفاق کا آغاز اس وقت ہوا جب اسلام مدینہ میں داخل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات کے قریب تک یہ جاری رہی اور کسی وقت بھی مدینہ منافقین سے خالی نہ تھا ۔ اگرچہ ان کے مظاہر اور وسائل بدلتے رہے ۔ جس دور میں یہ سورت نازل ہوئی ہے اس میں ' معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریک زوروں پر تھی ۔ اس نے مسلمانوں کو بہت پریشان کر رکھا تھا ' مسلمانوں کی قوت اور طاقت اور توجہ اس عرصہ میں زیادہ تر منافقین ہی کی طرف رہی ۔ اور قرآن کریم اور احادیث نبوی میں بڑی کثرت سے ان کا ذکر آیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفاق کی تحریک مدینہ میں ایک بااثر تحریک تھی اور بعض اوقات تو اس کا اثر واضح طور پر محسوس ہوتا تھا ۔

اس تحریک کے بارے میں استاذ محمد عزہ دروزہ کی کتاب "سیرت رسول قرآن کی روشنی میں" سے یہاں چند پیراگراف نقل کرنا مناسب ہو گا ۔

"مدینہ میں اس تحریک کے ظہور کا سبب واضح ہے ۔ کیونکہ مسلمان اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں اس قدر قوی نہ تھے کہ ان سے کچھ لوگ ڈرتے اور ان سے کسی کو خیر کی توقع ہوتی یا شر کی توقع ہوتی ۔ اس لیے کسی کو ضرورت نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کی چاپلوسی کرے اور بظاہر ان کے ساتھ شریک ہو جائے اور درپردہ ان کے خلاف سازش کرے اور عیاری و مکاری سے مخالفت کرے ۔ کیونکہ مکہ کے اکثر کبرا اور بالا تر لوگ اسلام کے خلاف تھے ' ان میں سے جو چاہتا ' کہہ سکتا ۔ مسلمانوں کو اذیت بھی دیتا اور تحریک اسلامی کے خلاف کھلے طور پر تمام وسائل استعمال کرتا ۔ بغیر کسی جھجک کے اور مکہ میں

قوت بھی کفار کے ہاتھوں میں تھی' اور اسی وجہ سے مسلمانوں کو ہجرت کر کے ترک وطن پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ پہلے وہ حبشہ گئے پھر یثرب کی طرف ہجرت کر گئے ۔ اور بعض کو اہل مکہ نے پکڑے رکھا' یا دبا کر اور خوفزدہ کر کے ہجرت سے بھی روکے رکھا۔ اور بعض مسلمان ایسے بھی ہوں گے جن کو مکہ میں اسلام چھپانا پڑا ہو گا اور بعض ایسے بھی تھے جن کو اہل مکہ نے تشدد کر کے شہید بھی کر دیا تھا۔ لہٰذا مکہ میں کسی کو نفاق کی ضرورت نہ تھی"۔

گویا مدینہ میں حالات مکہ سے بالکل مختلف تھے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مدینہ کو ہجرت کرنے سے پہلے ہی اوس اور خزرج کے نہایت ہی بااثر لوگوں کی حمایت اور نصرت حاصل کر چکے تھے ۔ اور آپ نے تب ہجرت فرمائی جب آپ کو تسلی ہو گئی کہ وہاں آپ کی پوزیشن مضبوط ہو گی ۔ مدینہ میں کوئی عرب گھرانا ایسا نہ رہ گیا تھا' جس میں اسلام داخل نہ ہو گیا ہو۔ اس لیے ایسے حالات میں یہ بات ممکن ہی نہ تھی کہ جو لوگ ایمان نہ لائے تھے' وہ جہالت یا نادانی کی وجہ سے یا غصے' کینہ' اور عناد کی وجہ سے رسول اللہ کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوں' کیونکہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ کا لوگوں نے جس طرح استقبال کیا تو اس سے ان کو معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کی قوت کیا ہے اور اثر کیا ہے ۔ اس لیے ایسے حالات میں مدینہ میں کوئی مسلمانوں اور مہاجرین و انصار کے بالمقابل علانیہ کھڑا نہ ہو سکتا تھا۔ اوس اور خزرج کی بڑی تعداد انصار نبی بن گئی تھی اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ وفائی معاہدے کر لیے تھے ۔ اور ان کی اکثریت بہترین مسلم بن گئی تھی اور وہ یہ یقین کرتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نصرت اور اطاعت فرض ہے۔

آپ ان کے لیڈر' مرشد اور واجب الاطاعت نبی تھے ۔ اس لیے جن لوگوں نے ابھی تک عقیدۂ توحید کو قبول نہ کیا تھا اور دل کے بیمار تھے اور ہٹ دھرمی اور کینہ میں مبتلا تھے اور نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور دعوت اسلامی کے مخالف اور دشمن تھے ۔ ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی مخالفت علانیہ کریں ۔ وہ مجبور تھے کہ بظاہر وہ بھی اپنے اسلام کا اعلان کر دیں' نمازیں پڑھیں' اسلام کے ارکان پورے کریں اور اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ امن و امان پائیں ۔ اور ان کی برادری بھی قائم رہے' ان کی مکاری' سازشیں اور چالیں اس طرح گہری تھیں جس طرح پہلوانی کے داؤ ہوتے ہیں' اور یہ کام وہ چھپ کر کرتے تھے ۔ اور اگر ان کو کوئی علانیہ کام بھی کرنا پڑتا تب بھی وہ اسے نفاق کے رنگ میں چھپا کر کرتے ۔ لیکن نظر بہرحال یہ آتا کہ یہ ان کی منافقانہ چال ہے ۔ لیکن وہ اس کے لیے بظاہر کوئی حیلہ بہانہ' مصلحت یا دلیل اور منطق کا کوئی پردہ ضرور اختیار کرتے اور یہ لوگ کسی حال میں بھی اپنے کفر اور نفاق کو ظاہر نہ کرتے تھے ۔ لیکن باوجود ان کی ان احتیاطوں کے اور ان کی ان تمام پردہ داریوں کے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اور مخلص مہاجرین و انصار پر' ان کی یہ منافقت پوشیدہ نہ تھی ۔ البتہ اسلامی مہمات اور بحرانوں کے اندر ان کا منافقانہ رویہ صاف صاف ظاہر ہو جاتا اور یہ لوگ سخت شرمندہ ہوتے ۔ اور قرآن کریم ان کی حالت پر جو تبصرہ کرتا اس سے بھی وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہوتے ۔ قرآن مجید گویا ان کے کفر نفاق اور شرپسندیوں اور سازشوں کو ان پر کھول دیتا اور وقتاً فوقتاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے بارے میں متنبہ کر دیتا"۔

"قرآن کریم کی مدنی آیات نے ان پر جو تبصرے کیے ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سازشوں کے دور رس اثرات تھے ۔ اور یہ ایک قومی کشمکش تھی ۔ ایسی ہی کشمکش جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور زعماء مکہ کے درمیان تھی۔

اگرچہ دونوں کے زمانے اور نتائج مختلف تھے ۔ کیونکہ مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوزیشن روز بروز مضبوط ہوتی جاتی تھی ۔ آپ کی قوت میں اضافہ ہو رہا تھا' اسلام کا دائرہ وسیع تر ہو رہا تھا۔ اور یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اب حکمران بھی تھے ۔ آپ کے احکام نافذ ہوتے تھے ۔ اور آپ کے ارد گرد ایک قوت جمع تھی ۔ پھر آپ کے مقابلے میں منافقین ایک بلاک کی صورت میں منظم نہ تھے جن کی کوئی عیاں شخصیت ہو۔ ان کی کمزوری' ان کی تعداد کی کمی' اور ان کی حیثیت کی کمی' ان کو زوال کی طرف لے جا رہی تھیں۔ جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت بڑھ رہی تھی ۔ اسلام وسیع ہو رہا تھا اور اس کی عزت اور قوت میں اضافہ ہو رہا تھا"۔

"مدینہ کے ابتدائی دور میں منافقین اسلامی حکومت کے لیے جس طرح عظیم خطرہ بنے ہوئے تھے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں ان کے قبائل کی عصبیت تازہ تھی اور ابھی اوس اور خزرج کے قبائلی تصورات ختم نہ ہوئے تھے جبکہ یہ منافق بھی ابھی تک زیادہ ترچھپے ہوئے تھے اور اسلام کمزور تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چاروں طرف سے مشرک قبائل کے گھیرے میں تھے اور اہل مکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن تھے' اور پورے جزیرۃ العرب کے قبلہ و کعبہ تھے ۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں موقع کی تلاش میں تھے ۔ اور ہر وقت اس انتظار میں تھے کہ ان کو کوئی موقعہ ملے اور وہ فیصلہ کن وار کریں ۔ اور ابتدائی ادوار میں مدینہ کے ارد گرد یہودی بھی رہ رہے تھے ۔ ان یہودیوں نے آغاز میں تو صرف حضورؐ کو ناپسند کیا' لیکن بعد میں انہوں نے بھی کفر اور دشمنی شروع کر دی اور سازشیں کرنے لگے ۔ جلد ہی ان کے اور منافقین کے درمیان غیر تحریری اتفاق ہو گیا کہ اسلام کی بیخ کنی کرنی ہے ۔ اور مسلمانوں کے خلاف مل کر کام کرنا ہے ۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ منافقین نہ قوی تھے اور نہ کوئی کارروائی کر سکتے تھے ۔ انہوں نے جو کچھ کیا وہ یہودیوں کی شہ پر ان کی سازشوں اور درپردہ ریشہ دوانیوں اور یقین دہانیوں کی وجہ سے کیا۔ اور محض اس لیے کیا کہ ان کے اور یہودیوں کے درمیان ایکا ہو گیا تھا اور ان کا یہ شر اور یہ بلاک تب ختم ہوا کہ اللہ نے احسان فرمایا اور اسلام اور نبی اسلام کو غلبہ عطا فرمایا"۔ (دیکھئے کتاب مذکور کا ص ۲۱۶ تا ۲۱۶)

---

# درس نمبر ۲۶۳ تشریح آیات

## ۱ ـ ـ تا ـ ـ ۱۱

سُورَةُ الْمُنٰفِقُوْنَ (۶۳) مَدَنِيَّةٌ (۱۰۴) — اٰيَاتُهَا ۱۱ — رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴿۱﴾ اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۳﴾ وَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَ اِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۫ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۴﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔

"اے نبیؐ ' جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسولؐ ہیں"۔ اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اس کے رسولؐ ہو' مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں"۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور اس طرح یہ اللہ کے راستے سے خود رکتے اور دنیا کو روکتے ہیں۔ کیسی بری حرکتیں ہیں جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ ان لوگوں نے ایمان لا کر پھر کفر کیا' اس لیے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی' اب یہ کچھ نہیں سمجھتے۔ انہیں دیکھو تو ان کے جثے تمہیں بڑے شاندار نظر آئیں۔ بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے ہو مگر اصل میں یہ گویا لکڑی کے کندے ہیں جو دیوار کے ساتھ چن کر رکھ دیئے گئے ہوں۔ ہر زور کی آواز کو یہ اپنے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہ پکے دشمن ہیں' ان سے بچ کر رہو' اللہ کی مار ان پر' یہ کدھر الٹے پھرائے جا رہے ہیں"۔

یہ رسول اللہ کے پاس آتے تھے۔ آپ کے سامنے یہ لوگ آپ کی رسالت پر ایمان کی شہادت دیتے تھے' لیکن دل

سے یہ شہادت نہ ہوتی۔ بطور تقیہ یہ شہادت دیتے' تاکہ ان کی حقیقت مسلمانوں سے چھپ جائے' لیکن درحقیقت یہ جھوٹی شہادت دے رہے تھے۔ محض دھوکے کے لیے آتے۔ یہ اس کے ذریعہ اپنے آپ کو چھپاتے۔ چنانچہ اللہ فرماتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔ لیکن اس موقعہ پر اللہ حضورؐ کی رسالت کی تصدیق خود فرماتا ہے اور منافقین کی جھوٹ کی شہادت دیتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ (۶۳ : ۱) "اللہ جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں"۔ اور وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (۶۳ : ۱) "اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں"۔

یہاں انداز تعبیر میں نہایت احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے۔ منافقین کے قول کی تکذیب سے پہلے اللہ رسالت محمدی کی تصدیق فرماتا ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو صرف یہ بات آتی کہ منافقین کی شہادت جھوٹی ہے۔ اور شہادت تو رسالت سے متعلق ہے۔ اور قرآن کا مقصد یہ نہ تھا۔ "ان کی شہادت سچی ہے لیکن وہ اپنی شہادت میں جھوٹے ہیں"۔ مطلب یہ ہے کہ شہادت سچی ہے لیکن وہ اقرار رسالت میں جھوٹے ہیں۔ ضمیر کے مطابق شہادت نہیں دے رہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً (۶۳ : ۲) "انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایمان کے بارے میں جب ذرا بھی شبہ پیدا ہوتا تو وہ قسمیں اٹھانا شروع کر دیتے۔ یہ اس وقت ہوتا جب معلوم ہوتا کہ انہوں نے فلاں فلاں سازش میں حصہ لیا۔ یا جب ان کی کوئی تنقید مسلمانوں تک پہنچ جاتی۔ جب بھی ان کی کوئی ایسی بات کھلتی وہ قسمیں شروع کر دیتے۔ یوں وہ اپنی صفائی بیان کر دیتے۔ اور اس ڈھال کے پیچھے اپنے آپ کو بچا لیتے' تاکہ آئندہ وہ اپنی سازشیں اور خفیہ تدابیر جاری رکھ سکیں اور ان میں جو بے وقوف تھے ان کو مزید دھوکہ دے سکیں۔

فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۶۳ : ۲) "اس طرح وہ اللہ کے راستے سے رکتے اور روکتے ہیں"۔ یعنی خود اپنے نفوس کو بھی روکتے ہیں اور دوسرون کو بھی روکتے ہیں۔ اور سچائی کے ساتھ یقین نہیں کرتے۔ اور اس سلسلے میں جھوٹی قسموں کا سہارا لیتے ہیں۔

اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۶۳ : ۲) "یعنی بری حرکتیں ہیں جو یہ لوگ کرتے ہیں"۔ آخر جھوٹ' فریب اور گمراہ کرنے سے بڑھ کر اور کیا برائی ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ یہ لوگ یہ کام کیوں کرتے ہیں؟ جھوٹی شہادت' جھوٹی قسمیں اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنے کا عمل نامشکور کیوں کرتے ہیں؟ یہ اس لیے کہ انہوں نے ایمان کے بعد کفر اختیار کر لیا ہے۔ یعنی اسلام کو اچھی طرح جاننے اور دیکھنے کے بعد انہوں نے کفر پر چلنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (۶۳ : ۳) "یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ ان لوگوں نے ایمان لا کر پھر کفر کیا' اس لیے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی' اب یہ کچھ نہیں سمجھتے"۔

انہوں نے اسلام کو اچھی طرح پہچان لیا ہے۔ لیکن اعلان ایمان کرنے کے بعد انہوں نے دوبارہ کفر کی طرف لوٹنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کوئی سمجھ دار' باذوق اور زندہ دل انسان یہ نہیں کر سکتا کہ ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر کی طرف لوٹ

جائے ۔ کون ایسا ہو سکتا ہے جو ذوق رکھتا ہو' معرفت رکھتا ہو۔ جو اس کائنات کے ایمانی تصور سے واقف ہو' جس نے ایمانی زندگی کا مزہ چکھا ہو' اور ایمان کی پاکیزہ فضا میں زندگی بسر کی ہو' ایمان کی روشنی میں سیدھی راہ پر چلا ہو' جو ایمان کے سایوں میں رہا ہو' اور پھر وہ کفر کی سیاہ رات اور کفر کی گرم اور جھلسا دینے والی فضاؤں میں جانا پسند کرے ۔ یہ حرکت وہی شخص کر سکتا ہے جس کا ذوق نہ ہو' جس کا دل حسد سے بھرا ہوا ہو۔ جس کے اندر کوئی احساس و شعور نہ ہو اور جو سیاہ و سفید میں تمیز نہ کر سکتا ہو۔

فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (۶۳ : ۳) "اس لیے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے' اب یہ کچھ نہیں سمجھتے"۔

اس کے بعد ان کی ایک نہایت منفرد تصویر پیش کی جاتی ہے ۔ اس تصویر کو دیکھ کر حقارت' نفرت پر بے اختیار ہنسی آتی ہے کہ یہ عجیب کندۂ ناتراش ہیں ۔ اندھے اور بہرے ہیں ۔ بے عقل' خالی الدماغ' اندھے' بزدل' سخت بخیل اور حاسد بلکہ وہ کندۂ ناتراش کی طرح ایک دیوار کے ساتھ چنے ہوئے ہیں ۔

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۶۳ : ۴) "انہیں دیکھو تو ان کے جثے تمہیں بڑے شاندار نظر آئیں ۔ بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے ہو مگر اصل میں یہ گویا لکڑی کے کندے ہیں جو دیوار کے ساتھ چن کر رکھ دیئے گئے ہوں ۔ ہر زور کی آواز کو یہ اپنے خلاف سمجھتے ہیں ۔ یہ پکے دشمن ہیں' ان سے بچ کر رہو' اللہ کی مار ان پر' یہ کدھر الٹے پھرائے جا رہے ہیں"۔

یہ اس طرح ہیں جس طرح مضحکہ خیز بت ہوتے ہیں ۔ انسان معلوم ہی نہیں ہوتے ۔ جب یہ خاموش ہوتے ہیں تو کندۂ ناتراش نظر آتے ہیں اور جب یہ بولتے ہیں تو ان کے الفاظ ہر قسم کے مفہوم' احساس' اثر یا حقیقت سے خالی ہوتے ہیں' تم ان کی بات سنتے ہو' یوں نظر آتے ہیں کہ گویا لکڑیاں ہیں جن کو دیوار کے سہارے سے کھڑا کر دیا گیا ہے (یعنی یہ بے جان ہیں اور ماسوائے آواز کے ان میں زندگی کی کوئی علامت نہیں)۔

ایک طرف تو وہ ایسے جامد' نافہم اور بے روح ہیں اور دوسری طرف سے یہ اس قدر چوکنے ہیں اور ڈرپوک ہیں اور ہر وقت کانپتے ہی رہتے ہیں اور انہیں ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں راز فاش نہ ہو جائے ۔

يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ (۶۳ : ۴) "ہر زور کی آواز یہ اپنے خلاف سمجھتے ہیں"۔ ان کو تو علم ہے کہ وہ منافق ہیں ۔ اور ان کے اوپر نفاق کا مہین پردہ پڑا ہوا ہے' جو چالاکی' قسموں اور احتیاطوں کی وجہ سے ابھی تک فاش نہیں ہوا۔ ہر وقت وہ سہمے رہتے ہیں کہ یہ پردہ چاک ہی نہ ہو جائے اور راز فاش ہی نہ ہو جائے ۔ تصویر یوں کھینچی گئی ہے کہ ہر وقت ادھر ادھر دیکھتے رہتے ہیں ۔ ہر حرکت' ہر آواز اپنے خلاف سمجھتے ہیں ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہر حرکت ان پر وار ہے' اور ہر آواز ان کی پکار ہے ۔ یہ عجیب تصویر ہے ان کی اگر معاملہ فہم و ادراک کا ہو' تو وہ لکڑی کے بت ہیں ۔ کوئی سمجھ' کوئی روح' کوئی شعور اور ایمان کا اثر ان پر نہیں ہے ۔ اور اگر معاملہ ثابت قدمی اور خوف کا ہو تو وہ اس باریک شئی

کی طرح ہیں جو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ جھکتی رہتی ہے۔ ہروقت کپکپاتی رہتی ہے۔ اور اپنی ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ وہ رسول اللہ کے دشمن نمبرایک ہیں۔

هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ (٦٣ : ٤) "یہ پکے دشمن ہیں ان سے بچ کر رہو"۔ یہ اسلامی محاذ کے اندر چھپے ہوئے خفیہ دشمن ہیں۔ اسلامی صفوں کے اندر ہیں' اس لیے یہ خارجی دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔

فَاحْذَرْهُمْ (٦٣ : ٤) "ان سے بچ کر رہو"۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم نہیں دیا گیا کہ ان کو قتل کرو' ان کو دوسرے انداز سے پکڑنا مطلوب تھا۔ اور اس میں حکمت' یقین' رواداری کے ساتھ ان کی سازشوں سے بچنا مطلوب تھا۔ (اس کا ایک نمونہ ابھی آرہا ہے)

قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (٦٣ : ٤) "اللہ کی مار ان پر یہ کدھر الٹے پھرائے جارہے ہیں"۔ یہ جہاں بھی جائیں اللہ ہی ان کے ساتھ جنگ کرنے والا ہے۔ اور اللہ جس کے خلاف دعا کرے' تو یہ حکم تصور ہوتا ہے کہ گویا فیصلہ ہو گیا کہ یہ ختم ہو گئے' قتل ہو گئے۔ اور یہی ہوا۔ پہلے مدینہ اور پھر جزیرۃ العرب میں۔

مزید بتایا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی اندرونی حالت کیا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف خفیہ طور پر کیا سازشیں کرتے ہیں اور آپ کے سامنے کس طرح جھوٹ بولتے ہیں ان کی اہم صفات یہ ہیں :

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ
وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ
يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ
لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ
لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ
ع ٨ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

١٣ "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تاکہ اللہ کا رسول تمہارے لیے مغفرت کی دعا کرے تو سر جھٹکتے ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ آنے سے رکتے ہیں۔ اے نبیؐ، تم چاہے ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو یا نہ کرو' ان کے لیے یکساں ہے' اللہ ہرگز انہیں معاف نہ کرے گا' اللہ فاسق لوگوں کو ہرگز ہدایت نہیں دیتا۔ یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول کے ساتھیوں پر خرچ کرنا بند کرو تاکہ یہ منتشر ہو جائیں۔ حالانکہ زمین اور آسمانوں کے خزانوں کا مالک اللہ ہے'

مگر یہ منافق سمجھتے نہیں ہیں ۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم مدینہ واپس پہنچ جائیں تو جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا ۔ حالانکہ عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے مگر یہ منافق جانتے نہیں ہیں"۔

سلف صالحین میں سے بے شمار لوگوں کی رائے یہ ہے کہ یہ آیات عبداللہ ابن ابی ابن سلول کے بارے میں ہیں ۔ علامہ ابن اسحاق نے غزوۂ بنی المصطلق کے ذیل میں اس کی تفصیلات دی ہیں ۔ یہ واقعہ بنی المصطلق کے پانی کے چشمے المریسیع پر سن ۶ ہجری میں ہوا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پانی پر نزول فرمایا تھا' غزوہ کے واقعات کے بعد' واقعہ یوں ہوا کہ لوگ پانی بھرنے کے لیے اس پانی پر جمع ہوگئے ۔ حضرت عمر کے ساتھ ایک شخص ملازم تھا جو بنی غفار قبیلے کا تھا اور اس کا نام جہجاہ ابن مسعود تھا ۔ یہ آپ کے گھوڑے کو چلاتا تھا ۔ یہ جہجاہ اور ایک دوسرے شخص سنان ابن وبر الجہنی بنی عوف ابن الخزرج کا حلیف ایک دوسرے سے آگے ہونے کی وجہ سے پانی پر لڑ پڑے ۔ جہنی نے آواز دی "اے قوم انصار" ۔ اور جہجاہ نے آواز دی "اے مہاجرین" ۔ اس پر عبداللہ ابن ابی ابن سلول سخت غصے میں آگیا ۔ اس وقت اس کی قوم کے کچھ لوگ اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ۔ ان میں حضرت زید بن ارقم ایک نوجوان لڑکے بھی تھے ۔ عبداللہ ابن ابی ابن سلول نے کہا اچھا' یہاں تک بات پہنچ گئی' اب یہ لوگ ہمارے علاقے میں زیادہ ہو کر ہمیں یہاں سے نکالنا چاہتے ہیں ۔ خدا کی قسم قریش کے ان گرے پڑے لوگوں اور ہماری مثال ایسی ہے جیسے کسی نے کہا : کتے کو پالو کہ وہ تمہیں کاٹے' خدا کی قسم اگر ہم مدینہ گئے تو ہم میں سے جو زیادہ عزت دار ہو گا وہ ذلیل کو نکال دے گا ۔ اس کے بعد اس نے حاضرین مجلس سے خطاب کر کے کہا ۔ یہ تو کام تو تم نے اپنے ساتھ خود کیا ہے ۔ تم نے ان کو اپنے علاقے میں آنے دیا ۔ تم نے ان کے ساتھ اپنے مال تقسیم کیے ۔ خدا کی قسم اگر تم نے ان سے اپنے ہاتھ کھینچ لئے ہوتے تو وہ دوسرے علاقوں کا رخ کرتے ۔ یہ باتیں زید ابن ارقم نے سن لیں ۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور یہ پوری باتیں آپ کو سنائیں ۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ رسول اللہ اپنے دشمنوں سے فارغ ہوگئے تھے ۔ جب حضورؐ کے سامنے یہ بات کی گئی تو حضرت عمر موجود تھے ۔ تو حضرت عمر نے کہا حضور عباد ابن بشر کو حکم دیں کہ اسے قتل کر دے ۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا "عمر اس پر تو لوگ یہ کہیں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرنے لگا ہے ۔ یہ تو نہیں ہو سکتا البتہ فوراً کوچ کا اعلان کر دو" ۔ یہ ایسا وقت تھا کہ اس میں رسول اللہ کبھی سفر نہ فرماتے تھے ۔ لوگ نکل پڑے ۔ عبداللہ ابن ابی ابن سلول حضور اکرم کے پاس گیا ۔ یہ اس وقت جب اسے معلوم ہو گیا کہ زید ابن ارقم نے پوری بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دی ہے ۔ اس نے قسم اٹھائی کہ نہ میں نے یہ بات کی ہے اور نہ اس بارے میں کوئی لفظ کہا ہے ۔ یہ عبداللہ ابن ابی اپنی قوم میں بڑا معزز اور ذی مرتبہ تھا ۔ اس کی ساتھ جو صحابہ کرام انصار سے آئے تھے ۔ انہوں نے کہا رسول خدا ممکن ہے یہ لڑکا بات کو پوری طرح نہ سمجھا ہو' یا وہم سے اس نے ایک بات سے کچھ اور سمجھا ہو ۔ اور بات اسے پوری طرح یاد نہ رہی ہو ۔ یہ لوگ عبداللہ ابن ابی ابن سلول پہ مہربان تھے اور اس کے طرفدار تھے ۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب حضورؐ نے کوچ کیا اور چل پڑے تو اسید ابن حضیر آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کا سلام کیا' اور پھر کہا اللہ کے نبی آپ تو ایک ایسے وقت میں کوچ کر رہے ہیں جو ایک نیا وقت ہے ۔ ایسے اوقات میں آپ نے کبھی کوچ کا حکم نہیں دیا ۔ رسول اللہ نے فرمایا کیا تم نے سنا نہیں کہ تمہارے ساتھی نے کیا کہا ۔ تو انہوں نے کہا "حضورؐ وہ کون ساتھی ہے تو آپ نے فرمایا (عبداللہ ابن ابی) ۔ تو انہوں نے کہا اس نے کیا کہا ہے ؟ تو حضورؐ نے فرمایا

کہ "اس کا خیال ہے کہ جب ہم مدینہ پہنچیں گے تو ہم میں سے عزت دار آدمی ذلیل لوگوں کو نکال دے"۔ تو انہوں نے کہا رسول اللہ تو پھر آپ اسے مدینہ سے نکال دیں گے۔ اگر آپ چاہیں گے۔ خدا کی قسم وہ ذلیل ہے اور آپ معزز ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ رسول اللہ اس کے ساتھ نرمی فرمائیں' خدا کی قسم اللہ نے آپ کو ہمارے پاس بھیجا ہے اور اس کی قوم اس کے لیے موتی تلاش کر رہی تھی کہ ان سے تاج بنا کر اسے پہنا دے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ آپ نے اس سے ایک مملکت چھین لی ہے۔

اس کے بعد حضورؐ اس دن پورا دن لوگوں کو لے کر چلے' شام ہو گئی' پھر ساری رات چلے کہ صبح ہو گئی' اور دوسرے دن بھی سورج نکل آیا اور وہ ان کو اذیت دینے لگا۔ اس کے بعد حضورؐ نے حکم دیا کہ پڑاؤ کرو۔ جونہی لوگ اتر کر زمین پر پڑے سو گئے اور حضورؐ نے یہ کام اس لیے کیا کہ لوگوں کو کل کی بات پر کوئی چہ میگوئی کرنے کا موقعہ ہی نہ ملے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں اس وقت سورہ منافقون نازل ہوئی۔ یہ ابن ابی کے بارے میں نازل ہوئی اور ان لوگوں کے بارے میں جو اس جیسے تھے۔ جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضورؐ نے زید ابن ارقم کو کان سے پکڑا۔ "یہ شخص ہے جس نے اللہ کے لیے اپنے کانوں سے کام کیا"۔ اور عبد اللہ ابن عبد اللہ ابن ابی ابن سلول کو پتہ چل گیا کہ اس کے والد نے کیا کیا ہے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھے عاصم ابن عمر ابن قتادہ نے بتایا کہ یہ عبد اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آئے۔ اور کہا کہ یا رسول اللہ ؐ ........ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ میرے والد عبد اللہ ابن ابی کو قتل کرنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ لازماً یہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ مجھے حکم دیں میں اس کا سر لا کر حاضر کر دوں گا۔ کیونکہ خزرج کو معلوم ہے کہ اپنے والد کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے والا میرے مقابلے میں کوئی نہیں ہے۔ مجھے یہ خطرہ ہے کہ آپ کسی اور کو حکم دیں کہ وہ میرے والد کو قتل کر دے۔ میرا نفس مجھے اجازت نہ دے گا کہ عبد اللہ ابن ابی کا قاتل مدینہ میں لوگوں کے اندر پھرے اور میں مجبور ہو جاؤں کہ ایک کافر کے بدلے مومن کو قتل کر دوں اور ہمیشہ کے لیے جہنمی ہو جاؤں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: "نہیں ہم اس کے ساتھ نرمی کریں گے اور اس کی ملاقات بھی اچھے طریقے سے کریں گے جب تک وہ ہمارے اندر زندہ ہے"۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کے بعد جب بھی وہ کوئی ایسی حرکت کرتا' اس کی قوم اس پر اس کی سخت گرفت کرتی۔ اسے پکڑتے اور اس کے ساتھ لوگ سختی کرتے۔ اس پر رسول اللہ ؐ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ اس کی قوم اس سے نفرت کرنے لگی ہے۔ "عمر تمہاری اب کیا رائے ہے؟ کہ جس دن تم نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں اسے قتل کر دوں' اگر میں اسے اس دن قتل کر دیتا تو اس کی وجہ سے شورش پیدا ہو جاتی اور آج اگر میں خود اس کے قبیلے کو حکم دوں تو وہ اسے قتل کر دیں" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا' خدا کی قسم مجھے اب معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے میری رائے سے بہت زیادہ برکت والی ہے۔

عکرمہ اور ابن زید وغیرہ نے ذکر فرمایا ہے کہ لوگ جب واپس مدینہ پہنچے تو حضرت عبد اللہ ابن عبد اللہ ابن ابی ابن السلول رضی اللہ عنہ مدینہ کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے تلوار نکال لی' لوگ اس کے پاس سے گزرتے رہے' جب اس کے والد رئیس المنافقین آئے تو انہوں نے باپ سے کہا: "پیچھے کھڑے ہو جاؤ"۔ خدا کی قسم' تم اس جگہ

سے ادھر نہیں آ سکتے۔ جب تک رسول اللہ اجازت نہ دے دیں۔ اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ معزز ہیں۔ اور تم ذلیل ہو' جب رسول اللہ تشریف لائے تو آپ اس وقت قافلے کے "ساقہ" کے طور پر آ رہے تھے (ساقہ قافلے کے پیچھے چلنے والا افسر جو دیکھے کہ کسی نے راہ گم کر دیا ہو یا کوئی ضرورت مند ہو گیا ہو) تو رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی ابن سلول نے حضورؐ سے اپنے بیٹے کی شکایت کی تو عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا حضور یہ اس وقت تک شہر کے اندر نہیں جا سکتا جب تک آپ اجازت نہ دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اجازت دی۔ اور بیٹے سے کہا: اب جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی ہے تو آپ جا سکتے ہیں"۔

یہاں آکر ہم کبھی ان واقعات کو دیکھتے ہیں' کبھی صحابہ کرام کو دیکھتے ہیں اور کبھی نصوص قرآنی کو دیکھتے ہیں' یوں ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت' اللہ تعالیٰ کے نظام تربیت اور اللہ کے دست قدرت اور نظام قضا و قدر کو دیکھتے ہیں۔ تو حیران رہ جاتے ہیں--- مسلمانوں کی صفوں کے اندر منافقین نہایت دور تک گھسے ہوئے ہیں۔ یہ منافق تقریباً دس سال سے یہاں رہ رہے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان کو چن کر اپنی صفوں سے نکالتے نہیں ہیں اور ان منافقین کے ناموں اور اشخاص کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو صرف اپنی وفات سے چند ایام قبل ہی اطلاع دیتا ہے۔ اگرچہ حضورؐ ان کی چاپلوسی' چالاکی اور عیاری کی وجہ سے انہیں خوب جانتے تھے۔ اسی طرح دوسری علامات کی وجہ سے بھی کہ جب کوئی بات ہوتی ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا۔ اور اللہ نے یہ حکم اس لیے دیا کہ اللہ کسی شخص کے دل کو کسی دوسرے کے اختیار میں نہیں دیتا۔ دلوں کا مالک صرف اللہ ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو دلوں کے بھیدوں پر محاسبہ کر سکتا ہے۔ لوگوں کا تعلق لوگوں کے ساتھ ظاہری اقرار اور حالات پر ہو گا۔ اور محض شک کی بنا پر کسی کو پکڑا نہ جائے گا بلکہ شک کی بنا پر چھوڑا جائے گا۔ محض عقل کی بنیاد پر کسی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تک کہ جب اللہ نے رسول کو اطلاع دے دی کہ آخر تک بعض لوگ نفاق پر قائم ہیں اور نام بھی بتا دیئے تب بھی حضور نے ان کو جماعت سے نہ نکالا۔ جب تک کہ وہ اسلام کا اقرار کرتے اور اسلامی فرائض و واجبات ادا کرتے رہے اور حضورؐ نے صرف حذیفہ ابن الیمان رضی اللہ عنہ کو اطلاع دی تھی اور انہوں نے مسلمانوں کے اندر اس راز کو نہیں پھیلایا۔ یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت حذیفہ کے پاس آتے تھے اور اپنے بارے میں ان سے اطمینان حاصل کرتے کہ بتاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تو منافقین میں شمار نہیں کیا۔ تو حضرت حذیفہ فرماتے' عمر رضی اللہ عنہ تم ان میں سے نہیں ہو اور اس سے زیادہ کچھ نہ کہتے اور رسول اللہ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ ان میں سے اگر کوئی مرجائے تو اس کا نماز جنازہ نہ پڑھائیں ۔جب ان میں سے کوئی مرجاتا تو رسول اللہ اس کی نماز جنازہ نہ پڑھاتے ۔ یوں معلوم ہو جاتا کہ یہ منافق ہے۔ جب رسول اللہ فوت ہو گئے تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ان لوگوں کی نماز جنازہ میں شریک نہ ہوتے تھے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی نماز جنازہ میں نہ جاتے تھے' جن میں حضرت حذیفہ نہ گئے ہوں۔ جب وہ دیکھتے کہ حضرت حذیفہ موجود ہیں تو معلوم کر لیتے کہ منافقین میں سے نہیں ہے۔ اور اگر حذیفہ نہ ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز نہ پڑھتے لیکن منہ سے کچھ نہ کہتے۔

اس طرح یہ واقعات آگے بڑھتے رہے' اللہ کی تقدیر اور حکمت کے مطابق۔ اللہ کی مقرر کردہ حکمتوں اور مقاصد کے حصول کے لیے تربیت' عبرت اور اخلاقی اور تنظیمی تربیت کی خاطر--- یہ واقعہ جس کے بارے میں یہ آیات نازل

ہوئیں 'اس کے اندر کس قدر عبرتیں ہیں؟

ذرا عبداللہ ابن ابی ابن سلول کو دیکھیں ۔ یہ مسلمانوں کے اندر رہ رہا ہے ۔ رسول اللہ کے قریب رہتا ہے ۔ اس دین کی حقانیت کے واقعات و احادیث اور نشانات و علامات اس کے ماحول میں 'اس کے سامنے پے در پے ظاہر ہو رہے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اسے توفیق ایمان نہیں دے رہا ہے ۔ کیونکہ اللہ کے نظام قضا و قدر میں اس طرح لکھا ہی نہ گیا تھا ۔ اثر آفرینی اور ضوپاشی کا یہ سیلاب اس تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوا' اس لیے کہ اس کے دل میں اس دین کی دشمنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ یوں کہ وہ اوس اور خزرج کا بادشاہ نہ بن سکا ۔ اس نے یہ کھیل تیار کر لیا تھا 'مگر اسلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں داخل ہوئے تو یہ کھیل خراب ہو گیا ۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ہدایت قبول نہ کی ۔ حالانکہ ہدایت کے دلائل ہر طرف سے آ رہے تھے ۔ اور اسلام میں ہر طرف وسعت ہو رہی تھی ۔

لیکن دوسری طرف ان کے بیٹے ہیں' ان کا نام بھی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ہے ۔ یہ ایک مسلم اور مخلص مسلم کا بلند ترین نمونہ ہیں ۔ یہ باپ ان کے لیے مصیبت ہے' یہ باپ کے کارناموں سے تنگ آ چکے ہیں ۔ باپ جو موقف اختیار کرتا ہے' وہ ان کے لیے شرمندگی کا سبب ہے ۔ لیکن باپ جو بھی کرے وہ اس کے ساتھ حسن سلوک کرنے والے سعادت مند بیٹے ہیں ۔ یہ سنتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو شاید اس شخص کو اب قتل ہی کرا دیں ۔ ان کے دل میں جذبات اور ردعمل کا واضح طوفان اٹھتا ہے ۔ اور وہ رسول اللہ کے سامنے ان کا اظہار صاف صاف کر دیتے ہیں ۔ وہ اسلام سے محبت کرتے ہیں ۔ رسول اللہ کے مطیع فرمان بھی ہیں ۔ وہ صاف کہتے ہیں کہ اگر رسول اللہ مجھے اپنے باپ ہی کے خلاف حکم دیں تو میں تعمیل کروں گا ۔ لیکن وہ اس بات کو برداشت نہیں کرتے کہ کوئی اور آگے بڑھے اور ان کے باپ کی گردن اڑا دے ۔ وہ زمین کے اوپر زندہ پھرے اور لوگ انہیں دیکھیں ۔ وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ شاید میرا نفس اس منظر کو برداشت نہ کر سکے ۔ شیطان مجھے بدلہ لینے پر مجبور کر دے ۔ تو وہ حضورؐ کے سامنے اپنے یہ خلجانات پیش کر کے مسئلے کے حل کی درخواست کرتے ہیں ۔ اور خود ہی تجویز پیش کرتے ہیں کہ اگر آپ نے لازماً یہ کام کرنا ہی ہے تو مجھے حکم دیں ۔ میں اس کا سر آپ کے سامنے پیش کر دوں گا تاکہ کوئی غیر اس کام کو نہ کرے اور میں اپنے کافر والد کے بدلے ایک مسلمان کو قتل کر دوں اور جہنم رسید ہو جاؤں ۔

انسانی فکر و خیال کو جس میدان میں بھی جولانی دی جائے 'اور جس پہلو سے بھی اس واقعہ پر نظر دوڑائی جائے اس میں حسن و جمال ہی نظر آتا ہے ۔ ایک مومن کے دل میں ایمان کس قدر خوبصورت نظر آتا ہے کہ وہ رسول اللہ کے سامنے یہ تجویز رکھتا ہے کہ دنیا کا مشکل ترین کام یعنی خود اپنے باپ کے قتل کا حکم مجھے دیجئے ۔ اور یہ ذیوٹی وہ صداقت سے لے رہا ہے ۔ اور نور ایمان اور حکمت ایمانی کا جمال دیکھیے کہ اس پیشکش کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو کس حکمت سے اس سے بھی بڑی مصیبت سے بچاتا ہے ۔ یہ کہ وہ انسانی جذبات سے مغلوب ہو کر ایک کافر باپ کے بدلے مومن کو قتل کر دے اور وہ مومن کو جنت میں پائے اور اپنے آپ کو دوزخ میں ۔ اور اسی مومن کی صداقت اور سچائی دیکھیے کہ وہ اپنی کمزوری کا بھی صاف صاف اظہار کرتا ہے اور وہ کہتا ہے "خدا کی قسم خزرج کو معلوم ہے کہ میرے مقابلے میں والد کے بارے میں احسان کرنے والا جوان نہیں ہے" ۔ چنانچہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کرتے ہیں کہ انہیں اس مشکل سے نکالا جائے ۔ یہ مومن اپنے کیس کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ نہ حکم عدولی ہوتی ہے اور نہ آپ کی دل شکنی

ہوتی ہے ۔ کیونکہ حکم رسول کو ماننے کے لیے وہ تیار ہیں ۔ اشارے کی ضرورت ہے ۔ بشرطیکہ حضور حکم دیں اور وہ والد کا سر پیش کر دیں ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ سچا مومن کس قدر مشکل صورت حال میں پھنس گیا ہے ۔ حضورؐ نہایت ہی شریفانہ انداز میں ان کی ہر مشکل دور فرما دیتے ہیں ۔ بلکہ حضورؐ فرماتے ہیں ''ہم اس کے ساتھ نرمی کریں گے اور اس کے ساتھ محفل میں اچھا سلوک کریں گے جب تک کہ وہ زندہ ہے'' ۔ اور اس سے قبل جب حضرت عمر نے اس کے قتل کی تجویز پیش کی تو آپ نے ان کی تجویز یہ کہہ کر رد کر دی کہ لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں ۔

پھر اس واقعہ میں حضرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو تصرفات و اقدامات ہیں وہ بھی قابل ملاحظہ اور قابل تقلید ہیں ۔ آپ ایک ایسے قائد کی طرح کام کرتے نظر آتے جو الہام کی روشنی میں کام کرتا ہے ۔ آپ نے لشکر کو حکم دیا کہ کوچ کرو ، حالانکہ آپ کی ایسے اوقات میں کوچ کرنے کی عادت نہ تھی ۔ اور آپ نے اس سفر کو اس قدر طویل وقت کے لیے جاری رکھا کہ لوگ تھک کر چور ہو گئے تاکہ لوگوں کے اندر عصبیت جاہلیہ کے جذبات پھیلائے جانے کا کوئی موقعہ ہی کسی کو نہ ملے ۔ کیونکہ دو افراد نے اپنی جنگ میں عصبیت کا سہارا لیا تھا ۔ ایک نے کہا اے انصاریو ! دوسرے نے کہا اے مہاجرو ! اور پھر اس موقعہ پر رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی ابن سلول جو فتنہ انگیزی کرنا چاہتا تھا اسے بھی حضورؐ نے دبا دیا ۔ اس کی اسکیم یہ تھی کہ مہاجرین اور انصار کے درمیان جو اخوت اور محبت ہے ، اس کو جلا کر رکھ دے ۔ حالانکہ یہ اخوت و محبت کا وہ نادر نمونہ تھا جس کی مثال انسان کی ہزاروں سالوں کی تاریخ میں نہیں ملتی ۔ اس کے بعد اسید ابن حضیر کے ساتھ حضورؐ کی گفتگو اور اس کے اندر پائی جانے والی روحانی تیاری ، جو اس فتنے کے مقابلے میں حضور فرما رہے تھے اور پھر اس فتنے کے سرغنے کو پکڑنے کا جوش جبکہ وہ اپنی قوم میں اب تک بھی با اثر ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ سب سے آخر میں رجل مومن عبداللہ ابن عبداللہ کا کردار نہایت ہی روشن اور خوبصورت ہے کہ وہ مدینہ کے باہر تلوار لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے باپ کو شہر کے اندر داخل نہیں ہونے دیتے ، جب تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہ دیں ۔ اور یہ ہے مظاہرہ اس بات کا کہ ۔

لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ (۶۳ : ۸) ''اس سے معزز شخص ذلیل شخص کو نکال باہر کرے گا'' ۔ اور اس پر بھی رجل مومن نے یہ کام اس لیے کیا کہ لوگ جان لیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عزت دار ہیں اور ان کا باپ ذلیل ہے ۔ آخر کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں اور اس ذلیل شخص کو داخلے کی اجازت ہوتی ہے ۔ اور سائنسی تجربہ بتا دیتا ہے کہ عزیز کون ہے اور ذلیل کون ؟ اسی واقعہ میں اور اسی وقت میں ۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بلند ترین چوٹی ہے جہاں تک یہ مومنین پہنچ چکے تھے ۔ ایمان نے ان کو ان مقامات بلند اور مراتب بلند تک پہنچا دیا تھا لیکن وہ تھے انسان ۔ ان میں بشری کمزوریاں تھیں ، ان میں جذبات تھے ، ان کے دلوں میں خلجانات آتے تھے ، یہ ہے اس دین کا نہایت ہی نمایاں وصف ، بشرطیکہ لوگ اسے اس کی حقیقت کے مطابق سمجھیں ۔ اور لوگ ان لوگوں کو ایک انسان کی طرح رکھ کر سمجھیں کہ یہ لوگ مکہ اور مدینہ کی سرزمین پر بطور انسان رہے ، کھانا کھاتا رہے اور بازاروں میں پھرتے رہے اور پھر بھی اس مقام تک پہنچ گئے ۔

اب وہ آیات جو ان واقعات کے بارے میں نازل ہوئیں' مناسب ہے کہ قدرے ان کے ساتھ بھی رہیں :

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا یَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَ رَاَیْتَهُمْ یَصُدُّوْنَ وَ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ (۶۳ : ۵) "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تاکہ اللہ کا رسول تمہارے لیے مغفرت کی دعا کرے تو سر جھٹکتے ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ آنے سے رکتے ہیں"۔ یہ لوگ یہ فعل کرتے ہیں' اور اس قسم کی باتیں منہ سے نکالتے ہیں' جب ان کو معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ باتیں پہنچ گئی ہیں تو پھر یہ فوراً ڈر جاتے ہیں۔ ذلیل ہو کر جھوٹی قسمیں اٹھاتے ہیں اور ان جھوٹی قسموں کے سہارے زندہ رہ رہا ہے اور اگر وہ امن کی حالت میں ہوں' کوئی ان سے کہے کہ آؤ رسول اللہ سے درخواست کرو کہ تمہاری بخشش کے لیے رسول اللہ دعا کریں تو سر جھٹکتے ہیں اور نہایت ہی تکبر میں حضورؐ کے پاس آنے سے رک جاتے ہیں۔ یہ منافقین کی دونوں باہم متضاد صفات ہیں۔ اگرچہ یہ اپنی قوم میں' باعزت اور باتمام لوگ ہوں۔ یہ دل میں اپنے اندر سے اس قدر کھوکھلے اور ڈرپوک ہوتے ہیں کہ یہ تکبر کرتے ہیں' اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ سر جھٹک کر پھیر دیتے ہیں' جب ان کو خوف نہ ہو' لیکن جب یہ خوف ہو کہ رسول اللہ کے سامنے جاتا ہے تو پھر قسمیں اٹھاتے ہیں۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ نے ان کے بارے میں فیصلہ کر دیا ہے' لہٰذا اب آپ ان کے بارے میں استغفار کریں یا نہ کریں' استغفار کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ (۶۳ : ۶) "اے نبیؐ ' تم چاہے ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو یا نہ کرو' ان کے لیے یکساں ہے' اللہ ہرگز انہیں معاف نہ کرے گا' اللہ فاسق لوگوں کو ہرگز ہدایت نہیں دیتا"۔

ان کے فسق و فجور کی ایک جھلک ملاحظہ ہو' جس کی وجہ سے اللہ نے ان کے بارے میں فیصلہ کر دیا ہے کہ انہیں ہدایت نصیب نہ ہو گی۔

هُمُ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰی یَنْفَضُّوْا (۶۳ : ۷)

"یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ کے ساتھیوں پر خرچ کرنا بند کر دو' تاکہ یہ منتشر ہو جائیں"۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کے کہنے والے کا خبث باطن عیاں ہے اور یہ شخص نہایت ہی ذلیل انسان ہے۔ یہ وہ منصوبہ ہے جو اہل باطل روز اول سے اہل ایمان کے خلاف آزماتے ہیں۔ زمان و مکان کی قید کے سوا ہر جگہ اور ہر دور میں اہل باطل نے یہ نسخہ آزمایا ہے جیسا کہ اگلوں پچھلوں نے مشورہ کر کے یہ طے کر دیا ہے کہ اہل دین اور اہل نظریہ لوگوں پر رزق کے دروازے بند کر دو۔ یہ اس لیے کہ یہ لوگ اس قدر ذلیل ہوتے ہیں کہ یہ لوگ ہر بات ہر فیصلہ پیٹ کے نقطہ نظر سے کرتے ہیں۔ چنانچہ اہل ایمان کے خلاف شیطان نے یہی نسخہ آزمانے کی تجویز کی۔

یہی نسخہ قریش نے بنی ہاشم کے خلاف آزمایا اور ان کو شعب بن طالب میں محصور کر دیا اور راشن اور ضروریات زندگی ان پر بند کر دیں تاکہ بنو ہاشم رسول اللہ کی حمایت چھوڑ دیں اور رسول اللہ کو مشرکین کے سپرد کر دیں۔

یہی منصوبہ منافقین مدینہ کے رئیس نے پیش کیا کہ تم ان لوگوں پر انفاق بند کر دو 'یہ سب بھاگ کر چلے جائیں گے۔ تنگی حالات اور بھوک و افلاس سے مجبور ہو کر۔

اور یہی نسخہ کمیونسٹوں نے اپنے علاقے میں ان اہل دین کے خلاف استعمال کیا کہ ان پر ضروریات زندگی بند کر دیں تا کہ بھوک سے مر جائیں یا دین اور خدا کا انکار کر دیں۔ اور نماز و روزہ چھوڑ دیں۔

آج ہمارے دور میں پوری دنیا میں احیاء اسلام کی جو تحاریک چل رہی ہیں ان کے ساتھ بھی ان کے مخالفین یہی سلوک کر رہے ہیں۔ ان کے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں' انہیں افلاس سے مار رہے ہیں اور ان پر ملازمتوں کے دروازے بند کر رہے ہیں۔

غرض تمام دشمنان اسلام نے بالاتفاق اس ذلیل ذریعہ کو اہل ایمان کے خلاف آزمایا ہے۔ اور یہ طریقہ قدیم زمانوں سے آج تک یونہی چلا آ رہا ہے۔ لیکن ان دشمنان اسلام نے اس حقیقت کو بھلایا ہے۔

وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ (۶۳ : ۷) "حالانکہ زمین و آسمان کے خزانوں کا مالک اللہ ہے مگر یہ منافق سمجھتے نہیں ہیں"۔ حالانکہ زمین و آسمان کے خزانوں ہی سے اللہ ان لوگوں کو رزق دے رہا ہے جو مسلمانوں کا رزق بند کر رہے ہیں۔ کیونکہ نہ یہ لوگ خود اپنا رزق پیدا کر رہے ہیں اور نہ مومنین کا رزق بند کر سکتے ہیں لیکن یہ لوگ غبی ہیں اور یہ اس واضح حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ وہ خود اپنی روزی کے مالک نہیں اور بند کرنا چاہتے ہیں دوسروں کا رزق۔

یوں اللہ تعالیٰ مومنین کو ثابت قدم اور ان کی دلوں کو مضبوط فرماتے ہیں تا کہ وہ دشمنان اسلام کے اس ذلیل منصوبے کا مقابلہ کریں۔ کیونکہ اللہ کے دشمنوں کے پاس اب اور کوئی ہتھیار نہیں رہا ہے۔ اس لیے وہ اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے ہیں۔ اللہ ان کو مطمئن کرتا ہے کہ زمین و آسمان کے خزانوں کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ لہٰذا اگرچہ دشمنوں کو بھی دیتا ہے لیکن دوستوں کو بھی نہیں بھلاتا۔ اللہ کی رحمت کا قانون یہ ہے کہ وہ دشمنوں کو بھی رزق دیتا ہے۔ کسی کو بھی بھوک سے نہیں مارتا۔ ان لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر اللہ ان کا رزق کاٹ دے تو یہ لوگ کچھ بھی نہ پائیں گے۔ اس لیے اللہ اپنے بندوں کو ایسے حالات کے سپرد نہیں کرتا کہ وہ روزی سے محروم ہو جائیں۔ وہ تو بہت بڑا کریم ہے۔ کیونکہ کسی پر رزق کے دروازے بند کرنے کا کام وہ شخص ہی کر سکتا ہے جو بہت ذلیل اور پرلے درجے کا خسیس ہو۔ اور اس کے بعد ان کا یہ قول :

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ (۶۳ : ۸) "یہ کہتے ہیں کہ ہم مدینہ واپس پہنچ جائیں تو جو عزت والا ہے وہ ذلیل" کو وہاں سے نکال باہر کرے گا"۔ اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ اس حقیقت کو عبداللہ ابن عبداللہ ابن ابی نے کس طرح حقیقت کر کے پیش کیا اور کس طرح ذلیل آدمی عزت دار آدمی کی اجازت سے شہر میں داخل ہوا۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۶۳ : ۸) "حالانکہ عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے مگر یہ منافق جانتے نہیں"۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ اور مومنین

کو اپنے ساتھ ایک صف میں شامل کر کے ان کو بھی معزز بنایا اور یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے کہ اللہ اپنے رسول اور مومنین کو اپنے پہلو میں کھڑا کر دے ۔ اور کہے ''ہم ہیں معزز اور یہ ہیں ذلیل ۔ اللہ نے بالکل سچ کہا' کہ اس نے قلب مومن میں ایمان کو عزت کے مساوی قرار دیا اور مومن کو عزت حاصل ہوئی اللہ کی عزت سے 'ایسی جو نہ ہلکی ہوتی ہے' نہ اس میں سستی آتی ہے' نہ جھلکتی ہے' اور نہ نرم ہوتی ہے ۔ اور یہ عزت نفس انسان مومن کو بہت ہی متزلزل حالات میں بھی' ایمان کے حوالے سے کمزور ہونے نہیں دیتی ۔ اس طرح جب کسی کے دل میں ایمان اچھی طرح قرار پکڑ لیتا ہے اور پختہ ہو جاتا ہے تو اس شخص کے دل میں عزت بھی نہایت مضبوط اور جڑ پکڑ لیتی ہے ۔

وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۶۳ : ۸) ''مگر منافق جانتے نہیں'' ۔ وہ کیا جانیں' انہوں نے نہ تو عزت نفس کا ذوق پایا اور نہ ان کے پاس اس کا سرچشمہ ہے ۔

اب اللہ تعالیٰ ان مومنین کو آخری بار پکارتا ہے' وہ مومنین جن کے رسول کو اور خود ان کو اللہ نے اپنی عزت سے معزز بنایا' اللہ کی طرف سے ان کی طرف اب اس سورت میں آخری ندا آتی ہے کہ وہ عزت اور شرف کے اس مقام تک بلند ہو جائیں اور منافقین کی تمام صفات اپنے اندر سے نکال دیں ۔ اور مال اور اولاد سے بلند ہو کر شرف کا یہ مقام حاصل کریں ' دیکھو دنیا کا کوئی مفاد' چاہے مال ہو یا اولاد ہو' تمہیں روک نہ دے ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ
عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ وَاَنْفِقُوْا مِنْ
مَا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ
اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ
۲ ع ۲ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

۱۴ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں ۔ جو لوگ ایسا کریں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں ۔ جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور اس وقت وہ کہے کہ ''اے میرے رب' کیوں نہ تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا'' ۔ حالانکہ جب کسی کی مہلت عمل پوری ہونے کا وقت آ جاتا ہے تو اللہ کسی شخص کو ہرگز مزید مہلت نہیں دیتا' اور جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اس سے باخبر ہے'' ۔

اگر انسان کا قلب زندہ نہ ہو تو مال اور اولاد انسان کو غافل کر دینے والے بن جاتے ہیں ۔ یہ سامان لہو و لعب ہیں ۔ قلب زندہ ہو گا تو معلوم ہو گا کہ انسان کا مقصد وجود کیا ہے ۔ اسے معلوم ہو گا کہ اللہ نے اسے پیدا کیا ہے اور اس کے اندر اپنی روح پھونکی ہے ۔ اس کی روح کے اندر ایک ایسا روحانی شوق پیدا کیا جو انسان کو' انسانی طاقت کی حدود کے اندر'

صفات الٰہیہ کا عکس دیتا ہے ۔ یہ مال و اولاد تو دنیا کے عارضی انتظام اور دنیا میں رہنے کی حد تک محدود ذمہ داریاں ہیں' جو انسان پر ڈالی گئی ہیں ۔ اس لیے نہیں کہ یہ انسان کو آخرت کی اصل باقی اور دائمی زندگی سے غافل کر دیں اور انسان اللہ اور اللہ تک پہنچنے کے اعلیٰ مقصد کو بھلا ہی دے اور انسان وہ سبق بھلا دے جو عالم بالا سے اسے ملتا ہے ۔ یوں وہ غافل ہو کر خسارے میں پڑ جائے ۔

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۶۳: ۹) "جو لوگ ایسا کریں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں" ۔ یوں ان کو پہلا خسارہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ انسانی صفات بھلا دیتے ہیں ۔ کیونکہ انسان مکمل انسان تب ہی بنتا ہے کہ اسے عالم بالا سے اتصال حاصل ہو اور جو شخص انسانیت ہی گنوا دے' اس نے گویا سب کچھ گنوا دیا ۔ اس نے گویا اموال و اولاد کو بھی گنوا دیا ۔

ایک ہی آیت میں انفاق کے لیے بے شمار موثر اکساہٹیں

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ (۶۳: ۱۰) "جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو" ۔ یہ سمجھایا جاتا ہے کہ تمہارے ہاں رزق اور وسائل رزق جو آتے ہیں وہ کہاں سے آتے ہیں؟ یہ اس اللہ کے ہاں سے آتے ہیں جس پر تم ایمان لائے ہو' اور جو تمہیں انفاق کا حکم دیتا ہے ۔

مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ (۶۳: ۱۰) "قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے" ۔ بس اس سے سب کچھ رہ جائے اور یہ اس کی اولاد یا دوسروں کے پاس چلا جائے ۔ اور اگلے جہاں میں جب وہ تلاش کرے تو اسے آگے بھیجا ہوا کچھ نظر نہ آئے ۔ یہ سب سے بڑی حماقت اور سب سے بڑا خسارہ ہے ۔ پھر وہاں یہ تمنائیں کرے گا کہ اسے دوبارہ مہلت دی جائے اور وہ دوبارہ صالحین میں سے بن جائے گا ۔ لیکن یہ تو محض تمنا ہی ہوگی ۔

وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا (۶۳: ۱۱) "حالانکہ جب کسی کی مہلت عمل پوری ہونے کا وقت آ جاتا ہے تو اللہ کسی کو مزید مہلت نہیں دیتا" ۔ مزید مہلت ممکن نہ ہوگی ۔

وَاللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۶۳: ۱۱) "اور جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اس سے باخبر ہے؟"

غرض ایک ہی آیت میں یہ مختلف قسم کی یاد دہانیاں ہیں ۔ اور منافقین کی خصوصیات اور مسلمانوں کے خلاف ان کی سازشوں کو بیان کرنے کے بعد یہ ہدایات برمحل تھیں ۔ اب جبکہ مسلمان اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صف میں اہل عزت کے ساتھ یکجا کھڑے ہیں ۔ لہٰذا ان کا فرض ہے کہ وہ ایمان کے تقاضے پورے کریں ۔ اللہ کو یاد کریں اللہ کی قوت امن کا سرچشمہ ہے ۔ یوں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو قرآن کے ذریعہ تربیت دیتا ہے ۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ـــ ۲۸

## سورۃ التغابن ۔ ۶۴

## ۱ ـــ تا ـــ ۱۸

# سورۃ التغابن ایک نظر میں

اس سورت کے موضوع' محور' انداز گفتگو' ماحول اور اشارات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت مکی سورتوں کی طرح ہے۔ خصوصاً اس کے ابتدائی پیراگراف اور آیت۔ صرف آخری پیراگرافوں اور آیات میں مدنی فضا کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے ابتدائی پیراگراف یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا (آیت ۱۴) تک اسلامی عقائد و نظریات سے متعلق ہیں اور اسلوب بھی مکی سورتوں کی طرح ہے جن میں خطاب مشرکین مکہ کو ہوا کرتا تھا۔ اور خطاب کا انداز اور مضامین و تصورات بھی ایسے ہیں کہ جس طرح دعوت کا آغاز بالکل نئے مخاطبین سے ہو رہا ہے گویا مخاطب کے سامنے پہلے یہ تصورات پیش نہیں ہوئے۔ پھر ان میں اس کائنات کی نشانیاں پیش کی گئی ہیں۔ سابق امم کے واقعات کی طرف اشارہ ہے اور بعث بعد الموت اور قیامت کے مشاہد ہیں جن کو نہایت ہی تاکید کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح کہ گویا مخاطبین ان عقائد کے منکر ہیں۔

آخری فقرات بے شک مدنی مزاج و انداز کے ہیں۔ جس طرح اکثر مدنی سورتوں کا انداز ہوتا ہے۔ یہ کہ انفاق فی سبیل اللہ بہت اہم ہے' یہ کہ مال و اولاد اسلامی انقلاب کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ یہ مضامین اکثر مدنی دور کے ہیں اور بار بار آتے ہیں کیونکہ مدینہ ہی میں نئی اٹھنے والی امت مسلمہ کو ان باتوں کی ضرورت تھی۔ پھر ان آیات میں ان ذمہ داریوں کا بھی ذکر ہے جو مومنین کے کاندھوں پر پڑ گئے ہیں۔ معاملات کو اللہ کے بھروسے پر چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے اور مسئلہ تقدیر کو ذہنوں میں بٹھانے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ مضامین جہاد کے راستے میں رکاوٹوں کے حوالے سے مدنی سورتوں میں بکثرت آتے ہیں۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور بعض میں آتا ہے کہ یہ مدنی ہے اور اس کے مدنی ہونے کو ترجیح بھی دی گئی ہے۔ قریب تھا کہ میں اس کے مکی ہونے کی طرف مائل ہو جاتا کیونکہ اس کے ابتدائی پیراگراف خالص مکی انداز کے ہیں۔ لیکن آخر کار میری رائے یہی بنی کہ یہ مدنی سورت ہے۔ اور یہی راجح رائے ہے۔ کیونکہ ہجرت کے بعد مدینہ میں بھی مکہ ہی جیسے حالات تھے۔ اور مدینہ سے لے کر مکہ کو بھی خطاب ہو رہا تھا۔ اور مدینہ کے ارد گرد جو مشرک قبائل تھے' ان سے بھی خطاب ہو رہا تھا۔ نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ مدینہ میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں کوئی ایسی بحث نہ تھی جس میں خالص نظریاتی اور دعوتی پہلو ہو۔ مدینہ میں بھی ایسے لوگ تھے جن کے سامنے خالص مکی انداز میں دعوت اسلامی کے پیش کرنے کی ضرورت تھی۔

اس سورت کے پہلے پیراگراف میں ایمانی تصورات کے آفاقی پہلو کو لیا گیا ہے یہ کہ یہ پوری کائنات اللہ کی تخلیق ہے اور اس میں اسی کی بادشاہت ہے اور وہ اس کے ساتھ ہر وقت رابطہ رکھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے بعض اسماء حسنیٰ اور بعض صفات کا اس کائنات میں موثر ظہور ہوتا ہے۔

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۱) هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُمْ مُّؤْمِنٌ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۲) خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ (۳) يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (٤) (٦٤ : ١ تا ٤) "اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے ۔ اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور پھر تم سے کوئی کافر ہوئے اور کوئی مومن ہوئے اور اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو ۔ اس نے زمین و آسمان کو برحق پیدا کیا اور تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی ہے اور اسی کی طرف آخر کار تمہیں پلٹنا ہے ۔ زمین و آسمان کی ہر چیز کا اسے علم ہے ' جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو ' سب اس کو معلوم ہے ۔ اور وہ دلوں کا حال تک جانتا ہے" ۔

ایمان کا یہ کائناتی اور آفاقی تصور اس قدر دقیق اور اس قدر وسیع اور جامع و مانع ہے کہ ایمان کی تاریخ میں اسلام جیسا جامع تصور نہیں دیکھا گیا ۔ اسلام کا تصور یہ ہے کہ تمام رسالتوں کا عقیدہ یہی عقیدۂ توحید رہا ہے ۔ اور یہ عقیدہ ہر امت کے ہاں رہا ہے ۔ کہ اس کائنات کو اللہ نے پیدا کیا اور تمام مخلوق کو اللہ ہی نے پیدا کیا اور اللہ اس پوری مخلوقات کی نگرانی کر رہا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے اور قرآن نے تمام رسولوں کا یہی عقیدہ نقل کیا ہے اور ان باتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے ۔ جو تحریف شدہ کتب سماوی میں پائی جاتی ہیں ' یا وہ لوگ جو ان ادیان کے بارے میں کتابیں لکھتے ہیں اور ان کا قرآن پر ایمان نہیں ہے ۔ نہ پورے قرآن پر اور نہ قرآن کے بعض حصوں پر ۔ کتب سماوی میں ایمانی عقائد میں جو تبدیلیاں آئی ہیں وہ بعد کے ادوار میں ان کتب کے ماننے والوں نے ان میں پیدا کیں ۔ بعد کے ادوار کی تحریفات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں میں خالص توحید نہ تھی یا یہ کہ تخلیق کائنات کے بعد اللہ اس کائنات میں متصرف اور اس کا مدبر نہیں رہا ہے ۔ تو یہ بعد کے ادوار کی تحریفات ہیں ۔ کیونکہ اللہ کا دین آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزمان تک ایک رہا ہے ۔ اس لیے کہ تمام ادیان اللہ کی طرف سے ہیں تو پھر ان تحریف شدہ کتابوں میں جو تصورات ہیں یا ان پر لکھے جانے والے تبصروں میں جو تصورات ہیں ' ان کا تعلق خدا تعالیٰ کے دین سے نہیں ہو سکتا اور نہ ایسے متضاد تصورات اللہ کی طرف منسوب ہو سکتے ہیں ۔

یہ اس حقیقت کے باوجود کہ تمام رسالتوں کے اندر ذات باری کے بارے میں بنیادی تصور ایک ہی رہا ہے لیکن اس کے باوجود یہ کہنا کوئی غلط بات نہ ہو گی کہ اسلام نے ذات الٰہی کا جو تصور پیش کیا اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں جو عقائد وضع کیے ہیں ' وہ تمام سابق امتوں کے تصور سے زیادہ لطیف ' زیادہ وسیع ' زیادہ شامل زیادہ کامل اور جامع و مانع ہیں ۔ یہ ایسا تصور ہے جس میں ذات باری اپنی مخلوق اور کائنات کے ساتھ زندہ اور فعال تعلق رکھتی ہے ۔ اور اس

کی صفات اس پوری کائنات میں کام کرتی ہیں اور یہ بات اس حقیقت سے بھی موافق ہے کہ اسلامی رسالت آخری رسالت ہے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین آخری دین ہے اور یہ امت آخری امت ہے اور عقلی اعتبار سے ' سن رشد کو پہنچنے والی امت ہے ۔ لہٰذا اس اعتبار سے اسے کامل 'شامل اور لطیف تصور دیا گیا ہے 'جس کے اندر الہیات کے بارے میں ہر سوال کا جواب موجود ہے ۔ اور عقیدہ توحید کے تمام تقاضوں کی وضاحت بھی موجود ہے اور اس عقیدے کے پورے آثار و نتائج بھی بتائے گئے ہیں ۔

اس تصور کا خلاصہ یہ ہے کہ قلب بشری اپنے ظرف کے مطابق الوہیت کی حقیقت سمجھ لے 'اس کی عظمت اپنے دل میں بٹھالے ۔ اس کو قدرت الہیہ کا شعور ہو اور اس کائنات میں قدرت الہیہ کے آثار کو وہ پالے ۔ اور خود اپنے نفوس کے اندر بھی وہ قدرت کے آثار کو شاہد و مشہود پائے اور وہ ان دیکھے جانے والے 'اور محسوس کیے جانے والے ' آثار قدرت کے درمیان زندگی بسر کرے ۔ اور کسی وقت بھی وہ اس کے احساس سے دور نہ ہوں اور وہ اس بات کو محسوس کرتا ہو اور دیکھتا ہو کہ یہ قدرت اور اس کے آثار ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہیں ۔ ہر چیز کے محافظ ہیں ۔ ہر چیز کے مدبر ہیں ۔ اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے ۔ خواہ وہ حقیر اور عظیم ہو یا بڑی اور چھوٹی ہو ۔

اس تصور کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ انسانی قلب کے اندر تیز احساس پیدا کر دیا جائے ' دائمی خوف 'احتیاط 'خشیت ' طمع اور امید پیدا ہو جائے اور انسان اپنی زندگی میں اللہ کے ساتھ متعلق ہو کر چلے ۔ ہر وقت اس کے دل میں قدرت الہیہ کا شعور زندہ ہو 'اللہ کے علم اور اس کی نگرانی کا شعور اسے ہر وقت ہو 'اللہ کی قہاری و جباری کا ہر وقت احساس ہو 'اللہ کی رحمت و فضل کا وہ ہر وقت طلبگار ہو ۔ اور ہر حال اور ہر وقت وہ یہ شعور رکھتا ہو کہ وہ شہ رگ سے بھی قریب ہے ۔

اور پھر اس تصور ایمان کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ اس کے مطابق انسان یہ احساس رکھتا ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ کی مطیع فرمان ہے ۔ اس کے آگے سجدہ ریز ہے ۔ اور اس کے ساتھ یہ مومن بھی اللہ کی طرف متوجہ ہے ۔ دونوں اس کی حمد و تسبیح کرتے ہیں ۔ دونوں اس کے زیر تدبیر چلتے ہیں ۔ یہ کائنات قانون قدرت کے مطابق اور ہر انسان قانون شریعت کے مطابق ۔ اس معنی میں اسلام کا تصور ایمانی ایک آفاقی اور کائناتی تصور ہے ۔ اسی طرح بعض دوسرے پہلو بھی ہیں کہ اسلام کا تصور ایمان جامع ہے اور قرآن میں جگہ جگہ اس کے بارے میں اشارات ملتے ہیں ۔ اور اس کی بہترین مثال وہ ہے جو سورہ حشر کے آخر میں گزری ہے ۔

---OOO---

# درس نمبر ۲۶۴ تشریح آیات

## ۱ ـ ـ تا ـ ـ ۱۸

سُورَةُ التَّغَابُنِ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۸ ۶۴ آیاتُها ۱۸ رکوعاتُها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ ۖ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲﴾ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۳﴾ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴﴾ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۡ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْۤا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ فَكَفَرُوْا وَ تَوَلَّوْا وَّ اسْتَغْنَى اللّٰهُ ۭ وَ اللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۶﴾

”اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے ۔ اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا اسے علم ہے ' جو کچھ تم چھپاتے ہو ' اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو ' سب اس کو معلوم ہے ' اور وہ دلوں کا حال تک جانتا ہے ۔ کیا تمہیں ان لوگوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جنہوں نے اس سے پہلے کفر کیا اور پھر اپنی شامت اعمال کا مزہ چکھ لیا؟ اور آگے ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے ۔ اس انجام کے مستحق وہ اس لیے ہوئے کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی دلیلیں اور نشانیاں لے کر آتے رہے ' مگر

انہوں نے کہا "کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے ؟" اس طرح انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا اور منہ پھیر لیا' تب اللہ بھی ان سے بے پرواہ ہو گیا اور اللہ تو ہے ہی بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود۔"

زمین اور آسمانوں میں 'جو مخلوق بھی ہے' وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہے ۔اس کی تسبیح اور تعریف کر رہی ہے ۔گویا اس پوری کائنات کی روح مومن ہے ۔اور اس پوری کائنات کا دل مومن ہے ۔اللہ اس پوری کائنات کا مالک ہے ۔اور اس کائنات کی ہر چیز میں اس کا شعور بھی ہے ۔اللہ اپنی ذات میں بھی ستودہ صفات ہے اور اس مخلوقات کے اندر بھی اس کی تعریف اور تمجید ہوتی ہے ۔اب اگر اس وسیع کائنات کے سمندر میں ایک اکیلا انسان کافر بن جائے اور اس کی روح اور اس کا قلب غافل اور منکر ہو' وہ سرکش اور نافرمان ہو' اللہ کی تسبیح نہ کرے 'اس کی طرف متوجہ نہ ہو تو یہ بالکل شاذ ہو گا' اور انوکھا ہو گا' اور عجیب ہو گا اور نمایاں طور پر الگ ہو گا۔اس طرح جس طرح کسی کو یہ پوری کائنات دھتکار دے ۔

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (٦٤ : ١) "اور وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ اللہ کی قدرت بے قید اور لامحدود ہے ۔قلب مومن میں قرآن اس حقیقت کو طبع کرتا ہے ۔یوں انسان اس حقیقت کو جانتا ہے اور اس کے مدلول سے متاثر ہوتا ہے ۔اور وہ یہ ۔۔۔ ہے کہ قدرت جو چاہے اس کے ساتھ کرے ۔وہ اپنے آپ کو قدرت کے سپرد کر دیتا ہے کہ قدرت اس معاملات کے اندر جو چاہے تصرف کرے ۔

قدرت الٰہیہ کا یہ جامع تصور کہ یہ ہر شے اس کی تسبیح کرتی ہے 'اس کی تعریف کرتی ہے اور اس کی طرف متوجہ ہے' یہ اسلام کے اس عظیم جامع تصور کا ایک اہم پہلو ہے ۔

دوسری چٹکی خود قلب انسانی کے اندر۔انسان کا یہ چھوٹا سا دل اس عظیم کائنات کے سمندر کے اندر ہے ۔یہ پوری کائنات تسبیح الٰہی اور حمد الٰہی میں رطب اللسان ہے ۔یہ چھوٹا سا دل کبھی مومن بن جاتا ہے اور کبھی کافر۔اس چھوٹے انسان کا چھوٹا قلب ہی اس کائنات میں ایسا موقف اختیار کرتا ہے ۔کائنات کی کوئی شے اس کفر میں اس کا ساتھ نہیں دیتی ۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (٦٤ : ٢) "وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا' پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن"۔ یہ انسان اللہ کی قدرت اور اللہ کے ارادے سے وجود میں آیا ہے ۔اور یہ اللہ ہی ہے جس نے انسان کے اندر کفر کے رجحان کے امکانیات اور ایمان کے رجحان کے امکانیات رکھے ۔اس حضرت انسان کے اندر مختلف الجہات استعدادیں بیک وقت ودیعت کر دیں اور پھر اللہ نے اسے نیک و بد کی تمیز بھی عطا کی ۔اور اسی استعداد کے مطابق اس انسان کے اندر ایمان پیدا ہوا۔ایمان اللہ کی طرف سے ایک بڑی امانت ہے اور اس کی بڑی ذمہ داریاں ہیں ۔اس کے بعد اللہ نے اسے دین و شریعت بھی عطا کی جس کے مطابق وہ اپنے ایمان اور عمل کو وزن کرتا ہے ۔یہ دین اس نے رسولوں پر نازل فرمایا اور یوں اللہ تعالیٰ نے انسان کی معاونت کی کہ وہ اس امانت کو اٹھائے اور دوسرے انسانوں کی اس میں داخل ہونے کے لیے مدد دے ۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (٦٤ : ٢) "اور اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو"۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ انسان کر کیا رہا ہے؟ وہ انسانوں کی نیت اور رجحان سے واقف ہے لہٰذا انسان کو عمل بھی کرنا چاہئے اور ڈرنا بھی

چاہئے کیونکہ نگران علیم و بصیر ہے 'کہیں سویا ہوا نہیں ہے۔

انسان کی حقیقت اور اس جہاں میں اس کے مقام و موقف کے بارے میں یہ تصور ' اس کائنات کے بارے میں اسلام کے واضح سیدھے تصور کا ایک حصہ ہے کہ انسان کو یہاں استعداد و اختیار دیا گیا ہے اور وہ اپنے خالق کے سامنے اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور خالق علیم و بصیر ہے۔

اب تیسرا نشتر' یہ اشارہ کر رہا ہے اور یہ احساس دلاتا ہے کہ حق روح کائنات ہے 'حق ہی کی وجہ سے یہ کائنات قائم ہے ورنہ یہ ختم ہو جائے اور یہ کائنات اللہ کی ایک بالکل حیران کن تخلیق ہے ۔ اور آخر کار سب نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے ۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (٤ ٦ : ٣) "اس نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے 'اور تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی ہے 'اور اسی کی طرف آخر کار تمہیں پلٹنا ہے"۔

آیت کا پہلا حصہ یہ ہے کہ "اس نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا"۔ اس سے ایک مومن کو یہ شعور ملتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق اور تدبیر میں حق ایک بنیادی عنصر ہے ۔ یہ کوئی عارضی یا غیر ضروری چیز نہیں ہے ۔ اس کائنات کی تشکیل ہی حق پر ہے اور جو ذات یہ حقیقت بیان کر رہی ہے وہ وہی ہے جس نے زمین و آسمان اور اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور اسے معلوم ہے کہ یہ کائنات کس بنیاد پر قائم ہے ۔ کسی شخص کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے تو جب اس کا سچائی پر اعتماد بحال ہوتا ہے تو اس کا اپنے دین پر بھی اعتماد بحال ہوتا ہے ۔ کیونکہ دین اسلام بھی حق پر قائم ہے اور دین حق ہے ۔ اور یہ کائنات بھی حق پر قائم ہے جو انسان کے اردگرد پھیلی ہوئی ہے ۔ لہٰذا حق غالب ہو گا ۔ حق باقی رہے گا اور جب باطل کی جھاگ بیٹھ جائے گی تو حق نمودار ہوتا ہے ۔

اور آیت کے آخری حصہ میں ایک دوسری حقیقت بیان کی گئی ہے ۔

وَ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (٤ ٦ : ٣) "اور اس نے تمہاری صورت بنائی اور بہت عمدہ بنائی"۔ انسان کو یہ شعور دیا جاتا ہے کہ اللہ کے نزدیک تم مکرم ہو اور اللہ نے تمہیں بہترین صورت میں پیدا کیا ہے ۔ تمہاری اخلاقی تصویر بھی اچھی ہے اور تمہاری شعوری تصویر بھی اچھی ہے اور پیدائشی تصویر بھی بہت حسین ہے ۔ انسان اپنی جسمانی ساخت کے اعتبار سے بھی زندہ اشیاء سے زیادہ مکمل جسم کا مالک ہے ۔ اور روحانی ' و شعوری اور قابلیتوں کے لحاظ سے بھی وہ مکمل ہے 'یہی وجہ ہے کہ زمین پر خلافت کا منصب انسان کو دیا گیا ہے اور انسان کے لحاظ سے اس وسیع جگہ یعنی زمین پر اسے بسایا گیا ہے ۔

اگر انسان کی جسمانی ساخت اور اس کے نقشے پر ذرا گہری نظر ڈالی جائے یا انسانی جسم کے نظام کے کسی بھی حصے پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے ۔

وَ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (٤ ٦ : ٣) "اس نے تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی"۔

یہ ایک ایسا نقشہ ہے جس کے اندر کمال و جمال دونوں پائے جاتے ہیں اور پھر ہر انسان کے اندر خوبصورتی میں تفاوت ہے لیکن جہاں تک مجموعی نقشے کا تعلق ہے وہ بہت ہی خوبصورت ہے ۔ اور کامل ہے اور انسانی ضروریات تمام زندہ چیزوں کی ضروریات کے مقابلے میں بطریق احسن پوری کرتا ہے ۔

وَاِلَیْهِ الْمَصِیْرُ (۶۴ : ۳) "اور اسی کی طرف آخر کار تمہیں پلٹنا ہے"۔ ہر چیز کا انجام ' ہر مخلوق کا مرجع اور ہر معاملے کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے ۔ اس پوری کائنات کا مرجع بھی وہ ہے ۔ اس انسان کے لوٹنے کی جگہ بھی وہ ہے ۔ اللہ کے ارادے ہی سے ان چیزوں نے وجود پایا ۔ اور اسی کی طرف لوٹنا ہے ۔ پیدائش بھی اس سے حاصل کی اور فنا اور انجام بھی اسی کی طرف ہے ۔ وہی اول ہے اور وہی آخر ہے ' ہر چیز پر محیط ہے ۔ آغاز بھی وہ اور انجام بھی وہ اور وہ لامحدود ہے ۔

---ooo---

اور چوتھا تیز احساس جو اس آیت میں دیا گیا ہے ' وہ ہے اللہ کے جامع اور شامل اور محیط علم کی ایک ایسی تصویر ' جو انسان کے خفیہ رازوں کو جاننے والا ہے ' راز سے بھی خفیہ چیز ' جو دل میں آتی ہے ' جسے "ذات الصدور" کہتے ہیں ' جن کی گرفت میں دل ہوتا ہے ' انہیں بھی جانتا ہے ۔

یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَیَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۶۴ : ۴) "زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا اسے علم ہے ' جو کچھ تم چھپاتے ہو ' اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو ' سب اس کو معلوم ہے ' اور وہ دلوں کا حال تک جانتا ہے"۔

اس حقیقت کا ایک مومن کے دل میں بیٹھنا ' اسے معرفت رب عطا کرتا ہے ۔ اس طرح اپنے رب کی معرفت حاصل ہونے کے بعد اس کے آفاقی اور کائناتی ایمان کا یہ پہلو بہت مضبوط ہو جاتا ہے ۔ وہ یہ شعور رکھتا ہے کہ وہ اللہ کی نظروں میں ہے ۔ کوئی ایسا راز نہیں ہے جو اس پر مخفی ہو ۔ اس کے ضمیر میں کوئی گہری سوچ بھی ایسی نہیں ہے جس سے اللہ باخبر نہ ہو ۔

یہ تین آیات ہی انسان کے لیے اس قدر رہنمائی فراہم کر دیتی ہیں کہ انسان اپنی حقیقت کو سمجھے ' اس کائنات کو سمجھے اور اس کائنات اور اپنے خالق کی ساتھ اپنا تعلق جوڑے ۔ اللہ سے ڈرے ۔ ہر حرکت اور ہر رخ میں ۔

اب ہم آتے ہیں اس سورت کے دوسرے پیراگراف کی طرف ۔ اس میں ان اقوام ماضیہ کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے رسولوں کی تکذیب کی ۔ جن کا بڑا اعتراض یہ تھا کہ ایک بشر کو کس طرح رسول بنایا گیا؟ مشرکین مکہ بھی یہی سوال دہراتے تھے اور اسی وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تعلیمات کی تکذیب کرتے تھے ۔

اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۶۴ : ۵) ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِیْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ (۶۴ : ۶) (۶۴ : ۵ ۔ ۶) "کیا تمہیں ان لوگوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی

جنہوں نے اس سے پہلے کفر کیا اور پھر اپنی شامت اعمال کا مزہ چکھ لیا؟ اور آگے ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ اس انجام کے مستحق وہ اس لیے ہوئے کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی دلیلیں اور نشانیاں لے کر آتے رہے، مگر انہوں نے کہا "کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے؟" اس طرح انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا اور منہ پھیر لیا، تب اللہ بھی ان سے بے پرواہ ہو گیا اور اللہ تو ہے ہی بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود"۔

یہ خطاب تمام مشرکین کو ہے کہ اس سے قبل جن لوگوں نے تکذیب کی ان کا جو انجام ہوا، اس پر ذرا غور کر لو۔ استفہام تو کبھی اس لیے ہوتا ہے کہ اقوام سابقہ کے حالات ان مشرکین کو بتا دیئے جانے کے بعد بھی یہ کفر کرتے ہیں تو ان کا یہ رویہ قابل مذمت ہے اور کبھی اس لیے ہوتا ہے کہ دیکھو اور اس طرح توجہ کرو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس کا انجام یوں بھی ہوتا ہے (یعنی مذمت اور توجہ مبذول کرانے کے لیے) یہ لوگ تو امم سابقہ کے احوال سے واقف تھے، قصے ان کے ہاں مشہور تھے۔ مثلاً عاد، ثمود اور لوط علیہ السلام کی قوم کے بارے میں تو عرب واقف تھے۔ ان کھنڈرات پر سے وہ گزرتے تھے جب وہ شمال اور جنوب کے سفروں پر جاتے تھے۔

دنیا میں ان کا جو انجام ہوا وہ تو زبان زد عام ہے، قرآن اس پر یہ اضافہ کرتا ہے۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (٦٤: ٥) "اور آگے ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے"۔ یہ آخرت کا عذاب ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے۔

ذٰلِكَ بِأَنَّهُ كَانَتْ تَّأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالُوا أَبَشَرٌ يَهْدُونَنَا (٦٤: ٦) "اس انجام کے مستحق وہ اس لیے ہوئے کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی دلیلیں اور نشانیاں لے کر آتے رہے، مگر انہوں نے کہا "کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے؟" اور یہ وہی اعتراض تھا جو مشرکین مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے تھے۔ یہ بہت ہی گراپڑا اعتراض ہے اور خالص جہالت پر مبنی ہے۔ یہ لوگ منصب رسالت کو سمجھے ہی نہیں اور اس بات کو سمجھے ہی نہیں کہ رسول اور رسالت نے انسانوں کے سامنے اللہ کی شریعت اور نظام پیش کرنا ہوتا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اس نظام کو ایک بشر اپنے اوپر نافذ کر کے لوگوں کو دکھائے۔ یوں رسول کا بشر ہونا انوکھا نہیں بلکہ ضروری تھا۔ یہ رسول ہی ہوتا ہے جو اسلامی شریعت اور قانون پر عمل کر کے دکھاتا ہے، اگر رسول اور لوگوں کی جنس ہی الگ ہو تو لوگ رسالت کی ایک عملی صورت سے محروم ہو جائیں گے اور ان کے لیے یہ ممکن ہی نہ ہو گا کہ اس کی اطاعت کریں۔ اپنی ذات، اپنے اخلاق اور اپنی انداز معیشت میں۔ پھر ان کی یہ رائے خود انسان کی حقیقت سے جہالت پر مبنی ہے کہ اللہ نے انسان کو یہ صلاحیت عطا کی کہ وہ عالم علوی سے ہدایت اخذ کرنے کے قابل ہو، اور اس کے لئے کسی فرشتے کو رسول بنانے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ انسان کے اندر تو اللہ کی روح پھونکی ہوئی ہے اور انسان کی اسی روحانیت کی وجہ سے وہ اللہ سے براہ راست رسالت اخذ کرتا ہے۔ اور اس کے فرائض اللہ کی منشا کے مطابق ادا کرتا ہے۔ یہ انسانوں کے لیے ایک ایسا اعزاز ہے جس سے انکار کوئی جاہل ہی کر سکتا ہے جس کو انسان کے مقام و مرتبہ کا علم نہ ہو۔ اگر کوئی جاہل نہیں ہے تو پھر وہ متکبر اور مغرور ہے۔ اور اپنے کبر و غرور کی وجہ سے رسول اللہ کی اطاعت نہیں کرتا۔ گویا یہ اعتراض کرنے والے یا جاہل ہیں یا متکبر ہیں اور نظر انداز کرنے کے قابل ہیں۔ ان کے نزدیک یہ تو جائز ہے کہ جنس انسان کے علاوہ کوئی جنس فرشتے وغیرہ آئیں تو ان کی

رسالت کو تو یہ ماننے کے لیے تیار ہیں مگر اپنے میں سے ایک انسان کو یہ رسول ماننے کے لیے تیار نہیں۔

صرف یہی وجہ ہے جس کی بنا پر تاریخ میں لوگوں نے رسولوں کا انکار کیا ' حالانکہ ان کے ساتھ دلائل و معجزات تھے ' اور اعلیٰ تعلیمات تھیں۔اس جہالت اور کبر کی وجہ سے لوگوں نے کفر و شرک تو اختیار کیا مگر رسالتوں کا انکار کرتے رہے۔

وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (٦٤ : ٦) "تب اللہ بھی ان سے بے پرواہ ہو گیا اور اللہ تو ہے ہی بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود"۔ اللہ ان کے ایمان اور ان کی اطاعت سے مستغنی ہو گیا۔ اللہ کو ان چیزوں کی ضرورت کیا ہے۔ اللہ تو ان چیزوں کا اصلاً محتاج ہی نہیں ہے ' وہ غنی ہے اور اپنی ذات ہی میں محمود ہے۔ یہ تو تھے وہ لوگ جنہوں نے کفر و شرک کیا اور اپنے اس فعل کے انجام تک پہنچ گئے اور سبب صرف جہل اور کبر تھا۔ اب مشرکین مکہ اور مدینہ کس وجہ سے کفر اور شرک پر اصرار کر رہے ہیں۔ کیا یہ بھی اسی انجام کو پہنچنے کے خواہش مند ہیں۔

تیسرا پیراگراف دوسرے پیراگراف کا تتمہ ہے کہ رسالت پر اعتراض کے ساتھ یہ لوگ بعث بعد الموت کے بھی منکر ہیں۔ یہ لوگ مکہ اور مدینہ کے مشرک تھے ' جن کے سامنے رسول اللہ کی دعوت پیش کی جا رہی تھی۔ اس پیراگراف میں رسول اللہ کو ہدایت فرمائی جاتی ہے کہ آپ بطور تاکید مزید ان تک یہ بات پہنچا دیں کہ مزاح نہ سمجھو تم نے ایک دن اٹھنا ہے۔ پھر اس دن کا ایک منظر بھی پیش کیا جاتا ہے جس میں مکذبین اور مصدقین کا انجام بتایا جاتا ہے۔ آخر میں ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ ایمان لاؤ اور ہر معاملے میں رسول کی اطاعت کرو اور ہر معاملے کو اللہ کے سپرد کر دو۔

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ
لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ
رَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ
لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ
عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ
ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ
ع ۱۰ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَ
۱۵ مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا
الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰي رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ
وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

"منکرین نے بڑے دعوے سے کہا ہے کہ وہ مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے۔ان سے کہو "نہیں' میرے رب کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے' پھر ضرور تمہیں بتایا جائے گا کہ تم نے (دنیا میں) کیا کچھ کیا ہے' اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔پس ایمان لاؤ اللہ پر' اور اس کے رسولؐ پر' اور اس روشنی پر جو ہم نے نازل کی ہے۔جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔(اس کا پتہ تمہیں اس روز چل جائے گا) جب اجتماع کے دن وہ تم سب کو اکٹھا کرے گا۔وہ دن ہو گا ایک دوسرے کے مقابلے میں لوگوں کی ہار جیت کا' جو اللہ پر ایمان لایا ہے اور نیک عمل کرتا ہے' اللہ اس کے گناہ جھاڑ دے گا اور اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔یہی بڑی کامیابی ہے۔اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہے۔وہ دوزخ کے باشندے ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گی اور وہ بد ترین ٹھکانا ہے۔کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اذن ہی سے آتی ہے۔جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو' اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے' اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو لیکن اگر تم اطاعت سے منہ موڑتے ہو تو ہمارے رسول پر صاف صاف حق پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں' لہٰذا ایمان لانے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔"

مشرکین اور کافرین کے اس قول کو کہ ہمیں دوبارہ نہ اٹھایا جائے گا' آغاز ہی سے زعم باطل کہا اور یہ بتا دیا کہ یہ سفید جھوٹ ہے۔اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کہا جاتا کہ آپ ان سے سخت ترین الفاظ میں کہہ دیں کہ تمہیں اٹھایا جائے گا۔اور اس تاکید کو اپنے رب کے نام سے حلف اٹھا کر مزید موکد کر دیں۔آخر رسول جب اپنے رب کے نام کی قسم اٹھا کر کوئی بات کرے تو اس سے مزید تاکید اور کیا ہو سکتی ہے۔

قُلْ بَلٰى وَ رَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ (٦٤ : ٧) "ان سے کہو میرے رب کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے"۔اور نہ صرف یہ کہ اٹھائے جاؤ گے بلکہ۔

ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ (٦٤ : ٧) "پھر تمہیں بتایا جائے گا کہ تم نے کیا کچھ کیا ہے"۔اس میں سے کوئی چیز بھی چھوٹی ہوئی نہ ہو گی۔اور اللہ تمہارے اعمال سے اچھی طرح باخبر ہو گا' اس لیے وہ قیامت کے دن بتا دے گا۔

وَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ (٦٤ : ٧) "اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے"۔وہ زمین و آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے' وہ ظاہری اور خفیہ سب چیزوں کو جانتا ہے۔وہ ان رازوں سے واقف ہے جو دلوں کے راز ہیں۔اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے جیسا کہ سورت کے آغاز میں بطور تمہید یہی فقرہ آیا۔

ان تاکیدوں کی روشنی میں ان کو دعوت دی جاتی ہے' کہ اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ نے رسول پر جو تعلیمات اتاری ہیں ان کو تسلیم کرو' وہ تو نری روشنی ہے۔یہ قرآن دراصل علم کی روشنی ہے' اور قرآن جو دین و شریعت پیش کرتا ہے' وہ بھی روشنی ہے۔یہ تعلیم اپنی حقیقت میں نور ہیں' کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ نور السموات والارض ہے۔پھر یہ تعلیمات اپنے آثار کے اعتبار سے بھی نور ہیں۔اور اپنی ذات کے لحاظ سے بھی نور ہیں۔اس روشنی میں انسان اپنی حقیقت پا لیتا ہے اور اس جہاں کے حقائق کو اس کائنات کے حقائق سے دیکھتا ہے۔

دعوت ایمان دینے کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کا سب کچھ اللہ پر ظاہر ہے۔اس سے کوئی شے مخفی نہیں رہی۔

بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (٦٤: ٨) "اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے"۔

اس کے بتایا جاتا ہے کہ ذرا دیکھو جس بعث بعد الموت کی تیاری کی تمہیں دعوت دی جاتی ہے۔وہ کیسی ہوگی؟

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ (٦٤: ٩) "جب اجتماع کے دن وہ تمہیں اکٹھا کرے گا۔وہ دن ہو گا ایک دوسرے کے مقابلے میں لوگوں کی ہار جیت کا"۔یوم الجمع تو اس لیے ہو گا کہ تمام اگلے پچھلے انسانوں کو اس دن جمع کیا جائے گا۔اور تمام ملائکہ کو بھی اس دن حاضر کیا جائے گا۔اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہو گی۔انسانی تصور کے قریب کرنے کے لیے حدیث میں آتا ہے۔حضرت ابوذر سے روایت ہے۔فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو کچھ تم نہیں دیکھ رہے۔اور میں وہ کچھ سن رہا ہوں جو تم نہیں سن سکتے۔آسمان بوجھ کی وجہ سے چرچرایا اور اس کا حق ہے کہ وہ چرچرائے۔کیونکہ آسمان میں چار انگلیوں کی جگہ بھی نہ ہوگی جہاں ایک فرشتہ اللہ کے سامنے سجدہ ریز نہ ہو۔خدا کی قسم اگر تم وہ کچھ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم بہت کم ہنستے اور روتے ہی رہتے۔اور تم اپنے بستروں پر اپنی بیویوں سے لذت اندوز نہ ہوتے اور تم اونچے مقامات پر چڑھ کر 'اللہ کے سامنے روتے کہ اے اللہ 'کاش میں ایک درخت ہوتا جسے کاٹ لیا جاتا"۔(ترمذی)

آسمان جہاں چار انگلیوں کی جگہ پر بھی ایک فرشتہ سجدہ ریز ہو گا 'کس قدر وسیع ہے؟ یہ ناقابل تصور وسیع فضا ہے۔انسان نے ابھی تک اس کی حدود کو معلوم نہیں کیا؟ اور اس میں ہمارے سورج جیسے کئی سورج اس طرح ہیں جس طرح ایک ذرہ فضا میں اڑ رہا ہے۔تو کیا اس سے یہ بات انسانی تصور کے قریب ہوگئی کہ یوم الجمع یعنی قیامت کے دن کس قدر فرشتے جمع ہوں گے؟

اس عظیم اجتماع میں تغابن ہو گا۔یہ غبن سے باب مفاعلہ سے ہے۔یہ ایک تصویر ہے کہ مومنین کس قدر کامیاب ہوں گے اور کافرین کس قدر محروم ہوں گے۔یہ جہنم میں جاکر ہر چیز سے محروم ہو جائیں گے اور مومنین جنت میں جاکر سب کچھ پالیں گے۔دونوں کا نصیب بہت ہی مختلف ہے۔یوں کہ گویا کامیابی کا ایک مقابلہ منعقد ہے اور ایک طرف ہر قسم کی کامیابی ہے اور دوسری طرف ہر قسم کی ناکامی ہے اور ہر فریق اپنے مقابل کو غبن کر رہا ہے۔اس مقابلے میں مومن کامیاب ہوئے اور انہوں نے سب کچھ جیت لیا اور کافر ہار گئے اور سب کچھ ہار گئے۔اس معنی میں یہ یوم التغابن ہے اور اس کی تفسیر یہ آیات کر رہی ہیں:

وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (٩) وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اُولٰئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (١٠) (٦٤: ٩ — ١٠) "جو اللہ پر ایمان لایا ہے اور نیک عمل کرتا ہے 'اللہ اس کے گناہ جھاڑ دے گا اور اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے

نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہے۔ وہ دوزخ کے باشندے ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گی اور وہ بدترین ٹھکانا ہے"۔

اس سے قبل کہ ان کو ایمان کی طرف بلایا جائے۔ ایمان کا ایک بنیادی قاعدہ یہاں متعین کر دیا جاتا ہے یعنی ایمان اللہ اور بالرسالت کے بعد۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ مَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَه وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ

عَلِيْمٌ (۶۴ : ۱۱) کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اذن ہی سے آتی ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو' اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے' اللہ کو ہرچیز کا علم ہے"۔ اس پیراگراف میں چونکہ لوگوں کو ایمان کی طرف بلایا گیا تھا' اس لیے اس کے ساتھ اس حقیقت کا ذکر بھی مناسب سمجھا گیا کیونکہ یہ ایمان کے متعلق امور میں سے ہے کہ انسان ہرچیز کو اللہ کی طرف لوٹا دے۔ اور یہ عقیدہ رکھے کہ خیروشر اللہ کی طرف سے ہے۔ یہ ایمان کی تفصیلات ہیں اور ان کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔ عملی زندگی میں اس عقیدے کے سوا ایمانی شعور کا تصور نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ آیات کے نزول کے وقت کوئی ایسی صورت حال بھی ہو جس میں لوگوں کو یہ تسلی دی گئی کہ خیرو شر اللہ کی طرف سے ہے مثلاً مومنین اور مشرکین کے درمیان کوئی خاص واقعہ اس سورت اور اس واقعہ کے نزول کے وقت ہو۔

بہرحال یہ بات کہ نفع و نقصان اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ ایمان کا بہت ہی اہم پہلو ہے۔ اس طرح اللہ پر ایمان لانے والے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جو کچھ پیش آتا ہے اللہ کی طرف سے ہے۔ ہر حرکت اور حادثہ سے بھی اللہ کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور مومن کو جو خوشی یا غم پیش آتا ہے وہ اس پر مطمئن ہوتا ہے۔ غم پر صبر کرتا ہے اور خوشی کا شکر ادا کرتا ہے اور کبھی کبھار تو بعض مومنین اس سے بھی اوپر چلے جاتے ہیں۔ وہ خوشی اور غم دونوں میں شکر ادا کرتے ہیں اور ہر حال کو' وہ اللہ کا فضل سمجھتے ہیں' یوں کہ غم میں ان کے گناہ معاف ہوتے ہیں اور حسنات میں اضافہ ہوتا ہے۔

متفق علیہ حدیث ہے۔ مومنین کے مزے ہیں کہ اللہ جو فیصلہ کرتا ہے ان کے لیے اس میں خیر ہی ہوتی ہے۔ اگر مصیبت آئے تو وہ صبر کرتے ہیں تو ان کو ثواب ملتا ہے۔ اور اگر ان کو خوشی ملے تو شکر کرتے ہیں تو بھی اس کے لیے خیر ہوتی ہے اور یہ صرف مومنین کے لیے ہے"۔

وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۶۴ : ۱۱) "اللہ کو ہرچیز کا علم ہے"۔ یہ تعقیب اسی لیے آئی کہ اللہ کا علم کلی ہے اور اس شخص کو بھی اس قسم کی کلی ہدایت مل جاتی ہے۔ اور یہ علم' اللہ اس کو دیتا ہے جس کو وہ ہدایت کرنا چاہے۔ جب کسی کا ایمان صحیح ہوتا ہے تو اس کے سامنے سے کئی پردے اٹھ جاتے ہیں اور کئی اسرار اس پر واشگاف ہو جاتے ہیں۔ ایک مقدار کے مطابق۔

آگے دعوت ایمان کے سلسلے میں ان کو حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔

وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۶۴ : ۱۲)

”اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو‘ لیکن اگر تم اطاعت سے منہ موڑتے ہو‘ تو ہمارے رسول پر صاف صاف حق پہنچا دینے کی ذمہ داری کے سوا کچھ ذمہ داری نہیں ہے“۔ اس سے قبل ان کو لوگوں کا انجام بتایا جا چکا ہے جو منہ موڑتے ہیں۔ یہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ رسول کا کام تبلیغ پر ختم ہو جاتا ہے۔ اگر اس نے بات پہنچا دی تو وہ اپنے فریضے سے سبکدوش ہو گیا۔ اور اس طرح لوگوں پر حجت تمام ہو گئی اور اب لوگ اس معصیت اور منہ موڑنے کے انجام کا انتظار کریں جو انہیں ابھی ابھی سنا دیا گیا ہے۔

اس کے بعد یہ پیراگراف عقیدۂ توحید کی قرارداد پر ختم ہوتا ہے جس کا وہ انکار کرتے تھے اور تکذیب کرتے تھے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے مومنین کا تعلق اللہ کے ساتھ کیسا ہوتا ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (٦٤ : ١٣) ”اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں اور ایمان لانے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے“۔

توحید کی حقیقت ہی ایمان کی اساس ہے۔ اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کو صرف اللہ پر بھروسہ ہو‘ صرف اللہ پر بھروسہ کرنا صحیح عقیدۂ توحید کے اثرات میں سے ایک اثر ہے جو دل میں موجود ہوتا ہے۔ اس دعوت ایمان سے آگے پھر اہل ایمان کو خطاب شروع ہوتا ہے۔ گویا یہ آیت پچھلے پیراگراف اور آنے والے کے درمیان پل کا کام دے رہی ہے۔

---ooo---

اب مومنین کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ بیویاں‘ اولاد اور مال ایک بہت بڑا فتنہ اور آزمائش ہوتے ہیں۔ اور اس آزمائش میں کامیاب وہی ہو سکتا ہے جو خدا کا خوف رکھتا ہو۔ سمع‘ طاعت اور انفاق ہی کے ذریعہ انسان ان فتنوں پر قابو پا سکتا ہے اور مومنین کو نفسیاتی کنجوسی سے بھی متنبہ کیا جاتا ہے اور سخاوت اور انفاق کے بدلے میں اجر‘ مغفرت اور فلاح اخروی کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ آخر میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ حاضر و ناظر ہے۔ اس کی قدرت غالب ہے۔ اور وہ زبردست حکیم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ
عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَ اِنْ تَعْفُوْا وَ تَصْفَحُوْا وَ تَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ۝ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ
مَا اسْتَطَعْتُمْ وَ اسْمَعُوْا وَ اَطِيْعُوْا وَ اَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ
۲ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَ يَغْفِرْ
۸ ع لَكُمْ ۭ وَ اللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ع
۱۶

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو‘ تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں‘ ان سے ہوشیار

رہو۔ اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور و رحیم ہے۔ تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں' اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے۔ لہذا جہاں تک تمہارے بس میں ہو' اللہ سے ڈرتے رہو' اور سنو اور اطاعت کرو' اور اپنے مال خرچ کرو' یہ تمہارے ہی لیے بہتر ہے۔ جو اپنے دل کی تنگی سے محفوظ رہ گئے بس وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اگر تم اللہ کو قرض حسن دو تو وہ تمہیں کئی گنا بڑھا کر دے گا اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا' اللہ بڑا قدر دان اور بردبار ہے' حاضر اور غائب ہر چیز کو جانتا ہے' زبردست اور دانا ہے"۔

ان آیات کے بارے میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ پہلی آیت کے بارے میں ان سے کسی نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ مکہ کے کچھ لوگ تھے جو اسلام لے آئے تھے۔ انہوں نے ارادہ کر لیا کہ وہ ہجرت کر کے رسول اللہ کے پاس آ جائیں' لیکن ان کی بیویوں اور ان کی اولاد نے' اس سے انکار کر دیا۔ اور ان کو نہ چھوڑا۔ پھر بعد میں جب وہ رسول اللہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ لوگ تعلیم دین کے میدان میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ تو انہوں نے ارادہ کر لیا کہ ان بیویوں اور اولاد کو سزا دیں۔ اللہ نے یہ آیت نازل کی :

وَ اِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَ تَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۶۴ : ۱۴) "اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور و رحیم ہے"۔ امام ترمذی نے اسے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اسناد حسن صحیح ہے۔ یہی عکرمہ مولی ابن عباس کی رائے ہے۔ لیکن آیت کی عبارت اور نص عام ہے۔ اور اس جزئی واقعہ تک اس کے مفہوم کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تنبیہہ بھی اس طرح ہے جس طرح اگلی آیت میں مال اور اولاد سے متنبہ کیا گیا ہے۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۶۴ : ۱۵) "تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں"۔ تنبیہہ یہ ہے کہ بعض اوقات مال اور اولاد دشمن بن جاتے ہیں۔ یہ بات انسانی زندگی کی ایک نہایت ہی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ زندگی کے اندر بعض اوقات روابط اور تعلقات اس قدر متنوع اور مختلف سمتوں سے دامن کش ہوتے ہیں کہ انسان آزمائش میں پڑ جاتا ہے۔ ازواج اور اولاد بھی انسان کو ذکر الہی سے غافل کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات یہ ایمان کے مشکل ترین تقاضے پورے کرنے کی راہ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مثلاً فریضہ جہاد فی سبیل اللہ میں دنیاوی نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ انسان اور اس کی اولاد اور اہل خاندان تشدد کا شکار ہوتے ہیں۔ بعض اوقات انسان اپنی ذات پر سختی برداشت کر سکتا ہے لیکن بیوی بچوں پر سختیاں اور تشدد برداشت نہیں کر سکتا۔ یوں انسان جدوجہد اور جہاد میں بزدلی اختیار کرتا ہے کہ بچوں اور بیوی کے آرام اور آسائشوں میں خلل نہ ہو۔ اور وہ اس کے دشمن نہ ہو جائیں اور یوں دراصل وہ دشمن ہو جاتے ہیں اور اسے راہ راست سے روک دیتے ہیں۔ یوں ایک مومن اعلیٰ مقاصد اور بلند مراتب کے حصول سے نیچے رہ جاتا ہے۔ بعض اوقات تو ازواج و اولاد ٹھیک کھڑے ہو کر راہ روک دیتے ہیں اور مومن اپنے فرائض سرانجام دینے سے رک جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ مومن کے نظریاتی مخالف ہوتے ہیں۔ اور مومن کے لیے ان سے صاف صاف قطع تعلق بھی ممکن نہیں ہوتا۔ غرض یہ اور بے شمار دوسری صورتیں اس دشمنی اور آزمائش کی پیش آ سکتی ہیں۔

اس لیے اللہ نے اولاد' بیوی اور مال کے فتنوں اور آزمائشوں کے بارے میں یہاں سختی کے ساتھ متنبہ کیا کہ ان کے

بارے میں مومن کے دل میں ایک احتیاط اور ایک شعور موجود ہو اور اس کا دل بیدار ہو اور برداشت کرنے کی تیاری میں اگر کوئی دباؤ آئے تو وہ مقابلہ کرے۔

اس کے بعد مال اور اولاد کی دشمنی کو ایک دوسرے رنگ میں تکرار کر کے پیش کیا کہ یہ فتنہ بھی ہوتے ہیں۔ لفظ فتنہ کے دو معنی ہوتے ہیں: ایک یہ کہ اللہ تمہیں مال اور اولاد کے ذریعہ آزماتا ہے' لہذا چوکنے رہو' احتیاط کرو کہ تم اس آزمائش میں پاس ہو جاؤ۔ اور خلوص اور تجرد اختیار کرو۔ فتنے کے معنی یہ ہیں کہ سنار سونے کو آگ میں ڈال کر پگھلاتا ہے تاکہ اس سے کھوٹ نکال دے۔ یہ عمل فتنہ کہلاتا ہے۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ مال و اولاد خود فتنہ ہیں اور یہ شیطان کے ہتھیار ہیں۔ یہ تمہیں دین کی مخالفت اور معصیت میں ڈالتے ہیں۔ لہذا اس معنی میں دشمن ہیں ان سے بچو کہ وہ تمہیں نقصان نہ پہنچادیں۔ یہ دونوں معنی قریب قریب ہیں۔

امام احمد نے روایت کی ہے۔ عبداللہ ابن بریدہ سے' انہوں نے ابوبردہ سے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم خطبہ دے رہے تھے۔ حسن اور حسین آئے۔ انہوں نے سرخ قمیض پہن رکھے تھے۔ یہ چلتے تھے اور گرتے پڑتے آرہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم منبر سے اترے' ان کو اٹھایا۔ اپنے سامنے بٹھایا۔ اور پھر فرمایا: "اللہ اور اللہ کے رسول نے سچ کہا کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے آزمائش ہے۔ میں نے دونوں بچوں کو دیکھا کہ چل رہے ہیں اور گرتے پڑتے آرہے ہیں۔ مجھ سے نہ رہا گیا' میں نے خطبہ چھوڑ کر ان کو اٹھا لیا"۔ اصل سنت نے واقد سے اسے روایت کیا ہے۔ یہ ہیں رسول اور یہ ہیں آپ کے نواسے۔ لہذا اولاد کا معاملہ بہت ہی نازک اور اہم ہے اور خطرہ ہے اور ان کے بارے میں تنبیہہ ضروری تھی۔ اللہ نے اسے ضروری سمجھا اور یہ تنبیہہ کی۔ اللہ تعالیٰ' جو لوگوں کا خالق ہے' ان کے جذبات اور شعور کا بھی خالق ہے۔ اور یہ جذبات اور میلانات اولاد کے بارے میں اسی نے حضرت انسان میں رکھے ہیں۔ اللہ نے ضروری سمجھا کہ لوگ افراط و تفریط سے بچیں اور کہیں ان کی اولاد ان کی ہلاکت کا باعث نہ بن جائے۔ اللہ جانتا تھا کہ یہ محبتیں بعض اوقات دشمن سے بھی زیادہ نقصان دے سکتی ہیں۔ اور بعض اوقات یہ ایسی سازش کر سکتی ہیں جس طرح ایک گمراہ دشمن چال چلتا ہے۔

انسان کو مال و اولاد کے فتنے سے ڈرا کر' اور ان کی جانب سے نہایت ہی گہری دشمنی سے خبردار کر کے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فتنہ ہیں۔

وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۶۴:۱۵) "اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے"۔

اب اہل ایمان کو ان کی طاقت اور استطاعت کے مطابق' اللہ سے ڈرنے اور سمع و اطاعت کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا (۶۴:۱۶) "لہذا جہاں تک تمہارے بس میں ہو' اللہ سے ڈرتے رہو اور سنو اور اطاعت کرو"۔ یہ شرط کہ "جہاں تک تمہارے بس میں ہو"۔ یہ اللہ کی طرف سے اپنے بندوں پر بہت بڑا رحم و کرم ہے۔ اللہ کو علم ہے کہ بندے کے اندر کتنی طاقت ہے۔ کس قدر تقویٰ اور اطاعت وہ کر سکتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: "جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو اس کی تعمیل اس حد تک کرو جس حد تک تمہارے بس میں ہو۔ لیکن میں جس بات سے منع کر دوں تو پوری طرح رک جاؤ"۔ اطاعت امر کی تو حدود نہیں اس

لیے اس میں حکم بقدر استطاعت ہے۔رہی نہی تو اس پر پورا پورا عمل کرنا ہو گا' بغیر نقصان کے اور بغیر کمی کے۔
اس کے بعد ان کو انفاق فی سبیل اللہ پر آمادہ کیا جاتا ہے۔

وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ (۶۴ : ۱۶) "اور اپنے مال خرچ کرو یہ تمہارے لیے بہتر ہے"۔ یہ جو کوئی خرچ کرتا ہے تو یہ دراصل اپنے لیے کرتا ہے۔وہ حکم دیتا ہے کہ اس کام کو اپنے لیے کرو' گویا وہ خود اپنے اوپر خرچ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا تمہیں اجر ملے گا۔گویا یہ بھی تم اپنے اوپر خرچ کرتے ہو۔

اب اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو بتاتا ہے کہ انفاق کی راہ میں رکاوٹ بخیلی اور دل کی تنگی ہے اور یہ ایک ایسی مصیبت ہے جو انسان کے ساتھ لگی رہتی ہے۔سعادت مند وہ ہے جو اس بخل سے نجات پا گیا۔اور جو اس سے بچا لیا گیا وہ سمجھ جائے کہ اس پر فضل و کرم ہو گیا ہے اور وہ کامیاب ہو گیا ہے۔ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۶۴ : ۱۶) "اور جو اپنے دل کی تنگی سے محفوظ رہ گئے بس وہی فلاح پانے والے ہیں"۔

اس کے بعد ان کو انفاق اور اللہ کی راہ میں مزید خرچ کرنے پر آمادہ کیا جاتا ہے اور ان کے دلوں میں انفاق کو محبوب بنانے کے لیے' انفاق کو قرض حسن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اور قرض حسن بھی ایک غلام سے اس کا آقا مانگ رہا ہے۔ قرض لے کر وہ کئی گنا کر کے دیتا ہے۔اور قرض دینے والے کا شکر بھی ادا کرتا ہے اور تمہاری کوتاہیوں کو بھی معاف کرتا ہے۔اور اللہ انسان کی کوتاہیوں کو دیکھ کر بہت ہی حلم سے کام لیتا ہے۔اس لیے کہ وہ اللہ ہی تو ہے۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ (۶۴ : ۱۷) "اگر تم اللہ کو قرض حسن دو تو وہ تمہیں کئی گنا بڑھا کر دے گا۔اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا۔اللہ بڑا قدر دان اور بردبار ہے"۔اللہ بہت ہی برکت والا اور عظیم ہے۔کتنا بڑا کریم ہے' کتنا بڑا ہے۔ وہ بندے کو پیدا کرتا ہے' اسے رزق دیتا ہے' پھر اس سے قرضہ مانگتا ہے قرض حسن۔پھر صرف قرض ہی نہیں لوٹاتا بلکہ اسے کئی گنا کر کے لوٹاتا ہے۔پھر اللہ اپنے بندے کا شکریہ ادا کرتا ہے۔اور اس کے ساتھ نہایت ہی حلم سے معاملہ کرتا ہے۔اللہ اور اپنے غلام کا شکر' یا اللہ یہ تیرا ہی کام ہے! اور ایک عظیم انعام ہے!

اللہ ہمیں اپنی صفات سے آگاہ کرتا ہے کہ ہم اپنے نقائص اور اپنی کمزوریوں پر کس طرح قابو پائیں اور ہم ہمیشہ اللہ کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھیں اور ہم اللہ جل شانہ کی تقلید زمین پر کریں۔اپنی محدود طاقت کے مطابق۔اللہ نے فرمایا ہے کہ میں نے انسان کے اندر اپنی روح پھونکی ہے۔اس روح کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اللہ کی صفات کی تقلید کریں۔اپنی طاقت کے مطابق کریں۔انسان کے سامنے یہ بلند آفاق ہر وقت کھلے ہیں کہ یہ جس قدر ان میں بلندیوں تک جا سکتا ہے' جا سکے۔ان بلندیوں تک وہ درجہ بدرجہ بلند ہو۔یہاں تک کہ وہ اللہ تک جب پہنچے تو ایسی حالت میں ہو کہ اللہ اسے پسند کرے۔اور اس سے راضی ہو۔

اب اس سورت کا خاتمہ ایک ایسی صفت الٰہی پر ہوتا ہے کہ جس سے ہمارے دلوں کے اندر خوف و تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (٦٤ : ١٨) "اللہ حاضر اور غائب ہر چیز کو جانتا ہے' زبردست اور دانا ہے"۔ اس کے علم کے سامنے سب کچھ کھلا ہے۔ اس کی سلطنت کے سامنے سب کچھ جھکا ہوا ہے۔ وہ اپنی حکمت سے اس پوری کائنات کی تدبیر کر رہا ہے۔ یوں کہ لوگ زندہ ہیں اور یوں رہیں کہ اللہ انہیں دیکھ رہا ہے۔ اس کی مکمل حکومت ان پر نافذ ہے۔ ہر حاضر اور غائب کو اس کا دست قدرت چلا رہا ہے۔ جب یہ تصور قلب مومن میں بیٹھ جاتا ہے تو وہ اللہ کے سامنے خلوص اور اطاعت کرتے جاتا ہے۔ اور اللہ کے احکام کی اطاعت نہایت آمادگی سے کرتا ہے۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ـــ ۲۸

## سورۃ الطلاق ـ ٦٥

## ۱ ـــ تا ـــ ۱۲

# سورۃ الطلاق ایک نظر میں

اس سورت کا نام الطلاق ہے' اس لیے کہ اس میں طلاق کے احکام ہیں۔ اس سورت میں طلاق کے احکام کو قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ سورہ بقرہ میں بھی طلاق کے احکام گزرے ہیں۔ لیکن یہاں تفصیلات ہیں کہ طلاق کی صورت میں کیا خاندانی احکام ہیں۔ اس سورت میں وہ وقت بتایا گیا ہے جس میں طلاق واقع ہوتی ہے' جسے اللہ قبول کرتا ہے اور جو اللہ کے طریقے کے مطابق ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِىُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (٦٥ : ١) "اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کو ان کی عدت کے لیے طلاق دیا کرو"۔

مطلقہ کا یہ حق ہے اور اس پر واجب ہے کہ وہ گھر میں رہے۔ یعنی جس نے اسے طلاق دی ہے اسی کے گھر میں' یعنی وہ خود بھی گھر سے نہ نکلے اور اسے نکالا بھی نہ جائے' الا یہ کہ وہ کھلی فاشی کا ارتکاب کرے۔

لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (٦٥ : ١) "نہ تم ان کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ نہ وہ خود نکلیں الا یہ کہ وہ کسی صریح برائی کی مرتکب ہوں"۔

عدت پوری کرنے کے بعد اس کا حق ہے کہ وہ گھر سے چلی جائے اور پھر اپنے بارے میں جو فیصلہ چاہے' کرے۔ ہاں اگر خاوند نے دوران عدت رجوع کر لیا ہو اور اسے روک لیا ہو تو پھر وہ حسب سابق بیوی رہے گی لیکن یہ رجوع اس لیے نہ ہو گا کہ اسے ضرر پہنچائے یا اسے اذیت دے اور اسے معلقہ کی طرح رکھے اور بیوی بنا کے نہ رکھے۔ صرف اس صورت میں رجعت ہو سکتی ہے' جب وہ معروف طریقے سے اسے رکھنا چاہئے۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (٦٥ : ٢) "پھر جب وہ اپنی عدت کے خاتمہ پر پہنچیں تو یا انہیں بھلے طریقے سے روک رکھو یا بھلے طریقے پر ان سے جدا ہو جاؤ"۔

جو بھی فیصلہ کرو رکھنے کا یا جدا کرنے' اس پر گواہ ٹھہرالو۔

وَّاَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (٦٥ : ٢) "اور دو ایسے آدمیوں کو گواہ بنا لو جو تم میں سے صاحب عدل ہوں"۔

سورہ بقرہ میں ہے کہ جن عورتوں کو حیض آتا ہے ان کی عدت تین قروء ہے جس کے معنی فقہی اختلافات کے مطابق تین حیض ہیں یا تین طہر ہیں۔ یہاں ان عورتوں کی عدت کے احکام ہیں' جن کو حیض نہیں آتا۔ یا چھوٹی ہیں ابھی حیض

شروع ہی نہیں ہوا۔

وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ (٦٥ : ٤) "اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہیں یا ان کے معاملہ میں اگر تم لوگوں کو کوئی شک لاحق ہے تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔ یہی حکم ان کا ہے جنہیں ابھی حیض نہ آیا ہو"۔ اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل تک ہے۔

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (٦٥ : ٤) "اور حاملہ عورتوں کی عدت کی حد یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے"۔

پھر یہ حکم ہے کہ عدت گزارنے والی کہاں عدت گزارے اور جو عورت وضع حمل کا انتظار کر رہی ہے اس کا نفقہ کس کے ذمہ ہے۔

اَسْکِنُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ سَکَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِکُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَیِّقُوْا عَلَیْهِنَّ وَاِنْ کُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَیْهِنَّ حَتّٰی یَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (٦٥ : ٦) "اور ان کو زمانہ عدت میں اسی جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو، جیسی کچھ بھی جگہ تمہیں میسر ہو اور انہیں تنگ کرنے کے لیے ان کو نہ ستاؤ۔ اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر اس وقت تک خرچ کرتے رہو جب تک ان کا وضع حمل نہ ہو جائے۔

اگر وضع حمل کے بعد بچے کو دودھ پلانا ہے، اور زوجین کے درمیان اتفاق ہو جائے کہ یہی والدہ دودھ پلائے، بچے کی مصلحت کو مد نظر رکھتے ہوئے تو اس کا نفقہ یا اتفاق نہ ہو تو کوئی دوسری پلائے۔

فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَکُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ وَاْتَمِرُوْا بَیْنَکُمْ بِمَعْرُوْفٍ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗ اُخْرٰی (٦٥ : ٦) "پھر اگر وہ تمہارے لیے دودھ پلائیں تو ان کی اجرت انہیں دو، اور بھلے طریقے سے، باہمی گفت و شنید سے طے کر لو، لیکن اگر تم نے ایک دوسرے کو تنگ کیا تو بچے کو کوئی اور عورت دودھ پلالے گی"۔

اجرت کا معیار کیا ہونا چاہئے۔ تمام حالات میں اجرت خاوند کی مالی استطاعت کے مطابق طے ہونا چاہئے۔

لِیُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَیْهِ رِزْقُهٗ فَلْیُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰهُ اللّٰهُ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰهَا (٦٥ : ٧) "خوشحال آدمی اپنی خوشحالی کے مطابق نفقہ دے اور جس کو رزق کم دیا گیا ہو وہ اسی مال میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ نے جس کو جتنا کچھ دیا ہے اس سے زیادہ کا وہ اسے مکلف نہیں کرتا"۔

یوں ان نصوص کے اندر تمام حالات طلاق کے لیے مفصل احکام دے دیئے ۔ طلاق کی وجہ سے ٹوٹنے والے خاندان کے تمام بنیادی مسائل یہاں حل کر دیئے گئے اور ان احکام کی حکمت بھی بتا دی گئی ۔ نہایت نرمی ' نہایت بارکی اور نہایت وضاحت کے ساتھ ۔

جب انسان اس سورت پر غور کرتا ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے ' اس چھوٹی سی سورت میں وہ تمام احکام دے دیئے گئے ہیں جو کسی ایسے خاندان کو درپیش ہوتے ہیں جس میں بدقسمتی سے طلاق ہو جاتی ہے ۔ اس سورت میں تمام متعلقہ احکام و قوانین مفصل بتلائے ہیں لیکن ان احکام کے اندر ہی ترغیب ' ترہیب ' ڈراوا اور ہر حکم پر حکیمانہ تبصرہ کیا گیا ہے ۔ اللہ نے یہ ہدایت کی ہے کہ تحلیل شدہ خاندان یہ سمجھے کہ اللہ کی تقدیر اور فیصلہ ہی ایسا ہو گا ' اصل فیصلے زمین و آسمانوں کا مالک آسمان پر کرتا ہے اور پھر یہ بھی اسی سورت میں بتا دیا گیا کہ جو لوگ اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں ' اللہ انہیں ہلاک کرتا ہے ۔ اور ان لوگوں کے لیے بڑی وسعت ہوتی ہے جو اس سے ڈرتے ہیں ۔ تمام احکام کے درمیان بھی یہی تلقین ہے کہ معروف طریقے سے ' باہم رضامندی سے ' باہم احسان کے ساتھ اور ایثار کے ساتھ ' اور اجر اخروی کا لحاظ رکھتے ہوئے ' معاملات کو طے کرو ' یہ بھی تلقین کی گئی ہے کہ تخلیق اور رزق کے معاملات میں اور رزق کی تنگی اور کشادگی کے معاملات میں اللہ کی تقدیر چلتی ہے ۔

سورت کا موضوع ہے معاملہ طلاق لیکن اس کے اندر جابجا بکثرت عظیم کائناتی حقائق بھی بیان کیے گئے ہیں ۔ اور پھر طلاق کے موضوع پر قانون سازی اور ہدایات کو اس قدر اہم سمجھا گیا ہے کہ احکام کے بیان میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کیا گیا ہے ' خاص آپ کی ذات کو ۔ حالانکہ احکام و ہدایات سب مومنین کے لیے عام ہیں ۔ یہ اس لیے کہ دیکھو یہ کوئی بہت اہم معاملہ ہے ۔

یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ ( ۶۵ : ۱ ) سے خطاب شروع ہو رہا ہے ۔ پھر احکام کی تفصیلات دی گئی ہیں ' ایک ایک حالت کا حکم ہوا ۔ ہر حکم تو نہایت سخت تاکیدی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ان احکامات پر سختی سے عمل کرو ' ان کے نفاذ میں خدا سے ڈرو ' ان کو اخذ کرنے میں اللہ کو حاضر و ناظر سمجھو ' درمیان میں ترغیب ' ترہیب ' تبصروں اور احکام کی علت کے بیان میں تفصیل سے کام لیا گیا ہے ۔ اس قدر تفصیل سے کہ انسان سمجھتا ہے کہ شاید اسلام کا مرکزی مضمون ہی قانون طلاق ہے ۔ بس یہی دین ہے ۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ عالم بالا خود فیصلہ کرنے بیٹھا ہے ۔ خود اس کی نگرانی کر رہا ہے کہ احکام نافذ ہو رہے ہیں یا نہیں ۔ اور ان احکام کے نفاذ میں جو لوگ تقویٰ اور خدا خوفی کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کو اعلیٰ درجے کا مومن کہا جاتا ہے ۔ اور جو لوگ ان احکامات میں چالیں چلتے ہیں ' تامل کرتے یا تعمیل میں ہچکچاہٹ کا اظہار کرتے ہیں ' زوجین میں سے کسی کو مضرت پہنچاتے ہیں ان کو سخت ترین سزا کی دھمکی دی جاتی ہے ۔ اور اگر زوجین ایک دوسرے کے ساتھ حسن اخلاق کا برتاؤ کریں ' بھلائی اور آسانی پیدا کریں اور رواداری پیدا کریں اور معروف طریقے سے معاملات طے کریں ' تو اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ جدائی بھی فریقین کے لیے باعث خیر بن سکتی ہے ' اللہ کے خزانے بھرے ہوئے ہیں ۔

پھر قارئین ان احکامات کے درمیان آیات کے درج ذیل ٹکڑے پڑھتے ہیں ۔

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ( ۶۵ : ۱ ) "اللہ سے ڈرو جو تمہارا رب ہے" ۔

وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَ مَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ (٦٥ : ١) "یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں اور جو کوئی اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا"۔

لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا (٦٥ : ١) "تم نہیں جانتے کہ شاید اس کے بعد اللہ کوئی صورت پیدا کر دے"۔

وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (٦٥ : ٢) "اور دو ایسے آدمیوں کو گواہ بنالو جو تم میں سے صاحب عدل ہوں اور گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے لیے ادا کرو"۔

ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (٦٥ : ٢) "یہ باتیں ہیں جن کی لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے، ہر اس شخص کو جو اللہ اور آخرت دونوں پر ایمان رکھتا ہو"۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا (٢) وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (٦٥ : ٣) "جو اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔ جو اللہ پر بھروسہ کرے وہ اس کے لیے کافی ہے۔ اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے"۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا (٦٥ : ٢) "اور جو شخص اللہ سے ڈرے اس کے معاملے میں وہ سہولت پیدا کر دیتا ہے"۔

ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗ اِلَيْكُمْ (٦٥ : ٥) "یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے"۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗ اَجْرًا (٦٥ : ٥) "اور جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کی برائیوں کو اس سے دور کر دے گا اور اس کو بڑا اجر دے گا"۔

سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا (٦٥ : ٧) "بعید نہیں کہ تنگ دستی کے بعد فراخ دستی بھی عطا فرما دے"۔

پھر اسی سورت میں ایک قاری ایک شدید ڈراوا بھی پڑھتا ہے جو بہت طویل ہے :

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا

وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا (٨) فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا (٩) اَعَدَّ

اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا --- (٦٥ : ١٠) "کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے ان سے سخت محاسبہ کیا اور ان کو بری طرح سزا دی۔ انہوں نے اپنے کیے کا مزہ چکھ لیا اور ان کا انجام کار گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔ اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے"۔

اور اس کے بعد اس قسم کے انجام سے ڈرایا جاتا ہے اور اللہ کی نعمتیں یاد دلائی جاتی ہیں، خصوصاً اللہ کا رسول تم میں اٹھایا جانا اور اسے ایک ایسا دین عطا کرنا جو نور ہی نور ہے یہ بھی ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ اور پھر قیامت کا اجر کبیر جو تیار پڑا ہے۔

--- فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا (١٠)

رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ

الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا (١١) "پس اللہ سے ڈرو اے صاحب عقل لوگو، جو ایمان لائے ہو۔ اللہ نے تمہاری طرف ایک نصیحت نازل کر دی ہے۔ ایسا رسول جو تم کو اللہ کی صاف صاف ہدایت دینے والی آیات سناتا ہے تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ جو کوئی اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے اللہ اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی یہ لوگ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اللہ نے ایسے شخص کے لیے بہترین رزق رکھا ہے"۔

اور اس کے بعد عظیم کائنات میں انسانی فکر کو گھمایا جاتا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا

اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا (٦٥ : ١٢) "اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہی کے مانند، ان کے درمیان حکم نازل ہوتا رہتا ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے"۔

ایک انسان ان سب باتوں کو احکام طلاق کے ضمن میں اور ان پر تبصروں کے ضمن میں پڑھتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ قرآن کی ایک پوری سورت صرف خانگی امور سے متعلق وقف ہے، عائلی مسائل، طلاق اور طلاق کے بعد کے حالات اور ان معاملات کو اس کائنات، اور اس کے بارے میں نظریات اور انسانی نفسیات سے منسلک کیا جاتا ہے حالانکہ موضوع زیر بحث تغیر کے لیے نہیں تخریب کے لیے ہے۔ اور اس میں ایک خاندان کی صرف تحلیل ہو رہی ہے۔ نہ کوئی خاندان وجود میں آ رہا ہے اور نہ کسی حکومت کی تشکیل کا کوئی مسئلہ ہے۔ جب کہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ شاید کسی حکومت کی تشکیل سے

بھی بڑا کوئی معاملہ درپیش ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس عائلی مسئلہ کو اس قدر اہمیت کیوں دی گئی ہے؟

اس سے کئی امور معلوم ہوتے ہیں' ان میں اہم امر یہ ہے کہ دین اسلام ایک بلند مرتبہ اور سنجیدہ دین ہے اور اس کا سرچشمہ قطعاً انسان نہیں ہے۔ اگر دوسرے شواہد کو نظرانداز بھی کر دیا جائے تو صرف یہی ایک سورت ہی اس حقیقت پر کافی شہادت رکھتی ہے۔

پھر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں خاندان کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام دراصل ہے ہی ایک خاندانی نظام۔ اسلامی نظام کے زاویہ سے خاندان ہی ذریعہ سکون ہے اور اس کے ذریعہ لوگ باہم محبت اور شفقت کے مظاہر دیکھتے ہیں' ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی' ایک دوسرے کے رازدار' ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک' کردار کی طہارت کے باعث اور ایک دوسرے کے لیے کفیل ہوتے ہیں۔ اس خاندان کے ماحول میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے' آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہے' اور افراد خاندان کے باہم محبت اور باہم کفالت کا انتظام ہوتا ہے۔

قرآن کریم گھریلو زندگی کی نہایت ہی خوبصورت تصویر کھینچتا ہے' جس کے اندر ہر طرف شفقت کے سائے چھائے ہوئے ہیں۔ ہر طرف رحمت اور شفقت کی خوشبو ہی خوشبو ہے اور نہایت ہی لطیف تعلق کی تروتازگی ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً "اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے نفوں سے تمہارے لیے جوڑے بنائے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی"۔ اور دوسری جگہ ہے:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ "وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو"۔

ایک نفس دوسرے نفس کے ساتھ متعلق ہو جاتا ہے اور دونوں کے لیے یہ تعلق سکون و قرار ہے۔ محبت اور رحمت ہے۔ ایک دوسرے کے لیے پردے اور ایک دوسرے کی زینت ہیں۔ انسان خود ان الفاظ کے اندر نہایت مٹھاس اور محبت محسوس کرتا ہے۔ الفاظ کے اندر ہی ایک اچھی فضا اور تروتازگی نظر آتی ہے۔

ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس رابطے اور تعلق کے لیے اسلام کیا حقیقی اساس تجویز کرتا ہے۔ یہ نہایت ہی پختہ تعلق اور نہایت ہی نرم تعلق ہے۔ اور اس تعلق سے وہ اصل مقاصد بھی معلوم ہوتے ہیں جن کے لیے یہ تعلق قائم کیا گیا ہے۔ یہ کہ نسل انسانی کا تسلسل قائم رہے۔ یہ تمام فطری اغراض و مقاصد ایک بڑے مقصد کو پورے کرنے کے لیے ہیں۔ وہ یہ کہ

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ "کہ تمہاری بیویاں تمہارا کھیت ہیں"۔ اس تعلق سے بڑا مقصد یہ ہے کہ نسل انسانی کے بڑھانے کا انتظام ہو۔ لیکن یہ مقصد اور اس سے متعلق تمام دوسرے مقاصد نہایت پاکیزگی' طہارت کے رنگ میں ہوں' یہ تعلق ایک بامقصد اور سنجیدہ تعلق ہو' اور تمام آلودگیوں سے پاک ہو۔

اس ابتدائی یونٹ یا خلئے یا نرسری کی اسلامی نظام پوری حفاظت کرتا ہے۔ اور اسے بقا کی پوری پوری ضمانتیں عطا

کرتا ہے۔ اسلام اس خلیے کو 'محض اخلاقی اور روحانی اشراق کے ذریعہ نشو و نما نہیں دیتا بلکہ وہ اس کو مکمل دستوری اور قانونی تحفظات بھی دیتا ہے۔

جو شخص اسلام کے عائلی قانون پر ایک سرسری نگاہ ڈالے اور اس سلسلے میں قرآن و سنت کی ہدایات کو غور سے پڑھے 'کہ قرآن و سنت نے مختلف حالات میں کیا کیا ہدایات دی ہیں اور پھر ان قانونی 'اخلاقی ہدایات کے ساتھ ساتھ 'ان پر کس قدر دلائل اور حکمتیں اور تبصرے اور سبق آموز نتائج دیئے ہیں۔ اور جس طرح ان تمام حالات کو اللہ کی ذات سے جوڑا گیا ہے 'جیسا کہ اس سورت میں آپ نے بطور نمونہ دیکھ لیا۔ تو وہ بڑی سہولت سے پوری طرح اس حقیقت کا ادراک کر لیتا ہے کہ اسلامی نظام میں معاشرتی نظام کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور اللہ کے نزدیک اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ سورہ نساء کے آغاز ہی میں اللہ نے فرمایا کہ مجھ سے ڈرو اور رحم کے حقوق سے ڈرو۔ ذرا پیچھے چلئے اس آیت کو دوبارہ پڑھیں۔

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا (٤ : ١) "اے لوگو' اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پھیلائے۔ اسی خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے"۔

اور سورہ اسراء میں اللہ کی عبادت اور والدین کے ساتھ احسان کو ایک سطح پر رکھا گیا۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (١٧ : ٢٣) "تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر اس کی اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو"۔ پھر سورہ لقمان میں اللہ کے شکر اور والدین کے شکر کو ایک ساتھ لایا گیا۔

اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ "شکر کرو میرا اور اپنے والدین کا"۔

اسلامی نظام میں خاندان کی نگہداشت اور حفاظت پر اس لیے زور دیا گیا ہے کہ خالق کے نظام تخلیق میں انسانی زندگی کو ایک خاندان کی صورت میں تسلسل دیا گیا ہے۔ اللہ نے انسانیت کا پہلا خلیہ آدم اور حوا کو قرار دیا۔ لوگ بعد میں اسی خاندان سے زیادہ ہو کر پھیلے۔ اللہ اس پر قادر تھا کہ وہ لوگوں کو کئی ملین کی تعداد میں ایک ہی بار پیدا کر دیتا۔ لیکن اللہ نے ماں اور باپ پر مشتمل ایک خاندان کو حیات انسانی کے لیے گہوارہ بنا کر اس منہاج پر نسل کو چلایا۔ کیونکہ ایک خاندان ہی بچے کی فطری ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔ اس کے ماحول ہی میں اس کی استعداد بڑھ سکتی ہے اور خاندان ہی میں اس کی شخصیت اور اس کی قابلیت پروان چڑھ سکتی ہے۔ خاندان ہی میں وہ گہرے اثرات لے سکتا ہے۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے اسلامی نظام زندگی بھی اپنی تخلیق کے نظام کے مطابق بناتے ہوئے اس کی انہی خطوط پر شیرازہ بندی کی 'جس

طرح انسانیت کی تخلیق ایک خاندانی نظام کے مطابق ہے 'جس طرح اسلامی نظام قانون میں خاندان کی اہمیت ہے اسی طرح اسلامی نظام اور اسلامی قانون بھی نظام فطرت کے مطابق ہیں۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اسلامی نظام حیات اور قرآن و سنت نے عائلی زندگی اور خاندانی نظام کو جو بے حد اہمیت دی گئی ہے اس کا مقصد اس نظام کو خدا کے ساتھ پیوست کر کے ایک مقدس رنگ دینا ہے۔ یہ نظام اور معاہدۂ زوجیت صرف ایک سول معاہدہ ہی نہیں بلکہ یہ ایک مقدس بندھن ہے۔ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مومنین کے اندر ایک روحانی پاکی اور شعوری صفائی فرماتا ہے۔ جبکہ بت پرستانہ اور دوسرے تحریف شدہ اور گمراہانہ ادیان میں اس کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام فطرت کے تقاضوں کے ساتھ جنگ نہیں کرتا۔ نہ فطری تقاضوں کو ایک گندا عمل قرار دیتا ہے بلکہ اسلام فطری خواہشات کو منظم کر کے اور پاکیزہ راہوں سے اسے بلند کرتا ہے۔ اور ان تقاضوں کو اسلام خالص حیوانی سطح سے اٹھا کر اس بلند مقام تک لے جاتا ہے کہ بے شمار نفسیاتی' اجتماعی اور سماجی آداب کے لیے یہ تقاضے محور کا کام دیتے ہیں۔ اس کے بعد پھر جنسی تعلقات نہایت اعلیٰ درجے کے انسانی شعور پر مبنی ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کہ جب دو جسم آپس میں ملتے ہیں تو اس کے نتیجے میں دو دل بھی مل جاتے ہیں' دو روحیں بھی مل جاتی ہیں بلکہ دو انسان آپس میں ایک ہو جاتے ہیں۔ مشترکہ زندگی ان کو باہم مربوط کرتی ہے۔ ان کی امیدیں مشترکہ ہوتی ہیں۔ ان کے درد اور دکھ ایک ہوتے ہیں' ان کا مستقبل ایک ہوتا ہے اور اولاد کی صورت میں تو ان کے جسم بھی ایک ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ اولاد اک گھر میں پیدا ہوتی ہے اور یہ اولاد پھر والدین کے اندر ان کے ازدواجی رشتے کو اور مربوط اور مستحکم کر دیتی ہے۔

اسلام ازدواجی زندگی کو پاکیزگی اور بلندی کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اس لیے اسلام حکم دیتا ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان شادی کا انتظام کرو۔

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲۴ : ۳۲) وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

"تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی' غلاموں میں سے جو صالح ہوں ان کے نکاح کر دو' اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا' اللہ بڑی وسعت والا اور علیم ہے۔ اور جو نکاح کا موقع نہ پائیں انہیں چاہئے کہ عفت مآبی اختیار کریں۔ یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے"۔

اسلامی قانون نے شادی شدہ مرد اور عورت کو محصن اور محصنات کہا ہے' یعنی بچے ہوئے لوگ۔ مقصد یہ ہے کہ بغیر شادی کے رہنا اگرچہ ایک نہایت ہی معمولی عرصہ ہو' اللہ اس سے راضی نہیں ہوتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا "مجھے یہ ڈر لگا کہ میں اللہ سے ملوں اور رنڈوا ہوں"۔ یہ بات انہوں نے اس وقت کہی جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد جلد انہوں نے شادی کر لی۔ یوں نکاح کرنا اسلامی نظام اور دین اسلام میں عبادات میں شمار ہوتا ہے اور اس کا درجہ اسی طرح ہے جس طرح دوسری عبادات ہوتی ہیں۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اسلام کے عائلی قوانین پر نظر ڈالی جائے تو یہ نہایت ہی فطری لیکن حقیقت پسندانہ قوانین ہیں۔ یہ عائلی تعلقات اور ان کے ضابطے انسانوں کو انسان سمجھ کر بنائے گئے ہیں۔ فطری انداز کے عائلی روابط کو پھر اٹھا کر بلند اور مقدس مقام تک لے جایا گیا ہے۔ زندگی کے حقیقی حالات اور انسان کی حقیقی سطح اور اس کی صلاحیت کو سامنے رکھتے ہوئے۔ یہ چونکہ دو دلوں کے اندر جوڑ پیدا کرتا ہوتا ہے' اس لیے اسلام نے ان روابط کی شیرازہ بندی میں صرف قانونی اقدامات پر ہی اکتفاء نہیں کیا' نہ صرف اخلاقی وعظ پر فریقین کو چھوڑ دیا گیا ہے بلکہ قانونی ضوابط بھی وضع کیے گئے ہیں۔ اخلاقی ہدایات بھی دی گئی ہیں۔ خدا کے خوف سے بھی ڈرایا گیا ہے' لیکن ان کے ساتھ ساتھ انسان کے حقیقی نفسیاتی حالات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔

اسلام نے عائلی تعلقات کے اندر سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو دی ہے کہ یہ تعلقات دائمی ہوں اور چلتے رہیں۔ اور ان تعلقات کو جاری رکھنے کے لیے اسلام نے کافی ضمانتیں فراہم کی ہیں۔ اسلام نے زوجین کو کہا ہے کہ رشتہ ازدواج دراصل ایک مقدس رشتہ اور عبادت ہے۔ اس کے قیام کے لیے سرکاری بجٹ میں مد رکھی گئی ہے۔ فقراء کے لیے اور فقیرات کے نکاح کے لیے معاونت رکھی ہے۔ پھر زینت کی نمائش کو ممنوع قرار دیا ہے کہ محروم لوگوں کے اندر جنسی اشتعال نہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ بازاروں میں حسن پھرے اور اس کے پیچھے دیوانے لگے ہوئے ہوں۔ اسلام نے حد زنا' اور حد قذف کا قانون جاری کیا۔ گھروں کے اندر داخلے کے لیے استیذان کا قانون جاری کیا۔ اور خود ایک گھر میں رہنے والے لوگوں سے بھی کہا گیا کہ جب وہ گھر میں داخل ہوں تو اجازت لے کر آئیں۔

اسلام نے ازدواجی تعلقات کے لیے ایک متعین قانون بنایا' پھر گھر کا انتظام مرد کے ہاتھ میں دیا اور اسے گھر کا منتظم اعلیٰ مقرر کیا۔ کیونکہ جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ قوی تر ہے تاکہ خاندان کے انتظام میں انتشار نہ ہو' غرض خاندانی نظام کے بچانے کے لیے اسلام نے ہر ذریعہ استعمال کیا۔ جذباتی ہدایات نیز تعلقات کو اللہ کی نگرانی میں دینا اور ان کے سلسلے میں خدا خوفی پیدا کرنا بھی خاندانی نظام کے استحکام کے لیے ہیں۔ غرض اسلام نے ان تعلقات کو صرف جذبات کے حوالے نہیں کیا۔

لیکن ان تمام قانونی' اخلاقی اور دینی انتظامات کے باوجود بعض اوقات ایسے عملی حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ کوئی خاندانی یونٹ قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ حالات چونکہ عملی اور حقیقی ہوتے ہیں' اس لیے اسلام نے ایسے حالات کے لیے بھی ایک عملی ضابطہ اختیار کیا ہے' کہ اگر زوجین کے درمیان اس قدر تلخی ہوگئی ہو کہ ان کا یکجا رہنا ممکن نہ ہو تو اسلام اس قسم کی کوئی عبث کوشش نہیں کرتا کہ فریقین کو زبردستی جوڑے رکھا جائے اور اگر تحلیل کی ضرورت ہو تو اس کے لیے راہ چھوڑتا ہے لیکن :

اسلام یہ اجازت نہیں دیتا کہ اس ابتدائی یونٹ میں معمولی خرابی ہوتے ہی اسے تحلیل کر دیا جائے بس معمولی اختلاف ہو اور فوراً طلاق واقع ہو جائے۔ اسلام اس یونٹ کو بچانے کی پوری پوری سعی کرتا ہے اور تحلیل کی اجازت اس وقت دیتا ہے جب بچنے کی کوئی صورت نہ رہے۔ مکمل مایوسی ہو جائے۔

چنانچہ اسلام کا حکم یہ ہے خصوصاً مردوں سے کہا جاتا ہے :

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللَّهُ

فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ( ٤ : ١٩ ) "اور ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو' اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو' مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو"۔ اگر کوئی خاوند بیوی کو ناپسند بھی کرتا ہو' پھر بھی قرآن اسے آمادہ کرتا ہے کہ ذرا صبر سے کام لو' طلاق کے فیصلے میں جلدی نہ کرو اور ان کو امید دلاتا ہے کہ "ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو"۔ کیا پتہ ہے کہ ان مکروہ عورتوں ہی میں تمہارے لیے بھلائی ہو۔ اور یہ خیر ان کے ذریعے آنے والی ہو۔ لہٰذا ان کو چاہئے کہ اس خیر سے اپنے آپ کو محروم نہ کریں۔ یہ ایک نہایت ہی بلیغ انداز ہے جس کے ذریعہ قرآن کریم محبت اور حسن سلوک کے جذبات کو زندہ کرتا ہے اور نیز اس بلیغ انداز سے کراہت اور ناپسندیدگی کی سختی کو نرمی سے بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جب یہ نفاق اس قدر بڑھ گیا کہ محض ناپسندیدگی نہیں رہی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر عورت کی طرف سے نافرمانی اور نشوز پیدا ہو گیا ہے پھر بھی طلاق آخری حل نہیں ہے بلکہ فریقین کے درمیان اس تنازعہ کو رفع کرنے کی کوشش ہونی چاہئے۔

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِنْ يُّرِيدَا

إِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا ( ٤ : ٣٥ ) "اگر تم لوگوں کو کہیں میاں بیوی کے درمیان تعلقات بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو' وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا' اللہ سب کچھ جانتا ہے اور باخبر ہے"۔ اور دوسری جگہ ہے:

وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُّصْلِحَا

بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ( ٤ : ١٢٨ ) اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخی کا خطرہ ہو' تو کوئی مضائقہ نہیں کہ میاں بیوی آپس میں صلح کر لیں۔ صلح بہرحال بہتر ہے"۔

اگر جرگہ سے بھی مصالحت نہ ہو' اور کوئی صورت نہیں ہے کہ یہ یونٹ بچ سکے اور اس سلسلے میں کی جانے والی تمام کوششیں رائیگاں گئی ہیں اور جس قدر دباؤ پڑتا ہے' حالات اور خراب ہوتے ہیں تو حکمت اور دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ واقعات کو تسلیم کر لیا جائے۔ پھر اس قسم کی باہم جکڑی ہوئی زندگی کو اسلام بھی پسند نہیں کرتا تو آخری حل سامنے آتا ہے اور یہ جائز قرار پاتا ہے لیکن جائز ہونے کے باوجود۔ "ابغض الحلال عند اللہ الطلاق"

(اللہ کے نزدیک طلاق ناپسندیدہ ترین حلال امر ہے) اب اگر خاوند طلاق کا آخری فیصلہ کرلے تو پھر اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ فوراً ہی تعلقات کاٹ دے۔ سنت طریقہ طلاق یہ ہے کہ طلاق یوں دی جائے کہ جب عورت ایام ماہواری سے فارغ ہو تو قبل اس کے کہ خاوند اس کے ساتھ ہم بستری کرے اسے ایک طلاق دے دے۔ اس کے بعد

دوسری بار عورت اس طرح فارغ ہو تو دوسری طلاق دے۔ تیسرے مہینے وہ اسی طرح فارغ ہو تو تیسری بار طلاق دے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ خاوند غصے میں آکر یکدم تعلقات کاٹ نہ دے۔ اس طریقہ طلاق کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طلاق رجعی ہوتی ہے۔ اس دوران اگر کوئی صورت پیدا ہو جائے تو خاوند رجوع کر سکتا ہے۔ اسی طرح دوسری طلاق بھی رجعی ہوگی پھر بھی وہ رجوع کر سکتا ہے۔ اگر دو ماہ میں بھی ان کے درمیان کوئی صلح نہ ہو سکے تو پھر آخری بار طلاق فائنل ہوگی۔

اس کے بعد پھر عدت کا دور آتا ہے۔ اگر کسی عورت کو ایام ہوتے ہیں تو تین بار ایام سے پاکی سے عدت گزر جائے گی۔ اور جس عورت کا حمل ہو تو وضع حمل سے اس کی عدت گزر جائے گی اور جس کا حمل بھی نہ ہو اور حیض بھی نہ آتا ہو اس کی عدت تین ماہ ہوگی۔ اسی طرح نابالغ کی عدت بھی تین ماہ ہوگی۔ اگر عدت جاری ہو تو دوران عدت خاوند رجوع کر کے تعلقات کو پھر سے بحال کر سکتا ہے۔ (اگر تین طلاق بیک وقت دے دی ہوں اور عدت گزر رہی ہو تو احناف کے نزدیک رجوع کا اختیار نہ ہوگا)۔

لیکن اسلام کی یہ تمام کوششیں اس بات کی نفی نہیں کرتیں کہ قطعی جدائی نہیں ہو سکتی۔ اسلام حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسے حالات کو تسلیم کرتا ہے اور ایسے حالات کے لیے قانونی اقدامات بھی کرتا ہے۔ جدائی کی صورت میں ذمہ داریوں کا تعین بھی کرتا ہے۔ اس سورت میں ایسے ہی حالات کے لیے مفصل قانون سازی کی گئی ہے۔ ان قانونی اقدامات سے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام کس قدر فطری اور واقعیت پسند دین ہے۔ اور اس نے انسان کی زندگی کے مسائل کو کس قدر خوبصورتی کے ساتھ حل کیا ہے اور انسان کو آگے بڑھایا ہے بلکہ اسے آسمانوں تک بلند کر کے معرفت الٰہیہ سے نوازا ہے۔

اس سورت سے چوتھا نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اسلامی سوسائٹی میں جاہلیت سے ورثے میں ملے ہوئے بعض عملی مسائل موجود تھے۔ یہ مسائل اور رسم و رواج پہلے سے عملاً اسلامی سوسائٹی میں چلے آرہے تھے۔ اس لیے اسلامی سوسائٹی کو خاندانی نظام کی تشکیل جدید کے لیے ترغیب 'ترہیب 'تبصرے' حکمتوں اور احکامات پر عمل کرنے کی شدید تاکید کی ضرورت پیش آئی۔ ان مسائل کی وجہ سے عورت ظلم کی چکی میں پس رہی تھی۔ اور ہر معاملے میں اس پر مظالم ہوتے تھے جس کی وجہ سے ان احکامات کے نفاذ میں اس قدر تشدید کی ضرورت پیش آئی۔ اس لیے نفسیاتی دلائل 'نہایت باریک قانونی تفصیلات اور خدا خوفی کی بار بار اپیلیں کرنی پڑیں تاکہ لوگوں کو ان جدید احکام میں تاویل کرنے 'اور پہلوتہی کرنے کا موقعہ ہی نہ ملے۔ کیونکہ اسلام سے پہلے مرد و عورت کے تعلقات کسی ضابطے کے پابند نہ تھے اور مرد جس وقت چاہتا تھا' خاندان کا شیرازہ بکھیر دیتا تھا۔

عورت پر مظالم کے یہ حالات صرف جزیرۃ العرب تک محدود نہ تھے۔ اس وقت کی پوری دنیا میں عورتوں پر مظالم ہو رہے تھے۔ پوری دنیا میں عورت' غلاموں سے بھی بدتر حالات میں زندگی بسر کر رہی تھی بلکہ دوسری جگہوں میں تو عورت کے ساتھ تعلق کو ایک گندہ تعلق سمجھا جاتا تھا۔ اور عورت کو شیطان کا ہتھیار سمجھا جاتا تھا۔

جب اسلام آیا تو اس نے عورت کو اس گرے ہوئے مقام سے اوپر بلند کیا اور مرد و عورت کے تعلقات کو بالکل مساوی سطح پر لاکر اسے وہ تقدس بخشا جس کی طرف ہم نے گزشتہ صفحات میں اشارہ کیا ہے۔ قدر و قیمت 'حقوق' تحفظات کے اعتبار سے عورت کو بالکل ایک جدید زندگی بخشی۔ اب وہ ایک ایسی بچی نہیں ہے جسے زندہ درگور کر دیا جائے 'جس کی

توہین کی جائے ۔اب وہ ایک ایسی خود مختار ہستی ہے ۔کہ اس کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح نہیں ہو سکتا' خواہ وہ باکرہ ہو یا شادی شدہ ہو' وہ اگر کسی کی عورت ہے تو اس کے لیے حقوق اور تحفظات ہیں ۔اور یہ حقوق قانونی حقوق ہیں' محض رسم و رواج نہیں ہیں ۔ مطلقہ ہے تو اس کو وہ حقوق حاصل ہیں جو اس سورت میں مفصل ہیں ۔

اسلام نے عورت کو یہ حقوق اس وقت دیئے جبکہ جزیرۃ العرب یا دنیا کے کسی خطے میں 'کسی عورت کے اندر یہ شعور نہ تھا کہ معاشرہ نے ان کو جو مقام دیا ہوا ہے وہ ان کے استحقاق سے فروتر ہے ۔اور یہ حقوق اسلام نے عورت کو اس لیے بھی نہ دیئے تھے کہ خود مردوں کے اندر یہ شعور بیدار ہو گیا تھا کہ عورت پر ظلم ہو رہا ہے' نہ یہ حقوق اس لیے دئے گئے تھے کہ عربی عورتوں کی کوئی انجمن تھی' وہ مطالبہ کر رہی تھی یا زمین کے اوپر دوسرے علاقوں میں عورتوں کی کوئی انجمن تھی' اور وہ مطالبہ کر رہی تھی ۔یا اس لیے بھی وہ حقوق اسلام نے نہیں دیئے کہ کچھ عورتیں مکہ کے دارالندوہ کی ممبر بن گئی تھیں یا مجلس شوریٰ اور پارلیمنٹ کی ممبر بن گئی تھیں ۔یا اس لیے کہ اس کرۂ ارض کے اوپر کہیں سے کوئی آواز ان کے حقوق کے لیے اٹھ گئی تھی ۔یہ تو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے از خود یہ شریعت بھیجی' اللہ بادشاہ سماوات نے اہل زمین پر رحم کیا ۔اور حکم دیا کہ عائلی زندگی کو اس گراوٹ سے بلند کیا جائے ۔اور عائلی تعلقات کو شرعی اصولوں پر استوار کیا جائے ۔یہ کہ زوجین نفس واحدہ ہیں اور ان کے حقوق بھی بحیثیت انسان برابر ہیں ۔

یہ ہے ایک بلند اور ارفع دین ۔اس سے وہی شخص منہ موڑ سکتا ہے جو اندھا ہے اور اس میں عیب وہی تلاش کرتا ہے جو پسماندہ ذہنیت رکھتا ہے ۔اور اس کے ساتھ وہی جنگ کرتا ہے جو منحوس اور کینہ ہو' اس لیے کہ اللہ کی شریعت کو ترک کر کے انسانوں کی شریعت وہی شخص اختیار کرتا ہے جو ہوائے نفس کا غلام ہو ۔

میں سمجھتا ہوں اس سورت پر اس قدر تبصرہ کافی ہے اور اب مناسب ہے کہ ہم اس کی آیات پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں ۔یہ تبصرہ بھی سورت کی فضا سے کچھ زیادہ بعید نہیں ہے' نہ غیر متعلق ہے ۔نہ اس پارے کی فضا سے دور ہے ۔جس میں اسلامی جماعت کی تشکیل اور تنظیم پر زور دیا گیا ہے ۔ہاں البتہ تفصیلی احکام اس مجمل تبصرے سے قدرے مختلف ہوں گے ۔تفصیل سے معلوم ہو گا کہ وہ زندہ' متحرک' باشعور' ہدایت پذیر سوسائٹی کی عملی باتیں ہیں ۔اور یہی فرق ہے قرآن و سنت کے احکام اور کتب فقہ کے احکام کا ۔فقہ اور اصول فقہ کے احکام کا وہ رنگ نہیں ہوتا جو قرآن میں بیان احکام کے وقت ہوتا ہے کیونکہ قرآن میں احکام کے ساتھ ہدایات اثر اندازی اور اثر پذیری بھی ساتھ ساتھ نمایاں نظر آتی ہے جبکہ فقہ و قانون میں خشک احکام ہی ہوتے ہیں ۔

---○○○---

# درس نمبر ۲۶۵ تشریح آیات

## ۱ ـــ تا ـــ ۱۲

آیاتھا ۱۲ سُوْرَةُ الطَّلَاقِ (۶۵) مَدَنِيَّةٌ (۹۹) رکوعاتھا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ
مُّبَيِّنَةٍ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ لَا
تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝١ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ
بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ
لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ
لَّهٗ مَخْرَجًا ۝٢ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ
حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝٣ وَالّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ
مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ
يَحِضْنَ ؕ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ
يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝٤ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ
يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ۝٥

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"اے نبیؐ' جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے لیے طلاق دیا کرو اور عدت کے زمانے کا ٹھیک ٹھیک شمار کرو' اور اللہ سے ڈرو' جو تمہارا رب ہے۔ (زمانہ عدت میں) نہ تم انہیں ان کے گھروں سے نکالو' اور نہ وہ خود نکلیں' الا یہ کہ وہ کسی صریح برائی کی مرتکب ہوں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں' اور جو کوئی اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اپنے اوپر خود ظلم کرے گا۔ تم نہیں جانتے' شاید اس کے بعد اللہ (موافقت) کی کوئی صورت پیدا کر دے۔ پھر جب وہ اپنی (عدت کی) مدت کے خاتمہ پر پہنچیں تو یا انہیں بھلے طریقے سے (اپنے نکاح میں) روک رکھو' یا بھلے طریقے پر ان سے جدا ہو جاؤ اور دو ایسے آدمیوں کو گواہ بنالو جو تم میں سے صاحب عدل ہوں اور (اے گواہ بننے والو) گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے لیے ادا کرو۔ یہ باتیں ہیں جن کی تم لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے' ہر اس شخص کو جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو۔ جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔ جو اللہ پر بھروسہ کرے اس کے لیے وہ کافی ہے۔ اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے۔ اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں ان کے معاملہ میں اگر تم لوگوں کو کوئی شک لاحق ہے تو (تمہیں معلوم ہو کہ) ان کی عدت تین مہینے ہے۔ اور یہی حکم ان کا ہے جنہیں ابھی حیض نہ آیا ہو۔ اور حاملہ عورتوں کی عدت کی حد یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے۔ جو شخص اللہ سے ڈرے اس کے معاملہ میں وہ سہولت پیدا کر دیتا ہے یہ اللہ کا حکم ہے۔ جو اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔ جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کی برائیوں کو اس سے دور کر دے گا اور اس کو بڑا اجر دے گا"۔

یہ پہلا مرحلہ ہے اور یہ پہلا حکم ہے کہ خطاب تو صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن حکم تمام مومنین کے لیے ہے۔ کیونکہ خطاب۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ (۶۵ : ۱) سے ہے اور حکم یوں شروع ہوتا ہے:

اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (۶۵ : ۱) "جب تم لوگ طلاق دو"۔ معلوم ہوا کہ اس حکم کی خدا کے نزدیک بہت بڑی اہمیت ہے اور اس لیے یہ تاثر دیا گیا کہ اسے نہایت سنجیدگی سے لیا جائے۔ یہ اہم حکم ہے۔ اللہ اپنے نبی کو خصوصی طور پر خطاب فرماتا ہے کہ یہ حکم لیجئے اور اسے لوگوں تک پہنچائے۔ یہ ایک نفسیاتی انداز ہے اور نہایت ہی اونچے درجے کے اہتمام کا۔

اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (۶۵ : ۱) "جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انہیں عدت کے لیے طلاق دو"۔ اس آیت کے مفہوم کے تعین میں بخاری شریف کی ایک صحیح حدیث وارد ہے۔ یحیٰی ابن بکیر سے' لیث سے' انہوں نے عقیل سے' انہوں نے ابن شہاب سے' انہوں نے سالم سے' انہوں نے عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے وہ کہتے ہیں کہ میری ایک بیوی تھی جسے میں نے طلاق دے دی۔ اس وقت وہ حائضہ تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ کو بہت غصہ آیا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: "اسے چاہئے کہ اس سے رجوع کرے۔ پھر اسے بیوی بنا

رہے : ...... وہ حیض سے پاک نہ ہو جائے اور اس کے بعد وہ دوبارہ حائضہ ہو جائے اور پھر حیض کی مدت ختم ہونے پر پاک ہو جائے ۔ اب اگر وہ اسے طلاق دینا چاہتا ہے تو دے دے ۔ ایسی حالت میں کہ وہ پاک ہو اور قبل اس کے کہ اس نے ہاتھ لگایا ہو ۔ یہ ہے وہ عدت جس کا حکم اللہ نے دیا ہے "۔ مسلم نے بھی اس کو روایت کیا ہے ۔ البتہ ان کے الفاظ یہ ہیں : "یہ ہے وہ عدت جس کے لیے اللہ نے عورتوں کو طلاق دینے کا حکم دیا ہے "۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طلاق واقع ہونے کا ایک متعین وقت ہے ۔ لہٰذا مرد کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جس وقت چاہے عورت کو طلاق دے دے الا یہ کہ اس کی بیوی پہلے سے حالت طہر میں ہو اور اس طہر میں اس نے اپنی بیوی کو ہاتھ نہ لگایا ہو ۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ ایک دوسری صورت بھی ہے جس میں طلاق دی جا سکتی ہے ۔ وہ یہ کہ عورت واضح طور پر حاملہ ہو ۔ اس میں حکمت الٰہیہ یہ ہے کہ طلاق اس طرح ایک متعین وقت کے لیے موخر ہو جائے گی ۔ اور جس وقت مرد طلاق دینے کے لیے آمادہ ہوتا ہے 'فوراً نہ دی جا سکے گی ۔ عملاً طلاق موخر ہو جائے گی ۔ اور فائدہ یہ ہو گا کہ اگر کوئی فوری غیظ و غضب کا معاملہ ہو تو وہ ٹھنڈا ہو جائے ۔ اور اس دوران فریقین کے درمیان تعلقات درست ہو جائیں ۔ نیز اگر حاملہ ہے تو حمل کی تفتیش میں بھی وقت گزر سکتا ہے ۔ بعض اوقات ہو سکتا ہے کہ ایک شخص حمل ہی کی وجہ سے طلاق سے رک جائے ۔ جب حمل معلوم ہو جائے 'اس صورت میں اگر وہ طلاق دے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ سوچ سمجھ کر طلاق دینے کا فیصلہ کر چکا ہے ۔ "یہ کہ طہر میں طلاق دی جائے جس میں عورت کے پاس نہ گیا ہو "۔ یہ اس لیے کہ اس صورت میں حمل کا امکان کم ہوتا ہے ۔ اور یہ شرط کہ "وہ پہلے یہ تفتیش کرائے کہ حمل نہیں ہے "۔ یہ اس لیے کہ اسے معلوم ہو کہ بیوی حاملہ ہے ۔

یہ پہلی کوشش ہے کہ خاندان کے خلیے پر وار کرنے سے خاوند کو روکا جاتا ہے اور اس عمارت کو گرانے کے لیے مارے جانے والے کدال کو روک دیا جاتا ہے یا روکنے کی سعی کی جاتی ہے ۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر کوئی شخص ان شرعی ہدایات کی پرواہ کیے بغیر طلاق دیتا ہے تو واقع نہیں ہوتی ۔ جس وقت بھی کوئی طلاق دے طلاق واقع ہو جاتی ہے ۔ لیکن اس طرح طلاق دینا مکروہ ہے ۔ اللہ اور رسول سے ایسے شخص پر غضب کا نزول ہو گا ۔ (اور اسے طلاق بدعی ) کہتے ہیں اور ایک سچے مومن کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اس سے بچے اور اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرے ۔

وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ ( ۶۵ : ۱ ) "عدت کے زمانے کا ٹھیک ٹھیک شمار کرو "۔ تاکہ اس کے عدم شمار میں عدت گزارنے والی عورت پر مدت زیادہ نہ ہو جائے اور عدت گزارنے کے بعد اگر وہ دوسرا خاوند کرنا چاہتی ہے تو اسے بلاضرورت دیر نہ کرنا پڑے ۔ یا اگر مدت کم شمار ہو تو اس سے مدت کے جو مقاصد ہیں وہ پورے نہ ہوں ۔ یعنی نسب کی حفاظت کے لیے رحم مادر کی پاکی کا یقین ہونا ۔ اس کے بعد عدت گزارنے کے بارے میں مفصل احکام ۔ اور معاملے کو اللہ کی نگرانی اور خدا خوفی کے حوالے کیا جاتا ہے ۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ( ۶۵ : ۱ ) "اور اللہ سے ڈرو جو تمہارا رب ہے 'نہ تم انہیں گھروں سے نکالو 'نہ وہ خود نکلیں الا یہ کہ وہ کسی

صریح برائی کے مرتکب ہوں"۔ یہ پہلی پکار کے بعد پہلی تنبیہ ہے۔ اور عورتوں کو گھروں سے نکالنے یا ان کے خود نکلنے کو خدا خوفی کے حوالے کیا گیا ہے کہ اس معاملے میں خدا سے ڈرو۔ یہ کہا گیا ہے کہ "ان کو ان کے گھروں" سے نہ نکالو حالانکہ گھر تو خاوند کے ہیں' لیکن چونکہ ان کو وہاں رہنے کا استحقاق ہے اور ان کا وہاں رہنا اللہ نے فرض قرار دیا ہے' اس لیے ان خاوندوں کے گھروں کو ان کے گھر کہا گیا ہے۔ ہاں صرف ایک صورت میں وہ گھروں سے نکل سکتی ہیں' یا نکالی جا سکتی ہے کہ ان سے کسی کھلی فحاشی کا ارتکاب ہو' اگر وہ زنا کا ارتکاب کریں تو حد کے لیے نکالا جائے گا۔ یا یہ کہ خاوند کے رشتہ داروں کے لیے وہ ایذا کا سبب ہوں۔ یا بعض اوقات خاوند کے ساتھ نافرمانی اور بدکلامی بھی ہو سکتی ہے' کیونکہ عورت کو خاوند کے گھر رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کے لیے ایسے مواقع فراہم ہوں کہ وہ رجوع کے لیے آمادہ ہو سکیں۔ اور محبت کے جذبات کو کام کرنے کے مواقع فراہم ہوں۔ مشترکہ زندگی کی یادیں اپنا کام کر سکیں' یوں کہ عورت جسمانی لحاظ سے خاوند سے دور ہوگی اور اس کی نظروں کے سامنے ہوگی۔ اس حالت میں دونوں کے درمیان معاملات کی درستگی کے امکانات موجود ہوں گے۔ اگر وہ خاوند کے گھر رہتے ہوئے' زنا کا ارتکاب کرتی ہے' یا فحاشی اور بدکلامی کرتی ہے' یا اس کو اور اس کے اہل خانہ کو ایذا دیتی ہے' تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ٹھہرانے سے جو مقاصد پیش نظر تھے ان کے حصول کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لہٰذا اب اس کا یہاں رہنا مزید بدمزگی کا باعث ہوگا۔ فریقین میں مزید کشیدگی ہوگی۔

وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (٦٥: ١) "یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں اور جو کوئی اللہ کی مقرر کردہ حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا"۔ یہ دوسرا ڈراوا ہے جو اسلام کے قانون طلاق پر عمل نہ کرنے والوں کو دیا گیا ہے۔ کیونکہ اپنے احکام کی تعمیل کروانے اور ان پر عمل کی نگرانی کرنے والا اللہ بذات خود ہے۔ اگر کوئی مومن ہے تو وہ حدوں کو ہرگز عبور نہیں کر سکتا جن کا نگران اللہ ہے۔ یہ تو کھلی ہلاکت اور تباہی ہے۔ "جو اللہ کی مقرر کردہ حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا"۔ اس لیے کہ اللہ کی حدود پر اللہ کی فوجیں کھڑی ہیں' پھر یہ شخص اپنی بیوی پر ظلم کر کے خود اپنے ساتھ ظلم کر رہا ہے کہ دونوں ایک ہی نفس سے پیدا کردہ ہیں۔

لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا (٦٥: ١) "تم نہیں جانتے کہ شاید اللہ اس کے بعد کوئی صورت پیدا کر دے"۔ یہ نہایت موثر احساس دلاتا ہے۔ کوئی ہے جو مستقبل کے پردے کے پیچھے پوشیدہ امور کو جانتا ہو۔ یا کون ہے جو اللہ کی تقدیر کو جانتا ہے اور اس حکمت کو جانتا ہے کہ عدت کیوں مقرر کی گئی ہے اور یہ کیوں مقرر کیا ہے کہ وہ گھروں میں رہیں۔ یہ ان کو امید اور اچھی امید کی یقین دہانی ہے۔ بعض اوقات اس سے بہت بڑی خیر نکل آتی ہے۔ بعض اوقات اچانک حالات تبدیل ہو جاتے ہیں' غلط فہمی دور ہو کر رضامندی پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ کی تقدیر تو ہر وقت حرکت میں رہتی ہے۔ اس کے اندر ہر وقت تغیر ہوتا رہتا ہے۔ نئے نئے واقعات سامنے آتے رہتے ہیں لہٰذا اللہ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی بہتر طریقہ ہے اور اللہ سے ڈرنے ہی میں خیر ہے۔

نفس انسانی پر بعض اوقات وقتی حالات چھا جاتے ہیں۔ اور موجودہ حالات کے ہاتھوں وہ مجبور ہو جاتا ہے۔ اور مستقبل کی راہیں اس پر مسدود ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ وہ موجودہ حالات کی گندگی میں مجبوراً پڑا رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے اب یونہی رہنا ہے۔ یہی صورت باقی رہے گی۔ اور موجودہ حالات ہمیشہ اس کے رفیق رہیں گے اور موجودہ سائے اس کا

پیچھا کرتے ہی رہیں گے ۔ یہ ایک نفسیاتی جیل خانہ ہوتا ہے جس میں کوئی شخص خود اپنے ہاتھوں قید ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اعضاء شکن ہوتا ہے ۔

لیکن حقیقت یوں نہیں ہوتی ۔ اللہ کی تقدیر تو حالات پر خندہ زن ہوتی ہے ۔ حالات تو بدلتے رہتے ہیں ۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں ۔ بعض اوقات مشکلات کے بعد ایسے حالات پیش آ جاتے ہیں کہ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے ۔ مشکل کے بعد ہمیشہ آسانیاں ہوتی ہیں ۔ تنگی کے بعد کشادگی ہوتی ہے اور اللہ کی ہر روز نئی شان ہوتی ہے ۔ تمام تخلیق اس کے ہاتھ میں ہے ۔

اللہ یہ چاہتا ہے کہ لوگوں کے شعور میں یہ فکر مستقلاً بیٹھی ہو' تاکہ وہ پرامید رہیں اور اللہ کی طرف نظریں لگائے ہوئے ہوں' کہ وہ کسی بھی وقت مشکلات کو دور کر دے گا ۔ اور حالات کے بدلنے میں کوئی دیر نہیں لگتی' لہٰذا انسانی ذہن کو بھی اپنے دروازے اس کے لیے کھلے رکھنے چاہئیں اور مایوس ہو کر وہ ذہن کو بند نہ کر دے ۔ آنے والی گھڑی میں انقلاب برپا ہو سکتا ہے ۔

لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا (۶۵:۱) "تم نہیں جانتے کہ اللہ اس کے بعد کوئی صورت مصالحت پیدا کر دے" ۔

---ooo---

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ذٰلِكُمْ یُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا (۶۵:۲) وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا (۶۵:۳) (۶۵:۲ - ۳) "پھر جب وہ اپنی (عدت کی) مدت کے خاتمہ پر پہنچیں تو یا انہیں بھلے طریقے سے (اپنے نکاح میں) روک رکھو' یا بھلے طریقے پر ان سے جدا ہو جاؤ اور دو ایسے آدمیوں کو گواہ بنا لو جو تم میں سے صاحب عدل ہوں اور (اے گواہ بننے والو) گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے لیے ادا کرو ۔ یہ باتیں ہیں جن کی تم لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے' ہر اس شخص کو جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو ۔ جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو ۔ وہ جو اللہ پر بھروسہ کرے اس کے لیے وہ کافی ہے ۔ اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے ۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے" ۔

یہ دوسرا مرحلہ اور اس کا حکم ہے۔عدت پوری ہو جاتی ہے' اور جب تک عورت عدت سے خارج نہیں ہو جاتی' خاوند کو رجوع کا حق رہتا ہے اور محض رجوع کرنے سے وہ اس کی بیوی بن جاتی ہے۔یاد رہے کہ عدت کی مختلف میعادیں ہم نے پہلے بتا دی ہیں۔یہ ہے امساک یعنی روک لینا۔یا اگر وہ (دوسری یا تیسری) طلاق نہیں دیتا اور عورت بائن ہو جاتی ہی یعنی عورت ایک یا دو طلاقوں ہی سے جدا ہو جاتی ہے تو پھر وہ آزاد ہو جاتی ہے۔اس کے بعد اگر خاوند چاہے تو اس کی مرضی سے جدید نکاح کر سکتا ہے لیکن اگر وہ رجوع کرتا ہے یا عورت کو جدا کرتا ہے' حکم یہ ہے کہ اس کے ساتھ معروف طریقے کے مطابق برتاؤ کرے۔یہ بھی منع ہے کہ کہ اسے محض تنگ کرنے کے لیے رجوع کرے۔مثلاً یہ کہ عورت کو ایک طلاق دے۔پھر وہ پوری عدت گزارنے سے قبل رجوع کرے' پھر اس کو طلاق دے اور پھر وہ تین مہینے کی عدت شروع کرے اور ختم ہونے سے قبل پھر رجوع کرے اور پھر طلاق دے دے۔یوں اس کی عدت نو ماہ تک چلی جائے۔یہ ہے عورت کو محض اذیت دینا۔مطلب یہ ہے کہ اگر رکھنا ہے تو رجوع کرے۔اور اس طرح بھی نہ ہو کہ رجوع کر کے اسے معلق رکھ دے کہ وہ بے چاری مالی تاوان دینے پر مجبور ہو جائے۔جب یہ سورت نازل ہوئی تو اس وقت عرب معاشرہ میں ایسی صورتیں ہو رہی تھیں اور ہمیشہ ایسا ہوتا ہے جب انسانی دلوں سے اللہ کا خوف نکل جاتا ہے۔معاشرت اور جدائی دونوں حالتوں میں خوف خدا ہی بہترین ضامن ہوتا ہے۔نیز عورت کو جدا کرتے وقت سب و شتم' سختی' سخت کلامی یا مارپیٹ معروف طریقہ نہیں ہے۔معروف طریقہ یہ ہے کہ شرافت سے رخصت کیا جائے۔یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں کو پھر ایک جگہ رہنا پڑے۔اور اس صورت میں بری یادیں بیچ میں حائل نہ ہوں۔اس طرح بری اور ناخوش گوار یادیں' یہ برے الفاظ یا طنز و تشنیع دوبارہ تعلقات قائم ہونے کی راہ میں حائل نہ ہوں۔یہ اسلام کا عظیم تادیبی سبق ہے کہ ایسے مشکل اور تلخ حالات میں بھی انسان کو شریفانہ طرزعمل اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

ہاں اب جدائی ہو یا رجوع دونوں حالات میں شہادت کا قیام ضروری ہے۔دو عادل گواہ اس پر قائم ہوں تاکہ شک کسی معاملے میں نہ ہو کہ لوگوں کو طلاق کے بارے میں تو معلوم ہو اور رجوع کرنے کے بارے میں معلوم نہ ہو۔لوگوں میں شکوک پھیل جائیں اور لوگ باتیں بنائیں کہ فلاں کی بیوی تو مطلقہ ہے۔جبکہ اسلام کی پالیسی یہ ہے کہ میاں بیوی کے متعلق لوگوں کے دل بھی صاف ہوں اور ان کی زبانیں بھی صاف ہوں۔فقہاء کی اکثریت کا خیال ہے کہ رجوع یا فراق کے لیے شہادت کا قیام ضروری نہیں۔بعض فقہاء اسے ضروری خیال کرتے ہیں لیکن دونوں کا خیال یہی ہے کہ شہادت ضرور قائم کی جائے تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔اور لوگوں کو باتیں بنانے کا موقعہ نہ ملے۔چنانچہ اس بیان کے بعد متعدد ہدایات دی جاتی ہیں اور یاد دہانیاں کرائی جاتی ہیں:

وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (۶۵ : ۲) "اور شہادت قائم کرو اللہ کے لیے"۔کیونکہ یہ ایک اہم معاملہ ہے۔اور اس میں اللہ کے لیے شہادت دینا گواہ پر لازم ہے۔اللہ اس کے قیام کا حکم دیتا ہے۔وہی اس کی ادائیگی کا بھی حکم دیتا ہے۔اور اس پر اجر بھی وہ دے گا۔اس میں معاملہ خدا کے ساتھ ہے' نہ خاوند کے ساتھ' نہ بیوی کے ساتھ' اور نہ لوگوں کے ساتھ ہے۔

ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (۶۵ : ۲) "یہ باتیں ہیں جن کی تم کو

نصیحت کی جاتی ہے' ہر اس شخص کو جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو"۔ ان آیات کے مخاطب مومنین تھے اور وہ سب کے سب اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے تھے۔ اللہ ان کو کہتا ہے کہ یہ بہت ہی اہم معاملات ہیں۔ اگر انہوں نے سچے دل سے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا ہے تو پھر انہیں ان احکام الہی کا احترام کرنا چاہئے۔ یہ ان کے ایمان کے لیے معیار تصور ہو گا اور دعوائے ایمان کا یہ پیمانہ ہو گا۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا (٢) وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (٦٥ : ٣)

"اور جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر کا اسے گمان بھی نہ جاتا ہو"۔ وہ دنیا اور آخرت کی تنگیوں سے انہیں نکال دے گا۔ اور رزق ایسے ذرائع سے اسے دے گا جدھر کا اسے گمان بھی نہ ہو گا۔ یہ ایک عام فیصلہ اور دائمی حقیقت ہے۔ لیکن یہاں ان اصولوں کو احکام طلاق پر منطبق کیا جاتا ہے۔ اشارہ یہ ہے کہ ان احکام پر پورا پورا عمل کرو۔ خدا خوفی ایک ایسا ضابطہ ہے جو ایسے معاملات میں سب سے زیادہ کارگر ہے۔ خوف خدا ہی انسان کے لیے ایک اچھا نگراں ہے ورنہ قانونی ضوابط میں سے لوگ اپنے لیے راہیں نکال لیتے ہیں صرف تقویٰ ہی انسان کو صحیح عمل پر گامزن کر سکتا ہے۔

وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ (٦٥ : ٣) "جو اللہ پر بھروسہ کرے اس کے لیے وہ کافی ہے اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے"۔ اس معاملے میں سازشوں کی بڑی گنجائش ہوتی ہے' اور بعض اوقات سازش کا مقابلہ کرنے کے لیے سازش کرنی پڑتی ہے' یہاں کہا جاتا ہے کہ ایسی سازشیں نہ کرو' اللہ پر بھروسہ کرو' اور جو لوگ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں وہ ان کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اللہ اپنے کام کر کے رہتا ہے' وہ جو فیصلے کر چکا ہے وہ واقع ہو کر رہتے ہیں۔ لہذا اللہ اور اس کے فیصلوں پر بھروسہ کرنا' جبکہ وہ بڑی قوت ہے اور جو چاہتا ہے' کرتا ہے۔ کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے۔

یہ آیت عام ہے۔ مقصد یہ ہے کہ دلوں کے اندر ایمان اور بھروسے کی صحیح کیفیت پیدا کی جائے۔ اللہ کے ارادے اور اللہ کی تقدیر کے حوالے سے۔ لیکن یہاں چونکہ یہ عام بات طلاق کے حوالے سے آئی ہے تو اس کا یہاں خاص طلاق کی طرف بھی اشارہ ہے' کیونکہ یہ بھی اللہ کے فیصلوں میں سے ایک فیصلہ ہے۔

قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (٦٥ : ٣) "اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے"۔ ہر چیز اس کی مقدر ہے' اس کے زیر نگین ہے' ہر واقعہ کی ایک جگہ' ایک مقام ہے۔ اس کے حالات' اس کے اسباب اور نتائج اس کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ کوئی چیز از خود وجود میں نہیں آتی۔ نہ یہ معاملات یونہی چلتے ہیں جس طرح کوئی چلائے۔ یہ پوری کائنات' نفس انسانی اور اس کی زندگی کے تمام واقعات' اسی عظیم حقیقت کے نتیجے میں نمودار ہوتے ہیں یعنی مطابق تقدیر الہی۔ (اس پر ہم نے آیت۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا کے ضمن میں تفصیل سے بات کی ہے دیکھئے سورہ الفرقان: ۲) یہاں مقصد

یہ ہے کہ یہ طلاق اور یہ رجوع' عدت' شہادت' ادائیگی شہادت وغیرہ سب احکام اللہ کے ہاں مقدر ہیں۔ اور یہ اس طرح ہوتے چلے جاتے ہیں جس طرح کائنات میں سنت الٰہیہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح انسان ان معاملات کو یوں سمجھتا ہے جس طرح اللہ کے ہاں فیصلے ہوتے ہیں۔

---000---

وَالّٰٓـِٔیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـِٔیْ لَمْ یَحِضْنَ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ یُسْرًا (٤) ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَیْكُمْ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یُكَفِّرْ عَنْهُ سَیِّاٰتِهٖ وَ یُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا (٥) (٦٥ : ٤ تا ٥) "اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں ان کے معاملہ میں اگر تم لوگوں کو کوئی شک لاحق ہے تو (تمہیں معلوم ہو کہ) ان کی عدت تین مہینے ہے۔ اور یہی حکم ان کا ہے جنہیں ابھی حیض نہ آیا ہو۔ اور حاملہ عورتوں کی عدت کی حد یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے۔ جو شخص اللہ سے ڈرے اس کے معاملہ میں وہ سہولت پیدا کر دیتا ہے یہ اللہ کا حکم ہے۔ جو اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔ جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کی برائیوں کو اس سے دور کر دے گا اور اس کو بڑا اجر دے گا"۔

ان آیات میں ان عورتوں کی مدت عدت کی تحدید کی گئی ہے جن کو حیض نہیں آتا اور وہ حاملہ بھی نہیں ہیں۔ یعنی وہ عورتیں جن کو حیض آنا بند ہو گیا ہو' یا ان کو ایام بیماری کی وجہ سے یا صغر سنی کی وجہ سے آتے ہی نہ ہوں۔ کیونکہ اس سے قبل سورہ بقرہ میں عدت کی جو مدت بتائی گئی تھی وہ ان عورتوں کے لیے تھی جن کو حیض آتا ہو۔ چاہے لفظ قروء سے مراد تین ایام ماہواری لیے جائیں یا تین ایام فراغت لی جائے۔ یہ فقہی اختلاف ہے۔ رہی وہ عورتیں جن کے ایام آنا بند ہو گئے ہوں یا آتے ہی نہ ہوں یا شروع ہی نہ ہوئے ہوں تو ان کا معاملہ مجمل تھا کہ وہ کس طرح عدت گزاریں۔ چنانچہ یہ آیات نازل ہوئیں کہ شک کو دور کر کے حکم کو منفصل کر دیں۔ ان کے لیے تین مہینے کی مدت مقرر ہے تاکہ ان کی مدت ایام ماہواری کے ساتھ ایک جیسی ہو جائے۔ رہی وہ عورتیں جو حاملہ ہیں تو ان کی مدت وضع حمل ہے۔ طلاق کے بعد یہ مدت طویل ہو یا مختصر' اگرچہ نفاس سے طہارت کے لیے چالیس ایام کی مدت ہے۔ لیکن عدت کو اس لیے مقرر کیا گیا تھا کہ یہ دیکھا جائے کہ عورت کے ہاں بچہ تو نہیں ہے۔ اب حاملہ مطلقہ تو وضع حمل کے ساتھ ہی خاوند سے جدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس کے بعد انتظار کی ضرورت نہیں ہے اور وضع حمل کے بعد اس کے ساتھ رجوع نہیں ہو سکتا' صرف نیا نکاح ہی ہو سکتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک میزان مقرر کر دیا ہے لہٰذا ہر حکم کے پیچھے حکمت ہے۔

یہ تو تھا حکم' اب نصیحت' عبرت اور حکمتیں۔

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ یُسْرًا (٦٥ : ٤) "جو شخص اللہ سے ڈرے اس کے معاملہ میں

وہ سہولت پیدا کر دیتا ہے"۔ انسان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ معاملات میں اس کے ساتھ نرمی ہو۔ اور یہ بہت بڑا انعام ہے کہ اللہ اپنے امور میں سے کچھ میں لوگوں کے لیے سہولت پیدا کر دے۔ یوں ان کو کوئی مشکل 'کوئی عذاب' اذیت اور تنگی اور مشقت نہ ہو۔ اور وہ اپنے اندازے اور اپنے شعور کے مطابق سہولت محسوس کرے۔ حرکت و عمل میں معاملات کو آسان پاتا ہو۔ کام کرنے اور اس کے نتائج حاصل کرنے میں وہ اس کو آسان پائے اور وہ ایسی ہی حالت میں رہے اور اللہ کے ساتھ اس کی ملاقات ہو جائے۔ اور یہ طلاق بھی ان معاملات میں سے ہے جن میں اللہ نے سہولت پیدا کی ہے۔ (عیسائیت اور ہندو مذہب میں طلاق تھی ہی نہیں)۔

ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ (۶۵ : ۵) "یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے"۔ یہ ایک دوسرا احساس ہے۔ متنبہ کیا جاتا ہے کہ ذرا سنجیدہ ہو جاؤ۔ یہ حکم اللہ کا ہے۔ یہ اللہ نے اتارا ہے ان لوگوں پر جو مومن ہیں۔ لہٰذا اس کی تعمیل تقاضائے ایمان ہے۔ اور اس حکم کی تعمیل کا تعلق اللہ سے ہے۔

دوبارہ لوگوں کو خدا خوفی کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جس پر اس سورت میں بہت زور دیا گیا ہے حالانکہ یہ احکام کی سورت ہے۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا (۶۵ : ۵) "اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس کی برائیوں کو اس سے دور کر دے گا اور اس کو بڑا اجر دے گا"۔ پہلی بات یہ تھی کہ اللہ سہولیات پیدا کر دے گا اور اب یہ کہ اس کے گناہ معاف ہوں گے اور اجر زیادہ ہو گا۔ چنانچہ یہ دو طرفہ فیض ہے اور انسان پر اثر انداز ہونے والا فائدہ ہے۔ یہ عام حکم ہے اور طلاق اور تمام دوسری امور پر منطبق ہونے والا امر ہے لیکن یہاں اس کا سایہ طلاق کے معاملات پر ڈالنا مقصود ہے تاکہ لوگ اللہ کی نگرانی کے شعور سے سرشار ہوں اور اللہ کے فضل کا احساس کریں کہ اگر کوئی کام انہیں مشکل بھی نظر آئے تو اللہ اس کو آسان بنا دے گا اور اس میں اگر کوئی کوتاہی ہوگئی تو مغفرت کر دے گا۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ
وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ۭ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا
عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاْتَمِرُوْا
بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى ۝ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ
سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا ۱
اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۭ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ ع ۷
۱۷

عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸﴾ فَذَاقَتْ
وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ﴿۹﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا
اللّٰهَ يٰۤاُولِى الْاَلْبَابِ ۖۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۛۚ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ﴿۱۰﴾ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا
عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ
اِلَى النُّوْرِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ﴿۱۱﴾ اَللّٰهُ الَّذِىْ
خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا ۲
اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَىْءٍ عِلْمًا ﴿۱۲﴾ ع ۵
۱۸

"ان کو (زمانہ عدت میں) اسی جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو' جیسی کچھ بھی جگہ تمہیں میسر ہو اور انہیں تنگ کرنے کے لیے ان کو نہ ستاؤ۔ اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر اس وقت تک خرچ کرتے رہو جب تک ان کا وضع حمل نہ ہو جائے۔ پھر اگر وہ تمہارے لیے (بچے کو) دودھ پلائیں تو ان کی اجرت انہیں دو' اور بھلے طریقے سے (اجرت کا معاملہ) باہمی گفت و شنید سے طے کر لو۔ لیکن اگر تم نے (اجرت طے کرنے میں) ایک دوسرے کو تنگ کیا تو بچے کو کوئی اور عورت دودھ پلائے گی۔ خوشحال آدمی اپنی خوشحالی کے مطابق نفقہ دے' اور جس کو رزق کم دیا گیا ہو وہ اسی مال میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ نے جس کو جتنا کچھ دیا ہے اس سے زیادہ کا وہ اسے مکلف نہیں کرتا۔ بعید نہیں کہ اللہ تنگ دستی کے بعد فراخ دستی بھی عطا فرما دے۔ کتنی ہی بستیاں ہیں جنھوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے ان سے سخت محاسبہ کیا اور ان کو بری طرح سزا دی۔ انہوں نے اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور ان کا انجام کار گھاٹا ہی گھاٹا ہے' اللہ نے (آخرت میں) ان کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ پس اللہ سے ڈرو۔ اے صاحب عقل لوگو' جو ایمان لائے ہو۔ اللہ نے تمہاری طرف ایک نصیحت نازل کر دی ہے' ایک ایسا رسول جو تم کو اللہ کی صاف صاف ہدایت دینے والی آیات سناتا ہے تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ جو کوئی اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے' اللہ اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ لوگ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ نے ایسے شخص کے لیے بہترین رزق رکھا ہے۔ اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہی کے مانند۔ ان کے درمیان حکم نازل ہوتا رہتا ہے۔ (یہ بات

تمہیں اس لیے بتائی جارہی ہے) تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہرچیز پر قدرت رکھتا ہے' اور یہ کہ اللہ کا علم ہرچیز پر محیط ہے"۔

یہ آخری بیان ہے جس میں گھروں میں رہائش کے مسئلے کو لیا گیا ہے اور عدت کے دوران نفقہ کے مسئلہ کو لیا گیا ہے جو بھی عدت کی مدت قرار پائے۔ مسئلہ یہ ہے کہ جس قسم کی رہائش بھی ہو' خاوند کو چاہئے کہ وہ بیوی کو فراہم کرے۔ جس طرح کی رہائش میں وہ خود رہتا ہے اور جس قدر وہ اپنی مالی پوزیشن کے مطابق فراہم کر سکتا ہے۔ باہم برتاؤ میں نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ ہو۔ نہ مکان میں تنگی کی جائے' نہ عزت میں کمی کی جائے' اور نہ دوسرے معاملات میں مثلاً گفتگو وغیرہ میں۔ حاملہ عورتوں کے نفقے کو مخصوص طور پر ذکر کیا گیا حالانکہ ہر قسم کی عدت گزارنے والی عورتوں کے لیے نفقہ واجب ہے۔ کیونکہ حمل کی مدت بعض اوقات طویل ہو جاتی ہے اور یہ خیال ہو سکتا ہے کہ تین مہینے ہی نفقہ واجب ہے یا حمل اگر طلاق کے بعد صرف مختصر ترین وقت وضع ہو جائے تو پھر یہ وہم ہو سکتا ہے کہ شاید زیادہ مدت کے لیے نفقہ دینا ہو گا۔ لہٰذا اس کا تعین کر دیا گیا یعنی جب تک قانونی مدت عدت ختم نہیں ہو جاتی خواہ مختصر ہو یا طویل۔

اس کے بعد دودھ پلانے کے مسئلہ کی تفصیلات دی گئیں۔ دودھ پلانا بغیر معاوضہ کے ماں کی ذمہ داری نہیں قرار دی گئی۔ جب تک وہ دونوں کے مشترکہ بچے کو دودھ پلا رہی ہے تو اس کا حق ہے کہ اسے اس خدمت کا معاوضہ ملے کہ وہ زندہ رہ سکے اور بچے کے لیے دودھ بھی جاری ہو۔ یہ ہیں اسلامی نظام قانون کی وہ رعائتیں جو ماں کو دی گئیں۔ ان رعائتوں کے ساتھ دونوں کو یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ وہ اس بچے کے معاملات کو باہم مشورہ سے طے کریں۔ اور بچے کی مصلحت کو پیش نظر رکھیں کہ وہ دونوں کے درمیان ایک امانت ہے۔ یہ نہ ہو کہ ان دونوں کی مشترکہ زندگی کی ناکامی اس بچے کے لیے مصیبت بن جائے۔ جس کا کوئی قصور نہیں ہے۔

یہ ہے وہ حسن سلوک جس کی طرف دونوں کو دعوت دی جاتی ہے۔ اگر انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا اور رضاعت اور اس کے اجر کے بارے میں ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق نہ ہو سکا تو بچے کو تو بہرحال دودھ پلانا ہے' کوئی اور پلائے گی۔

فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰی (۶۵ : ۶) "تو بچے کو کوئی اور عورت دودھ پلائے گی"۔ نہ ماں کا اعتراض ہو گا اور نہ بچے کو دودھ سے محروم کر کے مار دیا جائے گا کیونکہ ان کی مشترکہ زندگی تحلیل ہوئی اور پھر انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ سختی کی' بچے کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔

اس کے بعد نفقہ کے اصول کا تعین کر دیا جاتا ہے۔ اس میں ایک دوسرے کو سہولت دینا ہے' تعاون اور عدل و احسان سے کام لینا ہے۔ اس میں سختی اور ہٹ دھرمی جائز نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کو اللہ نے وسعت دی ہے تو وہ وسعت کے مطابق خرچ کرے' سکونت اور معیشت دونوں میں اور رضاعت کی اجرت میں اور جس کی مالی حالت اچھی نہ ہو تو کوئی حرج نہیں ہے کہ اس سے محدود اجرت لی جائے۔ کیونکہ اللہ کسی سے اسی قدر مطالبہ کرتا ہے جس قدر اسے اللہ نے دیا ہے اور کوئی شخص بھی اپنے مال وسائل سے زیادہ خرچ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ دولت تو وہی ہے جو اللہ کسی کو دیتا ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰهَا (۶۵ : ۷) "اللہ نے جس کو جتنا دیا ہے اس سے زیادہ کا وہ اسے مکلف نہیں کرتا"۔

رضاعت کے دوران دونوں کو یہ امید دلائی جاتی ہے 'کہ اللہ ہی سے اچھے حالات کی امید اور خواہش رکھیں :

سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا (۶۵ : ۷) "بعید نہیں کہ اللہ تنگ دستی کے بعد فراخ دستی بھی عطا فرما دے"۔ تنگی کے بعد آسانی اور مشکلات کے بعد فراخی یہ سب اللہ کا کام ہے۔ اس لیے ان دونوں کو چاہئے کہ وہ اللہ ہی کی طرف متوجہ ہوں۔ اللہ ہی سے امیدیں وابستہ کریں ' وہی داتا ہے ' وہی کشادگی عطا کرنے والا ہے اور تنگی و کشادگی ' مشکلات اور سہولیات 'سختی اور نرمی سب اسی کے اختیار میں ہے۔

یہاں تک طلاق کے تمام احکام اور طلاق کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اثرات کے قانونی انتظامات بیان کیے اور تمام آثار کے بارے میں واضح حل بتایا گیا۔ اور اس منہدم گھرانے کا تمام ملبہ 'اس کے غبار تک کو ٹھکانے لگا دیا گیا تاکہ دل غبار آلود نہ ہوں ' دلوں ... کدورتیں دور ہو جائیں ' اور زوجین ماضی کو بھلا کر از سرنو نئی زندگی شروع کر دیں ' سابقہ عداوت کو پوری طرح مٹا دیا جائے ' دلوں کے اندر جو قلق تھا ' اسے ختم کر دیا تاکہ کوئی اضطراب از سرنو پیدا نہ ہو۔

دلوں سے وسوسے اور گراوٹیں دور کر دیں۔ اور فریقین کو اس قابل بنا دیا کہ ایک دوسرے کے ساتھ از سرنو سماجی تعلقات قائم کر سکیں۔ خاوند اگر اپنی مطلقہ بیوی یا خود اپنے بچے پر کچھ فراخدلانہ خرچ کرتا ہے تو اسے بتا دیا گیا کہ اس خرچ کی وجہ سے وہ فقیر نہ ہو گا اور بیوی کو بھی کہا گیا کہ وہ پھر اگر بچے کو دودھ پلانے کا کوئی کم معاوضہ لے تو اس سے وہ زیادہ امیر نہ ہو گی ' لہٰذا اسے بھی چاہئے کہ اپنے سابق شوہر اور خود اپنے بچے کے معاملے میں کوئی سخت رویہ اختیار نہ کرے۔ اللہ ہی ہے جو مشکلات کے بعد کشادگی دینے والا ہے۔ دنیا کے رزق سے آخرت کا رزق زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

طلاق کے نتیجے میں جو کدورتیں اور بدمزگیاں پیدا ہو جاتی ہیں ان کے بارے یہ حکم دیا گیا کہ ان کو بھلا دیا جائے اور اللہ سے بہتر مستقبل کی امید رکھی جائے جو کچھ ہو چکا وہ مقدر تھا۔ اب آئندہ ایک دوسرے کے ساتھ معروف انداز میں معاملہ کیا جائے اور خدا کا خوف رکھا جائے۔

یہ مکمل علاج ہے ' یہ موثر نصائح ' یہ مکرر ' سہ کرر تاکیدات کہ معروف کے ساتھ معاملہ کرو سب کی سب اس ناخوشگوار واقعہ کے اثرات کو دور کرنے کی بہترین ضمانت ہیں۔ ضمیر کے احساس اور خدا خوفی کے سوا کوئی اور چیز مسلمانوں کے درمیان اصلاح ذات البین کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ اگر خدا خوفی کو ہٹا کر فریقین کے درمیان صرف قانونی جنگ چھڑ جائے تو اس کا انجام تلخی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ بعض احکام اس قدر نرم ہیں کہ خود ان سے تلخیاں دور ہو جاتی ہیں۔ جن کو کسی قانون کے ذریعہ گنوایا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ اس اخلاقی حکم کے ذریعہ بتایا گیا کہ عورتوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ دی جائے۔ اس سلسلے میں خدا کا خوف اختیار کیا جائے۔ اللہ ہی ہے جو ہر خفیہ اور ظاہری چیز کو جاننے والا ہے۔ اور متقین کو دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ اجر دینے والا ہے۔ خصوصاً رزق کا معاملہ تو ہے ہی اللہ کے ہاتھ میں جس کا اس سورت میں بار بار تذکرہ ہوا۔ کیونکہ رزق اور مفاد ہی وہ اصل بات ہے جس پر تنازعہ ہوتا ہے ' اور طلاق کے بعد زیادہ تر جھگڑا مالی معاملات و مفادات پر ہوتا ہے۔

---ooo---

طلاق کے معاملات کے اختتام کے بعد اب پورے دین کے معاملہ میں ایک تاریخی رویہ کو ذکر کیا جاتا ہے 'کہ اگر تم

طلاق کے قوانین کی خلاف ورزی کرو گے تو تاریخ میں کئی اقوام نے 'رسولوں کی رسالت اور ان کے پیش کردہ دین سے منہ موڑا لیکن ان کا انجام اچھا نہ ہوا۔ اب بھی یہ دین اور یہ شریعت اس صورت کی شکل میں تمہیں دیا جا رہا ہے جو ایک نعمت ہے 'اس کی قدر کرو۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا (٨) فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا (٩) اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا (١٠) رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا (١١) (٦٥: ٨ تا ١١) "کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے ان سے سخت محاسبہ کیا اور ان کو بری طرح سزا دی۔ انہوں نے اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور ان کا انجام کار گھاٹا ہی گھاٹا ہے' اللہ نے (آخرت میں) ان کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ پس اللہ سے ڈرو۔ اے صاحب عقل لوگو' جو ایمان لائے ہو۔ اللہ نے تمہاری طرف ایک نصیحت نازل کر دی ہے' ایک ایسا رسول جو تم کو اللہ کی صاف صاف ہدایت دینے والی آیات سناتا ہے تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ جو کوئی اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے' اللہ اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ لوگ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ نے ایسے شخص کے لیے بہترین رزق رکھا ہے"۔

یہ ایک طویل ڈراوا ہے' جس کے تفصیلی مناظر ہیں۔ پھر جو لوگ ایمان لائے ہیں اور ان کو ایمان کی روشنی نصیب ہوئی ہے ان کو بتایا گیا کہ یہ تم پر اللہ کا بہت بڑا کرم ہے اور اس کا بدلہ تمہیں قیامت میں ملے گا اور قیامت کا بدلہ ہی دراصل رزق حسن ہے۔

تاریخ میں جن لوگوں نے رسالت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا اور نافرمانی کی ہے تو اللہ کی یہ سنت رہی ہے کہ نافرمانوں کو اس نے پکڑا ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا (٦٥: ٨) "کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے ان سے سخت محاسبہ کیا اور ان کو بری طرح سزا دی"۔ ان کے پکڑ کی تفصیل اور سخت حساب اور سخت عذاب اور برے انجام کی تصویر یہ تھی۔

فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ( ۶۵ : ۹ ) "انہوں نے اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور ان کا انجام کار گھاٹا ہی گھاٹا ہے" اللہ نے (آخرت میں) ان کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے ۔ اور اس عذاب کی تصویر یہ تھی ۔

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ( ۶۵ : ۱۰ ) "اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے"۔ اس عذاب اور برے انجام کی یہ تفصیلات اس لیے دی ہیں کہ اللہ کے احکام کی نافرمانی کی سزا کا خوف دیر تک انسانی اعصاب پر رہے ۔ یہ قرآن کا انداز ہے کہ وہ عذاب الہی کے مناظر کو نہایت ہی مفصل اور طوالت سے بیان کرتا ہے ۔

اس ڈراوے پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ باری باری نافرمان اقوام کو پکڑا گیا اور اس پکڑ کا ذکر یہاں احکام و قوانین کی نافرمانی کے ضمن میں آرہا ہے ۔ گویا طلاق کے احکام قوانین کا تعلق بھی سنت الٰہیہ سے ہے ۔ اس سے یہ تاثر دینا مطلوب ہے کہ قوانین طلاق محض ایک سول لاء ہی نہیں بلکہ ان کا تعلق امت مسلمہ کے اجتماعی نظام سے ہے ۔ اس سلسلے میں پوری امت بھی مسئول ہوگی اور اگر ان قوانین کی خلاف ورزی ہوئی تو پوری امت پر عذاب الہی آئے گا ۔ احکام طلاق اور اسلامی نظام کے دوسرے احکام کی مخالفت کے انجام سے پوری امت مسئول ہے ۔ کیونکہ اسلامی نظام اور اسلامی منہاج کے چلانے کی ذمہ داری اجتماعی ہے ۔ صرف وہ لوگ ہی عذاب الہی کے مستحق نہ ہوں گے جو خلاف ورزی کرتے ہیں بلکہ پورا گاؤں اور پوری امت مسئول ہوگی ' جو اپنے نظام زندگی کی تنظیم میں خلاف ورزی کو برداشت کرتی ہے ۔ یہ دین اسی لیے آیا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے ' اسے نافذ کیا جائے ۔ یہ پوری زندگی پر حاوی ہو ۔ اس طرح یہاں پوری امت نافرمان قرار دی گئی ' اگر اسلامی نظام کے قیام کی مسئولیت شخصی ہوتی تو پوری امت کو ہلاک نہ کیا جاتا ۔

یہ بستیاں نافرمان قرار دی گئیں اور انہوں نے وبال کو چکھا ۔ اور آخر کار خسارے میں مبتلا ہوئیں ۔ اور یہ سزا ان کو اسی دنیا میں دی گئی ۔ بستیوں ' اقوام اور ملل کو یہ سزا دی گئی جنہوں نے اسلامی منہاج سے انکار کیا ہے ۔ ہم بھی شہادت دیتے ہیں اور ہمارے اسلاف بھی شہادت دیتے ہیں کہ احکام نکاح و طلاق کی نافرمانی کرنے والی اقوام کو عذاب دیا گیا ۔ وہ فساد ' انتشار ' غربت ' قحط ' ظلم ' بے چینی اور نہایت ہی بدامنی اور ڈر کی زندگی گزارتی رہیں جس میں کوئی اطمینان اور سکون نہ تھا اور آج بھی ہم اس کرۂ ارض پر ایسی کئی اقوام کو دیکھ رہے ہیں ۔

یہ سزا اس کے علاوہ ہے جو ان نافرمانوں کے انتظار میں ہے جنہوں نے اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کی اور جنہوں نے اسلامی نظام سے بغاوت کی ۔ اللہ فرماتا ہے :

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ( ۶۵ : ۱۰ ) "اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے" ۔ اور اللہ بہت ہی سچا ہے ۔

یہ دین ایک منہاج حیات ہے اور اس کا ایک اجتماعی نظام زندگی ہے ' جس کی تفصیلات ہم نے سورہ صف میں دی ہیں ۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ ایک ایسی جماعت تشکیل دے جس کا ایک نظام ہو ۔ اس جماعت اور سوسائٹی کی زندگی کو بدل کر رکھ دے لہٰذا یہ پوری جماعت اس دین کے بارے میں مسئول ہوگی ۔ اور یہ جماعت ان احکام کی خلاف ورزی نہ کرے گی کہ اس پر یہ دھمکی صادق آجائے ' جو امم سابقہ کو دی گئی ' جنہوں نے امر الٰہی سے نافرمانی کی ۔

اس ڈراوے اور اس کے طویل مناظر میں عقلمند لوگوں کو خطاب کیا گیا ہے 'جو ایمان لاتے ہیں' اور ان کی عقلمندی کا ثبوت ہی یہ ہے کہ وہ ایمان لے آئے کہ اس اللہ سے ڈرو جس نے تم پر یہ یاد دہانی نازل کی ہے۔

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا (۶۵ : ۱۰) "اللہ نے تمہاری طرف ایک نصیحت نازل کی ہے"۔ اور یہ ذکر مشخص تمہارے پاس موجود ہے۔ رسول مجسمہ ذکر ہیں۔ پوری ذات رسول کو نحوی اعتبار سے الذکر کا بدل کر کے لایا گیا ہے۔

رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ (۶۵ : ۱۱) "ایک رسول جو تم کو اللہ کی صاف صاف ہدایت دینے والی آیات سناتا ہے"۔

یہ نہایت ہی گہرا قابل توجہ نکتہ ہے اور اس کے اوپر کئی دلائل ہیں۔ یہ ذکر جو رسول لوگوں تک پہنچانے کے لیے لائے ہیں وہ رسول اللہ کی شخصیت کے اندر سے ہو کر ان تک پہنچا ہے۔ آپ صادق و امین تھے اور آپ نے پورا ذکر ان تک پہنچا دیا گویا یہ ذکر خدا سے براہ راست ان تک پہنچ گیا۔ اور رسول کی ذات نے اس کا کوئی حصہ چھپایا نہیں تھا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہ آیت ذات رسول کو ذکر بتاتی ہے کہ رسول کی ذات پوری کی پوری ذکر ہو گی۔ رسول گویا مجسمہ ذکر ہیں اور وہ زندہ قرآن ہیں۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ۔

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ "آپ کے اخلاق قرآن تھے"۔ آپ کے دل میں قرآن تھا اور آپ عملی زندگی میں قرآن کو پیش کرتے تھے۔

ذکر کے علاوہ اہل ایمان کو نور 'ہدایت' صالحیت اور جنتوں کی نعمتوں کا وعدہ بھی کیا گیا اور یہ بتایا گیا کہ جنتوں میں جو رزق ملیں گے۔ وہ دنیا کے ارزاق کے مقابلے میں بہت ہی مکرم رزق ہیں 'بہت ہی احسن ہیں۔

ایک بار پھر رزق کی بات ہوتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ دنیا کا رزق تو ہر کسی کو ملتا ہے۔ اصل رزق تو رزق آخرت ہے 'جبکہ مومنین کے لیے دنیا میں بھی رزق حسن کا وعدہ ہے۔

---○○○---

اور آخر میں پھر پوری کائنات کا زمزمہ جو بہت ہی محیر العقول حد تک وسیع ہے۔ یوں اس پوری سورت کے موضوع کو یعنی قوانین طلاق کو 'اللہ کے نظام قضا و قدر اور اس وسیع کائنات میں اللہ کے قانون قدرت کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا (۶۵ : ۱۲) "اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہی کے مانند۔ ان کے درمیان حکم نازل ہوتا رہتا ہے۔ (یہ بات تمہیں اس لیے بتائی جا رہی ہے) تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے 'اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے"۔

سات آسمانوں کے بارے میں ہمیں ابھی تک پورا علم حاصل نہیں ہوا ہے کہ ان کی دوریاں اور فاصلے کتنے ہیں۔ اسی طرح سات زمینوں کا بھی ہمیں علم نہیں ہے۔ یہ زمین جس کے اوپر ہم رہتے ہیں ان میں سے ایک ہو گی اور باقی اللہ

کے علم میں ہوں گی اور یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ یہ زمین آسمانوں ہی کے جنس سے ہے۔ اپنی ترکیب اور اپنے خصائص کے اعتبار سی' ان آیات کو ابھی ہم اپنے سائنسی معلومات پر منطبق کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے علم نے ابھی تک اس کائنات کے بہت ہی تھوڑے حصے کا احاطہ کیا ہے۔ اس لیے یہ تحقیق کے طور پر نہیں کہہ سکتے کہ قرآن کا مفہوم یہ ہے اور انسان یہ بات اس وقت تک نہیں کہہ سکتا جب تک اسے اس کائنات کا تمام علم حاصل نہ ہو جائے۔ لہٰذا ہم اس آیت کے نفسیاتی پہلو ہی پر اکتفاء کرتے ہیں کہ اللہ کے احکام پوری کائنات پر حاوی ہیں۔

اس پوری کائنات کی طرف یہ اشارہ۔

سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (۶۵ : ۱۲) "سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہی کے مانند"۔ جب انسان اس پر غور کرتا ہے تو اس کے سامنے اس کائنات کا ہولناک اور محیر العقول وسیع منظر آ جاتا ہے۔ اللہ کی مملکت کی وسعت' اللہ کی قدرت کے عظیم مشاہد' جن کے مقابلے میں یہ زمین' رائی کے دانے جیسی حقیر نظر آتی ہے' اور اس کے اندر جو مخلوق ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس سے حقیر تر ہے۔ اور اس کے حادثات پھر مزید حقیر تر ہیں' اللہ کی کائنات میں اگر پوری زمین ایک حقیر سی گیند ہے تو اس کے اندر چند ٹکوں کی کیا حقیقت ہے جو ایک خاوند خرچ کرتا ہے اور ایک بیوی وصول کرتی ہے؟

اس ہولناک طور پر وسیع اور محیر العقول طور پر عظیم کائنات کے اندر اللہ کے احکام و اوامر چلتے ہیں نکاح و طلاق تو اللہ کے اوامر کا ایک حصہ ہیں۔ خود انسانی علم کے زاویہ سے بھی اللہ کے احکام جو اس کائنات میں نازل ہوتے ہیں' خود انسانی تصورات کے پیمانوں سے بھی بہت عظیم ہیں۔ اللہ کے کسی حکم کی مخالفت گویا پوری کائنات کی مخالفت کو دعوت دینا ہے۔ زمین و آسمان کی مخالفت کو دعوت دینا اور یہ مخالفت بہت ہی جسارت ہے۔ کوئی عقلمند آدمی اس جسارت کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔ جبکہ رسول آ گیا ہے' وہ کھلی آیات سنا رہا ہے اور لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لا رہا ہے۔

زمین اور آسمان میں اللہ کے احکام کے نزول کا مطلب یہ ہے کہ قلب مومن میں یہ تصور بٹھایا جائے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ جو چاہتا ہے اسے کوئی چیز اس سے عاجز نہیں کر سکتی۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ اس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں۔ ہر چیز اس کی بادشاہت میں ہے اور وہ دلوں کے راز بھی جانتا ہے۔

اس بات کے یہاں دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ جو اللہ یہاں عائلی احکام دے رہا ہے' وہ وسیع علم رکھتا ہے۔ اللہ تمام حالات' تمام مصلحتوں اور انسان کی استعداد کی حدود سے واقف ہے' لہٰذا لوگوں کو اللہ کے احکام سے سرمو سرتابی نہیں کرنا چاہئے کیونکہ وہ علیم و محیط کا بنایا ہوا قانون ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ احکام اور ان پر تعمیل تمہارے دلوں اور تمہارے ضمیر پر چھوڑ دی گئی ہے اور تمہارے ضمیر اور شعور کا بھی اللہ کو علم ہے۔ لہٰذا اپنے دل کی گہرائیوں سے ان احکام پر صدق دل کے ساتھ عمل کرو' اللہ دنیا کے قوانین کے مقننین کی طرح نہیں ہے کہ جو جانتے نہیں۔ وہ تو علیم بذات الصدور ہے۔

اس آخری زمزمے اور وسعت علم الٰہی کے زمزمے پر اس سورت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ انسان سوچ کر ہی ذ غ ف ہ جاتا ہے اور اس کے سامنے سر جھکانے' اطاعت کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہتا۔ سبحان اللہ' اللہ ہی تو دلوں کا خالق ہے' وہ ان دلوں کی وادیوں کے نشیب و فراز سے ہی واقف ہے۔

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ۔۔ ۲۸

## سورۃ التحریم ۔ ٦٦

## ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۲

# سورۃ التحریم ایک نظر میں

جب تقدیر الٰہی نے یہ فیصلہ کیا کہ رسالت محمدی کو آخری رسالت قرار دے اور نظام مصطفیٰ کو آخری نظام زندگی قرار دے ـ اور اس نظام کے مطابق دنیا میں مسلمانوں کی زندگیوں کو چلا کر دکھا دے ـ اور یہ کہ اس دین کو پوری انسانی زندگی کی سرگرمیوں پر حاوی کر دے اور ہر میدان تک وسیع کر دے ـ

جب تقدیر الٰہی نے یہ فیصلہ کر دیا تو اس نے اسلامی نظام زندگی کو یہ رنگ دیا ـ اسے کامل ' جامع اور مکمل بنایا ' جسے انسان کی تمام ضروریات کے لیے کفیل بنایا ـ اس نظام کو اللہ نے اس طرح بنایا ہے کہ یہ انسان کی صلاحیتوں کو چار چاند لگا کر انہیں ہر پہلو سے گرمی دیتا ہے اور انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض کے طور پر اپنے فرائض اچھی طرح ادا کر سکے ـ اور اپنے آپ کو ایک ایسی مخلوق ثابت کرے جسے اللہ نے مکرم بنایا اور اس کی تخلیق کے بعد اللہ نے اس کے اندر اپنی روح پھونکی ـ

چونکہ یہ آخری نظام تھا تو اللہ نے اس کی تشکیل یوں کی کہ وہ زندگی کی گاڑی کو آگے کی طرف بڑھاتا چلا جائے ' وہ پیداوار میں اضافہ کرے ' پاکیزگی کے ساتھ آگے کی طرف بڑھے ' اور یہ سب کام نہایت خوش اسلوبی سے بیک وقت ہوں ـ اس نے یعنی اسی نظام نے انسان کی کسی بھی تعمیری صلاحیت کو معطل نہیں کیا ـ اس نے کسی مفید صلاحیت کو دبانے کی سعی نہیں کی ـ بلکہ اس نے صلاحیتوں کو نشاط بخشا ' خفیہ قوتوں کو جگایا ـ لیکن اس نے آگے بڑھنے کی حرکت کو نہایت توازن کے ساتھ منظم کیا ـ تاکہ وہ نہایت ہی باوقار افق تک بلند ہو ' یوں کہ اس دنیا میں انسان کو آخرت کی زندگی کے لیے تیار کرے اور اس فانی مخلوق کو باقی رہنے والے جہاں کے لیے تیار کرے ـ

یہ انتظام اللہ نے یوں کیا کہ اس نظام کے مظاہرے کے لیے اللہ نے ایک انسان رسول کریم کو بھیجا اور اس نے اس نظام پر عمل کر کے لوگوں کو سمجھایا ـ چنانچہ اسلامی نظریہ حیات ' اپنے تمام خصائص کے ساتھ آپ کی زندگی میں مجسم کر کے چلتا پھرتا سمجھایا گیا ـ اور رسول کریم کی زندگی کو اسلام کا ظہور ' مظاہرہ اور مشاہدہ قرار دیا گیا ـ آپ ایک بشر تھے جس کی تمام قوتوں کو مکمل کر دیا گیا تھا ـ آپ جسمانی لحاظ سے مکمل ' آپ کا جسمانی ڈھانچہ ' آپ کے حواس ' آپ کا شعور ' آپ کا ذوق نہایت کامل اور سلیم تھے ـ آپ کے جذبات ' آپ کی طبیعت ' آپ کے احساسات ' آپ کا ذوق جمال ' سب کے سب کامل اور مکمل تھے ـ آپ کی عقل بہت برتر تھی ـ آپ کی فکر بہت ہی وسیع تھی ' آپ کے ادراک کے آفاق بہت وسیع تھے ـ آپ کی قوت ارادی ایسی تھی کہ آپ کو حالات پر مکمل کنٹرول ہوتا تھا ـ ان صلاحیتوں سے برتر بات یہ تھی کہ آپ کی روح کو اشراق کلی حاصل تھا ـ آپ کی ذات معراج کی صلاحیت رکھتی تھی ـ آپ عالم بالا کی آواز سنتے تھے ' نور ربی کو دیکھ سکتے تھے ' اور اشکال و مظاہر سے صرف نظر کرتے ہوئے آپ کی روح کو روح کائنات سے اتصال حاصل تھا ـ یہاں تک کہ شجر و حجر آپ پر سلام بھیجتے تھے ـ ستون آپ کے لیے روتا تھا اور کانپ اٹھتا تھا اور یہ سب قوتیں آپ کی شخصیت

میں متوازن تھیں' جس طرح یہ کائنات متوازن ہے ۔ اسی طرح آپ کی شخصیت متوازن تھی اور پھر یہ نظام جو آپ کو دیا گیا اور آپ نے مومنین کو دیا وہ بھی متوازن ہے ۔

چونکہ اسلامی نظام زندگی کو آپ کی زندگی کی صورت میں عملی شکل دینا مقصود تھا تو آپ کی زندگی کو ایک کتاب مفتوح قرار دیا گیا تاکہ اسے تمام انسان پڑھ سکیں ۔ اس میں یہ عقائد بھی موجود ہوں' ان کی واقعی اور عملی شکل بھی موجود ہو' چنانچہ آپ کی زندگی کا کوئی حصہ چھپا ہوا نہ تھا ۔ نہ اس کا کوئی حصہ لپٹا ہوا دفتر تھا بلکہ آپ کی زندگی کے بعض واقعات کو قرآن نے پیش کیا اور ایسے واقعات کو بھی کھول کر پیش کیا جو بالعموم عام انسان بھی ان کو عوام کے سامنے پیش کرنا پسند نہیں کرتے ۔ انسان کی وہ کمزوریاں جن پر انسان کو کوئی کنٹرول نہیں ہوتا ۔ ان کو بھی نہیں چھپایا گیا ۔ یوں نظر آتا ہے کہ رسول اللہ کی زندگی کے بعض نہایت ہی خفیہ گوشوں کو بھی دست قدرت نے لوگوں پر ظاہر کر دیا ۔

اس لیے کہ حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں پرائیویٹ نام کی کوئی چیز نہ تھی ۔ آپ کی ساری زندگی دعوت کی زندگی تھی اور پبلک زندگی تھی ۔ اس لیے اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ اسے چھپایا جائے' آپ کی زندگی ایک ترجمتی منظر تھا ۔ قابل عمل اور قابل تقلید زندگی تھی ۔ اور اسلامی عقیدۂ حیات پر مبنی تھی تاکہ لوگ اسلام کو آپ کی شخصیت میں زندہ دیکھ سکیں ۔ جس طرح آپ کی زبان سے اسلام کو سنتے تھے' اسلام کو آپ کے عمل میں دیکھتے بھی تھے ۔ یہی تھی آپ کی غرض تخلیق اور یہی تھا آپ کا مقصد بعثت ۔

آپ کے رفقاء نے آپ کی باتیں یاد کیں اور بعد کے لوگوں کے لیے نقل کیں ۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے ۔ ان لوگوں نے نہایت باریک ترین تفصیلات قلم بند کیں ۔ یہاں تک کہ آپ کی زندگی کا کوئی چھوٹا بڑا واقعہ ان سے رہ نہ گیا ۔ یہاں تک کہ آپ کی روز مرہ کی باتیں بھی جو انہوں نے یاد کیں ان کو بھی قلم بند کیا ۔ اور یہ بھی اللہ کے نظام تقدیر میں لکھا ہوا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے تمام واقعات قلم بند ہوں ۔ اور اسلامی نظریہ حیات کی ایک ایک بات عملی شکل میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں پائی جاتی ہو ۔ رسول اللہ کی زندگی کا یہ پہلو اس کے علاوہ تھے' جو قرآن نے قلم بند کیے ۔

اس سورت کے آغاز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کا ایک صفحہ قلم بند کیا گیا ہے ۔ اس میں آپ کی ازواج مطہرات کے بعض انسانی تاثرات اور ان پر ردعمل کو بیان کیا گیا ہے ۔ ان ازواج کے آپس کے تعلقات اور پھر آپ کے ساتھ ان کے تعلقات کو بیان کیا گیا ہے ۔ پھر ان واقعات اور ان کے اثرات ازواج مطہرات پر اور پھر امت پر بیان کیے گئے ہیں اور اس کے بعد وہ ہدایات اور رہنمائی امت کو دی گئی ہے جو واقعات کی شکل میں ہے ۔

جن حالات میں یہ واقعات ہوئے' جس زمانے میں ہوئے' اس کی طرف اس سورت میں کوئی اشارہ موجود نہیں ہے ۔ لیکن اس سلسلے میں جو روایات آئی ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات زینب بنت جحش ﷺ کے نکاح کے بعد پیش آئے ۔

یہاں مناسب ہے کہ ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات اور آپ کی گھریلو زندگی کے بارے میں کچھ باتیں بتا دیں ۔ جن کی روشنی میں وہ واقعات اچھی طرح سمجھ میں آجائیں' جو اس سورت میں لیے گئے ہیں ۔ یہ واقعات ہم نے امام ابن جریر کی کتاب جوامع السیرۃ سے لیے ہیں ۔ نیز سیرۃ ابن ہشام میں بھی یہ روایات موجود ہیں ۔

۱۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہلی زوجہ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا تھیں ۔ آپ کے ساتھ حضور ﷺ

کا نکاح اس وقت ہوا جب کی عمر ۲۵ سال تھی ۔ بعض روایات میں ۲۲ سال بھی آئی ہے ' جبکہ حضرت خدیجہ کی عمر چالیس یا اس سے بھی زیادہ تھی ۔ آپ ہجرت سے تین سال قبل فوت ہوگئیں ۔ حضورﷺ نے ان کی زندگی میں کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کی ۔ جب وہ فوت ہوئیں تو ان کی عمر ۵۰ سال سے زیادہ تھی ۔

۲۔ حضرت خدیجہ ؓ کی وفات کے بعد آپ نے حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ شادی کی ۔ کوئی ایسی روایت نہیں ہے کہ آپ بہت خوبصورت یا جوان تھیں ۔ یہ سکران ابن عمرو ابن عبدالشمس کی بیوہ تھیں ۔ یہ شخص قدماء مسلمین میں سے تھے ۔ یہ حبشہ کی طرف ہجرت کرکے گئے تھے ۔ جب یہ فوت ہوگئے تو ان کی بیوہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے نکاح کر لیا۔

۳۔ اس کے بعد آپؐ نے حضرت عائشہ بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہا سے شادی کی ۔ یہ چھوٹی تھیں ۔ اور ہجرت کے بعد آپ کی رخصتی ہوئی۔ ان کے سوا آپ نے کسی کنواری عورت کے ساتھ شادی نہیں فرمائی ۔ ان کے ساتھ حضورؐ کو بہت محبت تھی ۔ کہتے تھے : کہ رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال تھی اور آپ کے نکاح میں وہ ۹ سال اور پانچ ماہ رہیں ۔ اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ فوت ہوگئے ۔

۴۔ اس کے بعد آپ نے حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا کے ساتھ شادی کی ۔ یہ شادی بھی ہجرت کے بعد دو سال اور کچھ مہینوں کے بعد ہوئی ۔ یہ بیوہ تھیں ۔ حضرت عمرؓ نے ان کے رشتے کے لیے حضرت ابوبکرؓ ' حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ سے کہا مگر کسی نے قبول نہ کیا تو حضورﷺ نے فرمایا کہ ان سے اچھا رشتہ اسے مل جائے گا اور پھر خود ان کے ساتھ نکاح کر لیا۔

۵۔ اس کے بعد آپ نے زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کیا۔ ان کے پہلے خاوند عبیدہ ابن الحارث ابن عبدالمطلب تھے ۔ یہ بدر کے دن مارے گئے تھے ۔ یہ زینب رضی اللہ عنہا حضور اکرم ﷺ کی زندگی ہی میں فوت ہوگئی تھیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ ان کے پہلے خاوند عبداللہ ابن جحش اسدی تھے جو احد کی جنگ میں شہید ہوئے ۔ یہ روایات زیادہ قریب صحت نظر آتی ہے ۔

۶۔ اس کے بعد آپ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ آپ سے پہلے یہ ابو سلمہ کی بیوی تھیں ۔ یہ احد کی جنگ میں زخمی ہوگئے تھے اور یہ زخم بگڑتا گیا یہاں تک کہ وہ فوت ہوگئے ۔ حضور نے ان کی بیوہ کے ساتھ نکاح کر لیا اور ان کے تمام بچوں کو بھی اپنی پرورش میں لے لیا۔

۷۔ آپ نے زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کیا۔ پہلے آپ نے ان کا نکاح اپنے غلام اور متبنیٰ زید بن حارثہ سے کرایا۔ ان دونوں کی باہم نہ بن سکی ۔ زید نے ان کو طلاق دے دی ۔ سورہ احزاب پارہ ۲۲ میں ہم نے ان کا قصہ بیان کر دیا ہے ۔ یہ بہت حسین و جمیل تھیں ۔ انہی کے بارے میں حضرت عائشہؓ یہ سوچتی تھیں کہ یہ میرے مقابلے میں زیادہ اہمیت اختیار کرلیں گی کیونکہ یہ حضورﷺ کی پھوپھی زاد تھیں اور بہت ہی خوبصورت تھیں ۔

۸۔ اس کے بعد آپ نے حضرت جویریہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کیا۔ یہ شخص بنی مصطلق کے سردار تھے ۔ اور یہ نکاح ۶ ہجری کے وسط میں ہوا۔ ابن اسحاق روایت کرتے ہیں : محمد ابن جعفر ابن زبیر سے ' وہ عروہ ابن زبیر سے ' وہ حضرت عائشہ سے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے بنی المصطلق کی قیدی عورتوں کو تقسیم کیا تو جویریہ بنت

الحارث ثابت ابن قیس ابن شماس کے حصے میں آئیں یا ان کے ایک چچا زاد کے حصے میں۔ اس نے اس عورت کے ساتھ معاہدہ آزادی کر لیا۔ یہ اس قدر میٹھی اور خوبصورت عورت تھی کہ اسے جو بھی دیکھتا فریفتہ ہو جاتا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور آپ سے اپنی آزادی کے سلسلے میں مالی اعانت طلب کی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جونہی میں نے اسے اپنے کمرے کے دروازے کے پاس دیکھا میں نے اسے بہت ناپسند کیا۔ میں نے معلوم کیا کہ حضور ﷺ اسے پسند کریں گے۔ یہ آئی اور اس نے کہا رسول خدا کہ میں جویریہ بنت حارث ابن ابو ضرار ہوں جو قوم کا سردار ہے، مجھ پر جو مصیبت آئی ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میں ثابت ابن قیس ابن شماس کے حصے میں آئی ہوں یا اس کے چچازاد کے حصے میں۔ میں نے اس کے ساتھ مکاتبت کر لی ہے۔ میں اس سلسلے میں آپ سے مالی امداد چاہتی ہوں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم اس سے بھی زیادہ اچھی بات پسند کرو گی؟ تو اس نے کہا کہ رسول خدا وہ کیا چیز ہے؟ کہا کہ "میں تمہاری مکاتبت کی پوری رقم ادا کر دوں اور تمہارے ساتھ نکاح کر لوں"۔ تو اس نے کہا ہاں رسول خدا ﷺ میں نے یہ تجویز منظور کر لی۔

۹۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کیا۔ یہ ابو سفیان کی بیٹی تھیں اور حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ ان کے خاوند عبداللہ ابن جحش عیسائی ہو کر مرتد ہو گئے۔ اور انہوں نے ام حبیبہ کو چھوڑ دیا۔ حضور ﷺ نے ان کو پیغام نکاح دیا اور نجاشی نے حضور ﷺ کی طرف سے ان کو مہر دیا اور یہ حبشہ سے مدینہ کو آئی۔

۱۰۔ فتح خیبر کے بعد آپ نے حضرت صفیہ ... ... بنت حی ابن اخطب رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کیا۔ یہ بنو نضیر کا سردار تھا۔ یہ کنانہ ابن ابو الحقیق کی بیوی تھیں اور یہ بھی یہودیوں کا ایک سردار تھا۔ ابن اسحاق ان کے ساتھ نکاح کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ اسے لایا گیا اور اس کے ساتھ ایک اور عورت بھی تھی۔ حضرت بلال ان کو لے کر مقتولین یہود کے پاس سے گزرے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو دوسری عورت تھی۔ اس نے دور سے آواز میں چیخ لگائی، اپنے منہ کو پیٹا، اور اپنے سر پر مٹی ڈالی۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا دور کرو میرے پاس سے اس شیطانہ کو۔ صفیہ کے بارے میں آپ نے حکم دیا کہ آپ کے پیچھے بیٹھا دیا جائے اور اس کے اوپر چادر ڈال دی۔ مسلمانوں نے جان لیا کہ حضور اکرم ﷺ نے اسے اپنے لیے چن لیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال ﷺ سے کہا: (جس طرح مجھ تک اطلاع پہنچی ہے) "بلال تمہارے دل سے رحم کا جذبہ نکال دیا گیا تھا جب تم ان دو عورتوں کو لے کر ان کے مقتولین پر گزار رہے تھے"۔

۱۱۔ اس کے بعد آپ نے میمونہ بنت حارث ابن حزن رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا یہ خالد ابن ولید اور عبداللہ ابن عباس کی خالہ تھیں۔ حضور اکرم ﷺ سے قبل یہ ابو رھم ابن عبدالعزی کی بیوی تھیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ خویطب ابن عبدالعزی کی بیوی تھیں۔ یہ آخری عورت تھیں جن نے حضور ﷺ نے نکاح کیا۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر عورت کے ساتھ نکاح کرنے کی اپنی ایک کہانی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نکاح کا ایک خاص سبب تھا اور اس میں حکمت تھی، ماسوائے زینب بنت جحش اور جویریہ بنت حارث کے ان میں سے اور کوئی بھی نوجوان نہ تھی۔ یا ایسی نہ تھیں کہ ان کی خوبصورتی کی وجہ سے کوئی ان میں دلچسپی لیتا ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

حضورﷺ کو زیادہ محبوب تھیں ـ یہاں تک کہ مذکورہ بالا دونوں جو خوبصورت تھیں' ان کے نکاح کی بھی ان کے جمال کے علاوہ ایک نفسیاتی وجہ بھی تھی ـ میں اس بات کی نفی نہیں کرتا کہ ان کے نکاح میں خوبصورتی کو دخل نہ تھا جس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں اندازہ کیا اور وہ درست نکلا ـ نہ میں زینب کے جمال کی نفی کرتا ہوں ـ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زندگی سے ہم اس قسم کے انسانی اور بشری میلان کی نفی نہیں کر سکتے ـ نہ اس قسم کا ذوق ہونا کوئی کمزوری ہے کہ انصار نبی اس کی مدافعت کریں ـ یا آپ کے دشمنان اس کے بارے میں آپ پر الزام لگائیں کیونکہ حضورﷺ ایک انسان تھے ـ ایک بلند پایہ انسان لیکن بیویوں کے سلسلے میں آپ کے جذبات مختلف اور نکاح کے سلسلے میں اسباب بھی مختلف تھے ـ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنی ازواج کے ساتھ ایک بشر اور رسول کی طرح زندہ رہے' جس طرح اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ اس بات کا اعلان کر دیں ـ

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ''کہہ دو پاک ہے میرا رب' میں تو فقط ایک بشر رسول ہوں'' ـ

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنی ازواج کے ساتھ حسن معاشرت فرمائی ـ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: ''حضور اکرم صلعم جب اپنی ازواج کے ساتھ تنہا ہوتے تو بہت ہی نرم مزاج اور بہت ہی شریف انسان ہوتے ـ نہایت ہی زیادہ ہنسنے والے اور مسکرانے والے'' ـ لیکن آپ کی ذات' آپ کے روحانی فیوض اور آپ کے قلبی جذبات' آپ کے حسن ادب اور حسن معاملہ سے بھی وہ فیضیاب ہوتیں ـ رہا یہ کہ ان ازواج کی مادی زندگی کیسی تھی تو وہ بقدر کفاف تھی ـ یہاں تک کہ فتوحات کے بعد جب کہ مسلمان اموال غنیمت کی وجہ سے مالدار ہو گئے تھے ـ آپ اس سے قبل سورہ احزاب میں حضور اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات اور وسعت نفقہ کے مطالبات کے بارے میں پڑھ آئے ہیں ـ جس کے نتیجے میں ایک بحران پیدا ہو گیا اور آخر کار اللہ نے ان کو اختیار دے دیا کہ وہ یا حضور اکرم ﷺ کا انتخاب کر لیں یا آزادی کو اختیار کر لیں ـ لیکن سب نے اللہ اور رسول اور دار آخرت کو اختیار کیا ـ (دیکھئے پارہ ۲۲)

لیکن حضور اکرم ﷺ کے گھر میں زندگی بسر کرنے کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ انسانی جذبات بالکل ختم ہو گئے تھے ـ آپ کی ازواج مطہرات بہرحال بشر تھیں ـ اور بشری جذبات وہاں بھی موجود تھے ـ بعض اوقات ان کے درمیان تنازعہ بھی ہو جاتا جو بالعموم ایسے گھرانوں میں ہو جاتا ہے ـ اس سے قبل ابن اسحاق کی روایت میں گزرا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کو دیکھتے ہی اسے ناپسند کیا اور سمجھ لیا کہ یہ حضور اکرم ﷺ کے دل میں گھر کرے گی ـ جب بھی حضورﷺ نے اسے دیکھا اور عملاً ایسا ہی ہوا ـ پھر صفیہ کے ساتھ جو ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کے کسی قصور کے بارے میں تذکرہ کیا کہ صفیہ کی تو یہ یہ بات آپ کے لیے کافی ہے تو حضورﷺ نے فرمایا کہ تم نے اتنی بڑی بات کی ہے کہ اگر اسے سمندر کے اندر ملایا جائے تو اس کا رنگ بدل جائے'' ـ اور اپنے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جب تخییر کی آیت نازل ہوئی تو میں نے اللہ' رسول اور دار آخرت کو چنا' لیکن رسول اللہ سے درخواست کی کہ اپنی دوسری ازواج کو میرے فیصلے کی اطلاع نہ دیں تو حضورﷺ نے فرمایا ''اللہ نے مجھے سخت گیر

بنا کر نہیں بھیجا' مجھے تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ مجھ سے جس نے بھی پوچھا میں اسے بتاؤں گا کہ عائشہ نے کیا فیصلہ کیا ہے کہ اس نے اللہ' رسول اور دار آخرت کو اپنایا ہے"۔

یہ واقعات جو حضرت عائشہ نے اپنے بارے میں خود نقل کیے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر سچی تھیں کیونکہ وہ اسلام کی تربیت یافتہ تھیں۔

ان مثالوں میں معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے گھر کے اندر کی فضا کیسی تھی اور آپ جس طرح پوری امت کی تربیت فرما رہے تھے اسی طرح اپنے گھر کے اندر بھی لوگوں کی تربیت کر رہے تھے۔

یہ واقعہ جس کے بارے میں اس سورت کی ابتدائی آیت نازل ہوئی۔ ایسے ہی واقعات میں سے ایک واقعہ تھا جو آپ اور آپ کے ازواج مطہرات کے درمیان پیش آیا۔ اس کے بارے میں متعدد روایات ہیں اور ان کے درمیان اختلاف بھی ہے۔ قرآن کی نصوص کی تشریح کے وقت ہم ان کی تفصیلات دیں گے۔

اس واقعے کے حوالے سے جو ہدایات دی گئیں خصوصاً آپ کی دو بیویوں کو جو یہ حکم دیا گیا کہ توبہ کریں اور اس کے بعد پھر تمام مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ اپنے گھرانوں کی تربیت کر کے انہیں دوزخ کی آگ سے بچائیں اور اپنے آپ کو آگ سے بچائیں اور پھر کافروں کا ایک منظر بھی پیش کیا کہ جہنم میں ان کی حالت کیا ہو گی اور پھر سورت کے آخر میں حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی کافر بیویوں کی ایک مسلمان گھرانے میں ہونے کی مثال دی گئی اور پھر فرعون کی بیوی ایک کافر کے گھر میں اور پھر مریم بنت عمران کی مثال کہ وہ ایک اعلیٰ خاتون تھیں جس کے رحم میں کلمہ الٰہیہ پھونکا گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور وہ نہایت ہی عبادت گزار خاتون تھیں۔

ان آیات کے نزول کے بارے میں (آیت ۱ تا ۵) متعدد روایات وارد ہیں۔ امام بخاری نے ان آیات کی تفسیر کے ضمن میں روایت کیا ہے' ابراہیم ابن موسیٰ سے' انہوں نے ہشام ابن یوسف سے' انہوں نے ابن جریج سے' انہوں نے عطا سے' انہوں نے عبید ابن عمر سے' انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہ "نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم زینب بنت جحش کے ہاں شہد پیا کرتے تھے۔ اور آپ کے ہاں قدرے ٹھہرتے تھے۔ میں نے اور حفصہ نے یہ طے کیا کہ ہم میں سے جس کے ہاں بھی حضور آئیں گے تو وہ کہے گی کہ حضور آپ نے منافیر کھایا ہے (یہ ایک پھل ہے جس کا ذائقہ میٹھا ہوتا ہے' لیکن بدبودار ہوتا ہے)۔ تو آپ نے فرمایا نہیں لیکن میں نے زینب بنت جحش کے ہاں شہد پیا ہے۔ میں دوبارہ نہیں پیوں گا۔ میں نے حلف اٹھا لیا ہے۔ لیکن یہ بات کسی سے نہ کہنا"۔ یہ تھی وہ بات کہ آپ نے اپنے اوپر شہد حرام کر دیا حالانکہ وہ حلال تھا۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ (۶۶ : ۱) "اے نبی تم کیوں اس چیز کو حرام قرار دیتے ہو' جو اللہ نے تمہارے لیے حلال قرار دی ہے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ جس عورت نے یہ مکالمہ حضورؐ کے ساتھ کیا' اس نے اپنی دوسری ہم مشورہ کو بتا دیا' حالانکہ حضور اکرم ﷺ نے اسے حکم دیا تھا کہ کسی سے نہ کہنا۔ اللہ نے حضور ﷺ کو بذریعہ وحی سب کچھ بتا دیا۔ اس پر حضور ﷺ نے مکالمہ کرنے والی بیوی کو اور پھر اپنی ہم مشورہ بیوی کو بتانے والی کو بتا دیا کہ تم نے تو اس بات کو پھیلا دیا

ہے ـ لیکن حضور ﷺ نے اسے اپنے حسن خلق کی بنا پر پورا واقعہ نہ بتایا ـ ایک مختصر سی بات کی اس حد تک کہ وہ مکالمہ کرنے والی جان لے کہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو تو اصل بات معلوم ہو گئی ـ یہ پریشان ہوئی اور پوچھا ـ

مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا (٦٦ : ٣) "آپ کو اس کی کس نے خبر دی؟" شاید اس کے دل میں یہ بات آئی ہو کہ شریک مشورہ نے راز کھول دیا ہے ـ تو حضور ﷺ نے بتا دیا :

نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ (٦٦ : ٣) "مجھے تو علیم و خبیر نے یہ واقعہ بتایا ہے" ـ مطلب یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بذریعہ الہام سب کچھ بتا دیا گیا ـ

اس واقعہ کے بعد 'اور پھر اللہ کی جانب سے دو بیویوں کے اس مشورہ کے انکشاف کے بعد اور رسول اللہ ﷺ کے گھر میں ایسا واقعہ ہو جانے کے بعد حضور اکرم ﷺ اپنی ازواج سے بہت ناراض ہو گئے اور آپ نے بلا کر کہا' کہ ایک ماہ ان کے قریب نہ جائیں گے ـ یہ باتیں مشہور ہو گئیں کہ آپ نے ازواج مطہرات کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیا ہے ـ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا غصہ اس وقت ٹھنڈا ہوا جب یہ آیات نازل ہوئیں ـ اور آپ دوبارہ اپنی ازواج کے پاس گئے ـ

دوسری روایت امام نسائی نے نقل کیا ہے ـ یہ حضرت انس ﷺ کی حدیث ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی ایک لونڈی تھی اور حضور ﷺ اس کے ساتھ مجامعت فرماتے تھے ـ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ آپ کے پیچھے پڑ گئیں اور آپ نے اس کو اپنے اوپر حرام کر دیا ـ اس پر اللہ نے یہ آیات نازل کی :

یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ (٦٦ : ١) "اے نبی تم کیوں حرام قرار دیتے ہو اس چیز کو' جو اللہ نے تمہارے لیے حلال قرار دی ہے' تم اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہو" ـ

اور ابن جریر اور ابن اسحاق کی ایک روایت میں یہ ہے' ماریہ جو آپ کے بیٹے ابراہیم کی ماں تھیں اور ام ولد لونڈی تھیں ـ ان کے ساتھ آپ نے حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں مجامعت کی ـ اس پر حفصہ رضی اللہ عنہا کو غصہ آیا اور انہوں نے اسے اپنی توہین سمجھا ـ حضورؐ نے ان کے ساتھ وعدہ کر لیا کہ وہ ماریہ کو اپنے اوپر حرام کرتے ہیں اور قسم اٹھا لی ـ اور حکم دیا کہ اس بات کو خفیہ رکھیں ـ حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتا دیا' یہ تھا اصل واقعہ ـ

دونوں روایات میں سے ایک ان آیات کے نزول کا سبب ہو سکتی ہے ـ یہ دوسری روایت زیادہ قریب ہے ـ اس حادثہ کی فضا کے مجموعی تاثر کے ساتھ خصوصاً اس کے بعد جب حضور ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیا ـ اس لحاظ سے کہ یہ موضوع زیادہ حساس ہے ـ لیکن پہلی روایت زیادہ قوی ہے بلحاظ سند ـ یہ پہلی روایت ممکن الوقوع بھی ہے اور اس پر جو اثرات مرتب ہوئے وہ بھی ممکن الوقوع ہیں ـ

رہا معاملہ ایلا کا تو اس کی تصویر کشی امام احمد کی روایت میں بہت اچھی طرح کی گئی ہے ـ اس روایت میں اس وقت کے اسلامی معاشرے کی تصویر کشی بھی ہوتی ہے ـ امام احمد نے روایت کیا' عبدالرزاق سے' انہوں نے معمر سے' انہوں نے زہری سے' انہوں نے عبید اللہ ابن عبداللہ ابن ابوثور سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے وہ فرماتے ہیں مجھے شوق تھا کہ میں حضرت عمر ﷺ سے ان دو عورتوں کے بارے میں پوچھوں' جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے :

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (٦٦ : ٤) ''اگر تم اللہ سے توبہ کرتی ہو' (تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے) کیونکہ تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں''۔ کہ یہ کون تھیں۔

ایک بار حضرت عمرؓ ایک طرف ہوئے اور میں ان کے ساتھ کوزہ لے کر ایک طرف ہوا۔ آپ قضائے حاجت کے لیے گئے اور میرے پاس آئے۔ میں نے ان کے ہاتھوں پر پانی ڈالا۔ اسی موقعہ پر میں نے ان سے پوچھ لیا کہ وہ دو عورتیں کون تھیں' جن کے بارے میں یہ آیا ہے :

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (٦٦ : ٤) تو حضرت عمرؓ نے فرمایا ابن عباس تم عجیب آدمی ہو (زہری کہتے ہیں حضرت عمرؓ نے سوال کو اچھا نہ سمجھا لیکن چھپایا نہیں) فرمایا یہ کہ عائشہ ........ اور حفصہ ....... تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا۔ ہم اہل قریش ایسے لوگ تھے کہ ہم نے عورتوں کو خوب کنٹرول میں رکھا ہوا تھا۔ لیکن جب ہم مدینہ آئے تو وہاں ہم نے دیکھا کہ عورتیں لوگوں پر غالب ہیں۔ تو ہماری عورتوں نے بھی ان سے سیکھنا شروع کر دیا۔ میری رہائش دار السید ابن زید' محلہ عوالی میں تھی۔ میں ایک دن اپنی بیوی پر غصہ ہوا تو اس نے آگے سے جواب دیا۔ میں نے اس بات کو بہت برا سمجھا کہ عورت آگے سے بات کا جواب دیتی ہے۔ اس نے کہا میرا جواب دینا آپ کو اس قدر برا لگا ہے' خدا کی قسم رسول اللہ کی عورتیں آپ کے ساتھ تیز باتیں کرتی ہیں اور بعض اوقات ان میں سے ایک صبح سے شام تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روٹھ جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں : میں اٹھا اور حفصہ کے پاس گیا اس کے گھر میں۔ میں نے اسے کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ باتیں پلٹا کر کرتی ہو اور سنا ہے کہ تم میں بعض صبح سے شام تک آپ سے روٹھ جایا کرتی ہے۔ تو اس نے کہا ہاں ایسا تو ہوتا ہے۔ تم میں سے جس نے ایسا کیا وہ تو تباہ و برباد ہوا۔ کیا تمہیں ڈر نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے تم پر اللہ کا غضب آ جائے اور تم ہلاک ہو جاؤ۔ تم کبھی رسول کی بات کو پلٹا کر جواب نہ دیا کرو۔ تم رسول اللہ سے کچھ بھی نہ مانگا کرو۔ اور میرے مال سے تمہیں جو درکار ہو مجھ سے مانگا کرو۔ تمہیں یہ بات کہیں غرے میں نہ ڈال دے کہ تمہاری سوکن تم سے زیادہ خوبصورت بھی ہے اور رسول اللہ کو محبوب بھی ہے یعنی (عائشہ) فرماتے ہیں کہ میرا ایک انصاری پڑوسی تھا۔ ہم رسول اللہ ﷺ کی محفل میں باری باری جاتے تھے۔ ایک دن وہ جاتا اور دوسرے دن میں جاتا اور وہ مجھے وحی کے بارے میں اطلاع دیتا' اسی طرح اپنی باری پر میں اسے اطلاع دیتا۔ ان دنوں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ غسانی ہمارے خلاف حملے کے لیے گھوڑے تیار کر رہے ہیں۔ میرا ساتھی ایک دن گیا۔ واپسی پر اس نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر اس نے آواز دی۔ میں نکلا تو اس نے کہا بہت بڑا واقعہ ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کیا غسانی آ گئے ہیں؟ تو اس نے کہا نہیں اس سے بھی بڑا اور طویل حادثہ ہو گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ میں نے کہا کہ '' حفصہ تباہ و برباد ہو گئی''۔ میرا خیال تھا کہ ایک دن یہ بات ضرور ہو گی۔ میں نے صبح کی نماز پڑھی اور اپنے اوپر کپڑے باندھے اور اترا اور سب سے پہلے حفصہ کے پاس گیا۔ وہ رو رہی تھی۔ میں نے کہا کیا رسول اللہ ﷺ نے تمہیں طلاق دے دی ہے؟ اس نے کہا مجھے علم نہیں ہے۔ وہ یہ ہیں الگ مشربہ (پانی پینے کی جگہ) میں۔ میں ایک سیاہ غلام کے پاس آیا اور اسے کہا کہ حضور اکرم ﷺ سے عمر کے لیے اجازت طلب کریں۔ غلام اندر گیا اور پھر باہر آیا اور کہا میں نے تمہارا تذکرہ کیا' حضور ﷺ خاموش

رہے ۔ میں گیا اور منبر رسول ﷺ کے پاس آیا وہاں کچھ لوگ بیٹھے رو رہے تھے ۔ میں منبر کے پاس قدرے بیٹھا۔ اس کے بعد میں جو محسوس کر رہا تھا اس نے مجھے بیٹھنے نہ دیا۔ میں پھر غلام کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ عمر کے لیے اجازت طلب کرو' وہ اندر گیا اور پھر واپس آیا اور کہا کہ میں نے آپ کا تذکرہ کیا مگر حضور ﷺ خاموش رہے ۔ میں پھر نکلا اور منبر کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ اس کے قدرے وقفے کے بعد پھر میرے احساس نے مجھے مجبور کر دیا۔ میں پھر غلام کے پاس آیا اور وہ اندر گیا اور پھر واپس ہوا۔ اور یہی کہا کہ میں نے آپ کا نام لیا کہ عمر ہیں۔ حضور ﷺ خاموش رہے ۔ میں واپس چلا گیا۔ اچانک دیکھا کہ وہ غلام مجھے پکار رہا ہے ۔ اس نے کہا آپ کو اجازت مل گئی ہے' اندر جائیں ۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا۔ آپ باریک بنی ہوئی چٹائی پر تکیہ لگائے ہوئے تھے ۔ جس نے آپ کے پہلو پر دھاریاں ڈال دی تھیں ۔ میں نے حضور ﷺ سے دریافت کیا حضور کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟ تو آپ نے فرمایا: "نہیں" ۔ میں نے کہا اللہ اکبر۔ حضور آپ غور فرمائیں قریشی عورتوں پر غالب ہوا کرتے تھے ۔ جب ہم مدینہ میں آئے تو یہاں کے لوگوں پر عورتیں غالب تھیں' ہماری عورتوں نے آہستہ آہستہ ان سے سیکھنا شروع کر دیا۔ ایک دن میں اپنی بیوی پر غصہ ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ آگے سے بات لوٹا رہی ہے ۔ میں نے اس بات کو بہت ہی برا سمجھا۔ میری بیوی نے کہا تمہیں یہ بات کیوں اتنی بری لگ گئی' رسول اللہ ﷺ کی بیویاں تو آپ کے جواب میں بات بھی کرتی ہیں اور ان میں سے ایک صبح سے شام تک آپ سے روٹھ بھی جاتی ہیں تو میں نے کہا جو ایسا کرتی ہے وہ تو برباد ہوئی ۔ کیا جو ایسا کرتی ہے وہ اللہ کے غضب سے نہیں ڈرتی ۔ کہ اگر اپنے رسول کی وجہ سے اللہ غضب میں آ جائے' اور وہ ہلاک ہو جائے ۔ اس پر آپ مسکرائے ۔ تو میں نے کہا حضور میں حفصہ کے پاس گیا تھا اور میں نے کہا تم کہیں اپنی پڑوسن کی وجہ سے غرے میں نہ پڑ جاؤ ۔ وہ تم سے خوبصورت بھی ہے اور رسول اللہ اس سے تمہارے مقابلے میں زیادہ محبت بھی کرتے ہیں ۔ تو رسول اللہ دوسری بار مسکرائے ۔ تو میں نے کہا حضور میں بیٹھ سکتا ہوں ۔ تو آپ نے فرمایا "ہاں" ۔ میں بیٹھ گیا۔ میں نے گھر پر ایک نظر ڈالی ۔ خدا کی قسم گھر میں کوئی چیز ایسی نہ تھی' جس پر میری نظر جمتی !۔

میں نے کہا رسول اللہ آپ دعا فرمائیں کہ آپ کی امت پر اللہ کشادگی کر دے ۔ اللہ نے فارسیوں' رومیوں پر کشادگی کر دی ہے' جبکہ وہ اللہ کی بندگی نہیں کرتے ۔ اس پر حضور ﷺ بیٹھ گئے اور فرمایا "ابن خطاب تم شک میں ہو کہ وہ ایک ایسی قوم ہیں جن کو اس دنیا کے مزے اللہ نے یہاں ہی جمع کر دیئے ہیں" ۔ میں نے کہا رسول اللہ ﷺ میرے لیے معافی طلب فرمائیں اور رسول اللہ ﷺ نے قسم اٹھائی کہ ایک ماہ تک ان کے پاس نہ جائیں گے کیونکہ آپ ان پر بہت ناراض ہو گئے تھے ۔ اس پر اللہ نے رسول اللہ ﷺ پر عتاب فرمایا اور یہ آیات نازل ہوئیں" : (بخاری' مسلم' ترمذی' نسائی' سب نے زہری سے )

---ooo---

# درس نمبر ۲۶۶ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۱۲

آیاتها ۱۲ — سورۃ التحریم ۶۶ — مدنیۃ ۱۰۷ — رکوعاتها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱) قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ
الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (۲) وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا
نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا
نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۭ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ (۳) اِنْ تَتُوْبَآ
اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَ
جِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ (۴) عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ
طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰۗىِٕبٰتٍ
عٰبِدٰتٍ سٰۗىِٕحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا (۵)

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”اے نبی، تم کیوں اس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہے؟ (کیا اس لیے کہ) تم اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہو؟ --- اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اللہ نے تم لوگوں کے لیے اپنی قسموں کی پابندی

سے نکلنے کا طریقہ مقرر کر دیا ہے ۔ اللہ تمہارا مولیٰ ہے 'اور وہی علیم و حکیم ہے ۔ پھر جب اس بیوی نے (کسی اور پر) وہ راز ظاہر کر دیا' اور اللہ نے نبی کو اس (افشائے راز) کی اطلاع دے دی 'تو نبیؐ نے اس پر کسی حد تک (اس بیوی کو) خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے درگزر کیا ۔ پھر جب نبیؐ نے اسے (افشائے راز کی) یہ بات بتائی تو اس نے پوچھا آپ کو اس کی کس نے خبر دی؟ نبیؐ نے کہا " مجھے اس نے خبر دی جو سب کچھ جانتا ہے اور خوب باخبر ہے ۔ اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو (تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے) کیونکہ تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں ۔ اور اگر نبیؐ کے مقابلے میں تم نے جتھہ بندی کی تو جان رکھو کہ اللہ اس کا مولیٰ ہے اور اس کے بعد جبریل اور تمام صالح اہل ایمان اور سب ملائکہ اس کے ساتھی اور مددگار ہیں ۔ بعید نہیں کہ اگر نبی تم سب بیویوں کو طلاق دے دے تو اللہ اسے ایسی بیویاں تمہارے بدلے میں عطا فرما دے جو تم سے بہتر ہوں ۔ 'سچی مسلمان' باایمان' اطاعت گزار' توبہ گزار' عبادت گزار اور روزہ دار' خواہ شوہر دیدہ ہوں یا باکرہ" ۔

یہ دراصل ایک عتاب ہے کیونکہ کوئی مومن اپنے اوپر اس چیز کو حرام نہیں کر سکتا جو اللہ نے حلال کی ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "شہد" یا "ماریہ" کے پاس جانے کو ازروئے قانون اور شریعت تو حرام نہ کیا تھا ۔ صرف اپنے بارے میں فیصلہ کیا تھا کہ میں اس کام کو دوبارہ نہیں کروں گا ۔ اس پر یہ جھڑکی آئی کہ جن چیزوں کو اللہ نے حلال کیا ہے 'کسی کو خوش کرنے کے لیے ان سے اپنے آپ کو محروم کرنا بھی جائز نہیں ہے ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا ۔

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٦٦ : ١) "اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے" ۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ فعل قابل مواخذہ ہے ۔ اور اس کا علاج یہ ہے کہ اللہ کی مغفرت طلب کی جائے اور اللہ کی رحمت شامل حال ہو جائے ۔ یہ نہایت ہی لطیف اشارہ ہے ۔

قرآن جس حلف کی طرف اشارہ کر رہا ہے 'جو رسول اللہ نے کر لیا تھا کہ دوبارہ ایسا نہیں کروں گا تو اللہ نے فرمایا کہ اس قسم سے نکل آؤ 'یعنی کفارہ ادا کر کے اور قسم اگر کسی اچھے کام سے رکنے کے لیے ہو تو اس کا توڑنا اور کفارہ دینا فرض ہے ۔

وَاللّٰهُ مَوْلٰكُمْ (٦٦ : ٢) "اللہ تمہارا مولیٰ ہے" ۔ اللہ تمہاری کمزوریوں پر تمہاری معاونت کرتا ہے ۔ اور اس معاملے میں بھی تمہاری معاونت کرتا ہے جو تمہارے لیے گراں گزرے ۔ اور یہ قسموں کو حلال کرنا اور ان سے کفارہ ادا کر کے نکل آنے کا طریقہ اسی لیے تو اللہ نے فرض کیا ہے ۔

وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (٦٦ : ٢) "وہی علیم و حکیم ہے" ۔ وہ تمہارے لیے جو قوانین بناتا ہے 'وہ علم و حکمت سے بناتا ہے ۔ اور تمہارے لئے جو احکام دیتا ہے وہ ایسے ہوتے ہیں کہ تم ان پر عمل کر سکتے ہو اور وہ تمہارے لیے مفید ہوتے ہیں ۔ لہٰذا انہی چیزوں کو حرام کرو جو اللہ نے حرام کیں ۔ اور جو اللہ نے حلال کی ہیں ان کو حرام نہ کرو ۔ یہ مناسب نتیجہ ہے ۔

اس کے بعد روئے سخن اس بات کی طرف ہے جو آپ نے فرمائی تھی لیکن اس کی تفصیل نہیں بتائی گئی ۔ کیونکہ نفس بات اس قدر اہم نہ تھی ۔ اور نہ کوئی ایسی بات تھی جس کا قیامت تک تاریخی ریکارڈ پہ لانا ضروری تھا ۔ بس جس چیز کو

باقی رکھنا مطلوب تھا' وہ پاس بات کے آثار و نتائج تھے ۔

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا (٦٦ : ٣) "(اور یہ معاملہ بھی قابل توجہ ہے کہ) نبیؐ نے ایک بات اپنی ایک بیوی سے راز میں کہی تھی"۔

عجیب زمانہ تھا یہ کہ لوگوں کی روز مرہ کی زندگی میں بھی عالم بالا سے بر ملا مداخلت ہو رہی تھی ۔ معلوم یہ ہوا کہ اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بتا دیا کہ جو راز ایک بیوی کے حوالے کیا گیا تھا' اس تاکید کے ساتھ کہ کسی اور کو پتہ نہ چلے' وہ اس نے دوسری کو بتا دیا ہے ۔ اور نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جب اس راز دار بیوی سے بات کی تو صرف اشارہ کر دیا گیا کہ تم نے راز کو راز نہیں رکھا ۔ پوری تفصیل نہ بتائی کہ تم نے یہ یہ باتیں دوسری بیوی سے کیں اور یہ آپ کے مکارم اخلاق کا تقاضا تھا کہ کسی کو زیادہ شرمندہ نہ کیا جائے ۔ آپ نے یہ بتا دیا کہ مجھے عالم بالا سے خبر آگئی ہے ۔

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِہٖ وَاَظْہَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ عَرَّفَ بَعْضَہٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَھَا بِہٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ ھٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ (٦٦ : ٣) "پھر جب اس بیوی نے (کسی اور پر) وہ راز ظاہر کر دیا' اور اللہ نے نبیؐ کو اس (افشائے راز) کی اطلاع دے دی' تو نبیؐ نے اس پر کسی حد تک (اس بیوی کو) خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے درگزر کیا ۔ پھر جب نبیؐ نے اسے (افشائے راز کی) یہ بات بتائی تو اس نے پوچھا آپ کو اس کی کس نے خبر دی؟ نبیؐ نے کہا" مجھے اس نے خبر دی جو سب کچھ جانتا ہے اور خوب باخبر ہے"۔

یہ خبر چونکہ دو بیویوں کے درمیان ان کی جتھہ بندی کی وجہ سے پھیلی ہوئی تھی' تو خبر پھیلانے والی بیوی کو شرمندہ کرنے کے لیے بس اشارہ ہی کافی تھا ۔ ایسے مواقع میں اللہ کے علم اور اللہ کی خبر دادی کی طرف اشارہ بہت ضروری ہے کیونکہ ایسی غلطی تب ہی سرزد ہوتی ہے کہ انسان اللہ کے علم و خبرداری سے غافل ہو جائے یا اسے بھول جائے ۔ اس لیے قرآن مسلمانوں کو متنبہ کرتا ہے ۔ کہ تمہاری نادانیاں اللہ کے علم میں بہرحال ہیں ۔

اب یہاں انداز کلام حکایت سے خطاب کی طرف آجاتا ہے' اور جن دو ازواج نے یہ کام کیا تھا' ان سے خطاب کیا جاتا ہے ۔ گویا بات ان کے سامنے ہو رہی ہے ۔

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَی اللّٰہِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا وَاِنْ تَظٰھَرَا عَلَیْہِ فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ مَوْلٰىہُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَہِیْرٌ (٦٦ : ٤) "اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو (تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے) کیونکہ تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں ۔ اور اگر نبیؐ کے مقابلے میں تم نے جتھہ بندی کی تو جان رکھو کہ اللہ اس کا مولیٰ ہے اور اس کے بعد جبریل اور تمام صالح اہل ایمان اور سب ملائکہ اس کے ساتھی اور مددگار ہیں"۔

آغاز خطاب میں ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ توبہ کریں تاکہ ان کے دل اللہ کی طرف مائل ہو جائیں کیونکہ ان کے دل اللہ سے دور ہوگئے تھے۔ جب یہ دعوت دے دی جاتی ہے تو پھر ان پر ایک خوفناک تنقید کی جاتی ہے۔ نہایت رعب دار آواز میں :

اس زبردست تنقید سے معلوم ہوتا ہے کہ حادثہ اور واقعہ جو بھی تھا مگر رسول اللہ کے قلب مبارک پر اس کا گہرا اثر تھا۔ چنانچہ اللہ کو اعلان کرنا پڑا کہ اللہ ' ملائکہ اور صالح مومنین اس کے لیے کافی طرفدار ہیں۔ اس اعلان سے ' حضور اکرم ﷺ کا غبار خاطر دور ہو جاتا ہے اور آپ مطمئن ہو جاتے ہیں۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ واقعہ جو بھی ہو ' لیکن حضور ﷺ پر اس واقعہ کا گہرا اثر تھا۔ حضور اپنے گھروں میں اس قسم کے ماحول کی توقع نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر ﷺ کے پڑوسی انصاری نے ' اس واقعہ کی جو رپورٹ دی ' وہ اس قدر خوفناک تھی کہ اس کے قول کے مطابق غسانیوں کے حملے سے بھی بڑی بات ہوگئی ہے۔ غسانیوں کی اس وقت شام پر حکومت تھی۔ اور وہ سلطنت روم کے موالی تھے۔ ان کے ان کے ساتھ دوستی کے معاہدے تھے۔ اس دور میں مدینہ پر غسانیوں کا حملہ آور ہونا بہت ہی خطرناک بات تھی۔ لیکن مسلمانوں کے لیے رسول اللہ کا پریشان اور بے قرار ہونا غسانیوں کے حملے سے بھی بڑی بات تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھرانے کی سلامتی سب سے بڑی بات تھی۔ اور آپ ؐ کا اضطراب لوگوں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خیر القرون کے یہ لوگ معاملات کو کس زاویہ سے دیکھتے تھے۔ جس طرح اس انصاری نے اس واقعہ کو ایک عظیم واقعہ سمجھا۔ اسی طرح اللہ نے بھی اسے سمجھا ان حضرات کی سوچ خدا اور رسول ؐ کی سوچ کی سمت اختیار کر چکی تھی۔

پھر اگلی آیت میں ان کو نہایت ہی صراحت کے ساتھ بتایا گیا کہ نبی کریم ﷺ کے لیے اور آپ کے گھرانے کے لائق کیسی خواتین درکار ہیں۔ اگر تمہیں طلاق دے دی گئی تو تم سے بہتر اور ان صفات والی خواتین تمہاری جگہ لیں گی :

عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا (٦٦ : ٥) "بعید نہیں کہ اگر نبی تم سب بیویوں کو طلاق دے دے تو اللہ اسے ایسی بیویاں تمہارے بدلے میں عطا فرما دے جو تم سے بہتر ہوں۔ سچی مسلمان ' باایمان ' اطاعت گزار ' توبہ گزار ' عبادت گزار اور روزہ دار ' خواہ شوہر دیدہ ہوں یا باکرہ"۔

اشارتاً ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہیں تو ایسا ہونا چاہئے ' یعنی تمہیں ایسا مسلمان ہونا چاہئے کہ تم اطاعت شعار ہو اور دین کے احکام کو قائم کرو ' تمہارا ایمان ایسا ہو جو کاسہ دل کو ایمان و یقین سے لبالب کر دے اور تم دل سے خدا و رسول کی اطاعت کرو۔ اور توبہ کرو جس کے معنی یہ ہیں کہ جو ہو چکا اس پر نادم ہو جاؤ اور آئندہ کے لیے اطاعت شعار ہو جاؤ ' ہر وقت عبادت میں مشغول رہو ' سیاحت اور سائحات کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت اللہ کی بڑائی اور کبریائی میں غور کیا جائے۔ اور ان صفات کے ساتھ ساتھ وہ شوہر دیدہ بھی ہوں گی اور باکرہ بھی ہوں گی۔ جس طرح کہ موجودہ ازواج مطہرات میں دونوں قسم کی خواتین ہیں۔

یہ ان کے لیے ایک زبردست تادیبی سرزنش تھی کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف جتھہ بندی کی۔ یاد رہے

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم معمولی باتوں پر غصہ نہ فرماتے تھے۔

ان آیات کے نزول سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو تسلی ہوگئی۔ خود رب تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کے اہل بیت کو خطاب فرمایا۔ اور اس زلزلہ کے بعد تو اہل بیت کے اندر بھی سخت پشیمانی ہوگئی اور اللہ کی ہدایات کے بعد سب کچھ درست ہوگیا اور یہ اس گھرانے کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کہ اللہ تعالیٰ خود اس کو مخاطب کرے 'کیونکہ یہ کوئی معمولی گھرانا تو تھا نہیں' اس کی تو ہربات بعد میں آنے والوں کے لیے منہاج حیات تھی۔ ضابطہ اخلاق اور قانون تھی۔

یہ اس ذات کے گھریلو حالات تھے جو ایک امت کی تربیت کر رہا تھا۔ ایک مملکت کی بنیاد رکھ رہا تھا اور یہ ایسی مملکت تھی جس کی کوئی مثال گزری ہوئی تاریخ میں نہ تھی۔ اس جیسا نظام امم سابقہ میں نہ تھا۔ ایک ایسی امت تشکیل پا رہی تھی۔ جو الٰہی نظریہ حیات کو آخری شکل میں پیش کر رہی تھی۔ ایک ربانی معاشرہ وجود میں لایا جا رہا تھا اور ایسا معاشرہ جو قیامت تک کے لیے اسوہ بن رہا تھا۔

پھر ان آیات میں ایک عظیم ' جلیل القدر ' بلند کردار اور کریم انسان کی تصویر ہے۔ ایک ہی وقت میں وہ اپنا انسانی کردار بھی ادا کر رہا ہے اور نبوی کردار بھی ادا کر رہا ہے۔ دونوں کے اندر کوئی بارڈر لائن متعین نہیں کر سکتا۔ کیونکہ تقدیر الٰہی کا فیصلہ یہ تھا کہ تمام رسول بشر ہوں گے۔ اور اس بشر رسول نے انسانیت کو آخری نظام زندگی عطا کرنا تھا' جو قیامت تک کے لیے انسانیت کا منہاج قرار پاتا تھا۔

یہ ایک کامل رسالت تھی ' جسے ایک کامل رسول لے کر آیا تھا۔ اور اس کا کمال یہ تھا کہ یہ رسالت انسان کو انسان بنا رہی تھی۔ وہ انسانی قوتوں میں سے کسی قوت کو دبا نہیں رہی تھی۔ نہ انسان کی تعمیری قوتوں میں سے کسی قوت کو نظرانداز کر رہی تھی۔ انسانی صلاحیتوں میں سے کسی صلاحیت کی بیخ کنی کرنا' اس رسالت کا منشا نہ تھا بلکہ یہ انسانی قوتوں کو زیادہ مہذب ' زیادہ تربیت یافتہ اور زیادہ بلند کرتی تھی۔ یہ تھی آخری رسالت۔

اسلام کو جن لوگوں نے سمجھا اور اپنے آپ کو اسلام کے سانچے میں ڈھالا' اسلام نے ان کو اسی طرح چار چاند لگا دیئے کہ یہ لوگ اسلام کا صحیح ایڈیشن بن گئے۔ اور اسی طرح ان کے نبی کی سیرت اور اس کی عملی زندگی جس میں' انسانی تجربات بھی تھے ' انسانی سعی بھی تھی ' انسانی ناتوانیاں بھی تھیں' انسانی قوتیں بھی تھیں۔ قرآنی دعوت اور ہدایات کے ساتھ مل کر ان لوگوں کو قدم بقدم آگے بڑھایا جس طرح آپ کے اہل خانہ اور ان لوگوں کی زندگیون سے ظاہر ہوتا ہے ' جو آپ کے قریب رہتے تھے ' اور اس طرح یہ جدوجہد کامیاب کوشش بن گئی۔ اور ان زندگیوں میں قیامت تک آنے والوں کے لیے نمونہ لیکن صرف ایسے لوگوں کے لیے ' جو اسے دیکھنا چاہیں ' اور جو عملی دنیا میں رہنے والے ہوں ' صرف اپنے خول اور اپنے خیالات کے محدود دائروں کے اندر بند نہ ہوں' جنہوں نے اپنی آنکھیں بند نہ کی ہوں۔

اس آخری رسالت کو کامل اور مکمل شکل میں نازل کر کے قدرت الٰہیہ نے اسے ایک ایسے رسول کی زندگی میں عملی شکل دی ' جو اس رسالت کو آسمان سے اخذ کرتا تھا ' اور زندہ صورت میں اس کا ترجمہ کرتا تھا۔ یوں قدرت الٰہیہ نے اس رسول آخرالزمان کی زندگی کو 'ایک کتاب مفتوح بنایا کہ آپ کی زندگی سے آنے والی نسلیں بہترین نمونہ اور اسوہ اخذ کریں۔

اس واقعہ کی روشنی میں ' جس کے سبب مسلمانوں کی زندگی پر گہری اثرات مرتب ہو گئے تھے ' اب قرآن کریم مسلمانوں کو یہ ہدایت دیتا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و اولاد کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔ چنانچہ قیامت کا

ایک نہایت ہی موثر منظر بھی ان کے سامنے پیش کیا جاتا کہ وہاں کفار کی حالت کیا ہوگی ۔ جس طرح اس واقعہ میں ازواج کو دعوت دی تھی کہ توبہ کرو اسی طرح یہاں اہل ایمان کو دعوت دی جاتی ہے کہ توبہ کرو اور توبہ کرنے والوں کے لیے اللہ نے جو باغات تیار کر رکھے ہیں وہ بھی بتا دیئے جاتے ہیں ۔ اور جھلک دکھا دی جاتی ہے ۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جاتا ہے کہ کفار اور منافقین سے جہاد کرو ۔ یہ ہے اس سورت کا دوسرا پیراگراف :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا
النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ
اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿٦﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ
اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٧﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً ع
نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ ١٩
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى
بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٨﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ
وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿٩﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو ‘ بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے ‘ جس پر نہایت تند خو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں ۔ (اس وقت کہا جائے گا کہ) اے کافرو ‘ آج معذرتیں پیش نہ کرو ‘ تمہیں تو ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے ۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو ‘ اللہ سے توبہ کرو ‘ خالص توبہ ‘ بعید نہیں کہ اللہ تمہاری برائیاں دور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل فرما دے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی ۔ یہ وہ دن ہو گا جب اللہ اپنے نبیؐ کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں ‘ رسوا نہ کرے گا ۔ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہم سے درگزر فرما ‘ تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۔ اے نبیؐ ‘ کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ ۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے“ ۔

اپنے نفس اور اپنے اہل و عیال کے بارے میں مومن پر عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے ۔ قیامت کے دن کی آگ

موجود ہے ۔ اور اس نے اس سے اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو بچاتا ہے ۔ یہ ایسی دہکتی ہوئی آگ ہے ۔

وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (٦٦ : ٦) "جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے"۔ لوگ اس میں اس طرح ہوں گے جس طرح پتھر پڑے ہوتے ہیں 'سنگ راہ کی طرح کوئی ان کی طرف توجہ نہ کرے گا۔ کس قدر سخت آگ ہوگی کہ اس میں پتھر جلیں گے اور کس قدر سخت عذاب ہو گا اور اہل جہنم کس قدر بے وقعت ہوں گے ۔ جہنم کا سب ماحول نہایت شدید اور خوفناک ہو گا۔

عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ (٦٦ : ٦) "جس پر نہایت تند خو اور سخت گیر فرشتے ہوں گے"۔ ان کا مزاج اس عذاب کی سختی کی طرح سخت ہو گا۔

لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (٦٦ : ٦) "جو کبھی اللہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور 'جو حکم بھی دیا جاتا ہے وہ بجالاتے ہیں"۔ ان کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرتے ہیں ' اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ جو بھی حکم ان کو دیا جاتا ہے وہ اسے کر گزرتے ہیں 'اور وہ اپنی اس قوت اور مضبوطی کی وجہ سے اس آگ پر متعین ہوئے ہیں ۔ لہذا ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس آگ سے اپنے نفس اور دین کو بچائے اور قبل اس کے کہ فرصت کی گھڑیاں ختم ہوں وہ اپنے اور اپنے اہل و عیال اور آگ کے درمیان پردے حائل کر دے ۔

دیکھو وہاں اہل کفر جب اس کے دہانے پر پہنچیں گے 'تو وہ عذرات پیش کریں گے ' اور کوئی عذر نہ سنا جائے گا' بلکہ ان کو وہاں سخت مایوسی ہوگی 'جب سب عذرات رد کر دیئے جائیں گے ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (٦٦ : ٧)

"اے کافرو' آج معذرتیں پیش نہ کرو 'تمہیں تو ویسا ہی بدلہ دیا جارہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے"۔ آج عذرات پیش نہ کرو 'کیونکہ آج عذرات کا دن نہیں ہے ۔ آج تو ہر کسی کو اپنے کیے کا پھل مل رہا ہے ۔ اور تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ آج تمہیں کس چیز کا پھل مل رہا ہے؟

سوال یہ ہے کہ مومنین اپنے نفس کو اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے کس طرح بچائیں ۔ ان کو راستہ بتایا جاتا ہے اور امید دلائی جاتی ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (٦٦ : ٨) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے توبہ کرو' خالص

بعید نہیں کہ اللہ تمہاری برائیاں دور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل فرما دے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ یہ وہ دن ہو گا جب اللہ اپنے نبیؐ کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں' رسوا نہ کرے گا۔ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہم سے درگزر فرما' تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

یہ ہے طریقہ 'خالص توبہ کا۔ توبہ' جو قلب کو پاک و صاف کر دے' اور اس کے بعد کوئی دھوکہ نہ ہو۔ گناہوں سے توبہ یوں ہوتا ہے کہ آدمی نے جو گناہ کیے ہیں' ان پر نادم ہو جائے اور اس کے بعد ان کی جگہ ندامت لے لے۔ یہ توبہ قلب کو پاک کر دیتی ہے اور اس پر معاصی کا جو رنگ ہوتا ہے یا میل ہوتی ہے' وہ دور ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد پھر یہ دل انسان کو عمل صالح پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ ہوتا ہے توبۃ النصوح۔ یعنی ایسی توبہ جو قلب کو یاد دہانی کراتی رہتی ہے اور دوبارہ اسے معاصی کا ارتکاب کرنے نہیں دیتی۔ (مسلسل نصیحت کرنے والی)۔

اگر کوئی اس قسم کی توبہ کرلے تو اس کے بعد اس بات کی امید کی جا سکتی ہے کہ اس توبہ کی وجہ سے سابقہ معاصی بھی معاف ہو جائیں گے' اور توبہ کرنے والا جنتوں میں داخل ہو جائے گا۔ اس دن جب کہ کفار سخت شرمندہ ہوں گے اور اس دن نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل ایمان شرمندہ نہ ہوں گے۔

یہاں اللہ نے مومنین کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ضم کیا ہے۔ یہ اس لیے کہ ان کو توبہ پر آمادہ کیا جائے کہ "دیکھو اس دن تمہارے لیے اس قدر حوصلہ افزائی ہو گی کہ تم حضرت نبی کریم ﷺ کی صف میں کھڑے ہو گے اور تمہاری عزت ہو گی اور تمہیں شرمندہ نہ کیا جائے گا۔ اور اس دن تمہارے آگے آگے ایک نور جا رہا ہو گا"۔

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ (۸:۶۶) "ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا" اس دن وہ اس نور کے ساتھ پہچانے جائیں گے یہ دن تو بہت ہی خوفناک' طوفانی اور دل دہلا دینے والا ہو گا۔ جس میں ہر طرف اژدحام ہی اژدحام ہو گا اور ان کو یہ اعزاز ہو گا کہ جنت میں داخلے کے وقت ان کے آگے آگے اور دائیں جانب ایک نور جا رہا ہو گا۔ اس نور کے ساتھ وہ جنت میں جائیں گے' جہاں نور علی نور ہو گا۔

اہل ایمان اگرچہ اس شدید اور خوفناک مقام میں ہوں گے' لیکن ان کو وہاں یہ دعا اور عرضداشت اللہ کے سامنے پیش کرنے کی ہمت ہو گی۔

يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۸:۶۶) "اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے' اور ہم سے درگزر فرما تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ اس وقت جب زبانیں گنگ ہوں گی اور دل بیٹھ رہے ہوں گے' اس خوفناک موقف میں ایسی دعا اہل ایمان کو سکھانا ہی اس بات کی علامت ہے کہ یہ منظور ہو گی۔ یہ تو سکھائی ہی اس لیے گئی کہ منظور ہو۔ کیونکہ یہ دعاء بھی اللہ ان کو بطور احسان سکھا رہا ہے' جس طرح نور اس کی عزت افزائی کے لیے دوڑ رہا ہو گا۔

یہ عذاب اور یہ ثواب دراصل ایک مومن کی ذمہ داری کا تعین کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو اور خاندان کو بچانے کے سلسلے میں مومن پر کس قدر عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ خصوصاً جبکہ یہ ہدایات اس واقعہ کے ضمن میں دی جا رہی ہیں

جونہی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں پیش آیا کہ ایک مومن اپنے خاندان کی ہدایت اور تربیت کا ذمہ دار ہے ۔جس طرح وہ اپنی اصلاح کا مکلف ہے اپنے اہل و عیال کی اصلاح کا بھی مکلف ہے ۔

یاد رہے کہ اسلام ایک خاندانی نظام ہے' جیسا کہ ہم نے سورہ طلاق میں کہا' مومن پر اس کے گھرانے کی اصلاح کی ذمہ داری ہے ۔کیونکہ ایک مومن گھرانہ اسلامی جماعت کا پہلا خلیہ ہے ۔ اور اسی خلیے سے پھر اسلامی جماعت میں دوسرے زندہ خلیے پیدا ہوتے ہیں ۔ ہرایک گھر اسلامی نظریہ حیات کا حلقہ یا مورچہ ہے ۔ یہ حلقہ اپنی بناوٹ میں بہت ہی مضبوط ہونا چاہئے ۔ اس حلقے کا ہر فرد سرحدوں پر دفاع میں مصروف ہونا چاہئے ۔اگر یہ مورچہ مضبوط نہ ہو گا تو دشمن اندر گھس آئے گا اور کوئی دفاع ممکن نہ ہو گا ۔

مومن داعی کا فرض ہے کہ وہ اپنی دعوت پہلے اپنے گھر سے شروع کرے ۔ اور اندر سے یہ قلعہ مضبوط ہو' اور اس قلعے سے باہر نکلنے سے پہلے وہ گھر کے اندر کے قلعے کے تمام سوراخ بند کر دے ۔ایک گھرانے کی حفاظت تب ہی ہو سکتی ہے جب کسی گھر میں ماں بھی مسلمہ ہو' صرف باپ اس قلعے کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ ماں اور باپ دونوں مل کر لڑکے لڑکیوں کو درست کر سکتے ہیں ۔ اس لیے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ میں صرف مردوں سے اسلامی سوسائٹی تشکیل دینا چاہتا ہوں تو یہ ممکن نہیں ہے ۔ اسلامی انقلاب کے لیے مومن عورتوں کی بھی ضرورت ہے تاکہ وہ آنے والی نسل کی تربیت اسلامی خطوط پر کر سکیں ۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن جس طرح مردوں کے لیے نازل ہوا' اسی طرح عورتوں کے لیے نازل ہوا۔ وہ مردوں کی تنظیم کے ساتھ گھرانوں کی تنظیم بھی کر رہا تھا۔ گھرانوں کو اسلامی منہاج پر استوار کر رہا تھا۔ اس لیے اس نے ایک مسلمان پر اس کی دینی ہدایت اور اہل و عیال کی ہدایت کی ذمہ داری عائد کی ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ( ٦٦ : ٦ ) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنے نفس اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ"۔

یہ وہ نکتہ ہے کہ اس کو وہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں جو لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دیتے ہیں ۔ اصلاح کے کام کا آغاز اپنی بیوی سے شروع کرنا چاہئے ۔ ماں سے' اس کے بعد اولاد کی طرف بڑھنا چاہئے اور پھر اپنے تمام رشتہ داروں تک ۔ نہایت کوشش کرنی چاہئے کہ ہم ایک مسلم خاتون پیدا کر لیں' جس سے مسلمان پیدا ہوں' جو شخص ایک مسلم گھرانا تعمیر کرنا چاہتا ہے' اس کا فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے ایک مسلم خاتون کی تلاش کرے' اگر ہم گھر کی مالکہ مسلم پیدا نہ کر سکے' تو یاد رہے کہ اسلامی جماعت اور اسلامی سوسائٹی کی تشکیل میں بہت دیر لگے گی ۔ اور ہماری جماعت کی اساسوں اور بنیادوں کے اندر کمزوریاں ہوں گی ۔

پہلی جماعت اسلامی کے اندر تو یہ کام بہت ہی آسان تھا کیونکہ مدینہ میں ایک ایسا اسلامی معاشرہ وجود میں آگیا تھا' سوسائٹی پر پاکیزہ خیالات غالب تھے ۔ اسلامی شریعت کا ساتھ ساتھ نفاذ ہو رہا تھا۔ اور مرد اور عورتیں سب کے سب اللہ اور رسول کی طرف اپنے مسائل لے کر رجوع کرتے تھے ۔ اور اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حکم پر کان دھرتے تھے ۔ اور جب کوئی حکم نازل ہوتا تھا تو وہ آخری فیصلہ ہوتا تھا۔ اس وقت اسلامی سوسائٹی موجود تھی پھر غالب تھی اور ان حالات میں عورت کے لیے بھی یہ بات آسان تھی کہ وہ اپنے آپ کو اسلامی خطوط پر ڈھال لے ۔ خاوندوں کے

لیے بھی آسان تھا کہ وہ ان کو نصیحت کریں اور بچوں کی تربیت کریں۔

لیکن ہم تو نہایت ہی بدلے ہوئے حالات میں ہیں۔ہم ایک مکمل جاہلی معاشرے میں زندہ رہ رہے ہیں۔قانون جاہلی کا غالب ہے۔اخلاق جاہلیت'علم و ثقافت جاہلی ہیں۔اور آج عورت بھی اس جاہلی معاشرے میں کام کر رہی ہے۔ آج جب عورت اسلام کی دعوت پر لبیک کہنے کا ارادہ بھی کرلے تو وہ اس میں بہت بڑا بوجھ محسوس کرتی ہے' چاہے وہ خود اسلام کی طرف بڑھنا چاہے یا اس کا خاوند اور باپ اسے اسلام کی طرف بڑھانے کی ہدایت کریں۔

قرن اول میں مرد عورت اور معاشرے ایک ہی تصور کے زیرنگیں تھے۔ان پر اسلام کی حکمرانی تھی'شکل ایک تھی اور اسلام عمل میں موجود اور نافذ تھا۔آج مرد مومن کی حالت یہ ہے وہ ایک ایسے ایمانی تصور کی حکمرانی چاہتا ہے جو عملاً موجود نہیں ہے۔اور معاشرہ عملاً جاہلیت کا معاشرہ ہے۔اس معاشرے کا دباؤ مرد کے مقابلے میں عورت پر زیادہ ہے۔ جدید معاشرہ عورت کو بڑی تیزی سے گمراہ کر رہا ہے۔

اس نکتے پر آکر پھر مرد کی ذمہ داری بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔اس لیے اسے خود اپنے آپ کو بھی بچانا ہے اور اپنے اہل و عیال کو بھی بچانا ہے'پھر ایسے حالات میں کہ بیوی اور بچے ایسے ماحول میں گھرے ہوئے ہیں کہ ان پر ہر طرف سے جاہلیت کا حملہ ہے۔

اس لیے آج کے مسلمان کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس کو اصلاح کے لیے قرن اول کی جماعت مسلمہ کے مقابلے میں ہزار ہا گنا زیادہ جدوجہد کرنی ہوگی'اس لیے جو شخص آج کے دور میں کوئی اسلامی قلعہ تعمیر کرنا چاہتا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ ایک ایسا گھر تعمیر کرنے کے ارادے سے پہلے اپنے لیے اس قلعے کا ایسا چوکیدار تلاش کرے'جس کے تصورات اور نظریات ویسے ہی ہوں جیسے اس کے اپنے تصورات ہوں۔اس سلسلے میں ایک انقلابی خاوند کو پھر کچھ قربانیاں دینی ہوں گی۔پہلی قربانی یہ ہوگی کہ وہ خوبصورت کی تلاش نہ کرے'مالدار کی تلاش نہ کرے'جھوٹی ملمع کاری پر خوش نہ ہو۔اسے چاہئے کہ وہ دین دار عورت کی تلاش کرے جو اس کے ساتھ مل کر'ایک مسلم گھرانے کی تشکیل کرے اور ایک مسلم قلعے کی تعمیر کرے۔اور بچوں کے جو باپ ہیں ان کا بھی فرض ہے کہ وہ جو قلعے بناتے ہیں وہ بھی اپنی اولاد اور اہل و عیال کی طرف متوجہ ہوں۔کسی دوسرے کو دعوت دینے سے پہلے اپنے بچوں' بیٹوں' بیٹیوں اور پوتیوں کی طرف توجہ کریں۔اور اللہ جو پکار کر کہہ رہا ہے'اس پر عمل کریں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ( ٦٦ : ٦ ) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنے نفس اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ"۔

ایک بار پھر میں اس بات کی طرف آتا ہوں کہ اسلام ایک ایسی سوسائٹی تعمیر کرنا چاہتا ہے جس کے اوپر اسلام کی حکمرانی ہو'جس کے اندر اسلام کا واقعی وجود ہو۔اس کا طریق کار اسلام نے یہ اختیار کیا ہے کہ ایک ایسی جماعت ہو جس کا عقیدہ اسلام ہو'جس کا نظام اسلام ہو'جس کا قانون اسلامی ہو'جس کا منہاج زندگی اسلامی ہو' اور وہ اپنے تمام تصورات تعلیمات اسلام سے اخذ کرے۔

اسلامی تصور حیات کی کا خزانہ یہ جماعت ہوتی ہے۔یہ اس کی محافظ ہوتی ہے اور یہ اسے دوسروں تک منتقل کرتی ہے۔اور ہر قسم کے جاہلی دباؤ کے مقابلے میں یہ اس کا دفاع کرتی ہے اور اس جماعت کو اس اذیت سے بچاتی ہے۔

لہٰذا ایک اسلامی جماعت یا اسلامی سوسائٹی کا قیام ضروری ہے' جس کے اندر ایک مسلمہ زندہ رہے اور اس پر اس کے ماحول کی جاہلیت کا اثر نہ ہو' دباؤ نہ ہو' اس طرح یہ عورت اسلامی تقاضوں اور جاہلیت کے مطالبات کی کشمکش سے باہر نکل آئے گی ۔ ایسے حالات میں اگر ایک مسلم مرد نوجوان اور یہ مسلمہ مل کر ایک اسلامی قلعہ تعمیر کریں تو ایسے قلعوں سے اسلامی بلاک اور اسلامی محاذ تشکیل پا سکتا ہے ۔

یہ ایک ضرورت ہے' فرض ہے' محض نفل نہیں ہے کہ ایک ایسی اسلامی سوسائٹی قائم ہو' جو باہم ایک دوسرے کو حق اور اسلام کی نصیحت کرے' اپنی فکر کو نشوونما دے' اپنے اخلاق و آداب کو عملاً جاری کرے اور اس سوسائٹی کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ اسلامی رنگ میں زندہ رہیں ۔ اسلام کے لیے زندہ ہوں' اسلام کے محافظ ہوں' اسلام کے داعی ہوں ۔ اور اہل جاہلیت میں سے جن کو وہ اپنی سوسائٹی کی طرف بلائیں ان کو نظر آئے کہ ان لوگوں کی جماعت اور ان کی سوسائٹی کے اندر ایک زندہ اسلام ہے تاکہ وہ اندھیروں سے اللہ کے حکم سے نور کی طرف نکل آئیں اور یہ سوسائٹی اسی طرح بڑھتی رہے کہ اللہ اسلامی انقلاب برپا کر دے اور پھر آئندہ اسلامی انقلاب کے رنگ میں اس جماعت اور اس کے زیر تربیت آئندہ نسلیں تیار ہوں ۔

مدینہ میں مسلمانوں نے ایسی ہی جماعت بنائی تھی' اور ایسا ہی انقلاب برپا کر دیا تھا' اس لیے یہاں اس کے بچانے کی ہدایت کی جاتی ہے' کیونکہ کفار اور منافقین اس کو ختم کرنا چاہتے تھے ۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ( ٦٦ : ٩ ) "اے نبیؐ' کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ ۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے"۔ پہلے یہ حکم دیا گیا کہ مسلمان اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم سے بچائیں' خالص توبہ کریں جس کی وجہ سے ان کے گناہ معاف ہوں گے ۔ اور وہ جنتوں میں داخل ہوں گے' جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں ۔ اب حکم یہ ہے کہ کفار و منافقین کے ساتھ جنگ کرو' اس لیے کہ وہ اس قسم کی اسلامی سوسائٹی کے قیام سے خائف ہیں' جس میں اسلام کے شیدائی تیار ہوں ۔ وہ اس قسم کی سوسائٹی پر حملہ آور ہوتے ہیں ۔ جیسا کہ مدینہ میں بھی کفار اور منافقین کا یہی ہدف تھا اور آج بھی یہی ہے اور آئندہ بھی یہی ہو گا ۔

یہاں کفار اور منافقین دونوں کے ساتھ جہاد اور سختی کا حکم دیا گیا ہے ۔ کیونکہ دونوں اسلامی سوسائٹی کے انہدام کے لیے ایک ہی جیسے مقاصد رکھتے ہیں ۔ لہٰذا دونوں پر سختی کی ضرورت ہے ۔

وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ( ٦٦ : ٩ ) ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے"۔ یوں ان دونوں باتوں کے درمیان ربط ہو جاتا ہے ۔

اس کے بعد اب تیسرا دور آتا ہے ۔ اس سورت کا یہ آخری دور ہے ۔ اور یہ تیسرا دور بھی پہلے دور کا تکمیلی دور ہے ۔ یہ انبیاء کے گھروں میں کافر عورتوں اور کفار کے گھروں میں مومن عورتوں کی بات کرتا ہے ۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ

امْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا
فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ﴿١٠﴾
وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ
عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿١١﴾ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ ١
رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ﴿١٢﴾ ع ع
٢٠

"اللہ کافروں کے معاملہ میں نوح علیہ السلام ..... اور لوط علیہ السلام ..... کی بیویوں کو بطور مثال پیش کرتا ہے ۔ وہ ہمارے دو صالح بندوں کی زوجیت میں تھیں 'مگر انہوں نے اپنے ان شوہروں سے خیانت کی اور وہ اللہ کے مقابلہ میں ان کے کچھ بھی نہ کام آ سکے ۔ دونوں سے کہہ دیا گیا کہ جاؤ آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی چلی جاؤ اور اہل ایمان کے معاملہ میں اللہ فرعون کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے ۔ جب کہ اس نے دعا کی "اے میرے رب' میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچالے اور ظالم قوم سے مجھ کو نجات دے"۔ اور عمران کی بیٹی مریم کی مثال دیتا ہے جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی تھی 'پھر ہم نے اس کے اندر اپنی طرف سے روح پھونک دی' اور اس نے اپنے رب کے ارشادات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزار لوگوں میں سے تھی"۔

حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیویوں کے بارے میں جو یہ آیا ہے کہ انہوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی' اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے خاوندوں کی دعوت کے خلاف کام کیا ۔ یہ نہ تھا کہ وہ کسی فحاشی کی مرتکب ہوئی تھیں ۔ نوح علیہ السلام کی بیوی بھی دوسرے مزاح کرنے والوں کے ساتھ اپنے شوہر کے ساتھ مزاح کرتی تھی ۔ اور لوط علیہ السلام کی بیوی نے ان کے مہمانوں کی اطلاع اوباشوں کو دی' حالانکہ اس کو معلوم تھا کہ حضرت لوط علیہ السلام اس بدفعلی کے خلاف ہیں ۔

فرعون کی عورت کے بارے میں یہ بات منقول ہے کہ یہ مومنہ تھی ۔ شاید یہ ایشیائی ہوگی اور دین موسیٰ کو ماننے والی ہوگی ۔ تاریخ میں آتا ہے کہ بادشاہ مصر امنحوتب چہارم کی والدہ ایشیائی تھیں اور یہ مصریوں کے دین پر نہ تھیں ۔ یہ وہی بادشاہ تھا جس نے مصریوں کے لیے ایک خدا تجویز کیا اور سورج کی ٹکیہ کو اس کے لیے رمز بنایا اور اس نے اپنے آپ کو اخناتون کا لقب دیا ۔ بہرحال یہ عورت مراد ہے' یا موسیٰ علیہ السلام کا جو فرعون تھا اس کی بیوی مراد ہے ۔ موسیٰ علیہ السلام کا فرعون امنحوتب نہ تھا ۔

یہاں ہمیں فرعون کی عورت کی تاریخی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے ۔ قرآن کریم نے جو اشارہ کر دیا ہے وہ کافی ہے ۔ نام یا اشخاص تو اصولوں کے لیے مثال ہوتے ہیں ۔ قرآن کریم نام اور اشخاص اکثر ترک کرتا ہے ۔ یہ حکم دینے کے بعد کہ

اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو بچانے کی سعی کرو' یہ اصول بہرحال دہرایا جاتا ہے کہ ہر شخص اپنے کیے کا ذمہ دار خود ہے۔ ازواج مطہرات اور ازواج مومنین سے کہا جاتا ہے' اپنے انجام کی فکر کرو' محض اس لیے کسی کو نہ چھوڑا جائے گا کہ وہ نبی کا بیٹا ہے یا وہ نبی کی بیوی ہے یا کسی صالح شخص کا بیٹا ہے یا بیوی ہے۔

ذرا دیکھو نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی بیویوں کو۔

كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّ قِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ (٦٦ : ١٠) "وہ ہمارے دو صالح بندوں کی زوجیت میں تھیں' مگر انہوں نے اپنے ان شوہروں سے خیانت کی اور وہ اللہ کے مقابلہ میں ان کے کچھ بھی نہ کام آسکے۔ دونوں سے کہہ دیا گیا کہ جاؤ آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی چلی جاؤ"۔ کفر کے معاملے میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہے اور نہ کفر و ایمان میں کوئی سفارش چلتی ہے۔ اگر اسلامی نظریہ حیات کے ساتھ کوئی خیانت کرے گا تو وہ نبی کی بیوی کیوں نہ ہو' جہنم رسید ہو گی۔

دیکھئے فرعون کی بیوی کو' کفر کا طوفان متاثر نہ کر سکا حالانکہ وہ اس طوفان میں زندگی بسر کر رہی تھی' فرعون کے محل میں۔ وہ اس سے نجات طلب کرتی تھی اور حقیر فرعون کے مقابلے میں جنت میں محل چاہتی تھی۔ اور وہ فرعون کے کفر کے ساتھ نہ تھی' اس سے نجات طلب کر رہی تھی' اور اس کی خواہشات یہ تھیں:

اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (٦٦ : ١١) "جب اس نے کہا اے میرے رب' میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچالے اور ظالم قوم سے مجھ کو نجات دے"۔

فرعون کی مومنہ بیوی کی دعا ایک مثال ہے اس بات کی کہ جب ایمان راسخ ہو جاتا ہے تو ایک مومنہ دنیا کی اعلیٰ ترین زندگی پر لات مار دیتی ہے۔ فرعون مصر اپنے دور میں دنیا کے بڑے بادشاہوں میں شمار ہوا کرتا تھا۔ اور قصر فرعون میں ایک عورت سب سے اونچا ساز و سامان پاتی ہے۔ لیکن ایمان کی وجہ سے وہ اس سے بھی اونچی پرواز کرتی ہے۔ وہ اسے عیش و عشرت نہیں سمجھتی بلکہ ایک گندگی سمجھتی ہے۔ اور اس زندگی سے پناہ مانگتی ہے اور چاہتی ہے کہ وہ اس سے نجات پائے۔

یہ ایک نہایت ہی عظیم مملکت کی خاتون اول ہے۔ اور یہ اس کی عظیم امتیازی خصوصیت ہے' کیونکہ عورت ہمیشہ معاشرتی دباؤ اور اثر کو قبول کرتی ہے لیکن یہ اکیلی عورت اس عظیم دباؤ کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑی ہے۔ اس پر معاشرے کا دباؤ ہے' اس پر محل کا دباؤ ہے' اس پر مملکت کا دباؤ ہے' اس پر بادشاہ کے وزراء اور حاشیہ نشینوں کا دباؤ ہے' اور اس پر بادشاہ کی ملکہ ہونے کے منصب کا دباؤ ہے' لیکن اس ہمہ جہت دباؤ کے مقابلے میں' یہ عظیم عورت اپنا سر آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے ہے' اور کفر کے اس عظیم سمندر کے اندر ایک چھوٹے سے تختے پر بیٹھی ہے اور اس کا دامن ان تمام آلودگیوں سے تر نہیں ہو رہا ہے۔ کس قدر عظیم ہے وہ!!

اللہ کے لیے خالص ہو جانے کی یہ ایک نہایت ہی اعلیٰ مثال ہے' کہ وہ تمام موثرات کا مقابلہ کر رہی ہے۔ تمام

تعلقات کا مقابلہ کر رہی ہے' تمام رکاوٹوں کو عبور کر رہی ہے ـ یہی وجہ ہے کہ اللہ کی لازوال کتاب میں وہ اپنا نام لکھوا گئی ـ اور جب اس کتاب کے نزول کے وقت اس عورت کا نام پکارا جا رہا ہو گا کہ اس عظیم کائنات کی لامحدود وادیوں میں اس کی گونج بجی ہو گی ـ

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ (۶۶ : ۱۲) "عمران کی بیٹی مریم" یہ بھی آغاز ہی سے پارسا خاتون تھیں ـ قرآن کریم نے دوسری سورتوں میں ان کی تعریف کی ہے ـ یہاں ان کی پاکیزگی سیرت کی بات ہے ـ

الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (۶۶ : ۱۲) "جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی تھی" ـ یہودی آپ پر الزامات عائد کرتے تھے' قرآن کریم آپ کی برات کا اعلان کرتا ہے ـ

فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (۶۶ : ۱۲) "پھر ہم نے اس کے اندر اپنی طرف سے روح پھونکی" ـ اور اس روح کے نتیجے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے' جیسا کہ سورہ مریم میں اس کی تفصیلات گزر گئی ہیں ـ یہاں ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ـ کیونکہ یہاں مقصد صرف آپ کی طہارت اور آپ کے ایمان کامل کو ثابت کرنا ہے ـ

وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ (۶۶ : ۱۲) "اور اس نے اپنے رب کے ارشادات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزار لوگوں میں سے تھی" ـ

یہاں امراۃ فرعون کا علیحدہ ذکر کرنا' پھر اس کو حضرت مریم علیہ السلام کے ساتھ برابری کی سطح پر ذکر کرنا' اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کے نزدیک فرعون کی بیوی کا مرتبہ بھی بہت بلند تھا' کیونکہ وہ نہایت ہی مشکل حالات میں راہ ایمان پر جمی ہوئی تھی ـ بہرحال نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات کے سامنے یہ دو نمونے رکھے جاتے ہیں کہ آپ لوگوں کا کردار اس قدر بلند ہونا چاہئے اور اہل ایمان کو قیامت تک یہ بتایا جاتا ہے کہ اسلامی سوسائٹی کو قائم کرنا ہے تو اس کے لیے باکردار اور مسلم خواتین پیدا کرو ـ

بہرحال آخر میں ہم دوبارہ اس طرف قارئین کی توجہ مبذول کراتے ہیں کہ یہ سورت اور یہ پورا پارہ بہترین اور زندہ مثال ہے نبی کریم کی سیرت کی ـ اور ان سورتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام اور صحابیات کی جو جماعت تیار کی' تاریخ انسانی میں اس کی مثال نہیں ہے ـ پھر قرآن کریم نے سیرت النبی کے واقعات کو جس انداز میں بیان کیا ہے وہ قرآن کا منفرد انداز ہے ـ ایک جزوی واقعہ کو مخصوص حالات سے نکال کر اور زمان و مکان کا رنگ اڑا کر قرآن اس کو ایک ابدی اصول کے طور پر پیش کرتا ہے ـ یہ کام قرآن ہی کر سکتا ہے ـ پڑھنے والا اسے ایک واقعہ کے پس منظر میں پڑھ کر سمجھتا ہے' لیکن قرآن اس سے جو نتائج اخذ کرتا ہے' وہ کلی ہوتے ہیں ـ

صدق اللہ العظیم

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۲۹

## سورہ الملک - ٦۷

## ۱ -- تا -- ۳۰

# سورۃ الملک ایک نظر میں

یہ پورا پارہ ہی مکی سورتوں پر مشتمل ہے جیسا کہ اس سے پہلے کا مکمل پارہ مدنی سورتوں پر مشتمل تھا۔ مکی اور مدنی سورتوں کا اپنا اپنا ذوق اور اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اس پارے کی بعض سورتوں کے ابتدائی حصے ایسے ہیں جو ابتدائی حصے کے ٹکڑے ہیں مثلاً سورہ المزمل اور سورہ المدثر کی ابتدائی آیات۔ ان میں سے بعض سورتیں ایسی ہیں جو بعثت کے تین سال بعد نازل ہوئی ہیں' مثلاً سورہ القلم بعض بعثت کے دس سال بعد نازل ہوئی ہیں' جیسا کہ سورہ جن' جس کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ یہ سفر طائف سے واپسی پر نازل ہوئی' جہاں آپ کو بنو ثقیف نے بہت ہی اذیت دی۔ اللہ نے جنوں کا ایک طائفہ آپ کی طرف موڑ دیا' اس وقت آپ نہایت دل سوز انداز میں قرآن پڑھ رہے تھے۔ سورہ الجن میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے' جو اسی پارے میں ہے۔ طائف کا سفر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابو طالب کی وفات کے بعد ہوا' یعنی ہجرت سے ایک سال قبل یا دو سال قبل' اگرچہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ سورت آغاز بعثت میں نازل ہوئی ہے اور یہی راجح ہے۔

مکی قرآن کا موضوع اور محور بالعموم اسلامی عقیدۂ توحید' وحی الٰہی پر یقین اور آخرت کے حساب و کتاب پر یقین ہوتا ہے۔ اس تصور کے مطابق پھر اس کائنات کے بارے جو نظریہ بنتا ہے اور اس پوری کائنات اور خالق کائنات کا باہم تعلق اور خالق کائنات کی ایسی تعریف کی۔ خالق کائنات کا شعور انسانی تصور اور عقائد میں زندہ' موثر اور فعال ہو اور یہ تصور انسان اور خدا کے درمیان عبد و معبود کا تعلق قائم کرتا ہو۔ پھر اس تصور کے مطابق ایک بندہ اس دنیا کی تمام اشیاء کی قدر و قیمت متعین کرتا ہو۔ اس سے قبل کی مکی سورتوں میں اس قسم کے افکار ہم نے مطالعہ کیے ہیں۔ اس پارے میں بھی "آفاقی ایمان" کے نمونے موجود ہیں۔

یہ تو تھا موضوع اور حال مکی قرآن کا۔ رہا مدنی قرآن تو اس کا موضوع' ان عقائد تصورات اور پیمانوں کے مطابق عملی زندگی اور نظام کی تشکیل ہے۔ مدینہ میں اہل ایمان کو زندگی کی عملی کشمکش میں ڈال کر دین اور شریعت کی امانت اٹھانے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ مدنی قرآن ایک کشمکش پیہم ہے جو ایمان و ضمیر کے میدان میں بھی ہے اور زندگی کے عملی مظاہر میں بھی ہے۔ اس عملی کشمکش کا مطالعہ ہم نے اس سے قبل مدنی سورتوں میں کیا ہے اور خصوصاً گزشتہ پارے میں اس کی بڑی تفصیلات مطالعہ کیں۔

یہ سورت اس کائنات کے بارے میں انسان کو بالکل ایک نیا تصور دیتی ہے اور یہ متعین کرتی ہے کہ اس کا خالق کائنات سے تعلق کس نوعیت کا ہے۔ یہ تصور نہایت وسیع اور جامع اور مانع ہے۔ یہ اس زمین کے چھوٹے سے کرے سے بہت زیادہ متجاوز اور وسیع ہے۔ اور اس دنیا کی مختصر زندگی سے بھی متجاوز اور وسیع ہے۔ اسی سلسلے میں انسان کو بتایا جاتا ہے کہ آسمانوں میں بڑے بڑے جہاں آباد ہیں اور اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے اور انسانوں اور پرندوں کے علاوہ اور مخلوقات بھی ہیں مثلاً جن' اور اس جہاں کے بعد دوسرا جہاں بھی ہے' جہاں جنتیں اور ان کے خدم و حشم اور نوکر

جاکر اور دوزخ اور اس کے داروغے اور چوکیدار و حوالدار اور عالم شہادت جس کے ساتھ لوگوں کے دل معلق ہیں' کے علاوہ عالم غیب کے کئی جہاں ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتے اور جن کے ساتھ صرف مومنین کے دل معلق ہوتے ہیں ۔ پھر اس جہاں میں پائے جانے والے معجزات اور انسانوں کے نفوس کے اندر پائے جانے والے معجزات جن کے اوپر سے انسان نہایت ہی غفلت کے ساتھ گزر جاتا ہے ۔ یہ سب اس سورت کے موضوعات و مضامین ہیں ۔

اس سورت کا اہم کام اور ہدف یہ ہے کہ یہ انسانی قلب و نظر سے' وہ تمام تصاویر' نقوش اور وہ تمام تصورات کھرچ کر دور کرتی ہے' جو جاہلیت کے پسماندہ' جامد' غیر معقول افکار کی وجہ سے قلب و نظر پر تہہ بہ تہہ جمع ہوئے تھے ۔ یہ سورت ان افکار میں نقب لگاتی ہے' فکر و نظر سے ان کے غبار کو صاف کرتی ہے اور انسانی حواس' انسانی عقل اور انسانی بصیرت کو جلا دیتی ہے ۔ انسان کو اس کائنات میں پھراتی ہے' اسے نفس انسانی کی گہرائیوں میں لے جاتی ہے' فضائے کائنات کا سفر کراتی ہے' آسمانوں کے طبقات و مقامات اور ابعاد دکھاتی ہے ۔ زمین کے اوپر پانیوں کی روانی' اور اس میں پھر عالم الغیب کے جو حقائق کی تصویر کشی اور اللہ کا دست قدرت کام کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔ اس میں قدرت کی قوت سے ہر چیز متحرک اور دوڑتی نظر آتی ہے ۔ انسان جب اس سورت کے اندر سفر کرتے ہوئے اس کے آخر سے نکلتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ بہت ہی بڑا ہے ۔ یہ کائنات بہت وسیع ہے ۔ اس زمین کے اوپر آسمان ہیں اور آسمانوں کے اوپر اور جہاں ہیں ۔ مظاہر قدرت کے پیچھے حقائق قدرت ہیں اور یہ کہ یہ کائنات جامد نہیں ہے' متحرک ہے اور یہ حرکت اللہ کی قدرت کی وجہ سے ہے ۔ زندگی کی حرکت اور زندوں کی حرکت عبارت ہے اس کائنات سے ۔

زندگی اور موت کیا ہے؟ رات اور دن باہم موت و حیات کو دیکھ رہے ہیں' لیکن یہ سورت ہمیں موت و حیات کے پردے کے پیچھے لے جاتی ہے کہ حیات اور موت کے پیچھے تقدیر الہی اور اللہ کا نظام قضا و قدر کار فرما ہے ۔ وہ تمہیں اس زمین پر آزما رہا ہے ۔ وہ حیات و کائنات کا مدبر ہے ۔

الَّذِىْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ( ۶۷ : ۲ ) ''جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی ہے''۔

اور آسمان ایک عظیم مخلوق ہے' جو ہماری جاہل آنکھوں کے سامنے ہے' یہ جاہل آنکھیں اس سے آگے بڑھ کر اس دست قدرت کو دیکھ نہیں پاتیں' جس نے آسمان اور زمین ایجاد کیا ہے ۔ ہماری ان جاہل آنکھوں کو اس آسمان کے اندر کوئی کمال نظر نہیں آتا ہے ۔ لیکن یہ سورت انسانی فکر میں ارتعاش پیدا کر کے اس پر غور و فکر اور تامل کی دعوت دیتی ہے ۔ اور یاد دہانی کراتی ہے کہ اس آسمان کے کمال و جمال پر ذرا غور کرو' اور اس کی حرکات کیسی ہیں اور ان کے مقاصد کیا ہیں ۔

الَّذِىْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰى فِىْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ (۳) ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا

وَهُوَ خَسِيْرٌ (٤) وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ

(٥) (٦٧: ٣ تا ٥) "جس نے تہ بہ تہ آسمان بنائے۔ تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے۔ پھر پلٹ کر دیکھو، کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ۔ تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔ ہم نے تمہارے قریب کے آسمان کو عظیم الشان چراغوں سے آراستہ کیا ہے اور انہیں شیاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ بنا دیا ہے"۔

افکار جاہلیت میں یہ دنیا ہی اس کائنات کے وجود کا مقصد ہے اور بس یہی آخری چیز ہے۔ لیکن یہ سورت ایک دوسرے جہاں سے نہایت موثر انداز میں پردہ اٹھاتی ہے، جو شیاطین اور کافرین کے لیے تیار کردہ ہے۔ یہ ایک زبردست خوفناک جہاں ہے۔ جہنم کا ایک منظر آتا ہے جو حرکت، انتظار اور بھاگ دوڑ سے بھرپور ہے۔

وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ (٥) وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (٦) اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ (٧) تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ (٨) قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ (٩) وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (١٠) فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ

السَّعِيْرِ (١١) (٦٧: ٥ تا ١١) "ان شیطانوں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ ہم نے مہیا کر رکھی ہے اور جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ جب وہ اس میں پھینکے جائیں گے تو اس کے دہاڑنے کی ہولناک آواز سنیں گے اور وہ جوش کھا رہی ہوگی، شدت غضب سے پھٹی جاتی ہوگی۔ ہر بار جب کوئی انبوہ اس میں ڈالا جائے گا تو اس کے کارندے ان لوگوں سے پوچھیں گے "کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا؟" وہ جواب دیں گے "ہاں، خبردار کرنے والا ہمارے پاس آیا تھا مگر ہم نے اسے جھٹلا دیا اور کہا اللہ نے کچھ بھی نازل نہیں کیا ہے، تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو"۔ اور وہ کہیں گے "کاش ہم سنتے یا سمجھتے تو آج اس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں نہ شامل ہوتے"۔ اس طرح وہ اپنے قصور کا خود اعتراف کر لیں گے، لعنت ہے ان دوزخیوں پر"۔

فکر جاہلیت کے اندر انسانوں کی سوچ صرف اس زندگی تک محدود ہوتی ہے، اور وہ عالم غیب کی طرف اپنی سوچ کا رخ پلٹاتے ہی نہیں کہ عالم غیب کے اندر کیا کیا مستور ہے۔ جاہلیت کی فکر اس دنیا میں قید ہوتی ہے، اور یہ زمین جو اس فکر کے نزدیک ثابت ہے اور برقرار ہے، یہ یونہی ہے، یہ سورت انسانی فکر و نظر کو کھینچ کھینچ کر عالم غیب اور عالم سموات کی طرف لے جاتی ہے اور قدرت الٰہیہ کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اگرچہ ذات باری کو کسی نے دیکھا نہیں ہے، لیکن وہ ذات قادر مطلق ہے، جو چاہے کرے، جہاں چاہے کرے، اور جب چاہے کرے۔ یہ سورت اس زمین کو بھی حرکت دیتی ہے جسے وہ ساکن اور جامد سمجھتے ہیں، اور اس پر مطمئن چلتے پھرتے ہیں اور اس کی سرگرمیوں میں غرق ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ (١٢) وَ اَسِرُّوْا
قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (١٣) اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَ هُوَ
اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (١٤) ع هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَ
كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَ اِلَيْهِ النُّشُوْرُ (١٥) ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ
الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ (١٦) اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا
فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ (١٧) (٦٧ : ١٢ تا ١٧) "جو لوگ بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں' یقیناً ان کے لیے مغفرت ہے اور بڑا اجر۔ تم خواہ چپکے سے بات کرو یا اونچی آواز سے (اللہ کے لیے یکساں ہے) وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟ حالانکہ وہ باریک بین اور باخبر ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو تابع کر رکھا ہے' چلو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق' اسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے۔ کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے 'تمہیں زمین میں دھنسا دے اور یکایک یہ زمین جھکولے کھانے لگے؟ کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے تم پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیج دے؟ پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میری تنبیہہ کیسی ہوتی ہے"۔

پرندے' رنگ برنگ کے پرندے اللہ کی مخلوقات ہیں اور انسان ان کو دیکھتے ہیں اور رات دن دیکھتے ہیں۔ لیکن ان پرندوں کی حقیقت اور تخلیق پر بالکل غور نہیں کرتے۔ یہ سورت ان کے دامن کو پکڑ پکڑ کر ان کو کہتی ہے کہ ذرا ان پرندوں پر غور تو کرو' اور اللہ کی قدرت کو دیکھو کہ اس نے ان کی صورتیں کیسی پیاری بنائی ہیں۔ اور ان کو قوتیں کیسی دی ہیں۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّ يَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ اِنَّهٗ بِكُلِّ
شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ (٦٧ : ١٩) "کیا یہ لوگ اپنے اوپر اڑنے والے پرندوں کو پر پھیلاتے اور سکیڑتے نہیں دیکھتے۔ رحمٰن کے سوا کوئی نہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہو؟ وہی ہر چیز کا نگہبان ہے"۔

یہ لوگ اپنے گھروں میں بے فکر بیٹھے ہوئے ہیں' اللہ کی قدرت اور اللہ کے نظام قضا و قدر سے غافل پڑے ہیں۔ لیکن یہ سورت ان کو اس جمود اور بے حسی کی نفسیاتی حالت سے نکالتی ہے' جبکہ وہ ان کے پاؤں کے نیچے زمین کو بھی ہلا مارتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ تم ہر طرف سے اللہ کے قہر اور اللہ کے جبروت میں گھرے ہوئے ہو۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ
غُرُوْرٍ (٦٧ : ٢٠) "بتاؤ' آخر وہ کون سا لشکر تمہارے پاس ہے جو رحمٰن کے مقابلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ منکرین دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں"۔

یہ رزق جو یہ رات دن کھاتے ہیں' ان کے خیال میں بھی یہ ان کی زندگی کا قریبی سبب ہے۔ اور اس دنیا میں ان کے سارے تنازعے اس رزق ہی پر ہیں۔ یہ سورت ان کی توجہ بہت دور ان ظاہری اسباب سے پیچھے حقیقی اسباب کی طرف مبذول کراتی ہے۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ (۶۷ : ۲۱)

"یا پھر بتاؤ' کون ہے جو تمہیں رزق دے سکتا ہے' اگر رحمن اپنا رزق روک لے؟ دراصل یہ لوگ سرکشی اور حق سے گریز کرنے پر اڑے ہوئے ہیں"۔

یہ اپنی گمراہی میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں جبکہ در حقیقت وہ گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ سورت ان کی تصویر اور اہل ہدایت کی تصویر کھینچتی ہے۔ نہایت موثر اور اشاراتی انداز میں۔

اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُكِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ

(۶۷ : ۲۲) "بھلا سوچو' جو شخص منہ اوندھائے چل رہا ہو' وہ زیادہ صحیح راہ پانے والا ہے یا وہ جو سر اٹھائے سیدھا ایک ہموار سڑک پر چل رہا ہو"۔

اللہ نے ان کو سوچنے سمجھنے کی استعداد دی ہے لیکن یہ اس سے استفادہ نہیں کرتے اور وہ جن چیزوں کو حواس سے دیکھتے ہیں ان کے ظاہری قالب اور صورت کے پیچھے وہ اصل حقائق دیکھنے کے اہل نہیں۔ یہ سورت ان کو یاد دہانی کراتی ہے' کہ اللہ نے تم کو کیسی کیسی نعمتیں دی ہیں' کیسی کیسی قوتیں دی ہیں' اور حکم دیا ہے کہ اپنی ان قوتوں کو کام میں لاؤ اور مستقبل کے لیے ان کو کام میں لاؤ' اور اس کائنات کی اصل غرض و غایت کو معلوم کرو۔

قُلْ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۶۷ : ۲۳) "ان سے کہو' اللہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا' تم کو سننے اور دیکھنے کی طاقتیں دیں اور سوچنے سمجھنے والے دل دیئے مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو"۔ ان سے کہو وہ اللہ ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا ہے اور اسی کی طرف سمیٹے جاؤ گے۔

یہ لوگ بعث بعد الموت اور حشر و نشر کو جھٹلاتے ہیں اور چڑ کر حشر کا وقت پوچھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے سامنے حشر و نشر کی ایک تصویر کھینچ دی جاتی ہے۔

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲۵) قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۲۶) فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِیْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَقِیْلَ هٰذَا الَّذِیْ

كُنتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ (۲۷) (۶۷:۲۵ تا ۲۷) "یہ کہتے ہیں "اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ وعدہ کب پورا ہو گا"۔ کہہ دیجئے "اس کا علم تو اللہ کے پاس ہے 'میں تو بس صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں"۔ پھر جب یہ اس چیز کو قریب سے دیکھ لیں گے تو ان سب لوگوں کے چہرے بگڑ جائیں گے جنہوں نے انکار کیا ہے اور اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جس کے لیے تم تقاضے کر رہے تھے"۔

یہ لوگ اس انتظار میں ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہلاک ہو جائیں ' آپ ؐ کے ساتھی مسلمان بھی ختم ہو جائیں اور یہ آواز جس نے ان کی نیندیں حرام کر دی ہیں 'یہ ختم ہو جائے حالانکہ یہ تو نصیحت ہے 'جمود کو توڑنے والی آواز ہے ۔سوئے ہوؤں کو جگانے والی آواز ہے ۔یہ سورت بتاتی ہے کہ اگر پیغمبر ہلاک ہو جائے اور آپ کے سب رفقاء ہلاک ہو جائیں تو کفر اور تکذیب پر جو تمہیں عذاب ملنے والا ہے اس سے تمہیں کون بچائے گا۔ لہٰذا ان کے لیے مناسب ہے کہ وہ قیامت کے آنے سے قبل ہی اپنے معاملات پر غور کر لیں۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۲۸) قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۲۹) (۶۷:۲۸ تا ۲۹) "ان سے کہو' وہ بڑا رحیم ہے 'اسی پر ہم ایمان لائے ہیں 'اور اسی پر ہمارا بھروسہ ہے 'عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ صریح گمراہی میں پڑا ہوا کون ہے"۔

آخر میں ان کو دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر اللہ صرف ایک پانی کو بند کر دے جس پر تمہاری زندگی موقوف ہے اور یہ اللہ کا جاری کردہ ہے تو تمہارا کیا بنے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ (۶۷:۳۰) "ان سے کہو' کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر تمہارے کنوؤں کا پانی زمین میں اتر جائے تو کون ہے جو اس پانی کی بہتی ہوئی سوتیں تمہیں نکال کر لا دے گا؟"

غرض پوری سورت حرکت ہے 'حس کی حرکت 'احساس کی حرکت 'فکر کی حرکت اور شعور کی حرکت ۔اس سورت کا محور اور کنجی اس کا پہلا فقرہ ہے ۔جو نہایت جامع اور معنی خیز ہے ۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ (۶۷:۱) "نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں سلطنت ہے ۔اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ تمام صورتیں اور تمام مناظر جو اس سورت میں پیش کیے گئے ہیں یہ اسی دست قدرت کی کارستانیاں ہیں ۔تمام ظاہر اور غائب حرکات جن سے انسان کا قلب متاثر ہوتا ہے ان کا محرک وہی قدرتوں والا ہے ۔

اللہ کی بادشاہت اور قدرت کا سب سے بڑا کارنامہ موت و حیات کی تخلیق ہے ۔ پھر انسانوں کو اس جہاں میں آزمانے کے لیے بھیجا ہے ۔پھر اللہ کی قدرت کی بڑی نشانی آسمانوں کے اندر خوبصورت چراغ پیدا کرنا اور شیطانی قوتوں

کے اوپر شہاب ثاقب چھوڑتا ہے۔ اور پھر اللہ کی قدرتوں کا ایک نمونہ جہنم کی تیاری ہے اور جہنم کے اوپر زبردست داروغوں کا تقرر ہے۔ پھر اللہ کی قدرت کا مظہر سب کچھ جاننا اور زمین کو انسانوں کے لیے مسخر کرنا ہے۔ پھر انسانی تاریخ میں مکذبین پر آنے والے عذاب خسف اور پتھروں کی بارش' پھر پرندوں کا ہوا کے اوپر سوار ہونا۔ پھر اللہ کی قہاری و جباری اور تمام کائنات پر حاوی ہونا۔ لوگوں کی تخلیق' ان کے لیے ذوق کی تخلیق' انسانوں کی شخصیت میں سننے' دیکھنے اور سوچنے کی قوتیں پیدا کرنا' زمین میں لوگوں کو دفن کرنا اور پھر اٹھانا۔ آخرت کا علم صرف اس کے لیے محفوظ ہونا اور کافروں کو عذاب دینا اور لوگوں کے لیے زمین میں پانی کے چشمے جاری کرنا اور انہیں خشک کر دینا' یہ سب کچھ اللہ کی قدرت اور بادشاہت کے کارنامے ہیں۔

غرض یہ پوری سورت اور اس کے موضوعات اور اس کی تمام تصویریں اور تمام اشارات اسی پہلے فقرے کی تشریح ہیں اور اللہ کے نظام اور مملکت اور بادشاہت کے مختلف پہلو ہیں۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ (٦٧ : ١) "نہایت بزرگ اور برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

اس سورت میں جو حقائق بیان ہوئے ہیں اور جو ارشادات دیئے گئے ہیں' وہ اس میں مسلسل جوش و خروش سے اٹھتے ہیں' موجوں پر موجیں حقائق لے کر اٹھ رہی ہیں۔ اور اس پہلے فقرے کی تشریح کر رہی ہیں۔ اس لیے اس سورت کو ہم مختلف اسباق میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ اب ذرا آیات کی تفصیل!

---ooo---

# درس نمبر ۲۶۷ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۳۰

سورۃ الملک مکیۃ
آیاتہا ۳۰ رکوعاتہا ۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

**تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ٘ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُۙ۝۱**

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں (کائنات کی) سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

سورت کے آغاز میں اللہ کی برکات پر مشتمل یہ سپاس نامہ اس بات پر دال ہے کہ اللہ کی برکتیں اور اللہ کے کرم' اور اللہ کے فیوض کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اللہ کی برکتیں اللہ کی سلطنت میں ہیں اور اس کی بادشاہت میں کوئی کمی نہیں۔ اللہ کی ذات اور اللہ کی صفات کی برکات کا فیض عام اس پوری کائنات میں جاری و ساری ہے اور یہ پوری کائنات اس کا حمد گا رہی ہے اور اس لا انتہا وجود کی وادیوں میں اس کی گونج ہے۔ قلب مومن ان برکتوں سے لبالب ہے اور یہ کائنات اس کتاب الہی کے ذریعہ قلب مومن پر نازل ہوتی ہے اور اس پوری کائنات میں ان کا ظہور ہے۔

بِيَدِهِ الْمُلْكُ (۶۷ : ۱) "جس کے ہاتھ میں سلطنت ہے"۔ وہ اس کائنات کا مالک ہے' اس کا اس نے احاطہ کر رکھا ہے۔ اس کی چوٹی کے بال اس کے ہاتھ میں ہیں' وہ اس میں متصرف ہے۔ یہ ہے اصل حقیقت کہ اس پوری کائنات کا بادشاہ وہی ہے جب یہ حقیقت انسانی ضمیر میں بیٹھ جاتی ہے تو یہ اپنی راہ خود بخود متعین کر دیتی ہے اور اس کے بعد پھر کوئی بھی اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کے لیے فارغ نہیں ہوتا۔ پھر وہ ایک ہی آقا' ایک معبود اور ایک ہی بادشاہ کا قائل ہوتا ہے۔

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۶۷ : ۱) "اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ کوئی چیز اس پر غالب نہیں ہے' کوئی چیز اس کے ارادے کے سامنے رکاوٹ نہیں بن سکتی' اس مشیت کی حدود و قیود سے باہر' جو چاہتا ہے' تخلیق کرتا ہے' جو چاہتا ہے کرتا ہے' جو چاہے کر سکتا ہے' جو حکم دے اس کی تعمیل کروا سکتا ہے۔ اس کی قدرت بے حد و بے قید ہے۔ جب یہ حقیقت ذہن میں بیٹھ جائے تو ہمارے احساسات' تصورات اور عقل میں کسی قوت کے لیے کوئی سوچ

جاتی ہے تو اس کی نفی ہو جاتی ہے ۔ انسان جو کچھ بھی سوچ سکتا ہے اس کی قدرت اس سے زیادہ ہوتی ہے ۔ انسان کا تصور بہت ہی محدود ہے کیونکہ انسان کی ذات اور اس کی فکری کائنات محدود ہے ۔ انسان اپنے ماحولیات اور معلومات کے محدود دائرے میں سوچنے کا عادی ہے جو بہت ہی محدود ہوتا ہے ۔ یہ حقیقت کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ یہ انسان کو اس محدود دائرے سے نکالتی ہے ۔ انسان یقین کرتا ہے کہ اللہ کی قدرت لامحدود ہے تو انسان اپنے آپ کو اس کے حوالے کرتا ہے اور یوں وہ اس محدود سوچ سے لامحدود سوچ کی طرف نکل جاتا ہے ورنہ انسان حاضر و موجود کے محدود تصور ہی کا غلام ہوتا ہے ۔

**الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۝۲**

"جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے' اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی"۔

یہ کہ وہ قادر مطلق ہے اور اپنی مملکت میں ہر قسم کے تصرفات کرتا ہے' تو اس کے آثار قدرت اور نمونہ تصرفات ملاحظہ فرمائیں کہ اس نے موت و حیات کی تخلیق کی ۔ موت میں وہ حالت بھی شامل ہے جو کسی زندہ چیز کو حیات دینے سے پہلے ہوتی ہے ۔ اور وہ حالت بھی شامل ہے' جو حیات واپس لینے کے بعد طاری ہوتی ہے ۔ اور حیات میں بھی پہلی زندگی شامل ہے اور مرنے کے بعد اٹھائے جانے والی زندگی بھی شامل ہے ۔ یہ سب حالات اللہ کی تخلیقات میں آتے ہیں ۔ ذہن انسانی میں یہ حقیقت بٹھانے کا مقصد یہ ہے کہ اے انسان تجھے بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا تو ایک ذمہ دار مخلوق ہے ۔ یہ نہیں ہے کہ بس یونہی اتفاقاً تو آگیا ہے اور بس یونہی ایک دن مر کر مٹی ہو جائے گا ۔ اور یہ کام اور یہ عظیم تخلیقی عمل بے مقصد نہیں ہے بلکہ یہ انسانوں کو آزمانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے تاکہ اللہ کے علم میں جن انسانوں کو جو مظاہرہ کرنا تھا وہ سامنے آجائے' جس کا اللہ کو پہلے سے علم تھا ۔ اور وہ اپنے اعمال پر مناسب جزاء و سزا کے حقدار ہو جائیں ۔

لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ( ٦٧ : ٢ ) "تاکہ تم لوگوں کو آزما دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔ جب یہ عقیدہ ذہن میں بیٹھ جائے تو انسان بیدار' محتاط' چوکنا اور سمجھدار ہو جاتا ہے ۔ وہ دل میں چھوٹے بڑے کاموں کے بارے میں سوچتا ہے اور پوشیدہ اور ظاہری باتوں کے بارے میں غور کرتا ہے ۔ یہ عقیدہ انسان کو غفلت میں نہیں چھوڑتا ۔ نہ مطمئن اور بے فکر چھوڑتا ہے ۔ چنانچہ کہا جاتا ہے ۔

وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ( ٦٧ : ٢ ) "اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی ہے"۔ اس اختتامیہ سے یہ اطمینان دلانا مطلوب ہے کہ بے شک اللہ قدیر ہے اور زبردست ہے لیکن وہ غفور بھی ہے ۔ وہ بندوں پر سختی نہیں کرتا ۔ جب انسان کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ میرا امتحان ہے تو وہ ہر وقت خائف رہتا ہے کہ کیا نتیجہ نکلے گا لیکن جب وہ یہ سوچے گا کہ اللہ تو غفور و رحیم ہے تو اسے امید بندھ جائے گی اور وہ ثبات و قرار کے ساتھ صراط مستقیم پر چلے گا ۔

اسلام نے انسانوں کے سامنے خدا کا جو تصور پیش کیا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ جو ہر وقت انسانوں کا پیچھا کرتا ہے' نہ ایسا ہے کہ اسے عذاب دینے میں مزا آتا ہے' نہ وہ عذاب دینے کو پسند کرتا ہے بلکہ اللہ ہر وقت یہ یاد دہانی کراتا ہے کہ تمہارا ایک مقصد وجود ہے' اس کو نظروں سے اوجھل ہونے نہ دو' اپنی حقیقت کے مقام تک اپنے آپ کو بلند کرو' اور جس طرح اللہ نے اپنی روح تم میں پھونک کر تمہیں ایک بلند مرتبہ دیا۔ اس پر فائز ہو کر اللہ کی مخلوقات تمام مخلوقات سے اپنے آپ کو افضل ثابت کرو' جب لوگ اس مقصد کو پالیں تو پھر ان پر اللہ کی رحمتوں کی بارش ہوتی ہے۔ قدم قدم پر ان کی معاونت کی جاتی ہے اور حساب و کتاب میں عفو و درگزر سے کام لیا جاتا ہے۔

یہ کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اسی نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ لوگوں کو آزمائے تو اس حقیقت کا مطالعہ ایک طرف اس پوری کائنات کے میدان میں کرایا جاتا ہے اور دوسری طرف حشر کے میدان میں اسکے مظاہر دکھائے جاتے ہیں۔

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ﴿۳﴾ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیْرٌ ﴿۴﴾ وَ لَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَ جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنِ وَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِیْرِ ﴿۵﴾ وَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۶﴾ اِذَاۤ اُلْقُوْا فِیْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِیْقًا وَّ هِیَ تَفُوْرُ ﴿۷﴾ تَكَادُ تَمَیَّزُ مِنَ الْغَیْظِ ؕ كُلَّمَاۤ اُلْقِیَ فِیْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَذِیْرٌ ﴿۸﴾ قَالُوْا بَلٰی قَدْ جَآءَنَا نَذِیْرٌ ۙ۬ فَكَذَّبْنَا وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ ۖۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ كَبِیْرٍ ﴿۹﴾ وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْۤ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ﴿۱۰﴾ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ﴿۱۱﴾

''جس نے تہ بہ تہ سات آسمان بنائے۔ تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے۔ پھر پلٹ کر دیکھو' کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ۔ تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔ ہم نے تمہارے قریب کے آسمان کو عظیم الشان چراغوں سے آراستہ کیا ہے اور انہیں شیاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ بنا دیا ہے''۔

''ان شیطانوں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ ہم نے مہیا کر رکھی ہے۔ جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے

لیے جہنم کا عذاب ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے ۔جب وہ اس میں پھینکے جائیں گے تو اس کے دہاڑنے کی ہولناک آواز سنیں گے اور وہ جوش کھا رہی ہوگی' شدت غضب سے پھٹی جاتی ہوگی ۔ ہر بار جب کوئی انبوہ اس میں ڈالا جائے گا' اس کے کارندے ان لوگوں سے پوچھیں گے "کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا؟" وہ جواب دیں گے "ہاں' خبردار کرنے والا ہمارے پاس آیا تھا مگر ہم نے اسے جھلا دیا اور کہا اللہ نے کچھ بھی نازل نہیں کیا ہے' تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو"۔ اور وہ کہیں گے "کاش ہم سنتے یا سمجھتے تو آج اس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں نہ شامل ہوتے"۔ اس طرح وہ اپنے قصور کا خود اعتراف کر لیں گے' لعنت ہے ان دوزخیوں پر"۔

ان آیات میں جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ پہلی آیت کا مفہوم ہیں اور اس کی مثالیں ہیں ۔ اللہ اپنی بادشاہت کو جس طرح چلاتا ہے اس کے مظاہر ہیں اور اللہ کی بے قید قدرت کے آثار ہیں ۔ اور پھر تفصیلات میں انسان کی آزمائش اور جزاو سزا کی ۔ تہ بہ تہ سات آسمانوں کا مطلب ہم موجودہ فلکی نظریات سے اخذ نہیں کر سکتے کیونکہ فلکی نظریات' جوں جوں ہمارے آلات مشاہدہ آگے بڑھتے ہیں' بدلتے رہتے ہیں ۔ آیت سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ فقط اس قدر ہے کہ اوپر کی کائنات کے سات ایسے طبقے ہیں جو ایک دوسرے سے ایک فاصلے پر ہیں' اس لیے انہیں طبقات کہا گیا ہے ۔

قرآن مجید ہماری نظر کو زمین و آسمان کی تخلیق کی طرف مبذول کرتا ہے اور انسانوں کو یہ چیلنج کرتا ہے کہ ذرا زمین و آسمان کے اس نظام کو دیکھو' اس میں کوئی نقص بھی ہے ۔ تمہارا مشاہدہ تھک تھکا کر عاجز رہ جائے گا اور اسے کوئی نقص نظر نہ آئے گا۔

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (۶۷ : ۳) "تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے"۔ اللہ کی مخلوقات میں نہ کہیں خلل ہے' نہ نقص ہے اور نہ اضطراب ہے ۔

فَارْجِعِ الْبَصَرَ (۶۷ : ۳) فارجع "پھر پلٹ کر دیکھو"۔ دوبارہ کوشش کرو' اچھی طرح معلوم کرنے کی کوشش کرو۔

هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ (۶۷ : ۳) "کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے"۔ کیا تمہاری نظروں نے کوئی شگاف دیکھا' کوئی نقص اور کوئی خلل دیکھا؟

ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ (۶۷ : ۴) "بار بار نگاہ دوڑاؤ"۔ شاید کوئی چیز دیکھنے سے رہ گئی ہو' اور تم معلوم نہ کر سکے ہو' لہذا پھر بھی نگاہ ڈالو۔

یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ (۶۷ : ۴) "تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی"۔ یہاں چیلنج یہ ہے کہ ان آسمانوں اور اللہ تمام کی تمام مخلوقات کو ذرا گہری نظر سے دیکھو' اس کائنات کا سنجیدہ مطالعہ کرو' اور اس میں تامل و تدبر کرو' اور اس چیز اور اس صفت ہی کو دراصل قرآن کریم انسانوں میں عام کرنا چاہتا ہے کہ تم اس کائنات کا گہرا مشاہدہ کرو۔ یہ کائنات دراصل بہت عجیب و غریب اور نہایت ہی خوبصورت ہے اور اس کے اندر

معجزات و کمالات موجود ہیں لیکن ہم اس کے اندر اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ اس کا انوکھا پن ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے ۔ اور اس کی عظیم خوبصورتی ہمیں کوئی خوبصورتی نظر نہیں آتی ۔ حالانکہ یہ اس قدر خوبصورت ہے کہ نظر اس کی خوبصورتی کو دیکھ دیکھ سیر ہی نہ ہو اور اس کے اندر جو سبق اور اشارات ہیں ہمارے قلب ونظر کو اس سے سیر ہی نہ ہو ۔ اور عقل تدبر کرتی ہی رہ جائے اور اس کے نظام کی بوقلمونیاں ختم ہی نہ ہوں ۔ اس نقطہ نظر سے اگر انسان اس کائنات کا مطالعہ کرے تو اسے یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی تیار کردہ اور سجائی ہوئی حسین و جمیل نمائش گاہ نظر آئے 'جس کا انوکھا پن اور جس کی خوبصورتی کبھی پرانی نہ ہو کیونکہ اس طرح عقل و نظر کے لیے اس کی خوبصورتی روز نئی ہو گی ۔

جو لوگ اس کائنات کی حقیقت سے قدرے واقف ہیں اور وہ جدید سائنسی علوم کے مطابق اس کے بعض پہلوؤں کے حالات اور اس کے نظام کو کام کرتا ہوا دیکھتے ہیں وہ تو حیران رہ جاتے ہیں اور ان کی عقل چکرانے لگتی ہے ۔ لیکن اس کائنات کی خوبصورتی کے مشاہدے کے لیے کسی بڑی مقدار علم کی ضرورت نہیں ہے ۔ انسان پر اللہ کا یہ کرم ہے کہ اس کو اللہ نے ایسی صلاحیت دی ہے کہ وہ معمولی مشاہدے اور غور و فکر کے ساتھ اس کائنات کے ہمقدم اس طرح چل سکتا ہے جس طرح ایک زندہ آدمی دوسرے زندہ آدمی کے ساتھ چلتا ہے ۔ انسان کا قلب براہ راست اس کائنات کے پیغام کو پاتا ہے اور اس کی خوبصورتی کو دیکھتا ہے 'بشرطیکہ وہ آنکھیں اوپر کر کے دیکھے اور دل کھول کر کچھ اخذ کرے ۔ اور وہ اس کائنات کو ایک زندہ مخلوق سمجھ کر اس کا رفیق بن جائے 'قبل اس کے کہ وہ اپنے نور فکر اور اپنی رصد گاہوں سے اس عظیم اور عجیب کائنات کے رازوں کو افشا کرے ۔

چنانچہ قرآن مجید لوگوں کو اس کائنات کے حوالے کرتا ہے ۔ ان کے ہاتھ میں کائنات کی کھلی کتاب پکڑاتا ہے 'کہ اس کائنات کی آواز سنو 'اس کے مناظر اور عجائبات کی سیر کرو 'اس لیے کہ قرآن مجید کے مخاطب صرف سائنس دان نہیں ہیں 'بلکہ ہر دور اور ہر سطح کے انسان ہیں ۔ قرآن کو ایک جنگلی اور صحراوی بھی پڑھتا ہے اور شہر میں بسنے والا اور سمندروں میں سفر کرنے والا بھی پڑھتا ہے ۔ وہ ایک ان پڑھ سے بھی مخاطب ہے 'جس نے ایک حرف بھی نہیں پڑھا ۔ اور اسی طرح وہ ماہر علم نجوم و فلکیات سے بھی مخاطب ہے ۔ وہ ماہر طبیعیات سے بھی ہمکلام ہے اور ماہر فلسفی سے بھی ۔ ہر ایک کو قرآن میں عجائبات ملتے ہیں 'جن میں وہ تامل کرتا ہے اور قرآن ان سب کے غور و فکر کی قوتوں کو بیدار کرتا ہے ۔

کمال کی طرح اس کائنات کی ہر چیز میں جمال بھی مقصود بالذات ہے بلکہ کمال اور جمال ایک ہی حقیقت کے دو نام یا دو پہلو ہیں 'کسی چیز میں کمال ہی اس کی خوبصورتی کا اعلیٰ درجہ ہوتا ہے ۔ چنانچہ قرآن نے پہلے آسمانوں کی خوبصورتی کی طرف متوجہ کیا اور اس کے بعد کمال کی طرف ۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ (۶۷ : ۵) ''اور ہم نے تمہارے قریب کے آسمان عظیم الشان کو چراغوں سے آراستہ کیا''۔ یہ سمائے دنیا کہلاتا ہے ۔ شاید یہ وہ بلندی ہے جو زمین کے سکان اور قرآن کے مخاطب انسانوں کے فہم کے قریب ہے ۔ مصابیح اور چراغوں سے مراد ستارے اور سیارے ہیں جو ہمیں نظر آتے ہیں ۔ جن انسانوں سے قرآن مخاطب تھا وہ آسمانوں کو دیکھ کر یہی سمجھتے تھے کیونکہ ان کے پاس رصد گاہیں نہیں تھیں اور اس وقت بھی اور آج بھی کوئی آنکھوں سے آسمان کو دیکھے تو اس میں ستارے روشن چراغ نظر آتے ہیں ۔

یہ منظر کس قدر خوبصورت ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔ اس قدر خوبصورت کہ انسان کے دل کو کھینچ لیتا ہے۔ اس منظر کے کئی رنگ ہیں۔ صبح و شام اس کا الگ الگ نظارہ۔ طلوع اور غروب کا الگ نظارہ ہے۔ تاریک رات اور چاندنی رات کا الگ منظر ہوتا ہے۔ مطلع صاف ہو تو اور منظر ہے۔ مطلع غبار آلود ہو اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو اس کا الگ منظر ہے۔ گھڑی بھر میں مناظر بدلتے رہتے ہیں۔ جگہ کی تبدیلی سے مناظر بدلتے ہیں۔ زاویہ کی تبدیلی سے بدلتے ہیں لیکن جو منظر بھی سامنے آئے ذہن کو گرفت میں لے لیتا ہے۔

یہ اکیلا ستارہ جو دور افق پر چمک رہا ہے گویا وہ خوبصورت آنکھ ہے 'نہایت محبت سے پکارتی ہے۔ پھر وہ دو ستارے جو الگ نظر آتے ہیں' یہ اژدحام سے دور محو گفتگو ہیں۔ اور وہ ستاروں کا جھرمٹ جو جگہ جگہ نظر آتا ہے وہ کائنات کے میلے کا ایک حلقہ یاراں ہے جو کبھی یہاں جمع ہوتا ہے تو کبھی وہاں!

یہ باریک چاند جو ایک رات ایک شاخ کی طرح ہوتا ہے اور ایک رات اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے اور پھر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر معدوم ہو جاتا ہی اور دوبارہ وہ ولادت پاتا ہے۔ ہر رات کو اس کا نیا روپ ہوتا ہے۔

یہ وسیع فضائے کائنات جس کی لمبائیوں اور دوریوں تک بینائی ساتھ نہیں دیتی۔ اور خوبصورتی اس قدر کہ آنکھیں دیکھتی رہ جائیں۔ یہ ہے حقیقی خوبصورتی 'جس کا تصور بھی انسان نہیں کر سکتا' لیکن انسان اگر ان خوبصورتیوں کو الفاظ کا جامہ پہنانا چاہے تو ممکن نہیں۔ انسانی عبارات اس سے قاصر ہیں۔

قرآن کریم انسانوں کو اس آسمان اور اس پوری کائنات کے جمال کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ کیونکہ جمال کائنات کا ادراک ہی ایک ذریعہ ہے جس کی وساطت سے انسان خالق کائنات کے جمال کا تصور کر سکتا ہے۔ اور یہی ادراک انسان کو اس بلند مقام تک پہنچاتا ہے 'جس تک انسان کبھی پہنچنے کی تمنا کر سکتا ہے کیونکہ اس پوئنٹ تک پہنچ جاتا ہے جہاں سے آگے وہ ابدی حیات پا سکتا ہے۔ اب وہ ایک خوبصورت آزاد اور لازوال دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ زندگی اس دنیا کی آلودگیوں سے پاک ہوتی ہے اور انسانی زندگی کے وہ لمحات لازوال لمحات ہوتے ہیں جن میں کوئی انسان اس کائنات کے لازوال حسن کا ادراک کر لے 'ایسے ہی حالت میں وہ ذات باری کے قریب تر ہو جاتا ہے اور ذات باری کے کمالات کا تصور کر سکتا ہے۔

اور اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ انسان کے یہ خوبصورت ستارے ایک دوسرا کام بھی کرتے ہیں۔ یہ شہاب ثاقب بن کر شیطانوں پر بمباری بھی کرتے ہیں۔

وَ جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ (۶۷ : ۵) "اور انہیں شیاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ بنایا"۔ ہم نے "فی ظلال القرآن" میں یہ رویہ اختیار کیا ہے کہ غیبی امور کے بارے میں بات کو اسی حد میں رکھیں جس حد تک قرآن کریم نے کہہ دی ہے۔ اس معاملے میں قرآن نے جو پہلو بتایا ہے اسی تک محدود رہیں۔ جس قدر قرآن نے کہہ دیا ہے وہ ایک مکمل بات ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ ایک مخلوق ہے 'جس کا نام شیطان اور شیاطین ہے' قرآن میں ان شیطانوں کی بعض صفات وارد ہیں۔ ظلال القرآن میں اس موضوع پر پہلے بات ہو چکی ہے۔ اس پر مزید اضافے کی ضرورت نہیں ہے' اور ہمارا یہ ایمان

ہے کہ یہ شیاطین جب عالم بالا میں جانے کی کوششیں کرتے ہیں تو ان کو شہاب ثاقب بھگاتے ہیں' دوسری جگہ آیا ہے۔

وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ (۷) ------- اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (۳۷ : ۱۰) "اور ہر شیطان سرکش سے اس کو محفوظ کر دیا..... تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے"۔

یہ شہاب ثاقب کس طرح پیچھا کرتا ہے۔ یہ شہاب کس قدر بڑا ہے۔ اس کی شکل کیا ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں اللہ نے تفصیلات ہمیں نہیں بتائیں اور کوئی دوسرا ذریعہ علم انسانوں کے پاس نہیں ہے' جس سے کوئی بات پوچھی جا سکے۔ بس جس قدر قرآن نے کہہ دیا اس پر اکتفا کرنا چاہئے۔ اور یہی یہاں مقصود ہے۔ اگر اس سے زیادہ بتانا مقصود ہوتا تو اللہ بتا دیتا۔ اس لیے جس چیز کو اللہ نے ہمارے لیے موجب خیر و برکت نہیں سمجھا' اس کے پیچھے نہیں پڑنا چاہئے۔ شیاطین کا رجم بھی ایسے ہی معاملات میں سے ہے' جس کا تفصیلی علم ہمیں نہیں دیا گیا۔ اور دنیا میں شہاب ثاقب کی سزا کے علاوہ آخرت میں ان کے لیے اور سزا ہے۔

وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ (۶۷ : ۵) "اور ان شیطانوں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ ہم نے مہیا کر رکھی ہے"۔ یہ بمباری دنیا میں اور آگ کا عذاب آخرت میں۔

شیاطین اور کافرین کے درمیان چونکہ واضح تعلق ہے اس لیے ساتھ ہی ان کا ذکر بھی کیا گیا ان کے لیے بھی عذاب جہنم ہے۔

وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۶۷ : ۶) "اور جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے"۔ اس کے بعد جہنم کے ایک منظر کی تفصیلات دی جاتی ہیں جس میں جہنم نہایت ہی غیظ و غضب اور نہایت انتقامی حالت میں نظر آتی ہے۔

اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ (۷) تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ (۶۷ : ۸) "جب وہ اس میں پھینکے جائیں گے تو اس کے دھاڑنے کی ہولناک آواز سنیں گے اور وہ جوش کھا رہی ہوگی۔ شدت غضب سے پھٹی جاتی ہوگی"۔ ذرا جہنم کو دیکھو' یہ زندہ مخلوق کی طرح ہے۔ اسے غصہ آ رہا ہے اور وہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے اور اس کی سانس پھول رہی ہے اور اس طرح اس کی سانس شدت غضب سے پھنکار کی شکل اختیار کر رہی ہے۔ اس پر اس کے غصے' کراہت اور نفرت کی وجہ سے اس قدر دباؤ ہے کہ قریب ہے کہ وہ پھٹ پڑے۔

بظاہر تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ انداز بیان ایک مجازی تصویر کشی کا انداز ہے لیکن ہم اس کائنات کا جس قدر گہرا مطالعہ کریں گے' معلوم ہو گا کہ اللہ کی مخلوقات میں سے ہر مخلوق زندہ ہے اور اس کی ایک مخصوص روح ہے۔ اور ہر مخلوق

اپنے رب کو جانتی ہے ۔ اور اس کی حمد و ثنا کرتی ہے اور اللہ کی ہر مخلوق جب دیکھتی ہے کہ انسان رب تعالیٰ کا کفر کرتا ہے تو تمام مخلوقات خوفزدہ ہو جاتی ہیں کیونکہ ہر چیز کو اپنے خالق کی معرفت حاصل ہے اور ہر چیز مطیع فرمان ہے ' لہٰذا ہر چیز کو نافرمان مخلوق پر غصہ آتا ہے اور مخلوقات کی روح تمام منکرین سے نفرت کرتی ہے ۔

قرآن کریم میں آتا ہے ۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيهِنَّ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ( ۱۷ : ۴۴ ) "اس کی پاکی کو ساتوں آسمان و زمین اور وہ ساری چیزیں بیان کر رہی ہیں جو آسمان اور زمین میں ہیں ۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو ' مگر تم اس کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو" ۔ اور اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں ہے ۔

يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَ الطَّيْرَ ( ۳۴ : ۱۰ ) "(ہم نے حکم دیا) اے پہاڑو ' اس کے ساتھ ہم آہنگی کرو اور یہی حکم ہم نے پرندوں کو دیا" ۔

اور دوسری جگہ بھی صراحت کے ساتھ وارد ہے ۔

ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ( ۴۱ : ۱۱ ) "پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھا ' اس نے آسمان اور زمین سے کہا وجود میں آ جاؤ تم چاہو یا نہ چاہو ' دونوں نے کہا : ہم آ گئے فرماں برداروں کی طرح" ۔

یہ تمام چیزیں ' جس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں وہ یہ ہے کہ ہر چیز رب تعالیٰ پر ایمان لاتی ہے ' اس کی تسبیح کرتی ہے ' تعریف کرتی ہے اور جب یہ چیزیں دیکھتی ہیں کہ انسان خالق کائنات کی نافرمانی کرتا ہے تو یہ دہشت زدہ ہو جاتی ہیں ۔ جب انسان ایک مختلف رویہ اختیار کرتا ہے تو یہ چیزیں غضب الٰہی کے خوف سے کانپ اٹھتی ہیں ۔ اور ان کو اس قدر غصہ آتا ہے کہ شدت غضب کی وجہ سے قریب ہے کہ یہ ایک دھماکے کے ساتھ انسان پر حملہ آور ہو جائیں ۔ جس طرح کوئی کسی شریف اور عزت نفس رکھنے والے شخص کو برا بھلا کہے ۔ غضب کے مارے اس کا گلا گھٹ جاتا ہے اور سانس پھول جاتی ہے اور وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاتا ہے اور اسی طرح کی حالت جہنم کی بتائی گئی ۔

وَ هِيَ تَفُوْرُ (۷) تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ( ۶۷ : ۸ ) "وہ جوش کھا رہی ہو گی اور شدت غضب سے پھٹی جا رہی ہو گی" ۔

اور جہنم کے نگرانوں کی حالت بھی یہی ہو گی ۔

كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ( ۶۷ : ۸ ) "ہر بار جب کوئی انبوہ

اس میں ڈالا جائے گا' اس کے کارندے ان لوگوں سے پوچھیں گے "کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا"۔ یہ بات واضح ہے کہ جہنم میں ان سے یہ سوال محض معلومات حاصل کرنے کے لیے نہ ہو گا' یہ ان کی سرزنش کرنے اور ان کو ذلیل کرنے کے لیے ہو گا' گویا جہنم کے کارندے بھی جہنم کے ساتھ اس غیظ و غضب میں شریک ہوں گے۔ جس طرح وہ دونوں ان کو عذاب دینے میں شریک ہیں اور کسی مصیبت زدہ اور پریشان شخص پر اگر سرزنش اور دھتکار کے کوڑے بھی لگیں تو اس کی تلخی کی تو حد ہی نہ ہوگی لیکن ذرا ان لوگوں کا جواب سنیں کہ یہ لوگ کس قدر ذلیل و خوار ہو گئے ہیں۔ اب وہ برخورداروں کی طرح اپنی غفلت اور حماقت کا اقرار کرتے ہیں' جبکہ وہ پہلے بڑے غرور کے ساتھ رسولوں کو گمراہ کہتے تھے۔

قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ (٩) وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْۤ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (١٠) فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (٦٧ : ١١) "وہ جواب دیں گے "ہاں' خبردار کرنے والا ہمارے پاس آیا تھا مگر ہم نے اسے جھٹلا دیا اور کہا اللہ نے کچھ بھی نازل نہیں کیا ہے' تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو"۔ اور وہ کہیں گے "کاش ہم سنتے یا سمجھتے تو آج اس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں نہ شامل ہوتے"۔ اس طرح وہ اپنے قصور کا خود اعتراف کرلیں گے' لعنت ہے ان دوزخیوں پر"۔

جو سنتا ہے اور عقل سے بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے آپ کو اس پوزیشن میں نہیں ڈالتا۔ اور اس طرح انکار نہیں کرتا جو ان بدبختوں نے کیا۔ اور وہ رسولان برحق کو جھٹلانے کی جسارت نہیں کرتا اور نہ اس قدر بھونڈے انداز کی ساتھ ان پر گمراہی کا الزام لگاتا ہے' بغیر کسی معقول وجہ کے' الٹا یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ اللہ نے تو کچھ نازل نہیں کیا' تم جھوٹ بول رہے ہو' جیسا کہ گویا وہ ابھی اللہ کے پاس سے آیا ہے۔

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (٦٧ : ١١) "اس طرح وہ اپنے قصور کا خود اعتراف کرلیں گے' لعنت ہے ان دوزخیوں پر"۔ سحق کے معنی بعد کے ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ان کے لئے بددعا ہے۔ جب انہوں نے اعتراف کرلیا اور یہ اعتراف' اس وقت کیا جب وہ منظر ان کے سامنے آگیا' جس کے وقوع کا وہ انکار کر رہے تھے۔ اور اللہ جس کے لئے بددعا کر دے تو گویا ان کی بربادی کا فیصلہ ہو گیا۔ یہ لوگ رحمت خداوندی سے دور ہو گئے' اب ان کو اللہ کی مغفرت کی کوئی امید نہیں رہی ہے۔ نہ عذاب سے چھوٹنے کی کوئی امید ہے۔ اب تو وہ دوزخ کے ساتھی ہیں۔ کیا ہی بری صحبت ہے اور کیا ہی بری ہم نشینی ہے ان کی اور کیا ہی برا انجام!

یہ عذاب' جہنم کا عذاب' جو پھنکاریں مار رہی ہے' ایک شدید عذاب ہے۔ خوفناک عذاب ہے۔ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر نفس کے اندر اللہ نے ایمان کی حقیقت اور ایمان کے دلائل رکھ دیئے ہیں اس کے باوجود بھی اگر کوئی نفس اللہ کا انکار کرتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر کوئی بھلائی نہیں اور وہ ہر قسم کی بھلائی سے محروم

ہے ۔ اسی طرح وہ اپنے وجود اور شخصیت کی تمام بنیادی صفات کا بھی وزن کھو بیٹھتی ہے ۔ وہ اسی طرح ہے جس طرح جہنم میں پتھروں کو جلایا جائے ۔ اس کی شخصیت نے اپنے آپ کو اپنے مکان سے گرا کر اس آگ میں ڈالا ہے حالانکہ اس کا فرض یہ تھا کہ وہ اس سے بھاگتی ۔

جو شخص اللہ کا انکار کرتا ہے وہ آگے بڑھنے کے بجائے الٹے پاؤں پھرتا ہے اور اوندھے منہ گرتا ہے اور وہ زندگی کے ہر دوڑ میں گرتا ہی چلا جاتا ہے' یہاں تک کہ وہ انتہائی بری' پسماندہ اور قابل نفرت شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ آخر کار وہ ایک مکروہ جہنمی کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ وہ اس قدر بدشکل ہو جاتا ہے کہ اس جہاں کی کوئی چیز بھی اس قدر کریہہ المنظر نہیں ہوتی ۔ جس طرح کوئی چیز مسخ ہو جائے ۔ تو ایسے شخص کے سوا تمام جہاں ایک طرف ہوتی ہے ۔ ہر چیز مومن ہے ۔ اللہ کی ثناخواں ہے' اور ہر چیز میں خیر موجود ہے اور تمام اشیاء کے اندر ایمان ایک رابطہ ہے ۔ ماسوائے ان نفوس انسانی و شیطانی کے جو کفر اختیار کرتے ہیں ۔ ان منکر اور بھٹکے ہوئے افراد کا ہر قسم کا تعلق جہاں بھی وہ ہوں' ہر چیز سے کٹ جاتا ہے' ماسوائے جہنم کے وہ کسی کام کے نہیں ہوتے ۔ ان کے اندر کوئی معنی کوئی حقانیت اور کوئی عزت نہیں ہوتی ۔ اس لیے یہ نفوس جہنم کے مستحق ہو جاتے ہیں ۔

قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ وہ صفات بالمقابل پیش کرتا ہے ۔ جس طرح جہنم والوں کے مناظر دکھائے گئے ۔ اس کے بالمقابل مومنین کے حالات بھی دکھائے جاتے ہیں ۔ اور یہ پورے قرآن کریم کا انداز ہے ۔ چنانچہ یہاں بھی آیات

لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (۶۷ : ۲) "تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون اچھے اعمال کرتا ہے" ۔ کے مضمون کے مطابق آزمائش کے بعد جو کامیاب ہوئے ان کی جزاء کا ذکر ہے ۔

إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿۱۲﴾

"جو لوگ بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں' یقیناً ان کے لیے مغفرت ہے اور بڑا اجر" ۔

غیب سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنے رب کو دیکھا نہیں اور اس سے ڈرتے ہیں' اور یہ مراد بھی ہے کہ اس حالت میں بھی رب سے ڈرتے ہیں جب انہیں کوئی نہیں دیکھ رہا ہوتا ۔ ایک انسان جب چھپے ہوئے بھی برائی نہیں کرتا تو اس کا ضمیر زندہ ہوتا ہے اور وہ خدا کا صحیح طرح مومن ہوتا ہے ۔ حافظ ابوبکر بزار نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے' طالوت ابن عباد سے' انہوں نے حارث ابن عبید سے' انہوں نے ثابت سے' انہوں نے انس سے وہ کہتے ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا اے رسول خدا ..... ہم آپ کے پاس ایک حال میں ہوتے ہیں لیکن جب ہم آپ سے جدا ہوتے ہیں تو ہمارا حال اور ہوتا ہے ۔ تو آپ ؐ نے فرمایا تم اور تمہارے رب کے ساتھ تعلق کیسا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ رب تو تنہائی میں اور محفل میں ہر جگہ ہمارا رب ہے ۔ تو آپ ؐ نے فرمایا کہ یہ "نفاق نہیں ہے" ۔ لہٰذا اللہ کے ساتھ رابطہ حقیقی رابطہ ہے ۔ جب اللہ پر یقین ہو تو ایسا شخص مومن ہے ۔

یہ مذکورہ بالا آیت مضمون ماقبل اور مضمون مابعد دونوں کو آپس میں ملاتی ہے ۔ یہ کہ اللہ کو ہر حالت کا علم ہے خواہ کوئی ظاہر ہو یا خفیہ' تنہائیوں میں ہو ۔ اللہ تعالیٰ پکار کر لوگوں کو کہتا ہے کہ میں نے تمہیں پیدا کیا اور میں تمہارے ظاہر و باطن دونوں سے واقف ہوں مجھے اپنی مخلوق کی تمام صلاحیتوں کا علم ہے ۔

وَ اَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۳﴾ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ
خَلَقَ ؕ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۴﴾

"تم خواہ چپکے سے بات کرو یا اونچی آواز سے (اللہ کے لیے یکساں ہے) وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟ حالانکہ وہ باریک بین اور باخبر ہے"۔

تم کوئی بات خفیہ کرو یا جہراً کرو' اللہ کو تو علم ہے۔ وہ جہر' خفی اور دل کی باتوں کو بھی جانتا ہے۔

اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (٦٧ : ١٣) "وہ دلوں کا حال جانتا ہے"۔ وہ بات جو ابھی دل کو چھوڑ کر منہ پر نہیں آئی۔ کیونکہ ان باتوں کو دلوں کے اندر اس نے تو پیدا کیا ہے جس طرح دلوں کو اس نے پیدا کیا ہے۔

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (٦٧ : ١٤) "کیا وہی نہ جانے جس نے پیدا کیا"۔

وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (٦٧ : ١٤) "حالانکہ وہ باریک بین اور باخبر ہے" اس کا علم بہت ہی باریکی اور تاریکی تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ ہر خفی و مستور بھی اس کے علم میں ہے۔

جو لوگ اپنی کوئی حرکت اللہ سے چھپاتے ہیں' یا باتیں اللہ سے چھپاتے ہیں' یا دل کی نیت کے بارے میں یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ تو نیت ہے' وہ ایک مضحکہ خیز سوچ رکھتے ہیں۔ جس ضمیر میں وہ بات چھپاتے ہیں وہ کس کے ہاتھ میں ہے؟ وہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کے اندر ابھرنے والی سوچ کی تمام لہروں کو وہ جانتا ہے۔ نیت و ارادہ بھی اللہ کی مخلوقات کا حصہ ہے۔ اور اس کو بھی وہ جانتا ہے کہ کون کیا ارادہ رکھتا ہے۔ لوگ کیا چھپاتے ہیں اور کیا نہیں چھپاتے۔

قرآن انسانی قلوب میں یہ حقیقت بٹھانا چاہتا ہے' اس لیے کہ اس طرح وہ حقیقت کبریٰ کا صحیح ادراک کر سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ ان کے اندر بیداری اور تقویٰ کا احساس بڑھتا ہے' جس کا تعلق اس عظیم ذمہ داری کے ساتھ ہے' جو انہوں نے اس جہاں میں اٹھائی ہے یعنی دنیا میں صحیح نظریہ حیات پھیلانا' عدالت کا قیام' اور نیت اور عمل میں خلوص کا حصول اور یہ مقام کوئی انسان اس وقت تک نہیں پا سکتا جب تک وہ ظاہر و باطن میں خدا سے نہ ڈرتا ہو' اور اللہ بہت ہی لطیف و خبیر ہے۔

جب ایک مومن اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ خفیہ نیت میں بھی اللہ سے ڈرتا ہے اور دل میں پوشیدہ وسوسہ کے بارے میں بھی ڈرتا ہے اور ظاہری قول اور فعل سے بھی ڈرتا ہے اگر وہ اللہ کی مرضی کے خلاف ہو' کیونکہ اللہ تو وسوسہ سے خبردار ہے۔

اس کے بعد اب روئے سخن انسان کے نفوس اور ان کی نگرانی کے موضوع سے' زمین کی طرف پھرتا ہے کہ اس کی تخلیق انسان کے لیے ہوئی ہے اور اس زمین کو تمہارے زیر نگیں بنایا گیا ہے اور سب چیزیں تمہارے لیے پیدا کی ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوْا

مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ ﴿۱۵﴾

"وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو تابع کر رکھا ہے' چلو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق' اسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے"۔

لوگوں کی حالت یہ ہے کہ اس زمین پر رہتے رہتے اور اس زمین پر ان کو ہر قسم کی رہائشی سہولتیں ہونے کی وجہ سے' اس میں چلنے پھرنے کی قدرت اور اس کی مٹی' پانی' ہوا اور دوسرے خزانوں پر دسترس کی وجہ سے اور اس کی تمام پیداوار استعمال کرنے کی وجہ سے' لوگ یہاں کی زندگی کے عادی ہو گئے ہیں اور یہ بات تک بھول گئے ہیں کہ اللہ نے اس کو ان کے لیے مسخر کر دیا ہے اور ان کی دسترس میں دے دیا ہے۔ قرآن کریم بار بار ان کو یہ سبق یاد دلاتا ہے کہ ذرا اس پر غور کرو اور دیکھو۔ چنانچہ ہر دور میں لوگوں نے اپنے اپنے علم کے مطابق تسخیر کائنات کے مفہوم کو سمجھا۔

ایک مسخر زمین' ابتدائی دور کے سننے والوں کے ذہن میں صرف یہ مفہوم رکھتی تھی کہ اس زمین کے اوپر ہم چل سکتے ہیں۔ پیدل یا گھوڑوں پر سوار ہو کر' یا کشتی پر سوار ہو کر جو سمندر کے سینے کو چیرتی چلی جاتی ہے۔ اور اس میں زراعت کر سکتے ہیں اور اس کے اندر جو کچھ زندہ و مردہ مخلوقات ہے' اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ پانی' ہوا اور زمین اور ہر قسم کے نباتات وغیرہ۔

یہی مجمل مفہومات تھے جن کو اب سائنس نے ذرا مزید مفصل بنا دیا ہے' جہاں تک آج ہمارا علم آگے بڑھا ہے۔ اور ہمارے اس علم کی وجہ سے اس نص قرآنی کا مفہوم بھی مزید وسیع ہو گیا ہے آئندہ نسلیں اس سے زیادہ سمجھیں گی۔

اب جدید علوم کے مطابق اس کا مفہوم کس قدر وسیع ہے۔ یہ لفظ ذلول بالعموم ایک جانور کے لیے استعمال ہوتا ہے جو سدھایا ہوا ہو۔ یعنی جو سواری کے لیے اچھا ہو' مطیع ہو' زمین پر اس لفظ کا اطلاق اب ہم اچھی طرح سمجھے ہیں کہ یہ زمین بھی دراصل ایک سواری ہے' اگرچہ یہ ٹھہری ہوئی' پرسکون اور جمی ہوئی ہے' لیکن دراصل یہ متحرک سواری ہے بلکہ نہایت ہی تیز رفتار سواری ہے۔ اللہ نے اسے ایسا تابع جانور بنایا ہے کہ سوار کو اٹھا کر پھینک نہیں دیتی اور نہ اسے ہوا میں اڑا دیتی ہے۔ نہ اس کے اوپر انسان کے قدم ڈگمگاتے ہیں اور نہ یہ انسان کو گھوڑے یا اونٹ پر سوار ہونے والے کی طرح ہلاتی ہے' جھٹکے دیتی ہے' اچھالتی ہے' جس طرح ایک غیر "ذلول" جانور ایسا کرتا ہے۔ پھر یہ ایک ایسا جانور ہے کہ تابع جانور کی طرح دودھ دینے والی بھی ہے۔

یہ جانور یا یہ گولا جس کے اوپر ہم سوار ہیں' یہ اپنے اردگرد ایک ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے چکر لگا رہی ہے اور اس محوری رفتار کے ساتھ ساتھ یہ سورج کے گرد ۶۵ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی دوڑ رہی ہے۔ پھر یہ زمین' یہ سورج اور سورج کی پوری کہکشاں ۲۰ ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے آسمان کے برج جبار (VAST ORBTTA) کی سمت چلتے ہیں جس کا ایک چکر ۲۶ کروڑ سال میں پورا ہوتا ہے۔ ان تمام رفتاروں کے باوجود' ان تمام دوڑوں کے باوجود ہم بڑے آرام سے اس گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ گھوڑا بہت بڑا "ذلول" ہے۔ اس قدر سکون سے جا رہا ہے کہ رفتار کا احساس بھی نہیں ہو رہا ہے۔ بڑے سکون سے بیٹھا ہے۔ اس کے اعصاب پر کوئی دباؤ نہیں ہے اور یہ نہیں ہو رہا کہ اس سے گر کر اس کی بوٹی بوٹی اس کائنات میں بکھر جائے۔ اور اس گھوڑے کے اوپر سے انسان کبھی بھی

نہیں کرتا۔

پھر یہ تین مختلف الاطراف حرکتوں میں یہ گھوڑا جتا ہوا ہے ۔ ان میں دو حرکتوں ' یعنی حرکت محوری اور حرکت شمسی کے اثرات کو تو ہم جانتے ہیں ۔ انسانوں پر بھی ان کا اثر ہے ' زمین پر بھی ان کا اثر ہے اور اس زمین پر پائی جانے والی زندگی پر بھی ان کا اثر ہوتا ہے ۔ زمین کی گردش محوری کی وجہ سے لیل و نہار پیدا ہوتے ہیں ۔ اگر ہمیشہ رات ہوتی تو سردی کی وجہ سے تمام چیزیں جم جاتیں ' اور سورج کے گرد اس کا جو دورہ ہے اس سے موسم اور مختلف فصلوں کے اوقات کا تعین ہوتا ہے ۔ اور اگر ایک ہی موسم رہتا تو زمین کی موجودہ شکل نہ ہوتی ۔ رہی تیسری حرکت تو ابھی ہمیں اس کی حکمت کا علم نہیں ہو سکا اور یہ ضروری ہے کہ اس عظیم کائنات کے کسی عظیم تر نظام سے اس کا کوئی تعلق ہو ۔ واللہ اعلم !

یہ گھوڑا جو بیک وقت ان مختلف اطراف میں یہ حرکات کر رہا ہے اپنی اس حرکت کے دوران اپنی جگہ جما ہوا ہے یا جما ہوا نظر آتا ہے ۔ اور یہ اپنے محور پر 23.5 درجے جھکا ہوا ہے ۔ اور اس جھکاؤ کے نتیجے ہی میں چار مختلف موسم پیدا ہوتے ہیں ۔ یہ موسم زمین کی گردش شمسی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں ۔ اگر اس حرکت میں ذرا بھی خلل آ جائے تو ہمارا تمام موسمی نظام ' بارشوں کا نظام اور فصلیں اگنے کا نظام اور ماہ و سال کا نظام ختم ہو جائے ' بلکہ ممکن ہے کہ زمین پر سے زندگی ہی ناپید ہو جائے ۔

اللہ نے زمین کو اس طرح انسان کے لیے سدھایا ہوا ہے کہ اس کے اندر جاذبیت کی ایسی مقدار رکھی ہے کہ زمین انسان کو اپنے اوپر چپکائے رکھتی ہے اور تمام حرکات کے دوران انسان اس کے اوپر اودھر ادھر نہیں لڑھکتے ۔ اسی طرح اس کے اوپر فضا کے دباؤ کا نظام قائم کیا گیا ہے جس کی وجہ سے انسان بسہولت اس کے اوپر چل سکتا ہے ۔ اگرچہ موجودہ فضائی دباؤ ذرا بھی زیادہ ہوتا تو انسان کے لیے زمین کے اوپر چلنا ممکن ہی نہ رہتا یا چلنا بہت ہی مشکل ہوتا ۔ زیادہ دباؤ کی وجہ سے انسان چپک جاتا یا چلنے کے قابل نہ ہوتا ۔ اور اگر موجود دباؤ سے بھی اسے قدرے کم کر دیا جاتا تو انسان فضا میں چھلانگیں لگاتا پھرتا اور اس کے قدم مضطرب ہو جاتے ۔ یا اس کا پیٹ اندرونی دباؤ سے پھٹ جاتا ۔ کانوں کے پردے پھٹ جاتے ۔ جس طرح ان لوگوں کو پیش آتا ہے جو بالائی فضا میں چلے جاتے ہیں اور ان کو موجودہ فضائی دباؤ مصنوعی طور پر فراہم نہیں کیا جاتا ۔

پھر اللہ نے موجودہ زمین کو مسخر کر دیا ۔ اس نے زمین کی سطح کو ہموار کر دیا ہے اور اوپر سے اس پر نرم مٹی فراہم کر دی ہے ۔ اگر یہ زمین ایک مضبوط صحرا کی طرح ہوتی جس طرح سائنس دانوں نے یہ مفروضہ کیا ہے کہ یہ ٹھنڈی ہو کر ایک چٹان بن گئی تھی ۔ تو اس پر چلنا بھی مشکل ہوتا اور اس کے اندر کوئی روئیدگی بھی نہ ہوتی ' لیکن فضائی عوامل ' ہوا ' گرمی ' سردی اور بارشوں نے ان سخت پتھروں کو توڑا پھوڑا اور اس طرح زمین پر یہ مٹی پیدا ہوئی ' جس کے اندر ہر قسم کی پیداوار ممکن ہوتی ہے (اور اسی سے انسان بھی بنایا گیا) یوں اس سواری کے سوار اس کا دودھ بھی پیتے ہیں ۔

اور اللہ نے زمین کو اس طرح مسخر بنایا کہ اس کے اوپر جو ہوا جمع کی اس کے اندر انسان اور دوسری زندگی کی تمام ضروریات جمع کر دیں ۔ اور یہ ضروریات اس طرح باریک بینی کے ساتھ اس ہوا کے اندر رکھ دیں کہ اگر ان عناصر میں سے کوئی چیز ذرا بھی کم و بیش کر دی جائے تو کرۂ ارض کے اوپر سے تمام زندگی ختم ہو جائے ۔ ہوا میں آکسیجن کی نسبت ۲۱ جز ہے اور نائٹروجن ۷۸ جز ہے اور باقی کاربن ڈائی آکسائیڈ ہے اور دوسری گیسیں ہیں ۔ اور یہ نسبت زمین پر زندگی کے

قیام کے لیے لازمی ہے۔

پھر اللہ نے زمین کو انسانی زندگی کی ہزارہا ضروریات کے لیے موزوں قرار دیا۔ ان میں زمین کا موجودہ حجم' سورج کا موجودہ حجم اور چاند کا موجودہ حجم سب کے سب سازگار ہیں۔ پھر شمس و قمر سے زمین کی موجودہ دوری' سورج کا درجہ حرارت' اور زمین کے چھلکے کا موجودہ موٹاپا اور زمین کی موجودہ رفتار' زمین کا اپنے محور پر ایک طرف جھکا ہوا ہونا اور پھر خشکی اور تری کی موجودہ نسبت اور ہوا کی موجودہ کثافت اور یہ اس قسم کی دوسری چیزیں سب مل کر زمین کو انسان کے لیے مسخر کرتی ہے اور ذلول بناتی ہیں اور انہی چیزوں کی وجہ سے انسانوں کا رزق فراہم ہوا ہے اور ان سے مختلف حیوانات اور پھر انسان کو زندگی ملی ہے۔

یہ قرآنی آیت ان امور کی طرف اشارہ کر رہی ہے تاکہ اسے ہر دور کا آدمی اپنی علمی استطاعت کے مطابق سمجھ سکے۔ جس قدر انسانی مشاہدہ آگے بڑھے گا۔ آیت کا مفہوم وسیع ہوتا جائے گا اور انسان یہ شعور تازہ کرتا رہے گا کہ سب بادشاہی اللہ کے ہاتھ ہی میں ہے۔ وہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔ انسان کے پورے ماحول میں ہر چیز کا بھی نگہبان ہے۔ یہ زمین انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ انسان کی حفاظت بھی اللہ کر رہا ہے اور اگر کسی وقت اس کی نگہبانی اٹھ جائے تو یہ پورے کا پورا نظام یکلخت بگڑ جائے۔

جب انسانی ضمیر میں یہ بات بیٹھ گئی' تو اللہ رحمٰن اور رحیم نے حکم دیا کہ اس زمین کی چھاتی پر گھومو پھرو اور اس کے اندر جو ارزاق رکھے ہوئے ہیں ان کو استعمال کرو۔

فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَ کُلُوْا مِنْ رِّزْقِه (۶۷: ۱۵) "چلو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق"۔ مناکب کے معنی ہیں اس کی بلندیاں یا اس کی پہلو۔ جب اللہ نے زمین کی بلندیوں اور پہلوؤں پر پھرنے کی اجازت دے دی تو اس کے میدان اور اس کی وادیوں میں پھرنے کی اجازت بھی اس میں آگئی اور اس کے اندر جو بھی رزق ہے وہ اللہ کا پیدا کردہ ہے۔ وہ کسی کا مال نہیں ہے' جو کسی کے ہاتھ میں ہو' یہ سب اس کی ملکیت میں ہے۔ اور اس کا مفہوم بہت ہی وسیع ہے' اس سے جو بالعموم لوگوں کے ذہن میں آتا ہے' لفظ رزق سے۔ اس سے صرف وہ مال مراد نہیں ہے جو کسی کے قبضے میں ہو تاکہ وہ اس سے اپنی ضروریات پوری کرے۔ اس رزق سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جو انسان کے لیے رزق کے اسباب ہیں اور جو اس زمین کے اندر ودیعت کی ہوئی ہیں۔ وہ تمام عناصر جن سے یہ زمین بنائی گئی ہے اور وہ تمام عناصر جن کے استعمال کے لیے اللہ نے نباتات' حیوانات اور انسانوں کو اہل بنایا۔ اس رزق کی تشریح جدید علوم نے خوب کر دی ہے مختصراً اس کی نوعیت یوں ہے :

"ہر پودے کی زندگی ہوا میں موجود کاربن ڈائی آکسائیڈ کے چھوٹے ذرات مالیکیولز لوذرات پر موقوف ہے جو ہوا میں ہوتے ہیں۔ جن کو یہ پودا سانس لے کر جذب کرتا ہے۔ یہ ایک کیمیاوی عمل ہے جو سورج کی روشنی میں مکمل ہوتا ہے' یوں سمجھنا چاہئے کہ درختوں کے پتے دراصل درختوں کے پھیپھڑے ہیں۔ سورج کی روشنی میں پودے اس قابل ہوتے ہیں کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کریں اور کاربن کو آکسیجن سے علیحدہ کر دیں اور آکسیجن کو واپس کر دیں اور کاربن کو ہائیڈروجن کے ساتھ ملا کر' جسے جڑوں کے ذریعہ پودا پانی کی شکل میں اخذ کرتا ہے' (جہاں پانی کی آکسیجن اور

ہائیڈروجن کی علیحدگی ہو جاتی ہے) اور پھر نہایت ہی حیران کن انداز سے قدرت ان عناصر سے شکر اور نامیاتی ریشے اور متعدد دوسرے کیمیاوی مواد تیار کرتی ہے' جس سے پھل اور پھول تیار ہوتے ہیں اور جس مواد سے پودا اپنی غذا بھی لیتا ہے اور روئے زمین کے تمام دوسرے حیوانات کے لیے غذا تیار بھی کرتا ہے' اور اس دوران یہ پودا جو آکسیجن سانس کے ذریعہ کھینچتا ہے اسے نکال دیتا ہے' جس کے بغیر پانچ سیکنڈ کے اندر اندر زندگی ختم ہو جاتی ہے"۔

"اس طرح معلوم ہوتا ہے تمام نباتات' تمام جنگلات' تمام جھاڑیاں پانی پر پائی جانے والی کائی' تمام فصلیں دراصل کاربن اور پانی سے تشکیل پاتی ہیں۔ حیوانات اور انسان کاربن ڈائی آکسائیڈ نکالتے ہیں اور نباتات آکسیجن نکالتے ہیں۔ اگر یہ تبادلہ نہ ہوتا تو انسانی زندگی اور حیوانی زندگی سب آکسیجن اور سب کاربن ڈائی آکسائیڈ کو آخر کار ختم کر دیتے اور جب یہ توازن ختم ہو جاتا تو پودے جھلس جاتے اور انسان مر جاتے۔ حال ہی میں یہ انکشاف ہوا ہے کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کی ایک قلیل مقدار حیوانات کی زندگی کے لیے ضروری ہے جبکہ نباتات کو بھی آکسیجن کی قلیل مقدار کی ضرورت ہوتی ہے"۔

"اگرچہ ہم ہائیڈروجن کو سانس کے ذریعے نہیں جذب کرتے۔ لیکن اس کا وجود بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر پانی موجود نہیں ہوتا اور پانی انسانی اور حیوانی زندگی کے لیے نباتات کے لیے اس قدر ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسانوں اور حیوانوں کی زندگی ممکن ہی نہیں"۔ (۱)

اسی طرح نائٹروجن کا بھی زمین کے رزق کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

"نائٹروجن کے بغیر کوئی غذائی پودا نشوونما ہی نہیں پا سکتا۔ اسے کسی نہ کسی طرح نائٹروجن ملنا چاہئے۔ زرعی زمین میں نائٹروجن کے داخل ہونے کے دو طریقے ہیں۔ یہ کہ ایک خاص قسم کا بیکٹریا یعنی (جراثیم) سبزی نما نباتات کی جڑوں میں رہتے ہیں۔ شفتل' چنا' لوبیا وغیرہ کی جڑوں میں۔ یہ جراثیم خالص نائٹروجن حاصل کرتے ہیں مثلاً ہوا سے اور ان کو مرکب شکل میں زمین میں چھوڑتے ہیں اور پھر پودا اس کو اپنے اندر جذب کر سکتا ہے۔ جب یہ پودا مر جاتا ہے تو یہ مرکب نائٹروجن زمین کے اندر ہی رہ جاتا ہے"۔

"ایک طریقہ دوسرا بھی ہے' جس کے ذریعہ نائٹروجن زمین میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب لمبی ہوائیں چلتی ہیں جن میں بجلی چمکتی ہے۔ ہواؤں کے اندر جب بھی چمکتی ہے تو کسی قدر آکسیجن اور نائٹروجن کو متحد کر دیتی ہے۔ اور بارش اسے زمین پر ایک مرکب نائٹروجن کے طور پر پھینک دیتی ہے۔ اس صورت میں کہ پودے ان کو جذب کر سکیں"۔

کیونکہ پودے خالص نائٹروجن کو اپنے اندر جذب نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ ہوا میں اس کی نسبت ۷۸٪ ہوتی ہے"۔ (۲)

اور زمین کے اندر جو جامد اور سیال رزق موجود ہے یہ سب زمین اور اس کے حالات رزق کے ساتھ متعلق ہے۔

(۱) "سائنس ایمان کی دعوت دیتی ہے" ترجمہ محمود صالح فلکی ص ۲۰' ۲۱۔
(۲) "سائنس ایمان کی دعوت دیتی ہے" ترجمہ محمود صالح فلکی ص ۲۰' ۲۱۔

یہاں اندر کے ارزاق کی تشریحات کی ضرورت نہیں ہے۔کیونکہ لفظ رزق کا مفہوم یہاں بہت ہی وسیع ہے اور بہت ہی گہرا ہے۔اور جب اللہ ہمیں اجازت دیتا ہے کہ تم زمین میں پھرو اور رزق تلاش کرو کہ تمہارے لیے زمین کو مسخر کیا گیا ہے تو یہ سب اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں اور ہمیں اجازت ہے۔جس قدر انسان اس سے استفادہ کر سکے۔

فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَ کُلُوْا مِنْ رِّزْقِه (١٥:٦٧) "چلو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق"۔

لیکن یہ اجازت ایک متعین وقت تک کے لیے ہے اور وقت کا تعین کر دیا گیا ہے جو اللہ کے علم میں ہے۔اللہ کی تدبیر کائنات کے مطابق ہے۔زندگی اور موت کے عرصہ ابتلا تک کھاؤ لیکن اس کے بعد۔

وَ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ (١٥:٦٧) "اسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے"۔اسی کی طرف جانا ہے اور اگر تم نہیں مانتے تو بتاؤ کس کی طرف جانا ہے؟اس کے سوا جائے پناہ تو کہیں بھی نہیں ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ابھی انسان اس زمین کی پشت پر اور اس کے اندر اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہی ہو رہا تھا اور اللہ کے حکم سے زمین پر چل کر نعمتیں سمیٹ رہا تھا کہ اچانک اس سدھائی ہوئی تابعدار زمین کے اندر ایک جنبش پیدا ہوتی ہے اور اس کا یہ توازن اور رفتار یکدم ختم ہو جاتی ہے۔اب یہی پرسکون زمین ان پر بمباری کر رہی ہے اور پہاڑ گرا رہی ہے۔ان کے احساس اور تصورات میں ایک زلزلہ برپا کر دیا جاتا ہے تاکہ یہ لوگ زمین کے قرار و سکون اور نعمتوں سے لطف اندوز ہونے میں ہی مگن نہ ہو جائیں اور ذرا اس بادشاہ کی طرف بھی دیکھیں جس نے اس نظام کو قائم کر رکھا ہے' اپنے دلوں اور سوچوں کو اللہ کے ساتھ مربوط رکھیں۔

ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ﴿١٦﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعْلَمُوْنَ کَیْفَ نَذِیْرِ ﴿١٧﴾ وَ لَقَدْ کَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَکَیْفَ کَانَ نَکِیْرِ ﴿١٨﴾

"کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے' تمہیں زمین میں دھنسا دے اور یکایک یہ زمین جھکولے کھانے لگے؟کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے' تم پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیج دے؟پھر تمہیں معلوم ہو جائے کہ میری تنبیہ کیسی ہوتی ہے۔ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ جھٹلا چکے ہیں۔پھر دیکھ لو کہ میری گرفت کیسی سخت تھی"۔

یہ انسان جو اس سدھائی ہوئی مطیع فرمان سواری پر سوار ہو کر مزے لوٹ رہا ہے اور اس سواری کے اندر ہی اپنا رزق دودھ کی شکل میں حاصل کرتا ہے' اسے معلوم ہے کہ یہ مطیع فرمان سواری ایک دن بگڑ جائے گی اور جب اللہ کا حکم ہو گا تو یہ ایسی نہ رہے گی۔یہ ذرا سا جھٹکا ہی دے گی کہ اس کے اوپر کی تمام چیزیں ادھر ادھر بکھر جائیں گی اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح لرز جائیں گے اور یہ اس قدر تیز جھکولے کھانے لگے گی اور ایسے حالات بڑے زلزلوں اور بڑی بڑی

آتش فشانیوں کے وقت بھی ہوتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رکی ہوئی اور تابع زمین کے اندر کس قدر سرکشی ہے جو ناقابل کنٹرول ہے۔ اس کی زمام تو اللہ نے پکڑ رکھی ہے۔ اس لیے یہ جھٹکے نہیں کھاتی ہے اور جب یہ چند سیکنڈ یا ایک منٹ کے لیے بھی جھٹکے دے تو زمین کے اوپر انسانوں نے جس قدر پختہ سے پختہ قلعے تعمیر کیے ہوئے ہیں 'سب مسمار ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بستیوں کی بستیاں اس کے پیٹ کے اندر دھنس جاتی ہیں اور جب انسان اس کے اندر جا رہے ہوں تو کوئی چیز بھی انہیں بچا نہ سکے۔

زلزلوں' آتش فشانی اور دھنسنے کے وقت یہ فرعون انسان پھر چوہوں کی طرح ادھر ادھر بھاگتے ہیں۔ جس طرح چوہے پنجرے میں بند ہوں اور وہ نکلنے کے لیے ادھر ادھر بھاگتے ہیں۔ ایک منٹ پہلے تو یہ غافل 'مست' سرکش اور اس ذات عالی مقام سے غافل تھے جس نے اس سرکش سواری کی زمام کو تھام رکھا تھا اور اب ہر طرف بھگدڑ ہے۔

انسان اس دنیا میں ایسی آندھیاں بھی دیکھتے ہیں جو باد و باراں کے ساتھ پتھر بھی برسا رہی ہوتی ہیں اور جس جس بستی سے گزرتی ہیں' درختوں' خیموں اور مکانات کو اڑاتی چلی جاتی ہیں۔ جنگلات کو جلا کر بھسم کر دیتی ہیں اور لوگ دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ بے بس دیکھتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا علم اور ان کی قوت اور ٹیکنالوجی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ یہ طوفان ہزاروں میل کی رفتار سے چلتے ہیں اور پتھر اڑاتے اور سمندروں کو خشکیوں پر چڑھاتے چلے جاتے ہیں تو انسان ان کے سامنے ایک مچھر اور چیونٹی کے برابر رہ جاتا ہے' لیکن یہ اللہ کی قوت ہی ہوتی ہے جو اپنی افواج کو روکتی ہے اور پھر یہ زمین اور یہ سواری قرار پکڑتی ہے۔

قرآن کریم انسانوں کو یاد دلاتا ہے کہ یہ سواری جو تمہارے لیے سدھائی ہے اور بڑی سلامتی سے چل رہی ہے' تم کہیں دھوکہ نہ کھا جاؤ' یہ تو خالق کائنات کے کنٹرول میں ہے اور اسی نے اسے تمہارے لیے سدھایا ہے' اس کی سرکشیاں جب شروع ہوں گی تو تم پھر اپنے آپ کو کسی صورت میں بچا نہ سکو گے۔ یہ زمین جھکولے کھا سکتی ہے اور تیز رفتاری اختیار کر سکتی ہے۔ یہ اپنے اندر سے گرم گرم لاوا بھی اگل سکتی ہے' یہ تمہیں زمین کے اندر بھی دھنسا سکتی ہے' پتھروں کی بارش بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی انسانی طاقت اس کو نہیں روک سکتی۔ اور نہ کوئی انسانی طاقت اسے تباہی و بربادی سے دور کر سکتی ہے۔ اللہ اس قدر ڈراتا ہے کہ دل دہل جاتے ہیں اور اعصاب شل ہو جاتے ہیں اور اعضا تھر تھرانے لگتے ہیں۔

فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ (۶۷: ۱۷) "پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میری تنبیہ کیسی ہوتی ہے"۔ اب ان کے سامنے تاریخی واقعات کی طرف ایک مجمل اشارہ پیش کیا جاتا ہے کہ ازمنہ ماضیہ میں بعض منکرین کا عبرتناک انجام تمہارے سامنے ہے۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ (۶۷: ۱۸) "ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ جھٹلا چکے ہیں پھر دیکھ لو میری گرفت کیسی سخت تھی"۔ نکیر کا مفہوم ہے غصہ اور سرزنش اور اس کے نتیجے میں آنے والی سزا۔ ان کو وہ واقعات معلوم ہیں کہ اللہ نے امم سابقہ کو پکڑا۔ انہی سے پوچھا جاتا ہے کہ تم ہی بتاؤ کہ پکڑ کیسی رہی۔

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ( ۶۷ : ۱۸ ) کیونکہ آثار ان کے سامنے تھے ۔ لہٰذا وہ جانتے کہ عذاب کیسا رہا ۔

یہاں اللہ ان کی جس بے خوفی پر تنبیہ فرماتا ہے وہ ایسی بے خوفی ہے جس میں انسان اللہ سے غافل ہو جائے ۔ ایسا امان ہے جس کے نتیجے میں انسان کے دل سے اللہ کی قدرت کا ڈر نکل جائے اور اللہ کی عظمت کا خیال نہ رہے ۔ اس بے خوفی سے مراد وہ امن و اطمینان کی حالت نہیں ہے جو ذکر الٰہی کے نتیجے میں انسان کو حاصل ہوتی ہے ۔ جو اللہ کی رحمت اور اس کی نگہبانی کے یقین سے نصیب ہوتا ہے ۔ مومن اللہ کی رحمت اور فضل کا امیدوار ہوتا ہے ۔ لیکن غافل نہیں ہوتا ۔ اللہ کو یاد کرنے والا مومن تو ہر وقت اس کی طرف نظریں اٹھائے ہوئے ہوتا ہے ۔ اس سے حیا کرتا ہے ۔ اس کے غضب سے ڈرتا ہے ۔ اور وہ ہر وقت دعا کرتا ہے کہ اے اللہ تیری تقدیر میں میرے لیے جو مشکل لکھی ہے اس سے بچا لو ۔ عافیت نصیب کر ۔ وہ ہر وقت ڈرتا ہے ۔

امام احمد نے اپنی اسناد کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا ” میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی بے فکری کی حالت میں یوں ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ آپ کی حلق کا کوا نظر آتا ہو ۔ آپ صرف تبسم فرماتے ۔ اور رسول اللہ ﷺ یوں تھے کہ جب کوئی بادل دیکھتے یا تند ہوا دیکھتے تو آپ کے چہرے پر اثر ہو جاتا ۔ تو میں نے کہا کہ اے رسول خدا لوگ جب بادل دیکھتے ہیں یا ہوا دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اس امید پر کہ اس میں بارش ہو گی ۔ اور میں دیکھتی ہوں کہ آپ جب ان چیزوں کو دیکھتے ہیں تو آپ کے چہرے پر کراہیت کے آثار نظر آتے ہیں ۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ” اے عائشہ ........ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اس میں عذاب ہی نہ ہو ۔ بعض اقوام کو ہوا سے عذاب دیا گیا ” ” ایک قوم نے عذاب دیکھا اور کہا یہ بادل ہے جو ہم پر بارش کرے گا “ ۔ صحیحین

یہ ہے وہ جاگتا احساس ' اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے نظام قضا و قدر کے بارے میں جو احادیث میں آپ کی سیرت سے بھی نقل ہوا ہے ' یہ احساس اللہ کی رحمت پر اطمینان اور اللہ کے فضل کی امیدواری کے خلاف نہیں ہے ۔

یوں آیات میں بتایا جاتا ہے کہ تمام ظاہری اسباب کا ایک مسبب الاسباب ہے ۔ تمام سبب کو سبب اول کی طرف لوٹایا جاتا ہے ۔ اور وہ ذات باری ہے ' جس کے ہاتھ میں پوری بادشاہت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ لہٰذا کسی گاؤں کو زمین میں دھنسا دینا ' کسی کو آتش فشاں کی زد میں لانا ' کسی بستی کو زلزلے سے تباہ کر دینا اور کسی بستی کو تیز ہواؤں کی زد میں لانا صرف اللہ کی قدرت میں ہے ۔ اور ان کے علاوہ یہ تمام کائناتی قوتیں اور یہ تمام طبیعیاتی قوتیں کیا کسی انسان کے ہاتھ میں ہیں ۔ ان کا معاملہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔ ان کے بارے میں جو اسباب گنواتے ہیں ۔ وہ تو محض مفروضے ہیں جن کے ذریعہ انسان ان واقعات کی کوئی معقول تشریح کرنا چاہتے ہیں ۔ لیکن ان واقعات میں ان کا دخل و عمل کوئی نہیں ہوتا ۔ اور نہ اپنے آپ کو ان واقعات سے بچا سکتے ہیں ۔ اور انسان اس زمین کی پشت پر جو تبدیلیاں لاتے ہیں وہ ایک ہی جھٹکے سے نیست و نابود ہو جاتی ہیں ۔ ایک آندھی اٹھتی ہے جس میں آگ ہوتی ہے تو وہ بھسم کر کے رکھ دیتی ہے ۔ گویا کہ یہ کاغذی کھیل تھا ۔ لہٰذا لوگوں کو چاہئے کہ وہ ہر معاملے کو صرف خالق کائنات کی طرف لوٹائیں اور اسے ہی تمام حادثات کا سبب اول سمجھیں ' اسے ہی ان قوانین قدرت کا جاری کرنے والا سمجھیں جن کے مطابق کائنات چلائی جاتی ہے ۔ اور وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ آسمان ہی علامت بلندی ہے ۔ اور یوں اللہ کو یاد کریں جس کے ہاتھ میں سب بادشاہیاں ہیں اور وہ سب چیزوں پر قادر ہے ۔

انسان کے اندر جو قوت ہے وہ وہی ہے جو اسے خالق نے بخشی ہے - اس کے پاس وہی علم ہے جو خالق نے اسے دیا ہے - لیکن اس پوری کائنات کی زمام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے - اور اس کائنات کے قوانین اس اللہ کے بنائے ہوئے ہیں - اور اس کے اندر جو قوتیں ہیں وہ اللہ کی مدد کی وجہ سے ہیں - اور یہ قوتیں اللہ کے نظام قضا و قدر کے مطابق چلتی ہیں ان سے جو تکلیف انسان کو پہنچتی ہے' ان سے جو نعمتیں انسان کو پہنچتی ہیں اور وقتاً فوقتاً جو واقعات و حادثات اس کائنات میں انسان کو پیش آتے رہتے ہیں یہ سب اللہ کی طرف سے ہیں اور جو بڑے بڑے حادثات انسان کو اس دنیا میں پیش آتے ہیں اور جن کے سامنے انسان بے بس کھڑا ہوتا ہے اور نہایت ہی بڑا نقصان اٹھاتا ہے ان کے جواب میں انسان صرف یہ کر سکتا ہے کہ وہ اللہ خالق کائنات کو یاد کرے اور اس کے سامنے دست بدعا ہو - جس نے ان قوتوں کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے اور صرف اللہ سے معاونت طلب کرے کہ وہ ان قوتوں کو انسان کے لیے مسخر کر دے -

اور انسان جب اس حقیقت کو بھول جاتا ہے اور غرے میں مبتلا ہو کر دھوکہ کھا جاتا ہے اور اکڑتا ہے کہ اس نے تو اس کائنات کی بعض قوتوں کو مسخر کر لیا ہے' تو ایسا شخص دراصل حقیقی علم سے دور ہو جاتا ہے اور اس کا رابطہ اب حقیقی علم سے کٹ جاتا ہے حالانکہ یہ حقیقی علم اسے اعلیٰ سرچشمے تک بلند کرتا ہے - اس طرح وہ مسخ ہو کر زمین پر گر جاتا ہے جبکہ حقیقی علم رکھنے والا شخص جو سچا مومن ہوتا ہے' وہ سرنگوں ہوتا ہے لیکن وہ اس کائنات کے وسیع میلے تک رسائی حاصل کر لیتا ہے' اس کا رابطہ باری تعالیٰ تک ہو جاتا ہے - یہ ہے وہ رحمت خداوندی جس کا مزا وہی شخص لے سکتا ہے جس پر یہ رحمت ہوئی ہو اور یہ رحمت خداوندی اس شخص پر ہوتی ہے جس کے لیے اللہ لکھ دے -

لیکن انسان جس قدر چاہے غرور کرے' اس کائنات کی قوتیں اسے مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ عجز و انکسار کے ساتھ اپنی بے بسی کا اعتراف کر لے' چاہے وہ حقیقی علم سے لذت آشنا ہو یا نہ ہو - وہ نئے نئے انکشافات کرتا ہے اور نئی نئی طبیعی قوتوں کی تسخیر کرتا ہے' اس کے بعد جب وہ کائناتی سرکش قوتوں کا بھی سامنا کرتا ہے تو وہ اپنی عاجزی تسلیم کر لیتا ہے اور نہایت ذلت کے ساتھ تسلیم کرتا ہے - ٹھیک ہے کہ کبھی وہ تند طوفان سے کسی پناہ گاہ میں چھپ جاتا ہے لیکن یہ طوفان نہایت سرکشی سے اس کے اوپر سے گزرتا ہے اور یہ اس کی راہ نہیں روک سکتا - زیادہ سے زیادہ وہ جو کر سکتا ہے' وہ یہ ہے کہ طوفان کی زد سے بچ سکتا ہے - لیکن یہ بھی کبھی کبھار - بعض اوقات یہ قوتیں اس قدر سرکش ہوتی ہیں کہ دیواروں سے پیچھے اور تہ خانوں کے اندر اسے ہلاک کر دیتی ہیں اور کبھی جب اس کو سمندر کی سرکشی سے واسطہ پڑتا ہے تو اس کے بڑے بڑے جہاز موجوں اور بگولوں کے اندر آکر غرق ہو جاتے ہیں اور یوں نظر آتے ہیں جس طرح بچوں کا کوئی کھیل تھا - رہے زلزلے اور آتش فشاں تو وہ تو اول روز سے آج تک ناقابل کنٹرول ہیں - یہ صرف عقل کا اندھا پن ہے جو کسی انسان کو یہ باور کرا سکتا ہے کہ وہ اللہ کے سوا اکیلا بھی یہاں رہ سکتا ہے یا یہ کہ وہ اس کائنات کا مالک ہے -

حقیقت یہ ہے کہ انسان اس زمین میں خدا کا نائب اور خلیفہ ہے - اور اسے علم' قوت اور قدرت اسی قدر دی گئی جس قدر اللہ نے چاہا ہے - حقیقت یہ ہے کہ یہاں اس کا محافظ اور نگہبان اللہ ہی ہے - وہ رازق بھی ہے اور معطی بھی ہے - اگر اللہ کا دست قدرت ایک لحظہ کے لیے بھی اس کی نگہبانی چھوڑ دے تو اس دنیا کی طبیعی قوتیں اسے ایک سیکنڈ کے اندر پیس کر رکھ دیں - بلکہ صرف مکھیاں اور چیونٹیاں ہی اسے کھا جائیں - لیکن وہ اللہ کے حکم سے یہاں محفوظ ہے اور معزز ہے - لہٰذا اسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ یہ شرف و کرم کہاں سے اخذ کرتا ہے' یہ تو اللہ کا فضل ہے جو اسے دیا گیا ہے -

اب ڈراوے اور تنبیہ کے بعد اسے دوبارہ غور و فکر کی دعوت دی جاتی ہے اور یہ ایک ایسے منظر میں جسے وہ بہت دیکھتا رہتا ہے' ہر وقت دیکھتا رہتا ہے لیکن یہ انسان اس پر کم ہی غور کرتا ہے۔ حالانکہ وہ منظر قدرت الٰہی کا ایک بہت بڑا منظر ہے اور اگر وہ اس پر غور کرے تو بہت کچھ اس سے سیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کی قدرت کے آثار میں سے ایک عجیب اثر ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ ۚ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ ۚ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ ﴿١٩﴾

"کیا یہ لوگ اپنے اوپر اڑنے والے پرندوں کو پر پھیلائے اور سکیڑتے نہیں دیکھتے؟ رحمن کے سوا کوئی نہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہو؟ وہی ہر چیز کا نگہبان ہے"۔

یہ خارق العادت معجزہ جو ہر وقت واقع ہوتا رہتا ہے۔ یہ چونکہ بار بار واقع ہوتا ہے اس لیے ہم اسے اہم نہیں سمجھتے۔ اور اس کے اندر اللہ کی جو قدرت کام کر رہی ہے اسے بھی ہم بھول جاتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ وہ صف بندی میں اڑتے ہیں اور پروں کو پھیلاتے ہیں اور سکیڑ لیتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں وہ صف بستہ اڑتے ہیں اور ہوا میں وہ پروں کو بند کر کے بھی اللہ کی قدرت سے اڑتے ہیں اور پروں کو پھیلا کر بھی اللہ کی قدرت سے اڑتے ہیں۔ اور یہ پرندے بعض اوقات ایسے کرتب دکھاتے ہیں' جن سے ان کی تخلیق کی خوبصورتی ظاہر ہوتی ہے۔ انسان دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اللہ کی عجیب و غریب مخلوقات کا یہ ایک عجیب تماشا ہے۔ جس کے اندر کمال اور جمال باہم یکجا نظر آتے ہیں۔ اس منظر کی طرف قرآن کا اشارہ یہ ہے!

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ (۶۷ : ۱۹) "کیا یہ لوگ اپنے اوپر اڑنے والے پرندوں کو پر پھیلائے اور سکیڑتے نہیں دیکھتے؟" اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ ان کو کس نے ڈیزائن کیا ہے؟۔

مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ (۶۷ : ۱۹) "رحمن کے سوا کوئی نہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہو"۔ اور رحمن نے ان کو ہوا میں ان قوانین قدرت کے مطابق رکھا ہوا ہے جو ہوا کے بارے میں اللہ نے یہاں رکھے ہوئے ہیں اور ان قوانین کے اندر ایک عجیب ترتیب ہے اور ان قوانین کے مطابق اللہ ان پرندوں کی تخلیق کی ہے جس میں ایک ایک خلیے اور ایک ایک ذرے کا حساب ملحوظ ہے۔ یہ وہ قوانین ہیں جن کے مطابق فضا کے اندر ہزاروں مساواتی فارمولے چلتے ہیں تاکہ ہوا میں پرندوں کی اڑان کا عمل مکمل ہو۔ اور یونہی انتظام کے ساتھ چلتا رہے۔

اور رحمن نے ان پرندوں کو اس حالت میں اپنی قدرت قادرہ کے ذریعے یوں رکھا ہوا ہے اور ان پر اس کی نظر اور نگرانی ہر وقت حاضر ہے اور کسی بھی وقت دور نہیں ہوتی۔ یہ اللہ ہی ہے کہ جو ان قوانین اور فارمولوں کو اس جہاں میں ہر وقت قائم' متوازن اور منظم رکھتا ہے۔ یہ اصول کسی بھی وقت ٹوٹتے نہیں۔ ان میں کبھی خلل نہیں آتا۔ کبھی ان میں اضطراب نہیں آتا۔ ایک پلک جھپکنے کے لیے بھی' ہر وقت۔

مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ (۶۷: ۱۹) "صرف رحمٰن ہی انہیں اس طرح تھامے ہوئے ہے" کہ ہر پرندے اور ہر پر کو اللہ نے تھام رکھا ہے۔ اور یہ پرندہ جب ہوا میں پروں کو سکیڑ لیتا ہے تو پھر فضا میں معلق ہوتا ہے' اللہ اسے وہاں رکھ رہا ہوتا ہے۔

اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيْرٌ (۶۷: ۱۹) "وہی ہے جو ہر چیز کا نگہبان ہے"۔ وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے' ہر چیز کی خبر رکھتا ہے۔ اس کے لئے حالات زندگی تیار رکھتا ہے' اسے قوت دیتا ہے اور ہر لمحہ اس کی ضروریات' روز مرہ کی ضروریات مہیا رکھتا ہے۔ جس طرح کوئی خبیر و بصیر رکھتا ہے۔ پرندوں کو فضا میں اسی طرح رکھتا ہے جس طرح تمام حیوانات کو زمین پر رکھتا ہے' جو فضا میں نہیں اڑتے ہیں۔ جس طرح اس فضائے کائنات میں اس نے بڑے بڑے اجرام فلکی روک رکھے ہیں۔ جنہیں یوں روکنے والا اللہ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ لیکن قرآن کریم لوگوں کو پکڑ کر ان کی آنکھوں اور دلوں کو ان تمام مناظر کی طرف کھینچ کر لاتا ہے جن کو وہ دیکھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ اور ان کے دلوں پر ان مناظر کے اشارات اور اثرات بٹھاتا ہے۔ ورنہ اللہ کی ہر صنعت میں اعجاز ہے اور اللہ کی ہر مخلوق میں اس کے آثار ہیں۔ اور ہر تن اور ہر نسل اس سے اپنی عقل کے مطابق دیکھ سکتی ہے۔ ایک بدوی کہتا تھا:

البعرۃ تدل علی البعیر "اونٹ کی مینگنی دلالت کرتی ہے کہ اونٹ گزرا ہے"۔ اور آج کا انسان اپنے مشاہدات کے ذریعہ توفیق الہی سے سب کچھ جانتا ہے یا بہت کچھ جانتا ہے۔

اب قرآن دوبارہ ان کو ان کے ان حالات کی طرف لاتا ہے جن میں وہ بے بس ہوتا ہے' طوفانوں' زلزلوں' آتش فشانی میں اور سنگ باری میں۔ فضا میں تیرنے والے پرندے کو دیکھ لیں کہ وہ تو فضائے کائنات میں اللہ کی توفیق سے امن میں ہیں تو دوبارہ ان کو ان کے مشکل لمحات یاد دلائے جاتے ہیں اور اس تکرار کا بہت اثر ہوتا ہے۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ؕ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ۚ﴿۲۰﴾

"بتاؤ' آخر وہ کون سا لشکر تمہارے پاس ہے جو رحمٰن کے مقابلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ منکرین دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں"۔

اللہ نے اس سے پہلے انسانوں کو خسف سے ڈرایا' جبکہ اس سے قبل کئی مکذبین کو یہ سزا دی گئی' پھر سنگباری سے ڈرایا جبکہ کئی پر سنگباری کی گئی۔ اور اسی طرح دوسرے مکذبین کی مختلف ہلاکتوں سے ڈرایا تھا۔ یہاں دوبارہ ان سے پوچھا جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کون ہے جو ان کی امداد کرتا ہے اور اس قسم کی مختلف ہلاکتوں سے تمہیں بچاتا ہے؟ اللہ کی پکڑ کو رحمٰن کے سوا کون روکے ہوئے ہے؟۔

اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ (۶۷: ۲۰) "حقیقت یہ ہے کہ یہ منکرین دھوکے میں پڑے ہوئے

ہیں"۔ یہ دھوکہ ان کو اس بات پر مطمئن کر دیتا ہے کہ وہ امن میں ہیں۔ کسی کی ضمانت اور اطمینان میں ہیں' حالانکہ وہ اللہ کے غضب اور عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں۔ کیونکہ وہ نہ ایمان لائے ہیں اور نہ عمل صالح کر رہے ہیں' جن کی وجہ سے اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے اور اللہ کا عذاب واقع نہیں ہوتا ہے۔

اور ایک چٹکی پھر دوبارہ' ان کو احساس دلایا جاتا ہے کہ یہ رزق الٰہی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اگر اللہ کی طرف سے بند کر دیا جائے تو پھر کون ہے جو اس قدر عظیم انتظام کر سکتا ہے۔

أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ ۚ بَل لَّجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ ﴿٢١﴾

"یا پھر بتاؤ' کون ہے جو تمہیں رزق دے سکتا ہے۔ اگر رحمن اپنا رزق روک لے؟ دراصل یہ لوگ سرکشی اور حق سے گریز پر اڑے ہوئے ہیں"۔

جیسا کہ اوپر گزر گیا۔ ہر انسان اللہ کے پیدا کردہ اسباب کا مرہون منت ہے۔ اللہ ان اسباب میں سے کسی ایک سبب کو کھینچ لے تو بھوک سے لوگ مر جائیں۔ اور یہ رزق اللہ نے اس کائنات کی اسکیم میں بطور سلسلہ اسباب رکھا ہوا ہے۔ یہ اسباب سب کے سب ایسے ہیں جو انسان کی قدرت میں نہیں ہیں۔ اور یہ تمام انسانوں کی دسترس میں ہیں۔ یہ سب اسباب انسان کے وجود سے بھی پہلے پیدا کر دیئے گئے تھے۔ اور یہ اسباب اپنی طبعی قوت اور طاقت کے اعتبار سے انسان سے بہت ہی بڑے ہیں اور ایسے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک سبب بھی دست قدرت کی طرف سے محو کر دیا جائے تو انسان سب کے سب صفحہ ہستی سے مٹ جائیں۔

اگر اللہ پانی ختم کر دے' ہوا کو بند کر دے یا وہ عناصر ختم کر دے جن سے اشیاء بنی ہیں' تو کون ہے جو ان سکتا ہے۔ زمین سے ہزار گنا بڑے ستارے موجود ہیں لیکن حیات اور اسباب حیات سے خالی ہیں۔

اس گہرے وسیع اور عظیم مفہوم کے اندر لفظ رزق کے تمام مفہوم سما جاتے ہیں۔ جس رزق کے بارے میں انسان یہ زعم رکھتا ہے کہ اسے وہ کماتا ہے' مثلاً محنت کر کے ایجاد کر کے' پیداوار حاصل کر کے' جبکہ یہ تمام کام بعض اسباب و عناصر پر موقوف ہیں اور دوسری جانب سے اللہ نے جن اقوام کو وہ اسباب دیئے ہیں ان پر بھی موقوف ہیں۔ کیونکہ ایک کام کرنے والا جو سانس بھی لیتا ہے اور جو حرکت بھی کرتا ہے' وہ اللہ کے رزق ہی کی وجہ سے کرتا ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے اس عامل کو پیدا کیا۔ اسے قدرت اور طاقت بخشی۔ اسے ایک نفس دیا' جو اس دنیا میں سانس لیتا ہے' پھر اس کے جسم کے اندر جو مواد چلتا ہے' اس کے ذریعہ اسے قوت حاصل ہوتی ہے اور وہ حرکت کرتا ہے' اور جو عقلی کام وہ کرتا ہے وہ بھی اس عقلی قوت کی وجہ سے کر پاتا ہے جو اللہ نے اس کے دماغ میں رکھی ہے اور صانع اور موجد جو بھی ایجاد کرتا ہے اس میں اللہ ہی کا پیدا کردہ میٹریل استعمال کرتا ہے۔ اور اس عمل میں بھی انسانی اور کائناتی اسباب استعمال کرتا ہے جو اللہ کا رزق اور عطیہ ہیں۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ (٦٧ : ٢١) "پھر بتاؤ' کون ہے جو تمہیں رزق دے اگر رحمٰن اپنا رزق روک لے"۔

بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ (٦٧ : ٢١) "دراصل یہ لوگ سرکشی اور حق سے گریز پر اڑے ہوئے ہیں"۔ یہ طے کرنے کے بعد کہ رزق صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے' یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ روگردانی اور سرکشی کرتے ہیں اور نہایت ہی تکبر میں دعوت اسلامی سے نفرت کرتے ہیں ۔ حالانکہ یہ اللہ کے رزق پر پل رہے ہیں لہٰذا اللہ کا رزق کھاکر سرکشی کرنا اور غرور میں دین سے گریز کرنا نہایت قبیح اور گھٹیا فعل ہے کیونکہ ان کی تمام ضروریات اللہ کی طرف سے فضل وکرم پر مشتمل ہے ۔ اور پھر بھی یہ روگردانی اور تکبر کرتے ہیں ۔

یہ ان لوگوں کی تصویر ہے جو اللہ کی دعوت کا انکار کرتے ہیں' کبرو سرکشی کی حالت میں اور سخت تکبرانہ نفرت کے ساتھ' یہ بھولے ہوئے ہیں کہ وہ اللہ کی مخلوق ہیں اور اللہ کے فضل وکرم پر زندہ رہ رہے ہیں اور وہ اپنے وجود' اپنی زندگی کی ضروریات کے مالک بھی نہیں ہیں ۔

اپنے ان حالات کے باوجود اشاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے بارے میں یہ دعویٰ کرتے تھے کہ یہ گمراہ لوگ ہیں ۔ اور اپنے آپ کو ہدایت پر سمجھتے تھے ۔ اور ہر دور میں خدا کی طرف بلانے والوں کے بارے میں یہی سمجھا جاتا ہے' چنانچہ ایسے مدعیان اور اہل ایمان کی اصل حقیقت کو ایک تمثیل یا ایک منظر کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے ۔

اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤى اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿٢٢﴾

"بھلا سوچو' جو شخص منہ اوندھائے چل رہا ہو' وہ زیادہ صحیح راہ پانے والا ہے یا وہ جو سر اٹھائے سیدھا ایک ہموار سڑک پر چل رہا ہو؟" جو شخص اوندھا چلتا ہے وہ دو طرح کا ہوتا ہے ۔ ایک یہ کہ وہ پاؤں پر سیدھا نہیں چلتا بلکہ منہ کے بل چلتا ہے' حالانکہ اللہ نے چلنے کے لیے پاؤں پیدا کیے ہیں' یا اس سے مراد یہ ہے کہ وہ راہ میں گرتا پڑتا ہے اور پھر اٹھ کر چلتا ہے ۔ اور پھر منہ کے بل گرتا ہے' اور اسے سیدھی چال نصیب نہیں ہے ۔ یہ اس بدبخت شخص کی حالت ہے جو مشقت برداشت کرتا ہے' تکلیفیں اٹھاتا ہے' گرتا پڑتا جاتا اور منزل مقصود سے بھی محروم رہتا ہے' اس کے مقابلے میں ایک مومن سیدھا شاہراہ پر ایک متوازن رفتار سے جا رہا ہے' راستہ بھی واضح ہے' جاری راستہ ہے اور یقیناً منزل تک پہنچانے والا راستہ ہے ۔

پہلا حال ایک بدبخت' گمراہ اور سرکش انسان کا ہے ۔ یہ اللہ کی راہ سے محروم ہے' اللہ کی ہدایت سے محروم ہے ۔ یہ اللہ کے قوانین قدرت سے محروم ہے' یہ فطرت کے اصولوں سے ٹکراتا ہے' مخلوق خدا سے متصادم ہے ۔ اس لیے کہ یہ غلط راہ پر چلتا ہے اور سیدھی راہ نہیں لیتا ۔ یہ غلط پگڈنڈیوں پر جا رہا ہے جن میں نشیب و فراز اور پتھریلی راہ ہے ۔ یہ گرتا پڑتا ہے اور سخت مشقت میں راہ طے کر رہا ہے اور دائمی گمراہی میں ہے ۔

اور دوسرا وہ شخص ہے جو نیک بخت ' سنجیدہ ' راہ خدا سے واقف ' اس پر چلنے والا ' اللہ کے قوانین قدرت کے مطابق صحیح رفتار رکھتا ہے ' سیدھی جاری راہ پر ہے جس پر قافلہ ایمان اپنے لاؤ لشکر اور سازو سامان کے ساتھ رواں دواں ہے جس پر اس پوری کائنات کا قافلہ مخلوقات رواں دواں ہے ۔ خواہ زندہ مخلوق ہے یا غیر زندہ !

ایمان کی زندگی دراصل یسر ہے ' آسانی ہے ' استقامت ہے ' سیدھی راہوں پر چلنا ہے ' اور کفر کی زندگی سختی ہے ' گرنا پڑنا ہے ' اوندھا چلنا ہے اور غلط راہوں پر چلنا ہے ۔

پھر ہر شخص غور کرے کہ ان دونوں میں سے کون سی راہ درست ہے ' کیا اس کے جواب کی ضرورت ہے ۔ نہیں اس سوال کے اندر جواب موجود ہے ۔ یہ تصدیقی اور تقریری سوال ہے کہ بات یہی ہے ۔

یہ سوال و جواب یوں ختم ہوتا ہے جب ہمارا تخیل ان دو افراد کی تصویر اور تمثیل کے پیچھے دوڑتا ہے ۔ ایک گروہ ہے کہ اپنے منہ کے بل چلتا ہے ' گرتا ہے ' اٹھتا ہے ' پھر گرتا ہے ' پتھریلی راہ ہے ۔ ٹیڑھی راہ ' خار دار راہ ہے ۔ منزل مقصود معلوم نہیں ہے ' صرف گرتا ' اٹھتا ہے ۔ ہر کوئی اپنے طور پر بھاگ رہا ہے جبکہ دوسری ایک جماعت ہے جو ایک قافلے کی شکل میں ہمقدم چل رہی ہے ۔ جس کے قدم سیدھے نہیں ' راہ سیدھی ہے ' جاری رہا ہے بلکہ شاہراہ ' اور منزل مقصود یعنی کہ سب لوگ ادھر جا رہے ہیں ۔

یہ ہے قرآنی انداز گفتگو کہ معنوی اور فلسفیانہ حقائق کو نہایت ہی مجسم اور مشخص انداز میں ہماری نظروں کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ معانی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں ۔

مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖ اَهْدٰى (۶۷ : ۲۲) ہدایت و ضلالت کے ذکر کے بعد ' اب ان کو وہ وسائل دکھائے جاتے ہیں جو اللہ نے ہدایت و ضلالت کے سلسلے میں ان کو دے رکھے ہیں ' یعنی وہ قدرتی قوتیں جن کے ذریعے وہ حقائق کا ادراک کر سکتے ہیں ۔ جن سے وہ فائدہ نہ اٹھاتے تھے اور جن کا وہ شکر بھی ادا نہ کرتے تھے ۔

قُلْ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۳﴾

" ان سے کہو ' اللہ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ' تم کو سننے اور دیکھنے کی طاقتیں دیں اور سوچنے سمجھنے والے دل دیئے ' مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو " ۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اللہ ہی نے انسان کو پیدا کیا ' اور اسے دیکھنے سننے اور سوچنے کی قوتیں بھی اللہ ہی نے دیں اور یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اللہ کی مخلوقات میں سے انسان اعلیٰ و ارفع مخلوق ہے ۔ اور وہ اس جہاں میں موجود ہے ۔ اس نے خود اپنے آپ کو نہیں پیدا کیا ' لہٰذا اس سے اعلیٰ و ارفع اور زیادہ علم والا موجود ہو گا ۔ اور وہی خالق ہے کوئی شخص خالق کے اعتراف سے نہیں بھاگ سکتا ' کیونکہ خود انسان کا محض وجود ہی تقاضا کرتا ہے کہ کوئی ارفع قوت موجود ہے اور اس میں بحث و جدال کرنا اور شک کرنا محض ہٹ دھرمی ہے ۔ قرآن کریم اس حقیقت کو یہاں اس لیے لاتا ہے کہ

وہ بتائے کہ اللہ نے انسان کو سوچنے سمجھنے کی قوتیں دی ہیں۔

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (٦٧ : ٢٣) "تم کو سننے' دیکھنے اور سوچنے کی طاقتیں دیں" اور انسان نے اللہ کے یہ انعامات پاکر کیا کیا؟ یہ سمع' یہ بصارت اور یہ عقل کی قوت؟ اور انسان کا طرز عمل دیکھئے!

قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (٦٧ : ٢٣) "مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو"۔

سننے کی قوت اور دیکھنے کی قوت انسان کے نفس کے اندر دو عجیب معجزے ہیں۔ انسان نے ان کے بعض پہلو معلوم کر لیے ہیں۔ اور وَالْأَفْئِدَةَ سے قرآن سوچنے کی قوت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ تو اعجب العجائب ہے۔ انسان کی عقلی قوت کے بارے میں ابھی تک انسان پوری معلومات نہیں حاصل کر سکا۔ عقل انسان کے اندر اللہ کا ایک منفرد معجزہ ہے۔

جدید علوم نے سننے کی قوت کے بارے میں بعض حیران کن باتوں کو دریافت کر لیا ہے' مناسب ہے ان میں سے بعض چیزوں کا یہاں ذکر کر دیا جائے۔

"ہمارے سننے کی حس بیرونی کان سے کام شروع کرتی ہے اور اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ اس کی انتہا کہاں ہوتی ہے؟ سائنس دان کہتے ہیں کہ آواز ہوا کے اندر جو لہریں پیدا کرتی ہے یہ لہریں کان تک جاتی ہیں۔ یہ کان ان کو اندر داخل کرنے کے لیے منظم کرتا ہے' تاکہ یہ کان کے پردے کے اوپر پڑیں اور یوں یہ آواز کان کے پردے کی دوسری طرف گہرائی تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ گہرائی ایسی ہے کہ اس میں اسپرنگ کی طرح گول نالیاں ہیں اور یہ نصف دائرے کی شکل میں ہیں۔ اس گول نالیوں کے حصے میں چار ہزار قوس ہیں' جو سر کے آلہ سماعت کے ساتھ پیوست ہیں"۔

"سوال یہ ہے کہ ہر ایک قوس کا طول کیا ہے اور اس کا حجم کیا ہے اور یہ قوس کس طرح بنائے گئے ہیں' جن کی تعداد ہزاروں میں ہے اور یہ کس قدر چھوٹی جگہ میں رکھ دیئے گئے ہیں جبکہ ان کے علاوہ اور کئی ہڈیاں ہیں جو موجوں کی طرح متحرک ہوتی ہیں۔ اور یہ تمام سامان کان کے پردے کے پیچھے ایک چھوٹی سی کھلی جگہ میں ہے! کان میں ایک سو ہزار (ایک لاکھ) سماعتی خلیات ہیں! اور سماعت کے اعصاب کے آخر میں باریک ترین ریشے ہیں' ان کی باریکی ہی محیر العقول ہے اور اس کے تصور ہی سے سر چکرانے لگتا ہے"۔ (۱)

"انسانی حاسہ بصارت کو ذرا دیکھئے' اس کے مرکز میں روشنی کا استقبال کرنے والوں کی ۱۳۰ ملین (۱۳ لاکھ) سیل ہیں۔ یہ استقبال کرنے والی آنکھیں اعصاب کے سرے ہیں اور آنکھ کے اہم حصے صلب قرنیہ (Carnea) جھلی (Placenta) جالی (Ratina) یہ اہم اعضا' ہزارہا اعصاب اور مراکز کے علاوہ ہیں"۔ (۲)

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کر کے یہ خصوصیات اسے عبث نہیں دیں۔ اور نہ بغیر کسی ارادے منصوبے کے یونہی اتفاقاً یہ کام ہو گیا ہے۔ بلکہ یہ اس لیے دی گئی ہیں کہ انسان اس زمین پر زندگی بسر کر سکے۔ اور یوم

(۱) اللہ اور جدید علوم' عبد الرزاق نوفل' ص ۵۷۔
(۲) حوالہ بالا ص ۵۸

الجزاء میں پھر اس سے زندگی کا حساب لے کر اسے جزاء و سزا دی جائے ۔

قُلْ هُوَ الَّذِىْ ذَرَاَكُمْ فِى الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

"ان سے کہو' اللہ ہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا ہے اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے"۔

الذ رء کا عربی میں مفہوم ہے کہ کسی چیز کا بڑھانا۔ اور بڑھانے کے ساتھ ساتھ پھیلانا بھی اس کے مفہوم میں آ جاتا ہے اور الحشر کے معنی جمع کرنا' یعنی پھیلانے کے بعد جمع کرنا۔ "تصوراتی اعتبار سے یہ دونوں مخالف یا مختلف حرکتیں ہیں اور معنوی اعتبار سے باہم متقابل ہیں۔ ایک کے مفہوم میں بڑھانا' زمین میں پھیلانا اور بکھیرنا اور دوسرے مفہوم کا منظر ہے جمع کرنا اور اٹھانا' ایک ہی آیت میں اللہ تعالیٰ دونوں مناظر کو جمع فرما دیتا ہے تاکہ انسانی احساس میں دونوں مناظر آ جائیں۔ یہ قرآن کا تصور ہے۔ انسان جو زمین کے اندر منتشر ہوتے اور پھیلتے جاتے ہیں ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ ایک دن تمہارے جمع کا بھی ہے۔ جہاں جمع کر کے تمہیں ایک ہی میدان میں اٹھایا جائے گا اور اس حیات اور اس موت کے بعد یہ بہت ہی بڑا معاملہ ہے۔

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اس بڑے معاملے میں تم شک میں پڑے ہو؟ اور سوالات کرتے ہو؟

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾

"یہ کہتے ہیں "اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ وعدہ کب پورا ہو گا؟"

یہ ایک خلجان آلودہ سوال ہے اور اس کے اندر ہٹ دھرمی اور تکبر کی بو بھی۔

اس وعدے اور قیام قیامت کے وقت کا علم ہمیں اس قدر ہے کہ وہ اپنے وقت سے مقدم و موخر نہیں ہو سکتا۔ اس کا وقت ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ یہ یوم الجزاء ہے۔ ہمارے لیے اس میں کیا فرق ہے کہ وہ کل آ جائے یا کئی ملین سال بعد آ جائے' ہماری زندگی تو مختصر سی زندگی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ آنے والی ہے اور اس کے لئے تیاری کرنا ضروری ہے۔ تمہیں اس میں بہرحال اٹھایا جائے گا اور جزاء و سزا ہو گی۔

اس لیے اللہ نے اس کے وقت کی اطلاع کسی کو نہیں دی۔ کیونکہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم ہو جانے میں کوئی فائدہ ہی کیا ہے۔ انسان کی عملی زندگی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ان احکامات کے ساتھ اس کا تعلق ہے' جو انسان کو دیئے گئے ہیں۔ بلکہ مصلحت تو اس میں ہے کہ عام لوگوں کو اس کے وقوع کے وقت کا پتہ نہ ہو' صرف اللہ کو پتہ ہو۔

قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۶﴾

"کہو "اس کا علم تو اللہ کے پاس ہے' میں تو بس صاف صاف خبر کر دینے والا ہوں"۔

یہاں خالق اور مخلوق کے درمیان پورا فرق ہو جاتا ہے۔ اللہ کی ذات علیحدہ اور ممتاز ہو جاتی ہے' نہ اس کا کوئی شبیہ رہتا ہے اور نہ شریک۔ اور علم خالص اسی کے لیے مخصوص ہو جاتا ہے اور تمام مخلوق رسول' ملائکہ اللہ کے سامنے باادب کھڑے رہ جاتے ہیں۔ "کہو اس کا علم تو اللہ کے پاس ہے۔ میں تو بس صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں"۔ جس

طرح حدیث جبریل میں آتا ہے۔

ما المسئول عنها باعلم من السائل ''کہ مسئول عنہ سائل سے زیادہ علم نہیں رکھتا''۔ یہ علم نہ رسولوں کے پاس ہے اور نہ فرشتوں کے پاس ہے' رسول کا کام فقط ڈرانا ہے۔

یہ لوگ شک کے انداز میں قیامت کے بارے میں سوالات کرتے تھے اور اللہ کی طرف سے ان کو نہایت قطعی انداز میں جواب دیا جا رہا تھا' قرآن کریم اپنے مخصوص انداز میں یہ تخیل دیتا ہے کہ گویا یہ دن آ ہی گیا ہے اور یہ لوگ حشر کے میدان میں ہیں اور قیامت درپیش ہے اور اب وہاں یہ ہو رہا ہے۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ قِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ۝۲۷

''پھر جب یہ اس چیز کو قریب دیکھ لیں گے تو ان سب لوگوں کے چہرے بگڑ جائیں گے' جنہوں نے انکار کیا ہے' اور اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جس کے لیے تم تقاضا کر رہے تھے''۔

جب انہوں نے اسے دیکھ لیا اور وہ ان کے سامنے ہے۔ ان کو توقع ہی نہ تھی کہ ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اب تو ان کے چہروں کی شکل بگڑ رہی ہے۔ غم کے بادل ہیں ان چہروں پر۔ اب ان کو یوں سرزنش کی جاتی ہے۔

هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ (٦٧ : ٢٧) ''یہی ہے وہ چیز جس کے لیے تم تقاضے کرتے تھے''۔
یہ ہے حاضر اور قریب۔ اور دعویٰ تمہارا یہ تھا کہ قیامت کہاں ہے؟

یہ انداز کہ ہونے والے واقعات کو قرآن اس طرح پیش کرتا ہے کہ گویا ہو گئے' یہ ان کے شکوک و شبہات کے جواب میں کیا ہی خوب انداز ہے۔ ان کو ایک شعوری جھٹکا دیا جاتا ہے کہ وہ دیکھو قیامت تو برپا ہے۔ اور تکذیب کرنے والا اور شک کرنے والا کلام ربانی کے سامنے مبہوت رہ جاتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ منکر ہے بلکہ منظر کے سامنے کھڑا رہتا ہے۔

اور یہ تصویر کشی اثر انداز اس لیے ہوئی ہے کہ اللہ کے علم میں ہیں وہ ہونے والے مناظر' گویا فی الواقعہ وہ مناظر قائم ہیں' کیونکہ اللہ کا علم زمان و مکان کے قید کے اندر محدود نہیں۔ یہ ماضی' حال اور مستقبل تو انسان کے لیے ہیں۔ آج اگر اللہ حکم دے تو یہ شاید ہم اسی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح اچانک منکرین مخاطبین کو دنیا سے آخرت میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اور شک و شبہ کی بجائے ان کا سامنا کرا دیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کے سامنے ان کو لایا جاتا ہے جو اللہ کے علم میں قائم ہے' اگر پردہ اٹھا دے تو ہم بھی دیکھ لیں' لیکن اللہ یہاں صرف اس کی تصویر دکھاتا ہے۔

مشرکین مکہ اس قدر احمق' خوش فہم اور معاند تھے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور مٹھی بھر مومنین کے بارے میں یہ تمنائیں کرتے تھے کہ وہ ہلاک ہو جائیں اور یہ مومنین سے بے غم ہو جائیں۔ اور وہ ایک دوسرے کو یہی نصیحت کیا کرتے تھے کہ بھائی صبر کرو' چند لوگ ہیں مرکھپ جائیں گے۔ اس لیے یہ انتشار خود بخود ختم ہو جائے گا جو قریش کی صفوں میں انہوں نے برپا کر دیا ہے اور بعض اوقات تو وہ اس زعم میں مبتلا ہو جاتے تھے کہ اللہ عنقریب محمد ﷺ اور

اس کے ساتھیوں کو ہلاک کر دے گا۔ اس لئے کہ وہ صابی اور گمراہ ہیں کیونکہ یہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں ۔اب حشر و نشر کے اس میدان کے بعد ان کو کہا جاتا ہے تمہاری یہ تمنائیں تو اپنی جگہ 'لیکن اگر محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ان کے ساتھی ہلاک کر دیئے گئے تو تم عذاب الیم سے کس طرح بچ جاؤ گے ۔تم اپنے رویہ اور اپنے عقائد اور اپنے اعمال پر غور کرو ۔اگر یہ پیغبر اور اس کے مٹھی بھر ساتھی ہلاک ہو گئے تو اس سے تمہیں کیا فائدہ ہو گا؟

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

"ان سے کہو 'کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اللہ خواہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک کر دے یا ہم پر رحم کرے ' کافروں کو دردناک عذاب سے کون بچالے گا"۔

یہ ایسا سوال ہے 'جو انہیں سنجیدہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور یہ دعوت ہے کہ اپنے معاملات پر ذرا غور کرو 'تمہارے لیے بہتر یہ ہے ۔اگر نبی اور اس کے مٹھی بھر ساتھی ہلاک بھی ہو جائیں تو تمہیں کیا فائدہ ہو گا۔اللہ تو باقی ہے ۔نبی اور اس کے ساتھی اللہ کے دائرہ رحم میں ہیں 'لیکن تمہیں تو اس کے سامنے جانا ہے ۔اس نے تمہیں پیدا کیا اور اسی کی طرف جانا ہے ۔تمہاری تیاری کیا ہے؟

یہ سیاق کلام میں ۔

مَنْ يُجِيْرُكُمْ نہیں کہا جاتا 'بلکہ يُجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ (٦٧ : ٢٨) کہا جاتا ہے ۔یہ نہیں کہا جاتا کہ تم کافر ہو 'بلکہ یہ کہ جو کافر ہوں گے ان کو کون بچائے گا۔اشارہ یہ ہے کہ عذاب کافروں کے لیے ہے ۔

فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (٦٧ : ٢٨) "کافروں کو دردناک عذاب سے کون بچائے گا"۔ یہ دعوت کا حکیمانہ اسلوب ہے ۔ایک طرف انہیں ڈرایا جاتا ہے دوسری جانب اشارہ دیا جاتا ہے کہ واپس ہو جاؤ اس راہ سے ۔اگر یہ کہا جاتا کہ تم تو کافر ہو اور تمہارے لیے عذاب الٰہی سے کوئی بچاؤ کی راہ نہیں ہے تو وہ شاید جہالت و حماقت کا راستہ اختیار کر کے منہ آتے ۔اور براہ راست اقدام کی وجہ سے عناد میں مبتلا ہو جاتے ۔

بعض اوقات اشاراتی انداز صریح انداز سے زیادہ اثر کرتا ہے ۔"نہ ہم سمجھے کہ تم آئے کہیں سے"۔ایسا انداز بہت موثر ہوتا ہے ۔

اب اس اشارہ کے بعد دونوں موقف برابر نہیں ہیں ۔مومنین کو اپنے رب پر بھروسہ ہے ۔وہ توکل علی اللہ کر کے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں 'اور اپنے ایمان پر وہ مطمئن ہیں 'وہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ راہ ہدایت پر ہیں اور دراصل کھلی گمراہی میں تو ان کا فریق مخالف مبتلا ہے ۔

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ

ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۹﴾

"ان سے کہو 'وہ بڑا رحیم ہے 'اسی پر ہم ایمان لائے ہیں 'اور اسی پر ہمارا بھروسہ ہے 'عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ صریح گمراہی میں پڑا ہوا کون ہے"۔

یہاں اللہ کی جگہ رحمن کی صفت اس لیے لائی گئی ہے کہ اللہ نبی اور اس کے مٹھی بھر ساتھیوں کو ہلاک نہیں کرتا بلکہ وہ ان پر رحیم وکریم ہے 'جس طرح کہ تمہاری تمنائیں ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ساتھیوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے موجودہ تعلق کو مضبوط کرو' اعلان کردو۔

اٰمَنَّا بِهٖ ( ٦٧ : ٢٩ ) "ہم اس پر ایمان لائے ہیں" صرف اللہ پر۔ انداز کلام اس کا اظہار کرتا ہے کہ اللہ مسلمانوں کے بہت ہی قریب ہے۔ ان کے درمیان اعتماد کا تعلق ہے۔

وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ( ٦٧ : ٢٩ ) "اور اس پر ہمارا بھروسہ ہے" صرف اس پر۔ اللہ تعالیٰ نبی کو حکم دیتا ہے کہ اس فضل وکرم کا اعلان کردیں۔ آپ کو گویا کہا جاتا ہے کہ ان کفار کی تمناؤں اور اقوال سے نہ ڈریں۔ میں تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ساتھ ہوں۔ لہٰذا یہ اعلان کردیں اور یہ اللہ کی جانب سے نبی اور دوستان نبی کے ساتھ دوستی کا اعلان ہے۔ جس میں ان کے لیے اعزاز ہے۔

اور فریق مخالف کو بالواسطہ دھمکی دی جاتی ہے۔

فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ( ٦٧ : ٢٩ ) "عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ صریح گمراہی میں پڑا ہوا کون ہے"۔

یہ بھی ایک انداز ہے جو ہٹ دھرمی اور اصرار کے قلعوں میں دراڑیں ڈال دیتا ہے اور مخاطب کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی پوزیشن پر غور کرے کہ کہیں وہ خود تو گمراہ نہیں ہے۔ کہیں وہ خود تو عذاب کا مستحق نہیں ہو رہا ہے۔

فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ( ٦٧ : ٢٨ ) "کون ہوگا جو کافروں کو عذاب الیم سے پناہ دے گا" لیکن اس پوری گفتگو میں اللہ ان کو یہ نہیں کہتا کہ تم کافر ہو تاکہ وہ ضد میں نہ آجائیں۔ یہ دعوت کا اسلوب ہے جو زیادہ تر حالات میں مفید رہتا ہے۔

اور اب عقل و خرد کی تاروں پر آخری شدید ضرب جن سے زمزمہ اٹھتا ہے۔ یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ خبردار یہ تو ہے اخروی عذاب۔ لیکن اللہ نافرمانوں کو اس دنیا میں بھی عذاب دیا کرتا ہے۔ آج ہی اگر اللہ پانی بند کردے تو سوچو تمہاری حالت کیا ہو جائے۔ ۲

۱۶ع قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴿۳۰﴾ ۲

"ان سے کہو' کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر تمہارے کنوؤں کا پانی زمین میں اتر جائے تو کون ہے جو اس پانی کی بہتی ہوئی سوتیں تمہیں نکال کر لا دے گا؟"

مَآؤُكُمْ غَوْرًا (٦٧ : ٣٠) کے معنی اس پانی کے ہیں جو زمین کی رگوں میں دور تک چلا جائے اور اسے واپس لانے کی کوئی سبیل نہ ہو۔

مَّعِيْنٍ (٦٧ : ٣٠) وہ چشمہ جو زمین سے ابل کر پانی لا رہا ہو۔ یہ مناظر وہ دیکھتے رہتے تھے۔ اگرچہ وہ اس دن اس میں شک کرتے تھے۔ لیکن زمین و آسمان کی بادشاہت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے' وہ جس وقت چاہے ان چشموں کو خشک کر دے۔ اگر اللہ ان کی زندگی کے اس سبب کو ہی کشید کر لے تو نتائج کیا ہوں۔ اس کے بعد ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے ذرا اس پر بھی غور کر لو۔

یوں اس سورت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ دلائل 'تاثرات' ملکوت سماوات اور ارض کی سیر' ہر آیت ایسی کہ بذات خود فکر انگیز 'قلب و نظر اور فکر و خیال کی جولانی۔

یہ بہت ہی زیادہ فکر انگیز سورت ہے۔ حجم اگرچہ کم ہے لیکن تصورات' ہدایات آفاق کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ اشاراتی تیر ہیں جو بہت ہی دور تک فکر و خیال کو لے جاتے ہیں اور کائنات کی سیر کراتے ہیں۔

یہ سورت اسلامی تصور حیات کی بنیادیں رکھ دیتی ہے۔ یہ ضمیر کے اندر بٹھاتی ہے کہ تمام فیصلے ازل میں ہو چکے ہیں۔ تمام کائنات پر اللہ کا مکمل کنٹرول ہے' انسانوں کو یہاں آزمائش اور امتحان کے لیے بھیجا گیا جس کا نتیجہ حشر و نشر کے دن نکلے گا۔ اللہ کی مخلوقات میں کمال و جمال انتہاؤں پر ہے۔ اللہ کا علم ظاہر و باطن پر محیط ہے' رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ مخلوقات کا محافظ ہے' وہ مخلوقات کے ساتھ ہے' ایک مسلم کا تصور اب کیا ہے' پھر اس کائنات کا اللہ کے ساتھ کیا تعلق ہے' یہ وہ مجموعہ تصورات ہے جس کے اوپر اسلامی نظام حیات کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ مومن کا تعلق اپنے رب کے ساتھ' مومن کا تعلق اپنے نفس کے ساتھ' مومن کا تعلق اپنے بھائیوں اور انسانوں کے ساتھ' مومن کا تعلق تمام زندہ مخلوقات کے ساتھ' مومن کا تعلق روئے زمین کی اشیاء کے ساتھ۔ یہ تصورات انسان کے ضمیر میں ان تعلقات کو اس تفصیلی کیفیات عطا کرتے ہیں۔ اس سے ایک مسلم کی زندگی کی اقدار اور پیمانے وضع ہوتے ہیں۔

---○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ـــ ۲۹

## سورۂ القلم ـ ۶۸

## ا ـــ تا ـــ ۵۲

# سورۃ القلم ایک نظر میں

یہ ممکن نہیں ہے کہ اس سورت کے نزول کی تاریخ کا تعین کیا جاسکے ۔ چاہے اس کا آغاز ہو یا دوسرے پیراگراف ہوں ۔ نیز یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ابتدائی آیات پہلے نازل ہوئیں اور دوسری آیات بعد میں نازل ہوئیں ۔ ان احتمالات میں سے کسی کو ترجیح بھی نہیں دی جاسکتی۔

روایات میں آتا ہے کہ سورت علق کے بعد نازل ہونے والی یہ دوسری سورت ہے' اور مختلف مصاحف کی ترتیب میں بھی یہ دوسری سورت ہے ۔ لیکن سورت کا سیاق کلام' اس کے موضوعات و مضامین اور اس کا اسلوب اس موقف کے خلاف ہیں ۔ بلکہ نظریوں آتا ہے کہ یہ سورت انفرادی دعوت کے سہ سالہ دور کے بعد نازل ہوئی ہے' جبکہ دعوت عام شروع ہوگئی تھی اور قریش نے علی الاعلان دعوت اسلامی کی مخالفت شروع کر دی تھی ۔ قریش نے رسول اللہ کے بارے میں اپنا یہ شرمناک الزام لگانا شروع کر دیا تھا ۔ اور قرآن نے اسے نقل کر کے اس کی تردید شروع کر دی تھی ۔ اور اس کے ساتھ قرآن کریم نے دعوت اسلامی کی راہ روکنے والوں کو دھمکی دینا بھی شروع کر دی تھی ۔ یہ دھمکی اس سورت میں موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلقات تلخی تک پہنچ گئے تھے ۔

اور یہ احتمال کہ اس سورت کی پہلی آیات بھی سورہ علق کی ابتدائی آیات کی طرح نہایت ہی ابتدائی دور کی ہیں اور یہ کہ یہاں جس جنون کی نفی کی گئی ہے' اس سے مراد وہ خیال ہے جو حضورﷺ کو آغاز وحی کے دور میں لاحق تھا کہ شاید آپ کو کوئی جنون لاحق ہوگیا ہے تو یہ نہایت ہی غلط بات ہے ۔ کیونکہ ایک تو اس بارے میں کوئی صحیح ثابت شدہ روایت نہیں ہے' دوسرے یہ کہ سورت کا انداز بیان مسلسل ہے اور اس سورت کے آغاز میں جس جنون کا ذکر ہے ۔

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (٦٨ : ٢) "تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو" اس سے مراد حضورﷺ کا اپنا تاثر نہیں ہے بلکہ مراد وہ جنون ہے' جو سورت کے آخر میں مخالفین آپ پر الزام لگاتے کیونکہ سورت کے آخر میں آیا ہے ۔

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ (٦٨ : ٥١) "اور یہ کافر لوگ کلام نصیحت (قرآن) سنتے ہیں تو تمہیں ایسی نظروں سے دیکھتے کہ گویا تمہارے قدم اکھاڑ دیں گے اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے"۔ یہی وہ بات ہے کہ جس کا جواب سورت کے آغاز میں بھی دیا گیا ہے ۔ نیز سورت کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تمام کڑیاں باہم ملی ہوئی ہیں ۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ اس سورت کی آیات ۱۷ سے لے کر ۳۳ تک مدنی ہیں ۔ ان آیات میں باغ والوں کا

ذکر آیا ہے' ان کی آزمائش کا ذکر ہے - نیز آیات ۴۲ سے آیات ۵۰ تک بھی مدنی ہیں جن میں صاحب الحوت یعنی مچھلی والے کے قصے کی طرف اشارہ ہے - ہم سمجھتے ہیں یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں - اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ پوری سورت مکی ہے - کیونکہ پوری سورت کا انداز مکی ہے اور اس پر گہری مکی چھاپ ہے - اور سورت کا سیاق اور انداز سورت کے مکی اور مدنی ہونے میں زیادہ فیصلہ کن ہوتا ہے - یہ پوری سورت اپنے موضوع کے ارد گرد نہایت ربط اور ترتیب کے ساتھ چل رہی ہے -

ہماری رائے یہ ہے کہ یہ سورت ترتیب نزولی کے اعتبار سے دوسری سورت تو نہیں ہے' لیکن یہ بات درست ہے کہ یہ سورت اس وقت نازل ہوئی جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عام دعوت شروع کر دی تھی - اور یہ سورت اس حکم کے بعد نازل ہوئی ہے -

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ "اور اے پیغمبر اپنے خاندان کے قریبی لوگوں کو ڈرائیں" - اس وقت تک قرآن کریم کا ایک حصہ نازل ہو گیا تھا - جس میں انبیائے سابقین کے احوال اور قصص بھی آگئے تھے جن کے بارے میں اہل مکہ نے کہا -

اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۶۸ : ۱۵) "پرانی کہانیاں ہیں" - اور قریش کو پورے اسلام کی دعوت دے دی گئی تھی - اور اہل قریش غلط اور باطل الزامات عائد کر کے دعوت اسلامی کے مقابلے پر اتر آئے تھے - اور انہوں نے تحریک کے خلاف شدید حملے کر کے اس کو آنکھیں دکھانا شروع کر دی تھیں - سورت کی آخری آیت -

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ (۶۸ : ۵۱) "اور یہ کافر لوگ کلام نصیحت (قرآن) سنتے ہیں تو کہیں ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ گویا تمہارے قدم اکھاڑ دیں گے اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے" - اس سے نظر آتا ہے کہ آپ نے عام لوگوں کو دعوت دینا شروع کر دی تھی - آغاز دعوت میں یہ منظر نہ تھا - آغاز میں تو افراد کو دعوت دی جاتی تھی اور انفرادی ذرائع سے دی جاتی تھی - اور کفار کے جلسہ ہائے عام میں بات نہ کی جاتی تھی اور دعوت کا یہ منظر نامہ نبوت کے تیسرے سال کے بعد کی بات ہو سکتی ہے -

پھر اس سورت میں یہ بھی ہے کہ مشرکین نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے مصالحت کی تجاویز بھی پیش کرنا شروع کر دی تھیں تاکہ کچھ لو اور کچھ دو کے معاملے پر یہ مسئلہ طے ہو جائے اور نظریاتی معاملات میں مصالحت ہو جائے - لیکن قرآن نے صاف صاف جواب دیا -

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (۶۸ : ۹) "یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو یہ بھی مداہنت کریں" - ظاہر ہے کہ اگر دعوت ایک ایک فرد کو دی جا رہی ہے تو اس اجتماعی فیصلے کا مطالبہ کس طرح ہو سکتا ہے - کیونکہ انفرادی دعوت سے کوئی معاشرتی خطرہ پیدا نہیں ہوتا - اور اس قسم کا خطرہ تو تب ہوتا ہے جب دعوت ظاہر ہو اور زور پکڑ لے - یوں بے شمار دلائل و شواہد خود سورت کے اندر ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت ابتدائی دور کی نہیں

ہے اور یہ سورت کم از کم نبوت کے تین سال بعد نازل ہوئی ہے ۔ اور اس کا عرصہ اس سے بھی متاخر ہو سکتا ہے ۔ یعنی دعوت کے آغاز اور نزول کے درمیان تین سال سے بھی زیادہ عرصہ ہو سکتا ہے ۔ یہ بات بھی معقول نظر نہیں آتی کہ تین سال گزر گئے ہوں اور ان میں قرآن کریم نازل نہ ہوا ہو۔ معقول بات یہی ہے کہ اس تین سال کے عرصے میں کئی سورتیں اور ان کے اجزاء نازل ہوئے ہوں گے ۔ جن کے اندر صرف عقیدے اور نظریہ کی بات ہوگی اور ان میں مخالفتوں پر تنقید زیادہ نہ ہوگی جس طرح اس سورت میں سخت تنقید وارد ہے ۔ اول سے آخر تک تنقیدی جملے ہیں ۔

لیکن اس سے اس کی نفی بھی نہیں ہوتی کہ سورہ المزمل اور المدثر اور یہ سورت دعوت کے ابتدائی ایام میں نازل ہوئی ہیں ۔ اگرچہ بہت ابتدائی نہ بھی ہوں' جس طرح مصاحف میں آیا ہے ۔ اور اسباب و دلائل وہی ہیں جن کی طرف اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں ۔ یہ بحث و استدلال سورہ المزمل اور المدثر پر بھی صادق آتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ پودا' یعنی اسلامی نظریہ حیات کا صاف و ستھرا پودا اس زمین میں سب سے پہلے لگایا جا رہا تھا۔ نظریہ نہایت بلند اور صاف ستھری شکل میں اور عربوں کے اندر جو جہالت اور جاہلیت چھائی ہوئی تھی' اس کی آب و ہوا اس پودے کے لیے بے حد ناموافق تھی ۔ نہ صرف عربوں میں بلکہ پورے کرۂ ارض پر سے صحیح عقیدہ توحید اٹھ چکا تھا۔

قریش کے ہاں ملت ابراہیم کے کچھ مدھم سے خطوط تھے ۔ اور جن کو انہوں نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا' لیکن ان کے اندر انہوں نے مشرکانہ خرافات' افسانوں اور قصے کہانیوں اور اوہام اور سنی سنائی باتوں کو ملا دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ملت ابراہیمی کو جس صاف اور ستھری صورت میں پیش کیا' جس قدر سیدھے اور سادہ طریقے سے بیان کیا' اور جس قدر جامع اور مانع عقیدہ توحید کی شکل میں ان کے سامنے رکھا' ان کو یہ بالکل نئی چیز نظر آئی ۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقائد اس سرچشمے سے تھے جس سے ابراہیم علیہ السلام کا دین حنیف اول آیا تھا۔ پھر اس کو اللہ نے اس جدید دور کے لیے مزید مکمل نظریہ و عمل کی شکل دے دی تھی کیونکہ اس دین کو اب قیامت تک کے لوگوں کی رہنمائی کرنی تھی اس لئے کہ اب انسان وہ انسان نہ رہا تھا جو ابراہیم علیہ السلام کے دور کا پسماندہ انسان تھا' اب تو انسانیت عقلی اعتبار سے رشد و بلوغ کے دور میں داخل ہو گئی تھی ۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پیش کردہ عقیدۂ توحید اور عربوں میں مروجہ بے شمار الہوں کے عقیدے کے درمیان ایک بہت بڑا انقلابی اور بنیادی فرق تھا۔ ان ارباب متفرقون کے علاوہ یہ لوگ اب جنوں کی بھی پوجا کرتے تھے ۔ ملائکہ کی پرستش بھی کرتے تھے ۔ نیز دوسری اقوام سے بھی انہوں نے ادھر ادھر کے عقائد' ٹکڑیوں کی شکل میں لے رکھے تھے جبکہ قرآن میں یکلخت تمام الہوں کی نفی کر کے صرف ایک اللہ کو الہ مانا گیا تھا' واحد الہ عظیم الہ ۔ ہر چیز پر قادر الہ' اور ایسا الہ جو ہر وقت اپنی پوری کائنات اور پوری مخلوقات کا نگہبان ہے اور جس کا ارادہ براہ راست ان کے ساتھ متعلق ہے ۔

پھر اس وقت اہل عرب کے اندر جو طبقات تھے ' طاقتور قبائل کے سردار' کاہن اور خانہ کعبہ کے مجاور اور خادم اور عام لوگ' ان کے درمیان مختلف قسم کے امتیازات قائم تھے جبکہ اسلام کا نظریہ حیات ان تمام امتیازات کو ختم کر رہا تھا' تمام انسانوں اور انسانوں میں سے محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں کھڑا کر رہا تھا جیسا کہ قرآن کریم کی عام تعلیمات تھیں ۔

اسی طرح قرآن کریم ایک اخلاقی انقلاب کا داعی تھا۔ عربوں میں رائج اخلاقیات کو ختم کر کے ایک نیا اخلاقی نظام قائم

کر رہا تھا، جس پر محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عمل پیرا تھے۔

صرف اخلاقی انقلاب ہی اس بات کے لیے کافی تھا کہ قریش اس دین جدید کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں، لیکن ان کو صرف جدید اخلاقیات ہی پر اعتراض نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ دوسرے اعتبارات بھی تھے اور قریش کے نزدیک سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بتوں کو برا بھلا کہتے تھے۔

بعض لوگوں کے نزدیک یہ بات بھی قابل اعتراض تھی کہ مکہ اور طائف کے دو شہروں میں بعض نہایت ممتاز لوگ بھی تھے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ یہ قرآن کسی ممتاز شخص پر نازل کیا جاتا۔

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ "یہ قرآن ان دو شہروں کے کسی عظیم آدمی پر نازل کیوں نہیں کیا گیا؟" دو شہروں سے مراد مکہ اور طائف ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ قریش کی ایک اعلیٰ شاخ کے چشم و چراغ تھے لیکن بعثت سے پہلے آپ سردار نہ تھے۔ جبکہ اہل مکہ میں سرداری کا نظام تھا، نیز بنوثقیف میں بھی سرداری کا نظام تھا جبکہ اس وقت کی عرب سوسائٹی میں اقتدار قبائل کے سرداروں کے پاس ہوا کرتا تھا۔ اور ان سرداروں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنی سرداری چھوڑ کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اطاعت شروع کر دیں۔ یہ بہت ہی بڑا انقلاب تھا۔ (حضورﷺ سرداری نظام کو ختم کر کے مرکزی انتظامیہ قائم کرنا چاہتے تھے)۔

پھر خود قریش کے اندرونی خاندانی رقابتیں بھی زوروں پر تھیں۔ مثلاً ابوجہل جیسا ضدی آدمی اس بات پر تلا ہوا تھا کہ دین اسلام میں داخل ہو کر وہ کس طرح بنو عبد مناف کی سیادت کو قبول کرے۔ اخنس ابن شریق اور ابوسفیان کے ساتھ اس کی جو گفتگو تاریخ کی کتابوں میں نقل ہوئی کہ یہ تینوں ایک دوسرے سے چھپ کر تین راتیں قرآن سنتے رہے اور ہر رات یہ وعدہ کرتے رہے کہ یہ دوبارہ نہ آئیں گے مگر آتے ہی رہے۔ بعد میں انہوں نے آخر کار حلف اٹھایا کہ آئندہ نہ آئیں کہ اگر عوام نے انہیں دیکھ لیا تو ان پر اثر ہو جائے گا، جب اخنس ابن شریق نے ابوجہل سے، اس کی رائے دریافت کی تو اس کا جواب یہ تھا: "تم نے کیا سنا؟ ہم اور بنو عبد مناف ایک دوسرے سے عزت اور شرف کے حصول کے لیے لڑتے رہے۔ انہوں نے لوگوں کو کھانے کھلائے تو ہم نے بھی کھلائے۔ انہوں نے لوگوں کو سواریاں دیں تو ہم بھی سواریاں دیں یہاں تک کہ گھٹنے سے گھٹنا ملا کر ہم نے گھوڑوں پر مقابلہ کیا۔ اور ہم یوں تھے جیسے مقابلہ کرنے والے سوار۔ اب وہ کہتے ہیں کہ ہم میں سے ایک نبی پیدا ہو گیا ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے تو ہم نبی کہاں سے لائیں۔ خدا کی قسم! ہم اس پر کبھی ایمان نہ لائیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے"۔

ان وجوہات کے علاوہ بھی بعض اسباب تھے اور بعض ایسے حالات تھے کہ لوگوں کے مفادات، ان کے طبقات، اور ان کے نفسیاتی تصورات اور عزت نفس پر زد پڑتی تھی۔ یہ تصورات اور برتری کا یہ شعور ایام جاہلیت سے ان کے دل و دماغ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس لیے یہ تمام قوتیں اس سعی میں لگی ہوئی تھیں کہ اس نظریاتی پودے کو کسی طرح اکھاڑ پھینکیں، قبل اس کے کہ اس کی جڑیں مضبوط ہو جائیں اور گہری زمین کے اندر چلی جائیں۔ اور قبل اس کے کہ یہ درخت تنومند ہو کر پھیل جائے۔ خصوصاً اس وقت جب یہ انفرادی خفیہ دعوت کے دور سے گزر کر تحریک آگے بڑھ گئی۔ اللہ نے اپنے نبی کو حکم دے دیا کہ اب علانیہ اجتماعی دعوت شروع کر دیں اور دعوت کے خدوخال واضح ہونے لگے اور قرآن کریم مسلسل نازل ہونے لگا اور شرکیہ عقائد اور غلط رسومات کو اس نے جڑ سے اکھاڑنا شروع کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اگرچہ نبی تھے ـ آپ پر رب تعالیٰ کی طرف سے وحی آ رہی تھی' عالم بالا سے آپ کا رابطہ تھا لیکن بہرحال آپ بشر تھے' انسانوں کے جذبات اور خلجانات آپ کی ذات کا حصہ تھے' آپ کو سخت مخالفت کا سامنا تھا۔ مشرکین نے اب ہر طرف سے مخالفت شروع کر دی تھی ـ آپ اور آپ کے مٹھی بھر ساتھی یہ تمام مشکلات جھیل رہے تھے ـ

آپ بھی مشرکین کی باتیں سنتے تھے اور آپ کے مٹھی بھر ساتھی بھی مشرکین کی باتیں سنتے تھے ـ یہ لوگ آپ پر ذاتی حملے کرتے تھے ـ

وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ (٦٨ : ٥١) ''وہ کہتے تھے کہ ضرور یہ دیوانہ ہے''۔ آپؐ کے ساتھ وہ جو مزاح کرتے تھے یہ اس کا ایک نمونہ ہے ـ جو قرآن نے نقل کر دیا ہے ـ یہ تو تھا ان کا حملہ آپ کی ذات کے بارے میں ـ اس کے علاوہ جو لوگ مسلمان ہو گئے ان کے اقربا ان پر اپنے گھروں میں مظالم ڈھا رہے تھے ـ مسلمان قلیل تھے' ضعیف تھے اس پر ان کا مزاح اور ٹھٹھے' ان کے لیے شدید اذیت کا باعث ہوا کرتے تھے ـ اگرچہ یہ رسول اللہ ﷺ کی ذات کے متعلق تھے ـ

چنانچہ اس پارے میں اور اس دور کی تمام سورتوں میں یہ نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کو اور مسلمانوں کو بہت زیادہ تسلی دیتا ہے ـ اور ان کو اپنی نگہداشت میں رکھے ہوئے ہے' وہ ان کا ولی اور نگہبان ہے ـ اللہ ان کو تسلی دیتا ہے ـ ان کی تعریف کرتا ہے اور اس دعوت کا جو اخلاقی پہلو ہے' اسے نمایاں کیا جاتا ہے جو نبی کریم کی ذات اور مسلمانوں کے نفوس کے اندر نمایاں ہے ـ اور اللہ تعالیٰ الزامات کی تردید فرماتا ہے اور ضعیف مسلمانوں کے دلوں کو مطمئن فرماتا ہے اور یہ تسلی دیتا ہے کہ دشمنوں کے ساتھ لڑنے کے لیے وہ کافی ہے اور ان کا بندوبست وہ خود کر دے گا ـ تم فکر نہ کرو' اگرچہ تمہارے دشمن قوی اور مضبوط ہیں ـ

سورہ القلم میں اس قسم کی بے شمار تسلیاں ہیں ـ

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (١) مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (٢) وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ (٣) وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (٤) (٦٨ : ١ تا ٤) ''قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں' تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو' اور یقیناً تمہارے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو''۔

اور دوسری جگہ ہے :

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (٣٤) اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ (٣٥) مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (٣٦) (٦٨ : ٣٤ تا ٣٦) ''یقیناً خدا ترس لوگوں کے لیے ان کے رب کے ہاں نعمت بھری جنتیں ہیں ـ کیا ہم فرماں برداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے تم کیسے حکم لگاتے ہو''۔

اور نبی کے ایک کھلے اور ممتاز دشمن کے بارے میں اللہ فرماتا ہے :

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ (١٠) هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيمٍ (١١) مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ (١٢) عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيمٍ (١٣) أَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِينَ (١٤) إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (١٥) سَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرْطُومِ (١٦) (٦٨: ١٠ تا ١٦)

"ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا ہے' بے وقعت آدمی ہے' طعنے دیتا ہے' چغلیاں کھاتا پھرتا ہے' بھلائی سے روکتا ہے' ظلم و زیادتی میں حد سے گزر جانے والا ہے' سخت بد اعمال ہے' جفاکار ہے' اور ان سب عیوب کے ساتھ بداصل ہے۔ اس بنا پر کہ وہ بہت مال اور اولاد رکھتا ہے۔ جب ہماری آیات اس کو سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلے وقتوں کے افسانے ہیں۔ عنقریب ہم اس کی سونڈ پر داغ لگائیں گے"۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ مکذبین کے ساتھ نمٹ لینے کا اعلان کرتا ہے۔

فَذَرْنِي وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيثِ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ (٤٤) وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ (٤٥) (٦٨: ٤٤ تا ٤٥) "پس اے نبی تم اس کلام کے جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ ہم ایسے طریقے سے ان کو بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ میں ان کی رسی دراز کر رہا ہوں۔ میری چال بڑی زبردست ہے"۔

اور اس دنیا کے عذاب کے سوا ان کو آخرت کا عذاب بھی دیا جائے گا' جو بہت ہی سخت ہے۔

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ (٤٢) خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سٰلِمُونَ (٤٣)

(٦٨: ٤٢ تا ٤٣) "جس روز سخت وقت آپڑے گا اور لوگوں کو سجدہ کرنے کے لیے بلایا جائے گا تو یہ لوگ سجدہ نہ کر سکیں گے' ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی' ذلت ان پر چھائی ہوگی' یہ جب صحیح سالم تھے' اس وقت انہیں سجدے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ (اور یہ انکار کرتے تھے)

ان کے سامنے باغ والوں کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ یہ اس دنیا کا قصہ ہے' اس سے عرب واقف تھے' سخت اترانے والے مالک تھے اس باغ کے۔ یہ تہدید ہے کبراء قریش کو جو اپنے مال و اولاد پر اترا رہے تھے' جس طرح اس سے قبل کہا گیا کہ ان کا سخت رویہ اس وجہ سے ہے کہ یہ صاحب مال و اولاد ہیں۔

سورت کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ صبر جمیل اختیار کریں۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ (٦٨: ٤٨) "اپنے رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کرو اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جاؤ"۔

ان تسلیوں سے ' ان تعریفوں سے ' ان حوصلہ افزائیوں سے 'مکذبین کو ان شدید دھمکیوں سے ' جو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جا رہی ہیں ' اور خدا کی طرف سے ان کے خلاف اس اعلان جنگ سے ' ان سب امور سے کیا معلوم ہوتا ہے ؟ یہ کہ یہ دور مسلمانوں پر بہت سخت تھا 'تعداد بہت کم تھی ' مخالفین طاقتور تھے ' غریب اور نادار لوگوں پر تشدد ہو رہا تھا ' اور نہایت ہی مشکل حالات میں ناموافق زمین پر تحریک اسلامی کا پودا لگایا جا رہا تھا ۔ یہ نظریاتی پودا جبکہ اسے اکھاڑنے کی سعی ہر طرف سے ہو رہی تھی ۔

اس سورت کے اسلوب بیان سے ' اس کے انداز تعبیر سے ' اس کے موضوعات سخن سے بھی وہ حالات اچھی طرح عیاں ہیں ' جو تحریک اسلامی کو اس وقت درپیش تھے ۔ مخالفین اپنے خیالات 'تصورات اور اعتراضات کے حوالے سے نہایت ہی سادہ ' بدوی نظر آتے ہیں اور ان کی ترجیحات اور اجتماعات نہایت فروتر قسم کے ہیں جیسا کہ کسی بھی پرلے درجے کی پسماندہ سوسائٹی میں ہوتا ہے ۔

جس انداز سے اللہ تعالیٰ ان کی افتراء پردازیوں کا رد فرماتا ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی سوسائٹی کیسی تھی ۔

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (٢) وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ (٣) وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (٤) فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ (٥) بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ (٦) (٦٨ : ٢ تا ٦) "تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو ' اور یقیناً تمہارے لیے ایسا اجر ہے 'جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو ۔ عنقریب تم بھی دیکھ لوگے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون جنون میں مبتلا ہے " ۔ اور اس طرح اللہ کی جانب سے شدید دھمکی کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ حالات کس قدر سخت تھے اور یہ لوگ کس قدر اجڈ تھے ۔

فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (٤٤) وَاُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ (٦٨ : ٤٥) "پس اے نبی تم اس کلام کے جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو ۔ ہم ایسے طریقے سے ان کو بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی ۔ میں ان کی رسی دراز کر رہا ہوں ۔ میری چال بڑی زبردست ہے " ۔

اور حالات کی سنگینی اور ان لوگوں کی بدویت ان سخت الفاظ سے بھی معلوم ہوتی ہے ' جو ان سے ایک شخص کے بارے میں استعمال ہوئے ۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ (١٠) هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ (١١) مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (١٢) عُتُلٍّۢ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ (١٣) (٦٨ : ١٠ تا ١٣) "ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا ہے ' بے وقعت آدمی ہے ' طعنے دیتا ہے 'چغلیاں کھاتا پھرتا ہے ' بھلائی سے روکتا ہے 'ظلم و زیادتی

میں حد سے گزر جانے والا ہے' سخت بداعمال ہے' جفاکار ہے' اور ان سب عیوب کے ساتھ بداصل ہے ۔

ان کے لیے اللہ نے جس قصے کا انتخاب کیا ہے' وہ بھی بعض سادہ لوح لوگوں کا قصہ ہے' جن کی فکر' جن کا تصور' جن کی سرکشی اور حرکات کا انعکاس اس سے خوب ہوتا ہے ۔ ذرا اس قصے کے کرداروں کے اقوال دیکھیں ۔

وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ (۲۳) اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ (۶۸ : ۲۴) "اور وہ آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے کہ آج کوئی مسکین تمہارے ساتھ باغ میں نہ آنے پائے" ۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف ان لوگوں کو جس انداز میں خطاب کیا جاتا ہے' اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بہت سادہ تھے ۔

اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ (۳۷) اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ (۳۸) اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ (۳۹) سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ (۴۰) (۶۸ : ۳۷ تا ۴۰) "کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم یہ پڑھتے ہو کہ تمہارے لیے ضرور وہاں وہی کچھ ہے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو؟ یا پھر کیا تمہارے لیے روز قیامت تک ہم پر کوئی عہد و پیمان ثابت ہے کہ تمہیں وہی کچھ ملے گا جس کا تم حکم لگاؤ؟ ان سے پوچھو تم میں سے کون اس کا ضامن ہے؟"

یہ وہ صفات ہیں جو ان قرآنی تعبیرات سے' واضح طور پر سامنے آتی ہیں' جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی ایام میں دعوت اسلامی کو کس قدر سادہ لوح لوگوں سے واسطہ تھا ۔ اور دعوت اسلامی کو کن حالات سے گزرنا پڑا ۔ اور ان سادہ لوح بدوی لوگوں کو دعوت اسلامی اور قرآن نے حضور اکرم ﷺ کے آخری عہد میں کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا اور ان کی سادگی' ان کی فکر' ان کے تصورات اور ان کے شعور اور ان کی ترجیحات میں کس قدر عظیم انقلاب برپا کر دیا ۔ چنانچہ قرآن کے آخری دور یعنی ۲۲ سال بعد کے اسالیب کلام' طرز خطاب' انہی لوگوں کے شعور' افکار اور ترجیحات میں کیا انقلاب برپا ہوا؟ حالانکہ بیس بائیس سال کا عرصہ اقوام کے عروج و زوال کی تاریخ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا ۔ یہ اس طرح تھوڑا ہوتا ہے جس طرح پلک جھپکنے کا وقت ۔ ۲۲ سال کا عرصہ اور ایک بدوی قوم کے اندر ایک عظیم انقلاب ۔ یہ سوسائٹی اس قلیل وقت میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور اس نے دنیا سے علمی' فکری اور سیاسی قیادت چھین لی اور پھر دنیا کو اس مقام تک پہنچایا جس تک وہ کبھی نہ پہنچی تھی ۔ نہ نظریاتی اعتبار سے' نہ اس زاویہ سے کہ کسی نظریہ نے لوگوں کی زندگیوں کو اس قدر بدل کر رکھ دیا ہو' نہ اس اعتبار سے کہ کسی نظریہ نے اس قدر وسیع آبادی کو مختصر وقت میں اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو اور اسے رواداری' محبت اور فکری غذا فراہم کی ہو' اور شعوری ضروریات پوری کی ہوں' ایک اجتماعی نظام دیا ہو' تنظیمی ادارے دیئے ہوں' اور تمام پہلوؤں سے انسانیت کو بلند کیا ہو؟

اس سورت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے سادہ ترین بدویت کے اندر کس قدر عظیم انقلاب برپا کیا' جو گہرا بھی تھا' جامع و مانع بھی تھا اور وسیع بھی تھا ۔ غرض یہ ایک ہمہ گیر انقلاب تھا جس نے ضعف کو قوت میں بدل دیا ۔ قلت کو کثرت میں بدل دیا ۔ اور فکر کی کایا پلٹ دی ۔ یاد رہے کہ انسانوں کی ظاہری صف بندی کے مقابلے میں فکری اصلاح مشکل ترین کام ہوتا ہے ۔

# درس نمبر ۲۶۸ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۵۲

آیاتہا ۵۲　سُورَةُ الْقَلَمِ (۶۸)　مَكِّيَّةٌ (۲)　رکوعاتہا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نٓ وَ الْقَلَمِ وَ مَا يَسْطُرُوْنَ ۝۱ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝۲ وَ اِنَّ لَكَ
لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝۳ وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝۴ فَسَتُبْصِرُ وَ يُبْصِرُوْنَ ۝۵
بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝۶ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ
بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝۷ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۸ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝۹ وَ لَا
تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝۱۰ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ ۝۱۱ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝۱۲
عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝۱۳ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِيْنَ ۝۱۴ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا
قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۵ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ۝۱۶

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ن۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں، تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو۔ اور یقیناً تمہارے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔ عنقریب تم بھی دیکھ لوگے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون گمراہی میں مبتلا ہے۔ تمہارا رب ان لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں، اور وہی ان کو بھی اچھی طرح جانتا ہے جو راہ راست پر ہیں۔ لہٰذا تم ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو یہ بھی مداہنت کریں۔ ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا بے وقعت آدمی ہے، طعنے دیتا ہے، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے، بھلائی سے روکتا ہے،

ظلم و زیادتی میں حد سے گزر جانے والا ہے 'سخت بداعمال ہے 'جفاکار ہے اور ان سب عیوب کے ساتھ بداصل ہے 'اس بنا پر کہ وہ بہت مال اور اولاد رکھتا ہے ۔جب ہماری آیات اس کو سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلے وقتوں کے افسانے ہیں ۔ عنقریب ہم اس کی سونڈ پر داغ لگائیں گے"۔

اللہ یہاں ن 'قلم اور کتابت کی قسم اٹھاتا ہے اور حرف نون ایک منفرد حرف ہے ۔اس میں اور قلم و کتابت میں تعلق واضح ہے ۔ان چیزوں کی قسم کیوں اٹھائی ہے؟ اس لیے کہ اسلام میں لکھنے پڑھنے کو بڑی اہمیت دی گئی ہے ۔اس سے یہ ہدایت مقصود ہے کہ اس کام کی طرف توجہ کرو کیونکہ عرب امی تھے اور وہ لکھنے پڑھنے کی طرف متوجہ نہ تھے ۔بہت ہی کم لوگ عربوں میں لکھنا پڑھنا جانتے تھے جبکہ امت محمدیہ نے آئندہ انسانوں میں جو اہم کردار ادا کرنا تھا'اس کے لیے لکھنا پڑھنا بہت ہی ضروری تھا۔اور قرات اور کتابت کا پھیلانا اسلامی پالیسی کا بنیادی نکتہ تھا تاکہ یہ نظریہ اور اس کے اوپر جو نظام برپا کیا جانا تھا' اسے پوری دنیا میں پھیلایا جاسکے اور یہ امت انسانیت کی قیادت کرسکے ۔اس میں شک نہیں ہے کہ اس مقصد کے لیے لکھنا پڑھنا ایک بنیادی ضرورت تھی ۔

اس بات کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ وحی کا آغاز یوں ہوا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (١) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (٢) اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ (٣) الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (٤) عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (٥) (٩٦ : ١ تا ٥)

"پڑھو اے نبی اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا' جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی ۔پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا"۔اور پھر یہ حکم دیا نبی امی کو جس کے بارے میں اللہ نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ امی ہیں اور اس کی خاص حکمت تھی ۔لیکن جب وحی آئی تو اس ہدایت کے ساتھ کہ پڑھو اور لکھو۔یہاں نون کے ذریعہ اس کی مزید تاکید کی ۔اور قلم اور سطروں کی قسم اٹھائی ۔یہ ایک انداز تھا اس امت کی تربیت کا۔جس نے اس کائنات میں ایک عظیم کردار ادا کرنا تھا۔

غرض یہاں قسم ہے حرف تہجی نون کی اور پھر قلم کی اور پھر سطروں کی ۔ایک اس بات کے لیے کہ قرات اور کتابت اسلام کی بنیادی پالیسی اور بہت اہم ہے ۔ دوسرے اس بات کی تردید کے لیے جو کفار الزام لگاتے تھے کہ حضور اکرم مجنون ہیں تو اللہ تعالیٰ یہاں تردید کرتا ہے کہ رب کے فضل و کرم سے آپ مجنون نہیں ہیں۔

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (٦٨ : ٢) "تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو"۔ایک مختصر سی آیت میں ایک بات کو ثابت کیا جاتا ہے اور ایک کی نفی کردی جاتی ہے ۔ ثابت یہ کیا جاتا ہے کہ آپ پر اللہ کا فضل و کرم ہے ۔اور نفی اس بات کی کی جاتی ہے کہ آپ مجنون نہیں ہیں ۔اور اثبات رحمت نہایت ہی اپنائیت کے ساتھ ہے ۔

رَبِّكَ یعنی تمہارے رب کے فضل و کرم سے ۔

جب انسان قبل نبوت کی سیرت کے واقعات پڑھتا ہے تو وہ متعجب ہوتا ہے کہ اس شخص پر یہ لوگ ایسا الزام لگاتے

ہیں جس کے بارے میں وہ جانتے تھے کہ وہ بہت بڑا دانا شخص ہے ۔ نبوت سے کئی سال پہلے جب ان کے درمیان حجراسود کے نصب کرنے پر اختلاف ہو گیا تو آپ نے بڑی عقلمندی سے مسئلہ کو حل کر دیا ۔ پھر انہوں نے آپؐ کو امین کا لقب دیا ۔ اور آپؐ کے پاس وہ اپنی امانتیں رکھتے تھے ۔ یہاں تک کہ ہجرت کے وقت تک امانتیں آپؐ ہی کے پاس رکھی جاتی تھیں ۔ سخت دشمنی کی حالت میں بھی ان کا اعتماد تھا ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ ہجرت کے بعد ایک زمانہ تک مکہ میں رہے تاکہ لوگوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیں جو آپ کے پاس رکھی ہوئی تھیں ۔ پھر یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے حضور اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے کبھی جھوٹ نہ سنا تھا ۔ جب ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا کیا نبوت سے پہلے تم نے کبھی اس پر جھوٹ بولنے کا الزام لگایا؟ ابوسفیان اگرچہ آپ کا سخت دشمن تھا مگر اس نے کہا کہ "نہیں" ۔ تو اس پر ہرقل نے کہا کہ جو شخص تم میں سے کسی پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ خدا پر کس طرح جھوٹ باندھ سکتا ہے کہ لوگوں سے سچ کرے اور خدا سے جھوٹ ۔

انسان حیران رہ جاتا ہے کہ مکہ کے لوگوں نے حضور اکرم ﷺ کے بارے میں یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں کرنے کی جرات کی ۔ حالانکہ آپ بہت بلند اخلاق ' مہربان ' سچے اور ان کے درمیان نہایت ہی عقلمند مشہور تھے ۔ لیکن محبت و نفرت انسان کو اندھا اور بہرہ کر دیتی ہیں ۔ اور انسان اپنے مقاصد کے لیے جھوٹ بولنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے ۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ کہنے والا کذاب ہے ۔

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ( ۶۸ : ۲ ) "تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو" ۔ یوں نہایت محبت اور ہمدردی کے ساتھ آپ پر سے اس الزام کی نفی کی جاتی ہے ۔ اور آپ کو اس سے باعزت طور پر بری قرار دیا جاتا ہے ۔ اور ان کے کافرانہ عناد اور مذموم الزام کو رد کر دیا جاتا ہے ۔

وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ( ۶۸ : ۳ ) "اور یقیناً تمہارے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے" ۔ یعنی آپ کے لیے دائمی اور مسلسل اجر کا انتظام ہے ۔ یہ سلسلہ کبھی منقطع نہ ہو گا ' نہ انتہا کو پہنچے گا ۔ تمہارے رب نے تجھے نبوت عطا کی ہے اور یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے ۔ یہ ایک نہایت بڑی اور حقیقی تسلی ہے اور نہایت ہی بھرپور ہے ۔ اس کے بعد انسان کوئی محرومی 'کوئی ظلم 'کسی بہتان کی کوئی پرواہ نہیں کرتا ۔ جب رب تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ تمہارے لیے ایسا مسلسل اجر ہے 'جس کا سلسلہ منقطع ہونے والا نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ پھر انسان اس راہ میں آنے والی کسی مشکل کی کوئی پرواہ نہیں کرتا خصوصاً جبکہ رب تعالیٰ کی طرف سے اپنائیت اور اعزاز و تکریم کے ساتھ یہ یقین دہانی ہو ۔

اس کے بعد ایک عظیم شہادت آپ کے حق میں آتی ہے ۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے ۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ( ۶۸ : ۴ ) "اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو" ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس تعریف و ثنا میں پوری کائنات شریک ہو جاتی ہے اور اس پوری کائنات کی روح کے اندر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آپ خلق عظیم کے مالک تھے ۔

کسی قلم میں یہ قوت نہیں ہے کہ وہ آپ کے مناقب بیان کر سکے 'کسی شخص میں یہ قوت نہیں ہے کہ وہ آپ کے اخلاق کا تصور کر سکے ۔ اور اس عظیم سرٹیفیکیٹ کی تشریح کر سکے ۔ یہ عظیم کلمات رب عظیم کی طرف سے ہیں ۔ اور رب

تعالیٰ ہی اپنی اس عظیم شہادت کی تشریح کر سکتا ہے ۔ اللہ کے ہاں عظمت کے کیا پیمانے ہیں ' اس کا بندہ کس قدر عظیم ہے ' یہ وہی جانتا ہے ۔ جس نے کہا ۔

وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (٦٨ : ٤) "اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو" ۔ یہ خلق عظیم وہ ہے جس کا تصور کسی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی محدود عقل و ادراک سے اس کا تصور کر سکے ۔ لیکن مختلف پہلوؤں سے آپ کے اخلاق "عظیم" تھے ۔

سب سے پہلا پہلو تو یہ ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آ رہی ہے ۔ رب تعالیٰ آپ کو خلق عظیم کا لقب عطا فرما رہا ہے ۔ اس میں اللہ کی مخلوق اور اس کی ناپید اکنار کائنات بھی شامل ہے ۔ اور ملاء اعلیٰ کی تمام مخلوقات جو رب تعالیٰ کی کائنات کے کارندے ہیں ' سب اس میں شامل ہیں ۔

آپ کے خلق عظیم کا ایک پہلو یہ ہے کہ آپ نے یہ ربانی شہادت حاصل کی ۔ اپنے رب کی طرف سے حاصل کی ۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس عظیم کائنات کا عظیم باری تعالیٰ یہ کہہ رہا ہے "یہ ایک بہت اعزاز ہے" ۔ ان کلمات کا ایک عظیم مفہوم ہے ' ان کی ایک وسعت ہے ' ان کی ایک بلند گونج ہے ۔ آپ جانتے تھے کہ کس عظیم ذات کی ہے یہ شہادت اور یہ شہادت کس قدر عظیم ہے ۔

یہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہی کا ظرف تھا جو اس عظیم شہادت کو قبول کرنے کی طاقت رکھتا تھا ۔ صرف آپ ہی کا حوصلہ تھا کہ اس عظیم مصدر سے یہ شہادت پائے اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی جگہ اور مقام پر قائم رہے ۔ اور اس عظیم شہادت کے دباؤ اور اثر کو برداشت کر سکے ۔ یہ ایک تعریف تھی لیکن آپ کی ذات کے اندر کوئی حرکت ' کوئی اضطراب پیدا نہ ہوا ۔ نہایت اطمینان ' نہایت توازن اور سنجیدگی کے ساتھ آپ نے یہ اعزاز لیا ۔ اور آپ کی عظمت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ نے اس عظیم خطاب کے بوجھ کو اٹھا لیا ۔

آپ کے خلق عظیم کی روایات سے سیرت کی کتب بھری ہیں ۔ آپ کے صحابی اس مضمون پر رطب اللسان ہیں اور خود آپ کا برتاؤ ہی ایک بڑی شہادت ہے ' اس بات کی ۔ لیکن رب تعالیٰ کی طرف سے یہ عظیم اعزاز عظیم تر ہے ۔ یہ علی کبیر اور رب متعال کی طرف سے ہے ۔ اور پھر اس سے بھی عظیم تر یہ بات ہے کہ خالق کائنات کی طرف سے یہ عظیم شہادت پاکر آپ سنجیدہ ' مطمئن ' مضبوط اور اپنے مقام پر جمے رہے ۔ آپ نے انسانوں پر اپنی برتری نہیں جتائی ' آپ نے علو اختیار نہیں کیا ' بڑائی اختیار نہیں کی اور آپ نے اسے ہضم کر لیا اور آپ کا انکسار وہی رہا ۔ حالانکہ یہ بہت ہی عظیم اعزاز تھا ۔

اللہ جانتا ہے کہ وہ کس کو رسول بنا رہا ہے ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنی اس عظمت کے باوجود ....
...... رسول تھے اور اپنی اس کائناتی عظمت کے باوجود رسالت کی ذمہ داریاں اٹھا رہے تھے اور لوگوں کے سامنے ایک انسان کی طرح عظمت اخلاق کا نمونہ پیش فرماتے تھے ۔

یہ آخری رسالت جس قدر کامل اور جمیل ہے ' جس قدر عظیم اور جامع ہے ' جس قدر حق اور سچی ہے ' اس کا حامل وہی شخص ہو سکتا تھا ' جس کو خالق کائنات یہ لقب دے کہ تم خلق عظیم پر ہو ۔ اور پھر آپ کی شخصیت کو بھی یہ قوت دی

گئی کہ وہ اس عظمت کو وصول کر سکے ـ اور متوازن اور سنجیدہ رہے ـ ایک عظیم انسان کی طرح مطمئن رہے ـ ایک عظیم شخص ہی اس عظمت کو اٹھا سکتا ہے جو ان الفاظ میں دی گئی ہے ـ اس عظیم ثنا اور تعریف کے بعد قرآن میں بعض اوقات آپؐ پر عتاب بھی آیا ہے' لیکن آپؐ نے اسے بھی نہایت ہی عظمت کے ساتھ سنا ہے ـ نہایت توازن اور اطمینان کے ساتھ ـ جس طرح آپ کی اس عظمت کا اعلان ہوا ـ اسی طرح آپ کو تنبیہہ کرنے والی آیات کو بھی اس لازوال کتاب میں جگہ دی گئی ہے ـ اللہ نے کوئی بات چھپا کر نہیں رکھی ـ اور دونوں حالات میں نبی آخرالزمان عظیم رہے ـ آپؐ نے دونوں باتوں کو عظمت کے ساتھ لیا ـ

نفس محمدی کی حقیقت دراصل رسالت محمدی کے اندر پوشیدہ ہے' اور عظمت محمد ﷺ کا پیمانہ رسالت محمدیہ کی عظمت ہے ـ اور حقیقت محمدیہ حقیقت دین اسلام کی طرح انسان کے ادراک سے اور انسان کے مشاہدے سے اس طرح دور ہے جس طرح اس کائنات میں کوئی کہکشاں دور ہے ـ ایک شخص رصد گاہ میں بیٹھ کر دور سے اس کی طرف اشارہ تو کر سکتا ہے لیکن کسی کے لیے حقیقت محمدیہ کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے ـ کیونکہ یہ حقیقت انسان کے مشاہدے اور ادراک سے بہت دور ہے ـ انسان ایک کہکشاں کی طرح دور سے اس کی طرف اشارہ تو کر سکتا ہے لیکن وہ اس کے بارے میں پوری بات نہیں کر سکتا ـ

میں ایک بار پھر یہ نکتہ اٹھاتا ہوں اور اس سوچ میں پڑا ہوں کہ حقیقت محمدیہ نے کس قدر عظیم اعزاز پایا اور اسے اپنایا اور آپ کی شخصیت متوازن' ثابت قدم اور مطمئن رہی ـ آپ بہرحال انسان تو تھے ـ کبھی جب آپؐ اپنے کسی رفیق کی تعریف فرماتے تو آپ کا وہ رفیق اور اس کے دوست یار خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے ـ اس کا ان پر اس قدر اثر ہوتا کہ قریب تھا کہ ان کو شادی مرگ سے دوچار ہونا پڑے ـ باوجود اس کے کہ آپ بشر تھے ـ آپؐ کے ساتھی جانتے تھے کہ آپؐ بشر ہیں ـ اور آپؐ نبی ہیں اور نبوت کا ایک معلوم دائرہ ہوتا ہے ـ نبی بشر ہوتا ہے لیکن حضور اکرم ﷺ کا معاملہ اور ہے ـ آپؐ کے حق میں تو شہادت رب کائنات دے رہا ہے ـ آپؐ جانتے ہیں کہ رب کائنات کس قدر عظیم ہے ـ اور اگر کوئی نہیں جانتا تو حقیقت محمدیہ تو رب کائنات کی عظمت کو خوب جانتی ہے ـ لیکن اس کے باوجود آپ اس عظیم شہادت کو نہایت سنجیدگی سے ہی لیتے ہیں اور اپنی روش میں کوئی فرق آنے نہیں دیتے ـ یہ ہے اصل عظمت اور یہ ہے وہ بات' جو ہر اندازے سے بلند ہے ـ

حضرت محمد ﷺ وحدہ اس مقام تک پہنچے ہیں' اس عظمت کے مقام تک ـ یہ عظمت و کمال کی بلند چوٹی ہے جس کو آپؐ نے صرف آپؐ نے سر کیا ہے ـ اس مقام تک کوئی اور انسان نہیں پہنچ سکا اور یہ حقیقت محمدیہ تھی جو اس رسالت کے اٹھانے کے اہل ہوئی جو کائناتی رسالت ہے' ابدی رسالت ہے' اور عالمی انسانی رسالت ہے ـ یہ رسالت آپ کی شخصیت میں مشخص ہوئی اور عملی شکل میں انسانیت کو ملی ـ یہ آخری رسالت اسی طرح آئی کہ مکہ اور مدینہ میں انسانی شکل میں پھرتی رہی ـ یہ تھے محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ـ اس مقام کے لائق اور اللہ ہی جانتا تھا کہ اس مقام کا اہل اس کی مخلوق میں سے کون ہے؟ اس لیے اس نے اعلان فرمایا کہ

وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ( ۶۸ : ۴ ) اللہ نے بذات خود یہ اعلان کیا اور اعلان فرمایا کہ اللہ خود حضرت

محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر صلوۃ و سلام بھیجتا ہے ۔ اور یہ اللہ ہی کی بخشش ہے جو کسی انسان کو عطا کرتا ہے ۔ یہ رتبہ بلند ہے جس کو مل گیا ۔

پھر اس شہادت کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے 'اور وہ یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے انسانی نظام کے اندر اخلاق کی اہمیت کیا ہے ۔ اسلامی نظام حیات میں حسن اخلاق ہر معاملے میں ایک بنیادی عنصر ہے ۔

اسلامی نظریہ حیات کا مطالعہ کریں یا نبی آخر الزمان کی سیرت کا مطالعہ کریں 'نظر آئے گا کہ ان میں بنیادی عنصر اسلامی اخلاق کا ہے ۔ اسی اخلاقی عنصر پر اسلام کا تہذیبی اور قانونی نظام قائم ہے ۔ اس نظام میں طہارت 'نظافت' امانت' سچائی' عدل' رحم دلی' نیکی' وعدہ وفائی' قول و فعل کے درمیان مطابقت' نیت اور ضمیر کے درمیان مطابقت' ظلم اور زیادتی کی مخالفت' ظلم اور دھوکہ بازی کی ممانعت' لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھانے کی ممانعت' لوگوں کی عزت پر حملے کی ممانعت' فحاشی کے ارتکاب اور فحاشی کی اشاعت کی ممانعت' خواہ وہ جس شکل میں بھی ہو ۔ اور اس نظام میں جس قدر قانون سازی بھی کی گئی ہے وہ ان اخلاقیات میں سے کسی نہ کسی اخلاق کی حفاظت کے لیے کی گئی ہے اور اس قانون سازی کے ذریعہ لوگوں کے سلوک' ان کے شعور اور طرز عمل میں اخلاقی قدریں پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہے ۔ اور یہ اخلاقیات بیک وقت انفرادی' اجتماعی اور بین الاقوامی طرز عمل میں ملحوظ رکھے گئے ہیں ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا فرمان ہے :" مجھے اس لیے بھیجا گیا کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کر دوں" ۔ آپ نے اپنی بعثت کا مقصد اخلاقی تطہیر کے اندر محدود کر دیا ۔ اور احادیث کا ایک زمزمہ بہہ رہا ہے کہ خلق حسن اختیار کرو' کریمانہ انداز اپناؤ' آپ کی سیرت طیبہ اس کی ایک مثال ہے اور ایک صاف صفحہ ہے ۔ اور ایک اعلیٰ تصویر ہے مکارم اخلاق کی ۔ اور فی الواقعہ آپ اس بات کے مستحق تھے کہ خالق کائنات یہ شہادت دے کہ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ (۶۸ : ۴) جس طرح حضور اکرم ﷺ خلق عظیم کے اعلیٰ درجے پر ہیں اسی طرح آپ کا پیش کردہ اسلامی نظام حیات بھی اعلیٰ اخلاقی قدروں کا حامل ہے ۔ اس اخلاق کے ذریعہ زمین کی بستیوں کو آسمانوں سے ملا دیا گیا اور لوگوں کے دلوں کو خدا سے جوڑ دیا گیا اور یہ بتا دیا گیا کہ اللہ کن کن باتوں پر راضی ہوتا ہے ۔

یہ پہلو اسلام کے اخلاقی نظام میں ایک ممتاز پہلو ہے ۔ کیونکہ اسلامی اخلاقیات کسی سوسائٹی کی پیداوار نہیں ہیں' یہ زمینی اور مادی اصولوں سے ماخوذ نہیں ہیں' نہ یہ کسی رسم و رواج' عرف' مصلحت اور باہمی روابط و تعلقات سے ماخوذ ہیں ۔ ان اخلاقیات کا دارومدار رضائے الہی پر ہے ۔ اس دعوت پر ہے کہ لوگو' اللہ کی طرف بلند ہو جاؤ' اللہ کی صفات حمیدہ کو اپنے اندر پیدا کرو' تاکہ تمہاری انسانیت کے آفاق آسمانوں سے مل جائیں' تاکہ تم اخروی زندگی کو بہتر کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پاؤ ۔ اور تم اللہ کے ہاں ۔

فِىْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ (۵۴ : ۵۵) "ایک مقتدر بادشاہ کے ہاں سچی مجلس میں" بیٹھنے کے قابل ہو جاؤ ۔ اس لیے اسلامی اخلاقیات کسی مادی تصور کے اندر محدود نہیں ہیں ۔ یہ لامحدود اخلاقیات ہیں ۔ اور یہ ان انتہائی بلندیوں پر ہیں جہاں تک کوئی انسان پہنچنے کا تصور نہیں کر سکتا ہے ۔ کیونکہ یہ اخلاقیات اللہ کی صفات کی پیروی پر مبنی ہیں' گرے ہوئے مادی اصولوں سے ماخوذ نہیں ہیں ۔

پھر اسلامی اخلاقیات 'مفرد اخلاقیات' نہیں ہیں ـ صدق 'امانت' عدل 'رحم' نیکی' یہ سب ایسی اخلاقیات ہیں 'جن میں ایک سے زیادہ انسانوں کا باہم تعلق پیش نظر ہوتا ہے ـ یہ ایک نظام کے ساتھ متعلق اخلاقیات ہیں ـ باہم تعاون' باہم معاملہ' تقسیم کار اور تقسیم حقوق اور اجتماعی تنظیم سے متعلق امور ہیں ـ ان کا تعلق زندگی کے ایک تصور سے ہے اور ان کا ماخذ ذات باری ہے ـ اس لیے یہ رہبانیت یا ذاتی اذن پر مبنی بھی نہیں ہیں اور مادی مفادات اور زمین کے اعتبارات ان کا ماخذ نہیں ہے بلکہ اللہ کی رضا ان کا اصل ماخذ ہے ـ

یہ اخلاقیات اپنے کمال' جمال' توازن' سیدھے پن' تسلسل اور ثبات کے پہلو سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مکمل طور پر منعکس ہوئیں اور اس وجہ سے حضور ﷺ سے کہا گیا۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸ : ۴) "اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو"۔ اس تعریف عظیم کے بعد فرمایا جاتا ہے کہ آپ کا مستقبل نہایت تابناک ہے ـ مشرکین سے کہہ دیں کہ تم اپنے برے انجام کا انتظار کرو' تم خلق عظیم کے مالک پر ایسے الزامات عائد کرتے ہو ـ تنبیہ کی جاتی ہے کہ تمہارے دعووں کی حقیقت تم پر جلد ہی کھل جائے گی کہ مجنون کون ہے؟

فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ (۵) بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ (۶) اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (۷) (۶۸ : ۵ تا ۷) "عنقریب تم بھی دیکھ لو گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون گمراہی میں مبتلا ہے ـ تمہارا رب ان لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں' اور وہی ان کو بھی اچھی طرح جانتا ہے جو راہ راست پر ہیں"۔

اَلْمَفْتُوْنُ (۶۸ : ۶) سے مراد ہے گمراہ۔ اللہ فرماتا ہے کہ اللہ ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی جانتا ہے اور گمراہوں کو بھی ـ یا اس کے معنی ہیں وہ شخص جو آزمائش میں ڈال دیا گیا ہے اور جس کا نتیجہ نکلنے والا ہے ـ دونوں مفہوم قریب قریب ہیں ـ اس وعدے میں رسول اللہ اور مومنین کے لیے اطمینان ہے جبکہ مخالفین کے لیے دھمکی ہے ـ انہوں نے رسول اللہ ﷺ پر جنون کا الزام لگایا تھا ـ اس جنون سے ان کی مراد یہ نہ تھی کہ آپ کی عقل چلی گئی ہے کیونکہ واقعی صورت حال اس کی تکذیب کر رہی تھی بلکہ اس سے وہ مراد لیتے تھے کہ آپ پر جنون کا اثر ہو گیا ہے اور اس میں ان کا اشارہ اس طرف تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے' جو اس پر شعر وحی کرتا ہے ـ اشارتاً وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اس بات کو منسوب کرتے تھے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو تعلیمات پیش کرتے' ان کا تعلق نہ شعر سے تھا اور جنون کی باتوں سے ـ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ تسلی دیتا ہے کہ مستقبل نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقت کو بھی ظاہر کر دے گا اور آپ کی تکذیب کرنے والوں کی حقیقت کو بھی ـ اور معلوم ہو جائے گا کہ دونوں میں سے کون گمراہ ہے؟ اور مزید اطمینان کے لیے کہا جاتا ہے کہ رب تعالیٰ تو جانتا ہے کہ کون گمراہ ہے اور کون راہ راست پر ہے ـ یہ کلام تو وہی وحی کر رہا ہے ـ لہٰذا

اس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے ۔ یہ ایسی بات ہے جس کی وجہ سے آپ دشمنوں کی ہر زیادتی کو برداشت کر لیتے تھے اور اس کے نتیجے میں آپ کے دشمن پریشان ہو جاتے تھے اور آپ کی ثابت قدمی کی وجہ سے ان کے اندر قلق اور تزلزل پیدا ہو جاتا تھا' جیسا کہ اگلی آیات میں آتا ہے ۔

اگلی آیت میں آپ کو بتایا جاتا ہے کہ اندر سے ان لوگوں کا حال بہت پتلا ہے ۔ ان کی سوچ اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہے ۔ بظاہر تو وہ مخاصمت کرتے ہیں ' جھگڑتے ہیں 'حق کا انکار کرتے ہیں ' آپ پر طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں ' لیکن اندر سے ان کے اندر تزلزل پیدا ہو گیا ہے ۔ وہ ہل گئے ہیں اور جن عقائد پر وہ جمے ہوئے نظر آتے ہیں ' درحقیقت ان کے ایک بڑے حصے پر خود ان کو اعتماد نہیں ہے ۔ یہ سودا بازی کے لیے تیار ہیں ' یہ چاہتے ہیں کہ کچھ آپ نرم ہوں اور کچھ یہ نرم ہوں لیکن جن لوگوں نے نظریاتی انقلاب لانا ہوتا ہے وہ تب ہی لا سکتے ہیں جب وہ اپنے اخلاقی نظریات پر جم جائیں ۔ ان لوگوں کے جو عقائد ہیں یہ ان کے بارے میں کچھ زیادہ سنجیدہ نہیں ہیں ۔ انہوں نے چند ظاہری رسوم کو پکڑا ہوا ہے جن کے ساتھ ان کے مفادات وابستہ ہیں ۔ لہٰذا ان کی کوئی بات نہ مانو ۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ (٨) وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ (٦٨ : ٩) "تم جھٹلانے والوں کے دباؤ میں نہ آؤ یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو یہ بھی مداہنت کریں" ۔ دراصل اندر سے یہ لوگ سودا بازی کے لیے تیار ہیں ۔ چاہتے ہیں کہ نصف نصف سودا طے ہو جائے جس طرح تاجر لوگ مول تول کر لیتے ہیں ۔ لیکن ان کو معلوم ہے کہ نظریات اور تجارت میں فرق ہوتا ہے ۔ ایک نظریاتی شخص اپنے عقائد اور نظریات میں کبھی سودا بازی کے لیے تیار نہیں ہوا کرتا ۔ کیونکہ نظریات میں چھوٹی بات بھی بڑی بات کی طرح قیمتی ہوتی ہے بلکہ نظریات میں چھوٹی اور بڑی بات ہوتی ہی نہیں ہے ۔ نظریہ ایک مکمل اکائی ہوتا ہے ۔ اس میں کوئی کسی کی نہ اطاعت کرتا ہے اور نہ اپنے نظریات کے کسی حصے سے دستبردار ہوتا ہے ۔

اس بارے میں بے شمار روایات وارد ہیں کہ وہ کیا معاملات تھے جن پر مشرکین مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سودا بازی کے لیے تیار تھے کہ آپ نرمی کریں تو وہ بھی کریں یہ کہ حضور ﷺ ان کے الہوں کو برا بھلا کہنا ترک کر دیں اور یہ بھی نہ کہیں کہ ان بتوں کی عبادت کرنا ایک احمقانہ فعل ہے ۔ یا یہ کہ حضور اکرم کچھ باتیں ان کے دین کی مان لیں اور کچھ باتیں وہ مان لیں گے ۔ یوں جمہور عرب کے سامنے ان کی لاج رہ جائے گی ۔ جس طرح ہمیشہ مصالحت کرنے والوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ نصف نصف پر فیصلہ کر لیتے ہیں ۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رویہ تو دو ٹوک تھا ۔ آپؐ اس میں نہ مداہنت کرتے تھے اور نہ نرمی فرماتے تھے لیکن دین اسلام کے اصولوں کے علاوہ آپ تمام معاملات میں ' نہایت ہی نرم رویہ اختیار فرماتے تھے ۔ معاملات میں نہایت ہی اچھے تھے ' معاشرت میں نہایت ہی خوش اخلاق تھے اور لوگوں کے ساتھ نہایت ہی اچھا رویہ رکھتے تھے ۔ رہا دین کا معاملہ تو وہ خدا سے متعلق تھا ۔ اور خدا کی ہدایت یہ تھی ۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ (٦٨ : ٨) "لہٰذا تم ان جھٹلانے والوں کی کوئی بات نہ مانو" ۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں ایسے حالات میں بھی دین کے معاملے میں کوئی سودا بازی نہیں کی جبکہ آپ نہایت ہی مشکل حالات میں تھے ۔ آپ کی تحریک محاصرے میں تھی ۔ آپ کے ساتھ چند ساتھی تھے ۔ ہر طرف سے ان پر مظالم ہو رہے

تھے ۔ اچک لیے جاتے تھے ۔ شدید ترین اذیتیں دی جاتی تھیں لیکن وہ صبر کرتے تھے ۔ البتہ وہ بڑے سے بڑے جبار کے سامنے کلمہ توحید پڑھنے سے کبھی باز نہ آتے تھے ۔ نہ وہ ان کے تالیف قلب کے لیے اور نہ ان کی اذیت سے جان چھڑانے کے لیے ۔ نہ وہ کسی ایسی حقیقت کی وضاحت سے چوکتے تھے جس کا ان کے ایمان سے کوئی دور کا بھی تعلق ہوتا تھا ۔

ابن ہشام نے اپنی سیرت میں ابن اسحاق سے روایت کی ہے :"رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنی قوم کے سامنے اسلام کا اظہار اور علانیہ دعوت شروع کر دی تو انہوں نے آپ کے دین کا کوئی رد یا جواب نہ دیا ۔ یہاں تک کہ آپ نے ان کے الہوں کا ذکر شروع کر دیا اور ان کی عبادت کو احمقانہ فعل بتایا ۔ جب حضورﷺ نے یہ کہا تو انہوں نے اسے ایک عظیم جرم سمجھا اور اس پر بہت برا منایا ۔ یہ لوگ آپ کے خلاف جمع ہو گئے اور دشمنی شروع کر دی ۔ ماسوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ اسلام میں لے آیا تھا ۔ لیکن یہ بہت ہی قلیل اور کمزور تھے ۔ رسول اللہ کے چچا ابو طالب نے آپ کی حمایت کی اور آپ کا دفاع کیا' اور آپ کے محافظ کے طور پر آپ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور رسول اللہ اپنا کام کرتے رہے ۔ خوب اظہار خیال کرتے رہے اور کوئی آپ کو اپنی باتوں سے روک نہ سکتا تھا ۔

جب قریش کو معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں سے باز نہیں آتے جن کو وہ برا سمجھتے ہیں اور یہ کہ ان کی صفوں میں تفرقہ پڑ گیا ہے اور وہ بدستور ان کے الہوں پر تنقید کرتے ہیں ۔ پھر انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ان کے چچا ان کی حمایت پر تلے ہوئے ہیں اور وہ ان کو قریش کے سپرد نہیں کرتے ۔ تو قریش کے اشراف کا ایک وفد ابو طالب کے پاس گیا ۔ ان میں عتبہ اور شیبہ پسران ربیعہ ' ابو سفیان ابن حرب ابن امیہ ' ابوالبختری العاص ابن ہشام ' اسود ابن مطلب ابن اسد ' ابوجہل (اس کا نام ابو الحکم عمر ابن ہشام تھا) ' ولید ابن مغیرہ 'نبیہ اور منبہ پسران حجاج ابن عامر اور دوسرے لوگ جو ان کے ساتھ گئے تھے ۔ انہوں نے کہا ابو طالب "یہ کہ تمہارے بھتیجے نے ہمارے الہوں کو گالیاں دیں اور ہمارے دین میں عیب نکالے اور ہمارے خیالات کو احمقانہ کہا ۔ ہمارے آباؤاجداد کو گمراہ کہا ' اب تمہارے سامنے دو راستے ہیں یا تو اسے ان باتوں سے روک دو یا ہمارے اور اس کے درمیان سے ہٹ جاؤ' کیونکہ جس طرح ہم اس کے دین کو نہیں مانتے تم بھی نہیں مانتے ۔ ہم اس کا علاج کر دیں گے" ۔ ابو طالب نے ان کے ساتھ نہایت ہی نرم باتیں کیں اور انہیں اچھے طریقے سے رخصت کر دیا ۔ یہ لوگ واپس ہو گئے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنا کام جاری رکھا ۔ آپ اپنے دین کا اظہار فرماتے اور لوگوں کو اس کی طرف بلاتے ۔ لیکن اس کے بعد آپ کے اور قریش کے درمیان اختلافات شدید ہو گئے ۔ دشمنی میں دور تک چلے گئے اور لوگوں کی آتش عناد تیز ہو گئی اور جگہ جگہ آپ کے خلاف باتیں ہونے لگیں ۔ اور لوگ آپ کے خلاف ایک دوسرے کو اکسانے لگے ۔ انہوں نے کہا کہ اٹھو' اس شخص کے خلاف ۔ یہ لوگ دوبارہ ابو طالب کے پاس گئے اور کہا ابو طالب تم ہم میں سب سے معمر ہو' عزت دار ہو' اور شریف ہو ۔ ہم نے تم سے درخواست کی تھی کہ اپنے بھتیجے کو اس کام سے روکو مگر تم نے اسے نہ روکا ۔ خدا کی قسم! ہم اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے آباؤاجداد کو گالیاں دے ' ہمارے عقائد کو احمقانہ بتلائے اور ہمارے الہوں کی عیب جوئی کرے ۔ یا تو آپ اسے روکیں یا پھر اس کی حمایت سے ہاتھ اٹھالیں ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان جنگ ہو گی جو فریق بھی ہلاک ہو گیا ۔ یا اس طرح کی سخت باتیں انہوں نے کہیں اور چلے گئے ۔ ابو طالب پر قوم کے درمیان یہ جھگڑا ذرا گراں گزرا ۔ اور انہوں نے پوری قوم کی عداوت کو بھاری سمجھا ۔

اور یہ بھی وہ نہ چاہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ان کے حوالے کر دیں اور شرمندگی اٹھائیں۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھے یعقوب ابن عتبہ ابن مغیرہ ابن اخنس نے بتایا کہ جب قریش نے ابوطالب سے یہ باتیں کیں تو انہوں نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بلایا۔ ان سے کہا بھتیجے! تمہاری قوم میرے پاس آئی اور انہوں نے یہ کہا اور یہ کہا۔ اس لیے تم مجھ پر اور اپنے آپ پر ذرا رحم کرو اور مجھ پر اس قدر بوجھ نہ ڈالو جس کے اٹھانے کی مجھے طاقت نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ سمجھا کہ شاید ابوطالب کی رائے اس معاملے میں بدل گئی ہے۔ اور یہ کہ آپ بھی اب ساتھ چھوڑنے والے ہیں اور مجھے قریش کے حوالے کرنے والے ہیں اور یہ کہ ابوطالب بھی اب حمایت اور نصرت سے دستکش ہو رہے ہیں۔ تو حضورﷺ نے فرمایا "چچا! خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ دیں اور یہ مطالبہ کریں کہ یہ کام چھوڑ دو تو یہ نہیں ہو سکتا' میں یہ کام کرتا رہوں گا جب تک یہ دین غالب نہیں ہو جاتا یا میں ہلاک نہیں ہو جاتا۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ کی آواز روندھ گئی اور آپ روپڑے اور اٹھ کر چلے گئے۔ جب آپ چلے گئے تو ابوطالب نے آواز دی: بھتیجے! ادھر آؤ' رسول اللہ واپس ہوئے تو انہوں نے کہا "جاؤ جو چاہو کرو' خدا کی قسم میں تمہیں کسی قیمت پر ان کے حوالے کبھی بھی نہ کروں گا"۔

یہ ہے تصویر حضور اکرم ﷺ کی کہ آپ اس وقت بھی اپنی دعوت پر جمے ہوئے تھے جبکہ آپ کے چچا محترم بھی دستکش ہونے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ جو آپ کے حامی اور محافظ تھے اور یہ آخری قلعہ تھے' جس میں آپ اس کرۂ ارض پر اپنے دشمنوں کے مقابلے میں پناہ لے سکتے تھے۔

یہ تو تھی ایک نہایت ہی روشن اور قوی تصویر۔ یہ اپنی نوعیت اور حقیقت کے اعتبار سے بالکل ایک انوکھی تصویر تھی۔ اس کا رنگ اور پرتو سب ہی انوکھے تھے۔ اس کی عبارت اور مکالمات بھی اپنی نوعیت کے تھے۔ نہایت نئے اور سنجیدہ موقف کی ایک تصویر اس طرح روشن' جس طرح یہ عقیدہ روشن ہے۔ اور اس میں سرٹیفکیٹ اور شہادت کا مصادق اور مفہوم موجود۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸ : ۴) "اور بے شک آپ عظیم اخلاق کے نہایت ہی بلند مرتبے پر ہیں"۔ اور ان اخلاق عالیہ کی ایک دوسری تصویر بھی خود ابن اسحاق نے نقل کی ہے۔ کہتے ہیں روایت بیان کی یزید ابن اسحاق نے' محمد ابن کعب قرظی سے' انہوں نے کہا مجھے یہ بتایا گیا کہ عتبہ ابن ربیعہ ایک سردار تھا۔ یہ ایک دن قریش کی ایک محفل میں بیٹھا ہوا تھا' اس نے تجویز پیش کی' جبکہ حضور اکرم مسجد نبوی میں اکیلے بیٹھے ہوئے تھے 'کیا مناسب نہیں ہے کہ میں محمد ﷺ سے بات کروں اور ان کے سامنے کچھ باتیں رکھوں شاید وہ اسے قبول کر لیں۔ اس طرح کہ ان کے جو مطالبات ہوں ہم انہیں دے دیں اور وہ ہمارے خداؤں سے باز آجائیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت حمزہ اسلام قبول کر چکے تھے اور قریش نے دیکھ لیا تھا کہ حضورﷺ کے حامیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا: ابوالولید جاؤ اور ان سے بات کرو' عتبہ اٹھا اور آیا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے کہا بھتیجے! ہمارے اندر تمہاری جو حیثیت ہے' وہ تم جانتے ہو۔ تمہارا ابت اونچا درجہ ہے اور تمہارا نسب بھی بہت اونچا ہے اور تم نے اپنی قوم کو ایک بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ جماعت کے اندر تفریق پیدا ہو گئی ہے۔ تم نے ہمارے نظریات کا مذاق اڑایا ہے' ہمارے دین

اور الهوں پر تنقید کی ہے اور تم نے ہمارے آباؤ اجداد کو کافر کہا۔ تم میری بات سنو۔ میں تمہارے سامنے کچھ تجاویز پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم ان پر غور کرو گے ۔ شاید ان میں سے بعض کو تم منظور کر لو۔ کہتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا "ابوالولید کہو ۔ میں سنتا ہوں"۔ اس نے کہا: "بھتیجے! تم جو دین پیش کرتے ہو اگر اس سے تمہارا مقصد بہت زیادہ مال جمع کرنا ہے' تو ہم تمہارے لیے اس قدر مال جمع کرتے ہیں کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ گے ۔ اور اگر تم اونچا مقام چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا سردار بناتے ہیں' ہم تمہارے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں گے ۔ اگر تم بادشاہت چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں۔ اور اگر تم پر کوئی دورہ پڑتا ہے جس کا دفعیہ تم نہیں کر سکتے تو ہم تمہارے علاج کا انتظام کرتے ہیں۔ اس پر ہم سے جو ہو سکا' خرچ کریں گے یہاں تک کہ تم تندرست ہو جاؤ۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ انسان کے ساتھ کوئی چیز لگ جاتی ہے اور اس کو اس کا علاج کرنا پڑتا ہے" یہ اور ایسی اور باتیں جو اس نے کیں ۔ عتبہ ان باتوں سے فارغ ہوا اور رسول اللہ یہ باتیں سنتے رہے ۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا ابوالولید تم کہہ چکے؟ اس نے کہا: "ہاں"۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا اب میری بات سنو۔ اس نے کہا: ہاں "کہو"۔ اس پر حضور ﷺ نے پڑھنا شروع کیا:

حٰمٓ (۱) تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۲) كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۳) بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (٤) وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ (٥) قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ (٦) (٤١ : ١ تا ٦) "ح م ۔ یہ خدائے رحمن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے' ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں ۔ عربی زبان کا قرآن' ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں' بشارت دینے والا اور ڈرانے والا مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے ۔ کہتے ہیں "جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں' ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا ہے تو اپنا کام کر ہم اپنا کام کیے جائیں گے"۔۔۔ اے نبی ان سے کہو' میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا ۔ مجھے وحی کے ذریعہ بتایا جاتا ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے' لہذا تم سیدھے اسی کا رخ اختیار کرو ۔ اور اس سے معافی چاہو ۔ تباہی ہے مشرکوں کے لیے ..."

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بعد بھی سورہ حم سجدہ پڑھتے رہے ۔ جب عتبہ نے اسے سنا تو خاموش ہو گیا اور اپنے ہاتھ پشت کے پیچھے زمین پر لگا کر ٹیک لی اور سنتا رہا ۔ اب رسول اللہ ﷺ سجدہ تک پہنچ گئے اور آپ نے سجدہ کیا ۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا ابوالولید تم نے سنا جو سنا بس یہ ہے جواب تم جانو اور تمہارا کام"۔ عتبہ اپنے ساتھیوں کے پاس گیا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا: ہم خدا کی قسم اٹھا کر کہتے ہیں کہ یہ شخص جو چہرہ لے کر گیا تھا اس کے ساتھ واپس نہیں

آیا۔ جب یہ جا کر ان کی محفل میں بیٹھا تو انہوں نے پوچھا ابوالولید کیا خبر لائے ہو؟ تو اس نے کہا خبر یہ ہے کہ میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے خدا کی قسم میں نے ایسا کوئی کلام کبھی نہیں سنا۔ یہ نہ تو شعر ہے نہ جادو ہے' نہ کہانت ہے۔ اے آل قریش میری بات مانو اور میں اس کا ذمہ دار ہوں' یہ شخص جو کچھ کرنا چاہتا ہے اسے کرنے دو اور اس کی راہ نہ روکو۔ اس کو الگ چھوڑ دو' خدا کی قسم اس کی جو بات میں نے سنی ہے اس کی شہ سرخی لگنے والی ہے۔ اگر اس کو عربوں نے ختم کر دیا تو تمہارا کام وہ کر دیں گے اور تمہیں اسے مارنے کی ضرورت نہ ہوگی اور اگر یہ عربوں پر غالب آگیا تو اس کی حکومت تمہاری حکومت ہوگی اور اس کی عزت تمہاری عزت ہوگی۔ اور تم اس کی وجہ سے نہایت ہی نیک بخت ہو گئے' انہوں نے کہا ابوالولید خدا کی قسم اس نے اپنی زبان سے تمہیں مسحور کر دیا۔ اس نے کہا: اس کے بارے میں یہ میری حقیقی رائے ہے۔ اب تمہاری مرضی ہے جو چاہو کرتے رہو۔

دوسری روایات میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ عتبہ کو کلام الٰہی سناتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچے۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُکُمْ صٰعِقَۃً مِّثْلَ صٰعِقَۃِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (۴۱ : ۱۳) "اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اس طرح کے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا کہ عاد و ثمود پر نازل ہوا تھا" تو ابوالولید خوفزدہ ہو کر اٹھا اور آپ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگا: "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں تمہیں خدا کا اور رحم کا واسطہ دیتا ہوں"۔ یہ اس ڈر کی وجہ سے کہ کہیں فی الواقع یہ عذاب نازل نہ ہو جائے۔ اس کے بعد وہ قوم کے پاس گیا اور ان سے وہ بات کہی جس کا اوپر تذکرہ ہوا۔

بہرحال یہ قریش کی طرف سے سودے بازی کی دوسری کوشش تھی۔ یہ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلق عظیم کی ایک تصویر ہے۔ اس سے آپ کے آداب اچھی طرح معلوم ہوتے ہیں کہ آپ عتبہ کی بات نہایت تحمل سے سنتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ فارغ ہو جاتا ہے حالانکہ اس کی باتیں نہایت بے معنی ہیں۔ ان باتوں کا تعلق صرف اس زمین سے ہے۔ لیکن آپ کے اخلاق کریمانہ تھے کہ آپ نہ اس کی بات کاٹتے ہیں نہ جلدی کرتے ہیں اور نہ غصے میں آتے ہیں اور نہ اس کو جھڑکتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ شخص اپنی بیہودہ باتوں سے فارغ ہو جاتا ہے اور آپ پوری توجہ سے سنتے ہیں۔ اس کے بعد آپ نہایت نرمی سے پوچھتے ہیں۔ ابوالولید آپ کی بات ختم ہوئی' اور یہ تاکید مزید کے لیے کہ وہ یہ نہ کہے کہ میری بات رہتی ہے۔ یہ ہے سچا اطمینان' اور حقیقی ادب کہ آپ پوری پوری بات سنتے ہیں۔ یہ بھی آپ کے خلق عظیم کا ایک پہلو ہے۔ بیہودہ باتیں بھی تحمل سے سنتے ہیں۔

اور ایک تیسری سودابازی بھی مروی ہے۔ ابن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ اسود ابن المطلب ابن اسد ابن عبدالعزی' ولید ابن مغیرہ' امیہ ابن خلف اور عاص ابن وائل سہمی نے آپ کو روکا اور یہ لوگ اپنے قبائل میں نہایت ہی معتبر لوگ تھے۔ انہوں نے کہا: "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم اس کی عبادت کرتے ہیں جس کی تم کرتے ہو' اور تم ان الہوں کی عبادت کرو جن کی ہم کرتے ہیں۔ ہم اور تم شریک ہو جائیں گے۔ اگر جس خدا کی تم عبادت کرتے ہو وہ اچھا ہوا تو ہمارا بھی اس میں حصہ ہوگا اور ہم جن کی عبادت کرتے ہیں اگر وہ اچھے ہوئے تو تم نے بھی اپنا حصہ اس بھلائی سے لیا ہوگا۔ ان کے بارے میں اللہ نے یہ سورت نازل کی۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (١) لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (١٠٩ : ٢) "اے کافرو! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم کرتے ہو"۔ اس سودا بازی کو دو ٹوک انداز میں ختم کر دیا گیا۔ اور رسول اللہ نے ان کو یہ سورت سنا دی جس طرح اللہ کا حکم تھا۔

اب رسول اللہ کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک متعین شخص بڑا چرب زبان ہے 'اس کی کسی بات کو تسلیم نہ کریں ۔ یہاں قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں اس کا نام نہیں لیا' لیکن اس کی تمام گھٹیا صفات کو گنوا دیا گیا' جو اس شخص کے اندر پائی جاتی تھیں ۔ اس شخص کو نہایت ذلت اور حقارت کے ساتھ دھمکی دی جاتی ہے :

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ (١٠) هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ (١١) مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (١٢) عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ (١٣) اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ (١٤) اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (١٥) سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ (١٦) (٦٨ : ١٠ تا ١٦) "ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا بے وقعت آدمی ہے' طعنے دیتا ہے' چغلیں کھاتا پھرتا ہے' بھلائی سے روکتا ہے' ظلم و زیادتی میں حد سے گزر جانے والا ہے' سخت بداعمال ہے' جفاکار ہے اور ان سب عیوب کے ساتھ بداصل بھی ہے' اس بنا پر کہ وہ بہت مال اور اولاد رکھتا ہے۔ جب ہماری آیات اس کو سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلے وقتوں کے افسانے ہیں۔ عنقریب ہم اس کی سونڈ پر داغ لگائیں گے"۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ ولید ابن مغیرہ ہے' اور اسی کے بارے میں سورہ مدثر کی یہ آیات بھی نازل ہوئیں :

ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا (١١) وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا (١٢) وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا (١٣) وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا (١٤) ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ (١٥) كَلَّا اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا (١٦) سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا (١٧) اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ (١٨) فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (١٩) ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (٢٠) ثُمَّ نَظَرَ (٢١) ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ (٢٢) ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ (٢٣) فَقَالَ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ (٢٤) اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (٢٥) سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ (٢٦) (٧٤ : ١١ تا ٢٦) "چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا' بہت سا مال اس کو دیا' اس کے ساتھ حاضر رہنے والے بیٹے اس کو دیئے' اور اس کے لیے ریاست کی راہ ہموار کی' پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔ ہرگز نہیں' وہ ہماری آیات سے عناد رکھتا ہے۔ میں تو اسے عنقریب ایک کٹھن چڑھائی چڑھواؤں گا۔ اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی تو خدا کی مار اس پر' کیسی بات بنانے

کی کوشش کی ـ ہاں ' خدا کی مار اس پر ' کیسی بات بنانے کی کوشش کی ـ پھر لوگوں کی طرف دیکھا ـ پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا ـ پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا ـ آخر کار بولا یہ کچھ نہیں 'مگر ایک جادو' جو پہلے سے چلا آرہا ہے ـ یہ تو ایک انسانی کلام ہے ـ عنقریب میں اسے دوزخ میں جھونک دوں گا"ـ

اس شخص کے بارے میں بہت سی روایات میں آتا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ہر وقت سازشوں میں لگا رہتا تھا ـ آپ کے ساتھیوں کو ڈراتا تھا ـ دعوت اسلامی کی راہ روکتا تھا ـ اور رات دن لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتا تھا ـ نیز بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ سورہ **القلم کی آیات اخنس ابن شریق اور ولید بن مغیرہ کے بارے میں ہیں**ـ یہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے سخت مخالف تھے ـ یہ ہر وقت آپؐ سے بر سرپیکار رہتے تھے ـ اور لوگوں کو آپ کے خلاف اکساتے تھے ـ

یہ سخت تہدیدی جملہ اس سورت میں اور دوسری سورتوں میں جو اس دور میں نازل ہوئیں ' اس بات کا ثبوت ہے کہ اس دور میں حالات بہت شدید تھے اور یہ شخص جو مسلمانوں اور تحریک اسلامی کے خلاف سرگرم تھا ' خواہ ولید تھا یا اخنس تھا (پہلا قول راجح ہے ) تحریک اسلامی کی راہ روکنے میں اس کا بہت بڑا دخل تھا ـ نیز ان تنقیدی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بہت بدفطرت شخص تھا اور اس کے نفس میں بھلائی کی کوئی رمق نہ تھی ـ

یہ کس قسم کا آدمی تھا ' قرآن نے اس کی ۹ صفات بیان کی ہیں اور سب کی سب مذموم صفات ہیں :

۱ـ حلّاف ( ٦٨ : ١٠ ) (بہت قسمیں کھانے والا ) زیادہ قسمیں وہی اٹھاتا ہے جو سچا نہیں ہوتا ' اس کے شعور میں یہ بات ہوتی ہے کہ لوگ اس پر اعتماد نہیں کرتے اور اسے جھوٹا سمجھتے ہیں ـ یہ شخص قسمیں اٹھاتا ہے اور بہت زیادہ قسمیں اٹھا کر اپنے جھوٹ کو چھپاتا ہے اور اس طرح لوگوں کا اعتماد حاصل کرتا ہے ـ

۲ـ مَّهِين ( ٦٨ : ١٠ ) (بے وقعت ) اپنی نظروں میں خود ہلکا ' لوگوں کی نظروں میں ناقابل اعتبار ـ زیادہ قسمیں اٹھانے کی ضرورت ہی اسے اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ ہلکا ہے ـ خود اسے اپنے اوپر اعتماد نہیں ـ نہ لوگوں کو ہے ـ اگرچہ بظاہر وہ دولتمند ہے ' جتھے دار ہے ـ لہٰذا ایک بادشاہ ' ایک مالدار اور ایک قوی اور جبار شخص بھی ہلکا ہو سکتا ہے ـ اس لیے کہ اہانت اور عزت دونوں نفسیاتی صفات ہیں ـ یہ کبھی انسانی شخصیت سے دور نہیں ہوتیں ـ ایک شریف انسان باوزن ہوتا ہے ـ اگرچہ دنیا کے دوسرے پہلوؤں سے وہ کوئی بڑا آدمی نہ ہو ـ

۳ـ هَمَّاز ( ٦٨ : ١١ ) (طعنے دینے والا ) یہ شخص اقوال و اشارات سے لوگوں کے عیب بیان کرتا ہے ' ان کے سامنے بھی اور ان کے پس پشت بھی ـ ایسے شخص کو اسلام بہت برا خیال کرتا ہے جو لوگوں کے عیب نکالتا ہے ـ یہ بات مروت کے خلاف ہے ـ اعلیٰ آداب کے بھی خلاف ہے ' نیز لوگوں کے ساتھ برتاؤ ' لوگوں کے اکرام کے خلاف ہے ' خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں ـ اس صفت کو قرآن کریم نے متعدد مقامات میں لیا ہے ـ اور اس کی سخت ممانعت کی ہے ـ

ایک جگہ کہا گیا ـ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ( ١٠٤ : ١ ) "تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو لوگوں پر طعن کرے اور برائیاں کرنے کا خوگر ہو" ـ اور دوسری جگہ ہے ـ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا

نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا

بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ (۴۹ : ۱۱) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو' ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے"۔ یہ سب بدخوئی اور چغل خوری کی اقسام ہیں۔

۴۔ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ (۶۸ : ۱۱) (چغلیاں کھاتا پھرتا ہے) وہ لوگوں کے درمیان ایسی باتیں پھیلاتا ہے جن سے ان کے دل میلے ہوں' تعلقات ختم ہوں' محبت ختم ہو' یہ ایک ذلیل حرکت ہے اور ہلکے لوگ ایسا کام کیا کرتے ہیں۔ کوئی خوددار شخص اس قسم کی حرکت کا ارتکاب نہیں کیا کرتا جو یہ توقع کرتا ہو کہ لوگ اسے اچھی نظروں سے دیکھیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ اس قسم کے شخص کی باتیں سنتے ہیں وہ بھی اسے اچھا نہیں سمجھتے۔ دل سے یہ لوگ بھی اسے برا سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ کاش یہ شخص یہ بری بات انہیں نہ بتاتا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس بات کو پسند نہ فرماتے تھے کہ آپ کو ایسی بات بتائی جائے جس سے آپ کا دل اپنے کسی صحابی سے خفا ہو۔ آپ فرماتے "کوئی شخص مجھے میرے ساتھی کی ایسی بات نہ بتائے کیونکہ میں پسند کرتا ہوں کہ میں تمہارے پاس نکلوں اور میرا دل تمہارے بارے میں صاف ہو"۔ (ابوداؤد وغیرہ)

صحیحین میں ہے "رسول اللہ ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے اور فرمایا یہ دونوں عذاب میں مبتلا ہیں' اور یہ کسی بڑے جرم میں سزاوار نہیں ہیں۔ ایک تو اس لیے کہ یہ پیشاب سے اپنے آپ کو بچاتا نہ تھا اور دوسرا چغل خور تھا"۔

امام احمد نے حضرت حذیفہ کی یہ حدیث نقل کی ہے "جنت میں چغلی کھانے والا داخل نہ ہو گا"۔ (ابن ماجہ)

امام احمد نے بریدہ ابن الحکم کی روایت نقل کی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا بتاؤں میں کہ تم میں سے اچھا کون ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ! "وہ لوگ جب ان کو دیکھا جائے تو خدا یاد آ جائے"۔ پھر فرمایا کہ بتاؤں کہ برے لوگ کون ہیں؟ "وہ جو چغلی کھاتے ہیں' جو دوستوں کے درمیان دشمنی پیدا کرتے ہیں جو پاک دامن لوگوں میں 'عیب تلاش کرتے ہیں"۔

اسلام کے لیے اس قسم کی بری خصلت کی مذمت بہت ضروری تھی' کیونکہ یہ خصلت نہایت مذموم' گری ہوئی اور سوسائٹی میں فساد ڈالنے والی ہے' جس طرح دوستوں میں فساد پیدا کرتی ہے اور اس قسم کے شخص کو ننگا کرنا ضروری تھا' قبل اس کے کہ وہ اسلامی سوسائٹی کے اندر فساد پیدا کر دے' لوگوں کے دلوں کو ایک دوسرے سے بھر دے' اور قبل اس سے کہ وہ سوسائٹی کی سلامتی کو نقصان پہنچائے۔ ایسے لوگ اکثر اوقات بے گناہ لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

۵۔ مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ (۶۸ : ۱۲) (بھلائی سے روکنے والا) یعنی وہ بھلائی سے اپنے آپ کو بھی محروم کرتا ہے اور دوسروں کو بھی۔ یہ شخص لوگوں کو ایمان سے روکتا تھا' حالانکہ ایمان بھلائی کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ اس شخص کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ شخص اپنی اولاد اور اہل خاندان سے کہا کرتا تھا: "اگر تم میں سے کسی نے دین محمد کو قبول کیا تو میں اسے کبھی بھی کوئی نفع نہ پہنچاؤں گا"۔ جس کے بارے میں اسے شک ہوتا کہ وہ دین اسلام کی طرف مائل ہے۔ یوں ان کو وہ اس طرح دھمکی دے کر ڈراتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس کی اس حرکت کو بھی ریکارڈ کر دیا کہ وہ بھلائی سے روکنے والا ہے۔

۶۔ مُعْتَدٍ (۶۸ : ۱۲) (ظلم و زیادتی میں حد سے گزرنے والا ہے) حق اور عدل سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر یہ شخص تعدی کرتا' مسلمانوں پر ظلم کرتا' اپنے خاندان والوں پر ظلم کرتا' اور ان کو ہدایت اور دین حق سے روکتا۔ کسی پر ظلم کرنا بہت ہی بری حرکت ہے اور قرآن و سنت میں اس کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ اسلام ظلم کی ہر صورت کی بیخ کنی چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ کھانے اور پینے میں بھی۔

كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَلَا تَطْغَوْا "جو رزق ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور حد سے نہ گزرو"۔ عدل اور اعتدال اسلام کا بنیادی اصول اور اسلام کی نشانی ہے۔

۷۔ أَثِيمٍ (۶۸ : ۱۲) (بداعمال ہے) وہ برے اعمال کا ارتکاب کرتا ہے گویا اثم کی صفت اس کے ساتھ لازم ہوگئی ہے۔ پس یہ گناہگار ہے' اور ہر قسم کے معاصی کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہ صفت اس کے ساتھ لازم ہے۔ گویا اس کا مزاج ہی ایسا ہے کہ ہر برائی کا ارتکاب کرے۔

۸۔ عُتُلٍّ (۶۸ : ۱۳) (جفاکار) یہ ایک لفظ ہے جو اپنے تلفظ اور مفہوم کی رنگارنگی کی وجہ سے کئی معانی دیتا ہے' یہ ایک ایسا جامع مفہوم دیتا ہے کہ کئی الفاظ اس کو ادا نہیں کر سکتے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عتل کے معنی سخت اور خشک کے ہیں' یعنی ظالم۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ بہت کھانے اور پینے والا ہے۔ اور سخت وحشی اور روکنے والا ہے' اپنی مذموم طبیعت میں بیگانہ ہے۔ معاملات میں برا ہے۔

حضرت ابوالدرداء سے روایت ہے "عتل' بڑے پیٹ والا' کج خلق' بہت کھانے والا' بہت پینے والا' دولت جمع کرنے والا' اور بخیل و کنجوس ہوتا ہے"۔ لیکن لفظ عتل میں یہ سب مفہوم اس کی کرخت آواز ہی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ یعنی وہ شخص جو مکارم اخلاق کے ہر پہلو سے کریہہ المنظر ہو۔

۹۔ زَنِيْمٍ (۶۸ : ۱۳) "بے اصل" یہ اخلاق ذمیمہ کا خاتمہ ہے۔ یہ اسلام کے دشمنوں میں سے ایک دشمن کی صفات ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے دشمن ایسے ہی مکروہ لوگ ہو سکتے ہیں۔ زنیم اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی قوم کے ساتھ لاحق ہو گیا ہو اور وہ دراصل ان میں سے نہ ہو' یا یہ کہ ان میں اس کی نسب مشکوک ہو اور اس کے مفاہیم میں یہ بھی ہے کہ جو شخص لوگوں میں خباثت' ذلت اور شرارتوں میں بہت ہی مشہور ہو' اسے بھی زنیم کہا جاتا

ہے۔ دوسرا مفہوم زیادہ قریب ہے اور ولید ابن مغیرہ پر زیادہ فٹ آتا ہے۔ اگرچہ اس لفظ کا اطلاق اس پر ایسی صفت چسپاں کرتا ہے کہ قوم میں وہ ہلکا ہو جبکہ وہ زیادہ فخر کرنے والا اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والا ہو۔

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ ان ذاتی صفات کے علاوہ اس نے دین اسلام کے خلاف یہ موقف جو اختیار کر رکھا ہے یہ اس لیے ہے کہ اللہ نے اس کو مال و دولت اور اولاد دی ہے۔

اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِيْنَ(١٤) اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ

الْاَوَّلِيْنَ(١٥)(٦٨: ١٤ — ١٥) "اس بنا پر کہ وہ بہت مال اور اولاد رکھتا ہے"۔ جب ہماری آیات اس کو سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلے وقتوں کے افسانے ہیں۔ کیا ہی بری بات ہے کہ ایک انسان کو اللہ مال و دولت دے اور وہ اس کے بدلے میں 'اللہ کی آیات کے ساتھ استہزا کرے۔ اور اللہ کے رسول کے ساتھ مذاق کرے۔ اور اللہ کے دین پر دست درازی کرے۔ صرف یہی ایک صفت مذکورہ بالا تو صفات سے زیادہ بھاری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سخت توہین آمیز تہدید آتی ہے۔ یہ جبار و قہار کی تہدید ہے۔ یہ اپنے آپ کو بڑا اور طاقتور سمجھتا ہے۔ مال اور اولاد پر فخر کرتا ہے۔ اپنے مقام' مرتبے اور نسب اور شرارتوں پر فخر کرتا ہے۔ اگر یہ طاقتور ہے تو۔

سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ(٦٨: ١٦) "ہم اس کی اس سونڈ پر داغ لگائیں گے"۔ خرطوم کے معانی میں سے ایک یہ ہے کہ خرطوم خنزیر کی ناک کے کنارے کو کہتے ہیں۔ شاید یہی یہاں مراد ہے اور عربی میں انف عزت کو کہا جاتا ہے۔ اونچی ناک والا۔ اور رغم الانف ناک کا خاک آلودہ ہونا ذلت کے معنی میں آتا ہے۔ کہا جاتا ہے ورم انفہ 'حمی انفہ' یعنی غضبناک ہوا اس سے الانفہ (عزت نفس) ہے۔ خرطوم پر داغ لگانے کے معنی ہیں اسے ذلیل کیا جائے گا۔ ایک تو اس پر داغ لگا دیا جائے گا جس طرح غلاموں پر داغ لگائے جاتے تھے اور دوسرے یوں کہ اس کی ناک کو خنزیر کی ناک کی طرح بنایا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ولید پر یہ آیات بم کی طرح آکر گریں ہوں گی کیونکہ وہ ایک ایسی قوم سے تھا جس میں شاعروں کی ہجو سے بھی' شریف لوگ بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن یہاں تو خالق سموات نے اس پر ایسی سنگباری کی اور اس انداز سے کی جس کی مثال نہیں ہے۔ اور پھر اس ہجو کو ایک ایسے نوشتے میں ریکارڈ کر دیا گیا' جس کے ایک ایک لفظ کو اس پوری کائنات میں پڑھا اور تلاوت کیا جاتا ہے اور یہ اس پوری کائنات میں قرار پکڑتا ہے اور اسے دوام نصیب ہوتا ہے۔

یہ تھی رب ذوالجلال کی طرف سے سنگباری' اس ذلیل شخص پر جو اس کے دین کا دشمن تھا' جو رسول کریم کا دشمن تھا۔ وہ رسول کریم جو خلق عظیم کے مالک تھے اور یہ دشمن اسلام جو بھی ہو' وہ اس کا مستحق تھا۔

مال اور اولاد کے اشارے کی مناسبت سے اور تکذیب کرنے والوں کی سرکشی اور دست درازیوں کے حوالے سے ایک ایسی کہانی کی طرف یہاں اشارہ کیا جاتا ہے جو ان کے ہاں معروف تھی۔ اور عوام کے اندر اس کا بہت چرچا تھا۔ نعمت خداوندی پر ناشکری کی سزا سے اللہ خبردار کرتا ہے۔ جو لوگ دوسروں کے حقوق ادا نہیں کرتے' بھلائی سے منع کرتے ہیں۔

مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ (۶۸ : ۱۲) میں ان کو خبردار کیا جاتا ہے کہ یہ مال و اولاد تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بھی ایک آزمائش ہے جس طرح باغ والے آزمائش میں تھے۔ ہر چیز کا ایک انجام ہے اور ہر کوئی ایک حالت میں نہیں ہوتا۔

إِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ أَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ إِذْ أَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا
مُصْبِحِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ
نَآئِمُوْنَ ﴿۱۹﴾ فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ﴿۲۰﴾ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ أَنِ اغْدُوْا عَلٰى
حَرْثِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ﴿۲۳﴾ أَنْ لَّا
يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ﴿۲۴﴾ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ فَلَمَّا
رَأَوْهَا قَالُوْٓا إِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴿۲۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ أَوْسَطُهُمْ
أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ إِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَأَقْبَلَ
بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ إِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰى رَبُّنَآ
۱ أَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ إِنَّآ إِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۚ وَلَعَذَابُ
۳۳ ع الْاٰخِرَةِ أَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾

۳ "ہم نے ان (اہل مکہ) کو اسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے جس طرح ایک باغ کے مالکوں کو آزمائش میں ڈالا تھا' جب انہوں نے قسم کھائی کہ صبح سویرے ضرور اپنے باغ کے پھل توڑیں گے اور وہ کوئی استثناء نہیں کر رہے تھے۔ رات کو وہ سوئے پڑے تھے کہ تمہارے رب کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر پھر گئی اور اس کا ایسا حال ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو۔ صبح ان لوگوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ اگر پھل توڑنے ہیں تو سویرے سویرے اپنی کھیتی کی طرف نکل چلو۔ چنانچہ وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے کہ آج کوئی مسکین تمہارے پاس باغ میں نہ آنے پائے۔ وہ کچھ نہ دینے کا فیصلہ کیے ہوئے صبح سویرے جلدی جلدی اس طرح وہاں گئے جیسے کہ وہ (پھل منع کرنے پر) قادر ہیں۔ مگر جب باغ کو دیکھا تو کہنے لگے "ہم راستہ بھول گئے ہیں' ---- نہیں' بلکہ ہم محروم رہ گئے"۔ ان میں جو سب سے بہتر تھا اس نے کہا "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے؟" وہ پکار اٹھے "پاک ہے ہمارا رب' واقعی ہم گناہ گار تھے"۔ پھر ان میں سے ہر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگا۔ آخر کار انہوں نے کہا "افسوس ہمارے حال پر' بے شک ہم سرکش ہو گئے تھے۔ بعید نہیں کہ ہمارا رب ہمیں بدلے میں اس سے بہتر باغ عطا فرمائے' ہم اپنے رب کی طرف رجوع

کرتے ہیں" ۔ ایسا ہوتا ہے عذاب ۔ اور آخرت کا عذاب اس سے بڑا ہے 'کاش یہ لوگ اس کو جانتے" ۔

ہو سکتا ہے کہ یہ قصہ اہل مکہ کے درمیان معروف ہو ۔ لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ اس دنیا کے تمام کام دست قدرت میں ہیں ۔ اور یہاں کوئی خوشحال ہے یا بدحال ہے 'وہ اللہ کی آزمائش میں ہے ۔ اور یہی اس قصے سے یہاں مقصود و مطلوب ہے ۔

اس قصے کے کرداروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی پسماندہ قسم کے سادہ لوح لوگ ہیں ۔ جس طرح دیہات کے سادہ لوح باشندے ہوتے ہیں ۔ زیادہ گہرے افکار سے بہرہ ور نہیں ہوتے ۔ اور سیدھی سیدھی بات کرتے ہیں ۔ اس دور میں جب یہ آیات اتر رہی تھیں تو قرآن کے مخاطب اکثر ایسے ہی سادہ لوگ تھے ۔ جو اسلام سے دشمنی رکھتے تھے اور اسلام کا انکار کرتے تھے 'لیکن ان کے دماغ زیادہ پیچیدہ نہ تھے اور نہ فلسفیانہ افکار وہ رکھتے تھے ۔ اکثر لوگ سادہ لوح اور سیدھے تھے ۔

جہاں تک اس قصے کی طرز ادا کا تعلق ہے تو یہ قرآن کے انداز بیان کا ایک نمونہ ہے ۔ اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جو کسی قصے میں اچانک نمودار ہوتی ہیں اور پڑھنے اور معلوم کرنے کا شوق بڑھاتی ہیں اور اس میں انسانی تدابیر اور ان کے فیل ہونے کے مناظر بھی ہیں کہ انسان کس طرح اپنی طرف سے کوشش کرتا ہے مگر ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے ۔ اور یہ قصہ یوں بیان ہوتا ہے کہ گویا کردار ہمارے سامنے یہ سب کچھ کر رہے ہیں ۔ ذرا اسے دیکھئے خود قرآن کے الفاظ میں ۔

اب ہم باغ والوں کے سامنے ہیں ۔ یہ دنیا کی جنت ہے 'آخرت کی جنت نہیں ہے ۔ یہ اس باغ کے بارے میں رات فیصلہ کرتے ہیں 'بالعموم جب باغ توڑا جاتا ہے تو ہر معاشرہ میں مساکین بھی اس دن حاضر ہوتے ہیں اور وہ بھی پیداوار میں سے اپنا حصہ پاتے ہیں ۔ اور اس باغ کے سلسلے میں بھی یہی معمول تھا ۔ لیکن اس باغ کے وراثت میں پانے والے موجودہ مالکان نے 'یہ اسکیم بنائی ہے کہ مساکین کو محروم کر دیا جائے ۔ واقعات یوں آگے بڑھتے ہیں ۔

إِنَّا بَلَوْنَٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ أَصْحَٰبَ ٱلْجَنَّةِ إِذْ أَقْسَمُوا۟ لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ (١٧) وَلَا يَسْتَثْنُونَ (١٨) (٦٨: ١٧ – ١٨) "ہم نے ان (اہل مکہ) کو اسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے جس طرح ایک باغ کے مالکوں کو آزمائش میں ڈالا تھا 'جب انہوں نے قسم کھائی کہ صبح سویرے ضرور اپنے باغ کے پھل توڑیں گے اور وہ کوئی استثناء نہیں کر رہے تھے" ۔ انہوں نے یہ طے کیا کہ صبح تڑکے باغ کا پھل توڑ لائیں لیکن اس قرارداد کے بعد انہوں نے انشاء اللہ نہ کہا ۔ یا یہ نہ طے کیا کہ مساکین کے لیے بھی کچھ چھوڑیں گے اور اس پر انہوں نے قسم بھی اٹھائی کہ ایسا ضرور کریں گے اور اس امر کا فیصلہ کر لیا ۔ اور رات کو انہوں نے یہ شریر فیصلہ کیا ۔ انہوں نے جو سازش کی یہ انہی کے دلوں میں رہی اور ان کو پتہ ہی نہ چلا کہ رات کی تاریکی میں باغ کے ساتھ کیا ہوتا ہے ۔ اس کا انہیں تصور بھی نہ تھا ۔ یہ تو سو گئے لیکن اللہ تو نہیں سوتا ۔ اللہ نے وہ کام کیا جو ان کی تدبیر کے برعکس تھا ۔ اور یہ بطور سزا ہوا کہ انہوں نے نعمت کا شکر ادا کرنے کے بجائے سرکشی کی اور مساکین اور فقراء کا حصہ کاٹنے کا فیصلہ کیا حالانکہ وہ پہلے سے چلا آ رہا تھا ۔ یہ اک اچانک آفت ہے جو اس مرحلے پر سامنے آتی ہے ۔ رات کی تاریکی میں دست قدرت کے بھیجے ہوئے کچھ سائے حرکت میں آتے ہیں ۔ لوگ سوئے ہوئے ہیں ۔

فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ(۱۹) فَاَصْبَحَتْ

كَالصَّرِيْمِ(۲۰) (۶۸ : ۱۹ — ۲۰) "رات کو وہ سوئے پڑے تھے کہ تمہارے رب کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر پھر گئی اور اس کا ایسا حال ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو"۔ یعنی اس بلا نے رات کو اس کے تمام پھل ختم کر دیئے۔ لیکن اس باغ کا منظر اب نظروں سے ہٹا لیجئے ...... اب ان لوگوں کا منظر سامنے آتا ہے جنہوں نے رات کو تدبیر کی تھی اور خفیہ فیصلہ کیا تھا۔ یہ لوگ صبح سویرے ایک دوسرے پر آوازیں بھی دے رہے ہیں تاکہ وہ اپنے منصوبے پر عمل کریں۔

فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ(۶۸ : ۲۱) اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

صٰرِمِيْنَ(۶۸ : ۲۲) (۶۸ : ۲۱ — ۲۲) "صبح سویرے انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ اگر پھل توڑنے ہیں تو سویرے سویرے اپنی کھیتی کی طرف نکل چلو"۔ صبح وہ ایک دوسرے کو اٹھاتے جگاتے ہیں اور رات کے فیصلے کو یاد دلاتے ہیں اور چپکے چپکے یہ عمل ہو رہا ہے۔ اس کے بعد سیاق کلام میں ان کے ساتھ ایک مذاق بھی ہوتا ہے۔ ان کے اٹھنے اٹھانے، چلنے اور باہم گفتگو کی تصویر خوب کھینچی جاتی ہے۔ یہ نہایت دھیمی آواز سے بات کرتے ہیں تاکہ ان کی تدبیر پوری طرح کامیاب ہو، تاکہ پورا پھل توڑ لیں اور مساکین کو پوری طرح محروم کر دیں۔

فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ(۲۳) اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ(۲۴)

(۶۸ : ۲۳ — ۲۴) "چنانچہ وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے کہ آج کوئی مسکین تمہارے پاس باغ میں نہ آنے پائے"۔ اب حالت یہ ہے کہ ہم جو قرآن پڑھ رہے ہیں ہمیں تو معلوم ہے کہ آگے کیا آ رہا ہے لیکن ان بیچاروں کو تو پتہ نہیں ہے کہ آگے وہ کیا دیکھنے جا رہے ہیں۔ ہم نے تو یہ منظر دیکھ لیا ہے کہ رات کو دست قدرت اپنا کام کر گیا ہے۔ باغ میں تو اب کچھ نہیں توڑنے کے لیے۔ باغ یوں ہے کہ گویا کسی نے اس کے تمام پھل توڑ لیے ہوں اور وہاں کچھ بھی باقی نہ ہو۔ اور خفیہ ہاتھ نے یہ کام کر دیا۔ اب ہماری سانس رک رہی ہے کہ یہ لوگ کس صورت حال سے دوچار ہونے والے ہیں۔ ان کی تمام تدابیر ان پر الٹ گئی ہیں۔

سیاق کلام مزید مذاق کر رہا ہے ان لوگوں کے ساتھ۔

وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ(۶۸ : ۲۵) "وہ کچھ نہ دینے کا فیصلہ کیے ہوئے صبح سویرے جلدی جلدی اس طرح وہاں گئے جیسے وہ پھل کو منع کرنے پر قادر ہیں"۔ وہ اس ارادے سے چلے کہ وہ مساکین سے پھل روکنے اور انہیں منع کرنے پر قادر ہیں۔ اب پہلی مرتبہ وہ ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں جس کی توقع وہ نہ کرتے تھے۔ اب مزاح کی جگہ سنجیدگی آ جاتی ہے۔

فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ(۶۸ : ۲۶) "مگر جب باغ کو دیکھا تو کہنے لگے "ہم راستہ بھول

گئے ہیں"۔ یہ تو ہمارا باغ ہی نظر نہیں آتا۔ ہمارا باغ تو پھل سے لدا تھا۔ شاید ہم راستہ بھول کر کسی دوسری جگہ آ گئے ہیں۔ لیکن جب معلوم ہوتا ہے کہ راستہ تو نہیں بھولے وہی معروف راستہ ہے جس سے آئے۔

بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ (۲۷:٦٨) "نہیں بلکہ ہم محروم رہ گئے"۔ اور یہ ہے اصل حقیقت۔ اب سازش اور مکاری کے انجام نے انہیں گھیر لیا تھا۔ سرکشی اور دوسروں کے حقوق مارنے کا انجام انہوں نے دیکھا۔ اب ان میں سے معتدل، عقلمند اور صالح آدمی یہ تبصرہ کرتا ہے :

معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ لوگ اس حرکت کا فیصلہ کر رہے تھے تو اس نے ان کو غریبوں کی اس حق تلفی سے منع کیا تھا۔ اس نے چونکہ اپنی رائے پر اصرار نہ کیا تھا اس لیے اسے بھی دوسروں کے ساتھ نقصان میں شریک ہونا پڑا۔ لیکن وہ انہیں یاد دلاتا ہے کہ تم نے میری بات نہ سنی۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یَّتَلَاوَمُوْنَ (۳۰:٦٨) "پھر ان میں سے ہر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگا"۔ لیکن آخر کار وہ جان لیتے ہیں کہ سب کی غلطی ہے، اب نادم ہوتے ہیں۔ اور توبہ کے بعد امید کرتے ہیں کہ شاید اللہ ان کو یہ باغ دوبارہ عطا کر دے۔ دوبارہ اسے باردار کر دے کیونکہ اب وہ مساکین کے خلاف سازش اور بخل سے باز آنے کا عزم کر چکے ہیں۔

قَالُوْا یٰوَیْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا طٰغِیْنَ (۳۱) عَسٰى رَبُّنَاۤ اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْهَاۤ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ (۳۲) (۳۱:٦٨ - ۳۲) "آخر کار انہوں نے کہا "افسوس ہمارے حال پر، بے شک ہم سرکش ہو گئے تھے۔ بعید نہیں کہ ہمارا رب ہمیں بدلے میں اس سے بہتر باغ عطا فرمائے، ہم اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں"۔ اور قبل اس کے کہ اس منظر پر سے پردہ گر جائے، ہم یہ نصیحت سنتے ہیں :

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (۳۳:٦٨) "ایسا ہوتا ہے عذاب اور آخرت کا عذاب اس سے بڑا ہے۔ کاش یہ لوگ اس کو جانتے"۔ یوں ہوتی ہے نعمتوں میں بھی آزمائش۔ اس لیے اہل مکہ کو معلوم ہونا چاہئے۔

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَاۤ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ (۱۷:٦٨) "ہم نے ان کو اسی طرح آزمائش میں ڈال دیا ہے جس طرح باغ والوں کو آزمایا تھا"۔ لہٰذا ان کو دیکھنا چاہئے کہ ان کی بھلائی کس میں ہے۔ اور یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ دنیا کی آزمائش اور عذاب تو مختصر ہوتا ہے۔ اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (۳۳:٦٨) "لیکن آخرت کا عذاب اس سے بہت بڑا ہے، کاش یہ لوگ جانتے"۔

یوں قریش کے سامنے خود ان کے بدوی معاشرے کا ایک مشہور واقعہ رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ بتایا جاتا ہے کہ یہ پرانا واقعہ پھر دہرایا جا سکتا ہے۔ ان کو چاہئے کہ اپنی دولت کو دین اسلام پر ظلم کے لیے استعمال نہ کریں۔ ورنہ اللہ اس کو ضائع کر سکتا ہے۔ اور اہل ایمان کو یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ کبراء قریش کو جو مال و دولت اور جاہ و مرتبہ دیا گیا ہے اور وہ اسے غلط استعمال کر رہے ہیں' یہ سخت آزمائش میں ہیں۔ بہت جلد نتائج سامنے آجائیں گے۔ اور اگر یہ باز آجائیں تو ان کے لیے بہتر ہے 'کاش کہ وہ ہوش کے ناخن لیتے۔

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۶۸:۳۳) "لیکن آخرت کا عذاب اس سے بہت بڑا ہے 'کاش یہ لوگ جانتے"۔ رہے وہ لوگ جو ڈرنے والے ہیں اور چوکنے ہیں تو ان کے لیے درجات ہیں۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۳۴﴾

"یقیناً خدا ترس لوگوں کے لیے ان کے رب کے ہاں نعمت بھری جنتیں ہیں"۔

یہ ہے دونوں کے انجام کا فرق۔ اور یہ ہے دونوں کے طرز عمل اور حقیقت کا فرق۔ دونوں کی راہ الگ ہے تو یقیناً دونوں کا انجام بھی الگ الگ ہو گا۔

اب اس کے بعد قرآن کریم ان کے ساتھ ایک ایسا مکالمہ کرتا ہے جو بالکل قابل فہم ہے اور سورت کے ماقبل کے مضامین نے اسے واضح کر دیا ہے۔ اور ان پر اب سوال پر سوال کیا جاتا ہے۔ ایسا سوال جس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ اس لیے وہ جواب نہیں دے سکتے۔ کیونکہ ان سوالات کا واحد جواب ہے جو کڑوا ہے۔ اس کے سوا یہ کوئی جواب نہیں دے سکتے اور آخرت میں ان کے لیے ایک خوفناک منظر ہے۔ اور دنیا میں ان کے ساتھ رب تعالیٰ کا اعلان جنگ ہے۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَكُمْ ٞ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿۳۸﴾ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۹﴾ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۴۱﴾ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۴۲﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۗ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ۗ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۗ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۴۵﴾ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ

الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ ﴿٤٧﴾

”فرمانبرداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے 'تم کیسے حکم لگاتے ہو؟ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم یہ پڑھتے ہو کہ تمہارے لیے ضرور وہاں وہی کچھ ہے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو؟ یا پھر کیا تمہارے لیے روز قیامت تک ہم پر کچھ عہد و پیمان ثابت ہیں کہ تمہیں وہی کچھ ملے گا جس کا تم حکم لگاؤ؟ ان سے پوچھو تم میں سے کون اس کا ضامن ہے؟ یا پھر ان کے ٹھہرائے ہوئے کچھ شریک ہیں (جنہوں نے اس کا ذمہ لیا ہو)؟ یہ بات ہے تو لائیں اپنے ان شریکوں کو اگر یہ سچے ہیں۔

جس روز سخت وقت آپڑے گا اور لوگوں کو سجدہ کرنے کے لیے بلایا جائے گا تو یہ لوگ سجدہ نہ کر سکیں گے 'ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی 'ذلت ان پر چھا رہی ہوگی۔ یہ جب صحیح و سالم تھے 'اس وقت انہیں سجدے کے لیے بلایا جاتا تھا (اور یہ انکار کرتے تھے)۔

پس اے نبیؐ 'تم اس کلام کے جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ ہم ایسے طریقہ سے ان کو بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ میں ان کی رسی دراز کر رہا ہوں' میری چال بڑی زبردست ہے۔ کیا تم ان سے کوئی اجر طلب کر رہے ہو کہ یہ اس چٹی کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہوں؟ کیا ان کے پاس غیب کا علم ہے جسے یہ لکھ رہے ہوں؟“

اس مکالمے اور تحدیات کے درمیان یہ دھمکی بھی آتی ہے کہ آخرت میں تو ان کے لیے عذاب ہے ہی لیکن دنیا میں بھی ان کے خلاف جنگ ہوگی۔ یوں مکالمے میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے اور چیلنج زور دار ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اہل مکہ کو چیلنج کے انداز میں کہا جاتا ہے۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ (٦٨ : ٣٥) ”کیا ہم فرمانبرداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں؟“ یہ سوال آیات سابقہ میں پائے جانے والے لوگوں کے حوالے سے ہے جو مجرم تھے اور اس کا جواب صرف ایک ہے کہ مسلمین مجرمین کی طرح نہیں ہو سکتے۔ مسلمین رب کے سامنے جھکنے والے ہیں۔ یہ کبھی بھی ان لوگوں کی طرح نہیں ہوا کرتے جو جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں' جن کی اوصاف آیات سابقہ میں بیان کر دی گئی ہیں اور جو اہل مکہ پر چسپاں ہوتی ہیں۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے۔ انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مجرموں اور مسلموں کا انجام ایک طرح کا نہ ہو۔ چنانچہ دوسرا سوال کیا جاتا ہے۔ یہ بھی سرزنش کا سوال ہے۔

مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (٦٨ : ٣٦) ”تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے' تم کیسے حکم لگاتے ہو“۔ یعنی آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے' تمہاری عقل کیوں کام نہیں کر رہی ہے۔ تم فیصلے کن دلائل پر کرتے ہو؟ آخر حسن و قبح کے پیمانے تمہارے ہاں کیا ہیں؟ کہ تمہارے میزان کے مطابق ایک مسلم اور مجرم برابر ہے --- اس سرزنش اور استنکاری سوالات کے بعد اب قرآن ان کے ساتھ مزاحیہ انداز اختیار کرتا ہے کہ یہ کسی سنجیدہ گفتگو کے قابل ہی نہیں۔

اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ (۳۷) اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ (۳۸) (۶۸: ۳۷

— ۳۸) "کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو کہ تمہارے لیے ضرور وہاں وہی کچھ ہے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو؟" یہ ان کے ساتھ ایک مذاق ہے کہ کس کتاب سے یہ علم لے کر آئے ہو' کیونکہ عقل و عدل کا کوئی معیار تمہارے اس فیصلے کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ تمہارے فیصلے کا خلاصہ تو یہ ہے کہ مسلموں اور مجرموں کا ایک ہی انجام ہے۔ پھر یہ عجیب مضحکہ خیز کتاب ہوگی جو تمہاری خواہشات اور تمہاری مرغوبات کے مطابق فیصلے کرتی ہے کہ جو تم چاہتے ہو' وہی فیصلے اس میں درج ہیں۔ حق اور عدل پر مبنی نہیں ہیں۔ نہ معقول و معروف کے کسی اصول پر مبنی ہیں۔

اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ (۶۸: ۳۹) "یا پھر کیا تمہارے لیے روز قیامت تک ہم پر کچھ عہد و پیمان ثابت ہیں کہ تمہیں وہی کچھ ملے گا جس کا تم حکم لگاؤ"۔ اگر کتاب نہیں ہے تو پھر اللہ کا کوئی عہد تمہارے ساتھ ہو گا پھر؟ اور یہ عہد قیامت تک کے لیے ہو گا۔ اور اس کے مطابق تمہارا یہ حق تسلیم کر لیا گیا ہو گا' کہ تمہارے نفس کے بارے میں تمہارا اپنا اختیار ہے تم جو چاہو' کرو لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے' اللہ کے ہاں ایسا عہد کسی کے ساتھ نہیں ہے۔ آخر وہ کس بنیاد پر ایسی باتیں کرتے ہیں اور ان کی دلیل کیا ہے؟

سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ (۶۸: ۴۰) "ان سے پوچھو تم میں سے کون ہے اس کا ضامن"۔ یعنی اس معاہدے کے اوپر کوئی ہے دستخط کرنے والا اور اس پر عمل کروانے کی ضمانت دینے والا کہ اللہ کے ساتھ ایسا کوئی معاہدہ ہوا ہے اور جو قیامت تک کے لیے قابل عمل اور قابل نفاذ ہے۔ یہ اس قسم کا مزاح ہے' اس قدر فصیح و بلیغ مزاح ہے کہ اسے سن کر ایک معقول آدمی تو پانی پانی ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ اسے ایک نہایت ہی کھلی اور روشن حقیقت کا سامنا ہوتا ہے۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ (۶۸: ۴۱) "یا پھر ان کے ٹھہرائے ہوئے کچھ شریک ہیں (جنہوں نے ذمہ اٹھایا ہے) تو لائیں اپنے ان شریکوں کو اگر یہ سچے ہیں"۔ یہ لوگ اللہ کے ساتھ کئی الہوں کو شریک ٹھہراتے تھے' لیکن قرآن مجید ان کو اپنا شریک نہیں کہتا' ان کا شریک کہتا ہے۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ اللہ کا شریک تو اللہ کو معلوم نہیں ہے۔ اور چیلنج دیتا ہے کہ یہ جو سمجھتے ہیں کہ ہیں تو لے آئیں تاکہ ان کو دیکھا جائے' لیکن کہاں سے لائیں؟

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ (۴۲) خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ (۴۳)

(۶۸: ۴۲ — ۴۳) "جس روز سخت وقت آپڑے گا اور لوگوں کو سجدہ کرنے کے لیے بلایا جائے گا تو یہ لوگ

سجدہ نہ کر سکیں گے 'ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی' ذلت ان پر چھا رہی ہوگی ۔ یہ جب صحیح و سالم تھے 'اس وقت انہیں سجدے کے لیے بلایا جاتا تھا (اور یہ انکار کرتے تھے)"۔ یوں یہ لوگ قیامت کے اس منظر کے سامنے ہیں ۔ گویا قیامت برپا ہے ۔ اور ان کو بلایا جا رہا ہے 'کہ لاؤ شریکوں کو جن کا تم دعویٰ کرتے تھے ۔ اور اللہ کے علم میں تو یہ دن حقیقتاً حاضر ہے ۔ کیونکہ اللہ کے علم میں ماضی' حال اور مستقبل نہیں ہے ۔ یوں اللہ کے علم کو پیش کرنا 'نہایت گہرا اثر ڈالتا ہے اور قرآن مجید کا مخصوص انداز بیان ہے ۔

يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ "جب پنڈلی کھل جائے گی"۔ یہ عربی محاورے میں سختی اور کرب کے لیے آتا ہے ۔ یعنی مشکل وقت میں انسان آستین چڑھاتا ہے اور پائنچے اٹھاتا ہے اور پنڈلی کھل جاتی ہے ۔ بالعموم مشکل وقت میں انسان ایسا کرتا ہے 'اور اس وقت ان کو دعوت دی جائے گی کہ اللہ کے سامنے سجدہ کرو' یہ نہ کر سکیں گی 'کیونکہ وقت چلا گیا ہو گا اور یا اس لیے کہ اس وقت جس طرح دوسری جگہ کہا گیا :

مُهْطِعِينَ مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ "سر اٹھائے بھاگے چلے جا رہے ہوں گے"۔ حالت یہ ہوگی کہ ان کے اعصاب اور اجسام خوف کے مارے اکڑے ہوئے ہوں اور وہ غیر ارادی طور پر سجدہ نہ کر سکیں گے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت ہی خوفزدہ پریشان ہوں گے ۔ مزید ہیئت کذائی یہ ہوگی ۔

خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ (۶۸ : ۴۳) "ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی' ذلت ان پر چھائی ہوئی ہوگی"۔ یہ متکبر اور اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھنے والے اس دن یوں ہوں گے ۔ نیچی نظر اور ذلیل حالت یہ دو حالتیں ان کی بداعمالیوں کا بدلہ ہیں ۔ سورت کے آغاز میں جو ڈراوا آیا تھا کہ اس کی سونڈ پر ہم داغ لگائیں گے یہاں اس کی طرف اشارہ ہے کہ یہ گہری ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوں گے اور ذلیل و خوار ہوں گے ۔

یہ ایسے حالات میں ہیں شکستہ و ریختہ کہ ان کو ڈرایا دلایا جاتا ہے کہ اس حالت تک وہ کس وجہ سے پہنچے 'کیونکہ یہ لوگ حق سے منہ موڑتے تھے اور تکبر کرتے تھے ۔ اور جب صحیح سالم تھے اور ان کو سجدوں کے لیے بلایا جاتا تھا' تو یہ تکبر کرتے تھے ۔ اب اس وجہ سے یہ لوگ اس ذلیل موقف میں ہیں اور اس مختصر دنیا کو تو یہ پیچھے چھوڑ آئے ہیں ۔ آج انہیں بلایا جاتا ہے مگر ان کے اندر سکت ہی نہیں ہے ۔

وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ (۶۸ : ۴۳) "جب صحیح و سالم تھے اس وقت انہیں سجدے کے لیے بلایا جاتا تھا" مگر یہ انکار کرتے تھے ۔ اور آج بلایا جاتا ہے 'کرنا چاہتے ہیں' مگر طاقت نہیں ہے یا موقعہ نہیں ۔ ایسی ہی حالت میں ایک دوسری تہدید دلوں کو ہلا مارنے والی جبکہ وہ پہلے سے کرب اور بے چینی میں ہیں اور حواس باختہ ہیں ۔

فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهَذَا الْحَدِيثِ (۶۸ : ۴۴) "پس اے نبی' تم اس کلام کو جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو"۔ مارے گئے ۔ یہ خوفناک دھمکی ہے اللہ جبار و قہار کی طرف سے 'جو قوی اور مضبوط ہے ۔

حضور اکرم ﷺ سے کہا جاتا ہے کہ چھوڑ دیجئے ان ٹٹ پونجیوں کو جو اس عظیم کلام کی تکذیب کرتے ہیں - میں ان سے لڑوں گا - یہ کون تھا جو تکذیب کرتا تھا؟ یہ وہی انسان ہے جس کی قوت ایک چیونٹی سے بھی کم ہے - بلکہ اس پوری کائنات کی نسبت سے یہ تو ایک ذرے کے برابر بھی نہیں ہے جو ہوا میں اڑ رہا ہے - اللہ قہار و جبار کی قوت کے مقابلے میں' اس کی عظمت کے مقابلے میں انسان بیچارہ ہے کیا؟

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم ان کو میرے لیے چھوڑ دو' آپ اور اہل ایمان آرام و اطمینان سے بیٹھیں' یہ جنگ میرے ساتھ ہے' میرے دین کی وجہ سے ہے - یہ لوگ میرے دشمن ہیں - میں ان کے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے رہا ہوں' ان کو معلوم ہو جائے گا - آپ لوگ آرام و اطمینان سے بیٹھ جائیں - کس قدر خوفناک دھمکی ہے - اور کس قدر باوثوق یقین دہانی ہے' ان لوگوں کو جو اس وقت نہایت ہی کمزور پوزیشن میں ہیں - اور یہ محض یقین دہانی ہی نہیں ہے - اللہ جبار و قہار بتلا دیتا ہے کہ ان کے خلاف کیا سٹریجی اختیار کی جائے گی - یہ تو بہت ہی کمزور ہیں اور ضعیف ہیں -

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (٤٤) وَ اُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ (٤٥) (٦٨: ٤٤ — ٤٥) "ہم ایسے طریقے سے بتدریج ان کو تباہی کی طرف لے جائیں گے' کہ ان کو خبر ہی نہ ہوگی میں ان کی رسی دراز کر رہا ہوں - میری چال بڑا زبردست ہے"- ان مکذبین اور تمام روئے زمین کے باشندے اس سے فروتر ہیں کہ اللہ ان کے بارے میں کوئی تدبیر کرے - لیکن اللہ تعالیٰ ان کو اپنی قوتوں سے ڈراتا ہے کہ وہ اللہ کے غضب کو دعوت نہ دیں - اور وقت کے چلے جانے سے پہلے ہی' اپنے آپ کو درست کر لیں' اور یہ جان لیں کہ یہ ظاہری عافیت جس میں وہ ہیں' یہ بھی ان کے لیے بڑی فتح ہے جس پر وہ غرور کر رہے ہیں - اور یہ کہ ان کو جو ظلم کرنے' سرکشی کرنے' دین اسلام سے منہ موڑنے' اور گمراہی اختیار کرنے کی جو مہلت دے دی گئی ہے' یہ دراصل مزید برے انجام کی تدبیر ہے - یہ اللہ کی تدبیر ہے کہ یہ لوگ اپنے بوجھ پورے کے پورے اٹھائیں اور قیامت میں جب آئیں تو گناہوں سے لدے ہوئے ہوں اور شرمندگی' سرزنش اور عذاب میں ڈالے جانے کے مستحق ہو چکے ہوں -

اللہ نے جو تدبیر کی ہوئی ہے' اس میں بھی اللہ نہایت ہی عادلانہ اور رحیمانہ انداز اپناتا ہے کہ ان کو پہلے سے بتا دیتا ہے' حالانکہ وہ اس کے دین کے دشمن ہیں' رسول اللہ ﷺ کے دشمن ہیں تاکہ وہ غور کر لیں اور اگر چاہیں تو راہ راست پر آ جائیں -

اللہ تعالیٰ مہلت تو دیتا ہے لیکن یونہی شتر بے مہار نہیں چھوڑتا - جب وہ ظالموں کو پکڑتا ہے تو اس کی پکڑ سے پھر کوئی بچ نہیں سکتا - یہاں اللہ اپنے طریقے' اپنی سنت اور اپنی مشیت بتاتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتاتا ہے کہ جو لوگ اس کلام کا انکار کرتے ہیں ان کو ذرا چھوڑیں کہ میں کس طرح انجام تک پہنچاتا ہوں - یہ لوگ مال' اولاد اور مرتبہ و مقام پر اتراتے ہیں - میں ان کو مہلت دیتا ہوں - یہ نعمتیں ہی ان کے لیے باعث عذاب ہوں گی - یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطمئن کر دیا جاتا ہے اور ان کو عذاب کے منہ میں جانے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے -

اس خوفناک منظر اور اس خوفناک تہدید کی فضا میں اب یہ مکالمہ یوں اختتام پذیر ہوتا ہے' ان کے موقف پر تعجب کیا جاتا ہے اور چیلنج دیا جاتا ہے -

أَمْ تَسْئَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ (٦٨ : ٤٦) "کیا تم ان سے کوئی اجر طلب کر رہے ہو کہ یہ اس چٹی کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہوں"۔ کیا اسلام میں داخل کرنے کی کوئی بڑی فیس ہے جس سے یہ لوگ ڈر رہے ہیں اور بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اور منہ موڑ رہے ہیں۔ اور اس لیے مجبور ہیں کہ یہ برا انجام ہی اختیار کریں۔ محض اس لیے کہ ادائیگی مشکل ہے۔

أَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ (٦٨ : ٤٧) "یا ان کے پاس غیب کا علم ہے جسے یہ لکھ رہے ہیں"۔ ان کو یقین ہے کہ وہ بچی راہ پر ہیں۔ اور وہ ڈرتے نہیں۔ ان کو یہ غیبی تائید حاصل ہے اور یہ علم انہوں نے لکھ رکھا ہے اور ان کو یقین ہے یا انہوں نے خود اسے لکھ لیا ہے اور ان کو یقین ہے کہ یہ درست ہے۔ کچھ بھی ان کے پاس نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان کو کوئی یقین حاصل ہے اور نہ ہی آپ کوئی فیس طلب کرتے ہیں۔

---ооо---

یہ انداز تعبیر نہایت معنی خیز 'خوفناک اور عجیب ہے۔

فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ (٦٨ : ٤٤) "چھوڑ دو مجھے اور ان لوگوں کو جو اس کلام کی تکذیب کرتے ہیں"۔ میرے اور ان احمقوں کے درمیان اب گویا جنگ شروع ہو گئی ہے اور ایسے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ اللہ کی جنگ رہی ہے۔ اس اعلان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ معرکہ ایمان و کفر' معرکہ حق و باطل میں' دراصل تم فریق نہیں ہو۔ ایک فریق یہ احمق ہیں اور دوسرا اللہ ہے۔ اس جنگ کی کمان اللہ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔

اور یہ بات دراصل ہے بھی حقیقت' اگرچہ بظاہر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام ؓ معرکہ حق و باطل میں اہم کردار نظر آتے ہیں' ان کا جو کردار ہے وہ بھی سنت الٰہیہ اور تقدیر الٰہی کی تدبیر کا ایک حصہ ہے۔ رسول اللہ اور مسلمان تو دست قدرت کے آلات کار تھے' یہ اللہ ہی تھا جو انہیں استعمال کرتا تھا۔ وہ فعال لما یرید ہے جو چاہتا ہے' کرتا ہے اور کراتا ہے۔ کام اللہ خود کرتا ہے۔

جب یہ آیات نازل ہوئیں' تو حضور ﷺ مکہ میں تھے اور مکہ کے بھی ابتدائی ایام تھے۔ مسلمان نہایت ہی قلیل تعداد میں تھے' ضعیف تھے۔ یوں اللہ نے ان کے کاسہ دل کو اطمینان سے بھر دیا اور یوں ان لوگوں کو خوفزدہ کر دیا جو قوت' مال' مرتبے اور اولاد کی وجہ سے غرے میں مبتلا تھے۔ اس کے بعد جب حضور ﷺ مدینہ گئے تو وہاں ظاہری حالات بدل گئے۔ اللہ نے یہ چاہا کہ رسول اللہ اور مسلمانوں کا اس معرکہ میں ایک ظاہری کردار بھی ہو۔ لیکن اصل حقیقت اللہ نے ہمیشہ دو ٹوک الفاظ میں بتائی جہاں وہ مکہ میں ضعیف تھے' تب بھی اور مدینہ میں وہ بظاہر کامیاب اور طاقتور تھے تب بھی۔ بدر میں کہا۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (٨ : ١٧) "پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انہیں

قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا اور اے نبی تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا (اور مومنوں کے ہاتھ جو اس کام میں استعمال کیے گئے ) تو یہ اس لیے تھا کہ اللہ مومنوں کو ایک بہترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزار دے ' یقیناً اللہ سننے اور جاننے والا ہے"۔ تاکہ ان کے دلوں میں یہ حقیقت بیٹھ جائے کہ جنگ کا فریق دراصل اللہ ہے۔ اور یہ جنگ اس کی جنگ ہے ' تاکہ اس آزمائش میں اللہ کے لیے اجر لکھ دے۔ رہی اصل جنگ تو وہ اللہ کی ہے اور رہی فتح تو وہ بھی اللہ عطا کرتا ہے ' مسلمانوں کے بغیر بھی یہ فتح اللہ عطا کر سکتا ہے۔ رہے یہ لوگ جو اس میں شریک ہوتے ہیں تو یہ دست قدرت کے آلات ہوتے ہیں۔ اور اللہ کی افواج صرف مومنین تک محدود نہیں ہیں۔

بہرحال قرآنی آیات میں اس حقیقت کو بالکل واضح کر کے بیان کیا ہے ' خواہ بظاہر مسلمان کمزور ہوں یا مضبوط ' نیز اللہ کے نظام قضا و قدر کے ساتھ بھی یہی بات متفق ہے۔ اللہ کی سنت اور اللہ کی مشیت کا بھی یہی تقاضا ہے۔ رہے مسلمان اور اسلامی افواج تو وہ محض آلات اور اسباب ہیں۔

یہ وہ حقیقت ہے جو مومن کو حالت قوت اور ضعف دونوں میں مطمئن کر دیتی ہے بشرطیکہ قلب مومن مخلص ہو ' اور جہاد میں وہ اللہ پر بھروسہ کرتا ہو ' کیونکہ کفر و اسلام کے معرکوں میں مسلمانوں کی قوت فیصلہ کن نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی نصرت فیصلہ کن ہوتی ہے۔ اللہ نصرت کا ضامن بن جاتا ہے۔ اگر مسلمان ضعیف بھی ہوں تو بھی فتح پاتے ہیں کیونکہ ان کو اللہ کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ ہاں اللہ دشمنوں کو مہلت دیتا ہے۔ ان کی رسی دراز کرتا ہے۔ اور اپنی مشیت ' حکمت ' اور عدل اور رحمت کے مطابق اپنے مناسب وقت پر اپنے دشمنوں کو شکست دیتا ہے۔

نیز یہ ایک ایسی حقیقت بھی ہے جس سے اللہ کے دشمنوں کے دل بھی تھرتھر کانپتے ہیں۔ چاہے مسلمان حالت ضعف میں ہوں یا حالت قوت میں ہوں۔ اس لیے کہ دشمن اسلام بھی جانتا ہے کہ ہمارا مقابلہ مسلمانوں سے نہیں بلکہ خدا سے ہے۔ اس خدا سے جو اپنے نبی سے کہہ رہا ہے۔

فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهَٰذَا الْحَدِيثِ (۶۸:۴۴) "چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جو اس کلام کی تکذیب کرتا ہے"۔ تم الگ ہو جاؤ اور اس بدبخت کو میرے لیے چھوڑ دو لیکن اللہ کی چال زبردست اور اس کا جال نظر فریب ہوتا ہے۔ یہ اس میں اس طرح پھنس جائیں گے کہ پتہ بھی نہ چلے گا۔ اگرچہ یہ طاقتور ہوں۔ یہ ان لوگوں کی قوت جس کی وجہ سے یہ غرے میں مبتلا ہیں یہی ان کے لیے موجب شکست ہوگی۔

وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ (۶۸:۴۵) "میں ان کی رسی دراز کر رہا ہوں میری چال زبردست ہے"۔ رہی یہ بات کہ فتح کب ہوگی ' تو اس کا علم اللہ کو ہے۔ کوئی اللہ کی چال اور جال سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔ اس سے وہی لوگ غافل ہوتے ہیں جو فسق و فجور میں بہت دور چلے جاتے ہیں۔

ایسے حالات میں آخر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صرف یہی کہنے کی ضرورت ہے کہ آپ وقت آنے تک صبر کریں۔ مشکلات برداشت کریں ' رسالت اور دعوت کی ذمہ داریاں پوری کریں ' نفس کی خواہشات پر صبر کریں۔ ان کی ایذا رسانیوں پر صبر کریں۔ یہاں تک کہ اللہ کے مقابلے کا وقت آ جائے۔ یہاں دعوت اسلامی کی تاریخ سے ایک واقعہ بتایا جاتا ہے کہ جلد بازی نہ کریں اللہ نظام کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور حضرت یونس علیہ السلام نے بے صبری کی تھی تو

اللہ کے فضل ہی نے ان کی مدد کی۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ إِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ۞ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ۞ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۞

"اچھا' اپنے رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کرو اور مچھلی والے (یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہو جاؤ' جب اس نے پکارا تھا اور وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔ اگر اس کے رب کی مہربانی اس کے شامل حال نہ ہو جاتی تو وہ مذموم ہو کر چٹیل میدان میں پھینک دیا جاتا۔ آخر کار اس کے رب نے اسے برگزیدہ فرما لیا اور اسے صالح بندوں میں شامل کر دیا"۔

مچھلی والے حضرت یونس علیہ السلام ہیں۔ ان کے واقعہ کی تفصیلات سورہ صافات میں گزر گئی ہیں۔ ان کے تجربہ کا خلاصہ یہ ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے' کہ حضرت یونس علیہ السلام کو اللہ نے ایک گاؤں کی طرف بھیجا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ موصل کے قریب نینویٰ نامی گاؤں تھا۔ ان لوگوں نے ایمان لانے میں دیر کر دی۔ آپ کو ان کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ غصے میں آپ نے ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ اپنے دل میں کہا کہ اللہ نے مجھ پر یہ لازم نہیں کیا کہ ان ہٹ دھرموں اور معاندین کے درمیان میں بیٹھا رہوں جبکہ یہ نہیں مان رہے ہیں' تو میں کسی دوسری قوم میں کام کر سکتا ہوں یا اللہ مجھے دوسری جگہ بھیج سکتا ہے۔ اس غصے کی حالت میں آپ ساحل کے کنارے تک چلے گئے۔ ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ جب یہ سمندر کے درمیان گئے تو کشتی بھاری ہو گئی اور غرق ہونے لگی۔ انہوں نے قرعہ پھینکا کہ کشتی کو ہلکا کرنے کے لیے ایک آدمی کو کم کیا جائے۔ قرعہ آپ کا نکلا۔ لوگوں نے آپ کو سمندر میں پھینک دیا۔ مچھلی نے نگل لیا۔ اس وقت حضرت یونس علیہ السلام نے اللہ کو پکارا جب کہ وہ سخت مشکل میں تھے اور قریب المرگ تھے۔ سمندر کے اندر مچھلی کے پیٹ میں تھے۔ تاریکیوں پر تاریکیاں تھیں۔ اور موجوں پر موجیں تھیں۔ یہاں انہوں نے پکارا۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ "نہیں ہے کوئی الٰہ مگر تو' تو پاک ہے اور میں ظالموں میں سے تھا"۔ اس وقت اللہ کا فضل و کرم آ پہنچا' مچھلی نے انہیں حکم الٰہی کے مطابق ساحل پر اگل دیا۔ اور اس وقت ان کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ گوشت کا لوتھڑا رہ گئے تھے۔ مچھلی کے معدے کے کیمیاوی عمل نے ان کی جلد کو رقیق بنا دیا تھا جبکہ ابھی تک اللہ نے ان کو زندہ رکھا۔ معجزانہ انداز میں اور اللہ خود اپنے بنائے ہوئے قوانین حیات کا پابند نہیں ہے۔

یہاں اللہ فرماتا ہے کہ اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو مچھلی انہیں اس حالت میں پھینکتی کہ وہ مذموم ہوتے۔ یعنی رب تعالیٰ کی طرف سے مذموم ہوتے۔ کہ وہ اپنے مقام دعوت سے ذرا جلدی چلے گئے۔ اللہ نے ان کی اس تسبیح کو قبول کیا اور ان کے اعتراف اور عذر کو قبول کر لیا اور ان پر رحم و کرم کر دیا۔

فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۶۸ : ۵۰) "آخر اس کے رب نے اسے برگزیدہ فرما لیا اور

اسے صالح بندوں میں شامل کر لیا"۔

یہ تجربہ خاتم النبیین کے لیے پیش کیا گیا تاکہ آپؐ اپنے فرائض رسالت کی ادائیگی میں اس سے استفادہ کریں۔ کیونکہ آپ نے آخری رسالت کا کام تمام سابقہ تجربات کی روشنی میں کرنا تھا۔ تمام نصیحتیں، تمام عبرتیں اور تمام تجربات کی فصل آپ نے کاٹنی تھی تاکہ آپ کے لیے اپنے کام میں فیصلے کرنے میں آسانی ہو۔ اور آپ یہ بوجھ اچھی طرح اٹھا سکیں۔ تاکہ آنے والے زمانے میں، جدید سے جدید تر حالات میں بھی زندگی کی گاڑی ان اصولوں کے مطابق چلائی جا سکے اور جب مستقبل کوئی نیا مسئلہ لے کر آئے تو اس دعوت اور رسالت کے اصولوں میں اس کا حل موجود ہو۔

یہ تجربہ جس سے حضرت یونس علیہ السلام گزرے، یہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں کہ انہی کی طرح لوگ ہٹ دھرمی، تکذیب اور سرکشی پر اترے ہوئے ہیں اور یہ نصیحت آپ کو اس وقت کی گئی جب حق و باطل کے معرکے کی ذمہ داری سے آپ کو سبکدوش کر دیا گیا۔ یہ ذمہ داری اللہ نے لے لی۔ جس طرح چاہے گا، جنگ کرے گا، جس وقت چاہے گا، کرے گا۔ آپ کو یہ حکم دے دیا کہ آپ صبر اور ثابت قدمی سے اپنا کام یعنی ابلاغ کرتے رہیں، چاہے اس راہ میں جو مشکلات بھی آئیں، تمام فیصلے وقت پر ہوں گے۔ مقام دعوت نہ چھوڑیں نہ جلدی کریں۔

دعوت اسلامی کی مشکلات اور مشقتوں میں سے سب سے بڑی مشقت صبر کرنا ہے۔ اور اس وقت کا انتظار کرنا ہے کہ جب اللہ اپنا آخری فیصلہ صادر کر دے کیونکہ دعوت کی کامیابی کے وقت کا فیصلہ اللہ کے پاس ہے اور یہ فیصلہ اللہ اپنی حکمت کے مطابق صادر فرماتا ہے۔ اس فیصلے کی گھڑی کے آنے سے پہلے اس راہ میں بڑی مشقتیں آتی رہتی ہیں، لوگ جھٹلاتے ہیں، پھر تشدد کرتے ہیں۔ چالیں چلتے ہیں اور سخت عناد رکھتے ہیں۔ باطل اپنی قوت کا مظاہرہ کرتا ہے اور وہ اسے اس طرح بڑھا کر پیش کرتا ہے جس طرح غبارے میں ہوا بھر دی جاتی ہے۔ اور وہ خوفناک نظر آتا ہے، لوگ ظاہری کامیابی اور باطل کی چلت پھرت سے مرعوب ہو کر اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں، پھر مشکل ترین مشقت یہ ہوتی ہے کہ داعی نہایت ثابت قدمی، استقلال، سنجیدگی کے ساتھ جم کر کام کرتا رہے اور وعدہ حق کی آمد کا انتظار کرے۔ کوئی شک نہ کرے، کوئی تردد اسے نہ ہو، سیدھی راہ پر جا رہا ہو، اگرچہ راہ میں رکاوٹیں آئیں تو گویا وقت کے آنے کا انتظار بڑی مشقت ہے۔ رہا اصل معرکہ تو یہ اللہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ وہی اس معرکے میں فریق ہے، وہی تدبیر کر رہا ہے۔ وہ ظالموں کی رسی دراز کر رہا ہے۔ اور اس میں حکمت پوشیدہ ہے۔ یہی وعدہ ان مشکل حالات میں نبی کریم ﷺ سے ہوا اور بعد کے حالات نے اس کی تصدیق کی۔

آخر میں کافروں کے ایک دوسرے منظر کو یہاں لایا جاتا ہے۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی دعوت اور تبلیغ سن کر سخت غصے میں آتے تھے اور جل بھن جاتے تھے اور ان کے دل مین سخت عناد اور حسد پیدا ہوتا ہے، جس کا اظہار ان کی نظروں سے ہوتا۔ زہر آلود اور قہر آمیز نظروں سے یہ لوگ آپ کو گھورتے ہیں۔ قرآن کریم ان کو نہایت ہی خوبصورتی سے بیان کرتا ہے جس پر اضافہ ممکن نہیں۔

وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا

۲

الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ﴿۵۱﴾ وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ﴿۵۲﴾ الربع ۱۹ ع

۴

"جب یہ کافر لوگ کلام نصیحت (قرآن) سنتے ہیں تو تمہیں ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ گویا تمہارے قدم اکھاڑ دیں گے 'اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے' حالانکہ یہ تو سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے"۔

یہ ممکن تھا کہ یہ خشمگیں نظریں حضور اکرم ﷺ کے قدم ہلا دیں اور آپ پھسل جائیں ۔ اور آپ ڈگمگانے لگیں ۔ ان کی نظروں میں جس قدر قہر' غضب' شرارت' جوش انتقام اور حسد اور گرمی تھی' قرآن کریم نے اسے بہت ہی خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے ۔ اور ان نظروں کے ساتھ وہ سب وشتم اور اتہام و الزام بھی لگاتے اور کہتے ۔

اِنَّهُ لَمَجْنُوْنٌ (۶۸ : ۵۱) "یہ تو ایک مجنون ہے"۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جسے دست قدرت کا قلم ہی رقم کر سکتا ہے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دعوت اسلامی اس ابتدائی دور میں کس قدر مشکل حالات سے گزر رہی تھی ۔ اس وقت مکہ کے مخالفین کا حلقہ بااثر مجرمین کا ایک وسیع حلقہ تھا ۔ ان کے دل جل رہے تھے اور آنکھیں مارے غصب کے پھٹ رہی تھیں ۔ لیکن اللہ فرماتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر احمق ہیں کہ مکہ کے اس چھوٹے سے شہر میں جل بھن رہے ہیں یہ تو ایک عالمی پروگرام ہے ۔

وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۶۸ : ۵۲) "حالانکہ یہ تو جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے"۔ صرف مکہ والوں کے لیے نہیں ہے اور پھر یہ جو الزام لگاتے ہیں وہ کس قدر احمقانہ ہے کہ کیا دیوانے عالمی اصلاح کا کوئی پروگرام پیش کرتے ہیں ۔ صدق اللہ العظیم !

یہاں مناسب ہے کہ لفظ العالمین پر بات ہو جائے ۔ ابھی یہ دعوت مکہ میں ہے' چند ماننے والے ہیں اور رسول کو خشمگیں نظروں سے دیکھا جا رہا ہے ۔ اور مشرکین مکہ اس کے خلاف جنگ میں اپنے پورے وسائل استعمال کر رہے ہیں ۔ اس ابتدائی دور میں' اس مشکل وقت میں بھی اعلان کر دیا جاتا ہے کہ یہ عالمی تحریک ہے ۔ جس طرح کہ اس کی حقیقت تھی ۔ لہٰذا مدینہ میں جب اس تحریک نے عالمی انداز اختیار کیا تو یہ کوئی نئی بات نہ تھی ۔ جس طرح آج کل مغربی افتراء پرداز یہ الزام لگاتے ہیں کہ دعوت اسلامی نے عالمی رنگ صرف مدینہ کی کامیابی کے بعد اختیار کیا ۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ پہلے دن سے ایک عالمی دعوت تھی ۔ یہی اللہ کا ارادہ تھا اور یونہی یہ دعوت زمانہ آخر تک رہے گی ۔ یہ اللہ کا ارادہ ہے ۔ یہ دعوت اللہ کی ہے اور وہی اس کا محافظ ہے ۔ وہ اس کا حامی اور ناصر ہے ۔ وہی اس کی جانب سے لڑنے والا ہے ۔ اور اس کے حاملین کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اس پر جم جائیں ۔ وہ سب سے اچھے فیصلے کرنے والا ہے ۔

--- ○○○ ---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۲۹

## سورۃ الحاقۃ- ۶۹

## ۱--تا-- ۵۲

# سورۃ الحاقہ ایک نظر میں

یہ نہایت ہی ہولناک ' خوفناک اور پرشوکت سورت ہے ۔ آپ جب چاہیں اسے پڑھیں ۔ آپ کے احساسات میں ایک زلزلہ برپا ہو گا ۔ اول سے لے کر آخر تک احساسات کے دروازے پر دستک دے رہی ہے ۔ خوفناک ضربات لگاتی ہے ' دو ٹوک بات کرتی ہے ' اور اس کی اسکرین پر منظر کے بعد منظر آتا ہے اور ہر منظر میں یہ اصرار ہے کہ احساس کرو ' کبھی خوفناک انداز میں ' کبھی پرشوکت انداز میں ' کبھی عذاب آخرت دکھا کر اور کبھی اچھی طرح جھنجھوڑ کر ۔

لطف یہ ہے کہ پوری سورت پردہ احساس پر ایک ہی مفہوم اور ایک ہی حرکت پیدا کرنا چاہتی ہے ۔ خبردار یہ معاملہ یعنی دین و ایمان کا معاملہ ایک سنجیدہ اور اہم اور فیصلہ کن معاملہ ہے ' اس میں کوئی بات برائے وزن بیت نہیں ہے ۔ اور نہ مزاح ہے ۔ دنیا میں بھی اہم ہے ' آخرت میں بھی اہم ہے ۔ اللہ کے حساب و کتاب میں بھی اہم ہے ۔ نہ دنیا میں اس پر سودا بازی ہو سکتی ہے اور نہ قیامت میں اس میں سے کسی جز کو ترک کیا جا سکتا ہے ۔ اس میں ذرا سی چوک بھی غضب الہٰی کو دعوت دینا ہے ۔ اپنے آپ کو اللہ کی پکڑ کا مستوجب بنانا ہے ۔ اگرچہ وہ رسول خدا کیوں نہ ہوں ' لہٰذا تمام انسان کو یہاں تک کہ رسول اللہ خیرالبشر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں ' یہ حق ہے ۔ حق الیقین اور عین الیقین ہے اور رب العالمین کی طرف سے ہے ۔

یہ مفہوم اس لفظ سے بھی ظاہر ہے ' جو اس سورت میں قیامت کے لیے استعمال ہوا ہے ۔ اَلْحَاۗقَّةُ (۶۹ : ۱) الحاقہ ' اس لفظ کا صوتی ترنم اور اس کا مفہوم ' یعنی وہ امر جس کا وقوع ہونا ہے ' ہوتی شدنی ہے ' سنجیدہ ' دو ٹوک سچائی اور طے شدہ ہونے کا مفہوم پردۂ احساس پر چھوڑتا ہے ۔ لفظ کے تلفظ ہی میں ایک قاری بوجھ محسوس کرتا ہے اور پھر یہ مفہوم مضبوطی سے شعور میں بیٹھ جاتا ہے ۔ نہایت قرار و سکون کے ساتھ ۔ اس میں حرف حا کا مد ہے اور یہ مد بالالف ہے اور بعدہ قاف مشدد ہے اور آخر میں تائے تانیث ہے جو وقف کی صورت میں ہا کا آواز دیتی ہے گویا ایک بھاری بوجھ اٹھا کر آرام سے رکھ دیا جاتا ہے ۔

اس کے بعد قیامت کے منکرین ایک ایک کر کے اسکرین پر آتے ہیں ۔ ان کو سخت عذاب میں جتلا کر کے دکھایا جاتا ہے ۔ ہر ایک کی تباہی فیصلہ کن ہے ۔ یہ احساس دلایا جائے کہ قیامت فیصلہ کن ہے لہٰذا تمام دارومدار ایمان پر ہے ۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ (٤) فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ (٥) وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ (٦) سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (٧) فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ (٨) وَجَاۗءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ (٩) فَعَصَوْا رَسُوْلَ

رَبِّہِمْ فَاَخَذَہُمْ اَخْذَۃً رَّابِیَۃً (۱۰) اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰکُمْ فِی الْجَارِیَۃِ (۱۱)

لِنَجْعَلَہَا لَکُمْ تَذْکِرَۃً وَّ تَعِیَہَآ اُذُنٌ وَّاعِیَۃٌ (۱۲) (۶۹: ۴ تا ۱۲) "اور عاد نے اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت کو جھٹلایا تو ثمود ایک حادثہ سے ہلاک کیے گئے اور عاد ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کر دیے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلسل سات رات اور آٹھ دن ان پر مسلط رکھا' تم دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح بچھڑے پڑے ہیں گویا وہ کھجور کے بوسیدہ تنے ہوں۔ اب کیا ان میں سے کوئی باقی بچا نظر آتا ہے؟ اور اسی خطائے عظیم کا ارتکاب فرعون اور اس سے پہلے کے لوگوں نے اور تلپٹ ہونے والی بستیوں نے کیا۔ ان سب نے اپنے رسول کی بات نہ مانی تو اس نے ان کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑا۔ جب پانی کا طوفان حد سے گزر گیا تو ہم نے تم کو کشتی میں سوار کر دیا تھا' تاکہ اس واقعہ کو تمہارے لیے سبق آموز یادگار بنا دیں اور یاد رکھنے والے کان اس کی یاد محفوظ رکھیں"۔ یوں جس نے بھی دین و ایمان اور حساب و کتاب اور قیامت کو نظر انداز کیا اللہ تعالیٰ کی خوفناک پکڑ سے دوچار ہوا۔ اور اسے اللہ نے پیس کر رکھ دیا۔ یہ سب مناظر بتاتے ہیں کہ ایمان اور قیامت کا معاملہ خصوصاً نہایت ہی سنجیدہ' فیصلہ کن' دو ٹوک اور قطعی ہے۔ یہ مزاح کی باتیں نہیں ہیں۔ یہ کھیل تماشا نہیں کہ ان پر نظر ڈال کر نظر انداز کر دیا جائے۔

یہ سنجیدگی اور قیامت کے خوفناک مناظر۔ ان سے یہ بات جھلکتی ہے کہ ایک دن یہ پوری کائنات ختم کر دی جائے گی اور جلال ربانی کا ظہور ہو گا۔ اور نہایت ہی خوفناک دن ہو گا۔ جس میں بڑے بڑے اجرام فلکی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَۃٌ وَّاحِدَۃٌ (۱۳) وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُکَّتَا

دَکَّۃً وَّاحِدَۃً (۱۴) فَیَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَۃُ (۱۵) وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَہِیَ یَوْمَئِذٍ

وَّاہِیَۃٌ (۱۶) وَّالْمَلَکُ عَلٰٓی اَرْجَآئِہَا وَ یَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّکَ فَوْقَہُمْ یَوْمَئِذٍ ثَمٰنِیَۃٌ

(۱۷) (۶۹: ۱۳ تا ۱۷) "پھر جب ایک دفعہ صور میں پھونک مار دی جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا' اس روز وہ ہونے والا واقعہ پیش آ جائے گا۔ اس دن آسمان پھٹے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی' فرشتے ان کے اطراف و جوانب میں ہوں گے اور آٹھ فرشتے اس روز تیرے رب کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے"۔

قیامت کے ایک منظر میں بھی اس خوف اور سنجیدگی کی تلقین کی جاتی ہے۔ جب حساب و کتاب ہو گا' حساب و کتاب کے یہ مناظر فیصلہ سنائے جانے کے بعد بھی خوفناک ہیں اور اس سورت کے اشارات اور احساس دلانے کے موثر طریقوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اس دن جو کامیاب ہو جاتا ہے اور جس کو نتیجہ بھی مل جاتا ہے وہ بھی اس قدر خائف ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَہٗ بِیَمِیْنِہٖ فَیَقُوْلُ ہَآؤُمُ اقْرَءُوْا کِتٰبِیَہْ (۱۹) اِنِّیْ

ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ (۲۰) (۶۹ : ۱۹ ـ ۲۰) "اس وقت جس کا اعمال نامہ اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا' وہ کہے گا "لو دیکھو' پڑھو میرا نامہ اعمال میں سمجھتا تھا کہ مجھے ضرور اپنا حساب ملنے والا ہے"۔ یہ نجات پا چکا ہے لیکن پھر بھی مارے خوف کے اسے یقین نہیں آرہا ہے۔

وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ کِتٰبِیَهْ (۲۵) وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ (۲۶) یٰلَیْتَهَا کَانَتِ الْقَاضِیَةَ (۲۷) مَآ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ (۲۸) هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ (۲۹) (۶۹ : ۲۵ تا ۲۹) "اور جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا "کاش' میرا اعمال نامہ مجھے نہ دیا گیا ہوتا اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ کاش میری وہی موت (جو دنیا میں آئی تھی) فیصلہ کن ہوتی۔ آج میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا۔ میرا سارا اقتدار ختم ہو گیا"۔ کس قدر فریاد و فغاں ہے۔ اور یہ کس طرح پردۂ احساس پر بیٹھ جاتی ہے۔ یہ ہے رنگ اس سورت کا۔

اور اس سورت کی ہولناکی اور سنجیدگی اور قطعیت اس وقت بھی سامنے آتی ہے جب مجرمین کو نہایت ہی سخت الفاظ میں فیصلہ سنایا جاتا ہے۔ فضائے عدالت خوفناک ہے۔ ہر طرف خاموشی اور آواز آتی ہے:

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ (۳۰) ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ (۳۱) ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ (۳۲) (۶۹ : ۳۰ تا ۳۲) "پکڑو اسے اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو' پھر اسے جہنم میں جھونک دو' پھر اس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو"۔ اس حکم کا ایک ایک فقرہ اس قدر بھاری ہے کہ زمین و آسمان کے بوجھ سے زیادہ ہے اور وادی شعور میں اس کے گولے اس قدر دھماکے سے گرتے ہیں کہ انسان حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ دل و دماغ پر ایک سنجیدگی طاری ہو جاتی ہے۔ اس عدالتی فیصلے کے دلائل بھی گنوائے جاتے ہیں۔ اور جن سے اس جرم کا انجام منصفانہ ثابت ہو جاتا ہے۔

اِنَّهٗ کَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِیْمِ (۳۳) وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (۳۴) فَلَیْسَ لَهُ الْیَوْمَ هٰهُنَا حَمِیْمٌ (۳۵) وَّ لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ (۳۶) لَّا یَاْکُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ (۳۷) (۶۹ : ۳۳ تا ۳۷) "یہ نہ بزرگ و برتر اللہ پر ایمان لاتا تھا اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔ لہٰذا آج نہ یہاں اس کا کوئی یار غم خوار ہے اور نہ زخموں کے دھوون کے سوا اس کے لیے کوئی کھانا' جسے خطاکاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا"۔

پھر اسی مفہوم کو ایک ہولناک قسم کھا کر کتاب میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس دین کی حقیقت کیا ہے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اس پر غور کریں:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ (۳۸) وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ (۳۹) اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۴۰) وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ (۴۱) وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۴۲) تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۳) (۶۹:۳۸ تا ۴۳) "پس 'میں قسم نہیں کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جو تم دیکھتے ہو اور ان کی بھی جنہیں تم نہیں دیکھتے' یہ ایک رسول کریم کا قول ہے' کسی شاعر کا قول نہیں ہے' تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو۔ اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے' تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے"۔

اور آخر میں آخری ضرب لگائی جاتی ہے۔ دو ٹوک دھمکی دی جاتی ہے اور جو بھی اس دین سے کھیلتا ہے' یا اس میں تبدیلی کرتا ہے اسے سخت گرفت کی دھمکی دی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ کام کرنے والے محمد رسول اللہ ہی کیوں نہ ہوں۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ (۴۴) لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ (۴۵) ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ (۴۶) فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ (۴۷) (۶۹:۴۴ تا ۴۷) "اور اگر اس (نبیؐ) نے خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے' پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس کام سے روکنے والا نہ ہوتا"۔ اس معاملہ میں نہ نرمی کی جا سکتی ہے' نہ خواہشات کی پیروی۔

اور سورت کا خاتمہ اس قرارداد پر ہوتا ہے' جو بالکل فیصلہ کن دو ٹوک ہے اور جس سے معاملے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (۴۸) وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ (۴۹) وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۵۰) وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ (۵۱) فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (۵۲)

(۶۹:۴۸ تا ۵۲) "در حقیقت یہ پرہیزگار لوگوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے کچھ لوگ جھٹلانے والے ہیں۔ ایسے کافروں کے لیے یقیناً یہ موجب حسرت ہے اور یہ بالکل یقینی حق ہے' پس اے نبی اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کر"۔ یہ ایسا خاتمہ ہے کہ بات کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ فیصلہ کن قرارداد آ جاتی ہے اور ہر قسم کی لغو سے دامن جھاڑ لیا جاتا ہے اور پس رب عظیم کے نام کی تسبیح اور حسن انجام کا انتظار۔

یہ مفہوم اور معنی جو یہ سورت انسانی احساس و شعور میں بٹھانا چاہتی ہے' اس کا اسلوب' اس کے اثرات' اس کے مناظر' اس کی تصاویر اور اس کے سائے نہایت ہی خوبصورتی سے' نہایت موثر انداز میں قاری اور سامع کے ذہن نشین کراتے ہیں۔

سورت کا انداز ایسا ہے کہ اپنے زندہ و تابندہ اور متحرک مناظر کے ذریعے انسانی احساس کو ہر طرف سے گھیر لیا جاتا

ہے' اس طرح کہ انسان اس تاثر سے نکل کر کہیں بھاگ نہیں سکتا۔ وہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ معانی' مضامین اور واقعات زندہ ہیں اور ابھی وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔

اقوام عاد و ثمود کی تباہیاں یوں بیان ہوئیں کہ گویا ابھی یہ واقعات ہو رہے ہیں۔ فرعون اور قوم لوط کی بستیاں جو الٹ دی گئی تھیں' یوں نظر آتی ہیں کہ گویا نظر آ رہی ہیں اور انسان اشارہ کر سکتا ہے کہ وہ رہیں۔ طوفان نوح گویا برپا ہے اور وہ ہے کشتی بھری ہوئی پردۂ خیال پر۔ اور نہایت ہی مختصر الفاظ ایک دو آیات میں' معانی کے سمندر اور تصاویر پیش کر دی جاتی ہیں۔ ذرا پڑھئے:

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ (٦) سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (٧) فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْ بَاقِيَةٍ (٨) (٦٩: ٦ تا ٨) "اور عاد ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کر دیئے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلسل سات رات اور آٹھ دن ان پر مسلط رکھا۔ (تم وہاں ہوتے تو) دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح پچھڑے پڑے ہیں جیسے وہ کھجور کے بوسیدہ تنے ہوں۔ اب کیا ان میں سے کوئی تمہیں باقی بچا نظر آتا ہے؟"

کون ہے جو ان آیات کو سمجھ کر پڑھے اور اس کے پردۂ احساس پر تیز طوفانی ہوا کا منظر نکھر نہ جائے' جو ہر طرف سے دھاڑتی چنگھاڑتی آ رہی ہو اور توڑ پھوڑ کر ہر چیز کو نیست و نابود کر رہی ہو۔ پوری سات راتیں چل رہی ہو اور آٹھ دن چل رہی ہو اور لوگوں کی لاشوں کا منظر اس میں یوں ہو کہ جیسے کھجور کے درخت جڑ سے اکھاڑ پھینکے گئے ہوں۔

كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (٦٩: ٧) "جیسا کہ کھجور کے بوسیدہ تنے گرے پڑے ہوں"۔ یہ ایسا منظر ہے جو زندہ' آنکھوں کے سامنے متمثل ہوتا ہے۔ بادل میں تخیل کی شکل میں زندہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ کی پکڑ کے دوسرے سب مناظر جو اس میں بیان ہوئے۔

پھر ہمارے سامنے اس دنیا کے خاتمہ کے مناظر آتے ہیں۔ یہ نہایت ہی خوفناک اور ہولناک مناظر ہیں۔ یہ مناظر ہمارے تخیل کے اندر وہ زلزلہ برپا کرتے ہیں کہ پورے ماحول کو خوف' رعب اور درماندگی سے بھر دیتے ہیں۔

وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً (٦٩: ١٤) "زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا"۔ جو بھی اسے پڑھے گا اس کے پردۂ تخیل پر زمین اپنے پہاڑوں سمیت اٹھتی ہے اور یکبارگی دے ماری جاتی ہے اور ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے اور۔

وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ (١٦) وَّالْمَلَكُ عَلٰى اَرْجَآئِهَا (٦٩: ١٧) "اس دن آسمان پھٹے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی' فرشتے ان کے اطراف و

جوانب میں ہوں گے"۔ جو بھی اسے پڑھتا ہے اس کے ذہن میں زمین و آسمان کے اس نظام کا انجام بیٹھ جاتا ہے کہ اس خوبصورت آسمان کا یہ انجام ہو گا۔ اور پھر۔

وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ (۱۷) يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ (۱۸) (۶۹:۱۷ - ۱۸) "فرشتے اس کے اطراف میں ہوں گے اور آٹھ فرشتے اس روز تیرے رب کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے"۔ اس سے انسان کے ذہن میں بادشاہ کے جلال کا تصور آ جاتا ہے۔

اب ذرا اس شخص کی خوشی کو دیکھیں جو اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں پاتا ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے۔ لوگوں کو خوشی کے مارے دکھاتا پھرتا ہے اور پھولا نہیں سماتا۔

هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ (۱۹) اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ (۶۹:۲۰) "لو دیکھو پڑھو میرا نامہ اعمال میں سمجھتا تھا کہ مجھے ضرور اپنا حساب ملنے والا ہے"۔

اور پھر تباہ ہونے والے کا منظر جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جاتا ہے اس کے الفاظ' کلمات اور تاثرات سے حسرت اور مایوسی ٹپکتی پڑتی ہے۔

يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ (۲۵) وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ (۲۶) يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ (۲۷) مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ (۲۸) هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ (۲۹) (۶۹:۲۵ تا ۲۹) "کاش میرا اعمال نامہ مجھے نہ دیا گیا ہوتا اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ کاش میری وہی موت (جو دنیا میں آئی تھی) فیصلہ کن ہوتی۔ آج میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا۔ میرا سارا اقتدار ختم ہو گیا"۔

اور جب انسان اللہ کا آخری فیصلہ سنتا ہے تو کانپ اٹھتا ہے۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ (۳۰) ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ (۳۱) ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ (۳۲) (۶۹:۳۰ تا ۳۲) "پکڑو اسے اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو' پھر اسے جہنم میں جھونک دو' پھر اس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو"۔ اور اللہ کے کارندے ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر ان سب امور کی تعمیل کرتے ہیں۔ اور یہ بدبخت مارا جاتا ہے۔ اور یوں ہو جاتی ہے اس کی حالت:

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ (۳۵) وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ (۳۶) لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ (۳۷) (۶۹:۳۵ تا ۳۷) "لہذا آج نہ یہاں اس کا کوئی یار غم خوار ہے اور نہ زخموں کے

دھوون کے سوا اس کے لیے کوئی کھانا' جسے خطاکاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا"۔

اور آخر میں وہ عظیم دھمکی آتی ہے جس میں تمام انسانوں کے ساتھ رسول کریم بھی شامل ہیں۔ کوئی نہیں ہے جو اسے سن کر کانپ نہ جاتا ہو۔ اور ہیبت میں مبتلا نہ ہو جاتا ہو۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ (٤٤) لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ (٤٥) ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ (٤٦) فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ (٤٧) (٦٩: ٤٤ تا ٤٧) "اور اگر اس (نبیؐ) نے خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے' پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس کام سے روکنے والا نہ ہوتا"۔

غرض پوری سورت میں پر شوکت' زندہ' متحرک مناظر ہیں اور انسانی احساس اس پوری سورت میں ان کی شدید گرفت میں رہتا ہے۔ پوری سورت میں انسانی شعور بڑے اضطراب' الحاح اور دباؤ میں رہتا ہے اور اس پر مثبت اور حقیقی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اس سورت میں آیات کے قافیے اور مقطعے نہایت نغمہ بار اور متنوع ہیں۔ مناظر اور ماحول کے لحاظ سے اثر آفرینی کی جاتی ہے۔ بعض جگہ مد طویل ہے' بعض جگہ تشدید ہے' اور بعض جگہ سکتہ ہے۔ مثلاً

الْحَاقَّةُ (١) مَا الْحَاقَّةُ (٢) وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحَاقَّةُ (٣) (٦٩: ١ تا ٣) میں مد اور تشدید کے بعد یا ہائے ساکت آتی ہے یا اس سے قبل یاء ہے۔ ان تمام مناظر میں جن میں تباہی کے مناظر ہیں' دنیا میں یا آخرت میں یا خوشی اور غم کے مناظر ہیں' ان میں یہی قافیہ ہے۔ اس کے بعد جب حکم بادشاہی یا عدالت عالیہ کا فیصلہ آتا ہے تو یہ قافیہ ایک خوفناک انداز بادشاہی اختیار کر لیتا ہے۔

خُذُوهُ فَغُلُّوهُ (٣٠) ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ (٦٩: ٣١) اس کے بعد جب اس فیصلے کے دلائل دیئے جاتے ہیں تو یہ قافیہ میم و نون سے بدل جاتا ہے اور انداز فیصلہ کن اور دو ٹوک ہو جاتا ہے۔

إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ (٣٣) وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ (٣٤) فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هَاهُنَا حَمِيمٌ (٣٥) وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ (٣٦) (٦٩: ٣٣ تا ٣٦) اور فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (٦٩: ٥٢) حروف قافیہ میں تغیر اور مد کی نوعیت میں تبدیلی مناظر اور موقف اور انداز کلام کی مناسبت سے ہے۔ ہر موقعہ کے محل اور ماحول کے مطابق الفاظ اور قافیوں کا انتخاب ہے۔ اور ہر جگہ احساس پر ایک نیا اثر ہوتا ہے۔ الغرض یہ ایک نہایت پر تاثیر سورت ہے' پر شوکت کلام ربانی ہے۔ اثر کا عالم وہی جانے جو اسالیب کلام عرب سے ذرا بھی واقف ہو۔ انداز کلام بہترین بیانیہ کلام ہے' بہترین نمونہ ہے' بہترین تبصرہ ہے اور بہترین دلائل ہیں۔

--- ○○○ ---

# درس نمبر ۲۶۹ تشریح آیات

## ۱-- تا-- ۵۲

سُوْرَةُ الْحَاقَّةِ مَكِّيَّةٌ (۶۹) (۷۸) اٰيَاتُهَا ۵۲ رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَاۤقَّةُ ۝۱ مَا الْحَاۤقَّةُ ۝۲ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحَاۤقَّةُ ۝۳

"ہونی شدنی! کیا ہے وہ ہونی شدنی؟ اور تم کیا جانو کہ وہ کیا ہے ہونی شدنی؟"

اس سورت کا موضوع اور محور ہولناک مشاہد قیامت ہیں۔ آغاز بھی قیامت کے ایک نام سے ہے اور نام بھی اس سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ نام قیامت کے واقعات کا اظہار اپنے تلفظ اور مفہوم دونوں سے کرتا ہے۔ الحاقہ اس آفت کو کہا جاتا ہے جس کا آنا ٹھہر گیا ہو۔ وہ حق ہو چکی ہو اور اس کا نزول لازمی ہو گیا ہو اور جس نے ہونا ہو اور اٹل ہو۔ یہ سب مفہوم ایسے ہیں کہ جن کے اندر قطعیت 'جزم' شدنی کا مفہوم ہے۔ لہٰذا قیامت کے لیے اس لفظ کا استعمال سورت کے موضوع اور مضمون کے ساتھ نہایت ہی مناسب ہے۔ پھر اس لفظ کے تلفظ کے اندر بھی وہ اشارہ موجود ہے' جو بات اس کے مفہوم میں ہے اور آگے سورت میں جو فضابیان ہوئی ہے اس کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے۔ نیز تکذیب کرنے والوں کا دنیا و آخرت میں جو انجام ہونے والا ہے اس کے لیے یہ لفظ الحاقہ حق ہے اور برحق ہے۔

پوری سورت کی فضا نہایت سنجیدہ اور قطعیت کی فضا ہے اور خوفناک حقیقی فضا ہے۔ ایک طرف تو اس میں قدرت الہیہ کی ہیبت ناکیاں ہیں۔ اور دوسری جانب اس میں اس انسان کی' اس قدرت الہیہ کے سامنے بے بسیاں ہیں اور پھر ان کے ساتھ اس کی خرمستیاں ہیں اور جب وہ اللہ کی شدید گرفت میں آتا ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت کے مناظر میں بھی' اس دنیا میں اس وقت جب یہ اسلامی نظام کو رد کر کے رسولوں کی تکذیب کرتا ہے' تو اللہ کی شدید پکڑ میں آتا ہے اور اس گرفت اور پکڑ کے پھر کئی رنگ ہیں اور ہر رنگ دوسرے سے خوفناک ہے۔ اس لیے کہ یہ اس دنیا میں شتر بے مہار نہیں چھوڑا گیا تھا۔ نہ اس لیے کہ یہاں یہ کچھ اور بن جائے۔ بلکہ اس کا فریضہ یہ تھا کہ رسولوں کا احترام کرے اور ان کی اطاعت کرے۔

اس پوری سورت کے الفاظ' اپنے تلفظ' ترنم' اپنے مفہوم' اپنے اجتماع اور ترکیب کے لحاظ سے یہ فضا بنانے میں

شریک ہیں۔ سورت کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ایک مفرد کلمہ لایا جاتا ہے۔ یہ مبتدا ہے اور اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔

اَلْحَآقَّةُ (۶۹ : ۱) اس کے بعد اس عظیم حادثہ کے بارے میں ایک بھرپور خوفناک اور ہولناک سوال اور استفہام ہے۔

مَا الْحَآقَّةُ (۶۹ : ۲) "کیا ہے 'یہ واقعہ" تمہیں اس کا کیا پتہ ہے کہ یہ کس قدر ہولناک ہو گا۔ اس کے بعد خود ہی بتا دیا جاتا ہے کہ تمہیں کچھ پتہ نہیں ہے کہ یہ کس قدر ہیبت ناک واقعہ ہو گا؟ مخاطب کو لاعلم اور جاہل بنا کر اور بتا کر اس کے ہول اور خوف کو دوچند کر دیا گیا اور اس کے بعد مزید خوفناک بات یہ ہے کہ کوئی جواب نہیں دیا جاتا۔ کوئی وضاحت ابھی نہیں کی جاتی تاکہ خوف اور ہراس کی یہ فضا ذرا دیر تک قائم رہے۔ انسان سوچے کہ کوئی بہت بڑا واقعہ ہے جس کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں ہے اور نہ بتایا جا رہا ہے۔ کیا ہی محیرالعقول انداز ہے!

اس سوال کو یہاں چھوڑ کر مکذبین کو لیا جاتا ہے۔ جن پر اس دنیا میں قیامت گزر گئی جو پیس کر رکھ دیے گئے۔ بہت ہی ناقابل انکار 'سنجیدہ واقعات' کوئی شخص ان واقعات کی تکذیب پر اصرار نہیں کر سکتا۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَ عَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ﴿۴﴾ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ﴿۵﴾ وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ﴿۶﴾ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ﴿۷﴾ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ﴿۸﴾

ثمود اور عاد نے اس اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت کو جھٹلایا۔ تو ثمود ایک سخت حادثہ سے ہلاک کیے گئے۔ اور عاد ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کر دیے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلسل سات رات اور آٹھ دن ان پر مسلط رکھا' تم دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح پچھڑے پڑے ہیں گویا وہ کھجور کے بوسیدہ تنے ہوں۔ اب کیا ان میں سے کوئی باقی بچا نظر آتا ہے؟"

اَلْحَآقَّةُ (۶۹ : ۱) کے بعد قیامت کا دوسرا نام آتا ہے اَلْقَارِعَة۔ یہ نام اَلْحَآقَّةُ (۶۹ : ۱) سے بھی سخت۔ الحاقہ تو وہ واقعہ جو ہونی شدنی ہے اور القرع کے معنی ہیں۔ ایک سخت چیز کو دوسری اسی قسم کی سخت چیز پر مارنا اور قیامت کے قیام کو اَلْقَارِعَة اسی لیے کہا گیا ہے' اس کی وجہ سے دلوں پر ہولناک اور خوفناک ضربات پڑیں گی اور یہ پوری کائنات توڑ پھوڑ کا شکار ہو جائے گی۔ لفظ اَلْقَارِعَة بھی اپنے تلفظ' اپنی سخت آواز کی وجہ سے ٹکراتا' مارتا اور دلوں کے اندر جزع و فزع پیدا کرتا ہے۔ عاد اور ثمود نے اس ہونی شدنی کا انکار کیا' اس کھڑکھڑا کر ٹوٹ پڑنے والی آفت یعنی قیامت کا انکار کیا۔

فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ (۶۹ : ۵) "ثمود ایک بڑے حادثہ سے ہلاک کیے گئے"۔ جیسا کہ

دوسری سورتوں میں آیا ہے ۔ثمود شمالی حجاز کے علاقہ حجر میں رہتے تھے ' حجاز اور شام کے درمیان ۔ یہ ایک سخت دھماکے کی آواز سے ہلاک کیے گئے ۔ دوسری جگہوں پر اس کے لیے الصیحہ کا لفظ آیا ہے ' لیکن یہاں ات الطاغیہ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ کیونکہ الطاغیہ کے معنی ہیں ایک ایسا حادثہ جس پر کنٹرول نہ کیا جا سکتا ہو ' اور یہاں اس سورت کی فضا میں ہولناکی اور خوفناکی کے اظہار کے لیے بھی لفظ الطاغیہ موزوں تھا اور جو قافیہ سابقہ آیات کا چلا آ رہا تھا اس کے لیے بھی یہ تبدیلی ضروری تھی ' اس لیے الصیحہ کی جگہ الطاغیہ کا لفظ آیا۔ثمود کا قصہ صرف اس ایک آیت سے تمام کر دیا گیا ۔ دفتر لپیٹ لیا گیا ' وہ ڈوب گئے اور ہوا نے ان کی خاک بھی اڑادی اور الطاغیہ نے انہیں یوں روندا کہ ان کا سایہ تک باقی نہ رہا۔

لیکن عاد کی تباہی کو ذرا تفصیل اور طوالت سے لیا جاتا ہے ۔ یہ اس لیے کہ ان کا عذاب بھی سات راتیں اور آٹھ دنوں تک مسلسل جاری رکھا گیا تھا۔ جبکہ ثمود ایک چیخ ' ایک کڑک کے ساتھ چشم زدن میں تباہ ہو گئے تھے ۔

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ (۶۹ : ۶) " عاد ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کر دیئے گئے "۔ الریح الصرصر کے معنی ہیں ' سخت ٹھنڈی ہوا۔لفظ صرصر سے ہوا کی آواز بھی ظاہر ہو رہی ہے ۔ اور اس ہوا کی زیادہ شدت ایک دوسرے لفظ عَاتِيَة سے ظاہر کی گئی تاکہ عاد کی سرکشی کا علاج اس سرکش ہوا سے کیا جائے ۔ مناسب عمل کی مناسب سزا۔ یہ عادی سخت جبار اور سرکش تھے ۔ قرآن نے دوسری جگہ تفصیلات دی ہیں ۔ یہ لوگ یمن اور حضرموت کے درمیان احقاف میں رہتے تھے ۔ یہ نہایت سخت گیر اور جبار تھے ۔ یہ ہوا جو صرصر تھی اور " عاتی " تھی " شدید سرد اور سرکش "۔

سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا (۶۹ : ۷) " اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن ان پر مسلط کیا "۔ الحسوم کے معنی ہیں مسلسل کاٹ دینے والی ۔ یہ شدید چلنے والی ' دھاڑتی چنگھاڑتی اور تباہی مچاتی ہوئی ' اس طویل عرصے کے لیے مسلسل جاری تھی ۔جس کا وقت قرآن تعین کے ساتھ کر رہا ہے ۔

فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (۶۹ : ۷) " تم دیکھتے کہ وہاں اس طرح پچھڑے پڑے ہیں جیسا کہ کھجور کے بوسیدہ تنے "۔ گویا یہ منظر اسکرین پر پیش ہو رہا ہے یا سامنے ہے ۔ انداز تعبیر ایسا ہے کہ پردۂ احساس پر منظر نمودار ہو جاتا ہے ۔ صرعیٰ ۔ وہ گرے پڑے اور بکھرے ہوئے ۔ گویا وہ ایسے ہیں جیسے اعجاز نخل ۔ (کھجور کے تنے جڑوں اور تنوں کے ساتھ ) خاویہ یعنی بوسیدہ جو اندر سے خالی ہوں اور بوسیدگی کی وجہ سے جگہ جگہ گرے ہوئے ہوں ۔ یہ ایک ایسا منظر ہے کہ چند الفاظ میں اس کا نقشہ قرآن ہی کھینچ سکتا ہے ۔ اب نہایت ہی ٹھہراؤ ہے اور وہ منظر کہ جب ہوا چنگھاڑتی ہوئی گزر گئی ہے ۔

فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ (۶۹ : ۸) " پھر کیا اب ان میں سے کوئی باقی بچا ہوا نظر آتا ہے "۔ نہیں کچھ بھی باقی نہیں ہے ۔ ویرانی ہی ویرانی ہے ۔

یہ تو ہے عاد و ثمود کا قصہ ' یہی حال ہے دوسرے مکذبین کا ۔ اب فقط دو آیات میں کئی واقعات ۔

وَ جَآءَ فِرْعَوْنُ وَ مَنْ قَبْلَهٗ وَ الْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۝۹ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝۱۰

"اور اسی خطائے عظیم کا ارتکاب فرعون اور اس سے پہلے کے لوگوں نے اور تلپٹ ہو جانے والی بستیوں نے کیا۔ ان سب نے اپنے رب کے رسول کی بات نہ مانی تو اس نے ان کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑا"۔

فرعون مصر میں تھا۔ یہ حضرت موسیٰ کے دور کا فرعون تھا۔ اس سے قبل اس کی تفصیلات نہیں آئیں۔ المؤتفکت سے وہ بستیاں مراد ہیں جو ہلاک ہوئیں' تباہ ہوئیں' تلپٹ ہوئیں۔ یہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں تھیں' جن کو ہلاک کیا گیا اور یوں کہ انہیں الٹ دیا گیا۔ لفظ مؤتفکت کے مفہوم میں یہ دونوں باتیں آتی ہیں۔ ان سب لوگوں کے کام اور بدعملی کو الخاطئۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی انہوں نے غلط فعل کا ارتکاب کیا۔ یہ الخطیئۃ سے ماخوذ ہے یعنی عظیم غلطی۔ یہاں فعصوا رسول ربهم (۶۹ : ۱۰) "ان سب نے اپنے رب کے رسول کی بات نہ مانی"۔ حالانکہ انہوں نے کئی رسولوں کی بات نہ مانی تھی۔ ایک رسول نہ تھا لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے رسول اور رسالت ایک ہی چیز ہے۔ گویا تمام رسول ایک ہی رسول ہیں۔ قرآن کریم کے یہ انوکھے اشارات میں سے ایک اشارہ ہے۔ اور اس سورت کی فضا کے مطابق ان سب کا ایک ہی ہولناک انجام ذکر کر دیا جاتا ہے۔ جو فیصلہ کن انجام ہے۔

فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً (۶۹ : ۱۰) "تو اس نے ان کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑا"۔ رابیہ کے معنی ہیں : اعلیٰ' ڈھانپنے والی' دفن کرنے والی۔ یہ لفظ یہاں اس لیے لایا گیا ہے کہ لفظ طاغیہ کے ساتھ مناسبت پیدا ہو جائے جو ثمود پر آئی ہے۔ اور عاتیہ کے ساتھ یکساں ہو جائے جو عاد پر پڑی۔ اور اس سورت کی فضا اور ماحول سے مناسب لفظ بھی فراہم ہو جائے لیکن تفصیل اور طوالت بھی نہ ہو کیونکہ اس سورت میں انحصار بھی ملحوظ ہے۔

اب اس کے بعد سفینہ جاریہ کا منظر۔ اس میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی ہلاکت کے منظر کی طرف اشارہ ہے۔ انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب کی۔ حضرت نوح کا یہ امتیاز ہے کہ ان کے ساتھیوں کی نسل ہی سے موجودہ آبادی چلی ہے۔ لیکن انسانوں نے اس عظیم معجزے سے نہ عبرت پکڑی اور نہ خدا کا شکر ادا کیا' کہ اس واقعہ میں اللہ نے ہمارے اجداد کو بچایا۔

اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝۱۱ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّ تَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۝۱۲

"جب پانی کا طوفان حد سے گزر گیا تو ہم نے تم کو کشتی میں سوار کر دیا تھا تاکہ اس واقعہ کو تمہارے لیے ایک سبق آموز یادگار بنا دیں اور یاد رکھنے والے کان اس کی یاد محفوظ رکھیں"۔

یہ پانی کی پہاڑوں کی طرح موجیں اور ان پر چلنے والی کشتی کا منظر' دونوں اس سورت کی خوفناک فضا کی خوفناکیوں میں اضافہ کرنے والے ہیں۔ اور سورت کے مناظر کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہیں اور جاریہ اور واعیہ کے الفاظ قافیہ کو یکساں کرتے ہیں۔ اور پھر یہ نصیحت آموز تبصرہ۔

لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ (۶۹: ۱۲) "تاکہ اس واقعہ کو تمہارے لیے ایک سبق آموز یادگار بنا دیں اور یاد رکھنے والے کان اس کی یاد محفوظ رکھیں"۔ یہ نصیحت جامد اور پتھر دل پر بھی اثر کرتی ہے۔ اور یہ آواز ایسے کانوں سے بھی پار ہو جاتی ہے' جن پر کوئی آواز اثر نہیں کرتی۔ جو ہر چیز کو سننے سے انکار کرتے ہیں اور تکذیب کرتے ہیں۔ رسولوں کا انکار اور امم سابقہ کی ہلاکتوں سے چشم پوشی سے تمام نشانات' معجزات اور تذکروں کا انکار۔ اللہ کی نعمتوں اور ان کے آباؤ اجداد پر ہونے والی نعمتوں کا انکار۔

اب ایک عظیم ہولناک منظر آتا ہے اور اس کے سامنے یہ سب چھوٹے چھوٹے مناظر نہایت ہی چھوٹے نظر آتے ہیں۔ یہ ہے ہولناک منظر الحاقہ کا۔ القارعہ کا جس کی یہ لوگ اس کے باوجود تکذیب کرتے ہیں کہ انہوں نے ان امم سابقہ کا انجام ابھی دیکھ لیا جنہوں نے تکذیب کی تھی۔

اقوام سابقہ کی ہلاکتوں کا خوف محدود ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ بھی بہت بڑا خوف ہے' کیونکہ قیامت سے قبل ہونے والی تباہی کے مقابلے میں یہ سب تباہیاں بہرحال محدود اور معمولی ہیں۔ اس مختصر تمہید کے بعد اب پردہ اٹھایا جاتا ہے۔ اس عظیم' ہمہ گیر تباہی اور ہولناکی کے مناظر سے۔ یہ بڑا منظر سابقہ چھوٹے مناظر کا تکملہ ہے۔

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ﴿۱۶﴾ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ؕ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴿۱۷﴾

"پھر جب ایک دفعہ صور پھونک مار دی جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا' اس روز وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا۔ اس دن آسمان پھٹے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی' فرشتے ان کے اطراف و جوانب میں ہوں گے اور آٹھ فرشتے اس روز تیرے رب کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے"۔

ہمارا ایمان ہے کہ ایک دن صور پھونکا جائے گا اور اس کے بعد پھر علی الترتیب یہ واقعات ہوں گے۔ ان واقعات کی تفصیلات اور ان کی کیفیات کو ہم یہاں قلم بند نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ واقعات عالم غیب میں ہونے والے ہیں۔ اور ہمارے پاس چونکہ یہ آیات ہی ہیں جو مجمل ہیں اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس میں تفصیلات دی گئی ہوں۔ اور ان نصوص میں اگر تفصیلات دے بھی دی جاتیں تو اصل مقصد جو یہاں دینا مقصود تھا' اس میں کوئی اضافہ نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا ان تفصیلات کے پیچھے پڑنا ایک عبث بات ہے۔ محض ظنوں اور قیاسات سے شریعت نے منع کیا ہے۔

جب صور پہلی بار پھونکا جائے گا اور اس کے بعد یہ ہولناک حرکات و تغیرات ہوں گے۔

وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً (۶۹: ۱۴) "اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھاکر ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا"۔ زمین اور پہاڑوں کو یکبارگی اٹھاکر پٹخ دینا جو سب اونچ نیچ کو برابر کر دے اور یہ نہایت ہی خوفناک منظر ہو گا۔ یہ زمین جس کے اندر انسان پرامن طور پر چلتا پھرتا ہے اور اطمینان سے زندگی بسر کرتا ہے۔ اور یہ زمین انسان کے نیچے نہایت ہی سکون سے رکی ہوئی ہے۔ اور یہ اونچے گہرے اور مضبوط پہاڑ جن کے ثبات و قرار سے انسان کو خوف ہوتا ہے۔ اپنی اس اونچائی اور عظمت کے باوجود اٹھاکر پٹخ دیئے جائیں گے۔ جس طرح بال کو اٹھاکر مار دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جو انسان کو قدرت خداوندی کے مقابلے میں اس کی اور اس کرۂ ارض کی کمزوری، چھوٹائی اور نہایت ہی بے وزنی کا اظہار کرتا ہے۔

جب صور میں ایک بار پھونک مار دی گئی اور یہ سب ہولناک واقعات ہو گئے زمین اور پہاڑوں کو اٹھاکر ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔ تو یہ سورت جس ہولناک امر کا اظہار کر رہی ہے یہ امر اس دن وقوع پذیر ہو گا۔

فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (۶۹: ۱۵) اور واقعہ بھی قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ جس طرح الحاقہ اور القارعہ ایک نام ہے۔ واقعہ اس لیے کہ اس نے واقع ہونا ہے۔ اس کی اصل حقیقت ایک واقعہ ہی کی ہے۔ یہ اس قسم کا نام ہے جس میں ایک خاص اشارہ ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو اس میں شک کرتے رہیں۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ تو واقعہ ہے۔

اور معاملہ یہیں تک محدود نہیں ہے کہ زمین اور پہاڑوں کو ایک گیند کی طرح اٹھاکر زمین پر مار دیا جائے گا اور یہ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے بلکہ آسمان میں بھی تغیرات رونما ہوں گے۔ آسمان صحیح سلامت نہ رہے گا۔

وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ (۶۹: ۱۶) "اس دن آسمان پھٹے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی"۔ اور ہمیں معلوم نہیں ہے کہ اس آسمان سے کون سا آسمان مراد ہے۔ جس کے شق کا یہاں ذکر ہے۔ لیکن یہ آیات اور دوسری آیات اشارہ اس طرف کر رہی ہیں کہ قیامت کے دن ہولناک فلکی تغیرات اور تضادات ہوں گے۔ مقصد یہ ہے کہ کرات فلکی کی چولیں کھل جائیں گی اور جس چیز نے اس نظام کو ایک منظم طریقے سے نکا رکھا ہے، اس کا نظم کھل جائے گا۔ اور جب یہ نظام کھل گیا تو اس کا انتشار دیدنی ہو گا۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج کل علمائے فلک نے آخرکار موجود نظام کے خاتمے کی جو صورت اپنے مشاہدات سے تجویز کی ہے وہ بعینہ وہی ہے، جو قرآن تجویز کرتا ہے۔ حالانکہ انہوں نے یہ اندازے محض سائنسی مشاہدات سے لگائے ہیں۔ انہوں نے بہرحال اس کائنات کے بارے میں بہت قلیل مشاہدہ کیا ہے اور اس قلیل مشاہدے پر یہ مفروضے قائم کیے ہیں۔

لیکن ہم مومنین وہ مفروضے ان قرآنی آیات کے اندر نہایت مفصل انداز میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ نہایت مجمل آیات ہیں اور یہ متعین واقعات نہیں بلکہ اصولی اور کلی واقعات بیان کرتی ہیں۔ ہم بس صرف ان اصولی واقعات پر اکتفا کرتے ہیں، جو قرآن نے بیان کیے۔ یہ ہمارے لیے سچی خبریں ہیں۔ کیونکہ یہ آیات اس ذات نے بیان کی ہیں جس نے

قرآن بھی نازل کیا ہے اور کائنات کو بھی بنایا ہے ـ اور جو اپنی مخلوقات کو ہمارے محدود مشاہدات سے بڑھ کر بہت ہی اچھی طرح جانتا ہے ـ کیونکہ اللہ کی کائنات میں 'یہ زمین اور یہ پہاڑ اور زمین اور سورج کے ساتھ تمام کہکشاں اور ستارے ایسے ہی ہیں جیسے زمین کے اوپر غبار کے چھوٹے چھوٹے ذرات اڑتے ہیں ـ لہٰذا ہم میں سے ایک انسان جس طرح دو ذرات کو اٹھا کر پھینک سکتا ہے 'اللہ کے نزدیک زمین کو اٹھا کر پھینکنا ایسا ہی ہے تو قیامت میں جب آسمانوں کی بندش کھلے گی تو زمین و آسمان ذرات کی طرح اڑتے پھریں گے اور یہ باتیں بھی قرآن کی زندہ آیات سے معلوم ہوتی ہیں ـ

اب رب ذوالجلال کا جلال منظر پہ چھا جاتا ہے 'اور صور پھونکے جانے اور زمین اور پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہونے اور بھونچال و انتشار کے بعد اس پوری کائنات میں ایک ٹھہراؤ آ جاتا ہے ـ اور رب ذوالجلال اور قہار کی بزرگی اور عظمت چھا جاتی ہے ـ

وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ (۶۹:۱۷)

"فرشتے اس کے اطراف و جوانب میں ہوں گے اور آٹھ فرشتے اس روز تیرے رب کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے"ـ فرشتے اس کائنات و سماوات کے اطراف و جوانب میں ہوں گے اور اس کائنات کے اوپر عرش الٰہی ہو گا اور اس کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے ـ یہ آٹھ فرشتے ہوں گے یا آٹھ صفیں ہوں گی یا ان کے آٹھ طبقات ہوں گے یا یہ آٹھ اللہ کے علم میں ہوں گے کہ وہ کیا ہوں گے؟ یہ آٹھ کون ہیں اور کیا ہیں؟ اس کی تفصیلات کا بھی ہمیں علم نہیں ہے ـ نہ ہمیں عرش کی کیفیت کا علم ہے نہ اٹھانے کی کیفیت کا علم ہے ـ ہم ان تمام امور کو ایک طرف چھوڑ دیتے ہیں 'اس لیے کہ ان کا تعلق غیبی معاملات سے ہے جن کا تفصیلی علم ہمیں نہیں دیا گیا اور ہمیں اللہ نے ان چیزوں کے تفصیلی علم کے حصول کا نہ مکلف بنایا ہے 'نہ حصول کا حکم دیا ہے ـ ہم ان تفصیلات کو بھی اللہ کے غیبی علم پر چھوڑ دیتے ہیں ـ بس اب اللہ ہی اللہ ہو گا 'سب کچھ فنا ہو گا اور یہی شعور ہے جو قرآن اور یہ سورت ہمیں دینا چاہتی ہے کہ ہم اللہ سے ڈریں 'قیامت کی جوابدہی سے ڈریں اور اللہ کی قدرت اور جلالت سے ڈریں ـ

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾

"وہ دن ہو گا جب تم لوگ پیش کیے جاؤ گے 'تمہارا کوئی راز بھی چھپا نہ رہ جائے گا"ـ سب کے سب کھلے اور ننگے ہوں گے ـ جسم بھی 'ضمیر بھی 'عمل بھی اور انجام بھی ـ وہ تمام راز جو پردوں کے نیچے تھے 'کھل کر سامنے آ جائیں گے ـ انسانی نفس ننگا ہو گا 'انسانی جسم ننگا ہو گا 'انسانی عیوب سامنے آ جائیں گے ـ گواہ سامنے آ جائیں گے ـ انسان کی مکاریاں اور فن کاریاں کافور ہو جائیں گی ـ سب حیلے تدبیریں بے اثر ہوں گی ـ اور وہ باتیں بھی کھل جائیں گی جن کو وہ اپنے آپ سے چھپاتا تھا ـ یہ کس قدر شرمندگی ہو گی کہ وہ راز طشت از بام ہوں گے ـ لوگوں کی نظروں میں انسان کس قدر شرمندہ ہوں گے ـ رہے اللہ تو اس کے سامنے تو پہلے بھی سب کچھ کھلا تھا ـ اب بھی کھلا ہے لیکن انسان کے ذہن میں یہ بات شعوری طور پر بیٹھی نہیں ہے ـ اس لیے کہ اس کے شعور میں زمین کے اندر ایک انسان اور انسان کے درمیان پردہ داری کا شعور ہے جبکہ قیامت کے دن فرق صرف یہ ہو گا کہ اس بیچارے انسان کے شعور میں پردے کا جو شعور تھا وہ اٹھ جائے

گا۔ اور وہ سمجھے گا کہ سب پردے گر گئے ہیں۔ اس کائنات میں سب چیز کھلی ہے۔ اب جبکہ زمین اٹھا کر پٹخ دی گئی ہے تو تمام اوٹ ختم ہو گئے ہیں۔ یہ ہموار ہے' میدان ہے۔ آسمان کی بندشیں بھی کھل گئی ہیں اور آسمانوں کے پیچھے بھی کوئی شے چھپی نہیں ہے۔ اجسام بھی ننگے ہیں' انسانی نفسیات بھی کھلی ہیں' نہ راز ہے اور نہ نیاز ہے۔

مگر یہ ایک نہایت پریشان کن کام ہے اور یہ اس پوری زمین اور تمام پہاڑوں سے بھی بڑا کام ہے۔ اور اس سے بھی شدید ہے کہ آسمان پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نیچے گر جائیں کہ انسان بالکل ننگا کھڑا ہو' اس کی نفسیاتی کیفیات لوگوں پر کھل جائیں' اس کا شعور بھی عیاں ہو جائے' اس کی پوری ہسٹری سامنے آ جائے' اس کے تمام کرتوت فلم میں بند ہو جائیں اور اس کی تمام چھپی ہوئی باتیں کھل جائیں اور یہ سب امور پوری انسانیت کے بھی سامنے آ جائیں۔ فرشتوں کے سامنے' جنوں کے سامنے' انسانوں کے سامنے اور وہ اللہ کے عرش و جلال بادشاہی کے نیچے ہوں گے اور سخت خوفزدہ ہوں گے۔

انسانی مزاج اور نفسیات نہایت پیچیدہ ہوتی ہیں۔ انسانی نفسیات کے اندر بے شمار نشیب و فراز ہوتے ہیں جس کے اندر اس کا نفس' جس کے اندر اس کے مشاعر' اور جس کے اندر اس کے جذبات اور میلانات ہوتے ہیں' اچھے یا برے۔ اس کی صلاحیتیں اور اس کے پوشیدہ راز ہوتے ہیں۔ (توقعہ بالامیہ ص ۸۱) سیپی کے سمندری جانور کی طرح کہ جب اسے ایک سوئی یا کانٹا بھی چبھ جائے تو وہ بڑی جلدی سے سکڑ کر اپنی سیپی کے خول میں چھپ جاتا ہے۔ اور مکمل طور پر اندر داخل ہو جاتا ہے۔ اور اپنے آپ کو پوری طرح بند کر دیتا ہے۔ انسان بھی ایسا ہی کرتا ہے۔ جب اسے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی آنکھ اسے دیکھ رہی ہے اور اس کی تمام حرکات نوٹ رہی ہیں اور وہ جن چیزوں کو چھپا رہا ہے وہ تو ظاہر ہو گئی ہیں۔ تو انسان نہایت شدید تکلیف محسوس کرتا ہے کہ اس کے نہایت ہی خفیہ معاملات بھی کھل گئے ہیں۔

اب دیکھئے کہ اس قسم کا انسان اس دن ننگا ہو گا اور ہر طرح سے ننگا ہو گا' جسم اور قلب کے لحاظ سے ننگا ہو گا۔ شعور' نیت اور ضمیر کے لحاظ سے ننگا ہو گا۔ ہر پردے سے محروم ہو گا۔ اور وہ اللہ جبار و قہار کے تحت الحکم ہو گا اور تمام روئے زمین کے انسانوں اولین و آخرین کے سامنے ہو گا۔ یہ بہرحال ایک کڑوی صورت حال ہو گی ہر چیز سے زیادہ کڑوی اور تلخ۔ اس کے بعد نجات پانے والوں اور جہنم میں بھیجے جانے والوں کا منظر پیش کیا جاتا ہے۔ یوں جیسا کہ یہ منظر آنکھوں کے سامنے ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِیَهْ ۚ﴿۱۹﴾ اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ ۚ﴿۲۰﴾ فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ۙ﴿۲۱﴾ فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ ۙ﴿۲۲﴾ قُطُوْفُهَا دَانِیَةٌ ﴿۲۳﴾ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِیْٓــٴًـۢا بِمَاۤ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَةِ ﴿۲۴﴾

"اس وقت جس کا نامہ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا "لو دیکھو' پڑھو میرا نامہ اعمال' میں سمجھتا تھا کہ مجھے ضرور اپنا حساب ملنے والا ہے"۔ پس وہ دل پسند عیش میں ہو گا' عالی مقام جنت میں' جس کے پھلوں کے گچھے جھکے پڑ رہے ہوں گے۔ (ایسے لوگوں سے کہا جائے گا) مزے سے کھاؤ اور پیو اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم نے

گزرے ہوئے دنوں میں کیے ہیں"۔

یہ کہ اعمال نامہ دائیں ہاتھ اور بائیں ہاتھ میں دیئے جانے اور آگے سے اور پیچھے سے دیئے جانے کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ عملاً ایسا ہو گا اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ عربی زبان کے یہ محاورے میں 'اچھے سلوک کی تعبیر دائیں ہاتھ سے اور برے سلوک کی تعبیر بائیں سے کی گئی ہے یا برے سلوک کی صورت میں اعمال نامہ پیچھے سے دیا جانا تعبیر کیا گیا ہے جو بھی مفہوم ہو۔ اس لیے ہم اس بحث میں نہیں پڑتے 'اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ ناکام لوگوں کے ساتھ وہاں اچھا سلوک نہ ہو گا۔

جو منظر یہاں پیش کیا گیا ہے' وہ اس شخص کا ہے جو کامیاب ہو گیا وہ دن نہایت ہی خوفناک ہو گا' اس لیے اس منظر میں یہ شخص نہایت ہی فرحاں و شاداں ادھر ادھر دوڑ رہا ہے۔ دیکھو صفیں چیرتا ہوا دوستوں کو تلاش کر رہا ہے۔ اس کے جسم کے روئیں روئیں سے خوشی ٹپک رہی ہے اور وہ خوشی کے مارے چلا اٹھتا ہے۔

هَآءُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ (٦٩: ١٩) "دیکھو' یہ ہے پڑھو میرا اعمال نامہ"۔ اس کے بعد وہ مزید خوشی کا اظہار یوں کرتا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ مجھے یقین نہ تھا کہ میں نجات پا جاؤں گا بلکہ مجھے ڈر یہ تھا کہ مجھ سے حساب لیا جائے گا۔ اور حدیث میں ہے۔

من نوقش الحساب عذب "جس کا حساب کتاب مناقشہ کے ساتھ کیا گیا' بس وہ عذاب دیا گیا"۔ حدیث میں آتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے ساتھ حساب و کتاب میں جھگڑا کیا گیا بس وہ عذاب میں مبتلا ہوا۔ میں نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ

مَسْرُوْرًا "تو حضور ﷺ نے جواب دیا۔ اس میں تو یہ ہے کہ ہر کسی کے سامنے اس کا حساب پیش کیا جائے گا۔ قیامت کے دن عملاً آڑے نہ ہو گا۔ اگر کسی کے ساتھ ہوا تو مارا گیا"۔ (بخاری' مسلم' ابو داؤد)

ابن ابوحاتم نے روایت کی' بسر ابن بکر واسطی سے' انہوں نے زید ابن ہارون سے' انہوں نے عاصم ' احول سے' انہوں نے ابو عثمان سے وہ کہتے ہیں: مومن کو اس کے دائیں ہاتھ میں اس کا اعمال نامہ دیا جائے گا۔ نہایت خفیہ انداز میں' وہ اپنی کوتاہیاں اس میں پڑھے گا۔ جوں جوں وہ اپنے گناہ پڑھتا جائے گا۔ اس کا رنگ بدلتا جائے گا۔ پھر یہ اپنی نیکیاں پڑھے گا تو اس کی حالت بحال ہو گی۔ پھر وہ اچانک دیکھے گا کہ اس کی تمام بداعمالیاں نیکیوں میں بدل جائیں گی۔ اس وقت پھر یہ لوگوں سے خوش ہو کر کہے گا۔

هَآءُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ (٦٩: ١٩) "یہ ہے پڑھو' میرا اعمال نامہ"۔

حضرت عبداللہ ابن حنظلہ سے روایت ہے' جن کا لقب غسیل ملائکہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اللہ اپنے بندے کو قیامت میں کھڑا کرے گا تو اس کی برائیاں اس کے اعمال نامے کی پشت یعنی پہلے ہی صفحے پر درج ہوں گی۔ اور اسے کہے گا تم نے یہ کیا ہے تو وہ کہے گا ہاں اے رب' تو اللہ تعالیٰ اسے کہے گا میں نے تجھے دنیا میں شرمندہ نہیں کیا اور میں نے تمہیں بخش دیا

ہے ۔اس وقت یہ بندہ یہ کہے گا۔

هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ (۶۹ : ۱۹) "یہ ہے پڑھو' میرا اعمال نامہ"۔

اور صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ہے جب ان سے نجویٰ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا "میں نے رسول اللہ سے سنا:" اللہ قیامت کے دن اپنے بندے کے قریب ہو گا۔اس سے اس کے تمام گناہوں کا اقرار لیا جائے گا۔جب وہ بندہ یہ یقین کرلے گا کہ بس وہ مارا گیا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔میں نے یہ باتیں دنیا میں چھپا رکھی تھیں اور اب یہاں میں انہیں معاف کرتا ہوں۔اس کے بعد اس کی اچھائیوں کی کتاب اس کے دائیں ہاتھ میں دی جائے گی۔رہے کافر اور منافق 'تو گواہ کہیں گے یہ وہ لوگ ہیں' جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا۔خبردار اللہ کی لعنت ہو کافروں پر"۔

اس کے بعد علی الاعلان بتا دیا جائے گا کہ ان لوگوں کے لیے اللہ نے یہ یہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں۔یہاں اس کے سامنے ایسی حسی اور مادی نعمتیں گنوائی جا رہی ہیں۔جن کو عرب اچھی طرح مادی ترقی کا کمال سمجھتے تھے۔اس وقت کے لوگ چونکہ دور جاہلیت سے ابھی ابھی ایک بدوی معاشرہ سے نکل کر آئے تھے' اس لیے ان کے مزاج کے مطابق بعض پسندیدہ باتیں یہاں گنوائی جاتی ہیں۔کیونکہ نہ تو وہ زیادہ ترقی یافتہ تھے اور نہ جنت کی نعمتوں کا کوئی تصور کر سکتا ہے۔

فَهُوَ فِىْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (۲۱) فِىْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ (۲۲) قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ (۲۳) كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِيْٓئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِى الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ (۲۴) (۶۹ : ۲۱ تا ۲۴) پس وہ دل پسند عیش میں ہو گا' عالی مقام جنت میں' جس کے پھلوں کے گچھے جھکے پڑ رہے ہوں گے۔(ایسے لوگوں سے کہا جائے گا) مزے سے کھاؤ اور پیو اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیے ہیں"۔یہ نعمتیں اور پھر ان کے ساتھ ساتھ یہ اعزاز و اکرم اور یہ تواضع اور پھر باری تعالیٰ کی طرف سے یہ مکالمہ "کھاؤ اور پیو' اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیے ہیں"۔یہ وہ سادہ رنگ ہے جہاں تک عہد اول کے مسلمانوں کا تعلق باللہ پہنچ گیا تھا' حالانکہ اللہ کے قرب میں اس سے بھی زیادہ انعامات ہیں۔نیز تعلق باللہ اور جنتوں کے ان انعامات میں بعض لوگوں کے لیے قیامت تک کشش رہے گی۔لوگوں کے بھی رنگ اور اقسام ہیں اور نعمتوں کے بھی رنگ و اقسام ہیں۔

وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ۬ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِیَهْ ۚ﴿۲۵﴾ وَ لَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ ۚ﴿۲۶﴾ یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِیَةَ ۚ﴿۲۷﴾ مَاۤ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ ۚ﴿۲۸﴾ هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ ۚ﴿۲۹﴾

"اور جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا "کاش میرا اعمال نامہ مجھے نہ دیا گیا ہوتا اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے ۔ کاش میری وہی موت (جو دنیا میں آئی تھی) فیصلہ کن ہوتی ۔ آج میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا ۔ میرا سارا اقتدار ختم ہو گیا"۔

اب یہ شخص جان چکا ہے کہ اس کے خلاف فیصلہ ہو چکا ہے ۔ اور اس کا انجام کار آخر کار جہنم رسیدگی ہے ۔ یہ اس میدان میں نہایت ہی حسرتناک انجام لیے کھڑا ہے ۔ نہایت درجے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے ۔ اور درج بالا تبصرہ وہ کرتا ہے ۔

نہایت طویل منظر ہے اس شخص کا ۔ اس کی حسرت کو ذرا طوالت سے بیان کیا گیا ہے ۔ اس قدر کہ ایک قاری یہی سمجھتا ہے کہ یہ بیان ختم ہی نہ ہو گا ۔ لہجہ بھی مایوس کن ہے لیکن یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز کہ وہ بعض مناظر و مواقف کو طوالت دیتا ہے اور بعض کو چند جملوں میں بیان کر دیتا ہے ۔ اور اس طرح نفس انسانی پر نہایت ہی مفید اثرات چھوڑ دیتا ہے ۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ حسرت اور پشیمانی کی سوچوں کو ذرا طوالت دی جائے تاکہ لوگ ابھی سے سوچ لیں کہ وہاں کس قدر حسرت اور شرمندگی کا سامنا ہو گا ۔ عذاب تو بہت بڑی چیز ہے ۔ چنانچہ اس منظر کو ذرا طویل کر دیا گیا کیونکہ سیاق کلام میں اصل مقصود یہی تھا ۔ اس میں عبارت بھی بڑی نغمہ بارے ۔ یہ بدبخت شخص تمنائیں کرتا ہے کہ اے کاش یہ وقت نہ آتا ۔ اسے کتاب اعمال ہی نہ دی جاتی' اسے علم ہی نہ ہوتا کہ کیا ہوا ۔ اور یہ کہ یہ قیامت کا وقت یا اس لیے جو موت آئی تھی' وہ دائمی ہو جاتی ۔ میرے وجود کے عناصر ترکیبی ہی ختم کر دیئے جاتے ۔ مزید افسوس اس پر کہ دنیا میں جن چیزوں پر وہ فخر کرتا تھا وہ اس کے لیے بالکل نافع نہیں ہے ۔

مَآ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ (٦۹ : ۲۸) "آج یہاں میرا مال میرے کچھ کام نہیں آیا"۔ بلکہ میرا سب کا سب اقتدار جاتا رہا ہے' نہ مال مفید ہے اور نہ میرا اقتدار مفید رہا ہے ۔ بات کی ٹون نہایت ہی حسرت اور یاس سے بھری ہوئی ہے ۔ اور قرآن کریم نے اس کے لیے جو قافیے چنے ہیں وہ اسے نہایت طویل کر دیتے ہیں (جس طرح کوئی میت پر روتا ہے) یوں کہ آخر میں ہا ۔ اور اس سے قبل یا ۔ اور اس سے قبل الف ۔ کتابیہ' حسابیہ' قاضیہ' مالیہ اور سلطانیہ ۔ الفاظ بھی ایک قسم کا مد ہے اور حسرت آمیز ہے ۔ اور نہایت ہی فصیح و بلیغ انداز میں ۔

یہ نہایت ہی حسرتناک ٹون اس وقت ختم ہوتی ہے' جب عدالت خداوندی سے ایک زوردار ڈگری کے ساتھ تعمیل کے احکام بھی صادر ہوتے ہیں ۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴿٣٠﴾ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ﴿٣١﴾ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴿٣٢﴾

"(حکم ہو گا) پکڑو اسے اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو' پھر اسے جہنم میں جھونک دو' پھر اس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو"۔

کس قدر ہولناک احکام ہیں' کس قدر قابل دہشت ہے اور جلال ربی کس قدر نمایاں ہے !!

خُذُوْهُ (۶۹ : ۳۰) "پکڑو اسے" یہ حکم اللہ العلی العظیم کی طرف سے صادر ہو رہا ہے ـ اس کمزور و نحیف اور عاجز و مسکین پر پوری کائنات ٹوٹ پڑتی ہے ـ ہر طرف سے مامورین لپکتے ہیں ـ ابن ابو حاتمؒ منہال ابن عمر سے روایت کرتے ہیں "جب اللہ یہ حکم دے گا کہ "پکڑو اسے" تو ستر ہزار فرشتے لپکیں گے ـ ہر ایک اس کیڑے پر لپکے گا' جبکہ یہ کافر نہایت ہی حقیر اور کرب زدہ ہے ـ

فَغُلُّوْهُ (۶۹ : ۳۰) "گردن میں طوق ڈالو اس کے" جو بھی ان ستر ہزار میں سے پہنچے گا طوق ڈال دے گا اس کی گردن میں؟

ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ (۶۹ : ۳۱) "پھر اسے جہنم میں جھونک دو"ـ قریب ہے کہ جہنم میں اس کے بھن جلنے کی آواز ہم سن لیں ـ

ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ (۶۹ : ۳۲) "پھر اس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو"ـ آگ کی زنجیروں میں سے ایک گز زنجیر بھی اس کیڑے کے لیے کافی ہے' لیکن مزید لمبی زنجیر اسے ذلیل کرنے کے لیے اور لفظ سبعین کے استعمال کے لیے ہے ـ یوں انسانوں کو ڈرانا مقصود ہے ـ اب یہ حکم اور ڈگری صادر ہو گئی ہے ـ اس کا اجراء ہو گیا ہے اور مجرم جہنم رسید ہو گیا ہے' تو اب اس حکم پر دلائل دیئے جاتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا ـ اس قدر سخت سزا کا یہ مستوجب کیوں ہوا؟

إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ﴿٣٣﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ﴿٣٤﴾

"یہ نہ اللہ بزرگ و برتر پر ایمان لاتا تھا اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا"ـ

اس کا دل ایمان باللہ سے خالی تھا ـ یہ محض انسانی لحاظ سے بھی کوئی اچھا انسان نہ تھا ـ لوگوں پر رحم نہ کرتا تھا ـ لہٰذا اس آگ کے سوا اس کے لیے کوئی اور مناسب جگہ ہی نہ تھی ـ

جس آدمی کا دل ایمان سے خالی ہو' وہ مرجاتا ہے ـ اس کا دل کھنڈر بن جاتا ہے' برباد ہو جاتا ہے ـ اس کے اندر کوئی روشنی نہیں ہوتی' وہ مسخ ہو گیا ہے ـ وہ حیوانوں سے کم تر مخلوق جمادات سے بھی کم تر ہو گیا ہے ـ کیونکہ ہر چیز مومن ہے ـ ہر چیز تسبیح کرتی ہے ـ ہر چیز اپنے وجود کے اصل مصدر سے پیوستہ ہوتی ہے ـ رہا یہ عقلمند انسان تو اپنے اصل اور سرچشمے سے یہ اپنے آپ کو کاٹ دیتا ہے ـ

پھر اس کا دل انسانوں پر ترس نہیں کھاتا ـ اللہ کے بندوں میں سے مساکین تو اللہ کی رحمت کے زیادہ محتاج ہوتے ہیں ـ ان کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہئے ـ ان کے قیام اور طعام اور لباس کا خیال رکھنا ہم انسانوں ہی کا فرض ہے ـ اس طرح معلوم ہوا کہ انسانوں کی اجتماعی معاشی ضروریات سوسائٹی کے ذمہ ہیں اور ان کا تعلق ایمانیات کے ساتھ ہے ـ

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هَاهُنَا حَمِيمٌ ﴿٣٥﴾ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ ﴿٣٦﴾

۱

لَّا يَأْكُلُهُۥٓ إِلَّا ٱلْخَـٰطِـُٔونَ ۝٣٧ ع ٣٧

۵

"لہذا آج نہ یہاں اس کا کوئی یار غم خوار ہے اور نہ زخموں کے دھوون کے سوا اس کے لیے کوئی کھانا' جسے خطاکاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا"۔

اس بدبخت شخص کے انجام بد کا یہ تکمیلی بیان ہے۔ یہ اللہ عظیم پر ایمان نہ لاتا تھا۔ مساکین کی ضروریات بھی فراہم نہ کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب قیامت میں اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيمٌ (۶۹: ۳۵) "لہذا آج یہاں اس کا کوئی غم خوار نہیں ہے"۔ اور اس کے وہاں کھانے کا انتظام مساکین سے بھی بدتر ہے۔

وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ (۶۹: ۳۶) "زخموں کے دھوون کے سوا اس کے لیے کوئی کھانا نہیں ہے"۔ غسلین سے مراد اہل جہنم کی پیپ اور زخموں کے پانی اور اس پانی کو کہتے ہیں جو زخموں کے دھونے سے نکلتا ہے۔ ایسے گندے لوگوں کے لیے' اب ایسی ہی گندی خوراک موزوں ہے۔ کیونکہ اس شخص کا دل مساکین پر رحم سے خالی تھا۔

لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ (۶۹: ۳۷) "جسے خطاکاروں کے سوا اور کوئی نہیں کھاتا"۔ گناہگار' جن کی فطرت میں یہ گناہ رچے بسے ہوں۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی وجہ سے یہ شخص پکڑے جانے' طوق پہنائے جانے' آگ میں جلائے جانے کا مستحق ہو اور اسے اس قدر طویل بیڑیاں پہنائی گئیں۔ جہنم اور اس کے اندر بیڑیاں' یہ جہنم کے عذاب کے درجات میں سے شدید درجہ ہے۔ یہ تو اس شخص کی حالت ہے جو مساکین کے طعام پر لوگوں کو ابھارتا نہیں' لیکن اس "شخص" کا عذاب تم خود سوچو جو بچوں' عورتوں اور بوڑھوں کو زندہ رکھتا ہے اور ان کے سرپرستوں کو ناحق سرکشوں اور جباروں کی طرح پکڑتا ہے اور جو ان کے ہاتھ سے لقمے اور کپڑے بھی چھین لیتا ہے اور وہ سخت سردیوں کے اندر ننگے آسمان کے نیچے ہوتے ہیں۔ ایسے "ڈکٹیٹر" کہاں جائیں گے جبکہ وہ زمین میں جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔ ذرا سوچ لو' کہ ان کے لیے اللہ نے کیا تیار کیا ہو گا جبکہ صرف مسکینوں کے کھانے پر لوگوں کو نہ ابھارنے پر یہ سخت سزا رکھی گئی ہے۔

یہ سخت' اور پرتاثیر منظر اس شدید سورت میں اس لیے لایا گیا کہ یہ ابتدائی ایام کی سورت ہے اور اس وقت عرب سوسائٹی نہایت اجڈ اور سخت تھی۔ اور ان کو اسی طرح کے سخت مناظر دکھانے کی ضرورت تھی تاکہ اس سے ذرا خائف ہو جائیں اور اپنی روش میں قدرے نرمی اختیار کریں اور اس شرمندگی سے اپنے آپ کو بچانے کی سعی کریں اور جب بھی انسانیت اس قسم کے مختلف النوع معاشرتی سطح پر ہوتی ہے' جس میں ایک طرف اس قسم کے سخت اور اجڈ لوگ ہوتے ہیں دوسری طرف ایسے لوگوں کے مقابلے میں نرم خو اور اثر لینے والے بھی موجود ہوتے ہیں۔ یعنی جن میں لوگوں کی نفسیاتی حالت مختلف درجات پر ہوتی ہے اس لئے قرآن مجید کے انداز خطاب میں یہ سب لوگ پیش نظر ہوتے ہیں اور دعوت کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس سے مختلف سطح کے لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔ آج بھی بعض علاقوں میں سنگدل لوگ رہتے ہیں۔ ایسے مزاج کے لوگ بھی ہیں جو نہایت ہی سخت اور ان پر ایسے ہی الفاظ اثرانداز ہو سکتی ہے جو شعلہ بار ہوں' جس

طرح اس سورت میں ہیں ۔ وہ ایسے ہی مناظر سے ڈر سکتے ہیں جو اس سورت میں بیان ہوئے ہیں ۔

اس قسم کے سخت الفاظ اور سخت مناظر کے زیر سایہ ' جو اس سورت میں مسلسل چلے آرہے ہیں جن میں وہ مناظر بھی ہیں کہ لوگوں کو اس دنیا میں عذاب الٰہی میں گرفتار بتایا گیا ہے اور وہ مناظر بھی ہیں جن میں یہ پوری کائنات اڑتی دکھائی گئی ہے ۔ پھر قیامت کے مناظر جہاں تمام انسانوں کو ننگا دکھایا گیا ہے اور وہ مناظر جن میں لوگ خوشی کے مارے اڑتے بھی دکھائے گئے ہیں ۔ ان تمام مناظر کے بعد اب ایک نہایت ہی سنجیدہ ' فیصلہ کن اور دو ٹوک بات آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بات کر رہے ہیں ' اس کی حقیقت کیا ہے ۔ جبکہ یہ لوگ اس میں شک کرتے ہیں ۔ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور تکذیب کرتے ہیں ۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

پس ' میں قسم نہیں کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جو تم دیکھتے ہو اور ان کی بھی جنہیں تم نہیں دیکھتے ' یہ ایک رسول کریم کا قول ہے ' کسی شاعر کا قول نہیں ہے ' تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو ۔ اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے ' تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو ۔ یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے "۔

یہ معاملہ بہت ہی واضح ہے اور اس پر کسی قسم کی ضرورت نہیں ہے اور عقلی لحاظ سے ثابت ہے اور ایک واقعہ ہے اور اس پر کوئی قسم اٹھانے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے ۔ یہ حق ہے ' حق کی طرف سے نازل شدہ ہے ' نہ شعر و شاعری ہے نہ کسی کاہن کی کہانت اور بڑ ہے نہ کسی افتراء پرداز کی افتراء ہے ۔ لہٰذا قسم کی ضرورت نہیں ۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ (۳۸:٦۹) وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ (۳۹:٦۹) "پس ' میں قسم نہیں کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جو تم دیکھتے ہو ' اور ان کی بھی جنہیں تم نہیں دیکھتے "۔

یہ قسم بہت عظیم ہے ۔ اس کائنات ' عظیم کائنات کی قسم ہے جو تم دیکھتے ہو اور اس عظیم کائنات کی قسم ہے جو نظر نہیں آتی ۔ یہ کائنات انسان کے مشاہدے سے بہت زیادہ عظیم ہے بلکہ یہ اس سے بھی بہت بڑی ہے جس قدر انسان ادراک کر سکتا ہے ۔ انسان اس کائنات کے نہایت ہی تھوڑے حصے کا ادراک کر سکتا ہے اور بہت ہی تھوڑے حصے کا مشاہدہ کر سکتا ہے ۔ اللہ نے انسان کو اسی قدر طاقت دی ہے جس قدر انسان کو ضرورت ہے ۔ اس زمین میں رہنے ' اس کو ترقی دینے اور یہاں اللہ کا نائب اور خلیفہ ہونے کے لیے جس قدر ضرورت ہے ورنہ اگر پوری زمین کا مقابلہ پوری کائنات سے کیا جائے تو یہ ایک چھوٹا سا ذرہ ہے جو اس قابل بھی نہیں ہے کہ اس کائنات کے دوسرے سرے سے نظر آئے ۔ اس عظیم کائنات الٰہیہ میں سے انسانوں کو نہایت ہی محدود حصے کی بصیرت و بصارت کی قدرت دی گئی ہے ۔ انسان اس کے اسرار و رموز اور حالات اور قوانین قدرت کا بہت ہی تھوڑا سا حصہ ابھی تک معلوم کر سکا ہے ۔ ایک بہت بڑا

حصہ ہے جسے انسان نہیں دیکھ پا رہا ہے ۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ (٦٩ : ٣٨) وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ (٦٩ : ٣٩) "پس' میں قسم نہیں کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جو تم دیکھتے ہو' اور ان کی بھی جنہیں تم نہیں دیکھتے" ۔

یہ اشارہ انسانی دل و دماغ کو بہت کھول دینے والا ہے ۔جب انسان یہ پاتا ہے کہ انسانی فکر و نظر کے موجودہ دائرے سے وراء بھی کچھ پہلو ہیں ۔کچھ جہاں اور بھی ہیں 'کچھ اسرار و رموز پوشیدہ بھی ہیں ' جو ابھی انسان کو نظر نہیں آ رہے ' تو اس طرح انسانی تصور اور انسانی ادراک کے دائرے کو وسعت ملتی ہے ۔اس کائنات کے آفاق وسیع ہو جاتے ہیں ۔ لہٰذا اس قرآن میں رہنے اور بسنے والا انسان اس محدود جگہ (Space) کا پابند نہیں ہوتا جس میں وہ رہتا ہے ۔ نہ وہ اپنی آنکھوں کے محدود مشاہدے کا قیدی بنتا ہے ' نہ اپنی موجودہ محدود ادراک پر اکتفاء کرتا ہے ۔یہ کائنات ہمارے مشاہدے سے زیادہ وسیع اور یہ حقیقت ہماری قوت ادراک سے بڑی ہے ۔کیونکہ اس محدود انسان کو جو محدود مشاہدہ اور قوت مدرکہ دی گئی ہے ' وہ اس دنیا پر اس کی محدود ضروریات کے لیے دی گئی ہے ۔ہاں وہ اپنے مشاہدے اور قوت مدرکہ کو وسعت دے سکتا ہے ۔اور اپنی ان محدود قوتوں کو بھی وسعت دے سکتا ہے لیکن وہ یہ بھی اس وقت کر سکتا ہے کہ جب اس کو احساس ہو کہ کچھ حقائق اور جہاں اور بھی ہیں ' جن تک ابھی ہماری رسائی نہیں ہوئی ہے ۔اور پس پردہ ان جہانوں سے زیادہ وسیع جہاں ہیں جن تک ہماری رسائی ہو گئی ہے ۔یہاں آکر انسان کا رابطہ اس ذات مطلق سے پیدا ہو جاتا ہے ۔جو انسان کو نور بخشتی ہے اور اس سے براہ راست تعلق پا کر انسان پھر دوسرے جہانوں کی سیر کرتا ہے ' جو بظاہر مستور ہیں ۔

وہ لوگ جو اپنے آپ کو ان حقائق کے اندر محدود کرتے ہیں جن کو آنکھ دیکھ سکتی ہے ' یا جن کو ہماری قوت مدرکہ پا سکتی ہے ' یہ لوگ دراصل مساکین ہیں ۔ درحقیقت اس قسم کے لوگ اپنے نہایت محدود محسوسات اور مدرکات کے قیدی ہیں ۔ یہ لوگ اس وسیع دنیا میں رہتے تو ہیں مگر انہوں نے اپنے آپ کو کنویں کا مینڈک بنا دیا ہے جب کہ انسان کو ایک عظیم کائنات کے اندر بھیجا گیا ہے تاکہ اسے دیکھے اور عبرت لے ۔

اس کائنات کے اندر اور اس زمین کے اوپر رہنے والے ' اس انسان کی تاریخ میں ' بارہا ایسا ہوا ہے کہ کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو ' اس طرح کنویں کا مینڈک بنایا ہے ۔انہوں نے اپنے اوپر معرفت اور روشنی کے دروازے بند کیے ہیں ۔اور ایمان اور شعور کے راستے سے حقیقت کبریٰ تک پہنچنے سے اپنے آپ کو محروم کیا ہے ۔پھر وہ یہ کوشش بھی کرنے لگتے ہیں کہ روشنی کے یہ دروازے ' جس طرح انہوں نے اپنے اوپر بند کیے ' دوسروں پر بھی بند کر دیں ۔کبھی وہ جاہلیت کے نام سے ایسا کرتے رہے ہیں اور کبھی وہ لادینیت کے نام سے ایسا کرتے رہے ہیں ۔ جاہلیت اور جدید علمی جاہلیت دونوں دراصل ایک بڑے قید خانے ہیں جن کے اندر ان لوگوں نے اپنے آپ کو محصور کر لیا ہے اور معرفت اور روشنی کے حقیقی سرچشموں سے اپنے آپ کو محروم کر دیا ہے ۔

گزشتہ دو سو سالوں کے اندر ' مغربی سائنس نے اپنے غرور اور حماقت کی وجہ سے ' اپنے آپ کو ' ان مضبوط سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا تھا ۔ لیکن اس صدی میں ' خود مغربی سائنس نے آہستہ آہستہ ان مضبوط سلاخوں کو توڑنا شروع کر دیا ہے اور خود اپنے تجربات کو نور کے سرچشموں سے جوڑنا شروع کر دیا ۔یہ اس وقت ممکن ہوا جب سائنس کا جوش و غرور

ٹھنڈا ہوا اور وہ کلیسا کی حماقتوں اور اس کے خلاف جوش انتقام کی مدہوشی سے باہر نکل آئی ہے۔ (۱)

اور سائنس نے معلوم کر لیا کہ اس کائنات کے اندر اس کے حدود کار ہی محدود ہیں اور اس نے تجربہ کر لیا کہ یہ محدود آلات جن کے ذریعے وہ اس کائنات کا مشاہدہ کر رہی ہے' وہ تو اسے کسی لامحدود کائنات کی طرف لے جا رہے ہیں۔ چنانچہ سائنس نے ایمان کی دعوت دینا شروع کر دی۔ (۲)

نہایت عاجزانہ انداز میں سائنس نے خوشخبری دی اور اعلان کیا کہ اب وہ اس قید خانے سے رہا ہو گئی ہے۔ جب بھی انسانیت نے اپنے آپ کو مادیت کی سلاخوں کے پیچھے بند کیا۔ اس کے ساتھ یہی سلوک ہوا۔

ڈاکٹر الیکس کاریل' جنہوں نے خلیہ پر تحقیقات میں تخصص حاصل کیا۔ اور جنہوں نے خون کی گردش کے نظام پر کام کیا اور عملاً پریکٹس بھی کرتے رہے۔ اور انہوں نے کئی اداروں کی سرجری اور مختلف طریقہ ہائے علاج پر کام کیا۔ اور جن کو ۱۹۱۲ میں نوبل انعام ملا اور دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں انسٹی ٹیوٹ آف ہیومنزم فرانس کے ڈائریکٹر رہے' وہ لکھتے ہیں :

"یہ کائنات بہت وسیع ہے' اور اس کے اندر ہمارے انسانی عقول کے علاوہ بھی کئی فعال عقل کام کرتی ہیں۔ ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کی وادیوں کے' نشیب و فراز میں انسانی عقل جب چاہے' ان عقول سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ نماز ان ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے جس کے ذریعہ ہم ان عقول تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم اس ابدی عقل سے جا ملتے ہیں جس کا کنٹرول اس کائنات کی تمام تقدیروں پر ہے۔ چاہے یہ تقدیرات ہمیں نظر آ رہی ہوں یا ہماری نظروں سے اوجھل ہوں۔ (۳)

"تقدس کا یہ شعور اور دوسری روحانی سرگرمیاں انسانی زندگی پر گہرے اثرات ڈالتی ہیں۔ تقدس کے اس شعور اور روحانی سرگرمیوں کی وجہ سے ہم' اس عظیم روحانی دنیا سے متصل رہتے ہیں جس کے آفاق بہت ہی وسیع ہیں اور جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے"۔ (۴)

ایک دوسرے ڈاکٹر ڈی نوئے ہیں۔ انہوں نے استاد کوری اور ان کی بیوی کے ساتھ مل کر تشریح الابدان اور طبیعیات کے میدان میں کام کیا۔ اور راکفیلر انسٹی ٹیوٹ نے ان کو اپنے ادارے کے دوسرے ممبران کے ساتھ سرجری اور اس کی خصوصیات کے موضوع پر تحقیقات کے لیے بلایا۔ وہ فرماتے ہیں :

"کئی ذہین اور نیک نیت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ اللہ پر ایمان نہیں لا سکتے۔ اس لیے کہ وہ اللہ کا تصور یا ادراک نہیں کر سکتے۔ حالانکہ ایک دیانت دار انسان جو اپنے نفس کو علمی تحقیقات میں لگائے رکھتا ہے' اس پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اللہ کا تصور بھی کر سکے' جس طرح ایک ماہر طبیعیات پر لازم نہیں ہے کہ وہ بجلی کا تصور کر سکے۔ جس طرح خدا کا تصور

(۱) انسان' مادیت اور اسلام کے درمیان۔ محمد قطب
(۲) سائنس کی طرف سے دعوت ایمان۔ ترجمہ محمود فلکی۔ تصنیف اے۔ کریسی مورین
(۳) بیسویں صدی کے مفکرین کے عقائد۔ استاد عناد
(۴) بیسویں صدی کے مفکرین کے عقائد۔ استاد عناد

انسان ناقص ہو گا' اسی طرح بجلی کا تصور بھی ناقص ہو گا اور باطل ہو گا۔ اس لیے کہ بجلی کا مادی تصور ممکن ہی نہیں ہے۔ بجلی ناقابل تصور ہونے کے باوجود ایک ثابت شدہ حقیقت ہے اور یہ لکڑی کے ایک ٹکڑے سے زیادہ ثابت شدہ ہے جس کا تصور کیا جا سکتا ہے"۔ (۱)

سر آرتھر ٹامسن ' اسکاٹ لینڈ کے مشہور مصنف ہیں ' کہتے ہیں :"ہم ایک ایسے زمانے میں زندگی بسر کر رہے ہیں کہ اس میں یہ حقیقت ٹھوس اور شفاف بن گئی ہے۔ ایتھر نے اپنا مادی وجود کھو دیا ہے۔ مادی تاویلات میں غلو کرنے کی صلاحیت کے معاملے میں وہ حدیث العہد ہے۔

ایک مجموعہ مضامین بعنوان "سائنس اور مذہب" میں کہتے ہیں :

" دینیات کے اہل علم کو اس بات پر تاسف نہیں کرنا چاہئے کہ ایک ماہر طبیعیات ' طبیعیات کے دائرے سے نکل کر رب طبیعیات تک کیوں نہیں پہنچ پاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنسی تحقیقات کا رخ الہیاتی نہیں ہے۔ لیکن اگر علمائے طبیعیات ' طبیعیات کے دائرے سے نکل کر ماقوق الطبیعیات میں داخل ہو گئے تو اس کے نتائج نہایت ہی عظیم ہوں گے۔ آج تک کی تحقیقات کے بعد ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ ہم اس پر خوشی کا اظہار کریں کہ سائنس دانوں نے اس سمت کام کرنے کی راہ فراہم کر دی ہے کہ اب دینی جذبات سائنس میں سانس لے سکیں۔ جبکہ ہمارے آباؤ اجداد کے زمانے میں ' یہ ممکن نہ تھا کہ سائنس کے مضامین میں مذہب کی بات کی جا سکے۔ جس طرح مسٹر لانچڑوں ڈیفس نے اپنی کتاب میں ' جو یہ غلط دعویٰ کیا تھا ' اس کے بالمقابل اب ہم یہ بات نہایت زور اور اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ سائنس نے اللہ تعالیٰ کے نہایت ہی اعلیٰ اور نہایت بلند مرتبہ تصور کے لیے راہ ہموار کر دی ہے۔ اور اب ہم اس قول کا لفظی مفہوم درست سمجھتے ہیں کہ سائنس نے انسانوں کے لیے جدید آسمان اور جدید زمین ' پیدا کر دیئے ہیں اور انسان کو عقلی جدوجہد میں اس قدر آگے بڑھا دیا کہ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ انسان کو امن و سلامتی صرف اس صورت میں ملے گی کہ وہ اللہ کی ذات پر یقین کر لے"۔ (۲)

اس سے قبل ہم اے۔ کریسی مور سن ' صدر سائنس اکیڈمی نیویارک اور امریکہ میں قومی تحقیقات کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر کی کتاب سے یہ اقتباس نقل کر چکے ہیں۔ کتاب کا نام ہے "انسان اکیلا نہیں کھڑا"۔

"ہم عملاً ایک وسیع عالم مجہول کے قریب جا پہنچے ہیں۔ کیونکہ یہ بات سائنسی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ مادہ دراصل عالمی دور کا ایک مظہر ہے۔ اور یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے قوت ہے۔ لیکن اس بات میں شک نہیں ہے کہ اس کائنات کو وجود میں لانے میں کسی بخت و اتفاق کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ محیر العقول عظیم کائنات ایک ضابطے کی پابند ہے"۔

" یہ کہ یہ انسان ایک حیوان تھا جو ایک ایسے "موجود" کی شکل اختیار کر گیا جو باشعور ' مفکر ' اپنے وجود کو جاننے والا بن گیا ' یہ بات درست نہیں کہ یہ انسان محض مادی عوامل کی وجہ سے ایسا بن گیا اور اس کے پیچھے کسی تخلیق کرنے والے کا قصد و ارادہ نہ تھا ' یہ کوئی ممکن بات نہیں ہے"۔

---

(۱) بیسویں صدی کے مفکرین کے عقائد ـ استاد عناد
(۲) دور جدید کے مفکرین کے عقائد ـ استاد عناد

''اگر قصد و ارادے کو تسلیم کیا جائے تو اس کے مطابق پھر انسان ایک مشین ہو گا تو سوال یہ ہو گا کہ اس مشین کو کون چلا رہا ہے' کیونکہ چلانے کے بغیر اس سے کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ سائنس یہ بتانے سے قاصر ہے کہ انسانی مشین کا مدیر کون ہے اور پھر سائنس یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتی کہ ارادہ کوئی مادی چیز ہے''۔

''ہم اس مقام تک پہنچ چکے ہیں کہ ہم کہیں کہ اللہ نے اپنے نور کا ایک حصہ انسان کو عطا کیا ہے''۔

یوں نظر آتا ہے کہ سائنس اب مادیت کے قید خانے سے اس کی سلاخیں توڑ کر اور دیواریں گرا کر باہر نکل آئی ہے۔ اور وہ اب کھلی فضا میں آزادانہ غور و فکر کرتی ہے۔ جس طرح قرآن نے فرمایا:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ (۶۹: ۳۸) وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ (۶۹: ۳۹) ''پس میں قسم نہیں کھاتا ہوں ان چیزوں کی جو تم دیکھتے ہو اور ان کی جو تم نہیں دیکھتے ہو''۔

یہ اور اس قسم کی متعدد آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ بعض ''کیڑے'' سوچنے والے ''کیڑے'' ابھی تک سائنس کے نام پر اپنے اوپر رب تعالیٰ کے نور کے دروازے بند کیے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ دراصل نہ سائنس دان ہیں اور نہ مومن۔ یہ جس طرح سائنس کے میدان میں پسماندہ ہیں' اسی طرح دین کے میدان میں پسماندہ ہیں۔ اور لاشعوری طور پر یہ مادیت کے قید خانے میں مبتلا ہیں۔ اور اس مقام اور مرتبے سے پیچھے رہ گئے ہیں جو انسان جیسے مکرم مخلوق کے لائق ہے۔

ذرا دوبارہ غور کریں:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ (۳۸) وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ (۳۹) اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۴۰) وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ (۴۱) وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۴۲) تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۳) (۶۹: ۳۸ تا ۴۳) ''پس میں قسم نہیں کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جو تم دیکھتے ہو اور ان کی بھی جنہیں تم نہیں دیکھتے' یہ ایک رسول کریم کا قول ہے' کسی شاعر کا قول نہیں ہے' تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو۔ اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے' تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے''۔

رسول اللہ پر اور قرآن پر جو الزامات مشرکین مکہ نے لگائے ان میں سے ایک یہ تھا کہ آپ شاعر ہیں۔ دوسرا یہ تھا کہ آپ کاہن ہیں اور یہ ان کا ایک سطحی شبہ تھا۔ اور یہ اس لیے ان کو لاحق ہو گیا تھا کہ یہ قرآن ایک لاجواب کلام تھا۔ اور عام لوگوں کے کلام سے اس کا معیار بہت بلند تھا۔ اور شاعر اس لیے کہتے تھے کہ ان کا یہ وہم تھا کہ شاعروں پر جن آتے ہیں اور وہ ان سے اس قسم کا کلام سنا کرتے ہیں۔ اسی طرح کاہنوں کو بھی وہ جنوں کے ساتھ تعلقات رکھنے والے سمجھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ باتیں ان کو یہ جنات بتاتے ہیں۔ یہ شبہ بہت ہی سطحی تھا اور قرآن اور رسالت اور ذات رسول پر تدبر کرنے سے یہ جلدی ہی زائل ہو سکتا تھا۔

یہ درست ہے کہ شعر میں بعض اوقات اچھی موسیقی ہوتی ہے' اعلیٰ خیالات ہوتے ہیں' خوبصورتی ہوتی ہے لیکن قرآن

اور شاعری بالکل جدا چیزیں ہیں ۔ دونوں کے درمیان بنیادی فرق ہے ۔ قرآن کریم ایک مکمل نظام زندگی عطا کرتا ہے اور یہ نظام سچائی پر مبنی ہے ۔ اس کی بنیاد نظریہ توحید پر مبنی ہے ۔ یہ اس کائنات کے ایک خالق پر ایمان کو ضروری سمجھتا ہے ۔ وہ انسانوں کی طرح اس کائنات کو بھی زندہ اور مطیع رب سمجھتا ہے ۔ جبکہ شعر چند تاثرات 'جذبات' متفرق واقعات پر مشتمل ہوتا ہے ۔ اس کا نظام زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ نہ ایک نظریہ پر مبنی ہوتا ہے' جو خوشی اور غم' آزادی اور قید اور محبت اور نفرت میں ایک ہو' جبکہ شعر ان حالات میں یکسر بدل جاتا ہے اور مختلف حالات میں مختلف ہوتا ہے ۔

علاوہ ازیں یہ کہ قرآن کریم نے جو تصور حیات پیش کیا ہے اس کی پہلی اینٹ بھی اسلام اور قرآن نے رکھی ہے ۔ اس کے جزئیات' اس کے اصول بھی' سب کے سب قرآن نے دیئے اور اس عقیدے کے ساتھ دیئے کہ یہ سب من جانب اللہ ہے ۔ اس تصور حیات کا منہاج ہی ایسا ہوتا ہے جو انسانی نہیں ہو سکتا ۔ انسان کوئی ایسا جامع نظام اور تصور تجویز نہیں کر سکتا' جس کی نہ پہلے کوئی مثال ہے اور نہ بعد میں ۔ اس کے مقابلے میں انسانوں نے اس کائنات' اس کی قوت خالقہ اور قوت مدبرہ کے بارے میں جو فلسفے گھڑے ہیں' وہ بھی ہمارے سامنے موجود ہیں جو علم فلسفہ' علم شعر' دوسرے فکری اور نظریاتی مکاتب میں تفصیل سے کتابوں میں موجود ہیں ۔ جب ان کا تقابلی مطالعہ قرآن سے کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن بالکل کسی علیحدہ سرچشمے کا فیض ہے ۔ یہ منفرد مزاج اور منفرد خصوصیات رکھتا ہے اور اس کے مقابلے میں انسانی تصورات پائے چوبیں کی طرح ہیں ۔

اس طرح کہانت اور کاہنوں سے جو باتیں صادر ہوتی رہتی ہیں' آج تک انسانی تاریخ میں کوئی کاہن ایسا نہیں گزرا جس نے ایک نظام زندگی' فلسفہ زندگی اور نظام آخرت دیا ہو اور وہ اسی طرح کامل' مکمل اور معقول ہو' جس طرح قرآن کا پیش کردہ نظام معقول ہے ۔ کاہنوں سے جو کچھ نقل ہوا ہے' وہ یہ ہے کہ چند مہمل کلمات' چند سجع اور قافیے جن میں تیر تکے لڑائے گئے ہیں اور ایک آدھ کہیں' کوئی سنی سنائی حکمت کی بات بھی ہوتی ہوگی ۔

لیکن قرآن کے اندر بعض ایسی جھلکیاں بھی ہیں جن پر غور کرنے سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کبھی اس طرح سوچ ہی نہیں سکتا ۔ ہم نے فی ظلال القرآن میں ایسی بعض جھلکیاں دکھائی ہیں کہ نہ قرآن سے پہلے اور نہ بعد میں انسانوں کا ذہن کبھی اس طرف گیا ہے ۔ بعض آیات یہاں بھی غور کے لیے پیش کی جاتی ہیں ۔

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ

( ٦ : ٥٩ ) ''اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا ۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے' سب سے وہ واقف ہے ۔ درخت سے گرنے والا کوئی پتہ ایسا نہیں ہوگا جس کا اسے علم نہ ہو ۔ زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں ہے جس سے وہ باخبر نہ ہو ۔ خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے''۔

مثلاً یہ تصور :

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (٥٧ : ٤) "اس کے علم میں ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے' اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے' اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے' اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ہے' جہاں بھی تم ہو اور جو کام بھی تم کرتے ہو وہ اسے دیکھ رہا ہے"۔ یا مثلاً اس قسم کے خیال کی طرف۔

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (٣٥ : ١١) "کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی اور نہ بچہ جنتی ہے مگر یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہوتا ہے۔ کوئی عمر پانے والا عمر نہیں پاتا اور نہ کسی کی عمر میں کچھ کمی ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوتا ہے۔ اللہ کے لیے یہ بہت کچھ آسان کام ہے"۔

نیز نہ پہلے کسی انسان کو اس بات کا دھیان ہوا' اور نہ بعد میں ہو گا کہ اللہ نے اس کائنات کو کس طرح تھام رکھا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَلَئِنْ زَالَتَاۤ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ (٣٥ : ٤١) "حقیقت یہ ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے۔ اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے سوا کوئی دوسرا تھامنے والا نہیں ہے"۔

یا پھر یہ منظر کہ اس کائنات میں زندگی کس طرح پھوٹتی ہے اور خالق کائنات نے یہاں زندگی کے قیام کے لیے کس قدر انتظامات کیے ہیں اور موافق حالات بنائے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (٩٥) فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (٩٦) وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (٩٧) وَهُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (٩٨) وَهُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ

وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْا اِلٰی ثَمَرِهٖ اِذَآ اَثْمَرَ وَ یَنْعِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۹۹) (۶ : ۹۵ تا ۹۹) ”دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے۔ وہی زندہ کو مردے سے نکالتا ہے' اور وہی مردہ کو زندہ سے خارج کرنے والا ہے۔ یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ ہے۔ پھر تم کدھر بہکے جا رہے ہو؟ پردۂ شب کو چاک کر کے وہی صبح نکالتا ہے۔ اسی نے رات کو سکون کا وقت بنایا ہے۔ اسی نے چاند اور سورج کے طلوع اور غروب کا حساب مقرر کیا ہے۔ یہ سب اسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھہرائے ہوئے اندازے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا۔ دیکھو ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں' ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے ایک جان سے تم کو پیدا کیا' پھر ہر ایک کے لیے ایک جائے قرار ہے اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ ہے۔ یہ نشانیاں ہم نے واضح کر دی ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں' اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا' پھر اس کے ذریعہ سے ہر قسم کی نباتات اگائی۔ پھر اس سے ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کیے۔ پھر ان سے تہ بہ تہ جڑے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کیے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں۔ اور انگور' زیتون اور انار کے باغ لگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور پھر ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا بھی۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو۔ ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں“۔

اس قسم کی جھلکیاں قرآن میں بہت زیادہ ہیں' اور انسانی خیالات اور اسالیب کلام میں اس قسم کی باتیں نہیں ہوتیں۔ قرآن کے صرف یہی پہلو' اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ یہ قرآن منجانب اللہ ہے۔ دوسرے دلائل سے اگر صرف نظر کر دیا جائے جو خود اس کتاب کے اندر بھی ہیں اور ان حالات کے اندر بھی جن میں یہ کتاب نازل ہوئی تو اس کتاب کے اندر بعض ایسی باتیں ہیں جن کی طرف انسانی خیال جاتا ہی نہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کے یہ شبہات سطحی ہیں اور ان کا اظہار انہوں نے اس وقت کیا' جس وقت قرآن کی چند سورتیں نازل ہوئی تھیں۔ پورا قرآن ابھی مکمل نہ ہوا تھا۔ اس وقت بھی قرآن کریم کے اندر یہ خصوصیت موجود تھی۔ اس کے اندر واضح اشارات تھے کہ اس کا سرچشمہ زمین پر نہیں ہے' آسمان پر ہے۔

کبراء قریش اپنے دلوں میں یہ بات محسوس بھی کرتے تھے اور کبھی کبھار اپنے درمیان اس کا اعتراف بھی کرتے تھے۔ لیکن مفادات انسان کو اندھا کر دیتے ہیں' جن کے پیش نظر انسان ہدایت کی راہ پر آنے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ ایسے حالات کے بارے میں قرآن نے پیشگی کہہ دیا تھا کہ اب وہ اس قسم کے الزامات لگائیں گے کہ یہ ایک قدیم جھوٹ ہے۔

کتب سیرت میں متعدد واقعات نقل ہوئے ہیں کہ زعمائے قریش جب اپنے ہاں اس شبہے کے بارے میں باتیں کرتے تھے تو وہ خود تسلیم کرتے تھے کہ ان کی یہ بات غلط ہے۔

ابن اسحاق نے ولید ابن مغیرہ اور نضر ابن الحارث اور عتبہ ابن ربیعہ کے متعلق یہ روایت نقل کی ہے۔ ان میں سے پہلے شخص کے بارے میں اس نے نقل کیا ہے۔

"پھر یہ ہوا کہ ولید ابن مغیرہ کے پاس قریش کے کچھ لوگ جمع ہوئے ۔ یہ ان میں معمر آدمی تھا' اور موسم حج آنے ہی والا تھا ۔ اس نے ان سے کہا اے اہل قریش! تم جانتے ہو کہ حج کا موسم آنے والا ہے ۔ اور اس میں تمام عالم عرب سے وفود تمہارے پاس آئیں گے اور تمام عربوں نے تمہارے اس شخص کے بارے میں خبریں سن رکھی ہیں ۔ لہٰذا اس کے بارے میں اپنی آراء مجتمع کر لو اور ایک ہی بات کرو' اور اس کے بارے میں باہم متضاد باتیں نہ کرو کہ خود تمہاری باتیں ایک دوسرے کو جھٹلا دیں ۔ اور تم خود اپنی تردید کرو ۔ انہوں نے کہا ابو عبدالشمس سب سے پہلے تم ہی بتاؤ اور ہمارے لیے ایک بات طے کر دو ہم وہی کریں گے ۔ اس نے کہا پہلے تم بتاؤ کہ تمہاری آراء کیا ہیں؟ بعض نے کہا کہ ہم کہیں گے کہ یہ کاہن ہے ۔ اس نے کہا یہ تو نہیں' خدا کی قسم! یہ کاہن نہیں ہے ۔ ہم نے کہان کو دیکھا ہے ۔ اس کا کلام کاہنوں کی گنگناہٹ سے مختلف ہے ۔ نہ کاہنوں جیسا سجع ہے' اس میں ۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ ہم یہ کہیں گے کہ یہ مجنون ہے ۔ تو اس نے کہا مجنون بھی تو وہ نہیں ہے ۔ ہم نے پاگلوں کو دیکھا ہے اور پاگلوں کو جانتے ہیں ۔ نہ اس پر دورے پڑتے ہیں' نہ اسے کوئی وہم ہوا ہے' نہ وسوسہ میں گرفتار ہے وہ ۔ تو بعض نے کہا تو پھر اسے شاعر کہا جائے ۔ تو اس نے کہا کہ وہ شاعر نہیں ۔ ہم سب لوگ شعراء کو جانتے ہیں ۔ اقسام شعر میں رجز' ھزج' قریض' مقبوضہ' مبسوطہ' لہٰذا قرآن تو ان میں سے نہیں ہے ۔ تو اس کے بعد کہا کہ پھر اسے ساحر اور جادوگر کہا جائے ۔ تو اس نے کہا کہ یہ تو جادوگر بھی نہیں ہے ۔ جادوگروں کو ہم نے دیکھا ہوا ہے نہ یہ جادوگروں کی طرح پھونکتا ہے اور نہ یہ گانٹھیں باندھتا ہے ۔ اس کے بعد انہوں نے کہا: عبدالشمس تم ہی بتاؤ کہ پھر ہم اسے کیا کہیں؟ اس نے کہا "خدا کی قسم اس کے کلام میں زبردست مٹھاس ہے' اس کی جڑیں نہایت گہری ہیں اور شاخیں پھیلی ہوئی ہیں ۔ اور اس کی شاخوں میں پھل ہیں ۔ تم ان باتوں میں سے جو بھی کہو گے عام آدمی کو معلوم ہو گا کہ یہ جھوٹ ہے ۔ اور قریب ترین بات جو کہی جا سکتی ہے وہ یہی ہے کہ وہ ایک جادوگر ہے ۔ ایسا جادو لایا ہے کہ بیٹے کو باپ سے جدا کر دیا ہے' بہن کو بھائی سے الگ کر دیا ہے' خاوند کو بیوی سے جدا کر دیا ہے ۔ ایک شخص کو خاندان سے جدا کر دیا ہے ۔ وہ اس سے یہ باتیں لے کر نکلے اور مکہ کی راہوں میں بیٹھ گئے ۔ جب موسم حج میں لوگ آنے لگے تو جو بھی آتا وہ اس سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کرتے اور لوگوں کو ان سے ڈراتے ۔

اور نضر ابن الحارث کے بارے میں مروی ہے کہ اس نے کہا "اے قوم قریش! خدا کی قسم تم پر ایک ایسی مصیبت آ پڑی ہے جس کا کوئی علاج تمہارے پاس نہیں ہے ۔ محمد تم میں ایک چھوٹا سا نو عمر بچہ تھا' وہ تم میں سب کا محبوب تھا' وہ تم میں سب سے سچا تھا' وہ تم میں سب سے زیادہ امین تھا' جب تم نے اس کے چہرے پر بڑھاپا دیکھا اور وہ بات تمہارے پاس لے کر آیا جو وہ لے کر آیا تو تم نے کہا یہ جادوگر ہے ۔ نہیں خدا کی قسم! ایسا نہیں ہے' وہ جادوگر نہیں ہے ۔ ہم نے جادوگروں کو دیکھا ہے ۔ ان کی پھونک اور ان کی گانٹھوں کو بھی دیکھا ۔ تم نے کہا کہ وہ کاہن ہے ۔ نہیں' خدا کی قسم! وہ کاہن نہیں ہے ۔ ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے ۔ ان کے خلجانات کو بھی دیکھا ہے ۔ ان کا سجع کلام بھی سنا ہے تم کہتے ہو وہ شاعر ہے ۔ نہیں' خدا کی قسم! ایسا نہیں' وہ شاعر نہیں ہے ۔ ہم نے شعراء دیکھے ہیں اور شعراء کے اصناف شعر سے بھی ہم واقف ہیں ۔ رجز' ھزج وغیرہ ۔ تم کہتے ہو کہ وہ مجنون ہے ۔ ہم نے مجنونوں کو دیکھا ہے' نہ اس پر دورے پڑتے ہیں' نہ وہ وسوسوں کا شکار ہے اور نہ اس کی باتیں غلط سلط ہیں ۔ اے گروہ قریش! اپنے اس معاملے میں غور کرو' خدا کی قسم! میں

سمجھتا ہوں تم پر ایک عظیم مصیبت آگئی ہے ....."

اس کی باتوں میں اور عتبہ کی باتوں میں پوری طرح یکسانیت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ ہو' جو کبھی عتبہ کی طرف منسوب ہو گیا ہو اور کبھی نضر کی طرف۔ لیکن' یہ بات بعید نہیں ہے کہ دونوں نے ایک ہی طرح کی بات کی ہو۔ کیونکہ دونوں قریش کے اکابر میں سے تھے۔ اور ان کے تاثرات قرآن کے بارے میں ایک ہی جیسے تھے۔

عتبہ کا جو موقف تھا اس کا قصہ اس سے قبل ہم نے سورہ قلم کے ابتدائیہ میں بیان کر دیا ہے۔ یہ موقف بھی حضور اکرم اور قرآن کے بارے میں ولید اور نضر کے قریب قریب تھا۔

غرض یہ لوگ جو الزام لگاتے تھے کہ آپ ساحر ہیں یا کاہن ہیں' کبھی تو یہ بطور عیاری و مکاری یوں کہتے تھے اور کبھی وہ محض مغالطہ انگیزی کے لیے کر رہے تھے۔ اور اس میں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ قرآن مجید بذات خود اس قدر واضح تھا کہ سنتے ہی لوگ اسے سمجھ لیتے تھے۔ اس لیے وہ قسم کا محتاج ہی نہ تھا کہ خدا ان چیزوں کی قسم اٹھائے جو معلوم ہیں اور جو معلوم نہیں ہیں۔ (۱)

بے شک یہ رسول کریم ﷺ کا قول ہے یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔ اور نہ کاہن کا کلام ہے۔ یہ تو رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہے۔

یہاں جو یہ کہا گیا کہ یہ رسول کریم کا قول ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رسول کریم ﷺ نے یہ کلام تخلیق کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے طرز کا کلام ہے۔ شاعر اور کاہن ایسا کلام پیش نہیں کر سکتے۔ ایسا کلام ایک رسول ہی پیش کر سکتا ہے۔ اللہ نے بھیجا اور اس کی طرف یہ نازل کیا اسی لیے بعدہ متصلا کہہ دیا گیا۔

تَنْزِيلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶۹ : ۴۳) "یہ رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہے"۔

اور یہ تعقیبات۔

قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ (۶۹ : ۴۲) "تم کم ایمان لاتے ہو"۔

قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۶۹ : ۴۲) "تم کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو"۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ تم ایمان نہیں لاتے' اور تم نصیحت نہیں حاصل کرتے۔ یہ انداز تعبیر مکمل نفی کے لیے عربی زبان میں عام تھا کہ مکمل نفی کو قلیل کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ حدیث شریف میں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم (قلیل اللغو) تھے یعنی بالکل لغویات نہ کرتے تھے۔ یہاں مراد مکمل نفی ہے۔ ورنہ اگر کسی کا قلیل ایمان بھی ہو' اور کوئی قلیل نصیحت بھی قرآن سے لیتا ہو' وہ رسول اللہ کو شاعر' کاہن نہیں کہہ سکتا بلکہ ایک کافر اور غافل ہی حضور ﷺ کے بارے میں ایسی بات کر سکتا ہے۔

اور آخر میں یہ خوفناک ڈراوا آتا ہے کہ جو بھی عقیدے کے بارے میں اللہ پر افتراء باندھے گا وہ اللہ کی گرفت میں آ

(۱) سید قطب کے نزدیک آیات کے معنی یہ ہوں گے میں قسم نہیں اٹھاتا۔ لیکن ہندوستانی علماء کا ترجمہ درست ہے کہ (پس نہیں' میں قسم اٹھاتا ہوں)

جائے گا۔ اور یہ تہدید اس ایک احتمال کی نفی بھی کر دیتی ہے جو رہ جاتا ہے کہ حضور ﷺ نے یہ اپنی طرف سے بنایا ہو۔ تو اللہ فرماتا ہے کہ آپ سچے ہیں اگر ہم پر وہ کوئی افتراء باندھتے تو ہم اسے سختی سے پکڑتے ہیں۔ اسلامی عقائد میں جو قلیل تحریف بھی کرتا ہے' وہ پکڑا جاتا ہے۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ﴿٤٤﴾ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ﴿٤٥﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ﴿٤٦﴾ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ﴿٤٧﴾

"اور اگر اس (نبیؐ) نے خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے' پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس کام سے روکنے والا نہ ہوتا"۔

ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ خود تمہارے اقوال کے مطابق بھی صادق و امین ہیں۔ اور اگر انہوں نے اس کلام سے کوئی بات اپنی طرف سے بنائی ہوتی تو ہم اس کو اپنی گرفت میں لے لیتے اور چونکہ آپ پر خدا کی پکڑ نہیں آئی' اس لیے لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ آپ سچے ہیں۔ یہ تو تھا ایک مثبت استدلالی نظریہ اور ثبوت' لیکن جس انداز میں یہ بات کی گئی ہے وہ ایک مکمل اور متحرک منظر کا انداز ہے۔ مثلاً یوں نظر آتا ہے کہ جس طرح ایک قوی تر انسان باز پرس کے لیے کسی کو پکڑ لے اپنے دائیں ہاتھ سے' اور پھر اس کی رگ جان کاٹ دے۔ یہ بھی نہایت ہی سخت اور متاثر کر دینے والا منظر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی قدرت کس قدر عظیم ہے اور اس کے سامنے انسان کس قدر عاجز ہے۔ سب کے سب انسان اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظریہ حیات' اسلامی عقائد' دین سے استدلال اور تمام دینی مباحث' نہایت ذمہ داری کا کام ہے۔ اور اس میں ہر شخص کو ذمہ داری سے اقدام و کلام کرنا چاہئے' جبکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ دھمکی دی گئی ہے تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا' جو اسلام کے بارے میں لاپرواہ ہو کر کلام کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ نہایت خوف' ڈر اور احتیاط اور خضوع و خشوع کا مقام ہے اور محتاط رہنے کا کام ہے۔

اب آخری اختتامیہ آتا ہے۔ اس میں فیصلہ کن بات بیان کر دی جاتی ہے اس دین کی حقیقت کیا ہے؟

وَإِنَّهُ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٤٨﴾ وَإِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنكُم مُّكَذِّبِينَ ﴿٤٩﴾ وَإِنَّهُ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٥٠﴾ وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ﴿٥١﴾

"درحقیقت یہ پرہیزگار لوگوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے کچھ لوگ جھٹلانے والے ہیں۔ ایسے کافروں کے لیے یقیناً یہ موجب حسرت ہے اور یہ بالکل یقینی حق ہے"۔

یہ قرآن صرف ان دلوں کو نصیحت دے سکتا ہے جن کے اندر جوابدہی کا کسی قدر خوف ہو یعنی جس حقیقت کو قرآن لے کر آیا ہے' وہ ان کے دلوں کے اندر موجود ہو۔ اور قرآن ان کو یاد دلائے کہ اسے بھی یاد کرو' اور دلوں کو اس پر

ابھارے ۔ رہے وہ لوگ جو سرے سے ڈرتے ہی نہیں تو ان کے دل غافل اور اندھے ہیں مسخ شدہ ہیں ۔ وہ نور معرفت اور نصیحت سے محروم ہیں اور نہ قرآن ان کے لیے مفید ہے ۔

وَ اِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ( ۶۹ : ۴۹ ) "اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں کچھ لوگ جھلانے والے ہیں" ۔ لیکن بعض لوگوں کے جھلانے سے حقیقت نہیں بدل جاتی ۔ اس طرح تمہارا یہ فعل حقائق کو نہیں بدل سکتا ۔

وَ اِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ( ۶۹ : ۵۰ ) "ایسے کافروں کے لیے یہ یقیناً موجب حسرت ہے" ۔ اس لیے کہ یہ قرآن اہل ایمان کی تو شان بلند کرتا ہے جبکہ تکذیب کرنے والوں کی حیثیت کو گراتا ہے اور آخر کار تو حق نے غالب ہونا ہے ۔ اور مکذبین نے ذلیل ہونا ہے ۔ عنقریب ایسا ہو گا اور پھر ان کے لیے یہ موجب حسرت ہو گا اور قیامت کے دن بھی ان پر یہ حجت ہو گا اور موجب حسرت ہو گا کیونکہ تکذیب کی وجہ سے ان کو سخت عذاب دیا جائے گا ۔ لہٰذا دنیا اور آخرت دونوں میں ان کے لیے موجب حسرت ہو گا ۔

وَ اِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ( ۶۹ : ۵۱ ) "اور یہ بالکل یقینی حق ہے" ۔ جھلانے والوں کے جھلانے کے باوجود یہ حق ہے ۔ یقینی ہے ۔ صرف یقینی نہیں بلکہ حق الیقین ہے ۔ حق الیقین ایک خاص انداز کی تاکید ہے جو لفظاً بھی زوردار ہے اور معناً بھی تاکید ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ سچائی میں یہ گہرا ہے ۔ یقین میں نہایت گہرا ہے اور جو کچھ اس میں بیان ہوا ہے یہ حق اور سچائی ہے ۔ ایک ایک آیت میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا سرچشمہ خدا تعالیٰ ہے ۔

یہ ہے اس دین کا مزاج اور طبیعت اور یقینی نتیجہ ۔ نہ یہ شاعری ہے نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے ۔ نہ یہ اللہ پر افتراء ہے ۔ بلکہ یہ اللہ رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہے اور یہ متقی لوگوں کے لیے تذکرہ اور یاد دہانی ہے ۔ اور حق الیقین ہے ۔

اب آخر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو آخری ہدایات دی جاتی ہیں ۔ گزشتہ مباحث کے بعد اس قسم کی تلقین کا بہترین اور مناسب وقت ہے ۔ لہٰذا یہ نہایت ہی بروقت ہدایت ہے ۔

۲
ع۱۵ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۵۲﴾

۶ "پس اے نبیؐ ! اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو" ۔ ایسی تسبیح جس میں اللہ کی پاکی بھی ہو اور اللہ کی بڑائی بھی ۔ جس میں اعتراف حق بھی ہو اور تحقیق حق بھی ہو ۔ جس میں عبودیت بھی ہو اور خضوع و خشوع بھی ہو ۔ اس طویل بحث و مباحثہ کے بعد جس میں اللہ کی عظیم قدرتوں کا بیان ہوا ' اور رب کریم کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے ۔ دلوں کے اندر یہ شعور پیدا کیا جاتا ہے کہ اللہ رب عظیم ہے ۔

---○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۲۹

## سورۃ المعارج - ۷۰

## ۱ -- تا -- ۴۴

# سورۃ المعارج ایک نظر میں

یہ سورت طویل اور ست رفتار نفسیاتی علاج کی ایک کڑی ہے ۔ مشرکین کے ذہنوں میں دور جاہلیت کی جو گہری اور پیچیدہ بیماریاں تھیں اور قرآن کریم ان کا علاج کر رہا تھا' یہ اس کی ایک کڑی ہے ۔ اور اس میں جاہلیت کی بقایا تاریکیوں اور بیماریوں کی صفائی کی گئی ہی ۔ جس طرح یہ مہم اس وقت قرآن کو درپیش تھی' اسی طرح آئندہ بھی تحریک اسلامی کو ایسی ہی مہم درپیش ہو سکتی ہے ۔ ہر دور کی جاہلیت کی سطح میں اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن اس کے ظاہری اور پوشیدہ حقائق میں اختلاف نہیں ہوتا ۔

غرض یہ ایک نفسیاتی مہم ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انسانی نفس کے نشیب و فراز میں جہاں جہاں بھی جاہلیت کے اس قسم کے آثار ہوں اور تہہ بہ تہہ تاریکیاں جمی ہوئی ہوں' ان کی صفائی کر دی جائے اور یہ اس قدر مشکل مہم تھی' جو ان جنگی مہمات' سے زیادہ مشکل تھی' جن میں' بعد کے ادوار میں' مسلمانوں نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ۔ یہ ذہنی اور نفسیاتی تاریکیاں اور بیماریاں ان سیاسی قوتوں سے زیادہ سخت اور زیادہ دفاع کرنے والی تھیں بلکہ حملہ آور ہونے والی تھیں' جو تحریک اسلامی کی پوری تاریخ میں اس کے خلاف حملہ آور رہیں ۔ قدیم زمانے میں بھی اور آج کی جدید تاریخ میں بھی ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کو نفسیات اور عقائد و نظریات کے میدان میں جنگ کرنی پڑی ۔

اس سورت کا بنیادی موضوع اور اس کا محور عقیدۂ قیامت ہے ۔ قیامت کا ثبوت اسے لوگوں کے دل و دماغ میں بٹھانا کہ وہ دن آئے گا' جس میں جزاء و سزا کا عمل ہو گا ۔ اور کافروں کو وہ سزا دی جائے گی جس سے قرآن ان کو ڈراتا ہے ۔ اس سورت کا ہدف صرف یہی ہے کہ اس حقیقت کو ذہن نشین کر لیا جائے اور نفس انسانی اگر مومن ہو تو وہ بہت مختلف ہوتا ہے اس سے جب وہ کافر ہو ۔ چنانچہ یہ سورت نفس مومنہ کی صفات اور علامات بھی بتاتی ہے ۔ اور اس کے شعور اور طرز عمل کو بھی بتاتی ہے اور اللہ کے ہاں اس کے استحقاق کو بھی ظاہر کرتی ہے اور نفس امارہ کفارہ کے بارے میں بھی بتاتی ہے اور یہ بھی بتاتی ہے کہ اس کے لیے کیا عذاب ہے اور کس قدر ذلت و اہانت ہے ۔ اور یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان کی طے کردہ قدریں کیا ہوتی ہیں؟ اور خالق کائنات کی طے شدہ قدریں کیا ہیں؟

یوں یہ سورت انسان کی نفسیاتی بیماریوں کا طویل المدت علاج کرتی ہے ۔ نفس انسانی کی دنیا کے نشیب و فراز میں اترتی ہے' اور اس کی کمزوریوں اور بیماریوں کو لیتی ہے اور ان کا علاج کرتی ہے ۔ یہ تھا وہ نفسیاتی معرکہ جو اس کتاب نے ایک طویل عرصے تک لڑا اور اس میں یہ کتاب کامیاب رہی' بعد کے ادوار میں مسلمانوں کے لیے پھر میدان معرکہ مشکل نہ تھا کیونکہ قرآن نے اس جنگی میدان میں معرکے سے قبل کفار کو نفسیاتی' دینی اور نظریاتی میدان میں شکست دے دی تھی ۔ اور یہ بہت مشکل کام ہوتا ہے' خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ کسی نظریاتی قوت کی پشت پر کوئی مادی قوت نہ ہو ۔

جو لوگ قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کے ذہن میں واقعات سیرت بھی مستحضر ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مکہ کے

اندر قرآن کریم کس قوت کے ساتھ عربوں کی نفسیاتی دنیا پر لشکر کشی کر رہا تھا اور کس طرح نفوس کو فتح کر کے ان کو برضا و رغبت اسلامی قیادت کی حلقہ بگوشی تسلیم کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ مکہ مکرمہ میں جب انسان قرآن کی فتوحات پر نظر ڈالتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن انسانی نفسیات پر عجیب عجیب زاویوں سے حملے کرتا تھا اور ان کو فتح کر لیتا تھا۔ کبھی تو قرآن کا انداز یوں ہوتا کہ کسی سورت میں طوفان اور سیلاب کی طرح دلائل اور موثرات آتے ہیں۔ اور جاہلیت کے افکار باطلہ کے خس و خاشاک کو بہا کر لے جاتے ہیں اور بعض اوقات اندازبیان یوں ہوتا ہے جس طرح ایک غضبناک قوم حملہ آور ہوتی ہے اور جو بھی اس کے سامنے آتا ہے اسے مٹا کر رکھ دیتی ہے۔ یوں قرآن کریم جاہلیت کے آثار اور تصورات کو مٹا دیتا ہے اور بعض اوقات وہ یوں حملہ آور ہوتا ہے کہ گویا وہ کوڑے برسا رہا ہے' جس سے انسانی احساس جل اٹھتا ہے۔ اور انسان ان کی مار کو اور درد کو برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ اور بعض اوقات قرآن کریم کا انداز بہت ہی خوشگوار' محبت آمیز مکالمات سے بھرپور ہوتا ہے اور یہ مکالمات محبت اور ہمدردی سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور انسانی شعور اور دل کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات قرآن کی پکار نہایت ہی ہولناک ہوتی ہے۔ سننے والوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ اسی چیخ اور زوردار پکار کو سن کر انسان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ محسوس کرتا ہے کہ بہت ہی خطرہ درپیش ہے۔ اور بعض اوقات قرآن کا انداز نہایت سادہ اور صاف ہوتا ہے۔ اور کوئی عقلمند انسان اسے نظرانداز نہیں کر سکتا۔ اور نہ اس میں کوئی جدل و جدال کر سکتا ہے۔ کبھی اس کا انداز نہایت پرامیدی کا ہوتا ہے اور قرآن قاری کو امید کی ایک کرن عطا کرتا ہے' جس سے انسانی شعور میں روشنی اور صبح نو اور تروتازہ فضا کی امید پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی انداز یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم انسانی مغیبات کی پیچیدہ وادیوں اور اس کے اندرونی نشیب و فراز میں اتر جاتا ہے اور انسان کی داخلی کیفیات کو ایک منظر کی شکل عطا کر دیتا ہے اس طرح کہ انسان اس منظر کو دیکھ کر شرمندگی محسوس کرتا ہے کہ یہ تو میرا راز افشا ہو گیا۔ یوں انسان خود اپنے تاثرات اور اپنے میلانات اور انفعالات سے واقف ہوتا ہے جبکہ اس سے قبل وہ خود اپنے میلانات سے غافل تھا۔ غرض قرآن کریم میں سینکڑوں نیچ' سینکڑوں تنبیہات' سینکڑوں پکاریں' سینکڑوں دلائل ہیں' جو تلاوت قرآن کے دوران سامنے آتے ہیں۔ اور ان کے ذریعہ قرآن اس فکری اور شعوری میدان جنگ میں کشکش برپا کیے ہوئے ہے۔ غرض یہ طویل' مسلسل اور پیہم جدوجہد قرآن نے جاری رکھی اور عربوں جیسے معاند دلوں کو شکست دے دی۔

یہ پوری سورت ان کوششوں کا ایک نمونہ ہے جس میں ثبوت آخرت پر بحث ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے متعلقہ موضوعات بھی اس میں لیے گئے ہیں۔

سورہ الحاقہ بھی دراصل ثبوت آخرت ہی کے موضوع پر تھی۔ لیکن سورہ الحاقہ اور اس سورت کے انداز میں بہت فرق ہے۔ اس سورت میں قیام قیامت کے موضوع کو بالکل ایک نئے زاویہ سے لیا گیا ہے۔ اور بالکل جدید رنگ اور جدید انداز اور جدید سائے اور عکس میں!

پچھلی سورہ الحاقہ میں قیامت کے ہولناک اور خوفناک مناظر لیے گئے تھے جنہیں پڑھ کر انسان ششدر رہ جاتا ہے اور جو مناظر اور حرکات دکھائی گئی تھیں وہ بھی شدید اور خوفناک تھیں۔ مثلاً :

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ (۱۳) وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا

دَكَّةً وَّاحِدَةً (١٤) فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (١٥) وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ (١٦) (٦٩ : ١٣ — ١٦) "پھر جب ایک دفعہ صور میں پھونک مار دی جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا' اس روز وہ ہونے والا واقعہ پیش آ جائے گا۔ اس دن آسمان پھٹے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی۔

اور اسی سورت میں اللہ کی شان کبریائی اور جلالت کو یوں خوفناک انداز میں بیان کیا گیا ہے :

وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ (٦٩:١٧) يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ (٦٩:١٨) (٦٩ : ١٧ — ١٨) "فرشتے اس کے اطراف و جوانب میں ہوں گے اور آٹھ فرشتے اس روز تیرے رب کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ وہ دن ہو گا جب تم لوگ پیش کیے جاؤ گے تمہارا کوئی راز بھی چھپا نہ رہ جائے گا"۔

اسی طرح سورہ الحاقہ میں جو عذاب کے مناظر تھے' وہ بھی نہایت ہولناک تھے۔ یہاں تک کہ عدالت کبریائی کی طرف سے عذاب کے جو احکامات صادر ہوئے' ان کے الفاظ میں بھی شدت صاف صاف نظر آتی ہے۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ (٣٠) ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ (٣١) ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ (٣٢) (٦٩ : ٣٠ تا ٣٢) "پکڑو اسے اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو' پھر اسے جہنم میں جھونک دو' پھر اس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو"۔ اور جن لوگوں کو عذاب دیا گیا ان کی چیخ و پکار اور آہ و فغاں میں بھی یہ شدت اور سختی عیاں ہے' زور زور سے آہ و زاری کر رہے ہیں وہ۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ (٢٥) وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ (٢٦) يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ (٢٧) (٦٩: ٢٥ تا ٢٧) "کاش میرا اعمال نامہ مجھے نہ دیا گیا ہوتا اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ کاش میری وہی موت (جو دنیا میں آئی تھی) فیصلہ کن ہوتی"۔

رہی یہ سورت تو اس کے تمام مناظر اس کائنات کے بجائے نفس انسانی کے اندر ہیں۔ انسانی نفس کے خدوخال' اس کی علامات' اس کے خلجان' اس کے اقدامات وغیرہ۔ اگر اس میں اس کائنات کا کوئی منظر ہے بھی تو اس کا خوف بھی نفسیاتی دنیا میں ہے۔ ظاہری مناظر میں نہیں ہے۔ یعنی نفس انسانی کے اندر جو ڈر' زلزلہ' خلجان' بھوک اور خوف کی حالت ہوتی ہے' یہاں یوں اس کے اندر محدود ہے۔

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ (٨) وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ (٩) وَلَا يَسْئَلُ

حَمِيمٌ حَمِيمًا (١٠) يُبَصَّرُونَهُمْ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ (١١) وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ (١٢) وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ (١٣) وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ (١٤) (٧٠: ٨ تا ١٤) "جس روز آسمان پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون جیسے ہو جائیں گے۔ اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو' اپنی بیوی کو' اپنے بھائی کو' اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا' اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اسے نجات دلا دے"۔ یہ سب نفسیاتی اتار چڑھاؤ ہیں۔

اس سورت میں جہنم بھی ایک زندہ نفس کی شکل میں آتی ہے۔ اور وہ تمام زندوں کے احساسات میں شریک ہے۔

كَلَّا إِنَّهَا لَظَى (١٥) نَزَّاعَةً لِلشَّوَى (١٦) تَدْعُوا مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّى (١٧) وَجَمَعَ فَأَوْعَى (١٨) (٧٠: ١٥ تا ١٨) "وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہوگی جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی' پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی ہر اس شخص کو' جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری اور مال جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا"۔

اس سورت میں جو عذاب مذکور ہے اس کی نوعیت بھی حسی سے زیادہ نفسیاتی ہے۔

يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلَى نُصُبٍ يُوفِضُونَ (٤٣) خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ذَلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ (٤٤) (٧٠: ٤٣ - ٤٤) "جب یہ اپنی قبروں سے نکل کر اس طرح دوڑے جا رہے ہوں گے جیسے اپنے بتوں کے استھانوں کی طرف دوڑ رہے ہوں' ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی' ذلت ان پر چھا رہی ہوگی یہ وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے"۔

لہٰذا اس سورت کے مناظر' تصاویر اور سائے سورہ الحاقہ سے اس طرح مختلف ہیں جس طرح دونوں سورتوں کا ماحول اور انداز مختلف ہے۔ لیکن دونوں سورتیں ایک ہی حقیقت کو بیان کر رہی ہیں۔ یعنی عقیدۂ آخرت اور آخرت کے مناظر۔

یہی وجہ ہے کہ سورہ معارج میں انسانی نفس کے وہ حالات بھی بیان کیے گئے ہیں جو خوشی کی حالت میں ہوتے ہیں اور وہ حالات بھی جو مشکلات میں ہوتے ہیں۔ ایمان کی حالت اور کفر کی حالت۔ اور یہ اس سورت کے نفسیاتی رنگ کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انسان کے نفسیاتی حالات کے بارے میں ہے :

إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا (١٩) إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا (٢٠) وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا (٢١)

اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ (۲۲) الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (۲۳) (۷۰: ۱۹ تا ۲۳) "انسان تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے' جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔ مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں' جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں"۔ اور اہل ایمان کی نفسیاتی اور عملی حالت یہ ہے:

اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ (۲۲) الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (۲۳) وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ (۲۴) لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۲۵) وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (۲۶) وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ (۲۷) اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ (۲۸) وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (۲۹) اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ (۳۰) فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (۳۱) وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (۳۲) وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ (۳۳) وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (۳۴) اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ (۳۵) (۷۰: ۲۲ تا ۳۵) جو نماز پڑھنے والے ہیں' جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں' جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے' جو روز جزا کو برحق مانتے ہیں' جو لپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی بے خوف ہو' جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ــــ بجز اپنی بیویوں یا اپنی مملوکہ عورتوں کے' جن سے محفوظ نہ رکھنے میں ان پر کوئی ملامت نہیں' البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں ــــ' جو اپنی امانتوں کی حفاظت اور لپنے عہد کا پاس کرتے ہیں' جو اپنی گواہیوں میں راست بازی پر قائم رہتے ہیں اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ لوگ عزت کے ساتھ جنت کے باغوں میں رہیں گے"۔

سورہ الحاقہ کا محور اور مضمون یہ تھا کہ اسلامی عقیدہ اور نظریہ کے متعلق فیصلہ کن انداز اختیار کیا جائے اور عقیدۂ آخرت چونکہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقیدے کے ایک جزکی حیثیت سے زیر بحث تھا۔ باقی مضامین بھی تھے مثلاً زمین میں مکذبین پر عذاب کا نزول۔ اور سخت گرفت اور یہ کہ اسلامی نظریہ میں اگر کوئی تبدیلی کرتا ہے تو ان کی گرفت۔ لیکن سورہ المعارج کا زیادہ تر مضمون صرف قیامت کے بارے میں ہے۔ وہاں کی جزاء و سزا' گویا وہاں آخرت کا مضمون ضمنی اور یہاں اصل محور ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو دوسرے مضامین یہاں لائے گئے ہیں' وہ براہ راست آخرت سے متعلق ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ اللہ

کے ہاں ایام اللہ کا حساب و کتاب کیا ہے اور آخرت کے بارے میں لوگوں کے کیا اندازے ہیں اور اللہ کے ہاں اس کی حقیقت کیا ہے؟

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (٤)فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا (٥) اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا (٦) وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا (٧) (٧٠: ٥ تا ٧)

"ملائکہ اور روح اس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ پس اے نبیؐ صبر کرو شائستہ صبر۔ یہ لوگ اسے دور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں"۔ یہ بھی آخرت سے متعلق حقیقت ہے۔

اسی طرح یہ بات کہ انسانی نفس اگر ایمان رکھتا ہو یا ایمان سے خالی ہو' ان دونوں حالتوں میں فرق کیا ہوتا ہے۔ دونوں کا انجام کیا ہوتا ہے؟

پھر یہ بات کہ کافر دھوکہ کھاتے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ جنت میں داخل ہوں گے' حالانکہ اللہ کے ہاں ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے اور وہ اللہ سے آگے ہو کر کوئی کام نہیں کر سکتے اور نہ اللہ کے عذاب سے بچ سکتے ہیں اور یہ بات بھی سورت کے اصلی محور سے متعلق ہے۔

یوں یہ سورت قریب قریب قیامت کے موضوع تک محدود ہے۔ اور اسی حقیقت کو لوگوں کے ذہن نشین کرانا چاہتی ہے' باوجود اس کے کہ اس کے بیچ متنوع ہیں اور بعض ایسے موضوعات بھی اس میں ہیں جو اصل موضوع کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔

اب ہم اس طرف آتے ہیں کہ اس سورت کا ایک خاص انداز تعبیر ہے اور ایک خاص موسیقی اس میں ملحوظ ہے۔ سورہ الحاقہ میں تنوع یہ تھا کہ قافیہ ایک ایک پیراگراف میں بدل جاتا تھا۔ اور یہ تبدیلی معنوی تبدیلی کے ساتھ ہوتی تھی' لیکن اس سورہ المعارج میں قافیہ اور موسیقی کا تنوع ذرا مزید گہرا ہے۔ اس میں جملوں میں موسیقی کے لحاظ سے بھی تنوع ہے اور قافیہ کے لحاظ سے بھی۔ اور اس میں جملوں کی ترکیب موسیقی کے زاویہ سے ذرا گہری اور سورت کے پہلے حصے میں خاص طور پر نمایاں ہے۔

آغاز میں تین جملے موسیقی اور قافیہ کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ جملوں کی طوالت بھی یکساں ہے مثلاً:

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ (١) لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ (٢) مِّنَ اللّٰهِ ذِى الْمَعَارِجِ (٣) تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (٤) فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا (٥) (٧٠: ١ تا ٥) یہاں پانچویں آیت اور قافیہ میں اس پیراگراف کو جمیلاً کی الف پر ختم کیا گیا ہے۔

اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا (٦) وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا (٧٠: ٧) صرف دو فقرے اور خاتمہ الف پر دونوں مرتبہ

اور دوسرے فقرے پر پیرا ختم ہے۔

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ (٨) وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ (٩) وَ لَا يُسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا (١٠) (٧٠: ٨ تا ١٠) اس میں داخلی قافیے مختلف ہیں' لیکن تیسرے فقرے پر الف پر پیرا ختم۔

يُّبَصَّرُوْنَهُمْ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيْهِ (١١) وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ (١٢) وَ فَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُئْوِيْهِ (١٣) وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ (١٤) كَلَّا اِنَّهَا لَظٰى (١٥) نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى (١٦) تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى (١٧) وَ جَمَعَ فَاَوْعٰى (١٨) اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (١٩) اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا (٢٠) وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا (٢١) (٧٠: ١١ تا ٢١) اس پیرے میں جو چھ مرتبہ الف پر وقف ہے' تین آخری الف کا انداز پہلے تین سے مختلف ہے۔ اور اس کے بعد پھر آیات کا خاتمہ میم اور نون پر یا یاء اور نون پر ہوتا ہے۔

سورت کے آغاز میں موسیقی کی متنوع ٹون ہے' یہ ٹون نہایت گہری اور پیچیدہ ہے۔ اور اس کی یہ پیچیدگی' اور اس کا یہ تنوع' موسیقی کا ذوق رکھنے والے کانوں کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے اندر موسیقی کا وہ حسن ہے جو عربی معاشرے کے ذوق موسیقی کے لیے انوکھا ہے۔ اور اس کا ٹون عربی موسیقی کے ٹون سے مختلف ہے لیکن قرآن اپنے مخصوص اسلوب کے ساتھ اسے سہل بناکر عربی ذوق کے سامنے رکھتا ہے اور یہ عربی ذوق اسے قبول کر لیتا ہے۔ اگرچہ یہ ٹون اپنی تشکیل کے اعتبار سے بالکل ایک جدید اور گہرا فن ہے اور عربوں کے عادی ذوق موسیقی سے مختلف ہے۔ ان گزارشات کو وہ لوگ تو بسہولت سمجھ سکتے ہیں جو کسی قدر اصول موسیقی سے واقف ہیں اور وہ ان باتوں کو سمجھنے میں زیادہ وقت محسوس نہ کریں گے۔ عام لوگوں کے لیے مناسب ہے کہ وہ میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن کی فصل ''التناسق'' کا مطالعہ کریں۔

اب آیات کی تفصیلات اور تفسیر۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۲۰۷ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۴۴

سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ (۷۰) مَكِّيَّةٌ (۷۹) اٰيَاتُهَا ۴۴ رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۝۱ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۝۲ مِّنَ اللّٰهِ ذِي
الْمَعَارِجِ ۝۳ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ
اَلْفَ سَنَةٍ ۝۴ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۝۵ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝۶ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝۷
يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۝۸ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝۹ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ
حَمِيْمًا ۝۱۰ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ۭ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۢ بِبَنِيْهِ ۝۱۱
وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۝۱۲ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۝۱۳ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا
ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝۱۴ كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ۝۱۵ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝۱۶ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝۱۷
وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝۱۸

اللہ کے نام سے جو بے انتا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"مانگنے والے نے عذاب مانگا ہے' (وہ عذاب) جو ضرور واقع ہونے والا ہے' کافروں کے لیے ہے 'کوئی اسے دفع کرنے والا نہیں' اس خدا کی طرف سے ہے جو عروج کے زینوں کا مالک ہے۔ ملائکہ اور روح اس کے حضور ﷺ چڑھ کر جاتے ہیں۔ ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ پس اے نبی صبر کرو' شائستہ صبر۔ یہ لوگ اسے دور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں"۔ (وہ عذاب اس روز ہو گا) جس روز آسمان پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہو

جائے گا اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون جیسے ہو جائیں گے ـ اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے ـ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو' اپنی بیوی کو' اپنے بھائی کو' اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا' اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیرات نجات دلا دے ـ وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہوگی جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی' پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی ہر اس شخص کو' جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری اور مال جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا"۔

مشرکین عرب کے نزدیک حقیقت آخرت کو سمجھنا نہایت ہی مشکل کام تھا ـ جب حضور اکرم ﷺ نے ان کے سامنے یہ حقیقت پیش فرمائی تو انہوں نے اس کے مقابلے میں سخت نفسیاتی ردعمل کا اظہار کیا ـ یہ لوگ اسے نہایت تعجب انگیز' عجیب و غریب اور ایک خوفناک قسم کا نظریہ سمجھتے تھے ـ اس لیے انہوں نے بڑی سختی سے اس کا انکار کیا ـ اور مختلف انداز میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو چیلنج کہ آپؐ یہ دن لا کر دکھائیں ـ کبھی کہا اس کا وقت ہی بتا دیں ـ

حضرت ابن عباس کی ایک روایت میں آتا ہے کہ جس شخص نے عذاب قیامت لانے کے بارے میں سوال کیا تھا' وہ نضر ابن حارث تھا اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ کفار کی طرف سے سوال تھا کہ لاؤ عذاب اور اللہ نے فرمایا مانگنے کی ضرورت نہیں ہے وہ تو کفار پر آنے ہی والا ہے ـ

بہرحال کوئی تھا جس نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ آجائے قیامت اور ہو جائے ان کو عذاب ـ تو اللہ نے فرمایا کہ یہ بہت جلد آنے والا ہے ـ کیونکہ اللہ نے اسے مقدر کر دیا ہے تم اسے بعید سمجھتے ہو' لیکن ہے یہ قریب' اور کوئی اسے دفع نہیں کر سکتا اور نہ روک سکتا ہے ـ لہٰذا اس کے بارے میں مطالبہ کرنا جبکہ وہ واقع ہونے ہی والا ہے' سوال کرنے والے کی بدنصیبی کے سوا کچھ نہیں ہے ـ یہ سوال کرنے والا ایک ہو یا بہت سے سوال کرنے والے ہوں' بہرحال سوال کیا گیا تھا ـ

کافرین مطلقاً عذاب کے مستحق ہیں' چاہے وہ قیامت کے بارے میں سوال کریں یا نہ کریں اور یہ عذاب وقوع پذیر ہونے والا ہے' اس اللہ کی طرف سے' جو عروج کے زینوں کا مالک ہے' جو ہر قسم کی برتری کا مستحق ہے اور جو بڑے درجوں والا اور صاحب عرش عظیم ہے ـ

اس افتتاحی فقرے کے بعد' جس میں عذاب کے موضوع پر فیصلہ کن بات کر دی گئی کہ یہ واقع ہو گا' فلاں فلاں اس کے مستحق ہوں گے' یہ عذاب اللہ کی طرف سے ہو گا' جو نہایت ہی بلند اور قوتوں والا ہے' اور اس کے بارے میں جو فیصلہ ہے وہ نافذ ہونے والا ہے' کوئی قوت اسے رد کرنے والی نہیں ہے ـ یہ فیصلہ عالم بالا کا ہے' اب اس یوم العذاب کی تفصیلات اور اس دن کے واقعات پائے جاتے ہیں' جس کے بارے میں یہ لوگ جلدی مچا رہے ہیں ـ یہ قریب ہے لیکن اللہ کے ہاں زمانوں کا حساب انسانوں کے زمانوں کے حساب سے بہت ہی مختلف ہے ـ اللہ کے اندازوں اور انسانوں کے اندازوں کے درمیان بہت فرق ہے ـ اللہ کے معیار اور انسان کے معیار مختلف ہیں ـ

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (٤)
فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا (٥) اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا (٦) وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا (٧) (٧٠: ٤ تا ٧)

اور روح اس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے ۔پس اے نبیؐ صبر کرو' شائستہ صبر ۔یہ لوگ اسے دور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں"۔ راجح بات یہ ہے کہ جس دن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' وہ قیامت کا دن ہے کیونکہ سیاق کلام میں یہ معنی متعین نہیں ہیں ۔اس دن ملائکہ اور روح اللہ کی طرف چڑھتے ہیں اور روح سے مراد راجح روایت کے مطابق حضرت جبرئیل ہیں ۔جیسا کہ دوسرے مقامات پر ان کو اسی نام سے موسوم کیا گیا ہے ۔ملائکہ کے بعد خصوصاً ان کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اہم مرتبہ ہے اور اس دن کے حوالے سے یہ ذکر کہ ملائکہ اور روح الامین اس دن اوپر جائیں گے ۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت ہی اہم دن ہو گا ۔اور اس کی یہ خصوصیت ہوگی ۔ اور وہ اس دن اس کے انتظامات اور معاملات کے بارے میں اوپر جائیں گے اور ہمیں یہ معلوم نہیں ہے اور نہ ہی ہمیں اللہ نے اس کا مکلف بنایا ہے کہ ہم جانیں کہ ان کی یہ دوڑ دھوپ کن معاملات کے لیے ہوگی اور نہ یہ کہ یہ فرشتے کس طرح چڑھیں گے اور کہاں جائیں گے چڑھ کر؟ یہ عالم غیب سے متعلق امور ہیں اور اس آیت کے مفہوم میں ان سے کوئی اضافہ نہیں ہو گا ۔اور کوئی دلیل بھی ہمارے پاس نہیں ہے ۔بس یہ کہ وہ بہت ہی اہم دن ہو گا' جس میں اس قدر اہم لوگ بہت ہی زیادہ مشغول ہوں گے ۔

رہی یہ تعبیر ۔

كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ (۷۰ : ٤) تو اس سے مراد طویل زمانہ بھی ہو سکتا ہے اور عربی اسالیب میں یہ استعمال عام ہے' اور اس سے مراد کوئی متعین وقت بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فی الواقعہ دنیا کے سالوں کی طرح یہ پچاس ہزار سال کا ایک طویل دن ہو ۔ہمارے زمانے میں یہ حقیقت قریب الفہم ہو گئی ہے کیونکہ ہمارا دن تو زمین کی گردش محوری سے بنتا ہے اور یہ گردش چوبیس گھنٹوں میں مکمل ہو جاتی ہے اور ایسے ستارے بھی ہیں جن کی گردش محوری ہمارے اس ستارے زمین کی گردش سے کئی ہزار گنا زیادہ وقت میں مکمل ہوتی ہے ۔اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ گویا ستر ہزار سالوں یا پچاس ہزار سالوں سے مراد کوئی متعین زمانہ ہے بلکہ اس سے مراد ایک معیار ہے اللہ کے معیاروں میں سے ۔

اور اللہ کے ایام میں سے ایک دن اگر پچاس ہزار سال کے برابر ہے تو قیامت کے عذاب کو یہ لوگ جو دور دیکھتے ہیں' وہ اللہ کے نزدیک قریب ہے ۔یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا جاتا ہے کہ آپ صبر جمیل سے کام لیں اور ان کی تکذیب اور عذاب آخرت کے بارے میں شتابی سے پریشان نہ ہوں ۔

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا (٥) إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا (٦) وَنَرَاهُ قَرِيبًا (٧) (۷۰: ۵ تا ۷)

"پس صبر کرو شائستہ صبر' یہ لوگ اسے دور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں"۔صبر کی ہدایت پر دعوت ہر داعی کو دی جاتی رہی ہے ۔ ہر رسول کو یہی ہدایت کی گئی کہ صبر کریں اور رسولوں کے متبعین مومنین کو بھی صبر جمیل کی ہدایت کی گئی ۔ یہ راہ جس قدر دشوار گزار ہے اور یہ دعوت جس قدر بھاری ہے' اور اس میں کمزور نفس انسانی کو لغزشوں سے بچانے کی جس قدر ضرورت ہے' اس کی اہمیت عیاں ہے کیونکہ اسلامی انقلاب کا ہدف دور نظر آتا ہے اور مقصد اور منزل

افق میں بہت دور اور بلندی پر ہوتی ہے۔

صبر جمیل سے مراد وہ صبر ہے جس سے صبر کرنے والا مطمئن ہو' اس کے دوران صبر کرنے والا مصیبت' بے چینی اور شک کا احساس نہ رکھتا ہو۔ اسے یقین ہو کہ اس کے ساتھ جو وعدہ کیا گیا ہے وہ سچا ہے۔ صبر کرنے والے کی کیفیت یہ ہو کہ اس کا انجام بہتر ہونے والا ہے' جو اللہ کی تقدیر پر راضی ہو اور جو ابتلاء آرہی ہے' وہ یقین رکھتا ہو کہ اس میں حکمت الٰہی مضمر ہے۔ اور صبر کرنے والا یہ سمجھتا ہو کہ جو مصیبت بھی اس پر آتی ہے وہ اللہ کی طرف سے آرہی ہے۔ اور اسے اس کا اجر دیا جائے گا۔

یہی وہ صبر ہے جسے صبر جمیل کہا گیا ہے۔ اور یہی صبر ایک داعی کو زیب دیتا ہے کیونکہ وہ اللہ کی طرف بلاتا ہے' اللہ کی دعوت دیتا ہے۔ اس میں اس کا اپنا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس دعوت کے ساتھ اس کے ذاتی مفادات وابستہ نہیں۔ اس لیے اس پر جو مصائب آرہے ہیں وہ اللہ کی راہ میں ہیں اور اس کے بارے میں جو فیصلے ہوتے ہیں وہ اللہ کے فیصلے ہیں۔ اس لیے صبر جمیل وہ ہے جو حقیقت پسندانہ اور شائستہ ہو۔ اور اس صبر کرنے والے کو ان امور کا گہرا شعور ہو۔

یہ دعوت جس کے مقابلے میں مکذبین کھڑے ہو جاتے ہیں' اور اس کی راہ روکتے ہیں' یہ اللہ کی دعوت ہے اور قیامت جس کی وہ تکذیب کرتے ہیں اور اس کے برپا ہونے کے لیے جلدی مچاتے ہیں۔ یہ بھی اس کی دعوت ہے اور وہی ہے جو اپنی تدبیر اور حکمت کے مطابق اس کے قیام کے وقت کا تعین کرتا ہے۔ لیکن لوگ اس تدبیر اور تقدیر کو سمجھ نہیں پاتے۔ اور جلدی مچاتے ہیں۔ اور جب وقت زیادہ گزر جائے تو وہ اس میں شک کرتے ہیں۔ بعض اوقات تو خود داعی سخت بے چینی محسوس کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں بھی یہ رغبت اور خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ اللہ کا وعدہ جلدی ہی سامنے آجائے اور ایسے ہی اوقات میں داعی کو ایسی ہدایت کی جاتی ہے۔

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا (۷۰:۵) "صبر کرو' شائستہ صبر"۔

یہاں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے' تاکہ آپ کا قلب مبارک مخالفت اور تکذیب کے دکھ کو برداشت کرلے۔ اور اس کے ساتھ دوسری حقیقت کو سمجھ لے کہ واقعات و معاملات کے پیمانے اللہ کے ہاں اور ہوتے ہیں اور لوگوں کے ہاں اور۔

اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا (۷۰:۷) "یہ لوگ اسے دور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں"۔ اس کے بعد اس دن کے مناظر پیش کیے جاتے ہیں' جس میں واقع ہونے والا عذاب آئے گا' جسے وہ بعید سمجھتے ہیں اور اللہ اسے قریب سمجھتا ہے یہ مناظر اس کائنات میں ہیں اور انسان کی نفسیاتی دنیا کے اندر بھی۔ یہ اس قدر ہولناک ہوں گے کہ انسان کے اوسان خطا ہو جائیں گے اور اس کائنات اور نفس انسانی کے اندر زلزلہ برپا ہو گا۔

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ (۸) وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ (۷۰:۹) "جس روز آسمان پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون جیسے ہو جائیں گے"۔ مہل کے معنی ہیں خام معدنیات کو پگھلانا مثلاً تیل کی تلچھٹ' اور العہن کے معنی ہیں اون کا منقش کپڑا۔ قرآن کریم مختلف مقامات میں یہ

اطلاع دیتا ہے کہ اس دن عظیم واقعات رونما ہوں گے ۔ ان کی وجہ سے اس دنیا کے اجرام فلکی کی موجودہ حالت نہیں رہے گی ۔ ان کے اوصاف ' حالات اور شکل بدل جائے گی اور ان میں سے ایک یہ آسمان یوں ہو جائے گا جس طرح پگھلی ہوئی معدنیات ۔ اور جو لوگ علوم طبعیہ پر تحقیقات کرتے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ ان آیات پر غور کریں ۔ ان کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ تمام فلکی اجرام دراصل پگھلے ہوئے مادے سے منجمد ہوئے ہیں ' یہاں تک کہ یہ مادہ گیس کی شکل میں تھا اور گیس کا درجہ پگھلنے اور سیال ہونے کی حالت کے بھی بعد آتا ہے ۔ شاید یہ تمام مادہ قیامت کے دن بجھ جائے گا ۔ جس طرح کہا گیا ۔

وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ "اور جب ستارے تاریک ہو جائیں گے"۔ اور ٹھنڈے ہو کر سیال ہو جائیں گے ' یوں ان کی گیس کی طبیعت میں تبدیلی ہو جائے گی ۔

بہرحال یہ تو ایک احتمال ہے اور اس زاویہ سے تحقیقات کرنے والوں کی دلچسپی اس میں ہو سکتی ہے ۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم تو اس بات پر ایمان رکھتے ہیں جو آیت کا مفہوم ہے ۔ اور جس میں یہ خوفناک نقشہ کھینچا گیا ہے کہ آسمان پگھلے ہوئے مواد کی طرح ہوں گے ۔ اور پہاڑ دھنکے ہوئے متلون اون کی طرح ہوں گے ۔ اور نہایت ہی خوفناک منظر ہو گا جس کی تعبیر قرآن اس خوفناک الفاظ میں کر رہا ہے ۔

وَ لَا يَسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا (۱۰) يُّبَصَّرُوْنَهُمْ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيْهِ (۱۱) وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ (۱۲) وَ فَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُئْوِيْهِ (۱۳) وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ (۱٤) (۷۰: ۱۰ تا ۱٤) کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے ۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو ' اپنی بیوی کو ' اپنے بھائی کو ' اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا ' اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اسے نجات دلا دے "۔

لوگ اس دن نہایت پریشان ہوں گے اور ہر ایک کو اپنی پڑی ہو گی ۔ کوئی شخص اپنے سوا کسی دوسرے کی طرف ملتفت ہونے کا موقعہ نہ پائے گا ۔ اور اس کے شعور میں کسی غیر کے لیے کوئی وسعت نہ ہو گی ' جگری دوست بھی جگری دوست کو نہ پوچھے گا ' ایک مدہوش کر دینے والا خوف ہو گا اور اس کی وجہ سے لوگوں کے تمام روابط منقطع ہوں گے اور ہر شخص اپنے مسائل اور اپنی پریشانی میں گھرا ہو گا ۔ وہ ایک دوسرے پر پیش کیے جائیں گے اور ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے اور عمداً ایسا کیا جائے گا لیکن ہر کسی کو اپنی پڑی ہو گی ۔ ہر ضمیر کا اپنا شغل ہو گا ۔ لہذا دوست دوست کو نہ پوچھے گا ' نہ کوئی کسی سے مدد طلب کر سکے گا ۔

اور مجرم کا حال کیا ہو گا ؟ اس کی جان خوف کے ہاتھ میں ہو گی ۔ اس کا احساس ہی جاتا رہے گا اور وہ اس دن کے عذاب سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے اپنی عزیز ترین متاع دینے کے لیے تیار ہو گا ۔ جبکہ اس زندگی میں وہ اس متاع پر

جان چھڑ کتا تھا' اور اس کی پوری زندگی ان کے لیے تھی ۔ مثلاً اولاد' بیوی' بھائی' خاندان جو حامی و مددگار ہوتا ہے ۔ بلکہ اس دن اپنی جان کو بچانے کے لیے تو وہ اس پوری دنیا کے اموال و اقتدار کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو گا' کہ کسی طرح نجات پا جائے ۔ رنج و الم کی یہ کس قدر بھیانک تصویر ہے ۔ یہ شخص نیم مدہوش ہے اور پوری کائنات بخشنے کے لیے تیار ہے ۔ یہ انداز تعبیر قرآن کے ساتھ مخصوص ہے ۔

یہ ہے مجرم کی حالت' یہ ہیں اس کی تمنائیں کہ اس حالت میں وہ ایسے حالات دیکھتا ہے کہ امید کی آخری چنگاری بھی بجھ جاتی ہے' جھوٹی تمنائیں ختم ہو جاتی ہیں اور اصل اور حقیقی صورت حالات سامنے آتی ہے ۔

كَلَّا إِنَّهَا لَظَىٰ (١٥) نَزَّاعَةً لِّلشَّوَىٰ (١٦) تَدْعُوا مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ (١٧) وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ (١٨) (٧٠: ١٥ تا ١٨) "ہرگز نہیں' وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہو گی جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی' پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی ہر اس شخص کو' جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری اور مال جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا" ۔ یہ ایک منظر ہے کہ جسے دیکھ کر انسان کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں جبکہ اس منظر سے قبل رنج والم کی وجہ سے یہ مدہوش تھا ۔ کلا' یہ نہایت سختی سے تردید اور جھڑکی کا لفظ ہے ۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ۔ یہ باطل خواہشات ہیں کہ کوئی بیٹوں' بیوی' خاوند' بھائی' بہن اور خاندان اور روئے زمین کی جائیداد کا فدیہ دے سکے گا' ہرگز نہیں ۔

إِنَّهَا لَظَىٰ (٧٠: ١٥) "وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہو گی" ۔

نَزَّاعَةً لِّلشَّوَىٰ (٧٠: ١٦) "جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی" ۔ چہرے اور سر کے گوشت کو' اور پھر یہ بلا کی شکل میں ہو گی ۔ زندہ چلتی ہوئی ۔ اور اس خوفناکی میں وہ قصداً اضافہ کر رہی ہو گی ۔

تَدْعُوا مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ (١٧) وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ (٧٠: ١٨) "پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی ہر اس شخص کو جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری اور مال جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا" ۔ یہ اس کو اسی طرح بلائے گی جس طرح اسے اس سے قبل دنیا میں راہ ہدایت کی طرف بلایا جاتا تھا ۔ اور یہ پیٹھ پھیر کر چلا جاتا تھا ۔ لیکن آج جبکہ اسے یہ بلا رہی ہے تو اس قابل نہیں ہے کہ پیٹھ پھیر کر چلا جائے ۔ اس سے قبل یہ دعوت اسلامی کے مقابلے میں مال جمع کرنے میں لگا ہوا تھا اور اس مال کو وہ برتنوں اور تجوریوں میں محفوظ کر کے رکھتا تھا ۔ اور آج یہ دعوت بلائے جہنم کی طرف سے ہے ۔ نہ یہ اسے رد کر سکتا ہے نہ مال دے کر جان کو چھڑا سکتا ہے ۔

اس سورت' اس سے پہلی سورت اور سورہ قلم میں بھی تاکید اس بات کی تھی کہ ان کے جرم میں یہ بات بھی شامل تھی یہ لوگ مال جمع کرتے تھے اور مساکین کے کھانے پر لوگوں کو نہ ابھارتے تھے ۔ یعنی کفر' شرک اور تکذیب کے ساتھ ساتھ ان کا یہ جرم بھی تھا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر' گمراہی اور تکذیب کے ساتھ ساتھ مکہ میں تحریک کو یہ مشکل بھی درپیش تھی کہ لوگ بخیل تھے اور دولت پرست تھے اور غریبوں کا خیال نہ رکھتے تھے ۔ اس لیے بار بار ان امور کی طرف بھی اشارہ کیا کہ فقیروں' مسکینوں کو نظر انداز کرنا اور بہت زیادہ دولت پرست و مادہ پرست ہونا موجب عذاب ہے ۔

اس سورت میں دوسرے اشارات بھی ہیں جن سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت دعوت اسلامی کا آغاز جس کی معاشرے میں ہوا تھا' اس کے خدوخال کیا تھے۔ یہ ایک ایسا معاشرہ تھا جس میں لوگ مال و دولت جمع کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ تجارت اور سود خواری ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ قریش کے سردار تجارتی کوٹھیوں کے مالک تھے اور ہر ایک کے اپنے اپنے قافلے ہوتے تھے۔ جو یہ گرمیوں اور سردیوں میں چلاتے تھے۔ دولت پر لوگ ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے تھے۔ ہر شخص بے حد بخیل تھا۔ فقراء اور مساکین محروم تھے۔ یتیم اور لاچار بھوکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس معاشی ناہمواری کو دور کرنے کے لیے قرآن کریم نے بار بار بتکرار احکامات صادر کیے' بار بار حرص کی مذمت کی۔ انسانی نفوس کے اندر اتر کر بخل اور حرص کو جڑوں سے نکالا۔ اور یہ کام اسلام نے فتح سے قبل نظریاتی طور پر کیا اور فتح کے بعد عملی طور پر کیا۔ مثلاً ربا کی ممانعت کی گئی۔ لوگوں کے اموال باطل طریقوں سے کھانے کی ممانعت کی گئی۔ یتیموں کے مال کے کھانے کو آگ کھانا بتایا گیا' اور یتیموں کے مال میں اسراف سے اور ظلم سے روکا گیا۔ یتیموں کے نکاح کو اس لیے روکنے کی ممانعت کی گئی کہ ان کا مال کھاتے رہیں یا یتیم لڑکیوں کے ساتھ نکاح کرنے کی رغبت اس لیے رکھی جائے کہ ان کا مال ہڑپ کر لیں۔ غرض جو اقدامات' ہدایات اور تنبیہات کی گئیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت لوگوں کی معاشی صورت حالات کیا تھی اور یہ کہ اسلام کی ابدی معاشی پالیسی کیا ہے۔ کسی اسلامی معاشرے کے لیے دائمی ہدایات یہی ہیں کہ بخل' حسد اور حرص سے بچو اور مادیت اور دولت کے بندھنوں سے اپنے آپ کو آزاد کرو اور یہ پالیسی پورے قرآن میں جاری رکھی گئی۔

--- ۱ ۱ ۱ ---

اس سے قبل قیامت کے ہولناک مناظر دکھائے جا چکے' خوف اور عذاب کی صورت میں۔ اب بتایا جاتا ہے کہ خوشی اور غم کے مختلف مواقع پر نفس انسانی کا ردعمل کیسا ہوتا ہے۔ ایمان کی حالت میں انسان مختلف حالات کے مقابلے میں کیا ردعمل کرتا ہے اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ایمان کی حالت میں ردعمل کیا ہوتا ہے۔ اور ایمان نہ ہونے کی صورت میں کیا ہوتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ مومنین کا انجام کیا ہے اور کافرین کا انجام کیا ہے؟

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ﴿١٩﴾ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ﴿٢٠﴾ وَإِذَا
مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ﴿٢١﴾ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿٢٢﴾ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿٢٣﴾
وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ﴿٢٤﴾ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ﴿٢٥﴾ وَالَّذِينَ
يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿٢٦﴾ وَالَّذِينَ هُم مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ﴿٢٧﴾
إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ﴿٢٨﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ﴿٢٩﴾ إِلَّا
عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ﴿٣٠﴾ فَمَنِ ابْتَغَىٰ

وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ
رٰعُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ
۲۵ ع یُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴﴾ اُولٰٓئِكَ فِیْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۳۵﴾

"انسان تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے' جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے ـ مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں' جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں ـ جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے' جو روز جزا کو برحق مانتے ہیں' جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی بے خوف ہو' جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں بجز اپنی بیویوں یا اپنی مملوکہ عورتوں کے' جن سے محفوظ نہ رکھنے میں ان پر کوئی ملامت نہیں' البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں ' جو اپنی امانتوں کی حفاظت اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں' جو اپنی گواہیوں میں راست بازی پر قائم رہتے ہیں اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں ـ یہ لوگ عزت کے ساتھ جنت کے باغوں میں رہیں گے"ـ

"اس" انسان کی تصویر ذرا دیکھئے' یہ ایمان سے محروم انسان ہے ـ قرآن کریم اس کی کس قدر سچی تصویر کھینچتا ہے ـ اور اس تصویر میں ایک غیر مومن انسان کے خدوخال اور فیچرز کس قدر نمایاں ہیں ـ ان تمام خدوخال سے انسان تب ہی محفوظ ہوتا ہے' جب وہ مومن ہوتا ہی ـ ایک مومن پر اگر کوئی مصیبت آ جائے تو وہ صبر جمیل کا پیکر ہوتا ہے اور مطمئن ہوتا ہے ـ جزع وفزع سے دور' اور اگر اسے خوشحالی نصیب ہو تو وہ نہ بخل کرتا ہے نہ اتراتا ہے ـ

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (۱۹) اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا (۲۰) وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا (۲۱) (۷۰: ۱۹ تا ۲۱) "انسان تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے' جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے"ـ یوں نظر آتا ہے کہ ایک ایک لفظ مصور قدرت کا ایک رنگ ہے اور وہ انسان کے چہرے اور اس کی خصوصیات کو صاف بتا رہا ہے ـ یہاں تک کہ جب انسان یہ نہایت ہی مختصر سی تین آیات پڑھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ان میں چند ہی کلمات استعمال ہوئے ہیں' تو اسے ایمان سے خالی انسان کی **ایک** نہایت چمکدار اور واضح تصویر نظر آتی ہے ـ اس کے تمام فیچرز نمایاں ہیں ـ ھلوع' جزوع اور منوع اس انسان کو اگر کوئی مصیبت پیش آ جائے یا حقائق حیات کا کوئی ڈنک لگ جائے تو یہ آہ و فغاں کرنے لگتا ہے ـ یہ سمجھتا ہے کہ بس وہ اب اسی حالت میں رہے گا ـ وہ سمجھتا ہے کہ اب تو وہ ہمیشہ کے لئے اس مصیبت میں پھنس گیا ہے' اور کوئی نہیں ہے جو اس کو اس مصیبت سے نکال دے ـ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ گویا مصیبت کی یہ گھڑی دائمی ہے ـ اس وقت یہ شخص اوہام میں بندھ جاتا ہے اور مصیبت اور مشقت اور بڑھ جاتی ہے ـ اس کے تصور میں بھی یہ بات نہیں ہوتی کہ اس مشکل کے بعد کوئی آسانی بھی آ سکتی ہے ـ وہ اللہ سے کسی قسم کی رحمت اور مہربانی کا امیدوار نہیں ہوتا ـ چنانچہ یہ جزع فزع اس کو کھا جاتی ہے ـ اس کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے ـ اور اس صورت کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک قوی ذات کی

پناہ میں نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی مضبوط سہارا نہیں ہوتا' جس سے اس کو کوئی امید ہے۔ اور اس کے برعکس اگر وہ خوشحال ہو' عافیت میں ہو' تو وہ نیکی کا کوئی کام کرنے سے رکنے والا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ سہولیات اس کو اس کی محنت اور مشقت کی وجہ سے حاصل ہیں' اس لیے یہ ان کو اپنے لیے مخصوص کر لیتا ہے' اپنی ذات کے لیے چھپا لیتا ہے اور بلکہ یہ اپنی مملوکات کا غلام ہو جاتا ہے۔ اور اپنی جائیداد اور مال پر مرمٹنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اسے معلوم نہیں ہے کہ رزق کی حقیقت کیا ہے اور یہ کہ رزق کے ملنے میں خود انسان کا کردار کیا ہے۔ یہ شخص یہ امید نہیں رکھتا کہ اگر دنیا میں وہ خرچ کر دے تو اللہ کے ہاں اسے اس سے بھی زیادہ بہتر رزق ملے گا۔ تو یہ شخص جس کا دل ایمان سے خالی ہے' دونوں حالتوں میں تھڑدلا ہے۔ حالت خیر میں بھی اور حالت شر میں بھی۔ یہ ایک انسان کی بہت ہی بری تصویر ہے۔ لیکن اس انسان کی جس کا دل نور ایمانی سے خالی ہو۔

لہٰذا اللہ پر ایمان لانا دراصل بڑا اہم مسئلہ ہے۔ یہ محض ایک لفظ نہیں ہے جو زبان سے ادا کر دیا جائے۔ اور نہ ہی یہ چند مذہبی رسومات عبادات سے متعلق ہے۔

یہ دراصل ایک نفسیاتی حالت ہے اور یہ ایک مکمل نظام حیات ہے اور حالات و واقعات کے لیے یہ ایک معیار ہے۔ اور انسان کا دل اگر ایمان سے خالی ہو جائے تو وہ اس قدر ہلکا ہو جاتا ہے جس طرح پرندوں کا ایک پر جسے ہوا کے جھونکے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر اڑا کر گھماتے ہیں اس کا کوئی وزن اور پیمانہ نہیں ہوتا۔ اس قسم کا انسان ہمیشہ قلق اور خوف کا شکار رہتا ہے۔ اگر اسے کسی مصیبت سے دوچار ہونا پڑے تو وہ جزع فزع کرتا ہے۔ اگر اسے کوئی بھلائی نصیب ہو تو بخیل ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس کا ظرف ایمان سے بھرا ہوا ہو' تو وہ نہایت اطمینان' عافیت میں ہوتا ہے' اس لیے کہ اس کا ربط ایک حقیقی سرچشمے سے ہوتا ہے۔ جہاں سے تمام واقعات و حالات کنٹرول ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی تقدیر پر مطمئن ہوتا ہے' چاہے خیر ہو یا شر ہو۔ اگر خیر ہو تو وہ مطمئن ہوتا ہے۔ اللہ کی رحمت کا شعور رکھتا ہے۔ اللہ کی آزمائشوں میں وہ ہمیشہ شمع امید روشن رکھتا ہے۔ کہ مشکل کے بعد آسانی آتی ہے۔ وہ امید رکھتا ہے کہ ہر مشکل کے بعد آسانی آتی ہے۔ اسے اگر خیر ملتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کچھ فرائض ہیں۔ اس کے لیے خرچ کرتا ہے اور اسے اس کی جزاء آخرت میں ملے گی۔ بلکہ دنیا و آخرت دونوں میں اسے جزاء ملے گی۔ لہٰذا ایمان دنیا میں ایک ایسی کمائی ہے جس کی جزاء آخرت میں ملے گی اور اس کی وجہ سے انسان کو راحت' اطمینان اور ثبات و قرار ملتا ہے۔ اور پوری زندگی میں وہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اہل ایمان کو اس صورت حال سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ پھر ان کی صفات کیا ہیں۔ انسان کی ان عام صفات سے جن کا اوپر ذکر ہوا' ایک مومن کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔ مثلاً:

إِلَّا الْمُصَلِّينَ (٢٢) الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ (٢٣) (٧٠: ٢٢ تا ٢٣)

"مگر وہ لوگ جو نماز پڑھنے والے ہیں' جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں"۔ نماز بنیادی طور پر رکن اسلام اور علامت ایمان ہے' لیکن اس کی حکمت یہ ہے کہ یہ درحقیقت للہ کے ساتھ ذریعہ اتصال ہے۔ اور یہ ایک ایسے تعلق کا مظہر ہے جس میں صرف بندہ اور اس کا رب آمنے سامنے ہوتے ہیں۔ بندہ مقام بندگی کے اعلیٰ مرتبے پر اور رب تعالیٰ مقام ربوبیت اور معبودیت کے اعلیٰ مرتبے پر ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ کہا گیا کہ ایمان کی صفت دائمہ صلوۃ ہے۔

اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (۷۰:۲۳) "جو اپنی نماز کی پابندی کرتے ہیں"۔ نماز کے ساتھ تسلسل اور دوام ایک لازمی صفت ہے۔ گذے دار قسم کی نماز' سستی سے پڑھی جانے والی نماز مکمل نماز نہیں ہے۔ نماز کے بارے میں سستی' ست روی اور غفلت سخت معیوب ہے۔ نماز چونکہ بندے اور رب کے درمیان رابطہ ہے اس لیے اس میں دوام لابدی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کوئی عبادت کرتے تو آپ اس پر دوام اختیار فرماتے۔ حدیث شریف میں ہے "اللہ کے نزدیک اعمال میں سے محبوب ترین عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے۔ اگرچہ وہ قلیل ہو" لہٰذا اللہ کے ساتھ تعلق کا یہ مقدس رابطہ دائمی ہونا چاہئے۔ اسے مزاج نہ ہونا چاہئے کہ کبھی ہو اور کبھی نہ ہو۔ جس طرح جی نے چاہا کر لیا۔

وَالَّذِیْنَ فِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ (۲۴) لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۲۵) (۷۰:۲۴

- ۲۵) "جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے"۔ یہ خصوصاً زکوٰۃ کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی وہ صدقات جو معلوم اور متعین ہیں' وہ مومنین کے اموال میں غرباء کا حق ہیں اور "حق معلوم" کا اس سے بھی زیادہ جامع مفہوم یہ ہے کہ وہ خود اپنے اموال میں ایک متعین حق سائلین کے لیے مقرر کرتے ہیں اور وہ اپنے جذبے سے کہتے ہیں کہ یہ ان کا حق ہے۔ اس طرح وہ بخل اور کنجوسی کے جذبہ پر قابو پاتے ہیں۔ اور اسی طرح یہ شعور ابھرتا ہے کہ اہل معاشرہ پر ناداروں کے حوالے سے ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ خصوصاً اسلامی امت تو باہم متکافل امت ہے۔ سائل وہ ہے جو سوال کرتا ہے اور محروم وہ نادار جو سوال نہیں کرتا۔ اور اپنی ضرورت کا اظہار کسی کے سامنے نہیں کرتا' یوں وہ محروم رہتا ہے۔ یا محروم وہ شخص ہے جس پر کوئی مصیبت آئی ہو اور اسے نعمتوں سے محروم کر دیا گیا ہو اور اس نے سوال کرنے سے اجتناب کیا ہو۔ یہ شعور کہ محتاجوں اور محروم لوگوں کا بھی دولت میں حصہ ہے ایک زاویہ سے تو اللہ کے فضل کا شعور ہے اور دوسری جانب سے انسانی اخوت کا شعور ہے جبکہ نفسیاتی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان بخل اور کنجوسی کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور یہ ایک اجتماعی ضمانت میں بھی ہے۔ لہٰذا معاشرے کے مالی حقوق ادا کرنے میں بہت فائدے ہیں۔ غرض زکوٰۃ و صدقات میں نفسانی' ذاتی اور معاشرتی فائدے ہیں۔ اور یہاں اس کا ذکر انسان کے نفسیاتی علاج کے حوالے سے ہے۔

وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ (۷۰:۲۶) "جو روز جزاء کو برحق مانتے ہیں"۔ یہ صفت تو اس سورت کے محور سے براہ راست متعلق ہے' کیونکہ سورت کا محور اور موضوع قیامت ہے۔ لیکن یہاں ان آیات میں ایک مومن کی نفسیاتی حالت سے بحث ہے۔ قیامت کی تصدیق ایمانیات کا اہم حصہ ہے اور کسی نظام زندگی کی تشکیل میں اس کا شعوری اور عملی اثر ہوتا ہے کیونکہ جو شخص قیامت کی تصدیق کرتا ہے اس کی قدریں اور پیمانے اور ہوتے ہیں اور جو قیامت کی تصدیق نہیں کرتا یا اس کے بارے میں شک میں ہوتا ہے' اس کی قدریں بالکل جدا ہوتی ہیں' چاہے ان کا تعلق نظریات سے ہو یا اعمال سے ہو یا زندگی کے اہم حادثات سے ہو۔

قیامت پر یقین رکھنے والا آسمانوں (خدا) کے میزان اور نظام کے مطابق کام کرتا ہے۔ وہ آخرت کے حساب و کتاب کے لیے تیاری کرتا ہے۔ صرف دنیا پر نظریں مرکوز نہیں کرتا۔ اور اسے زندگی میں جن حادثات اور جن واقعات

سے دوچار ہونا پڑے خواہ اچھے ہوں یا برے' اس کے بارے میں اس کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ یہ تو دنیا کے عارضی حالات ہیں' اصل جہان تو اور ہے۔ لہٰذا وہ اپنی قیامت کو درست کرتا ہے اور جو آخرت کی تکذیب کرتا ہے اس کا سب کچھ اسی دنیا کے لئے ہوتا ہے۔

اگر وہ یہاں کسی چیز سے محروم ہوگیا تو اس کے نزدیک گویا وہ سب چیزوں سے محروم ہوگیا۔کیونکہ اس کی تمام سرگرمیاں اس جہاں کے لیے ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس کے حساب وکتاب کے پیمانے مختلف ہوتے ہیں اور وہ ہر معاملے میں ایک غلط نتیجے تک پہنچتا ہے۔اور وہ اپنے آپ کو اس محدود دنیا کے مختصر وقت کے اندر محدود کر دیتا ہے۔چنانچہ یہ بدبخت' مسکین' ہروقت عذاب میں مبتلا اور قلق میں گرفتار ہوتا ہے۔کیونکہ اس دنیا کے بارے میں اس کے تمام اندازے غلط ہوتے ہیں۔وہ کبھی مطمئن اور خوش نہیں ہوتا۔کبھی عادلانہ اور منصفانہ فیصلے نہیں کرتا۔اس لیے کہ اس کے فیصلے دنیا کے محدود دائرے میں محدود ہوتے ہیں' لہٰذا یہ خود بھی پریشان ہوتا ہے اور اپنے ماحول کو بھی پریشان کرتا ہے۔ آزردہ دل آزردہ کند انجمنے را..... غرض وہ اس دنیا میں بھی کوئی اعلیٰ اقدار پر مشتمل زندگی نہیں پاتا۔یہی وجہ ہے کہ اسلام میں یوم الآخرت پر یقین کو اسلامی نظریہ حیات کا جز بنایا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ (۲۷) اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُوْنٍ (۲۸) (۷۰:۲۷ – ۲۸) "جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی بے خوف ہو"۔ مجرد تصدیق قیامت سے یہ ایک آگے کا درجہ ہے۔یہ قیامت کے بارے میں زیادہ حساسیت اور اللہ کی نگہبانی کا تازہ احساس اور اللہ کے دربار میں تقصیر کا شعور ہے اور زیادہ عبادت گزاری ہے۔ اور یہ خوف ہے کہ کسی وقت بھی اللہ کا عذاب آسکتا ہے۔اس لیے ایسے لوگوں کے سامنے ہروقت غضب الٰہی کا خوف رہتا ہے اور وہ اللہ کی حمایت اور بچاؤ کے طلبگار رہتے ہیں۔

حضرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے عذاب سے خوف کھاتے تھے۔ حالانکہ اللہ کے نزدیک آپ کا جو مرتبہ تھا' وہ معلوم ہے اور آپ کو اچھی طرح معلوم بھی تھا کہ آپ برگزیدہ ہیں اور اللہ کی آپ پر مہربانیاں ہیں۔چنانچہ آپ کو یہ یقین تھا کہ صرف اللہ کا فضل ہی آپ کو جنت میں داخل کر سکتا ہے۔اس لیے آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا "کسی کا عمل اسے ہرگز جنت میں داخل نہیں کر سکتا"۔اس پر صحابہ کرام ﷺ نے پوچھا رسول اللہ کیا آپ پر بھی اسی اصول کا اطلاق ہے؟" آپ نے فرمایا:"اور میں بھی! الا یہ کہ اللہ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے"۔(بخاری ومسلم)

اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُوْنٍ (۷۰:۲۸) "کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی بے خوف ہو"۔اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ اللہ کے عذاب سے ہروقت ڈرتے رہنا چاہئے۔اور اس سے کسی لحظہ بھی غافل نہیں ہونا چاہئے۔بعض اوقات غفلت کے اوقات میں ایسے امور سرزد ہو جاتے ہیں جو سبب عذاب ہوتے ہیں۔ لہٰذا غفلت بہت ہی خطرناک ہے۔اور اللہ کی غرض بھی یہ ہے کہ لوگ ہروقت حساس رہیں اور بیدار رہیں۔اور اس کے باوجود اگر ان سے کوئی کمزوری سرزد ہوگئی ہو تو اللہ کی رحمت وسیع ہے اور اس کی مغفرت حاضر ہے۔اور توبہ کا دروازہ

کھلا ہے وہ بند نہیں ہے ۔ یہ ہے اسلام کا سیدھا موقف ' جو غفلت اور قلق کے درمیان درمیان ہے کہ انسان کا دل اللہ سے مربوط بھی رہے اور وہ ڈرتا بھی رہے اور اس کی رحمت کا امیدوار بھی رہے ۔ اور اس کی رحمت پر مطمئن بھی رہے ۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (۲۹) اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ (۳۰) فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (۳۱)

(۷۰ : ۲۹ تا ۳۱) "جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ـــ بجز اپنی بیویوں یا اپنی مملوکہ عورتوں کے ' جن سے محفوظ نہ رکھنے میں ان پر کوئی ملامت نہیں ' البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں" ۔ اس سے غرض نفس انسانی اور انسانی سوسائٹی کی طہارت ہے ۔ اسلام ایک پاک و صاف سوسائٹی کی تشکیل چاہتا ہے ۔ ایک ایسی سوسائٹی جس کی ہر بات کھلی ہو یا صریح ہو ۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں تمام فرائض حیات ادا کیے جاتے ہوں ' جس میں فطری میلانات کی تشفی ہوتی ہو ' لیکن اس طرح نہ ہوں کہ فطری حاجات پورا کرنے کے لیے کوئی بے حیائی کا ارتکاب کرے اور یا پیچیدہ اور خفیہ طریقوں سے غلطیوں کا ارتکاب کیا جائے ۔ اسلام ایک ایسا معاشرہ تعمیر کرتا ہے جو قانونی اصولوں پر ایک جائز خاندان کی تشکیل سے اٹھتا ہے ' جس میں میاں بیوی کا تعلق علانیہ ہوتا ہے اور جس کے واضح حدود و قیود ہوتے ہیں ۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں ہر بچے کو پتہ ہو کہ اس کا باپ کون ہے ' جس میں کسی بچے کی ولادت کسی کے لیے شرمندگی کا باعث نہ ہو ۔ ایک ایسا معاشرہ جس کے افراد کے چہروں پر شرم و حیاء کا پردہ ہو ' لیکن اس میں جنسی تعلقات نہایت پاک ہوں ۔ مستقل اساسوں پر ہوں ' بامقصد ہوں اور یہ تعلقات اس لیے ہوں کہ فریقین ایک انسانی فریضہ بھی پورا کرتے ہوں ۔ محض شہوت رانی مقصد نہ ہو ' یعنی آنے والی نسلوں کے حوالے سے فریقین اپنے فرائض بھی پورے کرتے ہوں ۔

قرآن کریم مومنین کی صفات میں یہ ذکر فرماتا ہے کہ ۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (۲۹) اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ (۳۰) فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (۳۱)

(۷۰ : ۲۹ تا ۳۱) "جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ـــ بجز اپنی بیویوں یا اپنی مملوکہ عورتوں کے ' جن سے محفوظ نہ رکھنے میں ان پر کوئی ملامت نہیں ' البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں" ۔

لہٰذا وہ اپنی بیویوں اور اپنی مملوکہ لونڈیوں کے ساتھ پاکیزہ تعلق قائم کر سکتے ہیں اور یہ تعلق پاکیزہ بھی ہو اور قانونی بھی ہو ۔ اور اسلام لونڈیوں کا واحد قانون راستہ اس طرح تجویز کرتا ہے کہ جو عورتیں جنگی قیدی کے طور پر آئیں اور ان کو فدیہ اور احسان کے طور پر چھوڑنے کا فیصلہ اسلامی حکومت نے نہ کیا ہو ۔ اس سلسلے میں سورہ محمد کی یہ

آیت اصول طے کرتی ہے :

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا "پس جب کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو' اس کے بعد احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کرو تاآنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے"۔

لیکن بعض اوقات کسی قیدی کا تبادلہ نہیں ہوتا' فدیہ بھی نہیں ملتا' اور حکومت اسلامی بطور احسان چھوڑنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتی تو اس صورت میں قیدی مرد یا عورت غلام ہوں گے جب تک دوسرا فریق مسلمان قیدیوں کو غلام بناتا ہے۔ اگرچہ دشمن قوم غلامی کا کوئی اور نام رکھ دے۔ یوں اس ناگزیر صورت میں اسلام نے لونڈیوں کے ساتھ صرف ان کے مالکوں کو معاشرت کی اجازت دی ہے اور ان غلاموں کی آزادی کا بندوبست اسلام نے پھر ان صورتوں میں کسی ایک کے ذریعے کیا جو اس نے غلاموں کی آزادی کے لیے تجویز کیں۔ غلاموں کی آزادی کا بندوبست قرآن نے متعدد ذرائع سے کیا۔ اس طرح اسلام نے قیدی عورتوں کو معاشرے میں کھپانے کا ایک واضح بندوبست کیا تاکہ وہ معاشرے کے اندر شتر بے مہار کی طرح پھر کر گندگی نہ پھیلائیں' یوں ان کو معاشرے میں آزاد کر دیا جائے کہ جو چاہیں کریں۔

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (۷۰ : ۳۱) "البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں"۔ یوں اسلام ہر قسم کی جنسی گندگی کے سامنے یہ بند باندھ دیتا ہے۔ ان دو واضح صورتوں کے علاوہ جنسی تعلق حرام ہے۔ اسلام نفس جنسی تعلق میں کوئی گندگی محسوس نہیں کرتا لیکن ان دو جائز صورتوں کے علاوہ سب تعلقات کو حرام قرار دیتا ہے۔ اسلام ایک صاف ستھرا اور واضح اور کھلا معاشرتی نظام چاہتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (۷۰ : ۳۲) "جو اپنی امانتوں کی حفاظت اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں"۔ یہ وہ اخلاقی قدریں ہیں جن پر اسلام اپنے معاشرے کی بنیاد اٹھاتا ہے۔ معاشرے میں امانتوں کی رعایت و حفاظت اور عہد کی حفاظت کا تصور اس امانت کبریٰ کی رعایت اور حفاظت سے اٹھتا ہے جو اللہ نے زمین اور پہاڑوں پر پیش کی۔ اور انہوں نے اس امانت کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا اور یہ انکار اس خوف کی وجہ سے ہوا کہ یہ بہت بڑا بھاری بوجھ ہے' لیکن انسان نے اسے اٹھالیا۔ یہ تھی 'اسلامی نظریہ حیات کی امانت۔ عقیدۂ توحید کی امانت اور یہ انسان نے اختیاراً قبول کی' مجبوراً نہیں۔ یہ امانت جو انسانوں نے قبول کی جب وہ اپنے والد کی پشت میں تھے اور اس پر وہ گواہ ہوئے اور ان کی پیدائش اس پر گواہ ہوئی' اسی امانت و دیانت سے یہ لازم آیا کہ دنیا میں تمام عہد پورے کرو' چنانچہ اسلام نے عہد پورا کرنے میں بہت سختی سے کام لیا اور اس کی تاکیدات کی گئیں تاکہ اسلامی معاشرہ نہایت ہی پختہ اصولوں پر قائم ہو۔ اور امانت و دیانت اور رعایت عہد کو نفس مومنہ کی خصوصیت قرار دیا اور خیانت اور وعدہ خلافی کفار کی صفت قرار دیا۔ اور اس کو قرآن کریم میں بار بار دہرایا اور تاکیدات فرمائیں تاکہ اس میں شک نہ رہے کہ امانت اور وفائے عہد

اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ (۷۰ : ۳۳) "جو اپنی گواہیوں میں راست بازی پر قائم رہتے ہیں"۔ اللہ نے ادائے شہادت کے ساتھ بے شمار حقوق وابستہ کیے ہیں۔ بلکہ شہادت پر اللہ کی حدود کا قیام موقوف ہے۔ اگر شہادت قائم نہ ہو تو حدود قائم نہیں ہو سکتیں۔ یہ کہ کسی کو شہادت ادا نہ کرنے کا گناہ نہ کرنا چاہئے اور جب کسی سے شہادت مانگی جائے تو وہ اسے کبھی بھی نہ چھپائے۔ اور شہادت کو صحیح طرح ادا کرنا چاہیے اس میں ادھر ادھر کی بات نہیں کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس شہادت کو اس شخص کی شہادت قرار دیا ہے تاکہ اسے اللہ کی اطاعت کے ساتھ واسطہ کیا جائے۔ دوسری جگہ ہے:

وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ "اور شہادت اللہ کے لیے قائم کرو"۔ اور یہاں اسے صفات مومنین میں سے ایک صفت قرار دیا۔ اور یہ شہادت بھی امانات میں سے ایک امانت ہے یہاں اسے علیحدہ بھی ذکر کیا کیونکہ یہ بہت اہم فریضہ ہے۔

اور صفات مومنین کا آغاز بھی نماز سے اور خاتمہ بھی نماز سے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (۷۰ : ۳۴) "جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں"۔ صفات مومنین کے آغاز میں جو صفت بیان کی گئی تھی' وہاں کہا تھا کہ وہ نماز پر دوام اختیار کرتے ہیں اور یہاں ذکر ہے کہ وہ نماز کی حفاظت کرتے ہیں یعنی نماز کے فرائض' اس کے اوقات' اس کے سنن' اس کی ہیئت اور اس کی روح کی حفاظت کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ اسے مہمل طور پر اور سستی کر کے نہیں ادا کرتے۔ اور اسے یوں ضائع نہیں کرتے کہ صحیح طرح نہ پڑھیں اور آغاز و انجام دونوں جگہ نماز کا ذکر کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام میں نماز کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ اسی پر مومنین کی صفات ختم ہوتی ہیں۔

اب یہاں ان کا انجام بھی دیا جاتا ہے جبکہ دوسرے فریق کا انجام اس سے قبل بتا دیا گیا تھا۔

اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ (۷۰ : ۳۵) "یہ لوگ عزت کے ساتھ جنت کے باغوں میں رہیں گے"۔ یہ مختصر ترین آیت حسی مزے اور معنوی مزے دونوں کو ایک جگہ جمع کر دیتی ہے۔ یہ باغات میں ہوں گے اور باعزت طور پر ہوں گے۔ یوں لذت بھی پائیں گے اور عزت بھی پائیں گے۔ اور یہ ان کے ایمان ایقان اور نیکی کی وجہ سے' ان کا امتیاز ہو گا۔

اب آخر میں دعوت اسلامی کا ایک منظر۔ یہ مکی منظر ہے۔ ایک جگہ رسول کریم ﷺ کھڑے دعوت دے رہے ہیں۔ قرآن پڑھ رہے ہیں اور مشرکین ہر طرف سے امنڈتے چلے آ رہے ہیں:

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿۳۶﴾ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿۳۷﴾

"پس اے نبیؐ کیا بات ہے کہ یہ منکرین دائیں اور بائیں سے گروہ در گروہ تمہاری طرف دوڑے چلے آرہے ہیں؟"

مُھْطِع اس شخص کو کہتے ہیں جو گردن لمبی کرتے ہوئے تیز تیز چلتا ہے ۔ گویا رسی گلے میں ڈال کر کھینچا جا رہا ہو' اور عزین جمع عزہ کی اور اس کا وزن اور معنی دونوں لفظ ۔

فئة کی طرح ہے 'یعنی گروہ ۔ اس میں ان کی اس مشکوک حرکت پر ایک مزاح بھی ہے اور اس ہئیت اور حرکت کی ایک تصویر بھی ۔ ان پر تعجب کیا جاتا ہے اور ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف اس لیے نہیں بھاگ رہے کہ آپ کی باتیں سنیں یا آپ سے ہدایات لیں ۔ بلکہ وہ نہایت حواس باختہ انداز میں معلوم کرنے کے لیے دوڑتے ہیں کہ آپ ۴ کیا کہتے ہیں اور پھر واپس بھاگتے ہیں ۔ اور اپنے اپنے ہاں جا کر حلقوں میں بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ ............ آپؐ کے خلاف کیا سازشیں کریں؟

أَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ ﴿٣٨﴾

"کیا ان میں سے ہر ایک یہ لالچ رکھتا ہے کہ وہ نعمت بھری جنت میں داخل کر دیا جائے گا"۔ اور وہ اپنے موجودہ حال میں ہوتے ہوئے بھی جنتی ہوں گے بلکہ ایسے مجرمین تو آگ کی لپیٹ میں ہوں گے ۔ شاید یہ لوگ اپنے آپ کو اللہ کے نزدیک کوئی بڑی چیز سمجھتے ہیں ۔ اس لیے یہ کفر کرتے ہی ۔ رسول اللہ ﷺ کو اذیت بھی دیتے ہیں ۔ قرآن سنتے ہیں اور پھر خفیہ سازشیں کرتے ہیں اور پھر بھی یہ توقع کرتے ہیں کہ جنت نعیم میں داخل ہوں گے اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے نزدیک بڑی چیز سمجھتے ہیں ۔

كَلَّا ۖ إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّمَّا يَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾

"ہرگز نہیں 'ہم نے جس چیز سے ان کو پیدا کیا ہے اسے یہ خود جانتے ہیں"۔ یعنی ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ان کی اس تمنا اور خوش فہمی کو نہایت حقارت کے ساتھ رد کیا جاتا ہے ۔ ان کو معلوم ہے کہ ہم نے ان کو ایک حقیر پانی کی بوند سے پیدا کیا ہے ۔ قرآن کریم ان کو اپنی اصل حقیقت سے آگاہ کرتا ہے ۔ یوں ان کے اندر جو کبر و غرور اور تکبر و علو تھا اسے ملیامیٹ کر دیا جاتا ہے اور ان کے غرور کی عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے ۔ اور یہ صرف ایک لفظ کے ذریعہ ۔ ایک اشارہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہم نے ان کو کس چیز سے پیدا کیا ہے ۔ انسان کی کمزوری' ناتوانی اور بے وزنی کی بہترین تصویر ہے ۔ تعجب کیا جاتا ہے کہ یہ کس طرح یہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں جبکہ ان کے افعال ایسے ہیں ۔ پھر وہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں ۔ ان کو دیکھنا چاہئے کہ ان کے مدارج تخلیق کیا ہیں ۔ اللہ کے ہاں ان کی اہمیت' ان کے اس کفر کی وجہ سے ' مچھر کے برابر بھی نہیں ہے ان کو تو ان کے کفر کی وجہ سے جہنم کی آگ کی لپیٹ میں جانا ہے ۔ یہ کس طرح اللہ کی نعمتوں کی توقع کرتے ہیں ۔

ان کے معاملے کو غیر اہم سمجھتے ہوئے اور ان کی اہمیت کو کم دکھاتے ہوئے اور ان کی بڑائی کے بت توڑتے ہوئے اللہ اپنے اس فیصلے کا اعلان کرتا ہے کہ اگر یہ ہدایت نہیں حاصل کرتے تو اللہ ان کے مقابلے میں اچھے لوگوں کو پیدا کر دے گا ۔ یہ اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ اپنے اسی انجام تک جا پہنچیں گے جس کے وہ مستحق ہیں ۔

فَلَآ أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ إِنَّا لَقٰدِرُونَ ۝ عَلٰٓى أَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ۝

"پس میں قسم نہیں کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی' ہم اس پر قادر ہیں کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور کوئی ہم سے بازی لے جانے والا نہیں ہے"۔

اس معاملے پر قسم اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ مشرقوں اور مغربوں کے رب کی طرف اشارہ کر کے اللہ کی عظمت کو بتایا گیا۔ مشارق و مغارب سے کبھی تو ستاروں کے مقامات طلوع مراد ہوتے ہیں جو بہت زیادہ ہیں جو اس طویل و عریض کائنات میں بہت زیادہ ہیں اور اس سے یہ مفہوم بھی مراد لیا جا سکتا ہے کہ وہ مشرق جو مختلف علاقوں میں مسلسل آتے رہتے ہیں اور یہ مشرق بروقت رہتے ہیں کیونکہ جب زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے تو دنیا کی کوئی نہ کوئی جگہ مشرق ہوتی ہے اور کوئی نہ کوئی جگہ مغرب ہوتی ہے۔

بہرحال مشارق و مغارب کا جو مفہوم بھی ہو' اس سے اس کائنات کی ضخامت معلوم ہوتی ہے۔ اور خالق کائنات کی عظمت کا تصور ابھرتا ہے۔ کیا ان بے وقعت و بے قیمت لوگوں کا معاملہ' جن کو ہم نے جس چیز سے پیدا کیا ہے اسے یہ جانتے ہیں' اس بات کا محتاج ہے کہ رب المشارق اور رب المغارب کے نام کی قسم اٹھائی جائے۔ جبکہ وہ ان جیسے دوسرے لوگ اٹھانے پر قادر ہے۔ اور وہ اس کے مقابلے میں نہیں آ سکتے' اس سے بچ نہیں سکتے۔ اس سے کہیں بھاگ نہیں سکتے۔

--- ○○○ ---

جب سیاق کلام اس مقطع تک پہنچتا ہے اور یہ بتا دیا جاتا ہے کہ قیامت کا عذاب کس قدر ہولناک ہے اور اس دن کافروں کی کیا ذلت ہوگی اور مومنین کی کیا عزت ہوگی' تو اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف روئے سخن پھر جاتی ہے کہ آپ پریشان نہ ہوں اور ان لوگوں کو چھوڑ دیں کہ وہ اسی دن کے عذاب کے لیے آگے بڑھیں۔ اس موقعہ پر پھر اس عذاب کے منظر کو یہاں بیان کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ کس قدر کربناک منظر ہے یہ۔

فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتّٰى يُلٰقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي
۲ يُوعَدُونَ ۝ يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلٰى نُصُبٍ يُوفِضُونَ ۝
۹ ع خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۚ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ۝
۸

"لہٰذا انہیں اپنی بیہودہ باتوں اور اپنے کھیل میں پڑا رہنے دو یہاں تک کہ یہ اپنے اس دن کو پہنچ جائیں جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے' جب یہ اپنی قبروں سے نکل کر اس طرح دوڑے جا رہے ہوں گے جیسے اپنے بتوں کے استھانوں کی طرف دوڑ رہے ہیں' ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی' ذلت ان پر چھا رہی ہوگی۔ وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے"۔

آپ ؐ کو کہا جاتا ہے کہ یہ نہایت بے وقعت لوگ ہیں اور ان کا انجام نہایت ہی خوفناک ہے ۔ چنانچہ قیامت کے دن ان کے حال اور کسمپرسی کا جو نقشہ کھینچا جاتا ہے وہ اپنی جگہ بہت ہی خوفناک ہے جبکہ اسی نقشہ کشی اور تصویر سازی میں حقارت آمیزی اور مضحکہ خیزی کے رنگ بھرے ہوئے ہیں اور یہ اس حال کے جواب میں ہے جس میں یہاں دنیا میں یہ لوگ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے تھے ۔

یہ لوگ جب قبروں سے نکلیں گے ' تو گھبراہٹ میں اس تیزی سے بھاگیں گے جیسے یہ اپنے آستانوں کی طرف بھاگ رہے ہوں ۔ دنیا میں جس طرح ان کی چال ہوتی تھی اس کی طرف تہکمانہ اور توہین آمیز اشارہ ہے ۔ یہ اپنے میلوں ٹھیلوں میں استھانوں کی طرف بھاگا کرتے تھے ۔ اور ان بتوں کے گرد جمع ہوتے تھے ۔ یہ لوگ آج بھی تیزی سے بھاگ رہے ہیں لیکن اس بھگدڑ اور اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔

اس کے بعد ان کی حالت کی تصویر یوں کھینچی جاتی ہے :

خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ( ۷۰ : ۴۴ ) "ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی ' ذلت ان پر چھارہی ہو گی" ۔ ان الفاظ سے ان کی ہیئت کذائی کی خوب تصویر کھینچی گئی ہے ۔ اور وہ نہایت تھکے ماندے اور ذلیل و خوار نظر آتے ہیں ۔ اس سے قبل دنیا میں ان کی دوڑ دھوپ 'ستی اور کھیل کود کی تھی اور اب یہ ذلیل و خوار ہو کر ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں ۔

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِىْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ( ۷۰ : ۴۴ ) "یہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا تھا" ۔ اور یہ اس میں شک کرتے تھے ' تکذیب کرتے تھے اور جلدی مچاتے تھے ۔

یوں سورت کا آغاز اور انجام ایک ہو جاتا ہے ۔ اور بعث بعد الموت کے مسئلہ کا یہ حلقہ بھی اپنے اختتام کو پہنچتا ہے ۔ اور یوں زندگی کے جاہلی تصور اور اسلامی تصور کے مابین یہ معرکہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے ۔

--- ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۲۹

## سورہ نوح ۔ ۷۱

## ۱۔۔تا۔۔۲۸

# سورۂ نوح ایک نظر میں

یہ پوری سورت حضرت نوح علیہ السلام کے قصے پر مشتمل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ آپ کے ساتھ آپ کی قوم نے کیا سلوک کیا۔ یہ قصہ دعوت دین کا کام کرنے والوں کے لیے ایک تجربہ ہے کہ دیکھو کبھی یوں بھی ہوتا ہے اور کبھی کبھی انسانیت پر ایسا دور بھی آتا ہے اور خیر و شر' ہدایت و ضلالت اور حق و باطل کی دائمی کشمکش کے اندر بھی خیر' ہدایت اور حق کو ایسے حالات سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

اس سورت میں ایک ایسی انسانی سوسائٹی کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو حد درجہ ہٹ دھرم' گمراہ اور باطل پرست ہے۔ لوگ پوری طرح گمراہ قیادت کی گرفت میں ہیں اور یہ قیادت حد درجہ متکبر' حق سے منہ موڑنے والی' دلائل ایمان اور معجزات حق پر توجہ نہ کرنے والی ہے۔ حالانکہ یہ معجزات ان کے نفوس اور آفاق کائنات کے اندر جابجا بکھرے پڑے تھے۔ یہ نشانات و معجزات اس کائنات کی کھلی کتاب میں موجود تھے اور نفس انسانی کی خفیہ کتاب کے اوراق کے اندر بکھرے پڑے تھے۔

یہ سورت رحمت الہیہ کے مختلف نمونوں میں سے ایک واضح نمونہ بھی ہے' جس سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس انسان پر کس قدر مہربان ہے کہ وہ محض اپنے فضل وکرم کی وجہ سے اس انسان کو راہ ہدایت دکھانے کے لیے پے درپے رسولان کرام کو بھیجتا رہا ہے۔ جبکہ یہ انسان ہمیشہ گمراہ قیادت کی اطاعت کو پسند کرتا رہا ہے۔ ایک ایسی قیادت کا گرویدہ ہوتا رہا ہے۔ جو گمراہ کرتی ہے' گمراہ کنندہ ہوتی ہے اور ہدایت و سچائی کو قبول کرنا اپنی توہین سمجھتی ہے۔

یہ سورت تھکا دینے والی جدوجہد' ناقابل برداشت بوجھ' صبر جمیل اور جہد مسلسل اور اپنے نظریہ پر اصرار کا ایک بہترین نمونہ بھی پیش کرتی ہے کہ انبیائے کرام نے اس گم کشتہ راہ' ضدی اور معاند انسانیت کو راہ راست پر لانے کے لیے کس قدر ان تھک جدوجہد کی جبکہ اس جدوجہد کے نتیجے میں وہ اپنے لیے کچھ نہ چاہتے تھے۔ نہ وہ ان لوگوں سے کوئی اجر طلب کرتے تھے جو ہدایت پاتے تھے' وہ نہ کوئی انعام چاہتے تھے اور نہ کوئی شکرانہ وصول کرتے تھے۔ نہ وہ کوئی فیس یا تنخواہ وصول کرتے تھے جو بالعموم معلمین وصول کرتے ہیں' یا جس طرح مدارس' جامعات اور اداروں کے کارکن وصول کرتے ہیں۔ جس طرح دور جدید کا رواج ہے اور قدیم زمانوں میں بھی یہ معاوضہ کسی نہ کسی صورت میں ہوا کرتا تھا۔

حضرت نوح علیہ السلام رب تعالیٰ کے سامنے اپنی ساڑھے نو سو سال کی جدوجہد کی جو رپورٹ پیش کرتے ہیں وہ اس تھکا دینے والی جدوجہد اور اعصاب شکن محنت کی اچھی تصویر ہے۔ نیز وہ اس میں ان کی قوم کی ہٹ دھرمی' عناد' ضال و مضل قیادت کی اطاعت اور اقتدار پرستی کی بھی اچھی تصویر کشی کرتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں :

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَھَارًا (۵) فَلَمْ یَزِدْھُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا

(٦) وَاِنِّیْ کُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا (٧) ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا (٨) ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا (٩) فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا (١٠) یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا (١١) وَّیُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَیَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّیَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا (١٢) مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (١٣) وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (١٤) اَلَمْ تَرَوْا كَیْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (١٥) وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (١٦) وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا (١٧) ثُمَّ یُعِیْدُكُمْ فِیْهَا وَیُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا (١٨) وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا (١٩) لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا (٢٠) (٧١: ٥ تا ٢٠) اس نے عرض کیا "اے میرے رب میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا مگر میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا۔ اور جب بھی میں نے ان کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کر دے انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔ پھر میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی۔ پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔ میں نے کہا "اپنے رب سے معافی مانگو' بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا' تمہیں مال اور اولاد سے نوازے گا' تمہارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کر دے گا۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کے لیے تم کسی وقار کی توقع نہیں رکھتے؟ حالانکہ اس نے طرح طرح سے تمہیں بنایا ہے۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا؟ اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا' پھر وہ تمہیں اسی زمین میں واپس لے جائے گا اور اس سے یکایک تم کو نکال کھڑا کرے گا۔ اور اللہ نے زمین کو تمہارے لیے فرش کی طرح بچھا دیا تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں میں چلو"۔

اس جہد مسلسل' اس بے مثال اصرار اور دعوت' اس ثابت قدمی کے ساتھ طویل تبلیغ کے بعد' انہوں نے فرمایا:

رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا (٢١) وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا (٢٢) وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا یَغُوْثَ وَیَعُوْقَ وَنَسْرًا (٢٣) وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا (٢٤) (٧١: ٢١ تا ٢٤) "میرے

رب 'انہوں نے میری بات رد کر دی اور ان (رئیسوں) کی پیروی کی جو مال اور اولاد پاکر اور زیادہ نامراد ہوگئے ہیں ۔ ان لوگوں نے بڑا بھاری مکر کا جال پھیلا رکھا ہے ۔ انہوں نے کہا ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو 'اور نہ چھوڑو ود اور سواع کو' اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو ۔ انہوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے "۔ بے شک یہ نہایت ہی تلخ حاصل تھا اور نہایت ہی کڑوا پھل تھا مگر وہ یہ محنت ساڑھے نو سو سال تک کرتے رہے ۔ یہ کیونکہ ایک رسول کا فریضہ تھا ۔ یہ انہیں ادا کرنا تو تھا ہی ۔

حضرت نوح علیہ السلام کے اس تلخ تجربہ کی روئیداد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کی جا رہی ہے کیونکہ دعوت اسلامی کا فریضہ اب قیامت تک آپ کے سپرد کر دیا گیا ہے اور پورے کرۂ ارض کے حوالے سے یہ فریضہ آپ کے حوالے کیا گیا ہے ۔ یہ سب سے بڑا فریضہ ہے جو کبھی کسی رسول کے حوالے کیا گیا ۔ حضورﷺ دیکھ رہے تھے کہ آپ کے ایک بھائی نے کس قدر طویل جدوجہد کی اور اس کرۂ ارض پر ایمان کا دیا روشن کرنے کے لیے کس قدر جدوجہد کی اور لوگوں نے اس دعوت کے مقابلے میں کس قدر اندھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا ۔ کس طرح دنیا کی گمراہ لیڈر شپ نے ہدایت یافتہ لیڈر شپ کو مغلوب کر دیا ۔ اور لوگوں کے عناد اور گمراہی کے باوجود کس طرح اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے مسلسل رسول بھیجے ۔ اور نوح علیہ السلام کے بعد 'جو آدم ثانی ہیں 'یہ سلسلہ چلتا ہی رہا ۔

اور یہ روئیداد مکہ میں اٹھنے والی جماعت مسلمہ کے سامنے بھی پیش کی جا رہی ہے کہ اب قیامت تک یہ امت اس دعوت کی وارث ہوگی ۔ اس دعوت کے خطوط پر جو منہاج زندگی قائم ہوگا اور جس طرح یہ نظام اس وقت کی جاہلیت کے بالمقابل پیش ہو رہا ہے 'اسی طرح آئندہ بھی ہر جاہلیت کے مقابلے میں قائم کرنا ہوگا تاکہ امت مسلمہ دیکھے اور سمجھے کہ اس نے اس راہ میں کس قدر جدوجہد کرنی ہے ۔ اس نے اپنی اس دعوت پر کس طرح اصرار کرنا ہے 'کس قدر ثابت قدمی دکھانی ہے 'اس طرح جس طرح آدم ثانی حضرت نوح علیہ السلام نے دکھائی ۔ نیز وہ یہ سبق بھی لے کہ مومنین کی قلیل تعداد پر اللہ ہمیشہ نظر کرم رکھتا ہے اور کس طرح ان کو ایک مکمل تباہی کے طوفان سے بچانے کا انتظام کرتا ہے ۔

نیز مشرکین مکہ کو بھی یہ بتانا مقصود ہے کہ ذرا غور کریں کہ ان کے اسلاف مکذبین کا انجام کیا ہوا اور اللہ کی اس عظیم نعمت پر غور کریں کہ اللہ نے تمہارے لیے ایک نہایت ہی رؤف و رحیم رسول بھیجا 'جو حضرت نوح علیہ السلام کی طرح تمہاری ہلاکت اور بربادی کی دعا نہیں کرتا 'اس لیے کہ اللہ کے نظام قضا و قدر نے تمہیں ایک وقت تک مہلت دے دی ہے اور یہ تم پر بہت بڑی رحمت ہے کہ تمہارے نبی نوح علیہ السلام کی طرح تمہارے خلاف بد دعا نہیں کرتے اور جس طرح اللہ نے حضرت نوح علیہ السلام کو دعا سکھائی تھی ایسی کوئی ہدایت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں کی گئی ۔ حضرت نوح علیہ السلام نے تو یہ بد دعا فرمائی ۔

وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا ضَلٰلًا (۷۱ : ۲٤) "اور تو ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں ترقی نہ دے "۔ اور مزید فرمایا :

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا (۲٦) اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا یَلِدُوْۤا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (۲۷) (۷۱ : ۲٦ – ۲۷) "اور نوح نے کہا — "میرے رب 'ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ ۔ اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ

تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہو گا' بدکار اور سخت کافر ہی ہو گا"۔

انسانی تاریخ میں دعوت اسلامی کی اس کڑی کی روئیداد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دعوت اسلامی کے اصول اور فروع اور جڑیں ایک رہی ہیں۔ ایک ہی بنیاد پر یہ نظریہ مبنی رہا ہے۔ اور اس کی جڑیں انسانی تاریخ میں گہری ہیں اور یہ عمارت ایک مستقل اور نہایت متعین بنیادوں پر استوار رہا ہے۔ پھر یہ نظریہ اس پوری کائنات کے نظام' اس پوری کائنات میں جاری اللہ کے نظام قضا و قدر اور اللہ کے ارادے اور مشیت سے مربوط ہے۔ یہ باتیں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت سے صاف ظاہر ہوتی ہیں۔ حضرت نوح ؑ فرماتے ہیں :

قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (٢) اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ (٣) يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَاۗءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (٤) (۷۱: ۲ تا ٤) "اس نے کہا' اے میری قوم کے لوگو' میں تمہارے لیے ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا (پیغمبر) ہوں۔ (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو' اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں ایک وقت مقرر تک باقی رکھے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آ جاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا' کاش تمہیں اس کا علم ہو"۔

اور حضرت نوح علیہ السلام کی ایک دوسری تقریر کو یوں نقل کیا گیا ہے :

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (١٣) وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (١٤) اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (١٥) وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (١٦) وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا (١٧) ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا (١٨) وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا (١٩) لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا (٢٠) (۷۱: ۱۳ تا ۲۰) "تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کے لیے تم کسی وقار کی توقع نہیں رکھتے؟ حالانکہ اس نے طرح طرح سے تمہیں بنایا ہے۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا؟ اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا' پھر وہ تمہیں اسی زمین میں واپس لے جائے گا اور اس سے یکایک تم کو نکال کھڑا کرے گا۔ اور اللہ نے زمین کو تمہارے لیے فرش کی طرح بچھا دیا تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں میں چلو"۔

یہ باتیں مسلمانوں کے شعور میں بٹھانے کی اہمیت یہ ہے کہ وہ اپنی دعوت کی نوعیت کو سمجھ جائیں' ان کو اپنا نظریاتی شجرۂ نسب معلوم ہو جائے اور وہ یہ جان لیں کہ تاریخ انسانیت میں ان کے قافلے کی اہمیت کیا ہے۔ اور انہوں نے اس دعوت اور

اس دعوت پر مبنی نظام کے قیام کے لیے کیا کچھ کرتا ہے اور یہ کہ یہ دعوت اللہ کا منہاج قدیم ہے جس کے لیے تمام پیغمبروں نے کام کیا ہے ـ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے ـ

جب انسان تمام رسولوں کی جدوجہد' اس انتھک جدوجہد کی روئیداد پر غور کرتا ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے 'اور وہ کانپ اٹھتا ہے کہ رسولان کرام کی طویل جدوجہد کے نتیجے میں کیا تبدیلی آئی؟ نظر تو یہی آتا ہے کہ انسانیت نے بے راہ روی ہی اختیار کی اور رسولوں کے ساتھ سخت عناد کیا ـ اور مان کر نہ دیا لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا اور ایک کے بعد ایک رسول آتا رہا' یہ کیوں؟

ایک انسان یہ سوال کر سکتا ہے کہ آیا اس طویل جدوجہد اور اس کے نتائج کے درمیان کوئی نسبت ہے؟ جو حضرت نوح علیہ السلام سے چلی اور چلتے چلتے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جاری رہی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کی امت کے مختلف لوگ بھی یہ جدوجہد کرتے رہے اور اس سلسلے میں ناقابل تصور قربانیاں دی جاتی رہیں' تو کیا اس عظیم جدوجہد اور اس کے نتائج کے درمیان کوئی توازن اور نسبت ہے؟

اوروں کو تو چھوڑیئے' کیا خود حضرت نوح علیہ السلام کی جدوجہد جس کی تفصیلات اس سورت میں دی گئی ہیں اور دوسری سورتوں میں بھی اس کی روئیداد موجود ہے کہ آپ نے نہایت ہی طویل عرصہ تک یہ جدوجہد فرمائی اور اس میں قوم نوح نے کفر اور نافرمانی ہی پر اکتفاء نہ کیا بلکہ وہ آپ کا مذاق بھی اڑاتے رہے' بلکہ مذاق کے علاوہ بہتان تراشی بھی کرتے رہے اور آپ تھے کہ صبر اور نیکی اور اعلیٰ شائستہ آداب اور نہایت ہی دلسوز انداز بیان کے ذریعہ اپنا کام رکھتے رہے ـ

ازمنہ قدیمہ سے' یہ جہد مسلسل' یہ ناقابل تصور قربانیاں جاری ہیں ـ ایک کے بعد ایک رسول آتا ہے ـ اس کا انکار ہوتا ہے' مذاق اڑایا جاتا ہے' بعض کو آگ میں جلایا جاتا ہے' بعض کو آروں کے ساتھ چیرا جاتا ہے' بعض کو اپنے گھروں سے اور اپنے ملک سے نکالا جاتا ہے ـ یہاں تک کہ آخری رسالت آجاتی ہے ـ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی طرح جدوجہد کرتے رہے ہیں' جس کا مفصل ریکارڈ قرآن وسنت وسیرت میں موجود ہے ـ اس کے بعد امت میں مصلحین اور مجددین آتے ہیں ـ اور وہ بے حد جدوجہد کرتے ہیں' ہر ملک اور ہر سرزمین تک پہنچتے ہیں ـ ہر دور اور ہر زمانے میں جہد مسلسل اور دعوت جاری رہتی ہے ـ

کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس جہاد اور سعی اور ان تھک محنتوں اور کاوشوں کے مطابق نتائج نکلے ہیں؟ اور کیا انسانیت جس نے ان عظیم مساعی کی ناقدری کی اور اب بھی کر رہی ہے' یہ انسانیت اس بات کی مستحق تھی کہ اللہ اس پر اس قدر کرم کرتا؟ یا کیا اب بھی لوگ اس کے مستحق ہیں کہ یہ جدوجہد جاری رکھی جائے' لوگوں کے انکار' ناقدری اور مسلسل روگردانی کے باوجود کیا یہ مناسب ہے کہ اللہ ان پر اسی طرح رحمتیں کرتا چلا جائے' اس ناشکرے' حقیر' چھوٹے کیڑے پر' جسے انسان کہا جاتا ہے؟

ہاں یقیناً ان سب سوالات کا جواب اثبات میں ہے اور بلاجدل وجدال اور بغیر کسی شک وشبہ کے اثبات میں ہے ـ

حقیقت یہ ہے کہ زمین کے اوپر ایمان کی حقیقت کا قائم ہو جانا' اس پوری جدوجہد' اس مسلسل صبر' اس ان تھک محنت اور ان بے مثال قربانیوں کے برابر ہے ـ تمام انبیاء اور ان کے متبعین نے اس سلسلے میں جو مساعی کیں' خواہ جس زمان ومکان میں بھی کیں' حقیقت ایمان کا قیام ان کا مناسب حاصل ہے ـ بلکہ حقیقت ایمان کا قیام ان تمام مساعی سے زیادہ قیمتی ہے' بلکہ اس کی قدروقیمت اس پوری کائنات سے زیادہ ہے ـ یہ پوری کائنات جس کے اندر اس زمین کی وہی حیثیت ہے جو

ہماری اس زمین کی فضا میں اڑنے والے ایک ذرے کی بمقابلہ اس زمین کے ہے ۔ ایسا ذرہ جسے کوئی محسوس ہی نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تقاضا یوں ہوا کہ اس انسانی مخلوق کو متعین خصائص عطا کیے جائیں اور اس نظام کو اس کے ضمیر میں بٹھا دیا جائے اور اس کی زندگی میں قائم کر دیا جائے اور یہ قیام خود اسی کے ہاتھوں سے ہو۔ اور اللہ انسان کو ایسا کرنے کی توفیق دے اور اس کی مدد کرے ۔ ہمیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ اللہ نے اس مخلوق کو یہ خصوصیات کیوں عطا کیں ۔ اور کیوں اللہ نے انسان کو یہ خصوصیت دی کہ وہ اپنی جدوجہد اور اپنے ارادے سے اپنی ذات میں بھی حقیقت ایمان پیدا کرے اور دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے وہ جو نظام زندگی اختیار کرے 'اس میں بھی اس حقیقت کو قائم کرے اور اللہ نے انسان کو اس طرح نہیں پیدا کیا جس طرح فرشتے ہوتے ہیں کہ وہ ازروئے تخلیق مومن 'مطیع اور نیکوکار ہیں اور ان کے اندر شر اور معصیت کی قدرت ہی نہیں ہے 'جس طرح ابلیس کے اندر ہے۔

ہمیں اس کا راز نہیں معلوم کیونکہ اللہ نے بتایا نہیں ہے' البتہ اس طرح تخلیق کرنے میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہو گی ۔ اس کائنات کے لیے اس قسم کی مخلوق کو کیوں پیدا کیا گیا ہے؟

لہٰذا انسانی دنیا میں حقیقت ایمان کے قیام کے لیے انسانی جدوجہد کی ضرورت ہے اور اسی جدوجہد کے لیے اللہ نے انبیائے کرام کا برگزیدہ گروہ بھیجا اور انبیاء کے بعد ان کے متبعین میں سے ایک برگزیدہ گروہ کو چنا' جو سچی طرح حقیقت ایمان پر عمل پیرا تھا اور انبیاء کے سچے متبعین کو بھی اللہ نے اس مقصد کے لیے چنا اور انہوں نے بھی حقیقت ایمان کے قیام کے لیے انتھک سعی کیں ۔ نہایت ہی جامع اور نہایت پر مشقت جہاد کیا۔

اس حقیقت کا دل میں بیٹھنے کا مفہوم یہ ہے کہ دل کے اندر اللہ کے نور کی ایک چنگاری بیٹھ جائے اور قلب انسانی کے اندر اللہ کے اسرار پوشیدہ ہوں اور مومن کا یہ دل اللہ کی تقدیر کا آلہ بن جائے اور یہ ایمان ایک عظیم حقیقت ہو' مجرد تصور ہی نہ ہو اور پھر یہ عظیم حقیقت خود انسان اور انسان کے ماحول میں پائے جانے والے' زمین و آسمان سے بھی عظیم تر ہو بلکہ یہ حقیقت پوری کائنات سے بھی بڑی ہو۔

جب حقیقت ایمان انسانوں کی زندگی میں ٹھوس شکل اختیار کرے یا انسانوں میں سے ایک جماعت کی زندگی میں ٹھوس شکل اختیار کرے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس زمین کی زندگی عالم بالا کی زندگی سے مربوط ہو جاتی ہے ۔ اور پھر انسان اس حقیقت کی وجہ سے عالم بالا کی زندگی سے رابطہ پیدا کرنے کے لائق ہو جاتا ہے ۔ ایک فانی ایک باقی کے ساتھ رابطہ قائم کر لیتا ہے ۔ ایک جزء ایک کل کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے ۔ ایک ناقص ایک کامل کے ساتھ جڑ جاتا ہے ۔

یہ وہ حاصل ہے جو ہر قسم کی انسانی جدوجہد اور محنت سے بھاری ہے ۔ ہر قربانی سے زیادہ قیمتی ہے ۔ اگرچہ یہ مقام کسی کو اس زمین پر ایک دن یا اس سے بھی کم وقت کے لیے حاصل ہو ۔ کیونکہ جب انسانیت اس مقام تک پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کی نظریں بلند افق پر ہوتی ہیں اور اس کے سامنے ایک عملی روشنی اور نور آ جاتا ہے ۔ اور اس نور کی روشنی میں پھر وہ صدیوں تک جدوجہد کرتی رہتی ہے ۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ انسانوں نے جب کبھی ترقی و کمال کے اعلیٰ مدارج حاصل کیے وہ ایمان ہی کی روشنی میں حاصل کیے ۔ اور ایمان ہی کی وجہ سے حاصل کیے ۔ صرف ایمان ہی کے ذریعہ انسانیت کو وسعتیں حاصل ہوئیں ۔ انسانی تاریخ میں جن ادوار میں انسانیت کو عروج حاصل ہوا وہ ایمان ہی کے ادوار رہے ہیں ۔ ان ادوار میں ایمان کو زمین پر عروج حاصل ہوا اور

ایمان نے انسانیت کی قیادت سنبھالی ۔ یہ ادوار زمانہ مابعد کے لوگوں کو محض خیالی اور تصوراتی ہی نظر آتے ہیں لیکن دراصل وہ حقیقت ہوتے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی فلسفہ 'کسی علم 'کسی فن 'کسی مذہب اور کسی نظام کے ذریعہ انسانیت اس قدر ترقی نہیں کر سکتی ' جس قدر اس ذریعہ سے کر سکتی ہے کہ ''حقیقت ایمان'' زمین پر ایک حقیقت کا روپ اختیار کر لے 'یوں کہ لوگوں کے عقیدے ' ان کی عملی زندگی ' ان کے اخلاق ' ان کے تصورات اور ان کی اقدار میں ''حقیقت ایمان'' ایک حقیقت بن جائے ۔ اور اس حقیقت کے نتیجے میں انسان ایک مکمل نظام زندگی اختیار کر لیں 'جس طرح ہر رسالت کے دور میں ایسا ہی ہوا کہ رسولوں نے ایمان کی حقیقت کو لوگوں کی زندگی میں جاگزیں کیا اور اس کے نتیجے میں ایک مکمل نظام زندگی وجود میں آیا۔

اور یہ کہ ''اسلامی نظریہ حیات اللہ کی جانب سے ہے'' ۔ یہ امر واقعہ قطعی دلیل ہے کہ جب بھی انسانیت نے ایمان باللہ کو اس زمین پر حقیقت کا روپ دیا ہے 'انسانیت نے بے پناہ ترقی کی ہے اور اس کے سوا کوئی اور ذریعہ سے کبھی بھی انسانیت کو ترقی اور عروج نصیب نہیں ہوا۔ نہ سائنس کے ذریعہ ' نہ فلسفہ کے ذریعہ ' نہ علوم و فنون کے ذریعہ اور نہ کسی نظام زندگی کے ذریعہ ۔جب انسانیت کے اندر حقیقی مومنین کی قیادت ناپید ہوئی 'اسے ایمان کے سوا کوئی اور حقیقت فائدہ نہیں دے سکی بلکہ ایمان کے بغیر انسانیت کی اقدار 'اس کے پیمانے اور اس کی انسانی سطح گر گئی اور اس پر نفسیاتی مصیبت 'فکری انتشار اور اعصابی امراض کا بدترین دور آ گیا ۔ اور باوجودیکہ مادی ترقی کے 'انسانیت مصائب کا شکار ہوئی ۔ باوجود مادی ترقی' جسمانی آرام اور عقلی ترقی اور مادی سہولیات کے انسانیت 'اطمینان' راحت اور سکون سے محروم رہی ۔ اور اس کا تصور حیات اس قدر بلند نہ ہو سکا۔جس طرح ایمان کی روشنی میں بلند ہوا۔ نیز اس کائنات کے ساتھ اس کا ربط اس قدر مضبوط نہ ہوا جس طرح ایمان کے زیر سایہ انسان اس پوری کائنات سے مربوط ہو جاتا ہے اور نہ حقیقت ایمان گم کر دینے سے انسانیت کو انسانی شرف حاصل ہوا۔ پوری انسانی تاریخ میں اگر ایمان تصورات کا گہرا مطالعہ ہو تو انسان اسی نتیجے پر پہنچتا ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ہمیشہ اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ وہ حقیقت ایمان کو دنیا پر غالب کرنے کے لیے قربانیاں دیں اور حقیقت ایمانی کے استقرار کے لیے اس قدر عظیم قربانیاں دیں 'جس قدر ان کی قوت و استطاعت ہو ۔ ایک ایسا گروہ تیار کریں جن کا دل 'نور الٰہی سے بھرا ہوا ہو' اور اس گروہ کے دل اللہ کی روح سے متصل ہوں ۔ ان لوگوں کی زندگیاں اس طرح بسر ہوں کہ وہ اسلامی نظام زندگی کا زندہ نمونہ ہوں ۔ جو اعلیٰ انسانی تصورات اور اعلیٰ انسانی اخلاق کا نمونہ ہوں ۔ اور ان کی عمومی زندگی بھی ایک اعلیٰ معیاری زندگی ہو۔ اس طرح جس طرح حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں ''الگ زندگی'' عملاً برپا ہوئی تھی ۔

انسانیت پھر بھی دعوت اسلامی سے اس طرح منہ موڑے گی جس طرح اس نے حضرت نوح 'حضرت ابراہیم 'حضرت موسیٰ 'حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد علیہم السلام اور ان کے بھائی دوسرے انبیاء کی دعوت سے منہ موڑا۔ اور آئندہ بھی بشریت انہی گمراہ قیادتوں کے پیچھے بھاگے گی جس طرح اس سے پہلے انسانی تاریخ میں ہوتا ہے ۔لوگوں نے انہی لوگوں کی اطاعت کی جو گمراہی میں دور تک ڈوبے ہوئے تھے اور آئندہ بھی سچائی کی طرف بلانے والوں کو قسم قسم کی سزائیں دی جائیں گی ۔ اور ان سے قسم قسم کے انتقام لیے جائیں گے 'جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا گیا 'جس طرح بعض پیغمبروں کو آرے کے ساتھ چیرا گیا 'جس طرح تمام رسولوں کے ساتھ مذاق کیا گیا ۔ اور پوری انسانی تاریخ میں ایسا ہوتا رہا۔

لیکن اللہ کی طرف دعوت کا کام یونہی جاری رہا‘جس طرح اللہ نے چاہا کیونکہ یہ وہ نتیجہ ہے جس کی راہ میں ہمیشہ بڑی بڑی قربانیاں دی جاتی رہی ہیں اور یہ اس قدر قیمتی مقصد ہے کہ اس کے لیے عظیم قربانیاں دی جاتی رہی ہیں ۔اگرچہ حاصل صرف یہ نکلے کہ ایک یا چند افراد کے دلوں میں نور ایمان کا چراغ روشن ہو جائے ۔اور صرف ایک ہی دل اللہ سے مربوط ہو جائے ۔

حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک نبوت اور دعوت کا یہ طویل فاصلہ اس بات کا مظہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنے ذمہ لگائی ہے کہ دعوت ایمانی کا سلسلہ جاری رہے گا اور ہر دور اور ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی انسان ایمان کی دعوت لے کر اٹھتا رہے گا ۔اس طویل اور مسلسل جدوجہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اس دعوت کی قدر و قیمت کیا ہے ۔اس جدوجہد سے کم ازکم مطلوبہ نتائج نہ ملیں کہ ایک داعی بذات خود سچا مومن بن جائے ‘ وہ دعوت کی راہ میں اپنی جان تک دینے کے لیے تیار ہو جائے اور کسی صورت بھی دعوت اسلامی کی جدوجہد سے منہ نہ موڑے ۔یہی وہ اعلیٰ نصب العین ہوتا ہے جس کی وجہ سے داعی اس پوری زندگی کے دائرہ کشش سے بلند ہوتا ہے ۔اس پر اس زمین کی کشش اور جاذبیت اثرانداز نہیں ہوتی ۔اور وہ اس زمین اور زمینی میلانات کے دائرہ کشش سے باہر نکل جاتا ہے ۔یہ ایک عظیم حاصل ہے ۔یہی عظیم کمائی ہے ۔اور یہ اس قدر قیمتی ہے کہ اس کے مقابلے میں تلخ ترین جدوجہد بھی کم نظر آتی ہے ۔

یہ داعیان الی اللہ کی کمائی ہے ۔یہ انسانیت کی کمائی ہے جس کی وجہ سے یہ انسانیت شرف اور بلندی حاصل کرتی ہے اور اس شرف اور کمائی کی وجہ ہی سے فرشتے انسانوں کو سجدے کرتے ہیں حالانکہ انسان زمین پر فساد برپا کرنے والا اور خونریزی کرنے والا ہے ۔لیکن ان کمزوریوں کے باوجود انسان اپنی جدوجہد سے ایمان کی روشنی بھی حاصل کر لیتا ہے ۔اور ایمان کی راہ میں قربانیاں بھی دیتا ہے اور اپنی جدوجہد کے ذریعہ ہی وہ دست قدرت کی تقدیر بن جاتا ہے اور پھر زمین پر اللہ کا مقرر کردہ نظام زندگی قائم کرتا ہے ۔اور وہ اس قدر روحانی آزادی حاصل کر لیتا ہے کہ اس راستے میں اپنی جان تک دے دیتا ہے ۔اور وہ اس قدر عظیم مشقتیں برداشت کرتا ہے جو زندگی سے بھی بھاری ہوتی ہیں تاکہ وہ اپنے عقیدے کو سینے سے لگاکر نجات حاصل کرے ۔اور اس زمین پر اس عقیدے اور ایمان کو ثبات و قرار عطا کر دے ۔اور دوسرے لوگ اس عقیدے اور ایمان سے مستفید ہوں ۔اور اس طرح ایک مومن کی قربانیوں کی وجہ سے دوسرے لوگ مستفید ہوتے ہیں اور ان کو کامیابی نصیب ہوتی ہے ۔جب کسی روح کو اس قدر آزادی نصیب ہوتی ہے تو اس کے لیے ہر قسم کی جدوجہد اور مشقت آسان ہو جاتی ہے ۔پھر وہ ہر قسم کی قربانیاں دیتا ہے ۔اور یہ ان تھک جدوجہد اور عظیم قربانیاں پس پردہ چلی جاتی ہیں اور وہ ”حاصل“ نمایاں ہوکر سامنے آجاتی ہے جو اللہ کے ترازو میں زمین و آسمانوں اور پوری کائنات سے بھاری ہے ۔

اب اس تبصرے کے بعد سورہ نوح کی آیات کی تشریح جس میں اول سے آخر تک یہی حقیقت بیان کی گئی ہے ۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۷۱ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۲۸

آیاتها ۲۸ سُورَةُ نُوحٍ ۷۱ مَكِّيَّةٌ ۷۱ رکوعاتها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ۝۱ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اتَّقُوْهُ وَ
اَطِيْعُوْنِ ۝۳ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ اَجَلَ
اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۴

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ہم نے نوح ۴ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (اس ہدایت کے ساتھ) کہ اپنی قوم کے لوگوں کو خبردار کر دے قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آئے۔

اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو' میں تمہارے لیے ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا (پیغمبر) ہوں۔ (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو' اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں ایک وقت مقرر تک باقی رکھے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آجاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا' کاش تمہیں اس کا علم ہو"۔

سورت کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ رسالت اور نبوت کا سرچشمہ کیا ہے اور یہ نظریہ اور عقیدہ کہاں سے آرہا ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ (۷۱ : ۱) "ہم نے نوح ۴ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا" گویا' سرچشمہ ہدایت و رسالت ذات باری تعالیٰ ہے۔ تمام انبیاء اپنے عقائد اور ہدایات اللہ سے لیتے ہیں' اللہ انسانوں کا بھی خالق ہے۔ اس کائنات کا بھی خالق ہے اور اللہ ہی ہے جس نے انسانوں کی فطرت کے اندر معرفت رب کی استعداد

رکھی ۔ اور جب بھی انسانوں نے راہ فطرت اور اللہ کی ہدایت سے منہ موڑا' اللہ نے کوئی نہ کوئی رسول بھیج دیا۔ اور تمام رسول ہمیشہ گم کردہ راہ انسانیت کو راہ راست کی طرف موڑتے رہے ۔ حضرت نوح علیہ السلام سلسلہ رسل کی پہلی کڑی تھے ۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ۔ قرآن کریم نے حضرت آدم کی رسالت کا ذکر نہیں فرمایا کہ انہوں نے انسانوں کی ہدایت کے لیے یہ یہ کام کیا' اس لیے کہ حضرت آدم صرف اپنے بیٹوں اور پوتوں کی ہدایت پر مامور تھے ۔ اور حضرت آدم کے پوتے اور اولاد آپ کی وفات کے بعد ایک عرصے کے بعد گمراہ ہوئی اور اپنے لیے بت گھڑ لیے ۔ اور ان کی پوجا کرنے لگی ۔ پہلے تو وہ ان کو مقدس قوتوں کے لیے بطور رمز و اشارہ استعمال کرتے تھے بعد میں انہوں نے ان بتوں ہی کی پوجا اختیار کر لی ۔ اور ان بتوں میں سے مشہور وہ پانچ بت تھے 'جن کا ذکر اس سورت میں آرہا ہے ۔ چنانچہ جب یہ لوگ گمراہ ہوگئے تو اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کو ارسال فرمایا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ان کو عقیدۂ توحید کی طرف واپس لانے کی طویل جدوجہد کی ۔ اور ان کے عقائد کو درست کرنے کی سعی کی ۔ کتب سابقہ میں حضرت ادریس علیہ السلام کو سب سے پہلے نبی کے طور پر ذکر کیا گیا۔ یعنی حضرت نوح علیہ السلام سے بھی پہلے ۔ لیکن کتب سابقہ کے مندرجات ہمارے لیے حجت نہیں ہیں' اس لیے کہ ان کے اندر بار بار تحریف ہوتی رہی ہے اور ان میں بار بار حذف و اضافہ ہوتا رہا ہے ۔

قرآن کریم کے قصص کے مطالعے سے یہی تاثر ملتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سب سے پہلے نبی ہیں اور ان کو بالکل انسانیت کے ابتدائی دور میں بھیجا گیا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نوسو سال تک تبلیغ کی ۔ اس دور کے لوگوں کی یہ طویل عمر بھی یہ بتاتی ہے کہ یہ لوگ بہت ہی ابتدائی دور کے لوگ تھے اور پھر اس دور میں انسانوں کی تعداد بھی بہت کم تھی اور انسانوں کی نسل ابھی تک اس طرح نہ پھیلی تھی جس طرح زمانہ مابعد میں پھیل گئی ۔ حیاتیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اشیاء کی تعداد کم ہو تو عمر زیادہ ہوتی ہے ۔ اللہ ہی حقیقت سے واقف ہے ۔ یہ سنن الٰہی کے مطالعہ پر مبنی ہمارا قیاس ہے ۔

اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی رسالت کے مشن اور ہدف کی طرف مختصر اشارہ آتا ہے ۔ یہ کہ اے نوح علیہ السلام تم اپنی قوم کو ڈراؤ :

اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۷۱ : ۱) ”کہ اپنی قوم کے لوگوں کو خبردار کر دو قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آجائے“۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم جس حالت تک پہنچ چکی تھی اور جس طرح وہ آپ کی ہدایات اور تبلیغ سے منہ موڑ رہی تھی' تکبر کر رہی تھی اور نہایت ہی ہٹ دھرمی اور عناد میں مبتلا تھی' اس کے لیے یہاں یہ کہنا نہایت مناسب ہے کہ بس تم ان کو انجام بد سے ڈراؤ' چنانچہ انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز یوں کیا کہ لوگو' دنیا و آخرت کے عذاب سے ڈرو' تم اپنے آپ کو اس عذاب کا مستحق بنا رہے ہو۔

فریضہ رسالت کے تعین کے بعد فوراً یہ بتایا جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام تبلیغ شروع کر چکے ہیں ۔ آپ کا خطاب یوں ہے کہ لوگو تم اگرچہ نہایت گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کر چکے ہو لیکن باز آجاؤ' توبہ کرو' تمہارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور تمہارا احساب قیامت تک کے لیے ملتوی کر دیا جائے گا۔ ورنہ تم تو فوری ہلاکت اور پکڑ کے مستحق

ہو ۔ ساتھ ساتھ اصول دعوت کا ذکر بھی کر دیا گیا کہ اللہ وحدہ کی بندگی کرو، تمام معاملات میں میری سنت کی پیروی کرو۔

قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۲) اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ (۳) يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۴) (۷۱ : ۲ تا ۴) "اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو، میں تمہارے لیے ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا (پیغمبر) ہوں۔ (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں ایک وقت مقرر تک باقی رکھے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آ جاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا، کاش تمہیں اس کا علم ہو"۔

قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۷۱ : ۲) "اے میری قوم کے لوگو، میں تمہارے لیے صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں"۔ آپ اپنی دعوت میں جس بات کی وضاحت کرتے ہیں وہ ڈراوا ہے۔ اور اس ڈراوے کو آپ نہایت ہی وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ مجمل بات نہیں کرتے نہ پیچیدہ کر کے اور لپیٹ کر محض اشارات و کنایات سے بات کرتے ہیں نہ آپ اپنی دعوت کے سلسلے میں شش و پنج کرتے ہیں۔ اور قوم نوح جس انجام سے دوچار ہونے والی تھی وہ بھی آپ نے صاف صاف بتا دیا کہ اگر تم باز آ جاؤ تو دنیا کا عذاب موخر ہو سکتا ہے۔

حضرت نوح ؑ جو دعوت پیش کر رہے تھے، وہ بھی سادہ اور سیدھی ہے۔

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ (۷۱ : ۳) "کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو"۔ یعنی اللہ وحدہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرو، تمہارے شعور و سلوک پر یہ بات چھائی ہوئی ہو، اور رسول اللہ کی اطاعت وہ بات ہے جس سے نظام زندگی پھوٹتا ہے اور زندگی کے تفصیلی قواعد وضع ہوتے ہیں جس کی تعبیر سنت رسول ؐ سے کی جاتی ہے۔

بس تمام ادیان سماوی کے یہی خطوط ہیں۔ اللہ کا حکم اور رسول اللہ کی اطاعت۔ انہی خطوط پر دین استوار ہوتا ہے۔ تفصیلات ہر دور کے حالات کے مطابق ہوتی ہیں۔ انسانیت کے تفصیلی سوالات، اس کا تصور وجود اور اس کائنات کے اندر پائے جانے والے مختلف سوالات جو مختلف ادوار میں ہوتے ہیں ان کے جوابات کے نتیجے میں ادیان کی تفصیلات اور فروعات میں اختلاف ہوتا ہے۔

اللہ کی پوری بندگی کرنا ہی دراصل ایک مکمل نظام ہوتا ہے۔ اللہ کی بندگی میں تصور الٰہ، اس کی اطاعت کی تفصیلات، خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی نوعیت، اس کائنات میں حسن و قبح کے اصول۔ لوگوں کی زندگیوں میں حسن و قبح کے اصول۔ اس طرح اللہ کی بندگی کے اصول سے ایک مکمل نظام زندگی قائم ہو جاتا ہے۔ زندگی گزارنے کا ایک منہاج سامنے آ جاتا ہے۔ یہ ایک ربانی منہاج حیات ہوتا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندگی اور خدائی کا باہم تعلق کیا ہوتا ہے؟ اور وہ کیا قدریں ہیں، جو زندہ اور غیر زندہ اشیاء کے متعلق اللہ نے تجویز فرمائی ہیں۔

اور "خدا کا خوف" وہ ضامن ہے جو اس نظام زندگی اور منہاج حیات کو قائم رکھتا ہے۔جس قوم کے دل میں خدا کا خوف ہو وہ اس منہاج سے ادھر ادھر نہیں جاتی۔نہ اس میں حیلے اور بہانے تلاش کرتی ہے۔نیز تقویٰ کے بدولت انسان کے اندر اخلاق فاضلہ بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔انسان کا طرز عمل حقیقی ہوتا ہے 'بغیر کسی ظاہرداری اور دکھاوے کے۔

اطاعت رسول سے دراصل راستے کی حدود کا تعین ہوتا ہے اور انسان اس سیدھی راہ پر چلنے کے لیے تفصیلی ہدایات اخذ کرتا ہے اور براہ راست رب تعالیٰ اور عالم بالا سے مربوط رہتا ہے۔

یہ تھے وہ خطوط جن پر حضرت نوح علیہ السلام نے آغاز انسانیت سے لوگوں کے لیے راہ ہدایت اور منہاج حیات استوار کیا۔اور ازمنہ مابعد کی تمام دعوتیں انہی خطوط پر استوار ہوتی رہیں اور حضرت نوح علیہ السلام نے قوم سے وعدہ کیا کہ اگر تم نے توبہ کر لی اور لوٹ آئے تو اللہ معاف کر دے گا۔

يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (۷۱ : ۴) "اور تمہارے گناہوں سے درگزر کرے گا اور تمہیں وقت مقررہ تک باقی رکھے گا"۔اور یہ باقی رکھنا' اس بات کے عوض میں ہو گا کہ تم اللہ کی بندگی کرو گے 'اللہ سے ڈرو گے اور رسول خدا کی اطاعت کرو گے 'اور اس کے بدلے اللہ مزید یہ کرے گا کہ تمہارے سابقہ گناہ بھی معاف کر دے گا اور تمہارا احساب و کتاب اس وقت تک موخر ہو جائے گا جو اللہ نے مقرر کر رکھا ہے یعنی یوم الآخرت تک۔اور اس طرح دنیا میں تم پر جو تباہ کن عذاب آنے والا ہے' وہ موخر ہو جائے گا۔(عنقریب حضرت نوح علیہ السلام پیش کریں گے کہ اللہ نے ان لوگوں کے ساتھ اور بھی وعدے فرمائے تھے)۔

اس کے بعد یہ فرمایا گیا کہ قیام قیامت حتمی ہے اور وہ اپنے وقت پر ضرور آئے گی۔اس میں کوئی تاخیر نہیں ہو سکتی۔جس طرح دنیا کے عذاب میں تاخیر ہو سکتی ہے۔چنانچہ قیامت کے بارے میں عقیدے کو یوں درست کر دیا جاتا ہے۔

اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۷۱ : ۴) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آ جاتا ہے تو ٹالا نہیں جاتا' کاش تمہیں اس کا علم ہوتا"۔اس سے مراد قیامت بھی ہو سکتی ہے اور ہر وہ دوسرا وقت بھی ہو سکتا ہے جو اللہ کسی واقعہ کے وقوع کے لیے مقرر کر دے۔بہرحال یہاں یہ عام عقیدہ ذہنوں میں بٹھانا مقصود ہے کہ اللہ کا مقرر کردہ وقت ٹالا نہیں جا سکتا۔ہاں اگر یہ لوگ اطاعت کر لیں اور توبہ کر لیں تو اللہ دنیا میں تباہ کر دینے کے بجائے 'قیام قیامت تک کے لیے ان کا عذاب ٹال دے گا۔

--- ○○○---

حضرت نوح علیہ السلام اپنی مساعی جاری رکھے ہوئے ہیں 'اور اپنی قوم کی ہدایت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔وہ کسی مصلحت کی پرواہ نہیں کرتے 'کسی مفاد کا لحاظ نہیں کر رہے۔وہ اس عظیم مقصد کے لیے وہ سب کچھ برداشت کر رہے ہیں۔لوگ اعتراض کر رہے ہیں' منہ موڑ رہے ہیں اور مذاق کر رہے ہیں۔لیکن آپ ہیں کہ کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ساڑھے نو سو سال اس جدوجہد میں گزر جاتے ہیں۔چند لوگ ہی دعوت قبول کرتے ہیں جبکہ قوم کی طرف سے منہ موڑنے 'گمراہی پر اصرار کرنے اور مذاق کرنے میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ٹھیک ساڑھے نو سو سال کے بعد حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے دربار میں اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرتے ہیں۔اس طویل عرصے میں جو کچھ پیش آیا' وہ عرض

کر دیتے ہیں ' جبکہ رب تعالیٰ کو تو پہلے سے معلوم ہے ۔ اور حضرت نوح علیہ السلام بھی جانتے ہیں کہ رب کو معلوم ہے ' لیکن شکوہ شکایت یونہی دہرائی جاتی ہے اور انبیائے کرام کا شکوہ تو اللہ ہی سے ہو سکتا ہے ۔ وہ اللہ کے ہاں ہی اپنی فریاد پیش کر سکتے ہیں ۔ اور وہ مومنین جن کو حقیقت ایمان تک رسائی حاصل ہوتی ہے وہ بھی صرف اللہ ہی سے شکایات کرتے ہیں ۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّ نَهَارًا ۝۵ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ
اِلَّا فِرَارًا ۝۶ وَ اِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ
وَ اسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَ اَصَرُّوْا وَ اسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝۷ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ
جِهَارًا ۝۸ ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَ اَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝۹ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا
رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝۱۰ یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا ۝۱۱ وَّ یُمْدِدْكُمْ
بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِیْنَ وَ یَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ یَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝۱۲ مَا لَكُمْ لَا
تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝۱۳ وَ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝۱۴ اَلَمْ تَرَوْا كَیْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ
سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝۱۵ وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝۱۶ وَ اللّٰهُ
اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝۱۷ ثُمَّ یُعِیْدُكُمْ فِیْهَا وَ یُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۝۱۸
ع ۲۰ ۱ وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۝۱۹ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝۲۰

9 اس نے عرض کیا " اے میرے رب ' میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا مگر میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا ۔ اور جب بھی میں نے ان کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کر دے ' انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا ۔ پھر میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی ۔ پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا ۔ میں نے کہا " اپنے رب سے معافی مانگو ' بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے ۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا ' تمہیں مال اور اولاد سے نوازے گا ' تمہارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کر دے گا ۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کے لیے تم کسی وقار کی توقع نہیں رکھتے ؟ حالانکہ اس نے طرح طرح سے تمہیں بنایا ہے ۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا ؟ اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا ' پھر وہ تمہیں اسی زمین میں واپس لے جائے گا اور اس سے یکایک تم کو نکال کھڑا کرے گا ۔ اور اللہ نے زمین کو تمہارے لیے فرش کی طرح بچھا دیا تاکہ تم اس

کے اندر کھلے راستوں میں چلو"۔

یہ تھی حضرت نوح علیہ السلام کی کارکردگی اور یہ رہی ان کی رپورٹ۔ اس طویل عرصہ کارکردگی میں وہ اپنے رب کے سامنے اپنا حساب پیش فرماتے ہیں۔ آپ کی رپورٹ میں جو چیز نمایاں ہے' وہ آپ کی جہد مسلسل ہے۔

انی دعوت قومی لیلا ونھارا (۷۱ : ۵) "میرے رب' میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا"۔ انہوں نے ہمت نہ ہاری' وقفہ نہیں کیا' اور وہ لوگوں کے مسلسل اعراض اور اصرار کے باوجود مایوس نہیں ہوئے لیکن

فلم یزدھم دعاءی الا فرارا (۷۱ : ۶) "لیکن میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا"۔ یعنی وہ داعی الی اللہ سے بھاگتے رہے اور شیطان کے پیچھے پڑے رہے۔ حالانکہ اللہ ان کا خالق تھا' جن انعامات میں وہ مزے سے رہ رہے تھے' وہ اللہ کی تخلیق کردہ تھیں۔ یہ ہدایت بھی اللہ ہی کی طرف سے آرہی تھی' اور داعی نہ اجر کا طلبگار تھا اور نہ فیس عائد کر رہا تھا۔ اور جس ذات سے وہ بھاگ رہے تھے وہ ان کو اس لیے بلا رہی تھی کہ آؤ تمہیں بخش دیا جائے' آؤ تمہیں ان گناہوں کے انجام سے بچایا جائے اور معصیت اور ضلال سے بچایا جائے۔

وہ تو بھاگتے رہے لیکن داعی حق ان کو گھیرتے رہے اور ہر طرح ان کے کانوں تک کلمہ حق پہنچاتے رہے لیکن انہوں نے نہ اس بات کو برداشت کیا کہ ان کے کانوں میں کلمہ حق پڑے اور نہ اس بات کو پسند کیا کہ پیغمبر پر ان کی نظریں پڑیں' اس لیے انہوں نے گمراہی پر بے حد اصرار اور کلمہ حق کے قبول کرنے سے بڑا تکبر کیا۔

وانی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اذانھم واستغشوا ثیابھم واصروا واستکبروا استکبارا (۷۱ : ۷) "اور جب بھی میں نے ان کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کر دے' انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا"۔ یہ ہے انداز داعی حق کا کہ وہ اپنی دعوت پر اصرار کرتا ہے اور جونہی اور جب بھی اسے موقعہ ملے وہ کلمہ حق کہہ دیتا ہے جبکہ اہل کفر کے اصرار کی بھی یہ ایک مثال ہے کہ جب وہ ہٹ دھرمی پر اتر آئیں تو منہ بھی چھپا لیتے ہیں۔ اس دعوت اور اس انکار سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی ایام میں جبکہ بشریت عہد طفولیت میں تھی۔ دعوت کے شب و روز کیا تھے کہ لوگ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تھے اور سروں کو چادروں میں چھپا لیتے تھے۔ انداز تعبیر سے لوگوں کا کافرانہ طرز عمل ظاہر ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں کہ یہ انگلیوں کو کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں۔ پوری انگلیاں تو کانوں میں نہیں ٹھونسی جاتیں مگر یہ مبالغہ کے لیے کہا گیا کہ وہ کانوں کو یوں بند کر رہے ہیں کہ آواز کسی طرح بھی ان کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ گویا یہ کوشش کر رہے تھے کہ پوری انگلی کو کانوں میں ٹھونس لیں۔ یہ سخت اصرار اور ہٹ دھرمی کی شکل ہے اور ابتدائی ادوار میں یہی صورت حالات تھی۔

مسلسل دعوت دیتے چلے جانے' ہر موقعہ سے فائدہ اٹھانے اور ان تھک جدوجہد کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت نوح

علیہ السلام نے دعوت اسلامی کے لیے ہرانداز بھی اختیار کیا۔ کبھی انہوں نے ببانگ دہل دعوت دی۔ کبھی انہوں نے خفیہ تحریک چلائی۔

ثُمَّ اِنِّیْ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا (۷۱: ۹) "پھر میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی۔ پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا"۔

اس دعوت کے دوران حضرت نوح علیہ السلام نے ان کو یہ بھی بتایا کہ اگر تم میری دعوت قبول کر لو تو تمہیں دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کی کامیابی نصیب ہوگی۔ اور یہ بھی بتایا کہ اگر تم لوگ اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرو تو وہ تمہیں بخش دے گا کیونکہ وہ تو بہت بخشنے والا ہے۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا (۷۱: ۱۰) "میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو وہ بہت بڑا معاف کرنے والا ہے"۔ اور ان کو یہ لالچ بھی دیا کہ اللہ تمہیں وافر رزق بھی دے گا' بارشوں کے ذریعہ نہریں بہا دے گا' اولاد دے گا' اموال دے گا' جو تمہیں بہت عزیز ہیں۔

يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا (۷۱: ۱۱) وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا (۷۱: ۱۲) "وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا' تمہیں مال اور اولاد سے نوازے گا' تمہارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کر دے گا"۔

حضرت نوح علیہ السلام نے استغفار اور عطائے رزق جہاں کو باہم یکجا کر دیا اور قرآن میں بے شمار مواقع پر ایمان' ہدایت اور صلاح اور تقویٰ اور خوشحالی اور وافر رزق کو ایک دوسرے کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۷: ۹۶) "اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم آسمان و زمین سے ان پر نعمتیں کھول دیتے لیکن انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کو ان کے اعمال کے بدلے پکڑا"۔

اور دوسری جگہ ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (۶۵) وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (۶۶) (۵: ۶۵ ـ ۶۶) "اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور

ڈرتے تو ہم ان سے ان کی برائیاں دور کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کر دیتے' اگر وہ توریت' انجیل اور جو ان کی طرف نازل کیا گیا ان کے رب کی طرف سے' ان کو قائم کرتے' تو وہ اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے کھاتے"۔ اور دوسری جگہ ہے :

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنَّنِیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ (۲) وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ یُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّیُؤْتِ كُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ (۳) (۱۱ : ۲ ۔ ۳) "یہ کہ عبادت نہ کرو مگر اللہ کی میں تم کو اس کی طرف سے ڈر اور خوشخبری سناتا ہوں اور یہ کہ گناہ بخشواؤ اپنے رب سے اور اس کی طرف رجوع کرو' وہ تم کو بہت اچھا فائدہ پہنچائے گا۔ ایک مقرر وقت تک اور دے دے گا ہر صاحب فضل کو اس کا فضل"۔

یہ اصول جس کا ذکر قرآن کریم متفرق مقامات پر کرتا ہے ایک صحیح اصول ہے اور یہ اللہ اپنے وعدے پر قائم ہے اور ان سنن حیات پر قائم ہے جو اللہ نے اس کائنات میں جاری کیے ہیں اور انسانوں کی عملی تاریخ اس پر شاہد عادل ہے۔ یہ قاعدہ اقوام کے لیے ہے افراد کے لیے نہیں ہے۔ اس جہاں میں جب بھی کسی قوم نے شریعت پر اپنا نظام استوار کیا ہے اور عمل صالح اختیار کر کے خدا خوفی کا رویہ اپنایا ہے اور اللہ سے ڈر کر اپنی کوتاہیوں سے معافی طلب کی ہے' اللہ نے اسے مادی ترقی بھی دی ہے۔ غرض جب بھی کسی قوم نے تقویٰ اختیار کر کے اللہ کی بندگی اختیار کی ہے اور شریعت کو نافذ کیا ہے' اور لوگوں کے درمیان عدل کا نظام رائج کیا ہے تو اس کائنات کی قدرتی قوتوں نے اس کے ساتھ تعاون کیا ہے اور اللہ نے اسے زمین پر تمکین عطا کی ہے اور وہ دنیاوی ترقی کے اعتبار سے بھی عروج تک پہنچی ہے۔

بعض اوقات ہم اس کرہ ارض پر ایسی اقوام دیکھتے ہیں جو اللہ سے نہیں ڈرتیں اور جو اللہ کی شریعت کے مطابق عمل پیرا نہیں ہوتیں' لیکن اس کے باوجود ان کو وافر رزق ملتا ہے۔ اور اس زمین کے اوپر ان کو اقتدار اعلیٰ بھی ملا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہوتی ہے۔

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَةً "اور ہم تمہیں خیر و شر کے ذریعہ سے آزماتے ہیں"۔ پھر یہ خوشحالی ایک سڑی ہوئی خوشحالی ہوتی ہے اور اسے اجتماعی بیماریاں' اخلاقی گراوٹ' ظلم اور زیادتی' انسانی شرافت کا فقدان جیسی خرابیاں لاحق ہوتی ہیں اور ان کا مزہ کرکرا ہوتا ہے۔ آج ہمارے سامنے دو بڑی حکومتیں ہیں جن کو اللہ نے رزق میں وہ وسعت دی ہے۔ زمین کے ایک بڑے حصے پر ان کو اقتدار ملا ہوا ہے۔ ایک سرمایہ دار ہے اور ایک اشتراکی ہے۔ (سید قطب' آپ کو اللہ نے اطلاع دے دی ہوگی کہ یہ نابود ہو چکی ہے) جہاں تک پہلی کا تعلق ہے اس کی اخلاقی حالت حیوانوں سے بھی زیادہ گری ہوئی ہے۔ اور ان کی زندگی کی مجموعی حالت یہ ہے کہ یہ صرف ڈالر پر قائم ہے اور ڈالر کے سوا وہاں کوئی اخلاقی قدر نہیں ہے۔ اور دوسری سمت میں انسان ایک غلام سے بھی گرا ہوا ہے اور اس کا جاسوسی نظام اس قدر خوفناک ہے کہ ہر شخص ایک دائمی خوف میں زندگی بسر کرتا ہے۔ کوئی شخص رات کو اس حال میں نہیں سوتا کہ اسے صبح

گرفتاری کا ڈر نہ ہو۔ یہ دونوں ممالک انسانی معیاروں کے لحاظ سے گرے ہوئے ہیں۔ (صرف سٹالن نے ۲ کروڑ انسان تہ تیغ کیے۔ مترجم)

اب ذرا دیکھئے کہ حضرت نوح علیہ السلام اپنی طویل جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ اپنی قوم کو انفس و آفاق میں پائے جانے والے دلائل ایمان کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ آپ حیران رہ جاتے ہیں کہ اس کے جواب میں قوم ان کو کس طرح رد کرتی ہے 'نہایت گستاخانہ رویہ اپناتی ہے۔ آپ اس رویہ پر ان کی سرزنش کرتے ہیں۔

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (۷۱:۱۳) وَ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (۷۱:۱۴)

"تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کے لیے تم وقار کی توقع نہیں رکھتے۔ حالانکہ اس نے طرح طرح سے تمہیں بنایا ہے"۔ یہ اطوار کیا تھے؟ قوم نوح علیہ السلام ان کو اچھی طرح سمجھتی تھی یا اس کا کوئی ایسا مفہوم تھا جو وہ لوگ اس وقت اچھی طرح سمجھتے تھے اور یہ طور اور تفریق کا ان کے ذہنوں پر بہت ہی اچھا اثر تھا۔ اس پر غور کرنے سے وہ راہ راست پر آ سکتے تھے۔ اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ مراد جنین کے مختلف اطوار ہیں۔ نطفہ' علقہ، مضغہ اور موجودہ ہیکل انسانی۔ اور اس حقیقت کو وہ لوگ بھی سمجھتے تھے اور ہم بھی۔ کیونکہ وہ جو جنین کامل ہونے سے قبل ہی گر جاتے ہوں گے' ان کے مشاہدے سے وہ انسانی اطوار کو سمجھتے ہوں گے۔ بہرحال اس آیت کے ممکنہ معنوں میں سے یہ ایک مفہوم ہے۔ یہ بھی ممکن ہے اس سے مراد جنین کے اطوار ہوں کہ آغاز میں وہ ایک خلیے کا حیوان ہو جاتا ہے۔ پھر متعدد خلیوں والا بن جاتا ہے' پھر پانی کے حیوانات کی طرح' پھر پستانوں والے حیوانات کی طرح اور آخر کار موجودہ شکل انسانی کی طرح۔ لیکن یہ اطوار قوم نوح علیہ السلام کے لیے قریب الفہم نہ تھے کیونکہ یہ اطوار حال ہی میں مشاہدے میں آئے ہیں۔ اور اس کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے جو دوسری آیات کا ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ "پھر اٹھا کھڑا کیا اس کو ایک نئی صورت میں' تو اللہ برکتوں والا ہے سب سے بہتر بنانے والا"۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان دونوں آیات کا اس کے سوا بھی کوئی اور مفہوم ہو۔ جسے ابھی تک ہم نہ سمجھ سکے ہوں اور آئندہ کسی وقت سمجھ لیں۔

بہرحال نوح علیہ السلام نے ان کو مطالعہ ذات کی طرف متوجہ کیا اور اس بات پر سخت گرفت کی کہ دیکھو تو سہی کہ اللہ نے تم کو کس طریقے سے پیدا کیا ہے اور پھر بھی لوگ خالق کو نہیں پہچانتے حالانکہ وہ دیکھتے ہیں کہ تمام مخلوقات میں سے انسان محیر العقول مخلوق ہے۔ اور اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام ان کو کائنات کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (۱۵) وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (۷۱:۱۶) "کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا؟" سات آسمانوں کے مفہوم کا تعین ہم ان سائنسی نظریات کے مطابق نہیں کر سکتے' جو سائنس دان اس کائنات کے بارے میں گھڑتے رہتے ہیں۔ کیونکہ سائنسی نظریات تو مفروضات ہوتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے لوگوں کو سات آسمانوں کی طرف متوجہ کیا اور اللہ نے ان کو بتایا کہ یہ سات ہیں ۔ اور ان آسمانوں میں شمس و قمر اس طرح ہیں کہ ایک نور ہے اور دو سراچراغ ہے ۔ لوگ آسمانوں کو بھی دیکھ رہے تھے 'اور شمس و قمر کو بھی دیکھ رہے تھے ۔ آسمان اس فضا سے عبارت ہے جو نیلگوں ہے ۔ یہ ہے کیا؟ اس کی حقیقت نہ وہ معلوم کر سکتے تھے اور نہ ان سے مطلوب تھا ۔ نہ آج تک ان کی حقیقت معلوم ہو سکی ہے ۔ اس حد تک وضاحت اس بات کے لیے کافی ہے کہ انسان اس ہولناک کائنات پر غور وفکر کرے اور دیکھے کہ قدرت الٰہیہ نے کس قدر عجیب تخلیق کی ہے اور یہی مقصد تھا حضرت نوح علیہ السلام کا ۔ اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام ان کو متوجہ کرتے ہیں کہ اللہ نے تمہیں کس طرح زمین سے پیدا کیا اور کس طرح دوبارہ زمین کی طرف لوٹایا ۔ اور پھر اس سے تمہیں نکالے گا ۔

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا (۱۷) ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا (۷۱ : ۱۸) ”اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا پھر وہ تمہیں اسی زمین میں واپس لے جائے گا اور پھر یکایک اس سے نکال کھڑا کرے گا“ ۔

انسان کی تخلیق کے عمل کو یہاں ”اگانے“ سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ ایک عجیب انداز تعبیر ہے ۔ قرآن کریم میں کئی جگہ یہ انداز اختیار کیا گیا ہے ۔ مثلاً ۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ”ایک پاکیزہ زمین اپنے نباتات اپنے رب کے اذن سے نکالتی ہے اور جو خبیث ہے وہ صرف کم پیداوار نکالتی ہے“ ۔ اس آیت میں انسانوں کی پیدائش کی طرف اشارہ ہے ۔ اور انسان کی پیدائش کے ساتھ نباتات کی پیدائش کا ذکر تو کئی جگہ آتا ہے ۔ سورہ حج میں بعث بعد الموت پر دلیل دیتے ہوئے یہ کہا گیا ہے :

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ (۲۲ : ۵) ”اے لوگو، تمہیں قیامت میں زندہ ہو کر اٹھنے میں شبہ ہے تو ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا 'پھر نطفہ سے 'پھر گوشت کی بوٹی سے 'جو مختلف تھی بنی ہوئی اور غیر بنی ہوئی 'تاکہ تم کو بتا دیں اور ارحام میں ہم ٹھہراتے ہیں جو چاہتے ہیں ایک مقرر وقت تک 'پھر تمہیں طفل کی شکل میں نکالتے ہیں تاکہ تم جوانی تک پہنچو 'پھر تم میں سے بعض کو موت آلیتی ہے اور بعض ذلیل عمر تک لوٹ جاتے ہیں 'تا

کہ اس طرح وہ علم کے بعد کچھ نہ جانیں اور تم دیکھتے ہو کہ زمین خراب پڑی ہے ۔ جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ تازہ ہو جاتی ہے ۔ اور ابھرتی ہے ۔ اور وہ ہر قسم کی پررونق چیز اگاتی ہے"۔ اور سورہ مومنون میں پیدائش کے مختلف مدارج بتلانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے ۔

فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ "پھر ہم اس کے ذریعے تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغات اگاتے ہیں"۔ اور اسی طرح دوسرے مقامات پر بھی ۔

یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو قابل نظر ہے ' یہ بتاتی ہے کہ روئے زمین پر اللہ نے حیات و نبات کے لیے تقریباً ایک ہی جیسے اصول رکھے ہیں ۔ انسان کی تخلیق بھی اسی طرح ہے جس طرح نباتات کی تخلیق ہے ۔ جن عناصر سے انسان پیدا ہوتا ہے انہی سے حیوانات و نباتات بھی پیدا ہوتے ہیں ۔ دونوں انہی عناصر سے غذا اخذ کرتے ہیں ۔ انسان حیوان بھی زمین کے نباتات میں سے ایک نبات ہیں ۔ جس طرح اللہ نے نباتات کو رنگا رنگی دی ہے ' اسی طرح حیوانات اور انسانوں کو بھی تنوع اور رنگارنگی دی ہے ۔ دونوں زمین سے ہیں ' دونوں زمین سے غذا لیتے ہیں اور دونوں زمین میں فنا ہوتے ہیں ۔

یوں ایمان کے ذریعہ ایک مومن کے شعور میں اس زمین کی زندہ اگنے والی مخلوق کے بارے میں صحیح تصور پیدا ہوتا ہے ۔ یہ ایک زندہ اور علمی شعور ہے کیونکہ اس کی اساس شعوری ایمان پر ہے اور یہ قرآنی علوم کا مخصوص امتیاز ہے ۔

جو لوگ زمین سے پیدا کیے گئے ہیں وہ دوبارہ اس زمین کے پیٹ میں جاتے ہیں ۔ جس طرح اللہ نے ان کو زمین سے نکالا ' دوبارہ زمین کی طرف لوٹائے گا ۔ چنانچہ اس طرح ان کی ہڈیاں اور بوسیدہ اجزائے وجود زمین کے ذرات کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں ۔ جس طرح یہ ذرات پیدائش سے پہلے زمین کے اندر تھے ۔ اور اللہ دوبارہ ان ذرات کو زمین سے نکالے گا ۔ اور یہ اسی طرح ہو گا جس طرح پہلی مرتبہ ہوا ۔ یہ نہایت ہی سہل کام ہے اللہ کے لیے ۔ یہ کام اللہ ایک لمحہ اور ایک لحظہ میں کر دے گا ۔ یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے ۔ بشرطیکہ لوگ قرآنی زاویہ سے اس حقیقت پر غور کریں ۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس حقیقت کی طرف متوجہ فرمایا تاکہ ان کو معلوم ہو کہ اللہ قدرتوں والا ہے کہ اس نے تمہیں اس زمین سے اگایا ہے اور دوبارہ بھی وہ تمہیں اسی طرح اگائے گا ۔ جب یہ شعور انسان کے اندر بیٹھ گیا تو پھر انسان خوف آخرت کرنے لگتا ہے ۔ اور اس کی تیاری کرتا ہے کیونکہ یہ قیامت تو اسی طرح آسانی سے قائم ہو جائے گی جس طرح اس زمین پر نباتات اگتے ہیں ۔ نہایت آسانی اور سہولت کے ساتھ ۔ جس کے اندر کوئی معقول انسان ' کوئی قیل و قال نہیں کر سکتا ۔

آخر میں حضرت نوح علیہ السلام لوگوں کو اس طرف متوجہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے زمین کے اندر تمہارے لیے کیا کیا سہولیات پیدا کی ہیں ۔ اس زمین کو تمہارے لیے مسخر کیا ' سدھایا ۔ اس میں تمہارے زندہ رہنے کے لیے تمام سہولیات رکھ دیں ۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا (۱۹) لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا

(۷۱: ۲۰) "اور اللہ نے زمین کو فرش کی طرح تمہارے لیے بچھایا تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں میں چلو"۔

یہ حقیقت جو حضرت نوح علیہ السلام نے لوگوں کے سامنے پیش کی اور ان کے سامنے موجود تھی' حضرت نوح علیہ السلام کی باتوں سے وہ تو بھاگتے تھے لیکن ان میں جو حقائق تھے' ان سے ان کے لیے فرار مشکل تھا۔ یہ زمین ان کے سامنے بچھی ہوئی تھی۔ یہ پہاڑ موجود تھے' یہ وادیاں موجود تھیں اور ان وادیوں کی راہوں پر ہی وہ چلتے تھے۔ پیدل بھی چلتے' سوار ہو کر بھی چلتے اور تیر کر بھی چلتے۔ اور اس کے اندر اللہ کے جو فضل و کرم بکھرے ہوئے تھے ان سے وہ استفادہ کرتے تھے اور نہایت ہی آسانی سے وہ استفادہ کرتے تھے۔

یہ حقائق وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے' اس سلسلے میں کسی گہری علمی تحقیق کی ضرورت نہ تھی۔ یہ اصول فطرت تھے اور ان کے مشاہدے اور تجربے میں تھے۔ اور ان حقائق کے اندر وہ زندہ رہ رہے تھے۔ ہاں جوں جوں انسان نے علمی ترقی کی اس نے ان حقائق کے مزید پہلو معلوم کر لیے۔ جس کے بارے میں قرآن کی ہدایت بھی ہے کہ تم زمین میں پھرو اور نصیحت حاصل کرو۔

هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِىْ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَ اِلَيْهِ النُّشُوْرُ (سورۂ ملک) یوں حضرت نوح علیہ السلام نے کوشش کی کہ اپنی قوم کے کانوں میں کسی نہ کسی طرح کلمہ حکمت ڈال دیں' مختلف طریقوں اور مختلف اسالیب کے ذریعہ اور اس کے لیے انہوں نے مختلف انداز اختیار کیے اور طویل عرصہ اس کام میں لگایا۔ صبر جمیل کے ساتھ اور ان تھک جدوجہد کے ساتھ' ساڑھے نو سو سال مسلسل! اس کے بعد اب حضرت نوح علیہ السلام رب تعالیٰ کی طرف لوٹتے ہیں' جس رب تعالیٰ نے ان کو یہ مشن دیا تھا۔ رپورٹ پیش کرتے ہیں نہایت تفصیلی رپورٹ ہے یہ۔ یہ رپورٹ نہایت ہی دردناک لہجے میں ہے اور نہایت موثر الفاظ میں ہے۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کس قدر جدوجہد کی۔ انہوں نے گم کردہ راہ انسانیت کو راہ ہدایت پر لانے کے لیے کیا کچھ کیا۔ لیکن یہ تو سلسلہ رسالت کی ایک ہی کڑی ہے۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِىْ وَ اتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَ وَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾ وَ مَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾ وَ قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۙ وَّ لَا يَغُوْثَ وَ يَعُوْقَ وَ نَسْرًا ﴿۲۳﴾ وَ قَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾

نوح نے کہا "میرے رب' انہوں نے میری بات رد کر دی اور ان (رئیسوں) کی پیروی کی جو مال اور اولاد پا کر اور زیادہ نامراد ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں نے بڑا بھاری مکر کا جال پھیلا رکھا ہے۔ انہوں نے کہا ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو' اور نہ چھوڑو ود اور سواع کو' اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو۔ انہوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے' اور تو

بھی ان ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں ترقی نہ دے"۔

حضرت نوح علیہ السلام کی فریاد کا خلاصہ یہ ہے کہ قوم نے اس طویل جدوجہد و مسلسل جہاد کے باوجود ان کو پوری طرح مسترد کر دیا۔ حقیقت کو اچھی طرح پیش کرنے اور حقائق پر اچھی طرح روشنی ڈالنے کے باوجود لوگوں نے منہ موڑ لیا۔ ان کو ڈرایا بھی گیا' مال دولت اور اقتدار و اولاد کے وعدے بھی ان کے ساتھ کیے گئے۔ ترقی اور خوشحالی کا لالچ بھی دیا گیا۔ یہ لوگ چونکہ گمراہ قیادتوں کے پیچھے چلتے تھے' اور گمراہ قیادتیں ہمیشہ اپنے عوام کو دھوکہ دیتی ہیں' اس لیے کہ گمراہ قیادتوں کے ہاتھ میں مالی وسائل اور جاہ و اقتدار ہوتا ہے' تو لوگ انہی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا (۷۱ : ۲۱) "اور ان (رئیسوں) کی پیروی کی جو مال اور اولاد پاکر اور زیادہ نامراد ہوگئے"۔ اس مال اور اولاد نے انہیں دھوکہ دے کر مزید گمراہ کر دیا۔ لہٰذا مال و اولاد کے نتیجے میں انہیں بدبختی اور خسارہ ہی ملا۔

ان لوگوں نے صرف گمراہی پر اکتفا نہ کیا' بلکہ۔

وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا (۷۱ : ۲۲) "ان لوگوں نے بڑے بھاری مکر کا جال پھیلا کر رکھ دیا"۔ یعنی اس قدر عظیم سازش کی کہ اس سے آگے کوئی بڑی سازش نہ ہو۔ انہوں نے دعوت اسلامی کے تمام راستے بند کرنے کے لیے مکاری کی۔ لوگوں کے دلوں کو دوسرے کاموں میں مشغول کر دیا اور ان کے دلوں کے اندر دعوت اترنے کے مواقع ہی ختم کر دیئے۔ کفر' گمراہی اور جاہلیت کو ان کے لیے حسین بنا دیا۔ اور لوگ جاہلیت ہی میں بھٹکتے رہے۔ ان کی بڑی مکاری یہ تھی کہ یہ لوگوں کو ان الہوں کی عبادت میں لگائے رکھتے تھے جن کو انہوں نے الہ کہہ رکھا تھا۔ عوام الناس کے دلوں میں ان بتوں کی حمیت اور غیرت پیدا کر دی تھی۔

وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ (۷۱ : ۲۳) "انہوں نے کہا' ہرگز نہ چھوڑو اپنے الہوں کو"۔ ان الہوں کو انہوں نے "تمہارے الہ" کہہ کر پکارا تاکہ ان کو جوش آئے۔ جھوٹی حمیت اور گناہ پر آمادہ کرنے والی غیرت جاگے۔ پھر انہوں نے ان بتوں میں سے جو زیادہ معزز اور مشہور تھے' ان کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا تاکہ عوام ان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں۔

وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا (۷۱ : ۲۳) "نہ چھوڑو' ود' سواع' یغوث اور یعوق اور نسر کو"۔ یہ نسر تو ان کا بڑا بت تھا جو حضور ﷺ کے دور کی جاہلیت میں بھی پوجا جاتا تھا۔

ہمیشہ گمراہ قیادتیں عوام الناس کی پوجا کے لیے بت گھڑتی ہیں' ان کے نام اور شکلیں ہی مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہیں' لیکن عوام الناس کو ان کے ارد گرد گھمایا جاتا ہے۔ عوام کے دلوں میں ان بتوں کی جاہلانہ محبت پیدا ہو جاتی ہے تاکہ وہ عوام کو ہلاکت کے جس گڑھے میں چاہیں' لے جاکر گرا دیں۔ اور ان کو اس گمراہی پر قائم رکھیں اور اس گمراہ قیادت کی قید میں رہیں۔

وَ قَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا (۷۱ : ۲۴) "انہوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیا"۔ ہر گمراہ قیادت اسی قسم کے بتوں کے سامنے عوام کو جمع کرتی ہے' یہ بت پتھروں کی شکل میں بھی ہوتے ہیں' افراد کی شکل میں بھی ہوتے ہیں اور افکار کی شکل میں بھی ہوتے ہیں۔ اور یہ سب کے سب بت ہوتے ہیں' سب کے سب دعوت اسلامی کی راہ روکتے ہیں۔ عوام کو داعیان حق سے دور رکھتے ہیں۔ بڑی بڑی سازشیں کرتے ہیں اور ان سازشوں پر اصرار کرتے ہیں۔

اس مقام پر اس نبی کریم کے دل سے ان گمراہوں' مکاروں' گمراہ کرنے والوں اور ان کے متبعین کے لیے یہ بددعا نکلتی ہے۔

وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا (۷۱ : ۲۴) "اے اللہ تو بھی ان ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں ترقی نہ دے"۔ یہ ایک ایسے دل کی بددعا ہے جس نے ایک طویل عرصہ تک جدوجہد کی۔ ایک طویل عرصہ تک مشقتیں برداشت کیں۔ یہ بددعا تب نکلی کہ تمام ذرائع ختم ہو گئے اور معلوم ہو گیا کہ ان ظالم باغی اور سرکش دلوں میں اب بھلائی کا رمق بھی باقی نہیں ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ دل رب کی ہدایت اور نجات کے مستحق ہی نہیں رہے۔

قبل اس کے حضرت نوح علیہ السلام کی پوری بددعا یہاں نقل کی جائے' ظالموں اور خطاکاروں کا انجام نقل کیا جاتا ہے۔ ان کا وہ انجام بھی جو یہاں ہوا اور وہ بھی جو آخرت میں ہوا۔ کیونکہ اللہ کے علم کے نقطہ نظر سے آخرت بھی حاضر و موجود ہے اور اس زاویہ سے بھی کہ اس کا وقوع اس قدر یقینی ہے کہ گویا واقع ہو گیا۔

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ﴿۲۵﴾

"اپنی خطاؤں کی بنا پر ہی وہ غرق کیے گئے اور آگ میں جھونک دیئے گئے' پھر انہوں نے اپنے لیے اللہ سے بچانے والا کوئی مددگار نہ پایا"۔

ان کی خطاکاریوں' ان کے گناہوں اور ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے وہ جہنم میں داخل ہوئے۔ یہاں فائے تعقیب بالارادہ لائی گئی ہے۔ کیونکہ ان کے غرق ہوتے ہی ان کو جہنم رسید بھی کر دیا گیا اور ان کے غرق ہونے اور جہنم کے داخل ہونے کے درمیان جو زمانی فاصلہ ہے وہ گویا ہے ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ کے میزان اور معیار میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ گویا اس دنیا میں ان کا غرق کیا جانا اور آخرت میں ان کا دوزخ میں داخل کیا جانا گویا باہم قریب و متصل ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد عذاب قبر کا عرصہ ہو جو نہایت ہی مختصر ہے۔

فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا (۷۱ : ۲۵) "پھر انہوں نے اپنے لیے اللہ سے بچانے والا کوئی مددگار نہ پایا"۔ نہ اولاد' نہ مال' نہ مرتبہ' نہ دوست اور نہ ان کے نام نہاد الٰہ۔

ان دو چھوٹی سی آیات میں ان سرکشوں کا قصہ تمام ہو گیا اور ان کا قصہ حیات ختم ہوا۔ لیکن ابھی حضرت نوح علیہ السلام کی دعا ختم نہیں ہوئی کہ اے اللہ ان کو فنا کر دے۔ یوں کہ ان کا وجود تک نہ رہے۔ یہاں ان کی غرقابی اور طوفان

کے قصے کی تفصیلات نہیں دی گئیں' اس لیے کہ اس مقام پر نہایت شتابی کے ساتھ ان کا قصہ تمام کر کے دکھانا مطلوب تھا۔ یہاں تک کہ غرقابی اور داخلہ جہنم کے درمیان کے طویل فاصلے کو صرف فانسے تعقب کے ذریعہ لپیٹ لیا گیا۔

اب حضرت نوح علیہ السلام کی مکمل دعا آتی ہے :

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ
الْكٰفِرِينَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا
كَفَّارًا ﴿٢٧﴾ رَّبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَن دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ ٢
وَالْمُؤْمِنٰتِ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِينَ إِلَّا تَبَارًا ﴿٢٨﴾ النصف ع ٨

"اور نوح ؑ نے کہا" "میرے رب' ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ۔ اگر تو نے ان کو ١٠
چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہو گا' بدکار اور سخت کافر ہی ہو گا۔ میرے رب' مجھے اور میرے والدین کو' اور ہر اس شخص کو جو میرے گھر میں مومن کی حیثیت سے داخل ہوا ہے' اور سب مومن مردوں اور عورتوں کو معاف فرما دے' اور ظالموں کے لیے ہلاکت کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کر"۔

حضرت نوح علیہ السلام کے قلب مبارک پر یہ الہام آگیا تھا کہ اس ناپاک زمین کو غسل دینا مقصود ہے اور ظالموں اور سرکشوں نے اس کو شر و فساد سے بھر دیا ہے۔ یہ شر اس قدر غالب ہو گیا ہے اور اس قدر جم گیا ہے کہ اس نے دعوت دین کو جامد کر کے رکھ دیا ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کے لوگ اب ناقابل اصلاح ہو گئے ہیں اور بارہا ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی وقت اہل زمین ناقابل اصلاح ہو جائیں تو ان پر عام تباہی آتی ہے اور اس طرح اللہ زمین کی تطہیر فرما دیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں تک حضرت نوح علیہ السلام پہنچ چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے دعا فرمائی کہ اے اللہ' ان لوگوں کو ختم کر دے' ظالموں کو بیخ و بن سے اکھاڑ دے' کوئی زندہ وجود باقی نہ رہے' اور انہوں نے دلیل بھی دے دی۔

إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ ( ۲۷ : ۷۱ ) "اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے"۔ عبادک سے مراد یہاں اہل ایمان ہیں یعنی لوگ تو ایمان لائیں گے لیکن یہ بااثر اور سرکش مقتدر لوگ اپنے اقتدار اور قوت کے بل بوتے پر ان کو گمراہ کر دیں گے۔ اور اس سے مراد عام انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ پھر معنی یہ ہو گا کہ یہ عوام الناس کو اپنے مرتبے اور بلند مقام کی وجہ سے متاثر کریں گے اور اللہ سے دور کر دیں گے۔

پھر ان لوگوں نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی ہے' جس میں سے صرف کفار ہی پیدا ہوتے ہیں۔ جو بچے بھی پیدا ہوتے ہیں' ان کی پیدائش کے نتیجے میں کفار نسل تیار ہوتی ہے۔ کیونکہ ظالموں نے جو فضا تیار کر رکھی ہے اس میں ظالم اور گمراہ نسل ہی تیار ہوتی ہے۔ جو نور ایمان سے محروم ہوتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف حضرت نوح علیہ السلام نے اشارہ فرمایا اور قرآن کریم نے آپ کی زبانی نقل کیا۔

وَ لَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ( ۷۱ : ۲۷ ) "اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہو گا' بدکار اور سخت کافر ہو گا"۔ کیونکہ وہ اپنی سوسائٹی میں برے اور گمراہ کن حالات' طریقے اور افکار شائع کرتے ہیں۔ اور انہوں نے اپنی سوسائٹی اور نظام کو ایسا بنا دیا ہے کہ اس کے اندر فاسق و فاجر ہی پیدا ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ آپ نے دوبارہ ان کی بیخ کنی کے لیے دعا کی۔ اللہ نے ان کی دعا کو قبول کر لیا اور روئے زمین کو ان کی گندگی سے صاف کر دیا۔ ان پر ایسا سیلاب آیا جو سب کچھ بہا کر لے گیا۔ اور اس قسم کا تباہ کن سیلاب اللہ جبار و قہار ہی لا سکتا ہے۔

ایک طرف حضرت نوح علیہ السلام نے کفار کے بارے میں دعا فرمائی کہ ان کو نیست و نابود کر دیا جائے۔

وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ( ۷۱ : ۲۸ ) "اور ظالموں کے لیے ہلاکت کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کر"۔ اور دوسری جانب انہوں نے اپنے لیے دعا فرمائی :

رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ( ۷۱ : ۲۸ ) "میرے رب' مجھے اور میرے والدین کو' اور ہر اس شخص کو جو میرے گھر میں مومن کی حیثیت سے داخل ہوا ہے' اور سب مومن مردوں اور مومن عورتوں کو معاف فرما دے"۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ کو اپنی مغفرت کے لیے بھی پکارا۔ اور یہ ہیں انبیاء کے آداب بارگاہ رب تعالیٰ میں۔ اللہ کے سامنے بندے کو اس طرح عاجزی سے بات کرنا چاہئے جس طرح نوح علیہ السلام کر رہے ہیں۔ وہ اس طرح دعا کر رہے ہیں جس طرح ایک انسان دعا کرتا ہے۔ انسان سے غلطی بھی ہوتی ہے' تقصیرات بھی ہوتی ہیں۔ اگرچہ ایک نبی غایت درجہ مطیع رب ہوتا ہے' جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں بھی جنت میں رب کریم کے فضل کے سوا داخل نہیں ہو سکتا۔ حضرت نوح علیہ السلام نبی ہیں۔ انہوں نے ایک طویل عرصہ اعصاب شکن جدوجہد کی' پھر بھی وہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ' جو تقصیرات ہوئی ہیں معاف کر دی جائیں۔

پھر وہ اپنے والدین کے لیے دعا کرتے ہیں۔ ایک نبی اپنے والدین کا احترام کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مومن ہوں گے۔ اگر مومن نہ ہوتے تو اللہ آپ کو اس کی اجازت نہ دیتا جس طرح اللہ نے آپ کی بات اپنے بیٹے کے بارے میں نہ سنی جو کافر تھا۔

پھر آپ کی دعا ان لوگوں کے بارے میں ہے جو آپ کے گھرانے میں اور آپ کی سوسائٹی میں بطور مومن بیٹھیں۔

یہ ایک مومن کی دوسرے مومن کے ساتھ نیکی ہے۔ ایک مومن اپنے لیے جو چیز پسند کرتا ہے وہی دوسرے مومن کے لیے بھی پسند کرتا ہے۔ گھر کا ذکر یہاں اس لیے ہوا کہ اس طوفان میں تمام مومنین کے لیے احکام تھے کہ وہ آپ کے گھر میں داخل ہو جائیں اور آپ ان کو سفینہ میں لے کر نکلیں گے۔

اس کے بعد عام مومنین اور مومنات کے لیے دعا ہے۔ یہ بھی ایک نبی کا رویہ ہے کہ وہ تمام اہل ایمان کے لیے نیک خواہشات رکھتا ہے۔ چاہے یہ مومنین اس کے دور کے ہوں' اس سے پہلے گزرے ہوں یا بعد کے ادوار میں آنے والے ہوں۔ یہ اسلامی نظریہ حیات کا ایک راز ہے کہ اس نظریہ کے ساتھ منسلک ہونے والے لوگوں کا آپس میں بہت

ہی گہرا رابطہ ، تعلق اور محبت اور برادرانہ جذبات ہوتے ہیں ۔ اور یہ خصوصیت صرف اسلامی نظریہ حیات ہی کو حاصل ہے ۔ اس محبت کے مقابلے میں پھر کافروں کے ساتھ دشمنی اور کراہیت ۔

وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا (۷۱ : ۲۸) "اور ظالموں کے لیے ہلاکت کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کر"۔ یہاں یہ سورت ختم ہوتی ہے جس میں ایک طرف ایک شریف نبی کی ان تھک جدوجہد کی تصویر کشی ہے اور دوسری طرف سرکشوں اور معاندین کی تصویر ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعیان حق کو کس قدر عظیم جدوجہد کرنی چاہئے اور یہ کہ اس راہ میں کس قدر مشکلات ہوا کرتی ہیں ۔ اور کس قدر عظیم قربانیوں کا تقاضا کرتی ہے 'تحریک دعوت اسلامی؟ اور یہ عظیم جدوجہد اس لیے ضروری ہے کہ کوئی انسانی سوسائٹی دعوت اسلامی اور اسلامی نظام کے سوا نہ ہی دنیا میں اور نہ آخرت میں ترقی اور کامیابی حاصل کر سکتی ہے ۔ غرض ترقی کا راز اور انسانیت کے عروج کا ذریعہ دعوت اسلامی اور اسلامی نظام کے قیام میں ہے ۔

--- ○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۲۹

## سورۃ الجن - ۷۲

## ۱ -- تا -- ۲۸

# سورۃ الجن ایک نظر میں

اس سورت کے معانی اور مفاہیم پر غور کرنے سے پہلے ہر احساس پر جو نمایاں چیز نمودار ہوتی ہے اور جو بہت واضح نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک موسیقی کا قطعہ ہے 'جس کی آواز کانوں میں مسلسل آرہی ہے ۔جس کا نغمہ نہایت قوی ہے اور جو ترنم سے بھرپور ہے ۔یہ پوری سورت گنگناہٹ سے بھرپور ہے ۔اس کی آواز میں حزن و ملال اور تاسف اور شکایت و غم نمایاں ہے ۔بلکہ اس پوری سورت کے اندر رنج و الم اور درد و کرب واضح نظر آتا ہے ۔یہ خصوصیت اس سورت کے مناظر' اس کی فضا اور اس کی روح میں نمایاں ہے ۔خصوصاً سورت کے آخری حصے میں جہاں جنوں کے قول کے اختتام پر حضور اکرم ﷺ کو خطاب ہوتا ہے ۔اس خطاب کو سن کر ہر شخص کے دل میں حضور ﷺ کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے ۔اور اس ہمدردی میں محبت کے جذبات بھرے نظر آتے ہیں ۔اس خطاب میں حضور ﷺ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جاتا ہے ۔کہ آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تبلیغ کریں اور یہ کہ اللہ آپ کا نگران و نگہبان ہے ۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا (۲۰) قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا (۲۱) قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (۲۲) اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا (۲۳) حَتّٰٓی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا (۲۴) قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا (۲۵) عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا (۲۶) اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا (۲۷) لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا (۲۸) (۷۲ : ۲۰ تا ۲۸) ''اے نبیؐ 'کہو کہ ''میں تو اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا''۔کہو ''میں تم لوگوں کے لیے کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں نہ کسی بھلائی کا''۔کہو '' مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی بچا نہیں سکتا اور نہ میں اس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں۔ میرا کام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی بات اور اس کے پیغامات پہنچا دوں ۔اب جو بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات

نہ مانے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے اور ایسے لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔ (یہ لوگ اپنی اس روش سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کس کا جتھا تعداد میں کم ہے۔ کہو "میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی لمبی مدت مقرر فرماتا ہے۔ وہ عالم الغیب ہے' اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا' سوائے اس رسول کے جسے اس نے (غیب کا علم دینے کے لیے) پسند کر لیا ہو' تو اس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے تاکہ وہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے' اور وہ ان کے پورے ماحول کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے"۔

جنات نے جو حقائق پیش کیے ان کا نفسیاتی اثر اس کے علاوہ ہے۔ اس سورت میں جنات کی ایک طویل تقریر پیش کی گئی ہے۔ اور اس تقریر میں جنات نے بہت ہی وزن دار حقائق بیان کیے ہیں۔ جن کا انسانی احساس اور انسانی ادراک پر بہت بھاری اثر ہوتا ہے۔ اور انسان غور و فکر پر مجبور ہوتا ہے کہ جس دعوت کو جنات اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں ان کو انسان کیونکر نظرانداز کر سکتے ہیں۔ یہ غور و فکر جب اس سورت کے عمومی مغموم لہجے اور مغموم اور درد بھری موسیقی سے ملتے ہیں تو یہ باہم نہایت ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور پردۂ احساس پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔

پھر جو لوگ اس سورت کو' ترتیل کے ساتھ اور اس پس منظر کے ساتھ سمجھتے ہوئے پڑھتے ہیں تو یہ احساسات واضح ہو کر سامنے آتے جاتے ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا۔

یہ تو تھا اس سورت کا ایک ممتاز پہلو' اب اس سے آگے بڑھ کر جب ہم اس کے محور' موضوع اور اس رخ کلام پر غور کرتے ہیں تو اس میں علم و حکمت کے بے شمار معانی و اشارات پائے جاتے ہیں۔

یہ سورت ایک دوسرے جہاں سے اسلامی نظریہ حیات پر شہادت ہے' جس کے بارے میں مشرکین جھگڑتے تھے۔ جدال و جدال کرتے تھے اور محض تیر تکے چلاتے تھے اور بعض اوقات سرے سے اس کے منکر ہو جاتے تھے۔ وہ کبھی یہ کہتے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اسلامی نظریہ حیات کے بارے میں جو باتیں کرتے ہیں وہ ان پر جن القا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سورت میں جنوں کی طرف سے اس نظریہ کی تصدیق آتی ہے اور وہ اس کی سچائی کی شہادت دیتے ہیں۔ اور اس بات کی تکذیب کرتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جنوں سے لداد لیتے ہیں حالانکہ خود جنوں کا حال یہ تھا کہ انہیں اس قرآن کا تب پتہ چلا جب انہوں نے خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے اسے سنا اور قرآن سن کر یہ جن دم بخود رہ گئے' مرعوب ہو گئے اور ان پر اس قرآن کے گہرے اثرات پڑے۔ ان کے دل اللہ کے فیوض و برکات سے اس قدر بھر گئے کہ اب وہ خاموش نہیں رہ سکے۔ نہ انہوں نے اس سلسلے میں کوئی مجمل اور سرسری بات کی' نہ مختصر بات کی بلکہ نکلے اور اس پیغام کو پوری تفصیل کے ساتھ اپنی قوم تک پہنچا دیا۔ جس طرح کسی کو اچانک عظیم خبر مل جاتی ہے اور وہ ہر کسی سے کہتا پھرتا ہے کیونکہ نزول قرآن دراصل ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس سے زمین و آسمان' کواکب و سیارے' جن و انس' ملائکہ اور پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا' اور اس واقعہ نے تمام عالم کو متاثر کر لیا تھا۔ یہ جنوں کی طرف سے اسلام کے حق میں ایک نہایت موثر نفسیاتی شہادت تھی۔

اس کے بعد اس سورت نے جنوں کے بارے میں وہ تمام اوہام و خرافات ختم کر دیئے جو ان کے بارے میں لوگوں کے

عقائد میں رچے بسے تھے' نیز قرآن کے مخاطبین سے پہلے اور بعد کے زمانوں میں جنوں کے بارے میں لوگوں کے جو اوہام تھے' ان کی تصحیح بھی کر دی ۔ اور اس چھپی ہوئی مخلوق کی پوری حقیقت بتادی کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے' بغیر افراط و تفریط کے ۔ اس لیے کہ قرآن کریم کے پہلے مخاطبین کے عقائد میں یہ بات اچھی طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ جنات کو اس کرۂ ارض پر اقتدار حاصل ہے ۔ اس لیے اہل عرب جب کسی بھی وادی اور نشیبی جگہ میں داخل ہوتے تھے یہ لوگ جنوں سے ان کے سردار کے ہاں پناہ لینے کا اعلان کرتے ۔ اور کہتے کہ میں اس وادی کے سردار کے ہاں اس وادی کے احمقوں کی حماقتوں سے پناہ مانگتا ہوں ۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ کو امن میں سمجھتے تھے ۔ نیز ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ جنات غیب بھی جانتے ہیں اور یہ غیب کی خبریں کاہنوں کو دیتے ہیں اور یہ کاہن پھر پیش گوئیاں کرتے تھے ۔ بعض عرب جنوں کی عبادت بھی کرتے تھے اور بعض نے اپنا نسب نامہ جنوں کے ساتھ ملا دیا تھا ۔ اور بعض یہ کہتے تھے کہ اللہ کی ایک بیوی جنوں میں سے ہے جس سے فرشتے پیدا ہوتے ہیں ۔

جنوں کے بارے میں یہ اور اس قسم کے دوسرے عقائد و تصورات جاہلیت میں عام تھے اور بعض حلقوں اور علاقوں میں یہ اوہام و خرافات آج تک موجود ہیں ۔ ایک طرف تو یہ اوہام و خرافات تھے جو ایام جاہلیت میں لوگوں کے تصورات پر چھائے ہوئے تھے ۔ اور جن کے آثار آج بھی باقی ہیں ۔ دوسری طرف ایسے لوگ بھی تھے اور ہیں جو سرے سے جنوں کے وجود سے انکار کرتے ہیں اور یہ لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جنات کے بارے میں جو بات بھی ہو وہ خرافات ہے ۔ چنانچہ بعض لوگ تو وہم کے سمندر میں غرق تھے اور بعض انکار کے اندھیرے میں غرق تھے ۔ ان کے دو انتہاؤں کے درمیان اسلام نے جنوں کی اصل حقیقت بیان کر دی ۔ اور ان کے بارے میں لوگوں کے افکار درست کر دیئے ۔ لوگوں کے دل و دماغ سے خرافات بھی نکال دیئے' ان کے دلوں سے ان کا خوف بھی نکال دیا' اور لوگوں کو اس بات سے نجات دے دی کہ لوگ خواہ مخواہ ان کی سلطنت کے تابع ہوں ۔

جن ایک حقیقی مخلوق ہیں ۔ وہ یہاں خود اپنے بارے میں یہ معلومات دیتے ہیں :

وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا (۷۲ : ۱۱) "اور ہم میں سے کوئی صالح ہیں اور کچھ اس سے فروتر ہیں ہم مختلف طریقوں میں بٹے ہوئے ہیں" ۔ بعض گمراہ اور گمراہ کنندہ ہیں اور بعض سادہ اور بے گناہ ہیں ۔ یہ سادہ لوگ دھوکہ بھی کھا جاتے ہیں ۔

وَ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا (٤) وَّ اَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (۷۲ : ۵) "اور یہ کہ ہمارے نادان لوگ اللہ کے بارے میں بہت خلاف حق باتیں کہتے رہتے ہیں" اور یہ کہ "ہم نے سمجھا تھا کہ انسان اور جن کبھی خدا کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتے" ۔ اور یہ کہ جنات ہدایت کے قابل ہیں ۔ اسی طرح وہ گمراہ بھی ہوتے ہیں اور قرآن کریم کو سن کر وہ سمجھتے ہیں اور گمراہ تاثر لیتے ہیں ۔

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۱) يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَ لَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (۷۲ : ۲) "اے نبی کہو' میری طرف وحی بھیجی گئی ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے غور سے سنا اور پھر جا کر اپنی قوم کے لوگوں سے کہا : "ہم نے ایک بڑا عجیب قرآن سنا ہے جو راہ

راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس لیے ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے"۔ اور یہ کہ وہ ازروئے تخلیق انسانوں کی طرح ایک ذمہ دار مخلوق ہیں اور ان پر جزاء و سزا کا اصول جاری ہوتا ہے۔ اور ایمان اور کفر کے بارے میں وہ مکلف ہیں۔

وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا (۱۳) وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا (۱۴) وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (۱۵) (۷۲: ۱۳ تا ۱۵) "اور یہ کہ جب ہم نے ہدایت کی تعلیم سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اب جو کوئی بھی اپنے رب پر ایمان لائے گا اسے کسی حق تلفی یا ظلم کا خوف نہ ہوگا اور یہ کہ ہم میں سے کچھ مسلم ہیں اور کچھ حق سے منحرف تو جنہوں نے اسلام اختیار کر لیا انہوں نے نجات کی راہ ڈھونڈلی اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں"۔ یہ انسانوں کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتے جب یہ لوگ ان کی پناہ مانگتے ہیں بلکہ اس پناہ مانگنے کی وجہ سے جن اور مغرور ہو جاتے۔

وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (۷۲: ۶) "اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جن میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے، اس طرح انہوں نے جنوں کا غرور اور بڑھا دیا"۔ اور یہ کہ وہ نہ علم غیب جانتے ہیں اور نہ عالم بالا میں انہیں کوئی رسائی حاصل ہے۔

وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّ شُهُبًا (۸) وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا (۹) وَّ اَنَّا لَا نَدْرِيْۤ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا (۱۰) (۷۲: ۸ تا ۱۰) "اور یہ کہ "ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو دیکھا کہ وہ پہریداروں سے پٹا پڑا ہے اور شہابوں کی بارش ہو رہی ہے"۔ اور یہ کہ "پہلے ہم سن گن لینے کے لیے آسمان میں بیٹھنے کی جگہ پالیتے تھے، مگر اب جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے لیے گھات میں ایک شہاب ثاقب لگا ہوا پاتا ہے"۔ اور یہ کہ "ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آیا زمین والوں کے ساتھ کوئی برا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کا رب انہیں راہ راست دکھانا چاہتا ہے"۔ اور یہ کہ ان کے اور خدا کے درمیان کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔

وَّ اَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّ لَا وَلَدًا (۷۲: ۳) "اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے اس نے کسی کو بیوی یا بیٹا نہیں بنایا ہے"۔ اور اللہ کی قوت کے مقابلے میں جنوں کی کوئی قوت نہیں ہے نہ وہ اللہ کے کاموں کے مقابلے میں کوئی حیلہ رکھتے ہیں۔

وَّ اَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا (۷۲ : ۱۲) "اور یہ کہ ہم سمجھتے تھے نہ زمین میں ہم اللہ کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ بھاگ کر اسے ہرا سکتے ہیں"۔

یہ صفات جو یہاں ذکر ہوئیں اور ان کے علاوہ قرآن کریم میں ان کی جو صفات مذکور ہیں یا جو حالات بیان ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جن علم غیب نہیں جانتے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے میں آتا ہے کہ آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کے لیے مسخر شدہ جن 'ایک عرصہ تک کام کرتے رہے اور انہیں معلوم نہ تھا کہ حضرت سلیمان فوت ہو چکے ہیں۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ

(۳۴ : ۱۴) "پر جب اس کی موت کا فیصلہ کر دیا تو اس کی موت کی اطلاع ان کو گھن سے لگی جس نے اس کا عصا کھا لیا۔ پھر جب وہ گر پڑا تو جنوں کو علم ہوا کہ اگر وہ غیب کا علم جانتے تو اس ذلت کی تکلیف میں نہ رہتے"۔

ابلیس جو جنوں میں سے ہے' اس کے بارے میں قرآن خصوصیت سے یہ کہتا ہے۔

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (۷ : ۲۷) "وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھتا ہے جبکہ تم انہیں نہیں دیکھ سکتے"۔ یعنی ان کا وجود ایسا ہے کہ انسان اس کو نہیں دیکھ سکتے جبکہ جن انسانوں کو دیکھ سکتے ہیں۔

اور سورہ رحمان میں جنوں کے مادۂ تخلیق اور انسانوں کے مادۂ تخلیق کی تفصیلات دی گئی ہیں۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (۱۴) وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (۱۵) (۵۵ : ۱۵) "آدمی کو کھنکھارتی مٹی سے بنایا' جیسے ٹھیکری ہوتی ہے' اور جن کو آگ کی لپٹ سے"۔

ان تمام آیات سے اس مخلوق کے وجود اور اس کی نوعیت کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں اور اس کی بیشتر خصوصیات بھی معلوم ہوتی ہیں۔ اور وہ تمام اوہام اور قصے کہانیاں اور خرافات کی تردید بھی ہو جاتی ہے' جو جاہلیت کے دور میں جنوں کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔ یوں جنات کے بارے میں ایک مسلم کا تصور بالکل صاف ستھرا اور واضح ہو جاتا ہے اور اس میں اوہام و خرافات کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اور اس سے ان لوگوں کی بھی تردید ہو جاتی ہے جو جنات کے سرے سے وجود کے منکر ہیں۔

اس سورت نے مشرکین عرب کے ان خیالات کی پوری پوری تردید بھی کر دی جو وہ اس کائنات میں جنوں کے کردار کے بارے میں رکھتے تھے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے جنوں کے وجود ہی کا انکار کیا ہے تو ان سے ہمارا سوال یہ ہے کہ وہ اپنے اس انکار کو کس دلیل پر مبنی کرتے ہیں؟ اور پھر اس قدر قطعی اور جزمی بات کرتے ہیں اور جو لوگ جنات کو تسلیم کرتے ہیں ان کے ساتھ ہنسی مزاح کرتے ہیں اور اسے خرافات قرار دیتے ہیں۔ یہ ان کا کام ہے کہ وہ بتائیں کہ ان کا دعویٰ کس دلیل پر مبنی ہے؟

ان لوگوں کا دعویٰ صرف اس صورت میں درست ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اس پوری کائنات کو چھان مارا ہو اور ان کو اس میں جن نہ ملے ہوں۔ آج تک کسی سائنس دان نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے پوری کائنات کو چھان

مارا ہے ۔ جبکہ خود اس زمین کے اندر بے شمار زندہ مخلوق ہے جس تک ابھی ہمارا علم رسائی حاصل نہیں کر سکا۔ روزانہ کسی نہ کسی مخلوق کا انکشاف ہوتا رہتا ہے ۔ اور آئندہ بھی کئی زندہ اشیاء معلوم ہوں گی جو ابھی تک معلوم نہیں ہیں ۔

کیا انہوں نے اس کائنات کی تمام قوتوں کو معلوم کر لیا ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان میں سے جن نام کی کوئی قوت نہیں ہے ۔کوئی معقول شخص اس قسم کا دعویٰ نہیں کر سکتا ۔ اس جہاں میں کئی پوشیدہ قوتیں ہیں اور آئے دن ان کے انکشافات ہوتے رہتے ہیں ۔ اور کل وہ قوتیں معلوم نہ تھیں اور اہل علم بڑی سنجیدگی سے مزید قوتوں کے انکشاف میں لگے ہوئے ہیں ۔ اور جو انکشاف ہوئے وہ لوگ نہایت عاجزی سے اپنی کم مائیگی کا اعلان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو جہالت کی چوکھٹ پر کھڑے ہیں اور ابھی تک انہوں نے کسی علمی کام کا آغاز ہی نہیں کیا ہے ۔

کیا ان سائنس دانوں نے پوری کائناتی قوتوں کے انکشاف کر دیئے ہیں اور ان میں سے جنات اور بجلی کو یہ لوگ ایک علمی حقیقت قرار دیتے ہیں ۔ لیکن ان میں سے کسی نے بجلی کو دیکھا تک نہیں ہے ۔ اور نہ ان کی تجربہ گاہوں میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں یہ اس بجلی کو جمع کر سکیں جس کے بارے میں یہ لوگ رات دن بحث کرتے ہیں ۔

لہٰذا جو لوگ اس قدر قطعیت اور جزم کے ساتھ جنات کا انکار کرتے ہیں آخر ان کے پاس کیا علمی دلیل ہے 'اس دعویٰ پر؟ اصل بات یہ ہے کہ اس کائنات اور اس کی قوتوں کے بارے میں انسان کا علم اس قدر کم ہے کہ کوئی معقول انسان کسی بات پر کوئی دعویٰ قطعیت کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ بات حقیقت ہے کہ جنات کے ساتھ لوگوں نے بے شمار خرافات وابستہ کر لی ہیں ۔ اور ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم ان تمام خرافات کا انکار کرتے ہیں جس طرح قرآن کریم نے کئی خرافاتی کہانیوں کا انکار کیا بلکہ ان کی تردید کر دی ۔ اس طرح نہیں کہ ہم سرے سے اس مخلوق کے وجود ہی کا انکار کر دیں اور بلاحجت اور دلیل انکار کر دیں ۔ یہ ایک غائب مخلوق ہے اور اس قسم کے غیبی امور کے بارے میں ہمیں چاہئے کہ ہم کسی ایسے سرچشمہ علم کی طرف رجوع کریں جو یقینی ہو اور سائنسی تصورات کے نتیجے میں اس یقینی سرچشمے کی مخالفت سے باز رہیں کیونکہ قرآن و سنت ایک یقینی ذریعہ علم ہے اور اس نے جو کچھ جنات کے بارے میں کہہ دیا' وہ حرف آخر ہے ۔

مذکورہ بالا امور کے ساتھ ساتھ یہ سورت' اسلامی تصور حیات کی حقیقت الوہیت اور حقیقت عبودیت کی وضاحت بھی کرتی ہے ۔ اس کائنات اور اس کے اندر پائے جانے والی مخلوق کی حقیقت بھی واضح کرتی ہے ۔ پھر اس مخلوق کے باہمی ربط و تعلق کو بھی واضح کرتی ہے ۔

جنات کی تقریر میں عقیدۂ توحید کی بہت ہی خوبصورت وضاحت کی گئی ہے ۔ اس بات کی تردید کی گئی ہے کہ اللہ کی کوئی بیوی ہے یا اس کی کوئی اولاد ہے ۔ اور اس بات کی تشریح بھی کی گئی ہے کہ آخرت میں سب نے حساب دینا ہے اور یہ کہ زمین میں کوئی ایسی قوت نہیں ہے کہ وہ اللہ پر غالب ہو سکے یا اللہ سے چھوٹ سکے یا رہ سکے ۔ اور اسے منصفانہ جزاء و سزا نہ ملے ۔ اور اس سورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خطاب کیا گیا ہے اس میں ان حقائق میں سے بعض حقائق بھی لیے گئے ہیں ۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا (۲۰) قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا (۲۱) قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (۲۲)

( ۷۲ : ۲۰ تا ۲۲ ) "اے نبیؐ کہو کہ "میں تو اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا"۔ کہو "میں تم لوگوں کے لیے کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں نہ کسی بھلائی کا"۔ کہو " مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی بچا نہیں سکتا اور نہ میں اس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں"۔ اور یہ اس واقعہ کے بعد ہوا جب جنات نے اس حقیقت پر صریح شہادت دے دی۔

اس سورت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اللہ وحدہ حاکم مطلق ہے اور انسانوں کے لیے اعلیٰ و ارفع مقام یہ ہے کہ وہ بندگی کے برتر مقام پر پہنچ جائیں۔

وَّ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ كَادُوْا یَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا ( ۷۲ : ۱۹ ) "یہ کہ جب اللہ کا بندہ اس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو گئے"۔ اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا ہے تو اس مضمون کی پھر تاکید کی گئی ہے۔

قُلْ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا ( ۷۲ : ۲۱ ) "کہو میں تم لوگوں کے لیے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا"۔

یہ کہ غیب جاننے والا صرف اللہ وحدہ ہے 'جنات غیب نہیں جانتے۔

وَّ اَنَّا لَا نَدْرِیْۤ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ( ۷۲ : ۱۰ ) "اور یہ کہ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آیا زمین والوں کے ساتھ کوئی برا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کا رب انہیں راہ راست دکھانا چاہتا ہے"۔ اسی طرح رسولوں کو بھی علم غیب نہیں ہے 'ان کو اسی قدر علم ہوتا ہے جس قدر اللہ بتا دے۔

قُلْ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْۤ اَمَدًا ( ۲۵ ) عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰى غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ( ۲۶ ) اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ( ۲۷ ) ( ۷۲ : ۲۵ تا ۲۷ ) "کہو "میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی لمبی مدت مقرر فرماتا ہے۔ وہ عالم الغیب ہے 'اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا' سوائے اس رسول کے جسے اس نے (غیب کا علم دینے کے لیے ) پسند کر لیا ہو 'تو اس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے"۔

رہے اللہ کے بندے اور مخلوقات جو اس کائنات میں موجود ہیں 'تو اس بارے میں سورت بتاتی ہے کہ ان میں سے بعض اور بعض کے درمیان کچھ مشترک امور ہیں اور باہم ملنے کی کچھ راہیں ہیں۔ اگرچہ ان کی ساخت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ مثلاً جنوں اور انسانوں کے درمیان بعض امور بہت ہی مشترک ہیں 'جس طرح اس سورت اور دوسری سورتوں میں بتایا گیا ہے۔ انسان اس زمین پر بھی دوسری مخلوقات سے علیحدہ اور دور نہیں ہے۔ انسان اور دوسری مخلوقات کے درمیان باہم اتصال اور باہم اشتراک ہے۔ اور یہ انسان جو محسوس کرتا ہے کہ اس کی جنس 'اس کی

اس کی قبائلی اور قومی حیثیت الگ اور ممتاز ہے ۔تو یہ بے حقیقت سوچ ہے ۔اس کائنات کی ساخت اور مزاج میں نہ ان چیزوں کا وجود ہے اور نہ کوئی حقیقت ہے ۔ انسان کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ اس کائنات کے حوالے سے اپنے تصور اور شعور کو ذرا کھول دے کیونکہ اس کائنات میں انسان کے علاوہ کئی دوسری مخلوقات بھی ہیں 'ارواح ہیں اور خفیہ قوتیں ہیں ' انسان کو ان کے بارے میں علم نہیں ہے 'لیکن اس کائنات میں وہ موجود ہیں ۔ انسان کے اردگرد موجود ہیں 'انسان اس کائنات میں وحدہ مالک نہیں ہے جس طرح بعض اوقات وہ محسوس کرتا ہے ۔

پھر یہ دینی اور نظریاتی حقیقت کہ لوگ اگر اسلامی نظام پر قائم ہو جائیں اور یہ کائنات اس کے نتیجے میں اپنی حرکت اور رفتار بدل دے تو یہ بھی ایک معلوم حقیقت ہے 'جب انسان بدلتے ہیں تو اس کائنات کی قوتیں ان کے حق میں بدل جاتی ہیں ۔

وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا (١٦) لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَ مَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا (٧٢: ١٧) "اور لوگ راہ راست پر ثابت قدمی سے چلتے تو ہم انہیں خوب سیراب کرتے تاکہ اس نعمت سے ان کی آزمائش کریں اور جو اپنے رب کے ذکر سے منہ موڑے گا اس کا رب اسے سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا" ۔یہ وہ حقیقت ہے جو اسلامی تصور حیات کا ایک اہم پہلو ہے کہ انسانی قوتوں اور اعمال اور کائناتی قوتوں اور ان کے افعال کے درمیان ایک ربط ہے ۔یوں یہ سورت نہایت وسیع طول و عرض میں اشارات اور ہدایات کو پھیلاتی ہے 'اگرچہ اس کی آیات صرف ۲۸ ہیں اور اس کا نزول ایک متعین واقعہ کے بعد ہوا ہے ۔

رہا وہ واقعہ جس کی طرف اس سورت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ بعض جنوں نے قرآن کریم سنا تو اس کے بارے میں روایات میں اختلاف ہے ۔

حافظ ابوبکر بیہقی اپنی کتاب دلائل النبوت میں یہ روایت کرتے ہیں 'ابوالحسن علی ابن احمد ابن عبدان سے 'انہوں نے احمد ابن عبید الصفار سے 'انہوں نے اسماعیل قاضی سے 'وہ مسدد سے 'وہ ابو عوانہ سے 'وہ ابوبشر سے 'وہ سعید ابن جبیر سے 'وہ ابن عباس سے (رضی اللہ عنہم) وہ کہتے ہیں :"رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے نہ تو جنوں کے سامنے تلاوت کی اور نہ ہی جنات کو دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ عکاظ کے بازار کی طرف چل پڑے ۔اس دور میں شیاطین پر پابندی لگ گئی تھی کہ وہ اب آسمانوں کی خبروں کی کن سن نہیں لے سکتے ۔جب بھی شیاطین آسمانوں میں چڑھتے 'ان پر شہاب ثاقب کی بارش ہو جاتی ۔شیاطین اپنی قوم کے پاس آئے ۔انہوں نے رپورٹ دی کہ صورت حال کیا ہے ؟ تو سب نے کہا کہ ہمارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ پیدا کر دی گئی ہے ۔اور جب بھی ہم اوپر جانے کی کوشش کرتے ہیں شہاب ثاقب ہمارا پیچھا کرتے ہیں ۔سب نے یہ کہا کہ یہ پابندی جو لگ گئی ہے تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس کائنات میں کوئی بڑا واقعہ ہو گیا ہے ۔لہٰذا اس زمین کے اطراف میں مشرق و مغرب کی طرف نکلو اور دیکھو کہ کیا بڑا واقعہ ہو گیا ہے اور یہ رکاوٹ کیوں ڈال دی گئی ہے ۔چنانچہ شیاطین مشرق و مغرب کی طرف نکل گئے اور معلوم کرنے لگے کہ کیا بڑا واقعہ ہو گیا ہے کہ ہم پر آسمانوں کی خبریں لینے کی پابندی لگ گئی ہے ۔جو لوگ تہامہ کی طرف نکلے تھے 'وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے ۔اس وقت آپ نخلہ کے مقام پر تھے اور آپ عکاظ کی طرف جا رہے تھے ۔

آپ اس وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز فجر ادا کر رہے تھے ۔ جب انہوں نے قرآن مجید کو سنا تو اس کو کان لگا کر سنا۔ قرآن سننے کے بعد انہوں نے کہا کہ یہ ہے وہ بڑا واقعہ جس کی وجہ سے ہمارے اور آسمان کے درمیان رکاوٹ ہوگئی ہے ۔ یہاں سے جب یہ جن اپنی قوم کی طرف لوٹے تو انہوں نے یہ کہا" اے ہماری قوم :

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۱) یَّهْدِیْ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَ لَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا اَحَدًا (۷۲ : ۲) اور اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر یہ آیات نازل کیں ۔

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ ---- اللہ دراصل نبی ﷺ کی طرف جنوں کے اقوال وحی فرمائے ۔ (امام بخاری نے مسدد سے اسی طرح کی روایت نقل کی ہے اور امام مسلم نے شیبان ابن فروخ سے بھی یہی روایت نقل کی ہے"۔

یہ تو ہے ایک روایت اور صحیح مسلم میں اور روایات بھی ہیں ۔ وہ روایت کرتے ہیں 'محمد ابن مثنیٰ سے 'وہ عبدالاعلیٰ سے 'وہ داؤد سے (یہ ابن ابوہند ہیں) وہ عامر سے 'یہ کہتے ہیں : کہ میں نے علقمہ سے پوچھا کہ جنوں والی رات میں ابن مسعود موجود تھے ؟ تو علقمہ نے کہا میں نے خود ابن مسعود سے یہ پوچھا تھا کہ جنوں کی رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تم میں سے بھی کوئی تھا؟ تو انہوں نے فرمایا :"نہیں" لیکن رسول اللہ ﷺ ایک رات غائب ہوگئے 'ہم نے آپ کو وادیوں اور پہاڑیوں اور جھاڑیوں میں تلاش کیا ۔ کسی نے کہا کوئی آپ کو لے اڑا 'یا کسی نے اچانک قتل کر دیا ۔ اس رات ہم پر بہت مصیبت گزری ۔ یہ اس قدر بری رات تھی جو کسی پر آسکتی ہے ۔ جب صبح ہوئی تو کیا دیکھتے ہیں حضور ﷺ حرا کی طرف سے آرہے ہیں ۔ ہم نے کہا حضور ہم نے آپ کو نہ پایا اور بہت تلاش کیا ۔ آپ نہ ملے ۔ اور ہم پر یہ رات اس قدر بری گزری جو کسی پر گزر سکتی ہے ۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا :"میرے پاس جنوں کی طرف سے بلانے والا آیا تھا' میں ان کے ساتھ چلا گیا اور ان پر قرآن کریم پڑھا"۔ کہتے ہیں حضور ﷺ ہمارے ساتھ اس مقام تک تشریف لے گئے اور آپ ﷺ نے ہمیں جنوں کے آثار اور ان کی آگ جلانے کے مقامات بتلائے"۔ لوگوں نے آپ سے جنوں کی خوراک کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا" وہ سب ہڈیاں جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہو' وہ تمہارے ہاتھ لگ جاتی ہیں اور جن پر بہت گوشت ہوتا ہے اور ہر وہ مینگنی جو تمہارے جانوروں کی ہو' وہ جنوں کی خوراک ہے ۔ لہٰذا تم ہڈیوں اور مینگنیوں کے ساتھ استنجا نہ کرو 'کیونکہ یہ تمہارے بھائی جنوں کی خوراک ہے"۔

حضرت ابن مسعود سے ایک اور روایت بھی ہے کہ وہ اس رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے ۔ لیکن پہلی روایت کی سند زیادہ قوی ہے ۔ لیکن ایسی روایات کو ہم نظر انداز کرتے ہیں ۔ صحیحین کی دونوں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو معلوم نہ تھا کہ جنات موجود ہیں اور قرآن سنتے ہیں ۔ اور حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ جنوں نے خود دعوت دی تھی ۔ امام بیہقی دونوں روایات کو علیحدہ علیحدہ واقعات قرار دیتے ہیں ۔

ابن اسحاق نے ایک تیسری روایت بھی نقل کی ہے ۔"جب ابو طالب فوت ہوگئے تو قریش حضور اکرم ﷺ سے زیادہ اذیت محسوس کرنے لگے 'جو وہ ابو طالب کی موجودگی میں نہ کرتے تھے 'تو حضور ﷺ طائف کی طرف نکل گئے کہ بنو ثقیف کی حمایت حاصل کرلیں 'اور اس طرح ثقیف قریش کے مقابلے میں آپ کو بچانے میں تعاون کریں اور شاید وہ دعوت

اسلامی کو قبول کرلیں۔ حضور اکرم ﷺ اکیلے ان کی طرف گئے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں' برید 'بن زیاد نے روایت کی' محمد ابن کعب قرظی سے' یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب طائف پہنچے تو آپ بنوثقیف کے چند لوگوں سے ملے جو ان کے اشراف اور سردار تھے۔ یہ تین بھائی تھے' یالیل ابن عمرابن عمیر' مسعود ابن عمرابن عمیر اور حبیب ابن عمرابن عمیر۔ ان میں سے ایک کی بیوی قریشی تھی یعنی بنی جمح میں سے۔ ان کے پاس حضور ﷺ بیٹھے' ان کو اللہ کی طرف بلایا۔ اور ان کے ساتھ اسلام کی نصرت کرنے کے موضوع پر بات کی اور یہ درخواست کی کہ قریش کے مخالفین کے مقابلے میں میری امداد کرو۔ ان میں سے ایک نے کہا' کہ اگر اللہ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے تو میں کعبہ ہی کو نہیں مانتا (یہ شخص کعبہ کا کپڑا اکھاڑنے لگا) دوسرے بھائی نے کہا کیا اللہ کو تیرے سوا کوئی اور نہ ملا تھا اور تیسرے نے کہا خدا کی قسم میں تجھ سے بات ہی نہ کروں گا۔ اگر تو رسول ہے' جس طرح تیرا دعویٰ ہے تو میں مناسب نہیں سمجھتا کہ تیری بات کے خلاف کروں اور اگر تو جھوٹا ہے تو جھوٹے شخص کے ساتھ بات کرنا ہی مناسب نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ اٹھے اور ثقیف کے بارے میں ہر قسم کی بھلائی سے مایوس ہوگئے۔ حضور ﷺ نے ان سے یہ کہا "تم نے مجھے جو جواب دیا سو دیا لیکن اب تم یہ مہربانی کرو کہ اس بات کو یہاں تک ہی رہنے دو"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کو پسند نہ کیا کہ آپ کی قوم کو آپ کے بارے میں یہ اطلاع ملے۔ اور وہ آپ کے خلاف مزید جری ہوجائیں۔

چنانچہ انہوں نے ایسا نہ کیا اور اپنے اوباشوں' غلاموں کو آپ کے پیچھے لگا دیا' وہ آپ ﷺ کو گالیاں دیتے رہے۔ آپ ﷺ پر آوازے کستے رہے یہاں تک کہ لوگ جمع ہوگئے اور آپ ﷺ مجبوراً ایک باغ کے اندر چلے گئے۔ یہ باغ عتبہ اور شیبہ پسران ربیعہ کا تھا۔ یہ دونوں باغ میں موجود تھے۔ جب ثقیف کے اوباش چلے گئے جو آپ کا پیچھا کر رہے تھے تو آپ نے انگور کی ایک بیل کے نیچے آرام کرنے کا ارادہ کیا۔ آپ انگور کے سایہ میں بیٹھ گئے۔ ربیعہ کے بیٹے دور سے دیکھ رہے تھے کہ ثقیف کے لوگوں نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ جب رسول اللہ ﷺ مطمئن ہوگئے تو آپ نے یہ دعا فرمائی "اللہ' میں تیرے سامنے اپنی ناتوانی کی شکایت کرتا ہوں' اپنی بے تدبیری کی کا اعتراف کرتا ہوں' اور اس بات کا بھی شکوہ کرتا ہوں کہ لوگوں کے دل میں میرا احترام نہیں رہا۔ اے ارحم الراحمین تو کمزوروں کا رب ہے اور میرا بھی رب ہے۔ تو مجھے کن لوگوں کے سپرد کر رہا ہے' تو کیا مجھے کسی غیر کے حوالے کر رہا ہے جو مجھ سے ترش روی سے پیش آئے یا میرا معاملہ تو نے کسی دشمن کے حوالے کر دیا ہے' اگر تو مجھ پر ناراض نہیں ہے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے لیکن تیری عافیت میرے لیے بہت ہی وسیع ہے۔ میں تیرے چہرے کے نور کی پناہ مانگتا ہوں جس سے پوری دنیا روشن ہے اور جس کی وجہ سے دنیا اور آخرت کی بھلائی ملتی ہے۔ میں تیرے غضب سے پناہ مانگتا ہوں۔ اس سے بھی پناہ مانگتا ہوں کہ تیرا غضب مجھ پر نازل ہوجائے' تو میری سرزنش کر سکتا ہے کہ تو راضی ہو اور تیرے سوا نہ جائے پناہ ہے اور نہ قوت کا سرچشمہ ہے۔"

کہتے ہیں کہ جب آپ ﷺ کو عتبہ کے لڑکوں نے اس حال میں دیکھا تو ان کو آپ پر رحم آگیا۔ ان کا ایک عیسائی غلام تھا' جس کا نام عداس تھا۔ تو انہوں نے اسے حکم دیا کہ انگور کا ایک گچھا لو' اسے تھالی میں رکھو' اس شخص کے پاس لے جاؤ' اور اس سے کہو یہ کھائیں۔ عداس نے ایسا ہی کیا۔ حضور ﷺ کے سامنے انگور رکھے اور کہا آپ تناول فرمائیں۔ جب حضور اکرم ﷺ نے اس میں ہاتھ ڈالا تو فرمایا "بسم اللہ" اس کے بعد کھایا۔ عداس نے آپ کی طرف دیکھا اور کہا یہ بات تو اس علاقے کے لوگ نہیں کہتے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے کہا عداس تم کہاں کے رہنے والے ہو' اور تمہارا دین کیا ہے؟ تو

اس نے کہا میں نصرانی ہوں اور میں "نینوی" کا رہنے والا ہوں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ "یونس ابن متی کے گاؤں کے ہو جو ایک صالح شخص تھا"۔ تو عداس نے کہا آپ کو کیا پتہ ہے کہ یونس ابن متی کون تھا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا "وہ میرا بھائی ہے۔ میں بھی نبی ہوں اور وہ بھی نبی تھا"۔ عداس رسول اللہ ﷺ پر جھک پڑا۔ آپ کا سر' ہاتھ اور پاؤں چومنے لگا۔ اس پر ربیعہ کے لڑکوں میں سے ایک نے دوسرے کو کہا کہ تمہارے غلام کو اس نے بگاڑ ہی دیا۔ جب عداس آیا تو دونوں نے اس سے پوچھا: عداس تم ہلاک ہو تم اس شخص کے سر اور پاؤں اور ہاتھ کو کیوں چوم رہے تھے۔ تو اس نے کہا: آقا! اس سے زیادہ اچھی چیز اس روئے زمین پر نہیں ہے۔ اس نے مجھے ایسی بات بتائی ہے جو ایک نبی ہی بتا سکتا ہے وہ کہنے لگے عداس تم پر ہلاکت ہو تمہیں وہ اپنے دین سے نہ پھیر دے' تمہارا دین اس سے بہتر ہے۔

اس کے بعد حضور اکرم ﷺ طائف سے مکہ کی طرف آئے۔ آپ ثقیف کی جانب سے مایوس ہو گئے۔ نخلہ کے مقام پر آپ رات کو رہے اور وہاں آپ نے نصف رات کو نماز میں تلاوت شروع کی۔ اس موقعہ پر جنات کے کچھ لوگ آئے اور انہوں نے قرآن سنا جس کا تذکرہ قرآن مجید میں کیا گیا۔ جیسا کہ کہا گیا ہے یہ لوگ سات افراد تھے' دو حصوں میں۔ انہوں نے غور سے قرآن کو سنا۔ جب حضور ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو وہ پلٹ کر اپنی قوم کی طرف چلے گئے۔ یہ ایمان لے آئے اور انہوں نے دعوت اسلامی کو قبول کر لیا جس کی حکایت اللہ نے کی۔

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ..... تا ..... يُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ اور دوسری جگہ فرمایا

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ ---- یعنی سورہ جن کی پوری آیات۔

ابن کثیر نے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے یہ صحیح ہے لیکن یہ کہ جنوں نے اس رات کو حضور ﷺ کا کلام سنا' یہ محل نظر ہے۔ بلکہ جنوں نے کلام الہی آغاز وحی کے دور میں سنا تھا جس طرح حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما میں مذکور ہے۔ اور حضور ﷺ طائف کو اس وقت گئے جب آپ کے چچا فوت ہو گئے تھے۔ اور یہ واقعہ ہجرت سے ایک سال قبل یا دو سال قبل کا ہے۔ واللہ اعلم!

اگر یہ حدیث صحیح ہو کہ حضور طائف سے دل شکستہ واپس ہوئے تھے کیونکہ طائف کے ذلیل کبراء نے حضور ﷺ کے ساتھ نہایت ہی توہین آمیز سلوک کیا تھا۔ اور اس کے بعد آپؐ نے رب تعالیٰ کے سامنے وہ دعا فرمائی تھی جس کے ایک ایک لفظ سے دل شکستگی ٹپکی پڑتی ہے تو اللہ کی جانب سے یہ نہایت ہی حوصلہ افزا کارروائی ہے کہ حضور ﷺ کی طرف جنات کا رخ پھیر دیا جائے تاکہ آپ ان کو تبلیغ کریں اور وہ اپنی قوم تک اس پیغام کو پہنچائیں۔ اس میں نہایت ہی لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ اگر انسان نہ مانیں تو اس دعوت کو کائنات کی دوسری قوتیں تسلیم کریں گی۔

غرض واقعہ وہ ہو یا یہ' بہرحال یہ ایک عظیم واقعہ ہے۔ اس کا مفہوم بھی عظیم ہے اور حکمت بھی عظیم ہے۔ اور قرآن کے بارے میں جنوں کا جو تبصرہ ہے وہ بھی نہایت ہی معنی خیز ہے۔ اسلام کے بارے میں انسان کے ریمارکس اور جنوں کی پوری تقریر کا قرآن میں نقل ہونا بھی معنی خیز ہے۔ اب آیات کی تفصیلات!

--- OOO ---

# درس نمبر ۲۷۲ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۲۸

آیَاتُهَا ۲۸　سُوْرَةُ الْجِنِّ (۷۲) مَكِّيَّةٌ (۴۰)　رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝۱
يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۝۲ وَّاَنَّهُ تَعٰلٰى جَدُّ
رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۝۳ وَّاَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ
شَطَطًا ۝۴ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝۵ وَّاَنَّهُ
كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝۶ وَّ
اَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝۷

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"اے نبی کہو' میری طرف وحی بھیجی گئی ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے غور سے سنا اور پھر جاکر اپنی قوم کے لوگوں سے کہا :"ہم نے ایک بڑا عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست کی طرف راہنمائی کرتا ہے اس لیے ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے"۔"اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے اس نے کسی کو بیوی یا بیٹا نہیں بنایا ہے"۔"اور یہ کہ ہمارے نادان لوگ اللہ کے بارے میں بہت خلاف حق باتیں کہتے رہتے ہیں" اور یہ کہ "ہم نے سمجھا تھا کہ انسان اور جن کبھی خدا کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتے"۔ اور یہ کہ "انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے' اس طرح انہوں نے انسانوں کی بے چینی کو اور زیادہ بڑھا دیا"۔ اور یہ کہ "انسانوں نے بھی وہی گمان کیا جیسا تمہارا گمان تھا کہ اللہ کسی کو رسول بنا کر نہ بھیجے گا"۔

نفر اور رھط کا اطلاق تین سے نو تک ہوتا ہے جبکہ جنوں کے بارے میں روایت ہے کہ یہ نو تھے۔جس انداز سے

یہاں اس واقعہ کا آغاز کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ یوں تھا کہ حضورﷺ نے قرآن کی تلاوت فرمائی اور جنوں نے قرآن کو سنا اور پھر اپنی قوم کے پاس جاکر انہوں نے تبلیغ کی اور اس کا علم حضور اکرمﷺ کو نہ تھا' اس تمام واقعہ کی اطلاع اللہ نے حضورﷺ کو بذریعہ وحی دی اور یہ پہلا واقعہ تھا اور اس کے بعد بھی کئی واقعات ہوئے ہوں گے کہ حضورﷺ نے قرآن پڑھا اور جنوں نے سنا ہو گا۔ اور اس بات کا اظہار حضورﷺ کی قرات کے بارے میں وارد احادیث سے بھی ہوتا ہے کہ حضورﷺ نے یہ جانتے ہوئے اسے پڑھا کہ جن بھی سنتے ہیں۔ امام ترمذی نے حضرت جابر ابن عبداللہ سے روایت کی ہے :"حضور اکرمﷺ نکلے اور اپنے ساتھیوں کے سامنے سورہ رحمان کی تلاوت فرمائی' اول سے آخر تک' سب لوگ خاموش ہوگئے۔ حضورﷺ نے فرمایا یہ سورت میں نے جنوں پر تلاوت کی ہے' وہ اس کا تم سے اچھا جواب دینے والے تھے۔ جب بھی میں پڑھتا۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ تو وہ جواب میں کہتے۔

لا بشئی من نعمتك ربنا نكذب فلك الحمد "اے ہمارے رب' ہم تیری نعمتوں میں سے کسی چیز کی تکذیب نہیں کرتے لہٰذا سب تعریفیں تیرے لیے ہیں"۔ اس روایت سے ابن مسعود کی روایت کی تائید ہوتی ہے' جس کو ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔

یہ پہلا موقعہ ہے جس میں جنوں کے سماعت قرآن کی بات کی گئی ہے۔ اسی موقعہ کے بارے میں سورہ احقاف کی آیات میں بھی بات کی گئی ہے۔

وَ اِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ (۲۹) قَالُوْا یٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یَهْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ وَ اِلٰی طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۳۰) یٰقَوْمَنَآ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ یُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ (۳۱) وَ مَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰهِ فَلَیْسَ بِمُعْجِزٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَیْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءُ اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۳۲) (٤٦ : ۲۹ تا ۳۲) "جس وقت متوجہ کیا ہم نے آپ کی طرف جنوں میں سے کچھ لوگ' جو سننے لگے قرآن مجید کو' پھر وہ جب وہاں پہنچ گئے' بولے' چپ رہو' پھر جب تلاوت ختم ہوئی تو واپس ہوئے اپنی قوم کی طرف ان کو ڈراتے ہوئے' کہنے لگے اے ہماری قوم کے لوگو' ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد اتری ہے' یہ اگلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ سچائی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ایک سیدھے راستے کی طرف' اے ہماری قوم کے لوگو' اللہ کی طرف بلانے والے کو مان لو' ایمان لاؤ اس پر' اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں عذاب

الیم سے نجات دے گا۔اور جو کوئی للہ کی طرف بلانے والے کی بات نہ مانے گا تو وہ اس بات کو زمین میں روک نہ سکے گا اور للہ کے سوا اس کا کوئی مددگار نہ ہو گا اور ایسے لوگ کھلی گمراہی میں ہوں گے''۔

یہ آیات اور یہ سورت دونوں یہ بتاتے ہیں کہ قرآن مجید جنات کے کانوں میں اچانک پڑ گیا تھا۔اور اس کا ان پر اس قدر اثر ہوا کہ ان کے قدم اکھڑ گئے۔ان کے دلوں میں ایک زلزلہ سا برپا ہو گیا۔اور ان کے وجود کے اندر ایک سخت جھٹکا سا پیدا ہوا اور حالت یہ ہو گئی کہ ان کا پورا وجود ایمان اور فیوض الہیہ سے بھرا ہوا تھا۔اس لیے وہ فوراً اپنی قوم کی طرف لوٹے اور اس حال میں لوٹے کہ ان کے قلوب کا جام نور ایمان سے چھلک رہا تھا اور وہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی توقف نہ کر سکتے تھے۔چنانچہ انہوں نے نور ایمان کو فوراً دوسروں کی طرف منتقل کرنا شروع کر دیا۔وہ نہایت ہی گرمی اور جوش سے اس نور کو دوسروں کی طرف منتقل کرنے لگے تھے۔نہایت گرم جوشی سے' نہایت سنجیدگی اور نہایت اہتمام سے۔یہ ایک ایسی حالت ہے کہ جب کسی پر یہ پہلی مرتبہ طاری ہوتی ہے تو انسان کی شخصیت کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔اور وہ پھر فوراً اپنے احساسات' جذبات اور تاثرات کو دوسروں تک منتقل کرنے کی سعی کرنے لگتا ہے۔بہت ہی جوش و خروش کے ساتھ۔

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۷۲ : ۱) ''ہم نے ایک بڑا عجیب قرآن سنا ہے''۔قرآن کریم کی جو پہلی خصوصیت ان کو واضح نظر آئی وہ یہ تھی کہ یہ عجیب اور غیر مالوف ہے اور اس کو سن کر دلوں کے اندر خوف پیدا ہو جاتا ہے۔جو شخص بھی قرآن مجید کو تیز احساس اور کھلے دل کے ساتھ پڑھے گا' دل کی کشادگی اور معتدل ذوق کے ساتھ پڑھے گا یا سنے گا' وہ اس سے مرعوب ہو جائے گا۔اور اسے نظر آئے گا کہ یہ ایک عجیب چیز ہے۔اس کے اندر قوت استدلال ہے۔اس کے اندر بے پناہ جاذبیت ہے۔اور اس کے اثرات اس قدر شدید ہیں کہ قلب و ضمیر کے تاروں کے اندر ایک زبردست ارتعاش اور نغمہ پیدا کر دیتا ہے۔یہ عملاً بھی عجیب ہے۔اس پر جنات کا ردعمل شاہد ہے کہ انہوں نے اسے ایسا پایا اور فوراً عمل کے لیے تیار ہو گئے۔

یَّهْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ (۷۲ : ۲) ''جو راہ راست کی رہنمائی کرتا ہے''۔یہ قرآن مجید کی دوسری ممتاز بدیہی صفت ہے' جنوں کے اس گروہ نے بادی النظر میں اسے محسوس کر لیا۔اور انہوں نے جب قرآن کی حقیقت کو اپنے دلوں کے اندر پا لیا تو انہوں نے معلوم کر لیا کہ یہ کتاب کتاب ہدایت ہے۔پھر ہدایت کے بجائے انہوں نے ارشاد کا لفظ استعمال کیا جو ہدایت سے زیادہ وسیع المفہوم ہے۔یعنی یہ کتاب ہدایت کرتی ہے اور حق و صواب کی راہ دکھاتی ہے۔اور رشد کے لفظ میں ایک اور مفہوم بھی ہے یعنی سنجیدگی' اعتدال اور علم و معرفت تو گویا یہ کتاب علم و معرفت' سنجیدگی اور اعتدال کے ساتھ راہ صواب کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔اور اس کا انداز عالمانہ ہے۔اور اس مطالعے سے ان حقائق تک پہنچنے کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔گویا یہ نتائج اس کتاب کے ذاتی اثرات و نتائج ہیں۔

قرآن رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے۔یوں کہ یہ دلوں کے اندر احساس اور کشادگی پیدا کر دیتا ہے' ادراک اور معرفت کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔اللہ کے ساتھ رابطہ پیدا کرتا ہے' جو نور ہدایت کا سرچشمہ ہے۔پھر یہ کتاب اس پوری کائنات کے اندر جاری قوانین فطرت کے ساتھ انسان کو جوڑ دیتی ہے اور پھر عملی زندگی میں یہ کتاب زندگی کا ایک عملی نظام تجویز کرتی ہے۔اور اس نظام کے نتیجے میں انسانیت کو وہ عروج نصیب ہوتا ہے جو اس کے سوا کبھی کسی اور نظام میں نصیب

نہیں ہوتا۔ اور یہ کتاب پھر ایک ممتاز تہذیب و تمدن کو وجود میں لاتی ہے۔ جس کے اندر زندگی بسر کرنے والے لوگ فکری 'تصوراتی' اخلاقی' قانونی اور عملی اعتبار سے نہایت ہی ممتاز اور ترقی یافتہ لوگ ہوتے ہیں۔

فَاٰمَنَّا بِهٖ ( ۷۲ : ۲ ) "ہم اس پر ایمان لائے ہیں"۔ قرآن سننے کے بعد یہ ایک قدرتی اور فطری ردعمل ہے کہ انسان اسے تسلیم کرلے' اس کو سمجھ لے۔ اور اس سے حقیقی تاثر حاصل کرلے۔ اللہ تعالیٰ جنات کا یہ تبصرہ مشرکین مکہ کی غیر آموزی کے لیے نقل کرتے ہیں کہ تم عرصے سے قرآن سن رہے ہو اور مان کر نہیں دیتے۔ اور تم اس کتاب کو جنات کی طرف منسوب کرتے ہو۔ اس طرح کبھی کہتے ہو کاہن ہے' کبھی کہتے ہو شاعر ہے اور کبھی کہتے ہو مجنون ہے۔ اور ان تینوں کا جنات سے تعلق ہوتا تھا۔ لیکن ذرا جنوں کی حالت دیکھو کہ وہ قرآن سن کر مدہوش ہوگئے' انہوں نے اسے سمجھ لیا اور اس دعوت کو لے کر اپنی قوم میں پھیل گئے۔ ایک منٹ بھی انہوں نے دیر نہ کی۔ نہ اپنے آپ کو روک سکے' فوراً اس دعوت اور تاثر کو لے کر نکل گئے۔ انہوں نے حق کو پہچان لیا اسے قبول کرلیا' یقین کرلیا اور اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔ اور کوئی مکر و فریب نہ کیا اور کوئی بغض و عناد نہ کیا جس طرح مشرکین مکہ کر رہے تھے۔

وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ( ۷۲ : ۲ ) "اور ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے"۔ یہ خالص' صریح اور صحیح ایمان ہے' اس میں نہ شرک شامل ہے' نہ وہم کا دخل ہے۔ اور نہ خرافات کے لیے کوئی راہ ہے۔ یہ ایمان حقیقت قرآن کے ادراک کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے اور اس حقیقت کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے جس کی طرف قرآن داعی ہے۔ یعنی خالص توحید بغیر شائبہ شرک

وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ( ۷۲ : ۳ ) "اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس نے کسی کو بیوی یا بیٹا نہیں بنایا"۔ الجد کے معنی حصہ اور نصیب کے ہوتے ہیں۔ یعنی قدر اور مقام' عظمت اور اقتدار۔ یہ سب امور لفظ "جد" میں شامل ہیں اور اس کے پرتو ہیں۔ لیکن اجمالی مفہوم یہ ہے کہ اللہ بہت ہی بلند مرتبے والا ہے۔ وہ بہت عظیم اور جلیل القدر ہے۔ اس لیے اس نے نہ کسی کو بیوی بنایا ہے اور نہ بیٹا بنایا ہے۔

عربوں میں یہ غلط خیال تھا کہ ملائکہ اللہ کی لڑکیاں ہیں اور یہ لڑکیاں اس طرح پیدا ہوئیں کہ اللہ کی بیوی جن تھی۔ خود جنوں کی زبانی اس کہانی اور افسانے کی تردید کر دی گئی کہ اللہ ان چیزوں سے پاک و صاف ہے۔ اور انہوں نے بڑی کراہت کے ساتھ اس کی طرف اس غلط نسبت کی نفی کر دی کہ نہ اس قسم کی کوئی رشتہ داری ہے اور نہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ گویا یہ اللہ کی بہت بڑی توہین ہے۔ اس قسم کے تمام تصورات اور اس سے ملتے جلتے تمام تصورات غلط اور مشرکانہ ہیں' چاہے وہ کسی شکل و صورت میں ہوں۔ مشرکانہ کہانیاں ہوں' یا اقانیم کے افسانے ہوں یا کوئی اور صورت ہو۔

وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ( ٤ ) وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ( ۷۲ : ۵ ) "اور یہ کہ ہمارے نادان لوگ اللہ کے بارے میں بہت خلاف حق باتیں کہتے رہے ہیں اور یہ کہ ہم نے سمجھا تھا کہ انسان اور جن کبھی خدا کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتے"۔ جن اس بات کو

دہرا رہے کہ ہمارے بعض بے وقوف خدا کے بارے میں خلاف حق تصورات رکھتے تھے اور اللہ کے لیے بیوی اور اولاد کا اعتقاد رکھتے تھے ۔ اور قرآن کریم سننے کے بعد ان پر یہ بات واضح ہوگئی کہ ان کے یہ عقائد درست نہ تھے اور جنوں میں سے جو لوگ اس بات کے قائل تھے وہ بڑے جاہل اور احمق تھے ۔ اس قدر جاہل کہ وہ یہ تصور کرتے تھے کہ انسانوں اور جنوں میں سے کوئی شخص اللہ پر جھوٹ کیسے باندھ سکتا ہے؟ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی جھوٹ نہیں باندھ سکتا تھا۔ اس لیے جب بعض احمقوں نے یہ عقیدہ اختیار کر لیا کہ اللہ کی بیوی اور اولاد ہے تو انہوں نے بھی اس بات کو مان لیا' کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے اللہ پر کوئی افتراء کیسے باندھ سکتا ہے ۔ لیکن یہی شعور ان کے لیے موجب ایمان بن گیا کیونکہ ان کے دل میں یہ پاک خیال تھا ۔ ادھر کسی نے اللہ پر جھوٹ باندھا نہیں ادھر اللہ نے اس کی گردن دبوچی نہیں ۔ ان جنوں پر گمراہی کا یہ غبار ان کی جہالت کی وجہ سے آگیا تھا ۔ جونہی ان کو حق ملا انہوں نے گمراہی کے غبار کو جھاڑ دیا ۔ حقیقت کو پا لیا ۔ اصل حقیقت کو چکھ لیا اور وہ بول اٹھے :

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۱) یَّهْدِیْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (۲) وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا (۳) (۷۲ : ۱ تا ۳) ”ہم نے ایک بڑا عجیب قرآن سنا جو راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے' اس لیے ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے' اس نے کسی کو بیوی اور بیٹا نہیں بنایا“ ۔

اور یہ جھاڑ اور صفائی اس وجہ سے ان کو نصیب ہوئی کہ وہ حق تک پہنچ گئے اور یہ حقیقت اس قابل تھی جس پر کبرائے قریش کے اکثر بر خود غلط دماغ اس پر غور کرتے' جو یہ گمان کرتے تھے کہ اللہ کی بیوی ہے اور بیٹیاں ہیں اور اس حقیقت سے ان کے دلوں میں خدا خوفی اور احتیاط پیدا ہو جاتی اور وہ اس پیغام کو سمجھنے کی کوشش کرتے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سامنے پیش کر رہے تھے ۔ اور کبرائے قریش کے جو احمقانہ عقائد تھے' ان کی صداقت میں شک و شبہ پیدا ہو جاتا' لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا ۔ اس قصے کو یہاں لانے کا مقصد بھی یہ تھا کہ کبرائے قریش کے عقائد کی تردید کی جائے ۔ قرآن کریم اور کبرائے قریش کے درمیان جو نظریاتی جنگ برپا تھی' یہ سورت اس کی ایک جھڑپ کا نمونہ تھی ۔ اور یہ سورت دراصل ان بیماریوں کا ایک دیرپا علاج کر رہی تھی جو زمانہ جاہلیت سے باقی رہ گئی تھیں ۔ اور ابھی تک لوگوں کے دلوں پر چھا رہی تھیں ۔ لوگ سادہ لوح تھے اور وہ ان عقائد سے بری الذمہ تھے' لیکن گمراہ اور بر خود غلط قیادت کی طرف سے ان کو اسی راہ پر چلایا جا رہا تھا اور زمانہ جاہلیت کے خرافات کو دین بنا کر ان کے سامنے پیش کیا جاتا تھا ۔

وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (۷۲ : ۶) ”اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ کی پناہ مانگا کرتے تھے ۔ اس طرح جنوں نے ان کی بے چینی کو اور زیادہ بڑھا دیا“ ۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف جو ایام جاہلیت میں متعارف تھا اور آج بھی کئی

معاشروں میں یہ بات متعارف ہے کہ جنوں کو زمین اور انسانوں پر اقتدار حاصل ہے اور یہ کہ وہ انسانوں کو نفع نقصان بھی پہنچا سکتے تھے ۔ اور یہ کہ بعض اراضی اور سمندروں اور فضا میں یہ جن محکوم ہیں' اور ان کے سردار ان پر حکمران ہیں ۔ چنانچہ جب یہ لوگ کسی 'غیر آباد جگہ جاتے یا کسی جنگل اور پہاڑ میں ہوتے تو یہ اس علاقے کے سردار جن کی پناہ مانگ لیتے کہ اس کے زیر دست جن کہیں اسے نقصان نہ پہنچا دیں ۔ یہ پناہ مانگنے کے بعد' وہاں شب باشی کرتے ۔

شیطان کو یہ طاقت دے دی گئی ہے کہ وہ انسانوں کے قلوب پر اثر انداز ہو' (ماسوائے ان لوگوں کے جو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑیں' ایسے لوگ اس کی دسترس سے بچے رہتے ہیں ) لیکن انسانوں میں سے جو شخص شیطان کی طرف جھکتا ہے تو وہ اسے کوئی نفع نہیں دیتا ۔ اس لیے کہ شیطان انسانوں کا دشمن ہے ۔ یہ دراصل انسان کو گمراہ کرتا ہے' اور اسے اذیت دیتا ہے ۔ چنانچہ یہ گروہ جن اس حقیقت واقعہ کو یوں بیان کرتا ہے ۔

وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ

رَهَقًا ( ٧٢ : ٦ ) "اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے ۔ اس طرح انہوں نے انسانوں کی بے چینی کو اور زیادہ کر دیا"۔ اور یہاں رہق کے معنی گمراہی 'قلق' حیرت کے ہیں اور یہ ان دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے جو شخص اپنے دشمن کے سامنے جھک جاتا ہے اور اس پر بھروسہ کرتا ہے ۔ اور جو اللہ پر بھروسہ نہیں کرتا اور نہ اللہ سے پناہ مانگتا ہے ۔ اہل قریش ایسا ہی کرتے تھے حالانکہ حضرت آدم علیہ السلام سے ادھر تمام انسانوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے ۔

انسانی قلب جب غیر اللہ کے ہاں نفع کی امید سے پناہ مانگتا ہے یا اس امید سے کہ غیر اللہ ضرر رفع کر دے گا ۔ ایسا شخص قلق' حیرت اور بے ثباتی اور بے اطمینانی کے سوا کچھ نہیں پاتا ۔ اور یہ رہق کی بدترین صورت ہے ۔ یعنی ایسی بے چینی جس کے اندر قلب کوئی آرام اور امن محسوس نہ کرے ۔

اللہ کے سوا ہر چیز بدلنے والی' ہر چیز زائل ہونے والی ہے اور ہر چیز فنا ہونے والی ہے' جب کوئی دل اللہ کے سوا کسی اور چیز سے متعلق ہو جائے تو وہ ڈگمگاتا رہتا ہے' وہ حیران و پریشان رہتا ہے ۔ اور اس لیے کہ وہ جس چیز کے ساتھ متعلق ہے' اس کا رخ جدھر ہو گا' اس کا رخ بھی ادھر ہو گا ۔ اللہ وحدہ باقی ہے ۔ زوال پذیر نہیں ہے' زندہ ہے' مرنے والی ذات نہیں ہے ۔ دائم ہے متغیر نہیں ہے ۔ اس لیے جو شخص اللہ کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرے گا وہ گویا ایک مستقل محور کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر دے گا اور اس کے اندر بھی ایک قسم کا استقلال پیدا ہو جائے گا ۔

وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ( ٧٢ : ٧ ) "اور یہ کہ انسانوں نے بھی وہی گمان کیا جیسا تمہارا گمان تھا کہ اللہ کسی کو رسول بنا کر نہ بھیجے گا"۔ جن اپنی قوم سے گفتگو کرتے ہیں کہ جس طرح بعض انسان جنوں کی پناہ مانگتے تھے اسی طرح وہ بھی یہ گمان رکھتے تھے جس طرح تم گمان رکھتے ہو کہ اللہ رسول نہ بھیجے گا ۔ لیکن دیکھ لو اللہ نے تو رسول بھیج دیا ہے اور رسول کو یہ قرآن بھی دے دیا ہے جو رشد و ہدایت کا سامان فراہم کر رہا ہے یا مفہوم یہ ہے کہ ان کے عقائد یہ تھے جس طرح تمہارے ہیں کہ اللہ قیامت میں کسی کو نہ اٹھائے گا لہٰذا انہوں نے قیامت

کے لیے کوئی تیاری نہ کی اور رسول خدا نے جس انجام سے ڈرایا تھا اس کی پرواہ نہ کی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اللہ کسی کو نہیں اٹھائے گا۔

یہ دونوں ظن وگمان حقیقت کے مطابق نہ تھے ۔ یہ جاہلانہ خیالات پر مبنی تھے ۔ اور اس پوری کائنات کی حکمت و تخلیق سے بے خبری پر مبنی تھے ۔ اللہ نے تمام مخلوق کو یوں پیدا کیا ہے کہ اس کے اندر خیر کی صلاحیت بھی تھی اور شر کی صلاحیت بھی تھی ۔ (جس طرح اس سورت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں کو بھی دو ہری صلاحیت دی گئی ہے ۔ خیر کی بھی اور شر کی بھی ' ہاں ان میں سے بعض نے اپنے آپ کو شر مجسم کر لیا مثلاً ابلیس ' جس نے اپنے آپ کو رحمت خداوندی سے محروم کر لیا اور خالص شر بن گیا ) اور اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو بھیج کر خیر کی معاونت کی ۔ رسولوں کا مشن یہ قرار پایا کہ وہ انسانوں کے اندر پائی جانے والی خیر کی صلاحیت کو ابھاریں اور ان کی فطرت میں جو خیر کی استعداد ہے اسے جلا دیں ' لہٰذا یہ عقیدہ بالکل غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ رسولوں کو نہ بھیجے گا۔

یہ تو اس صورت میں ہے جب ہم آیت میں بعث سے مراد "رسولوں کا بھیجنا" لیں ۔ اگر بعث سے مراد آخرت میں اٹھانا ہے تو پھر بھی یہ بات حکمت تخلیق کے خلاف ہے کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی نیکی اور بدی کا حساب و کتاب اس دنیا میں پورا نہیں ہو جاتا ۔ لہٰذا اللہ کی حکمت تخلیق اور عدل کے تقاضے کے مطابق بھی ضروری ہے کہ ایک ایسا جہاں ہو جہاں مظلوموں کے ساتھ انصاف کیا جائے ' نیکو کاروں کو انعام اور بدکاروں کو سزا دی جائے اور حساب و کتاب بے باک ہو ۔ اور جو جس مقام کا حیات دنیا کے مطابق ' اہل بنتا ہو ' اس میں جائے ۔ لہٰذا اس بات کا کوئی موقعہ و مقام نہیں ہے کہ اللہ کسی کو دوبارہ نہیں اٹھائے گا ۔ یہ اعتقاد حکمت الٰہیہ کے خلاف ہے ۔ عدل و انصاف کے اصولوں کے خلاف ہے ۔

چنانچہ اس انداز میں جنوں نے اپنی قوم کے غلط خیالات کو درست کرنے کی سعی کی اور قرآن نے یہ بات مشرکین عرب کے غور کے لیے نقل کی کہ جن تو خود اپنے خیالات پر نظر ثانی کر رہے ہیں تم کیا کر رہے ہو۔

--- ○○○ ---

اس آخری رسالت کے اثرات اس پوری کائنات پر مرتب ہوگئے ہیں ' کائنات کے اطراف میں قوائے طبیعیہ بھی بدل گئی ہیں ۔ زمین و آسمان میں انتظامی تبدیلیاں آگئی ہیں تاکہ وہ اپنی وہ تمام کاروائیاں ترک کر دیں جو اس آخری رسالت کے ساتھ متفق نہیں ہیں ۔ ہر قسم کی غیب دانی کا دعویٰ ترک کر دیں اور یہ کہ وہ اعلان کر دیں کہ اس کائنات میں وہ کچھ قوت بھی نہیں رکھتے ۔

وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّ شُهُبًا ﴿۸﴾ وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ﴿۹﴾ وَّ اَنَّا لَا نَدْرِيْۤ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ﴿۱۰﴾

"اور یہ کہ "ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو دیکھا کہ وہ پہریداروں سے پٹا پڑا ہے اور شہابوں کی بارش ہو رہی ہے"۔ اور یہ کہ "پہلے ہم سن گن لینے کے لیے آسمان میں بیٹھنے کی جگہ پا لیتے تھے' مگر اب جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے لیے گھات میں ایک شہاب ثاقب لگا ہوا پاتا ہے"۔ اور یہ کہ "ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آیا زمین والوں کے ساتھ کوئی برا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کا رب انہیں راہ راست دکھانا چاہتا ہے"۔

یہ واقعات جو جنوں کے ذریعہ قرآن نے نقل کیے ہیں' بتاتے ہیں کہ اس آخری رسالت سے قبل کے زمانے میں' جس میں رسول نہ تھا یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کے دور میں' جنوں کا یہ مشغلہ تھا کہ وہ عالم بالا کی طرف جاتے تھے اور عالم بالا میں اس زمین اور کائنات کے بارے میں جو احکام صادر ہوئے تھے یا فرشتوں کے درمیان زیر بحث آتے تھے' مثلاً اللہ تعالیٰ فرشتوں کو جو احکام برائے نفاذ صادر کرتا تھا' یہ جن عالم بالا میں بعض مقامات تک پہنچ کر گن سن لے لیتے تھے اور پھر ان سچی معلومات کے ساتھ بہت سی غلط معلومات جمع کر کے' یہ جن دنیا میں کاہنوں' قیافہ دانوں اور دوسرے مذہبی رہنماؤں کو دیتے اور یہ لوگ ان حقیقی معلومات کو شیطانوں کے آمیزے کے ساتھ مزید اپنے مفاد کی چیزیں ملا کر لوگوں میں پھیلاتے' ان کو گمراہ کرتے اور اس طرح شیطانی منصوبہ چلتا رہتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اور حضور ﷺ سے قبل یہ نظام کس طرح چلتا تھا' اس کی تفصیلات قرآن نے نہیں دی ہیں اور نہ یہ تفصیلات جاننے کی کوئی ضرورت ہے۔

چنانچہ جنوں کا یہ گروہ کہتا ہے کہ اب عالم بالا سے یہ گن سن ممکن نہیں رہی ہے۔ اب جب وہ یہ کوشش کرتے ہیں جسے وہ "لمس سماء" سے تعبیر کرتے ہیں تو وہ دیکھتے ہیں کہ ہر طرف سے شدید پہرے لگے ہوئے ہیں اور جو جن بھی ایک حد سے اوپر جاتا ہے آگے سے شہاب ثاقب کی بمباری ہوتی ہے۔ جو بھی ایسی کوشش کرتا ہے شہاب گر کر اسے ختم کر دیتا ہے۔ وہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم تو غیب نہیں جانتے کہ ان نئے انتظامات کے مقاصد کیا ہیں اور اللہ تعالیٰ کیا چاہتا ہے:

وَّ اَنَّا لَا نَدْرِیْۤ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا (۷۲ : ۱۰)

"اور یہ کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آیا زمین والوں کے ساتھ کوئی برا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کا رب انہیں راہ راست دکھانا چاہتا ہے"۔ یہ تمام غیبی امور صرف اللہ کے علم کے حوالے ہیں' جن کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ پس پردۂ تقدیر سے کیا چیز نمودار ہوتی ہے۔ آیا انسانوں پر کوئی مصیبت آ رہی ہے اور وہ گمراہی میں مزید آگے جائیں گے یا ان کے لیے ہدایت اور رحمت کے دروازے کھل گئے ہیں۔ انہوں نے ہدایت کو شر کے مقابلے میں ذکر کیا گویا حقیقی خیر ہے ہی ہدایت۔

جب وہ ذریعہ ہی اس بات کی تردید کر دے' جس کی طرف کاہن اپنا یہ دعویٰ منسوب کرتے تھے کہ وہ اپنے مزعومہ افکار وہاں سے لیتے ہیں' تو پھر کاہنوں کے مزعومہ دعوؤں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ جنوں نے یہ کہہ دیا کہ وہ تو علم غیب نہیں جانتے۔ لہٰذا بات ختم ہو گئی' ہر قسم کے زعم باطل قرار پائے اور کاہنوں اور عرافوں کے دعوؤں کا اعتبار جاتا رہا۔ یہ بات ثابت ہو گئی کہ غیب صرف اللہ جانتا ہے۔ لہٰذا نہ کوئی غیب کا دعویٰ کر سکتا ہے اور نہ پیش گوئی کر سکتا ہے۔ یوں قرآن کریم نے انسانی عقل کو ہر قسم کے اوہام و خرافات سے پاک کر دیا اور ان تمام مزعومات کے دروازے بند کر

دیئے' جو کیے جا سکتے تھے اور اعلان کر دیا کہ اب انسانی عقل سن رشد کو پہنچ گئی ہے اور انسانی افکار کے اندر اوہام و خرافات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آسمانوں کے یہ پہریدار کس طرح کھڑے ہیں' یہ شیاطین کو کس طرح روکتے ہیں؟ شہاب ثاقب کس طرح فائر کرتے ہیں۔ تو اس بارے میں نہ قرآن نے ہمیں کچھ بتایا ہے اور نہ صحیح احادیث میں اس کی تفصیلات ہیں اگر قرآن و سنت اس کی ضرورت محسوس کرتے کہ اس میں انسانوں کے لیے کوئی خیر ہے تو ضرور بتلا دیتے۔ جب اللہ نے کچھ نہیں بتایا تو یہ کوشش ہی عبث ہے۔ اس سے ہماری زندگی اور ہمارے علم میں کوئی تعمیری اضافہ نہیں ہو سکتا۔

شہابوں کے بارے میں بھی کسی جدل و مباحثے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ شہاب دراصل اس کائنات کے نظام کے مطابق حرکت کرتے ہیں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی ایسے تھے۔ اور بعد میں بھی اور ان کا ضابطہ عمل وہی ہے جس کو سائنس دان اب معلوم کرنے کی سعی کر رہے ہیں جن کی سوچ کبھی درست نکلتی ہے اور کبھی غلط ہو کر ترمیم پذیر ہو جاتی ہے۔ اگر سائنس دانوں کے موجودہ نظریات درست بھی ہوں تو اس سے قرآن کے فرمان کی نفی نہیں ہوتی۔ یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ اور ممکن ہے کہ یہ شہاب شیطانوں کے لیے رجم ہوں اور یہ کام اللہ کی مشیت کے مطابق ہوتا ہو جس کا ابھی تک ہمیں پورا علم نہیں ہے۔

جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ ایک تمثیل ہے' جس میں بتایا گیا ہے کہ کلام الہی میں کوئی التباس نہیں ہو سکتا اور اس میں باطل کی آمیزش کرنے والے نہیں کر سکتے اور یہ کہ اس آیت کو اپنے ظاہری مفہوم میں نہیں لیا جا سکتا' تو ان بیچاروں کی حالت یہ ہے کہ یہ لوگ پہلے سائنسی نظریات پر قطعی ایمان لا کر قرآن کے پاس آتے ہیں اور ان کے ذہنوں میں یہ نظریات جدید سائنسی نظریات سے آتے ہیں۔ پھر یہ قرآن کی تفسیر ان مزعومہ نظریات کے مطابق کرنے بیٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ ملائکہ کو قوائے خیر اور قوائے مطیعہ کی تفسیر و تمثیل قرار دیتے ہیں' شیاطین کو قوائے شر اور قوائے مفسدہ کی تمثیل کہتے ہیں اور رجوم شیاطین کو تمثیل حفظ قرآن قرار دیتے ہیں اس لیے کہ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی موجود ہو اور مشاہدے سے باہر ہو' وہ ملائکہ' جنات اور شیاطین کے وجود کو اس طرح مشاہدہ کر سکیں کہ جس طرح وہ انسانوں اور دوسرے طبیعی اجسام کو دیکھتے ہیں۔ اس لیے وہ ان غیر مرئی اجسام اور موجودات کا انکار کرتے ہیں۔ لیکن اگر انہی سے پوچھا جائے کہ تمہارے ان مزعومات کی حقیقت کیا ہے' جن کے اوپر تم قرآن و سنت کو پرکھتے ہو تو ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر اور اسلامی تصور کی تشکیل اور تشریح کا صحیح طریقہ ہی یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن سے پہلے تمام افکار و تصورات نکال دے اور قرآن کو کسی سابقہ تحفظ کے بغیر مطالعہ کرے۔ یہ سابقہ تصورات' عقلی ہوں' شعوری ہوں یا نفسیاتی ہوں اور قرآن کا مطالعہ کر کے اپنے تصورات اور افکار کی تشکیل قرآن کے مطابق کرے۔ اور اس کائنات کے حقائق کی روشنی میں' سنت نبوی کے حدود کے اندر کرے۔ یہ نہ ہو کہ قرآن اور سنت کو بیرونی افکار و نظریات کے کٹہرے میں لا کر کھڑا کر دیا جائے اور ان پر محاکمہ کیا جائے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم ہرگز کسی ایسی چیز کا انکار نہ کریں جسے قرآن ثابت کرتا ہے۔ نہ ان میں تاویلات کریں۔ نہ ایسے امور کو قطعی سمجھیں جن کا قرآن انکار کرتا ہے۔ ہاں قرآن و سنت کی منفیات اور ثابت شدہ حقائق کے دائرے سے باہر انسان آزاد ہے کہ اپنی عقلی اور سائنسی جدوجہد کے ذریعہ جو چاہے

نظریات قائم کرے۔

یہ بات ہم قرآن کے بارے میں' اہل ایمان کی عمومی روش کے پیش نظر کہہ رہے ہیں' جو قرآن کی نصوص کی تاویلات اپنے ذہنی افکار کے مطابق کرتے ہیں کیونکہ وہ اس دنیا کو اپنے افکار کے مطابق دیکھنا چاہتے ہیں' میں خود اپنے آپ کو اس روش سے بری الذمہ قرار نہیں دے سکتا' ظلال القرآن کے ابتدائی حصوں میں' میں خود بھی غیر شعوری طور پر اس طرف جھک گیا ہوں گا' لیکن اگر توفیق الٰہی شامل حال رہی تو آئندہ ایڈیشنوں میں اس قسم کے رجحان کی اصلاح کر دوں گا۔ یہاں میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یہی حق ہے' اور یہ اللہ کی طرف سے میرے لیے خاص عنایت اور ہدایت ہے۔

رہے وہ لوگ جو سرے سے قرآن پر ایمان ہی نہیں لاتے' اور ان حقائق کے انکار میں ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں اور محض اس لیے ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ ابھی تک انہوں نے ان کا ادراک نہیں کیا ہے' تو ایسے لوگوں کا طرز عمل مضحکہ خیز ہے۔ کیونکہ سائنس ابھی تک ان حقائق کا بھی پوری طرح ادراک نہیں کر سکی۔ جو اس کے سامنے موجود ہیں۔ ان حقائق پر ابھی سائنس تجربہ کر رہی ہے۔ للذا ان حقائق کے عدم ادراک سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ موجود نہیں۔ نیز حقیقی سائنس دانوں نے اہل دین کی طرح رب عالم مجہول کو تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے' اگر وہ کتب سماوی کے طریقے پر کسی چیز کو تسلیم نہیں کرتے تو کسی چیز کا انکار بھی نہیں کرتے۔ کیوں کہ انہوں نے سائنسی تجربات کے ذریعے معلوم کر لیا ہے کہ انسان دراصل عالم الغیب کی ایک وسیع دنیا کے دروازے پر کھڑا ہے۔ جبکہ کچھ عرصہ پہلے وہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے تمام حقائق دریافت کر لیے ہیں۔ چنانچہ اب سائنس دانوں نے بھی اپنی علمی کم مائیگی کا اظہار کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور ان کا انداز اب ان مدعیان علوم سائنس کا سا نہیں ہے جو سماوی حقائق' نامعلوم حقائق کا انکار بطور فیشن کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی اس وسیع و عریض کائنات میں نامعلوم حقائق اور اسرار کے انبار لگے ہوئے ہیں اس کائنات کے اندر بے پناہ قوتیں ہیں اور یہ سورت ہمیں اس کائنات کا ایک حصہ بتاتی ہے۔ چنانچہ ان نامعلوم حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے اس کائنات کے بارے میں ہم صحیح اور متوازن تصورات ذہنوں میں رکھ سکتے ہیں۔ اس طرح اس جہاں کی مادی قوتوں' روحانی موجودات' ارواح' حیوانات' ہمارے ماحول طبیعی کے حقائق' ہماری زندگی' ہماری ذات اور ہمارے افعال کے بارے میں ہماری سوچ درست ہو جاتی ہے۔ یہ متوازن سوچ ہی ایک مسلم کو دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اچھی طرح نکھار کر ممتاز کر دیتی ہے۔ نہ وہ اوہام و خرافات کو تسلیم کرتا ہے' اور نہ وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اس کائنات کے تمام حقائق پر عبور حاصل کر لیا ہے۔ اور اس متوازن سوچ کا ماخذ' قرآن اور سنت ہیں۔ چنانچہ ایک مسلم اپنی سوچ کو قرآن اور سنت کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور تمام حقائق کو قرآن و سنت کے مطابق جانچتا ہے۔ خواہ وہ اخلاقی حقائق ہوں یا طبیعی۔

عالم نامعلوم کے میدانوں میں اترنے کے لیے اور عقل انسانی کی ترک تازیوں کے لیے متعین راستے موجود ہیں۔ اسلام عقل انسانی کو ان میدانوں میں اترنے کے لیے آگے بڑھاتا ہے۔ لیکن ان متعین راستوں اور میدانوں سے آگے کچھ ایسے جہاں بھی ہیں جہاں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے عقل کے اندر کوئی قوت نہیں ہے۔ یہ میدان عقل سے ماوراء ہیں۔ پھر عقل انسانی کو ان جہانوں تک پہنچنے کی ضرورت بھی نہیں ہے' کیونکہ اس زمین پر قدرت نے انسانوں کے لیے جو فریضہ منصبی متعین کیا ہے اور جس کے لیے انسان کی تخلیق ہوئی ہے' یعنی انسان بطور خلیفۃ اللہ فی الارض' تو اس

زاویہ سے انسانوں کو ان نامعلوم جہانوں کے بارے میں جاننے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔کیونکہ جس قدر علم کی اسے ضرورت تھی اللہ نے قرآن و سنت کے ذریعہ اسے یہ علم دے دیا ہے' تاکہ انسان اس جہاں میں ' اس زمین پر اپنے مقام اور حیثیت اور اپنے ماحول کو جان سکے 'کیونکہ یہ علوم حاصل کرنا انسان کی قدرت ہی میں نہیں ہے اور غیوبات یعنی ملائکہ ' فرشتوں ' جنات اور شیاطین سب اس زمرہ میں آتے ہیں۔ اسی طرح روح انسان ' انسان کی تخلیق اور اس کا انجام اسی دائرے میں آتے ہیں۔یہ ایسے میدان ہیں جہاں عقل انسانی صرف وحی پر بھروسہ کر سکتی ہے۔

رہے وہ لوگ جو سنت الٰہیہ کی ہدایت کی روشنی میں چلتے ہیں۔وہ ان میدانوں کے حدود پر جاکر رک جاتے ہیں جو خدا اور رسول نے انسان کو بتا دیئے ہیں۔ اللہ اور رسول ﷺ نے ان غائب جہانوں کے بارے میں انسان کو یہ شعور دیا ہے کہ یقین کر لو کہ اللہ بہت ہی عظیم ہے اور وہ بہت بڑا حکیم ہے اور یہ کہ اس جہاں میں انسان کا منصب کیا ہے؟ اور اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں انسان کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنی پہنچ کے دائرے میں ' اپنے ماحول کے اندر ہی غور و فکر کرے ' اور جس قدر اس کی طاقت میں ہے وہ کام کرے۔اور اپنی طاقت کے حدود کے اندر جس قدر ٹیکنالوجی وہ دریافت کرلے ' اسے اس جہاں میں پیداوار کے اضافے اور سہولیات حیات کی فراہمی کے لیے استعمال کرے اور یہاں اللہ کے نائب ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دے۔اللہ کی ہدایات کے مطابق کام کرے ' اللہ کی طرف اپنا رخ کرتے ہوئے چلے ' اور اس قدر بلندی اختیار کرتے ہوئے آگے بڑھے ' جس قدر اللہ نے اس کے لیے پسند کیا ہے۔

رہے وہ لوگ جو اللہ کی ہدایات کو تسلیم نہیں کرتے تو وہ دو بڑے گروہوں کی شکل میں موجود ہیں۔ایک گروہ تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے صرف اپنی عقل کے ہتھیار کو کام میں لاتا ہے۔حالانکہ عقل انسانی محدود ہے اور ذات باری لامحدود ہے۔یہ گروہ غیبی حقائق کو کتب منزلہ کی روشنی میں نہیں بلکہ اپنی عقل کے زور پر معلوم کرنا چاہتا ہے۔یہ گروہ فلاسفہ ہے ' جنہوں نے اس کائنات اور اس کے رابطوں کی عقلی توجیہ کی ہے۔ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے کچھ بچے ایک ایسے عظیم پہاڑ کی چوٹی سر کرنے کے لیے نکلیں جس کی بلندی کا علم ہی نہ ہو اور وہ گرتے پڑتے آگے بڑھ رہے ہیں یا چند بچے ہوں جنہوں نے ابھی تک حروف تہجی بھی نہ سیکھے ہوں ' لیکن وہ اس کائنات کے وجود کو دریافت کرنے کی سعی کر رہے ہوں۔انہی لوگوں میں یونان کے بڑے بڑے فلسفی شمار ہوتے ہیں اور خود مسلمانوں میں سے وہ فلسفی اور منطقی بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔جو یونانی فلاسفہ کی لائن پر سوچتے رہے ہیں۔اور اسی زمرے میں وہ جدید فلاسفہ بھی آتے ہیں جو اسلامی لائن پر نہیں سوچتے۔یہ تو رہا ' ایک گروہ۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو اس انداز فکر سے مایوس ہوگیا۔اس گروہ نے اپنے آپ کو تجربے پر مبنی علم تک محدود کر دیا۔اور یہ طبقہ تمام مجہولات سے صرف نظر کرتا ہے۔اس کی علمی دنیا میں ' ان میدانوں تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔اور اس سلسلے میں یہ طبقہ بھی قرآن و سنت سے کوئی ہدایت لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔یہ طبقہ خدا اور رسول کی ہدایت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار اس لیے نہیں ہوتا کہ یہ سمجھتا ہے کہ انسان کے لیے خدا کا تجرباتی ادراک ممکن نہیں ہے۔اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی علمی دنیا پر یہ طبقہ چھایا رہا۔لیکن بیسویں صدی کے آغاز سے اس طبقے نے معلوم کر لیا کہ اس کا یہ علمی غرور بھی لاعلمی پر مبنی ہے۔اس لیے کہ اس طبقے کے لوگ اس مادے پر تجرباتی کام کرتے کرتے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ مادہ بھی دراصل ایک نور اور چمک سے قریب ہے اور نور اور چمک کا بھی وہ ابھی تک حقیقی ادراک نہیں کر سکے۔اور نور کا قانون اور

اس کی حقیقت بھی دراصل انسان کے دائرۂ ادراک سے ماوراء ہے۔ اس لیے بیسویں صدی کے طبیعی سائنس دانوں کو بھی اپنی تنگ دامانی کا اچھی طرح ادراک ہو گیا ہے۔

اس کے بعد یہ جنات اللہ کی ہدایت کے حوالے سے' اپنا حال اور موقف بیان کرتے ہیں۔ یہ کہ وہ بھی بعینہ انسانوں کی طرح' ہدایت و ضلالت کی استعداد رکھتے ہیں اور انسانوں کی طرح ذمہ دار مخلوق ہیں۔ یہاں وہ رب تعالیٰ کے بارے میں اپنا عقیدہ بتاتے ہیں کہ ہم جو ایمان لائے ہیں وہ یہ ہے اور وہ اپنا نظریہ ہدایت و ضلالت واضح طور پر پیش کرتے ہیں۔

وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآىِٕقَ قِدَدًا ﴿۱۱﴾ وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ﴿۱۲﴾ وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤى اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا ﴿۱۳﴾ وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓىِٕكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾ وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾

"اور یہ کہ "ہم میں سے کچھ لوگ صالح ہیں اور کچھ اس سے فروتر ہیں' ہم مختلف طریقوں میں بٹے ہوئے ہیں"۔ اور یہ کہ "ہم سمجھتے تھے کہ نہ زمین میں ہم اللہ کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ بھاگ کر اسے ہرا سکتے ہیں"۔ اور یہ کہ "ہم نے جب ہدایت کی تعلیم سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اب جب کوئی بھی اپنے رب پر ایمان لے آئے گا اسے کسی حق تلفی یا ظلم کا خوف نہ ہو گا"۔ اور یہ کہ "ہم میں سے کچھ مسلم (اللہ کے اطاعت گزار) ہیں اور کچھ حق سے منحرف۔ تو جنہوں نے اسلام (اطاعت کا راستہ) اختیار کر لیا' انہوں نے نجات کی راہ ڈھونڈ لی اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں"۔

یہ توضیحات کہ جنوں میں سے بعض لوگ اچھے ہیں اور بعض برے ہیں' بعض مسلم ہیں اور بعض منکر حق ہیں۔ یہ بتاتی ہیں کہ جن بھی دوہری شخصیت کے مالک ہیں' جس طرح انسان دوہری شخصیت کا مالک ہے' جو نیکی اور بدی دونوں کی استعداد رکھتا ہے' ہاں جنوں میں سے بعض لوگ خالص شر اور خالص بدی کے مجسم ہو گئے' مثلاً ابلیس اور اس کے قبیلے کے لوگ' ان توضیحات کی بڑی اہمیت ہے اور ان کی وجہ سے اس مخلوق کے بارے میں ہمارے خیالات درست ہو جاتے ہیں' کیونکہ اکثر لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جن صرف شرارت کی فطرت رکھتے ہیں اور صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جس کے اندر خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں۔ اور انسانوں کے یہ خیالات اس لیے تھے کہ ان کو قرآن کی فکری اصلاح پر غور کرنے کا موقعہ نہ ملا تھا لیکن قرآن کی ان توضیحات کے بعد تو انسانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے خیالات کو درست کر لیں۔

جنوں کے اس گروہ کا قول ہے :

وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ (۷۲ : ۱۱) "اور یہ کہ ہم میں کچھ لوگ صالح ہیں اور کچھ اس سے فروتر ہیں"۔ اور اپنا عمومی حال وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا (۷۲ : ۱۱) "ہم مختلف طریقوں میں بٹے ہوئے ہیں"۔ یعنی ہر شخص نے اپنے لیے ایسا طریقہ اپنا لیا ہے جو دوسرے سے مختلف ہے اور کٹا ہوا ہے اور وہ ایمان لانے سے پہلے کے اپنے عقائد یوں بیان کرتے ہیں۔

وَّ اَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا (۷۲ : ۱۲) "اور یہ کہ ہم سمجھتے تھے کہ نہ زمین میں ہم اللہ کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ بھاگ کر اسے ہرا سکتے ہیں"۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ کو اس زمین میں ان پر پوری پوری قدرت حاصل ہے۔ یہ بھی وہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ اللہ سے بھاگ بھی نہیں سکتے۔ یعنی بندہ رب کے سامنے بہت ضعیف ہے۔ اور تمام مخلوق خالق کا مقابلہ نہیں کر سکتی یعنی اسلام لانے سے پہلے بھی یہ گروہ اللہ کی قدرت اقتدار اور غلبے کا شعور رکھتا تھا۔

یہ تھے وہ جن، جن کے ہاں بعض انسان دور جاہلیت میں پناہ لیتے تھے۔ اور مشرکین عرب تو اپنی حاجات میں جنوں کو پکارتے تھے اور انہوں نے ان جنوں اور رب تعالیٰ کے درمیان رشتہ داری کا عقیدہ بھی تصنیف کر لیا تھا۔ جبکہ یہ جنات اپنی عاجزی اور اللہ کی قدرت کا اقرار کرتے ہیں۔ یہ اپنی ضعیفی اور اللہ کے اقتدار کی بات کرتے ہیں۔ یہ اپنی عاجزی اور اللہ کی قہاری و جباری کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ بات وہ صرف اپنی قوم سے ہی نہیں کہتے بلکہ مشرکین مکہ سے بھی کہتے تھے کہ حقیقی قوت صرف اللہ کے پاس ہے جو اس کائنات کو تھامے ہوئے ہے۔

اور اب وہ ہدایت کا پیغام سننے اور سمجھنے کے بعد یہ کہتے ہیں:

وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ (۷۲ : ۱۳) "اور یہ کہ ہم نے جب ہدایت کی تعلیم سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے"۔ اور ہدایت کا پیغام سننے والے ہر شخص کا فریضہ یہی ہے۔ یہ لوگ قرآن کو یہاں ہدایت کا نام دیتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کی اصل ماہیت ہدایت ہی ہے اور اس کا نتیجہ بھی ہدایت ہے --- اور ان کو اپنے رب پر پورا اعتماد بھی ہے۔ جس طرح ہر ایمان لانے والے کو اپنے آقا پر ہونا چاہئے۔

فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا (۷۲ : ۱۳) "اب جو کوئی بھی اپنے رب پر ایمان لائے گا، اسے کسی حق تلفی یا ظلم (یعنی طاقت سے زیادہ کام دینے) کا خوف نہ ہو گا"۔ ایک مومن ایمان کے بعد اللہ پر پورا پورا بھروسہ کرنے لگتا ہے۔ اور اسے اللہ کے عدل پر پورا بھروسہ ہوتا ہے اور یہی ہے ایمان کی حقیقت کہ اللہ عادل ہے۔ وہ کسی مومن کا حق نہیں مارتا۔ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ نہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ ڈیوٹی دیتا ہے۔ اللہ مومن بندے کو اس کے استحقاق سے ذرہ بھر بھی محروم نہیں کرتا۔ اور اللہ اپنے بندے کو رھق سے بھی بچاتا ہے۔ رھق کے معنی ہیں طاقت سے زیادہ جہد و مشقت میں ڈالنا۔ لہٰذا کوئی اور شخص بھی ایک مومن پر ظلم کرنے کی جرات نہ کر سکے گا کیونکہ مومن اللہ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک مومن بعض اوقات اس دنیا کی سہولیات سے محروم

رہتا ہے لیکن یہ محرومیاں "بخس" کے مفہوم میں نہیں آتیں ـ بعض اوقات ایک مومن کو اذیتیں بھی دی جاتی ہیں اور یہ اس زمین کی بعض چھوٹی قوتوں کی طرف سے ہوتی ہیں ـ لیکن یہ اذیتیں رہق کے مفہوم میں داخل نہیں ہیں کیونکہ اللہ کو معلوم ہے کہ کون کس قدر مشقت برداشت کرنے کا اہل ہے اور کون کس قدر سہولیات کا اہل ہے ـ اور اللہ بعض بندوں کو مشقتوں میں ڈال کر ان کو اپنے قریب کرتا ہے ـ اور یہ ان کے لیے مفید ہوتی ہیں ـ

لہٰذا ایک مومن نفسیاتی لحاظ سے حق تلفی اور قوت برداشت سے زیادہ مشقت اٹھانے سے محفوظ ہوتا ہے ـ اس لیے اسے ـ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا (۷۲: ۱۳) کسی حق تلفی سے بھی نہیں ڈرنا چاہئے اور یہ خیال بھی نہیں کرنا چاہئے کہ اس پر اس کی قوت برداشت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا گیا ہے ـ یہ تصور انسان کے اندر اطمینان، آرام اور سکون پیدا کر دیتا ہے ـ انسان قلق، چبھن اور بے چینی محسوس نہیں کرتا ـ یہاں تک کہ وہ اگر مشقت میں ہو پھر بھی جزع فزع نہیں کرتا، نہ ڈرتا ہے، نہ اپنے اوپر دروازے بند کرتا ہے ـ وہ مشقت کو آزمائش سمجھتا ہے ـ صبر کرتا ہے اور اللہ سے فراخی کی امید رکھتا ہے ـ اور اس پر بھی اسے اجر ملتا ہے ـ لہٰذا امارت و غربت اور ضعف و قوت دونوں حالتوں میں وہ فائدے میں رہتا ہے ـ اور اسے کوئی نقصان نہیں ہوتا ـ اور جنوں کے اس گروہ نے اس حقیقت کو بہت ہی اچھے انداز سے ذہن نشین کرایا اس کے بعد یہ لوگ اب ہدایت و ضلالت کی حقیقت ذہن نشین کراتے ہیں اور ہدایت و ضلالت پر جزاء و سزا کا ذکر کرتے ہیں:

وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا (۱۴) وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (۷۲: ۱۵) "اور یہ کہ "ہم میں سے کچھ مسلم (اللہ کے اطاعت گزار) ہیں اور کچھ حق سے منحرف ـ تو جنوں نے اسلام (اطاعت کا راستہ) اختیار کر لیا انہوں نے نجات کی راہ ڈھونڈ لی اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں" ـ قاسط کے معنی ظالم اور حق سے ایک طرف ہونے والے عدل و نیکی سے منحرف ہونے والے کے ہیں ـ جنوں نے ان کو مسلمانوں کے مقابل لاکر ذکر کیا ہے اور اس کے اندر ایک لطیف اشارہ ہے، کہ ایک مسلمان عادل اور مصلح ہوتا ہے اور اس کا فریق مقابل ظالم اور مفسد ہوتا ہے ـ

فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا (۷۲: ۱۴) "جس نے اسلام کی راہ لی اس نے نجات کی راہ ڈھونڈ لی" ـ یہاں ان کے اس فعل کو لفظ "تحروا" سے تعبیر کیا ـ نہایت گہری سوچ سے راہ ہدایت تلاش کرنا ـ اور اس کے بالمقابل ہے گمراہی اور ضلالت ـ "تحری" کے معنی ہوتے ہیں نہایت دقت سے راہ صواب کو اختیار کرنا اچھی طرح سوچ کر اور اچھی چھان بین کر کے ـ یہ نہیں کہ جدھر منہ ہوا ادھر چل دیا ـ بغیر سوچ سمجھ کے، یعنی اسلام قبول کرتے ہی وہ راہ صواب تک پہنچ گئے ـ اشارہ اس طرف ہے کہ اسلام عین راہ نجات ہے اور یہ بہت ہی خوبصورت اشارہ ہے ـ

وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (۷۲: ۱۵) "اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں" ـ یعنی ان کے جہنمی ہونے کا فیصلہ ہو گیا ہے اور جب یہ جہنم میں پھینکے جائیں گے تو جہنم کی آگ

ان کی وجہ سے اس طرح تیز ہو گی جس طرح خشک ایندھن کی وجہ سے آگ زیادہ مشتعل ہو جاتی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جنات کو بھی جہنم کا عذاب ہو گا۔ اور یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ نیک جن جنت کے بھی مستحق ہوں گے۔ یہی حقیقت ہے' کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس کے سوا کسی اور چیز کا عقیدہ اختیار کرے۔ اگر کوئی کرتا ہے تو وہ باطل ہو گا اور جو کچھ قرآن کہتا ہے بلاجدال درست ہو گا۔ لہٰذا جو بات جنوں پر صادق ہے وہی انسانوں کا انجام بھی ہو گا۔

یہاں تک تو قرآن نے جنوں کی باتیں ان کے اپنے الفاظ میں نقل کیں۔ لیکن اب باری تعالیٰ کی طرف سے ان کے مقالات کا خلاصہ پیش ہوتا ہے کہ وہ یوں بھی کہتے ہیں کہ جو مخلوق بھی راہ استقامت اختیار کرے گی اللہ کا اس کے ساتھ یہی سلوک ہو گا۔

وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾

"اور لوگ اگر راہ راست پر ثابت قدمی سے چلتے تو ہم انہیں خوب سیراب کرتے تاکہ اس نعمت سے ان کی آزمائش کریں اور جو اپنے رب کے ذکر سے منہ موڑے گا اس کا رب اسے سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا"۔

اللہ فرماتا ہے کہ جن ہمارے متعلق یہ کہتے تھے کہ اگر لوگ یا ظالم اور کافر لوگ راہ راست پر آجائیں تو ہم ان کو خوب سیراب کریں۔ اور یوں ان کے رزق میں اضافہ ہو' تاکہ "ہم" ان کو آزمائیں کہ شکر ادا کرتے ہیں یا ناشکری کرتے ہیں۔

طرز ادا میں یہ تبدیلی کہ جنوں کے قول کو نقل کرنے کے بجائے جنوں کے قول کا مفہوم قرآنی الفاظ میں ادا کیا گیا اور جنوں کی بات تو اس طرح قرآن کریم میں کئی جگہ آتی ہے اور اس سے کلام میں تاکید مزید پیدا کرنا مطلوب ہوتا ہے اور قاری اس طرف زیادہ متوجہ ہوتا ہے۔

توجہ مبذول کرانے کے اس نوٹ میں کئی حقائق ہیں' جن کے مطابق ایک مومن کا ایمان تشکیل پاتا ہے اور ان کے مطابق وہ معاملات کے فیصلے کرتا ہے اور واقعات کے باہم روابط متعین کرتا ہے۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ اقوام اور سوسائٹیاں اور معاشرے کس طرح صراط مستقیم پر قائم رہ کر اللہ تک پہنچ سکتی ہیں۔ اور پھر وصول الی اللہ اور پیداوار میں اضافہ اور خوشحالی کے حصول کے درمیان ربط کیا ہے جبکہ خوشحالی کا سبب اول آبپاشی کا انتظام اور کثرت ہے جہاں تک زندگی کا تعلق ہے وہ تو پانی سے تشکیل پاتی ہے۔ آج ہمارے صنعتی دور میں بھی خوشحالی کا دارومدار بہرحال پانی اور سیرابی پر ہے۔ اگرچہ صرف زراعت پر زندگی موقوف نہیں رہی ہے۔ لیکن پھر بھی تعمیر و ترقی کا مدار پانی ہی پر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ راہ راست پر قائم رہے تو نہ صرف وہ ترقی یافتہ اور خوش حال ہو جاتا ہے بلکہ ایسے لوگوں کو زمین پر اقتدار اعلیٰ بھی حاصل ہوتا ہے' امت عربیہ.

اس کی واضح مثال ہے کہ ایام جاہلیت میں جزیرۃ العرب کے درمیان یہ نہایت پسماندہ زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن جب وہ راہ راست پر چل پڑے تو ان کے لیے ایسی زمینوں کے دروازے کھل گئے جہاں پانی بڑی مقدار میں مہیا تھا اور جب یہی عرب بدعمل ہو گئے اور انہوں نے راہ راست سے انحراف اختیار کیا تو وہ دوبارہ پسماندہ ہو گئے اور اس لیے وہ اس وقت بدحال ہیں۔ اور یہ اس وقت تک بدحال رہیں گے جب تک یہ دوبارہ راہ راست پر نہیں آجاتے۔ اور جب بھی یہ آئے ان پر خوشحالی آجائے گی اور ان کو زمین میں تمکن حاصل ہو گا۔

اگر ایسی اقوام کہیں موجود ہوں جو راہ راست پر نہ ہوں اور پھر بھی وہ باوسائل ہوں، تو اللہ ان پر دوسرے عذاب مسلط کر دے گا اور وہ کئی آفات و بلیات سے دوچار ہوں گی۔ ایسی اقوام انسانیت، اقدار، انسانی شرف اور کرامت کے اعتبار سے گر جائیں گی۔ یوں ان کی یہ خوشحالی اور مادی ترقی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ اور ان کی زندگی تلخ، اور پر مشقت ہوگی۔ ایسی اقوام انسانی شرف سے محروم ہوں گی۔ اور ان کو زندگی میں کوئی اطمینان نہ ہو گا۔ اس مضمون کی تشریحات ہم سورہ نوح میں کر آئے ہیں۔

اور اس نوٹ سے جو دوسری حقیقت ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ خوشحالی اور تمکین فی الارض بھی دراصل ایک ابتلا ہے، ایک آزمائش ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کو اچھے اور برے حالات کے ذریعہ آزماتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خوشحالی میں اللہ کا شکر ادا کرنا بہت مشکل کام ہے بہ نسبت اس کے کہ کوئی بدحالی پر صبر کرے، جبکہ بادی النظر میں انسان کی توجہ ایک طرف ہو جاتی ہے، اس کی مدافعانہ قوتیں مجتمع ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اپنی پوری قوتوں کو صورت حالات کی مدافعت میں لگا دیتا ہے۔ مثلاً وہ اللہ کو یاد کرتا ہے، اللہ سے دعا کرتا ہے، اور اللہ سے ان مشکل حالات میں مدد طلب کرتا ہے جبکہ تمام دنیاوی سہارے ختم ہوتے ہیں تو انسان اللہ کا سہارا لیتا ہے۔ رہی خوشحالی تو وہ انسان کو غافل کر دیتی ہے، انسان فضولیات میں مشغول ہو جاتا ہے۔ انسانی احساسات ہو جاتے ہیں، قوت مدافعت سو جاتی ہے اور انسان کے لیے غفلت اور بے راہ روی کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں۔ اور انسان بڑی سہولت سے شیطان کے پھندے میں پھنس جاتا ہے۔

جب انسان پر خوشحالی اور نعمتوں کی کثرت کی آزمائش آجائے تو اسے ہروقت چوکنا رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مال و دولت بسااوقات انسان کو سرکشی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ انسان اللہ کا شکر نہیں کرتا، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بخیل ہو جاتا ہے اور دنیاوی اخراجات میں اسراف کرنے لگتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں زندگی کے توازن کے لیے عذاب بن جاتی ہیں۔ اسی طرح اقتدار کی قوت بھی اکثر اوقات انسان کو اندھا کر دیتی ہے، وہ ظالم اور سرکش ہو جاتا ہے، وہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے، اور حدود سے آگے بڑھتا ہے۔ لوگوں پر دست درازی کے بعد ایسا شخص پھر اللہ کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے۔ اسی طرح مال و جمال کے فتنے انسان کو کبر و غرور اور بے راہ روی اور بدعملی اور بدکرداری اور فسق و فجور میں مبتلا کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی ذکی اور ذہین ہے تو وہ دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے اور پر خود غلط ہو جاتا ہے اور وہ اعلیٰ قدروں کو پامال کرتا ہے۔ غرض ہر نعمت آزمائش ہے الا یہ کہ کوئی بروقت اللہ کو یاد کرے اور اللہ کی پناہ طلب کرے۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ ذکر الٰہی سے اعراض کے نتیجے میں ایک طرف انسان خوشحالی میں آزمایا جاتا ہے تو دوسری طرف وہ عذاب اخروی میں بھی مبتلا ہو گا۔ قرآن کریم اس کی تصریح کرتا ہے۔

يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ( ٧٢ : ١٧ ) "اس کا رب اسے سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا"۔ یعنی یہ عذاب بہت شدید ہو گا ' جس طرح ایک آدمی چڑھائی چڑھ رہا ہو تو وہ مشکل محسوس کرتا ہے۔ جوں جوں چڑھتا ہے اس کے لیے رفتار مشکل ہوتی جاتی ہے۔ قرآن کریم نے کئی جگہ شدت عذاب کی تعبیر چڑھائی چڑھنے کے ساتھ کی ہے۔ ایک دوسری جگہ ہے۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ( ٦ - ١٢٥ ) "پس جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے۔ اور ایسا بھینچتا ہے کہ اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا وہ آسمانوں کی طرف چڑھ رہا ہے"۔ اور دوسری جگہ ہے۔

سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ( المدثر - ١٧ ) "میں عنقریب اسے ایک کٹھن چڑھائی چڑھاؤں گا"۔

یہ تیسری آیت ہو سکتی ہے کہ یہ جنوں کے قول کی حکایت ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ کا کلام ہو۔

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿١٨﴾

"اور یہ کہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں ' لہٰذا ان میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سجدہ بھی صرف اللہ کے لیے ہے اور مقامات سجود ' مساجد بھی اللہ کی ملکیت ہیں۔ لہٰذا اسلام مکمل توحید کا قائل ہے۔ اللہ کے سوا کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کسی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اور اللہ کی توحید کے سوا تمام اعتبارات اور تمام حیثیات ہیچ ہیں۔ لہٰذا کسی کے ہاں کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ اور نہ کسی سے طلب کرنا چاہئے اور نہ اللہ کے سوا کسی اور کو اپنے قلب میں استحضار دینا جائز ہے۔ اگر یہ آیت جنوں کا مقولہ ہے تو پھر یہ جنوں کی اس بات کی تاکید ہے۔

وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا اَحَدًا ( ٧٢ : ٢ ) "اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے"۔ خصوصاً عبادت اور ذکر و فکر کے مقام میں بالخصوص سجدہ ریزی میں۔ اور اگر یہ ابتداء ہی سے کلام الٰہی ہے تو پھر موقعہ کی مناسبت سے اللہ کی طرف سے ہدایت ہے اور یہ قرآن کا انداز ہے کہ وہ برمحل ہدایت دے دیتا ہے اور اسی طرح اگلی آیت : ا

١٩ع وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴿١٩﴾

١١ "اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو گئے"۔

یعنی سب جمع ہو کر اور جتھا بنا کر اس وقت اس پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار ہو گئے جب وہ اللہ کو پکارنے کے لیے یعنی اللہ کے سامنے نماز ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوا۔ نماز یعنی صلوٰۃ کے معنی دعا کے ہیں۔ صلوٰۃ کے اصلی معنی ہی دعا کے ہیں۔ اگر یہ آیت جنوں کا قول ہو تو اللہ کی جانب سے ان کی بات کی حکایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوتے اور تلاوت کرتے تو مشرکین مکہ آپ کے ارد گرد جمع ہو جاتے جیسا کہ سورۃ المعارج میں ہے۔

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ (٣٦) عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ (٣٧) (٧٠: ٣٦ - ٣٧) "پس اے نبی کیا بات ہے' کہ یہ منکر دائیں اور بائیں سے گروہ در گروہ تمہاری طرف دوڑے چلے آتے ہیں"۔ اور نہایت حیرانی سے قرآن سنتے ہیں اور قبول نہیں کرتے۔ یا وہ ادھر ادھر سے آپ پر حملہ آور ہونے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ آپؐ کو ان سے بچاتا ہے اور ایسے مواقع بارہا پیش آئے۔ اگر یہ جنوں کا قول ہے تو وہ اپنی قوم کے سامنے مشرکین مکہ کے رویہ پر تعجب کا اظہار کر رہے ہیں اور اگر ابتداء ہی سے کلام الٰہی ہے تو یہ حکایت جنوں کی حالت کی بھی ہو سکتی ہے کہ وہ نہایت حیرانی اور دہشت کی حالت میں آپ کے ارد گرد جمع ہوتے ہیں' کلام سنتے ہیں' تعجب کرتے ہیں اور یہ رسول اللہ کے ارد گرد اس طرح جمع ہوتے ہیں جس طرح اونی کپڑے کے بنے ہوئے بال ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ مفہوم اس تعجب' حیرانی اور دہشت کے زیادہ مناسب ہے جو جنات کے پورے کلام کے دوران موجود رہی ہے۔ کیونکہ جنات کا پورا کلام در حقیقت اظہار تعجب اور اچنبھے کا نمونہ ہے۔ واللہ اعلم!

اسلامی دعوت اور قرآن کے کلام کے بارے میں جب جنوں کا کلام یہاں آکر ختم ہوتا ہے' جس میں جنوں نے اپنے تعجب کا اظہار کیا' جس میں ان کے شعور اور ان کی سوچ میں ارتعاش پیدا ہوا اور انہوں نے دیکھا کہ ارض و سما اور جنات و فرشتے اور ستارے اور سیارے سب کے سب اس عظیم دعوت اور اس عظیم کلام کے حوالے سے متحرک ہیں۔ کائنات کا یہ عظیم نظام بھی اس کی وجہ سے متاثر ہو گیا ہے اور یہ ایک نہایت اہم اور سنجیدہ تحریک ہے۔ تو اس کے ساتھ ہی روئے سخن اب نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کو نہایت ہی دوٹوک' فیصلہ کن اور اٹل ہدایات دی جاتی ہیں کہ آپ تبلیغ کے لیے خالص ہو جائیں اور یہ کہہ دیں کہ میں کسی کے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں۔ نہ میں غیب دانی کا مدعی ہوں' نہ میں لوگوں کی تقدیر بدل سکتا ہوں۔ یہ بات نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ اور شکایت کے انداز میں کی جاتی ہے۔ نہایت سختی اور فیصلہ کن انداز میں:

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴿٢٠﴾ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿٢١﴾ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ڏ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿٢٢﴾ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴿٢٣﴾ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ﴿٢٤﴾ قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا ﴿٢٥﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰي غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿٢٦﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿٢٧﴾ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ

۲

۹ع رَبِّهِمْ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَ اَحْصٰى كُلَّ شَىْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾

۱۲

"اے نبیؐ کہو کہ "میں تو اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا"۔ کہو "میں تم لوگوں کے لیے کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں نہ کسی بھلائی کا"۔ کہو "مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی بچا نہیں سکتا اور نہ میں اس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں۔ میرا کام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی بات اور اس کے پیغامات پہنچا دوں۔ اب جو بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات نہ مانے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے اور ایسے لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔ (یہ لوگ اپنی اس روش سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کس کا جتھا تعداد میں کم ہے۔ کہو "میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی لمبی مدت مقرر فرماتا ہے۔ وہ عالم الغیب ہے' اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا' سوائے اس رسول کے جسے اس نے (غیب کا علم دینے کے لیے) پسند کر لیا ہو' تو اس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے تاکہ وہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے' اور وہ ان کے پورے ماحول کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے"۔

اے محمدؐ آپ یہ اعلان کر دیں۔

اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا (۷۲ : ۲۰) "میں تو اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا"۔ یہ اعلان اس وقت آتا ہے جب جنات بھی اپنی قوم کے سامنے یہ اعلان کرتے ہیں۔

وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (۷۲ : ۲) "اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے"۔ یوں اس اعلان کا بہت اثر ہو گا۔ اور یہ اعلان بیک وقت جن و انس کا اعلان ہو جائے گا۔ اور یہ اعلان دونوں کی شناخت ہو گا۔ اور جو شخص اس اعلان سے برات کرے گا وہ گویا جن و انس دونوں سے اپنے آپ کو علیحدہ کر دے گا۔ وہ دونوں جہانوں اور دونوں آبادیوں سے دور ہو گا۔

قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا (۷۲ : ۲۱) "کہو' میں تم لوگوں کے لیے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں نہ کسی بھلائی کا"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ خالص اللہ کے لیے ہو جائیں اور ہر قسم کے دعوے سے دستبردار ہو جائیں اور صاف صاف اعلان کر دیں کہ اللہ کی خصوصیات میں سے کوئی خصوصیت بھی مجھے حاصل نہیں ہے بلکہ یہ کہ میں بندہ ہوں اور اللہ کے لیے کوئی شریک نہیں ٹھہراتا۔ یہ صرف اللہ ہے جو انسانوں کے نفع و نقصان کا مالک ہے۔ یہاں قرآن مجید ضرر اور مضرت کے مقابل رشد و ہدایت کو لایا اور یہی بات جنات نے بھی کہی تھی۔

وَّ اَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا (۷۲ : ۱۰) "اور یہ

کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ زمین والوں کے ساتھ کوئی بڑا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کا رب انہیں راہ راست دکھانا چاہتا ہے؟" یوں دونوں آیات اور دونوں اقوال کے درمیان مناسبت پیدا ہو گئی ۔ الفاظ میں بھی اور مفہوم میں بھی اور یہ مناسبت قصے اور اس پر تبصرے دونوں میں مقصود ہے ۔

یہاں قرآن کریم جنات سے بھی اس بات کی نفی کر دیتا ہے کہ وہ کسی کو نفع یا نقصان دے سکتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں بھی یہ تردید کر دی جاتی ہے کہ آپؐ کسی کو نفع یا نقصان دے سکتے ہیں اور نفع و نقصان دینا اللہ کی خصوصیت قرار پاتا ہے ۔ یوں اسلامی عقیدہ اور اسلامی تصور حیات صاف ستھرا ہو کر سامنے آ جاتا ہے ۔

قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (۲۲) اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ (۷۲ : ۲۳) "کہو" مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی بچا نہیں سکتا اور نہ میں اس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں ۔ میرا کام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی بات اور اس کے پیغامات پہنچا دوں" ۔ یہ ایک نہایت ہی خوفناک دھمکی ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالت کا معاملہ کس قدر نازک اور سنجیدہ ہے ۔ رسالت اور دعوت اسلامی نہایت حساس امور ہیں ۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اس بات کا اعلان کر دیں کہ مجھے اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی نہیں ہے ۔ اور اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں ' بچنے کی صورت صرف یہ ہے کہ میں تبلیغ کروں میرے پاس اللہ کی جو امانت ہے اسے پہنچا دوں ۔ یہی ایک معاملہ ہے جس کی گارنٹی دے دی گئی ہے ۔ اس معاملے میں میرے اختیارات نہیں ۔ میں تو صرف تبلیغ پر مامور ہوں اور اس کے سوا میرے لیے کوئی اور صورت نہیں ہے ۔ کیونکہ یہ تو لازمی سروس ہے ۔ اور میں اس سے کہیں بھاگ نہیں سکتا ۔ نہ کوئی جائے پناہ ہے ۔ ایسی پناہ گاہ جہاں میں بچ سکوں ۔ میرے لیے صرف یہ صورت ہے کہ میں اپنا فریضہ ادا کرتا رہوں ۔

ذرا غور کیجئے کس قدر نازک ' سنجیدہ اور خوفناک معاملہ ہے رسالت اور دعوت کا ۔ یہ کوئی رضاکارانہ معاملہ نہیں ہے کہ کوئی چاہے تو دعوت پیش کرے اور کوئی نہ چاہے تو چھوڑ دے ۔ یہ ایک لازمی سروس کی ڈیوٹی ہے ۔ نہایت حساس ڈیوٹی ہے ۔ اللہ دیکھ رہا ہے اور اللہ سے کوئی کہیں بھاگ نہیں سکتا ۔ یہ کوئی ذاتی شغل اور ہابی (Hobby) بھی نہیں ہے کہ کوئی ذاتی خوشی اور حصول لذت کے لیے یہ کام کرے تو یہ حاکم مطلق کا حکم ہے ۔ اور اس سے روگردانی نہیں کی جا سکتی ۔ نہ اس میں کوئی تردد کر سکتا ہے ' یوں دعوت اسلامی کی نوعیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ رسول کے بعد کے انسانوں میں آنے والے داعی بھی از سر نو اس کی حیثیت کو سمجھیں کہ یہ ایک لازمی فریضہ ہے اور نہایت حساس ' سنجیدہ معاملہ ہے اور اللہ جو کبیر اور متعال ہے ' خود اس کا نگران ہے ۔

وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا (۲۳) حَتّٰۤی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا (۷۲ : ۲۴) "اب جو بھی اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی بات نہ مانے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے اور ایسے لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے" ۔

(یہ لوگ اپنی اس روش سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جارہا ہے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کس کا جتھا تعداد میں کم ہے"۔

یہ ظاہری اور درپردہ دونوں انداز میں ایک خوفناک تہدید اور ڈراوا ہے' ان لوگوں کے لیے جن کے پاس یہ پیغام پہنچ جائے اور وہ اس سے روگردانی کریں جبکہ اس سے قبل ان لوگوں کو سخت تنبیہہ کر دی گئی کہ جو قبول کر لیں پھر وہ دوسروں تک نہ پہنچائیں۔

اگر مشرکین کو یہ ناز ہے کہ وہ قوت رکھتے ہیں اور ان کی تعداد زیادہ ہے اور وہ اس کا مقابلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی کمزور قوت اور قلت تعداد سے کرتے ہیں تو ان کو جلد ہی اپنی قوت کا اندازہ ہو جائے گا' جب وہ اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے جس سے ان کو ڈرایا جارہا ہے۔ یا تو دنیا ہی میں دیکھ لیں گے اور یا آخرت میں دیکھ لیں گے کہ۔

مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّ اَقَلُّ عَدَدًا (۷۲ : ۲۴) "کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کس کا جتھا تعداد میں کم ہے"۔ کون ضعیف' ناتواں اور بے وقار ہے۔ اور کون زور آور ہے۔

اب ذرا پیچھے لوٹیے کہ جنات نے کیا کہا تھا:

وَّ اَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا (۷۲ : ۱۲) "اور یہ کہ ہم سمجھتے تھے کہ نہ زمین میں ہم اللہ کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ بھاگ کر اسے ہرا سکتے ہیں"۔ یوں اس قصے پر تبصرہ کے الفاظ قصے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ گویا اس پورے قصے کا مقصد ہی یہ تھا کہ اس پر یہ تبصرہ کیا جائے کہ اللہ کو کوئی ہرا نہیں سکتا۔

اب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ طاقت کے علاوہ اپنے بارے میں علم غیب کی بھی نفی کر دیں۔

قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا (۷۲ : ۲۵) "کہو' میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی لمبی مدت مقرر فرماتا ہے"۔ دعوت کے معاملات میں آپ کا کوئی اختیار نہیں اور نہ اس میں آپ کا کوئی ذاتی حق ہے۔ آپ کا کام صرف یہ ہے کہ تبلیغ کریں۔ اور اپنے آپ کو اس طرح محفوظ خطے میں داخل کر دیں اور محفوظ خطے میں وہی شخص داخل ہو سکتا ہے جو تبلیغ کا حق ادا کر دے۔ اور تکذیب اور نافرمانی پر اللہ جس برے انجام سے ڈراتا ہے وہ بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔ آپ کو اس میں بھی کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ نہ آپ کو اس کا کوئی وقت وقوع معلوم ہے کہ وہ قریب ہے یا دور ہے؟ یہ سب غیبی امور ہیں اور ان کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ان امور کا علم اللہ کے لیے مخصوص ہے۔

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا (۷۲ : ۲۶) "وہ عالم الغیب ہے' اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا"۔ یوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے الوہیت کی تمام صفات کی نفی کر دی جاتی ہے اور آپ صرف بندہ مختار

رہ جاتے ہیں اور کسی انسان کے لیے بندگی سے بڑا کوئی وصف اور اعزاز نہیں ہو سکتا۔ بندگی اور عبودیت انسان کے مراتب و درجات میں سے اعلیٰ مرتبہ اور درجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طرح نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو الوہیت کی تمام صفات سے مبرا کر دیا جاتا ہے اور حکم دے دیا جاتا ہے کہ آپؐ تبلیغ کریں۔ "کہو' میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے' وہ قریب ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی لمبی مدت مقرر فرماتا ہے۔ وہ عالم الغیب ہے اور اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا"۔

اس سے فقط ایک استثناء ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کسی غیب کے بارے میں اجازت دے دے اور اس سے کسی رسول کو مطلع کر دیا جائے۔ اور یہ بھی ان معاملات کے بارے میں جن کا تعلق آپ کی دعوت کے فرائض سے ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف جن باتوں کا پیغام آتا تھا تو وہ بھی غیبی امور ہی تھے۔ اپنے وقت میں حضورؐ پر ایک مقدار کے مطابق احکام آتے تھے اور پھر رسولوں کی بھی آگے پیچھے سے نگرانی کی جاتی تھی کہ ان پر جو غیب آیا ہے انہوں نے اس کی تبلیغ کر دی ہے یا نہیں۔ حضور اکرمؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اس بات کا اعلان بھی کر دیں اور نہایت صراحت اور سنجیدگی کے ساتھ اور نہایت ہی خشوع کے ساتھ کر دیں۔

اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا (۲۷) لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَ اَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا (۷۲ : ۲۸) "سوائے اس رسول کے جسے اس نے (غیب کا علم دینے کے لیے) پسند کر لیا ہو' تو اس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے تاکہ وہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے' اور وہ ان کے پورے ماحول کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے"۔ پس وہ رسول جن کو وہ اپنی دعوت کے پہنچانے کے لیے چن لیتا ہے ان کو اللہ اپنے عالم غیب میں سے کچھ بتا دیتا ہے اور وہ پہلو وہی ہے جو وحی پر مشتمل ہے۔ یعنی وحی کے موضوعات' اس کا طریقہ یعنی وہ فرشتے' جو وحی اٹھا کر لاتے ہیں اور وہ سرچشمہ جس سے وہ لاتے ہیں یعنی لوح محفوظ اور اس کا نظام حفاظت جس کا ذکر ہوا اور وہ دوسرے امور جن کا تعلق رسول کی رسالت اور دعوت کے ساتھ ہے۔ یہ تمام امور غیبی امور ہیں اور انسانوں میں سے کوئی ان کے بارے میں نہیں جانتا۔ (لہٰذا رسول کو جو غیب دیا جاتا ہے وہ وحی الٰہی سے متعلق ہوتا ہے)

اور اس کے ساتھ ساتھ رسولوں کے اردگرد اللہ کے نگران مقرر کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ نگران ان کی حفاظت بھی کرتے ہیں اور ان کے کام کی نگرانی بھی کرتے ہیں۔ یہ نگران ان کو شیطان کے وسوسوں سے بھی بچاتے ہیں' شیطانوں کی مداخلت سے بھی بچاتے ہیں' اور شیطان کی خواہشات اور تمناؤں سے بھی بچاتے ہیں۔ یہ ان کو ان بشری کمزوریوں سے بھی بچاتے ہیں کہ وہ رسالت و دعوت میں کوئی سستی نہ کریں' کسی بات کو بھلا نہ دیں' راہ راست سے منحرف نہ ہو جائیں اور ان کو دوسری بشری کمزوریوں اور ناتوانیوں سے بچاتے ہیں۔

لیکن انبیاء کے اس حفاظتی نظام میں ایک قسم کا خوف اور حساسیت پائی جاتی ہے۔ ذرا انداز بیان پر غور کریں۔

فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا (۷۲ : ۲۷) "تو اس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے"۔ تو ہر رسول کی مسلسل نگرانی ہو رہی ہے کہ آیا وہ اپنا فریضہ ادا کر رہا ہے یا نہیں۔

لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ (۷۲ : ۲۸) "تاکہ وہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغام پہنچا دیئے"۔ اللہ تو پہلے سے جانتا ہے لیکن اللہ چاہتا ہے کہ ان سے عمل تبلیغ عملاً صادر ہو جائے اور وہ نظر آ جائے اور اللہ کا علم اس سے متعلق ہو۔

وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ (۷۲ : ۲۸) "اور وہ ان کے پورے ماحول کو احاطہ کیے ہوئے ہے"۔ ان کے نفوس' ان کی زندگی جو کچھ بھی ہے اور ان کے ماحول میں جو کچھ بھی ہے اسے اللہ جانتا ہے۔ اللہ کے علم سے کوئی چیز غائب نہیں ہوتی۔

وَ اَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (۷۲ : ۲۸) "اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے"۔ نہ صرف یہ کہ جو رسولوں سے متعلق ہے' بلکہ اس کا احاطہ اور اس کا شمار ہر چیز کو شامل ہے۔ ذرے ذرے کو بھی شامل ہے۔

ذرا اس حالت کا تصور کیجئے! ایک رسول تبلیغ کر رہا ہے اور اس کے آگے پیچھے نگراں لگے ہوئے ہیں۔ یہ محافظ بھی ہیں اور رقیب بھی ہیں اور اللہ رسولوں کے پورے ماحول سے براہ راست رابطہ رکھتا ہے۔ لہذا رسول کا فریضہ اور آپ کی سروس ایک لازمی فوجی سروس ہے۔ اور آپ کو یہ فریضہ ادا کرنا ہے۔ رسول اپنا کام کر رہا ہے۔ خود مختار نہیں ہے' نہ وہ کمزوری دکھا سکتا ہے' نہ اپنی خواہش کی پیروی کر سکتا ہے۔ نہ اپنی پسند کے پیچھے جا سکتا ہے بلکہ ایک نہایت ہی حساس' سنجیدہ اور سخت ڈیوٹی ہے جس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ ہر رسول اس بات کو جانتا ہے اور اس طرح اپنا فریضہ ادا کرتا چلا جاتا ہے۔ اور ادھر ادھر دیکھتا بھی نہیں۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی سخت نگرانی ہو رہی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا ہر فعل اللہ کے علم میں ہے اور برملا ہے۔

یہ ایک ایسا منظر ہے جس کو دیکھ کر ہر شخص کے دل میں رسول سے نہایت گہری ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور ہمدردی کے ساتھ ایک خوف اور دہشت بھی اس کے دامن گیر ہو جاتی ہے کہ دعوت دین کا معاملہ کس قدر حساس ہے۔

---()()()---

اس خوفناک اور مرعوب کن ہدایت پر یہ سورت ختم ہو جاتی ہے' جس کا آغاز بھی اسی قسم کے ماحول سے ہوا تھا' جسے جنوں کے طویل اقتباس سے شروع کیا گیا تھا اور جس میں جنوں کے کپکپا دینے والے واقعات بیان ہوئے تھے۔

یہ سورت جس کی کل آیات ۲۸ سے زیادہ نہیں ہیں' اسلامی نظریہ حیات سے متعلق بے شمار حقائق کو طے کرتی ہے۔ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقائد کا ایک نہایت ہی متوازن اور سیدھا راستہ تجویز کرتی ہے جس کے اندر کوئی غلو نہیں ہے اور نہ افراط و تفریط ہے۔ یہ سورت عالم کے بارے میں بھی نہایت معتدل لائن دیتی ہے۔ انسانوں کے سامنے عالم غیب کے دروازے بھی بند نہیں کرتی اور نہ انسانوں کو عالم غیب کے بارے میں افسانے اور خرافات گھڑنے کی اجازت دیتی ہے۔ اور جنوں کا یہ تبصرہ اس سورت میں نہایت ہی قیمتی ہے۔

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۷۲ : ۱) يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ (۷۲ : ۲) "ہم نے قرآن سنا جو راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے تو ہم اس پر ایمان لے آئے"۔

---()()---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۲۹

## سورۃ المزمل - ۷۳

## ۱--تا--۲۰

# سورۃ المزمل ایک نظر میں

اس سورت کے اسباب نزول میں یہ روایت بھی ہے کہ اہل قریش دارالندوہ میں جمع ہوئے اور یہ سوچنا شروع کیا کہ دعوت اسلامی کو روکنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کریں اور رسول اللہ کے خلاف کیا سازشیں کریں ۔ یہ اطلاعات رسول اللہ ﷺ تک پہنچیں تو آپ بے حد پریشان ہوئے ۔ آپ ﷺ نے اپنا کمبل اوڑھ لیا اور نہایت فکرمندی کی حالت میں سو گئے ۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس سورت کی ابتدائی آیات لے کر تشریف لائے ۔

یٰاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ (۱) قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا (۷۳ : ۲) ---- اور سورت کا دوسرا حصہ جو

اِنَّ رَبَّكَ یَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ -------- آخر تک ' اس پورے ایک سال بعد نازل ہوا جبکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے کچھ ساتھی رات کو طویل وقت تک عبادت کرتے رہتے تھے اور ان کے پاؤں پھول گئے تھے ۔ چنانچہ اللہ کی طرف سے یہ تخفیفی احکامات نازل ہوئے ۔ سورت کا دوسرا حصہ گویا پورے بارہ ماہ بعد نازل ہوا ۔

ایک دوسری روایت بھی اس مضمون کو دہراتی ہے ۔ ہم ان شاء اللہ سورہ مدثر کے مقدمے میں نقل کریں گے ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ غار حرا میں ذکر الہٰی کے لیے جایا کرتے تھے تاکہ روحانی پاکیزگی اختیار کریں ۔ یہ واقعہ بعثت سے تین سال پہلے کا ہے ۔ آپؐ غار حراء میں سال کا ایک مہینہ گزارتے ۔ یہ رمضان کا مہینہ ہوتا ۔ یہ غار مکہ سے تقریباً دو میل دور ہے ۔ آپؐ اپنی اہلیہ کو بھی ساتھ لے جاتے ' جو آپؐ کے قریب ہی ہوتیں ۔ مساکین میں سے جو بھی آتا ' اسے کھانا کھلاتے ' آپؐ پورا مہینہ عبادت اور ذکر و فکر میں گزارتے ۔ آپ پوری کائنات پر غور فرماتے اور دیکھتے کہ اس کائنات کی پشت پر ایک عظیم قوت کارفرما ہے ۔ پھر آپ اپنی پاکیزہ فطرت کی بنا پر اس صورت حال کو پسند نہ کرتے تھے جو اس وقت موجود تھی یعنی اہل عرب کے عقائد ' افسانوی تصورات اور اوہام و اخرافات جن میں یہ لوگ بندھے ہوئے تھے ۔ لیکن آپؐ پریشان تھے کہ اگر ان طور طریقوں کو ختم کر دیا جائے تو پھر کیسا نظام رائج ہو ۔ آپؐ کے سامنے کوئی واضح راستہ نہ تھا جو آپؐ لوگوں کے لیے تجویز کرتے ۔

حضور اکرم ﷺ کو اس طرح غار حرا کی تنہائیوں میں بھجوانا بھی اللہ کی ایک تدبیر تھی تاکہ آپؐ آنے والے منصب کی ذمہ داریوں کے لیے ذہناً تیار ہو جائیں اور یہ ایک عظیم حکمت تھی ۔ اس تنہائی میں آپؐ اپنے آپ کو دنیا کی مصروفیات سے علیحدہ کر دیتے تھے ۔ اور ان میں آپؐ اپنی فطرت صافی سے ہدایات لیتے تھے ۔ اس کائنات اور اس کی تخلیق کے مناظر پر غور کرتے تھے ۔ آپ کی روح کائنات کے ساتھ تسبیح الہٰی میں مصروف ہوتی تھی ۔ اور آپ اس کائنات کے جمال و کمال کو اپناتے تھے ۔

اور اس پوری کائنات کے ساتھ آپ کی سوچ مصروف تھی - آپ اس نظام قدرت کو سمجھنے کی سعی فرماتے تھے -

ایسی روحانی شخصیات کو 'جنھوں نے زندگی کے دھارے کو بدل ڈالنا ہوتا ہے اور جنھوں نے زندگی کی اداؤں کو بدلنا ہوتا ہے 'اس بات کی ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ کچھ وقت کے لیے عزلت نشینی اختیار کریں اور ایک عرصہ کے لیے اس دنیا کے مشاغل سے دور ہو جائیں اور اس حقیر دنیا کے چھوٹے موٹے غموں سے اپنے آپ کو دور کر دیں -

ایسے افراد کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایک طویل وقت صرف غوروفکر میں گزاریں اور ان کا معاملہ اور موضوع فکر یہ پوری کائنات ہو - جب انسان اس دنیائے دنی کے مشاغل اور شوروشغب میں مصروف ہوتا ہے تو وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے - وہ اس میں گم ہو جاتا ہے اور مگن ہو جاتا ہے کہ اس کے ذہن سے اس دنیا کے بدل دینے کا داعیہ ہی جاتا رہتا ہے - لیکن جب انسان کچھ دیر کے لیے اس دنیا سے ایک طرف ہو جائے 'اس سے دوری اختیار کرلے 'تو پھر ایسے انسان کے لیے ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ کسی بڑی بات کے بارے میں سوچ سکے 'جو اس دنیائے دنی کی نہایت ہی حقیر اور معتبر چیزوں اور قدروں سے بڑی ہو - اس طرح اس کی روح اور اس کی سوچ مروج رسوم و رواج اور مروجہ اقدار سے ذرا آزاد ہو کر کسی اعلیٰ اور برتر مصدر سے حقائق اخذ کرتی ہے -

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایسا ہی چاہا - چونکہ آپ کو ایک عظیم ذمہ داری کے لیے تیار کیا جارہا تھا - آپ کے ذمہ یہ فریضہ عائد کیا جارہا تھا کہ آپؐ نے زمین کے چہرے کو بدل کر کے رکھ دینا ہے - تاریخ کا دھارا بدل دینا ہے تو آپ کی ذات کی تربیت کے لیے اللہ نے آپ کو یہ ترغیب دی - اور آپ پورے تین سال تک ایک ماہ کے لیے غار حرا میں عزلت نشینی اختیار کرتے رہے - اس عرصہ میں آپ اپنی روح کو اس دنیا کی آلودگیوں سے جدا کر دیتے اور اس کائنات کے پردوں کے پیچھے جو خفیہ غیبی راز اور حکمتیں تھیں 'ان پر غور کرتے رہتے - یہاں تک کہ وہ وقت آپہنچا جس کے لیے آپ کو تیار کیا جارہا تھا - اللہ کا حکم ہوا کہ آپ اٹھیں اور لوگوں کو ڈرائیں -

غرض جب وقت آگیا - اللہ کا حکم صادر ہو گیا کہ اب اس فیض اور رحمت کے دروازے اہل جہاں کے لیے کھول دیئے جائیں 'تو جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے - اس وقت آپ غار حراء میں تھے - یہ کہانی ابن اسحاق نے وھب ابن کیسان سے 'انہوں نے عبید سے یوں روایت کی ہے :

جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے 'میں سو رہا تھا - ریشمی کپڑے کا ایک ٹکڑا تھا 'جس میں ایک کتاب تھی 'تو انہوں نے کہا پڑھو - میں نے کہا میں نہیں پڑھتا ' (بعض روایات میں آتا ہے میں پڑھنے والا نہیں ہوں) فرمایا : "انہوں نے مجھے خوب دبایا 'یہاں تک کہ میں نے یہ گمان کر لیا کہ میری موت کا وقت قریب آگیا ہے - اس کے بعد مجھے چھوڑ دیا - اور کہا : پڑھو 'میں نے پھر کہا : میں نہیں پڑھا کرتا 'آپ نے فرمایا انہوں نے دوبارہ مجھے دونوں بازوؤں میں پکڑ کر دبایا - یہاں تک کہ میں گمان کرنے لگا کہ شاید میں مر جاؤں گا - اس کے بعد مجھے چھوڑا اور کہا : پڑھو 'آپؐ نے فرمایا : "میں نے کہا میں کیا پڑھوں ؟" آپ فرماتے ہیں کہ یہ سوال میں نے اس لیے کیا کہ وہ مجھے دوبارہ اس طرح نہ دبائیں جس طرح پہلے انہوں نے مجھے دبایا - اس پر انہوں نے کہا

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (۱) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۲) اِقْرَاْ وَ

رَبُّكَ الْاَكْرَمُ (۳) الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (٤) عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (٥) (٩٦ : ١ تا ٥) ''پڑھو اے نبی' اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا' جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے 'انسان کی تخلیق کی - پڑھو' اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا' انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا''۔ آپؐ نے فرمایا تو میں نے اسے پڑھا۔ پھر یہ ختم ہوا اور وہ مجھ سے چلے گئے۔ اور میں اس خواب سے اٹھا اور میری حالت یہ تھی کہ گویا میرے دل کے اوپر ایک تحریر لکھ دی گئی تھی۔ میں غار حرا سے نکلا یہاں تک کہ میں پہاڑ کے درمیان تھا کہ میں نے آسمان سے ایک آواز سنی جو کہہ رہی تھی ''اے محمد' تم رسول اللہ ہو اور میں جبرائیل ہوں''۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جبریل ایک مرد کی شکل میں ہیں' پاؤں آسمان کے افق پر ہیں' کہتے ہیں اے محمد تم رسول اللہ ہو اور میں جبریل ہوں۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ نہ آگے جاتا ہوں' نہ پیچھے۔ میں افق پر ان سے چہرہ پھیرتا ہوں' میں افق پر جس طرف دیکھتا ہوں آگے جبریل نظر آتے ہیں۔ میں اسی طرح کھڑا ہوں نہ آگے جاتا ہوں' نہ پیچھے۔ یہاں تک کہ خدیجہ نے میری تلاش میں آدمی بھیجے' یہ لوگ مکہ کے بالائی حصے تک گئے اور واپس ہو گئے اور میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ پھر وہ چلے گئے اور میں بھی اپنے گھر کو لوٹ آیا۔ میں خدیجہ ...... کے پاس آیا۔ میں ان کے پہلو میں ان کی ران کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا ''ابو القاسم تم کہاں تھے؟ میں نے تمہاری تلاش میں لوگ دوڑائے' وہ اعلیٰ مکہ تک گئے اور واپس آگئے''۔ اس کے بعد میں نے ان کے سامنے یہ واقعہ دہرایا۔ تو انہوں نے کہا کہ اے میرے چچازاد تمہیں مبارک ہو تم ثابت قدم رہو۔ اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے مجھے امید ہے کہ تم اس امت کے نبی ہو گے''۔

اس کے بعد ایک مدت کے لیے وحی بند ہو گئی۔ ایک بار پھر آپؐ پہاڑ پر تھے تو آپؐ نے دیکھا کہ جبریل پھر موجود ہیں۔ حضور ﷺ پر ان کے رعب کی وجہ سے کپکپی طاری ہو گئی۔ حضور ﷺ آہستہ آہستہ چل کر اور زمین کی طرف جھکتے ہوئے اور کانپتے ہوئے اپنے اہل و عیال کے پاس گئے۔ آپ یہ کہہ رہے تھے مجھے کپڑا اڑھاؤ' مجھ پر لحاف ڈالو''۔ گھر والوں نے ایسا ہی کیا اور آپؐ اس طرح کانپ رہے تھے جس طرح سخت سردی لگی ہو' چنانچہ حضرت جبریل نے آواز دی۔

یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ (۷۳ : ۱) (بعض روایات میں آیا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ (۷٤ : ۱) خدا کو علم ہے کہ اس وقت کون سی آیت تھی۔

اس سورت کی ابتدائی آیات کے نزول کے بارے میں پہلی روایت صحیح ہو یا دوسری' بہرحال رسول اللہ ﷺ یہ جان گئے کہ اب سونے کا وقت چلا گیا ہے' اب تو مجھ پر بھاری ذمہ داری آن پڑی ہے۔ اب مجھے ایک طویل جدوجہد کرنی پڑے گی' اب جاگنا ہے' بیداری ہے' جدوجہد ہے اور پکار ہے اور یہ پکار مجھے کبھی سونے نہ دے گی۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کہا گیا ''اٹھو''۔ آپؐ اٹھ کھڑے ہوئے اور کھڑے رہے۔ اور تئیس سال تک کھڑے رہے۔ آپؐ کھڑے ہو گئے اور کھڑے رہے اور ہمیشہ دعوت دیتے رہے۔ یہ بوجھ آپؐ نے اٹھا لیا۔ یہ تو بہت ہی بھاری بوجھ تھا۔ یہ امانت کبریٰ کا بوجھ تھا۔ پوری انسانیت کا بوجھ تھا۔ اسلامی نظریہ حیات کا بوجھ تھا اور مختلف

میدانوں میں جدوجہد کا بوجھ تھا۔

یہ بوجھ انسانی ضمیر کی صفائی کا بوجھ تھا۔ انسانی ضمیر جاہلیت کے اوہام اور خرافات میں غرق تھا' انسانی نفس پر زمین کے رجحانات اور میلانات چھائے ہوئے تھے۔ انسانی شہوات نفسانیہ کے ہاتھوں میں قید تھا' اور اس کے گلے میں دنیا پرستی کے طوق پڑے ہوئے تھے۔ جب حضور اکرم ﷺ اپنے ساتھیوں کی تطہیر سے فارغ ہوئے تو دوسرے معرکے شروع ہو گئے' اسلام کے دشمن ہر طرف سے اس تحریک پر حملہ آور ہوگئے اور حضور اکرم ﷺ نے جو گروہ تیار کیا تھا اور جن کا ضمیر صاف ہوگیا تھا یہ دشمن اس گروہ کو نیست و نابود کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ اس پودے کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے۔ قبل اس کے کہ وہ تناور درخت ہو جائے اور دوسرے علاقوں کو اپنے سائے میں لے لے۔ ابھی حضور اکرم ﷺ جزیرۃ العرب کے معرکوں سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ رومی حملہ آور ہوگئے اور شمال کی جانب سے انہوں نے سخت گرفت کی سعی کی جس کا حضور ﷺ اور مسلمانوں نے مقابلہ کیا۔

لیکن ان تمام معرکوں اور تمام میدانوں کے اندر لڑنے کے باوجود ایمان و خیر کا معرکہ بہرحال جاری رہا۔ کیونکہ نفس و ضمیر کے معرکے کا فریق مخالف شیطان ہوتا ہے اور شیطان انسانی نفس اور انسانی ضمیر کے میدان میں ہروقت بر سرپیکار رہتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی موجود تھے۔ آپؐ بھی ہر میدان میں بر سرجنگ تھے اور یہ چونکہ لڑائی آپ نہایت غربت اور تنگدستی کی حالت میں لڑ رہے تھے حالانکہ دنیا کے وسائل آپ کے پاس ہر طرف سے اڈتے چلے آ رہے تھے۔ آپؐ اس حال میں بھی جہد مسلسل میں اور مشقت میں رہے جبکہ آپ کے ارد گرد اہل ایمان نہایت خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ آپ یہ ان تھک جدوجہد کر رہے تھے' مسلسل صبر کر رہے تھے' راتوں کو جاگ رہے تھے' رب کی عبادت کر رہے تھے' قرآن مجید نہایت درد سے سنا رہے تھے' اللہ کے ہوگئے تھے' جس طرح اللہ نے آپؐ کو یہ احکام دیئے تھے:

يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (١) قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا (٢) نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا (٣) اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (٤) اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا (٥) اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا (٦) اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا (٧) وَ اذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (٨) رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا (٩) وَ اصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ اهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (١٠) (٧٣: ١ تا ١٠) "اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے' رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم' آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ دن کے اوقات میں تو تمہارے لیے بہت مصروفیات ہیں۔ اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔ وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے' اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے' لہٰذا اسی کو اپنا وکیل بنالو اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ ان سے

الگ ہو جاؤ''۔

یوں حضورﷺ کھڑے ہوگئے اور اس طرح آپؐ نے اس جہد مسلسل کا مظاہرہ کیا اور یہ مسلسل جنگ لڑی۔ بیس سال سے زیادہ عرصہ تک آپؐ میدان جنگ میں رہے۔ اس دوران کوئی بات آپؐ کو اس معرکے سے غافل نہ کر سکی۔ جب سے آپؐ نے عالم بالا سے یہ نداء سنی کہ قُمْ تو آپ کھڑے رہے اور انسانیت کے ساتھ آپؐ نے جو بھلائی کی اس پر اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔

سورت کا یہ پہلا حصہ یکساں ترنم کا انداز رکھتا ہے۔ ایک ہی نون ہے۔ لام ممدود پر آیات ختم ہوتی ہیں' یہ لہجہ نہایت ہی نرم' سنجیدہ اور رعب دار ہے۔ جس طرح ایک عظیم ذمہ داری کے احکامات دیئے جا رہے ہیں اس طرح انداز بھی ذمہ دارانہ ہے۔ سیاق کلام میں بھی واضح کر دیا جاتا ہے کہ معاملہ کس قدر ذمہ داری کا ہے اور کس قدر نازک' حساس اور بھاری ہے۔ ایک بھاری ذمہ داری عائد کی جا رہی ہے اور اس میں مخالفین کے لیے بھی سخت تہدید ہے۔

وَ ذَرْنِیْ وَالْمُكَذِّبِیْنَ اُولِی النَّعْمَةِ وَ مَهِّلْهُمْ قَلِیْلًا (۱۱) اِنَّ لَدَیْنَآ اَنْكَالًا وَّ جَحِیْمًا (۱۲) وَّ طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّ عَذَابًا اَلِیْمًا (۱۳) (۷۳: ۱۱ تا ۱۳) ''ان جھٹلانے والے خوشحال لوگوں سے نمٹنے کا کام تم مجھ پر چھوڑ دو اور انہیں ذرا کچھ دیر اسی حالت پر رہنے دو۔ ہمارے پاس (ان کے لیے) بھاری بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی ہوئی آگ اور حلق میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب ہے''۔ اس کائنات کے ہولناک مشاہد اور نفس انسانی کی گہرائیوں میں ایک زلزلہ برپا ہوتا ہے۔

یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ وَ كَانَتِ الْجِبَالُ كَثِیْبًا مَّهِیْلًا (۷۳: ۱۴) ''یہ اس دن ہو گا جب زمین و پہاڑ لرز اٹھیں گے اور پہاڑوں کا حال ایسا ہو جائے گا جیسے ریت کے ڈھیر بکھرے جا رہے ہیں''۔ اور

فَكَیْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا (۱۷) السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا (۷۳: ۱۸) ''اگر تم ماننے سے انکار کرو گے تو اس دن کیسے بچ جاؤ گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا جس کی سختی سے آسمان پھٹا جا رہا ہو گا؟ اللہ کا وعدہ تو پورا ہو کر ہی رہتا ہے''۔

اب ہمارے سامنے سورت کی ایک طویل آیت ہے' سورت کا دوسرا حصہ بھی آیت ہے۔ یہ قیام اللیل کے سال کے بعد نازل ہوئی جبکہ حضورﷺ اور آپ کے ساتھیوں میں سے ایک گروہ کے پاؤں سوج گئے تھے۔ اس قیام کے ذریعہ اللہ ان لوگوں کو جس عظیم کام کے لیے تیار کر رہا تھا' وہ واضح ہے۔ اس آیت کے ذریعہ یہ تخفیف نازل ہوئی اور آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو یہ تسلی دی گئی کہ یہ انداز تربیت اللہ نے اپنے علم و حکمت کے ذریعہ تمہارے لیے تجویز کیا تھا۔ اور یہ فرائض اللہ کے علم اور حکمت کے مطابق ضروری تھے۔ اس آیت کا اسلوب بھی خاص ہے اور مضمون اور معانی کے اعتبار سے طرز ادا بھی طویل جملوں والی ہے۔ اور انداز بیان میں ٹھہراؤ اور وضاحت کا انداز ہے۔ اور الفاظ اور قافیہ

بھی انہی کے مناسبت سے ہے۔

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ یعنی میم اور اس سے قبل پائے مدود۔

یہ سورت اپنے دونوں حصوں کے ساتھ دعوت اسلامی کی تاریخ کی ایک اہم کڑی پر مشتمل ہے۔اس کا آغاز عالم بالا کی ایک پکار سے ہوتا ہے جس میں آپ کے کاندھوں پر عظیم ذمہ داری عائد کی جاتی ہے' اور حکم دیا جاتا ہے کہ اس عظیم ڈیوٹی کے لیے تربیت کی ضرورت ہے 'قیام اللیل 'نماز' ترتیل قرآن' ذکر وفکر اور خضوع وخشوع اور اللہ کے لیے کٹ کر علیحدہ ہو جانا' صرف اللہ پر بھروسہ کرنا' اس راہ کی مشکلات پر صبر کرنا۔اور اگر کسی سے قطع تعلق کرنا ہی پڑے تو اچھے انداز سے قطع تعلق کرنا۔ منکرین کے معاملے کو جبار و قہار کے سپرد کر دینا کیونکہ یہ دعوت اور یہ دین تو اسی کا ہے۔وہ جانے اور اس کی دعوت کے معاندین جانیں۔

اس کے بعد پھر ٹریننگ اور تربیت کے کورس میں قدرے تخفیف کی جاتی ہے' اور سہولت پیدا کی جاتی ہے۔ہدایت کی جاتی ہے کہ اللہ کی بندگی کرو' اللہ کے راستے میں خرچ کرو' اور اللہ کی رحمت طلب کرو' اللہ غفور رحیم ہے۔ غرض یہ سورت دراصل اس جدوجہد کا آغاز ہے جو تاریخ انسانیت کے بہترین لوگوں نے پوری انسانیت کی خاطر شروع کی تاکہ اس گم گشتہ راہ انسانیت کو واپس رب کی طرف لایا جائے۔اس گروہ کو ہدایت کی گئی کہ اس جدوجہد کی راہ میں جو مشکلات پیش آئیں۔ان پر صبر کریں اور خود اپنے ضمیر کے اندر آنے والے خیالات کے ساتھ بھی مجاہدہ کریں۔تمام دنیاوی اغراض سے اپنے آپ کو بالا کرلیں' تمام فوائد سے دستکش ہو جائیں اور ان تمام راحتوں کو خیرباد کہہ دیں جن سے بے کار لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور نیند کو بھی کم کر دیں جس سے فارغ البال لوگ استفادہ کرتے ہیں۔یہ تھے اس سورت کے مضامین' اب ذرا تفصیلات کے ساتھ۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۲۷۳ تشریح آیات

## ۱ــ تا ــ ۲۰

سُورَةُ الْمُزَّمِّلِ (۳) مَكِّيَّةٌ (۳)
آیاتها ۲۰ — رکوعاتها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝۱ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۲ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝۳ اَوْ زِدْ
عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝۴ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝۵ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ
هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝۶ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝۷ وَاذْكُرِ اسْمَ
رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝۸ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ
وَكِيْلًا ۝۹

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے' رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم' آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ دن کے اوقات میں تو تمہارے لیے بہت مصروفیات ہیں۔ اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔ وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے' اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے' لہٰذا اسی کو اپنا وکیل بنا لو"۔

يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (۷۳: ۱) قُمْ --- (۷۳: ۲) "اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے کھڑے جاؤ....." آسمانوں کی پکار' اللہ اور کبیر اور متعال کا حکم "تم" کھڑے ہو جاؤ۔ اس عظیم کام کے لیے کھڑے ہو جاؤ جو ایک عرصہ سے تمہارے انتظار میں ہے۔ یہ ایک بھاری ذمہ داری ہے اور یہ تمہارے لیے ہے۔ اٹھو اور اس راہ میں جدوجہد کرو۔ ان تھک جدوجہد کرو' اٹھو نیند اور آرام کا وقت اب گیا۔ تیاریاں کرو اس عظیم جدوجہد اور اس چوکھی

لڑائی کے لیے۔

یہ ایک عظیم حکم ہے' ایک خوفناک حکم ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ گرم و نرم بستر کو چھوڑ دو۔ آرام دہ اور پرسکون گھر کو چھوڑ دو۔ غرض اس حکم کے ذریعہ آپ کو ایک عظیم کشمکش اور عظیم جدوجہد کے سمندر میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اور پھر یہ کشمکش خشکیوں میں' سمندروں میں اور انسان کی عملی زندگی میں اور انسانی ضمیر میں ہر جگہ برپا ہوتی ہے۔

جو شخص صرف اپنے لیے زندگی بسر کرتا ہے بعض اوقات وہ بڑی خوشگوار زندگی بسر کرتا ہے' لیکن وہ نہایت صغیرو حقیر زندگی بسر کرتا ہے اور ایک معمولی انسان کی طرح مرتا ہے۔ بڑا آدمی وہ ہوتا ہے جو بڑی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ لہٰذا ایسے بڑے آدمی کے لیے سونا ممکن ہی نہیں رہتا' اسے آرام نصیب ہی نہیں ہوتا' اسے گرم بستر کم ہی نصیب ہوتے ہیں' اسے عیش و عشرت سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہتا۔ اسے سازوسامان فراہم کرنے کی فرصت ہی نہیں رہتی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حقیقت کو پالیا تھا' اس لیے آپؐ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا جبکہ وہ آپ ﷺ کو مطمئن کر رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ سو جائیں۔ "خدیجہ ...... سونے کا زمانہ تو گیا"۔ ہاں وہ دور چلا گیا۔ اب تو جاگنے کا دور ہے' مسلسل بیدار رہنے کا زمانہ ہے۔ اب تو جدوجہد ہے یا جہاد ہے۔ اور طویل مشقتیں ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (١) قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا (٢) نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا (٣) اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (٤) (٧٣: ١ تا ٤) "اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے' رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم' آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو"۔

یہ ایک عظیم مہم کے لیے منجانب اللہ تربیت تھی اور اس تربیت میں ایسے ذرائع استعمال کیے گئے جن کی کامیابی کی ضمانت من جانب اللہ دی گئی تھی۔ قیام اللیل' جس کی زیادہ سے زیادہ حد نصف رات یا دو تہائی رات سے کم یا ایک تہائی ہے۔ اس میں صرف ترتیل قرآن اور نماز ہوتی ہے۔ ترتیل قرآن کا مطلب ہے قرآن کو تجوید کے ساتھ قرآن کے اصولوں کے مطابق پڑھنا' جلدی جلدی بھی نہ ہو اور محض گانے بجانے کا انداز بھی نہ ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایات وارد ہیں کہ آپ نے قیام اللیل کے دوران گیارہ رکعات سے زیادہ نہ پڑھا تھا لیکن ان گیارہ رکعات میں رات کے دو تہائی حصے سے قدرے کم وقت گزارتے تھے اور آپ قرآن مجید کو خوب رک رک تجوید کے ساتھ پڑھتے تھے۔

امام احمد نے اپنی سند میں روایت کی ہے' یحییٰ ابن سعید سے (یہ ابن عروبہ ہیں) انہوں نے قتادہ سے' انہوں نے زرارہ ابن اوفی سے' انہوں نے سعید ابن ہشام سے کہ وہ حضرت ابن عباس کے پاس آئے اور ان سے وتروں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایک ایسے شخص کے بارے میں نہ بتاؤں جو تمام اہل زمین سے حضور ﷺ کے وتروں کے بارے میں زیادہ جانتا ہے؟ فرمایا عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو۔ اور پوچھ کر ان کا جو جواب ہو' وہ مجھے بھی بتا دو۔ سعید ابن ہشام کہتے ہیں۔ میں نے پوچھا: اے ام المومنین۔ مجھے بتایئے کہ

حضورﷺ کے اخلاق کیسے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ میں نے کہا پڑھتا ہوں۔ انہوں نے کہا بس رسول اللہ کا اخلاق قرآن تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ میں اٹھ کھڑا ہوں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ حضورﷺ کے قیام اللیل کے بارے میں پوچھوں تو میں نے کہا ام المومنین رسول اللہ قیام اللیل کس طرح فرماتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ کیا تم سورہ المزمل نہیں پڑھتے؟ میں نے کہا ہاں پڑھتا ہوں۔ اللہ نے اس سورت کے پہلے حصے میں قیام اللیل فرض فرمایا تھا۔ تو رسول اللہﷺ اور آپؐ کے ساتھی ایک سال تک قیام اللیل پر عمل پیرا رہے۔ یہاں تک کہ ان کے پاؤں پھول گئے اور اللہ نے اس کا اختتام آسمانوں میں بارہ مہینے روکے رکھا۔ اس کے بعد اس سورت کے آخری حصے میں تخفیف نازل فرمائی' اس کے بعد قیام اللیل نفلی ہو گیا جبکہ پہلے فرض تھا۔ میں نے پھر ارادہ کر لیا کہ اٹھ کر چلا جاؤں تو مجھے حضورﷺ کے وتر کے بارے میں خیال آگیا۔ میں نے پوچھا ام المومنین مجھے حضورﷺ کے وتر کے بارے میں بتائیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہم آپ کے لیے مسواک اور وضو کا پانی تیار کرتے تھے۔ تو اللہ رات کو آپ کو اٹھاتا تھا' جس وقت اللہ اٹھانا چاہتا۔ آپ پہلے مسواک کرتے' پھر وضو فرماتے' پھر آپ آٹھ رکعات پڑھتے اور ان میں نہ بیٹھتے' صرف آٹھویں رکعت کے بعد بیٹھتے۔ آپ بیٹھ کر اللہ کو یاد کرتے' دعا کرتے' پھر آپ سلام پھیرے بغیر آٹھویں رکعت کے بعد اٹھتے تاکہ نویں رکعت پڑھیں۔ پھر بیٹھتے اور اللہ وحدہ کو یاد کرتے' پھر دعا کرتے اور پھر سلام پھیرتے اور ہم سلام پھیرنے کی آواز سنتے۔ اس کے بعد آپ بیٹھ کر دو رکعات پڑھتے۔ یہ سلام پھیرنے کے بعد پڑھنے بیٹھتے۔ یہ گیارہ رکعات ہو گئے۔ جب حضورﷺ معمر ہو گئے اور آپؐ کا جسم مبارک بھاری ہو گیا تو ساتویں رکعت وتر ہوتی۔ پھر ساتویں کے بعد دو رکعات بیٹھ کر پڑھتے۔ اس طرح نو رکعتیں ہوتی ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ عادت تھی کہ آپ جو نماز پڑھتے تو اس بات کو پسند کرتے تھے کہ اس پر مداومت کریں اور جب کبھی حضورﷺ جاگ نہ سکتے' یا کسی درد یا بیماری کی وجہ سے رات کو نہ اٹھتے تو دن کو بارہ رکعات ادا فرماتے۔ اور مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ رسول خدا نے ایک ہی رات میں تمام قرآن مجید کو پڑھ کر ختم کیا ہو اور یہ بھی میرے علم میں نہیں ہے کہ ماسوائے رمضان کے آپؐ نے کبھی پورے مہینے کے روزے رکھے ہوں۔ (امام مسلم نے بھی اسے قتادہ سے روایت کیا ہے' دیکھئے زاد المعاد' ابن قیم مفصلا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ تربیت اس لیے کی جارہی تھی کہ ایک بھاری ذمہ داری آپ ؑ کے سپرد کی جانے والی تھی۔

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا (۷۳ : ۵) "ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں"۔ اس سے مراد یہ قرآن ہے' اور قرآن مجید سے آگے پھر مزید احکامات ہیں۔ قرآن مجید کلامی اعتبار سے ثقیل نہیں ہے' یہ تو آسان ہے۔ اور اس سے نصیحت حاصل کرنا بھی بہت سہل ہے لیکن سچائی کے ترازو میں یہ بہت ہی وزن دار ہے اور اس کے اثرات بہت دور رس ہیں اور اس نظام کے قیام کی ذمہ داریاں بھاری ہیں۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ

(۵۹ : ۲۱) "اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو تم دیکھتے کہ وہ جھک جاتے اور اللہ کے ڈر سے ریزہ ریزہ ہو جاتے"۔ اس لیے اللہ نے اس قرآن کو ایک ایسے دل پر نازل فرمایا جو پہاڑ سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔ اس لیے اس نے

اس کو اخذ کر لیا۔

پھر قرآن کی روشنی کو اخذ کرنا' اس کی حقیقت کو جاننا اور اس کا استیعاب حاصل کرنا بہت بھاری ہے اور اس کے لیے بہت طویل تیاری اور تربیت کی ضرورت ہے۔ عالم بالا سے رابطہ قائم کرنا' اس کائنات کی روح تک پہنچ جانا' اور اس کائنات کے زندہ اور جامد ارواح تک پہنچ جانا' جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس تک رسائی حاصل ہوئی' ایک طویل اور ثقیل ذمہ داری ہے اور اس کے لیے طویل جہد و تربیت کی ضرورت ہے۔

پھر اسلام کے جادۂ مستقیم پر بلا تردد اور بلاشک قائم ہو جانا اور ادھر ادھر نہ دیکھنا اور دنیا کے میلانات و جاذبیتوں سے متاثر نہ ہونا اور اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں' ان کو عبور کرتے چلے جانا اور جو مشکلات آئیں ان کو برداشت کرنا' بہت ہی بھاری ذمہ داری ہے اور اس کے لیے بھی طویل تیاری اور جہد کی ضرورت ہے۔

راتوں کو جاگنا جب کہ لوگ سو رہے ہیں' اور روز مرہ کی زندگی کی کدورتوں سے دور ہونا اور دنیاوی جھمیلوں سے ہاتھ جھاڑ کر اللہ کا ہو جانا اور اللہ کی روشنی اور اللہ کے فیوض وصول کرنا اور وحدت مطلقہ سے مانوس ہونا اور اس کے لیے خالص ہو جانا اور رات کے سکون اور ٹھہراؤ کے ماحول میں ترتیل قرآن' ایسی ترتیل کہ گویا یہ قرآن ابھی نازل ہو رہا ہے اور یہ پوری کائنات اس قرآن کے ساتھ رواں دواں ہے۔ انسانی الفاظ اور عبارات کے سوا ہی یہ پوری کائنات قرآن کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ قیام اللیل میں انسان قرآن کے نور کی شعاعیں' اس کے اشارات' نہایت پرسکون ماحول میں حاصل کرتا ہے اور یہ سب اس دشوار گزار راستے کا ساز و سامان ہے۔ کیونکہ اس کٹھن راستے کی مشکلات رسول اللہ ﷺ کے انتظار میں تھیں اور یہ ہر اس شخص کا انتظار کرتی ہیں' جو بھی اس دعوت کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ جو شخص بھی جس دور میں دعوت اسلامی کا کام کرتا ہے' شیطانی وساوس اور اس راہ کے تاریک ترین لمحات میں یہی زاد راہ کسی داعی کے کام آتا ہے اور اس سے اس کی راہ روشن ہوتی ہے۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا (۷۳ : ۶) "درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے زیادہ موزوں ہے"۔ اور قرآن کو ٹھیک ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ اس سے مراد عشاء کے بعد اٹھنا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ رات کے وقت اٹھنا جسم کے لیے باعث مشقت ہے اور۔

اَقْوَمُ قِيْلًا (۷۳ : ۶) یعنی بھلائی میں مضبوط طریقہ ہے (مجاہد) کیونکہ دن کی جدوجہد کے بعد تھکاوٹ کا غلبہ ہوتا ہے اور نرم بستر بہت جاذبیت رکھتا ہے۔ یہ جسم کو روندنے کے لیے بہت ہی موثر ہے۔ لیکن جو شخص یہ عمل کرتا ہے' وہ گویا اعلان کرتا ہے کہ اس پر روحانیت غالب ہے' اور اس نے اللہ کی دعوت پر لبیک کہہ دیا ہے۔ اور وہ دعوت پر سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رات کو قرآن کریم بھی اچھی طرح پڑھا جا سکتا ہے' رات کے وقت اللہ کے ذکر میں مٹھاس ہوتی ہے اور نماز تو نہایت ہی خضوع و خشوع کے ساتھ پڑھی جا سکتی ہے اور رات کے وقت اللہ کے سامنے عرض و معذرت اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ انسان کے دل میں محبت الٰہی پیدا ہوتی ہے۔ انسان کو آرام ملتا ہے اور انس و محبت حاصل ہوتی ہے' دل میں سکون' خوشی اور نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ جبکہ دن کی نمازوں میں یہ مقام حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ جس نے یہ دل پیدا کیا ہے' وہ اس دل کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے۔ اللہ کو معلوم ہے اس

میں کیا چیز اثر سکتی ہے اور کس چیز کا اس پر اثر ہوتا ہے۔ اور کن اوقات میں دل زیادہ اثر لیتا ہے اور اچھے اثرات لینے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ اور کیا اسباب ہیں جو اس پر زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔

اللہ اپنے بندے اور رسول کو ایک عظیم جدوجہد کے لیے تیار کر رہا تھا اور ان پر عظیم فرائض نازل ہونے والے تھے۔ اس لیے اللہ نے ان پر قیام اللیل فرض کیا کیونکہ نفس کو قابو کرنے کے لیے یہ موزوں ترین طریقہ ہے۔ اس سے نفس اچھی طرح روند ڈالا جاتا ہے اور پھر اس سے قرآن کی تلاوت اور اس کی حکمت سمجھنے میں زیادہ مدد ملتی ہے۔ تیز دن کے وقت ہر شخص کی بے شمار مصروفیات ہوتی ہیں اور یہ مصروفیات بہت سا وقت لیتی ہیں اور مختلف اطراف میں انسانی توجہ مبذول رہتی ہے۔ اور اس میں انسانی قوت کا ایک بڑا حصہ صرف ہو جاتا ہے۔

اِنَّ لَكَ فِى النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِيۡلًا (۷۳ : ۷) "دن کے اوقات میں تو تمہارے لیے بہت مصروفیات ہیں"۔ لہٰذا دن کو ان مصروفیات میں گزرنا چاہئے اور رات کو اللہ کے لیے مختص کرنا چاہئے اور نماز اور ذکر میں مصروف رہنا چاہئے۔

وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلۡ اِلَيۡهِ تَبۡتِيۡلًا (۷۳ : ۸) "اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو"۔ اللہ کے نام کے ذکر سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ کوئی صرف اللہ کا نام ہی جپتا رہے۔ اور سو دانوں یا ہزار دانوں کی تسبیح رولتا رہے' بلکہ اس سے یہ ذکر مراد ہے کہ زبان پر اللہ کا نام ہو اور دل میں اللہ کی شان حاضر ہو۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ نماز پڑھو جس میں اللہ کا ذکر ہی ذکر ہے اور تلاوت قرآن ہے اور تبتل کے معنی ہیں اللہ کے سوا ہر چیز سے کٹ جانا اور پوری طرح عبادت اور ذکر میں مشغول ہو جانا اور ہر شغل اور ہر تصور سے ایک طرف ہو جانا' اور اپنے مشاعر اور تصورات کے ساتھ اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔

جب تبتل کا ذکر ہوا جس کا مفہوم ہے اللہ کے سوا ہر چیز سے کٹ جانا' تو اس کے ساتھ اس بات کی تصریح ضروری ہو گئی کہ یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ اللہ کے سوا کوئی اس کا اہل ہی نہیں ہے۔ اللہ ہی فقط اس بات کا مستحق ہے کہ انسان اس کی طرف متوجہ ہو۔

رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذۡهُ وَكِيۡلًا (۷۳ : ۹) "وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے' اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے' لہٰذا اسی کو اپنا وکیل بنا لو"۔ وہ ہر متوجہ ہونے والے کا رب ہے۔ مشرق و مغرب کا رب ہے' وہ واحد اللہ ہے اور اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اور جو شخص اللہ کا ہو جائے' وہ دراصل اس کائنات کی واحد حقیقت تک پہنچ گیا اور اللہ پر توکل کرنا دراصل اس کائنات کی واحد حقیقت پر عمل کرنا ہے۔ اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اس کے ذہن میں یہ عقیدہ خود بخود آ جاتا ہے کہ اللہ اس کائنات کے شرق و غرب اور پوری کائنات پر قادر مطلق ہے۔ اور رسول اکرم ﷺ جن سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اٹھو کہ تم نے اس جہاں میں ایک بھاری ذمہ داری اٹھائی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم اللہ کے ہو جاؤ اور پوری کائنات کی طرف پشت کر کے اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ کیونکہ اس کام کے لیے قوت' طاقت' ساز و سامان اسی سرچشمے سے ملتا ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپ کی قوم کی طرف سے آپ کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا جا رہا ہے' لوگ منہ موڑ رہے ہیں' الزامات لگاتے ہیں اور دوسروں کو راہ راست سے دور کرتے ہیں اور تکذیب کرتے ہیں۔ ان مکذبین کو مجھ پر چھوڑ دیں' میں ان سے نمٹ لوں گا کیونکہ میں نے ان کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے اور ان سے میں سخت انتقام لوں گا۔

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا ﴿۱۰﴾ وَذَرْنِیْ وَ
الْمُكَذِّبِیْنَ اُولِی النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِیْلًا ﴿۱۱﴾ اِنَّ لَدَیْنَاۤ اَنْكَالًا وَّجَحِیْمًا ﴿۱۲﴾ وَّ
طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۳﴾ یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ
الْجِبَالُ كَثِیْبًا مَّهِیْلًا ﴿۱۴﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ رَسُوْلًا ۙ۬ شَاهِدًا عَلَیْكُمْ كَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ
اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ فَعَصٰی فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِیْلًا ﴿۱۶﴾
فَكَیْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبَا ﴿۱۷﴾ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ؕ كَانَ
وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿۱۸﴾

"اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ۔ ان جھٹلانے والے خوشحال لوگوں سے نمٹنے کا کام تم مجھ پر چھوڑ دو اور انہیں ذرا کچھ دیر اسی حالت پر رہنے دو۔ ہمارے پاس (ان کے لیے) بھاری بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی ہوئی آگ اور حلق میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب"۔ یہ اس دن ہو گا جب زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے اور پہاڑوں کا حال ایسا ہو جائے گا جیسے ریت کے ڈھیر ہیں جو بکھرے جا رہے ہیں۔

تم لوگوں کے پاس ہم نے اسی طرح ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا۔ (پھر دیکھ لو جب) فرعون نے اس رسول کی بات نہ مانی تو ہم نے اس کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔ اگر تم ماننے سے انکار کرو گے تو اس دن کیسے بچ جاؤ گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور جس کی سختی سے آسمان پھٹا جا رہا ہو گا؟ اللہ کا وعدہ تو پورا ہو کر ہی رہتا ہے"۔

اگر یہ روایت صحیح ہو کہ اس سورت کی ابتدائی آیات آغاز بعثت میں نازل ہوئیں تو پھر یہ دوسرا حصہ یقیناً قدرے بعد کے زمانے میں نازل ہوا' جبکہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے علانیہ دعوت کا آغاز کر دیا تھا اور مکذبین اور تحریک کے کارکنوں پر دست درازیاں کرنے والے میدان میں آ گئے تھے اور یہ لوگ رسول اللہ اور اہل اسلام کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ اور اگر دوسری روایت درست ہو تو پھر پہلا حصہ بھی اس وقت نازل ہوا جب حضور اکرم ﷺ کو

مشرکین اور مکذبین نے دکھ دینا شروع کر دیا اور یہ لوگ دعوت اسلامی کا راستہ روکنے کے لیے سرگرم تھے ۔

بہر حال جو صورت بھی ہو' قیام اللیل اور ذکر و فکر کے ساتھ صبر کی تلقین کرنا (اور یہ دونوں باتیں بالعموم جمع ہوتی ہیں) تحریک اسلامی کے لیے ایک بہترین زاد راہ ہے ۔ اور اس راہ کی مشکلات کو صرف انہی ہتھیاروں اور تدابیر کے ذریعے برداشت کیا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ یہ راہ بہت طویل اور صبر آزما ہے ۔ خواہ انسانی افکار کے میدان کی کشمکش ہو یا میدان جنگ کی ضرب و حرب ہو ۔ دونوں مشکل کام ہیں ۔ دونوں میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے ۔

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (۷۳ : ۱۰) "جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو" ۔ کیونکہ یہ لوگ اشتعال انگیز کاروائیاں کرتے تھے اور ناقابل برداشت حد تک ہٹ دھری کرتے تھے ۔

وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (۷۳ : ۱۰) "اور شرافت کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ" ۔ نہ کوئی عتاب ہو اور نہ آپ ان پر غصہ ہوں' نہ بائیکاٹ ہو اور نہ دشمنی ہو ۔ یہ تھا منصوبہ دعوت اسلامی کا پوری مکی زندگی میں ۔ خصوصاً مکہ کے ابتدائی زمانے میں ۔ محض قلب و ضمیر اور دل و دماغ کو اپیل کی جاتی تھی ۔ نہایت نرمی سے تبلیغ کی جاتی تھی اور صرف کھول کھول کر حقائق بیان کیے جاتے تھے ۔

اور ان لوگوں کی دست درازیوں اور تکذیب کا دفاع ذکر الہی کے بعد صبر جمیل ہی سے کیا جا سکتا تھا' اللہ نے ہر رسول کو صبر کا حکم دیا ہے' اور بار بار دیا ہے ۔ پھر اللہ نے ہر رسول کے ساتھیوں اور بعد میں آنے والے مومنین کو بھی صبر کا حکم دیا ہے ۔ رسولوں کے زمانوں کے بعد میں بھی جس شخص نے دعوت اسلامی کا بیڑا اٹھایا ہے' اس کا زاد راہ صبر ہی رہا ہے ۔ اس کا اسلحہ اور ساز و سامان صبر ہی رہا ہے ۔ صبر بہترین ڈھال اور بہترین اسلحہ ہے ۔ صبر ہی بہترین قلعہ اور پناہ گاہ ہے ۔ یہ نفس اور اس کی خواہشات کے ساتھ جہاد ہے ۔ یہ نفس کی بے راہ رویوں اور خواہشات کے خلاف جہاد ہے ۔ یہ نفس کی سرکشی' جلد بازی اور مایوسی کے خلاف بھی ایک جدوجہد ہے ۔ اور دعوت اسلامی کے دشمنوں' ان کی ریشہ دوانیوں اور اذیتوں کے خلاف بہترین دفاع اور ہتھیار ہے ۔ اور یہ بالعموم نفس انسانی کے خلاف بھی ہتھیار ہے ۔ یہ نفس بالعموم دعوت اسلامی کی تکالیف اور ذمہ داریوں سے جان چھڑانے کی تدابیر کرتا ہے ۔ نفس انسانی مختلف رنگوں اور لباسوں میں اس دعوت کی ذمہ داریوں سے جان چھڑانا چاہتا ہے اور سیدھی راہ پر چلنا نہیں چاہتا ۔ اور داعی کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں رہتا کہ وہ ان تمام باتوں پر صبر کرے ۔ اور ذکر و صبر دونوں ایک ساتھ چلتے ہیں ۔ ہر موقعہ پر جہاں صبر کرنا ہوتا ہے ۔ یہ اللہ کی یاد کے ساتھ ہی ممکن ہے ۔

اور اے پیغمبر　یہ لوگ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں اس پر صبر جمیل اختیار کرو اور ان کو نہایت ہی شریفانہ انداز میں چھوڑ دو' ان مکذبین کے لیے مجھے چھوڑ دو ۔ میں ان کا انتظام خود کر لوں گا ۔

وَذَرْنِیْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِی النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا (۷۳ : ۱۱) "ان جھٹلانے والے خوشحال لوگوں سے نمٹنے کے لیے تم مجھے چھوڑ دو اور انہیں ذرا کچھ دیر اسی حالت میں رہنے دو" ۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو ہمیشہ جبار و قہار اور مضبوط قوت والے کہا کرتے ہیں ۔ یہ جھٹلانے والے تو ابن آدم میں سے ہیں اور دھمکی دینے والی ذات وہ

ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے اور جس ذات نے اس عظیم اور وسیع کائنات کو پیدا کیا ہے اس نے اس تمام جہاں کو صرف لفظ کن کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

مجھے ذرا چھوڑ دو کہ میں ان مکذبین کے کام سے نمٹ لوں' یہ دعوت تو میری دعوت ہے' تمہارے ذمہ تو صرف تبلیغ ہے۔ انہیں جھٹلانے دو اور تم ان کو شریفانہ انداز میں چھوڑ دو۔ ان کے ساتھ جنگ میں خود کروں گا۔ تم اس کے بارے میں پریشان نہ ہو۔

اور یہ تو پیس کر رکھ دینے والی ایک تباہی ہوگی' جب اللہ جبار و قہار کی ذات ان کی طرف متوجہ ہو جائے گی تو ان کی قوت کو ہلا کر رکھ دے گی اور یہ پاش پاش ہو جائیں گے اور یہ لوگ جو اپنے آپ کو "صاحبان نعمت" سمجھتے ہیں نیست و نابود ہوں گے۔

وَ مَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا (۷۳:۱۱) اگر پوری دنیا کی زندگی کی مہلت بھی ان کو دے دی جائے تو بھی یہ ایک وقت قلیل ہے۔ اللہ کے حساب میں تو یہ ایک دن کا بھی ایک حصہ ہے۔ اور خود ان لوگوں کے اندازے کے مطابق بھی پوری زندگی ساعت قلیل ہے۔ قیامت میں یہ خود بھی یہی اندازہ کریں گے کہ ہم ایک دن یا دن کا کوئی حصہ ہی دنیا میں رہے ہیں۔ بہرحال بظاہر کفار کو مہلت جس قدر لمبی دے دی جائے وہ قلیل ہی ہے۔ اگر اس دنیا میں ان پر اللہ کی گرفت نہ آئی تو قیامت بہت ہی قریب ہے۔

اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّ جَحِيْمًا (۱۲) وَّ طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّ عَذَابًا اَلِيْمًا (۷۳:۱۳)

"ہمارے پاس بھاری بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی ہوئی آگ' اور حلق میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب ہے"۔

انکال کے معنی بیڑیاں ہیں۔ جحیم جہنم ہے اور طعام ذاغصہ' وہ جو اس قدر پھنسنے والا ہے جو حلق کو توڑ دے اور یہ صاحبان نعمت کے لیے مناسب جزاء ہے۔ جنہوں نے نعمتوں کی کوئی رعایت نہیں کی اور نہ نعمتوں کا شکر ادا کیا۔ اے محمد ﷺ صبر کرو' صبر جمیل کرو' اور ان سے نمٹنے کا کام ہمارے ذمہ چھوڑ دو۔ ہمارے پاس ان کے لیے بہت کچھ سامان ہے۔ پہلے بڑی بڑی بیڑیاں ہیں جو ان کے لیے باعث اذیت ہوں گی' اور پھر جہنم ہے جو انہیں خوب تپائے گی اور گرمائے گی۔ پھر ان کے لیے ایک ایسا کھانا ہے جو حلق میں پھنس کر اسے زخمی کر دے گا۔ اور پھر مزید یہ کہ سخت عذاب ہو گا اور یہ عذاب ان کو ایک خوفناک دن میں دیا جائے گا۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَ كَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا (۷۳:۱۴) "یہ اس دن ہو گا جب زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے اور پہاڑوں کا حال ایسا ہو جائے گا جیسے ریت کے ڈھیر بکھرے جا رہے ہیں"۔

یہ ہے اس دن کی ہولناکی' اس کی زد میں یہ وسیع زمین بھی آ رہی ہے۔ یہ زمین لرز رہی ہے' ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے' یہ انسان تو نہایت ہی کمزور اور حقیر ہیں۔ بڑے بڑے کرات ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔

اب رخ ذرا ان صاحبان نعمت کی طرف ہوتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ فرعون بڑا جبار تھا' لیکن اس کا جو انجام ہوا وہ تمہارے سامنے ہے۔ قیامت کا ہول تو تم نے دیکھ لیا ذرا فرعون کے اس دنیاوی انجام کو بھی دیکھ لو۔

إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ أَرْسَلْنَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا (۱۵)

فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَٰهُ أَخْذًا وَبِيلًا (۷۳ : ۱۶) "ہم نے تمہارے پاس اسی طرح ایک رسول بھیجا ہے' جس طرح ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا' فرعون نے اس رسول کی بات نہ مانی تو ہم نے اسے بڑی سختی سے پکڑ لیا"۔ یوں اختصار کے ساتھ ان کے دلوں کے اندر زلزلہ پیدا کیا جاتا ہے اور ان کو اپنے سخت موقف سے اکھارنے کی سعی کی جاتی ہے جبکہ اس سے قبل پہاڑ کے زلزلہ اور ریزہ ریزہ کر دینے کا منظر گزر گیا ہے۔ وہ ہے آخرت کا عذاب اور پکڑ اور یہ ہے دنیاوی پکڑ۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں جو پکڑ بھی ہو تم اس سے کیسے بچ سکتے ہو؟ خصوصاً قیامت کی پکڑ تو اس قدر شدید ہوگی :

فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَٰنَ شِيبًا (۷۳ : ۱۷) السَّمَآءُ مُنفَطِرٌ

بِهِ (۷۳ : ۱۸) "اگر تم ماننے سے انکار کرو گے تو اس دن کیسے بچ جاؤ گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا جس کی سختی سے آسمان پھٹا جا رہا ہو گا؟" یہ اس قدر ہولناک صورت حالات ہوگی کہ آسمان پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گا' اس سے قبل زمین پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی ہو گی اور پھر جب اس دن جو بچے بھی ہوں گے وہ غم کے مارے بوڑھے ہو جائیں گے۔ یہ ہولناکی اب انسانی ذات کے اندر آ جاتی ہے۔ زندہ انسانوں کی حالت کیا ہو گی؟ یہ لڑکے بھی بوڑھے ہو جائیں گے اور لوگوں کے احساس کو اس طرف پھیرا جاتا ہے اور پھر بطور تاکید کہا جاتا ہے کہ ایسا ضرور ہو گا۔

كَانَ وَعْدُهُۥ مَفْعُولًا (۷۳ : ۱۸) "اللہ کا وعدہ پورا ہو کر ہی رہتا ہے"۔ یہ ایک واقعہ ہو گا' کیونکہ یہ اللہ کی مشیت ہوگی اور اللہ کی مشیت کے مطابق واقعات رونما ہوتے ہیں۔

یہ ہولناکی جو زمین کے لرزہ' قیام قیامت اور نفس انسانی کی خوفزدگی کی شکل میں سامنے آئی' اس کے بعد اب یہ بتایا جاتا ہے کہ اس سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟

۱۹ ع ۱ إِنَّ هَٰذِهِۦ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَن شَآءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِۦ سَبِيلًا ﴿١٩﴾

۱۳ "یہ ایک نصیحت ہے' اب جس کا جی چاہے' اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے"۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی طرف جانے کا راستہ بہت ہی آسان ہے۔ ان راستوں کے مقابلے میں جو مشکوک ہیں' جو ہولناک اور خوفناک ہیں کیونکہ وہ راہ مستقیم ہے۔

یہاں ایک طرف تو اسلام کے ہٹ دھرم مکذبین کے دلوں کے اندر خوف اور زلزلہ پیدا کیا گیا' دوسری جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک اور ضعیف اور قلیل اہل ایمان کی ڈھارس بندھائی گئی ہے کہ اطمینان رکھو اور یقین کرو' تمہارا رب تمہارے ساتھ ہے' وہ تمہارے اعدا سے خود نمٹ لے گا۔ بس ان کے لیے ایک قلیل مہلت مقرر ہے' یہ ایک معلوم وقت ہے۔ اس کے بعد حق و باطل کا فیصلہ ہو گا' جب اس فیصلے کا وقت آ جائے گا چاہے

اس دنیا میں ہو یا آخرت میں اور اللہ پھر اپنے دشمنوں سے انتقام لے گا۔ ان کو فرعون کی طرح غرق کر دے گا یا قیامت میں بیڑیاں پہنا کر عذاب جہنم میں تپائے گا اور سخت عذاب ہو گا۔ یاد رکھو کہ اللہ اپنے دوستوں کو بے یارومددگار نہیں چھوڑتا اور اگر دشمنوں کو مہلت دیتا ہے تو وہ بھی ایک وقت تک دیتا ہے۔

اب سورت کا دوسرا حصہ آتا ہے اور یہ پورا حصہ ایک طویل آیت کی صورت میں ہے۔ روایات کے مطابق سورت کے پہلے حصے کے پورے ایک سال بعد نازل ہوا ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَآئِفَةٌ
مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَ اللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ
عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَ اٰخَرُوْنَ
يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ ۖؗ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ
قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ
٢ اَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۰
ا ع
۱۴

"اے نبی، تمہارا رب جانتا ہے کہ تم کبھی دو تہائی رات کے قریب اور کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے ہو، اور تمہارے ساتھیوں میں سے بھی ایک گروہ یہ عمل کرتا ہے۔ اللہ ہی رات اور دن کے اوقات کا حساب رکھتا ہے، اسے معلوم ہے کہ تم لوگ اوقات کا ٹھیک شمار نہیں کر سکتے، لہٰذا اس نے تم پر مہربانی فرمائی، اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو، پڑھ لیا کرو۔ اسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ مریض ہوں گے، کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں، اور کچھ اور لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پس جتنا قرآن بآسانی پڑھا جا سکے، پڑھ لیا کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو۔ جو کچھ بھلائی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے، وہی زیادہ بہتر ہے اور اس کا اجر بہت بڑا ہے۔ اللہ سے مغفرت مانگتے رہو، بے شک اللہ بڑا غفور و رحیم ہے"۔

یہ ایک خوبصورت رعایت ہے۔ اس پر مشقت، واماندہ اور تھکے ہارے شخص کے لیے خوشخبری کہ چلو چھٹی مل گئی۔ اللہ کی طرف سے نبی اور مومنین کے لیے نہایت ہی مناسب تخفیف اور چھوٹ کا اعلان ہے۔ اللہ کو معلوم تھا کہ وہ مخلص ہیں اور وہ نہایت تندہی سے احکام بجالا رہے ہیں۔ رات کے طویل قیام کی وجہ سے ان کے پاؤں پھول گئے ہیں اور رات کا بڑا حصہ تلاوت قرآن اور نماز میں بسر ہو رہا ہے۔ اللہ کا مقصد یہ نہ تھا کہ قرآن کے ذریعہ لوگوں کو مشقت میں ڈال دیا

جائے بلکہ مقصد یہ تھا کہ جو عظیم ذمہ داری نبی اور مسلمانوں پر عائد ہو رہی ہے 'اس کے لیے ان کو تیار کیا جائے - اور یہ ذمہ داری چونکہ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں ادا کرنی تھی اس لیے ان کے لیے اس ٹریننگ کا انتظام ضروری تھا۔

یہاں جس انداز میں بات کی گئی ہے 'وہ نہایت ہی اطمینان بخش ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ (٧٣: ٢٠) "اے نبی تمہارا رب جانتا ہے کہ تم کبھی دو تہائی رات کے قریب اور کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے ہو اور تمہارے ساتھیوں میں سے بھی ایک گروہ بھی"۔ اللہ نے تمہارا قیام اللیل دیکھ لیا۔ اور تمہارے ساتھیوں کو بھی دیکھ لیا۔ اور اللہ نے تمہاری اس عبادت کو قبول کر لیا ہے۔ اللہ نے جان لیا کہ تمہارے اور ان کے پہلو گرم و نرم بستروں سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ تم لوگوں نے ان نرم بستروں کی پکار کو نہ سنا اور اللہ کی پکار کو سنا۔ اب اللہ تم پر مہربانی فرماتا ہے۔ اور تم پر اور تمہارے ساتھیوں پر قدرے تخفیف فرماتا ہے۔

وَ اللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ (٧٣: ٢٠) "اور اللہ رات اور دن کے اوقات کا حساب رکھتا ہے"۔ یوں کہ کبھی رات زیادہ لمبی ہوتی ہے اور کبھی دن۔ اور تم اور تمہارے ساتھی رات کی ایک تہائی 'نصف رات یا دو تہائی رات عبادت کرتے رہتے ہو۔ پھر اللہ تمہاری طاقت کی حدود سے بھی واقف ہے۔ اور اللہ کا مقصد تمہیں تھکانا اور عذاب دینا نہیں ہے۔ اللہ تو تمہیں ایک مقصد کے لیے تیار کر رہا ہے۔ جب تم تیار ہو گئے تو پھر تخفیف کر دی تو تم بھی اپنے نفوس پر تخفیف کرو 'اور اب اس کام پر اس قدر سختی نہ کرو۔

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (٧٣: ٢٠) "اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو' پڑھ لیا کرو"۔ یعنی رات کے وقت نماز میں۔ لیکن اپنے آپ کو مشقت اور تنگی میں نہ ڈالو۔ اور یہاں بعض امور ایسے بھی بتا دیئے جاتے ہیں جن میں مستقبل میں اہل اسلام نے مشغول ہونا تھا اور ان ڈیوٹیوں کے ساتھ قیام اللیل ذرا زیادہ مشکل تھا۔

عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى (٧٣: ٢٠) "اسے معلوم تھا کہ تم میں سے کچھ مریض ہوں گے"۔ ان پر قیام اللیل کا فریضہ پر مشقت ہو گا۔

وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (٧٣: ٢٠) "کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کے تلاش میں سفر کرتے ہیں"۔ یعنی تلاش معاش میں سفر اور سفر کی مشقتیں۔ کیوں کہ معاشی جدوجہد بھی ضروریات زندگی میں سے ہے۔ اللہ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ تم دنیا کی زندگی کی ضروریات کے لیے جدوجہد ترک کرو اور رھبان بن جاؤ۔

وَ اٰخَرُوْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (۷۳ : ۲۰) "کچھ لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے"۔ اللہ کو علم تھا کہ عنقریب وہ ظلم کے مقابلے میں جہاد کی اجازت دے دے گا' اسلام کے جھنڈے بلند ہوں گے اور باغیوں کا مقابلہ کیا جائے گا۔ لہٰذا اس مقابلے کے لیے اب یہ تخفیف کی جاتی ہے۔ اب بغیر مشقت کے جس قدر ممکن ہو پڑھو۔

فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْهُ (۷۳ : ۲۰) "لہٰذا قرآن سے جس قدر تم آسانی سے پڑھ سکتے ہو' پڑھ لو"۔ بغیر مشقت اور تنگی کے۔ اور باقی دینی فرائض پر پوری طرح جم جاؤ۔

وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ (۷۳ : ۲۰) "اور نماز پڑھو اور زکوۃ دو"۔ اور اس کے بعد قرض حسن بھی دو۔

وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَیْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا (۷۳ : ۲۰) "اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو۔ جو کچھ بھلائی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے' وہی زیادہ بہتر ہے اور اس کا اجر بہت بڑا ہے"۔ اور اللہ کی طرف اس طرح متوجہ ہوتے جاؤ کہ استغفار کرتے رہو' اپنی تقصیرات کی معافی چاہو' انسان سے قصور سرزد ہوتے ہیں' وہ خطا کا ارتکاب کرتا ہے۔ اگرچہ وہ کوشش کرے اور درست افعال کرنے کی سعی کرے۔

وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۷۳ : ۲۰) "اور اللہ سے مغفرت مانگو اللہ غفور و رحیم ہے"۔ یہ رحمت' شفقت اور تیسیر کی ایک چٹکی ہے اور ایک سال قیام کے بعد اب یہ سہولت نازل ہوتی ہے۔ اللہ نے مسلمانوں پر یہ تخفیف فرمائی ہے۔ اب قیام اللیل نفلی ہو گیا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پھر بھی اپنی روش ہی پر قائم رہے۔ ثلث اللیل سے آپ کا قیام اللیل کبھی کم نہ ہوا۔ یہ اللہ کے ساتھ مناجات تھی۔ رات کی تنہائیوں میں' دنیا کے شور وشغب سے دور۔ یوں آپ اس مناجات سے زاد راہ لیتے رہے۔ اور پوری زندگی میں یہ جدوجہد جاری رہی۔ لیکن سوتے میں بھی آپ کی آنکھیں بند ہو جاتیں تو آپ کا دل بیدار ہی رہتا تھا۔ آپ کا قلب مبارک ہر وقت اللہ کو یاد کرتا رہتا تھا۔ آپ ہر وقت سوتے یا جاگتے اللہ کے ساتھ جڑے رہتے تھے۔ غرض آپ دنیا کی تمام آلودگیوں سے علیحدہ ہو کر رب کے ہو گئے تھے۔ اور اس راہ میں جس قدر بوجھ آپ برداشت کر سکتے تھے۔ آپ نے برداشت کیا۔

---000---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ٢٩

## سورۃ المدثر۔ ٧٤

## ١ -- تا -- ٥٦

# سورۃ المدثر ایک نظر میں

سورۃ مزمل کے مقدمہ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس سورت کے سبب نزول اور وقت نزول کو بھی متعین کرتا ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ سورت بھی علق کے بعد نازل ہونے والی پہلی سورت ہے اور بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ علانیہ دعوت شروع ہونے کے بعد نازل ہوئی۔ اس وقت جب مشرکین نے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ایذائیں دینا شروع کر دی تھیں۔

امام بخاری نے روایت کی 'یحییٰ ابن بکیر سے 'انہوں نے وکیع سے 'انہوں نے علی ابن مبارک سے 'انہوں نے یحییٰ ابن ابو کثیر سے 'انہوں نے فرمایا: میں نے ابو سلمہ ابن عبدالرحمٰن سے پوچھا کہ قرآن مجید میں سب سے پہلے کیا نازل ہوا تو انہوں نے کہا

یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ (۷۴ : ۱) میں نے کہا لوگ کہتے ہیں۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (۹۶ : ۱) پہلے نازل ہوئی تو ابو سلمہ نے کہا: میں نے یہ سوال جابر بن عبداللہ سے کیا تھا اور میں نے ان سے یہی کہا جو تم نے مجھے کہا۔ تو جابرؓ نے فرمایا میں تمہیں صرف وہی بات بتاؤں گا جو مجھے رسول اللہ ﷺ نے بتائی۔ آپ نے فرمایا: "میں نے حرا میں تنہائی اختیار کی جب میں نے اپنا وقت پورا کر دیا' تو نیچے اترا' تو مجھے ایک آواز دی گئی تو میں نے اپنے دائیں طرف دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا' میں نے شمال کی طرف دیکھا تو بھی کچھ نظر نہ آیا' آگے کو دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا' پیچھے کو دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا تو ایک چیز دیکھ لی۔ اس کے بعد میں خدیجہ رضؓ کے پاس آیا اور کہا "مجھے کچھ اوڑھا دو اور مجھ پر ٹھنڈا پانی ڈالو"۔ آپ نے فرمایا: چنانچہ انہوں نے مجھ پر کچھ ڈالا اور مجھ پر ٹھنڈا پانی بھی ڈالا اور اس کے بعد مجھ پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ (۷۴ : ۱) قُمْ فَاَنْذِرْ (۷۴ : ۲) وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ (۷۴ : ۳) (۷۴ : ۱ تا

۳) اس روایت کو امام مسلم نے عقیل سے 'انہوں نے ابن شہاب سے 'انہوں نے ابو سلمہ سے نقل کیا ہے۔ ابو سلمہ نے کہا مجھے جابر ابن عبداللہ نے بتایا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو' وحی رک جانے کے واقعہ کے بارے میں یہ کہتے ہوئے سنا۔ (آپؐ نے اپنی بات میں فرمایا) کہ میں جا رہا تھا کہ میں نے آسمان سے آواز سنی۔ میں نے اپنی نظریں آسمان کی طرف اٹھائیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو حرا میں میرے پاس آیا تھا' زمین و آسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ میں اس سے اس قدر گھبرایا کہ میں زمین کی طرف جھک گیا۔ میں گھر والوں کے پاس آیا۔ میں نے کہا مجھے کچھ اوڑھاؤ' تو انہوں نے مجھے اوڑھایا۔ اس کے بعد اللہ نے یہ آیات نازل کیں۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (١) قُمْ فَاَنْذِرْ (٢) وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ (٣) وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (٤)

وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ (٥) (٧٤ : ١ تا ٥) تک۔ ابو سلمہ کہتے ہیں رجز سے مراد بت ہیں۔ یہاں تک کہ وحی کے نزول میں گرمی آگئی اور پے در پے نازل ہونے لگی۔

اس حدیث پر ابن کثیر نے یہ تبصرہ کیا کہ اس کا سیاق محفوظ ہے اور اس حدیث کے متن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے قبل وحی نازل ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس حدیث میں ہے "پس کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو میرے پاس حرا میں آیا تھا"۔ یہ جبرئیل امین تھے اور غار حرا میں آیات۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ (١) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (٢) اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ

الْاَكْرَمُ (٣) الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (٤) عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (٥) (٩٦ : ١ تا ٥)

لے کر آئے تھے اور اس کے بعد کچھ عرصہ کے لیے وحی رک گئی تھی اور اس وقفے کے بعد یہ فرشتہ دوبارہ آیا تھا۔ اور دونوں احادیث کے درمیان تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ فترۃ الوحی کے بعد یہ سورت نازل ہوئی۔

یہ ہے ایک روایت 'لیکن ایک دوسری روایت بھی ہے۔ طبرانی نے روایت کی ہے' محمد ابن علی ابن شعیب السمسار سے' انہوں نے حسن ابن بشر بجلی سے' انہوں نے معافی ابن عمران سے' انہوں نے ابراہیم ابن زید سے' وہ کہتے ہیں میں نے ابو ملیکہ کو یہ کہتے سنا کہ میں نے ابن عباس ﷺ سے یہ سنا کہ ولید ابن مغیرہ نے قریش کے لیے ایک دعوت ترتیب دی۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو ولید نے کہا تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو تو بعض نے کہا جادوگر ہے۔ بعض نے کہا جادوگر نہیں ہے۔ بعض نے کہا کاہن ہے اور بعض نے کہا کاہن نہیں ہے۔ بعض نے کہا شاعر ہے اور بعض نے کہا نہیں۔ بعض نے کہا یہ ایسا پرانا جادوگر یا موثر جادوگر ہے تو ان کی رائے اس پر بیٹھ گئی کہ یہ پرانا جادو ہے۔ ان لوگوں کا یہ تبصرہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچا تو آپ بہت ہی متفکر ہوئے۔ آپ نے اپنا سر جھکایا اور اپنے اوپر کپڑا اوڑھ لیا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (١) قُمْ فَاَنْذِرْ (٢) وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ (٣) وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (٤)

وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ (٥) وَ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (٦) وَ لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (٧) (٧٤ : ١ تا ٥) یہ وہی روایت معلوم ہوتی ہے جو سورہ مزمل کے بارے میں نقل ہوئی۔ لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ دونوں میں سے کون سی سورت پہلے نازل ہوئی اور یہ روایت کس سورت کے بارے میں ہے۔

ہاں سورت کے نفس مضمون اور داخلی شہادت کا تقاضا یہ ہے کہ سورت کی ابتدائی آیات۔ وَ لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (٧٤ : ٧) تک 'ممکن ہے کہ دعوت اسلامی کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہوں جس طرح سورہ مزمل کی ابتدائی آیات۔

وَ اذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (٨) رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا (٧٣ : ٩) اور یہ دونوں ہدایات نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس عظیم بوجھ کے اٹھانے کے لیے

تیار کرنے کے لیے دی گئی ہوں اور اس مرحلے کی تیاری کے لیے دی گئی ہوں کہ اب حضور ﷺ نے علانیہ دعوت کے مرحلے میں داخل ہونا تھا اور قریش کے سامنے پوری دعوت پیش کرنا تھی جس کے نتیجے میں آپ کو کئی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا تھا۔ اور آنے والی مشکلات کے لیے نفسیاتی اور نظریاتی تیاری کی ضرورت تھی۔ اور ان دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات کے بعد والی آیات ایک مناسب وقفے کے بعد اس وقت نازل ہوئی ہوں جب قوم نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جھٹلا دیا تھا' اور آپ کی دشمنی میں کھل کر آ گئے تھے اور مسلمانوں اور آپ کو ہر قسم کی ایذا دینے لگے تھے۔ آپ کے خلاف جھوٹے الزامات کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ اور نہایت ہی گھٹیا ہتھیار استعمال کر رہے تھے۔

بہرحال یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات سورتوں کے آخری حصوں کے ساتھ ہی اس وقت نازل ہوئی ہوں۔ جب کفار مکہ نے آپ کی تکذیب کر دی تھی اور وہ سازشیں 'تبصرے اور پروپیگنڈے شروع کر دیئے تھے جن کا ذکر ہوا اور ان سے حضور مغموم ہو کر اور کچھ اوڑھ کر لیٹ گئے ہوں اور یہی صورت سورہ قلم کی بھی ہے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا۔

بہرحال اس سورت کا شان نزول اور وقت نزول جو بھی ہو' اس کے آغاز میں عالم بالا نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمہ وہ بھاری ذمہ داری عائد کی ہے جس نے آپ کی نیند حرام کر دی' آپ کے آرام اور بے فکری کے دن جاتے رہے۔ اور آپ نے اس مسلسل جدوجہد اور جہاد فی سبیل للہ کا آغاز کر دیا جو آپ نے اپنی پوری زندگی میں جاری رکھا۔

يٰاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (۱) قُمْ فَاَنْذِرْ (۷۴ : ۲) "اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے' اٹھو اور خبردار کرو"۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت دی کہ اس عظیم امر کے لیے تیاری کرو' اور اس کام میں درج ذیل امور سے مدد حاصل کریں۔

وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ (۳) وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (۴) وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (۵) وَ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (۶) وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (۷) (۷۴ : ۳ تا ۷) "اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو' اور اپنے کپڑے پاک رکھو' اور گندگی سے دور رہو۔ اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو"۔ یہاں ہدایات کا خاتمہ صبر پر ہوتا ہے جس طرح سورت المزمل میں کہا گیا تھا۔

اس کے بعد اس سورہ میں قیامت کے منکرین کو سخت تہدید کی جاتی ہے کہ ان کے ساتھ جنگ صرف اللہ ہی کی ہے۔ جس طرح سورہ المزمل میں بھی یہی مضمون آیا تھا۔

فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ (۸) فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ (۹) عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ (۱۰) ذَرْنِيْ وَ مَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا (۱۱) وَّ جَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا (۱۲) وَّ بَنِيْنَ شُهُوْدًا (۱۳) وَّ مَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا (۱۴) ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ (۱۵) كَلَّا اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا (۱۶) سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا (۱۷) (۷۴ : ۸ تا ۱۷) "اچھا' جب صور میں پھونک ماری جائے گی' وہ دن بڑا ہی سخت دن ہو گا'

کافروں کے لیے ہلکا نہ ہو گا۔ چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا' بہت سا مال اس کو دیا' اس کے ساتھ حاضر رہنے والے بیٹے دیئے' اور اس کے لیے ریاست کی راہ ہموار کی' پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔ ہرگز نہیں' وہ ہماری آیات سے عناد رکھتا ہے۔ میں تو اسے عنقریب ایک کٹھن چڑھائی چڑھواؤں گا"۔

سورہ مدثر میں ایک خاص شخص کے اوصاف نمایاں کر کے بیان کیے گئے ہیں' اور اس کی سازشوں میں سے ایک سازش کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ اسی طرح سورہ قلم میں وارد ہوا ہے۔ شاید یہ دونوں نقشے ایک ہی شخص کے بارے میں ہوں۔ جس طرح بعض روایات میں کہا گیا کہ یہ شخص ولید ابن مغیرہ تھا۔ (روایات تشریح آیات میں آ رہی ہیں) یہاں اس کے ساتھ اللہ کی جنگ کی وجوہات بھی بیان کی جاتی ہیں۔

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ قَدَّرَ (۱۸) فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (۱۹) ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (۲۰) ثُمَّ نَظَرَ (۲۱) ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ (۲۲) ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ (۲۳) فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ (۲۴) اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (۲۵) (۷۴:۱۸ تا ۲۵) "اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی تو خدا کی مار اس پر' کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ ہاں' خدا کی مار اس پر' کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ پھر (لوگوں کی طرف) دیکھا۔ پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا۔ پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا۔ آخر کار بولا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آ رہا ہے' یہ تو ایک انسانی کلام ہے"۔ اس کے بعد اسی شخص کے انجام کا ذکر ہے۔

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ (۲۶) وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سَقَرُ (۲۷) لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ (۲۸) لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ (۲۹) عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ (۳۰) (۷۴:۲۶ تا ۳۰) "عنقریب میں اسے دوزخ میں جھونک دوں گا۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دوزخ؟ نہ باقی رکھے نہ چھوڑے۔ کھال جھلس دینے والی۔ انیس کارکن اس پر مقرر ہیں"۔

جہنم کے منظر اور اس کے انیس داروغوں کے ذکر پر مکہ میں ایک شور سا مچ گیا۔ ہر طرف سے شک کا اظہار ہونے لگا اور سوالات اٹھائے گئے اور مزاح ہونے لگا۔ اس سے ضعیف الایمان لوگ بھی متاثر ہوئے اور مشرکین کے اندر چرچا بھی ہوا۔ چنانچہ یہاں انیس کے عدد کی تفسیر اور توجیہہ بھی کر دی گئی کہ انیس فرشتے کیوں مقرر ہیں۔ اس کے بعد عالم غیب کی جانب ایک دریچہ کھولا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ غیب اللہ کا خاصہ ہے۔ اس دریچے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تصور حیات میں اللہ کے خفیہ جہانوں اور غیبوں کے بارے میں کیا احکام ہیں۔

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ

اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ وَ مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا

هُوَ وَ مَا هِىَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ (۷۴: ۳۱) "ہم نے دوزخ کے یہ کارکن فرشتے بنائے ہیں' اور ان کی تعداد کو کافروں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے' تاکہ اہل کتاب کو یقین آ جائے اور ایمان لانے والوں کا ایمان بڑھے' اور اہل کتاب اور مومنین کسی شک میں نہ رہیں' اور دل کے بیمار اور کفار یہ کہیں کہ بھلا اللہ کا اس عجیب بات سے کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ اس طرح اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے' ہدایت بخش دیتا ہے اور تیرے رب کے لشکروں کو خود اس کے سوا کوئی نہیں جانتا--- اور اس دوزخ کا ذکر اس کے سوا کسی غرض کے لیے نہیں کیا گیا ہے کہ لوگوں کو اس سے نصیحت ہو"۔

آخرت اور دوزخ اور اس کے کارکن فرشتوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ کچھ مناظر قدرت بھی دیئے جاتے ہیں' جو ہماری نظروں کے ہر وقت سامنے ہیں تاکہ یاد دہانی اور ڈراوے کے موقعہ پر دلوں پر اچھا اثر ہو۔

كَلَّا وَالْقَمَرِ (۳۲) وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ (۳۳) وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ (۳۴) اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ (۳۵) نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ (۳۶) لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ

يَتَاَخَّرَ (۳۷) (۷۴: ۳۲ تا ۳۷) "ہرگز نہیں' قسم ہے چاند کی' اور رات کی جبکہ وہ پلٹتی ہے اور صبح کی جبکہ وہ روشن ہوتی ہے' یہ دوزخ بھی بڑی چیزوں میں سے ایک ہے' انسانوں کے لیے ڈراوا۔ تم میں سے ہر اس شخص کے لیے ڈراوا جو آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے رہ جانا چاہے"۔

اس کے بعد پھر مجرموں اور نیکوں کا مقام بھی بتایا جاتا ہے۔ یعنی دائیں بازو والوں اور بائیں بازو والوں کا۔ جہاں مکذبین صاف صاف اعتراف کرتے ہیں کہ وہ اس قدر قید و بند اور سزا کے مستحق ہیں جس کا فیصلہ ان کے حق میں ہوا ہے' اور اس کے بعد فیصلہ کن انداز میں بتا دیا جاتا ہے کہ اب کسی سفارش کرنے والے کی سفارش ان کو کوئی فائدہ نہ دے گی۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (۳۸) اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ (۳۹) فِىْ جَنّٰتٍ يَتَسَآءَ لُوْنَ (۴۰) عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ (۴۱) مَا سَلَكَكُمْ فِىْ سَقَرَ (۴۲) قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (۴۳) وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ (۴۴) وَ كُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ (۴۵) وَ كُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (۴۶) حَتّٰىٓ اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ (۴۷) فَمَا

تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ (۴۸) (۷۴: ۳۸ تا ۴۸) "ہر شخص اپنے کسب کے بدلے رہن ہے۔ دائیں بازو والوں کے سوا' جو جنتوں میں ہوں گی' وہ مجرموں سے پوچھیں گے "تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟" وہ کہیں گے "ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے' اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے' اور حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل

کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے' اور روز جزاء کو جھوٹ قرار دیتے تھے' یہاں تک کہ ہمیں اس یقینی چیز سے سابقہ پیش آگیا۔ اس وقت سفارش کرنے والوں کی کوئی سفارش ان کے کسی کام نہ آئے گی۔

اس شرمسار کنندہ موقف اور اس توہین آمیز اقرار کی فضا میں سرزنش کے انداز میں پوچھا جاتا ہے کہ دعوت اسلامی کے خلاف انہوں نے یہ موقف کیوں اختیار کر رکھا ہے۔ حالانکہ یہ دعوت نصیحت اور نجات کی دعوت ہے' جس کو قبول کر کے وہ برے انجام سے بچ سکتے ہیں۔

چنانچہ ان کی تصویر کشی ایک نہایت ہی مضحکہ خیز انداز میں پیش کی جاتی ہے کہ یہ اس قدر نفرت کرتے ہیں جس طرح جانور شیروں سے نفرت کرتے ہیں۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ (٤٩) كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ (٥٠) فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ (٥١) (٧٤: ٤٩ تا ٥١) آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ اس نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں 'گویا یہ جنگلی گدھے ہیں جو شیر سے ڈر کر بھاگ پڑے ہیں"۔

اب بتایا جاتا ہے کہ وہ کس غرور میں مبتلا ہیں' جو ان کو اس نصیحت آموز دعوت کے قبول کرنے سے روکتا ہے۔

بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً (٧٤: ٥٢) "بلکہ ان میں سے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اس کے نام کھلے خط بھیجے جائیں"۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ ہر ایک کے نام الگ خط اور صحیفہ آئے۔ اور اس سے بھی گہرا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں کے اندر خدا خوفی نہیں ہے۔

كَلَّا بَل لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ (٧٤: ٥٢) "ہرگز نہیں اصل بات یہ ہے کہ یہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے"۔

آخر میں ایک فیصلہ کن قرار داد۔

كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ (٥٤) فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ (٧٤: ٥٥) "ہرگز نہیں' یہ تو ایک نصیحت ہے' اب جس کا جی چاہے اس سے سبق حاصل کرے"۔ اور نصیحت حاصل کرنے یا نہ کرنے کا معاملہ بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ (٧٤: ٥٦)

"اور یہ کوئی سبق حاصل نہ کریں گے الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔ وہ اس کا حقدار ہے کہ اس سے تقویٰ کیا جائے اور وہ اس کا اہل ہے کہ (تقویٰ کرنے والوں کو) بخش دے"۔

یوں قرآن مجید نے قریش کے ذہنوں سے جاہلیت کے عقائد و تصورات نکالنے کے لیے یہ سخت جدوجہد کی اور قریش کے بغض و عناد کا مقابلہ کیا۔ جو انہوں نے عمداً اسلامی تحریک کے خلاف روا رکھا ہوا تھا اور وہ مختلف طریقوں سے قصداً ایسا کر رہے تھے۔ اس سورت اور سورہ مزمل کے درمیان کئی یکسانیاں بھی ہیں اور سورہ قلم بھی انہی جیسی ہے۔ چونکہ ان تینوں سورتوں کا رخ ایک ہی طرف ہے اس لیے ممکن ہے کہ یہ تھوڑے تھوڑے وقفے کی بعد نازل ہوئی ہوں اور ایک جیسے

حالات میں نازل ہوئی ہوں۔ ہاں سورہ مزمل کا دوسرا حصہ جو حضور اکرم ﷺ اور آپ کے بعض ساتھیوں کی جسمانی اور روحانی ریاضت اور عبادت کے بارے میں نازل ہوا' وہ بعد میں نازل ہوا۔

اس سورت کی آیات مختصر' تیز رفتار اور مختلف القافیہ ہیں۔ کبھی اس میں ٹھہراؤ ہے اور کبھی تیز رفتار بہاؤ ہے۔ خصوصاً ایک مکذب کی تصویر کشی کے وقت' خصوصاً جبکہ وہ سوچتا ہے اور بات کا اندازہ کرتا ہے۔ تیوری چڑھاتا ہے اور منہ بناتا ہے۔ اور دوزخ کا منظر۔

لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ (٢٨) لَوَّاحَةٌ لِلْبَشَرِ (٧٤:٢٩) اور ان کے بھاگنے کا منظر حمر' مستنفرہ' فرت' قسورۃ' قافیے اور زیروبم کے اس تنوع کی وجہ سے اور مناظر اور سایوں کی بوقلمونی کی وجہ سے اس سورت کے اندر ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض قافیوں کو ختم کر کے دوبارہ شروع کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً راء ساکنہ 'المدثر' انذر' فکبر اور اس کا ترک اور دوبارہ آجانا' قدر' بسر' استکبر' سقر' نیز ایک قافیہ سے دوسرے قافیہ کی طرف چلا جانا اور ایک ہی فقرے میں' خصوصی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے' مثلاً۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ (٤٩) كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ (٥٠) فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ (٥١) (٧٤:٤٩ تا ٥١) پہلی آیت میں سوال ہے اور یہ سوال استنکاری ہے۔ دوسری اور تیسری آیت میں تصویر کشی اور مزاح ہے۔ اب آیات پر تفصیلی بحث۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۲۷۴ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۵۶

سُورَۃُ الْمُدَّثِّر مَکِّیَّۃ آیاتُہَا ۵۶ رکوعاتُہَا ۲

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳ وَ ثِیَابَكَ فَطَهِّرْ ۝۴ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝۵
وَ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝۶ وَ لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝۷

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔

"اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے ' اٹھو اور خبردار کرو ۔ اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو ' اور اپنے کپڑے پاک رکھو ' اور گندگی سے دور رہو ۔ اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو"۔

یہ عالم بالا کی بہت ہی اہم آواز ہے ۔ اور اس نہایت ہی اہم معاملے کے بارے میں ہے ۔ معاملہ یہ ہے کہ انسانوں کو ڈراتا ہے ' ان کو جگاتا اور بیدار کرتا ہے اور دنیا میں ان کو شر و فساد سے بچاتا ہے اور آخرت میں آگ سے بچاتا ہے ۔ اور وقت ختم ہونے سے قبل ہی نجات کا طریقہ اور امتحان میں کامیابی کی حکمت بتاتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت ہی بڑی ذمہ داری ہے خصوصاً جبکہ یہ ذمہ داری ایک فرد بشر کے کاندھوں پر ڈال دی جائے ۔ اگرچہ یہ فرد و بشر نبی اور رسول ہو 'کیونکہ انسان اس قدر گمراہ ' سرکش ' باغی ' نافرمان ' معاند ' کج رو اور اپنے رویہ پر اصرار کرنے والا ہے کہ کسی انسان کے لیے اس کی اصلاح کا کام بہت ہی مشکل کام ہے ۔ دنیا کے مشکل سے مشکل کام کے مقابلے میں بھی یہ زیادہ مشکل تر کام ہے ۔

یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ (۱) قُمْ فَاَنْذِرْ (۷۴ : ۲) "اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے ' اٹھو اور خبردار کرو"۔ رسالت کے فرائض میں سب سے بڑا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو برے انجام سے ڈرایا جائے ۔ اور ان کو متنبہ کیا جائے کہ خطرہ بہت قریب ہے ۔ اور عذاب ان لوگوں کے لیے گھات میں بیٹھا ہوا ہے جو غافل ہیں اور جو بری راہوں پر سرپٹ دوڑ رہے ہیں اور ان کو خطرے کا کوئی شعور اور احساس نہیں ہے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کو اپنے بندوں سے کس قدر زیادہ ہمدردی ہے اور وہ کس قدر رحیم ہے ۔ باوجود اس حقیقت کے کہ اگر سب کے سب انسان گمراہ ہو جائیں تو وہ اللہ کی بادشاہت میں ذرہ برابر کمی نہیں کر سکتے اور اگر یہ سب کے سب ہدایت پر آجائیں تو اللہ کی بادشاہت میں کوئی اضافہ نہیں کر

سکتے - لیکن یہ اللہ کا رحم و کرم ہے کہ وہ ان کو آخرت کے دردناک عذاب سے بچانے کے لیے اس قدر انتظامات کرتا ہے - دنیا میں لوگوں کو شر سے بچاتا ہے - اور رسولوں کو بھیجتا ہے کہ آؤ میں تمہیں بخش دوں اور اپنے فضل و کرم سے جنت میں داخل کر دوں -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ عظیم ڈیوٹی سپرد کرنے کے بعد اب آپ کی ذات کے بارے میں خصوصی ہدایات دی جاتی ہیں -

(۱) پہلے یہ کہ اپنے رب کی بڑائی بیان کرو -

وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ (۷۴ : ۳) "اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو" - یعنی صرف اللہ وحدہ کی بڑائی کا اعلان کر دو - کیونکہ در حقیقت بڑا صرف اللہ ہے - اور صرف وہی مستحق ہے کہ اس کا نعرۂ تکبیر بلند کیا جائے - اس ہدایت میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اسلامی نظریہ حیات میں اللہ 'اور توحید کے مفہوم کے اندر یہ بات شامل ہے کہ اللہ وحدہ بڑا ہے -

ہر فرد' ہر شے' ہر قدر' اور ہر حقیقت اللہ کے مقابلے میں صغیر و حقیر ہے - اور اللہ وحدہ کبیر اور متعال ہے - اللہ کے جلال کبریائی میں تمام اجرام فلکی' تمام حجم' تمام قوتیں' تمام قدریں' تمام واقعات' تمام حالات' تمام معانی اور تمام صورتیں ناپید اور غائب ہو جاتی ہیں - اور اللہ عظیم اور بلند اور بلند تر ہو جاتا ہے -

نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ اس بلندی تصور اور علو عقیدہ کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر' دنیا کو ڈرانے اور متنبہ کرنے اور ہوشیار و خبردار کرنے کا فریضہ اپنے ذمہ لیں اور حالات اور مشکلات کا مقابلہ کریں اور اس کی سختیاں اور بوجھ برداشت کریں - لہٰذا اس تصور کے مقابلے میں مخالفین کی تمام سازشیں جھوٹی ہوں گی' تمام قوتیں ہیچ ہوں گی' تمام رکاوٹیں دور ہوں گی - اگر داعی یہ سچا تصور رکھتا ہو کہ وہ جس رب کی دعوت لے کر اٹھا ہے' وہ سب سے بڑا ہے تو اس کے سامنے کوئی مشکل کھڑی نہیں ہو سکتی - دعوت اسلامی کی سختیاں اور مشکلیں یہ تقاضا کرتی ہیں کہ انسان کے ذہن میں اللہ کی کبریائی اور کبریائی کا عقیدہ مستحضر ہو -

(۲) دوسری ہدایت یہ دی جاتی ہے -

وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (۷۴ : ۴) "اور اپنے کپڑے پاک رکھو" - یہ کنایہ ہے' قلبی' اخلاقی اور عملی پاکیزگی سے - شخصیت کی پاکیزگی' جس میں ظاہری طہارت بھی شامل ہے اور وہ تمام معاملات بھی شامل ہیں جن کا کسی نہ کسی طریقے سے ذات نبی ؐ سے تعلق ہے اور روحانی اور اخلاقی پاکیزگی ہی میں انسان عالم بالا سے اشارات اخذ کر سکتا ہے - اور رسالت کے مزاج ہی میں پاکیزگی ہوتی ہے' اس لیے یہاں پاکیزگی کا حکم دیا گیا - پھر فریضہ رسالت اور لوگوں تک پیغام پہنچانے اور ان کو ڈرانے اور مختلف قسم کے لوگوں' مختلف قسم کی خواہشات اور مختلف قسم کے نشیب و فراز میں دعوت اسلامی کے کام کے لیے یہ ضروری تھا کہ آپ کا دامن ہر داغ اور دھبے سے پاک ہو - نیز فریضہ رسالت سپرد ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ہر قسم کے لوگوں میں جانا تھا - جن میں گندے لوگ بھی تھے اور غلیظ بھی - جو گندگی اور غلاظتوں میں ڈوبے ہوئے تھے اور آپ کو حکم یہ تھا کہ ان کی گندگیوں اور غلاظتوں میں ملوث ہوئے بغیر دعوت اسلامی کا فریضہ آپ نے سرانجام دینا ہے - یہ نہایت ہی اہم اور گہرا اشارہ ہے' ان تمام لوگوں کے لیے جو

دعوت اسلامی کا کام لے کر اٹھتے ہیں' اور جو وارثین انبیاء کے مقام پر ہوتے ہیں اور جنہوں نے ہر قسم کے لوگوں کے اندر رہ کر کام کرنا ہوتا ہے۔ ہر قسم کے حالات میں کام کرنا ہوتا ہے' ہر قسم کے معاشروں اور سوسائٹیوں میں کام کرنا ہوتا ہے۔

(۳) آپ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ شرک ترک کر دیں اور تمام وہ افعال ترک کر دیں جو آخرت میں عذاب کا موجب ہوں گے۔

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (۷۴: ۵) "اور گندگی سے دور ہو جاؤ"۔ حضور اکرم ﷺ تو پہلے سے ہر قسم کے شرک اور ان باتوں سے اجتناب کر رہے تھے جو آخرت میں عذاب کے موجب تھے اور منصب نبوت پر فائز ہونے سے پہلے ہی آپ اس ہدایت پر عمل پیرا تھے' کیونکہ آپ نے اللہ کے حکم سے پہلے اپنی فطرت سلیمہ کے تقاضے کے مطابق ان برائیوں کو ترک کر دیا تھا۔ تمام نظریاتی' اخلاقی' رواجی اور عملی جاہلیت سے آپ پہلے سے مجتنب تھے۔ کسی روایت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ آپ نے کسی جاہلی رسم اور شرکیہ عمل میں شرکت کی ہو۔ پس یہ ہدایت دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ آپ ان سے دور رہیں اور یہ چیزیں اسلام سے لگا نہیں کھاتیں۔ کوئی اسلامی روش ان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ اس لیے آپ کو بطور تاکید ہدایت کی گئی ہے کہ آپ ان چیزوں سے دور رہیں۔ "رجز" کے معنی عذاب کے ہوتے ہیں' اس کے بعد اس کا اطلاق ان باتوں پر بھی ہوا جو عذاب کے اسباب تھے یعنی ان چیزوں کو چھوئیں بھی نہیں۔

(۴) یہ ہدایت بھی آپ کو دی جاتی ہے کہ نبوت کے کام سے اپنے ذاتی مفادات کو دور رکھیں اور آپ جو عظیم کام کر رہے ہیں اس پر احسان نہ جتلائیں۔

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (۷۴: ۶) "اور احسان نہ کرو' زیادہ حاصل کرنے کے لیے"۔ حضور اکرم ﷺ نے دعوت کی زندگی میں بہت کچھ صرف کرنا تھا' اپنی پوری مادی اور اخلاقی اور جسمانی قوت اس راہ میں صرف کرنی تھی اور قربانیاں دینی تھیں لیکن رب تعالیٰ کا مطالبہ آپ سے یہ تھا کہ اس عظیم جدوجہد کو عظیم نہ سمجھیں اور کسی پر احسان نہ جتلائیں۔ دعوت اسلامی کی راہ میں اگر کسی کے اندر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ میں نے بہت کچھ کیا ہے تو وہ ہرگز داعی نہیں رہ سکتا۔ اس راہ میں جدوجہد اس وقت عظمت کا رنگ لیتی ہے' جب اسے بھلا دیا جائے' بلکہ نفس انسانی کے اندر یہ شعور اچھی طرح بیٹھ جائے کہ اس راہ میں جو کچھ صرف ہو رہا ہے وہ اللہ ہی کا دیا ہوا ہے۔ اور یہ اللہ ہی ہے جس نے ہمیں اس مقصد کے لیے چنا' توفیق دی اور وسائل دیئے اور ہم اس کے اہل ہوئے۔ بس یہ اللہ کا کرم' اس کا چناؤ اور اس کی تکریم ہے اور عزت افزائی ہے جو اس نے ہمیں اس کام کے لیے توفیق دی۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اللہ کے اس دین پر اس کا شکر ادا کریں نہ یہ کہ کسی پر احسان جتلائیں۔

(۵) آخر میں حضور اکرم ﷺ کو یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ جو بھی پیش آئے' آپ صبر کریں۔

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (۷۴: ۷) "اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو"۔ قرآن کریم میں دعوت اسلامی کے سلسلے

میں اللہ بار بار صبر کی تلقین فرماتا ہے' اور حقیقت بھی یہ ہے کہ دعوت اسلامی کی راہ میں صبر ہی اصل سازو سامان ہے۔ یہ ایک چوکھی لڑائی ہوتی ہے'ایک طرف خود اپنی خواہشات اور میلانات کے خلاف جنگ کرنا ہوتی ہے' دوسری جانب دعوت اسلامی کے دشمنوں کے خلاف جنگ کرنا ہوتی ہے۔ یہ دشمن شیطانوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور مفادات و خواہشات کے لیے لڑ رہے ہوتے ہیں۔ پھر طویل جدوجہد اور قلت وسائل اور اجر سب کا سب اخروی ہوتا ہے۔ اس دنیا کا کوئی مفاد اس جہد سے وابستہ نہیں ہوتا۔ ان حالات کے ساتھ بھی لڑنا پڑتا ہے۔ خالص رضائے الٰہی کے لیے۔

جب نبی کریم ﷺ کو یہ اہم ہدایات دے دی گئیں تو اب بتایا جاتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس سے آپ نے لوگوں کو ڈرانا ہے۔ ایک چٹکی میں اس بات کو سامنے لایا جاتا ہے۔ وہ خوفناک دن ان کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے جس سے آپؐ نے لوگوں کو ڈرانا ہے۔

فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ﴿٨﴾ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ﴿٩﴾ عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ ﴿١٠﴾

"اچھا' جب صور میں پھونک ماری جائے گی' وہ دن بڑا ہی سخت دن ہو گا' کافروں کے لیے ہلکا نہ ہو گا"۔

فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ (۷۴: ۸) کے معنی بھی بگل میں پھونکنے کے ہیں لیکن نقر کے معنی میں آواز کی سختی بھی ہے اور آواز کی اس سختی سے اشارہ مقصود ہے' اس دن کی سختی کی طرف۔ گویا ناقور میں آواز ٹھونکی جاتی ہے اور اس سے سخت آواز نکلتی ہے اور یہ آواز کانوں پر فائر کی طرح لگتی ہے۔ اس لیے یہ دن کافروں پر بہت ہی سخت ہو گا اور اس میں ان کے لیے کوئی سہولت نہ ہو گی۔

عَلَی الْکٰفِرِیْنَ غَیْرُ یَسِیْرٍ (۷۴: ۱۰) "کافروں کے لیے ہلکا نہ ہو گا"۔ یہ دن سب کا سب سخت ہو گا۔ اس قدر سخت کہ اس میں کوئی نرمی نہ ہو گی' لہٰذا یہ سمجھو کہ اس دن بے حد کرب ہو گا' سخت تنگی ہو گی' لہٰذا اس کے بارے میں محتاط ہو جاؤ۔ اور صور سے بچنے سے پہلے ہی تیاریاں کر لو۔ یوں ان کے سامنے اس دن کا منظر پیش کیا جاتا ہے۔

اب روئے سخن ایک مخصوص مکذب اور جھٹلانے والے معاند کی طرف پھر جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص دعوت اسلامی کا ایک خاص معاند تھا اور دعوت کے خلاف تمام تدابیر یہ کرتا تھا۔ چنانچہ اسے سخت دھمکی دی جاتی ہے اور اس کی ایسی تصویر کھینچی جاتی ہے کہ سننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کون ہے؟ اس شخص کے پورے خدوخال اس قلمی تصور میں دے دیئے گئے ہیں اور یہ شخصیت صاف صاف الفاظ کے اندر متحرک نظر آتی ہے۔ ذرا ملاحظہ کریں:

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ﴿١١﴾ وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا ﴿١٢﴾
وَبَنِينَ شُهُودًا ﴿١٣﴾ وَمَهَّدْتُ لَهُ تَمْهِيدًا ﴿١٤﴾ ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ
أَزِيدَ ﴿١٥﴾ كَلَّا ۖ إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا ﴿١٦﴾ سَأُرْهِقُهُ صَعُودًا ﴿١٧﴾ إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ﴿١٨﴾

فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿١٩﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿٢٠﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿٢١﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿٢٣﴾ فَقَالَ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ﴿٢٤﴾ إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿٢٥﴾ سَأُصْلِيهِ سَقَرَ ﴿٢٦﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُ ﴿٢٧﴾ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ﴿٢٨﴾ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿٢٩﴾ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿٣٠﴾

"چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا' بہت سا مال اس کو دیا' اس کے ساتھ حاضر رہنے والے بیٹے دیئے' اور اس کے لیے ریاست کی راہ ہموار کی' پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔ ہرگز نہیں' وہ ہماری آیات سے عناد رکھتا ہے۔ میں تو اسے عنقریب ایک کٹھن چڑھائی چڑھواؤں گا۔ اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی تو خدا کی مار اس پر' کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ ہاں' خدا کی مار اس پر' کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ پھر (لوگوں کی طرف) دیکھا۔ پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا۔ پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا۔ آخر کار بولا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آ رہا ہے' یہ تو ایک انسانی کلام ہے۔ عنقریب میں اسے دوزخ میں جھونک دوں گا۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دوزخ؟ نہ باقی رکھے نہ چھوڑے۔ کھال جھلس دینے والی۔ انیس کارکن اس پر مقرر ہیں"۔

متعدد روایات میں یہ بات وارد ہے کہ ان آیات سے مراد ولید ابن مغیرہ مخزومی ہے۔ علامہ ابن جریر روایت کرتے ہیں' ابن عبد الاعلیٰ سے' وہ محمد ابن ثورہ سے' وہ معمر سے' وہ عبادہ ابن منصور سے' وہ عکرمہ سے' کہ ولید ابن مغیرہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ نے اس کے سامنے قرآن کریم پڑھا۔ اس کا دل نرم ہو گیا۔ یہ بات ابوجہل ابن ہشام کو پہنچی۔ یہ اس کے پاس آیا اور کہا "تمہاری قوم چاہتی ہے کہ تمہارے لیے مال جمع کرے"۔ اس نے کہا: کس لیے؟ اس نے کہا کہ یہ مال وہ تمہیں دینا چاہتے ہیں کیونکہ تم محمدؐ کے پاس گئے اور تم پر اس کا اثر ہو گیا ہے۔ (ابوجہل نے اس کی عزت نفس کے احساس سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ ایک غیرت مند شخص ہے) ولید نے کہا قریش کو معلوم ہے کہ میں ان کا مالدار شخص ہوں۔ ابوجہل نے کہا' لہٰذا تم اس کے بارے میں کوئی ایسی بات کہہ دو تاکہ لوگ سمجھیں کہ تم اس کے اقوال کو ناپسند کرتے ہو اور محمدؐ کی باتوں کے منکر ہو۔ تو ولید نے کہا کہ میں اس کے بارے میں کیا کہوں "خدا کی قسم تم میں سے کوئی شخص محمدؐ جیسا ادب اور شعر میں ماہر نہیں ہے۔ میں اشعار کی تمام اقسام سے واقف ہوں' رجز' قصیدہ اور اشعار تک جانتا ہوں۔ اس کا کلام ان میں سے کسی کے مماثل نہیں ہے بلکہ اس کے کلام میں ایک مٹھاس ہے' اس کے سامنے جو آتا ہے' پاش پاش ہو جاتا ہے۔ اور اس سے جو بلند ہونا چاہے یہ اس سے بلند ہوتا ہے۔ تو ابوجہل نے کہا خدا کی قسم تمہاری قوم ہرگز اس وقت تک تم سے راضی نہ ہوگی جب تک تم اس کے بارے میں کچھ نہ کہو۔ تو اس پر اس نے کہا ذرا مجھے سوچنے دو' جب اس نے سوچا تو اس نے کہا' یہ کلام ایک ایسا جادو ہے جو اگلے وقتوں سے چلا آ رہا ہے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں:

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا (۷۴:۱۱) ——— عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ (۷۴:۳۰) تک۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضورﷺ کے ساتھ ولید کی ملاقات کے بعد قریش نے کہا کہ اگر ولید بے دین ہو گیا تو تمام قبیلہ قریش بے دین ہو جائے گا۔ تو ابوجہل نے کہا کہ ولید کو میں ٹھیک کر دوں گا۔ اس کے بعد ابوجہل ولید کے پاس آیا۔ اور طویل غور و فکر کے بعد اس نے کہا۔ "یہ پرانا جادو ہے' کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ ایک آدمی اور اس کے گھرانے کے درمیان جدائی کر دیتا ہے۔ باپ کو بیٹے سے جدا کر دیتا ہے اور مالک اور غلام کے درمیان جدائی پیدا کرتا ہے"۔

یہ ہے واقعہ جس طرح روایات میں آتا ہے۔ لیکن قرآن اس کو نہایت ہی زندہ و تابندہ الفاظ میں پیش کرتا ہے۔ انداز نہایت ہی موثر ہے۔ اس طرح آغاز ہوتا ہے۔

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا (۷۴ : ۱۱) "چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا"۔ یہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جسے میں نے اکیلا پیدا کیا تھا اور اس وقت اس کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی نہ تھی جن پر اہل دنیا فخر کرتے ہیں۔ مال و دولت اور اولاد اور دوسری اشیاء مثلاً معاشرے میں عزت و احترام' یہ چیزیں میں نے اسے دیں' اور اب یہ ان پر اترا کر تحریک اسلامی کے خلاف جنگ کرتا ہے' سازشیں کرتا ہے' اس کو میرے ذمہ چھوڑ دو۔ میں اس سے نمٹ لوں گا۔ اس مقام پر جب انسان قدرے غور کرتا ہے تو کانپ اٹھتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ اس بدبخت کے خلاف علیم و خبیر کی بے پناہ قدرت اور قوت نے کام شروع کر دیا ہے۔ اللہ جبار و قہار کی قوت ہے۔ یہ قوت اس حقیر و ناتواں کو تو پیس کر رکھ دے گی اور اس کا کیا حال ہو گا۔

اس آیت نے اس شخص کے خد و خال ذرا نہایت ہی طوالت سے بیان کیے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کی وہ تفصیلات بھی دی ہیں' جو اللہ نے اس شخص کو دی تھیں۔ یہ تفصیلات اس کے اعراض اور اس کی سازشوں کے ذکر سے بھی پہلے دی گئی ہیں کہ میں نے اسے اکیلا پیدا کیا' اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا' یہاں تک کہ بدن پر کپڑے بھی نہ تھے۔ اس کے بعد اللہ نے اسے بہت وسیع دولت دی۔ اور اس کو ڈھیر سے بیٹے دیئے جو اس کے ارد گرد ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اور ان کی وجہ سے وہ نہایت ہی معزز سمجھا جاتا تھا۔ اور اللہ نے اس کے لیے زندگی کا ہر سامان فراہم کیا اور ہر موڑ کو آسان کیا۔

ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ (۷۴ : ۱۵) "پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں"۔ یعنی موجود دولت پر قانع نہیں ہے۔ مزید بھی چاہتا ہے لیکن نہ قناعت کرتا ہے' اور نہ شکر بجالاتا ہے۔ یا وہ یہ طمع کرتا ہے کہ اس پر بھی وحی نازل ہو اور اسے کتاب دی جائے جس طرح سورت کے آخر میں آتا ہے۔

بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً (۷۴ : ۵۲) "بلکہ ان میں سے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اس کے نام کھلے خط بھیجے جائیں"۔ یہ شخص ان لوگوں میں سے تھا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے حسد کرتے تھے کہ آپ کیوں نبی ہو گئے۔

یہاں اس کی سرزنش کی جاتی ہے اور اس پر سخت عتاب آتا ہے۔

إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا (۷۴ : ۱۶) "یہ ہماری آیات سے عناد رکھتا تھا"۔ اس نے عناد کی وجہ سے حق

کے دلائل کو رد کر دیا اور ان اشارات کو قبول نہ کیا جو ایمان کی طرف لے جاتے تھے - یہ دعوت اسلامی کے مقابلے میں آکھڑا ہوا - رسول اسلام سے جنگ شروع کر دی' لوگوں کو اسلام سے روکا اور اس کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈا کیا -

اس کے بعد' اس سخت ترین سرزنش کے بعد اب اسے دھمکی دی جاتی ہے' جس کی وجہ سے اب اس کو حاصل سہولیات مشکلات میں بدل جاتی ہیں - اور آسانیوں کی جگہ دشواریاں لیتی ہیں -

سَأُرْهِقُهُ صَعُوْدًا (۷۴ : ۱۷) "عنقریب اسے میں کٹھن چڑھائی چڑھاؤں گا" - مشقت اور دشواری کی یہ بہترین تمثیل و تصویر ہے - چڑھائی چڑھنا نہایت مشقت کا عمل ہوتا ہے اور انسان کے لیے سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے - اور اگر یہ کام کسی سے زبردستی لیا جائے اور چڑھنے والے کی کوئی ذاتی دلچسپی نہ ہو تو یہ عمل پھر مزید دشوار ہو جاتا ہے - یہ تمثیل اور تصویر ایک حقیقی تعبیر بھی ہے - کیونکہ جو شخص ایمان کے سیدھے' ہموار اور خوشگوار راہ سے منحرف ہو جاتا ہے تو اسے انحراف کی راہ میں مشکلات پیش آتی - بے شمار ناہمواریاں اور مشکلات - ایسے شخص کی زندگی قلق اور بے چینی میں گزرتی ہے - وہ ہمیشہ حیران و پریشان رہتا ہے گویا اسے زبردستی آسمان پر اور سولی پر چڑھایا جا رہا ہو' اس کی زندگی میں نہ تروتازگی ہوتی ہے' نہ راحت' نہ خوشی' اور نہ سکون اور نہ یہ امید کہ اس پر مشقت سفر کے نتیجے میں وہ منزل مقصود تک پہنچ جائے گا -

اب اس شخص کی ذہنی کیفیت اور اندرونی نفسیات کی وہ بھدی تصویر کھینچی جاتی ہے جس میں ہر شخص خود اپنے تاثرات اور احساسات کی تکذیب کرتا ہے - یہ اپنے اعصاب پر دباؤ ڈالتا ہے' ماتھے پر شکن آتی ہے اور منہ بناتا ہے - اور یہ تمام ذہنی اور فکری زور اس بات کے لیے لگاتا ہے کہ قرآن اور صاحب قرآن کے اندر کوئی عیب نکال لائے -

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ قَدَّرَ (۱۸) فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (۱۹) ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (۲۰) ثُمَّ نَظَرَ (۲۱) ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ (۲۲) ثُمَّ اَدْبَرَ وَ اسْتَكْبَرَ (۲۳) فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ (۲۴) اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (۲۵) (۷۴ : ۱۸ تا ۲۵) "اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی تو خدا کی مار اس پر' کیسی بات بنانے کی کوشش کی - ہاں' خدا کی مار اس پر' کیسی بات بنانے کی کوشش کی - پھر (لوگوں کی طرف) دیکھا - پھر پیشانی سیکڑی اور منہ بنایا - پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا - آخر کار بولا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آ رہا ہے' یہ تو ایک انسانی کلام ہے" -

انداز تعبیر ایسا ہے کہ ایک ایک لمحے' ایک ایک سوچ اور ایک ایک حرکت کی تصویر کشی کی جا رہی ہے - گویا ایک ماہر عکاس کی قلم ہے جو تصویر بناتی جاتی ہے' الفاظ نہیں بلکہ رنگ بھرے جا رہے ہیں - نہیں گویا ایک ریل چل رہی ہے اور ایک ایک منظر نظروں کے سامنے آ رہا ہے - جو لمحہ بہ لمحہ بدل رہا ہے -

ایک تصویر میں یوں نظر آتا ہے کہ ہر شخص سخت غور و فکر میں ڈوبا ہوا ہے - اس منظر میں اسے ایک بد دعا بھی دی جاتی ہے -

فَقُتِلَ (۷۴ : ۱۹) "یہ مارا جائے" پھر ایک شدید استہزاء ہے -

كَيْفَ قَدَّرَ ( ٧٤ : ١٩ ) "کیسی بات بنانے کی کوشش کی اس نے"۔ اس کے بعد دوبارہ بددعا دی جاتی۔

ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ( ٧٤ : ٢٠ ) "پھر خدا کی مار اس پر 'کیسی بات بنانے کی کوشش کی"۔

پھر اگلی تصویر میں وہ 'ادھر ادھر دیکھتا ہے 'منہ بناتا ہے' پیشانی سکیڑتا ہے اور مضحکہ خیز صورت بناتا ہے۔ جس کے اندر نہایت درجہ مصنوعیت ہے۔

اس کی یہ تمام بناوٹ اور سوچ اسے کوئی معقول نتیجہ نہیں دیتی۔ پس وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ روز روشن کو رات کہے اور حق کو باطل کہے۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ( ٢٤ ) اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ( ٧٤ : ٢٥ ) "یہ کچھ نہیں مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آ رہا ہے' یہ تو ایک انسانی کلام ہے"۔

یہ زندہ لمحات ہیں جن کو قرآن مجید الفاظ کی شکل دیتا ہے۔ یہ اس قدر قوی اور واضح تخیل دیتے ہیں کہ تصویر سے زیادہ واضح ہے 'اور متحرک قلم سے زیادہ اثر انگیز اور سحر آفریں ہے۔ جس شخص کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اسے قیامت تک اضحوکہ اور قابل نفرت اور نہایت ہی بدنما تصویر دے دی جاتی ہے۔ جسے نسلوں تک لوگوں نے دیکھا پڑھا اور دیکھیں گے اور پڑھیں گے۔ اس تصویر کشی کے بعد اب اس شخص کو ایک خوفناک دھمکی دی جاتی ہے۔

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ( ٧٤ : ٢٦ ) "عنقریب میں اسے دوزخ میں جھونک دوں گا"۔ لیکن اس دوزخ کو ایک خوفناک نامعلوم بلا بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سَقَرُ ( ٧٤ : ٢٧ ) "اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دوزخ؟" یہ بہت ہی خوفناک چیز ہے۔ ہماری قوت مدرکہ سے وراء ہے۔ اور اس اجمال اور عدم علم کے بعد دوزخ کی بعض شدید خصوصیات بتائی جاتی ہیں۔

لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ( ٧٤ : ٢٨ ) "نہ باقی رکھے اور نہ چھوڑے"۔ یہ جھاڑو دے کر سب کچھ نگل جانے والی ہے اور سب کچھ مٹا دینے والی ہے۔ کوئی چیز بھی اس کے سامنے کھڑی نہیں رہ سکتی۔ اور نہ اس سے کوئی چیز رہتی ہے۔ اور نہ اس سے کوئی چیز زیادہ ہوتی ہے' وہ سب کچھ فنا کر دیتی ہے۔

اب انسان کے ساتھ اس کا سلوک کیا ہے۔

لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ( ٧٤ : ٢٩ ) "کھال جھلس دینے والی ہے"۔ جس طرح سورہ معارج میں کہا گیا۔

تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ( ٧٠ : ١٧ ) "یہ ہر اس شخص کو بلاتی ہے جو پیٹھ پھیر کر جائے اور منہ موڑے"۔ وہ سب کو اپنی طرف بلانے والی ہے اور اس کا منظر بہت ہی خوفناک ہے۔۔ پھر اس کے اوپر چوکیدار اور نگران کھڑے ہیں:

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ (۷۴: ۳۰) "اس کے اوپر انیس کارکن مقرر ہیں"۔ یہ نگران ملائکہ ہیں۔ جو نہایت ہی شدید القوت ہیں یا ملائکہ کی صفت کی کوئی اور مخلوق ہے۔ یا ملائکہ کی ایک نوع ہے۔ بہرحال' اللہ نے یہ بتایا کہ انیس ہیں۔ ہمارا اس پر ایمان ہے۔

جہاں تک اہل ایمان کا تعلق ہے وہ چونکہ ذات باری تعالیٰ پر پختہ یقین رکھتے تھے تو انہوں نے کلام الٰہی سنتے ہی یقین کر لیا۔ اور ایسا رویہ اختیار کیا جس طرح بندے کو رب تعالیٰ کے ساتھ اختیار کرنا چاہئے۔ اس لیے انہوں نے کوئی شک نہ کیا۔ رہے مشرک تو انہوں نے فرشتوں کی اس تعداد کو ایک فتنہ بنا دیا۔ کیونکہ ان کے دل ایمان سے خالی تھے۔ ان کے دلوں میں ذات باری تعالیٰ کا مناسب احترام نہ تھا۔ وہ اس عظیم معاملے میں سنجیدہ ہی نہ تھے۔ اس لیے یہ سنتے ہی وہ طنز و مذاق کرنے لگے اور انہوں نے اسے عجیب شے سمجھ کر مذاق شروع کر دیا۔ بعض نے کہا کیا تم میں سے دس آدمی ان انیس میں سے ایک کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بعض نے کہا صرف دو کا مقابلہ تم کر لو باقی کو میرے ذمہ چھوڑ دو۔ میں ان کا بندوبست کر لوں گا۔ اس قسم کی اندھی' تنگ نظر اور ہٹ دھرم روح کے ساتھ انہوں نے اس کتاب عظیم کو لیا۔

آنے والی آیات اس بارے میں نازل ہوئیں۔ ان میں اس بات کی تشریح کی گئی ہے کہ اللہ کے غیب کے خفیہ خزانوں میں سے ایک نکتے کا علم کیوں ظاہر کیا گیا۔ اور یہ کہ انیس کی تعداد کیوں مقرر کی گئی ہے اور اس معاملے کو اللہ کے علم غیب کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ جہنم اور اس کے فرشتوں اور کارکنوں کی تعداد کے ذکر سے کیا مطلب اور مقصود ہے۔

وَمَا جَعَلْنَآ أَصْحٰبَ النَّارِ إِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ
إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ آمَنُوْٓا
إِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ
قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ
مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرٰى ١
لِلْبَشَرِ ﴿٣١﴾ ع ۱۵

"ہم نے دوزخ کے یہ کارکن فرشتے بنائے ہیں' اور ان کی تعداد کو کافروں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے' تاکہ اہل کتاب کو یقین آجائے اور ایمان لانے والوں کا ایمان بڑھے' اور اہل کتاب اور مومنین کسی شک میں نہ رہیں' اور دل کے بیمار اور کفار یہ کہیں کہ بھلا اللہ کا اس عجیب بات سے کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ اس طرح اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے' ہدایت بخش دیتا ہے اور تیرے رب کے لشکروں کو خود اس کے سوا کوئی نہیں جانتا ---- اور اس دوزخ کا ذکر اس کے سوا کسی غرض کے لیے نہیں کیا گیا ہے کہ لوگوں کو اس سے نصیحت ہو"۔

آیت کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ یہ فرشتے انیس ہیں اور مشرکین اس تعداد میں شک کرتے ہیں۔

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً (۷۴: ۳۱) "ہم نے دوزخ کے یہ کارکن فرشتے بنائے ہیں"۔ تو یہ کارکن ان فرشتوں میں سے ہیں جو نہایت ہی قوت والے ہیں اور ان کی طبیعت اور مزاج کو اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ نہایت ہی قوی ہیں اور ان کے بارے اللہ نے فرمایا ہے۔

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ "وہ ان احکام کی خلاف ورزی نہیں کرتے اور ان کو جو کچھ حکم دیا جاتا ہے وہ اسے کر گزرتے ہیں"۔ یعنی وہ اللہ کے احکامات کی پیروی کرتے ہیں۔ اور ان کے اندر اس بات کی طاقت ہے کہ اللہ جو حکم دے وہ اس کی تعمیل کریں۔ اللہ نے ان کو ایسی قوت دے رکھی ہے کہ وہ ان کو جو حکم دے 'اس کی تعمیل وہ فوراً کر دیں۔ اگر اللہ نے ان کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ آگ کے اندر اللہ کے احکام کی تعمیل کریں تو اللہ نے ان کو قدرت دی ہے کہ وہ ایسے حالات میں کام کر سکیں۔ جس طرح اللہ نے ان کو سکھایا۔ لہٰذا ان فرشتوں کے ساتھ یہ بیچارے کب پنجہ آزمائی کر سکتے ہیں 'ان لوگوں نے جو یہ کہا کہ ان فرشتوں کو وہ قابو کر لیں گے تو یہ محض جہالت کی وجہ سے کہا 'ان لوگوں کو دراصل اللہ کی قوتوں اور اللہ کی فوجوں کی طاقت کا کوئی پتہ ہی نہیں۔ اور یہ معلوم ہی نہیں کہ اللہ اپنے معاملات کو کس طرح چلاتا ہے۔

وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۷۴: ۳۱) "اور ہم نے ان کی تعداد کو کافروں کے لیے فتنہ بنایا ہے"۔ یہ کافر دراصل ان فرشتوں کی تعداد پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ وہ مقامات کیا ہیں جہاں تسلیم کے بغیر بات نہیں بنتی اور وہ مقامات کیا ہیں جہاں جدل و جدال اور بحث و مباحثے کی گنجائش ہوتی ہے۔ یہ معاملہ غیبیات کا ہے۔ اور اس میں تسلیم و رضا کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان غیبی شعبوں اور موضوعات پر انسان کے پاس نہ قلیل علم ہے اور نہ کثیر علم ہے۔ جب اللہ نے اپنے نبی کے ذریعہ یہ اطلاع کر دی اور نبی سچا ہے اور اللہ سچا ہے تو پھر بحث و مباحثہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ انسان کا مقام یہ ہے کہ بس نبی کی بات کو تسلیم کرے اور یہ اطمینان رکھے کہ جس قدر خبر اللہ نے بتا دی اسی قدر بتانے میں خیر ہے اور اس میں مباحثے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ انسان مناقشہ اس موضوع پر کر سکتا ہے جس کے بارے میں اس کے پاس کوئی سابقہ علم ہو اور جدید علم کے بارے میں وہ اعتراض کرتا ہو۔ تو فرشتوں کی تعداد کے بارے میں انسان کے پاس سرے سے کوئی سابق علم ہی نہیں ہے اور یہ کہ "وہ" انیس ہیں تو اس کا علم اللہ ہی کو ہے کہ وہ کیا ہیں اور انیس کیوں ہیں؟ تو اعتراض کرنے والے بیس پر بھی اعتراض کر سکتے ہیں۔ آخر آسمان سات کیوں بنائے ہیں 'اس پر بھی اعتراض ہو سکتا ہے اور انسان کو موجودہ شکل میں کیوں بنایا اور سوکھی مٹی سے کیوں بنایا اور جنوں کو آگ کے شعلے سے کیوں بنایا؟ اور انسان کیوں ماں کے پیٹ میں ۹ ماہ رہتا ہے اور کچھوے کیوں ہزارہا سال زندہ رہتے ہیں اور یہ کیوں؟ اور یہ کیوں؟ جواب صرف یہی ہے کہ یہ اللہ کی مرضی ہے اور یہی حقیقی جواب ہے ایسے معاملات کا۔

لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (۷۴: ۳۱) "تاکہ اہل کتاب کو یقین آجائے اور ایمان لانے والوں کا ایمان بڑھے 'اور اہل کتاب اور مومنین کسی شک میں نہ رہیں"۔ اور یہ دونوں فریق دوزخ کے نگرانوں کی تعداد میں یقین کا مواد

پائیں گے اور اہل ایمان کا تو ایمان زیادہ ہو گا۔ رہے اہل کتاب ' تو ان کے پاس اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی علم ضرور ہو گا۔ اور جب وہ سنیں گے کہ قرآن کریم بھی اس بات کی تصدیق کر رہا ہے تو وہ بات درست ہے کیونکہ قرآن کریم کتب سابقہ کی تصدیق کرنے والا ہے ۔ رہے اہل ایمان ' تو ان کا ایمان تو ہرنئی آیت کے بعد زیادہ ہی ہوتا ہے ۔ کیونکہ ان کے دل کھلے ہیں اور عالم بالا سے ان کا بذریعہ رسول ہروقت رابطہ رہتا ہے ۔ اور جو حقائق بھی وارد ہوتے ان کے ایمان میں اضافے کا موجب بنتے ہیں ۔ ان کے دلوں میں عنقریب یہ حکمت بیٹھ جائے گی کہ کیوں اللہ نے انیس فرشتے مقرر کیے ہیں 'کیونکہ اللہ کے نظام تخلیق وتدبیر میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے اور ان دونوں کے ذہن میں جب یہ حقیقت بیٹھ جائے گی تو یہ دونوں فریق شک نہ کریں گے کیونکہ یہ بات اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے ۔

وَ لِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَا ذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا

مَثَلًا ( ٧٤ : ٣١ ) ''اور دل کے بیمار اور کفار یہ کہیں کہ بھلا اللہ کا اس عجیب بات سے کیا مطلب ہو سکتا ہے؟'' یوں اس ایک ہی حقیقت کا اثر مختلف دلوں میں مختلف ہوتا ہے ' جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ یقین کرتے ہیں اور جو مومن ہیں ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور جن لوگوں کے دل میں بیماری ہے اور جو ضعیف الایمان اور منافق ہیں وہ حسرت استعجاب میں پوچھتے ہیں :

مَا ذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ( ٧٤ : ٣١ ) ''اللہ کا اس بات سے مطلب کیا ہے؟'' کیونکہ اس تعداد کی حکمت وہ نہیں سمجھتے ۔ اور نہ وہ اصولاً اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ خالق کائنات کی تمام باتوں میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے ۔ وہ خدا اور رسول اللہ ﷺ کی خبروں کی تصدیق پیش کرتے ہیں اور نہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ اللہ کے ہر کام میں خیر اور حکمت پوشیدہ ہوتی ہے ۔

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ( ٧٤ : ٣١ ) ''اس طرح اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے 'ہدایت بخشتا ہے''۔ ''اسی طرح'' یعنی حقائق کے بیان کے ذریعہ اور آیات قرآنیہ کے بیان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مختلف دلوں کو مختلف انداز میں متاثر کرتا ہے ۔ ایک گروہ اللہ کی مشیت کے مطابق ان سے ہدایت لیتا ہے دوسرا گروہ اللہ کے نظام مشیت کے تحت گمراہ ہوتا ہے ۔ کیونکہ ہر امر کا آخری سبب اللہ کا ارادۂ مطلقہ ہوتا ہے ۔ ان انسانوں کو قدرت الٰہیہ نے دونوں طرز کی صلاحیتیں دی ہیں ۔ ان کے اندر ہدایت کی صلاحیت بھی ہے اور گمراہی کی صلاحیت بھی ہے ۔ یہ صلاحیت اللہ کے نظام مشیت کے اندر ہے ۔ پس جو گمراہ ہو ' وہ بھی مشیت کے اندر ہے اور جو ہدایت پائے وہ بھی دائرے کے اندر ہے 'کیونکہ ان کی تخلیق کے اندر دونوں قسم کی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں ۔ دونوں راستے ان کے لیے آسان کر دیے گئے ہیں ' جو کوئی جس راستہ کو اختیار کرتا ہے ' اللہ کے دائرہ مشیت کے اندر ہی ہوتا ہے اور یہ دائرہ اللہ کی گہری حکمت پر مبنی ہے ۔

یہ تصور کہ اللہ کی مشیت مطلق اور بے قید ہے اور اس کائنات میں جو امر واقع ہوتا ہے وہ اس مشیت کے دائرے کے اندر ہوتا ہے ۔ یہ ایک وسیع تصور ہے اور یہ متکلمین کی ان محدود بحثوں سے وسیع تر ہے جو وہ انسان کی جبریت اور اختیار

بارے میں کرتے رہے ہیں - یہ ایک ایسی بحث ہے جس کا کسی فیصلہ کن انجام تک پہنچنا ہی ممکن نہیں ہے - کیونکہ جبر و اختیار کی مباحث نہایت ہی تنگ زاویہ سے کی جاتی ہیں -

یہ بحثیں انسان کی محدود سوچ ' محدود طرز استدلال کے انداز میں اور انسان کے محدود تصورات کے اندر کی جاتی ہیں جبکہ اللہ کے نظام مشیت کا تعلق اللہ کی غیر محدود الوہیت کے نظام سے ہے -

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ہدایت اور ضلالت کا راستہ بتا دیا اور وہ منہاج بھی بتا دیا جس پر چل کر ہم سعادت اور کامیابی حاصل کر سکتے ہیں - اور وہ طریقے بھی بتا دیئے جن کے ذریعہ انسان گمراہ ہوتے ہیں اور برے انجام تک پہنچ جاتے ہیں - اس کے بعد اللہ نے ہمیں مکلف نہیں بنایا کہ اس سے زیادہ بھی ہم جان لیں ' نہ اللہ نے اس سے زیادہ ہمیں قدرت اور طاقت دی ہے - اللہ کا کہنا یہ ہے کہ میرا ارادہ بے قید ہے اور میں جو کچھ چاہتا ہوں وہی ہوتا ہے - لہٰذا ہمیں اپنے فہم اور ادراک کے مطابق اللہ کی بے قید مشیت اور ارادۂ مطلق کو سمجھنا چاہئے اور اس کے مطابق چلنا چاہئے - ہمیں اس منہاج پر چلنا چاہئے جس کے نتیجے میں ہدایت ملتی ہے اور اس منہاج سے بچنا چاہئے جس سے ہم گمراہ ہوتے ہیں اور ان مسائل پر ہمیں فضول اور لاحاصل بحث نہیں کرنا چاہئے جن تک انسانی قوائے مدرکہ کی رسائی ممکن ہی نہیں ہے - اس اصول کے مطابق متکلمین مسئلہ قدر و اختیار کے موضوعات پر جو مباحث کیے ہیں وہ لاحاصل ہیں -

ہم اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے کہ اللہ کی مشیت ہمارے بارے میں کیا کرتی ہے - البتہ ہم اس حقیقت کو پا سکتے ہیں کہ انسان اللہ کے فضل و کرم کے مستحق کس طرح ہوتے ہیں لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی قوتیں ان کاموں میں صرف کریں جن کا ہمیں مکلف بنایا گیا ہے اور اللہ کے پوشیدہ اور مشتبہ امور کو اللہ پر چھوڑ دیں - جب اللہ کی مشیت ظاہر ہو جاتی ہے تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ کی مشیت تھی اور ایسا ہو گیا - مشیت کے ظہور سے قبل ہم سمجھ ہی نہیں سکتے - ہر مشیت کے پیچھے ایک حکمت پوشیدہ ہوتی ہے اور یہ حکمت بھی اللہ جانتا ہے ' صرف اللہ وحدہ - یہ تو ہے ایک سچے مومن کا طریقہ کار -

وَ مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ( ٧٤: ٣١ ) "اور تیرے رب کے لشکروں کو خود اس کے سوا کوئی نہیں جانتا" - اس لیے اللہ کی افواج ' ان کی حقیقت ' ان کے وظائف اور ان کی قوت کا ہمیں علم نہیں ہے ' کیونکہ یہ اللہ کے غیبی امور میں سے ہیں - یہ اللہ کی مرضی ہے کہ وہ ان امور میں سے کسی چیز کا انکشاف کر دے - اور اللہ جو بات کر دے وہ فیصلہ کن اور اٹل ہوتی ہے - اللہ کے قول کے بعد کوئی مجادلہ نہیں کر سکتا ' کسی کو کوئی بات کرنے کی اجازت نہیں ہے اور نہ کسی بات کے معلوم کرنے کی اجازت ہے - کیونکہ یہ کام کوئی کر ہی نہیں سکتا -

وَ مَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ( ٧٤: ٣١ ) "اور اس دوزخ کا ذکر اس کے سوا کسی غرض کے لیے نہیں کیا گیا کہ لوگوں کو اس سے نصیحت ہو" - ھی کی ضمیر یا تو اللہ کے "جنود" کی طرف راجع ہے یا جہنم کی طرف - اور اس پر جو فرشتے ہیں ان کی طرف - اور یہ بھی اللہ کی افواج میں سے ہیں - اور ان کا ذکر لوگوں کو متنبہ کرنے اور ڈرانے کے لیے کیا گیا ہے - محض جدل و جدال کے لیے نہیں - اللہ کے کلام سے صرف اہل ایمان ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں ' رہے گمراہ دل ' تو وہ ان چیزوں کو محض جدل و جدال کا ذریعہ بناتے ہیں -

اس غیبی حقیقت کی وضاحت اور ہدایت لینے اور گمراہ ہونے کے طریقے اور اسباب بتانے کے بعد اب حقیقت آخرت '

حقیقت جہنم اور رب تعالیٰ کی خفیہ قوتوں کو اس کائنات کے ظاہری مشاہد اور نشانیوں کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ ان ظاہری نشانیوں کو تو انسان دیکھتے ہوئے بھی غفلت اور لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہیں جبکہ غیبی حقائق معلوم کرنے کے لیے تیر تکے چلاتے ہیں' حالانکہ ان ظاہری امور اور نشانات سے اللہ کے ارادے اور قوتیں اچھی طرح ظاہر ہوتی ہیں اور ان ظاہری نشانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیچھے بڑا مقصد اور ایک طاقتور ارادہ ہے۔

كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿٣٢﴾ وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ﴿٣٣﴾ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ﴿٣٤﴾ إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ﴿٣٥﴾ نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ ﴿٣٦﴾

" ہرگز نہیں' قسم ہے چاند کی' اور رات کی جبکہ وہ پلٹتی ہے' اور صبح کی جبکہ وہ روشن ہوتی ہے' یہ دوزخ بھی بڑی چیزوں میں سے ایک ہے' انسانوں کے لیے ڈراوا"۔

چاند کے مناظر' رات کے مناظر جب وہ ختم ہوتی ہے اور صبح نمودار ہوتی ہے' یہ زبردست مشاہد اور مناظر ہوتے ہیں۔ یہ آنکھیں کھول دینے والے مناظر ہیں اور انسانی دل و دماغ پر ان کے بے شمار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اور انسان ان پر اگر غور کرے تو اس پر کئی راز کھلتے ہیں۔ کئی گہرے تصورات انسان کے پردۂ خیال پر آتے ہیں اور اسے پختہ شعور ملتا ہے۔ قرآن کریم انسان کو ان مظاہر کی طرف متوجہ کر کے انسان کے دل میں ان تصورات کو بٹھاتا ہے۔ اور ان احساسات کو اچھی طرح جانتا ہے۔

جب چاند طلوع ہوتا ہے' فضائے کائنات میں چلتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔ اگر انسان اسی پر غور کرے تو وہ انسان کے کان میں اس کائنات کے کچھ نہ کچھ راز ضرور ڈال دیتا ہے اور بعض اوقات تو چاند کی روشنی میں کھڑے ہو کر غور و فکر کرنے سے انسان پر یہ اثر ہوتا ہے کہ گویا اس نے نور کا غسل کر لیا ہے۔

اور رات کے جانے کا منظر بھی عجیب ہوتا ہے' صبح کی نموداری کے وقت اور سورج کے طلوع سے پہلے کے ان پرسکون لمحات میں' اگر انسان چشم بینا سے دیکھے تو اس کو نظر آتا ہے کہ ایک شعوری ارادہ اور دست قدرت ایک صورت حال کو ہٹا کر دوسری حالت کو بڑھا رہا ہے۔ اس منظر میں جس طرح دنیا آہستہ آہستہ منور ہوتی ہے' قلب بینا بھی منور ہوتا چلا جاتا ہے۔ غرض صرف چشم بینا کی ضرورت ہے اور احساس و شعور کی۔

اللہ تعالیٰ انسانی قلب و نظر کا خالق ہے اور وہ جانتا ہے کہ یہ مناظر انسانی احساسات پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ اور بعض اوقات تو یہ اثرات اس قدر گہرے ہوتے ہیں کہ انسان یہ سمجھتا کہ وہ از سر نو پیدا کر دیا گیا ہے اور پہلی مرتبہ یہ دیکھ رہا ہے۔

اور ان موثرات' اشراقات اور تاثرات کے استقبال کے پیچھے' شمس و قمر اور لیل و نہار اور نموداری صبح میں ایک دوسری عظیم حقیقت بھی پوشیدہ ہے جس کی طرف قرآن انسان کو متوجہ کر رہا ہے۔ انسانی قلب و نظر کو آمادہ کر رہا ہے کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کرے کہ ان مظاہر میں اللہ کی قدرت تخلیق' اللہ کی حکمت تدبیر اور اس کائنات کے زبردست نظم و نسق کے نشانات ہیں اور یہ کہ یہ کائنات اس قدر دقیق اور پیچیدہ نظم کے ساتھ چل رہی ہے کہ اسے دیکھ کر انسانی عقل

حیرت زدہ ہو جاتی ہے۔

ان عظیم کائناتی حقائق کے ساتھ قسم اٹھا کر اللہ تعالیٰ غفلت میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو جگاتا ہے کہ اللہ کی عظیم قدروں کو ذرا سمجھنے کی کوشش کرو، اور ان کے اندر جو آثار و نشانات ہیں ان سے عبرت لو۔ یہ کہ جہنم اور اس کے اوپر متعین افواج الٰہیہ اور آخرت اور اس کی ہولناکیاں دراصل ان عظیم امور میں سے ہیں جو عجیب بھی ہیں اور خوفناک بھی ہیں اور یہ واقعات نہایت ہی پر خطر ہیں۔ انہیں سنجیدگی سے لو۔

اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ (۳۵) نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ (۳۶:۷۴) "یہ دوزخ بھی بڑی چیزوں میں سے ایک ہے، انسانوں کے لیے ڈراوا"۔ یہ قسم اور اس کے مشمولات اور وہ بات جس پر اس انداز میں قسم اٹھائی جارہی ہے، یہ سب باتیں انسانی قلب و نظر کو جھنجھوڑنے والی ہیں اور انسان کو بڑی شدت سے جھٹکے دینے والی ہیں اور یہ بات اپنے مضمون اور صوتی ہم آہنگی کے اعتبار سے 'صور میں پھونکے جانے (النقر في الناقور) کے تیز سورت کے آغاز میں مدثر کے نام سے پکارنے اور نہایت ہی سخت حکم بلکہ کاش۔

قُمْ فَاَنْذِرْ (۲:۷۴) کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ گویا حالات خطرناک ہیں، فضا پر خوف طاری ہے اور ہنگامی حالت کا ہائے وہو برپا ہے۔

اب ان شدید جھٹکوں اور تنبیہات اور نہایت ہی اثر انگیز نداؤں کی روشنی میں یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہر نفس اپنے کیے کا حق دار اور ذمہ دار ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو چاہئے کہ جو راہ وہ اختیار کرتا ہے، پوری پوری ذمہ داری کے ساتھ اختیار کرے۔ یہ کہ ہر نفس خود مختار ہے اور وہ اپنے لیے جو انجام چاہے اختیار کرلے۔ وہ اپنے اعمال اور کسب کا ذمہ دار ہے۔ ہر شخص اپنے حق کا حقدار ہو گا اور اپنے گناہوں کا بوجھ خود اٹھائے گا۔

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿۳۸﴾

"تم میں سے ہر اس شخص کے لیے ڈراوا جو آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے رہ جانا چاہے۔ ہر شخص اپنے کسب کے بدلے رہن ہے"۔

ہر شخص اپنے نفس کا ذمہ دار ہے، جس حالت میں اسے چاہے، رکھ دے، جو بوجھ چاہے اٹھالے، جو قدم چاہے اٹھائے۔ اچھائی کی طرف آگے بڑھے، یا پیچھے رہ جائے۔ اپنے آپ کو عزت دے یا ذلیل کرے۔ ہر نفس اپنی کمائی کے ہاتھ رہن ہے اور اپنے اعمال کے ہاں قید ہے۔ اللہ نے ہر شخص کو راہ ہدایت بھی بتا دی ہے اور راہ ضلالت بھی دکھا دی ہے اور اس کائنات کے ان مناظر کی روشنی میں اور جہنم کی منظر کشی کے بعد وہ ہر اس چیز کو فنا کر دینے والی ہے، جو اس کے دائرے کے اندر آجائے۔

اس منظر کے بعد کہ ہر نفس اپنے کیے کا ذمہ دار ہے اور جو کچھ اس کیا اس کا مرہون ہے۔ یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اصحاب الیمین ان جکڑ بندیوں اور ان پابندیوں سے آزاد ہوں گے اور وہ حساب و کتاب کے بعد رہائی پالیں گے۔ اور اس کامیابی کے بعد اب وہ مجرمین سے پوچھیں گے کہ وہ کیا وجوہات تھیں جن کی وجہ سے وہ اس انجام سے دوچار ہوئے۔

إِلَّآ أَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿٣٩﴾ فِىْ جَنّٰتٍ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿٤٠﴾ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٤١﴾
مَا سَلَكَكُمْ فِىْ سَقَرَ ﴿٤٢﴾ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿٤٣﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿٤٤﴾
وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٤٦﴾ حَتّٰىٓ أَتٰىنَا
الْيَقِيْنُ ﴿٤٧﴾

"دائیں بازو والوں کے سوا' جو جنتوں میں ہوں گی' وہ مجرموں سے پوچھیں گے "تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟" وہ کہیں گے "ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے' اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے' اور حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے' اور روز جزاء کو جھوٹ قرار دیتے تھے' یہاں تک کہ ہمیں اس یقینی چیز سے سابقہ پیش آگیا"۔

اصحاب الیمین کی رہائی اور قید و بند سے ان کے چھوٹ جانے کا واقعہ کیونکر پیش آیا کہ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ان کی نیکیوں کو دوگنا کر دیا اور ایسے مشکل حالات میں ان کی رہائی اور کامیابی کا اعلان دلوں کو گرما دیتا ہے اور انسان اللہ کی رحمتوں کے یقین سے سرشار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس بات کا اثر مجرموں اور تکذیب کرنے والوں پر بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو سخت ترین حالات میں محصور پاتے ہیں۔ نہایت ہی اہانت آمیزی کے ساتھ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور ایک طویل بیان ریکارڈ کراتے ہیں' جبکہ وہ اہل ایمان جن کو وہ اس دنیا میں کچھ چیز ہی نہ سمجھتے تھے اور ان کو ذرہ برابر اہمیت بھی نہ دیتے تھے' وہ اب عزت و تکریم کی بلندیوں پر ہیں۔ اور وہ ان سے اس انداز میں سوال کرتے ہیں جس طرح کوئی نہایت ہی شکست خوردہ شخص سے کرتا ہے۔ ذرا سوال دیکھیں :

مَا سَلَكَكُمْ فِىْ سَقَرَ (٧٤ : ٤٢) "تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟" اور اس صورت حال کا اہل ایمان کے دل پر گہرا اثر ہوتا ہے' جو ان مجرمین کے ہاتھوں اس جہاں میں سخت اذیتیں جھیل رہے تھے۔ آج وہ عالم آخرت میں اپنے آپ کو نہایت ہی اعلیٰ مقام میں پاتے ہیں' جبکہ ان کو دق کرنے والے اس توہین آمیز پوزیشن میں ہیں' یہ منظر اس قدر دلکش اور پرتاثیر ہے کہ فریقین اپنے آپ کو قیامت کے دن حاضر و موجود پاتے ہیں۔ گویا اس دنیا کا صفحہ لپیٹ لیا گیا ہے اور ہم قیامت کے میدان میں حاضر و موجود ہیں۔

اور اب ذرا اس طویل اعتراف جرم کو پڑھیں جو ان مکذبین اور متکبرین نے اللہ اور مومنین کی موجودگی میں کیا' اور نہایت ہی ذلت اور خواری کے ساتھ کیا۔

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (٧٤ : ٤٣) "وہ کہیں گے ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے"۔
اشارہ یہ ہے کہ ہم ایمان لا کر اس گروہ میں شامل نہ ہوئے جو نمازیوں کا گروہ تھا' اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں نماز کی اہمیت کیا ہے۔ یہ گویا ایمان اور فلاح کی دلیل ہے اور نماز کا انکار دراصل کفر ہے اور جو شخص نماز نہیں پڑھتا۔ وہ

صفت ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔

وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ( ٧٤ : ٤٤ ) "اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے"۔ یہ دوسری صفت ہے۔ نماز اللہ کی بندگی کی صفات میں سے ہے جس کا تعلق ذات باری سے ہے جبکہ اطعام مساکین وہ عبادت ہے جس کا تعلق انسانوں کی ذوات سے ہے۔ قرآن کریم میں انسانوں کے رزق کے انتظام کو ایمان کا حصہ قرار دیا گیا ہے اور اس پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ عرب معاشرہ' جہاں فخر و مباہات پر وہ سب کچھ لٹا دیتے تھے۔ وہاں غرباء اور مساکین بھوک سے مرتے تھے اور کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ قرآن اس مسئلہ کی طرف خالص انسانی بنیادوں پر متوجہ کرتا ہے اور صرف رضائے الٰہی کے لیے اطعام مساکین کو عبادت قرار دیتا ہے۔

وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ( ٧٤ : ٤٥ ) "اور حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے"۔ یہاں بتایا جاتا ہے کہ وہ لوگ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقیدہ کے بارے میں کس قدر بے باک تھے اور وہ اسلامی عقیدے کو محض گپ شپ سمجھتے تھے۔ اور ایمان ان کے لیے طنز و مزاح کا موضوع تھا۔ حالانکہ ایمان اور عقیدہ ایک نہایت ہی سنجیدہ' خطرناک اور خوفناک نتائج کا حامل معاملہ تھا۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس میں ان کو چاہئے تھا کہ نہایت غور و خوض کے بعد کوئی فیصلہ کرتے۔ زندگی کے تمام معاملات سے قبل اس بارے میں فیصلہ ضروری تھا۔ اس کا تصور' اس کا شعور' اس کی قدر و قیمت اور اس کی حقیقت کے تعین پر تمام حقائق حیات کا تعین موقوف ہے۔ لہٰذا اس موضوع پر سنجیدگی اور غور و فکر کے ساتھ فیصلہ نہ کرنا ایک احمقانہ قدم تھا اور ہم سے اس حماقت کا صدور ہو چکا ہے کہ ہم اس قدر اہم معاملے کو گپ شپ سمجھتے رہے۔

وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ( ٧٤ : ٤٦ ) "اور روز جزاء کو جھوٹ قرار دیتے تھے"۔ یہ ہے اس مصیبت کی اصل بنیاد' جو شخص قیام قیامت کا منکر ہوتا ہے اس کی زندگی کی تمام قدریں اور پیمانے خلل پذیر ہو جاتے ہیں اور اس کی تمام اقدار مضطرب ہوتی ہیں۔ اس کے احساسات میں زندگی کا دائرہ بہت ہی محدود اور تنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی پوری سوچ اس زمین کی مختصر عمر تک محدود ہو جاتی ہے اور وہ انہی نتائج کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔ جو اس مختصر زندگی میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ ان نتائج پر کبھی مطمئن نہیں ہوتا اور آخرت کا کوئی حساب و کتاب اس کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے تمام معیارات اور تمام قیاسات فساد پذیر ہوتے ہیں۔ اس کے دنیاوی امور میں بھی فساد برپا ہوتا ہے اور اس کے تمام امور شر پر منتج ہوتے ہیں۔

مجرم یہ کہتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ ہمارے احوال کچھ یوں تھے کہ ہم نماز نہ پڑھتے تھے' مساکین کو کھانا نہ کھلاتے تھے اور محض گپ شپ اور غیر سنجیدہ گفتگو میں لگے رہتے تھے اور قیامت کی تکذیب کرتے تھے۔

حَتّٰی اَتٰنَا الْيَقِيْنُ ( ٧٤ : ٤٧ ) "یہاں تک کہ اس یقینی چیز سے سابقہ پیش آگیا"۔ یعنی ہم موت سے دوچار ہو گئے' جو تمام شکوک و شبہات کو ختم کر دیتی ہے۔ اور معاملے کا فیصلہ کر دیتی ہے اور یہ فیصلہ اس قدر یقینی ہوتا ہے کہ

کوئی اسے رد نہیں کر سکتا۔اب نہ ندامت مفید ہوتی ہے اور نہ توبہ قبول ہوتی ہے۔اور نہ عمل صالح کا وقت رہتا ہے۔ اور اب یقینی صورت حالات پیش آتی ہے۔

یہاں اس برے موقف پر ایک تبصرہ ہوتا ہے کہ اب تو تمام امیدیں کٹ گئی ہیں اور یہ لوگ اس انجام تک آپہنچے ہیں۔

فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ﴿٤٨﴾

"اس وقت سفارش کرنے والوں کی کوئی سفارش ان کے کسی کام نہ آئے گی"۔اب تو فیصلہ ہو چکا اور بات پچ ہو گئی۔سب کا فیصلہ ہو گیا' اور یہ فیصلہ اور یہ انجام مجرمین کا حقیقی انجام تھا۔اب ان مجرموں کو کسی کی کوئی سفارش فائدہ نہ دے گی اور اگر فرض کر لیا جائے کہ کوئی سفارش ہو گی تو بھی یہ سفارش کام نہ آئے گی۔

اس توہین آمیز اور مایوس کن صورت حالات کی تصویر دکھا کر اب پھر ان لوگوں کو 'متوجہ کیا جاتا ہے کہ اس دنیا میں ان کے لیے جو مواقع فراہم کر دیئے گئے ہیں' ان کو چاہئے کہ وہ ان مواقع سے فائدہ اٹھائیں لیکن وہ اس ہدایت سے منہ موڑ رہے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے روکتے ہیں بلکہ وہ ہدایت اور خیر سے دور بھاگتے ہیں۔اور ان وسائل سے دور بھاگتے ہیں جو زندگی' ابدی زندگی کے حقیقی وسائل ہیں۔چنانچہ یہ لوگ جس صورت حال میں ڈوبے ہوئے ہیں اس کی ایک مضحکہ خیز جھلک دکھائی جاتی ہے۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ﴿٤٩﴾ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ ﴿٥٠﴾ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾

"آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ اس نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں 'گویا یہ جنگلی گدھے ہیں جو شیر سے ڈر کر بھاگ پڑے ہیں"۔

جنگلی گدھے بہت ہی ڈرپوک ہوتے ہیں 'جب یہ شیر کی دھاڑ کی آواز سنتے ہیں تو یہ جدھر منہ ہوتا ہے ادھر بھاگ جاتے ہیں۔عرب اس قسم کے مناظر سے واقف تھے۔جب انسانوں کو ان خوفزدہ گدھوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔تو یہ منظر نہایت ہی مضحکہ خیز ہوتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ تذکرہ اور نصیحت سے ان کی نفرت اور فرار انہیں انسانوں کی بجائے گدھے بنا دیتا ہے۔اس لیے نہیں کہ انہیں کوئی خوف درپیش ہے بلکہ اس لیے کہ ایک یاد دہانی کرانے والا ان کو اپنے رب کی طرف بلا رہا ہے اور انہیں یہ موقعہ فراہم کر رہا ہے کہ یہ لوگ اس خوفناک انجام سے دوچار ہونے سے بچ جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دست قدرت کی محیر العقول عکاسی ہے 'جس نے اس تشبیہ کو یوں ریکارڈ کیا تاکہ قیامت تک لوگ اسے پڑھتے رہیں اور ان لوگوں کا رویہ قابل نفرت نظر آتا رہے اور لوگ ایسے رویئے سے بچتے رہیں اور جن لوگوں نے یہ رویہ اختیار کیا وہ شرمساری سے منہ چھپاتے پھریں۔

یہ تو تھی ان لوگوں کی بیرونی تصویر کہ "وہ جنگلی گدھے ہیں جو شیر کے ڈر سے بھاگ پڑے ہیں"۔لیکن ان کی داخلی نفسیاتی تصویر کیا ہے اور ان کا شعوری خلجان کیا ہے

بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾

"بلکہ ان میں سے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اس کے نام کھلے خط بھیجے جائیں"۔

یہ شعور وہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ حسد کی وجہ سے رکھتے تھے کہ حضور ﷺ کو یہ منصب کیوں عطا ہوا؟ ہر کہ ومہ یہ چاہتا تھا کہ یہ منصب اسے دیا جائے اور ہر شخص کے اوپر کھلے صحیفے اترتے نظر آئیں ۔ یہ اشارہ ہے ان کبرائے قریش کی طرف جو اس بات پر جل بھن گئے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) ابن عبداللہ پر یہ کلام کیوں نازل ہوا:

لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْآنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ "یہ قرآن دو شہروں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں ہوا؟" لیکن اللہ نے فرمایا کہ وہ جانتا ہے کہ منصب رسالت کا اہل کون ہے اور اس عظیم کام کے لیے اس نے کس کا انتخاب کرنا ہے ۔ یہی بات تھی جس کی وجہ سے یہ لوگ اسلامی نظریہ حیات سے نفرت کرتے تھے اور قبولیت پر آمادہ نہ تھے ۔

ان لوگوں کے نفوس کی اندرونی تصویر کشی جاری ہے' چنانچہ اس طمع اور لالچ اور حسد سے بھرپور ایک دوسرا سبب بھی سامنے رکھ دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس بے جا حسد اور لالچ میں کیوں مبتلا ہوگئے ہیں تو اس سے بھی دور رس سبب یہ ہے کہ یہ لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ۔ اس وجہ سے اللہ کے اس فضل و کرم سے محروم ہوگئے ہیں ۔

كَلَّا ۖ بَل لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ﴿٥٣﴾

"ہرگز نہیں' اصل بات یہ ہے کہ یہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے"۔

ان کی یہ بے خوفی اور لاابالی پن ہی ہے جو انہیں اس نصیحت و حکمت سے دور کر رہا ہے اور دعوت اسلامی سے یہ دور بھاگ رہے ہیں ۔ اگر ان کے دلوں میں آخرت کا شعور ہوتا تو ان کی صورت حال یہ نہ ہوتی کہ یہ ہر معاملے میں شک میں گرفتار ہیں ۔

اس کے بعد ایک بار پھر ان کو تنبیہ کی جاتی ہے ۔ اب آخری بات کہہ دی جاتی ہے اور ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اب جو چاہیں' کریں اور جو انجام چاہیں' قبول کریں ۔

كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ﴿٥٤﴾ فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ ﴿٥٥﴾

"ہرگز نہیں' یہ تو ایک نصیحت ہے' اب جس کا جی چاہے اس سے سبق حاصل کرلے"۔

یہ قرآن جس کے سننے سے یہ لوگ منہ موڑ رہے ہیں اور اس طرح بھاگ رہے ہیں جس طرح جنگلی گدھے بھاگتے ہیں ۔ جبکہ ان کے دل حسد اور لالچ سے بھرے ہیں ۔ اور آخرت کے بارے میں یہ لوگ لاپرواہ ہیں ۔ یہ تو ایک تذکرہ اور تنبیہ اور نصیحت ہے ۔ جو چاہے یہ نصیحت حاصل کرے ۔ جو نہ چاہے نہ کرے ۔ نفع نقصان ہر کسی کا اپنا ہے ۔ جو چاہے عزت اور جنت حاصل کرے اور جو چاہے ذلت اور جہنم حاصل کرے ۔

یہ بات کہنے کے بعد کہ لوگ نیک و بد کے اختیار کرنے میں آزاد و مختار ہیں ۔ یہ حقیقت بھی سامنے لائی جاتی ہے کہ ان کی یہ آزادی اور اختیار دائرہ مشیت الٰہیہ کے اندر ہے اور اللہ کی مشیت بے قید ہے ۔ اور انجام کار تمام امور اللہ کے

دائرہ اختیار ہی میں ہیں ۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآن ہر موقعہ و مناسبت میں واضح کرتا ہے تاکہ انسان یہ نہ سمجھ لے کہ اللہ کی مشیت محدود ہے ۔ مطلب یہ کہ انسانی اختیار بھی دائرہ مشیت کے اندر ہی ہوتا ہے اور تمام واقعات اللہ کے حکم و مشیت سے وقوع پذیر ہوتے ہیں ۔ ۲

۵۶ وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾ ۱۶

"اور یہ کوئی سبق حاصل نہ کریں گے الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے ۔ وہ اس کا حقدار ہے کہ اس سے تقویٰ کیا جائے اور وہ اس کا اہل ہے کہ (تقویٰ کرنے والوں کو) بخش دے"۔

اس کائنات میں جو چیز بھی واقع ہوتی ہے اللہ کے عظیم تر نظام مشیت میں بندھی ہوتی ہے ۔ اللہ کے ارادے اور مشیت ہی کے رخ پر اور اس کے وسیع دائرے کے اندر واقعات چلتے ہیں ۔ لہٰذا کسی انسان سے کوئی فعل اللہ کی مشیت کے بغیر سرزد نہیں ہو سکتا ۔ زمین کی تمام قدروں کو مشیت الٰہیہ اپنے دائرے کے اندر لیے ہوئے ہوتی ہے ۔ کیونکہ تمام قدریں اللہ کی مشیت کی پیدا کردہ ہیں اور انسان اور نوامیس فطرت اللہ کے پیدا کردہ ہیں ۔ اس کائنات میں جو واقعات چلتے ہیں وہ مشیت الٰہیہ کی ریل کے اندر ہی چلتے ہیں جس پر کوئی حد اور قید نہیں ہے ۔ اس ریل کے اندر ہر انسان آزاد بھی ہے اور بند بھی ۔

تذکر اور نصیحت آموزی تو اللہ کی توفیق کے مطابق ہوتی ہے ۔ اللہ جانتا ہے کہ کون اس کا مستحق ہے ۔ دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہوتے ہیں ۔ اللہ جس طرف چاہتا ہے انہیں پھیر دیتا ہے ۔ اگر اللہ جان لے کہ یہ شخص اچھی نیت کا مالک ہے تو اللہ اسے اچھائی کی طرف پھیر دیتا ہے ۔

لیکن انسان کو کوئی پتہ نہیں ہے کہ اللہ کیا چاہتا ہے؟ اللہ کی چاہت تو پردۂ غیب میں ہے ۔ البتہ اس کو یہ معلوم ہے کہ اللہ کی رضا کیا ہے؟ کس میں ہے؟ اور یہ بات اللہ نے قرآن میں بتا دی ہے کہ اللہ کی رضا کس میں ہے؟ جب انسان اللہ کی مرضی کے راستے کی طرف بڑھتا ہے تو اللہ اسے مزید آگے بڑھنے کی توفیق دیتا ہے ۔

لیکن اللہ تعالیٰ ایک مومن کے احساس کے اندر جس چیز کو اچھی طرح بٹھانا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی مشیت بے قید ہے ۔ اور یہ کہ اللہ کی مشیت اسے گھیرے ہوئے ہے' تاکہ ایک مخلص بندے کی تمام تر توجہ اللہ کی ذات پر مرکوز رہے ۔ اور ایک مسلم پوری طرح اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کیے رکھے ۔ یہ ہے وہ بنیادی حقیقت جسے ذہن نشین کیے بغیر اسلام کسی انسان کے دل میں جاگزیں نہیں ہو سکتا ۔ اور جب یہ کیفیت ذہن میں اچھی طرح بیٹھ جائے اور انسانی قلب و نظر اس میں سرشار ہو جائیں اور انسان زندگی کے تمام واقعات اور حادثات کی تعبیر اس تصور کے مطابق کرنے لگے تو وہ صحیح طرح مسلم ہوتا ہے ۔ یہی مقصد ہے اللہ کی مشیت کے بے قید ہونے کا اور اللہ کی مشیت کا یہ اطلاق قرآن میں ہر فیصلے کے ساتھ لایا جاتا ہے ۔ چاہے جنت اور دوزخ کا فیصلہ ہو' چاہے کسی شخص کی ہدایت و ضلالت کا فیصلہ ہو ۔

رہا وہ تاریخی اور کلامی مجادلہ و مباحثہ جو انسان کے جبر و اختیار کے بارے میں چلا' تو وہ پوری حقیقت کو ظاہر نہیں کرتا' وہ دراصل کلی حقیقت کے ایک جزء کو لیتا ہے اور اس کی وجہ سے فکر انسانی کبھی تشفی بخش قول تک کبھی نہیں پہنچ سکا ۔ کیونکہ یہ مباحثہ و مجادلہ قرآن کے صحیح اور سادہ راہوں سے ہٹ کر نہایت ہی پیچیدہ راہوں پر جا نکلا اور جس قدر یہ مباحثہ آگے بڑھا' فکر انسانی کی تگ و تازی کی راہیں تنگ ہوتی رہیں ۔

وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۷۴ : ۵٦) "اور یہ کوئی سبق حاصل نہ کریں گے۔ الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے"۔ کیونکہ وہ اللہ کی مشیت کے نظام سے متصادم نہیں ہو سکتے۔ اور نہ وہ کسی حیثیت میں کوئی مخالفانہ حرکت کرتے ہیں۔ انسان کی حرکت اور انسان کا ارادہ بھی وسیع تر دائرہ مشیت کے اندر ہی ہوتا ہے۔

هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى (۷۴ : ۵٦) "وہ اس کا حقدار ہے کہ اس سے تقویٰ کیا جائے"۔ اللہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کے بندے اس سے ڈریں' اس لیے ان پہ مطالبہ ہے کہ وہ اللہ سے ڈریں۔

وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ (۷۴ : ۵٦) "اور وہ اس بات کا اہل ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو بخش دے"۔

اور یہ کرم وہ جن بندوں پر چاہتا ہے 'کرتا ہے اور اللہ کا کرم اس کے نظام مشیت کے مطابق ہوا کرتا ہے۔ تقویٰ ہی انسان کو مغفرت کا اہل بناتا ہے۔ اور اللہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔

هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ (۷۴ : ۵٦) "وہ اس بات کا حق دار ہے کہ اس سے تقویٰ کیا جائے اور وہ اس کا اہل ہے تقویٰ کرنے والوں کو بخش دے"۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۲۹

## سورۃ القیامۃ ۔ ۷۵

## ۱ -- تا -- ۴۰

# سورۃ القیامة ایک نظر میں

یہ ایک چھوٹی سی سورت ہے ' لیکن انسان کے دل و دماغ پر یہ اس قدر حقائق و دلائل ' تصاویر اور مناظر اور اثرات و اشارات کا القا کرتی ہے جن کا کوئی انسان نہ دفاع کر سکتا ہے اور نہ ان سے صرف نظر کر سکتا ہے ۔ ان مناظر اور تاثرات کو یہ سورت نہایت ہی قوت کے ساتھ ' اپنے خاص قرآنی اسلوب میں ' نہایت بھرپور انداز میں اور بڑی کثرت سے پیش کرتی ہے ۔ انداز تعبیر بھی نہایت پر شوکت ' نہایت ہی مترنم اور نہایت ہی معنی خیز ہے ۔ اگر کوئی اسے کھلے دل اور شعور کے ساتھ پڑھے تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پہلی دو آیات میں قیام قیامت اور نفس لوامہ کی قسم کی طرف اشارہ ہے ۔

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (١) وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (٧٥ : ٢) "میں قسم نہیں کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور میں قسم نہیں کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی" ۔ اس کے بعد قیامت اور نفس لوامہ دونوں کے متعلق مباحث آتے ہیں اور سورت کے اختتام تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ قیامت اور ملامت کرنے والے نفس کے موضوعات ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۔ گویا قسم نہ کھانے کا اعلان قسم کی طرف اشارہ ہے ۔ اور دونوں نکات موضوع سورت ہیں ۔ گویا دونوں واقعات کے درمیان ایک خوبصورت اور گہرا ربط ہے ۔

ان بڑے حقائق میں سے جو اس سورت میں لائے گئے ' اور جن کے ذریعہ قلب انسانی کے گرد ایسا حصار ڈالا گیا ہے کہ اس سے اس کے بھاگنے کا کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا گیا ۔ ایک حقیقت یہ ہے کہ موت ایک ایسا حادثہ ہے جس سے ہر انسان کو دوچار ہونا ہے ۔ کوئی اسے روک نہیں سکتا ۔ نہ اس کا مقابلہ کر سکتا ہے ۔ اس کا وقوع ہر لمحہ ہوتا رہتا ہے ۔ بڑے ' چھوٹے ' بڑے امیر و فقیر ' قوی اور ضعیف سب اس سے دوچار رہتے ہیں ۔ اس کے مقابلے میں کسی کے پاس نہ کوئی حیلہ ہے اور نہ وسیلہ ' نہ قوت مدافعت ہے اور نہ سفارش ۔ نہ تقدیم ہے اور نہ تاخیر ۔ یہ فیصلہ ایک ایسے پلیٹ فارم سے آتا ہے جہاں کسی کا کوئی زور نہیں چلتا اور ماسوائے سر تسلیم خم کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا ۔ اس بارگاہ کا ارادہ اٹل ہے ۔ یہ بہت ہی بلند ارادہ اور اونچی بارگاہ ہے ۔ غرض یہ سورت انسانی دلوں کی یوں چٹکیاں بھرتی ہے :

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ (٢٦) وَقِيْلَ مَنْ رَاقٍ (٢٧) وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ (٢٨) وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ (٢٩) اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ (٣٠) (٧٥ : ٢٦ تا ٣٠) "ہرگز نہیں ' جب جان حلق تک پہنچ جائے گی ' اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ' اور آدمی سمجھ

لے گا کہ یہ دنیا سے جدائی کا وقت ہے اور پنڈلی سے پنڈلی جڑ جائے گی ۔ وہ دن ہو گا تیرے رب کی طرف روانگی کا"۔

یہ سورت جو حقائق پیش کرتی ہے 'ان میں سے ایک انسان کی پہلی پیدائش ہے اور یہ پہلی تخلیق دراصل دوسری تخلیق پر دلیل ہے ۔ اور یہ کہ انسان کی تخلیق کے پیچھے تدبیر بھی ہے اور تقدیر بھی ہے ۔ یہ ایک ایسی نمایاں حقیقت ہے جس کے مراحل کو اللہ تعالیٰ نہایت تفصیل کے ساتھ بتاتا ہے ۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخلیق کس قدر پیچیدہ ہوتی ہے اور اس پر بروقت ذات باری کو قدرت حاصل ہے ۔ اور جو لوگ آخرت کی تکذیب کرتے ہیں وہ بھی تخلیق انسان کا دعویٰ نہیں کر سکتے ۔ یہ تخلیق اس بات کو قطعیت کے ساتھ طے کرتی ہے کہ ایک الٰہ ہے جو ان امور کی تدبیر کرتا ہے اور یہ سب امور اس کی تقدیر اور اندازے کے مطابق ہیں ۔ لہٰذا دوبارہ تخلیق اس دنیا کے معاملات کا حتمی اور لازمی نتیجہ ہے کیونکہ اللہ نے انسان کو بے مقصد پیدا نہیں کیا اور نہ اللہ کے نزدیک انسانوں کی زندگی اور ان کے اعمال بلاوزن ہیں ۔ اور نہ حساب و کتاب سے آزاد ہیں ۔ یہ ہیں وہ موثرات جن کے ذریعہ یہ سورت انسان کے احساسات کو جگاتی ہے ۔

چنانچہ اس بحث کے آغاز ہی میں کہا جاتا ہے :

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (۳۶) اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى (۳۷) ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى (۳۸) فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى (۳۹) اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى (۴۰) (۷۵ : ۳۶ تا ۴۰) "کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا' پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے' پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں ۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر دے"۔

اس سورت کے موثر ترین مناظر میں سے 'قیام قیامت کا منظر ہے ۔ اس منظر کا قلب انسانی پر بے حد گہرا اثر ہوتا ہے ۔ اس منظر میں قیام قیامت کے وقت کے کائناتی انقلابات 'نفسیاتی تغیرات' اور خوف و ہراس کی فضا کا بیان ہے 'جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوف و ہراس کائنات کی روح پر چھا گیا ہے اور نفس انسانی کی گہرائیوں تک جا پہنچا ہے ۔ نفس انسانی کی حالت یوں ہے کہ وہ یوں اچھل کود رہا ہے جس طرح پنجرے میں بند چوہا اچھل کود رہا ہوتا ہے اور ادھر ادھر سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے ۔ یہ منظر انسانوں کے اس قول کے جواب میں پیش کیا گیا ہے کہ قیامت ممکن نہیں ہے اور یہ پردۂ غیب میں مستور ایک چیز ہے ۔ انسان اسے اہم نہیں سمجھتا اور اس کے بارے میں شک کا اظہار کرتا ہے اور اس کے بارے نہایت فاسقانہ تبصرہ کرتا ہے ۔ چنانچہ نہایت ہی سرعت سے قیامت کی چند تیز رفتار جھلکیاں دکھائی جاتی ہیں ۔

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ (۵) يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ (۶) فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ (۷) وَخَسَفَ الْقَمَرُ (۸) وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (۹) يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ

اَیْنَ الْمَفَرُّ (۱۰) کَلَّا لَا وَزَرَ (۱۱) اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذِ نِ الْمُسْتَقَرُّ (۱۲) یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ (۱۳) بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَۃٌ (۱٤) وَّ لَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ (۱۵) (۷۵: ۵ تا ۱۵) "میں قسم نہیں کھاتا ہوں قیامت کے دن کی' اور میں قسم نہیں کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی 'کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔ مگر انسان چاہتا ہے کہ آگے بھی بد اعمالیاں کرتا رہے۔ پوچھتا ہے "آخر کب آنا ہے وہ قیامت کا دن؟" پھر جب دیدے پتھرا جائیں گے اور چاند بے نور ہو جائے اور چاند سورج ملا کر ایک کر دیئے جائیں گے۔ اس وقت یہی انسان کہے گا "کہاں بھاگ کر جاؤں؟" ہرگز نہیں' وہاں کوئی جائے پناہ نہ ہو گی' اس روز تیرے رب ہی کے سامنے جا کر ٹھہرنا ہو گا۔ اس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے"۔

ان مناظر میں سے ایک منظر مومنین کا بھی ہے جو اپنے رب کے سامنے نہایت ہی اطمینان کے ساتھ کھڑے ہیں۔ وہ مشتاقان دید ہیں' حالانکہ یہ دن ایسا ہے کہ جس کے اندر ہر طرف خوف و ہراس کی فضا ہے اور مومنین کے بالمقابل ایسے لوگوں کا منظر ہے جو اللہ سے ڈرے ہوئے ہیں' ناامید ہیں اور انہوں نے جو کفر اور معصیت کی ہے اس کے انجام کی توقع وہ رکھتے ہیں۔ یہ منظر اس قدر پر شوکت ہے کہ گویا وہ آنکھوں کے سامنے نظر آتا ہے۔ یہ منظر ان لوگوں کی تردید میں ہے جو آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ منظر یوں ہے :

کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ (۲۰) وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَۃَ (۲۱) وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ (۲۲) اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَۃٌ (۲۳) وَ وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ بَاسِرَۃٌ (۲٤) تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَۃٌ (۲۵) (۷۵: ۲۰ تا ۲۵) "ہرگز نہیں' اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔ اس روز کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے' اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے اور کچھ چہرے اداس ہوں گے اور سمجھ رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ برتاؤ ہونے والا ہے"۔

اس سورت کے ان مشاہد' تاثرات اور دلائل کے درمیان چار آیات کا ایک نکتہ معترضہ ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک خاص ہدایت کی گئی ہے۔ یہ ہدایت اس قرآن کے بارے میں ہے اور یہ نکتہ بھی اس سورت کے اندر موجود ایک مناسبت کی وجہ سے آیا ہے' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات کا خوف کیا کرتے تھے کہ کہیں آپ وحی کی کوئی چیز بھول نہ جائیں۔ چنانچہ آپ وحی وصول کرتے وقت فقرہ فقرہ دہراتے تھے۔ اور زبان کو حرکت میں لاتے تھے تاکہ اسے یاد کر لیں۔ چنانچہ یہ ہدایت دی گئی :

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ (۷۵: ۱٦) اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ (۷۵: ۱۷) فَاِذَا

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (۱۸:۷۵) ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ (۷۵:۱۹)(۷۵:۱۶ تا ۱۹) ”اے نبی ؐ اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو ' اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے ' لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں ' اس وقت تم اس کی قرأت کو غور سے سنتے رہو ' پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے“۔ یہ یقین دہانی اس لیے کرائی گئی کہ یہ وحی ' اس کا نزول اور اس کی حفاظت ' اس کا جمع کرنا اور اس کا سمجھانا اور بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے ۔ یہ اللہ کا کام ہے ۔ آپ کا کام صرف اخذ کرنا اور تبلیغ کرنا ہے ۔ لہٰذا آپ مطمئن رہیں اور آپ کے دل میں بھول جانے کے بارے میں جو خدشات ہیں ان کو نکال دیں ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قرآن کی تعلیم بھی آج تک ویسی ہی موجود ہے کیونکہ یہ اللہ کا فرمان تھا اور اللہ کا فرمان اسی طرح حقیقت بنتا ہے جس طرح فرمان ہوتا ہے ۔ اسے کوئی رد نہیں کر سکتا۔ یہ اللہ کا فرمان ہے اور کتاب اللہ کا حصہ ہے ۔ لہٰذا کلام الٰہی کے حفظ میں شک کرنا کفر ہے ۔ قرآن نے یہ ہدایت اس سورت میں اس مقام پر اس لیے دی ہے کہ قرآن بھی اللہ کے دوسرے کلمات کی طرح ایک کلمہ ہے اور اللہ کے کلمات اور جہالت میں تغیر و تبدل ممکن نہیں ہے ۔ جس طرح اللہ کے کائناتی قوانین میں تغیر ممکن نہیں ۔ اسی طرح قرآن کے کلمات میں بھی تغیر ممکن نہیں اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے اس لیے قرآن کا کوئی ایک حرف بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ حق ہے ' سچ ہے ' نہایت اہم اور قابل قدر ہے ۔

اس سورت کو پڑھتے ہوئے قلب انسانی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ گھیر لیا گیا ہے ' اور اب اس کے سامنے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے ۔ وہ اس سورت کی عملیات میں گھر گیا ہے ۔ اب اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ ہے ' اور نہ کوئی بچانے والا ہے ۔ اس کی پیدائش ' اس کی تربیت اور قدم بقدم اس کا آگے بڑھنا اللہ کے علم کے مطابق ہے ۔ چاہے یہ بڑھنا پہلی پیدائش میں ہو یا دوسری میں ۔ حالانکہ اس کی حالت یہ ہے کہ وہ لہو و لعب میں گرفتار ہے اور اس دنیا سے دھوکہ کھائے ہوئے ہے اور اپنے آپ کو کوئی چیز سمجھتا ہے ۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى (۳۱) وَ لٰكِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى (۳۲) ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى (۳۳)(۷۵:۳۱ تا ۳۳) ”مگر اس نے نہ سچ مانا اور نہ نماز پڑھی ' بلکہ جھٹلایا اور پلٹ گیا ' پھر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا۔

لیکن ان حقائق ' دلائل ' اشارات اور احساسات کے اندر بالواسطہ تہدید اور ڈراوا بھی لپٹا ہوا ہے ۔

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى (۳٤) ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى (۳٥:۷۵) ”یہ روش تیرے لیے سزاوار ہے ' اور تجھے زیب دیتی ہے ' ہاں یہ روش تیرے لیے سزاوار ہے اور تجھی کو زیب دیتی ہے“۔ یوں اس ڈراوے کا خوب اثر ہوتا ہے اور وہ خوب بامعنی ہوتا ہے ۔

یوں یہ سورت قلب انسان کی غفلت ' اس کے اعراض اور ہٹ دھرمی اور غفلت کا علاج کرتی ہے اور اسے ایک صحیح تصور دیتی ہے ۔ پھر یہ سورت اس قرآن کریم کے بارے میں بھی ایک دو ٹوک بات کرتی ہے کہ اس کا ایک حرف بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ عظیم اور جلیل کا کلام اور حکم ہے ۔ کیونکہ یہ پوری کائنات اللہ کے کلمات کے ہمقدم ہے ۔ اور

اللہ کے کلمات اس پوری کائنات کی عملی کتاب میں ثبت ہیں ۔جن کے مطابق یہ کائنات رواں دواں ہے اور دوسری جانب یہ کلمات اس کتاب میں ثبت ہیں جو نہایت ہی مکرم کتاب ہے ۔

ہم نے یہ حقائق اور مناظر الگ سے محض تبصرے کے لیے بیان کیے ہیں لیکن جب ان کو اس سورت کے اندر پڑھا جائے تو یہ پھر ایک دوسری چیز معلوم ہوتے ہیں ۔کیونکہ سیاق کے اندر جب یہ حقائق پے درپے آتے ہیں اور ان کے ساتھ دوسرے عوامل ملتے ہیں تو یہ ایک باشعور دل کو جگہ جگہ چٹکیاں بھرتے ہیں ۔کبھی ایک پہلو سامنے آتا ہے تو کبھی نگینے کا دوسرا رخ چمکتا ہے ۔یہ قرآن کریم کا خاص اسلوب ہے کہ جب وہ قلب بشر سے مخاطب ہوتا ہے تو وہ اس کے اندر وہ اثرات چھوڑتا ہے جو کسی دوسرے اسلوب کلام میں نہیں ہوتے ۔آج تک کوئی دوسرا طریقہ تکلم اور تحریر اس اسلوب کا سا اثر نہیں دکھا سکا ۔

اب ذرا سورت کا سامنا کیجئے ۔خود سیاق سورۃ میں اس کا مخصوص مزہ لیجئے ۔

---000---

# درس نمبر ٢٧٥ تشریح آیات

## ١ -- تا -- ٤٠

سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ مَكِّيَّةٌ (٣١)
آياتها ٤٠ — ركوعاتها ٢

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ﴿١﴾ وَلَآ أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ﴿٢﴾ أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ
أَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهُ ﴿٣﴾ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى أَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهُ ﴿٤﴾ بَلْ يُرِيْدُ الْإِنْسَانُ
لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ ﴿٥﴾ يَسْـَٔلُ أَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ﴿٦﴾ فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ﴿٧﴾ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ﴿٨﴾
وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴿٩﴾ يَقُوْلُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿١٠﴾ كَلَّا لَا وَزَرَ ﴿١١﴾ إِلٰى
رَبِّكَ يَوْمَئِذِنِ الْمُسْتَقَرُّ ﴿١٢﴾ يُنَبَّؤُا الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ﴿١٣﴾ بَلِ الْإِنْسَانُ
عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿١٤﴾ وَّلَوْ أَلْقٰى مَعَاذِيْرَهُ ﴿١٥﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”میں قسم نہیں کھاتا ہوں قیامت کے دن کی' اور میں قسم نہیں کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی' کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔ مگر انسان چاہتا ہے کہ آگے بھی بداعمالیاں کرتا رہے۔ پوچھتا ہے ”آخر کب آنا ہے وہ قیامت کا دن؟“ پھر جب دیدے پتھرا جائیں گے اور چاند بے نور ہو جائے گا اور چاند سورج ملا کر ایک کر دیئے جائیں گے۔ اس وقت یہی انسان کہے گا ”کہاں بھاگ کر جاؤں؟“ ہرگز نہیں' وہاں کوئی جائے پناہ نہ ہو گی' اس روز تیرے رب ہی کے سامنے جا کر ٹھہرنا ہو گا۔ اس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے“۔

قسم کی طرف اشارہ کرنا اور قسم نہ کھانا زیادہ اثر انگیز ہوتا ہے اور یہی اثر آفرینی یہاں مقصود ہے ۔ اور اس انداز سے یہ مقصد اچھی طرح حاصل ہوتا ہے اور یہ انداز قرآن کریم میں بار بار دہرایا جاتا ہے اور اس کے بعد پھر حقیقت قیامت اور ملامت کرنے والے نفس کی حقیقت بیان کی جاتی ہے ۔

قیامت کی حقیقت کے بارے میں اس سورت میں مکرر بات کی گئی ہے ۔ لیکن نفس لوامہ کیا ہے؟ اس کے بارے میں تفاسیر ماثورہ میں کئی اقوال مذکور ہیں ۔ حضرت حسن بصری سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ تم جب بھی دیکھو ایک سچا آدمی ہمیشہ اپنے آپ کو ملامت کرے گا کہ میری بات کا کیا مطلب تھا؟ میرے کھانے کا مقصد کیا ہے؟ اور میری بات کا فائدہ کیا ہے؟ رہا فاجر تو اپنی راہ پر آگے ہی بڑھتا ہے اور اپنے آپ کو کسی مرحلے پر بھی ملامت نہیں کرتا ۔ اور حضرت حسن سے روایت ہے کہ زمین و آسمان کے باشندوں میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا' جو اپنے آپ کو قیامت کے دن ملامت نہ کرے گا ۔ حضرت عکرمہ سے روایت ہے کہ تم خیر اور شر دونوں پر ایک دوسرے کو ملامت کرو گے کہ لے کاش کہ میں ایسا ایسا کرتا ۔ اور یہی روایت سعید ابن جبیر سے ہے اور حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ اس سے نفس لوّم مراد ہے ۔ اور ان ہی سے روایت ہے کہ وہ ملامت زدہ نفس جو کسی مذموم بات پر ملامت کیا جائے اور مجاہد سے روایت ہے کہ وہ نفس جو ان امور پر نادم ہو جو فوت ہوگئے ہوں اور اپنے آپ کو ملامت کرے ۔ قتادہ کہتے ہیں لوامہ وہ نفس ہے' جو فجور کا ارتکاب کرے ۔ ابن جریر کہتے ہیں یہ سب اقوال قریب المعنی ہیں اور زیادہ قریب یہ مفہوم ہے کہ نفس لوامہ سے وہ نفس مراد ہے جو اپنے آپ کو خیر اور شر پر ملامت کرے اور جو خیر رہ جائے اس پر نادم ہو ۔

ہمارے خیال میں حسن بصری کا قول زیادہ بہتر ہے کہ نفس لوامہ وہ ہے جو ملامت کرتا ہے کہ "خدا کی قسم ایک مومن کو جب بھی تم دیکھو وہ اپنے آپ کو ملامت ہی کرتا ہے کہ میں نے جو بات کی اس کا کیا مقصد ہے؟ میں نے جو کھایا اس کا کیا مقصد ہے' اور میں نے جو کچھ سوچا اس کا کیا مقصد ہے ۔ اور فاسق و فاجر بس آگے ہی بڑھتا جاتا ہے ۔ اپنی کسی بات پر اپنے آپ کو ملامت نہیں کرتا" ۔

تو نفس لوامہ وہ ہے جو بیدار ہے' خدا کا خوف رکھنے والا ہے' ہر وقت محتاط اور اپنا حساب رکھنے والا' جو اپنے ماحول پر نظر رکھتا ہو' وہ اپنی خواہشات پر نظر رکھتا ہو اور ہر وقت اس بات سے محتاط ہو کہ کہیں دھوکہ نہ کھا جائے ۔ یہ نفس اللہ کے ہاں قابل قدر ہے ۔ اور اس کا ذکر قیامت کے ساتھ ہو رہا ہے ۔ اور یہ نفس فاجرہ کے بالمقابل ہوتا ہے ۔ نفس فاجرہ وہ ہوتا ہے جو آگے بڑھتا رہتا ہے ۔ فسق و فجور میں گم ہوتا ہے' جس کی صفات یہ ہوتی ہیں کہ وہ جھوٹ بولتا ہے' روگردانی کرتا ہے' اور نہایت غرور سے اپنے اہالی و موالی کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنا محاسبہ نہیں کرتا ۔

لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (١) وَلَآ أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (٢) (٧٥ : ١ — ٢) "میں قسم نہیں کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور میں قسم نہیں کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی" ۔ یعنی وقوع قیامت پر قسم نہیں اٹھاتا' یہاں اللہ نے قسم اٹھانے کی بھی نفی کی اور اس بات کو بھی حذف کر دیا کہ کس بات پر قسم نہیں اٹھائی جارہی لیکن جس بات کی قسم اٹھائی جارہی ہے اس کا ذکر ایک دوسرے انداز میں کر دیا گیا ۔ گویا یہ نئی بات ہے اور قسم کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ۔

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ (۳) بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰۤى اَنْ نُّسَوِّيَ

بَنَانَهٗ (٤) (۷۵: ۳ – ٤) کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں"۔ مشرکین مکہ اس شعوری خلجان میں مبتلا تھے کہ پرانی ہڈیوں کو کس طرح یکجا کر کے انسان بنا دیا جائے گا جبکہ یہ ریزہ ریزہ ہو کر مٹی میں مل گئی ہوں اور زمین میں بکھر گئی ہوں ' کس طرح انسان کو بعینہ اسی طرح دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ اور یہ خلجان آج تک بعض دلوں میں موجود ہے ۔ قرآن کریم اس کی تردید نہایت تاکید کے ساتھ کرتا ہے کہ ہاں ایسا ہی ہو گا اور لازماً ہو گا۔

بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰۤى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ (۷۵ : ٤) "کیوں نہیں ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں"۔ بنان انگلیوں کے اگلے سرے کو کہتے ہیں ۔ مفہوم کے اندر تاکید یوں پیدا کی جاتی ہے کہ ہڈیوں کو ہم تو پورے پورے تک بنا دیں گے اور جب کوئی ایک ایک پورا بنا سکتا ہے اس کے لیے ہڈیاں جمع کرنا کیا مشکل ہے ۔ مقصد ہے کہ انسان کے ایک ایک جزء کو دوبارہ جمع کر دیا جائے گا اور کوئی جز نہ رہ جائے گا۔ پورے کا پورا آموجود ہو گا' خواہ چھوٹا حصہ ہو یا بڑا۔

یہاں تو یہ کہہ دیا' لیکن سورت کے آخر میں دوبارہ تخلیق پر ایک دوسری دلیل بھی لائی گئی ہے ۔ یہاں تو صرف ان کے خلجان اور اس کے ظاہری سبب کا اظہار کر دیا گیا کہ یہ لوگ ہڈیوں کے جمع ہونے کی توقع نہیں رکھتے ۔ انسان دراصل فسق و فجور کی خواہش رکھتا ہے ۔ اور چاہتا ہے کہ اس فسق و فجور میں آگے ہی جاتا رہے ۔ اور کوئی چیز اسے روکنے والی نہ ہو اور نہ اس کو حساب و کتاب کا سامنا کرنا پڑے اور نہ جزاء و سزا کا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وقوع قیامت کو مستبعد سمجھتا ہے اور قیامت کے وقوع سے فرار کی راہ ڈھونڈتا ہے ۔

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ (٥) يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ (٦) (۷۵: ٥ – ٦)
"مگر انسان چاہتا یہ ہے کہ آگے بھی بداعمالیاں کرتا رہے ۔ پوچھتا ہے "آخر کب آنا ہے وہ قیامت کا دن؟" یہاں سوال لفظ "ایان" سے لیا گیا ہے ۔ یہ لفظ مشدد اور مترنم ہے ۔ اور اس شد اور ترنم سے دراصل اشارہ ہے ۔ اس طرف کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی اور یہ سوچ ان لوگوں کو اس لیے کہ یہ فسق و فجور میں آگے ہی بڑھتے رہیں اور بعث بعد الموت اور جواب دہی کا تصور انہیں نہ روک سکے ۔ اور نہ ان کی زندگی کو مکدر کر سکے ۔ درحقیقت تصور آخرت ہی وہ چیز ہے جو اس قسم کے احساس کو لگام دے سکتا ہے ۔ اور محبان فسق و فجور کو روک سکتا ہے ۔ ایسے لوگ اس قسم کی رکاوٹوں اور فسق و فجور کی بندشوں کو بلا روک و ٹوک جاری رکھنا چاہتے ہیں۔

قیامت کے وقوع کے بارے میں ہٹ دھرمی اور اسے مستبعد سمجھنے کا جواب یہاں نہایت شتابی کے ساتھ ' فیصلہ کن انداز میں دیا گیا اور یوں دیا گیا کہ اس میں شک ہی نہ رہے ۔ اس جواب میں انسانی حواس ' انسانی شعور اور کائناتی مشاہد پیش کیے گئے ۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ (۷) وَخَسَفَ الْقَمَرُ (۸) وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (۹) يَقُوْلُ

الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ (۱۰)(۷۵:۷ تا ۱۰) "پھر جب دیدے پتھرا جائیں گے اور چاند بے نور ہو جائے گا اور چاند سورج ملا کر ایک کر دیے جائیں گے۔ اس وقت یہی انسان کہے گا "کہاں بھاگ کر جاؤں؟" جب بجلی چمکتی ہے تو نظر چندھیا جاتی ہے اور جلدی لوٹ آتی ہے۔ اور جب سورج خسف کا شکار ہوتا ہے تو بے نور ہو جاتا ہے اور سورج اور چاند دور ہیں لیکن یہ باہم مل جائیں گے اور اس طرح تمام فلکی انتظام مختل ہو جائے گا اور ایک خوفناک اور انقلابی صورت حالات ہوگی اس وقت ہر انسان باہم ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔

اَیْنَ الْمَفَرُّ (۷۵:۱۰) "بھاگنے کی جگہ کہاں ہے"۔ اور انسان اس جزع فزع میں پھر ہر طرف بھاگتا پھرے گا۔ جس طرح چوہا پنجرے میں بند ہو جاتا ہے اور ہر طرف بھاگتا رہتا ہے۔ اب نہ جائے فرار ہے' نہ جائے پناہ ہے' نہ آگے جا سکتے ہیں اور نہ پیچھے۔

كَلَّا لَا وَزَرَ (۱۱) اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذِ الْمُسْتَقَرُّ (۷۵:۱۲) "ہرگز نہیں وہاں کوئی جائے پناہ نہ ہوگی اس روز تیرے رب ہی کے سامنے جا کر ٹھہرنا ہوگا"۔

اس دن یہ صورت حالات نہ ہوگی جو انسان چاہتا ہے کہ بلاحساب و کتاب وہ فسق و فجور کے راستے پر آگے بڑھے اور کوئی پوچھنے والا نہ ہو' بلکہ اس دن تو پورا پورا محاسبہ ہوگا اور اس نے اپنے جو اعمال بھولے ہوں گے ان کے بارے میں اس سے پوچھا جائے گا۔ اور جب وہ یاد کرے گا تو پھر جزاء و سزا ہوگی۔

یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ (۷۵:۱۳) "اس روز انسان کو اس کا اگلا پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا"۔ یعنی وہ اعمال جو اس نے اپنی وفات سے پہلے کیے اور وہ آثار جو اس نے مرنے کے بعد چھوڑے۔ خواہ اچھے آثار ہوں یا برے آثار ہوں کیونکہ انسان کے بعض اعمال ایسے ہوتے ہیں جن کے آثار باقی رہتے ہیں اور وہ اس کے اعمال میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

پھر وہاں انسان جو عذرات بھی پیش کرے گا' اس کا کوئی عذر بھی قبول نہ ہوگا کیونکہ وہ اپنے کیے کا ذمہ دار ہوگا۔ نفس انسانی کو اللہ نے خیر و شر کی ہدایت کر دی ہے۔ اگر نفس انسان کو خیر تک لے جائے تو اچھا انجام ہوگا اور اگر شر تک لے جائے تو اس کا محاسبہ ہوگا۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ (۷۵:۱۴) وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (۷۵:۱۵) "بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے"۔ یہاں یہ بات نوٹ کیے جانے کے قابل ہے کہ اس سورۃ میں ہر چیز نہایت تیز رفتاری سے چل رہی ہے۔ فقرے' قافلے' موسیقی اور ترنم' مناظر اور چمک دمک' اسی طرح حساب و کتاب بھی سرعت سے ہوگا۔ مقدم اور موخر سب کچھ سامنے ہوگا اور یہ اس لیے کہ وہ ایان سے سوال کر کے قیامت کو بہت دور اور بہت ناممکن سمجھتے تھے۔

اب چار آیات آتی ہیں جو قرآن مجید کے بارے میں آپ کو ہدایات دے دی ہیں اور یہ جملہ معترضہ ہیں۔

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ﴿١٦﴾ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ﴿١٧﴾
فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ﴿١٨﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ﴿١٩﴾

"اے نبی ﷺ ' اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو' اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے' لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں' اس وقت تم اس کی قرات کو غور سے سنتے رہو' پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے"۔

ان آیات کے بارے میں ہم نے سورت کے مقدمہ میں جو کچھ کہہ دیا ہے اس پر اس قدر اضافہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کے حفظ و حفاظت کا کام اللہ نے مطلقاً اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ اللہ اس بات کا ضامن ہے کہ قرآن زندہ رہے گا' محفوظ رہے گا' جمع و تدوین مکمل ہوگی اور اس کی تشریح بھی اللہ کرے گا۔ مکمل ذمہ داری اللہ پر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذمہ داری فقط یہ ہے کہ آپ اسے اٹھائیں اور لوگوں تک پہنچا دیں۔ یہ اس لیے کہا گیا کہ حضور اکرم ﷺ اخذ وحی کے لیے بیتاب ہو جاتے تھے اور آپ جلدی سے سب کے سب قرآن کا اخذ اور حفظ چاہتے تھے۔ اور اس بارے میں بے حد سنجیدہ تھے کہ اس کا کوئی کلمہ رہ نہ جائے۔ اس لیے آپ جلدی جلدی دہراتے تھے' تو آپ کو یہ ہدایت کی گئی کہ آپ زبان سے دہرانے کی کوشش نہ کریں' حفاظت اللہ کی ذمہ داری ہے۔

یہ بات قرآن کے اندر کی جگہ ریکارڈ کی گئی ہے' اس لیے کہ خدا تعالیٰ یہ بات مسلمانوں کے ذہن میں بٹھانا چاہتا تھا کہ قرآن کا حفظ اور جمع بہت اہم ہے۔ جس کی طرف ہم نے سورت کے مقدمہ میں اشارات کیے ہیں۔

اس جملہ معترضہ کے بعد اب سورت میں قیامت کے مناظر آتے ہیں کہ نفس لوامہ کا اس میں کیا حال ہو گا۔ ان مناظر میں یہ بات یاد دلائی جاتی ہے کہ اس دنیا کے بارے میں تمہارے نفوس کے اندر کیا کیا امنگیں آتی ہیں' کس طرح تم دنیا کے اندر مگن ہو اور آخرت کو بھولے ہوئے ہو۔ اور آخرت کی پرواہ ہی نہیں کرتے ہو۔ زرا دیکھو تو سہی کہ وہاں تمہاری کیا گت بننے والی ہے۔ ایک نہایت ہی زندہ اور متحرک منظر میں اس حالت کو انسانوں کے سامنے رکھا جاتا ہے جو نہایت ہی موثر اور اشاراتی ہے۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ﴿٢٠﴾ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ﴿٢١﴾ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾
إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴿٢٤﴾ تَظُنُّ أَنْ يُفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿٢٥﴾

"ہرگز نہیں' اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔ اس روز کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے' اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے اور کچھ چہرے اداس ہوں گے اور سمجھ رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ برتاؤ ہونے والا ہے"۔

انداز بیان میں جو پہلی بات نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں دنیا کے لیے عاجلہ کا لفظ استعمال کیا ہے' اس لفظ

کے مفہوم میں ایک بات تو یہ ملحوظ ہے کہ یہ دنیا جلدی ختم ہونے والی چیز ہے۔ اور اصل مقصود یہی بتانا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ لفظ اس لیے بھی لایا ہے کہ اس سے قبل قرآن کے بارے میں جملہ معترضہ میں بھی یہ بات کہی گئی تھی۔

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ (۷۵: ۱٦) "وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو"۔ اس دنیا اور اس کے ہر کام میں عجلت دراصل اس دنیا کی خصوصیت ہے۔ اور دنیا میں مفادات کے لیے شتابی اور قرآن کو جلد یاد کرنے کے لیے عجلت دونوں اس دنیا کے رنگ ہیں۔ یہ قرآن کریم کا نہایت ہی لطیف اور گہرا اشاراتی ہم آہنگی ہے اور یہ قرآنی انداز کلام ہے۔

اب قرآن کریم کا پیش کردہ مصور منظر جو قرآن کا منفرد اسلوب ہے۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ (۲۲) إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (۷۵: ۲۳) "اس روز کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے"۔ یہ آیت ایک ایسی حالت کی طرف ایک جھلک کی شکل میں تیز اشارہ کر رہی ہے کہ الفاظ کے اندر کسی انسان کے لیے ایسا اشارہ ممکن نہیں ہے۔ نہ انسان اس حالت کا حقیقی ادراک ہی کر سکتا ہے۔ کامیاب اور نیک بخت لوگوں کی حالت کی یہ ایسی تصویر ہے جس کی حالاتی تصویر کشی ممکن ہی نہیں ہے بلکہ اس حالت کے مقابلے میں جنت کی بھی کوئی حقیقت نہیں رہی۔ حالانکہ وہ نعمتوں کی انواع و اقسام سے بھری ہوئی ہے۔ یہ حالت کہ یہ چہرے تروتازہ ہوں گے' اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ رب کی طرف دیکھ رہے ہوں اور خوش اور مطمئن ہوں۔ یہ ہے بلند ترین مقام سعادت مندی!

اس جہاں میں انسان بعض اوقات اس کائنات اور نفس انسانی کے اندر پائے جانے والے حسن و جمال سے بے حد لطف اندوز ہوتا ہے۔ انسان مثلاً چاندنی رات میں گم ہوتا ہے۔ اگر چاندنی نہ ہو تو اندھیری رات کا بھی ایک لطف ہوتا ہے۔ پھر نمود سپیدۂ صبح کیا خوبصورتی دکھاتا ہے۔ درختوں کے طویل اور گہرے سائے' سمندر کی پے درپے موجیں' صحراؤں کی دوریاں' باغات کی سرسبزیاں' خوبصورت پھل اور پھول فرحاں و شاداں دل' پختہ ایمانی لمحات' مشکلات کو انگیز کرنا اور دوسری خوبصورتیاں جن سے یہ جہاں پر ہے اور انسان ان سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے اور تصور اور نور کے پروں کے ساتھ اس جہاں میں دوڑتا اور اڑتا پھرتا ہے۔ اور اس قدر خوشی اور سرور پاتا ہے کہ زندگی کے درد اور دکھ بھول جاتا ہے اور مادی اور جسمانی خوشیوں کو بھول جاتا ہے۔ خواہشات نفس اور مادی شوق اور لذت ایک لمحے کے لیے ذہن سے دور ہو جاتے ہیں

لیکن اس کی خوشیوں کا عالم ہی کیا ہو گا جب وہ اللہ کے تخلیق کردہ کمال و جمال کے بھی آگے بڑھ کر ذات باری کے کمالات کو دیکھ رہا ہو اور اللہ کی طرف اس کی نظریں ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مقام تب حاصل ہوتا ہے جب اللہ کی خاص مدد شامل حال ہو' پھر یہ تب حاصل ہوتا ہے کہ جب کسی کو اللہ کی جانب سے ثابت قدمی حاصل ہو۔ انسانوں کو اپنے اوپر کنٹرول حاصل ہو' وہ استقامت کا مالک ہو اور اخروی سعادت مندی سے لطف اندوز ہو رہا ہو' وہ سعادت مندی جس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اور جس کی حقیقت کو پوری طرح سمجھنا ہی مشکل ہے۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ (٢٢) اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (٧٥: ٢٣) ''بعض چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے''۔ وہ تروتازہ کیوں نہ ہوں جبکہ وہ رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

انسان اس دنیا میں اللہ کی تخلیقات کا نظارہ کرتا ہے' خوبصورت پھل' عجیب و غریب پھول' خوش رنگ اور خوبصورت پرندے اور ان کے بال و پر' خوبصورت روحیں اور اچھے کام اور ان چیزوں کو دیکھ کر اس کا رواں رواں خوش ہوتا ہے۔ اور اس کے چہرے سے خوشی ٹپک رہی ہوتی ہے اور چہرہ تروتازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر انسان اللہ کے کمال اور جمال اور نور ذات کی طرف دیکھ رہا ہو تو اس کی خوشی اور خوش بختی کے کیا کہنے۔ انسان اس مقام تک تب ہی پہنچ سکتا ہے جب وہ ان تمام رکاوٹوں کو ایک جھٹکے کے ساتھ دور پھینک دے جو اس مقام بلند تک پہنچنے سے روک رہی ہوتی ہیں۔ یہ مقام تب ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی ذات اور اپنے ماحول سے تمام نقائص دور کر دے۔ اور وہ اللہ کے سوا کسی چیز کی طرف دیکھ ہی نہ رہا ہو۔

انسان اللہ کی طرف کس طرح دیکھے گا؟ کس عضو سے دیکھے گا؟ کیا آلہ بینائی اسے حاصل ہو گا؟ کیا ذریعہ ہو گا اللہ کے دیکھنے کا؟ تو یہ وہ بات ہے جو ہمارے تصور سے ماوراء ہے۔ یہ ایک تصور ہے جو قلب مومن کو دیا جا رہا ہے۔ ایک فیض ہے جس سے روح مومن فیض یاب ہوگی۔ یہ دنیا کی آلودگیوں سے پاک اور شفاف فیض سعادت ہے' جو مومن کو حاصل ہو گا۔

رہے عقلیت پسند تو وہ اس سے خوشی اور سرور حاصل کرنے کے بجائے ایسی آیات میں مجادلہ شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا' جس طرح وہ خوشی اور اطمینان سے محروم ہوتے ہیں۔ اسی طرح فہم و ادراک سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اس جہاں کی باتیں دنیا کی مالوف عقل سے نہیں' ایمان کی قوت مدرکہ سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔

انسانی شخصیت کا ارتقاء اور اس کو محدود زمینی شخصیت سے علیحدہ اور بلند کرنا ہی اسے قیامت کے روز لامحدود شخصیت اور ذات برتر و بالا سے ملا سکتا ہے۔ اس کے بغیر انسان کے لیے یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ وہ لامحدود کے ساتھ کیسے مل سکتا ہے۔ لہٰذا معتزلہ اور اہل سنت کے درمیان رویت باری کے بارے میں جو طویل بحثیں چلیں وہ بالکل لاحاصل تھیں' کیونکہ انسان کی اس زمینی شخصیت اور اخروی شخصیت کے درمیان فرق ہو گا۔

کلمات الٰہیہ کا ہم وہی مفہوم سمجھ سکتے ہیں جو ہماری محدود ذات کے اندر سماتا ہے' جب ہماری شخصیت ہی بدل جائے اور ان محدود تصورات سے بالا ہو جائے تو پھر ان کلمات کا مزاج اور مفہوم ہی بدل جائے گا۔ کلمات تو دراصل رمز ہوتے ہیں ان مفہومات کے لیے جو انسانی تصور میں ہوتے ہیں۔ جب انسانی تصورت کے حدود و قیود بدل جائیں تو کلمات کے مفہوم بھی بدل جائیں گے۔ جب انسانی شخصیت بدل گئی' اس کی قوت مدرکہ کی طاقت بدل گئی تو اس کے ساتھ ساتھ کلمات اور تصورات دونوں بدل جائیں گے۔ اس دنیا میں ان کلمات کا ہم وہ مفہوم سمجھتے ہیں جو ہمارے حسب حال ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیں ایسے مفاہیم میں نہیں الجھنا چاہئے جو ہم ان کلمات سے اخذ نہیں کر سکتے۔

بس ہمیں اس سعادت مندی اور اس مقدس خوشی اور سرور کی امید رکھنا چاہئے جس کا ہم اس دنیا کے مفاہیم کے اعتبار سے تصور کر سکتے ہیں۔ اور ہمیں چاہئے کہ ہم اس قسم کے فیوض کے لیے اپنی نظریں عالم بالا کی طرف بلند رکھیں۔ اور اس سے بڑا سرور اور کوئی نہیں ہے۔

وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ (٢٤) تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ (٧٥: ٢٥) ''اور کچھ چہرے

اس دن اداس ہوں گے اور سمجھ رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ برتاؤ ہونے والا ہے"۔ یہ کون ۔۔ چہرے ہوں گے ' جو پریشان 'بدبخت اور سیاہ رو ہوں گے ۔ یہ اللہ کی نظر کرم سے محروم اور ناامید ہوں گے ۔ اور یہ محرومی خود ان کی اپنی غلطیوں اور پسماندگیوں کی وجہ سے ہوگی ۔ ان کی مادیت اور بے بصیرتی کی وجہ سے ہوگی ۔ ان کے چہروں پر رنج و الم اور حزن و ملال چھایا ہوا ہوگا اور رنج و ملال کی وجہ سے چہروں پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی ۔ کیونکہ ان کو یہ شدید خطرہ لاحق ہوگا کہ وہ بہت جلد ایسے حادثے سے دوچار ہونے والے ہیں جو ان کی کمر توڑ کر رکھ دے گا ۔ فاقرہ ریڑھ کی ہڈی کو کہتے ہیں ۔ یہاں مراد خوف ' ڈر ' بے چینی ' چہرے کی سیاہی ' پریشانی اور رنج و الم ہے ۔

یہ ہے نقشہ آخرت کا جسے یہ لوگ پس پشت ڈال رہے ہیں اور مہمل چھوڑ رہے ہیں ' اور دنیا کی اس مختصر زندگی کے پیچھے دوڑ رہے ہیں ' جسے وہ بہت اہمیت دیتے ہیں ۔ حالانکہ جو دن آ رہا ہے وہ بہت اہم ہے ۔ اصل انجام کا وہاں فیصلہ ہوگا اور اس دنیا اور آخرت کی اہمیت میں بہت بڑا فرق ہے ۔ قیامت میں بعض چہرے تروتازہ ہوں گے اور رب تعالیٰ کی طرف دیکھ رہے ہوں گے جب کہ کچھ چہرے پژمردہ ہوں گے اور انہیں یہ شدید خطرہ لاحق ہوگا کہ ان کو کمر توڑ حادثہ پیش آنے والا ہے ۔

مشاہد قیامت یوں تھے کہ وہاں دیدے پتھرا جائیں گے ' چاند بے نور ہوگا اور شمس و قمر اکٹھے کر دیئے جائیں گے اور انسان بے اختیار پکار اٹھے گا کہ کہاں جاؤں اور پھر وہاں لوگوں کے انجام بہت مختلف ہوں گے ' اور جنتیوں اور دوزخیوں کے انجام کے درمیان طویل فاصلے ہوں گے ۔ جنتیوں کے چہرے تروتازہ ہوں گے ' وہ رب کی طرف نظریں جمائے ہوں گے ' جبکہ دوزخیوں کے چہرے سیاہ ہوں گے اور وہ شدید خطرے سے دوچار ہونے والے ہوں گے ۔

یہ وہ مناظر ہیں جو بے حد قوی الاثر ہیں اور ان کی اثر آفرینی کی اصل قوت قرآن کے اسلوب بیان میں ہے ۔ جو اک مشخص اور مصور اور زندہ اسلوب ہے ' تو ان مناظر اور مشاہد کو آگے بڑھاتے ہوئے ' اب ایک ایسا منظر سامنے لایا جاتا ہے جو روز مرہ کا منظر ہے اور جسے ہم روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ۔ یہ ایک بھاری اور ناگوار منظر ہوتا ہے مگر یہ ہونی شدنی ہے اور ہر جگہ اور ہر گھر میں واقع ہو جاتا ہے ۔

یہ منظر موت کا منظر ہے ۔ وہ موت جس سے ہر زندہ کو دوچار ہونا ہوتا ہے ۔ جس کو کوئی شخص نہ اپنے آپ سے دور رکھ سکتا ہے اور نہ کسی اور کو اس سے بچایا جا سکتا ہے ۔ یہ موت دو جگری دوستوں کو جدا کر دیتی ہے ۔ یہ اپنے راستے پر جاتی ہے اور جاری و ساری ہے ۔ کسی بھی وقت اس کے وقوع میں وقفہ نہیں ہوتا ۔ کسی کا رونا اور کسی کی چیخ و پکار کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ نہ جدا ہونے والوں کی حسرتوں کا اس پر اثر ہوتا ہے ۔ نہ کسی کی چاہت کا اس پر اثر ہوتا ہے اور نہ کسی کے ڈر کا اس پر اثر ہوتا ہے ۔ یہ موت جباروں اور قہاروں کو بھی اسی طرح دبوچ لیتی ہے جس طرح ایک کیڑے کو دبوچ لیتی ہے ۔ امراء و غرباء ' غلاموں اور ڈکٹیٹروں سب کو نابود کر دیتی ہے ۔ یہ موت جس کے مقابلے میں انسان کے لیے کوئی حیلہ اور چارہ نہیں ہے لیکن اے افسوس کہ لوگ اس کے بارے میں کم ہی سوچتے ہیں کہ موت کس قدر عظیم قوت قاہرہ رکھتی ہے ۔

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۲۶﴾ وَقِيْلَ مَنْ ٜ رَاقٍ ﴿۲۷﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾
وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ﹰالْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾ ع ۲۰
۱۷

"ہرگز نہیں ' جب جان حلق تک پہنچ جائے گی ' اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ' اور آدمی سمجھ لے گا کہ یہ دنیا سے جدائی کا وقت ہے اور پنڈلی سے پنڈلی جڑ جائے گی ۔ وہ دن ہو گا تیرے رب کی طرف روانگی کا"۔

یہ موت کا منظر ہے اور یہ نص قرآنی اسے یوں پیش کر رہا ہے گویا وہ آنکھوں کے سامنے ہے ۔ یہ منظر آنکھوں کی سامنے یوں آ رہا ہے جس طرح مصور کے قلم سے رنگ نکلتے ہی تصویر کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ (۷۵ : ۲۶) "ہرگز نہیں ' جب جان حلق تک پہنچ جائے"۔ جب روح حلق تک آ جائے تو اس وقت انسان کی زندگی کے آخری لمحات ہوتے ہیں ۔ ان لمحات میں انسان پر ذہول اور مدہوشی طاری ہو جاتی ہے ۔ انسان پر شدت کی ایسی حالت طاری ہو جاتی ہے کہ نظریں ٹکٹکی باندھ لیتی ہیں اور جس کی موت واقع ہو رہی ہوتی ہے ' اس کے ارد گرد دوست و رشتہ دار جمع ہو جاتے ہیں اور مرنے والے کو بچانے کے لیے ہر حیلہ اور ہر وسیلہ اختیار کرتے ہیں ۔

وَقِيْلَ مَنْ رَاقٍ (۷۵ : ۲۷) "کہا جائے کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا"۔ شاید بطور آخری چارہ کار یہ دم درود اور جھاڑ پھونک ہی مفید ہو جائے اور جس شخص پر موت کی حالت طاری ہے شاید یہ اس سے واپس آجائے اور آخری حالت ۔

وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ (۷۵ : ۲۹) "اور پنڈلی سے پنڈلی جڑ جائے"۔ ہر حیلہ اور ہر وسیلہ فیل ہو جائے اور یہ بات طے ہو جائے کہ آپ بیمار نے جانا ہی ہے جس طرح ہر زندہ نے آخر کار جانا ہوتا ہے ۔

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ (۷۵ : ۳۰) "وہ دن ہو گا تیرے رب کی طرف روانگی کا"۔ یہ منظر اس قدر زندہ اور متحرک ہے کہ انسان کو ریل پر چلتا ہوا نظر آتا ہے ۔ اور ہر لفظ ایک حرکت کو مصور کر رہا ہے ۔ ہر لمحہ اور ہر فقرہ دوڑ دھوپ اور حرکت کو ظاہر کرتا ہے ۔ جوں جوں موت قریب آتی ہے لوگوں کی حرکت اور جزع فزع میں تیزی آتی ہے ۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جس کی طرف پورا مجمع بڑھ رہا ہوتا ہے ۔ اس کے مقابلے میں تمام علاج ناکام ہو گئے ہیں ۔ اور آخری منظر آتا ہے ۔

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ (۷۵ : ۳۰) "یہ تو تیرے رب کی طرف چلنے کا دن ہے"۔ اب پردہ گرتا ہے ' لیکن ہمارے تخیل کے پردے پر تصویر جمی ہوئی ہے ۔ ہمارے احساسات پر انمٹ نقوش بیٹھے ہیں ۔ اب فضا پر مہیب خاموشی ہے ۔ کہیں کہیں رونے کی آواز آ رہی ہے ۔

اس زندہ ' حقیقی اور ناقابل دفاع منظر کے سامنے اب جھٹلانے والوں اور مدہوش اور غافل لوگوں کا بھی ایک نقشہ ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عمل اور اطاعت نہ کرنے کی وجہ سے سعادت سے محروم ہیں ۔ ان کے دامن میں معاصی اور نافرمانیاں ہی ہیں اور یہ لوگ لہو و لعب میں مصروف ہیں اور اپنے اس حال میں مگن ہیں ۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۳۲﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾

"مگر اس نے نہ سچ مانا اور نہ نماز پڑھی بلکہ جھٹلایا اور پلٹ گیا 'پھر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا"۔

روایات میں آتا ہے کہ یہ آیات ایک مخصوص شخص کے حق میں نازل ہوئیں 'بعض روایات میں اس شخص کا نام بھی لیا گیا کہ یہ عمرو ابن ہشام ابوجہل تھا۔ یہ شخص بعض اوقات رسول اللہ کے پاس آتا تھا اور قرآن کریم سنتا تھا۔ لیکن پھر چلا جاتا تھا اور ایمان نہ لاتا تھا۔ اور نہ آپ کی اطاعت کرتا تھا۔ نہ اللہ سے ڈرتا تھا۔ اور نہ مودبانہ رویہ اختیار کرتا تھا۔ بلکہ یہ حضور اکرم ﷺ کو مزید اذیت دینے لگتا تھا۔ آپ کو برا بھلا کہتا اور لوگوں کو دین اسلام میں آنے سے روکتا۔ پھر یہ اپنی ان کارروائیوں پر اتراتا' اور اپنے کارناموں پر فخر کرتا جیسا کہ اس آیت میں کہا گیا۔

قرآن کریم یہاں اس شخص کے ساتھ مزاح کرتا ہے اور نہایت ہی حقارت آمیز تبصرہ کرتا ہے۔ قرآن کریم اس شخص کے غرور کی حرکت کو لفظ یَتَمَطّٰی (۷۵ : ۳۳) کے ساتھ تعبیر کرتا ہے۔ یعنی اپنی پیٹھ کو اکڑاتا ہوا۔ اور نہایت ہی بوجھل قسم کے تعجب کا اظہار کرتا ہوا جس میں کراہیت کے آثار نمایاں ہیں۔

کسی مخصوص شخص کی بات چھوڑیئے' ہر دور میں حق کے مقابلے میں ایک ابوجہل ہوتا ہے جو سنتا ہے' سمجھتا ہے' لیکن منہ موڑ لیتا ہے اور اللہ کے راستے سے لوگوں کو ہٹانے میں بڑی بڑی فن کاریوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اور داعیان حق کو اذیت دیتا ہے۔ اور بڑی بڑی مکاریاں کرتا ہے۔ وہ منہ موڑتا ہے اور اپنی شرانگیزیوں پر فخر کرتا ہے حالانکہ دراصل یہ شخص زمین میں فساد پھیلاتا ہے اور حق' سچائی اور اصلاح کی راہ روکتا ہے۔

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٤﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٥﴾

"یہ روش تیرے ہی لیے سزاوار ہے اور تجھی کو زیب دیتی ہے۔ ہاں یہ روش تیرے ہی لیے سزاوار ہے اور تجھی کو زیب دیتی ہے"۔

یہ ایک عام اصطلاحی انداز تعبیر ہے' عربی روز مرہ کے مطابق' مگر اس کے اندر تہدید اور ڈراوا بھی ہوتا ہے۔ ایک بار حضور اکرم ﷺ نے ابوجہل کو گلے سے پکڑا اور کہا۔

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى (۳۴) ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى (۷۵ : ۳۵) تو اللہ کے اس دشمن نے کہا "محمد کیا تم مجھے دھمکی دیتے ہو؟ خدا کی قسم نہ تم اور نہ تمہارا رب میرا کچھ بگاڑ سکتے ہو اور میں ان تمام لوگوں سے زیادہ معزز ہوں جو مکہ کے دونوں پہاڑوں کے درمیان بھی چلے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن اسے پکڑا اور یوں حضرت محمد ﷺ اور رب محمد ﷺ نے اس کا سب کھیل بگاڑ دیا۔ اور ابوجہل سے قبل فرعون نے بھی اپنی قوم سے کہا تھا۔

مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِىْ "میں تمہارے لیے اپنے مقابلے میں کوئی دوسرا حاکم نہیں پاتا"۔ اور کہا۔

اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِىْ "کیا مصر کی بادشاہت میری نہیں ہے اور یہ نہریں میرے ماتحت نہیں چل رہی ہیں"۔ کئی ابوجہل گزرے ہیں جنہوں نے اسلامی دعوتوں کے مقابلے میں اپنے قبائل' اپنی قوت اور اپنی قوم کے بل بوتے پر جرائم کا ارتکاب کیا اور اپنے آپ کو کچھ چیز سمجھتے تھے' اور انہوں نے اللہ کو بھلا

دیا تھا لیکن اللہ نے ان کو مچھروں اور مکھیوں کے ذریعہ ہلاک اور برباد کر دیا۔ بہرحال ہر فرعون کی تباہی کی ایک میعاد ہوتی ہے جس میں کوئی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔

آخر میں لوگوں کی زندگی سے ایک اور اہم حقیقت کو سامنے لایا جاتا ہے۔ یہ حقیقت بھی حیات بعد موت پر دلالت کرتی ہے۔ جس کا وہ شدت سے انکار کرتے تھے۔ اور اس سے خود ان کی اس زندگی کی نشوونما کی تدبیر اور تقدیر اور تعجب خیز اور عبرت آموز ٹیکنالوجی بھی معلوم ہوتی ہے جو خدا کی پیدا کردہ ہے اور یہ تقاضا کرتی ہے کہ قیامت ضرور واقع ہوگی اور خود مطالعہ حیات وقوع حشر و نشر کو لابدی قرار دیتا ہے بشرطیکہ کوئی اسے چشم بینا سے مطالعہ کرے۔

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾ أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن
مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ﴿٣٧﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ﴿٣٨﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ ۲
وَالْأُنثَىٰ ﴿٣٩﴾ أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَن يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ﴿٤٠﴾ ۱۰ع
۱۸

"کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا' پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے' پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر دے"۔

یہ آخری مقطع ہے جو نہایت اثر آفریں ہے اور اس میں گہرے حقائق کی طرف اشارے ہیں۔ ان حقائق کے بارے میں اس وقت کے سامعین نے کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ ان حقائق میں سے زیادہ انسان کی تخلیق اور اس دنیا میں اس کی حیات کے نشوونما کے لیے تدابیر کی طرف اشارات ہیں۔

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى (۷۵: ۳۶) "کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اسے یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟" اہل عرب کے نزدیک زندگی ایک ایسی حرکت تھی جس کا نہ کوئی سبب تھا اور نہ کوئی علت تھی۔ نہ کوئی مقصد اور نہ غایت تھی۔ لوگ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے تھے اور قبروں میں جاتے تھے۔ اور پیدائش اور موت کے درمیان کا عرصہ لہو و لعب کے لیے مخصوص تھا۔ زندگی زینت اور زیبائش اور باہم فخر و مباہات سے عبارت تھی۔ لوگ زندگی اسی طرح گزارتے تھے جس طرح حیوانات گزارتے ہیں یہ کہ اس کائنات میں کوئی ناموس فطرت ہے اور زندگی کا کوئی مقصد ہے اور وہ ایک حکمت کے تحت وجود میں لائی گئی ہے۔ یہ باتیں ان کی سمجھ سے دور تھیں۔ وہ یہ نہ سمجھتے تھے کہ انسان ایک متعین تقدیر کے مطابق پیدا کیا گیا ہے اور یہ کہ وہ کوئی ذمہ دار مخلوق ہے اور اس کی تخلیق کے پیچھے کوئی جزاء و سزا کا نظام بھی موجود ہے۔ اور زندگی کا یہ سفر ایک آزمائش ہے۔ رہا یہ تصور کہ یہ زندگی ایک بامقصد زندگی ہے اور اس کی پشت پر ایک قادر مطلق ذات ہے جو اللہ العالمین ہے' اور اس نے ہر چیز کو ایک اندازے اور ایک حکمت کے مطابق پیدا کیا ہے اور ہر چیز ایک انجام کو پہنچنے والی ہے تو یہ تصورات ان کی سوچ میں نہ تھے' بلکہ یہ لوگ ان تصورات سے کوسوں دور تھے۔ اسلام

سے قبل کے زمانے میں عربوں کی ایسی ہی حالت تھی۔

حالانکہ انسان اور حیوان کے درمیان فرق ہی اس شعور کی وجہ سے ہے کہ واقعات ایک مقصد کے تحت وقوع پذیر ہوتے ہیں' ان کے اہداف اور مقاصد متعین ہیں۔جس طرح یہ پوری کائنات با مقصد ہے اسی طرح اس کے اندر حضرت انسان بھی با مقصد ہے۔جوں جوں انسان کا یہ شعور ترقی کرتا رہا ہے' انسانیت نے ترقی کی ہے' اس شعور کے تحت انسان کی زندگی باہم مربوط ہوتی ہے۔اس تصور کے تحت انسان اپنی زندگی کے لمحات کا حساب کرتا ہے۔تمام حادثات و واقعات پر غور کرتا ہے۔حال اور مستقبل کو ماضی سے مربوط رکھتا ہے۔پھر اس پوری زندگی کو اس کائنات کے نظام کے ساتھ مربوط رکھتا ہے۔اور پھر انسان اور پوری کائنات کو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ جوڑتا ہے کہ یہ انسان اور اس کی زندگی اور یہ جہاں عبث نہیں پیدا کیے گئے۔

یہ ہے وہ عظیم تصور حیات جس کی طرف قرآن نے لوگوں کو پہنچایا۔یہ ایک عظیم انقلابی تصور تھا۔اس وقت انسانوں کے اندر جو سوچ بالعموم موجود تھی اس پر اگر غور کیا جائے تو اس کے مقابلہ میں یہ بہت ہی انقلابی سوچ تھی۔نیز اس وقت دنیا میں جو فلسفے اور خیالات رائج اور مشاہد تھے ان کے مقابلے میں یہ تصور اور عقیدہ ایک انقلابی تصور اور سوچ تھی۔(دیکھئے میری کتاب اسلام کائنات اور زندگی اور انسان)۔

یہ چٹکی کہ۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (۷۵:۳۶) "کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اسے یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟" یہ دراصل ان چند قرآنی اشارات میں سے ہے جو انسان کو اس کائنات کے ساتھ روابط اور تعلقات قائم کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔اس جہاں اور انسان دونوں کے لیے غرض و غایت اور ایک مقصد متعین کرتے ہیں۔واقعات کے لیے علل و اسباب متعین کرتے ہیں اور کچھ چیزوں کو کچھ کے نتائج قرار دیتے ہیں۔یوں یہ پوری کائنات اور اس کے اندر انسان بامقصد اور باہم مربوط ہو جاتے ہیں۔

یہاں اس تصور پر نہایت ہی سادہ اور سیدھے دلائل لائے جاتے ہیں' جن کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہے۔خلاصہ یہ کہ انسان شتر بے مہار اور بے مقصد نہیں ہے۔

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى (۳۷) ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى (۳۸) فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰى (۳۹) (۷۵:۳۷ تا ۳۹) "کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا' پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے' پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں"۔

یہ انسان کیا ہے؟ یہ کس سے بنایا گیا ہے؟ کس طرح تھا اور کس طرح ہو گیا۔اور زندگی کا یہ سفر اس نے کہاں سے شروع کیا اور کہاں تک پہنچا۔اس کرۂ ارض پر وہ کیسے پہنچا جو ایک چھوٹا سا ستارہ ہے۔

کیا وہ پانی کا چھوٹا سا نطفہ نہیں تھا' پانی کی ایک بوند جو ٹپکتی ہے۔کیا انسان ایک نہایت ہی خوردبینی نکتہ نہ تھا۔پھر وہ ایک

خلیہ بن گیا۔ پھر وہ خون کا ایک مخصوص لوتھڑا بن گیا۔ یہ لوتھڑا رحم مادر میں بڑھتا رہا۔ پہلے یہ رحم کی دیواروں کے ساتھ معلق رہا اور اس کے خون سے اپنی غذا اخذ کرتا رہا۔ یہ تمام مراحل سفر اسے کس نے سکھائے؟ اور یہ طاقت اسے کس نے دی اور یہ راستہ اسے کس نے بتایا؟

اس کے بعد کس نے اسے ایک جنین کی شکل دی۔ جس کی قوتوں کے اندر اعتدال اور جس کے اعضا باہم ہم آہنگ اور متناسب بن گئے۔ پھر کس طرح یہ ایک خلیہ اب کئی ملین خلیوں کی شکل اختیار کر گیا۔ حالانکہ پہلے یہ ایک خلیہ تھا اور ایک خوردبینی انڈا تھا۔ وہ سفر اور تغیر پذیری جو اس خلیے نے ایک جنین تک طے کی' یہ پیدائش سے موت تک کے مراحل سے طویل تھی۔ سوال یہ ہے کہ کون ہے جو اسے ان طویل تغیرات کے لیے تیار کر رہا ہے۔ حالانکہ آغاز میں وہ ایک نہایت ہی چھوٹی مخلوق تھی۔ نہ عقل اور نہ قوائے ادراک اس کے اندر تھیں۔ اور نہ دنیاوی تجربات اسے حاصل تھے۔

پھر ایک ہی مخلوق سے اللہ نے کس طرح مرد اور عورت پیدا کیے۔ کیا یہ مخلوق خود اپنے آپ کو مرد اور عورت کی شکل میں ڈھالتی ہے۔ کیا یہ مخلوق خود مذکر مونث ہونے کا فیصلہ کرتی ہے یا یہ کوئی دوسری قوت ہے جو ان تاریکیوں میں اسے مذکر و مونث بناتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسی ذات کے تصور کے سوا اس جہاں کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا جو قادر مطلق ہے۔ جو مدبر ہے' جو تمام واقعات اور حادثات کا سبب اول ہے۔ جو قدرت مطلقہ رکھتی ہے۔ یہ وہی ذات ہے جو انسان کو ایک خوردبینی ذرے سے یہاں تک لاتی ہے۔

فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى (۷۵ : ۳۹) "پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں"۔

یہ حقیقت جو انسانی شعور کے ساتھ چپک جاتی ہے پھر پوری سورت کی تلخیص یوں کی جاتی ہے اور ان تمام حقائق سے نتیجہ یوں اخذ کیا جاتا ہے۔

اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْیِۦَ الْمَوْتٰى (۷۵ : ۴۰) "کیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر دے"۔ ہاں بے شک اللہ قادر ہے کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کر دے۔ ہاں اللہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ حشر و نشر کے دن سب کو اٹھائے۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ انسان مجبور ہے کہ عقیدۂ آخرت پر ایمان لائے۔ کیونکہ یہ پوری کائنات اس پر شاہد ہے۔

یوں یہ سورت ایک زوردار فقرے پر ختم ہوتی ہے۔ جس کا اثر فکر و احساس کے پردوں پر نہایت گہرا اور فیصلہ کن ہوتا ہے اور انسان اس کائنات' اس کی حقیقت اور اس کی پشت پر کام کرنے والی ذات مدبرہ کے قریب چلا جاتا ہے۔

--- ○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۲۹

## سورۃ الدھر۔ ۷٦

## ۱--تا--۳۱

# سورۃ الدھر ایک نظر میں

بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ سورت مدنی ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور اس کا مکی ہونا بالکل ظاہر ہے۔ اس کے موضوع سخن' طرز ادا اور تمام معنوی و کلامی خصوصیات بتاتی ہیں کہ یہ مکی ہے۔ اس لیے ہم ان روایات پر اعتماد کرتے ہیں جن میں ہے کہ یہ مکی ہے۔ بلکہ اس کی بعض باتیں تو یہ بتاتی ہیں کہ یہ مکی دور کی بھی نہایت ابتدائی سورتوں میں ہے۔کیونکہ جنات کے انعامات کی تفصیلات مکہ کی ابتدائی سورتوں کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے۔ اسی طرح قیامت کے سخت عذاب کی تصویر کشی بھی۔ نیز اس سورت میں حضور اکرم ﷺ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کے فیصلوں پر صبر کریں۔ یعنی مشکلات کو برداشت کریں۔ اور کسی آثم اور ناشکرے کی اطاعت نہ کریں۔ یہ اشارہ ان مظالم کی طرف ہے جب مکہ کے ابتدائی دور میں لوگ تحریک اسلامی کے کارکنوں پر کیا کرتے تھے۔ اس لیے اہل ایمان کو ہدایت ہوئی کہ ان ظالموں کو ذرا مہلت دیجئے اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیجئے اور جو سچائی آپ پر نازل ہوئی ہے اس پر جم جائیں اور کفار کی طرف ہرگز نہ جھکیں اور نہ ان کے ساتھ نرم رویہ اختیار کریں۔ جیسا کہ سورہ قلم' سورہ مزمل اور سورہ مدثر کے مضامین ہیں۔ لہٰذا یہ سورت اسی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کہ یہ سورت مدنی ہے' نہایت ضعیف بات ہے۔ جس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

سورت کا انداز نہایت نرم' تروتازہ اور دعوت الی اللہ کی التجا ہے۔ اللہ کے سامنے گڑگڑانا اور اس کی رضامندی کی طلب۔ اللہ کی نعمتوں کو یاد کرنا اور اللہ کے فضل کا احساس' اللہ کے عذاب سے بچنا' راہ خدا میں ابتلاؤں کو سمجھنے کی کوشش کرنا' اور انعام و اکرام اور ابتلا و آزمائش میں اس کی حکمتوں کو سمجھنا' اس سورت کے مضامین ہیں۔

اس سورت کا آغاز ایک نہایت موثر اور قلب پر رقت طاری کر دینے والے سوال سے ہوتا ہے کہ ذرا بھی سوچا ہے تو اے انسان' کہ تخلیق سے پہلے تو کہاں تھا؟ کس نے تمہاری تخلیق کی؟ اور کس نے تمہیں ایک قابل ذکر مخلوق بنایا؟ جبکہ اس سے قبل تو اس کائنات کی کوئی قابل ذکر مخلوق نہ تھا۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا (۷۶ : ۱) "کیا انسان پر لامتناہی زمانے کا ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جبکہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا"۔

اس کے بعد اس کی اصلیت اور حقیقت کے بارے میں ایک اشارہ ہے کہ اس کی تخلیق کس قدر حکیمانہ ہے اور اس کی تخلیق کے اندر کس قدر گہری حکمت پوشیدہ ہے۔ اور اس کے اندر احساس و ادراک کی کیا کیا عجیب قوتیں ودیعت کر دی گئی ہیں۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (۷۶ : ۲) "ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا"۔

پھر ایک تیسرا اشارہ کہ ہم نے انسان کو نیک و بد کی تمیز دی اور راہ ہدایت تک لانے میں اس کی مدد کی اور اس کے بعد اسے چھوڑ دیا کہ وہ راہ راست اختیار کرتا ہے یا بد۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (٧٦: ٣) "ہم نے اسے راستہ دکھایا خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا"۔

ان تین اشارتی چٹکیوں کے بعد' اور دل مومن کے اندر گہری سوچ پیدا کرنے کے بعد' اسے آگے اور پیچھے کی بصیرت عطا کرنے کے بعد' اور راہ کے انتخاب میں احتیاط اور تدبر کی تعلیم دینے کے بعد' انسانوں کو بیانگ دہل پکارا جاتا ہے کہ تمہارے آگے جنت بھی ہے اور دوزخ بھی ہے۔ اور جنت میں تمام انعام و اکرام ہوں گے اور عیش و آرام کی زندگی ہوگی جبکہ جہنم میں آگ اور زنجیریں ہوں گی۔

اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِيْرًا (٤) اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا (٥) عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا (٦) (٧٦: ٤ تا ٦) "کفر کرنے والوں کے لیے ہم نے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔ نیک لوگ (جنت میں) شراب کے ایسے ساغر پیں گے جن میں آب کافور کی آمیزش ہوگی۔ یہ ایک بہتا چشمہ ہوگا جس کے پانی کے ساتھ اللہ کے بندے شراب پیں گے اور جہاں چاہیں گے بسہولت اس کی شاخیں نکال لیں گے"۔

اس سے قبل کہ عیش و عشرت کی تصویر کشی کی جائے' ان ابرار اور نیک لوگوں کی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں' لیکن یہ خصوصیات نہایت محبت آمیز' ان کے جمال اور خوبصورتی کے ساتھ بیان کی گئیں جو ان نعمتوں کے حسب حال ہیں اور ان کے ساتھ مناسب ہیں۔

يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَ يَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا (٧) وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا (٨) اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا (٩) اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا (١٠) (٧٦: ٧ تا ١٠)

"یہ وہ لوگ ہوں گے جو (دنیا میں) نذر پوری کرتے ہیں' اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہو گی' اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان سے کہتے ہیں کہ) "ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں' ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ' ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا خوف لاحق ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہو گا"۔

اس کے بعد پھر ان لوگوں کی جزائے اخروی کی تفصیلات دی جاتی ہیں جو اس مصیبت کے طویل دن سے ڈرتے رہے

اور اللہ کے احکام بجالاتے رہے۔ جو نیک رہے' اور اپنی محتاجی کے باوجود اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہے۔ محض اللہ کی رضاجوئی کے لیے' جو کسی سے نہ بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ بلکہ وہ محض قیامت کے دن کے خوف سے یہ عبادات سرانجام دیتے ہیں۔

یہ لوگ جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ خضوع وخشوع کرنے والے ہیں' اللہ کے لیے کھانا کھلانے والے ہیں اور اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دینے والے ہیں' ان کے لیے کیا انعام ہے؟ اس کی تفصیلات دی جارہی ہیں۔ ان کے لیے امن و آرام اور عیش و عشرت ہیں۔

فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَ لَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا(۱۱) وَ جَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا(۱۲) مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّ لَا زَمْهَرِيْرًا(۱۳) وَ دَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَ ذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا(۱۴) وَ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّ اَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا۟(۱۵) قَوَارِيْرَا۟ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا(۱۶) وَ يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا(۱۷) عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا(۱۸) وَ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا(۱۹) وَ اِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّ مُلْكًا كَبِيْرًا(۲۰) عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّ اِسْتَبْرَقٌ وَّ حُلُّوْۤا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ وَ سَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا(۲۱) اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا(۲۲)

(۷۶: ۱۱ تا ۲۲) "پس اللہ تعالیٰ انہیں اس دن کے شر سے بچالے گا اور انہیں تازگی اور سرور بخشے گا۔ اور ان کے صبر کے بدلے میں انہیں جنت اور ریشمی لباس عطا کرے گا۔ وہاں وہ اونچی مسندوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ نہ انہیں دھوپ کی گرمی ستائے گی نہ جاڑے کی ٹھر۔ جنت کی چھاؤں ان پر جھکی ہوئی سایہ کر رہی ہوگی' اور اس کے پھل ہر وقت ان کے بس میں ہوں گے (کہ جس طرح چاہیں انہیں توڑ لیں) ان کے آگے چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش کرائے جارہے ہوں گے' شیشے بھی وہ چاندی کی قسم کے ہوں گے' اور ان کو (منتظمین جنت نے) ٹھیک اندازے کے مطابق بھرا ہوگا۔ ان کو وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی' یہ جنت کا ایک چشمہ ہوگا جسے سلسبیل کہا جاتا ہے۔ ان کی خدمت کے لیے ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے۔ تم انہیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دیے گئے ہیں۔ وہاں جدھر بھی تم نگاہ ڈالو گے نعمتیں ہی نعمتیں اور

ایک بڑی سلطنت کا سروسامان تمہیں نظر آئے گا۔ان کی اوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے ہوں گے' ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے' اور ان کا رب ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔یہ ہے تمہاری جزا اور تمہاری کارگزاری قابل قدر ٹھیری ہے"۔

جب نعمتوں اور عشرتوں کی یہ نمائش گاہ ختم ہوگئی اور خوشگوار زندگی اور جنتوں کے مزے کا بیان ہو گیا تو اب روئے سخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے تاکہ اس کفر' اعراض اور تکذیب کے مقابلے میں آپ جم جائیں اور صبر کریں اور قدرے انتظار کریں کہ اللہ کا فیصلہ آجائے۔اور اپنے رب کے ساتھ رابطہ کریں۔اور جب بھی راستہ طویل ہو' رب ہی سے مدد حاصل کریں۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِیْلًا (۲۳) فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (۲۴) وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا (۲۵) وَمِنَ الَّیْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَ سَبِّحْهُ لَیْلًا طَوِیْلًا (۲٦) (۷٦: ۲۳ تا ۲٦) "اے نبی' ہم نے ہی تم پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے' لہٰذا تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو' اور ان میں سے کسی بدعمل یا منکر حق کی بات نہ مانو۔اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کرو' رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو"۔

اس کے بعد لوگوں کو اس بھاری دن سے ڈرایا جاتا ہے جس کے لیے لوگ کچھ تیاری نہیں کر رہے ہیں اور نہ اس کو اہمیت دیتے ہیں اور نیک اور متقی لوگ اس سے بہت ڈرتے ہیں۔بتایا جاتا ہے کہ تمہارا معاملہ اللہ پر بہت ہی ہلکا ہے' جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور تمہیں قوت دی ہے اور جس طرح اس نے تمہیں پیدا کیا' تمہیں لے جا بھی سکتا ہے اور تمہاری جگہ دوسری اقوام بھی کھڑی کر سکتا ہے۔اگر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو تمہیں کبھی کا مٹا دیا ہوتا' اور یاد رکھو یہاں تمہیں بطور آزمائش بھیجا گیا ہے۔

اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ یُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَ یَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ یَوْمًا ثَقِیْلًا (۲۷) نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَ شَدَدْنَاۤ اَسْرَهُمْ وَ اِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَاۤ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِیْلًا (۲۸) اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِیْلًا (۲۹) وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا (۳۰) یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِهٖ وَ الظّٰلِمِیْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا (۳۱) (۷٦: ۲۷ تا ۳۱) "یہ لوگ تو جلدی حاصل کرنے والی چیز (دنیا) سے محبت رکھتے ہیں اور آگے جو بھاری دن آنے والا ہے اسے نظرانداز کر دیتے ہیں۔ہم نے ہی ان کو پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے ہیں' اور ہم جب چاہیں ان کو بدل کر رکھ دیں۔یہ ایک نصیحت ہے' اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے۔اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ نہ چاہے۔یقیناً اللہ بڑا علیم و حکیم ہے۔اپنی

رحمت میں جس کو چاہتا ہے ' داخل کرتا ہے اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

اس سورت کا آغاز انسان کی تخلیق کے مضمون سے ہوتا ہے۔ اور یہ کہ یہ تخلیق اللہ کے نظام تقدیر کے مطابق ہے۔ اور انسان کو اللہ نے اس جہاں میں آزمائش کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور سورت کا خاتمہ آخرت کی ابتلا اور آزمائش پر ہوتا ہے۔ چنانچہ زندگی کے آغاز اور خاتمہ کے درمیان پوری زندگی آتی ہے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ انسان کو یہ زندگی عبث ضائع نہیں کرنا چاہئے اور نہ غفلت اور لاپرواہی سے گزارنا چاہئے کہ نہ وہ اس کا کوئی مقصد سمجھے اور نہ رازہائے حیات کو سمجھے۔

اصل بات تو یہ ہے کہ وہ آزمائش کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اللہ نے اسے قوت مدرکہ دی ہے تاکہ وہ آزمایا جائے۔

آغاز اور انجام کے درمیان جنتوں کی نعمتوں اور عیش و عشرت کی ایک طویل ترین تصویر کشی کی گئی ہے۔ یا یہ قرآن کی طویل ترین تصویر یا تصاویر میں سے ہے۔ اگر ہم سورہ واقعہ کی تصویر کشی کو پیش نظر رکھیں۔ اس میں جنت کے انعامات کی طویل تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ تصویر کشی بالجملہ حسی نعمتوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ ان نعمتوں کے ساتھ اعزاز و اکرام بھی ہے ' لیکن اس کا حسی انداز یہ بتاتا ہے کہ یہ چھ آیات مکی دور میں نازل ہوئیں۔ کیونکہ مکی دور میں لوگ زمانہ جاہلیت میں ڈوبے ہوئے تھے اور حسی سوچ کے زیادہ قریب تھے اور حسی لطف اندوزی کے زیادہ دلدادہ تھے۔ وہ چیزیں جن کا یہاں ذکر ہوا۔ ان کو زیادہ متاثر کرتی تھیں اور ان کی طرف وہ بالعموم زیادہ راغب ہوتے تھے اور یہ ان کے لیے پرکشش تھیں۔ اور آج جدید ترقی یافتہ دور میں بھی اس قسم کے حسی لذات پر لوگ مرمٹتے ہیں۔ لہذا یہ رنگ اور یہ تصاویر ان کی خواہشات کے عین مطابق تھیں۔ اور اللہ تعالیٰ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے تخلیق کردہ دل چاہے کیا ہیں؟ اور ان کی ساخت اور ان کے شعور کے حسب حال کیا چیز ہے اور بعض انعامات ان حسی انعامات سے زیادہ ارفع بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً سورہ قیامت میں ہے۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ (۲۲) اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (۷۵: ۲۳) "بعض چہرے آج تروتازہ ہوں گے ' اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے"۔ بہرحال اللہ ہی جانتا ہے کہ اس کے بندوں کی اصلاح کے لیے کیا بہتر ہے۔

---○○○---

# درس نمبر۲۷۶ تشریح آیات

## ۱-- تا-- ۳۱

سُوْرَةُ الدَّهْرِ (۷۶) مَدَنِيَّةٌ (۹۸) اٰيَاتُهَا ۳۱ رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ۝۱ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝۲ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ۝۳

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"کیا انسان پر لامتناہی زمانے کا ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جبکہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا"۔

یہ استفہام تقریری ہے، یعنی کسی چیز کے بارے میں دریافت کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت کی اطلاع دینا مقصود ہے کہ ایسا ضرور تھا۔ لیکن سوالیہ انداز اس لیے اختیار کیا گیا کہ انسان کو خود اس حقیقت کے بارے میں سوال کرنا چاہئے، اور سوچنا چاہئے کہ وہ کسی وقت کوئی قابل ذکر شے نہ تھا اور جب وہ اب ایک قابل ذکر شے ہے تو اسے دست قدرت کا کسی قدر تو شعور ہونا چاہئے جو اسے عدم سے وجود میں لائی اور تاریکیوں سے روشنی کی طرف لائی۔ جہاں یہ اس دنیا کے اسٹیج پر اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

بہرحال استفہامیہ اور سوالیہ انداز میں، اس مقام پر چند حقائق کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ یہ نہایت ہی اونچے رتبے کے اشارات ہیں۔ گہرے حقائق ہیں اور ان کو پیش نظر رکھ کر قابل غور نکات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

ایک نکتہ یہ ہے کہ ذرا اپنے وجود میں آنے سے قبل اور آغاز وجود کے زمانے اور حالات پر غور کرو، کہ یہ دنیا ایسی تھی اور اس پر انسان آباد نہ تھا۔ ذرا غور کرو کہ اس وقت یہ دنیا کیسی لگ رہی ہوگی؟ انسان اللہ کی ایک مخلوق ہے،

لیکن اپنے آپ کو ایک بڑی چیز سمجھتا ہے اور مغرور ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتا کہ یہ دنیا اس کے وجود میں آنے سے بھی پہلے زمانوں سے ایسی ہی تھی۔ بلکہ اس کائنات کی مخلوق انسان کی تخلیق کی توقع ہی نہ رکھتی تھی۔ لیکن اللہ کا ارادہ ہوا اور اس نے انسان کی تخلیق فرمائی۔

ایک نکتہ یہ ہے کہ ذرا ان لمحات پر غور کرو جن میں یہ مخلوق انسانی وجود میں آئی۔ ان لمحات کے بارے میں انسان تو ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا ہے جبکہ تخلیق انسان کے آغاز کا علم تو خالق کائنات ہی کو ہو سکتا ہے۔ یہ تو خالق ہی جانتا ہے کہ اس کائنات اور دنیا میں حضرت انسان کا اضافہ کس طرح ہوا۔ اس کائنات کی طویل تاریخ میں اللہ ہی نے انسان کے لیے مخصوص کردار متعین کیا ہے۔

ایک نکتہ یہ ہے اس ذات انسان کو 'کائنات کے اس اسٹیج پر' دست قدرت نے کس طرح لاکر کھڑا کیا اور ایک ذمہ داری اور ایک کردار اس کے سپرد کیا؟ اس کے لیے اسے تیار کیا۔ اس کے کردار کا تانا بانا اس پوری کائنات کے خطوط کے ساتھ ملایا۔ اور وہ حالات اس کے لیے مہیا کیے جن کے اندر اس کے لیے وہ کردار ادا کرنا ممکن اور آسان ہوا۔ جو اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد قدم قدم پر اس کے لیے سہولیات فراہم کیں۔ یوں یہ حضرت انسان اس کائنات کی ہر چیز کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہو گیا۔

بہت سے اشارات ہیں اور بہت سے قابل غور نکات ہیں جو یہ آیات قلب انسانی کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ جن سے انسانی سوچ اور انسانی فکر 'انسان کے مقصد وجود' اس کے ارادوں اور آغاز سے انجام تک ہر مرحلے پر اس کے نظام تقدیر کے نکات اخذ کرتی ہے۔

یہ تو تھے نکات انسان کے آغاز تخلیق کے متعلق۔ رہا وہ نظام جو نسل انسانی کے بقائے دوام کے لیے اور تاقیامت تسلسل کے لیے وضع کیا گیا تو وہ نظام بالکل مختلف ہے اور اس کا ایک اپنا قصہ ہے۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (۷۶ : ۲) ”ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا“۔

امشاج کے معنی ہیں مخلوط۔ یہ اشارہ ہے اس حالت کی طرف جب مرد کا خلیہ عورت کے بیضے میں داخل ہو کر اس کے ساتھ خلط ہو جاتا ہے اور اس میں مرد اور عورت کی موروثی خصوصیات کی طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے' جن کو علمائے حیاتیات ”جینز“ کہتے ہیں۔ یہ وہ خصائص ہیں جو جنس انسانی کو دوسرے زندہ اجناس سے ممیز کرتے ہیں' پھر اس کے ذریعہ خاندانی موروثی خصائص بھی بچے میں منتقل ہوتے ہیں۔ اور انسانی نطفہ انسانی جنین کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اور دوسرے حیوانات سے مختلف شکل اختیار کرتا ہے اور یہی مخلوط نطفہ ہے جس کی طرف مرد اور عورت کی وراثتی خصوصیات منسوب کی جاتی ہیں بلکہ یہ مخلوط نطفہ کئی مختلف وراثتی خصوصیات کا مخزن ہوتا ہے۔

یوں اللہ نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔ یہ نہ اتفاقاً پیدا ہوا ہے۔ اور نہ اس کی تخلیق ایک بے مقصد اور عبث کام ہے۔ نہ اسے کھیل کے طور پر پیدا کیا گیا ہے۔ بلکہ انسان کو ایک ذمہ دار مخلوق کے طور پر امتحان اور آزمائش کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اللہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ آزمائش کیا ہے؟ کیا امتحان ہے؟ اور اس امتحان کا نتیجہ کیا ہو گا؟ البتہ انسان دنیا کے

اسٹیج پر جو ڈرامہ کرتا ہے' یہ محض نتیجے کے اظہار کے لیے ہے تاکہ یہ نتیجہ کھلی عدالت میں پیش ہو اور اس کے اوپر جزاء و سزا مرتب ہوں۔ اور لوگ اپنے اچھے اور برے انجام تک پہنچیں۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے انسان کو سمیع و بصیر بنایا ہے۔ یعنی اسے ادراک کے وسائل دیئے ہیں کہ وہ نیک و بد کو سمجھ سکے اور جان سکے۔ اور اس دنیا کے افعال و اشیاء کی حقیقت کو اچھی طرح پا سکے اور اس امتحان کو اچھی طرح پاس کر سکے۔

پس اللہ تعالیٰ نے انسان کے سلسلہ توالد و تناسل کو چلانے کا جو ارادہ کیا اور اس کے لیے جو نظام متعین فرمایا وہ نطفہ مخلوط سے اس کی تخلیق کا نظام ہے۔ اور اس میں گہری حکمت اور گہری مقصدیت ہے۔ یہ کوئی اتفاقی اور بے سوچے سمجھے کا سلسلہ نہیں ہے۔ اور یہ حکمت اور مقصد اس انسان کو آزمانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اس ذات کے اندر ہدایت کے اخذ کرنے اور حق کی قبولیت کی استعداد رکھی۔ اور پھر اسے علم و معرفت اور قدرت و اختیار عطا کیا گیا اور یہ تمام صلاحیتیں' علم و ادراک اور اخذ ہدایت اور تربیت کی اللہ نے ایک نہایت ہی متعین وزن اور مقدار کے ساتھ اسے عطا کیں۔

پھر علم و معرفت اور فہم و ادراک کے ساتھ ساتھ اسے یہ قدرت اور احتیاط بھی دیا کہ وہ راہ حق کو اختیار کرے۔ چنانچہ اسے حق و باطل کی تمیز دے کر چھوڑ دیا کہ جو راہ چاہے اختیار کرے۔ خواہ اللہ کی راہ اختیار کرے یا اس کے سوا کوئی اور راہ اختیار کرے۔

إِنَّا هَدَيْنَٰهُ ٱلسَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ( ۷۶ : ۳ ) ''اور ہم نے اسے راستہ دکھایا خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا''۔ یہاں اللہ نے راہ ہدایت کی تعبیر شکر نعمت سے کی ہے۔ کیونکہ جب کسی کو ہدایت عطا کر دی جاتی ہے تو اس کے پردۂ شعور پر سب سے پہلے شکر کا احساس نمودار ہوتا ہے' وہ جانتا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا' تو اللہ تعالیٰ نے اسے انسانیت عطا کر کے ایک قابل ذکر چیز بنایا۔ پھر اسے سمع و بصر عطا کر کے دوسرے حیوانات سے ممتاز کیا اور یوں وہ علم و معرفت پر قادر ہوا' پھر اسے ازروئے فطرت اور بذریعہ انبیاء ہدایت عطا فرمائی اور آزاد چھوڑ دیا کہ وہ راہ ہدایت اختیار کر کے مشکور بنے یا راہ ضلالت اختیار کر کے کفور اور ناشکرا بنے۔ لفظ کفور کے مفہوم میں ہے کہ ناشکری میں وہ غلو کرے۔

ان تین توجہ مبذول کرنے والی چٹکیوں اور تنبیہات کے بعد اب انسان محسوس کر لیتا ہے کہ وہ ایک ذمہ دار اور بامقصد مخلوق ہے اور وہ آزاد نہیں ہے بلکہ ایک محور کے گرد بندھا ہوا ہے۔ اور گھوم رہا ہے۔ اور اسے جو صلاحیتیں دی گئی ہیں ان پر اس سے حساب کیا جا رہا ہے اور یہ جہاں اس کے لیے دارالامتحان ہے۔ یہاں اسے آزمائشی طور پر رکھا گیا ہے۔ یہاں اسے کھیل کے میدان میں نہیں اتارا گیا بلکہ امتحان کے کمرہ میں بٹھایا گیا ہے۔ غرض ان مختصر تین آیات سے فکر و نظر کا بے بہا خزانہ ملتا ہے اور بلند افکار اور تصورات اور گہری حکمت کے جو ہر ظاہر ہوتے ہیں جبکہ ان تمام نکات کے نتیجے میں انسان پر ایک بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور شعور کی پختگی اور طرز عمل میں سنجیدگی اور وقار حاصل ہوتا ہے۔ یہ مختصر آیات انسان کا راہ حیات متعین کر دیتی ہیں۔ اس کے وجود کا مقصد بتاتی ہیں اور زندگی کا شعور عطا کرتی ہیں۔ اور ان کی روشنی میں انسان اپنی زندگی اور اس کی قدروں کا تعین کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان آیات کے بعد متصلاً یہ بتا دیا جاتا ہے کہ اس آزمائش اور ابتلا کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے۔ اور انسان اگر شکر کی راہ لے گا تو نتیجہ کیا ہو گا اور اگر انسان کفر اور کفران کی راہ لے گا تو انجام کیا ہو گا؟

جو کفر اور ناشکری کی راہ لیں گے' ان کا انجام نہایت ہی اختصار کے ساتھ دیا جاتا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ پوری سورت کی فضا اور اس کا انداز نرم و نازک اور سہولتوں اور خوشیوں اور جنتوں کی دائمی نعمتوں کا ہے۔ لہٰذا اللہ میاں عذاب جہنم کی تفصیلات دے کر اس سورت کی فضا کو مکدر کرنا نہیں چاہتے۔ نہایت اختصار کے ساتھ فرماتے ہیں:

إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلْكَٰفِرِينَ سَلَٰسِلَا۟ وَأَغْلَٰلًا وَسَعِيرًا ۝٤

"کفر کرنے والوں کے لیے ہم نے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے"۔ زنجیریں ان کے پاؤں میں ہوں گی' طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے' یہ لوگ زنجیروں میں بندھے ہوئے اور ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے جہنم میں گرائے جائیں گے۔ لیکن اس مختصر ذکر کے بعد اب جنت کی نعمتوں کی طرف روئے سخن پھر جاتا ہے اور نہایت ہی سرعت کے ساتھ اور قدرے تفصیل کے ساتھ۔

إِنَّ ٱلْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِن كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ۝٥ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ ٱللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا ۝٦

"نیک لوگ (جنت میں) شراب کے ایسے ساغر پئیں گے جن میں آب کافور کی آمیزش ہو گی۔ یہ ایک بہتا چشمہ ہو گا جس کے پانی کے ساتھ اللہ کے بندے شراب پئیں گے اور جہاں چاہیں گے بسہولت اس کی شاخیں نکال لیں گے"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک لوگوں کا مشروب ایسا ہو گا کہ اس میں کافور کی ملاوٹ ہو گی' یہ مشروب ایک ایسے چشمے سے بھر کر دیا جائے گا' جو ان کے لیے خصوصی طور پر بہایا گیا ہو گا۔ یعنی وہ نہر کی طرح وافر اور کثیر مقدار میں ہو گا۔ عربوں کی یہ عادت تھی کہ شراب میں کبھی کافور اور کبھی زنجبیل (سونٹھ) کا آمیزہ کرتے تھے۔ اور اس طرح شراب کو زیادہ لذیذ بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہاں انہیں بتایا جاتا ہے کہ جنت میں بھی پاک اور صاف مشروب ہو گا' جس میں کافور کا آمیزہ ہو گا اور یہ شراب بڑی وافر مقدار میں ہو گی۔ اس کا معیار کیا ہو گا' یہ دنیا کی شراب کے مقابلے میں بہت خوش ذائقہ ہو گی اور اس کی لذت اس قدر زیادہ ہو گی کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ تو درحقیقت قریب الفہم بنانے کے لیے ان اصطلاحات کے اندر کہا جا رہا تھا تاکہ لوگ سمجھ سکیں ورنہ جنت کی نعمتیں عالم غیب میں ہیں۔ ان کا صحیح تصور اور ان کی صحیح تعبیر ہم نہیں کر سکتے۔

اہل جنت کو پہلی آیت میں الابرار کہا گیا ہے اور دوسری میں عباد اللہ کہا گیا ہے۔ یہ محض قرب و محبت کے اظہار کے لیے اور فضل و کرم کے اعلان کے لیے ہے کہ یہ بندے اللہ کے قریب ہوں گے۔ اور ان کے اوصاف اور خدوخال یہ ہوں گے:

يُوفُونَ بِٱلنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُۥ مُسْتَطِيرًا ۝٧ وَيُطْعِمُونَ ٱلطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِۦ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝٨ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ ٱللَّهِ

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۝ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا۝

"یہ وہ لوگ ہوں گے جو (دنیا میں) نذر پوری کرتے ہیں' اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہو گی' اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان سے کہتے ہیں کہ) "ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں' ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ' ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا خوف لاحق ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہو گا"۔

یہ نہایت روشن اور شفاف تصویر ہے اور یہ ان مخلصین اور سچے لوگوں کی شکل ہے جو اللہ کے احکام اور اسلامی نظریہ حیات کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے بندوں پر غایت درجہ مہربان ہوتے ہیں۔ اور اپنے مقابلے میں دوسرے بندگان خدا کو ترجیح دیتے ہیں اور اللہ کا ڈر اور خوف ان پر طاری رہتا ہے' وہ اللہ کی رضامندی کے متلاشی ہوتے ہیں۔ اور ان پر اسلام کے حوالے جو بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے وہ اللہ کے عذاب سے ہروقت ڈرتے ہیں۔

يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ (۷۶ : ۷) "وہ نذر پوری کرتے ہیں"۔ یعنی جو عبادات اور نیک کام خود اپنے اوپر لازم کرتے ہیں' ان کی وفا کرتے ہیں یعنی وہ دین اسلام کے معاملے کو بڑی سنجیدگی سے لیتے ہیں اور اس کی ذمہ داریوں کو نبھاتے ہیں۔ وہ ان ذمہ داریوں سے پہلوتہی کرنے کی سعی نہیں کرتے اور نہ ذمہ داری قبول کر کے اور اس کا حلف اٹھانے کے بعد اسے نظرانداز کرتے ہیں۔ یہی ہے معنی اس بات کا کہ وہ نذر پوری کرتے ہیں۔ یہ ہے مفہوم یوفون بالنذر کا۔ اس کا مفہوم فقہی اور معروف نذر و نیاز سے زیادہ وسیع ہے۔ جس میں اجتماعی اور دینی ذمہ داریاں بھی داخل ہیں۔

وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا (۷۶ : ۷) "اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہو گی"۔ وہ اس دن کی حالت اور صفت کا نقشہ ان کے ذہن میں بڑی خوبی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوتا ہے' جس کی مصیبت عام ہو گی اور تمام قصورواروں اور بدکاروں تک اس دن کی مصیبت پہنچے گی۔ لہٰذا وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اس دن کے عام اور وسیع شر کے زد میں کہیں وہ نہ آجائیں۔ یہ ہے حالت ان کے موقف اور تقویٰ کی۔ وہ اس بھاری ذمہ داری اور دین کے عظیم فرائض کا شدید احساس رکھتے ہیں اور کوتاہیوں اور قصوروں سے ڈرتے ہیں۔ اگرچہ وہ عبادت گزار اور اطاعت شعار ہوں۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا (۷۶ : ۸) "اور اس کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں"۔ یہ ان کی نیکی' مہربانی اور بھلائی کا شعور ہے لیکن اس کا اظہار مساکین وغیرہ کو کھانا کھلانے کی شکل میں کیا گیا ہے۔ باوجود اس کے کہ ان کو اس کھانے کی خود اشد ضرورت ہے' کیونکہ ایسے لوگوں کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لوگ اس کھانے سے محبت کرتے ہیں' الا یہ کہ وہ خود اس کی طرف محتاج ہوں' لیکن اس

احتیاج کے باوجود وہ ایثار کرتے ہیں اور یہ کھانا دوسروں پر خرچ کرتے ہیں۔

اس صفت سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کے اندر موجود مشرک معاشرے میں معاشی صورت حال کیا تھی' یہاں غرباء اور محتاجوں پر انفاق کا کوئی رواج نہ تھا۔ فخر و مباہات اور نمائش کے لیے تو وہ بہت کچھ لٹا دیتے تھے لیکن غریبوں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس خود غرضی اور کنجوسی کے میدان میں اسلام کے پروردہ یہ نیک لوگ ہی غرباء کے لیے سایہ دار درخت تھے۔ وہ اپنی ذاتی محتاجی کے باوجود لوگوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ خلوص اور محبت کے جذبات کے ساتھ اور اللہ کی رضامندی کی خاطر وہ یہ نیکی کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی نیت اور ان کے مقصد کو بھی یہاں ظاہر کیا جاتا ہے کہ وہ کس طرح اور کیونکر خرچ کرتے تھے۔

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (۹) إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا (۱۰) (۷۶: ۹ – ۱۰) "ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں' ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ' ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا خوف لاحق ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا"۔ یہ گویا بلند پایہ قلوب کے اندر رحمت اور محبت کی موجیں ہیں۔ اور یہ محض اللہ کی رضامندی کے حصول کے لیے ہیں۔ ان مہربانیوں سے وہ کوئی جزاء اور کوئی معاوضہ بلکہ شکریہ تک نہیں چاہتے۔ نہ کبر و غرور کا اظہار کرتے ہیں اور نہ غرباء پر اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں۔ بس وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس فعل کی وجہ سے سخت مصیبت کے دن کی تکالیف سے بچ جائیں' کیونکہ صدقہ کی وجہ سے مصیبت ٹلتی ہے اور اہل ایمان کو حضور اکرم ﷺ نے بتایا ہے۔

اتق النار ولو بشق تمرہ "آگ سے بچو اگرچہ کھجور کے دانے کی ایک پھاڑی کے ساتھ"۔

اطعام مساکین دراصل اس اعلیٰ جذبے کا اظہار تھا جو یہ لوگ اپنے اندر رکھتے تھے۔ یوں وہ محتاجوں کی بنیادی ضروریات کا انتظام کرتے تھے' لیکن غریبوں اور محتاجوں کی امداد کی شکل و صورت مختلف معاشروں میں مختلف ہو سکتی ہے' لہٰذا ضروری نہیں ہے کہ غریبوں اور محتاجوں کے طعام کی شکل و صورت وہی ہو جو ابتدائی دور میں مروج تھی۔ اصل بات وہ جذبہ ہے جو اطعام المساکین کی تہ میں کام کر رہا ہوتا ہے۔ ہر معاشرے میں اہل ثروت کو اسے زندہ رکھنا چاہئے اور اس معاملے میں ان کے دلوں کو حساس ہونا چاہئے۔ جذبات زندہ ہوں اور دلوں کے اندر جذبہ خیر موجزن ہو' اور بھلائی کے اس جذبے کے تحت ماسوائے رضائے الٰہی کے اور کوئی دنیاوی مقصد نہ ہو کہ کوئی دنیاوی نفع مقصود ہو یہاں تک کہ شکریہ کی توقع تک پیش نظر نہ ہو۔

دور جدید میں منظم ٹیکس نافذ کیے جاتے ہیں۔ لوگوں کے ذمہ فرائض عائد کیے جاتے ہیں اور حکومتیں اجتماعی کفالت کے لیے بجٹ عائد کرتی ہیں۔ اور محتاجوں کی امداد بھی کی جاتی ہے لیکن ان آیات میں اسلامی نظام نے جو ہدایات دی ہیں' ان اقدامات کے ذریعہ ان کا ایک پہلو ہی پورا ہوتا ہے اور جسے فریضہ زکوٰۃ کے ذریعہ پورا کیا گیا ہے۔ لیکن یہ ایک پہلو ہے یعنی محتاجوں کی ضروریات کو پورا کرنا' جبکہ اسلامی نظام کے پیش نظر یہ بھی ہے کہ دہندگان کو بھی روحانی پاکیزگی حاصل ہو اور وہ بھی اعلیٰ سطح تک بلند ہوں' محتاجوں کی مدد کرنے والوں کی تہذیب اور تربیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ بعض لوگ غرباء کی امداد کو ایک برا فعل تصور کرتے ہیں کہ اس طرح غرباء ذلیل ہوتے ہیں اور دینے والوں کا بھی مزاج بگڑ جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام دلوں کا عقیدہ ہے' وہ ایک نظام تربیت ہے' اگر جذبہ انفاق درست ہو تو اس کے ذریعہ انفاق کرنے والے کی بھی اصلاح ہوتی ہے اور غرباء کو بھی نفع ہوتا ہے۔ یوں انفاق سے دو فائدے ہوتے ہیں' جو اس دین کے پیش

نظر ہیں۔

فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا ﴿۱۱﴾

"پس اللہ تعالیٰ انہیں اس دن کے شر سے بچالے گا اور انہیں تازگی اور سرور بخشے گا"۔

یہاں نہایت تیزی کے ساتھ یہ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس دن کے شر سے بچالیے جائیں گے جس سے وہ بہت ڈرتے ہیں تاکہ دنیا میں بھی یہ لوگ مطمئن ہو جائیں کیونکہ یہاں وہ قرآن کریم کی ہدایات اخذ کرتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں' اس لیے وہاں ان کو اللہ کی جانب سے تروتازگی اور مسرت حاصل ہوگی۔ ان کو سخت مصیبت والے دن کا وہاں احساس ہی نہ ہوگا کیونکہ یہاں وہ خوف کھاتے تھے اور اللہ کے سامنے جانے سے ڈرتے تھے۔ چنانچہ قیامت میں ان کے دل تروتازہ اور ان کا شعور مسرت آمیز ہوگا۔

اس کے بعد جنت کی نعمتوں کا مزید ذکر اور تفصیلات :۔

وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ﴿۱۲﴾

"اور ان کے صبر کے بدلے میں انہیں جنت اور ریشمی لباس عطا کرے گا"۔ اس جنت میں ان کی مستقل رہائش ہوگی اور ریشمی لباس ہوگا جسے وہ پہنیں گے۔

مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ﴿۱۳﴾

"وہاں وہ اونچی مسندوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ نہ انہیں دھوپ کی گرمی ستائے گی' نہ جاڑے کی ٹھر"۔

گویا وہاں ان کی محفلیں منعقد ہوتی رہیں گی جن میں وہ اطمینان کے ساتھ بیٹھیں گے اور سب کے سب خوشحال اور نعمتوں اور آسائشوں میں ڈوبے ہوئے' خوشگوار موسموں میں ہوں گے جہاں نہ گرمی کی شدت ہوگی اور نہ سردیوں کی منجمد کرنے والی سردی ہوگی۔ بہرحال وہ ایک دوسرا جہاں ہوگا۔ جس میں ہمارے جہاں والے شمس و قمر نہ ہوں گے۔ ایک نئی دنیا ہوگی یہی ہم کہہ سکتے ہیں۔

وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴿۱۴﴾

"جنت کی چھاؤں ان پر جھکی ہوئی سایہ کر رہی ہوگی' اور اس کے پھل ہر وقت ان کے بس میں ہوں گے (کہ جس طرح چاہیں انہیں توڑ لیں)"۔ یہ کہ چھاؤں بھی قریب ہوگی اور جنت کے درختوں کے پھل بھی ان پر جھکے ہوں گے' تو اس سے زیادہ خوشی اور مسرت اور عیش و عشرت کیا ہو سکتی ہے۔ یہ اعلیٰ ترین تصور ہے' خوشحالی اور فارغ البالی کا۔

یہ تو ہے اس جنت کی عمومی صورت حال جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے تیار کیا ہے' جن کے لیے یہ صورت بیان کی گئی ہے' جو نہایت ہی خوبصورت ہے اور روشن ہے تاکہ دنیا میں کتاب الٰہی میں پڑھ کر وہ خوش ہوں۔ ان نعمتوں اور سہولیات کی مزید تفصیلات :۔

وَ يُطَافُ عَلَيۡهِمۡ بِاٰنِيَةٍ مِّنۡ فِضَّةٍ وَّ اَكۡوَابٍ كَانَتۡ قَوَارِيۡرَا۟ ﴿۱۵﴾ قَوَارِيۡرَا۟ مِنۡ فِضَّةٍ قَدَّرُوۡهَا تَقۡدِيۡرًا ﴿۱۶﴾ وَ يُسۡقَوۡنَ فِيۡهَا كَاۡسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنۡجَبِيۡلًا ﴿۱۷﴾ عَيۡنًا فِيۡهَا تُسَمّٰى سَلۡسَبِيۡلًا ﴿۱۸﴾

"ان کے آگے چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش کرائے جا رہے ہوں گے' شیشے بھی وہ چاندی کی قسم کے ہوں گے' اور ان کو (منتظمین جنت نے) ٹھیک اندازے کے مطابق بھرا ہو گا۔ ان کو وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہو گی' یہ جنت کا ایک چشمہ ہو گا جسے سلسبیل کہا جاتا ہے"۔

یہ لوگ نہایت ہی آسائش اور عیش و عشرت میں ہوں گے۔ سایوں میں تختوں پر بیٹھے ہوں گے' سائے نہایت ہی گہرے اور خوشگوار ہوں گے' نہایت ہی اچھی فضا میں پھل درختوں کے ساتھ اس طرح لٹک رہے ہوں گے کہ وہ جب چاہیں توڑ سکیں گے۔ پھر ان پر جو مشروبات تقسیم ہوں گے' وہ چاندی کے خوبصورت برتنوں میں ہوں گے۔ اور شیشوں کے جام چل رہے ہوں گے اور یہ شیشے بھی چاندی کی قسم کے سفید ہوں گے۔ یعنی چاندی کو اس طرح شفاف بنایا جائے گا کہ وہ شیشہ نظر آئے گا۔ جس کی مثال اس جہاں میں نہ ہو گی۔ پھر جو مشروب ان کے سامنے پیش ہو گا' وہ نہایت مناسب' ہر شخص کی ضرورت کے مطابق ہو گا اور یہ مشروب اک ایسے جاری چشمے سے بھر کر لایا جائے گا جسے سلسبیل کہا جائے گا اور یہ نہایت ہی میٹھا اور خوشگوار ہو گا۔

اب خوشی میں مزید اضافے کے طور پر جو لوگ یہ چاندی کے برتنوں میں شراب طہور پیش کر رہے ہوں گے وہ نہایت ہی خوبصورت لڑکے ہوں گے جو ہمیشہ ایسے لڑکے رہیں گے اور روشن چہرے والے ہوں گے۔ یہ وقت گزر جانے کے ساتھ بوڑھے نہ ہوں گے۔ یہ لوگ ہمیشہ لڑکوں کی طرح تروتازہ اور خوبصورت چہروں والے ہوں گے۔ وہ یوں نظر آئیں گے جیسے موتی جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔

وَ يَطُوۡفُ عَلَيۡهِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ۚ اِذَا رَاَيۡتَهُمۡ حَسِبۡتَهُمۡ لُؤۡلُؤًا مَّنۡثُوۡرًا ﴿۱۹﴾

"ان کی خدمت کے لیے ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے۔ تم انہیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دیے گئے ہیں"۔

اس کے بعد قرآن مجید ایک نگاہ میں پورے لفظ کو نہایت مختصر الفاظ میں پیش کرتا ہے اور دعوت نظارہ دیتا ہے۔

وَ اِذَا رَاَيۡتَ ثَمَّ رَاَيۡتَ نَعِيۡمًا وَّ مُلۡكًا كَبِيۡرًا ﴿۲۰﴾

"وہاں جدھر بھی تم نگاہ ڈالو گے نعمتیں ہی نعمتیں اور ایک بڑی سلطنت کا سروسامان تمہیں نظر آئے گا"۔

ہر طرف نعمتیں ہی نعمتیں اور ایک عظیم مملکت کا سازوسامان ہو گا' جس میں ابرار عیش کریں گے جو اللہ کے مقرب

بندے ہوں گے اور یہ تو تھی جنت کی اجمالی حالت۔

یہاں بعض چیزوں کا خصوصی ذکر بھی کیا جاتا ہے جو اس عظیم حکومتی انتظام کا مظہر ہیں گویا یہ حکومتی نظام کا نمونہ ہیں۔

عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۡ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾

”ان کی اوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے ہوں گے' ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے' اور ان کا رب ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا“۔

سندس نہایت باریک ریشم کو کہتے ہیں اور استبرق موٹے ریشم کے کپڑوں کو کہتے ہیں۔ ایسے حالات میں جب وہ زیب زینت کیے ہوئے ہوں اور خوب عیش و عشرت کر رہے ہوں' ان کا رب ان کے لیے یہ انتظام فرما رہا ہو گا' جو نہایت ہی کریم عطا کنندہ ہے۔ اور اس سے ان انتظامات کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ انتظام رب تعالیٰ کی طرف سے ہو گا۔ اور ان بہترین انتظامات کے موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے اعزاز میں یہ کلمات بھی کہے جائیں گے۔

اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾ ع ۲۲

۱۹

”یہ ہے تمہاری جزا اور تمہاری کارگزاری قابل قدر ٹھہری ہے“۔

عالم بالا سے یہ تقریر ان کے اعزاز میں ہو گی' چنانچہ ان کلمات کی وجہ سے ان انعامات کی قدر و قیمت دوچند ہو جاتی ہے۔ ان الفاظ پر انعامات جنت کی یہ تفصیلات ختم ہوتی ہیں۔ اور یوں لوگوں کو پکارا جاتا ہے کہ قید و بند اور آگ و سلاسل سے بھاگو اور ان نعمتوں میں داخل ہو جاؤ۔ ابھی وقت ہے اور دونوں راستے تمہارے لیے کھلے ہیں۔

جنت کی طرف اس پکار کی انتہا پر اور جنت کی خوشگوار نعمتوں کے ذکر کے بعد' اب ان مشرکین کے حالات کو لیا جاتا ہے' جو عناد میں مبتلا ہیں اور تکذیب پر اصرار کر رہے ہیں' جو دعوت اسلامی کی حقیقت کو ابھی تک نہیں سمجھ سکے۔ اور وہ دعوت اسلامی کے معاملے میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ سودا بازی کرنا چاہتے ہیں۔ یا وہ چاہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی بعض ایسی باتوں کو ترک کر دیں جن سے ان کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ایک طرف یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سودا بازی کرتے ہیں اور دوسری طرف اہل ایمان پر تشدد کرتے ہیں۔ ان کو ایذائیں دیتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور خود بھلائی' جنت اور نعیم مقیم سے منہ موڑتے ہیں۔ ان حالات میں اس سورت کا یہ آخری حصہ آتا ہے اور ان مسائل پر قرآن کے مخصوص انداز میں تبصرہ کیا جاتا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ﴿۲۳﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۲۵﴾

وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿۲۶﴾

"اے نبیؐ، ہم نے ہی تم پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے، لہٰذا تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو، اور ان میں سے کسی بدعمل یا منکر حق کی بات نہ مانو۔ اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کرو، رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو"۔

ان چار آیات میں دعوت اسلامی کے حوالے سے ایک عظیم حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو داعیان حق کی زندگی میں اچھی طرح رچ اور بس جائے اور وہ ایک طویل عرصہ تک اس حالت میں رہیں اور اس میں غوروفکر کریں اور اس کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کے حقیقی مفہوم، اس کی عملی شکل اور اس کے ایمانی اور نفسیاتی تقاضوں کو پورا کریں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا بنیادی نکتہ عقیدۂ توحید تھا اور آپ ایک عرصہ تک مشرکین مکہ کے سامنے اسے پیش کرتے رہے تھے۔ آپ عقیدۂ توحید کو محض ایک عقیدے کے طور پر ان کے سامنے نہ پیش کرتے تھے۔ اگر آپ صرف ایک عقیدے کا اظہار کرتے تو اس کا برداشت کرنا ان کے لیے آسان ہوتا، کیونکہ عقیدۂ شرک جس کے اوپر وہ لوگ جمے ہوئے تھے، وہ کوئی ٹھوس قوت اور ثبات والا عقیدہ نہ تھا کہ وہ اس کے ذریعہ عقیدۂ توحید کا مقابلہ کر سکتے، کیونکہ اسلامی کا عقیدۂ توحید نہایت قوی، سادہ اور ٹھوس عقیدہ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلامی دعوت اور اسلامی عقیدۂ توحید کے ساتھ کچھ حالات ایسے تھے جن کی وجہ سے یہ لوگ عناد اور دشمنی پر اتر آئے۔ اور وہ تاریخی کشمکش برپا ہوئی جس کا ذکر قرآن نے بھی جابجا کیا ہے۔ شرک کے عقیدے کی وجہ سے دراصل قریش کو ایک اجتماعی قیادت کا مقام حاصل تھا۔ اور اس عقیدے کے اردگرد اعلیٰ خداؤں کا جو تانا بانا بنا گیا تھا، اور پھر ان خداؤں کے ساتھ ان کے جو اجتماعی مفادات وابستہ ہوگئے تھے یہی وہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے قریش دعوت اسلامی کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ حالانکہ ان کا موقف بظاہر بالکل باطل تھا۔ اور اس باطل عقیدے کو یہ لوگ لے کر اسلام کے ظاہر، سادہ اور قوی عقیدے کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مزید یہ کہ جاہلی زندگی کی عیاشی، لذت کوشی اور شہوت رانی اور اباحیت ان کو مجبور کر رہی تھی کہ اس نئے عقیدہ اور نظام کا مقابلہ کیا جائے۔ کیونکہ اس نظام میں قانونی، اخلاقی پابندیاں ہیں اور اعلیٰ انسانی قدروں پر زور دیا گیا ہے اور جس میں فحاشی اور آزاد شہوت رانی پر پابندیاں تھیں، جبکہ وہ ایسی زندگی گزار رہے تھے جو اخلاقی بندھنوں سے آزاد تھی۔

یہ اسباب خواہ ان کا تعلق اجتماعی قیادت و سیادت سے ہو یا اقتدار اور مصالح سے ہو یا عادات، عرف عام، رسم و رواج اور موروثی تقالید سے ہو، یا جن کا تعلق اخلاقی حدود و قیود کی آزادی سے ہو۔ جو پہلی دعوت اسلامی کے مقابلے میں اس وقت کے لوگوں کو اٹھا لائے تھے۔ یہی اسباب آج بھی قائم ہیں اور آج بھی ہر ملک اور ہر سرزمین کی دعوت اسلامی کا مقابلہ انہی اسباب و وجوہات سے کیا جا رہا ہے۔ یہ نظریاتی دعوت کا مقابلہ انہی اسباب کی وجہ سے کیا جاتا ہے، جس کی وجہ دعوت اسلامی کا کام پر مشقت، مشکل اور دشوار ہوتا ہے۔

لہٰذا داعیان حق کو چاہئے کہ وہ اس حقیقت پر طویل وقت تک غوروفکر کریں اور ان حقائق میں زندہ رہیں جو ان

آیات میں بیان ہوئے ہیں' چاہے یہ داعیان جس زمان و مکان میں ہوں کیونکہ دعوت اسلامی خواہ جس زمان و مکان میں ہو' اسے انہی حالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش آئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کی جانب سے یہ پیغام ملا کہ آپ لوگوں کو برے انجام سے ڈرائیں اور آپ سے کہا گیا۔

یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ (۷٤ : ۱) قُمْ فَاَنْذِرْ (۷٤ : ۲) "اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے اٹھو اور ڈراؤ"۔

جب آپ نے دعوت کا آغاز کیا تو یہ اسباب آپ کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوگئے۔ قوم پوری کی پوری دعوت جدید کی راہ روکنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ جس حالت پر وہ قائم ہیں ان کو جوں کا توں رکھیں' باوجود اس کے کہ وہ جانتے تھے کہ ان کا عقیدہ کمزور اور ناقابل قیام ہے۔ پہلے ان کے اندر عناد کا جذبہ پیدا ہوا' پھر انہوں نے اپنے ان کمزور اور بودے عقائد کا دفاع شروع کر دیا۔ اور ان کی جو اجتماعی حالت تھی۔ زندگی کے جو رسم و رواج تھے' جو آزادی اور بے قیدی تھی اور جو عریانی اور فحاشی رائج تھی اس کے دفاع میں یہ لوگ دعوت اسلامی کی راہ روکنے لگے کیونکہ یہ جدید دعوت ان کے لیے خطرہ تھی۔

دعوت اسلامی کا مقابلہ یوں شروع ہوتا ہے کہ ابتدا میں دعوت پر چند سعید روحیں لبیک کہتی ہیں۔ ان کو اذیت دی جاتی ہے اور دھمکیوں اور اذیتوں کے ذریعہ اس کو اس دین سے پھیرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے بعد دعوت کے خلاف ایسا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں دعوت کی غلط تصویر بیٹھ جائے۔ مختلف قسم کے بے بنیاد الزامات عائد کیے جاتے ہیں تاکہ جو لوگ داخل ہو گئے ہوں وہ اگر باز نہیں آتے تو اور لوگ داخل نہ ہوں۔ کیونکہ جو لوگ دعوت اسلامی کو سمجھ چکے ہوتے ہیں ان کو دعوت سے روکنے اور واپس لانے کے مقابلے میں نئے لوگوں کو روکنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔

یہ وسائل اختیار کرنے کے بعد انہوں نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دھمکیوں اور تشدد کے علاوہ دوسرے تمام دباؤ بھی ڈالنا شروع کیے کہ آپ ان کے ساتھ کچھ لو اور کچھ دو کا طریقہ اختیار کر لیں۔ اور آپ ان کے عقائد' ان کے رسم و رواج اور بتوں کے خلاف باتیں بند کریں وہ بھی آپ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کریں گے۔ یہ سودا بازی بعینہ ایسی تھی جیسا کہ دنیاوی معاملات کے بارے میں لوگ مصالحت کے لیے درمیانی راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یہی وہ مراحل ہیں جو ہر اس شخص کو پیش آتے جو بھی زمان و مکان میں منہاج النبوۃ پر دعوت اسلامی کا کام کرتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اللہ کے رسول تھے۔ اللہ نے ان کو فتنوں اور دشمنوں سے بچالیا۔ لیکن آپ بہرحال انسان تھے اور آپ کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا جو قلیل گروہ تھا' وہ بھی تھوڑی سی تعداد پر مشتمل تھا۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ آپ بشر ہیں اور آپ کے ساتھی ضعیف ہیں اس لیے اللہ نے ان کو دشمنوں کے حوالے نہیں فرمایا اور ان کی مدد فرمائی۔ اور قدم قدم پر نشانات راہ بتلائے گئے .... چنانچہ ان آیات میں اسی امداد کا ذکر ہے اور اس رہنمائی کا ذکر ہے جو اس مشکل مرحلے میں کی گئی۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِیْلًا (۷٦ : ۲۳) "اے نبی' ہم نے تم ہی پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا"۔

یہ پہلا نکتہ توجہ طلب ہے' بتایا جاتا ہے کہ اس دعوت کا سرچشمہ اور ماخذ کیا ہے ۔ یہ دعوت اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کی طرف ہے ۔ اور اللہ ہی اس کا سرچشمہ ہے ۔ اسی نے قرآن نازل کیا ہے ۔ اللہ کے سوا اس کے اندر کسی اور کا کوئی دخل نہیں ہے اور نہ اللہ کی دعوت کی سوا کسی اور کی دعوت اس کے ساتھ مل سکتی ہے ۔ اس کی ہدایات صرف اللہ سے لی جاتی ہیں ۔ اس کی کوئی فکر کسی اور ذریعہ سے نہیں پیش جاتی ۔ اللہ ہی نے قرآن کریم نازل فرمایا ہے' اللہ ہی حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا ہے لہٰذا یہ دعوت اللہ کی ہدایت کے مطابق چل رہی ہے اور اس کے بتائے ہوئے نشانات پر جاری ہے ۔ کیونکہ اس دعوت کا ماخذ قرآن ہے جو نازل ہی اللہ نے کیا ہے ۔

لیکن باطل نہایت مغرور اور سرکش ہوتا ہے اور شر بظاہر پھولا ہوا نظر آتا ہے' اس لیے مومنین کو اذیت دی جاتی ہے ۔ ہر قسم کا شر اور فتنہ ان کی راہ میں ہے ۔ دعوت اسلامی کے دشمن صرف یہ کر سکتے ہیں کہ وہ لوگوں کو دعوت اسلامی کو قبول کرنے سے روکیں اور اس پر وہ اصرار کرتے رہیں ۔ اس پر مزید یہ کہ وہ اپنے عقائد' رسم و رواج اور فتنہ انگیزیوں پر جمے ہوتے ہیں ۔ شر و فساد اور فتنہ انگیزی کے اس دور میں یہ لوگ مصالحت اور میانہ روی کی پیش کش کرتے ہیں' معاملات کو نصف نصف تقسیم کرتے ہیں ۔ یہ ان مشکل حالات میں ایک پرکشش پیشکش ہے ۔ اور ایسے حالات میں اس قسم کی پیشکش کو رد کرنا کوئی آسان کام نہیں ۔ لیکن ایسے حالات میں ایک دوسری تنبیہ آتی ہے اور اس اہم معاملے کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے ۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ( ٧٦ : ٢٤ ) "لہٰذا تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو اور اس میں کسی اور بدعمل یا منکر حق کی بات نہ مانو"۔ کیونکہ تمہارے اور ان کے درمیان کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی ۔ نہ تمہارے درمیان کوئی پل ہے' جس کے اوپر سے خیالات' نظریات ادھر ادھر جا سکیں ۔ کیونکہ تمہارے منہاج اور جاہلیت کے منہاج کے درمیان وسیع خلا ہے ۔ اس کائنات کے بارے میں تمہارا تصور ان کے تصورات سے جدا ہے ۔ تم حق پر ہو اور وہ کفر پر ہیں ۔ تم ایمان پر ہو اور وہ باطل پر ہیں ۔ تم نور پر ہو اور وہ اندھیرے میں ہیں ۔ تم علم و معرفت پر ہو اور وہ جاہلیت پر ہیں ۔

پھر معاملات تمام اللہ کے احکام کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں ۔ اللہ کا حکم اور نظام یہ ہے کہ وہ باطل کو بھی موقعہ اور مہلت دیتا ہے ۔ شر کو بھی موقعہ دیتا ہے اور بعض اوقات اہل ایمان کو دیر تک آزمائشوں میں ڈال کر ان کو پاک اور خالص کرتا ہے ۔ یہ تمام احکام اللہ کی حکمت کے مطابق صادر ہوتے ہیں' اللہ کی تقدیر اور حکمت دنیا کو چلاتی ہے ۔ لہٰذا ۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ ( ٧٦ : ٢٤ ) "رب کے حکم پر صبر کرو"۔ اس وقت تک جب وقت آ جائے ۔ اذیت پر بھی صبر کرو' مشکلات پر بھی صبر کرو' باطل اگر غالب ہو تو بھی صبر کرو ۔ شہ رگ پھولی ہوئی ہو تو صبر کرو' آپ حق کے حامل ہیں ۔ اور قرآن آپ کے پاس ہے جو حق پر مشتمل ہے اس لیے آپ حق پر جم جائیں' صبر کریں اور ان کی پیش کشوں کو نظر انداز کر دیں ۔ یہ لوگ کچھ دو اور کچھ لو کی پالیسی کے مطابق فیصلہ چاہتے ہیں ۔ کچھ اپنی باتیں منوانا چاہتے ہیں ۔

وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ( ٧٦ : ٢٤ ) "اور ان میں کسی بدعمل یا منکر حق کی بات نہ مانو"۔ کیونکہ یہ لوگ آپ کو اللہ کی عبادت' اللہ کی اطاعت اور حق پر چلنے نہیں دینا چاہتے ۔ کیونکہ یہ لوگ بدکردار اور کفار ہیں ۔ یہ

چاہتے ہیں کہ آپ بھی کسی قدر کفر اور شرک کا ارتکاب کریں تاکہ معاملے کا فیصلہ نصف نصف پر ہو جائے۔کچھ اچھی باتیں وہ مانیں 'کچھ بری باتیں آپ مان لیں۔اس طرح وہ آپ کو دھوکہ دے کر راضی کرنا چاہتے ہیں۔آپ کی جسمانی خواہشات پوری کرتے ہیں۔چنانچہ وہ آپ کو سربراہی کا منصب پیش کرتے ہیں۔اور آپ کو دولت کی پیشکش بھی کرتے ہیں۔

عتبہ ابن ربیعہ آپؐ سے کہتا ہے "اس کام کو چھوڑ دیجئے' میں اپنی بیٹی آپ کے نکاح میں دیتا ہوں۔میری بیٹیاں قریش خوبصورت ترین لڑکیاں ہیں"۔غرض ہر دور اور ہر زمان و مکان میں داعیان حق کو انہی ذرائع سے ورغلایا گیا ہے۔

صبر کریں اگرچہ طویل عرصہ تک آپ کو جدوجہد کرنی پڑے۔اگرچہ قریش کا تشدد سخت ہو جائے اور راستہ طویل ہو ے لیکن صبر تو بہت ہی مشکل کام ہے۔اور اس کے لیے سخت تیاری اور ریاضت کی ضرورت ہے اور وہ تیاری یہ ہے۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا(۲۵) وَ مِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَه وَ سَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا(۲۶)(۲۵:۷۶ – ۲۶) "اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کرو' رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو"۔یہ ہے زاد راہ۔صبح و شام اللہ کا نام لینا اور طویل راتوں میں اللہ کی پاکی بیان کرنا' اس سرچشمے سے رابطہ بحال رکھنا جہاں سے قرآن کریم کا نزول ہو رہا ہے۔جہاں سے دعوت اسلامی اور تحریک اسلامی برپا کرنے کا حکم صادر ہوا ہے۔یہی سرچشمہ قوت کا بھی سرچشمہ ہے۔یہی اس راہ کے سازوسامان کا بھی ماخذ ہے۔اور اس کے ساتھ رابطے کا طریقہ ذکر و فکر 'تسبیح و تہلیل اور دعاء و عبادت ہے۔خصوصاً طویل راتوں کے اوقات میں۔اس لیے کہ یہ راہ طویل ہے۔اور یہ بوجھ بھاری ہے۔لہٰذا اس راہ کے لیے بہت ہی بڑی مقدار میں زاد راہ کی ضرورت ہے۔اور طویل راتوں کی تنہائیوں میں صرف بندے اور رب کی ملاقات تنہائی میں رہتی ہے۔نہایت پرامیدی اور محبت کی فضا میں۔اس ملاقات سے تمام تھکاوٹیں اور تمام الجھنیں حل ہو جاتی ہیں۔اور ضعیفی اور قلت وسائل کی کمی دور ہو جاتی ہے۔اور تمام تھکاوٹیں ختم ہو جاتی ہیں۔اور انسان دیکھ لیتا ہے کہ جس مقصد کے لیے وہ کام کر رہا ہے وہ ایک عظیم مقصد ہے اور پھر اس کے مقابلے میں جدوجہد اور قربانیاں اور راہ کی مشکلات اور قربانیاں بہت کم نظر آتی ہیں۔

اللہ رحیم و کریم ہے' اس نے اپنے بندوں کو دعوت کا ذمہ دار بنایا' اس پر قرآن نازل فرمایا' انہیں بتایا گیا کہ ان ذمہ داریوں کا بوجھ کیا ہے' اور راہ کی مشکلات کیا ہیں۔لہٰذا اللہ نے اپنے نبی کو بے سہارا نہیں چھوڑا۔اس کی نصرت فرمائی اور یہ تربیت اور راہ کی ان مشکلات کے مقابلے کے لیے تیاری کروانا بھی دراصل اللہ کی مدد اور نصرت ہے۔اصحاب دعوت اور نیائے اسلام کے لیے کام کرنے والوں کا یہی زاد راہ ہے۔ہر دور میں اور ہر جگہ..... یہ دعوت ایک ہے۔اس کا طریق کار ں ایک ہے اور حالات اور واقعات بھی ایک ہیں۔اہل باطل نے ہمیشہ اس کے خلاف ایک ہی راستہ اختیار کیا ہے۔جو وسائل ﷺ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برخلاف باطل نے اختیار کیے وہی ہر باطل ہر حق کے خلاف استعمال کرتا ہے۔ہمیشہ باطل ایک قسم کے اسباب و وسائل لے کر حق کے مقابلے میں آتا ہے۔لہٰذا حق کے اسباب اور وسائل بھی وہی ہونے چاہئیں۔جو نے اختیار کیے ہیں۔

وہ حقائق کیا ہیں جن کے اندر داعیان حق کو رہنا چاہئے؟ یہ وہی ہیں جو داعی اول نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سکھائے ۔۔سب سے پہلی بات یہ ہے کہ یہ دعوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور یہ کام اللہ کا ہے۔' دوسری بات یہ کہ یہ حق جو

اللہ کی طرف سے آیا ہے۔اس کے ساتھ باطل کا آمیزہ نہیں ہو سکتا۔ نہ اہل حق اور اہل باطل کے درمیان باہم تعاون ہو سکتا ہے۔یا یہ لو اور کچھ دو پر سودا بازی ہو سکتی ہے۔اس لیے کہ دونوں کے منہاج باہم مختلف ہیں' دونوں کے راستے جدا ہیں۔اگر کسی وقت باطل اپنی قوت اور دبدبے کی وجہ سے غالب ہوتا ہے تو اس میں بھی اللہ کی رضا اور حکمت ہوتی ہے۔ایسے حالات میں اہل ایمان کے لیے صبر ضروری ہوتا ہے اور اس میں اللہ کی حکمت ہوتی ہے۔اور اہل حق کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ صبر' نماز اور تسبیح اور تہلیل اور ذکر و فکر کے ذریعہ مشکلات پر قابو پائیں۔...... یہ ہے وہ عظیم حقیقت جس کا ادراک ان تمام لوگوں کو اچھی طرح کر لینا چاہئے جو دعوت دین لے کر اٹھتے ہیں۔

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کے منہاج اور طریق کار کے درمیان جو جاہلیت کا منہاج ہے۔اور اسلامی منہاج اور طریق کار کے درمیان جو خدائی منہاج ہے۔مکمل جدائی اور فرق ہے۔یہ لوگ اپنا بھلا نہیں چاہتے' ان کے اغراض و مقاصد نہایت گرے پڑے ہیں اور ان کی سوچ بہت ہی چھوٹی ہے۔کیا فرق ہے دونوں میں؟

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا ﴿٢٧﴾

"یہ لوگ تو جلدی حاصل کرنے والی چیز (دنیا) سے محبت رکھتے ہیں اور آگے جو بھاری دن آنے والا ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں"۔یہ لوگ جن کی امیدیں نہایت ہی قریبی ہیں' جو نہایت ہی چھوٹی چیزوں کو بڑی اور اہم سمجھتے ہیں' جن کی سوچ اور جن کے مطالبے بہت ہی چھوٹے ہیں۔یہ چھوٹے لوگ ہیں اور یہ اس دنیا ہی میں گم ہیں' دنیا کے شب و روز ہی ان کے لیے اہم ہیں۔اور وہ عظیم اور ثقیل دن اور بھاری ذمہ داریوں کا دن ان کی نظروں سے اوجھل ہے۔حالانکہ وہ بہت ہی بھاری دن ہو گا۔یہ ایسے لوگ ہیں جن کی اطاعت کسی چیز میں نہیں کی جا سکتی۔جن کا اتباع کسی راہ پر نہیں کیا جا سکتا۔یہ مومنین کے ساتھ کسی دوراہے پر ملتے ہی نہیں'کسی نکتے پر ہم مقصد نہیں۔ان کی نظریں دنیا پر ہیں' دنیا کے اقتدار اور مال و اسباب پر ہیں' جو نہایت ہی حقیر و قلیل قدر و قیمت کی حامل ہیں۔

بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ اصل چیز سے غافل ہیں۔یہ لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز کو حاصل کرتے ہیں اور وہ بھاری نتائج کا دن جب یہ زنجیروں اور طوق و سلاسل میں جکڑے ہوں گے اور سخت حساب و کتاب ہو گا۔اسے یہ بھولے ہوئے ہیں۔

اس آیت میں روئے سخن تو نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کی طرف ہے کہ یہ لوگ ایسے ہیں اور ان کے ساتھ سلوک ایسا ہونا چاہئے لیکن بالواسطہ یہ ان لوگوں کو ایک قسم کی دھمکی ہے جو دنیا پرست ہیں اور دنیا کے اہتمامات میں لگے ہوئے ہیں۔اور ایسے دنیا پرست لوگ در حقیقت اسلامی تحریک کے کام کے نہیں۔

اب یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ ہی نے ان کو یہ حالات دیئے ہیں' یہ قوت' یہ مقام' یہ شوکت' ان کو اللہ ہی نے دی ہے۔اور اللہ اس پر قادر ہے کہ ان لوگوں کو ضعیف و ناتواں بنا دے اور ان سے ان کی یہ حالت چھین لے لیکن اللہ کے کام گہری حکمت پر مبنی ہوتے ہیں اور وہ اس دنیا کو ایک طویل عرصے سے اپنی حکمتوں کے مطابق چلاتا آرہا ہے۔

نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ ۖ وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا ﴿٢٨﴾

''ہم نے ہی ان کو پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے ہیں' اور ہم جب چاہیں ان کو بدل کر رکھ دیں''۔
یہ ذرا ان لوگوں کو تنبیہ اور تذکیر ہے جو اپنی قوتوں پر مغرور ہیں کہ تمہاری قوت بلکہ تمہارے وجود کا سرچشمہ بھی در حقیقت ہم ہیں۔ اور اس کے بعد مومنین کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ اگرچہ تم قلیل و ضعیف ہو لیکن تم جس ذات کی دعوت لے کر اٹھے ہو وہ نہایت ہی قوت والی ذات ہے۔ اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ تمام واقعات اللہ کی قدرت سے وجود میں آتے ہیں اور ان کی پشت پر اللہ کی قدرت کارفرما ہوتی ہے۔ اور تمام امور اس کی حکمت کے مطابق سرانجام پاتے ہیں اور وہ احکم الحاکمین ہے۔

وَ اِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا (٧٦ : ٢٨) ''اور جب ہم چاہیں ان کو بدل کر رکھ دیں''۔ اللہ کے مقابلے میں یہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اللہ نے ہی ان کو پیدا کیا ہے۔ یہ قوت اللہ ہی نے ان کو دی ہے۔ وہ اس بات پر قادر ہے کہ ان کے مقابلے میں ایک دوسری قوم اٹھا دے جو ان کی جگہ لے لے۔ اللہ نے جو ابھی تک ان کو مہلت دی ہے اور ان کی جگہ دوسری قوت نہیں اٹھائی تو یہ اللہ کا فضل و کرم ہے اور اس کا فیصلہ اور حکمت ہے۔
اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اور آپ ؐ کے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ اہل ایمان کے موقف اور دوسروں کے موقف کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو اس دنیا کے معاملات میں غرق ہیں' جو اپنی قوت پر مغرور ہیں کہ وہ اللہ کی نعمتوں کی قدر کریں' یہ نہ کریں کہ شکر ادا کرنے کی بجائے وہ اللہ کی نعمتوں کو ذریعہ غرور بنائیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ نعمتیں اور یہ مہلت دراصل آزمائش ہے۔ جس طرح سورت کے آغاز میں تصریح کی گئی تھی۔
اس کے بعد ان کو اس بات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ تم کو جو مہلت دی گئی ہے اس کی ایک ایک گھڑی تمہارے لیے بہت قیمتی ہے' قرآن کریم اللہ کی رحمت ہے۔ یہ مسلسل نازل ہو رہا ہے اور یہ سورت بھی ایک تذکرہ ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿٢٩﴾

''یہ ایک نصیحت ہے' اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے''۔
اور اس کی بعد یہ تصریح بھی کر دی جاتی ہے کہ اللہ کی مشیت بے قید ہے۔ اور ہر چیز اللہ کی مشیت کے مطابق ظہور پذیر ہوتی ہے۔ تاکہ لوگوں کی آخری توجہ اللہ کی طرف ہو۔ اور آخر کار سب لوگ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ انسان اپنی قوت پر مغرور ہونے کی بجائے اللہ کی قوت پر بھروسہ کرے۔ اور یہ عقیدہ رکھے کہ حقیقی قوت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے یعنی پوری طرح اللہ کے آگے جھک جائے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿٣٠﴾

''اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ نہ چاہے' یقیناً اللہ بڑا علیم و حکیم ہے''۔
یہ اس لیے تاکہ انسانوں کے دل یہ جان لیں کہ فاعل مختار دراصل اللہ ہے۔ وہی متصرف اور زبردستی کنٹرول کرنے

والا ہے تاکہ سب دل اللہ ہی کی طرف متوجہ ہوں اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ یہ ہے وہ حقیقت جو ان آیات میں بیان کی گئی ہے کہ اصل فاعل مختار اللہ ہے لیکن اللہ نے انسان کو یہ طاقت دی ہے کہ وہ حق و باطل کو سمجھ سکے اور اللہ کی مشیت کے مطابق سچائی یا باطل کی طرف اپنا رخ کر سکے۔ اس کے لیے اللہ نے انسان کو علم و معرفت بھی عطا کیا۔ اور رسول بھیج کر انسانوں کو حق و باطل کا راستہ بھی اچھی طرح سمجھایا۔ اور قرآن اور دوسری کتابیں اتار کر راستے کی نشاندہی بھی کر دی۔ لیکن یہ سب امور اللہ کی قدرت اور مشیت کے دائرے کے اندر ہوتے ہیں۔ پس جو شخص اللہ کی طرف اپنا رخ کرتا ہے۔ اللہ اسے راہ راست کی طرف آنے کی توفیق دیتا ہے۔ جب وہ اپنا رخ اللہ کی طرف نہ کرے اور اللہ کے سامنے دست بدعا نہ ہو تو وہ ہدایت و فلاح سے محروم ہو جاتا ہے اور ایسے شخص کو توفیق نہیں ہوتی۔

۲
یُّدۡخِلُ مَنۡ یَّشَآءُ فِیۡ رَحۡمَتِہٖ ؕ وَ الظّٰلِمِیۡنَ اَعَدَّ لَہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ﴿۳۱﴾ ع ۹

۲۰ "اپنی رحمت میں جس کو چاہتا ہے داخل کرتا ہے' اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

غرض اللہ کی مشیت بے قید ہے' جس طرح چاہے فیصلہ کر دے۔ اگر اللہ چاہے تو کسی کو بھی اپنی رحمت میں داخل کر دے۔ انسانوں میں سے ہو' جو بھی اس کی رحمت میں داخل ہونے کی التجا کرے۔ اس کی اطاعت پر اللہ کی مدد طلب کریں۔ ہدایت کی توفیق کے طلبگار ہوں جبکہ ظالموں کے لیے اس نے عذاب تیار کر رکھا ہے' جو بہت دردناک ہے اور اللہ نے ان کو اس جہاں میں مہلت دے رکھی ہے تاکہ وہ عذاب الیم تک جا پہنچیں۔

سورت کا یہ خاتمہ اس کے آغاز سے ہم آہنگ ہے۔ اس میں آزمائش کا آخری انجام بتلایا گیا ہے۔ جس کے لیے اللہ نے انسان کو نطفہ امشاج (مخلوط نطفے) سے پیدا کیا ہے جس کے لیے اللہ نے انسان کو سمع و بصر عطا کیا۔ اور جنت اور دوزخ کا راستہ بتلایا ہے۔

--- ooo ---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۲۹

## سورۃ المرسلٰت ۔ ۷۷

## ۱--تا--۵۰

# سورۃ المرسلٰت ایک نظر میں

اس سورت کے خدوخال تیز' اس کے مناظر شدید اور اس کے اثرات گہرے ہیں ۔ یوں نظر آتا ہے کہ گویا تیز اور کاٹنے والے کوڑے ہیں' جو آگ برسا رہے ہیں ۔ گویا ایک انسان اور اس کا قلب ایک عدالت میں کھڑے ہیں اور ان کا مقدمہ زیر سماعت ہے ۔ سوالات پر سوالات ہو رہے ہیں ۔ دھمکی آمیز سوالات اور تیر کی طرح تیز اور چبھتی ہوئی دھمکیاں آرہی ہیں ۔

اس سورت میں دنیا و آخرت کے مناظر پیش کیے گئے ہیں ۔ کائنات اور نفس انسانی کے حقائق بیان کیے گئے ہیں ۔ خوفناک عذاب الٰہی کے مشاہد ہیں اور ہر منظر اور مشہد کے بعد ایک چبھتا ہوا تیر مجرمین کے دلوں پر آکر گرتا ہے ۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۷۷ : ۱۵) "تباہی ہے' اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔ یہ چبھتا ہوا فقرہ دس مرتبہ دہرایا جاتا ہے جو ان مجرموں کے دلوں پر چرکے لگاتا جاتا ہے ۔ یہ فقرہ اس سورت کے تیز خدوخال اور شدید مناظر اور گہرے اثرات کے ساتھ زیادہ مناسب ہے ۔

یہ ویسا ہی مکرر فقرہ ہے اور بار بار کی ضرب ہے جیسا کہ سورہ رحمٰن میں ایک ایک نعمت کے گننے کے بعد یاد دہانی کا مکرر سوالیہ فقرہ دہرایا گیا تھا ۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ "اے جن و انس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"۔ اسی طرح ایک لازمی نتیجہ سورۂ قمر میں ہر واقعہ عذاب کے بعد لایا جاتا رہا ۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ "پس کیسا رہا میرا عذاب اور میری تنبیہہ"۔ یہاں اس فقرے کا بار بار دہرانا سورت کو ایک خاص ذائقہ اور تیز و طرار خصوصیات عطا کرتا ہے ۔

سورت کے مقطع اور فقلے چھوٹے چھوٹے ہیں اور پے درپے آرہے ہیں ۔ سرعت اور سختی کے ساتھ' قوافی میں تعدد ہے' ہر مقطع الگ قافیہ رکھتا ہے' بعض قافیے دہرائے بھی جاتے ہیں ۔ پردۂ احساس پر ان فواصل' قوافی اور مقطعوں کا ایک خاص اثر ہوتا ہے ۔ انداز کلام سخت ہے ۔ ایک ایک ضرب کے بعد گویا نئی ضرب لگائی جاتی ہے ۔ بلکہ یہ پوری سورت ہی عقل و خرد کے پردے پر مسلسل ضربات پر مشتمل ہے ۔ اور ہر ضرب شدید سے شدید تر ہے ۔

سورت کا آغاز ہی طوفانی فضا سے ہوتا ہے' شدید ہواؤں کا ذکر ہے' یا تیز رفتار فرشتوں کا ذکر ہے جو دوڑے پھرتے ہیں "قسم ہے ان ہواؤں کی جو پے درپے بھیجی جاتی ہیں' پھر طوفانی رفتار سے چلتی ہیں اور بادلوں کو اٹھا کر پھیلاتی ہیں' پھر ان کو پھاڑ کر جدا کرتی ہیں' پھر دلوں میں خدا کی یاد ڈالتی ہیں' عذر کے طور پر یا ڈراوے کے طور پر"۔ یہ ہے اس سورت کا آغاز جو اس کی فضا اور اس کے انداز کے عین مطابق ہے ۔

قرآن کریم کا یہ خاص انداز ہے کہ وہ سورت کے مضامین اور مناظر کے لیے ایک مخصوص ملائم فضا تیار کرتا ہے ۔ یہ

سورت بھی اسی قسم کے مضامین ' مناظر اور مخصوص فضا کی ایک مثال ہے ۔ مثلاً اس کے علاوہ ذرا سورہ الضحیٰ کو پڑھئے ۔ مضمون یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر رب کی مہربانیوں کا ذکر کیا جائے ۔ اس لیے صبح اور شام کا ذکر ہوا اور رات کے چھانے کا ذکر 'جس کے اندر انسان پناہ لیتا ہے اور آرام کرتا ہے ۔ حفاظت 'مہربانیوں اور رعایتوں کے لیے یہ مناظر مناسب تھے ۔ سورہ عادیات کا مضمون تھا لوگوں کو قبروں سے اٹھانا' جبکہ وہ مرمٹ کر مٹی اور غبار ہوں گے ۔ تو وہاں ایسے تیز رفتار گھوڑوں کا ذکر کیا گیا جو پھنکارتے ہوئے گردو غبار اڑاتے ہیں ۔ مناظر کے پس منظر کے اندر ہم آہنگی کی مثالیں قرآن کریم میں بے شمار ہیں ۔ (دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن)

اس آغاز کے بعد سورت کے دس مقطعوں میں سے ہر مقطع گویا ایک مشاہداتی سفر ہے ۔ ہر مقطعہ اس وسیع و عریض کائنات میں ایک سفر پر مشتمل ہے 'جس سے مسافر کو گہرا شعور' بلند خیالات اور پاکیزہ تاثرات حاصل ہوتے ہیں اور یہ اس کی زندگی کو تبدیل کرتے چلے جاتے ہیں ۔ یہ مشاہداتی اور تصوراتی بحران ان کلمات سے زیادہ وسیع ہے ۔ ہر مقطع کے چند الفاظ گویا نشانات راہ ہیں ۔ جگہ جگہ تیر کے نشان کی طرح ہیں جو ایک وسیع وادی کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ یہ دس مقطعے گویا دس جہانوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں ۔ اور ہر جہاں اور ہر میدان دوسرے سے مختلف اور وسیع تر ہے ۔

پہلا سفر وقوع قیامت کے مناظر پر مشتمل ہے ۔ اس میں وہ عظیم کائناتی انقلابات دکھائے گئے ہیں جو اس وقت وقوع پذیر ہوں گے نہ یہ آسمان رہے گا اور نہ یہ زمین اور اللہ کے نمائندے بندوں کے حسابات کے دفاتر اور فائلیں لے کر حاضر ہوں گے ۔

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ (۸) وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ (۹) وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ (۱۰) وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ (۱۱) لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ (۱۲) لِیَوْمِ الْفَصْلِ (۱۳) وَمَآ اَدْرٰكَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ (۱٤) وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ (۱۵) (۷۷: ۸ تا ۱۵) "پھر جب ستارے ماند پڑ جائیں گے' اور آسمان پھاڑ دیا جائے گا' اور پہاڑ دھنک ڈالے جائیں گے' اور رسولوں کی حاضری کا وقت آ پہنچے گا (اس روز وہ چیز واقع ہو جائے گی) کس روز کے لیے یہ کام اٹھا رکھا گیا ہے؟ فیصلے کے روز کے لیے ۔ اور تمہیں کیا خبر کہ وہ فیصلے کا دن کیا ہے؟ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔

دوسرا مطالعاتی سفر امم سابقہ کے بارے میں ہے ۔ یعنی ان اقوام کے بارے میں جو اللہ کے نبیوں کو جھٹلاتے ہیں ۔

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِیْنَ (۱٦) ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِیْنَ (۱۷) كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ (۱۸) وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ (۱۹) (۷۷: ۱٦ تا ۱۹) "کیا ہم نے اگلوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر انہی کے پیچھے ہم بعد والوں کو چلتا کریں گے ۔ مجرموں کے ساتھ ہم یہی کچھ کیا کرتے ہیں ۔ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔

تیسرا مطالعاتی سفر وادی تخلیق انسان میں ہے ۔ انسان کی تخلیق کا نظام ایک وسیع ترجہاں ہے ۔

اَلَمْ نَخْلُقْكُّم مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ (٢٠) فَجَعَلْنٰهُ فِیْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ (٢١) اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (٢٢) فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ (٢٣) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (٢٤) (٧٧: ٢٠ تا ٢٤) "کیا ہم نے ایک حقیر پانی سے تمہیں پیدا نہیں کیا اور ایک مقررہ مدت تک اسے ایک محفوظ جگہ ٹھیرائے رکھا؟ تو دیکھو، ہم اس پر قادر تھے، پس ہم بہت اچھی قدرت رکھنے والے ہیں۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔

اور چوتھا سفر اس زمین کا ہے جو اپنے زندہ اور مردہ بچوں کو اپنے سینے کے ساتھ جوڑے رکھتی ہے۔ اس زمین میں ان کا سامان حیات و ممات تیار رکھا ہے۔ اور اللہ نے اسے ایسا بنایا ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا (٢٥) اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا (٢٦) وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا (٢٧) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (٢٨) (٧٧: ٢٥ تا ٢٨) "کیا ہم نے زمین کو سمیٹ کر رکھنے والی نہیں بنایا، زندوں کے لیے بھی اور مردوں کے لیے بھی اور اس میں بلند و بالا پہاڑ جمائے اور تمہیں میٹھا پانی پلایا؟ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔

پانچواں سفر ان لوگوں کی دنیا کا ہے جو آواز حق کو جھٹلانے والے ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے فیصلے کے دن ان کے حالات کیا ہوں گے، کس قدر سرزنش ہوگی اور کس قدر سخت عذاب ہوگا۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (٢٩) اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ (٣٠) لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِیْ مِنَ اللَّهَبِ (٣١) اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ (٣٢) كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ (٣٣) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (٣٤) (٧٧: ٢٩ تا ٣٤) "چلو اب اسی چیز کی طرف جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ چلو اس سائے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے۔ نہ ٹھنڈک پہنچانے والا اور نہ آگ کی لپٹ سے بچانے والا۔ وہ آگ محل جیسی بڑی بڑی چنگاریاں پھینکے گی (جو اچھلتی ہوئی یوں محسوس ہوں گی) گویا کہ وہ زرد اونٹ ہیں۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔

چھٹا اور ساتواں سفر بھی انہی مکذبین کے ساتھ ہے۔ مزید سرزنش اور تذلیل ہے ان لوگوں کی۔

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ (٣٥) وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ (٣٦) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (٣٧) هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ (٣٨) فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ (٣٩) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (٤٠) (٧٧: ٣٥ تا ٤٠) "یہ وہ دن ہے جس میں وہ نہ کچھ بولیں گے اور نہ انہیں موقع دیا جائے گا کہ کوئی عذر پیش کریں۔ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے

لیے ۔ یہ فیصلے کا دن ہے ۔ ہم نے تمہیں اور تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو جمع کر دیا ہے ۔ اب اگر کوئی چال تم چل سکتے ہو تو میرے مقابلہ میں چل دیکھو ۔ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔

اور آٹھواں سفر متقین کے ساتھ ۔ یہ دکھایا گیا ہے کہ ان کے لیے کیا کیا انعامات ہیں ۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّ عُيُوْنٍ (٤١) وَّ فَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ (٤٢) كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (٤٣) اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (٤٤) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (٤٥) (٧٧ : ٤١ تا ٤٥) "متقی لوگ آج سایوں اور چشموں میں ہیں اور جو پھل وہ چاہیں (ان کے لیے حاضر ہیں) کھاؤ اور پیو مزے سے اپنے ان اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو ۔ ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں ۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔

نواں سفر بھی مکذبین کے ساتھ ایک جھلک ہے ۔ سخت سرزنش کرتے ہوئے ۔

كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ (٤٦) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (٧٧ : ٤٧)

"کھا لو اور مزے کر لو تھوڑے دن ۔ حقیقت میں تم لوگ مجرم ہو ۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔

اور دسواں سفر بھی مکذبین کے موقف کے بارے میں ہے کہ یہ لوگ کس طرح ہٹ دھرمی کر رہے ہیں ۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ (٤٧) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (٧٧ : ٤٩)

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (اللہ کے آگے) جھکو تو نہیں جھکتے تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔۔۔ ان سفروں' ان مناظر' ان موثرات و اشارات کے بعد یہ خاتمہ کلام ۔

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ (٧٧ : ٥٠) (اب اس قرآن کے بعد کون سا کلام ایسا ہو سکتا ہے جس پر یہ ایمان لائیں گے"۔

غرض قاری کا فکر و ذکر اس تیز رفتار سورت کے ساتھ' اس کے مشاہد و مناظر میں بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے ۔ رہے سورت کے موضوعات کلام تو وہ وہی ہیں جو قرآن کی دوسری سورتوں میں ہیں' خصوصاً مکی سورتوں میں ۔ لیکن وہی حقائق اس سورت میں بالکل ایک نئے زاویہ سے بیان کیے گئے ہیں ۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ وہی موضوع اور مضمون ہر بار نئے ذوق و شوق' نئے منظر و پس منظر کے ساتھ' نئی فکری اور نفسیاتی زاویوں کے ساتھ بیان ہوتا ہے ۔ ہر موقعہ و محل کی ضرورت کے مطابق ۔ چنانچہ وہی بات ہر بار جدید نظر آتی ہے اور اس کے اندر جدید نفسیاتی اشارات و دلائل ہوتے ہیں جو نفس انسانی کا حصہ بن جاتے ہیں ۔ اور انسان ہر بار ایک نئے انداز سے لبیک کہتا ہے ۔

اس سورت میں جہنم کے مناظر بھی جدید ہیں اور مکذبین کے سامنے یہ مناظر نئے انداز سے پیش کیے جاتے ہیں ۔ یوں نظر آتا ہے کہ مضمون کا انداز بیان اور مخاطبین سب نئے ہیں ۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے ہر سورت ایک نئی شخصیت بن کر سامنے آتی ہے ۔ جس کے اپنے فیچر اور خدوخال ہوتے ہیں اور وہ گہرے اثرات کی حامل ہوتی ہے ۔

# درس نمبر ۲۷۷ تشریح آیات

## ۱-- تا -- ۵۰

سُورَةُ الْمُرْسَلٰتِ مَكِّيَّةٌ (۷۷) (۳۳) اٰيَاتُهَا ۵۰ رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۝۱ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۝۲ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۝۳ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۝۴ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۝۵ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۝۶ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝۷

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"قسم ہے ان ہواؤں کی جو پے درپے بھیجی جاتی ہیں' پھر طوفانی رفتار سے چلتی ہیں اور بادلوں کو اٹھاکر پھیلاتی ہیں' پھر ان کو پھاڑکر جدا کرتی ہیں' پھر دلوں میں خدا کی یاد ڈالتی ہیں' عذر کے طور پر یا ڈراوے کے طور پر' جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے وہ ضرور واقع ہونے والی ہے"۔

مسئلہ دراصل وقوع قیامت کا ہے۔ مشرکین مکہ کے لیے اس کا سمجھنا مشکل ہو رہا تھا کہ آیا یہ کس طرح واقع ہوگی۔ قرآن کریم نے اس مسئلہ کو مختلف اسالیب میں' مختلف دلائل و شواہد کے ساتھ بیان فرمایا۔ یہ مسئلہ ان لوگوں کے ذہن میں بٹھانا بہت ہی ضروری تھا' اس لیے کہ اس کے سوا اسلامی نظریہ حیات ان کے ذہن میں بیٹھ ہی نہ سکتا تھا۔ اور نہ ان کی زندگی کی قدریں صحیح طرح متعین ہو سکتی تھیں۔ اور نہ زندگی کے اصول اور فروغ وضع ہو سکتے تھے۔ تمام آسمانی کتب اور عقائد میں وقوع قیامت کا عقیدہ پہلا زینہ رہا ہے۔ دراصل انسانی زندگی کی اصلاح اور صحیح تعمیر اس کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ انسان کی زندگی اور اس کے اعمال کا دارومدار اسی عقیدے پر ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو صرف اس عقیدے کے ذریعہ ہی درست کیا جا سکتا ہے۔ اور انسان کے لیے صحیح اعلیٰ قدریں قیامت کی جوابدہی کے تصور ہی سے کی جا سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس عقیدے کو عربوں کے ذہن میں بٹھانے کے لیے اس قدر طویل جدوجہد کی تاکہ وہ اس پر اچھی طرح یقین پیدا کرلیں۔

سورت کے آغاز میں اللہ قسم اٹھاتا ہے کہ آخرت کا وعدہ پورا ہونے والا ہے۔ اور قسم کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن امور پر اللہ نے قسم اٹھائی ہے وہ بھی غیبی حقائق ہیں۔ ایسی قوتیں جو پوشیدہ ہیں اور اس کائنات کے نظام میں وہ

بہت ہی موثر ہیں جس طرح انسانی زندگی کے اندر بھی موثر ہیں۔ سلف صالحین نے ان کے مفہوم کے تعین میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ ان تمام الفاظ سے مراد ہوائیں ہیں' بعض نے کہا کہ ان سے مراد ملائکہ ہیں۔ بعض نے کہا کہ بعض الفاظ سے مراد ہوائیں ہیں اور بعض سے مراد ملائکہ ہیں۔ ان تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مفہوم اور مدلول بہرحال مجمل اور پوشیدہ ہے۔ اور یہ اجمال 'غموض اور عدم وضاحت اس حقیقت کے زیادہ مناسب ہے۔ جس پر قسم اٹھائی جارہی ہے کیونکہ وہ بھی غیبی حقیقت ہے اور جس طرح وہ چیزیں جن کی قسم اٹھائی جارہی ہے' خواہ فرشتے ہوں یا ہوائیں ہوں' انسانی زندگی میں موثر ہیں۔ اسی طرح قیامت بھی انسانی زندگی میں موثر ہوگی۔

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا (۷۷ : ۱) "قسم ہے ان کی جو پے درپے بھیجی جاتے ہیں"۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ ان سے مراد ملائکہ ہیں۔ مسروق' ابوالضحیٰ' مجاہد سے ایک روایت کے مطابق 'سدی' ربیع ابن انس ابو صالح (ایک روایت کے مطابق) سے بھی ایسی ہی روایت ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ قسم ہے ان فرشتوں کی جن کو احکامات الٰہیہ کے ساتھ پے درپے بھیجا جاتا ہے۔ جس طرح گھوڑے کی گردن کے بال (ایال) لمبے اور مسلسل ہوتے ہیں۔ لیک لائن میں اسی طرح یہ فرشتے پے درپے آتے ہیں۔ یہی بات انہوں نے عاصفات' ناشرات' فارقات اور ملقیات کے بارے میں کہی ہے کہ ان سے مراد فرشتے ہیں۔

اور حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ المرسلات عرفا سے مراد ہوائیں ہیں' اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ وہ مسلسل اور پے درپے چلتی ہیں جس طرح گھوڑے کے ایال چلتے ہیں۔ یہی رائے ان کی عاصفات اور ناشرات کے بارے میں ہے۔ حضرت ابن عباس' مجاہد' قتادہ اور ابو صالح نے (ایک روایت کے مطابق) بھی اس کی تائید کی۔

ابن جریر نے المرسلات کے بارے میں توقف کیا ہے کہ اس سے مراد ملائکہ ہیں یا ہوائیں اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن عاصفات سے انہوں نے قطعاً مراد ہوائیں لی ہیں۔ یہی بات انہوں نے ناشرات کے بارے میں کہی کہ یہ ہوائیں ہیں جو بادلوں کو بکھیرتی ہیں۔

اور حضرت ابن مسعود سے روایت ہے (الفارقات فرقا، الملقیات ذکرا، عذرا او نذرا) سے مراد فرشتے ہیں۔ یہی رائے حضرت ابن عباس' مسروق' مجاہد' قتادہ' ربیع ابن انس' سدی اور ثوری سے منقول ہے۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ فرشتے اللہ کے احکام لے کر رسولوں پر آتے ہیں اور حق و باطل کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ رسولوں پر وحی کا القا کرتے ہیں' جس کے اندر لوگوں کے لیے ڈراوا اور اتمام حجت ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ ان الفاظ یا ان کے اس مفہوم کو ارادتاً مجہول رکھا گیا ہے جس کی قسم اٹھائی گئی ہے مثلاً (الذاریات ذروا) اور (النازعات غرقا) کے مفہوم کو ارادتاً مجمل رکھا گیا ہے۔ نیز متقدمین نے ان کے مفہوم میں جو اختلاف کیا ہے یہ بھی دلیل ہے اس امر پر کہ ان الفاظ کے مفہوم مقسم بہ کو مبہم رکھا گیا ہے اور ان مقامات پر ابہام اصل مقصود تھا۔ لہٰذا اشاراتی انداز ہی اس مقام پر زیادہ موزوں ہے۔ یہ الفاظ اور ان کی مبہم اشارات اور ان کا تسلسل اور ترنم اور ان کی پیدا کردہ فضا انسانی شعور کے اندر ایک ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ اور یہ ارتعاش اور کام پر ابھارنا اس سورت کے موضوع اور سورت کے رخ کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہیں۔ اس سورت کا ہر مقطع دراصل انسان کو ایک شدید جھٹکا دیتا اور جھنجھوڑتا

ہے کہ باز آجاؤ ان بداعمالیوں سے اور للہ کی ظاہر اور باہر اور حقیقی آیات و نشانات کا انکار نہ کرو۔ اور اگر تم باز نہیں آتے تو پھر تکذیب پر اصرار کرنے والوں کے متعین انجام کے لیے تیار ہو جاؤ۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ "اس دن انکار کرنے والوں کے لیے ہلاکت ہے"۔

اس کے بعد انسانی فکر و نظر اور شعور کو ایک شدید جھٹکا دیا جاتا ہے کہ جب وہ دن آئے گا جس کا تمام رسولوں کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے۔ جس دن تمام رسول اپنی کارکردگی پیش کریں گے اور جس دن لوگوں کی اعمال کے فیصلے ہوں گے تو وہ کیسا دن ہو گا۔

فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ ﴿٨﴾ وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ ﴿٩﴾ وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ﴿١٠﴾ وَإِذَا الرُّسُلُ أُقِّتَتْ ﴿١١﴾ لِأَيِّ يَوْمٍ أُجِّلَتْ ﴿١٢﴾ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ﴿١٣﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ﴿١٤﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿١٥﴾

"پھر جب ستارے ماند پڑ جائیں گے 'اور آسمان پھاڑ دیا جائے گا' اور پہاڑ دھنک ڈالے جائیں گے 'اور رسولوں کی حاضری کا وقت آپہنچے گا (اس روز وہ چیز واقع ہو جائے گی) کس روز کے لیے یہ کام اٹھا رکھا گیا ہے؟ فیصلے کے روز کے لیے۔ اور تمہیں کیا خبر کہ وہ فیصلے کا دن کیا ہے؟ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔

جب ستارے ماند پڑ جائیں گے اور ان کی روشنی چلی جائے گی۔ اور جب آسمان میں دراڑیں پڑ جائیں گی اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑا دیئے جائیں گے۔ اس قسم کے مناظر اور مشاہد کو قرآن کی مختلف سورتوں میں مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ سب کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ نظر آنے والی کائنات ایسی نہ رہے گی اور اس کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ یہ کرات سماوی ریزہ ریزہ ہوں گے۔ بہت عظیم دھماکے ہوں گے 'یہ عظیم دھماکے ایسے ہی ہوں گے جس طرح کے دھماکے معمولی پیمانے کے 'وہ زلزلوں اور آتش فشانی کی شکل میں دیکھتے رہتے ہیں۔ گویا قیامت کے دن یہ زلزلے' دھماکے' آتش فشانی کے واقعات بہت بڑے پیمانے پر ہوں گے۔ جس طرح عید اور شب قدر کے موقعہ پر بچے آتش فشانی کرتے ہیں یا مثلاً ایٹمی دھماکے اور ہائیڈروجن کے دھماکے۔ لیکن پوری کائنات کے کرات کے باہم ٹکرانے سے جو ہولناکیاں پیدا ہوں گی وہ بہت عظیم ہوں گے۔ وہ انسانی تصور سے بالا ہیں اور ان دھماکوں کے بعد پھر انسانوں کا زندہ موجود رہنا اور تماشے دیکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔

ان دھماکوں اور ہولناکیوں کے بعد پھر یہ سورت بتاتی ہے کہ ایک دوسرا عظیم واقعہ ہو گا اور وہ یہ کہ رسولوں سے کہا جائے گا کہ وہ اپنے فریضہ رسالت کی کارکردگی کی رپورٹ پیش کریں۔ آدم علیہ السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تک رسولوں کی حاضری کا وقت آجائے گا۔ اور یہ حساب و کتاب اس قدر عظیم ہو گا جس کے لیے اس پوری کائنات کے اندر زلزلہ برپا کر کے میدان ہموار کیا گیا۔ زمینی زندگی کے تمام فیصلے اب ہوں گے۔ اور ہر فیصلے اللہ کے احکام

کے تحت ہوں گے ۔اور تمام نسلوں کے انجام کا آخری فیصلہ کر دیا جائے گا۔

قرآن کریم نے اس مسئلے کو نہایت ہی ہولناک انداز میں پیش کیا ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت ہی عظیم حقیقت ہے ۔اس قدر عظیم کہ انسان اچھی طرح اس کا ادراک بھی نہیں کر سکتا۔

وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ (۱۱) لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ (۱۲) لِیَوْمِ الْفَصْلِ (۱۳) وَمَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ (۱۴) (۷۷: ۱۱ تا ۱۴) "اور رسولوں کی حاضری کا وقت آپہنچے گا (اس روز وہ چیز واقع ہو جائے گی) کس روز کے لیے یہ کام اٹھا رکھا گیا ہے؟ فیصلے کے روز کے لیے ۔اور تمہیں کیا خبر کہ وہ فیصلے کا دن کیا ہے؟"

اس انداز تعبیر ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عظیم بات کا ذکر ہو رہا ہے ۔جب انسانی شعور کے پردے پر اس قدر ہولناکی اور خوف طاری ہو گیا کیونکہ رسول جوابدہی کے لیے طلب ہو گئے اور ستارے بے نور ہو گئے اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑ گئے تو اس خوف و ہراس کی حالت میں یہ ڈراوا آتا ہے ۔

وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ (۷۷: ۱۵) "تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔اور یہ ڈراوا اللہ عزیز اور جبار کی طرف سے ہے اور ان حالات کے بعد ہے جو اس کائنات پر طاری کر دیے گئے ۔اور رسول حاضر ہو گئے اور ان سے بھی کارکردگی کی رپورٹ طلب ہونے لگی ۔اور وہ ایک ایک کر کے حساب پیش کرنے لگے 'تو ایسے حالات میں یہ ڈراوا بہرحال بے حد موثر ہوتا ہے ۔اور واقعی ایک حساس انسان پر مارے خوف کے غشی آنے لگتی ہے ۔

اب یوم الفصل اور یوم الحساب کی ان خوفناکیوں سے کھینچ کر انسان کو خود اس دنیا کی انسانی تاریخ کی طرف لایا جاتا ہے کہ اے مبہوت انسان ذرا اپنی تاریخ پر غور کرو۔

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٦﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ﴿١٧﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿١٨﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١٩﴾

"کیا ہم نے اگلوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر انہی کے پیچھے ہم بعد والوں کو چلتا کریں گے ۔مجرموں کے ساتھ ہم یہی کچھ کیا کرتے ہیں ۔تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔

یوں ایک ہی چوٹ میں اقوام و ملل سابقین کی ہلاکتوں کی ایک جھلک دکھا دی جاتی ہے ۔اور بعد میں آنے والی اقوام کی جھلک دکھائی جاتی ہے ۔حالانکہ تاریخ بعید اور تاریخ قریب میں ہلاک شدہ اقوام کی مثالیں بے شمار ہیں ۔دور دور تک اور قریب قریب کے زمانوں میں اقوام کی لاشیں ہی لاشیں نظر آتی ہیں ۔اور زبان حال سے سنت الٰہی کی گونج نظر آتی ہے اور سنائی دیتی ہے ۔

کَذٰلِکَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ (۷۷: ۱۸) "مجرموں کے ساتھ ہم یہی کچھ کیا کرتے ہیں"۔یہ تو اللہ کی سنت جاریہ ہے ۔کبھی رکتی نہیں 'کبھی اپنا راستہ بدلتی نہیں ۔جب مجرمین جان لیتے ہیں کہ ان کا انجام ان دور کے مجرمین اور

قریب کے مجرمین والا ہونے والا ہے تو ان پر ہلاکت کی بددعا آتی ہے اور اللہ کی طرف سے بددعا تو حکم ہلاکت ہوتی ہے۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۷۷ : ۱۹) "تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔

اب ہمارا سفر پھر ایک موڑ لیتا ہے۔ بربادیوں اور ہلاکتوں اور لاشوں کے مشاہدے سے بالکل مختلف تخلیق اور تعمیر کا سفر کہ اللہ کا نظام تخلیق اور نظام ربوبیت اور نظام تدبیر کس طرح کام کرتا ہے۔

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿۲۰﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۲۱﴾ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۲﴾ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۴﴾

"کیا ہم نے ایک حقیر پانی سے تمہیں پیدا نہیں کیا اور ایک مقررہ مدت تک اسے ایک محفوظ جگہ ٹھیرائے رکھا؟ تو دیکھو، ہم اس پر قادر تھے، پس ہم بہت اچھی قدرت رکھنے والے ہیں۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔

اس سے مراد جنین کا طویل اور عجیب سفر ہے۔ اس طویل نامیاتی سفر کو قرآن کریم چند جھلکیوں کے اندر بیان کر دیتا ہے۔ ایک حقیر پانی کی بوند، پھر قرار مکین اور محفوظ جگہ میں رکھنا، ایک متعین وقت تک ایک واضح نظام اور اندازے کے مطابق، اور اس نظام اور اندازے کے بارے میں یہ تبصرہ۔

فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ (۷۷ : ۲۳) "ہم قادر تھے پس ہم بہت اچھی قدرت رکھنے والے ہیں"۔

یہ قدرت اور یہ اندازہ اس قدر دقیق ہے کہ اس کا کوئی مرحلہ اور کوئی اندازہ غلط نہیں ہوتا۔ اور اس پر آخری تبصرہ۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۷۷ : ۲۴) "تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔

اس کے بعد اس زمین کا مطالعاتی سفر، یہ سفر انسانی زندگی کے بارے میں ہے۔ اور زمین کے اندر اس زندگی کے لیے تمام ضروریات کا مقرر کرنا اور اس کا مطالعہ۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا ﴿۲۶﴾ وَّ جَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّ اَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۸﴾

"کیا ہم نے زمین کو سمیٹ کر رکھنے والی نہیں بنایا، زندوں کے لیے بھی اور مردوں کے لیے بھی اور اس میں بلند و بالا پہاڑ جمائے اور تمہیں میٹھا پانی پلایا؟ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔

یعنی زمین کو ہم نے ایسا بنایا ہے کہ یہ اپنے دامن میں زندہ اور مردہ سب چیزوں کو لپیٹ کر رکھتی ہے اور اس میں ہم نے بلند، بالا پہاڑ جما دیئے ہیں جو بہت اونچے اور جمے ہوئے ہیں۔ اور ان کے اوپر ہر وقت بادل چھائے رہتے ہیں اور ان سے میٹھا پانی بہتا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کی عظیم قدرت اور ٹھیک ٹھیک اندازوں کا مظہر ہے۔ اور گہری حکمت پر دلالت

کرتا ہے ' لہذا مکذبین کے لیے کوئی جواز نہیں ہے کہ وہ جھلائیں ـ

اب ان مشاہد قدرت اور گہرے حکیمانہ قوانین فطرت کے پیش کرنے اور انسانی شعور کو تاثرات اور احساسات سے بھر دینے کے بعد اب روئے سخن حساب و کتاب اور روز جزاء کی طرف پھر جاتا ہے ـ ایک نہایت ہی مرعوب کرنے والا حکم ہم سنتے ہیں جس میں مکذبین سے کہا جاتا ہے کہ اٹھو اور راستہ لو اس عذاب کا جس کا تم انکار کرتے تھے ـ یہ حکم نہایت ہی سرزنش اور تکلیف دہ انداز میں دیا جاتا ہے ـ

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٢٩﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِىْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿٣٠﴾ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِىْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿٣١﴾ اِنَّهَا تَرْمِىْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿٣٢﴾ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿٣٣﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٤﴾

"چلو اب اسی چیز کی طرف جسے تم جھلایا کرتے تھے ـ چلو اس سائے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے ـ نہ ٹھنڈک پہنچانے والا اور نہ آگ کی لپٹ سے بچانے والا ـ وہ آگ محل جیسی بڑی بڑی چنگاریاں پھینکے گی (جو اچھلتی ہوئی یوں محسوس ہوں گی ) گویا کہ وہ زرد اونٹ ہیں ـ تباہی ہے اس روز جھلانے والوں کے لیے"ـ

یعنی جاؤ ' اب تم آزاد ہو ' قیامت کے طویل دن کے فیصلے اب ہو چکے ' لیکن یہ آزادی اب دائمی قید ہے ' جہنم کے اندر ـ

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۷۷ : ۲۹) "چلو اب اسی چیز کی طرف جسے تم جھلایا کرتے تھے"ـ یہ چیز اب تمہارے سامنے حاضر و موجود ہے ـ وہ کیا ہے ـ

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِىْ ثَلٰثِ شُعَبٍ (۷۷ : ۳۰) "چلو اس سائے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے"ـ یہ جہنم کا دھواں ہے ـ جس کی شاخیں اور بڑھ کر تین حصوں میں پھیل گئی ہیں ـ لیکن یہ بہرحال آگ کے شعلے سے زیادہ بہتر ہے لیکن

لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِىْ مِنَ اللَّهَبِ (۷۷ : ۳۱) "نہ ٹھنڈک پہنچانے والا نہ آگ کے شعلے سے بچانے والا"ـ یہ بظاہر سایہ ہے لیکن اس میں دم گھٹتا ہے ' سخت گرم ہے اور آگ کے شعلے کی طرح ہے اور اس کو سایہ محض مزاح کے طور پر کہا گیا ہے ـ بلکہ یوں ان کے دلوں کے اندر تمنا پیدا کی گئی ہے کہ کاش کوئی سایہ ہو جس میں وہ پناہ لے سکیں ـ

چلو ' لیکن تم جانتے ہو کہ تمہیں اب کہاں چلنا ہے اور جو فیصلہ ہوا ہے اس کی روشنی میں تم اپنی منزل کو جانتے ہو ـ لہذا تصریح و تشریح کی ضرورت نہیں ہے ـ اور جہاں تم جاؤ گے "وہ" کیا کر رہی ہے ـ

إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ (۳۲) كَأَنَّهُ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ (۷۷ : ۳۳) "وہ محل جیسی بڑی چنگاریاں پھینکے گی گویا کہ وہ زرد اونٹ ہیں"۔ شرارے یوں نکل رہے ہوں گے کہ گویا بڑے بڑے پتھروں کے محلات آگے پیچھے آکر گر رہے ہیں۔ (عرب پتھروں کے بنے ہوئے مکانات کو محلات کہتے تھے۔ ضروری نہیں ہے کہ مراد آج کے دیو ہیکل محلات ہوں) اور یہ شرارے آگے پیچھے یوں لگ رہے ہوں گے جیسے زرد اونٹ۔ یہ تو ہوں گے اس آگ کے شرارے۔ اب آگ کیسی ہوگی' اللہ ہی اس سے بچائے۔ اس خوفناک حالت میں مکرر تبصرہ آرہا ہے۔

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ (۷۷ : ۳۴) "تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔
اس مادی ہولناکی کے بعد اب ذرا نفسیاتی خوف و ہراس جس میں مکذبین ڈوبے ہوئے ہوں گے اور وہ نہایت ہی دباؤ میں ہوں گے لیکن کچھ کہہ نہ سکیں گے۔ یہ سب کچھ اب تو انہیں برداشت ہی کرنا ہے۔

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُونَ ﴿٣٥﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ ﴿٣٦﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٧﴾

"یہ وہ دن ہے جس میں وہ نہ کچھ بولیں گے اور نہ انہیں موقع دیا جائے گا کہ کوئی عذر پیش کریں۔ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔
یہ خوفناک خاموشی بتا رہی ہوگی کہ کس قدر خوف میں یہ لوگ مبتلا ہیں۔ کس قدر دباؤ ہے ان پر' کس قدر ہیبت ناک عاجزی ہے' نہ بات کر سکتے ہیں اور نہ عذرات پیش کر سکتے ہیں۔ کیونکہ بات اور عذرات کا وقت ہی گزر گیا۔ آج تو۔

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ (۷۷ : ۳۷) "تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔ بعض دوسرے مناظر میں یہ ذکر ہوا ہے کہ وہ حسرت اور افسوس کریں گے' قسمیں اٹھائیں گے' معذرتیں پیش کریں گے لیکن اب ان پر تو طویل دن آپڑا ہے۔ اس میں کبھی وہ مہیب سکوت میں ہوں گے اور کبھی چلاتے بھی رہیں گے' جیسا کہ حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا۔ البتہ اس سورت کی فضا کی مناسبت سے ان کی حالت سکوت اور حالت دباؤ کو لایا گیا ہے۔

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٨﴾ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ ١
فَكِيْدُوْنِ ﴿٣٩﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٤٠﴾ ع ۴۰
۲۱

"یہ فیصلے کا دن ہے۔ ہم نے تمہیں اور تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو جمع کر دیا ہے۔ اب اگر کوئی چال تم چل سکتے ہو تو میرے مقابلہ میں چل دیکھو۔ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔
آج تو فیصلے کا دن ہے۔ عذرات پیش کرنے کا دن نہیں ہے۔ آج تو اولین اور آخرین جمع ہیں۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے۔ اگر کوئی تدبیر خلاصی کی ہے تو چلو آزمالو۔ اگر تم کوئی تدبیر یا کوئی طاقت و قدرت رکھتے ہو؟ لیکن اللہ کے مقابلے

میں تدبیر کہاں اور طاقت کہاں؟ بس خاموشی ہی خاموشی ہے ۔ اور دردناک سرزنش ۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۷۷ : ٤۰) "تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔
مجرمین کے مناظر سرزنش کے بعد اب متقین کی بات بھی ہو جائے ۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِىْ ظِلٰلٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّ فَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۵﴾

"متقی لوگ آج سایوں اور چشموں میں ہیں اور جو پھل وہ چاہیں (ان کے لیے حاضر ہیں) کھاؤ اور پیو مزے سے اپنے ان اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔ ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں ۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔

یہ لوگ چھاؤں میں ہوں گے 'اب یہ حقیقی چھاؤں ہے 'یہ دھوئیں کی چھاؤں نہیں ہے ۔جس کے تین شعبے ہیں ۔نہ ٹھنڈی ہے اور نہ آگ کے شعلوں سے بچانے والی ہے ۔یہ لوگ چشموں میں ہوں گے 'گلا گھونٹنے والے دھوئیں میں نہیں۔

وَّ فَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ (۷۷ : ٤۲) "ایسے پھلوں میں جو وہ چاہیں گے"۔ ان مادی انعامات اور سہولیات کے علاوہ ان کو روحانی انعام بھی دیا جائے گا کہ علی رؤس الاشہاد کہا جائے گا ۔نہایت ہی اعزاز کے ساتھ ۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (٤۳) اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ (۷۷ : ٤٤) "کھاؤ اور پیو مزے سے اپنے ان اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔ ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں"۔

یہ ایک عظیم اعزاز ہے کہ ان کے بارے میں شاہی نوٹیفیکیشن جاری ہو گا۔ اور آخری تبصرہ ۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۷۷ : ٤٥) "تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔ اور یہ تبصرہ ان انعامات کے بالمقابل ہے ۔

یہاں 'سیاق کلام اب سرسری اشارہ بلکہ ایک جھلک دکھائی جاتی ہے ۔اس دنیا کی زندگی کے حالات کی جسے اب قیامت کے دن لپیٹ لیا گیا ہے ۔ہم اسکرین پر اس کا نقشہ اور ایک جھلک پھر دیکھتے ہیں 'جس میں مکذبین کی ذلت اور خواری دکھائی جاتی ہے ۔

كُلُوْا وَ تَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۷﴾

"کھالو اور مزے لے کر لو تھوڑے دن ۔ حقیقت میں تم لوگ مجرم ہو۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔ یوں گویا ہم آخرت کے میدان میں دنیا کی فلم دیکھ رہے ہیں اور یہ جھلک ہمیں صرف دو فقروں میں دکھائی جاتی ہے ۔گویا ہم اپنی آنکھوں سے یہ جھلکیاں دیکھ رہے ہیں۔اگرچہ دنیا و آخرت میں طویل عرصے ہیں' آخرت میں یہ خطاب متقین کو تھا' جبکہ دنیا میں یہ مجرمین کے لیے ہے اور زبان حال سے یہ کہا جارہا ہے کہ دیکھو کس قدر فرق ہو گا دونوں کے حالات میں ۔کہ ایک گروہ اس مختصر زمانے میں خوب کھاپی رہا ہے اور طویل زمانوں کے لیے پھر محروم ہو گا۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۷۷ : ٤۷ ) "آج قیامت میں جھلانے والوں کے لیے تباہی ہے"۔ اور قیامت کے بعد زمانے ختم نہ ہوں گے۔

اب تعجب کا اظہار کیا جارہا ہے مخاطبین قرآن پر کہ انہیں ایسی دعوت دی جا رہی ہے اور یہ قبول نہیں کرتے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾

۲ ۱۰ع ۲۲ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (اللہ کے آگے) جھکو تو نہیں جھکتے۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے۔اب اس (قرآن) کی بعد اور کون سا کلام ایسا ہو سکتا ہے جس پر یہ ایمان لائیں"۔

حالانکہ وہ دیکھ رہے ہیں اور انہیں اس خوبصورتی کے ساتھ سمجھایا اور ڈرایا جا رہا ہے۔اگر یہ اس انداز کلام سے متاثر نہیں ہوتے جس سے پہاڑ بھی ہل جاتے ہیں اور جمادات کے اندر بھونچال برپا ہو جاتا ہے۔تو اس کے بعد ان پر کوئی کلام کارگر نہیں ہو سکتا۔گویا یہ لوگ نہایت شقی' بدبخت اور برے انجام تک پہنچنے والے ہیں۔اور ان کی قسمت میں ہلاکت لکھی ہوئی ہے۔اور ان پر کلام نرم و نازک بے اثر ہے۔

یہ پوری سورت اپنے مضامین' اپنے انداز تعبیر' اپنے الفاظ کے ترنم' اپنے خوفناک مشاہد و مناظر اور اپنے چبھنے والے تیز اشارات کی وجہ سے اس قدر موثر ہے کہ کوئی دل اس کے مقابلے میں اپنی جگہ ٹھہر نہیں سکتا۔کوئی وجود متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔سخت سے سخت دل بھی پگھل جاتا ہے۔لیکن ان لوگوں پر اگر یہ سورت بھی کارگر نہیں تو پھر ان کا خدا ہی حافظ!

سبحان اللہ 'کیا کلام ہے یہ قرآن!کس قدر مضبوط گرفت ہے اس کی۔کس قدر قوت ہے اس میں!!

--- ○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ۔۔ ۳۰

| | |
|---|---|
| سورۃ الضحیٰ ۔ ۹۳ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۱ |
| سورۃ الم نشرح ۔ ۹۴ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۸ |
| سورۃ التین ۔ ۹۵ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۸ |
| سورۃ العلق ۔ ۹۶ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۹ |
| سورۃ القدر ۔ ۹۷ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۵ |
| سورۃ البینۃ ۔ ۹۸ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۸ |
| سورۃ الزلزال ۔ ۹۹ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۸ |
| سورۃ العادیات ۔ ۱۰۰ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۱ |
| سورۃ القارعۃ ۔ ۱۰۱ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۱ |
| سورۃ التکاثر ۔ ۱۰۲ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۸ |
| سورۃ العصر ۔ ۱۰۳ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۳ |
| سورۃ الھمزۃ ۔ ۱۰۴ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۹ |
| سورۃ الفیل ۔ ۱۰۵ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۵ |
| سورۃ القریش ۔ ۱۰۶ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۴ |
| سورۃ الماعون ۔ ۱۰۷ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۷ |
| سورۃ الکوثر ۔ ۱۰۸ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۳ |
| سورۃ الکافرون ۔ ۱۰۹ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۶ |
| سورۃ النصر ۔ ۱۱۰ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۳ |
| سورۃ اللھب ۔ ۱۱۱ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۵ |
| سورۃ الاخلاص ۔ ۱۱۲ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۴ |
| سورۃ الفلق ۔ ۱۱۳ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۵ |
| سورۃ الناس ۔ ۱۱۴ | ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۶ |

# پارہ ۳۰ اور سورۃ النباء ایک نظر میں

سورۃ نباء کا بلکہ اس پورے پارے کا ایک خاص مزاج ہے ۔ سورہ بینہ اور سورہ نصر کے سوا اس کی تمام سورتیں مکی ں ۔ بیشتر سورتیں چھوٹی اور بعض لمبی ہیں ۔ لیکن ان تمام سورتوں کا رنگ اور انداز ایک ہے ۔ اور یہ رنگ پورے پارے ی خصوصیت ہے ۔ موضوع 'گفتگو کے رخ 'انداز گفتگو' الفاظ' لہجہ اور تمام اسلوب کلام کے اعتبار اس پورے پارے میں یکسانیت ہے ۔ گو انسانی احساسات پر شدید ضربات لگائی گئی ہیں تاکہ انسانی احساس جاگے ۔ یوں نظر آتا ہے کہ شدید خطرے کے وقت کوئی کسی سوئے ہوئے غافل کو چیخیں لگا کر جگا رہا ہے یا کچھ لوگ غفلت اور نشے کی حالت میں ہیں ۔ لہو و لعب اور دنیا کی خرمستیوں میں بے ہوش ہیں اور اس دنیا کی دلچسپیوں میں مست ہیں اور کوئی ہمدرد داعی انہیں جگا رہا ہے اور زور زور سے پکار رہا ہے کہ ہوش میں آؤ' خطرہ ہے ۔ غور کرو ' فکر تو کرو ' آخر اس کائنات کا ایک مالک اور خالق ہے ۔ یہ کائنات اپنا ایک نظم رکھتی ہے ۔ ایک منصوبے کے مطابق چلتی ہے 'یہ بے مقصد نہیں ہے 'اسے ایک مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور یہ مقصد انسان کی آزمائش ہے ۔ کہ ایک دن انسان نے اپنا اعمال نامہ لینا ہو گا' حساب و کتاب دینا ہو گا ۔ جزا و سزا ہو گی ۔ ایک طرف عظیم سزا ہے اور دوسری جانب انعامات و اکرامات ہیں ۔ ذرا سوچو' ہوش کرو' اور غور و فکر کرو کہ کون سا انجام بہتر ہے تمہارے لیے ۔ یہ ضربات و تنبیہات ہیں ' پہلی ضرب دوسری ضرب 'تیسری ضرب' دسویں ضرب ۔ ان ضربات اور ان چیخوں کے ساتھ ساتھ ایک طاقتور ہاتھ ان غافل سوئے ہوئے لوگوں کو ہلا رہا ہے جو عیش و عشرت کے نشے میں مدہوش ہیں ۔ وہ ایک گہرے مدہوش شخص کی طرح آنکھیں کھولتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں ۔ یہ زبردست ہاتھ انہیں دوبارہ جگاتا ہے 'حرکت دیتا ہے اور پورے زور سے چیختا ہے ۔ یہ لوگ اگر جاگ بھی اٹھتے ہیں تو سخت ہٹ دھرمی 'نفرت اور عناد کے انداز میں کہتے ہیں ۔ جاؤ بابا کام کرو' جب یہ لوگ تنگ آتے ہیں تو اس ڈرانے والے پر سنگ باری شروع کر دیتے ہیں اور دوبارہ دنیا کی اس عیش و عشرت اور خرمستیوں میں ڈوب جاتے ہیں ۔

یہ تھے میرے احساسات اس پارے کو پڑھتے ہوئے 'اگرچہ یہ چند مخصوص اور متعین حقائق پر مشتمل ہے لیکن ان کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے ۔ نیز اس پورے پارے میں مخصوص انداز بیان بھی ہے جو دل میں اترنے والا ہے ۔ اس کائنات کے بعض مناظر اور نفس انسانی کے بعض حالات کو بھی لیا گیا ہے اور قیامت کے دن کے بعض واقعات بھی لیے گئے ہیں ۔ ان کا تکرار بھی ہے اور ان میں تنوع بھی ہے اور یہ تکرار قصداً کیا گیا ہے ۔ یوں مختلف زاویوں سے قلب و نظر کے تاروں کو چھیڑا گیا ہے ۔

ہر پڑھنے والا یہی محسوس کرتا ہے 'جب وہ پڑھتا ہے ۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ ( ۸۰ : ۲۴ ) "انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی خوراک پر غور کرے"۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ (۸۶ : ۵) "انسان کو غور کرنا چاہئے کہ وہ کس سے پیدا کیا گیا ہے"۔

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ (۱۷) وَ اِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ (۱۸) وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ (۱۹) وَ اِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ (۲۰) (۸۸ : ۱۷ تا ۲۰) "کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے' آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھائے گئے اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی"۔

نیز یہ آیات پڑھتے ہوئے بھی یہی احساسات پیدا ہوتے ہیں۔

ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا (۲۷) رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا (۲۸) وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا (۲۹) وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا (۳۰) اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا (۳۱) وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا (۳۲) مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (۳۳) (۷۹ : ۲۷ تا ۳۳) "کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی؟ اللہ نے اس کو بنایا' اس کی چھت خوب اونچی اٹھائی۔ پھر اس کا توازن قائم کیا اور اس کی رات ڈھانکی اور اس کا دن نکالا۔ اس کے بعد زمین کو اس نے بچھایا۔ اس کے اندر سے اس کا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑ اس میں گاڑ دیے سامان زیست کے طور پر' تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے"۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا (۶) وَّ الْجِبَالَ اَوْتَادًا (۷) وَّ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا (۸) وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا (۹) وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا (۱۰) وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (۱۱) وَّ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا (۱۲) وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا (۱۳) وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا (۱۴) لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا (۱۵) وَّ جَنّٰتٍ اَلْفَافًا (۱۶) (۷۸ : ۶ تا ۱۶) "کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا' اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔ اور تمہیں جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا' اور تمہاری نیند کو باعث سکون بنایا' اور رات کو پردہ پوش اور دن کو معاش کا وقت بنایا اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان قائم کیے اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا' اور بادلوں سے لگاتار بارش برسائی تاکہ اس کے ذریعے سے غلہ سبزی اور گھنے باغ اگائیں"۔ اور

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ (۲۴) اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا (۲۵) ثُمَّ شَقَقْنَا

الْاَرْضَ شَقًّا(۲٦)فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا(۲۷) وَّعِنَبًا وَّ قَضْبًا(۲۸) وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا(۲۹) وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا(۳۰) وَّ فَاكِهَةً وَّاَبًّا(۳۱) مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ(۳۲) (۸۰: ۲٤ تا ۳۲) "پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے۔ ہم نے خوب پانی لنڈھایا۔ پھر زمین کو عجیب پھاڑا۔ پھر اس کے اندر اگائے غلے' اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجور اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل اور چارے تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان زیست کے طور پر"۔

اور یہ آیت۔

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ(٦) الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ(۷) فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ(۸) (۸۲: ٦ تا ۸) "اے انسان' کس چیز نے تجھے اپنے رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا ہے جس نے تجھے پیدا کیا' تجھے نک سک سے درست کیا' تجھے متناسب بنایا' اور جس صورت میں چاہا' تجھے جوڑ کر تیار کیا"۔ اور پھر یہ آیات

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى(۱) الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى(۲) وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى(۳) وَالَّذِيْۤ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى(٤) فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى(٥) (۸۷: ۱ تا ٥) "اے نبی اپنے رب کے برتر نام کی تسبیح کرو' جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا' جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی۔ جس نے نباتات اگائیں پھر ان کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا"۔ اور پھر

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ(٤) ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ(٥) اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ(٦) فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ(۷) اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ(۸) (۹٥: ٤ تا ۸) "ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا' پھر اسے الٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کر دیا۔ سوائے ان لوگوں کے' جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔ بس اس کے بعد کون جزاو سزا کے معاملہ میں تم کو جھٹلا سکتا ہے۔ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟"

یہی احساسات ہوتے ہیں جب پڑھنے والا سورہ تکویر کی ان آیات کو پڑھتا ہے۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ(۱) وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ(۲) وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ(۳)

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (٤) وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (٥) وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (٦) وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (٧) وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ (٨) بِاَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (٩) وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (١٠) وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ (١١) وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ (١٢) وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ (١٣) عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ (١٤) (٨١ : ١ تا ١٤) "جب سورج لپیٹ دیا جائے گا' اور جب تارے بکھر جائیں گے اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے' اور جب دس مہینے کی حاملہ اونٹیاں اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گی۔ اور جب جنگلی جانور سمیٹ کر اکٹھے کر دیے جائیں گے اور جب سمندر بھڑکا دیے جائیں گے' اور جب جانیں جوڑ دی جائیں گی اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے اور جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا اور جب جہنم دہکائی جائے گی اور جب جنت قریب لے آئی جائے گی' اس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے"۔

اور سورہ انفطار کی یہ آیات

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (١) وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (٢) وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ (٣) وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ (٤) عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ (٥) (٨٢ : ١ تا ٥) "جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب تارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر پھاڑ دیے جائیں گے اور جب قبریں کھول دی جائیں گی' اس وقت ہر شخص کو اس کا اگلا پچھلا سب کیا دھرا معلوم ہو جائے گا"۔

اور سورہ انشقاق کی یہ آیات

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (١) وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (٢) وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ (٣) وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ (٤) وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (٥) (٨٤ : ١ تا ٥) "جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے گا اور اس کے لیے حق یہی ہے۔ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی' اور جو کچھ اس کے اندر ہے' اسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی۔ اور وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کے لیے حق یہی ہے"۔

اور سورہ زلزال کی یہ آیات

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (۱) وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (۲) وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا (۳) يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا (٤) بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (٥)

(۹۹: ۱ تا ۵) "جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی اور انسان کہے گا کہ یہ اس کو کیا ہو رہا ہے؟ اس روز وہ اپنے حالات بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اسے حکم دیا ہو گا"۔

ان آیات کے علاوہ جب پڑھنے والا سورتوں کے آغاز میں اور درمیان چند لمحات پاتا ہے اور اس کائنات کے دلائل و شواہد کی پکار کو سنتا ہے تو اس کے احساسات نور سے بھر جاتے ہیں۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ (۱۵) الْجَوَارِ الْكُنَّسِ (۱٦) وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ (۱۷) وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ (۱۸) (۸۱: ۱۵ تا ۱۸) "پس نہیں میں قسم کھاتا ہوں، پلٹنے والے اور چھپ جانے والے تاروں کی، اور رات کی جب وہ رخصت ہوئی اور صبح کی جب اس نے سانس لیا"۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ (۱٦) وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ (۱۷) وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ (۱۸) (۸٤: ۱٦ تا ۱۸) "پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی، اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے، اور چاند کی جب وہ ماہ کامل بن جاتا ہے"۔

وَالْفَجْرِ (۱) وَلَيَالٍ عَشْرٍ (۲) وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (۳) وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ (٤) (۸۹: ۱ تا ٤) "قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت اور طاق کی، اور رات کی جب وہ رخصت ہو"۔

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا (۱) وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (۲) وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا (۳) وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا (٤) وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا (٥) وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا (٦) وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا (۷) فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (۸) (۹۱: ۱ تا ۸) "سورج اور اس کی دھوپ کی قسم اور چاند کی قسم جب کہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے اور دن کی جب وہ اسے نمایاں کر دیتا ہے اور رات کی قسم جب وہ سورج کو ڈھانپ لیتی ہے اور آسمان کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے قائم کیا اور زمین کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے بچھایا، اور نفس کی اور اس ذات کی جس نے اسے سنوارا۔ پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی"۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى (١) وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى (٢) وَ مَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى

(٣) (٩٢ : ١ تا ٣) "قسم ہے رات کی جبکہ وہ چھا جائے اور دن کی جبکہ وہ روشن ہو' اور اس ذات کی جس نے نر اور مادہ پیدا کیا"۔

وَالضُّحٰى (١) وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى (٢) (٩٣ : ١ - ٢) "قسم ہے روز روشن کی اور رات کی جبکہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے"۔ یہ اور اس قسم کی دوسری آیات۔

الحاصل اس پورے پارے میں اس بات کو بطور شہادت پیش کیا گیا ہے کہ اللہ نے جس طرح انسانوں اور حیوانوں اور نباتات کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے' وہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ نیز اس کائنات کے دوسرے مظاہر قدرت کو بطور شہادت پیش کیا گیا جو اس کائنات کی کھلی کتاب میں جابجا موجود ہیں۔ نیز اس پارے میں قیامت کے سخت' خوفناک اور کھڑکھڑانے اور کپکپانے والے مظاہر پیش کر کے انسان کو ڈرایا گیا ہے۔ حساب و کتاب کے مناظر' جہنم کے عذاب کے خوفناک مناظر' جنت کی بے حد و حساب انعامات کو ترغیب اور ترہیب کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ قیامت کے مناظر کو اسی طرح خوفناک مناظر کی شکل میں پیش کیا گیا ہے جس طرح اس دنیا کے خوفناک مناظر ہوتے ہیں۔ ان تمام امور کو اللہ کے نظام تخلیق' قدرت تخلیق' تدبیر کائنات اور کائنات کے اندر جاری قوانین قدرت اور نوامیس فطرت پر دلیل کے طور پر لایا گیا ہے۔ اور ان سے انسان کو ڈرایا گیا ہے۔ کبھی کبھار ان مناظر کے اندر ان اقوام کے انجام کی طرف اشارات بھی کیے گئے ہیں جن کو انسانی تاریخ میں ان کی بدکرداریوں کی وجہ سے ہلاک کیا گیا۔ اس پورے پارے میں ان موضوعات پر بے شمار آیات ہیں لیکن ہم چند کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

یہ سورت یعنی سورہ نباء بھی مذکورہ بالا حقائق اور مناظر کے پیش کرنے کا ایک نمونہ ہے۔ اسی طرح سورہ النازعات' سورہ عبس' آغاز کی چند آیات کو چھوڑ کر باقی سورت میں یہی حقائق و مشاہد ہیں۔ پہلی آیات میں دعوت اسلامی کے ایک مخصوص واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ باقی پوری سورت میں انسانی پیدائش اور نباتاتی زندگی کے حقائق پیش کرنے کے بعد قیامت کے کڑاکے دار قیام کا ذکر ہے۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ (٣٤) وَاُمِّهٖ وَ اَبِيْهِ (٣٥) وَ صَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ (٣٦) لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ (٣٧) وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ (٣٨) ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ (٣٨) وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ (٤٠) تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (٤١) (٨٠ :

٣٤ تا ٤١) "اس روز آدمی اپنے بھائی' اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آپڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہو گا' کچھ چہرے' اس دن دمک رہے ہوں گے۔ ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہوں گے اور کچھ چہروں پر اس دن خاک اڑ رہی ہو گی۔ کلونس چھائی ہوئی ہو گی"۔

سورہ التکویر میں اس کائنات میں ہونے والے عظیم انقلابات کا ذکر ہے' جبکہ بعض کائناتی مناظر کی قسم اٹھا کر وحی کی سچائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو ثابت کیا گیا ہے ۔ سورہ انفطار میں قیامت کے دن سے قبل ہونے والے کائناتی انقلابات بیان کیے گئے ہیں اور جنت کے انعامات کو نہایت ہی دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔ یوں کہ انسان ان کے حصول کے لیے میدان میں نکل آئے ۔

يَأَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ (۸۲:۶) "اے انسان تیرے رب کریم کے بارے میں تجھے کس چیز نے غرے میں ڈال دیا ہے"۔ سورہ انشقاق میں قیامت کے روز ہونے والے عظیم کائناتی انقلابات' جنت کی نعمتوں کے مناظر اور دوزخ کے عذاب کے مناظر بیان کیے گئے ہیں اور سورہ بروج میں یوم قیامت کے مناظر' امم ماضیہ میں سے اسلام کے لیے جدوجہد کرنے والے لوگوں کی تعذیب کے ایک مخصوص واقعہ کی جھلکیاں اور چونکہ ان لوگوں نے مومنین کو آگ میں جلایا تھا اس لیے یہ سورت ان لوگوں کے لیے سزائے اخروی کے ذکر پر مشتمل ہے ۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ آخرت کا عذاب بہت ہی شدید ہو گا ۔

سورہ الطارق میں انسان کی تخلیق اور نباتات کی تخلیق کو بطور شہادت پیش کیا گیا ہے ۔

إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ (۱۳) وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۱۴) (۸۶: ۱۳-۱۴) "بے شک یہ ایک جچی تلی بات ہے' ہنسی مذاق نہیں ہے"۔ سورہ اعلیٰ تخلیق' تسویہ اور تقدیر اور ہدایت کا ذکر کرتی ہے ۔ اور اس کے بعد اس میں مختلف قسم کے نباتات کے اگانے اور پھر کو ڑا کرکٹ بنا دینے کا ذکر ہے ۔ اور اس سے یہ اشارہ دینا مقصود ہے کہ اللہ ایک دن اسی طرح پھر عام انسانوں کو اٹھائے گا ۔ اور حساب و کتاب ہو گا اور جزاء و سزا ہوگی اور سورہ غاشیہ میں جنت کی نعمتوں اور جہنم کے عذاب کے مناظر ہیں ۔ اور اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ اگر غور کریں تو اونٹ کی تخلیق آسمانوں کی رفعتوں اور دوریوں' اور زمین اور پہاڑوں کے اندر بہت کچھ سامان عبرت ہے ۔ غرض اسی طرح تمام سورتوں میں یہ مناظر و مشاہد بیان کیے گئے ہیں ۔ چند ہی سورتیں ایسی ہیں جن میں ایمان اور اسلامی نظام کی بات کی گئی ہے ۔ مثلاً سورہ اخلاص' سورہ الکافرون' سورہ الماعون' سورہ النصر' سورہ القدر' سورہ العصر وغیرہ یا پھر چند سورتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کا ذکر ہے ۔ اور آپ کو مشورہ دیا گیا ہے کہ آپ ہر شر سے اللہ کی پناہ طلب کریں ۔ مثلاً الضحیٰ' الانشراح' الکوثر' الفلق' الناس وغیرہ اور یہ بھی چند ہی ہیں ۔

اس پورے پارے کا ایک مخصوص انداز بیان بھی ہے ۔ نہایت صاف ستھرا انداز' جس میں اس کائنات سے حسن و جمال کے خاص پونٹ لیے گئے ہیں ۔ نفس انسانی سے بھی حسن و جمال کے پہلو لیے گئے ہیں ۔ اعلیٰ درجے کے خوبصورت مناظر و تصاویر' دلکش فضا میں' اور نہایت ہی مسحور کن مترنم قافیے اور آیات کے خاتمے پیش کیے گئے ہیں ۔ یہ تمام چیزیں' سوئے ہوئے غافل انسانوں اور بری راہوں پر سرپٹ دوڑنے والوں کو خطاب کرنے میں موزوں تر ہیں ۔ نیز لوگوں کے جگانے' ان کو راہ راست کی طرف کھینچنے اور ان کے احساسات کو بیدار کرنے کی خاطر قسم قسم کے دلائل اور موثرات پیش کرنے کی خاطر یہ اسلوب نہایت ہی مفید ہے ۔ یہ موثر انداز بعض مثالوں کے مطالعہ سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے ۔ مثلاً ستاروں کی قسم کھا کر کہا جاتا ہے کہ وہ یوں ہیں جس طرح زندہ چیزیں ہوتی ہیں اور وہ شیروں اور ہرنوں

طرح نمودار ہوتے ہیں اور چھپ جاتے ہیں۔ اور رات کو "چھپ جانے والی اور صبح کو "سانس لینے والی" کہہ کر ان کو زندگی بخشی گئی ہے لیکن سانس کے ذریعہ وہ گویا روشنی کی آکسیجن لیتی ہے۔ سورہ تکویر میں ہے:

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ (۱۵) الْجَوَارِ الْكُنَّسِ (۱٦) وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ (۱۷)

وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ (۱۸) (۸۱: ۱۵ تا ۱۸) "پس نہیں' میں قسم کھاتا ہوں پلٹنے والے اور پیچھے چلنے والے اور پھر چھپ جانے والے تاروں کی اور رات کی جب وہ اندھیروں میں گھس جاتی ہے اور صبح کی جب وہ روشنی کا سانس لیتی ہے"۔ اور سورج کے غروب ہونے کے مناظر' رات کی تاریکیاں اور چاندنی رات کی خوشگوار روشنی

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ (۱٦) وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ (۱۷) وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ

(۱۸) (۸٤: ۱٦ تا ۱۸) "پس نہیں میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور ان چیزوں کی جنہیں رات جمع کرتی ہے۔ چاند کی جب وہ ماہ کامل بن جاتا ہے۔ اور پھر نمود صبح کے مناظر' رات کا آہستہ آہستہ غائب ہوتے جانا کیا ہی خوبصورت منظر ہوتا ہے اور کس قدر خوبصورت انداز میں پیش ہوتا ہے۔ سورہ فجر ہے

وَالْفَجْرِ (۱) وَلَيَالٍ عَشْرٍ (۲) وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (۳) وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ

(٤) (۸۹: ۱ تا ٤) "قسم ہے صبح کی' اور قسم ہے دس راتوں کی اور قسم ہے جفت اور طاق کی اور قسم ہے رات کی جب وہ جا رہی ہو"۔ اور

وَالضُّحٰى (۱) وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى (۲) (۹۳: ۱ تا ۲) "قسم ہے دن کی اور قسم ہے رات کی جب چھا جائے"۔ اور سورت میں قلب ونظر کو متاثر کر دینے والی یہ آیات

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (٦) الَّذِىْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ (۷)

فِىْۤ اَىِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (۸) (۸۲: ٦ تا ۸) "اے انسان' تجھے کس چیز نے رب کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا ہے' جس نے تجھے پیدا کیا' پھر موزوں بنایا۔ اور پھر جس شکل وصورت میں چاہا' جوڑا"۔ اور جہنم کے بارے میں یہ الفاظ

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ (۸) فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (۹) وَمَاۤ اَدْرٰكَ مَاهِيَهْ (۱۰) نَارٌ

حَامِيَةٌ (۱۱) (۱۰۱: ۸ تا ۱۱) "اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے' اس کی جائے قرار گہری کھائی ہو گی اور تمہیں کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے؟ بھڑکتی ہوئی آگ"۔

بعض تعبیرات میں براہ راست بات کرنے کی بجائے اشارے کنایے کا انداز اپنایا گیا اور براہ راست لفظ کی بجائے

اس کے دور کے مشتقات کو لیا گیا ہے تاکہ نغمہ اور ترنم کے اعتبار سے موزوں تر لفظ کو استعمال کیا جائے۔ اس پورے سپارے میں انداز تعبیر کا یہ پہلو نمایاں اور مکرر ہے۔

یہ سورت اس پورے پارے کے انداز کا ایک نمونہ ہے۔ اس کے موضوعات' بیان کردہ حقائق' مناظر اور تصویر کشی' اس کی فضا' اس کے اثرات اور مچ' اس کے الفاظ اور عبارات' اس کائنات کے تاثرات سب کے سب ایسے ہیں کہ انسان کے پردۂ احساس پر ارتعاش پیدا کرتے ہیں اور انسانی ضمیر پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں جو دنیا اور آخرت دونوں کے زاویہ سے انسان کی اصلاح کرتے ہیں۔

سورت کا آغاز ایک سوال سے ہوتا ہے' جو اس حقیقت کی عظمت' خوفناک اور اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ جس سے وہ اختلاف کرتے تھے۔ حالانکہ وہ ایک عظیم معاملہ ہے اور بالکل ظاہر ہے اور ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا ہے۔ اس سوال کا جواب صرف یہ دے دیا جاتا ہے کہ اچھا عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔

عَمَّ يَتَسَاءَلُوْنَ (۱) عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ (۲) الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ (۳) كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ (٤) ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ (٥) (۷۸: ۱ تا ٥) "یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں؟ کیا اس بڑی چیز کے بارے میں جس کے متعلق یہ مختلف چہ میگوئیاں کرنے میں لگے ہوئے ہیں؟ ہرگز نہیں' انہیں معلوم ہو جائے گا' ہاں ہرگز نہیں' عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"۔

اس مختصر سوال اور جواب کے بعد اس موضوع پر بات ختم ہو جاتی ہے اور ان کو اس نظری موضوع کے بجائے ایسے حقائق کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو ان کے سامنے' ان کے ماحول میں' ان کے نفوس میں' ان کی دنیا میں موجود ہیں اور اگر ان پر غور کیا جائے تو وہ عظیم حقائق و شواہد ہیں اور وہ اس بات پر دلیل ہیں کہ جس معاملے میں اختلاف کر رہے ہیں وہ تو آنے والا ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا (٦) وَّ الْجِبَالَ اَوْتَادًا (٧) وَّ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا (٨) وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا (٩) وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا (١٠) وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (١١) وَّ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا (١٢) وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا (١٣) وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا (١٤) لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا (١٥) وَّ جَنّٰتٍ اَلْفَافًا (۷۸: ۱٦) (۷۸: ٦ تا ۱٦) "کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا' اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا اور تمہیں جوڑے کی شکل میں پیدا کیا اور تمہاری نیند کو باعث سکون بنایا' اور رات کو پردہ پوش اور دن کو معاش کا وقت بنایا اور تمہارے اوپر سات آسمان قائم کیے۔ اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا' اور بادلوں سے

لگاتار بارش برسائی تاکہ اس کے ذریعے سے غلہ اور سبزی اور گھنے باغ اگائیں"۔

حقائق و مناظر اور نہایت ہی موثر تصاویر دکھانے کے بعد انہیں پھر اس عظیم خبر' اس خوفناک موضوع کی طرف لایا جاتا ہے' جس میں ان کو اختلاف تھا' جس کے بارے میں وہ پوچھتے رہتے تھے اور آغاز سورت میں مفصل جواب کی بجائے تہدید آمیز انتظار ہی پر اکتفاء کیا گیا تھا کہ وہ کیسے ہو گا۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ چنانچہ اس کے بڑے بڑے واقعات ہوں گے۔

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا (۱۷) يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا (۱۸) وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا (۱۹) وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا (۲۰)

(۷۸:۱۷ تا ۲۰) "بے شک فیصلے کا دن ایک مقررہ وقت ہے' جس روز صور میں پھونک ماری جائے گی تو تم فوج در فوج آؤ گے اور آسمان کھول دیا جائے گا کہ وہ دروازے ہی دروازے بن کر رہ جائے گا اور پہاڑ چلائے جائیں گے یہاں تک کہ وہ سراب ہو جائیں گے"۔

پھر عذاب جہنم کی ایک خوفناک اور شدید جھلک دکھائی جاتی ہے۔

إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا (۲۱) لِّلطَّاغِينَ مَآبًا (۲۲) لَّابِثِينَ فِيهَا أَحْقَابًا (۲۳) لَّا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا (۲٤) إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا (۲۵) جَزَاءً وِفَاقًا (۲٦) إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا (۲۷) وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَّابًا (۲۸) وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا (۲۹) فَذُوقُوا فَلَن نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا (۳۰) (۷۸:۲۱ تا ۳۰) "درحقیقت جہنم ایک گھات ہے' سرکش کا ٹھکانا' جس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے' اس کے اندر کسی ٹھنڈک اور پینے کے قابل کسی چیز کا مزہ وہ نہ دیکھیں گے' کچھ ملے گا تو بس گرم پانی' اور زخموں کا دھوون' بھرپور بدلہ۔ وہ کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے اور ہماری آیات کو بالکل جھٹلا دیا تھا' اور حال یہ تھا کہ ہم نے ہر چیز گن گن کر لکھ رکھی تھی۔ اب چکھو مزہ' ہم تمہارے لیے عذاب کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کریں گے"۔

اور جنتوں میں اللہ کی نعمتوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر یوں ہو گا۔

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا (۳۱) حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا (۳۲) وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا (۳۳) وَكَأْسًا دِهَاقًا (۳٤) لَّا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذَّابًا (۳۵) جَزَاءً مِّن رَّبِّكَ عَطَاءً حِسَابًا (۳٦) (۷۸:۳۱ تا ۳٦) "یقیناً متقیوں کے لیے کامرانی کا ایک مقام ہے' باغ اور انگور' اور نوخیز ہم سن لڑکیاں' اور چھلکتے ہوئے جام' وہاں کوئی لغو اور جھوٹی بات وہ نہ سنیں گے۔ جزاء اور کافی انعام تمہارے رب

کی طرف سے' اس نہایت مہربان خدا کی طرف سے''۔

اب سورت کا خاتمہ ہے جو ایک عظیم حقیقت کا منظر ہے اور یہ فکر و نظر کے تاروں پر ایک عظیم چوٹ ہے۔ اس عظیم حقیقت کو ایک خوفناک منظر کی صورت میں پیش کر کے لوگوں کو اس سے ڈرایا جاتا ہے۔

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا (۳۷) يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا (۳۸) ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا (۳۹) اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَ يَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِىْ كُنْتُ تُرٰبًا (۴۰) (۷۸:۳۷ تا ۴۰)

''تمہارے رب کی طرف سے' اس نہایت مہربان خدا کی طرف سے جو زمین اور آسمان کا اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا مالک ہے جس کے سامنے کسی کو بولنے کا یارا نہیں۔ جس روز روح اور ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے' کوئی نہ بولے گا سوائے اس کے جسے رحمٰن اجازت دے اور جو ٹھیک بات کہے۔ وہ دن برحق ہے' اب جس کا جی چاہے' اپنے رب کی طرف پلٹنے کا راستہ اختیار کرے۔ ہم نے تم لوگوں کو اس عذاب سے ڈرا دیا ہے جو قریب آ لگا ہے۔ جس روز آدمی وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے اور کافر پکار اٹھے گا کہ کاش میں مٹی ہوتا۔

یہ ہے وہ عظیم شہ سرخی' جس کے بارے میں یہ لوگ باہم سوال کرتے ہیں اور یوں ہو گا وہ دن جب ان لوگوں کے سامنے یہ حقیقت ایک واقعہ کی شکل میں نمودار ہو گی۔

--- ooo---

# درس نمبر ۲۷۸ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۴۰

سُورَةُ النَّبَا مَكِّيَّةٌ (۸۰) آیاتها ۴۰ رکوعاتها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝۱ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝۲ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝۳

كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝۴ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝۵

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں؟ کیا اس بڑی خبر کے بارے میں جس کے متعلق یہ مختلف چہ میگوئیاں کرنے میں لگے ہوئے ہیں؟ ہرگز نہیں، عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا، ہاں، ہرگز نہیں، عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"۔

آغاز کلام ہی ان نام نہاد سوال کرنے والوں کے سوالات پر سرزنش سے ہوتا ہے۔ تعجب اس پر کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس قدر ظاہرو باہربات کے بارے میں قیل و قال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے سوالات دراصل قیام قیامت کے بارے میں تھے اور یہی موضوع تھا جس کے بارے میں وہ نہایت ہی شک اور خلجان میں مبتلا تھے اور سخت مجادلہ اور مباحثہ کرتے تھے۔ ان لوگوں کے تصور میں یہ بات آتی تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے، حالانکہ ایسا لازمی ہونا چاہئے اور قیام قیامت بالکل ایک منطقی امر ہے۔

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ (۷۸ : ۱) "یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں"۔ اور کس چیز کے بارے میں یہ مباحثے کر رہے ہیں اور اس کے بعد خود اس کا جواب دے دیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سوال برائے استفہام نہ تھا۔ نہ کچھ معلومات مطلوب تھیں۔ سوال محض ان کے حال پر تعجب کرنے کے لیے کیا گیا ہے اور مصلحت یہ تھا کہ ان لوگوں کی حالت قابل تعجب ہے کیونکہ ان کے سوالات ایک نہایت ہی عظیم معاملے کے بارے میں ہیں، جس کے بارے میں یہ شک میں ہیں اور اس کی حقیقت یہ ہے۔

عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ (۲) الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ (۷۸ : ۳) "کیا اس بڑی خبر کے بارے میں جس کے متعلق یہ مختلف چہ میگوئیاں کرنے میں لگے ہوئے ہیں"۔ یہاں اس عظیم حقیقت کا نام نہیں لیا گیا' صرف اسے نباء عظیم کہا گیا' جو اس کی صفت ہے ۔ اس لیے کہ تعجب اور مبالغے کے انداز کو جاری رکھا جائے ۔ اس دن کے بارے ں' اختلافات اہل ایمان اور اہل کفر کے درمیان تھے ۔ ان لوگوں کے درمیان جو اس پر ایمان لائے تھے اور ایسے لوگوں کے درمیان جو اس کا انکار کرتے تھے' سوالات دراصل انکار کرنے والوں ہی کی طرف سے تھے ۔

پھر اس سوال اور قیل و قال کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا ہے اور نہ اس بات کی تصریح کی جاتی ہے کہ یہ سوال و داب کس امر کے بارے میں ہے ۔ یہاں صرف اس امر عظیم کی صفت عظیم کا ذکر کر دیا جاتا ہے اور ایک ملفوف اور بالواسطہ دھمکی دینے پر ہی اکتفاء کر دیا جاتا ہے اور یہ بالواسطہ دھمکی ڈائریکٹ جواب سے زیادہ موثر ہے ۔ اور زیادہ خوفزدہ کر دینے والی ہے ۔

كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ (٤) ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ (۷۸ : ۵) "ہرگز نہیں' عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا' ہاں ہرگز نہیں' عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"۔ لفظ کلا زجر آمیز اور سخت توبیخ کے ساتھ انکار کرنے کے معنی میں آتا ہے ۔ یہاں جس قسم کی فضا پیدا کرنا مطلوب ہے' اس کے لیے یہ لفظ نہایت موزوں ہے ۔ لفظ کلا کے تکرار اور لفظ سیعلمون دونوں کے تکرار میں سخت تہدید اور ڈراوا ہے ۔

اب بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ روئے سخن اس عظیم خبر سے پھر کر کسی دوسرے موضوع کی طرف منتقل ہو گیا ہے تاکہ تھوڑے وقفے کے بعد اسے براہ راست لیا جائے' روئے سخن دراصل ہمارے پیش پا افتادہ کائنات کے اندر موجود بعض حقائق' مظاہر' مناظر اور شواہد کی طرف پھر جاتا ہے ۔ جن کو اگر چشم بینا سے دیکھا جائے اور ان پر غور کیا جائے تو وہ انسانی فکر و نظر میں ایک بھونچال پیدا کر دیتے ہیں اور فکر انگیز ہیں ۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝۶ وَّ الْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝۷ وَّ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۝۸ وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝۹ وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝۱۰ وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝۱۱ وَّ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝۱۲ وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝۱۳ وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝۱۴ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا ۝۱۵ وَّ جَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۝۱۶

"کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا' اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا ۔ اور تمہیں جوڑوں کی شکل ں پیدا کیا' اور تمہاری نیند کو باعث سکون بنایا' اور رات کو پردہ پوش اور دن کو معاش کا وقت بنایا اور تمہارے اوپر

سات مضبوط آسمان قائم کیے اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا' اور بادلوں سے لگاتار بارش برسائی تاکہ اس کے ذریعے سے غلہ سبزی اور گھنے باغ اگائیں"۔

یہ سفر اس عظیم اور طویل و عریض کائنات کے اطراف و جوانب میں ہے' اس سفر میں ہم بے شمار مناظر دیکھتے ہیں' اور مشاہدے کرتے ہیں۔ یہ طویل مناظر اور بے شمار تخلیقاتی تصاویر ہمارے سامنے نہایت ہی محدود اور مختصر الفاظ کے ذریعہ پیش کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہایت ہی محدود وقت میں' محدود الفاظ کے ذریعہ جب یہ مناظر پردۂ تخیل پر گزرتے ہیں تو فکر و نظر پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ عقل و خرد کی تاروں پر مضراب اپنا کام نہایت تیزی اور تسلسل کے ساتھ کر رہا ہے۔ یہ سب تصورات ایک اثباتی استفہام کے انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ایک طاقتور ہاتھ' نہایت ہی غفلت میں سوئے ہوئے لوگوں کو جگا رہا ہے۔ جو ان کے قلب و نظر کو اللہ کی اس گوناگوں مخلوقات کے مشاہدے کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ اور یہ دعوت دے رہا ہے کہ اس نظام کے پیچھے کام کرنے والی قوت مدبرہ پر ذرا غور کرو کہ کس طرح ہر چیز کو اس نے ایک مقدار کے مطابق رکھا ہوا ہے۔ کس طرح یہ کائنات پیدا کی گئی ہے' پیدا ہو رہی ہے۔ کیا کوئی عقل یہ سوچ سکتی ہے کہ یہ مخلوقات یونہی چھوڑ دی جائے گی اور کوئی حساب و کتاب نہ ہو گا بلکہ حساب و کتاب ہو گا اور یہ جب واقعہ ہو گا تو یہ وقت کی عظیم خبر ہوگی اور اس کی شہ سرخی لگے گی۔ مگر افسوس کہ اس عظیم حقیقت کے بارے میں یہ لوگ اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ اس سفر کے کئی مراحل ہیں' پہلا مرحلہ اس زمین کے مطالعے کا ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا (٦) وَّ الْجِبَالَ اَوْتَادًا (٧٨ : ٧) "کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا' اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا"۔ مہاد کے معنی ہیں سیر و سیاحت کے لیے تیار کردہ۔ نیز گہوارے کی طرح نرم۔ دونوں مفہوم لفظ مہاد سے نکلتے ہیں اور باہم قریب ہیں۔ انسان علم و معرفت کے جس مقام پر بھی ہو اور تہذیب و تمدن کے جس مرحلے میں بھی ہو' وہ اس حقیقت کو سمجھتا ہے کہ زمین اس کے لیے گہوارہ ہے بطور حقیقت واقعہ اس چیز کو سمجھنے کے لیے کسی بڑی مقدار علم کی ضرورت نہیں۔ پہاڑوں کا میخ کی طرح مضبوطی سے جما ہوا ہونا بھی انسان کو ہمیشہ نظر آتا ہے۔ اگرچہ وہ پتھر کے دور میں ہو یا زمانہ حال کی علمی ترقی کے دور کا ہو' یہ حقائق محسوسات ہیں۔ معمولی توجہ سے دریافت ہو سکتے ہیں۔

البتہ جس حقیقت کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے وہ پتھر کے دور کے انسان کے ابتدائی احساسات سے ذرا گہری ہے۔ انسان نے جوں جوں علم و معرفت میں ترقی کی' وہ اس کائنات کے حقائق کی گہرائیوں تک جا پہنچا۔ اور یہ حقائق انسان کی نفسیات پر چھاتے رہے۔ اور انسان نے اس بات کا ادراک کر لیا کہ اس کائنات کی پشت پر ایک گہری حکمت اور تدبیر کام کر رہی ہے۔ اور اس کے اندر ایک پیچیدہ ٹیکنالوجی رکھ دی گئی ہے اور تمام مخلوقات اور موجودات باہم مربوط اور معاون ہیں۔ اور ایک دوسرے کی ضروریات پوری کر رہے ہیں۔ اور یہ کہ اس زمین کو خصوصاً انسانی زندگی کے لیے مدد و معاون اور گہوارہ بنایا گیا ہے۔ اور یہ انسان اس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور اس کے اور ان کائناتی قوتوں کے درمیان ایک قسم کی مفاہمت ہے۔

زمین کو خصوصیت کے ساتھ انسانی حیات کے لیے گہوارہ بنایا گیا ہے' اور یہ ایک ایسا ثبوت ہے جس کی حقانیت میں شک نہیں کیا جا سکتا ہے' بشرطیکہ دیکھنے والا عقل و خرد سے بے بہرہ نہ ہو اور وہ اس ظاہری کائنات کی پشت پر بھی جھانک کر دیکھ سکتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے اس زمین میں جو قوتیں پیدا کی ہیں' اگر ان کی نسبت ترکیب کے اندر معمولی ردو بدل بھی کر دیا جائے' اور زمین کے ظروف و احوال وہ نہ رہیں جو ہیں' یا اگر زمین کی تخلیق کے اندر ملحوظ عناصر کے درمیان میں سے کسی ایک عنصر ہی کو غائب کر کے اس مرکب کی نسبتوں کے اندر ذرا سا بھی اختلال واقع ہو جائے تو زمین جس کو انسان کے لیے گہوارہ بنایا گیا ہے' انسان کے لیے موت کا کنواں بن جائے اور اس کے اندر سے وہ صفت مفقود ہو جائے جس کی طرف قرآن یہاں اشارہ کر رہا ہے۔ قرآن نے تو اس بات کی طرف یہاں مجمل اشارہ فرمایا ہے۔ تفصیلات انسان پر چھوڑ دی ہیں تاکہ انسان اپنی عقل و خرد اور علم و تجربہ کے مطابق تفصیلات کا مطالعہ کرے۔

اور اللہ نے پہاڑوں کو زمین کے اندر میخوں کی طرح گاڑ دیا۔ ہر انسان ایک سرسری نظر سے اس بات کو ظاہراً پاتا ہے کہ پہاڑ زمین کے اندر میخوں کی طرح گاڑے ہوئے ہیں۔ اس طرح جس طرح خیمے کی میخیں ہوتی ہیں' اور پہاڑ خیموں کی طرح نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کی حقیقت کیا ہے' تو قرآن سے ہم یہ پاتے ہیں اور اس بات کا ادراک کرتے ہیں کہ یہ زمین کو مضبوط کرنے اور اس کا توازن قائم کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے ازحد ضروری ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ پہاڑ اس لیے قائم کیے گئے ہوں تاکہ زمین پر سمندروں کی گہرائیوں اور پہاڑوں کی بلندیوں کی وجہ سے ایک توازن قائم ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی وجہ سے زمین کے اندرونی سکیڑ اور سطحی سکیڑ کے درمیان توازن قائم کیا گیا ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان پہاڑوں کی وجہ سے زمین کے بعض حساس مقامات پر زلزلوں اور آتش فشانیوں کو روکا گیا ہو' اور ان وجوہات کے علاوہ بعض دوسری نامعلوم وجوہات کے ناطے پہاڑوں کو میخیں کہا گیا ہو۔ جن کا ابھی تک انسان کو علم ہی نہ ہوا ہو' کیونکہ قرآن نے کئی نامعلوم حقائق کی طرف اشارات اور واضح اشارات کیے تھے اور انسانوں نے ان کا ایک نہایت ہی محدود حصہ صدیوں بعد معلوم کیا ہے۔

دوسرا سفر دراصل انسانی نفسیات کی وادیوں میں ہے۔ نفس انسانی کے بعض پہلوؤں کو لیا گیا ہے۔

وَّ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا (۸:۷۸) "اور ہم نے تمہیں مرد و عورت کے جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا"۔ یہ بھی اس دنیا کی ایک نہایت کھلی حقیقت ہے' جسے انسان نہایت ہی سادگی کے ساتھ پاتا ہے کہ انسانوں کو مرد اور عورت کی شکل میں پیدا کیا گیا ہے۔ پھر ان کو جوڑا بنایا گیا اور ان کے ملاپ سے سلسلہ حیات کو جاری رکھا گیا۔ ہر انسان اس حقیقت اور اس نظارے کو دیکھتا ہے اور پھر وہ دیکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ اس نظام کے اندر کس قدر لطف' مزہ' خوشی اور آرام رکھا گیا ہے اور ان امور کو سمجھنے کے لیے کسی وسیع علم کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے اللہ نے انسانوں کے سامنے یہ حقیقت رکھی' ہر تہذیب و تمدن کا بیٹا بھی اسے سمجھتا ہے اور ہر بدوی اور پہاڑی بھی اس کو محسوس کر کے اس کو برتتا ہے اور اس کے مطابق زندگی کو منظم کرتا ہے۔

اس گہری حقیقت کے اس اجمالی شعور سے آگے کچھ مزید قابل غور باتیں بھی ہیں' ان تک صرف ان لوگوں کو رسائی حاصل ہوتی ہے جو علم و معرفت میں ذرا گہرائی تک چلے جاتے ہیں' مثلاً انسانی جرثومے اور نطفے سے مذکر اور مونث

بنا دینا حالانکہ اس جرثومے کے اندر مذکر و مونث کی کوئی شناخت نہیں ہوتی۔ یہ اللہ ہی ہے جو کسی نطفے کو تذکیر کی طرف لے جاتا ہے اور کسی نطفے کو تانیث کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ صرف دست قدرت کے کارنامے ہیں۔ اللہ کی تخلیق اور اللہ کی ہدایت جس نطفے میں جو خصائص چاہے ڈال دے تاکہ انسان ایک جوڑے کی شکل میں پیدا ہوں اور زندگی کی گاڑی آگے بڑھے۔

وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا(۹) وَّ جَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا(۱۰) وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ

مَعَاشًا(۱۱) (۷۸: ۹ تا ۱۱) ”اور تمہاری نیند کو باعث سکون بنایا اور رات کو پردہ پوش اور دن کو معاش کا وقت بنایا“۔ اللہ کی مہربانیوں پر ذرا غور کریں کہ اس نے انسانوں کو سکون اور تازگی عطا کرنے کے لیے نیند کی تخلیق کی۔ یہ نیند جب انسان پر طاری ہوتی ہے تو ایک وقت کے لیے اس کی قوت مدرکہ اور قوت عمل کو موقوف کر دیتی ہے۔ اس وقفے میں انسان ایک ایسی حالت میں چلا جاتا ہے کہ جسے نہ حالت موت کہا جا سکتا ہے اور نہ حالت حیات۔ اس حالت میں جانے سے انسانی جسم اور اعصاب کی تمام تھکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔ اور وہ تازہ دم ہو کر اور از سرنو پیدا ہو کر زندگی کی جدوجہد اور مشغولیات اپنا لیتا ہے۔ حالت نوم کس طرح طاری ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں ایک انسان کس طرح تازہ دم ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کو صرف اللہ ہی جانتا ہے اور اس کام میں انسانی ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ نہ انسان اس بات کو جانتا ہے کہ یہ تازگی اس کے جسم میں کس طرح سرایت کر جاتی ہے۔ کیونکہ جب وہ جاگ اٹھتا ہے تو وہ نیند کے حالات کا تصور نہیں کر سکتا۔ اور نیند کی حالت میں بھی اس کی قوت مدرکہ معطل ہوتی ہے۔ یہ ہے ہر زندہ چیز سے متعلق ایک کھلے راز کی بات جسے صرف وہ ذات جانتی ہے جس نے ان زندہ مخلوقات کو پیدا کیا اور انسانی زندگی اور اس کی سرگرمیوں کو سونے اور نیند پر موقوف کیا۔ کیونکہ ہر زندہ مخلوق ایک محدود وقت تک ہی نیند کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے' اور اگر اسے مجبوراً دیر تک مصنوعی طریقے سے بیدار رکھا جائے تو اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

لیکن نیند میں جسمانی اور اعصابی ضروریات کے علاوہ بھی کچھ راز ہیں۔ یہ روح کے لیے بھی سکون کا ذریعہ ہے۔ روح کو بھی زندگی کی سخت کشمکش سے ہٹا کر اس کے لیے سکون کا ذریعہ ہے۔ یوں جس طرح ایک فوجی اسلحہ اتار کر قدرے ستاتا ہے اور امن و سکون کی حالت میں چلا جاتا ہے لیکن نیند کی حالت میں اسے جانا پڑتا ہے۔ وہ چاہے یا نہ چاہے کیونکہ نیند انسان کی ایک ایسی ضرورت ہے جس طرح کھانا پینا' اس کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات نیند کے نتیجے میں ایسی تبدیلی آتی ہے جو معجزات سے کم نہیں ہوتی۔ انسان روحانی تھکاوٹ میں مبتلا ہوتا ہے' اعصاب چور چور ہوتے ہیں' روح متزلزل ہوتی ہے' اور دل پریشانی سے بھرا ہوتا ہے۔ اچانک ایک اونگھ سی طاری ہوتی ہے' اور بعض اوقات یہ اونگھ چند لمحات سے زیادہ نہیں ہوتی۔ لیکن ایک فرد کے جسم اور روح پر تازگی طاری ہو جاتی ہے اور اس کی حالت میں ایک انقلاب آ جاتا ہے اور چند لمحات کے اندر انسان اپنے آپ کو تروتازہ بلکہ ایک نیا انسان محسوس کرتا ہے۔ غزوۂ بدر اور غزوۂ احد میں تھکے ہارے مسلمانوں پر اللہ نے ایسی ہی اونگھ طاری کر دی تھی جسے نعاس امنہ کہا گیا۔

اِذْ یُغَشِّیْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً (۸: ۱۱) ”اس وقت کو یاد کرو جب تمہیں ایک ایسی اونگھ نے ڈھانپ لیا'

سکون طاری کرنے کے لیے صرف اللہ کی طرف سے"۔ اور سورہ آل عمران میں

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ (۳: ۱۵۴) "اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر ایسی اطمینان کی حالت طاری کر دی کہ وہ اونگھنے لگے"۔ اور بعض اوقات بعض دوسرے لوگوں پر بھی ایسے حالات طاری کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ "سبات" یعنی زندگی کی سرگرمیوں اور عقل و روح کی تمام سرگرمیوں سے رک جانا' ہر زندہ مخلوق کی ضرورت ہے' اور دست قدرت اور خالق کائنات کے رازوں میں سے ایک راز ہے' اور ایک ایسی نعمت ہے جو خالص اللہ کی داد و دہش اور عطا اور مہربانی کا نتیجہ ہے۔ قرآن کریم انسان کے عقل و ادراک کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ اے انسان ذرا اپنی ذاتی خواص پر بھی غور کرو' اور جس دست قدرت نے یہ خواص رکھے ہیں اس پر بھی قدرے تامل اور تدبر کرو اور اس کی معرفت حاصل کرو۔

اور ذات باری کی قدرتوں میں سے ایک اہم قدرت اور تدبیر یہ ہے کہ اس نے اس کائنات کی حرکت کو بھی زندہ مخلوق کی حرکت کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔ جس طرح انسان کے اندر نیند رکھکر اسے سکون دیا گیا ہے کہ زندگی کی کشمکش کے بعد وہ قدرے سکون میں رہے۔ تو کائنات کے اندر اللہ نے رات کا ماحول پیدا کر کے انسان کے لیے نیند اور سکون کا سازگار ماحول پیدا کر دیا ہے۔ یوں اللہ کی مخلوق کے اندر باہم سازگار ماحول پیدا ہوا۔ اور یہ پوری دنیا زندہ مخلوقات کا ایک خاندان بن گئی۔ زندہ اشیاء کی یہ فیلی ان خصائص کے مطالبات پر لبیک کہتی ہے' جو اس کائنات کے اندر رکھ دیئے گئے ہیں' اور ان زندہ مخلوقات کی تمام اقسام کے اندر ایسی حرکت اور ایسی ضروریات رکھ دی گئی ہیں جو بعینہ اس پوری کائنات کے اندر رکھی گئی ہیں' اور یہ تمام امور دست قدرت نے سرانجام دیئے ہیں اور یوں اس کائنات اور اس پوری زندہ مخلوق کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور موافقت پیدا کر دی گئی ہے۔

اور ان آیات میں تیسرا رنگ یہ دکھایا گیا ہے' دور کے آسمانوں اور بلندیوں کا قریب کی زمین کے ساتھ رابطہ ہے۔

وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا (۱۲) وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا (۱۳) وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا (۱۴) لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا (۱۵) وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا (۱۶) (۷۸: ۱۲ تا ۱۶) "اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان قائم کیے اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا' اور بادلوں سے لگاتار بارش برسائی تاکہ اس کے ذریعے سے غلہ سبزی اور گھنے باغ اگائیں"۔

اور وہ سبع شداد جو انسان کے اوپر کھڑے کیے گئے وہ سات آسمان ہیں۔ اور دوسری جگہ ان کو سات راستے کہا گیا ہے۔ ان سے حقیقی طور پر مقصود کیا ہے۔ یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ سات کہکشانی مجموعے بھی ہو سکتے ہیں' یہ کہکشانی مجموعے اس قدر بڑے ہیں کہ ان میں سے ایک ہی کہکشانی گروپ میں ستاروں کی تعداد ایک سو ملین کے لگ بھگ ہے۔ اور ان سات مجموعوں کا ہماری زمین اور ہمارے مجموعہ شمسی سے تعلق ہے اور ان "سبع شداد" کا کوئی اور مفہوم بھی ہو سکتا ہے۔

اور اس بات کو اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ اس کائنات کے بارے میں ہمارا موجودہ علم بہت زیادہ دکھائی دینے کے باوجود بہت ہی قلیل ہے۔

اس آیت میں جو کچھ بتایا گیا وہ یہ ہے کہ یہ سات آسمان نہایت مضبوط ہیں۔ ان کی عمارت نہایت پختہ ہے۔ اور اس قدر مضبوطی کے ساتھ باہم دگر پیوست کر دیئے گئے ہیں کہ ان کے ڈھانچے میں کسی جگہ ٹوٹ پھوٹ اور انفکاک ممکن نہیں ہے۔ اور یہ وہی ہیں جن کو ہم اس فضائے کائناتی میں مشاہدہ کرتے ہیں اور جن پر آسمانوں کا لفظ بولا جاتا ہے اور لوگ سمجھ لیتے ہیں اور دوسری چیز یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ سات مضبوط آسمان زمین سے بھی مربوط ہیں اور انسان اور تمام دوسری زندہ مخلوقات سے بھی مربوط ہیں۔ اس لیے ان سات مضبوط چیزوں کا ذکر انسان کی زندگی اور اس کے قیام و انصرام کی تدابیر کے ضمن میں کیا گیا۔

وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا (۷۸ : ۱۳) "اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ بنایا"۔ اور یہ روشن اور گرم چراغ سورج ہے جس کی روشنی تیز ہے اور اس کے اندر بے پناہ گرمی ہے۔ جس کی وجہ سے زمین اور اس کے اوپر زندگی ممکن ہوتی ہے جو سمندر کے پانیوں کو گرم کر کے ان سے اس وسیع زمین پر آبپاشی کا بندوبست کرتا ہے۔ وہ بادلوں کو اٹھاتا ہے۔ ان کو بلندی کی اعلیٰ سطح تک لے جاتا ہے اور پھر ان بادلوں کو نچوڑ کر بارش برسائی جاتی ہے۔

وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا (۷۸ : ۱۴) "اور بادلوں سے لگاتار بارش برسائی"۔ یعنی قوانین قدرت ان بادلوں کو نچوڑتے ہیں اور ان کا پانی زمین پر گرتا ہے۔ یہ پانی کس طرح نچوڑا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہواؤں کے ذریعہ بادلوں سے پانی نچوڑا جاتا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بادلوں کے باہم ٹکرانے سے بجلی کی پیدائش کے عمل سے پانی نکل آتا ہو، لیکن ان تمام اسباب کے پیچھے اصل تو مسبب الاسباب ہے جو ان تمام اسباب اور اثرات ڈالنے والی چیزوں کا خالق ہے۔ اس سورج کو چراغ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں جلنے کا عمل اور روشنی ہوتی ہے اور یہی کام سورج کے اندر ہو رہا ہے کہ اس میں جلنے کا عمل اور روشنی بکھیرنے کا عمل ہو رہا ہے۔ لہٰذا سورج اور چراغ پوری طرح ایک ہی عمل کر رہے ہیں۔

اللہ کے روشن چراغ سے ہم پر گرم شعاعوں اور روشنی کی بارش ہوتی ہے اور بادلوں سے لگاتار بارش نچوڑی جاتی ہے۔ اور یہ بجلی کے کڑک کے عمل سے بار بار برستی ہے اور اس بارش اور اس گرمی ہی سے اس کرۂ ارض پر ہر قسم کے نباتات پیدا ہوتے ہیں اور ان نباتات سے وہ تمام حیوانات پیدا ہوتے جن کو انسان استعمال کرتے ہیں اور وہ تمام گھنے باغات پیدا ہوتے ہیں۔ الفاف سے مراد ہے وہ گھنے درخت جو ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے ہوئے ہوں اور ایک درخت کی ٹہنی دوسرے میں گھسی ہوئی ہو۔

اس کائنات کی تخلیق میں یہ ہم آہنگی، اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے پیچھے ایک حکیمانہ ہاتھ کام کر رہا ہے۔ نہایت حکمت کے ساتھ اس کی ہر چیز اندازے کے ساتھ بنائی گئی ہے۔ اور یہی ارادہ اس کو چلا رہا ہے اور اس حقیقت کو ہر انسان پاتا ہے، اگر وہ اپنی عقل اور اپنے شعور کو اس طرف متوجہ کرے، لیکن دور جدید میں جب انسان نے علم و معرفت میں ترقی کر لی، تو اس نے معلوم کیا کہ اس کائنات کی تخلیق میں کیا کیا تدابیر اختیار کی گئی ہیں اور اس کی ہر ہر چیز کو

کس طرح ایک فارمولے کے مطابق بنایا گیا ہے۔ یہ فارمولے اس قدر عجیب اور حیران کن ہیں کہ ان کو دیکھ کر عقل چکرانے لگتی ہے۔ اور علم و معرفت رکھنے والا جدید انسان اور سائنس دان اس بات کو احمقانہ تصور کرتا ہے کہ یہ کائنات یونہی بخت و اتفاق سے پیدا ہو گئی ہے اور جو لوگ اس کائنات کے کسی مدبر اور خالق کے تسلیم کرنے سے فرار اختیار کرتے ہیں۔ وہ لوگ دراصل محض ہٹ دھرمی اور ضد میں مبتلا ہیں۔ اور ان کے اس رویے کو اب احترام کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے۔ اور اس کائنات کے پیچھے ایک قوت مدبرہ کام کر رہی ہے جس نے ہر چیز کو نہایت ہی حساس سکیل کے ساتھ پیدا کیا ہے اور کائنات کی تمام قوتیں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ اور پیوست ہیں۔ اور قرآن کریم نے اس آیت میں اسی تنظیم 'ہم آہنگی اور تقدیر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ زمین کو گہوارہ بنایا ہے اور پہاڑوں کو میخوں کی شکل دی ہے اور لوگوں کو جوڑے جوڑے بنایا' نیند کو باعث سکون بنایا' اور رات کو سب کے لیے چھپنے اور آرام کرنے کا ذریعہ بنایا' اور سورج کے ذریعہ گرمی اور روشنی کا انتظام کیا۔ اور ہواؤں اور بادلوں کے ذریعہ بارشوں کا انتظام کیا' جن کے نتیجے میں سبزیاں' حیوانات اور پھل نکالے گئے۔ یہ تمام حقائق جس انداز سے بیان کیے گئے ہیں' سائنسی زاویہ سے بھی یہ باہم متوافق اور ہم آہنگ ہیں اور ان کے اندر گہرا تعلق سبب اور مسبب کا ہے۔ اور یہ تعلق ہی بتاتا ہے کہ اس کائنات کا ایک ایسا خالق ہے جو اس کے نظام کو نہایت ہی خوبصورتی اور حکمت سے ملا رہا ہے اور وہ حکیم و قدیر ہے۔ ان سائنسی اور مشاہداتی حقائق کو اگر کھلی آنکھوں سے پڑھا جائے تو اس سے انسان کو حکمت و دانش کا ایک بہت بڑا پیغام ملتا ہے اور اس کے بعد پھر وہ ایک عظیم پیغام پاتا ہے اور اس کی یہ شہ سرخی لگتی ہے کہ ایک فیصلے کا دن آنے والا ہے۔

یہ تمام مخلوقات یہاں تمہارے استفادے کے لیے ہیں' کھاؤ اور پیو اور عیش کرو' مگر ایک دن بھی آنے والا ہے' یہ دن یوم الفصل ہے' یہ دن فیصلوں کا دن ہے۔

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ﴿١٧﴾ يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا ﴿١٨﴾ وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ﴿١٩﴾ وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿٢٠﴾

"بے شک فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے جس روز صور میں پھونک مار دی جائے گی' تم فوج در فوج نکل آؤ گے۔ اور آسمان کھول دیا جائے گا' حتیٰ کہ وہ دروازے ہی دروازے بن کر رہ جائے گا اور پہاڑ چلائے جائیں گے یہاں تک کہ وہ سراب ہو جائیں گے"۔

لوگ عبث پیدا نہیں کیے گئے اور نہ ہی وہ شتر بے مہار ہیں۔ ان کی زندگی کے اندازے اور نظام' جس کا ذکر آیات ماقبل میں کیا گیا ہے' اور پھر اس کائنات کا نظام جس میں وہ رہ رہے ہیں' دونوں نظام پوری طرح ایک دوسرے کے

ساتھ ہم آہنگ ہیں' ان پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد ہر دانش مند آدمی اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ انسان مہمل اور غیر ذمہ دار نہیں ہیں کہ زمین پر اچھے کام کریں یا برے کام کریں اور پھر مرکر مٹی ہو جائیں ۔ راہ ہدایت پر ہوں یا راہ ضلالت پر ہوں' ان سے پوچھنے والا کوئی نہ ہو' زمین پر عدل کر لیا' یا ظلم' کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔

بہرحال ایک دن فیصلے کا ضرور ہے' جس دن تمام گزرے ہوئے معاملات کے فیصلے ہوں گے ۔ یہ طے شدہ' متعین دن ہے' جس کے رسم اور قواعد طے شدہ ہیں اور اس کا وقت بھی اللہ کے ہاں طے شدہ ہے ۔ اور مقرر و متعین ہے ۔

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا (۷۸: ۱۷) "بے شک فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے"۔ اس دن اس کائنات کا نظام بدل جائے گا اور اس نظام کی بندش کھل جائے گی

يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا (۱۸) وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا (۱۹) وَّ سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا (۲۰) (۷۸: ۱۸ تا ۲۰) "جس روز پھونک ماری جائے گی تو تم فوج در فوج نکل آؤ گے ۔ اور آسمان کھول دیا جائے گا حتیٰ کہ وہ دروازے ہی دروازے بن کر رہ جائے گا اور پہاڑ چلائے جائیں گے' یہاں تک کہ وہ سراب بن جائیں گے"۔

صور سے مراد بگل ہے ۔ ہم صرف اس کے نام سے واقف ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ اس میں پھونک ماری جائے گی ۔ اس کی کیفیت کیا ہوگی تو اس میں ہمیں نہیں پڑنا چاہئے ۔ اگر ہم اس کی تفصیلی کیفیت معلوم بھی کر لیں تو اس سے ہمارے ایمان میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اللہ نے ہماری قوت فہم و ادراک کو ایسے لاحاصل موضوعات پر کھپانے سے بچایا ہے اور جس قدر علم کی ضرورت تھی وہ ہمیں بتا دیا ہے ۔ پس ہم یہی سوچتے ہیں کہ ایک آواز ہوگی اور اس کے نتیجے میں سب انسان قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے ۔ ہمارے ذہنوں میں یہ منظر آتا ہے کہ انسانی نسلیں فوج در فوج چلی آ رہی ہوں گی ۔ حالانکہ دنیا میں اللہ نے ایسا نظام قائم کیا تھا کہ اگلی نسلیں جاتی رہتی تھیں اور نئی نسلیں ان کی جگہ لیتی تھیں تا کہ یہ نہ ہو کہ زمین پر لوگوں کے رہنے کی جگہ ہی نہ رہے' بہرحال ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ فوج در فوج ہر نشیب و فراز سے چلے آ رہے ہوں گے ۔ ایک ہی میدان میں ہوں گے ۔ یہ چیونٹیوں کی طرح قبروں سے نکل رہے ہوں گے اور یہ اس قدر لوگ ہوں گے کہ نہ ان کا پہلا سرا معلوم ہو گا اور نہ آخری ۔ اور یہ عظیم اجتماع دلوں کے اندر ایک خوف پیدا کر رہا ہو گا کیونکہ کسی نے بھی اس قدر عظیم اجتماع نہ دیکھا ہو گا اور نہ سوچا ہو گا اس لیے کہ یہ اجتماع قیامت کے دن ہی ہو گا۔ یہ کہاں ہو گا اس کا ہمیں علم نہیں ہے ۔ کیونکہ کائنات کا یہ نظام تو تباہ کر دیا جائے گا۔ عظیم حادثات اور انقلابات ہو چکے ہوں گے ۔

وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا (۱۹) وَّ سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا (۷۸: ۲۰) "اور آسمان کھول دیا جائے گا' حتیٰ کہ دروازے ہی دروازے بن کر رہ جائے گا اور پہاڑ چلائے جائیں گے یہاں تک کہ وہ سراب ہو جائیں گے"۔

یہ مضبوط آسمان کھول دیا جائے گا۔ یہ دروازے ہی دروازے ہو گا یعنی پھٹ کر اس میں دراڑیں پڑ جائیں گی جیسا کہ دوسری سورتوں میں آیا ہے۔ یہ ایسی صورت حال ہوگی جس کا ہم پوری طرح تصور نہیں کر سکتے۔ بڑے بڑے پہاڑ چل پڑیں گے اور سراب بن جائیں گے۔ یعنی باہم ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور ہوا میں بکھر جائیں گے۔ اور یوں نظر آئے گا جس طرح سراب۔ جیسا کہ دوسری سورتوں میں آیا ہے۔ جس طرح سراب کا وجود نہیں ہو گا۔ اسی طرح پہاڑ غبار بن کر معدوم ہو جائیں گے اور یہ ذرات اس طرح روشنی کو منعکس کریں گے جس طرح سراب میں روشنی منعکس ہوتی ہے اور پانی نظر آتا ہے۔ غرض اس کائنات میں ہولناک تبدیلیاں ہوں گی۔ اور یہ انقلاب نفخ صور کے بعد ہو گا۔ یہ ہے فیصلے کا دن۔ یہ مقدر ہے اور اللہ کی حکمت و تدبیر سے اس میں سب واقعات ہوں گے۔

اب نفخ صور کے متصلاً رونما ہونے والے واقعات سے قدرے بعد میں آنے والے کچھ واقعات، نیکوکاروں اور بدکاروں کے فیصلے کی ایک جھلک۔ لیکن پہلے ان لوگوں کا فیصلہ سنایا جاتا ہے جو بدکار ہیں۔

إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿٢١﴾ لِّلطَّاغِينَ مَآبًا ﴿٢٢﴾ لَّابِثِينَ فِيهَآ
أَحْقَابًا ﴿٢٣﴾ لَّا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ﴿٢٤﴾ إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا ﴿٢٥﴾
جَزَآءً وِفَاقًا ﴿٢٦﴾ إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ﴿٢٧﴾ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۱
كِذَّابًا ﴿٢٨﴾ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا ﴿٢٩﴾ فَذُوقُوا فَلَن نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا ﴿٣٠﴾ ع ۳۰

"درحقیقت جہنم ایک گھات ہے' سرکشوں کا ٹھکانا' جس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔ اس کے اندر کسی ٹھنڈک ۱
اور پینے کے قابل کسی چیز کا مزہ نہ چکھیں گے' کچھ ملے گا تو بس گرم پانی اور زخموں کا دھوون' (ان کے کرتوتوں) کا بھرپور بدلہ۔ وہ کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے اور ہماری آیات کو انہوں نے بالکل جھٹلا دیا تھا' اور حال یہ تھا کہ ہم نے ہر چیز گن گن کر لکھ رکھی تھی۔ اب چکھو مزہ' ہم تمہارے لیے عذاب کے سوا کسی چیز میں ہرگز اضافہ نہ کریں گے"۔

جہنم کو پیدا کر دیا گیا ہے' یہ موجود اور تیار ہے اور ایک انسان کی طرح گھات میں بیٹھی انتظار کر رہی ہے اور یہ لوگ آتے ہیں اور اس میں گرتے ہیں اور وہ برابر ان کا استقبال کر رہی ہے' گویا زمین پر ان کی زندگی ایک سفر ہے اور یہ لوگ لوٹ رہے ہیں' اپنی اصلی جائے رہائش کی طرف' اور اس مرجع اور ماویٰ میں انہوں نے اب ابد الآباد تک رہنا ہے۔ یہ ایک طویل زندگی ہوگی اور زمانوں پر زمانے گزرتے چلے جائیں گے اور ان کی حالت یہ ہوگی۔

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا (۷۸ : ۲۴) "اس کے اندر وہ کسی ٹھنڈے پانی کا مزہ نہ چکھیں گے"۔ ہاں پینے کے لیے انہیں کچھ ملے گا ضرور۔ وہ کیا ہو گا؟ بہت ہی تلخ اور مکروہ۔

اِلَّا حَمِيمًا وَّغَسَّاقًا (۷۸ : ۲۵) "کچھ ملے گا تو بس گرم پانی اور زخموں کا دھوون"۔ سخت گرم پانی جس سے ان کے حلق اور پیٹ جل بھن جائیں گے۔ یہ ان کے لیے "ٹھنڈک" ہے اور غساق وہ پانی جو جلے ہوئے

لوگوں کے زخموں سے بہتا ہے یہ ہے ان کا مشروب۔

جَزَ آ ءً وِّفَاقًا ( ۷۸ : ۲۶ ) "بھرپور بدلہ"۔انہوں نے جو کچھ کمایا اور جو کچھ قیامت کے لیے ذخیرہ کر کے بھیجا اس کا پورا پورا بدلہ۔

اِنَّھُمْ کَانُوْ الَا یَرْجُوْ نَ حِسَابًا ( ۷۸ : ۲۷ ) "وہ کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے"۔اور نہ نیک و بد کے انجام کے واقع ہونے میں یقین رکھتے تھے۔

وَّ کَذَّبُوْ ا بِاٰیٰتِنَا کِذَّ ابًا ( ۷۸ : ۲۸ ) "اور ہماری آیات کو انہوں نے جھٹلا دیا تھا"۔ان الفاظ کے ترنم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تکذیب میں شدید تھے اور تکذیب پر مصر تھے۔حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا ریکارڈ تیار کر رہا تھا۔اور یہ اس قدر کامل و شامل ریکارڈ تھا کہ اس سے کوئی بڑی چھوٹی چیز چوک نہ سکتی تھی۔

وَ کُلُّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰہُ کِتٰبًا ( ۷۸ : ۲۹ ) "اور حال یہ تھا کہ ہم ہر چیز گن گن کر لکھ رہے تھے"۔اس لیے اب یہاں ان کو سخت ملامت کی جاتی ہے۔

فَذُوْقُوْ ا فَلَنْ نَّزِیْدَ کُمْ اِلَّا عَذَابًا ( ۷۸ : ۳۰ ) "اب چکھو مزہ' ہم تمہارے لیے عذاب کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کریں گے"۔

اب مقابل کا منظر پیش ہوتا ہے۔یہ اہل تقویٰ اور ان نعمتوں کا منظر ہے جس میں وہ مزے سے رہ رہے ہیں۔ باغیوں اور نافرمانوں کے بعد یہ بھی ضروری تھا کہ ایک جھلک ان کی بھی دکھا دی جائے۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾ حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا ﴿۳۲﴾ وَّ کَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿۳۳﴾
وَّ کَاْسًا دِهَاقًا ﴿۳۴﴾ لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّ لَا کِذّٰبًا ﴿۳۵﴾ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ
عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾

"یقیناً متقیوں کے لیے کامرانی کا ایک مقام ہے' باغ اور انگور' اور نوخیز ہم سن لڑکیاں اور چھلکتے ہوئے جام۔وہاں کوئی لغو اور جھوٹی بات وہ نہ سنیں گے۔جزاء اور کافی انعام تمہارے رب کی طرف سے"۔

پہلے منظر میں جہنم آراستہ و پیراستہ تھی۔کفار کے ٹھکانے کے طور پر اور وہ یوں گھات میں تیار بیٹھی تھی جس طرح ایک شکاری گھات میں بیٹھتا ہے۔اور ایک ایک کو شکار کرتا ہے۔اسی طرح جہنم سے بھی کوئی بچ کر نہ نکل سکتا تھا۔اس منظر میں یوں نظر آتا ہے کہ اہل جنت نجات اور کامیابی کے مقام پر فائز ہو چکے ہیں۔اور یہ نجات اور کامیابی کی جگہ۔

حَدَآئِقَ وَاَعۡنَابًا (۷۸ : ۳۲) "باغ اور انگور"۔ کی صورت میں ہے۔ اور انگور کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لیے لیا گیا ہے کہ قرآن کریم کے مخاطب اس سے اچھی طرح واقف تھے۔ کواعب کے معنی ہیں ایسی نوخیز نوجوان لڑکیاں جن کے پستان گول ہوں اور اتراب کے معنی ہیں حسن و جمال اور ماہ و سال کے لحاظ سے ہم سن۔

وَّكَاۡسًا دِهَاقًا (۷۸ : ۳۴) "اور جھلکتے ہوئے جام" یعنی لبریز۔

ان انعامات کی ظاہری شکل و صورت حسی ہے اور ان کا ذکر جن چیزوں کا نام لے کر کیا گیا ہے وہ اس لیے تاکہ مفہوم لوگوں کے فہم کے قریب آ جائے۔ رہی ان کی حقیقت تو اہل زمین کے لیے اس کا ادراک ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کی فہم و ادراک زمین کے تصورات کے اندر مقید ہے اور ان کے عمومی اور معنوی حالات اسلامی ذوق و ضمیر کے مطابق ہوں گے۔ ایک مسلمان ان کا شعور رکھتا ہے کہ۔

لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا وَّلَا كِذّٰبًا (۷۸ : ۳۵) "وہاں کوئی لغو اور جھوٹی بات وہ نہ سنیں گے"۔ یعنی وہ ایسی زندگی بسر کر رہے ہوں گے کہ اس میں کوئی لغو بات نہ ہوگی۔ اور اس میں کوئی جھوٹ نہ ہوگا کیونکہ جھوٹ پر بالعموم جنگ و جدال کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے وہاں حقائق کھلے ہوں گے اور کسی کو بحث و مباحثے کا موقعہ نہ ہوگا۔ نہ ایسی باتیں وہاں ہوں گی جو بے فائدہ ہوں اور ان میں کوئی بھلائی نہ ہو۔ یہ صورت حالات اس جہان کے لیے مناسب ہے جو دارالخلد ہے۔

جَزَآءً مِّنۡ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا (۷۸ : ۳۶) "جزاء اور کافی انعام تمہارے رب کی طرف سے"۔ یہاں انداز تعبیر کی رعنائی اور پر ترنم آواز اور جزاء اور عطا کی تقسیم قابل ملاحظہ ہے۔ اور فواصل اور قوافی میں شدت اور صوتی ہم آہنگی اس پورے پارے میں ایک مخصوص انداز ہے اور بہت ہی خوبصورت۔

اس دن کے مناظر جس کے بارے میں سوال کرنے والے سوال کرتے ہیں جس کے بارے میں اختلاف کرنے والے اختلاف کرتے ہیں اب ختم ہوتے ہیں اور ان کے خاتمے پر لفظی اور معنوی اعتبار سے خوبصورت منظر ملاحظہ کیجئے، جس میں جبرئیل علیہ السلام اور دوسرے فرشتے صف بستہ کھڑے ہیں۔ یہ سب رحمن کے سامنے کھڑے ہیں، ان میں سے صرف وہی بات کر سکتا ہے جسے اجازت ہو۔ ایک ہیبت ناک اور خوفناک موقف ہے۔

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا الرَّحۡمٰنِ لَا يَمۡلِكُوۡنَ مِنۡهُ خِطَابًا ۝ يَوۡمَ يَقُوۡمُ الرُّوۡحُ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۗ لَّا يَتَكَلَّمُوۡنَ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَهُ الرَّحۡمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝

"اس نہایت مہربان خدا کی طرف سے جو زمین اور آسمانوں اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا مالک ہے، جس کے

سامنے کسی کو بولنے کا یارا نہیں ۔ جس روز روح اور ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے 'کوئی نہ بولے گا سوائے اس کے جسے رحمن اجازت دے اور جو ٹھیک بات کہے"۔

یہ جزاء و سزا جو اہل تقویٰ اور اہل ضلالت کے لیے 'اس سے قبل مفصل طور پر بیان ہوئی 'یہ تیرے رب کی طرف سے ہے ۔ اور

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ (۳۷:۷۸) ہے (اس نہایت مہربان خدا کی طرف سے جو زمین اور آسمانوں اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا مالک ہے) اس آخری ٹچ اور اس عظیم حقیقت کے بیان کے لیے اب یہ مناسب وقت ہے 'یعنی یہ کہ اللہ کی ربوبیت زمین و آسمانوں پر حاوی ہے 'اس کے اندر یہ دنیا بھی ہے اور آخرت بھی ہے ۔ یہ اہل تقویٰ کو جزاء دیتی ہے اور اہل ضلالت اور بدکاروں کو سزا دیتی ہے اور دنیا و آخرت کے تمام فیصلے اللہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں ۔ پھر یہ ربوبیت نہایت رحیمانہ ہے ۔ یہ جزاء بھی اس کی رحمت کا نتیجہ ہے اور سزا بھی اس کی رحمت کا تقاضا ہے ۔ یہ اس کی رحمت ہی کا تقاضا ہے کہ سرکشوں کو جہنم میں جلایا جائے ۔ کیونکہ یہ عین رحمت ہے کہ شر کو سزا ملے اور خیر و شر برابر نہ ہوں ورنہ یہ تو ظلم ہو گا ۔

پھر یہ رحمت اپنے اندر جلال لیے ہوئے ہے ۔ اس خوفناک دن میں اس دربار رحمت میں کوئی بات نہ کر سکے گا ۔ جبرئیل علیہ السلام اور دوسرے سربر آوردہ فرشتے بھی صف بستہ خاموش کھڑے ہوں گے ۔ صرف اجازت سے کچھ عرض کرتا ہو گا اور بات ہوگی ۔ لیکن بات بھی درست ہوگی ورنہ رحمٰن تو دل کی بات جانتا ہے 'بری بات کہنے کی اجازت ہی نہ ہوگی ۔

یہ منظر کہ بے گناہ لوگ اور سرکردہ فرشتے بھی اس بارگاہ میں خاموش کھڑے ہیں 'کوئی شخص بات بھی نہیں کرتا' سما ہوا کھڑا ہے 'فضا پر رعب' خوف' جلالت اور وقار کے گہرے بادل پھیلا دیتا ہے ۔ ایسے حالات میں جبکہ خوف کے بادل چھائے ہوئے ہوں' دنیا کے غافلوں اور بری راہوں پر سرپٹ بھاگنے والوں کو ایک بار پھر ڈرایا جاتا ہے' ایک زبردست چیخ آتی ہے اور مدہوش لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ۝ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ
عَذَابًا قَرِيْبًا ۚۖ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَ يَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ ۲
كُنْتُ تُرٰبًا ۝ ع۱۰
۲

"وہ دن برحق ہے 'اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف پلٹنے کا راستہ اختیار کر لے ۔ ہم نے تم لوگوں کو اس عذاب سے ڈرا دیا ہے جو قریب آ لگا ہے ۔ جس روز آدمی وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے' اور کافر پکار اٹھے گا کہ کاش وہ خاک ہوتا"۔

یہ ایک شدید جھٹکا ہے 'ان لوگوں کو نہایت شدت سے جھنجھوڑا جاتا ہے جو اس حق دن کے بارے میں شک میں مبتلا

تھے اور تشکیک پر مشتمل سوالات کرتے تھے ۔

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ (۷۸ : ۳۹) ”وہ دن برحق ہے“۔ لہٰذا اس کے بارے میں شکی سوالات کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ لوگو! ابھی فرصت کے اوقات موجود ہیں ‘ مہلت ملی ہوئی ہے ۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ ۔

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا (۷۸ : ۳۹) ”جس کا جی چاہے وہ رب کی طرف راستہ لے“۔ قبل اس کے کہ جہنم گھات لگا کر بیٹھے اور تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لے ۔

یہ سخت ڈراوا ہے ۔ اگر کوئی خواب خرگوش میں بھی ہو ‘ وہ بھی بیدار ہو سکتا ہے ۔

اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا (۷۸ : ۴۰) ”ہم نے تم لوگوں کو اس عذاب سے ڈرایا جو قریب آ لگا ہے“۔ وہ دور نہیں ہے ۔ یہ جہنم کا عذاب ہے جو تمہارے انتظار میں ہے ۔ جیسا کہ اس منظر میں تم نے دیکھ لیا ۔ یہ دنیا تو ایک مختصر سفر ہے اور عمر کی کشتی ساحل پر لگنے ہی والی ہے ۔

یہ اس قدر شدید عذاب ہو گا کہ کافر اپنے وجود ہی سے بیزار ہو گا اور اس بات کو پسند کرے گا کہ اے کاش اسے معدوم ہی کر دیا جائے۔

يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِىْ كُنْتُ تُرٰبًا (۷۸ : ۴۰)

”جس روز آدمی وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور کافر پکار اٹھے گا کہ اے کاش میں خاک ہوتا“۔ یہ وہ نہایت تنگ دل اور مایوسی سے کہے گا۔

اب فضا پر خوف اور ندامت کے بادل چھا جاتے ہیں کہ زندہ انسان یہ خواہش رکھتا ہے کہ وہ معدوم ہو جائے اور خاک و غبار بن جائے ۔ وہ اپنے معدوم ہونے ہی کی صورت میں اپنے آپ کو اس خوفناک عذاب سے بچا سکتا ہے ۔ یہ ہو گا ان لوگوں کا موقف جو آج اس عظیم حقیقت اور رشہ سرخیوں والی حقیقت کے بارے میں تشکیک پر مشتمل سوالات کرتے ہیں اور شبہات اٹھاتے ہیں ۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ -- ۳۰

## سورۃ النزعٰت ۔ ۷۹

## ۱ -- تا -- ۴۶

# سورۃ النزعت ایک نظر میں

یہ سورت بھی اس پارے کا ایک ممتاز نمونہ ہے۔اس کا مرکزی مضمون قیامت کے شعور کو پختہ اور بیدار کرنا ہے۔ قیام کے عظیم واقعات 'اس کی سنجیدگی 'اس کی ضخامت اور اس کی ہولناکیاں بتائی گئی ہیں اور یہ بھی ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ اس زمین کے اوپر انسانوں کی تخلیق اور انسانوں کے مراحل حیات کی تدبیر اور زمین کے اندر اور باہر زندگی کی نشوونما اور مراحل سب اس بات پر شاہد ہیں کہ قیام قیامت ایک حقیقت ہے اور اللہ کے ہاں اصل مقصود ہے۔یہ اس کائنات کا انجام ہے اور تمام تخلیقات اس لیے ہوئی ہیں کہ وہ اس انجام تک جاکر پہنچیں۔

اس عظیم حقیقت اور ہولناک واقعہ کو ذہن میں بٹھانے اور اس کے متعلق انسانی شعور کو بیدار کرنے کی خاطر ایک ایسا اسلوب بیان اختیار کیا گیا جس میں قلب و نظر کی تاروں کو خوب چھیڑا گیا ہے اور انسانی ادراک اور شعور پر اس قدر اثرات ڈالے گئے ہیں کہ انسانی احساس اور شعور اسے قبول کرنے کے لیے بخوبی تیار ہو جاتا ہے وہ قیامت کے حوالے سے حساس اور بیدار ہو جاتا ہے اور اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔

بات کی ابتداء ایک زوردار مگر مجمل اور غامض پیراگراف سے ہوتی ہے' جسے پڑھ کر انسان پر خوف اور تجسس کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔انسان نہایت ہی موثر مترنم اور کپکپا دینے والے انداز کلام میں بہتا چلا جاتا ہے۔یہ آغاز اس قدر رعب دار' اس قدر اچانک 'اس قدر خوبصورت ہے کہ ایک لمحے کے لیے تو سانس رک جاتی ہے۔نظریں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ذرا ملاحظہ کیجئے۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا (١) وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا (٢) وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا (٣) فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا (٤) فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (٥) (٧٩: ١ تا ٥) ''قسم ہے ان کی جو ڈوب کر کھینچتے ہیں اور آہستگی سے نکال لے جاتے ہیں اور جو تیزی سے تیرتے پھرتے ہیں' پھر سبقت کرتے ہیں' پھر حالات کا انتظام چلاتے ہیں۔

اس غامض 'مجمل اور لرزہ براندام کرنے والے خوفناک آغاز کلام کے بعد اصل موضوع یعنی قیامت کا پہلا منظر پیش کیا جاتا ہے۔اس منظر کی فضا اور ماحول بھی وہی انداز رکھتا ہے جو اس مطلع کی ہے۔گویا آغاز کلام اور مطلع اس منظر کا فریم اور کور ہے۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ (٦) تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ (٧) قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ (٨) اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ (٩) يَقُوْلُوْنَ ءَ اِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ (١٠) ءَ اِذَا كُنَّا

عِظَامًا نَّخِرَةً (۱۱) قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ (۱۲) فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ (۱۳) فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ (۱٤) (۷۹: ٦ تا ۱٤) "جس روز ہلا مارے گا زلزلے کا جھٹکا اور اس کے پیچھے اور جھٹکا پڑے گا 'کچھ دل ہوں گے' جو اس روز خوف سے کانپ رہے ہوں گے ' نگاہیں ان کی سہمی ہوئی ہوں گی ۔ یہ لوگ کہیں گے "کیا واقعی ہم پلٹا کر پھر واپس لائے گئے ہیں؟ جب کہ ہم کھوکھلی بوسیدہ ہڈیاں بن چکے تھے؟" کہیں گے "یہ واپسی تو پھر بڑے گھاٹے کی ہے" ۔ حالانکہ یہ بس اتنا کام ہے کہ ایک زور کی ڈانٹ پڑے گی اور یکایک یہ کھلے میدان میں موجود ہوں گے" ۔

اس لرزا دینے والے اور دہشت زدہ کر دینے والے خوفناک منظر کے بعد اب انسانی تاریخ میں گزرے ہوئے مکذبین کے انجام بد کا ایک منظر ۔ یہ قصہ فرعون و کلیم کا نہایت ہی موثر مترنم منظر ہے اور اس میں فضا کی خوفناکی اور دہشت کو ذرا کم کیا گیا ہے تاکہ انداز بیان حکایتی اور بیانیہ شکل و صورت اختیار کر لے ۔

هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى (۱۵) اِذْ نَادٰهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (۱٦) اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۱۷) فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى (۱۸) وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (۱۹) فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى (۲۰) فَكَذَّبَ وَعَصٰى (۲۱) ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى (۲۲) فَحَشَرَ فَنَادٰى (۲۳) فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۲٤) فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (۲۵) اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى (۲٦)

(۷۹: ۱۵ تا ۲٦) "کیا تمہیں موسیٰ کے قصے کی خبر پہنچی ہے؟ جب اس کے رب نے اسے طویٰ کی مقدس وادی میں پکارا تھا کہ "فرعون کے پاس جا' وہ سرکش ہو گیا ہے' اور اس سے کہہ کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو (اس کا) خوف تیرے اندر پیدا ہو؟" پھر موسیٰ نے (فرعون کے پاس جا کر) اس کو بڑی نشانی دکھائی 'مگر اس نے جھٹلا دیا اور نہ مانا' پھر چال بازیاں کرنے کے لیے پلٹا اور لوگوں کو جمع کر کے اس نے پکار کر کہا "میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں" ۔ آخر کار اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا ۔ درحقیقت اس میں بڑی عبرت ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے" ۔ یوں اس عظیم حقیقت کے لیے یہ قصہ بھی تمہید قرار پاتا ہے ۔

اب وادی تاریخ سے نکل کر ہم اس کائنات کے وسیع میدان میں داخل ہوتے ہیں ۔ ہمارے سامنے اس کائنات کے ہولناک مناظر ہیں ۔ یہ مناظر اس بات کے لیے شاہد عادل ہیں کہ اس کے پیچھے ایک دست قدرت اور گہری قوت مدبرہ کام کر رہی ہے اور ایک عظیم اللہ العالمین ہے جس نے اس ناپید کنار کائنات کو پیدا کیا ۔ جو اس کے انجام کو کنٹرول کرنے والا ہے ۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ۔ ان مناظر کو نہایت ہی موثر مناظر کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور انداز بیان

نہایت ہی زور دار ہے اور سورت کا آغاز اور اس کا انجام پرتاثیر انداز گفتگو کے عین مطابق :

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا (۲۷) رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا (۲۸) وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا (۲۹) وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا (۳۰) اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا (۳۱) وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا (۳۲) مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (۳۳)

(۷۹ : ۲۷ تا ۳۳) "کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی؟ اللہ نے اس کو بنایا' اس کی چھت خوب اونچی اٹھائی پھر اس کا توازن قائم کیا' اور اس کی رات ڈھانکی اور اس کا دن نکالا۔ اس کے بعد زمین کو اس نے بچھایا' اس کے اندر سے اس کا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑ اس میں گاڑ دیئے۔ سامان زیست کے طور پر تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے"۔

بات کو ذہن کے قریب کرنے کے لیے یہ تمہیدی باتیں کی گئیں اور یہ دل پر اثرانداز ہونے والے دلائل و اشارات دیئے گئے۔ اب وہ مقصد' ہنگامہ عظیم کا منظر پیش کیا جاتا ہے جو موضوع سورت ہے اور بتایا جاتا ہے کہ لوگوں نے دنیا میں جو رویہ اختیار کیا' اس کا انجام کیا ہو گا۔ یہ جزاء و سزا تو آخرت میں عملی شکل اختیار کریں گے لیکن ان کی تصویر کشی ایسے انداز میں کی گئی ہے جو قیامت کے ہنگامہ عظیم سے مماثلت رکھتی ہے۔

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى (۳۵) وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى (۳۶) فَاَمَّا مَنْ طَغٰى (۳۷) وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (۳۸) فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى (۳۹) وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (۴۰) فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (۴۱)

(۷۹ : ۳۴ تا ۴۱) پھر جب وہ ہنگامہ عظیم برپا ہو گا' جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا' اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی' تو جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی' دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہو گی۔ اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا' جنت اس کا ٹھکانا ہو گی"۔

اس ہنگامہ عظیم کے مناظر پیش کرنے سے ذہن انسانی میں جو شعور اور جو وجدان جاگزیں ہوتا ہے' جہنم دیکھنے والوں کو صاف نظر آتی ہے۔ ان لوگوں کا انجام بھی صاف نظر آتا ہے جنھوں نے دنیا کی زندگی کو ترجیح دی۔ اپنے رب سے ڈرے اور نفس کو خواہشات سے روکا' ان سب امور کے بعد اب ان لوگوں کو شدید دھمکی دی جاتی ہے جو اس عظیم ہنگامہ خیز حقیقت کی تکذیب کرتے ہیں' جس کے وقت کے بارے میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار سوالات کرتے ہیں' یہ دھمکی ایسے انداز میں ہے کہ اس سے اس عظیم حادثہ کی ضخامت اور عظمت اور خوفناکی ذہن میں

اچھی طرح بیٹھ جاتی ہے۔

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا (٤٢) فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا (٤٣) اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا (٤٤) اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا (٤٥) كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا (٤٦) (٧٩: ٤٢ تا ٤٦) "یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ "آخر وہ گھڑی کب آکر ٹھہرے گی؟" تمہارا کیا کام کہ اس کا وقت بتاؤ۔ اس کا علم تو اللہ پر ختم ہے۔ تم صرف خبردار کرنے والے ہو۔ ہر اس شخص کو جو اس کا خوف کرے۔ جس روز یہ لوگ اسے دیکھ لیں گے تو انہیں یوں محسوس ہو گا کہ (دنیا میں یا حالت موت میں) یہ بس ایک دن کے پچھلے پہر یا اگلے پہر تک ٹھہرے ہیں"۔

ان آیات میں ہائے ممدودہ بطور قافیہ لائی گئی ہے یہ انسان کے شعور پر طویل و وسیع اثرات چھوڑتی ہے۔ جس سے ایک طرف اس ہنگامہ خیز واقعہ کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری طرف اس واقعہ سے انسان اچھی طرح ڈر جاتا ہے۔

---000---

# درس نمبر ۲۷۹ تشریح آیات

## ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۴۶

سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ (۷۹) مَكِّيَّةٌ (۸۱) اٰيَاتُهَا ۴۶ رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۝۱ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝۲ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۝۳ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝۴ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝۵

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"قسم ہے ان کی جو ڈوب کر کھینچتے ہیں' اور آہستگی سے نکال لے جاتے ہیں' اور تیزی سے تیرتے پھرتے ہیں' پھر سبقت کرتے ہیں' پھر معاملات کا انتظام چلاتے ہیں"۔

ان کلمات کی تفسیر میں یہ کہا گیا ہے کہ ان سے مراد فرشتے ہیں' یعنی وہ جو انسانوں کی ارواح کو نہایت شدت سے کھینچتے ہے۔ ناشطات کے معنی ہیں چست اور کام کے لیے تیار ہیں۔ اور اس کائنات کے اطراف و اکناف میں تیرتے پھرتے ہیں۔ اور جو رب تعالیٰ کی اطاعت اور احکام کی بجا آوری میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں اور اس کائنات کے تمام امور کے انتظام اور انصرام میں لگے ہوئے ہیں۔

دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ ان سے مراد ستارے ہیں جو اپنے مداروں اور کائنات کی فضاؤں میں ڈوب جاتے ہیں اور پھر نکلتے ہیں۔ بڑی تیزی سے گردش کرتے ہیں۔ ایک منزل سے دوسری میں داخل ہوتے ہیں۔ اس فضائے کائنات میں وہ معلق ہیں۔ اور رفتار میں بعض تیز ہیں اور بعض سست۔ لہٰذا ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں اور دست قدرت نے ازروئے فطرت ان کو جو احکامات دیئے ہیں وہ سرانجام دیتے ہیں' اور زمین اور اس کے باشندوں کو متاثر کرتے ہیں' یوں وہ اس زمین کا انتظام و انصرام کرتے ہیں۔

بعض تفاسیر کے مطابق نازعات' ناشطات' سابحات اور سابقات سے مراد ستارے ہیں اور مدبرات سے مراد فرشتے

ہیں اور بعض حضرات نے یہ تفسیر بیان کی ہے کہ نازعات ' ناشطات اور سابحات سے مراد ستارے ہیں اور سابقات اور مدبرات سے مراد ملائکہ ہیں ۔

ان آیات و کلمات کا مفہوم جو بھی ہو ' لیکن قرآنی فضا میں زندگی بسر کرتے ہوئے میرا احساس یہ ہے کہ اس پیرائے میں گفتگو اور ان الفاظ کے لانے سے مراد انسانی احساس کو بیدار کرنا ' انسانی شعور کے اندر تجسس اور آنے والے پرخطر اور ہنگامہ خیز حالات کے بارے میں خبردار اور بیدار کرنا ہے ۔ یہ الفاظ اور یہ مفہوم ہمیں اس بات کے لیے تیار کرتے ہیں کہ آگے جو بات آرہی ہے وہ ایک عظیم واقعہ ہے ' جسے الطامۃ الکبریٰ راجفہ اور رادفہ کے الفاظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ۔ اگر ہم ان الفاظ کے تفصیلی معانی میں نہ الجھیں کہ ان سے حقیقی مراد کیا ہے ؟ تو اس طرح ہم قرآن کریم کے فطری انداز پر اکتفا کر کے زیادہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ قرآن کریم کا حقیقی ہدف یہ ہے کہ وہ دلوں کو ہلائے اور گرمائے اور اس مقصد کے لیے قرآن کریم موثر سے موثر اسلوب اختیار کرتا ہے ۔ ہمارے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کا انداز مطالعہ بھی ہے ۔ آپ سورہ عبس و تولی پڑھ رہے تھے جب

وَّ فَاكِهَةً وَّاَبًّا ( ۸۰ : ۳۱ ) تک پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ " فاکھہ " تو ہمیں معلوم ہے لیکن " ابا " کیا ہے ۔ اور اس کے بعد کہا ' اے عمر تیری جان کی قسم ' یہ محض تکلف ہوگا ۔ اگر تم اللہ کی کتاب کے مفہوم میں سے کسی بات کو نہ سمجھو تو کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی ۔ اور ایک دوسری روایت میں انہوں نے فرمایا کہ یہ سب کچھ ہم جانتے ہیں ۔ اگر ہم " اب " کا مفہوم نہ جانیں تو کیا ہے ؟ اس کے بعد انہوں نے اس عصا کو توڑ دیا جو ان کے ہاتھ میں تھا ' اور پھر کہا عمر یہ تو محض تکلف ہے عمر کی ماں کے بیٹے کیا ہو جائے گا اگر تو " اب " کے مفہوم کو نہ جانے ۔ " لوگو ' قرآن میں سے جو تم جانتے ہو ' اس پر عمل کرو اور جو نہیں جانتے اسے چھوڑ دو " ۔ یہ ایسی بات ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام قرآن کریم کے سامنے کس قدر سہمے رہتے تھے اور کس قدر احترام کرتے تھے ۔ جس طرح ایک بندہ اپنے مالک کے احکام کا احترام کرتا ہے اور فوراً تعمیل کرتا ہے ۔ قرآن کریم کے کچھ کلمات اگر مغلق اور غامض ہوں تو بھی ان کا ایک مقصد ہوتا ہے ۔

مطلع میں جن باتوں پر قسم اٹھائی گئی ہے اس کا جواب درج ذیل آیات ہے یعنی جواب قسم کی ان الفاظ میں تصویر کشی کی گئی ہے ۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝٦ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝٧ قُلُوْبٌ يَّوْمَىِٕذٍ وَّاجِفَةٌ ۝٨ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝٩ يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ۝١٠ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝١١ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝١٢ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝١٣ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۝١٤

" جس روز ہلا مارے گا ' زلزلے کا جھٹکا اور اس کے پیچھے ایک اور جھٹکا پڑے گا ' کچھ دل ہوں گے جو اس روز خوف

سے کانپ رہے ہوں گے ' نگاہیں ان کی سہمی ہوئی ہوں گی ۔ یہ لوگ کہیں گے "کیا واقعی ہم پلٹا کر پھر واپس لائے گئے ہیں؟ جب کہ ہم کھوکھلی بوسیدہ ہڈیاں بن چکے تھے؟" کہیں گے "یہ واپسی تو پھر بڑے گھاٹے کی ہے"۔ حالانکہ یہ بس اتنا کام ہے کہ ایک زور کی ڈانٹ پڑے گی اور یکایک یہ کھلے میدان میں موجود ہوں گے"۔

پہلے جھٹکے سے مراد زمین پر طاری ہونے والا جھٹکا ہے کیونکہ دوسری جگہ رجف کی نسبت صراحۃ زمین کی طرف کی گئی ہے ۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ "جب زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے"۔ رادفہ سے مراد' مطابق روایات آسمان کا لرزنا ہے ۔ یعنی زمین کے لرز اٹھنے کے بعد آسمان بھی لرز اٹھے گا۔ یہ پھٹ جائے گا' اور اس کے ستارے بکھر جائیں گے ۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ راجفہ سے مراد پہلا صور ہے ۔ پہلا صور جب سخت آواز نکالے گا تو زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے ' زمین کے اوپر درندے چرندے انسان سب لرز اٹھیں گے اور اس کے بعد زمین و آسمان کی تمام مخلوق بیہوش ہو جائے گی ۔ اور رادفہ سے مراد دوسرا صور ہے 'جس کے نتیجے میں تمام مخلوق زندہ ہو کر زمین سے اگ پڑے گی اور میدان حشر برپا ہو جائے گا جس طرح سورہ زمر آیت ۶۸ میں آیا ہے ۔

بہرحال جو مفہوم بھی ہو' انسانی شعور کے پردہ پر ایک زلزلہ برپا ہوتا ہے اور انسان پر اس تصویر کشی سے ایک خوف اور اضطراب پیدا ہو جاتا ہے ۔ اور مارے خوف کے انسان تھر تھر کانپنے لگتا ہے ۔ یوں انسانی شعور اس دن کے خوف و ہراس کو سمجھنے کے قریب ہو جاتا ہے کہ اس دن اس قدر خوف اور اضطراب ہو گا کہ مضبوط سے مضبوط شخص کے قدم اکھڑ جائیں گے اور وہ بے قرار ہو جائے گا۔ انسان اس بات کو پالیتا ہے کہ اس آیت کا مفہوم کیا ہے ۔

قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ (۸) اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ (۷۹ : ۹) "کچھ دل ہوں گے جو اس روز خوف کے مارے کانپ رہے ہوں گے ' نگاہیں ان کی سہمی ہوئی ہوں گی"۔ کیونکہ یہ دل شدید اضطراب میں مبتلا ہوں گے ' ان پر ذلت چھائی ہوئی ہو گی ۔ خوف ' دہشت اور ٹوٹ پھوٹ کے آثار ان پر نمایاں ہوں گے ۔ زلزلہ ہو گا اور تباہی کا سماں ہر طرف نمایاں ہو گا۔ اور ایسا ہی ٹوٹ پھوٹ اس دن زمین اور آسمان کے نظام میں ہو گا۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ (٦) تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ (۷۹ : ۷) اور یہی سماں اور یہی منظر ان الفاظ و کلمات سے بھی ظاہر ہوتا ہے جن کے ساتھ قسم کھائی گئی ۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا (١) وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا (٢) وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا (٣) فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا (٤) فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (٥) (۷۹ : ۱ تا ۵) یہ تمام مناظر (دل کی دنیا کے 'اس زمین و آسمان کے اور ان قسمیہ کلمات کے ) سب کی فضا' سائے اور اثرات ہم رنگ اور ہم آہنگ ہیں ۔ غرض یہ پوری سورت ایک ہنگامہ عظیم کے انداز میں ہے ۔

اب اس منظر کے بارے میں خود ان کے تاثرات یہاں نقل کیے جاتے ہیں کہ جب دوسرا صور پھونکے جانے کے بعد یہ ناگہاں اٹھیں گے اور سخت حیران ہو جائیں گے۔

يَقُوْلُوْنَ ءَ اِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ (۱۰) ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً

(۷۹ : ۱۱) "یہ لوگ کہیں گے 'کیا ہم واقعی پلٹا کر واپس لائے جا چکے ہیں؟ جبکہ ہم کھوکھلی بوسیدہ ہڈیاں ہو چکے تھے"۔ یہ گفتگو وہ اس وقت کر رہے ہوں گے 'جب پہلے پہل حشر کے میدان میں اٹھیں گے۔ کہا جاتا ہے۔

رَجَعَ فِي حَافِرَتِه "یعنی اس راستے سے گیا جس سے آیا تھا"۔ یہ گفتگو وہ مدہوشی اور حیرانی میں کریں گے کہ آیا وہ دوبارہ اسی زندگی میں آگئے ہیں۔ وہ حیران ہوں گے کہ ہم بوسیدہ ہڈیاں ہونے کے باوجود کس طرح زندہ انسان بن گئے۔

نَّخِرَةً (۷۹ : ۱۱) ان ہڈیوں کو کہتے ہیں جو اندر سے خالی ہو گئی ہوں اور ان کے اندر جب ہوا چلتی ہے تو سرسر کی آواز آ رہی ہو۔ لیکن جب وہ ذرا ہوش میں آئیں گے اور ان کے حواس بحال ہوں گے تو انہیں معلوم ہو گا کہ وہ تو فی الواقعہ زندہ کر دیے گئے ہیں لیکن یہ تو اخروی زندگی ہے۔ اب ان کو اپنے خسارے اور نقصان کا اندازہ ہو جائے گا۔ اب ان کا تبصرہ یہ ہو گا۔

قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ (۷۹ : ۱۲) "کہیں گے 'یہ واپسی تو پھر بڑے گھاٹے کی ہے"۔ یہ ایک ایسی زندگی ہے جس کو انہوں نے کوئی اہمیت نہ دی۔ اس کے لیے کوئی توشہ انہوں نے جمع کر کے نہ بھیجا اور اب تو کمائی کی جگہ نہیں ہے لہٰذا خسارہ ہی خسارہ ان کا مقدر ہے۔
ایسے حالات میں قرآن کریم بتاتا ہے کہ قیام قیامت کا یہ ہنگامہ عظیم بسہولت برپا کر دیا جائے گا اور اس کی حقیقت تو بس اتنی ہی ہے۔

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ (۱۳) فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ (۷۹ : ۱٤) "حالانکہ یہ بس اتنا کام ہے کہ ایک زور کی ڈانٹ پڑے گی اور یکایک یہ کھلے میدان میں موجود ہوں گے"۔ الزجر کے معنی ہیں تیز آواز۔ یعنی الصیحہ۔ لیکن یہاں الصیحہ کی بجائے الزجرۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے کیونکہ یہ لفظ اس سورت کی فضا اور ماحول کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔ یہاں ماحول شدت اور سختی کا ہے۔ ساھرہ سفید اور چمکدار زمین کو کہتے ہیں۔ مراد میدان حشر ہے۔ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ یہ میدان کہاں ہو گا۔ اس کے بارے میں ہماری معلومات مخبر صادق کی فراہم کردہ معلومات تک محدود ہیں۔ لہٰذا اس کے بارے میں ہم اس سے زیادہ کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتے کیونکہ مخبر صادق کے علاوہ کوئی بات وثوق اور محفوظ طریقے سے نہیں کی جا سکتی۔
اس ڈانٹ سے مراد' مطابق نصوص قرآن و سنت' دوسرا نفخ صور ہے 'جس کے ہوتے ہی تمام لوگ اپنی اپنی جگہ

اور اپنی قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے' جو الفاظ اس کے لیے چنے گئے ہیں' ان سے اس عمل کی سرعت معلوم ہوتی ہے کہ یہ عمل نہایت تیزی سے ہو گا۔ اس پوری سورت کے بیان کردہ واقعات سرعت اور خوف کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی سرعت اور خوف کی وجہ سے دلوں پر کپکپی اور جسموں پر لرزہ طاری ہو گا۔ اس سورت کی ہر حرکت' ہر لمحہ اور ہر منظر اور فضا میں ہم آہنگی کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

اب اگلے مرحلے میں تیزی' حرکت اور خوف کی یہ فضا قدرے تھم جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں قصہ موسیٰ و فرعون کی طرف مختصراً اشارات ہیں۔ اس میں اس سرکشی کا انجام دکھایا گیا ہے' اس لیے بیان میں قدرے سکون اور نرمی آجاتی ہے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿۱۵﴾ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ
طُوًى ﴿۱۶﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾
وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾ فَكَذَّبَ وَ
عَصٰى ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ ۱
فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَ الْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۲۶﴾ ع ۲۶

"کیا تمہیں موسیٰ کے قصے کی خبر پہنچی ہے؟ جب اس کے رب نے اسے طویٰ کی مقدس وادی میں پکارا تھا کہ ۳
"فرعون کے پاس جا وہ سرکش ہو گیا ہے' اور اس سے کہہ کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو (اس کا) خوف تیرے اندر پیدا ہو؟" پھر موسیٰ نے (فرعون کے پاس جا کر) اس کو بڑی نشانی دکھائی' مگر اس نے جھٹلا دیا اور نہ مانا؟ پھر چال بازیاں کرنے کے لیے پلٹا اور لوگوں کو جمع کر کے اس نے پکار کر کہا "میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں"۔ آخر کار اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا۔ درحقیقت اس میں بڑی عبرت ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ قرآن کریم میں بار بار آیا ہے۔ اور اس کی بہت تفصیلات دی گئی ہیں۔ اس سے قبل کی سورتوں میں اس کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔ ہر جگہ اس قصے کا حصہ آیا ہے۔ مختلف انداز اور مختلف اسلوب بیان میں آیا ہے۔ ہر جگہ قصے کا وہ حصہ اور اس انداز میں آیا ہے' جس کی ضرورت ہو اور جو موضوع و محل کے مناسب ہو۔ اس قصے کے بیان میں قرآن کریم کا اسلوب بیان اپنے عروج پر ہوتا ہے اور یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز ہے کہ وہ قصے کو نہایت برمحل اور مناسب انداز میں پیش کرتا ہے۔

یہاں یہ قصہ نہایت اختصار کے ساتھ آیا ہے' اس کے مناظر جھلکیوں کی شکل میں بڑی تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ کوہ طور کی وادی مقدس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پکارا جاتا ہے۔ اور انہیں فرعون کی طرف تبلیغی مشن پر جانے کے احکامات دیے جاتے ہیں اس کی سرکشی اور پھر دنیا و آخرت میں اس کے انجام بد اور اللہ کی گرفت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یوں اس کا انجام اس سورت کے موضوع اور مضمون کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو جاتا ہے کیونکہ سورت کا بنیادی موضوع ہے

حشر و نشر اور حساب و کتاب ہے ۔ چند مختصر آیات میں ' الف کے ساتھ طویل مد کے ترنم کے ساتھ اس قصے کی جھلکیاں بڑی تیزی کے ساتھ گزر جاتی ہیں ۔ یوں اس کا انداز اور اس کا اثر اس سورت کے مزاج کے مطابق ہو جاتا ہے ۔

ان مختصر آیات میں نہایت تیزی اور سرعت کے ساتھ اس قصے کے کئی پہلو دکھائے گئے ہیں ۔

اس کا آغاز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کیا جاتا ہے ۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى (۷۹ : ۱۵) "کیا تمہیں موسیٰ کے قصے کی خبر پہنچی ہے ؟" یہ سوالیہ انداز اس لیے اختیار کیا گیا ہے تاکہ مخاطب پوری توجہ سے قصے کو سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو جائے اور پوری طرح اخذ کرے ۔

اس کے بعد پھر واقعات کی تفصیلات آتی ہیں ۔ اس قصے کو لفظ حدیث (بات) سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ قصہ دراصل ہے ہی موسیٰ اور رب کا مکالمہ ۔ اس لیے لفظ حدیث لانا نہایت واقعیت پسندی ہے ۔ چنانچہ سوال و جواب اور رب کے ساتھ مناجات ۔

اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (۷۹ : ۱۶) "جب اس کے رب نے اسے طویٰ کی مقدس وادی میں پکارا تھا" ۔ راجح قول یہ ہے کہ طویٰ وادی کا نام ہے ' جو شخص شمالی حجاز میں مدین کی طرف سے آئے ' یہ وادی طور کے دائیں جانب پڑتی ہے ۔

یہ وقت جس میں اللہ کی جانب سے پکار آئی ' یہ ایک عظیم اور خوفزدہ کرنے والے لمحات ہیں اور عجیب کیفیات کا وقت ہو گا کہ اللہ جل شانہ بذات خود اپنے ایک بندے کو پکار رہا ہو گا اور سوچا جائے تو یہ ایک عظیم بات ہے ۔ ان لمحات کی خوفناکیوں کے بیان سے انسانی الفاظ قاصر ہیں ۔ اللہ کی عظیم بادشاہت اور حکومت کا یہ ایک راز ہے ۔ نیز نفس انسانی کے رازوں میں سے بھی یہ ایک سربستہ راز ہے کہ اللہ نے انسانی نفس میں یہ قوت ودیعت کی اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ ندائے جلیل کو سن سکے اور اس سے مفہوم اخذ کر سکے ۔ یہ وہ آخری بات ہے جو اس مقام کی نسبت سے ہم کہہ سکتے ہیں ۔ ورنہ مکالمہ الہی کے اس مقام اور اس کی کیفیت اور ماہیت کو سمجھنا انسان کے لیے نہایت ہی مشکل ہے ۔ انسان کے لیے مناسب ہے کہ اس مقام کے کنارے پر ہی کھڑا رہے ۔ اس وقت جب خود باری تعالیٰ انسان کو یہ قوت نہیں دے دیتا کہ وہ اس مقام کی کیفیات و تجلیات اور سوال و جواب کو سمجھ سکے اور اس کا شعور اور اس کی قوت مدرکہ اسے چکھ سکے ۔

دوسرے مقامات پر اللہ اور کلیم اللہ کے درمیان ' اس مقام پر ہونے والے مکالموں کی تفصیلات بھی دی گئی ہیں ' لیکن اس سورت میں چونکہ موضوع کے اردگرد مختصر باتیں رکھنی مقصود ہیں اس لیے یہاں زوردار باتیں نہایت موثر انداز میں اور ایک جھلک کی صورت میں کی گئی ہیں ۔ اس لیے یہاں بس چند کلمات کے بعد ہی ذکر کر دیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو یہ عظیم مشن سپرد کر دیا گیا ۔ پس آواز آئی اور حکم دے دیا گیا ۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۱۷) فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى (۱۸) وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (۷۹ : ۱۹) "فرعون کے پاس جا ' وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس سے کہہ کہ

کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف رہنمائی کروں تو خوف تیرے اندر پیدا ہو"۔

اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ (۷۹ : ۱۷) "فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے"۔ سرکشی ایسا گناہ ہے کہ اسے واقع ہی نہیں ہونا چاہئے اور اگر یہ سرزد ہو جائے تو اسے باقی نہیں رہنا چاہئے۔ یہ ایک ناپسندیدہ فعل ہے۔ اس سے زمین میں فساد پھیلتا ہے۔ اللہ سرکشی کو پسند نہیں کرتا' سرکشی کے نتیجے میں بے شمار مکروہات جنم لیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بلند ترین انبیاء میں سے ایک ممتاز نبی کو صرف اس لیے بھیجا کہ فرعون کی سرکشی کو مٹا دے اور یہ ڈیوٹی اللہ نے ان کے ساتھ خود ہمکلام ہو کر لگائی۔ براہ راست یہ حکم دیا گیا اور یہ مشن ان کے سپرد کیا گیا تاکہ یہ ممتاز نمایندہ اس شر کو ختم کرے۔ اور دنیا سے اس فساد کو دور کرے' یہ ایک نہایت ہی کریہہ فعل ہے کہ حکمرانوں میں سے کوئی سرکش اور ظالم ہو۔ اسی لیے اللہ نے بذات خود براہ راست یہ مشن اپنے ایک بندے کے سپرد کیا۔ اور حکم دیا کہ اس شخص کو اس حالت سے نکال کر انصاف کی راہوں پر لے آؤ' اگر وہ نہ آئے تو اس پر دنیا و آخرت کی سزا اور عذاب نازل کرنے کا جواز پیدا ہو۔

اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ (۷۹ : ۱۷) "فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ ظالم و سرکش ہو گیا ہے"۔ اس کے بعد اللہ اپنے بندے کو یہ بھی سکھاتا ہے کہ اس سرکش اور ظالم کے دربار میں انہوں نے اپنا پیغام اور دعوت کس اسلوب میں پیش کرنی ہے۔ نہایت نرم' پرکشش اور محبت بھرے انداز میں۔ شاید کہ وہ باز آ جائے اور اس کے دل میں بات اتر جائے۔ اور اللہ کے غضب اور عذاب سے بچ نکلے۔

فَقُلْ هَل لَّكَ إِلَىٰ أَن تَزَكَّىٰ (۷۹ : ۱۸) "کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے"۔ کیا تو اس بات کی خواہش رکھتا ہے کہ اس سرکشی اور ظلم کی گندگی سے نکل آئے۔ اور اللہ کی نافرمانیوں کو ترک کر دے۔ کیا تو نماز' دعا اور برکت کی راہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔

وَأَهْدِيَكَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَتَخْشَىٰ (۷۹ : ۱۹) "اور میں تیری رہنمائی تیرے رب کی طرف کروں کہ تیرے اندر خوف پیدا ہو"۔ کیا تیرے اندر یہ خواہش ہے کہ تو اپنے رب کے راستے کے نشیب و فراز سے واقفیت حاصل کرے۔ اگر تو رب کی راہوں پر چلے گا تو تیرے دل میں رب کا خوف پیدا ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ظالم اور سرکش تب ہی بنتا ہے جب اپنے رب سے دور چلا جائے۔ راہ حق بھلا دے اور سنگدل ہو کر فساد اختیار کرے۔ اس طرح وہ آخر کار سرکشی اور ظلم کو اپنا وطیرہ بنا لیتا ہے۔

یہ بات تو اس وقت کی گئی ہے جب اللہ کی جانب سے آواز آئی اور یہ عظیم مشن حضرت موسیٰ کے سپرد کیا گیا اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں پہنچے۔ تو انہوں نے یہی بات دہرائی جو اللہ نے سکھائی کہ ایسا کہو' لیکن تبلیغ کے وقت کی جو منظرکشی کی گئی اس میں اس کا تذکرہ نہیں ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ویسا ہی کہا ہو گا جس طرح اللہ نے فرمایا کہ یوں کہو۔ لہٰذا سپردگی مشن کے وقت جو بات کہی گئی اسے یہاں حذف کر دیا اور بات مختصر کر دی

اب یہاں آکر یہ منظر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور آخری بات کہی جاتی ہے ۔

فَاَرٰہُ الْاٰیَةَ الْکُبْرٰی (۲۰) فَکَذَّبَ وَعَصٰی (۷۹ : ۲۱) ''پھر موسیٰ نے اس کو بڑی نشانی دکھائی مگر اس نے جھٹلایا دیا' اور نہ مانا''۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہ بات پہنچا دی جو پہنچانی تھی ۔ اور اسی انداز میں اور اسی اسلوب میں پہنچا دی جس میں ان کے رب نے ان کو حکم دیا تھا لیکن اس قسی القلب اور سرکش آدمی کے ہاں یہ اسلوب ' کامیاب نہ ہوا کیونکہ مرد نادان پر کلام نرم و نازک بے اثر ہوا کرتا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہ عظیم معجزات پیش کیے ' عصا پیش کیا اور ید بیضا پیش کیا ' جیسا کہ دوسری سورتوں میں تفصیلات آتی ہیں ۔ تو اس نے ''جھٹلایا اور نہ مانا'' یوں اختصار کے ساتھ یہ منظر تکذیب اور معصیت پر ختم ہوتا ہے ۔

اب اسی اختصار کے ساتھ ایک دوسرا منظر سامنے آتا ہے ۔ فرعون موسیٰ علیہ السلام کو اپنی جگہ ہی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں جادوگروں کو جمع کرتا ہے ۔ اور سحر اور سچائی کا مقابلہ ہوتا ہے ۔ کیونکہ اس کا کبرو غرور یہ کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ وہ راہ ہدایت پر آجائے اور حق کو قبول کرے ۔

ثُمَّ اَدْبَرَ یَسْعٰی (۲۲) فَحَشَرَ فَنَادٰی (۲۳) فَقَالَ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی

(۷۹ : ۲۴) ''پھر چال بازیاں کرنے کے لیے پلٹا اور لوگوں کو جمع کر کے اس نے پکار کر کہا ''میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں''۔ سیاق کلام میں یہاں اس سرکش کافر کی بات کو نہایت سرعت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اور اس کی مساعی کی تفصیلات ' جادوگروں کا جمع کیا جانا ' اور مقابلہ آرائی کی تفصیلات کو یہاں حذف کر دیا جاتا ہے ۔ پس اتنا ہی کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کو چھوڑ کر چلا گیا ۔ اپنی سعی اور تدبیریں کرتا رہا اور عوام کو بھی جمع کیا اور جادوگروں کو بھی جمع کر لایا ۔ اور پس یہاں اس کی ایک ہی مکروہ اور گندی بات کو نقل کر دی ' جو جہالت اور غرور اور سرکشی سے اٹی پڑی ہے کہ ''میں ہوں تمہارا رب اعلیٰ'' نعوذ باللہ ۔

یہ بات اس سرکش نے اس بل بوتے پر کی کہ اسے یقین تھا کہ عوام تو جاہل ہیں اور انہوں نے اس بات پر لبیک کہنا ہے جو وہ کہہ دے ۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام سرکشوں اور ڈکٹیٹروں کو عوام کی جہالت ' عوام کی ذلت اور عوام کی غیر مشروط اطاعت سخت دھوکے میں ڈال دیتی ہے ۔ حالانکہ ہر سرکش اور ڈکٹیٹر تو دراصل ایک شخص ہوتا ہے ۔ اس کے پاس نہ قوت ہوتی ہے اور نہ دلیل ۔ بلکہ اس کی قوت اور دلیل یہی ہوتی ہے کہ ذلیل اور جاہل عوام اس کے سامنے بچھ جاتے ہیں وہ اپنے کاندھوں کو اس کے سامنے جھکاتے ہیں اور وہ ان پر سوار ہو جاتا ہے اور ان کی گردنیں لمبی ہوتی جاتی ہیں اور وہ ان میں رسی ڈال کر مزید کھینچتا رہتا ہے ۔ لوگ اس کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور وہ مزید سربلند کرتا ہے ۔ لوگ اس کے مقابلے میں اپنے حقوق اور اپنی عزت سے دست بردار ہوتے اور وہ مزید سرکش ہوتا رہتا ہے ۔

عوام الناس یہ کام کیوں کرتے ہیں ' ایک طرف سے وہ دھوکے میں ہوتے رہیں اور دوسری جانب سے وہ ڈرتے ہیں ۔ رہا ان کا خوف تو وہ محض وہم و گمان پر مبنی ہوتا ہے ۔ اس لیے کہ ہر ڈکٹیٹر اور سرکش تو ایک فرد ہوتا ہے ' وہ ہزاروں اور لاکھوں عوام کا کیا بگاڑ سکتا ہے ۔ اگر لوگوں کے اندر اپنی انسانیت ' اپنی کرامت ' عزت نفس ' اپنی آزادیوں کا احساس ہو

تو پھر ان ہزاروں اور لاکھوں عوام میں سے ایک شخص اس ڈکٹیٹر کے مقابلے کے لیے کافی ہوتا ہے لیکن یہ ڈکٹیٹر اور سرکش ان کو دھوکہ دیتا ہے' وہ کہتا ہے کہ وہ اختیارات کا سرچشمہ ہے۔ حالانکہ کسی قوم میں سے ایک فرد اٹھ کر کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں تمہارا رب اعلیٰ اور ڈکٹیٹر اور سرکش ہوں۔ اگر قوم بیدار ہو اور اسے نیک و بد کا علم ہو تو اس میں سے کبھی بھی سرکش ڈکٹیٹر پیدا نہیں ہو سکتا' پھر جو امت اپنے حقیقی رب اعلیٰ سے واقف ہو تو اس کے اندر کوئی اس قسم کا فرعونی ڈکٹیٹر سر نہیں اٹھا سکتا۔ نیز اگر کوئی قوم یہ فیصلہ کر لے کہ اس نے صرف رب واحد کی بندگی کرنی ہے اور اس رب کے سوا کوئی نہیں ہے کہ اسے نفع دے سکے یا نقصان۔ تو ایسی قوم میں کوئی مطلق العنان سر نہیں اٹھا سکتا۔

فرعون کو معلوم تھا کہ اس کی قوم غافل اور ذلیل ہے۔ اور اس کی رعیت کے لوگوں کے دل ذوق ایمان سے خالی ہیں۔ اس لیے اسے اس قدر جرات ہوگئی کہ وہ کہے۔

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۷۹ : ۲۴) "میں ہی تمہارا رب اعلیٰ ہوں"۔ اگر اس کی قوم میں ایمان ہوتا' عزت نفس ہوتی۔ وہ ایک آزاد قوم ہوتی اور ذی شعور قوم ہوتی تو اسے یہ بات کہنے کی جرات نہ ہوتی۔ کیونکہ وہ تو جانتا تھا کہ وہ تو دوسروں کی طرح ایک محتاج اور ضعیف بندہ ہے۔ وہ کوئی فوق الفطرت قوت نہیں رکھتا۔ اگر مکھی اور مچھر بھی اس سے کچھ لے بھاگے تو اس کی افواج اور وہ اسے نہیں پکڑ سکتے۔

اس کفر' سرکشی اور تکذیب اور گندی بات کے بعد اب اللہ کی عظیم قوتیں حرکت میں آتی ہیں۔

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (۷۹ : ۲۵) "آخر کار اللہ نے اسے دنیا اور آخرت کے عذاب میں مبتلا کر دیا"۔ یہاں آخرت کے عذاب کو دنیا کے عذاب پر مقدم کر دیا گیا' اس لیے کہ عذاب اخرت تو بہت ہی سخت اور شدید ہو گا۔ نافرمانوں اور سرکشوں کے لیے حقیقی عذاب تو عذاب آخرت ہو گا اور آخرت میں ایسے لوگ بڑی سختی اور بے رحمی سے پکڑے جائیں گے۔ پھر سورت کا موضوع ہی آخرت ہے۔ اس لیے عذاب آخرت کو مقدم کرنا ضروری ہوا۔ نیز لفظی ترنم اور قافیہ کے اعتبار سے بھی "آخرت" کو پہلے اور "اولیٰ" کو بعد میں ہونا چاہئے تھا' یوں لفظی اور معنوی اعتبار سے الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (۷۹ : ۲۵) ہم آہنگ ہوگئے۔

اس دنیا میں فرعون جس عذاب سے دوچار ہوا' وہ بھی بڑا سخت تھا۔ رہا آخرت کا عذاب تو وہ بہت ہی شدید اور سخت ہو گا۔ فرعون بڑی قوت والا تھا' اور خاندانی عزت اور وقار کا مالک تھا۔ اسے اگر اس قدر شدید عذاب سے دوچار کیا گیا تو دوسرے کم درجے کے مکذبین ڈکٹیٹر اور سرکش بہرحال شدید ترین عذاب سے دوچار ہوں گے اور رہے مشرکین مکہ تو عالمی قوتوں میں تو ان کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى (۷۹ : ۲۶) "درحقیقت اس میں بڑی عبرت ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے"۔ جو شخص اللہ کی معرفت رکھتا ہے' اللہ سے ڈرتا ہے' وہی اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ فرعون کے واقعہ میں لوگوں کے لیے کیا کیا عبرتیں ہیں۔ رہا وہ شخص جس کے دل میں تقویٰ' خوف اور خشیت ہی نہیں ہے۔ اس کے اور عبرت کے درمیان پردے حائل ہوگئے ہیں۔ اس کے اور نصیحت حاصل کرنے کے درمیان ایک دبیز پردہ حائل

ہو جاتا ہے ۔ آخر کار وہ انجام بد سے دوچار ہی نہیں ہوتا بلکہ انجام بد سے جاکر ٹکراتا ہے اور اللہ اس سے دنیا و آخرت میں انتقام لے لیتا ہے ۔ پس ہر شخص کو اللہ ہی عبرت ' راہ راست اور اچھے انجام کے لیے وسائل فراہم کرتا ہے ۔

ڈکٹیٹروں اور مادی و سیاسی قوت کے بل بوتے پر ظلم اور سرکشی کرنے والوں کے اس مطالعے اور نظارے کے بعد اب ذرا مشرکین مکہ کی طرف ' جن کو اپنی چھوٹی سی قوت پر بڑا گھمنڈ تھا ' ان کے سامنے بعض عظیم کائناتی قوتیں پیش کی جاتی ہیں ' تاکہ وہ ذرا سمجھیں کہ ان ہولناک کائناتی قوتوں کے سامنے ان کی قوت ہیچ ہے ۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا ﴿۲۹﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿۳۲﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۳﴾

" کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی؟ اللہ نے اس کو بنایا ' اس کی چھت خوب اونچی اٹھائی پھر اس کا توازن قائم کیا ' اور اس کی رات ڈھانکی اور اس کا دن نکالا ۔ اس کے بعد زمین کو اس نے بچھایا ' اس کے اندر سے اس کا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑ اس میں گاڑ دیئے ۔ سامان زیست کے طور پر تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے " ۔

یہ ایسا استفہام ہے جس کا جواب ایک ہی ہے اور ناقابل انکار اور ناقابل بحث و مباحثہ ہے ۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ( ۷۹ : ۲۷ ) " تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی " ۔ یقیناً آسمانوں کی تخلیق بہت بڑا اور مشکل کام ہے ۔ اس میں کوئی کلام نہیں ہے ۔ نہ بحث کی گنجائش ہے ۔ لہٰذا تمہیں جو اللہ نے مختصر سی قوت دی ہے ' اس پر تمہیں اس قدر نازکیوں ہے حالانکہ آسمان اور کائنات کی دوسری قوتیں تم سے قوی تر ہیں ۔ یہ تو ہے اس سوال کا ایک پہلو ' لیکن اس کی ایک جہت اور بھی ہے ' وہ یہ کہ تم اپنے دوبارہ اٹھائے جانے کو ایک مشکل کام تصور کرتے ہو ' جبکہ آسمانوں کی تخلیق تمہاری تخلیق سے مشکل ہے ' حالانکہ حشر میں تمہاری تخلیق ابتدائی تخلیق نہ ہوگی بلکہ محض اعادہ ہوگا اور جس ذات بابرکات نے آسمانوں اور جہانوں کی تخلیق کی ہے ' اس کے لیے تمہارا اعادہ زیادہ آسان ہے ۔

آسمانوں کی تخلیق بلاریب ایک عظیم کام ہے ۔

بَنٰهَا ( ۷۹ : ۲۷ ) " اس نے اسے بنایا " ۔ ہر عمارت قوت اور باہم سہارا لے کر قیام کی مظہر ہوتی ہے ۔ آسمانوں کا وسیع نظام بھی ایک عمارت کی طرح باہم بندھا ہوا ہے ۔ اس کے ستارے اور سیارے ایک نظام میں بندھے ہوئے ہیں ۔ کوئی چیز بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتی ۔ نہ اپنے مدار سے نکلتی ہے ' نہ گرتی ہے اور ٹکراتی ہے ۔ گویا یہ بالائی کائنات ایک وسیع عمارت ہے ' جس کے تمام اعضاء باہم متماسک ہیں ۔

رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا ( ۷۹ : ۲۸ ) "اس کی چھت خوب اونچی اٹھائی ۔ پھر اس کا توازن قائم کیا"۔ سمک بلندی اور قدو قامت کو کہتے ہیں ۔ آسمان بلند بھی ہے اور باہم جڑا ہوا بھی ہے اور اس کے اجزاء ایک دوسرے سے پیوست ہیں ۔ اسی کو

فَسَوّٰهَا ( ۷۹ : ۲۸ ) سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ آسمانوں کے نظام پر ایک سرسری نظر ڈالنے اور ایک معمولی علم رکھنے والے کو بھی یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ آسمانوں کے نظام کے اندر مکمل ہم آہنگی ہے ۔ ان عظیم اجسام کو جو چیز باہم جوڑ کر رکھ رہی ہے اور ان کی حرکات و اثرات کے درمیان جو چیز تنظیم پیدا کرتی ہے ۔ اس کا اگر تفصیلی مطالعہ کیا جائے 'تو ان الفاظ کے معانی بہت گہرے اور وسیع ہو جاتے ہیں اور یہ نظام اس قدر محیرالعقول ہو جاتا ہے جس کے بارے میں انسان پہلے کچھ زیادہ نہ جانتے تھے ۔ انسان ششدر رہ جاتا ہے اور مرعوب اور مبہوت ہو جاتا ہے اور سوائے اس کے کہ اس نظام کے پیچھے کام کرنے والی ایک عظیم قوت مدبرہ کو تسلیم کیا جائے ۔ انسانوں کے لیے اس محیرالعقول عظیم اور وسیع و عریض نظام کی تشریح کے لیے کوئی اور راہ ہی نہیں ہے ۔ بہرحال کسی نہ کسی مذہب اور دین کے مطابق الٰہ العالمین کو تسلیم کرنا ضروری ہے ۔

وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا ( ۷۹ : ۲۹ ) "اور اس کی رات ڈھانکی اور اس کا دن نکالا"۔ اس انداز تعبیر میں لفظاً اور معنیً شدت اور ترنم ہے ۔ اور یہ انداز تعبیر اس سورت کی شدت اور قوت کے عین مطابق ہے ۔

وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا ( ۷۹ : ۲۹ ) کے معنی ہیں رات کو سیاہ اور تاریک بنا دیا ۔

اور اَخْرَجَ ضُحٰهَا ( ۷۹ : ۲۹ ) کے معنی ہیں ' دن کو روشن کیا ۔ تاریکی اور روشنی کی لیے یہاں قرآن نے جو الفاظ چنے ہیں وہ سیاق کلام کے لیے بہت موزوں ہیں ۔ روشنی اور تاریکی کا پے در پے آنا اور جانا ' رات کی تاریکی اور چاشت کی روشنی ہر شخص کا دیکھا ہوا منظر ہے ۔ ہر دل اس سے متاثر ہوتا ہے ۔ انسان بعض اوقات 'زیادہ مانوس ہونے کی وجہ سے گردش لیل و نہار سے وہ تاثر نہیں لیتا جو قرآن یہاں بیان کرتا ہے ' لیکن قرآن مجید کا یہ کمال ہے کہ وہ انسانی احساسات کو تیز کرتا ہے اور انسان بھولے بسرے نغمے گانے لگتا ہے اور یہ سب کچھ انسان کو بالکل جدید لگتا ہے ۔ گویا ہر دن ایک نیا دن طلوع ہوتا ہے ۔ کل وہ شعور اور وہ تاثر نہ تھا جو آج قرآن کو پڑھ کر انسان کو حاصل ہوتا ہے ۔ ان حقائق کے حوالے سے قرآن انسانی احساسات کو بیدار کرتا ہے اور جوں جوں کائنات کےان مناظر اور حقائق کے بارے میں انسانی علم وسیع ہوتا ہے ' انسان کے تاثرات ' اس کی حیرانگی اور اس کی دہشت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔

وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ( ۳۰ ) اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰهَا ( ۳۱ )

وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ( ۷۹ : ۳۲ ) "اس کے بعد زمین کو اس نے بچھایا ' اس کے اندر سے اس کا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑ اس میں گاڑ دیئے"۔

دحو الارض کے معنی ہیں زمین کو تیار کرنا اور اس کے چھلکے کو بچھانا ہے ـ اس طرح کہ انسان اس کے اوپر چل بھی سکیں ـ اس کے اوپر جمع ہونے والی مٹی نباتات اگانے کے قابل ہو ـ اور اس کے اوپر پہاڑوں کا جمانا' یہ سب امور اسی طرح انجام پائے کہ اللہ سطح زمین کو اس اس طرح سکون و قرار عطا کیا اور اس کے اوپر درجہ حرارت اس مقدار میں پیدا کیا کہ یہاں حیوانی اور نباتاتی زندگی ممکن ہوئی ـ اور اللہ نے زمین سے پانی نکالا' چاہے اس سے مراد وہ پانی ہو جو چشموں کی صورت میں نکلتا ہے یا آسمانوں سے برستا ہے اور ندیوں کی صورت میں بہتا ہے ـ اور اللہ نے اس کے ذریعہ وہ تمام نباتات اگائے جس سے انسانی خوراک اور حیوانوں کی خوراک نکلی ـ بعض جانور براہ راست اس سے کھاتے ہیں اور بعض بالواسطہ ـ

یہ سب انتظام اس وقت ہوا' جب اللہ نے زمین و آسمان کا موجودہ نظام تعمیر کیا ـ رات اور دن کو پیدا کیا ـ زمین و آسمان کے بارے میں جدید نظریات اس آیت کے مفہوم کی مکمل تائید کرتے ہیں کہ زمین پر کئی ملین سال گزرے اور اسی طرح گردش لیل و نہار کا نظام جاری رہا اور بعد میں وہ جاکر انسانی زندگی اور زراعت کے قابل بنی اور اس کا چھلکا سخت ہوا اور سکڑ کر پہاڑ نمودار ہوئے ـ

قرآن کریم اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ یہ سب نظام تمہاری خاطر کیا گیا ـ

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (۷۹ : ۳۳) "سامان زیست کے طور پر تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے" ـ اس سے دو باتوں کی طرف اشارہ مطلوب ہے ـ ایک یہ کہ اللہ نے اس کائنات کے نظام کو چلانے کے لیے عظیم الشان تدابیر اختیار کی ہیں اور دوسرا یہ کہ اس نظام کے اندر ہر چیز ایک طے شدہ فارمولے کے مطابق نہایت صحیح اندازے سے بنائی گئی ہے ـ آسمانوں کو موجودہ شکل دینا' زمین کو اس شکل و صورت میں تیار کرنا' اور موجودہ نظام اتفاقاً پیدا نہیں ہو گیا ـ بلکہ پہلے سے مقدر اور مرتب تھا ـ اور اس کی ایک ایک چیز کو ایک حساب اور ایک اندازے سے پیدا کیا گیا ہے اور اسی مقصد کو سامنے رکھ کر پیدا کیا گیا ہے کہ اس زمین پر حضرت انسان نے آکر بسنا ہے ـ اس کا وجود' اس کی نشوونما' اور اس کی ترقی کے لیے یہاں بے شمار سازگار حالات پیدا کیے گئے ہیں اور ان کو اس نظام کے بنیادی ڈھانچے اور نقشے کے اندر رکھ دیا گیا ہے ـ پورا نظام شمسی اس طرح بنایا گیا ہے اور اس زمین کے اندر تو یہ امور علی الخصوص ملحوظ ہیں ـ

قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ اصل حقائق کی طرف ایک مجمل اشارات کرتا ہے' جن میں اصل بات اور حقیقت بھی آ جاتی ہے اور ایک عام سے عام آدمی بھی قرآنی مفہوم کو پا لیتا ہے ـ یہاں قرآن کریم نے جن سہولیات اور سازگار چیزوں کی طرف اشارہ کیا وہ آسمانوں کی تخلیق و تعمیر' رات کا چھانا اور پرسکون ماحول' دن کا ظہور' اور دوڑ دھوپ' زمین کا بچھانا اور سازگار بنانا' پانی کا بہانا اور نباتات کا اگانا اور پہاڑوں کا جمانا اور انسانوں اور حیوانوں کے لیے سامان زیست فراہم کرنا' ان اشارات سے ایک طرف تو اللہ کی تدبیر کی حکمت اور تخلیق کا حکیمانہ نظام نظر آتا ہے اور یہ حقائق وہ مظاہر ہیں جن کو ہر شخص دیکھتا اور سمجھتا ہے ـ ہر سطح اور ہر معاشرے کا انسان ان کو سمجھتا ہے ـ اور ان کے سمجھنے کے لیے کسی بڑے درجہ علم کی ضرورت ہی نہیں ہے ـ بس ایک انسان ہو' جہاں بھی ہو' جس زمانے میں ہو' وہ ان اشارات کو سمجھتا ہے ـ

لیکن اس عمومی سطح کے پس پشت اور گہرائی کے ساتھ اگر غور کیا جائے تو اس سطح کے نیچے عظیم حقائق ہوتے ہیں مثلاً

یہ کہ اس کائنات کی تخلیق کے منصوبے میں گہری منصوبہ بندی ہے' اور اس کا نظام محض بخت و اتفاق پر نہیں چل رہا ہے ۔ اس کائنات کی حقیقت اس بات کی نفی کرتی ہے ۔ کیونکہ محض اتفاقاً اس قدر حکیمانہ فارمولا بن جانا ممکن ہی نہیں ہے ۔ جو عجیب و غریب ہے اور جو نہایت حکیمانہ ہے ۔

جس کہکشاں میں ہم رہتے ہیں جسے شمسی کہکشاں کہا جاتا ہے' ہماری زمین اس کہکشاں کا ایک سیارہ ہے ۔ اس کی تنظیم اور اس کا نظام گردش ایک عجیب نظام ہے جو اس جیسی کروڑوں کہکشانوں میں نہیں ہے ۔ پھر یہ زمین تو تمام سیاروں میں سے ایک منفرد انداز کا سیارہ ہے' سورج سے اس کا فاصلہ' اس کے فضائی حالات اور اس کی گردش ایسے ہیں کہ اسے انسانی زندگی کے لئل بناتے ہیں ۔ آج تک انسان نے اس وسیع و عریض کائنات میں کوئی دوسرا سیارہ معلوم نہیں کیا جس میں ایسی ہی زندگی ہو' اور جس کے اندر ہزاروں لاکھوں ایسے عوامل ہیں جو انسانی زندگی کے مدد و معاون ہوں ۔

"اس لیے کہ اسباب حیات ایک ایسے سیارے میں فراہم ہوتے ہیں جس کا حجم مناسب ہو' جو سورج سے ایک مناسب دوری پر ہو ۔ اور اس کے عناصر کی ترکیب ایسی ہو جس کے اندر زندہ حرکت میں آسکے" ۔

"سازگار حجم کا مناسب ہونا اس لیے ضروری ہے کیونکہ کسی سیارے کے اردگرد کی فضا کا دارومدار اس پر ہوتا ہے کہ اس سیارے کا حجم کتنا ہے اور اس میں جاذبیت کی قوت کس قدر ہے" ۔

"اور معتدل دوری اس لیے ضروری ہے کہ جو سیارے سورج کے زیادہ قریب ہیں ۔ وہ اس قدر گرم ہوتے ہیں کہ ان میں اجسام کے اجزاء اپنی جگہ نہیں ٹھہر سکتے اور جو سیارے سورج سے بہت دور ہوتے ہیں وہ اس قدر سرد اور ٹھوس ہوتے ہیں کہ ان کے اندر کوئی جسم پھل پھول نہیں سکتا" ۔

"پھر کسی سیارے کی ترکیب ایسے عناصر سے ہونا ضروری ہے جس کے اندر زندگی ممکن ہو اور پھل پھول سکے' کیونکہ نباتات کے لیے اور حیوانات کے لیے وہ عناصر ضروری ہیں جو اس زمین میں رکھے گئے ہیں" ۔

"پھر زمین کو سورج سے اس قدر دور رکھا گیا ہے کہ اگر اس کا فاصلہ ذرا کم و بیش ہو جائے تو اس پر زندگی ممکن ہی نہ ہو ۔ اور اس کی تفصیلات ہم اب اچھی طرح جانتے ہیں ۔ آج تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس زمین کے علاوہ اور بھی کوئی سیارہ کسی سورج کے گرد ایسا ہے" ۔ (بیسویں صدی کے مفکرین کے افکار' استاد عقاد' ص ۳۶) ۔

یہ حقائق کہ یہ کائنات ایک خاص نظم' تدبیر اور منصوبے کے مطابق بنائی گئی ہے اور اس کے اندر انسان کی ایک مخصوص حیثیت ہے ۔ انسان کو اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے آمادہ کرتے ہیں کہ قیام قیامت ایک حقیقت ہے اور ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ انسان سے حساب و کتاب لیا جائے گا اور اس کے اعمال پر اسے جزاء و سزا دی جائے گی ۔ اگر اس کائنات اور اس میں انسانی زندگی کی تخلیق ایک حکیمانہ انداز کے مطابق ہے تو پھر لازماً انسان اس نتیجے تک پہنچے گا کہ ایک دن اس زندگی کا خاتمہ ہو گا اور انسان اپنے اعمال کی جزاء و سزا سے دوچار ہو گا ۔ یہ بات انتہائی غیر معقول اور غیر منصفانہ ہو گی کہ اس زندگی کا خاتمہ ایسا ہی ہو کہ ظالم' بدکار سزا پانے سے بچ جائیں اور مظلوم دنیا میں مشکلات جھیلنے کے بعد یونہی ختم کر دیئے جائیں ۔ اس قسم کے عقائد و نظریات اس حکمت' اس منصوبہ بندی اور اس تدبیر کے خلاف ہیں جو اس کائنات کی تخلیق اور تعمیر میں عیاں ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ ان حقائق کے بعد اب سورت کے مرکزی مضمون یعنی قیام قیامت کو لیا جاتا ہے یعنی وہ ہنگامہ عظیم جو

برپا ہو گا اور پھر اس جہاں کا خاتمہ ہو جائے گا۔اس سے قبل ذہنوں کو اس عقیدے کے قبول کرنے کے لیے تیار کر لیا گیا تھا۔ذہن قبولیت کے لیے تیار تھا۔لہٰذا یہ ذکر نہایت ہی مناسب وقت میں ہوا۔

فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ مَا سَعَىٰ ﴿٣٥﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ ﴿٣٦﴾ فَأَمَّا مَن طَغَىٰ ﴿٣٧﴾ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴿٣٨﴾ فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ﴿٣٩﴾ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ﴿٤٠﴾ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ﴿٤١﴾

"پھر جب وہ ہنگامہ عظیم برپا ہو گا' جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا' اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی' تو جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی' دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہو گی۔ اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا' جنت اس کا ٹھکانا ہو گی"۔

دنیا کی یہ زندگی چند روزہ ہے اور اس کے لیے یہاں نہایت گہرائی اور حکمت سے نظام زندگی اور سامان حیات تیار کیا گیا ہے۔اس کائنات کا نظام اور انسانی زندگی کے نظام کے درمیان گہرا ربط ہے۔لیکن اس کے باوجود یہ چند روزہ متاع ہے اور ایک دن اسے ختم ہونا ہے۔جب وہ ہنگامہ عظیم برپا ہو گا تو اس زندگی کا نظام معطل ہو جائے گا۔یہ چند روزہ زندگی ختم ہو گی۔یہ عظیم کائنات ختم ہو گی۔یہ بلند و بالا آسمان' یہ بلند پہاڑ' اور یہ وسیع و عریض زمین' اور اس زمین کے اوپر برپا ہونے والی تمام کشمکش اور یہ سرگرمیاں سب کی سب ختم ہو جائیں گی کیونکہ یہ حادثہ بہت عظیم ہو گا اور بہت ہی عام ہو گا۔یہ ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

اب انسان کو یاد آئے گا کہ وہ کیا کچھ کرتا رہا ہے' اب اسے اپنی تمام سرگرمیاں یاد آتی جائیں گی۔ زندگی کے واقعات یاد آتے جائیں گے۔ زندگی کی مصروفیات جنہوں نے انسان کو اس عظیم دن سے غافل کر دیا تھا' اب اسے سب کچھ یاد ہو گا۔ لیکن اب اس کی یہ یادداشت اسے حسرت اور مایوسی کے سوا کچھ نہ دے سکے گی۔اب تو اس کے سامنے ایک دوسرا نقشہ ہو گا۔

وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ (۷۹ : ۳۶) "اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی"۔اب یہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گی۔ ہر دیکھنے والا اسے دیکھ سکے گا۔لفظ "برزت" میں لفظی تشدید اور معنوی تشدید دونوں ملحوظ ہیں' اس لفظ کے ذریعہ ہر نظر کے سامنے منظر لایا گیا ہے اور پھر لفظ کا ترنم بھی۔

آج ہر کسی کا انجام مختلف ہو گا اور اللہ کا نظام کائنات اور نظام آزمائش اور پہلی زندگی کے مقاصد کھل کر سامنے آ جائیں گے۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی (۳۷) وَ اٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا (۳۸) فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی

(۷۹ : ۳۹) "تو جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی، دوزخ اس کا ٹھکانا ہوگی"۔ طغیان اور سرکشی کا مفہوم وسیع تر ہے، یہ ہر اس شخص پر صادق آتا ہے جو حق اور ہدایت کی راہ سے متجاوز ہوتا ہے۔ اس کے حدود قوت اور جبر اور اقتدار اعلیٰ کے بل بوتے پر ظلم اور تجاوز کرنے والے سرکشوں سے زیادہ وسیع ہیں۔ ہر وہ شخص جو دنیا پرست ہے اور راہ ہدایت سے ادھر ادھر متجاوز ہوتا ہے۔ وہ باغی اور طاغی ہے جس کی بڑی صفت یہ ہے کہ وہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دیتا ہے۔ آخرت کی جوابدہی کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آخرت کی فکر ہی انسان کے ضمیر اور اس کے عمل میں توازن پیدا کرتا ہے۔ اگر کوئی آخرت کو بھلا دے یا آخرت پر دنیا کو ترجیح دے تو اس کی قدروں اور پیمانوں کے درمیان خلل پڑ جاتا ہے اور اس کے تمام پیمانے اور قدریں بدل جاتی ہیں۔ اس کا شعور اور طرز زندگی بدل جاتا ہے۔ چنانچہ وہ باغی، طاغی اور حدود سے متجاوز ہو کر ظلم کا ارتکاب کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا انجام یہ ہوتا ہے: "دوزخ اس کا ٹھکانا ہوتی ہے"۔ وہ دوزخ جو کھلی تھی اور حاضر تھی اور عظیم دن میں اس کو نمایاں کر کے رکھ دیا گیا تھا۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی (۴۰) فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ

الْمَاْوٰی (۷۹ : ۴۱) "اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا، جنت اس کا ٹھکانا ہوگی"۔ جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا ہے، وہ کبھی بھی کسی معصیت کا ارتکاب نہیں کرتا۔ اگر کبھی بشری کمزوری سے اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو یہ خوف اسے ندامت اور استغفار پر مجبور کر دیتا ہے اور وہ توبہ کرتا ہے اور اس طرح وہ اطاعت کے دائرے میں دوبارہ داخل ہو جاتا ہے۔

نفس کو خواہشات سے باز رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان دائرۂ اطاعت سے باہر نہ نکلے، کیونکہ خواہشات نفسانیہ ہی انسانوں کو نافرمانی، طغیانی اور سرکشی پر آمادہ کرتی ہیں۔ آزمائش اور شر کا راستہ ہی خواہشات نفسانیہ ہیں۔ شیطان انسان پر اسی راستہ سے حملہ آور ہوتا ہے۔ جہالت کا علاج بہت آسان ہے۔ لیکن جانتے بوجھتے خواہشات نفسانیہ کی پیروی کرنا بہت بڑی مصیبت اور آزمائش ہوتی ہے۔ اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔

خواہشات نفسانیہ کے دباؤ کا مقابلہ صرف خشیت الہیہ سے کیا جا سکتا ہے۔ اللہ کے ڈر کے سوا کوئی ہتھیار اس دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایک ہی آیت میں ان کو جمع کیا ہے۔ اور بات کون کر رہا ہے؟ وہ ذات جس نے نفس انسانی کو پیدا کیا ہے۔ بیماری بھی وہی بتاتا ہے اور علاج بھی۔ انسانی نفس کے نشیب و فراز سے اس کا خالق ہی باخبر ہے۔ اس ذات کو معلوم ہے کہ اس مخلوق میں کس جگہ کمزوریاں ہیں اور ان کا علاج کیا ہے؟ ان خفیہ کمزوریوں کا تعاقب کس طرح کیا جا سکتا ہے اور اس کے کیا طریقے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس بات کا مکلف نہیں بنایا کہ اس کے نفس کے اندر خواہش ہی نہ ہو، بلکہ اللہ نے یہ حکم دیا ہے کہ نفس کو روکے، اس کو لگام دے، اور خواہشات کو ذرا دبا کر رکھے۔ اور اس معاملے میں خدا خوفی سے استعانت حاصل کرے کہ ایک دن اس نے رب جلیل کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ اور اگر وہ نفس کی خواہشات پر کنٹرول کرے گا تو

اس کا عوضانہ اسے جنت ملے گی اور یہ اس کا ٹھکانا ہوگی۔

فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی (۷۹ : ۴۱) "جنت اس کا ٹھکانا ہوگی"۔ کیونکہ اللہ جانتا ہے کہ نفس کے ساتھ جہاد' جہاد اکبر ہے اور اس کی قیمت یہ ہے کہ یہ نفس سیدھا ہو کر بلند مقام و مرتبہ تک پہنچ جائے۔

انسان' انسان تب ہو گا کہ وہ اس نہی پر عمل کرے۔ نفس کے خلاف جہاد کرے اور اس طرح گری ہوئی سطح سے اپنے آپ کو بلند کرے۔ انسان اس طرح انسان نہیں بن جاتا کہ وہ اپنے نفس کو خواہشات نفسانیہ کے حوالے کر دے اور جہاں تک ممکن ہو سکے خواہشات نفسانیہ کی پیروی کرے' اور دلیل یہ دے کہ اللہ نے اس کی فطرت میں یہ خواہشات رکھ دی ہیں' کیونکہ جس ذات نے نفس انسانی کے اندر خواہشات نفسانیہ کا وبال رکھا ہے' اسی نے انسان کو یہ قوت بھی دی ہے کہ وہ راہوار نفس کو لگام دے۔ اور حکم بھی دیا کہ نفس کی تمام خواہشات کی پیروی نہ کرو' اس کے دائرۂ جاذبیت اور دائرہ کشش سے اپنے آپ کو نکالو۔ اور اس کا صلہ بھی دینے کا اعلان کیا کہ تمہارا مستقل ٹھکانا جنت میں ہو گا' اگر تم نفس کے خلاف جہاد کر کے فاتح ہوگئے اور بلندی اختیار کی تو جنت میں جاؤ گے۔

ایک تو ہے انسانی آزادی جس کے ذریعہ اللہ نے اس انسان کو معزز بنایا ہے' یہ ہے آزادی اس بات کی کہ انسان اپنے نفس پر فتح حاصل کرے۔ اور خواہشات نفس کی غلامی سے آزادی حاصل کرے۔ اور نفس کے ساتھ ایسا متوازن رویہ رکھے جو انسانی آزادی' اختیار اور تقدیر کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ لیکن آج کل جس چیز کو انسانی آزادی کہا جاتا ہے وہ دراصل حیوانی آزادی ہے۔ اس میں ایک انسان اپنے نفس کی خواہشات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے' غلام بن جاتا ہے۔ اور اس کی زمام اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتی بلکہ اس کے نفس کی خواہشات کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ایسی آزادیوں کی بات وہی لوگ کرتے ہیں جو شکست خوردہ ہوتے ہیں' غلام ہوتے ہیں' ہاں انہوں نے غلامی کے لباس پر آزادی کا عنوان درج کر لیا ہے اور جنوں کا نام خرد رکھ دیا ہے۔

پہلی آزادی سے متصف انسان ہی دراصل بلند' ترقی یافتہ اور آزاد و بلند زندگی کا اہل ہوتا ہے' جس کا مقام جنت الماویٰ میں ہے۔ دوسری آزادی سے متصف شخص دراصل گرا ہوا ہے' خواہشات نفسانیہ کا غلام ہے اور ان کے سامنے گھٹنے ٹیکے ہوئے ہے۔ اور اس کا اصل مقام جہنم کی تہہ ہے جہاں انسانیت ختم ہو جاتی ہے اور یہ شخص درختوں اور پتھروں کی طرح جہنم کا ایندھن ہو گا۔ یہ پتھر ہے' انسان نہیں ہے۔

اس دین میں گراوٹ اور پسماندگی اور بلند ہونے اور ترقی یافتہ ہونے کا یہ معیار ہے جہاں چیزوں اور افعال کو حقیقی وزن دیا جاتا ہے۔

اب اس سورت میں عقل و خرد کی تاروں پر ایک شدید چوٹ لگائی جاتی ہے جس سے ایک طویل نغمہ بلند ہوتا ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۝ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ۝ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ۝ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ۝ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا

۲
۲۰ع
۴

# لَمْ يَلْبَثُوٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا ﴿۴۶﴾

"یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ "آخر وہ گھڑی کب آکر ٹھہرے گی؟" تمہارا کیا کام کہ اس کا وقت بتاؤ۔ اس کا علم تو اللہ پر ختم ہے۔ تم صرف خبردار کرنے والے ہو۔ ہر اس شخص کو جو اس کا خوف کرے۔ جس روز یہ لوگ اسے دیکھ لیں گے تو انہیں یوں محسوس ہو گا کہ (دنیا میں یا حالت موت میں) یہ بس ایک دن کے پچھلے پہر یا اگلے پہر تک ٹھہرے ہیں"۔

ہٹ دھرمی میں ڈوبے ہوئے مشرکین جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی روز قیامت کی یہ ہولناکیاں سنتے اور قرآن میں قیامت کے برپا ہونے کے عظیم واقعات اور افراتفری اور ہنگامہ عظیم کی بات سنتے کہ وہاں حساب و کتاب ہو گا اور جزاء و سزا ہو گی تو وہ فوراً سوال کر دیتے۔

اَيَّانَ مُرْسٰهَا (۷۹ : ۴۲) "آخر وہ گھڑی کب آکر ٹھہرے گی"۔ یہ تو تھا ان کا سوال۔

جواب یہ ہے۔

فِيمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا (۷۹ : ۴۳) "تمہارا کیا کام کہ تم اس کا وقت بتاؤ"۔ یہ ایسا جواب ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بہت بڑی عظیم بات ہو گی اور ایک عظیم حادثہ ہو گا اور ان لوگوں کا اس طرح سوال کرنا حماقت اور گھٹیا پن ہے۔ یہ بچگانہ سوال ہے اور اپنے حدود اور مقام سے آگے کی بات ہے۔ تو ان کو جواب دینے کے بجائے رسول اللہ کو جواب دیا جاتا ہے کہ "تمہارا کیا کام کہ تم اس کا وقت بتاؤ"۔ یہ تو اس سے بڑی چیز ہے کہ تم اس کے بارے میں پوچھو یا تم سے پوچھا جائے۔ اس کا وقت بتانا یا اس کا برپا کرنا میرے رب کا کام ہے' میرا کام نہیں ہے۔

اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا (۷۹ : ۴۴) "اس کا علم تو اللہ پر ختم ہے"۔ اس کا معاملہ اللہ پر آکر رک جاتا ہے اسی کو اس کے برپا ہونے کے وقت کا علم ہے۔ اور وہی اس کا مجاز ہے۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا (۷۹ : ۴۵) "تم تو خبردار کرنے والے ہو' ہر اس شخص کو جو اس کا خوف کرے"۔ تمہارا فریضہ بس یہی ہے۔ تمہارے حدود بھی یہاں تک ہیں کہ جو شخص قیامت سے ڈرتا ہے اس کو ڈرائیں۔ یعنی ایسے لوگ جو یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن ہم نے خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ یہ دن ضرور آتا ہے اور اس کے وقت کا علم صرف اللہ کو ہے۔

ہاں وقت بتانے کے بجائے اس کی ہولناکیاں اور ہنگامہ خیزیاں بتا دی جاتی ہیں۔ اور جب وہ برپا ہو گی تو اس وقت انسان کا شعور کیا ہو گا اور احساسات کیسے ہوں گے۔ اس کی عظمت کا اندازہ اسی سے لگا لو کہ اس وقت تم اس پوری دنیاوی زندگی کے بارے میں ان تاثرات کا اظہار کرو گے۔

كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا (۷۹ : ۴۶) "جس روز یہ لوگ اس کو

دیکھ لیں گے تو انہیں محسوس ہو گا کہ اس دنیا میں بس یہ دن کے پچھلے پہر یا اگلے پہر تک ٹھہرے ہیں"۔

اس کے بارے میں تمہارے تاثرات یوں ہوں گے کہ اس کی عظمت کو دیکھ کر تم پوری دنیا کو اور اپنی پوری عمروں کو اور اپنے سازوسامان کو یوں سمجھو گے کہ شاید صبح و شام کا ایک مختصر وقت تھا جو ہم نے دنیا میں بسر کیا۔

یہ دنیا جس کے لیے لوگ باہم لڑتے اور جھگڑتے ہیں۔اور ایک دوسرے کے ساتھ انہوں نے ہمہ گیر کشمکش برپا کی ہے۔اس دنیا کے لوگ مرتے ہیں اور آخرت کی لازوال اور بے پناہ انعامات کو اس کی خاطر ترک کرتے ہیں اور اس مختصر مدت کے لیے عظیم جرائم اور مظالم کا ارتکاب کرتے ہیں' نافرمانی کرتے ہیں' سرکشیاں کرتے ہیں' اور رات اور دن اس کی طلب میں غرق ہیں۔یہ دنیا ان دنیا داروں کی نظروں میں اس قدر سمٹ اور سکڑ جائے گی کہ وہ کہیں گے کہ ہم تو صرف اتنا عرصہ رہے ہیں جس طرح صبح کے وقت کا ایک مختصر حصہ یا شام کا ایک حصہ۔

یہ ہے دنیا' مختصر' جلدی سے فنا ہونے والی' حقیر و ناپائیدار' کم قیمت اور گھٹیا۔کیا لوگ اس دنیا کے ایک مختصر وقت کے لیے جس کے بارے میں خود ان کا تاثر یہ ہو گا کہ یہ ایک پورے دن کے برابر بھی نہیں ہے۔بلکہ صبح و شام کے ایک پہر کے برابر ہے۔ابدی زندگی اور اس کی نعمتوں کو ترک کر رہے ہیں حالانکہ اس دنیا کی خواہشات بھی زائل ہونے والی خواہشات ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک عظیم حماقت میں مبتلا ہے۔کوئی ذی عقل اور چشم بینا رکھنے والا انسان تو یہ فعل نہیں کر سکتا۔

--- ○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ------ ۳۰

## سورۃ عبس ۔ ۸۰

## ۱--- تا --- ۴۲

# سورۃ عبس ایک نظر میں

اس سورت کے پیراگراف قوی اور واضح ہیں اور اس میں بعض اہم حقائق بیان ہوئے ہیں ' جن کے گہرے اثرات ہیں ۔ اس کی فضا ' اس کے مناظر اور اشارات نہایت گہرے ہیں ' ایک طرف عقل و خرد کے تاروں کو چھیڑ کر شعور میں ارتعاش پیدا کیا گیا ہے اور دوسری جانب کانوں میں نہایت ہی میٹھا نغمہ گونجتا ہے ۔

پہلے پیرے میں سیرت النبوی کے ایک مخصوص واقعہ پر تبصرہ کیا گیا ہے ۔ واقعہ یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے بعض اکابر کے ساتھ محو گفتگو تھے ' ان کے سامنے اسلام کی تشریح فرما رہے تھے کہ ایک غریب اور نابینا شخص آگئے جن کا نام عبداللہ ابن ام مکتوم تھا ۔ ظاہر ہے کہ ان کو نابینا ہونے کی وجہ سے معلوم نہ تھا کہ آپ کی مجلس میں کون بیٹھا ہے اور آپ کس اہم کام میں مصروف ہیں ۔ انہوں نے آتے ہی مطالبہ کر دیا کہ اللہ نے آپ کو جو کچھ سکھایا ہے ' اس سے کچھ ان کو تعلیم دے دیں ۔ ان کی اس مداخلت کو حضورؐ نے ناپسند فرمایا ۔ آپؐ کے چہرۂ مبارک پر ناگواری کے آثار نمودار ہو گئے اور آپؐ نے چہرہ پھیر لیا ۔ چنانچہ اس سورت کے آغاز میں وحی الٰہی کے ذریعہ آپؐ کو سخت عتاب آیا ۔ اس عتاب کے ذریعہ یہ قرار دیا گیا کہ اسلامی تحریک میں فیصلہ کن قدریں کیا ہیں اور اس دعوت کی حقیقت کیا ہے اور اس دعوت کا مزاج اور اخلاقیات کیا ہیں ؟

عَبَسَ وَ تَوَلّٰی (۱) اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی (۲) وَ مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰی (۳) اَوْ
یَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی (٤) اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی (٥) فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی (٦) وَ مَا عَلَیْكَ
اَلَّا یَزَّكّٰی (۷) وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی (۸) وَ هُوَ یَخْشٰی (۹) فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی
(۱۰) كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ (۱۱) فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (۱۲) فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ (۱۳)
مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ (١٤) بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ (١٥) كِرَامٍ بَرَرَةٍ (١٦) (۸۰ : ۱ تا ۱٦)

" ترش رو ہوا اور بے رخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آگیا ۔ تمہیں کیا خبر ' شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو ' جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو ' حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے ؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور ڈر رہا ہوتا ہے ' اس سے تم بے رخی برتتے ہو ۔ ہرگز نہیں ' یہ تو ایک نصیحت ہے ' جس کا جی چاہے اسے قبول کرے ۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو

مکرم ہیں' بلند مرتبہ ہیں' پاکیزہ ہیں' معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں"۔

دوسرے پیراگراف میں بتایا گیا ہے کہ انسان ہمیشہ رب کا انکار کرتا ہے اور کھلے کفر کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس پیراگراف میں اس کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی ہے کہ وہ ذرا اپنے وجود اور مراحل حیات پر غور کرے کہ وہ کس طرح پیدا ہوا' کس سے پیدا ہوا اور رب تعالیٰ نے اس کی زندگی کے لیے کیا کیا سہولیات فراہم کیں؟ اور کس طرح اس کی موت ہوتی ہے اور پھر کس طرح اسے دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ لیکن ان عبرت آموز حقیقتوں کے باوجود انسان احکام الٰہیہ میں تقصیرات کرتا ہے۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ (۱۷) مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (۱۸) مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ (۱۹) ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ (۲۰) ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ (۲۱) ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ (۲۲) كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ (۲۳) (۸۰: ۱۷ تا ۲۳) "قتل ہو انسان' کیسا ناشکرا ہے یہ۔ کس چیز سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے؟ نطفہ کی ایک بوند سے۔ اللہ نے اسے پیدا کیا' پھر اس کی تقدیر مقرر کی' پھر اس کے لیے راہ آسان کی' پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا۔ پھر جب چاہے وہ اسے دوبارہ اٹھا کھڑا کر دے۔ ہرگز نہیں' اس نے وہ فرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا"۔

تیسرے پیرے میں انسان کو اس اہم چیز کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جو اس دنیا میں انسان کے لیے بہت اہم ہے یعنی انسان اور اس کے مویشیوں اور دوسرے حیوانات کی خوراک' پھر اس خوراک کی فراہمی کے لیے اللہ نے جو تدابیر اور انتظامات فرمائے ہیں اور ان انتظامات کے اندر ایسے ہی متعین اندازے اور قدریں رکھی ہیں جس طرح اس کی تخلیق کے اندر متعین قدریں تھیں۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ (۲۴) اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا (۲۵) ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا (۲۶) فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا (۲۷) وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا (۲۸) وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا (۲۹) وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا (۳۰) وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا (۳۱) مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (۳۲) (۸۰: ۲۴ تا ۳۲) "پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے۔ ہم نے خوب پانی لنڈھایا' پھر زمین کو عجیب طرح پھاڑا' پھر اس کے اندر اگائے غلے اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل اور چارے تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان زیست کے طور پر"۔

آخری پیرے میں شور قیامت کا ذکر ہے۔ یہ ایک ہولناک شور وشغب ہو گا۔ الصاخہ کے لفظ اور معنی دونوں خوفناک ہیں' اس قدر کہ انسان صرف اس شور وشغب کی طرف متوجہ ہو گا اور تمام دوسرے امور اس کی نظروں سے

اوجھل ہوں گے' ذہن و شعور کے علاوہ انسان کا چہرہ بھی متاثر ہو گا۔

فَإِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ (٣٣) يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ (٣٤) وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ (٣٥) وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ (٣٦) لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ (٣٧) وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُسْفِرَةٌ (٣٨) ضَاحِكَةٌ مُسْتَبْشِرَةٌ (٣٨) وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ (٤٠) تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (٤١) أُولَئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ (٤٢) (٨٠: ٣٣ تا ٤٢)

"آخر کار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز بلند ہوگی ۔۔۔ اس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آپڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہو گا۔ کچھ چہرے اس روز دمک رہے ہوں گے' ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہوں گے۔ اور کچھ چہروں پر اس روز خاک اڑ رہی ہوگی اور کلونس چھائی ہوئی ہوگی۔ یہی کافر و فاجر لوگ ہوں گے"۔

اس سورت کی آیات اور پیروں کو اس طرح جھلکیوں کے انداز میں پیش کرنا بے حد اثر آفریں ہے۔ انسانی احساس پر اس کے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ صرف پڑھتے ہی یہ جھلکیاں دل کا وہ حال کر دیتی ہیں کہ اس کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ اب ہم ان پیروں کی تفسیر تفصیلات سے لیں گے اور بعض ایسے نکات بھی بیان کریں گے جو سرسری نظر میں معلوم نہیں ہوتے۔

---ooo---

# درس نمبر ۸۰ ۲ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۴۲

سُوْرَةُ عَبَسَ مَكِّيَّةٌ (۸۰) (۲۴) — اٰيَاتُهَا ۴۲ — رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَبَسَ وَ تَوَلّٰىٓ ۝۱ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝۲ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ۝۳ اَوْ يَذَّكَّرُ
فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝۴ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝۵ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝۶ وَمَا عَلَيْكَ
اَلَّا يَزَّكّٰى ۝۷ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝۸ وَهُوَ يَخْشٰى ۝۹ فَاَنْتَ عَنْهُ
تَلَهّٰى ۝۱۰ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝۱۱ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝۱۲ فِىْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝۱۳
مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ۝۱۴ بِاَيْدِىْ سَفَرَةٍ ۝۱۵ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ۝۱۶

”ترش رو ہوا اور بے رخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آگیا۔ تمہیں کیا خبر' شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو' جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو' حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور ڈر رہا ہوتا ہے' اس سے تم بے رخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں' یہ تو ایک نصیحت ہے' جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں' بلند مرتبہ ہیں' پاکیزہ ہیں' معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں“۔

یہ ہدایات جو اس متعین واقعہ کے حوالے سے دی گئی ہیں بہت ہی اہم ہدایات ہیں' بادی النظر میں انسان ان کو پڑھ کر جو کچھ سمجھتا ہے' اس سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ یہ ایک معجزہ ہے' یہ ایک حقیقت ہے جسے اس کرۂ ارض پر ایک زندہ اور عملی حقیقت بنایا گیا ہے۔ یہ ایک عظیم معجزہ ہے۔ انسانی زندگی کو اس معجزے نے یکسر بدل دیا۔ اور یہ اسلام کا پہلا اور نمایاں معجزہ تھا۔ یہ ہدایات اگرچہ بظاہر ایک معمولی انفرادی اور جزوی واقعہ کے حوالے سے آئی ہیں لیکن اس سے ان کی

اہمیت کم نہیں ہوتی' کیونکہ یہ قرآن کریم کا ایک ربانی انداز ہے کہ وہ ایک لامحدود اور نہایت ہی گہری اور تمام حقیقت ایک محدود اور ظاہری واقعہ کے ضمن میں بیان کر دیتا ہے۔

اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو جو حقیقت یہاں ان ہدایات میں ذہن نشین کرائی جا رہی ہے اور اس کے نتیجے میں اسلامی معاشرے کے اندر جو عملی نتائج پیدا ہو رہے ہیں وہ تو عین اسلام ہے۔ یہی اسلام ہے جو ہر آسمانی رسالت نے پیدا کیا' اور اس کا پودا زمین کے اندر لگایا۔

یہ گہری حقیقت جو ان ہدایات کے ضمن میں بیان کی گئی ہے۔ محض یہ نہیں ہے کہ معاشرے کے افراد کے ساتھ برتاؤ کس طرح ہو' غرباء کے ساتھ کیا ہو اور امراء کے ساتھ کس طرح ہو' جیسا کہ بظاہر اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ حقیقت اس سے ذرا گہری ہے' بہت بڑی ہے۔ وہ یہ ہے کہ معاملات کے وزن اور قدر کا اسلامی پیمانہ کیا ہے۔ مسلمانوں نے اپنی قدریں اور پیمانے کہاں سے لینے ہیں۔

ان ہدایات کے ذریعہ جس حقیقت کو استقلال بخشا گیا ہے کہ لوگوں کو اپنی اقدار صرف آسمانی حوالوں سے اخذ کرنی ہیں۔ ان کے پیمانے آسمان سے متعین ہو کر آئیں' زمین اور اہل زمین کے ہاں کیا کچھ رائج ہے۔ یہ اسلامی نظروں میں کچھ نہیں ہے' اہل دنیا کی اقدار کیا ہیں۔ یہ اسلامی نگاہ میں غیر متعلق بات ہے۔

اب معلوم ہو گا کہ یہ تو ایک عظیم معاملہ ہے اور اس کرۂ ارض پر اس معیار کو قائم کرنا مشکل کام ہے۔ زمین کے اوپر زمین کے لوگ وہ قدریں اور پیمانے آسمان سے اخذ کریں جن کے اوپر زمین اور اہل زمین کی کوئی چھاپ نہ ہو' اور زمین کے رواج اور حوالوں سے وہ خالی ہوں یہ فی الحقیقت ایک عظیم امر ہے۔

ان ہدایات کی عظمت اور ان کی عملی مشکلات کا اندازہ تب ہوتا ہے جب ہم انسان کی پیچیدہ عملی زندگی کا گہرا مطالعہ کریں اور یہ اندازہ کریں کہ انسانی نفس' انسانی شعور پر ان کا دباؤ کیا ہوتا ہے۔ انسان کے لیے واقعی حالات' زندگی کے دباؤ اور پریشر' لوگوں کے خاندانی اور معاشی روابط کے بندھنوں سے نکلنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ انسان کی موروثی قدریں' تاریخی روایات اور تمام دوسری قدریں جو اسے زمین کے ساتھ مضبوطی سے باندھ رہی ہوتی ہیں اور جن کا دباؤ نفس انسانی پر بہت سخت ہوتا ہے۔

اور یہ معاملہ اس وقت بھی عظیم اور مشکل نظر آتا ہے' جب ایک انسان دیکھتا ہے کہ اس مسئلے پر سرور کونین کو بھی اللہ کی طرف سے ہدایات کی ضرورت پیش آئی بلکہ یہ ہدایات سخت عتاب کی شکل میں دی گئیں اور آپ کے طرز عمل پر بارگاہ رب العزت کی طرف سے تعجب کا اظہار کیا گیا۔

کسی معاملے کی عظمت اور اس کے مشکل الحصول ہونے کے لیے صرف یہ کہنا ہی کافی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت پیش آئی اور آپ کو ہدایت دی گئی اور تنبیہہ کی گئی کہ آپ کو یہ اعلیٰ معیار قائم کرنا ہے۔ یہ اس لیے کہ آپ کی عظمت' آپ کی بلندی اور رفعت اس بات کی دلیل ہے کہ اگر آپ کو بھی اس معاملے کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے تو یہ معاملہ فی الواقع بہت عظیم اور یہ معیار مشکل الحصول ہے۔ یہ ہے اس معاملے کی اہمیت اور حقیقت' جسے اللہ تعالیٰ زمین کے اوپر ایک واقعہ اور حقیقت نفس الامری کے طور پر' اس انفرادی واقعہ کی صورت میں' ایک مثال' معیار اور ماڈل کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا تاکہ لوگ اس میزان اور معیار کے مطابق اپنا طرز عمل درست کریں۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ' نمونہ اور عملی زندگی سے اپنے لیے میزان اور معیار اخذ کریں۔ یوں یہ واقعہ اور یہ ہدف ایک عظیم ہدف بن جاتا ہے۔ قرآن و سنت دراصل وہ پیمانہ ہے جسے اللہ نے رسولوں کو عطا کیا' ان پر نازل کیا تاکہ لوگ ان کے مطابق اپنے اعمال اور طرز عمل کو درست کریں' اس سلسلے میں یہ میزان کیا ہے؟ یہ ہے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ "تم میں سے معزز اللہ کے نزدیک' وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے"۔ بس یہی وہ وزن ہے جس کے مطابق کسی کا پلڑا بھاری ہو گا اور کسی کا ہلکا ہو گا۔ اور یہ خالص آسمانی قدر و قیمت ہے۔ آسمانی پیمانہ ہے اور اس کا زمین کے حالات و روایات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

لیکن لوگ تو اس زمین پر رہتے ہیں اور یہاں ان کے درمیان قسم قسم کے روابط ہیں۔ ہر رابطے کا ایک وزن' ایک دباؤ اور ایک کشش ہے۔ ان کی اقدار مختلف ہوتی ہیں۔ نسب' قوت' مال اور ان تینوں کی بنیاد پر قائم ہونے والے روابط و مفادات' اقتصادی اور غیر اقتصادی روابط جن میں بعض لوگوں کے حالات دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ نسب' مال اور قوت کے لحاظ سے اس زمین پر بعض لوگوں کا وزن زیادہ اور بعض کا کم ہوتا ہے۔

جب اسلام آتا ہے' تو اس کا اعلان یہ ہوتا ہے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ "تم میں سے معزز اللہ کے نزدیک' وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے"۔ تو وہ ان تمام روابط' اقدار اور تعلقات سے صرف نظر کر لیتا ہے۔ حالانکہ ان چیزوں کا ان کی عقلیت اور شعور پر دباؤ ہوتا ہے۔ ان میں جاذبیت ہوتی ہے۔ انسانوں کے فہم و شعور میں اس کی گہری جڑیں ہوتی ہیں۔ اسلام ان تمام چیزوں کو بدل کر انسانوں کو آسمانی قدریں دیتا ہے اور یہ آسمانی قدریں اور پیمانے صرف ایک معیار کو تسلیم کرتے ہیں کہ جو متقی ہے وہ مکرم ہے اور بس۔

ایک واقعہ' جزئی اور متعین واقعہ پیش آتا ہے اور اس کے ضمن میں یہ اصول اور یہ بنیادی قدر متعین ہو جاتی ہے کہ یہ آسمان سے نازل شدہ پیمانہ اور یہ قدر و قیمت آسمانوں سے مقرر ہوئی ہے۔ امت مسلمہ کا فریضہ یہ ہے کہ لوگ ہر اس چیز کو ترک کر دیں جو لوگوں کے ہاں عرف اور متعارف ہو' جو زمینی تصورات' زمینی اقدار اور عرف پر مبنی ہو' اور صرف ان قدروں اور پیمانوں کو اپنائیں جو آسمان سے نازل ہوں۔

ایک فقیر اور اندھا آتا ہے۔ نام عبداللہ ابن ام مکتوم ہے۔ یہ رسول اللہؐ کے ہاں آتا ہے تو آپؐ قریش کے سرداروں سے محو گفتگو ہیں۔ ان کو دعوت دین ہی دی جا رہی ہے۔ عتبہ' شیبہ' یہ دونوں سردار ربیعہ کے مشہور بیٹے ہیں۔ ابوجہل (عمرابن ہشام) امیہ ابن خلف' ولید ابن مغیرہ اور عباس ابن عبدالمطلب بھی ان کے ساتھ ہیں۔ حضورؐ کو یہ امید ہے کہ ان لوگوں کا اسلام اس وقت تحریک کی مشکلات میں کمی کر دے گا۔ کارکنوں پر مظالم ہو رہے تھے اور یہ چند افراد اپنے مالی' جانی اور سیاسی حیثیت کے تمام وسائل کو اسلام کی راہ روکنے کے کام میں جھونک رہے تھے۔ اور لوگوں کو اسلام کی راہ سے روک رہے تھے اور وہ اسلام کے خلاف ہر سازش کر رہے تھے کہ اسے مکہ کے اندر ہی منجمد کر کے رکھ دیں جبکہ دوسری اقوام مکہ سے باہر غیر جانب دار کھڑی تھیں اور باہر کی اقوام اس دعوت کو اس لیے قبول نہیں کر رہی تھی کہ خود اہل مکہ اس کی راہ روکے کھڑے تھے۔ سخت مخالفت کر رہے تھے' اور اس وقت کے قبائلی نظام میں اگر کوئی قبیلہ بھی کسی

سردار کی بات کو مان کر نہیں دیتا تو اس کی بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی۔

یہ فقیر اندھا شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان اکابر قریش کے ساتھ مصروف ہیں۔ اپنے کسی ذاتی معاملے میں نہیں' کسی ذاتی مفاد میں نہیں بلکہ دعوت اسلامی کے کام اور مفاد میں مصروف گفتگو ہیں۔ اگر یہ لوگ مسلمان ہو جاتے ہیں تو مکہ میں دعوت اسلامی کے راستے سے تمام رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔ اور اس کی راہ سے تمام نوکدار کانٹے چنے جاتے ہیں اور اسلام مکہ کے ارد گرد کے علاقوں میں بھی پھیل جاتا ہے۔ کیونکہ ان اکابر کے اسلام لانے کے بعد اسلام تیزی سے پھیل جاتا۔

یہ صاحب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس حال میں آتے ہیں اور کہتے ہیں حضورؐ مجھے اس علم میں سے کچھ پڑھائیے جو اللہ نے آپؐ کو دیا ہے۔ وہ بار بار اس بات کی تکرار کرتے ہیں اور اور جانتے بھی ہیں کہ حضورؐ مصروف ہیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ان فعل اور ان کی اس بات کو پسند نہیں کرتے اور آپؐ کے چہرے پر کراہت کے آثار نمودار ہوتے ہیں اور یہ شخص ان آثار کو نہیں دیکھ پا رہے ہیں۔ آپؐ ترش روئی اختیار کرتے ہیں اور منہ پھیر لیتے ہیں کیونکہ یہ شخص آپؐ کو ایک نہایت اہم معاملے سے روک رہے ہیں۔ یہ معاملہ اس لیے اہم ہے کہ اگر یہ کام ہو جاتا ہے تو دعوت اسلامی کو بہت فائدہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ کام آپؐ دین اسلام کے فائدے اور مدد کے لیے کر رہے ہیں' خالص دینی فائدے کے لیے۔ اسلام کی مصلحت کی خاطر اور اسلام کے پھیلانے کی چاہت کے جذبے سے۔

لیکن آسمانوں سے مداخلت ہوتی ہے۔ اس لیے مداخلت ہوتی ہے کہ اس موضوع پر فیصلہ کن بات کر دی جائے تاکہ دعوت اسلامی کے طریق کار میں کچھ نشانات راہ رکھ دیئے جائیں اور وہ ترازو قائم کر دیا جائے جس پر اسلامی نقطہ نظر سے اقدار کو تولا جائے گا۔ اور اس کے مقابلے میں تمام حالات اور تمام مقاصد ترک کر دیئے جائیں گے یہاں تک کہ خود اللہ کے دین کی مصلحت کو بھی نظرانداز کر دیا جائے گا۔ اگرچہ انسان اس معیار کے خلاف کسی چیز کو دعوت اسلامی کے لیے مفید سمجھتے ہوں۔ بلکہ اگرچہ سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایسی چیز کو دعوت اسلامی کے لیے مفید سمجھتے ہوں۔

چنانچہ عالم بالا سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عتاب آتا ہے اور نبی کریمؐ تو خلق عظیم کے مالک ہیں اور محبوب رب العالمین ہیں لیکن یہ عتاب نہایت ہی شدید اسلوب میں آتا ہے۔ پورے قرآن میں اس قسم کے سخت عتاب کی یہ واحد مثال ہے جس میں لفظ کلا استعمال ہوا ہے جو سختی سے تردید کے لیے آتا ہے اور جھڑکی کے موقعہ پر استعمال ہوتا ہے اور یہ اس لیے کہ یہ میزان وہ ہے جس کے اوپر پورا دین قائم ہے۔

جس اسلوب اور انداز میں یہ عتاب فرمایا گیا ہے وہ ایک منفرد انداز ہے۔ انسانی اسالیب اس کی نقل یا ترجمانی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ انسانی تحریر کی زبان کی کچھ حدود ہیں اور کچھ طریقے ہیں۔ انسانی اسلوب تحریر میں ایسے گرم اور سخت اشارات نہیں سموئے جا سکتے جو زندہ و تابندہ ہوں۔ یہ قرآن کریم کا اعجازی انداز گفتگو ہے جو اس قسم کے اشارے چند مختصر الفاظ میں کر دے اور عتاب کی ایک جھلک سی دکھا دے۔ ایسے انداز میں کہ گویا وہ نہایت ہی تیز تاثرات ہیں' زندہ صورت میں ہیں' مخصوص اثر اور انداز رکھتے ہیں۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰی (۱) اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی (۸۰ : ۲) ”ترش رو ہوا اور بے رخی برتی' اس بات پر

کہ وہ اندھا اس کے پاس آگیا"۔ یہ گفتگو اس انداز کی ہے کہ گویا ایک غیر موجود اور غائب شخص کے بارے میں بات ہو رہی ہے اور وہ مخاطب نہیں ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے 'بات اللہ کے نزدیک بڑی ناپسندیدہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے مناسب نہ سمجھا کہ اس کا تذکرہ اپنے نبی اور محبوب کو براہ راست خطاب کر کے کرے۔ یہ اس لیے کہ آپؐ اللہ کو بہت محبوب ہیں اور اللہ آپؐ کا اکرام فرماتا ہے اور براہ راست خطاب نہیں فرمایا کہ تم نے ایسا کیا۔ کیونکہ بات بڑی ناپسندیدہ ہے۔

اس کے بعد بات کا انداز بدلتا ہے۔ اصل بات کا تذکرہ کیے بغیر آپؐ سے خطاب شروع ہو جاتا ہے۔ اور خطاب میں بات کو یوں شروع کیا جاتا ہے۔

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ (٣) أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ (٨٠: ٤) "تمہیں کیا خبر شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو؟" آپؐ کو کیا معلوم کہ یہ عظیم بھلائی وقوع پذیر ہو جائے 'یہ کہ یہ اندھا فقیر پاک و صاف ہو جائے جو نہایت شوق سے آپ کے پاس آیا ہے 'ہدایت چاہتا ہے اور جب آپؐ اس کو ہدایت دیں تو اس کے لیے نفع بخش ہو جائے اور اس کے دل میں نور ربانی روشن ہو جائے اور زمین پر وہ اس طرح ہو جائیں جس طرح منارہ نور ہوتا ہے۔ اگر ایک دل میں ایمان بیٹھ جائے اور پوری طرح بیٹھ جائے تو اللہ کے نزدیک یہ ایک عظیم کام ہے۔

اب اس عتاب کا لہجہ ذرا اور تیز ہوتا ہے۔ بات کے اندر میں ذرا سختی آجاتی ہے۔ اور یہ اظہار تعجب اب شدید عتاب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ (٥) فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّىٰ (٦) وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ (٧) وَأَمَّا مَن جَاءَكَ يَسْعَىٰ (٨) وَهُوَ يَخْشَىٰ (٩) فَأَنتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ (١٠) (٨٠: ٥ تا ١٠)

"جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو' حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور ڈر رہا ہوتا ہے' اس سے تم بے رخی برتتے ہو"۔ یعنی جو آپؐ سے 'آپؐ کے دین سے' آپؐ کے پاس موجود ہدایت' بھلائی سے' نور اور طہارت سے جو قرآن کریم کی شکل میں ہے ان سب خزانوں سے بے پروائی برتتا ہے تو ایسے شخص کو آپؐ اہمیت دیتے ہیں' اس کی ہدایت کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ آپؐ اس کے درپے ہوتے ہیں اور وہ آپؐ سے منہ موڑ رہا ہوتا ہے۔

وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ (٨٠: ٧) "اگر وہ پاکیزگی اختیار نہیں کرتا تو اس کی ذمہ داری آپؐ پر نہیں ہے"۔ اگر وہ اپنی موجودہ گندی حالت اور ناپاکی کو جاری ہی رکھنا چاہتا ہے تو آپؐ پر کیا ذمہ داری ہے۔ اس کے کرتوتوں کی باز پرس آپؐ سے نہ ہوگی۔ آپؐ نہ اس کے ذمہ دار ہیں' نہ اس کا مواخذہ آپؐ سے ہوگا۔ اور وہ جو آپؐ کے پاس دوڑ کر آتا ہے۔

جَاءَكَ يَسْعَىٰ (٨٠: ٨) نہایت مطیع فرمان ہو کر اور وہ اللہ کی خشیت رکھتا ہے تو

فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى (۸۰: ۱۰) "آپ اس سے بے رخی برتتے ہیں"۔ یہ نہایت ہی شدید عتاب ہے۔ تلہی کے معنی کسی شخص کو چھوڑ کر دوسری طرف مشغول ہونا۔

اب اس عتاب کا لہجہ ذرا اور سخت ہو جاتا ہے اور جھڑکی اور سختی سے تردید کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔

كَلَّآ ہرگز نہیں' یہ ممکن نہیں' یہ ایک ایسا انداز خطاب ہے جس پر غور کرنا چاہئے' ایسا ہرگز نہ ہو گا۔

اس کے بعد دعوت اسلامی کی حقیقت' اس کی عظمت اور اس کی بلندی کو بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ایک ایسی دعوت ہے جو کسی کی محتاج نہیں ہے۔ اس کو کسی کی سند اور سہارے کی ضرورت نہیں ہے اور اس دعوت کی نظر میں وہی شخص قابل لحاظ ہے جو دعوت اسلامی کو صرف دعوت کی خاطر قبول کرتا ہے' دنیا میں اس کے حالات اور اس کی حیثیت جو بھی ہو۔

اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ (۱۱) فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (۱۲) فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ (۱۳) مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ (۱۴) بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ (۱۵) كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ (۱۶) (۸۰: ۱۱ تا ۱۶) "یہ تو ایک نصیحت ہے' جس کا جی چاہے' اسے قبول کرے۔ یہ صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں' بلند مرتبہ ہیں' پاکیزہ ہیں۔ معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں"۔ گویا یہ دعوت ہر لحاظ سے ایک قابل قدر دعوت ہے۔ اس کے صحیفے بھی مکرم ہیں۔ بلند مرتبہ اور پاکیزہ ہیں اور عالم بالا میں ان کا انتظام اور ان کی تبلیغ ایسے ہاتھوں میں دیا گیا ہے جو نیک اور معزز ہیں۔ لہٰذا دعوت اسلامی کے ساتھ جو بھی منسلک ہے' دور سے یا نزدیک سے' وہ مکرم اور نیک ہے اور اس دعوت کو ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے' جو اس سے منہ موڑتے ہوں اور بے پروائی برتتے ہوں۔ یہ تو صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو اس کی برتری اور اس کی پاکیزگی کے قائل ہیں اور جو اس سے پاکیزگی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

یہ ہے معیار' اللہ کا مقرر کردہ معیار۔ اسی میزان کے مطابق میں ہمیں لوگوں کے اور اپنے اعمال اور اپنی حیثیت کو وزن کرنا ہو گا۔ یہ اللہ کا حکم ہے' اللہ کا کلام ہے۔ اور اس کے مقابلے میں کسی بات کا کوئی وزن ہی نہیں رہتا' ہر فعل اور ہر حکم اس سے فروتر ہے۔

یہ حکم کہاں دیا گیا اور یہ واقعہ کہاں پیش آیا؟ مکہ میں' جبکہ دعوت اسلامی کا ہر طرف سے پیچھا کیا جا رہا تھا' مسلمان بہت ہی کم تعداد میں تھے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان بااثر لوگوں کی طرف کسی ذاتی مقصد کے لیے بھی متوجہ نہ تھے۔ اور اس اندھے سے لاپروائی کسی ذاتی غرض کے لیے نہ تھی۔ حضور کے پیش نظر بھی صرف اور صرف دعوت اسلامی کا مفاد تھا لیکن اس دعوت کا ترازو یہ تھا۔ اس کی قدریں دوسری تھیں اس نے تو لوگوں کے لیے قدروں کا تعین کرنا تھا' روایات کی تخلیق کرنی تھی۔ یہ دعوت تب ہی کامیاب' باوقار اور مضبوط ہو سکتی جب وہ ایسے پیمانے قائم کر دیتی۔

یہ فقط ایک انفرادی واقعہ نہ تھا' یہ ایک عظیم اصول تھا۔ نہ ایک معمولی اخلاقی برتاؤ کا معاملہ تھا' معاملہ یہ تھا کہ ایک اصولی اور دستوری مسئلہ درپیش تھا کہ لوگ نیک و بد کے پیمانے کہاں سے اخذ کریں۔ کیا زمین کے رسم و رواج سے یا

آسمانی ہدایات سے ' زمینی اور عوامی زاویوں سے یا بارگاہ رب العزت سے ' جہاں سے یہ اصول وضع ہوا ہے ـ

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ "تم میں سے اللہ کے نزدیک معزز وہ ہے جو تم میں سے متقی ہے"۔

اس دعوت اور اس تحریک میں وہی قابل لحاظ ہے جو اللہ کے نزدیک قابل لحاظ ہے ۔اگرچہ دنیاوی اعتبار سے وہ ان عناصر سے محروم ہو جو لوگوں کے نزدیک وزن دار ہیں ۔جن مناظر کا لوگوں پر دباؤ ہے اور جن کو دنیا والوں کے نزدیک اہم سمجھا جاتا ہے ' مثلاً نسب وحسب ' افرادی اور مالی قوت ' اور دوسری قابل لحاظ باتیں ۔اگر یہ چیزیں ایمان سے خالی ہوں اور ان کے ساتھ تقویٰ کا رنگ نہ ہو' تو اس دعوت میں ان کا کوئی وزن نہیں ہے ۔اس تحریک کے زاویہ سے اہم بات اور سب سے مقدم بات یہ ہے کہ ایک شخص اپنے حالات ایمان اور تقویٰ کے اعتبار سے درست کام کرے ۔

اس واقعہ ' انفرادی اور جزوی واقعہ کے حوالے سے ' اللہ تعالیٰ اس عظیم حقیقت اور اس عظیم اصول کو ذہن نشین کرانا چاہتا تھا اور قرآنی انداز اصلاح اور تربیت کے عین مطابق 'جس میں ایک انفرادی واقعہ سے ایک عظیم اصول نکال کر لوگوں کے ذہن نشین کرا لیا جاتا ہے ۔یہ اصول پھر دستوری قاعدہ بن جاتا ہے ۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ان ہدایات اور اس عتاب سے بے حد متاثر ہوئی ۔آپؐ نے نہایت جوش و خروش سے ان ہدایات کو قبول کیا اور ان پر عمل کر کے اس اصول اور دستور کو اسلامی معاشرے میں نافذ کیا ۔اس نئی جماعت کی عمارت اس اصول پر استوار ہوئی کہ یہ اسلامی معاشرے کی خشت اول تھی ۔

آپ کا پہلا فرض یہ قرار پایا کہ آپ اس واقعہ کو قرآن کی ایک سورت کے طور پر خود بیان کریں ۔یہ ایک عظیم بات تھی ۔یہ خدا کا رسول ہی کر سکتا تھا ۔جس پہلو سے بھی ہم اس پر غور کریں ۔انسان اپنی کمزوریوں کو چھپاتا ہے ۔یہ رسول خدا ہی تھے جنہوں نے اس عتاب الٰہی کا برملا اعلان فرمایا اور یہ اعلان بھی اس منفرد انداز میں فرمایا ۔اگر نبی کے سوا کوئی اور لیڈر ہوتا تو وہ اپنی غلطی کا احساس کر لیتا' آئندہ احتیاط کرتا' لیکن اللہ کے نبی کا مقام تو کچھ اور ہوتا ہے ۔منصب نبوت کے آفاق تو کچھ اور ہوتے ہیں 'بہت بلند اور بہت دور رس ۔

یہ نبی ہی تھا جو نہایت ہی مشکل اور نازک حالات میں ' قریش کے ایک بااثر اور مقدر لوگوں کے سامنے اس اصول کا اعلان کر دیں ۔جبکہ اس نئی دعوت کے مقابلے میں یہ بااثر لوگ اپنے مالی افرادی اور خاندانی عزت و جاہ کے سب وسائل لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور ایک ایسے معاشرے میں جس میں حسب و نسب اور عزت و جاہ کے سوا کوئی اور قدر رائج نہ تھی ' اس میں بات صرف یہ ہوتی تھی ۔محمد ابن عبداللہ ابن عبدالمطلب 'ابن ہاشم اور لوگ کہتے تھے ۔

لَوْلَا نُزِّلَ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ "یہ قرآن دو گاؤں کے کسی عظیم شخص پر کیوں نہیں اترا؟" ۔حضورؐ تو ان کے اندر صاحب نسب تھے 'لیکن رئیس نہ تھے اور وہ تو صرف جاہ و اقتدار کے پجاری تھے ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے معاشرے میں ایک نبی اور وحی الٰہی ہی اس قسم کا عظیم انقلاب برپا کر سکتی ہے ۔زمین پر رہنے والا کوئی شخص اور دنیاوی ذہن سے سوچنے والا کوئی فرد ایسا انقلابی اقدام نہیں کر سکتا اور خصوصاً ایسے حالات اور ایسے وقت میں جن میں حضور اکرمؐ دعوت اسلامی کا کام کر رہے تھے ۔

یہ آسمانی قوت اور آسمانی ہدایت ہی تھی جس نے اس معاملے کو اس انداز پر چلایا' یہ اصول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

ذات کے ذریعہ ان مشکل حالات میں نافذ کیا گیا۔ حضور اکرمؐ نے اسے نافذ کیا' نہایت جوش و خروش' نہایت قوت اور مضبوطی کے ساتھ اس دستور کو اس نئی سوسائٹی کی بنیادوں کے اندر رکھ دیا اور یہ امت مسلمہ کی زندگی میں ایک طویل عرصہ تک قائم و دائم رہا۔

یہ دراصل انسانیت کے لیے ایک دوسرا جنم تھا۔ جس طرح ایک انسان فطرتاً پیدا ہوتا ہے' بلکہ انسانیت کا یہ جنم دراصل زیادہ قیمتی تھا۔ اس طرح کہ انسانی سوسائٹی' کسی سرزمین میں متعارف جاری و ساری قدروں کو خیرباد کہہ دے اور ایسی قدروں کو اپنالے جو بالکل نئی ہوں۔ آسمانوں سے نازل شدہ ہوں۔ نئے تصورات' نئے نظریات آجائیں' ان کے نتیجے میں نئے حالات اور نئے اعمال اور نئے روابط اور ایک نیا شعور پیدا ہو جائے اور زمین پر عملاً پائے جانے والے تصورات' نظریات' حالات اور عملی روابط اور رسم و رواج کو اکھاڑ پھینکا جائے۔ اور لوگ ان سابقہ تصورات اور روابط کے دباؤ سے یکلخت آزاد ہو جائیں اور ان کے اندر جدید تصورات اور جدید قدریں رچ بس جائیں۔ وہ ان کو خوب سمجھ لیں۔ سب کے سب ان کو تسلیم کریں۔ اور یہ عظیم انقلاب برپا ہو جائے۔ یہ جدید قدریں مسلم سوسائٹی کے ضمیر میں نمایاں ہوں۔ اس کے قوانین میں واضح ہوں' تو فی الواقعہ یہ انسانوں کے لیے ایک نیا جنم تھا۔ یہ عظیم انقلاب تھا جس کے برپا کرنے کے لیے ذات محمدی کو بھی تنبیہہ اور ہدایت کی ضرورت پیش آئی اور یہ انقلاب ابتدائی دور کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک طویل عرصے تک نمایاں رہا۔

ہم جدید دور کے لوگ دراصل اس عظیم انقلاب اور انسانیت کے اس جدید جنم کو کماحقہ سمجھ نہیں پا رہے' اس لیے کہ ہم نے اس دنیا اور اس زمین کی قدروں' زمین کے روابط اور اس دنیا کی حیثیات اور نظریات کو ترک کر کے اپنے آپ کو اسلام کے مطابق نہیں ڈھالا۔ ہم پر مادیت اور مادی قدروں اور دنیاوی تصورات کا اس قدر غلبہ ہے کہ ہمارے دور کے بعض جاہل جو تاریخ کا مادی فلسفہ پیش کرتے ہیں۔ یہ سمجھنے لگے ہیں' کہ عقائد و تصورات اور اعلیٰ قدریں اور علوم و فنون دراصل مادی حالات اور مادی اور معاشی قدروں کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح تمام رسوم و رواجات اور اصول و قوانین جو اصل معاشی قدروں کی پیداوار ہوتے ہیں' یہ لوگ بے حد جاہل ہیں اور یہ نفس انسانی کے نشیب و فراز سے بالکل ناواقف ہیں۔ بہرحال اسلام نے جو انقلاب رونما کیا وہ ایک معجزہ تھا اور انسانوں کے لیے ایک نیا جنم تھا۔

انسانیت کے اس نئے جنم کے بعد اور اس عظیم انقلاب کے بعد' دنیا کی فضا پر یہ قدریں حاوی رہیں' لیکن ایک عربی معاشرے میں ان کا حاوی ہونا اس قدر آسان نہ تھا' نہ مسلمانوں کے نفوس پر ان کا حاوی ہونا کوئی سہل الحصول ٹارگٹ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنے ذاتی کمالات' پھر ارادۂ الٰہی' پھر خدا کی طرف سے ہدایات و تصرفات اور پھر قرآن کریم کی ہدایات پر گرم جوشی سے عمل پیرا ہونے کے شوق کی وجہ سے' ان عظیم اصولوں اور قدروں کو لوگوں کے شعور اور ضمیر میں بٹھایا' ایک پودے کی طرح ان کے دلوں میں یہ نئی اخلاقیات اور قدریں کاشت کی گئیں' پھر ان کی سخت نگہداشت کی گئی تاکہ ان کی جڑیں مضبوط ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی پر صدیاں گزر گئیں لیکن یہ قدریں اپنی جگہ جمی ہوئی ہیں حالانکہ ان صدیوں میں باد مخالف کے بڑے بڑے طوفان گزر گئے اور بے شمار عوامل ان قدروں کے خلاف کام کرتے رہے۔

اس واقعہ کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جب بھی ابن ام مکتوم کی ملاقات ہوئی' آپؐ ان کو ان کلمات کے

ساتھ خوش آمدید کہتے ۔" آیئے صاحب تمہاری وجہ سے مجھے اللہ جل شانہ نے سختی سے ٹوکا"۔ حضور اکرمؐ نے اس اندھے فقیر کو دو بار اپنی زندگی میں مدینے کا گورنر بنایا۔

عربی معاشرے میں کسی کو رشتہ دینا' ایک بڑا احساس مسئلہ تھا۔ اس معاملے میں جہاں لڑکی دی جاتی تھی' ان لوگوں کے لیے سخت معیار تھا' آپؐ نے اپنی پھوپھی زاد زینب بنت جحد اسدیہ کو اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کے نکاح میں دلوایا تاکہ ان جاہلی قدروں پر ضرب لگائی جاسکے۔

اس سے قبل جب آپؐ کے مدینہ میں مواخات کا نظام قائم کیا تو اپنے چچا حمزہ کا بھائی اپنے اسی آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کو بنا دیا۔ اور حضرت بلال ابن رباح کو حضرت خالد ابن رویحہ الخثعمی کا بھائی بنا دیا۔

حضرت زید کو غزوۂ موتہ میں امیر بنایا۔ یہ اس غزوہ کے پہلے امیر تھے۔ اس کے بعد جعفر ابن ابوطالب کا نمبر تھا' پھر عبداللہ ابن رواحہ انصاری کا۔ اس لشکر میں تین ہزار انصار اور مہاجرین تھے جن میں خالد ابن ولید بھی تھے۔ اس لشکر کو رخصت کرنے کے لیے حضورؐ خود نکلے۔ اس جنگ میں یہ تینوں شہید ہوگئے تھے۔ اللہ ان سے راضی ہو۔ اور آپؐ کے آخری احکامات میں سے یہ حکم تھا کہ آپؐ نے حضرت اسامہ ابن زید کو رومیوں کے ساتھ جنگ کے لیے کمانڈر مقرر کیا۔ اس لشکر میں بے شمار انصار اور مہاجرین شامل تھے۔ ان میں حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ جیسے لوگ بھی تھے جو آپؐ کے ساتھی اور وزیر و مشیر تھے اور جو آپؐ کے بعد خلیفہ تھے۔ نیز حضرت سعد ابن وقاص بھی تھے جو آپؐ کے قریبی بھی تھے اور قریش میں سے قدیم الاسلام تھے۔

بعض لوگوں نے حضرت اسامہ کی امارت پر تعجب کا اظہار بھی کیا' کیونکہ وہ بالکل کم عمر نوجوان تھے۔ حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں "حضورؐ نے ایک لشکر روانہ فرمایا اور اس پر اسامہ ابن زید کو امیر مقرر فرمایا' بعض لوگوں نے ان کی امارت پر اعتراض کیا تو آپؐ نے کہا اگر تم اسامہ ابن زید کی امارت میں طعن کرتے ہو تو تم نے اس سے قبل ان کے والد کی امارت پر بھی اعتراض کیا تھا' خدا کی قسم' وہ امارت کے اہل تھا اور مجھے سب لوگوں میں نہایت محبوب تھا اور یہ بھی مجھے تمام لوگوں سے محبوب ہے"۔ (شیخین اور ترمذی)

اور جب سلمان فارسیؓ کے بارے میں بعض لوگوں نے نازیبا الفاظ کہے اور عربی اور فارسی کے حوالے سے بات کی۔ اور ان باتوں سے محدود عربی قومیت کی بو آتی تھی' تو حضور اکرمؐ نے اس تصور پر بھی ایک فیصلہ کن ضرب لگائی اور فرمایا : "سلمان ہم اہل بیت میں سے ہے"۔ اور حضرت مسلمانوں کو آسمانی قدروں نے تمام گری ہوئی دنیاوی قدروں سے آگے بڑھا دیا اور وہ ایک لمحے میں آفاق سے بھی آگے بڑھ گئے اور محدود قومیت کی لکیریں مٹا دی گئیں جو عربوں کے نزدیک بہت اہم تھیں اور سلمان کو اہل بیت کا فرد قرار دیا (طبرانی و حاکم)۔

جب حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت بلالؓ کے درمیان تکرار ہوگئی اور حضرت ابوذرؓ کی زبان سے یہ لفظ نکل گیا "اے سیاہ فام عورت کے لڑکے"' تو اس پر حضور اکرمؐ شدید طور پر غضب ناک ہوگئے اور اس بات کو حضرت ابوذرؓ کے منہ پر مار دیا اور فرمایا "ابوذر پیمانے کو درست رکھو' اسلام میں سفید عورت کے بیٹے کو سیاہ عورت کے بیٹے کے اوپر کوئی فضیلت نہیں ہے"۔ چنانچہ آپؐ نے بات کو نہایت ہی ابتدائی جڑوں سے علیحدہ کر دیا۔ اسلام' اسلام ہے اور آسمانی قدروں پر مشتمل ہے اور جاہلیت' جاہلیت ہے۔ اس کی قدریں زمینی ہیں۔ (ابن مبارک)

حضرت ابوذرؓ کے حساس دل پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات کا سخت اثر ہوا' انہوں نے اپنی پیشانی زمین پر رکھ دی اور قسم اٹھائی کہ وہ اس وقت تک اپنی پیشانی کو اوپر نہ اٹھائیں گے جب تک بلالؓ اسے روند نہ ڈالیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک اس بری بات کا کفارہ یہی تھا۔

جس ترازو کے مطابق حضرت بلالؓ کو اس قدر وزن حاصل ہوا تھا' وہ آسمانی ترازو تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں' رسول اللہ نے فرمایا! ''بلالؓ مجھے بتاؤ کہ تم نے کون سا ایسا عمل کیا ہے جس پر تمہیں خدا کے ہاں بہت زیادہ اجر کی توقع ہے؟'' اس لیے کہ میں نے معراج کی رات' جنت میں تمہارے جوتوں کی آواز سنی ہے''۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ اسلام لانے کے بعد میں نے جب بھی مکمل پاکی اختیار کی ہے (وضو غسل) رات کو یا دن کو تو میں نے اس کے بعد نماز پڑھی ہے' جس قدر اللہ نے میرے لیے مقدر کیے تھے' بس یہی وہ بات ہے جس سے میں امید کرتا ہوں کہ مجھے زیادہ ثواب ملے گا۔ (شیخین)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمار ابن یاسر کے بارے میں فرمایا کرتے تھے' جب بھی انہوں نے حضورؐ سے ملاقات کی اجازت چاہی ''اسے اجازت دو' یہ پاک اور پاکباز ہے''۔ (نسائی) اور دوسری جگہ آپؐ نے فرمایا ''عمار سر سے پاؤں تک ایمان سے پر ہے''۔ اور حضرت حذیفہؓ کے بارے میں فرمایا ''مجھے معلوم نہیں ہے کہ میں تمہارے اندر اب کتنا عرصہ رہوں گا' لہٰذا ان دونوں کی پیروی کرو''۔ (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ کیا) اور عمار کے طریقے پر چلو اور تمہیں جو بات ابن مسعود نے بتائی' اس کی تصدیق کرنا''۔ (ترمذی)

حضرت ابن مسعود کی حالت تو یہ تھی کہ جو لوگ مدینہ کے رہنے والے نہ تھے' وہ آتے تو حضرت ابن مسعود کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کا آدمی سمجھتے ...... کیونکہ یہ اکثر آتے جاتے تھے اور بروقت حضورؐ کے ساتھ رہتے تھے۔ (شیخین و ترمذی)

ایک آزاد کردہ غلام جلیبیبؓ تھے' ان کے لیے حضورؐ خود ہی رشتہ تلاش فرماتے تھے۔ حضورؐ چاہتے تھے کہ انصار میں سے کوئی عورت ان کے لیے مل جائے۔ ایک لڑکی کے بارے میں حضورؐ نے پیغام دیا' اس کے والدین نے انکار کر دیا تو اس لڑکی نے کہا' کیا تم رسول اللہؐ کی بات کو رد کر رہے ہو؟ اگر رسول اللہؐ اس پر راضی ہیں تو مجھے اس شخص کے نکاح میں دے دو۔ اس پر والدین راضی ہوگئے اور انہوں نے وہ لڑکی اسے نکاح کر کے دے دی۔ (احمد)

یہ شخص اپنی اس شادی کے بعد جلدی پیش آنے والی کسی جنگ میں گم ہوگئے۔ حضرت ابو برزہ اسلمی روایت فرماتے ہیں کہ حضور ایک غزوہ میں شریک ہوئے۔ اللہ نے آپؐ کو فتح دی اور مال غنیمت بھی ملا۔ جنگ کے بعد حضورؐ نے فرمایا کیا تم کسی کو گم پاتے ہو' تو لوگوں نے کہا ہاں فلاں فلاں اور فلاں نہیں ہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے دوبارہ دریافت فرمایا کیا تم کسی کو گم پاتے ہو؟ تو لوگوں نے کہا' فلاں' فلاں اور فلاں نہیں ہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کیا کوئی اور شخص گم پا رہے ہو تو انہوں نے کہا نہیں اور تو کوئی گم نہیں ہے تو آپؐ نے فرمایا ہاں میں جلیبیب کو گم پاتا ہوں۔ لوگوں نے انہیں تلاش کیا' یہ سات مقتولین کفار کے پاس پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان سات کو قتل کر دیا تھا' جس کے بعد انہوں نے اسے شہید کر دیا تھا۔ آپؐ ان کی لاش کے پاس کھڑے ہوئے اور فرمایا اس نے سات کو قتل کر دیا۔ بعد میں انہوں نے اسے شہید کر دیا۔ یہ میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔ یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ اس کے بعد آپؐ نے اپنے

دونوں بازوؤں میں انہیں اٹھایا۔ حضورؐ کے بازوؤں کے سوا ان کے لیے کوئی چارپائی نہ تھی۔ ان کے لیے قبر کھودی گئی اور انہیں قبر میں رکھ دیا گیا۔ راوی نے غسل کا ذکر نہیں کیا۔ (مسلم)

اللہ کی ان ہدایات کے ذریعہ سے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوۂ حسنہ کی وجہ سے 'انسانیت کو ایک نیا جنم ملا۔ اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس میں حسن و قبح کے اصول آسمان سے لیے جاتے تھے۔ یہ معاشرہ اسی زمین پر ہوتے ہوئے بھی زمین کی گری پڑی اقدار سے آزاد تھا۔ یہ تھا اسلام کا عظیم معجزہ۔ یہ ایک عظیم معجزہ تھا اور کوئی معجزہ خدا اور رسولؐ کے احکام کے بغیر صادر نہیں ہو سکتا۔ اس معجزے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ دین اللہ کا دین تھا اور جس ذات بابرکات نے یہ دین پیش کیا وہ اللہ کا رسولؐ تھا۔

اور اللہ کی ایک خاص تدبیر تھی کہ رسول اللہ کے بعد آپؐ کے پہلے ساتھی حضرت ابوبکر صدیقؓ اس کے والی اور خلیفۃ المسلمین بنے۔ اس کے بعد آپ کے دوسرے ساتھی حضرت عمرؓ اس دین کے سربراہ بنے۔ یہ دوسرے خلیفہ دونوں میں سے اس نظام کو زیادہ سمجھنے والے تھے 'یہ زیادہ حضور اکرم کی سنت پر چلنے والے تھے اور رسول سے محبت کرنے والے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اطاعت کے میدان میں ان کے نقش قدم پر چلنے والے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اسامہ کے بارے میں حضورؐ کے اصرار کو سمجھ لیا تھا۔ اس لیے انہوں نے منصب امارت سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے یہی کام کیا۔ یہ لشکر حضور اکرمؐ نے تیار کیا تھا اور حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ کے باہر خود اسے الوداع کہا۔ اسامہ سوار تھے اور حضرت ابوبکرؓ خلیفۃ المسلمین ان کی سواری کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ حضرت اسامہ کو حیا آگئی کہ وہ سوار ہوں اور بوڑھے خلیفہ پیدل ساتھ ساتھ جا رہے ہوں۔ انہوں نے کہا "خلیفۃ المسلمین' یا تو آپ سوار ہوں یا میں اترتا ہوں"۔ خلیفۃ المسلمین قسم اٹھاتے ہیں "خدا کی قسم تم نہ اترو گے اور خدا کی قسم میں سوار بھی نہ ہوں گا 'کیا ہو جائے گا اگر میرے پاؤں بھی اللہ کے راستہ میں غبار آلود ہو جائیں"۔

اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے سوچا کہ آپ کو حضرت عمرؓ کی ضرورت ہے کیونکہ آپ کے کاندھوں پر خلافت کا بوجھ پڑ چکا ہے لیکن عمر تو جیش اسامہ کے ایک سپاہی ہیں۔ اسامہ امیر ہیں۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ اسامہ سے اجازت طلب کی جائے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں "اگر تم عمرؓ کو ترک کر کے میری مدد کر سکتے ہو تو مناسب ہو گا"۔ ذرا الفاظ کو دیکھو "اگر تم مناسب سمجھو تو حضرت عمرؓ کو چھوڑ کر میری مدد کرو"۔ یہ ہیں وہ بلندیاں جن تک اسلام نے انسانوں کو پہنچا دیا۔ یہ معجزہ صرف اللہ کی مرضی سے ہو سکتا ہے اور ایک رسول ہی اسے سرانجام دے سکتے ہیں۔

زمانے کا پہیہ گھومتا ہے اور ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ حضرت عمرؓ خلیفہ ہیں اور وہ حضرت عمار ابن یاسر کو کوفہ کا حاکم مقرر کرتے ہیں۔

ایک وقت یوں بھی آتا ہے کہ حضرت عمر کے دفتر کے سامنے سہیل ابن عمرو ابن الحارث ابن ہشام اور ابوسفیان کھڑے ہیں اور ان کے ساتھ قریش کے سرداروں کی ایک جماعت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے اور طلقاء کہلائے۔ حضرت عمرؓ ان سے پہلے صہیب اور بلال کو اندر بلاتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ اسلام کے سابقون الاولون اور اہل بدر میں سے تھے۔ ابوسفیان کے نتھنے مارے غصے کے پھول جاتے ہیں اور سخت جذباتی انداز میں کہتے ہیں "میں اپنی پوری زندگی میں ایسا دن نہیں دیکھا کہ ان غلاموں کو تو اندر بلایا جاتا ہے اور ہم دروازے پر چھوڑے جاتے ہیں"۔ اس

کے ایک ساتھی جنہوں نے حقیقت اسلام کو سمجھ لیا تھا اور ان کے شعور پر اسلام چھا گیا تھا' ان سے کہا "اے قوم تمہارے چہروں پر جو آثار نمودار ہیں' میں دیکھ رہا ہوں۔ اگر تمہیں غصہ آ رہا ہے تو یہ غصہ اپنے نفس سے اتارو' ان لوگوں کو بھی اسلام کی طرف بلایا گیا اور تمہیں بھی بلایا گیا۔ انہوں نے فوراً لبیک کہا اور تم نے دیر لگا دی۔ تم ذرا اس وقت کا خیال کرو کہ قیامت میں ان کو بلایا جائے اور تم وہاں بھی کھڑے کے کھڑے رہو۔ (اسلام کا اجتماعی عدل)

حضرت عمرؓ اسامہ ابن زید کے لیے عبداللہ ابن عمر سے زیادہ الاؤنس مقرر فرماتے ہیں۔ حضرت عبداللہ اس کا راز پوچھتے ہیں حضرت عمر جواب دیتے ہیں "بیٹے' زید رسول اللہ کو تمہارے باپ سے زیادہ محبوب تھے اور اسامہ رسول اللہ کے ہاں تم سے زیادہ محبوب تھے۔ اس لیے میں نے رسول اللہؐ کی محبت کو اپنی محبت پر ترجیح دے دی"۔ حضرت عمرؓ کو معلوم تھا کہ رسول اللہؐ کی محبت آسمانی پیمانوں سے ناپی جاتی ہے۔

--- ○○○---

حضرت عمرؓ حضرت عمارؓ ابن یاسر کو بھیجتے ہیں کہ وہ اسلام کے عظیم کمانڈر' فاتح اور اعلیٰ خاندان کے فرد حضرت خالد بن ولید کے خلاف بعض شکایات کی تفتیش کریں۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمارؓ نے ان کو ان کی چادر سے باندھا اور بعض روایات میں آتا ہے کہ ان کو خود ان کے عمامے سے باندھا گیا۔ یہاں تک کہ تفتیش ختم ہوگئی اور اس کے نتیجے وہ بے گناہ ثابت ہوگئے۔ اس کے بعد وہ انہیں کھولتے ہیں اور خود اپنے ہاتھ سے ان کے سر پر عمامہ باندھتے ہیں اور حضرت خالدؓ کو اس پر کوئی غصہ نہیں آتا۔ اس لیے کہ حضرت عمارؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی ہیں اور ان سے پہلے اسلام لانے والے ہیں اور ان کے بارے میں رسول اللہؐ نے جو کچھ فرمایا وہ ان کو معلوم تھا۔

حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں فرماتے تھے۔ یہ ہمارے سردار ہیں جنہوں نے ہمارے دوسرے سردار کو غلامی سے آزاد کرایا یعنی حضرت بلال کو جو امیہ ابن خلف کے مملوک تھے اور امیہ انہیں سخت اذیت دیتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے انہیں خریدا اور آزاد کر دیا۔ ان کے بارے میں حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ بلالؓ ہمارے سردار ہیں۔

یہ حضرت عمرؓ ہی تھے کہ انہوں نے فرمایا اگر ابوحذیفہ کے آزاد کردہ غلام سالم موجود ہوتے تو میں انہیں خلیفہ بنا دیتا۔ حضرت عمرؓ ایک طرف تو یہ کہتے ہیں اور دوسری جانب انہوں نے حضرت عثمانؓ' حضرت علیؓ' حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ جیسے لوگوں کو بھی خلیفہ نہ بنایا۔ بلکہ چھ آدمیوں کی شوریٰ مقرر کی کہ ان میں سے کسی ایک کو مقرر کیا جائے۔

حضرت علیؓ حضرت عمار اور حسن ابن علی کو اہل کوفہ کی طرف بھیجتے ہیں۔ وہ ان سے درخواست کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے ساتھ ان کا جو نزاع ہوگیا ہے اس میں وہ ان کا ساتھ دیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں "مجھے اچھی طرح علم ہے کہ حضرت عائشہؓ تمہارے نبیؐ کی بیوی ہیں' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی' لیکن اللہ نے تمہیں اس امتحان میں ڈال دیا ہے کہ تم میری اطاعت کرتے ہو یا ان کی"۔ (بخاری) اس طرح حضرت عائشہؓ کے بارے میں لوگ ان کی بات سنتے ہیں۔

حضرت بلالؓ یمن کے گورنر تھے۔ ابورویحہ خثعمی یمن کے ایک قبیلے میں شادی کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ان کی سفارش کریں۔ حضرت بلالؓ فرماتے ہیں میں بلال ابن رباح ہوں اور یہ میرے بھائی ابورویحہ ہیں۔ یہ ایک ایسا شخص ہے کہ نہ اس کے اخلاق اچھے ہیں اور نہ یہ زیادہ دیندار ہے۔ تم چاہو تو اپنی لڑکی ان کے عقد میں دے دو اور نہ چاہو تو نہ دو"۔ حضرت بلالؓ انہیں دھوکہ نہیں دیتے اور نہ اس کے معاملے میں کوئی بات چھپاتے ہیں'

اور نہ وہ اس بارے میں یہ کہتے ہیں کہ میں سفارشی ہوں۔ وہ صرف یہ بات پیش نظر رکھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہیں گے اللہ کے ہاں جوابدہ ہیں۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ کس قدر سچے ہیں اور وہ یہ رشتہ دے دیتے ہیں۔ بس وہ یہ بات کافی سمجھتے ہیں کہ وہ ایک صاحب نسب عرب ہیں اور ان کی پکی سفارش حضرت بلالؓ حبشی کر رہے ہیں۔

غرض یہ عظیم حقیقت اسلامی معاشرے میں عملاً قائم ہوگئی اور اس کے بعد ایک طویل زمانے تک قائم رہی۔ باوجود اس کے بعد کے زمانوں میں مسلمانوں کے اندر زوال اور تنزل کے بے شمار عوامل پیدا ہو گئے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس کا جب بھی ذکر ہوتا ہے تو ان کے ساتھ ان کے آزاد کردہ غلام عکرمہ کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ جب عبداللہ ابن عمر کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے ساتھ ان کے غلام نافع کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ انس ابن مالک کے ساتھ ابن سیرین کا ذکر ہوتا ہے' اور ابو ہریرہ کے ساتھ ان کے غلام عبدالرحمن ابن ہرمز کا ذکر ہوتا ہے' بصرہ میں حسن بصری' مکہ میں مجاہد' عطا ابن ابی رباح اور طاؤس ابن کیسان جیسے لوگ مشہور فقہاء تھے۔ عمر ابن عبدالعزیز کے زمانے میں' مصر میں یزید ابن ابی حبیب مفتی اعظم مقرر ہوئے۔ یہ علقمہ کے سیاہ فام آزاد کردہ غلام تھے۔

یہ تھیں آسمانی اور اسلامی قدریں جنھوں نے انسانیت کو تقویٰ کی بنیاد پر اس قدر بلند کر دیا' اگرچہ دنیا کے اندر مقبول ترین اقدار میں سے کوئی خصوصیت ان کے اندر نہ تھی۔ نہ اپنی ذات کے اعتبار سے اور نہ ان کے ماحول کے اعتبار سے۔ یہ میزان اور یہ پیمانے دنیا میں ماضی قریب تک قائم رہے۔ ماضی قریب میں پوری دنیا پر دوبارہ جاہلیت چھاگئی۔ دنیا کا ایک حصہ امریکی جاہلیت کے زیر اثر آگیا جس میں انسانوں کی قیمت ڈالر کی شکل میں متعین ہونے لگی اور نصف مشرق دنیا کی قیادت روسی جاہلیت کو حاصل ہوگئی اور اس میں انسان کی وقعت ایک پیداواری مشین کے سوا کچھ نہ تھی۔ رہی اسلامی دنیا تو اس پر وہی جاہلیت عربی قومیت کی جاہلیت چھاگئی جس کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لیے اسلام دنیا میں آیا تھا اور عملاً اسلام نے اسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ آج عالم اسلام سے اس اعلیٰ معیار اور اعلیٰ قدر کو مٹا دیا گیا ہے اور عالم اسلام ایک ایسی جاہلیت کی تاریکیوں میں ڈوب گیا ہے' جس کے اندر ایمان اور تقویٰ اعلیٰ قدر ہی نہیں ہے۔

ہاں عالم اسلام میں دعوت اسلامی اور احیائے اسلام کی تحریک جاری ہے۔ صرف اس تحریک پر امید ہے کہ یہ پوری دنیا کو جاہلیت سے نکال کر از سرنو آسمانی قدریں عطا کرے گی اور شاید ایک بار پھر انسانیت ایک نیا جنم لے جیسا کہ انسانیت کو آغاز اسلام کے دور میں نصیب ہوا۔ جس کی ایک جھلک اس سورت کی ابتدائی آیات میں دکھائی گئی ہے۔ یہ چند آیات ہیں لیکن نہایت ہی اہم اور سنگ میل اور فیصلہ کن ہیں۔

ایک مخصوص واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے سورت کے پہلے حصے میں اس عظیم حقیقت کو بیان کیا گیا' اب دوسرے حصے میں' اس انسان کے رویہ پر سخت تعجب کا اظہار کیا گیا ہے جو ایسے حقائق اور ایمان اور تقویٰ کی اس دعوت سے منہ موڑتا ہے' اور دعوت اسلامی سے اپنے آپ کو برتر اور بالا سمجھتا ہے۔ یہ انسان اپنے اصل اور اپنی تخلیق کے حالات پر اگر غور کرتا تو ہرگز اعراض نہ کرتا۔ انسان یہ نہیں دیکھتا کہ اس پر اللہ کی کیا کیا عنایات ہیں۔ اس کی زندگی قدم قدم پر اللہ کے کنٹرول میں ہے' دنیا اور آخرت میں یہ انسان دراصل ہر مرحلہ حیات میں اللہ کے اختیار میں ہے' لیکن یہ اپنے خالق' اپنے کفیل اور اپنے محاسب کے حقوق ادا نہیں کرتا اور نہ اس سے ڈرتا ہے۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾

"قتل ہو انسان' کیسا ناشکرا ہے یہ۔ کس چیز سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے' نطفہ کی ایک بوند سے۔ اللہ نے اسے پیدا کیا' پھر اس کی تقدیر مقرر کی' پھر اس کے لیے زندگی کی راہ آسان کی' پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا۔ پھر جب چاہے وہ اسے دوبارہ کھڑا کر دے۔ ہرگز نہیں' اس نے وہ فرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا"۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ (۸۰:۱۷) "انسان قتل ہو"۔ کیونکہ وہ اپنے ان قابل تعجب اعمال کی وجہ سے اس بات کا مستحق ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ یہ سرزنش اور طعن و تشنیع کا ایک انداز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان جو کچھ کر رہا ہے وہ اس قدر برا ہے کہ اگر اس پر اسے سزائے موت دے دی جائے تو قابل تعجب نہ ہوگی۔

مَآ اَكْفَرَهٗ (۸۰:۱۷) "کس قدر ناشکرا ہے"۔ وہ کفر' انکار میں بہت شدید ہے' اگر وہ اپنی تخلیق پر غور کرتا تو اپنے خالق کا شکر ادا کرتا۔ دنیا میں تواضع اختیار کرتا اور آخرت کا خیال رکھتا۔ یہ انسان کس بات پر مست ہے۔ اپنے آپ کو بے پرواہ سمجھتا ہے' اور ہدایت سے منہ موڑتا ہے۔ ذرا اپنی اصلیت اور آغاز وجود کے حالات پر تو غور کرے۔

مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (۸۰:۱۸) "کس چیز سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے"۔ اس کی اصلیت تو نہایت معمولی' متواضع اور حقیر ہے۔ اور یہ اللہ کا فضل و کرم ہی ہے جس نے اپنی تقدیر اور تدبیر سے اس جرثومے سے انسان بنایا ہے۔

مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ (۸۰:۱۹) "نطفہ کی ایک بوند سے اللہ نے اسے پیدا کیا۔ پھر اس کی تقدیر مقرر کی"۔ یعنی ایک ایسے نطفے سے جس کی کوئی قیمت نہیں ہے اور اس اصل جرثومے سے جس کے اندر کوئی قوت نہیں' وہ خود نہ آ سکتا تھا' یہ تو خالق تھا جس نے اس کا آنا مقدر کیا۔ پھر اس کی صنعت اور تخلیق میں مضبوطی پیدا کی۔ پھر اسے ایک تندرست و توانا مخلوق بنایا اور اسے تمام مخلوقات پر ترجیح دی اور مکرم بنایا' اور اس حقیر جرثومے کو اس زمین پر مختار ٹھہرایا۔

ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ (۸۰:۲۰) "پھر اس کے لیے راہ میسر کی"۔ زندگی کی راہ یا ہدایت کی راہ۔ زندگی کی راہ یا ہدایت کی راہوں پر چلنے کے لیے اس کے اندر استعداد اور صلاحیتیں ودیعت فرمائیں۔ اور جب زندگی کا یہ سفر ختم ہوا تو یہ انسان بھی اس انجام تک جا پہنچا جس تک تمام زندہ مخلوق کو پہنچنا ہے۔ اس انجام تک پہنچنے سے رکنا اس کے

اختیار میں نہیں ہے اور اس انجام سے کوئی راہ فرار نہیں ہے۔

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ (۸۰:۲۱) "پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا"۔ لہذا جس طرح اس کا آنا اللہ کے امر سے ہے' اس کا یہ انجام بھی اللہ کے امر سے ہے۔ اللہ نے جب چاہا اسے زندگی میں لے آیا اور جب چاہا زندگی کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اور قبر کے پیٹ مین رکھوا دیا۔ یہ قبر بھی اس کے لیے اس کی شرافت کی خاطر اور اس پر مہربانی کرتے ہوئے مقرر کی۔ یوں نہ چھوڑا کہ جہاں مرجائے' وہیں چھوڑ دیا جائے اور جانور اسے نوچتے رہیں۔ انسان کی فطرت میں یہ بات رکھ دی کہ مردہ انسانوں کی لاش کو قبر میں چھپایا جائے۔ یہ بھی اللہ کی تدبیر اور تقدیر اور احکام کا ایک حصہ ہے کہ مردوں کو دفن کیا جائے۔ اور جب اللہ کی مشیت کے مطابق باز پرس کا وقت آپہنچے گا تو اسے دوبارہ زمین سے اٹھا دیا جائے گا اور یہ بھی اللہ کے حکم سے ہو گا۔

ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ (۸۰:۲۲) "اور پھر جب چاہے اسے دوبارہ اٹھا کر کھڑا کر دے"۔ کیونکہ وہ یونہی بے کار چھوڑا جانے والا نہیں ہے اور نہ بغیر حساب و کتاب کے اسے یونہی زمین کا حصہ بنا دیا جائے گا۔ لہذا ذرا غور کرو کہ یہ انسان اسی حساب و کتاب کے لیے کچھ تیاری کر رہا ہے دیکھو کہ یہ انسان اسی حساب و کتاب کے لیے کچھ تیاری کر رہا ہے یا نہیں۔

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ (۸۰:۲۳) "ہرگز نہیں' اس نے وہ فرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا"۔ بات مطلق انسان کی ہو رہی ہے' تمام افراد انسان کی بہر دور کے انسان اللہ کے احکام بجا لانے میں کوتاہی کرتے ہیں' اپنی پوری زندگی میں ان کی روش یہی ہوتی ہے۔ "لما" سے اس مفہوم کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ ہرگز نہیں' انسان ہر صورت میں قصوروار ہے' یہ اپنے فرائض ادا نہیں کرتا' وہ اپنی اصلیت اور حقیقت کو بھی پیش نظر نہیں رکھتا' حالانکہ یہ بات ہروقت اس کے پیش نظر ہونی چاہئے۔ نیز وہ اپنے خالق' اپنے ہادی اور اپنے کفیل کا حق شکر بھی ادا نہیں کرتا۔ اور اس زندگی کا مختصر سا سفر اس طرح نہیں طے کرتا کہ اس کے اقدامات آخرت کو پیش نظر رکھ کر ہوں۔ مجموعی طور پر انسان کی حالت ایسی ہی ہے کہ اکثریت نافرمان' ناشکری' ہدایت سے بے نیاز اور متکبر ہے۔

اب جدید پیراگراف آتا ہے۔ سابقہ پیراگراف میں انسان کی پیدائش کی بات رکھی گئی تھی' اب کہا جاتا ہے کہ یہ انسان ذرا اپنی اور اپنے مویشیوں کی خوراک پر تو غور کرے۔ اس دنیا کی زندگی اور سفر میں اللہ نے انسان اور اس کے مویشیوں کے لیے کیا انتظام فرمایا۔ انسان کے غور کے لیے یہ ایک ہی چیز کافی ہے جو اللہ نے اس کے لیے فراہم کی ہے۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ﴿۲۴﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا ﴿۲۸﴾ وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ﴿۲۹﴾ وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾ وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ﴿۳۱﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ

وَّ لِاَنۡعَامِكُمۡ ﴿۳۲﴾

"پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے۔ہم نے خوب پانی لنڈھایا' پھر زمین کو عجیب طرح پھاڑا' پھر اس کے اندر اگائے غلے اور انگور اور ترکاریاں۔ اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل اور چارے تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان زیست کے طور پر"۔

یہ ہے قصہ انسان اور اس کے مویشیوں کی خوراک کا'جس کی تیاری کے تمام مراحل مختصر' یہاں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ انسان کو چاہئے کہ وہ ان پر غور کرے۔کیا ان انتظامات میں خود اس کا اپنا بھی کوئی دخل ہے۔کیا یہ سب کچھ اس کی تدبیر سے ہو رہا ہے۔جس ذات باری نے اسے پیدا کیا اور اس دنیا اور زمین پر لاکر کھڑا کر دیا۔یہ وہی ذات ہے جس نے یہ تمام انتظامات کیے۔

فَلۡيَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ (۸۰ : ۲۴) "پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے"۔ یہ نظام خوراک براہ راست اس کے ساتھ متعلق ہے'اس کے قریب ہے'اس کے ساتھ لازم و ملزوم ہے'اسے چاہئے کہ وہ اس حاضر و موجود اور لازم و مکرر نظام پر غور کرے۔اس کا قصہ اور اس کی کہانی کس قدر عجیب ہے اور کس قدر آسان ہے۔یہ کام چونکہ بسہولت ہوتا رہتا ہے اس لیے اس کے اندر جو عجائب و کمالات ہیں وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت یہ نظام رزق بھی ایسا ہی معجزہ ہے جس طرح انسان کی تخلیق ایک معجزہ ہے۔جس طرح تخلیق میں ہر مرحلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔اسی طرح اس نظام رزق کا ہر مرحلہ بھی اللہ کے دست قدرت میں ہے۔

اَنَّا صَبَبۡنَا الۡمَآءَ صَبًّا (۸۰ : ۲۵) "ہم نے خوب پانی لنڈھایا"۔پانی کا بارش کی صورت میں گرایا جانا ایک ایسا عمل ہے'جس سے ہر دور کا انسان واقف تھا۔علم و تجربہ کے ابتدائی اور انتہائی مراحل کے انسان اس سے واقف تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے جو انسان' ہر انسان کے سامنے پیش کی جاتی ہے لیکن جب انسان نے ترقی کر لی تو اسے معلوم ہوا کہ اس آیت کے مفہوم میں کیا کیا وسعتیں ہیں۔آج کل کے ماہرین ماحولیات اس زمین کے اوپر پانی کے اس اجتماع کے بارے میں جو مفروضے پیش کرتے ہیں'ان میں سے قریب ترین یہ ہے کہ یہ پانی ہمارے اوپر فضا میں تھا اور یہ بارش کی شکل میں زمین پر گرا اور سمندروں کی شکل اختیار کر گیا۔

دور حاضر کے سائنس دانوں میں سے ایک شخص یہ کہتا ہے :"اگر اس بات کو درست مان لیا جائے کہ سورج سے جدا ہونے کے وقت زمین کا درجہ حرارت یا زمین کی سطح کا درجہ حرارت تقریباً ۱۲۰۰۰ ڈگری تھا تو یہ بات تسلیم کرنی ہوگی کہ اس وقت تمام عناصر ایک دوسرے سے الگ تھے اور کسی کیمیاوی ترکیب کا امکان ہی نہ تھا۔پھر کرۂ ارض اور اس کے اجزائے ترکیبی بتدریج ٹھنڈے ہوگئے اور اس طرح مختلف کیمیاوی مرکبات وجود میں آئے۔اور اس دنیا کا ملبہ وجود میں آیا جسے ہم جانتے ہیں۔آکسیجن اور ہائیڈروجن اس وقت تک مل نہیں سکتے جب درجہ حرارت ۴۰۰۰ ہزار فارن ہیٹ تک نہ آجائے۔یوں جب درجہ حرارت ۴۰۰۰ ہزار فارن ہیٹ تک آیا تو یہ اجزاء مرکب ہوگئے اور پانی وجود میں آیا جس کے بارے میں جدید سائنس نے معلوم کر لیا ہے کہ وہ کرۂ ہوائی کی شکل میں تھا اور سمندر کا پانی زمین پر نہ تھا بلکہ ہوائی

شکل میں تھا۔ اور تمام دوسرے عناصر بھی مفرد تھے۔ ان کی ترکیب عمل میں نہ آئی تھی۔ یہ عناصر گیسوں کی شکل میں تھے۔ جب کرۂ ہوائی میں پانی تیار ہوا تو وہ زمین پر گرنے لگا لیکن یہ بارش جوں جوں زمین کے قریب آتی' زیادہ حرارت کی وجہ سے پھر گیس بن کر فضا میں اٹھ جاتی۔ کیونکہ زمین کا درجہ حرارت اس سے بھی زیادہ تھا جتنا ہزار ہا میل بالائی فضاؤں میں تھا۔ بالآخر جب زمین بتدریج ٹھنڈی ہوتی گئی تو بارشوں کا یہ طوفان زمین کے قریب پہنچ گیا اور گرمی کی وجہ سے دوبارہ بھاپ بن کر اٹھتا رہا۔ آخر کار اس عظیم طوفان نے زمین کی سطح کو ٹھنڈا کر کے 'یہ عظیم سمندر جو فضاؤں میں تھے' زمین پر اتار دیئے۔ یہ طوفان کس قدر عظیم تھے ان کا تصور بھی مشکل ہے"۔ (علم ایمان کی طرح ہوتا ہے' ترجمہ ڈاکٹر محمود صالح فلکی)

ہم ان مفروضوں اور نظریات کو مفروضے ہی مانتے ہیں اور قرآن کو ان کے ساتھ محدود نہیں کرتے لیکن یہ نظریات قرآن کے مفہوم کو وسیع کر دیتے ہیں اور اسے ہمارے فہم و ادراک کے قریب لے آتے ہیں۔ یہ دراصل پانی انڈیلنے کی سائنسی تاریخ ہے۔ یہ نظریات بہرحال نظریات ہیں' درست بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آئندہ پانی کے زمین پر آنے کے کچھ دوسرے نظریات بھی وجود میں آجائیں کیونکہ قرآن ہر دور اور ہر معیار علم کے انسانوں سے مخاطب ہوتا ہے۔ اور یہی قرآن کا اعجاز ہے کہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسے میں نے ہی سمجھا ہے۔

یہ تھا طعام کا ابتدائی حصہ۔

اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا (۸۰ : ۲۵) "ہم نے خوب پانی لنڈھایا"۔ کیا انسان یہ سوچ سکتا ہے کہ اس پانی کی تخلیق میں اس کا کوئی بھی دخل ہے۔ یا اس کی پیدائش کی ہسٹری میں اس کا دخل ہے یا انسانوں نے کسی تدبیر سے یہ سمندر زمین پر انڈیل دیئے تاکہ وہ اپنے طعام کا انتظام کریں۔

ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا (۸۰ : ۲٦) "پھر ہم نے زمین کو عجیب طرح پھاڑا"۔ پانی کے انڈیلنے کے بعد یہ تیسرا مرحلہ ہے۔ یہ بات بالکل ابتدائی اور پتھر کے دور کے انسان کی سمجھ میں بھی آتی تھی جو دیکھتا تھا کہ پانی آسمانوں سے برس رہا ہے اور یہ خدا کی قدرت سے برس رہا ہے اور اس میں انسان کی تدبیر اور تقدیر کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ زمین کو پھاڑ کر اس کی مٹی میں جذب ہوتا تھا' یا وہ دیکھتا تھا کہ زمین کی مٹی اللہ کی قدرت سے شق ہوتی ہے۔ اس سے نباتات نکلتے ہیں اور فضا میں بلند ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ نباتات نرم و نازک ہوتے ہیں اور زمین نہایت بھاری اور مضبوط ہوتی ہے لیکن یہ دست قدرت ہی ہے جو اس مضبوط زمین کو شق کر کے اس کے اندر سے نرم و نازک پودے کو نکالنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ بھی ایک معجزہ ہے جسے ہر انسان دیکھتا ہے جو پودے اور مٹی کا مشاہدہ رکھتا ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کے اندر ایک خفیہ قوت کام کر رہی ہے اور یہ نہایت ہی مہربان قوت ہے۔

لیکن اس ابتدائی مفہوم کے بعد جو علوم آگے بڑھتے ہیں تو آیت کے مفہوم و مدلول کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اور زمین کے شق ہونے کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ پودوں کی پرورش کے لیے سازگار بنا دی گئی ہے۔ جیسا کہ سابقہ نظریہ میں ہم نے بتایا کہ زمین کے اوپر پانی کے ہولناک طوفان آئے۔ جن کے نتیجے میں زمین کے چھلکے کی چٹانیں ٹوٹ

پھوٹ کر بہہ نکلیں اور ہموار میدان وجود میں آئے 'جس کے اندر ایسی مٹی جمع ہو گئی جو قابل زراعت ہے - یہ مفہوم بھی اس آیت میں داخل ہے -

ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ( ۸۰ : ۲۶ ) "پھر ہم نے زمین کو پھاڑا" کی آیت -

أَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ( ۸۰ : ۲۵ ) "ہم نے پانی لنڈھایا" کے بعد آتی ہے - اس سے بھی یہی اشارہ ملتا ہے کہ زمین کا شق ہونا پانی کے بعد ہوا -

بہرحال ان آیات کا یہ مفہوم ہو یا کوئی تیسرا مفہوم ہو 'بہرحال تخلیق کے تیسرے مرحلے میں نباتات کی تخلیق کا ذکر ہے اور بظاہر ان نباتات کی طرف اشارہ کیا گیا جو انسانوں اور انسانوں کے کام آنے والے مویشیوں کے لئے چارہ کا کام کرتے ہیں اور جن کو ابتدائی انسان بھی اچھی طرح سمجھتا تھا -

فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ( ۸۰ : ۲۷ ) "پھر اس میں غلے اگائے" - اس سے تمام حیوانات مراد ہیں - جن کو انسان کسی نہ کسی صورت میں استعمال کرتے ہیں اور جن کو مویشی کسی نہ کسی صورت میں اپنی غذا بناتے ہیں -

وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ( ۸۰ : ۲۸ ) "انگور اور ترکاریاں" - انگور تو مشہور ہیں - قضب ان سبزیوں کو کہا جاتا ہے جو سبزی کے طور پر کھائی جاتی ہیں - اور ان کو بار بار کاٹا اور چنا جاتا ہے -

وَّزَيْتُونًا وَّنَخْلًا ( ۲۹ ) وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ( ۳۰ ) وَّفَاكِهَةً وَّأَبًّا ( ۸۰ : ۳۱ ) "اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل اور چارے" - زیتون اور کھجور کے درخت مشہور ہیں اور حدائق حدیقہ کی جمع ہے 'یہ اس ثمردار باغ کو کہا جاتا ہے جو دیواروں کے اندر گھرا ہوا ہو اور غلباغلباء کی جمع ہے 'یعنی ایسے باغات جن کے درخت گھنے ہوں اور جن کی شاخیں ایک دوسرے کے اندر گھس گئی ہوں -

فَاكِهَةً وہ میوہ جو باغات سے حاصل ہو -

أَبًّا ( ۸۰ : ۳۱ ) کا مفہوم غالباً وہ جسے انسان چارے کے لیے کاشت و نگہداشت کریں - اس کے مفہوم کے بارے میں حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا - انہوں نے اس کے بارے میں اپنے آپ کو ملامت کیا تھا جیسا کہ سورہ نازعات میں گزر گیا ہے -

یہ تو تھا انسان کے طعام کا قصہ 'اور انسانی طعام کی تمام ضروریات صرف اللہ فراہم کرتا ہے اور اس میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہے - اس میں انسان کا کوئی دخل نہیں بلکہ انسان دخیل ہونے کا مدعی ہی نہیں ہے کہ وہ اس کے مختلف مراحل میں سے کسی مرحلے میں دخیل ہے - یہاں تک کہ زمین کے اندر وہ جو بیج بوتا ہے اس کی نشوونما میں بھی وہ دخیل نہیں ہے - نہ انسان نے بیج پیدا کیا ہے اور نہ ایجاد کیا ہے - ابتدائی طور پر یہ حیوانات کس طرح ایجاد ہوئے 'یہ ایک معجزہ

ہے۔ اور انسانی تصور اور ادراک سے وراء ہے۔ یہ مٹی انسان کے سامنے ہے اور ایک ہے' اور ہر دانہ ایک ہی زمین میں اور باہم متصل قطعات میں اپنے اپنے پھل اور پھول لاتا ہے جبکہ ایک ہی پانی اور دوسرے عناصر اسے غذا دیتے ہیں لیکن یہ درست قدرت ہی کا کام ہے کہ پودے اور پھل مختلف ہوتے ہیں۔ اور ان پودوں اور پھلوں سے آگے جو بیج پیدا ہوتے ہیں ان میں "ماں بیج" کے تمام خصائص موجود ہوتے ہیں۔ یہ باتیں اور یہ ٹیکنالوجی انسان سے مخفی ہے۔ اس کا راز کوئی نہیں جانتا' نہ اس میں کوئی فیصلہ کر سکتا ہے' اور نہ اس سے کوئی مشورہ لیا جاتا ہے۔ بہرحال دست قدرت نے جو کچھ کیا وہ یہ ہے اور

مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (۸۰: ۳۲) "تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان زیست کے طور پر"۔ ایک مقررہ وقت تک۔ اور جب یہ دنیا ختم ہو گی تو یہ سامان زیست بھی ختم ہو گا کیونکہ اللہ نے اسے متاع حیات کے طور پر بنایا ہے۔ اس کے بعد پھر ایک دوسرا عظیم واقع ہو گا۔ وہ کیا ہو گا؟ انسان کو چاہئے کہ اس کے واقع ہونے سے قبل ہی اس کے بارے میں غور کرے۔

فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ ﴿٣٣﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ
أَخِيهِ ﴿٣٤﴾ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ﴿٣٥﴾ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ﴿٣٦﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ
يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ﴿٣٧﴾ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿٣٨﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾ ۱
وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿٤٢﴾ ع ۴۲
۵

"آخر کار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز بلند ہو گی۔۔۔ اس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آپڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہو گا۔ کچھ چہرے اس روز دمک رہے ہوں گے' ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہوں گے اور کچھ چہروں پر اس روز خاک اڑ رہی ہو گی اور کلونس چھائی ہوئی ہو گی۔ یہی کافر و فاجر لوگ ہوں گے"۔

یہ دنیا کے ساز و سامان کا خاتمہ ہے۔ یہ اللہ کی طویل اسکیم' اور ایک کلی اور جامع تدبیر کے ساتھ موافق ہے' جس کے مطابق اللہ نے انسان کو مرحلہ وار پیدا کیا اور اس اسکیم کے مطابق آگے بڑھایا اور یوں آغاز کے عین مطابق اس کا خاتمہ ہوا۔ یہ آخری منظر ابتدائی منظر کے ساتھ ہم آہنگ ہے جس میں ایک شخص دوڑتا ہوا آیا' اس کا پیمانہ خوف خدا سے لبریز تھا اور اس کے مقابلے میں ایک شخص تھا جو لاپرواہ اور ہدایت سے منہ موڑنے والا تھا۔ یہ دونوں کردار اللہ کے پیمانوں میں جو مقام رکھتے تھے اور یہ دونوں کا انجام ہے سورت کے آخر میں:

الصَّاخَّةُ ایک ایسا لفظ ہے جو معنی کے ساتھ ساتھ آواز بھی سخت و کرخت رکھتا ہے۔ قریب ہے کہ کان کے پردے ہی پھٹ جائیں۔ یہ لفظ اپنے زور تلفظ سے ہوا کو پھاڑتا ہے۔ اور کانوں میں آکر پیوست ہو جاتا ہے۔

یہ لفظ اپنے اس کرخت تلفظ کے ذریعہ اگلے منظر کی راہ ہموار کرتا ہے' اگلا منظر کیا ہے۔ یہ منظر ایسا ہے جس میں انسان اپنے عزیز ترین تعلق داروں کو چھوڑ کر بھاگتے نظر آتے ہیں۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيهِ (٣٤) وَاُمِّهِ وَ اَبِيهِ (٣٥) وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ (٣٦)

(٨٠: ٣٤ تا ٣٦) ''اس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں' اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا''۔ یہی لوگ تھے کہ دنیا میں ان کے یہ روابط کسی حال میں بھی نہ ٹوٹتے تھے لیکن بس ایک سخت و کرخت چیخ ہوگی اور یہ تمام روابط ٹوٹ پھوٹ جائیں گے اور یہ تمام تعلقات کٹ جائیں گے۔

اس منظر میں خوف محض نفسیاتی خوف ہے۔ نفس انسانی پر جزع فزع کی حالت طاری ہوگی اور یہ انسان اپنے مقام اور ماحول سے جدا ہو جائے گا۔ بس وہ اپنی ہی سوچے گا۔ اس کے سامنے پریشانیوں اور خود اپنے مسائل کا انبار ہو گا۔ وہ اپنے سوا کسی کے لیے کچھ کرنے کے لائق نہ ہو گا نہ وقت اور قوت ہو گی۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيهِ (٨٠: ٣٧) ''ان میں سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آ پڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہو گا''۔

ان عبارات و کلمات کی تہہ میں غم و اندوہ کے گہرے سائے ہیں۔ پریشانیوں کی اس سے زیادہ بہتر تعبیر ممکن ہی نہیں ہے۔ احساس و ضمیر دونوں کے بوجھ کو یہ عبارت کیا خوب ظاہر کرتی ہے۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيهِ (٨٠: ٣٧) ''ان میں سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آ پڑے گا کہ ات اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہو گا''۔ (اقتباسات ازمشاهد القيامه)

یہ ہوگی حالت اس دن تمام لوگوں کی جب یہ آواز برپا ہوگی اور یہ ایسی سخت اور کرخت آواز ہوگی کہ کان بہرے ہو جائیں گے۔ اس روز مومنین کا کیا حال ہو گا اور کافروں کا کیا حال ہو گا؟ اس روز تو سب کو اللہ کے پیمانوں سے ناپا جائے گا اور اللہ کے ترازو سے تولا جائے گا۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ (٣٨) ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ (٣٩) ''کچھ چہرے اس روز دمک رہے ہوں گے' ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہوں گے''۔ یہ چہرے روشن چہرے ہوں گے' ان سے نور برس رہا ہو گا' خوش ہوں گے' ہنس رہے ہوں گے' اپنے رب سے امیدیں وابستہ کیے ہوں گے' وہ مطمئن ہوں گے کہ ان کا رب ان سے راضی ہے' یہ اس سخت ہولناک آواز کے خوف سے نجات پا چکے ہوں گے۔ یہ آواز تو ایسی ہوگی کہ سنتے ہی سب خوشیاں کافور ہو جائیں گی لیکن ان کو چونکہ ان کا انجام بتا دیا جائے گا اس لیے وہ ان ہولناکیوں کے باوجود خوش و خرم اور مطمئن ہوں گے۔

وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ (٤٠) تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (٤١) اُولٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ (٤٢) (٨٠: ٤٠ تا ٤٢) ''اور کچھ چہروں پر اس روز خاک اڑ رہی ہوگی اور سیاہی چھائی ہوئی

ہو گی ۔ یہی کافر اور فاجر لوگ ہوں گے "۔ یہ غبار حزن و ملال کا غبار ہو گا 'اور حسرت و یاس کا غبار ہو گا ۔ اور ذلت اور پریشانی کی وجہ سے چہروں پر سیاہی ہو گی ۔ ان کو معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے کیا کمایا ہے 'لہٰذا ان کو یقین ہو جائے گا کہ ان کا انجام کیا ہے ۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ (۸۰ : ۴۲) "یہ کافر اور فاجر لوگ ہوں گے"۔ جو اللہ اور اس کی رسالتوں پر ایمان نہیں لائے ۔ جنہوں نے اللہ کی حدود کو توڑا۔

یہ دو قسم کے چہرے ہوں گے اور دونوں چہروں کے اندر دو قسم کے لوگوں کا انجام اس طرح دکھایا گیا ہے جس طرح کوئی شیشے میں اپنا چہرہ دیکھتا ہے ۔ چہروں کے خدوخال الفاظ و عبارات میں اس طرح قلم بند کیے گئے ہیں کہ گویا ریل پر چلتے ہوئے چہرے صاف صاف نظر آتے ہیں ۔ یہ ہے قرآن کا زور دار انداز بیان اور ادبی مچ۔

اس انجام سے سورت کا آغاز اور انجام بھی باہم ہم آہنگ ہو جاتے ہیں ۔ آغاز میں اسلامی قدروں کا ذکر تھا 'اور انجام میں اسلامی پیمانوں اور اسلامی ترازو کے مطابق لوگوں کا انجام بتایا گیا ہے ۔ چنانچہ اس نہایت ہی مختصر سی سورت میں عظیم حقائق لائے گئے ہیں ۔ بہترین مناظر پیش کیے گئے اور بہترین ہدایات و اشارات دئے گئے ہیں اور یہ سورت اپنے خوبصورت انداز بیان کے ساتھ 'اپنے مقاصد کو نہایت خوبصورتی سے ادا کرتی ہے ۔

--- ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ------ ۳۰

## سورۃ التکویر ـ ۸۱

ا -- تا -- ۲۹

# سورۃ التکویر ایک نظر میں

یہ سورت صرف دو پیروں پر مشتمل ہے ۔ دونوں میں اسلامی نظریہ حیات کے عظیم اور بنیادی حقائق بیان کیے گئے ہیں ۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ جب قیامت برپا ہوگی تو اس سے قبل اس کائنات میں کیا کیا ہولناک تبدیلیاں ہوں گی ۔ یہ تبدیلیاں شمس و قمر' سیاروں اور ستاروں' سمندروں اور پہاڑوں' زمین و آسمان اور چرندوں و پرندوں میں آئیں گی اور انسان تو بہرحال ان عظیم انقلابات سے' سب سے زیادہ متاثر ہو گا۔

دوسرے پیرے میں جو عظیم حقیقت بیان کی گئی ہے وہ حقیقت وحی اور اس کے متعلقہ امور ہیں' وہ فرشتے کیسے ہیں جو وحی لاتے ہیں' اس نبیﷺ کا کیا مقام ہے جس پر یہ وحی آرہی ہے اور جن لوگوں کے سامنے یہ پیغام پیش کیا جارہا ہے ان کا ردعمل کیا ہے لیکن یہ اللہ کی مشیت ہے' جس نے ان کو پیدا کیا اور ان کے لیے نزول وحی کا انتظام فرمایا۔

اس سورت کا عمومی اثر ایسا ہے کہ گویا ایک تباہ کن مصیبت پھوٹ پڑی ہے' جو ہر چیز کو تہ و بالا کر رہی ہے ۔ ہر چیز کو بکھیرتی چلی جاتی ہے' ہر پرسکون چیز میں تلاطم پیدا کر دیتی ہے' ہر پرامن چیز کو خوفزدہ کر دیتی ہے ۔ ہر معمولی اور مروج کام میں گڑبڑ اور تبدیلی پیدا کر دیتی ہے اور نفس انسانی کو اس شدت سے جھنجھوڑ دیتی ہے کہ انسان سخت پریشان ہو جاتا ہے اور اس کا وہ سکون تباہ ہو جاتا ہے جس کا وہ عادی تھا ۔ اس ہولناک اور خوفناک فضا میں اور تیز و تند طوفاں میں نفس انسانی اس طرح ادھر ادھر اڑتا پھرتا ہے جس طرح ایک پر ہوا میں اڑ رہا ہے جس کا کوئی وزن نہیں ہے' نہ ایک جگہ ٹھہر سکتا ہے' نہ کوئی جائے فرار ہے اور نہ پناہ گاہ و قرار ہے ۔ صرف اللہ واحد اور قہار کی پناہ ہے جو وحدہ باقی اور دائم ہے ۔ اور آخری جائے قرار و اطمینان ہے ۔

اس سورت میں ایسا اثر ہے کہ انسان دنیا کے تمام ذرائع سکون و اطمینان کو بھلا دیتا ہے ۔ اور مارے خوف کے صرف اللہ کی پناہ حاصل کرتا ہے اور بھاگ کر اللہ کے ہاں سکون و قرار طلب کرنے لگتا ہے' اسے یقین ہو جاتا ہے اس ذات کبریا کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں ۔

اس کے باوجود یہ سورت حسین و جمیل مناظر کا مرقع ہے ۔ ان مناظر کا تعلق ہماری نظروں کے سامنے موجود کائنات سے بھی ہے ۔ اور عالم آخرت سے بھی ۔ جب اس جہاں کے تمام طور طریقے اور انداز بدل جائیں گے ۔ پوری سورت خوبصورت انداز تعبیر کا بھی نمونہ ہے ۔ جس میں رنگا رنگ مناظر اور سحر آفرینیاں پائی جاتی ہیں' لیکن یہ سب امور اس نہایت ہی مختصر سورت میں سمو دیئے گئے ہیں گویا دریا بحباب اندر ۔ چنانچہ یہ مختلف فیکٹر مردہ احساس کو پار کر کے شعور میں بیٹھ جاتے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سورت میں بعض الفاظ ایسے ہیں کہ آج کے عرب قارئین کے لیے بھی مشکل ہیں اور بعض تعبیرات ایسی ہیں جو مالوف نہیں ہیں' ورنہ میں اس سورت کی سرے سے تفسیر ہی بیان نہ کرتا' اور قارئین کو دعوت دیتا کہ

وہ اس سورت کے اثرات ' اس کی تصویر کشی ' اس کی فضا اور مناظر و حقائق سے براہ راست استفادہ کریں۔ کیونکہ ان چیزوں کی تشریح کسی انسانی زبان میں نہیں کی جا سکتی۔ اگر کوئی براہ راست سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو یہ سورت دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے اور خود اپنی تفسیر کرتی ہے لیکن آج کی دور میں قرآن کی سادہ زبان کی تشریح بھی ضروری ہو گئی ہے ہمارے زمانے میں عرب بھی قرآن کی مالوف زبان سے بہت دور ہو گئے ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۸۱ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۲۹

سُورَةُ التَّكْوِيرِ (٨١) مَكِّيَّةٌ (٧)
آيَاتُهَا ٢٩ رُكُوعُهَا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (١) وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتْ (٢) وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (٣) وَإِذَا
الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (٤) وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ (٥) وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (٦) وَإِذَا
النُّفُوسُ زُوِّجَتْ (٧) وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ (٨) بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ (٩) وَإِذَا
الصُّحُفُ نُشِرَتْ (١٠) وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ (١١) وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ (١٢) وَإِذَا
الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ (١٣) عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ (١٤)

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا' اور جب تارے بکھر جائیں گے' اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے' اور جب دس مہینے کی حاملہ اونٹنیاں اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گی' اور جب جنگلی جانور سمیٹ کر اکٹھے کر دیئے جائیں گے' اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے' اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑ دی جائیں گی' اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟ اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے' اور جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا' اور جب جہنم دہکائی جائے گی' اور جب جنت قریب لے آئی جائے گی' اس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے"۔

یہ ایک منظر ہے جس میں اس پوری کائنات میں مکمل انقلاب کے نظارے کی عکاسی کی گئی ہے ۔ تمام موجودات کے اندر انقلاب برپا ہے' یہ انقلاب اجرام سماوی اور اس کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے ۔ وحشی جانور اور خانگی

جانور بھی اس سے متاثر ہیں 'نفس انسانی اور اس کی حرکات بدل چکی ہیں' ہر نامعلوم حقیقت آنکھوں کے سامنے ہے اور ہر راز طشت ازبام ہو چکا ہے۔ اور انسان اپنی کمائی اور اپنے اس زادراہ کے سامنے کھڑا ہے اور حساب و کتاب شروع ہے اور حیران و پریشان ہے کہ اس کے اردگرد ہر چیز اس عظیم طوفان کی زد میں آچکی ہے 'اور کائنات کا تمام نظام اتھل پتھل ہو چکا ہے۔

یہ عظیم کائناتی واقعات اس طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ حسین و جمیل اور یہ عظیم کائنات اور اس کا نظام 'جس کی تمام حرکات موزوں اور مرتب ہیں' جس کی ساخت نہایت ہی مستحکم ہے۔ اور جس کے اندر قائم کشش نہایت موزوں ہے اور جسے نہایت علیم و حکیم ہاتھوں نے بنایا ہے 'یہ پوری کائنات بکھر بکھر جائے گی 'اس کے اس مستحکم نظام کی بندش کھل جائے گی۔ جن قوتوں اور جن صفات کی وجہ سے یہ اس طرح چل رہی ہے 'یہ سب جاتی رہیں گی' غرض یہ پورا موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا اور پھر یہ کائنات اور اس کی مخلوقات ایک نئی زندگی پائیں گے۔ یہ نئی کائنات اور یہ نئی زندگی موجودہ خصوصیات سے مختلف ہوگی۔

یہی تصور ہے جو یہ سورت قلب و نظر میں بٹھانا چاہتی ہے تاکہ انسان سوچ لے اور انسانی شعور ان ظاہری اور عارضی مناظر سے ہٹ جائے۔ اگرچہ بادی النظر میں یہ بہت ہی مضبوط نظر آئیں اور ان حقائق کو اپنے اندر سمو لے جو باقی رہنے والے ہیں۔ انسان اس ذات باری کا تصور کرے جو باقی اور لازوال ہے اور وہ ذات اس وقت بھی باقی ہوگی جبکہ یہ پوری کائنات زائل ہو جائے گی اور عظیم حوادث اس کی شکل ہی بدل دیں گے۔ اس سورت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس ظاہری اور عادی اور صرف نظر آنے والی کائنات کے دائرے سے نکل کر اس مطلق حقیقت اور ذات باری کے ساتھ جڑ جائے جو زمان و مکاں سے وراء ہے جو انسانی احساس اور تصور سے آگے ہے 'جو کسی دائرے اور حد کے اندر محدود نہیں ہے۔

یہ ہے وہ حقیقی شعور جو ہمارے اندر پیدا ہوتا ہے۔ جب انسان ان عظیم انقلابی مناظر کو اس سورت میں دیکھتا ہے۔ اس مشاہدے سے گویا انسان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور اللہ کی عظمت کا شعور ذہن میں بیٹھ جاتا ہے۔

لیکن عملاً کیا ہوگا؟ تو اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ ہمارا شعور اور ہمارا تصور بہت محدود ہے۔ آج ہم ان عظیم انقلابات کا پورا تصور نہیں کر سکتے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ سوچ سکتے ہیں کہ اس زمین پر ایک عظیم زلزلہ برپا ہوگا۔ اور یہ زلزلہ ہر طرف تباہی مچا دے گا اور زمین کے اندر سے ایک ایسا ناقابل کنٹرول آتش فشانی کا عمل ہوگا اور زمین کے اوپر سیارے اور ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گریں گے اور سمندروں کا پانی طوفانی شکل اختیار کر لے گا اور یہ کہ سورج کے اندر بھی آتش فشانی کا عمل ہوگا اور اس کے شعلے لاکھوں میلوں تک اٹھیں گے اور یہ مشاہدات انسان دیکھ بھی سکے گا۔

لیکن قیامت کے برپا ہونے کے وقت جو کائناتی انقلابات ہوں گے 'ہماری یہ سوچ یہ باتیں اور یہ مشاہدات ان کے مقابلے میں طفل تسلیاں ہیں۔ اگر ہمارے لیے ان کا سمجھنا ضروری ہے تو ہم صرف ایسی عبارات میں لا سکتے جو ان واقعات کا مجمل سا تصور پیش کریں کیونکہ اس کے سوا ہم اور کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

اذَ الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (۸۱: ۱) "جب سورج لپیٹ دیا جائے گا"۔ اس کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور اس کے اندر برپا اشتعال ختم ہو جائے گا۔ اس وقت سورج کے اندر جلن کا عمل شروع ہے اور اس

سے جو شعلے اٹھ رہے ہیں' وہ اس کے اردگرد ہزاروں میل تک بلند ہوتے ہیں۔ جب سورج گرہن ہوتا ہے تو اس وقت رصد گاہوں سے یہ عمل صاف نظر آتا ہے۔ اس کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ سورج کے اس جلنے کے عمل سے سورج پر موجود تمام مواد ایک اڑتے ہوئے گیس کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور یہ گیس جلتی ہوئی سورج کی فضا میں بلند ہوتی ہے۔ یہ حالت اس طرح نہ رہے گی اور سورج اسی طرح ٹھنڈا ہو جائے گا۔ جس طرح ہماری یہ زمین ٹھنڈی ہو گئی ہے اور اس کے اوپر کوئی التہابی عمل نہیں ہے۔ اس کے سوا سورت کا اور مفہوم بھی ہو سکتا ہے جو ابھی تک ہمارے علم میں نہیں ہے۔ یہ عوامل کس طرح وجود میں آئیں گے' ان کا علم اللہ ہی کو ہے۔

وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ (۸۱ : ۲) "اور جب تارے بکھر جائیں گے"۔ یعنی اس بندش کے نظام سے باہر نکل آئیں گے جو اس کائنات کے نظام میں موجود ہے اور جس نے سب کو باہم باندھا ہوا ہے۔ اور یہ کہ ان کی روشنی ختم ہو جائے گی اور وہ تاریک ہو جائیں گے۔ یہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ کن ستاروں کے ساتھ یہ حادثہ ہو گا۔ یہ تمام ستارے ہوں گے یا ستاروں کا ایک گروہ ہو گا جو ہمارے قریب ہے۔ مثلاً سورج کے قریبی ستاروں میں یہ عمل ہو گا یا ہماری پوری کہکشاں میں یہ عمل ہو گا' جس میں کروڑوں ستارے ہیں۔ یا تمام ستاروں میں **ہو گا** جن کے مقامات و مدارات کا علم بھی اللہ کو ہے اور تعداد کا علم بھی اللہ کو ہے کیونکہ جہاں تک ہماری رصد گاہیں ہمارے مشاہدے کو پہنچاتی ہیں ان سے آگے بھی بے شمار جہاں ہیں۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ ستارے بے نور ہو جائیں گے یا بکھر جائیں گے اور پوری حقیقت کا علم صرف اللہ کو ہے۔

وَ اِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (۸۱ : ۳) "جب پہاڑ چلائے جائیں گے"۔ پہاڑوں کے چلائے جانے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے' پیس کر ہوا میں بکھیر دیا جائے گا جیسا کہ دوسری سورت میں ہے۔

وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا (۲۰ : ۱۰۵) "تم سے یہ لوگ پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں تو کہہ دیں کہ تمہارا رب انہیں دھول بنا کر اڑا دے گا"۔ اور دوسری جگہ ہے۔

وَّ بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (۵) فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا (۶) (۵۶ : ۵، ۶) "اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے"۔

وَّ سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا (۷۸ : ۲۰) "اور پہاڑ چلائے جائیں گے یہاں تک کہ وہ سراب ہو جائیں گے"۔

ان سب آیات میں اس طرف اشارہ ہے کہ پہاڑوں کو ایک ایسا حادثہ پیش آئے گا' جس سے ان کی مضبوطی' ان کا باہم پیوست ہونا' اور اپنی جگہ پر برقرار رہنا جاتا رہے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس پورے عمل کا آغاز عملی زلزلہ سے ہو۔ اور اس زلزلہ کے بارے میں خود قرآن کریم تصریح کرتا ہے۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (۱) وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (۲) (۹۹ : ۱ ، ۲) "جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی"۔ یہ سب واقعات قیامت کے طویل دن میں رونما ہوں گے۔

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (۸۱ : ٤) "اور جب دس مہینے کی حاملہ اونٹنیاں اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گی"۔ العشار' ان اونٹنیوں کو کہتے ہیں جو حاملہ ہوں اور حمل کے دس مہینے ہو چکے ہیں۔ عربوں کے نزدیک اس سے بہتر اور کوئی ملکیت نہ تھی۔ اس کی وہ بہت زیادہ دیکھ بھال کرتے تھے کیونکہ وہ قریب زمانے میں بچہ دینے والی ہوا کرتی تھی اور پھر دودھ دیتی اور اس کی افادیت قریب ہوتی۔ جس دن یہ عظیم انقلابات ہوں گے لوگ گھبراہٹ کی وجہ سے ایسے قیمتی مال کو بھی چھوڑ کر بھاگ نکلیں گے۔ کوئی بھی ایسے قیمتی مال کی طرف متوجہ نہ ہو گا۔ جس دور کے لوگوں سے قرآن مخاطب تھا' خصوصاً عرب' وہ ایسے مال کو ہرگز نہ چھوڑتے تھے الا یہ کہ ان پر کوئی عظیم مصیبت آ جائے۔

وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (۸۱ : ٥) "اور جب جنگل کے جانور سمیٹ کر اکٹھے کر دیئے جائیں گے"۔ یہ وحوش جو انسانوں سے اور خود ایک دوسرے سے دور بھاگتے ہیں۔ ایسے خوفزدہ ہوں گے اور اس طرح ایک جگہ جمع ہو جائیں کہ بجائے پہاڑوں میں بکھرنے کے اور اپنے اپنے سوراخوں' غاروں اور بلوں میں گھسنے کے' جو ان کا معمول ہوتا ہے' ایک جگہ جمع ہوں گے' نہ ان کو انسانوں سے خوف ہو گا اور نہ ایک دوسرے سے۔ درندے اپنے شکار کو بھول جائیں گے' ادھر ادھر بھاگتے پھریں گے اور اپنے غاروں میں پناہ نہ لیں گے جیسا کہ بالعموم وہ ایسے بلوں میں گھس جانے کے عادی ہوتے ہیں۔ نہ شکاری درندہ شکار کے پیچھے بھاگے گا اور یہ حالت اس لیے ہوگی کہ یہ سب درندے اور پرندے خوفزدہ ہوں گے اور یوں اپنی حاجت ہی چھوڑ دیں گے۔ اگر حیوانوں کی یہ حالت ہوگی تو انسانوں کا کیا کہنا ہے۔

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۸۱ : ٦) "اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے"۔ سجرت کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ سمندروں کو پانی سے بھر دیا جائے گا۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ سمندروں میں یہ پانی اس طرح آئے گا جس طرح بادلوں اور بارشوں کے طوفان زمین پر حملہ آور ہوئے' جبکہ زمین سرد ہوئی اور اس کا چھلکا سخت ہوا۔ جس کا ذکر ہم نے سورہ نازعات میں کیا یا یوں کہ زمین میں جب زلزلے پیدا ہوں گے اور آتش فشانی کا عمل ہو گا تو سمندر کے درمیان سے خشکی ختم ہو جائے گی اور سمندر ایک دوسرے کے اوپر چڑھ دوڑیں گے۔ یا اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان میں آگ لگ جائے گی اور وہ پھٹ پڑیں گے جیسا کہ دوسری جگہ میں ہے۔

وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ (۸۲ : ۳) "اور جب سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے"۔ سمندروں کے پھٹنے کی عملی شکل یوں ہو سکتی ہے کہ پانی کے اجزاء ہائیڈروجن اور آکسیجن ایک جگہ جمع ہو جائیں یا ان کے اجزاء اس طرح پھٹ جائیں جس طرح ذرات اور ایٹم پھٹ جاتے ہیں۔ اور یہ شکل نہایت ہی ہولناک ہوگی' جب یہ صورت ہوگی تو ایک ناقابل تصور آگ ان سمندروں میں شعلہ زن ہو جائے گی۔ ایک محدود تعداد میں اگر ایٹمی یا ہائیڈروجن کا دھماکہ ہو جائے

تو اس سے بھی ایک ہولناک دھماکہ ہوتا ہے' لیکن اگر تمام سمندروں کے ذرات پھٹ جائیں تو انسان اس ہولناک دھماکے کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اس سے کس قدر عظیم جہنم برپا ہو جائے گا۔

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (۸۱:۷) "اور جب جانیں جوڑ دی جائیں گی"۔ اس کے ایک معنی یہ ہیں کہ تمام روحیں' اجسام کے ساتھ ملا دی جائیں گی' اور ان کو دوبارہ ملا کر از سرنو زندہ کر دیا جائے گا اور یہ بھی احتمال ہے کہ معنی یہ ہو کہ لوگوں کے باہم متجانس گروپ بنا دیئے جائیں گے جیسا کہ دوسری جگہ آتا ہے۔

وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً (۵۶ : ۷) "اور تم تین گروپ ہو گے"۔ یعنی مقربین الٰہی کا گروپ' دائیں بازو والے اور بائیں بازو والے یا کسی اور اصول تقسیم کے مطابق لوگوں کو ملا دیا جائے گا۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ (۸) بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (۸۱:۹) "اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی"۔ دور جاہلیت میں انسانیت کی تذلیل اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ لوگوں میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا عام رواج تھا۔ یہ حرکت وہ دو وجوہات سے کرتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اس بات کو عار سمجھتے تھے کہ ان کی لڑکیاں کسی کی بیوی یا لونڈیاں بنیں۔ دوسری وجہ یہ تھی وہ فقر اور غربت سے ڈرتے تھے۔ قرآن کریم نے اس عادت بد کو قلم بند کر کے دور جاہلیت کی اس برائی کو ہمیشہ کے لیے ریکارڈ کر دیا۔ کیونکہ اسلام آیا ہی اس لیے تھا کہ عربوں اور پوری انسانیت کو اس پستی سے نکال دے۔ اور انسانیت کو ترقی اور رفعت عطا کرے۔ قرآن کہتا ہے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (۵۸) يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۵۹)(۱۶: ۵۸ - ۵۹) "اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دے۔ دیکھو کتنے برے حکم ہیں جو یہ خدا کے بارے میں لگاتے ہیں"۔ اور دوسری جگہ ہے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (۱۷) اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ (۱۸)(۴۳:۱۷ - ۱۸) "اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کی یہ لوگ اس خدائے رحمٰن کی طرف نسبت کرتے ہیں' اس کی ولادت کا مژدہ اگر

جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے' اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔ کیا اللہ کے حصے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پالی جاتی ہے۔ اور بحث اور حجت میں اپنا مدعا پوری طرح واضح بھی نہیں کر سکتی"۔ اور تیسری جگہ یہ فرمایا۔

وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (۱۲ : ۳۱) "اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو' ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے"۔

یہ رسم عملاً نہایت سنگدلی سے پوری کی جاتی تھی۔ بیٹی کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ ایک صورت یہ ہوتی کہ جب بچی چھ سال کی ہو جاتی تو باپ ماں سے کہتا کہ لڑکی کو تیار کرو' میں اسے ماموں کے گھر لے جاتا ہوں۔ اس سے قبل وہ کسی خالی جگہ اس کے لیے کنواں کھود چکا ہوتا تھا۔ جب لڑکی کو لے جا کر کنویں پر پہنچا تو کہتا کہ کنویں میں دیکھو اور اسے کنویں میں گرا دیتا اور اوپر سے مٹی گرا دیتا۔ بعض اقوام میں رواج یہ ہوتا کہ جب کسی عورت کی ولادت کا وقت آتا تو اسے ایک گڑھے کے کنارے بٹھایا جاتا۔ اگر ولادت بیٹی کی ہوتی تو اسے گڑھے میں گرا دیتی۔ اور اگر بیٹا ہوتا تو لے کر گھر آ جاتی۔ اگر کوئی خاندان بیٹی کو زندہ درگور کرنے کا ارادہ نہ کرتا تو اسے نہایت ہی بری حالت میں رکھا جاتا اور جب وہ اونٹ چرانے کے قابل ہوتی تو اسے اون یا بالوں سے بنا ہوا ایک جبہ پہنا دیا جاتا اور دیہات میں بھیج دیا جاتا کہ اونٹ چرائے۔

جو لوگ بیٹیوں کو زندہ درگور نہ کرتے اور ان سے اونٹ بھی نہ چرواتے تو وہ دوسرے ذرائع سے ان کو زندہ درگور رکھتے۔ جب بیچاری کسی کے نکاح میں آتی اور خاوند مرجاتا تو خاندان کا سرپرست آتا اور اس کے سر پر کپڑا ڈال دیتا۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس عورت کے ساتھ کوئی شخص نکاح نہیں کر سکتا۔ اگر اسے خود پسند آتی تو اس کے ساتھ شادی کر لیتا چاہے وہ اس شادی کو پسند کرتی یا نہ کرتی۔ اگر یہ اسے پسند نہ ہوتی تو بھی وہ اسے روکے رکھتا یہاں تک کہ مرجاتی اور یہ اس کی وراثت پاتا۔ الا یہ کہ اپنا مال دے کر یہ عورت اپنے آپ کو آزاد کرا لیتی۔ بعض لوگ ایسے تھے کہ عورت کو اس شرط پر طلاق کرتے تھے کہ وہ صرف اس جگہ نکاح کرے گی جہاں ان کی مرضی ہوگی الا یہ کہ وہ فدیہ دے کر اس شرط کو ساقط کروا دیتی۔ بعض اوقات یوں ہوتا کہ اگر خاوند مرجاتا تو بیوی کو خاندان کے چھوٹے بیٹوں کے لیے روک رکھتے۔ لڑکا بالغ ہوتا اور نکاح کرتا۔ اگر کسی کی سرپرستی میں یتیم لڑکی ہوتی تو وہ اسے نکاح کرنے نہ دیتا تاکہ اس کی سرپرستی ختم نہ ہو جائے اور اس لیے کہ اگر اس کی بیوی مرجائے تو یہ اس کے ساتھ نکاح کرلے۔ یا اپنی چھوٹی اولاد کے ساتھ نکاح کرلے۔ یہ کام وہ محض مالی لالچ میں کرتے۔ یا اگر لڑکی اچھی ہوتی تو اسے خوبصورتی کی وجہ سے روک لیتے۔

بہرحال جاہلیت کے زمانے میں عورت بیچاری کے یہ شب و روز تھے۔ جب اسلام آیا تو اس نے ان تمام عادات و رسومات کی سخت مذمت کی۔ اس نے لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی مذمت میں بہت مبالغہ کیا۔ اور یہ بتایا کہ قیامت کے میدان میں اٹھنے والے سوالات میں سے یہ ایک اہم سوال ہو گا۔ اور اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ان ہولناک مناظر میں کیا ہے جن سے اس کائنات کا پورا نظام درہم برہم ہو گا' گویا یہ بھی ایک ایسا حادثہ تھا جس سے عمرانی نظام درہم برہم ہوتا ہے۔ اگر زندہ درگور کی جانے والی لڑکی سے بھی باز پرس ہوگی کہ اس کے ساتھ یہ فعل کیوں ہوا؟ تو جس شخص نے اس فعل شنیع کا ارتکاب کیا اس سے تو لازماً سوال ہو گا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی جاہلی نظام میں عورت عزت کا مقام حاصل نہیں کر سکتی تھی ۔ اگر اسلامی شریعت نے اور اسلامی نظام زندگی نے جنس بشر کو کرامت اور عزت عطا نہ کی ہوتی ۔ اور اس تکریم اور اعزاز میں مرد اور عورت کو برابر نہ کیا ہوتا' اور یہ نہ کہا ہوتا کہ انسان کے اندر اللہ نے اپنی روح پھونکی تو عورت کو یہ اعزاز کبھی نصیب نہ ہوتا جو اسلام نے اسے عطا کیا ہے ۔ عورت عزت و شرف کی زندگی صرف اسلامی نظام سے حاصل کر سکتی ہے ۔ اس کے سوا کسی اور عامل اور زندگی سے اسے عزت و شرف نہیں مل سکتا ۔ نہ کسی معاشرے سے مل سکتا ہے ۔

اس طرح انسانیت کو جو ایک نیا جنم ملا وہ ان اقدار کی بدولت ممکن ہوا جو آسمانوں سے طے ہو کر آئی تھیں ' اس کے نتیجے کے طور پر اس دنیا میں عورت کو بھی اپنا مقام ملا ۔ چنانچہ عورت کے فطری ضعف کی وجہ سے ' اس کی مادی زندگی کی ضروریات ' اس کے خاوند پر رکھی گئی ہیں ' اس کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت اور اس کے وزن اور مقام میں کوئی کمی نہیں آتی ۔ اس لیے کہ اسلامی نظام مین مادی زندگی کی اس قدر اہمیت نہیں ہے ۔ اسلامی نظام میں اصل وزن روحانی اقدار کا ہے جن کا تعلق اللہ سے ہے اور روحانی اقدار کے اعتبار سے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے ۔

جب وہ دلائل گنے جائیں کہ یہ دین اللہ کی طرف سے ہے اور جس ذات بابرکات نے یہ دین پیش کیا ہے وہ اللہ کے رسول ہیں ' تو اسلام نے عورت کو جو مقام دیا ہے ' وہ ان دلائل میں سرفہرست ہو گا ۔ اس لیے کہ جس دور میں اسلام نے عورت کو یہ مقام دیا اس میں ایسی کوئی علامت ' کوئی تحریک یا کوئی سماجی مطالبہ اور ایسا نہ تھا کہ عورت کو یہ مقام دیا جانا چاہئے ۔ نہ کوئی معاشی تحریک تھی اور نہ کوئی معاشرتی دباؤ تھا کہ عورت کو یہ مقام دیا جائے ' یہ خالص اسلامی نظام تھا جس نے خالص وحی الہی کے تحت یہ کارنامہ سرانجام دیا ۔ اسلام نے محض ربانی ہدایات کے مطابق عورت کو جاہلیت کی اس پستی سے نکال کر مقام بلند دیا اور اس کی زندگی کے حالات ہی بدل کر رکھ دیئے ۔

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (۸۱ : ۱۰) "اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے" ۔ صحف سے مراد نامہ اعمال ہے ۔ نشر ہونے سے مراد یہ ہے کہ جب سب لوگوں کے اعمال نامے خفیہ نہ رہیں گے کھل کر سب لوگوں کے سامنے آجائیں گے اور نہ ناقابل فہم رہیں گے ۔ اور ان کا یہ انکشاف ہی بدکاروں کے لیے سوہان روح ہو گا ۔ کیونکہ کئی ایسی خفیہ برائیاں ہوں گی کہ اگر ان کا انکشاف ہو تو بدکار کے لیے سخت شرمندگی کا باعث ہو گا اور وہ پگھل کر رہ جائے لیکن اس کا کیا حال ہو گا کہ جب اس وقت اس کے تمام اعمال لوگوں کے سامنے ہوں گے ۔

اعمال ناموں کا نشر ہونا اور رازوں کا کھل جانا بھی اس دن کی ہولناکی میں اضافہ کر دے گا اور یہ دنیا کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب ہو گا کہ راز کھل جائیں گے اور لوگوں کے وہ پوشیدہ راز بھی ظاہر ہوں گے جو سینوں میں ہوں گے ۔

وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ (۸۱ : ۱۱) "اور جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا" ۔ اعمال نامے تو زمین کے حالات پر مشتمل ہوں گے ' ان کے مقابلے میں آسمانوں کے حالات بھی کھل کر سامنے آجائیں گے ۔ لفظ آسمان کا پہلا مفہوم تو یہ ہے کہ ہمارے سروں پر جو نیلگوں پردہ ہے ' یہ ہٹ جائے گا ۔ یہ کس طرح ہٹ جائے گا تو اس کی کیفیت کا علم اللہ ہی کو ہے ۔ بہرحال ہمارے سروں پر جو نیلا گنبد نظر آتا ہے یہ نظر نہ آئے گا اور کوئی اور ہی منظر ہو گا ۔

اور اب آخری منظر ' اس دن کے مناظر میں سے آخری منظر یوں ہو گا ۔

وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ (۱۲) وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ (۸۱: ۱۳) ”اور جب جہنم دہکائی جائے گی اور جب جنت قریب لائی جائے گی“۔ یعنی جب جہنم میں آگ جلے گی اور اسے خوب دھکایا جائے گا اور اس کے شعلے زیادہ ہوں گے اور اس کا جوش و خروش اور حرارت زیادہ ہو جائے گی۔ یہ جہنم کہاں ہے اور کس طرح دھکائی جائے گی؟ کیسا ایندھن استعمال ہو گا' ہمارے پاس اس سلسلے میں صرف ایک آیت ہے۔

وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ”اس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے“۔ یہ حالت تو اس وقت کی ہوگی جب اہل جہنم کو اس کے اندر پھینک دیا جائے گا۔ اور جب جنت قریب کر دی جائے گی' اور جن لوگوں کو جنت میں داخل ہونا ہے' یہ ان کے سامنے آجائے گی' اور ان پر واضح ہو جائے گا کہ اب تو وہ بسہولت اس میں داخل ہوں گے تو ایسی صورت میں اسے ”مزلفہ“ کہا جاتا ہے یعنی قریبہ اور اس حال میں کہ وہ تیار اور آراستہ ہے اور اب چند قدم لینے کی دیر ہے' چند بے ترتیب قدم بھی پہنچا سکتے ہیں۔

جب اس کائنات میں' جب عالم اشیاء میں' خواہ زندہ ہوں یا جمادات ہوں یا نباتات' میں اس قدر انقلاب آجائے گا' تو اب کسی کو کیا شک رہے گا کہ یہ مرحلہ آنے ہی والا ہے' ہر شخص کو یقیناً اپنے اعمال یاد آجائیں گے' وہ اعمال جو کسی نے اس دن کے لیے تیار کیے' جو وہ لے کر آیا یا پیش کرنے کے لیے' جو تیار کیے حساب اور جواب حساب کے لیے۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا اَحْضَرَتْ (۸۱: ۱٤) ”اس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے“۔ اس خوفناک دن کے اندر ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کے پاس کیا ہے اور اس کے ذمہ کیا ہے' اس روز اس کو معلوم ہو جائے گا اور اس کی حالت یہ ہوگی کہ وہ کانپ رہا ہو گا اور اسے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اب وہ اپنے اعمال نامے میں کچھ بھی تغیر و تبدل نہیں کر سکے گا۔ نہ اس میں کوئی زیادتی ہوگی اور نہ کمی ہو گی' اسے یہ بات ایسے حالات میں معلوم ہوگی کہ وہ دنیا سے کٹ چکا ہو گا' مستقبل کے بارے میں ان کے جو تصورات تھے' وہ نہ رہے۔ وہ دنیا سے کٹ گئے اور دنیا ان سے دور ہو گئی۔ ہر شے متغیر ہو گئی اور ہر شے بدل سی گئی ہے۔ آج تو صرف ذات باری ہی قائم و دائم ہے۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ لوگ اس دنیا ہی میں رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے تاکہ قیامت میں بدلتے ہوئے حالات میں بھی اللہ ان کے سامنے موجود ہوتا۔

ان موثر اشارات پر یہ پہلا پیراگراف ختم ہوتا ہے اور انسانی احساس کو گہرے شعور سے بھر دیتا ہے اور قیامت کے مناظر انسان کے ذہن میں بیٹھ جاتے ہیں اور انقلاب مکمل ہوتا ہے۔

اب دوسرا پیراگراف آتا ہے' اس میں اس کائنات کے خوبصورت ترین مناظر کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ اس کے لیے نہایت ہی خوبصورت تصورات چنے گئے ہیں۔ وحی کیا ہے' اس پر قسم ہے' منصب رسالت اور وہ فرشتے کیسے ہیں جو اس کو لے کر آرہے ہیں اور اس قرآن کے مقابلے میں لوگوں کا جو ردعمل ہے وہ بھی دائرۂ مشیت الہیہ میں ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾ ذِیْ

قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ﴿٢٠﴾ مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ﴿٢١﴾ وَمَا صَاحِبُكُمْ
بِمَجْنُونٍ ﴿٢٢﴾ وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ ﴿٢٣﴾ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ﴿٢٤﴾
وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ ﴿٢٥﴾ فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ ﴿٢٦﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ
لِلْعَالَمِينَ ﴿٢٧﴾ لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ ﴿٢٨﴾ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ ۱
يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٢٩﴾ ع۲۹

۶ "پس نہیں' میں قسم کھاتا ہوں پلٹنے والے اور چھپ جانے والے تاروں کی' اور رات کی جبکہ وہ تاریک ہوئی اور صبح کی جبکہ اس نے سانس لیا' یہ فی الواقع ایک بزرگ پیغام بر کا قول ہے' جو بڑی توانائی رکھتا ہے' عرش والے کے ہاں بلند مرتبہ ہے' وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے' وہ بااعتماد ہے' اور (اے اہل مکہ) تمہارا رفیق مجنون نہیں ہے' اس نے اس پیغامبر کو روشن افق پر دیکھا ہے ۔اور وہ غیب (کے اس علم کو لوگوں تک پہنچانے) کے معاملہ میں بخیل نہیں ہے ۔اور یہ کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے ۔پھر تم لوگ کدھر چلے جا رہے ہو؟ یہ تو سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے' تم میں سے ہر اس شخص کے لیے جو راہ راست پر چلنا چاہتا ہو اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے"۔

الْخُنَّسِ – الْجَوَارِ – الْكُنَّسِ تینوں سے مراد ستارے ہیں ۔الخنس وہ ستارے جو اپنے دورۂ فلکی میں پلٹتے ہیں' الجوار جو چلتے ہیں اور الکنس' جو چھپتے ہیں ۔ انداز بیان کے استعارات ان ستاروں کو ہرنوں کی طرح زندگی کی خصوصیات بخش دیتے ہیں' جو پلٹتی ہیں' دوڑتی ہیں اور اپنے غار میں گھس جاتی ہیں ۔ایک طرف سے دوسری طرف لوٹ جاتی ہیں' یہ ستارے گویا زندہ ہرنوں کی طرح دوڑتے گھومتے اور زندہ نظر آتے ہیں ۔ انداز تعبیر ان ستاروں کی حرکت کو ایک حسن رفتار عطا کر دیتا ہے ۔اور ان کے ظہور میں بھی جمال نظر آتا ہے ۔اور فضا میں بھی اس کا جمال ہے ۔ چھپنا بھی خوبصورت اور نمودار ہونا بھی خوبصورت ۔ دوڑنا بھی اچھا اور مڑنا بھی اچھا ۔پھر الفاظ بھی خوبصورت اور ان کا تلفظ بھی پر نغمہ اور پر ترنم اور خوبصورت ۔ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں ۔

وَالَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ (۸۱:۱۷) "رات کی جب وہ تاریک ہوئی" ۔لیکن لفظ عسعس میں بھی مفہوم کی طرف اشارے ہیں ۔عس کے معنی اندھیرے میں ہاتھ پاؤں کے ساتھ چلنے کے ہیں جبکہ آنکھوں سے کچھ نظر نہ آتا ہو گویا رات تاریکی میں چل رہی ہے ۔یہ نہایت ہی خوبصورت انداز گفتگو ہے ۔

وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ (۸۱:۱۸) "اور صبح جب اس نے سانس لیا" بھی ایک زندہ بلکہ تابندہ انداز تعبیر ہے اور اس میں زیادہ اشاریت ہے ۔ سپیدہ صبح گویا زندہ ہے اور سانس لے کر نمودار ہوتا ہے ۔روشنی گو صبح کی سانس ہے اور صبح کے وقت وحوش و طیور اور انسانوں کی حرکت اس کی علامت زندگی ہے ۔میں یقین سے کہہ سکتا ہوں

عربی زبان کے خوبصورت ترین اسالیب اظہار کے اندر سپیدۂ صبح کی نمو داری کے لیے کوئی ایسا خوبصورت فقرہ نہیں ہے۔ زندہ حساس دل صبح کو دیکھ کر یہ شعور اچھی طرح پا لیتا ہے کہ یہ صبح سانس لے رہی ہے اور جب ایسا حساس دل پھر قرآن کی اس آیت کو پڑھتا ہے تو وہ یہی کہتا ہے کہ یہ بھی میرے دل میں تھی۔

جو شخص اسالیب کلام کو سمجھنے کا ذوق رکھتا ہے اور وہ اچھی منظر کشی اور تصویر کشی سے لطف اندوز ہو سکتا ہے' وہ جب یہ آیت پڑھتا ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ(۱۵) الْجَوَارِ الْكُنَّسِ(۱۶) وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ(۱۷)

وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ(۱۸)(۸۱: ۱۵ تا ۱۸) "پس نہیں' میں قسم کھاتا ہوں پلٹنے والے اور چھپ جانے والے تاروں کی' اور رات کی جبکہ وہ تاریک ہوئی اور صبح کی جبکہ اس نے سانس لیا"۔ تو اسے معلوم ہو گا کہ یہ عبارت شعور و معانی اور انداز تعبیر کا ایک بڑا ذخیرہ اپنے اندر رکھتی ہے اور جن کائناتی حقائق کی طرف اس میں اشارہ ہے وہ اس کے علاوہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کائناتی حقائق کو ایک تیز احساس اور شعور کے ساتھ لیا گیا ہے۔

یہ کائناتی مناظر جن کو زندگی کا لباس پہنایا گیا ہے۔ اور ایک زندہ اور خوبصورت اسلوب بیان کے ذریعہ ان کی روح انسانی روح کے ساتھ ملا دی گئی ہے۔ یہ مناظر انسان کی روح پر اس کے حقیقی اسرار و رموز کھولتے ہیں' اور اس قوت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو ان سب چیزوں کے پیچھے کارفرما ہے۔ اور جس ایمانی حقیقت کی طرف بلایا جا رہا ہے' یہ مناظر اس کے زمزمہ خواں ہیں۔ اس کے بعد اس حقیقت کو نہایت ہی بہترین حالات میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ اسے یاد رکھا جائے اور انسانی فطرت اس کا استقبال کرے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ(۱۹) ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ(۲۰) مُّطَاعٍ

ثَمَّ اَمِيْنٍ(۲۱)(۸۱: ۱۹ تا ۲۱) "یہ فی الواقعہ ایک بزرگ پیغام بر کا قول ہے' جو بڑی توانائی رکھتا ہے' عرش والے کے ہاں بلند مرتبہ ہے' وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے' وہ بااعتماد ہے"۔ یعنی یہ قرآن مجید جو آپ لوگوں کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے' خصوصاً یہ قیامت کی ہولناکیاں جو بیان کی جا رہی ہیں' یہ رسول مکرم کا قول ہے' یعنی جبرئیل علیہ السلام کا جو خدا کے فرستادہ ہیں اور جنہوں نے اس بات کو بحفاظت پہنچایا ہے **اور گویا قرآن** پہلے خدا کا قول ہے اور پھر جبرئیل کا قول ہے کہ انہوں نے بطور پیغام الہٰی دہرایا ہے۔

اور یہ پیغام لانے والا' جس کے ذمہ اس اہم پیغام کو آسمانوں سے نیچے پہنچانے کی ذمہ داری لگائی گئی وہ کیسی شخصیت ہے؟ یہ اللہ کے ہاں نہایت مکرم ہے اور اللہ کا یہ کہنا ہے کہ وہ نہایت ہی پختہ صلاحیتوں والا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے پیغام کو پہنچانے کے لیے جس فرشتے کی ذمہ داری تھی اسے اس بات کی ضرورت تھی کہ اسے اس کام کے لیے توفیق عطا ہو۔ اس کا اللہ کے ہاں مقام و مرتبہ بلند ہو اور عرش عظیم کے مالک کے ہاں وہ مکرم ہو اور مقرب ہو اور امین اور قابل اعتماد ہو' جو بات اسے دی گئی اسے پوری طرح پہنچاتا بھی ہو اور پہنچا بھی سکتا ہو۔

ان کی صفات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام نہایت مہتم بالشان ہے۔ بلند مرتبہ اور اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر کس قدر مہربانی فرمائی ہے کہ انسان کی ہدایت کے لیے قرآن نازل کرنے کے لیے اس قسم کا پیغامبر مقرر کیا ہے جو نبی مختار تک یہ پیغام پہنچاتا ہے۔ یہ اس قدر عظیم مہربانی اور عنایت ہے کہ اگر انسان اس پر غور کرے تو وہ پانی پانی ہو جائے کہ رب کائنات انسان پر اس قدر کرم فرماتا ہے کہ اللہ کی مخلوقات میں انسان مکرم 'اس پر آنے والا پیغام مکرم اور لانے والا فرشتہ مکرم 'اور جس نبی پر وہ آیا وہ نبی مختار مکرم ہے۔

یہ صفت تو اس پیغام لانے والے کی ہے جو اللہ کا کلام لایا اور نبی مختار کے حوالے کیا۔ اور اس رسول کا مقام کیا ہے جو لوگوں کے پاس یہ پیغام لے کر آیا ہے تو وہ تو تمہارے ساتھی اور بھائی ہے۔ ایک طویل عرصہ تک تمہارے اندر رہا ہے لہذا یہ بات قابل تعجب ہے کہ جب وہ تمہارے پاس یہ کلام عالیشان لے کر آیا تو تم نے اس پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ اور اس کے بارے میں تم نے مختلف رویے اختیار کر لیے حالانکہ وہ تمہارے ساتھی ہیں 'جس کے بارے میں تمہیں پوری پوری معلومات ہیں 'وہ تمہیں جو غیب کی باتیں بتاتے ہیں ان کے سلسلے میں وہ نہایت امین ہیں۔

وَ مَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ(٢٢) وَ لَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ(٢٣)وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ(٢٤) وَ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ(٢٥) فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ(٢٦) اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ(٢٧) لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ(٢٨) وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ(٢٩)(٨١:٢٢ تا ٢٩) "یہ تمہارا رفیق مجنوں نہیں ہے 'اس نے اس پیغامبر کو روشن افق پر دیکھا ہے 'اور وہ غیب کے معاملے میں بخیل نہیں ہے اور یہ کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے 'پھر تم لوگ کدھر چلے جا رہے ہو 'یہ تو سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔تم میں سے ہر اس شخص کے لئے جو راہ راست پر چلنا چاہتا ہو اور تمہارے چاہے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے"۔ یہ لوگ نبی کریمؐ کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے 'یہ بھی جانتے تھے کہ آپ انتہائی عقلمند آدمی ہیں 'سچے اور امین ہیں اور ثابت قدم اور راہ راست پر ہیں 'لیکن اس کے باوجود وہ کہتے تھے کہ آپ پاگل ہیں اور یہ کہ آپ جو باتیں فرماتے ہیں۔ آپ پر یہ شیطان القاء کرتا ہے۔ اور یہ باتیں وہ لوگ نبی کریمؐ کے خلاف بطور سازش کرتے تھے جس کی تفصیلات کتب احادیث میں موجود ہیں اور بعض لوگ قرآن کریم کے کلام عالی سے مرعوب ہو کر ایسا کرتے تھے کہ کوئی انسان ایسا کلام پیش نہیں کر سکتا۔ نہ انہوں نے کسی انسان سے ایسا کلام سنا تھا۔ پھر ان کے اندر یہ تصور بھی تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان لگا ہوتا ہے اور وہ شاعروں پر یہ کلام القاء کرتا ہے اور ان کا یہ تصور بھی تھا کہ کاہنوں کے ساتھ بھی شیاطین لگے ہوتے ہیں 'ان پر بھی وہ غیب کی باتیں القاء کرتے ہیں۔ اور یہ بات بھی ان میں عام تھی کہ بعض اوقات شیطان بعض لوگوں کے ساتھ لگ جاتا ہے۔ اور ان کی زبان پر وہ اپنی بات کرتا ہے۔ لیکن اس کلام عالی شان کی سچی تاویل اور تعبیر کرنے کے لیے وہ بہرحال تیار نہ تھے کہ یہ کلام رب العالمین کی طرف سے ہے۔

چنانچہ اس پیراگراف میں قرآن نے ان کو اس کائنات کی خوبصورتی کی طرف متوجہ کیا' اس کائنات کے زندہ اور تابندہ مناظر پر غور کرنے کی دعوت دی اور اس کے ذریعہ ان کے ذہن میں یہ تصور بٹھایا کہ یہ قرآن بھی اس کائنات کی طرح ایک بدیع اور بے مثال کلام ہے۔ اور اس ذات کی طرف سے ہے جو اس کائنات کی خالق ہے۔ جس نے جس طرح اس کائنات میں جمال رکھا ہے اسی طرح قرآن میں بھی جمال رکھا ہے۔ جس کی کوئی مثال نہیں۔ چنانچہ قرآن نے قرآن کے حامل فرشتے' قرآن کے مبلغ رسول کی صفات بیان کیں کہ یہ رسول تو تمہارا ساتھی ہے' تم اسے جانتے ہو۔ اس میں مجنون ہونے کی کوئی صفت نہیں ہے اور اس نے اپنی آنکھوں سے اس فرشتے کو دیکھا ہے' جو اس پر کلام لایا ہے۔ اس وقت وہ فرشتہ افق پر چھایا ہوا تھا اور رسول کو حق الیقین تھا کہ یہ فرشتہ ہے' فرستادۂ رب العالمین ہے اور جو غیب کے علوم حضورؐ پر آتے ہیں آپ نہایت امانت سے پہنچاتے ہیں۔ ان باتوں میں کوئی مشکوک بات نہیں ہے۔ خود تم نے بھی رسول اللہ سے کبھی کوئی غلط بات نہیں سنی۔

وَ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ (۸۱:۲۵) "اور یہ شیطان مردود کا قول نہیں ہے"۔ اس لیے کہ شیطان اس قسم کا سیدھا راستہ لوگوں کو نہیں بتلایا کرتا۔ اللہ تعالیٰ نہایت تنبیہہ کے انداز میں پوچھتے ہیں کہ تم کدھر جا رہے ہو؟

فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ (۸۱:۲۶) "پھر تم کدھر چلے جا رہے ہو؟" تم کس قدر غلط فیصلہ کرتے ہو' کس قدر بودی بات کرتے ہو؟ حق سے منہ موڑ کر کدھر جا رہے ہو؟ حالانکہ حق اور سیدھا راستہ تمہارے سامنے ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۸۱:۲۷) "یہ تو سارے جہاں والوں کے لیے ایک نصیحت ہے"۔ یہ ایک یاد دہانی ہے اور ان کو بتاتی ہے کہ تمہارے وجود کی حقیقت کیا ہے؟ تمہاری پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ تمہارے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کا مقصد کیا ہے؟ یہ دعوت تو ایک عالمی دعوت ہے۔ اگرچہ یہ دعوت اس وقت دشمنوں کے نرغے میں ہے لیکن یہ دراصل ایک عالمی تحریک ہے۔ یہ آیت اس بات پر شہادت ہے کہ دعوت اسلامی اپنے آغاز ہی سے ایک عالمی دعوت تھی۔

اس کے بعد ان کو بتایا جاتا ہے کہ ہدایت اور نصیحت ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اس کی طرف آگے بڑھنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ چونکہ اللہ نے تمہیں یہ سہولیات فراہم کر دی ہیں' اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تم ارادہ کر لو اور اس راستے پر چل نکلو۔ اگر تم نہ چلوگے تو تم سے بازپرس ہوگی۔

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ (۸۱:۲۸) "تم میں سے ہر اس شخص کے لیے جو سیدھے راستے پر چلنا چاہے"۔ یعنی جو راہ ہدایت لینے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اللہ کی طرف چلنا چاہتا ہو۔ کیونکہ اس کلام کے بعد تو اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا کہ اللہ کا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے۔ اس کلام اور تذکرہ کے بعد تو تمام عذرات ساقط ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ کلام ایک صحیح اور سلیم دل پر راہ راست آشکارا کر دیتا ہے۔ لہٰذا اب جو راہ راست سے انحراف کرے گا اس

سے باز پرس ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ انفس و آفاق میں اشارات ایمان اور دلائل ہدایت اس قدر کثرت سے ہیں کہ ہر انسان بمشکل ان کے دائرہ اثر سے اپنے آپ کو نکالتا ہے اور اس کے لیے اسے عمداً سعی کرنی پڑتی ہے۔ ہر انسان پر ان دلائل کا زبردست اثر ہروقت قائم رہتا ہے۔ خصوصاً جو شخص قرآن پر غور وتدبر کرے اور قرآن کے نہایت موثر اسلوب کلام کو سمجھتا ہو' اور جو لوگ بھی قرآن کو سنیں اور سمجھیں۔ وہ راہ حق سے انحراف عمداً کریں گے اور ان کے پاس کبھی بھی کوئی معقول عذر اور وجہ جواز نہ ہوگا۔

جب یہ بتا دیا گیا کہ تمام لوگوں کا راہ ہدایت پر آنا ممکن ہے اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ اللہ نے ہر کسی کے لیے راہ حق پر چلنا آسان کر دیا ہے' تو اس مقام پر مناسب سمجھا گیا کہ لوگوں کی خواہش کے پس پردہ جو عظیم حقیقت کارفرما ہے' وہ بھی انہیں صاف صاف بتا دی جائے۔ وہ یہ کہ اگر وہ چاہیں بھی تو' توفیق الٰہی کے بغیر راہ راست پر نہیں آسکتے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۸۱:۲۹) "اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا الا یہ کہ اللہ رب العالمین چاہے"۔ یہ اس لیے کہ وہ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ ان کی مشیت اللہ کی وسیع تر مشیت سے آزاد اور جدا ہے' جس کی طرف تمام امور لوٹتے ہیں' اللہ کی طرف سے اختیار دیا جانا اور راہ ہدایت پانے کے لیے سہولت فراہم کرنا بھی اللہ کی عظیم مشیت کے اندر محدود ہے' جس کے دائرے کے اندر وہ تمام امور محدود ہیں جو ہو چکے ہیں اور جو ہونے والے ہیں۔

یہ آیت اور اس قسم کی تمام دوسری آیات جن میں لوگوں کی مشیت کے متصلاً بعد یہ کہا جاتا ہے کہ ہوتا وہی کچھ ہے جو اللہ چاہے۔ یہ اس لیے لائی جاتی ہیں کہ اللہ کی مشیت کی عمومیت اور ہمہ گیری کے بارے میں لوگوں کے تصورات کو درست کیا جائے۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام امور اللہ کی مشیت کے دائرے میں ہیں۔ اور اللہ نے لوگوں کو جو آزادانہ اختیارات دیئے ہیں وہ اس کی وسیع تر مشیت کے دائرے کے اندر ہیں۔ مثلاً یوں کہ اللہ نے فرشتوں کو یہ توفیق دے دی ہے کہ وہ اللہ کے احکام کی تعمیل کریں۔ ان کو یہ اجازت بھی دے دی ہے کہ وہ ایسا کریں' اور استطاعت بھی دے دی ہے کہ وہ ایسا کر سکیں تو یہ بھی اللہ کی مشیت کا ایک پہلو ہے کہ وہ دو راستوں میں سے جو راستہ چاہیں اختیار کریں اور یہ اختیار وہ تعلیم اور بیان کے بعد استعمال کریں۔

مومنین کو چاہئے کہ وہ اپنے عقیدے اور اپنے تصورات میں اس حقیقت کا اقرار کریں تاکہ ان کو معلوم ہو کہ اصل حقیقت کیا ہے' وہ اللہ کی مشیت کبریٰ کو دیکھتے ہوئے اللہ ہی پر بھروسہ کریں' اللہ کی توفیق کے طالب ہوں اور جو راہ اختیار کریں اور جو راہ ترک کریں اس میں قدرت الٰہیہ اور مشیت الٰہیہ ان کے سامنے ہو۔

--- ○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ الانفطار ـ ۸۲

## ۱-- تا -- ۱۹

# سورۃ الانفطار ایک نظر میں

اس مختصر سورت میں اسی کائناتی انقلاب کا تذکرہ ہے جو سورہ تکویر میں ہوا تھا' لیکن یہ سورت اس انقلاب کو ایک نیا رخ اور شخصیت عطا کرتی ہے۔ اس کے مخصوص خدوخال ہیں' یہ سورت قلب انسانی کو اپنی مخصوص وادیوں میں گھماتی ہے اور بالکل نئے اثرات سے سرشار کر دیتی ہے۔ اس کا انداز سنجیدہ' گہرا اور رکا ہوا ہے اور اس کا لہجہ سرزنش کا ہے اور دھمکی آمیز ہے۔

چنانچہ کائناتی انقلاب کے مناظر مختصر لیے گئے ہیں' پوری سورت پر حاوی ہیں جس طرح سورہ تکویر میں تھے کیونکہ عتاب کی فضا یہاں سنجیدہ ہے اور اس کے اثرات بھی تدریجی ہیں۔ سورت کا ترنم اور نغمگی بھی سنجیدہ ہے۔ یوں ترنم' اثرات اور انداز بیان تینوں باہم مناسب اور موافق و متوازن ہیں۔

اس سورت کے پہلے پیراگراف میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب آسمان پھٹ جائے گا اور کواکب بکھر جائیں گے اور سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے اور قبریں کھل جائیں گی اور دوسرے ایسے حالات نمودار ہوں گے جن کے ذریعہ ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ اس سخت دن کے لیے کیا کچھ کمایا ہے اور کیا کچھ کوتاہی اس سے ہو گئی ہے۔

سورت کے دوسرے حصے میں سخت تنبیہہ میں لپٹا ہوا عتاب اور سرزنش کا احساس ہے اور یہ عتاب اس انسان کو کیا گیا ہے کہ تمہاری ذات اور تمہاری تخلیق کے اندر اللہ کے کیا کیا فیوض اور رحمتیں موجود ہیں لیکن تم ان فیوض اور رحمتوں کا حق ادا نہیں کر رہے ہو اور نہ اللہ کی ایسی قدر کرتے ہو جیسی اس کی کرنی چاہئے اور اللہ کے اس فضل و کرم کا وہ شکر ہی ادا نہیں کر رہے۔

يٰاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (٦) الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ (٧)

فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (٨) (٨٢ : ٦ تا ٨) "اے انسان' کس چیز نے تجھے اپنے اس رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا' جس نے تجھے پیدا کیا' تجھے نک سک سے درست کیا' تجھے متناسب بنایا' اور جس صورت میں چاہا' تجھ کو جوڑ کر تیار کیا"۔

تیسرے پیراگراف میں بتایا گیا ہے کہ اس نافرمانی اور انکار کی علت کیا ہے' یہ کہ یہ لوگ روز قیامت اور اس کے حساب و کتاب اور جوابدہی کے منکر ہیں اور قیامت کا انکار ہی ہر برائی کا سرچشمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت کے حساب و کتاب کی سخت تاکید کی جاتی ہے۔ اور بتایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ ہو گا اور پھر تمہارا انجام یوں ہو گا۔

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ (٩) وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ (١٠) كِرَامًا كَاتِبِيْنَ

(۱۱) يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ (۱۲) اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ (۱۳) وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ (۱٤) يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ (۱٥) وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ (۱٦) (۸۲: ۹ تا ۱٦) "ہرگز نہیں' بلکہ تم لوگ جزاء و سزا کو جھلاتے ہو' حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں' ایسے معزز کاتب جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔ بے شک نیک لوگ مزے میں ہوں گے' بے شک بدکار لوگ جنہم میں جائیں گے۔ جزاء کے دن وہ اس میں داخل ہوں گے اور اس سے ہرگز غائب نہ ہوں گے"۔

آخری پیراگراف میں اس دن کی عظمت کی تصویر کشی کی گئی ہے' اور اس کی ہولناکیاں دکھائی گئی ہیں' اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس دن کسی کو کسی کام کا یارانہ ہو گا اور صرف اللہ جل شانہ کا حکم چلے گا۔

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (۱۷) ثُمَّ مَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (۱۸) يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (۱۹) (۸۲: ۱۷ تا ۱۹) "اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ جزا کا دن کیا ہے؟ ہاں' تمہیں کیا خبر کہ جزاء کا دن کیا ہے؟ یہ وہ دن ہے جب کسی کے لیے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہ ہو گا' فیصلہ اس دن اللہ کے اختیار میں ہو گا"۔

تیسویں پارے میں جو تنبیہات اور موثرات عموماً بیان ہوئے ہیں' یہ سورت بھی انہی کا ایک نمونہ اور ایک کڑی ہے اور اس میں وہی حقائق اور مضامین مختلف اسالیب بیان کے مطابق بیان کیے گئے ہیں۔

--- ooo---

# درس نمبر ۲۸۲ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۱۹

سُورَةُ الانفطار (۸۲) مکیۃ — آیاتہا ۱۹ — رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ﴿۱﴾ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ﴿۲﴾ وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿۳﴾
وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ﴿۴﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"جب آسمان پھٹ جائے گا' اور جب تارے بکھر جائیں گے' اور جب سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے' اور جب قبریں کھول دی جائیں گی' اس وقت ہر شخص کو اس کا اگلا پچھلا سب کیا دھرا معلوم ہو جائے گا"۔

گزشتہ سورت میں ہم نے ان آثار کی بات کی تھی جو ان مظاہر کو دیکھ کر انسانی احساس پر نمودار ہوتے تھے' یہ مناظر اس عظیم انقلاب سے متعلق تھے جو دست قدرت اس کائنات میں برپا کر دے گا' اس کائنات کو اس طرح ہلا مارا جائے گا کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر قائم نہ رہے گی اور اس عظیم کائنات کو تہ و بالا کر دیا جائے گا۔ ہم نے وہاں یہ بھی بتایا تھا کہ ان آثار میں سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کا دل اس پوری کائنات سے اٹھ جاتا ہے اور انسان اپنا تعلق اس خالق حقیقی کے ساتھ جوڑ لیتا ہے جو باقی اور لازوال ہے۔ جو اس وقت بھی باقی رہے گا جب یہ پوری کائنات ہلا ماری جائے گی۔ ان تمام انقلابات' زلزلوں اور توڑ پھوڑ کے عظیم عمل میں انسان کے لیے واحد جائے پناہ اس ذات کبریا کی درگاہ ہے جو ثابت' برقرار اور اس قدر منظم ہے جسے خلود اور دوام حاصل ہے۔ اور یہ خلود اور دوام صرف اسی ذات کا خاصہ ہے۔

یہ اس عظیم کائناتی انقلاب کے جو پہلو لائے گئے ہیں' ان میں سے ایک پہلو آسمان کا پھٹنا ہے۔ آسمان کے پھٹنے اور شق ہونے کا ذکر اور منظر قرآن مجید کے کئی مقامات پر پیش کیا گیا ہے۔ سورہ رحمٰن میں ہے۔

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (۵۵ : ۳۷) "جب آسمان پھٹ جائے گا تو وہ اس طرح سرخ ہو گا جس طرح چمڑا سرخ ہوتا ہے"۔ اور سورہ الحاقہ میں ہے۔

وَ انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ (۶۹ : ۱۶) "اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس کی

بندش کھل جائے گی"۔ اور سورہ انشقاق میں ہے ۔

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (۸۴:۱) "جب آسمان پھٹ جائے گا"۔ اس مصیبت کے دن کی مشکلات اور حقائق میں سے ایک بڑی حقیقت یہ ہوگی کہ اس دن آسمان پھٹ جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ آسمان کے پھٹنے کی تفصیلی کیفیت کیا ہوگی؟ تو حقیقت یہ ہے کہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ نہ اس کی اصل حقیقت سے ہم خبردار ہیں ۔ جو کچھ ہم کہہ سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ اس کائنات کی شکل و صورت میں ایک عظیم تغیر رونما ہو گا جو ہمیں نظر آتی ہے اور اس کا یہ موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا اور اس کی موجودہ بندش کھل جائے گی جس نے اس کے تمام کرات کو اس وقت اپنی جگہ باندھ کر رکھا ہے ۔

یہاں اس عظیم فضا میں ستاروں کے بکھر جانے کا منظر بھی فضا کی ہولناکی میں شریک ہو جاتا ہے ۔ اس وقت یہ ستارے اپنے اپنے مدار میں ایک خوفناک سرعت اور تیزی کے ساتھ گردش کر رہے ہیں ۔ لیکن اپنے اپنے مدار میں جکڑے ہوئے ہیں ' اور ایسا نہیں ہے کہ اس محیر العقول وسیع فضا میں جدھر منہ ہو ' ادھر دوڑتے رہیں ' اور اگر یہ اس طرح بکھر جائیں جس طرح اس وقت ہو گا جب قیامت برپا ہوگی تو وہ اس نہایت مضبوط غیر مرئی نظام کی بندش سے چھوٹ جائیں ' جس نے ان کو جوڑ رکھا ہے ' تو یہ فضا میں اسی طرح پھرتے رہیں جس طرح ایک ذرہ فضا میں اڑتا رہتا ہے ۔

سمندروں کی "تفجیر" کا ایک مفہوم تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ بھر جائیں اور خشکی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیں اور ایک عظیم طغیانی آجائے ' نیز اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ پانی پھٹ جائے اور جن عناصر سے وہ مرکب ہے ' ان عناصر کی صورت اختیار کر لے ۔ یعنی آکسیجن اور ہائیڈروجن ۔ جس طرح پانی کی تشکیل سے قبل یہ ہائیڈروجن اور آکسیجن گیس کی شکل میں تھا۔ اور یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں عناصر بھی ایٹم اور ہائیڈروجن بم کی طرح پھٹ جائیں ۔ اس کا تصور اب اچھی طرح کیا جا سکتا ہے کہ اگر ایٹم اور ہائیڈروجن پھٹ جائیں تو اس کائنات کے اندر کیا کچھ ہو جائے گا جبکہ موجو ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم اس دھماکے کے مقابلے میں محض کھلونے ہیں یا "تفجیر" کے کوئی اور معنی ہیں جو ابھی تک ہماری سمجھ سے باہر ہیں ۔ غرض ایک عظیم ہولناک اور خوفناک صورت حالات ہوگی ۔

قبروں کا کھلنا بھی ان حالات کی وجہ سے ہو گا یا مفہوم یہ ہو گا کہ اس طویل تبدیلی کے دوران حقیقتاً قبریں پھٹ پڑیں گی اور ان میں سے لوگوں کے جسم اٹھ کھڑے ہوں گے تاکہ یہ میدان حشر میں حساب و کتاب کے لیے چل پڑیں ۔ اس آخری مفہوم کی تائید فقرۂ مابعد سے بھی ہوتی ہے ۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ (۸۲:۵) "اس وقت ہر شخص کو اس کا اگلا پچھلا سب کیا دھرا معلوم ہو جائے گا"۔ یعنی جو پہلے کیا اور جو بعد میں کیا ' یا یہ کہ جو اس نے دنیا میں کیا اور جو اچھے اور برے آثار دنیا میں چھوڑے یا جو دنیا میں عیش کیا اور جو آخرت کے لیے ذخیرہ کیا۔ مطلب یہ ہے کہ ان عظیم حادثات اور انقلابات کے بعد ہر شخص اگلا پچھلا جان لے گا۔ یہ حادثات میں ہر حادثہ ہی خوفناک ہو گا۔

قرآن کریم کا مخصوص انداز کلام ملاحظہ کیجئے ۔ کہا جاتا ہے ۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ "نفس یہ جان لے گا"۔ نفس سے یہاں مراد ہر نفس ہے لیکن "ہر" کو حذف کرنا بات کو

نہایت نفیس اور خوبصورت بنا دیتا ہے ۔ بات یہاں آکر ختم نہیں ہو جاتی کہ ہر ایک شخص اپنے تمام اعمال کا پورا پورا علم حاصل کرلے گا ۔ بلکہ اس علم کے انسان پر شدید اثرات ہوں گے ۔ جس طرح کہا جاتا ہے اچھا تمہیں معلوم ہو جائے گا ۔ اگرچہ آیت میں اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ کیا اثرات ہوں گے نفس پر ۔ لیکن یہ ان عظیم کائناتی حادثات سے بھی سخت ہوں گے ۔ انداز کلام سے اس مفہوم کا انعکاس ہوتا ہے ۔

یہ تھا ایک ایسا مطلع جس نے انسانی احساس و شعور اور عقل و خرد کو یوں بیدار کر دیا ۔ اب اگلے پیرے میں انسان کی موجودہ حالت پر ایک تبصرہ آتا ہے کہ یہ انسان کس قدر غافل اور لاپرواہ ہے ' یہاں انداز عتاب نہایت ہمدردانہ ہے اور اس عتاب میں سرزنش اور جھڑکی کا پہلو درپردہ ہے ۔ اور بظاہر بات اللہ کی عنایات پر تدبر کی گئی ہے ۔ خصوصاً انسان کی موجودہ ' متوازن اور خوبصورت اور معتدل شکل و صورت میں پیدائش کو مدنظر رکھتے ہوئے ۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں یہ بات تھی کہ انسان کو موجودہ معتدل اور متوازن شکل و صورت اور جسم کے اعضاء سے فروتر شکل دے دیتا لیکن اللہ نے اسے ایسی صورت دی کہ جو تکنیکی اور خوبصورتی دونوں اعتبار سے بے مثال ہے ۔ کیا انسان پر لازم نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں پر غور کرے اور شکر ادا کرے ۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلۡإِنسَٰنُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ ٱلۡكَرِيمِ ۝٦ ٱلَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّىٰكَ فَعَدَلَكَ ۝٧ فِيٓ أَيِّ صُورَةٖ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝٨

”اے انسان ' کس چیز نے تجھے اپنے اس رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا ' جس نے تجھے پیدا کیا ' تجھے نک سک سے درست کیا ' تجھے متناسب بنایا ' اور جس صورت میں چاہا ' تجھ کو جوڑ کر تیار کیا “ ۔

یہاں انسان کو خطاب اس کی انسانیت کے حوالے سے کیا گیا ہے ۔ انسان میں صفت انسانیت ہی وہ صفت ہے جو اسے ممتاز اور مکرم بناتی ہے ۔ اور اپنی اس صفت کی وجہ سے انسان کو تمام دوسرے حیوانات اور زندہ مخلوقات پر برتری اور فضیلت حاصل ہے ۔ اور جس کی وجہ سے انسان مقام بلند تک پہنچا ہے ۔ اور اس پر اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے ۔

اس کے بعد نہایت ہی ہمدردانہ اور خوبصورت تنبیہہ اور عتاب آتا ہے ۔ ذرا الفاظ دیکھئے :۔

مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ (۸۲ : ۶) ”کس چیز نے تجھے رب کریم سے دھوکے میں ڈال دیا ہے “ ۔ اے انسان ' ذرا غور کر ' تمہارا مربی ' تمہارا نگہبان تمہاری کس قدر عزت افزائی کرتا ہے ۔ جس نے تمہیں انسانیت بخشی جس کی وجہ سے تم غور و فکر کرتے ہو ' بات کو سمجھتے ہو ' حیوانیت سے بلند ہوتے ہو ' آخر کیا چیز ہے جس نے تمہیں اپنے رب کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا ہے اور تم رب کے احکام میں تقصیرات اور کوتاہیاں کرتے ہو اور سستی کرتے ہو ' اللہ کے بارے میں گستاخیاں کرتے ہو ' جبکہ وہ نہایت ہی مہربان مربی ہے ' جس نے قدم قدم پر تم پر فضل و کرم کر رکھا ہے ' جس کے کرموں اور انعامات میں سے بڑی نعمت اور کرم تمہاری یہ انسانیت ہے ' اور انسانیت کا خلاصہ یہ ہے کہ تم نیک و بد کی تمیز رکھتے ہو ۔

اس کے بعد اس ربانی تکریم اور عزت افزائی کی تفصیلات دی جاتی ہیں ۔ پہلے نہایت ہی موثر اشاراتی اور گہرے

معانی پر مشتمل ایک مجمل پکار تھی اور عزت و تکریم کے خفیہ اشارے تھے اور پوشیدہ معانی تھے جو ایک آسمانی پکار اور محبت آمیز ندامیں مضمر تھے ۔ اب تفصیلات ۔ تفصیلات میں انسان کی تخلیق 'اس کی موزونیت اور اس کے غایت درجہ اعتدال کے حقائق لائے جاتے ہیں ۔ اگر اللہ چاہتا تو انسان کو کسی اور صورت میں بنا سکتا تھا 'لیکن یہ محض اس کا فضل و کرم ہے کہ اس نے انسان کے لیے اس قدر خوبصورت شکل تجویز کی ۔ اگر انسان صرف اپنی شکل و صورت اور جسمانی ساخت کے تکنیکی کمالات پر ہی غور کرے تو وہ اللہ کا شکر کرے 'مگر انسان نہ صرف یہ کہ شکر نہیں کرتا بلکہ وہ نہایت غرے کے ساتھ راہ غفلت پر سرپٹ دوڑ رہا ہے ۔

مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (٦) الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ (۸۲ : ۷) "اے انسان' کس چیز نے تجھے اپنے اس رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا 'جس نے تجھے پیدا کیا' تجھے نک سک سے درست کیا' تجھے متناسب بنایا" ۔ یہ ایک ایسا اشارہ ہے کہ اگر انسان کی انسانیت بیدار ہو' اور اس کا قلب و نظر پاک ہو' تو اس سے اس کی انسانیت کا ذرہ ذرہ جاگ اٹھے اور اس کا پورا وجود کانپ اٹھے اس لیے کہ انسان کا خالق اس کی سرزنش کر رہا ہے ۔ اپنے احسانات بتلا کر سرزنش کرتا ہے جبکہ انسان خواب غفلت میں مدہوش ہے 'پرا ز تقصیرات زندگی بسر کر رہا ہے' بلکہ وہ اپنے آقا اور مولا کے بارے میں سخت گستاخ ہے حالانکہ اس آقا نے اسے اس قدر پیاری' متناسب اور معتدل شکل و صورت اور شخصیت دی ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کو موجودہ خوبصورت' معتدل اور متناسب شکل پر پیدا کرنا اور اس اتمام اعضا کا اچھی طرح اپنے وظائف کو پورا کرتے چلے جانا ایک ایسی حقیقت ہے جس پر طویل تدبر اور جدوجہد کی ضرورت ہے' اور اس غور و فکر کے بعد پھر شکر بجالانا فرض ہے ۔ اور اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان ایسے خالق کے ساتھ دل کی گہرائیوں سے محبت رکھے اور اس کا احترام کرے ۔ جس نے اس تخلیق کے ذریعے انسان کو مکرم بنایا' اور یہ تکریم اور تفضیل اللہ کا محض فضل و کرم تھا' اس لیے کہ اللہ اس بات پر قادر تھا کہ وہ انسان کو کسی بھی نئی شکل و صورت میں پیدا کرتا' جس طرح چاہتا' لیکن اللہ نے موجودہ خوبصورت پیاری اور معتدل اور متناسب شکل انسان کو عطا کی ۔

حقیقت یہ کہ اپنی ساخت کے اعتبار سے انسان بے مثال ہے ۔ اس کی شکل و صورت نہایت ہی موزوں و معتدل ہے اور اس کی ساخت کے نقشے میں بے شمار عجائبات ہیں ۔ خود انسان کو اللہ نے فہم و ادراک کی جو قوت دی ہے اس کے جسم کے اندر موجود تکنیکی کمالات اور عجائبات اس کی قوت ادراک سے وراء ہیں ۔ یہ تخلیق اس کائنات میں موجود دوسری تخلیقات سے بھی زیادہ عجیب ہے ۔

خوبصورتی' تناسب اور اعتدال انسان کے جسم سے بالکل عیاں ہیں' خود انسان کی قوائے مدرکہ بھی اپنی جگہ عجائبات ہیں ۔ انسانی نفسیات اور اس کی روحانی دنیا بھی عجیب تر ہے ۔ اور نفسیاتی اور روحانی دنیا بھی اس کے جسمانی اعتدال اور تناسب کے ساتھ ہم آہنگ ہیں ۔

دور جدید میں لوگوں نے صرف انسان کی جسمانی ساخت پر کئی کتابیں تصنیف کی ہیں اور ان میں تفصیلات کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ انسانی ساخت کے اندر کیا کیا تکنیکی عجائبات ہیں ۔ پورا مطالعہ پیش کرنا تو ممکن نہیں ہے بعض اشارات پر ہم یہاں اکتفا کریں گے ۔

انسانی جسم کے اندر جو بڑے بڑے نظام ہیں ' مثلاً ہڈیوں کا نظام ' عضلات کا نظام ' جلد کا نظام ' ہاضمے کا نظام ' دوران خون کا نظام ' سانس کا نظام ' تناسل کا نظام ' شریانوں کا نظام ' اعصاب کا نظام ' پیشاب کا نظام ' اس کی قوت ذائقہ ' قوت شامہ اور سمع و بصر کی قوتیں یہ تمام نظام اگر دقت نظر سے دیکھے جائیں تو اپنی اپنی جگہ پر سب عجائبات ہیں ۔ انسان نے آج تک جس قدر پیچیدہ سے پیچیدہ تکنیکی آلات ایجاد کیے ہیں وہ ان نظاموں کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے ۔ انسان جب ان نظاموں پر غور کرتا ہے تو اس پر دہشت طاری ہو جاتی ہے اور وہ سکتے میں آ جاتا ہے لیکن انسان ہے کہ اپنی ذات کے ان عظیم عجائبات سے صرف نظر کر لیتا ہے ۔

سائنس کا ایک انگریزی جریدہ لکھتا ہے :" ہاتھ قدرت کے عجائبات میں سے ایک منفرد عجوبہ ہے ۔ انسان کے لیے ایسا آلہ ایجاد کرنا ممکن ہی نہیں ہے ۔ کسی کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ہاتھ کی طرح سادہ آلہ ایجاد کرے جس کے اندر وہ کمالات ہوں جو ہاتھ میں ہیں ۔ انسان پڑھنے کے وقت کتاب کو ہاتھ سے پکڑتا ہے اور ہاتھ اسے آنکھ سے موزوں کر کے فاصلے پر لے جاتے ہیں ۔ یہ پوزیشن خود کار طریقے سے ہاتھ فوراً طے کر دیتے ہیں ۔ اگر آپ کتاب کا ورق الٹنا چاہیں تو ہاتھ کی انگلی نہایت تکنیکی طریقے سے ورق پر رکھی جاتی ہے ۔ اور تھوڑے سے دباؤ سے ورق الٹ جاتا ہے ۔ پھر قلم پکڑتے ہیں اور ہاتھ کے اعصاب خود بخود قلم کو چلاتے ہیں ' پھر یہ ہاتھ عجیب انداز سے انسانی ضرورت کے تمام ہتھیاروں اور اوزاروں کو استعمال کرتا ہے ۔ چمچ ' چھری ' قلم اور دوسرے آلات خود بخود جس طرح ہم چاہیں ' ہاتھ کی گرفت میں آتے ہیں ۔ یہ قدرتی آلہ ۲۷ ہڈیوں اور ۱۵ عضلات پر مشتمل ہے اور محیر العقول ہے "۔ (اللہ اور جدید علم ' استاد عبدالرزاق )

انسان کا کان اور اس کا جوف دراصل چار ہزار کے لگ بھگ نصف قوس کی کمانوں پر مشتمل ہے ' یہ کمانیں نہایت عمدگی سے بنائی گئی ہیں اور باہم دگر نہایت تکنیکی اعتبار سے مربوط ہیں ۔ یہ موسیقی کے آلات کے مشابہ ہیں ۔ اور یہ کمانیں ہر قسم کی آواز کو ایک عجیب انداز سے عقل اور دماغ کی طرف منتقل کرتی ہیں ۔ بجلی کی کڑک کی سخت آواز ہو یا درختوں کی نہایت خوشگوار سرسراہٹ ہو ' کرخت آواز ہو یا آلات موسیقی کی خوشگوار آواز ہو ' یہ نصف قوس کے بے شمار نشیب و فراز جو کان کے اندر بنے ہوئے ہیں ' اس آواز کو من و عن دماغ تک پہنچاتے ہیں "۔

" آنکھ بھی ایک عجیب آلہ ہے ' روشنی کو اخذ کرنے والے تین کروڑ سے اوپر اعصاب کے سرے اس کے اندر موجود ہیں ۔ پھر آنکھ کی حفاظت کے لیے پپوٹے اور اس کے اوپر پلکوں کا جنگلہ ہے ۔ یہ نہایت خوبصورتی سے کسی بھی بیرونی چیز کو اندر آنے نہیں دیتے ۔ اور خود کار طریقے سے حرکت میں رہتے ہیں ۔ اور اجنبی چیزوں کو روکتے اور موڑتے ہیں ۔ پلکوں کا سایہ دھوپ کی شدت کو بھی کم کرتا ہے اور پپوٹے خود کار طریقے سے آنکھ کو تر رکھتے ہیں ۔ آنکھ کی صفائی کا نظام کس خوبصورتی سے کیا گیا ہے ' یہ سیال مادہ جسے آنسو کا نام دیا جاتا ہے یہ آنکھ کو ہر وقت صاف رکھتا ہے اور بہترین صفائی کرنے والا سیال ہے "۔ (علم ایمان کی دعوت دیتا ہے )

" چکھنے کا نظام انسان کی زبان میں رکھا گیا ہے ۔ زبان کے لعاب دار پردے میں بے شمار چکھنے والے خلیے ہیں ۔ یہ خلیے گھنڈیوں کی شکل میں ہیں ۔ ان گھنڈیوں کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں ۔ کچھ ریشہ دار ہوتی ہیں ' بعض محدب ہوتی ہیں اور بعض پھٹی ہوئی ہوتی ہیں ۔ اور یہ خلیے زبان کے نکلنے اور چکھنے والے پٹھوں سے غذا حاصل کرتے ہیں ۔ جب انسان

کوئی چیز کھاتا ہے تو اس عمل سے چکھنے والے اعصاب متاثر ہوتے ہیں اور یہ اثرات دماغ تک جاتے ہیں اور یہ پورا نظام انسانی منہ کے ابتدائی حصہ میں تخلیق کیا گیا ہے تاکہ اگر انسان کسی چیز کو ناپسند کرتا ہے تو اسے تھوک سکے ۔ یوں منہ کے اندر ہی انسان معلوم کر لیتا ہے کہ جو چیز کھائی جا رہی ہے وہ تلخ ہے' شیریں ہے' گرم ہے' سرد ہے' نمکین ہے یا جلانے والی ہے ۔ زبان کے اندر چکھنے کی نو ہزار گھنڈیاں ہوتی ہیں اور یہ پٹھوں کے ذریعہ دماغ کے ساتھ مربوط ہوتی ہیں ۔ ان کا حجم کیا ہے اور یہ کس طرح عمل کرتی ہیں؟ یہ ایک حیرت انگیز بات ہے" ۔ (اللہ اور جدید سائنس)

"اور پھر اعصاب کا نظام جو پورے جسم میں پھیلا ہوا ہے' یہ ایسے باریک ریشوں کا مرکب ہے جو جسم کے ہر طرف پہنچے ہوئے ہیں ۔ جسم کے کونے کونے سے آگے یہ بڑے اعصاب سے جڑتے جاتے ہیں ۔ اور اعصاب کے مرکزی نظام سے مربوط ہوتے ہیں ۔ اگر جسم کا کوئی حصہ بھی کسی طرح متاثر ہو تو یہ نظام مرکزی نظام کو اطلاع دیتا ہے' چاہے موسم کی معمولی سی تبدیلی کیوں نہ ہو ۔ یہ نظام پورے جسم سے احساسات دماغ تک پہنچاتا ہے اور دماغ اس تاثر کے بعد حکم صادر کرتا ہے اور یہ نظام نہایت ہی تیزی سے پیغام رسانی کا کام کرتا ہے ۔ اس پیغام رسانی کی رفتار سو میٹر فی سیکنڈ ہے" ۔

"نظام ہضم ایسا ہے جس طرح کوئی کیمیاوی لیبارٹری ہوتی ہے ۔ کوئی چیز کھاتے ہی اس لیبارٹری میں ایک عجیب عمل شروع ہوتا ہے اور یہ فیکٹری ماسوائے معدے کے اس تھیلے کا سب کچھ چاٹ لیتی ہے ۔ اور یہ عمل نہایت ہی حیرت انگیز طریقہ سے ہوتا ہے" ۔

"اس لیبارٹری میں ہم انواع و اقسام کے کھانے داخل کرتے ہیں' ہمارے سامنے یہ بات نہیں ہوتی کہ ان کے ساتھ یہ لیبارٹری کیا کرے گی اور نہ ہم سوچتے ہیں کہ یہ کھانے کس طرح ہضم ہوں گے ۔ گوشت' تلی ہوئی مچھلی اور دوسری خوراکیں کچھ پانی کے ساتھ اس لیبارٹری میں داخل کر دیتے ہیں" ۔ (اللہ اور جدید سائنس)

"کھانوں کے اس مجموعے سے یہ لیبارٹری نفع بخش چیزیں لے لیتی ہے کہ تنور میں یہ مختلف کھانے اس طرح ٹوٹتے پھوٹتے ہیں کہ ان کے تمام اجزاء تحلیل ہو جاتے ہیں ۔ وہ فضلات کو نکال کر باقی چیزوں کو پروٹین کی شکل دیتی ہے تاکہ وہ جسم کے مختلف خلیات کے لیے غذا کا کام دیں ۔ یہ نظام ہضم اس ملغوبے سے ضروری اجزاء کیلشیم' گندھک' آیوڈین' لوہا اور بے شمار دوسرے اجزاء اخذ کر لیتا ہے اور اس بات کا پورا خیال رکھتا ہے کہ کوئی کار آمد جز ضائع نہ ہو' تاکہ ان سے ہرمون پیدا ہوں اور انسانی زندگی کے لیے تمام ضروری مواد بقدر ضرورت مہیا ہوتا رہے اور نہایت منظم طریقے سے ہوتا رہے ۔ معدہ چربی اور دوسرے بعض اجزاء کا ذخیرہ بھی کرتا ہے تاکہ ہنگامی ضروریات کے وقت یہ مواد کام آسکے ۔ اور یہ لیبارٹری یہ سب کام خود کار طریقے سے کرتی ہے اور انسان کو نہ اس کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے اور نہ کوئی کام کرنا پڑتا ہے ۔ نہ انسان کو اس کے اسباب و علل معلوم ہوتے ہیں ۔ ہم بس اس کے اندر بے شمار چیزیں ڈال دیتے ہیں اور پھر یقین ہوتا ہے کہ ہماری زندگی کو جاری رکھنے کے لیے معدہ خود بخود ضروری اشیاء اخذ کرے گا ۔ اور سارے کام خود کرے گا ۔

جب خوراک' نظام ہضم کے ذریعے نئی شکل اختیار کرتی ہے تو معدہ ان کو جسم کے کھربوں خلیات تک ان کی خوراک کے طور پر پہنچاتا ہے ۔ اس کرۂ ارض پر پوری آبادی سے زیادہ خلیات خود ایک انسان کے جسم میں ہیں ۔ اور ہر خلیہ الگ خوراک مانگتا ہے جسے فراہم کیا جاتا ہے ۔ ہر خلیہ تک صرف اس کی ضرورت کی غذا پہنچتی ہے ۔ اور یہ خلیات پھر اعضاء کی شکل اختیار کرتے ہیں مثلاً ہڈیاں' ناخن' کان' آنکھیں' دانت اور دوسرے اعضاء" ۔

"پس معدہ ایک ایسی لیبارٹری ہے جو کسی بھی انسانی تخلیق کردہ لیبارٹری سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ اور اس کے ساتھ ترسیل کا ایک عجیب نظام ہے جو کسی بھی انسانی نظام ترسیل اور انفذ سے زیادہ ٹیکنیکل ہے۔ اور آج تک انسان نے ایسا پیچیدہ نظام نہ دیکھا ہے نہ ایجاد کیا ہے اور اس لیبارٹری کا نظام نہایت ضبط اور منصوبہ بندی سے کام کرتا ہے۔ (یہ تمام اقتباسات کتاب "سائنس ایمان کی دعوت دیتی ہے" سے لیے گئے ہیں)۔

انسانی جسم کے اندر کام کرنے والے نظاموں کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ لیکن ان تمام نظاموں میں انسان کے ساتھ حیوانات بھی کسی نہ کسی طرح شریک ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ہر نظام خواہ انسانوں میں ہو یا حیوانات میں، اپنی جگہ معجزہ ہے۔ لیکن انسان کی عقلی، فکری اور روحانی خصوصیات وہ ہیں جس میں یہ منفرد ہے اور یہ وہی خصوصیات ہیں جن کے بارے میں اللہ انسان کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ یہ اس پر اس کا احسان عظیم ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ (۸۲ : ۷) "جس نے تمہیں پیدا کیا، تمہیں نک سک سے درست کیا اور متناسب بنایا"۔ اور یہ خطاب یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ سے شروع کیا۔

مثلاً انسان کی قوت مدرکہ جو عقل میں ہے، ہم اس کی حقیقت کو نہیں جانتے، اس قدر جانتے کہ یہ ادراک قوت عقلیہ کے ذریعے ہوتا ہے اور قوت عقلیہ ہی آلہ ادراک ہے۔ جہاں تک عقل کا تعلق ہے، ہم نہ اسے جانتے ہیں اور نہ یہ جانتے ہیں کہ اس قوت کا عمل ادراک کس طرح کام کرتا ہے۔

ہماری معلومات اور مدرکات کس طرح دماغ میں رہتی ہیں، ہم بس اس قدر فرض کر لیتے ہیں کہ نہایت ہی لطیف دماغی اور اعصابی ریشوں کے ذریعہ یہ معلومات اور مدرکات ذہن اور عقل میں منتقل ہوتی ہیں۔ لیکن عقل اسے کہاں سٹور کرتی ہے؟ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ دماغ کے اندر ریکارڈ کرنے کا کوئی فیتہ ہے تو پھر ساٹھ (۶۰) سال کے لیے کئی ملین میٹر طویل فیتہ ہونا چاہئے کہ وہ ساٹھ سالہ زندگی میں انسانی مشاہدات کو ریکارڈ کرے۔ ساٹھ سال کا ذکر ہم اس لیے کرتے ہیں کہ بالعموم اوسط عمر ساٹھ سال ہوتی ہے۔ ان ساٹھ سالوں میں انسان الفاظ و معانی، تاثرات اور شعور اور مناظر و مشاہد کے لاتعداد چیزیں اپنے دماغ میں ریکارڈ کرتا ہے۔

انفرادی الفاظ و معانی پھر کس طرح مرکب ہو کر نتائج پیدا کرتے ہیں۔ انفرادی حادثات اور انفرادی تصاویر کس طرح کمپوز ہو کر علم اور کلچر پیدا کرتی ہیں۔ یہ ایک الگ دنیا ہے اور معلومات علوم اور اصول میں بدل جاتی ہیں۔ مدرکات اور ادراک کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور تجربات سے علم و سائنس وجود میں آتے ہیں۔ یہ اپنی جگہ دنیا کے عجائبات ہیں۔

یہ تو ہوئی انسان کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت، جو اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور اس کی وجہ سے انسان ممتاز ہے۔ لیکن انسان کی خصوصیات میں سے یہ کوئی بڑی خصوصیت نہیں ہے بلکہ انسان کے اندر اللہ کی روح سے جلا ہوا ایک چراغ بھی ہے جسے انسانی روح کہا جاتا ہے۔ انسان کی یہ روح انسان کو جمال کائنات کے ساتھ جوڑتی ہے اور یہی روح ہر انسان کو خالق کی روح سے مربوط کرتی ہے۔ اور انسان کو وہ لمحات نصیب کرتی ہے جن میں انسان حقیقت کبریٰ کے ساتھ جڑ جاتا ہے، جو اپنی جگہ لامحدود ہے اور اس اتصال میں پھر انسان جمال حقیقت کبریٰ کی کچھ جھلکیاں پا لیتا ہے۔

انسان اس روح کی حقیقت سے بھی بے خبر ہے۔ روح تو ایک بڑی چیز ہے، انسان جن محسوسات کا ادراک کرتا ہے، وہ تو ان کی حقیقت سے بھی بے بہرہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ روح ہی ہے جو اسے خوشی اور سعادت مندی کے وہ لمحات اور وہ

جھلکیاں عطا کرتی ہے جن کی وجہ سے وہ اس زمین پر ہوتے ہوئے بھی عالم بالا سے مربوط ہو جاتا ہے ۔ اور یوں وہ جنت کی ابدی زندگی کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ حقیقت کبریٰ کے جمال کو دیکھ سکے ۔

یہ روح ' انسان کے لیے اللہ کا مخصوص تحفہ ہے ۔ اور اس روح ہی کی وجہ سے انسان ' انسان قرار پایا ہے ۔ اور اسی وجہ سے اللہ نے اسے یوں مخاطب کیا ۔

یٰاَیُّھَا الْاِنْسَانُ اور پھر اسے اس قدر محبت آمیز سرزنش کی ۔

مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ( ۸۲ : ۶ ) " تجھے رب کریم کے بارے میں کس چیز نے غرے میں ڈال دیا ہے " ۔ یہ اللہ کی طرف سے انسان کے لیے براہ راست سرزنش ہے ۔ اللہ بذات خود انسان کو پکارتا ہے اور انسان جب نظریں اٹھاتا ہے تو وہ اللہ کے سامنے ایک گناہگار ' غافل ' اللہ کے فضل و کرم کی قدر نہ کرنے والا ' بلکہ اللہ کے ہاں ایک گستاخ شخصیت کی صورت میں کھڑا نظر آتا ہے ۔ اب اللہ تعالیٰ اسے اپنی عظیم نعمت اور اپنے فضل و کرم سے آگاہ فرماتا ہے ۔ اور اس کو اس کی ناقدری ' اور اس کی تقصیرات اور گستاخیوں سے مطلع فرماتا ہے ۔

یہ ایک انسانی سرزنش ہے کہ اگر انسان میں احساس ہو تو وہ پانی پانی ہو جائے ۔ اگر انسان اپنی انسانیت کے سرچشمے کو تلاش کرے ' اور اللہ کی اس اطلاع اور اللہ کی ذات پر غور کرے اور یہ دیکھے کہ وہ کس بادشاہ کے سامنے کھڑا ہے ۔ اسے کس قدر عظیم ذات پکار رہی ہے ' اور اس کی سرزنش کر رہی ہے اور اس پر یہ عتاب ہو رہا ہے ' تو حقیقت یہ ہے کہ انسان پگھل کر رہ جائے ۔ ذرا غور کرو ۔

یٰاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ( ۶ ) الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ ( ۷ ) فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ( ۸ ) ( ۸۲ : ۶ تا ۸ ) " اے انسان ' کس چیز نے تجھے اپنے اس رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا ' جس نے تجھے پیدا کیا ' تجھے نک سک سے درست کیا ' تجھے متناسب بنایا ' اور جس صورت میں چاہا ' تجھ کو جوڑ کر تیار کیا " ۔

اب اگلے پیرے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ انسان کیوں غافل ہو جاتا ہے اور اس سے تقصیرات کیوں سرزد ہوتی ہیں ۔ ان کا اصل سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ قیامت کے دن کا یقین نہیں رکھتا ۔ بتایا جاتا ہے کہ حساب و کتاب ایک حقیقت ہے اور اس کی کیفیات اور مناظر یوں ہوں گے ۔ اور یہ کہ لوگوں کا انجام یکساں نہ ہو گا اور اس حقیقت کو نہایت تاکید کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے ۔

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝۹ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝۱۰
كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝۱۱ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝۱۲ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝۱۳ وَاِنَّ
الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۝۱۴ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ۝۱۵ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ۝۱۶

"ہرگز نہیں' بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) تم لوگ جزاو سزا کو جھلاتے ہو' حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں' ایسے معزز کاتب جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔ یقیناً نیک لوگ مزے میں ہوں گے اور بے شک بدکار لوگ جہنم میں جائیں گے۔ جزا کے دن وہ اس میں داخل ہوں گے اور اس سے ہرگز غائب نہ ہو سکیں گے"۔

لفظ کلا بھی زجر و توبیخ کا لفظ ہے' اس کے ذریعہ سرزنش کی جاتی ہے کہ تم جس حال میں ہو' یہ درست نہیں ہے۔ تمہاری سوچ غلط ہے۔ اس کے ذریعے سابقہ موضوع سے بات کو دوسرے موضوع اور نکتے کی طرف منتقل کیا جاتا ہے۔ ایک نئی بات سامنے لائی جاتی ہے اور یہ تاکید اور زوردار بات کرنے کا ایک انداز ہے۔ یہ انداز عتاب اور یاد دہانی اور تصویر کشی سے الگ ہے۔

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ (۸۲ : ۹) "ہرگز نہیں' اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جزاء و سزا کو جھلاتے ہو"۔ تمہیں یہ یقین نہیں ہے کہ اس زندگی کا جواب بھی دینا ہے اور یہی ہے تمہاری غفلت کا حقیقی سبب۔ جس کی وجہ سے تم سے تقصیرات ہوتی ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص زندگی کی جوابدہی اور حساب و کتاب پر یقین نہ رکھتا ہو اور پھر وہ سیدھے راستے پر بھی چلتا ہو' بھلائی بھی کرتا ہو' اور اللہ کی اطاعت بھی کرتا ہو۔ بعض اوقات' بعض لوگوں کے دل اس قدر صاف و شفاف ہو جاتے ہیں کہ وہ رب کی اطاعت صرف رب کی محبت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ اس وجہ سے نہیں کرتے کہ اللہ ان کو سزا دے گا یا جزاء دے گا' اور ان کو کسی انعام کا کوئی لالچ ہی نہیں رہتا۔ لیکن ایسے لوگ بھی قیامت پر یقین رکھتے ہیں' اللہ سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے ساتھ ملاقات کے شائق ہوتے ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ جس رب کے ساتھ انہیں محبت ہے اس کو دیکھیں۔ لیکن جب کوئی قیامت کی تکذیب کرتا ہے تو وہ آداب زندگی' اطاعت رب اور نورانیت اور روحانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے جسم کے اندر زندہ دل نہیں ہوتا' اور اس کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔

تم لوگ روز جزاء کی تکذیب کرتے ہو لیکن تم دراصل قیامت کے دن کی طرف کشاں کشاں جارہے ہو' تمہاری زندگی کا ریکارڈ تیار ہو رہا ہے۔ کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا اور نہ ضبط کیے جانے سے چھوٹ سکتا ہے۔ نہ فرشتے بھولتے ہیں۔

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ (۱۰) كِرَامًا كَاتِبِيْنَ (۱۱) يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ (۱۲) (۸۲ : ۱۰ تا ۱۲) "حالانکہ تم پر نگراں مقرر ہیں' یہ ایسے معزز کاتب ہیں جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں"۔ یہ محافظ وہ روحانی مخلوقات ہیں جو فرشتوں سے ہیں۔ یہ ہر وقت انسان کے ساتھ رہتے ہیں' اس کی نگرانی کرتے ہیں' اور جو اعمال وہ کرتا ہے اسے لکھتے ہیں' ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ کس طرح ریکارڈ تیار کرتے ہیں' اللہ کی طرف سے ہم پر ایسی کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی کہ ہم اس کی تفصیلی کیفیات بھی جانیں۔ اللہ کو معلوم ہے کہ ہمارے اندر ان غیبی امور کے ادراک کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اور نہ اس میں ہمارا کوئی فائدہ ہے کہ ہم ریکارڈ کیے جانے کی کیفیت بھی جانیں۔ کیونکہ یہ علم ہمارے فرائض میں سے نہیں ہے اور نہ اس سے انسان کے مقصد تخلیق کا تعلق ہے۔ لہٰذا اس میں مشغول ہونے کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ اس کا تعلق ان غیبی امور سے ہے جن کا انکشاف اللہ نے ہمارے سامنے نہیں کیا۔ ہمارے لیے صرف یہی شعور اور یقین دہانی ہے کہ انسان شتر بے مہار نہیں ہے۔ اور اللہ نے ایسے کارندے اس

کے اوپر نگران مقرر کر دیئے ہیں۔ جو اس کی ہر بات کو ریکارڈ کرتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ وہ جاگ اٹھے اور خوف کے مارے کانپ جائے اور اپنے مقصد زندگی کو پورا کرتے ہوئے آداب زندگی کو ملحوظ رکھے۔

اس سورت کی فضا اللہ کے انعامات اور اللہ کے فضل و کرم کی تھی' اس لیے ان فرشتوں کی یہ صفت یہاں لائی گئی کہ وہ "کرام" ہیں قابل قدر اور صاحب منزلت ہیں۔ یہ اس لیے کہ انسان کو یہ خوف لاحق ہو کہ اس پر معزز لوگ نگران ہیں۔ لہٰذا اسے ارتکاب جرائم و قبائح کے وقت شرم آنی چاہئے کیونکہ یہ بات انسان کی فطرت کا حصہ ہے کہ جب وہ شرفاء اور معزز لوگوں کے اندر بیٹھا ہو تو وہ قبیح حرکات نہیں کرتا' مبتذل الفاظ کا استعمال نہیں کرتا اور اپنی روش درست رکھتا ہے لیکن اگر انسان کو یہ شعور مل جائے کہ اللہ کے معزز فرستادہ اس کی باتوں کو نوٹ کر رہے ہیں تو انسان بے شمار قباحتوں سے بچ سکتا ہے جو شرفاء کے ساتھ لائق نہیں۔ قرآن کا یہ کمال ہے کہ وہ انسانی شعور کو زندہ و بیدار رکھتا ہے اور تصور قیامت اور عقیدۂ کاتبان الٰہی کے ذریعہ انسان کو اعلیٰ خیالات اور اعمال کے لیے پر جوش بناتا ہے۔

اس کے بعد نیک لوگوں کے انجام اور برے لوگوں کے انجام کا ذکر کیا جاتا ہے کہ فرشتے اور اللہ کے معزز نمایندے جو ریکارڈ تیار کرتے ہیں' وہ بہت اہم ہے اور اس کی بناء پر دائمی سعادت یا دائمی شقاوت نصیب ہوگی۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ (١٣) وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ (١٤) يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ (١٥) وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ (١٦) (٨٢: ١٣ تا ١٦) "یقیناً نیک لوگ مزے میں ہوں گے اور بے شک بدکار لوگ جہنم میں جائیں گے۔ جزا کے دن وہ اس میں داخل ہوں گے اور اس سے ہرگز غائب نہ ہو سکیں گے"۔

لہٰذا یقین کرو کہ یہ انجام لازمی ہونے والا ہے۔ یہ طے شدہ انجام ہے کہ نیک لوگ جنت میں اور برے لوگ جہنم میں داخل ہوں گے۔ بر' ابرار کا واحد ہے۔ وہ شخص کہ نیکی اس کی عادت ثانیہ بن جائے۔ نیک کاموں میں وہ تمام کام شامل ہیں جو اچھے کام ہیں۔ اور نیکی کی یہ صفت انسانی شرافت کے ساتھ مناسب ہے۔ اس کے مقابلے کا لفظ بھی ایسا ہی ہے۔ فجار' وہ گستاخ' بے ادب جو اثم و معصیت کے کاموں میں بے دھڑک کود پڑتے ہیں۔ جہنم ان کے فسق و فجور کے لیے موزوں جگہ ہے۔ مناسب جائے مقام ہے۔ ان کا حال کیا ہو گا؟

يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ (٨٢: ١٥) "جزا کے دن وہ اس میں داخل ہوں گے"۔ تو بطور تاکید مزید یہ کہا جاتا ہے کہ وہاں مجرم مفرور نہ ہو سکیں گے۔

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ (٨٢: ١٦) "اور وہ اس سے ہرگز غائب نہ ہو سکیں گے"۔ نہ آغاز فیصلہ میں یہ غائب ہوں گے اور نہ معافی کے ذریعہ جہنم سے نکل سکیں گے۔ یوں ابرار اور فجار کی حالت ایک دوسرے کے عین بالمقابل اور متضاد ہوگی۔ جنت اور جہنم کے حالات بھی باہم متضاد اور بالمقابل ہوں گے۔ جبکہ اہل جہنم کے حالات اور ورود جہنم کو ذرا تفصیل سے بتایا گیا ہے۔

اصل موضوع یہ تھا کہ یہ لوگ قیامت کے حساب و کتاب کے منکر تھے اور تکذیب کرتے تھے۔ لہٰذا اس دن کے

واقعات بیان کرنے کے بعد اس دن کی ہولناکیوں اور خوفناکیوں کو دوبارہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس دن کو وہ مکمل طور پر بے بس ہوں گے ۔ کسی کے لیے کوئی چارہ نہ ہو گا اور کسی جانب سے کوئی امداد و معاونت نہ ملے گی اور یہ دن اس قدر خوفناک ہو گا کہ تمہیں اس کا کوئی علم ہی نہیں ہے ۔ یہ بتا کر کہ تم اس دن کے ہول سے مکمل طور پر بے خبر ہو' اس خوف کو زیادہ کر دیا جاتا ہے جس طرح کہا جاتا ہے کہ عظیم مصیبت آنے والی ہے ۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۸﴾ يَوْمَ لَا
تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾ ع الربع ۱۹ ع

"اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ جزا کا دن کیا ہے؟ ہاں' تمہیں کیا خبر کہ وہ جزا کا دن کیا ہے؟ یہ وہ دن ہے جب کسی شخص کے لیے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہ ہو گا' فیصلہ اس دن بالکل اللہ کے اختیار میں ہو گا" ۔

قرآن کے انداز تعبیر میں کسی مصیبت کو مجہول اور نامعلوم کر کے بیان کرنا' ایک عمومی انداز ہے ۔ اس انداز سے اس کی خوفناکیوں میں خوب اضافہ ہو جاتا ہے ۔ یعنی یہ کہ انسانی تصور سے قیامت کی مصیبت ماوراء ہے ۔ مصیبت اور خوف کا ہم جو بھی بھیانک تصور کر سکتے ہیں' اس سے بھی وہ بڑھ کر ہے ۔ پھر سوال کو دہرا کر اس خوفناکی میں مزید اضافہ کیا جاتا ہے ۔

سوال دہرانے کے بعد اس کے ایسے خدوخال بیان کر دیئے جاتے ہیں جو اس کی خوفناکیوں کے ساتھ متناسب ہیں ۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا (۸۲ : ۱۹) "یہ وہ دن ہے جس میں کسی نفس کے لیے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہ ہو گا" ۔ یعنی انسان مکمل طور پر عاجز' لاچار اور بے بس ہوں گے ۔ ہر شخص کو اپنی پڑی ہو گی' وہ سب سے کٹ چکا ہو گا' کوئی دوست و یار یاد نہ ہو گا ۔

وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ (۸۲ : ۱۹) "فیصلہ اس دن صرف اللہ کے اختیار میں ہو گا" ۔ یہ صرف اللہ کی منفرد ذات ہو گی اور دنیا و آخرت کے فیصلے اسی کے اختیار میں ہوتے ہیں' لیکن اس دن یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی ۔ اگرچہ دنیا میں بعض لوگ اس حقیقت کے تصور سے غافل ہوتے ہیں اور غرے میں ہوتے ہیں ۔ لیکن قیامت میں یہ امر پوشیدہ نہ رہے گا ۔ ہر کسی پر عیاں ہو گا ۔ غافل' متکبر اور ہر خود غلط سب ہی اسے دیکھ لیں گے ۔

یہ سورت کا خوفناک اختتام ہے اور یہ اختتام سورت کے آغاز کے خوفناک انقلابات کائنات کے ساتھ مل کر' انسانی سوچ' انسانی احساسات کو گھیر لیتا ہے ۔ یہ دونوں خوف اور ہلا مارنے والے حالات انسان کو دہشت زدہ کر دیتے ہیں ۔ ان دونوں ہولناک حالات یعنی آغاز و انجام کے درمیان ایک پر محبت' ہمدردانہ ملامت ہے جس سے ایک خاص انسان پانی پانی ہو جاتا ہے ۔ یہ ہے سورت کا خاتمہ ۔

--- ○○○ ---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ--- ۳۰

## سورۃ المطففین ـ ۸۳

۱-- تا-- ۳۶

# سورۃ المطففین ایک نظر میں

مکہ مکرمہ میں دعوت اسلامی جن عملی حالات و مراحل سے گزر رہی تھی یہ سورت اس کے ایک مرحلے کا نمونہ ہے۔ اس کا مقصد خفتہ دلوں کو جگانا اور غافل قلوب کو متوجہ کرنا ہے' انسانی شعور کو جھنجھوڑنا ہے اور لوگوں کو عالم عرب اور اس کرۂ ارض پر اٹھنے والے اس عظیم انقلاب کی طرف متوجہ کرنا ہے جو عرب سوسائٹی اور انسانی کلچر کو بدل رہا تھا۔ یہ ایک آسمانی پیغام تھا اور زندگی کا بالکل ایک جدید تصور پیش کر رہا تھا۔

مکہ مکرمہ میں موجود سوسائٹی کے ایک عملی پہلو کو اس سورت کے آغاز میں لیا گیا ہے اور یہ صورت حالات مکہ میں عملاً موجود تھی کہ لوگ دیتے وقت کم دیتے تھے اور لیتے وقت زیادہ لیتے تھے۔ آغاز میں ایسے لوگوں (مطففین) کو دھمکی دی گئی ہے کہ وہ جب رب العالمین کے سامنے حشر کے میدان میں کھڑے ہوں گے تو کیا جواب دیں گے۔

یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۸۳:۶) "اس دن جبکہ لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے"۔ اور سورت کے آخر میں ان خیالات کی تصویر کشی ہے جو اس وقت کی سوسائٹی ان انقلابیوں کے بارے میں رکھتی تھی۔ یہ لوگ ان اہل ایمان پر اشاروں کنایوں میں اعتراض کرتے تھے' ان کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے تھے اور ان کے بارے میں کہتے تھے۔

اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ (۸۳:۳۲) "کہ یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں"۔ اس کے علاوہ اس سورت میں نیکوکاروں اور بدکاروں کے آخری انجام کی جھلک بھی دکھائی گئی ہے کہ اس یوم عظیم میں دونوں کے مآل و احوال کیسے ہوں گے۔

یہ سورت چار پیروں پر مشتمل ہے۔ پہلے پیرے میں مطففین کے خلاف اعلان جنگ کیا گیا ہے۔ یہ لوگ کون ہیں ان کی تعریف خود قرآن کرتا ہے:

وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ (۱) الَّذِیْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ (۲) وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ یُخْسِرُوْنَ (۳) اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ (٤) لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ (٥) یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (٦) (۸۳:۱ تا ٦) "تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو اپنے زور سے پورا پورا لیتے ہیں' اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انہیں گھاٹا دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اس

دن جبکہ سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے"۔

اور دوسرے پیراگراف میں فجار کو سخت سرزنش کی گئی۔ ان کو ہلاکت اور بربادی کی دھمکی دی گئی ہے اور ان پر الزام لگایا گیا ہے کہ وہ سخت تجاوز کرنے والے گناہگار ہیں۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے اس اندھے پن اور پسماندگی کی اصل علت کیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن وہ کس انجام بد سے دوچار ہونے والے ہیں اور ان کے لیے سب سے بڑا عذاب یہ ہو گا کہ وہ اپنے رب کے دیدار سے محروم ہوں گے کیونکہ اس دنیا میں بدکاری نے ان کے قلوب کو ڈھانپ رکھا ہے اور ان لوگوں کو جہنم میں نہایت ذلت اور سرکوبی کی حالت میں رکھا جائے گا۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ (۷) وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سِجِّيْنٌ (۸) كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۹) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۱۰) الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (۱۱) وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (۱۲) اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۱۳) كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۱۴) كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (۱۵) ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ (۱۶) ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۱۷) (۸۳: ۷ تا ۱۷) "ہرگز نہیں، یقیناً بدکاروں کا نامہ اعمال قید خانے کے دفتر میں ہے۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ کیا ہے وہ قید خانے کا دفتر؟ وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے جو روز جزا کو جھٹلاتے ہیں اور اسے نہیں جھٹلاتا مگر ہر وہ شخص جو حد سے گزر جانے والا بدعمل ہے۔ اسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے "یہ تو اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں"۔ ہرگز نہیں، بلکہ دراصل ان لوگوں کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔ ہرگز نہیں، بالیقین اس روز یہ اپنے رب کی دید سے محروم رکھے جائیں گے، پھر یہ جہنم میں جا پڑیں گے، پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے"۔

اور تیسرے پیرے میں اسی کا صفحہ بالمقابل ہے۔ تصویر کا دوسرا رخ ہے اور یہ تصویر ابرار اور نیکوکاروں کی ہے۔ اور ان انعامات کی تصویر کشی ہے جو ان کے لیے طے شدہ ہیں۔ اور پھر قیامت کے دن ان کے چہروں پر جو تروتازگی ہو گی اس کی تصویر کشی بھی ہے۔ اور ان چشموں کی بات ہے جس سے وہ صاف و شفاف شراب پی رہے ہوں گے۔ ان تختوں کی تصویر کشی ہے، جن پر وہ ایک دوسرے کے بالمقابل بیٹھے ہوں گے۔ یہ نہایت ہی تروتازہ، نرم اور روشن تصویر ہے۔

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا عِلِّيُّوْنَ (۱۹) كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۲۰) يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ (۲۱) اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ (۲۲) عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ (۲۳) تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ (۲۴) يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ (۲۵) خِتٰمُهٗ مِسْكٌ وَفِيْ ذٰلِكَ

فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۲۶) وَ مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ (۲۷) عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا

الْمُقَرَّبُوْنَ (۲۸) (۸۳:۱۸ تا ۲۸) "ہرگز نہیں' بے شک نیک آدمیوں کا نامہ اعمال بلند پایہ لوگوں کے دفتر میں ہے۔ اور تمہیں کیا خبر کہ کیا ہے وہ بلند پایہ لوگوں کا دفتر؟ ایک لکھی ہوئی کتاب' جس کی نگہداشت مقرب فرشتے کرتے ہیں۔ بے شک نیک لوگ بڑے مزے میں ہوں گے' اونچی مسندوں پر بیٹھے نظارے کر رہے ہوں گے' ان کے چہروں پر تم خوشحالی کی رونق محسوس کرو گے۔ ان کو نفیس ترین سربند شراب پلائی جائے گی جس پر مشک کی مہر لگی ہو گی۔ جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہوں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔ اس شراب میں تسنیم کی آمیزش ہوگی' یہ ایک چشمہ ہے جس کے پانی کے ساتھ مقرب لوگ شراب پییں گے"۔

اب آخری پیرے میں ان مشکلات کو ریکارڈ کیا جاتا ہے جو اس باطل اور غفلت کی دنیا میں فساق و فجار کے ہاتھوں اہل حق برداشت کر رہے تھے۔ یہ فجار اہل حق کو ایذائیں دیتے تھے' ان کے ساتھ مذاق کرتے تھے' اور نہایت گستاخی سے پیش آئے تھے تاکہ بطور تقابل فساق اور فجار کے انجام لوگوں کے سامنے ہو اور حقیقی اور ابدی اور طویل زندگی پیش کی جا سکے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ (۲۹) وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ (۳۰) وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ (۳۱) وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ (۳۲) وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ (۳۳) فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ (۳۴) عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ (۳۵) هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۳۶) (۸۳:۲۹ تا ۳۶) "مجرم لوگ دنیا میں ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ جب ان کے پاس سے گزرتے تو آنکھیں مار مار کر ان کی طرف اشارے کرتے تھے' اپنے گھر والوں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے' اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے تھے کہ یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں' حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ آج ایمان لانے والے کفار پر ہنس رہے ہیں' مسندوں پر بیٹھے ہوئے ان کا حال دیکھ رہے ہیں' مل گیا نا کافروں کو ان حرکتوں کا ثواب جو وہ کیا کرتے تھے"۔

بہرحال یہ سورت ایک طرف دعوتی ماحول بتاتی ہے اور دوسری طرف یہ بتاتی ہے کہ ایک عملی معاشرے اور ماحول میں دعوت اسلامی کا اسلوب کیا ہوتا ہے اور کسی معاشرے کے نفسیاتی حالات کا مقابلہ کس طرح کیا جاتا ہے۔ سورت کی تفصیلی تشریح کے وقت ان باتوں پر تفصیل سے بحث ہوگی' ان شاء اللہ!

---ooo---

# درس نمبر ۲۸۳ تشریح آیات

## ۱--- تا--- ۳۶

آیاتها ۳۶ سُورَةُ الْمُطَفِّفِينَ (۸۳) مَكِّيَّةٌ (۸۶) رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝۲ وَاِذَا كَالُوْهُمْ
اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝۳ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝۴ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵
يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو اپنے زور سے پورا پورا لیتے ہیں' اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انہیں گھاٹا دیتے ہیں۔کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اس دن جبکہ سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے"۔

سورت کا آغاز ناپ تول میں ڈنڈی مارنے والوں پر تنقیدی حملے سے ہوتا ہے کہ ان ڈنڈی مارنے والوں (مطففین) کے لیے تباہی اور ہلاکت ہے۔یہاں بطور فیصلہ یہ بات جتائی جا رہی ہے کہ ان کی ہلاکت کا فیصلہ ہو چکا ہو یا یہ ان کے حق میں بد دعا ہو' مطلب دونوں کا ایک ہی ہے کیونکہ اللہ کی جانب سے بد دعا بھی ایک فیصلہ ہوتا ہے۔

اگلی دو آیات میں مطففین کی تعریف کی گئی ہے کہ مطفف' ڈنڈی مارنے والا کون ہوتا ہے۔

الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ (۲) وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (۳) (۸۳ : ۲ — ۳) "یہ وہ لوگ ہیں جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو گھاٹا دیتے ہیں"۔جب وہ مشتری ہوں تو بہت ہشیاری سے پورا پورا لیتے ہیں اور اگر بیچنے والے ہوں تو کم دیتے ہیں۔

اس مکی سورت میں اس اہمیت کے ساتھ ناپ تول میں کمی کے مسئلہ پر بحث تعجب خیز ہے اور ایک خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ مکی سورتوں میں بالعموم کلی اور اصولی عقائد اور نظریات سے بحث کی گئی ہے۔ مثلاً توحید کا ثبوت' اللہ کی بے قید مشیت' عام مخلوق اور پوری کائنات پر اللہ کا کنٹرول' وحی کی حقیقت اور نبوت کا منصب' آخرت کی حقیقت اور حساب و کتاب اور عمومی انداز میں اخلاقی احساسات پیدا کرنا' خصوصاً ایسے احساسات جن کا ان بنیادی عقائد و نظریات کے ساتھ خاص ربط اور تعلق ہو۔ رہی یہ بات کہ کسی اخلاقی مسئلہ پر خاص طور پر بحث کرنا تو یہ بات مکی سورتوں میں نہیں ہے مثلاً کم ناپنے اور کم تولنے کا مسئلہ' اور دوسری معاملاتی بے قاعدگیاں۔ یہ تمام امور مدنی سورتوں میں آئے جبکہ اسلامی نظام حکومت قائم ہو گیا تھا اور اس نے معاشی' معاشرتی اور سماجی مسائل کو حل کرنا شروع کیا تھا کیونکہ یہی انداز اسلامی منہاج کا عمومی انداز تھا۔

لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ بتایا جائے کہ اس عمومی قاعدے سے ہٹ کر قرآن نے اس مسئلے کو کیوں لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان چند اور مختصر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بعض وجوہات تھیں۔

ان آیات سے ایک بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب اسلام آیا تو مکہ میں ناپ تول میں کمی کا ایک ظالمانہ نظام ایک خوفناک شکل میں موجود تھا۔ مکہ کے کبراء یہ کام کرتے تھے۔ ان لوگوں کا پورے عرب بلکہ شرق و غرب کی تجارت پر قبضہ تھا۔ اور یہ اکابر وسیع کاروبار کے مالک تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ذخیرہ اندوزی کا جال پھیلا رکھا تھا۔ یہ لوگ گرمیوں اور سردیوں کے سفر شام اور یمن کے ساحل کی طرف کرتے تھے اور انہوں نے مختلف مواقع پر تجارتی میلے بھی منظم کر رکھے تھے۔ مثلاً حج کے موقعہ پر عکاظ کا بازار لگتا تھا جس میں وسیع تجارتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ادبی اور تاریخی سرگرمیاں بھی زوروں پر ہوتی تھیں۔ لوگ مفاخر اور اشعار بھی پڑھتے۔

آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہاں ان اکابر مجرمین کو سخت دھمکی دیتا ہے کہ تباہی تمہارے سر پر ہے۔ اسی طرح ان کے خلاف اعلان جنگ کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ برا کام کرنے والے لوگ اونچے طبقات کے لوگ تھے۔ اور ان کو ایسا معاشرتی مقام حاصل تھا کہ یہ لوگوں کو اس پر مجبور کرتے تھے کہ ان کو کم دیں۔ قرآن نے لفظ (یکتالو ن علی الناس ) استعمال کیا جس میں لفظ "علی" برتری کے مفہوم میں ہے یعنی اپنی اونچی پوزیشن کی وجہ سے لوگوں پر کم ناپ و تول ٹھونستے تھے اور جب ان سے وہ کچھ لیتے تھے تو جبراً زیادہ لیتے تھے۔ اگر وہ پورا لیتے تو یہ بات قابل اعتراض نہ ہوتی اور اس کا ذکر ہی نہ کیا جاتا۔ یعنی وہ جو چاہتے 'جبراً لے لیتے۔ اور جب لوگوں کو دیتے تو اپنی سیاسی اور سماجی پوزیشن کی وجہ سے کم دیتے۔ کیونکہ وہ لوگ اپنے حقوق پورے حاصل کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے اس لئے کہ ان کبراء کو سیاسی اور قبائلی برتری حاصل تھی اور معاشی برتری کی وجہ سے لوگ مجبور ہوتے تھے کہ ان کے اس ظلم پر راضی ہوں۔ یہ ذخیرہ اندوزی کرتے تھے اور پھر لوگوں کو مہنگا فروخت کر کے ان کو کم دیتے تھے۔ جیسا کہ آج کل کے تجارتی نظام کی خصوصیت ہے۔ غرض ایک واضح ظالمانہ نظام تطفیف مکہ میں کام کر رہا تھا' اس لیے اسے چیلنج کیا گیا۔

اس مکی معاشرہ میں دعوت اسلامی کے نہایت ہی ابتدائی ایام میں اس مسئلے کی طرف توجہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام کا مزاج کیا ہے' نیز اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین ایک مکمل نظام زندگی ہے اور زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے خواہ نظریاتی ہو یا عملی۔ اور اس نظام کی اٹھان گہرے اخلاقی اصولوں پر ہے جو اس نظام کے اندر نہایت ہی گہرائی

میں رکھے گئے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ان ابتدائی ایام ہی میں اس غلط روش کو ناپسند کیا کیونکہ باہم معاملات میں یہ کھلی بداخلاقی تھی ۔ حالانکہ اس دور میں اسلام کو اجتماعی قیادت اور اختیارات حاصل نہ تھے ' نہ حکومت تھی اور نہ اسلامی شریعت نافذ تھی ۔ لیکن اسلام نے اپنے مزاج کے عین مطابق اس برائی کے خلاف یہ آواز بلند کی ۔ اور اعلان کر دیا کہ ناپ تول میں ڈنڈی مارنے والوں کے لیے ہلاکت اور بربادی ہے ۔ جو لوگ یہ کام کرتے تھے وہ مکہ کے سردار ' برسر اقتدار اور بااختیار تھے ۔ ان کو لوگوں پر روحانی سیادت حاصل تھی ۔ اور یہ عقیدۂ شرک کے محافظ تھے اور ان کو مکہ میں معاشی برتری بھی حاصل تھی ۔ اسلام نے ان لوگوں کی قیادت و سیادت کے باوجود ان کے اس ظلم اور دھاندلی کے خلاف آواز بلند کی ۔ اور غریب عوام کے حق میں آواز بلند کی جن کا استحصال کیا جارہا تھا اور یہ استحصال وہ ان مذہبی خیالات کی بنا پر کر رہے تھے جو انہوں نے ان عوام کے ذہنوں پر بٹھا دیئے تھے ۔ اسلام نے جو آواز اٹھائی وہ اسلام کی فطری آواز تھی ۔ اسلامی نظام کے مزاج کے عین مطابق تھی ' اور یہ ایک ایسی آواز تھی جو سوئے ہوئے عوام کو جگا رہی تھی اور تحریک اسلامی نے یہ آواز اس وقت اٹھائی جب اس کے ماننے والے اس وقت مکہ میں مقہور و محصور تھے اور جن لوگوں کے خلاف یہ اٹھائی گئی وہ معاشرے پر چھائے ہوئے تھے اور ان کو معاشی ' دینی اور مالی برتری حاصل تھی ۔

اس سے ہمیں ایک نہایت ہی حقیقت پسندانہ سبب ملتا ہے ۔ اس بات کا کہ مشرکین مکہ اسلام اور دعوت اسلامی کے معاملے میں کیوں ایک ناقابل عبور رکاوٹ بن کر کھڑے ہوگئے تھے ۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ جانتے تھے کہ یہ نیا نظریہ جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش فرما رہے ہیں ۔ یہ فقط عقیدہ اور زبانی اقرار ہی نہیں ہے کہ اللہ ایک ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں ۔ اور بتوں اور مورتیوں کو چھوڑ کر فقط ایک خدا کی عبادت اور بندگی کرنا ہے ۔ ایسا نہ تھا بلکہ وہ جانتے تھے کہ یہ عقیدہ اور نظریہ جاہلیت کی تمام بنیادوں کو اکھاڑ کر پھینک رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے تمام مفادات بھی ختم ہو رہے ہیں اور اس عقیدے سے ان کی عزت ' مقام اور اقتدار کو سخت خطرہ لاحق ہے ۔ اس نظام کا مزاج ہی دوئی قبول نہیں کرتا ۔ یہ نظام ایسے سیکولر عناصر سے بھی نہیں ملتا جن کا ربط آسمانی ہدایات و تصورات سے نہ ہو ' اور یہ نظام اس تمام زمینی مواد کو ختم کرتا ہے جس کے اوپر جاہلیت کا نظام قائم ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مکہ نے اس نئے نظام کے خلاف جو کبھی لڑائی شروع کر دی اور یہ لڑائی نہ ہجرت سے قبل کے زمانے میں کبھی رکی اور نہ بعد کے زمانوں میں ' یہ کبھی ختم نہیں ہوئی ۔ یہ جنگ دراصل کلچر کی جنگ تھی ۔ یہ لوگ ' اسلامی کلچر کے خلاف برسرپیکار تھے ۔ یہ محض دینی نظریاتی جنگ نہ تھی ۔

جو لوگ اسلامی نظام کے اقتدار کی راہ روک رہے ہیں ۔ ان لوگوں نے ہر دور اور ہر مقام پر اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھا ہے ۔ انہوں نے اسلامی نظام کے غلبے کے نتائج کو اچھی طرح جانا ہے تب ہی تو انہوں نے اسلامی نظام کے غلبے کو روکنے کی کوشش کی ۔ یہ لوگ جانتے تھے اور ہیں کہ ان کے باطل طور طریقے اور ان کے جابرانہ مفادات اور خود ان کی کھوئی قوت اور ان کی بے راہ روی ' غرض یہ سب چیزیں اسلامی نظام کے غلبے کے نتیجے میں ختم ہونے والی ہیں کیونکہ یہ تو ایک سیدھا اور نہایت ہی شریفانہ نظام ہے ۔

دوسرے لوگوں کے مقابلے میں یہ باغی اور سرکش اور ڈنڈی مارنے والے ' خواہ اس ڈنڈی مارنے اور ظلم کی جو صورت بھی ہو ' مالی ظلم ہو یا دوسرے حقوق و فرائض میں ظلم ہو ' یہ باغی اور سرکش دوسرے لوگوں کے مقابلے میں

اسلامی نظام سے زیادہ خائف رہتے ہیں کیونکہ یہ نہایت منصفانہ اور پاک و صاف نظام ہے۔ یہ نظام انسانی حقوق پر کوئی سودابازی اور کوئی مداہنت قبول نہیں کرتا اور نہ نصفانصف اور کچھ لو اور کچھ دو کا فیصلہ کرتا ہے۔

ہجرت سے قبل جن لوگوں نے عقبہ ثانیہ کی بیعت کی تھی۔ انہوں نے اسی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ ابن اسحاق کہتے ہیں: "اور مجھے عاصم ابن عمر ابن قتادہ نے بتایا کہ جب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کے لیے جمع ہوئے تو اس موقعہ پر عباس ابن عبادہ ابن نضلہ انصاری' بنی سالم ابن عوف کے فرد نے کہا: "اے اہل خزرج' کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم اس شخص کے ساتھ کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟" تو انہوں نے کہا "ہاں ہم جانتے ہیں"۔ تو اس نے کہا "حقیقت یہ ہے کہ تم اور ہم اسود و احمر کے ساتھ لڑنے جارہے ہیں۔ اگر تمہاری رائے یہ ہے کہ جب ہمیں مالی تاوان لاحق ہو گا' اور ہمارے شرفاء قتل ہوں گے اور ہم پھر اس کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں گے تو ابھی سے اسے چھوڑ دو' اگر بعد میں تم اسے چھوڑو گے تو دنیا و آخرت میں تباہ ہو جاؤ گے اور اگر تم اس بات پر تل گئے ہو کہ مال لٹانا اور اشراف کا قتل ہونا ہمیں منظور ہے تو بیعت کر لو۔ خدا کی قسم' یہ دنیا و آخرت سے بہتر ہیں" تو بیعت کرنے والوں نے کہا کہ "ہم مال لٹانے اور اشراف کے قتل پر بھی اسے ہی قبول کرتے ہیں"۔ اس پر اس شخص نے کہا: "رسول خدا! اس پر ہمیں کیا اجر ملے گا۔ اگر ہم نے یہ عہد پورا کر دیا" تو آپ نے فرمایا "جنت"۔ تو انہوں نے کہا "لائیے ہاتھ" آپ نے بھی ہاتھ بڑھایا اور لوگوں نے بیعت کی۔

غرض بیت عقبہ کرنے والوں نے بھی اس دین کے مزاج کو سمجھ لیا تھا اور کبرائے قریش نے بھی سمجھ لیا تھا کہ یہ دین تلوار کی دھار کی طرح عدل و انصاف کے اصولوں پر سیدھا قائم ہے۔ یہ زیادتی اور سرکشی کسی طرح بھی برداشت نہیں کرتا۔ نہ حد سے تجاوز اور بغاوت کو برداشت کرتا ہے اور نہ کبر و غرور کو اور نہ یہ دین کے نام پر ظلم' زیادتی اور دھوکہ بازی اور استحصال کو برداشت کرتا ہے۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو سرکش ہو' باغی ہو' متکبر ہو' استحصالی ہو' وہ اس دین' اس کی دعوت اور اس کے داعیوں کا دشمن ہوتا ہے۔

اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ (٤) لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ (٥) يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (٦) (٨٣: ٤ تا ٦) "کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں۔ اس دن جبکہ سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے"۔ ان لوگوں کا معاملہ بہت عجیب ہے۔ صرف یہ یقین کہ ہم نے ایک دن رب العالمین کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور اس دن رب العالمین کے سوا اور کوئی مختار نہ ہو گا' اس کے سوا کوئی آقا نہ ہو گا۔ اور اس دن صرف اللہ کے فیصلے کا انتظار ہو گا۔ اور اللہ کے سوا کوئی ولی اور مددگار نہ ہو گا۔ غرض صرف یہ ایک عقیدہ ہی اس بات کے لیے کافی تھا کہ وہ ڈنڈی مارنے کی اس گھناؤنی حرکت سے باز آجاتے اور لوگوں کے مال باطل طریقے سے نہ کھاتے اور اپنے اقتدار کو بذریعہ ظلم نہ بناتے اور لوگوں کے حقوق پر ڈاکے نہ ڈالتے۔ لیکن وہ ڈنڈی مارنے کے عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں گویا کہ ان کو یقین ہی نہیں ہے کہ انہوں نے ایک دن اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے اور یہ ایک عجیب طرز عمل ہے۔

اس سورت کے پہلے پیراگراف میں ان لوگوں کو مطففین کہا گیا یعنی ڈنڈی مارنے والے جبکہ دوسرے پیرے میں

ان کو فجار کہا گیا ہے یعنی بدکار۔ یہاں ان کو بدکاروں کی صف میں شامل کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ان کے شب و روز کیا ہیں' اللہ کے نزدیک ان کا مقام کیا ہے؟ اس زندگی میں یہ کیسے ہیں اور آخرت میں وہ کیسے ہوں گے اور کس قسم کے حالات ان کے انتظار میں ہیں۔

كَلَّآ إِنَّ كِتَٰبَ ٱلْفُجَّارِ لَفِى سِجِّينٍ ﴿٧﴾ وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا سِجِّينٌ ﴿٨﴾
كِتَٰبٌ مَّرْقُومٌ ﴿٩﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿١٠﴾ ٱلَّذِينَ يُكَذِّبُونَ بِيَوْمِ
ٱلدِّينِ ﴿١١﴾ وَمَا يُكَذِّبُ بِهِۦٓ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ﴿١٢﴾ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ءَايَٰتُنَا
قَالَ أَسَٰطِيرُ ٱلْأَوَّلِينَ ﴿١٣﴾ كَلَّا ۖ بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ ﴿١٤﴾
كَلَّآ إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ﴿١٥﴾ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا۟
ٱلْجَحِيمِ ﴿١٦﴾ ثُمَّ يُقَالُ هَٰذَا ٱلَّذِى كُنتُم بِهِۦ تُكَذِّبُونَ ﴿١٧﴾

"ہرگز نہیں' یقیناً بدکاروں کا نامہ اعمال قید خانے کے دفتر میں ہے۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ کیا ہے وہ قید خانے کا دفتر؟ وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے جو روز جزا کو جھٹلاتے ہیں اور اسے نہیں جھٹلاتا مگر ہر وہ شخص جو حد سے گزر جانے والا بدعمل ہے۔ اسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے "یہ تو اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں"۔ ہرگز نہیں' بلکہ دراصل ان لوگوں کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔ ہرگز نہیں' بالیقین اس روز یہ اپنے رب کی دید سے محروم رکھے جائیں گے' پھر یہ جہنم میں جا پڑیں گے' پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے"۔

ان لوگوں کو یہ یقین نہیں ہے کہ یہ لوگ قیامت کے یوم عظیم میں اٹھائے جائیں گے۔ اسی لیے قرآن کریم نہایت سرزنش اور زجر و توبیخ کے انداز میں اس سے روکتا ہے اور نہایت تاکید کے ساتھ بتاتا ہے کہ ایک کتاب میں ان کے تمام اعمال ثبت کیے جا رہے ہیں۔ اور اس بات کو زیادہ تاکیدی بنانے کے لیے یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ کتاب کہاں رکھی ہوئی ہے اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ جب ان فساق و فجار کے سامنے' اس عظیم دن میں ان کی کتاب پیش کی جائے گی تو ان پر بڑی بربادی واقع ہوگی۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ (۷) وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سِجِّيْنٌ (۸) كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۹) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۱۰) (۸۳:۷ تا ۱۰) "ہرگز نہیں' یقیناً بدکاروں کا نامہ اعمال قید خانے کے دفتر میں ہے۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ کیا ہے وہ قید خانے کا دفتر؟ وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔

تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔ فجار ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اثم و معصیت میں حدوں سے گزر جائیں ' خود لفظ فجار کی صوتی لہروں میں یہ مفہوم پوشیدہ ہے۔ ان کی کتاب سے مراد ان کا اعمال نامہ ہے۔ اس کی ماہیت اور کیفیت کا علم انسانوں کو نہیں ہے۔ یہ غیبی امور میں سے ہے اور اس کے بارے میں ہم صرف اتنی بات کر سکتے ہیں جو مخبر صادق نے ہمیں اطلاع دی ہو۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ بدکاروں کے اعمال کا ایک دفتر ہے اور یہ سجین میں ہے۔ قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ وہ کسی بات کو خوفناک بنانے کے لیے ایک سوال کر دیتا ہے۔

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سِجِّيْنٌ (۸۳:۸) "تمہیں کیا معلوم کہ سجین کیا ہے؟" مقصد یہ تاثر دینا ہے کہ یہ معاملہ تمہارے حد ادراک سے آگے اور دور ہے اور بہت عظیم ہے اور تمہارے دائرہ ادراک سے بڑا ہے۔ لیکن قرآن بہرحال اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ

اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ (۸۳:۷) "فجار کا اعمال نامہ سجین میں ہے"۔ جو ایک متعین جگہ ہے۔ اگرچہ انسان کو معلوم نہیں ہے۔ اس طرح قارئین کو ایک یقینی اطلاع دی جا رہی ہے کہ یہ اعمال نامہ تیار اور موجود ہے اور یہی یہاں مقصود ہے۔

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۸۳:۹) "وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی"۔ اعمال نامہ کی تفصیلات کہ فجار کا یہ اعمال نامہ تیار شدہ ہے۔ اور اس میں کوئی کمی بیشی اب نہیں ہو سکتی۔ بس اس عظیم دن میں اسے کھولا جائے گا۔ اس لیے خیال کرو۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۸۳:۱۰) "اس دن مکذبین کے لیے بربادی ہے"۔ اور مکذبین کی تعریف بھی کر دی جاتی ہے۔

الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (۱۱) وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (۱۲) اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۱۳) (۸۳:۱۱ تا ۱۳) "اور اسے نہیں جھٹلاتا مگر ہر وہ شخص جو حد سے گزر جانے والا بدعمل ہے۔ اسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں"۔ یہ الزام وہ اس لیے دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں امم سابقہ کے قصے اور حالات برائے عبرت لائے گئے ہیں۔ اور ان کے ذریعہ اس کائنات میں چلنے والی سنت الہیہ کی نشاندہی کی گئی ہے اور یہ سنت ایک اٹل قانون کی طرح لوگوں کو گرفت میں لیتی ہے۔

اس دست درازی اور تکذیب کے بعد اب ایک سرزنش اور تنبیہہ آتی ہے اور یہ کلا سے شروع ہوتی ہے اور اس میں ان کی اس روش کی اصلی علت اور سبب بتایا جاتا ہے کہ وہ کیوں ظلم کرتے ہیں اور حق کو کیوں جھٹلاتے ہیں؟ یہ کہ وہ غافل ہو گئے ہیں اور ان کے دل مسخ ہو کر زنگ آلود ہو گئے ہیں۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۸۳: ۱۴) "ہرگز نہیں، دراصل ان لوگوں کے دلوں پر، ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے"۔ یعنی وہ جن گناہوں اور نافرمانیوں کا ارتکاب کرتے ہیں انہوں نے ان کے دلوں کو ڈھانپ لیا ہے۔ اور جب کوئی شخص معصیت کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا دل زنگ پکڑ کر سیاہ ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح اس پر ایک دبیز پردہ پڑ جاتا ہے اور یہ دل نور سے چھپ جاتا ہے اور اس کا احساس دھیرے دھیرے ختم ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ احساس ہی ختم ہو جاتا ہے۔

امام ترمذی اور نسائی نے محمد ابن عملان سے انہوں نے قعقاع سے انہوں نے ابو صالح سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو اس سے اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔ اب اگر وہ توبہ کرے تو وہ نقطہ صاف ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ پھر گناہ کرے تو یہ سیاہی بڑھ جاتی ہے" امام ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔ اور امام نسائی کے الفاظ یہ ہیں: "جب انسان کسی غلطی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔ اگر اس نے برائی سے ہاتھ کھینچ لیا، استغفار کیا اور توبہ کر لیا تو اس کا دل صیقل ہو جاتا ہے۔ اگر اس نے دوبارہ اس برائی کا ارتکاب کیا تو اس نقطے میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ سیاہی اس کے پورے دل پر چھا جاتی ہے۔ یہ ہے وہ زنگ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۸۳: ۱۴) "ہرگز نہیں بلکہ ان لوگوں کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے"۔

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں "یہ گناہ پر گناہ ہے، یہاں تک کہ دل اندھا ہو جاتا ہے اور پھر مرجاتا ہے"۔

یہ ہے تکذیب کرنے والوں کا حال اور یہ ہے ان کی تکذیب اور ان کے فسق و فجور کی علت۔ اب اس عظیم دن میں ان کے ہونے والے انجام کا تذکرہ ہوتا ہے۔ ان کا اس عظیم دن میں جو انجام ہو رہا ہے وہ ان کے فسق و فجور اور ان کی تکذیب کے حسب حال ہے۔

كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ (۱۵) ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ (۱۶)

ثُمَّ يُقَالُ هَٰذَا الَّذِي كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ (۱۷) (۸۳: ۱۵ تا ۱۷) "ہرگز نہیں، بالیقین اس روز یہ اپنے رب کی دید سے محروم رکھے جائیں گے، پھر یہ جہنم میں جا پڑیں گے، پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے"۔

فسق و فجور اور گناہوں نے ان کے دلوں کو ڈھانپ لیا تھا۔ دنیا میں ان کے دل رب تعالیٰ کے احساس سے دور ہو گئے تھے اور گناہوں نے ان کی زندگی کو بے نور اور تاریک کر دیا تھا، وہ زندگی میں ایسی روش رکھتے تھے جس طرح اندھے ہوں۔ اب آخرت میں ان کا انجام بھی طبعی ہے اور ان کے حسب حال ہے۔ آخرت میں وہ دیدار رب کی عظیم نعمت سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ایک عظیم محرومی ہوگی۔ قیامت میں یہ نعمت صرف اس شخص کو نصیب ہوگی جس کی روح صاف اور شفاف ہو چکی ہو اور اسکی اس صفائی کی وجہ سے اس کے اور رب کے درمیان سب پردے دور ہو جائیں گے۔

سورہ قیامت میں انہی لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے ۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ "کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے"۔ قیامت میں رب تعالیٰ سے حجاب ان کے لیے عذاب قیامت سے بھی بڑا عذاب ہو گا۔ تمام محرومیوں سے یہ بڑی محرومی ہوگی اور یہ کسی انسان کی انسانیت کا بدترین انجام ہو گا کہ اس کی انسانیت رب کریم کے ساتھ جا ملنے اور اس تک پہنچ جانے سے محروم رہے ۔کیونکہ جب کوئی رب کریم تک پہنچنے سے محروم ہو جائے تو وہ اپنے انسانی خصائص کھو بیٹھتا ہے ۔اور اس حد تک گر جاتا ہے کہ وہ اب جہنم کے لائق اور مستحق ہو جاتا ہے ۔

ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ (۸۳:۱۶) "پھر یہ جہنم میں پڑ جائیں گے"۔ لیکن اس جہنم رسیدگی کے ساتھ ساتھ وہاں ان کی سرزنش بھی ہوگی اور یہ اس عذاب سے بھی زیادہ کڑوی ہوگی ۔

ثُمَّ يُقَالُ هَٰذَا الَّذِي كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ (۸۳:۱۷) "پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے"۔

اب اس کے بعد صفحہ بالمقابل پیش کیا جاتا ہے ۔ قرآن کریم کا یہ مستقل انداز بیان ہے کہ وہ بالعموم اچھائی اور برائی دونوں کی تصویر کے دونوں رخ پیش کرتا ہے تاکہ حسن وقبح کے تقابل سے لوگ بات کو اچھی طرح سمجھیں اور حقیقت ان کے ذہن نشین ہو جائے اور اچھوں اور بروں دونوں کا انجام بھی سامنے آ جائے ۔

كَلَّآ إِنَّ كِتَٰبَ ٱلْأَبْرَارِ لَفِى عِلِّيِّينَ ﴿١٨﴾ وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا عِلِّيُّونَ ﴿١٩﴾ كِتَٰبٌ مَّرْقُومٌ ﴿٢٠﴾
يَشْهَدُهُ ٱلْمُقَرَّبُونَ ﴿٢١﴾ إِنَّ ٱلْأَبْرَارَ لَفِى نَعِيمٍ ﴿٢٢﴾ عَلَى ٱلْأَرَآئِكِ يَنظُرُونَ ﴿٢٣﴾
تَعْرِفُ فِى وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ ٱلنَّعِيمِ ﴿٢٤﴾ يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ ﴿٢٥﴾ خِتَٰمُهُۥ
مِسْكٌ ۚ وَفِى ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ ٱلْمُتَنَٰفِسُونَ ﴿٢٦﴾ وَمِزَاجُهُۥ مِن تَسْنِيمٍ ﴿٢٧﴾ عَيْنًا
يَشْرَبُ بِهَا ٱلْمُقَرَّبُونَ ﴿٢٨﴾

"ہرگز نہیں ، بے شک نیک آدمیوں کا نامہ اعمال بلند پایہ لوگوں کے دفتر میں ہے ۔ اور تمہیں کیا خبر کہ کیا ہے وہ بلند پایہ لوگوں کا دفتر؟ ایک لکھی ہوئی کتاب ،جس کی نگہداشت مقرب فرشتے کرتے ہیں ۔ بے شک نیک لوگ بڑے مزے میں ہوں گے ، اونچی مسندوں پر بیٹھے نظارے کر رہے ہوں گے ، ان کے چہروں پر تم خوشحالی کی رونق محسوس کرو گے ۔ ان کو نفیس ترین سربند شراب پلائی جائے گی جس پر مشک کی مہر لگی ہوگی ۔ جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہوں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں ۔ اس شراب میں تسنیم کی آمیزش ہوگی ، یہ ایک چشمہ ہے جس کے پانی کے ساتھ مقرب لوگ شراب پئیں گے"۔

اس پیراگراف کے آغاز میں لفظ کلا "ہرگز نہیں"۔ زجر و توبیخ اور سرزنش کے لیے آیا ہے اور یہ زجر اس سے ماقبل مذکور ہے ۔

ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُوْنَ (۸۳: ۱۷) "پھر ان سے کہا جائے گا یہ وہی ہے جس کی تم تکذیب کرتے تھے"۔ اس پر بطور نتیجہ کہا ' ہرگز نہیں ۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے بعد نیک لوگوں کا بیان شروع ہوتا ہے اور یہ مثبت اور تاکیدی انداز میں آتا ہے۔

جس طرح پہلے کہا گیا تھا کہ بدکاروں کا نامہ اعمال سجین میں ہے تو یہاں کہا جا رہا ہے کہ نیکو کاروں کا نامہ اعمال علیین میں ہے۔ اور ابرار "نیکوکار" وہ لوگ ہیں جو اطاعت کیش اور ہر نیک کام کرنے والے ہیں ۔ یہ نافرمانوں اور حد سے گزرنے والوں کے بالمقابل یہاں لائے گئے ہیں۔

لفظ علیین سے علو اور بلندی کا مفہوم ذہن میں آتا ہے' اور اس سے ہم یہ بات اخذ کر سکتے ہیں کہ سجین کے اندر انحطاط ' پستی اور گراوٹ کا مفہوم ہو گا۔ اور اس کے بعد سوال ایک خوفناک سوال آتا ہے جو بتاتا ہے کہ مخاطب کو معلوم نہیں ہے کہ علییون ہے کیا؟ مطلب یہ ہے کہ تم ان بلندیوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے ۔ یہ مقام تمہارے حد ادراک سے ماوراء ہے۔

اس اشاراتی فضا سے نکل کر اب روئے سخن نیکو کاروں کے اعمال نامے کی طرف مڑ جاتا ہے تو وہ کیا ہے۔

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۲۰) يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ (۸۳: ۲۱) "ایک لکھی ہوئی کتاب ہے جس کی نگہداشت مقرب فرشتے کرتے ہیں"۔ لکھی ہوئی (مرقوم) کے معنی ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ یہاں اس قدر اضافہ ہے کہ مقرب فرشتے اس کتاب کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس سے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ کتاب نہایت پاکیزہ' نہایت قابل قدر' نہایت بلند مرتبہ کتاب ہے جس پر اللہ کے مقرب فرشتے حاضر رہتے ہیں اور اس کتاب میں چونکہ نہایت اعلیٰ اخلاق اور اعمال کا ذکر ہے۔ اس لیے یہ ان مقرب فرشتوں کے لیے متاع حیات ہے اور وہ ایسا لکھیں گے اس کتاب کی اس فضا کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ یہ قابل قدر کتاب ہے۔

اس قابل قدر کتاب کے ذکر کے بعد اب خود ابرار کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس اچھے اعمال نامے کے مالک ہیں اور ان انعامات و اکرامات کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں وہ رہ رہے ہوں گے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ (۸۳: ۲۲) "بے شک نیک لوگ بڑے مزے میں ہوں گے"۔ یہ نعیم جحیم کے مقابلے میں ہے۔

عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ (۸۳: ۲۳) "اونچی مسندوں پر بیٹھے نظارے کر رہے ہوں گے"۔ یعنی نہایت ہی مکرم مقام پر ہوں گے۔ اور اس مقام پر یہ جہاں چاہیں گے 'سیر کرتے پھریں گے۔ ذلت و خواری کی وجہ سے ان کی نظریں سہمی ہوئی نہ ہوں گی۔ اور نہ تھک تھکا کر وہ آنکھیں بند کر لیں گے۔ یہ لوگ تختوں پر اور مسندوں پر بیٹھے ہوں گے اور نظارے کر رہے ہوں گے جس طرح حجلہ عروسی پہ لوگ بیٹھے ہوتے ہیں۔ عربوں کے نزدیک عیش و عشرت اور نعمت اور آرام کا یہ ارفع مقام ہوا کرتا تھا کہ کوئی حجلہ عروسی میں ہو' اور اونچی اونچی مسندوں پر آرام سے بیٹھا ہو کیونکہ بالعموم ایک عربی کی زندگی سخت مشقت کی زندگی ہوتی ہے۔ یہ تو دنیاوی زندگی کی ایک تمثیل ہے۔ آخرت میں جو صورت

ہوگی وہ ناقابل تصور حد تک ارفع و بلند ہوگی۔اور ان کے بلند سے بلند تصور سے بھی اعلیٰ و ارفع ہوگی۔اور زمین اور اس دنیا کے اونچے سے اونچے تصور اور تجربے سے بھی اونچی ہوگی۔

ان نعمتوں میں وہ جسمانی طور پر بھی نرم و نازک ہوں گے۔اور ان کی اسی نزاکت اور نرمی اور خوشی اور خوشحالی کے اثرات ان کے چہرے سے ظاہر ہوں گے۔اور ہر آدمی اس کا مشاہدہ کر رہا ہوگا۔

تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ (۸۳:۲۴) "ان کے چہروں پر تم خوشحالی کی رونق محسوس کروگے"۔

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ (۸۳:۲۵) خِتٰمُهٗ مِسْكٌ "ان کو نفیس ترین سربند شراب پلائی جائے گی جس پر مشک کی مہر لگی ہوں گی"۔رحیق ' خالص اور صاف شراب کو کہتے ہیں 'جس میں کوئی ملاوٹ نہ ہوگی اور نہ کوئی کدورت ہوگی۔شراب کی یہ صفت کہ وہ سربند ہوگی اور اس کی مہر مشک سے بنی ہوئی ہوگی۔یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ وہ برتنوں میں ہوگی اور یہ برتن سربند اور مہر زدہ ہوں گے اور پینے کے وقت ان کو کھولا جائے گا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت اہتمام اور صفائی سے اسے تیار کیا جائے گا اور مشک سے مہر کرنا' اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ صاف اور خوش ذائقہ ہوگی۔یہ وہ اوصاف ہیں جو ان اصطلاحات میں بتائے گئے ہیں جن کے ساتھ انسان اس دنیا میں مانوس ہے 'لیکن جب اہل ایمان جنت میں داخل ہوں گے تو ان کا ذوق اس دنیا کے ذوق سے آزاد ہوگا کیونکہ دنیا کا ذوق نہایت محدود ہے۔

شراب کے وصف کا اختتام جو ان دو آیات میں ہوتا ہے۔

وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ (۲۷) عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ (۸۳:۲۸) "اس شراب میں تسنیم کی آمیزش ہوگی 'یہ چشمہ ہے جس کے پانی کے ساتھ مقرب لوگ شراب پئیں گے"۔اس اختتام سے پہلے ہی' درمیان میں ایک اہم ہدایت دے دی جاتی ہے اور یہ ہدایت ہے۔

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳:۲۶) "جو لوگ ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں"۔یہ ایک گہرا اشارہ ہے اور اس کے اندر ایک جہان معانی پوشیدہ ہے۔

یہ ڈنڈی مارنے والے' جو لوگوں کے اموال باطل طریقے سے کھاتے ہیں' اور آخرت کا کوئی خیال نہیں رکھتے۔قیامت کے حساب و کتاب کی تکذیب کرتے ہیں' اور ان کی بدکاری اور معصیت اور ظلم کی وجہ سے ان کے دلوں پر سیاہی چھائی ہے۔یہ لوگ تو اس دنیا کے مال و متاع میں ایک دوسرے کے ساتھ تنافس کرتے ہیں' ان میں سے ہر شخص اس دنیا کے مال و متاع میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتا ہے' اور دنیا کو زیادہ سے زیادہ سمیٹنا چاہتا ہے۔اس لیے ظلم کرتا ہے اور فسق و فجور میں مبتلا ہے۔اور اس زوال پذیر سازوسامان کے لیے مرمٹ رہا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ

اس دنیا کا مال و منال اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس کے بارے میں کوئی مقابلہ ہو' مقابلہ اور بازی لے جانا اگر کوئی چاہتا بھی ہے تو چاہئے کہ وہ قیامت اور آخرت کے سازوسامان کے لیے کرے۔

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳:۲۶) "جو لوگ ایک دوسرے پر بازی لے جانا چاہتے ہیں' وہ اس اخروی چیز کو حاصل کرنے کے لیے بازی لے جائیں"۔ کیونکہ یہی تو مطلوب مومن ہے۔ یہی وہ نصب العین ہے جس کی طرف وہ دوڑیں اور یہی وہ ٹارگٹ ہے جس کی طرف وہ سب سے آگے بڑھیں۔

دنیا کا سازوسامان' جاہ و مرتبہ جس قدر عظیم کیوں نہ ہو' اعلیٰ و ارفع کیوں نہ ہو۔ آخرت کے سازوسامان کے مقابلے میں حقیر اور بے قیمت ہے۔ یہ پوری دنیا اللہ کے ہاں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی قیمت نہیں رکھتی۔ آخرت اللہ کے پیمانوں میں بھاری ہے۔ لہذا آخرت ہی ایک ایسی قیمتی حقیقت ہے جس کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے بازی لے جانا مناسب ہے نہ کہ دنیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ آخرت کے لیے مقابلہ کرنے والوں کی روحیں بہت بلند ہو جاتی ہیں جبکہ دنیا کے لیے مقابلہ کرنے والے باہم حسد و دشمنی کی وجہ سے گر جاتے ہیں۔ ان کی روح گر جاتی ہے اور جو لوگ آخرت کے لیے سعی اور مقابلہ کرتے ہیں اس کی وجہ سے یہ پوری دنیا بھی خیر و برکت سے معمور ہو جاتی ہے اور یہ سب کے لیے پاکیزہ جائے رہائش بن جاتی ہے۔ جبکہ مقابلہ اگر دنیاوی مقاصد کے لیے ہو تو بغض و عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو اس طرح نوچ کھاتے ہیں جس طرح حشرات الارض ایک دوسرے کو کھاتے ہیں اور نیک لوگوں کی زندگی تو اس ماحول میں سخت دشوار ہوتی ہے۔ ہر طرف سے ان کی ٹانگ کھینچی جاتی ہے اور ہر طرف سے ان کو نوچا جاتا ہے۔

یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ اگر ہم آخرت ہی کے لیے باہم مقابلہ اور مسابقت کریں تو یہ دنیا خراب اور برباد ہو جائے گی' جیسا کہ بعض دنیا پرستوں کا خیال ہے۔ اسلام کا تصور یہ ہے کہ دنیا آخرت کے لیے ایک کھیت ہے۔ یہاں فصل کی بوائی ہوگی اور آخرت میں فصل کاٹی جائے گی۔ اصلاح و تقویٰ کے ساتھ اسلامی نظام زندگی کے مطابق اس دنیا کو آباد کرنا اور ترقی دینا' اسلامی نظریہ خلافت ارضی کے مطابق ایک مومن کا مطلوب و مقصود ہے۔ اسلام اس دنیا کی ترقی کی راہ ہی سے آخرت کی ترقی کا قائل ہے۔ یہی اسلام کا نظریہ عبادت ہے کہ اس دنیا کی پوری زندگی میں اللہ کی اطاعت کرنا ہی انسان کا مقصد تخلیق ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (ذاریات : ۵٦) "اور میں نے جن و انس کو اس کے سوا کسی اور مقصد کے لیے نہیں پیدا کیا کہ وہ میری اطاعت کریں"۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے سورہ ذاریات 'پارہ ۲۷)

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳:۲۶) "جو لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں بازی لے جانا چاہتے ہیں وہ اس چیز میں باری لے جائیں"۔ یہ ایک ایسی ہدایت ہے جو اس دنیا کے لوگوں کی نظریں اس کم قیمت اور حقیر زمین سے بلند کر کے آخرت پر مرکوز کراتی ہے۔ جبکہ عملاً وہ اسی دنیا میں انسان کے منصب خلافت کو ادا کرتے ہوئے اس زمین کی تعمیر و ترقی میں بھی مصروف ہوتے ہیں۔ اس کی مثال یوں ہے کہ مسلمان اس دنیا میں پائی

جانے والی گندگی کی تطہیر میں بھی مصروف ہوتے ہیں اور اس گندگی سے دامن بھی بچاتے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کی زندگی بہت ہی مختصر ہے ۔ اور آخرت کے جہاں میں انسان کی عمر طویل ہے ۔ اور اس کی انتہا کا علم اللہ ہی کو ہے ۔ پھر اس دنیا کا سازو سامان بھی محدود ہے ۔ اور جنت کا سازو سامان اس قدر زیادہ اور لامحدود ہے کہ انسان کے حد ادراک سے ماوراء ہے ۔ اس دنیا میں سازو سامان اور عیش و آرام کی سطح بھی معلوم اور محدود ہے جبکہ آخرت کا عیش و آرام لامحدود ہے ۔ آخرت کا میدان بہت ہی وسیع اور دنیا کا میدان بہت ہی محدود ہے ۔ دونوں کے مقاصد میں بھی بہت بڑا فرق ہے ۔ دونوں کا نفع نقصان بھی بہت ہی مختلف ہے ۔ اس لیے مقابلہ بھی مختلف ہے ۔ اور حکم یہ ہے ۔ وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳ : ۲۶) "جو لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں بازی لے جانا چاہتے ہیں وہ اس چیز میں بازی لے جائیں" ۔ یہاں ابرار اور نیکو کاروں کے انعامات اخروی کی تفصیلات ذرا طویل ہوگئیں اور یہ اس لیے بیان کی گئیں کہ مکہ کی سوسائٹی میں وہ فجار اور فساق کے ہاتھوں ظلم و ستم کا شکار تھے ۔ ان کو اذیت دی جارہی تھی ' ان کے ساتھ مذاق کیا جارہا تھا ' اور ان پر زیادتیاں ہورہی تھیں ' اس لیے ان انعامات کی بھی تفصیلات دی گئیں جو ان کے لیے تیار رکھی ہیں ' اور مذاق کے بدلے پھر کافروں کے ساتھ بھی مذاق ہوگا ' اس وقت وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ ابرار کو وہ انعامات پورے کے پورے مل گئے ہیں ۔

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا
يَضْحَكُونَ ﴿٢٩﴾ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ﴿٣٠﴾ وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انْقَلَبُوا
فَكِهِينَ ﴿٣١﴾ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ﴿٣٢﴾ وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ
حَافِظِينَ ﴿٣٣﴾ فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ﴿٣٤﴾ عَلَى الْأَرَائِكِ ا
يَنْظُرُونَ ﴿٣٥﴾ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾ ع ٣٦

"مجرم لوگ دنیا میں ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے تھے ۔ جب ان کے پاس سے گزرتے تو آنکھیں مار مار کر ان ۸
کی طرف اشارے کرتے تھے ' اپنے گھر والوں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے ' اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے تھے کہ یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں ' حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے ۔ آج ایمان لانے والے کفار پر ہنس رہے ہیں ' مسندوں پر بیٹھے ہوئے ان کا حال دیکھ رہے ہیں ' مل گیا نا کافروں کو ان حرکتوں کا ثواب جو وہ کیا کرتے تھے" ۔

اہل ایمان کے ساتھ مجرموں کے استہزا کے مناظر ' ان کی جانب سے دست درازیوں اور زیادتیوں کے جو شاید قرآن نے یہاں قلم بند کیے ہیں خصوصاً ان کا یہ تبصرہ کہ مسلمان گمراہ لوگ ہیں ' یہ سب مناظر مکہ کی سوسائٹی کے عملی مناظر ہیں ' لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اقامت دین کی ہر کسی تحریک کے کارکن انہی حالات اور انہی ریمارکس سے دوچار ہوتے ہیں ۔ ہر دور اور ہر نسل میں یہی صورت حالات ہوا کرتی ہے ۔ آج ہم اپنے دور کے حالات کو جب دیکھتے ہیں تو یہ نظر آتا

ہے کہ شاید یہ آیات ابھی ہمارے حسب حال اتری ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فساق و فجار کا مزاج ایک جیسا ہوتا ہے اور اہل حق کے مقابلے میں ان کا موقف بھی ہمیشہ ایک ہی جیسا ہوتا ہے ۔ اس میں زمان و مکان کے فرق سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ (۸۳:۲۹) "مجرم لوگ دنیا میں ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے تھے" ۔ یہ ایسے ہی تھے 'اس "تھے" نے صدیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے ۔ اب یہ آخرت کی بات ہو رہی ہے ۔ یہ اپنی آنکھوں سے اہل جنت کی نعمتوں کو دیکھ رہے ہیں ۔ یہاں آخرت میں ان کو ذرا یاد دلایا جا رہا ہے کہ تم تو یہ رویہ رکھتے تھے ۔ یاد ہے نا۔

یہ اہل ایمان سے بطور مذاق ہنستے تھے کہ یہ ہیں مومن ۔ یہ ہیں "صالح" ۔ یہ ہیں "صالحین" ۔ یہ کیوں ہنستے تھے ۔ یا تو اس لیے کہ یہ لوگ غریب اور فقیر تھے اور بات انقلاب کی کرتے تھے اور پہنے ہوئے ہوتے تھے چیتھڑے ۔ یا اس لیے کہ ہر طرف سے ان پر مار پڑتی ہے ۔ جیلوں میں ہیں 'اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے ۔ یا اس لیے کہ یہ لوگ ان کی حماقتوں میں شریک نہ ہوتے تھے ۔ ان لوگوں کے ہاں یہ سب باتیں مضحکہ خیز تھیں ۔ چنانچہ وہ اہل ایمان پر طنز و تشنیع کے تیر برساتے تھے ۔ ان کو اذیت دیتے تھے ۔ ان پر تشدد کرتے تھے اور نہایت ہی رذالت اور گھٹیا انداز میں ان سے مذاق کرتے تھے ۔ اس بات کا اہل ایمان پر برا اثر ہوتا تھا ۔ اور ان کو تکلیف ہوتی تھی لیکن وہ صبر کرتے تھے ۔ بلند اخلاقی اختیار کرتے تھے اور نہایت شائستگی سے بات کو ٹال دیتے تھے ۔

وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ یَتَغَامَزُوْنَ (۸۳:۳۰) "جب ان کے پاس سے گزرتے 'تو آنکھیں مار مار کر ان کی طرف اشارہ کرتے تھے" ۔ یعنی وہ آنکھوں سے اشارے کرتے تھے یا ہاتھوں سے اشارے کرتے تھے یا کوئی ایسی حرکت کرتے تھے جو ان کے درمیان مذاق اڑانے کے لیے متعارف تھی ۔ یہ ایسی گری ہوئی حرکت ہوتی جس سے ان کی گستاخی اور بے ادبی کا اظہار ہوتا' یہ حرکت تہذیب کے دائرے سے نکلی ہوئی ہوتی' اور ایسی حرکات سے ان لوگوں کا مقصد یہ ہوتا کہ اہل اسلام کے دل ٹوٹ جائیں اور ان کو شرمندہ کیا جائے اور وہ اس تحریک کی کامیابی سے مایوس ہو جائیں 'اس لیے یہ لوگ اس طرح کے اشارے کرتے اور چھچھوری حرکات کرتے ۔

وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓی اَهْلِهِمُ (۸۳:۳۱) "اور جب وہ اپنے گھروں کی طرف پلٹتے" ۔ یعنی مومنین کو ایذائیں دے کر اور ان کا مذاق اڑا کر جب وہ تھک جاتے تو اپنے گھروں کی طرف انْقَلَبُوْا فَکِهِیْنَ (۸۳:۳۱) "تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے" ۔ وہ اپنی ان حرکات پر خوش ہوتے 'اور نہایت مزے سے اتراتے ہوئے جاتے 'اور اپنی ان گھٹیا حرکات اور شرارتوں پر ان کو سخت مسرت ہوتی ۔ حالانکہ اگر ان کا ضمیر زندہ ہوتا تو ان کو ملامت کرتا' اور ان کو اپنے ان افعال پر ندامت ہوتی 'ان کو بالکل احساس نہ ہوتا کہ وہ کس قدر حقیر حرکت کر رہے اور کس قدر گندا طرز عمل ہے ان کا ۔ قلب و نظر کے مسخ ہونے اور ضمیر کے مرجانے کی یہ آخری حد ہے ۔

وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْآ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ (۸۳: ۳۲) "اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے کہ یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں"۔ اور یہ تو نہایت ہی تعجب خیز بات ہے کہ اب یہ لوگ ہدایت و ضلالت کے موضوع پر بات کرنے لگے ہیں اور بزعم خود یہ اہل حق اور اہل ہدایت کو اہل ضلالت اور گمراہ کہتے ہیں' اور نہایت وثوق اور تحقیر آمیز طریقے سے یہ تبصرہ کرتے ہیں۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ (۸۳: ۳۲) "کہ یہ لوگ بہکے ہوئے ہیں"۔

فسق و فجور کا یہ مزاج ہے کہ وہ ایک حد پر نہیں رکتا' وہ کسی بات سے نہیں شرماتا' کسی فعل پر نادم نہیں ہوتا۔ ان فساق و فجار کی طرف سے اہل ایمان جیسے معیاری لوگوں پر یہ الزام لگانا کہ وہ بہکے ہوئے ہیں' اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ فساق و فجار کسی حد پر جاکر نہیں رکتے اور بے حیا ہوتے ہیں۔

قرآن کریم اہل ایمان کی جانب سے نہ مناظرہ کرتا ہے اور نہ مجادلہ۔ نہ وہ اس افترا کی تردید کرتا ہے کیونکہ یہ ایک ایسی ناسقانہ گھٹیا بات ہے جس کی طرف سنجیدہ التفات کی ضرورت ہی نہیں ہے لیکن قرآن کریم ان لوگوں کے ساتھ ایک سنجیدہ مذاق ضرور کرتا ہے جو ایک ایسے معاملے مین ٹانگ اڑاتے ہیں جس کے ساتھ ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ان کا ہدایت و ضلالت سے کیا کام ہے۔ اور مسلمانوں کی نگرانی پر ان کو کس نے مامور کیا۔

وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ (۸۳: ۳۳) "حالانکہ وہ ان پر نگران بناکر نہیں بھیجے گئے"۔ نہ مسلمانوں کے امور ان کے سپرد کیے گئے ہیں' نہ یہ ان پر قیم ہیں' نہ اہل ایمان کے حالات و کوائف ان سے پوچھے گئے ہیں' لہٰذا ان کی جانب سے مسلمانوں پر یہ تبصرہ ایک بے تکی بات ہے۔

دنیا میں مجرمین اہل ایمان کے ساتھ جو برتاؤ کرتے تھے' اس کا منظر اب یہاں اس سنجیدہ مذاق کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے اور اب قیامت کے دن کا حاضر منظر پیش کیا جاتا ہے کہ دیکھو اب جنت میں یہ اہل ایمان کس مزے میں ہیں۔

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ (۳٤) عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ

(۸۳: ۳۵) "آج ایمان لانے والے کفار پر ہنس رہے ہیں' مسندوں پر بیٹھے ہوئے ان کا حال دیکھ رہے ہیں"۔ آج کا دن ایسا ہے کہ کفار دیدار ربانی جیسی نعمت سے محروم اور محجوب ہیں۔ اور اس محرومیت کا ان کو بے حد غم ہے' اس کی وجہ سے ان کی انسانیت گر گئی اور وہ واصل جہنم ہو گئے اور اس جہنم رسیدگی پر مزید یہ کہ ان کی اہانت بھی ہو گی اور سرزنش بھی ہو گی۔

هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۸۳: ۱۷) "وہ یہی ہے ناوہ چیز جس کی تم تکذیب کرتے تھے؟" آج کا دن تو یوں ہے کہ اہل ایمان اونچی اونچی مسندوں پر بیٹھے ہیں اور کفار کے حالات کا نظارہ کر رہے ہیں اور دائمی نعمتوں میں مزے لے رہے ہیں' سربند خالص اور صاف شراب سے ان کی تواضع ہو رہی ہے اور اس سربند شراب پر مہر اور سیل مشک کی ہو گی اور اس کے اندر چشمہ تسنیم کے خوش ذائقہ پانی کا امتزاج ہو گا اور آج کفار کے حالات کو دیکھ کر

اہل ایمان مسکرائیں گے ۔

ایک بار پھر قرآن نہایت سنجیدہ مزاح کرتا ہے ۔

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (۸۳: ۳۶) "مل گیا نا کافروں کو ان کی حرکتوں کا ثواب' جو وہ کیا کرتے تھے" ۔ ہاں کیا ان کو بدلہ مل گیا؟ وہ جو کچھ کرتے تھے اس کا ثواب مل گیا؟ ان کو ثواب تو نہ ملا تھا ۔ لفظ ثواب کا مفہوم تو حسن جزا ہے اور ان کو ہم ابھی جہنم میں چھوڑ کر آئے ہیں' اور انہوں نے اپنے کیے کی سزا پالی ہے ۔ تو یہ سزا گویا ان کے لیے ثواب ہے ۔ لفظ ثوب استعمال کر کے قرآن کریم نے ان کے ساتھ ایسا مذاق کیا جس کی چبھن وہ دل کی گہرائی میں محسوس کرتے ہیں ۔

اب ہم اس منظر کے سامنے قدرے کھڑے ہوتے ہیں' جس کے مناظر حرکت سے بھرپور ہیں ۔ یہ ان لوگوں کا منظر ہے جنہوں نے اس دنیا میں مسلمانوں اور تحریک اسلامی کے خلاف جرائم کا ارتکاب کیا تھا ۔ اس سے قبل ابرار اور نیک لوگوں کی جزا کے بیان میں قرآن کریم نے قدرے طوالت سے کام لیا تھا' اور ان کی عیش و عشرت کے مناظر میں طوالت سے کام لیا تھا ۔ یہ طویل بیان اور تفصیلات تاثیر کے لحاظ سے اعلیٰ خوبیوں کا مالک تھا' اور شعوری اور نفسیاتی لحاظ سے مکہ کے مشکل حالات میں کام کرنے والے مسلمانوں کے لیے بہترین تسلی تھی ۔ مکہ میں یہ مٹھی بھر مسلمان سخت مشکلات سے دوچار تھے ۔ ان کو اذیت دی جا رہی تھی اور ان پر قسم قسم کے تشدد ہو رہے تھے اور ان باتوں کا ان پر بہرحال گہرا اثر ہوتا تھا ۔ ان کو ضرورت تھی کہ ان کی ڈھارس بندھائی جائے اور ان کے حوصلوں کو بلند رکھا جائے اور ان کی مدد کی جائے ۔

مشرکین کی طرف سے مسلمانوں کو جو اذیت دی جا رہی تھی ۔ اس کی یہ تفصیلات مسلمانوں کے لیے اہم تھی ۔ ایک گونہ تسلی تھی کہ ان کا رب بہرحال دیکھ رہا ہے اور وہ ان تکالیف کو یونہی نہ چھوڑ دے گا ۔ اگرچہ وقتی طور پر کافروں کو مہلت دی جا رہی تھی اور یہ تصور کہ اللہ دیکھ رہا ہے ۔ اہل ایمان کے دلوں کی تسلی کے لیے کافی تھا' اس سے اہل ایمان کے زخم مندمل ہو جاتے تھے کہ اللہ دیکھ رہا ہے کہ اہل ایمان کے ساتھ مزاح کرنے والے کس طرح مزاح کر رہے ہیں اور اہل مکہ ان کو کیا کیا اذیتیں دے رہے ہیں ۔ اور ان کے آلام اور ان کی تکالیف سے کس طرح وہ لطف اندوز ہو رہے ہیں ۔ یہ کمینے کس طرح گھٹیا پن کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور ان کو کوئی شرم بھی نہیں آتی لیکن اہل ایمان کا رب یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور قرآن میں اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ریکارڈ کر رہا ہے ۔ اس لیے کہ یہ صورت حالات اللہ کے ہاں اس قابل ہے کہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ریکارڈ کر دیا جائے ۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اہل ایمان کے دلوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا تو ان کے تمام غم اور آلام دور ہو گئے ۔ تمام رنج و الم ختم ہو گئے ۔

پھر ان کا رب ان مجرموں کے ساتھ ایک سنجیدہ مذاق کرتا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ جری مجرم اس مزاح کو محسوس نہ کریں کیونکہ ان کو فطرت مسخ ہو چکی ہے اور ان کے قلوب ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے زنگ آلود ہو چکے ہیں بلکہ سیاہ ہو چکے ہیں لیکن اہل ایمان کے حساس دل اور خوف خدا سے کانپنے والے دل' اس مزاح کو اہمیت دیتے ہیں اور اس کی قدر کرتے ہیں اور یہ ان کے دکھوں اور دردوں کے لیے سکون بخش دوا ہے اور اس سے ان کو خوشی ہوتی ہے ۔

یہ مومن اس بات کو بھی اہمیت دیتے ہیں کہ ان کے رب کے ہاں ان کا ایک مقام ہے ۔ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ

جنتوں میں ان کے لیے نعمتیں ہیں اور عالم بالا میں' درگاہ الٰہی میں ان کے لیے بلند مرتبہ و مقام ہے اور عزت ہے۔ پھر وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان کے دشمنوں کا آخرت میں کیا حال ہے؟ اور اللہ کے ہاں وہ ذلیل و خوار ہیں۔ بے وقعت ہیں اور ان مناظر قیامت میں ان کے لیے کیسا توہین آمیز عذاب ہے۔ یہ مناظر وہ دیکھتے ہیں اور ان سے وہ یہ یقین حاصل کرتے ہیں کہ قیامت میں ان کی حالت کیا ہوگی۔ اس وقت مسلمان قلیل تھے' ان پر تشدد ہو رہا تھا' وہ کمزور تھے' ان کے ساتھ مزاح ہو رہا تھا اور وہ قلت تعداد کی وجہ سے اور کمزوری کے سبب ہر قسم کے مصائب جھیل رہے تھے' چنانچہ ان مناظر کے تاثرات اور یقین سے ان کی یہ تمام تلخیاں کم ہو جاتی تھیں اور دکھ اور درد کم ہو جاتے تھے۔ ان حالات اور مناظر اور ان کے نتیجے میں حاصل ہونے والے یقین کی وجہ سے بعض اہل ایمان ان تلخیوں میں بھی شیرینی محسوس کرتے اور وہ محسوس کرتے تھے کہ ان کو وہ دنیا ہی میں حقیقتاً دیکھ رہے ہیں' جن کا ان آیات میں ذکر ہے۔

لیکن سیرت صحابہؓ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ جس قدر اذیتیں جھیل رہے تھے اور جس قدر مجرمین ان پر تشدد کر رہے تھے اور ان کے ساتھ گھٹیا مزاح کرتے تھے ان سب مشکلات کو وہ صرف ایک ہی نصب العین کے لیے برداشت کر رہے تھے کہ ان کو جنت ملے گی اور ان کے مخالف کافروں کو جہنم ملے گی۔ اور اس دنیا میں ان دو گروہوں کے جو حالات ہیں وہ آخرت میں یکسر بدل جائیں گے۔ یہی وہ بات ہے جس کا اہل ایمان کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ فرمایا تھا' جنہوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور جس راہ میں وہ اپنے مال اور اپنی جان کھپا رہے تھے۔

رہی یہ بات کہ اس دنیا میں بھی تمہیں غلبہ نصیب ہوگا۔ اور تم ملکوں کو فتح کر لوگے تو اس کا تذکرہ قرآن مجید میں مکی دور میں بہت ہی کم ملتا ہے۔ یعنی اس غرض کے لیے کہ اہل ایمان کو اس سے تسلی دی جائے اور ان کے حوصلے بڑھانے چاہئیں۔

اصل بات یہ ہے کہ مکہ میں قرآن مجید ایسے افراد تیار کر رہا تھا جو وہ اس امانت اور اس نظریہ کی ذمہ داریوں کے اٹھانے کے قابل ہو جائیں اور یہ افراد اس قدر مضبوط' اس قدر قوی' اس قدر مخلص اور اس قدر باکردار ہوں کہ وہ اس دنیا کے تمام مفادات کو اس راہ میں قربان کر دیں۔ اور ان کے پیش نظر صرف آخرت کی کامیابی ہو اور صرف اللہ کی رضامندی کے وہ طالب ہوں ایسے لوگ جو اس دنیا میں گزرنے والی پوری زندگی کو مصیبت اور مشقت میں کاٹنے کے لیے تیار ہوں۔ تشدد اور ظلم برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں' ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے آمادہ ہوں اور اس جہاں میں وہ کسی اجر کے طالب نہ ہوں یہاں تک کہ وہ اس جہاں میں اسلامی انقلاب اور اسلام کے غلبے کے طلبگار بھی نہ ہوں' اور ان کے دلوں میں یہ خواہش بھی نہ ہو کہ وہ برسراقتدار آجائیں' قرآن کے پیش نظر ایک ایسی مخلص جماعت کی تیاری تھی۔

اور جب ایک ایسی جماعت تیار ہوگئی جس کے پیش نظر اس دنیا کے مختصر سفر کے اغراض و مقاصد میں سے کوئی مقصد نہ تھا' الا یہ کہ کوئی بات بغیر خواہش کے مل جائے اور ان کا نصب العین صرف جزائے اخروی کا حصول تھا' اور جن کا عقیدہ یہ تھا کہ حق و باطل کا اصل فیصلہ آخرت میں ہوگا' جب ایسی جماعت تیار ہوگئی اور اللہ نے جان لیا کہ یہ جماعت سچی ہے اور اس کی نیت خالص ہے اور اس نے جس مقصد کے لیے بیعت کی تھی' اسے سچ کر دکھایا تو پھر اس دنیا میں بھی اس کی نصرت کے لیے اللہ کی مدد آگئی۔ اور یہ نصرت بھی اس لیے آئی تاکہ وہ دعوت اسلامی کی امانت کا حق ادا کرے' اسلامی نظام حیات کا حق ادا کرے' نہ ایسی جماعت کے ساتھ دنیا کے مفادات کا کوئی وعدہ کیا گیا تھا اور نہ اس جماعت کے دل میں دنیاوی مفاد کا کوئی تقاضا تھا کہ اسے یہ دیا جائے یا وہ' یہ جماعت اس قدر مخلص ہوگئی تھی کہ اس کے پیش نظر

رضائے الٰہی کے سوا کوئی اور مقصد نہ تھا۔

جن آیات میں اس کرۂ ارض پر کامیابیوں کا ذکر ہے ۔یہ سب مدنی آیات ہیں اور مدنی حالات اس وقت پیدا ہوئے جب اہل ایمان کے دلوں میں ایسے حالات کی کوئی خواہش ہی نہ تھی نہ وہ ان کا انتظار کرتے تھے ۔ یہ نصرت اس وقت آئی جب اللہ کی مشیت کا یہ تقاضا ہوا کہ اسلامی نظام حیات ایک عملی شکل میں دنیا اور زمین پر قائم ہو جائے اور اس وقت کے لوگ اور آنے والے لوگ عملاً اسلام کو دیکھ لیں ۔ یہ نصرت اہل ایمان کی مشکلات ' مشقتوں اور اذیتوں اور قربانیوں پر بطور جزانہ تھی ۔بس یہ اللہ کا ایک فیصلہ تھا اور اس کی حکمت کو اب ہم سمجھنے کی سعی کر رہے ہیں ۔ (۱)

---○○○---

(۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سید قطب کے سامنے سید مودودی رحمتہ اللہ علیہ کا لٹریچر تھا ' اور ان کی یہ رائے مولانا ابو الحسن علی ندوی کے تبلیغی افکار پر مبنی ہے ۔ تبلیغی حضرات یہی انداز رکھتے ہیں ۔ فی ظلال القرآن کا پہلا ایڈیشن چار جلدوں میں تھا ۔جب انہوں نے اس پر نظر ثانی کی تو آٹھ جلدوں میں مفصل ایڈیشن شائع ہوا ۔یہ ۶۷ ۔ ۱۹۶۶ ء کا ایڈیشن تھا ۔نظر ثانی شدہ ایڈیشن میں سید قطب صاحب نے سید مودودی کے افکار کو سمیٹا ہے اور مفصل حوالے بھی دیئے ہیں ۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر کیا مکمل اسلامی انقلاب نظریہ تھا یا نہیں ' اس کی تفصیلات دیکھئے میری کتاب "قرآن سیرت اور انقلاب" جو قرآن مجید کا خلاصہ ہے اور ۱۱۴ سورتوں کا خلاصہ ترتیب نزولی کے مطابق ہے اور اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو بھی نہایت ہی اختصار کے ساتھ لیا گیا ہے ۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ جب صرف تین افراد مسلمان تھے ' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ اور حضرت علیؓ تو اس وقت بھی حضورؐ نے قیصرو کسریٰ کو فتح کرنے کی بات کی تھی ۔ (شیرازی)

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ الانشقاق ـ ۸۴

## ۱-- تا-- ۲۵

# سورۃ الانشقاق ایک نظر میں

اس سورت کا آغاز بعض کائناتی انقلابات کے مظاہر و مناظر سے ہوتا ہے ۔ پہلے سورہ تکویر' پھر سورہ انفطار میں.اور ان سے قبل سورہ النبا میں ان مشاہد کی تفصیلات دی گئی ہیں' لیکن یہ ان مناظر کا ایک خاص انداز ہے ۔ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ تمام واقعات دراصل اطاعت حکم ربی میں ہو رہے ہیں ۔ یہ زمین اور یہ آسمان دراصل رب تعالیٰ کے احکام کے مطیع ہیں اور نہایت خضوع و خشوع سے اللہ کی اطاعت کرتے ہیں اور یہ اطاعت نہایت ہی خضوع اور فرمانبرداری کے ساتھ ہوتی ہے ۔ اور بڑی سہولت سے ہوتی ہے ۔

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (١) وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (٢) وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ (٣) وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ (٤) وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (٥) (٨٤: ١ تا ٥) "جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے گا اور اس کے لیے حق یہی ہے (کہ اپنے رب کے حکم مانے) ۔ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی اور جو کچھ اس کے اندر ہے اسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کے لیے حق یہی ہے (کہ اس کی تعمیل کرے)" ۔

خود سپردگی سے بھرپور یہ پیراگراف دراصل تمہید تھا انسان کے خطاب کے لیے تاکہ یہ کائناتی خضوع و خشوع اس کے دل میں اتار دیا جائے اور اس کو اللہ کے احکام یاد دلائے جائیں اور یہ بتایا جائے کہ اللہ کے ہاں تمہارا انجام کیا ہو گا ۔ یہ خضوع اور اطاعت انسان کے دل میں اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ آسمان و زمین اور یہ پوری کائنات اس عظیم منظر میں اللہ کی مطیع ہے ۔

يٰاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ (٦) فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ (٧) فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا (٨) وَّيَنْقَلِبُ اِلٰى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا (٩) وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ (١٠) فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا (١١) وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا (١٢) اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا (١٣) اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ (١٤) بَلٰٓى اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا (١٥) (٨٤: ٦ تا ١٥) "اے انسان' تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا

جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے' پھر جس کا نامہ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا گیا' اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا اور وہ اپنے لوگوں کی طرف خوش خوش پلٹے گا۔ رہا وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا تو وہ موت کو پکارے گا اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا۔ وہ اپنے گھر والوں میں مگن تھا۔ اس نے سمجھا تھا کہ اسے کبھی پلٹنا نہیں ہے۔ پلٹنا کیسے نہ تھا' اس کا رب اس کے کرتوت دیکھ رہا تھا"۔

تیسرے پیراگراف میں اس کائنات کے ان مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے جو انسان کے مشاہدے میں ہیں اور جو یہ بات بتلاتے ہیں کہ اس کائنات کے نظام میں نہایت گہری منصوبہ بندی ہے اور انسان ایسے حالات میں زندگی کے شب و روز گزار رہے ہیں جو ایک اسکیم کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں' اور زندگی کا یہ نشیب و فراز انہوں نے دیکھنا ہے اور جو مشکلات بھی پیش آئیں انہیں برداشت کرنا ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ (١٦) وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ (١٧) وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ (١٨)

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (١٩) (٨٤: ١٦ تا ١٩) "پس نہیں' میں قسم کھاتا ہوں شفق کی' اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے' اور چاند کی جب کہ وہ ماہ کامل ہو جاتا ہے' تم کو ضرور درجہ بدرجہ ایک مشکل حالت سے دوسری حالت کی طرف گزرتے چلے جانا ہے"۔

اب سورت کا آخری پیراگراف آتا ہے' اس میں ان لوگوں کے حالات پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے جو دعوت اسلامی کو قبول نہیں کرتے۔ اور یہ ہے انسانیت کی حقیقت اور یہ ہے اس کا انجام جو آغاز سورت میں بتایا گیا۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (٢٠) وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ (٨٤: ٢١)

السجدة "پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے اور جب قرآن ان کے سامنے پڑھا جائے تو سجدہ نہیں کرتے"۔ اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنے اندرون میں جو کچھ رکھتے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ لہٰذا ان کا انجام متعین اور معلوم ہے۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ (٢٢) وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ (٢٣) فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (٢٤) اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (٢٥)

(٨٤: ٢٢ تا ٢٥) "بلکہ یہ منکرین تو الٹا جھٹلاتے ہیں' حالانکہ جو کچھ یہ (اپنے نامہ اعمال میں) جمع کر رہے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ لہٰذا ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ البتہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں' ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے"۔

اس سورت کا انداز دھیما اور اس کے معانی جلیل القدر ہیں۔ اس کائنات کے انقلاب کے مناظر بھی دھیمے انداز میں

پیش کیے گئے ہیں جبکہ اس سے قبل سورت تکویر میں ایسے ہی انقلابی مناظر کا انداز طوفانی تھا۔ غرض اس سورت کا لہجہ ایسا ہے جس طرح ایک رحیم و شفیق استاد نہایت آرام اور سہولت سے اپنے زیر تربیت افراد کو قدم بقدم پڑھاتا ہے اور نہایت نرم اور گہری تلقین کے ساتھ ' ذرا دیکھئے خطاب کس قدر ہمدردانہ ہے ' اے انسان! انسان کی انسانیت کو ابھارا جاتا ہے۔ اس میں نصیحت بھی ہے اور ضمیر کی بیداری بھی۔

اس سورت میں اسی دھیمے انداز میں پیراگراف مرتب کیے گئے ہیں ' جو انسان کے دل و دماغ کو اس کائنات کی وسیع وادیوں ' انسانیت کے مختلف میدانوں میں یکے بعد دیگرے سیر کراتے چلے جاتے ہیں ' انسان ایک ایسے کائناتی منظر کی سیر کرتا ہے جس میں ہر چیز قانون قدرت کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔ پھر انسانی قلب کی وادی میں اور پھر قیامت کے منظر جزاء و سزا کے میدان میں اور پھر وہاں سے واپس کائنات کے موجود اور حاضر مناظر و مشاہد میں ' اور پھر انسان کے عقل و خرد کی وادی میں پھر اس بات کا اظہار کرتے ہوئے کہ انسان کا یہ طرز عمل کس قدر عجیب ہے کہ ان مشاہد کو دیکھتے ہوئے بھی وہ ایمان نہیں لاتا۔ اور پھر یہ دھمکی کہ اگر اسی طرح انکار کرتے رہے تو عذاب الیم سے دوچار ہوں گے اور اگر ایمان لے آئے تو تمہارے لیے غیر منقطع اجر ہو گا۔

یہ سب مناظر اور مشاہد ' یہ سب اشارات و تاثرات ' اور یہ ملکوتی سیر ایک نہایت ہی مختصر سورت میں سمو دیئے گئے ہیں ' جس کا طول و عرض چند سطروں تک محدود ہے۔ یہ کام صرف قرآن کا خاصہ ہے۔ کسی دوسری کتاب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ اس قدر عظیم معانی اور مقاصد ہیں کہ ایک طویل کتاب میں بھی ان کو کماحقہ بیان نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کو اس قدر زوردار انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ قرآن ہے اور اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ لوگوں کے لیے آسان ترین طریقے سے ہدایت فراہم کی جائے۔ دلوں کو براہ راست خطاب کرے ' ایسی راہوں سے دلوں تک ہدایات پہنچائے جو قریب ترین ہوں۔ یہ ہے انداز اور رنگ علیم و خبیر کے اسلوب بیان کا۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۸۴ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۲۵

آیاتہا ۲۵ سُورَةُ الانْشِقَاقِ (۸۴) مَكِّيَّةٌ (۸۳) رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴿۱﴾ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ﴿۲﴾ وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ﴿۳﴾ وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ ﴿۴﴾ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے گا اور اس کے لیے حق یہی ہے (کہ اپنے رب کے حکم مانے)۔ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی اور جو کچھ اس کے اندر ہے اسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کے لیے حق یہی ہے (کہ اس کی تعمیل کرے)“۔

گزشتہ سورت میں ہم نے آسمان کے پھٹنے کی تشریح کی ہے۔ یہاں جو بات اضافی آئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کام اللہ کی اطاعت میں ہو گا۔ اور یہ کہ وہ اس بات کا ذمہ دار اور مستحق ہے کہ ایسا کرے اور اللہ کے اس حق کو ادا کرے کیونکہ اللہ کا حق ہے کہ اس کے احکام کی اطاعت کی جائے۔

وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ (۸۴ : ۲) ”اور اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے گا اور اس کے لیے حق یہی ہے“۔ کہ اپنے رب کے احکام کی تعمیل کرے۔ آسمان کی طرف سے ”اذن“ یعنی اعلان یا اجازت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ پھٹنے میں اللہ کے حکم کی تعمیل کرے گا اور حقت کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اوپر اللہ کا یہ حق واقع ہو گیا۔ اور اس نے اس بات کا اعتراف کر لیا کہ اس پر اللہ کا یہ حق ہے اور یہ بھی ایک طرح کا اظہار ہے۔ تسلیم اور اطاعت کا کہ یہ اللہ کا مسلمہ حق ہے آسمان پر۔

وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ (۸۴ : ۳) ”اور جب زمین پھیلا دی جائے گی“۔ یہ بھی ایک جدید منظر اور مفہوم ہے۔ زمین کے پھیلنے اور اس کی لمبائی کا مفہوم کیا ہے؟ یعنی وہ قوانین قدرت معطل ہو جائیں گے جو اس زمین کو

کنٹرول کرتے ہیں اور جو اسے اس کی موجودہ شکل میں قائم رکھتے ہیں۔ یعنی موجودہ گول یا بیضوی شکل میں قائم رکھتے ہیں۔ انداز کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے اندر یہ تبدیلی باہر کے عوامل سے پیدا ہوگی کیونکہ اس کے لیے صیغہ مجہول استعمال ہوا ہے یعنی لفظ مدت۔

وَ اَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَ تَخَلَّتْ ( ٨٤ : ٤ ) ”اور جو کچھ اس کے اندر ہے اسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی“۔ یہ ایک ایسی تصویر کشی ہے کہ یہ زمین گویا ایک زندہ اور صاحب ارادہ چیز ہے' اور وہ اپنے اندر کی چیزوں کو باہر پھینک کر خالی ہو رہی ہے۔ کیونکہ اس کے اندر بہت کچھ ہے۔ مثلاً یہ مخلوقات جن کا گننا مشکل ہے' جو صدیوں سے اس کے اندر دفن ہو رہی ہیں اور نہ اس کے زمانے کا علم ہے اور نہ لوگوں کی تعداد کا۔ زمین کے پیٹ کے اندر جو معدنیات' پانی اور دوسری چیزیں ہیں جن کا علم صرف اللہ کو ہے' سب باہر آ جائیں گی۔ صدیوں سے یہ زمین ان چیزوں کو اٹھائے ہوئے ہے۔ جب قیامت برپا ہوگی تو یہ سب چیزوں اور سب رازوں کو اگل دے گی۔

وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ( ٨٤ : ٥ ) ”اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کے لیے یہی حق ہے“۔ اذن کے معنی یہاں اطاعت رب کے ہیں اور اللہ کے احکام کی تعمیل کرنے کے ہیں۔ جس طرح یہ تعبیر آسمان کے لیے بھی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ زمین اعتراف کر رہی ہوگی' اللہ کا اس پر حق ہے کہ وہ اللہ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ انداز بیان میں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ گویا زمین' آسمان' ذی روح مخلوق ہیں۔ یہ اللہ کا حکم سنتے ہیں اور بالارادہ تعمیل کرتے ہیں' فوراً لبیک کہتے ہیں اور اس طرح اطاعت کرتے ہیں جس طرح ایک شخص اطاعت کا اقرار و اعتراف کرتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ اس پر ایسا کرنا حق ہے' اس لیے وہ سر تسلیم خم کرتا ہو اور بغیر جبر کے یہ کام کرتا ہو اور اس میں کوئی حیل و حجت نہ کرتا ہو۔

اگرچہ قیام قیامت کے دن اس کائنات میں ایک عظیم انقلاب ہوگا اور یہ اسی کا ایک منظر ہے' لیکن یہاں جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ پروقار اور دھیمی ہے۔ اور اس پر توازن اور خشوع کے گہرے سائے ہیں۔ جو تاثرات پردۂ احساس پر قائم رہتے ہیں وہ اطاعت' تسلیم و رضا' خضوع و خشوع اور بغیر حیل و حجت اور بغیر قیل و قال اطاعت کیشی کے ہیں۔

چنانچہ ایسی ہی فضا میں باری تعالیٰ کی جانب سے ایک پکار آتی ہے۔ اس میں انسان کو انسانیت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ دکھا کر کہ دیکھو یہ پوری کائنات اور یہ ارض و سما کس طرح سر اطاعت خم کیے ہوئے ہیں' اور اللہ کی اطاعت کو اپنے اوپر حق سمجھتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۝

”اے انسان' تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے“۔

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ ( ٨٤ : ٦ ) جس کو رب تعالیٰ نے مہربانی کر کے اس طرح بنایا ہے' جس کو اللہ نے پوری مخلوقات کے مقابلے میں انسانیت کی منفرد صفت دی۔ اس کو تو یہ چاہئے کہ یہ اپنے رب کی معرفت میں سب سے آگے

ہو ' اور اس پوری کائنات اور ارض و سما کے مقابلے میں اللہ کے سامنے زیادہ سر تسلیم خم کرنے والا ہو ' اللہ نے اس کے جسم میں اپنی روح پھونکی ' اسے یہ قوت دی اور یہ فہم دیا کہ وہ رب تک رسائی حاصل کر سکے اور اپنے نور کا دیا اس کی ذات میں جلایا ' اور اس کے اندر یہ تڑپ رکھی کہ وہ اللہ کے فیوض حاصل کرے ' اور ان کے ذریعہ روحانی پاکیزگی اختیار کرے اور لامحدود بلندیوں تک عروج حاصل کرے ۔ اور اس کمال کی انتہاؤں تک جا پہنچے جن تک انسان پہنچ سکتا ہے ۔ یاد رہے کہ انسانی ترقی اور کمال کے آفاق بہت وسیع ہیں ۔

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ (۸۴ : ۶) "اے انسان ' تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے"۔ اے انسان تو اپنا سفر حیات اس جہاں میں نہایت مشقت کے ساتھ طے کر رہا ہے ۔ اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے ' جدوجہد کر رہا ہے ' سانس پھولی ہوئی ہے ۔ راستہ دشوار ہے اور اس پر مشقت راستے کو طے کر کے تو پہنچنے والا کہاں ہے ؟ رب کی طرف مرجع ہے اور جائے پناہ درگاہ الٰہی ہی ہے اور تو اس تک اس جدوجہد اور مشقت کے بعد پہنچ رہا ہے ۔

اے انسان ' تو اس جہاں میں اپنی ضروریات زندگی بھی بڑی جدوجہد سے مہیا کر رہا ہے ۔ اگر کسی کو جسمانی مشقت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تو فکر معاش اور ذہنی پریشانی ہر کسی کو ہوتی ہے ۔ خوشحال اور غریب دونوں فکرمند ضرور ہوتے ہیں ۔ دونوں ہی مشقت کرتے ہیں ۔ اگرچہ مشقت کی نوعیت مختلف ہوتی ہے ۔ ورنہ مشقت اور جدوجہد انسان کی زندگی کا جزو لاینفک ہے ۔ لیکن سرمایہ دار اور نادار دونوں آخر کار اللہ کے ہاں جا پہنچتے ہیں ۔

اے انسان ' اس زمین پر تو ہرگز حقیقی راحت نہ پا سکے گا ۔ راحت اور آرام تو آخرت میں ہوں گے لیکن ان کے لیے جو سر تسلیم خم کرتے ہوئے احکام خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں اور آخرت کے لیے کچھ کماتے ہیں ۔ اس زمین کی مشقت ایک جیسی ہے ۔ اگرچہ رنگ مختلف ہوں اور ذائقے الگ ہوں لیکن جب انسان رب تعالیٰ کے ہاں پہنچے گا تو وہاں انجام کا اختلاف حقیقی ہو گا ۔ ایک فریق تو اس قدر مشقت میں ہو گا جس سے زمین کی مشقت بہت مختلف اور کم ہے اور دوسرا فریق اس قدر انعام پائے گا کہ ان کے مقابلے میں زمین کی تمام تھکاوٹیں دور ہو جائیں گی ۔ یوں محسوس ہو گا کہ اس نے کبھی کوئی تکلیف دیکھی ہی نہیں ۔ اے انسان ' تجھے تو انسانیت کی صفت دے کر ممتاز کر دیا گیا ہے ۔ اپنے لیے وہ انجام اور وہ مقام چن لے جو تیری انسانیت کے شایان شان ہو ' جو اس صفت کے مناسب ہو جو اللہ نے تجھے دی ہے ۔ وہ آرام اور وہ خوشی اور نعمت طلب کر جو آخرت میں ہے ۔

اس پکار کے اندر ہی چونکہ انسانیت کے انجام کے لیے اشارہ تھا ' اس لیے متصلاً یہ بات بھی بتا دی گئی کہ انسانیت اس پر مشقت جدوجہد کے بعد دونوں انجاموں میں کس انجام تک پہنچے گی ۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝

وَّ يَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝ فَسَوْفَ

يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۝ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝ اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ اِنَّهٗ ظَنَّ

اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ ۝۱۴ بَلٰٓی ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِیْرًا ۝۱۵

"پھر جس کا نامہ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا گیا' اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا اور وہ اپنے لوگوں کی طرف خوش خوش پلٹے گا۔ رہا وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا تو وہ موت کو پکارے گا اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا۔ وہ اپنے گھر والوں میں مگن تھا۔ اس نے سمجھا تھا کہ اسے کبھی پلٹنا نہیں ہے۔ پلٹنا کیسے نہ تھا' اس کا رب اس کے کرتوت دیکھ رہا تھا"۔

وہ لوگ جن کو ان کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا' ان سے اللہ راضی ہو گا' یہ نیک بخت ہوں گے' ایمان دار اور نیکوکار ہوں گے' اللہ ان سے راضی ہو جائے گا اور ان کی نجات کا فیصلہ ہو جائے گا۔ ان لوگوں کے ساتھ نرمی کے ساتھ حساب ہو گا۔ اللہ کے کارندے زیادہ بازپرس نہیں کریں گے اور نہ حساب میں گہرائیوں تک جائیں گے۔ اس کی تصویر کشی احادیث رسولؐ میں کی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان احادیث کو پڑھ لیا جائے تو مزید کسی تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے ساتھ حساب میں مناقشہ کیا گیا اسے ضرور سزا ہو گی۔ فرماتی ہیں میں نے کہا' اللہ نے نہیں کہا "اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا"۔ تو آپؐ نے فرمایا: "یہ کامیابی حساب سے نہیں ہو گی بلکہ صرف پیشی سے ہو گی' قیامت میں صورت یہ ہو گی کہ جس سے حساب لیا گیا' اس کو سزا ہو گئی"۔ (بخاری' مسلم' ترمذی' نسائی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک دوسری روایت ہے' فرماتی ہیں کہ میں ایک نماز میں حضور اکرمؐ سے سنا "اے اللہ میرے ساتھ ہلکا حساب فرمانا"۔ جب حضورؐ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے پوچھا کہ حضورؐ ہلکا حساب کیا ہوتا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ حساب کی کتاب کو دیکھ کر چشم پوشی کر دی جائے اور جانے دیا جائے۔ عائشہ اس دن جس سے پوچھ گچھ شروع ہو گئی وہ تو مارا گیا"۔ (احمد بشرط مسلم از عبداللہ ابن زبیرؓ)

غرض اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دے دیا گیا' اس کے ساتھ حساب یسیر ہو گا اور وہ نجات پا جائے گا۔

وَّ یَنْقَلِبُ اِلٰٓی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا (۸۴ : ۹) "اور وہ اپنے لوگوں کی طرف خوش و خرم پلٹے گا"۔ یعنی ان لوگوں کی طرف جو اس سے پہلے جنت میں جا چکے ہوں گے۔ اس انداز تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں بھی ہم خیال لوگ اکٹھے ہوں گے۔ اور ہر شخص اپنے صالح اہل و عیال اور دوستوں میں ہو گا۔ نجات پانے والے شخص کی تصویر کشی اسی طرح ہے کہ یہ یاروں' دوستوں اور اپنے خاندان والوں کی طرف فرحاں و شاداں جا رہا ہو گا اور اسے نجات اور ملاقات کی دوہری خوشی ہو گی اور پھر جنتوں میں۔

یہ تو تھی دائیں بازو والوں کی صورت حالات' اس کے مقابلے میں بالکل ایک مختلف صورت حالات بھی ہے ان لوگوں کی جو پکڑے جائیں گے' اپنے برے اعمال کی پاداش میں۔ یہ لوگ تو اپنا اعمال نامہ لینا بھی نہ چاہیں گے۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ (۱۰) فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا (۱۱) وَّیَصْلٰی

سَعِیْرًا (۱۲) (۸۴: ۱۰ تا ۱۲) "رہے وہ لوگ جن کا اعمال نامہ پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا تو وہ موت کو پکارے گا اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا"۔ ایسے مناظر کی تصویر کشی اس سے قبل قرآن کریم میں اس طرح کی گئی ہے کہ کامیاب ہونے والوں کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا گیا اور اہل جہنم کا بائیں ہاتھ میں۔ لیکن یہاں کی تصویر ذرا مختلف ہے۔ یہاں تصویر میں نظر یوں آتا ہے کہ اہل جہنم کو ان کا اعمال نامہ پیٹھ کے پیچھے سے دیا جا رہا ہے۔ لہذا تصویر میں کوئی تضاد نہیں ہے بائیں ہاتھ میں پیچھے سے دیا جا رہا ہے۔ یہ ایسے شخص کی تصویر ہے جو نامہ اعمال نہیں لینا چاہتا ہے' وہ سامنا نہیں کر سکتا' سخت پریشان و گریزاں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہم لوگ اعمال نامے' دائیں ہاتھ میں دیئے جانے اور بائیں ہاتھ میں دیئے جانے کی کیفیات سے واقف نہیں ہیں۔ ہم صرف یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے لوگ نجات پانے والے ہیں اور جنت میں جائیں گے اور دوسرے لوگ ناکام و نامراد ہونے والے ہیں اور جہنم میں جائیں گے اور ہلاک ہوں گے۔ اصل مقصود یہی بات ہے نہ یہ کہ کیفیت کیسی ہو گی۔ اور قرآن کریم نے جو شکل و صورت بیان کی ہے اس سے بہرحال انسان پر گہرے اثرات پڑے ہیں۔ اور انسان خوف کے مارے کانپ اٹھتا ہے۔ حقیقت احوال اللہ ہی کے علم میں ہے کہ یہ مراحل کس طرح طے ہوں گے۔

یہ بدبخت جس نے زمین پر بھی اپنی زندگی ان تھک جدوجہد میں گزاری اور تھک تھکا کر اللہ کے سامنے پہنچا لیکن معصیت اور نافرمانی میں ڈوبا ہوا' گناہوں کے بوجھ سے لدا پھندا۔ اب یہاں آکر اپنے انجام کو جان لیتا ہے۔ انجام بد سے دوچار ہوتا ہے۔ اب جانتا ہے کہ اب تو اس کی نہ ختم ہونے والی مشقت شروع ہو گئی' تو یہ بدبخت اب موت کو پکارتا ہے' موت دائمی موت اور فنا کی استدعا کرتا ہے تاکہ وہ اس بدبختی سے بچ جائے جو اس پر آنے ہی والی ہے۔ یاد رہے کہ انسان موت کی آغوش میں پناہ اس وقت لیتا ہے جب وہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی اور راہ نجات نہیں ہے۔ نہ کوئی جائے فرار ہے تو اس وقت موت اس کی آخری تمنا ہوتی ہے' یہ مفہوم متنبی نے اس شعر میں سمو دیا ہے

کفی بك داء ان تری الموت شافیا
وحسب المنایا ان یکن امانیا

"اس سے بڑی اور کیا ہو گی کہ تم موت کو شفا سمجھنے لگو اور یہ مشقت کافی ہے کہ موت آرزو بن جائے (اور آئے نہیں)"۔

لہذا اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہو گی' اور اس سے بڑی مصیبت اور کیا ہو گی کہ وہ وَّیَصْلٰی سَعِیْرًا (۸۴: ۱۲) "اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا"۔ اور یہ شخص اب موت کی تمنا کرے گا جو کبھی پوری نہ ہو گی..... اب ذرا ایک جھلک اس شخص کے ماضی کی یہاں دکھا دی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ اس انجام تک پہنچا۔

اِنَّهٗ کَانَ فِیْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا (۱۳) اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ (۸۴: ۱۴) "یہ اپنے گھر والوں میں مگن تھا' اس نے سمجھا تھا کہ اس نے پلٹنا نہیں ہے"۔ یہ حالت تو اس کی دنیا میں تھی اور وہ تو چلی گئی۔ آج تو

قرآن ہمیں قیامت کے میدان میں لے گیا ہے اور دنیا تو بیت گئی ہے اور یہاں حساب و کتاب ہو رہا ہے اور قرآن کے انداز نے زمان و مکان کو لپیٹ کر رکھ دیا ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا (۸۴: ۱۳) "یہ اپنے گھر والوں میں مگن تھا"۔ یہ حاضر و موجود کا فدائی تھا' غلام تھا' اور مستقبل سے غافل تھا۔ یہ اس بات سے لاپرواہ تھا کہ قیامت کے میدان میں اسے کیا پیش آنے والا ہے۔ یہ قیامت کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا اور نہ اس کے لیے کوئی تیاری کرتا تھا۔

اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ (۸۴: ۱۴) "اس نے سمجھا تھا کہ اس نے پلٹنا نہیں ہے"۔ رب کی طرف پلٹ کر نہیں جانا ہے۔ اگر اس نے یہ سمجھا ہوتا کہ اللہ کے سامنے جانا ہے تو یہ اس حاضری کے لے کچھ تو تیاری کرتا اور آخرت کو کچھ تو اہمیت دیتا لیکن اس کو یقین نہ تھا بلکہ ظن یہ تھا کہ قیامت ہی نہیں ہے۔

بَلٰٓى اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا (۸۴: ۱۵) "پلٹنا کیسے نہ تھا' اس کا رب اس کے کرتوت دیکھ رہا تھا"۔ اس کا ظن یہ تھا کہ اللہ کی طرف لوٹ کر ہی نہیں جانا ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا رب تو اس کے حالات سے باخبر تھا' اس کی حقیقت کو گھیرے میں لیے ہوئے تھا' اس کے تمام اقدامات' اور تمام حرکات سے واقف تھا' اللہ کو معلوم تھا کہ اس نے کس انجام تک پہنچنا ہے اور یہ کہ اللہ نے اس کو اس کے کیے کی سزا دینی تھی' چنانچہ ایسا ہی ہوا' جب اللہ کے علم کے مطابق اس نے اپنی زندگی جہنم کے مطابق گزار دی' اور اس نے ایسا ہی کرنا تھا۔

اس بدبخت کی تصویر کے بالمقابل ایک دوسرے شخص کی تصویر ہے جو نیک بخت ہے' اگرچہ یہ اپنی دنیا کی محدود زندگی میں اپنے گھر والوں کے دائرے کے اندر ہی خوش و خرم تھا لیکن اس کی زندگی مجموعی طور پر کسی نہ کسی طرح پر مشقت تھی۔ اس کے مقابلے میں یہ نیک بخت اب آخرت میں اپنے اہل و عیال کی طرف خوش و خرم لوٹ رہا ہے۔ یہ دنیا کی زندگی تو مختصر اور محدود تھی لیکن اخروی زندگی طویل اور لامحدود ہے۔ یہ زندگی اب بے قید ہے' خوشگوار ہے' طویل ہے اور ہر قسم کی مشقت اور پریشانی اور تھکاوٹ سے خالی ہے۔

اب قارئین اس طویل اور گہرے سفر سے فارغ ہوتے ہیں۔ اس میں انہوں نے بے شمار مناظر دیکھے اور تاثرات لیے' اب سیاق کلام انہیں اس کائنات کے ایسے لمحات میں لے جاتا ہے جن میں ان کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ یہاں انسانوں کو اس کائنات کے وہ مناظر دکھائے جاتے ہیں جن میں خود حضرت انسان کا منظر بھی ہے یہ چیزیں اس بات پر گواہ ہیں کہ انسان اور اس کے گرد پھیلی ہوئی یہ کائنات ایک گہری تدبیر اور نہایت ہی باریک اندازے اور تقدیر کے مطابق چل رہی ہے اور اس دنیا کے اور انسان کے بدلتے ہوئے لمحات و حالات اس گہری تدبیر اور تقدیر کے نتیجے میں ہیں۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾
لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾

"پس نہیں' میں قسم کھاتا ہوں شفق کی' اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے' اور چاند کی جب کہ وہ ماہ کامل ہو جاتا ہے' تم کو ضرور درجہ بدرجہ ایک مشکل حالت سے دوسری حالت کی طرف گزرتے چلے جانا ہے"۔

یہ چند مناظر ہیں' قرآن کریم ان کی قسم کھا کر قلب انسانی کو ان کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ ان پر غور کرو' اس طرح انسانی دل و دماغ کو اشارات اور تاثرات سے بھر دیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے یہ لمحات ایک خاص نوعیت رکھتے ہیں' ان میں ایک طرف خشوع اور دھیما پن ہے اور دوسری طرف پر جلال ہیبت ہے۔ جس طرح سورت کا آغاز پر جلال دھیمے مناظر سے تھا' یہ لمحات اور مناظر بھی ایسے ہی ہیں۔

شفق کا وقت وہ ہوتا ہے جس میں ہر چیز سہم جاتی ہے' غروب کے بعد نفس انسانی پر بھی ایک گہری خاموشی اور خوف کے سائے پڑ جاتے ہیں۔ انسانی سوچ ان کو الوداع کہتی ہے اور الوداع میں ہمیشہ خاموشی اور دکھ کے سائے ہوتے ہیں اور پھر رات کے خوفناک لمحات آتے ہیں' جن میں اندھیروں کی وحشت ہوتی ہے۔ اور آخر کار رات کی تاریکیوں میں ہر چیز لپٹ کر خاموش ہو جاتی ہے' اور ایک مہیب سکون کی فضا ہوتی ہے۔

وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ (۸۴ : ۱۷) "اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے"۔ رات اور اس میں جو کچھ جمع ہوتا ہے' اور جن چیزوں کو وہ اٹھا لیتی ہے۔ نام لیے بغیر ہر معلوم و نامعلوم چیز جو رات کے پردے میں آ جاتی ہے جو کچھ رات میں جمع ہوتا ہے' جن چیزوں کو وہ سینے سے لگا لیتی ہے۔ ان میں تمام چیزیں' تمام زندہ مخلوق' تمام جذبات اور تمام خفیہ جہان آ جاتے ہیں۔ وہ تمام چیزیں جو زمین پر چلتی ہیں یا جو انسانی ضمیر میں خفیہ طور پر جاری و ساری ہیں۔ غرض راہوار خیال دور تک جا کر واپس ہوتا ہے اور انسانی فکر اور سوچ ان تمام مناظر کا احاطہ نہیں کر سکتی جو قرآن کے اس مختصر سے فقرے کا مدلول ہیں۔

وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ (۸۴ : ۱۷) "قسم ہے رات کی اور ان چیزوں کی جو وہ سمیٹ لیتی ہے"۔ جس سے انسانی شعور پر خضوع و خشوع اور خوفناک اور مہیب سکون کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور یہ حالت شفق اور رات کے چھانے کی حالت سے ہم آہنگ ہے۔

وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ (۸۴ : ۱۸) "اور قسم ہے چاند کی جبکہ وہ ماہ کامل بن جائے"۔ یہ بھی ایک دھیما اور سحر انگیز خوبصورت منظر ہے۔ چاند جن راتوں میں مکمل ہوتا ہے۔ اور زمین پر اپنا ٹھنڈا' دھیما اور فکر انگیز نور بکھیرتا ہے۔ خاموشی' ٹھنڈے ماحول میں کیا ہی خوبصورت نظارہ ہوتا ہے۔ مادی اور ظاہری بھی اور معنوی اور فکری بھی۔ یہ ایک ایسا نظارہ اور سفر ہے جو شام' شفق اور رات کے چھا جانے سے ہم آہنگ ہے' اسی نظارے کے بنیادی عناصر جمال و جلال اور خضوع و خشوع اور خاموشی اور سکون ہیں۔

یہ عظیم کائناتی مناظر' نہایت ہی خوبصورت' نہایت ہی فکر انگیز' اور نہایت مرعوب کن' تیز رفتار جھلکیوں کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور انسانی قلب و نظر سے مخاطب ہوتے ہیں' ان دلوں کو جو اس کائنات کی پکار کو نہیں سنتے۔ ان مناظر کی قسم اٹھائی جاتی ہے تاکہ انسانی قلب و ضمیر پر اثر ہو اور وہ ان کی تروتازگی' ان کی خوبصورتی اور ان کے اشارات

اور ان کے اثرات کو قبول کر سکے اور اس ہاتھ کو دیکھ سکے جس نے اس کے خطوط کو متعین کیا ہے اور جو ان مناظر اور جھلکیوں کو پے درپے سامنے لاتا ہے' ان جھلکیوں میں یہ مناظر بھی ہوتے ہیں اور لوگ بھی بدلتے ہیں اور ان کے حالات بھی بدلتے ہیں' لیکن نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ان مناظر کو دیکھتے ہوئے بھی لوگ غافل ہیں۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴: ۱۹) "تم کو ضرور درجہ بدرجہ ایک مشکل حالت سے دوسری حالت کی طرف بدلتے چلے جاتا ہے"۔ یعنی ایک صورت حال کے بعد دوسری صورت حال سے تمہیں دوچار ہونا پڑے گا۔ جس طرح اللہ نے تمہارے مقدر میں لکھا ہوا ہے۔ یہاں ایک حال سے دوسرے حال کی تبدیلی کے لیے "سواری" کا لفظ استعمال کیا گیا۔ عربی میں مشکلات سے دوچار ہونے کے لیے معاملات' خطرات' حالات اور مشکلات پر سوار ہونے کا محاورہ عام ہے۔ کیا جاتا ہے۔

ان المضطر یرکب الصعب من الامور وھو عالم برکوبہ "مشکلات میں گھرا ہوا شخص مشکلات پر سوار ہو جاتا ہے اور وہ اس بات کو جانتا ہے کہ وہ ان پر کس طرح سوار ہو یعنی قابو پائے" تحریک اسلامی کو پیش آنے والے حالات و مشکلات ایک کے بعد ایک سخت ترین مراحل کی شکل میں آئیں گے۔ اور یہ حالات اللہ کی تقدیر اور مشیت کے مطابق آئیں گے جو اس راہ میں لوگوں کو چلاتی ہے' اور دست قدرت ان کو ایک انتہا تک پہنچاتا ہے۔ جہاں سے دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ جس طرح شفق نمودار ہوتا ہے' رات آتی ہے اور چھا جاتی ہے' چاند نمودار ہوتا ہے اور ماہ کامل بن جاتا ہے یہاں تک انسان اس سفر کو طے کر کے اللہ تک پہنچ جائیں جیسا کہ سابقہ پیراگراف میں تصریح کی گئی۔ پے درپے ہم آہنگ پیراگراف اور فقرات کا آنا' ایک مفہوم اور فکر سے دوسری سوچ اور معنی اخذ کرنے چلے جانا' اور ایک نظارے سے دوسرے نظارے تک پہنچنا' یہ قرآن کریم کا پر اعجاز اور انوکھا انداز ہے جس کی نقل اتارنا ممکن نہیں ہے۔

ان مناظر اور اشارات اور ان مشاہدات اور خوشگوار لمحات کی فضا' جو اس پوری سورت میں یکے بعد دیگرے آئے۔ ان کے ذکر کے بعد اب ایک عقلمند انسان پر تعجب کیا جاتا ہے کہ ان دلائل ایمان کے باوجود وہ ایمان نہیں لاتا حالانکہ اس کائنات میں اور خود ان کے نفوس میں وافر مقدار میں واضح دلائل موجود ہیں۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠﴾ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ﴿٢١﴾

"پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے اور جب قرآن ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے"۔

ہاں اس بات کے لیے ان کے پاس کوئی وجہ جواز نہیں ہے' اس کائنات کے مناظر میں' اور خود انسانوں کے نفوس میں اس قدر شواہد اور آثار ہیں کہ قلب انسانی جدھر بھی متوجہ ہو' وہ اسے دعوت نظارہ دیتے ہیں جہاں بھی زندہ فکر ہو' یہ شواہد بڑھ چڑھ کر سامنے آتے ہیں۔ یہ آثار و شواہد اس قدر کثرت سے ہیں' اس قدر قوی ہیں اور اس قدر گہرے ہیں کہ اگر کسی بشر کا دل ان کی طرف ذرا بھی ملتفت ہو' متوجہ ہو تو وہ اسے گھیر لیتے ہیں۔ اگر وہ ان کی طرف کان دھرے' متوجہ ہو اور ان کی بات سنے تو یہ شواہد ہر جگہ اس کے ساتھ سرگوشیاں کرتے ہیں اور با آواز بلند بھی بات کرتے ہیں۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲۰) وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ (۸۴: ۲۱)
السجدۃ "پھر ان کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے اور جب قرآن ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے"۔
قرآن ان کے ساتھ فطری زبان میں بات کرتا ہے 'اور انفس و آفاق میں جو دلائل فطرت اور اشارات ایمان پائے جاتے ہیں ان کے لیے ان کے دلوں کو کھولتا اور دلوں میں تقویٰ' اطاعت اور خضوع و خشوع کے جذبات ابھارتا ہے اور یہی انسانی قلوب کے لیے سجدہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات بہت ہی خوبصورت ہے 'اس کے اندر ہر طرف اشارات قدرت ہیں 'اس کے اندر ایسی تجلیات اور ایسے انوار اور ایسے مناظر موجود ہیں جو قلب انسانی کو خضوع و خشوع کے جذبات سے بھر دیتے ہیں۔

پھر یہ قرآن بھی خوبصورت اور اشاراتی ہے اور اس کے اندر بھی ایسے اشارات ' ایسے مناظر اور شواہد ہیں جو قلب بشری کا تعارف اس کائنات اور رب کائنات سے کراتے ہیں۔ اور انسان کے دل و دماغ میں اس عظیم کائنات کے عظیم حقائق ڈال کر اسے اس کائنات کے بزرگ و برتر خالق کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ کیا ہی شان ہے۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲۰) وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ (۸۴: ۲۱)
السجدۃ "پھر ان کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے اور جب قرآن ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے"۔
یہ حقیقت ہے کہ یہ ایک عجیب طرز عمل ہے۔ اور اس طرز عمل کے ذریعہ اب بات کا رخ اس عجیب مخلوق کی طرف مڑ جاتا ہے 'یعنی کفار کی طرف اور بتایا جا رہا ہے کہ کیا ہی برا انجام ان کے انتظار میں ہے۔

بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُكَذِّبُونَ ﴿٢٢﴾ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ ﴿٢٣﴾ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢٤﴾

"بلکہ یہ منکرین تو الٹا جھٹلاتے ہیں' حالانکہ جو کچھ یہ (اپنے نامہ اعمال میں) جمع کر رہے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ لہٰذا ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو"۔

اصل بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے وہ تکذیب کرنے پر تل گئے ہیں' جھٹلانا ان کا مزاج ثانی بن گیا ہے۔ تکذیب ان کی علامت ہے لیکن ان کے دلوں کے اندر جو بیماریاں ہیں اور جن کی وجہ سے انہوں نے تکذیب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہے۔ اللہ انہیں خوب جانتا ہے۔ یہ محض شرارت ہے اور برے مقاصد ہیں جو تکذیب کا سبب بن رہے ہیں۔

اب ان کی بات یہاں ختم ہوتی ہے اور روئے سخن براہ راست حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے۔

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۸۴: ۲۴) "لہٰذا ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو"۔ کیا ہی بری خوشخبری ہے جس میں کوئی مسرت نہیں 'جس کو پانے والا پسند ہی نہیں کرتا۔ نہ ایسی خوشخبری کا کوئی انتظار کرتا ہے۔ اور اہل ایمان جو تکذیب نہیں کرتے۔ ان کے لیے کیا کیا تیاریاں ہیں؟ جو عمل صالح کے ذریعہ قیامت کی تیاریاں کرتے ہیں تو

اے تکذیب کرنے والوں کے انجام سے مستثنیٰ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔

۲۵ع اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۲۵

"البتہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے"۔

عربی زبان میں اسے استثنائے منقطع کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ کفار کو جو ناگوار اور سیاہ خوشخبری دی گئی ہے یا سیاہ وارنٹ دیا گیا ہے اس میں اہل ایمان کو شامل ہی نہ تھے' لیکن اس استثنائی انداز سے مقصود یہ ہے کہ جن لوگوں کو مستثنیٰ کیا گیا وہ بہت ہی خوش قسمت ہیں۔

اور اجر غیر ممنون کیا ہے' وہ جو ختم نہ ہو' ہمیشہ باقی رہنے والا دائمی اجر۔ اس فیصلہ کن ضرب پر یہ سورت ختم ہوتی ہے۔ یہ ایک مختصر سورت ہے' چند سطری لیکن وسیع اور فکر انگیز موضوعات بحث پیش کرتی ہے۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ البروج ۔ ۸۵

## ۱ -- تا -- ۲۲

# سورۃ البروج ایک نظر میں

یہ مختصر سورت اسلامی نظریہ حیات کے حقائق بیان کرتی ہے کہ ایمانی تصورات کے بنیادی عناصر کیا ہوتے ہیں' جو ایک عظیم موضوع ہے ۔ یہ سورت دور دور تک اس موضوع پر روشنی ڈالتی ہے ۔ اس میں اسرار و رموز کا وہ ذخیرہ ہے کہ اس کی آیات بلکہ کلمات بھی دور رس حقائق و معانی پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ سورت ایک محل ہے جس کے روشن دانوں نے نور کی لہریں دور دور تک پھیل رہی ہیں ۔

براہ راست موضوع تو اصحاب الاخدود کا ایک انفرادی واقعہ ہے ۔ اسلام سے قبل کے زمانے میں اہل ایمان کا ایک گروہ' غالباً عیسائی موحدین' دشمنوں کے ظلم و ستم کا شکار ہوئے تھے ۔ یہ دشمن سخت سرکش اور شرپسند تھے' اور یہ ظالم ان مومنین پر ظلم اس لیے کر رہے تھے کہ مشرکوں نے صحیح دین چھوڑ کر شرکیہ عقائد اپنا لیے تھے اور یہ لوگ اپنے اصل عقیدے پر جمے ہوئے تھے اور اس بات کے لیے تیار نہ تھے کہ نیا شرکیہ عقیدہ اپنائیں ۔ پس ان سرکشوں نے زمین میں گڑھے کھدوائے' ان گڑھوں میں آگ جلائی گئی' اور اس آگ میں ان مومنین کو گرایا گیا اور وہ جل کر راکھ ہو گئے ۔ اور یہ کام ایسے حالات میں ہوا کہ ان سرکشوں نے پوری آبادی کو یہ منظر دیکھنے کے لیے جمع کر رکھا تھا تاکہ وہ اہل ایمان کے اس انجام کو دیکھ کر ڈر جائیں اور یہ سرکش اس منظر کو دیکھ کر خوش ہوں ۔ انسانوں کو جلا کر خوش ہوں ۔

وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (۸۵ : ۸) "اور ان اہل ایمان کے ساتھ ان کی دشمنی اس کے سوا کسی وجہ سے نہ تھی کہ وہ اس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور اپنی ذات میں محمود ہے"۔

سورت کا آغاز قسم سے ہوتا ہے ۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ (۱) وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ (۲) وَشَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ (۳) قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ (۴) (۸۵ : ۱ تا ۴) "قسم ہے مضبوط قلعوں والے آسمان کی' اور اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے' اور دیکھنے والے اور دیکھی جانے والی چیز کی کہ مارے گئے گڑھے والے"۔

یہاں آسمانوں اور ان کے درمیان پائے جانے والے عظیم قلعوں اور قیامت کے دن کو باہم مربوط کیا جاتا ہے کہ یہ قلعے بھی عظیم ہیں اور قیامت کے واقعات بھی بہت عظیم ہوں گے ۔ اور قیامت کے دن لوگوں کی عظیم تعداد حاضر ہو گی اور بڑے بڑے واقعات ہوں گے ۔ ان واقعات کو پھر اس عظیم دردناک واقعہ سے مربوط کیا جاتا ہے جس کے سرکش کرداروں پر اللہ کا عذاب لازم ہے ۔

اس کے بعد اس دردناک واقعہ کا سرسری بیان ہے ' یہ بیان نہایت مختصر ہے لیکن پردۂ شعور پر اس واقعہ کی بربریت کو اچھی طرح نقش کر دیتا ہے ۔ اور یہ اشارہ بھی دے دیا جاتا ہے کہ عقیدہ اور نظریہ کس قدر عظیم شے ہے اور عقیدے کے اندر کس قدر قوت ہوتی ہے کہ وہ بڑے سے بڑے تشدد پر بھی فتح پا لیتا ہے ' اور اس کی راہ میں زندگی تک قربان کر دیا جاتا ہے ۔ اور وہ آگ کا مقابلہ کر کے اس کو ٹھنڈا کر سکتا ہے ۔ اور وہ اس قدر بلندی تک پہنچ سکتا ہے کہ اس بلندی کو نسلوں تک یاد رکھا جاتا ہے ۔ اس میں اسی طرف اشارہ بھی ہے کہ یہ واقعہ نہایت ہی بدترین واقعہ تھا اور یہ فعل کرنے والے شر' فساد اور ظلم و زیادتی میں مست تھے ' ان کے مقابلے میں اہل ایمان سربلند' پاک اور معصوم تھے ۔

النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ (٥) اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ (٦) وَّ هُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ (٧) (٨٥: ٥ تا ٧) "اس گڑھے میں بھڑکتی ہوئی آگ تھی جبکہ وہ اس گڑھے کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ وہ ایمان لانے والوں کے ساتھ کر رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے"۔

اس کے بعد مختصر فقروں میں اسلامی نظریہ حیات کے سلسلے میں تبصرے اور نتائج آتے ہیں جن میں اسلامی انقلاب کی تحریک کے سلسلے کی بہت ہی اہم اور اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی دعوت و منشور کے سلسلے کی نہایت ہی بنیادی باتیں بتائی گئی ہیں :

○ یہ کہ زمین و آسمان کی بادشاہت صرف اللہ کی ہے اور زمین و آسمان میں جو واقعات ہوتے ہیں ' اللہ انہیں دیکھ رہا ہوتا ہے ۔

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (٨٥: ٩) "اللہ ' جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے ' اور وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے"۔

○ یہ کہ جہنم میں جلنے کا عذاب ان سرکشوں کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا ہے ۔ جو ظلم اور بربریت میں نہایت ہی گھٹیا مقام تک اتر گئے ہیں ۔ اور پھر جنت کے مزوں کا بھی ذکر ہے جو اہل ایمان کے لیے مخصوص ہیں اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے اس لیے کہ ان لوگوں نے اپنی زندگی پر اپنے ایمان اور اپنے عقیدے کو ترجیح دی ۔ اور انہوں نے آگ میں جلائے جانے کے عذاب کو برداشت کیا ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ (١٠) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ (١١) (٨٥: ١٠ ـ ١١) "جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں پر ستم توڑا اور پھر اس سے تائب نہ ہوئے یقیناً ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلائے جانے کی سزا ہے ' جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے ' یقیناً ان کے لیے جنت کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی

ہوں گی' یہ ہے بڑی کامیابی"۔

ان تبصروں میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ کی پکڑ بہت شدید ہوتی ہے کیونکہ وہی خالق ہے' پہلی بار بھی اسی نے پیدا کیا' دوبارہ بھی وہی پیدا کرے گا۔

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (۸۵ : ۱۲) "درحقیقت تمہارے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے' وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے' وہی دوبارہ پیدا کرے گا"۔ اس حقیقت کا تعلق ان مظلوم جانوں سے ہے جو اس حادثے میں تلف ہوئیں لیکن اس تبصرے میں اس سزا سے آگے مزید دور تک روشنی پڑتی ہے۔

اس کے بعد اللہ کی کچھ صفات کا ذکر ہے اور ان میں سے ہر صفت ایک متعین مقصد کے لیے لائی گئی ہے۔

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ (۸۵ : ۱۴) "وہ اللہ بخشنے والا اور محبت کرنے والا ہے"۔ وہ گناہوں کو بخشنے والا ہے' اگرچہ وہ بہت بڑے گناہ ہوں بشرطیکہ کہ ان کا مرتکب تائب ہو جائے۔ اور وہ ان لوگوں سے بہت محبت کرتا ہے جو اس اللہ کو دنیا کی ہر چیز پر ترجیح دیں۔ مثلاً جن لوگوں پر اس واقعہ میں شدید تشدد ہوا یا مکہ میں جو تشدد ہو رہا تھا' ان کے زخموں کے لیے یہ محبت کی نہایت ہی کارگر مرہم ہے کہ اللہ غفور و ودود ہے۔

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ (۱۵) فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (۸۵ : ۱۶) "عرش کا مالک ہے' بزرگ اور برتر ہے' اور جو کچھ چاہے کر ڈالنے والا ہے"۔ یہ صفات بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوقات پر مکمل کنٹرول ہے۔ وہ قادر مطلق ہے' اس کا ارادہ بے قید ہے' یہ تمام صفات اس واقعہ کے ساتھ براہ راست منسلک ہیں۔ اور اس واقعہ سے آگے بھی دور تک روشنی ڈالتی ہیں۔

آخر میں بتایا جاتا ہے کہ ان کافروں کا رویہ کیسا ہے اور یہ کہ اللہ تو انہیں گھیرے ہوئے ہے لیکن یہ جانتے نہیں ہیں۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ (۱۹) وَّ اللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ (۲۰)

(۸۵ : ۱۹ تا ۲۰) "مگر جنہوں نے کفر کیا ہے وہ جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں' حالانکہ اللہ نے انہیں گھیرے میں لے رکھا ہے"۔ اور اس قرآن کی حقیقت اور اس کی اصلیت اور حفاظت کی بات بھی کی گئی ہے۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ (۲۱) فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۸۵ : ۲۲) "بلکہ یہ قرآن بلند پایہ ہے اور لوح محفوظ میں درج ہے"۔

غرض یہ تھے اس سورت کے چند تبصرے جو دور دور تک روشنی پھیلاتے ہیں۔ اب ہم ذرا ان پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں۔

--- ooo ---

# درس نمبر ۲۸۵ تشریح آیات

## ۱-- تا-- ۲۲

سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ (۸۵) مَكِّيَّةٌ (۲۷) اٰيَاتُهَا ۲۲ رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ﴿۱﴾ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ﴿۲﴾ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"قسم ہے مضبوط قلعوں والے آسمان کی' اور اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے (یعنی قیامت)' اور دیکھنے والے کی اور دیکھی جانے والی چیز کی"۔

واقعہ اصحاب الاخدود کی طرف آنے سے قبل سورت کا آغاز اس قسم سے ہوتا ہے "قسم ہے مضبوط قلعوں والے آسمان کی"۔ "بروج" سے مراد یا تو عظیم الجثہ اجرام فلکی ہیں 'گویا وہ آسمانوں کے عظیم الشان قلعے ہیں' سورہ ذاریات میں کہا گیا۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (۵۱ : ۴۷) "اور آسمان کو ہم نے ہاتھوں سے بنایا اور ہم بہت وسعت دینے والے ہیں"۔ اور سورہ نازعات میں فرمایا۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا (۷۹ : ۲۷) "کیا تخلیق کے لحاظ سے تم مضبوط ہو یا آسمان جسے ہم نے بنایا"۔ اور یا بروج سے مراد وہ منزلیں ہیں جن کے اندر یہ اجرام گردش کرتے ہیں یعنی جب یہ اجرام اپنے ایک مدار کے اندر گردش کرتے ہیں اور اس سے سرمو تجاوز نہیں کر سکتے اور بروج کے لفظ سے ان کی ضخامت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' یہاں اس سورت کی فضا پر ضخامت کا سایہ ڈالنا مقصود ہے۔

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ (۸۵ : ۲) "اور قسم ہے اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے"۔ یہ وہ دن ہے جس میں دنیا کے اعمال اور واقعات کے فیصلے ہوں گے۔ اس دنیا میں جس نے جو کمایا ہو گا' اس کی جزاء و سزا ہو گی۔ اور اس

دن کو الیوم الموعود اس لیے کہا گیا کہ اس کے آنے کا اللہ نے وعدہ فرمایا تھا کہ اس دن حساب کے بعد جزاء و سزا ہو گی اور جن لوگوں پہ دنیا میں زیادتی ہوئی یا جنہوں نے کسی پر زیادتی کی اس دن تک اللہ نے ان کو مہلت دی اور یہ ایک عظیم دن ہو گا' جس کا لوگوں کو انتظار ہے تاکہ وہ دیکھیں کہ اس کے اندر کیا فیصلے ہوتے ہیں۔

وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ (۸۵ : ۳) "اور دیکھنے والے کی اور دیکھی جانے والی چیز کی"۔ اس دن لوگوں کے اعمال بھی پیش ہوں گے 'سب لوگ بھی پیش ہوں گے' تو یہ سب مشہود ہوئے 'اور سب لوگ دیکھیں گے تو وہ شاہد بھی ہوئے' اس دن ہر چیز پردے سے باہر آجائے گی اور ہر کسی کو نظر آئے گی۔

یہ عظیم اجرام فلکی والا آسمان' اور یہ عظیم دن جس میں حساب و کتاب ہو گا اور سب شاہد اور مشہود جمع ہوں گے۔ ان کے ذکر سے جو فضا بنتی ہے۔ وہ اپنی عظمت' اہمیت اور عظیم اجتماع کے لحاظ سے' اس بات کے لیے مناسب ہے کہ اس میں اصحاب الاخدود کا عظیم سانحہ بیان کیا جائے۔ یہ وسیع و عریض فضا گویا اس واقعہ کے بیان کے لیے اور اس حقیقت اور وزن دار بنانے کے لیے بنائی گئی یعنی قیامت کی فضا جو اس دنیا کی وسعتوں سے زیادہ وسیع ہے اور اس کی زندگی اور اس کا زمانہ اس دنیا کی محدود زندگی اور محدود زمانے سے زیادہ وسیع ہے۔

اس فضا کی تیاری کے بعد اور ایک وسیع میدان تیار کرنے کے بعد اب اس عظیم واقعہ کی طرف فقط سرسری اشارہ کیا جاتا ہے۔

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝

"مارے گئے گڑھے والے۔ (اس گڑھے والے) جس میں خوب بھڑکتے ہوئے ایندھن کی آگ تھی۔ جبکہ وہ اس گڑھے کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ وہ ایمان لانے والوں کے ساتھ کر رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے۔ اور ان اہل ایمان سے ان کی دشمنی اس کے سوا کسی وجہ سے نہ تھی کہ وہ اس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے' جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے' اور وہ خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے"۔

اس واقعہ کا آغاز اس تبصرے سے ہوتا ہے کہ اصحاب الاخدود پر اللہ کی مار ہو۔ ان الفاظ ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فعل پر اللہ بہت ناراض ہے اور جن لوگوں نے اس گھناؤنے فعل کا ارتکاب کیا وہ غضب الہی کے مستحق ہیں۔ یہ فعل اس قدر ظالمانہ ہے کہ اللہ جو حکیم ہے' اس کا غضب جوش میں آگیا اور اس نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ ان ظالموں سے انتقام لے گا۔

اس کے بعد اخدود (گڑھوں) کی تشریح کی جاتی ہے کہ وہ کیا ہیں؟ وہ آگ ہے بڑھکتی ہوئی' دراصل انہوں نے زمین کے اندر گڑھے بنوائے تھے ان میں آگ جلائی تھی اور ان کو آگ سے بھر دیا تھا' یوں گڑھوں کو دہکتی ہوئی آگ بتایا گیا۔ یعنی وہ گڑھے دہکتی ہوئی آگ سے بھرے ہوئے تھے۔

"گڑھوں والے قتل ہوئے" وہ قتل ہونے اور اسی طرح جلائے جانے کے مستحق ہیں کیونکہ انہوں نے جب یہ ظلم کیا تو وہ کیسے حالات میں تھے؟

اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ (٦) وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ (۸۵: ۷) "جبکہ وہ اس گڑھے کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ وہ ایمان لانے والوں کے ساتھ کر رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے"۔

یہ ایک ایسی تصویر کشی ہے کہ اس سے ان کا موقف اور ان کا منظر اچھی طرح ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ لوگ آگ جلا رہے ہیں' مومنین اور مومنات کو پکڑ پکڑ کر اس میں پھینک رہے ہیں اور ان کو کنارے پر بیٹھے جلتے دیکھ رہے ہیں۔ اس سنگدلی کے فعل کو قریب سے دیکھ رہے ہیں' سزادہی کے طریقوں کا مشاہدہ بھی کر رہے ہیں اور جوں جوں آگ ان کے اجسام کو کھاتی ہے' یہ خوش ہو رہے ہیں اور اس دردناک منظر کو اپنے مشاہدے پر ثبت کر رہے ہیں۔

اہل ایمان بے گناہ تھے۔ ان کے ذمہ ان ظالموں کا کوئی قصاص نہ تھا۔

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (٨) الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۸۵: ۹) "اور ان اہل ایمان کے ساتھ ان کی دشمنی اس کے سوا کسی وجہ سے نہ تھی کہ وہ اس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور اپنی ذات میں محمود ہے' جو آسمان اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے اور وہ خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے"۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ اللہ پر ایمان لائے تھے جو زبردست اور غالب ہے اور وہ جو کچھ بھی کرنا چاہے اس پر قادر ہے اور وہ الحمید ہے یعنی وہ ہر حال میں حمد و ثنا کا مستحق ہے اور بذات خود محمود ہے۔ اگرچہ جاہل اور نادان لوگ اس کی حمد و ثنا نہ کریں۔ وہ اس بات کا مستحق ہے کہ لوگ اس پر ایمان لائیں اور صرف اسی کی بندگی کریں اور زمین و آسمان کی بادشاہی اسی کی ہے۔ وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے اور حاضر و ناظر ہے۔ اور وہ اس مخصوص واقعہ کو بھی دیکھ رہا ہے جو اہل ایمان کو پیش آیا کہ ان کو گڑھے میں پھینکا گیا۔ اس ایمان مفصل کے بیان سے اور اللہ کی شہادت سے ہر اس مومن کو تسلی ہو جاتی ہے جسے محض ایمان کی وجہ سے سرکش اور جبار اذیت دیتے ہیں۔ اللہ گواہ ہے اور شہادت کے لیے وہ کافی ہے۔

غرض ان مختصر آیات میں یہ قصہ ختم کر دیا جاتا ہے' لیکن ان لوگوں کا یہ فعل اور تشدد اس قدر ظالمانہ اور سنگدلانہ ہے کہ ہر قاری کا دل ان لوگوں کے خلاف نفرت اور کراہت سے بھر جاتا ہے اور انسان سوچنے لگتا ہے کہ واقعہ کے اثرات و نتائج اللہ کے ہاں کیا ہوں گے۔ اللہ کے ہاں اس واقعہ کی اہمیت کیا ہوگی اور یہ ظالم اللہ کے ہاں کس غضب کے مستحق بن گئے ہیں۔ واقعہ تو اختصار کے ساتھ بیان ہو گیا لیکن انسانی سوچ میں یہ واقعہ یہاں ختم نہیں ہوا۔ اللہ کے ہاں اس کے اثرات اور اس کا حساب و کتاب باقی و موجود ہے۔

یہ قصہ ختم ہو گیا' لیکن انسانی قلب اس عظیم کارنامے سے مرعوب ہو جاتا ہے کہ ایمان کٹھن آزمائش پر فتح پا لیتا ہے' نظریہ زندگی پر ترجیح پاتا ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو زمین کی تمام دلچسپیوں اور جسم کی تمام خواہشات کو نظرانداز کر دیتے ہیں' ان لوگوں کے لیے ایک راہ یہ بھی تھی کہ ایمان کو چھوڑ کر زندگی کا سامان لے کر نکل جائیں' لیکن ان کا یہ سودا کس قدر خسارے کا سودا ہوتا' اس طرح پوری انسانیت گویا ہار جاتی۔ وہ اعلیٰ انسانی قدروں کو قتل کر دیتے۔ اب لوگوں کو نظریہ سے خالی زندگی حقیر نظر نہ آتی' غلامی پر وہ راضی ہو جاتے اور لوگ اس قدر ذلیل ہو جاتے کہ جسمانی غلامی کے بعد وہ روحانی غلامی بھی قبول کر لیتے۔ لیکن یہ عظیم اقدار تھیں جن کو انہوں نے اس وقت بھی خریدا اور نفع بخش سودا سمجھا جب وہ زمین پر زندہ تھے' اور ان کو انہوں نے اس وقت بھی ترجیح دی جب ان کے جسم جل رہے تھے۔ یوں یہ روحانی قدریں فتح مند ہوتی ہیں اور یہ قدریں آگ کی بھٹی سے پاک ہو کر نکلتی ہیں۔ اس کے بعد رب کے ہاں ان کے لیے بھی اجر ہے اور ان کے دشمنوں کا بھی حساب ہو گا' چنانچہ کہا جاتا ہے :

إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ﴿١٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ﴿١١﴾

"جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں پر ستم توڑا اور پھر اس سے تائب نہ ہوئے یقیناً ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلائے جانے کی سزا ہے۔ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے' یقیناً ان کے لیے جنت کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی' یہ ہے بڑی کامیابی"۔

جو کچھ اس زمین پر ہوا' وہ یہاں ختم نہیں ہو جاتا کہ جو ہونا تھا بس ہو چکا اور اس کے آثار بھی یہاں ختم ہو گئے۔ اس کے آثار باقی ہوتے ہیں۔ ہر کام کی سزا اور جزاء ہوتی ہے جس کے واقع ہونے پر ہی واقعہ ختم ہوتا ہے۔ اس لیے ان سرکشوں نے اہل ایمان کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا نتیجہ ابھی نکلنے والا ہے۔ اور اللہ قیامت کے دن فیصلہ کرنے والا ہے۔

انّ الّذینَ فتنُوا المُؤمنینَ وَالمومنٰت (۸۵ : ۱۰) "جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں پر ظلم کیا" اور وہ اپنی گمراہی میں آگے ہی بڑھتے رہے۔ ان کو کوئی شرمندگی لاحق نہ ہوئی۔

ثُمّ لَم یتوبو افلھم عذابُ جھنّمَ وَلھُم عذابُ الحَریق (۸۵ : ۱۰) "اور پھر تائب نہ ہوئے یقیناً ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے' اور ان کے لیے جلائے جانے کی سزا ہے"۔ یہاں قرآن کریم نے حریق 'جلانے کی صراحت کی ہے' معنی تو وہی ہے جو عذاب جہنم کا ہے لیکن لفظ حریق کو اس لیے لایا گیا ہے تاکہ اصحاب الاخدود کو دیئے جانے والی سزا کے بالمقابل یہاں بھی جلنے کا لفظ آ جائے کیونکہ اہل ایمان کی سزا کے لیے حریق کا لفظ استعمال ہوا تھا لیکن دنیا کے جلنے اور آخرت کے جلنے میں بڑا فرق ہے۔ دونوں کے جلنے کی شدت اور مدت دونوں میں فرق ہے۔ دنیا میں

جلانے والی آگ کو انسان جلاتے ہیں ' جبکہ آخرت کی آگ کو اللہ نے تیار کیا ہے ـ دنیا کی آگ تو چند لمحات تک جلاتی ہے اور پھر ختم ہو جاتی ہے لیکن آخرت کی آگ میں تو لاانتہا زمانوں تک جلتے رہیں گے ـ دنیا کے جلنے میں اللہ کی رضا پنہاں ہے اور اعلیٰ قدروں کی فتح ہے لیکن جب وہ آخرت میں جلیں گے تو اللہ کے دائمی عذاب اور غضب میں ہوں گے اور پستی ' گراوٹ اور مذمت ان کے ساتھ لازم ہو گی ـ

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے وہ جنت میں ہوں گے اور وہاں اللہ کے انعامات انہیں میسر ہوں گے اور اللہ ان سے راضی ہو گا ـ

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۸۵: ۱۱) "اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے یقیناً ان کے لیے جنت کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی" ـ یہ ہے حقیقی نجات اور کامیابی ـ

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِیْرُ (۸۵: ۱۱) "یہ ہے بڑی کامیابی" ـ فوز کے معنی نجات اور کامیابی کے ہیں ـ آخرت کے عذاب سے نجات پانا ہی بڑی کامیابی ہے اور باغات جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ـ یہ تو کامیابی پر کامیابی ہے ـ آخرت کے اس انجام پر اب یہ واقعہ مکمل ہوتا ہے اور یہی ہے حقیقی خاتمہ اور انجام دونوں فریقوں کے موقف کا ـ زمین میں جو واقعات ہوتے ہیں وہ حقیقی واقعات کا ایک حصہ ہوتے ہیں ' یہ تمام واقعہ نہیں ہوتے ' اس واقعہ پر آگے جو تبصرے آتے ہیں ان میں سے پہلا تبصرہ اسی غرض کے لیے ہے کہ اہل ایمان کے دلوں میں یہ حقیقت بٹھا دی جائے کہ واقعات دنیا ہی میں ختم نہیں ہوتے ـ اس دور میں ' جب یہ سورت نازل ہوئی مکہ مکرمہ میں مٹھی بھر مسلمان اس قسم کی مصیبتیں جھیل رہے تھے اسی طرح دنیا کے کسی زمان و مکان میں جو لوگ اسلام کے لیے کام کرتے ہیں اور ان پر تشدد ہوتا ہے تو ان کو بھی یہ بتلانا مقصود ہے کہ ان فتنہ سامانیوں کا انجام قیامت میں سامنے آئے گا ـ

اس کے بعد اب تبصرے آتے ہیں ـ پہلا تبصرہ :

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِیْدٌ ﴿۱۲﴾

"درحقیقت تمہارے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے" ـ یہاں اللہ کی پکڑ کو اس لیے شدید کہا گیا کہ اس زیر بحث واقعہ میں ان سرکشوں نے اہل ایمان کو جو سزا دی وہ ان کے خیال میں شدید سزا تھی ـ لوگوں کے خیال میں بھی شدید تھی لیکن یہاں کہا جاتا ہے کہ حقیقی پکڑ کر اللہ جبار و قہار کی پکڑ ہے جو زمین و آسمان کا بادشاہ ہے ' ان لوگوں کی سزا کیا سزا ہو گی جو زمین سے ایک ٹکڑے پر ایک محدود سا اقتدار رکھتے ہوں اور جو خود بھی ضعیف اور حقیر ہیں اور ان کا اقتدار بھی محدود وقت کے لیے ہے ـ

یہ بات یہاں نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ قائل رب تعالیٰ اور مخاطب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تعلق کے اظہار کے لیے (ربك) کا لفظ لایا گیا ہے ـ یہ تمہارا رب ہے جس کی ربوبیت کی طرف آپ کی نسبت ہے اور

جس کی امداد اور نصرت پر آپ کو بھروسہ ہے ـ اور جب فساق و فجار اہل ایمان پر تشدد کر رہے ہوں تو ایسے حالات میں اللہ کے ساتھ تعلق ہی اہم سازوسامان ہوتا ہے ـ

اِنَّهٗ هُوَ یُبْدِئُ وَ یُعِیْدُۚ۝۱۳

"وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا"۔ اصولی طور پر ابتدا اور اعادۂ حیات کا مفہوم ابتدائے حیات اور موت کے بعد قیامت میں حیات ثانی کے ساتھ مختص ہے ـ لیکن رات اور دن کے ہر لمحہ میں آغاز حیات اور اعادہ حیات کا عمل مسلسل جاری ہے ـ ہر لمحہ آغاز حیات اور تخلیق حیات کا عمل جاری ہے ـ اللہ نے ایک ایسا نظام وضع کیا ہے جس کے ذریعہ حیات کا تسلسل قائم ہے ـ جو چیز ہوتی ہے اس کا اعادہ ہوتا رہتا ہے ـ اور یہ کائنات مسلسل نئی زندگی پاتی رہتی ہے ـ آغاز اور اعادہ کے اس مسلسل نظام میں اصحاب اخدود کا واقعہ بھی اپنے نتائج کے ساتھ گزر گیا ـ اللہ نے ایسا ہی طے کیا تھا' جو ہو گیا اور ایسے ہی واقعات ہوتے رہیں گے ـ یہ واقعہ آغاز تھا جس کا اعادہ ہو گا' یا اس قسم کے پہلے واقعات کا اعادہ تھا' بہرحال اس دنیا میں واقعات کی ابتدا بھی ہوتی ہے اور اعادہ بھی ہوتا ہے اور یہ سب اللہ کی کتاب تقدیر کے مطابق ہوتا ہے ـ

وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُۙ۝۱۴ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُۙ۝۱۵

"اور وہ بخشنے والا ہے' محبت کرنے والا ہے' عرش کا مالک ہے اور بزرگ و برتر ہے"۔ یہاں مغفرت کا تعلق اور ربط آیت ماقبل سے ہے ـ

ثُمَّ لَمْ یَتُوْبُوْا (۸۵: ۱۰) "پھر اس سے تائب نہ ہوئے"۔ یہ اللہ کی بے پایاں رحمت اور اللہ کا فضل عظیم ہے ـ اور ایک کھلا دروازہ ہے اور یہ ہر واپس آنے والے اور ہر توبہ تائب ہونے والے کے لیے کھلا ہے ـ اگرچہ اس کا گناہ اور اس کی معصیت نہایت سخت ہو ـ لفظ ودود (محبت کرنے والا) کا تعلق اہل ایمان سے ہے جنہوں نے ہر چیز پر اپنے رب کو ترجیح دی ـ یہ وہ مقام محبت اور وہ مقام انس ہے جہاں تک اللہ کے خاص بندے ہی پہنچ سکتے ہیں ـ اس مقام تک اللہ صرف ان بندوں کو ترقی دیتا ہے' جو اللہ کے ساتھ ایسی محبت کرتے ہیں کہ ہر چیز پر' محبوب سے محبوب چیز پر اللہ کو ترجیح دیتے ہیں ـ ان بندوں کی صفت سے انسانی قلم قاصر ہے' الا یہ کہ کسی قلم کو اللہ طاقت دے ـ یہ مقام بلند جس تک ان مخصوص بندوں کو عروج نصیب ہوتا ہے' یہ اللہ کی محبت اور سچی دوستی کا مقام ہے ـ رب اور بندے کے درمیان دوستی! اور اللہ کی جانب سے اپنے محبوبوں اور مقربین کے ساتھ محبت کا مقام! لہٰذا اس مرتبہ و مقام کے مقابلے میں اس زندگی کی کوئی حیثیت نہیں ہے جو بہرحال ختم ہونے والی تھی' اور اس مرتبہ و مقام کے مقابلے میں اس عذاب حریق کی بھی کوئی حیثیت نہیں جو بہرحال ایک محدود وقت کے لیے تھا' یہ قربانیاں تو اللہ کی جانب سے محبت اور دوستی کے ایک لمحے کے برابر بھی نہیں ہیں ـ

اس زمین میں جو لوگ کسی ایک شخص کے غلام ہوتے ہیں ـ اگر یہ مجازی مالک ان کی تعریف میں ایک کلمہ بھی کہہ

دے اور اگر وہ دیکھ لیں کہ ان کے کسی فعل سے مالک مجازی کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہوگئے ہیں' یہ غلام بہرحال غلام ہے اور وہ مالک مجازی بھی اللہ کا بندہ اور غلام ہے۔ لیکن اللہ کے خاص بندے جن کے ساتھ اللہ محبت کرتا ہے' جن کے ساتھ محبت کرنے والا رب جلیل ہوتا ہے اور وہ عرش کا مالک ہوتا ہے' جو بلند اور برتر ہے' اور کریم ہوتا ہے تو ان بندے کی جان اگر جاتی ہے تو کچھ بھی نہیں' اگر ان پر تشدد ہوتا ہے تو کچھ بھی نہیں۔ دنیا کی پوری زندگی میں اگر تشدد ہوتا رہے تو بھی اس لمحہ محبت پر وہ قربان ہے جو رب ودود کی طرف سے محبت کا لمحہ ہے جو عرش کا مالک ہے اور عظیم ہے۔

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ (۸۵: ۱۵) "جو عرش کا مالک ہے اور بزرگ و برتر ہے"۔

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ﴿١٦﴾

"اور جو کچھ چاہے' کر ڈالنے والا ہے"۔ یہ اللہ کی وہ صفت ہے جو ہروقت سامنے آتی رہتی ہے۔ مسلسل روبعمل رہتی ہے۔ اللہ جو کچھ چاہے' کر ڈالنے والا ہے۔ اس کا ارادہ بے قید ہے' جو چاہتا ہے اختیار کر لیتا ہے' جو چاہتا ہے' کرتا ہے' اور یہ صفت دائمی اور ابدی ہے' یہ اللہ کی صفت ہے۔

بعض اوقات اللہ چاہتا ہے کہ اس دنیا ہی میں اہل ایمان کو فتح نصیب ہو اور اس میں کوئی حکمت ہوتی ہے' بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایمان کو عذاب پر ترجیح ملتی ہے۔ فانی جسم تو چلے جاتے ہیں' لیکن ایمان باقی رہتا ہے اور اس میں بھی حکمت ہوتی ہے۔ بعض اوقات وہ جباروں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اس میں حکمت ہوتی ہے اور بعض اوقات ایسے ہی دوسرے جباروں کو مہلت دیتا ہے اور اس میں بھی حکمت ہوتی ہے۔ اس کے سب کام اس کی تقدیر کے مطابق حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

یہ اللہ کی حکمتیں ہیں' اخدود والوں نے اہل ایمان کو ہلاک کر دیا' اور ان کو مہلت ملی اور فرعون اور ثمود کو اللہ نے ہلاک کیا۔ یہ سب واقعات اللہ کے ارادۂ مطلقہ اور اس کی حکمت اور تقدیر کے مطابق ہوئے۔ اور اللہ کا بے قید ارادہ اسی طرح اس پوری کائنات میں انہی حکمت کے مطابق کام کرتا ہے۔ اور اللہ جو چاہتا ہے' کر گزرتا ہے۔ اسی کا ایک نمونہ یوں ہے۔

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ﴿١٧﴾ فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ ﴿١٨﴾

"کیا تمہیں لشکروں کی خبر پہنچی ہے؟ فرعون اور ثمود (کے لشکروں) کی! یہ دو طویل قصوں کی طرف اشارہ ہے' اس لیے فرعون اور قوم ثمود کی باتیں مخاطبین کو معلوم تھیں۔ قرآن کریم نے دونوں قصوں کو بار بار بیان کیا ہے۔ یہاں ان کو جنود اس لیے کہا گیا کہ وہ بہت ہی طاقتور تھے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ان کا قصہ کیا ہے اور تمہارے رب نے ان کے ساتھ کیا کیا تھا؟ اللہ تو جو چاہے کر گزرتا ہے۔

فرعون اور ثمود دونوں کے قصے اپنی نوعیت اور نتائج کے اعتبار سے مختلف تھے۔ فرعون کو تو اللہ نے مع اپنے لشکر کے' غرق کیا اور بنی اسرائیل کو نجات دی۔ ان کو ایک عرصہ تک زمین کا اقتدار سونپا گیا تاکہ ان کے ذریعہ اللہ نے اپنی تقدیر کو ظاہر کرے اور اپنے ارادے پورے کرے۔ رہے ثمود تو اللہ نے ان کو ہلاک کر دیا اور حضرت صالح علیہ السلام کی

معیت میں ایک چھوٹی سی تعداد نے نجات پائی لیکن اس کے بعد اس تعداد کو زمین کا اقتدار نہ دیا گیا تھا' صرف یہ ہوا کہ ان فاسقوں سے ان کو نجات ملی۔

یہ دونوں واقعات اللہ کے ارادۂ مطلقہ اور اللہ کی بے قید مشیت کا نمونہ تھے۔اور دعوت اسلامی کے دو نمونے تھے کہ ان کے دو نتائج میں سے کوئی نتیجہ نکلنے کا احتمال ہے۔ہاں ایک تیسرا احتمال بھی ہے جو اصحاب اخدود کو پیش آیا۔یہ واقعات مکہ میں کام کرنے والی مٹھی بھر تحریک اسلامی کو بتائے جا رہے تھے کہ دعوت الی اللہ کو ان میں سے کوئی واقعہ پیش آ سکتا ہے' نہ صرف مکہ میں کام کرنے والے مسلمانوں کو یہ نقشہ دکھایا جارہا تھا بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی۔

آخر میں پردۂ احساس پر دو قوی ضربات لگائی جاتی ہیں' دونوں میں ایک فیصلہ کن بات ہے اور آخری فیصلہ ہے۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ﴿١٩﴾ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ﴿٢٠﴾

"مگر جنھوں نے کفر کیا ہے وہ جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں' حالانکہ اللہ نے ان کو گھیرے میں لے رکھا ہے"۔ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ یہ رات دن جھٹلاتے ہی رہتے ہیں' حالانکہ اللہ نے انھیں گھیر رکھا ہے اور اللہ کا قہر و غضب بھی انہیں گھیرے ہوئے رہے اور اللہ کا علم بھی۔وہ تو ایسے ہیں جیسے ایک عام سیلابی طوفان میں چوہوں کا حال ہوتا ہے۔　ا

ع ۲۲　بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿٢١﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿٢٢﴾

۱۰　"(ان کے جھٹلانے سے اس قرآن کا کچھ نہیں بگڑتا) بلکہ یہ قرآن بلند پایہ ہے اس لوح میں (نقش ہے) جو محفوظ ہے"۔مجید کے معنی ہیں بلند قابل قدر اور گہری اصلیت والا' اللہ کے کلام کے علاوہ یہ صفات کس پر صادق آ سکتی ہیں۔یہ کلام لوح محفوظ میں ہے۔ہمیں معلوم نہیں کہ لوح محفوظ کی نوعیت کیسی ہوگی کیونکہ یہ ایک غیبی معاملہ ہے۔اس کی حقیقت کے بارے میں صرف اللہ جانتا ہے۔ہم تو وہ پرتو جان سکتے ہیں جو اس تعبیر سے ذہن پر پڑتا ہے یا دل جو اشارہ قبول کرتے ہیں اور وہ اشارات یہ ہیں کہ قرآن ایک محفوظ کتاب ہے۔اور ہر معاملے میں اس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہے۔تمام باتیں ختم ہو سکتی ہیں لیکن یہ محفوظ ہے۔یہ بات تو واقعہ اخدود میں کی گئی ہے لیکن تمام معاملات میں قرآن کا فیصلہ آخری فیصلہ ہے۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ الطارق ۔ ۸۶

۱-- تا-- ۱۷

# سورۃ الطارق ایک نظر میں

اس پارے کے ابتدائیہ میں ہم نے بتایا تھا کہ یہ سورت دراصل انسان کے خوابیدہ احساس پر پے درپے شدید ضربات ہیں' شدید ترین ضربات اور ایسی بے ساختہ چیخ و پکار پر مشتمل ہے' جو کسی ایسے شخص کو جگانے کے لیے کی جاتی ہے جو غفلت کی نیند میں غرق ہو' یہ ضربات اور ان کے ساتھ یہ بے ساختہ آوازیں کچھ اس مضمون کی ہیں ۔اٹھو' جاگو' دیکھو' توجہ کرو' غوروفکر کرو' گہری سوچ سے کام لو۔ آخر اس کارخانہ قدرت کا ایک چلانے والا ہے ۔اس کائنات کی پشت پر ایک حکیمانہ قوت کام کر رہی ہے ۔یہ پوری کائنات ایک لگے بندھے ضابطے کے مطابق چل رہی ہے ۔دیکھو اس جہاں میں تمہارا امتحان ہو رہا ہے ۔تم اپنے اقوال و افعال کے ذمہ دار ہو' پوری زندگی کا حساب و کتاب تم نے پیش کرنا ہے ۔ ایک شدید عذاب بھی تیار ہے اور ایک عظیم نعمتوں بھری جنت بھی موجود ہے جس کا ایک عظیم مملکت کی طرح نظام ہے ۔

یہ سورت ان خصوصیات کا نمونہ ہے ۔اس کی ضربات میں اسی طرح شدت ہے جس طرح ان کے مناظر شدید ہیں ۔ موسیقی کا انداز بھی شدید ہے ۔الفاظ کا ترنم بھی شدید ہے' اور معنوی اشارات میں بھی شدت ہے ۔ مثلاً الطارق' الثاقب' الدافق' الرجع اور الصدع کے الفاظ لفظی اور معنوی اور ترنم میں شدت رکھتے ہیں ۔

معنوی سختی کا نمونہ یہ ہے کہ ہر نفس کی نگرانی ہو رہی ہے ۔

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (٨٦ : ٤) ''کوئی جان ایسی نہیں ہے جس کے اوپر کوئی نگہبان نہ ہو''۔اور قیامت کے دن ایسے شدید حالات ہوں گے کہ کسی کے پاس نہ کوئی اپنی طاقت ہوگی اور نہ کوئی مددگار ہوگا۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ (٨٦ : ٩) فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ (٨٦ : ١٠) ''جس روز پوشیدہ اسرار کی جانچ پڑتال ہوگی اس وقت انسان کے پاس نہ خود اپنا کوئی زور ہوگا اور نہ کوئی اس کی مدد کرنے والا ہوگا''۔اور یہ قرآن آخری اور فیصلہ کن بات ہے ۔

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ (١٣) وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (٨٦ : ١٤) ''یہ ایک نپی تلی بات ہے یعنی مذاق نہیں ہے''۔ پھر اس سورہ میں جو دھمکی دی گئی اس میں شدت اور سختی کا انداز شامل ہے ۔

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا (١٥) وَّ اَكِيْدُ كَيْدًا (١٦) فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا (٨٦ : ١٧) ''یہ لوگ کچھ چالیں چل رہے ہیں ۔میں بھی ایک چال چل رہا ہوں' پس چھوڑ دو اے نبیؐ

ان کافروں کو اک ذرا کی ذرا ان کے حال پر"۔

جس طرح ہم نے پارے کے مقدمہ میں کہا تھا اس میں وہ تمام موضوعات پائے جاتے ہیں کہ اس کائنات کا ایک اللہ ہے' یہ کائنات ایک تدبیر اور تقدیر کے مطابق چل رہی ہے۔ یہ زندگی ایک آزمائش ہے' انسان یہاں اپنے افعال و اقوال کا ذمہ دار ہے اور ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ جہاں جزاء و سزا ہوگی وغیرہ وغیرہ۔

جن کائناتی مناظر کو پیش کیا گیا ہے اور جن نظریاتی مقاصد کو پیش کیا گیا ہے ان کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور مطابقت ہے۔ اور اس کی تفصیلی فصاحت اس وقت ہوگی جب ہم قرآن کریم کی آیات بھی بحث کریں گے۔ اپنے انداز بیان کے اعتبار سے قرآن کی آیات تو بے مثال حسن رکھتی ہیں۔

---000---

# درس نمبر ۲۸۶ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۱۷

سُوْرَةُ الطَّارِقِ (۸۶) مَكِّيَّةٌ (۳۶) آیاتها ۱۷ رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴿۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ﴿۲﴾ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ﴿۳﴾ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ﴿۴﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔

"قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی ۔ اور تم کیا جانو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے ؟ چمکتا ہوا تارا ۔ کوئی جان ایسی نہیں ہے جس کے اوپر کوئی نگہبان نہ ہو" ۔

اس قسم میں ایک کائناتی منظر اور ایک ایمانی سچائی کو بیان کیا گیا ہے ۔ آغاز آسمان اور طارق کے ذکر سے ہوتا ہے اور جس طرح قرآن کریم کا انداز بیان ہے 'خود ہی پوچھ لیا جاتا ہے ۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ (۸۶ : ۲) "تم کیا جانو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا طارق کیا ہے" ۔ گویا وہ ایک ایسی چیز ہے کہ انسانی ادراک سے ماوراء ہے ۔ اس کے بعد قرآن مجید خود اس کی تعریف اور وضاحت کرتا ہے کہ وہ اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ (۸۶ : ۳) "چمکتا ہوا تارا" ہے اسے ثاقب اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی شعاعوں کے ذریعہ تاریکیوں کو پھاڑ کر اپنی روشنی زمین پر پھینکتا ہے ۔ اس مفہوم کے اعتبار سے ہر ستارہ نجم ثاقب ہے ۔ اس آیت سے ہم معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ ستارہ کون سا ہے اور نہ اس تعین کی چنداں ضرورت ہے بلکہ اس سے مطلق ستارہ مراد لینا ہی بہتر ہے ۔ اس طرح مفہوم یہ ہو گا "قسم ہے آسمان کی اور اس کے اندر موجود چمکتے ہوئے ستاروں کی جو تاریکیوں کو پھاڑ کر روشنی پہنچاتے ہیں" اور وہ اس روشنی کے ذریعہ اس پردۂ تاریکی کو پھاڑ کر نمودار ہو جاتے ہیں جو دوسری چیزوں کو چھپا لیتا ہے ۔ اسی مفہوم سے سورت کے اندر بیان ہونے والے حقائق اور مفاہیم کی طرف بھی اشارہ ہو گا جیسا کہ آگے تشریح میں آ رہا ہے ۔

جواب قسم یہ ہے کہ ہر نفس کے اوپر اللہ نے اپنے حکم سے ایک نگران مقرر کر رکھا ہے ۔

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ( ٨٦ : ٤ ) "کوئی جان نہیں ہے جس کے اوپر کوئی نگہبان نہ ہو"۔

جن الفاظ اور جس ترکیب میں یہ بات کی گئی ہے وہ سخت تاکیدی اسلوب ہے۔ نفی و اثبات کہ کوئی نفس نہیں ہے مگر اس پر نگراں مقرر ہے۔ جو اس کی نگرانی بھی کرتا ہے اور اس کے اعمال بھی لکھتا ہے۔ اور یہ نگران اس کی حفاظت بھی کرتا ہے اور اس کی تقرری اللہ کے حکم سے ہے۔ ان تمام باتوں کو نفس کی طرف منسوب کیا گیا ہے کیونکہ تمام انسانی راز تمام انسانی افکار' انسانی نفس کے اندر ہوتے ہیں اور یہ نفس ہی سزا و جزا کا ذمہ دار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کو یونہی نہیں چھوڑ دیا گیا کہ شتر بے مہار کی طرح جہاں چاہیں گھومیں پھریں اور ان کا کوئی محافظ اور چرواہا نہ ہو' اور ان کو زمین کی وادیوں میں بغیر نگراں کے چھوڑ دیا گیا ہو' کہ جہاں چاہیں گھومیں اور جہاں چاہیں چریں اور کوئی پوچھنے والا نہ ہو' بلکہ انسانوں کے اعمال کو بڑی دقت کے ساتھ ریکارڈ کیا جا رہا ہے اور یہ ریکارڈ ہر شخص کا براہ راست تیار ہو رہا ہے اور نہایت صفائی کے ساتھ ہو رہا ہے۔

یہ آیت اس بات اور خوفناک حقیقت کو سامنے لاتی ہے کہ انسان چاہے بظاہر اکیلا ہو' اکیلا کسی وقت نہیں ہوتا' جب دنیا میں کوئی بھی دیکھنے والا نہ ہو تو اللہ اور اللہ کا نمایندہ دیکھ رہا ہے اور ریکارڈ کر رہا ہے' اگر کوئی دنیاوی آنکھ اسے نہیں بھی دیکھ رہی اور کسی ستارے کی چمک بھی اس تک نہیں پہنچ رہی تو اللہ کی نظریں اس پر ہیں اور اللہ کا مقرر کردہ نگران ساتھ لگا ہوا ہے۔ اس طرح جس طرح نجم ثاقب کی روشنی تاریکیوں کو پھاڑ پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ کی نگرانی میں بھی کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔ اور اللہ کا مقرر کردہ نگران ساتھ لگا ہوا ہے۔ اس طرح جس طرح نجم ثاقب کی روشنی تاریکیوں کو پھاڑ پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ کی نگرانی میں بھی کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔ اور اللہ کے کمالات یکساں ہیں' وہ جس طرح آفاق میں کام کرتے ہیں اسی طرح انفس میں بھی کرتے ہیں۔

یہ چٹکی جس کے ذریعہ نفس انسانی کے احساس کو بیدار کر کے اسے اس کائنات سے جوڑ دیا گیا' اب ایک دوسری چٹکی کے ذریعہ اللہ کی گہری تدبیر اور اٹل تقدیر کے بارے میں اس کے احساس کو بیدار کیا جاتا ہے۔ آسمانوں اور ستاروں کی قسم اٹھا کر اس گہری تدبیر کی طرف اشارہ تھا۔ اب بتایا جاتا ہے کہ انسان اور زمین اور ستاروں کی بات تو دور کی بات ہے یہ تمہارا انفس بھی کرشمہ قدرت ہے۔ خود انسان کی تخلیق ہی بتاتی ہے کہ یہ انسان شتر بے مہار نہیں ہے اور نہ خودرو ہے۔ اور نہ بے مقصد سلسلہ وجود و عدم ہے۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۞ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۞ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَ التَّرَآئِبِ ۞

"پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے"۔

انسان کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا اور پھر دیکھتے دیکھتے کیا بن گیا۔ ایک ایسے پانی سے اسے پیدا کیا جو اچھل کر جسم انسانی سے نکلتا ہے اور یہ آتا کہاں سے ہے' انسان کی پیٹھ اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے۔

یہ پانی مرد کی ریڑھ کی ہڈیوں سے جمع ہوتا ہے۔ اور عورت کی سینے کی بالائی ہڈیوں سے نکلتا ہے اور اس پانی کا بننا اور اس کا یوں خارج ہونا اللہ کے رازوں میں سے ایک راز تھا جسے انسان ابھی تک نہیں جانتا تھا گزشتہ نصف صدی میں سائنس نے اپنے اسلوب تحقیق کے مطابق اس کے بعض پہلوؤں سے پردہ اٹھایا اور معلوم ہوا کہ انسان کی پیٹھ کی ہڈیوں اور عورت کے سینے کی بالائی ہڈیوں کے اندر عورت کا مادۂ منویہ بنتا ہے اور یہ دونوں مواد جب ایک نہایت ہی محفوظ جگہ میں اکٹھے ہوتے ہیں تو پھر ان سے انسان کی تخلیق ہوتی ہے۔

حقیقت ہے کہ انسان کی ابتدائی پیدائش اور آخری شکل تمام کے درمیان ایک طویل اور خوفناک سفر ہے۔ وہ پانی جو ریڑھ کی ہڈیوں اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے اس کے اور پھر ایک مکمل شکل و صورت کے انسان کے درمیان ایک طویل سفر ہے' جو عقل بھی رکھتا ہے۔ وہ عضوی' اعصابی' عقلی اور نفسیاتی پیچیدہ ترکیب بھی رکھتا ہے۔ یہ سفر جو اچھلتا پانی طے کر کے ایک عاقل و بالغ انسان کی شکل اختیار کر لیتا ہے' اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان سے باہر ایک قوت ہے جو اس مائع پانی کو ایک سمت میں چلاتی ہے' جبکہ ابتدائی حالت میں اس پانی کے اندر نہ قدرت ہے نہ کوئی ہیولا ہے' یہ پانی یہ طویل سفر نہایت ہی عجیب و غریب انداز میں طے کرتا ہے اور اس انجام تک پہنچتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس پر ایک نگران مقرر ہے کہ وہ اس باریک نکتے کی نگرانی کرتا ہے جس کے اندر نہ عقل ہے اور نہ اس کے اندر کوئی ہیولا نظر آتا ہے۔ نہ قوت ہے اور نہ ارادہ ہے اور اس نکتے کے اس طویل سفر میں مسلسل نگران رہتا ہے۔ اس نکتے کے اندر اس قدر عجائب ہیں کہ انسان اپنی شعوری زندگی کے آغاز سے انتہا تک اس قدر عجائب و غرائب نہیں دیکھ سکتا۔

یہ ایک نکتہ نہایت ہی باریک نکتہ ہوتا ہے اور یہ نہایت طاقتور خوردبین سے بھی بمشکل نظر آتا ہے۔ یہ پانی جب ایک بار مرد کی پشت سے اچھل کر نکلتا ہے تو اس کے اندر ایسے کروڑوں نکتے ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک نکتہ اپنے مقام تک پہنچتا ہے۔ یہ حقیقت کہ اس نکتے کی کوئی شکل نہیں ہوتی اس کے اندر عقل نہیں ہوتی' اس کے اندر کوئی قوت نہیں ہوتی' اور کوئی ارادہ نہیں ہوتا' اس وقت معلوم ہو جاتی ہے جب یہ نکتہ رحم مادر میں جا کر ٹھہرتا ہے اور پھر غذا کا متلاشی ہوتا ہے۔ اب دست قدرت اس کی رہنمائی یوں کرتا ہے کہ یہ نکتہ اپنے ارد گرد پائے جانے والے رحم مادر کی دیواروں کو کھانا شروع کر دیتا ہے اور یہ رحم مادر کے اندر اپنے لیے خون کا ایک حوض بنا لیتا ہے۔ یہ خون اس کے لیے غذا کا کام کرتا ہے۔ جونہی اسے اطمینان ہوتا ہے کہ اس کی خوراک کا انتظام ہو گیا ہے۔ یہ ایک نئی کارروائی شروع کرتا ہے۔ اب یہ تقسیم در تقسیم ہونا شروع کرتا ہے۔ اور مسلسل تقسیم ہوتا رہتا ہے۔ یہ سادہ' بے عقل اور بے شکل اور ضعیف و ناتواں اور قوت و ارادے سے محروم خلیے کو معلوم ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کس طرف بڑھنا ہے۔ یہ دست قدرت ہی ہے جو اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کی رہنمائی کرتا ہے اور اسے قوت و ارادہ سے نوازتا ہے کہ اسے کدھر جانا ہے اور کیا شکل اختیار کرنی ہے۔ دست قدرت اسے حکم دیتا ہے کہ وہ اس مسلسل تقسیم کے عمل سے پیدا ہونے والے خلیوں کو اس کام میں لگا دے جس کے لیے انہیں پیدا کیا جا رہا ہے۔ اس عمارت کے جس حصے کے لیے خلیے پیدا ہوتے ہیں وہ اس عضو کی طرف بڑھتے ہیں جبکہ جسم انسانی کی عمارت مجموعی اعتبار سے بے حد پیچیدہ عمارت ہے۔ تقسیم کے عمل سے پیدا ہونے والے یہ خلیے مسلسل چلتے ہیں اور ان اعضا کی شکل میں جمع ہوتے ہیں اور آخر کار یہ عظیم ہیکل تیار ہوتا ہے۔ یہ خلیے انسان کے جسم

کے اندر عضلاتی نظام تیار کرتے ہیں ۔ پھر ان کا ایک گروپ اعصابی نظام تیار کرتا ہے ۔ ان کا ایک گروپ شرائین کا جال بچھاتا ہے ۔ یہ اور اس عمارت کے دوسرے پیچیدہ نظام تیار ہوتے ہیں لیکن یہ تعمیر و تشکیل کا عمل اس قدر سادہ نہیں ہے جس طرح سمجھا جاتا ہے ۔ اس نظام کے اندر نہایت ہی گہری ٹیکنالوجی کام کرتی ہے ۔ ہڈیوں میں سے ہر ہڈی' عضلات میں سے ہر ایک عضلہ اور اعصاب میں سے ہر ایک پٹھا' کسی دوسری ہڈی' پٹھے کے پوری طرح مشابہ اور یکساں نہیں ہے ۔ کوئی پٹھا دوسرے اعصاب کے ساتھ یکساں نہیں ہے کیونکہ یہ عمارت بے حد پیچیدہ ہے ۔ اس کی ساخت بھی نہایت عجیب ہے ۔ ہر ایک کا فعل اور فریضہ الگ ہے ۔ اس لیے ہر خلیہ معلم قدرت سے یہ بات سیکھتا ہے اور اخذ کرتا ہے کہ وہ کس مخصوص عضو کے لیے مخصوص ہے ۔ اور اس نے اس عضو کے اندر پھر کیا ڈیوٹی سرانجام دینی ہے ۔ اس لیے جسم کے اندر جو چھوٹے سے چھوٹا خلیہ بھی حرکت کرتا ہے' معلم قدرت کی رہنمائی میں وہ اپنی راہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس نے کہاں جانا ہے اور اس کی ڈیوٹی کیا ہے اور اس نے کیا کرنا ہے ۔ کوئی ایک خلیہ یا ان کا گروپ بھی کبھی اپنی راہ غلط نہیں کرتا ۔ مثلاً جو خلیے آنکھ بناتے ہیں' ان کو معلوم ہوتا ہے کہ آنکھ سر میں ہوتی ہے ۔ یہ جائز نہیں ہے کہ وہ پیٹ یا پاؤں یا بازوؤں میں آنکھیں بنائیں ۔ حالانکہ اگر اللہ چاہے تو وہ پیٹ' ہاتھ اور پاؤں میں کسی جگہ آنکھ بنا دے ۔ اگر آنکھ بنانے والا پہلا خلیہ ان مقامات کی طرف چلا جائے اور وہاں آنکھ بنا دے تو وہ بنا سکتا ہے لیکن جب آنکھ کا خلیہ سفر کرتا ہے تو وہ اسی مقام کی طرف سفر کرتا ہے جو اس کے لیے اس انسانی پیچیدہ ہیولا کے اندر مخصوص کر دیا گیا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ اس خلیے کو یا ان خلیات کو یہ احکام کون دیتا ہے ۔ کون ہے جس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آنکھ کو اس جگہ ہونا چاہیے اور اس جگہ نہیں ہونا چاہیے ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ۔ یہ اللہ ہی حافظ و برتر ہے جو ان خلیات کی نگرانی کرتا ہے' ان کو ہدایت دیتا ہے' ان کو راہ بتاتا ہے اور ایسی تاریکیوں میں راہ بتاتا ہے جہاں اللہ کے سوا کوئی اور راہ بتانے والا ہوتا ہی نہیں ہے ۔

یہ تمام خلیے' اجتماعی طور پر بھی اور انفرادی طور پر اس فریم ورک کے اندر کام کرتے ہیں جو ان کے لیے ان خلیات کا مجموعی نظم طے کرتا ہے ۔ اس مجموعی نظم میں اس عضو کی شکل بھی ہوتی ہے اور اس کے اندر وراثتی خصوصیات بھی ہوتی ہیں' مثلاً اگر انسان کی آنکھ کے خلیات ہیں تو وہ ایک تو انسانی آنکھ بنائیں گے اور دوسرے یہ کہ اس آنکھ کے اندر اس انسان کے آباء و اجداد کی مخصوص شکل و صورت بھی محفوظ ہوگی ۔ اس نقشے سے معمولی انحراف بھی اس عضو کے نظام کو خراب کر دیتا ہے ۔ تو سوال پھر یہی ہے کہ وہ ہستی کون ہے جس نے خلیات کو یہ قدرت دی اور ان کو ایسا منظم عمل کرنے کا طریقہ سکھایا ۔ حالانکہ یہ ایک سادہ خلیہ ہوتا ہے اور اس میں عقل و ادراک نہیں ہوتا ۔ نہ قوت اور ارادہ ہوتا ہے ۔ اس سوال کا سیدھا سادھا جواب یہی ہے کہ صرف اللہ کی ذات ہے ۔ یہ اللہ ہی ہے جو ان خلیات کو وہ کچھ سکھاتا ہے کہ انسان نہ اس قسم کا نقشہ بنا سکتا ہے ۔ نہ ایک عضو تیار کر سکتا ہے ۔ نہ ہاتھ' نہ آنکھ' نہ ان کا کوئی حصہ ۔ اس کے برعکس ایک سادہ خلیہ یا خلیات کا مجموعہ یہ کام کر دکھاتا ہے' جو نہایت ہی عظیم اور پیچیدہ کام ہے ۔

ایک خلیے سے انسان تک اس سفر کے اس سرسری جائزے کے اندر ایک جہان ہے عجائبات اور انوکھی چیزوں کا' یعنی اچھلتے پانی سے انسان بننے تک کے مراحل میں ۔ اعضاء کا نظام' ان عجائب کی تفصیلات بیان کرنے سے بھی ہم عاجز ہیں ۔ اور نہ ظلال القرآن کے محدود صفحات میں یہ ممکن ہے لیکن یہ سب عجائبات اس بات پر شاہد ناطق ہیں کہ ایک خفیہ دست قدرت ہے جو ان خلیوں سے یہ کام کرواتا ہے ۔ ان حقائق سے ایک تو وہ حقیقت ثابت ہوتی ہے جس پر آسمان اور

الطارق کی قسم اٹھائی گئی ہے اور یہ قسم اور جواب قسم دوسری عظیم حقیقت کے لیے ایک تمہید ہے کہ ان تمام انسانوں نے ' اسی طرح ایک بار پھر خودکار انداز سے اپنی قبروں سے اٹھنا ہے لیکن اس دوسری حقیقت کا مشرکین مکہ انکار کرتے تھے جو قرآن کے اولین مخاطب تھے 'جن کے سامنے یہ سورت سب سے پہلے اتری تھی ۔

إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۝ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ ۝ فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ ۝

" یقیناً وہ (خالق) اسے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے ۔جس روز پوشیدہ اسرار کی جانچ پڑتال ہو گی ' اس وقت انسان کے پاس نہ خود اپنا کوئی زور ہو گا اور نہ کوئی اس کی مدد کرنے والا ہو گا" ۔

یہ اللہ ہی ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کی نگہداشت کی ۔ لہٰذا اس پر قادر ہے کہ موت کے بعد اسے زندگی بخشے اور مرکر مٹی میں مل جانے کے بعد اسے حیات جدید دے ۔ اللہ کی پہلی تخلیق جس کا اوپر ذکر ہوا' یہ شہادت دے رہی ہے کہ وہ دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے ۔ پہلی زندگی اللہ کی تدبیر اور اللہ کی قدرت پر شاہد عادل ہے کیونکہ پہلی تخلیق میں نہایت حکیمانہ ٹیکنالوجی پوشیدہ ہے ۔ اگر انسان کو دوبارہ زندہ کرنے اور حساب و کتاب لینے کو تسلیم نہ کیا جائے تو پہلی تخلیق کا پورا انظام عبث ہو جائے گا۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ (۸۶ : ۹) "جس دن پوشیدہ اسرار کی جانچ پڑتال ہو گی"۔ جب چھپے ہوئے راز کھلیں گے اور وہ پردے جن کی تہوں میں راز پوشیدہ ہوں گے ہٹ جائیں گے ' ان رازوں کی جانچ ہو گی وہ ظاہر اور کھلے ہوں گے اور راز نہ رہیں گے 'جس طرح چمکتا ہوا تارہ اندھیروں سے نمودار ہوتا ہے اور جس طرح نفس انسانی پردوں کے اندر ملفوف ہوتا ہے اور اس کا حافظ اس کی ہربات جانتا ہے تو جس دن انسان کے پاس نہ قوت ہو گی اور نہ اس کا کوئی مددگار ہو گا' اس دن سب کچھ سامنے آجائے گا۔

فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ (۸۶ : ۱۰) "اس وقت نہ انسان کے پاس اپنا زور ہو گا اور نہ کوئی اس کی مدد کرنے والا ہو گا" ۔ یعنی نہ ذاتی قوت ہو گی اور نہ خارج سے کوئی امداد ملے گی ۔ اور کوئی بات پوشیدہ بھی نہ رہے گی اور انسان کی تمام کمزوریاں ظاہر ہو جائیں گی تو یہ بہت ہی سخت گھڑی ہو گی ۔ ایسے حالات کا احساس انسان پر گہرا اثر ڈالتا ہے ' کہ یہ کائنات ' پھر نفس انسانی ' پھر تخلیق انسانی کے مختلف مدارج اور آخر کار قیامت کے دن انسان کی بے بسی کہ جب تمام راز کھل جائیں گے ' اور تمام قوتیں اور سہارے ختم ہوں گے ۔

شاید اب بھی کسی قدر شک باقی رہ گیا ہے ۔ نفس انسانی کے اندر کچھ خلجان موجود ہے اور بعض اوقات نہایت ہی موثر کلام اور اٹل دلائل کے بعد بھی انسان کے شبہات رہتے ہیں ۔ اس لیے پھر تاکیدی قسموں کے بعد جتایا جاتا ہے کہ یہ ایک فیصلہ کن بات ہے اور یہاں بھی اس قرآن اور کائنات کے درمیان ربط پیدا کر کے بات کی جاتی ہے جس طرح آغاز سورت میں کیا گیا۔

وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجۡعِ ﴿۱۱﴾ وَ الۡاَرۡضِ ذَاتِ الصَّدۡعِ ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ ﴿۱۳﴾ وَّ مَا هُوَ بِالۡهَزۡلِ ﴿۱۴﴾

"قسم ہے بارش برسانے والے آسمان کی اور (نباتات اگتے وقت) پھٹ جانے والی زمین کی' یہ ایک جچی تلی بات ہے' ہنسی مذاق نہیں ہے"۔

الرجع کے معنی ہیں لوٹنے کے' آسمان بار بار بارش برساتا ہے اور الصدع کے معنی پھٹنے کے ہیں اور بارش کے بعد جب زمین سے نباتات اگتے ہیں تو وہ پھٹتی ہے اور اس سے پودے پھوٹتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں زندگی کی ایک قسم کا اظہار کرتی ہیں۔ یعنی نباتات اور ان کی پہلی زندگی کہ آسمانوں سے پانی برستا ہے اور پھر نباتات اگتے ہیں۔ یہ تمثیل اس سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے کہ نطفے کا پانی اچھل کر برسے' اور آسمان کے بجائے ریڑھ اور سینے کی ہڈیوں سے نکلے اور رحم کے اندھیروں سے بچہ نمودار ہو۔ گویا ایک ہی زندگی ہے اور ایک ہی منظر ہے' ایک ہی قسم کی حرکت' ایک ہی نظام اور ایک ہی قسم کی تخلیق ہے اور دونوں سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں کا صانع ایک ہے۔ اور کوئی معقول انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا ہے کہ وہ ایسی کوئی تخلیق کر سکتا ہے اور ان تخلیقات کے ہم شکل کوئی مخلوق بنا سکتا ہے۔

یہ منظر چمکتے ہوئے ستارے کے منظر کے بھی ہم رنگ ہے۔ ایسے ستارے کی روشنی بھی ظلمتوں کے پردے پھاڑ کر سامنے آتی ہے اور جس طرح یہ روشنی نمودار ہوتی ہے اس طرح چھپے ہوئے راز بھی نمودار ہوں گے گویا یہ مناظر بھی ہم رنگ ہیں۔ اور ان سے بھی ایک ہی صانع کی قدرت کا پتہ چلتا ہے۔

یہ دو کائناتی مخلوقات ہیں جن کی قسم اٹھائی جا رہی ہے یا کائناتی حادثات ہیں جن کی قسم اٹھائی جا رہی ہے آسمان جو بار بار بارش برساتا ہے اور زمین جو نباتات کے اگنے کی وجہ سے بار بار پھٹتی ہے۔ ان دونوں واقعات یا حادثات کا منظر' اس منظر کے اندر پوشیدہ اشارات اور خود ان الفاظ صدع اور رجع کی قطعیت اور سختی اور پھر ان کے ساتھ اللہ کی قسم اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ دوبارہ زندگی اور باز پرس قطعی بات ہے۔ مذاق نہیں ہے۔ یا یہ کہ یہ پورا قرآن مجید ایک قطعی بات کرتا ہے اور اس کے اندر کوئی بات محض بات کے لیے نہیں کی گئی۔ اس میں جو تصورات بیان کیے گئے ہیں وہ فیصلہ کن خیالات اور نظریات ہیں اور وہ حق اور سچائی ہیں جن کے اندر کوئی شبہ اور شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ آخری بات ہے' اللہ کا آخری کلام ہے۔ اس کے بعد کوئی کلام نہیں ہے۔ اور اس کے حقائق میں کوئی کلام نہیں ہے۔ اور زمین و آسمان اس پر شاہد عادل ہیں خصوصاً بارش برسانے والا آسمان اور فصلیں اگانے والی زمین۔

ان حقائق کے بیان کے سایہ میں' کہ تمام انسانوں کو اٹھایا جائے گا اور ان سے باز پرس ہوگی' روئے سخن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس مٹھی بھر جماعت کی طرف پھر جاتا ہے جو مکہ مکرمہ میں نہایت ہی کٹھن حالات سے گزر رہے تھے۔ اور ان کے خلاف اور ان کی دعوت اور تحریک کے خلاف رات دن کی سازشیں ہو رہی تھیں۔ اور اس کام کے لیے یہ ہر وقت گھات میں بیٹھے رہتے تھے' اور اسلامی تحریک کے مقابلے میں مختلف تدابیر اختیار کرتے تھے اور دعوت اسلامی کے پھیلنے کے راستے بند کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ نئے نئے ہتھکنڈے استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کو تلقین کی جاتی ہے کہ آپ ثابت قدم رہیں اور ان لوگوں کی سازشوں کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ ایک وقت تک یہ مخالفت ہو گی اور آخر کار کامیابی آپ کے قدم چومے گی' اس دعوت کی قیادت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ صبر اور اطمینان سے کام جاری رکھیں۔ اللہ خود تدابیر اختیار کر رہا ہے۔

إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ﴿١٥﴾ وَأَكِيدُ كَيْدًا ﴿١٦﴾ فَمَهِّلِ الْكَافِرِينَ
ع ۱۷ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿١٧﴾
۱۱

"یہ لوگ (یعنی کفار مکہ) کچھ چالیں چل رہے ہیں اور میں بھی ایک چال چل رہا ہوں۔ پس چھوڑ دو اے نبیؐ ان کافروں کو اک ذرا کی ذرا ان کے حال پر چھوڑ دو"۔

ان لوگوں کی حقیقت تو ہم نے بھی بتا دی ہے' یہ ایک اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیے گئے ہیں جو والد کی پیٹھ اور والدہ کے سینے سے نکلتا ہے۔ ابتدائی طور پر اس پانی میں نہ طاقت تھی' نہ قوت اور نہ ارادہ۔ نہ علم اور نہ ہدایت۔ ان لوگوں کو تو دست قدرت اس طویل طریقے سے وجود میں لائی ہے اور ایک دن دوبارہ ان کو اسی طرح پیدا کیا جائے گا اور ان کے تمام راز کھل جائیں گے اور یہ پھر اسی طرح بے بس اور بے کس ہوں گے۔ یہ لوگ اللہ کی تحریک کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں؟ میں ان کا خالق' ہدایت دینے والا' حفاظت کرنے والا' پیدا کرنے والا' مارنے والا اور دوبارہ لوٹانے والا ہوں' ان کو میں نے اس امتحان میں ڈالا ہوا ہے۔ میں قادر اور قاہر ہوں اور آسمانوں پر چمکتے ستاروں کا پیدا کرنے والا ہوں۔ جس پانی سے وہ پیدا ہوئے ہیں اور اسے ایک بولنے اور سوچنے والا انسان بنایا' اللہ ہی نے یہ آسمان بنایا ہے جو بارش برساتا ہے اور اس میں نباتات پیدا کرتا ہے۔ یہ کام کرنے والا میں ہوں اور میں بھی ان کی تدابیر کے مقابلے میں تدابیر کرتا ہوں۔

اب ایک طرف ان لوگوں کی سازشیں ہیں اور دوسری طرف اللہ کی تدابیر ہیں' حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے' اس جنگ کا درحقیقت ایک ہی فریق ہے' دوسرا فریق جو بظاہر نظر آتا ہے وہ محض مذاق کے لیے ہے۔

فَمَهِّلِ الْكَافِرِينَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا (۸۶:۱۷) "پس چھوڑ دو' اے نبیؐ' ان کافروں کو' ان کو تھوڑی سی مہلت دے دو"۔ جلدی نہ کرو' اس معرکے کا انجام دور نہیں ہے۔ آپؐ نے اس معرکے کی حقیقت کو دیکھ لیا ہے' ان لوگوں کو ذرا سی مہلت بھی ایک بڑی حکمت کے تحت دی جا رہی ہے' اور یہ مہلت قلیل ہی ہے۔ اگرچہ تمہاری پوری زندگی اس میں لگ جائے اس لیے انسانوں کو جو عمر اس دنیا کے لیے دی گئی ہے' وہ تو قلیل ہی ہے۔

انداز تعبیر محبت بھرا ہے' اللہ تعالیٰ رسول اللہؐ سے فرماتا ہے کہ آپ ان کو مہلت دے دیں۔

فَمَهِّلِ الْكَافِرِينَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا (۸۶:۱۷) "آپ ان کافروں کو مہلت دے دیں ایک تھوڑے وقت کے لیے"۔ گویا اختیارات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہیں۔ گویا مہلت دینا آپؐ کے اختیارات میں ہے حالانکہ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے' یہ ایک انداز محبت ہے۔ اور اس انداز

سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رحمت و شفقت کے جھونکے محسوس کرتے ہیں ۔ اور آپ کی یہ خواہش کہ فوری کامیابی ہو' اس فضا میں ڈوب جاتی ہے' یوں اللہ آپ کے ارادے کو اپنے ارادے میں ملا دیتا ہے اور بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاید آپ اختیارات میں شریک ہیں' یوں آپ کے سامنے سے وہ پردے ہٹ جاتے ہیں اور آپ اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں قطعی فیصلے ہوتے ہیں ۔ گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ اختیارات آپ کے ہاتھ میں ہیں لیکن آپ قدرے مہلت دے دیں ۔ یہ انداز محبت ہے ۔ نہایت ہی لطیف انداز انس و محبت ۔ ایسے انداز گفتگو سے وہ تمام کلفتیں دور ہو جاتی ہیں جو اس راہ میں آپ کو پیش آ رہی تھیں ۔ تمام تھکاوٹیں' تمام مشکلات دور ہو جاتی ہیں' مشکلات اور مشقتوں کے پہاڑ پگھل جاتے ہیں اور فضا پر انس و محبت کے سائے چھا جاتے ہیں ۔

--- ○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ الاعلیٰ ـ ۸۷

۱-- تا-- ۱۹

# سورۃ الاعلیٰ ایک نظر میں

امام احمد نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سورہ۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى (۸۷: ۱) کو بہت پسند فرماتے تھے۔ اور امام مسلم کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نماز میں اور جمعہ کی نماز میں یہ سورت اور سورت هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ (۸۸: ۱) پڑھتے تھے۔ کئی بار عید اور جمعہ ایک ہی دن آئے تو بھی آپؐ نے ان کو پڑھا۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق تھا کہ آپؐ اس سورت سے محبت رکھتے کیونکہ یہ سورت اس پوری کائنات کو ایک عبادت خانہ بناتی ہے جس کی تمام مخلوق رسول اللہ کے ہمرکاب ہے اور اللہ کی تسبیح اور ثنا میں مصروف ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى (۱) الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى (۲) وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى (۳) وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى (٤) فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى (٥) (۸۷: ۱ تا ۵) "(اے نبیؐ) اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا، جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی، جس نے نباتات اگائیں پھر ان کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا"۔ سورت کا انداز نرم ہے، اللہ کی تسبیح و ثنا کی گونج دور تک سنائی دیتی ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بجا طور پر اس سورت کو پسند کیا، اس سورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خوشخبریوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ آپؐ کو تبلیغ اور یاد دہانی کرانے کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے:

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى (٦) اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى (۷) وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى (۸) فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (۹) (۸۷: ٦ تا ۹) "ہم تمہیں پڑھوا دیں گے، پھر تم نہیں بھولو گے سوائے اس کے جو اللہ چاہے، وہ ظاہر کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ پوشیدہ ہے اس کو بھی۔ اور ہم تمہیں آسان طریقے کی سہولت دیتے ہیں، لہٰذا تم نصیحت کرو اگر نصیحت نافع ہو"۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ ذمہ داری لیتا ہے کہ وہ آپؐ کے قلب مبارک میں قرآن کو بٹھا دے گا اور اس طرح آپؐ حفظ کرنے کی مشقت سے بے فکر ہو جائیں گے۔ پھر اللہ وعدہ فرماتا ہے کہ ہم آسان طریقوں کی رہنمائی کریں گے۔ تمام معاملات میں، اور خصوصاً دعوت اسلامی کے معاملات میں اور یہ ایک عظیم بات ہے۔

کیوں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت سے محبت کرتے؟ اس لیے کہ اس میں اسلامی تصور حیات کے

تمام بنیادی قواعد ثبت کر دیئے گئے ہیں ۔ عقیدہ توحید اس میں مذکور ہے ' وحی الہی کی بات اس میں آگئی ہے ' آخرت کی جزا و سزا کا ذکر بھی آگیا ہے ' یہ سب باتیں اسلامی ایمانیات کے بنیادی اجزاء ہیں ۔ پھر ان عقائد اور نظریات کو انسانی تاریخ میں دور تک پھیلا دیا گیا ہے 'کہ یہی باتیں تمام نبیوں نے کی ہیں ۔

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی (۱۸) صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰی (۸۷:۱۹)

''یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی ' ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں''۔ اس کے علاوہ سورت اسلامی نظریہ حیات کا جو مزاج متعین کرتی ہے ' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو طریقہ کار بتلاتی ہے اور امت مسلمہ کا جو رویہ دکھاتی ہے ' وہ سب ایسے ہیں کہ نرمی ' رواداری ان کی نمایاں خصوصیات ہیں ۔ ان سب امور کے بیان کے ضمن میں پھر نہایت ہی مختلف ہدایات و اشارات ہیں جن کی تشریح اپنی جگہ آئے گی ۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۲۸۷ تشریح آیات

## ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۹

سُورَةُ الْأَعْلٰى مَكِّيَّةٌ (۸) آیاتها ۱۹ رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ﴿١﴾ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى ﴿٢﴾ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى ﴿٣﴾ وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَى ﴿٤﴾ فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَحْوَى ﴿٥﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"(اے نبیؐ) اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا' جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی' جس نے نباتات اگائیں پھر ان کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا"۔

سورت کا آغاز نہایت ہی نرم اور نہایت لمبے آہنگ سے ہوتا ہے' اس لمبے ٹون کے ذریعہ فضا میں تسبیح کی خوشگوار اور خوشبودار آواز بکھیر دی گئی ہے۔ اس کے بعد پھر تسبیح کا حکم اور پھر وہ صفات جن کو تسبیح کے بعد لایا گیا ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى (١) الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى (٢) وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى (٣) وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَى (٤) فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَحْوَى (٥) (٨٧: ١ تا ٥) "(اے نبیؐ) اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو' جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا' جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی' جس نے نباتات اگائیں پھر ان کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا"۔ تاکہ اس تسبیح کے ذریعہ اس پوری کائنات کے اطراف و اکناف میں تسبیح کی یہ آواز گونج اٹھے اور پوری کائنات ایک معبد نظر آئے اور ایک عبادت گاہ کے ساتھ ساتھ یہ پوری کائنات صانع قدرت کی مصنوعات کی نمائش گاہ بھی بن جائے۔

الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى (٢) وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى (٨٧: ٣) "وہ جس نے پیدا کیا اور ہر چیز کو متناسب بنایا اور ہر چیز کی تقدیر بنا کر اسے ہدایت بخشی"۔

تسبیح کے کیا معنی ہیں۔ اللہ کی برتری ذہن میں بسانا' اللہ کو ہر عیب سے پاک سمجھنا اور ذہن میں اللہ کی صفات حسنیٰ کا استحضار اور ان چیزوں کی روشنی' چمک اور نورانیت سے اپنے ذوق و وجدان اور قلب و شعور کو روشن رکھنا' نام ہے تسبیح کا۔ محض زبان سے سبحان اللہ جپنے کو تسبیح نہیں کہتے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى (۸۷: ۱) "اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو"۔ یہ الفاظ انسانی وجدان اور شعور پر ایک حالت طاری کر دیتے ہیں۔ یہ وجدانی حالت ایسی ہوتی ہے جس کا اظہار الفاظ کے اندر ممکن نہیں ہے۔ یہ تو ایک وجدانی اور ذوقی چیز ہے اور ایک ایسی زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کا تعلق کچھ معانی اور کچھ صفات کے استحضار سے ہے نہ کہ کچھ الفاظ رٹنے سے۔

یہ معانی و صفات کیا ہیں؟ پہلی صفت 'صفت ربوبیت ہے۔ اور دوسری صفت اعلیٰ ہے۔ رب کے معنی مربی' نگران اور پالنے والے کے ہیں۔ ان صفات کے سائے اور پرتو اس سورت کی فضا اور اس کے اندر بیان کی جانے والی خوشخبریوں کے ساتھ ہم آہنگ ہیں' خصوصاً اس کے نرم انداز کے ساتھ۔ صفت اعلیٰ پردہ شعور پر ایسی تصاویر لاتی ہے جن سے علو' برتری اور غیر متناہی اور غیر محدود آفاق کا اظہار ہوتا ہے۔ انسانی روح دور تک تسبحات کرتی ہے اور اس تصور علو سے تسبیح میں پاکی اور عظمت کے ساتھ مناسبت پیدا ہوتی ہے اور تسبیح اپنے بنیادی عناصر کے اعتبار سے تصور علو رب کا نام ہے۔

ابتدائی خطاب ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے' اور یہ براہ راست اللہ کی طرف سے آپؐ کو خطاب ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اس حکم ربی کو پڑھتے تھے۔

سَبِّحِ "پاکی بیان کرو" تو اگلی آیات پڑھنے سے پہلے آپؐ اس حکم پر عمل کر لیتے اور آپؐ فرماتے۔

سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلَى "میں اپنے رب اعلیٰ کی پاکی بیان کرتا ہوں"۔ یوں حکم اور جواب حکم یا تعمیل حکم ہو جاتا۔ امر کی اطاعت ہو جاتی اور اللہ کے ساتھ مناجات اور سوال و جواب ہو جاتا۔ کیونکہ حضورؐ رب کے سامنے کھڑے ہوتے۔ براہ راست یہ کلام رب تعالیٰ سے لے رہے ہوتے تھے اور اس اتصال اور قرب کی حالت میں جواب دے دیتے۔ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ یہ تسبیح سجدے میں پڑھا کرو۔

(اجعلوا في سجودكم) اور اس سے قبل جب یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ "اپنے رب عظیم کے نام کا تسبیح کرو"۔ تو آپ نے حکم دیا کہ اس کو رکوع میں پڑھو چنانچہ رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ پڑھنا شروع کیا گیا۔ پس رکوع و سجود کی یہ تسبیح ایک زندہ تسبیح ہے' محض مردہ کلمات نہیں جس طرح ایک زندہ چیز کا جسم حیات اور زندگی سے گرم ہوتا ہے ایسی ہی تسبیح نماز میں مطلوب ہے تاکہ اس تسبیح سے براہ راست حکم خداوندی کی تعمیل ہو جائے یا بالفاظ دیگر اجازت خداوندی کی تعمیل ہو' کیونکہ اللہ کا اپنے بندوں کو یہ اجازت دینا کہ اس کی حمد و ثنا کرو' یہ بھی اللہ کا فضل و کرم ہے۔ کیونکہ اس طرح انسان کو یہ اجازت ملتی ہے کہ وہ اپنے حد تصور کے مطابق اللہ کے قریب ہو جائے۔ کیونکہ انسان اللہ کی ثنا اللہ کی ذات و صفات میں اپنے محدود تصور کے

مطابق ہی کر سکتا ہے۔ اور یہ اللہ کے فضل و کرم کی ایک شکل ہے کہ اللہ اپنی ذات کی معرفت اپنے بندوں کو اپنی صفات کے ذریعہ کرواتا ہے۔ ایسی حدود میں کہ جن کے اندر وہ اللہ کی معرفت کا تصور کر سکتے ہیں۔ اللہ اپنی ذات تک پہنچنے کے لیے اپنے بندوں کو جس شکل و صورت میں بھی اجازت دیتا ہے' یہ ان پر فضل و کرم کی ایک صورت ہوتی ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى (١) الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى (٢) وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى (٣) (٨٧: ١ تا ٣) "اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو' جس نے پیدا کیا' اور تناسب قائم کیا' جس نے تقدیر بنائی' پھر راہ دکھائی"۔ یعنی ہر چیز کو پیدا کیا اور نہایت مناسب شکل میں پیدا کیا اور اس تخلیق کے ہر پہلو کو کامل بنایا۔ اس حد تک کامل کہ کوئی اس میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی فلاں چیز اس کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اللہ نے تقدیر یوں بنائی کہ ہر چیز کے لیے اس کا فرض منصبی مقرر کر دیا اور اس کا مقصد تخلیق اور اس مقصد کو پورا کرنے کا طریقہ بھی اسے سمجھا دیا۔ ہر چیز کو عجیب الہامی انداز میں یہ تعلیم دی گئی۔ ہر چیز کو یہ شعور بھی بذریعہ الہام دے دیا کہ اس کی مقررہ زندگی کے لیے اس کو کس کس چیز کی ضرورت ہے۔

یہ ایک عظیم حقیقت ہے اور اس کائنات کی جس چیز کا تجزیہ کیا جائے اس کے اندر یہ حقیقت موجود ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات کی ہر چیز میں' خواہ بڑی ہو یا چھوٹی ہو' اہم ہو یا حقیر ہو' ہر چیز کی تخلیق میں تسویہ اور تناسب موجود ہے۔ ہر چیز کامل الخلقت ہے اور ہر چیز کی تخلیق کا ایک مقصد ہے اور وہ مقصد اس کی تقدیر ہے' اور ہر چیز کو اللہ نے اپنا مقصد وجود پورا کرنے کے لیے نہایت ہی آسان طریقہ کار فراہم کر دیا ہے۔ غرض اللہ کی ہر مخلوق مکمل اور متناسب ہے۔ اور ہر چیز اپنا انفرادی فریضہ ادا کرتی ہے۔

مثلاً ایٹم ایک اکیلا ایٹم' پروٹون اور الیکٹرون کی برقی رفتار کے اندر اسی قدر توازن رکھتا ہے جس طرح ایک کہکشاں اپنے سورج اور اس کے تابع ستاروں کے درمیان توازن رکھتی ہے۔ ایک ایٹم اپنے مقصد اور فریضے کو اسی طرح پورا کرتا ہے جس طرح ایک کہکشاں پورا کرتی ہے۔ دونوں کو اپنا مقصد اور طریقہ حصول مقصد معلوم ہوتا ہے۔

ایک منفرد خلیہ ایک مکمل تخلیق ہے۔ اور اس کے اندر اپنا مقصد تخلیق پورا کرنے کی پوری استعداد ہوتی ہے اور وہ اپنا مقصد اسی طرح پورا کرتا ہے جس طرح کوئی اعلیٰ مرکب اور پیچیدہ مخلوق کرتی ہے۔

پھر ایک منفرد ایٹم اور کسی کہکشاں کے درمیانی درجات پر الگ الگ مخلوق ہے۔ جس طرح ایک منفرد خلیہ اور پیچیدہ ترین مخلوقات کے درمیان زندہ مخلوقات کے مختلف درجے اور ان کی تنظیم ہے۔ اور ہر درجے اور ہر تنظیم کی تخلیق میں کمال اور تسویہ ہے اور ہر ایک کے لیے انفرادی فرائض اور اجتماعی مقاصد ہیں۔ دست قدرت الہامی طریقے سے ان سے یہ کام کراتا ہے اور اس گہری حقیقت یعنی تخلیق و تسویہ کا یہ کام پوری کائنات پر شاہد عادل ہے۔

اس حقیقت کو انسانی قلب پا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس کائنات کے اشارات اخذ کرنے کے لیے تیار ہو اور کھلے دل سے وہ اس کائنات کی موجودات پر غور کرے۔ انسان کا اکتسابی علم جس درجے کا بھی ہو اور وہ ترقی یافتہ معاشرے کا فرد ہو یا پسماندہ معاشرے کا فرد ہو وہ کائنات کی ان اشیاء سے یہ الہامی اشارات اخذ کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کے دل و دماغ کے دریچے بھی ان اشارات کو پانے کے لیے تیار ہوں اور کھلے ہوں اور کسی عقل و خرد کے تار اس قابل ہوں کہ وہ مضراب

حقیقت کے جواب میں نغمہ بار ہو سکیں۔

اس کے بعد کائنات کا مشاہدہ اور کسبی علم آتے ہیں اور انسان مطالعہ فطرت میں پہلی نظر سے جو الہام پاتا ہے' تمام مشاہدات اس کی تائید کرتے ہیں' بعض لوگوں نے مشاہدہ کائنات کے ذریعہ ایسے اشارات جمع کیے ہیں جو اس کائنات کے اندر پوشیدہ مجموعی حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

نیویارک کی سائنسی علوم کی اکیڈمی کے صدر کریسی موریسن اپنی کتاب "انسان اکیلا نہیں کھڑا" میں اپنے مشاہدات یوں قلم بند کرتے ہیں۔

"پرندوں میں وطن لوٹنے کا ایک ملکہ ہوتا ہے' ایک خاص چڑیا جو دروازوں پر گھونسلے بناتی ہے' خزاں کے موسم میں جنوب کی طرف ہجرت کر جاتی ہے اور اگلے سال بہار میں اپنے اسی مقام کی طرف لوٹ آتی ہے۔ ستمبر کے مہینے میں امریکہ کے اکثر پرندے جنوب کی طرف جاتے ہیں اور وہ سمندروں اور صحراؤں پر سے پرواز کرتے ہوئے ہزاروں میل سفر کرتے ہیں اور کبھی اپنا راستہ نہیں بھولتے۔ اور پیغام رساں کبوتر پنجرے میں طویل سفر کرتے ہیں اور جب ان کو پیغام دے کر چھوڑا جاتا ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حیران ہو کر چکر لگاتے ہیں اور اس کے بعد وہ سیدھے اپنے وطن کی طرف پرواز کرتے ہیں اور کبھی راہ نہیں بھٹکتے۔ شہد کی مکھی اگر کسی طرف جائے اور اس کے پیچھے نشانات راہ کسی طوفان کی وجہ سے مٹ جائیں تو بھی وہ راہ نہیں بھولتی اور سیدھی چھتے پر آ جاتی ہے۔ البتہ انسان کے اندر یہ جبلت کمزور ہے اور انسان اس کی کو اپنے آلات اور عقل کے ذریعہ پوری کر دیتا ہے۔ باریک کیڑے مکوڑے بھی نہایت ہی چھوٹی اور خوردبینی آنکھیں رکھتے ہیں اور یہ نہایت ہی مکمل آنکھیں ہوتی ہیں۔ باز اور عقاب وغیرہ کی آنکھیں دوربین کی طرح ہوتی ہیں' انسانی آنکھ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کی کو بھی انسانی عقل و تجربہ نے پورا کیا ہے۔ چنانچہ ان دوربینوں کے ذریعہ انسان سحابیوں کو دیکھ لیتا ہے اور اس نے ان کے دیکھنے کے لیے انسانی نظر کو بیس لاکھ گنا تیز کیا۔ نیز انسان نے ایسی خوردبینیں ایجاد کیں جن کے ذریعے وہ بیکٹریا اور دوسرے نہ نظر آنے والے کیڑے مکوڑے دیکھتا ہے۔

اب ذرا تم اپنے بوڑھے گھوڑے کو راستہ پر چھوڑ دو۔ جس قدر اندھیرا بھی ہو وہ راستہ نہ بھولے گا۔ وہ سخت تاریکی میں بھی دیکھ سکتا ہے اگرچہ بہت واضح نہ سہی۔ وہ راستہ میں اور اس کے دونوں جانب درجہ حرارت کو بھی دیکھ سکتا ہے۔ یہ درجہ حرارت اس کی آنکھیں انفراریڈ شعاعوں کے ذریعہ معلوم کر لیتی ہیں۔ الو ایک گرم چوہے کو سرد گھاس کے نیچے چلتا پھرتا دیکھ لیتا ہے اگرچہ سخت اندھیرا ہو اور انسانوں نے تو بجلی کے قمقموں کے ذریعہ تاریک رات کو دن بنا دیا ہے"۔

"شہد کی مکھیوں کی دنیا بھی عجیب ہے۔ کارکن مکھیاں چھتے میں مختلف قسم کے کمرے بناتی ہیں۔ یہ تربیت کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ چھوٹے کمرے کارکنوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور بڑے کمرے مردوں کے لیے اور ملکہ کے لیے خاص کمرے تیار ہوتے ہیں۔ یہ ملکہ مکھی جب غیر بار آور انڈہ دیتی ہے تو اسے مردوں کے کمرے میں رکھ دیتی ہے اور جب بار آور انڈہ دیتی ہے تو اسے اس کمرے میں رکھ دیتی ہے جس میں مونث کارکن مکھیاں ہوتی ہیں جو آگے جا کر ملکہ مکھی بننے والی ہوتی ہیں اور وہ کارکن مکھیاں جو مزدور ہوتی ہیں جب وہ ایک طویل عرصہ تک نسل تیار کرنے کا کام کر لیتی ہیں تو ان کو بدل دیا جاتا ہے۔ یہ کارکن مکھیاں بچوں کے لیے غذا تیار کرنے کا کام بھی کرتی ہیں۔ یہ شہد اور پھولوں کو چبا کر ہضم کے قابل بناتی ہیں' اور بچوں کے اندر نر اور مادے کا ظہور ہو جاتا ہے تو پھر یہ مذکورہ بالا طریقے سے غذا ہضم کے لیے

تیار کرنے کا عمل ترک کر دیتی ہیں ۔ اس کے بعد ان کو شہد اور پھولوں کا بور دیا جاتا ہے اور بچوں میں سے جو مونث اس طریقے سے تربیت پاتی ہیں وہ بعد میں کارکن مکھیاں بن جاتی ہیں"۔

جو مونث مکھیاں ملکہ مکھیوں کے حجروں میں ہوتی ہیں 'تو ان کو شہد اور پھولوں کے بورے کو ابتدائی طور پر قابل ہضم بنا کر غذا دینے کا سلسلہ جاری رکھا جاتا ہے 'اور جن مونث مکھیوں سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے بعد میں وہ ملکہ مکھی بن جاتی ہیں ۔ صرف یہ ملکہ ہی ایسے انڈے دیتی ہیں جو بار آور ہوتے ہیں ۔ اس ٹیکنالوجی کے مطابق جو بچے پیدا ہوتے ہیں ان کے لیے خاص قسم کے حجروں' ایک خاص قسم کے انڈوں اور ایک خاص قسم کی غذا کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اور غذا کے اندر تبدیلی کا اثر بھی عجیب ہوتا ہے ۔ اس قسم کی ٹیکنالوجی کے لیے مکھیوں کو ایک طویل عرصہ تک انتظار کی ضرورت پڑی ہوگی جنہوں نے ان اصولوں کے اندر تمیز کر کے ان کو نافذ کیا ہو گا اور غذا کے اثرات معلوم کیے ہوں گے ۔ اور ان اثرات کو اجتماعی طور پر نافذ کیا ہو گا جو ان کے وجود کے لیے ضروری ہو گا ۔ مکھیوں نے جب اجتماعی زندگی کا آغاز کیا ہو گا تب ان کو یہ اصول معلوم ہوئے ہوں گے 'کیونکہ مکھی کے وجود اور زندگی کی بقا کے لیے ان اصولوں کی دریافت ضروری نہ تھی ۔ لہذا معلوم ہوتا ہے کہ شہد کی مکھی نے غذا کے اثرات کے سلسلے میں انسان سے زیادہ تحقیق کی ہے"۔ (۱)

"کتے کو ایک اضافی ناک دی گئی ہے جس کے ذریعہ وہ تمام جانوروں کی بو سونگھ لیتا ہے جو کسی راستے سے گزرے ہوں' انسان کی قوت شامہ کتوں کے مقابلے میں کمزور ہے اور آج تک انسان نے کوئی ایسا آلہ بھی ایجاد نہیں کیا جو اس کی قوت شامہ کو ترقی دے 'لیکن ہماری یہ کمزور قوت شامہ بھی اس قدر چھوٹے ذرات کو محسوس کر لیتی ہے جیسے مائیکروسکوپ کے ذریعہ ہی دیکھا جا سکتا ہے ۔

اکثر حیوانات ایسی آوازیں سن لیتے ہیں جو ہمارے کانوں کے پردوں کے اندر ارتعاش پیدا نہیں کر سکتے 'کیونکہ یہ ہماری سماعت کی حد سے بہت ہی رقیق اور باریک ہوتے ہیں ۔ انسان نے ایسے آلات ایجاد کر لیے ہیں کہ وہ کئی میل دور اڑنے والی مکھی کے پروں کی آواز بھی سن لے 'اس طرح کہ گویا وہ اس کے کان کے پردے کے اوپر بیٹھی ہے ۔ ایسے ہی آلات کے ذریعہ سورج کی شعاعوں کی رفتار کی آواز بھی ریکارڈ کی جا رہی ہے"۔

"پانی کی مکڑیوں کی ایک قسم ایسی ہے جو پانی کے اندر غبارے کی طرح ایک گھونسلا تیار کرتی ہے 'یہ تار عنکبوت سے بنایا جاتا ہے اور اسے پانی کے نیچے کسی چیز سے باندھ دیا جاتا ہے ۔ اس کے بعد یہ مکڑی اپنے جسم کے بالوں کے ساتھ پانی کا ایک بلبلہ باندھتی ہے اور اسے لے جا کر اس گھونسلے سے باندھ دیتی ہے یہاں تک کہ گھونسلے کے گرد ہوا کے بلبلوں کا حصار بن جاتا ہے' اس کے بعد وہ گھونسلے کے اندر بچے دیتی ہے کہ وہ ہوا کے طوفان سے محفوظ رہیں ۔ اس گھونسلے کی ساخت میں ایک تو باریک بننے کا عمل ہے 'اس کے بعد دقیق انجینئرنگ اور ہوا بازی کا گہرا ادراک ہے"۔

"سالمن مچھلی 'جو چھوٹی سی ہوتی ہے اور سمندر میں کئی سال تک گھومتی پھرتی ہے 'اس کے بعد وہ اس دریا کی طرف

---

(۱) مغربی فکر میں ڈوبا ہوا مصنف یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اللہ نے جب مکھی کو پیدا کیا تو یہ سب کچھ سکھا دیا ۔ ان کے دماغوں پر ڈارون کا فلسفہ ارتقاء ہی بیٹھا ہوا ہے حالانکہ قرآن صاف کہتا ہے وعلم آدم الاسماء کلھا "اللہ نے آدم کو تمام نام سکھا دیئے"۔ اسی طرح اللہ نے مکھی کو بھی تمام بنیادی تعلیم دے دی تھی (مترجم)

واپس ہوتی ہے جہاں اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ آخر وہ کیا قوت ہے جو اسے اس کی جائے پیدائش تک رہنمائی کرتی ہے۔ یہ جب اپنی جائے پیدائش کی طرف بڑھتے ہوئے کسی غلط دریا کی طرف چلی جائے تو اسے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ دریا اس کی جائے پیدائش نہیں ہے۔ چنانچہ وہ دریا میں چلتی ہے اور پانی کے بہاؤ کے بالمقابل چل کر اپنی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔

پانی کے سانپوں کا معاملہ تو بہت ہی عجیب ہے۔ ان کا قصہ سالمن مچھلی کے برعکس ہے۔ اس مخلوق خدا کی عمر جب پوری ہوتی ہے تو یہ مختلف تالابوں اور دریاؤں سے سفر کر کے گہرے سمندروں کی طرف جاتے ہیں۔ اگر یورپ میں ہوں تو یہ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے جنوبی برمودا کی گہرائیوں کی طرف چلے جاتے ہیں۔ وہاں پھر یہ انڈے دے کر مر جاتے ہیں' اب ان کے جو بچے پیدا ہو جاتے ہیں تو وہ تو صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ نہایت گہرے پانیوں میں ہیں' لیکن یہ بچے اسی راستے سے ساحل کی طرف جاتے ہیں جس طرح ان کی ماں ساحل سے پانی کی طرف آئی تھی اور ساحل سے پھر یہ کسی دریا' یا نہر یا حوض اور تالاب کی طرف چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ پانیوں کی ہر قسم بحری سانپوں کے لیے موزوں ہوتی ہے۔ کیونکہ انہوں نے بڑی بڑی موجیں' طوفان اور سمندری تلاطم دیکھے ہوئے ہیں اور ان کا مقابلہ کیا ہوا ہوتا ہے۔ یہ ساحلوں پر چلتے ہیں اور جب یہ مکمل ہو جاتے ہیں تو کوئی خفیہ قانون ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ پھر واپسی کا سفر کریں اور گہرے سمندروں میں چلے جائیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ جذبہ ان کے اندر کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی شکاری یا مچھیرے نے یورپی سمندروں میں امریکی بحری سانپ پکڑا ہو' یا کسی امریکی مچھیرے کے جال میں یورپی سانپ آگیا ہو' یورپی بحری سانپ کو چونکہ گہرے سمندروں تک لمبا سفر کرنا پڑتا ہے اس لیے قدرت نے اسے ایک سال کی لمبی عمر عطا کی۔ یا اس سے بھی زیادہ تاکہ وہ مرنے سے قبل اپنی منزل مقصود کو پہنچ سکے۔ کیونکہ یورپی بحری سانپ کو امریکی بحری سانپ سے زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ ذرا دیکھو تو سہی کہ کون سے ایٹم اور کیا سالمے ہیں؟ جب بحری سانپ مچھلیوں کی شکل میں جمع ہوئے تو ان کے اندر اس قسم کی قوت ارادی پیدا ہو جاتی ہے جو ایسے دور دراز سفر کراتی ہے؟

"جب مادہ پروانہ ہوا کے دباؤ میں تمہارے کسی روشن دان سے اندر آ جاتا ہے تو وہ اپنے نر کو ایک سگنل بھیجتی ہے' چاہے وہ جتنا بھی دور ہو۔ بعض اوقات وہ بہت دور ہوتا ہے۔ وہ اس اشارے کو وصول کر لیتا ہے اور اس کا جواب دیتا ہے۔ اس کو گمراہ کرنے کی انسان جس قدر کوشش بھی کرے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ غلطی کرے۔ کیا ان کے پاس کوئی ریڈیو اسٹیشن ہے یا اس مرد کے پاس کوئی ریڈیو یا مشین ہے جو اس سے سگنل وصول کرتا ہے۔ ایریل کا ہونا تو بڑی بات ہے کیا اس کے پاس کوئی ایتھر ہے جس کے ذریعہ وہ ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ ٹیلی فون اور ریڈیو ہمارے پاس سریع الحرکت مواصلاتی آلات ہیں لیکن یہ تاروں کے ذریعے ایک جگہ کو دوسری جگہ سے منسلک کرتے ہیں۔ اس طرح تو یہ پروانہ ہم پر فوقیت رکھتا ہے"۔

نباتات اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے کئی چیزوں سے خدمت لیتے ہیں' بغیر ان کے علم و ارادہ کے۔ مثلاً حشرات پھولوں کا بور ان کے لیے منتقل کرتے ہیں' ہوا یہی کام کرتی ہے' وحوش و طیور بھی یہی کام کرتے اور ان کا بورا اور بیج بکھیرتے ہیں۔ سب سے آخر میں ان نباتات نے انسان کو بھی اپنے جال میں پھانس لیا۔ اس نے فطرت کو حسن بخشا اور فطرت نے اسے اس کا اجر دیا۔ لیکن انسان بھی تو کسی حد پر رکنے والا نہیں۔

هَلْ مِنْ مَزِيْد کا قائل ہے۔ اس نے ہل چلایا' بیج بویا' فصل کاٹی' انبار بھرے' پھر اس نے فصلوں کو ترقی دی' شاخ تراشی کی اور خوراک کا بندوبست کیا۔ اگر وہ یہ کام چھوڑ دے تو بھوک سے مرجائے اور دنیا سے تہذیب و تمدن کا خاتمہ ہو جائے اور انسانیت پتھر کے دور میں واپس چلی جائے"۔

پانی کے بے شمار جانور مثلاً جھینگا مچھلی کا ایک بازو اگر کٹ جائے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے جسم کا ایک حصہ ضائع ہو گیا ہے' اس کے خلیے اور جینز اس عضو کو دوبارہ بنانا شروع کر دیتے ہیں اور جب وہ عضو مکمل ہو جاتا ہے تو خلیے یہ کام بند کر دیتے ہیں اور ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی ڈیوٹی ختم ہے۔

پانی کے وہ کیڑے جن کے کئی پاؤں ہوتے ہیں' جب دو ٹکڑے ہو جائے تو وہ ان میں سے ایک ٹکڑے کی مدد سے اپنے آپ کو مکمل کر لیتا ہے۔ اگر تم اس کیڑے کا سر کاٹ دو تو وہ دوسرا سر بنا لیتا ہے۔

ہم زخموں کو مندمل کر سکتے ہیں لیکن ہمارے سرجن ابھی تک یہ بات نہیں جانتے کہ وہ خلیوں کو متحرک کریں اور وہ ایک نیا بازو بنا ڈالیں یا گوشت پوست' ناخن اور اعصاب بنا دیں' اگر ایسا ممکن ہو۔

اور ایک عجوبہ تو یہ ہے کہ اگر کوئی خلیہ ابتدائی ایام ہی میں دو مکمل حصوں میں تقسیم ہو جائے تو اس سے دو مکمل حیوان تیار ہو جاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ توام ہم شکل ہوتے ہیں' اس کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ حمل کے ابتدائی مرحلہ میں خلیہ منقسم ہو گیا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مرحلے میں خلیہ مکمل فرد ہوتا ہے۔ اور اسی طرح ایک فرد بھی ہر خلیہ میں ہوتا ہے۔

ایک دوسری فصل میں یہی مصنف لکھتا ہے:

شاہ بلوط کا بھورا بیج زمین پر گرتا ہے' اس کا بھورا چھلکا اسے محفوظ رکھتا ہے' اور یہ گرتا پڑتا زمین میں کسی دراڑ میں اٹک جاتا ہے۔ موسم بہار میں اس کے اندر کا جرثومہ جاگتا ہے۔ وہ اس چھلکے کو پھاڑ دیتا ہے اور یہ اس مغز سے خوراک حاصل کرتا ہے جو اس چھلکے کے اندر جمع کر دی گئی ہوتی ہے۔ جس کے اندر اس کے موروثی جینز ہوتے ہیں۔ اس کی جڑیں زمین میں جاتی ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ پودا نمودار ہوتا ہے' چھوٹا درخت اور پھر کامل درخت بن جاتا ہے۔ اس کے اندر کئی ملین جینز ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ اپنی جڑوں' چھلکے' پھل اور پتوں اور شاخوں میں بھی اس درخت کے مماثل ہوتا ہے جس سے وہ بیج نکلا۔ کروڑوں سال پہلے جو بلوط کا درخت پیدا ہوا تھا' اس کے پھل آج تک اپنے ذرات کی ترتیب اس طرح رکھتے ہیں جس طرح پہلے بلوط کے پھل نے رکھا تھا۔

یہی مصنف تیسری فصل میں لکھتا ہے: "ہر خلیہ جو کسی زندہ مخلوق میں پیدا ہوتا ہے' اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس طرح ڈھالے کہ گوشت کا حصہ ہو یا چمڑے کا حصہ ہو اور فنا ہو جائے' یا دانت کی چمک بن جائے یا آنکھ کا سیال مادہ بن جائے یا ناک اور کان بن جائے۔ ہر خلیہ اپنے آپ کو ایسی شکل میں ڈھالتا ہے کہ وہ اپنا فرض منصبی پوری طرح ادا کرے۔ یہ بات نہایت ہی مشکل ہے کہ کوئی تعین کرے کہ کون سا خلیہ دائیں ہاتھ ہے یا بائیں ہاتھ کا۔ لیکن ازروئے فطرت یہ بات متعین ہے کہ یہ خلیہ دائیں کان کا ہے اور یہ بائیں کان کا ہے۔ غرض ہزارہا خلیات چلائے جاتے ہیں کہ وہ ایک صحیح کام کریں' صحیح وقت پر کریں اور صحیح جگہ پر کریں"۔

چوتھی فصل میں یہ شخص کہتا ہے: "مختلف قسم کی مخلوقات میں بعض مخلوقات ایسے کام کرتی ہیں جو دانش مندی کے

اعلیٰ مرتبہ کے ہیں ۔ جن کی کوئی تشریح ہم نہیں کر سکتے ۔ مثلاً بھڑ ' ٹڈے کو شکار کرتی ہے ' زمین میں ایک گڑھا کھودتی ہے اور ایک مناسب جگہ اسے دفن کر دیتی ہے ۔ یہ شکار کرتے وقت اس کے ایسے مخصوص مقام پر ڈنگ مارتی ہے کہ وہ بیہوش ہو جاتا ہے لیکن اس کا گوشت صحیح و سالم زندہ رہتا ہے ۔ اب مادہ بھڑ اس کے قریب ایک متعین مقام پر انڈے دیتی ہے ۔ اسے شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ جب اس کے بچے پیدا ہوں گے تو اس ٹڈے کا گوشت کھائیں گے ۔ لیکن اسے قتل نہ کریں گے کیونکہ یہ گوشت ان کی غذا ہے اور گوشت خراب ہو کر زہریلا نہ بن جائے ۔ لازماً بھڑ نے ابتداء سے یہ کام شروع کیا ہو گا اور ہمیشہ وہ اسے دہراتی ہو گی ورنہ دنیا میں سے بھڑوں کا وجود ہی ختم ہو جاتا ۔ سائنس کے پاس ایسی کوئی تشریح نہیں ہے کہ وہ بھڑوں کے اس مسلسل فعل کا سبب بیان کرے اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ یہ کام بھڑیں محض اتفاق سے کرتی ہیں ' کیونکہ مادہ بھڑ تو زمین کے اندر کھودے ہوئے گڑھے کو بھر کر چلی جاتی ہے اور مر جاتی ہے ' نہ وہ اس کے اسلاف یہ جانتے تھے کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے ۔ نہ اسے اس کا علم اور مشاہدہ ہوتا ہے کہ اس کے بعد اس کے بچوں کو کیا پیش آتا ہے بلکہ بھڑ کو تو یہ علم بھی نہیں ہوتا کہ اس کے بعد کوئی چیز آنے والی ایسی ہے جسے وہ اپنا بچہ کہتی ہو ' بلکہ اسے یہ تک علم نہیں ہے کہ وہ یہ کام اپنے نوع کی حفاظت کے لیے کرتی ہے ۔

چیونٹیوں میں سے بعض کی یہ ڈیوٹی ہوتی ہے کہ وہ سردیوں کے موسم میں اپنی کالونی کو خوراک مہیا کرنے کے لیے حیوانات جمع کریں ۔ پھر وہ ایک سٹور قائم کرتی ہیں جہاں یہ خوراک پیس کر رکھی جاتی ہے ۔ پھر بعض چیونٹیاں ایسی ہوتی ہیں جن کو قدرت نے پیسنے کے جبڑے دیئے ہوتے ہیں ۔ ان کا کام صرف خوراک کو پیسنا ہوتا ہے ۔ جب سردیوں کا موسم آتا ہے اور تمام غلہ پیسا جا چکا ہوتا ہے تو اس کی سپلائی یوں ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد کو فائدہ پہنچایا جا سکے تاکہ سپلائی جاری رہ سکے ۔ اب چونکہ اگلی نسل میں مزید پیسنے والی چیونٹیاں پیدا ہوں گی ۔ اس لیے چیونٹیوں کی فوج ان پیسنے والیوں پر حملہ آور ہوتی ہے اور ان کو قتل کر دیتی ہے ۔ شاید ان کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے حصے کی خوراک پیسنے کے دوران کھالی ہے کیونکہ انہوں نے اس موقعہ سے ضرور فائدہ اٹھایا ہو گا ۔

بعض چیونٹیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی جبلت یا ان کی عقل ان کو کھانوں کے باغ بنانے پر آمادہ کرتی ہیں اور یہ چیونٹیاں ابتدائی کیڑوں کو اور پودوں کے چھلکوں پر پائے جانے والے کیڑوں کو گرفتار کر لیتی ہیں ۔ یہ گویا ان کے لیے گائے اور بکریوں کا کام دیتے ہیں ۔ ان کیڑوں سے یہ چیونٹیاں ایسا محلول لیتی ہیں جو شہد کی طرح ہوتا ہے اور یہ چیونٹیوں کی خوراک کا کام دیتا ہے ۔

چیونٹیاں بعض دوسری چیونٹیوں کو غلام بھی بنا لیتی ہیں ' اور جب یہ اپنے گھونسلے بناتی ہیں تو یہ پتوں کو مناسب حجم میں کاٹتی ہیں ۔ جب کارکن چیونٹیاں ان پتوں کو ایک طرف سے پکڑ کر اپنے مقام پر رکھتی ہیں تو اس وقت یہ ان بچوں سے بھی کام لیتی ہیں جو ابھی ارتقائی دور میں ہوتے ہیں لیکن ان کے ریشمی مواد سے یہ پتوں کو جوڑتی ہیں ' یوں یہ بچے اپنے لیے گھونسلا بنانے سے محروم رہتا ہے لیکن اپنے بنی نوع کے لیے ایک مفید کام کر چکا ہوتا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ جن ذروں سے چیونٹی بنتی ہے ان ذروں میں یہ کام کرنے کی صلاحیت کس طرح پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ان کا ایک خالق ہے جس نے ان کو اس طرح کرنے کی ہدایت کی "۔ (اقتباسات ختم ہوئے)

اس میں شک نہیں ہے کہ ایک خالق ہے جس نے اپنی تمام مخلوقات کو ہدایات دیں ' خواہ وہ بڑی مخلوق ہو یا چھوٹی

ہو' اور یہ وہی خالق ہے جو الْاَعْلٰی (١) الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی (٢) وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (٣) (۸۷: ۱ تا ۳) "جو برتر ہے 'جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا 'جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی"۔

ہم نے اوپر جو اقتباسات دیئے ہیں 'یہ تو اصل حقیقت کے ایک معمولی حصے کے مشاہدات ہیں 'جو انسانوں نے نباتات ' حشرات الارض 'پرندوں اور دوسرے حیوانات کے سلسلے میں ریکارڈ کیے ہیں۔ لیکن اس سے آگے علم و مشاہدہ کے اور بھی جہاں ہیں اور جو کچھ ہمارے علم میں ہے وہ اس قول باری کے مدلول اور مفہوم کا ایک نہایت ہی مختصر حصہ ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی (٢) وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (٣) (۸۷: ۲ تا ۳) "جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا 'جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی"۔ یہ قابل مشاہدہ کائنات جس کے ایک معمولی حصے کو ہم جانتے ہیں ' اس سے آگے عالم غیب کے جہاں پوشیدہ ہیں۔ ہمیں تو اپنی بشری قوتوں کے مطابق بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ یہ چند اشارات ہیں جو اللہ نے ہماری محدود قوت ادراک کے لیے کر دیئے ہیں۔

اس عظیم کائنات کا ایک وسیع صفحہ پیش کرنے اور اس کی وادیوں میں اللہ کی تسبیح و ثنا کی گونج پیدا کرنے کے بعد 'اللہ کی اس عظیم تسبیح کو مکمل کرنے کے لیے یہاں نباتات کی دنیا کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے اور یہاں اس اشارے کے اندر جہان معانی ہے۔

وَالَّذِیْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی (٤) فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی (۸۷: ۵) "جس نے نباتات اگائیں اور پھر ان کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا"۔ المرعیٰ ' ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو زمین سے اگتی ہے 'اس لیے کہ ہر اگنے والی چیز کسی نہ کسی مخلوق کے لیے خوراک ہے۔ لہٰذا مرعیٰ کا مفہوم یہاں اس سے کہیں وسیع ہے کہ کوئی چیز ہمارے مویشیوں کے چرنے کی ہے تو مرعیٰ ہے۔ کیونکہ اللہ نے زمین کو پیدا کیا اور اس زمین کے اوپر چلنے والی ہر مخلوق کے لیے اس کے اندر اس کی خوراک پیدا کی ' چاہے یہ مخلوق زمین کے اوپر چلتی ہو 'یا اندر چھپی رہتی ہو یا اس کی فضاؤں میں اڑتی ہو۔

نباتات ابتداء میں سبز ہوتے ہیں 'پھر پژمردہ ہو کر سیاہ ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو وہ سبزی کی حالت ہی میں خوراک کے قابل ہوتے ہیں اور بعض اوقات وہ پک کر سیاہ ہوتے ہیں تو خوراک کا کام دیتے ہیں۔ درمیانی حالت میں بھی وہ کسی نہ کسی خوراک کا کام دیتے ہیں۔ بہرحال نباتات کی ہر حالت ' اللہ کی تخلیق اور تسویہ کے مطابق کسی مخلوق کے لیے خوراک بنتی ہے۔

یہاں نباتاتی زندگی کے منظر کو پیش کر کے ایک اشارہ یہ کیا گیا ہے کہ جس طرح ہر نبات کوڑا کرکٹ بن کر انجام تک پہنچتا ہے۔ اس طرح ہر زندہ مخلوق بھی اس دنیا میں اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔ اور یہ اشارہ ہے اس حیات دنیا اور حیات اخروی کی طرف کہ حیات دنیا تو نباتات کی طرح ختم ہونے والی ہے اور حیات اخروی باقی اور لازوال ہے۔ بعد میں آتا ہے۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا (١٦) وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی (۸۷: ۱۷) "مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے"۔ دنیا کی زندگی اس کھیت کی طرح ہے جو ختم ہو کر کوڑا کرکٹ بن جاتی ہے اور آخرت باقی و لازوال ہوتی ہے۔

اس مقطع کے ذریعے اس عظیم کائنات کے صفحات کو دور تک پھیلا دیا جاتا ہے اور جن امور کا ذکر ہوتا ہے وہ سورت کے آنے والے حقائق کے ساتھ مناسب ہیں۔ یہ کائنات ان سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور یہ حقائق کائنات سے پیوست ہوتے ہیں۔ ایک نہایت ہی وسیع و عریض فریم ورک ہیں۔ اگر گہرا مطالعہ کیا جائے کہ اس سیپارے کے مضامین کو وسیع کائناتی دائرے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کائناتی دائرہ اس پارے کی فضا اور اس کے اشارات اور مضامین کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔

اب وہ خوشخبری آتی ہے جو آپؐ کے لیے ہے اور آپؐ کے بعد آپؐ کی امت کے لیے ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝

"ہم تمہیں پڑھوا دیں گے 'پھر تم نہیں بھولو گے 'سوائے اس کے جو اللہ چاہے ' وہ ظاہر کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ پوشیدہ ہے اس کو بھی۔ اور ہم تمہیں آسان طریقے کی سہولت دیتے ہیں 'لہٰذا تم نصیحت کرو اگر نصیحت نافع ہو"۔

اس عظیم خوشخبری کا آغاز ہوتا ہے کہ قرآن کے حفظ کرنے اور اسے باقی رکھنے کی ذمہ داری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھوں سے اتار دی جاتی ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى (۶:۸۷) "ہم تمہیں پڑھوا دیں گے 'پھر تم نہیں بھولو گے"۔ لہٰذا آپ اپنے رب سے یہ کلام لیں اور بس۔ اس کو یاد کرا دینا اللہ کا کام ہے۔ یہ بات فی الواقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بڑی خوشخبری تھی۔ آپ حفظ قرآن کے لیے فکر مند ہوتے تھے۔ اب تو اس کی حفاظت کی جانب سے مطمئن کر دیا گیا کیونکہ قرآن کریم ایک نہایت ہی عظیم کلام اور آپؐ اسے بہت ہی محبوب رکھتے تھے۔ آپؐ دل و جان سے قرآن پر فدا تھے۔ اور اس کی حفاظت کا بہت ہی خیال رکھتے تھے۔ اس پر حریص تھے اور اپنی عظیم اور بھاری ذمہ داری سمجھتے تھے۔ آپؐ ایک ایک آیت دہراتے تھے۔ جب جبرائیل علیہ السلام اسے لاتے تو آپؐ سننے کے ساتھ ساتھ تکرار کرتے اور زبان کو دہرانے میں لگا دیتے یہاں تک کہ یہ بشارت آگئی اور آپؐ کو مطمئن کر دیا گیا۔

پھر یہ آپؐ کے بعد آپؐ کی امت کے لیے بھی ایک خوشخبری ہے۔ امت بھی مطمئن ہو جاتی ہے کہ اس عقیدے کا اصل سرچشمہ ذات باری ہے اور اس کی حفاظت کا کفیل اور ذمہ دار بھی اللہ ہے۔ نبی کے دل میں بٹھانے کا ذمہ دار بھی اور بعد کے زمانے میں حفاظت کی ذمہ داری بھی۔ یہ اللہ کی بڑی مہربانی ہے اور اس دین کی عظمت ہے اور اللہ کے ہاں اس کی اہمیت کا ثبوت ہے۔

اس موقعہ پر اور ایسے تمام مواقع پر ایک اٹل بات ضرور سامنے آتی ہے۔ یہ ایک اٹل اور دائمی قانون ہے وہ یہ کہ اللہ کی مشیت بے قید ہے اور اللہ کی مشیت پر کوئی پابندی نہیں۔ آپ نہیں بھولیں گے الا یہ کہ اللہ کچھ بھلانا چاہے۔ اگرچہ یہ پابندی خود اللہ کی طرف سے ہو' لہٰذا اللہ کی مشیت بے قید اور اس پر کوئی قانونی قید ہے نہ کوئی وعدہ اسے پابند

کرتا ہے۔ قرآن اس اصول کو پوری طرح محفوظ رکھتا ہے جیسا کہ اس سے قبل ہم ظلال القرآن میں اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ یہاں بھی اس اصول کو قائم رکھا گیا۔

اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (۸۷ : ۷) "سوائے اس کے جو اللہ چاہے"۔ اگرچہ یہ وعدہ سچا ہے کہ حضورؐ نہ بھولیں گے مگر اللہ کی مشیت بھی بے قید ہے' اگر اللہ چاہے تو ایسا ہو سکتا ہے تاکہ تمام معاملات اللہ کی مشیت کے دائرے میں رہیں اور لوگ اللہ کی مشیت ہی پر نگاہ رکھیں۔ اگرچہ کسی معاملے میں سچا وعدہ کیا گیا ہو۔ انسانی دل و دماغ کو اللہ کی مشیت کے ساتھ ہی لگے رہنا چاہئے۔

اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى (۸۷ : ۷) "وہ ظاہر کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ پوشیدہ ہے اس کو بھی جانتا ہے"۔ یہ ہے اشارہ کہ اللہ پڑھائے گا' حفظ کرائے گا اور نسیان نہ ہو گا الا یہ کہ وہ کچھ اور چاہے کیونکہ یہ تمام امور اللہ کی مخفی حکمت پر مبنی ہیں جو ظاہر اور خفیہ سب کو جانتا ہے اور معاملات کو ان کے تمام پہلوؤں سے جانتا ہے اس لیے وہ تمام معاملات میں ایسے فیصلے کرتا ہے جس میں حکمت ہوتی ہے اور یہ حکمت اللہ کے بھرپور علم پر مبنی ہوتی ہے۔ اللہ کا علم کامل علم ہوتا ہے۔

اب دوسری خوشخبری وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى (۸۷ : ۸) "اور ہم تمہیں آسان طریقے کی سہولت دیتے ہیں"۔ یہ خوشخبری بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے لیے ہے۔ اور آپؐ کے بعد آپؐ کی امت کے لیے بھی ہے۔ اور اس سے اس دین کا مزاج بھی معلوم ہوتا ہے۔ دعوت اسلامی کی حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ انسانی زندگی میں کیا کردار ادا کرتی ہے اور اس کائنات میں اسلامی نظام زندگی کا مقام و مرتبہ کیا ہے۔ بظاہر تو یہ دو لفظ ہیں۔

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى (۸۷ : ۸) لیکن ان کے اندر جو حقیقت بیان کی گئی وہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام اور شریعت کی ایک عظیم حقیقت ہے' نیز وہ اس پوری کائنات کا بھی خلاصہ اور روح ہے۔ یہ حقیقت رسول اللہ کے مزاج کو' اس کائنات کے مزاج اور اس دین کے مزاج سے ملا دیتی ہے۔ یہ پوری کائنات دست قدرت نے بڑی آسانی سے بنا دی ہے۔ یہ کائنات نہایت آسانی سے چل رہی ہے' جس رخ پر اسے ڈال دیا گیا ہے وہ نہایت آرام اور سکون اور سہولت سے اسی رخ اور سمت پر چل رہی ہے۔ غرض یہ نور سے نکلی ہے اور ایسے حقائق کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو حدود و قیود سے ماوراء ہے۔

جس ذات کو اللہ آسانیاں میسر کر دے وہ اپنی زندگی کی راہوں پر بسہولت چلتا ہے۔ وہ اس کائنات کے ساتھ چلتا ہے جس کا وجود اور جس کی ترتیب باہم متناسب' جس کی حرکت متوازن اور جس کا رخ ایک طرف ہے یعنی اللہ کی طرف۔ ایسا شخص صرف ان قوتوں سے ٹکراتا ہے' جو اس عظیم کائنات کے خطوط سے منحرف ہوں۔ ایسے لوگوں کا موازنہ اگر اس پوری کائنات سے کیا جائے تو ان کا کوئی وزن نہیں رہتا۔ ایسا شخص جب چلتا ہے تو اس کی حرکت آسان' لطیف اور نرم ہوتی ہے۔ اس کائنات کے ہم آہنگ دنیا کے واقعات سے ہم آہنگ' دنیا کی چیزوں اور اشخاص کے ساتھ ہم آہنگ۔ اس کے ہاتھوں میں آسانی ہوتی ہے' اس کی زبان میں یسر ہوتا ہے' اس کے اقدامات آسان ہوتے ہیں' اس کا عمل یسر ہوتا

ہے ۔ اس کے خیالات آسان ہوتے ہیں' اس کی فکر آسان ہوتی ہے جو معاملات کو آسانی سے لیتا ہے' معاملات کو نہایت آسانی سے لیتا ہے' اپنے نفس کے لیے بھی آسان ہوتا ہے دوسروں کے لیے بھی آسان ہوتا ہے ۔

یہ تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' اپنے تمام امور میں یسر ہی یسر۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب دو کاموں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے تو آسان کو لیتے ۔یہ ہے روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ۔ (بخاری و مسلم)

اور آپؓ ہی سے روایت ہے "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے گھر میں تنہا ہوتے تو آپؐ تمام لوگوں سے نرم مزاج ہوتے' مسکراتے ہوئے اور ہنستے ہوئے"۔ اور صحیح بخاری کی ایک روایت ہے :"ایک لونڈی بھی رسول اللہؐ کا ہاتھ پکڑ لیتی اور جہاں چاہتی آپؐ کو لے جاتی"۔

لباس ' طعام' بچھونے وغیرہ میں آپؐ کی جو سیرت تھی اس پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ سادگی' آسانی اور بے تکلفی کو پسند فرماتے تھے ۔ ابو عبداللہ شمس الدین محمد ابن قیم الجوزیہ اپنی کتاب زاد المعاد میں لباس کے سلسلے میں آپؐ کی سیرت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ آپؐ کی ایک پگڑی تھی جسے "السحاب" کہا جاتا تھا۔ یہ آپؐ نے حضرت علیؓ کو دے دی تھی' آپؐ پگڑی باندھتے اور اس کے نیچے ٹوپی پہنتے' کبھی آپؐ ٹوپی بغیر عمامہ کے پہنتے' کبھی عمامہ بغیر ٹوپی کے بھی باندھتے ۔ آپؐ جب عمامہ باندھتے تو اس کے شملے کو دونوں کاندھوں کے درمیان لٹکا دیتے' جیسا کہ مسلم شریف کی روایت میں ہے ۔ حضرت عمر ابن حریث سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر دیکھا اور آپؐ نے سیاہ عمامہ باندھا ہوا تھا اور آپؐ نے اس کا ایک طرف دونوں کاندھوں کے درمیان لٹکایا ہوا تھا۔ اور مسلم میں حضرت جابر سے یہ بھی ہے ' بالوں کی لٹ کی طرح۔

--- ○○○---

اس سے معلوم ہوا کہ شملہ کو ہمیشہ کاندھوں کے درمیان سے نہ لٹکاتے تھے ۔ کہا جاتا ہے آپؐ مکہ میں داخل ہوئے' آپؐ نے جنگی لباس پہنا ہوا تھا اور آپؐ کے سر پر خود تھا۔ لہٰذا ہر موقعہ کی مناسبت سے لباس پہنتے تھے ۔

ایک دوسری فصل میں وہ فرماتے ہیں کہ بہترین طریقہ رسول اللہؐ کا طریقہ ہے جو طریقہ آپؐ نے رائج فرمایا اور جس کا حکم دیا اور جس کی ترغیب دی اور اس پر مداومت کی ۔لباس میں آپؐ کا طریقہ یہ تھا کہ جو لباس میسر ہوتا آپؐ وہ پہنتے کبھی اونی' کبھی روئی' کبھی کتان کا۔ آپؐ نے یمنی چادر بھی پہنی' سبز چادر بھی پہنی' حلہ' قبا اور قمیص بھی زیب تن فرمائی ۔ پاجامہ' ازار اور چادر بھی پہنی ۔ چمڑے کے موزے اور جوتے ۔ یہ سب چیزیں آپؐ نے استعمال فرمائیں اور عمامہ کا شملہ کبھی آپؐ نے پیچھے سے لٹکایا اور کبھی نہ لٹکایا"۔

اور کھانے کے بارے میں آپؐ کی سیرت یہ تھی کہ آپ کسی موجود کھانے کو رد نہ فرماتے اور نہ غیر موجود کے بارے میں تکلف فرماتے' پاکیزہ چیزوں میں سے جو بھی آپؐ کو پیش کی گئی آپؐ نے اسے تناول فرمایا۔ الا یہ کہ کسی چیز کو آپؐ کی طبیعت نہ چاہتی ہو تو آپؐ نے بغیر حرام قرار دینے کے اسے چھوڑ دیا۔ آپؐ نے کسی کھانے میں کبھی عیب نہیں نکالا۔ اگر چاہت ہوتی تو تناول فرماتے ورنہ چھوڑ دیتے' جس طرح آپؐ نے گوہ کو تناول نہ فرمایا کیونکہ آپؐ اس کے کھانے کے عادی نہ تھے لیکن امت پر اسے حرام بھی قرار نہیں دیا' بلکہ اسے آپؐ کے دسترخوان پر آپ کے دیکھتے ہوئے کھایا گیا۔ آپؐ نے حلوی اور شہد تناول فرمایا۔ ان کو آپؐ بہت پسند فرماتے تھے ۔ آپؐ نے تازہ اور خشک کھجوروں کو

تناول فرمایا۔ آپؐ نے خالص دودھ بھی پیا اور ملا ہوا بھی۔ آپؐ نے شہد اور ستو پانی کے ساتھ تناول فرمائے۔ آپؐ نے کھجوروں کا صاف پانی پیا' آپؐ نے حریرہ استعمال کیا۔یہ ایک قسم کی کھیر ہے جو دودھ اور آٹے سے بنتی ہے۔ آپؐ نے تروتازہ کھجور کے ساتھ ککڑی کھائی' پنیر تناول فرمایا' کھجور کے ساتھ روٹی کھائی' سرکے کے ساتھ روٹی کھائی۔ آپؐ نے پکا ہوا کدو کھایا اور اس کو آپ بہت پسند فرماتے تھے۔ آپؐ نے ابالا ہوا کدو بھی کھایا'گھی کے ساتھ ثرید کھایا' پنیر کھایا۔ تیل کے ساتھ روٹی کھائی' خربوزوں کو تازہ کھجوروں کے ساتھ اور کھجوروں کو مکھن کے ساتھ کھایا اور یہ آپؐ کو بہت پسند تھا۔ کسی پاکیزہ چیز کو آپؐ رد نہ کرتے اور نہ بتکلف خواہش کرتے بلکہ آپؐ کا طریقہ یہ تھا جو میسر ہو وہ تناول فرماتے' اگر کوئی چیز نہ ملتی تو صبر کرتے"۔

سونے اور بیدار ہونے کے بارے میں آپ کی سنت یہ تھی۔ کبھی اپنے بستر پر سوتے' کبھی کھال پر' کبھی چٹائی پر' کبھی زمین پر' کبھی تخت پر' کبھی سیاہ کمبل پر سوتے"۔

آپؐ کے فرامین سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام امور میں نرمی سے کام لیا جائے' جن میں اسلامی نظریہ حیات اور اس کے تقاضے بھی آتے ہیں۔اس سلسلے میں آپؐ کی ہدایات بہت زیادہ ہیں' سب کو یہاں لانا مشکل ہے'چند پیش خدمت ہیں :" یہ دین آسان ہے' جو شخص اس دین کے ساتھ کشتی کرے گا وہ شکست کھا جائے گا" (بخاری)۔" اپنے نفسوں پر سختی مت کرو' تم پر سختی کی جائے گی' ایک قوم نے اپنے آپؐ کو سختیوں میں ڈالا تو اس پر سختی کی گئی" (ابوداؤد)۔" جو شخص اپنی سواری پر سختی کرتا ہے' وہ نہ تو سفر طے کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کی سواری زندہ رہتی ہے" (بخاری)۔" آسانیاں کرو سختی نہ کرو" (بخاری و مسلم)۔

اور معاملات کے بارے میں آپؐ کی ہدایات یہ ہیں :" اللہ رحم کرے' اس شخص پر جو فروخت کرے تو نرمی اور فراخ دل سے' خریدے تو نرمی اور فراخ دلی سے اور تقاضا کرے تو بھی نرمی اور فراخ دلی سے" (بخاری)۔" مومن آسان اور نرم ہوتا ہے" (بیہقی)۔" مومن لوگوں سے مانوس ہوتا ہے اور لوگ اس سے مانوس ہوتے ہیں" (دارقطنی)۔" اللہ کے ہاں مبغوض ترین شخص وہ ہے جو جھگڑالو اور لڑنے والا ہو" (بخاری و مسلم)۔

آپؐ کی سیرت میں اس بات کی روشن مثالیں ملتی ہیں کہ آپؐ سختی اور مشکل کو پسند نہ فرماتے تھے' یہاں تک کہ نام اور چہرے کے خدوخال میں بھی۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا مزاج کیسا تھا' اور آپؐ کے ساتھ اللہ کا سلوک کیسا تھا' اور کس طرح اللہ نے آپ کو آپ کی ساخت اور مزاج کے اعتبار سے سہل پسند بنایا تھا اور اس کی طرف آپ کی رہنمائی فرمائی تھی۔ سعید ابن مسیب اپنے والد سے روایت فرماتے ہیں کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے' تو حضورؐ نے دریافت فرمایا تمہارا نام کیا ہے۔ والد نے کہا میرا نام حزن ہے (یعنی سخت دشوار) تو آپ نے فرمایا نہیں آپ "سہل" ہیں۔ تو انہوں نے کہا میں اس نام کو نہیں بدلوں گا جو میرے باپ نے رکھا ہے۔ ابن مسیب کہتے ہیں اس کے بعد ہمارے خاندان میں برابر سختی رہی" (بخاری)۔" حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے عاصیہ کا نام بدل کر جمیلہ رکھ دیا" (مسلم)۔ اور آپ کی مشہور حدیث ہے" یہ بات نیکی کا حصہ ہے کہ تم اپنے بھائی سے ہنس مکھ ہو کر ملو" (ترمذی)۔

غرض آپؐ اس قدر حساس تھے کہ آپؐ کو ناموں' چہرے کے خدوخال میں بھی درشتی پسند نہ تھی اور آپؐ نرمی اور آسانی کی طرف مائل ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ کی پوری سیرت نرمی' یسر' سہولت' اور سہل برتاؤ پر مشتمل ہے۔ آپؐ

نے ہمیشہ معاملات اور لین دین میں نرمی سے کام لیا۔ ایک مثال سے واضح ہوتا ہے کہ آپ اپنے برتاؤ کی وجہ سے لوگوں کی اصلاح کس طرح کرتے تھے۔

"ایک دن آپؐ کے پاس ایک دیہاتی آیا' وہ کوئی چیز مانگ رہا تھا۔ آپؐ نے اسے دے دی تو آپؐ نے اس سے پوچھا: کیا میں نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کیا؟ تو اس نے کہا: نہیں' تم نے اچھا سلوک نہیں کیا۔ مسلمانوں کو سخت غصہ آیا' اور وہ اس کی طرف لپکے۔ آپؐ نے اشارہ فرمایا کہ کچھ نہ کہو۔ آپؐ پھر گھر میں داخل ہوئے اور کچھ مزید دیا اور پھر پوچھا: کیا میں نے اچھا سلوک کیا؟ تو اس نے کہا: "ہاں"۔ اللہ آپ کو جزا دے۔ آپ اچھے خاندان کے ہیں۔ اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم پہلے جو بات کی وہ تمہیں معلوم ہے جس کی وجہ سے میرے ساتھی خفا ہوئے اور ان کے دل صاف نہیں۔ تو اگر تم پسند کرو تو یہ باتیں جو تم نے میرے سامنے کی ہیں ان کے سامنے بھی کرو' تاکہ ان کے دلوں میں تم پر جو غصہ ہے' وہ دور ہو جائے۔ تو اس نے کہا "اچھا"۔ دوسرے دن وہ پھر آیا۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس دیہاتی نے کل جو کچھ کہا وہ تمہیں معلوم ہے' ہم نے اسے مزید کچھ دیا۔ اب اس کا خیال ہے کہ وہ راضی ہو گیا ہے۔ بتاؤ بھائی کیا یہ درست ہے؟ تو دیہاتی نے کہا: "ہاں اللہ آپؐ کو جزائے خیر دے۔ آپؐ اچھے خاندان سے ہیں"۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری مثال اور اس دیہاتی کی مثال اس طرح ہے کہ اس شخص کی اونٹنی بگڑ گئی۔ لوگوں نے اس کا پیچھا کیا تو وہ اور بھاگنے لگی۔ تو مالک نے لوگوں کو چلا کر کہا: "میری ناقہ کو اور مجھے چھوڑ دو میں اس کے ساتھ زیادہ نرم سلوک کرتا ہوں اور اس کے مزاج کو اچھی طرح جانتا ہوں"۔ چنانچہ اس کا مالک اس کے سامنے سے آیا۔ اور زمین سے کچھ گھاس پھونس جمع کر کے اس کے لیے لے آیا۔ اور اسے آہستہ آہستہ واپس لایا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مقام پر آکر بیٹھ گئی۔ اس نے اس پر کجاوا کسا اور سوار ہو گیا۔ جب اس شخص نے جو کچھ کہا تھا اور تم اس پر لپکے تھے تو میں اگر تمہیں چھوڑ دیتا اور تم اسے قتل کر دیتے تو وہ جہنم میں چلا جاتا"۔

یہ تھا حضورؐ کا طرز عمل ان لوگوں کے ساتھ جو نہایت ہی سخت اور بدکنے والے تھے' اس قدر سادگی اور آسانی کے ساتھ اور اللہ کی ایسی توفیق کے ساتھ' آپؐ ان کے ساتھ حسن سلوک کرتے تھے۔ اس قسم کے بے شمار نمونے آپ کی سیرت میں موجود ہیں۔ یہی وہ بات ہے جو اس آیت میں بطور خوشخبری آپ کو کہی گئی ہے اور آپ کو اپنی پوری زندگی میں' آپ کو دعوت میں اور آپ کے معاملات میں اس کی آپؐ کو توفیق دی گئی۔

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى (۸۷ : ۸) "ہم آسان دین پر چلنے کو آپؐ کے لیے آسان کر دیں گے"۔

آپؐ کی ذات گرامی جو محبوب خلائق اور بلند اخلاق کی مالک تھی اور جسے ایک آسان دین کی طرف آسانی سے رہنمائی کی گئی تھی تو آپ نے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا۔ اور اسی انداز سے انسانیت کو دعوت دی' آپؐ کا مزاج ہی اس طرح بن گیا' اور آپؐ کی ماہیت ہی دین سہل میں بدل گئی اور آپؐ اسی امانت کبریٰ کے اٹھانے کے قابل ہو گئے' یہ امانت تو بہت بڑی اور بھاری تھی مگر اللہ نے اس ذمہ داری کی توفیق آپؐ کو دی اور آپؐ اس بھاری ذمہ داری اٹھانے کے قابل ہو گئے۔ آپؐ نے پسندیدہ طریقے سے کام کیا اور اچھے انداز سے محنت کی۔ اور خوشی اور شرح صدر سے کام کیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں اور آپؐ کے کام کی نوعیت کی تشریح کے بارے میں قرآن کریم میں کئی

آیات بھی نازل ہوئی ہیں۔

وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِينَ (الانبیاء : ۱۰۷) "اور ہم نے تمہیں کل جہاں کے لیے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے"۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷: ۱۵۷) "وہ لوگ جو اس نبی امی کی پیروی کرتے ہیں' جسے وہ اپنے ہاں تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں' انھیں وہ معروف کا حکم دیتے ہیں' برائی سے روکتے ہیں' پاکیزہ چیزیں ان کے لیے حلال کرتے ہیں' ناپاک چیزیں ان پر حرام ٹھہراتے ہیں' اور ان کے وہ بوجھ اور طوق جو ان کی گردنوں میں پڑے ہوئے ہیں' ان سے اتارتے ہیں"۔ لہذا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پوری انسانیت کے لیے رحمت تھی۔ آپؐ تشریف لائے اور آپؐ نے لوگوں کے کاندھوں سے بوجھ اتارے اور ان کے گلوں سے وہ طوق اتارے جو انہوں نے ڈال رکھے تھے اور یہ اس لیے کہ انہوں نے دین میں سختی کی تو اللہ کی طرف سے بھی ان پر سختی کی گئی۔ آپؐ جو دین اور جو دعوت لے کر آئے اس کے بارے میں بھی قرآن کہتا ہے :

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۴ : ۲۲) "اور ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان بنایا ہے' تو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا"۔ اور ایک دوسری جگہ ہے۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (۲۲ : ۷۸)
"اور اللہ نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی"۔ اور سورہ بقرہ میں ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (۲: ۲۸۶) "اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا"۔ اور مائدہ میں ہے۔

مَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ (۵ : ۶) "اللہ تعالیٰ دین کے سلسلے میں تم پر کوئی تنگی نہیں کرنا چاہتا' وہ تو تمہیں پاک کرنا چاہتا ہے"۔ غرض یہ آخری رسالت سہل ہے اور انسانی طاقت کی حدود میں ہے۔ اللہ نے لوگوں کو تنگی میں مبتلا نہیں کیا۔ نہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ لوگوں کی مشقت میں ڈالا جائے' اسلام کی روح میں بھی سہولت ہے اور اسلام کے احکام میں بھی سہولت کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ غرض یہ ایک فطری دین ہے۔ سورہ روم میں ہے۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (۳۰ : ۳۰) ”جس فطرت پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے ' یہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت ہے“۔

اور جب انسان اس عقیدے کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہے تو وہ اس کو بہت آسان پاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس میں انسانی قوت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس میں انسان کے مختلف حالات کی رعایت بھی کی گئی ہے۔ اس میں ان حالات کا بھی خیال رکھا گیا ہے جو مختلف قسم کے معاشروں میں انسان کو پیش آتے ہیں۔ اسلامی عقیدہ بذات خود نہایت ہی سہل اور قابل فہم ہے۔ بس ایک الٰہ کا عقیدہ ہے اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ تمام مخلوقات کو اسی الٰہ نے بنایا ہے اور اسی الٰہ نے ان کو ان کی پیدائش کا مقصد بھی بتایا ہے۔ پھر اس نے رسولؐ بھیجے ہیں اور ان رسولوں نے لوگوں کو ان کا مقصد وجود بتایا ہے۔ رسولوں نے لوگوں کو اپنے خلق کی طرف لوٹایا۔ اس کے بعد جو فرائض بھی ان پر عائد کیے گئے وہ اسی نظریہ سے نکلتے ہیں ' نہایت سیدھے سادھے طریقے سے جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے۔ اور لوگوں کو یہ حکم دیا کہ وہ ان میں سے جن احکام پر بھی عمل کر سکتے ہیں بغیر تنگی اور مشقت کے عمل کریں۔ حضورؐ نے فرمایا: ”جب میں تمہیں حکم دوں تو اس حکم کی تعمیل اس قدر کرو جس قدر تمہاری طاقت ہو اور جس کام سے میں روکوں ' رک جاؤ“ (بخاری و مسلم)۔ اور جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ' ان میں سے بھی حالت اضطرار مستثنیٰ ہے۔

اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ (۶ : ۱۱۹) ”الا یہ کہ تم ان کے لیے مضطر ہو جاؤ“۔

یوں رسول آخر الزمانؐ کا مزاج ان کی رسالت اور دعوت کے ساتھ گھل مل گیا ہے ' اور اس دعوت اور داعی کی حقیقت ایک ہوگئی ' خصوصاً اس بنیادی صفت اور اس ممتاز رنگ میں۔ اسی طرح اس امت کو بھی امت وسط اور سہل کہا گیا جس کے پاس رسول خداؐ یہ پیغام لے کر آئے تھے۔ یہ ایسی امت تھی جس پر رحمت ہوئی اور یہ رحمت اور محبت کا پیغام لے کر نہایت آسان اور سیدھا راستہ لوگوں کو بتانے کے لیے اٹھی۔ اس طرح کہ اس امت کا مزاج آفاقی اور کائناتی مزاج بن گیا۔ اور اس کے مزاج اور اس وسیع کائنات کے مزاج کے اندر گہری ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔

پھر ذرا اس کائنات کا مطالعہ کرو ' اس کی حرکت کا بہاؤ کس قدر سہل ' رواں دواں ہے اور اس میں کوئی ٹکراؤ اور تصادم نہیں ہے۔ اربوں کھربوں اجرام فلکی اس کائناتی فضا میں تیرتے پھرتے ہیں۔ نہایت ہم آہنگی کے ساتھ اپنے اپنے مدار میں بہتے چلے جا رہے ہیں ' نہایت تناسق ' خوشگوار کشش کے ساتھ جس کے اندر کوئی اضطراب نہیں۔ کوئی ایک بھی اپنے مدار سے ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ اربوں کھربوں زندہ مخلوقات اس کرۂ ارض پر زندگی بسر کر رہی ہے اور اپنے قریبی دور کے مقاصد پورے کر رہی ہے اور یہ زندگی نہایت پختگی اور زبردست انتظام کے ساتھ گزر رہی ہے۔ اور ہر چیز اپنا مقصد تخلیق نہایت ہی سہولت سے پورا کر رہی ہے ' اور اپنی متعین راہ پر اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ اس کائنات میں اربوں کھربوں حرکات واقعات ' اور حالات چل رہے ہیں ' مجتمع بھی اور متفرق بھی۔ اور یہ سب ایک راہ پر جا رہے ہیں جس طرح سازوں کا ایک گروپ اپنے اپنے آلہ سے بالکل مختلف آواز نکال رہا ہوتا ہے اور یہ سب مختلف آوازیں ایک ہی راگ تشکیل کر کے ایک طویل نغمہ بناتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کے وجود ' اسلامی نظام زندگی اور سیرت رسولؐ کے درمیان اور امت مسلمہ کے مزاج کے درمیان ایک زبردست ہم آہنگی ہے ' کیونکہ یہ اللہ کی صنعت ہے ' اللہ کی

بتائی ہوئی فطرت ہے ' اور اللہ کا راگ ہے ' اور وہ نہایت ہی حکیم صنعت کار ہے ۔

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (۸۷ : ۹) "لہذا نصیحت کرو اگر نصیحت نافع ہو"۔ اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھایا تو ضمانت دی کہ آپؐ نہ بھولیں گے ' الا ماشاء اللہ ۔ پھر اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بسہولت آسان طریقے پر چلنے کی سہولت فراہم کی تاکہ آپؐ اس عظیم امانت کا بار آسانی سے اٹھائیں اور لوگوں کو یاد دہانی کرائیں ۔ اسی لیے آپؐ کو تیار فرمایا اور خوشخبری دی گئی اور کہا کہ جب بھی موقعہ ملے یاد دہانی کرائیں ' جب بھی آپؐ دلوں کے اندر بات اتارنے کی راہ پائیں ' اور تبلیغ کے ذرائع میسر ہوں ۔ یہاں کہا گیا ہے ۔

اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (۸۷ : ۹) "اگر نصیحت فائدہ دے"۔ جب بھی یاد دہانی کرائیں فائدہ ہی ہوتا ہے ۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا ہے کہ نصیحت سے کسی کو کم یا زیادہ فائدہ نہ ہو ' کبھی کوئی نسل استفادہ کرنے والوں سے خالی نہیں ہوئی ۔ اگرچہ زمانہ کے اندر فساد عام ہو ' دلوں پر زنگ آگیا ہو ' اور ان پر پردے پڑگئے ہوں بہرحال تذکیر سے فائدہ ہوتا ہی ہے ۔

جب ہم ان آیات کی اس ترتیب پر غور کرتے ہیں تو ہمیں رسالت کی عظمت کا پتہ چلتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ امانت کس قدر عظیم اور اہم ہے ۔ کہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے اللہ نے آسان طریقے کی رہنمائی فرمائی اور آسانیاں بہم پہنچائیں ' پہلے یاد کروایا ' پھر اس پیغام کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھائی تاکہ رسول خدا اطمینان سے یاد دہانی کا فریضہ سرانجام دیں اور پھر حکم دیا کہ آپ یاد دہانی کرائیں اگر مفید ہو ' یہ سب سہولیات دے کر آپ کو کام پر لگایا اور یہ دراصل عظیم زاد راہ تھا ۔

جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا یہ فریضہ پورا کر دیا ' تو آپ کی ڈیوٹی ختم ہو گئی ۔ پھر لوگ جانیں اور ان کا کام ۔ تبلیغ و تذکیر کے بعد لوگوں کے مسالک ' ان کے اہداف اور انجام مختلف ہو جاتے ہیں ۔ اور یہ اللہ ہے جو کسی کو ایک انجام تک پہنچاتا ہے اور کسی کو دوسرے تک ۔ جس طرح انہوں نے رویہ اختیار کیا ' قبول کرنے کا یا رد کرنے کا ۔

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ﴿۱۰﴾ وَ يَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ﴿۱۱﴾ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ﴿۱۲﴾ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿۱۳﴾ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾

"جو شخص ڈرتا ہے وہ نصیحت قبول کر لے گا ' اور اس سے گریز کرے گا وہ انتہائی بدبخت جو بڑی آگ میں جائے گا ' پھر نہ اس میں مرے گا نہ جئے گا ۔ فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا ' پھر نماز پڑھی"۔

آپؐ یاد دہانی کرائیں اور اس یاد دہانی سے استفادہ وہی شخص کرے گا جو ڈرتا ہو ۔

مَنْ يَّخْشٰى (۸۷ : ۱۰) جس کے دل میں خدا کا خوف ہو ' اور جو خدا کے غضب اور خدا کے عذاب سے

ڈرتا ہو' اور وہی شخص ڈرتا ہے اور محتاط رہتا ہے جو زندہ ہو ـ اور یہ شخص جانتا ہو کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے 'جس نے اس جہاں کو پیدا کر کے اسے نہایت متوازن بنایا ہے 'تقدیر مقرر کی اور لوگوں کو راہ راست کی ہدایت کی ـ اس نے لوگوں کو ویسا ہی شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ دیا اور نہ مہمل پیدا کیا ہے ـ لہٰذا خیر و شر کے سلسلے میں اللہ حساب لینے والا ہے اور عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے والا ہے ـ تو ایسا شخص اللہ سے ڈرتا ہے اور جب اسے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ نصیحت لیتا ہے ' اسے بصیرت دی جاتی ہے تو قبول کرتا ہے اور جب اسے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ عبرت حاصل کرتا ہے ـ

وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى (۸۷: ۱۱) "اور اس سے گریز کرے گا انتہائی بدبخت"۔ جو شخص بدنصیب ہو گا وہ نصیحت سے دور ہو گا۔ لہٰذا ایسا شخص نہ نصیحت کی بات سنے گا اور نہ اس سے استفادہ کرے گا وہ بدنصیب ہو گا۔ مطلق بدنصیب ـ جس کے اندر بدبختی اعلیٰ درجے پر ہو 'یعنی انتہائی بدبخت ـ اپنی گری ہوئی روح کی وجہ سے بدبخت 'اس کائنات کے حقائق کا احساس نہ کرنے کی وجہ سے بدبخت ـ اس کائنات کے اندر پائے جانے والے شواہد کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بدبخت ' اشارات کائنات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بدنصیب ' جو نہایت حرص سے اس دنیا کے حقیر مفادات کے پیچھے بھاگ رہا ہو 'اس کے لیے ہلکان ہو رہا ہو 'اور آخرت کا بدبخت کہ وہاں اس کے نصیب میں دائمی جہنم ہوگی جس کے زمانوں کی کوئی انتہا نہ ہوگی ـ

الَّذِي يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرَى (۱۲) ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَى (۸۷: ۱۳) "جو بڑی آگ میں جائے گا اور نہ اس میں مرے گا اور نہ جئے گا"۔ یہ بڑی آگ کیا ہے؟ جہنم کی آگ ـ جس کی شدت بڑی ہوگی 'جس کے زمانے بڑے ہوں گے 'جس کی ضخامت بڑی ہوگی جس میں رہائش طویل ہوگی ـ اس میں نہ مر سکے گا کہ احساس عذاب نہ رہے اور نہ زندہ رہے گا کہ آرام سے ہو بلکہ دائمی عذاب ہو گا اور وہاں لوگ موت کو اس طرح چاہیں گے جس طرح یہاں بڑی بڑی خواہشات کے پیچھے مرتے ہیں ـ اس کے مقابلے میں نجات ہے ' فلاح ہے ' پاکیزگی اور نصیحت ہے ـ

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى (۱٤) وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى (۸۷: ۱۵) "فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا پھر نماز پڑھی"۔ تزکی کے معنی ہیں ہر گندگی اور ہر گناہ سے پاکیزگی اختیار کی ـ اس آیت میں اللہ فیصلہ فرماتا ہے کہ جو پاکیزگی اختیار کرے اور اپنے دل میں رب کا جلال بسائے اور پھر نماز پڑھے یا اللہ سے ڈرے اور اطاعت کرے ـ دونوں معنوں سے اللہ کی یاد تازہ ہوتی ہے اور جلال دل میں بیٹھتا ہے اور ضمیر میں اللہ کی ہیبت پیدا ہوتی ہے ـ تو فیصلہ یہ ہے کہ وہ شخص فلاح پائے گا۔ دنیا میں بھی وہ فلاح پائے گا کہ اس کا دل اللہ سے جڑا ہوا ہو گا ' زندہ ہو گا ' اللہ کے ذکر میں وہ مٹھاس محسوس کرے گا اور اس کو باری تعالیٰ سے انس ہو گا اور آخرت میں بھی فلاح پائے گا۔ وہاں بڑی آگ سے بچے گا اور جنتوں میں نعیم مقیم میں ہو گا ـ دونوں کا انجام دے دیا گیا اور دونوں کے انجام میں بعد المشرقین ہے

اس خوفناک منظر میں 'جس میں نار کبریٰ دکھائی گئی ہے اور اس کے بالمقابل نجات کا منظر دکھایا گیا ہے ان لوگوں کے

لیے جو پاکیزگی اختیار کرتے ہیں۔ ان مناظر کے بعد بتایا جاتا ہے لوگ بدبختی کے چنگل میں کیوں پھنس جاتے ہیں اور ان کی غفلت کا اصل سبب کیا ہے اور عبرت آموزی، تطہیر اور فلاح و نجات سے ان کو کیا چیز روکتی ہے۔ اور وہ کیا چیز ہے جو انہیں جہنم رسید کرتی ہے اور بدبخت بنا دیتی ہے۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۱۶﴾ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۱۷﴾

"مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا پرستی ہی ہر مصیبت کی جڑ ہے۔ اسی وجہ سے انسان نصیحت سے منہ موڑتا ہے کیونکہ آخرت کا مطالبہ یہ ہوتا ہے اس کی فکر کرو اور آخرت کو ترجیح دو۔ اور لوگ ہیں کہ دنیا کے طالب ہیں اور اس کو اولیت دیتے ہیں۔

اور اس دنیا کو دنیا ویسے نہیں کہا گیا، بلکہ یہ دنیائے دنی ہے، قریبی ہے اور جلد مٹنے والی ہے اور اس کے مقابلے میں آخرت اچھی اور بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى (۸۷ : ۱۷) یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے باقی رہنے والی اور اچھی اور ابد الآباد تک مسلسل ہونے والی ہے۔ لہٰذا جو لوگ آخرت پر دنیا کو ترجیح دیتے ہیں وہ بڑی حماقت کا ارتکاب کر رہے ہیں اور ان کا اندازہ غلط ہے۔ کسی عاقل اور بصیر کا یہ کام نہیں ہے۔

آخر میں یہ بتایا جاتا ہے کہ دعوت اسلامی کوئی نئی دعوت نہیں ہے، اس کی طویل تاریخ ہے۔ آغاز کائنات سے اور وجود انسانیت سے یہ دعوت چل رہی ہے اور اس کے اصول زمان و مکان کے قیود سے ماوراء ہیں۔ ۱

ع ۱۹ اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى ﴿۱۹﴾
۱۲

"یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی، ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں"۔ اس سورت میں جو مضامین آئے ہیں وہ اس عظیم عقیدہ کے بنیادی اصول ہیں اور یہ وہی بنیادی اصول دعوت ہیں اور اصول دین ہیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی کتابوں اور صحیفوں میں مذکور ہوئے تھے۔

یہ کہ سچائی ایک ہے، عقیدہ ایک ہے، اصول دین ایک ہے یہ اس بات کی شہادت ہے کہ یہ سب ادیان ایک اللہ کی طرف سے ہیں۔ وہ ایک ہی ارادہ اور مشیت ہے جس نے ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کو اور پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ارادہ کیا ہے۔ سچائی ایک ہے، تو اس کا سرچشمہ بھی ایک ہے۔ ہاں ادیان میں فروعی اختلافات ہیں لیکن وہ اس لیے کہ شریعت و قانون میں اللہ نے وقت کے حالات اور تقاضوں کے مطابق تبدیلی فرمائی۔ البتہ تمام شرائع کی اصل ایک ہے اور ایک ہی سرچشمہ سے تمام شریعتیں نکلیں یعنی اسی رب اعلیٰ کی طرف سے آئیں جس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے متناسب بنایا اور جس نے ہر چیز کو مقدر کیا، تقدیر بنائی اور ہر چیز کو ہدایت دی۔

---OOO---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ----- ۳۰

## سورۃ الغاشیۃ۔ ۸۸

## آیات ۱--- تا--- ۲۶

# سورۃ الغاشیۃ ایک نظر میں

اس سورت کا انداز نہایت گہرا' پر سکون اور فکر انگیز ہے۔ غور و فکر کے ساتھ ساتھ اس میں ایک طرف رجائیت ہے اور انسان عالم آخرت سے امید یں وابستہ کرتا ہے اور دوسری جانب احتیاط اور خوف اور یوم الحساب کی فکر اور تیاری پر ابھارا گیا ہے۔

یہ سورت انسانی فکر و نظر کو دو اہم اور پر خطر وادیوں کی سیر کراتی ہے۔ایک عالم آخرت' جو بہت ہی وسیع ہے' جس کے مناظر بہت ہی موثر ہیں اور دوسری وادی اس کائنات کی ہے جو ہمارے سامنے ہے' کھلی ہے' اور اس کے اندر پھیلی ہوئی مخلوق خدا میں آیات الٰہی بکھرے پڑے ہیں۔ ان دو وادیوں میں گھما کر انسان کو دعوت فکر دی جاتی ہے کہ آخر کار اسے اللہ کے سامنے جانا ہے' جہاں تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہوں گے۔ لہٰذا آخرت کی تیاری کرو۔ یہ تمام باتیں نہایت ہی موثر انداز میں کی گئی ہیں۔ انداز دھیما لیکن دل میں اترنے والا ہے' پختہ ہے لیکن خوفناک بھی۔

---○○○---

# درس نمبر ۲۸۸ تشریح آیات

# ۱ -- تا -- ۲۶

آیاتہا ۲۶ سُوْرَۃُ الْغَاشِیَۃِ (۸۸) مَکِّیَّۃٌ (۶۸) رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝۱

"کیا تمہیں اس چھا جانے والی آفت (یعنی قیامت) کی خبر پہنچی ہے؟" اس آغاز کے ذریعہ یہ سورت دلوں کو اللہ کی طرف متوجہ کرتی ہے اور اس کائنات میں جو نشانات الہیہ موجود ہیں ان کی طرف متوجہ کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ انسان نے قیامت میں حساب دینا ہے اور جزاء و سزا سے دوچار ہونا ہے ۔ اور یہ یقینی امر ہے ۔ استفہامی تاکیدی یا تقریری کے ذریعہ اس بات کو نہایت تاکید سے بیان کیا جاتا ہے ۔ اس استفہامی انداز میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اس سورت سے قبل اس امر کی بار بار تاکید اور تذکیر کی گئی ہے ۔ اس لیے یہاں قیامت کو ایک نیا نام دیا گیا ہے ۔ الغاشیہ (چھا جانے والی) یعنی ایک ایسی مصیبت جس کی ہولناکیاں لوگوں پر چھا جائیں گی ۔ یہ ایک نیا نام ہے لیکن اس نام کے ذریعہ قیامت کی خوفناکی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ اس بارے میں قیامت کے لیے کئی نام آئے ہیں ۔ الطامہ ، الصاخہ ، الغاشیہ اور القارعہ اور یہ سب نام اسی پارے کے مضامین کے ساتھ مناسب ہیں ۔

یہ سوال کہ کیا غاشیہ کی کچھ خبریں آپ کو ملی ہیں ' تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سمجھتے تھے کہ سب سے پہلے یہ سوال ان سے کیا گیا ہے ۔ جب بھی حضور اکرمؐ اس سورت کو پڑھتے یا سنتے تو یوں محسوس ہوتا کہ شاید حضور اکرمؐ نے اسے پہلی مرتبہ سنا ہے اور ابھی یہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہو رہی ہے ۔ آپ اللہ کے اس خطاب کو سن کر چونکنے ہو جاتے اور یہ خیال کرتے کہ یہ اللہ کا خطاب ہے ' اور آپؐ کے احساسات یہ ہوتے کہ ابھی یہ خطاب انہوں نے پایا اور سنا ۔ ابن ابوحاتم روایت کرتے ہیں ابن محمد طنافسی سے ' وہ ابوبکر ابن عباس سے ' وہ ابواسحاق سے ' وہ عمر ابن میمون سے کہ حضور اکرمؐ ایک عورت کے پاس سے گزرے جو پڑھ رہی تھی ۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ (۸۸ : ۱) "کیا آپ تک الغاشیہ کی بات پہنچی ہے؟" تو آپ کھڑے ہو

گئے اور آپؐ نے فرمایا "ہاں میرے پاس بات آئی ہے"۔

اس کے باوجود خطاب ہر اس شخص کو ہے جو قرآن مجید سنتا ہے یا پڑھتا ہے کیونکہ الغاشیہ کی بات قرآن کی بات ہے جو بار بار قیامت کا ذکر کرتا ہے۔ قرآن کریم قیامت کی یاد دہانی کرا کے لوگوں کو ڈراتا ہے اور خوشخبری دیتا ہے اور ڈرنے والے حساس اور متقی دلوں کے اندر عمل اور احتیاط کے جذبات ابھارتا ہے۔ ڈر اور احتیاط کے ساتھ ساتھ قرآن مجید امید اور فلاح کا انتظار بھی سکھاتا ہے تاکہ انسانی ضمیر غافل ہو کر مر ہی نہ جائے۔

اور یہ کہنے کے بعد کہ "کیا تمہیں اس چھا جانے والی آفت کی خبر پہنچی؟" اس خبر کی ہیڈ لائن دی جاتی ہیں۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ﴿٢﴾ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ﴿٣﴾ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ﴿٤﴾ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ﴿٥﴾ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ﴿٦﴾ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ﴿٧﴾

"کچھ چہرے اس روز خوفزدہ ہوں گے' سخت مشقت کر رہے ہوں گے' تھکے جاتے ہوں گے' شدید آگ میں جھلس رہے ہوں گے' کھولتے ہوئے چشمے کا پانی انہیں پینے کو دیا جائے گا' خار دار سوکھی گھاس کے سوا کوئی کھانا ان کے لیے نہ ہو گا جو نہ موٹا کرے نہ بھوک مٹائے"۔

یہاں نعمتوں کے منظر سے قبل عذاب کا منظر دکھایا گیا کیونکہ سوال قیامت کی ہولناکیوں سے متعلق تھا' بتایا جاتا ہے کہ لوگ سخت خوف کی حالت میں ہوں گے' تھکے ہارے اور ڈرے سہے ہوں گے۔ انہوں نے پوری زندگی جدوجہد میں گزاری' تھک اور ہار گئے لیکن ان کے اعمال کھوٹے نکلے اور کسی نے بھی ان کو قبول نہ کیا' عاقبت بھی خراب ہوئی اور مصیبت اور خسارے کے سوا کچھ نہ ملا۔ چنانچہ ان کی تھکاوٹ اور پریشانی اور درماندگی میں اضافہ ہی ہوا۔

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (۸۸ : ۳) "سخت مشقت کر رہے ہوں گے اور تھکے جاتے ہوں گے"۔ دنیا میں وہ صرف اپنے نفس اور اپنی اولاد کے لیے جدوجہد کر رہے ہوں گے' دنیا اور دنیا کی طمع اور آز کے لیے تھکے ہوں گے۔ پھر آج انجام ان کے سامنے ہے کہ دنیا میں ان کو مل گیا جو ملنا تھا' مگر آخرت میں تاریکی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اب یہ آخرت کا سامنا ذلیل ہو کر کر رہے ہیں' تنگ ہیں' خائب و خاسر ہیں اور مایوس ہیں۔ اور اس ذلت اور خواری کے ساتھ پھر دردناک عذاب۔

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً (۸۸ : ٤) "شدید آگ میں جھلس رہے ہوں گے"۔ یہ اس کا مزہ چکھیں گے اور مشقتیں برداشت کریں گے۔

تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ (۸۸ : ٥) "کھولتے ہوئے چشمے کا پانی انہیں پینے کو دیا جائے گا"۔ انیہ کے معنی

انتہائی گرم، کھولتا ہوا۔

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ (٦) لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوْعٍ (٨٨: ٧) "خاردار سوکھی گھاس کے سوا کوئی کھانا ان کے لیے نہ ہو گا جو نہ موٹا کرے نہ بھوک مٹائے"۔ "ضریع" کے معنی کے بارے میں دو قول ہیں 'ایک یہ کہ یہ ایک درخت ہو گا جو جہنم کے اندر ہی پیدا ہو گا جیسا کہ خود قرآن مجید میں زقوم آیا ہے کہ وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہہ میں پیدا ہو گا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ایک کانٹے دار جھاڑی ہے جو زمین کے ساتھ چپکی ہوئی ہوتی ہے 'اور جب یہ سبز ہوتی ہے تو اسے شبرق کہتے ہیں اور جب اسے کاٹ لیا جائے اور خشک ہو تو ضریع کہتے ہیں' اسے اونٹ چرتے ہیں۔ جب یہ خشک ہو تو اونٹ بھی اسے کھا نہیں سکتے کیونکہ اس کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے۔ غرض جو معنی بھی ہوں' یہ اس طرح کی خوراک ہے جس طرح پانی کے بارے میں آیا ہے کہ وہ غسلین یا غساق پئیں گے اور جو خوراک بھی وہاں ہوگی وہ نہ ان کو موٹا کرے گی اور نہ بھوک مٹائے گی۔

آخرت کا یہ عذاب کیسا ہو گا؟ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ہم اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ یہاں اس کی ایسی صفات دی جاتی ہیں تاکہ ہم بدترین سزا کا تصور کر سکیں۔ جس میں ذلت 'کمزوری' نامرادی 'گرم ترین آگ کی جلن' زمہریر یعنی بہت سرد' پینے کے لیے سخت گرم پانی 'اور اس قسم کا کھانا کہ اسے اونٹ بھی نہ کھا سکیں اور اگر کھائیں بھی تو ان کو کوئی نفع نہ دے۔ ان اوصاف سے ہمارے احساسات میں جو چیز بیٹھتی ہے وہ حد درجہ کا رنج و الم ہے۔ لیکن آخرت کا عذاب ہمارے تصورات سے شدید تر ہے۔ اور وہ کیا ہو گا' یہ وہی بتا سکتا ہے جو اس میں مبتلا ہو گا۔ العیاذ باللہ! اور دوسری طرف اہل ایمان :

وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاعِمَةٌ ﴿٨﴾ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿٩﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿١٠﴾ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ﴿١١﴾ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿١٢﴾ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ﴿١٣﴾ وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ﴿١٤﴾ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ﴿١٥﴾ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ﴿١٦﴾

"کچھ چہرے اس روز بارونق ہوں گے 'اپنی کارگزاری پر خوش ہوں گے' عالی مقام جنت میں ہوں گے 'کوئی بیہودہ بات وہ وہاں نہ سنیں گے' اس میں چشمے رواں ہوں گے 'اس کے اندر اونچی مسندیں ہوں گی' ساغر رکھے ہوئے ہوں گے 'گاؤ تکیوں کی قطاریں لگی ہوں گی اور نفیس فرش بچھے ہوئے ہوں گے"۔

اہل جنت کے چہروں سے معلوم ہو گا کہ یہ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ وہ رضائے الٰہی کی وجہ سے بے حد مطمئن ہوں گے۔ نعمتوں میں بس رہے ہوں گے۔ ان کے اعمال کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا' تعریف کی جائے گی اور انعامات پائیں گے۔ اس کے علاوہ ان کو بلند روحانی شعور حاصل ہو گا کہ اللہ ان کے اعمال سے راضی ہے۔ اور ان کو نظر آئے گا کہ اللہ راضی ہے۔ اس سے زیادہ روحانی سکون کسی کو نہیں مل سکتا کہ کوئی بھلائی کے کاموں پر مطمئن ہو جائے' اور اس

کا انجام اچھا ہو' اور پھر وہ دیکھے کہ اس کا مالک اس سے راضی ہے اور جنتوں میں داخل ہو جائے ـ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم رضائے الٰہی اور روحانی خوشی کا ذکر جنتوں کی مادی نعمتوں سے پہلے کرتا ہے اور اس کے بعد جنتوں میں ان کے مقامات کا ذکر کیا جاتا ہے ـ

فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ (۸۸ : ۱۰) "عالی مقام جنت میں ہوں گے"۔ ذاتی اعتبار سے بھی یہ بلند ہوں گے 'عزت کے اعتبار سے بھی بلند ہوں گے' درجات رہائش بھی بلند ہوں گے' مقامات بھی بلندیوں پر ہوں گے ـ غرض ان کے احساسات پر علو چھایا ہوا ہو گا ـ

لَا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً (۸۸ : ۱۱) "کوئی بیہودہ بات وہ وہاں نہ سنیں گے"۔ اس تعبیر میں ایک فضا اور اک جہان معانی سمو دیا گیا ہے ـ آرام ہو گا' سکون ہو گا' اطمینان اور سلامتی ہو گی' محبت اور رضامندی ہو گی' دوستوں کی محفلیں ہوں گی' آل اولاد جمع ہوں گے' طہارت و پاکیزگی ہو گی' ہر لغو بات سے وہ دور ہوں گے ـ کوئی ایسی بات نہ ہو گی جس میں ان کے لیے خیر و عافیت نہ ہو ـ اور ایسی فضا اپنی جگہ ایک نعمت ہوتی ہے' یہ صورت حال خود نیک بختی ہے اور سعادت مندی ہے ـ جب انسان اس دنیا کی زندگی کی مشکلات اور تلخیوں کا تصور کرے کہ یہاں کس قدر لغو' لڑائیاں جھگڑے' تو تو میں میں' شور و شغب' مذمت و ملامت' جھوٹ اور فریب' اور فتنہ و فساد ہے اور اس کے بعد جنت کی فضا کا تصور کرے جو پر سکون' پر امن' پر محبت' تر و تازہ ہے اور پھر قرآن کی یہ تعبیر جامع تعبیر ـ

لَا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً (۸۸ : ۱۱) "وہاں کوئی بیہودہ بات نہ سنیں گے"۔ یہ الفاظ ہی ایسے ہیں جن کے اندر نرمی' آسانی اور تر و تازگی ہے ـ ان کا تلفظ بھی پر ترنم ہے ـ نرم اور آسان ہے ـ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان کی زندگی اس جہاں میں' خصوصاً تحریک اسلامی کے کارکنوں کی زندگی بھی ـ دراصل جنت کا ایک نمونہ ہو گی جو لغو' فحش باتوں سے' جدل و جدال سے دور ہوتے ہیں ـ یہ گویا جنت کی زندگی کی تیاری ہوتی ہے ـ

یوں جنت کے حال احوال سے یہ روشن اور بلند مفہوم پیش کیا جاتا ہے اور اس کے بعد پھر جنت کی نعمتوں کا ذکر ہے جو انسانی حواس کے لیے باعث تسکین ہوتی ہیں' اور یہ اس صورت میں مذکور ہیں جس کا انسان تصور کر سکتا ہے' لیکن جنت میں یہ چیزیں اس شکل میں ہوں گی جس تک اہل جنت کے نفوس ترقی کر چکے ہوں گے' اور وہ کیا صورت ہو گی؟ جس کی معرفت انہی لوگوں کو ہو گی جنہوں نے ان کو برتا ـ

فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ (۸۸ : ۱۲) "اس میں چشمے رواں ہوں گے"۔ چشمہ جاری وہ چشمہ ہوتا ہے جس سے پانی ابل رہا ہوتا ہے' جاری چشموں میں خوبصورتی' پانی کی روانی اور پیاس بجھانے کا سامان بہت ہی خوبصورت ہیں ـ آب رواں' ایک قسم کی حیات کا مظہر ہوتا ہے اور وہ انسانی روح کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے ـ جو رواں اور متحرک ہوتی ہے ـ اس منظر اور اس کا یہ معنوی حسن دونوں انسانی احساس کی گہرائیوں تک اترتے ہیں ـ

فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ (۸۸ : ۱۳) "اس کے اندر اونچی مسندیں ہوں گی"۔ بلندی نظافت اور طہارت

دونوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

وَّ اَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ (۸۸:۱۴) "ساغر رکھے ہوئے ہوں گے"۔ یہ لائن پر رکھے ہوں گے تاکہ ان میں شراب صافی نوش کی جائے اور اہل جنت کو طلب کی ضرورت نہ ہوگی' ہر چیز ان کے لیے تیار ہوگی۔

وَّ نَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ (۸۸:۱۵) "گاؤ تکیوں کی قطاریں لگی ہوئی ہوں گی"۔ یعنی وہ تکیے جو نرم مواد سے بھرے ہوں گے اور جنہیں انسان آرام اور خوشی کے وقت استعمال کرتا ہے۔

وَّ زَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ (۸۸:۱۶) "اور نفیس فرش بچھے ہوں گے"۔ وہ فرش جو پشم دار ہو' یہ جگہ جگہ زینت اور آرام کے لئے بچھے ہوں گے۔

یہ وہ سہولیات ہیں جن کی نظیر دنیا میں ہم دیکھتے ہیں اور یہاں ان اصطلاحات میں جنت کی سہولیات کا ذکر ہمارے سمجھانے کے لیے ہے لیکن وہاں سہولیات کیسی ہوں گی' اس کا تعلق وہاں استعمال کرنے سے ہے۔ یہ وہی لوگ بتا سکیں گے جن کی قسمت میں جنت لکھی ہے۔

یہ بحث فضول ہے کہ ہم یہاں جنت کی سہولیات کی نوعیت اور کیفیت کا ذکر کریں یا قیامت کے عذاب کی کیفیات کا ذکر کریں اس لیے کہ اشیاء اور مدکارت کی نوعیت کا اظہار اس طرح ہو سکتا ہے کہ ان کے بارے میں انسانی ادراک مکمل ہو' اہل زمین کی قوت مدرکہ اس زمینی حواس کے محدود دائرے میں کام کرتی ہے۔ جب یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے تو ان کی قوت مدرکہ پر سے تمام حدود و قیود اٹھ جائیں گے اور وہاں ان کی روح اور احساس اور ادراک سب بہت ترقی کریں گے۔ جس طرح وہاں قوت مدرکہ ترقی کرلے گی' اسی طرح وہاں الفاظ کے معانی بھی وسیع تر ہو جائیں گے اور وہاں ہمارے ذوق و شوق اور فہم و ادراک کا عالم ہی اور ہو گا لہٰذا اس کی کیفیت یہاں ہم قلم بند نہیں کر سکتے۔

ہم یہاں صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ذہن میں لذت' عیش کوشی اور مٹھاس اور ذوق کا اعلیٰ ترین تصور یوں گا اور یہ ہم اپنے تجربے کے مطابق ہی کہہ سکتے ہیں۔ اصل حقیقت ہمارے علم میں تب آئے گی جب اللہ جل شانہ ہمیں وہاں یہ اعزاز بخش دے گا۔

یہاں آکر عالم آخرت کا مطالعاتی سفر ختم ہوتا ہے اور ہم اسی ظاہری کائنات کی طرف لوٹتے ہیں جو ہمارے سامنے کھڑی ہے اور جس کے اندر قادر مطلق کی تدبیر ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ جس میں اللہ کی صنعت ممتاز ہے' جس میں اللہ کی بنائی ہوئی چیزیں ممتاز نظر آتی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زندگی کے بعد اس سے ایک برتر زندگی ہے' اس زمین سے ایک برتر جہان ہے اور اس موت پر ہی خاتمہ نہیں ہے بلکہ لوگوں کا انجام کچھ اور ہے

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿١٧﴾ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿١٨﴾ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿١٩﴾ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿٢٠﴾

"(یہ لوگ نہیں مانتے) تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟"

یہ مختصر چار آیات ہیں لیکن ان کے اندر قرآن کریم کے پہلے مخاطب عرب سوسائٹی کے ماحول کی پوری طرح تصویر کھینچ دی گئی ہے' اور اس کے ساتھ ساتھ پوری کائنات کا نقشہ بھی۔ آسمان' زمین' پہاڑ اور زمین کے اوپر حیوانی خوبصورتی اونٹ کی صورت میں' کیونکہ اونٹ کی تخلیق نہایت پیچیدہ ہے اور عربوں کے لیے اس کی اہمیت مسلم ہے۔ انسان جہاں بھی ہو' یہ مناظر اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ آسمان' پہاڑ' ہموار زمین اور اس کے اوپر قسم قسم کے حیوانات۔ انسان علم و معرفت کے جس مقام پر بھی ہو' یہ مناظر اس کے علم' ادراک اور دلچسپی کا مرکز ہوتے ہیں۔ اگر انسان ان چیزوں کی ساخت پر غور کرے تو اس میں اسے وہ دلائل و شواہد مل سکتے ہیں جو اس کی رہنمائی اس کائنات کی پشت پر کارفرما قوت کی طرف کر سکتے ہیں۔

ان سب مناظر کی ایک معجزانہ شان ہے۔ ان کے اندر خالق کی صنعت کاری کے ایسے پہلو نمایاں ہیں جن کی کوئی مثال انسان کی دریافت میں نہیں ہے۔ یہ چیزیں اس بات کے لیے بالکل کافی ہیں کہ انسان اپنے ذہن میں ایک ابتدائی صحیح عقیدہ اور صحیح تصور جما لے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ (۸۸: ۱۷) "کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے"۔ قرآن کے پہلے مخاطب ایک عرب کے ہاں اونٹ کی اہمیت یہ تھی کہ وہ اس کے اوپر سفر کرتا تھا' اس کا دودھ پیتا تھا' اور اس کا گوشت کھاتا تھا' اور اس کے بالوں اور چمڑے سے لباس اور بچھونا بناتا تھا گویا اس کی زندگی کے لیے سپلائی کا یہ بڑا ذریعہ تھا اور زندگی کا ایک بڑا اثاثہ تھا۔ پھر اونٹ دوسرے حیوانات کے مقابلے میں کچھ منفرد خصوصیات بھی رکھتا تھا۔ ایک خصوصیت یہ تھی کہ اپنی ضخامت' قوت اور عظیم جثہ کے باوجود اس قدر شریف جانور ہے کہ ایک چھوٹا سا بچہ بھی اسے چلائے تو بڑی فرماں برداری سے اطاعت کرتا ہے۔ پھر اس سے انسانوں کو جس قدر منافع زیادہ ہیں' اسی نسبت سے اس کا سنبھالنا آسان تر ہے۔ اس کے کھانے اور چرنے کی چیزیں آسان ہیں اور اس کی خوراک کے لیے انسان کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی۔ جس قدر خانگی جانور ہیں ان میں سے یہ سب سے زیادہ بھوک' پیاس' مشقت اور برے حالات برداشت کرتا ہے۔ پھر اللہ نے جس سیاق میں اسے یہاں پیش فرمایا ہے اس میں اس کی ساخت نہایت موزوں تھی۔ اس کی تفصیلات آ رہی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنے مخاطبین سے کہا ذرا اونٹ کی تخلیق پر غور کرو' یہ تو ہر وقت تمہارے سامنے رہتا ہے۔ کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے' اس پر غور کرنے کے لیے کسی بڑے علم کی ضرورت نہیں ہے۔

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ (۸۸: ۱۷) "کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے بنائے گئے ہیں"۔ ان کی ساخت اور ان کی تخلیق پر غور نہیں کرتے۔ اور پھر غور نہیں کرتے کہ اس کی ساخت اس کے مقاصد تخلیق کے ساتھ کس قدر ہم آہنگ ہے۔ اور وہ کس طرح اچھے طریقے سے مقصد تخلیق کو پورا کرتے ہیں۔ یہ عرب معاشرے اور عرب ماحول میں اپنے فرائض کس اچھے انداز میں پورے کرتے ہیں۔ کیا اونٹوں کو کسی انسان نے بنایا ہے' کیا

اونٹ خود بخود بن گئے' اگر یہ دونوں صورتیں نہیں تو لازماً ایک خالق ہے' جب خالق ہے تو پھر وہ نہایت ہی حکیم ہے کہ اس نے ایسی عجیب اور مفید مخلوق بنائی۔

وَ اِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ (۸۸ : ۱۸) "اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا"۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ آسمانوں کی طرف غور کی نگاہ سے دیکھیں اور صحرا کے باشندوں کو تو بہت زیادہ آسمان کی طرف دیکھنا چاہئے اور غور کرنا چاہئے' جہاں کے باشندے ہروقت آسمان کے ساتھ ایک پرلطف ذوق اور اشارات رکھتے ہیں گویا آسمان تو ہے ہی ان کے لیے۔ اور آسمان ہوتا ہی صحراؤں پر ہے۔ آسمان اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ صحرا کے اوپر موجود ہے۔ اس کے روشن اور کھلے دن' آسمان کا ساحرانہ خوبصورت وقت زوال آفتاب غروب آفتاب کا منفرد منظر' جس میں جہان معانی پوشیدہ ہوتا ہے' آسمان اپنی وسیع راتوں کے ساتھ' اور اپنے چمکدار ستاروں اور خوبصورت کہانیوں کے ساتھ اور پھر اس کے خوبصورت اور روشن طلوع کے مناظر کے ساتھ تمہارے سامنے موجود ہے۔

یہ آسمان اور صحراؤں کی وسعتوں کے اوپر' کیا یہ لوگ اس کی طرف نہیں دیکھتے' کہ اسے کس طرح بلند کھڑا کیا گیا ہے۔ بغیر ستونوں کے یہ رفعتیں کس طرح قائم ہیں؟ اس کے اندر اربوں کھربوں ستارے بکھیر دیئے گئے ہیں اور اس کے اندر اس قدر خوبصورتی' اس قدر حسن اور اس قدر اشارات رکھ دیئے گئے ہیں۔ نہ انسانوں نے اسے بلند کیا اور نہ یہ خود بخود بلند ہو گیا۔ لہٰذا اسے یوں بلند کھڑا کرنے والا ضرور ہے' جس نے اسے وجود بخشا۔ یہ مشاہدہ ایسا ہے اور یہ غور و فکر ایسا ہے جس کے لیے کسی وسیع اور گہرے علم کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک بصیرت والی نظر کی ضرورت ہے۔

وَ اِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ (۸۸ : ۱۹) "اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے"۔ ایک عرب کے نزدیک پہاڑ بہت اہم تھے' پہاڑوں ہی میں عرب مشکل اوقات میں پناہ لیتے تھے۔ مشکل مراحل میں پہاڑ ہی ان کے انیس اور دوست ہوا کرتے تھے۔ پہاڑوں کے مناظر جب انسان دیکھتا ہے تو ان سے اس کو گہرے نفسیاتی اشارات ملتے ہیں۔ یہ پہاڑوں کے نظام میں ایک عظمت نظر آتی ہے۔ ایک جمال نظر آتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو کم تر سمجھ کر ان کے اندر پناہ لیتا ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں سکون حاصل کرتا ہے اور اس فطری ماحول میں خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ان اونچے پہاڑوں میں انسان یہ سوچتا ہے کہ وہ اللہ کے زیادہ قریب ہے۔ یوں بلند پہاڑوں کے دامن میں وہ زمین کے شور و شغب اور حقیر سرگرمیوں سے قدرے بلند ہو جاتا ہے۔ یہ بات نہ کوئی عبث بات تھی اور نہ کوئی اتفاقی فعل تھا کہ نبوت سے قبل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جبل ثور کے غار حرا میں علیحدگی اختیار فرماتے تھے' لہٰذا جو لوگ لافانی بالیدگی چاہتے ہیں ان کو چاہئے کہ ان کی روح ایک عرصہ کے لیے دنیاوی آلودگیوں سے دور ہو جائے۔ پہاڑوں کے بارے میں یہاں جو الفاظ غور کے لیے آئے ہیں وہ ہیں۔

کَیْفَ نُصِبَتْ (۸۸ : ۱۹) یعنی وہ زمین کے اوپر کس طرح جمائے گئے ہیں' یہ الفاظ منظر کے ماحول کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہیں۔

وَ اِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ (۸۸: ۲۰) "اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟" یہ بچھی ہوئی زمین تو ہمارے سامنے ہے۔ یہ زندگی گزارنے کے لیے' اس پر چلنے کے لیے' اور اس پر کام کرنے کے لیے آسان بنا دی گئی ہے۔ کیا اسے لوگوں نے بچھایا ہے' ظاہر کہ انہوں نے نہیں بچھایا' انسانوں کی پیدائش سے تو زمین پہلے تھی۔ کیا یہ اس پر غور نہیں کرتے۔ ان کے ذہنوں میں یہ سوال کیوں نہیں اٹھتا کہ کون ہے اس کو بچھانے والا؟ اور کون ہے اسے اس طرح درست کرنے والا کہ زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے۔

یہ مناظر قلب انسانی کی طرف اہم اشارات کرتے ہیں' محض تامل اور غور و فکر سے انسان یہ اشارات پاتا ہے اور یہ اشارات وجدان کے ابھارنے اور انسانی ضمیر کو بیدار کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان اشارات سے انسان اپنے موجد' خالق اور اس پوری کائنات کے خالق کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

اس کائناتی منظر کی منظر کشی میں جس توازن اور ہم آہنگی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس پر قدرے غور کی ضرورت ہے تا کہ یہ معلوم ہو کہ قرآن انسانوں سے کس خوبصورت زبان میں مخاطب ہوتا ہے۔ اور اس میں فنی خوبیوں کو کس قدر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور ایک باشعور مومن کے احساسات میں یہ دونوں چیزیں کس طرح پیوست ہوتی ہیں۔

اس منظر میں بلند آسمان اور بچھائی ہوئی زمین کو دکھایا گیا ہے۔ لیکن پہاڑوں کی بلندی افقی نہیں ہے اور نہ ہی وہ زمین پر گرے ہوئے ہیں' بلکہ وہ نصب کردہ ہیں۔ اس طرح نصب ہیں جس طرح اونٹ کے اوپر کوہان ہوتی ہے۔ اس منظر میں دو افقی خط ہیں اور دو راسی خط ہیں۔ لیکن باہم متناسب ہیں اور یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز ہے جس کے مطابق وہ مناظر کو پیش کرتا ہے۔ انداز تعبیر مجمل ہوتا ہے لیکن مصور ہوتا ہے۔

پہلا سفر تو تھا عالم آخرت میں' دوسرا مشاہداتی سفر تھا۔ اس کائنات کے مناظر میں' جو ہمارے سامنے تھے' اب روئے سخن حضور اکرمؐ کی طرف پھر جاتا ہے۔ آپ کو اپنے واجبات و فرائض کے حدود کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ کے فرائض کی نوعیت کیا ہے۔ اسی طرح لوگوں کے احساسات کو آخری چٹکی دی جاتی ہے تاکہ دعوت اسلامی کے حوالے سے سوئے ہوئے دلوں کو جگایا جائے۔

فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿۲۱﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿۲۲﴾

اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَ كَفَرَ ﴿۲۳﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ﴿۲۴﴾ اِنَّ اِلَيْنَاۤ

اِيَابَهُمْ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿۲۶﴾ النصف ع ۲۶ ۱ ۱۳

"اچھا تو (اے نبیؐ) نصیحت کیے جاؤ' تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو' کچھ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو۔ البتہ جو شخص منہ موڑے گا' اور انکار کرے گا تو اللہ اس کو بھاری سزا دے گا۔ ان لوگوں کو پلٹنا ہماری طرف ہی ہے' پھر ان کا حساب لینا ہمارے ہی ذمہ ہے"۔

ان کو آخرت کے واقعات کی یاد دہانی کرائیں اور اس کائنات کے شواہد بھی بتائیں۔ آپ کا بڑا فریضہ یہ ہے کہ یاد

دہانی کرائیں ۔ اور یہ ایک متعین اور مقدر فریضہ ہے ۔ دعوت اسلامی کے معاملے میں آپ کا کردار بس اسی قدر ہے کہ آپ دعوت پہنچا دیں ۔ اس کے بعد نہ آپ کا حق ہے کہ کچھ مزید کریں اور نہ آپ کی ذمہ داری ہے ۔ آپ کا فریضہ یہ ہے کہ آپ دعوت پہنچائیں اس سے آگے آپ کسی کو اسلام پر مجبور کرنے کے مکلف نہیں ہیں ۔

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُسَيْطِرٍ (۸۸: ۲۲) "آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہیں" ۔ کیونکہ دلوں کا مالک تو اللہ ہے ۔ آپ جبر کر کے ان کے دلوں کو نہیں پھیر سکتے ۔ دل تو اللہ کی انگلیوں کے درمیان ہیں ۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ جس دل کو چاہے ایمان کی طرف پھیر دے ۔

بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ صرف تبلیغ تھا تو پھر جہاد کیوں فرض کیا گیا؟ جہاد اس لیے نہیں فرض ہوا کہ لوگوں کو مومن بنایا جائے بلکہ اس لیے کہ تبلیغ کے راستے میں رکاوٹیں دور کی جائیں ۔ یہ نہ ہو کہ لوگوں تک دین کی بات ہی نہ پہنچے اور یہ بھی نہ ہو کہ اگر کوئی دین اسلام کو قبول کر لے تو اس پر تشدد ہو ۔ جہاد کا مقصد یہ تھا کہ تبلیغ دین کے راستے میں سیاسی رکاوٹیں دور کی جائیں ۔ رسولؐ کا اصل فریضہ بہرحال دعوت دین ہے ۔

یہ اشارات و ہدایات کہ رسول اللہؐ کی ڈیوٹی صرف تبلیغ ہے ۔ اس کو قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے اور اس کی کئی وجوہات ہیں ۔ پہلا سبب یہ ہے کہ تبلیغ کرنے کے بعد بھی اگر لوگ نہیں مانتے تو رسول خداؐ پریشان نہ ہوں ' ان کو تسلی ہو جائے کہ انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے ۔ وہ مطمئن ہو جائیں اور لوگوں کو تقدیر الٰہی کے حوالے کر دیں کہ وہ جو چاہے کرے ۔ کیونکہ انسانوں بالخصوص دعوت اسلامی کا کام کرنے والوں کے دلوں میں اس بات کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ ان کا مشن کامیاب ہو اور غالب ہو ۔ تمام لوگ اس کو قبول کر لیں اس لیے اللہ نے بار بار اس کی تاکید کی کہ داعی کا کام دعوت دینا ہے اور اسے اس قدر اخلاص سے کام کرنا چاہیے کہ ذاتی خواہش اور ذاتی پسند کو دعوت کے کھاتے سے نکال دے ۔ اور دعوت کا کام جاری رکھے ۔ آگے انجام کیا ہوتا ہے ۔ یہ اللہ پر چھوڑ دے ۔ اسے کیا ہے کہ کوئی مومن بنتا ہے یا کافر بنتا ہے ۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب کسی معاشرے میں دعوت اسلامی کے لیے حالات سازگار نہ ہوں ۔ لوگ دین سے دور ہوں اور دین کی راہ میں مادی و سیاسی رکاوٹیں ہوں تو داعی کو پریشان نہیں ہونا چاہیے ۔

یہ بات کہ دعوت اسلامی ایک خیر محض ہے اور ہر انسان یہ خواہش رکھتا ہے کہ لوگ اس میں داخل ہو جائیں ۔ اس خواہش کی شدت کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے بار بار یہ تلقین کی جاتی ہے کہ آپؐ کا کام صرف تبلیغ ہے ۔ آپؐ کسی پر جبر نہیں کر سکتے ۔ حالانکہ رسول اللہؐ خدا کے پیغمبر تھے ۔ آپؐ اپنی ڈیوٹی کے حدود و قیود سے اچھی طرح واقف تھے ۔ اللہ کے نظام قضا و قدر سے بھی واقف اور تربیت یافتہ تھے ۔ اس لیے بھی اس نکتے کو قرآن نے بار بار مکرر کر کے بیان کیا ہے ۔ لیکن اگر رسول اللہؐ کا فریضہ تبلیغ پر ختم ہو جاتا ہے ' تو انکار کرنے والوں کا معاملہ بہرحال ختم نہیں ہوتا ۔ اور نہ تکذیب کرنے والے چھوٹ جاتے ہیں اور صحیح سالم گھروں کو چلے جاتے ہیں ۔ اللہ موجود ہے اور تمام امور اللہ کے سامنے پیش ہونے والے ہیں ۔

إِلَّا مَنْ تَوَلَّى وَكَفَرَ (۲۳) فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ (۲۴) (۸۸: ۲۳ - ۲۴)

"البتہ جو شخص منہ موڑے گا اور انکار کرے گا تو اللہ اس کو بھاری سزا دے گا" ۔ اس لیے کہ وہ صرف اللہ ہی کے

سامنے لوٹنے والے ہیں اور وہ یقیناً ان کو جزا دینے والا ہے' یہ اس سورت کا آخری اعلان ہے اور حتمی اور دوٹوک اعلان ہے۔

اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ (۲۵) ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (۸۸: ۲٦) "ان لوگوں کو پلٹنا ہماری طرف ہی ہے پھر ان کا حساب لینا ہماری ہی ذمہ داری ہے"۔ یوں دعوت اسلامی میں رسول ؐ کے کردار پر بھی حدود و قیود عائد کر دیئے جاتے ہیں۔ اور آپ ؐ کے بعد بھی ہر داعی پر صرف دعوت دینا فرض ہے۔ یہ کہ ہر داعی کا کام یہ ہے کہ وہ یاد دہانی کراتا رہے اور حسب لینا اللہ کی ذمہ داری ہے۔ اللہ سے وہ کہیں بھاگ نہیں سکتے' نہ وہ اللہ کے محاسبے سے بچ سکتے ہیں۔ ہاں داعیان حق کی یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ انہوں نے دعوت اسلامی کے راستے میں پیدا کی جانے والی رکاوٹوں کو بھی دور کرنا ہے تاکہ لوگوں تک دعوت آزادانہ پہنچ سکے۔ اور رکاوٹیں دور کرنے کا کام فریضہ جہاد سے پورا ہوتا ہے جس طرح قرآن اور سیرت الرسول کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اسلام کے نظریہ جہاد کو کسی کمی اور بیشی کے سوا سمجھنا چاہیے۔ یہ بھی نہ ہو کہ اسلام کی راہ میں رکاوٹ موجود ہو' اور جہاد نہ کیا جائے۔ اور یہ بھی نہ ہو کہ تبلیغ کے راستے کھلے ہوں اور لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان کیا جائے۔

--- ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ الفجر ۔ ۸۹

## ۱-- تا-- ۳۰

# سورۃ الفجر ایک نظر میں

یہ سورت اپنے عمومی اعتبار سے اس پارے کا انداز ہی رکھتی ہے ' جیسا کہ کہا گیا اس پارے کے اہم موضوعات اور انداز یہ ہے کہ انسانی دل و دماغ کو بلند آواز میں ایمان 'تقویٰ ' دینی بیداری اور غور و فکر کی طرف بلایا جائے ' لیکن اس کے اندر جو مطالعاتی سفر' جو اشارات اور فضا ہے اس کے کئی رنگ ہیں ۔ مضامین ' مناظر اور فضا کے اختلاف کے باوجود لہجہ کے اعتبار سے یہ یک رنگ ہے ۔ انداز تعبیر کے لحاظ سے اس کا ترنم اور اور آہنگ متنوع ہے ۔

اس کے بعض مناظر میں نہایت سنجیدہ حسن ہے 'جن کے خدوخال تروتازہ 'جن کے اثرات نرم مثلاً آغاز کا منظر'جس میں کائنات کی جھلکیاں بھی ہیں 'جو نرم اور خوشگوار ہیں اور جس میں عبادت اور بندگی اور سرا گندگی کے مناظر بھی ہیں ۔

وَالْفَجْرِ (١) وَلَيَالٍ عَشْرٍ (٢) وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (٣) وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ (٤) (٨٩ : ١ تا ٤) "قسم ہے فجر کی ' اور دس راتوں کی ' اور جفت اور طاق کی ' اور رات کی جب رخصت ہو رہی ہو" ۔

لیکن اس کے مقابلے میں ' اس میں بعض مناظر ایسے ہیں جن کے اندر شدت اور بمباری یا سنگ باری جیسی سختی ہے ۔ ظاہری مناظر کے لحاظ سے بھی ' تلفظ اور موسیقی کے اعتبار سے بھی ' مثلاً یہ سخت اور خوفناک منظر:

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا (٢١) وَّ جَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (٢٢) وَ جِايْٓءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى (٢٣) يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِىْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِىْ (٢٤) فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ (٢٥) وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ (٢٦) (٨٩ : ٢١ تا ٢٦) "ہرگز نہیں 'جب زمین پے درپے کوٹ کوٹ کر ریگ زار بنا دی جائے گی ' اور تمہارا رب جلوہ فرما ہو گا اس حال میں کہ فرشتے صف درصف کھڑے ہوں گے ' اور جہنم اس روز سامنے لے آئی جائے گی 'اس دن انسان کو سمجھ آئے گی اس وقت اس کے سمجھنے کا کیا حاصل ؟ وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا! پھر اس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں ' اور اللہ جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں" ۔

اس کے بعض مناظر تروتازہ ہیں ۔ نرمی اور خوشگوار ماحول کے چشمے پھوٹ رہے ہیں ' ہر سو اطمینان کی فضا ہے '

مناظر متوازن' ہم آہنگ اور نغمے ہم آہنگ ہیں جیسا کہ سورت کی آخری آیات ۔

يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (۲۷) ارْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (۲۸) فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ (۲۹) وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (۳۰) (۸۹ : ۲۷ تا ۳۰) "اے نفس مطمئن چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو خوش اور پسندیدہ ہے' شامل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں"۔

اس سورت میں ایک جھلک اقوام گزشتہ کے سرکشوں کی بھی دکھائی گئی ہے۔ اس کا لہجہ بھی درمیانہ ہے جیسا کہ قصص کا لہجہ ہوتا ہے' انداز بیانیہ اور نرم اور اثرات گہرے اور قوی۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ (٦) اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ (٧) الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ (٨) وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (٩) وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ (١٠) الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ (١١) فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ (١٢) فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ (١٣) اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (١٤) (۸۹ : ٦ تا ١٤) "تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا۔ اونچے ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی؟ اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں؟ اور میخوں والے فرعون کے ساتھ؟ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی اور ان میں بہت فساد پھیلایا تھا۔ آخر کار تمہارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے"۔

اس سورت میں غیر ایمانی تصورات اور غیر ایمانی قدروں کی ایک جھلک بھی ہی ۔ انداز تعبیر اور اثرات کے اعتبار سے اس سورت میں اس جھلک کا اک خاص رنگ ہے ۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ (١٥) فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ (۸۹ : ١٦) "مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا۔ اور جب وہ اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا"۔

اس کے بعد ان کی اصل حقیقت بیان کر کے ان کے حالات کو رد کیا جاتا ہے' جس کی وجہ سے ان کے ذہنوں میں یہ خیالات' تصورات اور قدریں ابھر کر سامنے آئیں ۔ یہ آیات اپنی اپنی عبارت انداز بیان اور ترنم کے اعتبار سے دو رنگ رکھتی ہیں ۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (۱۷) وَلَا تَحٰضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۱۸) وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (۱۹) وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۲۰) (۸۹:۱۷ تا ۲۰) "ہرگز نہیں بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے' اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے' اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو' اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو"۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ انداز بیان کا یہ آخری رنگ ان کے حالات اور ان کے انجام' جلد ہی آنے والے انجام کے درمیان پل کا کام کرتا ہے۔ اس کے بعد سورت میں یہ آیات ہیں۔

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا (۸۹:۲۱) یہ انداز گویا پہلے نرم انداز اور آخر میں آنے والے شدید منظر کے درمیان وسط درجے کا ہے۔

اس سرسری تبصرے سے معلوم ہو گا کہ سورت میں آنے والے مناظر کے رنگ مختلف ہیں۔ اس کا انداز تعبیر اور اس کے اثرات سب مختلف النوع ہیں۔ پھر اس میں قافیوں اور فواصل کا نظام بھی مختلف ہے' جس طرح معانی اور موقف اور منظر مختلف ہے۔ پس اس زاویہ سے یہ سورت قرآن کے متوازن خوبصورت اور متناسب انداز بیان کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ جبکہ اس کا انداز بھی خوبصورت اور مانوس ہے۔

رہی یہ بات کہ اس سورت کے اغراض و مقاصد کیا ہیں' جن کے لیے یہ خوبصورت اور متوازن انداز بیان اختیار کیا گیا ہے تو مناسب ہے کہ تفصیلی تشریح آیات میں مطالعہ کیا جائے۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۲۸۹ تشریح آیات

## ا -- تا -- ۳۰

سُورَةُ الْفَجْرِ (۸۹) مَكِّيَّةٌ (۱۰) آیاتها ۳۰ رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْفَجْرِ ۝۱ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝۲ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝۳ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۝۴ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۝۵

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"قسم ہے فجر کی' اور دس راتوں کی' اور جفت اور طاق کی' اور رات کی جب رخصت ہو رہی ہو"۔

اس سورت کے آغاز میں قسم اٹھانے کے لیے ایسے مناظر اور مخلوقات کا انتخاب کیا گیا ہے جو انسانوں کے مانوس مناظر ہیں اور ایک لطیف روح رکھتے ہیں اور صاف و شفاف ہیں۔ "الفجر" ایک ایسا وقت ہے جس میں زندگی نہایت خوشگوار موڈ میں سانس لیتی ہے۔ نہایت خوشی' تبسم' محبت اور تروتازہ لگاؤ کے جذبات میں یہ پوری کائنات انگڑائی لیتی ہے۔ فجر کے یہ سانس گویا مناجات الٰہیہ کے انفاس ہیں۔ اور فجر کے وقت ہر چیز کھلی کھلی ہوتی ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ کلیاں خوشی کی وجہ سے کھل رہی ہیں۔

وَلَيَالٍ عَشْرٍ (۸۹ : ۲) "دس راتوں کی قسم"۔ ان دس راتوں کو قرآن نے مطلق چھوڑا ہے' ان کی تفسیر میں اقوال و روایات وارد ہیں' بعض میں ذوالحجہ کی دس راتیں' بعض میں محرم کی دس راتیں' اور بعض میں رمضان کی دس راتوں کا ذکر آیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ان کو اسی طرح مطلق اور عام ہی رہنے دینا چاہئے اور یہی زیادہ خوشگوار ہے۔ یہ دس راتیں جن کو اللہ ہی جانتا ہے اور اللہ کے ہاں جن کی ایک منزلت و اہمیت ہے' سیاق کلام میں ان دس راتوں پر یوں روشنی پڑتی ہے کہ شاید یہ ایک شخصیت اور ایک ذی روح راتیں ہیں' جس طرح زندہ ذی روح مخلوق ہوتی ہے۔ یہ راتیں ہم سے محبت کرتی ہیں' اور ہم ان سے محبت کرتے ہیں' اس قرآنی تعبیر کے آئینے میں۔

وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (۸۹ : ۳) "اور جفت و طاق کی قسم"۔ اس مانوس اور محبوب فضائے صبح گاہی میں اور قابل قدر دس راتوں میں شفع و تر روح صلوٰۃ ہیں۔ حدیث شریف کے الفاظ ہیں: "نماز میں سے شفع بھی ہے اور وتر

(ترمذی)۔ ان آیات میں جو فضا پائی جاتی ہے اس میں یہی مفہوم زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس چھا جانے والی کائنات کی روح کے ساتھ عبادت گزار روح کا اتصال ہی موزوں مفہوم ہے 'جس طرح ایک عبادت گزار روح اللہ کی پسندیدہ دس راتوں کی روح کے ساتھ وصال پاتی ہے اور پھر یہ راتیں اور یہ روشن نمود صبح سب باہم ملتے ہیں۔

وَ الَّيۡلِ اِذَا يَسۡرِ (۸۹ : ۴) "اور رات کی قسم جب وہ رخصت ہو رہی ہو"۔ یہ رات ہے یا کوئی زندہ مخلوق ہے جو اس کائنات میں چلتی پھرتی ہے 'گویا وہ عاشق زار ہے جو راتوں کو سرگرداں ہے 'یا مسافر ہے جو دور دراز منزل کی طرف رات کو رواں دواں ہے۔ کیا ہی خوبصورت انداز بیان ہے! منظر کس قدر مانوس ہے؟ الفاظ کا ترنم کس قدر خوشگوار ہے۔ فجر 'لیالی عشر اور الشفع والوتر میں الفاظ ' ترنم اور معانی کی ہم آہنگی قابل دید ہے۔ الفاظ و عبارات نہیں بلکہ نمود صبح کے خوشگوار اور گرم سانس ہیں ' خوشبودار آوازیں ' قلب حزیں کی پر محبت مکالمات ہیں یا روح کی لطیف سرگوشیاں ہیں یا انسانی ضمیر کی بیداری کے اشارات و لمحات ہیں۔

ذرا خوبصورتی کو دیکھیں ' پر محبت سرگوشیوں سے بھرپور حسن ' آزاد شاعرانہ حسن اس کا پاسنگ بھی نہیں۔ یہ تو معجزانہ تخلیقی حسن ہے اور حسن و جمال کے ساتھ حقائق پر مشتمل بھی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان قسموں کے بعد متصلا یہ کہا جاتا ہے۔

هَلۡ فِيۡ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيۡ حِجۡرٍ (۸۹ : ۵) "کیا اس میں صاحب عقل کے لیے کوئی قسم ہے؟" یہ ایک تقریری سوال ہے جس کا جواب ہے "بے شک اس میں قسم ہے ایک عقلمند آدمی کے لیے "ہاں"۔ اس میں ہر صاحب عقل و خرد کے لیے تسلی و تشفی ہے"۔ اس اثبات کے لیے استفہام کا انداز اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ یہ انداز نرم اور سرگوشی کے انداز کے ساتھ زیادہ مناسب ہے 'جو ان قسموں میں پایا جاتا ہے۔

یہاں اس بات کو سیاق کلام میں لپیٹ کر رکھ دیا گیا ہے جس پر قسم اٹھائی گئی تاکہ تجسس قائم رہے اور بعد کا مضمون اس کی تشریح کر دے۔ بعد کا موضوع ہے سرکشی 'فساد اور ظلم اور حد سے تجاوز کا۔ اور ایسے لوگوں کے ساتھ دست قدرت کے رویے کا۔ یہ کہ ایسے لوگوں سے لازماً اللہ انتقام لیتا ہے اور اسی پر اللہ قسم اٹھاتا ہے اور قسم بھی نہایت ہی نرم 'اشاراتی اور اجمالی انداز میں اٹھائی گئی۔

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝۶ اِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ ۝۷ الَّتِيۡ لَمۡ يُخۡلَقۡ مِثۡلُهَا فِي الۡبِلَادِ ۝۸ وَ ثَمُوۡدَ الَّذِيۡنَ جَابُوا الصَّخۡرَ بِالۡوَادِ ۝۹ وَ فِرۡعَوۡنَ ذِي الۡاَوۡتَادِ ۝۱۰ الَّذِيۡنَ طَغَوۡا فِي الۡبِلَادِ ۝۱۱ فَاَكۡثَرُوۡا فِيۡهَا الۡفَسَادَ ۝۱۲ فَصَبَّ عَلَيۡهِمۡ رَبُّكَ سَوۡطَ عَذَابٍ ۝۱۳ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالۡمِرۡصَادِ ۝۱۴

””تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا۔ اونچے ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی؟ اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں؟ اور میخوں والے فرعون کے ساتھ؟ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی اور ان میں بہت فساد پھیلایا تھا۔ آخر کار تمہارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے“۔

اس قسم کے مطابق سیاق کلام میں استفہام کا صیغہ پرکشش ہوتا ہے اور وہ سامعین کو زیادہ متوجہ کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ ابتداً یہ خطاب تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن بعدہ ہر اس شخص کو خطاب ہے جو ان اقوام کے عبرت آموز واقعات سے سبق لینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جس زمانے میں یہ آیات اتریں 'مخاطبین کے درمیان ان اقوام کے قصے معروف و مشہور تھے۔ اس علاقے میں جو آثار قدیمہ ابھی تک باقی ہیں اور جو قصے ابھی تک زبان زدعام ہیں 'ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان اقوام کے بارے میں عرب اچھی طرح جانتے تھے۔ یہاں فعل کا فاعل ””ربک““ کو لایا گیا ہے۔ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس وقت کے مٹھی بھر مسلمانوں کے لیے سامان اطمینان ہے۔ اس وقت مکہ کے مسلمان قریش کے سرکشوں کے ہاتھوں مظالم جھیل رہے تھے اور ان کے خلاف یہ لوگ ہر محاذ پر راہ روکے کھڑے تھے۔ اس پیرایہ اظہار سے ان کے دلوں میں راحت اور محبت پیدا ہوتی ہے۔

ان مختصر آیات میں اللہ نے تاریخ انسانی کے سرکردہ جباروں کی داستانوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک مشہور قوم عاد ارم ہے جسے عاد اولیٰ بھی کہا گیا ہے۔ یہ ان عربوں میں سے تھے جو ابتدائی ادوار میں خالص عرب تھے (عاربہ) یا ان عربوں میں سے تھے جن کی نسل ختم ہوگئی ہے (بائدہ) یہ لوگ احقاف میں رہتے تھے 'احقاف ریت کے ٹیلوں کو کہتے ہیں۔ جنوب عرب میں یمن اور حضرت موت کے درمیان ان کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ یہ بدوی لوگ تھے اور ایسے خیموں میں رہے تھے جو ستونوں پر قائم ہوتے تھے۔ قرآن کریم میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ یہ بڑے قوی تھے اور سخت گرفت کی طاقت رکھتے تھے۔ اپنے وقت پر یہ قوی تر قوم تھی اور اقوام میں زیادہ ممتاز تھی۔

الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ (۸۹: ۸) ””جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی“ یعنی اس وقت تک۔

وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (۸۹: ۹) ””اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں۔ ثمود حجر میں رہتے تھے۔ یہ جزیرۃ العرب کے شمال میں ہے۔ مدینہ اور شام کے درمیان وادی حجر ہے۔ انہوں نے چٹانیں کاٹ کر بڑے بڑے محلات بنا رکھے تھے اور پہاڑوں کے اندر قلعے اور غار بنا رکھے تھے۔

وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ (۸۹: ۱۰) ””اور میخوں والے فرعون کے ساتھ۔ راجح بات یہ ہے کہ اوتاد سے مراد اہرام ہیں جو میخوں کی طرح زمین میں نصب ہیں۔ اور نہایت پختہ بنیادوں پر ہیں۔ جس فرعون کی طرف یہاں اشارہ ہے وہ فرعون موسیٰ ہے جو بہت سرکش تھا اور جبار تھا۔

الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ (۱۱) فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ (۸۹: ۱۲) ””یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی اور ان میں بہت فساد پھیلایا تھا“۔ سرکشی کے بعد فساد ہی ہوتا ہے کیونکہ

سرکشی ' سرکش شخص کو خراب کر دیتی ہے ۔ اسی طرح جو لوگ سرکشی اور ظلم کا شکار ہوتے ہیں وہ بھی فساد میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔ ان کے اندر اخلاقی بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے ۔ اس کے بعد اجتماعی زندگی کا ہر پہلو فساد کی زد میں آ جاتا ہے اور زندگی اپنی صحت مند تعمیری اور پاکیزہ راستے سے ہٹ جاتی ہے اور ایسے راستوں پر پڑ جاتی ہے جو انسان کی خلیفہ اللہ فی الارض ہونے کی ذمہ داری کے خلاف ہوتی ہے ۔

طغیانی اور سرکشی کی وجہ سے عوام الناس غلام اور ذلیل ہو جاتے ہیں ' ان کے اندر ایک خفیہ بغض اور حسد پیدا ہو جاتا ہے ۔ وہ غصہ اور حسد کو ہروقت سینوں میں دبائے رکھتے ہیں ۔ اس طرح کے لوگوں کی شخصیت سے عزت نفس اور اعلیٰ انسانی شعور مٹ جاتا ہے ' اور ان میں سے تخلیقی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے ۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ تخلیقی عمل کے لیے آزاد فضا کا ہونا ضروری ہے ۔ اور جس سوسائٹی کو کوئی ڈکٹیٹر ذلیل کر کے رکھتا ہے وہ متعفن ہو جاتی ہے ۔ اور ایک سڑی ہوئی سوسائٹی ہوتی ہے ۔ اس میں لوگ اس طرح گری ہوئی زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح کیڑے مکوڑے ۔ زیادہ سے زیادہ وہ گری ہوئی عادتوں اور عیاشیوں کے رسیا ہو جاتے ہیں ۔ ان کی قوائے عقل و خرد ماند پڑ جاتی ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں ایسے لوگوں کے اندر جرائم پیدا ہو جاتے ہیں ۔ ایسے لوگوں کے اندر خود داری ہمت ' بلند عزائم ' بلند نگاہی جیسی اعلیٰ صفات ختم ہو جاتی ہیں اور یہ ہے بہت عظیم بگاڑ ۔

ڈکٹیٹر اور جبار ہمیشہ اعلیٰ قدروں اور سیدھی سوچ کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیتے ہیں ۔ اس لیے اعلیٰ اقدار اور سیدھی سوچ کے نتیجے میں ان کے باطل اقتدار کو خطرہ ہوتا ہے ۔ اس لیے جبار ہمیشہ لوگوں کے لیے کھوٹی قدریں وضع کرتے اور معاشروں میں فاسد پیمانے رائج کرتے ہیں اور غلط افکار و تصورات کو رائج کر کے خوشنما بناتے ہیں تاکہ لوگ ان کے عدوان اور قہاری و جباری کو قبول کریں ۔ اور اسے ایک پاپولر اور مقبول اور مروج نظریہ سمجھیں ۔ اور یہ ہے وہ بڑا فساد جس سے اور کوئی بڑا فساد نہیں ہے ۔ اور جب یہ لوگ زمین کے اندر ہمہ جہت فساد پھیلا دیتے ہیں ' اس لیے زمین کی تطہیر ضروری ہو جاتی ہے ۔

فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ (۱۳) اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (۸۹ : ۱۴)

" آخر کار تمہارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے " ۔ تمہارے گھات میں ہے اور وہ ان کے اعمال کو ریکارڈ کر رہا ہے اور جب ان کا فساد حد سے زیادہ ہو گیا تو اللہ کا کوڑا بجنے لگتا ہے اور ان پر اس دنیا ہی میں عذاب الٰہی نازل ہونے کا عمل جاری ہو جاتا ہے ۔ عذاب کے کوڑے سے مراد یہاں عذاب کی شدت اور چبھن ہے ۔ مراد یہ ہے کہ اللہ کا عذاب بہت عام اور ہمہ گیر ہوتا ہے اور وہ ہر طرف سے ان سرکشوں پر انڈیل دیا جاتا ہے ۔ جس کے اندر درد چبھن اور گہرائی ہوتی ہے ' اور یہ ان سرکشوں کو لے ڈوبتا ہے ۔ جنہوں نے اپنی سرکشیوں کی وجہ سے زمین کو فساد سے بھر دیا تھا ۔

جباروں اور ڈکٹیٹروں کے اس انجام کو دیکھ کر ایسے اہل ایمان اور داعیان حق کے دلوں پر اطمینان کے فیوض نازل ہو جاتے ہیں ' جن کو اس قسم کے ظالموں اور سرکشوں سے واسطہ ہوتا ہے ' چاہے وہ جس زمان و مکان میں ہوں اور پھر قرآن کریم نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں ۔

انَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (۸۹ : ۱۴) "حقیقت ہے کہ تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے"۔ یعنی تمہارا رب حاضر و ناظر ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے اور اس کی نظروں سے کوئی چیز اوجھل نہیں ہوتی۔ وہ نگرانی کر رہا ہے اور اس کی نظر سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ لہٰذا ایمان والوں کو چاہیے کہ وہ مطمئن ہوں' ان کی مصیبتیں دور ہوں گی اس لیے کہ رب دیکھ رہا ہے اور وہ شر و فساد کا دفعیہ خود کرے گا اور قیامت میں سزا بھی دے گا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں دعوت اسلامی کو نہایت ہی عجیب طریقوں سے مدد دی جاتی ہے ہر جگہ اصحاب البروج والا طریقہ پیش نہیں آتا۔ اسی طریقے کے مطابق قرآن دین کے لیے کام کرنے والوں کی اسی انداز سے تربیت کرتا ہے اور مختلف حالات اور مختلف ماحول میں مختلف انداز سے ان کی تربیت اور نصرت ہوتی رہتی ہے اور داعیان حق کے لیے اطمینان کا سامان ہوتا رہتا ہے۔ اہل ایمان دو باتوں کی توقع رکھتے ہیں اور اپنی جدوجہد کے بعد فیصلہ اور انجام اللہ کی مشیت کے حوالے کر دیتے ہیں کہ وہ دیکھ رہا ہے۔

تمہارا رب گھات لگائے بیٹھا ہے۔ حاضر و ناظر ہے' دیکھ رہا ہے' حساب و کتاب تیار ہو رہا ہے اور نہایت ہی صحیح اعمال نامے کی اساس پر وہ جزاء و سزا دے گا۔ جس میں نہ غلطی ہوگی' نہ ظلم ہوگا اور نہ وہ دنیا کے حساب کی طرح محض ظاہری حالات پر مبنی ہوگا بلکہ وہاں تو تمام امور کا فیصلہ حقائق کے مطابق ہوگا۔ رہا انسان تو دنیا میں اس کے موازنے بھی غلط ہو جاتے ہیں۔ اندازے بھی غلط ہو جاتے ہیں اور شہادتوں میں بھی وہ ظاہر پر فیصلہ کرتا ہے' الا یہ کہ وہ کوئی فیصلہ اللہ کی شریعت کے مطابق کرے اور اسلامی تصور حیات کے مطابق سوچے۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝۱۵ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝۱۶

"مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا۔ اور جب وہ اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا"۔

یہ تو ہے' انسان کی سوچ' ان حالات کے بارے میں جن سے وہ گزرتا ہے۔ کبھی وہ امیر ہوتا ہے' کبھی غریب ہوتا ہے' کبھی فراخی نصیب ہوتی ہے اور کبھی تنگی۔ کبھی اللہ اسے نعمتوں اور عزتوں سے آزماتا ہے کبھی جاہ و مال سے اس کی آزمائش ہوتی ہے لیکن وہ سمجھ نہیں پاتا کہ یہ تو آزمائش ہو رہی ہے کہ اگر وہ کامیاب ہوا تو اسے جزاء ملے۔ لیکن اس کی سوچ یہ ہے کہ وہ مال و منال کی فراخی اور عزت و جاہ سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک اس مقام و مرتبہ کا مستحق ہے اور یہ دولت اور یہ عزت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ سے وہ آزمائش کو انعام سمجھتا ہے اور امتحان کو نتیجہ سمجھتا ہے۔ اور اللہ کے نزدیک عزت و مقام کو وہ اس دنیا کی عزت اور مقام پر

قیاس کرتا ہے ـ اسی طرح ایسا شخص اگر غریب ہو جائے تو یہ سمجھتا ہے شاید اسے سزا دے دی گئی ہے ـ اور وہ آزمائش کو سزا سمجھتا ہے ـ اور اگر اللہ نے اس کے رزق میں کمی کر دی ہے تو یہ اسے سزا اور توہین سمجھتا ہے ـ اس کی سوچ یوں ہے کہ اگر یہ توہین آمیز سلوک نہ ہوتا تو اللہ اسے غریب نہ بناتا ـ

دونوں حالتوں میں ایسا سوچنے والا شخص غلطی پر ہوتا ہے ـ جس طرح اس کی سوچ غلط ہے اسی طرح اس کا اندازہ بھی غلط ہے ـ اصل بات یہ ہے کہ رزق کی تنگی بھی آزمائش ہے اور کشادگی بھی آزمائش ہے ـ کشادگی یوں آزمائش ہے کہ آیا اس پر وہ شکر ادا کرتا ہے یا دولت کو ظلم و سرکشی کا سبب بناتا ہے اور تنگی کی صورت میں آیا وہ صبر کرتا ہے یا ترش مزاجی کا اظہار کرتا ہے ـ دونوں حالات میں اس کا جو رد عمل ہو گا اسی کے مطابق جزاء و سزا ہو گی ـ دنیا کا مال اور دنیا کی غربت بذات خود نہ جزاء ہیں اور نہ سزا ہیں ـ اللہ کے بندوں کو ان کی دولت کی بنا پر نہیں تولا جاتا ـ نہ اس دنیا میں اللہ کی طرف نعمت کا عطا ہونا یا منع کیا جانا علامت ہے اللہ کی رضامندی کی یا اللہ کی طرف سے ناراضگی کی ـ اللہ تو نیکو کاروں کو بھی دیتا ہے اور بدکاروں کو بھی دیتا ہے ' اور نیکو کاروں سے منع بھی کرتا ہے اور عطا بھی کرتا ہے ـ

انسان کا قلب ایمان سے خالی ہوتا ہے ' تو وہ اللہ کی جانب سے دین یا محروم کرنے کی حکمت کو نہیں سمجھ پاتا ـ اور نہ وہ اللہ کے ہاں مقرر کردہ حسن و قبح کے پیمانوں کو سمجھتا ہے اور جب کسی کا دل ایمان سے بھر جاتا ہے تو وہ خدارسیدہ ہوتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے میزان میں کیا چیز وزن دار ہے ـ اس لیے ایسے شخص کے نزدیک دنیا کی کم قیمت منافع ہلکے ہو جاتے ہیں اور وہ جانتا ہے کہ آزمائش کے نتیجے میں جزاء ملتی ہے تو وہ رزق کی کشادگی اور تنگی دونوں حالتوں میں قیامت کے لیے کام کرتا ہے اور دونوں حالتوں میں تقدیر الہی پر مطمئن ہوتا ہے اور دنیا کی ظاہری ٹھاٹھ باٹھ کے بغیر بھی ' اللہ کے ہاں جو اقدار وزن دار ہیں ان کو سمجھتا ہے اور دنیا کی بے وزن قدریں اسے ہیچ نظر آتی ہیں ـ

قرآن کریم کے براہ راست مخاطب مکہ کے کچھ لوگ تھے ـ ایسے لوگ ہر سوسائٹی میں پائے جاتے ہیں ـ ان کا تصور یہ ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا سے وسیع تر دنیا اور بڑی دنیا کا تصور نہیں کر پاتے ـ یہ ایسے لوگ تھے جو تنگی رزق اور کشادگی رزق کے بارے میں اور اللہ کے بارے میں یہ تصور رکھتے تھے جس کا اوپر ذکر ہوا ـ وہ اپنی اس سوچ کے مطابق اس زمین پر لوگوں کی قدر و قیمت متعین کرتے تھے ـ خلاصہ یہ کہ ان کے نزدیک مال و جاہ ہی سب کچھ تھا ـ اس سے آگے ان کے نزدیک کوئی پیمانہ نہ تھا ـ یہی وجہ ہے کہ وہ دولت کے پیچھے مرتے تھے اور مال کی محبت میں حد سے گزر جاتے تھے ـ جس کی وجہ سے وہ بے حد لالچی اور ہر کسی سے فائدے کی امید اپنے دل میں لیے ہوئے تھے ' اور اس جذبہ کی وجہ سے یہ لوگ سخت لالچی ہو گئے تھے ـ چنانچہ اللہ یہاں ان لوگوں کی دلی حالت کو ذرا کھولتا ہے اور بتاتا ہے کہ مال و دولت کی یہ لالچ جو ان کے دلوں میں رچی بسی ہے ' وہ اس وجہ سے کہ مال و دولت کے بارے میں ان کی سوچ غلط ہے ـ یہ نہیں سمجھتے کہ مال و دولت نعمت ہی نہیں بلکہ آزمائش بھی ہے ـ اسی طرح غربت بھی مصیبت ہی نہیں بلکہ آزمائش ہے ـ

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ﴿١٧﴾ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ﴿١٨﴾ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ﴿١٩﴾ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿٢٠﴾

"ہرگز نہیں بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے ' اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے ' اور میراث کا سرا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو ' اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو"۔

بالکل یوں نہیں جس طرح ایمان سے خالی انسان سوچتا ہے۔ محض یہ کہ کسی کو کشادہ رزق دیا گیا ہے۔ یہ اللہ کے نزدیک کرامت والی بات نہیں ہے ' اور نہ تنگی رزق اس بات کی دلیل ہے کہ ایسے شخص کی اللہ کے ہاں کوئی قدر نہیں ہے اور اسے اللہ نے چھوڑ دیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم دولت کا حق ادا نہیں کرتے اور مال سے حقوق نہیں نکالتے۔ تم لوگ یتیم کی کفالت بھی نہیں کرتے ' جو اپنے والدین اور اولیاء اور سرپرستوں سے محروم ہو گیا ہے۔ اسی طرح معاشرے کے اندر موجود ناداروں کی معاشی کفالت کے لیے کوئی بندوبست نہیں کرتے۔ مسکین کے معنی ہیں وہ شخص جو ساکن ہے ' سکون سے بیٹھا ہے اور لوگوں سے مانگتا نہیں پھرتا۔ یہاں یہ کہا گیا کہ یتیموں اور مسکینوں کے کھانے یعنی معاشی ضروریات فراہم کرنے کے لیے دوسروں کو نہیں ابھارتا۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اسلامی نظام میں ناداروں کی کفالت کے لیے ایک عام تحریک ہوتی ہے 'عام لوگوں کی بھلائی کے لیے لوگ ایک دوسرے سے آگے بڑھتے اور ایک دوسرے کو آمادہ کرتے ہیں۔ ناداروں کی کفالت اسلام کی خصوصیت ہے۔

تم لوگ ابتلا کا مفہوم سمجھتے ہو۔ نہ اس آزمائش میں کامیاب ہونا چاہتے ہو ' حالانکہ اس آزمائش میں کامیابی کی راہ یہ ہے کہ یتیم کی عزت کرو ' ایک دوسرے کو یہ وصیت اور تلقین کرو کہ یتیموں کو کھانا کھلایا جائے بلکہ تم اس کے برعکس صورت اختیار کرتے رہو۔ تم لوگ نہایت لالچ کے ساتھ پوری کی پوری میراث ہڑپ کر جاتے ہو ' اور تم مال کی بھرپور محبت کرتے ہو ' جو کسی حد میں محدود نہیں ہے۔ مال کے معاملے میں تمہارے اندر کوئی خودداری 'کوئی وضع داری نہیں ہے۔ اور تم محتاجوں کی نہ عزت کرتے ہو اور نہ ان کی حاجت براری کرتے ہو۔

جیسا کہ ہم نے اس سے قبل تفصیلات دی ہیں 'مکہ میں ایسی صورت حال تھی کہ لوگ بے حد لالچی اور مفادات کے پیچھے کتوں کی طرح بھاگنے والے تھے ' اور ہر طریقے سے دولت سمیٹتے تھے 'جس کی وجہ سے ان کے دلوں میں بخل اور سنگدلی پیدا ہو گئی تھی۔ یتیم چونکہ بے سہارا ہوتے تھے اس لیے ان کے مال ہڑپ کر لیے جاتے تھے۔ خصوصاً یتیم عورت کے۔ پھر ان کو میراث سے محروم کر دیتے تھے جیسا کہ متعدد مقامات پر ہم نے تفصیلات دی ہیں۔ ان ہتھکنڈوں کے علاوہ سودی کاروبار کے ذریعہ بھی اہل مکہ رات دن دولت جمع کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ یہ بات یہاں نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ دولت کی پرستش ہر جاہلیت کی خصوصیت ہوتی ہے جہاں بھی ہو اور جب بھی ہو۔

ان آیات میں نہ صرف یہ کہ ان کے موقف کو اچھی طرح بیان کیا گیا ہے بلکہ ان کی مذمت بھی کی گئی ہے اور اس صورت حال کو بڑی سختی سے ناقابل برداشت بنایا گیا ہے اور اس کے لیے لفظ "کلا" استعمال کیا گیا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا 'ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ آیات کے انداز بیان اور زوردار تعبیر اور الفاظ کے زبردست لہجے سے بھی اس صورت حالات کی مذمت نکلتی ہے۔ ذرا دوبارہ غور کریں۔

وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (۱۹) وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۸۹: ۲۰) "اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو"۔

یہاں تک کہ ان کی ناپسندیدہ حالات کی تصویر کشی کر دی گئی اور امارت اور غربت کے بارے میں ان کے غلط تصور کی

تردید کر دی گئی ۔ اب ان کو قیامت کی حقیقت اور اس کے مرعوب کن حالات اور آزمائش کے نتائج اور جزاء و سزا اور حساب و کتاب کے مناظر کو نہایت ہی زور دار الفاظ میں لایا جاتا ہے ۔

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿۲۱﴾ وَّ جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾ وَ جِايْٓءَ يَوْمَىِٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ۬ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَ اَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ﴿۲۴﴾ فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌ ﴿۲۵﴾ وَّ لَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ اَحَدٌ ﴿۲۶﴾

"ہرگز نہیں، جب زمین پے درپے کوٹ کوٹ کر ریگ زار بنا دی جائے گی، اور تمہارا رب جلوہ فرما ہو گا اس حال میں کہ فرشتے صف در صف کھڑے ہوں گے، اور جہنم اس روز سامنے لے آئی جائے گی، اس دن انسان کو سمجھ آئے گی اس وقت اس کے سمجھنے کا کیا حاصل؟ وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا! پھر اس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں، اور اللہ جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں"۔

دُكَّتِ الْاَرْضُ (۸۹ : ۲۱) "زمین کو کوٹا جائے گا"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نشانات مٹا کر اسے برابر کر دیا جائے گا۔ یہ ان انقلابات میں سے ایک ہے جو قیامت کے وقوع کے وقت اس کائنات میں برپا ہوں گے۔ رہی یہ بات کہ رب تعالیٰ نزول اجلال فرمائے گا اور فرشتے صف در صف کھڑے ہوں گے تو یہ ایک غیبی معاملہ ہے۔ اس کی حقیقت کو اس وقت تک ہم سمجھ نہیں سکتے، کیونکہ ابھی ہم اس دنیا میں ہیں اور ہماری قوت ادراک محدود ہے۔ البتہ اس انداز تعبیر سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ بہت ہی ہیبتناک اور خوفناک صورت حال ہو گی۔ اسی طرح جہنم کو لایا جانا پوری طرح ہماری فہم سے دور ہے۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ مجرم اس کے قریب ہو جائیں گے اور وہ اہل جہنم سے قریب ہو جائے گی۔ رہی اصل کیفیت اور صورت حالات تو وہ ایک غیبی امر ہے اور یہ اسی دن اچھی طرح معلوم ہو گی جب برپا ہو گی۔

ان آیات کے ذریعہ ایک ایسی منظر کی تصویر کشی کی گئی ہے جس سے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ آنکھیں سہم کر جھک جاتی ہیں۔ الفاظ کا تلفظ اور ترنم بھی خوفناک ہے اور مناظر کی شدید گرفت ہے۔ زمین کا ریزہ ریزہ کر دیا جانا۔ رب تعالیٰ کا نزول وجلال اور فیصلے کرنا فرشتوں کا صف بستہ کھڑے ہونا اور جہنم کا تیار کر کے حاضر کر دیا جانا، ایسے مناظر ہیں جن کی وجہ سے انسان پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔

يَوْمَىِٕذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ (۸۹ : ۲۳) "اس دن بات انسان کی سمجھ میں آجائے گی"۔ وہ انسان اصل حقیقت کو سمجھ جائے گا جو اس جہاں میں امیری اور غریبی کی حقیقت کو بھی سمجھ نہ پا رہا تھا۔ جو میراث کا تمام مال سمیٹ کر کھا جاتا تھا۔ اور یتیموں اور عورتوں کا حق بھی مار لیتا تھا۔ اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار تھا۔ نہ یتیم کا اکرام کرتا تھا اور نہ مساکین کی معیشت کے لیے کوئی دوڑ دھوپ کرتا تھا۔ جو سرکش تھا اور جس نے اپنی دولت اور اقتدار کے بل بوتے

پر زمین کو فساد سے بھر دیا تھا۔ ایسا شخص آج سب کچھ سمجھ لے گا اور وہ نصیحت کو اچھی طرح قبول کرلے گا لیکن اب تو وقت جا چکا ہے۔

وَ اَنّٰی لَهُ الذِّکْرٰی (۸۹: ۲۳) "لیکن اس وقت اس کے سمجھنے کا کیا حاصل؟" نصیحت لینے اور عمل کرنے کا وقت تو جا چکا ہے۔ آج نصیحت کیا فائدہ دے گی۔ یہ تو دار الجزاء ہے۔ اب تو حسرت ہی حسرت ہے۔ تمہارے لیے دار العمل تو دنیا کی زندگی تھی جہاں تم نہ سمجھے اور نہ عمل کیا۔

یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ (۸۹: ۲۴) "وہ کہے گا کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا"۔ کچھ کمائی کر کے اس جہاں کے لیے جمع کی ہوتی' حقیقی زندگی تو یہ ہے جسے زندگی کہا جا سکتا ہے۔ تیاریاں اور کمائی اور ذخیرہ تو اس زندگی کے لیے ضروری تھا' اے کاش کہ میں نے کچھ کیا ہوتا! یہ ہوگی حسرتناک تمنا۔ اور وہاں انسان ان حسرتناک تمناؤں کے سوا اور کر کیا سکے گا۔

ان دل دوز حسرتوں اور بے کار تمناؤں کے بعد اب اس کا انجام مختصراً یہ ہوگا۔

فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَهٗ اَحَدٌ (۲۵) وَّلَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗ اَحَدٌ (۸۹: ۲۶) "پھر اس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں اور اللہ جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں"۔ اللہ قہار و جبار ہے۔ وہ اس دن ایسا عذاب دے گا جس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ اور اس دن اس کے باندھنے کا انداز بھی ایسا ہو گا جیسا انداز یہاں متصور نہیں ہے۔ اور اللہ کی پکڑ اور اس کے عذاب کے مناظر قرآن کریم نے بڑی کثرت' نہایت دلنشیں انداز میں بیان کیے ہیں۔ یہاں صرف یہ کہہ دیا گیا ہے کہ وہ عذاب بھی منفرد ہو گا اور وہ گرفتاری بھی منفرد ہوگی اور ایسی ہوگی کہ اس جہاں میں ان کی کوئی مثال نہیں ہے۔ اور یہ صورت حال ان صورتوں کے بالمقابل ہے جو اس سورت میں عاد' ثمود اور فرعون کی پکڑ' ان کے مظالم' ان کی جباری اور ان کے شر و فساد کی بتائی گئی ہیں کہ وہ لوگوں کو پکڑتے تھے اور ظلم کرتے تھے تو اے نبی اور اے اہل ایمان جو لوگ یہاں مسلمانوں پر مظالم کرتے رہے ہیں یا کر رہے ہیں اور ان پر تشدد کرتے رہے ہیں۔ ان کا حال قیامت میں ایسا ہو گا اور اللہ کے عذاب اور پکڑ اور مخلوق کے عذاب اور پکڑ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دنیا کے لوگ جو عذاب دیتے ہیں اور تشدد کرتے ہیں وہ کچھ بھی نہیں۔ بمقابلہ اس کے جس سے یہ لوگ دوچار ہونے والے ہیں۔ لہذا یہ لوگ جو چاہیں کریں۔ لیکن یاد رکھیں کہ ان کا حشر بہت برا ہونے والا ہے جو ہمارے تصور سے بھی بہت بڑا ہے۔

ایسے ہولناک مناظر میں' شدید پکڑ اور شدید عذاب کے مناظر میں' جس کا تصور بھی ہم نہیں کر سکتے' ایک پکار آتی ہے۔ یہ نفس مطمئنہ کے نام ہے اور ملاء اعلیٰ سے ہے۔

۱ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً
ع ۳۰ مَّرْضِیَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴿۳۰﴾
۱۴

"(دوسری طرف ارشاد ہوگا) اے نفس مطمئن' چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو خوش اور پسندیدہ ہے' شامل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں"۔

کس قدر پر محبت' مکمل یگانگت اور قرب کا ماحول ہے! اے نفس مطمئنہ' کس قدر روحانیت اور کس قدر تکریم اور عزت افزائی ہے۔ اس پکار میں۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (۸۹:۲۷) "اے نفس مطمئن" جبکہ دوسری طرف بے مثال پکڑ دھکڑ شروع ہے' بے مثال اور ناقابل تصور عذاب دیا جا رہا ہے' شدید ماحول ہے' اس شدید ماحول میں' یہ نرم اور پر محبت پکار!

ارْجِعِيٓ اِلٰى رَبِّكِ (۸۹:۲۸) "چل اپنے رب کی طرف"۔ چل اپنے اصل سرچشمے کی طرف' اپنے اصل گہوارے کی طرف' جو زمین کے اندر دوڑ رہا ہے' لوٹ اب اپنے رب کی طرف' تمہارے اور رب کے درمیان ایک خاص تعلق ہے' ایک خاص نسبت ہے' ایک خاص شناسائی ہے۔

رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (۸۹:۲۸) "تو بھی خوش ہے اور اللہ بھی تجھ سے خوش ہے"۔ ماحول پر اس خوشگوار اعلان سے محبت و رضا کے فیوض طاری ہو جاتے ہیں"۔

فَادْخُلِي فِي عِبٰدِي (۸۹:۲۹) "میرے بندوں میں داخل ہو جا"۔ جو میرے قریب و مختار بندے ہیں اور تو بھی یہ قرب پائے۔

وَادْخُلِي جَنَّتِي (۸۹:۳۰) "اور میری جنت میں داخل ہو جا!" میری حمایت میں اور میری رحمت میں۔ ان آیات میں جو محبت و شفقت ہے' آغاز ہی سے ان میں جنت کی باد نسیم محسوس ہوتی ہے۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (۸۹:۲۷) "اے نفس مطمئن" کے الفاظ ہی سے یہ ہوا چلنا شروع ہوتی ہے۔ یہ کون سا نفس ہے جو مطمئن ہے؟ جو رب سے مطمئن ہے' جو راہ حق پر مطمئن ہے اور گامزن ہے' اس راہ پر اسے جو کچھ پیش آئے اس پر مطمئن ہے' جو امیری میں بھی مطمئن ہے اور غریبی میں بھی۔ وہ دولت یقین سے مطمئن ہے' اس لیے اپنی راہ نہیں چھوڑتا۔ نہ راستے پر تھک ہار کر رکتا ہے' جو اس دنیا میں بھی مطمئن ہے اور قیامت کی ہولناکیوں میں بھی مطمئن ہے۔

ان آیات میں جو پکار ہے ان کی فضا خوشنودی' رضا اور طمانیت اور اللہ کی برکات و فیوض سے بھرپور ہے۔ الفاظ کا ترنم' معانی کا قرب و سکینت سے بھرپور ہونا اس پکار کی فضا ہے۔ یہ جنت کی فضا ہے۔ اور یہ فضا ان آیات کے الفاظ و معانی سے چھلکتی اور ٹپکتی ہے اور اس پر خدائے رحمٰن و رحیم کی تجلیات کا پرتو ہے۔

---000---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ـــ ۳۰

## سورۃ البلد ـ ۹۰

## ۱ ـــ تا ـــ ۲۰

# سورۃ البلد ایک نظر میں

یہ نہایت مختصر سورت ہے' اس میں انسان کی زندگی سے متعلق حقائق کی بہت بڑی مقدار سمیٹ لی گئی ہے جن میں گہرے اشارات' موج در موج امنڈتے چلے آرہے ہیں اور پردہ احساس کو حساس تر بنانے کے لیے چٹکیاں بھری جاتی ہیں - قرآن کے علاوہ کسی تحریر میں حقائق کی اس قدر تعداد اتنی مختصر عبارت میں نہ دیکھی گئی ہے اور نہ آئندہ دیکھی جائے گی - انداز بیان ایسا ہے کہ قلب و نظر کی تاروں کے اندر نہایت تیز اور گہرا ارتعاش پیدا کیا جاتا ہے - اس سورت کا آغاز ایک قسم سے ہوتا ہے اور یہ قسم ایک ایسی حقیقت پر اٹھائی گئی ہے جو حیات انسانی کی مسلم حقیقت ہے -

---()()---

# درس نمبر ۲۹۰ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۲۰

سُوْرَةُ الْبَلَدِ (۹۰) مَكِّيَّةٌ (۳۵)
اٰيَاتُهَا ۲۰ رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝۱ وَ اَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝۲ وَ وَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ ۝۳ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ ۝۴

"نہیں' میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی 'اور حال یہ ہے کہ تم اس شہر میں مقیم ہو' اور قسم کھاتا ہوں باپ کی اور اس اولاد کی جو اس سے پیدا ہوئی' درحقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے"۔

شہر سے مراد مکہ ہے 'جہاں بیت الحرام واقع ہے' یہ پہلا وہ گھر ہے 'جو صرف اللہ کی عبادت کے لیے اس زمین پر بنایا گیا ہے' تاکہ یہاں لوگ آزادی سے آجا سکیں اور امن سے رہ سکیں۔ جہاں آکر 'یہ اسلحہ پھینک دیں' اپنے ذاتی جھگڑے ایک طرف رکھ دیں 'عداوتوں کو بھلا دیں اور اس میں نہایت امن سے ملیں۔ جہاں کسی کا کسی پر اسلحہ اٹھانا حرام ہو' انسان ہی نہیں بلکہ یہاں کے پرندوں اور درختوں کو چھیڑنا اور نقصان پہنچانا بھی حرام ہو۔ پھر یہ شہر ابراہیم علیہ السلام کا گھر ہے' جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے والد محترم ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام عربوں کے والد اور مسلمانوں کے پیشوا ہیں۔

اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہ یوں عزت افزائی فرماتا ہے کہ اس شہر کی قسم اس حال میں اٹھاتا ہے کہ آپ اس میں مقیم ہیں' مطلب یہ کہ آپ کی یہاں موجودگی کی وجہ سے گویا اس شہر کی عزت و احترام میں اور شرف مقام میں اور عظمت و احتشام میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ اشارہ اس مقام پر گہرے اثرات کا حامل ہے' ان حالات میں کہ مشرکین اس گھر کی حرمت کو ان دنوں پامال کر رہے تھے' اس شہر میں جہاں نباتات و حیوانات بھی پر امن تھے مسلمانوں کو اذیت دی جاتی تھی۔ حالانکہ یہ گھر محترم تھا اور نبی کریم کی موجودگی کی وجہ سے اور محترم ہو گیا تھا اور جب اللہ نے اس شہر اور اس میں مقیم شخصیت کی وجہ سے قسم اٹھائی تو اس کی حرمت' عظمت اور مرتبہ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس لیے مشرکین مکہ کا یہ موقف کہ وہ اس گھر کے خدمت گار ہیں' اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہیں' ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں' بالکل غلط' متضاد اور جھوٹا موقف ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگلی قسم۔

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ (۹۰ : ۳) "اور قسم ہے باپ کی اور اس کی اولاد کی" ۔ میں حضرت ابراہیم اور ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کی طرف خاص اشارہ ہے اور مکہ کی قسم 'اس میں مقیم نبی آخر الزمان کی قسم اور پھر مکہ کے بانیوں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قسم ایک مناسبت رکھتی ہیں 'لیکن اس اشارے اور مناسبت کے باوجود والد اور ولد سے مراد مطلق والد اور مولود بھی ہو سکتے ہیں ۔ اور اس صورت میں مفہوم یہ ہو گا کہ اس آیت میں قسم انسانی پیدائش اور انسان کی نشوونما پر کھائی گئی ہے ۔ اس طرح یہ قسم تمہید ہوگی ۔ سورت کے اصل موضوع کے لیے جو انسان کی حقیقت ہے ۔

استاد محمد عبدہ نے اس مقام پر ایک خاص تفسیر کی ہے اور ایک لطیف نکتہ بیان کی ہے جو ظلال القرآن کی روح سے مطابقت رکھتا ہے ۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا یہاں نقل کرنا مناسب ہو گا ۔ وہ فرماتے ہیں :

اس کے بعد اللہ نے والد اور مولود کی قسم اٹھائی کہ اس کائنات کے مظاہر میں سے انسانیت کی پیدائش اور نشوونما کا مظہر بہت ہی اہم ہے یعنی نظام تولید اور اس کے اندر جو گہری حکمت پنہاں ہے اور انسان نے حضرت انسان کو کس قدر خوبصورت بنایا ۔ پھر یہ کہ والد اور مولود دونوں پیدا ہونے والے کی تکمیل میں کس قدر مشقت اٹھاتے ہیں اور کتنی مشقتوں اور محنتوں سے یہ مولود اپنے مقررہ کمال تک پہنچتا ہے" ۔

"یہی صورت ایک بیج کے اگنے اور نشوونما کے ساتھ تمام ادوار سے گزرنے میں بھی پیش آتی ہے ۔ اس بیج اور پودے کو فضا کے عوامل کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور یہ پودا مشقت کے ساتھ اپنے ماحول سے اپنے لیے مختلف عناصر اخذ کرتا ہے 'یہاں تک کہ وہ آخر کار ایک درخت بن جاتا ہے ۔ جس کا ایک بڑا تنا اور ٹہنیاں ہوتی ہیں ۔ اور پھر یہ درخت اور مکمل پودا مزید بیج پیدا کرتا ہے اور یہ بیج آگے اپنا کردار ادا کرتے ہیں 'اس طرح یہ زمین ان حیاتات کی وجہ سے خوبصورت بنتی ہے ۔ اگر تم ان سب امور کو ذہن میں رکھو اور پھر اس سے ذرا اوپر حیوانات پر غور کرو 'تو تمہیں معلوم ہو گا کہ والد اور مولود کی حیاتیات میں جو عجوبے ہیں وہ بہت بڑے ہیں 'اور والد اور مولود دونوں اس نشوونما کے عمل میں جن مشقتوں سے گزرتے ہیں اور جس طرح اس ذریعہ سے بقائے نوع کا انتظام کیا جاتا ہے اور ان کے ذریعے جس طرح اس کائنات کے حسن کو دوبالا کیا جاتا ہے ۔ تو اس عمل میں نہایت بلند اور اہم مظاہر قدرت ہیں" ۔

اور اس قسم کا جواب کیا ہے 'کس حقیقت کے اظہار کے لیے یہ قسم اٹھائی گئی ۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ (۹۰ : ٤) "درحقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے" ۔ سخت جدوجہد اور مشقت میں سخت کشمکش اور مصائب کے مقابلے کی حالت میں پیدا کیا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ۔

یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ (۸٤ : ٦) "اے انسان تو سخت مشقت کرتا ہوا اپنے رب کی طرف جا رہا ہے اور آخر کار تو اس سے ملنے والا ہے" ۔

رحم کے اندر جب ایک خلیہ قرار پکڑتا ہے تو وہ پہلے دن ہی سے جہد و مشقت شروع کر دیتا ہے کہ اپنے لیے غذا فراہم کرے اور آنے والی زندگی کے لیے اچھے حالات فراہم کرے 'یہ تمام کام وہ رب تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق کرتا ہے ۔ رحم کے اندر یہ اسی طرح جدوجہد میں ہوتا ہے 'یہاں تک کہ اس کے نکلنے کا وقت آتا ہے تو اپنی ماں کی طرح یہ بھی دردِ زہ کی تکالیف سہتا ہے 'اس پر رحم مادر سے نکلتے وقت سخت دباؤ پڑتا ہے 'پھر جب نکلتا ہے اور روشنی دیکھتا ہے تو بھی اس

پر دباؤ ہوتا ہے۔

باہر آتے ہی ایک نئی جدوجہد شروع ہوتی ہے' جب یہ ہوا کھینچتا ہے اور سانس لینے کا عمل شروع کرتا ہے اور پہلی مرتبہ وہ منہ کھولتا ہے' تو اس کے پھیپھڑے کام شروع کرتے ہیں تو اسے سخت تکلیف ہوتی ہے اور وہ چلانے لگتا ہے' اس کا خون دوران شروع کرتا ہے۔ پھر اس کا نظام ہضم کام شروع کرتا ہے اور یہ سب اعمال ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا وہ عادی نہیں ہوتا' اس کی انتڑیاں فضلات خارج کرنے کی عادی نہیں ہوتیں۔ غرض اس کے بعد اس کا ہر قدم مشقت میں اٹھتا ہے' ہر حرکت مشقت ہوتی ہے۔ ذرا دیکھئے اب یہ گھٹنوں کے بل چل رہا ہے' پھر یہ پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے اور چلتا ہے' یہ سب مشقتیں ہیں اور ہر مرحلے پر جدوجہد کرتی ہیں۔

پھر جب دانت نکلتے ہیں تو مشقت' سیدھا کھڑے ہونے میں مشقت اور اور جم کر چلنے میں مشقت' تعلیم حاصل کرنے میں مشقت' غور و فکر کرنے میں مشقت' غرض جو جدید تجربہ وہ کرتا ہے' جس طرح گھٹنوں کے بل چلنے کا تجربہ اس نے کیا' یہ سب مشقت اور جدوجہد ہے۔

اب ذرا آگے بڑھئے' اب ان مشقتوں کی شاخیں نکل آتی ہیں۔ یہ دیکھو' اپنے عضلات سے مزدوری کرنے کی مشقت کرتا ہے۔ دوسرا اپنی فکر سے مشقت کرتا ہے' یہ روح کے ساتھ محنت کر رہا ہے' یہ دیکھو ایک لقمہ جو کے لیے مشقت کر رہا ہے' یہ دوسرے کپڑے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے' اور یہ دوسرا ہزار کو دو ہزار بنا رہا ہے۔ پھر دس ہزار اور آگے' یہ دیکھو ایک حکومت اور مرتبے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے' ان میں ایک دیکھو اللہ کے راستے میں جدوجہد کر رہا ہے' بعض عیاشیوں اور خواہشات کے بندے ہیں' بعض جہنم کے لیے محنت کر رہے ہیں اور ان کے مقابلے دوسرے جنت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں' ہر شخص اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے جا رہا ہے اور بڑی مشقت کے ساتھ رب کے قریب ہو رہا ہے' اور جب میدان حشر میں اللہ کے سامنے سب کھڑے ہوں گے تو پھر بدبختوں کو دائمی مشقت اور مصیبت میں گرفتار ہونا ہو گا اور نیکوکاروں اور نیک بختوں کو عظیم نعمت اور آرام سے ملے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی زندگی ایک مشقت ہی ہے' لیکن اس کی مشقت کی شکلیں مختلف ہیں' نوعیت کے اختلاف کے باوجود اصل میں یہ زندگی مشقت ہی ہے۔ لیکن عظیم خسارہ اٹھانے والا شخص وہ ہے جو اس دنیا کی پوری مشقت اور مسلسل تکلیفات اٹھا کر نہایت ہی دائمی' تلخ مشقت تک جا پہنچتا ہے اور جہنم رسید ہوتا ہے اور اس جدوجہد میں سب سے زیادہ کامیاب وہ شخص ہوتا ہے جو نہایت ہی تکلیف دہ انداز میں اپنے رب کی طرف بڑھتا ہے اور ایسی کمائی کر کے اس دنیا کی زندگی کا بوجھ اپنے کاندھوں سے اتارتا ہے اور آخرکار دائمی کامیابی حاصل کرتا ہے اور دائمی راحت پاتا ہے۔

ہاں یہ ہے کہ بعض اوقات اس دنیا کی مشقتوں کا بعض انعام اس دنیا میں بھی مل جاتا ہے' کیونکہ جو شخص کسی اعلیٰ مقصد کے لیے جدوجہد کرتا ہے' وہ اس شخص کی طرح نہیں ہوتا جو کسی حقیر سے کام کے لیے محنت کرتا ہے۔ ایک اعلیٰ مقاصد کے لیے جان و مال خرچ کرتا ہے اور دوسرا حقیر مقاصد کے لیے' دونوں کی خوشی' اطمینان اور روحانی مسرت یکساں نہیں ہو سکتی۔ جو شخص محنت اور جدوجہد کرتا ہے' اور اس کے پیش نظر کوئی مادی مقصد نہیں ہے' یا وہ اس مادیت سے نکلنے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ وہ اس شخص کی طرح نہیں ہوتا جو اس مادیت کے لیے اس طرح ہلکان ہوتا جس طرح کیڑے مکوڑے اور حشرات الارض پیٹ بھرنے کے لیے مشقت کرتے ہیں۔ جو شخص اقامت دین کی جدوجہد کرتا ہے۔ وہ اس شخص کی طرح نہیں ہوتا جو کسی

دنیاوی خواہش کے پیچھے مرتا ہے ' دونوں کی مشقت ' شعور احساس برابر نہیں ہوتے ۔ زندگی کی حقیقت واضح کرنے کے بعد انسان کے بعض مزعومات 'تصورات اور بعض دعوؤں اور بعض تصرفات پر ناقدانہ تبصرہ کیا جاتا ہے !

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۝ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ ۝

"کیا اس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہ پا سکے گا؟ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اس کو نہیں دیکھا؟"

یہ انسان مشقت میں پیدا کیا گیا اور جو اپنی اس دنیا کی پوری زندگی میں اس مشقت سے چھوٹ نہیں سکتا' یہ اپنی حقیقت کو بھول جاتا ہے اور اس کا پیدا کرنے والا اسے جو قوت ' طاقت اور وجدان اور سازوسامان دیتا ہے 'تو وہ ان قوتوں میں ایسے تصرفات کرتا ہے جیسا کہ وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہے اور اسے اس جوابدہی کی توقع نہیں ہے اور یہ خوف نہیں ہے کہ ایک بڑی قوت اور قدر والا اسے پکڑ سکتا ہے اور حساب لے سکتا ہے ۔ اس لیے یہ انسان دیتا ہے 'پکڑتا ہے ' چھینتا ہے 'لوٹتا ہے ' جمع کرتا ہے ' اضافہ کرتا ہے 'فسق و فجور کرتا ہے ' نہایت بے خوفی اور نہایت بے باکی کے ساتھ ۔ یہ خدوخال اس انسان کے ہیں جس کا دل ایمان سے خالی ہو۔

پھر جب ایسے مواقع پر جیسے اس سورت میں مذکور ہیں 'اسے راہ خیر میں خرچ کرنے کی دعوت دی جائے تو پھر وہ کہتا ہے ۔

اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ( ۹۰ : ٦ ) "میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا"۔ اور میرے لیے بس یہ کافی ہے کہ میں نے اس قدر مال اڑا دیا۔

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ ( ۹۰ : ۷ ) "کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اس کو نہیں دیکھا"۔ یہ بھول جاتا ہے کہ اللہ تو دیکھ رہا ہے 'اللہ کا علم تو دلوں کی باتوں کو بھی گھیرے ہوئے ہے 'اللہ تو وہ سب کچھ کو دیکھ رہا ہے جو اس نے خرچ کیا اور اسے معلوم ہے کہ اس نے کس لیے خرچ کیا۔ لیکن یہ انسان اس حقیقت کو بھی بھول جاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ شاید وہ اللہ کی نظروں سے اوجھل ہے ۔

انسان کے اس غرور اور اس زعم کے مقابلے میں کہ وہ طاقتور ہے اور زور آور ہے اور اس کی کنجوسی اور پھر بھی دعوائے انفاق کثیر کے مقابلے میں 'قرآن خود اس کے نفس کا آئینہ اس کے سامنے رکھ کر اسے بتلاتا ہے کہ ذرا غور تو کرو کہ اللہ نے خود تمہارے نفس کے اندر اور تمہاری ساخت کے اندر تم پر کس قدر مہربانیاں کی ہیں اور کس قدر صلاحیتیں دی ہیں لیکن اے انسان تم نے تو ایک نعمت وصلاحیت کا شکر بھی ادا نہیں کیا۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝

"کیا ہم نے اسے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے؟ اور (نیکی اور بدی کے) دونوں نمایاں راستے اسے (نہیں) دکھا دیئے؟"

انسان اپنی قوت پر ہمیشہ مغرور ہو جاتا ہے' حالانکہ اس کے پاس جو چھوٹی موٹی قوت ہوتی ہے۔ وہ اسے اللہ نے دی ہوئی ہوتی ہے' پھر انسان مال کے بارے میں بڑا بخیل واقع ہوا ہے' حالانکہ یہ مال بھی اللہ ہی نے دیا ہے۔ اس کے باوجود' نہ وہ ہدایت کی راہ لیتا ہے اور نہ شکر منعم بجالاتا ہے۔ اللہ نے اسے حواس خمسہ عطا کیے۔ ان کے ذریعہ یہ عالم محسوسات میں کام کرتا ہے' پھر اس کو آنکھیں دی گئیں اور ان کی ساخت کس قدر دقیق اور پیچیدہ ہے اور جن کے ذریعہ وہ چیزوں کو دیکھتا ہے' پھر اللہ نے اسے قوت گویائی عطا کی اور آلہ گویائی بھی عجیب ہے' زبان اور دو ہونٹ۔

وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ (۹۰ : ۹) "ایک زبان اور دو ہونٹ"۔ اس کے بعد اللہ نے انسان کو خیر و شر میں تمیز کرنے کا ملکہ دیا۔ ہدایت و ضلالت میں اور حق و باطل میں فرق کرنے کے لیے قوت استدلال دی۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰ : ۱۰) "اور دونوں راستے اسے دکھائے"۔ کہ نیکی و بدی میں سے وہ جس راستے کو چاہے اختیار کرے۔ اس کو ایسی طاقت دی کہ وہ نیکی اور بدی میں سے جس کو چاہے' اپنائے اور انسان کی تخلیق میں یہ دوہری قوت رکھی گئی اور یہی اللہ کی حکمت تخلیق تھی۔ پھر اللہ نے ہر چیز کو خلقت بخشی اور اس کائنات میں اس کے لیے اس کا فریضہ منصبی آسان کر دیا۔

یہ آیت اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ انسان کی فطرت کیا ہے اور سورہ شمس میں اس کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا (۷) فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (۸) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۹) وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۱۰) (۹۱ : ۷ تا ۱۰) "قسم ہے نفس انسانی کی اور اس کی ساخت کی۔ اور پھر اسے بتایا کہ فجور کیا ہے اور تقویٰ کیا ہے۔ بے شک کامیاب ہوا وہ شخص جس نے نفس کو پاک کیا اور ناکام ہوا۔ وہ شخص جس نے اسے برباد کیا"۔ ان آیات میں نفس کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیلات سورہ شمس میں بیان کریں گے۔

یہ اللہ کی نعمتیں ہیں جو اللہ نے بنی نوع انسان کو عطا کی ہیں اور ہر انسان کے نفس میں یہ نعمتیں رکھ دی گئی ہیں' ان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہدایت قبول کرے' اس کی آنکھوں کا یہ فرض ہے کہ یہ کائنات میں قدرت الہیہ کے دلائل مشاہدہ کریں اور اشارات ایمان تلاش کریں اور دلائل قدرت اور اشارات ایمان اس کائنات میں ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔ پھر انسان کی زبان اور اس کے ہونٹ کلام اور بیان کے ذرائع ہیں۔ اور ان دونوں کی وجہ سے انسان اس کرۂ ارض پر بہت کچھ کرتا ہے' بعض اوقات ایک لفظ تلوار اور بم کا کام کرتا ہے اور کبھی وہ اس کے تلفظ کرنے والے کو آگ میں گرا دیتا ہے۔ غرض یہ الفاظ ہی ہیں جو انسان کو اٹھاتے اور گراتے ہیں' یعنی اس آگ میں: "حضرت معاذ ابن جبلؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھا۔ ایک دن میں آپؐ کے قریب آگیا اور ساتھ

ساتھ چلنے لگا۔ تو میں نے حضور اکرمؐ سے پوچھا اے رسول خدا! مجھے ایسا عمل بتایئے جو مجھے جنت میں پہنچا دے اور دوزخ سے بچائے۔ آپؐ نے فرمایا تو نے تو بہت بڑی بات پوچھی' مگر یہ بڑی بات ان لوگوں کے لیے آسان ہے جن کے لیے اللہ آسان کر دے۔ وہ یہ کہ تم اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو' نماز قائم کرو' زکوۃ ادا کرو' رمضان شریف کے روزے رکھو' بیت اللہ کا حج کرو۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں یہ نہ بتا دوں کہ خیر کے دروازے کیا ہیں؟ تو میں نے کہا ضرور۔ تو فرمایا' روزہ ڈھال ہے اور صدقہ گناہوں کو اس طرح مٹاتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھاتا ہے اور رات کے نصف آخر میں نماز نیک لوگوں کا شعار و علامت ہے۔ اور آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ "ان کے پہلو رات کو بستروں سے جدا ہو جاتے ہیں"۔ پھر فرمایا کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ اس معاملہ (دین) کا سرا کیا ہے؟ اس کا ستون کیا ہے؟ اور اس کی بلند ترین چوٹی کیا ہے؟ تو حضرت معاذ نے کہا اللہ کے رسول ضرور بتایئے۔ تو فرمایا اس معاملے کا سرا اسلام ہے' ستون نماز ہے' اور بلند ترین چوٹی جہاد ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ ان سب چیزوں کا دارومدار کس چیز پر ہے تو میں نے کہا اللہ کے رسول ضرور بتایئے' تو فرمایا اس پر (زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) قابو رکھو' تو میں نے کہا' اے رسول خدا! جو کچھ ہم بولتے ہیں اس پر بھی ہم سے مواخذہ ہو گا' آپؐ نے فرمایا' تمہاری ماں تمہیں روئے کہ لوگ اپنی زبان کی کاٹی ہوئی فصل کی وجہ سے منہ کے بل یا فرمایا ناک کے بل جہنم میں گرائے جاتے ہیں"۔ (احمد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)

پھر اللہ نے انسان کو یہ ہدایت دی ہے کہ وہ خیر و شر کو سمجھے اور یہ سمجھے کہ جنت کا راستہ کون سا ہے اور جہنم کا راستہ کون سا ہے۔ یوں یہ ہدایت کر کے اللہ نے انسان کے ساتھ یہ اعانت کی ہے کہ وہ سیدھا راستہ لے۔

ان سب ہدایات کے باوجود انسان پھر بھی اس مشکل گھاٹی کو عبور نہیں کرتا جو اس کے اور جنت کے درمیان حائل ہے اور اللہ نے اگلی آیات میں اس مشکل گھاٹی کی توضیح فرما دی ہے:

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ ﴿۱۸﴾

"مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہ کی اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دشوار گزار گھاٹی؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا' یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔ پھر (اس کے ساتھ یہ کہ) آدمی ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلق خدا پر) رحم کی تلقین کی۔ یہ لوگ ہیں دائیں بازو والے"۔

یہ ہے وہ دشوار گزار گھاٹی جس کو عبور کرنے کی ہمت انسان نہیں کرتا' الا یہ کہ جو لوگ اپنے پختہ ایمان سے مدد لیں ـ یہ گھاٹی انسان اور جنت کے درمیان حائل ہے' اگر انسان اسے عبور کر لے تو وہ سیدھا جنت میں داخل ہو جائے۔ یہاں قرآن کریم اس کی تصویر کشی اس طرح کرتا ہے کہ انسان کے دل میں اسے عبور کرنے کا جوش پیدا ہو' اور یہ تحریک ہو کہ وہ اسے عبور کر لے' ایک جست لگائے اور اس پار ہو' اس کی پوری طرح وضاحت کی گئی اور یہ یقین دلا دیا گیا کہ یہی تمہارے اور جنت کے درمیان حائل ہے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ (۹۰ : ۱۱) "مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہ کی"۔ لفظ اقتحام استعمال کر کے اس بات پر ابھارا گیا ہے کہ آگے بڑھو' ایک جست لگا کر اسے عبور کرو' گھس جاؤ۔

پھر اس گھاٹی کی عظمت اور بڑائی بیان کرنے کے لیے سوال

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ (۹۰ : ۱۲) "تم کیا جانو کہ وہ دشوار گزار گھاٹی کیا ہے"۔ یہ سوال اس لیے نہیں ہے کہ وہ گھاٹی کوئی بہت ضخیم ہے اور ناقابل عبور ہے' مطلب یہ ہے کہ یہ بہت اہم ہے۔ اللہ کے نزدیک اس کا عبور کرنا ضروری ہے تاکہ انسان جرات کر کے گھس جائے اور جست لگا دے۔ اگرچہ اس کی راہ میں مشکلات حائل ہوں' کیونکہ محنت اور مشقت کے بغیر تو کوئی کام بھی نہیں ہوتا اور اگر کوئی یہ مشقت برداشت کرے گا تو اسے ضرور اس کا ثمرہ مل جائے گا اور اس کی تکالیف کا صلہ اس کے سامنے ہو گا' اور اس کا کوئی عمل ضائع نہ ہو گا اور یہ کام ہر حال میں ہونے والا ہے۔

یہ دشوار گزار گھاٹی کیا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی مکہ کی سوسائٹی کو بے حد ضرورت تھی' جہاں تحریک اسلامی دعوت کا کام کر رہی تھی۔ ان غلاموں کو آزادی دلانا جو اس سوسائٹی میں نہایت ہی برے حالات کار میں کام کر رہے تھے' اس خود غرض سوسائٹی میں لوگ نہایت ہی خود غرضی سے مفادات کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور نادار لوگ بھوک سے مر رہے تھے۔ اس میں لوگوں کے لیے ابتدائی انسانی ضروریات فراہم کرنا' یہ باتیں تو مکہ کی سوسائٹی کے پس منظر میں تھیں' باقی بعض ایسی باتیں جن کا تعلق کسی زمان و مکان سے نہیں ہے اور جن کا تعلق تمام انسانوں کے ساتھ ہے اور جو نجات کے لیے ہمیشہ دشوار گزار گھاٹی کی طرح رہے ہیں مثلاً

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (۹۰ : ۱۷) "پھر وہ آدمی ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلق خدا پر) رحم کی تلقین کی"۔ روایات میں ہے کہ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانے کا مقصد یہ ہے کہ غلاموں کو آزاد کرنے میں شرکت کرنا' اور لغوی لحاظ سے عتق کے معنی ہیں کسی کو مکمل آزاد کر دینا یعنی ایک شخص کسی کو آزاد کر دے۔ کوئی کسی کی آزادی میں شریک ہو یا کسی کو پورا آزاد کر دے' حاصل دونوں کا ایک ہی ہے۔

جب یہ آیات نازل ہوئیں تو مکہ میں لوگوں نے اسلام کو ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ اسلامی حکومت قائم نہ تھی کہ وہ آزادی غلاماں کا قانون پاس کر دیتی۔ غلامی جزیرۃ العرب اور اس کے علاوہ پوری دنیا میں عام تھی اور پوری دنیا میں عورتوں کے ساتھ نہایت ظالمانہ سلوک کیا جاتا تھا' جب بعض غلام مسلمان ہو گئے' مثلاً عمار ابن یاسر کا خاندان' بلال

ابن رباح 'صہیب رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ تو ان غلاموں کے مالکان نے ان پر سخت تشدد شروع کر دیا۔ اور ان پر ایسا تشدد شروع کر دیا جو ناقابل برداشت تھا' مسلمان اس نتیجے پر پہنچے کہ ماسوائے آزادی کے اور کسی طریقے سے ان کی جان نہیں چھوٹ سکتی اور آزادی کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ ان لوگوں کو' ان کے شقی القلب اور سنگدل مالکان سے خریدا جائے۔ اس میدان میں حضرت ابوبکر صدیقؓ مرد اول رہے' جیسا کہ ان کی عادت تھی کہ وہ اسلام کے ہر معاملے میں سب سے پہلے لبیک کہتے' اور نہایت ثابت قدمی سے اور اطمینان سے اور استقامت سے اس راہ پر آگے بڑھتے۔

ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے آزاد کردہ غلام حضرت بلال' اس سے پہلے بنی جمح کے پیدائشی غلام تھے' یہ نہایت سچے مسلمان تھے' نہایت پاک دل تھے۔ امیہ ابن خلف ابن وہب ابن خذافہ ابن جمح تپتی دوپہر میں انہیں نکالتا' وادی مکہ میں زمین پر پیٹھ کے بل لٹاتا اور حکم دیتا کہ ان کے سینے پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا جائے اور ان سے کہتا کہ "تم اسی طرح رہو گے جب تک تم مر نہیں جاتے یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کا انکار نہیں کر دیتے اور لات و عزیٰ کی عبادت نہیں کرتے؟" اس مصیبت کی حالت میں وہ صرف یہی کہتے "احد .... احد"۔

ایک دن حضرت ابوبکر صدیقؓ پاس سے گزرے اور یہ لوگ اس وقت ان پر اس طرح تشدد کر رہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا گھر محلہ بنی جمح میں تھا۔ آپ نے امیہ ابن خلف سے کہا: "کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے 'کب تک تم یہ ظلم کرتے رہو گے؟" اس نے جواب دیا: "تم ہی نے تو اسے برباد کیا ہے لہٰذا اس عذاب سے تمہی اسے چھڑاؤ گے"۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا "اچھا میں کرتا ہوں۔ میرے پاس ایک سیاہ فام غلام ہے اس سے زیادہ قوی اور مضبوط اور وہ تمہارے دین پر ہے۔ میں اسے اس کے بدلے تمہیں دیتا ہوں"۔ امیہ ابن خلف نے کہا: "میں نے قبول کیا"۔ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسے اپنے غلام کے بدلے خرید لیا اور آزاد کر دیا۔

"مدینہ کو ہجرت کرنے سے پہلے' ان کے ساتھ اور چھ غلام بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آزاد کرائے' بلال ساتویں تھے۔ عامر ابن فہیرہؓ جو بدر میں شریک ہوئے اور بئر معونہ میں شہید ہوئے۔ ام عبیس' زنیرہ' جب ان کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آزاد کرایا تو ان کی بصارت چلی گئی۔ قریش نے کہا اس سے لات اور عزیٰ کے سوا کسی اور نے نظر نہیں چھین لی۔ اس پر اس نے یہ تبصرہ کیا: "وہ جھوٹ بولتے ہیں 'بیت اللہ کی قسم لات اور عزیٰ نہ نقصان پہنچا سکتے اور نہ نفع"۔ اس کے بعد اللہ نے اس کی نظر کو لوٹا دیا۔ نہدیہ اور اس کی بیٹی' یہ دونوں بنی عبدالدار کی ایک عورت کی لونڈیاں تھیں۔ اس نے ان کو آٹا دے کر بھیجا اور ساتھ ہی یہ کہا خدا کی قسم میں تمہیں کبھی بھی آزاد نہ کروں گی۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ پاس ہی سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے کہا: ام فلاں' اس قسم کا کفارہ ادا کر کے اس سے نکل آؤ' اس نے جواب دیا تم اس کا کفارہ ادا کرو' تم ہی نے تو ان کو خراب کیا ہے۔ لہٰذا تم ہی انہیں آزاد کرو' تو حضرت نے فرمایا' بتاؤ قیمت' اس نے کہا یہ ہے قیمت' حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا بس میں نے خرید لیا اور یہ آزاد ہوئیں۔ اس کا آٹا اسے لوٹا دو' انہوں نے کہا' مناسب نہیں کہ ہم اس سے فارغ ہو جائیں اور پھر اسے لوٹا دیں۔ تو انہوں نے کہا جس طرح تم چاہو۔

اسی طرح ایک بار وہ ایک لونڈی کے پاس سے گزرے' یہ بنی عدی قبیلے کی شاخ بنی مومل سے تھی اور مسلمان تھی۔ عمرو ابن الخطاب اسے سخت سزا دیتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ اسلام چھوڑ دو' اس وقت حضرت عمرؓ مشرک تھے' اسے یہ مار رہے تھے۔ جب وہ تھک گئے تو کہا میں معذرت کرتا ہوں کہ میں نے تمہیں محض اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ میں تھک گیا ہوں ورنہ اور

ماتا اور وہ کہتی 'اسی طرح اللہ تیرے ساتھ کرے ۔ اسے بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خریدا اور آزاد کر دیا"۔

ابن اسحاق کہتے ہیں 'محمد ابن عبداللہ ابن ابو عتیق نے بیان کیا' عامر ابن عبداللہ سے انہوں نے ابن زبیر سے 'انہوں نے ان کے خاندان والوں سے : یہ کہ ابو قحافہ نے کہا :" بیٹے میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ضعیف غلاموں کو آزاد کر رہے ہو 'اگر تم یہ کام کرتے ہی ہو جو کر رہے ہو تو پھر تمہیں چاہیے کہ مضبوط لوگوں کو آزاد کرو' جو تمہارے حامی ہوں اور جب تم پر مصیبت آئے تو تمہارے آگے کھڑے ہوں"۔ اس پر ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا :" اے باپ' میں جو چاہتا ہوں وہ صرف رضائے الٰہی کے لیے چاہتا ہوں"۔

یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے جو اس مشکل گھاٹی کو عبور کرنے کے لیے گھس رہے تھے' اور وہ ایسے مصیبت زدہ جن پر تشدد ہو رہا تھا' اور سوسائٹی ایسی تھی جس میں ایسا اقدام نہایت ابتدائی جست شمار ہوتا اور نہایت انقلابی اقدام ہوتا تھا۔ یوں جس طرح کوئی مشکل ترین گھاٹی کو عبور کرے۔

اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ (١٤) یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (١٥) اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (١٦) (٩٠ : ١٤ تا ١٦) "یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا"۔ مسغبہ کے معنی ہیں بھوک کے ۔ قحط کے دنوں میں چونکہ کھانا مہنگا ہوتا ہے' اس لیے ان دنوں غریبوں کو کھانا کھلانا' ایمان کے لیے معیار بن جاتا ہے ۔ اس وقت کی جاہلی سوسائٹی میں یتیموں کی حالت تو یہ تھی کہ ان کے حقوق ہر طرف سے پامال ہوتے تھے' ان کے مال کو غبن کیا جاتا تھا اور اس طرح سے اڑا لیا جاتا تھا کہ گویا زمین اسے کھا گئی ۔ اگرچہ یتیم قریبی رشتہ دار ہوتا۔ اس لیے کہ اس جاہلی سوسائٹی میں لوگ دولت کے پیچھے کتوں کی طرح ہلکان ہو رہے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کو یتیم کے مال کی حفاظت کے لیے بار بار وصیت کرنی پڑی' کیونکہ اس معاشرے میں یتیموں پر ظلم عام تھا۔ اس لیے یہ ہدایات قرآن حکیم میں جاری رہیں اور مدنی سورتوں میں یہ دی گئیں ۔ مثلاً میراث' وصیت اور نکاح کے قوانین کے ضمن میں ۔ ہم نے سورہ بقرہ اور نساء میں اس موضوع پر مفصل بات کی ہے ۔ خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔

اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (٩٠ : ١٦) اس لیے کہا گیا ہے کہ اپنی بدحالی کی وجہ سے وہ خاک آلود ہے۔ یہاں یتیموں اور مسکینوں کو کھانا کھلانے سے قبل قید لگا دی ۔

فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ (٩٠ : ١٤) "فاقے کے دن کسی یتیم اور مسکین کو کھانا کھلانا"۔ یہ اس لیے کہ اس گھاٹی کو مشکل گھاٹی کہا گیا ہے اور یہ گھاٹی معیار ہے ایمانی شعور' رحمدلی' ایثار اور اسلامی سوسائٹی کے نظام تکافل کے لیے ۔ لوگ اللہ کے اہل و عیال ہیں اور اللہ کے عیال کا خیال رکھنا ایمانی تقاضا ہے خصوصاً قحط سالی اور فاقوں کے دنوں میں ۔ اور دونوں کام' غلاموں کو آزاد کرنا اور غریبوں کو کھلانا' مکہ کی سوسائٹی میں نہایت ہی اہم تھے ۔ اگرچہ یہ دونوں کام اسلام کے عمومی مقاصد میں بھی داخل ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ان کو ایمان سے بھی مقدم ذکر کیا۔ حالانکہ ایمان لانا ایک بنیادی قاعدہ ہے ۔ اس کے بعد پھر عمومی اور بنیادی اصول کا ذکر کیا گیا۔

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (۹۰: ۱۷)

"سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آدمی ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور رحم کی تلقین کی"۔ لفظ ثم یہاں "پھر" کے معنی میں نہیں ہے' کہ پہلے یہ دو کام ہیں اور بعد میں اسلام ہے' بلکہ معنی یہ ہے کہ یہ دو جزوی کام بھی ضروری ہیں لیکن ان سے پہلے ایمان لانا ضروری ہے' اور یہ ضروری اور عام اصول ہے۔ اور اعلیٰ مقام و مرتبہ ہے' اگر ایمان نہیں ہے تو پھر غلاموں کو آزاد کرنا' اور لوگوں کو کھانا کھلانا مفید ہی نہیں ہے۔ ہر اچھے عمل سے قبل ایمان لانا ضروری ہے۔ اللہ کے ہاں کسی بھی عمل صالح میں وزن صرف ایمان کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ایمان ہی اعمال کو ایک منہاج' مسلسل منہاج کی لڑی میں پرو دیتا ہے۔ ایمان کی وجہ سے عمل صالح مسلسل اور دائمی نوعیت اختیار کر لیتا ہے اور ایمان کے بغیر اگر کوئی نیکی کرتا ہے تو وہ محض ایک عارضی جوش ہوتا ہے۔ بدلتے ہوئے مزاجوں کے ساتھ بدل جاتا ہے' یا کسی مصلحت کی وجہ سے کوئی نیکی کرتا ہے یا تعریف سننے کے لیے۔

اب معنی یوں ہوا کہ مشکل گھاٹی یہ ہے کہ کسی غلام کو آزاد کر دے' یا کسی یتیم و مسکین کو فاقے کے دن کھانا کھلائے لیکن سب سے اول یہ کہ وہ اہل ایمان میں سے ہو اور ایک دوسرے کو صبر اور رحم کرنے کی نصیحت کرنے والوں میں سے ہو۔ "ثم" کا لفظ گویا یہاں "پھر" کے معنی میں نہیں بلکہ "سب سے بڑی بات یہ کہ" کا مفہوم دیتا ہے۔

صبر کی وصیت اس لیے ضروری ہے کہ ایمان کے تقاضوں میں سے بالعموم اہم تقاضا صبر ہے۔ اور دشوار گزار گھاٹی کو عبور کرنے کے لیے بالخصوص صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر ایک دوسرے کو صبر کی وصیت بھی کرنا یہ صبر سے بھی ایک اونچا درجہ ہے۔ یعنی اسلامی جماعت ایسے درجے پر ہوتی ہے کہ اس کے افراد اور کارکن باہم ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں اور اس طرح وہ ایمان کے تقاضے پورے کرنے میں ایک دوسرے کے لیے مد و معاون ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کے احساسات ایک دوسرے کے ساتھ ہم رنگ ہوتے اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہیں' اور یہ سمجھتے ہیں کہ زمین کے اوپر ایمانی نظام کے قیام کا فریضہ صبر اور مصابرت ہی سے ادا ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ اس کارگراں کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات پر ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے ثابت قدمی کا باعث بنتے ہیں۔ ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے ہیں' ایک دوسرے کو قوت دیتے ہیں۔ یہ صبر اور تواصی بالصبر انفرادی صبر سے آگے ایک بلند درجہ ہے۔ اگرچہ یہ صبر بھی انفرادی صبر ہی پر قائم ہوتا ہے لیکن تواصی بالصبر سے اشارہ اس طرف ہے کہ مومنین اجتماعی صبر ہی کریں۔ اور یہ کہ وہ ایک دوسرے کے لیے ہمت توڑنے کا باعث نہ بنیں بلکہ ہمت بندھانے کا باعث ہوں۔ ہزیمت کا باعث نہ بنیں بلکہ اقدام اور مشکلات کو انگیز کرنے کا باعث بنیں۔ جزع فزع کا باعث نہ بنیں بلکہ ایک دوسرے کے اطمینان کا باعث بنیں۔

اسی طرح خلق خدا پر رحم کرنا ایک بات ہے اور ایک دوسرے کو لوگوں پر رحم کرنے کی تلقین کرنا ایک دوسرا فعل ہے۔ جو رحم کی تلقین کرنے پر ایک زیادہ بات ہے۔ اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ یہ صفت جماعت مسلمہ کی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو رحم کی وصیت کریں اور اس فعل پر ایک دوسرے کو اکسائیں اور اسے ایک انفرادی اور اجتماعی فریضہ سمجھیں کہ افراد جماعت کا یہ شعار ہو اور نکتہ تعاون ہو۔

صبر اور تواصی صبر' رحم اور تواصی رحم کے اندر سے یہ ہدایت نکلتی ہے کہ اسلام ایک اجتماعی دین ہے جس کے قیا

کے لیے جماعت ضروری ہے 'کیونکہ یہ ایک جماعت ایک سوسائٹی کا دین ہے اور اس کے قیام سے ایک امت وجود میں آتی ہے' لیکن یہ ایسا اجتماعی دین نہیں ہے کہ اس میں انفرادی ذمہ داری نہ ہو' یہ گویا انفرادی ذمہ داری کی بنا پر اجتماعی دین ہے۔ انفرادی ذمہ داری اس میں بہت واضح ہے۔

یہ لوگ جو اس مشکل گھاٹی کو عبور کرتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا۔

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ (۹۰ : ۱۸) "یہ لوگ دائیں بازو والے ہیں"۔ ان کو دوسری جگہ اصحاب الیمین کہا گیا ہے۔ یہ دائیں بازو والے اور سعادت مندی کی صفت والے ہیں۔ دونوں معانی ایمانی مفہوم سے پیوست ہیں۔

۲۰ ع وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ﴿۱۹﴾ عَلَیْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۲۰﴾ ع
۱۵

"اور جنہوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا وہ بائیں بازو والے ہیں' ان پر آگ چھائی ہوئی ہوگی"۔

بائیں بازو والے فریق کے بیان میں دوسری صفات کو ترک کر دیا گیا ہے۔

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا (۹۰ : ۱۹) "اور جنہوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا"۔ کیونکہ جب کافر ہو گئے تو بات ختم ہو گئی۔ کفر کے ساتھ کوئی نیکی جمع ہی نہیں ہو سکتی اور نہ کسی برائی کا علیحدہ اعتبار ہوتا ہے اس لیے کہ ہر برائی کفر کے اندر ہی ہوتی ہے اور یہ کفر اسے ڈھانپ لیتا ہے' لہٰذا اب اس بات کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ یہ لوگ غلاموں کو آزاد نہیں کرتے' اور کھانا نہیں کھلاتے' پھر ان لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کر دیا اور کافر ہو گئے تو پھر کوئی نیکی ان کے لیے مفید ہی نہیں ہے۔

یہ بائیں ہاتھ کے لوگ ہیں یا بدبخت لوگ' دونوں مفہوم مراد ہو سکتے ہیں' وہ بائیں ہاتھ والے بھی' اور منحوس بھی ہیں اور یہی دونوں مفہوم یعنی دائیں جانب اور نیک بخت ایمانی مفہوم میں بھی یکجا ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں نے جرأت کر کے دشوار گزار گھاٹی کو عبور نہ کیا۔

عَلَیْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ (۹۰ : ۲۰) "ان پر آگ چھائی ہوئی ہے"۔ یعنی آگ کے دروازے ان پر بند ہیں یعنی حقیقی معنی میں کہ اندر کر کے ان پر جہنم کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں اور یا اس معنی میں کہ آگ کا عذاب ان پر چھایا ہوا ہے۔ یہ لازمی معنی ہے کہ وہ اس سے خارج نہ ہو سکیں گے۔ جب آگ کو ہٹا نہ سکیں گے تو وہ ان پر بند ہے۔ یہ دونوں مفہوم لازم و ملزوم ہیں۔

یہ بنیادی حقائق جو اس انسان کی زندگی کا بنیادی امور ہیں' ایمانی عقیدے کے اساسیات ہیں' سب کے سب اس چند سطری سورت میں سمو دیے گئے ہیں اور نہایت وضاحت اور زور دار انداز سے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ ہے ممتاز خصوصیت قرآن کے انداز بیان کی۔

--- ○○○ ---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ الشمس ۔ ۹۱

## ۱-- تا -- ۱۵

# سورۃ الشمس ایک نظر میں

یہ مختصر سی سورت جس کا قافیہ ایک ہے' جس کا انداز ترنم ایک ہے ۔ اس میں متعدد وجدانی اشارات ہیں' یہ وجدانی اشارات' ان مظاہر قدرت اور مناظر فطرت سے نکلتے ہیں جن کے ساتھ اس سورت میں بات کا آغاز کیا گیا ہے ۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مناظر اس عظیم حقیقت کا فریم ہیں' جو اس سورت میں بیان کی گئی ہے ۔ یہ کیا حقیقت ہے؟ یہ کہ نفس انسانی کی اصلیت کیا ہے؟ نفس انسانی کی فطری استعداد کیا ہے؟ انسان کا خود اپنے نفس کے بارے میں کیا کردار ہے اور اس نفس کے انجام کے سلسلے میں انسان کی ذمہ داری کیا ہے؟ یہ ہے وہ عظیم حقیقت جس کا ربط یہ سورت اس کائنات کے مشاہد اور دوسرے حقائق کے ساتھ قائم کرتی ہے ۔ یوں یہ سورت اس کائنات کے فریم میں بات کرتی ہے ۔

اس سورت میں قصہ ثمود کا بھی ذکر ہے' جس نے اپنے نبی کی صریح تنبیہات کو رد کر دیا اور نبی کی تکذیب کی ۔ ناقۃ اللہ کو قتل کر دیا اور اس کے بعد اس قوم کو تباہ و برباد کر دیا گیا اور قوم ثمود کا قصہ ایک نمونہ ہے اس قوم کی ناکامی کا جو اپنے نفس کا تزکیہ نہیں کرتی ۔ ایسی اقوام نفس کو فسق و فجور کے لیے آزاد چھوڑ دیتی ہیں اور خدا کا خوف ان کے نفوس سے غائب ہو جاتا ہے' اور اس بات کو سورت کے پہلے ہی پیراگراف میں بتایا گیا ہے ۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۹) وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۹۱ : ۱۰) "یقیناً فلاح پا گیا جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو دبا دیا" ۔

---○○○---

# درس نمبر ۲۹۱ تشریح آیات

## ۱-- تا-- ۱۵

سُوْرَةُ الشَّمْسِ (۹۱) مَكِّيَّةٌ (۲۶) اٰيَاتُهَا ۱۵ رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا (۱) وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (۲) وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا (۳)
وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا (۴) وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا (۵) وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا (۶)
وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا (۷) فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (۸) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ
زَكّٰهَا (۹) وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۱۰)

"سورج اور اس کی دھوپ کی قسم' اور چاند کی قسم جب کہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے' اور دن کی قسم جب کہ وہ (سورج کو) نمایاں کر دیتا ہے' اور رات کی قسم جبکہ وہ (سورج کو) ڈھانک لیتی ہے' اور آسمان کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے قائم کیا' اور زمین کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے بچھایا' اور نفس انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا' پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی' یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا"۔

یہاں اللہ تعالیٰ جس طرح بعض کائناتی مخلوق اور بعض مظاہر کی قسم اٹھاتا ہے' اسی طرح نفس انسانی کی تخلیق اور متناسب بنانے اور اسے اچھی طرح ہموار کرنے اور نیک و بد کے الہام کی قسم اٹھاتا ہے۔ اور اس قسم اٹھانے کا مقصد یہ ہے کہ یہ مخلوقات خدا اہم بن جائیں' لوگ ان کو اہمیت دیں اور ان چیزوں پر غور و فکر کر کے معلوم کر لیں کہ ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کیا ہے اور ان چیزوں کے اشارات کیا ہیں' ان میں نشانات قدرت کیا ہیں تاکہ وہ یہ بات سمجھ لیں کہ کن وجوہات سے اللہ تعالیٰ نے ان کی قسم کھائی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان کے دل اور ان مناظر فطرت کے درمیان ایک مکالمہ ہوتا ہے' ان دونوں کے درمیان ایک

خاص خفیہ زبان ہے' یہ زبان گہرے انسانی شعور اور انسانی فطرت کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ ان مناظر کے درمیان' خواہ وہ جیسے بھی ہوں' اور انسانی فطرت اور شعور کے درمیان ایک گہری ہم آہنگی بھی ہے' دونوں کے درمیان مکالمہ ہوتا رہتا ہے' بغیر اس کے کہ کوئی آواز نکلے یا ریکارڈ پر کوئی سوئی لگائی جائے۔ یہ مناظر دل سے بات کرتے ہیں اور انسانی روح کی طرف ان کے اشارات ہوتے ہیں' اور ان کے اندر ایک ایسی زندگی رواں دواں ہے' جو ایک زندہ انسان کے ساتھ مانوس اور ہمکلام ہے۔ جب بھی ایک زندہ انسان ان مناظر سے دوچار ہو' تو ان مناظر میں اپنے لیے محبت اور انس کے جذبات جانے گا اور یہ مناظر نہایت ہی ہم آہنگی کے ساتھ اس کے ہمقدم ہوں گے اور اپنا پیغام اسے اپنی مخصوص زبان میں منتقل کر دیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید بڑی کثرت سے' مختلف اسالیب کے ذریعہ کائناتی مشاہد کی طرف انسان کی توجہ مبذول کراتا ہے اور اس سلسلے میں کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا' کبھی تو قرآن مجید براہ راست یہ ہدایت دیتا ہے کہ ان مناظر فطرت پر غور کرو اور کبھی مخفی اشارات کے ذریعہ جیسا کہ یہاں بعض تعلیقات اور بعض مناظر کی قسم اٹھا کر ان کی طرف یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ مناظر بھی آنے والے حقائق کے فریم ورک کے اندر ہی ہیں اور اس آخری پارے میں ہم نے اس بات کو بار بار نوٹ کیا ہے کہ اس قسم کی ہدایات اور اشارات بہت زیادہ ہیں۔ کوئی ایسی سورت نہیں ہے جس میں یہ ہدایت اور یہ اشارہ نہ ہو کہ ذرا کتاب کائنات کو پڑھو اور اس کائنات میں ہم آہنگی اور اشارات تلاش کرو' اور اس کائنات کے ساتھ اس کی مخصوص زبان میں مکالمہ کرو اور اس کے استدلال کو سنو۔

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا (۹۱ : ۱) "سورج اور اس کی دھوپ کی قسم"۔ یہاں سورج اور اس کے وقت ضحیٰ اور چاشت اور دھوپ نکلنے کی قسم کھائی گئی ہے۔ جب سورج نکلتا ہے اور اس کی دھوپ مکمل پھیل جاتی ہے تو اس وقت وہ نہایت ہی خوبصورت اور نہایت ہی اچھا بلکہ خوشگوار اور میٹھا ہوتا ہے اور سردیوں میں تو لوگ اس وقت دھوپ میں گرمی حاصل کرتے ہیں اور یہ وقت نہایت خوشگواری کا ہوتا ہے' اور گرمیوں میں بھی یہ اشراق کا وقت ہوتا ہے' خوبصورت ہوتا ہے اور دوپہر کی سخت گرمی سے قبل کا وقت ہوتا ہے' غرض چاشت کے وقت سورج اپنے مکمل حسن کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا ہے۔ بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ یہاں چاشت کے وقت سے مراد پورا دن ہے' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ "ضحیٰ" کے وقت اور لفظی مفہوم سے آگے بڑھ کر ہم کیوں پورا دن مراد لیں' کیونکہ چاشت کے وقت میں حسن اور خوش گواری کے زیادہ اشارات ہیں' جیسا کہ ہم نے پہلے کہا۔

وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (۹۱ : ۲) "اور چاند کی قسم جو اس کے پیچھے آتا ہے"۔ یعنی یہ سورج کے بعد آتا ہے' جب سورج غروب ہو تو پھر اس کا لطیف' شفاف' خوبصورت اور صاف نور نمودار ہوتا ہے۔ انسانی قلب اور چاند کے درمیان قدیم رشتہ محبت ہے' اور یہ رشتہ انسانیات میں دور تک گہرائیوں میں چلا گیا ہے' انسانی نفسیات و ضمیر میں' انسانی قلب و شعور میں یہ زندہ اور چمک دار نظر آتا ہے' پھر چاند انسانی قلب کے ساتھ خوشگوار اور محبت آمیز مکالمہ بھی کرتا ہے' اور محبت بھرے اشارات بھی دیتا ہے' اور اس میں خالق کی حمد و ثنا بھی ہے۔ قریب ہے کہ ایک سننے والا انسان' روشن چاند کی حمد و ثنا کو سنے' بعض اوقات جب ایک حساس دل چاندنی رات میں سوچتا ہے تو وہ چاند کے اس گہرے نور اللہ کی

ت اور فیوض کو محسوس کرتا ہے' اور ان نورانی موجوں میں اپنے شعور کی میل دور کرتا ہے' اپنی پیاس بجھاتا ہے اور اس نور سے سینہ لگاکر وہ اللہ کے اس نور میں ڈوب جاتا ہے۔

وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّاهَا (۹۱: ۳) "اور دن کی قسم جب وہ نمایاں کر دیتا ہے"۔ اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ (ضحھا) سے مراد ایک محدود وقت ہے' پورا دن نہیں ہے اور جلا کی ضمیر شمس کی طرف راجع ہے جو اس سیاق کلام میں مذکور ہے لیکن یہاں سیاق کلام میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ مراد "زمین" ہے۔ قرآن کریم میں اس قسم کا اسلوب بارہا اختیار کیا گیا ہے کہ کوئی ضمیر کسی ایسی چیز کی طرح راجع ہو' جو اگرچہ سیاق میں مذکور نہ ہو' لیکن معہود فی الذہن ہو اور انسانی شعور میں ہروقت حاضر ہو' یہاں سیاق کلام کا تقاضا یہ ہے کہ اس ضمیر کا مرجع زمین ہو۔ چنانچہ دن اس زمین کو روشن کر دیتا ہے اور لوگ اسے اچھی طرح دیکھتے ہیں۔ انسانی زندگی میں دن کا جو کردار ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ انسان کی حالت یہ ہے کہ دن اور رات کے مزے مسلسل لے لے کر وہ اس کا ذوق ہی بھول گیا ہے۔ چنانچہ یہاں گردش لیل و نہار کی ایک جھلک دکھا کر اس کی رعنائیوں کو قلب انسانی میں تازہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ انسان کے احساسات کو زندہ کر کے اور تیز کر کے اس کو اس منظر سے لطف اندوز کیا جائے۔

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا (۹۱: ۴) "اور رات کی قسم جب وہ ڈھانک لیتی ہے"۔ یہاں لفظ یغشی "ڈھانک لینا" بمقابلہ جلی "نمایاں کرنا' روشن کرنا" استعمال ہوا ہے' اس لیے کہ رات تمام چیزوں کو اپنے سینے سے لگا کر ڈھانپ لیتی ہے اور چھپا لیتی ہے۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جو انسان کے دل کو بے حد متاثر کرتا ہے' اور انسانی زندگی پر جس طرح دن کے اثرات ہوتے ہیں' اسی طرح رات کے اثرات بھی ہوتے ہیں۔

اس کے بعد آسمان اور آسمان کی ساخت اور اس کی تعمیر پر قسم کھائی جاتی ہے۔

وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا (۹۱: ۵) "اور آسمان کی قسم اور اس کے بنانے والے کی قسم"۔ ما یہاں عربی گرامر کے لحاظ سے اپنے مابعد آنے والے فعل کو مصدر بنا دیتی ہے۔ آسمان سے ہم جو کچھ سمجھتے وہ ایک نیلگوں قبہ ہے جو ہمارے سروں پر ہے اور اس قبے کو جب ہم دیکھتے ہیں تو اس کے اندر ستارے اور سیارے بکھرے پڑے ہیں' اور سیارے اس کی فضاؤں اور مداروں میں پھرتے ہیں۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ تو اصل حقیقت ہم نہیں جانتے' ہم اپنے سروں پر جو چیز دیکھ رہے ہیں یہ ایک ایسی چیز ہے جس طرح ایک عظیم الشان عمارت ہو' باہم پیوستہ اور نہایت مضبوط۔ یہ عظیم ہال کس طرح بنا ہوا ہے اور اس کے اجزاء کس طرح باہم پیوست ہیں اور وہ بکھر نہیں رہے۔ اور ایک ایسی فضا میں تیر رہے ہیں جس کے نہ آغاز کا ہمیں علم ہے اور نہ انجام کا ہمیں علم ہے۔ یہی وہ چیز ہے' جس کی حقیقت ہم نہیں جانتے۔ اس آسمان کے بارے میں آج تک اہل علم نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ نظریات ہی ہیں اور وہ ترمیم اور رد و قبول کرتے ہیں۔ یہ نظریات کسی دور میں بھی اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں رہے اور ہمیشہ قرار و ثبات سے محروم رہے ہیں۔ ہمارا نظریہ اور ایمان سب سے مضبوط ہے کہ دست قدرت نے انہیں تھام رکھا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ

اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ (۳۵ : ۴۱) "وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو ڈھلکنے سے روکے رکھا ہے۔ اگر وہ ہٹ جائیں تو پھر اللہ کے سوا کوئی انہیں اپنی جگہ قائم نہ کر سکے"۔ یہی وہ علم ہے جو نہایت مستحکم ہے' اس کے سوا یقینی بات کوئی اور نہیں ہے۔

اس کے بعد زمین اور اس کے بچھائے جانے کی قسم ہے۔

وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا (۹۱ : ۶) "اور زمین اور اس کے بچھائے جانے کی قسم"۔ طحی الطحو سے ہے جس کے معنی بچھانے کے ہیں' جس طرح الدحو کا مفہوم ہے بچھانا' اور زندگی کے لیے ہموار کرنا۔ اور یہ ایک عظیم اور نمایاں حقیقت ہے جس کے اوپر انسانوں اور تمام حیوانوں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ آسمان و زمین کے اندر اللہ نے جو ہم آہنگی پیدا فرمائی ہے' یہ اسی کی برکت ہے جس کی وجہ سے یہاں زندگی ممکن ہوئی اور یہ سب کام صرف اللہ کی تدبیر اور اندازوں کی وجہ سے ہوا۔ ہمارے لیے یہی واضح اور ظاہری حقیقت کافی ہے کہ اگر ان خصائص اور ہم آہنگیوں میں سے کوئی چیز بھی خلل پذیر ہو جائے تو نہ اس زمین میں زندگی کا وجود ہوتا اور نہ یہ زندگی اس انداز پر چلتی۔ زمین کا "الطحو" جو یہاں استعمال ہوا ہے یا "الدحو" جو سورہ نازعات (۳۰'۳۱) میں استعمال ہوا ہے۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا (۳۰) اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا (۷۹ : ۳۱)

"زمین کو اس کے بعد بچھایا اور اس کا پانی اور اس میں سے نباتات نکالی"۔ دونوں مفہوم بچھانا ہے اور یہ بچھانا ان خصائص اور ہم آہنگیوں میں سے بڑی ہم آہنگی ہے۔ اور یہ صرف دست قدرت کا کارنامہ ہے۔ یہاں اس بچھانے کا ذکر کر کے اشارہ قدرت الہیہ کی طرف ہے اور قلب انسانی کو اس بات پر اکسایا جاتا ہے کہ ذرا اس پر غور کرے اور نصیحت حاصل کرے۔

ان قسموں اور ان کے اندر پائے جانے والے مظاہر کائنات اور مناظر فطرت کے بعد اب نفس انسانی کے عظیم حقائق پیش کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ اس کائنات کے عجائبات میں سے یہ عظیم تر عجوبہ ہے۔ جو اس زمین و آسمان کی ان ہم آہنگیوں کی وجہ سے قائم ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا (۷) فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (۸) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا (۹) وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (۱۰) (۹۱ : ۷ تا ۱۰) "اور نفس انسانی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا۔ پھر اس کی بدی اور پرہیز گاری اس پر الہام کر دی۔ یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا"۔ ان چار آیات میں اسلام کا نظریہ نفس بیان کیا گیا ہے۔ اس کی طرف سورہ ماقبل' سورہ البلد میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰ : ۱۰) "اور ہم نے اسے دو راہیں دکھا دیں"۔ نیز سورہ دھر میں بھی اسی نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔

اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (۷۶:۳) "ہم نے اسے راہ دکھا دی۔ اب وہ یا تو شکرگزار بنے گا یا ناشکر"۔ اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ نفس انسانی میں ازروئے فطرت دو صلاحیتیں ہیں جیسا کہ سورہ ص میں کہا گیا ہے۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ (۷۱) فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ (۷۲) (۳۸: ۷۱ – ۷۲) "اور اس بات کو یاد کرو کہ جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر کو مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں تو جب میں اسے مکمل بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدہ ریز ہو جاؤ"۔ مذکورہ بالا آیات میں نفس انسانی کے متعلق جو کچھ کہا گیا' یہ امور اسلام کے نظریہ فردی ذمہ داری سے بھی مربوط ہے جیسا کہ سورہ المدثر میں کہا گیا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ "ہر نفس اپنی کمائی اور عمل کا ذمہ دار ہے"۔ اور یہ موضوع اس آیت سے بھی متعلق ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ کا معاملہ ہر انسان کے ساتھ اس کے اعمال کے مطابق ہوتا ہے جیسا کہ سورہ الرعد میں صراحت سے کہا گیا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ "اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں"۔ ان تمام آیات میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے بارے میں اسلام اور قرآن کا نقطہ نظر کیا ہے اور انسان کے خدوخال کیا ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ مخلوق اپنے اندر دو پہلو رکھتی ہے۔ اس کی صلاحیتیں بھی دو رخ رکھتی ہیں' اس کی ذات کے اندر دو صلاحیتیں ہیں۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس کی تخلیق کا ایک رخ مادی ہے یعنی وہ خاک جس سے اسے بنایا گیا اور دوسرا رخ اس روح کا ہے جو اس کے اندر پھونکی گئی ہے اور یہ روح اللہ کی روح ہے۔ چنانچہ خاک کی صلاحیت شر کی طرف جاتی ہے اور روح کی صلاحیت اسے خیر کی طرف لے جاتی ہے۔ اپنی تخلیق کے اعتبار سے یہ خیر و شر اور ہدایت و ضلالت دونوں کی طرف جا سکتا ہے اور خیر و شر کی تمیز کا ملکہ بھی اسے دیا گیا ہے اور اسے یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ اپنے نفس کو خیر کی طرف موڑ دے یا شر کی طرف موڑ دے۔ یہ طاقت' اختیار اور صلاحیت ازروئے تخلیق اس کے اندر موجود ہے۔ اس کی طرف قرآن نے کبھی تو الہام کے لفظ سے اشارہ کیا ہے۔

وَ نَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا (۷) فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا (۹۱: ۸) "اور نفس انسانی کی قسم اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا' پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی"۔ اور کبھی اس کی طرف لفظ ہدایت سے اشارہ کیا گیا ہے۔

وَ هَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ (۹۰: ۱۰) (البلد) "ہم نے اسے دو راہوں کی ہدایت کر دی"۔ تو یہ صلاحیت

اس مخلوق کی ذات میں ازروئے تخلیق رکھ دی گئی ہے ۔ تمام رسولوں کی جدوجہد ' تمام اچھے لوگوں کی ہدایات اور تمام خارجی موثرات اور عوامل دراصل اس صلاحیت کو جگاتے ہیں ' اسے ایک رخ اور سمت دیتے ہیں ' اسے تیز یا کند کرتے ہیں ۔ خارجی عوامل اس صلاحیت کی تخلیق نہیں کرتے کیونکہ یہ صلاحیت دو رخی صلاحیت ' ازروئے فطرت تخلیق ' ازروئے طبیعت ' ازروئے الہام الٰہی بشر کے اندر موجود ہے ۔

--- ○○○ ---

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۹) وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۹۱ : ۱۰) "یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا" ۔ مطلب یہ ہے کہ ان فطری قوتوں اور صلاحیتوں کے علاوہ انسان کے اندر ایک قوت مدرکہ ہے اور اس قوت مدرکہ کی وجہ سے انسان ایک ذمہ دار مخلوق بنایا گیا ہے ۔ اس قوت مدرکہ کو جس شخص نے نفس کی تطہیر کے لیے اور اس کے اندر بھلائی کی استعداد کو بڑھانے کے لیے استعمال کیا اور خیر کی صلاحیت کو شر پر غالب کر دیا تو یہ شخص کامیاب ہو گیا ' اور جس شخص نے اپنی قوت عقلیہ کو تاریک کر دیا اور اس کو چھپا کر اور دبا کر کمزور کر دیا تو وہ ناکام ہوا ۔

غرض انسان کی مسئولیت اس وجہ سے ہے کہ وہ قوت عقلیہ اور قوت مدرکہ رکھتا ہے ' اور اپنی اس قوت کی وجہ سے نفس کے اندر موجود خیر و شر کی صلاحیتوں کو ایک رخ دے سکتا ہے ۔ ان صلاحیتوں کو خیر کے میدان میں ڈال کر پروان چڑھا سکتا ہے اور شر کے میدان میں ڈال کر شر کو پروان چڑھا سکتا ہے ۔ اس آزادی و اختیار کے نتیجے میں انسان پر ذمہ داری عائد کی گئی ہے ۔ اس کی قوت پر فرض عائد ہوا ۔ یہ انعام تھا جس کے جواب میں اس پر فرائض عائد ہوئے ۔

لیکن اللہ نہایت رحیم ہے ۔ انسان کو محض فطری استعداد ' عقلی قوت مدرکہ اور فطری الہام و ہدایت کے حوالے ہی نہیں کر دیا گیا ' بلکہ آدم علیہ السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک اس کی ہدایت کے لیے رسول بھیجے گئے جو ان کے لیے مستقل قدریں وضع کرتے رہے ۔ انسان کو ایمان کی بنیادی باتیں بتاتے رہے ' ایمان و ہدایت کے دلائل سمجھاتے رہے ۔ نفس انسانی کے اندر موجود دلائل اور اس کائنات کے آفاق کے اندر موجود اشارات ایمان بھی سمجھاتے رہے ۔ انسان کی آنکھوں پر سے ضلالت کے پردے اتارتے رہے تاکہ اسے راہ ہدایت صحیح نظر آئے ۔ اور یہ راہ واضح ' صاف اور بغیر کسی التباس کے انسان کو معلوم ہو ' ہر طرف سنگ ہائے میل نصب کر دیئے تاکہ وہ انسان منزل مقصود تک پہنچے اور جس راہ پر اس نے جانا ہے ' علیٰ وجہ البصیرت جائے ۔ جس کو بھی وہ اختیار کرے اس پر چلے ۔

یہ تھی مختصراً انسان کے بارے میں اللہ کی اسکیم اور مشیت جو کام بھی ہوتا ہے ۔ اس کے دائرے کے اندر ہوتا ہے ۔ وہ اللہ کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے اور اللہ کی مکمل تقدیری نظام کے دائرے میں رہتے ہوئے ہوتا ہے ۔

انسان کی حیثیت اور مقام انسانیت کے بارے میں یہ اجمالی اور مختصر تبصرہ اپنے اندر نہایت ہی قیمتی نکات رکھتا ہے جو انسان کی تہذیب اور تربیت کے لیے نہایت مفید ہیں ۔ ایک یہ کہ اس سے حضرت انسان کو نہایت معزز اور مکرم مخلوق قرار دیا جاتا ہے ۔ اس طرح کہ اسے اپنے معاملات کا خود مختار اور ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے ۔ یہ اختیار اور ذمہ داری اگرچہ اللہ کے وسیع تر نظام مشیت اور تقدیر کے اندر ہے ' کیونکہ یہ حریت اور اختیار اللہ کی مشیت ہی نے اسے عطا کیا ' لیکن اس

سے بہرحال اس مقام و مرتبہ کا تعین ہوتا ہے اور وہ آزاد اور خود مختار مخلوق قرار پاتا ہے۔ یوں اس کائنات میں انسان ایک نہایت ہی بلند و برتر مقام رکھتا ہے کیونکہ یہ ایک ایسی مخلوق ہے جسے اللہ نے نہایت اہتمام سے تیار کیا' پھر اس میں اپنی روح پھونکی اور اس جہاں کے بہت سے اور بیشتر مخلوقات پر اسے فضیلت دی۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ ان آیات میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ انسان اپنے انجام کا خود ذمہ دار ہے۔ سارا معاملہ اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ (دائرہ مشیت الٰہیہ کے اندر اندر جیسا کہ ہم نے وضاحت کی) اس ذمہ داری سے اس کے شعور میں احتیاط اور تقویٰ کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اللہ کی تقدیر اس کی ذات میں اس طرح کام کرے گی جس طرح وہ اپنے تصرفات اور سرگرمیوں کو رخ دے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ "اللہ کبھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت بدلتے نہیں"۔ فی الحقیقت یہ نہایت ہی عظیم ذمہ داری ہے۔ کوئی ذی شعور شخص اس سے غافل اور لاپرواہ نہیں رہ سکتا۔

تیسری بات یہ ہے کہ یہ انسانی سوچ کے اندر یہ شعور پیدا کرتا ہے کہ وہ راہ راست پر ثابت قدم رہنے کے لیے اللہ کے مستقل پیمانوں اور دائمی قدروں کی طرف رجوع کرے تاکہ وہ یقین پر ہو کہ اسے اس کی خواہشات نے کہیں غلط راہوں پر تو نہیں ڈال دیا ہے' دھوکہ تو نہیں دے دیا تاکہ خواہشات نفس اسے ہلاکت کے راستے پر نہ ڈال دیں۔ اور یہ نہ ہو کہ تقدیر الٰہی کے نتیجے میں وہ کہیں اپنی خواہش کو الٰہ بنا چکا ہو۔ یہی وجہ ہے' اس طرح وہ مطیع شریعت ہونے کے سبب اللہ کے راستوں سے کبھی نہ بھٹکے گا۔ وہ اللہ کی ہدایات کے مطابق چل رہا ہوگا' اور اسی نور سے روشنی حاصل کرے گا جو دنیا کی ان تاریک راہوں پر چلنے کے لیے' اللہ نے اسے عنایت کیا۔

چنانچہ انسان کو اللہ نے اپنی ذات تک پہنچنے کے لیے تزکیہ نفس اور تطہیر ذات کے لیے بے شمار وسائل عطا کیے ہیں' اس کے اردگرد نور کے دریا بہہ رہے ہیں' وہ ان میں ہروقت غسل کر سکتا ہے اور اس کائنات میں معرفت کردگار کے جو سرچشمے رواں دواں ہیں وہ ان میں اپنی ذات کی تطہیر ہروقت کر سکتا ہے۔

اس کے بعد ایک زندہ تاریخی مثال سے اس بات کو واضح کیا جاتا ہے کہ کس طرح انسان اپنے نفس کو دنیا کی آلودگیوں میں دفن کر دیتا ہے۔ اور پھر اسے راہ ہدایت سے محروم کر دیتا ہے۔ یہ مثال قوم ثمود ہے' جو اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے اور جن پر سخت عذاب ٹوٹ پڑا اور ہلاک کر دیے گئے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ﴿١١﴾ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ﴿١٢﴾ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا ﴿١٣﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۙ۬ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿١٤﴾ وَ لَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿١٥﴾

۱
ع ۱۵
۱۶

"ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر جھٹلایا۔ جب اس قوم کا سب سے زیادہ شقی آدمی بپھر کر اٹھا تو اللہ کے رسولؑ نے ان لوگوں سے کہا کہ خبردار 'اللہ کی اونٹنی کو (ہاتھ نہ لگانا) اور اس کے پانی پینے (میں مانع نہ ہونا) مگر انہوں نے اس کی بات کو جھوٹا قرار دیا اور اونٹنی کو مار ڈالا۔ آخر کار ان کے گناہ کی پاداش میں ان کے رب نے ان پر ایسی آفت توڑی کہ ایک ساتھ سب کو پیوند خاک کر دیا' اور اسے (اپنے اس فعل کے) کسی برے نتیجے کا کوئی خوف نہیں ہے۔"

قوم ثمود اور ان کے نبی حضرت صالح علیہ السلام کی کہانی قرآن مجید میں کئی مقامات پر آتی ہے۔ ہر مقام پر ہم نے اس پر بات کی ہے اور ابھی سورہ الفجر میں 'اسی پارے میں یہ کہانی گزری ہے۔ تفصیلات ان مقامات پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

یہاں صرف یہ کہا گیا ہے کہ قوم ثمود نے صرف اپنی سرکشی کی وجہ سے اپنے نبی کی تکذیب کی۔ اور اس سرکشی کے سوا کوئی اور جواز اس کے لیے نہ تھا۔ واقعہ یوں ہوا کہ ان میں سے ایک نہایت ہی شقی القلب شخص اٹھا اور اس نے ناقتہ اللہ کو قتل کر دیا۔ یہ شخص ان میں نہایت سنگدل اور سرکش تھا کہ وہ اس قدر عظیم جرم کے ارتکاب کے لیے تیار ہو گیا۔ حالانکہ ان کے نبی نے واضح الفاظ میں ان کو متنبہ کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ اس ناقہ کو کوئی گزند نہ پہنچانا' نہ اس پانی میں مداخلت کرنا جس کو اللہ نے تمہارے اور ناقہ کے درمیان تقسیم کر دیا ہے کہ ایک دن تمہارے لیے اور ایک دن اس ناقہ کے لیے ہے اور یہ تقسیم اس لیے ہوئی تھی کہ انہوں نے اللہ کے نبی سے معجزے کا مطالبہ کر دیا تھا تو اللہ نے اس ناقہ کو معجزہ قرار دیا۔ اس ناقہ کی کوئی نہ کوئی معجزانہ شان تو بہرحال ہوگی۔ یہاں ہم اس کی تفصیلات میں نہیں جاتے۔ اس لیے کہ خود اللہ نے اس کے شان اعجاز کی تفصیلات نہیں دی ہیں۔ بہرحال انہوں نے اپنی سرکشی کی وجہ سے اللہ کی جانب سے ڈرانے والے کی تکذیب کی اور ناقہ کو قتل کر دیا۔ اور جس شخص نے عملاً یہ فعل اپنے ذمہ دیا۔ وہ ان میں سے بہت زیادہ بدبخت اور شقی تھا۔ لیکن ذمہ داری سب نے لی۔ اور سب ہی ذمہ دار اس لیے قرار پائے کہ انہوں نے اس شخص کو اس برے فعل سے نہ روکا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اسلام کے اصولوں میں سے یہ بنیادی اصول ہے کہ دنیا کی اجتماعی زندگی میں ذمہ داری بھی اجتماعی ہوتی ہے اور یہ اجتماعی ذمہ داری کا قانون اسلام کے انفرادی ذمہ داری کے اصول کے خلاف نہیں ہے۔ یعنی آخرت میں کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہو گا جو اس نے کمایا' کیونکہ اسلام میں یہ بھی گناہ کبیرہ ہے کہ کوئی دوسروں کو نصیحت کرنا چھوڑ دے' دوسروں کی اصلاح' ان کی کفالت سے دستکش ہو جائے اور نیکی کرنے اور ظالم کا ہاتھ پکڑنے پر لوگوں کو نہ ابھارے۔

جب انہوں نے اس عظیم جرم کا ارتکاب کیا تو پھر دست قدرت حرکت میں آیا۔

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰهَا (۹۱ : ۱۴) "آخر کار ان کے گناہ کی پاداش میں ان کے رب نے ان پر ایسی آفت توڑی کہ ایک ساتھ سب کو پیوند خاک کر دیا"۔ "دمدمہ" کے معنی غضب کے ہوتے ہیں اور غضب کے نتیجے میں جو انتقام اور عذاب آتا ہے۔ لفظ "دمدم" کا تلفظ ہی بتاتا ہے کہ وہ عذاب کس قدر سخت ہو گا۔ اس لفظ کا تلفظ اور ترنم ہی ایک خوفناک منظر کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اللہ نے ان کی زمین کو اوپر نیچے کر دیا اور برابر کر دیا۔ یہ ایک ایسی تصویر کشی ہے جس سے نہایت ہی ہمہ گیر بربادی کا اظہار ہوتا ہے۔

وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (۹۱ : ۱۵) "اور اسے اس کے کسی برے نتیجے کا خوف نہیں ہے"۔ وہ تو ہر

کمزوری سے پاک ہے' وہ کس سے خوف کر سکتا ہے؟ کہاں خوف کھا سکتا ہے اور کب خائف ہو سکتا ہے؟"

دراصل اس انداز تعبیر سے ایک لازمی مفہوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ کی گرفت نہایت سخت ہوتی ہے' اس لیے کہ دنیا کا جو شخص بھی اگر کسی انجام سے نہ ڈرتا ہو تو وہ سخت ترین مظالم ڈھاتا ہے۔ اسی طرح اللہ کی پکڑ سخت ہو گی کیونکہ اللہ سے تو کوئی پوچھنے والا ہے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ "بے شک تیرے رب کی پکڑ بہت شدید ہوتی ہے"۔ اس لیے یہ کہہ کر کہ وہ اپنے کسی فعل کے برے نتیجے سے نہیں ڈرتا' یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ کی پکڑ بہت شدید ہو گی۔

یوں نفس انسانی کو اس کائنات کے عظیم حقائق کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے اور اس کائنات کے مشاہد اور مناظر کے ساتھ نفس انسانی کو متعلق کیا جاتا ہے۔ پھر نفس انسانی اور مشاہد کائنات دونوں کو اللہ کی اس سنت کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے جو اس نے سرکشوں اور تکذیب کرنے والوں کی گرفت کے لیے وضع کی ہے۔ یہ سب واقعات اللہ کی تقدیر کے حدود کے اندر ہوتے ہیں۔ جس کے نظام میں اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے۔ ہر حادثہ کا ایک وقت طے شدہ ہے۔ ہر واقعہ کا ایک مقصد ہوتا ہے اور اس تقدیر کے نظام میں ہر ہر قدم پر حکمت ربانی کارفرما ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اللہ نفس کا بھی رب ہے۔ اس کائنات کا بھی رب ہے اور نظام قضا و قدر کا بھی وہی منتظم ہے۔ لہذا یہ سب اس کی وسیع تر اسکیم مشیت کے دائرے میں ہیں۔

--- ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ـــ ۳۰

## سورۃ اللیل ـ ۹۲

## ۱ـ تا ـ ۲۱

# سورۃ اللیل ایک نظر میں

یہ سورت مظاہر کائنات اور فطرت انسانی کے فریم ورک میں حقیقت عمل اور مکافات عمل کا تعین کرتی ہے ' دونوں چیزیں اپنے مظاہر کے اعتبار سے متنوع ہیں۔

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى (٤) فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى (٥) وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى (٦) فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى (٧) وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى (٨) وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى (٩) فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى (١٠) (٩٢: ٤ تا ١٠) "در حقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں۔ تو جس نے (راہ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا' اور بھلائی کو سچ مانا' اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے۔ اور جس نے بخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا' اس کو ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے"۔ چنانچہ آخرت میں بھی ہر کسی کا انجام اعمال کے مطابق ہو گا' جس نے جو رخ اختیار کیا' اسی منزل تک پہنچ جائے گا۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى (١٤) لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى (١٥) الَّذِىْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (١٦) وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى (١٧) الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (١٨) (٩٢: ١٤ تا ١٨) "پس میں نے تم کو خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے۔ اس میں نہیں جھلسے گا مگر وہ انتہائی بدبخت جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔ اور اس سے دور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے"۔

چونکہ اس حقیقت کے نتائج و مظاہر دو قسم کے تھے' اور ان نتائج کے دو مختلف رخ تھے۔ اس لیے کائنات اور طبیعت انسانی کے جس فریم ورک میں اس حقیقت کو لایا گیا اس کے مظاہر بھی مختلف ہیں۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى (١) وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى (٢) وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى (٣) (٩٢: ١ تا ٣) "قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے اور دن کی جب وہ روشن ہو اور اس ذات کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا"۔ قرآن کریم کا یہ انداز بیان فقید المثال ہے۔

---○○○---

# درس نمبر ۲۹۲ تشریح آیات

## ۱-- تا-- ۲۱

آیاتها ۲۱ سورۃ اللیل (۹۲) مکیۃ (۹) رکوعها ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ ﴿١﴾ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ﴿٢﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ﴿٣﴾

"قسم ہے رات کی جبکہ وہ چھا جائے ' اور دن کی جبکہ وہ روشن ہو اور نر اور مادہ کی تخلیق کی قسم"۔

ہللہ اس سورت کا آغاز دو کائناتی معجزات کی قسم اٹھا کر کرتا ہے اور ان دونوں معجزانہ مناظر کو ایسی صفت دیتا ہے جن سے ان کی خوب تصویر کشی ہوتی ہے۔

وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ (۹۲ : ۱) "قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے"۔ اور

وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ (۹۲ : ۲) "اور قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہو"۔ رات جب اس زمین کو ڈھانپ لیتی ہے اور اسے اپنی آغوش میں لے کر چھپا دیتی ہے۔ اور دن جب وہ روشن ہو کر ظاہر ہوتا ہے اور اس کی روشنی میں ہر چیز نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ آسمانوں کے مدار میں بھی دو مختلف اوقات ہیں اور اپنی شکل و صورت میں بھی مختلف مظاہر ہیں ' اور اپنے خصائص و آثار میں بھی مختلف ہیں۔ دوسری قسم دو مختلف جنسوں کے ساتھ ہے ' نر اور مادہ کے ساتھ ' جو جنسی اعتبار سے ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں۔

وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ (۹۲ : ۳) "اور نر و مادہ کی تخلیق کی قسم"۔ اس سے اس سورت کے باہم متقابل مظاہر اور حقائق کی تکمیل ہوتی ہے۔

گردش لیل و نہار دو ایسے مظاہر ہیں جن کے اندر ایسے معانی پوشیدہ ہیں جن کے ذریعہ وہ انسانی دل و دماغ کو بعض اشارات دیتے ہیں اور اگر ان پر غور کیا جائے تو ان کے اندر مزید گہرے معانی ملتے ہیں اور ان معانی کے پیچھے مزید وسعتیں ہیں۔ گردش لیل و نہار ایک ایسا مظہر ہے جس سے قلب انسانی براہ راست اثرات لیتا ہے۔ رات جب پوری طرح چھا جائے اور دن جب پوری طرح روشن ہو جائے ' ان دونوں کی مسلسل گردش دراصل گویا ہے اور اس کے اندر

کھلے اشارات ہیں ۔ یہ اشارات اس کائنات کے نامعلوم اسرار و رموز کی طرف ہیں اور اس گردش کی گفتگو ان مظاہر سے متعلق ہے 'جن میں معاملات کے بارے میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں ہے ۔ اشارات اس طرف بھی ہیں کہ ان مظاہر کی پشت پر ایک قوت مدبرہ ہے جو اس کائنات کو ہر آن نئی شان عطا کرتی رہتی ہے ۔ کائنات کی گاڑی رواں دواں ہے ۔ اور اسے کسی وقت بھی ایک حال پر قرار و ثبات نہیں ہے ۔

گردش لیل و نہار پر غور و فکر اور تدبر و تفکر کرنے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس عظیم کشتی کو ایک قدرتی ہاتھ چلانے والا ہے اور وہی لیل و نہار کے یہ عمومی مظاہر مسلسل پیدا کرتا رہتا ہے ۔ اور یہ گردش ایک عظیم نظام ایک عظیم تسلسل اور حرکت میں نہایت دقیق نظام پر مشتمل ہے ۔ اور جو ذات ان افلاک کو چلا رہی ہے وہی انسانی زندگی کو بھی چلا رہی ہے ۔ اور انسان شتر بے مہار نہیں چھوڑ دیا گیا اور نہ اس کی تخلیق عبث کی گئی ہے ۔

لوگوں کو گمراہ کرنے والے اور حق کا انکار کرنے والے اس حقیقت میں جس قدر رخنے ڈالنے کی سعی کریں اور لوگوں کی توجہ اس حقیقت سے ہٹانے کی جس قدر مساعی بھی کریں ' لیکن یہ ایک ایسی نمایاں حقیقت ہے کہ ایک سلیم الفطرت انسان کا دل اس کے ساتھ لگا رہتا ہے 'یہ اس حقیقت کو براہ راست پاتا ہے ۔ اس کے نظارے کرتا رہتا ہے 'اس کے اشارات وصول کرتا ہے ۔ اور اگر غور و فکر کرے تو اس حقیقت کو وہ پائے گا کہ اس کائنات کا ایک مدبر ہے جس کے شعور اور تصور سے کوئی انسان دامن نہیں بچا سکتا ۔ اگرچہ کوئی لغو بیانی اور بکواس کرتا رہے ' اور اگرچہ کوئی نہایت ہی ناپسندیدہ انداز میں انکار پر تل جائے ۔

یہی حال ہے ' نر اور مادہ کی تخلیق کی ' انسانوں اور ان حیوانوں میں جو دودھ پلانے والے ہیں ' رحم مادر میں ایک نہایت ہی خوردبینی جرثومہ اور خلیہ قرار پکڑتا ہے ۔ پھر یہ خلیہ عورت اور مادہ کے بیضہ کے ساتھ جڑ جاتا ہے ۔ اس کے بعد پھر بچہ میں یہ اختلاف کیونکر ہوتا ہے ؟ وہ کون ہے جو ایک بچہ کو کہتا ہے ۔ تم مرد ہو جاؤ اور دوسرے کو کہتا ہے تم عورت ہو جاؤ ۔ اگر یہ معلوم بھی ہو جائے کہ فلاں عوامل کسی خلیے کو نر بنا دیتے ہیں اور فلاں عوامل اسے مادہ بنا دیتے ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا 'کیونکہ پھر بھی یہ سوال ہو گا کہ کون ہے جو نر کے لیے یہ عوامل جمع کرتا ہے اور مادہ کے لیے یہ عوامل فراہم کرتا ہے ۔ اور ایک کو نر اور دوسرے کو مادہ بنا دیتا ہے ۔ اور یہ وہ واقعہ ہے جو پوری ذی روح مخلوق کے ساتھ ہوتا ہے اور اس طرح تمام ذی روح اشیاء کی نسل چلتی رہتی ہے ۔

کیا یہ کام محض اتفاقاً ہو جاتا ہے ؟ اتفاق کا بھی ایک قانون ہے اور اگر اس کا خیال رکھا جائے تو انسانی اور حیوانی زندگی کے اندر نر و مادہ کے اعتبار سے جو واقعات رونما ہوتے ہیں ان کو محض اتفاق کا نتیجہ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ لہٰذا صرف یہی ایک نظریہ اور عقیدہ رہ جاتا ہے کہ ایک خالق ہے جو بعض افراد کو نر اور بعض کو مادہ بنا دیتا ہے اور اس میں اس کی حکمت پوشیدہ ہے ۔ اور اس نظام سے اس کے کچھ مقاصد ہیں لہٰذا محض بخت و اتفاق پر تکیہ نہیں کیا جا سکتا ۔ اور نہ اس کائنات کے نظام میں خودکاری نام کی کوئی چیز ہے ۔

پھر دودھ پلانے والی ذی روح 'چیزوں کے علاوہ تمام دوسری زندہ مخلوقات میں بھی نر اور مادہ کا نظام جاری ہے بلکہ نباتات تک میں یہ نظام جاری و ساری ہے ۔ یہ ایک ہی اصول ہے جو ہر چیز میں جاری ہے اور کسی جگہ اس کی نفی نہیں ہے ۔ اس اصول سے صرف اللہ وحدہ کی ذات مستثنیٰ ہے کہ اس کا کوئی مادہ نہیں ہے کہ اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے ۔

یہ ہیں ان مناظر قدرت کے بعض اشارات اور یہ ہے انسانیت کی وہ اصلیت جس پر اللہ قسم اٹھاتا ہے ۔اس لیے کہ یہ مشاہد اور انسانیت کی تخلیق کے اندر گہرے دلائل و اشارات ہیں اور انہی سے قرآن مجید یہ نتائج اخذ کرتا ہے کہ اس جہاں کے بعد دوسرا جہاں ہے اور اس جہاں میں جزاء و سزا ہوگی اور یہ جزاء و سزا اس جہاں کے اعمال پر ہوگی ۔

اللہ تعالیٰ اس بات پر قسم اٹھاتا ہے کہ جس طرح اس کائنات کے مظاہر مختلف ہیں اور جس طرح لوگوں کی ساخت اور تخلیق مختلف ہے اسی طرح لوگوں کا طرز عمل اور ان کی جدوجہد بھی مختلف ہے ۔ لہٰذا پھر ان کی سعی و جدوجہد کے اختلاف کی طرح ان کی جزاء و سزا اور نتائج اعمال بھی مختلف ہیں ۔ لہٰذا ''خیر'' ''شر'' کے برابر نہیں ہے' ہدایت اور ضلالت برابر نہیں ہے' ایک صالح شخص ایک مفسد کے برابر نہیں ہو سکتا ہے' یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک سخی اور مال خرچ کرنے اور تقویٰ اختیار کرنے والا بخیل اور مستغنی کے برابر نہیں ہو سکتا ۔ نہ تصدیق کرنے والا اور سننے والا اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو تکذیب کرتا ہے اور منہ موڑتا ہے ۔ ہر ایک کا ایک طریقہ ہے اور ہر ایک کا ایک انجام ہے اور ہر ایک کی ایک مکمل جزاء ہے ۔ اور ایسا ہی ہونا چاہئے ۔

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰىؕ۝۴ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَ اتَّقٰىۙ۝۵ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰىۙ۝۶
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰىؕ۝۷ وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰىۙ۝۸ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰىۙ۝۹
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰىؕ۝۱۰ وَ مَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰىؕ۝۱۱

''در حقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں ۔تو جس نے (راہ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا' اور بھلائی کو سچ مانا' اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے اور جس نے بخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا' اس کو ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے ۔ اور اس کا مال آخر اس کے کس کام آئے گا جبکہ وہ ہلاک ہو جائے؟''

تمہاری مساعی مختلف ہیں' اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی تمہاری مساعی مختلف ہیں' اپنے اسباب اور محرکات کے اعتبار سے بھی مختلف ہیں' اپنے رخ اور سمت کے اعتبار سے بھی مختلف ہیں اور نتائج کے اعتبار سے بھی مختلف ہیں ۔ اس زمین پر بسنے والے انسانوں کے مزاج بھی مختلف ہیں ۔ ان کے تصورات و افکار بھی مختلف ہیں' ان کے ذوق اور مشرب بھی مختلف ہیں' اس کی ترجیحات بھی مختلف ہیں ۔ اور لوگوں کی حالت یوں لگتی ہے کہ گویا ان میں سے ہر شخص شاید ایک علیحدہ سیارے کا باشندہ ہے ۔

یہ تو ہے ایک حقیقت' لیکن ایک دوسری حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے' وہ یہ کہ ان تمام افراد بشریت کے درمیان ایک قدر مشترک بھی ہے جو انہیں باہم جوڑے ہوئے ہے ۔ اور ان تمام اختلافات کے درمیان مابہ الاشتراک بھی ہے ۔ یہ اشتراک انہیں دو گروہوں میں رکھتا ہے ۔ دو صفوں میں اور دو جھنڈوں کے تلے قائم رکھتا ہے جو ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں ۔ وہ کیا ہے ۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَ اتَّقٰى (٥) وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى (٩٢ : ٦) "تو جس نے دیا اور تقویٰ اختیار کیا اور بھلائی کو سچ مانا"۔ ایک تو یہ صف ہے اور دوسری صف ۔

مَنْ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰى (٩٢:٨) وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى (٩٢ : ٩) "جس نے بخل کیا اور بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا"۔

ایک گروہ ہے جو جان بھی کھپاتا ہے' مال بھی کھپاتا ہے ۔ اللہ کے عذاب اور اللہ کے غضب سے ڈرتا ہے اور سچائی کو مانتا ہے اور سچائی کا نام کیا ہے الحسنیٰ' اس کا علم کیا ہے الحسنیٰ ۔ یہ دو قسم کے لوگ ہیں جو دو صفوں میں کھڑے ہیں' مختلف الزاج لوگ' مختلف قسم کی مساعی' مختلف قسم کے طریقہ ہائے کار' مختلف قسم کے مقاصد ۔ ان دو صفوں میں صف آرا ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ ملتے ہیں' ہر ایک کا اپنا نظام اور منہاج کار ہے اور ہر ایک کو الگ الگ توفیق بخشی گئی ہے اور طریقہ دیا گیا ہے ۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَ اتَّقٰى (٥) وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى (٦) فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى (٧)

(٩٢ : ٥ تا ٧) "تو جس نے دیا' اور پرہیز گاری اختیار کی اور بھلائی کو سچ مانا اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے"۔ اس لیے کہ جو شخص مال دے' تقویٰ اختیار کرے اور سچائی کی تصدیق کر دے تو گویا اس کے پاس جو کچھ تھا اس نے حاضر کر دیا اور اپنے نفس کو پاک کرنے اور راہ راست پر لگانے کے لیے حتیٰ المقدور سعی کر لی ۔ اب وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ کی نصرت اس کی دستگیری کرے ۔ اور اس کو بھلائی کی توفیق دے کیونکہ اللہ نے اپنے اوپر لازم کر دیا ہے کہ جس شخص نے اچھا ارادہ کیا' اسے سہولیات فراہم کرے کیونکہ اللہ کی توفیق اور مشیت کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا ۔ اور اس کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا ۔

اور جس کو اللہ نیکی کی سہولیات فراہم کر دے تو گویا وہ منزل مقصود تک پہنچ گیا ۔ نہایت آسانی اور سکون و اطمینان کے ساتھ وہ پہنچ گیا ۔ وہ زمین پر ہوتے ہوئے بھی عالم بالا تک پہنچ گیا' وہ نہایت آسانی سے اس جہاں میں رہتا ہے' اس کا ماحول' اور اس کے اردگرد رہنے والے سب اس کے لیے سازگار ہو جاتے ہیں' ان کے قدم سہولت سے اٹھتے ہیں' اس کی راہ آسان ہو جاتی ہے' وہ بڑی آسانی کے ساتھ معاملات سے نمٹ لیتا ہے' غرض تمام کلیات و جزئیات میں اسے سہولیات حاصل ہو جاتی ہیں ۔ یہ ایک ایسا مقام و مرتبہ ہے جس کے دائرے مین سب کچھ آ جاتا ہے ۔ اور اس مرتبہ و مقام کو پانے والا رسول اللہ کے ساتھ حسب وعدہ ربی بڑی سہولیات پاتا ہے ۔

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى (٩٢ : ٧) "ہم اسے آسان راستے کی طرف سہولت دیں گے"۔

وَ اَمَّا مَنْ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰى (٨) وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى (٩) فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى (١٠) وَ مَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى (١١) (٩٢:٨ تا ١١) "اور جس نے

بخل اختیار کیا اور اللہ سے بے نیازی اختیار کی اور بھلائی کو جھٹلایا' اس کو ہم سخت راستے کی طرف سہولت دیں گے' اور اس کا مال آخر اس کے کس کام آئے گا جبکہ وہ ہلاک ہو جائے"۔

وہ شخص جو اپنے نفس اور مال میں بخل اختیار کرتا ہے اور اللہ کریم سے بے نیازی اختیار کرتا ہے' اور اس کی ہدایات سے غافل ہوتا ہے اور اللہ کے دین اور اس کی دعوت کی تکذیب کرتا ہے' تو وہ اپنے نفس کو انتہائی شروفساد کے لیے تیار کرتا ہے' اور پرلے درجے کے بگاڑ سے اس کو دوچار کرتا ہے' تو وہ اس بات کے مستحق ہوتا ہے کہ اللہ اس کے لیے ہر چیز مشکل کر دے اور اسے سخت راستوں کی سہولیات فراہم کی جائیں اور اسے توفیق دی جائے کہ وہ ہر قدم پر مشکلات سے دوچار ہو' اس پر آسانیوں کا دروازہ بند کر دیا جائے' اور اسے قدم قدم پر مشکلات درپیش ہوں' جو اسے راہ راست اور صراط مستقیم سے دور ہی لے جائیں۔ اور یہ شخص بدبختی کے راستے پر ہی آگے بڑھے۔ اگرچہ وہ بظاہر یہ محسوس کرے کہ وہ کامیابی کی راہ پر جا رہا ہے۔ حالانکہ وہ تو ٹھوکر کھاتا جاتا ہے اور وہ اپنی ایک ٹھوکر سے بچنے کے لیے دوسری ٹھوکر کھاتا ہے' جس کی وجہ سے وہ سیدھی راہ سے اور دور ہو جاتا ہے تاکہ وہ اللہ کی رضا سے محروم ہو جائے۔ اور جب وہ ٹھوکروں سے بھرے ہوئے اس منحرف راہ پر آگے بڑھتا ہے اور آخرکار ہلاکت کے گڑھے میں گرتا ہے تو اس وقت پھر اس کا مال اسے کوئی فائدہ نہیں دیتا' حالانکہ یہ مال ہی تھا جس نے اسے اللہ سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اب یہ مفید نہیں ہے۔

وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى (۹۲ : ۱۱) "اور اس کا مال اس کے کس کام آئے گا جبکہ وہ ہلاک ہو جائے"۔ کسی کو شر اور فساد کے لیے سہولیات فراہم کرنا اور اسے معصیت کی توفیق دینا دراصل اسے سخت کام اور سخت راستے کی طرف موڑنا ہے۔ اگرچہ ایسا شخص اس دنیا میں کامیاب نظر آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہنم سے کوئی مشکل منزل اور مشکل جائے قیام نہیں ہے اور العسریٰ سے یہاں مراد جہنم ہی ہے۔

یوں اس سورت کا پہلا پیراگراف ختم ہوتا ہے اور اس میں تمام انسانی سوسائٹیوں کے لیے دو راستے' دو طریقے اور دو نظام متعین کر دیئے جاتے ہیں اور یہ دو راستے ہر زمان و مکان کے لیے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دراصل یہ دو بادشاہ اور دو جھنڈے ہیں' اگرچہ ان کی شکل اور رنگ مختلف ہوں۔ اور یہ کہ ہر انسان مختار ہے' کہ اپنے لیے جو راستہ چاہے اختیار کرے اور جو طریقہ چاہے اپنائے۔ اللہ ہر کسی کو وہی سہولت دیتا ہے جو وہ چاہتا ہے' یا سہولت کا راستہ اور یا سختی کا راستہ۔

رہا اگلا پیراگراف تو اس میں ان دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کا انجام بتایا گیا ہے۔ یہ دکھایا گیا کہ وہ شخص دوڑتے بھاگتے کہاں تک پہنچ جائے گا۔ جس کو آسان راستوں کی سہولت دی گئی اور اس کی گاڑی کہاں جا کر رکے گی جس کو سخت راستوں پر چلایا گیا اور اس پیراگراف میں بتایا جاتا ہے کہ جس فریق کا جو انجام بھی ہو گا وہ حق ہو گا اور نہایت منصفانہ ہو گا اور ایسا ہی ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ نے لوگوں کو صحیح راستہ بھی بتلایا اور اگر وہ برے راستوں پر چلیں تو ان کو دہکتی ہوئی آگ سے بھی ڈرایا۔

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝۱۲ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ۝۱۳ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۝۱۴ لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۝۱۵ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝۱۶ وَسَيُجَنَّبُهَا

الْاَتْقَىۙ۝۱۷ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰىۚ۝۱۸ وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ
ع تُجْزٰۤىۙ۝۱۹ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰىۚ۝۲۰ وَ لَسَوْفَ یَرْضٰى۠۝۲۱

”بے شک راستہ بتانا ہمارے ذمہ ہے' اور در حقیقت آخرت اور دنیا' دونوں کے ہم ہی مالک ہیں۔پس میں نے تم کو خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے۔اس میں نہیں جھلسے گا مگر وہ انتہائی بدبخت جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔اور اس سے دور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے۔اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے' جس کا بدلہ اسے دینا ہو وہ تو صرف اپنے رب برتر کی رضا جوئی کے لیے یہ کام کرتا ہے اور ضرور وہ خوش ہو گا۔

اللہ نے محض اپنے فضل و کرم کی وجہ سے اپنے اوپر یہ بات فرض کر دی کہ لوگوں کی اس فطرت کے سامنے اور لوگوں کو دی ہوئی قوت مدرکہ کے سامنے ہدایت کا راستہ واضح طور پر بیان فرما دیں۔اسی طرح تمام رسولوں کا بھی یہ فرض قرار دیا گیا کہ وہ دعوت اسلامی کی تشریح کریں اور تمام دعوتی تحریکات اور تمام کتب سماوی اور معجزات بھی اس غرض کے لیے لائے گئے تاکہ کسی کے پاس کوئی بہانہ نہ رہے اور نہ کسی کے اوپر کوئی ظلم ہو۔

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰى (۹۲:۱۲) ”بے شک راستہ بتانا ہماری ذمہ داری ہے“۔یہ تو تھی پہلی حقیقت۔
دوسری حقیقت یہ ہے کہ یہاں ایک قوت قاہرہ ہے' جس نے تمام لوگوں کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔اس قوت کے مقابلے میں لوگوں کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔

وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَ الْاُوْلٰى (۹۲:۱۳) ”بے شک آخرت اور دنیا دونوں کے ہم مالک ہیں“۔
لہٰذا جو شخص اللہ سے دور ہونا چاہتا ہے وہ کہاں جا سکتا ہے۔اس کے مقابلے میں تو کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔
ان دونوں حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ راستہ بتانا اللہ نے اپنے ذمہ فرض قرار دیا ہے اور پھر سب لوگوں کو اللہ کے سامنے آنا ہے اور اللہ کے مقابلے میں ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔آغاز و انجام کا مالک اللہ ہے' تو اللہ نے انسانوں کو خبردار کر دیا کہ تم بھڑکتی ہوئی آگ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى (۹۲:۱۴) ”تو میں نے تم کو خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے“۔اور یہ بھڑکتی ہوئی آگ ہر کسی کے لیے نہیں ہے' بلکہ یہ تو بھڑکائی گئی ہے۔

لَا یَصْلٰىهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَى (۹۲:۱۵) ”اس میں نہیں جھلسے گا مگر انتہائی بدبخت“۔اور یہ انتہائی بدبخت وہ ہو گا جس کا نصیبہ تمام انسانوں میں برا ہو گا۔سوال یہ ہے کہ آگ میں جھلس جانے کے بعد پھر وہ کہاں جائے گا اور اس بدبخت کی مزید تشریح۔

الَّذِیْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى (۹۲:۱۶) ”جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا“۔یعنی اس کے سامنے دعوت

اسلامی پیش کی گئی اور اس نے تکذیب بھی کی اور منہ بھی پھیرا' حالانکہ اللہ نے حسب وعدہ اسے راستہ دکھانے کے لیے اس کے سامنے دعوت پیش کی تھی اور یہ وعدہ کیا تھا کہ جو شخص بھی دلی خواہش سے اللہ کی طرف آئے گا' وہ اسے راستہ دکھائے گا۔

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى (۹۲ : ۱۷) "اور اس سے دور رکھا جائے گا وہ جو نہایت پرہیزگار ہو گا"۔ اور یہ متقی شخص ہی نیک بخت ہے بمقابلہ بدبخت (اشقی) کے ۔ اور اس کی مزید تشریح۔

الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى (۹۲ : ۱۸) "جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے"۔ یعنی وہ اپنا مال خرچ کرتا ہے تاکہ اس انفاق سے وہ پاک ہو جائے' مال خرچ کرنے کا مقصد مال کی پاکیزگی ہے' دکھاوا یا بڑائی حاصل کرنا نہیں ہے ۔ وہ خوشی سے خرچ کرتا ہے اور اس لیے خرچ نہیں کرتا کہ کسی کا اس پر احسان تھا اور وہ اس کا بدلہ چکانا چاہتا تھا' نہ اس لیے کہ لوگ اس کا شکر ادا کریں' یہ خالص لوجہ اللہ خرچ کرتا ہے' جو اس کا اعلیٰ رب ہے ۔

وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَى (۱۹) إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى (۹۲ : ۲۰) "اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے کہ جس کا وہ بدلہ دیتا ہو' وہ صرف اپنے رب برتر کی رضا جوئی کے لیے یہ کام کر رہا ہے"۔

ایسے شخص کو کیا انعام ملنے والا ہے؟ جو متقی ہے' جو اپنے مال کو محض پاک کرنے کے لیے خرچ کرتا ہے' اور رب برتر کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتا ہے ۔ وہ جزاء اور وہ انجام جو ان صالح ارواح کو یہاں دکھائی جاتی ہے ۔ بہت عجیب جزاء و انعام ہے ۔ مروج طریقے سے ہٹ کر یہاں بالکل ایک نئے انعام کا اعلان کیا جاتا ہے ۔

وَلَسَوْفَ يَرْضَى (۹۲ : ۲۱) "اور ضرور وہ خوش ہو گا"۔ اس متقی کے کاسہ دل کو رضا سے بھر دیا جائے گا' اس کی روح رضا سے بھر جائے گی' اس کے تمام اعضاء راضی برضا ہو جائیں گے' اس کے وجود کے روئیں روئیں میں رضامندی سرایت کر جائے گی اور اس کی پوری زندگی تروتازہ ہو جائے گی ۔ کیا ہی خوب جزاء ہے اور کیا ہی خوب اور عظیم نعمت ہے یہ!

وَلَسَوْفَ يَرْضَى (۹۲ : ۲۱) "اور ضرور وہ خوش ہو گا"۔ اپنے دین پر خوش ہو گا' اپنے رب سے راضی ہو گا' اپنی تقدیر پر راضی ہو گا' اپنے نصیبے پر راضی ہو گا۔ خوشی اور غم دونوں پر راضی ہو گا' مالداری اور ناداری دونوں پر راضی ہو گا' آسانی اور مشکل دونوں پر راضی ہو گا۔ نرمی اور سختی دونوں پر راضی ہو گا' وہ قلق و اضطراب سے دور ہو گا۔ تنگدستی' جلد بازی' بوجھل پن اور مایوسی سے دور ہو گا۔ غرض یہ رضامندی وہ انعام ہو گا جس سے بڑا انعام اور کوئی نہ ہے اور نہ ہو گا۔ یہ ایسا انعام ہے جس کے لیے کوئی مال اور جان دونوں خرچ کر سکتا ہے ۔ جو اپنے مال کو خرچ کرتا ہے تاکہ اس کا رب اس سے راضی ہو ۔

یہ وہ انعام ہے جو اللہ ہی دے سکتا ہے اور یہ جزاء ان دلوں میں بھر دی جاتی ہے جو خالص اللہ کے ہو جاتے ہیں' جن کو اللہ کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ (۹۲ : ۲۱) "اور وہ عنقریب راضی ہو گا"۔ وہ راضی ہو گا' خوش ہو گا کہ اس نے معمولی قیمت دے دی اور اس کے بدلے اسے بہت کچھ دے دیا گیا۔

غرض اس مقام پر یہ اچانک خوشخبری ہے' البتہ ان لوگوں کے دلوں میں اس کی توقع ضرور ہے جو اپنے مال کو پاک کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں' ایسی صورت میں خرچ کرتے ہیں کہ کسی کا ان کے اوپر کوئی احسان نہیں ہے' پھر بھی خرچ کرتے ہیں۔ محض رضائے ربانی کے لیے خرچ کرتے ہیں' تو "ایسا شخص لازماً خوش ہو گا"۔ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ (۹۲ : ۲۱)۔

--- ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ الضحیٰ ۔ ۹۳

## ۱-- تا -- ۱۱

# سورۃ الضحیٰ ایک نظر میں

اپنے موضوع' انداز تعبیر' اپنی فضا اور اپنے اثرات کے اعتبار سے یہ سورت محبت کی ایک چٹکی ہے' رحمت خداوندی کی باد نسیم اور محبت کا پیغام ہے ۔ یہ رنج و الم میں مبتلا ایک مریض کے لیے دست شفقت ہے ۔ اور یہ پوری سورت روح پرور' رضامندی اور امید پر مشتمل ہے ۔ اور مخاطب کے دل کو ٹھنڈک' اطمینان اور یقین سے بھر دیتی ہے ۔

یہ پوری سورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے' آپ کے ساتھ رب تعالیٰ کی ہمکلامی ہے' آپ کے لیے تسلی' تسکین اور اطمینان ہے ۔ پوری سورت میں رحمت کے جھونکے ہیں اور محبت کی شبنم ہے ۔ اللہ کے قرب کی لطف اندوزیاں ہیں' ایک تھکی روح' ایک پریشان دل اور ایک رنجیدہ دل کے لیے تسلیاں اور تشفیاں ہیں ۔

کئی روایات میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ حضورؐ پر وحی آنا کچھ عرصہ کے لیے رک گیا اور جبرئیل علیہ السلام نہ آئے' مشرکین نے یہ کہنا شروع کر دیا ۔ محمدؐ کو اس کے رب نے چھوڑ دیا ہے' اس پر یہ سورت نازل ہوئی ۔

ان مشکل دنوں میں' جب کہ ہر طرف سے مصائب اور مشکلات کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے' آپ کے لیے وحی کا آنا' اور اللہ کے ساتھ ہمکلام ہونا ایک بڑی تسلی کا ذریعہ ہوتا تھا ۔ کفر و انکار کی تپش میں یہ آپؐ کے لیے ٹھنڈا پانی اور تکذیب کی گرمی اور شدت میں یہ آپؐ کے لیے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہوتے تھے ۔ حضور اکرمؐ اس زمانے میں یوں دن گزار رہے تھے جس طرح کوئی سخت دوپہر کی تپش میں سفر کر رہا ہو' ہر طرف سے نفرت' عناد' نافرمانی اور دور بدکنے کی فضا تھی ۔ یہی نہیں بلکہ آپؐ کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں' اذیت دی جا رہی تھی اور دعوت اسلامی کی راہ روکی جا رہی تھی' مشرکین دعوت اسلامی اور ہدایت کی تحریک پر حملہ آور ہو رہے تھے ۔

ان حالات میں جب سلسلہ وحی منقطع ہوا تو حضورؐ کا زاد راہ اور سرچشمہ قوت منقطع ہو گیا اور آپؐ کو سیراب کرنے والا سرچشمہ خشک ہو گیا اور دل بے قرار کو اپنے محبوب سے جدا کر دیا گیا ۔ اب آپؐ سخت تپش میں بغیر ساز و سامان اور بغیر ٹھنڈے پانی کے رہ گئے اور محبت بھری ہوا کے جھونکے آنا بند ہو گئے اور تمام مصائب کے مقابلے میں آپ کے لیے یہ بڑی مصیبت تھی ۔

ایسے حالات میں یہ سورت نازل ہوئی' محبت کے جھونکے آنا شروع ہوئے ۔ رحمت اور محبت' قرب اور امید اور رضا و اطمینان کا پیغام آنا شروع ہوا ۔ اور ہر طرف سے یقین کا پیغام آیا ۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى (۳) وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (۴) وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى (۵) (۹۳ : ۳ تا ۵) ”تمہارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا' اور نہ وہ ناراض

ہوا۔ اور یقیناً تمہارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے اور عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے"۔ تمہارے رب نے ہرگز تمہیں نہیں چھوڑا اور نہ ناراض ہوا ہے اور نہ اس نے تم پر سے دست شفقت اٹھالیا ہے بلکہ اس کی رحمت اور مہربانی اب بھی تمہارے شامل حال ہے۔

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى (٦) وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (٧) وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى (٨) (٩٣: ٦ تا ٨) "کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانہ فراہم کیا؟ اور تمہیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی اور تمہیں نادار پایا اور پھر مالدار کر دیا"۔ ذرا اپنی گزشتہ زندگی پر غور کرو' کیا یہ حقائق اس میں نہیں پائے جاتے؟ کیا یہ باتیں تم اپنے دل میں نہیں پاتے' اور تمہارے زندگی کے واقعات میں اس قسم کے آثار نہیں پائے جاتے۔ ہرگز نہیں' ہرگز نہیں' اللہ نے تمہیں ہرگز نہیں چھوڑا۔ اور نہ وہ ناراض ہوا ہے۔ اللہ کی بھلائی تمہارے شامل حال ہے۔ نہ اس کا سلسلہ کٹا ہے اور نہ کٹے گا بلکہ آنے والا دور بہت ہی خوب ہوگا اور تم اس پر بہت ہی خوش ہو گے۔

حقیقت نفس الامری کے ان لطیف جھونکوں میں اور حقیقت پسندانہ روح کے ساتھ' حقیقی انداز بیان اور حقیقی اثرات کے ساتھ' پھر اس حقیقت کو جس کائناتی فریم کے اندر رکھا گیا ہے اور روز روشن اور چھا جانے والی رات کے ساتھ قسم اٹھاتے ہوئے جو بات کی گئی ہے' اس انداز تعبیر نے درحقیقت فضا کو نہایت لطیف اور پر محبت بنا دیا ہے۔ ماحول پر رحمت و شفقت' مکمل رضامندی اور شفاف محبت اور رنج و الم کے شکوے چھائے ہوئے ہیں۔

وَالضُّحٰى (١) وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى (٢) مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى (٣) وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (٤) وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى (٥) اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى (٦) وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (٧) وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى (٨) (٩٣: ١ تا ٨)

"کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانہ فراہم کیا؟ اور تمہیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی اور تمہیں نادار پایا اور پھر مالدار کر دیا"۔

یہ ہے فضائے محبت' یہ ہے باران رحمت' یہ ہے مکمل رضامندی' اور یہ شکوے جو نہایت ہی فصیح و بلیغ انداز کلام میں بیان ہو رہے ہیں۔ الفاظ نرم' نہایت مترنم' موسیقی کی حرکات مرتب' قدم مضبوط' آواز بلند' اثر دردانگیز ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجئے' اس لطیف محبت' اس الوداعی شفقت' اس مکمل خوشنودی اور ان شفاف شکوؤں کی تصاویر کو کہ کیا خوبصورت فریم تیار کیا گیا ہے۔ روشن دن اور چھا جانے والی رات کا فریم۔

اوقات شب و روز میں سے یہ نہایت ہی صاف اور شفاف اوقات ہوتے ہیں' ان اوقات میں انسانی قلب و نظر غور و فکر کے لیے تیار ہوتا ہے اور انسان اس کائنات اور خالق کائنات کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ ان اوقات میں انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ پوری کائنات اپنے خالق کے آگے جھکی ہوئی ہے اور اپنے خالق کے سامنے تسبیح و تہلیل میں مصروف ہے۔ نہایت خوشی' سرور اور مدہوشی کی حالت میں' اس فریم کو اللہ نے کیا ہی خوبصورت نقش و نگار دیئے ہیں۔ رات کیسی ہے؟

وَالَّيۡلِ اِذَا سَجٰى (۹۳ : ۲) "قسم ہے اس رات کی جب وہ پرسکون ہو جائے"۔ صرف رات نہیں' جس میں وحشت ہوتی ہے' تاریکیاں ہوتی ہیں' یہ رات رکی ہوئی ہے' پرسکون ہے' صاف ہے' ہاں اس پر شفاف محبت اور گلے شکوے کی بدلیاں جابجا پائی جاتی ہیں' اور اس میں الوداعی تاملات کی کدورت بھی ہے جس طرح یتیموں اور غریبوں کی رات ہوتی ہے۔جس کی فضاؤں میں کدورتیں ہوتی ہیں' اور یہ رات بھر ایک صاف وشفاف دن میں بدل جاتی ہے۔یوں اس تصویر کے رنگ' اس کے فریم کے رنگوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور یہ تصویر خوب جچتی ہے۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا بے مثال فصیح اور بدیع کلام اس بات پر دلیل ہے کہ یہ اللہ کی کمال درجے کی صفت ہے'جس کی صفت کی کوئی نقل نہیں کر سکتا' اور نہ کوئی اس کی تقلید میں چند قدم آگے جا سکتا ہے۔

---ooo---

[1] یہ میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن سے ایک اقتباس ہے۔

# درس نمبر ۲۹۳ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۱۱

سورۃ الضحیٰ (۹۳) مکیۃ (۱۱) آیاتھا ۱۱ رکوعھا ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالضُّحٰى ۝١ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝٢ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝٣ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝٤ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝٥

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

"قسم ہے روز روشن کی اور رات کی جبکہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے' (اے نبیؐ) تمہارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا اور یقیناً تمہارے لیے بعد کا دور پہلے سے بہتر ہے اور عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے"۔

اللہ تعالیٰ ان دو خوبصورت اوقات کی قسم اٹھاتا ہے جن میں غوروفکر کے بہتر اور زیادہ مواقع ہوتے ہیں ۔ یہ اوقات ہی اپنے اندر اشارات رکھتے ہیں ۔ یوں اس کائنات کے مظاہر اور نفس انسانی کے درمیان ایک ربط پیدا کر دیا جاتا ہے' اور قلب بشری کو یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ یہ خوبصورت کائنات ایک روح رکھتی ہے' جو نفس انسانی کے ساتھ ہمقدم ہو کر چلتی ہے' اور یہ روح ہر زندہ مخلوق کے ساتھ ایک گونہ محبت رکھتی ہے' اس طرح ہر زندہ دل' اس کائنات کے اندر نہایت ہی انس و محبت کے ساتھ زندہ رہتا ہے' وہ اس میں اجنبی نہیں ہوتا اور نہ پریشان ہوتا ہے ۔ اور اس سورت میں اس کائنات کے ساتھ انس و ہم آہنگی کا ایک گہرا اثر بھی ہے ۔ اس سورت میں انس و محبت کی پینگیں بڑھانا مقصود ہے ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ اللہ نے تو آپؐ کے ماحول میں محبت کا نور پھیلا دیا ہے' یہ پوری کائنات انسان کے ساتھ زمزمہ خواں ہے' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ اس جہاں میں اکیلے اور پریشان حال ہوں ۔

قسم کے اس کائناتی اشارہ کے بعد اب بصراحت تاکید آتی ہے ۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى (۹۳ : ۳) "تمہارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا"۔ نہ اللہ نے آپؐ کو چھوڑ دیا ہے اور نہ آپ سے ناراض ہوا ہے ۔ ان لوگوں کو غلط فہمی ہے جو آپ کی روح کو

اذیت دیتے ہیں' جو آپ کے قلبی اطمینان پر حملہ آور ہوتے ہیں اور جو آپؐ کے لیے غبار خاطر بنتے ہیں۔ اللہ تو "تمہارا رب" ہے اور آپ اس کے ہیں۔ اس کی ربوبیت میں ہیں۔ لہٰذا وہ آپ کا نگران اور کفیل ہے۔

اللہ کے فضل و کرم کے سوتے خشک نہیں ہوگئے' اور اس کے فیوض و کرم رک نہیں گئے۔ آپؐ کے لیے آخرت میں وہ کچھ ہے جو اس جہاں کی ہر قسم کی داد و دہش سے بہتر ہے۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (۹۳ : ۴) "آخرت تمہارے لیے اس جہاں سے بہتر ہے"۔ وہ تو پہلے بھی اچھی ہے اور انجام کار بھی اچھا ہے۔

دعوت اسلامی کا مستقبل روشن ہے' تمہارے راستے سے تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں گی' تمہارا نظام زندگی غالب ہو گا' اور جس سچائی کے تم حامل ہو' وہ غالب ہو کر رہے گی۔ یہی باتیں تو آپ کو پریشان کر رہی تھیں کہ لوگ آپؐ سے عناد رکھتے تھے' جھٹلاتے تھے' پھر اذیت دیتے تھے' پھر سازشیں کرتے تھے' پھر آپؐ کے ساتھ ہر وقت مذاق کرتے تھے لیکن۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى (۹۳ : ۵) "عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے"۔ اب اس سورت کا سیاق آگے بڑھتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد دلاتا ہے کہ آپؐ کے ساتھ رب تعالیٰ کا سلوک تو روز اول ہی سے نہایت اچھا رہا ہے تاکہ آپ کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ رب تعالیٰ آپؐ پر مہربان رہا ہے۔ آپؐ کے ساتھ محبت کرتا ہے اور آپؐ پر رحم و کرم کرتا ہے اور اس سے قبل بھی کئی مواقع پر آپؐ پر فضل و کرم کرتا رہا ہے' محبت اور انس کا سلوک کرتا رہا ہے اور آپ کے ساتھ اس حسن سلوک کو نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝۶ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝۸

"کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانہ فراہم کیا؟ اور تمہیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی اور تمہیں نادار پایا اور پھر مالدار کر دیا"۔ ذرا اپنے عملی حالات پر غور کرو' ماضی قریب پر نگاہ ڈالو' کیا تمہارا ماضی یہ بتاتا ہے کہ تمہارے رب نے تمہیں چھوڑ دیا ہے اور تم سے ناراض ہو گیا ہے' یا کچھ اور بتاتا ہے۔ آپؐ پر تو نبوت سے پہلے بھی رب کا فضل رہا ہے' جب آپؐ یتیم تھے تو آپؐ کی نگرانی کون کر رہا تھا' جب آپؐ حیران تھے اور راستہ معلوم نہ تھا تو آپؐ کو کس نے راستہ بتلایا۔ پھر آپؐ نادار تھے' آپؐ کو کس نے مالدار بنا دیا--- آپؐ یتیم پیدا ہوئے تھے' اللہ نے آپؐ کو پناہ دی' لوگوں کے دل آپؐ پر مائل ہو گئے' اور ابو طالب آپؐ پر مہربان ہو گئے حالانکہ انہوں نے آپؐ کے دین کو قبول نہ کیا تھا۔ آپؐ فقیر تھے۔ اللہ نے آپؐ کو یوں غنی بنایا کہ آپؐ کو دلی قناعت نصیب فرمائی۔ پھر آپؐ نے تجارت فرمائی اور گھر والوں کی دولت آپ کے ہاتھ میں رہی تو آپ سے فقر کا احساس ہی جاتا رہا۔ اور ماحول میں جو لوگ اہل ثروت تھے ان کی دولت کی طرف آپ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔

آپؐ ایک ایسی سوسائٹی میں رہتے تھے جو جاہلی سوسائٹی تھی' جس کی قدریں مضطرب تھیں' عقائد و تصورات

ڈانواڈول تھے۔ طرز عمل اور رسم و رواج گھناؤنے تھے۔ آپؐ کی روح اس سوسائٹی میں مضطرب تھی' آپؐ مطمئن نہ تھے مگر آپؐ کو اس سے نکلنے یا اسے بدلنے کا راستہ بھی معلوم نہ تھا' نہ اس جاہلی سوسائٹی سے آپؐ مطمئن تھے' نہ دین موسیٰ کے ماننے والوں سے مطمئن تھے۔ نہ دین عیسیٰ کے ماننے والوں سے مطمئن تھے۔ پس اللہ نے آپؐ کی طرف وحی بھیجی اور ایک نظام زندگی آپؐ کو عطا کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ نظریاتی گمراہی بڑی گمراہی ہوتی ہے اور افکار و نظریات کے اعتبار سے درست ہونا ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ اگر کسی پر ہو جائے تو بڑا احسان ہے۔ یہ راحت بھی ہے اور اطمینان بھی ہے۔ اور نظریاتی گمراہی اس قدر عظیم ذہنی قلق ہوتا ہے۔ جس کے مقابلے میں کوئی اور قلق اور اذیت نہیں ہوتی۔ اس سے ذہنی تھکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کی ذہنی اذیت میں مبتلا تھے کیونکہ وحی رک گئی تھی' مشرکین ہنس رہے تھے' اور وحی الٰہی اور مکالمہ الٰہی جیسے محبوب امر سے آپؐ جدائی محسوس کر رہے تھے۔ ایسے مواقع پر یہ تذکرہ اور اطمینان آ گیا کہ تمہارے رب نے ہرگز تمہیں نہیں چھوڑا بلکہ آغاز وحی سے قبل بھی اللہ نے آپؐ کو تنہا نہیں چھوڑا کہ آپؐ حیران و پریشان اور سرگرداں پھریں۔

اس حوالے سے کہ یتیمی کی حالت میں آپ کو تحفظ دیا گیا اور حیرانی کی حالت میں راستہ بتلایا گیا' آپ کو اور آپ کے بعد اہل ایمان کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ سوسائٹی کے اندر پائے جانے والے تمام یتیموں کی کفالت کرو' تمام سائلوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور اللہ نے آپؐ پر جو عظیم فضل کیا ہے' اس پر تحدیث نعمت کرو' اور لوگوں کو دین کی طرف بلاؤ۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ
۱ ع ۱۱ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝

۱۸ "لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو' اور سائل کو نہ جھڑکو' اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو"۔

یہ ہدایات کہ یتیم کا اکرام کرو' اس پر سختی نہ کرو' اس کی دل شکنی نہ کرو' سائل کے ساتھ نرمی کا سلوک کرو' سائل کی عزت کرو۔ یہ ہدایات مکہ کی نہایت ہی منکر حق اور دولت پرست 'سوسائٹی میں بہت ضروری تھیں' جس میں ضعیف اور قوت نہ رکھنے والا شخص اپنا حق حاصل نہ کر سکتا تھا' جہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون تھا' لیکن جب اسلامی نظام نافذ ہوا تو اسلامی شریعت نے اس سوسائٹی کو حق پرست اور عدالت گستر سوسائٹی بنا دیا' لوگ نہایت محتاط ہو گئے' اللہ کے حدود پر رکنے لگے۔ اور وہ ایک طرف حدود اللہ کو قائم کرنے لگے اور دوسری طرف حقوق العباد کے محافظ ہو گئے' خصوصاً ایسے لوگوں کے حقوق کے محافظ ہو گئے جن کے پاس قوت نہ تھی' جو تلوار کے ذریعہ اپنا حق نہیں لے سکتے تھے۔ اللہ کے بندوں کے ساتھ احسان کرنے سے نعمت کا شکر ادا ہوتا ہے اور اس سے نعمت پاک بھی ہوتی ہے اور عملاً شکر کی ادائیگی بھی ہوتی ہے۔ اور خاموش گفتگو اور شریفانہ گفتگو بھی شکر الٰہی ہوتا ہے۔

--- ○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ ----- ۳۰

## سورۃ الم نشرح ۔ ۹۴

## ۱-- تا -- ۸

# درس نمبر ۲۹۴ تشریح آیات

## ۱ --- تا --- ۸

یہ سورہ الضحیٰ کے بعد نازل ہوئی۔ یہ دراصل الضحیٰ کا تکملہ ہی ہے۔ اس کی فضا بھی تروتازہ محبت کی فضا ہے۔ نہایت ہی محبت بھری گفتگو کی روح پر مشتمل ہے۔ اللہ کے کرم کے مناظر اور اللہ کی عنایات کے مقامات پر مشتمل ہے اور یہ خوشخبری کہ جلد آسانیوں کا دور آنے والا ہے۔ اور اس میں یہ حکمت بھی بتا دی گئی ہے کہ جدوجہد کے بعد آسانیاں آتی ہیں۔ اور یہ کہ تعلق باللہ اللہ کی طرف راغب ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔

سُورَةُ أَلَمْ نَشْرَحْ (۹۴) مَكِّيَّة (۱۲) آیاتها ۸ رکوعها ۱

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ﴿١﴾ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ﴿٢﴾ الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ ﴿٣﴾ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴿٤﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"(اے نبیؐ) کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا؟ اور تم پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا۔ اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا"۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح میں کوئی تنگی تھی اور آپؐ دعوت اسلامی کے سلسلے میں کچھ مشکلات محسوس فرماتے تھے۔ آپؐ پریشان تھے کیونکہ آپؐ کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں اور آپؐ کے دل پر ان کے اثرات پڑ رہے تھے اور آپؐ سمجھتے تھے کہ یہ ذمہ داریاں بہت بھاری ہیں اور یہ کہ آپؐ کو اللہ کی امداد' نصرت اور خصوصی زاد راہ کی ضرورت ہے۔

چنانچہ اس موقعہ پر آپؐ کے ساتھ یہ میٹھا مکالمہ ہوا۔ انداز گفتگو ایسا ہے کہ بات محبتوں سے بھری ہے۔

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (۹۴: ۱) "(اے نبیؐ) کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا"۔ آپؐ کا سینہ دعوت اسلامی کے کام کے لیے کھل گیا' اور آپ کے لیے اس ذمہ داری کا اٹھانا ہم نے آسان کر

دیا۔ یہ ذمہ داری ہم نے آپ کی لیے محبوب بنا دی اور راستہ ہم نے صاف کر دیا اور ہم نے آپؐ کو اسی راستے پر لگا دیا یہاں تک کہ آپؐ کو اس کا انجام نہایت خوبی سے نظر آنے لگا جو سعادتوں سے پر تھا۔

ذرا اپنے سینے کو ٹٹولیے 'کیا آپ اس میں کشادگی' خوشی اور ایک چمک نہیں پاتے۔ کیا اللہ کے اس دین کا ذوق واضح طور پر نہیں پاتے۔ بتایئے تو سہی کیا ہر مشکل اور مشقت میں آپ یہ بات نہیں پاتے 'کیا ہر تھکاوٹ میں آپ کو خوشی نہیں ہوتی' کیا ہر مشکل آپ کو آسان نہیں لگتی' کیا ہر محرومی پہ آپ راضی نہیں ہیں؟

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ (۲) الَّذِیْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (۹۴ : ۳) "اور ہم نے تم پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا" یعنی دعوت اسلامی کا بوجھ اس قدر بھاری ہو گیا کہ قریب تھا کہ آپ کی کمر ہی توڑ دے۔ ہم نے آپؐ کو شرح صدر عطا کیا اور یہ بوجھ ہلکا ہو گیا' آپ کو کام کرنے کی توفیق دی' آپ کے لیے دعوت کا کام آسان کر دیا اور یہ لوگوں کے دلوں تک پہنچنے لگی۔ وحی کا سلسلہ جاری ہو گیا اور بذریعہ وحی حقائق کا انکشاف ہونے لگا۔ اور یوں یہ دعوت دلوں میں اترنے لگی۔ اور بذریعہ وحی یہ کام نہایت آسانی' نرمی اور سکون سے ہونے لگا۔ کیا آپؐ اس تبدیلی کو اس بوجھ میں محسوس نہیں کرتے جس نے آپؐ کی کمر توڑ دی اور اب یہ ہلکا ہو گیا ہے۔ شرح صدر کے بعد اب آپؐ پر نہ بوجھ ہے اور نہ تنگی دل۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (۹۴ : ٤) "اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا"۔ آپؐ کا ذکر عالم بالا میں بلند ہونے لگا' پوری زمین میں آپؐ کی دعوت کا غلغلہ بلند ہو گیا۔ اس پوری کائنات میں آپؐ کا نام بلند ہو گیا اور پھر کلمہ طیبہ میں آپؐ کا نام اللہ کے نام کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہ جب بھی کوئی کلمہ پڑھے گا آپؐ کا نام بلند ہو گا' اس کے بعد آخر اور کیا مقام و مرتبہ ہو سکتا ہے؟ یہ تو آپؐ کا ایک منفرد مقام ہے اور تمام مخلوقات کے مقابلے میں آپؐ کے لیے مخصوص ہے۔

ہم نے آپؐ کا ذکر لوح محفوظ میں کر دیا کہ زمانے گزر جائیں گے' نسلیں جائیں گی اور آئیں گی اور کروڑوں ہونٹ آپؐ کے اسم گرامی کو ادا کرتے رہیں گے۔ صلوٰۃ و سلام بھیجتے رہیں گے۔ گہری محبت اور عظمت و احترام کا اظہار کرتے رہیں گے۔ آپؐ کا ذکر یوں بھی بلند ہوا کہ آپؐ کا نام اسلامی نظام زندگی اور شریعت محمدیؐ کے ساتھ منتھی ہو گیا۔ صرف آپؐ کا انتخاب ہی رفع ذکر کا باعث بنا۔ یہ وہ مقام تھا جو نہ کسی کو کبھی نصیب ہوا اور نہ ہو گا۔ لہٰذا اب مشقت کہاں' تھکاوٹ کہاں' یہ دین اس قدر عظیم دین ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ہر قسم کی مشقت اور تھکاوٹ کا احساس ہی جاتا رہتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود اللہ اپنے محبوب مختار کے ساتھ مزید مہربانیاں فرماتا ہے' آپؐ کی کلفتیں مزید دور فرماتا ہے' آپؐ کو خوش اور مطمئن فرماتا ہے اور یہ اطلاع دیتا ہے کہ بہت بڑی آسانیاں اور فراخیاں آپؐ کے انتظار میں ہیں۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝۵ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝۶

"پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ مشکل کے ساتھ آسانی لازمی ہے اور مشکل کے بعد آسانیاں ہوتی ہیں۔ اور اے نبیؐ یہ آپؐ کے ساتھ بھی لازم رہی

ہے - جب آپؐ پر دعوت کا بوجھ بھاری ہو گیا تو ہم نے آپؐ کا دل کھول دیا' یوں آپؐ کا بوجھ ہلکا ہو گیا جس نے آپؐ کی کمر توڑ دی تھی لہٰذا مشکل کے ساتھ ہی آسانی جڑی رہی اور یہ بھاری بوجھ ہلکا ہو گیا -

یہ اصول ایک اٹل اصول ہے 'اس لیے اسے انہی الفاظ میں مکرر لایا گیا ہے -

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (۵) اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (۹۴ : ۶) "پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے - بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے" - یہ تکرار اس بات کا اظہار کر رہا ہے کہ جس وقت یہ آیات نازل ہو رہی تھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بے حد مشقت اور تنگی میں تھے - اس لیے اللہ نے اس مسئلہ کی طرف اس طرح توجہ فرمائی 'یاد دہانی فرمائی' اللہ نے حضورؐ کی ذات کے حوالے سے اپنی سابقہ مہربانیاں گنوائیں اور اپنے فضل و کرم اور دستگیری کا ذکر کیا اور آئندہ کے لیے بھی اسی اصول کو تاکید مزید کے ساتھ بیان کیا' تاکہ آپؐ کو تسلی ہو کہ بہتر دور آنے والا ہے - یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضور اکرمؐ جن مشکلات میں گھرے ہوئے تھے وہ کوئی سخت مشکلات تھیں -

اب بتایا جاتا ہے کہ آپؐ پر جو بہتر دور آنے والا ہے وہ کس طرح آئے گا اور انشراح صدر کے حقیقی اسباب کیا ہوا کرتے ہیں اور دعوت اسلامی کی طویل راہ میں اور دشوار گزار سفر میں زاد راہ کیا ہے 'سیراب ہونے کے ذرائع کیا ہیں - ۱

۸ ع فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝

۱۹ "لہٰذا جب تم فارغ ہو تو عبادت کی مشقت میں لگ جاؤ اور اپنے رب ہی کی طرف راغب ہو جاؤ" - بے شک سختی کے بعد آسانی ہے 'تنگی کے بعد فراخی ہے' اور اس کے اسباب یہ ہیں 'ان پر عمل کیجئے کہ جب آپؐ لوگوں کے ساتھ اپنی مشغولیات سے فارغ ہو جائیں اور دنیا کے امور سے فارغ ہو جائیں اور زندگی کی سرگرمیاں قدرے رک جائیں' جب آپ ان امور سے فارغ ہو جائیں تو پھر اس میدان میں اتر جائیں جس میں آپ کو محنت اور جدوجہد کی ضرورت ہے یعنی اللہ کی عبادت' اللہ کی طرف توجہ -

وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ (۹۴ : ۸) "اپنے رب کی طرف راغب ہو جاؤ" - تو پھر آپ صرف رب کی طرف راغب ہو جائیں 'تمام دنیاوی امور چھوڑ دیں' یہاں تک کہ دعوت اسلامی کی سرگرمیاں بھی چھوڑ دیں' یہ ہے زاد راہ - ہر سفر کے لیے کوئی نہ کوئی سازوسامان ہوتا ہے اور یہ ہے سازوسامان اس سفر کا - جہاد کے لیے تیاری کی ضرورت ہے اور یہ ہے تیاری اور اس کے نتیجے میں تنگی کی بجائے فراخی آجائے گی - مشکل میں کشادگی آجائے گی اور یہی ہے صحیح طریق کار -

اس سورت کا خاتمہ بھی الضحیٰ کی طرح ہوتا ہے - اختتام پر دل میں دو قسم کے احساسات جاگزیں ہوتے ہیں - ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کو حضور اکرمؐ کے ساتھ نہایت ہی عظیم محبت ہے اور عالم بالا سے اس محبت کے تازہ بہ تازہ جھونکے دم بدم آ رہے ہیں' دوسری یہ بات کہ محبت کے ساتھ ساتھ ذات باری کو حضور اکرمؐ کے ساتھ بے حد شفقت اور ہمدردی ہے - اور دونوں سورتوں سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت حضور نہایت مشکل دور سے گزر رہے تھے - لہٰذا عالم بالا کی طرف سے اس محبت اور شفقت کے اظہار کی ضرورت تھی - یہ حق کی دعوت کی بھاری ذمہ داری ہے - کمر توڑ دینے والا ہے لیکن جو لوگ یہ کام کرتے ہیں ان پر اللہ کا نور اور رحمت ہروقت چوکس رہتی ہے -

--- ○○○ ---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ التین ـ ۹۵

## ۱-- تا-- ۸

# درس نمبر ۲۹۵ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۸

اس سورت میں جو بنیادی حقیقت بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ فطرت کیا ہے جس پر اللہ نے حضرت انسان کو پیدا کیا ہے اور یہ کہ ایمان کی وجہ سے یہ فطرت سیدھی راہ پر قائم رہتی ہے اور اس قدر نشو و نما پاتی ہے اور ترقی کرتی ہے کہ اپنے ان اعلیٰ مراتب تک جا پہنچتی ہے جو اللہ نے انسان کے لیے تجویز کیے ہیں۔ اور جب یہی فطرت ایمان سے محروم ہوتی ہے تو نچلے سے نچلے درجوں میں گر جاتی ہے۔

سُورَةُ التِّينِ (۹۵) مَكِّيَّةٌ (۲۸) آیاتها ۸ رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ﴿۱﴾ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ﴿۲﴾ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ﴿۳﴾

"قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور طور سینا اور اس پر امن شہر (مکہ) کی"۔ اللہ انسانی فطرت مستقیمہ پر انجیر' زیتون' طور سینا اور پر امن شہر مکہ کی قسم اٹھائی ہے۔ اور یہ قسم دراصل اس حقیقت یعنی فطرت انسان کے لیے ایک موزوں اور مناسبت فریم کا کام دیتی ہے۔ ہم اس سے قبل ثابت کر چکے ہیں کہ جس حقیقت کی تصویر کو فریم کرنے کے لیے جن مناظر قدرت کی قسم اٹھائی جاتی ہے اس حقیقت اور مناظر قدرت کے درمیان ایک خاص مناسبت ہوتی ہے اور یہ کسی جگہ واضح اور کسی جگہ بہت دقیق و لطیف ہوتی ہے۔

طور سینین سے مراد وہ پہاڑ ہے جس کے دامن میں اللہ اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان مکالمہ ہوا تھا اور بلد امین سے مراد شہر مکہ ہے۔ ان دونوں مقامات کا دینی حقائق کے ساتھ تعلق بالکل واضح ہے۔ انجیر اور زیتون تو بظاہر ان دونوں کا تعلق واضح نہیں ہے کہ ان کا فطرت انسانی اور تخلیق انسانی یا دینی حقائق کے ساتھ کیا تعلق ہے۔

تین اور زیتون کی تفسیر میں روایات اور اقوال بہت وارد ہیں۔ بعض اقوال میں آیا ہے کہ "تین" سے مراد "طور تینا" کا مقام ہے جو دمشق کے قریب ہے ...... بعض نے کہا ہے کہ تین سے راد وہ درخت ہے جس کے پتے حضرت آدم اور حوا علیہما السلام نے اپنے جسم پر لپیٹے تھے' جبکہ جنت میں شیطان کے ورغلانے پر ان کو لباس سے محروم ہونا پڑا تھا۔ اور اس کے بعد یہ دونوں زمین پر اتارے گئے تھے اور انہوں نے یہاں زندگی کا آغاز کیا تھا۔ بعض اقوال میں یہ تفسیر کی گئی ہے کہ

اس سے مراد کشتی نوح کے رکنے اور ٹھہرنے والی پہاڑی ہے جس میں انجیر کے درخت زیادہ اگے ہوئے تھے۔

زیتون کے بارے میں بہت سے اقوال وارد ہیں' بعض کے مطابق اس سے مراد "طور زیتا" ہے جو بیت المقدس میں ہے' بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد خود بیت المقدس ہے' بعض نے کہا کہ اس سے مراد زیتون کی وہ شاخ ہے جو وہ کبوترلے کر آیا تھا جسے حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی سے چھوڑا تھا' تاکہ آپ طوفان کے حالات کا مطالعہ کریں جب یہ کبوتر زیتون کی شاخ لے کر آیا تو آپ نے معلوم کر لیا کہ زمین کے بعض حصوں سے پانی اتر گیا ہے اور وہاں درخت اگ آئے ہیں۔

بعض حضرات اس طرف گئے ہیں کہ تین اور زیتون سے وہی پھل مراد ہیں جو ہم کھاتے ہیں اور جانتے ہیں اور ان سے کوئی اشاراتی مفہوم مراد نہیں ہے۔ یا اگر کوئی ہے تو صرف وہ جگہ ہے جہاں یہ لگتے ہیں۔ یہ تو تھے اقوال۔ جہاں تک زیتون کا تعلق ہے قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی اس کا ذکر آیا ہے کہ یہ طور کے پہاڑ میں لگتا ہے۔

وَ شَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ (۲۳ : ۲۰) "اور وہ درخت جو طور سینا سے نکلتا ہے تیل کی پیداوار دیتا ہے اور کھانے والوں کے لیے سالن ہے" اور سورہ عبس میں ہے۔

وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا (۸۰ : ۲۹) "اور زیتون اور کھجور کے درخت"۔ جبکہ تین کا ذکر پورے قرآن مجید میں صرف اس جگہ آیا ہے۔

لہٰذا مذکورہ بالا اقوال میں سے کسی ایک کے بارے میں ہم کوئی قطعی بات نہیں کر سکتے' البتہ پورے قرآن مجید میں قسموں کے معاملے میں قرآن کریم کے انداز کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تین اور زیتون سے اشارہ ایسے مقامات یا ایسے واقعات کی طرف ہو جن کا تعلق دین اور ایمان سے ہو' یا اس بات سے ہو جو جواب قسم کے طور پر آرہی ہے کہ انسان کو ہم نے ایک بہترین انداز پر پیدا کیا۔ شاید جنت کی وہ جگہ مراد ہو جہاں انسان نے اپنی زندگی کا آغاز کیا تاکہ ان دونوں قسموں کا یہ اشارہ بھی قرآن کریم کے عام انداز کے ساتھ ہم رنگ ہو جائے اور یہ فریم اس تصویر کے ہم آہنگ ہو جائے جو اس میں ہے۔ موضوع کے اعتبار سے سورت میں جو بات کی گئی ہے وہ یہ ہے :

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝۵ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۶

"ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا' پھر اسے الٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کر دیا' سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے آغاز تخلیق ہی سے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا اور حضرت انسان پر اللہ کی نظر عنایت رہی ہے' ویسے تو اللہ نے ہر چیز کو بہترین

ساخت پر پیدا کیا ہے' لیکن اس مقام پر اور دوسرے مقامات پر انسانی ساخت کی موزونیت کا ذکر' اور انسان کے تسویہ اور اس کے اعضا کی تعدیل کا ذکر اس بات کی علامت ہے کہ اللہ کے ہاں اپنی مخلوقات میں سے انسان کی اہمیت بہت زیادہ ہے' باوجود اس کے کہ انسان میں بہت سی کمزوریاں ہیں اور یہ کہ وہ راہ راست سے بھٹک جاتا ہے اور فطری راہ کو چھوڑ کر غلط راہوں پر چلتا ہے اور شر و فساد میں مبتلا ہوتا ہے۔ پھر بھی اللہ کی طرف سے اس کی طرف یہ توجہ بتاتی ہے کہ اللہ کے ہاں انسان کا ایک مقام و مرتبہ ہے اور یہ مقام و مرتبہ اس پوری کائنات کے نظام میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق اور اس کی ساخت کو نہایت اعلیٰ درجے کا بتایا ہے۔ جسمانی اعتبار سے بھی یہ مخلوق نہایت مکمل اور پیچیدہ نظام رکھتی ہے اور عقلی اعتبار سے بھی یہ تمام مخلوق سے برتر ہے اور روحانی کمالات کے اعتبار سے بھی یہ بہت ممتاز اور باکمال ہے۔

یہاں زیادہ اہمیت انسان کے روحانی پہلو کو دی گئی ہے۔ کیونکہ انسان اگر روحانی پہلو سے راہ فطرت کو چھوڑ دے اور غلط راہوں پر پڑ جائے اور ایمان کے بجائے کفر کو اختیار کرے تو بہت گر جاتا ہے۔ تمام مخلوقات سے نیچے چلا جاتا ہے اس لیے کہ انسان اپنی جسمانی ساخت تو نہیں بدل سکتا' سب سے نچی سطح پر یہ اگر گرتا ہے' تو روحانی اعتبار سے گرتا ہے۔

یہ روحانی خصوصیات ہی ہیں جن کی اساس پر انسان تمام دوسری مخلوقات پر فائق ہے۔ انسان ان خصوصیات کی بنا پر اس قابل ہے کہ ملائکہ مقربین سے بھی اونچے مقام تک چلا جائے' قصہ معراج اس بات پر دلیل ہے کہ ایک مقام تک جبرئیل علیہ السلام گئے اور پھر رک گئے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام سے آگے چلے گئے' بہت زیادہ بلندیوں اور رفعتوں تک۔ اور یہی مخلوق انسان اگر گرنے پہ آئے تو یہ اس مقام تک گرتا ہے جس تک دوسری کوئی مخلوق نہیں گرتی۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (۹۵ : ۵) "پھر اسے الٹا پھیر کر ہم نے نیچوں سے نیچا کر دیا"۔ اس قدر نیچے کہ بہائم بھی اس سے بلند نظر آنے لگے' وہ ایسے انسانوں کے مقابلے میں سیدھی راہ پر نظر آنے لگے کیونکہ وہ فطرت پر قائم ہوتے ہیں' ان کو اللہ کی تسبیح و تہلیل کا الہام ہوتا ہے اور وہ اس کرۂ ارض پر جس مقصد کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اسے پورا کرتے رہتے ہیں حالانکہ اس انسان کو دوسرے بہائم کے مقابلے میں نہایت ہی اچھی ساخت پر پیدا کیا گیا تھا' لیکن یہ رب تعالیٰ کا انکار کرنے لگا اور ایسے گہرے گڑھے میں گرا کہ اس سے زیادہ اور کوئی گہرائی اور گراوٹ نہ رہی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (۹۵ : ٤) "ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا"۔ یعنی اپنی فطرت اور اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ بہترین تھا۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (۹۵ : ۵) "پھر اسے الٹا پھیر کر ہم نے نیچوں سے نیچا کر دیا"۔ جب اس نے اپنی فطرت کو اس سطح سے گرا دیا جو اس کے لیے رب تعالیٰ نے مقرر کی تھی اور یہ تشریح کر دی تھی کہ اس خط سے نیچے گراوٹ ہے اور اوپر انسانیت اور فطرت ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۹۵ : ٦) "سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے"۔ تو یہ وہ لوگ ہیں جو فطرت کی راہ پر سیدھے قائم رہتے ہیں اور ایمان اور عمل صالح کے ساتھ اپنی فطرت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور پھر اس کمال تک پہنچتے ہیں جو ان کے لیے مقدر کر دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اکمل الکاملین بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے۔

فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ (۹۵ : ۶) "ان کے لئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے"۔ یعنی دائمی اور نہ رکنے اور نہ کٹنے والا۔ وہ لوگ جو اپنی فطرت کو نیچے سے نیچے گرا لیتے ہیں' تو وہ نیچے ہی گرتے چلے جاتے ہیں' یہاں تک کہ وہ جہنم کے بھی سب سے نچلے مرتبے میں ہوتے ہیں جہاں ان کی انسانیت کی آخری علامت بھی ختم ہو جاتی ہے اور وہ مجسم گراوٹ بن جاتے ہیں۔

اعلیٰ علیین اور اسفل سافلین دراصل دو انتہائی مقامات ہیں اور دونوں کا آغاز مقام فطرت کے خط مستقیم سے ہوتا ہے۔ مقام فطرت سے انسان ایمان و عمل صالح سے اٹھتا رہتا ہے اور اٹھتے اٹھتے اپنے مقام مقرر جنت نعیم تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اگر انسان فطرت سے انحراف کر لے اور نیچے کی طرف کرتا رہے اور روحانیت سے اپنا رشتہ کاٹ لے تو جہنم تک پہنچ کر اس کے بھی نچلے درجے میں جا گرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں ایمان کی قدر و قیمت کیا ہے۔ یہ وہ نور ہے جس کی روشنی میں انسان مقام بلند تک پہنچتا ہے۔ ایمان وہ رسی ہے جو انسانی فطرت اور اس کے خالق کے درمیان رابطے کا کام دیتی ہے۔ اور یہ وہ روشنی ہے جس کے نور میں یہ اس مقام تک قدم بقدم بڑھتا ہے جو نہایت مکرم لوگوں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔

جب یہ رابطہ ٹوٹ جاتا ہے جب یہ چراغ بجھ جاتا ہے' تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانیت نہایت ہی گہرے گڑھے میں گر جاتی ہے اور گرتی چلی جاتی ہے' آدمیت حیوانات سے بھی نیچے چلی جاتی ہے۔ اور انسان مٹی کا ایک بت رہ جاتا ہے اور پھر
۱ یہ پتھر کی طرح جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے۔ اس فضا اور ماحول میں انسان کے نام ایک کال آتی ہے :

ع ۸ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۞ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۞
۲۰

"پس (اے نبیؐ) اس کے بعد کون جزا و سزا کے معاملہ میں تم کو جھٹلا سکتا ہے؟ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟" اے نبیؐ ان حقائق کے ہوتے ہوئے کیا کوئی معقول شخص عقیدۂ آخرت کے بارے میں آپؐ کو کوئی جھٹلا سکتا ہے' خصوصاً جب کہ انسانیت کی قدر و قیمت ایمان کا بڑا مقام ہے اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کا انجام کس قدر گھناؤنا ہے جو نور سے محروم ہوتے ہیں اور جن کے ہاتھوں سے اللہ کی مضبوط رسی چھوٹ چکی ہوتی ہے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ (۹۵ : ۸) "کیا اللہ سب حاکموں میں سے بڑا حاکم نہیں ہے"۔ کہ وہ سب سے بڑا منصف نہیں ہے' جبکہ وہ لوگوں کے درمیان یوں انصاف کر رہا ہے۔ کیا مومنین کا انجام اور کافرین کا یہ انجام حکمت بالغہ پر مبنی نہیں ہے؟ انصاف واضح ہے' حکمت نہایت بلند ہے' یہی وجہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوع حدیث روایت ہے کہ جب تم میں سے کسی نے سورہ تین اور زیتون کو پڑھا اور وہ آخر تک پڑھ چکا اور اس نے پڑھا۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ (۹۵ : ۸) تو اسے کہنا چاہیے "ہاں اور میں اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں"۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ العلق ۔ ۹۶

## ۱-- تا -- ۱۹

# درس نمبر ۲۹۶ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۱۹

سُوْرَةُ الْعَلَقِ (۹۶) مَكِّيَّةٌ (۱)
آیاتها ۱۹ رکوعها ۱
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا' جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو' اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا' انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا"۔

اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیات قرآن مجید کی سب سے پہلی نازل ہونے والی آیات ہیں جن روایات میں آیا ہے کہ کچھ دوسری آیات سے وحی کا آغاز ہوا' وہ قوی روایات نہیں ہیں۔ امام احمد نے روایت کی ہے' عبدالرزاق سے' انہوں نے معمر سے' انہوں نے زہری سے' انہوں نے عروہ سے' انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہ وہ فرماتی ہیں :

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز یوں ہوا کہ سونے کی حالت میں آپؐ کو سچے خواب آتے۔ آپؐ جو خواب بھی دیکھتے وہ روز روشن کی طرح عیاں ہوتے۔ اس کے بعد آپؐ خلوت نشینی پسند کرنے لگے۔ چنانچہ آپؐ غار حرا میں جا کر خلوت اختیار فرماتے۔ آپؐ وہاں تحنث یعنی عبادت فرماتے' اور یہ سلسلہ کئی شب و روز تک رہتا۔ اور اس کے بعد آپؐ گھر والوں کے پاس آتے۔ اور اس خلوت نشینی کے لیے توشہ لے جاتے۔ پھر واپس حضرت خدیجہؓ کے پاس آتے اور مزید عرصے کے لیے سامان لے جاتے۔ یہاں تک کہ آپؐ پر سچائی آگئی' اس وقت آپؐ غار حرا ہی میں تھے۔ فرشتہ آیا تو اس نے کہا "پڑھو" تو حضورؐ نے فرمایا : "میں پڑھنے والا نہیں ہوں"۔ فرماتے ہیں اس نے مجھے پکڑا اور بھینچا یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ تب مجھے چھوڑا اور کہا : "پڑھو" تو میں نے وہی جواب دیا کہ "میں

پڑھنے والا نہیں ہوں"۔ اس نے دوسری مرتبہ مجھے پکڑا اور بھینچا یہاں تک کہ میری قوت جواب دینے لگی ۔ پھر مجھے چھوڑ دیا اور پھر کہا :"پڑھو" ' تو میں نے کہا :"میں پڑھنے والا نہیں ہوں"۔ تو اس نے مجھے پھر پکڑا اور بھینچا یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی اور پھر کہا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (۱) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۲) اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ (۳) الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (٤) (٩٦ : ١ تا ٤) "پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا' جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی ۔ پڑھو' اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا' انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا"۔

اس وحی کو لے کر حضورؐ واپس آئے اور حال یہ تھا کہ آپؐ کانپ رہے تھے ۔ آپؐ حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچے اور ان سے کہا" مجھے چادر اوڑھاؤ' مجھے چادر اوڑھاؤ"۔ تو انہوں نے آپؐ کو چادر اوڑھا دی ۔ یہاں تک کہ آپؐ کا خوف دور ہوا ۔ پھر آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے کہا مجھے کیا ہو گیا ہے اور پھر آپؐ نے ان کو پوری کہانی سنائی اور کہا میں تو ڈر گیا تھا کہ میری جان ہی نہ چلی جائے ۔ تو اس پر حضرت خدیجہؓ نے کہا' ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ۔ میں آپؐ کو خوشخبری دیتی ہوں' خدا کی قسم اللہ کبھی بھی آپ کو بے سہارا نہ چھوڑے گا ۔ آپؐ تو صلہ رحمی کرتے ہیں' سچ بولتے ہیں' کمزوروں کی مدد کرتے ہیں' مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی مصیبتوں میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں ۔ پھر حضرت خدیجہؓ آپؐ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ ابن نوفل ابن اسد ابن عبدالعزی ابن قصی کے پاس لے گئیں ۔ ورقہ زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے اور عبرانی اور عربی میں انجیل لکھتے ۔ جس قدر اللہ کی مشیت ہوتی ۔ اس وقت وہ بہت بوڑھے اور نابینا تھے ۔ حضرت خدیجہؓ نے ان سے کہا بھائی ذرا اپنے بھتیجے کا حال سنئے ۔ ورقہ نے کہا بھتیجے تمہیں کیا نظر آیا ۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ نظر آیا تھا آپؐ نے بیان فرما دیا ۔ اس پر ورقہ نے کہا یہ تو وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا' کاش میں جوان ہوتا اور کاش میں اس وقت زندہ ہوتا کہ جب تمہاری قوم تمہیں وطن سے نکال دے گی تو حضورؐ نے فرمایا کیا سچ وہ مجھے میرے وطن سے نکال دیں گے ۔ ورقہ نے کہا جو تعلیم تم لے کر آئے ہو' اس طرح کی تعلیم جو بھی لے کر آیا ہے لوگ اس کے دشمن ہو گئے ۔ اگر میں نے تمہارا یہ دور پایا تو میں ضرور تمہاری مدد کروں گا ۔ زیادہ مدت نہ گزری کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا"۔ (بخاری اور مسلم میں یہ حدیث امام زہری سے مروی ہے)

طبری نے حضرت عبداللہ ابن زبیر سے یہ روایت کی ہے"…. حضرت جبرئیل میرے پاس دیبا کا ایک ٹکڑا لے کر آئے ۔ جب میں سو رہا تھا ۔ اس میں ایک کتاب تھی' انہوں نے مجھ سے کہا پڑھو ۔ میں نے کہا میں نہیں پڑھتا تو انہوں نے مجھے بھینچا' اس قدر کہ میں سمجھا میری جان نکل گئی ۔ پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو' تو میں نے کہا میں کیا پڑھوں؟ یہ بات میں نے اس ڈر سے کہی کہ فرشتہ میرے ساتھ دوبارہ وہ کام نہ کرے جو اس نے کیا ۔ تو اس نے کہا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (۱) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۲) اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ (۳) الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (٤) عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (٥) (٩٦ : ١ تا ٥)

فرماتے ہیں اب میں نے اسے پڑھ لیا۔ میں نے آخر تک پڑھ لیا۔ اس کے بعد وہ میرے پاس سے چلا گیا اور میں نیند سے بیدار ہو گیا۔ حالت یہ تھی کہ میرے دل میں ایک کتاب لکھ دی گئی تھی۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ مخلوق خدا میں سے شاعر اور مجنون مجھے سب سے برے لگتے تھے۔ میں ان دونوں قسم کے لوگوں کی طرف دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ فرماتے ہیں میں نے سوچا کہ شاعر اور مجنوں سے تو موت ہی بہتر ہے۔ تاکہ قریش میرے بارے میں شاعر اور مجنوں کا لفظ نہ استعمال کر سکیں۔ بہتر ہے کہ میں اونچے پہاڑ پر چلاؤں' اپنے آپ کو اس پر سے گراؤں اور اپنے آپ کو قتل کر کے اس صورت حالات سے نجات پاؤں۔ چنانچہ میں اس ارادے سے نکلا یہاں تک کہ میں پہاڑ کے وسط میں تھا کہ میں نے آسمان سے ایک آواز سنی جو یوں تھی "اے محمدؐ تم اللہ کے رسول ہو اور میں جبرئیل ہوں"۔ میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا کیا دیکھتا ہوں کہ جبرئیل ایک انسان کی صورت میں آسمان کے افق پر کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں: "اے محمدؐ تم تو رسول اللہ ہو اور میں جبرئیل ہوں"۔ فرماتے ہیں میں کھڑا ہو گیا اور انہیں دیکھتا رہا۔ اور اس منظر نے مجھے اس کام سے روک لیا جو میں کرنا چاہتا تھا۔ میں نہ ایک قدم آگے بڑھ رہا تھا اور نہ پیچھے۔ میں نے کوشش کی کہ آسمان کے اطراف میں اس سے منہ پھیر لوں لیکن میں جدھر بھی دیکھتا انہیں وہاں کھڑا پاتا۔ چنانچہ میں یونہی کھڑا رہا' نہ ایک قدم آگے بڑھ رہا تھا اور نہ ایک قدم پیچھے مڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ خدیجہ نے اپنے آدمی میری تلاش میں بھیجے۔ یہ لوگ مجھے دیکھ کر مکہ پہنچ گئے اور خدیجہ کی طرف لوٹ گئے۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ اس کے بعد وہ چلے گئے اور میں بھی اپنے اہل و عیال کی طرف مکہ آگیا"۔ ابن اسحاق نے اس روایت کو طویل عبارت میں وھب ابن کیسان سے بھی روایت کیا ہے۔

اس واقعہ پر میں نے بہت غور کیا' اس پہلے واقعہ کو سیرت کی کتابوں میں تو ہم نے بارہا پڑھا تھا کتب تفاسیر میں بھی دیکھا تھا' لیکن ہم پڑھ کر آگے بڑھ گئے تھے یا قدرے غور کر کے آگے بڑھ گئے تھے۔ لیکن اب غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ تو ایک عظیم واقعہ تھا' اور نہایت ہی عظیم واقعہ تھا۔ ہم اس واقعہ کی عظمت کا جو تصور بھی کریں لیکن اس کے کچھ پہلو پھر بھی ہمارے تصور سے خارج رہیں گے۔ بہرحال یہ واقعہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی عظیم ہے اور اپنے مفہوم کے اعتبار سے بھی عظیم ہے۔ انسانوں کی زندگی پر اس کے جو آثار مرتب ہوئے اس کے اعتبار سے بھی عظیم ہے اور وہ لحات جن میں یہ واقعہ پیش آیا وہ اس زمین کے عظیم اور قیمتی لحات تھے۔ آغاز نظام کائنات سے لے کر اس کے انجام تک۔

سوال یہ ہے کہ یہ واقعہ کیا تھا اور ان لحات میں وہ کیا کچھ ہو گیا؟ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ جل شانہ جو بہت ہی عظیم' جبار و قہار اور متکبر ہے' اور مالک الملک ہے' اس اللہ نے اپنی بلندیوں سے اس حقیقت پر نظر کرم فرمائی جسے عرف عام میں "انسان" کہتے ہیں' جو اللہ کی اس عظیم کائنات کے ایک گمنام گوشے میں پڑا ہوا تھا' جسے عرف عام میں "زمین" کہتے ہیں۔ اللہ نے اپنی اس مخلوق انسان کو یہ اعزاز بخشا کہ وہ الہی تجلیات کا مہبط بنے' اللہ کی حکمت کا امین بنے' اللہ کے کلام کا منزل بنے اور یوں اللہ کی تقدیر اور تدابیر اس مخلوق کو جس مقام و مرتبہ تک لے جانا چاہتی تھی اس کی مثال بنے۔

یہ ایک عظیم بات ہے' اس قدر عظیم جس کی عظمتیں لا انتہا ہیں اور اس کی عظمتیں مزید واضح ہوتی ہیں۔ جب انسان اپنی قوتوں کی تنگ دامانی پر نظر ڈالے کہ ایک طرف حقیقت الوہیت ہے جو بے قید ہے' ازلی اور ابدی ہے جبکہ انسان کی جانب ایک حقیقت ہے جو بندگی کی حقیقت ہے' محدود ہے' بدلنے والی اور فنا ہونے والی حقیقت ہے۔ تب انسان کو صحیح شعور ہوتا ہے کہ اس مخلوق پر اللہ کی کس قدر عظیم عنایت تھی۔ تب پھر انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ کس قدر عظیم اور

خوشگوار حقیقت ہے اور پھر انسان نہایت عاجزی 'خشوع وخضوع اور شکر اور خوشدلی کے ساتھ اسے لیتا ہے ۔ پھر وہ اس کائنات کی لاانتہا اطراف میں اللہ کے کلمات کو گونجتا ہوا پاتا ہے کہ یہ کلمات اس ناچیز انسان پر 'اس ناچیز مکان میں نازل ہوتے ہیں 'یہ انسان ایک ناچیز ذرہ ہے اور یہ زمین ایک حقیر ذرہ ہے ۔

پھر اس عظیم واقعہ کے معانی کس قدر دور رس ہیں؟ اللہ کی جانب سے دیکھا جائے تو یہ اس کی جانب سے ایک وسیع فضل وکرم ہے ۔ وہ فضل وکرم کرنے والا ہے 'اس کی رحمت میں یہ انسان سرشار ہے 'وہ بہت بڑا کریم ہے 'محبت کرنے والا ہے 'احسان کرنے والا ہے 'وہ جس پر فضل وکرم کرتا ہے تو بغیر سبب وعلت کے کرتا ہے ۔ یہ فضل وکرم تو اس کی ذاتی صفات کا ایک پہلو ہے ۔

اور اگر انسان کے زاویہ سے دیکھا جائے تو اللہ نے انسان پر اس قدر فضل وکرم کیا ہے جس کا وہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا اور اب وہ اس کا شکر ادا نہیں کر سکتا ۔ صرف اس ایک کرم کا اگر تمام انسان شکر ادا کرنے لگ جائیں تو اگر وہ رات دن رکوع و سجود میں رہیں پھر بھی اس ایک کرم کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ کرم کہ اللہ بندے کو یاد کرے 'اس کی طرف نظر کرم کرے 'اس کے ساتھ رابطہ قائم کرے 'اور انسانوں ہی میں سے ایک ذات گرامی کو رسول بنا کر بھیج دے ۔ زمین اللہ کے کلمات کا مہبط بن جائے ۔ اس رسول کا مقام رہائش بن جائے اور اس زمین کے اطراف واکناف میں ان کلمات کی گونج بلند ہو رہی ہو ۔

پوری انسانیت کی زندگی میں اس واقعہ کے نتیجے میں کیا تغیر رونما ہوا 'تو بات یہ ہے کہ پہلے لمحے ہی سے انسانیت پر اس کے اثرات شروع ہوئے 'تاریخ کا دھارا بدل گیا 'انسانی ضمیر کے خطوط بدل گئے 'وہ قبلہ متعین ہو گیا جس کی طرف انسان نے رخ کرنا تھا اور جس سے انسانوں نے اقدار کے تصورات اور پیمانے اخذ کرنے تھے ۔ یہ پیمانے زمینی اور مادی نہ تھے بلکہ یہ آسمانی اور وحی الٰہی کے پیمانے تھے ۔

اس وقت سے آج تک وہ لوگ جن کی روح میں یہ بات بیٹھ گئی تھی وہ اللہ کے رحم وکرم میں داخل ہو گئے 'ان پر براہ راست اللہ کا رحم ہونے لگا ۔ ان لوگوں کا رویہ ہو گیا کہ وہ ہر معاملے میں براہ راست اللہ کی طرف نظریں اٹھائے رکھتے تھے 'خواہ کوئی چھوٹا سا معاملہ ہو یا بڑا ۔ یہ لوگ اللہ کی نظروں کے نیچے حرکت کرتے تھے 'وہ یہ توقع رکھتے تھے کہ اللہ ان کی دستگیری کرے گا 'اور ان کو اپنی منزل تک قدم بقدم چلائے گا ۔ ان کو غلط راہ سے روکے گا اور سیدھی راہ کی طرف موڑ دے گا ۔ اور وہ ہر وقت اس بات کی توقع رکھتے تھے کہ ابھی اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے اور ان کے دلی رازوں کو کھول دیتی ہے ۔ ابھی اللہ کا حکم آتا ہے اور ان کی مشکلات حل ہو جاتی ہیں کہ یہ بات کرو اور اس سے رک جاؤ ۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک عجیب زمانہ تھا 'یہ ۲۳ سالہ زمانہ تھا 'ان زمانوں میں انسانوں اور بندوں کے درمیان براہ راست تعلق قائم رہا ۔ یہ ایک ایسا زمانہ تھا کہ اس کی حقیقت کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے تھے 'جو اس میں رہتے تھے ۔ جنہوں نے اس زمانے کو محسوس کیا 'جنہوں نے اس کا آغاز اور انجام دیکھا 'جنہوں نے اس براہ راست رابطے کی شیرینی کو دیکھا 'اور انہوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ دست قدرت قدم قدم پر ان کی دستگیری کر رہی ہے 'اور انہوں نے دیکھا تھا کہ وہ کہاں سے چلے اور کہاں پہنچے 'یہ ایک لمبی مسافت تھی 'ایسا انقلابی سفر تھا جس کی طوالت کو اس دنیا کے کسی معیار سے نہیں ناپا جا سکتا تھا یہ انسانی ضمیر کا سفر تھا 'جسے کائنات کے فاصلوں کے پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا ۔ یہ دو اجرام

فلکی کے درمیان کا سفر بھی نہ تھا بلکہ یہ ایک مکمل تبدیلی اور انقلاب تھا' اب مادی اور زمینی پیمانوں کے مقابلہ میں آسمانی پیمانے آگئے تھے' خواہشات سے مدد طلب کرنے کی بجائے اب وحی سے مدد لی جا رہی تھی۔ لوگ جاہلیت سے سفر کر کے اسلام میں داخل ہو گئے تھے' شرک سے چل کر لوگ ربانیت میں داخل ہو گئے تھے۔ یہ طویل سفر تھا' زمین اور آسمانوں کے درمیان کے فاصلے سے بھی طویل اور بعید۔

یہ لوگ ذوق معرفت رکھتے تھے' اور اس کی شیرینی اور مٹھاس کو پاتے تھے' اس کی قدر و قیمت کا انہیں شعور تھا' اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے تو انہوں نے اس کمی کو محسوس کیا۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ یہ ایک دور تھا جو بیت گیا' اگر یہ دور عملاً گزرا نہ ہوتا تو عقل اس کا تصور بھی نہ کر سکتی۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا چلو ام ایمن کے پاس چلیں' ہم ان سے اسی طرح ملاقات کریں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ ملاقات کے لیے جاتے تھے۔ جب وہ اس کے قریب گئے تو وہ رونے لگیں' انہوں نے دریافت کیا کہ آپ کے رونے کی وجہ کیا ہے؟ کیا آپ نہیں جانتیں کہ اللہ کے ہاں رسول اللہ کا جو مقام ہے جو آپؐ کے لیے بہتر ہے۔ انہوں نے کہا ہاں میں جانتی ہوں کہ اللہ کے ہاں رسول اللہؐ کے لیے جو کچھ ہے وہ بہت بہتر ہے' لیکن میں اس لیے رو رہی ہوں کہ آسمان سے وحی کا آنا رک گیا ہے' ان کی بات نے ان دونوں کو رلا دیا اور وہ بھی رونے لگے۔ (مسلم)

یہ ایک مبارک گھڑی تھی اور اس کے اثرات اس وقت سے آج تک انسانی زندگی کو متاثر کر رہے ہیں اور یہ اثرات اس وقت تک اپنا کام کرتے رہیں گے جب تک اللہ زمین کا وارث نہیں ہو جاتا اور قیامت برپا نہیں ہو جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس گھڑی کے واقعہ نے انسان کو از سرنو زندگی عطا کی۔ اس طرح کہ اس نے اپنی قدریں زمین سے لینے کی بجائے آسمان سے لینا شروع کر دیں اور اپنی زندگی کا نظام وحی سے اخذ کرنے لگے' خواہشات نفسانیہ سے اخذ نہیں کرتے تھے۔

اس لمحہ میں جو کچھ ہوا اس نے تاریخ کا دھارا بدل دیا۔ اس سے قبل تاریخ میں کوئی ایسا انقلاب واقع نہ ہوا تھا اور نہ آپؐ کے بعد اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا۔ یہ واقعہ دراصل تاریخ کا دوراہا تھا۔ اس نے تاریخ کا رخ پھیر دیا اور پھر تاریخ میں ایسے نشانات راہ قائم کر دیئے گئے جنہیں آج تک مٹایا نہیں جا سکا۔ نہ بعد کے واقعات نے ان نشانات کا رنگ ہلکا کیا۔ انسانی عقائد و نظریات میں اس کائنات' اس زندگی' اور اس کی اعلیٰ قدروں کا ایک تصور بٹھا دیا گیا۔ ان کو اس طرح واضح کر دیا گیا کہ اس سے قبل تاریخ میں ان اعلیٰ قدروں کو اس طرح نہ نکھارا گیا تھا۔ اعلیٰ قدروں کی یہ ایک ایسی تصویر کشی تھی جو جامع تھی' جو صاف تھی' جو نہایت ہی مجرد تھی اور دنیا کے رنگوں سے خالی اور پاک تھی' جبکہ اس کے رنگ واقعی تھے اور انسانی زندگی کے ساتھ اچھی طرح ہم آہنگ تھے۔ چنانچہ اسلامی نظام زندگی کے اصول و قواعد رکھ دیئے گئے' اور اسلامی نظام کے نشانات اور خطوط وضع کر دیئے گئے۔

لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ "تاکہ جو نیست و نابود ہوتا ہے' وہ دلیل سے نیست و نابود ہو اور جو زندہ رہتا ہے وہ دلیل سے زندہ رہے"۔ ان خطوط میں کوئی اجمال اور ابہام نہ چھوڑا گیا۔ اگر کوئی نہیں مانتا تو پھر وہ جانتے بوجھتے نہ مانے گا' اب اگر کوئی راہ راست سے بھٹکتا ہے تو وہ ارادۃً ایسا کرے گا اور اگر کوئی کجی

اختیار کرتا ہے 'کو وہ قصداً ایسا کرے گا۔

اس منفرد لمحے میں یہ ایک ممتاز واقعہ تھا' یہ ایسا کائناتی حادثہ تھا جس نے ایک عہد کو ختم کر دیا جو دنیا سے نابود ہو گیا اور ایک عہد کا آغاز کر دیا جو ابد الاباد تک رہے گا۔

یہ حادثہ انسانی تاریخ میں ایک فرقان بن گیا۔ یہ انسانی زندگی میں فرقان بن گیا۔ صرف کسی امت یا قوم کی زندگی میں نہیں۔ اس حادثہ کی گونج پوری کائنات میں ریکارڈ ہو گئی اور پوری کائنات اس کے ساتھ چلنے لگی۔ یہ حادثہ انسانی ضمیر میں ریکارڈ ہو گیا۔ یہ انسانی ضمیر آج بھی اسے یاد کر رہا ہے اس کی یاد میں مناتا ہے اور کبھی اسے بھولتا نہیں اور انسانی ضمیر اس بات کو پاتا ہے کہ یا واقع' یہ حادثہ دراصل انسانیت کے لیے ایک نیا جنم تھا اور انسانی قدروں میں سے یہ انقلاب تاریخ میں ایک ہی بار واقعہ ہوا' اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ہے۔

یہ تھی بات اس سورت کے پہلے پیراگراف کی۔ رہیں بعد کی آیات اور پیرے تو ظاہر ہے کہ وہ بعد میں نازل ہوئے۔ بعد کی آیات سیرت النبی کے ان واقعات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں جو بہت ہی بعد کے زمانوں میں پیش آئے جبکہ رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ علانیہ تبلیغ کریں' اور اس دور میں پھر آپ ﷺ کی مخالفت شروع ہو گئی تھی جیسا کہ آتا ہے۔

اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یَنۡهٰی عَبۡدًا اِذَا صَلّٰی "کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جو اللہ کے بندے کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے"۔ لیکن بعد میں نازل ہونے کے باوجود سورت کے اجزاء میں ایک ربط ہے اور مطلع کے بعد جو حقائق لائے گئے ہیں ان میں مکمل ترتیب ہے۔ چنانچہ پوری سورت ایک کامل وحدت اور ایک مکمل مضمون بن جاتی ہے جس کے اجزاء باہم پیوست اور منظم ہیں۔

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِیۡ خَلَقَ (۱) خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ (۲) اِقۡرَاۡ وَ رَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ (۳) الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ (۴) عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ (۵) (۹۶:۱ تا ۵)

"پڑھو (اے نبی ﷺ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا' جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو' اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا' انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا"۔ یہ قرآن کی پہلی سورت ہے' رسول خدا ﷺ کو پہلا حکم کیا دیا جاتا ہے؟ پہلی ہدایت کیا دی جاتی ہے؟ ان لمحات میں جب پہلے پہل ان کا عالم بالا کے ساتھ رابطہ قائم ہوا' جب سب سے پہلے انہیں دعوت اسلامی کی ذمہ داری سپرد کی گئی' حکم یہ ہوا کہ "پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا"۔ اللہ کی صفات میں سے تخلیق کی صفت کو لیا گیا جس کے ذریعہ پوری کائنات کو عدم سے وجود میں لایا گیا۔

اس کے بعد اس کائنات میں انسان کی تخلیق اور انسانی دور کے آغاز کی حقیقت کو لیا گیا۔

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ (۹۶:۲) "جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی"۔ خون کے ایک نکتے سے' جو جامد تھا اور رحم کی دیواروں کے ساتھ چپک گیا تھا۔ یہ تھا انسان کی پیدائش کا نقطہ آغاز جس

کی ساخت بہت سادہ ہے' اس انداز تخلیق سے دو باتیں سامنے آتی ہیں' ایک یہ کہ اللہ بڑا کریم ہے اور دوسری یہ اس کی قدرت خود اس تخلیق سے عیاں ہے' کرم یہ ہے کہ اس نے خون کے جمے ہوئے اس نکتے' خوردبینی نکتے کو انسان کے مقام تک پہنچایا جو پڑھتا پڑھاتا ہے۔

اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ (٣) الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (٤) عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (٥)

(۹٦: ۳ــ۵) "پڑھو' اور تمہارا رب بڑا کریم ہے' جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا' انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا" ۔ انسان کی تخلیق کے بعد' یہ اس میں بہت بڑی تبدیلی تھی لیکن اللہ یہ کر سکتا ہے' وہ بڑا کریم ہے' اس لیے اللہ نے ایک خوردبینی نکتے میں یہ تغیر رونما کر دیا کہ وہ کامل انسان کے بعد عالم انسان بن گیا' یہ اس قدر عظیم تبدیلی ہے کہ اس سے سر چکرا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ان آیات میں اسلام کا نظریہ تعلیم بھی واضح کیا گیا ہے' رب نے انسان کو تعلیم "قلم" کے ساتھ دی۔ کیونکہ اس وقت بھی اور آج بھی انسان کی زندگی میں قلم اہم اور موثر ذریعہ تعلیم ہے اور اس حقیقت کو جس طرح ہم آج سمجھتے ہیں نزول قرآن کے وقت اس طرح نہ سمجھتے تھے' لیکن اللہ تعالیٰ تعلیم اور قلم کی قدر و قیمت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ لہذا آخری رسولؐ کو آخری مشن سپرد کرتے وقت اللہ نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا اور قرآن کی پہلی سورت میں یہ اشارہ کر دیا گیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ جس رسولؐ کو یہ ہدایت دی گئی وہ خط نہ لکھ سکتے تھے۔ لہذا اگر کوئی یہ کہے کہ یہ قرآن کسی انسان کی تصنیف ہے تو کوئی امی انسان یہ بات نہیں کر سکتا تھا۔ لہذا یہ ایک حقیقت ہے جو وحی الٰہی نے بتائی اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں۔

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے' کہ قرآن کے نظریہ کے مطابق تعلیم کا سرچشمہ کیا ہے۔ یہ سرچشمہ ذات باری ہے۔ انسان نے آج تک جس قدر علم حاصل کیا ہے یا آئندہ کرے گا۔ آج تک انسان پر اس کائنات کے جو اسرار کھلے ہیں وہ اللہ ہی کے فضل و کرم سے کھلے ہیں۔ انسانی زندگی اور انسانی نفس کے بارے میں جو اسرار کھلے ہیں وہ بھی اللہ کے فضل و کرم سے کھلے ہیں۔ اللہ ہی وہ واحد مصدر اور منبع ہے' جس کے سوا کوئی اور سرچشمہ علم و حکمت نہیں ہے۔

یہ پیراگراف جو ان لمحات کے آغاز میں نازل ہوا' جن میں سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عالم بالا کے درمیان رابطہ قائم ہوا' اس ایک ہی پیراگراف کے اندر ایمانی تصور حیات کے اساسی اصول بیان کر دیے گئے ماکہ "ہر حکم' ہر حرکت' ہر قدم' ہر عمل اور ہر کام للہ کے نام اور اللہ کے احکام کے مطابق ہو گا' اللہ کے نام سے اقدام ہو گا' اللہ کے نام سے چلے گا' اللہ کے رخ ہو جائے گا اور انجام کار اللہ تک پہنچے گا"۔ اس لیے کہ اللہ ہی خالق ہے' وہی جاننے والا اور جان کاری دینے والا ہے' اسی سے آغاز ہے' اسی کی جانب سے نشوونما ہے اور اسی کی طرف سے تعلیم و تربیت ہے' انسان سیکھتا ہے جو کچھ سیکھتا ہے وہ جانتا ہے جو کچھ بھی جانتا ہے لیکن سب علم و ہنر کا سرچشمہ ذات باری ہے جس نے پیدا کیا' علم کے ذرائع دیے اور

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (۹٦: ۵) "اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو انسان نہ جانتا تھا"۔ چنانچہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک نے عالم بالا کے ابتدائی لمحات ہی میں اس حقیقت کو اخذ فرمایا اور آپؐ کی سوچ ' آپؐ کے تصرفات ' آپؐ کے کلام اور آپؐ کے عمل اور آپؐ کے رخ پر اور آپ کی پوری زندگی میں یہ شعور چھایا رہا۔ کیونکہ یہ ایمان کا پہلا اصول تھا۔

امام شمس الدین ابو عبداللہ محمد ابن قیم الجوزیہ اپنی کتاب "زاد المعاد فی ہدی خیر العباد" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے اہم خدوخال کے بارے میں یوں فرماتے ہیں :

"اللہ کی یاد اور اس کے ذکر کے معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک نہایت ہی مکمل انسان تھے ' آپ کی گفتگو کا اہم حصہ ذکر الٰہی اور ذات باری کے متعلق مسائل ہی پر مشتمل ہوتا تھا۔ آپؐ کے احکام آپؐ کے مناہی ' اسلامی قوانین کی وضاحت ' اور تمام دوسری ہدایات دراصل ذکر الٰہی ہی کے پہلو تھے ' اللہ کے اسماء و صفات بیان کرنا ' اللہ کے احکام اور شریعت کے مسائل بیان کرنا ' انجام بد سے ڈرانا وغیرہ سب باتیں اللہ کا ذکر ہی تھیں ' پھر اللہ کی نعمتوں پر اس کی تعریف ' اس کی برتری ' اس کی حمد ' اس کی تسبیح اللہ کا ذکر ہی تو تھا ' پھر اللہ سے مانگنا ' دعا کرنا ' اللہ کی طرف راغب ہونا ' اللہ سے ڈرنا ' یہ سب ذکر الٰہی کے مختلف انداز ہی تو تھے ' جب آپؐ خاموش ہوتے تو بھی یاد الٰہی کرتے ' ہر وقت ہر حال میں آپؐ کے شعور میں ذات باری موجود ہوا کرتی تھی۔ ہر سانس جو اندر جاتا یا باہر آتا ' آپؐ کھڑے ہوتے یا بیٹھے ہوتے ' چلتے پھرتے یا سوار ہوتے ' سفر میں ہوتے یا حضر میں ' اقامت پذیر ہوتے یا کوچ کی حالت میں ہوتے ' غرض ہر دم اور ہر حال میں اللہ کو یاد فرماتے"۔

آپ جب نیند سے بیدار ہوتے تو فرماتے۔

الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا و الیہ النشور "اس ذات کے لیے حمد و ثنا ہے جس نے ہمیں موت دینے (نیند) کے بعد زندگی بخشی اور اسی کی طرف دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے"۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ رات کو جب کبھی اچانک بیدار ہوتے تو دس بار "اللہ اکبر" کہتے ' اور دس بار تہلیل کرتے یعنی کہتے۔

لا الٰہ الا اللہ "نہیں ہے کوئی حاکم مگر اللہ"۔ اور اس کے بعد دس بار یہ دعا پڑھتے۔

اللھم انی اعوذبک من ضیق الدنیا و من ضیق یوم القیمۃ "اے اللہ میں دنیا کی تنگی اور آخرت کی تنگی سے تیری پناہ مانگتا ہوں"۔ اس کے بعد آپ نماز شروع کرتے۔ اور انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ حضورؐ جب رات کو جاگتے تو یہ دعا پڑھتے۔

لا الٰہ الا انت سبحانك اللھم استغفرك لذنبي و اسئلك رحمتك اللھم زدني علمًا ولا تزغ قلبي بعد اذھدیتني وھب لي من لدنك رحمة انك انت الوھاب (ابوداؤد) "اے اللہ ' تیرے سوا کوئی حاکم نہیں ' تو پاک ہے اور برتر ہے۔ اے اللہ میں تجھ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہوں ' اور تجھ سے تیری رحمت طلب کرتا ہوں۔ اے اللہ میرے علم میں اضافہ فرما اور میرے دل کو ہدایت دینے کے بعد ٹیڑھا نہ کر ' اور مجھے اپنی جانب سے رحمت عطا فرما۔ بے شک تو ہی بخشنے والا ہے"۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص رات کو بیدار ہو اور کہے۔

لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ۔ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئی قدیر ۔ الحمد للہ وسبحان اللہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم "نہیں کوئی حاکم مگر اللہ' صرف وہی حاکم ہے' اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں' بادشاہت اسی کی ہے' تعریف اسی کی ہے' اور وہ ہر چیز پر قادر ہے' سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں' وہی پاک ہے' ہر عیب سے۔ اس کے سوا کوئی حاکم نہیں۔ اللہ ہی بڑا ہے' کوئی تدبیر اور کوئی قوت نہیں مگر اللہ کے ذریعہ ہی ہے' جو بلند اور عظیم ہے"۔ اور پھر وہ یہ دعا کرے۔

اللھم اغفرلي "اے اللہ' مجھے بخش دے"۔ یا کوئی اور دعا کرے تو یہ دعا قبول ہوگی اور اگر وہ وضو کر کے نماز بھی ادا کرے تو نماز قبول ہوگی (بخاری)۔

ایک بار حضرت ابن عباسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رات گزاری۔ فرماتے ہیں کہ نیند سے بیدار ہوئے تو آپؐ نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور سورہ آل عمران کی دس آیات

انا فی خلق السمٰوٰت سے آخر تک تلاوت کیں اور پھر اللہ کی حمد یوں بیان کی۔

اللھم لک الحمد انت نور السمٰوٰت والارض ومن فیھن ۔ لک الحمد انت قیم السموات والارض ومن فیھن ۔ ولک الحمد انت الحق وعدک الحق وقولک الحق ولقائک الحق والجنۃ حق والنار حق والنبیون حق، ومحمد حق، والساعۃ حق اللھم لک اسلمت وبک امنت وعلیک توکلت والیک انبت وبک خاصمت والیک حاکمت فاغفرلي ما قدمت وما اخرت وما اسررت وما اعلنت انت الٰھی لا الٰہ الا انت ولاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم "اے اللہ سب تعریفیں تیرے لیے ہیں' تو ہی زمین اور آسمان اور ان کے درمیان جو کچھ ہے' ان کا نور ہے' سب تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں' تو زمین و آسمان اور ان کے درمیان سب چیزوں کا قائم رکھنے والا ہے' حمد تیرے ہی لیے ہے۔ تو حق ہے تیرا وعدہ حق ہے' تیری بات حق ہے' تجھ سے ملنا حق ہے' جنت حق ہے' آگ حق ہے' نبی حق ہیں' محمدؐ حق ہیں' قیامت حق ہے۔ اے اللہ میں تیرا مطیع فرمان ہوں تیرے اوپر ایمان لانے والا ہوں' تجھ پر توکل کرنے والا ہوں' میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں تیری ہی خاطر لڑا' اور سب معاملات تیرے ہی سامنے پیش کیے۔ اس لیے مجھے معاف کر دے۔ میری اگلی اور پچھلی غلطیوں کو معاف کر دے' جو پوشیدہ رکھا اور جو علانیہ کیا' تو ہی میرا حاکم ہے اور تیرے سوا کوئی حاکم نہیں ہے۔ اور اللہ کے سوا کوئی تدبیر اور کوئی قوت نہیں ہے' جو علی و عظیم ہے"۔

اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں' حضور جب رات کو قیام فرماتے تو یہ دعا پڑھتے۔

اللھم رب جبرائیل ومیکائیل و اسرافیل فاطر السموات والارض عالم الغیب والشھادۃ انت تحکم بین عبادک فیما کانوا فیہ یختلفون اھدنی لما اختلف فیہ من الحق باذنک انک تھدی من تشاء الی صراط مستقیم "اور اللہ' جبرائیل' میکائیل اور اسرافیل کے رب' زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کھلی اور پوشیدہ ہر چیز کو جاننے والے' تو فیصلہ کرنے والا ہے ان چیزوں کا جن میں لوگ اختلاف کرتے ہیں' حق کی

جن باتوں میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے ان کے بارے میں مجھے راہ راست کی طرف ہدایت کر ' بے شک تو جسے چاہتا ہے راہ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے"۔ انہوں نے غالباً یہ کہا کہ حضورؐ نماز کا آغاز اسی دعا سے کرتے تھے۔

اور جب آپؐ وتر پڑھتے تھے تو وتر سے فارغ ہونے کے بعد آپ سبحان اللہ القدوس تین بار پڑھتے تھے اور تین بار باآواز بلند پڑھتے تھے۔ ذرا لمبی آواز کے ساتھ۔

آپ جب اپنے گھر سے نکلتے تھے تو یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

بسم اللہ توکلت علی اللہ اللھم انی اعوذ بک من ان اضل او اضل او ازل او اظلم او اظلم او اجھل او یجھل علی (حدیث صحیح) "اللہ کے نام سے شروع کیا' اللہ پر بھروسہ کیا' اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں گمراہ ہو جاؤ' یا گمراہ کر دیا جاؤں یا لغزش کروں یا میں ظلم کروں یا مجھ پر ظلم کیا جائے میں کسی سے جھگڑوں یا مجھ سے ناحق جھگڑا کیا جائے"۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے گھر سے نکلے وقت یہ دعا پڑھے۔

بسم اللہ توکلت علی اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ "شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے' میں نے اللہ پر بھروسہ کیا اور نہیں ہے کوئی تدبیر اور کوئی قوت مگر اللہ کے ساتھ"۔ تو اللہ کی طرف سے ایسے شخص کو کہا جاتا ہے۔

ھدیت و کفیت و وفیت "تمہیں راہ راست ملی' تمہاری حاجت پوری ہوئی اور تمہیں پورا پورا اجر ملا"۔ اور شیطان اس سے کنارہ کش ہو جائے گا (حدیث حسن)

حضرت ابن عباسؓ ایک رات آپؐ کے پاس رہے تو فرماتے ہیں کہ صبح کو جب آپؐ نماز کے لیے نکلے تو آپ نے یہ دعا پڑھی۔

اللھم احعل فی قلبی نورا، واجعل فی لسانی نورا، واجعل فی سمعی نورا، واجعل فی بصری نورا، واجعل فی خلفی نورا، ومن امامی نورا وجعل من فوقی نورا، واجعل من تحتی نورا، اللھم اعظم لی نورا "اے اللہ' میرے دل میں تو نور دے' میری زبان کو منور کر دے' میرے کانوں میں نور ڈال دے' میری آنکھوں میں روشنی کر دے' میرے پیچھے روشنی کر دے' میرے آگے روشنی کر دے' میرے اوپر روشنی کر دے' میرے نیچے روشنی کر دے اور میرے نور کو عظیم کر دے"۔

فضل ابن مرزوق نے عطیہ عوفی سے روایت کی ہے' انہوں نے ابو سعید خدری سے' وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا جو شخص بھی اپنے گھر سے نماز کے لیے نکلے اور یہ دعا پڑھے۔

اللھم انی اسئلک بحق السائلین علیک وبحق ممشائی الیک فانی لم اخرج بطرا ولا اشرا ولا ریاء ولا سمعة وانما خرجت اتقاء سخطك وابتغاء مرضاتك اسئلك ان تنقذنی من النار وان تغفرلی ذنوبی فانه لا یغفر الذنوب الا انت "اے اللہ میں تجھ سے ان سوال کرنے والوں کے حق کے ذریعہ سوال کرتا ہوں' جو تجھ پر ہے' پھر میری جانب سے تیری طرف چلنے کے حق سے سوال کرتا ہوں' کیونکہ میں نہ غرور کرتا ہوا

نکلا ہوں اور نہ اکڑتا ہوا نکلا ہوں' نہ ریاکاری سے اور شہرت کی طلب میں نکلا ہوں۔ تیرے غضب سے بچنے کے لیے نکلا ہوں اور تیری رضا کا طلبگار ہوں' میرا سوال یہ ہے کہ مجھے آگ سے بچا دے' میرے گناہوں کو بخش دے "گناہ بخشنے والا تو تو ہی ہے"۔ تو اللہ ستر ہزار فرشتے مقرر فرمائے گا جو اس کے لیے بخشش طلب کریں گے اور اللہ اس کی طرف اپنا چہرۂ مبارک کرے گا جب تک وہ نماز ادا نہیں کرتا (یہ حدیث سنداً و متناً ضعیف ہے)

امام ابو داؤد نے روایت کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی مسجد میں داخل ہوتے تو فرماتے۔

اعوذ باللہ العظیم وبوجھہ الکریم وسلطانہ القدیم من الشیطن الرجیم "میں شیطان رجیم سے اللہ عظیم کی پناہ مانگتا ہوں' اس کے مکرم چہرے کی پناہ مانگتا ہون اور اس کے قدیم اقتدار میں پناہ مانگتا ہوں"۔ جب کوئی یہ دعا پڑھتا ہے تو شیطان کہتا ہے کہ اس شخص نے پورے دن کے لیے اپنے آپ کو مجھ سے محفوظ کر لیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو' تو چاہئے کہ وہ مجھ پر صلوٰۃ و سلام پڑھے اور اس کے بعد یہ دعا پڑھے۔

اللھم افتح لي ابواب رحمتك "اے اللہ میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے"۔ اور جب مسجد سے نکلے تو یہ کہے۔

اللھم انی اسئلك من فضلك "اے اللہ میں تیرے فضل کا سوالی ہوں"۔ اور آپ سے یہ نقول ہے کہ جب بھی آپ مسجد میں داخل ہوتے تو محمدؐ اور آل محمدؐ پہ صلوٰۃ و سلام بھیجتے اور پھر کہتے۔

اللھم اغفرلي ذنوبي وافتح لي ابواب رحمتك "اے اللہ میرے گناہ بخش دے اور اپنی رحمت کے دروازے میرے لیے کھول دے اور جب آپ نکلتے تو پھر بھی حضرت محمدؐ اور آل محمدؐ پر صلوٰۃ و سلام بھیجتے اور پھر کہتے۔

اللھم اغفرلي ذنوبي وافتح لي باب فضلك "اے اللہ' میرے گناہ معاف کر دے اور میرے لیے اپنے فضل کا دروازہ کھول دے"۔

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جب صبح کی نماز پڑھتے تو مصلے پر بیٹھتے اور اللہ کو یاد فرماتے یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جاتا۔ جب صبح ہوتی تو آپؐ فرماتے۔ اللھم بك اصبحنا وبك امسینا وبك نحیا وبك نموت والیك النشور (حدیث صحیح) "اللہ تیرے ہی حکم سے ہم صبح تک پہنچتے ہیں اور تیرے ہی حکم سے ہماری شام ہوتی ہے اور تیرے ہی حکم سے ہم زندہ رہتے ہیں اور تیرے ہی حکم سے ہم مرتے ہیں اور تیرے ہی طرف ہم نے زندہ ہو کر اٹھنا ہے"۔

اور آپؐ یہ کلمات بھی کہا کرتے تھے:-

اصبحنا واصبح الملك للہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ وحدہ لاشریك لہ - لہ الملك ولہ الحمد وھو علی کل شئی قدیر - رب اسئلك خیر ما في ھذا الیوم وخیر ما بعدہ واعوذ بك من شر ھذا الیوم وشر ما بعدہ رب اعوذ بك من الکسل وسوء الکبر رب اعوذ بك من عذاب في النار وعذاب في القبر "ہم صبح میں داخل ہوئے اور تمام اقتدار اللہ کے لیے ہے' تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں' اللہ

کے سوا کوئی حاکم نہیں ۔ وہ واحد ہے ۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے ۔ اسی کی بادشاہت ہے 'اس کی تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اے اللہ میں تجھ سے اس دن کی بھلائی مانگتا ہوں اور اس کے بعد کے دن کی بھی اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اور اس دن کے شر سے اور اس کے بعد کے دن کے شر سے اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں سستی سے بڑھاپے کی کمزوریوں سے پناہ مانگتا ہوں ۔ اے اللہ میں آگ کے عذاب اور قبر کے عذاب سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں" ۔ اور شام ہوتی تو آپ یہی دعا یوں پڑھتے :

امسینا و امسی الملک بعد "ہم شام کے وقت تک پہنچے اور بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہے تا آخر (مسلم)
اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ مجھے ایسے کلمات بتایئے کہ میں صبح و شام کہوں تو آپؐ نے فرمایا یہ کلمات کہا کریں :

اللھم فاطر السموات و الارض عالم الغیب و الشھادۃ رب کل شئی ملیکۃ ومالکہ اشھد ان لا الٰہ الا انت – اعوذبک من شر نفسی و شر الشیطن وشرکہ و ان اقترف علی نفسی سوء او اجرہ الی مسلم "اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے ظاہر اور غیب کے جاننے والے ' ہر چیز کے رب حکمران اور مالک 'میں شہادت دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے ۔ میں اپنے نفس اور شیطان کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اس کے شرک سے تیری پناہ مانگتا ہوں ۔ اور اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں اپنے نفس کو نقصان پہنچاؤں یا کسی مسلمان کی طرف نقصان کا رخ کروں" ۔ اس کے بعد اس باب میں انہوں نے بہت سی احادیث نقل کیں ۔
"اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نیا کپڑا پہنتے تھے تو اس کا نام لیتے تھے یعنی پاجامہ ' قمیص اور چادر پھر یہ دعا پڑھتے تھے ۔

اللھم لک الحمد انت کسوتنیہ اسئلک خیرہ وخیر ماصنع لہ و اعوذبک من شرہ و شر ما صنع لہ "اے اللہ 'سب تعریفیں تیرے لیے ہیں ۔ یہ تو نے مجھے پہنایا ہے ۔ میں تجھ ہی سے اس کی بھلائی چاہتا ہوں اور اس مقصد کی بھلائی چاہتا ہوں جس کے لئے پہنا اور تجھ ہی سے اس کے شر اور اس چیز کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جس کے لیے اسے بنایا گیا" ۔ (حدیث صحیح)
"آپؐ سے یہ بھی منقول ہے کہ جب آپؐ اپنے گھر کو لوٹتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے ۔

الحمدللہ الذی کفانی و اوانی و الحمدللہ الذی اطعمنی وسقانی و الحمدللہ الذی من علی – اسئلک ان تجیرنی من النار "اس خدا کی تعریف جو میرے لیے کافی ہوا اور جس نے مجھے ٹھکانا دیا ۔ اس خدا کی تعریف جس نے مجھے کھلایا پلایا 'اس خدا کی تعریف جس نے مجھ پر احسان کیا ۔ اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے آگ سے بچا" ۔
اور صحیحین میں یہ روایت مروی ہے کہ آپؐ جب بیت الخلا کو جاتے تھے تو یہ فرماتے ۔

اللھم انی اعوذبک من الخبث و الخبائث "اے اللہ میں گندی چیزوں اور گندی باتوں سے تیری پناہ طلب

کرتا ہوں"۔ اور جب آپ بیت الخلاء سے نکلتے تھے تو فرماتے۔

غفرانک "اے اللہ میں تیری مغفرت طلب کرتا ہوں"۔ اور یہ بھی آتا ہے کہ آپ یہ الفاظ فرماتے۔

الحمد للہ الذی اذھب عنی الاذی وعافانی "اللہ کا شکر ہے کہ جس نے مجھ سے تکلیف دہ چیز دور کر دیا اور عافیت بخشی"۔ (ابن ماجہ)

اور آپؐ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپؐ نے اپنا دست مبارک ایک برتن میں ڈالا جس میں پانی تھا اور پھر صحابہؓ سے کہا' اللہ کے نام سے وضو کرو اور آپؐ سے یہ بھی منقول ہے کہ آپؐ چاند دیکھتے وقت یہ دعا پڑھتے تھے۔

اللھم اھلہ علینا بالامن و الایمان و السلامۃ و الاسلام ربی و ربک اللہ "اے اللہ' اس چاند کو ہم پر امن' ایمان' سلامتی اور اسلام کے ساتھ نکال۔ اے چاند میرا رب تیرا رب اللہ ہے"۔ (ترمذی)

اور جب آپؐ کھانے میں ہاتھ ڈالتے تو بسم اللہ پڑھتے اور لوگوں کو حکم دیتے کہ بسم اللہ کہہ کے کھاؤ' اور فرماتے جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو اس پر اللہ کا نام لے' اگر وہ بھول جائے اور آغاز میں نہ کہہ سکے تو یوں کہے۔

بسم اللہ فی اولہ واخرہ "اللہ کے نام سے آغاز میں بھی اور آخر میں بھی"۔ (صحیح)

یہ تھی حضورؐ کی زندگی اور اس پوری زندگی میں آپؐ اس ہدایت پر عمل پیرا تھے جو آغاز وحی میں کی گئی تھی۔ اور آپؐ کا ایمان' آپؐ کے نظریات اور آپؐ کے افعال و حرکات میں یہ بات رچ بس گئی تھی۔

اس حقیقت کے تقاضے تو یہ تھے کہ انسان اللہ کی معرفت حاصل کرتا اور اللہ کا شکر ادا کرتا' یعنی اس حقیقت پر کہ اللہ نے اسے پیدا کیا' اس نے علم سکھایا' اور اسے تمام مخلوقات میں مکرم بنایا' لیکن انسان نے ایسا نہ کیا۔ بلکہ وہ اس سے بالکل الٹا چلا اور اس کا انحراف اور اس کی خلاف توقع حرکت کا ذکر اگلے پیراگراف میں کیا جاتا ہے۔

كَلَّآ إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰٓ ﴿٦﴾ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰٓ ﴿٧﴾ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰٓ ﴿٨﴾

"ہرگز نہیں' انسان سرکشی کرتا ہے اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے (حالانکہ) پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے"۔

انسان یہ نہیں سوچتا کہ اسے دینے والا اور غنی کرنے والا تو اللہ ہی ہے۔ اس سے قبل اسے پیدا بھی اللہ نے کیا اور تمام مخلوقات سے مکرم بھی بنایا اور اسے تعلیم بھی دی لیکن انسان کا عمومی رویہ یہ ہے کہ جب اسے دیا جاتا ہے اور غنی بنا دیا جاتا ہے تو یہ بالعموم شکر رب ادا نہیں کرتا الا یہ کہ کسی کو اس کا ایمان اس ناشکری سے بچا دے۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو اس سرچشمے کا احساس بھی نہیں ہوتا جس سے یہ عطا اور غنا آرہی ہوتی ہے' حالانکہ اس کو دینے والا اور غنی بنانے والا وہی ہوتا ہے جس نے اسے پیدا کیا' عزت بخشی اور علم دیا۔ لیکن انسان نہ صرف یہ کہ اس منعم کا احساس مند نہیں ہوتا بلکہ وہ نہایت سرکشی اور فسق و فجور کی راہ اختیار کرتا ہے' بغاوت کرتا ہے اور تکبر کرتا ہے جبکہ اس کا حق یہ تھا کہ وہ

اللہ کے انعامات کو جانتا اور شکر کرتا ۔

یہ ایک سرکش انسان کی تصویر کھینچ دی گئی جو اپنی تخلیق کو بھی بھول چکا ہے اور جس کو دولت مندی نے سخت بگاڑ دیا ہے 'تو ایک ملفوف اور بالواسطہ انداز میں اسے دھمکی دی جاتی ہے ۔

انَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی (۹۶:۸) "بے شک پلٹنا تیرے رب کی طرف ہی ہے"۔ آخر یہ غافل اور سرکش بھاگے گا کہاں' آخر آنا تو اللہ ہی کے سامنے ہے ۔

لیکن اس تہدید کے ساتھ ساتھ اسلامی تصور حیات کا ایک بنیادی اصول اور نظریہ بھی پیش کر دیا جاتا ہے' یہ کہ سب نے اللہ کے دربار میں حاضر ہونا ہے ۔سب نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے' ہرچیز میں ہربات کے حوالے سے' ہرنیت و ارادہ میں اور ہر فعل و حرکت میں 'کیونکہ اللہ کے سوا اور تو کوئی جائے پناہ اور مرجع ہے ہی نہیں ۔اگر کوئی نیک ہے یا بد ہے' سب نے اللہ کے سامنے جاتا ہے ۔ اگر کوئی فرمان بردار ہے یا معصیت کیش ہے' حق پر ہے یا باطل پر ہے' اچھا ہے' یا شریر ہے ۔ غنی ہے یا فقیر ہے ۔سب نے اللہ ہی کے سامنے جانا ہے ۔یہ شخص جس نے اپنے آپ کو غنی سمجھ کر سرکشی کی یہ بھی اپنے آپ کو اللہ کے سامنے باندھا ہوا پائے گا ۔ لہٰذا ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اللہ کے سامنے پیش ہونے کے وقت کے لیے کچھ کرے ۔ کیونکہ وہی خالق ہے اور اس کی طرف لوٹنا ہے ۔اس طرح ان دو پیراگرافوں میں اسلامی نظریات و عقائد کے دونوں سرے لے لیے جاتے ہیں' یعنی اسلام کا نظریہ آغاز حیات اور نشوونما' پھر اسلام کا نظریہ تعلیم و تربیت اور تہذیب و شائستگی اور پھر اللہ کی طرف لوٹنا اور عقیدہ حشر و نشر اور حساب و کتاب کے لئے اللہ کے سامنے جانا ہے اور وہاں سب اختیارات اللہ کے ہوں گے ۔

انَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی (۹۶:۸) "بے شک تیرے رب ہی کی طرف پلٹنا ہے"۔

اب تیسرا پیراگراف آتا ہے' سورہ بہت ہی مختصر ہے' لیکن یہاں سرکشی کی ایک نہایت واضح اور گھناؤنی تصویر کشی کی جاتی ہے ۔انسانی انگشت بدنداں رہ جاتا ہے اور ایسے واقعات کو سخت ناپسند کرتا ہے ۔یہ تصویر کشی قرآن کے منفرد انداز میں ہے ۔

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی ﴿۹﴾ عَبْدًا اِذَا صَلّٰی ﴿۱۰﴾ اَرَءَیْتَ اِنْ کَانَ عَلَی الْهُدٰۤی ﴿۱۱﴾ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی ﴿۱۲﴾ اَرَءَیْتَ اِنْ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ﴿۱۳﴾ اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی ﴿۱۴﴾

"تم نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بندے کو منع کرتا ہے جبکہ وہ نماز پڑھتا ہو؟ تمہارا کیا خیال ہے اگر (وہ بندہ) راہ راست پر ہو یا پرہیز گاری کی تلقین کرتا ہو؟ تمہارا کیا خیال ہے اگر (یہ منع کرنے والا شخص حق کو) جھٹلاتا اور منہ موڑتا ہو؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے"۔

قرآن اس تصویر کو نہایت ہی گھناؤنی شکل میں لیکن نہایت ہی واضح انداز میں پیش کرتا ہے ۔انداز قرآن کا اپنا ہے'

جسے کوئی ادیب تحریری انداز نہیں دے سکتا۔ یہ ایک زندہ اور تابندہ تقریری انداز ہے جس میں نہایت ہی مختصر جھلکوں کی شکل میں 'نہایت آسانی اور ہلکے پھلکے انداز میں اور نہایت ہی تیز رفتار فلم کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

اَرَءَیْتَ "کیا تم نے دیکھا ہے؟" اس قسم کا مکروہ منظر بھی کبھی نظروں سے گزرا ہے۔ کیا آپ یقین کر سکتے ہیں کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی (۹) عَبْدًا اِذَا صَلّٰی (۹۶ : ۱۰) "کیا تم نے دیکھا ہے ایسے شخص کو جو منع کرتا ہے ایک بندے کو نماز پڑھنے سے"۔ تم دیکھتے نہیں کہ یہ کس قدر برا اور شنیع فعل ہے۔ سخت گھناؤنا فعل ہے کہ ایک شخص خدا کی عبادت کر رہا ہے اور دوسرا اسے عبادت کرنے سے روک رہا ہے۔ پھر صورت یہ ہو کہ وہ شخص راہ راست پر ہو اور لوگوں کو تقویٰ خدا خوفی اور اچھی باتوں کی ہدایت دے رہا ہو' اور روکنے والا اسے روک رہا ہو۔
پھر اس پر مزید کہ وہ یہ فعل' نہایت ہی گھناؤنا فعل بھی کر رہا ہے اور اس کے ساتھ اس سے بھی برے فعل کا ارتکاب کر رہا ہے۔

اَرَءَیْتَ اِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی (۹۶ : ۱۳) "تمہارا کیا خیال ہے اگر (یہ منع کرنے والا حق کو) جھٹلاتا بھی ہے اور حق بات سے منہ موڑتا ہو"۔ یہاں بھی ایک بالواسطہ اور درپردہ دھمکی دی جاتی ہے جس طرح سابقہ پیراگراف کے آخر میں دی گئی تھی۔

اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی (۹۶ : ۱۴) "کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے"۔ اللہ دیکھ رہا ہے کہ یہ شخص ناحق تکذیب کر رہا ہے اور ناحق منہ موڑ رہا ہے اور یہ بندۂ مومن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ناحق نماز سے بھی روکتا ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت پر ہیں اور تقویٰ کا حکم دیتے ہیں اور آخرت کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی (۹۶ : ۱۴) "کیا یہ نہیں سمجھتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے"۔ یہ ایک منظر ہے جس میں ایک شخص دعوت اسلامی کی راہ روکے کھڑا ہے' ایمان کی راہ روکے ہوئے ہے۔ اطاعت و تقویٰ کی راہ روکے ہوئے ہے۔ ایسے شخص کو اب آخری دھمکی دی جاتی ہے لیکن اس بات پر کھلی دھمکی ہے بغیر لاگ لپیٹ کے۔

كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ﴿١٥﴾ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿١٦﴾ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ﴿١٧﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿١٨﴾

"ہرگز نہیں' اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچیں گے' اس پیشانی کو جو جھوٹی اور سخت خطاکار ہے۔ وہ بلا لے اپنے حامیوں کی ٹولی کو' ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بلا لیں گے"۔
یہ ایک واضح اور براہ راست دھمکی ہے اور ہے بھی شدید الفاظ میں۔

كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ( ۹۶ : ۱۵ ) ”ہرگز نہیں اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچیں گے“ ـ یوں

لَنَسْفَعًا کا تلفظ بھی شدید اور اس کی آواز کی سختی اس کے مفہوم کی سختی پر دلالت کرتی ہے ـ سفع کے معنی سختی سے پکڑنے کے ہیں ـ ناصیہ کا مفہوم ہے پیشانی ـ پیشانی سرکشوں اور متکبرین کے اظہار کبر کے لیے اونچا مقام ہے ـ ایسے لوگ سر کو بلند رکھتے ہیں اور سر کی بلندی کے وقت پھر پیشانی سب سے بلند ہوتی ہے ـ لہذا ایسی پیشانی کو پکڑ کر گرانا ہی مناسب ہے ـ کیونکہ

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ ( ۹۶ : ۱۶ ) ”یہ جھوٹی پیشانی ہے“ ـ اور یہ چونکہ پکڑ دھکڑ کا مقام ہے اور ایسے مواقع پر لوگ یاروں مددگاروں کو بلاتے ہیں تو کہہ دیا گیا ـ

فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ( ۹۶ : ۱۷ ) ”بلائے اپنے حامیوں کے ٹولے کو“ ـ ہم بھی انتظام کرلیں گے ـ

سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ( ۹۶ : ۱۸ ) ”ہم بھی فرشتوں کو بلالیں گے“ ـ جو بہت سخت خو اور سخت گرفت والے ہیں ـ ظاہر ہے کہ ایسے معرکے کا انجام ان کی خواری ہی ہو گا ـ

یہ سورہ ایسے متوقع اور خوفناک منظر پر ختم ہوتی ہے ـ اس منظر پر اہل ایمان کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ایمان اور اسلام پر ثابت قدم رہیں اور اللہ کے احکام کی طاعت کرتے رہیں ـ

كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِب ۩ ﴿۱۹﴾ ا ۱۹ ع

”ہرگز نہیں ' اس کی بات نہ مانو اور سجدہ کرو اور (اپنے رب کا) قرب حاصل کرو“ ـ ۲۱

یعنی یہ سرکش جو تمہیں نماز سے روکتا ہے ' اس کی اطاعت نہ کرو ' یہ جو دعوت اسلامی کی راہ روکتا ہے ' اس کی مزاحمت کرو ' رب کے سامنے سجدہ ریز ہوکر اس کا قرب حاصل کرو ـ انسان صرف عبادت اور اطاعت کے ذریعہ ہی خدا کے قریب ہوتا ہے ـ ایسے سرکشوں کو نظرانداز کردو ' اسے چھوڑ دو کہ اللہ کی قوتیں اس سے نمٹ لیں ـ

روایات صحیح میں یہ بات مذکور ہے کہ اس سورت کے پہلے پیراگراف کے علاوہ اگلا پورا حصہ ابوجہل کے بارے میں نازل ہوا ہے ـ یہ جب خانہ کعبہ میں آیا تو حضور مقام ابراہیم پر نماز پڑھ رہے تھے ـ تو اس نے کہا اے محمدؐ کیا میں نے تم کو اس سے روکا نہ تھا ' اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھمکی دی اور حضورؐ نے بھی اس کو خوب ڈانٹا ـ اور شاید اس موقعہ پر حضورؐ نے اس کو گلے سے پکڑ کر کہا ـ

أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ (باز آجاؤ ورنہ ...) اور اس نے کہا ' اے محمدؐ تم مجھے کس چیز کی دھمکی دیتے ہو ' خدا کی قسم اس وادی میں میرے دوست و یار سب سے زیادہ ہیں ـ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ـ

فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ (۹۶ : ۱۷) "یہ اپنے یار و مددگار بلائے"۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اگر اس وقت یہ اپنے حامیوں کو بلاتا تو عذاب کے فرشتے اسی وقت ان کو دبوچ لیتے۔

لیکن اس سورت کا مفہوم عام ہے۔ ہر مومن اور مطیع فرمان داعی الی اللہ اور ان کے مقابل آنے والے سرکش اور نافرمان پر یہ سورت صادق آتی ہے۔ ہر وہ باغی جو لوگوں کو نماز سے روکتا ہے اور اللہ کی اطاعت شعاری سے منع کرتا ہے اور نیکی کے خلاف سازشیں کرتا ہے' اس کے لیے یہ دھمکی تیار ہے۔ آخری ہدایت یہ ہے۔

كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (۹۶ : ۱۹) "ہرگز نہیں اس کی بات نہ مانو اور سجدہ کرو' اور اللہ کا قرب حاصل کرو"۔ اس تفسیر کے مطابق سورت کے تمام پیراگراف باہم مربوط ہو جاتے ہیں۔

---○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ القدر ۔ ۹۷

## ۱-- تا -- ۵

# سورۃ القدر ایک نظر میں

اس سورت میں ایک مخصوص رات کا ذکر ہے' جس میں بہت سرگرمیاں تھیں اور سب لوگ وہاں حاضر تھے۔ پوری کائنات نے ریکارڈ کیا کہ یہ تو کوئی غیر معمولی بات ہے' جو لوگ اس محفل میں تھے وہ بہت ہی خوش نصیب' خوش و خرم اور رب ذوالجلال کے سامنے ہمہ تن گوش اور نہایت ہی عاجزی سے دست بدعا تھے' یہ کس قدر اہم رات تھی؟ یہ ایسی رات تھی جس میں اس زمین یا اہل زمین کا رابطہ عالم بالا سے ہوا۔ یہ وہ رات تھی جب عالم بالا کا پیغام' قرآن' قلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اترنا شروع ہوا۔ اس رات میں ایک ایسا واقعہ ہوا جو اپنی عظمت' اپنے اثرات اور اپنی معنویت کے اعتبار سے ایک ایسا واقعہ تھا' جس کی نوعیت کا کوئی واقعہ اس زمین نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ اس قدر عظیم تھا کہ انسان کی محدود قوت مدرکہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ واقعہ یہ تھا :

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (۱) وَمَآ اَدْرٰكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ (۲) لَیْلَةُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ (۳) (۹۷ : ۱ تا ۳) "ہم نے اس کو لیلۃ القدر میں نازل کیا ہے اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ایک ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے"۔

وہ آیات قرآنیہ' جن میں اس واقعہ کا ذکر ہے وہ اس طرح چمک رہی ہیں' اور اس طرح نور بکھیر رہی ہیں کہ اپنے پورے ماحول کو منور کر رہی ہیں' ان آیات سے ایک مسلسل' نہایت ہی خوبصورت' اور نہایت ہی پسندیدہ اور دھیمی روشنی بکھیر رہی ہے' یہ اللہ کا نور ہے جو پوری کائنات کو بقعہ نور بنا رہا ہے اور یہ نور قرآن سے پھوٹ رہا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (۹۷ : ۱) "ہم نے اسے قدر والی رات میں اتارا ہے"۔ یہ فرشتوں اور فرشتوں کی روح حضرت جبرئیل علیہ السلام کا لایا ہوا نور ہے جو صبح و شام زمین و آسمان کے درمیان چکر لگاتے رہتے ہے :

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ (۹۷ : ٤) "فرشتے اور روح' اس میں اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں"۔ اور صبح صادق کی روشنی اور قرآن کی روشنی کو قرآن کریم میں یکجا کر کے لایا جاتا ہے۔ جس کے ساتھ فرشتوں اور اسلام کی سلامتی کی روشنی اور روح شامل ہوتی ہے اور یہ سب روشنیاں اس جہاں میں زندہ ارواح کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہیں۔ اور ان کے اوپر چمکتی ہیں اور پھر اس پوری کائنات کی حالت یہ ہو جاتی ہے۔

سَلٰمٌ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷ : ٥) "یہ رات سراسر سلامتی ہے طلوع فجر تک"۔

یہ رات جس کا یہاں تذکرہ ہوا ہے' وہی رات ہے جس کا ذکر سورہ دخان کی اسی آیت میں ہوا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِیْنَ (٣) فِیْهَا یُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِیْمٍ (٤)

اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ؕ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِیْنَ (٥) رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (٦)

(٤٤ : ٣ تا ٦) "بے شک ہم نے اس کو بابرکت رات میں اتارا ہے ۔ یقیناً ہم لوگوں کو خبردار کرنے والے ہیں ' اس رات میں تمام حکیمانہ امور ہمارے حکم سے طے ہوتے ہیں اور بے شک ہم رسول بھیجنے والے ہیں ۔ یہ تمہارے رب کی رحمت کے باعث ہے ۔ یقیناً وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے ۔ اور یہ رات رمضان شریف ہی کی راتوں میں سے ایک رات ہے ۔ سورہ بقرہ میں اس کی تصریح ہے ۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ

الْفُرْقَانِ (٢ : ١٨٥) "رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا ' جو انسانوں کے لیے ہدایت ہے اور جس میں ہدایت کے واضح دلائل اور حق و باطل میں فرق کرنے والی واضح تعلیمات ہیں" ۔ مطلب یہ ہے کہ رمضان شریف میں نزول قرآن کا آغاز ہوا ۔ یہ رمضان شریف کے مہینے میں تھا ۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں عبادت گزاری میں مصروف تھے ۔

اس رات کے تعین میں کئی احادیث اور روایات مروی ہیں ۔ بعض میں تصریح کی گئی ہے کہ یہ رمضان المبارک کی ستائیسویں رات ہے ۔ بعض میں ہے کہ یہ اکیسویں رات ہے اور بعض میں ہے کہ یہ آخری عشرہ کی کوئی رات ہے ۔ بعض روایات میں یہ آتا ہے کہ یہ رمضان شریف کی راتوں میں سے کوئی ایک رات ہے ۔ بہرحال راجح بات اور یقین بات یہی ہے کہ یہ رمضان شریف کی ایک رات ہے ۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۹۷ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۵

سُوْرَةُ الْقَدْرِ (۹۷) مَكِّيَّةٌ (۲۵) اٰيَاتُهَا ۵ رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝۲ لَيْلَةُ
الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۳ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ
رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵ الثلثة ۵ ع ۱ ۲۲

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔ اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں وہ رات سراسر سلامتی ہے طلوع فجر تک"۔

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (۹۷ : ۱) "ہم نے اسے لیلۃ القدر میں اتارا ہے"۔ لیلۃ القدر کے معنی تقدیر اور تدبیر بھی ہو سکتے ہیں' اور قابل قدر اور بلند مرتبہ کے بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں معانی اس عظیم الشان کائناتی واقعہ کے ساتھ مناسب ہیں' یہ واقعہ کہ اس رات میں قرآن کریم نازل ہوا' یہ آخری رسالت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہوئی اور آپ ؐ نے دعوت کا کام شروع کیا۔ میں سمجھتا ہوں اس کائنات میں اس سے بڑا کوئی واقعہ نہیں ہے۔ اور انسانوں کی زندگی میں اس سے پر معنی اور زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت والا کوئی واقعہ بھی نہیں ہے۔ یہ رات ایک ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ مراد ہزار مہینوں کی تحدید نہیں ہے' مراد ہے کہ ہزارہا راتوں سے یہ رات زیادہ قیمتی ہے۔ الف شہر سے مراد زیادہ راتیں ہیں۔ مطلب ہے ہزاروں لاکھوں راتوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ یوں کہ ہزاروں لاکھوں کروڑوں راتیں انسانی زندگی کو اس قدر متاثر نہیں کر سکیں۔ جس قدر اس رات نے انسانی زندگی کو متاثر کیا۔ اس رات نے انسانی زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔

لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ (۹۷ : ۳) "شب قدر ایک ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے"۔

وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ (۹۷ : ۲) "اور تم کیا جانو کہ لیلۃ القدر کیا ہے"۔ یہ اس قدر عظیم ہے کہ انسانی فہم و ادراک کی حدود سے ماوراء ہے۔ بس یہی ہے اس کا مفہوم اور اس سلسلے میں عامۃ الناس میں جو اوہام و خرافات مشہور ہیں۔ ان کے تذکرے کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بس یہ ایک نہایت ہی عظیم رات ہے' اور اس کی عظمت اس وجہ سے ہے کہ اس کو اللہ نے ایک عظیم کام کے لیے منتخب کیا ہے یعنی نزول قرآن کریم کے لیے اور اس لیے کہ اللہ نے اس رات کو اپنے نور سے پوری کائنات کو بھر دیا۔ اور اس رات کو اللہ نے انسانیت کو وہ چیز عطا کی تھی جس کی اسے بے حد ضرورت تھی۔ انسانی روح اور انسانی زندگی کو اس رات یہ عطیہ ملا یعنی عمومی امن و سلامتی اور امن و سلامتی کا پیغام یعنی قرآن دیا۔ جس میں صحیح عقائد و تصورات وضاحت سے بیان ہوئے۔ جس میں ایسے آداب زندگی ثبت ہوئے جن کی وجہ سے انسانی ضمیر اور انسانی ماحول یعنی پوری زمین کو سلامتی ملی۔ اور حضرت روح الامین اس رات کو پیغام لے کر فرشتوں کے جلو میں آئے۔ یہ ایک جشن کا سماں تھا' انسانیت کو تو بہار مل رہی تھی۔ اسی جشن کو قرآن نے نہایت ہی عجیب انداز میں یہاں بیان کیا ہے۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ أَمْرٍ (۹۷ : ۴) "فرشتے اور روح الامین میں اس میں اپنے رب کے حکم سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں"۔ آج جب ہم صدیوں پیچھے کی طرف نظر دوڑاتے ہیں اور پھر ہماری نگاہ اس بزرگ اور عظیم رات پر پڑتی ہے۔ اور ہم اس جشن پر غور کرتے ہیں جو اس رات دیکھا گیا۔ پھر ہم ان امور کو دیکھتے ہیں جو اس رات میں فیصلہ ہوئے اور مکمل ہوئے اور دیکھتے ہیں کہ انسانی تاریخ نے کیا سفر طے کیا' کیا واقعات و حادثات رونما ہوئے' اس رات کے فیصلوں کے نتیجے میں انسانی قلب و نظر میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ ایک عظیم رات تھی اور اس میں جتایا جانے والا یہ حسن نو بہار اں بھی فی الواقعہ بجا تھا اور آج ہمیں اللہ کا یہ کلام اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے۔

وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ (۹۷ : ۲) "تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے"۔ اور یہ کہ اس رات تمام حکیمانہ امور طے ہوئے' اس رات اساس دین' دینی اقدار اور حسن و قبح کے پیمانے طے ہوئے۔ اس رات افراد کے علاوہ حکومتوں' ملتوں اور اقوام کی قسمتوں کا فیصلہ ہوا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر جس اہم چیز کا فیصلہ ہوا وہ یہ ہے کہ حق کا معیار طے ہوا۔ مستقل قدریں طے ہوئیں۔ طریق زندگی اور نظام شریعت طے ہوا اور روحانی اقدار طے ہوئیں۔ سَلٰمٌ "وہ رات سراسر سلامتی ہے"۔ انسانیت نے اپنی جہالت اور بدبختی کی وجہ سے شب قدر کی قدر و قیمت کو بھلا دیا ہے۔ اور اس عظیم واقعہ کی اہمیت کو دل سے محو کر دیا ہے' حالانکہ انسانی تاریخ کا یہ ایک عظیم واقعہ تھا' اور جب سے انسانیت نے اس عظیم واقعہ کو بھلایا اور اس عظیم پیغام کے حوالے سے غفلت کا مظاہرہ کیا تو انسانیت اللہ کی عظیم ترین رحمت و سعادت سے محروم ہو گئی۔ وہ کیا تھی؟ حقیقی امن و سلامتی کی سعادت' انسانی ضمیر و نفسیات میں امن و سلامتی کی سعادت' انسانی خاندان میں امن و سلامتی کی سعادت' وہ ہمہ گیر سعادت تھی جس سے اسلام نے دنیا کو مالا مال کر دیا تھا۔ یہ درست ہے کہ انسان نے اس عرصہ میں بے پناہ مادی ترقی کی' دنیا کو خوب آباد و شاداب کیا۔ لیکن اسلام نے جو امن

و سلامتی عطا کی ہے اسے انسان نہ پا سکا۔ باوجود مادی ترقی اور بے پناہ پیداوار کے انسانیت بدبخت بن رہی۔ وہ خوبصورت نور بجھ گیا جس نے کبھی اس کی روح کو روشن کر دیا تھا۔ اور وہ روشن خوشی ختم ہو کر رہ گئی جس نے اسے زمین کے بندھنوں سے آزاد کر کے عالم بالا کے ساتھ معلق کر دیا تھا' اور وہ مجموعی سلامتی ختم ہو گئی۔ جس کے فیوض و برکات انسانی قلب اور ارواح سے سرشار ہو گئے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ کھو چکنے کے بعد انسان نے نہ روحانی خوشی پائی' نہ آسمانی روحانیت ملی اور نہ انسان کو یہ آزادی ملی کہ وہ زمینی بوجھ سے ذرا اٹھ کر آسمانوں تک پہنچے۔

هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷ : ۵) "یہ طلوع فجر تک ہے"۔ ہم اہل ایمان اس بات پر مامور ہیں کہ اس جشن نو بہاراں کو بھی نہ بھلائیں ۔ یہ اچھی یادیں ہیں' اور ان یادوں کو تازہ رکھنے کے لیے ہمارے نبیؐ نے ہمارے لیے بہت ہی سہل طریقے بتائے ہیں تاکہ ہماری روحیں اس سرچشمے سے مربوط ہیں۔ اور وہ عظیم کائناتی واقعہ انہیں یاد رہے جو اس رات میں وقوع پذیر ہوا۔ وہ یوں کہ حضورؐ نے ہمیں تاکید فرمائی کہ ہر سال اس رات کو اللہ کی عبادت میں کھڑے رہو اور رمضان شریف کی آخری دس راتوں میں اسے تلاش فرو' صحیح حدیث ہے۔ تحروا لیلۃ القدر فی العشر الاواخر من رمضان "شب قدر کو رمضان کی آخری راتوں میں تلاش کرو"۔ اور صحیحین ہی کی ایک دوسری روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ من قام لیلۃ القدر ایمانا و احتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه "جس شخص نے شب قدر میں اللہ کی عبادت ایمان اور حسبۃ للہ کی حالت میں کی اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے"۔

اسلام محض ظاہری رسومات اور اشکال کا نام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عبادت کے سلسلے میں فرمایا۔

ایمانا و احتسابا "یعنی ایمان اور اخلاص کے ساتھ" تاکہ یہ قیام و عبادت اعلیٰ مقاصد کے لیے ہو جو اس رات میں متعین ہوئے اور احتساب کے طور پر یعنی خالص اللہ کے لیے ان دو شرائط سے انسانی دل میں ایسے حقائق جاگزیں ہوتے ہیں۔ جو انسان کو ان معانی کے ساتھ مربوط کر دیتے ہیں جن کے لیے قرآن نازل ہوا۔

اسلامی نظام زندگی کا یہ طریقہ ہے کہ وہ ایمان و عمل' ضمیر کے اندر موجود معتقدات اور عملی عبادات کے درمیان ربط پیدا کرتا ہے اور نظام عبادات اس طرح تجویز کرتا ہے جس کے ذریعہ انسان کے ضمیر و شعور میں وہ عقائد اچھی طرح مستحکم ہو جائیں اور زندہ شکل میں موجود ہوں اور یہ نظریہ و عقائد محض افکار کی حد تک محدود نہ ہوں بلکہ ان کا عملی اور زندہ اظہار بھی ہو۔

یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اسلامی نظام زندگی اور نظام عبادت دراصل ایک بہترین نظام ہے جو ان حقائق کو زندہ کرتا ہے اور انسانی ضمیر و شعور میں بھی اور عمل اور طرز عمل میں بھی زندہ اور متحرک کرتا ہے' ان حقائق کا محض ذہنی ادراک' بغیر عمل و عبادت کے' ان عقائد و نظریات کو ثبات و قرار نہیں بخش سکتا۔ عبادات و عمل کے بغیر نہ فرد کی زندگی اور نہ سوسائٹی میں یہ حقائق زندہ اور متحرک ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لیلۃ القدر کی یہ یاد اور اس میں ایمان اور خلوص کے ساتھ عبادت کرنے کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ اسلامی نظام زندگی کے منہاج اور طریقہ کار کا ایک خاص پہلو ہے۔

--- ○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ البینۃ ۔ ۹۸

## ۱-- تا -- ۸

# سورۃ البینۃ ایک نظر میں

قرآن کریم کے اکثر نسخوں اور اکثر روایات میں اسے مدنی سورتوں میں شمار کیا گیا ہے ' جبکہ بعض روایات ایسی بھی وارد ہیں کہ یہ مکی ہے ۔ روایات کے اعتبار سے اور اسلوب بیان کے اعتبار اس کے مدنی ہونے کو زیادہ ترجیح ملتی ہے ۔ جبکہ اس کا مکی ہونا ممکن نہیں ہے ۔ صرف اس وجہ سے کہ اس میں زکوٰۃ کا ذکر ہے یا اہل کتاب کا ذکر ہے ۔ یہ اس کے مکی ہونے کے مانع نہیں ہے ' کیونکہ بعض دوسری سورتیں جو یقیناً مکی ہیں ان میں بھی اہل کتاب کا ذکر ہے ۔ مکہ میں اہل کتاب موجود تھے ' جن میں سے بعض ایمان بھی لائے تھے اور بعض ایمان نہ لائے تھے ۔ نیز نجران کے عیسائی بھی ایک وفد کی صورت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں آکر ملے تھے اور ایمان بھی لائے تھے اسی طرح زکوٰۃ کا تذکرہ بھی مکی سورتوں میں پایا جاتا ہے ۔

یہ سورت کئی تاریخی اور ایمانی حقائق ہمارے سامنے رکھتی ہے ۔ لیکن اس کا اسلوب ایک قرارداد کے اسلوب میں ہے ' اور یہ اسلوب ہی اس رائے کو ترجیح دیتا ہے کہ یہ مدنی ہے جہاں بات فیصلہ کن اور معاملات و امور طے کرنے کے انداز میں ہوتی تھی ۔

اس سورت میں پہلی حقیقت یہ بیان کی جاتی ہے کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس لیے ضروری ہوگئی تھی کہ ان کو واپس لاکر صراط مستقیم پر قائم کیا جائے اور ان کے اندر جو تفرقے اور اختلافات پیدا ہوگئے تھے وہ اس رسالت کے بغیر درست نہ ہو سکتے تھے :

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ (۱) رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً (۲) فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۳) (۹۸ : ۱ تا ۳) " اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے ' (وہ اپنے کفر سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس دلیل روشن نہ آجائے (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہیں "۔

دوسری حقیقت یہ بیان ہوتی ہے کہ اہل کتاب نے اپنے دین میں اختلاف اس وجہ سے نہیں کیا کہ ان کے دین میں کچھ مشکلات تھیں ' بلکہ صحیح علم ان کے پاس آگیا تھا اور ہر مسئلے پر صحیح دلائل بھی ان کے ہاں موجود تھے ۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ (۹۸ : ٤) " پہلے جن

لوگوں کو کتاب دی گئی تھی' ان میں تفرقہ برپا نہیں ہوا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح بیان آ چکا تھا"۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ تمام ادیان اپنے اصل کے اعتبار سے ایک ہیں' ان کے بنیادی قواعد اور اصول ایک ہیں اور سادہ اور قابل فہم ہیں' ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہوا کرتی جس سے اختلاف پیدا ہوں کیونکہ دین کی بنیادیں سادہ اور قابل فہم ہوتی ہیں۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (۹۸ : ۵) "اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں' اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے' بالکل یک سو ہو کر' اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں۔ یہی نہایت صحیح و درست دین ہے"۔

اور چوتھی حقیقت یہ ہے کہ دلائل آ جانے کے بعد جو لوگ کفر کریں گے وہ تمام لوگوں میں سے بد ترین ہیں اور جو لوگ اس آخری رسالت کو تسلیم کریں گے وہ بہترین لوگ ہیں۔ اس لیے دونوں قسم کے لوگوں کا انجام بھی مختلف ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ (۶) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ (۷) جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ (۸) (۹۸ : ۶ تا ۸) "اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ یقیناً جہنم کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے' یہ لوگ بد ترین خلائق ہیں۔ جو لوگ ایمان لے آئے اور جنہوں نے نیک عمل کیے' وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں۔ ان کی جزا ان کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ کچھ ہے اس شخص کے لیے جس نے اپنے رب کا خوف کیا ہو"۔

یہ ہیں وہ چار بنیادی حقائق جو اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام عقائد اور آخری رسالت میں اور اسلامی نظام ایمانیات و عمل میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

---ooo---

# درس نمبر ۲۹۸ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۸

سُوْرَةُ الْبَيِّنَةِ (۹۸) مَدَنِيَّةٌ (۱۰۰) اٰيَاتُهَا ۸ رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴿۱﴾ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ﴿۲﴾ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے' (وہ اپنے کفر سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس دلیل روشن نہ آجائے (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ زمین کو ایک جدید رسالت کی ضرورت تھی۔ اس زمین میں ہر طرف شر و فساد عام ہو گیا تھا اور مذاہب عالم کا حال تھا کہ ان کی اصلاح ممکن ہی نہ رہی تھی۔ ایک جدید دین اور جدید رسالت کی ضرورت تھی۔ ایک نئی تحریک اور نئے نظام کی ضرورت تھی۔ اہل زمین کے عقائد و نظریات میں کفر سرایت کر چکا تھا' چاہے وہ اہل کتاب ہوں جن کو صحیح سماوی دین دیئے گئے تھے مگر انہوں نے جاننے کے بعد انہیں بھلا دیا تھا اور دین میں مکمل تحریف کر دی تھی' چاہے وہ جزیرۃ العرب کے مشرک ہوں اور اس سے باہر کے مشرک ہوں۔ دونوں کفر کی حالت میں داخل ہو گئے تھے۔

یہ کفر اور تحریف کے جس مقام پر پہنچ چکے تھے' وہاں سے ان کی واپسی ممکن نہ تھی' ان کی اصلاح صرف ایک جدید دین ہی کے ذریعہ ہو سکتی تھی' صرف ایک ایسے رسولؐ کے ذریعہ جو بذات خود ایک مبین دلیل ہو' اور اس کے پاس اپنی کتاب ہو جو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہو۔

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً (۹۸ : ۲) "یعنی اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے

پڑھ کر سنائے"۔ یہ صحیفے شرک اور کفر سے پاک ہوں۔

فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۹۸ : ۳) "جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔" "کتاب" کا لفظ موضوع اور مضمون پر بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً کتاب الطہارہ، کتاب الصلوۃ اور کتاب القدر۔ کتاب القیامہ، صحف مطہرہ سے مراد یہ قرآن ہے۔ جس میں راست اور درست کتابیں ہیں یعنی موضوعات و مسائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ رسالت اور یہ رسول نہایت وقت پر آئے۔ اور یہ صحیفے، یہ سورتیں اور یہ موضوعات تحن اور مسائل آئے تاکہ زمین کے اندر ایسی انقلابی اصلاح کریں جس کے سوا اصلاح کی کوئی اور صورت ممکن ہی نہ تھی۔ اس دور میں دنیا کو اس رسولؐ اور اس پیغام اور اس کتاب کی ضرورت کیونکر تھی؟ اس کا جواب میں ایک عظیم اسلامی مفکر سید ابو الحسن علی ندوی کی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کے ایک اقتباس سے دوں گا۔ یہ اقتباس نہایت مختصر اور موضوع پر واضح ہے۔ وہ باب اول کے فصل اول میں لکھتے ہیں :

چھٹی صدی عیسوی بلا اختلاف تاریخ انسانی کا تاریک ترین اور پست ترین دور تھا، صدیوں سے انسانیت جس پستی اور نشیب کی طرف جا رہی تھی۔ وہ اپنے آخری نقطے تک پہنچ چکی تھی اور روئے زمین پر اس وقت کوئی طاقت نہ تھی جو گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑ سکے اور ہلاکت کے غار میں گرنے سے اسے روک سکے۔ انسانیت کی حالت یہ تھی کہ نشیب کی طرف جاتے ہوئے روز بروز اس کی رفتار تیز ہو رہی تھی۔ انسان اس صدی میں خدا فراموش ہو کر، کامل طور پر خود فراموش بن چکا تھا۔ وہ اپنے انجام سے بالکل بے فکر اور بے خبر اور برے بھلے کی تمیز سے قطعاً محروم ہو چکا تھا۔ پیغمبروں کی دعوت کی آواز، عرصہ ہوا، دب چکی تھی۔ جن چراغوں کو یہ حضرات روشن کر گئے تھے وہ ہواؤں کے طوفان میں یا تو بجھ چکے تھے۔ یا گھٹاٹوپ اندھیرے میں اس طرح ٹمٹما رہے تھے جن سے چند خدا شناس دل ہی روشن تھے۔ جو شہروں کو تو کیا روشن کرتے، چند گھروں کو بھی پوری طرح روشن نہ کر سکتے تھے۔ دین دار اشخاص دین کی امانت کو اپنے سینے سے لگا کر، زندگی کے میدان سے کنارہ کش ہو کر دیر و کلیسا اور صحراؤں اور غاروں میں تنہائیاں اختیار کر چکے تھے اور زندگی کی کشمکش، اس کے مطالبات، اور اس کی خشک اور تلخ حقیقتوں سے دامن بچا کر دین و سیاست اور روحانیت اور مادیت کے معرکہ میں شکست کھا کر، اپنے فرائض قیادت سے دستکش ہو گئے تھے اور جو زندگی کے اس طوفان میں رہ گئے تھے، انہوں نے بادشاہوں اور اہل دنیا سے ساز باز کر لی تھی، اور ان کی ناجائز خواہشات اور ظالمانہ نظام سلطنت اور ظالمانہ نظام معیشت ان کے معاون ہو گئے تھے اور لوگوں کے مال کھانے اور ان کی قوت اور دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں ان دنیا داروں کے شریک و سہیم ہو گئے تھے"۔

"اس دور میں بڑے بڑے مذاہب بازیچہ اطفال بن گئے تھے اور منافقین کے لیے یہ مذاہب تختہ مشق بنے ہوئے تھے۔ ان مذاہب کی ظاہری صورت اور معنوی حقیقتوں کو اس حد تک مسخ کر دیا گیا تھا کہ اگر ان کے بانیاں اور داعیان کے لیے اس صدی میں آنا ممکن ہوتا اور وہ دیکھ سکتے کہ ان کے مذاہب کا کیا حشر ہوا ہے تو وہ ہرگز ان مذاہب کو پہچان ہی نہ سکتے۔ تہذیب و تمدن کے گہواروں میں خود سری، بے راہ روی اور اخلاقی گراوٹ پیدا ہو گئی تھی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ تمام اقوام اپنے اندرونی اختلافات و مسائل میں الجھ کر رہ گئی تھیں۔ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے نہ ان کے

پاس کوئی پیغام تھا اور نہ انسانیت کے لیے کوئی دعوت تھی' درحقیقت یہ اقوام اور مذاہب اندر سے پوری طرح کھوکھلے اور بودے ہو چکے تھے ۔ان کی زندگی کے سوتے خشک ہو چکے تھے ۔ان کے پاس نہ دینی ہدایات اور تعلیمات تھیں اور نہ نظام حکومت کے لیے کوئی معقول اصول تھے"۔ (کتاب مذکور' ص ۲۷' ۳۸ و ص ۲۹' ۳۰)

یہ تیز رفتار جھلک 'بعثت محمدیؐ' سے قبل دنیا کے ادیان کی حالت کی نہایت ہی اچھی اور مختصر تصویر دکھاتی ہے ۔ اہل کتاب اور مشرکین جن نکات کی وجہ سے کفر کی سرحدوں میں داخل ہو گئے تھے ۔ قرآن کریم نے ان کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے ' مثلاً یہودیوں اور نصاریٰ کے بارے میں قرآن نے یہ تصریح کی ہے ۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ (۹ : ۳۰)

"یہود نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے عیسائیوں نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے"۔ اور دوسرے مقام پر ہے ۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ (۲ : ۱۱۳) "یہود نے کہا کہ نصاریٰ کی کوئی دینی حیثیت نہیں ہے اور نصاریٰ نے کہا کہ یہودیوں کی کوئی دینی بنیاد نہیں ہے"۔

اور یہودیوں کے بارے میں سورۃ مائدہ آیت ۶۴ میں یہ ہے ۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ (۵ : ۶۴) "یہود کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں' ان کے ہاتھ بندھ جائیں اور ان کی اس بات کا سبب ان پر لعنت ہو' بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں ۔ وہ خرچ کرتا ہے جس طرح چاہتا ہے"۔

اور مائدہ ۷۲ میں ہے ۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (۵ : ۷۲) "یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہے" اور

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (مائدہ : ۷۳) "یقیناً کافر ہوئے وہ لوگ جنہوں نے کہا اللہ تین کا تیسرا ہے"۔

اور مشرکین کے بارے سورہ الکافروں میں ہے :

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (۱) لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (۲) وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (۳) وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ (۴) وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (۵) لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (۶) (۱۰۹ : ۱ تا ۶) "کہہ دو اے کافرو' میں ان کی عبادت نہیں کرتا' جن کی عبادت تم کرتے ہو' اور نہ تم

عبادت کرتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں' اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو' اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے"۔ یہ اور دوسری آیات جن میں مشرکین اور دوسرے کفار کی طرف اشارہ ہے۔

اور اس کفر کے نتیجے میں دنیا کے اطراف و اکناف میں شروفساد اور تخریب و زوال عام تھا۔ مولانا ندوی کے الفاظ میں :"خلاصہ یہ کہ ساتویں صدی عیسوی میں روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہ آئی تی جو مزاج کے اعتبار سے صالح کہی جا سکے اور نہ ایسی کوئی سوسائٹی تھی جو شرافت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کی حامل ہو' نہ ایسی کوئی حکومت تھی جس کی بنیاد عدل اور انصاف اور رحم پر ہو' اور نہ کوئی ایسی قیادت تھی جس کے پاس کوئی علم و حکمت ہو' نہ دنیا میں کوئی ایسا دین تھا جسے صحیح دین انبیاء کہا جا سکتا ہو' اور ان کی تعلیمات اور خصوصیات کا حامل ہو"۔

یہ وہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے اللہ کی رحمت کا تقاضا ہوا کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لیے ایک ایسا رسول بھیجے' جو پاکیزہ صحیفے پڑھے' جن کے اندر نہایت ہی راست اور درست تعلیمات ہوں۔ حقیقت یہ کہ مشرکین اور اہل کتاب کے کفار' ایک ایسی نئی رسالت اور ایسے دین کے سوا کسی صورت میں بھی اس شروفساد اور اس زوال وگراوٹ سے نکل نہ سکتے تھے۔

یہاں قرآن مجید اس بات کی وضاحت کر دیتا ہے کہ اہل کتاب نے جو انحراف کی راہ لی یا باہم اختلافات کیے تو یہ جہالت کی وجہ سے نہ تھے۔ یا اس وجہ سے نہ تھے کہ دین سماوی کی تعلیمات میں کچھ پیچیدگی یا اجمال تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ صحیح علم ان کے پاس آ چکا تھا' حق کے دلائل ان کے پاس موجود تھے اور اس کے باوجود انہوں نے باہم اختلاف کیا :

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝

"پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی ان میں تفرقہ برپا نہیں ہوا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس (راہ راست) کا بیان واضح آ چکا تھا"۔

پہلا اختلاف تو یہودیوں کے درمیان ہوا' یہ اختلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے قبل ہوا۔ یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور کئی فرقے اور پارٹیاں بن گئے۔ حالانکہ ان کا رسولؐ ایک تھا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی کتاب بھی ایک تھی یعنی تورات۔ یہ پانچ فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ مثلاً صدوقی' فریسی' آسین' غالی اور سامری۔ ان فرقوں میں سے ہر ایک کے اپنے اپنے عقائد' خصائص اور اپنا اپنا رخ تھا اور جب عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو یہودی اور عیسائی تنازعہ شروع ہو گیا۔ حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل میں سے آخری نبی تھے اور آپؑ نے تورات کی تصدیق فرمائی۔ یہودی اور مسیحی اختلافات اس قدر بڑھے کہ یہ دشمنی اور عداوت کی شکل اختیار کر گئے۔ اور دونوں فریقوں کے درمیان شدید نفرت پیدا ہو گئی اور اس کے نتیجے میں جو قتل عام ہوتا رہا ہے وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ یہ ایسا قتل عام تھا کہ جب انسان ان واقعات کو آج بھی پڑھتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

"چھٹی صدی کے آخر میں یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی رقابت اور منافرت اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ ان میں سے

کوئی دوسرے فریق کو ذلیل کرنے اور اس سے اپنی قوم کا انتقام لینے اور مفتوح کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرنے میں 'کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا تھا۔ ۶۱۰ء میں یہودیوں نے انطاکیہ میں عیسائیوں کے خلاف بلوہ کیا' شہنشاہ موتاس نے ان کی سرکوبی کے لیے مشہور فوجی افر بنو سوس کو بھیجا۔ اس نے پوری پوری آبادی کا اس طرح خاتمہ کیا کہ ہزاروں کو تلوار سے' سینکڑوں کو دریا میں غرق کر کے آگ میں جلا کر اور درندوں کے سامنے ڈال کر ہلاک کر دیا"۔ (دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر' ص ۲۷)

"مقریزی کی کتاب الخطط میں ہے 'فوقاس روم کے شہنشاہ کے زمانے میں ایران کے شہنشان کسریٰ نے شام اور مصر پر فوج کشی کی۔ اس فوج نے بیت المقدس' فلسطین اور شام کے گرجاؤں کو مسمار کیا اور شام کے تمام عیسائیوں کو قتل کر دیا۔ پھر وہ عیسائیوں کی تلاش میں مصر آیا' جہاں اس کی فوج نے عیسائیوں کو بہت بڑی تعداد میں قتل کیا اور بے حد و حساب افراد کو قید کر لیا۔ عیسائیوں کے خلاف اس جنگ میں اور گرجاؤں کو مسمار کرنے میں یہودیوں نے ایرانیوں کی مدد کی اور وہ طبریہ 'جبل الجلیل' قریہ' ناصرہ' صور اور بلاد قدس سے ایرانیوں کے پاس آئے اور انہوں نے عیسائیوں سے خوب انتقام لیا اور انہیں اذیت رسانی' اور قتل و غارت گری کا نشانہ بنایا۔ قدس میں ان کے دو گرجاؤں کو مسمار کر دیا اور تمام مکانات کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ مقدس عود صلیب کا ٹکڑا ساتھ لے گئے اور قدس کے پوپ اور ان کے بہت سے ساتھیوں کو قید کر لیا"۔

یہی مصنف قدس مفتوح ہونے کا ذکر یوں کرتا ہے :"اس اثنا میں یہودیوں نے صور کے شہر میں بغاوت کر دی۔ انہوں نے اپنے نمایندوں کو دوسرے شہروں میں بھیجا۔ چنانچہ یہودیوں نے عیسائیوں پر شدید حملہ کرنے اور انہیں قتل کر ڈالنے کے عہد و پیمان کیے۔ اس کے بعد دونوں فریقوں میں جنگ چھڑ گئی۔ یہودی بیس ہزار کی تعداد میں مجتمع ہو کر حملہ آور ہوئے اور انہوں نے صور کے باہر کے گرجاؤں کو مسمار کر دیا۔ اس پر عیسائیوں نے کثیر تعداد میں جمع ہو کر یہودیوں پر حملہ کیا۔ یہودیوں کو شکست فاش ہوئی اور ان کی بہت بڑی تعداد مقتول ہوئی۔ اس زمانے میں ہرقل قسطنطنیہ میں روم کا فرماں روا ہوا۔ اس نے ایک تدبیر سے جو اس نے شاہ ایران کے خلاف کی ایرانیوں کو شکست دے دی اور وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ اس فتح کے بعد ہرقل قسطنطنیہ سے روانہ ہوا تاکہ شام اور مصر کا نظم حکومت درست کرے۔ اور ایرانیوں نے جن مقامات کو تباہ و برباد کیا ہے' ان کی تعمیر نو کرے۔ یہودی طبریہ سے آکر ہرقل کے پاس حاضر ہوئے' اسے گراں قدر تحفے دیئے اور اس سے حلفیہ امان طلب کی۔ ہرقل نے انہیں حلفیہ امان دے دی۔ اس کے بعد ہرقل بیت المقدس پہنچا۔ عیسائیوں نے انجیلوں' صلیبوں' بخور اور جلتی ہوئی مشعلوں سے اس کا استقبال کیا۔ ہرقل نے شہر اور اس کے گرجاؤں کو برباد پایا' جس سے اسے شدید صدمہ ہوا۔

عیسائیوں نے ہرقل کو بتایا کہ کس طرح یہودی ایرانیوں کے ساتھ مل کر عیسائیوں کے خلاف حملہ آور ہوئے۔ انہیں قتل کیا اور ان کے گرجاؤں کو مسمار کیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ قتل و غارت گری میں وہ ایرانیوں سے بھی بدتر تھے اور انہوں نے عیسائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کمی نہ کی۔ عیسائیوں نے ہرقل کو ابھارا کہ وہ یہودیوں کی بیخ کنی کرے اور اس کے اچھے پہلو اس کے سامنے واضح کیے۔ ہرقل نے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ وہ انہیں امان دے چکا ہے اور اس نے ان سے حلفیہ وعدہ کیا ہے۔ عیسائیوں کے پادریوں' پوپوں اور مشائخ نے فتویٰ دیا کہ یہودیوں کو قتل کرنے میں کوئی

گناہ نہیں ہے کیونکہ انہوں نے ہرقل سے یہ امان دھوکہ دے کر حاصل کی ہے' اس لئے کہ ہرقل کو یہ نہیں بتایا گیا کہ عیسائیوں پر کیا کیا مظالم ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ہرقل کے کفارے کے طور پر یہ سال ایک جمعہ کو روزہ رکھا کریں گے ۔ یہ روزہ لازمی ہو گا۔ اور تمام عیسائیوں کو اس کا پابند بنائیں گے ۔ تب ہرقل نے ان کی بات مان لی اور یہودیوں پر شدید حملہ کیا اور انہیں نیست و نابود کر دیا۔ چنانچہ مصر و شام کی رومی سلطنت میں کوئی یہودی زندہ نہ بچا۔ سوائے ان کے جو بھاگ کر کہیں چھپ گئے ۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں قومیں یہود و نصاریٰ سنگدل' انسانی خون بہانے کی ہوس اور دشمن کو تباہ کرنے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور اسی معاملے میں یہ کسی حد پر جاکر نہیں رکتے"۔ ماذا خسر العالم استاد ندوی' ص ۹ تا ۱۱' طبع اول)

اس کے بعد عیسائیوں کے درمیان اختلافات پیدا ہونا شروع ہو گئے' حالانکہ ان کی کتاب بھی ایک تھی' نبی بھی ایک تھا' سب سے پہلے ان کے اختلافات بنیادی عقائد میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد وہ فرقے فرقے بن گئے۔ یہ فرقے ایک دوسرے سے سخت نفرت کرتے' ایک دوسرے کے سخت دشمن بن گئے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات اور ماہیت کے بارے میں اختلافات پیدا ہوئے کہ ان کی ماہیت لاہوتی ہے یا ناسوتی۔ پھر ان کی ماں کی ماہیت کے بارے میں اختلافات رونما ہوئے۔ پھر ٹرینٹی یعنی تثلیث کے مسئلہ پر اختلافات ہوئے۔ ان کے خیال میں خداتیوں کا ایک تھا۔ قرآن کریم نے ان کے ان عقائد کو نقل کر کے واضح طور پر کہا ہے کہ یہ لوگ کافر ہو گئے ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (۵ : ۷۲) "یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تو یہی مسیح ابن مریم ہیں"۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (مائدہ : ۷۳) "یقیناً وہ لوگ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین کا تیسرا ہے"۔

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِىْ وَ اُمِّىَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (مائدہ : ۱۱٦) "اور اس بات کو یاد کرو جب اللہ قیامت کے دن عیسیٰ ابن مریم سے کہے گا' کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا خدا بنا لو"۔

ان اختلافات کے نتیجے میں وہ شدید ترین تنازعہ پیدا ہوا جو شام کے عیسائیوں اور روم اور مصر کے عیسائیوں کے درمیان پیدا ہوا۔ اس کا ایک فریق روم اور شام کے ملکانی عیسائی تھے اور دوسرا فریق مصر کا منوفیثی فرقہ تھا۔ ملکانی عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت مسیح کی فطرت کے دو اجزاء ہیں ایک ملکوتی اور دوسرا ناسوتی جبکہ مصر کے منوفیثی عیسائی کہتے تھے کہ ان کی ایک ہی فطرت ہے جو اس طرح فنا ہو گئی جس طرح سرکے کا ایک قطرہ سمندر میں گر کر فنا ہو جاتا ہے۔ چھٹی اور ساتویں صدی میں یہ اختلاف ان دو فرقوں کے درمیان بہت شدت اختیار کر گیا"۔ اور یوں نظر آنے لگا کہ یہ دو

فرقے نہیں بلکہ دو الگ الگ دین و مذہب ہیں ۔جس طرح یہودی اور عیسائی دو الگ الگ اہل مذہب ہیں اور ہر ایک دوسرے کے بارے میں یہ تصور کرتا ہے کہ اس کے مذہب کی کوئی بنیاد نہیں ہے"۔ (مسلمانوں کا عروج و زوال' ابو الحسن علی ندوی)

" ۶۲۸ء میں ہرقل نے ایرانیوں پر فتح پائی' اس کے بعد اس نے عیسائیوں کے باہم بر سرپیکار اور متحارک مسلکوں کو جمع کرنے اور ان کے اند موافقت اور مصالحت پیدا کرنے کی سعی کی ۔فیصلہ یہ ہوا کہ لوگ حضرت مسیح کی فطرت کے موضوع پر بحث کرنے سے پرہیز کریں کہ ان کی فطرت ایک تھی یا دو تھیں ۔وہ اس بات کا اقرار کریں کہ اللہ کا ارادہ اور فیصلہ ایک ہی ہے ۔ ۶۳۱ء کے اوائل میں یہ بات طے ہوگئی کہ مینوتھیلین مذہب ہی حکومت اور کلیسا دونوں کا سرکاری مذہب ہوگا۔ ہرقل نے مختلف فرقوں کو ختم کرکے ایک مسلک پر ہونے کی سعی کی اور اس کے لیے ہر حربہ استعمال کیا' مگر مصر کے قبطیوں نے اس بدعت اور تحریف سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا اور شدید مخالفت کی' اور اپنے پرانے عقیدے کو جاری رکھنے کے لیے جان کی بازی لگادی ۔یہ لوگ اس کے دشمن ہوگئے ۔ ہرقل نے دوبارہ مختلف فرقوں کو ایک کرنے کی کوشش کی ۔اس نے اس بات پر زور دیا کہ لوگ صرف اس پر متحد ہو جائیں کہ اللہ کا ارادہ ایک ہے ۔رہا یہ کہ اللہ کا ارادہ نافذ کس طرح ہوتا ہے ۔اس پر بحث نہ کی جائے ۔اس نے حکم دیا کہ اس موضوع پر کوئی مناظرہ نہ کیا جائے ۔ایک سرکاری پیغام مرتب کرکے مشرق کے اطراف و اکناف میں پھیلایا ۔اس سے بھی مصر کا مذہبی طوفان نہ رک سکا ۔اس پر اسے غصہ آیا اور دس سال تک وہ مصر کے لوگوں پر شدید ترین ظلم اور ستم کرتا رہا۔اس نے جو مظالم کیے ان کی روئیداد پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔لوگوں کو اذیت ناک سزا دی جاتی' پھر انہیں دریا میں غرق کر دیا جاتا۔ مشعل جلا کر ان کے جسموں پر بجھائی جاتی ۔یہاں تک کہ بدن کی چربی پگھل کر زمین پر گرتی ۔ریت کے بوروں میں قیدیوں کو بند کرکے دریا برد کر دیا جاتا اور اس طرح کی دوسری لرزہ خیز سزائیں دی جاتیں"۔ (ماذا احسر العالم ابوالحسن ندوی' ص ۲ تا ۵)

اہل کتاب کے درمیان یہ اختلافات اور یہ عداوتیں اس کے بعد تھیں کہ ان کے پاس دلائل آچکے تھے ۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنَةُ (۹۸ : ٤) لیکن یہ علم اور یہ دلائل ان کے لیے مفید نہ تھے' خواہش نفس اور گمراہی ان کو حق سے دور کرتی چلی جا رہی تھی ۔حالانکہ دین اپنی اصلی اور ابتدائی شکل میں بالکل واضح تھا اور دینی عقائد بالکل واضح اور صاف تھے ۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِیْنُ الْقَیِّمَةِ ۝

"اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں' اپنے دین کو اس کے لیے خالص کرکے' بالکل یکسو ہو کر' اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں ۔یہی نہایت صحیح و درست دین ہے"۔

یہ اصول تمام ادیان کا اصل الاصول ہے کہ اللہ وحدہ کی عبادت کرو' دین صرف اللہ کا ہو' شرک اور اہل شرک سے

دور ہو' نماز قائم کرو' زکوۃ ادا کرو۔

وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (۹۸ : ۵) "یہی نہایت صحیح اور درست دین ہے" یعنی انسانی ضمیر و شعور میں عقیدہ خالص ہو۔ صرف اللہ کی بندگی اور غلامی ہو' جو اس عقیدے پر مبنی ہو' اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا جائے' یعنی زکوۃ دی جائے۔ جس شخص نے بھی ان اصولوں کو حقیقت کا روپ دے دیا تو اس کا ایمان قائم ہو گیا' جس طرح اہل کتاب کو اس کا حکم دیا گیا تھا۔ اور جس طرح اللہ کے تمام رسولوں کو یہی حکم دیا گیا تھا اور تمام رسولوں اور امتوں کا دین دراصل ایک ہے' عقیدہ ایک ہے' جس پر تمام رسولوں کا اتباع رہا ہے اور اس عقیدے اور عمل میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس میں افتراق و اختلاف کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ بے حد صاف ستھرا' سادہ اور آسان ہے۔ لہٰذا اہل کتاب کے ہاں زیر بحث اور زیر جدال عقائد کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ اللہ کے دین میں وہ چیزیں ہیں۔

ان لوگوں کے پاس اس سے قبل ان کے رسولوں کے ذریعہ بھی دلائل آگئے تھے۔ اس کے بعد پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بھی یہ دلائل آگئے تھے جو پاکیزہ صحیفے پڑھتے ہیں اور ان کے سامنے ایسے عقائد پیش کرتے ہیں جو واضح' سادہ اور آسان ہے لہٰذا صحیح راستہ واضح ہو گیا اور جو لوگ کفر کرتے ہیں اور ایمان نہیں لاتے۔ ان کا انجام بھی واضح ہو گیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۞ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۞ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ
عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ
رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۞ ۸ ع

۲۳ "اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ یقیناً جہنم کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے' یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔ جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کیے' وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں۔ ان کی جزا ان کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ کچھ ہے اس شخص کے لیے جس نے اپنے رب کا خوف کیا ہو"۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری رسول ہیں اور جو دین لے کر آئے ہیں وہ آخری دین ہے اس سے قبل یوں تھا کہ جب بھی انسانیت گمراہ ہوتی اور راستے سے ہٹ جاتی اللہ رسول بھیج دیتا' یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا اور لوگوں کو وقفے وقفے سے مہلت ملتی رہی کہ لوگ اپنی اصلاح کر لیں لیکن اللہ کی مشیت کا تقاضا یہ ہوا کہ ایک جامع' مانع اور مکمل دین بھیج کر رسولوں کے اس سلسلے کو ختم کر دے۔ یہ آخری مہلت ہے۔ لوگ اس آخری دین کو قبول کر کے نجات پا لیں گے یا انکار کر کے ہلاک و برباد ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ کفر اور شرک شر کے قائم مقام اور شر کی علامت بن جاتا ہے اور شرکی

کوئی حد نہیں ہوتی اور ایمان خیر کا قائم مقام ہو جاتا ہے ۔ اور ایمان کے نتیجے میں خیر اپنی انتہاؤں تک پہنچ جاتا ہے ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ (۹۸ : ۶) "اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ یقیناً جہنم کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے' یہ لوگ بد ترین خلائق ہیں" ۔ یہ ایک قطعی حکم ہے اور اس میں کوئی جدل وجدال نہیں ہے ۔ اگرچہ اہل کتاب اور مشرکین کے بعض اعمال اچھے ہوں' بعض آداب خوب ہوں اور بعض تنظیمات مفید ہوں ۔ جب تک ان لوگوں کو حقیقت ایمان حاصل نہیں ہوتی ۔ اور وہ اس آخری دین اور آخری نبی پر ایمان نہیں لاتے ۔ اس اٹل حکم میں ہم محض لوگوں کے بعض ظاہری اچھے اعمال کی وجہ سے شک نہیں کر سکتے اس لیے کہ کفار کے اعمال دراصل نیکی اور بھلائی کے اصل سرچشمے سے دور ہوتے ہیں ۔ اور وہ ایک مضبوط اور درست نظام زندگی کا حصہ نہیں ہوتے ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ (۹۸ : ۷) "جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں" ۔ یہ بھی ایک قطعی حکم ہے جس میں کسی قیل و قال کی گنجائش نہیں ہے ۔ اس کی شرط بھی واضح' صاف اور اٹل ہے ۔ یعنی یہ کہ جو "ایمان" لے آئیں ۔ یہ نہ ہو کہ وہ کسی ایسی سرزمین میں پیدا ہوئے ہوں جو مسلمان سرزمین ہونے کی مدعی ہو' یا کسی ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے ہوں جس کا دعویٰ یہ ہو کہ وہ مسلمان گھرانا ہے یا محض یہ کہ کوئی چند کلمات ادا کرتا ہو' نہیں بلکہ ایسا ایمان جو زندگی کے اندر عملاً نمودار ہوتا ہو ۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ "اور انہوں نے نیک کام کیے" ۔ اور ان کا ایمان اور اقرار ایمان محض الفاظ اور کلمات ہی نہ ہوں' جو صرف ہونٹوں پر ہوتے ہیں' صالحات وہ افعال ہیں جن کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہو' جن میں اخلاق بھی ہوں' اعمال بھی ہوں اور طرز عمل اور معاملات بھی ہوں اور اعمال میں سب سے بڑا عمل یہ ہے کہ اللہ کی شریعت کو زمین پر قائم کیا جائے اور لوگوں کے درمیان فیصلے اللہ کی شریعت کے مطابق ہوں ۔ جو لوگ یہ کام کریں وہ ہیں بہترین خلائق ۔

جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا (۹۸ : ۸) "ان کی جزاء ان کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے" ۔ ایسے باغات جن کی نعمتوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہاں مکمل امن ہو گا ۔ اور ان کے فنا ہونے اور رک جانے کا کوئی خطرہ نہ ہو گا ۔ فنا ہونے اور امن و اطمینان کا ختم ہو جانا ہی دنیا کی تمام سہولیات اور طیبات کا مزہ خراب کر دیتا ہے اور ان تروتازہ باغوں کے نیچے نہروں کا بہنا اس طرف اشارہ ہے کہ ان باغات میں تازگی اور بہار دائمی ہوگی اور یہ زندگی اور جمال سے بھرپور ہوں گے ۔

اس دائمی نعمت و رحمت کی تصویر کشی میں سیاق کلام دو قدم اور آگے جاتا ہے ۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ (۹۸ : ۸) "اللہ ان سے راضی ہو

اور وہ اللہ سے راضی ہوئے"۔ یہ رضامندی اللہ کی جانب سے ہے اور یہ تمام نعمتوں سے برتر اور تمام خوشیوں سے تروتازہ ہے۔ خود ان اہل ایمان کے دلوں میں جو رضامندی ہے وہ رب کی رضامندی ہے۔ اور یہ رضامندی ہے کہ ان کے بارے میں تقدیر الٰہی جو فیصلہ کرتی ہے وہ اس پر راضی ہیں۔ اور اللہ نے ان پر جو انعامات کیے ہیں اس پر بھی وہ راضی ہیں اور اپنے اور اللہ کے درمیان پائے جانے والے تعلق پر بھی راضی ہیں۔ یہ ایسی رضامندی ہے کہ اس سے انسان گہری خوشی اور مسرت و اطمینان محسوس کرتا ہے۔ یہ انداز کہ "اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں"۔ ایک ایسا انداز ہے جس کی تعبیر کسی دوسرے الفاظ میں نہیں کی جا سکتی۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ (۹۸ : ۸) "یہ کچھ ہے اس شخص کے لیے جو اپنے رب کا خوف کرتا ہو"۔ یہ آخری تاکید ہے' یہ کہ یہ سب کچھ اس پر موقوف ہے کہ کسی کا تعلق باللہ کیسا ہے۔ اور اس تعلق کی نوعیت کیسی ہے۔ یاد رہے کہ کسی دل میں جب خدا کے خوف کا شعور پیدا ہوتا ہے تو یہ شعور انسان کو نیکی پر آمادہ کرتا ہے اور ہر قسم کی کج روی سے انسان کو روکتا ہے۔ یہی شعور ہے جو انسان کی آنکھوں کے سامنے سے تمام پردے ہٹا دیتا ہے۔ اور انسان کا دل اللہ واحد و قہار کے سامنے براہ راست کھڑا ہوتا ہے' اور اس شعور کی وجہ سے انسان کی عبادت اور اس کے اعمال صالحہ ہر قسم کی شرک' ریاکاری سے پاک ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ جو شخص اپنے رب سے ڈرتا ہے۔ اس کا دل غیراللہ کے ڈر سے خالی ہو جاتا ہے' کسی دوسرے کی رو رعایت وہ نہیں کرتا۔ یہ شعور انسان کو یہ یقین دلا دیتا ہے کہ اللہ تمام ایسے اعمال کو رد کر دیتا ہے جن میں اس کی رضامندی کے سوا کوئی اور جذبہ بھی ہو' اللہ غنی بادشاہ ہے' اس کے لیے تو خالص عمل ہو گا ورنہ وہ اسے رد کر دے گا۔

اس مختصری سورت میں یہ چار عظیم حقائق قلم بند کیے گئے ہیں اور قرآن نے ان حقائق کو اپنے مخصوص اسلوب میں بیان کیا ہے اور یہ اسلوب ان چند سطروں والی سورت میں بہت اچھی طرح نمایاں ہے۔

--- ○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ الزلزال ـ ۹۹

۱ --- تا --- ۸

# سورۃ الزلزال ایک نظر میں

بعض مصاحف اور بعض روایات کے مطابق یہ سورمدنی ہے اور بعض دوسری روایات کے مطابق یہ مکی ہے۔ ہمارے نزدیک وہ روایات قابل ترجیح ہیں جو کہتی ہیں کہ یہ سورت مکی ہے۔ اس کا انداز گفتگو اور اس کا موضوع دونوں یہ تقاضا کرتے ہیں کہ یہ مکی ہے۔ یہ سورت دراصل غافل دلوں کے لیے ایک سخت جھٹکا ہے۔ موضوع سخن ' انداز کلام اور منظرکشی اور لفظی اثرات سب کے سب انسانی قلوب کو جھنجھوڑتے ہیں۔ یہ سورت دراصل ایک چیلنج ہے ' ایک سخت پکار ہے جو زمین اور اہل زمین کے اندر ایک زلزلہ پیدا کر دیتی ہے۔ اور لوگ گویا مدہوش ہو جاتے ہیں اور جب وہ ہوش میں آتے ہیں تو وہ میدان حشر میں حساب و کتاب کے لیے اپنے آپ کو کھڑا پاتے ہیں اور چند مختصر فقروں میں یہ سب کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پورے پارے میں ایسا ہی انداز گفتگو ہے اور یہ سورت گویا اس انداز کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

---:():():---

# درس نمبر ۲۹۹ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۸

سورۃ الزلزال (۹۹) مدنیۃ (۹۳) آیاتہا ۸ رکوعہا ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝۱ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۝۲ وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا ۝۳ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝۴ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝۵

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی' اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی' اور انسان کہے گا کہ یہ اس کو کیا ہو رہا ہے؟ اس روز وہ اپنے (اوپر گزرے ہوئے) حالات بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اسے (ایسا کرنے کا) حکم دیا ہو گا۔

یہ ہے منظر قیام قیامت کا' اس دن زمین نہایت شدت سے ہلا ماری جائے گی اور ایک شدید زلزلہ برپا ہو گا اور زمین کے پیٹ کے اندر جو کچھ ہو گا' وہ اسے باہر پھینک دے گی اور اس نے ایک طویل عرصے سے انسانی جانوں کا جو بوجھ اٹھا رکھا ہو گا' یا اس کے اندر جو معدنیات ہوں گے وہ ان کو اٹھا کر باہر پھینک دے گی' گویا اس بوجھ کو باہر پھینک کر وہ ہلکی ہو جائے گی۔

یہ ایک ایسی تصویر کشی ہے کہ سننے والے اپنے پاؤں کے نیچے کھڑی ہر چیز متزلزل محسوس کرتے ہیں کہ وہ ڈگمگا رہے ہیں' لڑکھڑا رہے ہیں' ان کے قدموں کے نیچے سے زمین کانپ رہی ہے' دوڑ رہی ہے' یہ ایک ایسا منظر ہے جس کو دیکھ کر انسان ان تمام امور سے قطع تعلق کر لیتا ہے جو انسان کو اس زمین سے وابستہ کرتے ہیں اور جن کے بارے میں انسان یہ خیال کرتا ہے کہ وہ ثابت اور باقی ہیں۔ قرآن اس قسم کے مناظر سے جو اثرات قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ ان میں سے پہلا اثر ہے اور قرآن کی یہ منفرد آیات سنتے ہی یہ اثر انسان کے اعصاب تک منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ تاثر اس وقت اور گہرا ہو جاتا ہے۔ جب قرآن کریم میدان حشر میں کھڑے اس "انسان" کے تاثرات قلم بند کرتا ہے' جو ان مناظر کو دیکھ رہا ہو گا۔

وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا (۹۹ : ۳) "اور انسان کہے گا' یہ اس کو کیا ہو رہا ہے؟" یہ ایک ایسے شخص کا

سوال ہے جو ایک اچانک ' خوفناک منظر کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتا ہے ' جو ایسا منظر دیکھ رہا ہوتا ہے جو نادیدنی ہو ' جو ایسی صورت حالات سے دوچار ہوتا ہے جس کو وہ سمجھ نہیں پا رہا ہوتا ' اور ایک ایسے منظر کو دیکھ رہا ہوتا ہے ' جس پر وہ نہ خاموش ہو سکتا ہے ' اور نہ صبر کر سکتا ہے۔

مَالَهَا ( ۹۹ : ۳ ) "اسے کیا ہو گیا ہے"۔ کیا سبب ہے کہ ایک زلزلہ برپا ہے اور زمین ہے کہ مسلسل حرکت کر رہی ہے اور اس کے قدم ہی نہیں جمتے اور وہ ادھر ادھر لڑھک رہا ہے اور کوشش کر رہا ہے کہ جو سہارا ہاتھ میں آئے اسے لے ' لیکن اس کے ماحول میں ہر چیز حرکت کر رہی ہے ' اور شدید زلزلے کی زد میں ہے۔

انسان نے اس سے قبل زلزلے اور آتش فشانی کے عمل دیکھے ہوئے تھے اور زلزلے اور آتش فشانی کے دوران خوف اور بے چینی سے وہ دوچار رہا ہے۔ اس نے ہلاکتیں اور بربادیاں دیکھی ہیں لیکن جب وہ قیامت کا زلزلہ دیکھتا ہے تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ دنیا کے زلزلوں اور آتش فشانیوں اور اس کی موجودہ حادثے کے درمیان کوئی مماثلت نہیں ہے۔ یہ کوئی اور ہی عمل ہے ' کوئی اور ہی حادثہ ہے۔ اس حادثے کا کوئی حقیقی سبب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ نہ اس کی کوئی مثال ہے۔ یہ ایک نہایت ہی ہولناک واقعہ ہے اور پہلی مرتبہ پیش آ رہا ہے۔

يَوْمَئِذٍ ( ۹۹ : ٤ ) "اس دن"۔ جس دن یہ زلزلہ واقعہ ہو گا اور انسان اس کے سامنے دہشت زدہ ہو گا۔ اس دن۔

تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ( ۹۹ : ٤ ) "وہ اپنے (اوپر گزرے ہوئے) حالات بیان کرے گی"۔ اس دن یہ زمین اپنی خبریں دے گی اپنے حالات بتائے گی اور اپنی پوری کہانی بیان کرے گی۔

بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ( ۹۹ : ۵ ) "کہ تیرے رب نے اسے ایسا کرنے کا حکم دیا ہو گا"۔ اس کو حکم دیا ہو گا کہ وہ اپنی حرکت تیز کر دے اور اپنے سکان کو خوب جھٹکے دے اور اپنے اندر کی چیزیں باہر پھینک دے اور یہ کام وہ رب کے حکم کی اطاعت میں کر رہی ہے۔

وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ "اور وہ اپنے رب کے حکم کی اطاعت کرے گی اور اس کا حق یہی ہے"۔ لہٰذا وہ اپنے حالات بتائے گی۔ غرض یہ صورت حال اور یہ منظر اس بات کا خوب اظہار کر رہا ہے کہ اس وقت اللہ کے احکام و اشارات کیا ہوں گے۔

اب یہاں حالات ایسے ہیں کہ انسان ششدر رہ گیا ہے ' سورت کی گھن گرج اور زوردار بیان سے خوف و ہراس کی فضا ہے ' ہر سو دہشت اور حیرانی کا دور دورہ ہے۔ اضطراب اور بھگدڑ ہے ' ایسے حالات میں انسان کا سانس پھولا ہوا ہے۔ اور وہ پوچھ رہا ہے کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔

مَالَهَا ( ۹۹ : ۳ ) "اسے کیا ہو گیا ہے"۔۔۔ ایسے حالات میں جواب ایک نئے منظر کی صورت میں آتا ہے ' یہ ہے منظر حشر و نشر ' حساب و کتاب اور میزان و جزاء کا ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۞ فَمَنْ
يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۞ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا ١
يَّرَهٗ ۞ ع ٨
٢٣

"اس روز لوگ متفرق حالت میں پلٹیں گے تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں ۔ پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا"۔

ایک لمحہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ قبروں سے اٹھتے چلے آرہے ہیں۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ( ٩٩ : ٦ ) "اس روز لوگ متفرق حالت میں پلٹیں گے"۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مختلف گروہوں مختلف اطراف سے چلے آرہے ہیں ۔ یوں لگتا ہے کہ گویا وہ بکھری ہوئی ٹڈیاں ہیں ۔

كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ "گویا کہ یہ لوگ بکھری ہوئی ٹڈیاں ہیں" یہ ایک ایسا منظر ہے جو اس سے قبل انسان نے کبھی نہیں دیکھا 'یہ کہ لوگوں کی نسلیں 'اگلوں پچھلوں کی یہاں سے اور وہاں سے اٹھ رہی ہیں ۔ جس طرح دوسری جگہ آیا۔

يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا "وہ دن جبکہ زمین پھٹے گی اور وہ اس میں سے تیزی تیزی سے نکل بھاگیں گے"۔ منظر یوں ہے کہ تاحد نظر انسان ہی انسان نظر آتے ہیں ۔ جو قبروں سے اٹھ رہے ہیں اور تیزی سے بھاگ رہے ہیں ۔ کسی طرف کسی کو توجہ نہیں ہے ۔ آگے اور پیچھے 'دائیں اور بائیں کچھ نہیں دیکھ رہے ہیں ۔ نظریں اٹھی ہوئی ہیں ۔

مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ "پکارنے والے کی طرف سر اٹھائے تیزی سے دوڑ رہے ہیں"۔ گردنیں بلند کی ہوئی 'نظریں پھٹی ہوئی۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ( ٨٠ : ٣٧ ) "ہر شخص کو اس دن بس اپنی پڑی ہوگی"۔

یہ ایک ایسا منظر ہے جس کی تصویر کشی کسی انسانی زبان میں نہیں کی جاسکتی ۔ "ہولناک" اور "خوفناک" "حیرت زدہ کر دینے والا" اور "مدہوش کر دینے والا"۔ غرض یہ اور اس قسم کے تمام دوسرے الفاظ اس منظر کی تصویر کشی سے عاجز ہیں ۔ ہاں صرف خیال و تصور کو ہم کسی قدر آگے بڑھا سکتے ہیں اور اس منظر کی تصویر کشی میں الفاظ کی بجائے خیال کی جولانی ہو سکتی ہے ۔ اپنی وسعت اور طاقت کے حدود کے اندر اندر۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ( ٩٩ : ٦ ) "اس روز لوگ متفرق حالت میں پلٹیں گے تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں"۔ اور یہ پھر اس منظر سے بھی شدید تر بات ہے ۔ اف 'ان کے سامنے تو ان کے اعمال پیش ہو رہے ہیں! کیا یہ اپنے اعمال کا سامنا کر سکیں گے؟ کیا اس سزا کا مقابلہ کر سکیں گے ۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لیے بعض اوقات خود اپنے اعمال کا مقابلہ نہایت ہی تلخ ہوتا ہے ۔ انسان بعض اوقات خود اپنے اعمال کا

سامنا کرنے سے بھاگتا ہے حالانکہ لوگوں کو ان کا پتہ نہیں ہوتا' لیکن جب توبہ و ندامت کے وقت خود انسان کے اعمال اس کے سامنے آکر کھڑے ہوتے ہیں تو وہ سخت نادم ہوتا ہے' اپنی نفسیات' اپنے ضمیر سے بھاگتا ہے' چہ جائیکہ کھلی عدالت میں اسے پیش ہونا ہو اور سب کے سامنے اس پر فرد جرم لگتا ہو اور عدالت کا سربراہ رب ذوالجلال ہو جو جبار اور متکبر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی کو اس کا عمل دکھانا بھی دراصل ایک خوفناک سزا ہے' صرف یہ بات کہ کوئی اپنا جتھا دیکھے اور جو کچھ اس نے کیا ہے اس کا سامنا کرے۔ خصوصاً ایسے اوقات میں جبکہ حساب و کتاب ایسا ہو کہ اس میں ذرہ ذرہ درج ہو' نہ شر کا ذرہ چھوڑا گیا ہو اور نہ خیر کا ذرہ چھوڑا گیا ہو۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (۷) وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۹۹ : ۸) "پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اسے دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہو گی وہ اسے دیکھے گا"۔ پرانے مفسرین ذرے کی تفسیر مچھر کے برابر کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے ذرہ وہ اڑنے والا چھوٹا ایٹم ہے جو سورج کی روشنی میں نظر آیا کرتا ہے۔ دراصل اس دور میں یہ وہ چھوٹی سے چھوٹی مقدار تھی جس کا وہ لوگ تصور کر سکتے تھے لیکن آج کے جدید زمانے میں ہم جانتے ہیں کہ ذرہ کیا ہے۔ وہ ایک متعین جسم ہے اور یہ یہ ذرہ سے بہت چھوٹا ہے جو فضا میں اڑ رہا ہوتا ہے اور جو سورج کی روشنی میں نظر آتا ہے اس لیے کہ ہوا میں اڑنے والی یہ چھوٹی سی مقدار محض آنکھ سے دیکھی جا سکتی ہے۔ رہے ایٹم تو وہ صرف خوردبین کے ساتھ لیبارٹری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ سائنس دان اس ذرے کو دراصل اپنے ذہن اور عقل سے دیکھتے ہیں اور اس کے آثار کو آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ پس قیامت کے دن اس ذرے یعنی ایٹم جتنی بھلائی یا برائی کی کوئی بھی جزاء و سزا ہو گی۔ یہ چھوٹی سی نیکی اور بدی بھی اس کے کرنے والے کے سامنے پیش ہو گی۔ اور وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔

یہاں آکر ہر انسان چوکنا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے خیر و شر سے غافل نہیں رہتا' اور یہ نہیں کہتا کہ یہ تو چھوٹا سا عمل نیک ہے یا یہ تو چھوٹی سی برائی ہے اور اس کا کوئی حساب و کتاب نہ ہو گا۔ اس نہایت ہی باریک اور لطیف ترازو کے سامنے ہر شخص کانپ اٹھتا ہے کہ جہاں ذرے کو بھی تولا اور ناپا جائے گا۔

اس جہاں میں تو ایسی کوئی میزان نہیں ہے جو اس قدر ناقابل وزن ذرے کو بھی ناپ اور تول سکے۔ البتہ قلب مومن میں جو تقویٰ کا میزان ہے وہ ذرے کو ہی ناپتا اور تولتا ہے۔ کیونکہ ایک مومن تو ذرے کے برابر گناہ سے بھی ڈرتا ہے۔ افسوس کہ اس جہاں میں ایسے سخت دل بھی ہیں جو پہاڑوں جیسے جرائم سے بھی نہیں ڈرتے' بلکہ ایسے سنگدل لوگ بھی ہیں جو خیر کے ایسے ایسے پہاڑوں کو بھی مٹانے کے درپے ہیں جن کے سامنے اس زمین کے اونچے اونچے پہاڑ بھی ہیچ ہیں۔

یہ نہایت ہی سخت دل ہیں' پتھروں جیسے سخت۔ یہ پتھروں کی طرح زمین کے ساتھ چپٹے ہوئے ہیں اور یہ دل جب قیامت کے دن آئیں گے تو اپنے گناہوں کے بوجھوں کے نیچے پس کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ [1]

---

[1] یہ پیراگراف خود سید قطب پر صادق آتا ہے جسے قسی القلب ناصر نے اس جہاں سے مٹایا' حالانکہ وہ نیکی کے ایک بلند پہاڑ تھے۔

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ العٰدیٰت ۔ ۱۰۰

## ۱--- تا--- ۱۱

# سورۃ العٰدیٰت ایک نظر میں

اس سورت کا سیاق کلام نہایت سریع الحرکت جھلکیوں کے انداز میں چلتا ہے ۔ انداز نہایت سخت اور نہایت موثر ہے جس طرح کوئی ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف کودتا ہے یا چھلانگ لگاتا ہے' نہایت ہلکے انداز میں' تیزی کے ساتھ اور آگے بڑھتے ہوئے ۔ یہاں تک کہ یہ جھلکیاں آخر تک پہنچ جاتی ہیں ۔ آخری فقروں میں الفاظ' معانی' موضوع اور اثرات تھم کر پر سکون ہو جاتے ہیں' جس طرح گھوڑ دوڑ میں مقابلہ جیت کر دوڑنے والا آخر کار پر سکون ہو جاتا ہے ۔

ذرا غور سے دیکھیے اس منظر کو' صبح سویرے کا وقت ہے ۔ گھوڑے جنگجو سواروں کو لیے ہوئے تیزی سے دوڑ رہے ہیں اور ہانپ رہے ہیں ۔ ان کی ٹاپوں سے چنگاریاں اٹھ رہی ہیں' غبار دھویں کی طرح آسمانوں تک اڑ رہا ہے ۔ وہ دیکھو یہ سوار دشمن کی صفوں میں گھس گئے ۔ دشمن کو حملے کی توقع نہیں' دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی' جس کا منہ جدھر ہے ادھر بھاگ رہا ہے ۔

اس عجیب منظر کے کرداروں کی قسم کھاتے ہوئے' نفس انسانی کی ایک جھلک' کہ یہ سخت منکر اور کافر ہے' اور اس کے ساتھ ساتھ دولت کا پجاری ہے ۔

اور اس کے بعد ایک دوسرا منظر زمین اور قبرستان پھٹ رہے ہیں اور لوگ ان میں سے چیونٹیوں کی طرح باہر نکل رہے ہیں' پھر انسانی دل و دماغ پھٹ رہے ہیں اور ان میں پوشیدہ تمام راز اگلے جا رہے ہیں ۔

سورت کے آخر میں منظر یہ ہے کہ گرد و غبار چھٹ جاتا ہے ۔ انکار و جحود اور حرص و بخل ختم ہو جاتے ہیں ۔ لوگ تمام کے تمام قبروں سے نکل کر جمع ہو جاتے ہیں ۔ اور رب کے سب اللہ کے سامنے کھڑے ہیں ۔ اور آخری انجام یہ ہے ۔

اِنَّ رَبَّھُمْ بِھِمْ یَوْمَئِذٍ لَّخَبِیْرٌ (۱۰۰ : ۱۱) "یقیناً ان کا رب ان سے اس دن خوب باخبر ہے" ۔

الفاظ کے ترنم میں بھی سختی' خشونت اور کرختگی ہے ۔ اور یہ اس شور و شغب کی فضا سے ہم آہنگ ہے جو قبروں کی اکھاڑ اور لوگوں کے خروج سے پیدا ہوتی ہے ۔ یہ اس فضا سے بھی متناسب ہے جس میں دلوں سے خفیہ راز بڑی شدت سے نکالے جا رہے ہیں ۔ پھر انکار و ہٹ دھرمی اور بخل اور دولت پرستی کی فضا سے بھی ہم آہنگ ہے ۔ ان سب درشت معانی کی تصاویر کو سجانے کے لیے جو فریم تجویز ہوا ہے وہ قبروں سے نکلنے کے ہائے و ہو' اور ایسے تیز رفتار گھوڑ سواروں کے شور سے تیار ہوا ہے جن کے کھروں کی ٹکر سے چنگاریاں اٹھ رہی ہیں اور علی الصبح دشمن پر حملہ آور ہوتے ہیں' جو گرد و غبار اڑاتے ہیں' جو دشمن کے اندر جا گھستے ہیں اور دشمن کی توقع ہی نہیں ہوتی' غرض ان سخت و کرخت معانی کے لیے یہ مناسب فریم ہے ۔ گو فریم تصویر سے لی گئی ہے اور تصویر فریم کے کرخت میٹریل سے بنی ہے ۔ (التصویر الفنی فی القرآن)

---ooo---

# درس نمبر ۳۰۰ تشریح آیات

## ۱-- تا-- ۱۱

سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ مَكِّيَّةٌ — اٰيَاتُهَا ۱۱ — رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ﴿۲﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ﴿۳﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ
نَقْعًا ﴿۴﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ﴿۵﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ﴿۶﴾ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ
لَشَهِيْدٌ ﴿۷﴾ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ﴿۸﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"قسم ہے ان (گھوڑوں) کی جو پھنکارے مارتے ہوئے دوڑتے ہیں' پھر (اپنی ٹاپوں سے) چنگاریاں جھاڑتے ہیں' پھر صبح سویرے چھاپہ مارتے ہیں' پھر اس موقع پر گرد و غبار اڑاتے ہیں' پھر اسی حالت میں کسی مجمع کے اندر جا گھستے ہیں' حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے' اور وہ خود اس پر گواہ ہے' اور وہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے"۔

اللہ تعالیٰ یہاں سواروں کے دستے کی قسم اٹھاتے ہیں۔ ان کی ایک ایک جنگی حرکت کو ترتیب کے ساتھ لایا جاتا ہے۔ جب یہ دستہ اپنے حملے کا آغاز کرتا ہے اور تیز رفتاری کے ساتھ منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ گھوڑے پھنکار مارتے آگے جا رہے ہیں۔ یہ اپنے سموں سے پتھروں سے چنگاریاں نکالتے جاتے ہیں۔ پھر عین صبح کے وقت یہ دشمن پر ٹوٹ پڑتے ہیں' یہ حملہ نہایت سرعت کے ساتھ ہوتا ہے اور اچانک ہوتا ہے۔ حملے کے وقت گھوڑوں کی بھگدڑ سے غبار اڑتا ہے۔ کیونکہ دشمن حملے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور اس کی حرکات غیر مرتب ہیں' جب یہ دستہ دشمن کی صفوں میں خلاف توقع جا گھستا ہے تو سخت انتشار و اضطراب برپا ہو جاتا ہے۔

یہ کسی بھی حملے کے وہ پے درپے اقدامات ہیں جن سے عرب خوب واقف تھے۔ اس قسم کے دستے اور گھوڑوں کی حرکات کی قسم کھانے کا مطلب یہی ہوا کہ اسلام میں اس قسم کے معرکے بہت محبوب ہیں' یہ اللہ کو بھی محبوب ہیں' اللہ ایسی حرکات کو اچھی نظروں سے دیکھتا ہے اور یہ پسندیدہ قدریں ہیں۔

پھر' یہ مناظر اور جنگی ایکشن ان معانی سے زیادہ ہم آہنگ ہیں جن پر یہاں قسم اٹھائی جا رہی ہے' جیسا کہ ہم نے تبصرے میں وضاحت کی ۔جس مفہوم اور معنی پر قسم اٹھائی جا رہی ہے ۔یہ انسان کی ایک نفسیاتی بیماری ہے اور یہ انسان کو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب انسان نفسیات ایمان سے خالی ہوں ۔ قرآن مجید اس حقیقت کی طرف بار بار اشارہ کرتا ہے تا کہ لوگ اس کے خلاف جدوجہد کریں ۔اس لیے کہ اللہ کو معلوم تھا کہ انسانی نفسیات کے اندر یہ بیماری کس قدر گہری جڑیں رکھتی ہیں ۔اور انسانی شخصیت پر اس کے کتنے اثرات ہوا کرتے ہیں ۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (٦) وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ (٧) وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (٨) ( ١٠٠ : ٦ تا ٨ ) "حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے اور وہ خود اس پر گواہ ہے اور وہ مال اور دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے" ۔بے شک انسان اپنے رب کی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے اور اللہ کے فضل و کرم کا عملی انکار کرتا ہے ۔اور اس کی یہ ناشکری اور کفران نعمت کئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے ۔اس کے افعال سے اور اس کے اقوال سے' چنانچہ اس کے اعمال و اقوال ہی اس کے اس جرم پر گواہ ہوتے ہیں ۔گویا آفتاب آمد دلیل آفتاب' وہ اپنے اوپر خود گواہ بن جاتا ہے' اور قیامت میں بھی ایسا ہی ہو گا ۔

وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ( ١٠٠ : ٧ ) "وہ خود اس پر گواہ ہے" ۔اور ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ سچائی کی شہادت خود اپنے خلاف دے گا ۔جس میں کوئی شک اور نزاع نہیں ۔

وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ( ١٠٠ : ٨ ) "اور یہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے" ۔یہ اپنی جان اور اپنے مفاد کو بہت ہی محبوب رکھتا ہے ۔اس لیے اسے دولت کے ساتھ بہت محبت ہے' دولت کو یہاں "خیر" سے تعبیر کیا گیا ہے' کیونکہ انسان سمجھتا ہے کہ اس کی بھلائی مال و متاع اور اقتدار و حکومت میں ہے جو دنیا کے ساز و سامان ہیں ۔

یہ ہے انسان کی فطرت' یہ ہے اس کا مزاج اور یہ تب بدل سکتا ہے جب اس کے مزاج اور اس کی نفسیات میں ایمان داخل ہو جائے ۔ایمان کی وجہ سے اس کے تصورات' اس کی قدریں اور اس کے پیمانے ہی بدل جاتے ہیں ۔اس کی ترجیحات بدل جاتی ہیں ۔جب اس کی نفسیات میں ایمان داخل ہوتا ہے تو پھر انکار اور ناشکری اللہ کے فضل کے اعتراف اور شکر میں بدل جاتی ہے ۔جبکہ بخل اور دولت کی محبت' ایثار اور محبت سے بدل جاتی ہے ۔یہ ایمان انسان کو ایسی قدریں عطا کرتا ہے جن کے لیے انسان حرص' لالچ' منافست اور جدوجہد کرتا ہے ۔اور یہ قدریں مال و دولت اور اقتدار اور حکومت سے زیادہ بلند ہوتی ہیں' اور وہ تمام دنیاوی اور حیوانی قدروں سے برتر ہوتی ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان ایمان کے بغیر نہایت ہی چھوٹا اور حقیر ہوتا ہے' جس کی امیدیں حقیر' جس کی ترجیحات حقیر اور جس کے اہداف حقیر ہوتے ہیں اگرچہ بظاہر وہ بہت عظیم مقاصد نظر آئیں ۔جوں جوں انسان کا حرص اور اس کی طمع بڑھتی ہے اور جوں جوں اس کا لالچ شدید ہوتا ہے' اس کے مقاصد بلند ہوتے ہیں' وہ زمینی قدروں کے دلدل میں گرتا جاتا ہے ۔اس کی تمام سرگرمیاں اس عمر کے لیے ہوتی ہیں ۔وہ اپنی ذات کے اندر محدود اور قید ہو جاتا ہے اور اس قید سے اسے رہائی صرف اس صورت میں نصیب ہو سکتی ہے جب وہ اس دنیا سے ایک بڑی دنیا کے ساتھ مربوط ہو جائے ۔

جو اس دنیا سے بہت بلند اور دور ہے' جو اس کی ذاتی محدود دنیا سے بہت وسیع ہے ۔ وہ ایسی دنیا ہے جو اللہ ازلی کی تخلیق ہے' جس میں تمام امور اللہ ازلی و ابدی کی طرف لوٹتے ہیں ۔ اور جس میں اس محدود دنیا کی سرحدیں ایک وسیع اور لازوال دنیا سے جاملتی ہیں ۔

چنانچہ سورت کی آخری جھلک اسی کے بارے میں ہے 'تاکہ انکار اور ناشکری کا علاج ہو سکے 'تاکہ خود غرضی اور مفاد پرستی کی بیماری کا علاج کیا جاسکے تاکہ نفس پرستی کے قلعے کو توڑ کر حقیقی انسان کو اس سے رہائی دلائی جا سکے ۔ چنانچہ حشر و نشر کے منظر کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ انسان اس دنیا پرستی اور خود غرضی کو' مارے خوف کے بھول جائے اور خواب خرگوش سے بیدار ہو کر چوکنا ہو جائے ۔

أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ ﴿٩﴾ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ ﴿١٠﴾

"تو کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ (مدفون) ہے اسے نکال لیا جائے' اور سینوں میں جو کچھ (مخفی) ہے اسے برآمد کر کے اس کی جانچ پڑتال کی جائے گی"۔

یہ ایک شدید اور موثر منظر ہے ۔ قبروں سے انسانوں کا نکالا جانا' اس عمل کے لیے "بعثرہ" کا شدید لفظ لایا گیا ہے اور پھر اس منظر میں ان رازوں کو کھینچ کھینچ کر باہر نکالا جا رہا ہے جن کو نفوس انسانی نے دبائے اور چھپائے رکھا تھا ۔ حصلت کا لفظ اس کے لیے استعمال ہوا ہے کہ گویا سرکاری کارندے زبردستی حاصل کر رہے ہیں ۔ سرکاری تحصیل دار پہنچے ہوتے ہیں اور نہایت شدید پکڑ دھکڑ کا منظر ہے ۔

کیا انسان نہیں جانتا کہ اسے اس قسم کے منظر سے گزرنا ہے ۔ اسے کچھ یاد ہے ان حقائق کے بارے میں' یہ حقائق تو ہر انسان کی فطرت میں ہیں ۔ اگر اسے علم ہے اور یاد ہے تو بس اس کی اصلاح کے لیے تو یہی کافی ہے ۔ اس علم کا جواب نہیں دیا جاتا کہ اگر وہ جانتا تو کیا ہوتا؟ تم خود ہی سوچ لو کہ کیا ہوتا ۔ بہت کچھ ہو جاتا ۔ اگر انسان اس بات کو جانتا' بہت بڑے بڑے نتائج برآمد ہو جاتے' مجرد اس علم سے ۔ یہ سب حرکات اور یہ جھلکیاں ایک آخری سکون و قرار پر ختم ہوتی ہیں جس تک پہنچ کر ہر حرکت اور ہر بات اپنے ٹھکانے تک پہنچ جاتی ہے ۔ ١

۱۱ع إِنَّ رَبَّهُم بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ ﴿١١﴾

۲۵ "یقیناً ان کا رب اس روز ان سے خوب باخبر ہو گا"۔ سب لوگ رب کی طرف لوٹنے والے ہیں اور اس دن ان کے امور' ان کے رازوں اور ان کے حالات سے اللہ نہایت ہی اچھی طرح خبردار ہو گا ۔ اس دن کی قید نہیں ہے' اللہ تو ہر وقت اور ہر دن ان کے حالات سے خبردار ہے ۔ لیکن یہاں "یومئذ" کا لفظ نہایت موثر ہے ۔ اور اس کے آثار انسان کو اس دن کے بارے میں چوکنا کر دیتے ہیں ۔ یہ کہ اللہ اس دن خبردار ہو گا یعنی کوئی سزا سے نہ بچ سکے گا ۔ حساب و کتاب نہایت علم و خبرداری پر مبنی ہو گا ۔ یہی ضمنی مفہوم ہی یہاں اہمیت رکھتا ہے ۔ غرض یہ پوری سورت ایک ہی مسلسل منظر ہے ۔ ایک خوفناک و ہیبت ناک منظر' معانی' الفاظ اور انداز بیان سب کچھ بدل جاتا ہے اور یہ منظر اختتام پذیر ہوتا ہے اور یہ قرآن کے معجز انداز کلام کا ایک مخصوص پہلو ہے ۔

--- ○○○ ---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ القارعۃ ۔ ۱۰۱

## ۱-- تا-- ۱۱

# سورۃ القارعۃ ایک نظر میں

القارعہ کے معنی ہیں کھٹکھٹانے والی یعنی قیامت ' الطامہ ، الصاخہ ، الحاقہ ، الغاشیہ سب قیامت کے صفاتی معنی ہیں ۔ القارعہ قیامت کو اس لیے کہا گیا کہ یہ اپنی ہولناکیوں سے انسانی قلوب کو جھنجھوڑ دے گی اور خوفزدہ کر دے گی ۔

یہ پوری سورت ایک ہی خوفناک منظر پر مشتمل ہے ۔ اس کا مفہوم ' اس کے واقعات اور اس کا انجام سب کے سب کھٹکھٹانے والے ہیں ۔ یہ قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر ہے ۔ اس منظر میں انسان اپنی کثرت کے باوجود نہایت ہی چھوٹے اور حقیر نظر آتے ہیں ۔ ان کو اس میں ۔

كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ (۱۰۱ : ٤) بکھرے ہوئے پروانوں سے تشبیہ دی گئی ہے ۔ یہ اس طرح اڑتے ہیں ' اس طرح بکھرے پڑے ہیں اور سب کے سب موت کی آغوش میں چلے گئے ہیں جس طرح پروانے اڑ اڑ کر چراغ پر مرتے اور جلتے ہیں اور پھر ادھر ادھر بکھرے پڑے ہوتے ہیں ۔ اور اپنے اوپر کوئی قابو نہیں رکھتے ۔ نہ ان کے نزدیک اس ہلاکت کا کوئی مقصد ہے ' اور نہ وہ کوئی مقصد اپنے پیش نظر رکھتے ہیں اور نہایت ہی مضبوط اور اونچے پہاڑ اس طرح ہلکے اور اڑتے نظر آتے ہیں جس طرح دھنی ہوئی اون ۔ جسے ہوا کے جھونکے ادھر سے ادھر اڑاتے پھرتے ہیں ' یہاں تک کہ ایک سانس بھی ان کو اڑا لیتی ہے ۔ معانی کی جو تصویر اس فریم میں سجائی گئی ہے ۔ اسے القارعہ کا نام دینا نہایت ہی موزوں ہے ۔ یہ لفظ اپنی سخت آواز ' اپنے حروف کی سختی کی وجہ سے پہاڑوں اور انسانی دلوں کے کھٹکھٹانے کے مفہوم کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے اور انسانی قلب و شعور پر اس کے نہایت ہی اچھے اثرات پڑتے ہیں اور انسان آگے حساب و کتاب کے منظر کو دیکھنے کے لیے تیار ہوتا ہے ۔

--- ooo---

# درس نمبر ۳۰۱ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۱۱

سُورَۃُ القَارِعَۃِ مَکِّیَّۃٌ (۱۰۱) (۳۰) آیاتہا ۱۱ رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْقَارِعَۃُ ۝۱ مَا الْقَارِعَۃُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَۃُ ۝۳

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"عظیم حادثہ! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے"۔ بات کا آغاز ایک منفرد لفظ سے ہوتا ہے القارعہ۔ گویا یہ ایک گولہ ہے جو آگرتا ہے اس کی کوئی صفت یا کوئی خبر سیاق کلام میں نہیں ہے۔ یہ اس لیے تاکہ یہ لفظ اپنی آواز' اپنے اثر اور اپنی شدت سے فضا میں ایک گونج پیدا کر دے' جس کا ایک طویل اشارہ ہے۔ اس کے فوراً بعد پھر ایک سوال آتا ہے :

مَا الْقَارِعَۃُ (۱۰۱ : ۲) "کیا ہے وہ کھٹکھٹانے والی؟" گویا وہ ایک نامعلوم' پوشیدہ اور خوفناک بات ہے جو کئی سوالات کو جنم دیتی ہے۔ اس کے بعد پھر ایک سوال کے ذریعہ پہلے سوال کا جواب دیا جاتا ہے کہ تم نہیں جانتے کہ وہ کیا ہے؟

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَۃُ (۱۰۱ : ۳) "تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟" یہ اس قدر عظیم حادثہ ہو گا کہ تمہارے قیاس و ادراک کے دائرہ سے باہر ہے۔ تمہارا تصور اسے نہیں چھو سکتا۔

اب اس عظیم حادثہ کے کچھ واقعات بتا کر اس کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے۔ اس کی تعریف اور حقیقت بیان نہیں کی جاتی۔ کیونکہ اس کی حقیقت کا ادراک ممکن ہی نہیں ہے جیسا کہ پہلے کہہ دیا گیا اور واقعات یہ ہیں :

یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝۴ وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِھْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝۵

"وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون کی طرح ہوں گے"۔

یہ تو تھا اس کھٹکھٹانے والی اور عظیم حادثے کا پہلا منظر۔ اس کو دیکھتے ہی دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اڑنے لگتا ہے' انسان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور وہ یوں محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس دنیا کی ہر وہ چیز جس کا سہارا وہ لے سکتا تھا' اڑی

اڑی سی جارہی ہے ۔ وہ ہوا میں اس طرح اڑتی ہے جس طرح ذرے اڑ رہے ہوتے ہیں اور اچانک آخری اور مکمل خاتمہ سامنے آجاتا ہے ۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ۝ وَ اَمَّا
مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ ۝ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا هِیَهْ ۝ نَارٌ ۱
حَامِیَةٌ ۝ ۱۱ع
۲۶

"پھر جس کے پلڑے بھاری ہوں گے ' وہ دل پسند عیش میں ہوگا ' اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے اس کی جائے قرار گہری کھائی ہوگی اور تمہیں کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے ؟ بھڑکتی ہوئی آگ " ۔ ترازو کے پلڑوں کے بھاری ہونے اور خفیف ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ پیمانے جن کا اللہ کے ہاں اعتبار ہے اور وہ پیمانے جن کا اللہ کے ہاں کوئی وزن نہیں ہے ' یہی بات قرآن کریم کے مجموعی انداز بیان سے معلوم ہوتی ہے ۔ واللہ اعلم !

رہے وہ عقلی اور لفظی مباحث جو ان امور کے بارے میں مفسرین و متکلمین کرتے ہیں ۔ یہ قرآن کریم کے ساتھ ناانصافی ہے ۔ یہ مباحث وہی لوگ کرتے ہیں جو قرآن کریم کی حقیقی ترجیحات اور اہتمامات سے واقف نہیں ہوتے ۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ ( ۱۰۱ : ۶ ) "پھر جس کی قدریں اہم ہوں گی " اور اللہ کے ہاں وہ درست ہوں گی ۔

فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ( ۱۰۱ : ۷ ) "وہ دل پسند عیش میں ہوگا " ۔ اور اس عیش کی تفصیلات مجمل چھوڑ دی گئی ہیں ۔ یعنی ایسا عیش ہوگا جس پر وہ راضی ہوگا ' بہترین نعمت یہ ہے کہ کسی حالت پر انسان راضی ہو ۔

فَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ ( ۱۰۱ : ۸ ) "جس کے پیمانے ہلکے ہوئے " ۔ اللہ کے اعتبار اور معیار کے مطابق ۔

فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ ( ۱۰۱ : ۹ ) "تو اس کی ماں گہری کھائی ہے " ۔ ماں دراصل بچے کی جائے پناہ ہوتی ہے ' تو ایسے لوگوں کی جائے پناہ جہنم کی گہری کھائی ہوگی اس لیے یہ ان کی ماں ہوئی ۔ کیا ہی خوب انداز تعبیر ہے جو موقع و مقام کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے ۔ یہاں عذاب کو مجمل رکھا گیا ہے تاکہ آیت مابعد میں اس کی وضاحت ایسے انداز میں کی جائے جو بہت ہی موثر ہو ۔

وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا هِیَهْ ( ۱۰۱ : ۱۰ ) "اور آپ کو کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے " ۔ یہ قرآن کریم کا معروف انداز بیان ہے کہ کسی چیز کو ہولناک بنانے کے لیے یہ کہہ دینا کہ تمہیں کیا معلوم کہ وہ کیا ہے ؟

اور پھر اس کے بعد ایک جواب آتا ہے اور یہ آخری لمحہ ہوتا ہے ۔

نَارٌ حَامِیَةٌ ( ۱۰۱ : ۱۱ ) "یہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے " ۔ اور جن لوگوں کے پیمانے ہلکے اور ناقابل اعتبار ہوئے ' یہ گرم آگ ان کی ماں ہوگی ۔ اس ماں کی جھولی میں وہ آرام کریں گے اور وہاں آرام و راحت پائیں گے یا تم سمجھ گئے کہ اس ماں کے ہاں وہ کیا آرام پائیں گے جو گہری کھائی ہے اور جس کے اندر گرم آگ ہے ۔ یہ اچانک طنزیہ انداز اس قدر حقیقی ہے اور اس قدر تلخ ہے جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا ۔

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ التکاثر ۔ ۱۰۲

## ۱--- تا--- ۸

# درس نمبر ۳۰۲ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۸

اس سورت کی چوٹ نہایت جلیل القدر' خوفناک اور گہرے اثرات کی حامل ہے ۔ اس طرح جس طرح کسی ایسے شخص کی آواز ہوتی ہے جو لوگوں کو خطرے سے آگاہ کرتا ہے اور اونچی جگہ پر کھڑا ہے ۔ اور اپنی پوری قوت کے ساتھ چیخ رہا ہے اور وہ ایسے لوگوں کو خبردار کر رہا ہے جو سوئے ہوئے ہیں' غافل ہی نہیں بلکہ مدہوش ہیں اور گویا گہری نیند میں ہیں اور بغیر دیکھے آگے بڑھ رہے ہیں اور ایک گہری کھائی میں گرنے ہی والے ہیں ۔ ان کی آنکھیں بند ہیں' ان کے حواس معطل ہیں' اس لیے یہ خبردار کرنے والا اپنی پوری قوت سے چیلنج کر رہا ہے ۔

سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ مَكِّيَّةٌ (۱۶) (۱۰۲) اٰیَاتُهَا ۸ رُکُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴿۲﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔

"تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو"۔

اے حالت مدہوشی میں سرپٹ دوڑنے والو' اے لاپرواہی کی حالت میں مال اور اولاد کی کثرت اور دنیا کے سازوسامان کی بہتات کے لیے جدوجہد کرنے والو' تم تو ان سب چیزوں کو اسی جہاں میں چھوڑ کر جانے والے ہو' اے دنیا کی مشغولیتوں میں دھوکہ کھانے والو' اے مال و اولاد کو چھوڑ کر جانے والو' ایک ایسے چھوٹے سے گڑھے' قبر میں جانے والو' قبر میں تو نہ مال ہوگا' نہ اولاد ہوگی اور نہ وہاں کوئی فخر ہوگا اور اظہار برتری ہوگا' جاگو' اور دیکھو' غور کرو۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (۱) حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲ : ۲) "تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو"۔ لیکن قبر کی سیر کے بعد وہاں تمہارے لیے ایک خوفناک منظر ہے' نہایت سخت اور زوردار انداز میں ان

کے دلوں کو یوں کھڑ کھڑایا جاتا ہے۔

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٣﴾ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٤﴾

"ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ پھر (سن لو کہ) ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا"۔ ان خوفناک الفاظ کو مکرر کہا جاتا ہے اور اس تکرار کے بعد جو بھاری بات آتی ہے اس کی وجہ سے یہ تاکید نہایت گہری اور خوفناک ہو جاتی ہے اور یہ لوگ اس ہولناک امر کی حقیقت کو نہیں جانتے کیونکہ یہ مدہوشی میں ہیں اور رات دن دولت جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ﴿٥﴾

"ہرگز نہیں، اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اس روش کے انجام کو) جانتے ہوتے (تو تمہارا یہ طرز عمل نہ ہوتا)"۔

اب اس خوفناک حقیقت کو بیان کیا جاتا ہے۔

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ﴿٦﴾

"تم دوزخ دیکھ کر رہو گے"۔ اس کے بعد اس حقیقت کی تاکید کی جاتی تاکہ دلوں پر اس کا خوف طاری ہو۔

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ﴿٧﴾

"پھر (سن لو کہ) تم بالکل یقین کے ساتھ اسے دیکھ لو گے"۔ اور اب آخری ضرب ایسی سخت لگائی جاتی ہے کہ ایک غافل سے غافل انسان بھی بیدار ہو کر رہ جاتا ہے، چوکنا ہو جاتا ہے اور جو منہ کے رخ سرپٹ دوڑ رہا ہے وہ بھی ذرا رک کر اس طرف توجہ کرتا ہے اور بڑے سے بڑے مالدار کا عیش بھی مکدر ہو جاتا ہے، وہ کانپنے لگتا ہے اور اس کے دل پر ان نعمتوں کے حوالے سے خوف طاری ہو جاتا ہے۔

۸ ع ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ﴿٨﴾

۲۷ "پھر ضرور اس روز تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی"۔

تم سے پوچھا جائے گا کہ یہ نعمتیں تم نے کہاں سے حاصل کیں۔ کہاں ان کو خرچ کیا۔ کیا اللہ کی اطاعت کر کے حاصل کیا اور اللہ کی اطاعت میں خرچ کیا یا اللہ کی معصیت کر کے حاصل کیا اور معصیت میں خرچ کیا۔ حلال راستہ سے کمایا اور حلال راہ میں خرچ کیا یا حرام راستہ سے کمایا اور حرام میں خرچ کیا۔ کیا تم نے ان نعمتوں کا شکر ادا کیا؟ کیا ان کا حق ادا کیا۔ کیا اس میں دوسروں کو شریک کیا یا خود ہی استعمال کرتے رہے۔

یہ سوالات لازماً تم سے ہوں گے کہ یہ دولت کس طرح اکٹھی کی اور کس طرح تم نے اس پر تفاخر کیا۔ یہ دولت او،

یہ انعامات تمہیں اپنی مدہوشی اور غفلت کی وجہ سے ہلکی نظر آتی ہیں - اور کھیل نظر آتی ہیں لیکن ان کے پیچھے تو ایک بھاری ذمہ داری ہے اور ایک سخت جوابدہی ہے -

یہ سورت 'نہایت ہی مختصر سورت اپنی تفسیر آپ ہے - یہ انسانی احساس پر چھا جاتی ہے 'اسے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور انسانی قلب و نظر اس کی گرفت میں بوجھل نظر آتے ہیں - انسان یکدم دنیا کی حقیقت پاکر 'اس کی حقیر لذتوں اور کم قیمت ترجیحات کو چھوڑ کر فکر آخرت میں مشغول ہو جاتا ہے جبکہ عام لوگ جن کے دل ان حقائق اور اثرات سے فارغ ہوتے ہیں وہ ان حقیر چیزوں کے لیے مرمٹ رہے ہوتے ہیں -

یہ سورت اس دنیا کو اس طرح پیش کرتی ہے جس طرح ایک طویل فلم میں ایک سیکنڈ کی ایک جھلک -

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (۱) حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲ : ۲) "تم کو تکاثر کی دھن نے قبرستان پہنچایا" - ان چند الفاظ میں پوری دنیاوی زندگی کی جھلک دکھا کر اسے لپیٹ لیا جاتا ہے - پھر دائمی اور حیات جاوداں کی فلم چلتی ہے - طویل زمانے میں اور مجرمین ابد الاباد تک بوجھ اٹھاتے پھریں گے - یہ تصور نہایت ہی خوبصورت انداز تعبیر میں دیا جاتا ہے اور اصل حقیقت اور انداز بیان یکساں ہو جاتے ہیں -

ایک عظیم خوفناک اور گہرے معانی رکھنے والی سورت جو شخص بھی سمجھ کر پڑھے گا 'جس کے اثرات زمین سے طوفان کی شکل میں اٹھ کر فضاؤں میں جاکر دور بلند مطالع پر نمودار ہوتے ہیں 'جس کے معانی نہایت ٹھوس ہیں اور دل و دماغ کے سمندر میں نہایت ہی گہرائیوں میں جاکر قرار پکڑتے ہیں تو اس کا دل بوجھل ہو جاتا ہے - وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر زندگی کی ایک جھلک اور چمک 'اپنے نتائج و اثرات کے لحاظ سے کس قدر طویل ہے - تو ہر باشعور شخص اخروی زندگی کی طویل تیاری کی راہ پر چل نکلتا ہے - اور اس راہ میں پھر وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے حوالے سے بھی حساس ہو جاتا ہے -

--- ○○○ ---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ العصر ۔ ۱۰۳

## ۱-- تا-- ۳

# درس نمبر ۳۰۲ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۳

یہ مختصر سورت جو صرف تین آیات پر مشتمل ہے ' مکمل اسلامی نظام پیش کرتی ہے ۔ تمام انسانوں کے لیے اسلام کیا نظام چاہتا ہے ' یہ ایمانی تصور حیات کے نمایاں خدوخال کو نہایت اور دقیق شکل میں پیش کرتی ہے ۔ چند کلمات میں دستور حیات کو قلم بند کر دیا جاتا ہے ۔ امت مسلمہ کو بتا دیا جاتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے ؟ اس کے فرائض کیا ہیں اور یہ تمام صرف ایک آیت میں بتا دی گئی ہیں یعنی آیات تین ہیں ۔ یہ ہے قرآن مجید کا حقیقی اعجاز اور یہ اللہ ہی کی قدرت ہے جو ایسا کلام کر سکی ہے ۔

سوال یہ ہے کہ وہ عظیم حقیقت کیا ہے جسے یہ سورت ریکارڈ کرتی ہے اور وہ دستور حیات کیا ہے ؟ اور یہ دستور حیات پوری انسانیت کے لیے ہے اور یہ حقیقت تمام زمانوں میں یہی ہے کہ انسان کی کامیابی کا منہاج صرف ایک ہی ہے ' ایک ہی راستہ نجات کا ہے جسے یہاں پیش کر دیا گیا ہے ۔ صحیح راستے کے نشانات وہی ہیں جو اس سورت نے قلم بند کر دیئے ہیں اور یہ کہ اس کے سوا جس قدر راستے اور طریقے ہیں وہ ٹیڑھے ہیں ' تباہی کے ہیں ۔ فقط ایمان ' عمل صالح ' حق کی وصیت اور صبر کی تلقین کی راہ ہی درست راہ ہے ۔

سُوْرَةُ الْعَصْرِ ۱۰۳ — مَكِّيَّةٌ (۱۳) — اٰیاتھا ۳ — رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعَصْرِ ۝۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝۲ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ
تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳

" زمانے کی قسم ' انسان درحقیقت خسارے میں ہے ' سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے ' اور نیک اعمال کرتے رہے ' اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے "۔

سوال یہ ہے کہ ایمان کیا چیز ہے ؟ ... ہم یہاں ایمان کی فقہی تشریح و تعریف نہیں کرتے ۔ ہماری بات ایمان کے مزاج ' اس کی قدر و قیمت اور زندگی پر اس کے اثرات تک محدود ہے ۔

ایمان دراصل وہ رابطہ ہے جو یہ چھوٹی ' محدود ' انسانی مخلوق ' اس حقیقت کے ساتھ قائم کر لیتی ہے جو ازلی ' ابدی

اور باقی رہنے والی ہے اور جو اس کائنات کی اصل ہے اور جس سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ انسانی مخلوق اس حوالے سے اس کائنات کے ساتھ بھی مربوط ہو جاتی ہے کہ دونوں کا خالق ایک ہے' اور پھر یہ حضرت انسان ان قوانین قدرت سے بھی مربوط ہو جاتا ہے جن کے مطابق یہ جہاں چلتا ہے اور انسان ان قوتوں سے بھی مربوط ہو جاتا ہے جو اس کائنات میں عمل پیرا ہیں اور انسان اپنی حقیر اور محدود ذات کے خول سے باہر آکر کائنات کی وسعتوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی محدود قوت کی حدود سے نکل کر' ان "لامحدود قوتوں میں داخل ہو جاتا ہے' جو اس کائنات کے اندر پائی جاتی ہیں اور یہ کائنات انسان کے مقابلے میں اس قدر بڑی ہے کہ اس کی حدود ہی انسان کے علم سے باہر ہیں' پھر انسان اپنی محدود عمر کے دائرے سے نکل کر قیامت اور قیامت کے بعد آنے والے زمانوں کے لامحدود زمانوں میں داخل ہو جاتا ہے۔

مخلوق انسانی کا یہ رابطہ جو قوت' جو وسعت' جو آزادی عطا کرتا ہے' اس کے ساتھ ساتھ' مزید اس کو یہ ذوق بھی عطا کرتا ہے کہ یہ انسان اس پوری کائنات اور اسکے اندر پائے جانے والے حسن و جمال سے بھی لطف اٹھا سکے۔ اور ان مخلوقات کو بھی دیکھ سکے جو اس کی روح کے ساتھ محبت کرنے والی ہے۔ اس رابطے کی وجہ سے زندگی کا مختصر سفر انسان کے لیے ایک تفریحی سفر بن جاتا ہے یا کسی نمائش کی ایک سیر بن جاتی ہے جو اللہ نے اس انسان کے لیے ہر مقام' ہر جگہ اور ہر زمانے میں سجا رکھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت بڑی خوش قسمتی ہے' اعلیٰ درجے کی خوشی اور تفریح ہے اور اس پوری کائنات کے ساتھ ایک دوستی ہے' اور یہ وہ دولت ہے جس کے مقابلے میں کسی اور دولت کی کوئی قیمت نہیں ہے' یہ ایک ایسا نقصان بھی ہے کہ اگر کوئی اس سے محروم ہو جائے تو اس سے بڑا نقصان اور گھاٹا اور کوئی نہیں ہے۔

پھر' ایمان کے بنیادی عناصر بھی وہ ہیں جو انسانیت کے بھی بنیادی عناصر ترکیبی ہیں :

(۱) ایک الٰہ کی بندگی سے انسان کو صرف ایک اللہ واحد کے علاوہ تمام اطاعتوں' بندگیوں اور پرستشوں سے نجات ملتی ہے۔ یوں انسانوں کے اندر یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ تمام بندے ایک مقام رکھتے ہیں اور باہم مساوی ہیں۔ لہٰذا یہ کوئی معقول رویہ نہیں ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی بندگی کرے یا ایک اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے اپنا سر جھکائے یہاں سے انسان کو آزادی کی حقیقی نعمت نصیب ہوتی ہے! یہ وہ آزادی ہوتی ہے جو انسانی ضمیر سے پھوٹتی ہے اور اس تصور سے پھوٹتی ہے جو بطور حقیقت واقعیہ موجود ہو اور وہ تصور یہ ہے کہ اس کائنات میں صرف ایک حقیقی قوت ہے اور ایک ہی حقیقی معبود ہے۔ چنانچہ اس تصور حیات و تصور کائنات کا طبعی تقاضا یہ ہے کہ انسان آزاد ہو اور اس عقیدے کا منطقی نتیجہ بھی یہی ہے کہ انسان آزاد ہو۔

(۲) انسان میں ربانیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے تمام تصورات' اپنی تمام قدریں اور پیمانے اپنی تمام ترجیحات' اپنا تمام دستور اور قانون اللہ سے اخذ کرتا ہے۔ اور اس کے روابط اللہ سے' اس کائنات سے' اور لوگوں سے' اللہ کے احکام و قوانین کے مطابق قائم ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی سے اس کی ذاتی خواہش اور اس کی ذاتی مصلحتیں معدوم ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ اللہ کی شریعت اور عدل لے لیتا ہے۔ مومن کے شعور میں اس کے نظام زندگی کی قدر و قیمت بلند ہو جاتی ہے' اس کی شخصیت جاہلیت کے تصورات اور اقدار سے بلند ہو جاتی ہے۔ جاہلی ترجیحات ختم ہو جاتی ہیں اور وہ تمام رابطے ختم ہو جاتے ہیں جو زمین اور اس دنیا اور مادی تصورات

پر مبنی ہوں ۔ اگرچہ یہ انسان ایک فرد ہو' اس لیے کہ ایک مومن فرد بھی اپنے تصورات ' اپنی قدریں اور اپنی ترجیحات براہ راست اللہ سے لیتا ہے 'کیونکہ یہ قدریں ہی زیادہ برتر' زیادہ محترم اور زیادہ انتفاع اور قابل لحاظ ہوتی ہیں ۔

(۳) ایمان کے نتیجے میں خالق و مخلوق کے تعلق کا بھی تعین ہو جاتا ہے ۔ الوہیت اور بندگی' خدائی اور عبودیت کے مقام کا بھی تعین ہو جاتا ہے اور یہ تعلق صاف و ستھرا ہو کر سامنے آتا ہے ۔ یہ تعلق جو ایک فانی انسان کو ایک لافانی ذات سے جوڑتا ہے ۔ بڑی سادگی اور قابل فہم انداز میں متعین اور واضح ہو جاتا ہے اور اس راہ میں انسان کو کسی واسطے کی ضرورت نہیں رہتی ۔ تعین مراتب سے دل میں نور اور روح میں اطمینان پیدا ہوتا ہے ۔ نفس انسانی میں محبت اور اعتماد پیدا ہوتا ہے ۔ تردد' خوف' قلق' اضطراب ختم ہو جاتے ہیں ۔ مراتب کی اس وضاحت سے انسان ناحق استکبار بھی نہیں کرتا اور نہ افترا پردازیاں کر کے 'من گھڑت تصورات کے بل بوتے پر دوسرے انسانوں پر اپنے لیے برتر مقام کا دعویٰ کرتا ہے ۔

(۴) ایمان کی وجہ سے اہل ایمان کو اسلامی نظام حیات پر استقامت نصیب ہوتی ہے ۔پس مومنین کے ہاں بھلائی کوئی عارضی امر نہیں ہوتا نہ کوئی اتفاقی منفرد حادثہ ہوتا ہے ' بلکہ اسلامی نظام ایک ایسا واقعہ ہوتا ہے جس کے حقیقی اسباب ہوتے ہیں اور اس کے کچھ حقیقی مقاصد ہوتے ہیں اور اسلامی نظام کو چلانے والے باہم فی اللہ مربوط لوگ ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں اور ایسے لوگوں سے ایک سلیم جماعت تشکیل پاتی ہے 'جس کا ایک ہی مقصد ہے 'ایک ہی ممتاز جھنڈا ہوتا ہے ۔یہ جماعت ایک تاریخی جماعت ہوتی ہے اور اس کی گزشتہ رفتہ نسلیں بھی آنے والی نسلوں سے مربوط ہوتی ہیں اور آنے والی نسلیں ماضی سے مربوط ہوتی ہیں ۔ اور یہ تعلق ایک مضبوط تعلق ہوتا ہے ۔

(۵) اس کے نتیجے میں لوگوں کے اندر یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ انسان نہایت مکرم ہے ۔انسان خود اپنی نظروں میں بلند ہو جاتا ہے اور مومن کے ضمیر میں یہ حیا جاگزیں ہوتی ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے جس کے نتیجے میں وہ اس مرتبہ سے گر جائے 'جس کی طرف اللہ نے اسے اٹھایا ہے اور یہ وہ اعلیٰ و ارفع مقام ہے جس تک پہنچنے کا کوئی انسان تصور نہیں کر سکتا ہے کہ وہ اللہ کے ہاں معزز ہے ۔ ہر وہ مذہب یا فلسفیانہ تصور جو انسان کو خود اپنی نظر میں گراتا ہے اور اس کو ایک حقیر مخلوق قرار دیتا ہے جو معتبر انداز میں بعد پیدا ہوئی ۔ وہ دراصل انسان اور عالم بالا میں دوری پیدا کرتا ہے اور اس قسم کا مذہب یا فلسفہ انسان کو گراتا ہے اور اس کو گراوٹ کی طرف لے جاتا ہے ۔اگرچہ وہ اسے یہ بات بصراحت نہ کہے ۔

چنانچہ ڈارون اور فرائیڈ کے فلسفے اور مارکسی نظام وہ بدترین فلسفے اور نظام تھے جنھوں نے انسان کو بدترین مصیبت میں مبتلا کیا اور اسے انسانیت 'فطرت اور انسانی لحاظ سے غلط رخ دیا اور اسے یہ باور کرایا کہ ہر گراوٹ ' ہر گندگی اور ہر حقارت دراصل انسانی زندگی کا طبعی اور لازمی حصہ ہے ۔یہ کوئی قابل تعجب بات ہی نہیں ہے ' لہٰذا اس میں شرمندہ ہونے کی کوئی بات ہی نہیں ہے ۔چنانچہ یہ فلسفے اور یہ نظام دراصل انسانیت کے خلاف ایک گھناؤنا جرم ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان سے نفرت کی جائے ۔ (سید کی روح کیا آپ کو یہ اطلاع مل چکی

ہے کہ مارکسیت کے تمام بت اشتراکی دنیا سے گرادیئے گئے ہیں) ۔

(۶) فقط یہ تصور کہ انسان اللہ کے نزدیک ایک مکرم مخلوق ہے' انسانی شعور کو پاک و صاف کر دیتا ہے' پھر یہ تصور کہ اللہ سب کا نگران ہے اور وہ علیم بذات الصدور ہے ۔ اس سے بھی انسانی شعور صاف ہوتا ہے' ایک سلیم الفطرت انسان جس کی فطرت کو کارل مارکس' فرائیڈ جیسے لوگوں کی تحریروں نے مسخ نہ کر دیا ہو' وہ اس بات سے حیا کرتا ہے کہ اس جیسا دوسرا انسان اس کے دل کے رازوں اور اس کے برے خیالات پر مطلع ہو ۔ اور ایک سچا مومن جو یہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے سینے کے تمام رازوں اور دفینوں سے اللہ باخبر ہے ۔ وہ اس تصور سے کانپ اٹھتا ہے کہ اس کے دل میں یہ یہ خیالات ہیں ۔ اس سے وہ اپنے شعور' احساسات چھوڑتا ہے اور دل کو بھی صاف کرتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان پیدا ہوتے ہی انسان کے اندر ایک اخلاق حسن پیدا ہو جاتی ہے وہ ایمان رکھتا ہے کہ ایک اللہ ہے جو عادل' رحیم کریم اور درگزر کرنے والا ہے ۔ حلیم ہے اور محبت کرنے والا ہے' وہ شر کو پسند نہیں کرتا' خیر کو پسند کرتا ہے ۔ وہ آنکھوں کے خائن کو بھی جانتا ہے اور دلوں کے بھیدوں کا جاننے والا ہے ۔

(۷) پھر یہ تصور کہ انسان کو ارادے کی آزادی دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ کی جانب سے اس کی مکمل نگرانی ہو رہی ہے' اور اس کے نتیجے میں ایک کے اندر احساس اور بیداری پیدا ہو جاتی ہے اور جو سمجھ داری اور تدبر پیدا ہوتا ہے اس کے نتیجہ میں انسان اپنے آپ کو ایک ذمہ دار مخلوق تصور کرتا ہے ۔ اور یہ ذمہ داری فقط انفرادی ذمہ داری نہیں ہے ۔ یہ ایک اجتماعی ذمہ داری ہے اور ہر بھلائی کا یہ حق ہے کہ اس کے حوالے سے انسان ایک ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرے اور دوسرے انسانوں کے حوالے سے بھی ذمہ داری کا احساس کرے ۔ اور یہ ذمہ داری اللہ کے سامنے ہے ۔ اس لیے جب ایک مومن کوئی بھی حرکت کرتا ہے تو اس کا احساس و شعور یہی ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملے اور ہر قدم پر اپنے دل میں سوچتا ہے اور قدم اٹھانے سے پہلے ہی نتائج پر غور کر لیتا ہے ۔ اس لیے کہ اس تصور کے مطابق انسان ایک ایسی مخلوق ہے جسے اس دنیا میں ایک پوزیشن حاصل ہے ۔ اس لیے اس کائنات کے نظام میں وہ ایک ذمہ دار مخلوق ہے ۔

(۸) ایمان کے آثار میں سے ایک اہم اثر یہ ہے کہ ایک مومن دنیا کے مفادات پر اس طرح نہیں ٹوٹ پڑتا جس طرح کتے ہڈیوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں ۔ ایمان کے اشارات و اثرات میں سے ایک اشارہ اور اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اس چیز کو اختیار کرتا ہے جو اللہ کے نزدیک اعلیٰ مقصدیت رکھتی ہو' اور جو "خیر" ہو اور باقی رہنے والی ہو ۔

وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳:۲۶) "مقابلے کرنے والے لوگ مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو بھلائی میں مقابلہ کریں" ۔ اللہ کے ہاں جو انعامات ہیں ان میں باہم مقابلہ انسان کو اس دنیا سے بلند کرتا ہے' اس کے قلب کی تطہیر کرتا ہے اور انسان صاف و ستھرا ہو جاتا ہے ۔ نیز اس سے ایک مومن کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے ۔ وہ دنیا کی سرحدوں سے نکل کر آخرت میں بھی سرگرم ہوتا ہے ۔ زمین کے ساتھ ساتھ وہ عالم بالا میں بھی جولانی دکھاتا ہے اور یہی بات اس کے اندر یہ قوت پیدا کرتی ہے کہ وہ نتائج کی پرواہ کیے بغیر نیکی کرتا چلا جائے یا نتائج کے بارے میں عجلت

نہ کرے' اس لیے کہ وہ بھلائی اس لیے چاہتا ہے کہ وہ بھلائی ہے اور اس لیے کہ اللہ کی مرضی اسی طرح ہے' یہ اس کی ذمہ داری نہیں ہے کہ اس چھوٹی سی محدود عمر میں بھلائی کے نتائج بھی نکلیں - اس لیے کہ جس اللہ کے لیے یہ بھلائی کی جا رہی ہے وہ زندہ ہے' وہ مرتا نہیں ہے - وہ بھولتا نہیں' وہ کسی چیز سے غافل نہیں - پھر یہ دنیا حقیقی دار الجزاء بھی نہیں ہے اور تمام حسابات اس جہاں ہی میں چکنے والے نہیں - لہٰذا مومن خیر کو جاری رکھنے کے لیے اس سرچشمے سے مدد لیتا ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ خیر کی تحریک جاری رہتی ہے - یہ کوئی وقتی جوش نہیں ہوتا اور نہ کوئی انفرادی واقعہ ہوتا ہے - یہی ایمانی جذبہ ہے جس کی وجہ سے 'ایک مومن کے اندر اس قدر قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ بڑے سے بڑے رشتہ کے مقابلے میں کھڑا ہو جاتا ہے' چاہے یہ شر کسی ایک ڈکٹیٹر اور سرکش کی صورت میں ہو یا جاہلی تصورات و ترجیحات کے دباؤ کی شکل میں ہو' یا انسان کی خواہشات نفس کی صورت میں ہو - یہ انفرادی دباؤ کسی فرد پر یوں پڑتا ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ دنیا مختصر ہے' عمر قلیل ہے اور اس میں عیش و عشرت کر لینا چاہئے -

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

یا یہ اس قدر مختصر ہے کہ اس میں نیکی کے نتائج نہیں نکل سکتے - اور ہمارے لیے یہ چانس نظر نہیں آتا کہ ہم باطل پر 'حق کا غلبہ دیکھ سکیں - اس لیے ایمان اس صورت حالات کا علاج کرتا ہے اور بنیادی علاج -

حقیقت یہ ہے کہ ایمان ہی زندگی کی اساس ہے' زندگی کی جڑ ہے اور اس سے بھلائی کی تمام شاخیں پھوٹتی ہیں اور اس کا ہر پھل انہی جڑوں سے متعلق ہوتا ہے - اور اگر ایمان نہیں ہے تو گویا درخت کی جڑ کٹ گئی ہے اور اس کی تمام شاخیں مرجھا کر خشک ہو جائیں گی اور اگر وہ خشک نہ ہوں تو پھر وہ شیطانی پھل ہو گا اور اس کو دوام اور فروغ حاصل نہ ہو گا -

حقیقت یہ ہے کہ ایمان وہ مرکز اور محور ہے جس کے ساتھ اعلیٰ زندگی کی تمام تاریں مربوط ہیں اور اگر ایمان نہیں ہے تو زندگی ایک غیر مربوط حرکت ہے اور ایمان کے بغیر اس زندگی کو کوئی ثبات و قرار نہیں ہے - خواہشات اور میلانات جدھر جائیں 'کسی کو کھینچ لے جائیں -

ایمان دراصل ایک نظام ہے اور اس کی وجہ سے تمام متفرق اعمال ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے یہ اعمال باہم ہم آہنگ ہو جاتے ہیں - ایک سمت میں ہو جاتے ہیں - ایک ہی حرکت' ایک ہی محرک' اور ایک ہی ہدف رکھتے ہیں -

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ہر اس عمل کو کالعدم قرار دیتا ہے جو اس اصل پر مبنی نہ ہو - جو اس محور کے گرد نہ گھومتا ہو اور جو سرچشمہ ایمان سے نہ پھوٹتا ہو - اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام عقائد اس معاملہ میں بالکل اوپن اور صریح ہے - سورہ ابراہیم میں ہے -

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ﹴاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ (١٤: ١٨) "جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ان کے اعمال کی مثال راکھ کی طرح ہے کہ تیز و تند آندھی ایک طوفانی دن میں اسے اڑائے پھرے - جو اعمال بھی انہوں نے کیے

تھے ان میں سے وہ کچھ بھی نہ پا سکیں گے"۔ اور سورہ نور میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا (۲۴: ۳۹) "جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے چٹیل میدان میں سراب 'پیاسا اسے پانی خیال کرے لیکن جب اس کے پاس پہنچے تو وہاں کچھ نہ پائے"۔ یہ نصوص بصراحت بتا رہی ہیں کہ اعمال جب تک ایمان پر مبنی نہ ہوں' اسلام میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اعمال کی تہہ میں جذبہ یہ ہونا چاہئے کہ خالق کائنات نے یہ حکم دیا ہے اور ان کا مقصد اس کائنات کی تخلیق کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ اور یہ منطقی نتیجہ ہے اس عقیدے کا جو تمام امور کو اللہ کی طرف لوٹاتا ہے اس لیے جس عمل کا تعلق ایمان سے کٹ گیا وہ اپنا مفہوم اور قیمت کھو بیٹھا۔[1]

ایمان اس بات کی دلیل ہے کہ صاحب ایمان کی فطرت درست ہے اور اس کی شخصیت کی ساخت صحیح سالم ہے اور وہ اس پوری کائنات کے ساتھ ہمقدم ہے۔ اور وہ اپنے ماحول میں پائے جانے والی فطرت کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس لیے وہ اس کائنات میں زندہ رہ رہا ہے۔ اور جس مومن کی شخصیت صحیح سالم ہوتی ہے اس کے اور اس کائنات کے درمیان ایک توافق ہوتا ہے اور یہ توافق اور یہ اتحاد صرف ایمان کا ثمرہ ہوتا ہے کیونکہ اس کائنات میں ایسے دلائل و اشارات موجود ہیں' جو یہ بتاتے ہیں کہ ایک ہی دست قدرت صانع کائنات ہے اس لیے انسان اور کائنات کے درمیان سے یہ توافق ختم ہو جائے تو یہ بات اس پر دلیل ہوگی کہ اس انسان کی شخصیت میں خلل آگیا ہے اور انسان کی وہ صلاحیت ختم ہوگئی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اس کائنات سے دلائل و اشارات اخذ کرتا ہے اور اس فساد کی وجہ سے انسان گھاٹے ہی میں رہے گا۔ اگرچہ بظاہر کچھ اعمال نیکی کی چھاپ والے معلوم ہوتے ہیں لیکن ایمان نہ ہونے کی وجہ سے یہ اعمال ناقابل قبول ہوں گے ــ غرض مومن کی دنیا وسیع' جامع' لمبی' بلند' خوبصورت اور کامیاب ہوتی ہے۔ جس کے مقابلے میں ان لوگوں کی دنیا جو مومن نہیں ہیں' چھوٹی' حقیر' گری ہوئی' کمزور اور نامراد اور بدبختی پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ اور انجام خسران اور نامرادی ہوتا ہے۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۱۰۳: ۳) "اور نیک اعمال کرتے رہے"۔ نیک عمل درحقیقت ایمان کا قدرتی پھل ہوتا ہے اور جب ایمان کسی قلب میں جاگزیں ہوتا ہے تو عمل صالح اس کی ذاتی حرکت ہوتی ہے (جس طرح

---

(۱) استاد محمد عبدہ' نے آیت فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (۷) وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۹۹: ۸) "جو ذرہ برابر نیکی کرے گا' اسے دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر بدی کرے گا اسے دیکھ لے گا" کے تحت لکھا ہے کہ "بعض علما نے اس پر اجماع لکھا ہے کہ کافر کو اس کی کوئی نیکی قیامت میں نفع نہ دے گی اور اس کے عذاب میں کوئی تخفیف نہ ہوگی' لیکن یہ ایک بے بنیاد بات ہے"۔ ہم سمجھتے ہیں یہ مسئلہ اجماع کا نہیں قرآن کی صریح نصوص کا ہے اور قرآن و سنت اس معاملہ میں بالکل واضح ہیں۔ (سید قطب)

دل متحرک ہوتا ہے) لہٰذا ایمان ایک متحرک اور مثبت حرکت کا نام ہے جونہی وہ کسی شخصیت میں بیٹھتا ہے تو وہ عمل صالح کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے ایمان ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسلام میں کسی ایسے ایمان کا تصور نہیں ہے۔ جو بجھا ہوا ہو اور جس کے نتیجے میں کوئی حرکت نہ پیدا ہوتی ہو' جو پوشیدہ ہو اور زندہ شکل میں مومن کی ذات سے باہر نہ آتا ہو' اگر اس کے اندر اس قسم کی طبعی حرکت نہ ہو تو وہ ایمان کھوٹا اور مردہ ایمان ہے' ایمان تو ایک پھول ہے جس کی خوشبو کو روکا نہیں جا سکتا۔ جہاں پھول ہو گا' اس سے خوشبو پھوٹتی رہے گی۔ اور اگر کسی شخص میں ایمان کی بو نہیں ہے تو گویا وہ موجود ہی نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان حرکت' عمل اور تعمیر کا نام ہے۔ اور یہ سب امور اللہ کی طرف سے متوجہ ہوتے ہیں۔ ایمان میں سکیڑ نہیں ہے' نہ وہ منفی چیز ہے۔ نہ وہ ضمیر کی تہوں میں جاگزیں ہوتا ہے۔ نہ ایمان نیک خواہشات کا نام ہے۔ جن کی پشت پر کوئی حرکت نہ ہو' یہ اسلام کا کھلا مزاج ہے جو اسلام کو ایک اعلیٰ تعمیری ذات بنا دیتا ہے اور یہ قوت عملی زندگی کے اندر کی مرکزی قوت محرکہ ہوتی ہے۔

یہ ہے مفہوم اس بات کا کہ ایمان کو اسلامی نظام حیات کے ساتھ متعلق ہونا چاہئے' اسلامی نظام حیات چونکہ ایک مسلسل حرکت کا نام ہے' جو اس پوری کائنات میں چل رہی ہے' اور یہ حرکت ایک قوت مدبرہ نے پیدا کی ہے اور اس کا ایک ہدف ہے اور انسانیت کی قیادت ایمان کے ہاتھ میں دینے کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسی قیادت وجود میں لائی جائے جو حرکت کا ایک ایسا منہاج وجود میں لائے جو اس پوری کائنات کے مزاج کے مطابق ہو' بالفاظ دیگر ایک اچھی' پاک تعمیری جدوجہد کو برپا کرنا جو اللہ کی طرف سے آئے ہوئے نظام زندگی کے شایان شان ہو۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳ : ۳) ''جو ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہتے ہیں''۔ حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کے اعمال میں سے امت مسلمہ کے خدوخال اچھی طرح واضح ہوتے ہیں۔ امت مسلمہ ہی کے خطوط پر جماعت مسلمہ بھی قائم ہوتی ہے۔ اس کا ایک خاص وجود اور شخصیت ہوتی ہے۔ اس کے افراد کے درمیان ایک امتیازی رابطہ ہوتا ہے۔ تمام لوگوں کی سمت ایک ہوتی ہے' اس امت یا جماعت کو اپنے وجود کا شعور بھی ہوتا ہے' اور اس کے جو فرائض ہیں وہ بھی اس کے پیش نظر ہوتے ہیں' اور یہ امت یہ جانتی ہے کہ اس نے ایمان اور عمل صالح کے حوالے سے کیا کچھ کرنا ہے؟ اور وہ جانتی ہے کہ ایمان و عمل صالح کے زاویہ سے اس نے پوری انسانیت کی قیادت بھی کرنی ہے' لہٰذا ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے امانت کبریٰ کو لے کر اٹھنا ہے۔

غرض لفظ ''تواصی'' اور اس کے اس مفہوم' اس کے مزاج اور حقیقت ہی میں سے امت مسلمہ کا وجود نمودار ہوتا ہے' یا ایک باہم متحد جماعت کا تصور ابھرتا ہے۔ یعنی ایسی امت جو ممتاز ہو' جو دانش مند ہو' جو اس کرۂ ارض پر سچائی' بھلائی اور عدل و انصاف کے قائم کرنے کی ذمہ دار ہو۔ یوں امت مسلمہ کی یہ نہایت ہی اعلیٰ اور خوبصورت تصویر ہے۔ اسلام اس طرح کی امت چاہتا ہے' ایک ممتاز' قوی' دانش مند اور حق اور بھلائی کی نگرانی کرنے والی امت۔ جس کے افراد ایک دوسرے کو ہروقت حق کی نصیحت کرتے ہوں اور صبر کی تلقین کرتے ہوں۔ باہم محبت اور تعاون سے زندگی بسر کرتے ہوں' ان کے درمیان ایک خصوصی اخوت کارفرما ہو۔ جسے قرآن مجید وصیت سے تعبیر کرتا ہے۔

حق کی تلقین اس لیے ضروری ہے کہ حق کو لے کر چلنا ایک دشوار کام ہے' اس دنیا میں بے شمار ایسے عوامل ہیں جو انسان کو سچائی کی راہ سے دور لے جاتے ہیں۔ خواہشات نفسانیہ 'مصلحتیں' قومی اور خاندانی تصورات' سرکشوں اور ڈکٹیٹروں کے مظالم' ظالموں کے ظلم' حد سے گزرنے والوں کے تجاوز اور تعدیاں وغیرہ۔ ایک دوسرے کو نصیحت کرنے سے دراصل یاددہانی ہو جاتی ہے۔ انسان کے حوصلے بڑھتے ہیں اور اغراض و مقاصد کے لحاظ سے افراد جماعت کے درمیان اتحاد اور یگانگت پیدا ہوتی ہے۔ اور ذمہ داریاں اٹھانے میں دراصل ایک دوسرے کا بوجھ اٹھایا جاتا ہے۔ نصیحت سے تمام انفرادی رجحانات اکٹھے ہو کر کئی گنا ہو جاتے ہیں اور وہ تمام لوگ جو سچائی کے نگران اور حامی ہوتے ہیں وہ محسوس کرتے ہیں کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ حق اور صداقت کی حفاظت کے کام میں میرے ساتھ اور لوگ بھی ہیں۔ جو اس کو نصیحت کرتے ہیں' اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس سے محبت کرتے ہیں' اس کی پشت پر کھڑے ہیں۔ اور یہ بھی اسے شرمندہ ہونے نہ دیں گے۔ یہ دین ہی دراصل حق ہے اور اس دین کی حفاظت ایک جماعت ہی کر سکتی ہے۔ جو باہم متعارف ہو' باہم کفیل ہو' اور ایک دوسرے کی معاون ہو اور ایک دوسرے کی کمزوریاں پوری کرنے والی ہو۔

اور صبر کی تلقین بھی بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ ایمان و عمل صالح پر گامزن رہنا اور حق و انصاف کی نگرانی کرنا ایک مشکل کام ہے۔ اس میں صبر اور مصابرت اور نفس کے اندر کے عوامل کے خلاف سخت جہاد کی ضرورت ہے اور نفس سے باہر کے عوامل کے خلاف جہاد کی بھی ضرورت ہے اور اس راہ میں آنے والی مشکلات پر صبر و مشقت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح باطل کے استکبار اور فخر پر صبر کرنا' راستے کی طوالت پر صبر کرنا اور کامیابی کی سست روی پر صبر کرنا اور راستے کے نشانات کا ناپید ہونا اور مٹ جانا اور ان پر صبر کرنا۔

صبر کی تلقین سے انسانی قوت میں اضافہ ہوتا ہے اور لوگوں کے اندر ایک اجتماعی احساس پیدا ہوتا ہے کہ ہم سب کا ہدف واحد ہے' رخ ایک طرف ہے' اس طرح اس سے سب کو ایک سہارا ملتا ہے۔ کارکن اس راہ میں کام کرتے ہوئے باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں اور نہایت عزم' ثابت قدمی اور اپنے مقصد پر اصرار کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ نیز اس سے کئی اور اجتماعی صفات بھی پیدا ہوتی ہیں اور یہ کئی اسلامی جماعت کے استحکام کے لیے ضروری ہیں کیونکہ اسلام جماعتی فضا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسلام کا ظہور بھی ایک سوسائٹی کی شکل میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی سوسائٹی ہی نہیں ہے تو اسلام نہ ہو گا اور یہ سراسر خسارہ ہو گا۔

قرآن نے ہمارے لیے جو دستور وضع کیا اور جس کے مطابق کسی سوسائٹی کو ایک کامیاب اور خسران دنیوی اور اخروی سے محفوظ قرار دیا ہے۔ اگر ہم اس دستور کی عینک لگا کر اس وقت دنیا کے حالات کا جائزہ لیں تو ہمارے سامنے دنیا کی یہ خوفناک تصویر آئے گی کہ اس وقت پوری دنیا مکمل خسارے سے دوچار ہے۔ اس خسارے کا زیادہ خوفناک پہلو یہ ہے کہ آخرت سے بھی پہلے ہم محض دنیاوی نقطہ نظر سے بھی سخت خسارے میں پڑ چکے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانیت نے اس بھلائی سے مکمل روگردانی اختیار کر لی ہے' جس کے فیوض و برکات اللہ نے انسانوں کے لیے عام کر دیئے تھے۔ نیز اس دنیا سے وہ اقتدار اعلیٰ ختم ہو چکا ہے جو ایمانی اور اسلامی ہو' جو بھلائی اور حق و انصاف کے اصول پر قائم ہو۔ اس تصویر کا نہایت ہی بھدا پہلو یہ ہے کہ مسلمان یا زیادہ صحیح الفاظ میں وہ لوگ جو اس زمین پر بسنے والے دوسرے انسانوں کے مقابلے میں' اس بھلائی اور خیر سے بہت دور پڑ گئے ہیں' وہ اس نظام زندگی سے بہت دور ہو گئے جو اللہ نے ان کے

لیے پسند فرمایا تھا۔ انہوں نے اس آئین و دستور کو پامال کر دیا جو اللہ نے ان کے لیے تجویز کیا تھا۔ جسے اللہ نے خسارے اور ناکامی سے نجات پانے کا واحد راستہ قرار دیا تھا۔ خصوصاً وہ علاقے جہاں سے اس بھلائی کے جھنڈے سب سے پہلے بلند ہوئے تھے۔ انہوں نے خود ان جھنڈوں کو گرا دیا ہے' جو ان کے لیے اللہ نے بلند کیے تھے۔ یہ تھے ایمان کے جھنڈے۔ اور نہایت بدقسمتی یہ ہے کہ جن علاقوں سے اللہ کے دین کے یہ جھنڈے بلند ہوئے تھے انہوں نے نسلی قومیت کو اپنا لیا ہے حالانکہ اس زمین کی تاریخ شاہد ہے کہ نسلی قومیت کے ذریعہ کبھی بھلائی تک کوئی قوم نہیں پہنچ سکی۔ ان لوگوں نے جس نسلی قومیت (عرب نیشنلزم) کے جھنڈے بلند کر رکھے ہیں۔ یہ قومیت اس کے پاس اسلام سے پہلے بھی تھی' لیکن اس کی وجہ سے نہ اس زمین پر انہوں نے کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام دیا اور نہ آسمان میں ان کا کوئی کارنامہ ریکارڈ ہوا' جب اسلام آیا تو عربوں کے ذریعہ اس نے ایک ایسا جھنڈا بلند کیا جو صرف اللہ کا جھنڈا تھا' اس میں کوئی اور عنصر شریک نہ تھا' یہ اللہ کے نام سے تھا' نام میں بھی کوئی شریک نہ تھا' یہ صرف اللہ کی طرف منسوب تھا' جس میں کوئی اور نسبت نہ تھی' صرف اللہ کا رنگ تھا' کوئی اور رنگ نہ تھا۔ اس جھنڈے کے زیر سایہ عربوں کو عروج نصیب ہوا۔ وہ دنیا کے قائد بن گئے۔ اور ان کی قیادت بھلائی کی قیادت تھی۔ ایک قوی قیادت تھی' دانشمند قیادت تھی اور ہر پہلو سے کامیاب قیادت تھی۔ یہ قیامت عربوں کی تاریخ میں بھی پہلی بار کامیاب ہوئی اور انسانی تاریخ میں بھی اسلامی انقلاب انسانیت کے لیے ایک نمایاں کامیابی تھی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی مشہور کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کے فصل "اسلامی اقتدار اور مسلمان قائدین" میں فرماتے ہیں :

"مسلمان میدان میں آئے' دنیا کی رہنمائی کی باگ انہوں نے اپنے ہاتھ میں لی اور ان بیمار قوموں کو رہنمائی کے اس منصب سے معزول کیا جس پر وہ قابض ہو گئی تھیں اور جس کو انہوں نے کبھی صحیح طور پر استعمال نہ کیا تھا۔ مسلمانوں نے پوری دنیا کے انسانوں کو اپنے ساتھ لیا اور متوازن اور صحیح رفتار سے اپنی صحیح منزل کی طرف بڑھانا شروع کیا۔ ان میں وہ تمام خصوصیات جمع تھیں' جو ان کو تمام اقوام کی رہنمائی کے منصب جلیل کا اہل ثابت کرتی تھیں اور ان کی نگرانی اور قیادت میں قوموں کی فلاح اور سعادت کی ضمانت دیتی تھیں۔ یہ امتیازی خصوصیات کیا تھیں وہ یہ ہیں :

(۱) ان کے پاس آسمانی کتاب اور خدا کی شریعت تھی' وہ اپنی جانب سے قانون سازی اور شریعت سازی نہ کرتے تھے' اس لیے کہ انسانی قانون سازی جاہلیت' ظلم اور غلطیوں کا سرچشمہ ہوتی ہے اور جب انسان انسانوں کے لیے قانون بناتے ہیں تو ہر روز ان میں ردوبدل اور ترمیم ہوتی رہتی ہے جبکہ آسمانی کتابیں ان غلطیوں سے محفوظ ہوتی ہیں۔ مسلمان اپنے روز مرہ کے معاملات اور سیاست اور سیادت میں اندھا دھند چلنے اور اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے سے محفوظ تھے۔ ان کے پاس وحی الٰہی کی روشنی تھی جس کے سہارے وہ چلتے تھے۔ اور جس سے زندگی کی تمام راہیں اور موڑ ان کے لیے روشن تھے۔ ان کا ہر قدم روشنی میں پڑتا تھا۔ اور ان کو اپنی منزل مقصود صاف نظر آتی تھی۔ سورہ انعام (۱۲۲) میں ہے۔

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَٰهُ وَجَعَلْنَا لَهُۥ نُورًا يَمْشِي بِهِۦ فِي ٱلنَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُۥ فِي

الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (٦ : ١٢٢) "کیا وہ جو پہلے مردہ تھا' پھر ہم نے اس میں جان ڈالی اور اس کو ایک روشنی عطا فرمائی جس کی مدد سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے' کیا وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہے کہ اندھیرے میں گھرا ہوا ہے' وہاں سے نکل نہیں سکتا۔

ان کے پاس ایک خدائی قانون اور شریعت تھی جس کے مطابق وہ لوگوں کے درمیان فیصلے کرتے تھے۔ وہ حق و انصاف کے علم بردار بنائے گئے تھے اور ان کو سخت سے سخت اشتعال اور برہمی اور عداوت' اور نفرت کی حالت میں بھی یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ سچائی اور انصاف کا دامن نہ چھوڑیں اور یہ نہ ہو کہ وہ حق و انصاف کے معاملے میں انتقام لیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (٥ : ٨) "اے ایمان والو' ہروقت انصاف کے ساتھ گواہی دینے کے لیے تیار رہو' اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں مجبور نہ کر دے کہ تم انصاف کو چھوڑ دو' عدل کرو' یہ بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ کو ان باتوں کا علم ہے جو تم کرتے ہو"۔

(۲) وہ حکومت اور قیادت کے منصب پر مستحکم اخلاقی تربیت اور تہذیب نفس کے بعد فائز ہوئے تھے۔ انہوں نے دنیا کی عام حکمران قوموں اور اہل حکومت کی طرح اپنے تمام اخلاقی عیوب اور نقائص کے ساتھ' پستی سے بلندی کی طرف جست نہیں لگائی تھی' بلکہ ایک طویل عرصہ تک وحی الٰہی ان کی اصلاح و تربیت کرتی رہی تھی اور سالہا سال وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل نگرانی اور تعلیم میں رہے تھے۔ آپ ان کا تذکیہ فرماتے رہے' ان کی مکمل تربیت فرمائی۔ زہد و ورع کی زندگی کا عادی بنایا' عفت و امانت' ایثار و قربانی' خوف خدا کا ان کو خوگر کیا۔ حکومت و مناصب کی حرص و طمع ان کے دل سے بالکل نکال دی۔ آپ کا ارشاد تھا "بخدا ہم کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کو سپرد نہیں کریں گے جس نے فرمائش کی یا جس کو اس کی خواہش ہے"۔ ترفع' سربلندی اور اعزاز کا شوق اور فتنہ و فساد کی خواہش سے ان کے دل بالکل صاف ہو گئے تھے' ان کے کانوں میں رات دن قرآن مجید کے یہ الفاظ پڑتے تھے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِى الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (٢٨ : ٨٣) "یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو عطا کریں گے' جو دنیا میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور فساد کے خواہاں نہیں اور اچھا انجام پرہیز گاروں کے لیے ہے"۔

اس لیے وہ حکومت کے عہدوں اور منصبوں پر پروانہ وار نہ گرتے تھے' بلکہ اس کے برعکس وہ ان کو قبول کرنے سے گریز کرتے تھے اور ان کی ذمہ داریوں کو سوچ کر کے وہ لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ ان میں سے

جس کو بھی کسی منصب کی پیش کش کی جاتی وہ پیچھے ہٹتا تھا۔ اور اپنے کو اس بار کا قابل نہ سمجھتا تھا۔ چہ جائیکہ ان میں سے کوئی اپنا نام حکومت کے لیے پیش کرے۔ یا اپنی ذات کے لیے پروپیگنڈا کرے۔ پھر وہ جب کسی ذمہ داری کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے تو اس کو مال غنیمت یا لقمہ تر نہ سمجھتے تھے بلکہ اس کو اپنے ذمہ ایک امانت اور اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھتے تھے۔ اور یقین رکھتے تھے کہ اللہ کے سامنے ان کو حاضر ہونا ہے اور ہر چھوٹی بڑی چیز کا جواب دینا ہے۔ اور وہ یہ آیت ہمیشہ پڑھتے تھے :

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (٤ : ٥٨) "مسلمانو' اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کو پہنچا دو اور جب فیصلہ کرنے لگو تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ کرو"۔ نیز یہ ارشاد۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٦ : ١٦٥) "اور اسی نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے اور تم میں سے بعض کو دوسروں پر درجے دیئے ہیں تا کہ تمہیں آزمائے' ان انعامات میں جو تمہیں دی گئیں۔ بے شک تمہارا پروردگار بڑی سزا دینے والا ہے اور وہی بخشنے والا مہربان ہے۔

(۲) وہ کسی قوم کے خدمت گزار اور کسی نسل اور وطن کے نمائندے نہ تھے' جن کے پیش نظر محض اس قوم اور نسل کی خوشحالی ہو' یا وہ کسی قوم کی برتری اور اسے تمام اقوام پر قیادت و سیادت کا مقام دلانے کے قائل ہوں۔ اور یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ ہماری قوم قیادت کرنے کے لیے ہے اور باقی اقوام صرف محکوم بننے کے لیے ہیں۔ وہ عالم عرب کے حدود سے باہر اس لیے نہ نکلے تھے کہ دنیا پر عرب شہنشاہیت قائم کریں۔ اور اس کے زیر سایہ راحت اور عشرت کی زندگی گزاریں۔ اور اس کے زیر حمایت دوسروں پر فخر و تکبر کریں۔ نہ اس لیے کہ لوگوں کو رومیوں اور ایرانیوں کی غلامی سے نکال کر عربوں کی اور اپنی غلامی میں داخل کرائیں۔ وہ صرف اس لیے نکلے تھے کہ وہ بندگان خدا کو اپنے جیسے تمام لوگوں کی بندگی سے نکال کر صرف اللہ وحدہ لاشریک کی بندگی میں داخل کریں۔ مسلمانوں کے سفیر ربعی ابن عامر نے یزدگرد شاہ ایران کے بھرے دربار میں اس حقیقت کا اعلان کیا۔ انہوں نے کہا اللہ نے ہم کو اس لیے بھیجا ہے کہ لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر ایک اللہ کی بندگی کی طرف اور دنیا کی تنگی سے رہائی دے کر اللہ کی وسعتوں کی طرف' اور مذاہب کے ظلم و ستم سے رہائی دلا کر اسلام کے عدل و انصاف میں لائیں۔ بس دنیا کی تمام قومیں اور تمام انسان ان کی نگاہ میں ایک حیثیت رکھتے تھے۔ اگر فرق تھا تو محض دین کا تھا۔ غرض رسول اللہؐ کے اس ارشاد پر ان کا پورا عمل تھا "سب لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے اور نہ عجمی کو عربی

پر فضیلت ہے' ماسوائے تقویٰ کے"۔
اور سورۂ حجرات کی آیت ۱۳ میں ہے

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (۴۹:۱۳) "اے لوگو' ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے' اور تمہیں قوم قبیلے میں تقسیم کیا تاکہ تمہارا باہم تعارف ہو' اللہ کے نزدیک تم میں سے مکرم وہی ہے جو زیادہ متقی ہے"۔

حاکم مصر حضرت عمر بن العاص کے بیٹے نے ایک موقعہ پر ایک مصری کو کوڑا مارا اور اپنے باپ دادا پر فخر کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس مصری کو اس سے بدلہ لینے کا حکم دیا۔ اور عمر ابن العاص سے کہا کب سے تم نے لوگوں کو غلام بنا لیا حالانکہ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے ہیں"۔

ان فاتحین اور حکمرانوں نے دین و علم و تہذیب کی بخشش میں کبھی بخل اور تنگ دلی سے کام نہیں لیا اور حکومت اور مناصب حکومت کے بارے میں کبھی وطنیت اور رنگ و نسل کا لحاظ نہیں کیا' وہ تو ایک ابر کرم تھے جو تمام عالم پر محیط تھا۔ اور اس کا فیض سب کے لیے عام تھا۔ جو سارے عالم کو سیراب کرتا گیا اور زمین کے ہر حصے نے اس کو دعائیں دیں اور مخلوقات نے اپنی اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق اس سے نفع اٹھایا۔

ان لوگوں کے زیر سایہ اور زیر حکومت دنیا کی تمام قوموں کو بلا اختلاف رنگ و وطن اور دین' علم و تہذیب اور حکومت میں اپنا پورا پورا حصہ لینے اور عربوں کے ساتھ تعمیر نو میں شریک ہونے کا پورا پورا موقعہ ملا۔ بلکہ ان کے بہت سے افراد بہت سی فضیلتوں میں عربوں سے سبقت لے گئے تھے اور ان میں ایسے ائمہ اور فقہا اور محدثین پیدا ہوئے جو خود عربوں کے سر کا تاج اور مسلمانوں کا سرمایہ افتخار تھے۔

(۴) انسان مجموعہ ہے جسم' قلب اور عقل کا۔ انسان حقیقی فلاح و سعادت اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا اور انسانیت کو متوازن ترقی اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان کی یہ تمام قوتیں متناسب طور پر' اس کے مرتبہ کے شایان شان' نشو و نما اور پرورش نہ پائیں۔ دنیا میں صالح تمدن کا اس وقت تک وجود نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایسا ہی دینی' اخلاقی' عقلی اور مادی ماحول نہ قائم ہو جائے۔ جس میں انسان کے لیے پوری پوری سہولت سے کمال تک پہنچنا ممکن ہو اور تجربہ نے ثابت کر دیا کہ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کسی زندگی کی رہنمائی اور تمدن کی جہاز رانی ان لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہو جو روحانیت اور مادیت دونوں کے قائل ہوں۔ اور دینی اور اخلاقی زندگی کا نمونہ کامل ہوں اور عقل سلیم اور علم صحیح سے متصف ہوں۔ (ص ۱۰۰ تا ۱۶۴)

اور ایک دوسرے فصل دور خلافت راشدہ کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں :

"چنانچہ ہم کو تاریخ میں خلافت راشدہ کے دور سے زیادہ ان تمام حیثیتوں سے مکمل اور کامیاب دور کا علم نہیں' اس دور میں روحانی' اخلاقی' دینی و علمی' روحانی وسائل و سامان' انسان کامل اور صالح تمدن کے وجود میں لانے میں ایک دوسرے کے مددگار تھے۔ اس حکومت میں' جس کا شمار دنیا کی عظیم ترین حکومتوں میں تھا' ایسی سیاسی و مادی قوت کے

جو تمام معاصر قوتوں سے فائق و برتر تھی۔ اعلیٰ اخلاقی نمونے اور اعلیٰ معیار کام دیتے تھے۔ تجارت و صنعت کے ساتھ اخلاق اور فضیلت بھی اپنے پورے عروج پر تھی۔ فتوحات کی وسعت اور تمدن کی ترقی کے ساتھ اخلاق اور افادیت دونوں کی ترقی بھی جاری تھی۔ چنانچہ اسلامی حکومت کی غیر معمولی وسعت' آبادی کی انتہائی افزونی عیش و عشرت کے وسائل و اسباب ترغیبات کے باوجود' جرائم' بداخلاقی کے واقعات بہت کم پیش آتے تھے۔ فرد کا دوسرے فرد کے ساتھ اور فرد و جماعت کا باہمی تعلق حیرت انگیز طریقے پر تھا۔ یہ ایک معیاری دور تھا جس سے زیادہ ترقی یافتہ دور کا انسان خواب بھی نہیں دیکھ سکا۔ اور اس سے زیادہ مبارک اور پر بہار زمانہ فرض ہی نہیں کیا جاسکتا"۔ (ص ۱۶۷) یہ تھے اس دور سعید کے بعض خدوخال جس میں انسانیت نے ایک مختصر سے عرصے کے لیے سورہ عصر کے وضع کردہ اسلامی دستور کے زیر سایہ زندگی بسر کی۔ اس عرصہ میں لوگوں پر ایسے لوگوں کی ایک ایسی ایمان والی جماعت کی حکومت تھی جس نے ایمان کے جھنڈے اٹھائے تھے اور عمل صالح اس کا پروگرام تھا اور حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین اس کا شعار تھا۔

یہ ایک ایسا سنہری دور تھا جس کا مقابلہ اس بربادی سے ہرگز نہ کیا جا سکتا۔ جس سے آج پوری انسانیت دوچار ہے۔ معرکہ 'خیرو شر' میں پوری انسانیت خسارے اور تباہی میں مبتلا ہے۔ پوری انسانیت نے 'اس عظیم خیر کی طرف سے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں' جو کبھی عربوں نے پوری انسانیت کے لیے عام کر دی تھی 'اس دور میں جب کہ انہوں نے اسلام کے جھنڈے اٹھا رکھے تھے۔ اور اس وقت وہ پوری انسانیت کے قائد اور رہنما تھے اور اس کے بعد کے ادوار میں جب انہوں نے یہ جھنڈے پھینک دیئے تو وہ قافلہ انسانیت کے خادم بن گئے جبکہ یہ قافلہ بھی بربادی کی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے اور جاتے جاتے یہ حالت ہو گئی ہے کہ پوری انسانیت نے شیطانی جھنڈے اٹھا لیے اور ان میں سے کوئی جھنڈا انسانی جھنڈا نہیں ہے۔ پوری انسانیت نے باطل کے جھنڈے اٹھا لیے 'کہیں بھی حق کا کوئی جھنڈا نظر نہیں آتا۔ پوری انسانیت نے اندھے پن اور گمراہی کے جھنڈے اٹھا لیے ان میں کہیں بھی ہدایت اور نور کا کوئی ایک جھنڈا نظر نہیں آتا۔ سب جھنڈے خسارے کے ہیں' کامیابی کا کوئی ایک جھنڈا بھی نظر نہیں آتا۔ اللہ کا وہ جھنڈا جس کے ذریعہ عرب دنیا پر چھا گئے تھے۔ آج بھی موجود ہے۔ یہ جھنڈا آج بھی کسی اٹھانے والے ہاتھ کا منتظر ہے۔ کسی ایک جماعت یا قوم کی ضرورت ہے جو اس جھنڈے کے نیچے بھلائی' ہدایت 'صلاح اور فلاح کی راہ پر چلے۔

یہ ہے 'اس جہاں میں نفع و نقصان کی کہانی۔ یہ دنیاوی عظمت اپنی جگہ بہت بڑی کامیابی ہے لیکن اگر ہم اس کا تقابل اخروی کامیابی کے ساتھ کریں تو یہ بہت ہی حقیر ہے۔ اصل نفع و نقصان آخرت کا ہے۔ وہاں ہی حقیقی نفع و نقصان ہے۔ اس لیے کہ وہ طویل زندگی ہے۔ اور ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی ہے۔ اور ہمیشہ رہنے والا جہاں ہے۔ اصل منافع اور اصل خسارہ وہاں ہے یعنی جنت' اللہ کی رضامندی کا منافع یا جہنم' اللہ کی ناراضگی کا خسارہ۔ آخرت میں جہاں انسان اپنے اعلیٰ ترین ترقی و کمال تک پہنچ سکا ہو گا یا اس قدر گر چکا ہو گا کہ اپنی انسانیت میں کھو بیٹھا ہو گا۔ وہ ایک پتھر کی قدر و قیمت تک گر جائے گا اور راحت و آرام میں پتھر سے بھی کم ہو گا۔

يَوْمَ يَنظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنتُ تُرَابًا (۷۸: ۴۰)

"جس دن ہر شخص وہ کچھ دیکھ لے گا جو اس نے کما کر آگے بھیجا اور کافر کہے گا کاش کہ میں مٹی ہو جاتا"۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سورت ایک فیصلہ کن اور دو ٹوک راہ حق بتاتی ہے' یہ بتاتی ہے کہ تمام راہیں خسارے کی ہیں ماسوائے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

( ۳ : ۱۰۳ ) "ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے اور حق کی وصیت کی اور صبر کی وصیت کی"۔ اور یہ ایک ہی راہ ہے اس میں تعدد نہیں ہے' یہ ایمان اور عمل صالح کی راہ ہے۔ایک اسلامی جماعت کے قیام کی راہ ہے۔ایک ایسی جماعت 'کی راہ جو حق کی نصیحت کرتی ہو اور جو خیر کی تلقین کرتی ہو' جو سچائی کی سپاہ ہو اور صبر اس کی تنخواہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ راستہ ایک ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب بھی رسول اللہ کے دو ساتھی ایک دوسرے سے ملتے تو تب جدا ہوتے جب وہ سورہ عصر پڑھ لیتے۔اس کے بعد وہ ایک دوسرے کو سلام کہہ کر چلے جاتے۔ دراصل ان کا باہم معاہدہ ہوتا تھا کہ اس انقلابی دستور پر چلیں گے وہ باہم معاہدہ کر لیتے تھے کہ ایمانی صلاح کی راہ پر گامزن رہیں گے۔حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہیں گے۔اور اس کا عہد کرتے تھے کہ وہ اس دستور کے چوکیدار رہیں گے اور اس جماعت کے فرد رہیں گے جو اس دستور پر گامزن ہوگی۔

---○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ -- ۳۰

## سورۃ الھمزۃ ۔ ۱۰۴

## ۱-- تا -- ۹

# درس نمبر ۳۰۴ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۹

آیاتها ۹ سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ (۱۰۴) مَكِّيَّةٌ (۳۲) رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ ﴿۱﴾ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ﴿۲﴾ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ
اَخْلَدَهٗ ﴿۳﴾ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ﴿۴﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ﴿۵﴾ نَارُ
اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ﴿۶﴾ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ﴿۷﴾ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۸﴾ ۱
فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿۹﴾ ع ۹
۲۹

”تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے' جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔ ہرگز نہیں' وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ چکنا چور کر دینے والی جگہ؟ اللہ کی آگ' خوب بھڑکائی ہوئی' جو دلوں تک پہنچے گی۔ وہ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی (اس حالت میں کہ وہ) اونچے ستونوں میں (گھرے ہوئے ہوں گے)“۔

یہ سورت بھی قرآن کے البم کی تصاویر میں سے ایک تصویر ہے۔ اور یہ تصویر دعوت اسلامی کے ابتدائی ایام کی حقیقی تصویر ہے لیکن یہ ایک ایسی تصویر ہے کہ ایسی تصاویر ہر سوسائٹی میں ملتی ہیں۔ یہ ایک گھٹیا اور چھوٹے درجے کے انسان کی تصویر ہے' ایک ایسے شخص کی جسے دولت دی گئی ہے اور دولت کی پرستش اور محبت اس پر چھا جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا چھوٹا ظرف اب طاقت نہیں رکھتا کہ اسے سمیٹ لے یا ہضم کرلے۔ ایسا شخص سوچنے لگتا ہے کہ دنیا میں تو ”مال“ اور ”دولت“ ہی اعلیٰ قدر ہے۔ یہ ایک ایسی قدر و قیمت ہے جس کے مقابلے میں تمام اقدار ہلکی ہیں' چاہے وہ ایمان کی قدریں' معانی کی قدریں ہوں' حقائق و عقائد کی قدریں ہوں اور وہ سوچتا ہے کہ چونکہ اسے مال دے دیا گیا ہے۔ اس

لیے اسے تمام اعزازات دے دیے گئے ہیں اور وہ لوگوں کی عزتوں اور حقوق کا مالک ہے۔

پھر یہ دولت مند یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ دولت کا دیوتا علی کل شئ قدیر ہے' وہ سب کچھ کر سکتا ہے اور کوئی ایسا کام نہیں ہے جو دولت کا دیوتا نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ وہ سمجھتا ہے کہ دولت کے ذریعہ سے موت کو بھی ٹالا جا سکتا ہے۔ زندگی کو دائمی بنایا جا سکتا ہے۔ اللہ کے نظام قضا و قدر و نظام جزاء و سزا کو بدلا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی حشر و نشر ہوا اور حساب و کتاب ہو بھی گیا تو وہاں بھی مال لگ سکتا ہے۔

چنانچہ ایسا شخص رات دن مال کے حصول کی جدوجہد کرتا ہے۔ دولت کو گنتا رہتا ہے اور گنتے گنتے مزے لیتا ہے۔ پھر اس مال کی وجہ سے اس کی فسق و فجور کی آگ بھڑکتی ہے۔ وہ لوگوں کے حقوق پامال کرتا ہے' ان کی آزادی سلب کرتا ہے اور ان کی عزت و شرافت کو پامال کرتا ہے۔ وہ لوگوں کو طعنے دیتا ہے اور ان کی برائیاں کرتا ہے۔ اپنی زبان سے ان کی عیب جوئیاں کرتا ہے اور اپنے رویے اور اپنی حرکات کے ذریعہ ان کے عیب نکالتا ہے۔ کبھی ان کی حرکات کی نقل اتارتا ہے' کبھی ان کی آواز کی نقل اتارتا ہے۔ کبھی ان کی صفات کو حقارت سے دیکھتا ہے' منہ زبانی یا اشارات کے ساتھ' کبھی ایک حقارت آمیز نظر سے اور کبھی گری ہوئی حرکات سے۔

یہ تصویر نفس انسانی کی تصاویر میں سے نہایت ہی حقیر اور گری ہوئی تصویر ہے۔ اس میں ایمان اور مروت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اسلام ایسی گری ہوئی تصاویر کو سخت ناپسند کرتا ہے' کیونکہ اسلام ایک بلند اخلاقی معیار رکھتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے بار بار مزاح' طعنہ زنی اور عیب جوئی سے لوگوں کو منع کیا ہے۔ البتہ اس سورت میں ان چیزوں کو نہایت ہی مکروہ شکل میں پیش کیا ہے اور ایسے گرے ہوئے اخلاق کا مظاہرہ کرنے والوں کو سخت دھمکی بھی دی ہے۔ اس سورت میں یہ اشارہ بھی ہے کہ دعوت اسلامی کے ابتدائی دنوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کی جماعت کو ایسے ہی حالات سے گزرنا پڑا تھا' چنانچہ بعض مالداروں کی ان حرکات کو سختی سے رد کیا گیا اور ان کو برے انجام کی سخت ترین دھمکی دی گئی۔ یہ حرکات کرنے والوں کے نام بھی بعض روایات میں بتائے گئے ہیں لیکن یہ روایات پختہ نہیں' لہذا یہی پس منظر مناسب ہے جو ہم نے بیان کر دیا۔

ایسے شخص کو یہاں جو دھمکی دی گئی ہے وہ قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کی شکل میں ہے' جس میں عذاب کی ایسی تصویر ہے جو مادی بھی ہے اور معنوی بھی ہے۔ آگ کی مادی اور حسی تصویر بھی کھینچی گئی ہے اور معنوی تصویر بھی۔ یہاں جرم و سزا اور طریقہ سزا اور عذاب کی فضا کے درمیان تقابل کی مناسبت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ایک ایسے ھمزہ (جو اشاروں سے لوگوں کا مذاق اڑاتا ہے) اور ایسے لمزہ (جو دوسروں کی صفات اور عزت پر زبان درازی کرتا ہے) کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ جس کا مشغلہ مال جمع کرنا ہے اور جو اس مال کو قاضی الحاجات بھی سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ یہ مال ہی اسے دوام بخشے گا جو مال کی وجہ سے اپنے آپ کو برتر سمجھتا ہے۔ اور جو مال ہی کو تمام قوتوں کا سرچشمہ سمجھتا ہے' لیکن ایسے شخص کی تصویر کے بالمقابل ایک دوسرے شخص کی تصویر ہے جو پرے پھینکا ہوا ہے' ناقابل التفات ہے اور الْحُطَمَة "چکنا چور کر دینے والی جگہ" میں پھینک دیا گیا ہے۔ یہ سزا اس کے لیے اس لیے تجویز ہوئی ہے کہ اس کے جسم کے ساتھ ساتھ اس کی کبریائی اور بڑائی کے زعم کو بھی پاش پاش کر دے اور یہ الْحُطَمَة ہے کیا نَارُ اللهِ الْمُوقَدَةُ (١٠٤ : ٦) "اللہ کی آگ خوب بھڑکائی ہوئی"۔ اس آگ کو اللہ کی آگ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ نادر

اور غیر معمولی آگ ہے' اس سے سننے والے پر ہوش ربا خوف اور دہشت طاری ہو جاتی ہے۔

الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ (۱۰۴:۷) "جو دلوں تک پہنچے گی"۔ اس شخص کے دل تک 'جس کے ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃٍ (۱۰۴:۱) کا فعل قبیح ابھرتا ہے اور جس کے اندر مزاح' تکبر اور غرور کا مواد چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یہ تصویر اس طرح مکمل ہوتی ہے کہ اس چھپکے ہوئے 'نظر انداز کیے ہوئے اور پاش پاش کر دیئے گئے شخص کو جس آگ میں پھینکا گیا ہے وہ اس کے روبرو سربند کر دی گئی ہے۔ کوئی اس سے نکل نہ سکے گا۔ کوئی وہاں اس کو پوچھنے کے لیے نہ آئے گا۔ اس آگ میں بھی یہ شخص ستونوں کے ساتھ بندھا ہوا ہو گا' جس طرح مویشیوں کو باڑوں میں باندھ دیا جاتا ہے۔ اس تصویر کشی کے لیے الفاظ کا جو رنگ استعمال کیا گیا ہے وہ بہت ہی شدید اور شوخ ہے۔

عَدَّدَہ --- کَلَّا لَیُنْبَذَنَّ --- تَطَّلِعُ --- مُّمَدَّدَۃٍ پھر جملوں کی جو تراکیب ہیں وہ بھی نہایت موکد اور زوردار ہیں۔

کَلَّا لَیُنْبَذَنَّ فِی الْحُطَمَۃِ (٤) وَمَآ اَدْرٰکَ مَالْحُطَمَۃُ (٥) نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ

(۱۰۴:۶) "البتہ وہ شخص تو لازماً ایک چکنا چور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ چکنا چور کر دینے والی جگہ؟ وہ اللہ کی آگ ہے 'خوب بھڑکائی ہوئی"۔ پہلے اسے مجمل لفظ سے تعبیر کیا گیا۔

الْحُطَمَۃ جہنم کے لیے صریح نہیں ہے اور یہ مبہم لفظ تھا۔ اس کے بعد اسے مزید خوفناک بنانے کے لیے سوال کیا تھا۔ اور اس کے بعد جواب دیا گیا اور تشریح کر دی گئی۔ یہ تمام اسالیب تاکید اور ہولناکی اور عظمت کے بیان کے لیے آتے ہیں' اور پھر انداز بیان تاکید کے ساتھ تہدید آمیز بھی ہے۔

وَیْلٌ "ہلاکت ہے اس کے لیے"۔ لَیُنْبَذَنَّ "اسے ضرور پھینکا جائے گا"۔ الْحُطَمَۃ "پاش پاش کرنے والی ہیں"۔ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ (۱۰۴:۶) "اللہ کی آگ جو خوب بھڑکائی ہوئی ہے"۔ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ (۱۰۴:۷) "جس کے اثرات دلوں تک پہنچیں گے"۔ اِنَّھَا عَلَیْھِمْ مُّؤْصَدَۃٌ (۱۰۴:۸) "اونچے ہوئے ستونوں میں بندھے ہوئے ہوں گے"۔ اس تصویر کشی کے لیے جو الفاظ چنے گئے ہیں ان میں تصویری اور شعوری مناسبت ہے ہمز اور لمز کا فعل بد کرنے والے شخص کے ساتھ۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم دعوت اسلامی کی رفتار پر نظر رکھ رہا تھا اور یہ قرآن ہی تھا جو روز مرہ کے واقعات پر تبصرہ کر کے رہنمائی کرتا تھا اور یہ بروقت راہنمائی ایک ایسا ہتھیار تھا جو دشمنوں کی سازشوں کا تانا بانا کاٹ کر رکھ دیتا تھا بلکہ ان پر ایک خوف طاری کر دیتا تھا اور اہل ایمان کی روحیں اطمینان سے سرشار ہو جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان دو تصویروں کی جو مذمت فرمائی ہے اس میں ہمیں حکمت کے دو نکات نظر آتے ہیں۔

(ا) یہ کہ اسلامی سوسائٹی اخلاقی گراوٹ کو قبول نہیں کرتی۔ اور اس قسم کے لوگ جہاں اور جس معاشرے میں ہوں

وہ قابل مذمت ہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی مدافعت فرماتا ہے اور ان کو اس بات سے بچاتا ہے کہ لوگوں کے اس توہین آمیز رویے سے کہیں ان میں احساس کمتری پیدا نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس سورت میں ان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے' اللہ دیکھ رہا ہے' اللہ اسے ناپسند کرتا ہے' اس پر ان کو سزا دے رہا ہے' اس طرح اہل ایمان روحانی تائید پاتے ہیں' اور ان کے اندر اخلاقی برتری کا احساس پایا جاتا ہے اور ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ ان کے خلاف جو سازشیں ہو رہی ہیں وہ بہت ہی گھناؤنی ہیں اور گھٹیا لوگوں کی طرف سے ہیں۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ الفیل ـ ۱۰۵

## ۱-- تا-- ۵

# سورۃ الفیل ایک نظر میں

اس سورت میں ایک ایسے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ' جو جزیرۃ العرب میں بہت مشہور تھا۔ یہ واقعہ بعثت نبوی سے قبل پیش آیا تھا ' اور اس سے یہ بات عیاں ہوگئی تھی کہ اس خطہ مبارکہ پر اللہ کا کس قدر کرم ہے اور یہ کہ اللہ نے اسے منزل نور اور مہبط ہدایت اور آخری وحی کے مرکز کے لیے منتخب کر لیا ہے ' اور یہ علاقہ جدید نظریہ کا گہوارہ قرار دیا ہے اور یہ کہ یہ نقطہ آغاز ہے جہاں سے یہ جدید عقیدہ پوری دنیا میں جاہلیت کا پیچھا کرنے والا تھا۔ اور اس طرح اللہ کے منشا اور ہدایت کے مطابق دنیا میں ہدایت ' حق اور بھلائی نے ثبوت و قرار پکڑنا تھا۔

اس حادثہ کے بارے میں جو متعدد روایات وارد ہیں ۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ یمن کے حبشی حاکم ابرہہ نے یمن میں ایک کنیسہ بنایا ' یہ اس وقت کی بات ہے جب ابرہہ نے یمن کو فتح کر لیا اور یہاں سے ایرانیوں کو نکال دیا ۔ یہ کنیسہ اس نے حبشہ کے بادشاہ کے نام سے بنوایا اور اس میں برتری اور عظمت کے تمام اسباب فراہم کیے ۔ مقصد یہ تھا کہ تمام عرب بشمول اہل یمن و اہل شمال خانہ کعبہ کا جو بے حد احترام کرتے تھے اور ان کو اس سے جو بے حد محبت تھی ' ان کو بیت اللہ سے موڑ کر اس نئے گرجا کا گرویدہ بنا دیا جائے ' اس نے شاہ حبشہ سے اپنی اس پالیسی کی منظوری بھی لی۔

لیکن عربوں کے دل سے اپنے مقدس مقام خانہ کعبہ کی محبت نہ نکلی کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی اولاد سے ہیں اور انہوں نے اس گھر کو تعمیر کیا ہے اور یہ ان کی شناخت ہے کیونکہ عرب نسب اور قوم پر بہت فخر کرتے تھے ۔ اور عربوں کے عقائد اور نظریات ' ان کی نظر میں انہی کمزوریوں کے باوجود ان کو اہل کتاب کے معتقدات اور نظریات سے بہتر نظر آتے تھے کیونکہ اہل کتاب کے نظریات بھی اصل حقیقت سے بہت دور ہو گئے تھے ۔

جب ابرہہ نے دیکھا کہ لوگ خانہ کعبہ سے اس کے بنائے ہوئے کنیسہ کی طرف نہیں لوٹ رہے ہیں تو اس نے فیصلہ کیا کہ خانہ کعبہ کو منہدم کر دیا جائے ۔ اس نے ایک ہزار لشکر تیار کیا جس کے آگے ہاتھیوں کا دستہ تھا اور ان کے آگے پھر ایک بڑا ہاتھی تھا جو ان کے نزدیک جنگ میں بہت مشہور تھا۔ عربوں کو ابرہہ کے ارادے کی اطلاع ہوگئی اور وہ اس بات سے بہت پریشان ہوئے کہ اب ان کا یہ مقدس گھر گرا دیا جائے گا۔ اہل یمن کے روساء اور بادشاہوں میں سے ایک شخص ذونفر نے اپنی قوم کو بلایا۔ پورے بلاد عرب میں سے جن لوگوں نے اس کی دعوت پر لبیک کہا۔ ان کے ساتھ ابرہہ سے لڑا لیکن وہ شکست کھا گیا اور ابرہہ نے اسے گرفتار کر لیا۔

اس کے بعد ابرہہ کا راستہ نفیل ابن حبیب خثعمی نے روکا ' جس کے ساتھ دو قبیلے تھے اور تمام دوسرے عرب قبائل نے بھی ایک بڑی تعداد میں اس کا ساتھ دیا۔ ابرہہ نے ان کو بھی شکست دی اور نفیل مذکور کو قیدی بنا لیا۔ نفیل اس بات پر راضی ہو گیا کہ وہ عرب کے علاقوں میں ابرہہ کے لیے گائیڈ کا کام کرے گا۔

جب یہ طائف پہنچا تو ثقیف کے کچھ لوگ اس سے ملے اور انہوں نے کہا کہ جس گھر کو وہ گرانے نکلا ہے وہ طائف

میں نہیں ہے ۔ وہ تو مکہ میں ہے ۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ انہوں نے لات بت کے لیے جو گھر بنایا تھا' اس کا منہ اس سے موڑ دیں ۔ انہوں نے اس کو خانہ کعبہ تک پہنچنے کے لیے گائیڈ دیئے ۔

جب ابرہہ مکہ اور طائف کے درمیان مقام مغمس تک پہنچا تو اس نے اپنے جرنیلوں میں سے ایک جرنیل کو مکہ بھیجا تو اس نے پورے تہامہ کے علاقے سے مال مویشی پکڑ کر ابرہہ کے پاس بھیجے ۔ جن میں قریش کے مال مویشی بھی تھے ۔ اور عبدالمطلب سے ابن ہاشم کے دو صد اونٹ بھی تھے ۔ عبدالمطلب اس زمانے میں قریش کے سردار تھے ۔ چنانچہ قریش ' کنانہ ' ھذیل اور دوسرے قبائل جو خانہ کعبہ کے اردگرد تھے ' نے ارادہ کیا کہ ابرہہ کے ساتھ لڑیں ۔ انہوں نے جب جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ ابرہہ کے ساتھ نہیں لڑ سکتے ۔ تو انہوں نے آخر کار لڑنے کا ارادہ ترک کر دیا ۔

ابرہہ نے اپنا ایک ایلچی مکہ بھیجا تا کہ ' یہاں کے سردار کو مل کر یہ کہہ دے کہ وہ لوگوں کے ساتھ لڑنے کے لیے نہیں آیا ۔ اس کا مقصد صرف اس گھر کو ڈھانا ہے ۔ اگر وہ اس کی راہ نہ روکیں تو اسے ان کے خون بہانے میں کوئی دلچپی نہیں ہے ۔

ابرہہ نے اپنے ایلچی کو ہدایات دیں کہ اگر مکہ کا سردار لڑنا نہیں چاہتا تو اسے ساتھ لے آئے ۔ اس موضوع پر جب عبدالمطلب نے اپنے لوگوں سے بات چیت کی تو ان سے کہا کہ ہم جنگ نہیں چاہتے اور نہ جنگ کی طاقت رکھتے ہیں ۔ یہ اللہ کا گھر ہے اور اللہ کے دوست ابراہیم خلیل اللہ کا گھر ہے ۔ اگر اللہ اس کا دفاع کرے تو یہ اس کا گھر اور حرم ہے ۔ اور اگر اللہ ابرہہ کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ اس کو گرا دے تو اس کی رضا ۔ ہم تو دفاع کی قوت نہیں رکھتے"۔ اس مشورے کے بعد عبدالمطلب ابرہہ کے ایلچی کے ساتھ چلے گئے ۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عبدالمطلب تمام لوگوں میں نہایت خوش شکل ' رعب دار اور پروقار شخص تھے ۔ جب ابرہہ نے انہیں دیکھا تو ان کا بڑا احترام کیا ۔ اور یہ پسند نہ کیا کہ انہیں تخت سے نیچے بٹھائیں ۔ اور یہ بھی اس نے مناسب نہ سمجھا کہ تخت کے اوپر وہ اس کے مساوی بیٹھیں ۔ چنانچہ ابرہہ اپنے تخت سے اترا تو فرش پر بیٹھا اور عبدالمطلب کو بھی ساتھ بٹھایا ۔ اس کے بعد اس نے اپنے ترجمان سے کہا کہ "اسے کہو تم کیا چاہتے ہو؟" تو انہوں نے جواب دیا "میرا مطالبہ یہ ہے کہ بادشاہ دو سو اونٹ دے دے جو میری ملکیت ہیں"۔ جب عبدالمطلب نے یہ کہا تو ابرہہ نے اپنے ترجمان سے کہا کہ اسے یوں کہو : "جب میں نے تمہیں دیکھا تو تمہاری شخصیت سے میں بہت متاثر ہوا ۔ لیکن جب تم نے میرے ساتھ بات کی تو میں سمجھتا ہوں کہ تم کچھ بھی نہیں ہو ۔ کیا تم مجھ سے صرف دو سو اونٹوں کے بارے میں بات کرتے ہو؟ اور اس گھر کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہتے ۔ جو تمہارا دینی مرکز ' تمہارے باپ کا دینی مرکز ہے اور میں اسے گرانے کے لیے آیا ہوں"۔ اس پر عبدالمطلب نے کہا : "میں تو ان دو سو اونٹوں کا مالک ہوں اور اس گھر کا مالک موجود ہے اور وہ عنقریب اس کا دفاع کرلے گا"۔ اس پر ابرہہ نے کہا "وہ میرا مقابلہ نہیں کر سکتا"۔ عبدالمطلب نے کہا تم جانو اور تمہارا کام ۔ اس کے بعد ابرہہ نے عبدالمطلب کے اونٹ لوٹا دیئے ۔

عبدالمطلب مکہ واپس ہوئے ' بات چیت کے بارے میں لوگوں کو مطلع کیا اور حکم دیا کہ شہر کو خالی کر دو اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر پناہ لے لو ۔ اس کے بعد عبدالمطلب اٹھے اور قریش کے کچھ دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ ہو لیے ۔ عبدالمطلب نے خانہ کعبہ کا کنڈا پکڑا اور اس کے ساتھ کچھ دوسرے لوگ کھڑے ہو گئے ' وہ اللہ سے زاری کرنے لگے '

اس کی مدد کے طلبگار ہوئے اور روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے اس موقعہ پر یہ اشعار پڑھے

لاھم ان العبد یمنع رحلہ فامنع رحالك

لا یغلبن صلیبھم ومحالھم ابدا محالك

ان کنت تارکھم وقبلتنا فامر ما بدا لك

"(۱) اے اللہ ہر بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے' تو اپنے گھر کی حفاظت فرمایا۔ (۲) ان کی صلیب اور ان کی تدبیر تیری تدبیر پر غالب نہ آئے۔ (۳) اگر تو ان کو ہمارے قبلے کو اپنے حال پر چھوڑتا ہے تو بھی جس طرح چاہے حکم دے"۔

ابرہہ نے اپنی فوج اور ہاتھی کو اپنی منزل کی طرف بڑھایا' مکہ کے قریب آکر ہاتھی پر بیٹھ گیا اور مکہ کے اندر داخل نہ ہوا۔ انہوں نے بے حد کوشش کی کہ ہاتھی کو مکہ میں داخل کریں مگر وہ کامیاب نہ ہوئے۔ اور یہ بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے بھی ثابت ہے جب حضورؐ کی اونٹنی قصواء مکہ کے باہر آکر بیٹھ گئی۔ تو لوگوں نے کہا کہ قصواء بگڑ گئی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ قصواء بگڑ کر نہیں بیٹھ گئی اور نہ یہ اس کی عادت ہے' لیکن اسے اس ذات نے روک دیا ہے جس نے ہاتھی کو روکا تھا"۔ (بخاری) اور صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا "اللہ نے مکہ سے ہاتھی کو روکا اور اپنے رسولؐ اور اہل ایمان کو اس پر مسلط کر دیا۔ اور آج مکہ کا احترام اسی طرح لوٹ آیا جس طرح کل وہ محترم تھا۔ یاد رہے کہ یہ بات ہر سننے والا غائب تک پہنچا دے"۔ لہٰذا یہ ایک مستند بات ہے کہ اصحاب فیل کے دن اللہ نے ہاتھی کو مکہ سے روک دیا تھا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ اللہ نے اس لشکر اور اس کے قائدین کو ہلاک کر دیا۔ اس لشکر پر غول کے غول پرندے بھیجے گئے' یہ پرندے ان پر کیچڑ سے بنی ہوئی کنکریاں پھینکتے تھے اور اس کے نتیجے میں اس لشکر کی حالت یہ ہو گئی جس طرح درختوں کے خشک پتے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں جس کی تفصیل قرآن نے بیان کی ہے۔ ابرہہ کا جسم بھی متاثر ہوا۔ یہ لوگ اسے اٹھا کر لے گئے۔ اس کا پورا پور اگر رہا تھا۔ اسے صنعا تک پہنچایا گیا۔ اور جس طرح روایات میں آتا ہے کہ اس کی موت یوں ہوئی کہ اس کا سینہ شق ہوا اور اس کا دل اس سے باہر نکل آیا۔

روایات میں ان پرندوں کے غولوں کے بارے میں اختلاف ہے کہ ان کی شکل کیسی تھی' حجم کیا تھا' ان پتھروں کا حجم کیا تھا' ان کی نوعیت اور اثرات کیسے تھے جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے۔ اس سال مکہ میں چیچک اور خسرہ کی وبا بھی پھوٹی۔

وہ لوگ جو یہ میلان رکھتے ہیں کہ خوارق عادت واقعات اور معجزات کے دائرے کو تنگ کر دیں اور واقعات کو اللہ کے ان قوانین کے اندر اندر دیکھا جائے جو اللہ نے جاری کیے ہیں اور جو مالوف ہیں' یہ خیال کرتے ہیں اور زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ واقعہ چیچک اور خسرے کی وجہ سے پیش آیا۔ الا یہ کہ لفظ "طیر" کا اطلاق عربی میں ہر اڑنے والی چیز پر ہوتا ہے جس میں مکھی مچھر شامل ہیں جو جراثیم کو ادھر ادھر منتقل کرتے ہیں۔

امام مفتی محمد عبدہ پارہ عم کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "اگلے روز لشکر میں چیچک اور خسرہ کی وبا پھوٹ پڑی۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ چیچک کی یہ پہلی وبا تھی۔ یعقوب ابن عتبہ کا قول ہے کہ چیچک کی وبا سب سے پہلے اسی سال پھیلی اور خسرہ بھی اسی سال دیکھا گیا۔ اس وبا نے ان کے اجسام پر انوکھے اثرات ڈالے۔ لوگوں کے جسموں سے گوشت کٹ کر گرنے لگا جب یہ

واقعات شروع ہوئے تو لشکر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ لوگ بھاگنے لگے ۔ اس بیماری کا اثر ابرہہ پر بھی ہوا۔ اس کے جسم کا گوشت بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرنے لگا۔ یہاں تک کہ سینہ تک پھٹ گیا اور صنعا پہنچ کر مر گیا"۔

"اس پر روایات متفق ہیں اور اس کو ماننا چاہیے۔ سورت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیچک اور خسرہ ان پرندوں کی وجہ سے پھیلا جو لشکروں کی صورت میں غول در غول ہواہیں اڑکر آتے اور لشکر پر برستے؟"

"یہ اعتقاد کیا جا سکتا ہے کہ یہ پرندے مچھر اور مکھی کے جنس سے تھے جن کی وجہ سے جراثیم پھیلتے ہیں ۔ اور سنگریزے اس خشک مٹی کے ہوں گے جسے ہوائیں اڑاتی ہیں ۔ اور جانوروں' پرندوں اور مچھروں اور مکھیوں کے ذریعہ ادھر ادھر منتقل ہوتے ہیں ۔ یہ زہریلا غبار انسانوں کے مساموں میں داخل ہو جاتا ہے اور اس سے پھوڑے اور زخم پیدا ہو جاتے ہیں ۔ بدن خراب ہو جاتا ہے اور گوشت کٹ کر گرتا ہے ۔ یہ پرندے 'مکھی اور مچھر اللہ کے لشکروں میں سے ہیں اور انہی کے ذریعہ اللہ کئی لوگوں کو ہلاک و برباد کرتا ہے ۔ یہ چھوٹے سے جانور جن کو جرثومہ اور جراثیم کہا جاتا ہے' یہ بھی اللہ کے لشکر ہیں ۔ اور ان لشکروں کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے ۔ باغیوں اور سرکشوں کو ہلاک کرنے کے لیے اللہ کی قدرت اس پر موقوف نہیں ہے کہ وہ پرندے بڑے بڑے ہوں' پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرح یا یہ کہ وہ عنقا کی طرح عجیب و غریب پرندے ہوں یا ان کے مخصوص رنگ ہوں ۔ نہ اللہ کی قوت سنگریزوں کے سائز پر موقوف ہے ۔ اور نہ ان تفصیلات پر کہ جسم پر ان کے اثرات کس طرح نمودار ہوئے ۔ کیونکہ ہر شے دراصل اللہ کی فوج کی حیثیت رکھتی ہے ۔

وفي كل شيء له آية – تدل على انه واحد

"اور ہر چیز میں اللہ کے نشانات ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہی وحدہ لاشریک ہے"۔

اس کائنات کے تمام قوانین اللہ کی مطیع فرمان ہیں ۔ چنانچہ اللہ نے اس سرکش انسان کی سرزنش کے لیے ایسے پرندے بھیجے' جنہوں نے اس تک خسرے اور چیچک کے جراثیم پہنچا دیئے' وہ ہلاک ہوا' اس کی فوج تتر بتر ہو گئی ۔ یہ لوگ مکہ میں داخل نہ ہو سکے اور اہل مکہ پر یہ اللہ کا خاص فضل و کرم تھا' جو ان کی بت پرستی کے باوجود ان پر کیا گیا ۔ اور یہ کام اللہ نے اپنے گھر کی حفاظت کے لیے کیا اور یہ بات تمہید تھی رسول آخر الزمان کی آمد کے لیے تاکہ وہ آئیں اور اپنے آخری دین سے اس گھر کو مزید مستحکم کر دیں ۔ اس طرح اللہ نے بیت اللہ کے مخالفین پر عذاب نازل کیا جو بغیر کسی جواز کے اس کو ڈھانے کے لیے آئے تھے اور انہیں تباہ کر دیا"۔

اس سورہ کی تفسیر میں یہی بات قابل اعتماد ہے اور اگر اس کے خلاف کوئی صحیح روایت بھی ہو تو اس کی تاویل کرنا چاہئے ۔ تاویل کے بغیر قبول کرنا درست نہ ہو گا ۔ کیا یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ نہیں ہے کہ جو سرکش ہاتھی جیسے قوی الجثہ حیوان کا سہارا لیتا ہے' اسے اللہ ایک چھوٹے سے حیوان جرثومے کے ذریعہ جو صرف خوردبین سے نظر آتا ہے' تباہ و برباد کر دے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دانش مند انسان کے لیے یہ عظیم تر معجزہ ہے اور عجیب و غریب ہے"۔

ان آیات کی تفسیر میں دو انتہائی آراء اختیار کی گئی ہیں' ایک یہ جس طرح امام عبدہ کہتے ہیں کہ یہ خسرے کی اور چیچک کی وبا تھی جس کے جراثیم پرندوں کے پاؤں کے ساتھ اٹی ہوئی مٹی کے ذریعہ پھیلے اور دوسری یہ کہ جس طرح روایات میں آتا ہے کہ پرندے جو پتھر پھینکتے تھے وہ بذات خود لوگوں کے سروں اور جسموں کو جلا دیتے تھے' یہ پتھر جسموں

کے اندر داخل ہو کر ان کو ریزہ ریزہ کر دیتے تھے اور اس طرح کر دیتے تھے جس طرح خشک پتھروں کے ٹکڑے ہوتے ہیں جس طرح کھایا ہوا بھوسہ ہوتا ہے۔ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان میں سے کون سی صورت زیادہ اللہ کی قدرت پر دلالت کرتی ہے یا اس واقعہ کی تفسیر کے لیے کون سی بہتر ہے۔دونوں کا امکان بہرحال ہے۔اور اس بات کا امکان ہے کہ اللہ کسی قوم کو اس ذریعہ سے ہلاک کرے جو معلوم و مالوف ہو یا کسی ایسے ذریعہ سے ہلاک کرے جو ہمارے حد ادراک سے ماوراء ہو اور ہم ابھی اسے جان نہ سکے ہوں۔

اللہ کی سنت فقط یہ نہیں ہے جسے لوگ جانتے ہوں اور اس کے جاری رہنے کے وہ عادی ہوں۔جبکہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ انسان ابھی تک سنن الہیہ کے بالکل ایک معمولی حصے کو معلوم کر سکا ہے اور اس کا علم اس کی طاقت کے حدود کے اندر ہے اور جس قدر سنن الہیہ کو انسان نے اپنے طویل تجربات اور اس کے نتیجے میں آنے والی معلومات و مدرکات کے ذریعہ معلوم کیا ہے جن باتوں کو لوگ معجزات کہتے ہیں وہ بھی دراصل اللہ کے جاری کردہ قوانین ہیں' یہ عجیب اور خارق عادت اور معجزہ صرف انسان کو نظر آتے ہیں۔انسانی محدود علم کے مطابق وہ معجزہ ہوگئے ہیں۔

لہٰذا ایسے خوارق کا ذکر پڑھ کر ہم نہ کوئی تردد کرتے ہیں اور نہ فضول تاویلات کرتے ہیں۔بشرطیکہ وہ روایات صحیح ہوں اور نصوص و روایات میں ایسی بات ہو جو معجزہ نظر آتی ہو اور لوگوں کے مالوف اور عادی طریقے کے برعکس ہو اور معجزہ ہو۔نیز یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اگر کوئی واقعہ انسانی مشاہدات کے مطابق ہو تو وہ کم اعجازی شان رکھتا ہے بمقابلہ اس واقعہ کے جو انسانی مشاہدے اور مالوف طریقے کے خلاف ہو' اور خارق عادت ہو۔کیونکہ وہ سنن الہیہ جو معروف و مشاہد ہیں' وہ بھی انسانی قدرت کے مقابلے میں معجزانہ شان رکھتی ہیں۔سورج کا طلوع و غروب ہر دن ہمارے مشاہدے میں ہے۔اور ہم اس کے عادی ہیں لیکن یہ نظام اپنی جگہ ایک معجزہ ہے۔ایک بچہ کی پیدائش نہایت ہی روٹین کی بات ہے۔ہر وقت بچے پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن بچے کی ولادت ایک بڑا معجزہ ہے۔اگر کوئی چاہے تو اس کا تجربہ کر لے۔اور پرندوں کا اس لشکر پر مسلط کیا جانا' چاہے وہ جو بھی پرندہ ہو' اور ان کے ذریعہ ایسے جراثیم اس لشکر کی طرف منتقل کیا جانا جن سے چیچک اور خسرہ کی وبا پھوٹ پڑے اور یہ جراثیم ایک مخصوص وقت میں مخصوص جگہ پر پیدا کرنا جس پر ایک لشکر حملے کے لیے تیار ہو۔اس انداز کا واقعہ بھی ایک معجزہ ہے بلکہ یہ معجزہ اپنے اندر کئی معجزات رکھتا ہے اور اس سے اللہ کی تقدیر اور اس کی قدرت کی وسعت معلوم ہوتی ہے۔یہ معجزہ اس شکل کے معجزے سے کم نہیں جس میں کچھ مخصوص پرندے' مخصوص شکل کے پتھر اٹھائے ہوئے غول در غول آئیں' ایک مقررہ وقت میں لشکر پر حملہ آور ہوں اور وہ پتھر اس لشکر کے جسم میں معجزانہ نتائج پیدا کر دیں۔اگر حقیقت بین نظر سے دیکھا جائے تو دونوں صورتیں معجزانہ ہیں اور دونوں برابر کا اعجاز رکھتی ہیں۔

جہاں تک اس مخصوص واقعہ کا تعلق ہے تو ہماری رائے یہ ہے کہ یہ ایک ایسا معجزہ ہے جو معمول کے مطابق نہیں ہے بلکہ خارق العادت اور غیر مالوف ہے۔اللہ نے غیر معمولی قسم کے پرندے بھیجے جو ابابیل تھے۔روایات میں ان کا حجم اور شکل اور صفات بھی بتائی گئی ہیں' لیکن ضروری نہیں ہے ایسی تمام روایات کو قبول کیا جائے۔کیونکہ ایسے مقامات پر مبالغہ کیا جاتا ہے اور بات کو خوفناک بنایا جاتا ہے۔بہرحال یہ پرندے غیر معمولی پتھر اٹھائے ہوئے تھے اور یہ جسموں پر غیر معمولی اثرات ڈالتے تھے۔

ہم اس واقعہ میں اس کے غیر معمولی ہونے کی طرف اس لیے مائل نہیں ہیں کہ اس صورت سے اللہ کی قدرت پر کچھ زیادہ روشنی پڑتی ہے یا حقیقت واقعہ میں کوئی عظمت پیدا ہوتی ہے بلکہ اس لیے کہ اس سورت کی فضا' واقعہ کے حالات میں یہ تفسیر زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس طرح اس گھر کی دھاک دلوں میں بٹھانا چاہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس گھر کی حفاظت اس لیے کرنا چاہتا تھا کہ یہ انسانوں کے لیے امن اور پناہ کی جگہ تھی اور اس کی اس حیثیت پر حرف نہ آئے۔ اور اس لیے بھی کہ نبی آخرالزمان آنے والے تھے اور وہ اس دنیا کو ایک نئی نظریاتی سوسائٹی اور ایک نیا نظریہ دینے والے تھے اور اللہ کو منظور یہ تھا کہ یہ نیا عقیدہ مکہ سے آزادی کے ساتھ ترقی کرے اور نہایت آزادانہ فضا میں یہاں سے پھیلے اور کوئی خارجی قوت اس پر اثرانداز نہ ہو' اور یہاں کوئی ایسی بین الاقوامی قوت نہ ہو کہ وہ اس نئے عقیدے کو اس کے سرچشمے کے اندر ہی دبا دے اور گھیر لے۔ اور اس لیے کہ یہ واقعہ سب لوگوں کے اور سب نسلوں کے لیے عبرت خیز ہو' اور قریش کو' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد' یہ بتایا جائے کہ دیکھو تم پر اس گھر کی وجہ سے اللہ کے کیا کیا احسانات ہوئے اور یہ کہ اس گھر کا نگران اللہ ہے' اس کی حرمت لازمی ہے اور اس واقعہ سے عبرت پکڑو۔ ان حالات میں مناسب یہی ہے کہ یہ واقعہ غیر معمولی ہو اور اس کے تمام اجزاء اور تمام عناصر غیر معمولی ہوں' فضا بھی غیر معمولی ہو تو ہمارے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ بتکلف اسے ایک معمولی واقعہ کی شکل میں پیش کریں۔

روایات میں اس واقعہ کے نتیجے میں جو اثرات بتائے گئے ہیں' وہ اثرات بالعموم چیچک اور خسرے کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوتے۔ اس واقعہ میں فوج اور اس کے کمانڈر کے اجسام ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اور ان کے پورے پورے گر گئے۔ اور سینہ پھٹ کر دل باہر آ گئے۔ یہ واقعات چیچک اور خسرے کی بیماری میں کب ہوتے ہیں اور خود سورت بتاتی ہے کہ اس واقعہ کے اثرات غیر معمولی تھے۔

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ (۱۰۵:۵) "ان کو جانوروں کے کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا"۔ اس میں اس واقعہ کے غیر معمولی ہونے کی طرف براہ راست اشارہ ہے۔

عکرمہ کی روایت اور یعقوب ابن عتبہ نے جو بیان کیا وہ اس بارے میں منصوص نہیں ہے کہ ابرہہ کی فوج یا وہ چیچک یا خسرے سے ہلاک ہوا' ان روایات میں صرف یہ بات صراحت سے کہی گئی ہے۔ کہ اسی سال عرب میں چیچک اور خسرہ کی وبا پہلی مرتبہ پھیلی۔ ان کے اقوال میں اس طرف اشارہ تک نہیں ہے کہ ابرہہ یا اس کا لشکر اس وبا میں مبتلا ہوا۔ اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ پرندے اور پھر ان جراثیم کو صرف ابرہہ اور اس کے لشکر کی طرف منتقل کر رہے تھے اور یہ جراثیم عرب کے باشندوں پر اثر نہ ڈالتے تھے تو یہ بات بذات خود ایک خارق عادت معجزہ بن جاتی ہے۔ اگر اس تاویل کے بعد بھی صورت معجزہ ہی کی رہ جاتی ہے تو پھر اس معجزے کو ایک معمولی اور مالوف واقعہ کی شکل دینے کے تکلف کی ضرورت کیا ہے۔ محض اس لیے کہ یہ لوگوں کے فہم کے اندر آ جائے۔ حالانکہ واقعہ کا ماحول اور پس منظر یہ تقاضا کرتا ہے کہ یہ معجزہ ہو۔

ہم ان حالات اور محرکات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جن کا دباؤ اس عقلی مکتب فکر پر تھا' جس کے صدر نشین ایک دور میں استاد محمد عبدہ تھے۔ ان محرکات کی وجہ سے اس مکتب فکر نے قرآن مجید کی تفسیر میں اور اسلامی تاریخ کی تعبیر میں خارق

عادت واقعات اور معجزات کے دائرے کو محدود کرنے کی کوشش کی ۔ ان حضرات کی کوشش یہ تھی کہ ان معجزات اور واقعات کو ان قوانین قدرت کے مطابق بنایا جائے جو اس کائنات میں جاری ہیں ۔ اس دور میں عامتہ المسلمین کے ذہنوں پر عجیب و غریب خرافات چھائے ہوئے تھے اور کتب تفسیر اور اسلامی تاریخ اسرائیلی خرافات سے بھری پڑی تھی ' اور یہ دور ایسا تھا کہ اس میں سائنس اور جدید انکشافات کا فتنہ اپنے عروج پر تھا اور لوگ دین کی اساسیات میں بھی شک کرنے لگے تھے اور فتنہ تشکیک اپنے عروج پر تھا ۔ اس مکتبہ فکر کی پالیسی یہ تھی کہ دین کو عقل کے مطابق بنا کر عوام الناس میں دین پر اعتماد از سر نو بحال کیا جائے ۔ اس لیے ان لوگوں نے بڑی کوشش کی کہ دین کو خرافات سے پاک کیا جائے ۔ پھر ان لوگوں نے مسلمانوں کے اندر ایک ایسی فکر پیدا کی جس کے نتیجے میں مسلمان اس کائنات میں جاری و ساری سنن الٰہیہ کو بھی سمجھنے لگے اور یہ بھی سمجھنے لگے کہ یہ سنن الٰہیہ اٹل ہیں ۔ اور جس طرح انسانی حرکات و سکنات ان سنن الٰہیہ کے تابع ہیں اسی طرح اس کائنات کے عظیم الجثہ کرات کی حرکات بھی انہی قوانین کے مطابق ہیں ۔ اور یہ فہم اور یہ شعور قرآن کریم کے عین مطابق ہے ۔ کیونکہ پورے قرآن میں لوگوں کو بار بار اس طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ ان قوانین فطرت پر غور کریں جو اس پوری کائنات میں جاری و ساری ہیں اور اٹل ہیں ۔ ان کے اندر تسلسل ہے اور تمام منفرد اور بکھرے ہوئے واقعات ان سنن کے مطابق ہیں ۔

اگرچہ اسی مدرسہ فکر پر ایک طرف سے خرافات کا دباؤ تھا ' دوسری طرف سے سائنسی خرافات کا دباؤ تھا ' لیکن اس دو طرفہ دباؤ کی وجہ سے یہ مدرسہ بھی توازن قائم نہ رکھ سکا اور اس کے اوپر کچھ برے اثرات بھی پڑے ۔ یہ مدرسہ بہت محتاط ہو گیا اور انہوں نے یہ قرار دیا کہ وہ سنن الٰہیہ جن کو انسانوں نے سمجھ لیا ہے وہ کلی ہیں اور ان کے اندر استثناء ممکن نہیں ہے ۔

چنانچہ استاد محمد عبدہ ' ان کے شاگرد استاد سید رشید رضا اور استاد شیخ عبدالقادر مغربی کی تفاسیر میں عام روش یہ اختیار کی گئی کہ جس قدر معجزات و خوارق عادت قرآن میں مذکور تھے ان کی ایسی تاویلات اور تعبیرات کی گئیں کہ وہ سائنس اور عقل انسانی کے مطابق ہو جائیں اور ایسے واقعات ہو جائیں جو معمول کے مطابق ہوتے ہیں اور انہوں نے بعض معجزات کی ایسی تفسیر کرنے کی کوشش کی کہ وہ معقول بن جائیں ۔ غرض انہوں نے تمام غیبی حقائق سے مکمل اجتناب کیا اور اس سلسلے میں سخت احتیاط سے کام لیا ۔

ہم اس بات کو بھی سمجھتے ہیں کہ اس مکتب فکر نے کن عوامل کے تحت یہ روش اختیار کی اور اس کی قدر بھی کرتے ہیں ۔ لیکن ہم اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس مکتب فکر نے مبالغے سے کام لیا اور قرآن کریم کے ایک دوسرے اٹل فیصلے کو نظرانداز کر دیا کہ اللہ کی مشیت بے قید ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ اور اللہ کی قدرت ان قوانین پر بھی حاوی ہے جو خود اللہ نے اس کائنات میں جاری کیے ۔ اللہ کی مشیت کی یہ بے قیدی اور یہ آزادی اس بات کی نفی کرتی ہے کہ عقل کوئی آخری حاکم اور سپریم جج ہے اور عقل کی معقولات ہی آخری معیار ہیں ۔ اگر کوئی بات ان معقولات کے خلاف ہے تو وہ قابل استرداد ہے اور اس کی تاویل ضروری ہے جیسا کہ ان حضرات کی تفاسیر اس روش سے اٹی پڑی ہیں ۔

نیز اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ اللہ کی سنن صرف ان سنن تک محدود نہیں ہیں جن کو تمہاری عقل نے ادراک کر لیا ہے ۔ جن سنن الٰہیہ کو انسان نے سمجھا ہے وہ قوانین قدرت کا نہایت ہی معمولی حصہ ہیں ۔ اللہ کے

قوانین قدرت جو ہمیں معلوم ہیں اور جو معلوم نہیں (معجزات) دونوں دراصل اللہ کی قدرت پر دال ہیں اور اللہ کے نظام قضا و قدر کی دقت اور شمول پر دلیل ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم نہایت احتیاط سے کام لیں اور خرافات اور قصے کہانیوں کی نفی بھی اعتدال سے کریں۔ کسی خاص معاشرے میں پائے جانے والے مروج افکار سے متاثر نہ ہوں اور نہ کسی دور میں مروج اور قبول عام رکھنے والے افکار کو بے سوچے سمجھے قبول کریں۔

اس قسم کی قرآنی آیات کی تفسیر کے لیے ایک محفوظ اصول و انداز ہے۔ مناسب ہے کہ یہاں اس کی وضاحت کر دی جائے۔ وہ یہ کہ ہمیں کسی آیت پر اس طرح غور نہیں کرنا چاہئے کہ ہم پہلے اپنے ذہنوں میں کچھ اصول طے کر لیں، کچھ عوامی سوچوں کو قبول کر لیں اور ان موضوعات پر اپنے طور پر فیصلے کر لیں اور پھر آیات میں تاویل کریں بلکہ ہماری روش یہ ہونی چاہئے کہ ہم خالی الذہن ہو کر قرآنی آیات سے نتائج اخذ کریں۔ ان آیات سے ایمان اور عقیدہ اخذ کریں اور ان آیات سے اپنی فکر اور اپنی سوچ اور اپنا ادراک اخذ کریں۔ اگر ان آیات میں کوئی بات طے شدہ ہو تو اسے طے شدہ سمجھیں۔ یہ اس لیے کہ جس چیز کو ہم عقل انسانی سمجھتے ہیں اور قرآنی اور تاریخی اور کائناتی واقعات کو اس کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں یہ تو انسان کے محدود تجربات کا نتیجہ ہے اور نہایت غیر یقینی چیز ہے۔

یہ عقل اگرچہ ایک مطلق قوت ہے اور یہ انفرادی واقعات و تجربات کے اندر محدود نہیں ہے۔ بلکہ عقل ان انفرادی واقعات سے ماوراء ایک مجرد حقیقت ہے لیکن یہ مجرد عقل بھی بہرحال ہمارے محدود وجود کے اندر ہی کی حقیقت ہے اور ہمارا وجود محدود اور مقید ہے۔ اصل وجود باری تعالیٰ کا ہے جو غیر محدود اور لا انتہا ہے۔ اور یہ قرآن اس اصل وجود کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ لہٰذا اصل حاکم وجود مطلق اور اس کا قرآن ہے۔ اور قرآن جو فیصلے کر دے ہمارا مقام یہ ہے کہ ہم اپنے فیصلے اور اپنے عقلی فیصلے قرآن سے اخذ کریں۔ اس لیے یوں کہنا درست نہیں ہے کہ اس نص کا مفہوم عقل سے متصادم ہے لہٰذا اس کی تاویل ضروری ہے۔ اور اس قسم کی عبارات اس مکتب فکر کے لوگوں کے کلام میں بہت سی ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم ہر وہم اور ہر کہانی اور تمام خرافات کے سامنے سپر انداز ہو جائیں۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ عقل قرآن کے فیصلوں کو پرکھنے کے لیے معیار نہیں ہے۔ جب قرآن کریم کا مفہوم اور اس کی تعبیر واضح اور سیدھی ہو، تو پھر یہ آیت ہی فیصلہ کرے گی کہ ہماری عقل اس کو کس طرح سے اخذ کرے اور کس طرح ہم اس آیت کی روشنی میں اپنے تصورات کے اصول وضع کریں اور ہمارا علم الکلام اس کی روشنی میں کس طرح وضع ہو، اور پھر تمام کائناتی حقائق کے بارے میں قرآنی منطق اور قرآنی طرز استدلال کو کس طرح متعین کیا جائے۔

اب ہم سورہ فیل اور اس میں بیان کردہ قصے کے مدلولات کی طرف آتے ہیں۔

--- ○○○---

# درس نمبر ۳۰۵ تشریح آیات

## ا -- تا -- ۵

سُوْرَةُ الْفِيْلِ (۱۰۵) مَكِّيَّةٌ (۱۹)
اٰيَاتُهَا ۵ رُكُوْعُهَا ۱
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝۱ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ
تَضْلِيْلٍ ۝۲ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝۳ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ
ا سِجِّيْلٍ ۝۴ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝۵
ع ۵
۳۰

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اس نے ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا؟ اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے جو ان کے اوپر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے' پھر ان کا یہ حال کر دیا جیسے (جانوروں کا) کھایا ہوا بھوسا"۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ (۱۰۵ : ۱) "تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟" یہ سوالیہ انداز تعجب انگیزی کے لیے اختیار کیا گیا ہے کہ یہ عجیب واقعہ تھا' اور اس میں بہت بڑی عبرت ہے اور اس میں عظیم معانی پوشیدہ ہیں۔ یہ واقعہ عربوں میں معروف و مشہور تھا۔ بلکہ اس واقعہ سے عربوں میں کیلنڈر شروع ہو گیا تھا اور یہ اہم تاریخ بن گیا تھا۔ لوگ کہتے فلاں واقعہ ہاتھی والوں کے سال ہوا' اور فلاں واقعہ عام الفیل سے دو سال پہلے ہوا۔ اور فلاں واقعہ عام الفیل کے دس سال بعد واقع ہوا۔ اور مشہور روایت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش بھی عام الفیل میں ہوئی اور یہ تقدیر کے فیصلوں کے مطابق عجیب اتفاق تھا۔

غرض اس سورت میں کوئی ایسا واقعہ بیان نہ ہوا تھا جسے وہ نہ جانتے ہوں۔ یہ ایک واقعہ تھا جو ان کے علم میں تھا اور قرآن نے ان کو یاد دلایا۔ اور مقصد اگلی جانب کی طرف متوجہ کرنا تھا۔

اس کے بعد کا فقرہ بھی سوالیہ ہے لیکن استفہام تقریری ہے' یعنی ایسا سوال جس کا جواب اثبات میں ہوتا ہے۔

اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ (۱۰۵: ۲) "کیا اس نے اس کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا" ـ یعنی ان کے مکر وتدبیر کو اس طرح بے راہ نہیں کر دیا کہ وہ نشانے پر نہ لگے اور اپنی منزل تک نہ پہنچے ـ اسی طرح جس طرح ایک انسان راہ گم کر دے اور منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے ـ اس طرح اللہ تعالیٰ قریش کو یاد دلاتا ہے کہ اس نے ان پر انعام و احسان کیا ـ ان کی حمایت کی اور اس گھر کو بچایا اور اس وقت بچایا جب وہ خود ابرہہ کے لشکر جرار کا سامنا کرنے سے قاصر تھے ـ شاید کہ وہ شرم کریں اور اس ذات باری کا انکار نہ کریں ـ جس نے ان کی مدد نہایت کمزوری اور عاجزی کی حالت میں کی تھی ـ ان کا کردار اس وقت بعینہٖ اسی طرح کا ہے جس طرح ابرہہ کا تھا ـ وہ مکہ کے مٹھی بھر مسلمانوں کو اپنے غرور اور قوت کے بل بوتے پر روند ڈالنا چاہتے تھے ـ ان کو چاہئے کہ ذرا اس زور آور کا حال یاد کر لیں جس نے بیت اللہ پر چڑھائی کی تھی اور اس کی حرمت کو پامال کرنے کا ارادہ کر لیا تھا ـ اللہ یہ طاقت رکھتا ہے کہ جس طرح اس نے بیت اللہ کو بچایا' اسی طرح اس کی دعوت کو لے کر چلنے والی حزب اللہ کو بھی بچائے ـ

سوال یہ ہے کہ اللہ نے پھر ان کی مکاری کو کس طرح گمراہ اور خطا کر دیا' تو اس کی تصویر کشی بھی قرآن کریم نہایت خوبصورت انداز میں کرتا ہے ـ

وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ (۳) تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ (٤) فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ (۵) (۱۰۵: ۳ تا ۵) "اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے جو ان کے اوپر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے' پھر ان کا یہ حال کر دیا جیسے (جانوروں کا) کھایا ہوا بھوسا" ـ

اَبَابِيْلَ (۱۰۵: ۳) کے معنی جھنڈ کے ہوتے ہیں ـ

سِجِّيْلٍ (۱۰۵: ٤) فارسی سے معرب ہے اور دو لفظوں سے مرکب ہے "سنگ گل" یعنی مٹی کو پکا کر اس سے پتھر بنا دیا گیا تھا' یا ایسے پتھر تھے جو کیچڑ کے ساتھ آلودہ تھے ـ

كَعَصْفٍ (۱۰۵: ۵) کے معنی ہیں درختوں کے خشک پتے ـ عصف کی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ ماکول ہے ـ یعنی کھایا ہوا' ہے یعنی پتوں کی حالت یہ ہے کہ ان کو حشرات الارض نے کھا کر پیس دیا ہے' یا حیوانات نے چبا کر ریزہ ریزہ کر دیا اور پیس دیا ہے ـ یہ ایک حسی تصویر کشی ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پرندوں کے جھنڈ ان پر پتھر مارتے تھے تو ان کے اجسام ریزہ ریزہ ہو جاتے تھے ـ لہٰذا ایسی تاویلات کی ضرورت نہیں ہے کہ چیچک یا خسرے کی وجہ سے ان کے اجسام ریزہ ریزہ ہو گئے ـ

اس واقعہ میں جو حقائق بیان ہوئے وہ کئی زاویوں سے ہمارے لیے عبرت انگیز اور بصیرت افروز ہیں :

(۱) اس سے پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ نے یہ پسند نہ فرمایا کہ وہ اپنے گھر کی حمایت اور اس کا بچاؤ مشرکین کے ذریعہ انجام دے ـ اگرچہ وہ اپنے آپ کو اس گھر کی طرف منسوب کرتے تھے' وہ اسے بچانے کی کوشش بھی کرتے اور اس میں پناہ بھی لیتے ـ جب اللہ نے ارادہ کیا کہ وہ اس گھر کو بچائے اور اس کی حفاظت کرے

اور اس کی حمایت کا اعلان کرے اور اس گھر پر غیرت کرے ' تو اللہ نے مشرکین مکہ کی حالت اس طرح کر دی کہ وہ اس جارح قوت کے سامنے بے بس ہو جائیں اور قدرت الٰہیہ بالکل عیاں ہو کر اپنے گھر کی حفاظت کرے جو ایک محترم گھر ہے تاکہ بیت اللہ کی حفاظت میں مشرکین کا کوئی تاریخی کردار نہ ہو۔ جس کے تحت حمیت جاہلیت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے ۔ یہ نکتہ اس بات کو بھی ترجیح دے دیتا ہے کہ اس حملہ آور لشکر کی ہلاکت میں اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی اور معجزانہ انداز اختیار کیا۔ اور ان کی ہلاکت میں کوئی عام مالوف طریقہ اختیار نہ کیا گیا تھا۔ یہ بات زیادہ مناسب اور قرین قیاس ہے۔

خانہ کعبہ کی حمایت میں اس کھلی مداخلت کا تقاضا یہ تھا کہ قریش اور بیت اللہ کے اردگرد پھیلے ہوئے عرب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد خود اسلام میں داخل ہوتے اور بیت اللہ کی خدمت اور فوقیت پر فخر نہ کرتے اور بیت اللہ کے اردگرد انہوں نے بت پرستی کا جو جال پھیلا رکھا تھا وہ ان کے اسلام میں داخل ہونے کے لیے مانع نہ ہوتا مگر افسوس کہ انہوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں اس حادثہ کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے کہ اہل قریش کو شرمندہ کیا جائے اور یہ گویا ان پر تنقید ہے اور ان کے معاندانہ موقف پر تعجب کا اظہار ہے کہ کیوں نہ انہوں نے اس واقعہ سے کوئی عبرت لی۔

(۳) اس سے تیسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ نے اہل کتاب ' ابرہہ اور اس کے لشکر کو توفیق نہ دی کہ وہ اس گھر کو گرا سکیں اور اس مقدس سرزمین پر اپنی حکومت قائم کر سکیں ۔ اگرچہ اس کے باسی مشرک ہوں اور اگرچہ اس گھر کے متولی بھی مشرک ہوں ' تاکہ یہ گھر کسی بھی استعماری قوت کے تسلط سے آزاد رہے ۔ اس علاقے میں کوئی بیرونی سازش کارفرما نہ ہو۔ اور اس سرزمین کی آزادی محفوظ ہو تاکہ اللہ کی تقدیر میں یہاں سے جو جدید دین اور جدید نظریہ اٹھنے والا تھا وہ آزادی کی فضا میں نمودار ہو۔ اس پر کسی حکومتی اقتدار کا دباؤ نہ ہو۔ اور کوئی بیرونی ڈکٹیٹر یہاں سرکشی نہ کر سکے اور کوئی دین اس دین سے برتر نہ ہو جو تمام ادیان کو اپنی گرفت میں لینے والا تھا اور جو پوری انسانیت کی رہنمائی کا فریضہ اپنے ہاتھ میں لینے والا تھا۔ جو تمام انسانوں پر اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کرنے والا تھا ' جو پوری انسانیت کی رہنمائی کرنے والا تھا ' کسی سے رہنمائی لینے والا نہ تھا۔ یہ تھی اللہ کی تدبیر نبی آخر الزمان ؐ اور آپ ؐ کے دین کے لیے ۔ یہ بات اس وقت ہو رہی تھی ' جب کہ لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ اس نئے دین کا قائد اسی سال پیدا ہو گیا ہے۔

آج عالمی صلیبیت اور عالمی صیہونیت مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کو نہایت فاجرانہ اور لالچی نظروں سے دیکھتے ہیں اور ان کے ان مکارانہ منصوبوں کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں ' لیکن اس سورت سے ہمیں جو اشارات ملتے ہیں ان سے ہمیں ایک گونہ اطمینان نصیب ہو جاتا ہے کہ اسلام کے مقامات مقدسہ کے خلاف ان کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ جس اللہ نے اپنے گھر کو اہل کتاب سے اس وقت بھی بچایا جب اس کے متولی اور مجاور مشرک تھے تو وہ اس کی حفاظت آج بھی کرے گا۔ اسی طرح اللہ اپنے نبی کے شہر کو بھی ان سازشوں اور للچائی ہوئی مکارانہ نظروں سے بچائے گا۔

(۴) چوتھی بات یہ کہ اس کرۂ ارض پر ماضی میں عربوں کا کوئی قابل ذکر کردار نہ تھا بلکہ اسلام سے قبل ان کا کوئی

وجود ہی نہ تھا۔ یمن میں وہ اہل فارس اور حبشیوں کے غلام تھے۔ اگر کہیں جنوبی عرب میں ان کی کوئی حکومت قائم بھی ہوئی تو وہ ایرانیوں کے زیر انتداب تھی۔ شمال میں شام کا علاقہ رومی مملکت کے تحت تھا۔ یہ علاقہ یا تو براہ راست رومی سلطنت کے تحت ہوتا یا وہ یہاں اپنے زیر حمایت کوئی عربی سلطنت قائم کرتے۔ صرف جزیرۃ العرب کا قلب ہی ایسا علاقہ تھا جو کسی غیر حکومت کے اثر ورسوخ سے پاک تھا لیکن اس علاقے کا کوئی عالمی کردار نہ تھا۔ یہ ایک پسماندہ بدوی علاقہ تھا۔ اس علاقے میں جب قبائلی جنگ چھڑ جاتی تو یہ چالیس چالیس سال تک جاری رہتی۔ اس انتشار کی وجہ سے ان علاقوں کے باشندوں کی کوئی وقعت قریبی ممالک کے ہاں نہ تھی۔ ان کی جو جنگی حیثیت تھی اس کا اظہار ہاتھی والوں کی مہم کے دوران ہو گیا تھا کہ وہ کسی بیرونی حملہ آور کے مقابلے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔

عربوں کو عالمی کردار ادا کرنے کا موقعہ 'سب سے پہلے اسلام کے جھنڈے تلے نصیب ہوا۔ ان کی ایک ایسی عالمی مملکت وجود میں آئی جس کی کوئی حیثیت تھی اور لوگ اس کا شمار بھی کرتے تھے۔ یہ دراصل سیلاب کی طرح ایک عالمی انقلاب تھا۔ اس انقلاب میں کئی مملکتیں بہہ گئیں 'کئی تخت گر گئے اور انسانیت کی قیادت کا مقام عربوں کو حاصل ہو گیا۔ یہ اس وقت ہوا جب اس کرۂ ارض پر سے گمراہ اور کھوٹی قیادتوں کے اختیارات زائل کر دیئے گئے۔ سوال یہ ہے کہ عربوں کو یہ مقام کب اور کیوں حاصل ہوا؟ یہ مقام انہیں اس وقت حاصل ہوا جب انہوں نے اس بات کو بھلا دیا کہ وہ عرب ہیں۔ انہوں نے علاقائی' نسلی اور لسانی عصبیت کے نعروں کو بھلا دیا۔ انہوں نے صرف اس بات کو یاد رکھا کہ وہ مسلم ہیں اور صرف مسلم ہیں۔ انہوں نے صرف اسلام کے جھنڈے بلند کیے اور وہ ایک عظیم نظریہ حیات لے کر اٹھے اور اسے تمام انسانوں تک پہنچا دیا۔ وہ انسانیت کے لیے رحم اور اس کے لیے بھلائی کے حامل بن گئے۔ انہوں نے نہ قومیت کا نعرہ بلند کیا' نہ نسلی عصبیت کا' بلکہ وہ ایک آسمانی ہدایت پر مبنی فکر لے کر اٹھے اور اسے ایک آسمانی ہدایت کے طور پر لوگوں تک پہنچایا۔ انہوں نے دین اسلام کو ایک دنیاوی مذہب اور دنیاوی نظریہ کے طور پر نہ لیا جس سے ان کا مقصد صرف یہ ہو کہ دنیا کی اقوام کو اپنا غلام بنا دیں۔ وہ عرب سے باہر صرف جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلے' ان کا مقصد یہ نہ تھا کہ کوئی عربی امپیریلزم قائم کر دیں' تاکہ اس کے زیر سایہ اس زمین پر خوب پھریں اور چمکیں۔ ان کی ناک اونچی ہو' اور وہ دنیا میں اس شہنشاہیت کی وجہ سے بڑے بن جائیں اور لوگوں کو رومیوں اور فارسیوں کی حکومت سے نکال کر عربوں کی حکومت میں داخل کر دیں بلکہ وہ اس لیے اٹھے تھے کہ لوگوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ وحدہ کی بندگی میں داخل کریں۔ جیسا کہ یزدگرد کی مجلس میں مسلمانوں کے نمائندے حضرت ربعی ابن عامر نے کہا۔ "اللہ نے ہمیں اس لیے اٹھایا ہے کہ ہم لوگوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کریں۔ اور دنیا کی تنگ دامنی سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں داخل کر دیں اور عوام کو دوسرے ادیان کے ظلم سے نکال کر اسلام کے انصاف میں داخل کریں"۔

یہ وہ وقت تھا جب دنیا میں عربوں کا وجود قائم ہوا' ان کو قوت ملی' ان کی قیادت قائم ہوئی' لیکن یہ دعوت اللہ کے لیے تھی اور یہ جہاد اللہ کی راہ میں تھا۔ یہ قوت ایک عرصہ تک قائم رہی' ایک زمانے تک وہ انسانیت کے قائد رہے' جب تک کہ وہ اپنے طریقے پر قائم رہے۔ جب انہوں نے اسلامی نظریہ حیات سے انحراف کیا اور وہ قومی عصبیت کے داعی بنے اور انہوں نے اللہ کے جھنڈے بلند کرنے کی بجائے عصبیت کے جھنڈے اٹھا لیے' تو زمین نے ان کو پرے پھینک دیا'

اقوام عالم نے انہیں روند ڈالا کیونکہ انہوں نے اللہ کو چھوڑ دیا تو اللہ نے ان کو چھوڑ دیا اور جس طرح انہوں نے اللہ کو بھلایا اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا۔

سوال یہ ہے کہ اسلام کے سواعربوں کی حیثیت ہی کیا ہے؟ اگر وہ اسلامی عقیدہ' اسلامی تصورات اور افکار کو ایک طرف رکھ دیں تو ان کے پاس کیا چیز ہے جو وہ انسانیت کے سامنے پیش کر سکتے ہیں؟ اور اگر کسی قوم کے پاس انسانوں کے لیے کوئی پیغام نہیں ہے تو وہ قوم ہی کیا ہے؟ تاریخ عالم گواہ ہے کہ جن اقوام نے کبھی انسانیت کی قیادت کی' ان کے پاس ایک فکر تھی' ایک پیغام تھا جو انہوں نے انسانیت کو دیا۔ جن اقوام کے پاس کوئی پیغام نہ تھا مثلاً تاتاری' جنہوں نے پورے مشرق کو روند ڈالا اور بربر جنہوں نے عالم عرب پر سے رومیوں کی سلطنت کو ختم کیا۔ یہ لوگ طویل عرصہ تک زندہ نہ رہ سکے' بلکہ یہ ان اقوام ہی کے اندر پگھل گئے جن کو انہوں نے فتح کیا تھا۔ یاد رہے کہ عربوں نے انسانیت کو جس نظریہ سے نوازا وہ فقط اسلامی نظریہ حیات تھا۔ اس نظریہ کی وجہ سے وہ عالمی قیادت کے منصب پر فائز ہوئے۔ جب انہوں نے اس نظریہ کو پس پشت ڈال دیا تو اس کرۂ ارض پر ان کا کوئی کام ہی نہ رہا۔ تاریخ سے ان کا کردار ختم ہو گیا۔ آج عرب اگر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ اس سبق کو یاد رکھیں۔ اگر وہ قوت اور قیادت چاہتے ہیں ورنہ ان کی کوئی حیثیت قائم نہیں ہو سکتی۔ اللہ ہی ہے جو گمراہوں کو ہدایت دے سکتا ہے۔

--- ○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۂ قریش ـ ۱۰٦

## ۱-- تا-- ۴

# درس نمبر ۳۰۶ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۴

سورۃ قریش مکیۃ (۲۹)
آیاتها ۴ رکوعها ۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ۙ﴿۱﴾ اٖلٰفِہِمۡ رِحۡلَۃَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیۡفِ ۚ﴿۲﴾ فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ ہٰذَا ۱
الۡبَیۡتِ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَہُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ۙ وَّ اٰمَنَہُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ﴿۴﴾ ع۴

۳۱ ”چوں کہ قریش مانوس ہوئے (یعنی) جاڑے اور گرمی کے سفروں سے مانوس ' لہذا ان کو چاہئے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک سے بچاکر کھانے کو دیا اور خوف سے بچاکر امن عطا کیا“۔

خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد 'جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے سامنے دست بدعا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ دعا یہ تھی :

رَبِّ اجۡعَلۡ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارۡزُقۡ اَھۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (۲ : ۱۲۶) ”اے میرے رب 'اس شہر کو امن کا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں کو پھلوں کی روزی دے“۔ تو اللہ نے اس گھر کو امن کا گھر بنا دیا اور ڈکٹیٹروں اور جباروں کے تسلط سے آزاد رکھا۔ جو شخص بھی اس گھر میں پناہ لیتا وہ امن پاتا اور اس کے ارد گرد جو اقوام و افراد رہتے تھے 'وہ ہر وقت خائف رہتے تھے اور اس گھر کو یہ اعزاز اس وقت بھی حاصل رہا جب اس کے باسیوں نے بت پرستی شروع کر دی۔ شرک کا ارتکاب شروع کیا اور اپنے رب کے ساتھ ساتھ انہوں نے خانہ کعبہ میں بت رکھ دیئے اور یہ اعزاز اللہ نے اس لیے بحال رکھا کہ اس گھر سے اللہ نے کچھ کام لینا تھا۔

پھر جب اصحاب الفیل نے اس گھر کو منہدم کرنے کا ارادہ کر لیا جس کی تفصیلات سورت الفیل میں گزر گئی ہیں 'اللہ نے اس گھر کے امن کی حفاظت فرمائی اور اس کے احترام کو بحال رکھا جبکہ اس کے ماحول میں لوگوں کی حالت یہ تھی۔

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنۡ حَوۡلِھِمۡ (۲۹ : ۶۷) ”کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ایک ایسا حرم بنایا ہے جو امن کی جگہ ہے 'جبکہ لوگوں کو اس کے گردو پیش سے اچک لیا

جاتا ہے"۔ جب فیل کا واقعہ ہوا تو عربوں کے دلوں میں بیت اللہ کا احترام بڑھ گیا۔ اور اس بات کا پورے جزیرۃ العرب میں غلغلہ ہو گیا۔ اسی طرح اس واقعہ کی وجہ سے اہل مکہ اور بیت اللہ کے مجاوروں کا احترام بڑھ گیا اور اس وجہ سے وہ نہایت امن و امان کے ساتھ پورے عرب میں چلتے پھرتے۔ اور یہ جہاں بھی ٹھہرتے لوگ ان کی رعایت اور احترام کرتے۔ اس کے نتیجے میں انہوں نے قافلوں کے لیے دو عمومی راستے بنا لیے۔ یہ راستے مکہ سے شمال کی طرف شام تک جاتے اور مکہ سے جنوب کی طرف یمن تک جاتے' اہل مکہ نے دو تجارتی سفر بھی منظم کر لیے۔ سردیوں کے موسم میں وہ یمن کے سفر پر جاتے اور گرمیوں کے موسم میں یہ شام کی طرف نکل جاتے۔

باوجود اس امر کے جزیرۃ العرب کے اطراف و اکناف میں امن و امان کی حالت کچھ اچھی نہ تھی' ڈاکے اور لوٹ مار ہر طرف عام تھے' لیکن بیت اللہ کے احترام کی وجہ سے قریش کے یہ تجارتی سفر پر امن رہتے اور یہ قریش کی ایک ممتاز خصوصیت ہو گئی تھی۔ اور اس وجہ سے ان کے سامنے رزق کے وسیع ذرائع کھل گئے تھے۔ اور وہ نہایت اطمینان سے اور امن و سلامتی سے یہ تجارتی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ قریش ان مفید اور نفع بخش سفروں کے عادی ہو گئے تھے۔ اور وہ ان کے بغیر چین سے نہ بیٹھتے تھے۔

جس طرح بعثت نبوی ؐ کے بعد واقعہ فیل کو بطور احسان ان کے سامنے پیش کیا گیا' اس طرح اس سورت میں بتایا گیا کہ یہ بھی اللہ کا احسان ہے کہ تم سردیوں اور گرمیوں کے سفر کے عادی ہو گئے ہو' اور ان سفروں سے تمہیں بہت تجارتی نفع ہوتا ہے۔ ان کا علاقہ بنجر اور خشک ہے اور وہ اس کے اندر نہایت ہی خوش گوار اور خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے اور اس فضل و کرم ہی کی وجہ سے وہ خوف سے مامون ہیں۔ چاہے وہ بیت اللہ کے جوار میں اپنے گھروں میں ہوں یا وہ اپنے سفر میں ہوں' اس گھر کے احترام کی وجہ سے وہ ہر قسم کی زیادتی اور ظلم سے محفوظ ہیں۔

اللہ اپنا یہ احسان ان کو یاد دلاتا ہے کہ وہ حیا کریں اور اس گھر میں اللہ کے سوا' اس کے اور شریکوں اور بتوں کی بندگی نہ کریں کیونکہ یہ گھر اس کا ہے' وہی رب ہے اور اسی نے اس گھر کو امن دیا ہے جس کے اندر وہ مزے سے رہتے ہیں' اس گھر کے نام سے ان کے سفر محفوظ ہیں اور سفروں سے یہ صحیح سالم گھروں کو لوٹتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قریش چونکہ گرمیوں اور سردیوں کے سفر کے عادی ہو گئے ہیں تو انہیں چاہئے کہ صرف اس گھر کے رب کی بندگی کریں جس نے ان سفروں کے دوران ان کے امن و امان کا بندوبست کیا اور انہیں اس سفر کا عادی بنایا جس کی وجہ سے انہیں مالی مفادات ملتے ہیں۔

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ (٣) الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ (١٠٦ : ٤) "لہٰذا ان کو چاہئے کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا"۔ ان کی زمین کی پیداوار کی جو حیثیت ہے' اس کے مطابق ان کی حالت تو یہ ہونی چاہئے تھی کہ وہ بھوک سے مرتے' لیکن اللہ نے ان کے لیے کھانے پینے کا بندوبست فراوانی سے کیا اور وہ پیٹ بھر کر کھانے لگے۔

وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ (١٠٦ : ٤) "اور خوف سے بچا کر انہیں امن دیا"۔ ان کی جو جنگی قوت تھی' ان کے اردگرد جو سوسائٹی تھی' اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ ہروقت خائف رہتے لیکن اللہ نے ان کا یہ خوف امن سے بدل دیا۔

یہ ایک ایسی یاد دہانی ہے جس کی وجہ سے انسان کے اندر حیا پیدا ہوتی ہے' وہ شرمندہ ہوتا ہے اور اپنے رویے پر نظر ثانی کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ قریش یہ بات جانتے تھے کہ اس گھر کی اہمیت کیا ہے اور اس گھر کے احترام کی وجہ سے ان کی زندگی پر جو اثرات تھے وہ ان سے بھی بے خبر نہ تھے۔ اور یہ بات بھی اپنی جگہ تھی کہ انتہائی شدید اور کربناک حالات میں وہ صرف اس گھر کے رب ہی کو پکارتے تھے۔ مثلاً دیکھئے کہ عبد المطلب ابرہہ کا مقابلہ فوج سے نہیں کرتے اور نہ اس کی قوت کے مقابلے میں مادی قوت فراہم کرتے ہیں۔ وہ اس گھر کے رب سے خطاب کرتے ہیں' جو اس کا حقیقی متولی اور حامی تھا۔ اس موقعہ پر عبد المطلب نے نہ کسی بت کی طرف توجہ کی اور نہ کسی معبود کی طرف اور نہ انہوں نے ابرہہ سے یہ کہا کہ اس گھر کے بت سے اللہ ہیں وہ اس کی حمایت کریں گے۔ بلکہ انہوں نے یہ کہا "میں تو اونٹوں کا مالک ہوں اور اس گھر کا ایک مالک ہے' وہ خود اس کی حفاظت کرے گا"۔ لیکن جاہلیت پر کبھی منطق اور حقیقت کا اثر نہیں ہوا کرتا۔ اور نہ جاہلیت حق کو تسلیم کرتی ہے اور نہ وہ معقول بات کی طرف لوٹتی ہے۔

یہ سورت' اپنے موضوع اور فضا کے اعتبار سے سورت فیل کا تسلسل ہے۔ اگرچہ یہ مستقل سورت ہے اور دونوں کے درمیان مصاحف میں بسم اللہ الرحمان الرحیم درج ہے۔ قرآن کی ترتیب نزولی سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ الفیل اور سورہ القریش کے درمیان ۹ سورتیں نازل ہوئیں' لیکن مصحف میں ان کو ایک دوسرے کے ساتھ اس لیے پیوست کیا گیا ہے کہ اس میں موضوع و مضمون کی ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ الماعون ۔ ۱۰۷

## ۱-- تا-- ۷

# سورۃ الماعون ایک نظر میں

بعض روایات کے مطابق یہ سورت مکی ہے اور بعض کے مطابق مکی اور مدنی ہے۔ (پہلی تین آیات مکی ہیں اور باقی مدنی ہیں) میرے خیال میں یہ راجح بات ہے۔ اگرچہ مضمون کے اعتبار سے سورت ایک ہی یونٹ ہے۔ اس کا روئے سخن بھی ایک ہی طرف ہے اور اس میں اسلامی نظریہ حیات کا ایک عمومی اصول بیان کیا گیا ہے۔ اسلامی نظریہ حیات کا یہی اصول ہے جو ہمیں آمادہ کرتا ہے کہ ہم اس سورت کو مدنی سمجھیں۔ کیونکہ اس میں جو اصول بیان ہوا ہے وہ مدنی موضوعات میں سے ہے۔ یعنی نفاق اور ریاکاری سے اجتناب یاد رہے کہ جن روایات میں آیا ہے کہ یہ مکی ہے۔ ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ ہم اس کی آخری چار آیات کو مدنی نہ تصور کریں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوئی ہوں اور مضمون اور موضوع کی مناسبت سے ان کو ان کے ساتھ ملا دیا گیا ہو۔ نزول کے بارے میں اس قدر کافی ہے۔ اب ہم موضوع مضمون کی طرف آتے ہیں اور اس عظیم حقیقت پر بات کرتے ہیں جو اس میں بیان کی گئی ہے۔

---ооо---

# درس نمبر ۳۰۷ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۷

سُورَةُ الْمَاعُونِ مَكِّيَّةٌ (۱۷) (۱۰۷) آیاتها ۷ رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ
عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ ۱
سَاهُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۝ ع ۷
۳۲

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزاو سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔ پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں' جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں"۔

یہ چھوٹی سی سورت جو صرف سات آیات پر مشتمل ہے اور آیات بھی چھوٹی چھوٹی ہیں' ایک عظیم حقیقت پر مشتمل ہے۔ اس کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ یہ گویا شعائر اسلام کو بدل کر رکھ دیتی ہے اور اس پر غور کرنے سے انسان کو ایمان و کفر کا مفہوم مکمل طور پر بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سے آگے یہ سورت ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اسلامی نظریہ حیات کا مزاج کیا ہے۔ اور اس میں انسانیت کے لیے کس قدر عظیم خیر اور بھلائی پوشیدہ ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کے لیے اپنا آخری مشن بھیج کر اللہ نے اس پر کتنا عظیم رحم کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دین چند ظاہری رسوم عبادات اور دینی شعائر ہی کا نام نہیں ہے۔ اس میں دینی مراسم اور شعائر اور عبادات اس وقت تک مفید نہیں ہوتے جب تک ان میں خلوص نہ ہوئے اور ان کی ادائیگی صرف رضائے الٰہی کے لیے نہ ہو۔ اور جب ان کی وجہ سے قلب انسانی میں ایسے آثار پیدا نہ ہوں جو انسان کو عمل صالح پر ابھارتے ہیں اور جب تک یہ آثار ایسا طرز عمل اختیار نہ کریں جن کے ذریعہ انسانی زندگی اصلاح آخرت پذیر ہو۔ اور اس دنیا میں بھی ان

کے نتیجے میں اصلاح اور ترقی نہ ہو۔

پھر یہ دین چند متفرق اجزاء اور ٹکڑوں میں بٹا ہوا دین نہیں ہے کہ انسان ان میں سے جس جزء کو چاہے ' لے کر نکل جائے اور جس جزء کو چاہے ترک کر دے۔ یہ ایک مکمل نظام زندگی ہے اور منہاج حیات ہے۔ اس کے مراسم عبودیت اور اس کے شعائر باہم پیوست ہیں' اس کے انفرادی فرائض اور اجتماعی احکام باہم مربوط اور معاون ہیں۔ اس کے تمام اجزاء کا مقصد ایک ہے اور وہ انسانیت کے ساتھ متعلق ہیں' یہ کہ انسانیت کو قلبی اور روحانی تطہیر نصیب ہو۔ ان کی زندگی سنور جائے۔ لوگ باہم معاون ہوں' ایک دوسرے کے کفیل ہوں' اور بھلائی' ترقی اور اصلاحات کی راہ میں ہمقدم ہوں۔ اور ان کی زندگی اللہ کی رحمتوں کا نمونہ ہو۔

انسان اپنی زبان سے کہتا ہے کہ میں مسلم ہوں' وہ مسلمان ہے اور دین اسلام کے تمام احکام اور فیصلوں کو قبول کرتا ہے' وہ نماز پڑھتا ہے' نماز کے علاوہ دوسرے مراسم عبودیت بھی سرانجام دیتا ہے' لیکن اس کے باوجود حقیقت ایمان اور دین وایمان کی تصدیق اس سے کوسوں دور ہوتی ہے۔ اس لیے کہ حقیقت ایمان کے کچھ آثار ہوتے ہیں' یہ آثار بتاتے ہیں کہ ایمان کی حقیقت موجود ہے۔ جب یہ آثار نہ ہوں تو کوئی کس طرح کہہ سکتا ہے کہ ایمان کی حقیقت موجود ہے۔ اگر آثار نہ ہوں تو محض اقرار ایمان ہے اور چند ظاہری مراسم عبودیت ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب ایمان کی حقیقت کسی دل میں پوری طرح بیٹھ جائے تو وہ فوراً عمل صالح کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے سورہ العصر میں تفصیلات دی ہیں۔ اگر کسی کا ایمان اس اسلوب سے متحرک نہیں ہوتا تو ظاہری علامت تو یہ ہوگی کہ ایمان اصلا موجود ہی نہیں ہے۔ یہ وہ عظیم حقیقت ہے جس کو یہ سورت ایک مکمل قرارداد کی شکل میں پیش کرتی ہے۔

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ (۱) فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ (۲) وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (۳) (۱۰۷ : ۱ تا ۳) "کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جو دین کو جھٹلاتا ہے۔ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں اکساتا"۔ آغاز ایک ایسے سوال سے ہوتا ہے کہ تمام لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں تاکہ ایسے شخص کی بابت علم حاصل کر سکیں کہ کون ہے وہ شخص جو دین کی تکذیب کرتا ہے اور اس بات کی صراحت قرآن مجید کر رہا ہے کہ ایسا شخص مکذب دین ہے۔ چنانچہ جواب آتا ہے۔

فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ (۲) وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (۳) (۱۰۷ : ۲ تا ۳) "وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں اکساتا"۔

ایمان اور دین کی جو روایتی تعریف ہے اس کو دیکھتے ہوئے قرآن کی یہ صراحت بادی النظر میں انوکھی معلوم ہو سکتی ہے' لیکن یہ اصل حقیقت ہے کہ جو شخص یتیم کو دھکے دیتا ہے وہ دراصل دین کی تکذیب کرتا ہے۔ یتیم کو دھکے دینے کا مطلب اسے ایذا دینا اور اس کی توہین کرنا ہے۔ اور

وَلَا یَحُضُّ (۱۰۷ : ۳) کے معنی یہ ہیں کہ وہ دوسرے لوگوں کو اس کام پر نہیں اکساتا اور مسکینوں کا

خیال نہیں رکھتا۔ اگر اس نے صداقت کے ساتھ دین اسلام کو قبول کیا ہوتا اور اس کے دل میں حقیقی تصدیق ہوتی تو وہ یتیم کو دھکے نہ دیتا' اور مساکین کو کھانے کے لیے اکسانے اور تحریک چلانے پر لوگوں کو آمادہ کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ دین کا اقرار اور تصدیق صرف زبانی فعل نہیں ہے بلکہ وہ ایک ذہنی اور قلبی انقلاب ہے جس کے نتیجے میں انسان خود بخود بنی نوع انسان پر رحم اور نیکی کرنے لگتا ہے۔ ان لوگوں پر جو امداد اور مراعات کے مستحق ہوں۔ اللہ کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ لوگ اپنی زبان سے محض چند کلمے جپتے جائیں۔ ان کلمات کے ساتھ ساتھ اللہ کا مطالبہ کچھ اعمال کا بھی ہے جو یہ تصدیق کریں کہ ایمان موجود ہے' ورنہ ایمان محض ایک ہوائی ذرہ ہو گا جو فضا میں ادھر ادھر اڑتا رہتا ہے۔

ان تین آیات میں اس حقیقت کو جس طرح نہایت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے اس کی مثال پورے قرآن میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ اسلامی نظریہ حیات کی روح ہے اور اس دین کا یہ مزاج ہے۔

ہم یہاں اسلام اور ایمان کی فقہی تعریفات اور ان کے حدود و قیود کے مباحث اور اختلافات میں داخل ہونا نہیں چاہتے۔ یہ تعریفات اس لیے کی جاتی ہیں کہ ان پر شرعی اور قانونی حقوق و فرائض کا فیصلہ کیا جا سکے۔ اس سورت میں جو بات کہی گئی ہے وہ اس حقیقت نفس الامری کا اظہار کرتی ہے جو اللہ کے ہاں معتبر ہے اور جو اللہ کے معیار کے مطابق ناپی تولی جاتی ہے۔ اللہ کے ہاں جو حقائق ہوتے ہیں وہ ان حقائق سے الگ ہوتے ہیں جن کے مطابق شرعی اور قانونی معاملات طے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس حقیقت اور اس اصول کے مطابق بعض عملی صورتوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ (٤) الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (٥) الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاۗءُوْنَ (٦) وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (٧) (۱۰۷: ۴ تا ۷) "پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں' جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں"۔ یہ ان لوگوں کے لیے بد دعا ہے یا دھمکی۔ ان لوگوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ وہ لوگ جو ریاکاری کرتے ہیں اور جو معمولی ضرورت کی چیزیں بھی دوسروں کو نہیں دیتے۔

یہ لوگ نماز تو پڑھتے ہیں مگر نماز کو قائم نہیں کرتے' یہ نماز کی حرکات تو پوری کرتے ہیں۔ اس کے اندر پڑھی جانے والی دعائیں بھی پڑھتے ہیں' لیکن ان کا دل و دماغ نماز کے اندر نہیں ہوتا۔ ان کی روح نماز کی حقیقت سے بیگانہ ہوتی ہے۔ ان کی سوچ ان معانی سے دور ہوتی جو وہ پڑھتے ہیں۔ جو قرات' جو دعائیں اور جو ثنائیں وہ پڑھتے ہیں اس سے ان کی روح دور ہوتی ہے' گویا وہ اپنی نماز سے جسے وہ پڑھ رہے ہوں' غافل ہوتے ہیں۔ اسے صحیح طرح ادا نہیں کرتے۔ اللہ کے ہاں مطلوب یہ ہے کہ نماز کو صحیح طرح قائم کیا جائے۔ فقط ادائیگی مطلوب نہیں ہے اور نماز قائم تب ہوتی ہے کہ اسے دینی روح اور اس کے معانی کے ساتھ پڑھا جائے اور جس میں اللہ کی ذات مستحضر ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جس نماز کو وہ پڑھ رہے ہوتے ہیں ان کی زندگی میں اس نماز کے آثار پیدا نہیں ہوتے کیونکہ وہ نماز کی حرکات کے دوران غافل ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ معمولی ضرورت کی چیز (ماعون) بھی دوسروں کو نہیں دیتے۔ دوسروں کے ساتھ کوئی امداد' نیکی' بھلائی نہیں کرتے۔ حالانکہ نماز کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نمازی اللہ کے بندوں کے ساتھ بھلائی کرے اور ان سے معمولی ضرورت کی چیز نہ روکے۔ اس لیے جو لوگ اس قسم کے ہوتے ہیں وہ دراصل حقیقی نماز

نہیں ادا کر رہے ہوتے ۔ لہٰذا اللہ کے نزدیک حقیقی اور سچی عبادت کا معیار یہ ہے کہ ایک انسان اپنے بنی نوع انسان سے معمولی ضرورت کی اشیاء نہ روکے ۔ ان کی معاونت سے دستکش نہ ہو ۔

یوں ہم دین کی ایک دوسری لائفک حقیقت کو سامنے اپنے آپ کو کھڑا پاتے ہیں اور یہ اسلامی نظریہ حیات کا تقاضا ہے وہ یہ کہ ایک قرآنی آیت نمازیوں کو کھلی دھمکی دے رہی ہے کہ وہ ہلاکت سے دوچار ہوں گے کیونکہ وہ نماز کو صحیح طرح قائم نہیں کر رہے ۔ بلکہ وہ ایسی حرکات کر رہے ہیں جن میں کوئی روح نہیں ہے ۔ وہ ان حرکات میں اللہ کے دربار میں حاضر نہیں ہوتے ۔ خالص اللہ کے نہیں ہوتے 'بلکہ محض لوگوں کو دکھاوے کے لیے وہ نماز پڑھتے ہیں 'اس لیے ان کی نماز ۔ سے وہ آثار نمودار نہیں ہوتے جو حقیقی نماز سے ہوتے ہیں 'نہ ان کے دل پر نماز کا اثر ہوتا ہے 'نہ ان کی عملی دنیا پر وہ اثر انداز ہوتی ہے ۔ لہٰذا یہ نماز ذرہ بے قیمت ہے 'ایک غبار ہے بلکہ نمازی کے لیے یہ نماز ایک وبال و ہلاکت ہے ۔

ان تصریحات کے بعد ہماری سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ جاتی ہے کہ اللہ لوگوں کے پاس رسول کیوں بھیجتا ہے اور لوگوں سے کیوں مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ ایمان لائیں اور بندگی کریں؟ ــــ اس ساری جدوجہد سے اللہ کا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے ۔ وہ تو غنی بادشاہ ہے ۔ اس لیے مقصود یہ ہے کہ خود انسانوں کی زندگی سنور جائے ان کی بھلائی مقصود ہے ۔ ان کے قلوب پاک ہوں اور زندگی کامیاب ہو 'وہ ان کے لیے ایک ایسی زندگی چاہتا ہے جو پاکیزہ شعور اور اعلیٰ نظریات پر قائم ہو ۔ جس کے اندر لوگ ایک دوسرے سے کفیل ہوں جن کی ذہنیت شریفانہ ہو 'جن کے اندر محبت اور بھائی چارہ ہو ' جن کا تصور اور طرز عمل دونوں پاک ہوں ۔

اے کاش ! انسانیت اس بھلائی کو چھوڑ کر کدھر جا رہی ہے ۔ اس رحمت کو چھوڑ کر کہاں بھٹک رہی ہے اور اس خوبصورت اور حسین و جمیل مقام بلند کو چھوڑ کر کن پستیوں میں گری ہوتی ہے یا کہاں وہ جاہلیت کے پیچیدہ اور تاریک راہوں میں گم گشتہ ہے حالانکہ اس کے سامنے نور 'اسلام کا نور' مرکزی چوک میں موجود ہے ۔

--- ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ الکوثر ۔ ۱۰۸

## ۱-- تا-- ۳

# سورۃ الکوثر ایک نظر میں

یہ سورت خالص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے متعلق ہے جس طرح سورت الضحیٰ اور سورہ الشرح آپؐ کے لیے تھی۔ یہ سورہ آپؐ کا غبار خاطر دور کرتی ہے اور یہ پیشن گوئی کرتی ہے کہ آپؐ کو خیر کثیر دیا گیا ہے اور آپؐ کے دشمنوں کو اس میں دھمکی دی گئی ہے کہ انکی جڑ کاٹ دی گئی ہے، لہذا آپ کو چاہئے کہ اپنے رب کا شکر ادا کریں۔

چنانچہ یہ سورت ابتدائی دور میں دعوت اور داعی کی زندگی کی ایک جھلک ریکارڈ کرتی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہر طرف سے سازشیں کی جا رہی ہیں اور آپؐ کو اذیت دی جا رہی ہے اور آپؐ کی دعوت کا راستہ روکا جا رہا ہے اور اس دور میں اللہ اپنے بندے پر جس طرح مہربان اور اہل ایمان کے مٹھی بھر دستے پر جس طرح مہربان تھا اس کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے۔ چنانچہ اس سورت میں آپؐ کو اطمینان دلایا جاتا ہے، اور آپؐ سے روشن مستقبل کا وعدہ کیا جاتا ہے اور آپؐ کے دشمن کے بارے میں تاریک مستقبل کی پیشن گوئی کی جاتی ہے کہ ان کی جڑ کٹنے والی ہے۔

وہ ہدایت، خیر اور ایمان کی حقیقت کو ایک طرف رکھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں کثرت، برکت اور دوام اور پھیلاؤ ہے۔ اور دوسری جانب گمراہی، شرک اور کفر کو رکھا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ان کی قسمت میں قلت، خسارہ اور جڑ کٹنا لکھا ہوا ہے۔ اگرچہ غافل لوگ اس کے برعکس سوچتے ہیں۔

--- ooo---

# درس نمبر ۳۰۸ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۳

سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ مَكِّيَّةٌ
اٰیاتُھَا ۳ رُکُوعُھَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّآ اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ ﴿۱﴾ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴿۲﴾ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"(اے نبیؐ) ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دیا پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو، تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے"۔

روایات میں آتا ہے کہ قریش کے اوباش رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہروقت پیچھا کرتے تھے۔ آپؐ کی دعوت کے خلاف سازشوں میں لگے رہتے تھے اور آپؐ کے ساتھ طنز و مزاح کرتے رہتے تھے۔ اس طرح وہ بزعم خود عوام الناس کو آپؐ کی دعوت حق سننے سے باز رکھتے تھے جو آپؐ لے کر آئے تھے۔ ان اوباشوں کے سرخیل عاص ابن وائل، عقبہ ابن ابو معیط، ابولہب، ابوجہل وغیرہ تھے۔ یہ کہتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم "ابتر" ہیں، یعنی ان کی نرینہ اولاد نہیں ہے۔ ان میں سے بعض نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ اسے چھوڑ دو، اس کی کوئی اولاد نہیں ہے، جب یہ مرجائے گا تو یہ تحریک خود بخود ختم ہوگی۔

عرب معاشرے میں چونکہ نرینہ اولاد کی بہت بڑی اہمیت تھی، اس لیے ان کے ہاں پروپیگنڈے کی اس سازش کا کافی اثر تھا۔ آپؐ کے مخالف اور دشمن اس گھٹیا پروپیگنڈے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور آپؐ کے قلب مبارک پر اس کا بہرحال اثر ہوتا تھا۔ اس وجہ سے یہ سورت نازل ہوئی کہ آپؐ کا غبار خاطر چھٹ جائے۔ آپؐ خوشی اور تازگی محسوس کریں اور آپؐ کو جو خیر کثیر دے کر بھیجا گیا تھا، اس کی حقیقت اچھی طرح دلوں میں بیٹھ جائے، اور یہ سمجھا دیا جائے کہ دراصل "ابتر" تو آپؐ کے دشمن ہیں اور وہ اس انجام تک پہنچنے والے ہیں کہ ان کی جڑ کٹ جائے اور ان کا نام و نشان مٹ جائے۔

إِنَّآ أَعْطَيْنَٰكَ ٱلْكَوْثَرَ (۱۰۸ : ۱) "ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دیا ہے"۔ کوثر کثرت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بے حد و حساب اور یہ مفہوم اس کے بالکل برعکس ہے جس کو ہر احمق آپ کی طرف منسوب کرتا تھا یعنی ہم نے آپ کو جو کچھ دیا ہے وہ ایک عظیم اور لامحدود فیض ہے۔ یہ مسلسل جاری رہے گا اور اس کا سلسلہ کٹنے والا نہیں ہے۔ جو شخص بھی غور کرے کہ وہ فیض کثیر کیا ہے' جو اللہ نے اپنے نبی کو دیا تو وہ اسے پا سکتا ہے جس طرف بھی وہ نگاہ کرے اسے موجود پائے گا۔

سب سے پہلے آپ کو جو منصب رسالت دیا گیا وہ خیر کثیر ہے' آپ کا عظیم سچائی سے رابطہ قائم ہوا۔ اس عظیم وجود سے آپ کا رابطہ ہو گیا جس کے سوا کوئی موجود نہیں ہے یعنی ذات باری سے اور جس شخص کا تعلق ذات باری سے قائم ہو جائے وہ سب کچھ پا لیتا ہے۔

پھر یہ خیر کثیر اس قرآن کی شکل میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ پورا قرآن نہیں' اس کی ایک ایک سورت خیر کثیر ہے اور ہر سورت ایک ایسا سرچشمہ ہے جس کے فیوض ختم نہیں ہوتے۔

پھر پورا عالم بالا آپ پر درود و سلام بھیجتا ہے اور ان لوگوں پر بھی درود و سلام بھیجتا ہے جو آپ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ اس طرح آپ کا اسم مبارک اس پوری کائنات میں اللہ کے نام کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔

پھر آپ کی سنت کی صورت میں بھی خیر کثیر موجود ہے اور یہ سنت اس جہاں کے اطراف و اکناف میں زندۂ جاوید ہے۔ لاکھوں کروڑوں لوگ آپ کی سنت پر چل رہے ہیں' لاکھوں کروڑوں لوگ آپ کے پروانے ہیں اور قیامت تک کروڑوں انسان آپ پر درود و سلام بھیجتے رہیں گے۔

پھر یہ کوثر اس خیر کثیر کی شکل میں بھی موجود ہے جس سے یہ پوری دنیا فیض یاب ہوئی اور پوری انسانی تاریخ میں یہ فیوض جاری ہیں۔ چاہے ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو' چاہے وہ ایمان لائیں یا نہ لائیں۔ لیکن اس سرچشمے کے اثرات ان پر پڑے اور کسی نہ کسی طرح وہ فیض یاب ہوئے۔

غرض یہ کوثر وہ خیر کثیر اور عظیم ہے جس کا شمار ممکن نہیں ہے۔ اور ہم اپنی کم مائیگی کے ساتھ اگر اس کا شمار کریں تو ہم اس کی قدر و قیمت کو کم ہی کر دیں گے۔

یہ درحقیقت ایک کوثر ہے اور اس کے فیوض کی انتہا نہیں ہے۔ اسی کے علوم و معارف کے لیے حدود و قیود نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اسے کوثر کہہ کر مجمل چھوڑ دیا اور ہر "خیر" اس کے دائرے میں آ جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ خیر۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ کوثر ایک نہر ہے جو جنت میں ہے۔ اور یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے تو حضرت ابن عباسؓ نے اس بارے میں کہا کہ وہ نہر بھی منجملہ اس خیر کثیر میں سے ہے جو آپ کو دی گئی ہے۔ گویا یہ کوثر الکوثر کا ایک حصہ ہے۔ یہ نہایت ہی مناسب تطبیق ہے جو اس بارے میں کی جا سکتی ہے۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَٱنْحَرْ (۱۰۸ : ۲) "پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو"۔ اس خیر کثیر کے موکد تذکرے کے بعد' جو مکہ میں تحریک اسلامی کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈا کرنے والوں اور دعوت اسلامی کے

خلاف سازشیں کرنے والوں کے علی الرغم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپؐ اس خیر کثیر کے عطا کیے جانے پر اللہ کا شکر ادا کریں اور اللہ کا پہلا شکر یہ ہے کہ انسان بندگی میں اور تمام تقریبات میں صرف اللہ وحدہ لاشریک کی طرف متوجہ ہو' اور صرف اسی کو یاد کرے۔ نماز میں بھی اور قربانی میں بھی۔ نماز بھی خالص اللہ کے لیے ہو اور قربانی بھی خالص اللہ کے لیے ہو۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (۱۰۸ : ۲) "یعنی اللہ ہی کے لیے نماز پڑھو اور اللہ ہی کے نام کی قربانی کرو" اور شرک کرنے والوں کے شرک کی کوئی پرواہ نہ کرو' اور اللہ کی بندگی کرو اور ان کے ساتھ شریک ہو کر کسی اور کی بندگی نہ کرو' اور اللہ کی قربانی میں اللہ کے سوا کسی اور کا نام نہ لو۔

قرآن کریم بار بار اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ تمام ذبیحوں پر صرف اللہ کا نام لو' اور یہ کہ جن ذبیحوں پر غیراللہ کا نام لیا گیا ہو' وہ حرام ہیں اور ان کا کھانا حرام ہے اور جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو' ان کا کھانا بھی حرام ہے۔ یہ اس لیے کہ قرآن کریم انسانی زندگی کو ہر قسم کے شرک کے آثار اور شائبوں سے پاک کرنا چاہتا ہے۔ صرف عقیدے سے شرک کو پاک کرنا مقصود اسلام نہیں ہے بلکہ قرآن انسان کی پوری زندگی سے شرک کی نفی کرتا ہے شرک کے تمام معانی اور تمام مفاہیم کے اعتبار سے اس کی نفی کرتا ہے' اس لیے کہ یہ دین وحدت اور توحید کا دین ہے۔ اور اس کی توحید کا نظریہ ہر پہلو سے مکمل ہے۔ اس لیے یہ دین آخر دم تک شرک کا پیچھا کرتا ہے اور اس کے تمام مظاہر سے اس کے نشان مٹاتا ہے۔ قرآن کریم اتنے دور تک شرک کا پیچھا کرتا ہے کہ اسے کسی کمین گاہ میں دم لینے نہیں دیتا۔ انسانی نفسیات' انسانی ضمیر اور انسانی فکر سے اس کا صفایا کرتا ہے۔ اسلامی عبادات سے اسے مٹاتا ہے۔ انسانی زندگی کے رسم و رواج سے اسے دور کرتا ہے اس لیے کہ زندگی ایک باہم پیوست کل (ایک نظام) ہے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے اور حصے بخرے نہیں کیے جا سکتے۔ اس لیے اسلام پوری انسانی زندگی سے شرک کے اثرات کو ختم کرتا ہے اور پوری زندگی کا رخ اللہ وحدہ کی طرف پھیر دیتا ہے۔ اور اسے پوری طرح واضح' صاف اور ستھرا بناتا ہے' چاہے قربانیوں اور ذبیحوں کا مسئلہ ہو یا عبادات و عقائد کا ہو یا رسوم و تقالید کا۔

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ (۱۰۸ : ۳) "تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے"۔ پہلی آیت کا فیصلہ یہ تھا کہ آپؐ کی جڑ نہیں کٹی بلکہ آپ تو الکوثر کے مالک ہیں' اور اس آیت میں شکاری اپنے جال میں پھنس جاتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابتر نہیں بلکہ آپؐ کے دشمنوں کی جڑ کٹ چکی ہے اور جو لوگ آپ کو ناپسند کرتے ہیں ان کا نام و نشان مٹ جانے والا ہے۔

اور اللہ کی یہ دھمکی سچی ثابت ہوئی' ان لوگوں کا نام و نشان مٹ گیا۔ اس دنیا سے ان کا تذکرہ ہی ختم ہو گیا جبکہ حضرت محمدؐ کا نام بلند ہوا اور آپؐ کے مراتب بڑھتے ہی رہے۔ آج ڈیڑھ ہزار سال کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ اس آیت میں کی گئی پیشن گوئی سچی ثابت ہو چکی ہے۔ اور اس آیت کا مصداق آج ایک واضح شکل میں ہمارے سامنے ہے جو ان لوگوں کے سامنے اس قدر واضح نہ تھا جنہوں نے ان آیات کو پہلی مرتبہ سنا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان' سچائی اور بھلائی کی جڑ کبھی نہیں کٹ سکتی۔ ان چیزوں کی جڑیں تو زمین میں گہری ہوتی ہیں۔

اور شاخیں آسمانوں کی فضا میں دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں بلکہ کفر' باطل اور شر کی جڑ کٹی ہوئی ہوتی ہے ۔ اگرچہ وہ بظاہر ترو تازہ اور پھلا پھولا نظر آئے ۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ کا معیار انسانوں کے معیار سے مختلف ہے ۔ انسانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ دھوکہ کھا جاتے ہیں ۔ فریب میں آجاتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کے معیار دراصل حقائق کا تعین کرتے ہیں ۔ اس سورت میں جو مثال دی گئی ہے' یہ ہمارے لیے ایک دائمی اور لازوال مثال ہے ۔ ذرا سوچئے تو سہی' وہ لوگ کہاں ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ گھٹیا زبان استعمال کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہم نے عوام کو گمراہ کر دیا ہے اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ختم ہو گیا ہے ۔ اس کا راستہ روک لیا گیا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کہاں ہیں ۔ ان کا ذکر کہاں ہے' ان کے آثار کہاں ہیں' اس کے مقابلے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن کو وہ ابتر کہتے تھے' ان کو تو ہر پہلو سے حظ وافر دیا گیا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بات ممکن نہیں ہے کہ دعوت الی اللہ' سچائی اور بھلائی کی تحریک ختم ہو جائے اور اس کی جڑ کاٹ دی جائے ۔ اور نہ اس تحریک کے داعی ابتر ہو سکتے ہیں اس لیے کہ اس تحریک کا محرک زندۂ جاوید' باقی' لازوال اور ہمیشہ رہنے والا ہے ۔ بلکہ کفر' باطل اور شر ختم ہونے والے ہیں اور ان کے حاملین کا نشان بھی مٹنے والا ہے ۔ اگرچہ کسی مختصر دور کے لیے یہ چیزیں مستحکم اور لازوال نظر آتی ہوں اور ان کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہوں ۔ یہ ہے سچی بات جو اللہ فرماتا ہے' اور سازشی اور مکار جو کچھ کہتے تھے وہ جھوٹ تھا اور جھوٹ ہے اور ہمیشہ جھوٹ رہے گا ۔

--- ○○○ ---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ الکافرون ۔ ۱۰۹

## ۱ -- تا -- ۶

# سورۃ الکافرون ایک نظر میں

عرب اللہ کے منکر نہ تھے 'لیکن ان کی نظروں سے وہ اوصاف اوجھل تھے جن سے اللہ نے اپنے آپ کو متصف فرمایا تھا یعنی احد ''اکیلا'' اور صمد ''جو کسی کا محتاج نہ ہو اور سب اس کے محتاج ہوں''۔ چنانچہ وہ کچھ دوسرے لوگوں کو اللہ کے ساتھ شریک کرتے تھے اور اللہ کی قدر اس طرح نہ کرتے تھے جس طرح اللہ کی عبادت کرنے کا حق ہے۔ وہ اللہ کے ساتھ کئی بتوں کو شریک کرتے تھے۔ یہ بت انہوں نے یا اپنے اسلاف کی طرف منسوب کر رکھے تھے یا بڑے اکابر کی طرف یا فرشتوں کی طرف۔ یاد رہے کہ یہ لوگ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے اور یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ اللہ اور جنوں کے درمیان نسب اور رشتہ ہے۔ مدت گزرنے کے بعد انہوں نے یہ نسبت بھلا دی اور ان الہوں کی بندگی شروع کر دی اور ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ان بتوں کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ان کو اللہ کے زیادہ قریب کرتے ہیں۔ سورہ زمر (۳) میں کہا گیا ہے۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (۳۹ : ۳) ''ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے ذریعے اللہ تک ہماری رسائی ہو جائے''۔ قرآن کریم نے ان کی یہ بات نقل کی ہے کہ وہ اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ زمین و آسمان کی تخلیق اللہ نے کی ہے اور شمس و قمر کو بھی اللہ ہی نے مسخر کیا ہے اور آسمانوں سے پانی بھی اللہ ہی اتارتا ہے۔ سورت العنکبوت (۶۱) میں ہے :

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (۲۹ : ۶۱) ''اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ اور سورج اور چاند کس کے تابع فرمان ہیں تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے''۔ اور آگے اسی سورت (۶۳) میں کہا گیا ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (۲۹ : ۶۳) ''اگر تم ان سے پوچھو کون ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا پھر اس سے زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے''۔

وہ جب قسمیں کھاتے تو اللہ کے نام کی کھاتے 'واللہ' باللہ اور تاللہ اور اپنی دعاؤں کا آغاز بھی وہ اللھم سے کرتے تھے۔ لیکن اللہ پر ایمان رکھنے کے باوجود شرک نے ان کے عقائد و تصورات' ان کے رسم و رواج' ان کے مراسم

عبودیت کو خراب کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے مزعومہ خداؤں اور دیوتاؤں کو اپنے مویشیوں' اپنی فصلوں اور اپنی اولاد میں شریک کر لیا تھا' اور اس سلسلے میں وہ اس قدر آگے بڑھ گئے تھے کہ وہ اپنے بیٹوں کو بھی بعض اوقات بتوں پر قربان کرتے تھے۔ سورہ انعام (۱۳۶ تا ۱۴۰) میں قرآن مجید یہ صراحت کرتا ہے۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (١٣٦) وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ (١٣٧) وَقَالُوْا هٰذِهٖ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (١٣٨) وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰى اَزْوَاجِنَا وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (١٣٩) قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (١٤٠) (٦ : ١٣٦ تا ١٤٠) "انہوں نے اللہ کے لیے خود اس کے کھیتوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ کے لیے ہے' بزعم خود' اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے' پھر جو چیز ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتی' مگر جو اللہ کے لیے ہے وہ ان شریکوں کو پہنچ جاتا ہے' کیسے برے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ؟ اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے لہٰذا انہیں چھوڑ دو کہ اپنی افترا پردازیوں میں لگے رہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھلانا چاہیں' حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے۔ پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی۔ اور کچھ جانور ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے' اور یہ سب کچھ انہوں نے اللہ پر افترا کیا ہے' عنقریب اللہ انہیں افترا پردازیوں کا بدلہ دے گا۔ اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے یہ ہمارے مردوں کے لیے مخصوص ہے۔ اور ہماری

عورتوں پر حرام' لیکن اگر وہ مردہ ہو تو دونوں اس کے کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ باتیں جو انہوں نے گھڑ لی ہیں۔ ان کا بدلہ اللہ انہیں دے کر رہے گا۔ یقیناً وہ حکیم اور سب باتوں کی اسے خبر ہے۔ یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت اور نادانی کی وجہ سے قتل کیا اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو اللہ پر افتراپردازی کر کے حرام ٹھہرالیا۔ یقیناً وہ بھٹک گئے اور ہرگز وہ راہ راست پانے والوں میں سے نہ تھے"۔

ان کا اعتقاد تھا کہ وہ دین ابراہیم پر ہیں۔ وہ یہ یقین بھی رکھتے تھے کہ وہ اہل کتاب سے زیادہ ہدایت پر ہیں۔ یہ اہل کتاب ان مشرکین کے ساتھ جزیرۃ العرب میں رہتے تھے کیونکہ یہودیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عزیر اللہ کے بیٹے ہیں۔ عیسائی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں اور خود یہ اہل عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ جنوں کی اللہ کے ساتھ رشتہ داری ہے' لہٰذا وہ اہل کتاب کے مقابلے میں اپنے آپ کو زیادہ ہدایت یافتہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ ملائکہ اور جنوں کی نسبت اللہ کی طرف اس عقیدے سے زیادہ قریب الفہم ہے کہ عزیر علیہ السلام یا عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ جبکہ یہ سب عقائد شرکیہ ہیں۔ اور شرک میں کوئی درجہ بھی اچھا نہیں ہے۔ البتہ وہ اہل کتاب کے مقابلہ میں اپنے عقائد کو بہتر سمجھتے تھے۔

جب آپؐ کی بعثت ہوئی اور آپؐ نے فرمایا کہ میں دین ابراہیم پر ہوں تو انہوں نے کہا جب ہم بھی دین ابراہیم پر ہیں تو ہمیں پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے باوجود ان کے ہاں ایک منصوبہ تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اختیار کر لی جائے۔ انہوں نے آپؐ کو یہ پیشکش کی تھی کہ آپؐ ان کے معبودوں کے سامنے جھک جائیں اور وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے الٰہ کے سامنے جھک جائیں گے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے الٰہوں پر تنقید نہ کریں' ہم ان کے الٰہ پر تنقید نہ کریں گے۔ اس کے علاوہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں پر جو شرائط عائد کریں آپ کی مرضی۔

ان لوگوں کے خیالات اور تصورات چونکہ مختلف النوع تھے۔ وہ ایک طرف اللہ کی عبادت کا دم بھرتے تھے اور دوسری جانب دوسرے الٰہوں کے بھی پجاری تھے اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ ان کے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان زیادہ فاصلے نہیں ہیں۔ اور اتحاد ممکن ہے۔ اور کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر باہم فیصلہ ہو سکتا ہے جس میں دونوں فریقوں کی رضا پیش نظر ہو۔

اس خیال کو پوری طرح رد کر دینے کی خاطر اور اس کوشش کا راستہ پوری طرح بند کر دینے کی خاطر اور اسلامی عبادات اور مشرکانہ عبادت' اسلامی نظام اور جاہلی نظام' اسلامی عقائد اور کافرانہ عقائد اور اسلامی طرز زندگی اور کافرانہ طرز زندگی کے درمیان مکمل فرق کر دینے کی خاطر یہ دو ٹوک بات کی ضرورت تھی اس لیے یہ سورت نازل ہوئی۔ جس کے اندر یہ بات نہایت تاکیدی انداز میں مکرر سہ کرر بیان کی گئی تاکہ اس موضوع پر بات ختم ہو جائے۔ توحید اور شرک کے اتحاد کے تمام راستے بند کر دیئے جائیں اور ہر قسم کی سودا بازی کی جڑ کاٹ دی جائے اور راستے کے نشانات واضح ہو جائیں اور نہ سودا بازی ہو اور نہ بحث و مباحثہ ہو۔

--- 000 ---

# درس نمبر ۳۰۹ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۶

سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ (۱۰۹) مَكِّيَّةٌ (۱۸)
اٰيَاتُهَا ۶ رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱﴾ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲﴾ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ
مَآ اَعْبُدُ ﴿۳﴾ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ﴿۴﴾ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ ۱
اَعْبُدُ ﴿۵﴾ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ﴿۶﴾ ع ۶

۳۴ اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"کہہ دو کہ اے کافرو' میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو' نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو' جس کی عبادت میں کرتا ہوں اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے' اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین"۔

انکار کے بعد انکار' تاکید کے بعد تاکید اور قطعیت کے بعد قطعیت۔ نفی' قطعیت اور تاکید کے تمام صیغے اور اسالیب اس سورت میں جمع کر دیے گئے ہیں۔

قُلْ "کہہ دو"۔ یہ دو ٹوک خدائی حکم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ عقیدہ اور یہ نظریہ مامور من اللہ ہے۔ یہ اللہ وحدہ کا حکم ہے اور اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ذاتی فیصلہ نہیں ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہے اور اس حکم سے سرتابی نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ کوئی ایسا وجود ہے جو اللہ کے حکم کو رد کر سکے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (۱۰۹ : ۱) "کہہ دو اے کافرو"۔ اللہ نے ان کو اس لفظ سے پکارا جس کا اطلاق ان پر حقیقی معنوں میں ہوتا ہے۔ ایک ایسی صفت سے ان کو بلایا گیا جو ان کے اندر فی الواقعہ موجود ہے۔ در حقیقت وہ کسی دین کے پیرو نہ تھے اور در حقیقت وہ مومن نہ تھے' وہ کافر تھے۔ لہٰذا تمہارے اور ان کے درمیان کوئی نکتہ اشتراک نہیں ہے۔

اس طرح سورت کے آغاز ہی سے یہ اشارہ دے دیا جاتا ہے اور چھوٹتے ہی یہ بات واضح کر دی جاتی ہے کہ ایک

مسلم مومن اور کافر کے درمیان کبھی بھی اتحاد نہیں ہو سکتا۔

لَآ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ (۱۰۹ : ۲) "میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو"۔ میری عبادت تمہاری عبادت سے مختلف ہے اور میرا معبود تمہارے معبود سے مختلف ہے۔

وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ (۱۰۹ : ۳) "نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں"۔ اس لیے کہ تمہاری عبادت میری عبادت سے مختلف ہے اور تمہارا معبود میرے معبود سے سوا ہے۔

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ (۱۰۹ : ۴) "اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم نے عبادت کی ہے"۔ یہ پہلے فقرے کی تاکید ہے لیکن یہ جملہ اسمیہ منفیہ کے ذریعے نفی ہے۔ جملہ اسمیہ منفیہ نہایت مضبوطی، دوام اور تسلسل کے مفہوم میں کسی امر کی نفی کرتا ہے۔

وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ (۱۰۹ : ۵) "نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں"۔ یہ دوسرے فقرے کی تاکید ہے تاکہ اس معاملے میں کوئی شک و شبہ نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر مکرر تاکیدات کے بعد شک و شبہ کی کوئی گنجائش بھی نہیں رہتی۔

اس کے بعد نہایت اجمالی طور پر ایک ہی فقرے میں دونوں گروہوں کے درمیان ایسی تفریق کر دی جاتی ہے جس میں کوئی اتحاد نہیں رہتا۔ اس قدر اختلاف پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد کوئی اتصال نہیں رہتا، دونوں کے درمیان اس قدر جدائی ہو جاتی ہے کہ جس کے بعد کوئی ملاپ متصور نہیں رہتا۔

لَكُمۡ دِيۡنُكُمۡ وَلِىَ دِيۡنِ (۱۰۹ : ۶) "تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے"۔ میں یہاں اپنے موقف پر ڈٹا ہوں اور تم اپنے موقف پر ڈٹے ہو، دونوں کے درمیان کوئی پل نہیں ہے جس پر یہ فریق مل سکیں۔ دونوں کے درمیان مکمل جدائی ہے۔ ایک واضح امتیاز اور گہری جدائی۔

یہ مکمل جدائی ضروری بھی تھی، تاکہ کفر و اسلام کے درمیان پائے جانے والے جوہری تضاد کے خدوخال واضح تر ہو جائیں، جن کو دیکھتے ہوئے ہر کوئی سمجھ لے کہ دونوں کے درمیان مصالحت اور کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اختیار کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اختلاف بنیادی نظریات میں ہے۔ اصل تصور اور منہاج زندگی، دونوں میں مختلف ہے اور طرز زندگی بھی بالکل جدا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ توحید ایک مکمل نظام ہے۔ شرک ایک متضاد نظام ہے۔ ان کا باہم ملاپ ممکن ہی نہیں۔ توحید ایک ایسا نظام اور تصور ہے جو انسان کو اس پوری کائنات کے ساتھ اللہ وحدہ لاشریک کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس جہت اور سمت کا تعین کر دیتا ہے جہاں سے انسان نے اپنی پوری زندگی کے لیے ہدایات لینی ہے، عقائد بھی اور قانون بھی۔ اقدار حیات اور پیمانے بھی۔ آداب اور اخلاق بھی، غرض اس زندگی اور اس کائنات کے بارے میں مکمل فلسفہ انسان اسی جہت سے لیتا ہے اور یہ جہت جہاں سے مومن یہ سب کچھ لیتا ہے ذات باری تعالیٰ کی جہت ہے جس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں ہے۔ اس

لیے اسلامی نظام زندگی میں زندگی کے تمام معاملات اسی اصول پر قائم ہوتے ہیں اور اس نظام میں اللہ کی ذات کے ساتھ کوئی شرک نہیں ہوتا۔ اسی طرز پر زندگی چلتی ہے ۔ یہ فیصلہ کن جدائی اسلامی نقطہ نظر سے داعی کے لیے بھی ضروری ہے اور جن کو دعوت دی جارہی ہے ۔ ان کے لیے بھی ضروری ہے ۔

بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ یہ خالص اسلامی تصور حیات اور جاہلی تصور حیات آپس میں مل جاتے ہیں خصوصاً ان سوسائٹیوں میں جنہوں نے پہلے خالص اسلامی تصور کو قبول کر لیا ہوتا ہے لیکن مرور زمانہ کے ساتھ ان کے اندر انحراف پیدا ہو جاتا ہے' اس قسم کی سوسائٹیوں کے سامنے جب خالص ایمانی دعوت پیش کی جاتی ہے اور ان کے سامنے اسلامی نظام کو سیدھے سادھے طریقے سے بغیر کسی ملاوٹ کے پیش کیا جاتا ہے تو یہ لوگ اس دعوت پر بہت سختی کرتے ہیں ۔ ان لوگوں کے مقابلے میں ان لوگوں کا رویہ زیادہ معقول ہوتا ہے جن تک کبھی اسلامی دعوت پہنچی ہی نہیں ہوتی ۔ اس لیے کہ جن سوسائٹیوں نے اسلام قبول کیا ہوتا ہے اور بعد کے ادوار میں وہ منحرف ہو چکی ہوتی ہیں' وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتی ہیں کہ وہ بھی تو ہدایت پر ہیں حالانکہ ان کے عقائد و اعمال میں صالح کے ساتھ فاسد کی ملاوٹ ہو چکی ہوتی ہے ۔ ایسی سوسائٹیوں میں کام کرنے والے ان داعیوں کو بھی بعض اوقات دھوکہ لگ جاتا ہے جو ایسی سوسائٹیوں کے صالح جانب کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے برے پہلو کو بدلنا چاہتے ہیں اور خود ایسی سوسائٹیوں کے برے پہلو سے دھوکہ کھا جاتے ہیں اور یہ دھوکہ نہایت خطرناک ہوتا ہے ۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام' اسلام ہے اور جاہلیت جاہلیت ہے ۔ ان کے درمیان بہت بڑا فرق ہے ۔ اصل طریق کار یہ ہے کہ لوگ جاہلیت سے پوری طرح نکل آئیں اور جاہلیت کے ہر رنگ سے پوری طرح نکل کر اسلام کی طرف ہجرت کر آئیں ۔

اس سلسلے میں پہلا قدم یہ ہوتا ہے کہ داعی مکمل شعور کے ساتھ جاہلیت سے نکل کر اسلام کی طرف آ جائے ۔ اپنے تصورات اور نظریات کے لحاظ سے' اپنے اعمال اور طریق کار کے لحاظ سے اور یہ جدائی ایسی ہو کہ ان دونوں کے درمیان کوئی مصالحت نہ ہو' کوئی تہذیبی مصالحت نہ ہو اور جب کوئی پوری طرح جاہلیت سے نکل کر اسلام میں آ جائے تو اس کے بعد پھر دونوں کے درمیان کوئی تعاون باقی نہیں رہتا ۔ پھر یہ نہیں ہوتا کہ اسلام کی گدڑی میں کسی دوسرے کلچر کے پارچے اور پیوند لگیں' نہ کچھ لو اور کچھ دو کا اصول چلتا ہے ۔ نہ ادھر سے جھکاؤ اور ادھر سے جھکاؤ ہوتا ہے ۔ اگرچہ جاہلیت اسلام کے روپ میں آئے اور اسلام کے عنوان سے بات کرے ۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی داعی کے لیے سب سے پہلے یہ بات ضروری ہے کہ اس زاویہ سے اس کا ذہن صاف ہو' یہ بنیادی بات ہے ۔ وہ مکمل شعور رکھتا ہو کہ وہ اس سوسائٹی سے ایک بیگانہ شخص ہے' اس کا اپنا دین ہے اور میرا اپنا دین ہے ۔ ان کا اپنا طریقہ ہے ۔ میرا اپنا طریقہ ہے ۔ اور وہ ایک قدم بھی ایسے لوگوں کی راہ پر نہیں چل سکتا ۔ لہٰذا اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے ہی راستے پر چلے اور بغیر کسی مداہنت کے وہ اپنے راستے میں اس طرح ڈٹا ہوا ہو کہ اس کا ایک قدم بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹے ۔ غرض مکمل برات کا اعلان ضروری ہے' مکمل جدائی ضروری ہے اور صریح اور فیصلہ کن بات ضروری ہے ۔

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ( ۱۰۹ : ۶ ) "تمہارا اپنا دین ہے اور میرا اپنا دین ہے" ۔

آج کے داعیان حق اس بات کے محتاج ہیں اور ان کے لیے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ وہ جاہلیت جدید کے مقابلے میں اپنی مکمل برات کا اعلان کریں اور دو ٹوک اور فیصلہ کن جدائی کا اعلان کر دیں ۔ آج کے داعی اس شعور کے محتاج ہیں کہ وہ اچھی طرح جان لیں کہ دراصل وہ مکمل جاہلانہ اور کافرانہ معاشرے میں از سرنو اسلام کا اجراء و احیا چاہتے ہیں اور ان کو ایسے معاشروں سے سابقہ درپیش ہے جو پہلے صحیح مسلمان تھے ۔ ان پر ایک طویل عرصہ گزر گیا۔

فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَسِقُونَ "ان پر بہت مدت گزر گئی اور ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر فاسق ہو گئے ہیں"۔ اس کے علاوہ کوئی درمیانی صورت نہیں ہے ۔ نہ کچھ لو اور کچھ دو کا معاملہ ہو سکتا ہے ' نہ یہ بات ہے کہ سوسائٹی تو اسلامی ہے 'چند عیوب کی اصلاح چاہئے 'کہیں تو درست ہے ایک پارچہ لگانا درکار ہے 'اصل طریقہ یہ ہے کہ اسلام کی طرف اسی طرح مکمل دعوت دی جائے جس طرح آغاز اسلام میں داعی حق نے مکمل دعوت دی تھی ' جبکہ وہ ایک جاہلی سوسائٹی کو بدل رہے تھے ۔ اسلام اور جاہلیت کے درمیان مکمل جدائی اور تفریق ضروری ہے ۔ یہ ہے میرا دین ' خالص اپنے عقائد و نظریات میں ' اپنی شریعت اور قانون میں ' اپنے تصورات و افکار ہیں یہ سب اللہ سے ماخوذ ہیں ۔ اس میں شرک کا کوئی شائبہ اور آمیزہ نہیں ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو ' انسانی طرز عمل کے ہر رخ پر ۔

اس فیصلہ کن جدائی کے سوا کوئی چارہ نہیں ورنہ جاہلیت کے ساتھ التباس رہے گا ۔ اسلامی کلچر میں دوسرے کلچروں کی پیوند کاری ہو گی اور جو بھی تحریک چلے گی وہ کمزور اور ضعیف بنیادوں پر ہو گی ۔ اسلامی دعوت و تحریک کے لیے ضروری ہے کہ وہ جرات مندی کے ساتھ دو ٹوک اور فیصلہ کن انداز میں دی جائے اور یہی طریق کار تھا داعی اول کا ۔ وہ صاف صاف کہتے تھے ۔

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (۱۰۹ : ٦) "تمہارے لیے تمہارا دین ہے ۔ میرے لئے میرا دین ہے"۔

--- OOO---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ النصر ـ ۱۱۰

## ۱-- تا -- ۳

# سورۃ النصر ایک نظر میں

اس مختصر سورت کے دو پہلو ہیں' ایک تو یہ ہے کہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک خوشخبری ہے کہ آپؐ کو فتح نصیب ہونے والی ہے اور اس فتح کے نتیجے میں لوگ جوق در جوق آپؐ کے دین میں شامل ہوں گے جو اللہ کا دین' اس لیے جب یہ موقعہ آجائے تو آپؐ کے لیے ہدایت یہ ہے کہ پھر آپؐ اللہ کی حمد و ثنا کریں اور تسبیح و تہلیل کرتے رہیں اور اللہ سے بخشش طلب کریں۔

ایک تو یہ پہلو ہے دوسرا یہ ہے کہ یہ سورت اس دین اور اس نظام اور اس نظریہ حیات کے حقیقی مزاج کو واضح کرتی ہے کہ اسلامی نظریہ حیات انسانت کو آزادی' رفعت اور کرامت اور خلوص عطا کرتا ہے اور ایک روشن مستقبل اور ایک بلند و برتر مقام عطا کرتا ہے۔ وہ مقام جس تک وہ نہ اس نظریہ سے پہلے پہنچ سکی اور نہ بعد میں۔ اور آئندہ بھی انسانیت کو یہ رفعت صرف اسلام کی روشنی میں نصیب ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اسلامی دعوت پر لبیک کہے۔

اس سورت کے نزول کے بارے میں متعدد روایات وارد ہیں۔ ہم ان میں سے امام احمد کی روایت کو لیتے ہیں: محمد ابن عدی روایت کرتے ہیں داؤد سے' وہ شعبی سے' وہ مسروق سے' وہ کہتے ہیں: حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آخری زمانے میں۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ بڑی کثرت سے پڑھتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: "میرے رب نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ تم اپنی امت میں ایک علامت پاؤ گے اور جب تم نے وہ علامت دیکھ لی تو اللہ کی تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اس سے طلب مغفرت کرو۔ بے شک وہ مغفرت کرنے والا ہے"۔ میں نے وہ علامت دیکھ لی ہے اور وہ یہ ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱) وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا

(۲) فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (۳) (۱۱۰ : ۱ تا ۳) "جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے اور تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو' بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے"۔ (امام مسلم از طریق داؤد ابن ہند)

امام ابن کثیر کہتے ہیں اس سورت میں فتح سے مراد فتح مکہ ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب کے تمام قبائل فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے کہ فتح ہو تو وہ اسلام قبول کریں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم

اپنی قوم پر غالب ہوگئے تو وہ نبی برحق ہوں گے۔ جب اللہ نے فتح مکہ نصیب کی تو تمام عرب فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہوگئے۔ دو سال نہ گزرے تھے کہ تمام جزیرۃ العرب نے ایمان قبول کر لیا۔ اور تمام قبائل عرب اقرار ایمان کرنے لگے۔ الحمدللہ۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں عمرابو سلمہ کی یہ روایت نقل کی ہے۔ جب فتح مکہ ہوگیا تو تمام اقوام دوڑ کر اسلام قبول کرنے لگیں اور رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اس سے قبل تمام قبائل فتح مکہ کے انتظار میں تھے' ان کا کہنا یہ تھا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کی قوم کو ایک دوسرے کے مقابلے میں چھوڑ دو۔ اگر وہ اپنی قوم پر غالب آگئے تو وہ نبی ہیں (بخاری)

اس سورت کے ظاہری مفہوم اور عبارت کے ساتھ یہ روایت مطابقت رکھتی ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱۱۰ : ۱) "جب اللہ کی نصرت آجائے اور فتح ہو"۔ تو اس میں کسی ایسے امر کی طرف اشارہ ہے جو آنے والا ہے۔ اور اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی جاتی کہ جب یہ امر واقع ہو جائے تو آپؐ نے یہ یہ کام کرنے ہوں گے۔

ایک دوسری روایت بھی اس موضوع پر ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے۔ اس روایت اور مذکورہ بالا روایت جس کو ہم نے اختیار کیا ہے ان کے درمیان تطبیق کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

امام بخاری کہتے ہیں' کہ موسیٰ ابن اسماعیل نے بیان کیا ابو عوانہ سے' انہوں نے ابوبشر سے' انہوں نے سعید ابن جبیر سے' انہوں نے ابن عباسؓ سے۔ وہ فرماتے ہیں حضرت عمر مجھے شیوخ بدر کے ساتھ اپنے ہاں بلایا کرتے تھے۔ بعض نے اس بات کو محسوس کیا کہ یہ حضرت عمرؓ کے پاس ہمارے ساتھ کیوں جاتے ہیں۔ ان کی عمر کے تو ہمارے لڑکے ہیں' تو انہوں نے کہا کہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں تم جانتے ہو۔ ایک دن حضرت عمر نے ان لوگوں کو بلایا اور مجھے بھی ان کے ساتھ بلایا۔ میں سمجھ گیا کہ آج حضرت عمر نے مجھے ان لوگوں کے ساتھ اس لیے بلایا ہے کہ انہیں دکھائیں۔ تو حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱۱۰ : ۱) کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ بعض نے کہا ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اللہ کی حمد بیان کریں' اس سے مغفرت کی دعا کریں اس لیے کہ اس نے ہماری نصرت کی اور ہمیں فتح نصیب ہوئی اور بعض دوسرے خاموش ہوگئے اور انہوں نے کوئی بات نہ کی۔ پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا ابن عباس تمہاری بھی یہی رائے ہے؟ تو میں نے کہا نہیں' تو انہوں نے فرمایا پھر تمہاری رائے کیا ہے۔ تو میں نے کہا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "اجل" کا اظہار ہے۔ اللہ نے پہلے سے آپ کو بتا دیا (کہ اس دنیا میں اب آپ کا وقت کم ہے) اللہ نے فرمایا۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱۱۰ : ۱) "جب اللہ کی مدد آگئی اور فتح ہوگئی تو یہ علامت ہے آپ کی وفات کی۔ اس لیے آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کریں اور اس سے دعائے مغفرت کریں بے شک اللہ بخشش کرنے والا ہے۔ تو حضرت عمر ابن الخطابؓ نے فرمایا میرے علم میں بھی وہی بات ہے جو تم کہتے ہو۔ (بخاری)

یہ بات ہماری رائے کے ساتھ متضاد نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی بتائی ہوئی علامت دیکھی ہو اور یہ بات سمجھ گئے ہوں کہ ان کا فریضہ ادا ہو چکا۔ اور یہ کہ وہ عنقریب رفیق اعلیٰ کے

ساتھ ملنے والے ہیں۔ یہ ہے مفہوم حضرت ابن عباس کے قول کا کہ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی بات کی گئی ہے۔

ہاں ایک دوسری حدیث جسے امام بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب سورت۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ (۱۱۰ : ۱) نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور کہا "مجھے میری موت کی اطلاع دے دی گئی ہے" تو وہ رو پڑیں اور پھر ہنس پڑیں۔ اور آپؓ نے فرمایا مجھے حضورؐ نے خبر دی کہ مجھے میری موت کی اطلاع دی گئی ہے تو میں رو پڑی اور پھر حضورؐ نے فرمایا "صبر کرو تم میرے اہل و عیال میں سب سے پہلے مجھ سے ملو گی"۔ اس پر میں ہنس پڑی۔

اس حدیث میں اس سورت کے نزول کا وقت متعین کر دیا گیا ہے۔ گویا یہ اس وقت نازل ہوئی جب علامت واقع ہو گئی تھی اور تمام عرب فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو گئے تھے۔ جب یہ سورت علامت کے مطابق نازل ہوئی تو حضورؐ نے اس بات کو سمجھ لیا کہ اب رحلت کا وقت قریب ہے۔ مگر ہم نے جو پہلی بات کی ہے وہ زیادہ قابل اعتماد اور مضبوط ہے۔ اور آیت کی ظاہری عبارت سے بھی زیادہ قریب ہے۔ خصوصاً اگر یہ بات پیش نظر رکھی جائے کہ حضرت فاطمہؓ کے ہنسنے اور رونے کی حدیث کو ایک دوسرے انداز سے بھی نقل کیا گیا ہے اور اس کو یہ ترجیح دیتے ہیں۔

حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو فتح کے سال بلایا اور ان کے ساتھ سرگوشی میں کوئی بات کی تو وہ رو پڑیں۔ اس کے بعد آپؐ نے ان سے مزید کوئی بات کی تو وہ ہنس پڑیں۔ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہؐ فوت ہوئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ سے رسول خدا نے کیا بات کی تھی کہ آپؓ رو پڑیں اور پھر ہنس پڑیں۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے رسول خدا نے یہ اطلاع دی کہ آپؐ جلد ہی فوت ہو جائیں گے تو میں رو پڑی' اس کے بعد مجھے انہوں نے یہ اطلاع دی کہ تم جنت کی عورتوں کی سردار ہو گی' ماسوائے مریم بنت عمران کے' تو میں ہنس پڑی۔

یہ روایت نص قرآنی کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اور امام احمد کی روایت کے ساتھ بھی متفق ہے۔ خلاصہ یہ کہ اللہ اور رسول اللہؐ کے درمیان ایک علامت تھی اور وہ تھی۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ (۱۱۰ : ۱) اور جب فتح ہو گئی تو معلوم ہو گیا کہ حضورؐ کی رحلت اور رفیق اعلیٰ سے ملنے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اس وقت آپؐ نے یہ بات حضرت فاطمہؓ کے گوش گزار کی جیسا کہ حضرت ام سلمہؓ نے روایت فرمائی۔

ان سب روایات سے ہم ایک دائمی اور مستقل نکتہ اخذ کرتے ہیں کہ اس مختصر سورت میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ انسانیت کو ایک نہایت اعلیٰ مقام تک بلند کرنا چاہتا ہے۔ وہ کیا سربلندی ہے؟

---000---

# درس نمبر ۳۱۰ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۳

آیاتہا ۳ سُوْرَۃُ النَّصْرِ (۱۱۰) مَدَنِیَّۃٌ (۱۱۴) رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝١ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝٢ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝٣

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے اور (اے نبیؐ) تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو' اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو' بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے"۔ اس سورت کی پہلی آیت ہی میں ایک متعین اشارہ ہے' اور یہ اشارہ کائناتی واقعات کے بارے میں ایک خاص تصور پیدا کرتا ہے اور اس تصور میں یہ بتلایا جاتا ہے کہ ان واقعات میں اہل ایمان کا کردار کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار کیا ہے۔ اور انسانی زندگی اور ان کائناتی واقعات و حادثات میں اہل ایمان اور نبیؐ کے دائرہ کار کی حد کیا ہے۔ یہ اشارہ اس فقرے میں ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ (۱۱۰ : ۱) "جب اللہ کی مدد پہنچ جائے" میں ہے۔ تمام دارومدار اللہ کی نصرت پر ہے اور اللہ کا وقت مقرر ہے' جس شکل میں نصرت آئے گی وہ بھی متعین ہے' جس مقصد کے لیے یہ نصرت ہوگی وہ بھی مقرر ہے۔ نبی اور اس کے ساتھیوں کا اس کی آمد کے سلسلے میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ اور نہ ان کا نصرت الٰہیہ میں کچھ کردار ہے۔ نہ اس نصرت کے سلسلے میں ان کی ذاتی کمائی کا کوئی دخل ہے۔ نہ ان کی ذاتوں کا کوئی حصہ ہے۔ یہ نصرت ایک ایسا واقعہ ہے جو اللہ کے فیصلے کے مطابق ان کی خصوصیات سے نہیں' باہر سے آتی ہے۔ ان کے لیے یہی اعزاز کافی ہے کہ اللہ یہ نصرت بظاہر ان کے ذریعہ لاتا ہے اور ان کو اس نصرت کا چوکیدار مقرر کرتا ہے اور یہ اس نصرت اور فتح کے امین

ہوتے ہیں ۔ پس فتح و نصرت میں ان کا حصہ یہی ہوتا ہے کہ لوگ جوق در جوق دین اسلام میں داخل ہوتے ہیں ۔ وہ بھی اور دوسرے لوگ بھی ۔

اس اشارے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فکر کی روشنی میں ۔ اس اعزاز اور تکریم کے حوالے سے جو ان کے ہاتھوں نصرت اور فتح کے ظہور کے سلسلے میں ہوا ۔ رسول اللہؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کی حیثیت کا تعین ہو جاتا ہے ۔ ان کی شان اور حیثیت اب یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف متوجہ ہو کر سراسر سپاس بن جائیں ۔ اللہ کی حمد و ثنا کریں اور اپنی کوتاہیوں پر مغفرت کی دعا کریں ۔ یہ حمد و ثنا اور شکر اس بات پر کہ اللہ نے ان کو اسلامی انقلاب کا امین اور نگران بنایا اور اپنے دین کی نصرت فرما کر اور اسے غالب فرما کر پوری انسانیت پر احسان فرمایا ۔ رسول اللہ فاتح ہوئے 'لوگ فوج در فوج اس خیر کثیر میں داخل ہوئے حالانکہ اس سے قبل وہ اندھے تھے 'گمراہ تھے اور سخت خسارے میں تھے ۔

استغفار کس لیے 'یہ ان نفسیاتی عوامل کے لیے ہے جو نہایت لطیف انداز میں دلوں میں داخل ہو کر بیٹھ جاتے ہیں ۔ جب کوئی قوت ایک طویل اور ان تھک جدوجہد کے بعد بر سر اقتدار آتی ہے تو فتح و کامرانی کے نشے میں اس کی نفسیات میں ایک قسم کا غرور چپکے سے داخل ہو جاتا ہے 'پھر مشکلات اور قربانیوں کے بعد انسان سے خوشیوں میں کچھ کوتاہیاں بھی ہو جاتی ہیں 'ان خفیہ نفسیاتی وائرس سے صرف توبہ و استغفار کے ذریعہ بچا جا سکتا ہے 'اس لیے یہاں استغفار کا حکم دیا گیا ہے ۔

یہ استغفار اس لیے بھی ہے کہ طویل جدوجہد کے زمانے میں ان تھک حالات کے نتیجے میں شدید مشکلات اور نہایت گھرے کربناک حالات کی وجہ سے انسانی قلب میں گھٹن آ جاتی ہے ۔ انسان سمجھتا ہے کہ اللہ کی نصرت کے پہنچنے میں دیر ہو گئی ہے 'اور داعی کو ہلا مارا جاتا ہے ۔ جیسا کہ بقرہ (۲۱۴) میں کہا گیا ہے ۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (۲ : ۲۱۴) "کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں ان حالات سے سابقہ پیش نہیں آیا جن سے تم سے پہلے اہل ایمان کو سابقہ پیش آیا تھا ۔ وہ فقر و فاقہ اور شدائد و آلام سے دوچار ہوئے اور ہلا مارے گئے یہاں تک کہ رسول اور ان کے ساتھ کے اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی 'سنو اللہ کی مدد قریب ہے" ۔ اس لیے حکم دیا گیا کہ استغفار کرو ۔

استغفار کا حکم اس لیے بھی دیا گیا کہ اللہ کی حمد و ثنا میں انسان سے تقصیر ہو جاتی ہے ۔ پس انسان کی جدوجہد جس قدر بھی زیادہ ہو 'وہ محدود ہوتی ہے اور انسان ضعیف ہے ۔ اور اللہ کی نعمتیں ہمیشہ بے شمار ہیں اور اس کا فیض عام ہے ۔

وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (۱۴ : ۳۴) "اگر تم اللہ کے احسانات کو شمار کرو تو تم ان کا احصا اور احاطہ نہیں کر سکتے" ۔ لہٰذا اس تقصیر پر استغفار کا حکم دیا گیا ۔

فتح و کامرانی کے موقعہ پر تسبیح و استغفار میں ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ فخر و مباہات کے مقام پر نفس کے اندر یہ شعور پیدا کیا جائے کہ انسان تو ہمیشہ عجز اور تقصیر کے مقام پر ہوتا ہے ۔ لہٰذا اسے چاہئے کہ وہ بڑوں کی سطح سے ذرا نیچے اتر

آئے ۔ اور اپنے رب سے اپنی تقصیرات کی معافی طلب کرے ۔ اس طرح انسانی شعور اور انسانی نفسیات سے فخر و مباہات کے میلانات کا صفایا ہو جاتا ہے ۔

اگر ایک فاتح کے دل میں یہ شعور بیٹھ جائے کہ وہ عجز اور تقصیر کا پتلا ہے اور اسے اپنی تقصیرات پر اللہ سے دعائے مغفرت کرنا چاہئے تو ایسا فاتح کبھی بھی مفتوح لوگوں پر ظلم اور تعدی کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔ ایسا شخص تو یوں سوچتا ہے کہ یہ تو اللہ کی ذات ہے جس کی نصرت کی وجہ سے وہ ان لوگوں پر مقتدر اعلیٰ بن گیا ہے ۔ اگر اللہ کی نصرت نہ ہوتی تو وہ تو بندۂ ناچیز و پر تقصیر ہے اور اللہ نے جو اس کو اقتدار دیا ہے تو یہ اس لیے دیا ہے کہ اللہ مفتوح لوگوں کے بارے میں کوئی خیر اور بھلائی چاہتا ہے ۔ درحقیقت فتح تو اللہ کی نصرت سے میسر ہوتی ہے ۔ نصرت بھی اس کی ہے اور فتح بھی اس کی ہے اور یہ فاتح کی فتح نہیں بلکہ اللہ کے دین کی فتح ہے ۔ اور تمام امور کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور تمام فیصلے اللہ کی طرف لوٹتے ہیں ۔

یہ ہے وہ روشن اور بلند مرتبہ افق 'جس کے اوپر نظریں مرکوز کرنے کے لیے قرآن پوری انسانیت کو دعوت دیتا ہے کہ وہ درجہ بدرجہ اس بلند افق تک بلند ہوتی چلی جائے ۔ جو شرافت اور نیکی کا اعلیٰ مرتبہ ہے ۔ اس تک پہنچ کر انسان بڑا بن جاتا ہے ۔ اس لیے کہ وہ اپنی بڑائی سے دستکش ہو جاتا ہے ۔ یہاں اس کی روح آزاد ہو کر مسرت حاصل کرتی ہے ۔ اس لیے کہ وہ اللہ کی غلامی اختیار کر لیتی ہے ۔

غرض یہ ایک آزادی ہے جس میں انسان اپنی ذاتی اور مادی بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور انسان اللہ کی روحانی مخلوق میں سے ایک مخلوق بن جاتا ہے اور یہ ایک ایسے مقام تک جا پہنچتا ہے کہ اللہ کی رضا اس کی رضا بن جاتی ہے اور یہ مقام حاصل کرنے کے بعد پھر وہ مجاہد بن جاتا ہے اور اس کی جدوجہد کا رخ یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلامی نظام کی صورت میں بھلائی کی نصرت کرے اور حق کو حقیقت بنا دے اور پھر اسلامی نظام کے قیام کے بعد وہ اس زمین کو ایسی ترقی دے اور دنیا کو ایسی قیادت فراہم کرے کہ دنیا شر و فساد سے پاک ہو جائے ۔ یہ قیادت صالح ' پاک اور تعمیری ہو ۔ اور اس کا مقصد ہر بھلائی کو پھیلانا اور ترقی دینا ہو ۔ اور اس طرح تمام امور کا رخ اللہ کی طرف پھیر دے ۔

انسان اگر اپنی ذات کے محدود کنویں کا مینڈک ہو اور اس میں قید ہو تو پھر اس کی آزادی کی مساعی عبث بن جاتی ہیں ۔ وہ آزادی کے بعد اپنی خواہشات کا غلام ہوتا ہے ۔ شہوات اور خواہشات میں گرفتار ہوتا ہے ۔ انسان اگر خواہشات نفسانیہ کے دائرہ نشیب سے آزاد نہ ہو تو دوسری آزادیاں عبث ہیں ۔ اسلام چاہتا ہے کہ دوسری آزادیوں کے ساتھ انسان نفسانی خواہشات سے بھی آزاد ہو جائے تاکہ وہ اللہ کو یاد کرے اور اس کا غلام ہو ۔

یہ ہیں آداب نبوت ' جو نبوت کے ساتھ لازم رہے ہیں اور اللہ کی مرضی یہ ہے کہ انسانیت ان آداب نبوت کے آفاق تک بلند ہو جائے ۔ اور اگر وہاں تک نہ بھی پہنچ سکے تو اس کی نظریں اس افق پر رہوں ۔ دیکھئے یوسف علیہ السلام اس مقام تک پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ مصر کے تمام خزائن اقتدار ان کے ہاتھ میں آچکے ہیں ۔ ان کا خواب سچا ہو چکا ہے ۔ انہوں نے جب والدین کو اپنے تخت پر اٹھایا تو بھائیوں نے ان کے سامنے سجدہ کیا ' اور حضرت یوسف نے والدین سے کہا کہ باپ ! یہ ہے میری خواب کی تعبیر 'اللہ نے تو اسے حقیقت بنا دیا ۔ اللہ کا احسان دیکھئے کہ اس نے مجھے قید سے نکالا ' آپ لوگوں کو دیہات سے مصر لایا حالانکہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان نزاع ڈال دیا تھا ۔ بے شک میرا رب لطیف تدابیر اختیار کرتا ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے ۔

غرض ایسے موقعہ پر حضرت یوسف علیہ السلام بلندی ' سرفرازی اور خوشی اور انبساط کے ماحول سے نکل آتے ہیں اور ذکر و فکر میں مشغول ہو کر اپنے رب کی حمد و ثنا کرتے ہیں - وہ اقتدار کے عروج پر ہیں ان کے تمام خواب حقیقت بن گئے ہیں لیکن ان کی دعوت یہ ہے :

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ (۱۲ : ۱۰۱) "اے میرے رب! تو نے مجھے اقتدار بھی دیا' اور مجھے باتوں کی تہ تک پہنچنے کا علم بھی دیا - اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی دنیا و آخرت میں میرا کارساز ہے - مجھے اسلام پر موت دے اور نیکو کاروں کے زمرے میں مجھے شامل کر" - یہاں جاہ و اقتدار پس منظر میں چلے جاتے ہیں - اہل و عیال اور بہن بھائیوں کا یہ اجتماع اور ایک عرصہ بعد رشتہ داروں اور والدین کی ملاقات کی خوشی کافور ہو جاتی ہے - اب اس آخری منظر میں ہمیں ایک ایسا فرد نظر آتا ہے جو رب تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا رہا ہے اور سوال یہ ہے کہ میرا اسلام محفوظ ہو اور میری سوسائٹی صالحین کے ساتھ ہو - اور یہ مرتبہ اللہ کے فضل و کرم سے ہی مل سکتا ہے -

اب حضرت سلیمان علیہ السلام کے آداب زندگی ملاحظہ ہوں - وہ بھی ایسے حالات میں ہیں کہ طرفۃ العین میں ملکہ سبا کا تخت ان کے سامنے ہے - دیکھئے قرآن ایسے حالات میں قوت و جاہ کے حالات میں ان کی کیفیات کس طرح ریکارڈ کرتا ہے -

فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ (۲۷ : ۴۰) "جب سلیمان نے تخت کو اپنے پاس رکھا ہوا پایا - تو وہ پکار اٹھے یہ میرے رب کے فضل و کرم سے ہے - یہ اس لیے کہ وہ مجھے آزمائے کہ میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں یا کفران نعمت کا مرتکب ہوتا ہوں - اور جو کوئی شکر کرے گا اپنے ہی لیے کرے گا اور جو ناشکری کرے گا میرا رب غنی اور بزرگ ہے" -

اور یہی تھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روش - آپ ؐ کو اپنی پوری زندگی میں یہی ادب اختیار کیا اور نصرت و فتح کے موقعہ پر جب اللہ نے آپ کے لیے خاص علامت قرار دیا تھا - تو حضور اپنی سواری کے اوپر جھکے ہوئے جا رہے تھے - آپ ؐ مکہ میں اسی طرح سر جھکائے ہوئے داخل ہوئے - آج آپ اس مکہ میں جس نے آپ کو اذیتیں دی تھیں' جس نے آپ کو گھر سے نکالا تھا - جس نے آپ کے ساتھ پے در پے جنگیں لڑیں' جو آپ ؐ کی دعوت کی راہ میں معاندانہ طور پر ڈٹ گیا تھا - جب آپ ؐ کو نصرت اور فتح نصیب ہوئی تو آپ ؐ نے فتح و کامرانی کے شادیانے نہ بجائے - آپ رب کا شکر ادا کرتے ہوئے جھکے جا رہے تھے - حمد و ثنا میں مشغول تھے اور جس طرح رب تعالیٰ نے آپ ؐ کو تلقین کی تھی - آپ ؐ تسبیح و تہلیل اور استغفار کر رہے تھے - جیسا کہ آثار میں آتا ہے کہ آپ کے بعد آپ ؐ کے صحابہ ؓ کا رویہ بھی ایسا ہی رہا - اللہ ان سے راضی ہو -

یوں بشریت ایمان کے ذریعہ سربلند ہوئی - انسانیت کا چہرہ روشن ہو گیا - وہ صاف و شفاف ہو گئی - اب انسانیت عظمت' قوت اور آزادی کے مقام بلند تک پہنچ گئی -

---OOO---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ اللہب ۔ ۱۱۱

## ۱--- تا--- ۵

# سورۃ اللھب ایک نظر میں

ابولہب کا نام عبدالعزیٰ ابن عبدالمطلب تھا۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا۔ ''ابولہب'' کے نام سے اس لیے مشہور ہو گیا کہ وہ شعلے کی طرح سرخ چہرہ رکھتا تھا۔ یہ اور ان کی بیوی، ام جمیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت زیادہ اذیت دیتے تھے۔ اور دعوت اسلامی کے جانی دشمن تھے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھے حسین ابن عبداللہ بن عبید اللہ ابن عباس نے بتایا، کہتے ہیں میں ربیعہ ابن معاذ دیلمی کو یہ کہتے سنا ''میں اپنے والد کے ساتھ تھا اور جوان تھا کہ ایک نوجوان شخص (رسول اللہؐ) کو میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک ایک قبیلے کے پاس جاتے ہیں (اور ان کے پیچھے ایک دوسرا شخص ہے جو حسین و جمیل ہے اور بڑے بڑے بالوں والا ہے اور بھینگا ہے) اور کہتے ہیں: ''اے بنی فلاں میں تمہاری طرف اللہ کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ میں تمہیں یہ حکم دیتا ہوں کہ صرف اللہ کی بندگی کرو، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، میری تصدیق کرو، اور میری حمایت و مدافعت کرو تاکہ میں اس چیز کو نافذ کر سکوں جس کے ساتھ مجھے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے''۔ یہ نوجوان جب اپنی بات سے فارغ ہوتا تو اس کے پیچھے کھڑا یہ دوسرا شخص یہ کہتا ''اے بنی فلاں یہ شخص یہ چاہتا ہے کہ تم لات اور عزیٰ کو چھوڑ دو، اور بنی مالک ابن اقمس کے ان دوستوں کو بھی چھوڑ دو جو تمہارے حلیف ہیں اور اس بدعت اور گمراہی کو قبول کر لو جو یہ لے کر آیا ہے۔ اس کی بات نہ سنو اور نہ اس کی اطاعت کرو''۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا یہ شخص کون ہے؟ تو انہوں نے کہا ''یہ ان کا چچا ابولہب ہے۔ (امام احمد و امام طبرانی)

یہ ایک نمونہ ہے ابولہب کی سازشوں کا جو وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کے خلاف کرتا رہتا تھا۔ ام جمیل، اس کی بیوی اس سلسلے میں اس کی معاون تھی۔ ان کی مہم نہایت ظالمانہ اور شدید تھی۔ ام جمیل کا نام اروی بنت حرب ابن امیہ ہے۔ یہ ابو سفیان کی بہن تھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوت کے خلاف ابولہب کا یہ رویہ اول روز سے تھا۔ امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ، حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ وادی بطحا کی طرف نکلے اور ایک پہاڑ پر چڑھ گئے اور پکارا ''یاصباحاہ'' اس پر قریش سب کے سب پہاڑ پر جمع ہو گئے۔ تو آپؐ نے ان سے پوچھا کہ بتاؤ اگر میں تم سے کہوں کہ دشمن تم پر صبح کو حملہ کرنے والا ہے یا شام کو تو کیا تم میری بات کی تصدیق کرو گے؟ تو انہوں نے کہا ''ہاں''۔ تو آپؐ نے فرمایا ''سنو میں تمہیں ایک شدید عذاب سے ڈراتا ہوں جو تم پر آنے والا ہے۔ اس پر ابولہب نے کہا ''کیا تم نے ہمیں اس لیے جمع کیا تھا تم ہلاک ہو جاؤ''۔ اس پر اللہ نے یہ سورت نازل کی۔

تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ (۱۱۱ : ۱) ''ٹوٹ گئے ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ ہلاک ہوا''۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ یہ اٹھا اور اپنے ہاتھ جھاڑنے لگا اور اس نے کہا ہلاکت ہو تم پر سارا دن؟ کیا تم نے ہمیں اسی لیے جمع کیا تھا تو اللہ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

جب بنو ہاشم نے ابو طالب کی قیادت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کا فیصلہ کیا' اگرچہ انہوں نے آپ ؐ کے دین کو قبول نہ کیا تھا لیکن عصبیت کے اصولوں کے مطابق انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کا فیصلہ کیا تو ابولہب بنو ہاشم سے نکل گیا۔ اور اس نے آپ ؐ کے خلاف قریش کے ساتھ حلیفانہ معاہدہ کیا۔ اور جب انہوں نے حضور اکرم ؐ اور بنو ہاشم کے ساتھ مقاطعہ کیا اور اس سلسلے کی تحریر پر ابولہب نے بھی دستخط کیے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بنو ہاشم کو قحط سے ڈرا کر اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حوالے کر دیں۔

آپ ؐ کی دو صاحبزادیاں رقیہ اور ام کلثوم ابولہب کے دو بیٹوں کی مخطوبہ تھیں۔ یہ رشتہ بعثت سے قبل ہوا تھا۔ ابولہب نے اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ ان کو طلاق دے دیں تاکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر خاندانی بوجھ بڑھ جائے۔

یوں ابولہب اور ان کی بیوی ام جمیل نے آپ ؐ کے خلاف شدید جنگ جاری رکھی ہوئی تھی۔ یہ دونوں دعوت اسلامی کے شدید دشمن تھے اور یہ جنگ انہوں نے اپنی پوری زندگی جاری رکھی۔ کسی وقت بھی اس میں انہوں نے کوئی رو رعایت نہ کی۔ ابو جہل کا گھر حضور اکرم ؐ کے گھر کے قریب تھا اس لیے آپ ؐ کو اذیت دینے کے مواقع بھی اس کو بہت ملتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ ام جمیل کانٹے جمع کرتی اور حضور ؐ کے راستے میں رکھ دیتی۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ لکڑیاں اٹھانا حضور ؐ کے خلاف فتنے اٹھانے۔ آپ ؐ کو اذیت دینے اور آپ ؐ کے خلاف سازشیں کرنے سے استعارہ ہے۔

---ooo---

# درس نمبر ۳۱۱ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۵

سُوْرَةُ اللَّهَبِ (۱۱۱) مَكِّيَّةٌ (۶) آیاتہا ۵ رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تَبَّتْ یَدَاۤ اَبِیْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ۝۱ مَاۤ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ ۝۲ سَیَصْلٰی ۱
نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝۳ وَّ امْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝۴ فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝۵ ع ۲۶

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ۔ اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اس کے کسی کام نہ آیا۔ ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا اور (اس کے ساتھ) اس کی جورو بھی، لگائی بجھائی کرنے والی، اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہوگی"۔

یہ سورت اللہ کی طرف سے اس لیے نازل ہوئی کہ ابولہب اور اس کی بیوی کی طرف سے برپا کی ہوئی جنگ میں حضور کی حمایت کی جائے۔ گویا یہ معرکہ اللہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

تَبَّتْ یَدَاۤ اَبِیْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ (۱۱۱ : ۱) "ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ"۔ تبت، تباب سے مشتق ہے جس کے معنی ہلاکت، تباہی اور انقطاع کے ہیں۔ یہاں تبت کے معنی ہیں بددعا کے اور دوسرے تب کے معنی ہیں کہ وہ ہلاک ہو گیا تباہ ہو گیا اور اس کا سلسلہ کٹ گیا۔ یہ خبر ہے وقوع بددعا کی۔ سورت کے آغاز ہی میں اس مختصر آیت میں بددعا اور اس کی تکمیل کا مکمل منظر ہے۔ گویا معرکہ ختم ہو جاتا ہے اور پردہ گر جاتا ہے۔

اس کے بعد، آنے والی دوسری آیت میں حقیقت واقعہ کا بیان ہے۔

مَاۤ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ (۱۱۱ : ۲) "اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اس کے کسی کام نہ آیا"۔ اس کے ہاتھ ٹوٹ گئے، وہ ہلاک و برباد ہو گیا۔ اس کا مال اور اسلام کے خلاف جدوجہد اس کے کچھ کام نہ آئی اور اس کی دولت اور اس کی مکاریاں اسے ہلاکت سے نہ بچا سکیں۔

یہ تو تھا اس کا انجام دنیا میں ۔ آخرت میں اس کا انجام کیا ہو گا؟

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (۱۱۱ : ۳) "ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا"۔ لہب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آگ بہت شدید اور شعلہ بار ہو گی اور سخت بھڑکی ہوئی ہو گی ۔

وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (۱۱۱ : ۴) "اور اس کی جورو لکڑیاں اٹھانے والی" بھی اس آگ میں ڈالی جائے گی ' اس حال میں کہ وہ لکڑیاں اٹھائے ہوئے ہو گی اور اس حال میں کہ ۔

فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (۱۱۱ : ۵) "اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہو گی"۔ اور اس رسی کے ساتھ اسے آگ میں باندھ دیا جائے گا یا یہ رسی وہ ہو گی جس کے ساتھ لکڑیاں باندھی جاتی ہیں ۔ اگر اس کا حقیقی معنی لیا جائے تو وہ وہاں بھی لکڑیوں اور کانٹوں کا گٹھا اٹھائے ہوئے جہنم میں جائے گی اور اگر مجازی معنی لیا جائے تو معنی یہ ہو گا جو شرارت کی آگ کو بھڑکاتی ہے ۔ اور فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے کی سعی کرتی ہے ۔

اس سورت کا طرز ادا اس کے موضوعات اور معانی کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔ سورت کی فضا کے مناسب طرز تعبیر اختیار کیا گیا ہے ۔ اس سلسلے میں میری کتاب "قرآن میں مناظر قیامت" سے چند سطریں یہاں نقل کرنا ضروری ہیں ۔ ان کا یہاں نقل کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اس سورت کے نزول سے ام جمیل کے دل میں ایک ایسا تیر لگا جس کی وجہ سے وہ برافروختہ ہو گئی اور پاگل ہو کر رہ گئی ۔

"ابولہب (شعلوں کا باپ) ایک ایسی آگ میں تپایا جائے گا جو شعلہ زن ہو گی اس کی عورت جو حضورؐ کی راہ میں خار دار جھاڑیاں لا کر ڈالتی تھی وہ جہنم میں اس حال میں گرائی جائے گی کہ اس کے گلے میں مونجھ کی رسی بندھی ہو گی"۔

"الفاظ بھی باہم متناسب اور صوتی ہم آہنگی رکھنے والے ' تصاویر بھی باہم ' یک رنگ ' بس جہنم میں اس کو گرایا جائے گا وہ شعلہ بار ہے ۔ اس میں شعلوں کے باپ (ابولہب) کو گرایا جائے گا ۔ اس کی عورت لکڑیاں لاتی ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں ڈالتی ہے اور آپؐ کو ایذائیں دیتی ہے ' خواہ حقیقی معنی لیا جائے یا استعارہ ۔ لکڑیوں سے آگ کو بھی بھڑکایا جاتا ہے اور ان لکڑیوں کو رسیوں میں باندھ کر لایا جاتا ہے ۔ اس لیے جہنم شعلہ زن میں اسے مونجھ کی رسی سے باندھ دیا جائے گا ۔ اور اسے اس رسی سے باندھ دیا جائے گا جس سے وہ لکڑیاں لاتی تھی ۔ تاکہ سزا ایسی ہو جیسا اس کا جرم تھا ۔ اور یہ تصویر اپنے سادہ رنگوں کے ساتھ سامنے آئے اور اس کے رنگ میں لکڑیاں ' رسی ' آگ اور شعلے ہوں ۔ اور اس آگ میں میاں بیوی دونوں تپ رہے ہیں"۔

ایک دوسرے زاویہ سے بھی اس سورت میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے ۔ الفاظ کی صوتی جھنکار ' لکڑیوں کے گٹھے کے باندھنے کی آواز اور گردن کو رسی سے باندھنے کی آواز بھی باہم یکساں ہیں ۔ ذرا پڑھیے ۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (۱۱۱ : ۱) ان الفاظ میں شدید صوتی درشتگی ایسی ہی ہے جس طرح لکڑیوں کے گٹھے کو باندھنے میں سختی ہوتی ہے ۔ جس طرح یہ الفاظ شدید ہیں اسی طرح گردن میں رسی باندھنے کا عمل اور

اسے کھینچنا شدید ہے ۔ اور پوری سورت میں اسی طرح کی کٹھن کی فضا ہے"۔

اس طرح صوتی ترنم 'عملی کشاکش کی آواز' اور سورت کی حرکات کی جزئیات کے درمیان گہری مناسبت اور ہم آہنگی ہے ۔ پھر الفاظ بھی ہم جنس 'اور تعبیر میں یکسانی کا لحاظ 'سب کے سب سورت کی فضا کے ساتھ ہم آہنگ ہیں ۔ پھر یہ تمام چیزیں سبب نزول اور سورت کے پس منظر کے ساتھ بھی جڑی ہوئی ہیں ۔ یہ سب فنی خوبیاں صرف پانچ مختصر فقروں میں ملحوظ خاطر رکھی گئی ہیں اور قرآن کی مختصر ترین سورتوں میں سے ایک میں اس فنی کمال کو ظاہر کیا گیا ہے ۔

اس سورت کی ان فنی خوبیوں کی وجہ سے اور بے پناہ اثر کی وجہ سے ام جمیل کا تاثر یہ تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں اس کی ہجو کی ہے ۔ یہ سورت فوراً مکہ میں پھیل گئی تھی 'جس میں میاں بیوی کی مذمت کی گئی تھی 'ان کو دھمکی دی گئی تھی اور نہایت بھدی تصویر کھینچی گئی تھی ۔ یہ ایسی تصویر کشی تھی جس نے ایک خود پسند عورت کے دل کو چور چور کر دیا ۔ جسے اپنے نسب وحسب پر بہت ہی غرور تھا ۔ جو اپنے آپ کو بہت ہی اونچے گھرانے کی عورت سمجھتی تھی ۔ لیکن قرآن نے اس کی تصویر کشی یوں کی :

حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (٤) فِي جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ( ۱۱۱ : ۵ ) "عورت' جو لکڑیاں اٹھانے والی ہے اور جس کے گلے میں چھال کی رسی بندھی ہوئی ہے"۔ یہ نہایت ہی عام صورت حالات ہے جو عربوں میں عام تھی ۔

ابن اسحاق کہتے ہیں مجھ تک یہ تذکرہ پہنچا ہے کہ ام جمیل حمالة الحطب نے جب اس سورت کے نزول کے بارے میں سنا کہ یہ اس کے بارے میں اور اس کے خاوند کے بارے میں نازل ہوئی ۔ یہ گئی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ۔ آپؐ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی بیٹھے ہوئے تھے ۔ اس کی مٹھی پتھروں سے بھری ہوئی تھی 'جب یہ ان دونوں کے پاس آکر کھڑی ہوئی تو اللہ نے اس کی آنکھوں پر اس طرح پردہ ڈال دیا کہ وہ صرف ابوبکر کو دیکھ سکتی تھی ۔ تو اس نے کہا :"ابوبکر کہاں ہے تمہارا ساتھی ' مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس نے میری ہجو کی ہے ۔ خدا کی قسم اگر وہ مجھے ملتا تو میں ان پتھروں سے اسے مارتی ۔ خدا کی قسم میں بھی تو شاعرہ ہوں اس کے بعد اس نے یہ شعر پڑھا

مذمما عصینا و امره ابینا

وہ محمد نہیں بلکہ مذمت کیے ہوئے ہیں 'ہم نے ان کی نافرمانی کی ہے اور ان کے احکام ماننے سے انکار کر دیا یا ان کے دین کو ماننے سے انکار کر دیا ہے ۔

یہ واپس چلی گئی ۔ حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہؐ سے کہا :کیا اس نے آپؐ کو نہیں دیکھا ۔ آپؐ نے فرمایا"اس نے مجھے نہیں دیکھا 'اللہ تعالیٰ نے اس کی نظر کو مجھ سے کھینچ لیا تھا"۔

حافظ ابوبکر بزار نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے ۔ حضرت ابن عباسؓ سے 'جب سورہ

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ( ۱۱۱ : ۱ ) نازل ہوئی تو ابولہب کی بیوی حرم میں آئی ۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ کعبہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا حضورؐ اگر

آپ ؐ ایک طرف ہو جائیں تو یہ آپ ؐ کو اذیت نہ دے سکے گی ۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " میرے اور اس کے درمیان پردہ حائل ہو جائے گا " ۔ یہ آئی اور حضرت ابوبکرؓ کے پاس کھڑی ہوگئی اور کہا : " ابوبکر تمہارے ساتھی نے ہماری ہجو کی ہے " ۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا : " اس گھر کی قسم انہوں نے ایسا نہیں کیا ' وہ نہ شعر کہتے ہیں اور نہ ہی پڑھتے ہیں " ۔ تو اس نے کہا آپ ؐ تو سچے ہیں ۔ جب واپس گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا " حضور ؐ کیا اس نے آپ ؐ کو نہیں دیکھا ؟ تو آپ ؐ نے فرمایا " جب تک وہ کھڑی رہی فرشتے مجھ پر ستر پھیلاتے رہے جب تک وہ چلی نہیں گئی " ۔

غرض اس کا پارہ اس قدر چڑھ گیا تھا کیونکہ یہ سورت پھیل گئی تھی ' اس نے اسے اپنی ہجو سمجھا ۔ اس زمانے میں ہجو صرف اشعار میں ہوتی تھی ۔ اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے جائز طور پر ہجو کی تردید کر دی ۔ اور وہ بہت سچے مانے جاتے تھے لیکن ان آیات میں اس کی جو حقارت آمیز تصویر کشی کی گئی ہے وہ اس دائمی کتاب میں ریکارڈ کر دی گئی ہے ۔ اللہ کی کتاب بھی لازوال ہے اور ان دونوں کی مذمت بھی لازوال ہوگئی ۔ اور یہ ایسی تصویر ہے جو ایک بولتی تصویر ہے ۔ یہ ہے سزا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ؐ کی دعوت کے خلاف سازش کرنے کی ۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بھی دعوت اسلامی اور داعیان حق کے خلاف اس قسم کی سازشیں کرتے ہیں ان کی قسمت میں دنیا میں بھی ناکامی لکھی ہوئی ہے ۔ وہ یہاں بھی ہلاک اور برباد ہوں گے ۔ اور آخرت میں بھی وہ ایک سخت سزا پائیں گے ۔ یہ ان کی مناسب سزا ہوگی ۔ دنیا میں لکڑہاروں کی رسی جس ذلت کی طرف اشارہ کرتی ہے ' آخرت میں بھی یہ رسی اس کے گلے میں ہوگی اور یہ ذلت کی کافی نشانی ہوگی ۔

--- ○○○---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ الاخلاص ـ ۱۱۲

## ۱--- تا --- ۵

# سورۃ الاخلاص ایک نظر میں

صحیح روایات میں آتا ہے کہ یہ مختصر سورت پورے قرآن کے ایک تہائی حصے کے برابر ہے ۔امام بخاری فرماتے ہیں : حدیث بیان کی اسماعیل نے ' مالک سے 'انہوں نے عبدالرحمن ابن عبداللہ ابن عبدالرحمن ابن صعصعہ سے 'انہوں نے اپنے والد سے 'انہوں نے ابوسعد سے ' وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو یہ پڑھتے سنا۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ( ۱۱۲ : ۱ ) یہ اسے بار بار پڑھ رہا تھا۔جب صبح ہوئی تو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا' یہ تذکرہ کرنے والا یہ تاثر دے رہا تھا کہ یہ بہت کم ہے جو پڑھنے والا پڑھ رہا تھا' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے 'یہ سورت تو ایک تہائی قرآن کے برابر ہے''۔
یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے اس لیے کہ جس توحید کے اعلان کرنے کا حکم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ( ۱۱۲ : ۱ ) ''کہہ دو کہ وہ اللہ یکتا ہے''۔یہ عقیدہ توحید انسانی ضمیر کا بھی عقیدہ ہے' یہ اس کائنات کی تفسیر بھی ہے اور یہ زندگی کا ایک نظام بھی ہے لہٰذا یہ سورت اسلامی نظام زندگی کے اہم ترین خطوط کا ایک بنیادی نقشہ پیش کرتی ہے۔

--- ooo---

# درس نمبر ۲۱۲ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۴

سُورَۃُ الْاِخْلَاصِ (۱۱۲) مَکِّیَّۃٌ (۲۲) آیاتہا ۴ رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳ وَلَمْ يَكُنْ
لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴

ع ۲ ۱

۳۷

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"کہو ' وہ اللہ ہے ' یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے"۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱۱۲ : ۱) "کہو ' وہ اللہ ہے یکتا"۔ احد کا لفظ واحد سے زیادہ گہرا ہے کیونکہ احد ' واحد کے مفہوم پر مزید اضافہ کرتا ہے ' کہ اس کے ساتھ اور کوئی چیز حقیقتاً موجود نہیں ہے اور اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے یعنی وہ یکتا ہے۔

"احد" میں وجود کی احدیت کا اظہار ہے ' یعنی اس کی حقیقت کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کے سوا اور کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔ اللہ کے سوا جس قدر موجودات ہیں وہ اپنا وجود اللہ سے اخذ کرتی ہیں اور وہ اپنی حقیقت اللہ کی حقیقت سے لیتی ہیں۔ وہ فاعلیت میں بھی یکتا ہے لہٰذا اللہ کے سوا اس پوری کائنات میں کوئی اور موثر اور کوئی اور فاعل نہیں ہے۔ لہٰذا یہ ایک نظریہ اور عقیدہ ہے جو انسان کے ضمیر میں جاگزیں ہوتا ہے اور یہ دراصل اس کائنات کی تفسیر بھی ہے۔ جب کسی دل میں یہ عقیدہ بیٹھ جاتا ہے اور عقل اس کا تصور کر لیتی ہے۔ اور اس پوری کائنات کی تفسیر اس کی روشنی میں ہو جاتی ہے تو انسانی دل پر کوئی اور تصور نہیں چھاتا اور انسانی قلب میں کسی اور سوچ کا شائبہ نہیں رہتا۔ اور انسانی قلب اس واحد ذات واجب الوجود کے سوا کسی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا ' کیونکہ دراصل موجود تو یہی ذات یکتا ہے اور فعال اور مؤثر بھی یہی واحد ذات ہے۔

پھر اس کائنات میں جو چیزیں بھی پائی جاتی ہیں ان کے ساتھ قلب انسانی کا رابطہ ختم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ہونا یہ چاہیے تھا

کہ انسانی دل سے ماسوی اللہ کے وجود کا شعور ہی ختم ہو جائے۔ اگر یہ شعور ختم نہ بھی ہو، تعلق ختم ہو جاتا، اس لیے کہ اللہ کے وجود کے سوا تمام دوسری اشیاء کے وجود کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور اس پوری کائنات میں اللہ کے ارادے کی فاعلیت اور تاثیر کے سوا کوئی اور چیز فعال اور موثر بھی نہیں ہے۔ لہذا عقیدۂ توحید کے بعد قلب انسانی کسی ایسی چیز سے کیوں متعلق ہو جو نہ حقیقتاً موجود ہے اور نہ کسی چیز میں فعال و موثر ہے۔

اب جب دل اللہ یکتا کے سوا تمام اشیاء کی حقیقت کے تصور ہی سے خالی ہو گیا اور اس میں ماسوی اللہ سے تعلق ہی نہ رہا۔ تو اب یہ دل صحیح میں آزاد ہوتا ہے، وہ ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس دل کی تمام خواہشات ختم ہو جاتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ خواہشات ہی دراصل پاؤں کی زنجیریں ہوتی ہیں۔ پھر خوف بھی اس دل سے ختم ہو جاتا ہے اور یاد رہے کہ اس خوف کی وجہ سے بھی انسان پابند سلاسل ہو جاتا ہے۔ انسان کے دل سے مرغوبات کیوں ختم ہو جاتی ہیں اس لیے کہ جب وہ اللہ کو پالیتا ہے تو وہ سب کچھ پالیتا ہے اور وہ ڈرتا اس لیے نہیں کہ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی فعال نہیں۔

جب انسانی شعور میں یہ حقیقت اچھی طرح بیٹھ جائے کہ انسان کو اس کائنات میں صرف اللہ کی حقیقت نظر آتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر اس کائنات میں انسان کو جو وجود نظر آئے گا اس میں بھی اسے یہی حقیقت نظر آئے گی۔ اس طرح پھر انسانی قلب کو ہر چیز میں دست قدرت نظر آتا ہے اور اس کے بعد پھر انسان اس درجے پر فائز ہوتا ہے کہ اسے اس کائنات میں اللہ کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

اس عقیدے اور تصور کے نتیجے میں انسان سوچنے لگتا ہے کہ ظاہری اسباب بھی ہیچ ہیں۔ اصل اور حقیقی سبب مسبب الاسباب ہے یعنی ذات باری تعالیٰ۔ یہ وہ نکتہ ہے جس کی طرف قرآن نے بہت توجہ کی ہے اور اسے اسلام کی ایمانیات میں داخل کر کے ذہنوں میں بٹھانے کی سعی کی ہے۔ چنانچہ ظاہری اسباب کو برطرف کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ اصل سبب مشیت الہیہ ہے۔

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸ : ۱۷) "جب تم نے پھینکا تو دراصل تم نے نہیں پھینکا مگر اللہ نے پھینکا"۔ اور آل عمران (۱۲۶) میں یہ کہا گیا:

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (۳ : ۱۲۶) "فتح و نصرت صرف اللہ کی طرف سے ہے"۔ اور الدھر (۳۰) میں ہے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۷۶ : ۳۰) "اور تم نہیں چاہتے الا یہ کہ اللہ چاہے"۔ اسی طرح کی بے شمار اور آیات ہیں۔

جب انسان اسباب ظاہری کو برطرف کر دیتا ہے تو پھر اسے نظر آتا ہے کہ تمام امور اللہ کی مشیت سے طے پاتے ہیں۔ پھر اس سے اس کے دل میں اطمینان پیدا ہو جاتا ہے اب وہ تمام مرغوبات اللہ سے طلب کرتا ہے اور تمام مکروہات سے بچنے کے لیے اللہ کے ہاں پناہ ڈھونڈتا ہے اور ظاہری عوامل، ظاہری اسباب اور موثرات جو کچھ کرتے نظر آتے ہیں، اس کائنات میں ان کی کوئی حقیقت اس کی نظروں میں نہیں ہوتی۔

یہ تھے وہ مقامات جن کو عبور کرنے کی سعی صوفیاء کرتے رہے۔ لیکن ان مقامات کی کشش ان کو کہیں دور ہی لے گئی۔ صوفیا اس بات کو سمجھ نہ سکے کہ اسلام لوگوں کو بلا کر ان مقامات بلند تک ضرور لے جاتا ہے لیکن وہ ان کو اس دنیا کی عملی زندگی کے تمام نشیب و فراز کے اندر رکھتے ہوئے اور ہر طرح کی انسانی زندگی کے اندر رہتے ہوئے اور اس زمین پر اللہ کی نیابت کے فرائض کی ادائیگی کرتے ہوئے ان مقامات تک پہنچاتا ہے۔ وہ اس دنیا کی زندگی میں بھرپور حصہ بھی لیتے ہیں اور اسے ہیچ بھی سمجھتے ہیں۔ وہ اس کائنات میں رہتے ہیں لیکن وہ حقیقی موجود صرف اللہ کو سمجھتے ہیں۔ وہ تمام واقعات و حادثات میں فعال اور موثر اللہ کو سمجھتے ہیں۔ اور اس طریقے کے سوا اسلام کوئی دوسرا طریقہ نہیں اپناتا' نہ چاہتا ہے۔ پس اس کے نتیجے میں ایک مکمل نظام زندگی وجود میں آتا ہے۔ یہ نظام اس کائنات کی اس تشریح اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے شعور' تصورات اور رجحانات کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس نظام زندگی کے خدوخال کیا ہیں؟

(۱) اس نظام کا ایک اپنا نظام عبادت ہے جس میں صرف اللہ کی بندگی کی جاتی ہے۔ وہ اللہ جس کے وجود کے سوا کسی وجود کی کوئی حقیقت نہیں' جس کی فاعلیت کے سوا کوئی اور فاعلیت نہیں۔ اور اس کے ارادے کے سوا کسی اور کا ارادہ موثر نہیں۔

(۲) یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں ایک انسان ہر حالت میں' امید میں اور خوف میں صرف اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ خوشی اور غم میں' امیری اور فقیری میں' غرض ہر حال میں اس کا رخ صرف اللہ وحدہ کی طرف ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس نظام میں ہر شخص یہ جانتا ہے کہ جب اللہ کے سوا کسی اور چیز کا وجود ہی حقیقی نہیں۔ تو پھر اس کی طرف توجہ اور پکار کا فائدہ کیا ہوگا۔ جب اللہ کے سوا اور کوئی نہ فاعل ہے اور نہ موثر تو پھر اس کی طرف توجہ سے حاصل کیا ہوگا۔

(۳) یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں ہدایات صرف اللہ سے لی جاتی ہیں۔ عقائد و نظریات' اقدار اور پیمانے' شریعت اور قانون' ادارے اور انتظام' رسوم و رواج' آداب و تقالید سب کی سب اللہ سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہر قسم کی ہدایت اور رہنمائی صرف اللہ وحدہ سے لی جاتی ہے۔ جو حقیقت واقعہ میں بھی اور ایک مسلم کے ضمیر میں بھی واحد موجود ہے۔

(۴) یہ نظام ایک نظام تحریک اور عمل ہے۔ اور یہ تحریک و عمل صرف اللہ وحدہ کے لیے ہے۔ اس کی رضا کے حصول کے لیے اس کے قرب کے حصول کے لیے۔ اس امید پر کہ اس تک پہنچنے کی راہ میں تمام پردے اور رکاوٹیں دور ہوں گی۔ اور گمراہی کے تمام شوائب سے انسان محفوظ ہوگا' چاہے یہ پردہ اور رکاوٹیں نفس انسانی کے اندر ہوں' یا انسانی ماحول کی چیزوں اور انسانوں کی طرف سے ہوں۔ جن میں خود انسان کی ذلت' انسان کا خوف اور اس کی خواہش اور اس دنیا میں اس کی مرغوب اشیاء سرفہرست ہیں۔

(۵) یہ ایک ایسا نظام ہے کہ مذکورہ بالا امور کے ساتھ ساتھ وہ قلب بشری اور اس کائنات کی تمام موجودات کے درمیان' محبت' انس' تعاون' یگانگت کا تعلق پیدا کرتا ہے۔ اس لیے کہ دنیا کے بندھنوں سے آزادی کے معنی یہ نہیں کہ انسان اس کو مکروہ سمجھے' اس سے نفرت کرے' اس سے بھاگے اور اس کے برتنے سے اجتناب کرے۔ اس لیے کہ دنیا کی اشیاء سب کی سب اللہ کے دست قدرت کے کرشمے ہیں۔ ان کا وجود اللہ کے وجود سے ماخوذ ہے۔ اور سب اشیاء پر اسی حقیقت کی پرتو پڑتی ہے' لہٰذا یہ سب چیزیں محبوب ہیں کیونکہ یہ اللہ کے تحفے ہیں جو حبیب ہے۔

(۶) یہ نظام نہایت بلند اور آزاد نظام ہے 'اس کی نظروں میں زمین ایک چھوٹی سی گیند ہے ' دنیا کا سازوسامان بے قیمت ہے اور ان پردوں اور رکاوٹوں سے آزادی سب کی تمنا ہے لیکن دنیا کی غلامی سے آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان دنیاوی امور سے الگ تھلگ ہو جائے اور اس دنیا کو یونہی مہمل چھوڑ دے ۔ یا اس سے نفرت کرے ' اور اس سے بھاگے ' بلکہ اسلامی نظام کا تقاضا یہ ہے کہ جہد مسلسل ہو ' دائمی جدوجہد برپا ہو ' انسانیت کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے تک ترقی دی جائے ' اور انسان کی زندگی پوری طرح آزاد اور فری ہو ۔ پس دنیا کی زندگی کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ منصب خلافت الہیہ ہے جس کی اپنی ذمہ داریاں ہیں لیکن ان ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے انسان ان کا غلام بھی نہیں ہے ۔ ان سے آزاد بھی ہے جیسا کہ ہم نے اس کی تشریح کی ۔

دنیا سے چھٹکارے کا ایک تو وہ طریقہ ہے جو گرجوں نے تجویز کیا لیکن اسلام صومعاتی رہبانیت کا قائل نہیں ہے اس لیے کہ انسان نے خلافت ارضی کے فرائض بھی سرانجام دینے ہیں اور انسانوں کو ایک اچھی قیادت کی بھی ضرورت ہے ۔ اور یہ دونوں امور انسان کی نجات اور فلاح اور اس دنیا کی غلامی سے چھٹکارے کے لیے ضروری ہیں ۔ یہ راہ بہت دشوار ہے ۔ یعنی انسان کی انسانیت کا تحقق صرف اسی صورت میں ممکن ہے ۔ اس طرح انسان کی شخصیت میں روحانیت کا غلبہ ہو جاتا ہے ۔ اور یہ ہے آزادی ' انسان کی روح دنیاوی آلائشوں سے آزاد ہو کر اپنے اصلی مصدر کی طرف آزاد ہو جاتی ہے اور انسان کو اللہ نے پیدا کر کے جس دنیا میں چھوڑا ہے اس میں کام کرتے ہوئے بھی وہ اپنی اعلیٰ روحانی مقام اور حقیقت کو برقرار رکھتا ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ رسالت کے آغاز میں دعوت کو صرف عقیدۂ توحید تک محدود رکھا گیا اور مندرجہ بالا معنوں میں عقیدۂ توحید کو لوگوں کے ذہنوں میں بٹھانے کی کوشش کی گئی کیونکہ اس معنی میں توحید انسانی قلب و ضمیر میں بیٹھا ہوا ایک عقیدہ بھی ہے ۔ اس کائنات کی تفسیر و تشریح اور تعبیر بھی ہے اور ایک مکمل نظام حیات بھی ہے ۔ اس مفہوم میں عقیدۂ توحید صرف الفاظ نہیں جن کا اقرار زبان سے کر دیا جائے اور صرف انسانی ضمیر و شعور کا پختہ یقین بھی نہیں ہے جو صرف ضمیر و شعور کے اندر ہی پوشیدہ ہو ' یہ سب کچھ ہے ' پورا دین ہے بلکہ اس عقیدے کی تفصیلات ہیں ۔ اس کے کچھ نتائج ہیں اور یہ تفصیلات اور یہ نتائج اس عقیدے کے طبعی اور لازمی نتائج ہیں ۔ اور یہ نتائج قوانین طبیعیہ کی طرح سامنے آتے ہیں ۔ اگر دین میں یہ عقیدہ موجود ہو ۔

اہل کتاب کے اندر جو انحراف پیدا ہوا ' جس نے ان کے عقائد و تصورات ' ان کی عملی زندگی کو برباد کر دیا ' اس کا آغاز بھی پہلے پہل حقیقی عقیدۂ توحید کے مٹ جانے کی وجہ سے ہوا ۔ عقیدۂ توحید کے مٹنے کے بعد پھر دوسرے انحرافات پیدا ہوئے ۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلام کے نظریہ توحید کی امتیازی شان یہ ہے کہ یہ انسانی زندگی کے اندر نہایت گہرائی تک اترتا ہے ۔ اسلام چاہتا ہے کہ انسانوں کی پوری زندی اس عقیدے پر استوار ہو ' اور انسانوں کی زندگی کا عملی نظام پورے کا پورا عقیدۂ توحید کی اساس پر قائم ہو ۔ جس طرح اس کے اثرات تصورات و عقائد میں ہوں اسی طرح شریعت و قانون میں بھی ہوں ۔ اور اس طرح کے آثار میں سے بڑا اثر اور اس کے نتائج میں سے بڑا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی پر شریعت الہیہ کی حکمرانی ہو ۔ اگر اقرار توحید کے بعد یہ آثار نمودار نہ ہوں تو یہ سمجھا جائے گا کہ عقیدۂ توحید موجود نہیں ہے ۔

اس لیے کہ اسلام کا عقیدۂ توحید جب دل میں اترتا ہے تو وہ ارکان حیات اور نظام حیات اور اعمال کی شکل میں اگتا ہے۔

اس کا مفہوم کہ اللہ "احد" ہے' یہ ہے کہ وہ "صمد" ہے' یعنی وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اور سب اس کے محتاج ہیں۔ اور یہ کہ نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔ اور اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ لیکن "احد" کے بعد ان دوسرے مفاہیم کو محض وضاحت کے لیے الگ ذکر کیا گیا ہے۔

اللّٰہُ الصَّمَدُ (۱۱۲ : ۲) "اللہ سب سے بے نیاز ہے"۔ صمد کا لغوی معنی ہیں وہ جس کی اجازت کے بغیر کوئی امر طے نہ ہوتا ہو اور اللہ تو وہ سردار ہے جس کے سوا کوئی سید اور سردار نہیں ہے۔ وہ اپنی الوہیت میں یکتا ہے اور سب اس کے غلام ہیں۔ اور وہی وحدہ قاضی الحاجات ہے۔ وہی ہے جو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہے' اور ہر بات کا فیصلہ اس کے حکم سے ہوتا ہے اور اس فیصلے میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہوتا۔ اور یہ مفہوم خود لفظ احد میں بھی مکمل طور پر موجود ہے۔

لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ (۱۱۲ : ۳) "نہ اس کی کوئی اولاد اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے"۔ اللہ کی ذات وہ حقیقت ہے جو ازلی اور ابدی ہے۔ اور اس کی ذات ایک حال سے دوسرے حال میں بدل نہیں سکتی۔ اس کی صفت یہ ہے کہ وہ کامل مطلق ہے اور تمام حالات میں ذات باری کامل ہوتی ہے۔ ولادت کا عمل سب کو معلوم ہے کہ پھٹنے اور بڑھنے سے عبارت ہے۔ عدم سے وجود میں آنا یا نقص سے کمال کی طرف بڑھنا دراصل ولادت کی علامات ہیں اور اللہ ان چیزوں سے پاک ہے۔ پھر ولادت کے لیے زوجیت کی ضرورت ہے اور پھر زوجہ ہمیشہ زوج اور خاوند کی ہم جنس ہوتی ہے۔ اور یہ بھی اللہ کے لیے محال ہے' اور خدا کے احد ہونے کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا۔

وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ (۱۱۲ : ۴) "اور کوئی اس کا ہمسر نہیں"۔ نہ اس کا کوئی مماثل ہے اور نہ برابر ہے۔ نہ وجود کی حقیقت کے اعتبار سے' نہ فاعلیت کے اعتبار سے' اور نہ اللہ کی کسی ذاتی صفت میں۔ اور یہ بات بھی لفظ "احد" میں موجود ہے۔ وہ چونکہ احد ہے اس لیے اس کا کوئی کفو نہیں ہے۔ یہ سب فقرے "احد" کی تاکید و تشریح ہیں۔ یہ عقیدہ اس زرتشتی عقیدے کی تردید کرتا ہے کہ اللہ خیر کا الٰہ ہے اور شر کا الٰہ کوئی اور ہے۔ یہ ثنائی عقائد کے پیروکاروں کا خود ساختہ عقیدہ ہے۔ یہ عقیدہ ایران میں مروج ہے۔ چنانچہ قدیم ایرانی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ایک خیر کا الٰہ ہے اور دوسرا شر کا الٰہ ہے۔ ایک نور کا الٰہ ہے اور دوسرا ظلمت کا الٰہ ہے اور جزیرۃ العرب کے جنوب میں بعض لوگ یہ عقائد رکھتے تھے جہاں ایرانیوں کی حکومت تھی۔

یہ سورت اسلام کے عقیدۂ توحید کو پوری طرح ثابت کرتی ہی۔ جس طرح سورۃ الکافرون کا موضوع یہ تھا کہ عقیدۂ توحید اور شرک کے درمیان کوئی مصالحت اور مفاہمت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا دونوں سورتوں کا موضوع مختلف زاویوں سے عقیدۂ توحید ہی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم روز مرہ کے معمولات کا آغاز صبح کی دو سنتوں سے کرتے تھے اور ان میں یہ دو سورتیں پڑھتے تھے۔ اور صبح کی سنتوں میں ان کا پڑھنا بامقصد تھا اور یہ بات واضح بھی ہے۔

---ooo---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ الفلق ۔ ۱۱۳

## ۱-- تا-- ۵

# سورۃ الفلق ایک نظر میں

یہ سورت اور اس کے بعد آنے والی سورت ابتداءً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص ہدایات ہیں اور اس کے بعد ان کا اطلاق تمام اہل ایمان پر بھی ہوتا ہے' کہ تمام خطرات سے بچنے کے لیے اللہ کے حظیرۂ امن میں آ جاؤ' اللہ کی حفاظت اور پناہ میں آ جاؤ۔ یہ خطرات ظاہری ہوں یا مخفی۔ معلوم ہوں یا مجہول۔ تمام خطرات سے اور خصوصاً فلاں فلاں خطرات سے۔ گویا اللہ تعالیٰ اپنے حظیرۂ امن اور اپنی پناہ گاہ کا دروازہ کھولتا ہے اور نہایت شفقت اور محبت سے ندا دیتا ہے کہ آؤ یہ محفوظ مقام ہے' یہ جائے پناہ ہے تمہارے لیے' تم یہاں مطمئن ہو جاؤ گے۔ آؤ' آؤ میں جانتا ہوں کہ تم ضعیف ہو' تمہارے بہت سے دشمن ہیں' تمہارے لیے پر خطر مقامات ہیں۔ اور یہاں امن' اطمینان ہے اور حفاظت و سلامتی ہے۔

اس لیے دونوں سورتوں کا آغاز یوں ہے :قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳ : ۱) ''کہو' میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی''۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴ : ۱) ''کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب کی''۔ اس کے نزول کو ہاتھوں ہاتھ لینے کے بارے میں متعدد روایات ہیں۔ ان روایات سے وہ تبصرہ اور وہ فضا ثابت ہوتی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا۔ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نہایت فرحت و انبساط اور نہایت گہرائی اور کشادگی سے لیا۔

حضرت عقبہ ابن عامر سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :''کیا تم نے ان آیات پر غور کیا جو آج کی رات مجھ پر نازل ہوئیں؟ ایسی آیات اس سے قبل ہرگز نہیں دیکھی گئیں وہ یہ ہیں۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳ : ۱) اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴ : ۱) ہیں۔ (مالک' مسلم' ترمذی' ابو داؤد' نسائی) حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا ''اے جابر پڑھو''۔ میں نے کہا میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں میں کیا پڑھوں۔ آپؐ نے فرمایا :پڑھو'

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳ : ۱) اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴ : ۱) میں نے ان کو پڑھا۔ آپؐ نے فرمایا ''انہیں پڑھو ان جیسی سورتیں تم نہ پڑھو گے''۔ (نسائی) زر ابن جیش سے روایت ہے' کہتے ہیں :میں نے حضرت ابی ابن کعبؓ سے 'معوذتین کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا ''ابو المنذر تمہارے بھائی ابن مسعودؓ ان کے بارے میں یہ یہ کہتے ہیں۔ (حضرت ابن مسعود ان کو اپنے مصحف میں نہ لکھتے تھے۔ لیکن بعد میں وہ صحابہ کرامؓ کی جماعت کی رائے کی طرف پلٹ گئے تھے اور ان کو اپنے مصحف میں لکھ لیا تھا)۔ تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا آپؐ نے فرمایا مجھ سے کہا گیا ''کہو''۔ تو میں نے کہا کہو۔ تو ہم اسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضور اکرمؐ نے کہا۔

غرض یہ تمام روایات اس پر مسرت اور پسندیدہ فضا کا اظہار کرتی ہیں جس کا ہم نے تذکرہ کیا۔

---

# درس نمبر ۳۱۲ تشریح آیات

## ۱-- تا-- ۵

آیاتہا ۵ سُوْرَۃُ الْفَلَقِ (۱۱۳) مَکِّیَّۃٌ (۲۰) رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲ وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا
۵ ع وَقَبَ ۝۳ وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۝۴ وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝۵ ع
۲۸

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"کہو' میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی' ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے' اور رات کی تاریکی کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے' اور گرہوں میں پھونکنے والوں (یا والیوں) کے شر سے' اور حاسد کے شر سے جب کہ وہ حسد کرے"۔

اس سورت میں اللہ اپنی وہ صفات بیان فرماتا ہے' جس کے ذریعہ اس شر سے پناہ حاصل ہوتی ہے' جس کا ذکر اس سورت میں کیا گیا ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳ : ۱) "کہو' میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی"۔ فلق کے معانی میں سے ایک معنی صبح کا ہے اور ایک معنی "فلوق" کا بھی ہے۔ بایں معنی کہ ہر وہ چیز جس سے وجود اور زندگی پھوٹتی ہے جس طرح سورہ انعام (۹۵) میں کہا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَ النَّوٰی یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ (۶ : ۹۵) "اللہ دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے۔ وہ زندہ کو مردے سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ سے نکالنے والا ہے"۔ اور اگلی آیت (۹۶) میں ہے۔

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَ جَعَلَ الَّیْلَ سَکَنًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا (۶ : ۹۶) "وہ صبح کو پھاڑ کر نکالنے والا ہے' اس نے رات کو وجہ سکون بنایا۔ اور سورج اور چاند کو حساب سے رکھا"۔

اگر فلق کے معنی صبح کا لیے جائیں تو معنی یہ ہوں گے ۔ صبح کے وہ رب جو روشنی پھیلا کر ہر چیز کو اس شر سے محفوظ کر دیتا ہے جو اندھیروں میں مستور ہوتی ہے اور اگر فلق سے مراد مخلوق ہو تو معنی یہ ہوں گے ۔ پناہ مانگتا ہوں مخلوق کے رب کی جو اپنی مخلوق کے شر سے پناہ دینے والا ہے ۔ لہٰذا دونوں صورتوں میں مفہوم بعد کے فقرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے ۔

مِن شَرِّ مَا خَلَقَ (۱۱۳ : ۲) " ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی یعنی مطلق اور اجمالاً تمام مخلوق کے شر سے ۔ اللہ کی مخلوقات میں سے بعض جب بعض سے ملتی ہیں تو اس اتصال سے بعض اوقات شر پیدا ہوتا ہے جبکہ بعض حالات میں مخلوقات کے ملاپ اور اتصال سے خیر اور نفع پیدا ہوتا ہے ۔ لہٰذا چاہا جاتا ہے کہ مخلوق کے شر سے پناہ مانگو تاکہ خیر ہی خیر رہ جائے ۔ اور اللہ کی ذات جو اس مخلوقات کی خالق ہے وہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ اس کو ایسی راہ کی ہدایت دے اور ایسی تدابیر کرے کہ ان سے خیر نمودار ہو اور شر کا ظہور نہ ہو ۔

وَمِن شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (۱۱۳ : ۳) "اور رات کی تاریکی کے شر سے جب وہ چھا جائے"۔ غاسق کے لغوی معنی کو دنے والے کے ہوتے ہیں اور وقب پہاڑ کے اس سوراخ کو کہتے ہیں جس سے پانی نکلتا ہے ۔ یہاں غاسق سے مراد رات ہے یعنی رات اور اس میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں یعنی وہ رات جب وہ پھوٹ کر زمین پر چھا جاتی ہے ۔ یہ رات بذات خود خوفناک ہوتی ہے اور اس وقت اس کی خوفناکی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب اس میں ہر خفیہ اور نامعلوم خطرہ درپیش ہو سکتا ہے مثلاً کوئی وحشی درندہ حملہ آور ہو جائے ' کوئی چور گھس جائے ۔ کوئی فریب دہندہ دشمن ہاتھ دکھا جائے ۔ کوئی زہریلا کیڑا مکوڑا اور سانپ کاٹ جائے ۔ پھر رات کے وقت خیالات و وساوس انسان پر حملہ آور ہوتے ہیں ۔ دکھ اور درد یاد آتے ہیں ۔ شعور و جذبات اور خواہشات و میلانات کی گھٹن زوروں پر ہوتی ہے ' اور تمام شیطانی قوتیں کھل جاتی ہیں اور ہر طرف سے برے اشارے ملتے ہیں ' اور انسانی شہوت رات کو زوروں پر ہوتی ہے ۔ غرض رات کے وقت ہر ظاہری اور خفیہ بلائیں حملہ آور ہوتی ہیں کیونکہ اس وقت اندھیرے چھائے ہوئے ہوتے ہیں ۔

وَمِن شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ (۱۱۳ : ٤) "اور گرہوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے"۔ گرہوں میں پھونکنے والیاں کون ہیں؟ وہ جادوگرنیاں جو انسانی حواس پر سحر انگیزی کر کے اذیت دیتی ہیں جو اعصاب کو دھوکہ دیتی ہیں ' انسانی نفس کو اشارات دیتی ہیں اور انسانی شعور کو متاثر کرتی ہیں ۔ جو دھاگوں میں گرہیں ڈالا کرتی تھیں اور ان میں پھونکا کرتی ہیں جیسا کہ جادوگروں کی عادت ہوتی ہے ۔

جادو چیزوں کی حقیقت اور ماہیت نہیں بدل سکتا ۔ نہ کوئی نئی حقیقت پیدا کر سکتا ہے البتہ احساس و شعور پر ایسی تخیلاتی حالت طاری ہو جاتی ہے جس طرح کہ جادوگر چاہتا ہے ۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں سورہ طٰہٰ (۶۵ تا ۶۹) میں قرآن کریم اس کی تصویر کشی کی ہے ۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰى اِمَّآ اَنْ تُلْقِىَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى (۶۵) قَالَ بَلْ اَلْقُوْا

فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (۶۶) فَاَوْجَسَ

فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی (٦٧) قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی (٦٨) وَ اَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا اِنَّمَا صَنَعُوْا كَیْدُ سٰحِرٍ وَ لَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰی (٦٩)

(۲۰ : ٦٥ تا ٦٩) "جادوگر بولے : موسیٰ تم پہلے پھینکتے ہو یا ہم پہلے پھینکیں؟ موسیٰ نے کہا : "نہیں تم ہی پھینکو"۔ یکایک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں ' ان کے جادو کے زور سے موسیٰ کو دوڑتی محسوس ہونے لگیں اور موسیٰ اپنے دل میں ڈر گیا۔ ہم نے کہا مت ڈرو ' تو ہی غالب رہے گا۔ پھینک جو تیرے ہاتھ میں ہے۔ ابھی ان کی ساری بناوٹی چیزوں کو نگل جاتا ہے۔ یہ جو کچھ بنا کر لائے ہیں یہ تو جادو کا فریب ہے۔ اور جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا خواہ کسی شان سے وہ آئے"۔

ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں سانپ نہ بن گئے تھے۔ البتہ حضرت موسیٰ اور عوام نے یہ خیال کیا کہ یہ رسیاں اور لاٹھیاں سانپ ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ اپنے نفس میں ڈر گئے اور اللہ کی طرف سے ان کو تسلی دینے کی ضرورت پیش آئی۔ لیکن حقائق اس وقت سامنے آئے جب عصائے موسیٰ فعلاً اژدھا بن گیا اور ان کی رسیوں اور لاٹھیوں کو نگل گیا۔

یہ ہے حقیقت سحر اور ہمیں چاہئے کہ ہم اسے اسی طرح تسلیم کریں۔ اس طرح یہ جادو لوگوں پر اثر ڈالتا ہے اور جادوگروں کے اشارے کے مطابق لوگوں کے حواس کو متاثر کرتا ہے۔ یہ انسانی نفسیات اور انسانی شعور میں خوف پیدا کرتا ہے اور لوگوں کو اذیت دیتا ہے۔ اور انسانی حواس اس طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جدھر جادوگر چاہتا ہے۔ جادوگری کی حقیقت بیان کرنے اور گرہوں میں پھونکنے کے مفہوم میں بس یہی کافی ہے۔ یہ ایک شر ہے جس سے بچنے کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی پناہ مانگو اور اللہ کی پناہ میں آجاؤ۔

بعض روایات میں آتا ہے۔ ان میں سے بعض اگرچہ متواتر نہیں مگر صحیح ہیں کہ لبید بن اعصم یہودی نے مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا ' بعض روایات میں آتا ہے کہ اس کا اثر چند دن تک رہا اور بعض میں آتا ہے کہ کئی مہینوں تک رہا۔ یہاں تک کہ آپؐ یہ خیال کرتے کہ آپؐ اپنی بیویوں کے پاس گئے ہیں حالانکہ آپؐ نہ گئے ہوئے تھے۔ اور بعض اوقات یوں محسوس کرتے کہ آپؐ نے کوئی کام کیا ہے ' حالانکہ آپؐ نے نہ کیا ہوتا تھا ' جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے اور پھر یہ سورتیں اس جادو کے ہٹانے کے لیے جھاڑ پھونک کے لیے نازل ہوئیں اور جب جادو کی وہ چیز حاضر کر لی گئی اور اس پر یہ سورتیں پڑھی گئیں تو وہ گرہیں کھل گئیں اور وہ برا اثر ختم ہو گیا۔ جس طرح بعض روایات میں آتا ہے۔

لیکن یہ روایات عصمت انبیاء کے بنیادی عقیدے کے خلاف ہیں کہ آپؐ اپنے تمام افعال اور تبلیغ میں معصوم عن الخطاء ہیں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ آپؐ کے اقوال و افعال سنت اور شریعت ہیں۔ یہ روایات اس سے بھی متصادم ہیں۔ پھر قرآن نے صراحت سے اس الزام کی تردید کی ہے کہ آپؐ پر جادو کیا گیا ہے کیونکہ مشرکین یہ الزام لگاتے تھے کہ آپؐ پر کسی نے جادو کر دیا ہے تب آپ یہ باتیں کرتے ہیں۔ اس لیے ہمارے نزدیک یہ روایات مستبعد ہیں۔ پھر خبر واحد کے ساتھ عقائد کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ عقائد کا ماخذ قرآن ہے اور احادیث سے عقائد تب ہی ثابت ہوتے ہیں جب وہ تواتر کی حد تک پہنچ جائیں اور جن روایات کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے وہ متواتر نہیں ہیں۔ مزید یہ کہ راجح قول یہ ہے کہ یہ سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں جس سے ان روایات کی بنیاد ہی کمزور ہو جاتی ہے۔

وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (۱۱۳:۵) "اور حاسد کے شر کے لیے جب وہ حسد کرے"۔ حسد کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کے اوپر اللہ کا کرم دیکھ کر کوئی برا تاثر لے اور یہ خواہش کرے کہ اس بندے پر سے اللہ کی نعمت زائل ہو جائے۔ چاہے اس تاثر کے بعد حاسد اس بندے سے نعمتوں کے دور کرنے کے لیے سعی بھی کرے۔ یا محض ذہنی تاثر کی حد تک رک جائے کیونکہ اس تاثر کے بعد ممکن ہے کہ وہ اس بندے کے خلاف کوئی شر عملاً بھی اٹھائے۔

اس کائنات کے بعض اسرار، نفس انسانی کے بعض راز اور جسم انسانی کے بعض رموز ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں ابھی تک ہمارا علم نامکمل ہے۔ اس لیے ہمیں بہت سختی سے ان کا انکار نہیں کرنا چاہئے۔ بعض پر اسرار واقعات ان میدانوں میں واقع ہوتے ہیں اور ہم ان کی ماہیت تک نہیں پہنچ سکتے۔ مثلاً دور سے خیالات کی منتقلی کا عمل! جب دو افراد کے درمیان رابطہ ہو جاتا ہے، ایسے روابط کی خبریں اس قدر تواتر سے آرہی ہیں کہ انسان ان میں شک نہیں کر سکتا، کیونکہ اس پر بہت تجربات ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں اور جو معلومات ہمیں دستیاب ہیں ان کی کوئی معقول توجیہ بھی ہمارے پاس نہیں ہے۔ مثلاً مقناطیسی عمل تنویم جو آج کل مکرر تجربے میں آرہا ہے لیکن اس کے راز سے کوئی واقف نہیں ہے۔ دور سے خیالات کی منتقلی اور مقناطیسی عمل تنویم (ہپناٹزم) کے علاوہ جسم انسانی اور انسانی نفسیات کے بہت افعال جن کی تہ تک ابھی تک انسان نہیں پہنچا۔

حاسد جدوجہد کرتا ہے اور اپنے اس تاثر کو اس شخص کی طرف بطور شر منتقل کرتا ہے تو ہم اس آثار کی اس منتقلی کا محض اس لیے انکار نہیں کر سکتے کہ ہمارے علم اور ہمارے آلات تجربہ کی رو سے اس انتقال کی کیفیت کو ابھی سمجھ نہیں سکے۔ اس لیے کہ نفس انسانی کے بارے میں ہماری معلومات ابھی تک ابتدائی ہیں اور یہ قلیل علم جو ہمیں حاصل ہوا ہے وہ محض اتفاقی طور پر ہمیں حاصل ہوا ہے۔ اس کو حقیقت کی شکل دینا ابھی تک باقی ہے۔

بہرحال حاسد کا شر ہوتا ہے اور اس سے اللہ کی پناہ مانگنا چاہیے اور اللہ کی حفاظت میں اپنے آپ کو داخل کرنا چاہئے۔ یہ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ وہ اپنے رسول ؐ کو ہدایت فرماتا ہے کہ وہ اللہ کی پناہ میں آئیں اور آپ ؐ کے واسطے سے آپ ؐ کے بعد آنے والی پوری امت کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ بھی اللہ کی پناہ میں آئے۔ جو ہر قسم کے شر سے پناہ گاہ فراہم کرنے والا ہے۔

امام بخاری نے، اپنی سند کے ساتھ، حضرت عائشہ ؓ سے روایت کی ہے کہ حضور اکرم ؐ جب رات بستر پر لیٹتے تو دونوں ہتھیلیوں کو ملا لیتے، پھر ان میں۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱۱۲:۱) --- قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳:۱) --- قُلْ

اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴:۱) پڑھ کر پھونکتے۔ اور پھر پورے جسم پر ہتھیلیوں کو پھیرتے، جہاں تک ممکن ہوتا۔ سر اور چہرے سے شروع کرتے، اور جسم کے سامنے کے حصے پر جس قدر ممکن ہوتا اور یہ عمل آپ ؐ تین بار کرتے۔ (اس حدیث کو اصحاب سنن نے اس طرح روایت کیا ہے)۔

--- ○○○ ---

# فی ظلال القرآن

## جلد ششم

## پارہ --- ۳۰

## سورۃ الناس ۔ ۱۱۴

## ۱-- تا-- ۶

# درس نمبر ۳۱۴ تشریح آیات

## ۱ -- تا -- ۶

سُوْرَۃُ النَّاسِ (۱۱۴) مَكِّيَّةٌ (۲۱)
آیَاتُهَا ۶ رُكُوْعُهَا ۱
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِۙ ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِۙ ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِۙ ﴿۳﴾ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ
ع ٦ الْخَنَّاسِ ۙ ﴿۴﴾ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِۙ ﴿۵﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ ﴿۶﴾
٣٩

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"کہو' میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب' انسانوں کے بادشاہ' انسانوں کے حقیقی معبود کی' اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے' جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے"۔

اس سورت میں پناہ مانگنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ انسانوں کے پروردگار' انسانوں کے بادشاہ' اور انسانوں کے الہٰ کی پناہ گاہ میں پناہ لینے کے اعلان کا حکم ہے اور جس چیز سے پناہ مانگنے کا حکم ہے وہ بار بار وسوسہ ڈالنے والے شیطان کا شر ہے' جو لوگوں کے دلوں تک جا پہنچتا ہے اور وہاں وسوسہ اندازی کا کام کرتا ہے اور جو جنوں سے بھی ہے اور انسانوں سے بھی ہے۔

یہاں رب تعالیٰ کی جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے یعنی رب' بادشاہ' الہٰ اور معبود' یہ وہ صفات ہیں جو بالعموم شر کا دفعیہ کرتی ہیں اور دفعیہ اس شیطان کے شر سے کیا جاتا ہے جو دلوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اور بار بار چھپ کر آتا ہے۔

صفت رب کے معنی ہیں' مربی' نگہبان' حامی' ہدایت دینے والا۔ ملک کی صفت کے معنی ہیں حاکم متصرف' مقتدر۔ الہٰ کے معنی ہیں بلند و برتر' حاوی اور مقتدر اعلیٰ۔ یہ وہ صفات ہیں جن میں شر سے بچانے کا عنصر شامل ہے' وہ شر جو دلوں تک خفیہ انداز سے پہنچ جاتا ہے۔ اور انسان کے بس میں یہ بات نہیں ہوتی کہ وہ اس خفیہ طور پر در آنے والے شر کا دفاع کر سکے۔

اللہ تو سب چیزوں کی پرورش کرنے والا ہے۔ سب کا مالک ہے' سب کا حاکم ہے لیکن یہاں ان صفات کی نسبت الناس کی طرف کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان یہ احساس کریں کہ اللہ کا مقام پناہ اور مقام حفاظت ان کے بہت قریب ہے۔

اور یہ اللہ کا بہت بڑا اکرم ہے کہ وہ اپنے حبیبؐ اور اس کی امت کو اس طرف متوجہ کرتا ہے اور اپنے حظیرہ میں پناہ لینے کی دعوت دیتا ہے۔ اور اس دعوت میں اپنی صفات کی یاد دہانی بھی کراتا ہے کہ شیطان کی بعض ایسی خفیہ کارروائیاں بھی ہیں جن کا دفاع تم رب' الہٰ اور بادشاہ عالمین کی مدد کے سوا نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ شیطان ایسے مقام سے حملہ

آور ہوتا ہے ۔ جس کا تمہیں شعور ہی نہیں ہوتا اور وہ ایسی راہ سے آتا ہے جس راہ سے اس کے آنے کا خیال تک نہیں ہوتا ۔ وسوسہ کے معنی نہایت خفیہ آزار کے ہیں ۔ خنوس کے معنی ہیں واپس ہو کر چھپ جانے کے ہیں اور خناس وہ ہوتا ہے جو یہ عمل ازروئے فطرت بہت زیادہ کرتا ہے ۔ اس آیت میں پہلی صفت کو عمومی انداز دیا گیا ہے ۔

الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ (۱۱۴ : ۴) "جو وسوسہ ڈالتا ہے اور جو بار بار پلٹ کر آتا ہے"۔ البتہ وسواس اور خناس کے کام کو متعین کر دیا گیا ہے ۔ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ (۱۱۴ : ۵) "جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے"۔ اور اس کے بعد اس کی حقیقت کو بھی کھول دیا گیا ہے ۔ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (۱۱۴ : ۶) "وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے"۔ یہ ترتیب گفتگو انسان کو بے حد چوکنا کر دیتی ہے ۔ انسان فوراً متنبہ اور متوجہ ہو جاتا ہے تاکہ وہ معلوم کرے کہ یہ خطرناک کام کرنے والا کون ہے ۔ (کیونکہ آغاز کلام میں اسے عمومی انداز میں بیان کیا گیا ہے )۔ اور یہ اپنے اس خطرناک کام کو کس طرح انجام دیتا ہے ۔ تاکہ وہ اس کی مسلسل نگرانی کرے اور اس کے دفاع میں جدوجہد کرے ۔

جب نفس انسانی 'اس بیداری اور تجسس پر برانگیختہ ہونے کے بعد معلوم کر لیتا ہے کہ یہ وسوسہ اندازی کرنے والا لوگوں کے دلوں میں گھس کر وسوسہ اندازی کرتا ہے اور یہ کام وہ نہایت خفیہ انداز میں اور غیر محسوس طریقے سے کرتا ہے اور پھر جب نفس یہ معلوم کر لیتا ہے کہ یہ جنات میں سے بھی ہے جو ایک خفیہ مخلوق ہے اور یہ انسانوں میں سے بھی ہے جو نہایت خفیہ انداز میں جنوں کی طرح وسوسہ اندازی کرتے ہیں 'جس طرح شیطان کرتا ہے ۔ تو نفس انسانی اس عمل کی مدافعت کے لیے تیار ہو جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کی کمین گاہ 'اس کے مقام حملہ 'اور اس کے انداز حملہ کو اچھی طرح جان چکا ہوتا ہے ۔

جناتی مخلوق کس طرح حملہ آور ہوتی ہے اور وسوسہ اندازی کرتی ہے ۔ اس کے طریقہ کار کو تو ہم اچھی طرح نہیں جانتے ۔ البتہ نفس انسانی پر اس کے آثار اور عملی زندگی میں اس کے نتائج کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ آدم و ابلیس کی کشمکش بہت قدیم ہے ۔ اور انسانیت کے خلاف اس جنگ کا اعلان تو شیطان نے پہلے سے کر رکھا ہے اور یہ اس داعیہ شر کی وجہ سے ہے جو خود اس کی تخلیق میں موجود ہے یعنی تکبر 'حسد اور انسان کے خلاف دشمنی کی وجہ سے ۔ اس سلسلے میں اس نے اللہ سے یہ کام کرنے کی مہلت بھی قدیم سے مانگ رکھی ہے اور اسے دے دی گئی ہے اور یہ اجازت اللہ نے اس حکمت کی بناپر دی ہے جسے صرف اللہ ہی جانتا ہے ۔ لیکن انسان کو بھی اللہ نے اس معرکہ میں ' مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا ہے 'اسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑا ۔ اسے ایمان کی ڈھال فراہم کی گئی ' اسے ذکر الٰہی کا اسلحہ دیا گیا ہے اور اللہ کی پناہ گاہوں میں داخل ہونے کے لیے مضبوط قلعے دیئے گئے ہیں ۔ اگر انسان اپنی ڈھال 'اپنا اسلحہ اور اپنے قلعوں کو نظرانداز کر دے تو یہ اس کی اپنی کوتاہی ہوگی اور وہ خود اس کے نتائج کا ذمہ دار ہوگا ۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے : فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان انسان کے قلب پر چھا جاتا ہے ۔ جب ابن آدم اللہ کو یاد کرتا ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب وہ غافل ہوتا ہے تو پھر وسوسہ اندازی کرتا ہے ۔ (بخاری)

رہے انسان تو ان کی وسوسہ اندازیوں کے بارے میں ہم بہت کچھ جانتے ہیں اور ان کی بعض کارروائیاں تو ایسی ہیں کہ جو شیطان کی وسوسہ اندازی سے بھی زیادہ سخت ہیں ۔

انسان کے ایک برے ساتھی ہی کو لیجئے ۔ یہ اپنے رفیق کے دل میں غفلت کے وقت شرارت کا ایک ذرہ اتار دیتا ہے '

اسے خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ کہاں سے حملہ آور ہوا' یہ بیچارہ اس حملے کا دفاع بھی نہیں کر سکتا کیوں کہ دوست تو محفوظ و مامون ہے۔

ہر بر سر اقتدار شخص کے ساتھ کچھ شیطان حاشیہ نشین لگ جاتے ہیں۔ اور اسے قہار و جبار بنا دیتے ہیں' پھر اس سے فساد فی للارض کراتے ہیں اور وہ نسلوں اور فصلوں کو برباد کرتا چلا جاتا ہے۔

کان بھرنے والے چغل خور لوگ جو نہایت چکنی چپڑی باتوں کرتے ہیں اور نہایت خوبصورت انداز گفتگو ہوتا ہے ان کا۔ یوں لگتا ہے کہ موصوف تو صریح حق گو آدمی ہیں اور اس کی باتوں میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اور وہ لوگ جو شہوات کا ساز و سامان فروخت کرتے ہیں' جو انسانی جبلت کی راہوں سے حملہ آور ہوتے ہیں اور اس قدر شدید اور پرکشش طریقے سے کام کرتے ہیں کہ صرف قلب کی بیداری ہی اس حملے کا دفاع کر سکتی ہے اور صرف اللہ کی معاونت اور مدد ہی بچا سکتی ہے۔

آج دسیوں خفیہ وسوسہ انداز' اپنے دام تزویر پھیلائے انسانیت کی راہ میں بیٹھے ہیں۔ یہ نہایت خفیہ طریقوں سے' نفس انسانی کی خفیہ ترین راہوں سے' جن کو وہ اچھی طرح جانتے ہیں' حملہ آور ہوتے ہیں' یہ لوگ جنی شیطان سے زیادہ خفیہ انداز میں کام کرتے ہیں۔ اور نہایت خفیہ اور غیر محسوس طریقے سے نفس انسانی کے اندر گھس کر وسوسہ ڈالتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ضعیف ہے اور وہ ان عیاروں کی ان چالوں کا دفعیہ نہیں کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ ان کو خبردار کرتا ہے' ان کو مسلح کرتا ہے' ان کو ڈھال اور قلعے فراہم کرتا ہے کہ وہ اس خوفناک جنگ میں مقابلہ کر سکیں۔

یہاں ایک بات قابل توجہ ہے اور اس وسوسہ ڈالنے کی ایک صفت نہایت بامعنی بتائی گئی ہے کہ وہ "الخناس" ہے۔ اس لفظ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ خفیہ طور پر چھپ کر بیٹھتا ہے۔ اور جونہی کوئی موقعہ ملتا ہے۔ خفیہ انداز میں گھس کر وسوسہ اندازی کرتا ہے لیکن یہ لفظ دوسری طرف سے یہ تاثر بھی دیتا ہے کہ یہ نہایت بودے کردار کا مالک ہے۔ اگر دیکھیں کہ شخص چوکنا ہے' اور بیدار ہے' تو یہ چھپ جاتا ہے اور یہ انسانوں میں سے ہو یا جنوں میں سے۔ جب کوئی اس کے مقابلے میں آئے تو یہ جہاں سے آتا ہے ادھر بھاگ جاتا ہے اور چھپ جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اچھی مثال دی ہے اور کیا ہی خوب تصویر کشی ہے۔

فاذا ذکر اللہ خنس و اذا غفل وسوس "جب آدمی اللہ کو یاد کرے تو یہ چھپ جاتا ہے اور جب غافل ہو کر وسوسہ اندازی کرتا ہے"۔ یہ نکتہ انسان کو ایک گونہ قوت فراہم کرتا ہے کہ وہ جرات سے اس خناس کا مقابلہ کر سکے۔ یہ خناس ہے' چھپ کر بھاگتا بھی ہے۔ اور جب کوئی مومن ہتھیار لے کر آتا ہے تو یہ مقابلہ نہیں کر سکتا۔

لیکن دوسری جانب حقیقت واقعہ یہ ہے کہ آدم و ابلیس کا معرکہ ایک طویل معرکہ ہے جو اس دنیا میں ختم نہ ہو گا۔ شیطان قیامت تک چھپ کر اور موقعہ تلاش کر کے حملہ آور ہوتا رہے گا۔ اس لیے اس کے مقابلے میں مسلسل بیداری ضروری ہے۔ صرف ایک دفعہ بیدار ہونا کافی نہیں۔ یہ جنگ جاری ہے اور قرآن نے اس کی مختلف مقامات پر نہایت ہی خوبصورت تصویر کشی کی ہے اور سورہ اسراء (۶۱ تا ۶۵) میں عجیب تر ہے۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا

(۶۱) قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا

قَلِيلًا (٦٢) قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَاؤُكُمْ جَزَاءً مَّوْفُورًا (٦٣) وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا (٦٤) إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ وَكَفَى بِرَبِّكَ وَكِيلًا (٦٥) (١٧:٦١ تا ٦٥) "اور یاد کرو جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو' تو سب نے سجدہ کیا' مگر ابلیس نے نہ کیا' اس نے کہا "کیا میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے"۔ پھر وہ بولا دیکھئے تو سہی کیا یہ اس قابل تھا کہ تو نے اسے مجھ پر فضیلت دی؟ اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے دے تو میں اس کی پوری نسل کی بیخ کنی کر ڈالوں۔ پس تھوڑے ہی لوگ مجھ سے بچ سکیں گے"۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اچھا تو جا' ان میں سے جو بھی تیری پیروی کریں' تجھ سمیت ان سب کے لیے' جہنم ہی بھرپور جزاء ہے۔ تو جس جس کو اپنی دعوت سے پھسلا سکتا ہے' پھسلا لے۔ ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا' مال اور اولاد میں ان کے ساتھ ساجھا لگا۔ اور ان کو وعدوں کے جال میں پھانس --- اور شیطان کے وعدے ایک دھوکے کے سوا کچھ نہیں--- یقیناً میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہو گا اور توکل کے لیے تیرا رب کافی ہے"۔

اس معرکے کی یہ تصویر کشی اور اس کے یہ محرکات' خواہ براہ راست شیطان کی طرف ہو یا اس کے کارندوں کی طرف سے ہو' انسان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس میں انسان کمزور اور مغلوب نہیں ہے۔ انسان کا رب' اس کا بادشاہ اور اس کا حاکم و معبود پوری مخلوق پر حاوی ہے۔ اس نے اگرچہ ابلیس کو اجازت دے دی ہے کہ وہ ابن آدم کے خلاف یہ جنگ جاری رکھے' لیکن یہ شیطان بھی اللہ کے کنٹرول میں ہے۔ اللہ نے اسے صرف ان لوگوں پر غلبہ کا اختیار دیا ہے جو اپنے رب' اپنے بادشاہ اور اپنے معبود سے غافل ہیں لیکن جن لوگوں کے دلوں میں اللہ کی یاد زندہ رہتی ہے وہ شیطان اور اس کی ریشہ دوانیوں سے بچے رہتے ہیں۔ خیر اور بھلائی کو دراصل اس قوت کا سہارا حاصل ہے جس کے سوا قوت کا اور کوئی سرچشمہ نہیں ہے۔ بھلائی کی پشت پر وہ حقیقت ہے جس کے سوا کوئی اور حقیقت نہیں ہے۔ بھلائی کی پشت پر رب' بادشاہ اور الٰہ العالمین کی قوت کا سہارا ہے اور شر کی پشت پر خفیہ طور پر وسوسے ڈالنے والا ڈرپوک شیطان ہے جو چھپ کر کام کرتا ہے۔ سامنا نہیں کر سکتا اور اللہ کے صحیح بندے جو اللہ کی پناہ میں ہوتے ہیں ان کے مقابلے میں وہ شکست کھاتا ہے۔

وہ حقیقت جس پر خیر قائم ہے اور وہ چیز جس کے سہارے شر قائم ہے یہ اس کی بہترین تصویر کشی ہے اور خیر و شر کا یہ بہترین تصور ہے۔ پھر انسان کی ہمت بندھانے اور شر کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ تصور خیر و شر کا بہترین تصور ہے۔ اور انسان کو قوت اعتماد اور اطمینان سے بھر دیتا ہے۔

خدا کا شکر ہے آغاز میں بھی اور آخر میں بھی اسی پر انسان کو اعتماد کرنا چاہئے اور وہی ہے جو توفیق دینے والا ہے۔ وہی ہے جس سے مدد طلب کرنا چاہئے اور وہی ہے جو مدد کرتا ہے۔

---ooo---

(مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۹۵ء' بوقت ۲۰:۱۰ رات سید معروف شاہ شیرازی)

(اختتام کپوزنگ ۱۷ مئی ۱۹۹۷ء بوقت ..: ۳ صبح قارئین سے مترجم اور ناشر "فی ظلال القرآن" کے لئے خصوصی دعاؤں کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور توشہ آخرت بنادے آمین ثم آمین۔ سید عارف شاہ شیرازی)